قسمت کے پھیر میں اُلجھے ایک نوجوان کی داستان

اناڑی

احمد اقبال

1

اناڑی دولہا

قسمت کے پھیر میں اُلجھے ایک نوجوان کی کتھا، حالات اور واقعات کا بہاؤ اُسے دیارِ غیر لے گیا جہاں وہ اناڑی تھا مگر خود کو کسی کھلاڑی سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ ایسا کھلاڑی جسے کسی بساط پر شکست نہیں دی جاسکتی تھی۔ اس کا اناڑی پن اُسے کھلاڑیوں کے مقابل کامیابیاں دلاتا رہا۔ اُسے پردیس راس آ گیا تھا جہاں کی ہنگامہ خیزیاں اس کا دل لبھاتی تھیں مگر دوسری طرف دیس میں اُس کی لاٹری کھل گئی، ایسی لاٹری کہ جس کے بعد اُسے لوٹنا تھا۔ اناڑی سے کھلاڑی بننے کے بعد...... وہ لوٹا...... تو ہنگامے اور شرارتیں اُس کے ساتھ تھیں۔ قدم قدم پر آنسو اور لحہ لحہ قہقہوں سے لبریز اُس اناڑی کی کہانی جس کا دل دو حصوں میں منقسم تھا۔

خوب صورت وگل رنگ جذبوں سے گندھی ایک تیز رفتار کہانی

لندن میں وہ میری آخری صبح تھی۔

اپنے بیڈروم کی کھڑکی کے پردے ہٹا کے میں نے باہر کی دنیا کو دیکھا تو صبح مجھے اداس لگی۔ غم زدہ سورج نے بادلوں کی نقاب میں چہرہ چھپا رکھا تھا۔ بارش کے قطرے آسمان سے ٹپکنے والے آنسو بن گئے تھے۔ ٹریفک کا سیل رواں ایک سوگوار خاموشی کے ساتھ گزر رہا تھا۔ افسردہ چہروں والے لندن کے باسی سرگوشی میں باتیں کرتے اور افسوس سے سر ہلاتے نظر آتے تھے۔

سارا لندن گویا سوگ میں ڈوبا ہوا تھا کیونکہ اس بار میں واقعی واپس جا رہا تھا۔ مجھے جانا پڑ رہا تھا۔

حقیقت کا اس منظرنامے سے کوئی تعلق نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا۔ یہ صرف میرے احساس کا کرشمہ تھا کہ ساری کائنات پر مجھے اداسی پھیلی نظر آ رہی تھی۔ ورنہ کیا فرق پڑتا ہے کسی کو کہ جناب آپ لندن سے واپس تشریف لے جا رہے ہیں یا اس عالم فانی سے رخصت ہو رہے ہیں۔ میں نے حقیقت پسندانہ انداز میں سوچنے کی کوشش کی۔ بقول شاعر ترک دنیا کا سماں ختم ملاقات کا وقت اور بے وفائی کی گھڑی۔ یہ سب ملول کرنے والے تجربات تو ہر شخص کی زندگی میں ایسے ہی آتے ہیں۔

پھر بھی کیا حرج تھا' میں نے کافی بنانے کے لیے کیتلی کا پلگ لگاتے ہوئے آہ بھری۔ اگر آج میرے اعزاز میں کوئی الوداعی تقریب ہوتی۔ لندن کے شہری مجھے سپاسنامہ پیش کرتے کہ چھ سال قیام فرما کے آپ نے ہماری سات پشتوں پر احسان کیا۔ برطانوی اخبارات اداریوں میں مجھے خراجِ تحسین پیش کرتے' بکنگھم پیلس پر پرچم سرنگوں ہوتا۔ مگر یہاں تو کسی کو پروا بھی نہیں۔

کافی ختم ہونے تک قنوطیت کے جذبات کا یہ ریلا گزر گیا تو میں نے خود کو قائل کرنے کے لیے اپنی مراجعت کے مثبت پہلوؤں پر غور کیا۔ مجھے تو خوش ہونا چاہیے کہ میری جلاوطنی کا زمانہ ختم ہوا۔ میں پاکستان جا رہا ہوں جو میرا وطن ہے۔ جہاں میرا گھر ہے اور میرے والدین ہیں اور وہ سب ہیں جو مجھ سے چاہت کا رشتہ رکھتے ہیں۔ لعنت اس گوری چمڑی والوں کے دیس پر جہاں نسلی تعصب ہے اور منافرت ہے۔ اپنے مستقبل سے ناامیدی آخر کیوں؟ زندگی کے سفر میں بہت سی خوشیاں اور کامرانیاں بھی آئیں گی۔ اجلے خوابوں والے روشن دن بھی ملیں گے۔ دلدار راتوں میں حسین چہروں کا مہرباں اجالا وہاں بھی ہوگا۔

مگر خوشی پر مجھے اختیار حاصل نہ تھا۔

یوں لگتا تھا جیسے چھ سال کے لیے مجھے پیرول پر عارضی رہائی عطا کی گئی تھی کہ جاؤ' دنیا کی جتنی خوبصورتی کو اپنے احساس میں سمیٹ سکتے ہو' سمیٹ لو۔ مسرتوں کے جتنے خوابوں کو سچ کر سکتے ہو کرلو۔ لوٹ کر تو تمہیں پھر وہیں آنا ہے جہاں سے چلے تھے کیونکہ دنیا گول ہے۔ چھانگا مانگا یا چیچوں کی ملیاں سے ناک کی سیدھ میں سفر کرتے ہوئے تم لندن' پیرس سے گزر دیا نیویارک اور ٹوکیو سے' پہنچو گے پھر وہیں' جتھے دی کھوتی او تھے آن کھلوتی۔

یہ چھ سال کیسے پلک جھپکتے بیت گئے۔ میں نے ایک اور ٹھنڈی سانس لے کر سوچا۔ بے فکری اور آزادی کے کیسے ہنگامہ پرور شب و روز تھے' کیا خوبصورت اور خواب صورت زمانہ تھا۔ حسن و رعنائی اور کیف و طرب کے کیسے کیسے عنوان تھے۔

مایوسی کے تاریک پردے پر عہد رفتہ کا ہر شوخ لمحہ' ہر نظر نواز چہرہ اور ہر یاد کا رنگین نقش کسی تصویر کی طرح روشن ہوتا تھا اور اپنی آخری جھلک دکھا کے رخصت طلب کرتا تھا کہ رفیق صاحب! یہاں کتاب زندگی کا ایک دلچسپ باب ختم ہوا۔

دروازے پر دستک ہوئی اور جوزف اندر آ گیا۔ پاکستان میں وہ محمد یوسف صدیقی تھا۔ جب ہم نے ایک ساتھ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بہانے پاکستان سے روانگی اختیار کی تو وہ ایم وائی صدیقی ہو گیا تھا مگر امریکا میں اسے جوزف بنا دیا گیا تو اس نے قطعی اعتراض نہیں کیا۔

اس نے اپنی بھیگی ہوئی برساتی اتار کے بڑی بدتمیزی سے صوفے پر ڈالی' اوورکوٹ کو بیڈ پر پھینکنے کے بعد اس نے ہیٹر کے سامنے ہاتھوں کو گھماتے ہوئے کہا "فیکے پتر! کیا حال ہے تیرا؟"

میں نے کہا "تو نیویارک سے کب آیا؟"

"بس ابھی ایرپورٹ سے سیدھا آ رہا ہوں۔ سوچا تیرے جنازے کو ایرپورٹ تک کندھا دے دوں۔ تیری صورت سے تو واقعی لگتا ہے کہ تجھ پر نزع کا عالم طاری ہے۔"

میں نے کہا "ایسی تو کوئی بات نہیں۔ بس مجھے رات بھر نیند نہیں آئی۔"

اس نے ہمدردی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا "یار! ابھی وقت ہے' ہمت سے کام لے اور خودکشی کر لے میرے سامنے۔"

"بکواس مت کر۔ یہ بتا' ناشتا کیا ہے تو نے؟"

"یار! کیا تو تھا...... مگر میں اسے بھول جاتا ہوں' تیرے ساتھ الوداعی ناشتا کرنا میری اخلاقی ذمے داری ہے۔ میں نے تیری خالہ سے بھی کہہ دیا تھا۔"

خالہ وہ مارتھا کو کہتا تھا جو میری لینڈ لیڈی تھی۔ جب ہم نیچے پہنچے تو وہ موجود نہیں تھی۔ باقی لوگ بھی اپنے اپنے کام سے جا چکے تھے۔ ناشتا مجھے خود بنانا پڑا۔

"کل سے تیری پھر وہی زندگی ہو گی" یوسف ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔

"زندگی......! میرے لیے وہ عمر قید کی باقی سزا ہے۔"

"اور ایسا صرف اس لیے ہے کہ تو بزدل ہے۔ تجھ میں ہمت نہیں ہے کچھ کرنے کی۔"

میں نے انڈے پر وار کرنے سے پہلے چھری کو شمشیر آبدار کی طرح لہرایا

"یار! میں کیا کروں......؟"

"پھر وہی فضول سوال...... اے انکار کر دے۔ بغاوت کر دے ان سارے بزرگوں کے خلاف جو زبردستی تیرے اخلاق و کردار کے ٹھیکے دار بنے بیٹھے ہیں۔ جو گزشتہ صدی کی روایات اور وضع داری کا بوجھ اب تجھ پر لادنا چاہتے ہیں۔ اب بھی وقت ہے' ان سے صاف کہہ دے کہ میں بالکل ہی بھٹک گیا ہوں صراط مستقیم سے۔ اپنی عاقبت خراب کر چکا ہوں۔ بہتر ہے آپ لوگ مجھے بھول جائیں۔ توڑ دے ساری غلامی کی زنجیریں۔ بھاگ جا بچے! کیا ہو گا زیادہ سے زیادہ' ناخلف کہلائے گا؟"

میں نے ناشتا میز پر رکھا اور اس کے سامنے بیٹھ گیا "دیکھ یار! تو یہ سب پہلے بھی کہہ چکا ہے اور میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ یہ بزدلی نہیں مجبوری ہے۔ تو اپنے حالات کا موازنہ میرے حالات سے کیوں کرتا ہے؟ ایک تو تیرا گھرانا تعلیم یافتہ ہی نہیں روشن خیال بھی ہے۔ میرے خاندان میں قدامت پرستی کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ پھر تو اپنے والدین کی اکلوتی اولاد نہیں ہے۔ تیرے دو بھائی تجھ سے پہلے باہر جا کے سیٹل ہو چکے تھے۔ ایک آسٹریلیا میں تھا دوسرا کینیڈا میں۔ جب تو امریکا گیا تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں سمجھی گئی۔ لاہور میں تیرے دو بھائی فیملی بزنس کو چلا رہے ہیں اور سب ٹھیک ہے۔ نہ کوئی معاشی مسئلہ ہے نہ جذباتی۔"

"نہیں' تو ایک بات بتا مجھے...... کیا ہو گا اگر تو نہ گیا......؟ کیا وہ تجھے اٹھا کے لے جائیں گے؟"

میں نے کہا "بالکل ایسا ہی ہو گا۔ خاندانی پولیس فورس کی سربراہ ہے میری دادی۔ وہ کہے گی کہ تم سب ٹھہرو' میں خود جا کے لاتی ہوں اس نمونے کو۔ اور وہ سچ مچ آ جائے گی۔ اپنا آلہ سماعت وہیں چھوڑ دے گی تاکہ میری ایک نہ سنے۔"

"اور تجھے کان سے پکڑ کے لے جائے گی...... کسی معصوم میمنے کی طرح؟" تو اس نے افسوس سے سر ہلایا۔

میں نے کہا "ہاں' تجھے یاد نہیں' جب ہم نے ایک ساتھ پڑھنے کے لیے امریکا جانے کا پروگرام بنایا تھا تو کیا ہوا تھا؟"

اس نے سر ہلایا اور جوتوں سمیت اپنے پیر دوسری کرسی پر رکھ کے بیٹھ گیا "وہ تو یاد ہے مجھے۔"

"اپنے پیر نیچے رکھ۔ مارتھا آ گئی تو ایسی بے عزتی کرے گی۔"

اس نے بے پروائی سے کہا "آدمی محسوس نہ کرے تو کوئی بے عزتی نہیں ہوتی۔ اپنا تو یہی اصول ہے۔ جب وہ دس منٹ بک بک کرلے گی تو میں مسکرا کے دس سیکنڈ میں پیر ہٹا لوں گا۔ خیر' تو یہ بتا کہ تو کرے گا کیا وہاں جا کے؟"

میں نے تلخی سے کہا "اپنی ہارورڈ کی ڈگری کو لگا دوں گا اس فائل میں جس میں میٹرک سے ایم اے تک کی اسناد اور میرے اسکول کالج سے یونیورسٹی کے زمانے تک شاندار کارکردگی پر ملنے والے سارے سرٹیفکیٹ لگے ہوئے ہیں۔ پھر اس فائل کو گوٹے کناروں والے کسی مخملیں غلاف میں لپیٹ کر طاق پر رکھ دوں گا۔ جیسے ہم قرآن کو رکھتے ہیں۔ بڑی عزت احترام کے ساتھ۔ مگر عملی زندگی میں اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے۔ نہ دنیا میں نہ آخرت میں۔"

"آخر اچانک ایسی کیا بات ہو گئی؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "کچھ پتا نہیں۔ جب انہوں نے مجھے پڑھنے کے لیے امریکا بھیجا تھا تو میرے سامنے کچھ اور مقاصد تھے۔ اگر وہ مجبور نہ ہوتے تو میری ہر دلیل رائیگاں جاتی۔ اس وقت مجھے اور میرے مستقبل کو محفوظ بنانے کا انہیں اور کوئی راستہ نظر نہ آیا۔ اس لیے وہ مان گئے تھے۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد جب میں نے انہیں بتایا کہ مجھے لندن سے بڑی اچھی آفر ملی ہے تو انہوں نے کہا کہ بھئی' اس بارے میں صحیح فیصلہ تم خود ہی کر سکتے ہو۔ یہ بات تجھ سے بہتر کون جانتا ہے کہ امریکا چھوڑ کے میں لندن کیوں آیا تھا' جبکہ مواقع وہاں زیادہ اچھے تھے۔"

"مگر فریال یہاں تھی...... تیرے فیصلے میں دماغ کو نہیں' دل کو فوقیت حاصل تھی۔"

"اس وقت ابا کے خیالات کچھ اور تھے۔ وہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ پاکستان میں ترقی کے مواقع بہت محدود ہیں۔ بڑے بڑے قابل لوگ اس کرپٹ نظام میں ترقی کا مطلب

سمجھ لیتے ہیں دولت مندی' اور کام صرف ایک قابل عزت مانا جاتا ہے' پیسا کمانا۔ اور پیسے کا اخلاقیات سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ اس لیے بہتر ہے کہ جہاں قابلیت کی قدر کے مطابق پیسا ملے وہیں کام کرو۔"

"اب ان کے نظریات بدل گئے ہیں؟"

"ایسا ہی لگتا ہے۔ پتا نہیں وہ کیا سوچ رہے ہیں میرے لیے؟"

یوسف نے کہا "یار! اچھا ہی سوچ رہے ہوں گے۔ کیا پتا تجھے سیاسی لیڈر بنانا چاہتے ہوں۔ بہت جلد وہ وقت آنے والا ہے دوست...... کہ وزیراعظم کے عہدے کے لیے امیدوار نہیں ملے گا' جس سے کہا جائے گا وہ ہاتھ جوڑے گا کہ مجھے تو معاف کرو۔ اللہ نے سب کچھ دے رکھا ہے' اپنی عزت اور جان و مال کو داؤ پر لگانے کی کیا ضرورت ہے مجھے۔ تیرا کیا اندازہ ہے آخر؟"

"وہ ایک شاندار مستقبل کے بجائے مجھے ایک شاندار ماضی کی طرف لے جانا چاہتے ہیں" میں نے تلخی سے کہا۔

یوسف ہنسنے لگا "ابے تمہارا کون سا شاندار ماضی تھا خاندانِ غلاماں کے ہونہار سپوت۔ آباؤاجداد سب انگریز کے غلام تھے اور جورو کے غلام تھے۔ یہ تو نے خود بتایا ہے کئی بار۔"

میں نے کہا "یار! ہماری خاندانی تاریخ بدل گئی ہے۔"

"یہ ہو رہا ہے دنیا میں فیکے پتر! ہر جگہ تاریخ ازسرنو لکھی جا رہی ہے۔ لکھوائی جا رہی ہے۔"

"تاریخ ہمیشہ لکھوائی جاتی ہے۔"

"اب کیا ثابت ہوا ہے...... یہ کہ تم خاندانی مغل ہو...... پدرم سلطان بود۔ یا یہ کہ اکبر بادشاہ کا درباری مسخرا ملا دو پیازہ تیرا لکڑ بگڑ دادا تھا......؟"

میں نے کہا "معلوم یہ ہوا ہے کہ ہماری ایک جدی پشتی محل نما حویلی تھی...... اور خاصی بڑی جاگیر۔ انیسویں صدی کے آخر میں میرے ابا کے پردادا اس کے پہلے مالک تھے۔"

وہ سیدھا ہو کے بیٹھ گیا "ویری انٹرسٹنگ...... تیرے ابا کے پردادا نے یقیناً غداری کا انعام پایا ہو گا۔ فرنگی آقاؤں سے۔ بڑے شرم کی بات ہے تیرے لیے۔"

میں نے اپنی خودی کو بلند رکھا "الو کے پٹھے! یہ جو ہمارے پیارے وطن اسلامی جمہوریہ پاکستان کے سیاسی وڈیرے ہیں' جو آج اسمبلی میں اور سینیٹ میں بیٹھے ہیں۔ یہ ایسے ہی لوگوں کی اولادیں نہیں ہیں کیا...... خان بہادر' رائے بہادر اور سر کے خطابات کسے ملتے تھے؟ انہی کی حکومت ہے

آج بھی۔"

"او کے ...... او کے! اچانک کلرکی کرنے والوں کے طبقے سے نکل کر تو اشرافیہ میں شامل ہوگیا ہے۔ میں مان لیتا ہوں ...... مگر یہ سب کیسے ہوا؟"

"اس میں تو کوئی شک نہیں کہ ہمارا تعلق ہوتا کسی شاہی خاندان سے تو ہمارے پاس ہوتا ایک شجرۂ نسب جسے ہمارے بزرگ بڑے غرور سے گلے میں لٹکائے پھرتے۔ ہم تو کسی علاقے کے صوبے دار وغیرہ بھی نہیں تھے اور نہ کوتوال۔ کبھی ذکر بھی نہیں ہوا میرے سامنے۔"

"یہی تو میں پوچھ رہا ہوں۔ اچانک یہ خاندانی حویلی اور جاگیر کہاں سے آگئی۔ اب تک کہاں تھی ......؟"

"تھی تو وہیں جہاں ہے۔ ملتان اور لاہور کے درمیان کوئی جگہ ہے' ست بدھائی۔ اب مجھ سے یہ مت پوچھنا کہ پانچ دریا تھے تو پنجاب بنا ...... ست بدھائی کیسے بنا؟"

یوسف نے کسی دانش ور کی طرح سر ہلایا "میں فرض کرسکتا ہوں کہ وہاں سات بھائی ہوں گے۔ ان کی بیویاں سات بہنیں ہوں گی اور ان سب کے سات سات بچے ہوئے تو سب نے سات سات بار بدھائی دی یعنی مبارک باد۔"

"بجا ارشاد ...... صحیح لوکیشن کا مجھے کوئی علم نہیں کیونکہ دیکھنا تو دور کی بات ہے' میں نے کبھی اس جگہ کے بارے میں کسی خاندانی مؤرخ سے کچھ سنا بھی نہیں تھا۔ تو خالو عنایت کو جانتا ہے؟"

"ہاں ...... جو آلو عنایت کہلاتے ہیں حالانکہ صرف ان کا سر آلو جیسا ہے۔"

"ابا نے تو کہا کہ جب تم آؤ گے تو پھر تفصیل سے بات ہوگی۔ خالو عنایت سے ایک دن فون پر بات ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ میاں' اب نوکری کریں تمہارے دشمن۔ واپس آ کے اپنا راج پاٹ سنبھالو۔ میں نے کریدا تو انہوں نے تاریخ پر اپنی تحقیق کا خلاصہ یوں پیش کیا کہ اس حویلی اور جاگیر پر پہلے دو بھائیوں کے درمیان عداوت ہوئی اور قانونی جنگ چلتی رہی۔ پھر ایک ہار گیا اور دوسرے کو ہارنے والوں نے جنت الفردوس میں جگہ دلوادی۔ وہ حج کی سعادت حاصل کر کے بحری جہاز سے بمبئی آ رہے تھے کہ سمندر میں گر گئے۔ نہ کہیں جنازہ اٹھا نہ کوئی مزار بنا۔ اب ہارنے والا قانونی وارث ٹھہرا کیونکہ حاجی صاحب بے اولاد تھے اور اس کی ذمے داری تین بیویوں پر عائد کرتے تھے جن کو وہ طلاق دے چکے تھے۔ خیر و عافیت سے لوٹ آتے تو چوتھی تلاش کرتے۔ پھر غالباً میرے پردادا اور ان کے بھائی کی اسٹوری ہے۔ تین چار نسلوں میں پھر وراثت کی جنگ چلی۔ اب خاندانی روایت میں یہ بھی شامل ہے کہ کسی نے اولاد پیدا کی تو زیادہ سے زیادہ ایک۔ مثلاً یہ ناچیز جو اپنے والدین کی اکلوتی اولاد ہے۔"

یوسف نے سر کھجایا "یار! وہ جو تیرا بڑا بھائی تھا ...... مرحوم ......"

میں نے کہا "وہ الگ کہانی ہے۔ یہ سمجھ لے کہ وہ میرا سگا بھائی نہیں تھا۔ مجھے بھی یہ بات اس کی وفات کے بعد پتا چلی۔ وہ زندہ رہتا تو شاید مجھے کوئی نہ بتاتا۔ میرے دادا پردادا کے ساتھ بھی یہی ہوا کہ کبھی کسی کی اولاد نہیں تھی یا ایک بیٹا تھا تو مر گیا ...... اور معلوم نہیں کیا ہوا کیسے ہوا کہ اچانک اس جاگیر اور حویلی کا کوئی وارث نہیں بچا۔ کسی دعوے کے بغیر ابا اس کے مالک قرار دے گئے۔"

"ابے واہ ...... اناڑی نکل آئی تیری تو ...... مالیت کیا ہوگی اس پراپرٹی کی؟ مجھے سخت حسد محسوس ہو رہا ہے۔"

"مجھے کیا معلوم یار! مجھے تو یہ سوچ سوچ کے وحشت ہو رہی ہے کہ آخر مجھے لندن سے واپس کیوں بلایا گیا ہے؟"

"یار! عیش کرنے کے لیے اور کس لیے ...... حویلی اور جاگیر جس کے پاس ہو وہ کہلاتا ہے جاگیردار یا وڈیرا۔ کام کرتی ہے اس کی رعیت۔ اس کے کھیتوں میں اصطبل اور باغات میں' وہ اعلیٰ نسل کے گھوڑے' ڈاکو اور کتے پالتا ہے۔ شکار کرتا ہے' غریب ہاریوں کی بہو بیٹیوں کی عزت سے کھیلتا ہے۔ الیکشن لڑتا ہے' اتنے کام ہیں ......"

"ابے ہم مڈل کلاس ذہنیت والے لوگ ...... شرافت اور اخلاقی قدروں کا بوجھ لاد کر پھرنے والے ...... ہم کچھ نہیں کرسکتے۔ تین نسلوں نے شہروں میں زندگی گزاری۔ ہم نے گاؤں دیہات صرف فلموں میں دیکھے ہیں۔ ہمارا اعلیٰ ترین خواب رہا ہے سول سروس۔ ہم بیوروکریٹ بننے کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ کاروبار کی سوجھے تو زیادہ سے زیادہ ایک بہت بڑا جنرل اسٹور ہوتا ہے ہمارے ذہن میں۔ ہم صنعت کاروں کی صف میں شامل ہونے کی ہمت نہیں رکھتے۔"

"تو ہمت کر۔"

میں نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا "اس فرسودہ روایات دقیانوسی خیالات اور قدامت پرستی کی زنجیروں سے جکڑے ہوئے خاندان میں رہ کے کوئی کیا کرسکتا ہے۔ ڈیری فارمنگ آج کل ایک صنعت ہے۔ دادی اماں واویلا مچا دیں گی کہ ہائے ہائے' ولایت میں پڑھ کے یہاں دودھ بیچے گا؟

ارے' یہ تو گوجروں کا کام ہے۔ پولٹری فارم یا فش فارم کا مطلب ہے مرغیاں بیچنا اور مچھلی بیچنے والے تو ہوتے ہیں مچھیرے۔ ہم تو اشراف ہیں۔ دادا کی روح فوراً تڑپ کر قبر سے نکلے گی اور وہ خواب میں آ کے دادی کے سامنے دہائی دیں گے۔ ورنہ تو جانتا ہے' آج کل کریڈٹ فنانسنگ کا دور ہے۔ انوسٹمنٹ کے لیے ہر بینک لون دینے پر تیار ہوگا۔ مگر ہم قرض لیں اور وہ بھی سود پر ......؟ توبہ توبہ ...... چچا کے فتوے کے آگے کس کی چل سکتی ہے۔ ہوگا بالآخر یہی کہ زمین اور حویلی وغیرہ سب کو فروخت کر دیا جائے گا۔ کوٹھیاں بنیں گی اور کاریں آئیں گی۔ عورتیں خوب زیور پہنیں گی' شادیوں پر لاکھوں لٹائے جائیں گے۔"

"یار! پھر تو نوکری چھوڑ کے مت جا۔ پہلے جا کے دیکھ کہ سب لوگوں نے کیا سوچا ہے؟"

"میں کوئی پاگل ہوں یار! کہ ان کی باتوں میں آ جاؤں اور ہمیشہ کے لیے بوریا بستر سمیٹ کر چلا جاؤں۔ میں ایک مہینے کے لیے جا رہا ہوں۔ ارادہ تو یہی ہے کہ اس کے بعد واپس آ جاؤں گا مگر سچی بات یہ ہے کہ ابا سے بات کرنے کے بعد مجھے اپنے ارادے پر اعتبار بہت کم ہے۔"

"کچھ بتا تو سہی ان سے بات کیا ہوئی تھی؟"

میں نے کہا "چل باہر کہیں لنچ کرتے ہیں۔ باتیں بھی کریں گے' رات کو میں نے فریال کو بلایا ہے ڈنر کے لیے۔"

"پھر وہی فریال ......! ابے کیوں دشمن ہوا ہے اپنی جان کا۔ عقل کے دشمن' جان چھڑا اس سے مجنوں کے بچے! ورنہ کہیں کا نہیں رہے گا۔ وہ صحرا کی خاک چھاننے اور دودھ کی نہر نکالنے والا صدیوں پرانا عشق اب کون کرتا ہے؟ یہ اکیسویں صدی ہے نیکے پتر! سپر کمپیوٹرز اور سیٹلائٹ کمیونی کیشن۔ پاپ میوزک اور فاسٹ فوڈ کا زمانہ ہے۔ شارٹ ٹرم کنٹریکٹ پر تعلق رکھتے ہیں پیار کرنے والے۔ ایک ہفتے' ایک مہینے یا زیادہ سے زیادہ سال بھر کے لیے ......" وہ سارا راستہ بولتا گیا۔

میں اس سے کیا کہتا ...... یہ اس کی سمجھ میں آنے والی بات ہی نہیں تھی۔

☆☆☆

مجھے واپس بلانے کی تحریک کا آغاز صوفی چچا نے کیا۔ نام تو ان کا نذیر احمد تھا' جوانی میں بڑے انقلابی اور دل پھینک قسم کے نوجوان تھے۔ دادی ان کے کارناموں کو "کرتوت" کے نام سے نشر کرتی تھیں تو بہت جز بز ہوتے تھے۔ ایک بار اندرون بھاٹی گیٹ کسی سے دل لگا بیٹھے' کچھ دن چوری چھپے پیار کا کھیل چلا۔ کچھ خط کتابت بھی ہوئی۔ پھر راز فاش ہوگیا اور ظالم سماج کی دیوار بیچ میں آ گئی۔ ملاقات تو کیا اس کی دید کو بھی ترس گئے تو عین اس کے گھر کے سامنے والے گھر میں کسی سے دوستی کی۔ پرانے شہر کی پتلی پتلی گلیاں تھیں۔ اوپر چوبارے اتنے آگے بڑھے ہوئے تھے کہ درمیانی فاصلہ چھ آٹھ فٹ اور کہیں اس سے بھی کم رہ جاتا تھا۔ انہوں نے تیسری منزل کی ایک کھڑکی سے براہِ راست محبوبۂ دلنواز کی خواب گاہ تک فلائی اوور بنانے کا سوچا۔ دس فٹ لمبا اور دو فٹ چوڑا تختہ اپنی کھڑکی سے سامنے والی کھڑکی تک لگایا۔ تختہ دونوں طرف کی چوکھٹ پر بڑی مہارت سے سیٹ کیا۔ سرکس کے بازیگر کی طرح جان ہتھیلی پر رکھ کے اس پل صراط پر سے گزرے اور رات کے آخری پہر میں شادماں و کامراں لوٹ آئے۔ جہاں چاہ ہے وہاں راہ ہے۔ زمین پر راستے بند کرنے والے فضائی رابطے کا تصور بھی نہ کرسکتے تھے۔ اسی راستے سے لڑکی کو نکالنے اور دنیا کی نظروں میں دھول جھونک کر فرار ہونے کا پلان فائنل تھا مگر لڑکی پر اس پل کو پار کرنے کے تصور ہی سے لرزہ طاری ہو جاتا تھا۔ چچا اس کا حوصلہ بلند کرنے میں ناکام رہے مگر عشق میں ناکامی ان کو منظور نہ تھی۔ وہ فرہاد جیسے انجینئر نہ تھے کہ دودھ کی نہر نکال لی اور پھر تیشہ مار کے خودکشی فرمالی۔ انہوں نے مسئلے کے مختلف حل تجویز کیے جس میں ایک یہ بھی تھا کہ ان کی محبوبہ اپنی کمر میں ایک رسی باندھ لے اور پل پر چل پڑے۔ رسی کا دوسرا کنارہ چچا کے ہاتھ میں ہوگا۔ وہ اسے یوں کھینچ لیں گے جیسے ڈور سے بندھی پتنگ کو اتارتے تھے۔ خدانخواستہ اس کے قدم دو فٹ چل کے لڑکھڑا گئے تب بھی وہ نیچے نہیں گرے گی۔ چھ فٹ پر معلق ہو جائے گی اور چچا اسے اوپر اٹھالیں گے۔ لڑکی پھر بھی ڈرتی رہی تو انہوں نے پل کے دونوں جانب رسی کی ریلنگ باندھنے کا فیصلہ کیا۔ ظاہر ہے یہ خاصا محفوظ طریقہ تھا۔ لڑکی نے اس کی منظوری دے دی مگر قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ شب فرار سے ایک روز قبل وہ صبح دم محبت سے بھرپور مستقبل کے پلان کو حتمی شکل دے کر مراجعت فرما رہے تھے کہ تختہ درمیان سے ٹوٹ گیا۔ چچا خلا میں ٹانگیں چلاتے بیس فٹ کی بلندی سے محبوبہ کے ابا پر یوں گرے جیسے پیراشوٹ سے جمپ لگانے والا شومئی قسمت سے دشمن کی توپ پر جا اترے۔ مذکورہ ابا نماز فجر مسجد میں ادا کرنے کے لیے عین اسی وقت گھر کے صدر دروازے سے برآمد ہوا تھا۔ بس ٹائمنگ ایسی ہوگئی کہ چچا کی ٹانگ ٹوٹی۔ جو راہِ عشق میں کوئی عظیم قربانی نہ تھی لیکن اس کے ابا کی دو پسلیاں ٹوٹنے کو

اس کے سوا کیا کہا جا سکتا تھا کہ وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔

ایسے ہی کسی خانۂ خراب عشق میں چچا تارک الدنیا ہوئے۔ دلیپ کمار کی طرح ماتھے پر گرنے والے بال کسی روڈ سائیڈ ہیئر اسٹائلسٹ سے صاف کرا دیے۔ شوخ رنگ شرٹس اور بیل باٹم پتلونوں کا اسٹاک کوڑیوں کے مول نیلام کر دیا۔ کھدر کا کرتا اور شرعی سائز کا ٹخنوں سے اونچا پاجامہ پہن کے داڑھی بڑھانے کے لیے وہ ہیئر ٹانک منہ پر ملنے لگے جو بالوں میں لگاتے تھے۔ فی زمانہ ان کی ایک بالشت سے بھی زیادہ لمبی لہلہاتی گولڈن داڑھی تھی۔ وہ مہندی نہ لگاتے تو اجلی سفید ہوتی اور وہ سانتا کلاز نظر آتے۔ ان کی صورت جڑواں بھائی کی طرح ملتی تھی۔

میں انہیں صوفی چچا کہتا تھا۔ وہ ایک کوالیفائیڈ پیر تھے۔ دادی کے معاملے میں یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ دروغ بر گردن راوی۔ وہ ہمیشہ سچ بولتی تھیں۔ ایک دن وہ صوفی چچا سے کسی بات پر اتنی خفا تھیں کہ انہوں نے صوفی چچا کے ظاہر و باطن کے انقلاب کے اصل حقائق بھی جاری کر دیے۔ اس وائٹ پیپر کے مطابق چچا کو انہی جیسے کسی گرو گھنٹال نے خوار کیا تھا۔ اس کے اشتہارات شہر کی ہر دیواروں پر تھے کہ ''محبوب آپ کے قدموں میں'' اس نے نقش اور تعویذ وغیرہ کے نام پر چچا کو خوب لوٹا اور بالآخر کوئی وظیفہ بتا دیا کہ فلاں قبرستان میں چالیس رات ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کے کرنا ہے یا پتا نہیں سر کے بل کھڑے رہ کر۔ چچا چلہ کاٹ کے لوٹے تو حلیہ بدلا ہوا تھا۔ جب یہ روح فرسا اطلاع ملی کہ جس کی خاطر سارے پاپڑ بیلے تھے' وہ تو دو ہفتے ہوئے پیا کے گھر سدھار گئی تو چچا کی نگاہوں میں دنیا تیرہ و تار ہو گئی۔ خنجر آبدار لے کر وظیفہ بتانے والے پیر کو قتل کرنے نکلے تو گھر کے ایک ملازم نے قدم پکڑ لیے۔ اس کا نام محبوب تھا۔ چچا کو غلطی کا احساس ہوا۔ محبوب واقعی ان کے قدموں میں تھا۔ پیر و مرشد برحق تھے۔ یہ دعویٰ انہوں نے کیا ہی نہیں تھا کہ محبوبہ آپ کے قدموں میں۔ شاید خواتین کے دل کی مراد بر آتی ہو۔

چچا کی دنیا تو بدل گئی تھی۔ حلیہ بھی بدل گیا تھا۔ انہوں نے پیشہ بھی بدل لیا۔ پہلے خدمت خلق کے ایک محکمے میں کلرک تھے' رشوت ہن کی طرح برستی تھی۔ جب چلہ کاٹ رہے تھے تو کچھ عقل کے اندھوں نے ان کی ریاضت دیکھی۔ کسی کو کیا معلوم وہ ایک لڑکی کے چکر میں یہ سب کر رہے ہیں۔ لوگ مرادیں اور نذرانے لے کر حاضر ہونے لگے۔ چلہ پورا ہونے تک خاصی شہرت ہو گئی۔ انہیں اندازہ ہوا کہ کام دلچسپ' آسان اور نوکری سے زیادہ فائدہ مند ہے۔

اب ان کے آستانۂ مبارک پر عقیدت مندوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ عزت' دولت' شہرت کی کمی نہ تھی۔ اب وہ سچ مچ خود کو پیر سمجھنے لگے تھے مگر خاندان والے حقیقت جانتے تھے۔ وہ خاطر میں نہیں لاتے تھے۔

سب سے پہلے ان کا فون موصول ہوا۔ ''بھتیجے' گزشتہ رات ہم نے ایک بہت برا خواب دیکھا۔''

میں نے کہا ''صوفی چچا! کیا نیلا خواب تھا؟''

انہوں نے گڑبڑا کے کہا ''نیلا خواب... یعنی...؟''

میں نے کہا ''میرا مطلب... کوئی مخرب اخلاق مناظر والا خواب تھا تو... مجھے شرم آتی ہے۔''

انہوں نے بڑی خفگی کا اظہار کیا ''لاحول ولا قوۃ۔ خواب میں پیر و مرشد تشریف لائے تھے۔''

''یہ تو واقعی برا خواب تھا۔ وہی ہوں گے جن کو دادی کہتی ہیں گرو گھنٹال۔''

''بھتیجے۔ تمہاری عاقبت ہمیں تم سے زیادہ عزیز ہے۔ اس لیے تمہاری گستاخی کو درگزر کرتے ہیں۔ پیر و مرشد نے فرمایا کہ نذیر! سات سمندر پار لحم خنزیر اور ام الخبائث کو حلال سمجھنے والے فرنگی کافروں کے ملک میں ایک نجیب الطرفین فرزند اسلام کے قلب کو منور رکھنے والی ایمان کی روشنی پر الحاد و گمراہی کی تاریکی غالب آ رہی ہے۔''

میں نے گھبرا کے کہا ''صوفی چچا! آپ کے پیر و مرشد یہ بات اردو میں کہتے تو شاید میری سمجھ میں آتی۔''

انہوں نے کہا ''نامعقول! یہ اردو نہیں تو کیا فرنچ ہے؟''

اس کے بعد انہوں نے سخت تشویش کے ساتھ تفتیش کی اور مجھ سے بیان حلفی لیا کہ میں روم میں وہ سب نہیں کرتا جو رومن کرتے ہیں۔ اور میں نے ہمیشہ کی طرح انہیں یقین دلایا کہ میں بڑی استقامت کے ساتھ صراط مستقیم پر چل رہا ہوں۔ ایسی گائے بکری بلکہ مرغی تک سے پرہیز کرتا ہوں جس کا کردار مشکوک ہو اور یہ پتا چل جائے کہ ایک بھی فارم پر کسی خنزیر سے دوستی رکھتی تھی۔ پانی میں بھی صرف وہ پیتا ہوں جو ایک برادر اسلامی ملک سے امپورٹ ہوتا ہے۔ میموں کا تو مجھ پر سایہ بھی پڑے تو غسل کو فرض سمجھتا ہوں' وغیرہ وغیرہ۔

لیکن بھتیجے سے زیادہ عیار چچا ایسی باتوں سے قائل ہونے والے نہیں تھے۔ انہوں نے کہا ''برخوردار! عقلمند کو اشارہ کافی ہوتا ہے۔ ہم سمجھ گئے ہیں کہ پیر و مرشد کا اشارہ کیا تھا۔ تم کو فوراً لوٹ کر پاکستان آ جانا چاہیے ورنہ کسی مشکل میں پڑ جاؤ گے۔ جس سے دنیا و عقبیٰ میں تمہاری اور ہماری رسوائی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔''

میں نے کہا ''صوفی چچا! وہاں آ کے میں کیا کروں؟ آپ کی طرح پیر بن جاؤں؟ پاکستان کا پہلا فارن کوالیفائیڈ ایم بی اے پیر' نعوذ باللہ۔ خدا کا ایجنٹ بن کے گارنٹی دینے لگوں' رزق کی' اولاد نرینہ کی' گھر بسنے کی' شفا کی... ان سادہ لوح کمزور عقیدے والے مجبور انسانوں کو لوٹوں جن کو ہر قسم کے ڈاکو پہلے ہی لوٹ رہے ہیں؟''

معلوم نہیں کیسے میں بے قابو ہو کے اتنا زیادہ بول گیا۔ صوفی چچا ہمیشہ ہی ایسی باتیں کرتے تھے اور میں انہیں بڑی شرافت اور سعادت مندی سے سن لیتا تھا۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کی رگ رگ سے واقف تھے چنانچہ یہ خوش فہمی کسی کو نہیں ہو سکتی تھی کہ دوسرا وہی کہہ رہا ہے جس پر صدق دل سے یقین بھی فرض ہے۔

صوفی چچا باقاعدہ ناراض ہو گئے۔ اسی شام ابا کا فون موصول ہوا۔ ''تم نے چچا سے بدتمیزی کی؟''

میں نے کہا ''ویسے تو میں نے صرف سچ بولا تھا لیکن میں ان سے معافی مانگ لوں گا۔''

''وہ تمہیں کچھ سمجھانا چاہتے تھے۔''

میں نے کہا ''ابا! وہ تو کہہ رہے تھے کہ میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے واپس پاکستان آ جاؤں۔''

''ہاں۔ ان کا بات کہنے کا اپنا انداز ہے۔ تم نے انہیں موقع دیا ہوتا پوری بات کرنے کا تو وہ وضاحت کرتے کہ یہ ہم سب کی خواہش ہے۔''

میں نے اپنے سر پر ہاتھ مارا ''او نو ابا جی! ڈونٹ ٹیل می کہ آپ بھی ان کے مرید بن گئے ہیں۔''

''فضول باتیں مت کرو۔ تمہیں اب واپس آنا ہے۔''

میں نے کہا ''مگر کیوں... سب خیریت تو ہے ناں ابا جی!''

''ہاں ہاں۔ سب خیریت ہے۔ بس مجھے تمہاری ضرورت ہے یہاں۔'' ابا نے کہا۔

میں تشویش میں مبتلا ہونے لگا ''آپ کچھ چھپا رہے ہیں مجھ سے۔ چچا نے بھی گھما پھرا کے بات کی تھی۔''

''بیٹا! فکر کی کوئی بات نہیں۔ میں اور تمہاری امی بالکل ٹھیک ہیں۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تم کب آ سکتے ہو؟''

میں نے کہا ''اگر ضروری کام ہے تو جو پہلی فلائٹ ملے گی میں پکڑ لوں گا۔''

انہوں نے کہا ''میرا مطلب تھا وہاں کے معاملات نمٹانے میں کتنا وقت لگے گا؟ ظاہر ہے تمہارا کمپنی سے کوئی ایگریمنٹ ہوگا۔ تم کو پہلے سے نوٹس دینا ہوگا۔ اس میں کتنا ٹائم لگے گا اندازاً...؟''

میں نے حیرانی سے کہا ''یعنی آپ بھی یہی کہہ رہے ہیں کہ میں اپنی نوکری چھوڑ کے ہمیشہ کے لیے پاکستان آ جاؤں؟''

''بالکل یہی کہہ رہا ہوں۔''

''لیکن کیوں ابا جی! ابھی تو میرا کیریر شروع ہوا ہے۔ بہت محنت کی تھی میں نے۔ دن رات ایک کر دیے تھے اپنی قابلیت کو تسلیم کرانے میں' مستقبل میرے لیے ایک چیلنج تھا۔''

''ایک بہت بڑا چیلنج یہاں بھی تمہارے لیے منتظر ہے۔''

''کیسا چیلنج...؟ آپ نے خود ہی کہا تھا کہ پاکستان میں ترقی کے مواقع نہیں ہیں۔ اچھے جاب نہیں ہیں۔''

''اس وقت حالات مختلف تھے۔''

''یہاں میں پاکستان کے حالات سے زیادہ باخبر ہوں۔ میری معلومات کے مطابق حالات بہتری کی طرف نہیں جا رہے ہیں۔ کرپشن' سیاسی عدم استحکام اور اداروں کی تباہی کی وجہ سے سرمایہ کاری رک گئی ہے۔ بے روزگاری بڑھ گئی ہے۔''

''دیکھو۔ میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا۔ ابھی میں نے کہا تھا کہ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ میں خود کچھ کر سکتا تو تمہیں کبھی نہ بلاتا لیکن بیٹا! اب میرے ارادے کی راہ میں میری عمر حائل ہو گئی ہے۔''

میں نے کہا ''ابا جی! اب کیا کرنا ہے آپ کو؟ بہت کام کر لیا آپ نے چالیس سال... اب آرام کریں' لائف کو انجوائے کریں۔''

''وہ تو میں کر رہا ہوں۔ میں نے اور تمہاری امی نے حج کی سعادت بھی حاصل کر لی گزشتہ سال۔ بڑی بے فکری ہے' اللہ کا بڑا احسان ہے۔ سوچا تو ہم نے یہی تھا کہ تمہارے کیریر کو ڈسٹرب نہیں کریں گے۔ لندن میں ہمارا رہنا مشکل تو ہے مگر لیکن ہم تمہیں مشکل میں نہیں ڈالیں گے۔ یہاں نہ رہ سکے تمہارے بغیر تو وہاں آ جائیں گے۔ کچھ دن یہاں کچھ دن وہاں۔ اسی طرح گزارا کریں گے جب تک زندگی ہے۔ یہاں ہیں انہیں بھی تو نہیں چھوڑ سکتے۔ لیکن اب اللہ کا احسان ہے' ایسے اسباب پیدا کر دیے ہیں کہ نہ تمہیں جلاوطن رہنے کی ضرورت ہے اور نہ ہمیں کسی سے دوری کا دکھ جھیلنے

کی۔‘‘

میں نے کہا ’’ایسی کیا بات ہوگئی ہے ابا جی!‘‘

انہوں نے اپنی بات جاری رکھی ’’آدمی اتنی جدوجہد کیوں کرتا ہے رفیق بیٹا! پہلے کسی قابل بننے کے لیے دن رات ایک کردیتا ہے‘ اس کے بعد اپنی محنت کو کیش کرانے میں جت جاتا ہے۔ لوگ گھربار اور سارے رشتوں کی قربانی دے کر باہر جاتے ہیں۔ گھر والوں سے دور رہنے کا دکھ اٹھاتے ہیں۔ وطن سے جلاوطن ہوتے ہیں اور اکیلے پن کا عذاب برداشت کرتے ہیں‘ صرف ریال اور ڈالروں کے چکر میں۔ جتنی دولت وہ کمانا چاہتے ہیں یہاں رہ کے نہیں کما سکتے۔‘‘

میں نے مؤدبانہ عرض کی ’’ابا جی! کیا دولت کمانا اور اسے دن رات ایک کردینا بری بات ہے؟ کم سے کم ہم رشوت کی ناجائز آمدنی پر تو انحصار نہیں ہے۔ محنت سے حق حلال کی کمائی کرتے ہیں یہاں آنے والے۔‘‘

’’نہیں‘ یہ بات نہیں۔ میں مواقع کی بات کررہا تھا۔ جن کے لیے یہاں مواقع نہیں‘ انہیں باہر ضرور جانا چاہیے۔ اپنے اور خاندان کے خوشحال مستقبل کے لیے محنت بھی کرنی چاہیے۔ جلاوطنی کی سختی بھی جھیلنی چاہیے لیکن سب کچھ اپنے گھر اور اپنے وطن میں رہ کر ملے تو پھر سارے جذبات کے رشتوں کا خون کرنے اور دیار غیر میں اکیلے پن کا عذاب جھیلنے کی کیا ضرورت ہے؟ مجھے بتاؤ‘ تم وہاں رہ کے کتنا کما لیتے؟ فرض کرو تم لکھ پتی‘ کروڑ پتی ہوجاتے۔ وہ اللہ کے فضل سے تم ویسے ہی بن گئے ہو۔‘‘

میں نے حیرانی سے کہا ’’وہ کیسے ابا جی!‘‘

وہ ہنسے ’’پتا چل جائے گا تمہیں جب تم آؤ گے۔‘‘

میں نے کہا ’’نہیں ابا جی! مجھے صاف صاف بتائیں کہ معاملہ کیا ہے۔ ایسی کون سی لاٹری نکل آئی ہے ہماری۔ کوئی مدفون خزانہ مل گیا ہے؟‘‘

’’بس کچھ ایسا ہی سمجھو رفیق بیٹا! یہ لگتی تو کچھ قصے کہانیوں کی بات ہے مگر سب قدرت کے کھیل ہیں۔ وہ دیتا ہے تو ایسے ہی چھپر پھاڑ کے دیتا ہے۔ ہماری زندگی تو گزر گئی۔ تمہارے نصیب کی بات ہے۔ حق بحقدار رسید۔ فون پر میں تمہیں ساری خاندانی تاریخ نہیں بتا سکتا۔ یہ سلسلہ تو کوئی سال بھر سے چل رہا تھا۔‘‘

پھر انہوں نے مجھے محل اور جاگیر کے بارے میں بتایا۔ میری عقل خبط ہوگئی ’’ابا جی! آپ کی بات پر میں شک کرنے کی ہمت نہیں کرسکتا۔ جیسا آپ نے فرمایا‘ ویسا ہی ہے اگر...... تب بھی میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے وہاں آجاؤں۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔‘‘

انہوں نے کہا ’’مجھے معلوم ہے تمہارے پاس سب کچھ ہے۔ ہمت‘ صلاحیت‘ ذہانت‘ مستقل مزاجی اور خود اعتمادی۔ اسی لیے تو میں تمہیں بلا رہا ہوں۔ وہاں تم اپنی صلاحیت کا استعمال کرکے منافع کماؤ گے دوسروں کے لیے۔ تمہیں وہی مقررہ معاوضہ ملے گا۔ تم انہیں اپنی محنت سے ایک کے دس اور دس کے ہزار بناکر دو گے۔ ترقی وہ کریں گے‘ فائدہ ان کے ملک کو ہوگا‘ کیا یہ معاشی غلامی نہیں۔‘‘

’’ابا! آپ جذباتی ہورہے ہیں۔‘‘

’’ہرگز نہیں بیٹا! میں بہت پریکٹیکل آدمی رہا ہوں ہمیشہ۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں بھی تمہیں باہر نہ جانے دیتا۔ تم اندازہ نہیں کرسکتے کہ یہ جذباتی قربانی دینا ہمارے لیے کتنا مشکل تھا۔ تم اکلوتے بیٹے ہو ہمارے۔ اب یہاں ایک کام ہے جو صرف تم کرسکتے ہو اور ایک چیلنج سمجھ کے۔ خود تمہاری ذات کو تو جو فائدہ ہوگا اس کی کوئی حد نہیں‘ مگر اس کے ساتھ تمہاری صلاحیت اور توانائی تمہارے وطن کے کام آئے گی۔ آخر پاکستان کے نوجوان کیوں باہر جارہے ہیں؟ اس لیے کہ یہاں ان کا ہر جگہ استحصال ہوتا ہے خصوصاً نچلی سطح پر۔ ان کے پاس جذبہ ہے‘ لگن ہے اور صلاحیت ہے مگر وہ مجبور ہیں۔ ان کے عزائم کی راہ میں رکاوٹیں آجاتی ہیں۔ سرخ فیتہ‘ اقربا پروری‘ تعصب‘ بدعنوانی‘ تم خوش قسمت ہو کہ تمہیں مجبوری کی دیواریں گراکے اپنے ہی وطن میں رہتے ہوئے کامیابی کے راستے پر چلنے کا موقع ملا ہے۔ خود اپنے وسائل سے...... اب تم واپس آسکتے ہو۔ اپنے وطن‘ اپنے گھر......‘‘

میں ان کی باتیں سنتا رہا کیونکہ وہ میری سننے کے موڈ میں نہیں تھے۔ جب بالآخر ان کو احساس ہوا کہ وہ صرف فون کے ریسیور سے باتیں کررہے ہیں تو وہ اچانک چپ ہوگئے۔

میں نے کہا ’’ابا جی! میں اب بھی کچھ نہیں سمجھا۔ فرض کریں ہمیں کوئی جاگیر اور ایک خاندانی محل مل گئے ہیں...... پھر؟ ہم کیا کریں ان کا......‘‘ آپ نے کچھ سوچ کے ہی فیصلہ کیا ہوگا کہ مجھے واپس آجانا چاہیے۔‘‘

’’ہم سب نے بہت سوچا۔‘‘

’’باقی سب کی بات تو رہنے دیں‘ آلو عنایت...... میرا مطلب ہے خالو عنایت‘ صوفی چچا...... دادی‘ یہ سب پچھلی صدی کے لوگ ہیں۔ شاید اس سے بھی پہلے کی دنیا کے۔‘‘

’’چلو تم یوں سمجھ لو کہ میرے ذہن میں ایک پلان ہے تمہارے لیے۔‘‘

’’یعنی یہاں لندن کے اس بین الاقوامی...... میرا مطلب ہے ملٹی نیشنل کاروباری ادارے میں جو کام میں کررہا ہوں‘ وہ زیادہ بڑے پیمانے پر اور بہتر طور پر وہاں کیا جاسکتا ہے؟ میری عقل میں نہیں آتی یہ بات۔‘‘

انہوں نے برہمی سے کہا ’’مجھے لگتا ہے چھ سال میں تمہاری عقل پر اس معاشرے کی سوچ غالب آگئی ہے۔ تم نے جذبات کو اور رشتوں کو غیر اہم سمجھ لیا ہے۔ ترجیح رکھتے ہیں تمہارے ذاتی مفادات۔ وہاں آتے تو تم ہمیں چھوڑ آتے کسی اولڈ ہوم میں۔ اب یہاں ہم اپنے ہی گھر کو اولڈ ہوم سمجھ لیں۔ یہی چاہتے ہو نا تم...... بس اخراجات پورے ہوتے رہیں گے ہمارے۔ اتنا پیسا ہے ہمارے پاس تو اور کیا چاہیے۔‘‘ انہوں نے فون بند کردیا۔

زندگی میں پہلی بار مجھے یوں لگا جیسے ابا رونے لگے تھے۔ اچانک میرے منطقی دلائل کے غبارے کی ساری ہوا نکل گئی۔ ایک احساس جرم وگناہ کی خلش نے مجھے بے چین کردیا۔ میں نے پھر فون ملایا اور کہا ’’ابا جی! آپ کی یہی خوشی ہے تو میں آرہا ہوں‘‘ اور ریسیور رکھ دیا۔

لیکن اس کے باوجود یہ فیصلہ آسان نہ تھا۔ میں رات بھر سوچتا رہا۔ مجھ میں ہمت نہ تھی کہ اپنے کسی دوست سے یہاں تک کہ عائشہ سے یا فریال سے بھی اس مسئلے پر بات کرسکوں۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اپنی زنانہ عقل کو جذبات سے الگ رکھ ہی نہیں سکتیں۔ وہ کہیں گی کہ رفیق! واٹ نان سنس! یہ کیا الف لیلہ کی داستان ہے۔ کیسی جاگیر‘ کیسی حویلی۔ تم اب لندن کو چھوڑ کے گاؤں کی اس آسیب زدہ حویلی میں رہو گے؟ کمپنی نے تمہیں جو ٹویوٹا لیکسس دے رکھی ہے۔ اس کی جگہ چار گھوڑوں والی بگھی میں پھرو گے اور اپنا حرم آباد کرو گے۔ کنیزیں رکھو گے۔ مجرے کراؤ گے ہر نومولود کی رسم مسلمانی پر...... اور تمہاری یہ ڈگری......!

صبح میں نے کمپنی کے نائب صدر سے بات کی کہ مجھے لمبی چھٹی چاہیے۔ کم سے کم تین مہینے کی۔

اس نے صاف انکار کردیا ’’نو دے...... تم چھوڑ کے جاسکتے ہو لیکن تم مجھے پرابلم بتاؤ تو شاید میں چیئرمین کو قائل کرلوں کہ تمہاری جگہ عارضی طور پر کسی کو رکھ لیا جائے۔ تم یقیناً ہمارے لیے قابل قدر تھے۔ تم نے ثابت کردیا تھا۔‘‘

میں نے کہا ’’میرا موقف شاید تمہیں غیر عملی لگے۔ لیکن یہ ہماری پرابلم ہے کہ ہم جذباتی ہیں۔ والدین کے لیے‘ اولاد کے لیے‘ وطن اور دین کے لیے۔ یہاں تک کہ گلی محلے کے لیے۔‘‘

میری بات سن کے وہ بہت حیران ہوا ’’یقین نہیں آتا کہ تم جیسا تعلیم یافتہ اور ذہین نوجوان اپنی سوچ میں اتنا مجبور ہوسکتا ہے۔ خیر‘ میں اس پر کوئی تبصرہ نہیں کروں گا۔ ایک مشورہ ہے‘ جاؤ اور دیکھو کہ وہ تمہارے لیے کیا پلان رکھتے ہیں۔ مستقبل تمہارا ہے تو فیصلہ بھی تمہارا ہی ہونا چاہیے۔ ایک ہفتہ اس کے لیے کافی ہوگا۔ اگر تم واپس آنا چاہو تو ہم دیکھ لیں گے...... ورنہ......‘‘

میں نے سوچ کے کہا ’’دو ہفتے نہیں ہوسکتے؟‘‘

تھوڑی سی بحث کے بعد وہ مان گیا۔ ہمارے درمیان یہ طے ہوا کہ پندرہ دن وہ کام چلائیں گے مگر سولہویں دن میری جگہ کوئی اور بیٹھا ہوگا۔ ظاہر ہے اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ یہ ایک دوستانہ مفاہمت کا عمل تھا۔ مجبوری نہیں تھی۔ نہ انہیں کام کرنے والوں کی کمی تھی اور مجھے جاب کی۔ سوچتا میں بھی یہی تھا کہ اپنے مستقبل کے بارے میں ہر فیصلے کا اختیار میرے پاس ہونا چاہیے لیکن یہ فقط آرزو کی بات نہیں تھی۔ ایک اندر کی آواز مجھے یقین دلاتی تھی کہ کیسے پتر! تم اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کرسکتے۔ خیر سے ولایت کو خیرباد کہو‘ تمہاری واپسی کے بعد کوئی واپسی نہیں۔

اس رات میں نے فون پر صوفی چچا سے معافی مانگی۔ ’’میں اپنی گستاخی پر شرمندہ ہوں‘‘ میں نے منافقانہ لہجے میں کہا‘ یہ حقیقت نہیں تھا‘ صرف ابا کی رنجیدگی کا خیال تھا۔ صوفی چچا ان کے حقیقی بھائی نہیں کزن تھے۔ تایا کے بیٹے لیکن‘ ایک حیرت انگیز اتفاق کے باعث دنیا میں ایک ساتھ ایک ہی دن آئے تھے۔ فرق صرف ایک گھنٹے کا تھا۔ صوفی چچا تولد ہوئے تو تاریخ بدل گئی۔ انہیں ایک دن چھوٹا قرار دے دیا گیا۔

صوفی چچا نے کہا ’’گویا اب تم نے حتمی مراجعت کا عزم صمیم کرلیا ہے۔‘‘

میں نے کہا ’’جی...... کیا کرلیا ہے؟‘‘

وہ بولے ’’تم واپس آرہے ہو ہمیشہ کے لیے۔ فہم وتدبر کے تقاضوں کی پاسداری نے تمہیں ناقابل تصور پرخطر عواقب سے تحفظ فراہم کردیا ہے۔‘‘

’’اف!‘‘ میں نے اپنے سر پر ہاتھ مارا ’’کس نے کیا کردیا ہے چچا!‘‘

’’مطلب یہ کہ بال بال بچ گئے تم...... ورنہ ہم نے اپنے موکلوں کو اس کام پر مامور کردیا تھا کہ تمہیں بیک بینی ودوگوش ہماری خدمت میں حاضر کردیں۔‘‘

میں نے کہا ’’موکل یعنی جنات! آپ اپنے احکامات منسوخ نہ کریں صوفی چچا! مقصد تو وہاں پہنچنا ہے۔ پی آئی

اسے لے جائے یا جنات لے جائیں۔ میرے ٹکٹ کے پیسے بچ جائیں گے۔''

صوفی چچا پھر خفا ہو گئے۔ ''اس انداز تمسخر سے صیہونیت کے ملحدانہ طرز فکر سے مسموم ذہن کی خو عیاں ہے۔''

میں پھر چکرا گیا ''جی ...... بجا ارشاد!''

''کیا؟'' انہوں نے گرج کے کہا ''اس درجہ دیدہ دلیری ...... گویا تم اعتراف جرم کرتے ہوئے انفعال کے جذبات سے لاتعلقی کی روش پر گامزن ہو۔''

میں نے گھبرا کے کہا ''صوفی چچا! چھ سال امریکا برطانیہ میں رہ کے میں تو اردو بھی بھول گیا ہوں۔ آپ فارسی بول رہے ہیں۔ مجھے تو صرف یہ عرض کرنا تھی کہ اسی ہفتے میں لاہور پہنچ رہا ہوں' اللہ حافظ!''

اگلے چند دنوں میں خالو عنایت نے فون پر مجھے وہ نظم سنائی جو انہوں نے بطور خاص میرے استقبال کے لیے کہی تھی۔ اس کا آخری شعر نماز فجر کے وقت نازل ہوا تھا۔ پاکستان کے معیاری وقت کا حساب کیے بغیر انہوں نے فوراً کال بک کرائی اور میں نے رات دو بجے سوتے سے جاگ کر پہلے چند اشعار پر اونگھتے ہوئے کہا ''واہ خالو عنایت!'' مگر اس کے بعد پھر نیند غالب آ گئی۔ صبح میں نے ریسیور کو اپنے سینے پر رکھا دیکھا۔ غالباً اپنی عاقبت نااندیشی کے باعث میں خاندان کے ایک اور بزرگ کی دل آزاری کا مرتکب ہو چکا تھا۔

دادی کا فون میں نے چند منٹ سنا۔ پھر مجھے اندازہ ہو گیا کہ انہوں نے کان میں آلۂ سماعت نہیں لگا رکھا ہے چنانچہ میں نے ریسیور نیچے رکھ دیا اور آرام سے ایک فلم دیکھتا رہا۔ دادی کو سنانے سے غرض تھی' سننے سے نہیں۔ آدھے گھنٹے بعد میں نے پھر ریسیور کان سے لگایا تو وہ حویلی کی تاریخ کا نہ جانے کون سا باب سنا رہی تھیں۔ اچانک لائن کٹ گئی تو میں نے خوشی سے بغلیں بجائیں اور ریسیور کو ایسے ہی پڑا رہنے دیا۔

☆☆☆

یوسف نے ایک آہ بھر کے کہا ''نیکے چتر! ایک آئس کریم اور منگوا۔ پھر میں چلتا ہوں۔''

میں نے کہا ''تو نے کہا تھا مجھے سی آف کرے گا۔''

''ہمیشہ کی طرح بکواس کی تھی میں نے۔ میں نے سوچا آخری بار تیرا چہرہ دیکھ لوں۔ لندن آنا تو آسان تھا۔ ست بدھائی آنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں جہاں تیری دکھ بھری زندگی کے باقی دن ان جانوروں کی طرح بسر ہوں گے جن کا حوالہ عبرت کے لیے دیا جاتا ہے۔ کولھو کا بیل' دھوبی کا کتا' گھر کی مرغی' مجھے شام کی فلائٹ سے واپس جانا ہے۔''

میں نے کہا ''نہیں جائے گا تو کیا ہوگا؟''

اس نے ادھر ادھر دیکھ کے بڑی رازداری سے انکشاف کیا ''یار! کل میری منگنی ہے' مجھے انگوٹھی پہنانی ہے کسی کو۔''

میں نے کسی خوشی یا حیرت کا اظہار نہیں کیا ''انگوٹھی وہی ہے؟''

اس نے شرمندہ ہوئے بغیر اعتراف میں سر ہلایا ''یہ تو آپ ہی سے سیکھا تھا اس ناچیز نے۔ استاد محترم! ...... کہ بیٹا' نقلی ہیرے کی انگوٹھی خریدو ہمیشہ۔ ننانوے فیصد لڑکیاں اصل اور نقل میں فرق کو سمجھ ہی نہیں سکتیں۔''

میں نے کہا ''رائٹ۔ باقی ایک فیصد کسی جوہری کی بیٹی ہوتی ہیں۔''

''مزید یہ کہ انگوٹھی واپس نہ ملے تو نقصان نہیں ہوتا۔ اللہ معاف کرے' ہم بڑے گنہگار ہیں۔ کتنے دل توڑے ہیں ہم نے۔''

میں نے بڑی حسرت سے اپنے ماضی قریب کو یاد کیا ''واقعی یار! پہلے یہ سب کتنا اچھا لگتا تھا۔ فتوحات میں ایک اور اضافہ۔ سرخاب کا ایک اور پر' ڈیٹ ...... ڈبل ڈیٹ۔ اور اعتماد حاصل کرنے کے لیے انہیں پروپوز کرنا۔ جذباتی استحصال کا کھیل۔''

''جسمانی استحصال کا گناہ تو جیسے آپ نے کبھی کیا ہی نہیں۔ اور یہ کھیل تھا تو کیا ہم اکیلے کھیل رہے تھے؟ ہمارا استحصال نہیں ہوا' بس یہ عورتیں معصوم اور مظلوم ہونے کا ڈراما زیادہ اچھا کر لیتی ہیں۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا ''نہیں یار! یہ ہوتی ہیں بے وقوف! یا یہ سمجھ لے کہ جذباتی طور پر کمزور' فطری طور پر رفاقت میں تحفظ کی چھتری تلاش کرنے والی۔ انہیں لائف ٹائم گارنٹی ملے اعتماد اور تحفظ کی تو وہ ہر قربانی دینے کو تیار ہو جاتی ہیں۔ مرد کبھی خود کو اتنا INSECURE محسوس نہیں کرتے۔ سہارا انہیں ڈھونڈتے پھرتے۔''

اس نے مجھے غور سے دیکھا اور پھر ہنس پڑا ''ایشا نے تجھے یہ فلسفہ دیا ہے؟ ایشا عرف عائشہ!''

میں نے کہا ''کیا تو اس سے انکار کر سکتا ہے؟''

''اور فریال ......! اس نے کیا' کیا تیرے ساتھ؟'' وہ تلخی سے بولا ''قربانی کا بکرا بنا رکھا ہے تجھے۔ مسلسل چھری تلے رکھتی ہے۔''

میں نے بہتر سمجھا کہ فوراً ہتھیار ڈال دوں ''اب تو میں

جا رہا ہوں یار! سارا قصہ ہی ختم۔''

اس نے کہا ''یار' یقین نہیں آتا کہ اتنی آسانی سے تو نے یوٹرن لے لیا ہے۔ جیسے بچے جمورے سے کوئی مداری کہتا ہے گھوم جا۔ تو وہ کہتا ہے گھوم گیا۔ آگے بڑھتے بڑھتے تو اچانک پیچھے چل پڑا ہے۔ کسی پریشانی یا مزاحمت۔ غصے یا پچھتاوے کے بغیر۔''

میں نے کندھے ہلا کے اپنی بے بسی کا اعتراف کیا ''پتا نہیں تو اسے میری خوبی سمجھتا ہے یا خامی۔ ہم سب زندگی کو ایسے ہی جیتے ہیں۔ جیسی ہے جہاں ہے کی بنیاد پر۔''

''یعنی اب سے دس بیس برس بعد کبھی میں آ گیا موضع ست بدھائی تو میری ملاقات ہو گی ایک زمیندار سے۔ ایک قدیم حویلی میں جہاں زنان خانہ ہوگا۔ بیویوں کا اصطبل ...... اور گھوڑوں کا اصطبل۔ تو مجھے اعلیٰ نسل کی بھینسیں دکھائے گا۔ یہ بتائے گا کہ کون سی بھینس کتنا دودھ دیتی ہے اور کون سی بیوی کتنے بچے دے چکی ہے۔ اس سال کتنی کپاس ہوئی اور کتنی گندم۔''

میں نے خفگی سے کہا ''اور تو خود کیا دیکھتا ہے اپنے لیے؟ کیسی ہو گی تیری فیملی؟ اس فیملی میں تیرا مرتبہ کیا ہوگا؟ امریکی معاشرے میں بالآخر تجھے اپنی آئیڈیل عورت مل جائے گی جو زندگی کے تیس چالیس سال تیرے ساتھ اپنی قربانیوں سے تجھے خوش رکھتے گزار دے۔ جیسے کبھی کوئی تجھ سے بہتر نہ لگے اور وہ تجھے چھوڑ کے نہ جائے۔ اور یہ تیری اولاد ...... بیٹے بیٹیاں' پوتے نواسے۔ کوئی پوچھنے والا ہوگا تجھے؟ کیا ہو گی تیری ENOTIONAL سیکورٹی کسی اولڈ ہوم میں۔ سوشل سیکورٹی کافی ہے تجھے۔''

وہ اٹھ کھڑا ہوا ''نیکے چتر! تو چاہتا ہے میں ڈپریشن میں مبتلا ہو جاؤں۔''

میں نے کہا ''ہو گیا تو کیا ...... سب کی طرح تو بھی پروزیک کھانا شروع کر دینا۔ چل ابھی وقت ہے' میں تیرے ساتھ ایئرپورٹ چلتا ہوں۔''

''میں تیرے دوستانہ جذبات پر مبنی پُرخلوص کو ٹھکرانے پر مجبور ہوں نیکے چتر! کیونکہ میں نے پھر جھوٹ بولا تھا تجھ سے' میری فلائٹ رات کو ہے' ابھی میں جاؤں گا کرس کے پاس'' اس نے کہا۔

میں نے کہا ''کون کرس؟''

''کرسٹینا ہڈسن! کیا اس کا پتا اور فون نمبر بتاؤں میں؟'' اس نے ڈھٹائی سے کہا۔

میں بھونچکا رہ گیا ''الو کے پٹھے۔ شرم نہیں آتی تجھے؟''

''نو سر! کیونکہ اسے بھی شرم نہیں آتی۔ ہم دونوں اتنے ہی بے شرم ہیں جتنا یہاں ہونا چاہیے۔ وہ کچھ عرصہ نیویارک میں میرے ساتھ بھی رہی۔ اس کے علاوہ دوست! کیا ہم ایک دوسرے کے کپڑے نہیں پہنتے رہے ہیں۔ ایک دوسرے کے پیسے نہیں چراتے رہے ہیں ...... پھر ایک لڑکی کے لیے اتنا جذباتی ہونے کی کیا ضرورت ہے۔''

جب یوسف گلے مل کر رخصت ہو گیا تو مجھے بہت سے کام یاد آئے۔ کچھ لوگ اب بھی باقی تھے جن سے مجھے الوداعی ملاقات کرنی تھی۔ کچھ لوگوں سے میں نے قرض لیا تھا اور لوٹایا نہیں تھا۔ کچھ میرے مقروض تھے۔ شاید لینے دینے کا حساب کیا جاتا تو برابر ہی نکلتا۔ پھر تردد کیسا؟ کچھ لوگوں کے چہرے میں نے مدت سے نہیں دیکھے۔ کچھ شاید آج بھی میرا چہرہ دیکھ کر خوش نہ ہوں۔ بہتر ہے میں خاموشی سے نکل جاؤں۔ اگر پھر واپس آنا ہوا تو کبھی نہ کبھی ملاقات ہو ہی جائے گی۔

آج کی شام کو میں نے ان کے لیے وقف کر دیا تھا جن کے ساتھ میرے تعلق کی حیثیت جذباتی وابستگی اور کاروباری جان پہچان سے کہیں زیادہ تھی۔ نہ چاہنے کے باوجود میں نے فریال کو فون کر دیا تھا اور مجھے یقین نہ آیا جب اس نے کہا کہ ڈنر تو خیر ناممکن ہے مگر میں چائے پینے ضرور آؤں گی۔

ایک ہفتے تک میں سوچتا رہا۔ ارادے باندھتا رہا اور توڑتا رہا۔ کبھی ہاں' کبھی نا ...... لیکن بالآخر وہی ہوا جو ہمیشہ ہوتا تھا۔ عقل کی ساری منطق مزاحمت اور ناراضی پر دل کی ایک ضد غالب آ گئی۔

میں نے اسے فون کیا۔ ایک پبلک کال آفس سے اور اپنی آواز بدل کے۔

وہ ہنسنے لگی ''کیسے ہو؟''

میں نے کہا ''ویسا ہی جیسا تھا۔ بدلنا چاہتا ہوں تمہاری طرح مگر نہیں بدل سکتا' کیا کروں؟''

''اچھا ...... طعنہ دے رہے ہو۔ کوئی بات نہیں' میں طعنہ پروف ہو گئی ہوں چھ سال میں۔''

میں نے اسے بتایا ''میں جا رہا ہوں پاکستان!''

''کتنے دن کے لیے' خیریت تو ہے نا؟''

میں نے کہا ''شاید واپس نہ آؤں میں۔''

''کوئی بڑی زبردست آفر ہوئی ہے ......؟ وزیر سفیر تو نہیں بن رہے ہو؟''

میں نے کہا ''میری شادی ہو رہی ہے۔''

وہ ہنسی ''مبارک ہو۔ فی الحال گزارا کرو جو بھی ملے۔

اگر بالکل ہی صبر نہیں ہوتا۔"

میں نے جل کے کہا "بعد میں کیا ہوگا؟"

"ہونے کو کیا نہیں ہو سکتا۔ تم ایک کے بعد دوسری پھر تیسری کرلو۔ بس میری جگہ خالی رکھنا۔ کیونکہ بالآخر میں سب سے چھین لوں گی تمہیں۔"

"پلیز شٹ اپ فریال! پتا نہیں کیوں میں نے تمہیں فون کر دیا۔ میں کل صبح جا رہا ہوں۔"

"اتنی ایمرجنسی میں کس سے شادی کر رہے ہو اور کیوں؟"

میں نے خود کو پرسکون رکھا "ابا نے کہا ہے کہ نوکری چھوڑو اور واپس آ جاؤ۔"

"شادی کے لیے نوکری چھوڑنے کی کیا تک ہے؟ اسے لے آنا یہاں۔"

میں نے چلا کے کہا "کون اُلّو کا پٹھا کر رہا ہے شادی؟ نہیں کروں گا میں کسی سے بھی شادی...... کبھی نہیں کروں گا۔"

"سوائے میرے...... اوہ رونی! آئی لو یو!" اس نے فون پر چٹاخ سے چومنے کی آواز پیدا کی "مجھے معلوم تھا۔"

"دیکھو فریال! میں ملنا چاہتا ہوں تم سے...... آخری بار۔"

"بکومت۔ یہ آخری بار کیا ہوتا ہے...... ہمیں ملنے سے کون روک سکتا ہے؟"

"ہاں' تمہارا وہ نامرد مجازی خدا...... میرا رقیب روسیاہ!"

"اتنے جذباتی کیوں ہو رہے ہو آج! میں نے انکار تو نہیں کیا' اچھا یہ بتاؤ کہاں ملو گے؟"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "وہیں......"

"او کے! ٹائم بتاؤ...... میں آتی ہوں۔"

"چھ بجے ہیں ابھی...... میں وہاں جا کے بیٹھ جاتا ہوں اور بیٹھا رہوں گا رات آٹھ بجے تک۔"

"کیوں' رات بھر کیوں نہیں...... اچھے چاہنے والے ہو تم!" اس نے شوخی سے کہا اور فون بند کر دیا۔

اگرچہ مجھے اس کے وعدے پر ذرا بھی یقین نہیں تھا مگر میں ٹاور برج کے اس ریسٹورنٹ میں جا کے بیٹھ گیا جہاں سے میں اس راستے پر نظر رکھ سکتا تھا جدھر سے اسے آنا تھا۔ اس وقت چھ بج کر دس منٹ ہوئے تھے۔ خود مجھے کچھ اندازہ نہ تھا کہ یہاں میں کب تک انتظار کروں گا۔

آٹھ بجے کی بات تو میں نے ایسے ہی کہہ دی تھی۔

نوعمر ویٹریس نئی تھی۔ آرڈر لینے سے زیادہ عندیہ لینے والی پُرتبسم ادا کے ساتھ وہ میری طرف آئی تو میں نے اسے بڑی رکھائی کے ساتھ واپس بھیج دیا۔ "ابھی میں کسی کا انتظار کر رہا ہوں" میں نے کہا۔ فوری طور پر میرا چائے یا کافی پینے کا موڈ نہ تھا۔

یوسف کا آنا مجھے اچھا لگا تھا۔ اس کے جانے سے میں اداس ہو گیا تھا۔ اس کا اور میرا ساتھ پرائمری اسکول سے شروع ہوا اور میٹرک پاس کرنے تک رہا۔ بلحاظ فطرت ہم بیشتر معاملات میں اختلاف رکھتے تھے۔ میں پڑھاکو تھا اور اسے مجبوراً پڑھنا پڑ رہا تھا۔ چنانچہ میں اپنا ہوم ورک کرنے کے بعد اس کی مدد کرتا تھا۔ ہر امتحان سے پہلے اپنے ساتھ اس کی تیاری بھی کراتا تھا۔ میں ڈویژن کے اور فرسٹ آنے کے چکر میں رہتا تھا۔ اسے صرف پاس ہونے سے غرض تھی۔ اس کی خواہش ہوتی تھی کہ ایک تہائی نمبر حاصل کرنے کے لیے صرف ایک تہائی نصاب پر محنت کرے اور وہ بھی تعلیمی سال کے ایک تہائی دنوں میں۔ یعنی اسکول میں اگر چھ مہینے پڑھائی ہوتی تھی تو وہ دو مہینے پڑھ کے پاس ہونا چاہتا تھا۔ باقی چار مہینے اس کی ساری توجہ غیر نصابی سرگرمیوں کی طرف رہتی تھی مثلاً کرکٹ اور آوارہ گردی۔ ہر امتحان سے پہلے میں نصاب کا نچوڑ دس سوالات کی صورت میں نکالتا تھا اور اسے یقین دلاتا تھا کہ پرچے میں سات ضرور آئیں گے اور چوائس کا مطلب ہے پرچا سو فیصد یہی ہوگا۔ پھر وہ اطمینان سے پانچ سوالات کاٹ دیتا تھا۔ "یار فیکے! مروا مت دینا۔ بس پانچ سوال پکے ہو جائیں تو سمجھ لے بیڑا پار۔ پچاس فیصد میں سے تینتیس فیصد نمبر تو ملیں گے نا۔"

میں اسے پانچ سوال کی تیاری کراتا تھا۔ عام طور پر میرا گیس صحیح ہوتا تھا مگر اس کے باوجود نقل میں مجھے اس کی مدد کرنا پڑتی تھی۔ اس کام میں وہ جینیئس تھا اور ایسے ایسے طریقے ایجاد کر لیتا تھا کہ ماہرین بھی دم بخود رہ جاتے تھے۔ اس کے باوجود کبھی وہ ایک پرچے میں کبھی فیل ہو جاتا تھا تو مجھ سے لڑتا تھا۔ "یار فیکے! اچھی دوستی نبھائی تو نے۔ مروا دیا نا' بڑا قابل بنتا تھا۔"

"یار یوسف! میرا کیا قصور......"

"اور کیا میرا قصور ہے' میں نے وہی لکھا جو تو نے بتایا۔ پھر نمبر کیوں نہیں آئے؟"

"لکھنے والا تو خود تھا۔ پتا نہیں کیا لکھا تو نے؟"

"اب ایسا بھی نہیں کہ مجھے پڑھنا نہیں آتا تو لکھنا بھی نہیں آتا۔ اب ایک ہفتے تک مصیبت رہے گی گھر میں۔ شودروں والا سلوک ہوگا میرے ساتھ۔ جوتے الگ پڑیں گے' صرف تیری وجہ سے۔"

"مجھے کیوں الزام دے رہا ہے' کاپی نکلوا لے۔"

وہ آہ بھرتا "کاپی تو نکلوا لوں...... مگر جواب غلط نکلے تو کیا ہوگا؟ بڑا رسک ہے اس میں فیکے! گھر جا کے دگنے جوتے پڑیں گے۔"

میں مار پیٹ میں کمزور تھا۔ ایسے متعدد مواقع آئے جب بزدلی سے کام لینے کے باوجود کوئی زبردستی گلے پڑ گیا۔ میری سوجی ہوئی ناک یا پھٹے کپڑے دیکھ کر یوسف پہلے تو بڑی لعن طعن کرتا تھا۔ ابے پھر مار کھا کے آیا ہے سالے' شرم سے ڈوب مر۔ تیرے ساتھ میری بے عزتی ہوتی ہے کہ ایسے...... دوست ہیں اس کے۔ جو لفظ وہ استعمال کرتا تھا وہ بہت عام فہم تھا۔ آج بھی انہی معانی میں استعمال ہوتا ہے۔

اگلے دن وہ میری حمایت میں فوج کشی کرتا تھا اور "دوست" کے دشمنوں کا حشر نشر کر دیتا تھا۔ یہ دوستی ایسے ہی جڑ پکڑتی گئی لیکن دوستی کے اس شجر کا سایہ میرے اور اس کے خاندانوں تک نہ پھیلا حالانکہ ہم رہتے بھی ایک ہی گلی میں تھے۔ اس کی بہت سی وجوہات تھیں۔ یوسف کے ابا کا تعلق قریش برادری سے تھا۔ ان کی گوشت کی دکان پہلے گلی کے موڑ پر تھی۔ پھر وہ مین مارکیٹ میں چلے گئے۔ اگلے دس برسوں میں انہوں نے اپنے بھائیوں کی مدد سے شہر کے دیگر علاقوں تک کاروبار کو پھیلایا۔ ان کی بڑی خواہش تھی کہ بچے کاروبار میں ان کے توسیع پسندانہ عزائم کا ساتھ دیں لیکن بیوی کے سامنے ان کی ایک نہ چلی۔ ماں نے صاف کہہ دیا کہ تم خود کو لاکھ قریشی صاحب کہو' لاکھوں کما لو مگر یہاں ہاتھ سے کام کرنے والے کو نہ عزت ملی ہے نہ ملے گی۔ زبانی باتیں لوگ جتنی چاہیں کرلیں مگر بچے ان پڑھ اور اسی پیشے میں رہے تو ہمیشہ قسائی کہلائیں گے اور کسی تعلیم یافتہ مہذب اور اچھے گھر میں انہیں قبول نہیں کیا جائے گا۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ بیٹی کوئی نہیں ورنہ جاتی ہمارے جیسے ہی کسی گھر میں۔

اس کی سوچ غلط نہیں تھی۔ یہ منافق معاشرہ کسی حق حلال کی روزی کمانے والے کو نام کی عزت تو دیتا ہے' دل سے عزت دار تسلیم نہیں کرتا۔ نائی کو باربر' حجام' خلیفہ' ہیئر ڈریسر' ہیئر اسٹائلسٹ یا کلپر کچھ بھی کہے' ایک رشوت خور قسم کا کلرک بھی بڑی حقارت سے کہتا ہے' میں آمدنی کو کیا دیکھوں' ہے تو وہ نائی کی اولاد۔

ماں کی وجہ سے بچوں نے پڑھا اور اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ ظاہر ہے پھر وہ دکان پر باپ کے شریک کار نہ بن سکے۔ جب ہم نے میٹرک کر لیا تو یوسف کے والد ایک دن فریادی بن کے ابا سے ملے۔

ابا نے میٹرک کے امتحان میں یوسف کی کامیابی پر انہیں مبارک باد پیش کی۔ "ماشاء اللہ اچھے نمبر لیے ہیں۔"

وہ دھڑام سے صوفے پر گر گئے "اجی رشید صاحب! کیا کریں ہم اچھے نمبروں کا' ہمیں تو فکر پڑ گئی ہے آگے کی۔"

"کیوں قریشی صاحب' کیا ہو گیا؟"

"اولاد کس لیے ہوتی ہے رشید صاحب!" وہ بولنے لگے "اس لیے کہ بڑھاپے میں ماں باپ کا سہارا بنے۔"

"وہ تو ان شاء اللہ ہوں گے۔"

"اجی کیا خاک ہوں گے۔ ہم نے سوچا تھا کہ بچے بڑے ہوں گے تو ہمارا ہاتھ بٹائیں گے۔ کاروبار ترقی کرے گا مگر ماں نے ڈال دیا انہیں پڑھنے لکھنے کے راستے پر۔ یوسف بھی ضد کر رہا ہے کالج میں جانے کے لیے۔"

"یہ تو اچھی بات ہے۔"

"کیا اچھی بات ہے رشید صاحب! پڑھ لکھ کے کیا کرتا ہے آدمی! وہی نوکری...... آپ نے بھی تو بہت پڑھا تھا۔ خیر سے وہ امتحان پاس کر لیا تھا' مقابلے کا۔ کلاس ون افسر بنے' بڑی ترقی کی مگر پیسا کتنا ملا ساری عمر نوکری کر کے؟"

"قریشی صاحب! پیسا ہی تو سب کچھ نہیں ہوتا۔"

"چھوڑو جی رشید صاحب! زمانے کو آپ بھی [illegible] رہے ہو۔ عزت کس کی ہے۔ پروفیسر کی یا اسمگلر کی۔ ٹی۔ [illegible] اور اسٹیج پر ناچنے گانے والے لڑکے لڑکیاں کتنا کما رہے ہیں اور کتنی عزت ہے ان کی۔ پیسے کے بغیر خالی عزت کس کام کی۔ آدمی جوتیاں چٹخاتا پھرتا ہے۔ ہم نے تو سوچا تھا ائرکنڈیشنڈ دکانیں ہوں گی کلفٹن میں' ڈیفنس میں...... وہیں رہیں گے" اس نے سخت ملال سے سر ہلایا۔

"اللہ نے چاہا تو پڑھ لکھ کے بھی بچے آپ کے خواب پورے کر دیں گے" ابا نے کہا۔

"یہ بھی خواب کی باتیں ہیں رشید صاحب! پڑھ لکھ کے وہ نکل جاتے ہیں امریکا اور کینیڈا...... اور لوٹ کے نہیں آتے۔ بھول جاتے ہیں کہ ہمیں پیدا کرنے والے ماں باپ بھی تھے۔"

ابا نے انہیں ٹالنے کی بہت کوشش کی "دیکھیے نا قریشی صاحب! زمانہ بدل گیا ہے' فکرِ معاش میں پہلے لوگ گاؤں سے شہر آتے تھے۔"

"اجی یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔ فکرِ معاش تو ہوتی ہے مجبوری۔ آدمی کو ہاتھ بھی پھیلانا پڑ جاتا ہے۔ مگر ان لونڈوں

کے لیے کمائی کرنا کوئی مسئلہ نہیں' بڑی گنجائش ہے یہاں مگر یہ باہر جا کے دوسروں کے لیے سب کچھ بیچ لیں گے اور سیلز مین یا سیلز منیجر بن کے اینٹھ جائیں گے۔ کوئی برگر بیچے وہاں سور کے گوشت والے تو منظور' یہاں حلال جانور کا گوشت بیچنا نامنظور۔ یہاں دودھ نہیں بیچ سکتے' وہاں شراب بیچ لیں گے۔''

تنگ آ کے ابا نے کہا ''قریشی صاحب! آپ بتایئے میں کیا کرسکتا ہوں یہ آپ کے گھر کا مسئلہ ہے۔''

''آپ فیکے چتر سے کہیں' یوسف کو سمجھائے۔ وہ اس کی مانتا ہے۔''

مجھے فیکے چتر کا خطاب دینے والے قریشی صاحب ہی تھے۔ بعد میں یوسف نے میرے چڑنے پر مجھے اسی نام سے پکارنا شروع کردیا۔ یوسف کے ابا کی بات پر میرے ابا اس کے سوا کیا کہہ سکتے تھے کہ 'اچھا' میں کہوں گا رفیق سے۔ مگر بعد میں وہ بہت خفا ہوئے کہ کیسا جاہل باپ ہے۔ بچوں کو پڑھنے نہیں دینا چاہتا۔ خود میں نے یوسف کو اکسایا کہ وہ بغاوت کا علم بلند رکھے۔ دنیا میں سری پائے اور گردے کپورے بیچنے کے خاندانی پیشے کے علاوہ بھی کام ہیں جن سے پیسا کمایا جاسکتا ہے۔

انجام یہ ہوا کہ قریشی صاحب نے بھی بغاوت کردی مگر ان کی بغاوت اس معاشرتی سوچ کے خلاف تھی جس نے انہیں دولت مند تو مان لیا تھا مگر عزت دار تسلیم نہیں کیا تھا۔ یہ عجیب المیہ تھا' جو عزت دار تھے ان کا مسئلہ دولت مندی تھی جو انہیں کار' کوٹھی اور اسٹیٹس دلا سکتی تھی اور جو دولت کما چکے تھے' انہیں عزت کا کمپلیکس تھا۔

قریشی صاحب نے اپنی بیف اینڈ مٹن شاپ فروخت کی۔ وہ بہترین جائے وقوع پر بہت چلنے والی دکان تھی۔ اس کے انہیں بہت اچھے پیسے ملے۔ انہوں نے اپنا سہ منزلہ رہائشی گھر اور ڈیفنس کا پلاٹ بھی بیچ دیا اور سارا نقد سرمایہ سمیٹ کر لاہور ہجرت کرگئے۔ وہاں انہیں کوئی نہیں جانتا تھا۔ انہوں نے متوسط طبقے کی آبادی میں گھر خرید لیا۔ اچھرہ کی مارکیٹ میں ''صدیقی اینڈ سنز'' کا آفس قائم کیا کیونکہ انہوں نے کسی قانونی کارروائی کے بغیر اپنا نام محمد یونس صدیقی کرلیا تھا۔ دولڑکے باہر تھے۔ وہاں ان کے قریشی یا صدیقی ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ یوسف کا نام بھی انہوں نے اعلان عام اور قانون کے سارے تقاضے پورے کرتے ہوئے یوسف صدیقی کردیا۔ اس کے دو چھوٹے بھائی بھی الیاس صدیقی اور انعام صدیقی ہوگئے۔ یوسف کا کہنا تھا کہ وہ تو انتہائی ردِعمل کے طور پر نام کے ساتھ چوہدری یا سید اور شاہ وغیرہ بھی لگانا چاہتے تھے مگر پھر نہ جانے کیا سوچ کے رہ گئے۔

صدیقی اینڈ سنز پہلے پراپرٹی کنسلٹنٹ تھے۔ یوسف کے ابا نے نئے نام کے ساتھ نیا کام شروع کیا تو ان کا تجربہ صفر تھا مگر پلاٹ' مکان اور دکانیں خریدنا بیچنا یا کرائے پر اٹھانا کیا مشکل تھا۔ پراپرٹی دوسروں کی تھی' کمیشن اپنا۔ یوسف کی اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکا جانے تک صدیقی اینڈ سنز بلڈر بن گئے تھے۔ یوسف کے دونوں بھائی اس کام میں لگ گئے۔ ایک نے کاروں کا شوروم کھول لیا اور دوسروں کی گاڑیاں بیچ کے کمیشن سمیٹنے لگا۔ دوسرے نے کنسٹرکشن کی۔ ابا جنرل منیجر اور ڈائریکٹر فنانس رہے۔ اشتعال میں اٹھائے جانے والے ایک انقلابی قدم اور تائیدایزدی سے خوشحالی' ترقی اور سوشل اسٹیٹس سب کچھ مل گیا۔ یوسف کے ابا نے تو دوسرے بھائیوں سے بھی کہا تھا کہ ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے قریشی برادری چھوڑ دیں مگر انہوں نے ہمت نہ کی۔

آج یہ سب یاد کرتے ہوئے مجھے ایک بات کا شدت سے احساس ہوا کہ سب والدین کی جذباتی مجبوریاں ایک ہی ہوتی ہیں خواہ وہ یوسف کے ابا کی طرح قسائی ہوں یا میرے ابا کی طرح سی ایس ایس افسر۔ وہ اپنے بچوں کو اپنے ساتھ دیکھنا چاہتے ہیں۔ یوسف کے ابا تعلیم کے اس لیے خلاف تھے کہ بچے خاندانی پیشہ ہی نہیں' انہیں بھی چھوڑ دیں گے۔ ایسا ہوا تھا اور اب پہلے سے زیادہ ہورہا تھا۔ انہوں نے بڑی ہوشیاری سے دو بچوں کو روک لیا ورنہ یہ بات یقینی تھی کہ یوسف کے دونوں چھوٹے بھائی بھی باہر چلے جاتے۔ میرے ابا نے بہت لبرل ہو کے اپنے جذبات کو میرے مستقبل پر قربان کیا تھا مگر بالآخر انہوں نے بھی مجبوری کے آگے اپنی ہار مان لی تھی۔ خاندانی جاگیر اور زمین تو بہانہ بن گئی تھی۔ ان کا مجھے واپس بلانے کا فیصلہ خالص جذباتی بنیادوں پر تھا۔

ایک بار پھر میں نے گھڑی دیکھی اور پھر اس راستے کو دیکھا جس پر گاڑیاں مسلسل رینگ رہی تھیں۔ میرون کلر کی ایک سیڈان گھوم کے اندر آئی اور پارکنگ لاٹ میں ٹھہر گئی۔ پھر میں نے اس کے چہرے کی ایک جھلک دیکھی اور مایوسی کا سارا غبار ایک دم چھٹ گیا۔ کسی ضرورت کے بغیر اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرا' ٹائی کی ناٹ درست کی اور اس کے استقبال کے لیے شیشے کے خودکار دروازے کی طرف گیا جو بڑی خاموشی سے ہر آنے جانے والے کو راستہ دیتا تھا۔

وہ اپنی نازک اور اجلی' ریشمی لمس والی کمر کے خم کو ہلکا سا

بل دے کے کار سے اتری۔ اس نے شوفر سے کچھ کہا اور پھر متلاشی نظروں سے ہر طرف دیکھتی ہوئی آگے بڑھی۔ اس کی ساڑی کا رنگ زرد تھا۔ کسی حد تک شوخ بسنتی رنگ جو نیلے بادلوں کے پس منظر میں اور بھی نکھرا ہوا لگتا تھا۔ کاسنی رنگ کے چھوٹے چھوٹے پھولوں کی ایک بیل تھی جو ساڑی کے ساتھ ساتھ بل کھاتی اس کے قوس درقوس جسم کے گرد لپٹتی جاتی تھی۔ خاصے کشادہ گلے کا سلیولیس بلاؤز اس کے کسے ہوئے پیٹ اور کمر کے ایک بالشت سے زیادہ حصے کی سنہری جلد کو بڑی دلکشی سے نمایاں کررہا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ زرد رنگ اس کے مدوّر شانوں اور چہرے کے نیچے گردن سے شروع ہونے والے اور پشت کی جانب پھیلے ہوئے جلد کے شفاف رنگ میں کیسا سنہرا پن جگا دیتا ہے اور مجھے کتنا مسحور کرتا ہے۔

شاید میں اس میں کچھ کمال ایک وقت سے نسبت کا بھی تھا۔ جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ ہمارے ہی خاندان کی تقریب تھی جہاں مایوں کے روایتی زرد لباس میں اور بھی بہت سی لڑکیاں تھیں اور میری عمر ایسی تھی کہ مجھے سب ہی اچھی لگ رہی تھیں لیکن جب وہ سامنے آئی تو میری نظر میں سب کے رنگ پھیکے پڑ گئے۔ بقول شاعر پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ اس میں میری نظر کا ذرا بھی قصور نہیں تھا۔ وہ تھی ہی کچھ ایسی...... آج بھی ہے۔

فریال کو یہ ساڑی میں نے انڈیا سے منگوا کے اس کی منگنی پر تحفے میں دی تھی۔ دس کنال پر محیط لاہور میں کیولری گراؤنڈ کے ایک قصرعالی شان میں وہ اپنے منگیتر صفدر سلطان مرزا کے ساتھ بڑی تمکنت اور شان دلربائی کے ساتھ کھڑی تھی۔ اسے دیکھ کر میں سخت حسد محسوس کرتا تھا اور احساس کمتری میں مبتلا ہو کے اسے قتل کرنے کے خطرناک منصوبے بنانے لگتا تھا۔ وہ میری طرح ہینڈسم ہیرو تو خیر نہیں تھا' اس کی تعلیم بھی واجبی تھی مگر وہ ذہین تھا اور دولت مند تھا۔ وہ جدی پشتی وڈیرا تھا۔ شہر کی طرف آنے کے لیے وہ زمیندار سے صنعت کار بن گیا۔ اس نے عملی سیاست میں حصہ نہیں لیا مگر سیاسی اور حکومتی حلقوں سے رابطے خوب استوار کیے اور اپر کلاس کو حاصل ہونے والی تمام مراعات اسے خودبخود حاصل ہوتی رہیں۔ زندگی میں رنگینی اور دلبستگی کا راستہ اس نے ایک فلم کا اعلان کرکے نکالا۔ چند سالوں میں وہ فلمساز سے ہدایت کار بھی ہوگیا۔ فریال جیسی نہ جانے کتنی حسیناؤں کو وہ ایک گلیمر سے بھرپور زندگی کے خواب دکھا کے میرے جیسے عاشقان صادق سے چھین چکا تھا۔ بڑی تحقیق کے بعد میں نے فریال کے سامنے تین لڑکیوں کے نام پیش کیے تھے جن سے صفدر سلطان مرزا گزشتہ سات برسوں میں منگنی کا ڈراما کرچکا تھا مگر فریال نے میرے سنسنی خیز انکشافات کو ہنس کے ٹال دیا تھا اور میری ناک پکڑ کے کہا تھا ''یار! ایک ڈراما مجھے بھی تو کرنے دو۔ ایسی رونی شکل مت بناؤ۔''

اپنی ذہنی کیفیت کے باعث میں حال سے نکل کے یوں ماضی میں بھٹکنے لگا تھا کہ جب فریال میرے سامنے آگئی تب بھی میں اسے یوں دیکھتا رہا جیسے ہم لندن کے ریسٹورنٹ میں نہیں' صفدر سلطان مرزا کے اسی لان پر کھڑے ہیں۔ اسے میری یہ سحرزدہ محویت اچھی لگی۔ اس کے رخسار پر شفق سی پھوٹی۔ وہ اپنے مخصوص انداز میں لہرا کے ہنسی اور اس نے میری آنکھوں میں جھانک کے اور میرے سامنے چٹکی بجا کے کہا ''اے رومیو! آئی ایم ہیئر۔''

میں نے مسکرا کے اس کا ہاتھ تھام لیا ''مجھے ابھی تک یقین نہیں آیا۔''

اس نے میرے شانے پر اپنا سر رکھا اور میرے سہارے پر چلنے لگی۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کی کمر کے گرد حمائل کردیا ''کب سے کھڑے تھے یہاں؟''

''پتا نہیں۔ شاید ہمیشہ سے۔''

اس نے کہا ''مجھے کچھ دیر ہوگئی۔''

''NOTHING UNUSUAL......''

''تم خفا ہونا......؟''

میں نے کہا ''بالکل بھی نہیں۔ انتظار کرنا مجھے اچھا لگتا ہے۔ اگر تم پہلے سے یہاں موجود ہوتیں تو یہ خوشی مجھے کہاں ملتی جو تمہیں گاڑی سے اترتا دیکھ کے ہوئی تھی۔''

کرسی پر بیٹھتے ہوئے اس کا آنچل نیچے گر گیا ''تمہیں یقین تھا کہ میں آؤں گی؟''

''ذرا بھی نہیں۔ لندن میں چھ سال ہوگئے مجھے۔ سو بار وعدہ کیا ہوگا تم نے۔ ملی ہو گیارہ مرتبہ...... کہو تو تاریخیں اور دن بتاؤں؟''

اس نے عادت کے مطابق چہرے پر آجانے والے بالوں کو بڑی نزاکت سے پیچھے کیا ''تم ملنے کی بات کرتے ہو' فون پر تم سے بات کرتے ہوئے مجھے اتنا محتاط رہنا پڑتا ہے۔''

''معلوم ہے۔ جب تم نے کہا تھا کہ میں آؤں گی تو میں نے سوچا تھا کہ میرے ساتھ پھر وہی ہوگا۔ جو اکثر ہوتا ہے...... گھنٹا بھر جھک مار کے میں نامراد واپس جاؤں گا۔''

''آئی ایم سوری رومیو! لیکن یہ ضروری ہے۔ صفدر ایک شکی مزاج شخص ہے۔''

''بس کرو فریال! میرے ضبط کا حوصلہ جواب دے چکا ہے۔ یہ بھی سوچا تھا میں نے کہ آج آخری موقع ہے تم سے بدلہ لینے کا۔ میں نہ جاؤں' ایک بار تو تمہیں بھی مایوس لوٹنا پڑے۔ پھر تمہیں احساس ہوگا کہ اس مایوسی میں کتنا دکھ' کتنا غصہ اور شکست کی کتنی جھنجلاہٹ شامل ہوتی ہے۔''

''پھر...... کیوں آ گئے؟'' اس نے مجھے جما کے دیکھا۔

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی ''آئی جسٹ ڈونٹ نو۔ شاید اس لیے میں الو کا پٹھا ہوں۔ میری بے چارگی کا احساس یقیناً تمہیں بہت خوشی دیتا ہوگا۔''

''ایسا مت کہو...... پلیز!''

میں نے کہا ''تم نہ بزدل ہو نہ بے وقوف۔ بزدل میں ہوں کہ ابھی تک کچھ بھی نہیں کر سکا سوائے بے وقوف بننے کے۔''

اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا ''کتنی بار اپنی مجبوری بتا چکی ہوں میں' تم سمجھتے ہو اچھی طرح۔''

میں نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ''نہیں فری! میرا ذہن یہ بات بالکل قبول نہیں کرتا کہ کوئی لڑکی جو تمہاری طرح پڑھی لکھی ہو' ذہین ہو اور لندن میں رہتی ہو' وہ اتنی بے بس ہو سکتی ہے جتنی وہ عورت جو کسی وڈیرے کی نجی جیل میں ہو۔ کیا کر سکتا ہے آخر وہ حرام زادہ......!''

''وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ مروا سکتا ہے مجھے اور تمہیں۔''

''رہنے دو فریال! ایسا ہوتا تو وہ مجھے کب کا مروا چکا ہوتا...... اور کیا فائدہ ایسے جینے کا۔ روز روز کے مرنے سے ایک بار مرنا اچھا۔''

''فضول باتیں مت کرو۔ ہم کیوں مریں آخر......؟ میری یہ احتیاط صرف تمہیں بچانے کے لیے تھی۔''

میں نے کہا ''تمہیں یہ یقین کیوں ہے کہ اسے کچھ معلوم نہیں۔ آخر چھ سال سے میں یہاں ہوں؟''

''اگر اسے ذرا بھی شک ہوتا...... تو نتیجہ اب تک سامنے آ جاتا۔ اس کے جاسوس اور مخبر پہلے دن رات مجھ پر نظر رکھتے تھے۔ تمہارے بارے میں اسے رپورٹ ملتی رہتی تھی کہ تم امریکا میں ہو۔ پھر یہ پتا چلا تھا کہ تم نے وہیں ملازمت کر لی ہے۔''

''تمہیں کیسے پتا چلتا تھا ان رپورٹوں کا؟''

''یہ رپورٹیں میرا شوفر دیتا تھا۔''

میں نے کہا ''شوفر کو اس نے رکھوایا تھا۔''

''نہیں۔ رکھا تو خود میں نے تھا۔ اس نے پیسا دے کر خرید لیا۔ آدمی بے وقوف ہے' میرے ہی گھر کے فون پر صفدر کو ہر بات بتاتا تھا۔ میرے بیڈ روم کا فون الگ ہے۔ وہ لاؤنج کے فون پر بات کرتا تھا۔ وہ بھی رات ایک دو بجے۔ جب پاکستان میں شام کے سات آٹھ بجے کا وقت ہوتا تھا۔ میں نے باہر والے فون کا کنکشن لیا مگر ایسے کہ پتا نہ چلے اور ایک کیسٹ ریکارڈر اپنے کمرے میں لگا لیا۔ روز صبح اٹھ کے گزشتہ رات کی گفتگو سن لیتی تھی۔''

''اور اگر یہ راز فاش ہو جاتا...... پھر......؟''

''کیسے فاش ہو جاتا۔ میرے بیڈ روم میں جا سکتا ہے کوئی؟ تمہارے سوا......'' وہ مسکرائی۔

ویٹرلیس نے ہمارے درمیان کافی اور سینڈوچ رکھ دیے۔ غور سے فریال کو دیکھا اور ستائش کے انداز میں سر ہلا کے چلی گئی۔

میں نے کہا ''اب تمہیں اندازہ ہو گیا ہے نا...... کہ تم نے کتنی بڑی حماقت کی تھی۔ بہت چالاک سمجھتی تھیں نا خود کو۔ کتنا مہنگا پڑا یہ ڈراما!''

وہ کافی پیتے ہوئے باہر دیکھتی رہی۔ ''اس نے دھوکا دیا مجھے۔''

میں نے کہا ''فارسی میں کہتے ہیں' چاہ کن را چاہ در پیش۔ جو دوسروں کے لیے گڑھا کھودے خود اس میں گر جاتا ہے۔''

''گڑھا اس نے کھودا خود اپنے لیے۔''

میں نے کہا ''کیا فائدہ خود کو دھوکا دینے کا فری! اس نے تم کو اپنی فلم میں ہیروئن بنانے کا وعدہ کیا تھا۔''

''لیکن اس کی قیمت وہ مجھ سے پہلے وصول کرنا چاہتا تھا۔''

''ایسا تو ہوتا ہے۔ ہر جگہ اور سب کے ساتھ ہوتا ہے۔ چانس کیا صرف خوبصورتی اور اداکاری کی صلاحیت پر ملتا ہے؟ یہ جو بڑی بڑی نامور ہیروئنیں ہیں آج' انہوں نے معمولی لائٹ مین سے ہدایت کار تک سب کی ہر شرط بلا چوں و چرا منظور کی۔ پردے پر نظر آنے سے پہلے کس کس کے ساتھ نظر آئیں۔ تم اتنی بھولی تو نہیں تھیں کہ یہ سب تمہیں معلوم نہ ہو؟''

''ایگریمنٹ میرے والد نے سائن کیا تھا۔''

میں نے برہمی سے کہا ''تمہاری رضامندی سے...... بہت خوش تھیں تم......''

''میں انکار نہیں کر سکتی تھی۔''

میں نے چلا کے کہا ''بکواس مت کرو میرے سامنے۔ کیا ہوتا اگر تم انکار کر دیتیں؟ وہ جان سے مار ڈالتا تمہیں؟ تم تو سمجھ رہی تھیں کہ پہلی فلم کی ریلیز کے ساتھ ہی تم فلمی آسمان کا سب سے روشن ستارہ بن جاؤ گی۔ ایشوریا رائے آف پاکستان کہلاؤ گی۔''

وہ خاموشی سے سینڈوچ کترتی رہی۔ اس کی خاموشی اعترافِ جرم تھی۔ ''میری ایک غلطی کو معاف نہیں کر سکتے......''

میں نے کہا ''ایک غلطی...... جب اس نے اپنی دوستی کا جال پھینکا تھا تو میں نے تمہیں خبردار کیا تھا یا نہیں...... منگنی کا ڈراما رچا کے وہ پہلے بھی نہ جانے کتنی لڑکیوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بنا چکا تھا۔ تم نے میری نہیں سنی' اپنی عقل اور ہوشیاری پر بڑا ناز تھا نا تمہیں۔ تم نے کہا کہ میں بھی تو ڈراما کر رہی ہوں۔ ادھر فلم مکمل ہوئی ادھر ڈراما ختم۔ بے وقوف' پاگل لڑکی! باپ ایک لاکھ روپے ایڈوانس لے کر شراب پی گیا اور تمہیں کنوئیں میں دھکا دے کر خود قبر میں جا لیٹا۔ نہ فلم بنی نہ تمہاری جان چھوٹی۔''

''مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وہ اتنا ضدی اور سر پھرا ہے...... اتنا منتقم مزاج ہے۔''

''بابا! ایسے ہی ہوتے ہیں یہ عیاش وڈیرے۔ ایک عورت ان کی انا کی شکست کا سبب بن جائے...... ناممکن۔ ان کی دولت اور ان کی طاقت کے سامنے کون ٹھہر سکتا ہے۔ عورت ان کے نزدیک پاؤں کی جوتی ہے۔ خواہ وہ مس یونیورس ہو۔ اسے وہ سر پر نہیں چڑھنے دیتے۔ تم اس کے لیے چیلنج بن گئی ہو۔ اب تمہارے لیے نجات آسان نہیں ہے فریال! یہ منگنی کیسے توڑو گی تم؟''

اس نے آنکھوں میں آ جانے والے آنسوؤں کو ٹشو پیپر سے صاف کیا ''میں سب ٹھیک کر لوں گی رومیو! مجھے تھوڑا سا وقت اور دو۔ اتنی جلدی مت کرو۔''

''جلدی...... چار سال گزر گئے ہیں اور تم کہتی ہو جلدی!'' میں نے تلخی سے کہا ''میرے پاس اب بالکل وقت نہیں ہے۔ میں نے تمہیں بلانے کے لیے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ میں صبح واقعی جا رہا ہوں اور میرے واپس آنے کا بھی کوئی امکان نہیں۔ شاید یہ ہماری آخری ملاقات ہو۔''

وہ مجھے دیکھتی رہی ''مجھے اسی لیے آنا پڑا کہ فون پر تم بہت سیریس لگ رہے تھے۔''

میں نے چلا کے کہا ''فریال! میں سیریس ہوں۔''

''نہیں۔ تم ایسا نہیں کر سکتے۔ تم ایسے مجھے چھوڑ کے نہیں جا سکتے...... میں...... آئی ول کل یو......'' اس نے میز پر آگے جھک کر میرا کالر پکڑ لیا۔

میں نے کہا ''ڈونٹ بی میڈ۔ لوگ دیکھ رہے ہیں۔''

''دیکھتے رہیں۔ مجھے کسی کی پروا نہیں۔ مجھے بتاؤ' تم ایسا کیوں کر رہے ہو آخر!'' اس پر ہسٹریا طاری ہونے لگا۔

''او کے...... او کے! میں بتاتا ہوں' ذرا آرام سے بیٹھو پلیز!'' میں نے اس کے گالوں پر تھپکی دی۔ اسے بٹھانے کے لیے مجھے اٹھنا پڑا۔

''نہیں۔ پہلے کہو کہ تم نہیں جاؤ گے'' اس نے مجھے ایک جھٹکا دیا اور پھر مجھ سے لپٹ گئی۔

لندن میں کوئی جذباتی منظر کسی کے لیے بھی باعث تشویش نہیں ہوتا۔ خصوصاً عشق کی وارفتگی کا۔ نوجوان گرد و پیش سے بے خبر یک جان دو قالب ہو کے بوس و کنار میں مصروف رہیں' کوئی مخل نہیں ہوتا۔ میں نے بھی فریال کو چوما اور اسے کھینچ کے اپنے ساتھ ٹیرس پر لے گیا کیونکہ وہ زار و قطار رونے لگی تھی۔

جب بالآخر اس کے آنسو تھمے تو میں نے اسے ریسٹ روم میں بھیج دیا جو لیڈیز کے لیے مخصوص تھا۔ وہ دس منٹ بعد اپنا میک اپ ٹھیک کر کے نکلی تو خاصی سنبھل چکی تھی۔ میں نے بہتر سمجھا کہ اسے کہیں اور لے جاؤں۔

دریا کے کنارے کی طرف چلتے ہوئے میں نے کہا ''یہ گاڑی کس کی تھی...... میرون!''

''ڈاکٹر شائستہ کی'' اس نے بے خیالی میں جواب دیا ''میری گاڑی اس کے کلینک کے باہر کھڑی ہے۔''

میں نے افسوس اور جھنجلاہٹ میں سر ہلایا مگر فریال کو کچھ کہنے سے گریز کیا۔ وہ خاصی تھکی ہوئی لگ رہی تھی اور کچھ ڈپریشن کا شکار تھی۔

ہم دریا کے کنارے خوبصورت باغ کی ایک بینچ پر بیٹھ گئے۔ وہیں ہم جیسے نوجوان تھے یا پھر بوڑھے۔ نوجوان اس منظر کا حصہ ہونے کے باوجود یہ منظر نہیں دیکھ رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے کی آنکھوں میں اپنے خواب دیکھ رہے تھے۔ بوڑھے اس دنیا پر الوداعی نظریں ڈالتے محسوس ہوتے تھے جو رفتہ رفتہ ان سے چھوٹتی جا رہی تھی۔

''تم کچھ دن تو ٹھہر سکتے ہو...... میری خاطر!'' فریال نے کہا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا ''کل علی الصباح میری فلائٹ ہے۔''

اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا ''رنی! جہاں اتنے دن گزرے ہیں، وہاں چند روز......''

میں نے اس کی بات کاٹ دی ''کیا ہوگا چند روز بعد فری! کچھ بھی نہیں، تم یہ بات اچھی طرح جانتی ہو کہ میرے باپ نے مجھے سات سمندر پار کیوں بھیج دیا تھا۔ حالانکہ میں اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ پاکستان میں میری جان کو ایک نہیں دو جان لیوا بلائیں چمٹ گئی تھیں۔ ایک گروہی سیاست...... اور دوسری تم۔''

''کیا میں بلا ہوں؟''

''بڑی خوبصورت قاتل بلا۔ ایسی حسین ناگن کہ جس کا کاٹا پانی بھی نہ مانگے۔ مجھے تم نے بھری جوانی میں ڈس لیا تھا۔ آج چھ سال بعد تمہارے عشق کا زہر میرے خون میں اور جسم کے ہر مسام میں ایسے رچ بس گیا ہے کہ نہ میں مر سکتا ہوں اور نہ جی سکتا ہوں۔ پتا نہیں میری زندگی کیسے گزرے گی۔''

اس نے میرے کندھے پر سر رکھ دیا۔ ''ایسی مایوسی کی باتیں کیوں کرتے ہو۔''

میں نے کہا ''پھر کیا کروں، جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھتا رہوں۔''

اس نے کہا ''ہمیں کوئی انتہائی قدم اٹھانا ہی ہوگا۔''

میں نے کہا ''مثلاً......؟''

وہ سوچتے ہوئے بولی ''چلو ہم شادی کرلیں۔''

میں نے کہا ''اچھا...... وہ کیسے؟''

''یار! جیسے سب کرتے ہیں۔ نکاح مسجد میں ہی ہوجاتا ہے دو گواہوں کے سامنے ورنہ تم آجاؤ برات لے کر میرے گھر۔''

''اور اس کے بعد......؟'' میں نے کہا۔

''اس کے بعد کیا......؟''

میں نے کہا ''شادی کرکے جائیں گے کہاں؟ کہاں رہیں گے......؟''

اس نے کہا ''اتنی بڑی دنیا ہے۔''

میں نے کہا ''ہاں، چلے جائیں گے تمہارے ماموں کے گھر امریکا۔''

''ماموں...... کون سے ماموں؟''

''جارج بش! وہ ہمیں گلے لگا کے کہیں گے کہ میرے بچو! آرام سے رہو یہاں، آدھا وائٹ ہاؤس خالی کرادیا ہے تمہارے لیے...... فکر کی کوئی بات نہیں۔''

''تم مذاق کیوں اڑاتے ہو ہر بات کا؟''

''اس لیے کہ تم پاگل ہو۔ اپنے ساتھ مجھے بھی پاگل بنا رکھا ہے۔ تم پر فلمی عشق سوار ہے۔ تم سمجھتی ہو ہم بھی ہیرو ہیروئن کی طرح اس شہرہ آفاق گانے سے فلاح پاسکتے ہیں جس میں ہیروئن نے کہا کہ چل چلیے دنیا دے اس نکرے جتھے بندہ نہ بندے دی ذات ہووے اور ہیرو نے کہا فبہا۔ اور وہ جا بیٹھے قطب شمالی یا ماؤنٹ ایورسٹ پر۔''

فریال ہنسنے لگی ''میں نے ایسا تو نہیں کہا۔''

''دنیا بہت بڑی ہے...... اور کیا مطلب ہے اس احمقانہ بات کا۔ ہم بھاگ کے کہاں جاسکتے ہیں فری! ہمارے پاس شہریت ہوتی امریکا، برطانیہ کی...... یا کسی یورپی ملک کی تو وہ پانچے خان کا سالا ہمارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ اب تو جینوئن گراؤنڈز پر بھی سیاسی پناہ نہیں ملتی۔ پہلے بہت لوگ جرمنی میں سیٹل ہوگئے کہ ہم مذہبی اقلیت ہیں اور پاکستان میں انتہا پسند ہمیں مار دیں گے۔ برطانیہ اور فرانس سب کے دروازے تو سب کے لیے کھلے ہوئے تھے لیکن وہ زمانے اب نہیں رہے۔ اب مسلمان دہشت گرد ہیں۔ خصوصاً پاکستانی۔ ہمیں تو واپس جانا ہی پڑے گا اور مرنا ہی پڑے گا۔''

''تم مرنے سے ڈرتے ہو؟''

میں اسے دیکھتا رہا ''اگر میں یہ کہوں فری کہ تم سے مجھے اتنی محبت نہیں ہے کہ تمہاری خاطر فلم مغل اعظم کا گانا 'اے محبت زندہ باد' گاتا ہوا جان دے دوں۔''

''تو میں نہیں مانوں گی۔''

''تم اس خیال میں بڑا غرور محسوس کرسکتی ہو مس فریال کہ تمہارے بہت سے چاہنے والوں میں ایک ایسا بھی ہے، اتنا وفا شعار، ایسا جانثار۔ زبردست الو کا پٹھا کہ تم نے منگنی کرلی، اس کا عشق وہی رہا۔ چھ سال سے تمہارے خیال میں جیتا ہے تمہارے نام پر مرتا ہے۔ دیوانگی کی ایسی انتہا دیکھی تم نے کہیں۔ وہ جو فرہاد صاحب تھے، دودھ کی نہر نکال لائے مگر شیریں کی شادی کی خبر ملی تو فوراً ہی خودکشی فرمالی۔ میرا حوصلہ دیکھو کہ میں جیتا رہا، جھوٹی آس پر۔''

''جھوٹی آس......؟'' اس نے روہانسا ہوکے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا ''اتنے ظالم تو نہ بنو رومیو!''

میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا ''بھاڑ میں گیا رومیو اور اب جہنم میں جائے جیولیٹ۔ میں مزید بے وقوف بننے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ ابا نے مجھے فوراً واپس بلایا ہے کہ لعنت بھیجو اس نوکری پر اور پاکستان آجاؤ۔''

''مگر کیوں...... پاکستان میں کیا ہے؟''

میں نے کہا ''تمہارے لیے واقعی کچھ نہیں ہے۔ منافقت بھرے ڈائیلاگ تو میں بول نہیں سکتا کہ مجھے وطن کی مٹی سے بہت پیار ہے اس لیے میں جا رہا ہوں۔ اصل بات یہ ہے کہ وہاں میرے والدین ہیں۔ گیارہ ستمبر والے واقعے کے بعد یہ ممکن نہیں رہا کہ میں انہیں بھی امریکا اور برطانیہ لے جاؤں اور ہم وہاں ہنسی خوشی سیٹل ہوجائیں۔ جب میں گیا تھا تو حالات کچھ اور تھے۔ انہیں میری زندگی کی فکر تھی۔ مجھے بھی ایک محفوظ مستقبل کی ضرورت تھی۔ چنانچہ انہوں نے مجھ سے جدائی کا عذاب قبول کرلیا۔ وہ خود اس عمر میں جلاوطنی برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ میرے اصرار پر وہ صرف ایک بار امریکا آئے تھے۔ ایک مہینا انہوں نے بڑی مشکل سے گزارا۔ نہ وہ وہاں کے ماحول کو قبول کرسکے اور نہ اس ماحول نے انہیں قبول کیا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں پاکستان جاؤں تو پھر انہی پرانے سیاست پیشہ دوستوں اور دشمنوں کے چنگل میں پھنس جاؤں۔ تم جانتی ہو منشیات فروشی کی طرح وہاں ضمیر فروشی بھی ایک انتہائی منافع بخش پیشہ ہے جسے جمہوریت کا نام دے دیا گیا ہے زبردستی......''

''پھر اب ایسی کیا بات ہوگئی ہے......؟''

میں نے اسے بتادیا، جس حد تک مجھے معلوم تھا۔ میری نظر گھڑی پر بھی تھی۔ اب نو بج رہے تھے۔ فریال کو توقع ہوگی کہ اب میں اسے کسی اچھی سی جگہ ڈنر کے لیے لے جاؤں گا مگر میں نے اسے بتادیا کہ آج رات میرے سب دوست ایک الوداعی دعوت میں شریک ہوں گے چنانچہ دس بجے تک مجھے واپس جانا ہوگا۔

''کچھ عجیب سی کہانی ہے'' اس نے کہا ''ناقابلِ یقین۔''

میں نے کہا ''ہاں، میری اور تمہاری کہانی بھی ایسی ہی ہے۔''

''کیا کرو گے تم واپس جاکے؟'' وہ ہیرے کی انگوٹھی کو انگلی میں گھماتی رہی۔

''وہی جو میرے والدین چاہیں گے۔''

''گڈ بوائے! فرض کرو انہوں نے کہا کہ برخوردار نورِ چشم ہم نے تمہارا رشتہ تمہاری عم زاد سے طے کردیا ہے۔ وہی جسے تم اللہ میاں کی بھینس قرار دیتے ہو......'' وہ ہنسی۔

میں نے کندھے اچکائے ''میں کہوں گا جیسی آپ کی مرضی۔ میں انکار نہیں کرسکتا۔''

''جھوٹ...... بکواس...... مجھے معلوم ہے تم ایسا نہیں کرسکتے۔''

''کیوں نہیں کرسکتا مس فریال! اگر تم نہیں تو پھر کیا فرق پڑتا ہے، کوئی بھی ہو۔ اگر میری پسند نہیں تو پھر ان کی پسند سہی۔ وہ تو خوش ہوجائیں۔ دس سال پہلے میری ماں نے خواب دیکھنے شروع کیے تھے۔ میرے سر پر سہرا سجانے کے، چاندی سی بہو لانے کے۔ اپنے پوتے نواسوں کے ساتھ کھیلنے کے اور انہیں لاڈ سے بگاڑنے کے۔ دو آرزو میں کٹ گئے، دو انتظار میں۔ باقی جو تم نے چھین لیے۔''

''مجھے الزام مت دو۔''

میں نے رکھائی سے کہا ''او کے۔ یہ ظلم میں نے کیا ان پر۔ اب میں اس کی تلافی کرنے جا رہا ہوں، کوئی اعتراض؟''

اس نے اعلانیہ اور دنیا و مافیہا سے بے خبر اظہار عشق میں مصروف ایک جوڑے کو دلچسپی سے دیکھا ''تمہاری گرل فرینڈز کا کیا ہوگا؟''

میں نے ہنس کے کہا ''وہی جو تمہارے بوائے فرینڈز کا ہوتا تمہاری شادی کے بعد۔''

وہ مسکرائی ''رومیو! اگر تم کسی میم کو شادی کے بعد اپنے ساتھ لے جاتے تو کیا ہوتا۔ مثلاً وہ لارڈ کی بیٹی...... عائشہ!''

میں نے پورے یقین سے کہا ''وہ اسے بھی گلے لگاتے۔ والدین بڑے مجبور لوگ ہوتے ہیں فری! خصوصاً وہ جن کا ایک ہی بیٹا ہو۔ بہت قابلِ رحم ہوتے ہیں۔ وہ انہیں جتنا بلیک میل کرنا چاہے کرسکتا ہے۔ کئی بار خود انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ آخر تم چاہتے کیا ہو؟ اور کوئی لڑکی نہیں ہے دنیا میں۔ ولایت میں بھی کوئی پسند نہیں آئی تمہیں۔''

''یعنی میرے سوا، مجھے وہ قبول نہیں کرسکتے۔''

''پلیز شٹ اپ فریال! تمہیں شرم آنی چاہیے۔ تم الزام انہیں دے رہی ہو۔ خرابی کا ذمے دار تھا تمہارا باپ۔ اب وہ اس دنیا میں ہی نہیں ہے تو میں اسے کیا کہوں؟ میری خاطر وہ سب کچھ کرسکتے تھے۔ اگر میں کسی چڑیل کا بھی کہتا تو وہ انکار نہ کرتے۔ پھر تمہیں کیسے قبول نہ کرتے؟ مگر تم نے کچھ بھی نہیں کیا۔ سوائے مجھے بے وقوف بنا کے میری زندگی خراب کرنے کے۔ مجھے خواب دکھانے کے، جھوٹے وعدوں سے بہلانے کے...... اور مجھے دھوکا دینے کے۔''

وہ چلائی ''ایسا مت کہو رنی! میں تھپڑ مار دوں گی۔''

میں نے آگے جھک کے کہا ''کس کے منہ پر...... بولو، میرے یا اپنے؟''

وہ رونے لگی۔ اس کا خیال ہوگا کہ میں اس کی خوبصورت آنکھوں سے ٹپکنے والے آنسوؤں کو اپنے ہونٹوں

سے پی لوں گا۔ اسے آغوش میں لے کر کہوں گا کہ فریال! یہ ظلم نہ کرو مجھ پر۔ تمہیں روتا دیکھتا ہوں تو میرے دل میں انگارے بھر جاتے ہیں۔ لیکن میں خود پر جبر کر کے کامل بے حسی کا اظہار کرتا رہا۔

کچھ دیر بعد وہ خود ہی چپ ہو گئی۔ اظہار ہمدردی کے طور پر کسی بھی لڑکی کو رومال پیش کر دینا اس سوسائٹی کے آداب مردانگی میں شامل تھا جو کہ شیولری کہلاتا تھا۔ دو بوڑھے انگریزوں نے مجھے پر ملامت اور شرمسار کرنے والی نگاہوں سے گھورا مگر میں نے پروا نہ کی۔ میں اپنے رویے سے فریال پر واضح کر دینا چاہتا تھا کہ اب میرا دل بھی پتھر ہو گیا ہے۔

اس نے دینٹی بیگ سے اپنا سنہرے فریم والا نازک سا آئینہ نکالا اور اس میں اپنا چہرہ دیکھ کے میک اپ ٹھیک کرنے لگی۔

میں نے کہا ''کچھ کھاؤ گی تم؟''

''کہاں لے جاؤ گے تم مجھے؟'' اس نے رکھائی سے کہا۔

''کہیں بھی نہیں۔ جہاں میں رہتا ہوں وہاں آج سب لوگ جمع ہوں گے۔ میرے دفتر کے ساتھی...... اور دوست!''

''وہ بھی ہوگی...... ایلشا...... جو تمہارے لیے عائشہ بن گئی؟''

''سب ہوں گے' سوائے تمہارے۔''

''مجھے کوئی دلچسپی نہیں اس ڈرامے سے۔ میں تمہیں الوداع کیوں کہوں؟ تمہارے پیچھے پیچھے آ رہی ہوں میں بھی۔''

''ابھی تمہارا کورس ختم ہونے میں چار مہینے باقی ہیں۔''

''اسی لیے تو کہہ رہی ہوں۔ ابھی مت جاؤ' سولہ ہفتے کی تو بات ہے۔''

میں نے کہا ''فری' کوئی اور بات کرو۔''

اس نے کہا ''پلیز...... چلو دو ہفتے۔ اب کیا میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑوں؟''

میں نے جھلا کے کہا ''کیا ہوگا دو ہفتوں میں؟''

''وہی جو تم چاہتے ہو۔ مجھے تھوڑی سی مہلت دو۔ ایک آخری موقع...... تمہیں میری قسم۔''

''فری! خدا کے لیے......'' مجھ پر جھنجلاہٹ طاری ہونے لگی' مجھے یہ بتاؤ کہ ایسا کون سا معجزہ رونما ہو سکتا ہے دو ہفتوں میں۔ کوئی جادو' کوئی روحانی وظیفہ' سفلی عمل یا نقش اعظم ہے جس سے کایا کلپ ہو جائے گی۔ حالات پلٹا کھا کے

ہمارے حق میں سازگار ہو جائیں گے۔ تمہارا وہ ہو[ا] مجازی خدا! تمہارا آقا و مالک' سرتاج اچانک تمہار[ے] عشق کے سامنے سر تسلیم خم کر دے گا۔ اتنا بڑا سیاسی جدی پشتی فیوڈل لارڈ۔ کینہ پرور اور کمینہ۔ وہ انتہائی ہو کے دست بستہ تمہاری خدمت میں حاضر ہوگا اور [کہے] مجھے معاف کر دو' زور زبردستی سے تمہاری محبت جیتنے کی کرنا میری بے وقوفی تھی۔ میں تمہارا گنہگار ہوں [میری] طرف سے تم آزاد ہو اور پھر خود تمہیں میرے پاس [لائے] تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے گا اور کہے گا کہ جا[ؤ] اب تیرے حوالے۔''

اس نے اپنا ہینڈ بیگ مجھ پر دے مارا'' بکواس [ختم] آپ یا کچھ اور کہنا باقی ہے؟''

میں نے کہا ''نہیں۔ اب تم بتاؤ کہ ناممکن کو ممکن بناؤ گی۔''

اس نے کہا ''مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ جا کے [میرے] لیے آئس کریم لاؤ۔''

میں کچھ فاصلے پر نظر آنے والے پارلر تک گیا [اور] اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ آدھا لیٹر کا ایک ڈبا میں نے تھما دیا۔

''چاکلیٹ ہے نا'' اس نے بچوں کی طرح پوچھا۔

''ہاں بابا چاکلیٹ ہی ہے۔''

''بابا جی ناراض کیوں ہوتے ہو'' اس نے پلاسٹک [کا] چمچ آئس کریم سے بھر کے منہ میں رکھا ''اچھی ہے۔''

''اتنی چاکلیٹ کھاتی ہو تم اور آئس کریم...... جنگ[لی] تمہیں کچھ نہیں ہوتا۔''

اس نے اوپر دیکھا ''اللہ کا کرم ہے۔ جلنے وا[لے جلتے] رہیں۔ دیکھو رومیو! یہ میرا آخری سمسٹر ہے۔ سولہ [ہفتے] ہیں۔ اس کے بعد ظاہر ہے میرے پاس شادی نہ کر[نے کا] بہانہ کوئی نہیں رہے گا۔ اس ضدی آدمی نے میرے [انکار] کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا ہے۔ اس نے واضح الفاظ [میں] بتا دیا تھا کہ وہ مجھے مہلت دیتا رہے گا۔ جتنی میں چاہ[وں] یہاں تک کہ میرے پاس سارے بہانے ختم ہو جائیں [اور] بالآخر مجھے اس کو قبول کرنا پڑے گا۔ بات صرف [وقت اور] حوصلے کی ہے۔''

''یعنی یہ ہو سکتا ہے کہ دس بیس پچاس سال [گزر] جائیں مگر یہ نہیں ہو سکتا کہ اس کی منگیتر سے کو[ئی اور] شادی کر سکے۔''

''اس کی فطرت کا یہ پہلو بعد میں سامنے آیا۔ وہ ا[...]

خطرناک آدمی ہے اور اسی لیے میں نے تمہارے معاملے میں بہت احتیاط سے کام لیا۔ اس کے لیے مجھے خود پر بھی بہت جبر کرنا پڑا۔''

''میں جانتا ہوں فریال! اور اسی لیے ذہنی طور پر میں بہت پہلے تمہارے عشق سے تائب ہوگیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ تم زندہ رہو۔ اور خود مجھے بھی مرنے کا شوق نہیں تھا۔ صورت حال آج بھی وہی ہے۔''

''ہاں...... مگر اب ہمیں صورت حال کو بدلنا ہوگا۔ سنا تم نے؟''

''ہاں سنا'' میں نے کہا'' لیکن تم بھی سن لو کہ میں بہت کم ہمت اور بزدل ہوں۔ میں ذرا بھی ہیرو نہیں ہوں۔ مجھے محبت میں جان کا سودا قطعی منظور نہیں۔ تم مجھے کم عقل اور بے وقوف بھی سمجھ سکتی ہو کہ مجھے انتقال پر ملال کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔''

اس نے آئس کریم کے خالی کپ کو حسرت سے دیکھا ''آخر ہم ہی کیوں مریں رومیو!''

''اس لیے کہ عاشقی کی روایات ایسی ہی ہیں۔ محبت کرنے والے ہی مرتے ہیں۔ آج تک کسی فلمی داستان عشق کے ہیرو نے اپنے رقیب روسیاہ کا مرڈر نہیں کیا۔''

''یہ اکیسویں صدی ہے ڈارلنگ! اب چراغ تلے نہیں چراغ کے اوپر اندھیرا ہوتا ہے۔ محبت کی روایات بھی بدل گئی ہیں۔ یہ کام تم کرسکتے ہو۔''

میں نے چونک کے کہا'' کون سا کام؟''

''کِل دیٹ باسٹرڈ!'' اس نے سکون سے کہا اور آئس کریم کے کپ کو بینچ کی سائیڈ میں رکھے ڈسٹ بن میں ڈال دیا'' اس کے سوا چارہ نہیں۔''

میں اسے دیکھتا رہا۔ وہ بالکل سنجیدہ تھی ''واٹ نان سنس!''

''رفی! ہمارے ملنے کی ایک ہی صورت ہے کہ اسے درمیان سے ہٹا دیا جائے۔ اس کو قتل کردیا جائے یا کرادیا جائے۔ آخر وہ بھی تو یہی کرے گا۔ جیت کے لیے پہل ضروری ہے۔ جارحیت ہی سب سے مؤثر دفاع ہے۔ اس سے پہلے کہ سانپ تمہیں ڈسے' اس کو مار ڈالو۔''

میں نے آسمان کو دیکھا'' ہاں' اس طرح ہماری ارواح کا عالم بالا میں ملن ہوسکتا ہے۔ وعدہ کرو کہ مجھے پھانسی ہوتے ہی تم بھی زہر کھا کے فوراً جان دے دوں گی۔ صحیح وقت پر۔''

''رفی! فار ہیون سیک۔ سیریس ہوں میں۔ کیوں ہوگی تمہیں پھانسی؟''

میں نے کہا'' چلو عمر قید ہوجائے گی۔''

''ایسا کیوں سوچتے ہو؟ پاکستان میں کسی کو مروانا کتنا آسان ہے۔ یہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔ بس ہمت ہونی چاہیے' ایک واضح پلان ہونا چاہیے۔ ذہانت اور پیسا ہونا چاہیے۔ کیا چیز نہیں ہے تمہارے پاس۔ پولیس خود تمہاری مدد کرے گی۔''

''اسٹاپ اِٹ فری!'' میں نے دھاڑ کے کہا۔

''چلانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ قربانی عشق کے دعوؤں کا وقت گزر گیا۔ اب کچھ کرنے کا وقت آیا ہے۔''

میں نے بے بسی سے کہا'' تم پاگل ہوگئی ہو سچ مچ!''

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا'' میری بات غور سے سنو رومیو! میں تم سے اس لیے کہہ رہی ہوں کہ تم مرد ہو۔ تم یہ کام بہتر طریقے پر اور آسانی سے کرسکتے ہو۔''

''آخر یہ کیسے فرض کرلیا ہے تم نے؟''

''تم انکار نہیں کرسکتے رفیق! تم کرتے رہے ہو یہ کام۔ تم جانتے ہو یہ کام کون لوگ کرتے تھے یا کراتے تھے۔ اس وقت کسی کو راستے سے ہٹانے والوں کی منزل تھی سیاست۔ ان کا جذبہ اتنا قوی تھا۔ وہ اپنی خواہش اور طلب کی شدت میں کسی بھی انتہا تک جانے کو ضروری سمجھتے تھے۔ تم ان کے مقصد سے اختلاف کرسکتے ہو۔ کہہ سکتے ہو کہ سیاست میں جمہوریت کا اصول چلنا چاہیے۔ مگر محبت میں سب جائز ہے۔ آل از فیئر ان لو اینڈ وار۔ کیا یہ غلط ہے...... بولو؟''

''میری مزاحمت کمزور پڑنے لگی۔ فریال کے دلائل مجھے اپیل کررہے تھے'' میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''دیکھو رومیو! زر' زن اور زمین کے لیے ہی دنیا کی تاریخ میں سارے قتل ہوئے۔ ہیلن آف ٹرائے کے لیے ایک جنگ لڑی گئی۔ نور جہاں کے لیے جہانگیر نے کیا نہیں کیا۔ اس کے شوہر کو شیر افگن کا خطاب دیا اور مروادیا۔ آج زمانہ لیلیٰ مجنوں کے عشق کا نہیں ہے کہ تم جنگل اور صحرا میں لیلیٰ لیلیٰ پکارتے پھرو اور جان دے دو۔ لوگ ہنسیں گے کہ کیسا بے وقوف آدمی تھا۔ اسے نکال کے لے جاتا اسے اگر اتنی ہی محبت تھی تو...... سارے پرانے قصے اب مضحکہ خیز لگتے ہیں۔ پرتھوی راج کیسے نکال کے لے گیا تھا'' سنجوگتا کو۔''

میں نے کہا'' یہ سب اتنا آسان نہیں ہے فری!''

''کیوں؟ تم کیا اتنے گئے گزرے ہو صفدر سلطان مرزا کے مقابلے میں۔ وہ تمہیں مار سکتا ہے۔ تمہاری محبوبہ کو قتل کرسکتا ہے اور تم صرف ڈر سکتے ہو۔ مقابلے کا نہیں سوچ سکتے۔ کیا ہے اس کے پاس جو تمہارے پاس نہیں ہے۔

تمہارے پاس تو زیادہ مضبوط اور معقول وجہ ہے۔ محبت' آج کی دنیا میں مانگنے سے کیا ملتا ہے' نہ آزادی نہ انصاف اور نہ اپنا حق۔''

''شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو......'' میں نے کہا۔

''وہ کیا شعر پڑھتے تھے تم اکثر' وصال یار فقط آرزو کی بات نہیں۔ واقعی' اس کے لیے آرزو سے زیادہ...... بہت زیادہ کرنا پڑتا ہے۔ محض آرزو کرنے سے کوئی بادشاہ نہیں ہوا۔ کوئی چیمپئن نہیں بنا۔ کسی کو کامیابی نہیں ملی۔ سوچو کہ یہ کانٹا درمیان سے کیسے نکالا جاسکتا ہے۔ ایسے کہ سانپ بھی مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ تم کہو گے کہ یہ کیسی عورت ہے جو قتل پر اکسا رہی ہے۔ بالکل یہی بات ہے۔ میں تمہیں اکسا رہی ہوں۔ تمہارا حوصلہ بڑھا رہی ہوں۔ اپنے دشمن کا خاتمہ کردو۔ یہی شرط ہے کامیابی کی اور اگر تم نے پھر بھی بزدلی دکھائی تو میں کروں گی یہ کام۔''

''فریال! مجھے سوچنے سمجھنے کا موقع دو۔''

''میرے پاس نہ عقل ہے نہ تجربہ۔ میں پلان تو کرسکتی ہوں مگر تمہاری طرح نہیں۔ میں نے سنا ہے کہ کرائے کے قاتل بھی ہوتے ہیں اسلحہ بھی کرائے پر ملتا ہے مگر مجھے معلوم نہیں کہاں؟ اگر تم پاکستان جارہے ہو تو سمجھو میدان جنگ ہے جہاں تمہیں چار مہینے میں دشمن کو نیست و نابود کرنا ہے۔ اس طرح کہ تم پکڑے نہ جاؤ۔ یہ واحد راستہ ہے ہمارے سامنے۔ تم مرد ہو' تم نے چوڑیاں پہن لیں تو مجھے کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ میں ایسے نہیں مروں گی رومیو! میں اسے مار کے مروں گی۔ انجام سے میں نہیں ڈرتی' یا تم یا موت۔''

''ایسا مت کہو فری!'' میں نے اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا'' تم کو کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم میری ہو' تمہیں مجھ سے کون چھین سکتا ہے۔ کوئی نہیں کوئی نہیں۔'' میں اسے چومتا رہا۔

''اتنا عرصہ بعد مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں رہی کہ میں کسی اور کی نہیں ہوسکتی۔ کسی اور کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے زندہ رہنے کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔ یہ بات ابھی صفدر سلطان مرزا نہیں جانتا۔ لیکن تم جانتے ہو کہ میں کس انتہا تک جاسکتی ہوں۔ جانتے ہو نا؟'' اس نے مجھے جھنجوڑ کے سوال کیا'' چار مہینے ہیں تمہارے پاس' پھر میں کچھ کروں گی۔''

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ لندن میں اس سے آخری ملاقات نے میری محبت کو میرے لیے مقصد حیات بنا دیا تھا۔ آرزو کو یقین میں بدل دیا تھا۔ اب میں جانتا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہوگا۔

جو مقصد میرے والدین نے میرے سامنے رکھا تھا اس کے اسباب اچانک پیدا ہوئے تھے۔ بظاہر ایسا ہی لگتا تھا۔ لیکن میری واپسی بھی بے سبب نہیں تھی۔ اسباب قدرت نے بہت پہلے طے کردیے تھے۔ ایک وقت پر وہ سامنے آگئے۔

میں نے کہا'' چلو میں تمہیں چھوڑ آؤں۔''

اس نے مسکرا کے میرے گال کو چوما'' میں چلی جاؤں گی۔''

اس نے مجھے شب بخیر کہا۔ جیسے ہمیشہ کہتی تھی۔ خدا حافظ یا الوداع نہیں کہا'' ہم جدا کب ہوتے ہیں۔ تم سامنے نہیں ہوتے تو خیالوں میں ہوتے ہو۔ خوابوں میں ہوتے ہو۔ عجیب پاگل لڑکی تھی...... اور اس نے اپنے پاگل پن میں مجھے بھی اسیر کر رکھا تھا۔

میں اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ میرے دل میں اب کوئی پچھتاوے کی خلش نہیں تھی۔ کوئی ملال نہیں تھا۔ میں مطمئن اور پر اعتماد تھا کیونکہ میرے پاس چار مہینے تھے۔

☆☆☆

ٹیکسی رک گئی۔ ڈرائیور نے دروازہ کھول کے مجھے یاد دلایا'' آپ نے یہی پتا بتایا تھا سر!''

میں چونک کے نیچے اترا'' تھینک یو سردار جی!'' میں نے اسے ایک نوٹ تھماتے ہوئے کہا۔

''اوئے بادشاہو!'' اس نے کہا'' کھلا نہیں ہے؟''

اگر میں اس کی تلاشی لیتا تو اس کی جیب میں سے ایسے دس نوٹوں کی چینج برآمد ہوتی مگر یہ بہت سے ڈرائیوروں کا مخصوص انداز تھا۔ داؤ چل جائے تو وارے نیارے۔ جب میں نے کہا کہ پلیز کیپ دی چینج تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔ جو رقم میں نے چھوڑ دی تھی وہ تقریباً کرائے کے برابر تھی۔ ایسی فیاضی کا مظاہرہ عموماً وہی کرتے تھے جو نشے میں ہوں یا جوئے میں سیکڑوں پاؤنڈز جیت گئے ہوں۔

''اللہ آپ کو خوش رکھے جی!'' اس نے سلیوٹ کے انداز میں اپنی پگڑی کو چھوا اور فرار ہوگیا جیسے اسے ڈر ہو کہ میرا ارادہ نہ بدل جائے۔ میں نوٹ واپس لے کر کہوں کہ ایک منٹ ٹھہرو میں کسی سے چینج لیتا ہوں۔

میری لینڈ لیڈی نے دروازہ کھولتے ہی بڑی ناراضی کا اظہار کیا'' اتنی دیر سے آرہے ہو۔ پتا ہے وقت کیا ہوا ہے؟''

''مارتھا...... ابھی دس بجے ہیں۔ ابھی تو کوئی بھی نہیں آیا ہوگا۔''

''سب آتے ہی ہوں گے'' اس نے کچن کی طرف

واپس جاتے ہوئے کہا۔

''تم ابھی تک پکانے میں لگی ہوئی ہو؟'' میں نے کہا۔

''رفیق! ذرا دیکھو یہ پلاؤ کیسا بنا ہے' اب تم کسی کو بتانا نہیں...... میں نے دوبارہ تیار کیا ہے۔ پہلی دفعہ خراب ہو گیا تھا۔''

میں نے ہنس کے کہا ''وہ کیسے......؟ اب تو بہت پریکٹس ہے تمہیں۔ تم دوسروں کو پکانا سکھا سکتی ہو۔''

''تم واقعی ایسا سمجھتے ہو یا مجھے خوش کرنے کے لیے کہہ رہے ہو؟'' اس نے ایک کوکنگ پاٹ کا ڈھکنا ہٹایا۔ کچن پلاؤ کی خوشبو سے بھر گیا۔

میں نے کہا ''کیا زبردست خوشبو ہے۔ مارتھا' تمہارے پلاؤ کو انٹرنیشنل کوالٹی سرٹیفکیٹ مل سکتا ہے۔''

''ایسے نہیں' چکھ کے دیکھو۔ کیا یہ کھانے کے قابل ہے؟'' اس نے خوش ہو کے مجھے ایک چمچہ دیا ''ایسا نہ ہو تمہارے دوست بھوکے رہ جائیں میری وجہ سے۔''

میں نے ایک چمچہ چاول نکال کے چکھے ''ونڈرفل مارتھا! کوئی یقین نہیں کرے گا کہ یہ بازار سے نہیں آیا ہے۔ کیا باقی چیزیں آ گئی ہیں؟''

اس نے کھانے کی میز کی طرف اشارہ کیا ''سب کچھ آ گیا ہے۔ میرا خیال ہے یہ سب بہت زیادہ ہوگا۔''

''مجھے بتاؤ' کون لوگ آ رہے ہیں۔ کل کتنے لوگ ہوں گے۔''

میں نے اسے گن کے بتایا ''تم سب کو جانتی ہو؟''

''اس کا مطلب ہے وہ نک چڑھی لڑکی نہیں آ رہی ہے۔ لارڈ ارنسٹ کی بیٹی ای شا۔''

''یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ نہ آتی۔ پہلے وہ ایشا تھی۔ اب وہ عائشہ ہے اور وہ نک چڑھی ہرگز نہیں ہے۔''

مارتھا نے اصرار کیا ''وہ نک چڑھی ہے' لیکن وہ خوبصورت ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تم سے کتنی محبت کرتی ہے۔ اس نے اپنے باپ دادا کا مذہب ترک کر دیا تمہارے لیے۔ بے شک یہ بہت گناہ کی بات ہے لیکن خداوند مسیح اسے معاف کرے گا۔ افسوس کہ تم نے پھر بھی اس سے شادی نہیں کی۔ تمہیں شرم آنی چاہیے۔''

میں نے کہا ''مارتھا۔ کیا تم جانتی ہو کہ ہم چار شادیاں کر سکتے ہیں۔ اس کی اجازت کیوں ہے۔ کیونکہ دل کے چار خانے ہوتے ہیں' میں ایک اس کے لیے ہمیشہ خالی رکھوں گا۔''

''او گاڈ! کیا واقعی تمہاری چار بیویاں ہوں گی رفیق!'' یہ تصور کرنا بہت مشکل ہے میرے لیے۔''

میں نے کہا ''کیوں...... تمہارے بھی تو چار شوہر تھے۔''

اس نے میری کمر پر چمچہ مارا ''ایک وقت میں نہیں بدمعاش! تمہیں ہمدردی ہونی چاہیے ایسی عورت سے جو تین بار بیوگی کا صدمہ جھیل چکی ہے اور اب دیکھو' دن رات آسٹن کی راہ دیکھ رہی ہوں۔ کیا پتا کب اسے مارتھا کی یاد آئے اور وہ واپس آ جائے۔ تم جانتے ہو میں کٹر رومن کیتھولک ہوں ورنہ طلاق لے کر اب تک اپنی تنہائی دور کر سکتی تھی۔''

میں نے کہا ''مارتھا۔ اب تو سچ بتا دو' میں جا رہا ہوں۔''

''ایسا کیا سچ ہے......؟''

میں نے کہا ''تم قسم لے لو مجھ سے' میں پولیس کو بالکل نہیں بتاؤں گا۔ آسٹن کو تم نے کہاں غائب کر دیا۔ قتل تو خیر پہلے بھی تین کو کیا تھا۔''

''یو راسکل! اس نے پھر چمچہ گھمایا مگر میں غوطہ مار کے نکل گیا۔ ''میں بتاتی ہوں تمہیں۔ بھیج دیتی ہوں آسٹن کے پاس۔ تم کبھی پاکستان نہیں پہنچو گے۔''

آسٹن اس کا چوتھا شوہر تھا جس نے صرف چھ مہینے مارتھا کے ساتھ گزارے اور پھر فرار ہو گیا۔ اب پتا نہیں یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ میری۔ وہ ہم سب کو ہنس ہنس کے بتاتی تھی۔ ''دراصل وہ بڑا ہی کنجوس تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اس کا سارا خرچہ اٹھاؤں میں نے کہا کہ آسٹن یہ تمہاری ذمے داری ہے کیونکہ شوہر تم ہو۔ اس کے پاس کچھ پیسا تھا۔ پتا نہیں کتنا۔ لیکن وہ خرچ نہیں کرتا تھا۔ بیمار ہو جاتے تو دوا تک نہیں لاتا تھا۔ ایک دن میں نے اسے نوٹس دے دیا کہ تم ایسے نہیں رہ سکتے۔ یہ کوئی یتیم خانہ نہیں ہے۔ اپنا خرچ تو تمہیں دینا ہی پڑے گا اور تم جانتے ہو میں کیا چارج کرتی ہوں۔ ایک اضافی سہولت تمہیں ملے گی کہ تم اپنی بیوی کے ساتھ سو سکتے ہو۔ اگر وہ تمہاری درخواست منظور کرے۔ بس اس کے بعد وہ چلا گیا کچھ بتائے بغیر۔''

مارتھا کے پہلے شوہر نے اس کے ساتھ چار سال گزارے۔ دوسرے نے سات سال۔ تیسرا نو سال زندہ رہا۔ مارتھا ان سب کو یاد کرتی تھی اور سب کی ازدواجی رفاقت کے واقعات ایسے سناتی تھی کہ ہم سب جو اس کے پیئنگ گیسٹ تھے' مارتھا کو چھیڑتے تھے ''بڑی ہی الم ناک کہانی ہے مارتھا۔ تمہیں گلے لگانے کے بجائے انہوں نے موت کو گلے لگا لیا۔ ہم ان کی جگہ ہوتے تو یہی کرتے۔''

ویسے تو ہر شوہر اس کے لیے کچھ نہ کچھ چھوڑ کے راہی

ملک عدم ہوا تھا مگر اس کے کہنے کے مطابق دوسرے شوہر کی موت تو ایک لاٹری کے ٹکٹ پر دو انعام جیسی تھی۔ یہ مکان اسی کا تھا جو میرے لیے سر چھپانے کا ٹھکانا بنا۔ وہ حادثے میں مارا گیا تھا چنانچہ انشورنس کی رقم بھی مجھے دگنی ہو کے ملی۔''

ہم میں سے کوئی شرارت سے پوچھتا ''ایکسی ڈنٹ تم نے کیسے پلان کیا تھا مارتھا؟''

وہ ہنستی ''تم سے پہلے پولیس کے سراغ رساں بہت سر کھپا چکے ہیں۔ بالآخر یہی ثابت ہوا کہ ان کی قضا آ گئی تھی۔ میرا بالکل کوئی قصور نہیں تھا۔ ایک اخبار نے آسٹن سے میری شادی کے وقت خبر لگا دی تھی۔ اب چوتھے کی باری ہے۔ میرے وکیل نے اسے نوٹس بھیج دیا۔ بیس ہزار پاؤنڈز ہرجانے کا کیس تھا۔ اس نے عدالت کے باہر پانچ ہزار پاؤنڈز دے کر اپنی جان چھڑائی اور معافی شائع کی۔''

ہر وقت ہنسنے اور ہنسانے والی مسز آسٹن اندر سے واقعی ایک دکھی عورت تھی۔ اس کا اندازہ ہر نئے پے انگ گیسٹ کو اس کے گھر میں کچھ عرصہ رہنے کے بعد ہوتا تھا۔ چالیس سال کی عمر میں وہ گوشت کا چلتا پھرتا پہاڑ بن گئی تھی اور اس کا وزن دو سو پچاس پاؤنڈ ہو چکا تھا۔ اس کی عمر کی لاکھوں عورتیں فٹ اور سلم رہ کے اور حسن و شباب کی حفاظت کے اصولوں پر عمل کر کے چوبیس سال کی جوان لڑکی نظر آنے میں کامیاب تھیں اور ایک آزاد معاشرے میں خوش رہنے کے تمام مواقع سے مستفید ہو کے لائف کو انجوائے کر رہی تھیں۔ ایکسر سائز تو دور کی بات تھی' وہ گھر کے اندر بھی کم سے کم نقل و حرکت کی قائل تھی۔ اشد ضرورت کے سوا کہیں آتی جاتی نہیں تھی اور ہر وقت کچھ نہ کچھ کھاتی رہتی تھی۔

مسز آسٹن کے بجائے مارتھا کہلوانا اسے زیادہ پسند تھا۔ آمدنی کا اسے کوئی مسئلہ نہیں تھا اسے حکومت کی طرف سے الاؤنس ملتا تھا۔ ایک شوہر کی انشورنس کی رقم کو اس نے بچت کی ایک منافع بخش اسکیم میں لگا رکھا تھا اور گھر کو اس نے گیسٹ ہوم بنا لیا تھا۔ آمدنی کے مقابلے میں اس کے اخراجات بہت کم تھے۔ سب ایک ساتھ بیٹھتے تھے تو کھانے کی میز جھولتی تھی اور فریاد کرتی تھی لیکن وہ کارپینٹر کو نہیں بلاتی تھی۔ ہمیں شرمندہ کرتی تھی کہ تم کیسے نوجوان لوگ ہو۔ کسی دن وقت نکال کے اس میں چار کیلیں نہیں ٹھونک سکتے۔ کرسیاں بھی پرانی تھیں۔ ایک گیسٹ کو کرسی پیچھے کر کے جھولنے کی عادت تھی۔ کرسی دو ٹانگوں پر کب تک ظلم سہتی۔ ایک دن کرسی ٹوٹی تو جھولنے والا پیچھے گرا اور اس کا سر دیوار پر لگا۔ تھوڑی دیر کے لیے وہ بے ہوش ہو گیا۔ ہم سب اسے اسپتال لے جانے کے لیے دوڑے جہاں ڈاکٹرز نے اسے چوبیس گھنٹے آبزرویشن پر رکھ کے واپس بھیج دیا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ مارتھا نے فوراً اسے نوٹس دے دیا کہ کرسی تمہاری بے ہودہ عادت کی وجہ سے ٹوٹی۔ اسے پھر قابل استعمال بنانے کی ذمے داری بھی تمہاری ہے۔ میرے باتھ روم کا نلکا مسلسل بہتا تھا۔ مارتھا نے اس کا یہ علاج کیا کہ ٹونٹی میں ایک ربر کا پلگ لگا دیا۔ جب ضرورت ہو ربر نکال لو۔ ٹونٹی بدلنے کی فضول خرچی غیر ضروری ہے۔

کفایت شعاری اور کنجوسی میں اس کے نزدیک چنداں فرق نہ تھا۔ وہ ہم سب کو وقت بے وقت لیکچر دیتی رہتی تھی۔ پیسا بچاؤ ینگ مین! دنیا میں اب رشتے کام نہیں آتے پیسا کام کرتا ہے۔ پیسا مشکل سے آتا ہے اور آسانی سے جاتا ہے۔ دیر سے آتا ہے اور ٹھہرتا نہیں ہے۔ جب یہ آئے تو اسے پکڑ لو' قید کر لو' اپنا غلام بنا لو۔

مارتھا کے بچے نہیں تھے۔ اس کی ساری ذمے داری وہ اپنے چار شوہروں پر عائد کرتی تھی۔ ''سوچو ذرا' جب چار مرد کچھ نہیں کر سکے تو میں اکیلی عورت کیا کر سکتی تھی۔ میں نے تو بہت ٹائم دیا انہیں۔ ایک کو چار سال' دوسرے کو سات سال' تیسرا گیارہ سال کوشش کرتا رہا۔ آسٹن کو بھی چھ مہینے بہرحال ملے۔ میری ماں کہتی تھی وہ شادی کے دوسرے دن حاملہ ہو گئی تھی۔ صرف ایک شوہر تھا میری دادی کا' گیارہ بچے پیدا کیے اس نے۔ اب کسی چیز کا معیار ہی نہیں رہا۔ ہر چیز کی کارکردگی خراب ہو گئی ہے۔ اب تم اس ریڈیو کو دیکھو' دوسری جنگ عظیم کے زمانے کا ہے اور صرف ایک بار خراب ہوا تھا۔ چرچل تقریر کر رہا تھا۔ اچانک اس کی جگہ چوہے کی آواز آنے لگی۔ پھر وہ بھی بند ہو گئی۔ میں تو خوف سے تھر تھر کانپنے لگی کہ ضرور جاپانیوں نے کچھ کیا ہے۔ برطانوی وزیراعظم کو چوہا بنا دیا ہے یا اس کی آواز بدل دی ہے۔ مگر میرا دوسرا شوہر بہت بہادر تھا۔ اس نے ریڈیو کو پیچھے سے کھولا اور ایک اچھا خاصا بڑا چوہا دم سے پکڑ کے نکال لیا۔ بے شک اسے چوہے نے کرنٹ بھی مارا۔''

اپنے اکیلے پن کو دور کرنے کے لیے مارتھا نے گھر میں چار پے اِنگ گیسٹ رکھ لیے تھے۔ اس دو منزلہ گھر کے اوپر والے حصے میں تین کمرے تھے۔ کچن اور لاؤنج ملا کے اس نے چوتھا کمرا بنایا۔ اوپر دو باتھ روم تھے۔ ایک کو اس نے ٹائلٹ بنا دیا اور دوسرے کو واش روم ''آخر کیا ضرورت ہے سب کو ایک ساتھ ٹائلٹ استعمال کرنے کی۔ اپنی عادتیں درست کرو۔ جو پہلے اٹھتا ہے یا جیسے پہلے جانا ہوا اسے پہلے

موقع دو۔ ورنہ آدھا گھنٹا پہلے اٹھ جاؤ۔''

نیچے وہ خود رہتی تھی۔ ایک لونگ روم تھا جہاں تھوڑا بہت وقت سب ہی گزار لیتے تھے۔ دہاں ٹی وی نہیں تھا۔ وہ کہتی تھی کہ ٹی وی دیکھنا ہے تو اپنے کمرے میں رکھو۔ ایک ٹی وی پر سب اپنی پسند کے پروگرام نہیں دیکھ سکتے۔ اخبار پڑھنا ہے' میوزک سننا ہے۔ سب اپنے کمرے میں۔ یہاں بیٹھو تو گپ شپ کرو۔

گیسٹ ہوم کے مستقل باسی چار تھے جو عام طور پر نوجوان طالب علم ہوتے تھے۔ انڈین اور پاکستانی طلبہ اکثر اس کے پاس پرانے حوالوں سے آتے تھے اور مایوس جاتے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ صرف سو پاؤنڈز میں وہ جتنی سہولتیں دیتی تھی اتنی اس زمانے میں لندن جیسے شہر میں ڈیڑھ سو پاؤنڈز میں بھی نہیں مل سکتی تھیں۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے گیسٹ ہاؤس کو فیملی ہوم کہتی تھی اور اس میں ایک گھر جیسا ماحول رکھنے کی قائل تھی۔ وہ پیسے کی نہیں محبت کی بھوکی تھی۔ وہ سب نوجوانوں کا خیال کسی ماں کی طرح رکھتی تھی اور بدلے میں یہ چاہتی تھی کہ اسے ماں جیسی عزت اور توجہ ملے۔ کوئی اس سے جھوٹ نہ بولے۔ اسے بے وقوف نہ بناتے۔ کبھی کبھار اس کی ڈانٹ ڈپٹ بھی سن لے اور شرافت سے رہے۔ ظاہر ہے ایسی سوچ صرف انڈیا پاکستان کے عام گھروں سے آنے والے لڑکوں کی ہوسکتی تھی۔ یورپی ممالک سے آنے والے ایسی خاندانی اقدار کو سمجھتے ہی نہیں تھے' جس میں بزرگ انہیں بالغ مانتے ہوئے انہیں کھلی چھٹی دے دیں اور ان کے اخلاق و کردار کی نگرانی سے دستبردار ہوجائیں۔

مارتھا لڑکیوں کو بھی جگہ نہیں دیتی تھی۔ ''نہیں بھئی' میں مشکل میں پڑنا نہیں چاہتی۔ ایک لڑکی ہوگی تو اس کے تین عاشق تو یہیں موجود ہوں گے۔ میں کس کس پر نظر رکھوں گی۔ ان کی آپس میں رقابت ہوگی تو جھگڑا ہوگا۔ خون خرابا بھی ہوسکتا ہے۔ پھر وہ باہر سے کسی کا بچہ لے آئی پیٹ میں تو میں کیا مڈوائف بنوں گی اس کی؟ ایک ایرانی نوجوان صالح نے ایک بار بڑی کوشش کی کہ خالی ہونے والا ایک کمرا اس کی بہن کو مل جائے۔ وہ اس کی نیک چلنی کی ضمانت دینے اور اس کی نگرانی کی ذمے داری بھی قبول کرنے کو تیار تھا مگر مارتھا کے اصول بہت سخت تھے۔ وہ تمہاری بہن ہے' باقی سب کی بہن نہیں ہے۔ میں کوئی رسک نہیں لے سکتی۔ اس نے صاف انکار کردیا۔ صالح سخت مایوس ہوا۔ اس کے باپ نے شاہ ایران کے خلاف انقلاب میں خمینی کا ساتھ دیا تھا مگر وہ بھائی بہن اب خمینی کا تختہ الٹ کے تہران کو پھر پیرس بنانا چاہتے تھے۔ وہ سابق شاہ پرستوں کی کسی تحریک کے سرگرم رکن تھے جو سب مغرب پرستی کے علمبردار تھے۔ اس تحریک کو یورپ اور امریکا سے حمایت اور مالی امداد بھی فراہم ہوتی تھی مگر انہیں پاسداران انقلاب کے ڈر سے چھپ کر رہنا پڑتا تھا۔

میں اس کے ساتھ دو سال سے تھا۔ جب میں آیا تو اس نے میرا بہت سخت انٹرویو لیا تھا ''کس نے بھیجا ہے تمہیں۔''

میں نے کہا ''شاہ محمد نے۔ جب وہ طالب علم تھا تو دو سال یہاں رہا تھا۔ امریکا میں وہ میرا روم میٹ تھا۔''

''تمہارے پاس اتنا اچھا جاب ہے۔ تم زیادہ پیسے خرچ کرنے کسی ہوٹل یا کرائے کے اپارٹمنٹ میں بھی رہ سکتے ہو۔ اگر تم کفایت شعار ہو تو اچھی بات ہے مگر مارتھا کا گیسٹ ہوم تمہیں کیوں پسند ہے؟''

میں نے کہا ''کیونکہ یہاں سب ایک فیملی کی طرح رہتے ہیں اور میں اپنی فیملی کو بہت مس کرتا ہوں۔ خصوصاً اپنی ماں کو۔''

یہ آخری جملہ کارگر ہوگا۔ مجھے پہلے ہی بتا دیا گیا تھا۔ اب مارتھا نے گیسٹ ہوم کے قواعد وضوابط بتانا شروع کیے ''میں کٹر رومن کیتھولک اور مذہبی ہوں۔''

''میں بھی پانچوں وقت نماز پڑھتا ہوں۔''

''شراب تو نہیں پیتے؟''

میں نے اپنے کانوں کو ہاتھ لگایا ''توبہ.....توبہ!''

''راتوں کو غائب تو نہیں رہتے۔''

''نہ میں جادوگر ہوں اور نہ بھوت۔''

اس نے مجھے ڈانٹا ''میں آدھی رات کے بعد کسی کے لیے دروازہ نہیں کھولتی۔''

''کوئی بات نہیں۔ میں کھڑکی کے راستے آجاؤں گا۔ پائپ سے چڑھ کے۔ دوسری چابی بنوالوں گا۔ میرا مطلب ہے کبھی ایسا ہوا تو۔ ویسے میں دس بجے سو جاتا ہوں۔''

''کبھی کبھار کی کوئی بات نہیں'' اس نے اطمینان کا سانس لیا ''یہاں تم جوا نہیں کھیل سکتے۔ گرل فرینڈز آسکتی ہیں مگر صرف ویک اینڈ پر۔ ان سے تم صرف لونگ روم میں مل سکتے ہو۔ انہیں کمرے میں نہیں لے جاسکتے۔ رات کو کمرے میں کوئی مہمان نہیں ٹھہر سکتا۔ سوائے تمہارے ماں باپ کے۔ اگر کبھی وہ لندن آئیں تو تم مجھے پہلے سے بتاؤ گے.....سگریٹ پیو مگر باہر۔''

ظاہر ہے' اتنی پابندیوں کے ساتھ رہنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ عام طور پر ایشیائی مسلمان اس ٹیسٹ میں

پاس ہوجاتے تھے لیکن جو کمرا ملا اس میں چار سال تک ایک بنگلا دیشی راجن چکرورتی رہا تھا۔ مارتھا اسے بہت یاد کرتی تھی۔ ہی واز اے پرفیکٹ جنٹلمین۔ اب یہ بات مذاق بن گئی تھی۔ ہر نامعقولیت کے مظاہرے پر ہم ایک دوسرے کو یاد دلاتے رہتے تھے کہ تم ایک پرفیکٹ جنٹلمین نہیں ہو۔

میرے علاوہ وہاں حیدر آباد دکن کا عباس حیدر تھا۔ جو بی بی سی میں ملازم تھا۔ وہ ذہین اور انقلابی سوچ رکھنے والا شخص ملک وقوم رنگ ونسل اور مذہب وملت کی کسی حد بندی کو عملاً قبول نہیں کرتا تھا۔ کیا یہ کافی نہیں کہ ہم ایک ہی وقت میں جینے والے انسان ہیں جو ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور مانتے ہیں۔ مگر اس روشن خیال روشن ضمیر کے ساتھ جو ہوا ایسا ہی تھا جیسے خوشبوؤں کا سوداگر کسی گٹر میں ڈوب کے مرجائے۔ وہ رات کو پروگرام کر کے لوٹ رہا تھا کے اسے نشے میں دھت چار نسل پرست گنجوں یعنی اسکن ہیڈز نے گھیر لیا۔ اس صلح پسند اور نرم خو آدمی نے جان چھڑانے کی بہت کوشش کی۔ ایک اور چار کا کوئی مقابلہ نہ تھا۔ اُن کے پاس فولادی زنجیریں تھیں اور بازوؤں کی ورزش میں کام آنے والے اسپرنگ دار ڈنڈے تھے۔ انہوں نے مار مار کے اسے پلپلا کردیا۔ مارتھا آج بھی اسے یاد کر کے روتی تھی۔ ایرانی نژاد صالح نے بڑی کوشش کی کہ خالی ہونے والا کمرا اس کی بہن کو مل جائے مگر اس میں بالآخر دہلی کا کمپیوٹر انجینئر مرشد آیا۔ ذہنی طور پر وہ خود بھی ایک کمپیوٹر تھا۔ اس کی کسی سے دوستی نہیں تھی اور وہ کمرے میں اپنا سارا وقت کمپیوٹر کے سامنے گزارتا تھا۔ ہم سب اسے کمپیوٹر صاحب کہتے تھے۔

میری زیادہ دوستی پاکستانی ڈاکٹر بشیر چوہدری سے رہی جو میری طرح لاہور کا رہنے والا تھا۔ وہ نیورو سرجری میں اسپیشلائز کرنے آیا تھا لیکن وہ طبعاً رنگین مزاج تھا اور لندن کے رومان پرور ماحول میں ایسا گم ہوگیا تھا کہ نہ اسے ڈگری لینے کی فکر تھی اور نہ واپس جانے کی۔ وہ یار باش ہر وقت خوش رہنے والا زور زور سے قہقہے لگانے والا شوقین مزاج آدمی تھا اور بیک وقت ایک درجن عشق چلاتا تھا تو ان میں سے نصف نوجوان طرح دار لڑکیاں ہوتی تھیں۔ ان کے لنچ ڈنر اور تحائف کے اخراجات پورے کرنے کے لیے وہ کچھ عشق خود سے دگنی عمر کی یا بدصورت عورتوں سے بھی کرتا تھا جو دولت مند ہوں۔

جب میں نے اپنی روانگی کا اعلان کیا تو ہمیشہ کی طرح مارتھا کا صدمے سے برا حال ہوگیا۔ وہ طبعاً اتنی نیک دل اور ہمدرد عورت تھی کہ سوائے کمپیوٹر صاحب کے ہم سب اسے اپنی ہر بات اسی طرح بتا دیتے تھے جیسے اپنی ماں کو بتاتے۔ اس میں ایک خوبی رازداری کی بھی تھی چنانچہ وہ میرے تمام حالات سے باخبر تھی۔ وہ میرے اور فریال کے سارے معاملات جانتی تھی۔ گیسٹ ہوم کے کسی بھی ساتھی کے سامنے میں نے کبھی فریال کا نام بھی نہیں لیا تھا چنانچہ وہ سمجھتے تھے کہ دل لگی کے لیے میں بھی موسم کے حساب سے گرل فرینڈز بدلتا رہتا ہوں۔ لیکن لارڈ ارنسٹ کی دولت مند مغرور اور انتہائی حسین بیٹی ایلشا کے ساتھ میرا بڑا جان لیوا قسم کا افیئر ہے ورنہ وہ اتنا بڑا اقدم کیسے اٹھاتی۔ میری خاطر وہ ماں باپ کا گھر' عیش وعشرت کی زندگی' اپنا مذہب اور ملک سب چھوڑنے پر تیار تھی۔

پہلے تو مارتھا نے مجھے روکنے کے لیے جذباتی دلائل کا سہارا لیا ''تم بہت بڑی غلطی کررہے ہو رفیق!''

''ایک فلسفی کا قول ہے کہ ہم پیدا ہو کے سب سے بڑی غلطی کرتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''مذاق مت کرو۔ جس حویلی اور جاگیر کی خاطر تم واپس جارہے ہو۔''

میں نے کہا ''اس بیان میں تصحیح ضروری ہے۔ میں والدین کے حکم پر واپس جارہا ہوں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن ان دونوں کا کیا ہوگا؟''

''کون دونوں؟''

''رفیق! واپس جا کے تم فریال سے شادی نہیں کرسکتے۔ وہ جو تمہارا دشمن ہے.....مرزا' وہ تمہیں مرڈر کردے گا۔''

''ایسا ہی کرنا چاہیے اسے.....اصولاً۔'' میں نے کہا۔

''فریال سے تم یہاں شادی کرسکتے تھے۔ لندن میں اس کی بدمعاشی نہیں چل سکتی تھی۔''

''ہم یہاں ہمیشہ نہیں رہ سکتے۔''

''کیوں نہیں رہ سکتے؟ لاکھوں پاکستانی ایسے ہی رہتے ہیں۔ لیکن فرض کرو تم کو شہریت کا مسئلہ درپیش ہو۔ تو سب سے آسان حل ہے کہ اس لارڈ کی بیٹی عائشہ سے شادی کرلو۔''

''اور برطانوی شہری ہونے کے بعد فریال سے شادی کرلوں۔ ایک چین ری ایکشن کے طور پر اسے بھی برطانیہ کی شہریت حاصل ہوجائے۔ تم بھی کیسی باتیں کرتی ہو۔''

''جب تمہارے مذہب میں ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت ہے.....''

''ایسا کرنا ہوتا مارتھا ڈارلنگ تو دو سال پہلے کرچکا

ہوتا۔ جب میں نے تمہیں دیکھا تھا اور پہلی نظر میں تم پر فریفتہ ہو گیا تھا۔"

اس نے ایک دم میرا کان پکڑ لیا "میں سیریس بات کر رہی ہوں اور تو مذاق کر رہا ہے......"

میں نے واویلا کیا "ارے' میرا کان نکل جائے گا۔ اسی سے سنتا تھا میں' دوسرا تو سن کے اڑانے کے لیے تھا۔"

اس نے میرا کان چھوڑ دیا۔ "میں تمہارا بھلا چاہتی ہوں رفیق! مجھے تمہارے فادر سے بات کرنی ہوگی۔"

میں نے کان ہلا کے کہا "کوئی فائدہ نہیں۔ وہ بہرے ہیں' صرف اپنے مطلب کی بات سنتے ہیں۔"

"ان کو سوچنا چاہیے۔ تم کو جس مجرموں کے گروہ سے نکال کے باہر بھیجا تھا۔ وہ اب پہلے سے زیادہ طاقتور ہے۔ یہ تم نے ہی بتایا تھا مجھے۔ پرانے آسیب کبھی پیچھا نہیں چھوڑتے۔ تم خوش قسمت تھے کہ جان بچانے میں کامیاب رہے تھے۔ کیا گارنٹی ہے اس کی کہ جب تم واپس جاؤ گے تو وہ پھر تمہیں استعمال نہیں کریں گے۔"

"وہ بات پرانی ہو گئی۔ پرانے لوگ مرکھپ گئے۔ میرا اب ان سے کوئی تعلق نہیں۔ رسک نہ ہونے کے برابر ہے۔"

"مگر ہے...... کیا ضرورت ہے رسک لینے کی۔ تمہارے والدین کو یہاں آ کے سیٹل ہو جانا چاہیے۔ یہ جو حویلی اور جاگیر ملی ہے انہیں۔ اسے بیچ دیں اور سارا پیسا لے کر یہاں آ جائیں۔ جہاں ایک شاندار مستقبل ہے...... اگر وہ تمہاری نہیں سنتے تو میں بات کروں گی ان سے۔"

اس نے بات کی۔ ہر حوالے اور دلیل سے۔ "یہ سات سمندر پار کی کال اسے میرے تین ماہ کے کرائے سے زیادہ مہنگی پڑی اور رائیگاں گئی۔ جذبات کے آگے دلیل ویسے بھی کون سنتا ہے۔"

فون رکھ کے وہ رونے لگی "کوئی نہیں سنتا میری۔ میں ہوتی بھی کون ہوں تمہیں روکنے والی۔ کیا حق ہے میرا تم پر۔"

میں نے اسے گلے لگا کے بہت تسلی دی "ایسا مت کہو مارتھا۔ یہاں تم نے مجھے ماں جیسی محبت دی حالانکہ میں ایک اجنبی تھا۔"

"رفیق! مائی سن! یور مارتھا کو بھلا مت دینا۔ مجھے خط لکھتے رہنا اور فون ضرور کرنا۔ کرسمس پر اور نئے سال پر مجھے وش ضرور کرنا۔ میری برتھ ڈے یاد ہے نا تمہیں۔ کارڈ بھیجنا مت بھولنا۔ یہ ای میل وغیرہ میں نہیں جانتی۔ خوبصورت کارڈ بھیجنا۔ میں انہیں سنبھال کے رکھوں گی...... اور ہاں' میرے مرنے سے پہلے ایک بار مجھ سے ملنے ضرور آنا۔"

میں نے کہا "مارتھا...... ایسی باتیں مت کرو' میں ضرور آؤں گا۔"

"سب ایسا ہی کہتے تھے' جو چلے گئے۔ صرف راجن چکرورتی وعدے کا پکا ثابت ہوا۔ ہی واز اے پرفیکٹ جنٹلمین! تم بھی اچھے لڑکے ہو رفیق۔ اپنی شادی کی تصویریں ضرور بھیجنا مجھے۔ بلکہ وڈیو فلم۔ شادی کے بعد اپنی بیوی کو مجھ سے ملوانے ضرور لانا۔ ہو سکے تو بعد میں اپنے بچوں کو بھی۔"

میں نے کہا "میں تمہیں اپنی شادی میں ضرور بلاؤں گا۔"

"فریال بہت پیاری لڑکی ہے۔ میں ہر روز تمہارے لیے دعا کروں گی۔ خداوند یسوع مسیح تمہاری مشکلات دور کرے گا۔ خیر' بہت دل چاہتا ہے کسی دھوم دھام والی شادی میں شرکت کروں۔ اسے دیکھوں وہ لال برائیڈل ڈریس میں ہاتھوں پر مہندی لگا کے اور ڈھیر سارا زیور پہن کے کیسی لگتی ہے لیکن میں کیسے جا سکتی ہوں اپنے دوسرے بچوں کو چھوڑ کے۔ وہ کیا کریں گے میرے بغیر۔ کون خیال رکھے گا ان کا۔"

اب میری روانگی کا وقت آ گیا تھا۔ مارتھا سخت اداس تھی لیکن پہلے کی طرح اس نے مجھے بھی خوش دلی سے رخصت کرنے کے لیے ایک الوداعی پارٹی کا بندوبست کیا تھا۔ اس کے ساتھ رہنے والے کبھی کبھی شوقیہ اپنے علاقے کی کوئی روایتی ڈش تیار کرتے تھے۔ ان میں سے کوئی ماہر نہ تھا مگر لندن آ کے سب پکانے لگتے تھے۔

لاہور کا چوہدری بشیر مچھلی فرائی کرتا تھا تو کہتا تھا "لے بھئی ماسی اپنے لہور کا پتا ہے نا' جارج بش نے اور کوفی عنان نے بھی ادھر مچھلی کھائی ادھر مزنگ چونگی میں تو کہا کہ واقعی لہور لہور ہے۔ اپنا ایک ہمنام ہے ادھر بشیر۔ کیا مچھلی بناتا ہے ماسی! بندے کو لائن میں لگنا پڑتا ہے۔ تمہارا شہزادہ چارلس جائے تو اسے بھی باری سے ملے گی اور لائن پتا ہے کدھر تک جاتی ہے' اپنے نیلے گنبد تک۔ نیلے گنبد کا پتا ہے نا' بلیو ڈوم...... تو ماسی مارتھا میں نے استاد بشیر آف دارالماہی کے گوڈے پکڑ لیے۔ گوڈے یعنی گھٹنے ...... اس طرح...... میں نے کہا استاد' جب تک مچھلی کے مسالے کا نسخہ نہیں بتاؤ گے' نسخہ وہ نہیں جو ہم جیسے ڈاکٹر لکھتے ہیں' فارمولا...... تب تک چھوڑوں گا نہیں۔ میں بھی ادھر بیٹھا ہوں آپ کے ساتھ۔ لو جی گوڈے چھڑاتا تو وہ خود گھر کیسے جاتا۔ اس نے کہا کہ اچھا' ادھر لا اپنا کان...... پھر میرے کان میں

نسخہ بتا کے مجھے قسم دی بہت بڑی' ایک یہ کہ مرتے دم تک نسخہ کسی پر ظاہر نہیں کروں گا' اپنی گھر والی پر بھی نہیں۔ عورت ذات جیسے حمل نہیں چھپا سکتی ایسے ہی بات نہیں چھپا سکتی۔ میں نے کہا استاد جی' اپنے پیو دا پتر نہیں میں جو پولیس بھی مجھ سے کچھ پوچھ سکے۔ بے شک تیرہ نمبر سے وہ روز صبح شام چھترول کریں' چھترول کا پتا ہے نا......؟"

عباس حیدر سے ہر شخص کہتا تھا کہ حیدرآبادی بینگن کھلاؤ کسی روز۔ اسے انڈا ابالنا بھی نہیں آتا تھا۔ کرنا خدا کا یوں ہوا کہ لندن میں ہی اس کا ایک حیدرآبادی خاتون سے افیئر ہو گیا۔ انہوں نے اور کچھ سکھایا یا نہیں مگر حیدرآبادی بینگن پکانا سکھا دیے۔ وہ بار بار کی پریکٹس کے بعد عباس حیدر نے اپنا شمار ماہرین میں کرنا شروع کر دیا اور فوراً ایک بنگالن پھانس لی۔ وہ رس گلے بھی اچھے بنانے لگا۔ زندگی نے وفا نہ کی ورنہ کسی دلی والے سے قورمہ اور کراچی والی سے سندھی بریانی کے علاوہ بہت کچھ سیکھنا اس کے پروگرام میں شامل تھا۔ کہتا تھا یار خواہ مخواہ علم کے چکر میں پڑ کے صحافی بنے۔ دولت کے چکر میں باورچی بننا آسان تھا۔ آج لندن میں اپنا کوئی ریسٹورنٹ ہوتا۔

مرشد نے صرف ایک بار غضب کا قورمہ بنایا اور پھر کہہ دیا تھا کہ آئندہ جسے بنانا ہو نسخہ اور طریقہ کمپیوٹر پر دیکھ لے۔ پہلے امریکا اور اب لندن میں مجھے چکن پلاؤ میں اعزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی گئی تھی۔ یہ عجیب بات تھی کہ لندن میں سب کچھ اسی طرح ملتا تھا جیسے لاہور' دہلی یا کراچی میں بلکہ کوالٹی میں بھی بہتر لیکن اس کے باوجود اپنے ہاتھ سے پکا کے کھانے کا شوق سب کو تھا۔ شاید اس طرح وہ گھر کے پکے کھانے سے وابستہ اپنایت کے احساس کو تازہ کرتے تھے۔ ہوٹلوں میں کھانا ہم سب کی معاشرت میں آج بھی اپنے گھر کے نہ ہونے کی خلش جگاتا تھا۔ ذائقے سے زیادہ یہ سکون غرور اور اعتماد و اطمینان کی بات تھی جو اپنی کار میں بیٹھنے والے کو ملتا ہے۔ ٹیکسی میں سفر کرنے والے کو نہیں۔

صرف ایرانی نوجوان صالح بالکل نکما تھا۔ وہ کچھ بھی نہیں پکا سکتا تھا مگر کھانے میں سب سے آگے رہتا تھا۔ معاملات کام و دہن میں وہ شرعی حدود کو بہت پہلے عبور کر چکا تھا۔ ظاہر ہے اس کا آج کے ایران میں گزارا ممکن نہ تھا اور مجھے اس کے خوابوں کا انقلاب محض خود فریبی نظر آتا تھا۔

مارتھا نے ہم سب سے کچھ نہ کچھ سیکھا تھا اور الوداعی دعوت میں وہ خود انڈین کھانے بناتی تھی۔ ہم انہیں پاکستانی قرار دیتے تھے۔ بہت سی دوسری باتوں کی طرح یہ بات بھی اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ تم لوگوں کی زبان ایک' لباس ایک' کھانے وہی' موسیقی وہی' صرف مذہب الگ ہے تو تم لوگ لڑتے کیوں ہو؟ یہاں تو نہیں لڑتے۔ ظاہر ہے یہ بات آسانی سے اس کی سمجھ میں آنے والی نہیں تھی چنانچہ ہم مذاق میں ٹال دیتے تھے۔

میں نے اپنے سات دوستوں کو مدعو کیا تھا۔ ان میں سے تین لڑکیاں تھیں۔ اتنے لوگوں کے لیے کھانا بنانا اکیلی مارتھا کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ صرف چکن پلاؤ بنا رہی تھی باقی چیزیں میں نے ایک مشہور پاکستانی ریسٹورنٹ سے منگوالی تھیں۔

کچن سے نکل کے اس نے کرسی پر گرتے ہوئے اپنا پسینہ صاف کیا "او گاڈ! میں کتنی تھک گئی ہوں لیکن خدا کا شکر ہے' سب تیار ہے۔"

میں نے کہا "مارتھا ڈارلنگ! جاؤ اب تم خود تیار ہو جاؤ۔"

"او بوائے! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں وہ مضحکہ خیز لباس کیسے پہنوں گی" اس نے فریاد کی۔

میں نے کہا "آخر تم ساڑی باندھنا جانتی ہو۔"

"وہ تو بس چھ گز سیدھا کپڑا ہے۔ میں لپیٹ لیتی تھی کسی نہ کسی طرح۔ اس کا ٹاپ تو ٹھیک ہے لیکن نیچے کا حصہ...... کیا بولتے ہیں اس کو...... گریگری۔"

میں نے ہنس کے کہا "غراری......!"

"وہ تو عجیب چیز ہے۔ جیسے دو اسکرٹ جوڑ دیے جائیں۔ ایک دائیں ٹانگ کے لیے۔ ایک بائیں ٹانگ کے لیے...... ہاؤ سلی!"

میں نے کہا "مارتھا یہ برائیڈل ڈریس ہے۔ ہماری دلہنیں پہنتی ہیں۔ میری شادی ہوگی تو دلہن پہنے گی۔ میری ماں نے اور اس سے پہلے دادی نے بھی یہی پہنا تھا۔ ڈونٹ کال اٹ سلی! کتنی اچھی لگتی ہیں ہماری دلہنیں۔ تم نے ویڈیو فلمیں دیکھی ہیں۔"

"یہ اتنا لمبا کیوں ہوتا ہے۔ کیا خیال ہے میں قینچی لے کر اسے نیچے سے کاٹ نہ دوں۔ مجھے ڈر ہے کہیں پیر الجھ گیا تو میں منہ کے بل گروں گی۔"

میں نے کہا "جو عروسی لباس تمہاری دلہنیں پہنتی ہیں اور تم نے بھی پہنا ہوگا۔ وہ کتنا لمبا ہوتا ہے۔ وہ مضحکہ خیز نہیں لگتا تمہیں' ڈائنا کا ڈریس دیکھا تھا...... وہ خود پادری کے پاس پہنچ گئی تھی' اس کے ڈریس کا پچھلا حصہ چرچ کے وسط میں تھا۔"

''رفیق! میں دلہن نہیں ہوں۔ ذرا اس کا شوخ لال رنگ دیکھو'لوگ مجھ پر ہنسیں گے۔''

''لوگ خوش ہوں گے۔ سب بچے ہیں تمہارے۔ پھر تمہارے ساتھ تصویریں بنوائیں گے۔ میں پاکستان جاؤں گا تو سب کو دکھاؤں گا۔ میں نے سب کو بتادیا ہے کہ میری فرمائش پر تم یہ لباس پہن رہی ہو۔ تم نے میری ماں کی شادی والی تصویر دیکھی ہے نا۔ جس میں میرے فادر بھی گلے میں پھول ڈالے کھڑے ہیں۔''

''ان کے چہرے کہاں نظر آرہے تھے۔ سر کے سامنے پھولوں کی چادر لٹکی ہوئی تھی۔''

میں نے کہا ''اسے ہم سہرا کہتے ہیں۔ انہوں نے شادی کے پچیس سال بعد اپنی شادی کی سلور جوبلی پر وہی لباس پھر پہنا تھا۔''

''کیسے پہنا تھا'' مارتھا نے اعتراض کیا ''وہ تو بہت چھوٹا پڑا ہوگا۔''

میں نے کہا ''یہ واقعی عجیب بات ہوئی۔ میری ماں شادی کے وقت کچھ موٹی تھی۔ اب سلم ہے۔ ابا تھوڑا سا پھیلے تھے۔ شیروانی میں پھنس گئے۔ تقریب کے مہمان جتنے خوش تھے اتنے حیران۔ بعد میں ابا کو شیروانی سے رہائی ملی تو انہوں نے کہا کہ میرا سانس بند ہو چکا تھا' ناؤ گو۔''

''اوکے' اوکے...... سنی!'' وہ ہمت کر کے اٹھی۔

''تمہارا ہیئر اسٹائل میں بناؤں گا اور پھر دوپٹا سیٹ کروں گا۔''

اس نے بے بسی سے ہاتھ ہلائے کہ اب جو ہو سو ہو۔

میں اپنے کپڑے بدل چکا تھا۔ جب گھنٹی بجی اور میں اپنے پہلے مہمان جوڑے کو اندر لے آیا۔ وہ میرے ساتھ کام کرنے والے مسز اور مسز ایلیٹ تھے۔ جب ان کا عشق چل رہا تھا تو وہ مسٹر اور مسز ایڈیٹ کہلاتے تھے۔ بظاہر محبت کے سوا ان میں کوئی قدر مشترک نہ تھی۔ جاپانی نژاد سوشی دیکھنے میں ایک سیدھی سادی نازک اندام لڑکی تھی مگر اس کے پاس مارکیٹنگ کے شعبے کا شاندار تجربہ تھا۔ جاپانی اپنی اصل عمر سے بہت کم کے نظر آتے ہیں۔ سوشی اگر خود کو بائیس چوبیس کا بتاتی تو لوگ یقین کرتے مگر اس کی عمر چونتیس سال تھی جو اس نے کبھی نہیں چھپائی۔ اس کے پاس فرانس کی سوبورن یونیورسٹی کی ڈاکٹریٹ تھی۔ دو سال اس نے ایک ریسرچ آرگنائزیشن کے لیے کام کیا۔ پھر الیکٹرانک ہوم اپلائنس بنانے والی ایک کمپنی کے ساتھ چھ سال گزارے۔ اصولی اختلاف کی بنا پر استعفیٰ دیا لیکن حریف کمپنی میں دگنی تنخواہ پر اچھا عہدہ بھی اصول پرستی کی وجہ سے قبول نہیں کیا۔ اب وہ اسی کمپنی میں مارکیٹنگ کے شعبے کی ڈائریکٹر تھی جہاں میں دو سال گزار چکا تھا۔ میں اس کا ماتحت تھا اور مسٹر ایلیٹ میرے ماتحت تھے۔ مسٹر ایلیٹ بھی خاموش طبع اور اپنے کام سے کام رکھنے والے آدمی تھے۔ ان کے عشق کی کسی کو خبر بھی نہ ہوئی۔ وہ آفس سے باہر لوگوں کو ایک ساتھ لنچ اور ڈنر کرتے نظر آئے تو بات کھلی۔ انہوں نے بڑی سادگی سے اعتراف کرلیا کہ وہ ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں اور بہت جلد شادی کرنے والے ہیں۔ ایک دن انہوں نے کسی کو بتائے بغیر شادی کرلی اور اس سے اگلے دن معمول کے مطابق آفس آئے۔ مجھے اس کی سادگی اور صاف گوئی بہت پسند تھی۔ وہ خوبصورت بھی تھی اور خوش اخلاق بھی۔ ایسی صلاحیت اور اتنے اچھے عہدے کی مالک کوئی اور لڑکی ہوتی تو اس کا دماغ خراب ہو جاتا۔ وہ کسی سے سیدھے منہ بات نہ کرتی۔ میں بہت سی انڈین اور پاکستانی لڑکیوں کو جانتا تھا جو معمولی عہدوں پر ترقی کرنے کے بعد کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھیں۔ جب میں نے ان سے پوچھا کہ انہوں نے ایسے خاموشی سے شادی کیوں کی تو اس نے کہا کہ اس میں ڈھول پیٹنے والی کون سی بات تھی۔ ہنی مون کے سوال پر اس نے کہا کہ وہ کام چھوڑ کے تو نہیں جا سکتے۔ جب ان کی سالانہ چھٹیاں ملیں تو چلے جائیں گے طبعاً مسٹر ایلیٹ ایک درویش تھے۔ قناعت پسند' پرسکون' ایماندار اور سب کے خیر خواہ۔ ان کی بیوی میں مجھے ایک مثالی مشرقی عورت کے تمام اوصاف نظر آتے تھے۔

میں نے انہیں بٹھا کے درمیان میں ڈرنکس رکھے ''میں کچھ مارتھا کی مدد کرنا چاہتا ہوں'' میں نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

اسی وقت اندر سے مارتھا کے چلانے کی آواز آنے لگی۔ وہ نہ جانے کس پر خفا ہو رہی تھی۔ ''کیا مطلب ہے آخر تمہارا اس فضول بات سے۔ کیا چاہتے ہو تم' دیکھو یہاں کوئی ڈرنے والا نہیں ہے تم سے بدمعاش۔ میں ابھی بتاتی ہوں پولیس کو۔''

جب میں گیا تو اس نے فون کا ریسیور رکھ دیا۔ وہ غرارہ سوٹ پہن چکی تھی۔ کچھ اس لباس کا اثر تھا کہ مارتھا کے چہرے پر لالی دکھائی دیتی تھی تو کچھ غصے کا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں فکر و تردد کے ساتھ خوف کی پرچھائیاں بھی نظر آئیں۔

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ بالکل ٹھنڈا تھا۔ ''واٹ از رانگ مارتھا! کیا تم نے پھر آسٹن کا بھوت دیکھ لیا ہے؟ یہ کال کس نے کی تھی' تمہارے کسی سابقہ شوہر نے......؟''

''اوہ ڈیئر!'' وہ کانپتی آواز میں بولی ''کوئی میرے ساتھ ایسا بے ہودہ مذاق نہیں کر سکتا۔ وہ بہت سیریس تھا۔ یہ واقعی بڑی پریشانی کی بات ہے۔''

میں نے کہا ''کیا ہوا...... مجھے بتاؤ...... کس نے فون کیا تھا؟''

''معلوم نہیں' دیٹ باسٹرڈ...... اس نے نام نہیں بتایا اپنا۔''

میں نے فون کا بٹن دبا کے دیکھا۔ اس پر کال کرنے والے کا نمبر موجود تھا۔ ''یہ تو کسی فون بوتھ کا نمبر ہے غالباً؟''

مارتھا نے سر ہلایا ''جب میں نے اسے پولیس کو بتانے کی دھمکی دی تو وہ ہنسا تھا۔ اسے کال ٹریس ہونے کا کوئی ڈر نہیں تھا۔''

''کیا کہا اس نے تم سے؟''

''وہ تمہارے بارے میں پوچھ رہا تھا...... راسکل' دھمکی دے رہا تھا۔''

میں نے کہا ''پرسکون ہو جاؤ مارتھا! مجھے بتاؤ کیا دھمکی دی تھی اس نے۔''

''اس نے مجھ سے پوچھا کہ رفیق آج کس سے ملنے گیا تھا۔ میں نے کہا کہ مجھے کیا معلوم باہر کون کس سے ملتا ہے؟ نہ کوئی مجھے بتا کے جاتا ہے' تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''صحیح جواب دیا تم نے۔''

''اس نے پوچھا کہ کیا وہ کسی لڑکی کے ساتھ گیا تھا۔ اور کیا وہ ایک پاکستانی لڑکی تھی؟ میں نے کہا کہ یہاں سے وہ اکیلا گیا تھا لیکن ان سوالات کا مقصد کیا ہے؟ اس نے کہا کہ جھوٹ مت بول قاتل بڑھیا' ہم سب جانتے ہیں۔''

''اوہ گاڈ! ایسا کہا اس نے تم سے؟''

''میں نے کہا کہ تم کو شرم آنی چاہیے۔ فون پر مجھے گالیاں اور دھمکیاں دے رہے ہو۔ میں تمہاری ماں کے برابر ہوں...... اور تم جانتے ہو تو پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو'' مارتھا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

میں نے اس کے سر کو سینے سے لگا کے تھپکا ''وہ بدمعاش نشے میں ہوں گے مارتھا۔ ان کی بات کو اہمیت مت دو' ٹیک اٹ ایزی!''

''نہیں رفیق! وہ نشے میں بالکل نہیں تھے۔ اور دو تھے۔ پیچھے سے دوسرا مسلسل بکواس کر رہا تھا۔ اس نے کہا کہ اس چڑیل سے پوچھو کہ کیا وہ کسی لڑکی کے ساتھ نہیں گیا تھا؟''

''اس کا مطلب ہے انہیں کچھ معلوم نہیں تھا۔''

''میں نے پوچھا کہ کون لڑکی! یہاں سے وہ اکیلا گیا تھا لیکن وہ اصرار کرتا رہا کہ رفیق کے ساتھ ایک پاکستانی لڑکی تھی۔ ضرور وہ تمہاری اور فریال کی بات کر رہا تھا' کیا تم اس کے ساتھ تھے؟''

میں نے اقرار میں سر ہلایا ''لیکن وہ میرے ساتھ نہیں گئی تھی۔ وہ ٹاور برج پر مجھ سے ملنے آئی تھی اور وہاں اس کے ساتھ کوئی بھی نہیں تھا۔ اگر کوئی ہوتا تو میں ضرور دیکھتا۔ میں وہاں ایک گھنٹے پہلے سے موجود تھا۔ میں ریسٹورنٹ کے اندر تھا اور میں نے شیشوں میں سے دیکھا تھا۔ وہ اپنی گاڑی بھی نہیں لائی تھی۔''

''وہ اس کی ٹیکسی کے تعاقب میں ہوں گے۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا ''وہ گھر سے اپنی پاکستانی دوست ڈاکٹر شائستہ کے کلینک گئی تھی۔ اگر کوئی اس کے پیچھے جاتا تو یہی سمجھتا کہ وہ مشورے کے لیے آئی ہے۔ ڈاکٹر شائستہ سے اس نے گاڑی لی اور اپنی گاڑی وہیں چھوڑ دی۔''

''پھر کسی نے اسے ڈاکٹر کی گاڑی میں بیٹھتے دیکھا ہوگا۔''

''نہیں۔ اس کی کار اپنے گھر کے گیراج میں ہوتی ہے۔ اور اس کے سیاہ شیشے ہیں۔ کوئی اندازہ نہیں کر سکتا کہ گاڑی کون چلا رہا ہے۔''

''وہ خود تو اس وقت مریضوں کو دیکھتی ہے۔''

''ہاں۔ مگر کار اس کے شوہر یا اس کے بچوں میں سے کوئی لے سکتا ہے۔ یہ کسی کو شک نہیں ہو سکتا کہ ایک مریضہ گاڑی لے گئی۔''

''اور معلوم ہے' اس نے کیا کہا؟'' مارتھا بے حد خوف زدہ تھی اور کانپ رہی تھی ''اس نے پوچھا کہ تمہارا وہ پے انگ گیسٹ کب واپس جا رہا ہے۔ میں نے کہا کہ صبح' تو وہ بولا کہ اسے کہنا۔ صبح ضرور واپس پاکستان چلا جائے' اپنے پیروں پر چل کے ورنہ...... ورنہ ہم اسے تابوت میں روانہ کریں گے۔ اس کا سائز ہمارے پاس ہے۔ او مائی گاڈ! وہ سیریس تھا۔''

''پھر تو ہمیں ضرور پولیس کو بتانا چاہیے' یہ قتل کی دھمکی ہے۔''

اس نے کہا ''ٹھہر جاؤ رفیق! ابھی تمہارے دوست آرہے ہیں۔ وہ بھی اپ سیٹ ہوں گے۔ ڈونٹ اسپائل دی فن۔ پولیس آئے گی تو پھر ضابطے کی پوری کارروائی ہوگی۔ وہ سب کا بیان لے گی۔ الوداعی تقریب غارت ہو جائے

گی۔ اگر اس نے پھر فون کیا تو ہم ضرور رپورٹ کر دیں گے۔‘‘

میں نے کہا ’’اس کے علاوہ صبح میں جا ہی رہا ہوں۔ اس کی دھمکی کو بے مقصد بکواس سمجھنا چاہیے۔‘‘

’’لیکن میں نے اس باسٹرڈ کو ایسا نہیں کہا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ کوئی تم سے ڈرتا نہیں ہے۔ وہ جب چاہے گا‘ جائے گا۔‘‘

میں نے اسے تسلی دی ’’حالانکہ فریال نے مجھے بہت روکا کہ میں چھ ہفتے کے لیے رک جاؤں۔ پھر وہ دو ہفتے تک میری روانگی ملتوی کرانا چاہتی تھی مگر میں نے کہا کہ میرا فیصلہ فائنل ہے۔ کیا دھمکی دینے والا کوئی پاکستانی تھا؟‘‘

’’نہیں۔ میں تمہیں بتانا چاہتی تھی۔ میں نے اس کے لہجے پر غور کیا تھا۔ وہ لندن کا رہنے والا نہیں ہو سکتا۔ وہ لوفروں کی زبان بول رہا تھا۔ وہ یقیناً اسکاٹ تھا۔ میں لہجے کا فرق بہت اچھی طرح پہچانتی ہوں۔ خیر‘ پولیس معلوم کر لے گی‘‘ اس نے پھر ریسیور اٹھایا۔

میں نے ریسیور اس کے ہاتھ سے لے لیا ’’کوئی فائدہ نہیں مارتھا بات کو بڑھانے کا۔ صبح تو میں جا رہا ہوں۔ اگر اس خیال سے وہ مطمئن ہو جاتا ہے کہ میں اس کی دھمکی سے ڈر کے بھاگ گیا۔ تو چلو اسے خوش ہونے دو۔‘‘

’’یہ بہت سیریس بات ہے نک!‘‘

’’جب میں خوف زدہ نہیں ہوا تو تم کیوں پریشان ہو۔ ناؤ کم آن! مہمان آ رہے ہیں۔ لاؤ میں تمہارے بال بنا دوں۔‘‘

اس نے کہا ’’رفیق! کیا تمہیں اس کا خیال نہیں آتا۔ وہ جو فریال کا منگیتر ہے...... مرزا......!‘‘

’’وہ ایسی حرکت کیوں کرے گا؟‘‘

’’رفیق! وہی دے سکتا ہے ایسی دھمکی۔ آفٹر آل وہ تمہارا جانی دشمن ہے۔ اس نے تمہیں فریال کے ساتھ دیکھ لیا ہوگا۔‘‘

’’وہ لندن میں نہیں ہے۔‘‘

’’سات گھنٹے میں کوئی بھی لندن آ سکتا ہے۔‘‘

میں نے کہا ’’او کے۔ میں دعوت کے بعد معلوم کر لوں گا۔‘‘

’’کیسے معلوم کر لو گے؟‘‘

میں نے کہا ’’اگر وہ یہاں ہوتا تو کیا فریال کے علم میں نہ ہوتا۔ وہ بتا سکتی ہے مجھے۔ ورنہ پاکستان میں میرا ایک دوست اخباری رپورٹر ہے۔ اسے سب کے بارے میں علم ہوتا ہے کہ کون کہاں ہے؟ وہ اسلام آباد میں بیٹھا ہے‘ جہاں سارے سیاست داں ہوتے ہیں۔‘‘

’’اچھا تو پھر اسے ابھی فون کرو۔‘‘

’’پہلے فریال سے پوچھ لوں۔‘‘

’’نہیں‘ یہ رسک کیوں لیتے ہو۔ کہیں وہ مشکل میں نہ پڑ جائے۔ پاکستان میں اپنے دوست سے معلوم کر لو۔‘‘

میں نے کہا ’’مارتھا دیر ہو رہی ہے‘ سب انتظار کر رہے ہیں۔‘‘

’’پانچ منٹ سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔‘‘

میں نے کہا ’’مجھے تمہارے بال اور دوپٹا سیٹ کرنا تھا۔‘‘

وہ بگڑنے لگی ’’بھاڑ میں گئے بال اور دوپٹا۔‘‘

پاکستان میں شام کے چھ بجنے والے تھے۔ میں نے راجا کے اخبار کے دفتر فون کیا۔ نیوز روم میں رپورٹر بھی سات بجے کے بعد ہی آتے تھے۔ گھنٹی بہت دیر بجتی رہی پھر کسی نے ریسیور اٹھایا اور میری بات سنتے ہی ’’راجا ابھی نہیں آیا‘‘ کہہ کے رکھ دیا۔ میں نے اس کے گھر فون کیا جہاں وہ اکیلا رہتا تھا لیکن اس وقت راجا کے گھر پر ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ آخری چانس کے طور پر میں نے پریس کلب میں کوشش کی۔ کوئی اسے تلاش کرنے گیا۔ اس نے راجا کو دیکھا تھا۔

راجا کی آواز پانچ منٹ بعد آئی ’’دیکھے پتر! خیر تو ہے۔‘‘ یوسف کی وجہ سے اب ہر دوست مجھے اسی طرح مخاطب کرتا تھا۔ میں نے کہا ’’مہاراجا! ایک بات پوچھنی تھی تجھ سے۔‘‘

’’پوچھ۔ پوچھ!‘‘

’’تجھے کچھ معلوم ہے‘ میرا وہ کالے کرتوت اور کالے منہ والا دشمن کہاں ہے؟‘‘

وہ ہنسا ’’سالے گورے! ویسے تو میں بھی اس تعریف پر پورا اترتا ہوں۔‘‘

میں نے کہا ’’ابے...... تجھے صفدر سلطان مرزا کا کچھ پتا ہے؟‘‘

’’ہاں‘ پتا ہے...... مگر بات کیا ہے؟ اس نے قتل کر دیا ہے تجھے بالآخر!‘‘

میں نے کہا ’’ابھی تک تو نہیں کیا مگر کر دے گا۔‘‘

’’انشاء اللہ‘‘ راجا نے بڑی قرأت کے ساتھ کہا۔

میں نے کہا ’’اسے کب دیکھا تھا تو نے‘ آخری بار؟‘‘

’’ابے وہ بھی کوئی دیکھنے کی چیز ہے؟ ابھی گزشتہ ہفتے

اس نے صحافیوں کو افطار پارٹی میں مدعو کیا تھا۔ اب رمضان شریف میں ہم ننگے بھوکوں کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔ سب زکوٰۃ خیرات دینے کے لیے بلا لیتے ہیں۔ روزہ ایک‘ افطاریاں تین چار بھی ہو جاتی ہیں۔‘‘

میں نے کہا ’’تیرے باپ نے بھی روزہ رکھا ہے کبھی؟‘‘

وہ بے شرمی سے ہنسا ’’جو بلاتے ہیں وہ اور جو آتے ہیں سب سالے ڈراما کرتے ہیں جیسے بھوک پیاس سے دم نکلنے والا ہو۔ دراصل افطاریاں سیاسی ڈنر ہو گئی ہیں۔ پریس کانفرنس تو بڑی رسمی چیز ہے۔ افطار پارٹی میں بڑا دوستانہ‘ روحانی اور غیر رسمی سا ماحول ہوتا ہے۔ جس سے جو کہنا ہو رازداری سے کہہ دیا۔‘‘

’’تو گیا تھا اس کی پارٹی میں‘ ملا تھا اس سے؟‘‘

’’نہیں یار! اسی دن گورنر صاحب نے بھی مدعو کر لیا تھا۔ ظاہر ہے‘ میں نے اسے ترجیح دی۔ کچھ کام کرانے تھے لوگوں کے اور اپنی جیب بھی خالی تھی۔ اچھا خاصا بھاری لفافہ ملا عیدی میں۔‘‘

میں نے کہا ’’مہاراجا! اتنی بے غیرتی سے تو اعتراف کر رہا ہے۔ سالے ضمیر کہاں گیا تیرا جس پر تجھے اتنا غرور تھا؟‘‘

اس نے ایک آہ بھری ’’ضمیر صاحب‘ تو اب پاکستان میں کہیں بھی نہیں۔ کچھ کہتے ہیں ان کی یہاں کوئی سنتا نہیں تھا۔ وہ چلے گئے امریکا جہاں امریکا کو اٹھتے بیٹھتے گالیاں دینے والوں کی اولادیں بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے جاتی ہیں۔ مگر تو بتا‘ صفدر سلطان مرزا کے بارے میں کیوں پوچھ رہا ہے؟‘‘

’’تفصیل ابھی نہیں بتا سکتا۔ یہ بتا وہ لندن میں ہے یا نہیں‘ آج کی تاریخ میں؟‘‘

’’یار میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔‘‘

’’دیکھ‘ یہ معلوم کرنا میرے لیے بہت ضروری ہے۔ کسی سے پوچھ کے بتا‘‘ میں نے کہا۔

’’پرابلم تو یہی ہے‘ کسی اور کو معلوم ہوتا تو مجھے بھی ہوتا۔‘‘

میں نے کہا ’’کیوں‘ وہ روپوش یا مفرور ہے؟‘‘

’’کچھ ایسا ہی سمجھ لے۔ تو جانتا ہے اس کی ایک خاندانی بیوی تھی۔ جیسے کہ ان سب فیوڈل لارڈز کی ہوتی ہے۔ کوئی عم زاد!‘‘

’’ہاں۔ کیا ہوا اسے؟‘‘

’’وہی جو ہوتا ہے...... اگر اپنے مجازی خدا کی عیش و عشرت اور بدکرداری ان کی قوت برداشت سے باہر ہو جائے۔ بدقسمتی سے وہ ایک پڑھی لکھی عورت تھی۔ وہی کہتی ہوگی جو کل کو مجھے بھی میری بیوی کہے گی کہ مصروفیت کا تو بہانہ ہے۔ مجھے پتا ہے تمہاری راتیں کہاں گزرتی ہیں اور کس کے ساتھ۔ میں بیوی ہوں تمہاری یا کنیز جسے تم نے گھر میں قید کر رکھا ہے اور خود باہر رنگ رلیاں مناتے پھرتے ہو۔‘‘

’’یار فضول بکواس پھر کبھی کرنا۔ میرے گھر میں مہمان بیٹھے ہیں۔ کام کی بات بتا۔‘‘

’’اس خاندانی بیوی نے خودکشی کر لی۔ کہا تو یہی گیا کہ وہ بیمار ہو گئی تھی...... لیکن اس اچانک ہونے والا جان لیوا بیماری کی تفصیلات میں بہت تضاد ہے۔ گاؤں میں مشہور تھا کہ اس پر جن آتے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا کہ وہ نفسیاتی مریض تھی اور اس نے خودکشی کر لی۔ کسی نے اس پر سفلی علم کرا دیا‘ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اصل بات وہی ہے کہ اسے قتل کر دیا صفدر سلطان نے۔ وہ بھی خاندان کی لڑکی تھی۔ باپ نے تو کچھ نہیں کہا۔ ماں کو بھی خاموش کر دیا ہوگا۔ مگر اس کا ایک بھائی امریکا میں رہتا ہے۔ وہاں پڑھنے گیا تھا دستور کے مطابق اور لوٹ کے نہیں آیا تھا۔ وہ پاکستان میں تھا‘ ایسے ہی آیا ہوا تھا۔ اس نے ہنگامہ کر دیا‘ پوسٹ مارٹم کے لیے اصرار کیا۔ آئی جی اور گورنر تک کو لکھ دیا۔ اس کے کہنے کے مطابق صفدر سلطان نازنین سے شادی کرنا چاہتا تھا۔‘‘

میں نے کہا ’’یہ نازنین کون ہے؟‘‘

’’تو نہیں جانتا...... مگر کیسے جانے گا؟ لندن میں بیٹھا ہے نا۔ یہ بڑی سنسنی خیز چیز ہے۔ نووارد ہے لیکن کچھ ہی دن میں ہر طرف تہلکہ مچا دیا ہے۔ پہلے ماڈل تھی‘ انڈیا کے اشتہاروں میں نمودار ہوئی کیونکہ یہاں تو زنانہ چیزوں کے اشتہار میں بھی کپڑے پہننے پڑتے ہیں۔ وہاں خاصی جمہوری آزادی ہے۔ ڈانسر بہت اچھی ہے۔ اس کا ایک ویڈیو کیسٹ دیکھا تھا میں نے۔ کسی پرائیویٹ فنکشن کی پرفارمنس تھی‘ چیز تو ویسی ہی ہے شاہی محلے جیسی مگر لیبل ماڈرن ہے۔ اپر کلاس کی محفلوں میں نظر آتی ہے۔ سنا ہے لندن سے پڑھی ہوئی ہے...... خیر‘ اپنے صفدر سلطان مرزا نے اس کے لیے ایک فلم فوراً اناؤنس کر دی تھی‘ نازنین اس کی ہیروئن تھی۔ اس کا مہورت بھی ہوا تھا تین مہینے پہلے مگر اس کے بعد شروع ہو گئی دوسری لو اسٹوری۔ اور اس کا انجام بہت زیادہ غیر متوقع نہیں سمجھا جا سکتا۔‘‘

’’بیوی کا قتل تو فیوڈل سیٹ اپ میں ہو جاتا ہے۔ کوئی

نازنین بھی بعض اوقات اتنی ذہین ثابت ہوتی ہے کہ داشتہ سے بڑھ کر زوجہ کے باعزت سمجھے جانے والے مرتبے پر فائز ہوجاتی ہے مگر ایک تو خاندانی بیوی ان معاملات سے بے نیاز اپنے گھر میں راج کرنے کی پالیسی میں خوش رہتی ہے۔ دوسرے شوہر فرار نہیں ہوتے۔''

اس نے کہا ''خرابی غالباً اس لیے ہوئی کہ نازنین نے نصف جائیداد اپنے نام کرنے کا مطالبہ کیا اور صفدر سلطان کی آنکھوں پر اس نے ایسی پٹی باندھ دی تھی کہ اس نے کچھ نہیں دیکھا۔ آدھی خاندانی جائیداد دے کر نازنین کو حاصل کرنے کا سودا اسے سستا لگا۔ اس پر جائیداد کے مالکوں کو اعتراض ہوا۔ قائد حزب اختلاف ہوگئی' خاندانی بیوی...... نتیجہ یہ کہ اپنی جان سے گئی مگر اس کے بھائی نے خاموش رہنے سے انکار کردیا۔ وہ اب صفدر سلطان کے خلاف قتل عمد کا مقدمہ درج کرانے کی پوری کوشش کررہا ہے۔ ظاہر ہے اسے مخالفت کا سامنا ہے۔ یعنی کہ سسرال سے بھی اور خود پولیس سے بھی۔ عام آدمی ہوتا تو اب تک اسے چپ کرادیا جاتا یا غائب کردیا جاتا۔ مگر وہ ہے امریکن' دنیا کی سپر پاور کا نمائندہ۔ اس نے امریکی کونسلیٹ کو بھی بتادیا ہوگا کہ وہ غیر محفوظ ہے اور اب حکومت کی مشنری خود اس کی حفاظت پر مجبور ہوگئی۔''

''مطلب یہ کہ اس کا کچھ پتا نہیں کہاں ہے؟ پاکستان میں یا ترکمانستان میں...... یا انگلستان میں......''

''آف کورس۔ وہ انگلستان میں بھی ہوسکتا ہے...... اکیلا' کیونکہ نازنین بہرحال اب اس کے ساتھ نہیں ہے۔ نہ خدا ملا نہ وصال صنم۔ تو ذرا احتیاط ہوجا۔''

لونگ روم سے سنائی دینے والے باتوں کے شور سے اندازہ ہوتا تھا کہ سب مہمان آچکے ہیں۔ مارتھا نے کہا ''ایک تو تم بھی عورتوں کی طرح بہت لمبی بات کرتے ہو۔ کیا پتا چلا' یہ لو چوڑیاں...... یہ بھی پہناتے جاؤ۔''

میں نے اسے مختصراً بتادیا ''وہ پاکستان سے بھاگا ہوا ہے یا وہیں روپوش ہے۔ اس نے ایک عورت کے چکر میں بیوی کو قتل کردیا تھا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ لندن میں ہو۔''

جب میں لونگ روم میں گیا تو میرے دوستوں نے ایک ساتھ بولنا شروع کیا۔ ''یہ کیا...... تم ابھی تک کھانا پکار ہے ہو؟''

میں نے کہا ''سوری فرینڈز! پاکستان سے ایک ارجنٹ کال آگئی تھی۔ کھانا تو بالکل تیار ہے' بس عائشہ آجائے۔''

''ہاں...... کھانا اسی سے مشروط ہے۔ وہ نہ آئی تو کیا ہمیں بھوکا واپس جانا پڑے گا۔'' مسز بریڈلے نے احتجاج کیا۔

اس کی صومالیہ کی رہنے والی سیاہ فام گرل فرینڈ نے مسکرا کے کہا ''اگر میں نہ آتی تو کیا تم کھانا کھالیتے؟''

''میں تمہارے حصے کا بھی کھاتا...... محبت میں۔'' بریڈلے بولا۔

اسی وقت عائشہ آگئی۔ میں ہی نہیں' اسے دیکھ کر سب کچھ دیر کے لیے مسحور اور مبہوت رہ گئے۔ اس خصوصی تقریب کے لیے اس نے پاکستانی لباس کا انتخاب کیا تھا۔ ظاہر ہے یہ میری خاطر تھا مگر شلوار قمیص اور دوپٹے میں وہ بالکل ایک پاکستانی لڑکی نظر آرہی تھی اور اس کے حسن کا تاثر قیامت خیز تھا۔

''سوری فرینڈز!'' اس نے ایک شرمیلی مسکراہٹ کے ساتھ پھولوں کا گلدستہ مجھے دیا ''مجھے کچھ دیر ہوگئی۔''

''میرا خیال ہے کہ اب کھانے میں مزید دیر مناسب نہیں۔ کیا خیال ہے لڑکو اور لڑکیو!'' مارتھا نے بھی اسی وقت ایک ڈرامائی انٹری دی۔

اس کے لباس عروسی پر بہت شور مچا۔ خواتین نے چیخیں ماریں اور حضرات نے تالیاں اور سیٹیاں۔ مارتھا شرم سے لال ہوئی تو زیادہ مضحکہ خیز نظر آنے لگی مگر وہاں موجود لوگ آداب اور شائستگی کے قائل تھے۔ سب کو اندازہ تھا کہ مارتھا کے اس بہروپ کا ذمے دار میں ہوں اور مارتھا کی یہ جذباتی حرکت میری خوشی کے لیے ہے۔ پاکستان میں ہونے والی بہت سی پوتیوں کی شادی میں ستر اسی سال عمر کے دادا دادی کو کانپتی ٹانگوں کے ساتھ ڈانس کرتے میں نے خود دیکھا تھا۔

سب نے مارتھا کے گلے لگ کر اس کے گالوں پر یا ماتھے پر عقیدت سے بوسا دیا اور اسے یقین دلایا کہ وہ بہت اچھی لگ رہی ہے۔ وقتی طور پر الوداعی تقریب کی اداسی ختم ہوگئی۔ وہ بہت خوش نظر آنے لگی۔ میری اسٹینو ایک انڈین چندرا تھی۔ اس نے کہہ دیا۔

''ایک تمہاری ماں لگ رہی ہے' دوسری اس کی بہو۔'' یہ تبصرہ ایک عام خواہش کی ترجمانی کرتا تھا کہ کاش ایسا ہوتا۔ اس نے عائشہ کو خفت میں مبتلا کردیا تو مجھے ندامت میں۔

عائشہ سال بھر پہلے ایشا ارنسٹ تھی۔ اس کا باپ لارڈ ارنسٹ اسی کمپنی کا مینجنگ ڈائریکٹر تھا جہاں میری ملازمت کو دو سال پورے ہوچکے تھے۔ وہ کاروباری طور پر کامیاب اور سیاسی حلقوں میں خاص اثر رسوخ رکھنے والا آدمی تھا۔ اپنی بیوی کے مقابلے میں وہ فراخ دل اور خاصا غیر متعصب شخص تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کی کمپنی میں گورے کالے اور ہر ملک کے باشندے ایک باعزت ماحول میں کام کرکے مطمئن تھے۔ وہ بیک وقت ایک اچھا منتظم' باصلاحیت ٹیم لیڈر' بے تکلف دوست اور شفیق و ہمدرد انسان تھا۔ انٹرویو کے وقت میں اس کے مثبت اور حوصلہ افزا رویے سے متاثر ہوا تھا۔ انٹرویو کے فوراً بعد اس نے مجھے بتادیا تھا کہ میں مطلوبہ معیار پر پورا اترتا ہوں اور مجھے وہی تنخواہ دی جائے گی جس کا میں نے اپنی سی وی میں مطالبہ کیا تھا۔ تاہم آنے والے تین ماہ میں مجھے اپنی کارکردگی کا عملی مظاہرہ کرنا ہوگا۔

عائشہ اپنے باپ کی کمپنی میں ایکسٹرنل ریلیشن کے شعبے کی ڈائریکٹر تھی لیکن اس میں سفارش یا باپ کے اثر رسوخ کو قطعی دخل نہ تھا۔ اس نے سوئیزرلینڈ سے پبلک ریلیشن کے ساتھ ہیومن ریسورسس میں ڈگری لی تھی۔ یہاں آنے سے پہلے وہ تین مختلف اداروں میں بہترین پرفارمنس دے چکی تھی اور دو سال کے مختصر عرصے میں اپنی ذہانت سے ثابت کرچکی تھی کہ وہ کس باپ کی بیٹی ہے۔ باپ کے بڑے نام کی رعایت اسے کہیں نہیں ملی تھی۔ وہاں کام اور کاروباری خاندانی حوالے کا تصور ہی نہیں۔ جب بالآخر باپ نے اسے دگنے معاوضے پر ڈائریکٹر کی پوسٹ آفر کی تو نہ باپ نے بیٹی پر احسان کیا اور نہ بیٹی نے باپ پر۔ دونوں طرف سے یہ قطعی غیر جذباتی قسم کا کاروباری فیصلہ تھا۔

عائشہ کو خدا نے حسن صورت کے ساتھ حسن سیرت سے بھی نوازا تھا۔ حسب نسب پر غرور کا زمانہ اب انگلستان میں بھی نہیں رہا۔ خود شاہی خاندان میں روایات کی پامالی نے قدامت پسندوں کو خاصا مایوس کیا۔ دنیا کو گلوبل ویلج بنانے کی حامی نسل نے ہر قسم کے تفرقات اور تکلفات کو طاق نسیاں پر رکھ دیا۔ اس کے باوجود عائشہ اپنے حسن' اپنی اعلیٰ تعلیم یا عہدے کے باعث احساس برتری میں مبتلا ہوسکتی تھی لیکن وہ طبعاً منکسر مزاج اور ملنسار لڑکی تھی۔ اس حد تک کہ اس کی دوستانہ مسکراہٹ اور بے تکلفی عموماً غلط فہمیاں پیدا کردیتی تھی۔ بقول شاعر میں جسے پیار کا انداز سمجھ بیٹھا ہوں۔ یہ تبسم' یہ تکلم تری عادت ہی نہ ہو۔

ابتدا میں یہ غلط فہمی مجھے بھی ہوئی مگر کچھ عرصے میں جب میں نے عائشہ کی فطرت کو سمجھ لیا تو میرے اور اس کے درمیان ایک بہت اچھی ورکنگ ریلیشن شپ بن گئی۔ کمپنی کی کامیابی کی ایک بڑی وجہ یہی تھی۔ وہاں ایک جیسی ذہنی سطح رکھنے والے لوگ تھے جو اشتراک جانتے تھے۔ ان کے درمیان مقابلہ نہ تھا۔ وہ اپنے کام کے ماہر تھے۔ تنخواہوں سے اور مالکوں کے رویے سے مطمئن تھے۔ چنانچہ کمپنی ایسے آگے بڑھ رہی تھی جیسے ایک اچھی کار آگے بڑھتی ہے تو اس کی کارکردگی میں تمام پرزے برابر کے شریک ہوتے ہیں۔

عائشہ اپنے مزاج اور فطرت میں اپنے باپ کی ساری صفات رکھتی تھی۔ حسن صورت میں اس نے ماں کی میراث حاصل کی تھی اور نتیجے میں پرفیکشن حاصل کرلی تھی۔ طبعاً اس کی ماں جہالت کی حد تک نسل پرست اور مغرور تھی۔ وہ خود خطاب یافتہ باپ کی بیٹی تھی اور اسے دعویٰ تھا کہ شاہی خاندان کے وارثوں کی لمبی فہرست میں اس کا نام بھی شامل ہے۔ دروغ برگردن راوی۔ یہ فہرست سو افراد پر مشتمل تھی۔ عائشہ مذاق میں کہتی تھی کہ اگر پہلے ننانوے وارث نہ رہیں تو میرا نانا ایڈرورڈنہم کے نام سے بادشاہ انگلستان ہوسکتا ہے۔

عائشہ سے میری دوستی کب شروع ہوئی اور کب درپردہ مراحل طے کرتی محبت بن گئی اس کا مجھے پتا ہی نہ چلا اور جب حقیقت مجھ پر عیاں ہوئی تو بہت دیر ہوچکی تھی۔ شاید ایک میں ہی تھا جو بے خبر رہا۔ باقی سب لوگ دیکھ رہے تھے۔ باتیں کررہے تھے اور پیش گوئیاں کرکے شرطیں لگارہے تھے۔ ایک وقت ایسا آیا جب میں نے محسوس کیا کہ میں محصور ہوگیا ہوں اور میرے لیے نہ بچ کر نکلنا ممکن ہے اور نہ پیچھے ہٹنا۔

میں اس کی محبت سے انکار نہیں کرسکتا تھا لیکن میرے جذبات کی کمان ہنوز عقل کے ہاتھوں میں تھی۔ میں نے جب خود سے سوال کیا کہ یہ محبت ہے یا جنسی کشش تو جواب ہمیشہ ایک ہی ملا کہ یہ محبت ہے۔ یہ ہوس کی آگ ہوتی تو بہت پہلے شعلہ بن کر ہمارے جذبات کو خاکستر کرچکی ہوتی اور اب تک سرد پڑجاتی۔ لندن جیسے شہر میں ہمارے تعلق کی راہ میں کسی اخلاقی' سماجی یا مذہبی حد کی دیوار حائل نہ تھی۔ قانون تو ہمارے تعلق کو تحفظ فراہم کرتا تھا کہ ایک بالغ مرد اور عورت آپس کی رضامندی سے جیسے تعلقات چاہیں استوار کریں' وہ شادی کیے بغیر ساتھ رہیں' بچے پیدا کریں' مشترکہ خاندان بنالیں۔ کسی ہم جنس سے شادی کرلیں۔ یہ اسی طرح ان کا ذاتی معاملہ ہے جیسے اپنی مرضی کے کپڑے پہننا یا اپنی پسند کے گانے سننا۔ سوسائٹی کو بھی ذاتی فیصلوں سے کیا۔ شخصی آزادی کا تقدس سب پر فوقیت رکھتا ہے۔

شاید میری یہی ادا عائشہ کو بھاگئی کہ میں رشتوں کے تقدس میں مشرق کی روایات پر کاربند تھا۔ جب ہم آفس کے باہر ملنے لگے تو خلوت میں ایسے ان گنت مواقع آئے جب وہ میرے بہت قریب آگئی۔ کئی بار لنچ یا ڈنر کے بعد وہ مجھے اپنے گھر لے گئی۔ میں نے اسے اپنے گھر مدعو کیا۔ ہم نے

ایک ساتھ سفر کیا۔ کبھی دوسرے شہر اور کبھی دوسرے ملک کے کسی ہوٹل میں قیام کیا لیکن ہمارے کمرے ہمیشہ الگ رہے اور کبھی جذبات عشق کی وارفتگی نے عائشہ کو خود سپردگی کے مرحلے تک پہنچادیا تو میں نے اعتماد کی دیوار کو گرنے نہ دیا۔ عائشہ حیران بھی ہوئی اور مایوس بھی لیکن جب میں نے اسے اپنی ذہنی تربیت کے مطابق یہ سمجھادیا کہ میرے نزدیک محبت کی آبرو کیا ہے اور بے آبروئی کیا تو وہ میرے کردار کی عظمت سے مسحور ہوگئی۔ محبت میں جسمانی تعلق سے گریز اس ماحول میں ابنارمل ہونے کی دلیل تھی۔ میں نے اگر عائشہ کی قربت سے فائدہ نہیں اٹھایا تو یہ مشرقی روایات کی ایک احمقانہ ''شرافت'' تھی جس کا مغرب میں کوئی تصور نہ تھا۔ اسے نامرد ہونے کے مترادف قرار دیا جاتا تھا۔

عائشہ کو میری یہ غیر مردانہ صفت ہی میرے فرشتہ سیرت ہونے کا وہ ثبوت لگی جس نے اس کے لیے میرے حصول کو مقصد حیات بنادیا حالانکہ میں ایک عام خطا کار انسان تھا جس کا دامن گناہوں کے داغوں سے پاک نہ تھا۔ جب میں امریکا پہنچا تھا تو میری حالت اس فاقہ زدہ قیدی جیسی تھی جس پر آزادی کے ساتھ دنیا کی ہر نعمت کے دروازے کھول دیے گئے ہوں اور وہ سب کچھ بھول کر ان پر ٹوٹ پڑے۔

میں نے عائشہ کو بہت سمجھایا کہ ہم زندگی ساتھ نہیں گزار سکتے۔

''کیوں ساتھ نہیں گزار سکتے؟ تم کیا سمجھتے ہو' میں جذبات کی رو میں بہہ جانے والی کم عمر اور کم عقل لڑکی ہوں؟''

''یس...... میں ایسا ہی سمجھتا ہوں۔ تمہاری ذہانت اور قابلیت کا معترف ہونے کے باوجود۔''

''تم ایک دقیانوسی ذہن سے سوچ رہے ہو۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور روشن خیال ہونے کے باوجود؟''

''ایشا۔ زمینی حقائق کبھی نہیں بدلتے۔''

''کون سے زمینی حقائق۔ زمین سب ایک ہوگئی ہے۔ اور ہمارے حقائق بھی ایک ہیں جو زندگی کی ضرورت ہوتے ہیں۔ کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتے؟ میری ذات میں کوئی خامی ہے؟ تمہیں اعتماد نہیں ہے مجھ پر یا خود پر' یہ ڈر ہے کہ کل کو میں نہ بدل جاؤں؟''

''نہیں' ایسی کوئی بات نہیں۔''

''پھر کیا بات ہے؟ تم فریال سے شادی کرنا چاہتے ہو؟''

میں نے کہا ''ہاں' مگر میرے چاہنے سے کچھ ہو نہیں سکتا۔ وہ مجھے نہیں ملے گی...... میں جانتا ہوں۔''

''پھر بھی امید سے دامن باندھے رکھنا چاہتے کتنی غیر عملی بات ہے'' اس نے مایوسی سے کہا۔

''ایشا ڈارلنگ! عقل کے فیصلے کو سامنے رکھو اس سے لاکھ درجے بہتر ہو۔ وہ نہ ملی ہوتی تو تمہیں پا یقیناً خود کو دنیا کا سب سے خوش نصیب آدمی سمجھتا میری زندگی میں شامل ہے اور میں اس سے کیسے ہو وفا کو خود کیسے توڑ سکتا ہوں...... امید کو ابھی سے کیسے ختم کر ہوں۔''

''یعنی مجھے انتظار کرنا ہوگا' امید کے ساتھ۔ قطا میرا نمبر اس کے بعد ہے۔''

میں نے کہا ''ایسا کیوں سمجھتی ہو' میری نظر میں اور مسائل ہیں۔ مشرق اور مغرب کی دوری ہے۔''

''وہ صرف سات آٹھ گھنٹے کی دوری ہوگئی ہے۔''

میں نے کہا ''کیا میں رڈیارڈ کپلنگ کا دہراؤں...... کہ مشرق مشرق ہے اور مغرب مغرب یہ دو کبھی ملے ہیں اور نہ ملیں گے۔''

''وہ پچھلی صدی میں کہا تھا اس نے۔ اب تم لندن رہتے ہو اور میں بھی لاہور میں رہ سکتی ہوں۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا ''ناممکن۔ ہمارے درمیا ماحول کا فرق ہے۔ طبقاتی خلیج ہے' ہمارے خاندانوں سوچ الگ ہے۔''

''لیکن یہ زندگی ہماری ہے۔ صرف میری اور تمہاری یہ سارے فرق اس پر اثر انداز نہیں ہوتے۔''

''ہوتے ہیں۔'' میں نے کہا ''ہم سب سے کٹ اکیلے نہیں رہ سکتے اور نہ اپنے بچوں کے ساتھ مریخ پر نئی د آباد کر سکتے ہیں۔''

''یعنی فریال تمہیں نہ ملے' اس کے بعد بھی تم مجھ سے شادی نہیں کرو گے' تمہیں صرف فرق نظر آرہے ہیں' میرا محبت محسوس نہیں ہوتی؟''

''ایلیشا' زندگی فلم نہیں ہے جو دو گھنٹے میں ختم ہو جا ہے۔ ایک طویل مدت ہے' مجھے بتاؤ یہ شادی ہو جائے ہمارے بچے کیا سمجھیں گے خود کو؟ گورا یا کالا؟ پاکستانی برطانوی' کرسچن یا مسلمان۔ کتنے کمپلیکس ہوں گے انہیں۔''

''مذہب میرے لیے ذاتی معاملہ ہے۔ میں مسلمان ہو جاؤں گی اور یہ مت سمجھنا میں بحث ہار گئی تو میں نے ہار مان لی۔''

اگلے دن وہ مسلمان ہوگئی۔ اس نے اسلامک سینٹر میں

کسی سے رابطہ کیا اور سارے قانونی تقاضے پورے کرنے کے بعد مجھے مطلع کیا کہ میرا اسلامی نام عائشہ رکھا گیا ہے۔ میں بھونچکا رہ گیا۔

میں نے فریال کو بتایا تو وہ خفا ہونے لگی "اس کے دین اور دنیا کی خرابی کے ذمے دار تم ہو۔"

"کیوں...... میں نے تو صاف انکار کر دیا تھا۔"

"بات کو اتنا بڑھانے کی کیا ضرورت تھی۔ مگر تمہاری مردانہ انا کو بہت تسکین مل رہی ہوگی نا کہ یک نہ شد دو شد۔ پہلے ایک پاگل تھی' اب دو ہیں...... اور لڑکی بھی ایسی......"

میں نے کہا "فریال! میں ہاتھ مار دوں گا۔ مجھے بتاؤ' میں کیا کروں؟"

"وہی جو میں کہتی رہتی ہوں۔ ابھی اس سے شادی کرلو۔ پھر مجھ سے کرلینا۔ دو کی گنجائش رکھنا' زندگی بڑی لمبی ہے...... اور تم ماشاءاللہ ایسے ہینڈسم ہیرو اور شہزادگلفام ہو کہ ایشوریا رائے بھی آئے گی کچے دھاگے سے بندھی' انجیلنا جولی بھی......"

اگلے دن ایشا یعنی عائشہ کی ماں کا فون آ گیا "میں تم سے فوراً ملنا چاہتی ہوں' گاڑی بھیج رہی ہوں۔"

میں نے کہا "لیڈی ارنسٹ! گاڑی ہے میرے پاس...... اور نہ ہوتی تو لندن میں ٹیکسی مل جاتی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اس وقت ٹائم نہیں ہے میرے پاس۔ آپ نے یہ کیسے فرض کرلیا کہ مجھے کسی بھی وقت طلب کیا جا سکتا ہے؟"

"اوکے! کب آ سکتے ہو تم؟" اس کی نخوت کچھ کم ہوتی۔

میں نے کہا "اگر مقصد ملاقات...... عائشہ......"

"اس کا نام ایشا ہے۔"

"آپ ماضی میں رہنا پسند کرتی ہیں تو آپ کی مرضی۔ میں عائشہ ہی کہوں گا اسے جو کہ وہ ہے۔ اس کے بارے میں کوئی بات کرنا چاہتی ہیں یا کوئی وضاحت مقصود ہے؟ تو میں معذرت چاہتا ہوں' آپ اپنی بیٹی سے پوچھیں جو پوچھنا ہے۔"

"اس کو خراب کرنے کے ذمے دار تم ہو؟" وہ برہمی سے بولی۔

میں نے کہا "اپنی اولاد کے بارے میں آپ کی رائے خراب ہے تو یہ سوال خود سے کریں کہ تربیت اور پرورش میں آپ سے کیا کوتاہی ہوئی۔ ویسے اسے سب اچھا سمجھتے ہیں...... مجھ سمیت۔"

"تم کیا سمجھتے ہو خود کو آخر...... بدمعاش! میں تمہارا دماغ درست کرادوں گی۔" وہ چلانے لگی۔

"ناحق اپنا وقت اور انرجی ضائع کریں گے آپ۔ میرا دماغ ٹھیک نہیں ہو سکتا خاتون!" میں نے ہنس کے کہا اور فون بند کر دیا۔

لیکن اس سے عائشہ کی ماں کا غصہ کم نہیں ہوا۔ وہ ایک دن میرے آفس پہنچ گئی۔ میں اس کی زبان نہیں پکڑ سکتا تھا۔ کان میں روئی ٹھونس کے بھی نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ میں واک آؤٹ کر گیا۔ اس نے سخت بے عزتی محسوس کی کیونکہ میں "ابھی آتا ہوں ایک منٹ میں" کہہ کے گیا تھا۔ پندرہ بیس منٹ بعد اسے بتایا گیا کہ رفیق صاحب تو چلے گئے ہیں۔

چند دن بعد وہ مارتھا کے گیسٹ ہوم میں آ دھمکی۔ میں طے کر چکا تھا کہ اس کی کسی بات پر مشتعل ہو کے جواب نہیں دوں گا مگر مارتھا نے میرے منع کرنے کے باوجود اس پر چڑھائی کر دی اور اس کی لیڈی شپ کی کھال کھینچ کر اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ جب وہ شور مچا کے اور دھمکیاں دے کر چلی گئی تو مارتھا نے لارڈ ارنسٹ کو فون کیا اور اسے قانونی چارہ جوئی کی دھمکی دی "تمہاری بیوی کا سارا غرور اور بدمعاشی نکال دوں گی میں۔ اس سے کہنا پھر میرے منہ نہ لگے۔"

لارڈ ارنسٹ نے مارتھا سے معافی مانگی۔ اس نے مجھ سے بھی بات کی مگر میں نے اسے مطمئن کر دیا۔ وہ سمجھ دار آدمی تھا۔ جانتا تھا کہ عائشہ بالغ اور خودمختار ہے۔ اس معاملے کے اچھالنے سے اس کی اپنی عزت جانے کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔ لیکن عائشہ کی ماں کا غصہ کم نہ ہوا۔ ایک دن مجھے تین بدمعاشوں نے گھیر لیا۔ انہوں نے عائشہ کا حوالہ دیے بغیر مجھے دھمکی دی کہ اگر میں واپس پاکستان نہ گیا تو میرا سر میرے کندھوں پر نہیں رہے گا۔

اتفاق کی بات ہے کہ ایک سال پہلے میں لندن پہنچا تھا تو رنگ دار ایشیائی تارکین وطن کے خلاف نسل پرست دہشت گرد گنجوں یعنی SKIN HEADS بہت ایکٹو تھے۔ ان کی غنڈا گردی کا خصوصی نشانہ پاکستانی تھے جن کو وہ بڑی نفرت اور حقارت سے پاکی کہتے تھے۔ وہ پاکستانیوں کے اسٹورز میں گھس کے توڑ پھوڑ کرتے تھے۔ انہیں اکیلا پا کے سڑک پر گھیر لیتے تھے اور بڑی بے رحمی سے مارتے تھے۔ وہ مہلک ہتھیار استعمال نہیں کرتے تھے۔ ڈنڈوں' ہاکیوں' فولادی زنجیروں اور تاروں سے حملہ کرتے تھے اور اتنی بے رحمی سے مارتے تھے کہ زخمی کا چہرہ بگڑ جاتا تھا اور وہ مہینوں بستر پر پڑا رہتا تھا۔ ان کی پرتشدد کارروائی کے نتیجے میں کچھ اموات بھی واقع ہوئی تھیں۔ بعد میں انہوں نے

عورتوں کو بھی نشانہ بنالیا تو پاکستانی کمیونٹی میں سراسیمگی پھیل گئی۔ پولیس الرٹ ہوگئی۔ بہت سے گنجے گرفتار بھی ہوئے مگر پاکستانیوں میں ایک ردِعمل کے طور پر خود حفاظتی کی تدابیر اختیار کرنے کی تحریک شروع ہوئی۔ لاہور کے ڈاکٹر بشیر نے ایک دن مجھے مطلع کیا کہ قریب ہی ایک مارشل آرٹ اکیڈمی ہے جہاں جاپان کا ایک جینوئن بلیک بیلٹ جوڈو کراٹے کی تربیت دیتا ہے اور ویسے تو جاپان سے بلیک بیلٹ کے لیے کوالی فائی کرنے میں کئی برس لگ جاتے ہیں مگر اس کا خود حفاظتی کا شارٹ کورس چھ مہینے کا ہے اور یہ کریش پروگرام مکمل کرنے کے بعد بندہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ ان بدمعاش گنجوں کو لنگڑا لولا بھی کر سکے۔ ہم نے ایک ساتھ اکیڈمی جوائن کی مگر صرف دو ہفتے بعد ڈاکٹر بشیر کو احساس ہوا کہ اس کی رنگین شاموں کا خود فراموشی پروگرام چوپٹ ہو رہا ہے تو خود حفاظتی پروگرام غیر اہم ہو گیا۔ میں نے ٹریننگ جاری رکھی اور چھ مہینے میں اپنی لگن سے اتنا سیکھ لیا جو بقول استاد محترم لوگ ایک سال میں نہیں سیکھ پاتے۔

جب ان تین گنجوں نے مجھے دھمکی دی تو میں نے کہا "اپنے ہیلمٹ اتار دو۔ پھر دیکھتے ہیں کس کا سر کہاں رہتا ہے؟"

ایک نے غرا کے کہا "کون سے ہیلمٹ؟"

میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا "اوہ...... معاف کرنا' یہ تو تمہارا اور جنل سر ہے' کسی بدشکل آلو جیسا ہے۔"

پھر اس سے پہلے کہ وہ مشتعل ہو کے اپنی جارحانہ کارروائی کا آغاز کرتے' میں نے غوطہ مار کے سرغنہ کے پیٹ میں ٹکر ماری اور اسے سر کے اوپر سے پیچھے اچھال دیا۔ دوسرے کو ایک ایڑھی پر گھوم کے لات رسید کی جو اس کے سینے پر لگی تو اس کا سانس رک گیا اور وہ لڑکھڑا کے گرا تو تیسرے کی زد میں آ گیا جو مرکھنے بیل کی طرح میری طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ منہ کے بل گیا تو میں نے اس کی پسلیوں میں پے در پے ٹھوکریں ماریں۔ اتنی دیر میں پہلا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ مجھ پر حملہ کرنے لپکا تو میں نے پیر پیچھے اٹھا کے اس کی ٹانگوں کے درمیان کک ماری اور پھر خود بھاگ کھڑا ہوا۔ میں پولیس کی کسی کارروائی سے دور رہنا چاہتا تھا۔ انہوں نے میرا تعاقب نہیں کیا کیونکہ انہیں اپنے حریف کی طاقت کا بخوبی اندازہ ہو گیا تھا۔

مجھے شک تھا کہ ان حملہ آوروں کو عائشہ کی ماں نے میری گوشمالی پر مامور کیا تھا۔ تصدیق کے لیے میں نے ایک قریبی پبلک کال آفس سے اسے فون کیا اور آواز بدل کے کہا "لیڈی' آپ کا کام تو ہو گیا...... مگر ایک گڑبڑ ہو گئی۔"

اس نے کہا "وہی...... اس پاکستانی کو واپس بھیجنے کا۔" اس نے کچھ دیر بعد کہا "گڑبڑ کیا ہو گئی؟"

"وہ مر گیا۔ ہم نے زیادتی نہیں کی' وہ کمزور تھا۔"

"او مائی گاڈ!" اس نے سخت پریشانی میں کہا "ایک منٹ رکو۔"

میں نے اپنا لہجہ اور آواز بدل کے بات کی تھی' پھر بھی اسے کچھ شک ہو گیا تھا۔ چند منٹ بعد کسی نے غرا کے کہا "کون ہو تم؟ یہاں فون کیوں کیا ہے؟"

میں نے ہکلا کے کہا "وہ...... دراصل...... وہ خود بھاگ گیا۔"

"جونی بھاگ گیا۔ بھاگ کے کہاں جائے گا وہ۔ میں نے اسے منع کیا تھا کہ فون پر بات نہ کرے۔ تم جونی کو کیسے جانتے ہو؟ یہ نمبر تم نے کہاں سے حاصل کیا؟"

میں نے فون رکھ دیا۔ میرے خدشات کی تصدیق ہو گئی تھی۔ لیڈی ارنسٹ نے غالباً اپنے کسی ملازم یا گارڈ سے کہا ہوگا کہ اس پاکستانی کا لندن میں رہنا مشکل کر دو۔ اس نے جونی نام کے کسی بدمعاش کو اس کارِ خیر کا ٹھیکا دیا ہوگا مگر یہ کام کرنے والے براہِ راست لیڈی ارنسٹ سے فون پر بات کیسے کر سکتے تھے۔ گھبراہٹ میں اس کے منہ سے جو بات نکل گئی' اس سے بھانڈا پھوٹ گیا۔ پھر اس کے معتمد نے جونی کا نام لے کر میرے شبہات کی تصدیق کر دی۔ اگر میں چاہتا تو پولیس کے پاس جا سکتا تھا مگر میں نے انتظار کیا۔ ایک دن میں اچانک لیڈی ارنسٹ کے سامنے چلا گیا۔ وہ بدحواس ہو گئی۔

میں نے کہا "مائی ڈیئر لیڈی! میں ابھی پاکستان واپس جانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔"

اس نے بوکھلا کے کہا "یہ...... یہ تم مجھے کیوں بتا رہے ہو؟"

میں نے کہا "اس کے علاوہ...... اب میں اپنے ساتھ بھرا ہوا ریوالور بھی رکھتا ہوں۔ جونی کو کتے کی طرح شوٹ کر دوں گا۔"

"تم نشے میں بے سروپا بول رہے ہو" اس نے کہا اور میرے سامنے سے ہٹ گئی مگر مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ڈر گئی ہے۔

آج فون پر مجھے پھر وہی دھمکی دی گئی تھی جو ایک سال پہلے تین گنجے حملہ آوروں نے دی تھی۔ پارٹی کے دوران مجھے بار بار انہی کا خیال آتا رہا۔ خود مارتھا اپنی پریشانی کو ظاہری

خوش اخلاقی کے پردے میں چھپانے کی کوشش کر رہی تھی۔ صرف میں اس فرق کو محسوس کر رہا تھا اور یہ چاہتا تھا کہ عائشہ کو شک نہ ہو۔ ابھی تک میں نے اسے نہ خود پر ہونے والے حملے کے بارے میں بتایا تھا اور نہ اس کی ماں کے مشکوک رویے کے حوالے سے کوئی بات کی تھی۔

الوداعی دعوت میں شریک ہونے والے سب مہمان میرے لیے تحائف لے کر آئے تھے۔ سوائے عائشہ کے' وہ صرف پھول لائی تھی۔ سب مہمان آدھی رات کے بعد باری باری رخصت ہونے لگے۔ انہیں معلوم تھا کہ میرا فیصلہ کتنا اٹل ہے اس کے باوجود انہوں نے کہا کہ مجھے لوٹ کر لندن آنے کے بارے میں ضرور سوچنا چاہیے اور اپنے والدین کو بھی قائل کرنا چاہیے کہ ایسا کرنا ہی بہتر ہوگا۔

آخر میں صرف عائشہ رہ گئی۔ اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا۔ میری فلائٹ میں چار گھنٹے باقی تھے۔ میں نے اپنے سامان کو کم سے کم رکھا تھا۔ میرے کمرے میں ذاتی استعمال کی جتنی چیزیں تھیں' وہ میں مارتھا کے لیے چھوڑ کے جا رہا تھا۔ ان میں میرا ٹی وی اور کمپیوٹر بھی شامل تھے۔ یہ میرے کمرے میں آنے والے کے لیے ایک نادیدہ پاکستانی دوست کا تحفہ ہوتا۔

مارتھا اتنی تھک گئی تھی کہ اس میں لباس تبدیل کرنے کی ہمت بھی نہ تھی۔ وہ بید کی آرام کرسی پر نیم دراز تھی۔ اچانک اس نے عائشہ کو مخاطب کیا ''کیا بات ہے عائشہ! تم صرف پھول لائیں؟''

میں نے جلدی سے کہا ''حقیقی جذبات کی ترجمانی پھولوں سے بہتر کون کر سکتا ہے؟''

عائشہ مسکرائی ''میں نے ایک خاص تحفے کا انتظام کیا تھا مگر معلوم نہیں کیوں وہ تم کو نہیں ملا۔ خیر کل مل جائے گا۔''

مارتھا نے دلچسپی سے پوچھا ''ایسی کیا چیز تھی؟''

''ایک وکٹورین اسٹائل ڈائننگ سیٹ تھا۔ برتنوں کا نہیں' ایک گلاس ٹاپ ٹیبل اور آٹھ کرسیاں۔''

مارتھا کا منہ حیرانی اور خوشی سے کھلا رہ گیا ''اتنا مہنگا تحفہ...... میرے لیے؟''

''وہ تمہیں ہمیشہ رفیق کی یاد دلائے گا اور اس تعلق کی جو تمہارے درمیان رہا'' عائشہ نے کہا۔

مارتھا اتنی جذباتی ہوئی کہ عائشہ کے گلے لگ کر رونے لگی۔ ''یہ بہت پتھر دل لڑکا ہے۔''

میں نے اسے ٹوکا ''مارتھا۔ ہم نے کس بات پر اتفاق کیا تھا؟ کوئی الوداعی ڈائیلاگ نہیں بولے گا۔ ڈرامائی سین نہیں ہوگا۔ رونا دھونا نہیں ہوگا...... رائٹ!''

''میں کیا کروں...... میں خود پر قابو نہیں رکھ سکتی۔''

میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور اسے پھر صوفے پر بٹھا دیا ''میں آتا جاتا رہوں گا مارتھا۔ ہو سکتا ہے وہاں جا کے مجھے اپنا فیصلہ بدلنا پڑے۔ ابھی کچھ دن میرا کمرا خالی رکھنا۔ اب میں عائشہ کو چھوڑ آؤں۔''

اس نے آنسو پونچھ کے سر ہلایا ''عائشہ آج خود ہی گاڑی چلا کے لائی تھی ورنہ رات کو کہیں دیر تک رکنا ہو تو شوفر اس کے ساتھ آتا تھا جو اس کا پرسنل باڈی گارڈ بھی تھا۔''

باہر آ کے عائشہ نے کہا ''جو تحفہ میں تمہارے لیے لائی تھی وہ سب کے سامنے دینا نہیں چاہتی تھی۔''

میں نے کہا ''کسی تحفے میں چھپانے والی کیا بات ہو سکتی ہے؟''

اس نے اپنے بیگ میں سے سرخ مخمل کی ایک چھوٹی سی ڈبیا برآمد کی ''بس...... میں خود کو مزید تماشا بنانا نہیں چاہتی تھی۔''

میں نے کہا ''یہ کیا ہے؟''

اس نے ڈبیا سے ایک ہیرے کی انگوٹھی نکالی ''یہ منگنی کی انگوٹھی ہے۔ اسے پہن لو' اپنا ہاتھ لاؤ...... میں پہنا دوں۔''

میں بھونچکا رہ گیا ''عائشہ!'' میں نے بڑی مشکل سے کہا۔

''یہ کوئی شادی کا بندھن تو نہیں۔ نہ کوئی قانونی حیثیت رکھنے والا حلف نامہ ہے۔ صرف ایک انگوٹھی ہے جسے تم جب چاہو اتار کے پھینک سکتے ہو۔''

میں نے کہا ''یہ کیسا پاگل پن ہے؟''

''میں نے سوچا تھا...... کہ تم مان جاؤ گے تو سب کے سامنے کسی تقریب میں پہناؤں گی'' اس نے ایک قطرۂ اشک کو انگلی سے جھٹک دیا۔

''مگر یہ تو لڑکا پہناتا ہے۔''

وہ اداسی سے مسکرائی ''کیا فرق پڑتا ہے اگر لڑکی پرپوز کرے اور لڑکا ہاں کہہ دے۔ کیا تم نے مجھے حضرت خدیجہؓ کی مثال نہیں بتائی تھی۔''

''لیکن...... کیا فائدہ اس کا...... جب شادی کا نہ ارادہ ہے نہ کوئی امکان۔'' میں نے بہتر سمجھا کہ اس کے دل میں باقی رہ جانے والی امید کی آخری کرن کو بھی بجھا دوں۔

یہ جھوٹ بھی نہیں تھا۔ فریال کے بارے میں بے یقینی کی کیفیت بالآخر باقی نہیں رہی تھی۔ میں فیصلہ کر چکا تھا کہ چار مہینے کے اندر اندر وہ زنجیر توڑ دوں گا جو برسوں سے اس کے

پیروں میں پڑی ہوئی تھی۔

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا ''ہر بات میں فائدہ نہیں دیکھنا چاہیے رفیق! بس میرا دل رکھنے کے لیے اسے پہن لو۔ نہ جانے کیوں میرا یہ اعتماد اور یقین مرتا نہیں کہ ایک نہ ایک دن تم ضرور واپس آؤ گے' تمہیں آنا پڑے گا...... صرف میرے لیے۔''

میں نے بڑے افسوس سے سر ہلایا ''عائشہ! یہ ظلم مت کرو اپنے ساتھ۔ خدا نے کتنی خوبصورت زندگی دی ہے تمہیں۔ صورت کی اور سیرت کی۔ شرافت اور نجابت کی۔ یہ خوشحالی اور کامیاب زندگی جو قدرت کا تحفہ ہے' اسے ایسے مت ٹھکراؤ۔ ایک آدمی ہوں میں' ایک اجنبی مسافر۔ مجھ سے لاکھ درجہ بہتر تمہاری ایک نظر کرم کے لیے چشم براہ ہیں۔''

''چھوڑو۔ یہ باتیں تو ہم کئی بار کر چکے ہیں۔'' اس نے کہا اور انگوٹھی میری انگلی میں پہنا دی۔ ''دیکھتے ہیں کس کا یقین درست ثابت ہوتا ہے۔''

میں نے کہا ''بے وقوف لڑکی! میں نہیں آ سکتا۔ یہاں سے جانے کے چار مہینے بعد میں فریال سے شادی کر رہا ہوں۔''

''میں تمہاری شادی میں ضرور آؤں گی۔ تم بلاؤ یا نہ بلاؤ...... لیکن ابھی یہ انگوٹھی تمہیں یاد دلاتی رہے گی کہ تم میرے ہو۔ میں کوئی زبردستی نہیں کر سکتی تھی تمہارے ساتھ لیکن تقدیر بعض اوقات زبردستی کرتی ہے۔ دنیا میں ناممکن کچھ بھی نہیں ہے۔ اگر تم آؤ گے تو مجھے یہ انگوٹھی دیکھ کر خوشی ہوگی کہ ایک مرحلہ تو میں نے طے کر لیا تھا۔ شادی سے پہلے ہی۔ دوسرا تم کو کرنا پڑا۔ انگوٹھی کی طلسماتی قوت تم کو واپس کھینچ لائی۔''

میں نے ایک گہری سانس لی ''او کے۔ لیکن فرض کرو' ایک لمحے کے لیے مان لو...... کہ میں نہ آ سکا...... پھر......؟''

''پھر یہ فریال کو پہنا دینا۔ اگر وہ برا نہ مانے...... اور چاہو تو میرے جانے کے بعد اتار دینا۔ پھینک دینا کہیں'' وہ ایک دم پلٹی اور گاڑی میں بیٹھ گئی۔ میں بے بسی سے دیکھتا رہا پھر میں آگے بڑھا۔

میں نے کہا ''عائشہ! ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔''

اس نے اپنے آنسو پونچھے ''سوری! میں نے وعدہ کیا تھا تم سے نہ رونے کا۔''

میں نے کہا ''ایئرپورٹ پر مجھے اپنی وہ مسکراہٹ دینا جو میرے ساتھ رہے۔''

''کیا تم مجھے اپنے ساتھ لے جا رہے ہو؟''

میں نے کہا ''کاش یہ ممکن ہوتا۔''

''ممکن تو ہے۔ میری سیٹ محفوظ ہے۔ میرے پاسپورٹ پر ویزا لگ چکا ہے۔''

میں بھونچکا رہ گیا ''کیا......؟''

''ہاں۔ اگر آخری لمحے میں تمہارا فیصلہ میرے حق میں ہو جاتا۔ تو میں تمہارے ساتھ بیٹھ جاتی۔ میں نے کوئی چانس نہیں لیا تھا۔''

''تم واقعی پاگل ہو۔''

''ایئرپورٹ میں صرف تمہارے ساتھ جانے کے لیے آ سکتی ہوں۔ تمہیں سی آف کرنے کے لیے نہیں۔ میں معجزات پر بڑا یقین رکھتی ہوں حالانکہ یہ معجزوں کی صدی نہیں ہے۔ اگر تم چاہو تو مجھے پک کر لینا جاتے ہوئے' میں تمہیں تیار ملوں گی'' اس نے کار کو ایک دم آگے بڑھا دیا۔

جب اس کی گاڑی کی ٹیل لائٹس بھی غائب ہو گئیں تو میں پلٹا۔ وہاں مارتھا دروازے میں کھڑی پھس پھس رو رہی تھی۔

میں نے کہا ''او گاڈ! اب تمہیں کیا ہوا ہے؟''

''کتنی پیاری لڑکی ہے۔ افسوس کہ یہ زندہ نہیں رہے گی۔''

میں اسے اندر لے گیا ''کیوں زندہ نہیں رہے گی؟ کوئی غیب کا فرشتہ بتا گیا ہے تمہارے کان میں؟''

''مجھے پتا ہے' وہ خودکشی کر لے گی۔''

میں نے دل پر جبر کر کے ایک مصنوعی قہقہہ لگایا ''مارتھا۔ یہ سب ایک رومانٹک ڈرامے کے کلائمکس میں ہوتا ہے۔ میرے جانے کے صرف دو دن بعد تم اسے دیکھنا۔ وہ نارمل ہوگی۔ صرف ایک مہینے بعد وہ مجھے بھول چکی ہوگی۔ چھ مہینے بعد وہ ایک نئے بوائے فرینڈ کے ساتھ ڈانس کر رہی ہوگی اور یہی ڈائیلاگ پھر بول رہی ہوگی۔''

مارتھا نے مجھے سخت ملامت بھری نظروں سے گھورا مگر اس سے پہلے کہ وہ مجھے شرمندہ کرنے والے الفاظ کے تیروں کا نشانہ بناتی' کال بیل بجی۔

میں نے گھڑی دیکھی ''اس وقت کون آ گیا؟''

''شاید کسی کو اب فرصت ملی ہو تم سے آخری ملاقات کی۔''

میں نے کہا ''آخری ملاقات ہوتی ہے ان کی جن کو صبح پھانسی دی جا رہی ہو'' اور دروازے کی طرف بڑھا۔

مارتھا نے جوتا اٹھا کے میری طرف پھینکا مگر میں بچ گیا۔ دروازہ کھولتے ہی میرے ذہن کو شدید جھٹکا لگا۔

''تم......؟'' میں نے کہا۔

''ہاں...... میں'' وہ پورے اعتماد کے ساتھ مسکراتا ہوا اندر آ گیا ''مجھے تو ڈر تھا کہ کہیں تم پہچاننے ہی سے انکار نہ کردو۔''

میں نے برہمی سے کہا ''کیوں آئے ہو تم یہاں؟''

وہ مجھے ایک طرف ہٹا کے آگے بڑھا اور لاؤنج میں اسی کرسی پر بیٹھ گیا جس پر مارتھا بیٹھتی تھی ''مجھے تم سے بات کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔''

میں نے کہا ''مگر مجھے کوئی بات نہیں کرنی۔ میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔''

اس نے بے نیازی سے اپنی سگریٹ جلائی ''ٹائم بہت ہے دوست!''

''میں تمہارا دوست بھی نہیں ہوں'' میں نے غصے سے کہا۔

مارتھا چلائی ''بدتمیز آدمی! سگریٹ بجھا دو۔ میں کسی کو اپنے گھر میں سگریٹ نہیں پینے دیتی۔''

''سوری میڈم!'' اس نے شائستگی سے کہا اور سگریٹ کو نیچے رکھ کے جوتے سے مسل دیا۔

''اور مجھے بتانے کی ضرورت نہیں کہ مجھے چیف نے بھیجا ہے۔ ہمیں ذرا دیر سے پتا چلا کہ تم لندن میں ہو۔''

''تین گھنٹے بعد میری واپسی کی فلائٹ ہے۔''

''ہاں...... یہ بھی معلوم ہوا تھا...... لیکن فی الحال تم واپس نہیں جارہے ہو۔'' اس نے قطعیت سے کہا۔

''کیا مطلب ہے آخر اس فضول بات کا؟''

''میں نے فارسی تو نہیں بولی۔'' اس نے اپنی کرخت اور بیٹھی ہوئی آواز میں کہا۔

وہ چھ فٹ لمبا اور کریہہ صورت شخص تھا۔ چھ سال میں اس کا وزن بڑھ گیا تھا چنانچہ وہ دیوزاد نظر آتا تھا۔ اس کے بالوں میں سفیدی جھلکنے لگی تھی۔ پہلے اس کی مصنوعی آنکھ کے نیچے زخم کا ایک نشان تھا' اب دوسرا زیادہ گہرا نشان اس کے ماتھے پر کراس کی صورت میں نظر آرہا تھا۔

میں نے کہا ''میرا تم سے اور تمہارے معاملات سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ پھر چیف نے تمہیں میرے پاس کیوں بھیجا ہے؟''

''تم تو اچھی طرح جانتے ہو۔ تعلق محض کہنے سے ختم نہیں ہوسکتا۔ ہم سب کے پاس ون وے ٹکٹ ہوتا ہے۔ ریٹرن ٹکٹ صرف ایک جگہ کے لیے ملتا ہے۔''

میرا حوصلہ جواب دینے لگا ''کیا تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا ''ایک سچائی بتارہا ہوں۔''

''تم مجھے جانے سے نہیں روک سکتے۔ میرے والدین میرا انتظار کررہے ہیں۔''

''تمہیں اپنے والدین کے بارے میں ضرور سوچنا چاہیے۔ آخر تم اکلوتے بیٹے ہو ان کے۔ اس عمر میں اگر ان کو پریشانی کا سامنا ہو تو کیا تمہیں افسوس نہیں ہوگا کہ تمہاری بے وقوفی سے ایسا ہوا۔''

اس کی دھمکی اب بہت واضح تھی۔ اگر میں اپنے انکار پر قائم رہا تو میرے ماں باپ کو اٹھالیا جائے گا۔ کسی کیس یا واردات میں ملوث کردیا جائے۔ تشدد کا نشانہ بنایا جائے گا یا مار دیا جائے گا۔

میری نظروں کے سامنے اندھیرا پھیلنے لگا۔ ''دیکھو' مجھے یہ دھمکی بھی دی گئی ہے کہ میں فوراً لندن سے چلا جاؤں ورنہ مجھے تابوت میں روانہ کردیا جائے گا۔''

اس نے مجھے غور سے دیکھا ''کس نے دی ہے یہ دھمکی؟''

میں نے کہا ''مجھے نہیں معلوم۔''

وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا جیسے یہ جتانا چاہتا ہو کہ ایسے جھوٹ سے وہ متاثر نہیں ہوسکتا۔ ''اس کی فکر مت کرو۔ ہم کردیں گے کوئی بندوبست۔ ابھی میری بات سنو۔''

میں نے چلا کے کہا ''میں تمہاری کوئی بات نہیں سن سکتا۔ میری فلائٹ کا ٹائم ہورہا ہے۔''

''فلائٹ تم کیسے پکڑو گے؟''

میں نے مارتھا سے کہا ''مارتھا۔ پولیس کو فون کرو۔''

مارتھا بڑے عزم کے ساتھ اٹھی۔ وہ زیرلب مسکراتا رہا اور دیکھتا رہا۔ مارتھا نے ریسیور اٹھایا اور میری طرف دیکھا ''یہ تو ڈیڈ ہے۔''

''تت...... تت......'' اس نے افسوس سے سر ہلایا ''فون بھی مرجاتے ہیں۔ انسان بھی مرجاتے ہیں' دنیا فانی ہے۔''

مجھ میں کھڑا رہنے کی ہمت نہ رہی۔ میں صوفے پر گر گیا۔

''آنٹی! کیا مجھے ایک کپ کافی مل سکتی ہے؟'' اس نے کہا اور ایک ریوالور نکال کے اپنی گود میں رکھ لیا۔

ریوالور پر سائلنسر لگا ہوا تھا۔

میرے پاس اتنی مہلت ہی نہیں تھی کہ میں کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے سوچ سکوں۔ بین الاقوامی پروازوں کے قواعد کی پابندی کرتے ہوئے لازمی تھا کہ دو گھنٹے قبل میں ایرپورٹ پہنچ جاؤں اور مجھے ایرپورٹ تک سفر کے لیے بھی ایک گھنٹا درکار تھا۔ فلائٹ پکڑنے کے لیے میری فوراً روانگی ضروری تھی۔

مجھے یہ مشکل ہی نہیں ناممکن لگتا تھا کہ کسی دلیل سے یا زور زبردستی سے میں اس شخص کا ارادہ بدل سکوں جو میرے ارادے کی راہ میں مزاحم تھا۔ میرے لیے یہ فرض کرنا بھی محال تھا کہ میری کوئی بات اچانک اس کے دل کو لگے اور پانچ دس منٹ میں وہ شرمندہ ہوکے اٹھے' ریوالور جیب میں رکھے اور مجھ سے ہاتھ ملا کے کہے ''سوری سر! میری وجہ سے آپ کو دیر ہوئی لیکن ابھی وقت ہے۔ آپ فلائٹ پکڑ سکتے ہیں' چلیے میں آپ کو ایرپورٹ چھوڑ دیتا ہوں۔''

نہ وہ اچھا آدمی تھا اور نہ اچھائی کرنا اس کے اختیار کی بات تھی۔ وہ حکم کا غلام احکامات کی حرف بحرف تعمیل میں ذرا بھی کوتاہی کرتا تو اس کو وہ سزا ملتی جو دوسروں کے لیے درسِ عبرت ہوتی۔ یہ بات وہ یقیناً بہت اچھی طرح سمجھتا تھا۔

زبردستی کا معاملہ ناممکن سے بھی زیادہ ناممکن تھا۔ بے شک ریوالور اس کی گود میں رکھا ہوا تھا۔ وہ بظاہر بے پروا اور ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کا شکار نظر آتا تھا مگر حقیقت اس کے برعکس تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ کتنا سفاک اور جان لینے کے معاملے میں فرشتۂ اجل کی طرح کتنا اٹل ہے چنانچہ پھرتیلے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے جھپٹ کر اس سے ریوالور چھیننا اور پھر بازی پلٹ دینا صرف اسی صورت میں ممکن تھا جب یہ سچویشن فلم میں ہوتی اور فلم کا ہیرو میں ہوتا۔

ایک گلاس ٹھنڈا پانی پی لینے کے بعد میں نے اطمینان سے صوفے پر بیٹھ کے کہا ''مارتھا' کافی میں بھی پیوں گا۔''

وہ خاصی مایوس ہوئی ''کیا مطلب...... تم نے پاکستان جانے کا ارادہ بدل دیا ہے؟''

میں نے مسکرا کے کہا ''ہاں۔ کیونکہ خدا کو ایسا منظور نہیں تھا۔ یہ تمہارا بھی عقیدہ ہے۔ غلطی میری ہے' اپنی روانگی کی تاریخ بتاتے ہوئے مجھے کہنا چاہیے تھا' انشاء اللہ۔''

اس نے ریوالور اٹھا کے واپس جیب میں رکھ لیا ''آئی ایم سوری مارتھا! مجھے مجبوراً یہ نکالنا پڑا۔ میرا مقصد تمہیں دہشت زدہ کرنا ہرگز نہیں تھا۔''

مارتھا نے ناگواری سے کہا ''تمہارے لیے میں مسز مارٹن ہوں' ڈونٹ کال می مارتھا' بدمعاش۔''

جب وہ کچن کی طرف چلی گئی تو میں نے کہا ''تمہارا نام تھا اشرف چیتا۔''

وہ بولا ''نام اور کام' دونوں آج بھی وہی ہیں۔''

''گویا تمہیں کچھ پتا نہیں کہ اتنے سال گزر جانے کے بعد اچانک آج چیف کو میری ضرورت کیوں پڑ گئی؟''

اس نے ایک جماہی لی اور نفی میں سر ہلا دیا ''میرا کام بس اتنا تھا کہ آج تمہیں پاکستان نہ جانے دوں۔''

''تم ناکام نہیں رہے۔ تمہارا ریکارڈ خراب نہیں ہوا لیکن فرض کرو تم کو دیر ہوجاتی' ٹریفک جام تو اس وقت نہیں ہوتا مگر حادثہ ہوجاتا یا کوئی بھی ایسی بات ہوجاتی۔''

''پھر تمہیں ایرپورٹ پر روک لیا جاتا۔'' اس نے بیزاری سے کہا۔

''رائٹ۔ اور میں وہاں بھی چکما دے کر نکل جاتا تو کراچی ایرپورٹ پر مجھے لندن کی اگلی فلائٹ سے واپس ارسال کردیا جاتا۔'' میں نے تلخی سے کہا۔

''امید ہے تم اگلی فلائٹ سے نکلنے کی کوشش نہیں کرو گے۔''

میں نے کہا ''میں اتنا بھی اناڑی نہیں ہوں۔ اب میری نگرانی کی جارہی ہوگی۔''

''ہاں...... اور یہ میری ذمے داری ہے۔ یہ شیطان کی خالہ تو مجھے یہاں ٹھہرنے نہیں دے گی۔ میں کافی پی کے چلا جاؤں گا باہر۔''

''تمہارے حق میں یہی بہتر ہے'' مارتھا نے اچانک کہا ''میں تم کو اپنے گھر کے اندر برداشت نہیں کرسکتی۔''

اشرف چونکا ''کیا یہ بڑھیا اردو سمجھ لیتی ہے؟''

میں نے کہا ''یہاں ایک بنگالی رہتا ہے اور ایک ایرانی۔ انہیں شک ہے کہ خالہ بنگالی اور فارسی جانتی ہے اور پنجابی بھی۔''

''میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تمہارا تعلق کسی گینگ سے ہوگا۔'' مارتھا نے افسوس سے سر ہلایا۔

میں نے کہا ''مارتھا۔ تم نے دو سال میں ایسی کوئی بات محسوس کی؟''

اشرف چیتے نے بھی دبے دبے لہجے میں احتجاج کیا ''میں بھی کسی گینگ میں شامل نہیں ہوں۔''

مارتھا غرائی ''شٹ اپ' یو راسکل! ایک بوڑھی عورت کو دہشت زدہ کرنے کے لیے اس کے گھر میں ریوالور نکالنا کیا شریفانہ حرکت تھی' میں اس کی رپورٹ کروں گی۔''

میں نے اشرف چیتے کو تسلی دی ''یہ غصے میں کہہ رہی

ہے۔ میں منع کروں گا تو مان جائے گی۔''

''رپورٹ کر کے میرا کیا بگاڑے گی' مشکل میں تم پڑ جاؤ گے۔''

میں نے کہا ''وہ تو تم نے بھی ڈال دیا ہے مجھے۔ اب میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ جو لوگ پاکستان میں میرے لیے چشم براہ ہیں انہیں مطمئن کیسے کروں گا۔ کیا وجہ بتاؤں گا کہ میں نے پروگرام کیوں بدل دیا؟ مجھے تو یہ بھی پتا نہیں کہ میں کب جاؤں گا۔''

''ابھی تو تم کہہ سکتے ہو کہ فلائٹ مس ہو گئی۔ بعض اوقات ایک ہفتے تک کراچی کی فلائٹ پر جگہ نہیں ملتی۔ اگر اس سے زیادہ رکنا پڑے تو کوئی قائل کرنے والا جھوٹ بول دینا۔ جھوٹ بولنا تمہارے لیے کیا مشکل ہے؟'' اشرف چیتے نے کہا۔

''ہاں' سچ بولنا مشکل ہے۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

''سب کے لیے ہوتا ہے یار!'' اس نے مجھے تسلی دی۔

میں نے مارتھا کی طرف دیکھا ''آج کے بعد شاید تم مجھے یہاں رکھنا پسند نہیں کرو گی۔ میرے بارے میں تم نے اپنی رائے بدل لی ہے مارتھا؟''

اس نے رکھائی سے کہا ''اس میں میری کیا غلطی ہے۔ رات کا وقت نہ ہوتا تو میں کہتی کہ اپنا سامان اٹھاؤ اور دفع ہو جاؤ۔''

''میں ایسا ہی کروں گا۔ اپنی صفائی میں کچھ کہنا لا حاصل ہوگا لیکن مارتھا' میری درخواست ہے کہ اس بارے میں کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ ایک دن تم مان لو گی کہ میرا تعلق کسی گینگ سے نہیں تھا۔ میں واقعی شریف آدمی تھا۔ جیسا کہ تم نے دو سال تک دیکھا۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا ''میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ ایسا نہ ہو بعد میں میرے لیے کوئی مشکل پیدا ہو جائے۔ تمہارے کسی معاملے میں پولیس ملوث ہو جائے اور سراغ لگاتی ہوئی یہاں آ جائے۔''

میں نے لجاجت سے کہا ''یقین کرو' ایسا نہیں ہوگا مارتھا۔''

اس نے کہا ''آخر یہ معاملہ کیا ہے؟''

''یہ ایک ذاتی معاملہ ہے۔''

''ہوگا...... لیکن یہ اس طرح میرے گھر میں طے ہو تو پھر میرا معاملہ بھی ہو جاتا ہے۔ آخر کیا چاہتا ہے یہ شخص؟''

میں بڑی مشکل میں پڑ گیا۔ میں اپنی زندگی کی کتاب کے ورق بہت پیچھے تک پلٹ کے آٹھ سال پہلے ہونے والے واقعات کی تفصیل بتاتا پھر بھی مارتھا کی سمجھ میں کچھ نہ آتا۔ وہ سیاسی' مذہبی اور لسانی بنیادوں پر استوار معاشرے میں دوستی اور دشمنی کے اسباب کو نہیں سمجھ سکتی تھی۔ طبقاتی فرق کے ساتھ وہاں صوبائی تعصب بھی تھا۔ ذات برادری کا نظام تھا۔ دیہی اور شہری امتیاز تھا اور فرقہ پرستی کے جنون کے ساتھ لسانی اختلافات تھے اور میں سازشوں کی سیاست یا سیاست کی سازشوں میں ایسے الجھ گیا تھا کہ سوائے جلاوطنی اور روپوشی کے میری جان بچنے کی کوئی صورت نہ رہی تھی۔ میرے جیسے سیکڑوں ہزاروں تھے جو ملک سے فرار ہو گئے تھے۔ کچھ نے سیاسی پناہ حاصل کر لی تھی' کچھ تعلیم اور روزگار کے بہانے باہر مقیم تھے تو کچھ غیر قانونی طور پر مختلف ممالک میں گمنامی کی زندگی گزار رہے تھے اور اپنے ماضی کے آسیب سے پیچھا چھڑانے کے لیے کوشاں تھے۔

مارتھا ایک ترقی یافتہ ملک کے مہذب معاشرے میں رہتے ہوئے میرے مسائل کو سمجھ ہی نہیں سکتی تھی چنانچہ میں نے اپنی جھوٹ بولنے کی خداداد صلاحیت اور ذہانت پر اعتماد کرتے ہوئے صرف ذاتی اور خاندانی دشمنی کے اسباب پر مبنی ایک ایسی کہانی کا تانا بانا تیار کیا جس کی بنیاد زر' زن اور زمین کے ازلی اور آفاقی اصولوں پر تھی۔ یہ کہانی میں نے سیکڑوں فلموں' کہانیوں اور حقیقی واقعات کی اس لائبریری سے اخذ کی تھی جو میرے دماغ میں موجود تھی۔

مارتھا سیدھی سادی عورت تھی۔ میرے جذباتی اندازِ بیان اور درد بھرے واقعات کو اس نے بڑی دلچسپی آمیز تشویش اور ہمدردی کے ساتھ سنا اور یقین کر لیا۔ صرف یقین ہی نہیں کیا' آخر میں وہ اتنی جذباتی ہو گئی کہ دکھ سے سر ہلانے لگی اور ٹھنڈی آہیں بھرنے لگی۔ اس نے کئی بار رنجیدہ لہجے میں کہا ''اوہ مائی گاڈ!'' میرے سر پر ممتا بھرا ہاتھ پھیرا اور آنکھیں بند کر کے اپنے رومن کیتھولک عقیدے کے مطابق خداوند یسوع مسیح سے میرے لیے سلامتی مانگی۔

اشرف چیتا صرف مسکراتا رہا اور میری بے بسی کے احساس سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ اس کے کام میں کوئی الجھن نہیں تھی۔ وہ اس سے کہیں زیادہ مشکل اور خطرناک ذمے داریاں پوری کر چکا تھا۔ وہ مجھ سے بہت زیادہ سینئر تھا اور اس کی وفاداریاں غیر مشروط تھیں۔ اس وفاداری کے بدلے اسے شاہانہ انداز میں جینے کی ہر سہولت حاصل تھی تاہم وہ اپنی کشتی چوبیس گھنٹے خطرات کے سمندر میں رواں رکھتا تھا۔ وہ ایک ایسا جواری تھا جو ہر داؤ پر اپنی زندگی لگاتا جاتا تھا اور ظاہر ہے' بے حد خوش قسمت تھا کہ ہار سے محفوظ تھا۔ یہ تقدیر کا سمجھ

میں نہ آنے والا کھیل تھا۔ میں نے پیدائشی اور ازلی و ابدی بدنصیب بھی دیکھے تھے جن کے بارے میں میرا خیال تھا کہ (پیدا ہونے کے سوا) انہوں نے کوئی گناہ نہیں کیا اور اس کی پاداش میں تمام عمر ہر خوشی اور کامیابی سے محرومی پر روتے رہے۔ اشرف چیتا ان کے برعکس تھا کہ اس کی خوش نصیبی کا کوٹا ختم ہونے میں ہی نہ آتا تھا۔ اسے دیکھ کے جو خیال آتا تھا وہ بھی برعکس ہی ہوتا تھا کہ وہ نہ ہوتا تو دنیا میں میرے جیسے ان گنت لوگ کتنے سکھی ہوتے۔

میرے لیے اس کی آمد اتنی ہی غیر متوقع اور تباہ کُن تھی جتنی کسی ہستی بستی آبادی پر سیلاب اور طوفان جیسی آفات کا نزول۔ اس نے میری پُرسکون زندگی اور خوشگوار مستقبل کے خوابوں میں زلزلہ برپا کر دیا تھا اور میں ہر طرف سے اندیشوں میں گھر گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب میں ان سب کو کیسے مطمئن کروں گا جو میری واپسی کے لیے چشم براہ ہیں۔ میں کسی سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اشرف چیتا میری راہ میں حائل ہو گیا ہے اور ابھی خود مجھے بھی معلوم نہیں کہ وہ کیا چاہتا ہے؟ کل کیا ہوگا' میری واپسی کب ہوگی' ہوگی یا نہیں ہوگی؟ ایسے کسی سوال کا جواب دینا میرے لیے ممکن ہی نہیں تھا۔

مجھے معلوم تھا کہ مجھ پر یقین کوئی نہیں کرے گا؟ نہ میرے سچ پر نہ جھوٹ پر۔ سمجھا یہی جائے گا کہ میں بغاوت اور نافرمانی پر آمادہ ہوں۔ کسی نے مجھے بہکا دیا ہے خود میرے شیطانی خیالات نے یا شیطان کے روپ میں مجھ پر غلبہ پانے والی کسی فرنگی حسینہ نے۔ پیر چچا فرمائیں گے ابجی ہمیں تو پہلے ہی ہمارے موکلوں نے خبردار کر دیا تھا۔ خالو عنایت اپنا تڑکا لگائیں گے کہ یہ تو ہونا ہی تھا۔ عدم آباد اور ولایت جانے والوں میں سے کون لوٹ کر آیا ہے۔ اور دادی جوتی اتار کے اٹھ کھڑی ہوں گی کہ اس نمونے کی یہ مجال' میں خود لاتی ہوں اسے کان سے پکڑ کے...... لیکن پہلے میں فون پر بات تو کر لوں اس کے بعد ٹیلی فون کالز کا ایک لمبا سلسلہ شروع ہوگا۔ سب بولیں گے' میری کون سنے گا!

دوسری طرف لندن میں اَن گنت لوگ ہیں جن کو میرے نہ جانے سے سخت حیرت کا شاک لگے گا۔ فریال' عائشہ' میرے ساتھ رہنے والے' آفس کے لوگ' میں کیا وضاحت کروں گا' کتنا جھوٹ بولوں گا؟

میرے ذہن میں نفرت کا آتش فشاں بھی دھواں دے رہا تھا اور مجھے ناقابلِ عمل خیالات بھی اکساتے تھے کہ میں صرف سوچنے کے بجائے کچھ کروں۔ چیتے کا کام تمام کر دوں یا اس کے ساتھ جا کے چیف کو گولی مار دوں تاکہ میرے ساتھ دنیا کو بھی ان کے شر سے نجات ملے ورنہ میں ساری عمر بلیک میل ہوتا رہوں گا۔ ان کے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے غلط اور خطرناک راستے پر چلتا رہوں گا اور اپنے لیے کبھی کچھ نہ کر پاؤں گا۔ ترقی' خوشحالی اور محفوظ مستقبل کے سارے خواب محض خواب ہی رہ جائیں گے اور یہ سب اس لیے ہوگا کہ میں ڈرتا ہوں۔ مجھے اپنی بزدلی پر بھی شرم آتی تھی۔ آخر مجھ میں کچھ کر گزرنے کا مجاہدانہ جذبہ کیوں نہیں ہے۔ جو ڈر گیا' سو مر گیا۔ اور یوں ڈر ڈر کے اور مر مر کے جینے سے تو بہتر ہے......

مگر جو ناممکن ہے وہ ناممکن ہے۔ میرے ایک احمقانہ قدم کا خمیازہ ان سب کو بھی بھگتنا پڑتا جن سے میرا جذبات کا اور خون کا...... پیار کا اور اپنایت کا رشتہ تھا۔ میں ان کے ساتھ دشمنی کیسے کر سکتا تھا! اس کے علاوہ میں خود بھی تو زندہ رہنا چاہتا تھا۔

میں نے خود کو قابو میں رکھا اور یہ سوچا کہ ناامیدی لاحاصل ہے۔ ممکن ہے چیف سے ملنے میں خطرے کی کوئی بات نہ ہو۔ وہ مجھ سے صرف ملنا چاہتا ہو' کچھ پوچھنا چاہتا ہو یا وہ میرے سپرد کوئی ایسا کام کرے جس سے میرا مستقبل متاثر نہ ہو۔ مجھے کل پرسوں یا ہفتہ دس دن بعد جانے کی اجازت مل جائے۔ چیف بے وقوف بہر حال نہیں ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کسی کی قوتِ برداشت کی حد کہاں ہوگی۔ میں اسے دلیل سے نہ سہی' منت سماجت سے قائل کر سکتا ہوں۔ میں نے اس پر غور کیا مگر پھر مجھے خود ہی یہ خیال احمقانہ محسوس ہوا۔ اگر رعایت کی کوئی بات ممکن ہو سکتی تو وہ اشرف چیتا کو اس طرح میرے پاس نہ بھیجتا۔ چیف سے بات نہ کرنے میں ہی عقل مندی تھی۔ میں نے ایک لمحہ سوچا اور پھر رضامندی کا اشارہ کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اشرف چیتا کے ہونٹوں پر کامیابی کی مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔

میں نے مارتھا سے کہا کہ میں جا رہا ہوں اور امید ہے فلائٹ پکڑنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ اگر معقول وجہ بتائی جائے تو ڈیڑھ گھنٹا پہلے پہنچنے والوں کو بھی بورڈنگ کارڈ جاری کر دیا جاتا ہے۔

''بس اب تمہیں کسی فکر میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں جا رہا ہوں اور یہ جو تھوڑی سی پریشانی تمہیں ہوئی' اس کی تم سے معافی مانگتا ہوں۔ امید ہے تم کسی کو کچھ نہیں بتاؤ گی۔''

''یہ کیسے ممکن ہے؟ میں سب کو بتاؤں گی اور کیوں نہ

بتاؤں' آخر جب اس میں نقصان کوئی نہیں۔ کیوں بلاوجہ ایک راز کا بوجھ اٹھاؤں جس کی کوئی اہمیت نہیں میرے لیے۔ کتنا اچھا ہوتا گر یہ سب میں نہ دیکھتی۔ تم چلے جاتے ہنسی خوشی اور میرے جذبات تمہارے لیے وہی رہتے جو دو سال تک تھے۔ --- اور یہاں سے جانے کے بعد کچھ بھی ہوتا۔ مجھے معلوم نہ ہوتا اور میں تمہیں صرف محبت سے یاد کرتی۔''

''کیا اب تمہیں نفرت ہوگئی ہے مجھ سے؟'' میں نے بڑے دکھ سے کہا۔

''نفرت؟...... نفرت کا تو کچھ یقین نہیں مجھے۔ لیکن میں مایوس ضرور ہوں اور کچھ خوف زدہ بھی...... کہ تم پوری طرح وہ نہیں تھے جو میں سمجھتی رہی۔ دراصل مجھے یقین نہیں کہ جو کچھ تم نے مجھے بتایا وہ کس حد تک سچ تھا۔ آج کل نوجوان بڑی آسانی سے جھوٹ بول سکتے ہیں اور اسے گناہ بھی نہیں سمجھتے۔'' اس نے آنکھوں میں آجانے والے ایک قطرۂ اشک کو انگلی سے جھٹک دیا۔

میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا ''اگر ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا مارتھا......! پلیز!''

اس نے سر ہلایا ''جاؤ' تمہیں دیر ہو رہی ہے۔''

اشرف چیتے نے بڑا سوٹ کیس اپنی گاڑی کی ڈکی میں رکھا۔ دوسرا میں نے پیچھے والی سیٹ پر رکھ دیا۔ مارتھا نے میرے باہر آتے ہی دروازہ بند کر دیا تھا مگر اس کا بے حد دکھی چہرہ ابھی تک میری نظروں کے سامنے تھا۔ اس کی آنکھوں میں اتر آنے والے ایک قطرۂ اشک نے میرے جذبات کے الاؤ کو بھڑکا دیا تھا۔

''یہ بڑھیا تو پاگل ہے۔'' اشرف چیتے نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

میں نے ایک دم اسے دبوچ لیا۔ ''یہ سب تیری وجہ سے ہوا کتے کے بچے! کیا ضرورت تھی تجھے ریوالور نکالنے کی...... تیری اور تیرے چیف کی تو......''

میری دیوانگی میں ایسی وحشیانہ قوت تھی کہ اشرف اپنی گردن نہ چھڑا سکا۔ وہ خاصا تندرست اور قوی تھا مگر میرے ہاتھوں کی گرفت کسی شکنجے کی طرح تھی اور اسٹیرنگ وہیل کے پیچھے اس کی مدافعت محدود ہوگئی تھی۔ وہ ڈیش بورڈ کے نیچے ٹانگیں چلا سکتا تھا اور اپنے جسم کو تھوڑا بہت دائیں بائیں حرکت دے سکتا تھا مگر اپنے دونوں ہاتھوں کی قوت سے مجھے دھکیل نہیں سکتا تھا۔ اس نے بائیں بازو کی کہنی میرے پیٹ میں ماری اور دائیں ہاتھ سے میرے بال بھی پکڑے مگر مجھے اشتعال کی شدید لہر نے بالکل پاگل کر دیا تھا۔ گالیاں دینے کے ساتھ میں اس کے سر کو اسٹیرنگ وہیل پر مارتا رہا۔

اچانک وہ ساکت ہوگیا۔ اس نے مزاحمت ختم کر دی اور اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا تو میں نے خود کو روکا۔ جب میں نے اپنے ہاتھوں کو اس کی گردن سے الگ کیا تب بھی وہ اسٹیرنگ پر سر رکھے پڑا رہا۔

کیا میں نے اسے مار ڈالا ہے؟ میں نے دہشت سے سوچا اور فوری طور پر اس کا ہاتھ پکڑ کے نبض کو محسوس کیا۔ نبض کی رفتار سست تھی لیکن وہ چل رہی تھی۔ اشرف چیتا صرف بے ہوش ہوا تھا۔ سانس رک جانے سے یا شاید سر کی کسی چوٹ سے۔ وہ مرا نہیں تھا اور یہ میرے لیے اطمینان کی بات تھی۔

میں نے سر گھما کے آگے پیچھے دیکھا۔ گلی میں بہت دور لیمپ پوسٹ کے نیچے ایک مرد اور عورت کا سایہ سا نظر آ رہا تھا۔ سامنے آخری حصے میں ایک شخص مخالف سمت میں جا رہا تھا۔ اشرف چیتے کے ساتھ ہونے والی چند منٹ کی لڑائی کسی نے نہیں دیکھی تھی اور نہ کسی نے کوئی آواز سنی تھی۔ فوری طور پر میں نے اشرف کو کھینچ کر اپنی جگہ پر بٹھایا اور سیٹ کو اتنا پیچھے کر دیا کہ وہ نیم دراز نظر آئے پھر میں نے گاڑی اسٹارٹ کی۔

اچانک مجھ پر بغاوت کا خیال غالب آ گیا۔ اس وقت میری ہمت اور بے خوفی کا گراف آسمان کو چھو رہا تھا۔ میں نے مستقبل کے سارے اندیشوں کو اور چیف کے احکامات کو نظر انداز کرتے ہوئے لندن سے فرار ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک اندر کی آواز میرا حوصلہ بڑھا رہی تھی۔ یہی موقع ہے نکل جاؤ...... دہشت گردی کے چنگل سے ورنہ مارے جاؤ گے۔ آٹھ سال کی جلاوطنی تم نے اس لیے تو قبول نہیں کی تھی کہ باقی عمر بلیک میل ہوتے رہو۔ یہ تو کبھی ختم نہ ہونے والا سلسلہ ہے۔ یہ لوگ تمہیں پھر دلدل میں کھینچنا چاہتے ہیں۔ ان سے ڈر کر پیچھے ہٹتے رہے تو یہ تمہیں دیوار سے لگا دیں گے اس لیے مقابلہ کرو۔ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے۔ لاقانونیت کا مقابلہ کرنے کے لیے اگر تمہیں بھی لاقانونیت کا ہتھیار اٹھانا پڑے تو اٹھا لو۔ فنا اور بقا کی جنگ میں غلط کچھ نہیں' جو جیتا وہی سکندر۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ فلائٹ ٹائم میں اب بھی سوا دو گھنٹے باقی تھے۔ اگر میں طوفانی رفتار سے گاڑی چلاتا تو آدھے گھنٹے میں ایرپورٹ پہنچ سکتا تھا مگر اس میں ٹریفک پولیس کا میرے پیچھے لگ جانا یقینی تھا۔ ایک مسئلہ اشرف چیتے کا بھی تھا۔ اس کی گاڑی کو میں پارکنگ ایریا میں چھوڑ سکتا تھا۔ گاڑی میں لیٹا ہوا وہ کسی کو فوراً نظر نہ آتا۔ میں اپنے سوٹ کیس نکال کے باہر رکھتا اور پورٹر کے پیچھے چل پڑتا۔ اشرف چیتے کے ہوش میں آنے یا بے ہوش پائے جانے سے پہلے جہاز اڑ جاتا۔

لیکن میں نے رسک کم کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے گاڑی کو سڑک کے کنارے کھڑا کیا۔ سوٹ کیس اٹھا کے کچھ دور گیا اور پھر پہلی ٹیکسی کو روک لیا۔ میں نے کہا ''میری گاڑی خراب ہوگئی ہے اور مجھے ڈر ہے کہ میں فلائٹ مس کر دوں گا۔ اگر تم مجھے آدھے گھنٹے میں پہنچا دو......''

سکھ ٹیکسی ڈرائیور نے سر ہلایا ''او جی پہنچانے کو میں بیس منٹ میں پہنچا دوں لیکن میرا ٹکٹ کٹ جائے گا۔''

میں نے کہا ''فرض کرو جرمانے کی رقم بھی میں ادا کر دوں؟''

''پھر فرض کیا کرنا جی! سمجھ لو آپ پہنچ گئے۔'' اس نے بڑے عزم سے کہا اور گاڑی کو یوں دوڑانے لگا جیسے اسے کار ریس کا مقابلہ جیتنا ہے۔ اتفاقات خوشگوار بھی ہوتے ہیں۔ تیز رفتاری کے جرم میں اس کا چالان نہیں ہوا اور مجھے صرف کرایہ دینا پڑا۔

ایک خوش مزاج اور خوش شکل لڑکی نے میری وضاحت مسکراتے ہوئے قبول کی اور مجھے بورڈنگ کارڈ جاری کر دیا۔ اس کے بعد کے مراحل رسمی تھے۔ ٹرانزٹ لاؤنج میں پہنچ جانے کے بعد یہ ڈر ختم ہوگیا کہ اشرف چیتا یا اس کا بھوت میرے عزائم کو ناکام بنانے کے لیے ''پکڑو' پکڑو'' چلاتا ہوا میرے پیچھے نہ آ جائے۔ جہاز کی پرواز کا وقت قریب تھا اور مسافروں سے التماس کی جا رہی تھی کہ وہ جہاز کی طرف روانہ ہوں۔ میں رکے بغیر ان میں شامل ہوگیا۔

جہاز میں میری سیٹ کھڑکی کے ساتھ تھی اور میں ہیتھرو ایرپورٹ کی ساری ایکٹیوٹی دیکھ سکتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ لندن امیگریشن پولیس کے اختیارات کیا ہیں۔ ضرورت پڑنے پر وہ کسی بھی فلائٹ سے فرار کی کوشش کرنے والے مجرم کو جہاز کے اندر آ کے گرفتار کر سکتے تھے لیکن مجھے یہ امکان نظر نہ آتا تھا کہ آدھے گھنٹے کے اندر اندر اشرف چیتا ہوش میں آ جائے تو میرے خلاف رپورٹ درج کرائے اور پولیس اس کی درخواست کو درخورِ اعتنا سمجھتے ہوئے مجھے جہاز سے اتارنے کے لیے دوڑے۔ لہولہان تو کیا وہ معمولی زخمی بھی نہیں تھا۔ اگر وہ ہکلاتے ہوئے بہکی بہکی زبان میں قاتلانہ حملے کی تفصیل پیش کرتا تو پولیس شاید پہلے یہ ٹیسٹ کراتی کہ اس پر سر کی چوٹ کا اثر ہے یا وہ نشے میں ہے؟

وہ ہوش میں نہ آتا اور پولیس دیکھ لیتی تو اسے پہلے اسپتال پہنچایا جاتا' اس کے باوجود اگر یہ ثابت ہو جاتا کہ میں نے ہی اسے ناک آؤٹ کیا تھا تو یہ الزام اتنا سنگین بہرحال نہ تھا کہ اس کے لیے بین الاقوامی پرواز سے کسی مسافر کو آف لوڈ کیا جائے۔ اشرف چیتا کی ایک اور مشکل یہ تھی کہ وہ صرف حکم کا غلام تھا۔ اسے اپنی مرضی سے ذاتی معاملات طے کرنے کی اجازت بھی نہ تھی۔ میرے معاملے میں وہ چیف سے پوچھے بغیر کوئی قدم اٹھانے کی جرأت ہی نہیں کر سکتا تھا۔

چنانچہ یہ معاملہ رفت گزشت ہوگیا تھا۔ ایک آواز اب مسافروں سے سیٹ بیلٹ باندھنے کی درخواست کر رہی تھی۔ جب ہیتھرو ایرپورٹ کا منظر پیچھے کھسکنے لگا تو میں سمجھ گیا کہ جہاز ٹیک آف کرنے کے لیے چل پڑا ہے۔ میں اپنے پروگرام کے مطابق لندن سے روانہ ہوگیا تھا۔ چیف اور اس کا پیغام بر اشرف چیتا مجھے روکنے میں ناکام رہے تھے۔ وقتی طور پر ان کی اس شکست سے مجھے بڑی طمانیت حاصل ہو رہی تھی۔

آگے کیا ہوگا؟ یہ ابھی میں سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ میں باہر دیکھتا رہا۔ لندن شہر کی روشنیاں آسمان کے تاروں کی طرح ہوگئی تھیں۔ میرے اردگرد آخر شب کا اندھیرا تھا جو گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ گزرے ہوئے چھ سالوں کی ہر یاد ہنوز میرے ساتھ تھی اور باہر تاریکی میں میرے تصور کے تراشے ہوئے سارے پیکر میرے سامنے سفر کر رہے تھے۔ جہاز کی رفتار سے اس کے متوازی اور میری کھڑکی کے بہت نزدیک پرواز کرتے جا رہے تھے۔ سب سے قریب عائشہ تھی' وہ پاگل لڑکی جس کے عشق نے الف لیلوی داستانوں سے آج کے دور کی فلموں تک محبت کی ہر روایت کو غیر حقیقی کر دیا تھا اور مجھے دائمی شرمندگی کی اذیت میں مبتلا کر دیا تھا کہ مرد اور بڑا روایت شکن ہیرو ہونے کے باوجود میں کتنا کم ہمت' بزدل اور بے بس تھا۔

جہاز کی کھڑکی سے نظر آنے والا اس کا چہرہ اداسی اور دل شکستگی کی وہ تصویر تھا جسے دنیا کا کوئی مصور کینوس پر نہیں دکھا سکتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے مگر وہ مسکرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے کہا' روفی...... میں نے آخری وقت تک تمہارا انتظار کیا۔ میں اپنا سوٹ کیس قریب رکھے کپڑے' جوتے پہن کے بالکل تیار بیٹھی کال بیل کی منتظر رہی۔ میں ناامید ہونا نہیں چاہتی تھی۔ میں یہی سوچتی رہی کہ تمہارا ارادہ بدل جائے گا۔ دنیا میں ناممکن تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ ایرپورٹ جاتے ہوئے تم مجھے لے جانے کے لیے رک جاؤ گے۔ فلائٹ ٹائم ہونے تک میں نے آس نہیں چھوڑی۔ اس وقت جب تمہارے طیارے نے ٹیک آف کیا ہوگا میں

چھت پر تھی اور اس سمت میں دیکھ رہی تھی جدھر تمہیں جانا تھا۔ مشرق کی طرف لیکن وہاں سے نظر کیا آتا؟ بس میں تصور میں تمہیں دیکھتی رہی اور سوچتی رہی کہ کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ تمہاری فلائٹ مس ہوجائے یا تم خود ایرپورٹ سے واپس آنے پر مجبور ہوجاؤ۔ میری محبت تمہیں مجبور کردے' محبت معجزے کی طاقت رکھتی ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہوا تو کوئی بات نہیں' میں تمہارے ساتھ ہوں اور رہوں گی...... تمہارے دل میں' تمہارے خیالوں میں اور خوابوں میں' جب تک ممکن ہوا۔

پھر فریال نے اسے پرے دھکیل دیا۔ ''یہ لڑکی بالآخر پاگل خانے پہنچ جائے گی۔ لکھوالو مجھ سے اور اس کو ٹھکرانے کا گناہِ عظیم تمہارے نامۂ اعمال میں لکھا جائے گا۔ تمہارے لیے ضمیر کی خلش سے چھٹکارا پانا اتنا آسان نہیں ہوگا رومیو' یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔''

میں نے کہا ''اور کیا کرتا میں؟''

''اسے لے جاتے اپنے ساتھ اور کیا کرتے۔ وہ تم سے کچھ مانگ تو نہیں رہی تھی؟''

''وہ مجھ سے مجھے مانگ رہی تھی۔''

''پھر کیا ہوا؟''

میں نے کہا ''وہ شادی کرنا چاہتی تھی مجھ سے۔''

''تو کرلیتے۔''

''پھر تمہارا کیا کرتا؟''

''میرا تو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ بعد میں مجھ سے بھی کرلیتے۔''

''لاحول ولاقوۃ۔ ایک میان میں دو تلواریں۔''

وہ ہنسی ''محبت کو تلوار سے تشبیہ مت دو۔ گلاب سے دو۔ ایک شاخ پر کیا دو گلاب نہیں کھل سکتے۔ محبت کی جگہ دل میں ہوتی ہے اور یہ تمہارا نہیں' میرا اور عائشہ کا معاملہ تھا۔ ہم گزارا کرلیتے۔ محبت میں گنجائش تو نکالنی ہی پڑتی ہے۔ دو بھوکے اگر کمینے اور خودغرض نہ ہوں تو ایک روٹی کے دو حصے کرکے کھالیتے ہیں۔''

''دوبارہ لاحول ولاقوۃ۔ نہ میں روٹی ہوں اور نہ ڈبل روٹی۔''

وہ ہنسی ''بس میں آرہی ہوں تمہارا سینڈوچ بنانے۔ چار مہینے ہیں تمہارے پاس۔''

میں نے کہا ''شٹ اپ!''

ایر ہوسٹس کا صدمے اور غصے سے برا حال ہوگیا ''سر میں نے تو صرف کافی کے لیے پوچھا تھا۔''

میری وہ حالت ہوئی جیسے مجھ پر گرم پانی کے شاور سے اچانک یخ بستہ پانی پڑ گیا ہو' ''آئی ایم سوری! رئیلی ویری سوری۔ میں نے تم سے کچھ نہیں کہا۔''

وہ مطمئن ہوکے مسکرائی اور مجھے کافی کا مگ تھما کے چلی گئی تو میں نے اپنے سفر کے پڑوسی پر غور کیا۔ وہ نورانی چہرے اور دو چار سال پرانی سیاہ چکی داڑھی والا طویل قامت دبلا پتلا نوجوان تھا جس کی ٹوپی کے نیچے گردن تک پہنچنے والے بالوں کے پٹے چنبیلی کے تیل میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں سرمے کی مقدار دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ جہاز کے بجائے وہ کراچی کی کسی ویگن میں کبڑا بن کے سفر کررہا ہوتا تو سرمہ اس کے رخساروں پر بہنے لگتا۔ اس کے جبہ نما سفید لبادے اور شانے پر پڑے ہوئے سفید رومال کو دیکھ کر اپنے قومی جھنڈے کا خیال آتا تھا جو کسی کے سوگ میں سرنگوں ہو۔ ایر ہوسٹس قریب تھی تو وہ ایسے سمٹ کر میری طرف ہوگیا تھا جیسے اس نے غلطی سے بھی چھولیا تو اس پر غسل واجب ہوجائے گا۔ اس نے پہلے شربت بادام طلب کیا پھر پوچھا' لسی ملے گی اور مایوس ہوکے چائے قبول کی بشرطیکہ وہ ملائی والی ہو۔ پھر وہ کسی وظیفے میں منہمک ہوگیا۔

آدھے گھنٹے بعد بھی جہاز کے باہر آغازِ سحر کے کوئی آثار تک نہ تھے۔ اچانک کھڑکی کے اسکرین پر مارتھا کا چہرہ نمودار ہوا۔ اس نے کہا ''یو سلی بوائے! اس کے باوجود کہ تمہارے رخصت ہوتے وقت ایک افسوسناک بلکہ شرمناک واقعہ رونما ہوا' میں تمہارے لیے اداس ہوں۔''

''مجھے امید ہے تم نے پولیس کو کچھ نہیں بتایا ہوگا۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا ''تم کو بہرحال اداس نہیں ہونا چاہیے کیونکہ تم رات سے صبح کی طرف جارہے ہو۔ تمہارے ملک میں اس وقت سورج چمک رہا ہوگا۔''

''ہاں...... اور لوگ لسی پی کے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے ڈکاریں ماررہے ہوں گے یا آتش فشاں نہاری کھاکے کانوں سے دھواں نکال رہے ہوں گے۔ میں لندن کے لیے اداس ہوں۔''

''تم ایک اچھے مستقبل کو پالو گے' جس میں تمہارے لیے ہی نہیں' سب کے لیے خوشی ہے۔ اصل بات یہی ہے' جو صرف اپنی خوشی کے لیے سوچتا ہے' اسے اگر خوشی ملے تو ادھوری ملتی ہے اور عارضی۔''

میں نے ایک یخ بستہ آہ بھری' ''میری خوشی ایسی ہی ہے مارتھا! اس کو مجبوری کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ خوشی مکمل تب ہوتی ہے جب مجھے مرضی کے خلاف واپس نہ جانا پڑتا۔ جب ایک رقیبِ روسیاہ کو جہنم رسید کیے بغیر مجھے فریال مل جاتی جب عائشہ کسی اور پر فریفتہ ہوتی۔''

''اور تم پاکستان کے وزیراعظم ہوتے۔'' وہ طنز سے بولی۔

میں نے کہا ''بددعائیں کیوں دیتی ہو۔ میری پریشانی یہ ہے کہ میں اس ازلی وابدی مثلث میں پھنس گیا ہوں۔''

''کون سی ازلی وابدی مثلث؟''

''وہی...... دو مرد ایک عورت...... دو عورتیں ایک مرد۔ جس کے بغیر کوئی کہانی ہی نہیں بنتی۔ نہ فلم کی' نہ ناول کی اور نہ ڈرامے کی۔ پہلے تو یہاں بڑی آسانی تھی۔ دو مرد تلواریں سونت کے سامنے آجاتے تھے اور خاتون بڑی دلچسپی سے فائٹ دیکھتی رہتی تھیں اور شہید محبت پر لعنت بھیج کے ہنسی خوشی فاتح کی ہوجاتی تھیں۔ نہ قانون کو اعتراض ہوتا تھا نہ معاشرے کو۔''

''اب ہم مہذب ہوگئے ہیں۔''

''ہاں۔ ٹاس کرلیتے ہیں یا دوسرا عشق شروع کردیتے ہیں مگر ہم بے چارے مشرق کے رہنے والے......''

''تم کیا کرتے ہو؟''

میں نے کہا ''ہماری فلموں کے آخری سین میں بڑی خوش اسلوبی سے معاملہ نمٹ جاتا ہے۔ دلن کو لگتی ہے ایسی پھینٹی کہ وہ کان پکڑ کے ناک سے فرش پر لکیریں نکالتا ہے اور توبہ کرتا ہے...... کہ باقی زندگی اللہ اللہ کرتے گزارے گا۔ خواتین دو ہوں تو ایک راہِ عشق میں قربان ہوجاتی ہے یا کردی جاتی ہے۔''

''مگر تمہاری زندگی فلم نہیں ہے۔''

''رائٹ۔ یہی تو میرا المیہ ہے۔ اس بات کے امکانات خاصے روشن ہیں کہ میرا انجام ولن جیسا نہ ہو۔ وہ بن جائے ہیرو۔ اِدھر محبت کا جنازہ جارہا ہو' اُدھر وہ سہرا باندھے گھوڑے پر سوار بینڈ باجے کے ساتھ ہیروئن کو لے جارہا ہو' معاف کرنا مجھے رونا آرہا ہے۔''

وہ بولی ''اتنا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔''

میں نے کہا ''مارتھا' یہ بڑی کمپلیکسڈ سچویشن ہے۔ مثلث کا ایک ضلع ختم کرنا ہو تو تم کیسے کروگی؟ مجھے تو نکالا نہیں جاسکتا ورنہ بعد میں دونوں خواتین کیا گلے مل کے روئیں گی میرے مرقد پر۔ فریال اور عائشہ میں سے کسے قربان کیا جاسکتا ہے؟''

اس نے سوچ کے کہا ''میں تو سمجھتی ہوں تمہیں پریکٹیکل ہونا چاہیے۔ قربانی کیا ضروری ہے۔ جب تمہارا مذہب اور معاشرہ دو کی اجازت دیتا ہے۔''

''پلیز...... شٹ اپ!''

''آخر کیا بات ہے سر!'' ایر ہوسٹس نے برہمی سے کہا ''میں نے خالی مگ ہی تو واپس مانگا ہے؟''

شرمندگی سے میری حالت غیر ہوگئی میں نے ہکلا کے کہا ''مس...... رئیلی سوری...... میں نے واقعی آپ سے نہیں کہا۔''

وہ مگ لے کر مجھے گھورتی ہوئی چلی گئی۔ اسے یقین ہوگا کہ میں نے جہاز پر چڑھنے سے پہلے ہی بہت چڑھالی تھی۔

میرے معطر پڑوسی نے مجھے دکھ سے دیکھا ''آپ نے مجھے شٹ اپ بولا تھا بھائی جی؟''

''ابھی تک تو نہیں بولا بھائی جی!'' میں نے کہا۔

وہ مزید دکھی ہوگیا ''آپ میری نقل اتارتے ہو بھائی جی!''

''میں آپ کی کوئی چیز نہیں اتارسکتا بھائی جی!'' میں نے اس کی ٹوپی سے جوتی تک دیکھا ''آپ کچھ اتارسکتے ہو؟''

''کیا مطلب بھائی جی؟'' وہ خفگی سے بولا۔

میں نے رازداری سے کہا ''آپ جن اتارسکتے ہو' یہ جہاز اتارسکتے ہو' میرا قرض اتارسکتے ہو۔''

''میرے پیر صاحب سب اتارسکتے ہیں۔'' اس نے بڑی عقیدت سے ایک شخص کی طرف اشارہ کیا جو سامنے تین قطاریں چھوڑ کے کونے میں خالی سیٹ میں پھنسا ہوا تھا۔ اپنی عظیم توند کے باعث وہ ایک بہت بڑا مٹکا نظر آتا تھا جس پر مٹی کا پیالا اوندھا رکھ دیا گیا ہو۔

میں نے کہا ''اچھا...... یہ پیر ہیں؟''

اس نے مؤدبانہ کہا ''ہاں بھائی جی!''

''اگر یہ پیر ہیں تو منگل اور بدھ کہاں ہیں؟'' میں نے کہا۔

اگلی سیٹ پر ایک خاتون کو اس مکالمے نے اتنا محظوظ کیا کہ وہ کھلکھلا کے ہنس پڑی۔ بھائی صاحب غیظ وغضب سے تھرتھر کانپنے لگے اور مجھے یوں گھورتے رہے جیسے اپنی نظروں کے جلالی لیزر سے میرے دل کے ٹکڑے کردیں گے اور جگر کو چھلنی کردیں گے۔ ظاہر ہے اس کے بعد ہمارے تعلقات انڈیا پاکستان جیسے ہوگئے۔

میرا باقی سفر سکون سے گزرا۔ میں پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا اور اس بار اسکرین پر اشرف چیتا نمودار ہوا۔ اس نے کہا ''فیکے پتر! یہ تم نے بہت برا کیا۔''

میں نے کہا ''تم کون سی اچھائی کررہے تھے میرے

ساتھ؟"

"فرار ہو کے تم کہاں جا سکتے ہو قاتل! تمہیں پھانسی ضرور ہوگی۔"

میں نے فوراً تردیدی بیان جاری کیا "میں نے تمہیں قتل نہیں کیا۔"

"پھر کیا جارج بش نے کیا؟ لندن پولیس میری لاش دریافت کر چکی ہے اور تمہارا سراغ بڑی آسانی سے لگا لے گی۔"

"بکواس بند کرو' نہ میرا ایسا ارادہ تھا اور نہ تم مرے تھے' تم صرف بے ہوش تھے۔ میں نے اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔"

"چیف سخت مشتعل ہے۔ اس کو احکامات کی خلاف ورزی بالکل پسند نہیں اور بغاوت کرنے والوں کی کیا سزا ہوتی ہے' یہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔"

"میں نے مزید بلیک میل نہ ہونے کا فیصلہ کرلیا ہے۔"

وہ ہنسا "اور چیف اس فیصلے کے آگے سر جھکا دے گا۔ اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو ٹھیک ہے' کراچی پہنچتے ہی معلوم ہو جائے گا۔"

میں نے کچھ تشویش کے ساتھ کہا "کراچی پہنچ کے کیا ہوگا؟"

"کارکن آئیں گے تمہارا استقبال کرنے۔ پھولوں کے ہار لے کر' چیف کی طرف سے تمہیں تمغۂ جرأت دیا جائے گا۔ بڑی شاندار تقریب ہوگی' تمہارے والدین بھی مدعو ہوں گے۔ تمہیں اپنا بھائی یاد تو ہوگا...... وہ بھی بہت بہادر تھا۔ اس کے ساتھیوں نے اتفاقِ رائے سے اس کی قبر پر نام کے ساتھ شہید لکھوایا تھا۔"

میں نے کہا "تم مجھے خوف زدہ کر رہے ہو؟"

"تمہارے ماں باپ زیادہ خوف زدہ ہیں۔ کسی نے کچھ دیر پہلے انہیں فون کر کے کہا تھا کہ میت سہ پہر ساڑھے تین بجے کراچی پہنچے گی' وصول کرلیں۔"

"تم... تم ایسا نہیں کر سکتے۔"

وہ شیطانی انداز میں ہنسا "ہم نے تو یہ بھی کہہ دیا تھا کہ کفن تیار رکھیں اور اپنے پہلے شہید بیٹے کی قبر کے ساتھ ہی دوسرے کے لیے بھی جگہ دیکھ لیں۔"

میں چلایا "نہیں...... یہ ظلم مت کرو۔ ان کا دنیا میں اور کوئی نہیں' بہت دکھ اٹھائے ہیں انہوں نے زندگی میں' وہ بوڑھے ہیں۔"

اس نے افسوس سے سر ہلایا "تت...... تت...... یہ تو تمہیں کوئی احمقانہ قدم اٹھانے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا بیکے پتر!"

"شٹ اپ!" میں نے غرا کے کہا۔

ایئر ہوسٹس نے کہا "آپ نے دیکھا...... پہلے بھی دو بار یہ سوری کہہ چکے ہیں......"

اس کے ساتھ آنے والے اسٹیورڈ نے کہا "آخر آپ کی پرابلم کیا ہے سر! اس نے یہی تو پوچھا تھا آپ سے کہ آپ بریک فاسٹ کیا لیں گے؟"

میں نے اپنا سر پکڑ کے کہا "اب میں کیا بتاؤں کہ میری پرابلم کیا ہے۔ کوئی ایک ہو تو بتاؤں...... تم اسے ایک نفسیاتی مسئلہ سمجھ لو۔ میں خود کلامی کرتا ہوں۔ اپنے آپ کو شٹ اپ کہا تھا میں نے پہلے بھی۔"

اسٹیورڈ نے سمجھنے کے انداز میں سر ہلایا "ایسے مسائل تو دوسروں کے لیے پیدا ہوتے ہیں سر! خیر' فرمائیے ناشتا کیا لیں گے آپ؟"

میں نے اپنے پڑوسی کی طرف دیکھا "وہی جو بھائی جی لیں گے۔"

"انہوں نے تو لاہوری ناشتا مانگا تھا۔ سری پائے' آپ انگلش لیں گے یا کانٹی نینٹل؟" ایئر ہوسٹس نے ناگواری سے کہا۔

میں نے کہا "آپ ٹاس کرلیں' چاند تارا ہو تو انگلش ورنہ کانٹی نینٹل اور سکہ کھڑا ہو جائے تو دونوں۔"

وہ چلی گئی۔ اس کے لیے یہ تجربہ نیا نہیں تھا۔ زیادہ تر پاکستانی مسافر بین الاقوامی پرواز پر بھی ایئر ہوسٹس سے چھیڑ چھاڑ کو اپنا قومی فریضہ سمجھتے ہیں۔ صورت شکل اور لباس سے وہ بھی تعلیم یافتہ ہی نظر آتے ہیں' ان میں کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو لندن میں رہ کے انگریزی بولنا بھی سیکھ جاتے ہیں لیکن انگریزی پڑھ نہیں پاتے۔ میرے بیشتر ہم وطنوں نے نہار منہ ہی پینی شروع کردی تھی کیونکہ مفت کی تھی اور اب ان کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

بھائی جی سے میرے تعلقات میں مزید کشیدگی آگئی تھی۔ اسے پیر صاحب سے جدائی بھی تڑپا رہی تھی۔ ناشتا آنے سے پہلے ہی اس نے مسافرانہ سفارت کاری کے عمل سے ایسا انتظام کرلیا کہ اسے پیر صاحب کے ساتھ والی سیٹ مل گئی۔ پیر صاحب کے ساتھ درمیان والی سیٹ پر ایک مسلسل پینے اور بولنے والا حبشی تھا۔ آخری کھڑکی والی سیٹ پر اسی کی نسل سے تعلق رکھنے والی مگر پُرشباب حسینہ تھی جو کسی بات پر حبشی کے تھپڑ رسید کر چکی تھی۔ حبشی خود خفت سے بچنے کے لیے سیٹ بدلنا چاہتا تھا۔ پیر صاحب نے اس کی جگہ لے لی اور

نوجوان مرید کو اپنی جگہ بٹھایا تاکہ حسینہ کا کالا جادو اس کے اخلاق و کردار پر اثر انداز نہ ہو۔ حبشی نے میرے ساتھ بیٹھنے کے بجائے پچھلے حصے کی ایک خالی نشست کو ترجیح دی جہاں سے واش روم قریب تھا تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ بھائی جی کی خفگی برداشت کی جا سکتی تھی' کسی شرابی کی بکواس نہیں۔ شاید اس کو دوسرا تھپڑ میں رسید کرتا۔

صبح اچانک ہی ہوگئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے ہماری مشرقی روایات کے مطابق صبح کاذب اور صبح صادق کا تکلف کیے بغیر سورج نے ہیلو کہنے میں دیر نہیں لگائی۔ بالکل اسی طرح جیسے ہمارے ماحول میں کسی بھی لڑکے کو اظہارِ عشق سے شبِ وصل تک کی مسافت طے کرنے میں مہینوں اور بعض اوقات برسوں لگ جاتے ہیں' دیارِ مغرب میں پہلی ملاقات سرِراہ ہوتی ہے تو چوبیس گھنٹے بعد حجلۂ عروسی میں ان کے درمیان اختلافات اتنے شدید ہو جاتے ہیں کہ صبح وہ علیحدگی اختیار کرتے ہیں اور اپنی اپنی راہ لیتے ہیں۔ برق رفتاری کے اس دور میں ہر چیز بہت فاسٹ ہے۔ فاسٹ فوڈ' فاسٹ میوزک' فاسٹ ٹریول' فاسٹ زندگی اور فاسٹ موت۔ وقت بھی دگنی رفتار سے بھاگ رہا تھا۔ فلائٹ کا دورانیہ تو ساڑھے سات گھنٹے تھا لیکن ساڑھے تین بجے لندن سے اُڑ کے میں ایک بجے کراچی میں نہیں اتر سکتا تھا۔ وہاں جہاز کی آمد کا وقت چھ بجے تھا چنانچہ میری گھڑی کو ساڑھے سات گھنٹوں میں ساڑھے بارہ گھنٹے آگے بڑھنا تھا۔

دن چڑھنے کے بعد جذبات کی دھند صاف ہوئی تو عقل کی روشنی میں بہت سے اندیشے میرے حواس پر یلغار کرنے لگے اور خطرات بن کے میرے خیالات پر یوں غالب آنے لگے جیسے افق سے اٹھنے والا بادل دیکھتے دیکھتے گھٹا بنے اور سارے آسمان کو ڈھک لے۔ میں نے تصور میں فریال کو بھی دیکھا تھا اور عائشہ کو بھی۔ مارتھا سے بھی باتیں کی تھیں اور اشرف چیتے سے بھی۔ وہ میرے خیالوں کی بازگشت تھی جو ان کی باتوں میں سنائی دی تھی۔

☆☆☆

اشرف چیتے کی آمد میرے لیے ایک وارننگ تھی کہ میں کسی خوش فہمی میں نہ رہوں۔ بے شک تنظیم سے میری عملی وابستگی چھ سال پرانی بات ہے مگر بات پرانی ہونے سے تعلق ختم نہیں ہوتا۔ مجھ پر آج بھی ان کا کنٹرول ہے۔

تنظیم اپنے کارکنوں پر ایسے ہی کنٹرول حاصل کرتی تھی۔ نچلی سطح پر ناپختہ ذہن رکھنے والے نوجوانوں کو پُرکشش نعروں یا استحصال سے غلام بنایا جاتا تھا۔ لالچ سے آگے بڑھایا جاتا تھا اور برین واش کیے جانے والے یہ نوجوان تنظیم کے مقاصد کی خاطر سب کچھ کرنے کو تیار ہو جاتے تھے۔ انہیں بھی بتایا جاتا تھا کہ ایک خوش حال مستقبل کی جدوجہد ایک جہاد ہے۔ اصل اہمیت مقصد کے حصول کی ہے اور اس کے لیے قربانی ناگزیر ہے۔ دنیا میں عزت سے جینے کا حق مانگنے سے نہیں ملتا۔ یہ حق چھیننا پڑتا ہے۔ فنا دبقا کی جنگ میں اخلاقیات کے اصول' امن پسندی اور شرافت وانسانیت کے نعرے دھوکا ہیں۔ طاقتور اور عیار دشمن کے وہ ہتھیار ہیں جو وہ حریف کو کمزور بنانے کے لیے استعمال کرتا ہے۔

لاکھوں نوجوان کارکن ترغیب کے اس جال میں گرفتار ہوئے۔ ہزاروں نے قیادت کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اپنی جان تک قربان کردی۔ بالکل اسی طرح جیسے ہٹلر نے نسلی برتری کے غرور میں مبتلا کر کے پوری جرمن قوم کو دنیا پر حکومت کے جنون میں مبتلا کردیا تھا۔ میرے جیسے نوجوان تمام اخلاقی اور قانونی حدود کو پھلانگ گئے۔ انہوں نے تنظیم کی قوت کے لیے جائز وناجائز ذرائع سے مالی وسائل فراہم کیے۔ ان دشمنوں پر حملے کیے جن کی تنظیم نے نشاندہی کی۔ سیاسی حریفوں کو قتل کیا اور ان کی املاک تباہ کیں۔ یہ سب ایک زہریلے' نفرت انگیز پروپیگنڈے کا سحر تھا کہ وہ آنکھوں پر پٹی باندھ کے اپنی قیادت کے اشاروں پر سب کچھ کرتے رہے۔

کچھ عیار اور موقع پرست نوجوان مالا مال ہو گئے۔ زیادہ ہوشیار اچھے عہدوں پر فائز ہو گئے۔ بے وقوف اپنا مستقبل تباہ کر بیٹھے۔ وہ بلیک میل ہوئے' ان کی تعلیم ادھوری رہ گئی۔ ان کے خاندان برباد ہو گئے۔ تنظیم ایک ایسی مافیا تھی جو نہ روگردانی برداشت کرتی تھی اور نہ غداری۔

میرا بھائی ایسی ہی دوسری خطرناک تنظیم کا آلۂ کار بن گیا تھا جو اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے مذہبی منافرت کے جذبات کا سہارا لیتی تھی اور اپنے فرقے کے سوا تمام مذاہب اور تمام عقائد کے ماننے والوں کے خلاف جہاد پر اکساتی تھی۔

ہر سال جب اکیس فروری کی تاریخ آتی تھی تو ہمارے گھر کو ایک سوگواری گھیر لیتی تھی۔ ابا خاموش اور ذہنی طور پر غیر حاضر محسوس ہوتے تھے۔ وہ بھول جاتے تھے کہ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے یا اخبار پر ان کی نظر ایسے ہی ٹھہر گئی ہے جیسے کلاک میں سیکنڈ کی بڑی سوئی چلتے چلتے رک جاتی ہے اور وہ پڑھ کچھ بھی نہیں رہے ہیں۔ اماں منہ پھیر کے بہانے بہانے دوپٹے سے آنکھوں کو صاف کرتی تھیں۔

دوپہر تک چھت پر دودھیا چاندنیاں بجھ جاتی تھیں۔

نمازِ ظہر سے پہلے بریانی' زردے کی دیگ آ جاتی تھی۔ پھر مدرسے کے مولوی صاحب اپنے شاگردوں کے ساتھ نمودار ہوتے تھے۔ وہ فاتحہ خوانی کرتے تھے۔ ابا گم صم ٹوپی اوڑھے خلا میں گھورتے رہتے تھے۔ اماں کی آنکھوں سے آنسو رخساروں پر بہتے جاتے تھے اور جب مولوی صاحب کلمۂ شہادت پڑھ کے منہ پر ہاتھ پھیرتے تھے تو وہ ہچکیوں سے روتے ہوئے اٹھ جاتی تھیں۔ کھانے کے بعد مدرسے کے طلبہ عصر تک قرآن خوانی کرتے تھے۔ پھر میں ابا کے ساتھ قبرستان جاتا تھا۔ ہم قدیر احمد شہید کی قبر پر پھول ڈال کے اور اگربتیاں سلگا کے دعا مانگتے تھے اور گھر لوٹ آتے تھے۔ رات تک اس ماتمی فضا کا اثر کچھ زائل ہونے لگتا تھا اور اماں ابا قدیر کی باتیں کرنے لگتے تھے۔ وہ کیا تھا' کیسا تھا۔ آج ہوتا تو یوں ہوتا' اس کی بیوی ہوتی' بچے ہوتے۔ اگلا دن معمول کے مطابق گزرتا تھا۔ گزشتہ چودہ سال سے ایسا ہی ہو رہا تھا۔

قدیر عمر میں مجھ سے صرف چھ سال بڑا تھا۔ آج اگر وہ زندہ ہوتا تو اس کی عمر چھتیس سال ہوتی لیکن انیس سو نوے میں اس کا قتل ہو گیا تھا۔ اس وقت میری عمر چودہ سال تھی اور قدیر کی بیس سال۔ عین عالمِ شباب میں وہ مر گیا۔ بے شک اس وقت تک اماں ابا نے اس کی شادی کے بارے میں سوچنا بھی شروع نہیں کیا تھا لیکن ان کا یہ دکھ اپنی جگہ تھا کہ اٹھائیس سال کی عمر میں وہ بہو لانے کے ارمان پورے کرتے تو آج شاید دو ننھے منے بچوں کی قلقاریوں سے یہ گھر آباد ہوتا۔ ایک پوتا اور ایک پوتی ان کے تصور میں جنم لینے سے قبل ہی بے وجود ہو گئے تھے۔

یہ محض اتفاق ہے کہ اس کا نام ہمارے خاندان کے ناموں جیسا تھا ورنہ قدیر احمد نہ میرا سگا بھائی تھا اور نہ سوتیلا۔ میرے والدین کی شادی 1965ء کی جنگ کے فوراً بعد ہوئی تھی۔ دس سال تک وہ اولاد سے محروم رہے اور ظاہر ہے' اس دوران دوا دارو سے دم درود اور دعا تک جو کچھ ان کے اختیار میں تھا' سب کیا مگر قدرت کے فیصلے کے آگے کسی کی نہ چلی۔

میرے ایک ماموں عرصۂ دراز سے امریکا میں تھے اور گائنوکولوجی میں اچھی شہرت رکھتے تھے۔ ان کی شادی ایک امریکن ڈاکٹر سے ہوئی جو اسی شعبے میں بڑی کامیاب سرجن تھی۔ انہوں نے میرے والدین کے علاج کی فائلیں منگوائیں اور یہ کیس ڈاکٹروں کے ایک پینل کے سامنے رکھا۔ پینل نے کسی واضح یقین دہانی کے بغیر انہیں امریکا بلوایا۔ ابا لمبی چھٹی نہیں لے سکتے تھے اور آمد و رفت یا علاج کے اخراجات بھی ان کی استطاعت سے باہر تھے۔ بہن کا دکھ سمجھنے والے بھائی نے یہ ساری ذمے داری قبول کی اور 1974ء میں میرے والدین نیویارک پہنچے۔ وہاں دو مہینے تک ٹیسٹ ہوئے۔ پھر ابا کو واپسی کی اجازت مل گئی اور انہوں نے ڈیوٹی جوائن کر لی۔ اماں کا علاج شروع ہوا تو سب سے فعال کردار خود بھائی نے ادا کیا۔ کسی کامیابی کی پیش گوئی ناممکن تھی۔ چھ ماہ بعد اماں بھی لوٹ آئیں۔ میری ممانی نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اگر حالات سازگار رہے تو وہ ایک بار ماں بن سکتی ہیں۔

حالات کو سازگار رکھنے میں مشیتِ ایزدی شامل رہی اور 1976ء میں میری پیدائش ہوئی۔ اماں پاکستان میں تھیں لیکن ان کی تمام رپورٹس باقاعدگی سے نیویارک ارسال کی جا رہی تھیں۔ میری پیدائش سے ایک ماہ قبل ماموں اور ان کی بیوی پاکستان آ گئے اور انہوں نے ڈلیوری کا یہ کیس اپنی نگرانی میں کیا۔ میری پیدائش بالکل نارمل طریقے سے ہوئی مگر جاتے وقت ماموں نے یہ کنفرم کر دیا کہ یہ میڈیکل سائنس کا اعجازِ مسیحائی نہیں رحمت پروردگار کا کرشمہ ہے اور ایسے کیس تو ہزاروں ہوتے ہیں لیکن کامیابی برسوں میں ایک ملتی ہے۔ ظاہر ہے اس کے بعد میری پرورش جتنی احتیاط اور جاں سوزی کے ساتھ ہوئی اس کا بیان لفظوں میں نہیں ہو سکتا۔

جیسا کہ مجھے بتایا گیا۔ دسمبر 1980ء میں ہم برف باری دیکھنے مری گئے۔ میری عمر اس وقت صرف چار سال تھی۔ تین دن مری میں قیام کے بعد ابا کا خیال آگے نتھیا گلی تک جانے کا تھا اور پھر نتھیا گلی سے ایبٹ آباد کے راستے پنڈی واپس پہنچنے کا مگر برف باری اتنی زیادہ ہوئی کہ جھیکا گلی سے آگے راستے بند ہو گئے۔ ابا نے واپسی کا فیصلہ کیا اور کرائے کی ایک کار لے لی۔ روانہ ہوتے ہوتے شام ہو گئی۔ اس زمانے میں راولپنڈی تک دو رویہ سڑک اتنی اچھی نہیں تھی جتنی آج ہے۔ اندھیرا ہو جانے کے بعد آمد و رفت بھی کم ہو جاتی تھی۔ ڈر یہ ہوتا تھا کہ برف باری شدید ہوئی تو رات کا سفر خطرناک ہو جائے گا۔

ہلکی ہلکی برف مری سے روانہ ہوتے وقت بھی پڑ رہی تھی اور آسمان ابر آلود تھا مگر مری کا رہنے والا ڈرائیور بہت تجربہ کار تھا۔ اس نے تسلی دی کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ گھوڑا گلی پہنچنے تک برف باری میں اضافہ ہو گیا مگر ڈرائیور نے گاڑی نہیں روکی۔ اس نے کہا کہ آٹھ دس میل بعد کم بلندی پر موسم اتنا خراب نہیں رہے گا۔

اچانک ہیڈ لائٹس کی روشنی میں ڈرائیور کو سڑک کے عین درمیان کوئی چیز دکھائی دی۔ اس نے بریک لگائے مگر کچھ

نشیب اور کچھ برف کی وجہ سے گاڑی کی رفتار پوری طرح کنٹرول میں نہ آئی۔ ڈرائیور نے دیکھ لیا تھا کہ سڑک پر کوئی چیز نہیں ایک بچہ پڑا ہوا ہے۔ بریک لگانے سے پہیے تو رک گئے لیکن کار آہستہ آہستہ پھسلتی گئی۔ آخری وقت میں بچے کو بچانے کے لیے ڈرائیور نے کار کا رخ بدلا اور اسے دائیں جانب کے پہاڑ سے ٹکرا دیا۔ اس سے کوئی بہت زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ کار ایک جھٹکے سے رک گئی۔ اس کا صرف بمپر اور بونٹ ٹیڑھا ہوا لیکن بچے کی جان بچ گئی۔

وہ کوئی بہت غریب سا اور کمزور بچہ تھا۔ یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ وہ سڑک پر اتنی برف باری میں کیسے آ گیا تھا اور کیوں بے ہوش پڑا تھا۔ ابا نے ڈرائیور کے ساتھ مل کے بچے کو گاڑی میں ڈالا اور کمبل میں لپیٹ دیا۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس میں سے ایک ٹوٹ کے بند ہو گئی تھی۔ ماہر ڈرائیور نے صرف ایک ہیڈ لائٹ پر راولپنڈی تک کا فاصلہ ایک گھنٹے میں طے کیا۔ اس بچے کی زندگی تھی کہ ڈرائیور نے اسے بروقت دیکھ لیا اور بچانے میں بھی کامیاب رہا۔ اگر وہ سائیڈ میں کہیں پڑا ہوتا تو شاید نظر بھی نہ آتا اور وہیں پڑے پڑے اکڑ کے مر جاتا۔ ابا اس رات کے سفر کو یاد کر کے کانوں کو ہاتھ لگاتے تھے اور کہتے تھے کہ صرف اس بچے کی نہیں' ہم سب کی زندگی خدا کو منظور نہ ہوتی تو کار حادثے کا شکار ہو جاتی۔

راولپنڈی پہنچتے ہی ڈرائیور اس بچے کو ہولی فیملی اسپتال لے گیا۔ ابا اور اماں رات بھر آئی سی یو کے باہر بینچ پر بیٹھے رہے۔ میں بھی اسی بینچ پر کمبل میں لپٹا سوتا رہا۔ صبح ڈاکٹرز نے بتایا کہ بچے کی حالت خطرے سے باہر ہے۔ اس کے جسم پر کپڑے ناکافی تھے اور وہ خوراک کی کمی کا شکار تھا۔ شام تک اس کی حالت مزید بہتر ہو گئی۔ اگلے دن اسے وارڈ میں شفٹ کر دیا گیا۔

ابا کے ایک دوست گورڈن کالج میں لیکچرار تھے اور وہیں سیٹلائٹ ٹاؤن میں رہتے تھے۔ انہوں نے ہمیں اپنے گھر میں رکھا اور بڑی بھاگ دوڑ کی۔ تین دن بعد وہ بچہ بھی ان کے گھر آ گیا۔ یہ بچہ قدیر تھا۔ اس کی عمر گیارہ بارہ سال تھی۔ وہ مری کے علاقے کا رہنے والا نہیں تھا جہاں پوٹھوہاری زبان بولی جاتی ہے جو غالباً پنجابی کی سب سے مشکل بولی ہے۔ وہ لاہور' فیصل آباد کے علاقے کی زبان بولتا تھا۔

جو کہانی اس نے سنائی وہ انتہائی لرزہ خیز تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کا نام قدیر احمد ہے۔ اس کا باپ ایک ٹرک ڈرائیور تھا وہ ایک سال پہلے حادثے میں ہلاک ہو گیا تھا۔ اسی حادثے کے چھ ماہ بعد ایک رات ڈاکو اس کی ماں کو اٹھا لے گئے۔ قدیر کے ایک رشتے کے چچا نے گھر کی ہر چیز پر قبضہ کر لیا اور قدیر کے ساتھ ایسا ظالمانہ سلوک کیا کہ ایک رات وہ گھر سے فرار ہو گیا۔ وہ لاہور آ گیا اور دو راتیں اس نے داتا صاحبؒ کے لنگر سے پیٹ بھر کے گزاریں۔ دن بھر وہ لاہور میں آوارہ گردی کرتا تھا اور کام تلاش کرتا تھا لیکن کسی جان پہچان اور تعارف کے بغیر کوئی اسے رکھنے کو تیار نہ تھا۔ اسے کوئی کام آتا بھی نہ تھا۔ اگر کسی ہوٹل یا گیراج میں کام مل جاتا تو اس کے رہنے کا ٹھکانا بھی ہو جاتا۔ سب سے آسان کام اسے بھیک مانگنا لگتا تھا لیکن اس میں ہمت نہ تھی کہ کسی کے سامنے گڑگڑائے اور ہاتھ پھیلائے۔ تیسری رات وہ پھر اپنی جگہ پر سونے پہنچا تو ایک ہٹے کٹے شخص نے اسے مارا اور باہر نکال دیا۔ ''روز آ جاتا ہے یہاں جیسے اس کے باپ کا بیڈ روم ہے۔'' اس نے کہا اور قدیر کو روتا دیکھ کے بولا ''دس روپے لیتا ہوں میں۔ تو پانچ دے سکتا ہے تو سو جا ورنہ پھٹ اِدھر سے۔''

تیسری رات قدیر مینارِ پاکستان والے گراؤنڈ کے باہر فرش خاک پر لیٹا جہاں لاتعداد بے گھر پڑے تھے۔ وہ دن بھر بھٹکتا پھرنے سے سخت تھکا ہوا تھا۔ اسے فوراً نیند آ گئی۔ صبح کسی نے ٹھوکر مار کے اسے جگایا۔ وہ ہڑبڑا کے اٹھا تو اسے آس پاس بہت سے لوگ اور کچھ پولیس والے نظر آئے۔ پھر اس کی نگاہ اپنے قریب سوئے ہوئے لوگوں پر پڑی تو خوف سے اس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ تین افراد اپنے ہی خون میں لتھڑے ہوئے بڑی بے ترتیبی سے الٹے سیدھے پڑے تھے۔ ان سب کے سر پھٹے ہوئے تھے اور زمین ان کے لہو سے لال ہو رہی تھی۔ کسی نے سوتے میں ان کے سروں کو بھاری پتھر مار کے کچل دیا تھا۔

وہ یقیناً درد اور اذیت سے چلائے ہوں گے لیکن قدیر کی نیند اتنی گہری تھی کہ اس نے کچھ نہیں سنا۔ آس پاس کے دوسرے لوگ شاید اٹھ کر بھاگ گئے تھے یا ان کے قریب کوئی بھی نہیں تھا۔ پولیس قدیر کو پکڑ کے تھانے لے گئی اور دو دن تک اس سے پوچھ گچھ کرتی رہی۔ نہ وہ مرنے والوں کو جانتا تھا اور نہ اس نے مارنے والوں کو دیکھا تھا مگر پولیس یہ ماننے کو تیار نہ تھی۔ اسے وحشیانہ تشدد کا نشانہ بنایا۔ قدیر نے بتا دیا تھا کہ وہ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے؟ تیسری رات اس کا رشتے کا چچا آ گیا۔ قدیر نے سوچا کہ اب تھانے سے اس کی گلوخلاصی ہو جائے گی۔ باہر نکل کے وہ چچا کو بتا دے گا کہ وہ واپس اس کے ساتھ گھر جانے کے لیے تیار نہیں لیکن اسے

سخت صدمہ ہوا جب چچا نے اسے پہچاننے سے بھی انکار کردیا۔ شاید وہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ قدیر اس کے گلے پڑے اور کل کو بڑا ہو کے باپ کے گھر کی ملکیت کا دعویٰ کرے۔ وہ دو کمروں کا چھوٹا سا مکان اور اس میں موجود ہر چیز قدیر کے باپ کی تھی۔ قدیر نے ابا کو بھی بتایا کہ اس کے ڈرائیور باپ نے گھر میں سہولت کی ہر چیز فراہم کر رکھی تھی۔ فریج' ٹی وی اور ڈیک وغیرہ وہ پشاور سے لاتا تھا۔

پولیس اتنی بے وقوف نہیں تھی کہ قدیر کے چچا کے انکار کو آسانی سے تسلیم کرلیتی۔ دس بارہ سال کے ایک بچے نے جھوٹ نہیں بولا تھا' اس نے اپنے چچا کا نام پتا سب ٹھیک بتایا تھا۔ پولیس نے ایک رات اسے بھی تھانے میں الٹا لٹکا کے سب پوچھ لیا۔ اب یہ خود قدیر کو بھی علم نہ تھا کہ چچا نے پولیس کے ساتھ کیا مک مکا کیا اور اس نے اپنی رہائی کے علاوہ قدیر سے چھٹکارا پانے کی کیا قیمت ادا کی۔ ابا کا اور ان کے لیکچرار دوست کا اندازہ تھا کہ پولیس نے اس سے غاصبانہ قبضے کو تحفظ فراہم کرنے کا خاصا معاوضہ وصول کیا ہوگا اور پھر اسے یقین دہانی کرادی ہوگی کہ اب وہ قدیر کی طرف سے مطمئن ہوجائے۔ اس کا پکا بندوبست کردیا جائے گا۔

قدیر نے مزید ایک ہفتہ تھانے میں گزارا اور یہ اس کی زندگی کا ایسا تجربہ تھا جس نے اس کی شخصیت پر گہرے منفی اثرات مرتب کیے۔ حوالات میں عادی مجرم اس سے گالی گلوچ اور فحش کلامی کرتے تھے۔ وہ ان کے پیر دباتا تھا اور ان کی ہر جائز دنا جائز حرکت برداشت کرنے پر مجبور تھا۔ انکار پر اس کو بے رحمی سے جسمانی تشدد کا نشانہ بنایا جاتا تھا۔ تھانے کی غیر انسانی روایات اور شرمناک ماحول کا اندازہ اور تجربہ مجھے بعد میں ہوا۔ اس بنا پر میں یہ قیاس کرسکتا ہوں کہ قدیر کے ساتھ بدفعلی کا ارتکاب بھی خارج از امکان نہیں۔

ایک ہفتے بعد ایک رات قدیر کو اس پُرعقوبت جہنم سے نکلنے کا ایک موقع ہاتھ آیا۔ کسی شخص نے ایک عمر رسیدہ خاتون کو تھانے پہنچایا تھا جو نسیان کے مرض کا شکار تھیں یعنی انہیں بھول جانے کی بیماری تھی۔ وہ اپنی بہو کے ساتھ بازار گئی تھیں اور وہاں کہیں بھیڑ میں گم ہوگئیں۔ وہ دوپہر سے شام تک نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتی پھریں۔ انہیں نہ گھر کا پتا یاد تھا اور نہ اپنے بیٹے کا نام لیکن یہ یاد تھا کہ بیٹا فوج میں کپتان ہے۔ وہ حلیے' لباس اور بات چیت میں بڑے رکھ رکھاؤ والی خاتون تھیں۔ رات تک ہر جگہ تلاش میں ناکامی کے بعد بیٹے نے پولیس سے رجوع کیا تو اسے معلوم ہوگیا کہ اماں فلاں تھانے میں بیٹھی ہیں۔

جب کیپٹن تھانے پہنچا تو پوری یونیفارم میں تھا۔ غالباً اسے گھر جا کے کپڑے بدلنے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی۔ قدیر کی اس پر نظر پڑی تو وہ کپتان صاحب کے اور پھر ان کی ماں کے پیروں سے لپٹ گیا اور دھاڑیں مار مار کے روتے ہوئے التجا کرنے لگا کہ وہ اسے تھانے والوں کے حیوانی ظلم سے بچائیں۔

تھانے کے عملے میں سراسیمگی پھیل گئی۔ ڈیوٹی افسر ایک سب انسپکٹر تھا۔ اس نے تھانہ انچارج کو خبر کی مگر اس کے آنے تک کیپٹن نے قدیر کی بات سن لی تھی اور سمجھ لی تھی۔ نوجوان کیپٹن کا مشتعل ہونا ایک فطری بات تھی۔ اس کی ماں نے تو قدیر کو سینے سے لگالیا اور بیٹے سے کہا کہ پولیس پر کیس کردے۔ بیٹا مقدمے بازی کے چکر میں تو نہیں پڑا مگر ماں کے ساتھ قدیر کو بھی اپنے گھر لے گیا۔

وہاں بدقسمتی ایک بار پھر قدیر کے آڑے آئی۔ کپتان صاحب کی بیوی بہت بدمزاج اور بدخصلت تھی۔ اسے قدیر کی گھر میں آمد ایک آنکھ نہ بھائی۔ اس نے ہنگامہ کیا کہ اس جانور کو انسان بنانا تو ہمارے بس کی بات نہیں۔ اس کے ساتھ رہ کے ہمارے بچے بھی خراب ہوں گے۔ نیک دل کپتان اس سے متفق نہیں تھا۔ وہ ماں کی وجہ سے بھی مجبور تھا۔ وہ قدیر کو پڑھانا' لکھانا اور اچھی زندگی کے تمام مواقع فراہم کرنا چاہتا تھا لیکن بیوی نے قدیر کو سرونٹ کوارٹر میں رکھا اور اس کے ساتھ نوکروں جیسا ہی سلوک رکھا۔ دسمبر میں ان کی فیملی سنوفال دیکھنے مری گئی اور وہ ایک ہوٹل میں ٹھہرے۔ وہاں کیپٹن کی بیوی کے ہاتھوں کے دو سونے کے کنگن اور دو جھمکے غائب ہوگئے جو اس کا کہنا تھا کہ میز پر تھے۔

کپتان نے کہا ''زیورات میز پر کیوں تھے؟''

اس نے کہا ''رات کو ہم کھانا کھا کے دیر سے آئے تھے تو میں نے سوتے وقت وہیں رکھ دیے تھے اور میز پر رکھنے میں کیا ہے؟ آخر تھے تو کمرے کے اندر......''

''لیکن یہ ہمارے گھر کا بیڈ روم تو نہیں ہے۔ ہوٹل کا کمرا ہے۔''

وہ بھڑک اٹھی ''کیا مطلب ہے آخر تمہارا۔ یہاں مسافروں کا سامان محفوظ نہیں۔ چور ڈاکو آجاتے ہیں کمروں میں۔ تم بلاؤ ہوٹل کے منیجر کو' میں خود بات کروں گی۔''

کپتان نے کہا ''پہلے اچھی طرح دیکھ لو۔ تم نے کہیں اور نہ رکھ دیے ہوں۔''

''میں نے سب دیکھ لیا ہے۔ بچے ابھی سو رہے ہیں۔ جب میں باتھ روم میں تھی تو تم کہاں چلے گئے تھے؟''

''میں اماں کو چائے دینے گیا تھا۔''

''اس وقت قدیر کہاں تھا؟'' وہ بولی۔

''وہ اماں کے ساتھ تھا اور کہاں...... میں نے اسے نیچے اخبار لینے بھیجا تھا۔''

''اس نمک حرام نے اِدھر سے گزرتے ہوئے دیکھا ہوگا کہ اندر کوئی نہیں......''

کپتان نے سختی سے کہا ''فضول بات مت کرو۔ ویٹر بھی تو آیا تھا چائے دینے' میں منیجر کو بلاتا ہوں۔''

منیجر گھبرا گیا۔ ''سر! ہمارے ویٹر بہت بھروسے کے ہیں۔ یہاں تو ہر قسم کے لوگ آتے ہیں مگر آج تک ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ لوگ بڑے بے پروا ہوتے ہیں۔ چیزیں گرا دیتے ہیں' کمرے کھلے چھوڑ جاتے ہیں مگر چوری کا سوال ہی نہیں۔ ایک بھی واقعہ ہوجائے تو ہوٹل کی ساکھ خراب ہوتی ہے۔ آپ چاہیں تو پولیس کو رپورٹ کرسکتے ہیں۔''

کپتان کی بیوی نے کہا ''میں ویٹر سے خود بات کروں گی پہلے۔''

ویٹر سامنے آکے ہاتھ جوڑنے لگا اور قسمیں کھانے لگا۔ ''میں قرآن پر ہاتھ رکھ کے کہنے کے لیے تیار ہوں جناب کہ میں تو دروازے کے قریب والی میز پر چائے رکھ کے چلا گیا تھا۔ میں نے دوسری میز کی طرف دیکھا تک نہیں۔''

''اتنی آسانی سے کون مانتا ہے؟'' کپتان کی بیوی نے کہا ''پولیس اپنے طریقے سے پوچھے گی تو سب سامنے آجائے گا۔''

پولیس ویٹر کو پوچھ گچھ کے لیے لے گئی تو کپتان کی بیوی نے قدیر پر ہی شک کا اظہار کیا ''اسے بھی پولیس کے حوالے کرو۔''

''تمہارا دماغ خراب ہے۔''

''کیوں...... وہ کوئی فرشتہ ہے؟ ساٹھ ستر ہزار کا سونا دیکھ کے اس کی نیت خراب نہیں ہوسکتی؟ آخر ہے تو ایک لاوارث اور نیچ خاندان کا دیہاتی۔ پتا نہیں کہاں کہاں سے بھٹکتا آگیا ہمارے گھر۔ ابھی اسے چھوڑ دیا تو غائب ہوجائے گا اور پھر ملے گا بھی نہیں۔''

''دیکھو۔ وہ ایسا نہیں ہے۔''

''اگر نہیں ہے تو معلوم ہوجائے گا لیکن ہم معلوم نہیں کرسکتے' یہ کام پولیس کو کرنے دو۔''

''محض شک کی بنا پر یہ ظلم مت کرو۔ پولیس بہت مارے گی اسے اور اماں کو کتنا صدمہ ہوگا۔''

اس نے کہا ''میں کچھ نہیں جانتی۔ اگر تم نے کچھ نہ کیا تو یہ میں کروں گی۔''

کپتان نے کہا ''اوکے۔ میں اسے پولیس اسٹیشن لے جاتا ہوں۔''

کپتان نے قدیر کو اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھایا اور پولیس اسٹیشن لے گیا۔ اس نے راستے میں قدیر سے زیورات کے بارے میں پوچھا تو وہ رونے لگا۔ وہ کپتان کی بیوی کی باتیں پہلے ہی سن چکا تھا۔ ''کپتان صاحب! آپ نے تو مجھے پولیس کے قبضے سے چھڑایا تھا۔ آپ مجھے پھر ان کے حوالے کررہے ہو۔ وہ مار ڈالیں گے مجھے۔''

کپتان نے اسے تسلی دی ''میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ اگر مجھے انسانوں کی پہچان نہ ہوتی تو میں تمہیں اپنے گھر کیوں لے جاتا۔ چاہتا تو میں کچھ اور تھا قدیر۔ لیکن افسوس کہ وہ میرے بس کی بات نہیں۔ میری بیوی تمہاری دشمن ہورہی ہے۔ وہ تمہیں گھر سے نکال کے رہے گی۔ آج نہیں تو کل وہ پھر تم پر اس سے بھی زیادہ سنگین الزام عائد کردے گی اور تمہاری زندگی برباد ہوجائے گی۔''

''آپ میری مدد کریں صاحب!''

کپتان نے ایک گہری سانس لی ''کیسے مدد کروں تمہاری! اگر میں تمہاری حمایت کروں گا تو وہ مجھ سے بھی لڑے گی۔ میرے گھر میں ہر وقت ٹینشن رہے گی۔ تمہاری ذلت الگ ہوگی۔ اماں کو الگ دکھ ہوگا۔ اس کے علاوہ بچوں پر اس کا کتنا برا اثر پڑے گا۔''

''پھر میں کیا کروں کپتان صاحب!'' قدیر نے روتے روتے کہا۔

کپتان نے اسے تسلی دی ''قدیر! رونے کی کوئی بات نہیں۔ میں تم سے بہت شرمندہ ہوں۔ مجھے معاف کردینا کہ میں تمہارے لیے وہ سب نہیں کرسکا جو کرنا چاہتا تھا۔ ایک سپاہی محاذ پر تو دشمن کا مقابلہ مرتے دم تک کرسکتا ہے' گھر میں بیوی سے کب تک لڑسکتا ہے' تم کہیں اور چلے جاؤ۔''

''کہیں اور چلا جاؤں...... مگر کہاں جناب!''

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ راولپنڈی میں میرا ایک کزن ہے۔ میں تمہیں اس کے نام تعارفی خط دے رہا ہوں۔ تم اس کے پاس چلے جاؤ۔ میں اسے فون بھی کردوں گا۔ اس کے والد میرے چچا ہیں اور اسٹریٹ چلڈرن کے لیے ایک این جی او چلا رہے ہیں۔''

قدیر نے کنفیوز ہوکے پوچھا ''کیا چلا رہے ہیں جی؟''

کپتان نے کہا ''وہ تمہارا خیال رکھیں گے۔ تم ایک ذہین اور باہمت لڑکے ہو۔ انشا اللہ بہت ترقی کروگے۔ میں

تم سے رابطہ رکھوں گا۔"

"آپ بیگم صاحبہ سے کیا کہیں گے کپتان صاحب؟"

"اس کی تم فکر مت کرو۔ عورت کی فطرت کو میں سمجھتا ہوں۔ اور وہ تو بیوی ہے میری' مجھے پورا یقین ہے کہ زیورات اسی کے سوٹ کیس میں مل جائیں گے اور وہ بڑی معصومیت سے سر پر ہاتھ مار کے کہے گی کہ میں بھی کتنی بھلکڑ ہوں' خود ہی احتیاط سے کپڑوں کے نیچے رکھے ہوں گے اور بھول گئی ...... لیکن ایسا ہمارے واپس کراچی جانے کے بعد ہوگا۔ ابھی تو میں اس سے کہہ دوں گا کہ تمہیں پولیس کے حوالے کر آیا ہوں۔ میں اس بے قصور ویٹر کو بھی رہائی دلا دوں گا اور ہم آج ہی واپس چلے جائیں گے۔"

قدیر خاموش ہو گیا۔ خود اس کی سمجھ میں یہ بات..... آ رہی تھی کہ دریا میں رہ کے مگر مچھ سے بیر نہیں رکھا جا سکتا۔ کپتان کی بیوی نہیں چاہتی تو اس کے گھر میں رہنا خطرناک ہوگا۔

کیپٹن نے اپنے کزن کے نام مختصر سا رقعہ لکھا اور اس کے پیچھے نام پتا لکھ کے قدیر کے حوالے کر دیا "راولپنڈی میں اس کو تلاش کرنا تمہارے لیے مشکل نہیں ہوگا۔"

قدیر نے رقعہ لے لیا "آپ فون تو کر دیں گے ناں۔"

"ہاں ہاں...... اور میں تم سے بھی فون پر بات کرتا رہوں گا۔" کپتان نے کہا اور جیب سے اپنا بٹوا نکالا "اس وقت میرے پاس صرف چار ہزار روپے ہیں۔ یہ رکھ لو' یہاں کسی سے پوچھ لینا بس کا اڈا کدھر ہے اور جو ویگن تیار ہو اس میں بیٹھ جانا۔ ٹھیک ہے' خدا حافظ!"

قدیر نے گاڑی کو موڑ کاٹ کے غائب ہوتے دیکھا اور پھر بس کے اڈے کی طرف چل پڑا۔ اڈے سے ایک ویگن نکل رہی تھی۔ ایک شخص نے اسے غور سے دیکھ کر کہا "پنڈی جانا ہے کاکا!"

قدیر صورت سے ہی بہت پریشان اور خوف زدہ لگتا تھا۔ اس نے سر ہلایا "دوسری ویگن کب جائے گی؟"

"اس کی سواریاں پوری ہونے میں دیر لگے گی۔ کیا پتا رات ہی ہو جائے۔ جلدی جانا ہے تو میری گاڑی میں بیٹھ جا۔ میں پنڈی جا رہا ہوں مگر مفت میں نہیں لے جاؤں گا' پیسے ہیں ناں۔"

قدیر نے سرخ رنگ کی خیبر کار کو دیکھا اور سر ہلایا "کتنے پیسے ہوں گے جی!"

"چل تو ویگن کا کرایہ ہی دے دینا۔ تو آگے بیٹھ جا' تین بندے پیچھے ہوں گے۔"

قدیر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ دس کے بجائے بیس منٹ گزر گئے۔ ڈرائیور بدستور آوازیں لگا رہا تھا "چلو' ایک سواری پنڈی!" جبکہ اسے تین مسافر درکار تھے اور شام ہو جانے کے بعد پنڈی جانے والوں کی تعداد بہت کم ہو گئی تھی۔ جو اِکّا دُکّا مسافر آتے تھے وہ بس میں بیٹھ جاتے تھے۔

آدھے گھنٹے بعد قدیر نے بے چینی سے کہا "اور کتنی دیر انتظار کرنا پڑے گا جی!"

وہ قدیر کو گھور کے بولا "بہت جلدی ہے تو ڈھائی سو نکال میں تجھے لے جاتا ہوں۔"

قدیر نے چار میں سے ہزار کا ایک نوٹ الگ کر کے ڈرائیور کی طرف بڑھا دیا "ٹھیک ہے' اب تم چلو۔"

نوٹ دیکھ کے ڈرائیور کی آنکھوں میں جو چمک پیدا ہوئی تھی' اسے نہ قدیر نے دیکھا اور نہ وہ اس کو خطرے کی علامت سمجھ سکتا تھا۔ ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کی اور بولا "پنڈی میں کہاں جانا ہے کاکا؟"

قدیر نے کپتان کا دیا ہوا پرچا اسے دکھایا۔ "اگر تم مجھے اس پتے پر پہنچا دو تو بڑی مہربانی......"

ڈرائیور نے ایڈریس دیکھا "یہاں تو میں بھی رہتا ہوں' کاکا جی! ہم تو پڑوسی ہیں' کبھی دیکھا نہیں تجھے۔"

قدیر نے کہا "یہ میرا گھر نہیں ہے۔"

ڈرائیور نے اس کے خوف زدہ لہجے پر غور کیا اور پھر اس کی صورت پر نظر آنے والی مجرمانہ گھبراہٹ کو دیکھا۔ اسے دال میں کچھ کالا نظر آیا۔ عموماً گھر سے فرار ہونے والے لڑکے ایسے ہی سب کی نظروں میں آ جاتے ہیں۔ دس بارہ سال کا ایک لڑکا جو مری کا رہنے والا بھی نہیں تھا اور جس کی جیب میں چار ہزار روپے بھی تھے' فرار ہو کے کہاں جا رہا تھا؟ شاید وہ کسی ٹورسٹ فیملی کا ملازم تھا جس کو چار ہزار کی رقم چوری کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ اس کے لیے یہ بہت بڑی رقم تھی اور اب وہ پکڑے جانے کے خوف میں مبتلا تھا۔ اس نے بڑے دوستانہ اور ہمدرد لہجے میں دوبارہ سوالات کیے تو قدیر نے سب اُگل دیا۔

ڈرائیور نے اندھیرا پھیل جانے کے بعد گاڑی کو ایک ہوٹل کے سامنے روک دیا جہاں آنے جانے والے اپنی گاڑیاں دھلواتے تھے اور جتنی دیر میں وہ چائے پیتے تھے یہ کام کرنے والے لڑکے پہاڑی چشموں کے پانی سے گاڑی چمکا دیتے تھے۔ گرمیوں میں پنڈی سے آنے والی گاڑیاں ٹھنڈی کی جاتی تھیں۔

آدھے گھنٹے بعد وہ پھر روانہ ہوئے تو پہاڑوں پر رات

کا سناٹا اور اندھیرا پھیل چکا تھا۔ سردی اچانک بڑھ گئی تھی اور ٹریفک بالکل موقوف ہو گئی تھی۔ ڈرائیور نے ڈکی سے کمبل نکالا اور اوڑھانے کے بہانے قدیر کو قابو کرنے کے لیے اس پر جال کی طرح پھیلا دیا۔ قدیر اس کا مقابلہ یوں بھی نہیں کر سکتا تھا' شیطان صفت ڈرائیور نے گاڑی کو بونٹ اٹھا کے کھڑا کیا اور قدیر کو ایک چٹان کے پیچھے لے گیا۔

پندرہ منٹ بعد وہ قدیر کو بے ہوش چھوڑ کے اور اس کے چار ہزار جیب میں ڈال کے واپس لوٹ گیا۔ قدیر کو کچھ دیر بعد ہوش آیا تو وہ گرتا پڑتا سڑک تک پہنچا اور کسی گاڑی کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ سخت ترین سردی میں جب برف باری شروع ہوئی تو اپنی جسمانی بدحالی کے باوجود اس نے راولپنڈی کی طرف پیدل چلنا شروع کر دیا مگر دو چار کلومیٹر کے بعد اس کی قوت برداشت ختم ہو گئی اور وہ سڑک پر ہی گر پڑا۔ جہاں سے ہم نے اسے اٹھا لیا۔

قدیر کو اسپتال سے اباجی کے دوست کے گھر لانے کے بعد یہ ساری صورت حال سامنے آئی تو پریشانی یہ پیدا ہو گئی کہ اب قدیر کو کہاں بھیجا جائے؟ اس کے پاس وہ پرچہ بھی نہیں تھا جس پر وہ نام پتا درج تھا۔ وہ واپس فیصل آباد جانے کے لیے ہرگز تیار نہ تھا۔ اس کی ذہنی کیفیت ایسی تھی کہ پولیس کے نام سے بھی وہ نروس ہو جاتا تھا۔ ابا نے اسے پولیس کے سپرد کرنے کی اور رپورٹ لکھوانے کی تجویز یکسر مسترد کر دی۔ ابا کے دوست نے تجویز دی کہ اسے یتیم خانہ و اسکول کی انجمن فیض الاسلام بھیج دیا جائے لیکن اس کی اماں نے شدید جذباتی مخالفت کی۔ بالآخر ابا نے اسے ساتھ لے جانے کا فیصلہ کیا اور قدیر سے پوچھا گیا تو اس نے بھی آمادگی کا اظہار کیا۔ اس نے چند روز میں ہماری تیمارداری اور بے غرض ہمدردی دیکھ لی تھی۔

کراچی آنے کے بعد چند روز قدیر کو صحت کی بحالی کے لیے آرام کرنے اور گھر کے ماحول سے مانوس ہونے کا موقع دیا گیا۔ ابا نے اسے اعتماد اور اماں نے پُرتحفظ شفقت کا احساس دلایا اور ایک ہفتے بعد وہ ہماری فیملی میں شامل ہو گیا۔ اس کے نئے کپڑے بنائے گئے۔ نئے جوتے' بستہ اور کتابیں لے کر وہ اسکول جانے لگا۔ اسے اور مجھے ایک ہی بیڈ روم میں اکٹھا کر دیا گیا اور میں اسے بھائی کہنے لگا۔ ابا اس معاملے میں بے حد محتاط تھے کہ کسی بھی معاملے میں سگے اور سوتیلے اور اپنے پرائے کے جذبات کا خفیف سا فرق بھی محسوس نہ ہو۔ میرے ساتھ چاہے زیادتی ہو جائے' قدیر کو اس کا احساس کبھی نہ ہو۔

اگلے تین برسوں میں قدیر نے حیرت انگیز نتائج حاصل کیے۔ اس نے میٹرک میں اے ون گریڈ حاصل کیا اور اس کی خواہش پر ابا نے اسے کامرس کالج میں داخلہ دلوا دیا حالانکہ اماں تو روایتی انداز میں اسے ڈاکٹر بنانا چاہتی تھیں۔ قدیر ایم بی اے کرنا چاہتا تھا یا چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بننا چاہتا تھا۔ ہم آپس میں اچھے دوست بھی تھے اور بھائی بھی۔ قدیر ایک خوش مزاج اور مہذب لڑکا تھا۔ اسے فیشن کے مطابق کپڑے پہننے اور بال بنانے کا شوق تھا جو اس کی عمر کے لحاظ سے ایک فطری بات تھی۔ وہ پاپ میوزک سنتا تھا اور کرکٹ کھیلتا تھا۔ اس کے دوست بھی بہت تھے۔

وہ انٹر کا امتحان دے چکا تھا اور سولہ سال کا تھا جب اس کی زندگی کا دھارا اچانک بدل گیا۔ اس کے خیالات و نظریات میں بڑی انقلابی تبدیلی رونما ہوئی اور یہ سب ان تین ماہ میں ہوا جب وہ فارغ تھا اور نتائج کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کا کوئی دوست یا واقف اسے دین کی تبلیغ کے نام پر ایک مخصوص فرقے کے عقائد کا درس دینے والی جماعت میں لے گیا۔ اس نے درس سنے اور اس جماعت کا لٹریچر پڑھا۔ فرقہ پرستی کے جذبات کو ہوا دینے والوں نے قدیر کے ذہنی جھکاؤ کو تاڑ لیا تھا۔ وہ ناپختہ ذہنوں کو اپنی راہ پر لگانے کا ہنر جانتے تھے۔ چند ہفتوں میں انہوں نے قدیر کی برین واشنگ کر دی۔

ظاہر ہے اس تبدیلی سے ابا بے خبر نہیں رہ سکتے تھے۔ انہوں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی مگر ان کے سمجھانے کا الٹا اثر ہوا۔ قدیر نے صاف کہا کہ ہم سب گمراہ ہیں اور اگر وہ راہ راست پر جا رہا ہے تو اسے روکنے کی کوشش نہ کی جائے ورنہ وہ گھر چھوڑ کے چلا جائے گا۔

قدیر کی یہ دھمکی جذباتی بلیک میلنگ کے مترادف تھی۔ اماں اور ابا ہتھیار کیسے نہ ڈالتے' تاہم ابا کی تشویش برقرار رہی۔ انہوں نے معلوم کر لیا تھا کہ قدیر کو اس راہ پر لگانے والے کون ہیں مگر نہ ان سے بحث کی جا سکتی تھی اور نہ انہیں قانونی طور پر روکا جا سکتا تھا۔ جب انٹر کا رزلٹ آیا تو ایک بار پھر قدیر نے بہترین نمبر حاصل کیے مگر اس وقت تک وہ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بننے یا ایم بی اے کرنے کا خیال ترک کر چکا تھا۔

ابا کیا کرتے' انہوں نے قدیر کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ یونیورسٹی میں داخلہ لے لے' بے شک ایم بی اے نہ کرے بلکہ اسلامیات میں ایم اے کر لے مگر وہ ناکام رہے۔

میرے کمرے میں ٹی وی تھا اور کمپیوٹر تھا۔ ڈیک تھا اور لہو و لعب کے دیگر اسباب تھے۔ تصویروں والے رسالے تھے اور انتہائی غیر شرعی بلکہ کافرانہ ماحول تھا چنانچہ اس نے اپنا

کمرا الگ کرلیا۔ گھر میں کوئی فاضل بیڈروم نہیں تھا۔ اس نے اپنا ٹھکانا اسٹور میں بنالیا۔

پھر ایک بار ہم نے اسے ایک احتجاجی جلوس میں آگے آگے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں لاٹھی تھی اور وہ اپنی عمر کے نوجوانوں کے ساتھ گزرتی ہوئی گاڑیوں پر لاٹھی مار رہا تھا اور ان کے شیشے توڑ رہا تھا۔ یہ احتجاج ایک عالم کے قتل کے خلاف تھا۔ وہ رات کو لوٹ کر گھر نہیں آیا تو ابا اس کو تلاش کرنے گئے اور وہ بالآخر ایک تھانے کی حوالات میں ملا۔ ابا نے بڑی بھاگ دوڑ اور رشوت دے کر اسے چھڑایا۔ ابا کے پاس ایک پیسا بھی حرام کی آمدنی کا نہیں آتا تھا مگر حرام کھلانا ان کی مجبوری تھی۔

قدیر اتنا سرکش اور برگشتہ تھا کہ اسے روکنا ٹوکنا کسی پاگل کتے کی دم پر پاؤں رکھنے سے کم خطرناک نہ تھا۔ اماں ابا سخت بے بس ہوگئے تھے۔ شاید میں ایسا کرتا تو وہ مجھے گھر سے نکال دیتے مگر قدیر چلا جاتا تو ان کی ساری محنت پر پانی پھر جاتا۔ وہ ایک امید پر سب برداشت کررہے تھے۔

لیکن یہ امید لاحاصل رہی اور بالآخر ان کی نیکی ہی ان کی سزا بن گئی۔ قدیر اس انجام کی طرف بڑھ رہا تھا جس کے تصور سے ان کے حواس گم ہوجاتے تھے مگر یہ ناگزیر تھا۔ بالآخر ایک دن وہ نامعلوم دہشت گردوں کی گولیوں کا نشانہ بن گیا۔ تین موٹر سائیکلوں پر آنے والے نقاب پوشوں نے اسے ہر طرف سے گھیر کر بھون ڈالا۔

یہی وجہ تھی کہ جب چار سال بعد میں ایک انقلاب پسند تنظیم کے جذباتی نعروں سے متاثر ہوا تو میرے والدین گھبرا گئے۔ والدین بڑے معصوم اور بے خبر لوگ ہوتے ہیں اور اپنی اولاد کے بارے میں ہمیشہ خوش گمانی کا شکار رہتے ہیں۔ میرے بارے میں بھی انہوں نے کبھی نہیں سوچا کہ فلسفہ اور نعرے مختلف سہی لیکن میں قدیر کا انجام دیکھنے کے باوجود خود بھی ایسے ہی راستے پر چل پڑا ہوں۔ وہ اپنے یقین کو دین سمجھتا تھا اور میرے سامنے دنیاوی کامیابیوں کا پرکشش جال پھیلانے والے سیاست کے بازیگر تھے۔ انہوں نے میری آنکھوں میں خوشحال مستقبل کے خواب بھر دیے تھے اور جدوجہد کے راستے پر مجھے آگے بڑھا دیا تھا۔

جب تک میرے والدین کو کچھ معلوم ہوتا' میں بھی اسی راستے پر اتنا آگے بڑھ گیا تھا کہ میرے لیے واپسی اپنے اختیار کی بات نہ رہی تھی۔ ابا نے بلا تاخیر انتہائی قدم اٹھایا اور مجھے اپنے گھر' ماحول' معاشرے اور ملک سے کاٹ کے جلاوطن کردیا۔ اس وقت تک خود میری سمجھ میں یہ بات آنے لگی تھی کہ میں ایک مافیا کا آلۂ کار بن چکا ہوں اور میرے لیے اس کی طاقت کے جال سے رہائی ممکن نہیں رہی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے راہ فرار اختیار کی اور ماضی کو بہت پیچھے چھوڑ دیا۔ مجھے یقین تھا کہ اب بے بسی کی پرانی زنجیریں زنگ خوردہ ہوکے ٹوٹ چکی ہیں اور میں اپنے مستقبل کے فیصلے کرنے کے لیے آزاد ہوں۔ خود میرے والدین کو یقین آچکا تھا کہ اب میری واپسی محفوظ ہے۔ پاکستان میں وہ میرے لیے کوئی بڑا کام دیکھ چکے تھے جو میں عزت' شہرت اور دولت کے سارے خوابوں کی تعبیر تھی۔

لیکن اشرف چیتے کی آمد نے میرے خوابوں' خیالوں کے شیش محل پر ایک چٹان لڑھکا دی تھی۔

☆☆☆

جہاز نے نصف سے زیادہ مسافت طے کرلی تھی۔ لندن بہت پیچھے رہ گیا تھا اور جیسے جیسے کراچی قریب آرہا تھا' میرے اطمینان پر یہ احساس غالب آرہا تھا کہ یوں لندن سے فرار ہوکے میں نے کوئی عقلمندی نہیں کی۔ بے شک لندن میں اشرف چیتے کو ناک آؤٹ کرکے میں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ میں ایک آزاد ملک کا آزاد شہری ہوں اور مجھے قول و فعل کی خودمختاری حاصل ہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ یہ یقین ایک سراب ثابت ہورہا تھا۔

اصل خطرہ تو پاکستان میں درپیش تھا۔ اب تک تنظیم کو ہدایات مل گئی ہوں گی کہ بغاوت' حکم عدولی اور غداری کے مرتکب محمد رفیق کے لیے اعلیٰ قیادت نے کیا سزا تجویز کی ہے۔ اس سزا سے بچنے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ اب میں پچھتاوے کا شکار ہورہا تھا۔ اگر میں اپنا دماغ ٹھنڈا رکھتا اور اشرف چیتے کے ساتھ جاکے چیف کی بات سن لیتا تو کیا حرج تھا؟ زیادہ سے زیادہ میری واپسی میں کچھ تاخیر ہوجاتی۔ میں چیف کو قائل کرنے کی کوشش ضرور کرسکتا تھا کہ میرے حالات اب مجھے تنظیم کے لیے خدمات سرانجام دینے کی اجازت نہیں دیتے' کیا پتا وہ قائل ہوجاتا۔

میں سخت الجھن میں تھا کہ اب تنظیم کی ہائی کمان کے سامنے اپنے طرز عمل کی کیا وضاحت پیش کروں گا۔ اچانک میرے ذہن میں ایک نیا خیال آیا۔ کیوں نہ میں صاف مکر جاؤں کہ اشرف چیتا مجھ سے ملا ہی نہیں۔ اگر وہ ایسا کہتا ہے تو بکواس کرتا ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ چیف مجھے طلب کرے اور میں نہ جاؤں؟ مجھے اس کا کوئی پیغام نہیں ملا' چنانچہ میں اپنے پروگرام کے مطابق لندن سے پاکستان کے لیے روانہ ہوگیا۔ اشرف چیتے کو کس نے ناک آؤٹ کرکے مرنے کے لیے

بے کنارے چھوڑا؟ یہ میں کیا بتا سکتا ہوں۔ اپنی کوتاہی اور ناکامی پر پردہ ڈالنے کے لیے اس نے کوئی ڈراما کیا ہوگا۔ اشرف چیتا میرے جھوٹ پر کتنا واویلا کرے گا' یہ سوچ کے مجھے ہنسی آگئی۔ ہنس پڑا۔

ایئر ہوسٹس نے میرے قریب آکے سوال کیا ''آپ کھانے میں کیا پسند کرتے ہیں سر!''

میں نے اپنی پسند بتادی ''سب سے زیادہ سرسوں کا ساگ' مکئی کی روٹی اور مکھن۔ اس کے بعد......''

اس کی مسکراہٹ ایک تیوری میں بدل گئی ''میرا مطلب تو آپ کیا کھائیں گے' پاکستانی' کانٹی نینٹل یا چینی؟''

میں نے سوچ کے کہا ''کیا چینی کھانے سے پیٹ بھرجاتا ہے؟''

''آف کورس سر! اینڈ یو ول لائک اٹ۔''

''اوکے۔ ایک پاؤ چینی لے آؤ اور ایک چمچہ۔ میں چینی کھاؤں گا' خواہ بعد میں مجھے شوگر ہوجائے۔''

اس نے اپنی ہنسی کو روک لیا اور آگے بڑھ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ مجھے چائنیز فوڈ دے گئی جو یقینا بہت اچھا تھا اور مجھے بھوک بھی بہت تھی۔ کھانے کے بعد میں نے آنکھیں بند کرکے قیلولہ فرمانے کی کوشش کی مگر میرے خیالات کے گھوڑے بے مہار ہوکے ہر سمت میں دوڑ رہے تھے۔

نیم غنودگی کے عالم میں میرے اندیشے بڑے اوٹ پٹانگ فلمی خواب بن کے سامنے آنے لگے۔ پہلے سین میں کوئی شاہی دربار تھا۔ چیف تخت شاہی پر شہنشاہِ اکبر کی طرح رعب و تمکنت کی تصویر بنا بیٹھا تھا اور ایک گلاب کے پھول کو سونگھ رہا تھا۔ دو حبشی غلام ننگی تلواریں اٹھائے مجھے گھسیٹتے ہوئے لاتے ہیں۔ میرے پاؤں میں بیڑیاں ہیں اور ہاتھوں میں زنجیریں۔ تمام اہلِ دربار یہ عبرت آموز منظر سکوت کے عالم میں دیکھ رہے ہیں۔ راجا مان سنگھ کے لباسِ فاخرہ میں اشرف چیتا آگے بڑھتا ہے اور کہتا ہے ''ظلِ سبحانی! یہ ہے بغاوت اور سرکشی کا مجرم محمد رفیق!'' اور حبشی غلام مجھے دھکیل کر شہنشاہ کے قدموں میں گرادیتے ہیں۔

اکبر اعظم کی آواز گونجتی ہے ''مجرم کو صبح دم قلعے کی فصیل سے ہاتھی کے پیروں میں ڈال دیا جائے۔''

میں چلاتا ہوں ''رحم شہنشاہ......رحم!''

دوسرا خواب اس سے بھی زیادہ مضحکہ خیز تھا۔ وہ کوئی بہت بڑا ہال تھا جو بالکل خالی تھا۔ میں اس کے وسط میں کھڑا تھا۔ پھر سامنے والے آخری حصے کے دروازے سے عائشہ اندر آئی۔ اس نے کلیساؤں میں نظر آنے والا سفید لباسِ عروسی پہن رکھا تھا اور اس کے ہاتھ میں لمبی نالی والا پرانے وقتوں کا ایک ریوالور تھا۔ پھر دوسری طرف کے دروازے سے فریال نمودار ہوئی۔ وہ بھاری سرخ عروسی جوڑے اور زیورات میں لدی پھندی ہوئی تھی مگر اس کے ہاتھ میں بھی ویسا ہی لمبی نال والا پرانا ریوالور تھا۔

میں چلا کے کہتا ہوں ''یہ کیا تماشا ہورہا ہے؟''

اچانک اسٹیج پر میرا دوست یوسف لمبی داڑھی ٹوپی اور لباسِ شرعی میں نمودار ہوتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں نکاح رجسٹر ہے اور دوسرے میں سیٹی۔ وہ سیٹی بجا کے کہتا ہے ''فکیے پتر......! ڈسٹرب مت کر۔ آج فیصلہ ہوجائے گا۔ ایک ہوگی تیری منکوحہ......دوسری مرحومہ۔''

میں کہتا ہوں ''یہ کیسا فیصلہ ہے؟''

''وہی جو مرد کرتے تھے۔ جب ایک عورت کے لیے ڈوئل ہوتا تھا تو ایک مارا جاتا تھا' دوسرے کی شادی ہوجاتی تھی۔ یہاں دو عورتیں ہیں اس لیے فیصلہ روایتی طریقے پر ہوگا۔'' وہ پھر سیٹی بجاتا ہے ''چلو بھئی' اپنے اپنے نشان پر......خواتین' رول آف دی گیمز معلوم ہیں ناں آپ کو؟ دونوں کو اس نشان سے پلٹ کے دس قدم دور جانا ہے اور پھر ایک ساتھ پلٹ کے فائر کرنا ہے' رائٹ......! اب میں گنتی شروع کرتا ہوں' ون......ٹو......تھری......فور......فائیو......''

میں چلاتا ہوں ''یوسف! کیا تو پاگل ہوگیا ہے؟''

یوسف گنتی جاری رکھتا ہے ''سکس......سیون......ایٹ......نائن......''

میں اپنی آنکھیں بند کرلیتا ہوں۔ میرے دل کی دھڑکن رک جاتی ہے۔ سانس رک جاتی ہے۔ ان میں سے کون شہیدِ محبت ہوگی' کون میری شریکِ حیات ہوگی؟ فریال یا عائشہ......؟ اف......کاش میں نے ٹاس کرلیا ہوتا۔''

میں انتظار کرتا ہوں مگر دھماکا سنائی نہیں دیتا۔ بہت دیر بعد میں آنکھیں کھول کے دیکھتا ہوں۔ نکاح خواں اسٹیج پر اکیلا کھڑا ہے۔ وہاں نہ عائشہ ہے اور نہ فریال۔

میں کہتا ہوں ''یوسف! وہ کہاں ہیں؟''

یوسف افسوس سے سر ہلاتا ہے۔ ''فکیے پتر! فریال کو لے گیا صفدر سلطان مرزا۔ عائشہ کو لے گئی اس کی ماں۔ تو بھی گھر جا۔ جا اپنی حسرتوں پر آنسو بہا کے سوجا۔ اسی لیے کہتا تھا تجھ سے کہ دونوں سے شادی کرلے۔ ایک پاکستانی' ایک ولایتی۔ ایک لاہور میں' ایک لندن میں۔ ایسی زبردست بیویاں ہوتیں تیری کہ زمانہ رشک کرتا مگر تو نے نہیں مانی' اب تو لوٹ جا اپنی اس عم زاد کی طرف جو تیرے نصیب میں لکھی گئی

تھی' موٹی کالی بھینس......''

میں نے چلا کے کہا''شٹ اپ......!''

میرے ساتھ والی سیٹ پر سے ایرہوسٹس نے مسکرا کے کہا''آپ کو سوری کہنے کی ضرورت نہیں۔ یہ غالباً کوئی موروثی بیماری ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ منکر نکیر سے بھی یہی کہہ دیں۔''

میں بھونچکا رہ گیا۔ وہ نہ جانے کب اور کیوں میرے ساتھ والی سیٹ پر آ بیٹھی تھی۔''وہ......دراصل مجھے نیند میں بولنے کی عادت ہے......اور چلنے کی بھی۔''

''جہاز کا دروازہ بند نہ ہوتا تو آپ بحرالکاہل میں اتر جاتے۔ کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ کرتے کیا ہیں؟''

میں نے کہا''عموماً وہ سب جو مجھے نہیں کرنا چاہیے۔''

وہ مسکرائی''میرا مطلب تھا آپ کوئی ایکٹر ہیں یا ماڈل......ایسا کیوں لگتا ہے کہ میں نے آپ کو پہلے بھی دیکھا ہے؟''

میں نے کہا''اس کے دو بہترین اور مقبول عام جوابات ہیں۔ ایک یہ کہ شاید ہم پچھلے جنم میں ملے تھے۔ دوسرا یہ کہ ہم خوابوں میں مل چکے ہیں۔ اصولاً یہ سوال مجھے کرنا چاہیے تھا۔''

اس نے میری طرف جھک کے کہا''مجھے ایک پیغام دینا تھا۔''

میں نے کہا''آہ...... یہ بھی مجھے کہنا تھا۔ پیغام ہمیشہ لڑکے کی طرف سے دیا جاتا ہے۔''

''ول یو پلیز شٹ اپ'' اس نے مسکرانا جاری رکھا''جو بات میں کہنے والی ہوں وہ سن کے تم چونکو گے نہیں۔ تم میری طرف دیکھتے رہو گے۔''

''آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے......''

''اس فلائٹ پر کوئی شخص ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون ہے......لنچ کے بعد جب میں ٹرالی پر خالی ٹرے لے کر گئی تو ایک ٹرے میں برتنوں کے نیچے سے مجھے ایک پیغام ملا...... اور دس ہزار روپے کا ایک چیک!''

میں نے اسے غور سے دیکھا''پیغام میرے لیے تھا؟''

''یس...... اور چیک میرے لیے'' وہ بولی۔

''کہاں ہے وہ پیغام؟'' میں نے کہا۔

''وہ میں نے ضائع کردیا...... کیونکہ مجھے اس کی تاکید تھی۔ مضمون اس کا یہ تھا کہ فرار ہو کے تم کہیں نہیں جا سکتے۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں' کراچی میں چیف کا انتظار کرو۔''

''آئی سی......'' میں نے کچھ دیر بعد کہا''تم بھی ان کے لیے کام کرتی ہو؟ میرا خیال تھا کہ ایرہوسٹس کی آمدنی کم نہیں ہوتی۔''

''ایرہوسٹس مجبور بھی تو ہو سکتی ہے' تمہاری طرح۔''

میں نے طنز سے کہا''ہاں...... دس ہزار کی رقم کو [illegible] نہیں کر سکتی۔''

''وہ بلا معاوضہ بھی سب کچھ کرا سکتے ہیں۔''

میں نے کہا''تم اپنے ماضی کی کس غلطی کو بھگت [illegible] ہو؟''

وہ اٹھ کھڑی ہوئی''نہیں۔ غلطی میرے بھائی نے [illegible] تھی۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔''

مجھے اس کی بے بسی پر ترس آیا۔ بہنوں کی وجہ سے بھ[illegible] اکثر بلیک میل ہونے پر مجبور ہوتے ہیں۔ یہ الٹا معاملہ تھ[illegible] بھائی کے اعمال کی سزا بہن کو بھگتنی پڑ رہی ہے۔ دو[illegible] مسافروں نے شاید مجھ پر رشک کیا ہو کہ انہیں گھاس نہ ڈ[illegible] والی ایرہوسٹس میرے پاس آ کے بیٹھ گئی تھی اور انہوں [illegible] فرض کرلیا ہوگا کہ وہ میری کزن ہے یا میرے اس کے [illegible] سے ناجائز مراسم ہیں۔ اس کی اور میری پریشانی کو کون سمجھ[illegible] تھا جو وجہ شناسائی تھی۔

کراچی تک صرف ایک گھنٹے کی پرواز باقی رہ گئی تھی [illegible] میرے لیے اچانک خطرات کا جنگل شروع ہو گیا تھا۔ [illegible] محتاط اور لاتعلقی کے انداز میں واش روم تک آتے جا[illegible] میں نے تمام مسافروں کی صورتوں کو دیکھا کہ کس کی صور[illegible] پر میری حالت میں دلچسپی کے آثار ہیں اور کون اپنی بدمعا[illegible] پر ناز کرتے ہوئے میری بے چارگی کے تماشے سے لطف اندوز ہو رہا ہے؟

معلوم نہیں کیوں' مجھے اپنی ہی قطار میں مخالف سمت کھڑکی کے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص پر شک ہو گیا کہ سیاہ [illegible] کے پیچھے سے اس کی نگاہیں میرا جائزہ لینے میں مصروف [illegible] اس شک کی واحد وجہ سیاہ چشمہ نہیں تھا' جہاز کے اندر دھوپ نہیں تھی اور وہ نظر کا چشمہ بھی نہیں تھا۔ کچھ لوگ [illegible] کی خاطر فوٹوسن یا فوٹو براؤن لینز والے چشمے استعمال کر[illegible] ہیں۔ ان کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ کم روشنی میں اور ان [illegible] وہ شفاف رہتے ہیں اور باہر جاتے وقت چشمہ بدلنا نہیں [illegible] چند سیکنڈ میں شفاف شیشے سیاہ ہو جاتے ہیں۔

اس شخص کا حلیہ بھی قدرے عامیانہ سا تھا۔ سرخ ر[illegible] کی ڈھیلی سی ٹی شرٹ' جس پر آنجہانی مارلن منرو ایک [illegible] اور سنسنی خیز پوز میں نظر آ رہی تھی۔ جینز اور جیکٹ' ہیئر [illegible] میں اس نے شاہ رخ خان کو کاپی کیا تھا حالانکہ اس کا [illegible] روپ اور چہرے کے نقوش جانی لیور جیسے تھے۔ [illegible]

پینتیس سال کی درمیانی عمر کا دراز قد اور صحت مند شخص تھا جو بظاہر چیونگم چبانے کے سوا کچھ بھی نہیں کر رہا تھا۔

اپنی سیٹ پر دوبارہ بیٹھ جانے کے بعد مجھے یہ خیال آنے لگا کہ وہ شخص لندن سے میرے ساتھ ہی سوار ہوا تھا۔ بلکہ وہ میرے بھی بعد آیا تھا۔ حالانکہ میں مقررہ وقت کے کافی دیر بعد پہنچا تھا۔ وہ میری طرف اسی وقت دیکھتا تھا جب ایرہوسٹس میرے پاس آئی تھی لیکن اس سے پہلے یا اس کے بعد بھی اگر وہ سیاہ چشمے کے پیچھے سے مجھے گھورتا رہا ہو تو مجھے معلوم نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ بالکل فارغ تھا۔ اس نے نہ کوئی اخبار اٹھایا تھا اور نہ رسالہ۔ شک کرنے کی کوئی بھی وجہ معقول نہ تھی لیکن میں عجیب سی بے چینی میں مبتلا ہو گیا۔ شک کے اگلے مرحلے میں مجھے اس کی صورت بھی مانوس محسوس ہونے لگی اور میں سوچنے لگا کہ ایسا کیوں ہے؟

اس وقت کوئی جواب میری سمجھ میں نہیں آیا مگر کچھ دیر بعد یہ ثابت ہوا کہ ذہنی خلش' چھٹی حس کی وارننگ' خواب میں الہام سب کے پیچھے کچھ ہوتا ضرور ہے۔ ماہرین نفسیات کے نزدیک لاشعور سے بھی نیچے تحت الشعور ہے۔ تاریک تہہ خانہ جس میں تمام عمر کے وہ تجربات محفوظ رہتے ہیں جن کو بظاہر ہم بھول جاتے ہیں۔ کبھی اچانک کوئی لائٹ جل اٹھے تو کوئی چہرہ' کوئی نام' کوئی بات' کوئی احساس' شعر' نغمہ یا خوشبو اچانک ذہن میں یوں آ جاتے ہیں جیسے پرانی البم اٹھاتے ہوئے کوئی تصویر نکل کے گر جائے۔

میرا شک بھی بے سبب نہیں تھا۔ کراچی پہنچنے کے بعد جب میں جہاز سے اتر کے اپنے بریف کیس اور شولڈر بیگ کے ساتھ مسافروں کی ایک لمبی قطار میں چل رہا تھا تو وہ پیچھے سے قدم بڑھاتا ہوا آیا اور میرے ساتھ چلنے لگا۔ اس کے کندھے پر بھی ایک بیگ تھا جو میرے بیگ سے ٹکرایا اور نیچے گرنے لگا تھا کہ میں نے سنبھال لیا۔

''آئی ایم سوری!'' اس نے رسماً کہا۔

میں نے بھی رسمی جواب دیا''کوئی بات نہیں۔''

''آپ رفیق احمد ہیں ناں...؟'' اس نے کہا۔

میں چونکا''یس......لیکن آپ کون ہیں' میں پہچانا نہیں۔''

وہ مسکرایا''کیسے پہچان سکتے ہیں۔ شاید ایک بار ہی ملاقات ہوئی تھی۔ ویسے میں اکثر آپ کو دیکھتا تھا۔''

میں نے کہا''کہاں...... پاکستان میں' امریکا میں یا لندن میں......؟''

اس نے میرے سوال کو زیادہ اہمیت نہیں دی''جگہ سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آپ نے اچھا کیا کہ واپس آ گئے۔''

میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹی گونجنے لگی''تمہیں اس میں کون سی اچھائی نظر آتی ہے؟ کون ہو تم آخر......؟''

اس وقت تک ہم کسٹم ہال میں پہنچ گئے تھے۔ اس نے مسکرا کے کہا''کیا والدین کے پاس اور اپنے وطن لوٹ آنا اچھی بات نہیں ہے رفیق صاحب!'' پھر وہ تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ ہمارے درمیان بہت سے دوسرے مسافر حائل ہو گئے اور میرے لیے اس کا راستہ روکنا ممکن نہ رہا۔ اس کے پاس اضافی سامان کوئی نہیں تھا چنانچہ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر جانے والے راستے کی طرف بڑھ گیا۔ مجھے اپنے سامان کے انتظار میں رکنا پڑا۔

کسٹم کے ایک خرانٹ نظر آنے والے افسر نے بڑے معنی خیز لہجے میں سوال کیا''صرف دو ہی سوٹ کیس ہیں آپ کے؟'' میں نے کہا''ابھی تو پیکیج آیا ہی نہیں' آپ نے دیکھ لیا؟''

''ہمیں بہت کچھ پتا ہوتا ہے سر! چھ سال باہر رہ کے آئے ہیں آپ!''

میں نے کہا''پھر آپ کے خیال میں میرے پاس کتنے سوٹ کیس ہونے چاہئیں؟ کوئی فارمولا ہے آپ کا؟ جو چھ سال باہر رہے اس کو چھ ضرور لانے چاہئیں۔''

پیچھے سے ایک شخص نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا''آپ اس کمینے شخص کے منہ نہ لگیں۔ چڑ گیا تو آپ کو بہت پریشان کرے گا۔''

''کیسے پریشان کرے گا؟'' میں نے اناڑی پن سے پوچھا۔''سو طریقے ہوتے ہیں جی ان کے پاس۔ سب سے پہلے تو آپ کا سارا سامان کھلوائے گا۔ ایک ایک چیز باہر نکالنے کو کہے گا۔''

مجھے کچھ پریشانی ہوئی''میں نے تو بڑی مشکل سے پیک کیا تھا سارا سامان دو سوٹ کیسوں میں۔''

اس نے مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔''آپ کے سامان میں کوئی ایسی ویسی چیز تو نہیں ہے ناں؟''

میں نے کہا''ہیروئن یہاں سے جاتی ہے۔ لندن سے کوئی کیا لا سکتا ہے۔''

''آپ نہیں جانتے......ممنوعہ اسباب کی ایک لمبی فہرست ہے۔ اگر انہوں نے کچھ نکال لیا۔''

میں نے برہمی سے کہا''کہاں سے نکال لیا' جب ہوگا ہی نہیں۔''

''ان کے پاس تو ہوتا ہے ناں سر! آپ کیسے انکار کریں

گے کہ وہ آپ کے سوٹ کیس میں سے نہیں نکلا اور ثابت کرنے میں آپ کو شام ہو جائے' رات ہو جائے۔ سارے مسافر نکل جائیں گے آپ کو گھیر لیں گے یہ سب مل کے۔ ایک نہیں یہاں دس قسم کے ڈاکو پھر رہے ہیں۔ آپ کی پرابلم میں ختم کرا سکتا ہوں۔'' اس نے سرگوشی میں کہا۔

اور تب مجھے یاد آیا کہ میں لندن کے ہیتھرو ایرپورٹ پر نہیں بفضلِ خدا مملکتِ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے قائداعظم انٹرنیشنل ایرپورٹ پر ہوں جہاں ان کی تصویر ویسے تو ہر سرکاری افسر کی کرسی کے پیچھے سے سب دیکھتی رہتی ہے مگر اصل مشکل کشا وہی تصویر ہے جو ہر کرنسی نوٹ پر نظر آتی ہے۔ قومی بے غیرتی کی انتہا یہ ہے کہ سو کے نوٹ والی تصویر کو رشوت کی اکائی بنا دیا گیا ہے۔

میں نے ہر جگہ مدد کے لیے نمودار ہونے والے فرشتۂ غیب یعنی ایجنٹ سے پوچھا ''کیا نذرانہ پیش کرنا ہوگا مجھے اس کارِ خیر کا؟''

اس نے پلک جھپکائے بغیر پانچ انگلیاں دکھائیں۔ ''پانچ قائداعظم سر! پانچ منٹ میں سامان کلیئر ہو جائے گا۔''

میرے پاس پاکستانی کرنسی نہیں تھی۔ ایجنٹ نے پانچ پاؤنڈ بڑی خوشی سے قبول کیے اور چند منٹ میں میرا اسباب باہر آ گیا۔ ایجنٹ نے بڑے خلوص سے ہاتھ ملا کے کہا ''میرا نام یاد رکھیے گا جناب! اسلم راہی' آپ کا خادم! میرا کارڈ رکھ لیں' اس پر میرا موبائل نمبر بھی ہے۔''

میں نے کارڈ لینے سے انکار کر دیا ''اسلم راہی...... آئندہ ہم دوزخ میں ہی ملیں گے۔''

اس کی شکل پر بارہ بج گئے ''ہیں جی!''

''ہاں جی۔ رشوت لینے والا اور دینے والا دونوں جہنمی اور جو اس پر یقین نہ رکھے وہ کافر۔''

اپنے ٹریول ایجنٹ کی نااہلی کے باعث مجھے کراچی سے لاہور جانے والی پہلی فلائٹ پر جگہ نہیں ملی تھی۔ لاہور میں تبلیغی جماعت کے اجتماع میں جانے والوں کا اتنا رش تھا کہ آئندہ تین دن تک چانس پر بھی سیٹ دستیاب نہ تھی۔ تاہم اس نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ کوئی چکر چلائے گا اور اس نے نائٹ کوچ میں میرے لیے جگہ نکال لی تھی۔ اب مجھے آٹھ نو گھنٹے ایرپورٹ کے نزدیک ہی کسی ہوٹل میں گزارنے تھے۔

میں ٹرالی کو دھکیلتا اور ٹیکسی والوں کی یلغار کا مقابلہ کرتا باہر آیا تو میری نگاہ اس شخص کو تلاش کرتی رہی جس نے مجھے میرا نام تو بتا دیا تھا مگر اپنا نام بڑی ہوشیاری سے گول کر گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ تم نے اچھا کیا واپس آ گئے' یہی بات کسی نے مارتھا کو فون کر کے بھی کہی تھی۔ اس سے میرے شک کو تقویت حاصل ہوئی تھی کہ وہ لندن سے میرے پیچھے لگا ہوا تھا اور میری واپسی کو یقینی بنانے کے مشن پر مامور تھا۔ آخر کون تھا وہ؟

اس نے راہ چلتے ایک ایسی جگہ مجھ سے بات کی تھی جہاں میں اس کا گریبان پکڑ کے سوال نہیں کر سکتا تھا کہ آخر یہ کیا چکر ہے؟ تم میرے بارے میں کیا جانتے ہو اور کیوں میرا پیچھا کر رہے ہو؟ اپنے بارے میں کچھ بتانے سے کیوں گریز کر رہے ہو؟ اس سرنگ جیسے راستے پر میں اس سے جھگڑا کرتا تو خود تماشا بن جاتا۔ وہ انجان اور معصوم بن کے کہتا کہ میں نے تو آپ سے صرف کسی اچھے ہوٹل کا نام پوچھا تھا۔ معلوم نہیں تو ناراض کیوں ہوتے ہو؟

اب وہ غائب ہو چکا تھا اور میرے پاس اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کا صرف ایک راستہ تھا جو بہت مشکل تھا۔ میں اس کی سیٹ نمبر کے حوالے سے پسنجرز لسٹ دیکھوں اور کوئی چکر چلا کے اس کے شناختی کارڈ نمبر یا پاسپورٹ سے اس کا نام پتا حاصل کروں۔ کوئی ایجنٹ میری یہ مشکل بھی آسان کر دیتا مگر فوری طور پر میں اس چکر میں پڑنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا تھا۔

لاؤنج کی ایرکنڈیشنڈ فضا سے باہر آ کے مجھے پسینہ آنے لگا۔ یہ نومبر کا مہینا تھا مگر کراچی میں دن کے وقت باقاعدہ گرمی تھی اور بہت زیادہ رطوبت میں پسینہ آنا ایک فطری بات تھی۔ میں نے اپنے کوٹ کی جیب سے رومال نکالا تو میری انگلیاں کاغذ کے کسی پرزے سے ٹکرائیں۔ میرے ذہن میں ایک سوالیہ نشان بن گیا کیونکہ میں نے اس جیب میں کوئی ایسی چیز نہیں ڈالی تھی۔

میں نے اس پرزے کو نکالا۔ یہ چھوٹا سا فولڈ کیا ہوا سفید کاغذ تھا جس پر صرف ایک جملہ لکھا ہوا تھا۔ ''دوبارہ لندن کا رخ کیا تو تمہیں ون وے ٹکٹ پر دوسری دنیا میں بھیج دیا جائے گا۔''

میں نے اس جملے کو کئی بار پڑھا حالانکہ وہ مجھے پہلی نظر ڈالتے ہی ازبر ہو گیا تھا۔ اس کے مضمون میں کوئی پیچیدگی یا سمجھ میں نہ آنے والی کوئی بات نہیں تھی۔ میں اسے بہت دیر تک گھورتا رہا۔ میری نظر میں اس شخص کا چہرہ تھا جس نے اپنے بیگ کو میرے شولڈر بیگ سے ٹکرایا تھا اور یقیناً اسی وقت جیب تراشوں کی طرح ہاتھ کی صفائی دکھاتے ہوئے یہ پیغام میری جیب میں منتقل کر دیا تھا۔ نہ میں نے کچھ محسوس کیا تھا اور نہ کسی تیسرے شخص نے کچھ دیکھا تھا۔ تاہم غور طلب بات یہ

تھی کہ تحریری طور پر مجھے وارننگ دینے کے بعد اس کو مجھ سے بات کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ تم نے اچھا کیا پاکستان آ گئے۔ کیا وہ مجھ پر اپنی موجودگی ظاہر کر کے مجھے ہراساں کرنا چاہتا تھا؟

قتل کی اس کھلی دھمکی کا مفہوم میرے ذہن میں الجھن کا سبب بن گیا تھا۔ یہ دھمکی کس کی طرف سے تھی؟ جن پر میں شک کر سکتا تھا ان میں پہلا نام صفدر سلطان کا تھا لیکن اسے دھمکی دینے کے لیے یہ پُراسرار طریقہ اختیار کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ مجھے براہِ راست میرے سامنے آ کے یا فون کر کے بھی دھمکی دے سکتا تھا۔ میرا لوٹ کر لندن جانے کا قطعی کوئی ارادہ نہیں تھا۔ یہ بات میں نے ہر جگہ سب سے کہی تھی اور اپنے مستقبل کے پلان کو بالکل واضح کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ چار ماہ بعد فریال کو خود بھی پاکستان لوٹ کر آنا تھا۔ ایسی صورت میں میرے لندن جانے سے صفدر سلطان کو کیا پریشانی ہو سکتی تھی؟

اچانک مجھے احساس ہوا کہ ایک ٹیکسی ڈرائیور جو باقی سب سے میرا سامان چھین لینے میں کامیاب ہو گیا تھا بہت دیر سے منتظر ہے کہ میں تشریف رکھوں۔ اس نے میری اجازت کے بغیر ہی سامان ڈکی میں رکھ دیا تھا۔

میں نے کہا ''دیکھو۔ مجھے نائٹ کوچ سے لاہور جانا ہے اس لیے قریب ترین ہوٹل لے چلو۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا ''سب ہوٹل بک ہیں سر جی! لیکن پی سی میں میری ذمے داری۔ اور نائٹ کوچ کی آپ فکر مت کریں' میں خود آپ کو لینے آ جاؤں گا۔''

وہ غالباً ہوٹل کے کسی ایجنٹ کا ایجنٹ بھی تھا اور پی سی کا مشورہ اس نے محض زیادہ فاصلے کا زیادہ کرایہ وصول کرنے کے لیے دیا تھا۔ ایرکنڈیشنڈ ٹیکسی میں بیٹھ کے مجھے کچھ سکون ملا۔ ٹیکسی شاہراہ فیصل کی ٹریفک سے گزرتی گئی اور میں اپنے دوطرفہ عذاب کے بارے میں سوچتا رہا۔ اچانک اور ایک ہی وقت میں میرے دو دشمن سامنے آ گئے تھے۔ ایک گن پوائنٹ پر مجھے لندن میں روکنا چاہتا تھا' دوسرا دھمکی دے رہا تھا کہ میں نے لندن نہ چھوڑا تو مجھے دنیا چھوڑنی پڑے گی۔ ایک مجھے آگے دھکیل رہا تھا دوسرا پیچھے۔

ہوٹل پہنچ کے میں نے کوٹ اور ٹائی سے نجات حاصل کی اور جوتے اتارے بغیر بیڈ پر دراز ہو گیا۔ روم سروس سے کافی طلب کرنے کے بعد میں نے پھر وہ کاغذ کا پرزہ نکالا اور اس کی تحریر کو گھورتا رہا جیسے شرلاک ہومز کی طرح اسی سے میں ہر سراغ لگا لوں گا۔ اس معاملے میں اب میرے لیے شک کی کوئی بات نہیں رہی تھی کہ میرے ساتھ لندن سے جہاز پر سوار ہونے والا وہ شخص اسی خدمت پر مامور تھا کہ میری لندن سے واپسی کو یقینی بنائے اور کراچی پہنچ کے رپورٹ ارسال کرے کہ رفیق کی طرف سے پریشانی کی کوئی بات نہیں رہی۔

کافی پیتے ہوئے میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس قسم کی رپورٹ سے صرف ایک فرد کو دلچسپی ہو سکتی تھی۔ عائشہ کی ماں لیڈی سیلیا ارنسٹ کو۔ وہ شخص یقیناً اسی کا واچ ڈوگ تھا۔ اس کی دھمکی مجھ تک پہنچانے کے بعد وہ لندن واپس چلا جائے گا اور لیڈی سیلیا ارنسٹ کو اطمینان دلائے گا کہ فکر کی اب کوئی بات نہیں رہی۔

مجھے پاکستان پہنچانے کا بندوبست بھی بہت پہلے ہی کیا گیا ہوگا۔ عائشہ کی ماں طے کر چکی ہوگی کہ خواہ بیٹی کو قتل کرنا پڑے یا مجھے مگر وہ اپنی عالی نسبت خالص انگریز بیٹی کی شادی ایک کالے اور پاکستانی مسلمان سے ہرگز نہیں ہونے دے گی۔ گیارہ ستمبر کے بعد حالات بھی سازگار ہو گئے تھے۔ اگر میں عزت و آبرو کے ساتھ نہ جاتا تو اس بات کا انتظام کیا جا سکتا تھا کہ مجھے دہشت گردی کے شبہے میں ملک بدر کر دیا جائے۔ میں برطانوی شہری نہیں تھا کہ اپنے حقوق کی جنگ لڑ سکتا اور محض پاکستانی مسلمان ہونے کی بنا پر عائد کیے جانے والے الزام کو تعصب اور ذاتی عناد کا نتیجہ قرار دے سکتا۔ ہوم آفس کا ایک فیصلہ مجھے ڈی پورٹ کرانے کے لیے کافی ہوتا اور ہوم آفس...... لیڈی سیلیا ارنسٹ کو کبھی مایوس نہ کرتا۔

عائشہ نے قانونی خودمختاری اور باپ کی حمایت سے بغاوت کا علم تو بہت پہلے بلند کر دیا تھا اور ماں بیٹی اپنی فتح و شکست کو انا کا مسئلہ بنا کے آمنے سامنے تھیں مگر میرے ساتھ پاکستان بھاگ جانے کا فیصلہ عائشہ نے مکمل رازداری کے ساتھ کیا تھا۔ اس نے تو مجھے یہ بات آخر میں بتائی تھی لیکن اس کا ارادہ زبردستی میرے ساتھ آنے کا بہرحال نہیں تھا ورنہ وہ مجھ سے پہلے جہاز میں موجود ہوتی۔

لیکن درونِ خانہ لیڈی سیلیا ارنسٹ کے کسی ہمدرد یا مددگار نے عائشہ کی تیاری کا راز فاش کر دیا ہوگا اور چالاک ماں نے ہنگامی طور پر ایسے انتظامات کر لیے ہوں کہ عائشہ میرے ساتھ پاکستان نہ جانے پائے۔ ممکن ہے اس نے عائشہ کو بھی زبردستی روکنے کی پوری تیاری کی ہو۔ جہاز پر عائشہ کی سیٹ خالی نہیں رہ سکتی تھی۔ اس کے لیے ایک نمک خوار کو نامزد کر دیا گیا اور چانس پر رہنے والی سیٹ آخری وقت میں اسے دے دی گئی۔ لیڈی سیلیا ارنسٹ کے اثر رسوخ اور دولت کے دائرۂ اختیار میں سب کچھ تھا۔

اس منطقی نتیجے پر پہنچ جانے کے بعد مجھے اس پر سخت طیش آیا۔ میں نے سوچا کہ میں ہوٹل سے عائشہ کی ماں کو کال کر کے اچھی طرح بے عزت کروں۔ اگر میں عائشہ سے شادی کرنا چاہتا تو کیا وہ مجھے روک سکتی تھی؟ اگر میں اسے اپنے ساتھ لانا چاہتا تو کیا وہ میرا راستہ بلاک کر سکتی تھی اور آج کے بعد بھی اگر میں عائشہ سے ملنا چاہوں یا وہ پاکستان آنا چاہے تو کیا اس کی بدمعاشی چلے گی؟ اس کی بیٹی عاقل وبالغ ہے اور اپنے قانونی حقوق رکھتی ہے۔ پھر لیڈی سیلیا ارنسٹ ایسی احمقانہ بلکہ مجرمانہ سوچ کیوں رکھتی ہے؟

پھر مجھے خیال آیا کہ میں عائشہ کو سب بتادوں یا اس کے باپ کو مطلع کر دوں لیکن میرے پاس ثبوت کوئی نہیں تھا۔ ایک سادے کاغذ پر لکھی ہوئی ایک سطر سے کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا تھا۔ وہ شخص جو تیس سیکنڈ میں اپنا کام کر کے نکل گیا تھا کوئی اجنبی تھا جس کا نام بھی مجھے معلوم نہ تھا لیکن اب اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ عائشہ میرے لیے یادِ ماضی ہوگئی تھی۔ میں مناسب وقت پر اپنے حالات کی مجبوری کو عذر بنا کے اس کی زندگی سے نکل آیا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ قطعی لاتعلقی کا رویہ ہی عائشہ کے حق میں بہتر ہوگا۔ وقت سب سے بڑا بازی گر ہے۔ سال دو سال بعد سب ویسا ہی ہوجائے گا جیسا کہ ہماری ملاقات سے پہلے تھا۔

میں نے کاغذ کے اس پرزے کو پھاڑ کر پھینک دیا۔ سوچا تو میں نے یہ تھا کہ میں اپنے مستقبل کا ایک کلین سلیٹ کے ساتھ آغاز کروں جس پر عمرِ رفتہ کی کوئی تحریر نہ ہو۔ مجھے دوستیوں' دشمنیوں' کامیابیوں اور ناکامیوں کا یہ سفر زیرو ریڈنگ سے شروع کرنا تھا چنانچہ عائشہ کو عذابِ رفتہ اور ماضی کی ایک یاد سے زیادہ اہمیت دینا لا حاصل تھا۔

تاہم میرے ارادے کو ماضیٔ بعید کے ایک ایسے دَور سے شکست کا سامنا تھا جسے میں نے اپنی چھ سالہ جلاوطنی میں بالکل بھلا دیا تھا اور بہت مطمئن تھا کہ میرے مستقبل پر کسی آسیب کا سایہ نہیں۔ صورتِ حالات یکلخت پلٹ گئی تھی اور عدم تحفظ کا احساس مجھ پر غالب آ رہا تھا۔

مجھے معلوم تھا کہ میرے گھر والے کتنی بے تابی سے میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ انہیں میں نے لندن سے روانگی کا وقت بہت پہلے بتادیا تھا۔ ابا مجھے ریسیو کرنے کے لیے کراچی آنا چاہتے تھے مگر میں نے انہیں روک دیا کہ کسی ناگزیر وجہ سے میرے شیڈول میں گڑبڑ ہوگئی تو انہیں کراچی میں پریشانی ہوگی۔ ابا پھر بھی بضد تھے کہ پریشانی کیسی؟ کراچی ہی ہمارا شہر ہے۔ ساری زندگی تو وہیں گزاری تھی۔ ہر جگہ دوست ہیں۔ ان کی بات غلط نہیں تھی۔ خود میں نے پیدائش سے گریجویشن تک اپنا سارا وقت وہیں گزارا تھا۔ اس کے باوجود میں نے ابا کو سختی سے منع کیا کہ وہ کراچی کا رخ نہ کریں۔ آٹھ سال قبل مجھے اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن بھیجنے سے قبل ہی انہوں نے بھی بہتر یہی سمجھا تھا کہ لاہور منتقل ہوجائیں۔ جو مکان انہوں نے ریٹائرمنٹ کے بعد ملنے والی گریجویٹی کی رقم سے 1971ء میں تعمیر کیا تھا' وہ تیئس سال بعد فروخت کر دیا گیا اور 1994ء میں ہم نے چوبرجی سے آگے ملتان روڈ پر نیو چوبرجی پارک اسکیم کا ایک گھر خرید لیا جو تیرہ مرلے پر بنا ہوا تھا۔ ابتدا میں یہ سنگل اسٹوری اسٹرکچر تھا۔ جب میں نے پنجاب یونیورسٹی سے اکنامکس میں ایم اے کرلیا تو کچھ میری خواہش اور کچھ خوف کی وجہ سے ابا نے مجھے ایم بی اے کے لیے امریکا روانہ کر دیا۔ اس مکان کی دوسری منزل بعد میں ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن سے قرضہ لے کر مکمل کی گئی۔ اوپر اب کرائے دار رہتے تھے اور ہر ماہ ملنے والے کرائے سے قرض کی قسط ادا کرنے کے بعد بھی ابا کو پہلے دو ہزار اور اب چار ہزار بچ رہے تھے۔ ان کی چار ہزار کی پنشن دگنی ہوگئی تھی۔

خاندانی تاریخ کے پرانے حوالے ہمیں جدی پشتی طور پر ضلع جہلم کا باسی ثابت کرتے تھے جو راولپنڈی اور لاہور کے درمیان کا علاقہ ہے۔ ابا نے سی ایس ایس کیا تھا اور ملازمت کے سلسلے میں پنجاب اور سندھ کے مختلف شہروں میں رہ چکے تھے مگر ہمارے خاندان کے دیگر افراد آج بھی راولپنڈی اور لاہور کے شہروں میں موجود تھے۔ اب اچانک پرانی حویلی نے ہمیں پھر وہیں کھینچ لیا تھا جہاں سے ابا نے اور ان کے ابا نے خانہ بدوشی کا سفر شروع کیا تھا۔ پوری ایک صدی کی مسافرت کے بعد وقت کی ایک کروٹ نے ہمارے شجرہ نسب پر پڑی ہوئی گرد صاف کر کے پانچویں چھٹی نسل کے وارثوں کے مستقبل کی سمت بدل ڈالی تھی۔ شاید ابا اس سے خوش تھے اور اس میں فخر بھی محسوس کرتے ہوں گے۔ میرے لیے یہ ایک دلچسپ اور پُرتجسس احساس تھا۔ ایک ایسا تجربہ تھا جس میں سنسنی خیزی تھی۔ شاید ویسی ہی جو کولمبس نے امریکا کی دریافت کے بعد محسوس کی ہوگی۔ آگے کچھ ہے جو بہت غیر معمولی ہے مگر کیا ہے...... یہی اسرار میری واپسی کو ایک ایڈونچر بناتا تھا۔

میں اپنے خیالات میں اتنا محو تھا کہ مجھے رات کا اندھیرا پھیلنے کی خبر بھی نہ ہوئی۔ کمرے میں صرف ایک لائٹ جل رہی تھی اور یہ ہلکی سی روشنی میرے اعصاب کے لیے بڑی پُرسکون ثابت ہورہی تھی۔ کہیں میرے لاشعور میں ایک

پُرخوف انتظار تھا۔ لندن سے تو میں بھاگ آیا تھا مگر اب کیا ہوگا؟ اس بارے میں سوچ کر میں مزید پریشان ہونا نہیں چاہتا تھا۔ میرا ذہنی رویہ اب یہی تھا کہ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ اچھا ہوگا یا برا ہوگا' میں اس کا مقابلہ اعتماد سے کروں گا۔

اچانک فون کی گھنٹی بجی تو میں چونکا۔ میں نے کمرے کی لائٹس جلا کے ریسیور اٹھایا اور کہا "ہیلو!"

"سر! آپ سے کوئی ملنے آیا ہے"۔ آپریٹر نے شائستگی سے کہا۔

یکلخت میرے سارے حواس بیدار ہوگئے۔ میرے کسی دوست آشنا کو علم نہیں تھا کہ میں کراچی کے کس ہوٹل میں مقیم ہوں۔ یہ صرف وہی جانتے تھے جو لندن سے کراچی تک میری نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ ان کو آنا ہی تھا اور وہ آگئے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ پوری تیاری کے ساتھ آئے ہوں گے۔ اپنی کہنے اور منوانے کے لیے۔

آپریٹر نے کچھ توقف کے بعد کہا "سر! آپ ان سے ملنا چاہیں گے یا نہیں؟"

میں نے کہا "کتنے لوگ ہیں' نام کیا ہے ان کے؟"

"دو سر! شہاب الدین اور محمد عمر۔"

میں نے کہا "ان میں سے ایک کو بھیج دو لیکن اس کی شناخت کے بعد' نام پتا نوٹ کرنے کے بعد۔"

"یس سر!"

"ایک اور بات...... اپنی سکیورٹی سے کہو' یہ دیکھ لیں کہ وہ مسلح نہیں ہے۔"

آپریٹر شاید تذبذب میں پڑگئی "ایک منٹ سر!" اس نے کسی سے مشورہ کیا اور پھر بولی "کیا یہ بہتر نہیں ہوگا سر...... کہ آپ ان سے لاؤنج میں مل لیں؟"

"یہ فیصلہ مجھے کرنے دو کہ کیا بہتر ہے؟" میں نے کہا اور فون رکھ دیا۔

صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے ذہنی طور پر میں بالکل تیار تھا۔ جسمانی طور پر بھی میں ایک کا نہیں دو کا مقابلہ کرسکتا تھا بشرطیکہ وہ مسلح نہ ہوں۔ میرے پاس کوئی ریوالور نہیں تھا لیکن لندن میں حاصل کی ہوئی جوڈو کراٹے کی چھ ماہ کی تربیت نے مجھے خالی ہاتھوں سے اپنا دفاع کرنا سکھادیا تھا۔ میرے جاپانی استاد کو ہمیشہ ملال رہا کہ میں نے بلیک بیلٹ کے لیے ٹریننگ مکمل نہیں کی ورنہ مجھ میں ایک قدرتی صلاحیت اور لگن موجود تھی۔

محمد عمر میرے لیے نیا نام تھا۔ شہاب الدین کی آمد میرے لیے قطعی غیر متوقع تھی۔ وہ چیف کی عدم موجودگی میں تنظیم کے قائم مقام چیف کے طور پر کام کر رہا تھا اور کراچی میں رہتا تھا۔ اس مقام تک پہنچنے میں اسے بیس سال لگے تھے۔ وہ پیشے کے اعتبار سے انجینئر تھا اور جب میں تعلیم کے بہانے ملک سے فرار ہوا تھا تو وہ پنجاب کا صوبائی چیف تھا۔ میری اس سے براہِ راست شناسائی نہیں تھی کیونکہ میں بہت نچلی سطح کا کارکن تھا اور مجھے سندھ کا چیف کنٹرول کرتا تھا۔ وہ دو سال پہلے لاپتا ہوگیا تھا۔

شہاب الدین کی آمد سے میں نے اندازہ کیا کہ معاملہ انتہائی اہم اور پرسّل ہوگا ورنہ اشرف چیتا جیسا کوئی کارکن اس کا پیغام مجھ تک پہنچا دیتا یا مجھے ساتھ لے جا کے شہاب الدین کی خدمت میں پیش کر دیتا۔

دروازے پر دستک ہوئی تو میں بالکل سامنے صوفے پر تیار بیٹھا تھا۔ میں نے بارعب اور پُراعتماد انداز میں کہا "یس!"

شہاب الدین مسکراتا ہوا اندر آگیا۔ چیف کے مقابلے میں اس کی شخصیت زیادہ متاثر کرنے والی تھی۔ وہ گورا چٹا اور وجیہہ ہونے کے ساتھ خوش پوش بھی تھا اور ہمیشہ سوٹ میں نظر آتا تھا۔ امپورٹیڈ کپڑے کے سوٹ' بہترین سلے ہوتے تھے اور وہ ٹائی بھی بہت سلیقے سے استعمال کرتا تھا۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ وہ مہذب اور خوش اخلاق بھی تھا اور بہت اچھا خاندانی بیک گراؤنڈ رکھتا تھا۔ کوئی اندازہ نہیں کرسکتا تھا کہ اس شائستہ اور نرم خو شخصیت کے پردے میں کتنا سفاک اور عیار شخص چھپا ہوا ہے۔ تنظیمی امور اور ڈسپلن کے معاملے میں وہ انتہائی سخت گیر تھا اور معاف کرنے کا قائل نہیں تھا۔ وہ بڑی شرافت سے مسکراتے ہوئے کسی بھی دوست یا دشمن کے لیے سزائے موت کے احکامات جاری کرسکتا تھا۔ یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ معمولی غلطی پر وہ کیا کارروائی کرے گا۔ چیف کی نمبر دو کی پوزیشن اپنی جگہ تھی مگر اس کا تاثر ایک فیملی کے سربراہ جیسا تھا جو بیک وقت سختی سے بھی کام لیتا تھا مگر نرمی برتنا بھی جانتا تھا۔ مشہور یہی تھا کہ سختی کے لیے وہ شہاب الدین کے ذریعے احکامات پر عمل درآمد کراتا تھا۔

میں نے پورے اعتماد کے ساتھ شہاب الدین کا اٹھ کر استقبال کیا اور ہاتھ ملا کے اسے اپنے ساتھ بیٹھنے کی دعوت دی مگر وہ میرے مقابل بیٹھ گیا۔ میں نے اس سے چائے کے لیے پوچھا۔

اس نے سرہلایا "چائے میں ضرور پیوں گا...... اور آپ کا تھوڑا سا ٹائم بھی لوں گا۔"

"آپ" اس کے طرزِ تخاطب نے مجھے حیران کیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

سوائے چیف کے وہ کسی کو آپ نہیں کہتا تھا۔ میں نے کہا ''آپ نے زحمت کی یہاں آنے کی۔''

اس نے کہا ''مجھے آنا پڑا...... چیف نے کہا تھا کہ میں خود آپ سے ملاقات کر کے صورتِ حال واضح کروں۔ اگر آپ چیف سے مل لیتے تو وہیں بات ہو جاتی اس مسئلے پر۔''

میں نے کہا ''کون سا مسئلہ؟ اور چیف سے میں کیسے ملتا۔ مجھے واپس آنا تھا۔ میرا پروگرام طے تھا۔''

اس نے کہا ''ہاں' یہ بات ہمیں دیر سے معلوم ہوئی۔ پھر بھی کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ آپ کچھ دن اور لندن میں قیام کی مدت بڑھا دیتے۔''

اس کا یہ مؤدب اور عاجزانہ لہجہ میرے اضطراب میں اضافہ کر رہا تھا۔ میں منتظر تھا کہ کسی بھی لمحے وہ اتنی ہی شرافت سے اور نرمی سے بات کرتے کرتے کہے گا کہ رفیق صاحب! آپ تو جانتے ہیں تنظیم میں حکم عدولی ایک سنگین جرم تصور کیا جاتا ہے۔ چیف کے احکامات کو نظر انداز کرنے کے علاوہ آپ نے یہ پیغام پہنچانے والے اشرف کو مارا اور لندن سے بھاگ اٹھے۔ اب آپ کو مرنا پڑے گا۔

روم سروس کا ویٹر چائے لایا تو میں نے اسے ایک کپ بنا کے پیش کیا۔ ''سوال یہ ہے شہاب صاحب کہ لندن میں مجھے کوئی ایسا کام نہیں تھا پھر میں وہاں کیوں رکتا؟''

اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا مگر آپ کا چیف سے ملنا ضروری تھا۔ آپ کا یوں فرار ہونا قطعی نامناسب بات تھی۔''

''فرار ہونا۔ لاحول ولاقوۃ۔ شہاب صاحب میں بہت پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق آیا ہوں۔''

اس نے کچھ سوچتے ہوئے خودکلامی کے انداز میں کہا ''اس کا یہ مطلب ہے کہ...... اشرف چیتا آپ سے نہیں ملا؟''

اس کے شک و شبہے سے میرا حوصلہ بڑھ گیا ''کیا وہ ایسا کہتا ہے؟'' میں نے کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا ''وہ تو کچھ کہنے کے قابل بھی نہیں رہا۔''

میں نے ظاہری بے نیازی سے پوچھا ''کیا مطلب؟''

شہاب نے چائے کی پیالی میز پر رکھ دی ''دماغ کی چوٹ سے اس کی یادداشت اور گویائی متاثر ہوئی ہے۔''

میرے لیے یہ ایک خوش خبری تھی کہ اشرف چیتا مرا نہیں تھا اور مجھ پر قتل کا کوئی الزام نہیں تھا۔ میں نے اس کا سر بڑے انتقامی جذبے کے ساتھ اسٹیئرنگ وہیل پر مارا تھا۔ اس کا شیطانی دماغ اندر سے الٹ پلٹ ہو گیا تھا۔ میرے دل سے دعا نکلی کہ خدا کرے اس کی یادداشت روٹھ کے میکے جانے والی بیوی کی طرح کچھ عرصے بعد واپس نہ آئے۔ طلاق لے کر جانے والی بیوی کی طرح کبھی نہ آئے۔

اب میں نے زیادہ اعتماد کے ساتھ اداکاری کی ''اشرف چیتا...... یہ وہی تو نہیں ہے' جو پہلے چیف کا باڈی گارڈ تھا' وہ زندہ ہے؟''

شہاب الدین نے سر ہلایا ''دو سال سے وہ بھی لندن میں تھا۔ چیف نے اسے تمہارے پاس بھیجا تھا۔''

''اچھا......'' میں نے حیرانی کا اظہار کیا ''کب؟''

''کل رات...... آج صبح پولیس نے اسے اپنی گاڑی میں بے ہوش پڑا ہوا پایا اور اسپتال پہنچا دیا۔ کسی نے اسے بڑی بے رحمی سے مارا۔''

میں نے کہا ''چیتا تو خود بڑا خونخوار تھا۔ اسے کس نے مارا؟''

''یہ تو وہ خود ہی بتائے گا۔ پولیس نے اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کیا لیکن چار گھنٹے بعد اندازہ ہوا کہ اس کا ذہنی توازن بگڑ گیا ہے۔ اس نے کسی کو پہچانا نہیں اور اپنا نام بھی نہیں بتا سکا۔''

میں نے واجبی سی دلچسپی سے کہا ''وہ ایکٹنگ تو نہیں کر رہا تھا۔''

شہاب الدین نے کہا ''اوّل تو اسے ایکٹنگ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ پھر ایکٹنگ چلتی بھی نہیں' ڈاکٹر سمجھ جاتے ہیں۔''

''اچھا' ڈاکٹر کیا کہتے ہیں...... اس کی ایسی حالت کب تک رہے گی؟'' میں نے کہا ''یہ پاگل پن عارضی ہے یا مستقل؟''

''فی الحال کوئی کچھ نہیں بتا سکتا۔ ڈاکٹرز کا کہنا ہے کہ وہ اچانک ٹھیک ہو سکتا ہے...... اور ٹھیک ہونے میں اسے زیادہ وقت بھی لگ سکتا ہے۔''

میں نے کہا ''چھ سال بعد چیف کو میرا خیال کیسے آ گیا تھا؟ کیوں بھیجا گیا تھا اشرف کو میرے پاس؟''

شہاب الدین نے پہلو بدلا اور جیب سے سگریٹ نکال کے اخلاقاً سوال کیا ''آئی ہوپ یو ڈونٹ مائنڈ......'' ایک میری طرف بڑھایا۔

میں نے کہا ''تھینکس! میں نہیں پیتا لیکن آپ جاری رکھیں۔''

شہاب الدین نے سگریٹ کا ایک کش لے کر دھواں آہستہ آہستہ خارج کیا ''آپ نے تنظیم کے لیے بڑے جوش اور ولولے سے بہت اچھا کام کیا تھا لیکن پھر آپ اچانک امریکا چلے گئے۔''

میں نے کہا ''جی...... والد چاہتے تھے میں اعلیٰ تعلیم حاصل کروں۔''

وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا ''آپ نے ہاورڈ سے ایم بی اے کیا ہے۔ گزشتہ دو سال سے آپ لندن میں تھے۔ آپ کو تنظیم میں اعلیٰ عہدہ دیا جا سکتا تھا۔ آپ لندن میں چیف کے مشیرِ اعلیٰ ہو سکتے تھے۔''

میں نے کہا ''اب میرے حالات اس کی اجازت نہیں دیتے۔ میرے والدین کی عمر کافی ہے اور ان کی صحت بھی ٹھیک نہیں رہتی۔ میرے سوا ان کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ نہ لندن میں رہ سکتے تھے اور نہ امریکا میں۔ اسی لیے مجھے واپس آنا پڑا۔ حالانکہ وہاں میرے لیے ترقی کے بہت اچھے مواقع تھے۔''

شہاب الدین نے سر ہلایا ''میں آپ کی مجبوری کو سمجھتا ہوں۔ خود چیف آپ کے حالات سے پوری طرح باخبر ہے۔ ہم ہرگز آپ کے لیے کوئی مشکل پیدا کرنا نہیں چاہتے لیکن ایک کام ایسا تھا جو آپ ہی کر سکتے تھے۔''

میں نے ہمت کر کے کہا ''شہاب الدین صاحب! آئی ایم سوری! فی الحال میرے لیے یہ ممکن ہی نہیں کہ میں تنظیم کو وقت دوں۔''

''یہ کام ایسا نہیں...... میرا مطلب ہے' آپ کو پرابلم کوئی نہیں ہو گی۔'' شہاب الدین نے کہا اور پھر کچھ دیر سوچتا رہا ''لندن میں آپ کی ایک دوست ہیں جو پہلے ایشا ارنسٹ تھیں' اب مسلمان ہونے کے بعد عائشہ خاتون ہو گئی ہیں۔''

میں نے عائشہ کے نام پر اپنے اضطراری ردِعمل کو چھپانے کی پوری کوشش کی ''آپ کی انفارمیشن درست ہے۔''

وہ مسکرایا ''ہماری معلومات کے مطابق وہ آپ کے ساتھ ہی پاکستان آنے والی تھیں' اسی فلائٹ سے۔''

''یہ بھی ٹھیک......''

''چیف کو آپ کے اور عائشہ کے قریبی تعلق کا علم اچانک ہوا اور آخری دن...... اس وقت یہ ضروری ہو گیا کہ آپ کو روکا جائے۔''

''اشرف اسی لیے گیا تھا۔ مگر بدقسمتی سے آپ تک پہنچ نہیں پایا...... مس عائشہ کیوں نہیں آئیں' آپ کے ساتھ؟''

میں نے کہا ''کیا یہ جاننا آپ کے لیے ضروری ہے؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا ''نہیں' ہماری معلومات کے مطابق عائشہ نے آپ کی وجہ سے اسلام قبول کیا تھا۔''

''وہ سوچ سمجھ کے مسلمان ہوئی تھی۔''

شہاب الدین نے میری بات کو قابلِ غور نہیں سمجھا ''وہ آپ سے شادی کرنا چاہتی تھی لیکن آپ کے والدین راضی نہیں تھے۔ ہماری انفارمیشن مکمل ہے رفیق صاحب! مگر میں یہاں آپ کے لوافیئر پر بات کرنے نہیں آیا ہوں۔''

شہاب الدین نے اچانک پینترا بدل لیا تھا۔ میں نے محتاط ہو کے کہا ''پھر آپ ہی فرمائیے بات کیا ہے؟''

شہاب الدین نے کہا ''عائشہ کے والد لارڈ ارنسٹ کا برطانوی ہوم آفس میں بہت اثر رسوخ ہے۔ وہ خارجہ تعلقات کی کمیٹی کے مشیر برائے ساؤتھ ایشیا بھی ہیں۔''

مجھے اس تمہید کے ساتھ ہی صورتِ حال کی ایک تصویر نظر آنے لگی مگر میں نے شہاب الدین کو بولنے دیا۔

''ایک زمانے میں برطانیہ جانے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ بہت سے لوگوں نے مذہبی اور سیاسی بنیادوں پر سیاسی پناہ بھی حاصل کر لی تھی مگر اب بڑی مشکلات پیدا ہو گئی ہیں۔''

میں نے کہا ''کیا چیف کے لیے کوئی پریشانی پیدا ہو گئی ہے؟ برطانوی حکام ان کی سیاسی پناہ کی مدت میں توسیع نہیں کر رہے ہیں؟''

اس نے کہا ''چیف کو کوئی پرابلم نہیں۔ اسے تو برطانوی شہریت دینے پر بھی غور ہو رہا ہے۔ مسئلہ ہے تین افراد کا۔ ان میں ایک میں ہوں' ایک پنجاب کا موجودہ صوبائی آرگنائزر

ہے گامے شاہ اور تیسرا ہے اشرف۔''

میں نے کہا ''اشرف کو اب پولیٹیکل سے زیادہ شاید مینٹل ASSYLUM کی ضرورت ہوگی۔''

''ہاں اگر وہ ٹھیک نہ ہوا۔''

''اسے کیا فرق پڑے گا اگر پاگل خانہ ولایتی نہ ہو۔''

شہاب الدین نے کچھ دیر بعد کہا ''ہم ایک بہتر آپشن پر بھی متفق ہیں۔ ایک پاگل کو اس سے بھی فرق نہیں پڑتا کہ وہ زندہ ہے یا مردہ؟ پاگل خانے میں ہے یا قبرستان میں۔ ہم اسے صحیح جگہ ضرور پہنچا دیں گے۔ نہ اس کے لیے پرابلم رہے گی نہ ہمارے لیے۔''

سفاکی شہاب الدین کی بے رحم فطرت کی عکاسی کرتی تھی۔ وہ ایسا شخص تھا جو ظاہر میں انتہائی مہذب نظر آنے کے باوجود اپنے باطن میں کسی خونخوار درندے سے کم نہ تھا۔ وہ ایسا شخص تھا جو تاش کی بازی کھیلتے ہوئے یا فیملی کے ساتھ ڈنر ٹیبل سے دومنٹ کے لیے اٹھ کے جا سکتا تھا اور کسی کے سر میں گولی مار کے واپس آتے ہی پتے اٹھا کے بازی یا اسی خوشگوار موڈ میں کھانا جاری رکھ سکتا تھا۔ وہ مجھے بتا رہا تھا کہ اشرف چیتا ٹھیک نہ ہوا تو اسے ٹھکانے لگا دیا جائے گا۔ وہ انسان نہیں تابعداری کی ایک مشین تھا جو خراب ہو جائے تو اسے جنک یارڈ میں پھینک دینا چاہیے۔ یہ کیا سوچنا کہ اس مشین نے کتنا عرصہ کیا خدمات سرانجام دی تھیں۔

''پھر پرابلم رہ جائے گی میری اور گامے شاہ کی۔ ہم دونوں کی درخواست سال بھر سے زیرِ غور ہے اور اگر فائل کو آگے بڑھانے کے لیے دھکا نہ لگایا گیا تو وہ وہیں رکھی رہے گی۔ خطرہ یہ بھی ہے کہ نگیٹو ریمارکس کے ساتھ واپس کر دی جائے۔''

''میں کیا کر سکتا ہوں اس سلسلے میں؟''

اس نے اپنی بات جاری رکھی ''اس کے متوازی دوسرا مسئلہ ہے ہمارے دو سیاسی حریفوں کا۔ ان کے لیے بھی سیاسی پناہ پر غور ہو رہا ہے اور شاید زیادہ ہمدردی کے ساتھ۔ کچھ رپورٹس ہیں ایمنسٹی کی اور ایک نیوز رپورٹر کی۔ انہوں نے الزام عائد کیا ہے کہ ہم نے اقتدار میں آنے کے بعد سرکاری مشینری کی مدد سے ان کے خلاف انتقامی کارروائی کی' اس میں بڑا مبالغہ ہے۔''

''یہ میڈیا والے آخر سمجھتے کیوں نہیں کہ ہمارے کلچر کی ایسی ہی روایات ہیں۔ خود ہمارے ساتھ انہوں نے یہی کیا تھا۔ آج ان کی باری آ گئی' یہ تو ہوتا رہے گا۔''

شہاب الدین نے میرے تبصرے کو نظر انداز کر دیا ''ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے حریفوں کی درخواست مسترد کر دی جائے۔ پھر حکومت کے پاس چار نہیں صرف کیس رہ جائیں گے۔''

''کیا یہ زیادہ آسان نہیں ہوگا کہ دو کیس یہیں ختم کر دیے جائیں'' میں نے کہا۔

''ہم کوشش کر رہے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ وہ روپوشی میں چلے گئے ہیں۔ اب ساری سچویشن سامنے آ گئی ہے تو میں آپ کے اس سوال کا جواب دوں گا کہ آپ کیا کر سکتے ہیں۔ ظاہر ہے براہِ راست تو کچھ نہیں کر سکتے آپ۔ یہ کام کرنا ہوگا لارڈ ارنسٹ کو۔''

''وہ ایک انتہائی مضبوط کردار کا آدمی ہے۔''

''مضبوط کردار والے آدمی کی کوئی کمزوری ضرور ہوتی ہے۔'' شہاب الدین مسکرایا ''لارڈ ارنسٹ کی کمزوری ہے اس کی اکلوتی بیٹی۔''

میں صدمے اور غصے پر قابو پانے کی کوشش میں کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ پھر میں نے دس تک گنا اور اٹھ کر پانی پیا۔ میں شہاب الدین کو گالیاں دے کے اور جوتے مار کے نکالنے کی وہ غلطی نہیں کرنا چاہتا تھا جو میرے مستقبل کو تباہ کر دے۔ بالآخر میں نے کہا ''آپ چاہتے ہیں میں عائشہ کو مجبور کروں؟''

''ہاں...... وہ دوست ہے تمہاری...... بلکہ دوست سے بھی زیادہ۔''

میں نے ایک گہری سانس لی اور ایک بار پھر روم سروس کو کافی کا آرڈر دینے کے بعد کہا ''شہاب الدین! شاید آپ کو پوری صورتِ حال کا اندازہ نہیں۔ آپ کی سیکریٹ سروس یقیناً بہت فعال تھی۔ میرا خیال تھا کہ انہیں کچھ پتا نہیں مگر وہ میرے شب و روز کے ہر لمحے پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ کسی حد تک انہیں میرے نجی معاملات کی خبر بھی ہوگی لیکن اصل صورتِ حال مختلف ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ عائشہ نے اس لیے اسلام قبول کیا تھا کہ اسے مجھ سے محبت تھی۔ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی تھی۔''

''اس کے جذبات تو آج بھی وہی ہیں'' وہ بولا۔

''رائٹ...... لیکن میں نے ایسا کبھی نہیں چاہا' نہ کبھی سوچا۔ میں نے ہمیشہ عائشہ کو سمجھایا کہ میں اس سے شادی کیوں نہیں کر سکتا لیکن وہ اپنی ضد پر قائم رہی اور الٹا مجھے یقین دلاتی رہی کہ وہ میرے ساتھ پاکستان میں خوش رہے گی خواہ میرے گھر' خاندان اور معاشرے کا ماحول کتنا ہی مخالف کیوں نہ ہو۔ خواہ میں دوسری' تیسری یا چوتھی شادی بھی کر لوں۔ وہ

ایک پاگل اور جذباتی لڑکی ہے۔ میں نے اسے صاف کہہ دیا تھا کہ میں ایک ہی شادی کروں گا مگر اس کے لیے میں کسی اور کے ساتھ جذباتی عہد کر چکا ہوں۔ بے شک عائشہ سے اچھی لڑکی میرے نزدیک کرۂ ارض پر موجود نہیں مگر یہ مسئلہ میرٹ پر انتخاب کا کبھی نہیں ہوتا۔ یہ تو ذاتی پسند کا معاملہ ہے۔ عائشہ ان دلائل اور حقائق کو تسلیم ہی نہیں کرتی۔ کسی کی نہیں سنتی۔ اس کی ماں میری دشمن ہو رہی ہے جیسے میں اس کی بیٹی کو ورغلانے کا ذمے دار ہوں۔ مجھے دھمکیاں ملتی ہیں اس کی طرف سے اب بھی۔ حالانکہ میں عائشہ کو چھوڑ آیا ہوں اور میرا کوئی ارادہ نہیں ہے کہ اس سے کسی قسم کا تعلق رکھوں۔ عائشہ یہ اچھی طرح جانتی ہے کہ میری شریکِ حیات کون ہوگی لیکن اس کے پاگل پن کا میں کیا علاج کروں؟ وہ تو میرے ساتھ آنے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔ آپ جانتے ہیں' اس کی سیٹ تک کنفرم تھی۔ مگر میں اسے چھوڑ آیا۔ مجھے خدا سے پوری امید ہے کہ بالآخر وہ مایوس ہو کے میرا خیال چھوڑ دے گی۔ وقت ہر زخم کا علاج کر دیتا ہے۔''

شہاب الدین نے سر ہلایا ''اور ہمارا کام اس وقت سے پہلے ہی ہو سکتا ہے۔''

روم سروس کے ویٹر نے کافی لانے کی اجازت طلب کی۔ اس کے واپس جانے تک مجھے اپنے خیالات کے انتشار پر قابو پانے کا موقع مل گیا۔

کافی کا پہلا گھونٹ لے کر میں نے کہا ''شہاب الدین صاحب۔ اگر عائشہ میری بیوی ہوتی...... یا میرا اس کے ساتھ جذباتی رشتہ ہوتا تو اور بات تھی' آپ یہ سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟''

''سمجھنے کی کوشش آپ کریں رفیق صاحب! آپ یقیناً اس پوزیشن میں ہیں آج...... اور نہیں ہیں تو آ جائیں' آپ اس تعلق کو بحال کریں۔ عائشہ کو یقین دلانے کے لیے عقل استعمال کریں کہ آپ کے خیالات بدل گئے ہیں یا حالات بدل گئے ہیں۔ اب آپ اس سے شادی کر سکتے ہیں۔''

میں نے مگ کو دھڑ سے میز پر رکھ دیا ''یہ ناممکن ہے۔''

''یہ بہت آسان ہے رفیق صاحب!'' وہ سکون سے بولا۔

میں نے کہا ''نو...... میں اس کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ اس سے اتنا بڑا جھوٹ نہیں بول سکتا۔''

بوجھل خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا جس میں شہاب الدین کافی پیتا رہا۔ کافی ختم کر کے اس نے سگریٹ جلائی ''مسٹر رفیق! یہ فیصلہ اتنی جلدی میں نہیں کیا جا سکتا' آپ سوچ لیں۔''

''مجھے کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں'' میں نے برہمی سے کہا۔

''اچھا' مجھے صرف پانچ منٹ دیں' اپنی بات مکمل کرنے کے لیے۔ آپ کی فلائٹ کا وقت بھی ہونے والا ہے اور مجھے بھی جانا ہے۔ درمیان میں آپ نہیں بولیں گے۔ عملی زندگی میں ہر شخص جو بھی فیصلہ کرتا ہے' اپنے اور دوسروں کے نفع ونقصان کو عقل کی ترازو میں تول کے کرتا ہے۔ یہ تو سوچنا ہی پڑتا ہے کہ دو ناقابلِ قبول خرابیوں میں سے کسے قبول کیا جائے۔ آپ ایک جھوٹ بول کے یا دھوکا دے کے اپنے' عائشہ کے اور دوسرے بہت سے لوگوں کی زندگی اور ان کے مستقبل کو بچانا پسند کریں گے یا اپنے اصولی موقف پر قائم رہیں گے؟ آپ کے نزدیک کیا بہتر ہے' وہ سچ جس میں خرابی ہی خرابی ہے...... یا وہ جھوٹ جس میں سب کا فائدہ ہے؟''

میں نے کہا ''یہ فیصلہ کون کرے گا کہ فائدہ کیا ہے اور نقصان کیا؟''

''آپ خود...... یہاں آپ کا مستقبل ہے...... اس کے ساتھ آپ کے والدین کی خوشیاں جڑی ہوئی ہیں۔ آپ کی ازدواجی زندگی کی خوشیاں وابستہ ہیں۔ اگر آپ نے یہ کام نہ کیا تو کیا ہوگا؟ یہ آپ خود ہی سمجھ سکتے ہیں۔''

''آپ مجھے دھمکی دے رہے ہیں؟''

''یس...... یہ دھمکی ہے۔ آپ کے لیے آپ کے والدین کے لیے۔ عائشہ کے لیے اور فریال کے لیے۔'' اس نے جذبات سے عاری سرد لہجے میں کہا۔ ''آپ جانتے ہیں کہ پاکستان کے حالات کیا ہیں۔ ان حالات میں ہم کیا کر سکتے ہیں اور کرا سکتے ہیں۔''

میرا خون سرد پڑنے لگا۔ مجھے اپنی بے بسی کا اندازہ ہو رہا تھا۔ میری حیثیت چوہے دان میں پھنسے ہوئے چوہے جیسی تھی۔ حقیقت یہی تھی کہ میں ان لوگوں کی طاقت کا مقابلہ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ ان کی دہشت گردی کی دس سالہ تاریخ بڑی لرزہ خیز تھی۔

شہاب الدین بولتا رہا ''لیکن آپ نے ہمارا کام کرا دیا تو مجھے چیف کی طرف سے آپ کو تحفظ کی پوری ضمانت فراہم کرنے کے لیے کہا گیا ہے۔ آپ اپنی زندگی بے خوفی کے ساتھ اپنی مرضی سے گزارنے کے لیے آزاد ہوں گے۔ یہ چیف کا ذاتی وعدہ ہے جس پر آپ اعتبار کر سکتے ہیں۔ آپ ہماری مدد کریں گے اور ہم آپ کے کام آئیں گے کیونکہ ہم احسان فراموش لوگ نہیں ہیں۔''

میرا دماغ ماؤف ہو رہا تھا۔ میں منجمد بیٹھا اسے پلک جھپکائے بغیر دیکھتا رہا۔

"آپ کا طریقۂ کار بہت آسان ہوگا۔ آپ عائشہ کو یقین دلائیں کہ آپ اس سے شادی کر کے اسے پاکستان لانا چاہتے ہیں' آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ فریال آپ کو نہیں مل سکتی۔ اس کے ہونے والے شوہر صفدر سلطان کی وجہ سے۔ آپ اس کی طرف سے مایوس ہو گئے ہیں۔ یہ آپ کی مرضی ہے کہ ایسا کہیں یا کچھ اور۔ ہمیں اس سے غرض نہیں۔ عائشہ کو یقین دلانا آپ کے لیے بالکل مشکل نہیں ہوگا۔ ظاہر ہے اس کے والدین پریشان ہوں گے۔ والدہ زیادہ پریشان ہوں گی۔ پھر وہ اپنے شوہر کو پریشان کرے گی۔ آپ اپنا مطالبہ اس کے سامنے رکھ دیں کہ شوہر سے ہمارا کام کرادے تو آپ عائشہ کی زندگی سے نکل جائیں گے۔ اب یہ جھوٹ ہے یا دھوکا ہے......تو مجبوری ہے۔ عائشہ کو ایک صدمہ اور ہوگا مگر جیسا کہ آپ نے کہا' وقت سب کا علاج کر دیتا ہے۔ وہ روئے گی' آپ کو مکار' دھوکے باز کہے گی اور بالآخر صبر کر کے خاموش ہو جائے گی۔ ہمارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ آپ کے سارے مسائل ختم ہو جائیں گے۔ جو مستقبل میں پیدا ہونے کا امکان تھا۔ میں نے اپنی بات واضح کر دی ہے' اب میں چلتا ہوں۔"

میں نے کہا "چیف کو بتا دینا کہ میں اپنے انکار پر قائم ہوں۔"

وہ مسکرایا "انکار کو اقرار میں بدلتے دیر نہیں لگتی۔ آپ کے پاس سوچ بچار میں ضائع کرنے کے لیے وقت نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو ہوم آفس سے ہمارے مفادات کے خلاف فیصلہ صادر ہو جائے اور آپ کو تمام عمر افسوس رہے کہ آپ نے جذبات کی رو میں بہہ کے یہ موقع گنوا دیا۔ نقصانات فوراً ہی آپ کے سامنے آ جائیں گے۔ آپ کو اتنا غیر عملی اور خود غرض نہیں ہونا چاہیے کہ اپنے ساتھ دوسروں کا مستقبل بھی داؤ پر لگا دیں۔ ان کا آپ سے رشتہ اور تعلق ہی ان کی بدبختی ہو جائے۔"

شائستہ لہجے اور مہذب الفاظ میں یہی دھمکی کوئی جاہل' بدمعاش دیتا تب بھی مطلب یہی ہوتا کہ جب ہم اس بڑھاپے میں تمہاری ماں کو وحشی درندوں کے حوالے کر دیں گے اور تمہارے باپ کی لاش کے ٹکڑے کتوں کے سامنے ڈال دیں گے تب تمہیں سمجھ آئے گی۔ جس دن عائشہ اور فریال کی آبرو کے لہو سے ایک داستانِ عبرت شہر کی دیواروں پر لکھی جائے گی' تب تمہیں اپنے انکار کی قیمت معلوم ہوگی۔ یہ سب اور اس سے کہیں زیادہ اس معاشرے میں ہوتا ہے جہاں صرف جنگل کا قانون نافذ ہو چکا ہے اور طاقت ہی کو (نعوذ باللہ) خدا مان لیا گیا ہے۔

وہ دروازہ بند کر کے چلا گیا۔ اس کے بعد بھی میں کسی پتھر کے بُت کی طرح بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ میرے اعصاب بالکل منتشر ہو چکے تھے اور میرے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں اور میرا وجود غیظ و غضب کی خوفناک آگ میں جل رہا تھا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ چیف اور شہاب الدین جیسے تمام شیطانوں کو نیست و نابود کر دوں جو اس ملک کے شریف انسانوں کے لیے خوشی اور خوشحالی کے خواب کو عذاب کر رہے تھے۔ امن و سلامتی کی خواہش کو ان کا جرم بنا رہے تھے اور ترقی اور کامیابی کے راستوں پر ان کی لاشیں گرا رہے تھے۔ میرے وطن میں جنگل کا قانون نافذ کرنے والے یہی درندے تھے۔ کاش میرے پاس کوئی ایسی جناتی طاقت ہوتی کہ میں ایک رات میں ایسے تمام انسانیت کے مجرموں کو موت کی نیند سلا سکتا۔

اچھی بات یہ ہوئی کہ اس وقت میرے پاس کوئی ریوالور نہیں تھا ورنہ شاید ایک جنونی کیفیت میں میرے ہاتھوں شہاب الدین کا خون ہو جاتا۔

اس کے جانے کے بعد بھی میں نہ جانے کتنی دیر انتقامی جذبات اور اپنی بے چارگی کی اذیت میں مبتلا رہا۔ مجھے ہوش اس وقت آیا جب میرے فون کی گھنٹی بجی اور آپریٹر نے مجھے یاد دلایا کہ مجھے ایرپورٹ لے جانے والی گاڑی آ گئی ہے۔ ڈرائیور وعدے کے مطابق نہ آتا تو شاید میں اپنی فلائٹ بھی مس کر دیتا۔

میں نے سوچا تھا کہ ہوٹل سے سب کو فون کروں گا۔ میرے والدین کو یقیناً میرے فون کا انتظار ہوگا۔ فلائٹ انکوائری سے انہیں پتا چل گیا ہوگا کہ میں کراچی پہنچ گیا ہوں۔ اب وہ زیادہ بے چین ہوں گے۔ یہ میرا فرض تھا کہ ان کے انتظار کی بے قراری کو کچھ کم کرتا۔ میرا ارادہ فریال سے عائشہ اور مارتھا سے بات کرنے کا بھی تھا مگر شہاب الدین نے میرے سارے پروگرام کو تہس نہس کر دیا تھا۔

تاہم اس کا آنا غیر متوقع نہیں تھا۔ وہ نہ آتا تو کسی دوسرے نام سے چیف کا کوئی اور نامہ بر آتا اور مجھ پر واضح کرتا کہ لندن سے فرار ہو کے میں نے اپنے پاؤں پر کس طرح کلہاڑی ماری ہے۔

جہاز میں بیٹھ جانے کے بعد میں نے اپنے منتشر خیالات کو اسی طرح منظم کیا جیسے پولیس لاٹھی چارج سے بے قابو ہجوم کو کنٹرول کرتی ہے۔ میں نے سوچا کہ میرا یہ ردِعمل مجھے کمزور کر رہا ہے اور اس رویے کے ساتھ میں اپنے تحفظ کی جنگ میں ناکامی کی دعوت دے رہا ہوں۔ میری پشت پناہی کرنے والی امریکا یا اسرائیل جیسی کوئی طاقت نہیں اور نہ کوئی مانتا کہ میں جہاں چاہوں اپنا میدان کارزار منتخب کر لوں۔ میں نہ کسی پاٹے خان کا سالا ہوں اور نہ پنجابی فلموں کا کشتوں کے پشتے لگانے والا گجر بدمعاش۔ میرے پاس نہ سیاست کی طاقت ہے نہ دولت کی۔ اگر کچھ ہے تو تھوڑی سی خداداد ذہانت اور یہ تو قانون فطرت ہے کہ فنا اور بقا کی ازلی و ابدی جدوجہد میں حاکمیت صرف دماغ کے لیے ہے۔

چنانچہ مجھے عقل سے قوت حاصل کرنا ہوگی۔ ہر قدم سوچ سمجھ کے اٹھانا ہوگا۔ اچھی بات یہ تھی کہ مجھے مہلت مل گئی تھی ورنہ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ چیتے جیسا کوئی جانور اب تک مجھے چیر پھاڑ چکا ہوتا۔ چیف نے ایسے بہت سے خونی درندے قابو کر رکھے تھے۔ بغاوت اور حکم عدولی پر مجرموں کو وضاحت کا موقع دیے بغیر سزائے موت دینا ڈسپلن برقرار رکھنے کے لیے ایک انتظامی ضرورت سمجھا جاتا تھا۔ میرے ساتھ ایسا نہیں ہوا تھا۔ چیف نے اپنی غرض سے مجھے ایک آفر کی تھی۔ یہ مشکل آزمائش ضرور تھی لیکن آنے والے دن سے امید کی جا سکتی تھی کہ خدا کوئی وسیلہ پیدا کر دے کہ میں بچ جاؤں۔

اس خیال نے مجھے بڑا حوصلہ دیا۔ کراچی سے لاہور تک صرف ڈیڑھ گھنٹے کی فلائٹ تھی' جس میں مجھے یہ موقع مل گیا کہ میں والدین اور استقبال کے لیے آنے والوں کے سامنے رونمائی کروں تو پریشان اور بدحواس نظر نہ آؤں۔

مجھے ریسیو کرنے کے لیے سارا خاندان ایک ہجوم کی صورت میں موجود تھا۔ قریبی عزیزوں کا آدھی رات کے وقت وہاں ہونا تو سمجھ میں آتا تھا لیکن جوش و خروش کا مظاہرہ کرنے والوں میں دور دراز کے ایسے چاچے' مامے اور ان کے لواحقین شامل تھے جن سے پہلے ملاقات ہوتی تھی تو کسی کے سوئم' چہلم پر یا برات ولیمے کے اجتماع میں۔ ابا بہت حوصلہ مند تھے۔ میں نے زندگی میں کبھی انہیں روتے نہیں دیکھا تھا۔ مجھے گلے لگاتے ہوئے وہ شدید جذباتی ہو رہے تھے اور ان کی آنکھوں میں نمی اتر آئی تھی مگر وہ مسکراتے رہے۔ اماں کے آنسو پونچھنے میں مجھے دیر لگی۔

اس کے بعد خیر مقدم کا مقابلہ شروع ہوا تو پروٹوکول کو نظر انداز کر دیا گیا۔ خالو عنایت کے ہاتھوں میں نوٹوں کا ایک ہار تھا جس میں زرق برق کلیاں اور پھندنے اور سجاوٹ کا خاصا سامان تھا جو عام طور پر ٹرکوں کی آرائش میں استعمال ہوتا ہے۔ وہ بسم اللہ' بسم اللہ کرتے آگے بڑھے ہی تھے کہ پیچھے سے رشتے کے چچا نمودار ہوئے۔ وہ کسی زمانے میں پہلوانی کرتے تھے لیکن اب چربی اور گوشت کا چلتا پھرتا پہاڑ بن چکے تھے۔

خالو عنایت کو پہلوان چچا نے مگدر جیسے بازو پھیلا کے یوں ایک طرف کر دیا جیسے بلڈوزر اپنا راستہ بناتا ہے۔ انہوں نے اپنی بڑی مونچھوں کو ہلاتے ہوئے نعرہ لگایا "آ گیا میرا فیکا پتر! اوئے آ گیا ولایت سے میرا شیر" اور مجھے مشک جیسی توند پر دبا کے اپنی طرف کھینچا۔ ان کے گلے لگنے کے لیے مجھے تقریباً رکوع کی حالت میں جانا پڑا اور میرا سانس رکنے لگا۔

خالو عنایت سخت خفا ہوئے "بھئی پہلوان! یہ کیا بداخلاقی ہے گویا۔ اکھاڑا سمجھ رکھا ہے' یہاں بھی دھینگا مشتی۔"

پہلوان چچا کی شفقت سے جانبر ہو کے میں نے پوری طرح سانس بھی نہیں لیا تھا کہ نہ جانے کہاں سے نکل کے چگی داڑھی والے ایک سوکھے بانس جیسے ماموں مجھ سے مقناطیس کی طرح چمٹ گئے۔ خالو عنایت کی پھر حق تلفی ہوئی۔ ان کو سینیارٹی میں چوتھے نمبر پر کر دیا گیا تھا اور ان کا صدمے سے برا حال تھا۔ "اجی ہٹو۔ تم کہاں سے نکل آئے اس پہلوان کی ٹانگوں میں سے۔" انہوں نے برہمی سے کہا اور اپنی تیسری کوشش میں کامیاب رہے۔ ہار گلے میں ڈال کے انہوں نے سینے سے لگا کے دعائیں دینے کی رسم پوری کی۔ وہ پستہ قد تھے اور بالوں سے بے نیاز ہو جانے والے سر کو کسی نہ کسی طلسماتی نسخے والے ہیئر آئل میں ڈبو کے رکھتے تھے اور ایک امید پرست کی طرح ہر روز اپنے سر کی بنجر سطح کا بغور جائزہ لیتے تھے کہ کہیں کوئی بال ضرور پھوٹا ہوگا۔ ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی۔ بڑی محنت سے انہوں نے سارا روغن میری قمیص پر مل دیا جس میں سے چالیس جڑی بوٹیوں کی بو ایسے آ رہی تھی جیسے تین دن کے مردہ چوہے کو گٹر سے نکال کے تارامیرا کے عرق میں اجالا گیا ہو۔

اگلے امیدوار نذیر چچا تھے جو ایک کوالی فائیڈ اور مارکیٹ ویلیو کے اعتبار سے خاصے کامیاب پیر ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھے۔ یہ غنیمت تھا کہ انہیں میرے خیر مقدم کے لیے کوئی ایک گز لمبا منظوم سپاسنامہ پڑھنے کا خیال نہیں آیا۔ تاہم انہوں نے دایاں ہاتھ میرے سر پر رکھ کے اور آنکھیں بند کر کے کوئی وظیفہ پڑھا اور دَم کرنے کے لیے پھونک ماری تو میرے چہرے پر ان کے تھوک کی ایک پھوار سی پڑی جس

میں پان کا رنگ بھی شامل تھا۔ صبح میں نے کالر پر سرخ ذرات دیکھے تو اپنا سر پیٹ لیا۔ یہ بالکل نئی قمیص میں نے ہیرڈز سے اسی پاؤنڈ میں لی تھی۔

تقریباً نصف درجن بزرگ فارغ ہوئے تو ایک درجن کزن مجھے نچوڑنے آئے۔ ان کے پیچھے خواتین کا اجتماع تھا جس میں سات سے ستر سال تک کی رشتے دار شامل تھیں جو تصور میں اپنی کسی نہ کسی بیٹی کا جوڑا ایک ولایت پلٹ داماد سے ملا رہی تھیں اور میری نیڑھی میڑھی نویں پاس میٹرک فیل عم زادوں کو اپنی طرف سے جدید ترین فیشن کے ڈریس میں یوں بنا سنوار کے لائی تھیں جیسے ایک نظر دیکھتے ہی سب پر فریفتہ ہو جاؤں گا تو بیک وقت چار عقد کرلوں گا۔ مجھ سے قرابت داری کا ایسا پُرجوش مظاہرہ اس وقت کبھی دیکھنے میں نہ آیا تھا جب میں تنظیم کا سرگرم کارکن تھا اور سب کو میرا مستقبل اپنے بھائی جیسی قبر کی طرح تاریک نظر آتا تھا۔

بالآخر ابا مجھے ان خیر خواہوں کے نرغے سے نکالنے میں کامیاب رہے اور ایک جلوس کی شکل میں میری روانگی ہوئی تو ایئر پورٹ پر استقبال کا یہ منظر دیکھنے والے شاید یہ سوچ رہے ہوں گے کہ میں حج یا عمرے کی سعادت حاصل کر کے لوٹا ہوں تو اپنے ہیئر اسٹائل اور حلیے سے پوپ سنگر کیوں نظر آتا ہوں؟

جب میرے لیے ایک سجی ہوئی گاڑی لائی گئی تو میرا حوصلہ جواب دے گیا "ابا! یہ کیا ہو رہا ہے؟ آپ کی گاڑی کہاں ہے؟"

ابا نے مجبوری کا اظہار کیا "میں نے کچھ نہیں کیا۔ تمہارے چچا نے تمہاری دادی سے کہا اور ان کے دماغ میں بیٹھ گئی۔ میں سب کو منع کر سکتا تھا' انہیں کیسے سمجھاتا' وہ سنتی ہیں کسی کی؟"

میں نے کہا "دادی اماں کی خواہش ہے تو پھر ٹھیک ہے ابا۔ وہ تو اگر گھوڑا اور بینڈ بھی بھیج دیتیں تو مجھے برات کی صورت میں جانا پڑتا' وہ آئیں نہیں؟"

"وہ کیسے آتیں؟" اماں نے کہا "اب تو چلنا پھرنا بھی وہیل چیئر پر ہوتا ہے۔ اس میں بھی تھک جاتی ہیں۔ تم میرے ساتھ بیٹھو۔"

ابا ڈرائیور کے ساتھ آگے بیٹھ گئے "عمر بھی تو نوے سال سے زیادہ ہو گئی ہے۔ پھر بھی اللہ کا شکر ہے' ایسی کوئی بیماری نہیں۔ نظر ٹھیک ہے اور دماغ تو ان کا ہمیشہ سے ہی قابلِ رشک تھا۔ آج بھی ہر بات کی گہرائی تک فوراً پہنچ جاتی ہیں۔ حافظہ ماشاءاللہ کمپیوٹر جیسا ہے۔"

میں نے کہا "ان کا دم غنیمت ہے ابا۔ ان کا وجود ہمارے لیے رحمت کا سایہ ہے۔"

میں دادی کی قدم بوسی کے لیے جھکا تو انہوں نے کرسی سے اٹھ کے مجھے گلے لگایا۔ "تو آ گیا نمونے۔ بہت اچھا کیا' میری آس نہیں توڑی" پھر ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

مجھے خوش آمدید کہنے کے لیے ایئر پورٹ آنے والوں میں سے بیشتر وہیں سے اپنے گھروں کو لوٹ گئے تھے۔ گھر میں اس وقت بھی پندرہ سولہ قریبی عزیز موجود تھے۔ وہ سب اتنے جذباتی تھے کہ کسی نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ یہاں تک کہ دادی نے بھی کہہ دیا تھا کہ وہ نمونہ آ جائے پھر اسی کے ساتھ کھاؤں گی۔ میرے کچھ نہ کھانے کی وجہ بالکل مختلف تھی۔ شہاب الدین نے میری نیند بھوک سب اُڑا دی تھی۔ لندن کی فلائٹ میں لنچ کے بعد میں نے صرف کافی پر گزارا کیا تھا۔ کافی کی عادت مجھے امریکا میں پڑی تھی وہاں چائے نہیں ملتی تھی۔

رات دو بجے دسترخوان بچھا اور میری پسند کے وہ سب کھانے بڑے اہتمام سے چنے گئے جو امی نے بطورِ خاص میرے لیے بڑے پیار سے بنائے تھے۔ اس دعوت میں مجھے مہمانِ خصوصی کی حیثیت حاصل تھی۔ یہ ہم مشرق کے رہنے والوں کی جذباتیت تھی۔ ہم اپنی محبت کا اظہار اسی طرح کرتے ہیں۔ باہر ان جذباتی رشتوں کی کوئی اہمیت نہیں رہی۔ بالغ ہونے کے بعد بچے اپنی دنیا الگ بسا لیتے ہیں۔ ماں باپ یا بھائی بہن سے تعلق اتنا ہی رہ جاتا ہے جتنا کسی پرانے پڑوسی سے۔

میرے والدین کی خوشی بیان سے باہر تھی اور یہ ایک فطری بات تھی۔ میری زندگی کی سلامتی کے لیے انہوں نے دل پر پتھر رکھ کے مجھ سے دوری برداشت کی تھی۔ گزشتہ چھ برسوں میں ایک بار بھی میں پاکستان نہیں آیا تھا۔ ایک بار وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کے امریکا آ گئے تھے مگر وہاں وہ نہیں رہ سکے تھے۔ میرے واپس آ جانے سے ان میں پھر سے جینے کی امنگ پیدا ہو گئی تھی۔ ان کے سارے خواب پھر سے جاگ اٹھے تھے اور ان کی آنکھوں میں غرور بن کے سما گئے تھے کیونکہ میں کامیابی کا تاج سر پر سجائے لوٹا تھا اور میں نے بڑی سعادت مندی سے ان کے خوابوں کو تعبیر دینے کی ذمے داری قبول کر لی تھی۔

لندن کے حساب سے پانچ گھنٹوں کے فرق کو اپنے معمولات میں شامل کرنا دشوار ہوتا ہے۔ جب یہاں

دوپہر کے کھانے کا وقت ہو تو وہاں ناشتے کا وقت ہوتا ہے۔ اس وقت لندن میں رات کے نو بج چکے تھے اور میں عام طور پر اسی وقت کھانا کھاتا تھا۔ چنانچہ مجھے بھوک لگی اور میں نے ڈٹ کر کھایا تو امی خوش ہو گئیں۔ باقی سب لوگ بہت سی باتیں کرنے کے موڈ میں تھے مگر دادی نے سب کو ڈانٹ لگائی کہ رفیق کو سونے دو۔ باتیں کرنے کو عمر پڑی ہے۔

اپنے پرانے بیڈروم میں آ کر مجھے بڑا عجیب سا محسوس ہوا۔ جیسے وقت نے پھر مجھے آٹھ سال پہلے کی دنیا میں دھکیل دیا ہے۔ میں نے لندن کے بارے میں سوچا تو وہ مجھے اپنے تصور سے بھی دور لگا۔ میرے اور عائشہ کے اور فریال کے اور مارتھا کے درمیان اور گزشتہ دو برسوں کی اَن گنت یادوں کے درمیان ایک سمندر حائل تھا اور دو تہذیبوں کی دوری حائل تھی۔ میرے مستقبل کے مقاصد حائل تھے۔

میں سونے کی کوشش میں جاگتا رہا۔ میرا ذہن ایک بار پھر پریشان کن خیالات کی طوفانی یلغار کا شکار تھا۔ ہر طرف سوالیہ نشانات یوں اٹھ کھڑے ہوئے تھے جیسے میں ہر طرف سے بند دیواروں کے حصار میں ہوں اور فرش پر کلبلانے والے سیکڑوں سانپ اپنا پھن اٹھا کے پھنکارنے لگے ہوں۔ میں بہت تھکا ہوا تھا اور سکون کے لیے نیند کی پناہ چاہتا تھا۔ میں نے نیند کی گولی کی ضرورت پھر محسوس کی۔ چھ سال پہلے بھی ایک دور میری زندگی میں ایسا آیا تھا جب میں سکون آور اور پھر خواب آور گولیاں کھانے لگا تھا اور جب اس عادت کو چھوڑا تھا تو میرے اعصاب کی بحالی میں بہت دشواری ہوئی تھی۔

ہار مان کے میں نے سونے کی کوشش ہی ترک کر دی۔ لندن سے آتے وقت میں نے اپنا موبائل فون ساتھ رکھ لیا تھا لیکن یہاں وہ بے کار تھا۔ اسے پاکستان کے نیٹ ورک پر لانے کے لیے نئی سم درکار تھی۔ جب میں گیا تھا تو ہمارے پاس ٹیلی فون کا ایک کنکشن تھا۔ پہلے ٹیلی فون سیٹ لاؤنج میں رکھا ہوا تھا پھر دوسرا سیٹ خرید کر ڈرائنگ روم میں بھی رکھ دیا گیا۔ بعد میں ایک بار کوئی کیبل فالٹ ہونے سے فون مہینا بھر سے زیادہ ڈیڈ رہا اور مجھ سے رابطے میں دشواری ہوئی تو ابا نے ایک نیا کنکشن حاصل کر لیا۔ دوسرا فون اوپر کی منزل پر تھا اور نیچے لاؤنج میں رکھا ہوا فون ابا نے اپنے بیڈروم میں لگا لیا تھا۔

میں نے باہر جھانک کے دیکھا تو مجموعی صورتِ حال اطمینان بخش نظر آئی۔ نچلی منزل پر تین بیڈروم تھے۔ میرا بیڈروم اور ڈرائنگ روم ملحق تھے۔ لاؤنج کے بعد پھر دو بیڈروم تھے۔ ان میں سے ایک دادی کے لیے تھا اور دوسرا میرے والدین کا تھا۔ دادی کو رات کے وقت بھی اکیلا نہیں چھوڑا جا سکتا تھا چنانچہ ابا نے درمیان والی دیوار میں سے دروازہ نکال لیا تھا جو رات کے وقت کھلا رہتا تھا۔

اوپر والی منزل کا بھی یہی نقشہ تھا۔ پہلے اس میں کرائے دار تھے۔ کرایہ سے ایچ بی ایف سی کے قرض کی ماہانہ قسط ادا ہوتی تھی۔ جب مجھے لندن میں ملازمت مل گئی تو میں نے باقی رہ جانے والے قرض کی یکمشت ادائی کر دی۔ اوپر رہنے والے کرائے دار دو بار تبدیل ہوئے۔ پہلے شریف اور خیال رکھنے والے لوگ تھے مگر بعد میں آنے والوں نے ابا کے لیے بہت مسائل پیدا کیے۔ جب بالآخر انہوں نے گھر خالی کیا تو میں نے ابا سے کہا کہ اب کسی کو کرائے دار مت رکھیں۔ یہاں آنے سے پہلے مجھے معلوم ہوا تھا کہ اوپر کی منزل پر نذیر چچا شفٹ ہونے کے لیے راضی ہو گئے تھے۔ یہ ابا کے لیے بھی خوشی کی بات تھی اور دادی کے لیے بھی کہ ان کے دونوں بیٹے پھر ایک ہی گھر میں اکٹھے رہیں۔ نذیر چچا نے اپنا مکان کرائے پر دینے کا مشورہ بھی مان لیا تھا۔ ابا بھی خوش تھے۔ اس انتظام میں واحد خرابی کی صورت یہ تھی کہ دادی کی چھوٹی بہو سے بالکل نہیں بنتی تھی اور کسی وجہ کے بغیر ہی وہ لڑ سکتی تھیں۔

آج رات قیام کرنے والوں کے لیے اوپر کی منزل کے دو بیڈرومز میں بستر بچھا دیے گئے تھے۔ اوپر سے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں لیکن نیچے خاموشی تھی۔ میں نیم تاریک لاؤنج سے دبے پاؤں گزرا اور ڈرائنگ روم میں داخل ہو کے دروازہ بند کر لیا۔

یہاں ڈائریکٹ ڈائلنگ صرف ملک کے اندر تک محدود تھی۔ بین الاقوامی کال کے لیے آپریٹر سے رجوع کرنا ضروری تھا۔ میں نے اسے مارتھا کا نمبر دیا اور دس منٹ انتظار کرتا رہا۔ پھر دوبارہ درخواست کی تو اس نے نمبر فوراً ملا دیا۔

مارتھا کے لیے میری کال بہت غیر متوقع تھی۔ عام طور پر وطن واپس جا کے لوگ اسے یکسر بھلا دیتے تھے۔ "یونانی بوائے! تم پاکستان سے بول رہے ہو یا دوسری دنیا سے؟"

میں نے کہا "دوسری دنیا سے تو میں بھوت بن کے آؤں گا ہر روز۔"

"اس کا مطلب ہے تم زندہ سلامت پہنچ گئے؟"

میں نے کہا "تمہیں شک کیوں ہے؟"

وہ بولی "تمہیں اس موت کے فرشتے نے کیسے چھوڑ دیا جو تمہیں گن پوائنٹ پر لے گیا تھا؟"

''ارے مارتھا۔ وہ تو مذاق کررہا تھا۔ دوست بے تکلفی میں بعض اوقات حد سے بڑھ جاتے ہیں۔''

''شٹ اپ! ایسا خبیث صورت شخص تمہارا دوست ہرگز نہیں ہوسکتا۔ اس کی آنکھوں سے شیطان جھانک رہا تھا۔ تم نے اس سے کیسے جان چھڑائی آخر؟ کیا تم نے اسے قتل کردیا؟''

''شش...... آہستہ بولو۔ دراصل پہلے میں نے اس کو قائل کرنے کی بہت کوشش کی کہ قتل کرنا ہے تو کسی اور کو کردے۔ یوں' کم سے کم دو لڑکیاں جو مجھ پر جان دیتی ہیں شادی سے پہلے ہی بیوہ کردی گئیں تو سچ مچ اپنی جان دے دیں گی۔ مارتھا کا انتخاب بالکل صحیح ہوگا جو چار شادیاں کرچکی ہے اور جی کے کیا کرے گی؟''

اس نے ایک آہ بھری' ''یہ تو سچ کہا تم نے۔''

''ارے مارتھا۔ مایوسی کی باتیں کیوں کرتی ہو۔ ابھی تو تم چار شادیاں اور کروگی الزبتھ ٹیلر کی طرح۔ تم کیا اس سے کم ہو۔''

''اب یہاں مجھ سے ایسی باتیں کرنے والا کوئی نہیں رہا۔ مجھے فون کرتے رہنا رفیق۔'' وہ اداس ہوگئی۔

میں نے کہا ''تم کو میں کیسے بھول سکتا ہوں مارتھا۔ ابھی میں نے اس لیے فون کیا ہے کہ تمہیں اپنی خیریت کی اطلاع کردوں۔ فکر کی بالکل کوئی بات نہیں رہی' چیئر اپ!''

''تم مجھے بتاؤ گے نہیں کہ وہ شخص کون تھا؟''

میں نے کہا ''تفصیلات جان کے تم کیا کروگی مارتھا۔ بس یہ سمجھ لو کہ مجھ سے نوجوانی میں کچھ غلطیاں سرزد ہوگئی تھیں۔ آٹھ سال بعد کسی نے مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ معاملہ ایسے ختم ہوگیا کہ آئندہ بھی کسی خرابی کا امکان نہیں۔ دراصل لندن میں میری پوزیشن مختلف تھی۔ میں برطانوی شہری نہیں تھا اور مجھے ڈرنا پڑتا تھا۔ یہاں پہنچ کے میں طاقتور ہوگیا ہوں۔''

''وہ کیسے...... کیا تم نے اس پاکستانی ڈاکٹر سے...... کیا نام ہے اس کا...... کیڈر' اس سے کوئی ایٹم بم خرید لیا ہے؟''

میں نے کہا ''ارے یہاں تو بچہ بچہ ایٹم بم بنا سکتا ہے' میزائل بھی گھر گھر بنتے ہیں۔''

پانچ منٹ کی بُک کرائی ہوئی کال کا وقت ختم ہوتے ہی کسی وارننگ کے بغیر لائن کٹ گئی۔ دوبارہ بکنگ کے طریقہ کار سے گزر کے رابطہ کرنا مجھے فوری طور پر اتنا ضروری نہیں تھا۔ بس کچھ دیر سوچتا رہا کہ عائشہ سے بات کروں یا نہ کروں؟

شہاب الدین کی بات کا میرے ذہن پر کوئی اثر نہ تھا۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے مجھ سے مطالبہ کیا جاتا کہ میں اپنے مذہب کو چھوڑدوں۔ والدین بدل لوں یا پاکستان میں نہ رہوں۔ جو ناممکن تھا وہ ممکن نہیں ہوسکتا تھا چنانچہ میں عائشہ کے ساتھ جذباتی استحصال کا شرمناک ڈراما نہیں کرسکتا تھا۔ ایک صورت یہ ہوسکتی تھی کہ میں اس سے مکمل لاتعلقی اختیار کرلوں اور اسے اپنی زندگی کے نفسیاتی مسائل سے نمٹنے کے لیے تنہا چھوڑدوں اور خودغرضانہ بے حسی اور سفاکی کے ساتھ اپنی خوشی کو اہمیت دوں لیکن یہ بھی میرے بس میں نہ تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ خوش رہے۔ حقیقت پسندانہ انداز میں زندگی سے سمجھوتا کرے اور ہمیشہ یاد رکھے کہ میں نے ایک مخلص دوست کی طرح اس کو سہارا دیا۔

دوسری ٹرنک کال ملنے میں بالکل دیر نہیں ہوئی لیکن میری بدقسمتی کہ دوسری طرف سے ریسیور عائشہ کی ماں نے اٹھایا۔

''تم......'' اس نے میری آواز پہچانتے ہی گالی دینے کے انداز میں کہا ''اب کیا چاہتے ہو؟''

میں نے کہا ''میں عائشہ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''وہ تم سے بات نہیں کرسکتی۔''

میں نے کہا ''اس کے لیے ضروری ہے کہ تم ریسیور اسے دو۔''

اس نے جھلّا کے کہا ''آخر تم ہمیں اکیلا کیوں نہیں چھوڑدیتے؟''

میں نے کہا ''یہ ایک فلسفی نے کہا تھا کہ اکیلا صرف شیطان ہوتا ہے یا جانور۔''

وہ چلّانے لگی ''یو راسکل! میں سمجھتی تھی کہ تم سے ہمارا پیچھا چھوٹ گیا۔ تم دفع ہوگئے ورنہ میں ضرور تمہیں قتل کرادیتی۔''

''تم صرف دھمکیاں پہنچاتی رہی ہو لیکن میں نے بھی اسکاٹ لینڈ یارڈ کو مطلع کردیا تھا کہ میری وفات کے اسباب پُراسرار ہوں تو فوراً اور تفتیش کا تکلف کیے بغیر لیڈی' سیلیا کو الیکٹرک چیئر پر بٹھادیا جائے۔ کیا اب تم عائشہ کو بلاؤ گی؟''

''نہیں آسکتی عائشہ!'' وہ چیخ کر بولی ''وہ یہاں نہیں ہے۔''

''پھر کہاں ہے؟''

''وہ اسپتال میں ہے۔ داخل ہے' تمہاری وجہ سے۔''

میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا ''کیا ہوا ہے اسے؟''

''یہ تم مجھ سے پوچھ رہے ہو' کمینے کالے آدمی! ہوس پرست لالچی انسان! تم نے اسے برباد کردیا۔ تم ایک عالی

نسب اور خاندانی رئیس لڑکی سے سب کچھ تو چھین چکے ہو۔ اس کا مذہب' ہم سے رشتے ...... اب کیا اس کی زندگی لوگے؟''

''لیڈی سیلیا! اپنی فضول بکواس بند کرو۔''

''یہ فضول بکواس نہیں ہے' حقیقت ہے۔ تم ایشا جیسی خوبصورت اور گوری لڑکی کے خواب دیکھ رہے تھے۔ تم اس کے باپ کے تنخواہ دار ملازم کاروبار کے مالک بننا چاہتے تھے۔ خاندانی کہلانے کے خواہش مند تھے۔ تم نے پاگل کردیا اسے۔ ضرور تمہارے پاس کسی پُراسرار کالے جادو کی طاقت ہے۔''

میں نے کہا ''یہ طاقت ہوتی میرے پاس تو میں نے کب کا تمہیں اپنی پالتو کتیا بنا کے تمہارے بھونکنے والے گلے میں پٹا ڈال دیا ہوتا۔''

ظاہر ہے' اس عزت افزائی کے بعد وہ مجھ سے بات جاری نہیں رکھ سکتی تھی۔ میری قوتِ برداشت جواب دے چکی تھی اور مجھے اس عورت سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نظر نہیں آتا تھا۔ اس نے عائشہ کے اسپتال میں ہونے کی خبر دے کر مجھے شدید ذہنی اذیت میں مبتلا کردیا تھا۔ اس اندیشے نے میرے ذہن کو جکڑ لیا تھا کہ ہو نہ ہو' معاملہ سنگین ہے۔ عائشہ کل تک ٹھیک تھی۔ اچانک کسی عام بیماری میں مبتلا ہوکے وہ اسپتال نہیں پہنچ سکتی۔ ضرور اس نے مایوسی اور ڈپریشن کی انتہائی کیفیت میں اپنی جان لینے کی کوشش کی ہوگی۔ ایئرپورٹ آتے ہوئے میں اس کو ساتھ لانے کے لیے نہیں گیا تھا۔ وہ پاگل لڑکی حقیقت سے سمجھوتا کرنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ وہ آخری وقت تک امید کے سارے چراغ روشن کیے سراپا انتظار رہی ہوگی۔ اسے پورا یقین ہوگا کہ میں آؤں گا۔

اس یقین کی شکست نے اسے ماردیا۔ جذباتی موت کے بعد اس نے اپنے جسم کو قیدِ حیات سے آزاد کرانے کے لیے کوئی انتہائی قدم اٹھانے میں دیر نہیں لگائی۔ اس کا فیصلہ شاید وہ پہلے ہی کرچکی ہوگی کہ بفرضِ محال...... بفرضِ محال۔

صحیح صورتِ حال معلوم کرنے کے لیے میں نے لارڈ ارنسٹ سے بات کرنے کا فیصلہ کیا مگر آپریٹر نے کہا کہ موبائل نمبر کی کال بُک نہیں ہوسکتی۔ معلوم نہیں وہ مجھے ٹال رہی تھی یا پھر ایسا ہی تھا۔ مجھ پر سخت جھنجلاہٹ سوار ہوگئی۔ یہ اس ملک کی پسماندگی کا خمیازہ تھا۔ مجھے اب آئی ایس ڈی فون لینا پڑے گا لیکن اس سے پہلے صبح اپنے موبائل فون کو سم اور کارڈ سے قابلِ استعمال بنانا مسئلے کا فوری حل ہے۔

میں نے بہت سے دوستوں کا سوچا پھر مجھے مارتھا کا خیال آیا۔ وہاں اور لوگ بھی تھے جن کے ساتھ میں دو سال رہا تھا۔ فریال بھی میری مدد کرسکتی تھی لیکن وہاں صفدر سلطان خود مل سکتا تھا ورنہ اس کا جاسوس نوٹ کرلیتا کہ رفیق نے پاکستان سے کال کیا تھا۔ مجھے فریال کو یہ بتاتے ہوئے جھجک بھی محسوس ہوئی کہ عائشہ نے میرے لیے نیا جذباتی مسئلہ پیدا کردیا ہے۔

بالآخر میں نے سوشی سے رابطہ کرنے کا فیصلہ کیا جو مسز ایلیٹ تھی اور عائشہ کے باپ کی کمپنی میں ڈائریکٹر مارکیٹنگ کے عہدے پر فائز تھی۔ وہ میری باس بھی تھی مگر اس سے زیادہ دوست تھی اور طبعاً ایک فرشتہ سیرت لڑکی تھی۔

میرے فون پر وہ جتنا حیران ہوئی اتنی خوش ہوئی ''رفیق' سب ٹھیک ہے نا؟''

میں نے کہا ''سوشی! ایسا نہیں ہے' مجھے تمہاری مدد درکار ہے۔''

''بولو' میں کیا کرسکتی ہوں؟''

''دیکھو...... ابھی مجھے لیڈی سیلیا ارنسٹ نے ایک بری خبر دی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ عائشہ اسپتال میں داخل ہے۔''

''کیا ہوا ہے اسے؟'' سوشی پریشان ہوگئی۔

''یہ اس نے نہیں بتایا۔ اب تم لارڈ ارنسٹ کو فون کرو' اس وقت وہ گھر پر نہیں ہوگا۔ اس سے موبائل فون پر بات کرو۔ یہاں کچھ ٹیکنیکل پرابلم ہے۔ میں اس سے بات نہیں کرسکتا۔ تم اس سے عائشہ کے بارے میں معلوم کرو اور پھر فون کرکے مجھے بتاؤ۔''

''اوکے۔ اپنا نمبر لکھواؤ۔'' وہ بولی ''میں تو خود بہت تشویش میں مبتلا ہوگئی ہوں۔''

ریسیور رکھ کے میں نے گھڑی دیکھی تو صبح کے چار بج رہے تھے۔ راجا عام طور پر اس وقت تک فارغ ہوکے گھر پہنچ جاتا تھا۔ اخبار کی آخری کاپی پریس میں جانے کے بعد اس کے لیے کوئی کام نہیں رہتا تھا لیکن اخبار کے دفتر سے وہ پریس کلب جاکے بیٹھ جاتا تھا جہاں دوسرے اخباروں میں کام کرنے والے بھی تھکے ہارے پہنچتے تھے۔

وہ گھر پہنچا ہی تھا۔ اس کی ہیلو کے جواب میں' میں نے کہا ''اُلّو آگیا آشیانے میں؟''

وہ بولا ''ہم اُلّو کا پٹھا بھی آگیا واپس۔''

میں نے کہا ''کیا کررہا ہے تو' کون ہے تیرے ساتھ؟''

''کوئی نہیں یار! کیا تو نے کوئی زنانہ آواز سنی تھی؟ سمجھ لے کہ ٹی وی پر ڈراما چل رہا تھا'' وہ خباثت سے ہنسا۔

میں نے کہا ''دیکھ اپنا ڈراما ختم کر۔ میں تیرا انتظار کر رہا ہوں۔''

''ابے سمجھا کر...... ڈرامے کا آخری سین رہ گیا ہے'' وہ آہستہ سے بولا ''بارہ ہفتے چلا ہے...... فل آف رومانس اینڈ سسپنس!''

میں نے کہا ''تیرا تو دوسرا ڈراما شروع ہو جائے گا اس کے بعد۔ میں بہت پریشان ہوں مہاراجا!''

وہ خفا ہونے لگا ''وہ تو ہمیشہ سے ہے تو' پیدائشی ہے۔ پریشان نہ ہو تو تیرا ہاضمہ بگڑ جاتا ہے۔ پہلے وہاں پریشان تھا' اب پریشانی کا ٹوکرا اٹھا کر یہاں آ گیا ہے ہمیں پریشان کرنے۔ نکے پتر' اپنا تخلص پریشان کر لے' رفیق احمد پریشان۔''

میں نے کہا ''اچھا دوست۔ میں آ جاتا ہوں تیرے ڈرامے کی آخری قسط میں دلن بن کے' ابھی دس منٹ میں۔''

اس نے جلدی سے کہا ''ابے نہیں یار! میں آ رہا ہوں نا' بس ایک گھنٹے کے اندر اندر...... بائے......''

میں نے ریسیور رکھا ہی تھا کہ ڈرائنگ روم کا دروازہ آہستہ سے کھلا اور مجھے اباجی کا مسکراتا ہوا چہرہ نظر آیا۔

''کیا بات ہے بیٹا' تم سوئے نہیں؟'' انہوں نے کہا۔

میں نے کہا ''جی...... وہ کچھ دیر سے سونے کی عادت تھی لندن میں اور پانچ گھنٹے کا فرق بھی ہے' آپ کیوں جلدی اٹھ گئے؟''

''جلدی کہاں' اسی وقت اٹھتا ہوں نماز کے لیے۔ ڈرائنگ روم میں روشنی نظر آئی'' وہ ایک صوفے پر بیٹھ گئے۔

میں نے دیکھا کہ پہلے کے مقابلے میں وہ کمزور ہو گئے ہیں۔ وہ زیادہ بوڑھے اور تھکے ہوئے بھی لگ رہے تھے۔

''نیند اب پہلے جیسی نہیں رہی' کم آتی ہے'' وہ بولے۔

میں نے کہا ''صحت کی طرف سے کوئی پریشانی تو نہیں ہے؟''

انہوں نے نفی میں سر ہلایا ''اللہ کا احسان ہے۔ دوا لیتا رہتا ہوں۔ اس سے بلڈ پریشر کنٹرول میں رہتا ہے۔''

''احتیاط نہیں کرتے آپ؟''

''احتیاط بھی کرتا ہوں۔ آج نہیں گیا ورنہ نماز کے بعد آدھا گھنٹا ٹہل کے آتا ہوں۔''

میں نے کہا ''رات کو آپ نے سب کچھ کھایا۔''

وہ ہنسے ''بھئی کبھی کبھار کی بدپرہیزی کی تو ڈاکٹر نے بھی اجازت دے رکھی ہے۔ ہاں تمہاری امی کچھ نہیں کرتیں۔ نہ خوراک کم کرتی ہیں اور نہ چلنا پھرنا ہے۔ وزن زیادہ ہو گیا ہے پہلے سے تو جوڑوں میں بھی درد رہنے لگا ہے۔ شوگر بڑھ جاتی ہے کبھی۔''

''وہ سو رہی ہیں؟''

''نہیں' نماز کے لیے ساتھ ہی اٹھتی ہیں۔ میں مسجد چلا جاتا ہوں۔ واپس آتا ہوں تو باہر بیٹھ کے چائے پیتے ہیں۔ دن ایسے ہی گزارتے ہیں' کوئی کام مصروفیت تو ہے نہیں۔''

اسی وقت امی چائے کی ٹرے کے ساتھ اندر آ گئیں۔

''کافی ہے تمہارے لیے۔ کریم پاؤڈر بھی ہے'' انہوں نے کہا۔

میں نے کہا ''میں اس کے بغیر ہی پیوں گا۔''

''کیا...... کافی اور وہ بھی کالی...... صحت کا ستیاناس!''

میں نے مسکرا کے کہا ''وہاں یہی پیتا تھا۔ کیا میری صحت خراب لگ رہی ہے آپ کو؟''

انہوں نے اپنی چائے کا کپ اٹھا لیا ''صحت تو خیر سے اچھی ہے' مجھے تو اتنی خوشی ہے' تو واپس آ گیا۔''

میں نے کہا ''کیسے نہ آتا۔ ایسے کب تک چل سکتا تھا کہ آپ یہاں رہیں اور میں لندن میں رہوں۔ اب تو حکم تھا آپ کا۔''

اباجی نے کہا ''ہم تو سوچنے لگے تھے کہ لندن چلے جائیں' تمہارا مستقبل کیوں خراب کریں۔ صرف اسی لیے کہ یہاں ہم اکیلے ہیں تم کو آنے پر مجبور کریں' امریکا میں واقعی مشکل تھا لیکن لندن تو سنا ہے' کراچی لاہور جیسا ہے۔''

''بالکل ٹھیک سنا ہے آپ نے۔ اس کے کچھ حصے واقعی ایسے ہی نظر آتے ہیں۔ لاکھوں انڈین اور پاکستانی ہیں۔ وہی کلچر نظر آتا ہے۔''

''اپنی جاب کا کیا' کیا؟'' ابا نے کہا۔

میں نے کہا ''تین ہفتے تک کام چلا سکتے ہیں وہ لیکن اس کی مجھے کوئی فکر نہیں۔''

''اس کی اب ضرورت بھی نہیں۔ تمہارے ٹیلنٹ کے لیے ایک بہت بڑا چیلنج ہے کہ تم کیا کر سکتے ہو اور کیا بن سکتے ہو۔ ایک بزنس مین یا انڈسٹریلسٹ۔''

''یہ حویلی اور زمین کا قصہ کیا ہے؟'' میں نے کہا۔

''قصہ تو بہت لمبا ہے۔ سو سال کی تاریخ ہے اور ریسرچ کا موضوع ہے۔ واقعات کا ایک لمبا سلسلہ ہے جو اٹھارہ سو ستاون کی جنگِ آزادی کے بعد پیش آئے تھے۔ موقع ملا تو سب کو ترتیب سے اکٹھا کر کے کوئی کتاب لکھوں گا۔ ابھی تو مختصراً تم اتنا ہی سمجھ لو کہ اب تک کسی دعوے کے بغیر ہمیں ایک بہت بڑی جاگیر مل گئی ہے۔ جیسے کسی کو مدفون خزانہ مل جائے یا

کسی کے نام کروڑوں کی لاٹری نکل آئے۔''

''آپ کروڑوں کی بات کر رہے ہیں۔''

ابا نے چائے کا آخری گھونٹ لیا ''شروع میں تو مجھے بھی اندازہ نہیں تھا اور یقین ہی نہیں آتا تھا مگر اب کوئی شک نہیں رہا۔ میری سمجھ میں تو کچھ آتا نہیں تھا۔ تمہارا وہ دوست ہے نا' راجا...... اس نے ایک لا فرم کا حوالہ دیا۔ وہ مختلف مالیاتی معاملات میں قانونی مشاورت کرتے ہیں۔ ان کا ایک شعبہ اسٹیٹ منیجمنٹ کا بھی ہے۔ وہ بڑے کام کے لوگ ثابت ہوئے۔ ملکیت کی منتقلی کے عدالتی امور کو بھی وہی دیکھ رہے ہیں۔ ان کے ایک ماہر بشارت علی زیدی نے تفصیلی جائزہ لے کر ایک ویلیوایشن کی ہے۔ یہ اسیس منٹ خاصی مارکیٹ ریسرچ کے نتیجے میں سامنے آئی ہے اور ان کے کہنے کے مطابق اس میں دس سے پندرہ فی صد کمی بیشی کا امکان ہے۔''

''یعنی پچاسی نوّے فی صد تک ان کا اندازہ درست ہے؟''

ابا نے سر ہلایا ''ہاں' یہ اندازہ کرنا بھی ہمارے لیے تو بالکل ہی ناممکن تھا۔ اس میں ایک تو وہی قدیم حویلی ہے جس کا صرف ایک حصہ سلامت ہے۔''

''یہ حصہ دیکھا ہے آپ نے اندر سے؟''

''ہاں وہ کسی میوزیم کی طرح ہے جس کی دیکھ بھال نہ کی گئی ہو' تاہم اسے رہائش کے قابل بنایا جا سکتا ہے۔ باقی حصہ خطرناک لگتا ہے کہ بوسیدہ دیواریں کسی بھی وقت گر سکتی ہیں مگر وہ برسوں سے ایسے ہی کھڑی ہیں۔ یہ حویلی تقریباً چار ایکڑ پر ہے۔''

''بیس ہزار مربع گز......''

''بھئی حویلیاں اور محل تو ایسے ہی ہوتے ہیں۔ چاروں طرف باغ تھا جو نہ جانے کب سے اجڑا پڑا ہے۔ ملازموں کی رہائش گاہیں اور اصطبل وغیرہ ہیں۔ اب اس کی مالیت کوئی کیسے بتا سکتا ہے۔ حویلی کے اندر جو سامان ہے وہ انٹیک میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ حویلی کے پیچھے دس ہزار ایکڑ زمین ہے۔''

میں اچھل پڑا ''دس ایکڑ...... یا دس ہزار ایکڑ!''

''دس ہزار ایکڑ'' ابا ہنسنے لگے ''اور وہ سب جنگل ہے جس میں زیادہ درخت شیشم کے ہیں۔ تم جانتے ہو اس کی لکڑی فرنیچر بنانے میں استعمال ہوتی ہے۔''

میں نے کہا ''میں نہیں جانتا۔''

''شیشم کو تعمیر میں ہی استعمال کیا جاتا ہے مگر یہ شیشم کی وہ کوالٹی ہے جو اعلیٰ قسم کا فرنیچر بنانے میں کام آتی ہے۔ اب سارے درخت گن کر ان کی مالیت کا حساب کرنا ظاہر ہے مشکل تھا۔ اس علاقے میں زمین کی ویلیو کیا ہے؟ یہ سب دیکھنے کے بعد مجھے بتایا گیا کہ یہ شاید ساڑھے تین کروڑ مالیت کی جاگیر ہوگی۔''

میں دم بخود بیٹھا رہا۔ ''مجھے یہ کوئی الف لیلوی کہانی لگتی ہے۔''

''ہمارے وکیلوں نے بڑی محنت کی۔ دستاویزات اور زمینوں کا ریکارڈ لینڈ ریونیو والوں کی فائلیں' محکمۂ جنگلات اور لینڈ سروے والوں کا ریکارڈ۔ یہ سب ہم کہاں دیکھتے۔ ساری عمر دھکے کھاتے رہتے۔ بشارت فاروقی کو سارے طریقۂ کار کا علم تھا اور اس کا رابطہ بھی تھا۔

میں نے کہا ''اباجی! یہ کام رشوت کے بغیر تو نہیں ہوتے۔''

''بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ دس لاکھ تو اس فرم کی فیس طے ہوئی تھی۔''

''دس لاکھ۔ جو قانونی اور مالیاتی مشیر تو پہلے فیس وصول کرتے ہیں۔ کم سے کم پچاس فی صد۔''

ابا نے سر ہلایا ''طریقہ تو یہی ہے۔''

''پھر آپ نے کہاں سے دیے؟''

وہ مسکرائے ''میں کہاں سے دیتا برخوردار۔ ان کے ساتھ ایک ایگریمنٹ ہو گیا ہے۔ تمام معاملات طے کرانے کے بعد وہ دس فی صد کے حصے دار تسلیم کیے جائیں گے۔''

''مجموعی مالیت کا دس فی صد...... یعنی پینتیس لاکھ وصول کریں گے'' میں نے کہا ''مگر کیسے؟''

''اس کے دو طریقے ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہم براہِ راست دس فی صد ان کے نام کر دیں۔ ایک حصہ انہیں دے دیں جس کی اتنی مالیت ہو' دوسرا یہ کہ ہم انہیں کاروبار میں ساڑھے بارہ فی صد کی پارٹنر شپ آفر کریں' دس سال کے لیے۔''

''ابھی وہاں کون سا کاروبار ہے؟''

''اس کی فیزبلٹی یعنی قابلِ عمل ہونے کی رپورٹ بن رہی ہے۔ ایگری کلچرل یا انڈسٹریل پروجیکٹ کیا ہو سکتے ہیں۔ ان کے لیے سرمایہ کیسے فراہم ہو سکتا ہے۔ وہ کتنے منافع بخش ہو سکتے ہیں اور انہیں کیسے مختلف سمتوں میں پھیلایا جا سکتا ہے۔ میں سیدھا سادا سول سرونٹ' ان ٹیکنیکل معاملات کو کیسے سمجھ سکتا ہوں۔ یہ تمہارا کام ہے اور اس لیے میں نے تمہیں مجبور کیا کہ سب کچھ چھوڑ کے یہاں آ جاؤ۔ دیکھو' سمجھو اور سنبھالو۔''

میں نے کہا ”ابھی تو میری عقل اس کا احاطہ کرنے سے قاصر ہے۔ یہ بہت بڑا کام ہے۔“

”ایک چیلنج ہے تمہارے لیے۔ میں نے کہا تھا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ تم آج کے ساڑھے تین کروڑ کو اگلے دس برسوں میں دس گنا کرلو۔ سب تمہاری محنت اور ہمت پر منحصر ہے۔“

”اور قسمت پر“ امی نے کہا۔

”وہ تو ہے امی! یہ سب قسمت ہی سے تو ملا ہے۔ مجھے تو اب بھی یقین نہیں آتا۔ آپ نے مجھے کچھ نہیں بتایا‘ راجا نے کچھ نہیں بتایا۔“

”فون پر کیا بتاتے اور کتنا بتاتے۔ اب تم خود جاؤ گے تو دیکھو گے۔ معاملات کا کنٹرول سنبھالو گے تو سب سمجھ میں آئے گا۔ میں کچھ نہیں کرسکتا۔“

میں نے کہا ”آپ دعا تو کرسکتے ہیں ابا جی کہ خدا مجھے ہمت دے۔ آپ کی دعاؤں کے طفیل ہی سب ہوا ہے آج تک“ میں نے گھڑی دیکھی۔

”یہ تم بار بار گھڑی کیوں دیکھ رہے ہو؟“

میں نے کہا ”ایک تو مجھے لندن سے کسی کے فون کا انتظار ہے۔“

امی نے معنی خیز سوالیہ نظروں سے ابا کی طرف دیکھا مگر مجھ سے نہیں پوچھا کہ وہ فون کس کا ہے؟ انہیں عائشہ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا لیکن وہ جانتے تھے کہ فریال لندن میں ہے اور غالباً یہ شک بھی کرتے تھے کہ میرے امریکا سے لندن آ کے ملازمت اختیار کرنے کی وجہ بھی وہی ہے۔

میں نے کہا ”راجا نے بھی آنے کے لیے کہا تھا۔“

امی نے اٹھتے ہوئے کہا ”میں ناشتے کا کچھ کروں۔“

عائشہ کی طرف سے میری تشویش بڑھتی جارہی تھی۔ سوشی کو میں نے ایک گھنٹا پہلے فون کیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ عائشہ کے باپ سے بات کرکے مجھے صورتِ حال سے مطلع کرنے میں اسے دس منٹ لگیں گے۔ اس میں کچھ تاخیر کے امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کیا پتا لارڈ ارنسٹ کہاں ہو۔ وہ کسی میٹنگ میں شریک ہو جہاں وہ کال نہ ریسیو کرسکتا ہو یا اس کا سیل فون بند ہو۔

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا‘ میری پریشانی بڑھ رہی تھی۔ یکلخت میرے لیے انتہائی ضروری ہوگیا تھا کہ مجھے عائشہ کی خیریت معلوم ہو۔ ابا سے گفتگو کے دوران میں یہ ممکن نہیں تھا کہ میں پھر سوشی سے بات کرنے کے لیے لندن کی کال بُک کراؤں۔

طبیعت کی کسل مندی دور کرنے کے لیے میں نے غسل کیا اور کپڑے بدل کر ناشتے کے دسترخوان پر پہنچ گیا جہاں اب باری باری سب اٹھ کر آرہے تھے۔ باتوں کا ایک ختم نہ ہونے والا سلسلہ تھا جس کا تعلق لندن میں میرے قیام کے بارے میں سوالات سے شروع ہوکے میرے مستقبل کی منصوبہ بندی پر ختم ہوجاتا تھا۔ سارا خاندان ایک خوشگوار سنسنی خیزی میں مبتلا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ رات کو میرے خیر مقدم کے لیے پہنچنے والوں کے جذبات کیا ہوں گے۔ ان کی اکثریت حسد کی آگ میں جل رہی ہوگی۔ ولایت میں میری اعلیٰ تعلیم ہی کم نہ تھی کہ قسمت نے میرے نام کروڑوں کی لاٹری نکال دی۔ ماں باپ کا اکلوتا میں ہی سب کا مالک تھا۔

تاہم وہ سب جو گھر میں تھے اور دسترخوان پر موجود تھے ان کے خلوص اور خیر خواہی کے جذبات پر شک نہیں کیا جاسکتا تھا۔ نذیر چچا کا بڑا بیٹا جسے امریکا جانے کا جنون تھا سب سے زیادہ سوالات کرتا رہا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ بہت پُرامید ہے کہ میں اسے اپنے ترقیاتی منصوبوں میں ضرور شریک کروں گا اور پھر شاید اسے امریکا جانے کی اتنی ضرورت نہیں رہے گی۔ وہ مجھے بار بار ہر طرح تعاون کا یقین دلا رہا تھا۔ خالو عنایت کا بیٹا کچھ شرمیلا اور کم گو تھا۔ اس کی بھرپور وکالت خود خالو فرما رہے تھے۔ یہ ایک خواہش کا فطری ردِعمل تھا کہ میری ترقی میں غیروں سے زیادہ اپنوں کی شرافت ہو اور خوشحالی کا دریا خاندان کو سب سے زیادہ سیراب کرے۔

جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے‘ میرے بارے میں بھی خاندان والوں کی رائے بہت زیادہ اچھی نہیں تھی۔ بچپن میں مجھے گول گپا کہا جاتا تھا کیونکہ میں کچھ ضرورت سے زیادہ صحت مند تھا۔ تعلیم میں میرا ریکارڈ کبھی قابلِ رشک نہ تھا اور میں کھیل کود‘ بزرگوں کی خدمت اور کام کاج‘ چالاکی اور بدمعاشی میں بھی دوسروں سے پیچھے تھا۔ جب میں بارڈ پالیٹکس میں پڑ گیا تو مزید بدنام ہوا۔ میرا مستقبل روشن تو کسی کو کبھی نظر نہ آیا تھا پھر باقاعدہ تاریک نظر آنے لگا۔ لوگ میری بدقسمتی پر افسوس کرنے لگے۔ ایک انڈا‘ وہ بھی گندا۔

آٹھ سال بعد صورتِ حال ڈرامائی طور پر بدل گئی۔ یہ تبدیلی معجزاتی تھی۔ آج میرے پاس اعلیٰ تعلیمی ڈگری تھی اور کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ میں نے نقل کرکے لی ہے۔ امریکا اور برطانیہ میں قیام کے دوران میں میرا رنگ روپ بدل گیا تھا۔ میری صحت اچھی ہوگئی تھی۔ باقاعدگی سے جوگنگ کرنے اور جمنازیم جانے سے میرا جسم متناسب اور مضبوط ہوگیا تھا۔ میرا لباس اور میرے انداز و اطوار سب میں نفاست آ گئی تھی

اور میری خوداعتمادی حیران کن تھی۔ رہی سہی کسر ساڑھے تین کروڑ کی لاٹری نے پوری کی تھی۔

اب میں ایک وی آئی پی تھا۔ مجھ سے قربت جتانے والے بھی یقین سے نہیں کہہ سکتے تھے کہ میری نظر میں ان کی اہمیت کیا ہوگی؟ میں کامیابی کی شاہراہ پر آگے بڑھوں گا تو پلٹ کے ان غریب رشتے داروں کی طرف دیکھوں گا یا نہیں؟ کسی کو اہمیت دوں گا یا دولت مندی کے نئے رشتے وہاں استوار کروں گا جہاں میرے ہم مرتبہ لوگ ہوں گے۔

میں ناشتا کر ہی رہا تھا کہ اندر فون کی گھنٹی بجی اور میری ایک عم زاد نے جو قریب ہی موجود تھی‘ ریسیور اٹھالیا۔

”کوئی لڑکی ہے۔ سوسی یا بھوسی۔ آپ کو لندن سے یاد کررہی ہے۔“ وہ بڑی معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ ریسیور لہرانے لگی ”کہتی ہے رونی کو بلا دو۔ رونی اینڈ بھوسی۔“

لوگ ہنسنے لگے‘ خالو عنایت نے کہا ”بھئی لوسی ہوگی‘ وہ آتا تھا نا...... ”لوسی شو۔“

عم زاد نے ریسیور مجھے تھمایا ”بہت اداس لگتی ہے بھوسی...... لوسی۔“

میں نے کہا ”بھوسی تمہارے دماغ میں ہے“ اور پھر ریسیور میں یوں کہا کہ سب سن لیں ”یس سوشی!“

سوشی نے کہا ”سوری‘ تمہیں اتنی دیر کے بعد بتا رہی ہوں دراصل پہلے میرا رابطہ نہیں ہورہا تھا۔“

میں نے کہا ”کوئی بات نہیں‘ سب ٹھیک ہے نا؟“

”ابھی میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ اس کا باپ تو گیا ہوا ہے فرینکفرٹ۔ اسے کچھ پتا نہیں۔ میں نے ایک اور ذریعہ استعمال کیا۔ اس سے اتنا کنفرم ہوگیا ہے کہ وہ گھر میں نہیں ہے۔“

”پھر کہاں ہے؟“

”کیا پتا کسی اسپتال میں ہی ہو۔ میں چیک کرکے بتاؤں گی۔ شام تک سام بھی آجائے گا۔“

وہ لارڈ ارنسٹ کو سام کہتی تھی‘ اس کا نام سیموئل ارنسٹ تھا۔

میں نے کہا ”مجھے تشویش رہے گی۔“

”آئی نو...... لیکن میرا خیال ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں۔“

”یہ تم میری تسلی کے لیے کہہ رہی ہو؟“

وہ بولی ”نہیں۔ دراصل میں نے سیلیا سے پوچھا تھا۔ دفتر کی بات میں اکثر عائشہ سے گھر پر بھی کرلیتی تھی۔ عائشہ اسپتال میں ہوتی تو سیلیا مجھے ضرور بتاتی۔ اس نے سرسری انداز میں کہہ دیا کہ وہ گھر میں نہیں ہے لیکن یہ نہیں بتاسکتی کہ وہ کہاں ملے گی یا کب واپس آئے گی۔ یہ مجھے ذرا عجیب لگا۔ عائشہ کا فون بند ہے۔“

میں نے کہا ”تھینکس‘ مجھے تمہارے فون کا انتظار رہے گا۔ فی الحال کسی اور سے میں بات کرنا نہیں چاہتا۔“

سب کے پُرتجسس چہروں پر لکھے ہوئے سوال کا جواب دینے کے لیے میں نے کہا ”سوشی جاپانی ہے۔ میں جس کمپنی میں تھا یہ وہاں مارکیٹنگ کے شعبے کی ڈائریکٹر تھی اور میری باس تھی لیکن ایسے مسکرانے کی ضرورت نہیں۔ اس کی شادی ہوچکی ہے کچھ عرصہ پہلے۔“

ناشتے کے بعد مجھے نیند آنے لگی کیونکہ لندن میں رات کے تین بج چکے تھے اور میرا جسم ابھی تک پرانے نظام الاوقات کی پابندی کررہا تھا۔ وہاں میں عموماً بارہ ایک بجے سوجاتا تھا۔ میں نے اپنی مجبوری بتا کے سب سے معذرت کی اور سونے چلا گیا لیکن ابھی میں دو گھنٹے ہی سو پایا تھا کہ جیسے قیامت آگئی۔

راجا نے لات مار کے دروازہ کھولا اور اندر آ کے چلّانے لگا۔ ”مردے...... اٹھ جا یا تیرے کانوں میں صورِ اسرافیل پھونکوں؟“ پھر اس نے ٹانگ پکڑ کے مجھے گھسیٹ لیا۔

میں آنکھیں ملتے ہوئے اٹھا ”ختم ہوگیا تیرا ڈراما۔“

راجا مجھ سے گلے مل کے ایک کرسی پر بیٹھ گیا ”ڈرامے چل رہے ہیں لیکے پتر۔ جیسے تیرے چل رہے ہیں۔ ہر چینل پر ڈراما چل رہا ہے۔ کیا بات ہے‘ تو گورا ہورہا ہے؟“

میں نے عاجزی سے کہا ”بس یار! مجھے خدا نے حسن کی دولت سے مالا مال کیا ہے اور تجھے کنگال رکھا ہے؟“

”یہ گوریوں کی صحبت کا نتیجہ ہے۔“

”اگرچہ لفظ قابلِ اعتراض استعمال کیا ہے تو نے مگر ایسا تو ہوتا ہے۔ خربوزی کو دیکھ کے خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ تو کیوں موٹا ہورہا ہے؟“

اس نے کہا ”ڈائٹنگ کی وجہ سے‘ شہناز سخت پریشان ہے۔“

”تیرے وزن میں اضافے سے؟“

”نہیں۔ ڈائٹنگ کے نتائج سے۔ وہ ہر ہفتے مجھے ایک چارٹ بنا کے دیتی ہے۔ پیر سے سنیچر تک مجھے کیا نہیں کھانا ہے۔ میں بطور خاص وہی سب کھاتا ہوں۔ غالباً میرے ضمیر پر بوجھ بڑھ رہا ہے۔“

میں نے اس سے اتفاق کیا ''اور تیرے گناہوں کا بھی' ماتو بیٹھ دومنٹ' میں تیار ہو جاؤں' چائے پیے گا؟''

''چائے وہ تیری عم زاد رابعہ لا رہی ہے بڑی محبت ہے۔'' اس نے دانت نکالے ''آج تو اسٹار پلس لگ رہی ہے بالکل۔''

میں نے کہا ''مہاراجا! اس کے ساتھ بھی تو نے کوئی سیریل تو شروع نہیں کر دیا ہے؟''

''ہوسکتا ہے کیونکہ وہ صدق دل سے چاہتی ہے لیکن کوئی پرانا سیریل ختم تو ہو۔ ابھی تو میں بہت مصروف ہوں۔''

''اچھا بیٹے' ابھی بتاتا ہوں شہناز کو۔ تو اسے دھوکا دے رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

راجا نے ایک آہ بھری ''یہ دنیا ایک دھوکا ہے فیکے پتر۔ یہاں جو ہے' سب دھوکا ہے۔ نظر کا دھوکا' عقل کا دھوکا۔''

''کسی دن شہناز دھوکے سے تجھے کوئی انجکشن ایسا لگا دے گی کہ چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔ تو کیسے آیا ہے؟ اپنی اسی دوسری جنگِ عظیم والی پھٹ پھٹی پر...... جو تو موت کے کنویں میں چلاتا تھا؟''

''نہیں یار...... شہناز سے گاڑی مانگ کے لایا ہوں کہ رفیق کو لے کر آتا ہوں۔''

''گویا اب پہلے وہاں حاضری لگانی ہوگی؟''

''اتنا سیریس ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے تو جھوٹ بولا تھا گاڑی کے لیے۔ وہاں گئے تو وہ کھول لے گی رجسٹرِ شکایات۔ چلتے ہیں پریس کلب۔ وہاں اس وقت کوئی نہیں ہوگا۔ دوپہر کو تو میرے اعزاز میں ظہرانہ دے گا شیرٹن میں۔''

ہم پریس کلب جا بیٹھے۔ میں نے راستے میں اپنے سیل فون کے لیے ایک سم خریدی اور دو ہزار والا کارڈ لوڈ کر کے مطمئن ہو گیا کہ اب میں بے رابطہ نہیں رہا۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد میں نے اصل موضوع چھیڑا۔

''راجا! تو نے کبھی نہیں بتایا کہ سال بھر سے یہاں کیا چکر چل رہا ہے۔ تجھے سب معلوم تھا' تو نے ہی ابا کو بشارت فاروقی کی فرم کے بارے میں بتایا تھا۔''

''بتایا تو تھا'' وہ سر کھجا کے بولا ''لیکن اس کے بعد میری کسی سے بات ہی نہیں ہوئی۔ وہ فاروقی کوئی میرا دوست تو ہے نہیں۔ میرا کلاس فیلو تھا دس سال پہلے۔ یہ مجھے معلوم تھا کہ کیا کرتا ہے اور آدمی بہرحال بھروسے کا تھا۔ جب تیرا فون آیا تو اس سے کچھ دن پہلے ہی انکل نے مجھے طلب کیا تھا۔ ان سے تفصیل پتا چلی۔''

''ابا نے آج مجھے سب بتایا۔''

''کیسی عجیب بات ہے' بالکل افسانوں' فلموں اور ناولوں والی۔ کسی کو خزانے کا نقشہ مل گیا۔ کسی کا لاولد رشتے دار کروڑوں چھوڑ کے مر گیا۔ فقیر ہو گئے راتوں رات شہزادے۔''

''مجھے ابھی تک یقین نہیں آتا۔''

''مجھے بشارت فاروقی نے پوری اسٹوری سنائی تو مجھے بھی چکر آ گئے تھے۔ سچ تو یہ ہے فیکے پتر کہ حسد کی آگ میں جل کے کوئلہ ہو گیا تھا میں۔ اپنے کمینے دوست کو معاف کر دے'' اس نے گلوگیر لہجہ بنا لیا۔

میں نے اسے تسلی دی ''میں جانتا ہوں تیری فطرت کو راجا۔ دکھی مت ہو۔ کتا اگر معافی مانگے کہ وہ بھونکتا ہے۔''

راجا نے افسوس سے سر ہلایا ''کیسی ناانصافی کی بات ہے کہ راجا میرا نام ہے اور خزانے کے مالک ہیں کنگلے۔''

میں نے کہا ''تو نے دیکھی ہے وہ جگہ' میرا بکنگھم پیلس اور شاہی جاگیر؟''

''دیکھی ہے' انکل مجھے ساتھ لے گئے تھے۔''

''کیسی جگہ ہے؟''

''جگہ ایسی ہی ہے'' وہ سوچ کے بولا ''جیسے کوئی پہاڑ جس میں سونے کی کان ہو یا زمین' جس کے نیچے تیل ہو۔ نکالنے والے کی ہمت پر ہے...... اور محنت پر۔''

''قسمت پر نہیں؟''

''نہیں۔ قسمت کا کھیل تو سامنے آ گیا۔ تیری قسمت پر کون شک کر سکتا ہے؟ آگے تیرا کام ہے' چاہے تو کچھ نہ کر' سب بیچ کے مال سمیٹ اور لمبی تان کے سو جا۔ زندگی فراغت بلکہ عیاشی سے گزر جائے گی یا چیلنج قبول کر لے' تیرے پاس وقت ہے' مواقع ہیں...... اور صلاحیت ہے۔''

میں نے کہا ''یہاں آنے سے پہلے میں بے یقینی کا شکار تھا۔''

''اور اب......؟'' اس نے مجھے غور سے دیکھا۔

''میں چیلنج قبول کر چکا ہوں۔''

اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا ''مجھے تو پتا تھا اور میں نے انکل سے بھی کہا تھا کہ بس' اب وہ بے فکر ہو جائیں۔ رفیق کو میں جانتا ہوں' وہ مہم جو اور خطرات پسند ہے۔ وہ ہنسنے لگے کہ میں بھی تو جانتا ہوں' آخر میرا بیٹا ہے۔''

میں نے کہا ''اکثر والدین ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ اسی خوش فہمی کا شکار ہوتے ہیں کہ انہوں نے پیدا کیا ہے اور پرورش کر کے اتنا بڑا کیا ہے تو وہ اپنی اولاد کو سمجھتے ہیں۔''

''ہاں یار! میرے ابا بھی سمجھتے تھے کہ صلاحیت موروثی ہوتی ہے اور میں ڈاکٹر ضرور بنوں گا۔ میں نے انہیں بہت مایوس کیا۔ رو پیٹ کے تھرڈ ڈویژن لی۔ تھرڈ کلاس تھرڈ ڈویژن والے مجھے داخلہ ہی نہیں ملا میڈیکل کالج میں تو میں صحافی بن گیا۔ انہیں صحافت اور ادب کے جراثیم مجھ میں کبھی نظر نہ آئے۔''

''غالباً یہی جنریشن گیپ ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔

دوپہر کے بعد راجا نے ایک مرغا پھانس لیا۔ اس کے موبائل پر کوئی کال آئی۔ اندر سگنل خراب تھا۔ وہ باہر گیا اور پانچ منٹ بعد آیا تو مجھ سے ہاتھ ملا کے بولا ''فیکے! تیرے پیسے بچ گئے اور اپنا بھی کچھ دال دلیا ہو گیا۔ چل اٹھ' پی سی چلتے ہیں۔''

میں نے راستے میں لندن کال کی۔ عائشہ کا فون بند تھا۔ ثوبی اسی وقت آفس پہنچی تھی۔ اس نے کہا ''سام سے میری بھی ابھی بات ہوئی ہے۔ وہ کچھ اپ سیٹ تھا بیٹی کے معاملے میں۔ کہہ رہا تھا کہ اس کا کچھ پتا نہیں چل رہا ہے۔''

''کیا مطلب......؟''

''وہ غائب ہے۔ گھر سے کل رات چلی گئی تھی مگر پھر رابطہ نہیں کیا۔ اس کے دوست بھی کچھ نہیں جانتے یا بتا نہیں رہے ہیں۔ جیسے ہی کچھ معلوم ہوا' میں تمہیں فون کروں گی'' ثوبی نے کہا۔

فریال کا فون بھی بند تھا جس کا ایک مطلب یہ بھی ہوسکتا تھا کہ صفدر سلطان وہاں موجود ہے۔ اپنی بیوی کو ٹھکانے لگانے کے بعد سے وہ لاپتا تھا تاہم اس کے لندن میں ہونے کی تصدیق نہیں ہوئی تھی۔ تاہم یہ ہوسکتا تھا کہ اس نے کسی دوسرے نام کے پاسپورٹ سے سفر کیا ہو۔ فریال عام طور پر دیر تک نہیں سوتی تھی۔

لنچ پر مدعو کرنے والا منشیات کے خلاف کوئی این جی او چلاتا تھا۔ بہت سے عیار اور مکار لوگوں نے اسے نیک نامی اور پیسا کمانے کا ذریعہ بنا لیا تھا۔ اس نے لنچ کرانے کے علاوہ اسے اپنے سفر حج کے مشاہدات اور تاثرات پر مبنی ایک کتاب بھی پیش کی جس کا مصنف وہ خود تھا۔

''یہ چھپ کر آ گئی تھی۔ میں نے سوچا آپ ملاحظہ فرمالیں اور جتنی کاپیاں درکار ہوں مجھے بتا دیجیے گا۔ سو تو میں کاپی بھجوا دوں گا'' اس نے جاتے ہوئے ہاتھ ملا کے کہا۔

اس کے جاتے ہی راجا نے براؤن پیپر کے لفافے سے کتاب نکالی۔ کتاب کے درمیان ایک اور سادہ لفافہ تھا جس میں پچاس ہزار کا بیرر چیک تھا۔ ''دیکھ فیکے پتر! ضمیر فروشی کی کتنی کم قیمت مل رہی ہے مجھے۔ اس کتاب کا مصنف میں ہوں' نام اس بدمعاش کا ہے۔''

میں نے حیرانی سے کہا ''تو گھوسٹ رائٹر بھی بن گیا ہے؟''

''پیسے کے لیے جو کچھ اس ملک میں معزز سمجھے جانے والے کر رہے ہیں۔ یہ اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔'' اس نے کہا ''میں نے اس ملک کے سادہ لوح عوام کو اور سرکاری خزانے کو نہیں لوٹا' مجھے لکھنا آتا ہے' میں نے کتاب پر محنت کی تھی' یہ میری حق حلال کی کمائی ہے۔''

میں نے کہا ''تیرے اصول اور نظریات سب بدل گئے ہیں؟''

''یہ دنیا اور یہ کائنات جب سے بنی ہے۔ ہر لمحہ بدل رہی ہے۔'' اس نے کسی فلسفی کی طرح فرمایا ''ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں۔ یہ علامہ صاحب نے فرمایا تھا۔ اس حقیقت کو سمجھ فیکے پتر! اور حیران ہونا چھوڑ دے۔ تو بتا تیرے معاملات کیسے چل رہے ہیں؟''

میں نے بڑے دکھ سے سر ہلایا ''محاورے کے برعکس دو مرغیوں میں ملّا حرام ہو رہا ہے۔ حالانکہ ملا اناڑی نہیں ہے۔'' اس نے گاڑی کو شہناز کے کلینک پر روک دیا ''سب محاورے الٹ گئے ہیں۔ اب چراغ تلے نہیں اوپر اندھیرا ہوتا ہے لیکن پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ ایسا تو فلموں کے علاوہ زندگی میں بھی ہوتا ہی رہتا ہے۔ حالات کو وقت کے دھارے پر چھوڑ دینا چاہیے۔ بالآخر سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔''

''نہیں یار! حالات خراب ہوتے جا رہے ہیں۔''

''میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں خرابی کیا ہے؟ یار......! دو لڑکیاں مرتی ہیں تجھ پر' ایک دیسی ایک ولایتی۔ ایک تجھے ضرور ملے گی' دوسری کا ہو جائے گا کوئی نہ کوئی ڈسپوزل۔ ہوسکتا ہے دونوں کو تیری منکوحہ کہلانے کا اعزاز حاصل ہو۔ کیا حرج ہے' اس میں بھی؟ زندگی کی گاڑی دو پہیوں پر چلتی ہے۔ تین پر رکشا چلتا ہے کہ نہیں...... بس ذرا شور زیادہ ہوتا ہے۔''

''مہاراجا!'' میں نے کہا ''سیریس ہو جا ورنہ میں ہاتھ مار دوں گا۔''

''او کے...... او کے! غور کریں گے تیرے مسئلے پر بھی۔ ابھی شہناز کو مت بتانا کہ مجھے پچاس ہزار کا چیک ملا ہے۔''

یہ بڑی عجیب بات تھی۔ سارے زمانے میں چکر چلانے والا' ذہین اور فطین...... بلکہ چالاک اور مکار' زمانہ ساز اور معاملہ فہم راجا شہناز سے ڈرتا تھا۔ وہ ایک بے باک صحافی

تھا۔ خطرات مول لے کر رپورٹنگ کرتا تھا اور اندر کے راز افشا کرنے کے چکر میں بارہا اپنے دشمنوں کی ریشہ دوانیوں کا شکار بھی ہو جاتا تھا۔ اس کی پٹائی تو کئی بار ہوئی۔ ایک بار کسی وزیر صاحب نے اپنے خلاف کرپشن کے ثبوت منظرِ عام پر لانے کے جرم میں راجا پر قاتلانہ حملہ بھی کرایا۔

لیکن اسے میں شہناز کے سامنے بھیگی بلی بنا دیکھتا تھا تو مجھے حیرانی ہوتی تھی۔ پہلے میں سمجھتا تھا کہ وہ شہناز کو بے وقوف بنانے کے لیے اداکاری کرتا ہے۔ جیسے باہر دوسری لڑکیوں پر ڈورے ڈالنے کے لیے کرتا تھا مگر یہ حقیقت تھی۔

شہناز اس کی کزن تھی۔ وہ میڈیکل کے فائنل ایئر میں تھی جب راجا پر اچانک اس کے عشق کے وائرس کا شدید حملہ ہوا۔ اس سے پہلے وہ شہناز سے دور بھاگتا تھا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ قدرت نے ہر کام کے لیے ایک وقت مقرر کیا ہے۔ موت زندگی کی طرح عشق کا ٹائم ٹیبل انسان نہیں بنا سکتا۔

شہناز ایک عام سی لڑکی تھی۔ میرے نکتۂ نظر سے ذرہ بھی خوبصورت نہیں تھی۔ دبلی پتلی اور سانولی۔ قد میں راجا سے دو انچ زیادہ، عمر میں راجا سے دو سال بڑی۔ اس کی صورت کے نقوش تیکھے تھے، آنکھیں بڑی بڑی تھیں اور بال حیرت انگیز حد تک لمبے تھے مگر اس کی شخصیت کی سب سے بڑی دلفریبی اس کی مسکراہٹ تھی۔ دائمی پرخلوص اور مہربان۔ اعتماد جگانے والی اور حقیقی۔ وہ کھنکتے لہجے میں بات کرتی تھی اور اسے کپڑے پہننے کا سلیقہ تھا۔ تین سال سے راجا اس کے سحر میں گرفتار تھا اور اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ رکاوٹ ڈالنے والا اور کوئی نہیں تھا۔ خود شہناز نے راجا کے سامنے کچھ شرائط رکھ دی تھیں۔ راجا کے الفاظ میں، وہ کہتی تھی کہ تم سے شادی کر کے میں اپنی زندگی خراب نہیں کر سکتی۔ پہلے تم سدھر جاؤ...... اور اپنی تمام تر کوشش کے باوجود راجا سدھرنے میں ناکام تھا۔

ہم لاؤنج میں بیٹھے ہی تھے کہ شہناز آ گئی۔ ”بڑا انتظار کرایا آپ نے رفیق بھائی۔ میں تو صبح سے انتظار کر رہی تھی۔“

میں نے کہا ”ہاں...... مگر راجا نے کہا کہ مشکل سے گاڑی ملی ہے۔ پہلے کچھ آوارہ گردی کر لیں، پھر آرام سے چلیں گے۔“

راجا نے مجھے گھورا ”یہ مجھے لنچ پر لے گیا تھا۔“

”جھوٹ مت بول راجا! لنچ تو اس منشیات فروش نے کرایا ہے ہمیں پی سی میں...... جس نے تجھے پچاس ہزار بھی دیے ہیں۔“

”پچاس ہزار دیے ہیں...... کس بات کے؟“ شہناز نے کہا ”تم کیا اس کے لیے کام کرنے لگے ہو؟“

راجا نے برہمی سے کہا ”یہ بکواس کرتا ہے۔“

میں نے کہا ”بکواس کیا...... چیک اس کی جیب میں ہے۔“

شہناز نے ہاتھ آگے بڑھایا ”راجا۔ چیک دو مجھے۔“

راجا نے بڑی فرماں برداری سے چیک شہناز کو دے کر مجھ پر ایک خوں آشام نگاہ ڈالی ”الو کے پٹھے!“

شہناز نے چیک کو غور سے دیکھا اور پھر اس کے دو ٹکڑے کر دیے ”تم اتنے گر گئے ہو، مجھے یقین نہیں آتا۔“

راجا نے سر پکڑ لیا ”یہ تم نے کیا، کیا شہناز! میں نے کوئی کام نہیں کیا، مجھ سے پوچھا تو ہوتا۔“

میں نے کہا ”میں بتاتا ہوں، تم نے کیا، کیا ہے؟ شہناز اس نے سفرنامہ لکھا ہے۔ ایک منشیات کے اسمگلر کے نام سے وہ کتاب شائع ہوئی ہے جس نے کبھی عمرہ تک نہیں کیا، نکما نکتی ہے۔ راجا نے دوسروں کے سفرنامے دیکھ کے سب لکھ دیا۔“

شہناز کے سامنے راجا کی وہی حالت تھی جو تھانے...

...کے سامنے مبینہ ملزم کی ہوتی ہے مگر اس سے پہلے کہ شہناز کچھ کہتی یا راجا اپنی صفائی پیش کرتا میرا سیل فون بجنے لگا۔ میں نے سی ایل آئی پر دیکھا تو یہ سوشی کا نمبر تھا۔ میری ہیلو کے جواب میں اس نے کہا ”رفیق! تمہارے لیے اچھی خبر نہیں ہے۔“

میں نے پریشان ہو کے کہا ”عائشہ تو ٹھیک ہے......؟“

”آئی ایم سوری!“ سوشی بولی۔

مجھے اس کی آواز بہت دور جاتی محسوس ہوئی۔ کسی بازگشت کی طرح جو پہاڑوں کے درمیان بھٹکتی ہوئی اپنا وجود بھی ختم کر دیتی ہے اور سناٹے میں دفن ہو جاتی ہے۔

میں نے خود کو ذہنی طور پر بدترین جذباتی صدمے کے لیے تیار کر لیا۔ چند سیکنڈ کے پُرآزار لمحوں کے اس وقفے میں خود ہی احساس کی عدالت نے مجھ پر فردِ جرم عائد کر دی تھی۔ عائشہ کے قاتل تم ہو، تم اگر چاہتے تو وہ زندہ رہ سکتی تھی مگر تم نے اسے مرنے دیا۔ تم نے اسے ٹھکرا دیا، یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس جذباتی بحران کے بعد وہ زندہ نہ رہ سکے گی اور تم نے دیکھا کہ اس نے اپنی جان لے لی، صرف تمہاری وجہ سے۔

چند سیکنڈ کے اس پُرآزار وقفے میں میرے تصور نے مجھے وہ سب دہشت ناک مناظر دکھا دیے جو ہنستی مسکراتی، متحرک اور توانا، حسن و رعنائی کے احساس سے معمور زندگی کی تصویر نظر آنے والی عائشہ کی موت سے منسوب تھے۔

پھر میں نے دل کو مضبوط کیا اور کہا ”سوشی! تم خاموش کیوں ہو۔ کیا وہ مر گئی ہے؟ اگر اس نے خودکشی کر لی ہے تو مجھے بتاؤ۔“

”خودکشی...... اوہ نو! خدا نہ کرے، ایسا مت کہو رفیک...... چیئر اَپ...... حالات اتنے بھی خراب نہیں ہیں“ سوشی نے حوصلہ افزا لہجے میں کہا۔

میں نے محسوس کیا جیسے میرے وجود کو دبانے والی بھاری چٹان ہٹ گئی ہے اور اب میں سانس لے سکتا ہوں ”پھر کیا ہوا ہے؟“

سوشی نے کہا ”کچھ نہیں...... وہ دراصل...... عائشہ کو پولیس نے گرفتار کر لیا ہے۔“

”گرفتار کر لیا ہے...... مگر کیوں......؟“

سوشی نے کہا ”اس کی اپنی ماں سے لڑائی ہوئی تھی۔ بس اس کے بعد وہ گھر سے چلی گئی اور لوٹ کے نہیں آئی۔ ماں کا خیال تھا کہ وہ کسی دوست کے ساتھ ہو گی۔ اس نے ہر جگہ معلوم کیا اور بالآخر کسی نے اسے بتا دیا کہ عائشہ ایک ہوسٹل میں چلی گئی ہے۔ وہ سخت پریشان ہوئی کیونکہ وہ ہوسٹل بہت خراب جگہ ہے۔ وہاں کا ماحول انتہائی غیر شریفانہ ہے۔ وہاں زمانے بھر کے بگڑے ہوئے لوفر اور جرائم پیشہ رہتے ہیں۔ زیادہ تر سیاہ فام ہیں۔“

میں نے کہا ”یہ سب تم کیسے جانتی ہو؟“

”میں نے عائشہ کی ماں سے بات کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ایک تو وہ بیٹی کی وجہ سے اَپ سیٹ تھی۔ دوسرے وہ کچھ فطری طور پر بددماغ اور بدزبان عورت ہے۔ مجھ پر برس پڑی کہ تم کیوں پریشان کر رہی ہو مجھے۔ وہ خود تو چلا گیا، ہم ابھی تک مصیبت میں ہیں۔ تم کیا اس کی ایجنٹ ہو۔ کیا مقصد ہے آخر اس انکوائری کا؟ میں کیا کہتی، میں نے پھر اس سے بات نہیں کی۔ میں نے عائشہ کے باپ سے پوچھا۔ بے چارا بیٹی کے لیے بہت دکھی تھا۔ اس نے کہا کہ وہ ذاتی ضمانت پر عائشہ کی رہائی کے لیے پولیس اسٹیشن جا رہا ہے۔“

”سوشی! یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ آخر پولیس کو عائشہ کے اس ہوسٹل میں رہنے سے کیا پریشانی لاحق تھی۔ وہ خودمختار ہے، جہاں چاہے رہے، کیا پولیس نے لیڈی سیلیا ارنسٹ کے دباؤ پر اسے وہاں سے گرفتار کر لیا۔“

”نہیں، وہ ایسا کیسے کر سکتے ہیں۔ دراصل کل رات کو وہ کسی نائٹ کلب میں تھی۔ وہ بھی انتہائی غیر شریفانہ اور کسی حد تک غیر محفوظ علاقے میں ہے اور وہاں بھی زیادہ تر کالے ہی جاتے ہیں۔ تم خود اندازہ کر سکتے ہو کہ عائشہ جیسی لڑکی اس ماحول میں کتنی مس فٹ ہو گی۔ خیر، آدھی رات کے بعد وہ کسی کالے کے ساتھ نکلی۔ ان کے پاس ایک پرانی بغیر چھت والی گاڑی تھی۔ ایک کالا اسے چلا رہا تھا اور اس کے ساتھ کوئی کالی لڑکی بیٹھی تھی جو اسے شراب پلا رہی تھی۔ جب پولیس نے انہیں گرفتار کیا تو وہ ایک چرچ کے سامنے کھڑے ایک فحش گانا گا رہے تھے۔ تم نے سنا ہو گا۔ لو آن دی روڈ۔ پیچھے والی سیٹ پر عائشہ ایک اور سرمنڈے حبشی نوجوان کے ساتھ کھڑی تھی۔ ان کے لباس نامکمل تھے اور کار چلانے والے کے بارے میں پولیس کا بیان ہے کہ اس نے کچھ بھی نہیں پہن رکھا تھا۔ جب اسے اتارا گیا تو پتا چلا۔“

”او مائی گاڈ! کیا عائشہ بھی شراب کے نشے میں دھت تھی“ میں نے بڑے دکھ سے پوچھا۔

”نہیں رفیق، اس نے ڈرگز لی تھیں۔ ہیروئن...... لیکن تم تو جانتے ہو وہ اس کی عادی نہیں ہے۔“

”عادی نہیں ہے تو ہو جائے گی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ خود کو احساسِ جرم کی اذیت سے کیسے دور رکھوں۔ یہ سب بہرحال میری وجہ سے ہوا۔ اگر اس نے خود کو تباہ کر لیا تو میں

خود کو معاف نہیں کر پاؤں گا' سوشی مجھے بتاؤ میں کیا کروں؟''

اس نے ہمدردانہ لہجے میں کہا ''رفیک! ٹیک اٹ ایزی' اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں' ایسا کچھ نہیں ہوگا جیسا تم سوچ رہے ہو۔''

''ایسا ہوتا ہے سوشی! فرشتہ جب بغاوت کرتا ہے تو شیطان بن جاتا ہے۔''

اس نے کہا ''میں سمجھتی ہوں کہ عائشہ کی اس حالت کی ذمے دار تم سے زیادہ اس کی ماں ہے۔ اس بے وقوف عورت کو سمجھنا چاہیے تھا کہ اس کی بیٹی ایک جذباتی صدمے سے گزر رہی ہے۔ شاک کی کیفیت میں ہے۔ عائشہ کو ایک ہمدرد ماں کی آغوش کی ضرورت تھی' کسی غمگسار دوست کی ضرورت تھی' کسی سخت گیر نگراں کی نہیں' جو اس کو لعن طعن کرے۔ اس کا باپ موجود ہوتا تو ایسی صورتِ حال پیدا نہ ہوتی۔ تم جانتے ہو' وہ کتنا معقول آدمی ہے۔ اس نے مجھے یقین دلایا ہے کہ وہ سب ٹھیک کرلے گا۔''

''عائشہ بھی باپ پر بہت بھروسا کرتی ہے۔''

''میری تو سمجھ میں نہیں آتا رفیک! ان دونوں نے اتنے سال کیسے گزار لیے۔ سیلیا نے اور سام نے۔ زمین آسمان کا فرق ہے میاں بیوی کی فطرت میں۔ سیلیا تو لارڈ ارنسٹ سے شادی کر کے لیڈی سیلیا ارنسٹ بن گئی مگر لارڈ ارنسٹ کو کیا ملا؟ میں اس کی قوتِ برداشت کی بھی داد دیتی ہوں' کوئی اور سیلیا کے ساتھ گزارہ نہیں کرسکتا تھا۔''

میں نے کہا ''وہ رومن کیتھولک ہیں۔ طلاق ممکن نہیں تھی۔ اس لیے گزارہ کرنا پڑ رہا ہے۔ نقصان تو ہو رہا ہے عائشہ کو۔ وہ کتنی ذہین اور پُراعتماد لڑکی ہے۔''

''اسی لیے مجھے امید ہے کہ حالات ٹھیک ہوجائیں گے۔ عائشہ ایک باہمت اور مضبوط کردار کی مالک ہے۔ یہ جو وقتی ردِعمل ہے' یہ بالکل نارمل ہے۔ شاید اس کی جگہ میں ہوتی تو ایسے ہی کرتی۔ تم بس اپنا خیال رکھو' میں تمہیں پھر فون کروں گی۔''

''پلیز...... مجھے صورتِ حال سے باخبر رکھنا۔ میں تم پر ہی بھروسا کرتا ہوں اور دیکھو...... موقع ملے بات کرنے کا تو اس جذباتی لڑکی کو بھی سمجھانا' وہ تمہاری عزت کرتی ہے' بائی۔''

جب میں لوٹ کے اندر گیا تو میرے دل میں احساسِ جرم کی ایک خلش تھی جسے عقل کی یہ دلیل نہیں مٹا سکتی تھی کہ سات سمندر پار ایک عاقل و بالغ لڑکی اپنی زندگی کے سارے فیصلوں میں اپنے اختیار کو کیسے استعمال کرتی ہے' اس سے اب مجھے سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ میں یہ تسلیم کرنے پر مجبور تھا کہ ایسا نہیں ہے اور میں عائشہ سے لاتعلق نہیں رہ سکتا۔

اندر شہناز کا اصلاحی لیکچر چل رہا تھا۔ راجا ایک نمبر ڈھیٹ اور بڑا اچھا ایکٹر تھا۔ شہناز سے اختلاف کرتا تھا اور نہ ہی بحث۔ اس کے نزدیک جان چھڑانے کا یہ بے ضرر طریقہ تھا کہ سنتے جاؤ اور سر ہلاتے جاؤ۔ اچھا جی' آپ کہتی ہیں تو ٹھیک ہے۔ آپ کہتی ہیں غلط ہے' تو غلط ہے۔ وہ کہتا تھا کہ شہناز کو بولنے کی عادت ہے اور مجھے سننے کی عادت پڑ گئی ہے۔ جب وہ بول بول کے تھک جاتی ہے تو بات ختم ہوجاتی ہے۔

مجھے دیکھتے ہی شہناز نے کہا ''رفیق بھائی۔ آپ بتایئے کیا جو راجا نے کیا' ٹھیک کیا؟''

میں نے کہا ''اس نے زندگی میں ایک ہی کام ٹھیک کیا کہ تمہیں اپنے لیے پسند کیا' عاقبت سدھر گئی اس کی۔''

وہ کچھ شرمائی ''اب یہ کہتا ہے کہ پیسا جائز اور ناجائز نہیں صرف پیسا ہوتا ہے۔ دھن کالا ہوتا ہے نہ سفید بس' دھن ہوتا ہے۔''

راجہ نے دبا دبا احتجاج کیا ''میں نے کہا تھا کہ لوگ ایسا سمجھتے ہیں۔''

''پھر تم نے اس ہیروئن کے اسمگلر کا پیسا کیوں لیا؟''

''یار شہناز! میں نے اتنی محنت کی تھی۔ ایک کتاب لکھی تھی' اس نے جو کچھ مجھے دیا وہ حقِ محنت تھا'' راجا نے کہا۔

''پھر وہی بات۔ تم نے اس کتاب میں جھوٹ لکھا تھا۔ ایک تو یہ گناہ کیا کہ اس شخص کو حاجی بنا دیا جس نے کوئی حج نہیں کیا۔ اسے مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ ہر جگہ پہنچا دیا۔ سارے ارکان حج ادا کرا دیے۔ اپنے قلم سے جھوٹ لکھ لکھ کے اور پھر اس کے حرام کے پیسے سے معاوضہ وصول کرلیا۔ یہ تو اللہ معاف کرے ایسا ہی ہے جیسے کوئی شراب بیچنے والا تمہیں ایک لاکھ دے کہ فلاں پیش امام صاحب میرے خلاف بولتے ہیں۔ انہیں قتل کردو۔ ایک تو قتل' وہ بھی عالم دین کا...... اور ادائیگی شراب کی کمائی سے...... کیا تم اسے حقِ محنت کہو گے...... بولو؟''

راجا نے مجھے آنکھ ماری اور ایک دم جھک کر شہناز کے پیر پکڑ لیے ''تم بالکل ٹھیک کہتی ہو۔ میں واقعی بہت برا آدمی ہوں۔ بہت کمینہ ہوں۔ تم فرشتہ ہو اور میں شیطان ہوں۔ میں ہرگز تمہارے لائق نہیں ہوں۔ تمہارا کتا کہلانے کے لائق بھی نہیں ہوں۔ بس آج کے بعد تم میرا منحوس چہرہ نہیں دیکھو گی۔ میں اپنی اس شرمناک زندگی کا خاتمہ کرلوں گا۔ میں

نیند کی گولیاں کھا کے سو جاؤں گا' ہمیشہ کے لیے۔ میرے مرنے کے بعد تم کسی اچھے آدمی سے شادی کرلینا۔''

شہناز کی حالت غیر ہوگئی۔ اس نے راجا کو اپنی طرف کھینچ لیا ''راجا! خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کرو۔ میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔ یہ سب میں اس لیے کہتی ہوں تم سے کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ تمہارے بغیر میری زندگی کا کوئی مطلب نہیں' میں کیسے زندہ رہوں گی۔''

راجا نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا ''سچ کہتی ہو۔''

''بالکل سچ'' راجا کے ڈرامے نے شہناز کو سخت جذباتی کردیا۔

راجا نے اس کے دونوں ہاتھ تھام کے چومے اور بولا۔ ''اچھا۔ پھر میں اپنا مرنے کا پروگرام ملتوی کرتا ہوں۔۔ فی الحال...... یار' ذرا اچھی سی کافی بنا کے لاؤ۔''

میں ہنس پڑا ''اس سالے ڈراما باز کی کافی میں زہر ملا کے لانا اور مگ اسکے سامنے رکھ کے کہنا کہ پی کر دکھائے۔ تم بھی بلاوجہ متاثر ہوجاتی ہو ڈاکٹر شہناز۔''

شہناز نے جھینپ کر مجھے دیکھا اور کافی بنانے چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی راجا مجھ پر برس پڑا ''ابے میں نے کیا تیرے باپ کی جائداد ہتھیالی تھی یا تیری گھر والی اٹھالی تھی۔ کیوں دشمنی کرتا ہے مجھ سے بلاوجہ کی۔''

میں نے کہا ''یار' میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔''

''الو کے پٹھے' اتنی آگ لگا کے کہتا ہے میں نے کچھ نہیں کیا۔ ابے کیا ضرورت تھی تجھے اتنا سچ بولنے کی۔ پیٹ میں درد ہو رہا تھا...... یا کہیں اور۔ چپ نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ تو ہے بے وقوف۔ بڑا تیر مارا' چیک پھاڑ دیا۔ میں کل دوسرا بنوا لوں گا۔''

میں نے کہا ''مہاراجا! شہناز بے وقوف ہوتی نا تو کب کی تیرے چکر میں آ کے برباد ہوجاتی۔ جیسے کہ خود کو بہت چالاک اور قابل سمجھنے والی بہت سی لڑکیاں ہوئیں۔ یہ شہناز ہی کا کمال ہے کہ اس نے تیرے جیسے پرانے چکر باز کو چکر میں ڈال رکھا ہے۔''

''مگر یار' یہ ہر وقت کی بک بک اور نصیحت۔ محبوبہ نہیں تھانے دارنی ہوگئی ہے۔ پیار سے کبھی بات ہی نہیں کرتی۔ ہر وقت میرے اخلاق و کردار کے پیچھے پڑی رہتی ہے۔ تنگ آگیا ہوں میں بھی۔ کسی دن واقعی خودکشی کرلوں گا یا بھاگ جاؤں گا تو روتی رہے گی عمر بھر...... جیسے ابھی رو رہی تھی۔''

''نہیں راجا! تو کہاں جاسکتا ہے' اس نے بڑی مضبوط زنجیروں سے تجھے جکڑ رکھا ہے۔''

راجا نے ایک ٹھنڈی سانس لی ''یہ بھی ٹھیک کہا تو نے یار!''

''اور اسے اپنی خوش قسمتی سمجھ' ایک عورت ہے جو تیرا خیال رکھتی ہے۔ تجھے سنبھال سکتی ہے۔ باقی سب کو جیسے تو الو بناتا ہے ویسے ہی وہ تجھے الو بناتی ہیں۔ تجھے انسان بنا سکتی ہے تو صرف شہناز!''

شہناز نے کافی کا ایک مگ میرے سامنے رکھا اور دوسرا راجا کو دیا۔ ''کس کا فون تھا رفیق بھائی!'' وہ میرے سامنے بیٹھ کر بولی۔

میں نے کہا ''ایک دوست نے لندن سے کیا تھا۔''

''خیریت تو ہے نا۔ آپ کچھ اَپ سیٹ ہیں'' شہناز نے کہا۔

راجا نے کہا ''اپنا فیکا بہت پریشان ہے' اس کے ساتھ ''یک نہ شد دو شد'' والا معاملہ ہوگیا ہے۔''

میں نے کہا ''تم سے تو کچھ بھی چھپا ہوا نہیں ہے شہناز۔ تم جانتی ہو کہ ابا جی نے مجھے امریکا کیوں بھیجا تھا۔''

راجا بولا ''اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے...... مگر جیسا کہ شیخ سعدی نے فرمایا ہے۔ حضرت عیسیٰ کا گدھا اگر مکہ چلا جائے تو حاجی نہیں ہوجاتا' گدھا ہی رہتا ہے۔''

میں نے کہا ''نہیں' یہ حالات کی مجبوری تھی۔ میں ان کی اکلوتی اولاد تھا۔ وہ ہرگز مجھے اپنی نظروں سے دور نہ کرتے۔ تعلیم یہاں بھی حاصل کی جاسکتی تھی مگر اصل مقصد تو میری جان بچانا تھا۔ خود پر جبر کر کے انہوں نے ایک غیر جذباتی مگر بالکل صحیح فیصلہ کیا۔ اگر میں یہاں رہتا تو مجھے یقین ہے کہ میرا انجام بھی وہی ہوتا جو میرے بھائی کا ہوا تھا۔ آج اس کی قبر کے ساتھ ہی میری قبر بھی ہوتی۔ میں نے جوانی کے جوش میں ایک ایسا راستہ اختیار کرلیا تھا جو تباہی کی طرف جاتا تھا۔ جو بزعم خود میرے خیر خواہ تھے اور مجھے بھی ایسا لگتا تھا کہ میرے دوست ہیں۔ انہوں نے مجھ سے بہت سے ایسے کام کرائے جو غلط تھے' قانون کی نظر میں جرم کا درجہ رکھتے تھے اگر میں یہاں رہتا تو ان کے ہاتھوں بلیک میل ہوتا رہتا۔ میں ان کی مانتا جاتا یا نہ مانتا اور بغاوت پر اتر آتا دونوں صورتوں میں میرا انجام وہی ہوتا۔ وہ خود مجھے مار دیتے یا میں خود چل کے تختۂ دار تک پہنچ جاتا۔''

''چلیں' وہ بات تو اب پرانی ہوگئی'' شہناز نے کہا۔

''نہیں شہناز! ماضی کا آسیب کبھی پیچھا نہیں چھوڑتا۔ وہ ہر جگہ آدمی کا تعاقب کرتا ہے۔''

''تو کیا ..... وہ پھر آپ کے پیچھے پڑ گئے ہیں؟'' وہ بولا۔

میں نے کہا ''میں نے چار سال امریکا میں گزار دیے۔ اپنی تعلیم مکمل کر لی۔ اس کے بعد لندن میں بہت اچھی نوکری مل گئی۔ دو سال اچھے گزر گئے۔''

''اچھے کیسے نہ گزرتے شہناز! اس کے لیے تو دن عید اور رات شب برات۔ پوچھنے والا کوئی نہیں کہ فیکے پتر! دیسی شراب پیتے ہو یا ولایتی وہسکی'' راجا نے کہا۔

شہناز نے اسے گھورا ''کبھی تو سیریس ہو جایا کرو۔''

راجا نے قہقہہ مارا ''شنوڈارلنگ! وہ دونوں اس کی جان کے درپے ہیں' پوچھ لو اس سے۔ ایک فریال ہی لندن میں کیا کم تھی کہ دوسری مقابلے پر آ گئی۔ لارڈ ارنسٹ کی دختر نیک اختر' ایلیشیا۔ اس کی خاطر وہ عائشہ بھی ہو گئی' اب بے چارہ فیکا کیا کرے؟''

میں نے کہا ''راجا ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہ ایسا مسئلہ ہے جس کا کوئی حل میری سمجھ میں نہیں آتا۔ مزید مشکل یہ ہو گئی کہ ابا جی نے اپنا نادر شاہی فرمان جاری کر دیا کہ سب چھوڑ کے پاکستان آ جاؤ کیونکہ تمہارے نام قسمت کی لاٹری نکل آئی ہے اور تم بن گئے ہو کروڑپتی۔''

''اس میں تو کوئی شک نہیں کہ آپ بہت خوش قسمت ہیں رفیق بھائی۔ آپ کو کیا ضرورت ہے پردیس میں نوکری کرنے کی۔''

''یہ تو خیر ٹھیک ہے مگر معاملات بہت پیچیدہ ہیں شہناز۔ اب تم فریال کو ہی لو۔ اپنے پاؤں میں بیڑی اس نے خود ڈالی۔ صفدر سلطان سے منگنی کر کے۔''

''لیکن یہ فیصلہ کرنے والا تو اس کا باپ تھا۔''

''نہیں شہناز! اپنے لیے یہ عذاب خود فریال نے مول لیا۔ جب صفدر سلطان نے اسے پہلی بار دیکھا تو اس کے حسن پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ فریال کے کالج میں کوئی تقریب تھی جس میں وہ مہمان خصوصی تھا۔ اس نے فریال کو ڈرامے میں پرفارم کرتے دیکھا اور تقریب کے بعد اس سے ملا تو اسے اپنی فلم میں لیڈ رول کے لیے آفر دے دی۔ اکثر لڑکیاں تو ایسے ہی خواب دیکھتی ہیں۔ اس کے لیے بڑے جتن بھی کرتی ہیں اور خوار بھی بہت ہوتی ہیں۔ فریال کی تو جیسے لاٹری نکل آئی۔ سارے کالج میں دھوم مچ گئی کہ اسے ایک فلم میں ہیروئن کے لیے سائن کر لیا گیا ہے۔ حالانکہ معاملہ صرف زبان کا تھا۔ صفدر سلطان جیسے عیاش اور اوباش دولت مندوں کے ہاتھ میں چانس ایک جال کی طرح ہوتا ہے جس میں لڑکیاں دن رات پھنستی رہتی ہیں۔ فریال کو اپنی ہوشیاری پر بہت ناز تھا اور اپنے حسن پر بھی۔ اسے یقین تھا کہ پہلی فلم ریلیز ہوتے ہی وہ فلمی آسمان کا سب سے روشن ستارہ بن کے چمکنے لگے گی۔ اس کے دروازے پر فلمسازوں کی لائن لگ جائے گی جن میں صفدر سلطان بھی شامل ہوگا۔ صفدر سلطان یہ کھیل تو کھیلتا ہی رہتا تھا۔ اس نے ایگریمنٹ کیا اور ایک لاکھ ایڈوانس بھی دے دیا جو فریال کے باپ نے وصول کیا اور ٹھکانے بھی لگا دیا۔ کچھ شراب میں اور کچھ بازاری عورتوں پر جو اسٹوڈیو میں شکار ڈھونڈتی پھرتی ہیں۔ فریال نے صفدر کی پیش قدمی کے سارے حربے ناکام بنا دیے تو اس نے آخری وار آزمایا۔ اس نے فریال کو شادی کی پیش کش کر دی۔ وہ فریال کو بے وقوف بنا رہا تھا۔ فریال نے اسے بے وقوف بنانے کی کوشش کی۔ اس نے کہا کہ شادی تو میں ابھی نہیں کر سکتی۔ جب تک یہ فلم ریلیز نہ ہو جائے۔ صفدر نے ایسی بہت سی فلموں کے اعلانات پہلے بھی کیے تھے جن کی نئی ہیروئن بڑی آسانی سے ترغیب کے جال میں پھنس جاتی تھی۔ وہ ایڈوانس لیتی تھی' پھر اس کی قیمت ادا کرتی تھی اور اپنے دامن میں رسوائی کے داغ اور دل میں سپر اسٹار بننے کی حسرت لے کر رخصت ہو جاتی تھی۔ فریال نے ابھی تک اسے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیا تھا۔ اس کا دفاعی حصار توڑنے کے لیے صفدر سلطان نے منگنی کا باضابطہ اعلان کر دیا اور فریال اس خوش فہمی میں رہی کہ منگنی کوئی نکاح تو نہیں ہے۔ جب وہ شہرت کے آسمان پر ہوگی تو صفدر جیسے نہ جانے کتنے اس کے پیچھے دم ہلائیں گے اور وہ سب کو دھتکار دے گی۔ صفدر سلطان کی اس وقت کیا مجال ہوگی کہ منگنی کے نام پر اپنا حق جتا سکے لیکن فریال کے سارے اندازے غلط ہو گئے۔ اگر صفدر کو کچھ نہیں ملا تو فریال کے ہاتھ بھی کچھ نہ آیا اور پیروں میں زنجیر بلاوجہ پڑ گئی۔ نہ فلم بنی اور نہ وہ ہیروئن مگر صفدر سے جان چھڑانا مشکل ہو گیا۔ وہ ایک سیاسی وڈیرا' زمیندار اور صنعت کار' خود کو حسن کا شکاری سمجھنے والا۔ اس نے اپنی سخت سبکی محسوس کی۔ پیٹھ پیچھے اس کے حواری بھی مذاق اڑانے لگے کہ کڑی قابو نہ آئی۔ اس انا پرست اور کینہ پرور شخص نے اسے زندگی اور موت کا مسئلہ بنا لیا۔ اس نے فریال کو بھی وارننگ دے دی کہ وہ تعلقات میں محتاط رہے کیونکہ اب وہ صفدر سلطان مرزا کی منگیتر ہے جس سے بالآخر اس کی شادی ہونی ہے۔ فریال کو تب اندازہ ہوا کہ وہ کتنی بری طرح پھنس گئی ہے۔ ان سب نے جو فریال کے ساتھ مخلص تھے اسے سمجھا دیا تھا کہ وہ ایسی غلطی نہ کرے مگر اس وقت وہ اونچی ہواؤں میں اڑ رہی تھی

اسے اپنی ہوشیاری پر بہت بھروسا تھا۔ اس نے سب کو یہی جواب دیا تھا کہ وہ جب چاہے گی منگنی توڑ دے گی۔ پہلا اس سے زبردستی تو شادی نہیں کر سکتا اور صفدر سلطان زبردستی دکھائی تو وہ نمٹ لے گی۔ بے وقوف لڑکی' یہ نہیں جانتی کہ صفدر سلطان جیسے لوگوں سے تو قانون بھی نہیں نمٹ سکتا کیونکہ قانون خود ان کا زر خرید رہتا ہے۔ فریال پہلے بہانے کرتی رہی کہ ابھی مجھے بی اے کرنا ہے' پھر ایم اے۔ صفدر سلطان ڈھیل دیتا گیا کہ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے..... لیکن یہ مت بھولنا کہ تم میری ہو۔ اگر تم نے کسی اور کی طرف دیکھا یا کسی نے تمہاری طرف تو پھر یہ میری غیرت کا مسئلہ بن جائے گا۔ میں کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ فریال نے کہا کہ مجھے دو سال کے لیے لندن جا کے فیشن ڈیزائنر کا کورس کرنا ہے۔ اس نے کہا کہ جاؤ..... لیکن اس کے بعد سوائے شادی کے کچھ نہیں ہوگا۔ چار ماہ بعد یہ کورس ختم ہو جائے گا۔''

''اور اب فریال کیا کہتی ہے؟'' شہناز نے فکرمندی سے کہا۔

میں نے ایک گہری سانس لی ''اب وہ چاہتی ہے کہ میں کچھ کروں اور کچھ نہیں کر سکتا تو پھر صفدر سلطان کو قتل کر دوں یا کرا دوں۔''

شہناز دم بخود رہ گئی ''وہ پاگل تو نہیں ہے۔''

''اس میں کیا شک ہے۔ وہ پاگل ہے اور اس سے بڑا پاگل میں ہوں ورنہ صرف کہہ دیتا کہ اپنا کیا بھگتو' اب میں کچھ نہیں کر سکتا اور اس کے بعد اس کے معاملات سے قطعی لاتعلق ہو کے عائشہ سے شادی کر لیتا مگر فریال کے سامنے میں بے بس ہوں' وہ مجھ سے کچھ بھی کرا سکتی ہے۔''

''تو کیا تو نے قطعی فیصلہ کر لیا ہے' تو صفدر سلطان کو قتل کرے گا؟'' راجا نے کہا۔

''یار' میں کیا کروں؟ فریال نے مجھے چار ماہ کی مہلت دی ہے۔ اس کے بعد صفدر سلطان اس سے زبردستی شادی کر لے گا۔ وہ کہتی ہے کہ اس کے سوا دوسرا کوئی راستہ ہی نہیں ہے۔ اگر میں نے یہ کام نہ کیا تو پھر وہ خود صفدر کو قتل کر دے گی۔''

''اور اس کے بعد......''

''میں نے سمجھایا تھا اسے۔ صفدر سلطان کو قتل کرنا یا کرانا کوئی آسان کام ہے..... مگر وہ سمجھتی ہے کہ آسان ہے۔ اس کا دماغ ایسے ہی سوچتا ہے۔ اس کے دماغ پر مرڈر اسٹوریز کا اور جاسوسی فلموں کا اثر ہے۔ کہتی ہے کہ کام ہوشیاری سے کیا جائے تو خیر سے ہماری پولیس کبھی سراغ نہیں لگا سکتی۔''

''مگر شک تو براہِ راست تم دونوں پر ہی جائے گا'' شہناز نے کہا۔

''ظاہر ہے اور جو کام اسکاٹ لینڈ یارڈ کے سراغ رساں عقل سے لیتے ہیں وہ یہاں تیرہ نمبر کے چھتر سے ہو جاتا ہے۔ پتھر بھی اعترافِ جرم کر لیتے ہیں۔ میں کہاں مقابلہ کر سکتا ہوں پولیس کے پُرتشدد حربوں کا لیکن یہ بات اس کی سمجھ میں تب آئے گی جب مجھے پھانسی ہو جائے گی۔''

شہناز نے دہل کے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا ''بری بات منہ سے نہ نکالیں رفیق بھائی اور حوصلہ رکھیں' نکل آئے گا اس کا بھی کوئی حل۔''

میں نے کہا ''مسئلہ صرف فریال ہی کا نہیں ہے شہناز' عائشہ کا بھی ہے۔ میرا خیال ہے کہ سمجھانے سے وہ سمجھ گئی ہے یا اس نے ہر مجبوری کو قبول کر لیا ہے۔ اس حقیقت سے سمجھوتا کر لیا ہے کہ نہ میں اس سے شادی کر سکتا ہوں کیونکہ میں فریال کا ہو چکا ہوں اور نہ وہ میرے ساتھ یہاں ساری زندگی گزار سکتی ہے۔''

''اس نے تو آپ کی خاطر اپنا مذہب تک چھوڑ دیا۔''

میں نے کہا ''وہ ماں باپ اور گھر اور وہ ملک۔ سب کچھ چھوڑنے کو تیار ہے میں اس کے جذبات کی قدر ضرور کرتا ہوں لیکن تم خود سوچو کہ جس شاہانہ ماحول میں اس نے پرورش پائی ہے' لندن کی آزاد فضا اور برطانیہ جیسا ملک چھوڑ کے پاکستان میں رہ سکتی ہے؟ میرا خاندان تو خاصا دقیانوسی ہے۔ اخلاقی اور معاشرتی قدروں کے اعتبار سے ابھی تک شاید انیسویں صدی کا ماحول ہے۔ کیا وہ میرے گھر کی چار دیواری میں وہ زندگی گزار سکتی ہے جو میری ماں نے گزاری۔ اس کے پاگل پن کی انتہا تو یہ ہے کہ میرے ساتھ آنے کے لیے اس نے ویزا لے لیا تھا اور اپنی سیٹ بھی بک کرا لی تھی۔''

شہناز پھر دم بخود رہ گئی ''اچھا؟ پھر آئی کیوں نہیں۔''

''ظاہر ہے میں نے روک دیا۔ میرا خیال تھا کہ کچھ عرصے بعد اس جذباتی صدمے کا اثر باقی نہیں رہے گا۔ وقت سب سے بڑا درماں ہے لیکن ابھی فون پر لندن سے میری ایک کولیگ نے بتایا ہے کہ عائشہ کی وجہ سے اس کے والدین بہت پریشان ہیں۔ اس کی ماں ہمیشہ سے میری مخالف بلکہ دشمن رہی ہے اور بیٹی کے ساتھ میرے معاملے میں اس کا رویہ غیر ہمدردانہ ہے۔ اب وہاں والدین اپنی مرضی تو چلا نہیں سکتے' لڑکی خود مختار ہے' باپ کی کمپنی میں اچھے عہدے پر ہے۔ تعلیم یافتہ اور ذمے دار ہے۔ ماں کی اس سے لڑائی ہوئی اور وہ غصے میں گھر سے چلی گئی۔ نہ جانے کہاں اور کس

کے ساتھ رہی۔ وہاں ڈرگز لیں' رات کو پولیس نے پکڑ کے بند کردیا۔"

"او مائی گاڈ۔ پھر اب کیا ہوگا؟" شہناز نے کہا۔

"کیا ہوگا...... باپ اسے ضمانت پر رہا کروائے گا لیکن اسے روکے گا کون...... وہ پھر نکل جائے گی۔ خدانخواستہ منشیات کی عادی ہوگئی تو تباہ ہوجائے گی۔ اتنی مہذب' تعلیم یافتہ اور خوبصورت لڑکی نشہ کرنے والے اوباشوں اور نفسیاتی مریضوں کے چنگل میں پھنس گئی تو خود بھی نفسیاتی مریض بن جائے گی۔ خودکشی کرلے گی کسی دن۔"

راجا نے کہا "تجھے بہت فکر ہے اس کی؟"

میں نے برہمی سے کہا "ہاں ہے اور کیوں نہ ہو' میں جانتا ہوں کہ یہ سب خرابی میری وجہ سے ہوئی' اس کا ذمے دار میں ہوں۔"

"وہ تو خیر ٹھیک ہے مگر ٹیکے پتر! یہاں بیٹھ کے تو کیا کرسکتا ہے؟ آخر وہاں بھی تو اس کے خیر خواہ ہیں۔" راجا نے کہا۔

میں نے کہا "راجا میرے ضمیر پر ایک بوجھ ہے۔ اگر اسے کچھ ہوگیا تو ساری عمر میں خود کو معاف نہیں کر پاؤں گا۔"

شہناز نے کہا "پریشانی کی بات تو ہے لیکن اللہ نے چاہا تو اس مسئلے کا کوئی حل نکل آئے گا۔"

میں نے کہا "یہ کوئی ایک مسئلہ نہیں ہے۔ الگ الگ مسائل ہیں جو آپس میں الجھ گئے ہیں۔ اب دیکھو نا' ایک مسئلہ ہے فریال کا۔ صرف وہی ہوتا تو جیسے بھی ہوتا اس سے نمٹ لیتا مگر اچانک عائشہ کا مسئلہ نیا پیدا ہوگیا۔ اب فریال نہ ہوتی تو عائشہ جیسی لڑکی کی رفاقت کو میں اپنی خوش نصیبی سمجھتا لیکن میرے ساتھ واقعی یک نہ شد دو شد والا معاملہ ہوگیا۔"

"مسئلہ تو نے بنالیا ہے اپنے لیے۔ اب نمٹا دونوں کو۔ چار پر تیرا شرعی حق ہے۔"

"تمہیں شرم آنی چاہیے ایسی بات کرتے ہوئے" شہناز نے کہا۔

"رہنے دو بی بی! جس نے کی شرم اس کے پھوٹے کرم......اور میری سمجھ میں تو یہ بات آئی نہیں' نو آبجکشن سرٹیفکیٹ عائشہ بھی دیتی ہے اور فریال بھی تو پھر آپ کو کیا اعتراض ہے' عیش کریئے۔"

میں نے کہا "عائشہ کی بات تو ٹھیک ہے۔ وہ صلح پسند اور قربانی دینے والی لڑکی ہے مگر فریال صرف مذاق میں کہتی ہے کہ جتنی چاہو کرلو۔ بس میری جگہ خالی رکھنا۔ وہ کہاں شریک کرسکتی ہے محبت کے معاملے میں دوسری عورت کو۔ وہ میری مجبوری کو معاف کرسکتی ہے اور نہ ہی عائشہ کی مجبوری کو سمجھ سکتی ہے۔ وہ اسے بھی قتل کردے گی اور مجھے بھی۔"

"ابے کچھ مرد بن۔ اتنا ڈرتا کیوں ہے ایک عورت سے۔ دو بیویوں کے شوہروں کی طرح رہنا سیکھ لے۔ دونوں کو پاؤں کی جوتی سمجھ۔ ایک دائیں پیر کی' ایک بائیں پیر کی......اور میں شرط لگا سکتا ہوں کہ یہ جو ولایتی حسینہ ہے نا...... یہ بھاگ جائے گی بہت جلد۔ خود تنگ آجائے گی یا فریال اسے نکال باہر کرے گی۔"

میں نے کہا "یار! تو بند کر اپنی بکواس۔ یہ مسئلہ ایک اور مسئلے کی وجہ سے زیادہ مشکل بن گیا ہے۔ کچھ لوگ عائشہ کی وجہ سے مجھے بلیک میل کررہے ہیں۔"

"کون لوگ...... نسل پرست گورے یا اس کے چاہنے والے؟"

میں نے نفی میں سرہلایا "وہ میرے جاننے والے ہیں راجا۔ جن کی وجہ سے میں جلاوطن ہوا تھا تو شہاب الدین کو جانتا ہے نا؟"

"ہاں' اس کے بارے میں تو سنا تھا کہ مار دیا گیا۔ کچھ کہتے تھے کہ وہ مفرور ہے۔"

"جب میں چند گھنٹوں کے لیے کراچی میں رکا تھا تو وہ مجھ سے ملنے آیا تھا۔"

راجا نے کہا "اب کیا کام پڑگیا ہے اسے۔"

"میرا خیال تھا کہ وہ ڈانٹ ڈپٹ کرے گا۔ ڈرائے گا' دھمکائے گا کیونکہ میں نے چیف کا پیغام لانے والے ٹائیگر کو ٹھکانے لگا دیا تھا اور حکم عدولی کرتے ہوئے چیف سے ملے بغیر جہاز پر بیٹھ گیا تھا۔ اس کے لیے میں تیار تھا۔ جب اس نے پوچھا تو میں نے بڑے اعتماد سے جھوٹ بولا کہ ٹائیگر نے تو مجھے کوئی پیغام نہیں دیا اور کمال دیکھ کہ جھوٹ چل گیا۔ شہاب الدین نے بڑے افسوس سے مجھے مطلع کیا کہ وہ مجھ سے ملنے ہی آرہا ہوگا لیکن راستے میں اس کا کسی سے جھگڑا ہوگیا اور مار پیٹ میں اس کے سر میں ایسی چوٹ لگی کہ اندر سے دماغ الٹ پلٹ ہوگیا۔ ہوش میں آنے کے بعد اسے اپنا نام تک یاد نہیں۔ کچھ پتا نہیں وہ کب تک پاگل رہے گا۔"

"اسے زندہ کیوں چھوڑ دیا تھا تو نے یار!" راجا نے بے حد افسوس کا اظہار کیا۔

"شہاب الدین نے مجھے بتا دیا کہ چیف مجھ سے کیوں ملنا چاہتا تھا۔ یہ سالے کیسے فرعون بنے ہوئے تھے۔ اب کس بل نکل گئے ہیں تو سب کا لہجہ بدل گیا ہے۔ شہاب الدین بھی بڑی شرافت سے پیش آرہا تھا۔ اس نے کہا کہ ایک کام ہے جو آپ ہی کرا سکتے ہیں۔"

"اتنے عرصے بعد بھی انہوں نے آپ کا سراغ تلاش کرلیا" شہناز نے فکرمندی سے کہا "آخر یہ لوگ آپ کا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔"

"شہاب الدین نے صاف تو نہیں کہا مگر اشاروں میں واضح کردیا کہ یہ کام ہوجائے تو آیندہ کوئی خدمت میرے سپرد نہیں کی جائے گی لیکن میں نے انکار کیا تو مجھے سزا ضرور ملے گی اور ہوسکتا ہے کہ یہ سزا میرے گھر کو اور میرے مستقبل کو بھی متاثر کرے۔ دراصل شہاب الدین آج کل معتوب ہے۔ اس کے سیاسی حریف پاور میں ہیں اور یہ لوگ چھپتے پھر رہے ہیں۔ ان کے خلاف اب پرانے کیس درج ہورہے ہیں۔ جو کیس دبا دیے گئے تھے نکالے جارہے ہیں۔ کبھی کے دن بڑے کبھی کی راتیں جو انہوں نے دوسروں کے ساتھ کیا تھا وہی اب ان کے ساتھ ہورہا ہے۔ کچھ جان بچا کے فرار ہوگئے ہیں۔ باقی بھی نکلنا چاہتے ہیں۔ شہاب الدین کے ساتھ ایک اور بدمعاش گامے شاہ نے برطانیہ میں سیاسی پناہ مانگی ہے۔ ان کی پارٹی کے دو باغی جنہوں نے بغاوت کرکے اپنا گروپ بنانے کی کوشش کی تھی پہلے ہی برطانیہ میں ہیں اور ان کے کیس پر ابھی تک ہوم آفس نے فیصلہ نہیں کیا۔ شہاب الدین یہ چاہتا تھا اور چیف نے یہی کہنے کے لیے مجھے بلایا تھا کہ ان دونوں باغی ارکان کا کیس مسترد کرادوں' ان دونوں کو برطانیہ سے نکال دیا جائے اور شہاب الدین کے ساتھ گامے شاہ کی درخواست منظور کرلی جائے۔"

"کیوں......؟ ان کا کیا خیال ہے کہ برطانوی وزیراعظم تیرا ماما ہے؟"

میں نے کہا "وہ کہتے ہیں کہ لارڈ ارنسٹ اپنا اثر رسوخ استعمال کرے تو ہوم آفس سب کچھ کرسکتا ہے اور لارڈ ارنسٹ پردباؤ ڈالنے کے لیے میں عائشہ کو بطور لیور استعمال کروں۔"

"کیسا شیطانی دماغ ہے ان کا" راجا نے کہا۔

"ان کو یہ بھی معلوم ہے کہ لارڈ ارنسٹ کی بیوی لیڈی کیلیا کتنی متعصب عورت ہے اور عائشہ کے معاملے میں وہ بھری جانی دشمن ہورہی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں عائشہ کی ماں کو بلیک میل کروں۔ اس سے صاف بات کروں کہ یا تو اپنے شوہر سے ہوم آفس پر دباؤ ڈلوا کے یہ کام کرائے ورنہ میں اس کی بیٹی سے شادی کرکے اسے پاکستان لے آؤں گا۔ وہ ساری عمر روتی رہے گی اور کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گی کہ شاہی خطاب یافتہ گھر کی بیٹی ایک کالے انڈین کے

ساتھ بھاگ گئی۔ اگر وہ کام کرادے تو اس کی عزت محفوظ رہے گی۔ بیویاں اپنے شوہروں سے کچھ بھی کراسکتی ہیں۔"

"یہ تو ہے۔ شہناز بیوی بننے سے پہلے ہی مجھے بندر کی طرح اپنے اشاروں پر چلاتی رہی ہے۔ محبت کی ڈگڈگی بجا کے۔"

شہناز نے میری طرف فریادی نظروں سے دیکھا "رفیق بھائی! ایسا ہوتا تو پھر رونا ہی کیا تھا۔ آج تک تو میں اپنی ایک بھی بات نہیں منوا سکی۔"

راجا بولا "یار' دیکھ ابھی تیرے سامنے اس نے کہا تھا کہ خودکشی مت کرو اور میں مان گیا تھا۔ اس نے چیک پھاڑ کے پھینک دیا۔ میں نے چوں تک نہیں کی۔ یہ کہتی ہے خبردار' جو کسی کی طرف نظر اٹھا کے بھی دیکھا اور میں نہیں دیکھتا' تو جانتا ہے۔"

"میں سب جانتا ہوں مہاراجا۔ مگر مجھے بتا میں کیا کروں اگر میں کچھ نہیں کرتا تو ان کی کھلی دھمکی ہے کہ اس کا خمیازہ دوسروں کو بھگتنا پڑے گا۔ دوسرے میرے ماں باپ کے سوا کوئی نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ تم اب برطانیہ میں نہیں' پاکستان میں ہو اس لیے قانون کی بات مت کرنا۔ قانون کی زبان یہاں کون سمجھتا ہے۔"

راجا نے کہا "لیکن وہ جو چاہتے ہیں' وہ بھی ناممکن ہے۔ ایک لارڈ ارنسٹ کیا کرسکتا ہے؟"

"ایسا نہیں ہے کہ وہاں سفارش بالکل ہی نہیں چلتی۔ یہ خالص سیاسی فیصلہ ہے جس میں ہوم آفس دباؤ قبول کرتا ہے۔ لارڈ ارنسٹ کی ایک مضبوط لابی ہے۔ پھر وہ ایک بزنس ٹائکون بھی ہے لیکن عائشہ کا نام لے کر میں اس کے والدین کو بلیک میل کروں' اس کا میں سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"نیکے پتر! سیاسی بلیک میلنگ کا یہ سلسلہ اب ختم ہونا چاہیے' اگر تو نے ان کی بات مان لی تو وہ سمجھیں گے کہ تو ڈر گیا۔"

"راجا! ڈرتا ہوں میں اپنے والدین کی وجہ سے۔ اس عمر میں وہ میری وجہ سے ذلیل ہوں' مصیبت میں پڑیں۔ یہ میں برداشت نہیں کرسکتا مگر یہاں میں بھی بے بس ہوں۔ کتنا اچھا ہوتا اگر میں لندن میں رہتا اور میرے والدین بھی آجاتے۔ برطانیہ میں ہم سب محفوظ رہ سکتے تھے کیونکہ وہاں ایسا نہیں ہے کہ قانون کے رکھوالے بھی وہی ہوں جو لاقانونیت کے علمبردار ہیں۔ یہاں نہ حکومت کسی کو تحفظ فراہم کرسکتی ہے اور نہ عدالت۔ ایک پوری نسل نے جوان ہو کے دیکھا ہے کہ ملک میں طاقت کا قانون رائج ہے۔ خواہ وہ طاقت دولت کی ہو یا کلاشنکوف کی۔"

"تجھے واقعی لوٹ کے نہیں آنا چاہیے تھا۔"

"میں اپنی خوشی سے کب آیا ہوں یار! مجھے تو زبردستی کھینچا گیا ہے۔ باقی خاندان کی مجھے پروا نہیں تھی مگر میرے انکار پر ابا رو پڑے تھے۔ اس کے بعد میں نے کہا کہ اب جو ہو۔ کروڑوں کی جاگیر اور حویلی سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میرے والدین کسی قیمت پر پاکستان چھوڑ کے برطانیہ آنے پر راضی نہیں تھے۔ انہیں میں کیسے چھوڑ دیتا اور یہاں آکے میں مزید پھنس گیا ہوں۔ یہ تو ناممکن ہے کہ میں عائشہ کو دھوکا دوں۔ اس سے جھوٹ بولوں کہ میں شادی کے لیے تیار ہوں۔ اس کی ماں کو چکر دوں کہ تمہاری اکلوتی لاڈوں کی پلی بیٹی کو میں لے جارہا ہوں اور جب اسے چکر آنے لگیں تو کہوں کہ بڑی بی' اپنی گوری اور عالی نسب بیٹی کو ایک گھٹیا کالے آدمی کے چنگل سے بچانا ہے تو اپنے شوہر سے ایک کام کرادو۔ اس چور پارٹی کے مفرور بدمعاشوں کو برطانیہ کا معزز شہری بنوا دو اور ان کے دشمنوں کو ملک بدر کرادو۔ لاحول ولاقوۃ۔ اتنی گھٹیا حرکت کا سوچ کے بھی مجھے شرم آتی ہے۔ جب عائشہ کو یہ معلوم ہوگا کہ اپنا 'الو سیدھا' کرنے کے لیے میں اس کے جذبات سے کھیل رہا تھا۔ محبت کے نام پر میں نے اس کے والدین کو بلیک میل کیا ہے تو اس کی نظر میں میری کیا عزت رہ جائے گی؟"

راجا نے سوچ کے کہا "نیکے پتر! ہر مسئلہ تیری خواہش کے مطابق تو حل نہیں ہوگا۔ نہ ہر خرابی کسی نقصان کے بغیر دور ہوگی۔ اب تو دیکھ لے کہ تو کیا برداشت کرسکتا ہے۔"

میں نے کہا "تیرے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"دیکھ...... میں پریکٹیکل آدمی ہوں۔ عملی زندگی میں ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کے سامنے کئی راستے ہوتے ہیں۔ ایک 'برا' دوسرا زیادہ 'برا' تیسرا اس سے 'برا' چوتھا سب سے برا۔ بچنے کی صورت ہی نہ ہو اور کسی ایک راستے کا انتخاب ناگزیر ہو تو پھر کم تر برائی کو قبول کرلینا چاہیے۔"

"تو کہنا کیا چاہتا ہے؟"

"دیکھ یار! عائشہ کے لیے تو کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ اسی لیے تو اسے چھوڑ کر آگیا تھا۔ اسے اب تجھ سے کوئی امید نہیں ہے۔ اب فرض کر تو اس کی ماں کے سامنے اپنا مطالبہ رکھتا ہے۔ میرا مطلب ہے شہاب الدین کا مطالبہ۔"

میں نے خفگی سے کہا "راجا...... یہ کیا......"

راجا نے میری بات کاٹ دی "پہلے میری پوری بات سن لے۔ بے شک یہ بہت بری بات ہے مگر ایک برائی سے تو سمجھوتا کرنا ہی ہوگا۔ صرف اپنے لیے نہیں' دوسروں کے لیے بھی۔ اگر عائشہ کی ماں تیرے مطالبہ پر چراغ پا ہوتی ہے اور تجھے گالیاں دیتی ہے کہ ذلیل کالے آدمی' مجھے پتا تھا تم میری بیٹی سے محبت نہیں کرتے' اس کا استحصال کررہے ہو۔"

"ایسا تو وہ ضرور کہے گی" شہناز نے کہا۔

"یار' کہنے دو اسے۔ وہ پہلے کون سا اچھا سمجھتی ہے رفیق کو۔ پہلے بھی دشمن تھی۔ یہی کہے گی نا کہ تم میری توقع سے بڑھ کر ذلیل ثابت ہوئے۔ مگر اس دباؤ میں وہ کام کرادے تو ایک ساتھ دو مسئلے ختم ہوجاتے ہیں بلکہ سارے مسائل ختم ہوجاتے ہیں۔ اب پوچھ وہ کیسے؟ وہ ایسے دوست کہ لارڈ ارنسٹ کے اثر رسوخ سے شہاب الدین کا مطالبہ پورا ہوجائے تو ان کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں رہے گا' جو دھمکی دے رہے ہیں۔"

"بکواس بند کر اپنی راجا......" میں نے بگڑ کے کہا۔

"ابھی میری بات پوری ختم نہیں ہوئی۔ یہ ہے ایک پہلو' دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ عائشہ کی ماں اپنی بیٹی کو تجھ سے بدظن کرنے اور اس کے دل میں نفرت پیدا کرنے کے لیے اسے ضرور بتائے گی کہ وہ جسے تم اپنا سچا عاشق سمجھتی تھیں اور اس کے ساتھ شادی کرکے ہمیں چھوڑنے پر آمادہ تھیں' اس کی اصلیت کیا ہے۔ ظاہر ہے' عائشہ یقین نہیں کرے گی اور ماں کی بات کو جھوٹ اور پروپیگنڈا قرار دے گی لیکن جب بالآخر یہ ثابت ہوجائے گا کہ ماں کی بات غلط نہیں تھی اور تو نے واقعی عائشہ کے نام پر اس کے والدین کو بلیک میل کیا تھا تو عائشہ کے دل میں جتنی محبت ہے اتنی ہی نفرت پیدا ہوگی۔ ہوالمطلوب۔ یعنی یہی تو ہے یا ہونا چاہیے تیرا مقصد...... کہ وہ تجھ سے نفرت کرنے لگے اور اس کے بعد اللہ اللہ خیر صلا۔ رہ جائے گی مقابلے پر صرف فریال۔ یہاں کے معاملات تیرے ہاتھ میں ہوں گے۔"

"یہ ناممکن ہے راجا!"

"اسے ممکن بنا نیکے پتر! عائشہ آج دکھی ہے تو کل کچھ زیادہ دکھی ہوجائے گی۔ لعنت بھیج دے گی تیری محبت پر۔ اس کی ماں کے لیے تو آج بھی برا ہے۔ کل زیادہ برا ہوگیا تو کیا فرق پڑے گا۔ عائشہ جو آج بھی روتی ہے' کل کو رونے کے ساتھ اگر تجھے کوسنے لگے گی تو اچھا ہی ہوگا۔ بالآخر سب اپنی اپنی زندگی سے مفاہمت کرلیں گے۔"

میں نے کہا "چھوڑ راجا' مجھے تجھ سے ایسے مشورے کی امید نہیں تھی۔ میں نے اپنا وقت ضائع کیا' میں چلتا ہوں۔"

[illegible] نے میرا ہاتھ پکڑ لیا "اچھا' جانے دے اس بات کو۔ میں دوسرا حل تجویز کرتا ہوں۔ تیرے پاس جو تھوڑی بہت عقل ہے وہ بھی فی الحال کام نہیں کررہی ہے مگر میرا دماغ پوری طرح ایکٹیو ہے۔ آدمی کو سب کی سن لینی چاہیے' کیا پتا کس کا مشورہ کام کر جائے۔"

میں نے کہا "او کے۔ میں تجھے پانچ منٹ دیتا ہوں۔"

"یار! تو نے بھی تو کچھ سوچا ہوگا؟" راجا بولا۔

"میں خاک سوچوں...... میرا بس چلتا تو میں لعنت بھیجتا ترقی اور خوش حالی کے ان تمام منصوبوں پر جن کی بنیاد اس حویلی اور جاگیر پر رکھی گئی ہے۔ میں یہ سب کچھ بیچ کے اماں ابا کے ساتھ بھاگ جاتا لندن...... لیکن میرے ملیے ابا کو منانا اس لیے ناممکن ہے کہ ان کا راستہ روک کے کھڑی ہیں ان کی اماں۔ وہ کہتی ہیں مجھے دفنا کے جانا۔"

"دیکھ یار! دادی اماں کی عمر اسی برس سے اوپر ہوگئی ہے۔ جب وہ نہیں ہوں گی تو تیرے لیے والدین کو منانا آسان ہوگا۔ آخر تو اکلوتا ہے ان کا۔"

میں نے کہا "لیکن مجھے تو فریال نے الٹی میٹم دے رکھا ہے کہ تمہارے پاس چار مہینے ہیں۔"

راجا بولا "تیرے مسائل کا دوسرا حل یہ ہے نیکے پتر' کہ تو فریال کو صاف انکار کردے کہ میں باز آیا محبت سے اٹھالو پائیدان اپنا۔ میں صفدر سلطان کو قتل کرکے پھانسی کیوں چڑھوں؟ جب اس سے منگنی کی تھی تو میں نے روکا تھا کہ یہ بے وقوفی مت کرو۔ میری ایک نہیں سنی' اب تمہاری یہی سزا ہے کہ اپنا کیا بھگتو۔ جس سے منگنی کی تھی' اسی سے شادی کرلو۔ اس کے بعد آرام سے بیاہ رچا لارڈ ارنسٹ کی بیٹی عائشہ سے سیٹل ہوجا برطانیہ میں۔ لارڈ مرے گا تو اس کا سارا کاروبار بھی تیرا ہوجائے گا۔ پانچوں گھی میں اور سر کڑاہی میں۔"

میں نے مایوسی سے کہا "چھوڑ راجا۔ کوئی فائدہ نہیں۔ تیرا یہ مشورہ بھی احمقانہ ہے۔ تو کیا جانتا نہیں فریال کو۔ وہ اپنی اور میری جان ایک کردے گی۔ تجھ سے بات کرنا بے کار ہے۔"

میں جانے کے لیے اٹھا تو شہناز نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے کہا "رفیق بھائی! جب دماغ پر ایک ساتھ بہت سے مسائل کا بوجھ ہو تو واقعی کچھ نہیں سوجھتا۔ کنفیوژن بڑھتا جاتا ہے۔ ایسے میں سب سے بہتر یہ ہوتا ہے کہ کچھ عرصے کے لیے سارے مسائل کو بھول کر کسی اور کام میں معروف ہوجائیں۔ کہیں اور دل لگالیں۔"

"ہاں۔ کسی تیسری جگہ دل لگالیں" راجا نے کہا "مثلاً اپنی اس کزن رابعہ سے جو بچپن سے تیری ساتھی رہی ہے۔"

''میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ آپ اپنی جاگیر اور حویلی دیکھنے چلے جائیں۔ توجہ دوسری طرف کرتے سے الجھن چلی جاتی ہے لاشعور کے کمپیوٹر میں۔ وہاں کام ہوتا رہتا ہے اور کوئی نہ کوئی حل ضرور نکل آتا ہے' یہ آزمودہ نسخہ ہے۔ آپ بھی آزمالیں' ابھی زیادہ مت سوچیں۔''

میں نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھا ''شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔''

راجا نے کہا ''نیکے پتر! شاید نہیں' شہناز ہمیشہ ٹھیک کہتی ہے یونہی تو نہیں مرتا میں اس پر۔''

شہناز خوش ہو کے شرمائی ''پھر میری مانتے کیوں نہیں۔''

راجا نے کہا ''چل میں تجھے بشارت فاروقی کے آفس چھوڑ دیتا ہوں۔ تو اس سے اپنی ریاست کے معاملات کو سمجھ لے۔ آج تو میں کچھ مصروف ہوں۔ اگر موڈ ہے ریاست کے دورے کا تو کل پرسوں کا پروگرام بنا لیتے ہیں' شہناز بھی چلے گی۔''

''میں کلینک چھوڑ کے نہیں جاسکتی۔'' شہناز نے کہا ''صرف اتوار کو جاسکتی ہوں بلکہ ہفتے کی رات کو۔''

''میرا خیال ہے کہ پہلے ہم دیکھ آئیں وہ جگہ رہنے کے قابل بھی ہے یا نہیں'' میں نے کہا۔

جب میں بشارت فاروقی کے پاس پہنچا تو شام ہونے لگی تھی۔ اس کا آفس جی پی او کے پیچھے ایک پرانی عمارت کے پہلے فلور پر تھا باہر سے عمارت قدیم اور خراب حال نظر آتی تھی۔ اندر سے آفس کو جدید ترین انداز میں ڈیکوریٹ کیا گیا تھا۔ آفس کے دو بڑے ہال تھے۔ داخل ہوتے ہی جو ہال آتا تھا اس کو پارٹیشن سے دو حصوں میں تقسیم کردیا گیا تھا۔ دائیں ہاتھ والے کیبن میں فاروقی کے اسسٹنٹ بیٹھتے تھے۔ ایک اسٹینو ٹائپسٹ' ایک منشی۔ بائیں طرف استقبالیہ تھا جہاں اس کی سیکریٹری اپنی میز پر فون اور انٹرکام سجائے بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے دیوار کے ساتھ ایک صوفہ سیٹ ملاقات کا انتظار کرنے والوں کے لیے تھا۔ دوسرے ہال جیسے کمرے میں بشارت فاروقی بیٹھتا تھا۔ اس کا شمار دیوانی مقدمات کے ماہرین میں ہوتا تھا۔

سیکریٹری تیس بتیس کی نظر آنے والی گوری چٹی اور بھرے بھرے گداز بدن والی دلکش عورت تھی۔ اس کے شانوں تک تراشے ہوئے بال اس کے بیضوی چہرے کے گرد ہالہ سا بناتے تھے اس کے بالوں کا گہرا کالا رنگ دیکھ کے مجھے شبہ ہوا کہ وہ ہیئر کلر استعمال کرتی ہے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں بھی ہلکی سی کاجل کی تحریر تھی اور اس نے ساری بھی کالی باندھ رکھی تھی جس میں اس کا اجلا رنگ مزید تابناک ہوگیا تھا۔ بلاؤز اس کے شانوں' بازوؤں اور جسم کے نشیب وفراز پر ایسے چپکا ہوا تھا کہ جیسے کسی درزی نے اسے سیا نہیں کمال کی طرح جسم پر منڈھ دیا ہے۔ ستر پوشی کا یہ اہتمام اس کے حسن وشباب کی نمائش کا وہ الزام تھا جسے قبول کرتے ہوئے اس کی مسکراہٹ میں بھی غرور آجاتا تھا۔ میں گردن کے آگے اور پیچھے گریبان کی وسعت سے اس کے دل میں جھانکنے کی کوشش کررہا تھا کہ اس نے کمپیوٹر سے نظر ہٹا کے مجھے ایک مہربان مسکراہٹ سے نوازا ''جی..... فرمائیے؟''

میں نے کہا ''ہمیں بشارت فاروقی سے ملنا ہے۔''

''کس سلسلے میں؟''

''سلسلے تو بہت ہیں' آپ انہیں بتادیں کہ نواب صاحب آپ کو شرفِ ملاقات عطا کرنے تشریف لائے ہیں۔''

اس کا منہ حیرانی سے کھل گیا ''نواب صاحب.....!''

''جی۔ نواب رفیق احمد آف ریاست ست بدھائی۔ کمال ہے کہ آپ ہمیں نہیں پہچانتیں۔''

اس نے کچھ بے یقینی کے ساتھ انٹرکام کا بٹن دبایا اور میری بات من وعن دہرادی۔ انٹرکام پر میں نے اس کا جواب سنا ''ان سے کہیں کہ بس پانچ منٹ'' ظاہر ہے اس کے بعد سیکریٹری کے لیے شک کی گنجائش ہی نہ رہی تھی۔ نواب رفیق احمد آف ست بدھائی اسٹیٹ کے لیے اس کا رویہ انتہائی مودبانہ اور احترام آمیز ہوگیا۔

پانچ منٹ پورے ہونے سے پہلے ہی وہ شخص رخصت ہوگیا جو پہلے سے بشارت فاروقی کے ساتھ تھا اور وہ بڑے جوشیلے انداز میں مسکراتا ہوا نمودار ہوا۔ وہ ناقابلِ تصور حد تک موٹا اور دراز قد تھا چنانچہ انسان سے زیادہ دیوزاد نظر آتا تھا لیکن اس کا پھولا ہوا گول مٹول چہرہ کسی بچے کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ پتلون اس کی توند کے گنبد پر ٹھہر نہیں سکتی تھی چنانچہ اسے روکنے کے لیے وہ الاسٹک والے گیلس استعمال کرتا تھا۔ کوٹ جب سلا ہوگا تو فٹ ہوگا مگر اب اس کے بٹن بند نہیں کیا جاسکتے تھے۔

''آہا..... قبلہ نواب صاحب!'' ایک بلند بانگ قہقہے کے ساتھ بشارت فاروقی دونوں بازو پھیلا کے آگے آیا ''مجھے آپ کا انتظار تھا۔ معلوم ہوگیا تھا کہ آپ ولایت سے تشریف لے آئے ہیں۔ بالکل اوریجنل کنڈیشن میں۔ یعنی جیسے مجرد گئے تھے ویسے ہی بنا میم کی سند کے لوٹ

آئیے..... بھئی بہت خوب..... آئیے اندر آئیے۔''

گلے ملنے کے عمل میں مجھے یوں لگا جیسے میں ربر فوم کے کسی پہاڑ میں گھس گیا ہوں۔ وہ مجھے بڑی محبت سے دبوچ کے اپنے چیمبر میں لے گیا۔ اس کا آفس بہت شاندار اور متاثر کرنے والا تھا۔ سیاہ پالش والی قوس نما میز کی سطح شیشے کی طرح چمک رہی تھی۔ اس پر دائیں جانب تین فون رکھے تھے اور چوتھا انٹرکام سیٹ تھا۔ بائیں ہاتھ پر چند فائلیں پڑی تھیں۔ سفید چینی کے گلدانوں میں شوخ رنگوں والے پھول ملے تھے۔ اس کی بلیک لیدر کے کشن والی کرسی بھی بشارت فاروقی کے سائز کی تھی۔ اس کے پیچھے والی دیوار کے وسیع حصے پر وال پیپر تھا اور اس پر ایک بہت خوبصورت سینری تھی۔ کسی جھیل کا کنارا' سبزہ زار' ایک سفید گھوڑا پس منظر میں' کنارے پر رکھی ہوئی دو لکڑی کی کرسیاں۔ ایک پر کسی کا سرخ دوپٹا پڑا ہوا تھا۔ دوسری پر اخبار رکھا ہوا تھا۔ نیچے کافی یا چائے کے دو خالی مگ نظر آرہے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ سارا منظر زندہ ہے۔ وہ جو ان کرسیوں پر بیٹھے تھے' ابھی ابھی اٹھ کر کہیں گئے ہیں۔

باقی دیواروں پر لکڑی کی الماریاں تھیں جن کے شیشے کے پٹ تھے اور ان کے پیچھے ضخیم قانونی کتابوں کی جلدیں نظر آرہی تھیں۔ دنیا بھر کی عدالتوں کے صادر کردہ فیصلوں کا ریکارڈ اور پی ایل ڈی کے مجموعے۔ ہر بڑے وکیل کی ذاتی لائبریری میں حوالوں کے لیے یہی کتابیں ہوتی ہیں۔

جب میں اس کے سامنے بیٹھ گیا تو اس نے کہا ''نواب صاحب! کس چیز سے شوق فرمائیں گے؟''

میں نے کہا ''اگر کافی مل جائے تو کافی ہے۔''

اس نے مایوسی سے سر ہلایا ''اجی حضرت' ہم نے تو شوق فرمانے کی بات کی تھی۔ اس خیال سے کہ جناب ولایت سے تشریف لائے ہیں۔ لگتا ہے آپ تو بچ بچ کافرستان سے ایمان سلامت بچالائے'' اس نے انٹرکام کا بٹن دبا کے کہا ''بھئی شہلا! اپنے پیارے پیارے ہاتھوں سے ایک مسکراتی گنگناتی' نشہ آور کافی تو روانہ کردو۔ اپنے نواب صاحب بھی کہیں کہ ایک جام اور......''

میں نے کہا ''آپ نہیں پئیں گے؟''

وہ ہنسا ''اجی' ہم بھی پئیں گے۔ ضرور پئیں گے آپ کے ساتھ مگر کافی نہیں'' اس نے دراز میں سے ایک بوتل نکالی جس میں کوئی اورنج کلر کا مشروب تھا'' تقویت قلب کے لیے یہ شربت مفرح تجویز کیا ہے میرے چارہ گر نے۔''

میں نے کہا ''کیا ہوا ہے آپ کے قلب کو؟''

''اجی حضرت۔ یہ پوچھئے کہ اس دل صد چاک کے ساتھ کیا نہیں ہوا۔ کتنی بار چوری ہوا' کس کس نے بے وفائی کے صدمات سے دوچار کیا اور توڑا۔ بس یہی رہ گیا ہے درد دل کا مداوا'' اس نے بوتل سے ایک گھونٹ لیا۔

وہ خوش باش اور زندہ دل آدمی تھا۔ وکالت جیسے خشک پیشے میں بھی اس کی طبعی حسِ مزاح ختم نہیں ہوئی تھی۔ وہ ان لوگوں میں تھا جو ناموافق حالات میں بھی روتے نہیں اور خود پر ہنسنا جانتے ہیں۔ اس کا شگفتہ اور پرمزاح لہجہ اس کی خوش ذوقی کا آئینہ دار تھا۔ جب شہلا کافی لے کر آئی تو اس نے کہا ''بھئی دیکھو' ہم تخلیہ چاہتے ہیں۔''

وہ جاتے جاتے پلٹی ''جی..... کیا چاہتے ہیں؟''

''میرا مطلب ہے اپنے نواب صاحب قبلہ سات سمندر پار سے تشریف لائے ہیں۔ کوئی ہمیں ڈسٹرب نہ کرے' نہ ملاقاتی' نہ فون۔''

''اور آج کوئی کلائنٹ آجائے تو.....؟'' شہلا نے مجھے کن انکھیوں سے دیکھا۔ شاید یہ دیکھنے کے لیے کہ ٹی شرٹ جینز اور جاگرز کے ساتھ مجھ میں نواب صاحب قبلہ والی کون سی بات ہے؟

''یار! اب تک تمہیں جھوٹ بولنا سکھانا پڑتا ہے۔ کہہ دینا کہ وکیل صاحب عالم نزع میں ہیں۔ صرف فرشتۂ اجل کو اندر جانے کی اجازت ہے۔''

وہ مسکرائی ''اور اگر آپ کے گھر سے فون آئے؟''

''اس سے تو صاف کہہ دینا کہ وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے۔ مرحوم ومغفور ہوئے۔ بادھوری ڈکشٹ جو روز خواب میں آتی تھی' آج آفس میں آگئی اور لے گئی انہیں۔ جو دل چاہے فرمادینا۔ میری طرف سے اجازت ہے۔'' اس نے قہقہہ مارا اور پھر میری طرف متوجہ ہوگیا ''جی نواب صاحب' اب سنائیے احوال واقعی؟''

میں نے کہا ''آپ نے تو مجھے باقاعدہ نواب صاحب بنادیا۔ میں صرف رفیق ہوں۔ آپ غائبانہ طور پر مجھ سے یقیناً متعارف ہوں گے۔''

''آپ کے آنے سے پہلے میں نے اس تاریخی کہانی پر بہت ریسرچ کی تھی' جس کے آپ ہی ہیرو ہیں۔''

''یہ بڑی ڈرامائی اور فلمی صورتِ حال ہے۔''

''اور اب آپ اس صورت حال کے بارے میں مجھ سے تفصیلی معلومات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یعنی اس خاندانی اسٹیٹ کے بارے میں' جس کے آپ اچانک مالک بن گئے ہیں؟'' وہ اچانک سنجیدہ ہوگیا۔

"یعنی اس کے لیے مجھے سب کچھ چھوڑ کے واپس آنا پڑا۔ اپنا مستقبل' اپنے کیریئر کے سارے پلان۔"

اس نے کہا "جہاں تک قانونی معاملات ہیں' تو وہ تقریباً طے ہوگئے ہیں۔ ان کی تفصیل میں گئے تو آپ کو فائلوں کے ایک پورے دفتر کا مطالعہ کرنا پڑے گا۔ ہزاروں صفحات پر مشتمل پرانا ریکارڈ ہے۔ کچھ تو مجھے لینڈ ریونیو کے دفتروں سے نکلوانا پڑا۔ باقی یہاں تاریخی دستاویزات کے قبرستان کی خاک چھاننے سے ملا۔"

میں نے کہا "مجھے گڑے مردے اکھاڑنے سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

"آپ کی سہولت کے لیے میں نے مستند تاریخی حوالوں کے ساتھ ایک سمری بنائی ہے۔ اس میں تقریباً ایک سو پچاس سال کی ہسٹری ہے۔ جب آپ وہ سمری دیکھیں گے تو آپ کو ایسا لگے گا جیسے آپ کوئی تاریخی ناول پڑھ رہے ہیں۔ یہ حقائق آج کسی داستان سے زیادہ دلچسپ اور سبق آموز ہیں لیکن ان کی تلاش بہت مشکل کام تھا۔ میرے تین اسسٹنٹ ایک ایک صفحہ پڑھتے رہے اور ان کی نقول حاصل کرتے رہے۔ ان کی تصدیق کرتے رہے اور خلاصے بنا کے میرے سامنے رکھتے رہے۔ میں نے یہ سارا مواد عدالت کے سامنے رکھا اور آپ کے سامنے حالات وواقعات کی تصویر پیش کرنے کے لیے تمام خلاصوں کی مدد سے یہ سمری بنالی۔"

میں نے کہا "آپ کی محنت کا صلہ میں کیا دوں...... صرف شکریہ ادا کرسکتا ہوں۔ آپ نے ماؤنٹ ایورسٹ کو سر کیا اور میرے لیے آسان راستہ بنادیا کہ اس پر اپنا جھنڈا لہرادوں۔"

اس نے ایک فائل اپنے سامنے رکھ لی "رفیق صاحب! دنیا واقعی جائے عبرت سرائے فانی ہے۔ ڈیڑھ سو سال پہلے یہ حویلی بنانے والے تمہارے ہی آباواجداد تھے۔ میرے حساب سے تمہارے دادا کے دادا کے دادا۔ پتا نہیں انہیں کیا کہا جائے گا۔ لکڑ دادا کہ لکڑ بگڑ دادا۔ آج تم یا تمہارے والد ان کے نام سے بھی واقف نہیں۔ جب انہوں نے یہ حویلی بنوائی ہوگی تو انہیں اس پر کتنا غرور ہوگا۔ گردونواح کے علاقے میں دور دور تک اس کی دھوم ہوگی۔ وہ اس میں بڑی شان وشوکت کے ساتھ رہتے ہوں گے۔ ہاتھی گھوڑے' غلام اور کنیزیں۔ اس دور کے نوابوں' راجوں اور جاگیرداروں کے ساتھ ایسے ہی تصورات وابستہ ہیں۔ اب جاکے دیکھو' صرف کھنڈر ہیں اور خانہ ویرانی' بے شک ایک گوشے میں چند قبریں ہیں جن پر کچھ نام بھی پڑھے جاتے ہیں۔ سب کی ہڈیاں تک خاک میں مل گئی ہوں گی۔"

میں نے کہا "یہ تو زمانے کا چلن ہے۔ آج ہم خود تاریخ کا ایک باب ہیں۔ کل کسے یاد رہے گا کہ ہم کون تھے اور کیا تھے؟"

اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ "جب میں نے اہرام مصر دیکھے تو وہاں ایک لائٹ اینڈ ساؤنڈ شو ہوتا ہے۔ روم کے ایکروپولیس میں بھی ہوتا ہے۔ اب سنا ہے لال قلعے اور تاج محل میں بھی ہونے لگا ہے۔ یہاں ہمارے شاہی قلعے میں گائیڈ ہیں۔ گائیڈ تو ہر جگہ ہوتے ہیں۔ وہ بادشاہوں کی شان وشوکت اور طرز زندگی کے افسانے بڑی رنگ آمیزی کے ساتھ سناتے ہیں۔ بڑی منظرکشی کرتے ہیں۔ اس کے بعد گردوپیش پر نگاہ ڈالو تو بڑا عجیب لگتا ہے۔ شکستہ دیواروں کی زبوں حالی دیکھ کر' کھنڈروں میں گونجنے والے سناٹے کو محسوس کرکے...... کہ خالق نہیں رہتا' تخلیق باقی رہتی ہے۔ انسان فنا ہوجاتا ہے' اینٹ پتھر رہتے ہیں۔ مٹی رہتی ہے' اس کی ملکیت پر غرور کا حق اگلی نسل کو منتقل ہوجاتا ہے۔"

میں نے کہا "یقین کیجیے میں ذرا بھی مغرور نہیں ہوں۔ میں تو بڑی مشکل میں پڑگیا ہوں۔"

وہ ہنسنے لگا۔ "مجھے معلوم ہے' تم آنا نہیں چاہتے تھے لیکن غالباً اس میں دیگر معاملات کو بھی دخل تھا۔ جلوۂ فرنگ' یادگلرنگ اور حسینان صدرنگ۔"

"اب یہ الزام تو قبول کیے بنا چارہ نہیں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ میں اپنے والدین کے حکم سے نافرمانی نہیں کرسکتا تھا۔ اس محل یا جاگیر سے مجھے قطعی دلچسپی نہیں تھی۔"

"میرا خیال ہے کہ تم دیکھ آؤ" اس نے فائل میں سے اسٹیپل کیے ہوئے چند صفحات نکالے اور میرے سامنے رکھ دیے۔

میں نے سرسری انداز میں ایک نظر ڈال کے ان صفحات کو اپنے سامنے رکھ لیا "اس کا مطالعہ میں فرصت سے کرلوں گا۔ وہاں میں کب جاسکتا ہوں۔"

"بھئی جاگیر کا مالک جب چاہے جائے' جہاں چاہے جائے۔"

"اگر ہم کل چلیں...... ہم سے میری مراد ہے میں' راجا اور آپ" میں نے کہا۔

اس نے ایک ڈائری کے چند صفحات پلٹ کے نفی میں سرہلایا "آئی ایم سوری۔ آیندہ چند روز میرے لیے انتہائی مصروفیت کے ہیں' کل ایک کیس ہے ہائی کورٹ میں۔ پرسوں شاید ایک اور کیس میں سپریم کورٹ کا فیصلہ ہے۔ پورا ہفتہ ہی ایسا ہے۔ ویسے بھی میرا خیال ہے کہ مجھ ناتواں کو آپ اس ایڈونچر کی صعوبت سے معاف فرمادیں۔ میں سب دیکھ چکا ہوں۔ ویسے بھی یہ چند گھنٹوں کی سیر وتفریح نہیں ہوگی۔ ممکن ہے آپ کو وہاں کئی روز رکنا پڑے۔"

میں نے کہا "کیا وہاں رہائش کا کوئی انتظام ہے؟"

وہ ہنسنے لگا۔ "اجی قبلہ نواب صاحب! ایڈونچر اور پکنک کے لیے لوگ پہاڑوں' ریگستانوں اور جنگلوں کا رخ کرتے ہیں۔ وہاں بھی تو رہتے ہیں۔ ظاہر ہے ست بدھائی میں کسی فائیو اسٹار ہوٹل کے ائرکنڈیشنڈ کمرے یا میکڈانلڈ کے برگر تو ملیں گے نہیں۔ حویلی کے چند کمرے سلامت ہیں اور قابل رہائش بنائے جاسکتے ہیں۔ گردونواح میں گاؤں دیہات کی آبادی ہے' وہاں ضرورت کی ہر چیز مل جاتی ہے۔"

"اس بات کا کتنا امکان ہے کہ میں اس کھنڈر میں قیام فرمانے کا رسک لوں اور زندہ سلامت لوٹ آؤں؟"

"نہیں' ایسی کوئی بات نہیں' زیادہ حصہ تو کھنڈر ہی ہے لیکن ایک حصہ بہت بہتر ہے۔ اس کے گرنے کا کوئی امکان نہیں۔ میں نے بھی وہاں ایک دن گزارا تھا۔ رات کا کچھ پتا نہیں' اگر جن بھوت ہوں گے تو ظاہر ہے وہی ہوں گے جو تمہارے اسلاف تھے۔ ان کی ارواح شاید تمہیں شرف ملاقات بخشنے آجائیں کہ بالآخر آگیا ہمارا وارث!"

میں نے کہا "ان سے میں نمٹ لوں گا۔ یہ بتائیں کہ بجلی ہے یا نہیں؟ اور پینے کا پانی؟"

"اس علاقے سے دریائے کنہار گزرتا ہے۔ بہت پہلے اس پر رہتاس ڈیم بنانے کا منصوبہ بھی تھا جو بعد میں نامعلوم وجوہ کی بنا پر ختم کردیا گیا۔ قلعہ رہتاس سے تقریباً تیس کلومیٹر کے فاصلے پر ٹیلہ جوگیاں ہے۔ وہاں تک جانے کے لیے گاڑی اچھی ہونی چاہیے۔ فوروہیل ڈرائیو ہو تو بہت بہتر ہے۔ ٹیلہ جوگیاں کے فوراً بعد ست بدھائی کا گاؤں ہے۔ چار پانچ کلومیٹر کا فاصلہ ہے لیکن کوئی سڑک نہیں ہے۔ ایک کچا راستہ ہے۔ تاہم اس علاقے میں کنوئیں اور ٹیوب ویل ہیں۔ ٹیوب ویل بجلی سے چلتے ہیں اس لیے پینے کے پانی کا کوئی مسئلہ نہیں اور ممکن ہے حویلی کے اس حصے میں بجلی ہو جہاں ایک چوکیدار کا پورا خاندان آباد ہے۔ بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ ان کے دس بارہ گھر ہیں' کچے پکے۔"

"اس چوکیدار کی ہسٹری کیا ہے' یہ کب سے ہے اور کون ہے؟"

"وہ ہے ایک ستر سالہ بوڑھا۔ بیوہ نہیں ہے۔ چار بیٹے ہیں اور پھر ان کے سات آٹھ بیٹے۔ بڈھے نے کہا کہ پاکستان بننے سے پہلے وہ یہاں آیا تھا۔ پہلے یہاں اس کی بیوی بھی کام کرتی تھی۔ دونوں تنخواہ دار تھے۔ پھر مالک چلے گئے' انہوں نے خالی پڑی ہوئی زمین پر کاشت شروع کردی۔ ان کی گزراوقات اسی زمین پر ہے۔ اس کے وہ مالک نہیں ہیں لیکن آج تک کسی نے ان کو چھیڑا نہیں تو وہ بھی آرام سے بیٹھے ہیں۔ سبزیاں اگاتے ہیں اور چالیس پچاس کلومیٹر دور دینہ میں فروخت کرتے ہیں۔"

"اس بڈھے کا کیا نام ہے؟"

"جانو! جان محمد ...... اس کے پاس کافی انفارمیشن ہوگی۔ مجھے زیادہ بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔ تم چکر لگا کے آؤ تو پھر بیٹھ کے تفصیل سے باتیں کریں گے۔ آج رات یہ سمری ضرور دیکھ لینا۔ تمہیں بہت مزہ آئے گا۔"

شہلا نے بڑی ادائے ناز سے اندر آکے کہا "سر...... کیا میں جاؤں؟"

فاروقی نے کہا "بھئی چند منٹ...... پھر چلتے ہیں۔"

میں نے کہا "آپ کی سیکریٹری پسند آئی۔"

وہ ہنسنے لگا "بے چاری بیوہ ہے۔ ایک بچہ بھی ہے۔ شوہر غائب ہوگیا۔"

"جیسے جن بھوت غائب ہوجاتے ہیں؟" میں نے کہا۔

"یہی سمجھ لو۔ نو سال ہوگئے کچھ پتا نہیں۔ پولیس نے تو اسے شک میں پکڑلیا تھا کہ تو نے ہی اپنے کسی آشنا کے ساتھ مل کر اسے قتل کیا ہوگا اور کہیں گاڑ دیا ہوگا۔ میں نے اس کی جان بچائی۔ ملازم رکھ لیا اپنے پاس۔ ورنہ کیا کرتی اکیلی عورت۔ اپنی حفاظت کیسے کرتی؟ بہت محنت سے کام کرتی ہے۔ صبح میں اپنے ساتھ لے آتا ہوں۔ شام کو چھوڑ دیتا ہوں۔ باتیں بنانے والے بہت باتیں بناتے ہیں۔ سب سے زیادہ میری بیوی بولتی ہے۔ میں بہرا گونگا بن گیا ہوں۔ شہلا بھی پروا نہیں کرتی۔"

میں نے معنی خیز لہجے میں کہا "اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔"

رات کو کھانے کے بعد جب میں نے ذکر چھیڑا تو خاندان کے دیگر افراد نے ست بدھائی کے بارے میں اپنے اپنے نقطۂ نظر سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ان میں ابا کے علاوہ صوفی چچا نذیر اور خالو عنایت عرف آلو عنایت سب ہی شامل تھے۔ قانونی قبضے کی کارروائی کے وقت وہ بشارت فاروقی کے ساتھ ایک ویگن میں بھر کر گئے تھے اور دن کے وقت انہوں نے حویلی میں بڑے جوش وخروش کے ساتھ ایک پکنک بھی منائی تھی۔ مرد جنگل میں کافی آگے تک گھوم آئے

تھے۔ خواتین پر کچھ وہاں کے پرآسیب ماحول کا ڈر غالب تھا۔ انہوں نے شام کا اندھیرا پھیلنے سے قبل ہی روانگی پر اصرار کیا۔ رات کو وہاں قیام کرنے کی ہمت مردوں نے بھی نہیں کی۔

مجھے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں ہوا کہ ماضی کے واقعات کا صحیح علم کسی کو نہیں۔ گزشتہ ڈیڑھ سو سال کی تاریخ میں ان کی دلچسپی صرف قصے کہانیوں کی حد تک تھی۔ ان کے ذہن میں اصل واقعات بھی غیر مستند روایات کی طرح تھے۔ تحقیق سے کسی کو سروکار نہ تھا۔ ماضی غیر اہم تھا۔ اصل اہمیت اس مستقبل کی تھی جس کے ساتھ سب کو اپنے مفادات وابستہ نظر آتے تھے۔ مجھے ورثے میں ملنے والی جاگیر کسی مدفون خزانے جیسی حیثیت رکھتی تھی۔ یہ جاننے سے کسی کو دلچسپی نہ تھی کہ خزانہ کس کا تھا اور کہاں سے آیا اور کیسے آیا۔ سنسنی خیزی کا اصل پہلو اس کی مالیت میں تھا۔

صوفی چچا کے خیال میں زمین بنجر اور بے کار تھی۔ ایک حصے میں جو جنگل تھا وہ کچھ کارآمد تھا۔ حویلی کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔ اسے گرا دینا ہی بہتر ہوگا۔ اس زمین پر کاشت ہو سکتی ہے۔ مویشی بھی پالے جا سکتے ہیں لیکن یہ سب کرے گا کون؟ اس مصیبت میں پڑنے سے بہتر ہے کہ زمین بیچ کر پیسے کھرے کر لیے جائیں۔ خالو عنایت کا خیال اس کے برعکس تھا۔ ان کے پاس زراعت اور فارمنگ کا پورا پلان تھا۔ جنگل کو مزید وسعت دینے اور وہاں عمارتی لکڑی کا کارخانہ قائم کرنے کے امکانات بہت روشن تھے۔ وہاں فرنیچر بھی بنایا جا سکتا تھا۔

خواتین کو صرف اس کی مالیت سے دلچسپی تھی۔ وہ حتمی طور پر یہ جاننا چاہتی تھیں کہ آج میں کروڑوں کا مالک ہوں تو کتنے کروڑ کا۔ اور مستقبل کے لیے میرے منصوبے کیا ہیں؟ کیا میں ساری زمین جاگیر بیچ کے واپس سات سمندر پار چلا جاؤں گا۔ جاتے وقت میں کسی فراخ دل رئیس کی طرح اپنوں کو بھی کچھ دے کر جاؤں گا یا نہیں؟ یہ کچھ آخر کتنے ہوں گے؟ کیا اس سے ان کی زندگی میں تھوڑی بہت فراغت آئے گی؟ ان کے بچوں کا مستقبل بنے گا یا نہیں؟ اگر میں نے کنجوسی اور بے مروتی کے ساتھ اپنوں کو خیرات زکوٰۃ کے طور پر اتنا بھی نہ دیا جتنا ہوٹل میں بل ادا کرنے والے ویٹر کو ٹپ دیتے ہیں تو پھر خون کے رشتوں کی کیا حیثیت رہ جائے گی۔

چہروں اور باتوں سے اور ظاہری رویوں کو دیکھتا تھا تو مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میری خوش بختی پر دل کی گہرائی سے کسی کو خوشی ہے تو وہ میرے والدین کے علاوہ دادی تھیں۔ باقی سب کے دل میں رشک سے زیادہ حسد کے جذبات موجزن نظر آتے تھے۔ یہ ایک فطری بات تھی۔ ہم ایک نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور قناعت کا فلسفہ اختیار کر کے اللہ کا شکر بھی ادا کرتے رہتے تھے لیکن خوشحالی اور دولت مندی ایک ایسا خواب تھی جس کی تعبیر پانے کے لیے سب دن رات جدوجہد کرنے میں مصروف تھے۔ حق حلال کی روزی اور محنت کی کمائی میں گزارا کرتے کرتے سب جیسے تھک گئے تھے۔ ایک مہینہ مشکل سے پورا ہوتا تھا کہ دوسرا پرانے مطالبات کے ساتھ آ جاتا تھا۔ بجلی، گیس اور ٹیلی فون کے بل، اسکول کی فیس، گھر کا خرچ، سب لگے بندھے اخراجات تھے۔ بیماری یا خوشی کے خرچ کی گنجائش بھی مشکل سے نکلتی تھی۔ چنانچہ عیاشی کی زندگی کے صرف خواب دیکھے جا سکتے تھے۔ شاندار گھر، گاڑی، شاپنگ اور سیر تفریح کے خوابوں کو زندہ رکھنے کے لیے وہ کبھی پرائز بانڈ لیتے تھے تو کبھی لاٹری کے ٹکٹ۔

ان حالات میں ان سب کا میری خوش قسمتی پر حسد محسوس کرنا ایک فطری سی بات تھی۔ اگر انہوں نے مجھ سے توقعات وابستہ کر لی تھیں تو یہ بھی غلط نہ تھا۔ میں یہ محسوس کرتا تھا کہ سب کے دل میں اچانک اپنائیت کا سیلاب امڈ آیا ہے۔ اپنے اپنے حوالوں سے وہ سب میرے ساتھ اپنے رشتے کی اہمیت بڑھا رہے تھے۔ مقصد سب کا ایک ہی تھا مجھے احساس دلانا کہ وہ محاورہ آج بھی درست ہے۔ اول خویش بعدہ درویش۔ دولت کا چشمہ خاندان میں پھوٹا ہے تو ان کی خواہشات کی زمین کو پیاس بجھانے کا حق سب سے پہلے ہے۔

یہ لوگ میری عادت، فطرت اور مزاج کے شناسا بھی تھے۔ ایک طرف ابا کے چھوٹے بھائی تھے۔ انہوں نے زندگی میں نہ جانے کتنے کام کیے لیکن جم کے کچھ بھی نہیں کیا۔ منصوبے وہ بڑے جوش و خروش سے بناتے تھے لیکن ان پر عمل درآمد کی نوبت بہت کم آتی تھی۔ گزشتہ چند برسوں میں ان کی پیری مریدی، تعویذ گنڈے اور عملیات کا دھندا اچھا خاصا چل گیا تھا۔ ظاہر ہے، یہ دھوکے فریب، چرب زبانی اور چالاکی کا دھندا ایسے کمزور عقیدے کے مگر اکثریت میں پائے جانے والے بے عقل لوگوں پر چل رہا تھا جو بدقسمتی سے جاہل بھی تھے یا جاہل ہونے کی وجہ سے بدقسمت تھے۔

ان کی بیوہ آمنہ بھی بڑی تیز طرار، موقع شناس اور زمانہ ساز خاتون تھیں۔ میں تو اکثر مذاق میں کہہ دیتا تھا کہ چچا، آپ روحانی علاج کا ایک زنانہ شعبہ بھی قائم کر دیں۔ چچی

آپ سے زیادہ کامیاب لیڈی پیر ثابت ہوں گی۔ چچی نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اپنی دختر نیک اختر رابعہ کو مجھ پر ڈورے ڈالنے کے لیے مامور کر دیا تھا۔ وہ تو خدا کا شکر ہے رابعہ میری واپسی سے قبل ہی خالو عنایت کے بیٹے سے عہد و پیمان کر چکی تھی۔ چچا نذیر کو میرے معاملات سے اگر کوئی دلچسپی تھی تو انہوں نے اس کا اظہار نہیں کیا۔

اس کے برعکس اماں کی بڑی بہن خالہ شاہدہ حد درجہ نفاست پسند اور صابر و شاکر قسم کی خاتون تھیں تو ان کے میاں خالو عنایت ہر جگہ منہ مارنے والے ڈھیٹ قسم کے بیل تھے۔ سب کی امیدوں کا اصل انحصار دادی پر تھا۔ سب جانتے تھے کہ وہ نہ خود ولایت جائیں گی اور نہ اپنے کسی بیٹے کو جانے دیں گی چنانچہ اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ میں ساری دولت سمیٹ کے والدین کے ساتھ ہمیشہ کے لیے ولایت جا بسوں اور بھول جاؤں کہ میرا کسی وطن سے یا کسی شخص سے جذبات کا کوئی رشتہ تھا۔

دسترخوان پر دادی نے اچانک چچی کو ٹوک دیا ”ارے چھوٹی دلہن، یہ رابعہ نے کیا کپڑے پہن رکھے ہیں؟ ایسے پہلے تو نہیں پہنے؟“

آمنہ چچی نے تنک کے کہا ”کیوں اماں، کیا ہے ان کپڑوں میں، آج کل تو سبھی پہن رہی ہیں۔“

دادی نے خفگی سے کہا ”پہن رہی ہوں گی جو اپنوں کو چھوڑ کر غیروں کو رجھاتی پھرتی ہیں۔“

آمنہ چچی نے بیٹی کا بھرپور دفاع کیا ”آپ بھی حد کرتی ہیں اماں! یہ تو فیشن ہے، آپ ٹی وی کے ڈراموں میں دیکھو تو پتا چلے۔“

”تو یہاں بھی کوئی ٹی وی کا ڈراما ہو رہا ہے کیا؟“ دادی نے کہا۔

خالو عنایت نے قہقہہ مارا ”ڈراما تو ہو رہا ہے۔ ہم بھی دیکھ رہے ہیں، لانا بھئی ذرا یہ گاجر کا حلوا۔“

آمنہ چچی نے فوراً رابعہ سے کہا ”رابعہ، بھائی کو دے نا گاجر کا حلوا“ اور پھر براہِ راست مجھے مخاطب کیا ”رابعہ نے خود بنایا ہے۔“

میں نے معذرت کی ”چچی۔ اب تو گنجائش نہیں رہی۔“

خالو عنایت نے ڈونگا میرے سامنے سے اٹھا لیا اور آدھا خالی کر کے پھر بیچ میں رکھ دیا ”بھئی ہم ناقدر دان! یہ ولایت پلٹ لوگ کیا جانیں دیسی گھی کے حلوے کو۔ ارے بھئی آمنہ! یہ تو بالکل وہی ہے...... شیریں محل والا...... میں تو ذائقہ پہچانتا ہوں ہر ایک کا۔“

چچی آمنہ نے جز بز ہو کے کہا ”خاک جانتے ہو تم عنایت! کیا ذائقہ کسی اور کے ہاتھ میں نہیں ہو سکتا۔“

اب خالہ نے دخل دیا ”اپنا رفیق جب چھوٹا تھا تو میرے ہاتھ کا حلوا بڑے شوق سے کھاتا تھا۔ جب آتا تھا، پوچھتا تھا خالہ گاجر کا حلوا بنایا اور میں کہتی تھی پگلے، مئی جون میں گاجر کا حلوا کہاں؟ سردیوں میں بناؤں گی جب گاجریں آئیں گی۔“

آمنہ چچی نے فوراً کہا ”بچپن کی بات اور ہے۔ یہ تو ابھی جب ولایت گیا تو کہہ رہا تھا کہ چچی ایک بار پائے کھلا دو اپنے ہاتھ کے۔ پھر ولایت میں کہاں نصیب ہوں گے۔“

اس کے بعد خواتین میں مجھ پر اپنائیت کے حق کی برتری ثابت کرنے کا مقابلہ شروع ہوا۔ آمنہ چچی نے کہا کہ وہ ہر سال مجھے اپنے ہاتھ سے سوئیٹر بن کے دیتی تھیں۔ خالہ نے کہا کہ رفیق کو قرآن پاک کی تعلیم میں نے دی اور دو سال میں پورے تیس پارے ختم کرا دیے۔ خالہ نے اس کا یہ جواب دیا کہ چوتھی جماعت تک اسے میں نے پڑھایا۔ تب کہیں اس کا اسکول میں داخلہ ہوا اور بعد میں بھی اس کا ہوم ورک میں ہی کراتی تھی۔ چچی نے دعویٰ کیا کہ میں رابعہ کے بغیر ایک پل نہیں رہ سکتا تھا تو خالہ نے کہا کہ افضل سے بڑھ کر نہ میرا کوئی دوست تھا نہ رازدار۔ میں خاموشی سے سنتا رہا اور مرد مسکراتے رہے۔

یہ مقابلہ دادی کی مداخلت سے ختم ہوا۔ انہوں نے کسی بات کے بیچ میں کہا ”نذیر! اوپر کی منزل پر صفائی بھی ہو گئی ہے۔ اگر رنگ کرانا چاہو تو بتا دو، بعد میں مشکل ہو گی۔“

نذیر چچا نے کہا ”رنگ ٹھیک ہے اماں۔ ابھی تو کرایا تھا بھیا نے۔“

”ہاں...... مگر کرائے دار جاتے ہیں تو ستیاناس کر جاتے ہیں۔ اماں ٹھیک کہہ رہی ہیں، سامان لانے سے پہلے رنگ کرانا آسان ہوتا ہے۔“

آلو عنایت نے ایک ڈکار لے کر کہا ”گویا اب یہ طے ہے کہ پیر صاحب کا آستانہ یہاں منتقل ہو جائے گا۔“

دادی نے انہیں ڈانٹا ”عنایت! نذیر میرا بیٹا ہے۔“

”وہ تو ہے...... مگر اماں بڑا مسئلہ ہو جائے گا سب کے لیے اگر یہاں ان کے مرید جوق در جوق آنے لگے“ آلو عنایت نے کہا ”ان میں عورتیں بچے بھی ہوں گے۔ جن بھوت اتارے جائیں گے، جھاڑ پھونک ہو گی۔“

آمنہ چچی نے شوہر کا دفاع کیا ”تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے کوئی ہڑبونگ ہو گی، شور شرابا ہو گا۔“

''ارے آمنہ! میں نے تو خود دیکھا ہے۔ یہ جن کوئی آسانی سے اترتے ہیں......'' آلو عنایت نے کہا ''انہوں نے ایک لڑکی کو مرچوں کی دھونی دی' الٹا لٹکا کے۔ پھر جھاڑو سے خوب جھاڑا۔ اس نے اتنا ہنگامہ کیا' اتنی چیخ پکار مچائی کہ توبہ۔ میں تو سمجھا مر جائے گی۔''

دادی نے کہا ''نہیں۔ یہ سب یہاں نہیں ہوگا۔''

چچا نذیر نے کہا ''مگر اماں...... میں نے تو اپنے مکان کے لیے کرائے دار سے بات بھی کر لی تھی۔''

''انکار کر دے اسے۔ ابھی گھر خالی تو نہیں کیا تو نے۔ اپنا آستانہ وہیں رکھ'' دادی نے کہا۔

آلو عنایت ہنسے ''نذیر بھائی! اب اسے باقاعدہ درگاہ بنالو۔ میرا مطلب ہے اس میں گنبد کا اور محرابوں کا اضافہ کرو۔ اپنا حجرۂ خاص بنواؤ۔ یہ کوئی پارٹ ٹائم بزنس تو ہے نہیں۔ اچھی خاصی آمدنی ہو رہی ہے۔ چاہو تو مجھے بھی اپنا اسسٹنٹ رکھ لو۔ مارکیٹنگ منیجر' میں پبلسٹی کروں گا۔ مریدوں کو گھیر کے لاؤں گا۔ کمیشن طے کر لو میرا۔''

چچا نذیر نے سخت برا مانا لیکن وہ دادی کے سامنے بول نہیں سکتے تھے۔ گھر میں چچا کا ایسے ہی مذاق اڑایا جاتا تھا۔ نہ کوئی ان کی پیری مریدی کو تسلیم کرتا تھا اور نہ روحانی طاقت کو مانتا تھا۔ ابا تو پھر بھی خاموش رہتے تھے مگر دادی تو منہ پر صاف کہتی تھیں کہ حرام خور' یہ جھاڑ پھونک اور کالے پیلے عمل کی بڑ میرے سامنے ماری نا تو میں جوتا ماروں گی کھینچ کر۔''

کچھ دیر بعد جب دادی سونے چلی گئیں تو نذیر چچا کی آلو عنایت سے زبردست جھڑپ ہوئی اور انہوں نے اپنی روحانی طاقت کو ثابت کرنے کے لیے اسی لڑکی پر سے جن اتارنے کا واقعہ سنایا جس کا حوالہ آلو عنایت نے کچھ دیر پہلے دیا تھا۔

''بھئی وہ سیالکوٹ کے ایک مشہور گھرانے کی لڑکی تھی۔ پڑھی لکھی اور ماڈرن۔ مگر جن اس پر عاشق ہو گیا۔''

میں نے کہا ''چچا۔ آخر یہ معاملہ کیا ہے' تمام جنات کو اپنے انڈیا پاکستان کی لڑکیوں سے ہی کیوں عشق ہوتا ہے؟''

''کیا مطلب ہے تمہارا برخوردار!'' وہ بولے۔

میں نے کہا ''جن بے چاری غریب گھرانوں کی لڑکیوں پر ہی کیوں عاشق ہوتے ہیں' پوش علاقوں کی فیشن ایبل صحت مند اور خوبصورت لڑکیاں ان سے کیسے محفوظ رہتی ہیں۔ انہیں یہ فاقہ زدہ' بدصورت اور جاہل لڑکیاں ہی کیوں پسند آتی ہیں آخر؟''

چچا نے متانت سے کہا ''جنات کا وجود تو قرآن سے ثابت ہے۔''

میں نے کہا ''اس میں کیا شک ہے۔ اصل مسئلہ تو ان کے رومانس کا ہے۔ اور وہ بھی دیسی لڑکیوں سے' وہ فلرٹ کرنے کے لیے سعودی عرب' ایران' یورپ' امریکا وغیرہ کے چکر نہیں لگاتے۔ کسی مس ورلڈ یا مس یونیورس پر کیوں فریفتہ نہیں ہوتے؟''

رابعہ ہنسنے لگی ''اتنی دور کیوں جاتے ہیں۔ میں کیا کم ہوں کسی مس یونیورس سے۔ مگر مجھے کوئی جن گھاس ہی نہیں ڈالتا۔''

رابعہ کی ماں نے اسے ڈانٹا ''لڑکی! باؤلی ہو گئی ہے کیا۔ رفیق کے ساتھ مل کر تو بھی جنات کا مذاق اڑا رہی ہے۔''

نذیر چچا نے بھی اسے گھورا ''اللہ سے توبہ کرنی چاہیے۔ ابھی جس لڑکی کا حوالہ عنایت خان نے دیا تھا' وہ بھی ماشاء اللہ سے بی اے پاس تھی اور خیر سے بڑی حسین و جمیل تھی۔ چھ بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ بڑے لاڈ پیار سے پلی بڑھی۔ نہ کوئی مسئلہ نہ پریشانی۔ رشتہ بھی اس کا بچپن ہی میں طے کر دیا گیا تھا' اپنے ہی عزیزوں میں۔''

میں نے کہا ''اور یہ بچپن والا دولہا کیا بچپن کا ہو گیا تھا؟''

انہوں نے کہا ''اس کی عمر کچھ زیادہ تھی۔ مگر اب اتنی بھی نہیں۔''

چچی نے فوراً حمایت میں دلیل دی ''فرق تو رکھا جاتا ہے اتنا۔ اب ان کے اور میرے درمیان پورے اٹھارہ سال کا فرق ہے۔''

میں نے عمر کے اس فرق کو چیلنج نہیں کیا۔ دوسرے بھی جانتے تھے کہ چچی اس فرق کو بڑھاتی جا رہی ہیں۔ پہلے وہ بارہ سال کا فرق بتاتی تھیں مگر ان کی اپنی عمر ایک جگہ رک گئی تو نذیر چچا بڑھتے بڑھتے اٹھارہ سال بڑے ہو گئے۔ دادی سے کیا چھپا ہوا تھا جو انہیں بیاہ کر لائی تھیں لیکن وہ بھی فضول بحث سے گریز کرتی تھیں۔

میں نے کہا ''لڑکی بی اے پاس اور خوبصورت تھی۔ صاحب زادے کتنا پڑھے ہوئے تھے اور کرتے کیا تھے؟''

''بھئی ماشاء اللہ سے گوجرانوالہ کے اسٹیشن پر چائے کا اسٹال تھا۔ اچھی بھلی کمائی ہو جاتی تھی۔ ورنہ بی اے ایم اے کی آج کل کیا اوقات ہے۔ جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں اور چار ہزار کی کلرکی بھی نہیں ملتی گوجرانوالہ ہے مین لائن پر۔ چوبیس گھنٹے گاڑیاں آتی جاتی ہیں۔ دونوں ہاتھوں سے پیسا سمیٹتا تھا۔''

میں نے کہا ''چوبیس گھنٹے اسٹال پر رہنے والے کو گھر بسانے کی کیا ضرورت تھی؟''

''دیکھو میاں! اب ایسے سوالوں کا جواب تو میرے پاس ہے نہیں۔ جب اس پر جن آیا تو ماں باپ بڑے پریشان ہوئے۔ بہت علاج کرائے' پتا نہیں کس کس کے پاس لے گئے۔ آخر میں لڑکی کے منگیتر نے ہمارے بارے میں بتایا۔ وہ ہمارا مرید اور بڑا عقیدت مند تھا۔ اب تم اس کا بھی مذاق اڑاؤ گے مگر یہ حقیقت ہے کہ اس کا کاروبار پہلے چلتا ہی نہ تھا' قریب ہی دوسرا اسٹال تھا۔ اس کی بہت سیل تھی۔ ہر وقت مجمع لگا رہتا تھا۔ ایک روز اس نے ہم سے التجا کی کہ پیر و مرشد۔ کچھ کیجیے۔ ہم نے ایک خاص وقت میں عمل کیا اور اسے ایک نقش دیا۔ اس سے کہا کہ پہلی جمعرات کو نصف شب کے بعد چائے کے لیے پانی ابالے تو نقش کو پانی میں ڈال دے اور چائے بنا کے بلا معاوضہ پلائے۔ جب آخری کپ رہ جائے تو کسی طرح دوسرے اسٹال والے کو پلا دے۔ اب شکل یہ کہ نئی اسٹال کا مالک خود اپنی چائے بنا کے پی لیتا ہے۔ وہ دوسرے اسٹال کی چائے کیوں پیے گا۔ خیر جی' اس نے دوسرے اسٹال والے کو بڑی محبت سے بلایا اور کہا کہ کیا ہم سے ناراضی ہے۔ نہ ادھر آتے ہو نہ بات کرتے ہو۔ اس نے کہا کہ کیا کروں' اتنا رش ہوتا ہے کہ فرصت ہی نہیں ملتی۔ اس نے چائے پیش کی اور اس نے پی لی۔ بس ہو گیا کام۔ دیکھتے دیکھتے ہمارے مرید کا کاروبار چمک اٹھا۔ جو لوگ اس کے حریف کے اسٹال پر چائے پینے جاتے تھے ان کو چائے کا ذائقہ اتنا خراب لگتا تھا کہ وہ ایک گھونٹ پی کے چھوڑ دیتے تھے۔ پھر ساتھ والے اسٹال پر جاتے تھے تو لطف آ جاتا تھا۔ دو ہفتے میں نقشہ الٹ گیا۔ اب وہ مکھیاں مارتا نظر آتا تھا جس کو سر کھجانے کی فرصت نہ تھی اور سارا رش میرے مرید کے اسٹال پر رہتا تھا۔ تب سے وہ ایسا مرید بنا ہے کہ جب اس کی منگیتر کو جن نے بے حد پریشان کیا تو اس نے اپنے ہونے والے سسر سے کہا کہ اس کا علاج کوئی کر سکتا ہے تو بس صوفی نذیر۔''

میں نے کہا ''نذیر چچا! کیا حرج تھا اگر لڑکی کو اسی جن کے ساتھ رخصت کر دیا جاتا۔ ایسا عاشق صادق تھا تو اسے خوش بھی رکھتا۔ اس کی ہر فرمائش پوری کرتا۔ جو مانگتی حاضر کرتا۔ گھومنے پھرنے کو جی چاہتا تو اڑا کے ہر جگہ لے جاتا...... لندن' پیرس۔''

سب ہنسنے لگے تو صوفی چچا نے ناراضی کا اظہار کیا ''یہ سب ولایتی تعلیم کا نشہ ہے رفیق میاں کہ سوچے سمجھے بغیر بولے چلے جا رہے ہو۔ یہاں ہوتے تم تو بچشم خود ملاحظہ کرتے اس لڑکی کی حالت کیا تھی۔ اس کے باپ اور بھائی کے لیے اسے قابو کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ خود کو چھڑا کے بھاگتی تھی اور زمین پر لوٹتی تھی۔ ہم تو پہلی نظر میں تاڑ گئے تھے کہ معاملہ کیا ہے۔ اسے باندھ کر ڈالا اور ایک جلالی وظیفے کا آغاز کیا۔ جن چلانے لگا اور مغلظات بکنے لگا۔ انتہائی مردانہ قسم کی' عین مردانہ آواز میں' ہمیں ڈرانے دھمکانے لگا۔ ہم سمجھ گئے کہ یہ کوئی عام جن نہیں ہے' وہ اپنی اصلیت ظاہر نہیں کرتا تھا۔ ہم نے مراقبہ کیا تو غیب سے سارے اسرار فاش ہوئے۔ پتا چلا کہ اس نادان لڑکی نے خود جن کو ورغلایا تھا۔''

ابا نے حیرت سے کہا ''جن کو ورغلایا تھا...... وہ کیسے؟''

صوفی چچا نے کہا ''بھائی صاحب' آپ تو بچپن سے سنتے آئے ہوں گے' یہ بات کہ نوجوان لڑکیوں کو غروب آفتاب کے بعد بال کھول کر چھت پر جانے سے روکا جاتا ہے۔ وہی وقت ہوتا ہے جنات کے واپس لوٹنے کا۔''

میں نے کہا ''کیا ان کا بھی کوئی گھونسلا ہوتا ہے؟ وہ بھی پرندوں کی طرح صبح نکل جاتے ہیں؟''

صوفی چچا نے کسی کے ہنسنے کی پروا نہیں کی ''اس لڑکی نے بزرگوں کی بات پر دھیان نہیں دیا۔ ایک روز شام تک سوتی رہی اور اٹھی تو اکیلی کوٹھے پر چلی گئی۔ نیچے حبس تھا اور گرمی تھی۔ گرج چمک پر آنکھ کھلی تو ٹھنڈی ہوا کھانے کو دل چاہا۔ بس شامت اعمال نے بلایا تھا۔ اوپر گئی تو بارش کا طوفان۔ ایسے میں ایک حسین اور جوان لڑکی' بال بکھرائے بارش میں بھیگے اور ناچنے لگے۔''

میں نے کہا ''یعنی وہ ڈانس بھی کر رہی تھی' کلاسیکی یا فلمی؟''

چچا نے اپنی بات جاری رکھی ''لڑکیوں پر اثر ہے بھارتی فلموں کا۔ ورنہ ہمارا کوئی ایسا کلچر ہے۔''

میں نے کہا ''گستاخی معاف چچا! کیا آپ نے پاکستانی کلچر کی نمائندہ شہکار پنجابی فلمیں دیکھی ہیں' جن میں ریشمی لاچے پہن کے لڑکیاں ایسا رقص کرتی ہیں کہ فیملی کے ساتھ آنے والے پریشان اور پشیمان نظر آتے ہیں یا ان سے بھی بڑھ کر پشتو فلمیں......''

چچا نے بڑی قرأت کے ساتھ کہا ''لاحول ولاقوۃ۔ ہماری نظر تو سنیما کے باہر سے گزرتے ہوئے پوسٹر دیکھ کر بھی جھک جاتی ہے لیکن اب جو وی سی آر نے گھر گھر سنیما کھول دیے ہیں تو شریف مسلمان گھروں کی بہو بیٹیاں بھی بے ہودہ فلمی گانوں کی دھن پر رقص کرتی ہیں۔ ہم نے تو سارا منظر

مراقبے کی حالت میں گویا خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔"
"مگر آپ کے مقابلے میں جن زیادہ حسن پرست اور عاشق مزاج ثابت ہوا۔ وہ رہتا کہاں تھا چچا؟"
ابا نے مجھے گھورا مگر مسکراتے رہے۔ باقی سب جو نذیر چچا کی روحانی قوت کے کرشموں کی داستانیں سنتے رہتے تھے اور یہ قصہ بھی کئی بار سن چکے تھے' خاموش رہے۔
چچا نے کہا "لڑکی کے گھر کے پچھواڑے ایک پرانا پیپل کا درخت تھا۔ آج کل وہاں آبادی ہے لیکن تقسیم سے پہلے مرگھٹ تھا۔ ہندو وہاں اپنے مردے جلاتے تھے۔ وہاں ہندوؤں کی ارواح خبیثہ کا غلبہ تھا۔ تقسیم کے بعد ہندو گئے تو ارواح نے بھی وہ مسکن چھوڑ دیا۔"
"یعنی پارٹیشن میں جن بھوت بھی تقسیم ہوئے؟" رابعہ نے دبے دبے لہجے میں سوال کیا۔
نذیر چچا نے اسے گھورا "بھئی وہ انہی ہندوؤں کے باپ دادا کی روحیں تھیں' جو یہ جگہ چھوڑ کر گئے۔"
میں نے کہا "اور ان کی جگہ انڈیا سے ہجرت کر کے آنے والے جنات نے ڈیرا ڈال لیا۔ جیسے مہاجروں نے ہندو سکھوں کے مکان الاٹ کرائے تھے؟"
چچا کی متانت میں کوئی فرق نہ پڑا "رفیق میاں! یہ تو ہم نہیں جانتے کہ وہ جن کب سے وہاں تھا۔ اس نے پیپل کے درخت سے لڑکی کو بارش میں بھیگتا اور رقص کرتا دیکھا تو اس پر فریفتہ ہو گیا۔ کچھ دیر بعد ہی لڑکی پر جنونی کیفیت کا غلبہ ہوا۔ اس نے دہشت میں چلانا شروع کیا اور اپنے کپڑے پھاڑ لیے' بال نوچے اور پھر بے ہوش ہو کے گر گئی۔ اس کے باپ اور بھائی نے اسے بڑی مشکل سے اٹھایا اور نیچے لائے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ دبلی پتلی لڑکی تھی مگر اس کا وزن اتنا زیادہ محسوس ہوتا تھا کہ وہ ہانپ گئے۔ ہوش میں آتے ہی لڑکی پھر اٹھی۔ جن نے اسے مجبور کیا کہ ڈانس کرے۔ اس نے باپ کو پٹخنی دی۔ بھائی کو ایسا دھکا دیا کہ وہ دیوار سے جا لگا۔ گھر کی عورتیں چیخنے چلانے لگیں۔ ایسی طوفانی بارش میں بھلا مدد کے لیے کون آتا۔ کچھ دیر بعد وہ تھک کے گری تو اس کے منہ سے کف جاری تھا اور ہاتھ پاؤں اکڑ گئے تھے۔ جب بارش تھمی تو گھر والے باندھ بوندھ کر کسی ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ اس نے انجکشن لگا دیا فوراً ...... ایسا ہی کرتے ہیں سارے ڈاکٹر۔ لڑکی کو اس نے انجکشن لگا لگا کے چھلنی کر دیا۔ انجکشن کے اثر سے وہ سو جاتی تھی لیکن اٹھتی تھی تو پھر وہی حالت۔ کھانا پینا سب چھوٹ گیا تھا۔ جسم میں خون تو جیسے خشک ہو گیا تھا۔ رنگ ہلدی جیسا پیلا پڑ گیا تھا اور جسم کی کھال سوکھ کے چمڑا ہو گئی تھی۔ گھر والے ڈاکٹر اور حکیم بدلتے گئے مگر لڑکی کی حالت میں افاقے کی صورت پیدا نہ ہوئی۔ اس کے بعد عامل بلوائے گئے۔ ان کے وظیفے اور عمل الٹ گئے۔ ایک بڑا نامور عامل اندرونِ سندھ سے آیا۔ اس نے حصار کھینچ کر آگ جلائی اور اپنا سفلی عمل شروع کیا۔ لڑکی نے یعنی جن نے اس کے ایسی لات ماری کہ بے پیندے کے لوٹے کی طرح لڑھک گیا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ بڑے بڑے ازلی جنات کو بھسم کر چکا ہے۔ جب وہ ہوش میں آیا تو بہکی بہکی باتیں کر رہا تھا۔ اس کے دماغ پر ایسا اثر ہوا کہ ایک رات کہیں نکل گیا۔ بہت ڈھونڈا مگر اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ پھر ایک روز اچانک اس کی لاش ملی۔ جن نے اسے پیپل کے اس درخت سے لٹکا دیا تھا۔ قصہ مختصر' جب اس مریضہ کو ہمارے پاس لایا گیا تو ہمیں بھی اندازہ ہو گیا کہ یہ کتنا منہ زور جن ہے۔ ذرا کوتاہی ہوئی تو ہماری جان کے بھی لالے پڑ جائیں گے۔ اب قسمت ایسی تھی اس کی۔"
"کس کی...... جن کی؟" میں نے کہا۔
چچا نے دخل اندازی کی پروا نہیں کی "اس لڑکی کی قسمت میاں رفیق! اس جن کو شکست دینے کے لیے ایک جلالی وظیفہ ضروری تھا۔ اس کے لیے شوال کے مہینے کی شرط تھی کہ چودھویں شب ہو اور جمعرات پڑے۔ خدا کی قدرت کہ ایسا ہی ہوا۔ پھر چتا کی آگ کے کوئلوں کی ضرورت تھی۔ وہ انڈیا سے لائے گئے۔ ان کوئلوں کو ایک کنواری لڑکی کی کھوپڑی میں دہکانا تھا۔ چکوال کے ایک گورکن نے کسی قبر کی نشاندہی کی جہاں سال بھر پہلے کوئی لڑکی دفن کی گئی تھی۔ اس نے خودکشی کی تھی چنانچہ وارث رات کے وقت خاموشی سے گاڑ گئے تھے۔"
میں نے کہا "چچا' ممکن ہے اسے قتل کیا گیا ہو؟"
"ہو سکتا ہے لیکن اس سے ہمیں فرق نہیں پڑتا تھا۔ کھوپڑی مل گئی تو اس میں چتا کے کوئلے دہکائے گئے۔ ان پر کالی بلی کا خون چھڑکا' سور کی چربی اور پاگل کتے کی دم کے بال جلائے گئے۔ پھر دم کی ہوئی سات مرچوں کی دھونی دی اور وظیفہ شروع کیا تو لڑکی ذبح کی ہوئی مرغی کی طرح پھڑکنے لگی۔ لڑکی نہیں وہ جن تڑپ رہا تھا۔ اس نے اذیت سے چیخنا چلانا شروع کیا مگر ہم نے دوسرا اور پھر تیسرا وظیفہ شروع کر دیا۔ جن کی مزاحمت کمزور پڑنے لگی۔ اس کے حلق سے ایسی آوازیں نکلنی شروع ہوئیں جو قربانی کے بعد بکرا نکالتا ہے۔ بالآخر لڑکی ساکت ہو گئی اور سکون سے سو گئی۔ اس کے قالب سے جن نکل گیا تھا مگر وہ بڑا ہی ذلیل اور ڈھیٹ جن

تھا۔ وہ ایک جوں بن کے ہمارے بالوں میں گھس گیا۔"
میں ہنس پڑا "جن ایک جوں بن گیا۔"
"دادی کہا کرتی ہیں ارے اس کے بالوں میں تو ہمیشہ جوئیں پڑ جاتی تھیں' جب یہ چھوٹا تھا۔" رابعہ نے منہ جھکا کے دھیرے سے کہا۔
ایک بار پھر سب ہنسنے لگے مگر نذیر چچا اس مخالفانہ رویے کے عادی ہو چکے تھے۔ بالفاظ دیگر ڈھیٹ بن گئے تھے۔ انہوں نے مجھے مخاطب کر کے ڈانٹا "میاں' ہنسنے کی بات نہیں۔ جنات سے واسطہ پڑا تو ساری ہنسی بھول جاؤ گے۔ جن خاکی نہیں ناری ہوتے ہیں۔ کسی بھی قالب میں ڈھل جاتے ہیں۔ ہم اس وقت خود سے بے خبر تھے۔ جلال و غضب میں خود اپنا ہوش نہ تھا۔ جب حالت بہتر ہوئی تو جن نے آزار پر کمر باندھی۔ سر میں خارش شروع ہوئی اور بڑھتی چلی گئی۔ ہم تو سر کھجا کھجا کے پاگل ہو گئے۔ کسی نے کہا کہ جوئیں مارنے والی دوا سر میں لگاؤ' ہم نے باری باری ہر دوا آزمالی۔ پھر کسی نے مشورہ دیا کہ کھٹمل مارنے والی دوا سر میں ڈالو۔ کسی نے کہا کہ کاکروچ ختم کرنے والا تیل ڈالو۔ سب آزما کے دیکھ لیا۔ وہ خبیث دن میں چپکا پڑا رہتا تھا۔ رات کو ادھر سونے کا ارادہ کیا ادھر اس نے کروٹ لی۔ رات تکیے پر سر پٹختے گزر جاتی تھی۔ نیند کی کمی کا اثر دن کے کام پر پڑتا تھا۔ سارا دن اونگھتے گزرتا تھا۔ بالآخر سر منڈوا دیا۔ اب خدا کی قدرت دیکھو کہ جو حجام آیا وہ بچپن میں ہمیں مسلمان کر چکا تھا۔"
مجھے پھر ہنسی آئی "یہ نیکی تو اس کے نامۂ اعمال میں لکھی گئی۔"
چچا نے کہا "میاں رفیق! خود تم بھی اسی کے ہاتھوں مسلمان ہوئے تھے اور تمہارے ابا بھی۔ اللہ اس کی مغفرت کرے۔ سو سال سے زائد عمر میں وفات پائی۔ اس کے استرے پر لکھا ہوا تھا بسم اللہ' اللہ اکبر۔ بس اسی کی وجہ سے جن کو بھاگنا پڑا۔ مگر وہ بھی ایک خبیث تھا' سر کے بالوں سے نکلا تو داڑھی میں داخل ہو گیا۔"
ابا نے کہا "ارے بھئی نذیر! اتنی بھی مت ہانکو۔"
خود میرے لیے بھی ہنسی کو ضبط کرنا محال ہو رہا تھا۔ آمنہ چچی مجھ سے ہی نہیں سب سے خفا نظر آتی تھیں مگر ابا کے سامنے بول نہیں سکتی تھیں۔ انہوں نے خفگی سے کہا "کھی کھی کرنے والی اس میں کیا بات ہے۔ یہ کوئی جھوٹ تو نہیں بول رہے ہیں۔"
اماں نے کہا "ہمیں سب پتا ہے جھوٹ سچ کا۔"
نذیر چچا نے کہا "آپ کے سر عزیز کی قسم بھابی! وہ بدباطن جن چاہتا تھا کہ ہم سر کی طرح چہرے پر بھی استرا پھروا دیں۔ یہ ناممکن تھا۔ ہماری تو عمر بھر کی کمائی یہی ریش مبارک ہے۔ اس سے تو ہمارے چہرے کی زینت ہے۔ کم ہمت جن نے ہمیں اتنا زچ کیا کہ کبھی کبھی تو ہم خود اپنی داڑھی نوچ لیتے۔ پھر ایک رات خواب میں ہمارے پیر و مرشد تشریف لائے اور بتایا کہ یہ وہی جن ہے جو اب ہمارا دشمن ہو گیا ہے اور ہماری زندگی اجیرن کرنے پر آمادہ ہے۔ اس نے ہمیں گنجا تو پہلے ہی کرا دیا ہے۔ ریش مبارک سے بھی محروم کر دے گا اور اس کے بعد بھی اپنی بے آبروئی اور شکست کا بدلہ لینے کے لیے کسی نہ کسی صورت ہمیں اذیت دیتا رہے گا۔ ممکن ہے وہ مچھر بن جائے یا چیونٹی بن کے کاٹتا رہے۔ ہمارے جسم میں خارش کر دے جس میں کیڑے پڑ جائیں اور پیپ بہے۔ اس کا خاتمہ بے حد ضروری ہے۔ پھر آپ نے ایک ناری چلہ بتایا۔"
میں نے کہا "یہ ناری چلہ کیا ہوتا ہے؟"
"بھئی نار کا مطلب ہے آگ۔ جنات بھی ناری ہیں اور ان کو فنا کرنے کے لیے ناری چلہ آخری ہے۔ جیسے کہتے ہیں نا کہ لوہے کو لوہا کاٹتا ہے تو آگ کی مخلوق کو آگ ہی تباہ کرتی ہے لیکن ذرا سی کوتاہی یا غلطی ہو جائے تو انجام وہی ہوتا ہے جو آگ سے کھیلنے والے کا ہو سکتا ہے۔ چلہ کرنے والا خود جل کے راکھ ہو جاتا ہے۔ پیر صاحب قبلہ نے ایک قبر کی نشاندہی فرمائی۔ وہ ایک ایسی ہی لڑکی کی قبر تھی جس کی جان اسی جن نے لی تھی۔ اس قبر کے بارے میں گورکن نے بتایا کہ جب اسے دفن کیا گیا تو پوری رات قبرستان کے درختوں میں بسیرا کرنے والے پرندے مضطرب رہے اور خوف زدہ آوازوں میں چلاتے رہے۔ کچھ فاصلے پر ایک سوکھا ہوا درخت تھا۔ اس کی ٹنڈ منڈ شاخ پر ایک الو کا بسیرا تھا۔ وہ رات بھر چیختا رہا۔ آدھی رات کے وقت گورکن کو قبرستان میں سے کسی عورت کے چیخنے چلانے اور زور زور سے رونے کی آواز سنائی دی تو وہ گھبرا کے باہر نکلا۔ اس کا خیال تھا کہ غنڈے بدمعاش یا شرابی کسی عورت کو پریشان کر رہے ہیں۔ لیکن وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ گورکن کو یوں محسوس ہوا جیسے اس لڑکی کی قبر کے پاس ایک سایہ سا گردش کر رہا ہے۔ وہ ڈر کے واپس اپنی کوٹھری میں گھس گیا کیونکہ بظاہر انسان نظر آنے والا وہ سایہ درخت سے اونچا تھا۔ اچانک وہ چھوٹا ہونے لگا۔ یوں جیسے قبر کے اندر دھنس رہا ہو۔ اگلے روز جب لڑکی کے لواحقین قبر پر فاتحہ خوانی کرنے آئے تو گورکن نے معلوم کیا کہ لڑکی کو کیا بیماری تھی۔ کسی عزیز نے بتایا کہ لڑکی پر ایک جن

فریفتہ ہوگیا تھا' ایک عامل نے جن کو قابو کرنے کی کوشش کی تو جن نے اس کی گردن مروڑ دی۔ دوسرے کو خون کی الٹیاں آنے لگیں۔ پھر لڑکی کو جھنگ کے کسی عامل کے پاس لے گئے تھے۔ وہاں سے آنے کے بعد اس کی حالت اور بگڑ گئی۔ حالانکہ عامل نے کہا تھا کہ وہ تین راتوں کے بعد ٹھیک ہوجائے گی۔ تیسری رات وہ مرگئی۔ یہ کافی پرانی بات تھی۔ جب ہمیں وہاں ناری چلہ کاٹنے کے لیے کہا گیا تو ہم نے رات کے وقت جا کر دیکھا۔ قبر ایک طرف سے دھنس گئی تھی۔ ہم نے اندر اتر کے اس کے پیروں کی طرف سے ہڈیوں کو ہٹایا اور اپنے کھڑے ہونے کے لیے جگہ بنائی۔ یہ تین رات کا چلہ تھا۔ پہلی رات خبیث جن مختلف صورتیں بدل کے ہمیں ڈرانے آتا رہا۔ کبھی سانپ بن کر ٹانگوں سے لپٹ جاتا' کبھی بچھو بن کے گردن پر رینگنے لگتا۔ ہمارے استغراق میں فرق نہ آیا۔ ہمیں معلوم تھا کہ وہ نابکار ہمیں گزند نہیں پہنچا سکتا۔ دوسری رات وہ زیادہ بے چین ہوا اور تڑپ تڑپ کے عجیب منحوس آوازیں آنے لگیں۔ بالآخر وہ رونے پیٹنے اور منت سماجت کرنے لگا۔ تمام عمر ہماری تابعداری کے دعوے کرنے لگا۔ لالچ دینے لگا اور پھر دھمکیاں لیکن ہم نے تو اسے تہس نہس کرنے کی قسم کھالی تھی۔ ہم نے وظیفہ نہیں چھوڑا۔ آخر شب میں اچانک ہماری داڑھی سے دھواں خارج ہونے لگا۔ ایسا لگتا تھا کہ داڑھی میں آگ لگ جائے گی مگر پھر بالوں سے راکھ جھڑنے لگی اور قبر کے اندر گرنے لگی۔ قبر کے اندر راکھ کا ڈھیر جمع ہوگیا۔ اذان فجر کی آواز آئی تو ہم نے طبیعت میں بہت سکون محسوس کیا۔ قبر سے نکل کے مسجد کا رخ کیا اور وضو کرکے نماز ادا کی۔ نماز کے بعد جب روشنی پھیل گئی تو تجسس نے دوبارہ قبرستان جانے پر مجبور کیا۔ اس قبر کو دیکھا تو راکھ کہیں نہ تھی مگر اردگرد کے درخت پودے اور گھاس پھوس جل کر سیاہ ہوچکے تھے اور وہاں ایسی بدبو تھی کہ سانس بھی لینا محال تھا۔ الحمدللہ وہ لڑکی بھی ٹھیک ہوگئی اور کچھ عرصے بعد اس نے شادی بھی کرلی۔''

میں نے کہا ''اسی بچپن اینڈ پچپن کے منگیتر سے؟''

چچا نے قدرے تامل کیا ''نہیں' وہاں تو شادی نہیں ہوئی۔''

''پھر کہاں ہوئی؟'' رابعہ چپ نہ رہ سکی۔

''وہ دراصل ...... ہمارے اس مرید کے دل میں کچھ خوف بیٹھ گیا تھا کہ کہیں وہ جن اس کا دشمن نہ ہوجائے۔''

میں نے کہا ''اسے تو آپ نے بھسم کردیا تھا۔''

''ہاں...... لیکن وہ ڈر گیا تھا۔ ہمیں موقع ہی نہ ملا کہ اسے سمجھاتے' بعد میں پتا چلا کہ لڑکی کے لیے کہیں سے ایک رشتہ آیا اور گھر والوں نے لڑکی سے پوچھ کے شادی بھی کردی۔ اب ماشاءاللہ اپنے گھر میں خوش ہے۔ دو بچے بھی ہیں اس کے۔''

میں نے سوچ کے کہا ''وہ لڑکا اسی گلے محلے کا ہوگا یا پھر اسی کالج میں پڑھتا ہوگا جس میں لڑکی پڑھ چکی تھی؟''

بے خیالی میں چچا نے کہہ دیا ''دونوں ہی باتیں تھیں۔''

میرا اندھیرے میں چلایا ہوا تیر نشانے پر لگا تھا۔ میں نے کہا ''پھر تو سب ٹھیک ہونا ہی تھا چچا! یہ پہلے ہوجاتا تو آپ کو ناری چلہ بھی نہ کاٹنا پڑتا۔''

چچا بگڑ گئے ''گویا تم سمجھ رہے ہو کہ اس لڑکی نے دوسری جگہ شادی کرنے کے لیے سارا ڈراما کیا تھا؟ اسے ہسٹریا کے دورے پڑتے تھے۔ میاں' تمہارا کیا ہے' تم تو ناری چلے کو بھی ڈراما کہہ دوگے۔ ولایت میں گزار آئے ہو چھ سات سال۔ تمہاری آنکھوں پر تو انگریزی تعلیم نے پٹی باندھ دی ہے'' وہ اٹھے اور بڑبڑاتے ہوئے چلے گئے۔

سب کو اندازہ تھا کہ اب وہ احتجاجاً واک آؤٹ کریں گے۔ ایسے بے سروپا قصے میں بچپن سے سنتا آرہا تھا۔ آمنہ چچی کا موڈ بھی خراب ہوگیا تھا۔ صرف رابعہ تھی جو اس موضوع پر مزید بات کرنے کے موڈ میں تھی لیکن میں نے معذرت کی اور سونے کے بہانے اپنے کمرے میں آگیا۔

گھڑی میں رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ گویا لندن میں رات کے ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ لارڈ ارنسٹ اپنی بیٹی کو ذاتی ضمانت پر چھڑا کے گھر لے گیا ہوگا کیونکہ ایک تو جرم کی نوعیت زیادہ سنگین نہیں تھی دوسرے عائشہ کا سابقہ ریکارڈ بے داغ تھا۔ میں دوبارہ کوشش کرتا رہا مگر مواصلاتی نظام کی خرابی تھی یا کوئی اور وجہ کہ میری کال ہی نہیں لگی۔

صوفی چچا کے جناتی قصے نے میرا بہت وقت ضائع کیا تھا اور میرا دماغ خراب کردیا تھا۔ اگرچہ واقعات میرے لیے ناقابل یقین تھے مگر میں پورے وثوق سے نذیر چچا کی بات کو سو فیصد جھوٹ سمجھنے سے قاصر تھا۔ دوسروں کے سامنے وہ کچھ بھی کہیں' گھر میں ایسے واقعات گھڑ کے سنانے کی انہیں کوئی ضرورت نہ تھی۔ وہ جانتے تھے کہ یقین کوئی نہیں کرے گا اور دادی تو بالکل معاف نہیں کریں گی۔

پراسرار واقعات ہر جگہ پیش آتے تھے۔ خود لندن جیسے شہر میں عاملوں کی کمی نہ تھی جو روحوں کو بلاتے تھے اور ان سے بات کرانے کے دعوے دار بھی تھے۔ وہ کرسٹل بال میں دیکھ کر

مستقبل کے واقعات کی نشاندہی بھی کرتے تھے اور ان کے پاس سب گورے آتے تھے جو بڑی بڑی فیسیں ادا کرتے تھے۔ ان عالموں پر یقین کرنے والوں میں نوجوان بوڑھے عورت مرد سب شامل ہوتے تھے۔ لندن کے اخباروں میں آسیب زدہ مکانوں کے بارے میں واقعات بھی شائع ہوتے تھے۔ بڑے بڑے صاحبانِ عقل بھوتوں کے بارے میں ایسے ایسے واقعات سناتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔ امریکا اور یورپ میں عجیب و غریب فرقے تھے جو روحانیت کے بارے میں ناقابلِ فہم عقائد رکھتے تھے۔ ان میں ایسے فرقے بھی تھے جو شیطان کے پیروکار اور پجاری سمجھے جاتے تھے۔ جادو ٹونا پورے یورپ امریکا میں عام تھا۔ میرا ذاتی مشاہدہ کچھ نہ تھا۔ مجھے کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں ملا تھا جو خود کسی پرسرار واقعے کا کردار بنا ہو۔ آپ بیتی بھی کسی نے نہیں سنائی تھی کہ ایسا میرے ساتھ ہوا۔ سب وہ جانتے تھے جو دوسروں پر گزری تھی۔ سنی سنائی باتیں دہراتے تھے اور اکثر جھوٹ بولتے تھے چنانچہ ایسی باتوں پر سوچنا بھی میرے نزدیک تضیعِ اوقات کے سوا کچھ نہ تھا۔

اچانک مجھے بشارت فاروقی کی دی ہوئی سمری کا خیال آیا اور میں لیٹ کر پڑھنے لگا۔

☆☆☆

روایات کے مطابق حویلی اور جاگیر سے منسوب تاریخی واقعات کا سلسلہ 1857ء کی جنگ آزادی سے بھی بہت پہلے شروع ہوتا تھا۔ سترہ سال قبل یعنی 1840ء تک انگریز فوج کی عمل داری پورے ہندوستان پر قائم ہوچکی تھی اور انہوں نے کلکتہ سے بمبئی' دہلی اور لاہور تک عوام اور حکمرانوں پر اپنی طاقت سے دہشت بٹھادی تھی۔ آخری تاجدار سلطنت مغلیہ بہادر شاہ ظفر کی حکومت قلعے تک محدود ہوگئی تھی اور انگریز کی نظر اب ہندوستان کے دیگر علاقوں سے بڑھ کر دیگر ممالک تک پہنچ رہی تھی۔

افغانستان میں سردار دوست محمد کی حکومت تھی لیکن وہاں بھی کابل اور جلال آباد میں انگریز اپنی چھاؤنی قائم کرچکے تھے اور فوجی قوت کے بل پر پورے افغانستان کو اسی طرح اطاعت گزار بنانا چاہتے تھے۔ جیسے وہ ہندوستان کو بنا چکے تھے لیکن عملاً یہ مشکل ہی نہیں ناممکن تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان ان گنت چھوٹی بڑی ریاستوں راجواڑوں ذاتی جاگیروں کے علاوہ صوبوں میں بٹا ہوا تھا۔ جو اختلاف رعایا میں مذہبی' معاشرتی' لسانی اور تہذیبی قبیلوں پر تھا وہی حکمرانوں کے درمیان تھا اور اسی انتشار سے فائدہ اٹھا کے انگریزوں نے ہندوستان کو غلام بنالیا تھا لیکن افغانستان میں ایسا نہ تھا۔ وہاں ایک قوم بستی تھی اور وہ سب ایک زبان بولتے تھے۔ ان کا مذہب ایک تھا اور تہذیبی روایات ایک تھیں۔ وہ آپس میں ضرور لڑتے تھے مگر کسی بیرونی حکمران کے سامنے متحد تھے اور کافر فرنگی جو شراب پیتا تھا اور سور کھاتا تھا تاقیامت ان پر حکومت نہیں کرسکتا تھا۔

انگریزوں کی طاقت ان کی فوجی قوت کے ساتھ ان کے ڈسپلن اور سیاسی چالبازی میں مضمر تھی۔ انہوں نے سندھ اور بلوچستان کے راستے افغانستان پر یلغار کی تو ان کی منظم فوج کے پاس بے پناہ اسلحہ اور توپ خانہ تھا۔ سردار دوست محمد اس کا مقابلہ کیسے کرتا اور کب تک کرتا۔ انگریزوں نے اسے گرفتار کرلیا اور قیدی بنا کے ہندوستان بھیج دیا۔ اس کی جگہ انگریزوں نے اپنے ایک پٹھو شاہ شجاع کو تخت پر بٹھادیا اور اپنی افواج کو جلال آباد اور کابل میں چھاؤنی بنا کے رکھا۔

صرف ایک سال بعد ہی افغانوں نے انگریز کے بنائے ہوئے حکمراں شاہ شجاع کو قتل کردیا اور سردار دوست محمد کے بیٹے اکبر خان کی بادشاہت قائم کردی۔ اکبر خان نے عنانِ حکومت سنبھالتے ہی کابل کے انگریز کمانڈر جنرل سیل کو نوٹس دے دیا کہ وہ ایک مہینے میں اس کے والد سردار دوست محمد خاں کو ہندوستان سے واپس لائے اور افغانستان میں اس کی حکمرانی بحال کرے ورنہ افغانستان میں موجود ہر ایک انگریز کو چن چن کر قتل کردیا جائے گا۔

جنرل سیل نے غور و خوض اور وائسرائے ہند سے مشورے کے لیے ایک ماہ کی مہلت طلب کی۔ اکبر خان کو اس کے جاسوسوں کے ذریعے اطلاع ملی کہ انگریز اس کے والد سردار دوست محمد خان کے ساتھ ایک مشروط معاہدہ کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ دوست محمد کو گوالیار کے قلعے میں رکھا گیا تھا۔ وائسرائے کے ایک نمایندے نے اس سے ملاقات میں کہا کہ تمہارا باغی بیٹا یہ چاہتا ہے کہ تم کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے تاکہ وہ افغانستان کا مستقل بادشاہ تسلیم کرلیا جائے۔ اس کے بعد وہ انگریزوں کی اطاعت بھی قبول کرلے گا مگر ہندوستان کا انگریز وائسرائے ایسا کرنے سے پہلے دوست محمد خان کو ایک موقع اور دینا چاہتا ہے۔ اگر وہ انگریزوں کی اطاعت قبول کرلے تو اسے واپس بھیج کر افغانستان کا حکمراں بنادیا جائے گا اور اس کے بیٹے اکبر خان کو تخت سے اتار کے بغاوت کے جرم میں پھانسی پر لٹکا دیا جائے گا۔

کہتے ہیں سردار دوست محمد خان نے قیدی اور مجبور

ہونے کے باوجود وائسرائے کے نمائندے کے منہ پر تھوک دیا اور کہا ''جھوٹے پر خدا کی جو لعنت ہوتی ہے وہ تیری صورت پر نظر آ رہی ہے۔ نہ میرا بیٹا ایسا ہے اور نہ میں کہ افغانستان کے تخت کے لیے کافر انگریز ہم سے اطاعت خرید سکے۔''

خود اکبر خان بے وقوف نہیں تھا۔ اس نے کابل کے انگریز کمانڈر جنرل سیل کو دوسرا نوٹس بھیجا کہ سردار دوست محمد خان کو باعزت طور پر واپس لانے اور افغانستان کا حکمران بنانے کے بعد انگریزوں کو ایک ماہ کے اندر اپنی ساری فوج افغانستان سے نکالنی ہوگی ورنہ حریت پسند اور غیرت مند افغان ایک بھی سپاہی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ تاہم انگریزوں نے سوچنے کے لیے وقت مانگا ہے تو انہیں مزید ایک ماہ کی مہلت دی جائے گی۔ لیکن بدعہدی کے خلاف ضمانت کے طور پر جنرل سیل کی بیوی اور انگریز فوج کے سو افسروں کو شاہی مہمان رکھا جائے گا۔ دھوکے' فریب اور عیاری کا مظاہرہ کرنے کی صورت میں سب سے پہلے انہی کو تہ تیغ کیا جائے گا۔

یہ خط روانہ کرنے سے پہلے ہی اکبر خان کی فوج کے کچھ دستوں نے جن میں خاص مزاج کے کفن پوش جانباز شامل تھے چھاؤنی پر رات کے وقت حملہ کیا اور پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق سو انگریز افسروں کو اور جنرل سیل کی بیوی کو اٹھا کر لے گئے۔ انہوں نے کسی کے ساتھ بھی بدسلوکی نہیں کی۔ کوئی لوٹ مار نہیں مچائی اور کسی کو بلاوجہ قتل نہیں کیا۔ ہاں مقابلے پر آنے والے اور مزاحمت کرنے والوں کا صفایا کر دیا گیا۔ تمام قیدیوں کو شاہی مہمان کی حیثیت دی گئی اور کسی نامعلوم مقام پر منتقل کر دیا گیا۔ انہیں بتا دیا گیا کہ معاہدے کی خلاف ورزی نہ ہوئی تو سب کو باعزت طور پر واپس پہنچا دیا جائے گا۔

جنرل سیل پھنس گیا۔ اس نے معاہدے کی نقل وائسرائے ہند کی معرفت انگلستان میں ملکہ وکٹوریہ کو ارسال کی۔ جب وہاں غور و خوض میں تاخیر ہوئی تو جنرل سیل خود لندن پہنچا۔ وہاں اسے صاف بتا دیا گیا کہ حکومت برطانیہ کسی طرح بھی باغیوں سے بلیک میل نہیں ہوگی۔ جنرل سیل اپنی مدد کے لیے جلال آباد چھاؤنی سے فوج طلب کرے اور قیدیوں کو چھڑانے کے بعد باغیوں کے ساتھ سختی سے نمٹے۔ افغان سرداروں کو سرعام پھانسی پر لٹکایا جائے اور ان کی لاشوں کو درس عبرت کے لیے تین دن تک نہ اتارا جائے۔ عام باغیوں کو توپ دم کر دیا جائے۔

جنرل سیل نے ایسا ہی کیا۔ اس نے جلال آباد کے علاوہ ہندوستان سے بھی انگریز فوج طلب کی مگر افغانوں نے ایک جنگی حکمتِ عملی کے مطابق انہیں ایک پہاڑی درے میں گھیر لیا جس کا نام جگدلک تھا اور لشکر کے ایک ایک سپاہی کو چن چن کر قتل کر دیا۔ صرف ایک انگریز کو زندہ چھوڑا گیا جو ڈاکٹر تھا۔ اس کا نام برائی ڈن تھا۔ کہتے ہیں اسے کپڑے اتار کے ایک پنجرے میں ڈالا گیا اور اسی حالت میں سردار اکبر خان کے سامنے پیش کیا گیا تو دہشت سے اس کی حالت غیر تھی۔ اکبر خان نے کہا کہ اب ہم تمہیں جنگی قیدی نہیں بلکہ سفیر کا درجہ عطا کرتے ہیں۔ پھر اس کو پنجرے سے نکال کے شاہی خلعت پہنائی گئی اور ایک خط دیا گیا۔ اس تاکید کے ساتھ کہ سوائے جنرل سیل کے یہ خط کسی کو نہ دیا جائے۔ پھر اسے سواری کے لیے ایک گھوڑا دے کر روانہ کر دیا گیا۔

ڈاکٹر برائیڈن اتنا دہشت زدہ تھا کہ روانگی کے بعد وہ مسلسل گھوڑا دوڑاتا رہا اور خوف سے مڑ کے دیکھتا گیا کہ کہیں افغان اس کے تعاقب میں تو نہیں ہیں۔ وہ خود تو اس طویل سفر کی سختی جھیل کے بھی زندہ رہا مگر اس کا گھوڑا مر گیا۔ جنرل سیل کے بارے میں اسے بتایا گیا کہ وہ وائسرائے سے مشورے کے لیے ہندوستان گیا ہوا ہے۔ جلال آباد سے ہندوستان تک کے طویل سفر میں اس پر کیا بیتی' یہ بڑی لمبی کہانی ہے۔ جب وہ سندھ سے گزر کے پنجاب میں داخل ہوا تو مرنے کے قریب تھا۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا بے حد دلچسپ اور افسانوی تھا۔ کہتے ہیں حقیقت ہر افسانے سے زیادہ پُراثر ہوتی ہے۔ الف لیلہ کی داستانوں میں الہ دین کو وہ چراغ مل گیا تھا جس کے تابع جن الہ دین کی ہر فرمائش پلک جھپکتے میں پوری کر دیتے تھے۔ خوش نصیبی نے علی بابا کو چالیس چوروں کے خزانے تک پہنچا دیا تھا۔ ایسی ہی ایک جدید دور کی کہانی بشیر ساربان کی ہے جو اونٹ پر سوار کراچی کے کسی راستے پر کھڑا منتظر تھا کہ امریکی صدر جانسن کی شاہی سواری گزر جائے تو وہ بھی اپنی راہ لے۔ جب صدر کا جلوس گزرا تو جانسن کی نظر بشیر ساربان پر گئی۔ انہوں نے گاڑی رکوائی' نیچے اتر کے بشیر ساربان سے ہاتھ ملایا اور اسے امریکا آنے کی دعوت دے ڈالی۔ جسے پیا چاہیں وہی سہاگن۔ بشیر اونٹ والا امریکی صدر کا مہمان بن کے امریکا پہنچا تو اس کی بے حد خاطر مدارت ہوئی اور وہ امریکا سے ڈھیر دل تحفے تحائف لے کر واپس آیا۔ سنا ہے اس میں ایک ٹرک بھی تھا۔ اگر وہ دور اندیش ہوتا تو باقی زندگی ٹھاٹ باٹ سے گزارتا مگر معلوم نہیں اس کے ساتھ کیا

ہوا کہ اس کے پاس کچھ باقی نہ رہا۔ زندگی کے آخری دور میں وہ کراچی کی ایک مضافاتی بستی لانڈھی میں بڑی عسرت کے دن گزار رہا تھا۔

ڈاکٹر برائیڈن کو بہاولپور کے گرد و نواح میں کسی کسان نے دیکھ لیا جو اپنی فیملی کے ساتھ بیل گاڑی میں کہیں جا رہا تھا۔ برائیڈن بے ہوش پڑا تھا اور اگر کسان کی نظر نہ پڑتی تو شاید بھوک پیاس سے مر جاتا۔ کسان نے اسے اٹھا کے گاڑی میں ڈالا۔ جب پانی پی کے اسے ہوش آیا اور کچھ کھانے کو ملا تو اس نے کسان سے گزارش کی کہ وہ اسے کسی طرح جہلم کے قریب رہتاس کے قلعے میں پہنچا دے۔ جنرل سیل وہاں انگریزی فوج کے کسی دوسرے جنرل سے ملاقات میں مصروف تھا اور ان کے درمیان یہ مشورہ جاری تھا کہ افغانستان کی شرمناک' عبرت ناک اور دردناک شکست کا بدلہ لینے کے لیے کتنا بڑا لشکر جرار تشکیل دیا جائے جو ایک مقتول انگریز کے بدلے میں دس افغانوں کو قتل کرے۔ ایک سو ایک یرغمال بنائے جانے والے انگریز افسروں کے بدلے میں ایک ہزار ایک افغان معززین کو قیدی بنا کے لائے اور جنرل سیل کی خالص ولایتی بیوی کے بدلے میں افغان سردار کی ہر بیوی اور خاندان کی ہر عورت کو اٹھا لائے۔

ابھی یہ صلاح مشورہ جاری ہی تھا کہ ایک فوجی گارڈ نے اس انتہائی اہم اور خفیہ اجلاس میں مداخلت کی اور سلیوٹ مار کے کہا کہ ڈاکٹر برائیڈن افغانستان کے سردار اکبر خان کا انتہائی اہم پیغام لے کر آیا ہے۔

''کہاں ہے وہ پیغام؟'' جنرل سیل نے کہا۔

''ڈاکٹر برائیڈن کہتا ہے کہ یہ پیغام وہ خود صرف جنرل سیل کے ہاتھ میں دینے کا پابند ہے'' گارڈ نے کہا۔

''او کے...... ڈاکٹر برائیڈن کہاں ہے' اسے بھیجو۔''

''وہ قلعے کے باہر بیل گاڑی میں لیٹا ہوا ہے سر' جسے ایک انڈین دیہاتی ڈرائیو کر رہا ہے اور برائیڈن کا اصرار ہے کہ بیل گاڑی کو قلعے میں داخل ہونے کی اجازت دی جائے'' گارڈ نے کہا' ''یہ اس کی درخواست ہے۔''

''واٹ نان سنس! خیر اسے آنے دو' جیسے بھی وہ آنا چاہے۔''

چنانچہ وہ بیل گاڑی رہتاس کے قلعے میں یوں داخل ہوئی جیسے جنرل سیل کو لانے والی فوجی گاڑی۔ گاڑی عین ملٹری ہیڈ کوارٹر کے سامنے آ کر رکی تو ڈاکٹر برائیڈن نے خط کے ساتھ اس دیہاتی کو بھی پیش کیا جس نے اس کی جان بچائی تھی۔ اس کی تیمارداری کی تھی اور اسے رہتاس تک پہنچایا تھا۔

جنرل سیل اس دیہاتی کی خدمت گزاری سے اتنا متاثر ہوا کہ خود اس کی بیل گاڑی میں بیٹھ کے اسے قلعے کی فصیل کے باہر تک چھوڑنے آیا۔ باہر آنے کے بعد اس نے ہاتھ لہرا کے کہا ''ویل ینگ نیٹو! ہم تم سے بہت خوش ہوا۔ تم ڈاکٹر برائیڈن کا جان بچایا۔ وہ افغانستان میں برٹش سفیر ہے۔ تم نے ملکہ برطانیہ کے لیے بہت بڑا خدمت سرانجام دیا' ابھی ہم تم کو ملکہ کی طرف سے اس کارگزاری کا انعام دے گا۔ بولو' کیا مانگتا ہے؟''

دیہاتی کے لیے فوری طور پر فیصلہ کرنا دشوار ہو گیا کہ وہ کیا مانگے اور کیا نہ مانگے۔ اسے تذبذب میں مبتلا دیکھ کر جنرل نے کہا ''او کے' ابھی تم بیل گاڑی میں جاؤ' ادھر سارا زمین کوئین کا ہے۔ شام تک تم جتنا زمین کا راؤنڈ لگائے گا' سب تمہارا انعام ہوگا۔ ناؤ' گو...... جب سورج غروب ہوگا تو ہم تم کو ادھر ملے گا۔''

اب واللہ اعلم ٹائم کم تھا یا طویل سفر کے بعد بیل تھک گئے تھے اور اس انعامی اسکیم والی میراتھن کے لیے پوری طرح فٹ نہیں تھے۔ یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ دیہاتی نے بیوی بچوں کو وہیں چھوڑا اور بیل گاڑی کو شام تک دوڑاتا رہا۔ سورج غروب ہوا تو وہ پھر اپنے نقطۂ آغاز پر تھا جہاں جنرل سیل اس کا منتظر تھا۔ وعدے کے مطابق اس نے وہ ساری زمین اس دیہاتی کے نام کر دی جس کا وہ چکر لگا کے آیا تھا۔

یہ دیہاتی ہمارے جدامجد عزت علی تھے جن کی ہم آٹھویں یا نویں پیڑھی میں شمار ہوتے تھے۔ عزت علی کے بیوی بچے انہی کے ساتھ تھے۔ غالباً وہ لوٹ کر اس راستے پر ہی نہیں گئے جس پر نہ جانے کہاں سے آ رہے تھے اور کہاں جا رہے تھے۔ وہ اسی جگہ آباد ہو گئے جو اب موضع ست بدھائی تھا۔

اس ضمن میں ایک دلچسپ بات جس کا میری کہانی سے کوئی تعلق نہیں۔ اگلے سال یعنی 1842ء میں جنرل سیل نے ایک بہت بڑی اور طاقتور فوج کے ساتھ افغانستان پر چڑھائی کی۔ افغانوں کو تمام معلومات مل رہی تھیں اور وہ پہلے سے زیادہ تیاری کے ساتھ انگریز فوج کے استقبال کے منتظر تھے۔

جنرل سیل کی بیوی بدستور سردار اکبر خان کی مہمان خاص کی حیثیت سے اس کے گھر میں موجود تھی۔ سردار اکبر اس عورت کی فہم و فراست اور سیاسی بصیرت سے بے حد متاثر تھا۔ اس نے سردار سے کہا کہ اس کشت و خون کو روکا جا سکتا ہے۔ اگر تم میری ملاقات میرے شوہر جنرل سیل سے کرا دو۔

سردار اکبر خان مان گیا اور اس کے خصوصی ایلچی ایک یرغمالی انگریز افسر میجر اسنارٹن کے ساتھ جنرل سیل سے ملاقات کے لیے پہنچے۔ انہوں نے جنرل سیل کو اس کی بیوی کا پیغام دیا اور معلوم نہیں کیا ضمانت دی کہ جنرل سیل نے اکبر خان کے قاصدوں کے ساتھ جانا منظور کرلیا۔ جنرل پہلے اپنی بیوی سے ملا اور اس نے اپنے شوہر کو سمجھایا کہ وہ جنگ سے باز رہے اور مصالحت کے ایک فارمولے کو منظور کرلے۔ یہ فارمولا خود جنرل سیل کی بیوی نے پیش کیا تھا۔ سردار اکبر خان اور جنرل سیل کی دن ٹو دن ملاقات میں اس فارمولے پر اتفاق رائے ہوگیا۔ ایسا نہ ہوتا تو دوسری شکست کے بعد انگریز فوج میں ڈاکٹر برائیڈن جیسا نامہ بر بھی بچ کے نہ جاتا۔

غیرت علی کے بعد ان کا بیٹا محفوظ علی اس جاگیر کا وارث ہوا۔ ان کے تین بیٹے اور بھی تھے مگر دستور کے مطابق جاگیر کی ملکیت کا حق محفوظ علی کو منتقل ہوا۔ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ عزت علی کی کتنی بیٹیاں تھیں اور وہ رخصت ہو کے کہاں گئیں۔ محفوظ علی نے جاگیر کو منظم کیا۔ اس کے گرد باڑھ لگوائی اور قریب سے گزرنے والے دریائے کہار سے ایک چھوٹی سی نہر نکال کے زمین کے لیے پانی حاصل کیا۔ عزت علی کے بیٹوں یعنی محفوظ علی کے بھائیوں کے شادیاں بھی گردونواح کے عزت دار گھرانوں میں ہوئیں اور ان سب کی اولادیں بھی جاگیر میں رہیں۔ ان کی رہائش ایک بہت بڑے احاطے میں تھی جس میں سب کی ضرورت کے مطابق کمروں کا اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ بیس بائیس افراد پر مشتمل یہ گھرانا بے حد خوش حال زندگی بسر کررہا تھا کہ بیسویں صدی کا آغاز ہوتے ہی خاندان کو کسی پراسرار بیماری نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ غالبًا یہ بیماری طاعون تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے جاگیر میں ایک قبرستان آباد ہوگیا۔ ایک شیر خوار کے سوا کوئی نہ بچا۔ اس کے بارے میں اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔

اس بچے کو جب جارج ششم کی تخت نشینی پر 1912ء کے دہلی دربار میں پیش کیا گیا تو وہ تین سال کا تھا۔ اس کی پرورش ایک ملازم اور اسکی بیوی نے کی تھی جو خود بے اولاد تھے۔ انگریز نے اس بچے کو جاگیردار تسلیم کیا اور اس کی حفاظت کی۔ یہ میرے پردادا کے بھائی قدیر احمد تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران انگریز حاکموں کی مہربانی اور قدردانی سے انہیں سپلائی کے ٹھیکے ملے تو وہ مالا مال ہوگئے اور جنگ عظیم ختم ہوئی تو انہوں نے بیس بائیس افراد کی ویران رہائش گاہوں کو گرا کے ایک شاندار حویلی تعمیر کی۔

قدیر احمد کی پہلی بیوی سے سات بیٹے تھے۔ جب اس کا انتقال ہوا تو قدیر احمد پچاس سے اوپر کے ہوگئے تھے اور ان کے بیٹے جوان ہوچکے تھے یا ہورہے تھے۔ ایک بیٹی کی خواہش میں انہوں نے یکے بعد دیگرے تین نکاح کیے مگر شاید عمر کے اس دور میں وہ ''بے تخم'' ہوچکے تھے اور صاحب اولاد نہیں ہوسکتے تھے۔ یہ قدیر احمد خود بھی نہیں جانتے تھے کہ ان کا کوئی سوتیلا بھائی بھی ہے۔

قدیر احمد اپنی حویلی اور جاگیر پر بڑے ٹھاٹ باٹ سے رہتے تھے اور بے حد دولت مند شمار ہوتے تھے۔ ان کے بیٹوں کو اس غیر آباد جگہ پر رہنا پسند نہیں تھا مگر جاگیر اور اس کی ساری آمدنی قدیر احمد کے قبضے میں تھی اور اس کے بغیر بیٹے لاہور میں کوٹھی بنا کے رہنے اور شہری زندگی اختیار کرنے کے خواب پورے نہیں کرسکتے تھے۔ وہ زیادہ پڑھے لکھے بھی نہیں تھے۔ ان کی تعلیم ایک چھوٹے سے قصبے دینا کے مڈل اسکول تک محدود رہی تھی چنانچہ وہ زمینداری کرتے رہے اور محدود سی عیاشی کرتے رہے۔ اس امید میں کہ جب ابا دنیا سے کوچ کریں گے تو جاگیر کو ٹھکانے لگائیں گے۔ اپنے اپنے حصے کی دولت سمیٹ کر جہاں چاہیں گے آباد ہوجائیں گے۔ ان میں سے کوئی بزنس کرنا چاہتا تھا تو کوئی لندن یا امریکا میں آباد ہونے کا خواہش مند تھا۔

ایک روز قدیر احمد صبح اٹھے تو دیکھا کہ ان کی حویلی کے عین مقابل باغ میں کسی جوگی یا درویش نے ڈیرا ڈال رکھا ہے۔ وہ سخت برافروختہ ہوئے اور ایک ملازم کو بھیجا کہ درویش کو نکال باہر کرے۔ ملازم کچھ دیر بعد پریشان اور سہما ہوا آیا۔ اس نے کہا کہ جناب' وہ کہتا ہے اس زمین کا مالک ہی مجھے یہاں سے اٹھا سکتا ہے۔

قدیر احمد خود گئے اور بڑے غصے میں کہا ''بڈھے! خیریت چاہتا ہے تو اپنا بوریا بستر سمیٹ اور یہاں سے نکل جا۔''

درویش نے سر اٹھایا ''تو مالک ہے اس زمین کا۔''

''ہاں' یہ میری زمین ہے۔''

درویش نے ایک مٹھی بھر کے مٹی اٹھائی ''یہ تو مٹی ہے اور مٹی اللہ کی امانت ہے' ہمیں بھی مٹی نے بلایا ہے۔''

قدیر احمد آپے سے باہر ہوگئے ''بکواس کی تو یہیں زندہ گاڑ دوں گا۔''

ان کے چلانے کی آواز سن کے ساتوں بیٹے باہر آگئے تھے۔ درویش نے انہیں مسکرا کے دیکھا۔ ''تو سات بیٹوں کا باپ ہے۔ سات بار تجھے مبارک۔ سات سال ہی کا کھیل ہے۔'' پھر وہ سیدھا لیٹ گیا۔ قدیر احمد نے بیٹوں کو حکم دیا کہ اسے اٹھا کے باہر پھینک دیں۔ اسے ہاتھ لگایا تو وہ سرد ہوچکا تھا۔ یوں جیسے مرے ہوئے بھی کئی گھنٹے ہوچکے ہوں۔

قدیر احمد لرز گئے۔ شدید صدمے نے ان کے اعصاب پر بہت برا اثر ڈالا اور ان کے دماغ کو احساس جرم و گناہ کے آزار میں مبتلا کردیا۔ درویش نے کہا تھا کہ اسے تو مٹی نے بلایا تھا۔ اسے وہیں دفن کردیا گیا اور قدیر احمد نے پختہ قبر بنوا کے اس کے گرد ایک احاطہ اور پھر ایک کمرا بھی تعمیر کرایا۔ وہ ہر روز فاتحہ خوانی کرتے' وہیں بیٹھ کے تلاوت میں مصروف رہتے۔ جمعرات کو چراغ جلاتے اور نیاز بانٹتے۔ اللہ سے توبہ کرتے۔

لیکن درویش نے جو کہا تھا کہ سب سات سال کا کھیل ہے وہ گویا نوشتۂ تقدیر تھا جو اس نے پڑھ کے سنا دیا تھا۔ اس واقعے کو ایک سال گزر گیا۔ ان کا سب سے بڑا بیٹا اچھا گبرو جوان تھا' شہسواری کا شوقین تھا اور اکثر شکار پر جاتا تھا۔ ایک رات قریب کے کسی گاؤں میں ہونے والے نیزہ بازی کے مقابلے میں شرکت کرکے لوٹ رہا تھا کہ نہ جانے کیسے اس کا سدھایا ہوا اور من پسند گھوڑا بدک کے بے قابو ہوگیا۔ اس کے ساتھ آنے والے ایک ملازم نے بتایا کہ وہ اصل راستے سے بھٹک گئے تھے مگر مالک نے کہا کہ فکر کی کون سی بات ہے۔ دوسرا راستہ تھوڑا لمبا ہوجائے گا۔ آدھا گھنٹا دیر سے گھر پہنچ جائیں گے۔ ہماری کون سی گاڑی نکلی جارہی ہے۔ یہ سب راستے ان کے دیکھے بھالے تھے جن پر وہ برسوں سے آباد رہے تھے۔ ملازم خاموش ہوگیا۔ اس کے کہنے کے مطابق ایک جگہ گھوڑا اچانک بے قابو ہوکے اچھلنے لگا۔ ملازم کا خیال تھا کہ جانور نے' کوئی بدروح یا شیطانی مخلوق دیکھ لی تھی۔ ملازم نیچے گر گیا۔ مالک نے گھوڑے کو بہت چمکارا اور آگے بڑھانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہوا۔ پھر یکلخت گھوڑا سرپٹ بھاگا اور جنگل میں غائب ہوگیا۔ ملازم پیچھے دوڑا مگر وہ ان کا سراغ نہ پاسکا۔ صبح گھوڑا خود ہی گھر آگیا تو قدیر احمد ملازمین اور مزارعوں کے ساتھ جنگل کی طرف گئے اور انہیں ایک جگہ بیٹے کی اکڑی ہوئی لاش مل گئی۔ پتھر پر لگنے سے اس کا سر بھی پھٹ گیا تھا اور گردن بھی ٹوٹ گئی تھی۔

دوسرے سال اس سے چھوٹا بیٹا دریائے کہار میں ڈوب گیا۔ یہ عام دنوں میں کسی نالے کی طرح بہتا تھا اور پانی اتنا کم ہوتا تھا کہ لوگ جوتے اتار کے اسے کہیں سے بھی عبور کرلیتے تھے۔ صرف برسات کے موسم میں اس پر بھی کبھی طغیانی آتی تھی تو پانی کناروں کو چھونے لگتا تھا اور بعض اوقات گردونواح کے علاقوں میں فصلیں اور مویشی بھی ڈوب جاتے تھے۔ لیکن قدیر احمد کا بیٹا اپریل میں ایک ایسی جگہ ڈوب گیا تھا جہاں اس حادثے کا کوئی امکان ہی نہ تھا۔ وہاں سے بچے بوڑھے سب ہی دریا پار کر جاتے تھے اور کبھی کوئی حادثہ نہیں ہوا تھا جس سے اندازہ ہوتا کہ تہ آب کوئی قدم کھینچ لینے والی گہرائی بھی ہے۔ بدقسمتی سے مرنے والے کو تیرنا بھی نہیں آتا تھا۔

ایک سال اور گزر گیا۔ ایک رات ان کا تیسرا بیٹا سوتے میں کوئی آہٹ سن کے جاگا۔ اسے شک ہوا کہ باہر باڑے میں کوئی چورانہ کارروائی میں مصروف ہے۔ آدھی رات کے وقت مرغیاں کڑکڑا رہی تھیں۔ پھر بکریاں بولنے لگیں اور اسے یوں لگا جیسے کچھ لوگ سرگوشی میں بول رہے ہیں۔ اس کے کان کھڑے ہوئے تو اس کے کانوں نے گفتگو بھی سمجھ لی۔ پہلے کسی نے کہا ''اوئے پاگل دے پتر!'' پھر دوسرا بولا ''جلدی کرو......'' اس نے دانت پیس کر گالی بھی بکی۔ قدیر احمد کا بیٹا جست لگا کے بستر سے اٹھا اور اپنی شکاری بندوق کے ساتھ باہر لپکا۔ جب اس نے دروازہ کھول کے چوروں کو للکارا تو گھر میں سب ہی بیدار ہوگئے۔ چور جو گھوڑے چرانے آئے تھے' فرار ہوگئے۔ قدیر احمد کا بیٹا ان کے پیچھے دوڑا۔ اس نے ایک فائر سے ایک ملزم کو گرالیا۔ قدیر احمد اسے روکتے رہے کیونکہ نقصان کوئی نہیں ہوا تھا تو خطرہ یا پریشانی مول لینے کی کیا ضرورت ہے۔ کچھ دیر بعد دوسرے فائر کی آواز سنائی دی تو وہ سمجھے کہ بیٹے نے دوسرے چور کو بھی نشانہ بنالیا ہے مگر حقیقت اس کے برعکس تھی۔ بھاگنے والے دوسرے چوروں نے تعاقب کرنے والے کو روک دیا تھا۔ جاتے وقت وہ اپنے زخمی ساتھی کو بھی اٹھا کر لے گئے' بعد میں وہ زخمی مرگیا اور ناکام چور بھی پکڑ لیے گئے۔ ان پر چوری' ڈکیتی اور قتل کے مقدمات بھی چلے اور دو کو پھانسی بھی ہوئی مگر قدیر احمد نے تیسرے سال اپنا تیسرا بیٹا گنوادیا تو وہ تقریبًا پاگل ہوگئے۔ فقیر کی بددعا نے فرشتۂ اجل کا روپ دھار لیا تھا اور وہ ان کے بیٹوں کے تعاقب میں تھی۔ اسی ترتیب سے انہیں دوسری دنیا میں بھیج رہی تھی جس ترتیب سے وہ اس دنیا میں آئے تھے۔ وہ فقیر کے مزار پر سر پٹختے رہے' روتے رہے اور معافیاں مانگتے مگر ایک نحس انجام سے بچنے کی سبیل نہ کر پائے۔

چوتھا بیٹا یوں گیا کہ ایک رات اس کے پیٹ میں شدید درد اٹھا۔ وہ اسے گاڑی میں ڈال کے جہلم لے جارہے تھے کہ آدھے راستے میں گاڑی بند ہوگئی۔ اچانک ان کی نظر فیول میٹر پر گئی تو پتا چلا کہ پیٹرول ختم ہوگیا ہے۔ یہ ناقابل

یقین بات تھی۔ تمام گاڑیوں کے ٹینک عام طور پر فل رہتے تھے اور اضافی پیٹرول کا ایک ڈرم کبھی خالی نہیں ہوتا تھا کیونکہ پیٹرول پمپ اس جگہ سے بتیس میل دور تھا۔ جب قدیر احمد نے نیچے اتر کے دیکھا تو انہیں اندازہ ہوگیا کہ پچھلے حصے کی ڈکی سے شروع ہو کے آگے انجن تک جانے والی فیول کی پائپ لائن ٹوٹ گئی ہے۔ غالباً نیچے سے کوئی پتھر اچھل کر فلور سے ٹکرایا تھا۔ رات کے وقت اس سڑک پر کسی دوسری گاڑی کی آمد کا امکان بھی نہ تھا۔ قدیر احمد کے بیٹے کی اپنڈکس پھٹ گئی اور صبح تک وہ اس کی لاش لیے ویران راستے پر بیٹھے رہے۔

پانچواں بیٹا جی ٹی روڈ پر اپنی گاڑی میں سفر کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک دوست بھی تھا جسے لاہور جانا تھا۔ اس نے دوست سے کہا کہ وہ گاڑی لے جائے ورنہ اس جگہ راولپنڈی سے آنے والی کسی بس میں اسے جگہ نہیں ملے گی۔ وہ خود کسی کرائے کی گاڑی میں دینا سے گھر چلا جائے گا۔ دوست نے بہت کہا کہ وہ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں اسے گھر چھوڑ کے بھی اپنا سفر جاری رکھ سکتا ہے مگر اس نے دوست کی نہ مانی اور کہا کہ میری فکر مت کرو۔ میں پیدل بھی جا سکتا ہوں۔ دوست کے جانے کے بعد وہ سڑک عبور کر کے اس جگہ آ گیا جہاں سے مین روڈ سے آنے والی گاڑیاں رہتاس جانے والی چھوٹی سڑک پر مڑ جاتی تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ کوئی نہ کوئی سوزوکی ویگن یا کار اسے لفٹ دے کر حویلی تک پہنچا دے گی۔ وہ کوئی اجنبی نہیں تھا۔ اس علاقے کے بیشتر لوگ اسے پہچانتے تھے۔ ابھی اسے وہاں کھڑے پانچ منٹ ہی ہوئے تھے کہ لاہور کی طرف سے آنے والی ایک ویگن نے مڑنے کا اشارہ دیا۔ ڈرائیور نے اسے دیکھ کے بریک بھی لگائے مگر اچانک گاڑی کا ٹائی راڈ کھل گیا اور گاڑی بے قابو ہو کے قدیر احمد کے بیٹے پر چڑھ گئی۔

چھٹا بیٹا بیمار ہوا تو قدیر احمد اسے لے کر لاہور دوڑے۔ اسے کوئی خاص بیماری نہیں تھی۔ ایک بہت اچھی شہرت رکھنے والے اور دی آئی پی اسپتال کے ڈاکٹر نے انہیں تسلی دی کہ اتنا گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ یہ معمولی موسمی بخار ہے جو کل تک اتر جائے گا لیکن اس رات نرس نے اسے کسی دوسرے مریض کا انجکشن لگا دیا۔ نرس پرانی اور تجربہ کار تھی اور تحقیقات میں یہ معلوم نہ ہو سکا کہ آخر انجکشن کیسے بدل گئے تھے۔ وہ انجکشن بھی خطرناک قسم کا نہیں تھا۔ وہ عام پنسلین اینٹی بایوٹک کا انجکشن تھا مگر یہ بات اس کے مرنے کے بعد معلوم ہوئی کہ قدیر احمد کے بیٹے کو پنسلین سے شدید الرجی تھی۔

قدیر احمد کی اب عجیب حالت ہوگئی تھی۔ وہ نفسیاتی مریض تو بہت پہلے سے تھے۔ اب ان پر ڈیپریشن اور پاگل پن کے دورے بھی پڑنے لگے تھے۔ جب وہ ہوش میں ہوتے تھے تو درویش کی قبر پر بیٹھے روتے رہتے تھے اور اس کے پیروں کی طرف ایک قطار میں بنی ہوئی چھ قبروں کو گھورتے رہتے تھے۔ ان کی راتوں کی نیند اڑ گئی تھی۔ خوف نے ان کے ذہن کو مکڑی کے جالے کی طرح جکڑ رکھا تھا۔ انہیں تصور میں یا خواب میں ساتویں بیٹے کی موت کے مناظر دکھائی دیتے تھے تو وہ چیخ مار کے بھاگتے تھے۔ اسی کیفیت میں وہ ایک بار سیڑھیوں سے گر گئے اور دوسری بار دیوار سے ٹکرائے۔ پھر نہ جانے کس نے انہیں ایک راہ سجھائی کہ ساتویں بچے کو وہ اس حویلی کے آسیب سے نکال کے کہیں دور بھیج دیں۔ اتنی دور کہ وہ فقیر کی بددعا سے محفوظ ہو جائے۔ مشورہ دینے والے کا پاگل پن تھا۔ اپنی موت سے بچ کے کوئی کہاں جا سکتا ہے۔ قدیر احمد نے آخری بیٹے کو لندن بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ فلائٹ رات کے وقت روانہ ہوئی تھی۔ وہ ائرپورٹ سے لوٹے تو کچھ بے چین تھے۔ انہیں وہ سکون حاصل نہیں ہوا تھا جس کی توقع تھی۔ وہ سونے کے لیے لیٹے تو کروٹیں بدلتے رہے تیسرے دن اس بے چینی کا سبب اخباری خبر کی صورت ان کے سامنے آ گیا۔ فرشتہ اجل نے انہیں مطلع کیا۔ جس جہاز پر ان کا بیٹا موت سے دور بھاگ رہا تھا وہ سمندر میں گر گیا ہے۔

بس اس کے بعد قدیر احمد کا دماغ الٹ گیا۔ انہوں نے بندوق نکالی' باری باری تینوں بیویوں کو گولی مار کے ایک کنوئیں میں ڈالا اور پھر کنوئیں کی منڈیر پر منہ پھیر کے بیٹھ گئے۔ بندوق کو پیر سے پکڑ کے انہوں نے نال اپنے منہ سے لگائی اور انگوٹھے سے گھوڑا دبا دیا۔ دھماکا ہوتے ہی وہ پلٹ کر کنوئیں میں غائب ہو گئے۔

اس کے بعد ایک طویل عرصے تک اس کے آسیب زدہ حویلی اور اس سے ملحق جاگیر کا والی وارث کوئی نہ تھا۔ جگہ فقیر کی سات مبارک بادوں کے بعد ست بدھائی پہلے ہی مشہور ہوگئی تھی۔ اس فقیر کی قبر رفتہ رفتہ زیارت گاہ بن گئی۔ گرد و نواح کے کچھ لوگ حقائق سے باخبر تھے۔ باقی عقیدت میں چراغ جلاتے رہے۔ پھر کسی نے وہاں جمعرات کو محفل سماع کی ابتدا کی اور قوال آئے تو ہر جمعرات کو صوفیانہ کلام پر جھومنے والے بھی آئے اور چادر چڑھانے والے بھی۔

پھر اچانک ایک شخص کفیل احمد نمودار ہوا۔ اس نے

عدالت میں حق ملکیت کا دعوئی دائر کیا اور بتایا کہ قدیر احمد کے والد محفوظ علی نے ایک نہیں دو شادیاں کی تھیں مگر ان کی دوسری شادی خفیہ طور پر اپنی ہی ایک ملازمہ مبارک بیگم سے ہوئی تھی۔ اپنے والد کے ڈر سے اور کچھ خاندانی بیوی کے خوف سے انہوں نے دوسری بیوی کو حویلی میں نہیں رکھا۔ وہ لاہور میں رہی اور اس نے شوہر سے کیے ہوئے حلفیہ وعدے کو مرتے دم تک نبھایا کہ اس راز کو وہ ہمیشہ اپنے سینے میں دفن رکھے گی۔ اس نے ثابت کیا کہ وہ بھی محفوظ علی کا بیٹا ہے اور قدیر احمد کا سوتیلا بھائی ہے۔ محفوظ علی کا سارا خاندان طاعون کے مرض میں ختم ہو گیا تھا۔ مگر مبارک بیگم لاہور میں ہونے کی وجہ سے بچ گئی تھی۔ کفیل احمد اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اپنی زندگی میں تو ماں نے اسے کبھی باپ کا نام نہیں بتایا تھا مگر اس کی موت کے بعد جب کفیل احمد نے ایک صندوق کو کھولا جو ہمیشہ اس کی ماں مبارک بیگم کی تحویل میں اور مقفل رہتا تھا' تو اس میں سے بہت سے دستاویزی ثبوت برآمد ہوئے جن سے اس کو معلوم ہوا کہ وہ قدیر احمد کا بیٹا ہے۔ کفیل احمد نے یہ سارے ثبوت عدالت کے سامنے رکھے تو شک و شبے کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی اور ست بدھائی کی حویلی اور جاگیر پر اس کا حق ملکیت تسلیم کر لیا گیا۔

تاہم کفیل احمد نے عدالت میں حلف اٹھانے کے باوجود جھوٹ بولا تھا۔ وہ مبارک بیگم کے بطن سے محفوظ علی کا اکلوتا بیٹا نہیں تھا۔ پہلا بیٹا عزیز احمد تھا۔ یہ میرے دادا تھے۔ ان کی پیدائش بارہ اپریل 1912ء کی تھی۔ پہلی بیوی کے بطن سے پیدا ہونے والے قدیر احمد صرف سات دن چھوٹے تھے اور انیس اپریل کو پیدا ہوئے تھے۔ گویا قدیر احمد میرے سوتیلے دادا تھے۔

کفیل احمد کی پیدائش سات سال بعد کی تھی۔ وہ مبارک بیگم کا اکلوتا بیٹا نہیں دوسرا بیٹا تھا لیکن عدالت میں اس کے بیان کی صداقت کو چیلنج کرنے والا کوئی نہ تھا۔ قانونی ضرورت پوری کرنے کے لیے اخباروں میں اشتہار ضرور شائع کیا گیا تھا کہ ست بدھائی کی جاگیر کی ملکیت کے مقدمے میں کوئی فریق ہو تو سامنے آئے۔ جب دوسرا کوئی دعوے دار سامنے نہ آیا تو کفیل احمد ہی کو واحد وارث قرار دیتے ہوئے ساری جاگیر اور حویلی کی ملکیت دے دی گئی۔

دراصل کفیل احمد کے بڑے بھائی یعنی میرے دادا تلاش معاش میں دہلی چلے گئے تھے۔ بعد میں حالات ایسے بنے کہ انہیں ریلوے میں ملازمت ملی اور وہ ایک شہر سے دوسرے شہر ٹرانسفر ہوتے رہے۔ اسی دوران ایک حادثہ پیش آ گیا۔ یہ

میرے دادا عزیز احمد کا دادی جان سے عشق تھا جس کا احوال دادی جان نے مختلف مواقع پر آہیں بھر بھر کے الگ الگ حوالوں سے سنایا تھا۔ کسی بھی موقعے پر وہ دادا کو یاد کر کے کوئی واقعہ سنا دیتی تھیں۔ پھر ہم کریدتے تھے۔ وہ کچھ خفا ہوتی تھیں کچھ خوش اور بالآخر شرماتے شرماتے بہت کچھ بتا دیتی تھیں۔ ان سب کو جوڑ کے ہم نے ستر سال پہلے دستِ قدرت کے ہاتھوں لکھی جانے والی دادا دادی کی داستانِ عشق مرتب کر لی تھی۔

واقعات کے مطابق دادا عزیز احمد بسلسلۂ ملازمت دہلی سے لکھنو یا شاید لکھنو سے دہلی جا رہے تھے۔ کسی اسٹیشن پر انہوں نے پلیٹ فارم کے دوسری طرف کھڑی ہوئی ٹرین کے زنانہ ڈبے کی ایک کھڑکی میں دادی کے حسن بے مثال کا جلوۂ بے حجاب دیکھ لیا۔ وہ برقعے کا نقاب اٹھا کے ڈول ہاتھ میں تھامے کسی قلی کو یا ریلوے کے ملازم کو متوجہ کرنا چاہتی تھیں کہ انہیں پینے کے لیے پانی لا دے مگر ہڑبونگ میں ان کی کوئی نہیں سن رہا تھا کیونکہ اسٹاپ بہت مختصر تھا۔ اس مختصر سے وقت میں دادا نے ایک تاریخ ساز فیصلہ کیا۔ انہوں نے دادی سے ڈول لیا بلکہ چھینا۔ انہیں پانی لا کے دیا اور پھر اپنی ٹرین چھوڑ کے اس ٹرین میں سوار ہو گئے جو مخالف سمت میں جا رہی تھی۔ انہوں نے اپنے سامان پر بھی لعنت بھیج دی۔ وہ ادھر چلے گئے جدھر دل لے گیا۔

اس عشق کی تفصیل میں زندگی کے ان گنت واقعات آتے ہیں۔ مختصراً یہ کہ دادا نے بالآخر دادی کو پا لیا مگر اس جرم عاشقی کی پاداش میں ماں نے انہیں لکھ دیا کہ اب وہ مرتے دم تک ان کی صورت نہ دیکھیں گی کیونکہ روایتی انداز میں انہوں نے دادا کی نسبت کہیں طے کر رکھی تھی۔ بیٹے کی اس حرکت نے انہی کو بدعہدی کا مجرم بنا دیا تھا۔ رشتہ مانگ کے اور زبان دے کے کسی وجہ کے بغیر پھر جانا اس عہد میں ایک ناقابل معافی جرم سمجھا جاتا تھا اور ایسا کرنے والا معاشرے میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا تھا۔

یوں دادا اپنے خاندان سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے۔ وہ کبھی لوٹ کے گھر نہیں گئے اور ان کی اپنے بھائی کفیل احمد اور اپنی ماں مبارک بیگم سے ملاقات نہ ہوئی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد جب تقسیم ہوگئی اور پاکستان بن گیا تو عزیز احمد لوٹ کے لاہور آئے۔ انہیں معلوم تھا کہ اسی شہر میں کہیں ان کا چھوٹا بھائی ہوگا اور ممکن ہے ان کی ماں بھی مل جائے گو اس کا امکان بہت کم تھا۔

یہ بات مجھے خود دادی جان نے بتائی تھی کہ ان کے شوہر

عزیز احمد نے اپنے گم شدہ بھائی اور لاپتا ماں کا سراغ لگانے کی کتنی کوشش کی تھی۔ چالیس سال سے زائد عرصہ گزر چکا تھا۔ وہ عشق ایک داستان ماضی بن گیا تھا جس نے انہیں سب سے چھڑا دیا تھا۔ اب رشتوں کی خلش ایک آزار بن رہی تھی۔

یہ ہوسکتا ہے کہ کفیل احمد کی نظر سے بھی کوئی اشتہار گزرا ہو مگر وہ بڑے بھائی سے ملتا تو جائداد کی خاطر بولا جانے والا جھوٹ اس کا جرم بن جاتا۔ شاید اسے دھوکا دہی اور غلط بیانی کے جرم میں جیل کی ہوا بھی کھانی پڑتی۔ وہ تن تنہا ست بدھائی کی حویلی اور جاگیر کا مالک بنا بیٹھا تھا۔ اس نے دانستہ دعمداً تمام اشتہارات کو نظر انداز کیا ہوگا۔ عزیز احمد بھی کچھ عرصے بعد مایوس ہو گئے اور انہوں نے تلاش ختم کر دی۔

کفیل احمد لاولد رہا۔ اولاد کے لیے اس نے یکے بعد دیگرے چار شادیاں کر ڈالیں مگر کسی نے اس کو ایک وارث نہ دیا۔ اس نے باری باری سب کو بانجھ ہونے کے جرم میں طلاق کا پروانہ تھمایا اور رخصت کر دیا۔ آخری بیوی سے مایوس ہونے کے بعد اسے یقین آ گیا کہ وہ مشیت ایزدی سے نہیں لڑسکتا۔ اس کی عمر بھی ساٹھ سال سے زائد ہو چکی تھی۔ ممکن ہے اس وقت تک کسی نے اس کو یہ بھی سمجھا دیا ہو کہ بانجھ اس کی کوئی بیوی نہیں تھی۔ بانجھ وہ خود ہے۔ یہ ایک ایسی تلخ حقیقت ہے جسے آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی مرد تسلیم نہیں کرتے۔ اس نے پانچویں شادی نہیں کی اور اتنی بڑی جاگیر کی ملکیت حاصل کر کے اسے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اس میں اتنی صلاحیت بھی نہ تھی کہ اس کی دیکھ بھال کرسکتا اور جاگیر کے انتظام کو چلاتا۔ سکندر کی طرح وہ بھی جب دنیا سے گیا تو دونوں ہاتھ خالی تھے۔ ست بدھائی کی حویلی اور جاگیر ایک بار پھر لاوارث ہو گئی۔

لیکن یہ وراثت کی اس کہانی کا ڈراپ سین نہیں تھا۔ واقعات نے ایک نیا موڑ لیا۔ جاگیر کا ایک ایسا وارث سامنے آ گیا جس کے بارے میں فرض کر لیا گیا تھا کہ وہ مر چکا ہے۔ یہ قدیر احمد کا سب سے چھوٹا یعنی ساتواں بیٹا تھا جس کو فقیر کی بددعا سے بچانے کے لیے جہاز پر سوار کرا کے سات سمندر پار بھیج دیا گیا تھا۔ جہاز کے کریش ہونے کی اطلاع درست تھی۔ فلائٹ پر ایک سوستر مسافر اور باقی عملے کے ارکان تھے۔ زیادہ تر مسافروں کی شناخت ہو گئی تھی تاہم ایک خاصی بڑی تعداد ان کی تھی جن کے جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے تھے۔ تحقیقات کرنے والوں نے بڑی محنت سے مرنے والوں کی فہرست مرتب کی تھی۔ ان کے یقین کے مطابق کوئی زندہ نہیں بچا تھا لیکن یہ یقین غلط تھا۔

نہ جانے اسے کیا کہا جائے گا؟ شاید قدیر احمد کی بددعا پوری ہو گئی تھی۔ اس لیے کہ اس کی زندگی پوری ہو گئی تھی۔ کریش کی اطلاع ملتے ہی اس نے خودکشی کر لی تھی۔ شاید اس کے ساتھ ہی فقیر کی بددعا نے اس کا پیچھا چھوڑ دیا تھا۔ ممکن ہے وہ خودکشی نہ کرتا تو اس کا آخری بیٹا بھی ہلاک ہو جاتا جو اس کی موت کے وقت وہ زندہ تھا اور قدرت کے معاملات کو بھلا کس نے سمجھا ہے۔ یہ ایک معجزہ تھا کہ وہ زندہ رہا۔ زخمی اور بے ہوشی کی حالت میں وہ ایک تختے پر تیرتا رہا اور بچ گیا۔

اس کا نام عقیل احمد تھا اور بہت مدت گزر جانے کے بعد اس نے حق ملکیت کا ایک اور مقدمہ دائر کیا تھا۔ وہ مقدمہ جیت گیا تھا اور اس نے یہ حویلی اور جاگیر میرے نام کر دی تھی۔

☆☆☆

ست بدھائی کی حویلی اور جاگیر کے بارے میں اس تاریخی دستاویز کو پڑھ کے میرا دماغ چکرا گیا۔ جب میں نے اس کی فائل کو ختم کیا تو صبح کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔ رات ابھی دور تھی اور میرے آس پاس آدھی رات کے ماحول کا سکوت تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں نے تاریخ نہیں پڑھی کوئی تاریخی ناول پڑھا ہے۔ میٹرک کے زمانے میں اور اس کے بعد نوجوانی میں ایک دور ایسا بھی آیا تھا جب میں نے بہت سے ولولہ انگیز تاریخی ناول بڑے جذبۂ ایمانی کے ساتھ پڑھے تھے اور میرا کامل اعتقاد تھا کہ ادب کا نوبل انعام اگر نسیم حجازی کو نہیں دیا گیا تو اس کی وجہ محض انگریزوں اور عیسائیوں کا تعصب ہے ورنہ اس سے عظیم ادب نہ تخلیق ہوا ہے نہ ہوگا۔ وقت کے ساتھ وہ جذبہ مفقود ہو گیا تھا اور اب مجھے تاریخی ناولوں میں تاریخ کے ساتھ ہونے والی ''زیادتی'' پر افسوس ہوتا تھا لیکن جو میں نے فائل کی سمری میں پڑھا وہ ایک طرح سے میرے ماضی کی سرگزشت تھی۔ وہ حقیقی واقعات تھے جو میرے خاندان کے ساتھ پیش آئے۔ ان میں میری انتہائی دلچسپی ایک قدرتی بات تھی۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے کوئی اپنے خاندانی میوزیم میں وہ سب کچھ دیکھے جو اس کے اپنے آبا و اجداد سے منسوب ہو۔ ان کی تصاویر، ان کے ذاتی استعمال کی اشیا۔ ان کے کتب خانوں کے قلمی نسخے...... اور وہ سب جو عجائب خانوں میں رکھا جاتا ہے۔

میری نیند اڑ گئی تھی۔ تاریخ کے ان ڈرامائی واقعات سے آگاہی کے بعد مجھے یوں لگا جیسے میں نے کوئی ہارر فلم دیکھی ہو اور مجھ پر ایک نامعلوم خوف سوار ہو گیا۔ خاندانوں کو اجاڑنے اور بنانے والی اس نحوست زدہ حویلی اور جاگیر کا مالک اب میں تھا۔ مجھ سے پہلے جو کچھ قدیر احمد کے ساتھ ہوا، لرزہ خیز تھا۔ اس درویش کی قبر کے نیچے اس کی بددعا کے سارے کشتگان آج بھی چھ قبروں میں موجود ہوں گے۔ ان کے ڈھانچے جو حویلی کے مالک تھے، ایک فقیر کے ڈھانچے کے قدموں میں پڑے تھے۔ مجھے میر کا قطعہ یاد آیا

> کل پاؤں ایک کاسۂ سر پر جو آ گیا
> یکسر وہ استخوان شکستوں سے چور تھا
> کہنے لگا کہ دیکھ کے چل راہ بے خبر
> میں بھی کبھی کسی کا سرِ پُرغرور تھا

کیا وہ کنواں آج بھی ہوگا، جس کے زرخیزی دینے والے اور پھول کھلانے والے شفاف پانی میں حویلی کے مالکوں کی خونی لاشیں گری تھیں۔ میں نے کچن میں کافی کے لیے الیکٹرک کیتلی کا پلگ لگاتے ہوئے سوچا۔ کتنی خواری اٹھا کے اور کتنے حلفیہ جھوٹ بول کے کفیل احمد نے اس حویلی اور جاگیر کا حق ملکیت حاصل کیا تھا مگر یہ حق کتنے دن رہا؟ اسے تو ایک وارث تک نصیب نہ ہوا اور آج اگر وقت کے ہاتھوں نے وراثت اور ملکیت کا پانسا میرے حق میں پلٹ دیا ہے تو کیا مجھے خوش ہونا چاہیے؟ مجھے تو ڈرنا چاہیے۔

فطرت، مزاج اور ذہنی تربیت کے اعتبار سے میں ذرا بھی توہم پرست اور شکی مزاج یا کمزور عقیدے کا آدمی نہیں ہوں۔ میرا مافوق الفطرت واقعات یا حالات پر کوئی یقین نہیں اور نہ میں ایسا سمجھتا ہوں کہ جن بھوت اور بدارواح انسانوں کی دنیا میں کسی قسم کی خرابی یا تباہی کا سبب بن سکتے ہیں۔ میں نے زندگی میں ان گنت پراسرار واقعات سنے اور پڑھے تھے جو ہر زمانے میں ہر جگہ پیش آ چکے تھے اور آج بھی پیش آتے رہتے تھے مگر میرا ان سے براہِ راست واسطہ نہیں پڑا تھا چنانچہ وہ سب میرے لیے قصے کہانیوں سے زیادہ کچھ نہ تھے۔

میرے نزدیک جو تھا منجانب اللہ تھا۔ اس قادرِ مطلق نے کائنات کو ایک نظم و ضبط کے ساتھ تخلیق کیا تھا۔ گھڑی کی سوئیوں کی طرح آسمانوں اور زمینوں کے درمیان جو کچھ تھا اس کرشمۂ تخلیق کا آئینہ دار تھا، بدلتے موسم، ستاروں اور سیاروں کی گردش، سیلاب اور زلزلے، زندگی کا چکر، بقا اور فنا۔ سب اسباب و علل کی بنیاد پر اپنا وجود رکھتے تھے۔ بلاجواز کچھ نہ تھا۔ یہی فطرت تھی، یہی کائنات کا ڈسپلن تھا چنانچہ مافوق الفطرت کچھ نہ تھا۔

تاہم ناقابلِ فہم بہت کچھ تھا اور انسان کی عقل کی ہنوز قدرت کے تمام اسرار و رموز تک رسائی نہ تھی۔

واپس اپنے کمرے میں آ کے کافی پیتے ہوئے مجھے اپنے خاندان کی تاریخ میں اپنی یاد کا ایک صفحہ جوڑنے کی ضرورت محسوس ہوئی جو آج سے پہلے ایسے ہی تھا جیسے کسی کتاب سے نکلا ہوا ورق۔ یہ میری زندگی کا ایک انوکھا اور کسی حد تک پراسرار تجربہ تھا جس کو میں کسی حوالے سے بھی سمجھ نہیں پایا تھا مگر اب سارے حوالے مکمل تھے۔

مجھے یاد آ رہا تھا کہ ست بدھائی کی حویلی اور جاگیر کے آخری وارث سے لندن میں میری ملاقات ہو چکی تھی۔ اتفاقات کے کچھ سلسلے بالکل فلمی اور ناقابلِ یقین ضرور ہوتے ہیں مگر ناممکن کچھ بھی نہیں ہوتا۔ خصوصاً اس لیے کہ قدرت اپنے قبضۂ اختیار میں سب کچھ رکھتی ہے۔ یہ دو سال پہلے ہونے والی ملاقات بھی ایسی ہی تھی۔ میں عقیل احمد سے مل چکا تھا لیکن آج تک مجھے اس کی غرض و غایت کا علم نہ تھا۔ اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔ یہ بھی نہیں کہ رشتے میں وہ میرا دادا ہی تھا لیکن سگا نہیں کیونکہ وہ میرے دادا کا سوتیلا بھائی تھا جسے جہاز کے کریش میں مرحوم مان لیا گیا تھا۔

مجھے لندن میں اپنی ملازمت کا آغاز کیے تین ہی مہینے ہوئے تھے کہ ایک دن میرے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میرے ہیلو کے جواب میں کسی نے کہا ''رفیق صاحب! میں عبدالقیوم بول رہا ہوں۔ میری لیگل فرم لندن میں غیر قانونی تارکین وطن کے معاملات سے ڈیل کرتی ہے۔''

میں نے کہا ''فرمایئے۔ میں تو یہاں سو فیصد قانونی طریقے سے آیا ہوں، چار سال سے امریکا میں تھا۔''

اس نے کہا ''مجھے معلوم ہے، کیا میں آپ سے مل سکتا ہوں؟''

''بالکل مل سکتے ہیں لیکن یہ تو بتا دیجئے کہ کس سلسلے میں؟ مجھے تو نہ سیاسی پناہ کا مسئلہ ہے نہ حصول شہریت کا۔''

وہ ہنسنے لگا ''یہ معاملہ کچھ اور ہے۔ جب میں ملوں گا تو عرض کروں گا۔ کیا آپ اس وقت فارغ ہیں؟''

''فارغ ہو جاؤں گا آدھے پون گھنٹے میں'' میں نے گھڑی دیکھی۔

''میں حاضر ہوتا ہوں'' اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

وہ ٹھیک آدھے گھنٹے بعد آ گیا۔ اس نے مجھے اپنا کارڈ دیا ''ہم صرف پاکستانیوں کی مدد کرتے ہیں۔ ان کے تمام قانونی اور غیر قانونی مقدمات کی پیروی کرتے مجھے دس سال ہو گئے۔ میری فرم میں میرے ساتھ کام کرنے والے بھی سب پاکستانی ہیں۔''

میں نے اخلاقاً کہا "آپ سے مل کے خوشی ہوئی۔ اب فرمایئے۔"

وہ بولا "کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم کسی جگہ بیٹھ کے ایک کپ کافی پیتے ہوئے بات کریں۔"

میں اسے ایک ریسٹورنٹ میں لے گیا "آپ نے میرے تجسس کو بہت بڑھا دیا ہے۔ میں مزید سسپنس برداشت نہیں کر سکتا۔"

وہ بولا "مسٹر رفیق' کیا آپ کسی عقیل احمد کو جانتے ہیں؟"

میں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے نفی میں سر ہلایا "یہ کون صاحب ہیں؟"

اس نے کہا "وہ ایک خاصا عمر رسیدہ اور مفلوج شخص ہے۔ تقریباً پچاس سال پہلے لندن آنے والے ایک جہاز کے کریش میں وہ ذہنی طور پر بھی ناکارہ ہو گیا تھا اور چالیس سال زیر علاج رہا۔"

"چالیس سال......؟" میں نے حیرت سے دہرایا۔

"جی...... چالیس سال!" عبدالقیوم نے کہا "حادثے کے بعد دماغ کی چوٹ سے اس کی یادداشت متاثر ہوئی تھی۔ وہ اپنا نام تک نہیں بتا سکتا تھا۔ جہاز سمندر میں گرا تھا اور یہ شخص بے ہوشی کی کیفیت میں تین دن تک ایک تختے پر پڑا رہا تھا۔ اب یہ قدرت کے کھیل ہیں۔ لیٹے لیٹے وہ تختہ بہت دور چلا گیا اور اسے کسی بحری جہاز کے عملے نے نکال لیا۔ ڈاکٹر اس کی جسمانی یا ذہنی صحت یابی کے بارے میں ایک فیصد بھی پُرامید نہ تھے لیکن انہوں نے علاج جاری رکھا۔ یہاں لندن میں ایک رفاہی ادارہ ہے۔ اسے چند دولت مند خاندانوں کا مالی تعاون حاصل ہے۔ ایک فیملی نے اس کی ذمے داری قبول کر لی اور علاج چلتا رہا ورنہ اس کے اخراجات بہت زیادہ تھے۔ تقریباً پینتیس سال بعد اس کی یادداشت اچانک بحال ہو گئی۔ کسی وجہ کے بغیر۔ ڈاکٹر تسلیم کرتے ہیں کہ یہ کسی دوا یا علاج کا کمال نہیں تھا۔"

میں نے کہا "ویری گڈ۔ لیکن یہ آپ مجھے کیوں بتا رہے ہیں؟"

اس نے کافی کا ایک گھونٹ لیا "وہ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"

"مجھ سے......؟" میں نے حیرانی سے کہا "کیوں قیوم صاحب؟"

قیوم نے کہا "پہلی بات تو یہ کہ مجھے میرے موکل نے منع کیا ہے کہ میں کسی کو کچھ نہ بتاؤں۔ اور ویسے بھی اس پیشے کی اخلاقیات کا تقاضا ہے کہ میں اس کی مرضی جانے بغیر کوئی انکشاف نہ کروں۔"

میں نے کہا "اور وجہ جانے بغیر میں اس سے ملنے سے انکار کر دوں...... پھر؟"

"پھر کیا...... اس میں زبردستی کون کر سکتا ہے۔ میں اسے بتا دوں گا لیکن......" وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"لیکن کیا قیوم صاحب......؟"

"وہ ایک بہت بوڑھا بیمار اور تنہا آدمی ہے۔ اس نے اپنی ساری زندگی ایک زندہ لاش کی طرح گزاری ہے۔ اب بھی وہ وہیل چیئر پر پڑا ہی رہتا ہے۔ اگر آپ اپنے وقت میں سے دو گھنٹے نکال کے اس کی خواہش پوری کرنے چلے جاتے ہیں تو میرے نزدیک یہ ایک نیکی ہوگی۔ یہاں بہت سے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں باقاعدگی سے اولڈ ہومز میں جاتے ہیں۔ ان لوگوں کی تنہائی دور کرتے ہیں جن کا دنیا میں کوئی نہیں یا ہے تو انہیں چھوڑ چکا ہے۔"

"وقت ملا تو میں بھی ایسا کروں گا مسٹر قیوم! ابھی تو سوال یہ ہے اس معذور بوڑھے کا ...... کیا نام بتایا آپ نے؟"

"عقیل احمد۔ جب آپ اس سے ملیں تو ممکن ہے وہ خود آپ کو بتا دے کہ وہ کیوں ملنا چاہتا تھا۔ مجھے تو اس نے جھڑک دیا تھا کہ اپنے کام سے کام رکھو۔ اس لڑکے سے رابطہ کرو اور کہہ دو کہ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

میں نے کچھ دیر سوچ کے کہا "او کے قیوم صاحب۔ مجھے کب چلنا ہوگا' آپ کے موکل کے پاس۔"

اس نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی "یہ تو آپ کی فرصت پر منحصر ہے۔ اگر وقت ہے اور آپ کی کوئی مصروفیت نہیں ہے تو ہم ابھی جا سکتے ہیں۔"

"اتنی جلدی کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"جلدی تو ہے رفیق صاحب! یُوسی' وہ اپنا وقت گزار چکا ہے۔ اب موت کی دہلیز پر کھڑا ہے۔ کیا پتا کب گزر جائے۔ پھر تاخیر سے کیا حاصل؟ ویسے تو ظاہر ہے آپ کی مرضی۔"

میں نے کہا "او کے' میں چلتا ہوں۔"

معاملہ پُراسرار تھا چنانچہ میں نے بہتر یہی سمجھا کہ اس سے نمٹ ہی لیا جائے تو بہتر ہے۔ عبدالقیوم نے' جس کا اصرار تھا کہ میں اسے بٹ صاحب کہوں' مجھے اپنی گاڑی میں بٹھا لیا "لندن کی ٹریفک میں دو گاڑیوں کا ایک ساتھ چلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ آپ اپنی گاڑی چھوڑ دیں۔ میں آپ کو

اسی جگہ چھوڑ دوں گا۔"

"نو پرابلم!" میں نے کہا "واپسی پر میں ٹیکسی لے لوں گا۔"

گاڑی لندن کی معروف شاہراہوں سے گزرتی جنوبی علاقے کی طرف چلتی گئی۔ تقریباً سوا گھنٹے بعد ہم مضافات کے ایک پُرسکون علاقے میں پہنچ گئے۔ گاڑی سرسبز درختوں سے گھری ہوئی دو منزلہ عمارت کے احاطے میں داخل ہوئی جو لندن کے مخصوص انداز میں سرخ اینٹوں کی بنی ہوئی تھی اور اس کے دروازے کھڑکیاں چمکتے ہوئے سفید تھے۔ گاڑی کو آخری حصے میں پارک کر کے ہم لوٹے تو مجھے دونوں طرف ہرے بھرے گھاس کے تختے نظر آئے جن کے گرد رنگین پھولوں کی جھالریں سی بنی ہوئی تھیں۔ درمیان میں فوارے چل رہے تھے۔ لمبائی کے رخ بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ سفید پتھر کی بینچیں رکھی ہوئی تھیں۔ درمیان میں سفید روغن والی لکڑی کی آرام کرسیاں پڑی تھیں' پانچ مرد اور سات بوڑھی عورتیں مختلف جگہ چپ چاپ اور ساکت بیٹھے خلا میں گھور رہے تھے۔ وہ آپس میں کوئی بات نہیں کر رہے تھے۔

بٹ صاحب نے مجھے کاریڈور سے ایک دروازہ دکھایا اور بولا "میں گاڑی میں بیٹھا ہوں" اور واپس ہو گیا۔

میں نے دروازہ کھولا تو اپنے عین مقابل ایک شخص کو وہیل چیئر پر دیکھا۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر اسی سال سے زائد ہو سکتی تھی کیونکہ اس کے سر اور بھنوؤں کے بال بالکل سفید تھے۔ وہ دبلا پتلا تھا اور وہیل چیئر پر بالکل ساکت بیٹھا تھا مگر اس کی آنکھیں بہت بے چین تھیں۔ وہ اس عمر میں بھی چشمہ نہیں لگاتا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہوئی اور اس کے چہرے کے سخت نقوش میں مسکراہٹ کی نرمی پیدا ہو گئی۔

میں نے کہا "السلام علیکم! میں رفیق احمد ہوں۔"

اس نے ریموٹ سے ٹی وی بند کر دیا "میں نے تمہیں پہچان لیا تھا' پوچھو کیسے؟"

میں نے مجبوراً پوچھا "کیسے؟"

"تمہاری ناک سے۔ بالوں کے اور آنکھوں کے رنگ سے۔ آؤ' آگے آ کے میرے پاس بیٹھو" اس نے ایک خالی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

میں کرسی پر بیٹھ گیا "آپ کے وکیل عبدالقیوم بٹ نے مجھے بتایا تھا کہ آپ مجھ سے ملنا چاہتے تھے؟"

اس نے سر کو خفیف سی جنبش دی "تم رشید احمد کے بیٹے ہو...... اور عزیز احمد کے پوتے...... رائٹ؟"

میں نے کہا "جی...... لیکن آپ انہیں کیسے جانتے ہیں؟"

اس نے کہا "کیا میرے بارے میں تم نے ان سے کچھ نہیں سنا؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کبھی کسی نے آپ کا ذکر کیا ہو۔ عقیل احمد کا نام میں نے کسی سے نہیں سنا۔"

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولا "مبارک بیگم کا نام تو یقیناً نہیں سنا ہوگا؟"

میں نے کہا "کون تھیں وہ...... ایک مبارک بیگم نے تو فلم دائرہ کے گانے گائے تھے۔"

"شٹ اَپ! وہ تمہارے دادا عزیز احمد کی والدہ تھیں" اس نے لہجہ بدلے بغیر کہا "تمہاری پردادی!"

مجھے حیرت کا جھٹکا سا لگا "میری پردادی کے بارے میں آپ کیسے جانتے ہیں؟"

"قدیر احمد تمہارے پردادا تھے۔ انہوں نے دو شادیاں کی تھیں۔ تم پہلی بیوی کی اولاد سے ہو۔ تمہارے پردادا کے والد تھے محفوظ علی اور دادا عزت علی۔ میرا ایک سوتیلا بھائی تھا' کفیل احمد!" وہ جیسے اپنے آپ سے بولتا گیا۔

میں نے کہا "مجھے افسوس ہے کہ یہ سب نام میرے لیے اجنبی ہیں۔"

اس کی آنکھوں میں دکھ اتر آیا "مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہاں بھی دنیا اتنی بدل گئی ہے۔ یہاں کی بات الگ ہے۔ یہاں سب بھان متی کے کنبے ہیں۔ کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا۔ بھان متی نے کنبہ جوڑا۔ پھر اینٹ کہیں گئی' روڑا کہیں گیا۔ کسی کو کسی کا پتا نہیں۔ نہ بچوں کو غرض کہ ماں کون تھی اور باپ کون تھا۔ پھر آگے کی کون بتائے کہ دادا کون تھا۔ دادی کون تھی؟ پہلے تو بڑے ہی سب بتاتے تھے۔ کیا اب بڑوں کے پاس بھی وقت نہیں وہاں خود بخود تو بچے کچھ نہیں جان سکتے۔ لوگ اپنے ماضی سے کٹ گئے ہیں۔"

میں نے کہا "سر! آپ نے مجھے سخت تجسس میں مبتلا کر دیا ہے۔ آخر آپ کا میری فیملی سے کیا رشتہ ہے۔"

اس نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا اور مجھے پلک جھپکائے بغیر دیکھتا رہا "ممکن ہے تمہاری قوت مشاہدہ بھی تمہاری مدد نہ کرے۔ سر کے بال بالکل سفید ہو گئے ہیں اور آنکھیں بھی میلی ہو گئی ہیں لیکن ایک دن تمہیں معلوم ہو جائے گا۔ ابھی تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ' تم یہاں ایک بزنس فرم میں کنسلٹنٹ ہو' رائٹ!"

میں نے کہا ”جی......!“

”تم نے امریکا سے ایم بی اے کیا تھا۔ پھر ملازمت کے لیے لندن کیوں آ گئے؟“

میں نے کہا ”مجھے امریکا پسند نہیں تھا۔“

”تمہیں پاکستان پسند ہے...... یا برطانیہ!“

میں نے کہا ”پاکستان میرا وطن ہے۔ دنیا کا کوئی ملک اس جیسا نہیں ہو سکتا۔“

”میں نے سنا ہے کہ آج کل تمہاری عمر کے نوجوان بڑی منافقت کرتے ہیں۔ باتیں ایسی ہی کرتے ہیں لیکن بھاگتے ہیں امریکا کی طرف۔ آسٹریلیا اور کینیڈا کی طرف۔ کیا تم بھی ایسے ہی ہو؟“

میں نے کہا ”سر......! میں نے مجبوری میں جلاوطنی اختیار کی تھی۔“

”یعنی تم واپس جانا چاہتے ہو؟“ اس نے مجھے غور سے دیکھا۔

”جی...... اگر وہاں مجھے ایک اچھے مستقبل کی ضمانت حاصل ہو...... محفوظ بھی ہو اور خوشحال بھی۔“

”یہ سب یہاں ہے۔ پھر تم اپنے والدین کو یہاں کیوں نہیں بلا لیتے۔“

میں نے کہا ”وہ کبھی نہیں آئیں گے۔ وہ یہاں نہیں رہ سکتے۔“

”تم رہ سکتے ہو؟“

میں نے کہا ”نہیں، میں بھی نہیں رہوں گا۔ جیسے ہی مجھے موقع ملا، میں پاکستان چلا جاؤں گا۔ کیا اب آپ مجھے بتائیں گے کہ آپ نے بطور خاص مجھے ملاقات کے لیے کیوں طلب کیا تھا اور آپ میرے بارے میں اتنی معلومات کیسے رکھتے ہیں۔“

اس نے گھڑی کی طرف دیکھا ”معلومات حاصل کی ہیں میں نے۔ ورنہ میں تو دنیا سے بالکل کٹ گیا تھا۔“

میں نے کہا ”عبدالقیوم بٹ نے مجھے بتایا ہے کہ آپ پینتیس سال تک خود فراموش رہے۔“

”سینتیس سال...... اس نے تمہارے بارے میں بڑی اچھی رپورٹ دی تھی۔ بس ایک بار دیکھنا بھی چاہتا تھا۔“

میں نے اصرار کیا ”لیکن کیوں......؟“

اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا ”ہو سکتا ہے میں تمہیں کوئی تحفہ دوں۔ اب تم جا سکتے ہو۔ میرے کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔ میں جلدی کھانا کھاتا ہوں اور جلدی سو جاتا ہوں۔ گاڈ بلیس یو...... میرا مطلب ہے خدا حافظ!“

اب میرے پاس چارہ نہ تھا کہ میں رخصت لوں۔ عقیل احمد نے میرے کسی سوال کا جواب نہیں دیا تھا کہ اسے مجھ سے کیا دلچسپی تھی اور وہ میری فیملی کے بارے میں اتنی معلومات کیسے رکھتا تھا۔ جب میں باہر آیا تو مجھے قیوم بٹ کی گاڑی نظر نہ آئی۔ میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ ایک ملازم میرے قریب آیا۔

”اگر آپ مسٹر بٹ کو تلاش کر رہے ہیں تو آپ کے لیے اطلاع ہے کہ وہ چلے گئے“ اس نے کہا۔

”اس نے کہا تھا کہ وہ انتظار کر رہا ہے۔ یہ سخت بدتمیزی کی بات ہے“ میں نے کہا۔

”اس کو گھر سے کال آئی تھی۔ اس کی بیوی کو ایمرجنسی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ آپ سے معذرت کر لوں“ ملازم فرض پورا کر کے چلا گیا۔

اس کے بعد اتفاق کچھ ایسا ہوا کہ میں نے دو بار قیوم بٹ کو فون کیا مگر وہ نہیں ملا۔ پھر ایک دن اتفاق سے وہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے نظر آیا تو میں نے اسے روک لیا۔ میرے ہر سوال کے جواب میں اس نے وہی کہا کہ وہ ضابطۂ اخلاق کا پابند ہے اور میرے کسی سوال کا جواب نہیں دے گا۔

میں نے کہا ”اس نے کوئی تحفہ دینے کی بات کی تھی۔“

”یہ تو اچھی بات ہے۔“

”مگر وہ کیا تحفہ دینا چاہتا ہے مجھے...... اور کیوں؟“

بٹ نے گھڑی دیکھی ”دیکھو، یہ جو لاوارث بوڑھے ہوتے ہیں یہاں، ان میں سے کچھ دولت مند بھی ہوتے ہیں۔ وہ کسی بھی نوجوان کے لیے وصیت کر جاتے ہیں کہ ان کے مرنے کے بعد......“

میں نے کہا ”بٹ صاحب! مجھے کسی کا ترکہ نہیں لینا اور میں نے تو اس کے ساتھ کوئی نیکی بھی نہیں کی۔“

قیوم بٹ نے کہا ”یار! ابھی میں جلدی میں ہوں۔ پھر بات کریں گے۔“

لیکن پھر بات کرنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اگلی رات ہی میں کاروباری معاملات میں الجھ گیا۔ پہلے دس دن کے دورے پر جرمنی گیا پھر فرانس، میری زندگی کے روز و شب انتہائی مصروف رہے اور عقیل احمد کا خیال خود بخود ذہن کے نہاں خانوں میں اتر گیا۔ اور کچھ عرصے بعد اتنا غیر اہم ہو گیا کہ مہینے بھر بعد جب میں نے ابا جی سے بات کی تو مجھے وہ سارے نام بھول چکے تھے جن کا حوالہ عقیل احمد نے دیا تھا۔ میں نے ابا جی سے پوچھا کہ کیا وہ لندن کے کسی عقیل احمد کو جانتے ہیں تو انہوں نے کہا کہ لندن میں کیا پاکستان میں اس

نام کے کسی آدمی سے میری واقفیت نہیں۔

میں نے کہا ”وہ خاصا عمر رسیدہ ہے۔ اسّی پچاسی کا تو ہو گا، مفلوج ہے۔ کسی ایئر کریش میں زخمی ہوا تھا۔ پینتیس چالیس سال اسپتال میں پڑا رہا۔ وہ ہماری ساری فیملی کو جانتا ہے۔“

ابا جی نے کہا ”ایسا کون ہے؟ مجھے تو معلوم نہیں، تمہاری دادی سے پوچھوں گا۔“

شاید انہوں نے کبھی دادی سے نہیں پوچھا ہو گا ورنہ شاید کسی حوالے سے دادی کو یہ نام یاد آ جاتا۔ دراصل عقیل احمد کے بارے میں نصف صدی قبل ہی فرض کر لیا گیا تھا کہ وہ مر چکا ہے۔ مرنے والوں کے نام اتنا عرصہ کون یاد رکھتا ہے۔ خصوصاً ان کے جن سے آپ کا براہِ راست کوئی رشتہ نہ ہو۔

اپنی خاندانی تاریخ کے اوراق پڑھنے کے بعد میرے ذہن کے سارے خلا پر ہو گئے اور واقعات کا سلسلہ آپس میں جڑ گیا۔ میری سمجھ میں آ گیا کہ عقیل احمد کی یادداشت بحال ہوتے ہی اسے یاد آ گیا ہو گا کہ اس کے چھ بڑے بھائی کس طرح باری باری دنیا سے رخصت ہوئے تھے اور اسے فقیر کی بددعا سے بچانے کے لیے لندن بھیجا گیا تھا۔ وہ موت سے بچ گیا تھا مگر اس کی زندگی موت سے بدتر تھی۔ اس نے سینتیس سال تک مردوں جیسی زندگی گزاری تھی اور جب حقیقی زندگی کے احساس کی طرف لوٹا تو تنہا تھا اور مفلوج پڑا تھا۔ اس نے عبدالقیوم کی معرفت حویلی اور جاگیر کے بارے میں معلومات حاصل کی ہوں گی تو اسے ساری صورت حال پتا چل گئی ہو گی کہ دادا کے بھائی کفیل احمد نے بدنیتی سے اور جھوٹ بول کے خود کو جاگیر کا تنہا وارث ثابت کر دیا تھا اور اس کا مالک بن گیا تھا۔ عزیز احمد کو پتا ہی نہیں چلا تھا۔ دونوں بھائیوں کا تمام عمر آپس میں تعلق نہیں رہا تھا اور ایک کو دوسرے کی کوئی خبر ہی نہ تھی کہ زندہ ہے یا مر چکا ہے۔

عقیل احمد نے قیوم بٹ کے ذریعے تمام معاملات طے کیے اور اپنا حق وراثت حاصل کرنے کے بعد بشارت فاروقی کو مختارِ کل بنا دیا۔ عقیل احمد کے لیے عمر کے اس حصے میں اور اس حالت میں حویلی یا جاگیر کا قبضہ حاصل کرنا لا حاصل تھا۔ وہ جگہ اس کے لیے ایک جائے عبرت اور اذیت کی علامت تھی۔ وہاں اس کے چھ بھائی ایک قطار میں اپنی قبروں میں لیٹے ہوئے تھے اور اس کے والدین کی لاشوں کو نگلنے والا کنواں موجود تھا۔ وہ خود اس منحوس ذلت کی نشانی بن کر زندہ تھا۔ وہ اس حویلی میں کیا سر پھوڑنے جاتا؟

میرے دادا عزیز احمد کا حق مارنے والا ان کا بھائی کفیل احمد بھی مر چکا تھا۔ جاگیر پھر لاوارث تھی اس لیے عقیل احمد کو آسانی سے مل گئی شاید اس نے ماضی کی تلافی کا فیصلہ کیا۔ اگر کفیل احمد یہ جھوٹ نہ بولتا کہ وہ واحد وارث ہے تو اس کے وارث میرے دادا عزیز احمد ہی ہوتے اور ان کے بعد یہ جاگیر اور حویلی خود بخود حق وراثت میں ان کے بیٹوں کو ملتی یعنی رشید احمد اور میرے چچا نذیر احمد اس کے مالک ہوتے۔

معلوم نہیں کیوں عقیل احمد نے یہ جاگیر اور حویلی میرے والد اور چچا کے حوالے نہیں کی۔ اس نے میرا انتخاب کیا۔ یہ کام اس نے اپنی زندگی میں ہی کر لیا۔ اگر وہ ایسے ہی مر جاتا تو ایک بار پھر اس جاگیر اور حویلی کا کوئی مالک نہ رہتا۔ شرعی قانونی وراثت کے مطابق جو پاکستان میں رائج ہے میرے والد اور چچا میں یہ جائیداد برابر تقسیم ہوتی اور پھر ان کی اولادوں میں لیکن ایک تو عقیل احمد پاکستان میں نہیں تھے دوسرے کسی جائیداد کا مالک اپنی زندگی میں اپنا سب کچھ کسی کو بھی دے سکتا ہے۔

جیسا کہ مجھے قیوم بٹ نے بتایا تھا، عقیل احمد نے میرے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کی تھیں۔ پھر وہ مجھ سے ملا تھا اور اس ملاقات میں نہ اس نے اپنے اور میرے رشتے کی وضاحت کی تھی اور نہ مقصد ملاقات واضح کیا تھا۔ اشاروں میں اس نے یہ ضرور کہا تھا کہ وہ مجھے کوئی تحفہ دے گا مگر ایک مفلوج بیمار بوڑھے سے کوئی اجنبی یہ توقع کیسے رکھ سکتا تھا کہ تحفے میں وہ کروڑوں کی جائیداد دے سکتا ہے۔ یہ خیال مجھے کیسے آ سکتا تھا کہ سینتیس سال ایک فلاحی ادارے میں زیرِ علاج رہنے والا اتنی بڑی جاگیر کا مالک ہے۔ تحفے کی مجھے ضرورت ہی نہ تھی چنانچہ میں نے اس کی نوعیت کے بارے میں سوچنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی۔

اگر عقیل احمد چاہتا تو بشارت فاروقی سے کہہ کے ساری جائیداد کو فروخت کرا دیتا اور رقم برطانیہ منگوا لیتا یا یہ سب پاکستان کے کسی ویلفیئر ٹرسٹ کے حوالے کر جاتا۔ اب اس سوال کا جواب دینے والا کوئی نہ تھا کہ آخر اس نے یہ تحفہ یا انعام مجھے ہی کیوں دیا۔ اس عنایتِ خسروانہ کے لیے میرا ہی انتخاب کیوں کیا؟ کیونکہ اس داستان کا آخری ڈرامائی موڑ کچھ عرصہ پہلے آ چکا تھا۔ جب ابا نے بشارت فاروقی سے تمام واقعات معلوم ہونے کے بعد لندن میں قیوم بٹ کی معرفت عقیل احمد سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تو انہیں بتایا گیا کہ دو ہفتے قبل عقیل احمد کا سوتے میں انتقال ہو گیا تھا۔

اب اپنی مجرمانہ کوتاہی اور بے حسی پر مجھے دکھ اور شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ میں دوبارہ عقیل احمد سے نہیں ملا

تھا جو میرے دادا کا بھائی ہونے کے ناتے میرا دادا ہی تھا۔ میں وہاں موجود تھا جسے اس نے اپنی ساری جائیداد کا وارث بنادیا تھا مگر وہ خود لاوارث مر گیا۔ آخر اس نے ایسی رازداری کیوں برتی؟ کیوں مجھے نہیں بتایا کہ وہ کون ہے؟ اس نے میرے والد اور چچا نذیر کو بھی کچھ نہیں بتایا۔ آخر کیوں؟ ہر الجھن کسی نہ کسی ''کیوں؟'' پر تمام ہوتی تھی مگر سارے سوال بے جواب تھے۔ خود اباجی اور چچا نے لندن میں مجھے کچھ نہیں بتایا ورنہ اور کچھ نہ سہی میں کم سے کم اپنے اس خاندانی بزرگ اور محسن کی قبر پر فاتحہ پڑھ آتا تو یہی بات کچھ باعث سکون ہوتی۔

نیند اڑ جانے کے بعد میں کسی بے خواب اُلو کی طرح اپنے خیالوں میں بھٹک رہا تھا۔ اچانک ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تو میں چونک پڑا۔ آخر اس وقت مجھے فون کرنے والا کون ہوسکتا ہے؟ میں نے سوچا۔ سوال کے ساتھ ہی ذہن کے اسکرین پر جواب بھی نمودار ہوگیا۔ لندن میں اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے۔ میری داستان ماضی کی بھول بھلیوں میں سرگرداں دماغ ایک جست میں آج کے سنگین حقائق کی دنیا میں پہنچ گیا۔ چند لمحے پہلے میرے تصور میں حویلی اور جاگیر سے منسوب روایات کی تاریخی فلم چل رہی تھی۔ دوسرے لمحے جیسے چینل بدل گیا اور اسکرین پر لندن ابھر آیا جہاں عائشہ تھی اور اس کے نفسیاتی مسائل تھے جن کا ذمے دار میں خود کو سمجھنے پر مجبور تھا۔

میں نے ریسیور اٹھا کے کہا ''ہیلو!''

دوسری طرف سے لارڈ ارنسٹ کی آواز آئی ''از دس رفیق؟''

میں نے کہا ''میں تمہارے فون کا انتظار کر رہا تھا۔''

''اوہ! میں تو سمجھ رہا تھا کہ تمہیں نیند سے جگانا پڑے گا۔ تمہارے ملک میں تو اس وقت چار بجے ہوں گے۔''

میں نے کہا ''ہاں...... لیکن میں عائشہ کی طرف سے پریشان تھا۔ وہ اب کیسی ہے؟''

''ابھی تک کوئی ایسی بات تو نہیں ہوئی ہے لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ میرے لیے ایک مسئلہ بن جائے گی۔''

میں نے کہا ''آپ پریشان نہ ہوں......''

اس نے کہا ''جب تک تم یہاں تھے میں پریشانی کا شکار نہیں ہوا تھا' جانتے ہو تمہارے جانے کے بعد اس نے کیا' کیا؟''

میں نے کہا ''ہاں...... سوشی نے مجھے بتایا تھا...... کہ وہ گھر سے چلی گئی اور پھر...... پکڑی گئی۔''

''ہاں۔ میں نے اسے چھڑالیا۔ وہ پہلی بار کسی غیر اخلاقی فعل میں ملوث ہوئی تھی اس لیے سزا سے بچ گئی۔ تاہم مجھے پولیس کے سامنے خفت اٹھانی پڑی۔ پولیس نے بھی رازداری سے کام لیا اور کسی کو پتا نہیں چلا لیکن مجھے ڈر ہے کہ ایسا دوسری بار بھی ہوگا۔ بار بار ہوگا۔ اس کے بعد یہ بات کسی سے بھی چھپی نہیں رہے گی اور ہماری پوزیشن ضرور خراب ہوگی۔''

''آپ اسے سمجھا سکتے ہیں۔''

وہ طنزیہ انداز میں ہنسا ''کیا وہ کوئی بچی ہے کہ میرے سمجھانے سے سمجھ جائے۔ قانونی طور پر وہ عاقل و بالغ ہے اور مجھے یہ حق حاصل ہی نہیں کہ میں اسے روک سکوں۔''

''لیکن اخلاقی طور پر آپ اس کا حق رکھتے ہیں۔ آخر آپ اس کے والدین ہیں۔''

وہ بولا ''شاید تمہارے ملک میں والدین کا اخلاقی حق اہمیت رکھتا ہو۔''

میں نے کہا ''آپ اسے کسی نفسیاتی کلینک میں رکھ سکتے ہیں۔ یا کسی سائیکاٹرسٹ سے مشورہ کر سکتے ہیں۔''

''میں نے عائشہ سے بات کی تھی مگر اس نے وہی کہا جس کی مجھے توقع تھی۔ اس نے کہا کہ ڈیڈی! اب یہ میری زندگی ہے۔ اس کو بنانے 'بگاڑنے کی ذمے داری آپ کی نہیں رہی۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ ایسے غیر بن کے اور اتنی بے مروتی کے ساتھ اس نے کبھی مجھ سے بات نہیں کی تھی۔ وہ جانتی ہے' میں اس سے کتنی محبت کرتا ہوں۔''

میں نے کہا ''وہ فرسٹریشن کا شکار ہے۔''

''اوہ نو۔ اب تو یہ اس سے بہت آگے کی بات ہے۔ وہ ڈپریشن میں چلی گئی ہے۔ تم جانتے ہو وہ کتنی ذہین ہے۔ وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ وہ کیا کر رہی ہے لیکن اب تو اس نے لائف میں اپنا انٹرسٹ ہی ختم کر دیا ہے۔''

میں نے کہا ''یہ میرے لیے بڑی اذیت کی بات ہے کہ میں خود کو عائشہ کی اس حالت کا ذمے دار سمجھتا ہوں لیکن اس کے لیے کچھ کر نہیں سکتا۔''

''رفیق! کیا واقعی تم اس کی مدد کرنا چاہتے ہو۔''

میں نے کہا ''اپنے احساس جرم کی خلش سے نجات کے لیے میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ عائشہ کی مجھے اتنی ہی پروا ہے جتنی آپ کو۔''

''تھینک یُو۔ تم تو جانتے ہو کہ وہ میری ایک ہی اولاد ہے۔ اسی سے میری ساری امیدیں وابستہ تھیں۔ اگر میرا کم سے کم ایک بیٹا ہوتا تو شاید صورت حال مختلف ہوتی۔

...باتی طور پر اتنا کمزور نہ ہوتا۔ تم سے یہ حقیقت بھی ...نہیں کہ میری اپنی بیوی سے نہیں بنتی۔ اس کے اور ...مزاج میں زمین آسمان کا فرق ہے جو یقیناً پہلے بھی ...ب میں نے اس سے شادی کی تھی لیکن میری نظر نہ دیکھ ...شاید میں دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ عشق میں آدمی صرف ...ں سے کام لیتا ہے۔ عقل سے نہیں' خیر...... یہ کوئی ایسی ...نہیں تھی۔ اکثر جوڑے ایڈجسٹ نہیں کر سکتے تو اپنے ...الگ کر لیتے ہیں۔ ایسا میں بھی کر سکتا تھا۔ میری مالی ...لی پوزیشن ایسی تھی کہ سیلیا کو چھوڑ دیتا تو مجھے کوئی فرق نہ ...فرق اسے پڑتا۔ وہ بہت عامیانہ گھرانے کی لڑکی تھی۔ ...خاندانی تعصب نہیں رکھتا مگر یہ حقیقت ہے کہ طبقاتی فرق ...ہی مسائل پیدا کرتا ہے۔ صرف عائشہ کے لیے میں نے ...برداشت کیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ عائشہ کا بچپن ماں یا ...کے بغیر گزرے اور وہ بعد میں نفسیاتی مسائل کا شکار ہو۔ ...کی ماں نے میری مجبوری کو اپنی شہ زوری بنالیا۔ اس نے ...بلیک میل کیا۔ میں سخت دباؤ میں رہا۔''

میں نے ہمدردانہ لہجے میں کہا ''میں سمجھ سکتا ہوں۔''

''میں نے عائشہ کو اعلیٰ تعلیم دلائی اور ذمے دار بنایا۔ ...یقین تھا کہ وہ میرے کاروبار کو ترقی دینے کی پوری ...صلاحیت رکھتی ہے۔ اس بات کی کوئی اہمیت نہیں کہ میرا جو کچھ ...سب اسی کا ہے۔ اصل پریشانی میری یہ ہے کہ عائشہ ہی ...کے لیے سب کچھ ہے۔''

میں نے کہا ''آپ ضرورت سے زیادہ مایوسی کا شکار ...رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ عائشہ کو بھی آپ کا بہت خیال ...ہے۔''

''نہیں' اب اسے صرف تمہارا خیال ہے۔ اس نے ...تمہارے لیے اپنا مذہب بدل لیا۔ مذہب ہر شخص کا ذاتی ...معاملہ ہے۔ وہ تم سے شادی کرتی تو یہ بھی اس کا ذاتی معاملہ ...تھا۔ میں بس اسے خوش دیکھنا چاہتا تھا اور حقیقت تو پوچھو تو میں ...تمہیں بھی پسند کرتا تھا۔ میرے معیار سے تم عائشہ کے لیے ...موزوں تھے۔''

میں نے کہا ''عائشہ کی ماں ہرگز ایسا نہیں سمجھتی۔''

''یہ اس کی ناسمجھی ہے جس کی سزا میں بھی بھگت رہا ہوں ...عائشہ بھی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اس طرح ...ایک عائشہ کو چھوڑ کے واپس جانے کا فیصلہ کر لو گے۔''

میں نے کہا ''وہ میری مجبوری تھی۔''

''میں سمجھتا ہوں۔ مگر عائشہ نہیں سمجھتی۔ وہ حقیقت کو تسلیم ...نہیں کرتی۔ کیا تم نے اسے سمجھایا نہیں تھا کہ تم اس کو پسند کرنے کے باوجود اس سے شادی کیوں نہیں کر سکتے؟''

میں نے کہا ''میں نے بہت سمجھایا تھا اور میرا خیال تھا کہ وہ سمجھ گئی ہے۔''

لارڈ ارنسٹ نے ایک ٹھنڈی سانس لی ''کاش ایسا ہوتا رفیق۔ جانتے ہو' جب میں پولیس اسٹیشن گیا تو وہ کس کے ساتھ تھی۔ اس کے ساتھ ایک سیاہ فام لڑکا تھا' مجھ سے ضمانت نامے پر دستخط کرانے والے پولیس افسر نے مجھے بتایا کہ جو سیاہ فام نوجوان عائشہ کے ساتھ تھا۔ اس کا بہت لمبا چوڑا کرمنل ریکارڈ ہے۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ عائشہ جیسی لڑکی کا ایسا بوائے فرینڈ کیوں ہے؟ مجھے سخت غصہ آیا مگر میں خاموش رہا۔ میں نے کہا کہ اگر وہ ایسا کہتا ہے تو بکواس کرتا ہے۔ میری بیٹی نہ جانے کیسے وہاں پہنچ گئی۔ ان جرائم پیشہ لوگوں کے ٹھکانے پر۔ جسے عائشہ پسند کرتی ہے وہ تو بہت اعلیٰ تعلیم یافتہ' مہذب اور ہینڈسم آدمی ہے۔ اس نے پوچھا کہ وہ کہاں ہے اور اس کا نام کیا ہے تو میں نے کہا کہ وہ عائشہ کو چھوڑ گیا ہے اور اسی لیے عائشہ نفسیاتی طور پر ڈسٹرب ہے۔ اس نے بڑی ہمدردی کی اور عائشہ کو میرے ساتھ بھیج دیا۔ اس لڑکے کو بند رکھا۔ گھر آ کے میں نے اس کی ماں کو عائشہ سے دور رکھا اور اس سے بالکل دوستوں کی طرح بات کی۔ میں نے سوشی کو بھی بلا لیا تھا۔''

''مجھے یقین ہے اس نے آپ کی بات سنی ہوگی۔''

''رفیق...... بات سمجھ میں آتی ہے عقل سے اور جب عقل پر جذبات کا غلبہ ہو تو دلیل بے اثر ہو جاتی ہے۔ اسے کس نے نہیں سمجھایا۔ تمہارے علاوہ بھی بہت لوگ تھے۔ میں اس کے کچھ مخلص دوستوں کو جانتا ہوں۔ انہوں نے بھی عائشہ سے بات کی تھی۔ کل سوشی نے میری مدد کی۔ اس نے عائشہ سے کہا کہ اول تو رفیق تم سے شادی کرنے پر راضی نہیں اور اگر ہو جائے تب بھی تمہارا اس کے ساتھ پاکستان میں رہنا ناممکن ہوگا۔ سوشی نے خود اپنی مثال دی کہ میں صرف ملازمت کے لیے برطانیہ میں مقیم ہوں۔ مستقل طور پر میں جاپان کے علاوہ دنیا کے کسی ملک میں نہیں رہ سکتی خواہ مجھے وہاں دنیا بھر کی آسائشات فراہم کر دی جائے۔ رفیق ایک مرد تھا۔ تعلیم یافتہ بھی تھا اور خوش حال بھی۔ اسے یہاں کوئی مسئلہ نہیں تھا مگر وہ یہاں نہیں رہ سکا تو تم ساری زندگی پاکستان میں کیسے گزارو گی؟ غنیمت ہے کہ اس وقت عائشہ کا موڈ جارحانہ نہیں تھا۔ اس نے کہا کہ دیکھو' تم عائشہ نہیں ہو اور میں سوشی نہیں ہوں۔ پھر تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ میرے لیے کیا ممکن ہوگا اور کیا ناممکن؟ ظاہر ہے اس کے بعد سوشی تو لاجواب

ہو کے چلی گئی۔ بعد میں اس کے کچھ دوستوں نے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر اس نے کسی سے بات نہیں کی۔ ایک طرح سے اس نے سب سے قطع تعلق کرلیا ہے اور یہ میرے لیے سخت پریشانی کی بات ہے۔"

میں نے کہا "آپ کی پریشانی بالکل جائز ہے۔"

اس نے اپنی بات جاری رکھی "کچھ دیر بعد میں نے اس سے کہا کہ آؤ' کہیں باہر چلتے ہیں۔ میں اسے ڈنر پر لے گیا۔ تا کہ اس کا دل بہل جائے اور موڈ کچھ ٹھیک ہو تو میں پھر بات کروں۔ کھانے کے بعد وہ بالکل نارمل تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ ہنی' تم نے کیا سوچا ہے؟ اب تمہارے کیا پلان ہیں؟ رفیق کو جانا تھا' وہ چلا گیا اور اب واپس نہیں آ سکتا۔ اس نے بڑے سکون کے ساتھ کہا کہ ڈیڈی' یہ کوئی ون وے ٹریفک کا مسئلہ تو نہیں ہے۔ اگر وہ نہیں آ سکتا تو کوئی بات نہیں' میں اس کے پاس جا سکتی ہوں۔ اس میں کیا مشکل ہے۔ میں نے کہا کہ مشکل تو کوئی نہیں مگر مجھے ایک بات بتاؤ' جب وہ تم سے شادی کرنے پر رضامند ہی نہیں تو تم اس کے پاس جا کے کیا کرو گی؟ وہ ہنسنے لگی کہ ڈیڈی' شادی تو پہلے بھی میرا مسئلہ نہیں تھا۔ میں یہ بات جانتی تھی کہ وہ کسی اور سے شادی کرے گا۔ وہ اس کی ہم وطن لڑکی ہے اور یہاں لندن میں ہی ہے۔ فریال اس کا نام ہے اور وہ ایک دوسرے سے بہت پہلے عہد و پیمان کر چکے تھے۔ میرا مطلب ہے لندن آنے سے بہت پہلے۔ اب وہ ایک دوسرے کو چھوڑ نہیں سکتے۔ اب یہ میرا مسئلہ ہے' میں بھی رفیق کو نہیں چھوڑ سکتی۔ یہ ایک ازلی اور ابدی تکون ہے جس کا کوئی ضلع الگ نہیں ہو سکتا۔ میں رفیق سے محبت کرتی ہوں۔ وہ فریال سے محبت کرتا ہے اور فریال اس سے محبت کرتی ہے۔ یہ صورت حال تو ایسے ہی رہے گی۔ فلم ہوتی تو اسکرپٹ رائٹر یا ڈائریکٹر آخر میں کوئی حل نکال لیتا۔ قدرت کا کچھ پتا نہیں حقیقی زندگی کی اس کہانی کو کیسے ختم کرے۔ ابھی تو میں نے رفیق کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا ہے' اسی طرح جیسے یہاں رہتی تھی۔"

میں نے کہا "لارڈ ارنسٹ! میں نے اس پر واضح کردیا تھا کہ میرا مشرقی روایات والا ذہن بے حد قدامت پسند ہے۔ میں کسی بھی لڑکی سے تعلق کو ایسے قبول نہیں کر سکتا جیسے مغرب میں تمہاری سوسائٹی کرتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں گرل فرینڈ کا کوئی تصور ہی نہیں۔ پاکستان ایک ایسا ملک ہے جہاں اسے برداشت بھی نہیں کیا جاتا۔"

"اسے معلوم ہے۔ یہ بات میں نے اسے پھر سمجھانا چاہی تو اس نے جواب دیا کہ ڈیڈی' بس میں نے فیصلہ کرلیا ہے پاکستان جانے کا۔ آپ بتایئے آخر میں پاکستان کیوں نہیں جا سکتی؟ اگر میں امریکا' آسٹریلیا' افریقہ یا قطب شمالی جا سکتی ہوں تو پاکستان پر پابندی کیوں؟ دنیا کے کسی بھی حصے میں رہنے والے جہاں چاہیں رہ سکتے ہیں اور رہتے ہیں۔ ہر ملک میں لاکھوں کروڑوں غیر ملکی آباد ہیں جو اپنے آبائی وطن چھوڑ آتے ہیں۔ میں نے کہا کہ بات پابندی کی نہیں' سوال یہ ہے کہ وہاں تم اکیلی کیسے رہو گی؟ اس نے کہا کہ میں وہاں سیٹل ہو جاؤں گی۔ جیسے پاکستانی یہاں ہوتے ہیں۔ برطانیہ کے رہنے والے ہر جگہ ملتے ہیں۔ اب رہی کچھ کرنے کی بات تو میرے پاس اچھی کوالیفکیشن ہے' اس کی بنیاد پر مجھے اچھی جاب مل سکتی ہے۔ ورنہ میں آپ کے بزنس کو وہاں شروع کر سکتی ہوں۔ ایک آزاد زندگی میں یہاں بھی گزار رہی تھی' وہاں بھی گزار سکتی ہوں۔ کیا یہ میرا حق نہیں ہے کہ اپنی زندگی کے فیصلے اپنی مرضی سے کروں؟ اب بتاؤ میں اس کا کیا جواب دیتا۔"

"آپ نے اسے مشکلات سے آگاہ نہیں کیا؟"

"سب کہا تھا اور اسے کیا معلوم نہیں' وہ سب جانتی ہے' سب سمجھتی ہے لیکن اس کا کہنا ہے کہ پاکستان کوئی پسماندہ افریقی ملک نہیں ہے یا برفانی صحرا نہیں ہے۔ لندن میں کیا ہے جو کراچی یا لاہور میں نہیں۔ رفیق نے مجھے اس ملک کے بارے میں بہت کچھ بتایا تھا۔ موسم کو پہلے گرم سمجھا جاتا تھا۔ اب تو ائرکنڈیشنز یا ہیٹر سے اپنی مرضی کا موسم بنالیا جاتا ہے۔ فاصلے بہت سمٹ گئے ہیں۔ وہاں بھی ایک ویسٹرن سوسائٹی کا سارا کلچر ہے اور اوپر والے طبقے کا لائف اسٹائل تو بالکل امریکن ہے۔ ذہنی طور پر وہ امریکن ہیں۔ اس کے علاوہ میں آتی جاتی رہوں گی۔ سات آٹھ گھنٹے کی تو فلائٹ ہے۔ اس سے زیادہ دور تو نیویارک ہے۔ قصہ مختصر' اس نے تمہارے پاس آنے کا فیصلہ کرلیا ہے اور وہ اس پر سختی سے قائم ہے۔"

میں نے پریشانی سے کہا "یہ تو بڑی پرابلم ہو جائے گی میرے لیے بھی۔"

"یقیناً ہو گی مگر اسے نہ تم روک سکتے ہو نہ میں۔ وہ کہتی ہے کہ رہائش کے لیے میں کوئی اپارٹمنٹ خرید سکتی ہوں اور چاہوں تو کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں رہائش اختیار کر سکتی ہوں۔ آخر میں لارڈ ارنسٹ کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ افورڈ کر سکتی ہوں۔ میرے پاس اپنی گاڑی کے ساتھ ایک شوفر ہو گا۔ میں کوئی ذاتی محافظ بھی رکھ سکتی ہوں۔ رہی مصروفیت کی بات تو میں آپ کے بزنس کو وہاں پھیلاؤں گی۔ میں نے کہا کہ بزنس تمہارا ہے۔ جو چاہو کرو' جب تم نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں تمہارے لیے زیادہ سے زیادہ آسانی پیدا کروں گا تا کہ تمہیں وہاں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ ہو لیکن میری ایک درخواست ہے۔ اس نے پوچھا کہ وہ کیا؟ میں نے کہا کہ تم جاؤ' وہاں رہو...... ماحول کو سمجھو۔ مگر ہوٹل یا اپنے اپارٹمنٹ میں اکیلی مت رہو۔ تم رفیق کے گھر میں رہو۔ اس گھر کے لوگوں سے ملو۔ ماحول کو دیکھو' ان کا رویہ دیکھو۔ وہ تم سے کس طرح پیش آتے ہیں۔"

میں نے کہا "لارڈ ارنسٹ! میرے والدین پرانی وضعداری کے قائل ہیں۔ وہ کسی مہمان کے ساتھ بداخلاقی کا سوچ بھی نہیں سکتے۔"

"بات یہ ہے رفیق۔ میں اس معاملے کو ذرا مختلف انداز سے سنبھالنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہ ڈائریکٹ نہیں' اِن ڈائریکٹ طریقہ ہے۔ کان کو پیچھے سے پکڑنے کا۔ اس طرح کہ کان پکڑنے والا ہاتھ نظر نہ آئے۔"

میں نے کہا "میں سمجھا نہیں۔"

لارڈ نے کہا "اس معاملے میں مجھے تمہارے تعاون کی ضرورت ہے۔ تم کہہ سکتے ہو کہ یہ ایک سازشی منصوبہ ہے لیکن اب یہی ایک صورت ہے عائشہ کو سمجھانے کی۔ میں نے اس سے کہا ہے کہ وہ تمہاری فیملی کے ساتھ رہے۔ بالکل اسی طرح جیسے دوسری عورتیں رہتی ہیں۔ چھ مہینے گزارے یا ایک سال......"

میں نے گھبرا کے کہا "کیا اس نے آپ کی بات مان لی؟"

"ہاں۔ اس نے کہا کہ ایک سال کیا' میں تو زندگی بھر رہ سکتی ہوں رفیق کے گھر میں' رفیق کے ساتھ لیکن میں اپنے عمل سے یہ ثابت کردوں کہ میں اس کے گھر میں بہت خوش اور مطمئن ہوں' مجھے نہ کوئی پریشانی ہے اور نہ پشیمانی...... تو کیا یہ ہو سکتا ہے کہ اس کا دل پسیج جائے۔"

"اُف لارڈ ارنسٹ...... آپ نے تو مجھے پھنسا دیا' مروا دیا۔"

"میری بات سنو پہلے' یہ سب اس لڑکی کا پاگل پن ہے۔ ذرا اندازہ کرو اس کی دیوانگی کا۔ اس نے کہا کہ مسلمان ایک ساتھ چار بیویاں بھی رکھ سکتے ہیں۔ رفیق اگر چاہے تو میں اس کی دوسری بیوی بن جاؤں گی کیونکہ پہلی تو بہرحال فریال ہو گی...... کیا ایک سال بعد وہ ایسا چاہے گا؟"

"او مائی گڈنس...... پھر آپ نے کیا کہا؟"

وہ ہنسا "میں نے کہا کہ بے بی' اس کے بعد شک کی کون کی بات رہ جائے گی۔ وہ تم سے امپریس ہو جائے گا تو خود التجا کرے گا کہ مجھ سے شادی کرلو۔ اور اگر تمہارے اتنا کرنے کے باوجود اس نے تمہیں ٹھکرا دیا تو میں اسے گولی مار دوں گا۔"

"ایک منٹ' میری بات بھی تو سنیے سر! یہ آپ نے یکطرفہ طور پر کیا کیس بنادیا ہے۔ مجھ سے پوچھے بغیر۔ یہ ممکن نہیں ہو گا۔ نہ میں ایسی آزمائش کے لیے تیار ہوں اور نہ میری فیملی کسی مشکل میں پڑنے کے لیے راضی ہو گی۔"

اس نے کہا "لک ہیئر مائی بوائے! یہ سب میں نے ایسے ہی نہیں کیا تھا۔ اپنی بیٹی کو میں تم سے بہتر طور پر جانتا ہوں۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کے یہ جوا کھیلا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ ہار جائے گی۔ جس آزمائش کو اس نے جذبات کی رو میں بہہ کر آسان سمجھا ہے وہ اس میں بہت جلد ناکام ہو گی۔ چھ مہینے سال کی بات تو بہت دور ہے۔ وہ تین مہینے بھی نہیں گزار پائے گی' اس سے پہلے ہی بھاگ آئے گی۔"

"لیکن اپنی فیملی سے مشورہ کیے بغیر' انہیں سمجھائے بغیر اور ان کی اجازت لیے بغیر میں عائشہ کو اپنے گھر میں تین مہینے بھی نہیں رکھ سکتا۔ میرا بہت چھوٹا سا گھر ہے اور اس میں بہت سے لوگ رہتے ہیں۔ جوائنٹ فیملی سسٹم کے تحت۔ میرے والدین' انکل کی فیملی' دادی...... وہ دقیانوسی سوچ رکھنے والے لوگ ہیں۔ سوائے میرے والد کے سب تقریباً جاہل ہیں ......اور تنگ نظر بھی۔"

"دیکھو۔ ابھی وقت ہے' غور سے سنو تمہیں کیا کرنا ہو گا۔ تمہیں اس کا بالکل الٹ ثابت کرنا ہو گا جو وہ سمجھتی ہے۔ یہ ظاہر کرنا ہو گا کہ تم اپنی فطرت اور مزاج میں اس کے برعکس ہو جیسا کہ تم خود کو یہاں ظاہر کرتے تھے۔ تم ذرا بھی ترقی پسند اور روشن خیال نہیں ہو۔ تم متعصب سوچ رکھنے والے تنگ نظر مرد ہو۔ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود سخت جاہل ہو' تم عورت کی بالکل عزت نہیں کرتے بلکہ اس کو بچے پیدا کرنے والے جانور کی حیثیت دیتے ہو۔ خدمت گار سمجھتے ہو۔ مساوی درجہ دینے کا کیا سوال...... تم اس بات کے قائل ہو کہ وفاداری صرف عورت پر لازم ہے۔ مرد آزاد ہے کہ جس عورت سے چاہے مراسم رکھے۔ کیا تم میری بات سمجھ رہے ہو؟"

میں نے کہا "اب شاید کچھ سمجھ رہا ہوں۔"

"گڈ۔ دس از مائی پلان۔ تم خود کو ایک برا آدمی ثابت کرو گے' قابل نفرت۔ تم اپنے ماحول کو عائشہ کے لیے ناقابل برداشت بنا دو گے۔ اگر تم اپنی فیملی کو اعتماد میں لے سکتے ہو تو وہ تمہارے ساتھ مل کے اس پلان کو کامیاب بنا سکتے ہیں۔ وہ اپنے رویے سے عائشہ کا جینا عذاب کر سکتے ہیں۔"

میں نے ہنس کے کہا "سوچ لو' اچھی طرح لارڈ ارنسٹ! تم اپنی بیٹی کو خود عذاب میں دھکیل رہے ہو؟"

"اوہ نو! وہ خود عذاب میں پڑنا چاہتی ہے مگر اسے عذاب سمجھنے پر تیار نہیں۔ یہ سب بالآخر عائشہ کے مستقبل کی بہتری کے لیے ہے۔ تم دیکھ لینا' وہ حقیقت کا ایسا بھیانک روپ دیکھ کر کتنی جلدی پچھتائے گی۔ اپنی عقل ٹھکانے آئے گی تو اسے اندازہ ہوگا کہ ہم اس کے خیر خواہ تھے۔ وہ تم سے بدظن ہو کے اور تمہاری محبت پر لعنت بھیج کے واپس بھاگے گی۔ اس کے خواب بکھر جائیں گے تو وہ روتی ہوئی واپس آ کے میرے گلے لگ جائے گی کہ ڈیڈی' آپ ٹھیک کہتے تھے۔"

میں نے کہا "میں تمہارے پلان کی تعریف کرنے پر مجبور ہوں لارڈ!"

وہ خوش ہو کے بولا "کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ تم ویسا کرو گے جیسا کہ میں نے تمہیں سمجھایا؟"

"میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ عائشہ کی خاطر میں کچھ بھی کر سکتا ہوں۔"

"دیٹ وڈ بی جسٹ فائن۔ اس بے وقوف لڑکی کا یہی علاج سب سے بہتر ہے۔ کنوئیں میں گرنے سے چوٹ لگتی ہے' کنوئیں میں کود کے دیکھ لو۔"

میں نے کہا "کیا اس کی ماں بھی ایسا ہونے دے گی؟"

"اسے میں راضی کر لوں گا۔"

میں نے کہا "اسے میری نیک نیتی کا یقین دلانا۔ وہ مجھ سے سخت بدگمان ہے۔ عائشہ یہاں اتنی ہی محفوظ ہوگی جتنی گھر میں ہے۔ یہی میری عائشہ کے لیے حقیقی محبت ہے کہ میں اسے مستقبل میں ہمیشہ بہت خوش دیکھنے کی آرزو رکھتا ہوں۔"

"تم یقیناً اسے خوابوں کی تعبیر دے سکتے تھے' جو مجھے نہیں ملی۔"

میں نے کہا "کاش یہ ممکن ہوتا۔ اگر مجبوری حائل نہ ہوتی تو ہماری ازدواجی زندگی مثالی ہوتی۔ لیکن آدمی کو چاہنے سے سب نہیں ملتا۔"

اس نے کہا "ہو سکتا ہے ایک دو روز میں عائشہ خود تمہیں بتائے کہ وہ پاکستان آ رہی ہے۔"

"تب تک میں اپنے خاندان والوں سے بات کروں گا اور پھر عائشہ کو خود انوائٹ کروں گا کہ وہ ہمارے گھر میں ہمارے ساتھ رہے۔"

"وہ تو خوشی سے پاگل ہو جائے گی۔ سمجھے گی میں نے ایک معرکہ سر کر لیا لیکن رفیق! میرے دل کے کسی گوشے میں ایک ڈر کیوں بیٹھا ہوا ہے۔ شکست کا ڈر' اس بات کا ڈر کہ کہیں میرا اندازہ غلط نہ ہو جائے۔ اگر سب ویسا نہ ہوا جیسا میں نے سوچا ہے' پھر......؟"

"آپ کے لیے کوئی رسک نہیں......"

"رسک کیوں نہیں۔ فرض کرو' ناممکن کچھ بھی نہیں ہوتا اس لیے بس یہ سوچتا ہوں کہ کہیں وہ میری توقعات سے بڑھ کر بہادر اور مستقل مزاج ثابت ہوئی' وہ سب برداشت کر گئی ......اور تم نے اس سے بھی شادی کر لی...... پھر......؟"

میں نے ہنس کے کہا "لارڈ ارنسٹ! آپ کو بالکل فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ کی بیٹی لوٹ کر آپ کے پاس آئے گی۔ یہ میرا وعدہ ہے اور میری گارنٹی ہے۔ آپ بس عائشہ کو یہاں آنے دیں۔ میں نے طے کر لیا ہے کہ جیسا آپ چاہتے ہیں' ویسا ہی ہوگا۔ میں اس کے دل میں اپنی محبت کو نفرت میں بدل کے دکھاؤں گا' یہ چیلنج میں نے قبول کر لیا ہے۔"

"تھینکس بوائے۔ تم نے میرا سارا غم کا بوجھ اتار دیا۔ بیٹی کے معاملے میں' میں انتہائی کمزور آدمی ہوں۔ حالانکہ میں ایسا ظاہر نہیں کرتا مگر تم سے کچھ چھپانا نہیں چاہتا۔ اس جذباتی سہارے کے بغیر میں زندہ رہنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ میں تم کو بہت پسند کرتا ہوں۔ خدا حافظ۔ میری نیک خواہشات تمہارے ساتھ ہیں۔"

"تھینکس لارڈ ارنسٹ!" میں نے کہا اور فون رکھ دیا۔

اس سے بات کر کے میں اس نئی صورتِ حال کا تصور کرتا رہا اور مسکراتا رہا۔ اچانک ہیرو سے میرا رول ایک ولن کا ہو گیا تھا۔ میں دیکھتا ہوں کہ برطانیہ کی اور شاہانہ عیش و عشرت کے ماحول کی پروردہ ایک لڑکی اس گھر میں کیسے گزارہ کرے گی۔ ست بدھائی کی جاگیر پر ایک آسیب زدہ حویلی میں کیسے رہے گی؟

پورا خاندان نہ سہی میرے والدین بہت فراخ دل اور روشن خیال لوگ تھے۔ وہ میری خوشی کے لیے میری ہر بات مان سکتے تھے اور سب کچھ برداشت کر سکتے تھے۔ اگر بالفرض محال میں عائشہ سے شادی کا فیصلہ بھی کر لیتا تو وہ پوری طرح اور خوشی خوشی میرا ساتھ دیتے۔ کسی دقیانوسی اور جاہل خاندان میں عام عورت کے لیے گھر کوئی سپنوں کا محل نہیں ہوتا۔ عملاً وہ ایک قید خانہ ہوتا ہے مگر ہمارے گھروں کے ماحول میں پرورش پانے والی لڑکی ایسا نہیں سمجھتی۔ کیونکہ اس کی ذہنی تربیت اسے سکھاتی ہے کہ وہ میرا گھر میری جنت کے فلسفے پر قانع ہو۔ گھر میں اپنی حیثیت کو فطری' موروثی اور نوشتۂ

تقدیر جانے اور خوش رہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ خوش رہتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے چڑیا گھر کے پنجرے میں پیدا ہونے والے شیر کے بچے خود کو کسی قید میں محسوس نہیں کرتے۔

لیکن آزاد فضاؤں میں پرواز کرنے والا پنچھی اچانک پنجرے میں بند کر دیا جائے تو بہت پھڑپھڑاتا ہے۔ پنجرہ توڑ کے نکل جانا چاہتا تھا۔ عائشہ کے ذہن میں میری تعلیم' تہذیب اور روشن خیالی کا جو تصور ہے اور پاکستان کی ماڈرن ویسٹرن سوسائٹی کا جو نقشہ ہے' اگر وہ باطل ہو جائے یا باطل کر دیا جائے تو یہ اس کے لیے بہت بڑا امینٹل شاک ہوگا۔ اگر اسے یقین دلا دیا جائے کہ یہ عشق نہیں آسان بلکہ اک آگ کا دریا ہے' تو وہ بھی محبت کے زنداں سے آزادی حاصل کر کے فرار میں ہی عافیت جانے گی لیکن اس کے لیے پہلے سے حالات پیدا کرنا ضروری ہوگا۔ سب کو سمجھانا پڑے گا کہ لارڈ ارنسٹ کا منصوبہ کیا ہے اور اس پر عمل درآمد سے کیا فائدہ حاصل کرنا مقصود ہے۔ اماں اور ابا طبعاً نیک اور سیدھے سادے شریف لوگ ہیں۔ ان کے لیے گھر آئے مہمان کے ساتھ بداخلاقی کا رویہ رکھنا بہت مشکل ہوگا۔ اس سے زیادہ بڑی پرابلم دادی کی ہوگی۔ وہ ایسے کسی ڈرامے کا کردار بننے پر کہاں رضامند ہوں گی۔ وہ تو کہیں گی کہ ارے نمونے' ذرا آنے تو دے اس لڑکی کو میرے سامنے۔ میں دیکھتی ہوں کہ میری بات اس کی سمجھ میں کیسے نہیں آتی۔ دادی کے علاوہ گھر میں چچا اور چچی جیسی شخصیات ہیں۔ چچا تو کہیں گے کہ بھتیجے' میں اپنے موکلوں کو اس میم کے پیچھے لگا دیتا ہوں۔ دیکھنا کیسے الٹے پاؤں جاتی ہے ولایت۔ چچی کی اپنی عقل ہے۔ وہ میری ساری کوشش کو اپنی سادہ لوحی یا کم عقلی سے ناکام بھی کر سکتی ہیں۔

اچانک مجھے اپنے پیچھے ایک آہٹ سی محسوس ہوئی اور میں چونک کے پلٹا تو پردے کے پیچھے سے مس رابعہ بتیسی چکانی نمودار ہوئیں۔

میں نے حیرانی سے کہا "تم...... اس وقت یہاں......؟"

وہ ہنسی اور کرسی پر بیٹھ گئی "ہاں۔ میں نے کمرے میں لائٹ دیکھی اور آ گئی۔ پہلے سمجھی شاید تم نماز فجر کے لیے اٹھے ہو۔ مگر یہاں تو معاملہ ہی کچھ اور تھا۔"

"تم شرافت سے بھی آ سکتی تھیں۔ یوں پردے کے پیچھے کیوں چھپی کھڑی تھیں؟" میں نے کہا۔

"وہ دراصل آپ کچھ راز و نیاز میں مصروف تھے۔ میں نے دخل در معقولات سے گریز کیا۔"

"بڑی نوازش ہے آپ کی۔ اب یہ فرماؤ کہ تم کو آخر کس کی یاد نے بے قرار کیا ہے کہ تمہاری آنکھوں کی نندیا اڑ گئی ہے؟"

اس نے کہا "کزن...... جاگ تو تم بھی رہے ہو۔"

"میرے جاگنے کی وجہ دوسری ہے۔ لندن کے حساب سے میرے سونے کا وقت اب ہوا ہے' تم کو کیا ہوا ہے؟"

"عشق......" اس نے ایک لمبی آہ بھری "تم کو تو احساس ہوتا نہیں ......اور کیسے ہو' ولایت سے آئے ہو' وہاں ناشتے کے وقت ایک سے عشق ہوتا ہے' لنچ میں دوسری مرتی ہے' ڈنر تیسری کراتی ہے۔ ولایتی گوری چمڑی کے مقابلے میں اپنی کالی کلوٹی کزن کی کیا اوقات ہے مگر بابو! دل تو سب کا ایک ہی ہوتا ہے۔"

میں نے سر پکڑ کے کہا "اف...... کتنا بولنے لگی ہو تم۔"

اس نے اٹھ کے دروازہ بند کیا "میں نے سوچا نہار منہ سب سے پہلے میں تم سے اظہار عشق کر کے جملہ حقوق اپنے نام محفوظ کرا لوں۔ بعد میں تو پتا نہیں کتنی ڈورے ڈالیں گی تم پر۔"

میں نے کہا "بکواس بند کرو اور یہ دروازہ کھول دو۔"

رابعہ ہنسی "ارے یار! اتنا ڈرنے کی کیا ضرورت ہے' آخر میں کزن ہوں تمہاری...... کوئی بلا تو نہیں۔ اور بدنامی ہوگی تو میری......"

"مجھے تم سے بہادری کی سند نہیں چاہیے۔ کیا ضرورت ہے کسی کو باتیں بنانے کا موقع دینے کی" میں نے کہا اور دروازہ کھول دیا۔

"رفیق صاحب! ہماری خاندانی اور تہذیبی روایات کے مطابق کزن سے عشق لازمی ہوتا ہے' تمہیں بھی کرنا پڑے گا۔"

"اگر تم شرافت سے باعزت طور پر رخصت ہو جاؤ تو...... ہمارے تعلقات آئندہ بھی اچھے رہیں گے' مجھے نیند آ رہی ہے۔"

اس نے ہاتھ باندھ کے کمرے میں ٹہلنا شروع کیا "دیکھو کزن! میں زیادہ وقت نہیں لوں گی۔ بس ایک گھنٹے میں حال دل کہوں گی اور چلی جاؤں گی۔ رہی نیند کی بات تو نیند مجھے بھی آ رہی ہے۔ کیا خیال ہے یہیں سو جاؤں...... تمہارے ساتھ۔ اسی بیڈ پر...... شرافت سے۔"

میں نے کہا "کچھ شرم کرو۔"

"یار! ہم کئی بار سو چکے ہیں' تمہیں یاد نہیں۔ دادی جب

اس جن کی کہانی سناتی تھیں جو انسانوں کا خون ایسے پی جاتا تھا جیسے لوگ بوتل منہ سے لگا کے کوک پیتے ہیں تو رات کو مجھے ڈر لگتا تھا اور میں گھس جاتی تھی تمہارے ساتھ...... آہ...... اس کے باوجود تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہوئی۔"

"رابعہ......!" میں نے ہار مانتے ہوئے کہا "اگر افضل نے تمہیں دیکھ لیا تو کیا وہ جلے گا نہیں؟"

"اسے میں جلاتی رہتی ہوں۔ بجھا بھی دیتی ہوں۔ اس کی فکر مت کرو۔ اسے میں نے ایک چڑیل کی طرح اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا ہے اور اب تم سے کیا پردہ...... دل سے تو ہم نے ایجاب و قبول کرلیا ہے۔ کسی مولوی کے سامنے ہونا باقی ہے۔ ابھی ہمارے ناجائز تعلقات ہیں۔"

میں نے کہا "جاؤ پہلے کافی بنا کے لاؤ میرے لیے۔ پھر کریں گے باقی باتیں۔"

وہ اٹھی "میں چائے پیتی ہوں' تمہیں بھی وہی ملے گی۔ کافی پینے کی نہیں' سننے کی چیز ہوتی ہے...... بابا بلھے شاہ کی کافی۔"

رابعہ میرے معیار سے ایک عام سی لڑکی تھی۔ وہ اپنی ماں جیسی تیز طرار اور چالاک نہیں تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا اور میرا بچپن ایک ساتھ گزرا تھا۔ سب سے زیادہ میں اس کو پیار دیتا تھا اور اس کے باوجود وہ سب سے زیادہ مجھے پریشان کرتی تھی۔ کبھی اپنی شرارتوں سے' کبھی فرمائشوں سے' کبھی باتوں سے۔ میری ایک ذمے داری یہ بھی تھی کہ اسے پڑھاؤں کیونکہ پڑھائی کے معاملے میں اس کا دماغ چلتا ہی نہیں تھا۔ اور چلتا بھی کیسے' کتابوں سے زیادہ اس کی دلچسپی پہلے گانوں میں تھی' پھر فلموں میں ہوگئی۔ جب وہ میٹرک میں پڑھتی تھی تو ہمارے گھر آکے وی سی آر پر کوئی فلم لگانے کی فرمائش کرتی تھی۔ پھر دروازہ بند کر کے گانوں کی دھن پر ڈانس کرتی تھی اور مجھ سے پوچھتی تھی کہ میں کیسا ناچتی ہوں؟ گانے کے لیے تو اس کی آواز بہت خراب تھی مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ پریکٹس کے بعد وہ اچھا ڈانس کرنے لگی تھی۔ میں خود اس کے ڈانس کو دلچسپی سے دیکھتا تھا۔ اس کے ایک اندر ایک رقاصہ کی بے چین روح یقیناً تھی مگر گھر کا ماحول ایسا تھا کہ اس کی فطری صلاحیت کا اظہار "بے شرمی" کہلایا۔ اس کے شوق کو غیر اخلاقی اور غیر شرعی قرار دے کر ختم کر دیا گیا۔

اس نے رو دھو کے اور نقل کر کے میٹرک پاس کیا اور چار سال میں انٹر کا مرحلہ بھی طے کرلیا مگر اس کے بعد یونیورسٹی میں جا کے اس نے پہلے اسٹیج ڈرامے میں حصہ لیا۔ ان سرگرمیوں کی رپورٹ گھر تک گئی تو رابعہ کو فوراً گھر میں نظر بند کر دیا گیا کہ بی بی' اب بی اے' ایم اے جو کرنا ہے پرائیویٹ امتحان دے کر کرو۔ احتجاجاً اس نے کچھ بھی نہیں کیا۔

اس کی صورت اچھی تھی لیکن رنگ سانولا تھا۔ اس نے اپنے رخ روشن پر رنگ گورا کرنے والی ہر کریم آزمائی تھی۔ جب بھی اس کے سامنے کسی نئی کریم کا اشتہار آتا تھا' وہ مجھ سے کہتی تھی۔ بعض اوقات اس کے پیسے بھی مجھے دینے پڑتے تھے۔ میں اسے سمجھاتا تھا کہ ساری دنیا کے بیوٹی سوپ' لوشن اور کریمیں مل کر بھی کسی بھینس کو گائے جیسا نہیں بنا سکتے مگر اس پر اثر نہیں ہوتا تھا۔ میرے لندن جانے سے پہلے اس پر ڈیپریشن طاری تھا۔ اس نے بے تحاشا کھانا شروع کر دیا تھا اور واقعی بھینس بن گئی تھی لیکن اب ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنا وزن کم کرنے میں کامیاب رہی ہے۔ اپنے ہیئر اسٹائل' لباس اور میک اپ کے سلیقے سے وہ پرکشش نظر آنے لگی تھی۔

رابعہ کو ٹی وی ڈراموں اور فلموں میں کام کرنے کا شوق تھا۔ اس شوق پر ماں کو قطعی اعتراض نہ تھا مگر صوفی چچا جیسا شخص خود اپنے گھر میں یہ لہو و لعب کیسے برداشت کرسکتا تھا۔ وہ بھی بیٹی کے معاملے میں۔ نتیجہ یہ کہ رابعہ جلد سے جلد اس گھر سے رخصتی کی خواہش مند تھی۔ اسے یقین تھا کہ شادی کے بعد وہ من مانی کرسکے گی اور شوہر کی طرف سے اسے پوری آزادی مل جائے گی تو وہ شوبز کے افق کا سب سے روشن ستارہ بن کے چمکے گی۔ دولت اور شہرت اس کے گھر کی باندی ہوگی۔

اس کے دل کی مراد بر آنے میں تاخیر کے دو بنیادی اسباب تھے۔ رابعہ بچپن سے میری خالہ کے بیٹے افضل سے منسوب تھی۔ رابعہ اور افضل کی لیلیٰ مجنوں والی محبت کے قصے اور مناظر سب نے ہی دیکھے اور سنے تھے۔ صوفی چچا کے لیے یہ بڑے اطمینان کی بات تھی اور یہ صورت حال اس لیے بھی مثالی تھی کہ افضل ان کا مرید ہو چکا تھا۔ وہ انتہائی عقیدت مندی سے چچا کے ہاتھ چومتا تھا۔ ان کی ہر خدمت بجا لاتا تھا اور پیری مریدی کے دھندے میں ان کا معاون خصوصی تھا۔ انہیں یقین تھا کہ ایک دن وہ ان کی جگہ لے گا اور ان سے زیادہ کامیاب رہے گا۔ چچی کو اس سے چڑ تھی۔ ان کے نزدیک افضل وہ مثالی داماد نہیں تھا جو وہ اپنی بیٹی کے لیے چاہتی تھیں۔ وہ صرف میٹرک پاس تھا۔ صورت سے بھی پرلے درجے کا احمق لگتا تھا اور اپنی حرکتوں سے بھی ایسا ہی ثابت کرتا رہتا تھا۔ وہ کوئی کام دھندا نہیں کرتا تھا اور اپنا زیادہ وقت پیر و مرشد کی بارگاہ میں گزارتا تھا۔ چچی نے شادی دفتروں کے چکر لگائے' دروغ برگردن راوی' ضرورت رشتہ

کے کالم میں اشتہار دینے کے بعد خود اپنے شوہر سے' جسے وہ گھر کی مرغی دال برابر سمجھتی آئی تھیں' اچھے رشتے کے لیے تعویذ' درود وظائف' نقش اور عملیات تک سب کرائے تھے مگر افضل سے بہتر کوئی رشتہ اگر آیا تھا تو خود رابعہ نے انکار کر دیا تھا۔ تاہم ان میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو صورت میں پری زاد' سیرت میں فرشتہ اور قسمت میں شاہزادہ ہوتا۔

پھر اچانک پردیس سے میری واپسی کا غلغلہ ہوا۔ میں چچی کے خوابوں والی ہمہ صفت داماد کی جیتی جاگتی تصویر تھی۔ مجھے لندن میں ہی اطلاع مل گئی تھی کہ چچی نے تمام امکانات کو مسترد کر کے خود اپنے طور پر فیصلہ کرلیا تھا کہ رابعہ کی شادی ہوگی تو مجھ سے۔ بدخواہوں کے منہ میں خاک' ہنسنے اور مذاق اڑانے والے حاسدوں کا منہ کالا۔ سب دیکھتے رہ جائیں گے۔ افضل تو کسی گنتی میں ہی نہیں۔ باقی سب کی بھی کیا حیثیت ہے۔ کہاں کی فریال اور کون عائشہ۔ وہ ایسا چکر چلائیں گی کہ ساری بلائیں دور ہو جائیں گی۔ اس غیر اعلانیہ جنگ میں وہ خود کو نپولین اعظم سے زیادہ شاطر اور نڈر جرنیل سمجھتی تھیں۔ رابعہ سے بھی انہیں پوری امید تھی کہ میرے معاملے میں وہ افضل کو بھی دودھ میں پڑی مکھی کی طرح نکال باہر کرے گی اور مجھے حاصل کرنے کی جدوجہد میں ماں کا یوں ساتھ دے گی کہ سارے حریف شکست تسلیم کرنے پر مجبور ہوں گے۔ ایسی باتیں سن کے مجھے ہنسی بھی آتی تھی اور پریشانی بھی ہوتی تھی۔

رابعہ دروازے کو لات سے کھول کے اندر آئی تو اس کے ہاتھ میں کافی کے دو مگ تھے۔ ایک مجھے تھما کے وہ میرے سامنے بیٹھ گئی۔

میں نے کہا "کافی تو سننے کی چیز ہوتی ہے۔"

اس نے ایک چسکی لے کر کہا "تمہاری خاطر میں بھی یہ زہر پی رہی ہوں کزن! ترے عشق نچایا کر تھیا تھیا۔ جب سے تم آئے ہو' تمہیں فرصت ہی نہیں ہے بات کرنے کی۔"

میں نے کہا "فرصت تو آج بھی نہیں ہے۔ مجھے جانا ہے اپنی ریاست کے دورے پر۔"

وہ ہنسی "سلطنت کیوں نہیں کہتے۔"

میں نے کہا "رابی! کیا تمہیں اندازہ ہے کہ میں کتنی مشکلات میں گھرا ہوا ہوں۔ کیسے سنگین مسائل سے دوچار ہوں؟"

"بالکل ہے۔ لیکن تمہاری تشریف آوری نے میرے لیے کیسے سنگین مسائل پیدا کر دیے ہیں۔ اس کا تمہیں کوئی اندازہ نہیں۔ حالات ایسے ہیں رفیق صاحب کہ ہم ایک دوسرے کے مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔"

میں نے ہاتھ جوڑے "مجھے تو معاف ہی رکھو بی بی! خدا مجھ پر ایسا برا وقت نہ لائے کہ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت پڑے۔"

وہ بولی "تمہاری شادی ایک قومی بلکہ بین الاقوامی مسئلہ بن چکی ہے۔ تم ہر طرف سے خطرات میں گھر گئے ہو مسٹر فیکے!"

میں نے رقت انگیز لہجے میں کہا "بلاشبہ کزن! خود تم سب سے بڑا خطرہ بن کے مجھے گھیر رہی ہو۔"

اس نے اپنی ہمت جاری رکھی "مجھے وہ بھی معلوم ہے جو تم سمجھتے ہو کسی کو معلوم نہیں' پوچھو کیسے؟"

مجبوراً میں نے کہا "او کے۔ پوچھ لیتا ہوں' وہ کیسے؟"

"وہ ایسے کہ میرا ایک شعبۂ سراغ رسانی ہے۔ وہ بہت ایکٹیو ہے کیونکہ الحمدللہ اس کی سربراہ میرے جیسی ذہین خاتون ہے۔ آج کل تمہارے کیس پر میری ساری توجہ ہے کیونکہ تمہاری ملکیت کے جھگڑے پر پاکستان اور انگلینڈ کے درمیان تیسری جنگ عظیم کے خطرات پیدا ہو رہے ہیں' پوچھو وہ کیسے؟"

"ہرگز نہیں پوچھوں گا۔"

"او کے' میں بتا دیتی ہوں۔ کرکٹ کی تو کوئی بات نہیں کزن! اس میں ہار جیت چلتی ہے مگر یہ معاملہ ہے زندگی اور موت کا۔ ایک بڑی خطرناک قسم کی پاکستانی لڑکی ہے۔ دوسری سرمایہ دار ملک کی حسینہ ہے۔ ان دونوں نے تم کو مسئلہ کشمیر بنا لیا ہے' رائٹ!"

"رائٹ' مگر یہ بات تو سب جانتے ہیں۔"

"جو بات رابعہ جانتی ہے کوئی نہیں جانتا کہ بہت جلد وہ ولایتی حسینہ یہاں آرہی ہے' پاکستان میں اور اس گھر میں جو عجائب گھر ہے۔"

میں اچھل پڑا "یہ تمہیں کیسے پتا چلا؟"

وہ ہنسی "بھئی معاف کرنا...... مجھے انگریزی زبان تو نہیں آتی مگر جتنی آتی ہے اس کے مطابق......" اس نے لوفرانہ انداز میں بائیں آنکھ دبائی اور بولی "جب تم فون پر بات کر رہے تھے تو میں پردے کے پیچھے کھڑی سب سن رہی تھی لیکن فکر کی کوئی بات نہیں کزن۔ اگر یہ راز ہے تو راز ہی رہے گا۔ تم مجھ پر بھروسا کر سکتے ہو۔ میں تمہاری معاون خصوصی...... دوست' مشیر' جاسوس' سیکریٹری یہاں تک کہ محبوبہ کا رول بھی کرسکتی ہوں۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا "میرے حال زار پر یہ

بھوج کے آگے گنگو تیلی!''

''اور تم نے کہا' آف کورس پاپا!''

''جی۔ میں نے آمنّاً صدقناً کہا۔ چنانچہ اب تم پر تین طرف سے یلغار ہے کزن! فریال' عائشہ اور یہ ناچیز۔''

میں ہنس پڑا ''تم تو بے حد ذہین اور سمجھ دار ہو گئی ہو۔ میری اور تمہاری پارٹنر شپ چل سکتی ہے۔''

''عائشہ اور فریال میں سے تم بالآخر کس کا شکار بنتے ہو' اس کا فیصلہ تو وقت کرے گا یا تمہاری تقدیر۔ میری طرف سے بے فکر ہو جاؤ۔ میں والدہ کو گمراہ رکھنے کے لیے ان کے پلان پر سنجیدگی سے عمل کرتی نظر آؤں گی مگر وہ سب اسٹیج ڈرامے کی طرح ہوگا۔ میرا ٹارگٹ ہے افضل۔ اور افضل کے معاملے میں تم میری مدد کرو گے۔''

''جو کچھ مجھ سے ہوگا میں ضرور کروں گا۔''

''افضل صرف میٹرک پاس ہے...... لیکن وہ دل کا بہت اچھا ہے اور مخلص ہے۔ تم بھی اس پر بھروسا کر سکتے ہو۔ اسے ابا جی کی پیری مریدی کے چکر سے نکالو۔ اگر تم اسے اپنے ساتھ رکھو۔''

''ساتھ رکھوں...... کہاں؟ ابھی تو میں کچھ بھی نہیں کر رہا ہوں۔''

''ابھی نہیں کر رہے ہو لیکن تم کچھ نہ کرنے کے لیے تو واپس نہیں آئے ہو' کیا پلان ہیں آخر تمہارے؟''

''ابھی تو کچھ نہیں...... لیکن ٹھیک ہے' میں دیکھوں گا کہ افضل کیا کر سکتا ہے۔ میرے ذہن میں کچھ پروجیکٹ ہیں لیکن یقینی بات کوئی نہیں۔ میں نے تو یہ بھی سوچا تھا کہ میں واپس چلا جاؤں گا لیکن اب یہ ناممکن لگتا ہے۔''

اس نے کہا ''تم اس عائشہ والے بحران سے کیسے نمٹو گے؟''

میں چونکا ''یہ تو میں نے ابھی نہیں سوچا۔ لیکن اب سوچ رہا ہوں کزن کہ اس میں تم یقیناً میری مدد کر سکتی ہو۔ ایک پلان ہے میرے پاس۔''

اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا ''ایک دوسرے کی مدد کر کے ہم اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوں گے رفیق۔ تم میرے ساتھ اپنا رویہ وہی رکھنا جو ہے...... بالآخر والدہ مایوس ہو جائیں گی۔ یہ سمجھ لیں گی کہ مشن امپاسیبل ناکامی سے دوچار ہوا۔ اس وقت تک افضل بھی کچھ کرنے لگے گا۔ ابا کی سپورٹ مجھے پہلے ہی حاصل ہے۔ میری اور افضل کی شادی ہو جائے گی۔''

میں نے کہا ''تم افضل سے کہنا کہ مجھ سے مل لے۔ آخر وہ ہے کہاں...... اب تک اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔''

''اسے ابا نے کہیں بھیجا تھا۔ شاید آج شام تک لوٹ آئے گا۔ میں ایک بات اور کہنا چاہتی ہوں' تمہیں ایک خطرے سے خبردار کرنا چاہتی ہوں۔''

میں نے کہا ''رابعہ! کیا میرے لیے صرف خطرات رہ گئے ہیں؟''

وہ بولی ''تمہیں تو شاید اندازہ ہی نہیں ہوگا اس خطرے کا مگر تمہیں اس کے بارے میں ضرور سوچنا چاہیے اور اپنی حفاظت بھی کرنی چاہیے۔''

میں نے اسے غور سے دیکھا ''لڑکی! کیا تم اپنی اوقات سے بڑی باتیں نہیں کر رہی ہو' ایسی کیا بات ہے آخر؟''

''دیکھو۔ اسے مذاق مت سمجھو۔ یہ جو تم راتوں رات کنگال سے مالا مال ہو گئے ہو' اس پر بہت سے لوگ جل بھن کے کوئلا ہو گئے ہیں۔ خیر سے میں بھی ان میں شامل ہوں۔''

میں نے کہا ''لکڑی جل کر کوئلا ہوئی کوئلا جل کے راکھ۔ میری صحت پر اس سے کوئی اثر نہیں پڑتا۔''

اس نے اپنی بات جاری رکھی ''بات یہ ہے...... اکثریت تو ان کی ہے جنہوں نے تم سے توقعات وابستہ کر لی ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ تمہاری فطرت میں فیاضی ہے۔ وضع دار ہو اور سب کے خیر خواہ...... لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جو سمجھتے ہیں کہ تم نے ان کا حق مار لیا۔ جو لاٹری تمہارے نام نکلی ہے' اس میں وہ نصف کے حق دار تھے۔''

میں نے کہا ''رابعہ! کبھی لاٹری بھی حق دار کے نام اس کی ضرورت کے مطابق نکلتی ہے؟''

''مگر جن کو اپنے نصیب سے شکایت ہے' وہ ذمے دار تمہیں سمجھ رہے ہیں۔''

''میں سمجھ گیا' تم کیا کہنا چاہتی ہو۔ نذیر چچا سمجھتے ہوں گے کہ ان کی حق تلفی ہوئی۔''

''ہاں' عقیل احمد ان کے بھی تو چچا تھے۔ انہوں نے زیادتی کیوں کی؟'' رابعہ نے کہا۔

''پھر وہ کیا کرتے؟''

''کچھ بھی نہ کرتے۔ بس فوت ہو جاتے' قانون کے مطابق ان کے وارث دونوں بھائی ہوتے۔ رشید احمد اور نذیر احمد۔''

میں نے کہا ''کیا تمہیں بھی مرحوم سے شکایت ہے کہ انہوں نے تمہیں اپنا وارث کیوں نہیں بنایا' یہ شکایت غلط ہے۔''

''غلط تو ہے' دینے والی کی مرضی۔ اپنی زندگی میں ...

...ت کیوں؟''

''دراصل میری والدہ ماجدہ نے مجھے ایک مشن سونپا ہے جو میرے خیال میں مشن امپاسیبل ہے۔ پہلا مرحلہ ہے تمہیں پھانس کے الو بنانا یا الو بن کے پھانسنا۔ جیسے تم چاہو۔ دوسرا مرحلہ ہے تم سے شادی کرنا۔ اس مرحلے کو سر کرنے کے لیے مجھے دو قتل کرنے کی بھی اجازت ہے۔ ایک فریال کو دوسرے عائشہ کو۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟''

''بالکل نہیں...... مگر......''

''اگر مگر چھوڑو...... مجھے تو یہ بھی اجازت ہے کہ ناکامی کا خطرہ ہو تو تمہیں بھی قتل کر دوں...... تم کیسے قتل ہونا پسند کرو گے کزن!''

میں نے کہا ''میں عزت سے خودکشی کو ترجیح دوں گا۔''

وہ ہنسی ''یار! تم تو ڈر گئے۔ فکر مت کرو' تم بالکل محفوظ ہو۔ ویسے تو میں نے والدہ کی بات مانتے ہوئے اس مشن کو تکمیل تک پہنچانے کا عزم کر لیا ہے...... مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ میرے نزدیک تم ہرگز اس قابل نہیں کہ تم پر ڈورے ڈالے جائیں۔ شادی تو دور کی بات ہے۔''

''تھینک یو کزن! کون ہے اس قابل تمہارے خیال میں؟''

''افضل آف کورس!'' اس نے مجھے ڈانٹا ''تم کو اتنا بے خبر نہیں ہونا چاہیے۔ یہ تو بچپن سے طے تھا۔ کیا کہتے ہیں...... مٹھیکرے کی منگنی۔ اس کے علاوہ دنیا میں اس سے بڑا الو کون ہو سکتا ہے؟''

''تمہیں شوہر کی جگہ کاٹھ کا الو چاہیے؟'' میں نے حیرانی سے کہا۔

''مسٹر رفیق! میری جیسی لڑکی کسی آپ جیسے شخص کے ساتھ بھلا کیسے گزارا کر سکتی ہے۔ میں تمہیں نکیل ڈال کے نہیں رکھ سکتی۔ تم کو اپنے اشاروں پر نہیں نچا سکتی۔ تم سے اپنی ہر جائز ناجائز بات نہیں منوا سکتی۔ یہ وہی کر سکتا ہے جو ڈبل الو ہو۔ یعنی ایک تو میرے عشق میں پاگل ہو' دوسرے سچ مچ الو ہو۔ عقل کے اعتبار سے بھی۔ یہ دونوں خوبیاں افضل میں ہیں۔''

میں نے کہا ''اللہ اس پر رحم کرے۔''

وہ بولی ''دیکھو رفیق! تم بچپن سے مجھے جانتے ہو بلکہ ... ہو۔ تم مجھے ڈانس کی فلمیں لا کے دیتے تھے۔ میرا ڈانس دیکھ کر میری تعریف کرتے تھے۔ میری حوصلہ افزائی کرنے والے صرف تم تھے۔ باقی سب نے میرے شوق کا خون کیا۔ میرے اندر کے آرٹسٹ کے قاتل ہیں سب۔ مجھے ایکٹنگ کا شوق تھا۔ ٹی وی کے ڈراموں سے میں فلموں میں جمپ لگا سکتی تھی۔ رقص کرنا میرا جنون تھا۔ یہاں میرے پیروں میں زنجیریں ڈال دی گئیں۔''

میں نے کہا ''مجھے تم سے ہمدردی ہے مگر یہ خاندان' جس میں تم پیدا ہوئیں اور یہ معاشرہ' اس میں لڑکی ہونا تمہاری بدنصیبی تھی۔''

''کزن......!'' اس نے مجھے ترچھی نظر سے دیکھا ''اگر تم میرے شوہر ہوتے تو کیا مجھے یہ سب کرنے دیتے؟ ایمانداری سے بتاؤ؟''

''شاید نہیں'' میں نے اعتراف کیا۔

''یہی وجہ تھی کہ میں نے افضل کو چنا۔ اس کی محبت میں تو کوئی شک نہیں۔ وہ بس مجھے خوش دیکھنا چاہتا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا تھا یہی سوال۔ تو اس نے کہا کہ تمہاری خوشی میں ہی میری خوشی ہے۔ اس سے شادی کر کے میں پھر رقص شروع کر دوں گی۔ سیکھوں گی' ریاض کروں گی اور دیکھ لینا' ایک دن کلاسیکی ڈانس میں میرا بھی نام ہوگا۔ ناہید صدیقی اور شیما کرمانی کی طرح۔''

''میری نیک خواہشات تمہارے ساتھ ہیں'' میں نے کہا۔

''جب والدہ نے مجھے سمجھانا شروع کیا بلکہ پٹی پڑھانی شروع کی کہ مجھے سب کچھ بھول کے اپنی ساری توجہ تمہیں پھانسنے پر صرف کرنی چاہیے۔ تو انہوں نے کہا کہ رابعہ وہ تو سچ مچ کا راجکمار بن گیا ہے۔ کروڑوں کی جاگیر مل گئی ہے اسے۔ وہ کتنا پڑھا لکھا ہے' کتنا خوبصورت ہے۔ یہ بتانے کی بات ہی نہیں' تیرا اس کا بچپن کا ساتھ ہے۔ پتا ہے تم چھوٹے تھے تو کیا کرتے تھے...... انہوں نے بہت سے شرمناک واقعات دہرائے۔''

میں نے کہا ''کیا انہیں وہ سب نہیں معلوم...... جو تم جانتی ہو؟''

''کیوں نہیں معلوم۔ انہوں نے فرمایا کہ رابعہ! اس ولایتی میم' معاف کرنا انہوں نے کہا تھا ولایتی کتیا...... اس کا پتا تو خود بخود صاف ہو گیا۔ اب رہ گئی وہ قطامہ حرافہ اینڈ فاحشہ یعنی فریال......!''

''چچی کی زباندانی کا میں قائل ہوں'' میں نے کہا۔

''انہوں نے کہا کہ وہ یہاں آئے تو سہی...... اس کی تو میں بنا دوں گی چٹنی۔ اس کو کالے جادو اور سفلی علم سے پاگل خانے نہ پہنچا دیا تو میرا بھی نام آمنہ نہیں۔ تو ذرا عقل سے کام لے اور سوچ کہ افضل کیا چیز ہے رفیق کے آگے۔ جیسے راجا

سب کو حاصل رہتا ہے کہ اپنی کوئی بھی چیز کسی کو بھی بخش دی مگر انصاف بھی تو کوئی چیز ہے۔"

"اگر انہوں نے ناانصافی کی تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ میں خود نہیں جانتا کہ ایسا کیوں ہوا؟ کیوں انہوں نے میرا انتخاب کیا۔ کیا نذیر چچا مجھ سے توقع رکھتے ہیں کہ اب میں نصف ان کے نام کردوں؟"

"ابا تو نہیں مگر اماں کو سخت صدمہ پہنچا ہے۔ وہ ضرور تم سے بات کریں گی۔ ان کا خیال یہ ہے کہ تم لندن میں تھے' تم نے عقیل احمد سے مل کے کوئی چکر چلایا' اسے کوئی پٹی پڑھائی۔"

میں نے برہمی سے کہا "لاحول ولاقوۃ۔ مجھے تو پتا بھی نہیں تھا کہ وہ لندن میں ہے۔ اس نے میرا پتا چلایا۔"

"یہ کہا جا رہا ہے کہ جیسے پہلے کفیل احمد نے غلط بیانی کی تھی کہ وہ اکیلا وارث ہے' ایسے تم نے فائدہ اٹھایا۔"

"رابعہ! خدا کی قسم ایسا نہیں ہے۔"

"میں کب کہہ رہی ہوں کہ ہے۔ مگر لوگوں کی زبان کون پکڑ سکتا ہے۔ ابا نے عملی صورت حال کو قبول کرلیا ہے کہ ایسا ہونا چاہیے تھا مگر نہیں ہوا تو اس میں تمہارا یا کسی اور کا کیا قصور۔ عقیل احمد نے زیادتی یقیناً کی۔ وہ دراثت کا معاملہ شرع اور قانون کے مطابق طے کرتے......"

"کیا یہ تمہارے جذبات ہیں؟"

"کزن! مجھے یہ بتاؤ کہ تمہاری اور میری پوزیشن میں کیا فرق ہے؟ آخر میرے ابا کے ساتھ ایسا کیوں ہوا؟ بے شک انہوں نے تمہارے دادا کو کچھ نہیں دیا مگر تمہیں دے دیا' بات تو ایک ہی ہے۔ حق تو اتنا ہی میرا بھی تھا۔"

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "رابعہ! میں تمہاری بات سے سو فیصد اتفاق کرتا ہوں۔ قانونی طور پر عقیل احمد مرحوم کا فیصلہ غلط نہیں تھا۔ اخلاقی اعتبار سے تھا لیکن اب میں کیا کروں؟"

"یہ تم خود سوچو کہ تمہیں کیا کرنا چاہیے۔ اماں آئیں گی تمہارے پاس فریاد لے کر۔ جھولی پھیلا کے حق اور انصاف کی دہائی دیں گی۔ نہیں گی کہ مرنے والا تو بیمار اور ذہنی طور پر بھی مفلوج تھا مگر تم کو سوچنا چاہیے۔ اس حق تلفی کا ازالہ تم کر سکتے ہو۔"

میں نے کہا "مطلب یہ کہ آدھی جائیداد انہیں دے دوں؟"

رابعہ نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا "دے دوگے رفیق صاحب تو غریب تو نہیں ہو جاؤ گے......اور نہیں دو گے تو......"

"تو کیا ہوگا؟" میں نے بوجھل دل کے ساتھ کہا۔

اس نے ایک گہری سانس لی "پتا نہیں ایسی بات مجھے کہنی چاہیے یا نہیں مگر کزن......! تمہارے ساتھ میں ہمیشہ مخلص رہی ہوں کیونکہ تم میرے ساتھ مخلص تھے۔ دولت کی مجھے ہوس بہرحال نہیں ہے لیکن میری والدہ......ان کی فطرت مجھ سے بالکل مختلف ہے۔ وہ تمہارے لیے خطرناک بھی ثابت ہو سکتی ہیں۔"

"کیا مطلب......؟" میں نے کہا "وہ مجھ پر تعویذ گنڈے کرائیں گی' سفلی عمل اور کالا جادو کرائیں گی۔"

وہ کچھ دیر فرش کو دیکھتی رہی اور پھر کھڑی ہوگئی۔ "سوچو کزن! کروڑوں کی جاگیر حاصل کرنے کے لیے کوئی کس انتہا تک جا سکتا ہے؟"

میں دم بخود رہ گیا۔ جاتے جاتے رابعہ نے واضح الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ حق دراثت کو منتقل کرنے کے لیے میری جان بھی لی جا سکتی ہے۔ جتنا مجھے ملا تھا' اس سے بہت کم کے لیے قتل کیے جاتے ہیں۔ اگر اتنی بڑی جاگیر حاصل کرنے کے لیے کوئی بھی قتل کردے یا کرادے اور وہ قتل کسی طرح بھی قتل ثابت نہ ہو بلکہ حادثہ نظر آئے یا طبعی موت تو جاگیر بالآخر کے ملے گی......میرے بعد وارث کون ہوگا......؟

اب صبح ہوگئی تھی اور گھر کے اندر سے سنائی دینے والی آوازیں یہ ظاہر کرتی تھیں کہ ماں نماز اور تلاوت سے فارغ ہو کے اب کچن میں مصروف ہوگئی ہیں۔ شاید ابا اور چچا بھی چائے پی رہے ہوں گے۔ رابعہ کی قدر میرے دل میں بڑھ گئی تھی۔ اس کی صاف گوئی اور اس کے خلوص نے مجھے بے حد متاثر کیا تھا۔ اس نے میری آنکھیں کھول دی تھیں اور مجھے ان اندیشوں سے ہوشیار کردیا تھا جن سے میں اپنی سادگی میں بالکل بے خبر تھا۔

جاگیر کی نحوست کے سائے اب میرے خاندان اور مستقبل کی طرف بڑھ رہے تھے اور میرا دل دہشت انگیز خیالوں کی یلغار میں تھا۔ کیا اب زندگی بھر رشتوں کی آبرو کا بھرم رکھنے والے بھائیوں کے دل بدظن ہو جائیں گے؟ محبت کی جگہ کدورت اور نفرت پروان چڑھے گی؟ جاگیر وجہ عداوت بن جائے گی؟ ریشہ دوانیاں اور سازشیں ہوں گی۔

اپنے بستر پر لیٹ کر چھت کو گھورتے ہوئے میں نے چشم تصور سے وہ سب دیکھ لیا جو ست بدھائی کی جاگیر اور حویلی سے مجھے متنفر کرنے کے لیے کافی تھا۔ پھر میں نے اس زندگی کا تصور کیا جو میرے والد نے سفید پوشی میں قناعت کے ساتھ

محترمہ فریدہ اشفاق کے قلم سے ایک حسین شاہکار

شکست شب

خواتین کا مقبول ترین ناول

...اکا شکر بجالاتے ہوئے بڑے سکون سے گزاری تھی۔ میں نے اپنی عمر رفتہ پر بھی رشک کیا جو ہوس زر کی بدباطنی سے ...ک تھی۔

رابعہ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اگر آدھی جائیداد تم انصاف کے ساتھ دوسرے حق دار کو دے دو گے تو غریب نہیں ہو جاؤ گے۔ بے شک مجھے ایسا ہی کرنا چاہیے۔

میرے خیالات کی رو ٹیلی فون کی گھنٹی سے ٹوٹ گئی۔ میں نے ریسیور اٹھا کے کہا "ہیلو!"

دوسری طرف سے کسی اجنبی آواز نے کہا "مجھے رفیق احمد سے بات کرنی ہے۔"

میں نے کہا "فرمائیے' میں رفیق احمد ہی ہوں۔"

ایک لمحہ توقف کے بعد دوسری طرف سے کہا گیا "میں لندن سے صفدر سلطان بول رہا ہوں۔"

پہلے مجھے شک ہوا کہ میرے کانوں نے غلط نہیں سنا تو پھر یہ بات غلط ہوگی مگر ہزاروں میل کی دوری سے ہوا کے دوش پر آنے والی اس آواز کو پہچاننا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ میں نے سنبھل کے کہا "جی فرمائیے؟"

اس نے خاصے پُررعونت اور خفگی آمیز لہجے میں پوچھا "کیا تمہیں معلوم ہے کہ فریال کہاں ہے؟"

میں نے پھر خود کو سنبھالا اور سپاٹ لہجے میں پوچھا "یہ میں پاکستان میں بیٹھ کے کیسے بتا سکتا ہوں' جب تمہیں لندن میں بیٹھ کے معلوم نہیں؟"

اس نے قدرے بدتمیزی سے کہا "دیکھو۔ پتا تو مجھے چل ہی جائے گا۔ وہ اپنے فلیٹ پر نہیں ہے۔ کیا وہ پاکستان میں ہے؟"

"میں سارے پاکستان کی خبر نہیں رکھتا اور فریال کے بارے میں مجھ سے سوال کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ تمہاری ذمے داری ہے یا میری؟"

اس نے کہا "مجھ سے چالاکی کرنے کی ضرورت نہیں۔ صرف اتنا بتا دو کہ وہ تمہارے گھر میں تو نہیں ہے؟"

میں نے دہاڑ کے کہا "میرے گھر میں......صفدر سلطان کیا تم نشے میں ہو؟"

"کسی خوش فہمی میں ہرگز نہ رہنا۔ اگر مجھے پتا چلا بعد میں تو ٹھیک نہیں ہوگا۔" اس نے مجھے دھمکی دی۔

"کیا ٹھیک نہیں ہوگا؟ تم تو پہلے ہی اپنے کیے کو بھگت رہے ہو۔ گھر سے اور ملک سے بھاگے ہوئے ہو۔ پہلے اپنے معاملات کو ٹھیک کرلو۔ اس کے بعد مجھے ٹھیک کرنے کی بات کرنا" میں نے غرا کے کہا اور فون بند کردیا۔

صفدر سلطان کے رویے اور لہجے پر مجھے سخت طیش آرہا تھا مگر اس سے زیادہ پریشانی اس بات سے ہو رہی تھی کہ آخر صفدر سلطان کو مجھ سے پوچھنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی؟ شک تو اسے مجھ پر ہمیشہ رہا مگر میں اپنی دانست میں بہت محتاط تھا۔ میں فریال سے بہت کم ملتا تھا اور ہم رازداری برتنے کی ضرورت کو کبھی نظر انداز نہیں کرتے تھے۔ اس کے باوجود صفدر سلطان نے مجھے فون کیا۔ آخر کیوں؟ کیا کسی نے اسے بتا دیا تھا کہ فریال میرے ساتھ تھی۔ لندن سے روانہ ہونے سے پہلے میں نے آخری شام اسی کے ساتھ گزاری تھی۔

دوسرا پریشان کن خیال یہ تھا کہ اگر فریال اپنے فلیٹ میں نہیں ہے تو پھر کہاں ہے؟ صفدر سلطان نے پہلے اسے لندن ہی میں تلاش کیا ہوگا۔ اس کے سارے ٹھکانے دیکھے ہوں گے' ہر طرف سے ناکام ہو کے ہی اس نے مجھے فون کیا ہوگا۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ صفدر سلطان نے اسے ٹھکانے لگا دیا ہو اور اب انجان بن کے مجھ سے پوچھ رہا ہو کہ فریال کہاں ہے؟ اپنی بے گناہی پر عیاری کا پردہ ڈالنے کا اصل مقصد مجھے مطلع کرنا ہوگا کہ میری وجہ سے فریال اپنی جان سے گئی۔

ابھی میں ان دہشت انگیز خیالوں کے گرداب میں ہی تھا کہ نیچے کسی نے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ کچھ دیر بعد نیچے سے رابعہ کی آواز آئی۔

"رفیق بھائی! آپ سے ملنے آیا ہے کوئی؟" پھر وہ ہنسی۔

میں نیچے اترا اور دروازے سے باہر نکلا تو ایک برقع پوش خاتون کو دیکھ کے حیران ہوا' میں نے کہا "جی فرمائیے۔ کس سے ملنا ہے آپ کو؟"

"آپ سے......" اس نے کہا اور برقعے کا نقاب الٹ دیا۔

وہ فریال تھی۔

اگر میں لندن میں ہوتا اور فریال ایسے اچانک شٹل کاک برقعے میں میرے سامنے آجاتی تو ہنستے ہنستے میرا برا حال ہو جاتا اور میں اس سے پہلا سوال یہ کرتا کہ یہ کیا ڈراما ہے؟ مگر یہاں اس کا چہرہ دیکھ کے میں اتنا حیران اور پریشان ہوا کہ بولنا ہی بھول گیا۔ آواز میرے حلق میں پھنس گئی۔ میں پتھر کے بت کی طرح دم بخود پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھتا رہ گیا۔

اس نے میری آنکھوں کے سامنے چٹکی بجائی۔ ''اے رومیو! ایسے کب تک دیکھتے رہو گے مجھے؟''

میں چونکا ''مگر فریال...... تم...... یہاں کیسے...... اور کیوں...... میرا مطلب ہے میرے پیچھے پیچھے...... اچانک۔''

میرے الفاظ میں کوئی ربط نہیں تھا۔ وہ لطف لینے کے لیے قہقہہ لگا کے ہنسی ''کیسی باتیں کرتے ہو۔ اگر تمہارے پیچھے نہیں آتی تو کیا ٹونی بلیئر...... کے پیچھے جاتی؟''

میں نے بوکھلا کے سر کھجایا ''وہ تو ٹھیک ہے مگر......''

اس نے مجھے ڈانٹا ''یہ کیا بدتمیزی ہے کہ دروازے پر روک کے اگر مگر کر رہے ہو۔ گھر آئے مہمانوں کے ساتھ ایسا سلوک ہوتا ہے تمہارے یہاں' پہلے تفتیش ہوتی ہے کہ کیوں آئے ہو' کیسے آئے ہو۔ مجھ سے اندر آنے کے لیے نہیں کہو گے۔''

اندر سے رابعہ نے جانتے بوجھتے چلّا کے پوچھا ''کون آیا ہے رفیق بھائی! کس سے باتیں کر رہے ہیں۔''

میں نے کہنے کی کوشش کی کہ فریال آئی ہے لیکن میرے حلق سے بے معنی آوازوں کی غرغراہٹ برآمد ہوئی۔ فریال نے مجھے سخت مشکل میں ڈال دیا تھا۔ اسے انکار کرنے کا یا کچھ سمجھانے کا فائدہ کچھ نہ ہوتا۔ وہ مجھے دھکا دے کر الگ کرتی اور زبردستی گھر میں گھس جاتی۔

اور اس نے یہی کیا ''چلو ہٹو...... راستہ دو۔ مجھے اور میرا سوٹ کیس اٹھا لاؤ۔'' وہ تقریباً غوطہ مار کے میری دائیں بغل سے نکلی...... اور برقع سمیت اندر چلی گئی۔

میں نے سوٹ کیس کو ایسے اٹھایا جیسے اس میں کوئی بم نصب ہے جو چند سیکنڈ میں پھٹ جائے گا۔ دھماکا اب ناگزیر تھا۔ اگر میں پہلے سے تیاری کرتا' اسباب بناتا اور کم سے کم دادی کو یا رابعہ کو شریک راز کر سکتا تو شاید فریال کا ایسے نازل ہونا کم خرابی پیدا کرتا اور میری مشکل کچھ آسان ہو جاتی لیکن اس کے بن بتائے نازل ہونے سے میرے گھر میں بھونچال آنا یقینی تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اپنی پوزیشن کیسے واضح کروں گا اور کیسے سب کو سمجھاؤں گا کہ فریال کی تشریف آوری کسی طے شدہ پروگرام یا سازش کا نتیجہ نہیں ہے۔

جب میں اندر پہنچا تو لاؤنج میں سب لوگ ایک نیم دائرے میں فریال کے مقابل کھڑے اسے یوں دیکھ رہے تھے جیسے چڑیا گھر کی شیرنی' جسے آج تک وہ سلاخوں کے پیچھے دیکھتے آئے تھے' اچانک ان کے سامنے آ کے کھڑی ہو گئی ہے اور اب پوچھ رہی ہے کہ ناشتے میں کسے تناول فرماؤں؟ جلدی فیصلہ کر کے بتائیں' مجھے بھوک لگ رہی ہے۔

میں نے ہکلا کے کہا ''یہ...... یہ فر...... فر...... فریال ہے' پتا نہیں کیوں آ گئی ہے۔''

فریال چمک کے پلٹی ''تمہیں پتا نہیں؟ تمہاری منکوحہ ہوں تو اور کہاں جاؤں گی...... یہی ہے اب میرا گھر۔ کیا تم نے بتایا نہیں تھا انہیں کہ تم مجھ سے شادی کر چکے ہو۔ یہ سب ایسے دیدے پھاڑ پھاڑ کے کیوں دیکھ رہے ہیں مجھے؟''

''شادی......؟'' سب سے پہلے رابعہ نے' پھر ایک سیکنڈ کے وقفے سے دیگر خواتین نے چیخ ماری ''رفیق! یہ کیا کہہ رہی ہے؟''

میں اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے چلّا کے کہا ''یہ بکواس کرتی ہے۔ جھوٹ بولتی ہے۔''

فریال نے بڑے طیش میں برقع اتار کے گولا سا بنایا اور بم کی طرح میری طرف پھینکا۔ ''میں جھوٹ بولتی ہوں۔ نکاح نامہ ہے میرے پاس رومیو' اس پر دستخط ہیں تمہارے...... اور دو گواہوں کے۔''

صوفی چچا نے بہ آواز بلند کہا ''استغفر اللہ۔'' اور پلٹ کے کمرے میں غائب ہو گئے۔ اندر سے انہوں نے تین بار لاحول پڑھی اور پھر کوئی جلالی وظیفہ شروع کر دیا۔ ایسا کرنے میں وہ سو فی صد حق بجانب تھے کیونکہ برقع کے نیچے فریال نے جو لباس زیب تن کر رکھا تھا' وہ لندن کے معیار سے بھی اتنا کم تھا کہ سڑک پر گوروں کے بھی سر گھوم جاتے۔ پاکستانی غیرت قومی سے زمین میں گڑ جاتے یا فریال کے پیچھے پڑ جاتے۔

آمنہ چچی کا آتش فشاں پھٹ پڑا ''اری چھنال! بے حیا' تن پر کپڑا نہیں' آ گئی برقع اوڑھ کے حق جتانے کہ میرا نکاح ہوا ہے۔''

فریال نے اپنے بیگ میں سے سگریٹ نکال کے جلائی ''آف کورس۔ یہ میرا قانونی شوہر ہے۔ میرے ہونے والے بچے کا باپ ہے۔''

دادی نے جوتی اتار کے میری طرف پھینکی ''تو کیا الو کی

طرح دیدے گھما رہا ہے نمونے! پکڑ چوٹی اس جھوٹی حرافہ کی اور نکال باہر کر۔''

میں خاصے جارحانہ عزائم کے ساتھ آگے بڑھا تھا کہ فریال نے اپنے بیگ میں سے ریوالور نکال لیا ''خبردار! جو کوئی میرے قریب آیا۔''

''کیا یہ فریال......'' میں نے محسوس کیا کہ میری آواز ہی نہیں ٹانگیں بھی کانپ رہی ہیں۔

فریال نے اطمینان سے صوفے پر بیٹھ کے ایک ٹانگ پر دوسری ٹانگ رکھی اور سگریٹ کے کش لے کر دھواں چھت کی طرف پھینکا ''کیوں ہیرو! رک کیوں گئے' تمہاری تو پتلون بھی گیلی ہو گئی ہے غالباً!''

میرا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا ''فریال۔ سیدھی ہو کے بیٹھو' لندن میں تو کبھی تم نے ایسا بے ہودہ لباس نہیں پہنا تھا۔''

فریال نے پوز بدل لیا یہ دوسرا پوز زیادہ قابل اعتراض تھا۔ ''بے ہودہ صرف انسان ہوتا ہے' میرا لباس کچھ بھی ہو' رہوں گی تو میں فریال!''

اماں نے زار و قطار روتے ہوئے کہا ''رفیق! اس بے شرم کو میری نظروں سے دور لے جا۔ میں یہ سب برداشت نہیں کر سکتی۔''

ابا کے چہرے پر سخت اذیت کے آثار تھے۔ ان کا ایک ہاتھ اپنے سینے پر تھا۔ ''رفیق بیٹا!'' انہوں نے کراہ کے کہا ''قصور تمہارا نہیں' یہ ہمارے اعمال کی سزا ہے...... آہ......''

اماں نے انہیں سہارا دیا اور وہ لڑکھڑاتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف جانے لگے۔ دادی نے سینے پر دو ہتھڑ مارے اور دوپٹا پھیلا کے آسمان کی طرف دیکھا ''یا میرے اللہ' تو مجھے اٹھا کیوں نہیں لیتا۔''

میں نے چیخ کے کہا ''فریال! یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔ اگر کسی کو کچھ ہوا تو......''

''تو کیا...... بولو'' اس نے مجھے آنکھ ماری ''یار' کیا میں سمجھتی نہیں' یہ سب لوگ ڈراما کر رہے ہیں۔ لباس کے معاملے میں خوامخواہ اتنے جذباتی ہو رہے ہیں۔ بعد میں سب ٹھیک ہو جائیں گے۔ تم دیکھ لینا...... اچھا اب مجھے بتاؤ کہ ہمارا کمرا کدھر ہے۔ میں آرام کرنا چاہتی ہوں۔''

میں نے دھاڑ کے کہا ''الو کی پٹھی۔ نکل جاؤ یہاں سے' دفع ہو جاؤ۔''

فریال پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے سگریٹ کے باقی ٹکڑے کو ایک انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے دور اچھال دیا۔

''رومیو! یہ لڑکی کون ہے؟''

وہاں اب رابعہ کے سوا کوئی نہیں تھا۔ اس نے آگ بگولا ہو کے کہا ''میں بتاتی ہوں تجھے کہ میں کون ہوں۔ میں رفیق کی عم زاد ہوں یعنی کزن۔ ہماری منگنی بچپن میں ہی طے کر دی گئی تھی۔ اور اب میں اس کی پہلی اور خاندانی بیوی ہوں۔''

میں نے چلّا کے کہا ''رابعہ......! واٹ نان سنس۔''

رابعہ اسی طرح بولتی رہی ''مجھ سے تحریری اجازت لیے بغیر یہ دوسری شادی کیسے کر سکتا ہے۔ مسلم عائلی قوانین مجریہ 1961 کے تحت تم دونوں اندر ہو جاؤ گے۔''

میں نے اپنے سر پر ہاتھ مارا ''یہ کیا بکواس لگا رکھی ہے تم نے...... کیا تم بھی پاگل ہو گئی ہو؟''

اسی وقت کال بیل بجی اور فریال نے تلخی سے ہنس کے کہا ''لو...... وہ بھی آ گئی۔ میم صاحب...... گورے لارڈ کی اولاد۔''

میں نے کہا ''کون...... عائشہ؟''

دروازہ کھلا ہوا تھا۔ عائشہ سیدھی اندر آ گئی۔ میں پھر پتھر کا بت بن گیا۔ عائشہ نے مجھے دیکھتے ہی چیخ ماری ''رفیق......! آئی ایم ہیئر......'' اور پھر مجھ سے لپٹنے کے لیے بانہیں پھیلا کے دوڑی لیکن اس نے زری گوٹے کے کام والا بہت بھاری شرارہ پہن رکھا تھا جو اتنا وسیع و عریض تھا کہ پھیلایا جاتا تو شامیانہ بن جاتا۔ اس کے ساتھ بنارسی دوپٹا بھی تھا اور سر سے پاؤں تک اس نے سیروں وزن کے بھاری گہنے لاد رکھے تھے چنانچہ کوئی قابل اعتراض بوس و کنار کا منظر پیش کرنے سے پہلے ہی وہ الجھ کے فریال کے قدموں میں جا گری۔

فریال نے اسے بڑی حقارت سے دیکھا ''تو یہاں بھی پہنچ گئی رفیق کے پیچھے دم ہلاتی' ولایتی کتیا!''

عائشہ نے متانت سے اپنا لباس درست کیا ''میں ایک عالی نسب خاندانی لڑکی نہ ہوتی تو ایسی ہی بازاری زبان میں تم کو دندان شکن جواب دیتی۔''

فریال نے تلخی سے کہا ''میں نے تو تجھے جہاز میں ہی دیکھ لیا تھا۔ اچھا ہوتا اگر دروازہ کھول کے تجھے سمندر میں پھینک دیتی۔ لال جوڑا تو یوں پہن کے آئی ہے جیسے آج ہی رفیق سے تیرا بیاہ ہو گا۔''

عائشہ دوسرے صوفے پر بیٹھ گئی۔ ''وہ تو ہو گا...... کیوں رفیق! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟ مجھے کچھ دیر اس لیے ہو گئی کہ میں یہ برائڈل ڈریس لینے چلی گئی تھی اور دلہن بننے کے

بعد میں نے سوچا کہ بیوٹی پارلر سے میک اپ بھی کرا ہی لوں۔ کیسی لگ رہی ہوں میں؟''

میں نے اپنا سر پیٹ لیا ''خدا کے لیے تم سب خاموش ہو جاؤ۔ اگر تم نے اپنی بکواس بند نہ کی تو میں خودکشی کرلوں گا۔ تم سب بیوہ ہو جاؤ گی شادی سے پہلے ہی۔''

فریال نے بے پروائی سے کہا ''یار! ایک تہائی بیوی بننے سے تو واقعی بیوہ ہو جانا ہی اچھا۔ تم چاہو تو خودکشی کے لیے یہ ریوالور لے لو۔''

میں نے طنز سے کہا ''میں سمجھ گیا.......... یہ نقلی ہے۔''

''شٹ اَپ...... ایک گولی سے میں صفدر سلطان مرزا کو جہنم رسید کر چکی ہوں۔ کہو تو دو گولیاں چلا کے دکھاؤں...... ان دونوں کو بھی وہیں بھیج دوں؟'' فریال نے ریوالور کا رخ باری باری عائشہ اور رابعہ کی طرف کیا۔

عائشہ نے نرمی سے کہا ''پلیز فریال! ایسی بات مت کرو۔ ٹیک اِٹ ایزی...... ہم اس مسئلے کا حل نکال سکتے ہیں۔''

میں نے کہا ''اقوام متحدہ بھی یہ مسئلہ حل نہیں کرسکتی۔''

عائشہ نے نفی میں سر ہلایا ''رفیق۔ تم کیوں پریشان ہو۔ اگر تم نے فریال سے پہلے شادی کرلی ہے تو مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ میں دوسری بیوی بننے کے لیے تیار ہوں۔''

فریال نے قہقہہ لگایا ''اب تم دوسری بھی نہیں' تیسری ہو دخترِ لارڈ۔ ہمارے اس چکرباز عاشق نے ایک تو پہلے ہی کرلی تھی۔''

عائشہ نے دلچسپی سے کہا ''اچھا! پہلی کون ہے؟''

رابعہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کے آگے آئی ''دیکھ لے مجھے گوری۔ میں ہوں پہلی...... اور جنگل خاندانی بیوی جس کی ایڈوانس بکنگ تھی برسوں سے۔''

عائشہ نے سر ہلایا ''ٹھیک ہے۔ رفیق نے مجھے بتایا تھا کہ وہ چار کرسکتا ہے۔ فی الحال ہم تینوں کو پُرامن بقائے باہمی کے کسی سمجھوتے کی ضرورت ہے۔''

''یہ ناممکن ہے۔ حجلۂ عروسی میں صرف ایک دلہن کی گنجائش رکھی جاتی ہے۔ تین دلہنوں کی پارکنگ نہیں ہوسکتی۔''

رابعہ نے اتفاق کیا ''ایک نیام میں تین تلواریں کیسے سما سکتی ہیں؟''

عائشہ نے کچھ دیر سوچ کے کہا ''میں سمجھ گئی۔ یہ گھر واقعی چھوٹا ہے لیکن اب تو ہمارے شوہر کے پاس بکنگھم پیلس جیسی خاندانی حویلی ہے۔ وہ شاہی حرم آباد کرسکتا ہے۔ مسئلہ ہے رفیق کا جو صرف ایک ہی ہے۔ گزارہ تو کرنا ہی پڑے گا ہمیں۔''

رابعہ نے کہا ''گزارہ کرتی ہے میری جوتی۔''

فریال نے ریوالور کو عائشہ کی پسلیوں پر رکھ کے دبایا ''ولایتی چڑیل' رفیق کوئی دولت مشترکہ نہیں ہے' وہ صرف میرا ہے۔''

رابعہ چلائی ''سب سے پہلا حق میرا ہے' میں پہلی بیوی ہوں۔''

فریال نے ریوالور کا رخ رابعہ کی طرف کردیا ''رفیق کی بیوی صرف میں ہوں۔ پہلی بھی اور آخری بھی' تم دونوں جاؤ بھاڑ میں۔''

اچانک اندر سے آمنہ چچی دہائی دیتی برآمد ہوئیں ''ارے تجھ پر اللہ کی مار۔ تیری صورت پر پھٹکار۔ بے حیا بدکردار' میرا داماد ہتھیانا چاہتی ہے نابنجار۔ میری رابعہ ہے اس کی حق دار۔''

فریال نے غرا کے کہا ''یہ کیا شاعرانہ بکواس لگا رکھی ہے بڑھیا۔ کیوں اپنی جان سے جانا چاہتی ہے۔''

چچی نے پلٹ کر ہانک لگائی ''اجی کیا کر رہے ہو' دیر کس بات کی ہی۔ آخر کب ختم ہوگا تمہارا جلالی وظیفہ؟''

اندر سے صوفی چچا کسی آتش فشاں کی طرح گڑگڑائے ''آرہے ہیں شاہ جنات' بریک فاسٹ کررہے ہیں۔''

چچی نے ہاتھ لہرا کے کہا ''ان سے کہو' بھسم کرڈالیں اس چڑیل کو۔''

صوفی چچا اندر سے ایک لمبی ڈنڈی والا کڑچھا اٹھائے نکلے جس میں انگارے دہک رہے تھے۔ انہوں نے آگ پر کچھ پڑھ کے چھڑکا تو ایک دم دھوئیں کا مرغولہ سا اٹھا۔

رابعہ نے قہقہہ لگا کے کہا ''اب دیکھنا کیا ہوتا ہے فریال! ابا کے کالے جادو کی کاٹ نہیں۔''

فریال نے قہقہہ لگایا ''اس کی کاٹ یہ ہے'' اور ریوالور اٹھا کے صوفی چچا پر فائر کیا۔

میں بجلی کی طرح لپکا ''نہیں فریال'' میں ایک دم صوفی چچا کے سامنے آگیا۔ گولی میرے سینے پر لگی' میں نے ایک چیخ ماری۔

اس کے ساتھ ہی مجھے یوں لگا جیسے بارش شروع ہوگئی ہے۔ پھر میرے کانوں میں رابعہ کے ہنسنے کی آواز آئی۔ میں گھبرا کے اٹھ بیٹھا۔

''کیا خواب دیکھ رہے تھے ہیرو؟'' رابعہ نے ہنستے ہنستے کہا۔

میں نے اسے ہونقوں کی طرح دیکھا ''رابعہ' کیا میں زندہ ہوں؟''

''نہیں' فوت ہوچکے ہو'' اس نے باقی پانی مجھ پر پھینک دیا۔ ''لگتا ہے رات کو میرے جانے کے بعد چڑھالی تھی۔ ولایت سے لائے ہوگے نا۔ خیر اب ہوش میں آجاؤ۔ سب ناشتے پر تمہارا انتظار کررہے ہیں۔''

جب وہ چلی گئی تو میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ اس میں نو بج رہے تھے۔ رابعہ فجر کی نماز کے بعد گئی تھی تو میں کچھ دیر کے لیے بستر پر دراز ہوگیا تھا۔ اس وقت چھ بجے تھے۔ میں نے ساری رات اپنی خاندانی جاگیر کی خونی داستان پڑھتے گزاری تھی۔ میرے ذہن پر ان تمام باتوں کا اثر بھی تھا جو مجھے رابعہ نے بتائی تھیں۔ میں نے فون پر عائشہ کے باپ سے بھی بات کی تھی اور صفدر سلطان مرزا سے بھی۔ ان سب تفکرات نے مل کر ایک بے سروپا خواب کی شکل اختیار کرلی تھی۔

ہاتھ منہ دھو کے کپڑے بدلتے ہوئے اس خواب کے مناظر یاد آئے تو مجھے بے ساختہ ہنسی آئی لیکن میں نے اس کا تذکرہ کسی سے بھی نہیں کیا۔ حقیقت کی دنیا میں مجھے بیک وقت بہت سے سنگین مسائل کا سامنا تھا اور ان کے مقابلے میں خواب غیراہم ہوگئے تھے۔ میں کنفیوژن کا شکار تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس مسئلے کو بلحاظ اہمیت ترجیح دوں اور ان کے حل کے لیے کون سی سمت میں قدم اٹھاؤں۔

فوری تشویش کا سبب فریال کی خیر و عافیت تھی۔ صفدر سلطان کا مجھے فون کرنا دو متضاد مقاصد کی عکاسی کرتا تھا۔ یا تو سچ مچ فریال لاپتا تھی اور وہ اس کے لیے اتنا متفکر تھا کہ لندن میں تلاش کے سارے امکانات ختم ہوگئے تو انتہائی مجبوری میں آخری کوشش کے طور پر اس نے مجھ سے رابطے کی ذلت کو بھی قبول کرلیا یا پھر خطرہ وہی تھا جس کی طرف سب سے پہلے میرا خیال گیا تھا۔ فریال کی کسی حرکت پر اشتعال کی انتہائی کیفیت میں اس نے فریال کو قتل کردیا اور اس کی لاش کو غائب کرنے کے بعد اب اپنی بے گناہی کی تشہیر کے لیے سارے زمانے سے پوچھتا پھر رہا ہے کہ فریال کہاں ہے؟

وہ پاکستان کے کسی شہر یا قصبے کا معاملہ نہیں تھا جہاں دھن' دھاندلی یا دھونس سے وہ اپنے جرم کی پردہ پوشی میں کامیاب ہوجاتا۔ یہاں قانون اور انصاف کے رکھوالے خود اس کی مدد کرتے اور نام نہاد تفتیشی کارروائی کے بعد کیس یوم حشر تک کے لیے لاکھوں انصاف طلب مقدمات کے قبرستان میں دفن ہوجاتا۔ بقول شاعر......

نہ بام پر کوئی دھبا نہ خاک پر کوئی داغ
کہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں لہو کا سراغ
نہ مدعی' نہ شہادت' حساب پاک ہوا
یہ خون خاک نشیناں تھا رزق خاک ہوا

لندن میں ایسا نہیں تھا۔ وہاں جرم کی نوعیت قانونی ہو یا محض اخلاقی' رائے عامہ پر اثرانداز ہونے والے سارے ادارے' میڈیا پبلک اور انصاف و قانون کی عمل داری قائم کرنے کے ذمے دار سب ایک ساتھ حرکت میں آجاتے ہیں اور جتنا مشکل جرم کا ارتکاب ہوتا ہے اس سے کہیں زیادہ مشکل اسے چھپانا ثابت ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ کوئی کیس کبھی ختم نہیں ہوتا۔ حل نہ ہونے والے کیس کی فائل بند کرکے کولڈ اسٹوریج میں پھینکنے کا کوئی تصور نہیں۔ برسوں بعد بھی مجرم کو یہ اعتماد اور اطمینان حاصل نہیں ہوسکتا کہ اب ڈر کی کوئی بات نہیں رہی۔ غیرحل شدہ جرائم کا ریکارڈ تازہ ترین صورت حال کے ساتھ ہر وقت دستیاب رہتا ہے اور جیسے ہی کوئی نئی شہادت سامنے آئے تحقیقات کا دفتر پوری مستعدی کے ساتھ پھر کھل جاتا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ صفدر سلطان کو فریال کے لاپتا ہونے کی فکر تھی۔ اسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ سب سے پہلے شک اسی پر جائے گا اور اس کے لیے تفتیش کرنے والوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنا ناممکن ہوگا۔ اگر اس نے فریال کو قتل کیا ہوگا تو اب وہ اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے حالات و واقعات کی شہادت پیدا کرے گا۔ سراغ مٹائے گا اور اپنے قانونی دفاع کے حصار کو مضبوط کرے گا۔

میں یہ جاننے کے لیے مضطرب تھا کہ حقیقی صورتِ حال کیا ہے۔ اگر فریال زندہ ہے تو میرے لندن سے آنے کے اڑتالیس گھنٹے کے اندر ایسی کیا بات ہوئی کہ وہ روپوشی اختیار کرنے پر مجبور ہوگئی۔ گھوم پھر کے میرے شکوک صفدر سلطان پر فوکس ہوجاتے تھے۔ صرف وہی تھا جس سے فریال کو خطرہ لاحق ہوسکتا تھا۔ لیکن نہ میرے پاس صفدر سلطان کا فون نمبر اور پتا تھا کہ میں اس سے کچھ پوچھ سکتا یا بالواسطہ طور پر لندن میں اس کی نقل و حرکت کے بارے میں کسی سے معلومات لے سکتا۔ نہ مجھے یہ اندازہ تھا کہ فریال کہاں ہوگی؟ عائشہ کے لیے تو میں نے سوشی کو معلومات کا ذریعہ بنالیا تھا۔ عائشہ کی ماں نے کچھ نہیں بتایا تھا مگر باپ نے کچھ نہیں چھپایا تھا۔ لندن میں میرے دوست ہمدرد اور شناسا بہت تھے لیکن فریال کا معاملہ مختلف تھا۔ میں اس کے ساتھ اپنے تعلق کو کسی طرح بھی اسکینڈل کی بنیاد نہیں بنا سکتا تھا۔

اچانک مجھے اس مہربان لیڈی ڈاکٹر کا خیال آیا جو فریال کی رازدار اور مددگار تھی۔ فریال علالت کے بہانے چیک اپ کے لیے اس کے پاس جاتی تھی۔ اپنی گاڑی باہر کے پارکنگ ایریا میں چھوڑتی تھی اور اندر سے ڈاکٹر کی کار میں بیٹھ کے مجھ سے ملنے آجاتی تھی۔ اس کا پیچھا کرنے والے جاسوس اور پہرے دار بے وقوفوں کی طرح فریال کی کار پر نظر رکھے مطمئن بیٹھے رہتے تھے کہ مالکن اندر ہی ہے۔ وہاں وہ صبح سے شام تک رہے تو اس کی مرضی۔ صفدر سلطان بھی جانتا تھا کہ لندن میں فریال کی ایک ہی دوست ہے اور فریال کبھی ضرورت کے تحت جاتی ہے اور دو چار گھنٹے گپ شپ میں گزار لیتی ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ رات کو وہ ہمیشہ اپنے فلیٹ میں ہوتی تھی اور باہر جہاں جاتی تھی، وہ بازار ہو، کلب یا ہوٹل، اس کا شوفر لے جاتا تھا جو صفدر سلطان کا نمک خوار غلام تھا اور فریال کے روز و شب کی تمام مصروفیات کی مکمل رپورٹ اپنے آقا کو ارسال کرتا رہتا تھا۔

میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ لندن میں ابھی صبح کے پانچ بجے تھے۔ فریال کی دوست لیڈی ڈاکٹر شائستہ بڑی خوش اخلاق تھی۔ میں اس سے کئی بار مل چکا تھا۔ وہ خاموش طبع اور بہت لیے دیے رہنے والی عورت تھی۔ میں نے اسے کبھی قہقہہ لگا کے ہنستے ہوئے یا اونچی آواز میں بے تکلفی سے بات کرتے نہیں دیکھا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کام کی بات کے سوا کوئی بات کرنا اسے اچھا نہیں لگتا۔ بعض اوقات تو مجھے کوفت ہونے لگتی تھی۔ میں نے فریال سے کہا تھا کہ آخر تمہاری یہ سہیلی اتنی آدم بیزار کیوں ہے؟

فریال نے کہا تھا ''تمہیں دیکھ کے اسے کچھ ہوجاتا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے چڑ کے کہا ''میری صورت ایسی ہے؟''

فریال نے متانت سے سر ہلا دیا ''غالباً...... بلکہ یقیناً۔''

''لاحول ولا قوۃ۔ اپنی صورت دیکھی ہے اس نے......''

''رومیو! اس پچ سے تمہیں مرچیں لگی ہیں نا۔ اس کا شوہر تو مرتا ہے اس کی صورت پر۔''

اب میں نے خود کو کنٹرول کیا ''وہ دراصل...... پیشہ ور عاشق اور کامیاب شوہر جھوٹ بولنے پر مجبور ہوتے ہیں...... میری طرح......''

میرے نزدیک فریال کی اور اس کی دوستی میں اتنی بھی قدر مشترک نہیں تھی جتنی قاضی حسین احمد اور بے نظیر بھٹو میں۔ بعض اوقات مجھے شک ہوتا تھا کہ فریال اس دوستی کو ایک ذاتی مقصد کے لیے اہمیت دینے پر مجبور ہے مگر ایسا ہرگز نہیں تھا۔ ایک بار میں نے چھپ کر ان کی باتیں سنیں تو شرم سے میرے کان لال ہوگئے۔ وہ ٹین ایجرز کی طرح بڑی بے شرمی کی باتیں کررہی تھیں، خوب شور مچا رہی تھیں اور ہنس رہی تھیں۔ اس روز میں نے آئینے میں اپنی صورت کا بغور جائزہ لیا کہ آخر مجھے دیکھ کے اسے کیا ہوجاتا ہے لیکن پھر اسی نتیجے پر پہنچا کہ خرابی اس کے دماغ میں ہے۔

اس کا شوہر بھی ڈاکٹر تھا اور کوئی بیس سال پہلے لندن آ کے آباد ہوا تھا۔ دس سال قبل وہ پاکستان کے پنڈ دادن خان گیا اور وہاں سے اپنی بچپن کی اس محبت کو عقد کی زنجیر میں باندھ کے لے آیا جو اپنے محبوب کی فرمائش پر ڈاکٹر بنی تھی۔ فتور دونوں کی نظر میں اور عقل میں تھا جو کوئی انوکھی بات نہ تھی۔ عشق ایسا ہو تو پھر یہی ہوتا ہے۔ مجھے سخت تعجب ہوتا تھا کہ شوہر کے منصب پر فائز ہونے کے باوجود وہ ڈاکٹر بدستور عاشق صادق کا رول بھی بڑی دل جمعی سے کررہا تھا۔ یہ ایکٹنگ بھی نہیں تھی۔ لندن جیسے شہر میں اور ایک اسپتال میں اسے دل لگی کے مواقع ہمہ وقت دستیاب تھے۔ خصوصاً یوں کہ وہ ہینڈسم بھی تھا۔ مگر اس نے تو جیسے غلطی سے بھی کسی پر غلط نگاہ ڈالنے کے گناہِ کبیرہ سے بچنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ میں نے فریال کے سامنے بڑے وثوق سے اعلان کیا تھا کہ سالا ڈرامے باز ہے۔ بیوی کو الو بناتا ہے...... مگر فریال نے جواب میں میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بڑے چیلنج کرنے والے انداز میں کہا کہ کوئی الو کا پٹھا یہ ثابت بھی تو کرے۔ اس کے بعد مجھ پر لازم ہوگیا کہ میں کسی پرائیویٹ سراغ رساں کی طرح کام کروں جو بیویوں کو طلاق حاصل کرنے کے لیے شوہر کی بے وفائی کے سارے ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ میں نے یہ کام بلامعاوضہ کیا۔ جھک ماری اور اپنی عقل پر ماتم کرتا رہا۔ وہ واقعی کاٹھ کا الو تھا۔

☆☆☆

اگر ابھی میں فون کرتا تو وہ لیلیٰ مجنوں ہرگز برا نہ مانتے مگر خود میں نے لذت خواب سحر میں دخل اندازی سے گریز کیا۔ راجا میرا بے تکلف دوست ہی نہیں ایک مضبوط سہارا بھی تھا۔ اپنے لامحدود وسائل اور کسی حد تک شیطانی ذہانت کے باعث اس کی مدد سے میرے مشکل کام بھی آسان ہوجاتے تھے۔ اپنے موجودہ حالات میں مجھے ہر لمحہ اس کی مشاورت درکار تھی۔

فون کرنے کے بجائے میں نے اس کے گھر جانے کا فیصلہ کیا۔ نہ وہ اس وقت آفس میں ہوسکتا تھا اور نہ پریس میں۔ عام طور پر وہ رات کے دو بجے اخبار کی آخری ... کے پریس میں جانے کے بعد فارغ ہوجاتا تھا تو گھر ... سوجاتا تھا اور پھر دوپہر تک سوتا رہتا تھا۔ میرا خیال تھا ... اس کے اٹھنے کا وقت ہوگیا ہے لیکن وہ غائب تھا۔

... ڈور لاک کو دیکھ کے اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ دروازہ اندر ... بند ہے یا مقفل ہے اور بار بار گھنٹی بجانے کے باوجود ... اوقات اس کی آنکھ نہیں کھلتی تھی۔ اس کی بھی ایک وجہ ... پہلے وہ سوتے وقت کانوں میں روئی ٹھونس لیتا تھا۔ ... میں وہ ایئر پلگ لے آیا جس سے کان بالکل ہی بند ... جاتے ہیں۔ اس کے دائیں بائیں رہنے والے دو ... کے درمیان ایک ختم نہ ہونے والی نظریاتی جنگ ... رہی تھی جو وقت کے ساتھ ساتھ شدت اختیار کررہی تھی۔ ... طرف کسی مدرسے کے مہتمم مولانا کا انتہا پسند مذہبی گھرانا ... وہ نماز فجر کے بعد اپنے ڈیک پر پہلے تلاوت کے اور پھر ... کے کیسٹ...... اذان کی طرح سارے محلے کو سنانا اپنا ... فریضہ سمجھتے تھے۔ دوسری طرف ایک ایسا گھرانا تھا جہاں ... مغرب کی پیروی گویا ان کے ماڈرن اور مہذب ... کی دلیل تھی۔ درجواب آں غزل۔ انہوں نے مولانا ... کا مقابلہ پاپ میوزک سے شروع کیا۔ دونوں کے ... پاورفل تھے اور کوئی والیوم کم کرتا تو یہ اپنی شکست تسلیم ... اور مدمقابل کو کھلی چھوٹ دینے کے مترادف ہوتا۔

... دور کے گھر ذرا کم متاثر ہوتے تھے اور دواجبی انداز میں ... نے ہمسائیگی کے نام پر امن کی اپیل کرچکے تھے لیکن ... کا اثر نہ ہوا تو سب نے کہا کہ اب کون ان کے منہ لگے ... پھٹے اور سننے پر کوئی راضی نہیں۔ مارا گیا راجا...... وہ بھی ... حرکہ کفر و اسلام کو روکنے میں ناکام رہا۔ ایک طریقہ یہ ... کہ وہ پولیس سے رجوع کرتا مگر اسے معلوم تھا کہ یہاں کا ... اس معاملے میں کتنا بے بس ہے۔ یہاں ''پبلک ...'' کا کوئی تصور بھی نہیں۔ نتیجہ یہ کہ اس نے بھی پبلک ... طرح صابر و شاکر رہنا بہتر سمجھا اور کان بند کر کے سونے ... اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ نعت خوانی اور پاپ میوزک ... پروگرام چل رہے ہیں یا بند ہوگئے ہیں؟ یہ پیش گوئی وہ ... کرتا تھا کہ ایک دن دونوں گھروں کے سربراہ جیل جائیں ... ان کے درمیان مار پیٹ تو ہوچکی تھی۔ اب ایک کے ... ہونے یا دوسرے کے جنت الفردوس میں جگہ پانے ... مرحلہ باقی تھا۔ ''ایک قتل ہوگا اور دوسرا پھانسی چڑھے گا تو ... کانوں سے ایئر پلگ نکال دوں گا'' اس نے مجھے یقین ... دلایا۔

اچھی بات یہ تھی کہ راجا نے دروازے پر ''ان یا آؤٹ'' ہونے کی اطلاع کا نظام اپنا رکھا تھا۔ جب وہ باہر جاتا تھا تو ایک سلائیڈنگ ونڈو سے ''آؤٹ'' کو نمایاں کردیتا تھا اور اندر قدم رکھتے ہی ''ان'' کو سامنے لانا نہیں بھولتا تھا۔

اس کے نام کی تختی کے نیچے ''آؤٹ'' دیکھ کر مجھے کچھ مایوسی اور کچھ حیرانی ہوئی...... یا تو وہ رات کو لوٹ کے آیا ہی نہیں تھا یا پھر صبح سویرے کہیں نکل گیا تھا۔ میں نے شہناز کے گھر فون کیا۔

اس نے خاصی افسردگی سے کہا ''ہاں رفیق بھائی! وہ یہاں ہے، سو رہا ہے۔''

میں نے کہا ''خیریت تو ہے نا؟''

''خیریت کہاں رفیق بھائی! کل رات اس پر کچھ لوگوں نے حملہ کیا تھا۔ ایک خبر شائع ہوئی تھی کسی فیکٹری میں ہڑتال اور تالہ بندی کے اصل اسباب کے بارے میں۔ اب پتا نہیں مالکوں نے غنڈے بھیجے تھے یا خود یونین والے تھے۔ دونوں ایک ہی ہیں، خبر دی تھی راجا نے......''

میں نے کہا ''اچھا، میں آتا ہوں۔''

شہناز کے گھر پہنچ کے میں نے راجا کو دیکھا تو مجھے کچھ تسلی ہوئی۔ وہ ڈرائنگ روم میں قالین پر سو رہا تھا۔ یہ خلاف معمول تھا کیونکہ شہناز کے گھر میں تین بیڈ روم تھے۔ ان میں سے ایک ابتدا سے راجا کے لیے وقف تھا۔ ان کے تعلقات کی یہ نوعیت بڑی عجیب تھی اور میرے سوا ساری دنیا اسے سمجھنے سے قاصر تھی۔ یہ طے تھا کہ ان کی شادی ہوگی۔ شہناز تو خیر بڑی نیک نیتی اور خشوع و خضوع سے راجا کو چاہتی تھی مگر باہر کوئی نہ کوئی چکر چلائے رکھنے والا راجا بھی سچ مچ کسی کے عشق میں مبتلا تھا تو وہ شہناز تھی۔ وہ راجا کا اسی طرح خیال رکھتی تھی جیسے کوئی بھی خدمت گزار اور وفا شعار بیوی رکھ سکتی ہے اور خود راجا ایک روایتی شوہر کی طرح شہناز سے ڈرتا تھا۔ وہ جب چاہتا تھا، شہناز کے گھر میں آ کے سو جاتا تھا مگر اس نے اپنا الگ گھر بھی لے رکھا تھا اور یہ بات صرف میں جانتا تھا کہ ان کے درمیان جہاں بیوی جیسے جسمانی مراسم کبھی نہیں رہے۔ اس کی وجہ شہناز کی سخت گیری تھی تو راجا کی وہ ''شرافت'' بھی جس کا وہ صرف شہناز کے معاملے میں قائل تھا۔

شہناز نے راجا کی ایک جھلک دکھا کے مجھے مطمئن کردیا تو میں نے کہا ''یہ کب آیا یہاں؟''

''صبح چار بجے۔''

میں لاؤنج کی ایک کرسی پر بیٹھ گیا'' اور ڈرائنگ روم

میں کیوں سو رہا ہے؟''

''کہہ رہا تھا ڈاکٹر نے فوم پر سونے سے منع کیا ہے۔ کمر میں بھی چوٹ آئی ہے۔ ریڑھ کی ہڈی پر'' وہ رونے کے قریب ہو گئی۔

میں نے کہا ''شہناز! تم کیسی ڈاکٹر ہو' تم نے دیکھا کوئی ایکسرے...... یا ایم آئی رپورٹ......؟''

''اس نے خود بتایا ہے......''

میں نے کہا ''شہناز! اچھی طرح جانتی ہو تم کہ کرائم رپورٹنگ کرتے کرتے وہ اسٹوری رائٹر بن گیا ہے۔ دنیا بھر کی جھوٹی سچی کہانیاں گھڑتا رہتا ہے۔ مجھے تو وہ ٹھیک لگ رہا تھا۔ میں جگاتا ہوں اسے۔''

شہناز نے تذبذب کا مظاہرہ کیا ''آرام کرنے دیں اسے۔''

میں اٹھ کھڑا ہوا ''سات آٹھ گھنٹے ہو گئے آرام کرتے۔ تکلیف میں ہوتا تو ایسی گہری نیند آتی...... خراٹے یہاں تک سنائی دے رہے ہیں۔ بس وہ تمہیں پریشان کرتا ہے اور تم کو بھی پریشانی اچھی لگتی ہے۔''

میں نے سوتے ہوئے راجا کے لات رسید کی ''اٹھ مردے' منکر نکیر آ گئے۔''

وہ ہڑبڑا کے اٹھا اور شہناز کو دیکھ کے کچھ گھبرایا۔ اس نے کراہ کے کہا ''آہ...... یار' مرے ہوئے کو کیوں مارتا ہے؟''

میں نے کہا ''تیری تو کمر کے سارے مہرے چور چور ہو گئے تھے؟''

اس نے خفگی سے کہا ''میں کیا جھوٹ بول رہا ہوں۔ چوٹیں بہت آئی ہیں۔''

میں نے سر ہلایا ''اس میں کیا شک ہے؟ شہناز نے بتایا کہ تجھے غنڈوں نے گھیر لیا تھا؟''

''ابے ہاں یار! میں اکیلا اور وہ چار'' اس نے دردناک آواز میں کہا اور پھر شہناز سے مخاطب ہوا ''تم کیا سن رہی ہو۔ سب کچھ بتا تو دیا تھا۔ جاؤ' کچھ چائے ناشتے کا کرو۔''

میں نے کہا ''تجھے لے جاتے ہیں کسی اسپتال کے آئی سی یو میں۔ تیری حالت سخت تشویشناک ہے۔''

راجا نے شہناز کو جاتا دیکھا اور دانت پیس کے کہا ''کیا چاہتا ہے آخر تو؟''

میں نے اس کو ہاتھ پکڑ کے ایک جھٹکے سے اوپر اٹھایا اور تھوڑا سا گھما کے آہستہ سے نیچے پھینک دیا ''پچ کیا ہے مہاراجا؟''

وہ ڈھٹائی سے ہنسنے لگا ''اب جانے بھی دے نکے پتر!''

میں نے کہا ''تو شہناز کو پریشان کیوں کرتا ہے؟''

''اسے اچھا لگتا ہے یہ سب' میرا جھوٹ بولنا' بہانے کرنا۔ جیسے مجھے اچھا لگتا ہے اس کا بگڑنا' ڈانٹ ڈپٹ کرنا۔ شہناز بے وقوف نہیں ہے اور نہ میں پاگل ہوں...... لیکن ہماری محبت ایسی ہی ہے۔''

میں نے کہا ''آخر ہوا کیا تھا؟''

وہ بولا ''کچھ نہیں یار! ہمارے ایک سابق گورنر صاحب عمرہ کرنے گئے تھے۔ اصل میں تو ایک دو کوڑی کے امریکی عہدے دار کی بریفنگ تھی۔ وہاں ان کا کوئی بزنس کنٹریکٹ بھی فائنل ہو گیا۔ اسی خوشی میں انہوں نے واپسی پر پارٹی دی۔ میرے جیسے دو چار خیراتی ٹٹو بھی بلا لیے۔ اچھا شغل تھا۔ وہاں کچھ لوگوں نے دھوکے سے پلا دی۔''

میں نے کہا ''میرے سامنے بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔ بڑا معصوم ہے نا تو...... شراب کے ذائقے کا کیا ہوا۔ انہوں نے کہا ہوگا یہ لبنانی گریپ اور اسٹرابیری جوس کی کاک ٹیل ہے۔ کیا حرکت کی تھی تو نے نشے میں؟''

اس نے سوچ کے جواب دیا ''یار! حرکت تو ایسی کوئی نہیں کی تھی' پہلے تو خرابی یہ ہوئی کہ واپسی پر میری گاڑی اسٹارٹ نہیں ہوئی۔ میں نے اسے وہیں چھوڑ دیا۔ میزبان نے کہا کہ وہ خود صبح اپنے ڈرائیور کے ساتھ بھیج دیں گے۔ ایک خاتون کے ساتھ مجھے بٹھا دیا کہ یہ آپ کو ڈراپ کر دیں گی۔ وہ ایک فیشن ڈیزائنر ہیں' پہلے ماڈل تھی۔ اس سے بھی پہلے سنگر تھی۔ اس سے بھی پہلے کچھ نہیں تھی۔ بھاگ بھری نام تھا۔ اب بی بی کہلاتی ہے۔ وہ مجھے اخبار کے دفتر کی طرف لے جانے لگی تو میں نے کہا کہ بی بی' آج ڈے آف ہے۔ مجھے گھر جانا ہے۔ کہنے لگی کہ ٹھیک ہے گھر چلو۔ وہیں تو رہتی ہوں میں۔ تمہارے اخبار کے آفس کے پیچھے۔''

میں نے اسے پُرملامت نظروں سے دیکھا ''اور تو نے کہا ہوگا کہ آپ نے تو میرے دل کی بات کی...... اللہ جزائے خیر دے۔''

''ابے نہیں یار! اب اتنا بدذوق بھی نہیں ہوں میں' میں نے کہا کہ مجھے اپنے گھر جانا ہے جہاں میری مس یونیورس بیوی میرے لیے چشم براہ ہے۔ وہ بہت ہنسی کہ تم کو نشے میں یہ بھی یاد نہیں کہ تمہاری تو شادی ہی نہیں ہوئی ہے۔ میں نے کہا کہ نشے میں میری اتنی عقل خراب نہیں ہوتی ہے کہ مجھے چڑیل بھی پری نظر آئے۔ بس اس کے بعد گاڑی روک کے اس نے مجھے اتار دیا۔ میں پیدل چل پڑا۔ اس وقت آدھی رات کو نہ جانے کہاں سے دو موٹر سائیکلوں والے نمودار ہو گئے۔ ایک پیچھے موٹر سائیکل اٹھا کے چلانے کا مقابلہ کر رہے تھے۔ میں ان کی لپیٹ میں آ گیا۔ میں نے کہا کہ یہ کیا بدمعاشی ہے' فٹ پاتھ پر موٹر سائیکل چلاتے ہو۔ وہ سالے بڑے کھلنڈرے' بگڑے ہوئے رئیس زادے' انہوں نے مجھ پر چڑھائی کر دی کہ یہ تیرے باپ کی فٹ پاتھ ہے۔ خود تو سڑک کے بیچ میں چل رہا تھا...... خیر' غنیمت ہے ہڈی پسلی سب سلامت ہیں۔ تو بتا' تیری شکل پر نحوست کیوں برس رہی ہے؟''

میں نے کہا ''چائے پینے سے پہلے منہ دھو لے۔ پھر کپڑے بدل کے چل میرے ساتھ۔ میں بہت پریشانی میں مبتلا ہوں۔''

وہ اٹھ کھڑا ہوا ''اللہ نے مقدر میں جو چیز لکھی ہے نکے پتر' وہی ملے گی۔ بقول شاعر...... ہر چند کہ دنیا میں تو دوڑا ہی پھرے گا' قسمت میں جو......''

شہناز کے چائے سمیت وارد ہونے سے بھی شعر نامکمل رہ گیا' جو ویسے بھی سنسر ہو جاتا۔ اب دوپہر کے بارہ بجنے والے تھے۔ لندن میں ڈاکٹر شائستہ کو فون کرنے کے لیے یہ وقت انتہائی مناسب تھا لیکن میں نے پہلے براہِ راست فریال کے اپارٹمنٹ کا نمبر ملانا بہتر سمجھا۔ دوسری طرف گھنٹی بجی تو میں نے ریسیور شہناز کو تھما دیا۔

''ذرا پوچھو کہ فریال کہاں ہے؟''

وہ کچھ حیران ہوئی ''آپ خود کیوں نہیں پوچھتے؟''

''بتاؤں گا بعد میں'' میں نے کہا۔

ریسیور دوسری طرف سے اٹھا لیا گیا تو شہناز نے کہا ''ہیلو...... جی کون بول رہا ہے...... میں...... میں ڈاکٹر شہناز ہوں...... مجھے فریال سے بات کرنی تھی۔''

میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے اور زیرلب کہا ''پوچھنا وہ کہاں ہے' کب ملے گی؟''

شہناز نے سر ہلایا ''میں اس کی فرینڈ ہوں...... وہ نہیں ہے؟ اچھا جی' کہاں گئی ہے...... بتا کے نہیں گئی' کب آئے گی؟...... نہیں پتا' چلیں جی! آپ بتا دیں کہ لاہور سے ڈاکٹر شہناز نے فون کیا تھا۔ موقع ملا تو میں پھر بات کروں گی۔''

راجا ناشتا کرتے ہوئے مجھے گھور رہا تھا ''یہ کیا چکر ہے؟''

میں نے کہا ''فریال غائب ہے۔''

''اس کا میں کیا مطلب نکالوں......؟ کیا وہ اغوا ہو گئی ہے یا برضا و رغبت...... تجھ سے جان چھڑا کے فرار ہو گئی ہے...... یا ایسے غائب ہو گئی ہے جیسے جادو کی چھڑی سے کوئی چیز غائب ہوتی ہے۔''

میں نے کہا ''آج صبح صبح صفدر سلطان نے فون کیا تھا مجھے۔''

پہلے اس نے سر ہلا کے ''اچھا'' کہہ دیا اور پھر اچھلا ''کون...... تیرا ہونے والا قاتل...... رقیب روسیاہ......؟''

میں نے کہا ''کیا اس نام کے دوسرے آدمی سے واقف ہے تو؟ اس نے بڑی فرعونیت کے ساتھ مجھ سے پوچھا تھا کہ فریال کہاں ہے؟''

''پھر...... تو نے کیا گالی دی اسے؟ شہناز' تم کان بند کر لو اپنے'' راجا نے حکم دیا ''اور منہ بھی پھیر لو۔''

''میں نے اسے ایک دندان شکن جواب دیا لیکن اس کے بعد سے میں سخت تشویش میں مبتلا ہوں۔ وہ خود تو پاکستان سے بھاگا ہے اپنی بیوی کو قتل کر کے۔ معلوم نہیں وہاں کیا ہوا...... کہ فریال روپوش ہونے پر مجبور ہوئی۔ مجھے تو ڈر یہ بھی ہے کہ کہیں اس نے فریال کو......''

راجا نے میری بات کاٹ دی ''ابے ایسا تیس مار خاں نہیں ہے وہ۔ اتنی ہمت تو تھی نہیں کہ یہاں رہ کے اپنی دولت اور طاقت سے قانون کا مقابلہ کرتا۔ گرفتار ہوتا تو ضمانت کرا لیتا' وہاں فریال کو قتل کر دے...... ناممکن۔''

''ناممکن کچھ نہیں ہوتا راجا۔ اشتعال کی حالت میں دماغ کام نہیں کرتا'' میں نے کہا ''آخر فریال کہاں ہے؟''

''پتا چل جائے گا نکے پتر! گھبرا مت۔''

میں نے فون اٹھایا ''اس کی رازدار ہے ڈاکٹر شائستہ۔ فریال کی کوئی بات اس سے چھپی ہوئی نہیں۔''

''اور بھی بہت لوگ ہیں یار! اخبار والوں کا پورا نیٹ ورک ہے۔ لندن میں چیونٹی بھی گم ہو جائے تو پتا چلایا جا سکتا ہے۔'' راجا نے کہا۔

دوسری طرف سے خود شائستہ نے فون اٹھایا ''ہیلو......!''

میں نے کہا ''ڈاکٹر شائستہ! میں پاکستان سے رفیق بات کر رہا ہوں۔''

''جی......'' اس نے مختصراً کہا۔

''کیا آپ کو فریال کے بارے میں کچھ معلوم ہے کہ وہ کہاں ہے؟''

''جی نہیں۔''

میں نے اسے بھی پوری بات بتائی اور اپنے خدشات کا

اظہار کیا "آپ کے خیال میں وہ کہاں ہو سکتی ہے؟"

"اس نے فون کیا تھا کہیں سے۔ میری بات نہیں ہوئی۔ میرے بیٹے سے اس نے کہا تھا کہ ممی کو بتا دینا' میں خیریت سے ہوں اور پھر فون کروں گی۔ یہ کل صبح کی بات ہے' پھر فون نہیں آیا۔"

میرے ذہن سے تفکرات کا بار گراں اتر گیا "اگر وہ پھر فون کرے تو اسے کہیں کہ مجھ سے ضرور بات کرے۔"

"جی بہت اچھا" شائستہ نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں راجا کو اپنے ساتھ لے گیا۔ ہم کسی ہوٹل میں چلے جاتے تو بہتر ہوتا۔ میں نے غلطی کی کہ اس کے ساتھ پریس کلب چلا گیا۔ بلاشبہ اس وقت وہاں کم لوگ تھے لیکن میں نے تفصیل سے راجا کو صورت حال سے آگاہ کیا تو اس میں خاصا وقت لگا اور دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا۔ راجا بظاہر بڑی دلچسپی اور توجہ سے میری بات سن رہا تھا لیکن مجھے یوں لگا جیسے وہ سیریس نہیں ہے۔ ہم الگ جگہ بیٹھے تھے اور ہماری ٹیبل پر آ کے کسی نے ہمیں ڈسٹرب نہیں کیا مگر ہال میں آنے جانے والے سب راجا کے ہم پیشہ اور بے تکلف لوگ تھے۔ وہ دور سے ہاتھ ملا کے وش کرتے تھے۔ ان کے درمیان ہیلو ہائے کا اور خیر و عافیت کے رسمی جملوں کا تبادلہ ہوتا تھا تو راجا کی توجہ وقتی طور پر ہٹ جاتی تھی۔ ایک بار وہ "سوری یار! میں آیا ایک منٹ میں" کہہ کر گیا تو پانچ منٹ میں واپس آ گیا۔ دوسری بار پھر اس نے یہی حرکت کی "یار! بڑا ضروری کام ہے اس بندے سے۔ میں آیا ایک منٹ میں" اس نے درمیان میں کہا اور اٹھ کے غائب ہو گیا۔

دس منٹ بعد اس نے سامنے بیٹھ کے معذرت کی "معاف کرنا یار! کیا کہہ رہا تھا تو؟"

میں نے برہمی سے کہا "کچھ نہیں کہہ رہا تھا میں' بکواس کر رہا تھا۔ اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا...... تو سن ہی نہیں رہا تھا۔"

وہ ہنسنے لگا "ایسی بات نہیں ہے لیکے پتر۔ تیری دردناک' عبرت ناک اور شرم ناک آپ بیتی کا ایک ایک لفظ بڑے غور سے سنا میں نے۔"

میں نے جل کے کہا "اس لیے ہنسی آ رہی ہے تجھے۔"

"یار! مجھے بتا رونے کی اس میں کون سی بات ہے۔ تو کچھ ضرورت سے زیادہ ٹینشن لے رہا ہے۔"

میں نے احتجاج کیا "ایسا ہرگز نہیں ہے۔"

"ایسا ہی ہے رفیق صاحب! میں بتاتا ہوں تجھے۔ چل تیرے مسائل کو نپٹتے ہیں ون بائی ون۔ پرابلم نمبر ون فریال کی تھی' رائٹ...... ؟ کیا کیا فرض کر رہا تھا تو...... خیر قصور تیرا نہیں' تیرے عشق خانہ خراب کا ہے۔ تیری یہ فکر تو دور ہوئی نا کہ صفدر سلطان نے اسے ٹوٹے ٹوٹے کر کے دریائے نیز میں بہا دیا ہوگا۔ اب وہ کہاں ہے؟ یہ بھی بہت جلد پتا چل جائے گا۔ اور میں اپنی دوربین نگاہوں سے اس کو بھی یہاں دیکھ رہا ہوں۔ تو چاہے تو شرط لگا لے پچاس پچاس ہزار کی" اس نے جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کے میز پر پھینکی۔

میں نے کہا "مہاراجا! یہ رقم کہاں سے آ گئی تیرے پاس؟"

اس نے فوراً نوٹ واپس اٹھا لیے "یار! پتا نہیں کیوں میں اتنا جذباتی ہو جاتا ہوں۔"

میں نے کہا "میں سمجھ گیا۔ یہ اسی اسمگلر نے دیے ہوں گے جس کے حج کا جعلی سفر نامہ تو نے لکھا تھا' چیک شہباز نے پھاڑ دیا تھا۔"

"بڑا تیر مارا تھا اس نے چیک پھاڑ کے۔ پاگل کی بچی! کل میں نے کیش لے لیا۔ میں نے کوئی رشوت تو نہیں لی ہے۔ تو خود انصاف سے کام لے۔ حج کرنے والے کے لیے تو سفر نامہ لکھنا بہت آسان ہے۔ جو دیکھا تھا لکھ دیا۔ میری دگنی محنت ہوئی تھی' میں نے ریسرچ کر کے لکھا۔"

میں نے کہا "میرے سامنے فضول بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔ تو آج کل جس قسم کی محنت کر رہا ہے' وہ مجھے معلوم ہے۔"

"او کے۔ پرابلم نمبر دو تو کسے سمجھتا ہے...... ؟ اس دھمکی کو جو شہاب الدین اینڈ گامے شاہ کے سلسلے میں چیف صاحب کی طرف سے دی گئی تھی۔ پہلی بات تو یہ کہ انہوں نے کوئی نوٹس نہیں دیا ہے کہ یہ کام ایک ہفتے میں ہو جانا چاہیے۔ وہ خود بھی جانتے ہیں کہ یہ کام آسان نہیں ہے۔ فی الحال لعنت بھیج ان پر۔ اگر کوئی فون کرے یہ پیغام ملے کہ جلدی کرو تو صاف کہہ دینا کہ میں کوشش کر رہا ہوں۔ گارنٹی کوئی نہیں دے سکتا...... اور تم جلدی کرا سکتے ہو تو کرا لو کسی اور سے۔"

"تو جانتا ہے ان کے طریقے...... ؟"

"ابے وہ کچھ نہیں کریں گے۔ کر سکتے تو کر نہ لیتے۔ وہ محتاج ہیں تیرے۔ انہیں تیرا وسیلہ بہت پاورفل لگتا ہے۔ وہ اس چانس کو ضائع نہیں کریں گے۔ وہ تجھے پورا موقع دیں گے اور اس مہلت میں کچھ نہ کچھ ضرور ہو جائے گا۔ کوئی راستہ ضرور نکل آئے گا۔ عائشہ خود یہاں آ رہی ہے۔"

"میں اس سے کوئی بات نہیں کروں گا۔"

"نہ کرنا' میں کرلوں گا۔"

میں نے بگڑ کے کہا "نہ تو اور نہ کوئی اور۔ میں تجھے بتا رہا ہوں تیری میری دوستی ختم ہو جائے گی۔"

"غصہ حرام ہے فیکے پتر! غصہ بندے کی عقل کو ایسے کھا جاتا ہے۔ جیسے حکمران اس ملک کو کھا گئے۔ سوائے حسرت تعمیر کے گھر میں خاک نہیں۔ عائشہ کا باپ جتنا دولت مند اور بااثر ہے' اتنا ہی سیانا بھی ہے۔ خیر' یہ کوئی کہنے کی بات نہیں۔ بے وقوف ہوتا تو دولت مند کیسے ہوتا۔ سیانے تو میرے جیسے بھی ہیں جو جوتیاں چٹخاتے اور کھاتے پھرتے ہیں' صد افسوس۔ اچھی بات یہ ہے کہ لارڈ ارنسٹ تجھے پسند کرتا ہے۔ اپنی بیٹی کے معاملے میں وہ تجھے بھروسے کے قابل بھی سمجھتا ہے چنانچہ بیٹی کو یہاں بھیج رہا ہے۔ اس امید میں کہ تو اس کا دماغ سیٹ کر کے اسے واپس ارسال کر دے گا۔ کیا وہ تیری جینوئن پرابلم نہیں سنے گا؟ اگر اس کے اختیار میں کچھ ہوگا تو وہ تیری مدد ضرور کرے گا۔ ورنہ صاف بتا دے گا کہ سوری' یہ کام نہیں ہو سکتا۔ تو یہی بات چیف صاحب کو بتا دینا' تیرا کام تمام۔"

"ہاں' پھر وہ میرا کام تمام کر دے گا" میں نے تلخی سے کہا۔

راجا نے میرے شانے پر ہاتھ مارا "اوئے فیکے پتر۔ مجاہد بن مجاہد...... نہ بن تیرا کام تمام کرنے والوں کی ایسی تیسی۔ ابے یہ شہاب الدین اور گامے شاہ چیز کیا ہیں۔ سالوں کو ایسے غائب کرا سکتے ہیں ہم کہ صور اسرافیل پر اٹھیں گے تو میدان حشر کا راستہ پوچھتے پھریں گے۔"

میرے دل کو راجا کی بات سے تھوڑی سی تقویت ملی۔ "بقا کی جنگ میں یوں ہتھیار ڈالنے والا تو میں بھی نہیں ہوں' لڑے بغیر۔"

"ابھی تو اس مسئلے کو بھی رکھ پرے۔ ایک مسئلہ ہے عائشہ کا۔ اسے روکنا تو تیرے بس کی بات ہے نہیں' آنے دے اسے۔ غریب خانہ ہے موجود ہر بلا کے لیے۔ نمٹ لیں گے اس بلا سے بھی۔ رابعہ تیری مخلص و مددگار ہے۔ وہ بہت کچھ کر سکتی ہے۔ ورنہ اشتا تو اپنے ابا کو سب بتا دے۔ ان کے اور تیرے درمیان جنریشن گیپ کم ہے کیونکہ وہ پروفیسر تھے۔ تیری عمر کے سیکڑوں نوجوان ان کے شاگرد رہے ہیں۔ اس سے گھر میں ماحول سازگار رہے گا۔ عائشہ کے عشق کا بھوت اترنے میں زیادہ دن نہیں لگیں گے۔ میرا اندازہ ہے کہ ایک مہینے میں وہ بھاگ جائے گی۔"

"اور نہ بھاگی پھر......؟"

"پھر کی پھر دیکھیں گے۔ اب آخری مسئلہ [illegible] جاگیر اور جائداد کا۔ رابعہ نے جو کچھ بتایا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خاندان میں شدید اختلافات کا ڈر ہے' دشمنی کا۔"

"یہ معاملات ایسے ہی ہوتے ہیں راجا۔ خون کے رشتے کے دعوے دار جان کے دشمن بن جاتے ہیں۔ اس لیے میں نے فیصلہ کیا ہے۔"

"غلط فیصلہ کیا ہے تو نے جلد بازی میں۔ ابھی [illegible] آزما۔ انسانوں کو پرکھنے کا یہ موقع ضائع مت کر۔ دیکھ لوگوں کے چہرے کیسے بدلتے ہیں۔ دوست دشمن کی پہچان [illegible] طرح ہوگی فیکے پتر۔ صاف انکار کر دے کہ کوئی مجھ سے سخاوت کی توقع نہ رکھے۔ جو کچھ مجھے ملا ہے جائز اور قانونی طریقے سے ملا ہے۔ نہ میں نے کسی کا حق مارا ہے اور نہ [illegible] کے ساتھ کوئی دھوکا کیا ہے۔ خیال میں سب کار کھوں [illegible] حقدار سمجھ کے کسی کو حصہ نہیں دوں گا۔ کوئی امید بھی نہ رکھے [illegible] اس کے بعد دیکھو کیا ہوتا ہے؟"

میں نے ایک گہری سانس لی "تیری بات دل کو لگی [illegible] راجا!"

اس نے اپنی غیر موجود مونچھوں پر تاؤ دیا۔ "اس [illegible] علاوہ تو اکیلا نہیں ہے میرے جگر کے ٹکڑے۔ قسم اللہ کی [illegible] کے پشتے لگا دیں گے اگر کسی نے تیری طرف میلی نظر [illegible] دیکھا۔ اپنا اسٹائل کچھ ایسے دیو کن جیسا ہے۔"

میں نے کہا "راجا' تو ست بدھائی جائے گا ہم [illegible] ساتھ۔ اگر آج شام نہیں تو کل...... یہ کام ضروری ہے۔"

"میری ملازمت بھی ضروری ہے۔"

میں نے کہا "اے لعنت بھیج ملازمت پر۔ مجھے [illegible] ضرورت ہے' اکیلا میں کچھ نہیں کر سکتا۔"

اس نے سر ہلایا "گھبرا مت فیکے پتر۔ تیرے لیے [illegible] جان بھی حاضر ہے۔ یہ بتا اسلحہ ہے تیرے پاس۔"

میں نے نفی میں سر ہلا دیا "کبھی ضرورت محسوس [illegible] ہوئی۔"

"تیرا واسطہ جن دشمنوں سے ہے۔ وہ صرف طاقت [illegible] زبان جانتے ہیں۔ ان کا مقابلہ کرنا پڑا تو کیسے کرے گا؟ [illegible] رہنا اب پہلے سے زیادہ مشکل ہو گیا ہے۔ جو لوگ آج [illegible] کے توازن کی بات کرتے ہیں' وہ بے وقوف ہیں [illegible] دھماکا کر کے صاف بتا چکے ہیں بھارت کو کہ کسی خوش فہمی [illegible] مت رہنا۔ ایٹم بم ہمارے پاس بھی ہے۔ خیر تو فکر مت [illegible] اس کا بندوبست میں کر دوں گا۔ اینٹی ڈکیتی کا ایک بندہ [illegible]

[illegible] قابو میں ہے' تھانے دار ہے۔"

"[illegible] وہ کیا کرے گا؟"

"وہ تجھے ہر چیز فراہم کر سکتا ہے۔ کلاشنکوف اور دستی بم [illegible] راکٹ تک ہر چیز وہ حسب ضرورت کسی کے قبضے سے [illegible] برآمد کرانے کے لیے حاضر اسٹاک میں رکھتے ہیں۔" راجا [illegible] راز داری سے کہا "افغانستان کے مجاہدین کا مال آج کل [illegible] آیا ہوا ہے۔ مجھے بہت شاندار چیز دی تھی اس نے۔ [illegible] پستول والا خودکار ریوالور ہے۔ کسی کو گولی مار دو تو اسے بھی [illegible] نہیں چلا کہ آخر ہوا کیا۔"

"تو نے ایسی خطرناک چیز کیوں لی؟"

"یار! مل رہی تھی اس لیے لے لی اور مفت بہر حال [illegible] نہیں لی۔ تیرے لیے بھی کوشش کرتا ہوں۔ ایک اور چیز اس [illegible] نے تحفے میں دی تھی۔ جیسے کہ آج کل مارکیٹنگ کا طریقہ [illegible] ہے۔ اونٹ لو تو بلی مفت۔ بیوی لو تو بچہ مفت۔ اس نے مجھے [illegible] اندھیرے میں دیکھنے والی عینک دی۔ سخت ممنوعہ ہے ویسے تو [illegible] مگر ممنوعہ تو یہاں جمہوریت بھی ہے۔" بات کرتے کرتے وہ [illegible] آگے جھکا "فوراً کھوپڑی مت گھمانا' تیرے پیچھے ذرا دائیں جانب ایک بندہ بیٹھا ہے' وہ مجھے کچھ مشکوک لگ رہا ہے۔"

"وہ کیوں؟"

"پریس کلب کا ممبر تو وہ ہے نہیں۔ ایک ممبر کے ساتھ آیا تھا لیکن بہت دیر سے اکیلا بیٹھا ہے۔ ممبر نہ جانے کہاں چلا گیا ہے۔"

"اس ممبر سے پوچھ لے فون کر کے۔"

"یار! وہ بھی جعلی صحافی ہے۔ کسی ذریعے سے ایک اخبار کے رپورٹر کا پریس کارڈ بنوا لیا ہے۔ لوگوں کو بلیک میل کرتا پھرتا ہے۔ یہ بندہ انجان نظر آنے کی کوشش تو کر رہا ہے مگر اس کی دلچسپی یا تیری ذات میں ہے یا مجھ میں۔"

"اس سے بات کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے؟"

راجا نے اسے ایک گالی دی "دراصل مجھے اس کا چہرہ [illegible] کہیں دیکھا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اب یاد آیا کہ اسے تو میں نے [illegible] کچھ دیر پہلے بھی اپنے گھر کے باہر دیکھا تھا۔ وہاں یہ [illegible] موٹر سائیکل میں کوئی خرابی تلاش کرنے کی ایکٹنگ کر رہا تھا۔"

میں نے کہا "تیرا مطلب ہے...... وہ ہمارا پیچھا کرتا ہوا یہاں آیا ہے؟"

"مورکھ سنگھ۔ یہ تیرے گھر سے تیرا تعاقب کر رہا ہوگا۔ اب تو ایسا کر...... ہال کے آخر میں ہے واش روم جاتے ہوئے اس پر ایک نگاہ ڈال اور بیت الخلا میں قیام کے دوران میں غور و خوض فرما۔ شاید تجھے کچھ یاد آ جائے" راجا نے کہا اور اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔

میں نے قہقہے کے ساتھ اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ جب میں اس شخص کے قریب سے گزرا تو وہ بالکل میری طرف متوجہ نہیں تھا۔ وہ شام کے ایک اخبار میں شائع ہونے والی کسی حسینہ کی جلوہ ریز تصویر پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ بائیس سال عمر کے اس نوجوان نے جینز پر ڈھیلی ڈھالی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی جس پر سامنے انگریزی کے حروف میں [illegible] لکھا ہوا تھا۔ وہ دبلا پتلا اور حد سے زیادہ سنجیدہ صورت تھا۔ [illegible] کا اندرونی اضطراب اس کی غیر ارادی حرکات و سکنات سے عیاں تھا۔ میں سیدھا واش روم میں گیا اور کچھ دیر میں [illegible] ہاتھ پونچھتا ہوا آیا اور راجا کے سامنے بیٹھ گیا۔ "ممکن ہے تیری [illegible] نے مجھے بھی وہم میں مبتلا کر دیا ہو مگر اس کی صورت واقعی شناسا سی لگتی ہے' یاد کچھ نہیں آ رہا۔"

"چل ہم اسے موقع دیتے ہیں۔ وہ خود ہی بتا دے گا" راجا نے کہا اور ہم اطمینان سے چلتے ہوئے باہر نکل گئے۔ جب میں گاڑی نکال رہا تھا تو راجا کے شبہات کی تصدیق ہونے لگی۔ وہ دیوار کے ساتھ کھڑی ہوئی بہت سی موٹر سائیکلوں میں سے اپنی موٹر سائیکل باہر نکال چکا تھا۔

میں نے کہا "راجا۔ اسے کہاں لے جائیں؟"

راجا نے کہا "ہم اسے ڈاج دینے کی کوشش کریں گے۔"

میں نے راجا کا مطلب سمجھ لیا۔ پریس کلب سے باہر آ کے میں نے گاڑی کی رفتار بڑھائی۔ راجا نے بیک ویو مرر کا رخ اپنی طرف کر لیا تھا۔ اس نے رننگ کمنٹری شروع کی۔ "تو آگے دیکھ کے گاڑی چلا۔ پیچھے میں نظر رکھتا ہوں۔ اب شک کی کوئی بات نہیں فیکے پتر! وہ لگا ہوا ہے پیچھے۔ کالی مرچ ہے یا کالا بکرا۔ اس کا بھی پتا چل جائے گا۔ اس کے تیور مجھے ٹھیک نہیں لگتے۔ بندہ خطرناک ہے۔"

میں نے کہا "راجا! ایسا نہ ہو کہ تیرے چکر میں میری جان جائے" اور گاڑی کو ایک دم موڑ لیا۔

"میرا کوئی دشمن نہیں" راجا نے کہا۔

"یاد کر ان سب کو جن کو تو نے رواں مالی سال میں اپنے عشق کے جال میں پھانسا۔ آخر وہ شریف زادیاں کسی کی عزت ہوں گی۔"

راجا تلخی سے ہنسا "شریف زادیاں! ابے ان کی اصلیت سامنے آ جائے تو شریف صاحب خودکشی کر لیں۔

گاڑی کو سیدھے ہاتھ کی طرف موڑ لے۔ یہ سڑک خالی ہی رہتی ہے۔ آگے کہیں اسے روک کے پوچھیں گے کہ بیٹے' آخر اس تعاقب کا مقصد کیا ہے؟ مگر یار' وہ تو غائب ہوگیا۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے مایوسی سے کہا۔

''مطلب یہ کہ وہ شاید سیدھا گزر گیا۔ وہ سمجھ گیا ہوگا کہ ہمیں شک ہوگیا ہے۔''

راجا کی بات مکمل بھی نہ ہوئی تھی کہ میرے کانوں میں فائر کی آواز آئی۔ جسم کے مدافعتی ردِعمل کے طور پر میرا سر خود بخود جھک گیا حالانکہ نشانہ میرا سر ہوتا تو یہ حرکت مجھے گولی سے بچا نہیں سکتی تھی۔ خطرے کا احساس میرے لاشعور میں موجود تھا چنانچہ میرے پیر نے بریک پیڈل کو دبا دیا۔ اس سے بس اتنا فائدہ ہوا کہ گاڑی کی رفتار کچھ کم ہوگئی۔

میں نے گولی چلنے کی آواز کے ساتھ ہی دوسرا دھماکا سنا۔ دونوں آوازوں کے درمیان سیکنڈ کے سویں حصے سے بھی کم کا فرق تھا۔ اس کے ساتھ ہی گاڑی میرے قابو سے باہر ہوئی۔ مجھے معلوم ہوگیا کہ گولی نے آگے دائیں ہاتھ والا ٹائر پھاڑ دیا ہے۔

ٹائر برسٹ ہوتے ہی گاڑی الٹ گئی۔ امریکا اور لندن میں رہنے کی وجہ سے مجھے سیٹ بیلٹ باندھنے کی عادت ہوگئی تھی ورنہ یہاں نہ کوئی قانونی ضرورت کو سمجھتا تھا اور نہ اپنی حفاظت کے لیے ایسا کرتا تھا۔ اسی عادت نے مجھے محفوظ رکھا مگر یہ بھی کہنا شاید غلط ہوگا' میرے ساتھ بیٹھے ہوئے راجا نے سیٹ بیلٹ نہیں باندھی تھی لیکن وہ بھی محفوظ رہا۔ بس ہماری زندگی تھی کہ ہم بچ گئے۔

گاڑی ایک بار الٹنے کے بعد پھر سیدھی ہوئی لیکن اپنی رفتار میں آگے بھی گئی۔ جھٹکوں کے دوران میں نے شیشہ ٹوٹنے کی اور گاڑی کی فولادی باڈی کے سڑک کی سطح سے تصادم کی ملی جلی آوازوں کا شور بھی سنا پھر ایک اور دھماکا ہوا اور یکلخت ساری آوازوں پر سکوت غالب آ گیا۔ وہ زلزلہ تھا' جس نے مجھے گاڑی کے اندر یوں ہلا دیا تھا جیسے میں گھومتے ہوئے کنکریٹ مکسر کے اندر پڑا ہوا پتھر ہوں۔

اس وقت اگر مجھے کوئی احساس تھا تو اپنے زندہ ہونے کا۔ مجھے یہ اندازہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ میں کس حد تک زخمی ہوں۔ اندرونی یا بیرونی چوٹیں معمولی ہیں یا سنگین۔ ہوش کے اولین لمحے کا پہلا ردِعمل یہ تھا کہ میں نے چلا کے راجا کو آواز دی۔ وہ میرے ساتھ ہی سیٹ پر الٹا پڑا تھا اور اس کے ماتھے پر خون تھا۔

میں نے چلا کے کہا ''راجا...... تو ٹھیک ہے راجا......؟''

جواب میں اس نے حرکت کی ''ہاں...... ہاں' ٹھیک ہے؟''

اب میں نے اپنے ہاتھوں پیروں کو ہلا کے دیکھا۔ اسکرین کا شیشہ باریک ذرات کی صورت میں اندر بکھرا تھا۔ یہ ذرات میرے سر کے بالوں میں پھنسے ہوئے تھے۔ میرے جسم کے کھلے حصوں پر خراشیں ڈال کے چپک گئے تھے۔ خون میرے چہرے پر اور ہاتھوں پر لکیریں بنا رہا تھا۔ میں نے سیٹ بیلٹ سے آزاد ہو کے راجا کو سہارا دیا اور اسے سیٹ پر سیدھا بیٹھنے میں مدد دی۔

اس وقت تک نہ جانے کہاں کہاں سے دوڑ دوڑ کے بہت سے لوگ آ چکے تھے۔ سڑک پر سے گزرنے والی بہت سی گاڑیاں رک گئی تھیں۔ وہ سب ہمارے مددگار تھے۔ انہوں نے بڑی محنت سے ہمیں باہر نکالا۔ چھت پچک جانے سے گاڑی کے دروازے پھنس گئے تھے۔ کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ چکے تھے۔ لوگوں نے ہمیں انہی کھڑکیوں سے باہر کھینچا۔ اس وقت تک مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ آخری دھماکا گاڑی کے کھمبے سے ٹکرانے کا تھا۔ ٹیلی فون کا کھمبا پیچھے کی طرف جھک گیا تھا۔

جب مجھے اور راجا کو اسپتال لے جانے کے لیے الگ الگ گاڑیوں میں منتقل کیا جا رہا تھا تو میں پوری طرح ہوش میں تھا۔ حادثے کی جگہ پر ٹریفک جام ہونے لگا تھا اور کم سے کم تیس چالیس افراد وہاں جمع ہو چکے تھے۔

اچانک میری نظر نے بہت سے دکھی اور مہربان انسانوں کے درمیان اپنے دشمن کا چہرہ پہچانا۔ اس چہرے پر نفرت کے زہر میں بجھی ہوئی مسکراہٹ تھی اور دو آنکھیں تھیں جن میں عداوت اور بغض کی آگ دہکتی محسوس ہوتی تھی۔ اس کو میں نے کچھ دیر پہلے ہی پریس کلب میں دیکھا تھا۔ اب اس نے چہرے کو ہیلمٹ میں چھپا رکھا تھا۔

میں نے چلا کے لوگوں کو بتانے کی کوشش کی ''وہ...... شخص...... اسے روکو۔''

دو افراد مجھے ایک کار کی پچھلی سیٹ پر لٹا رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا ''کون......؟'' اور پلٹ کے دیکھا۔

میں نے کہا ''وہ...... جس کی ٹی شرٹ پر ڈیزل لکھا ہے۔''

دوسرے نے اس وقت تک دروازہ بند کر دیا تھا ''چلو جی چلو۔ ادھر جو اسپتال بھی قریب ہو......''

آگے گاڑی کے ڈرائیور نے کلچ پیڈل چھوڑ دیا اور گاڑی ایک جھٹکے سے سڑک پر دوڑنے لگی۔ میں نے

سر اٹھا کے باہر دیکھنے کی کوشش کی مگر وہ اب وہاں نہیں تھا۔

میں نے کہا ''اس نے...... گولی چلائی تھی۔''

ڈرائیور نے سر گھما کے مجھے دیکھا ''کس نے گولی چلائی تھی؟''

میں نے کہا ''وہ...... نکل گیا۔ اس نے گولی چلائی تو ٹائر برسٹ کر گیا۔ اسی سے گاڑی الٹی تھی۔''

میرے خیر خواہ تشویش میں مبتلا ہوگئے۔ ''کون تھا وہ؟''

میں نے کہا ''اس کا نام تو میں نہیں جانتا۔''

کار چلانے والے نے کہا ''چلو جی' اللہ نے بچا لیا۔ اب آپ مہربانی کرنا۔ یہ بات اسپتال میں کسی سے مت کہنا ورنہ معاملہ لمبا ہو جائے گا۔ ہم کسی چکر میں پڑنا نہیں چاہتے۔''

پچھلی سیٹ پر مجھے سنبھالنے والے نے کہا ''ہم آپ کو سرکاری اسپتال لے جا رہے ہیں۔ پرائیویٹ اسپتال والے تو کیس لیں گے نہیں۔ آپ بس اتنا کہنا کہ ٹائر پھٹ گیا تھا۔ حادثہ بتانا' قاتلانہ حملہ بتاؤ گے تو آپ کے لیے بھی بڑی مصیبت ہو جائے گی۔''

ڈرائیور نے کہا ''پولیس والے بہت پیسا کھائیں گے۔ آپ تو اس بندے کا نام بھی نہیں جانتے۔''

''بس اللہ کا شکر کرو کہ جان بچ گئی آج۔ آخر کیوں چلائی تھی اس نے آپ پر گولی؟''

میں نے کہا ''مجھے یہ بھی علم نہیں۔''

انہوں نے گاڑی کو اسپتال کے اندر شعبۂ حادثات کے سامنے روکا اور مجھے نیچے اترنے میں مدد دی۔ ایک نے کہا کہ وہ کسی کو بلا کے لاتا ہے جو مجھے اسٹریچر پر لے جائے۔ اس نے مجھے وہیں ایک بینچ پر بٹھا دیا۔ دوسرے نے کہا کہ وہ گاڑی کو پارک کر کے آتا ہے۔ چند منٹ میں مجھے اندازہ ہوگیا کہ ہمدردی کے جذبات سے مغلوب ہو کے میری مدد کرنے والے اور مجھے یہاں تک لانے والے قانونی چکروں کے ڈر سے فرار ہوگئے ہیں۔

میری حالت ایسی نہیں تھی کہ مجھے اسٹریچر کی ضرورت ہوتی۔ میں خود چل کے بھی طبی امداد کے لیے بنے ہوئے کاؤنٹر تک جا سکتا تھا لیکن میں بیٹھا رہا۔ مجھے راجا کی آمد کا انتظار تھا۔ مجھے چوٹیں ضرور آئی تھیں مگر میری کوئی ہڈی نہیں ٹوٹی تھی اور میں یہ سوچ رہا تھا کہ راجا کی حالت ٹھیک ہوگی تو ہم سرکاری اسپتال کے چکر میں نہیں پڑوں گا۔

راجا کچھ دیر بعد ایک ایمبولینس میں پہنچا۔ اسے کوئی اپنی گاڑی میں چھوڑنے نہیں آیا تھا۔ شعبۂ حادثات کے سامنے کافی لوگ جمع تھے۔ ایمبولینس سائرن بجاتی آگے بڑھی تو لوگوں نے راستہ چھوڑ دیا۔ جب راجا کسی سہارے کے بغیر ایمبولینس سے اترا تو مجھے کچھ اطمینان حاصل ہوا۔

''ٹھیکے پتر! تو ٹھیک ہے نا؟'' راجا نے مجھے نظروں سے اور کچھ ہاتھوں سے ٹٹول کے دیکھا۔

''ہاں' اور تو......'' میں نے کہا ''تیرا تو کافی خون بہہ گیا ہے۔''

''اے نہیں۔ معمولی زخم ہیں۔ کچھ خراشیں ہیں' چل آ جا میرے ساتھ لیکن ایک بات دھیان سے سن لے۔ یہاں صرف حادثے کا سبب بتانا ہے۔ یہ نہیں کہنا ہے کہ کسی نے گولی چلائی تھی۔''

میں نے سر ہلایا ''میں کہہ دوں گا بریک فیل ہوگئے تھے۔''

لوگوں کے درمیان سے گزر کے ہم او پی ڈی انچارج کے پاس گئے۔ راجا کا پریس کارڈ نہ ہوتا تو وہ پہلے ہمیں پولیس سرجن سے رجوع کرنے کا مشورہ دیتا۔ ضابطے کی کارروائی کے بغیر ڈاکٹر نے ہمارا معائنہ کیا اور کہا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ معجزاتی طور پر ہماری سب ہڈیاں سلامت ہیں۔ ایک ہیوی ویٹ لیڈی ڈاکٹر نے ہمیں صدقے میں دو کالے بکروں کی قربانی کا مشورہ بھی دیا۔

جب ہمارے زخم صاف کر کے مرہم پٹی کر دی گئی تو مجھے اندازہ ہوا کہ زخم کتنے ہی سہی' میرے ہاتھوں پر اور چہرے پر اتنی خراشیں ہیں کہ میرا اس حالت میں گھر جانا قطعی مناسب نہیں۔ میرے ماتھے اور چہرے پر میڈیکل ٹیپ کے چار سفید کراس تھے۔ میری دائیں کلائی جھٹکے سے مڑ گئی تھی۔ اس پر ڈاکٹر نے اسٹریچ بینڈیج باندھ دی تھی۔ بائیں ہاتھ کی پوزیشن بھی بہتر نہ تھی۔ جسم کے دیگر حصے چوٹ سے متاثر ہوئے تھے۔ ڈاکٹر نے کہا تھا کہ ان میں کچھ درد اور سوجن کا اثر لازمی ہوگا۔ انہوں نے مجھے اور راجا کو اینٹی ٹیٹنس انجکشن لگائے۔ پانچ دن کے لیے اسٹرانگ اینٹی بایوٹک کے ساتھ درد مٹانے والی گولیاں دیں اور مکمل بیڈ ریسٹ کے لیے کہا۔

مجھے اپنی تباہ ہو جانے والی گاڑی کی فکر تھی۔ راجا نے کہا کہ یہ سارے معاملات وہ سنبھال لے گا۔ مجھے پریشانی تھی کہ گھر کیسے جاؤں گا۔ اماں تو مجھے دیکھتے ہی رونے لگیں گی اور ابا کو اختلاج ہونے لگے گا۔ میں ان کی اکلوتی اولاد تھا اور برسوں ان سے دور رہنے کے بعد پاکستان آیا تھا۔ انہیں سنبھالنا اور یہ یقین دلانا مشکل ہو جائے گا کہ تشویش کی کوئی

بات نہیں۔ سب سے بڑھ کر دادی۔ وہ تو عمر کے اس حصے میں ہیں جب معمولی سا صدمہ بھی جان لیوا ثابت ہو سکتا ہے۔

راجا نے کہا ''ابھی کیا ضرورت ہے گھر جا کے یہ چاند جیسا داغ دار چہرہ دکھانے کی۔ شہناز کے پاس چلتے ہیں۔''

میں نے کہا ''ٹھیک ہے' مگر شہناز سے کیا جھوٹ بولنا ہے؟''

''سچ وہی ہوگا جو تو بتائے گا۔ میری کسی بات کا تو وہ یقین ہی نہیں کرتی یار!'' راجا نے تاسف سے سر ہلایا۔

''اپنا اعتبار تو نے خود گنوایا ہے مہاراجا!''

ڈاکٹر ہونے کے باوجود شہناز نے خاصی بدحواسی دکھائی اور کچھ رونا دھونا بھی کیا مگر بالآخر اس نے ایک بیڈ روم کو جنرل وارڈ میں تبدیل کر کے ہمیں ساتھ ساتھ لٹا دیا۔ اس سے اچھی نرس ہمیں کہاں میسر آتی۔ ساتھ ہی اس نے اپنی ڈاکٹری بھی دکھائی اور ہمیں ایک انجکشن لگا دیا۔ اس کے بارے میں شہناز نے بتایا کہ سکون آور تھا۔ ''اب تم سو جاؤ گے اور جب اٹھو گے تو شاک کا اثر ختم ہو جائے گا۔ بہت بہتر محسوس کرو گے۔'' شہناز نے کہا۔

راجا نے احتجاج کیا ''ہم باتیں کرنا چاہتے تھے۔''

شہناز نے لائٹ آف کی اور دروازہ بند کر دیا ''اب تو سونا ہی پڑے گا۔ چلو آنکھیں بند کرو۔ منہ بند نہ کیا تو ٹیپ چپکا دوں گی۔''

''اُلّو کی پٹھی!'' راجا نے کچھ محبت اور کچھ خفگی سے کہا۔

میں نے کہا ''راجا۔ تیرے جیسے گھٹیا اور کمینے شخص کے ساتھ آخر شہناز کی کیسے گزرے گی؟''

''بہت اچھی گزرے گی۔ جیسے اب گزر رہی ہے۔''

راجا نے چڑ کے کہا ''تو اپنی فکر کر۔ تیرے پیچھے کئی بلائیں لگی ہوئی ہیں۔''

جب میری آنکھ کھلی تو میری حالت یقینا بہت بہتر تھی۔ راجا پھر پہلے اٹھ گیا تھا اور باہر لاؤنج میں بیٹھا گرم گرم پکوڑے کھا رہا تھا جو شہناز براہ راست کچن سے ارسال کر رہی تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ میں چھ گھنٹے کی نیند لے کر اٹھا ہوں اور باہر رات ہو گئی ہے۔

شہناز نے کہا ''رفیق بھائی' کیا حال ہے؟ چائے تیار ہے۔ بیٹھ جائیں آپ بھی انہی کے ساتھ۔ اب کیسا محسوس کر رہے ہیں؟''

''بہت بہتر۔'' میں نے کہا۔

حقیقت بھی یہی تھی۔ سکون آور دوا کے زیر اثر نیند نے مجھے واقعی پر سکون کر دیا تھا ورنہ سونے سے پہلے میں بہت نروس تھا۔ اس حادثے نے میرے اعصاب کو منتشر کر دیا تھا۔ ہر حادثے کی دہشت ایسی ہی ہوتی ہے جو تھوڑی دیر بعد اثر کرتی ہے لیکن اس سے نجات پانے میں بہت عرصہ لگتا ہے۔ میرے لیے دہرا عذاب اس خیال کا ہی تھا کہ گاڑی کا الٹ جانا محض ایک حادثہ نہیں تھا جو کسی کے ساتھ کہیں بھی پیش آ سکتا ہے اور جس کی وجہ کا تعین قدرت کرتی ہے۔ یہ ایک قاتلانہ حملے کا نتیجہ تھا۔

میرا عقیدہ پہلے بھی راسخ تھا کہ وقت آ جائے تو اسے تدبیر سے کوئی ٹال نہیں سکتا اور جس کا وقت نہ آیا ہو اسے کوئی مار نہیں سکتا۔ میں نے بالکل معمولی نظر آنے والے واقعات میں ناقابل یقین طور پر لوگوں کو مرتے دیکھا تھا۔ اتنے بڑے حادثے میں میرا یا راجا کا معمولی خراشوں کے ساتھ زندہ سلامت بچ جانا کسی معجزے سے کم نہ تھا۔

صحت اور سلامتی پر اعتبار بحال ہوتے ہی میرے خیالات پر ایک سوالیہ نشان یوں مسلط ہو گیا تھا کہ جواب لے بغیر اس سے چھٹکارا نہیں مل سکتا تھا لیکن لامحدود امکانات کے ڈھیر سے پورے یقین کے ساتھ ایک جواب نکالنا ناممکن تھا۔ سوال ایک ہی تھا۔ آخر وہ کون تھا؟ اس کے بطن سے دوسرا ضمنی سوال جنم لیتا تھا کہ وہ مجھے کیوں قتل کرنا چاہتا تھا؟

میں ایسے لوگوں کی فہرست بناتا جو میرے وجود کو لوح جہاں سے حرف غلط کی طرح مٹا دینا چاہتے تھے تو اس میں سب سے اوپر صفدر سلطان مرزا کا نام آتا لیکن وہ لندن میں تھا اور میری معلومات کی حد تک ابھی اس نے رقابت میں مجھے راستے سے ہٹانے کے لیے میری جان لینے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنا بھی شروع نہیں کیا تھا یا شاید میری معلومات ناقص تھیں۔

اس کے بعد لیڈی سیلیا ارنسٹ تھی جسے میں جانی دشمنوں میں شمار کرتا تھا اور لندن میں مجھ پر ایک ناکام قاتلانہ حملے کی سازش کے بارے میں ثبوت اس کے خلاف گئے تھے لیکن میرے تنہا پاکستان لوٹ آنے کے بعد وہ کچھ مطمئن ہو گئی تھی کہ اس کی سفید فام عالی نسب بیٹی فی الحال محفوظ ہے۔ چند دن میں وہ بھی یہ بندوبست نہیں کر سکتی تھی کہ پاکستان میں مجھے ٹھکانے لگانے کے لیے کرائے کے قاتل تلاش کر لے۔

خطرہ مجھے چیف کی طرف سے بھی تھا اور گاہے شاہ شہاب الدین جیسے لوگوں سے بھی لیکن فی الحال ان کے مفادات کے تقاضے کچھ اور تھے۔ وہ مجھ سے مدد کے طالب تھے اور مجھے نقصان نہیں پہنچا سکتے تھے۔ چیف کے نزدیک پہلے میں ایک مفرور تھا اور میرا فرار بھی بغاوت کے مترادف

تھا مگر آٹھ سال میں صورت حالات بدل گئی تھی۔ تنظیم کے قبضے سے اختیار و اقتدار کے سارے وسیلے نکل گئے تھے۔ ان کے سیکڑوں کارکن مارے جا چکے تھے اور ہزاروں جلاوطنی یا روپوشی کی زندگی گزار رہے تھے۔ نیرنگیٔ سیاست دوراں نے ان کے دشمنوں کو عروج بخش دیا تھا اور تنظیم اپنا وجود برقرار رکھنے کی جنگ بھی ہار رہی تھی۔

تنظیم کے دشمن منطقی طور پر میرے بھی دشمن تھے۔ وہ تنظیم کے ہر کارکن کے دشمن تھے جنہوں نے اپنے دور استبداد میں ہر طرح سے ان پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تھا۔ تنظیم کے چیف کے حکم پر اپنے حریفوں کا قتل عام کیا تھا۔ ان کے گھر اجاڑے تھے۔ انہیں نجی اور سرکاری جیلوں میں ٹھونسا تھا۔ ان پر جھوٹے مقدمات کے انبار لگا دیے تھے اور وحشیانہ تشدد کے سارے حربے آزمائے تھے۔ اب وہ برسر اقتدار تھے تو تنظیم کے لیے کام کرنے والے جنگی مجرم کا درجہ اختیار کر گئے تھے۔ ہر شکست خوردہ قوم کے ساتھ فاتح نے تاریخ کے ہر دور میں انتقامی کارروائی کی ہے تو مورخ نے بھی اسے مکافاتِ عمل کا نام دیا ہے۔

میرا خیال تھا کہ جیسے تنظیم مجھے بھول چکی ہے' ایسے ہی تنظیم کے ظلم و ستم کا شکار ہونے والے بھی مجھے بھول چکے ہوں گے۔ لیکن میرا خیال غلط تھا۔ اگر شہاب الدین نے پاکستان پہنچتے ہی مجھے احساس دلا دیا تھا کہ میں خود کو ان کے شکنجے سے آزاد نہ سمجھوں' ایسے ہی تنظیم کے دشمنوں نے بھی مجھے پہچان لیا ہوگا۔ میرا یہ عذر کون قبول کرے گا کہ میں نے جو غلط کام کیے تھے' جبر کے تحت کیے تھے اور تنظیم کے ہاتھوں بلیک میل ہو کے کیے تھے۔

ایک سوال یہ بھی تھا کہ آخر میں نے کیا غلط کام کیے تھے؟ میرا ماضی تاریخ کا حصہ تھا۔ جو کچھ میں کر چکا تھا' نہ بھلایا جا سکتا تھا اور نہ سنایا جا سکتا تھا۔ مجھے اب یاد بھی نہیں تھا کہ ظلم اور ناانصافی کا شکار ہونے والے کون تھے اور کتنے تھے۔

لیکن وہ بہت تھے۔ ان میں ایسے بھی تو ہوں گے جنہوں نے مجھے دیکھ لیا ہوگا' پہچان لیا ہوگا۔ میرا نام اس فہرست میں لکھ لیا ہوگا جن کے جرائم ناقابل معافی تھے۔ جن کے لیے سزا مقسوم تھی۔ یہ طے کر لیا گیا تھا کہ وہ جہاں ملیں گے اور جب ملیں گے' انہیں سزا ضرور دی جائے گی۔ انتقام کی سیاست میں معافی کسی کے لیے نہیں تھی۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کا چلن تھا چنانچہ معمولی جرم کی سزا کا عبرت آموز ہونا بھی ضروری تھا اور یہ عمل جاری تھا۔ جو کل ظالم تھا وہ آج مظلوم تھا اور مظلوم نے ظالم کا روپ دھار لیا تھا۔ کبھی وقت کا دھارا پھر الٹا بہنے لگے گا تو کردار بھی الٹ جائیں گے۔ تاریخ ایسے ہی بنتی ہے۔

کیا میرا نام بھی سزائے موت پانے والوں میں درج تھا؟ اگر تھا تو کس کس کی فہرست میں؟

راجا نے میرے سامنے چٹکی بجائی ''زمین پر آ جا فیکے پتر!''

''یار! میں سوچ رہا تھا......''

''اب سوچنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے'' اس نے میری بات کاٹ دی۔

میں نے کہا ''آخر وہ کون تھا؟ ہم پریس کلب میں ہی پوچھ لیتے اس سے۔ مگر خیر...... تیسری بار سامنے آیا تو چھوڑوں گا نہیں۔''

راجا ہنسا ''چپ چاپ پکوڑے کھا۔ شہناز کو بس یہی معلوم ہے کہ ایک معمولی سا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔''

میں نے کہا ''جس میں گاڑی مکمل طور پر تباہ ہو گئی۔ اب یہ بات بھلا چھپی رہ سکتی ہے۔ ہم تو فرار ہو گئے جائے حادثہ سے اور اسپتال سے گھر آ کے سو گئے۔ گاڑی کی لاش ابھی تک وہیں پڑی ہوگی۔''

راجا کے سکون اور اطمینان میں کوئی فرق نہیں آیا ''اسے پولیس اٹھا کے لے گئی تھی۔ میں نے بات کر لی ہے۔ تیرا جب دل چاہے ان کے مردہ خانے سے گاڑی کا جنازہ اٹھا لینا اور دفنا دینا کسی بھی قبرستان میں۔''

''لیکن یہ خبر چھپائی تو نہیں جا سکتی۔''

''خبر...... اب کیسی خبر؟ تو سمجھ لے کہ معاملہ ختم۔ وہ کیا کہتے ہیں...... انت بھلا سو بھلا۔''

میں نے کہا ''یہ اچھا انجام ہے......؟''

''اس سے اچھا انجام کیا ہو سکتا تھا دوست۔ ایسے حادثے میں آٹھ گھنٹے بعد یا تو مرحومین کفن پہنے تدفین کے مراحل سے گزر رہے ہوتے ہیں یا ٹوٹی پھوٹی ہڈیوں پر پلاسٹر چڑھائے پڑے ہوتے ہیں۔ ہم یہاں بیٹھ کے کھا رہے ہیں گرما گرم پکوڑے۔ کیا اس کے لیے ہمیں خدا کا خصوصی طور پر شکر گزار نہیں ہونا چاہیے کہ اس نے ہم جیسے گنہگاروں پر اتنا رحم کیا۔''

میں نے کہا ''اس میں کیا شک ہے۔''

راجا نے شہناز کی طرف دیکھا جو اب چائے کی ٹرے سجا رہی تھی۔ ''میری زندگی میں ایسے مواقع پہلے بھی آ چکے ہیں۔ جب میری وفات ممکن تھی۔ میرا خیال ہے کہ شہناز کی دعاؤں نے مجھے بچا لیا ورنہ یار' میرے اپنے اعمال تو ایسے

نہیں تھے۔"

میں نے کہا" میں خود حیران ہوتا ہوں کہ جس راہ پر میں چل نکلا تھا' اس پر چلتے چلتے میرا بھائی قدیر سیدھا قبرستان پہنچا۔ وہ موت کا کھیل ایسا ہی تھا۔ میں کیسے بچ گیا؟"

راجا نے ایک آہ بھری" یار! تیرے ساتھ ماں باپ کی دعائیں تھیں۔"

"مجھے انہی کی فکر ہے راجا! ان کے سامنے میں کیا منہ لے کر جاؤں گا۔ میں گھر سے نکلا تھا تو میرا منہ ایسا نہیں تھا۔"

راجا نے ایک ڈکار لی" ابے کیا ضرورت ہے فوری طور پر انہیں منہ دکھانے کی۔ دو چار دن میں یہ داغ دھبے اور خراشیں ایسی نہیں رہیں گی۔ تھوڑی سی سوجن ہے دائیں طرف اور ناک پر' یہ بھی ٹھیک ہو جائے گی۔"

"دو چار دن کیا میں چہرے پر نقاب ڈال کے پھروں؟ کچھ تو بتانا پڑے گا انہیں۔ وہ گاڑی کے بارے میں بھی پوچھیں گے' کتنا جھوٹ بولوں گا میں؟"

"اتنا مت گھبرا نکیے پتر! یاد رکھ' انسان کی سب سے بڑی طاقت ہے اس کا دماغ۔ دماغ سے بڑا کمپیوٹر نہ ایجاد ہوا ہے نہ ہوگا۔ اگر یہ تیرے کنٹرول میں ہے تو ہر مسئلے کا حل نکالا جا سکتا ہے۔ اس گاڑی کو جو درحقیقت تیرے ابا کی گاڑی تھی' ایسے ہی بھلا دے جیسے ان سب لڑکیوں کو تو نے بھلا دیا جو ولایت میں تیرے زیر استعمال رہیں۔"

میں نے کہا" بکواس نہ کر۔"

"دیکھ' میرے سامنے کبھی اپنی پارسائی کا راگ مت الاپنا۔ میں ذرا لگی لپٹی رکھے بغیر بات کرتا ہوں۔ اپنے ابا سے کہہ دینا کہ پرانی گاڑی تو میں نے بیچ دی۔ وہ میرے جیسے رئیس کے شایان شان بھی نہیں تھی اور ولایت میں جو لڑکیاں ...... میرا مطلب ہے جو گاڑیاں میرے زیر استعمال رہیں ان کے مقابلے میں ایسی ہی تھی جیسے عائشہ کے مقابلے میں رابعہ...... یا وہ' جو ماسی آتی ہے گھر میں جھاڑو برتن کرنے ...... وہ دروازے پر کھڑی دیکھیں گے نئی چم چم کرتی لمبی مرسیڈیز تو خوشی سے نہال ہو جائیں گے۔"

میں نے کہا" وہ مرسیڈیز تو خرید کے دے گا مجھے؟"

"یار! میں تو تجھ پر آس لگائے بیٹھا ہوں...... جیسے تیرا سارا خاندان بیٹھا ہے۔ اتنی بڑی جاگیر کا مالک تو ہے یا میں؟"

"ابے جاگیر' جاگیر' جاگیر...... سالے! ابھی تو میں نے صرف نام ہی سنا ہے۔ دیکھا تک نہیں ہے اس جگہ کو۔ اس کی مالیت کروڑوں میں ہوگی مگر میرے پاس تو نہیں ہیں کروڑوں۔ ابا کے پاس بینک میں کتنے ہیں' اس سے بھی مجھے غرض نہیں۔ خود میرے پاس ابھی دس لاکھ سے زیادہ نہیں ہیں۔ اتنا ہی پس انداز کیا تھا میں نے۔ دس ہزار پاؤنڈز تھے۔ یہاں وہ دس لاکھ روپے بن گئے۔"

راجا نے کہا" کل کی فکر نہ کر۔ جس کے اثاثے کروڑوں کے ہوں' اسے ہر بینک ہاتھ جوڑ کے کروڑوں دیتا ہے کہ سرکار آپ کی مرضی' کمرشل پلازا بنائیے' کوئی صنعت لگائیے' بین الاقوامی تجارت میں قدم رنجہ فرمائیے' کچھ بھی کیجیے بس قرض لے کر ہم پر احسان فرمائیے۔ ہم جیسے کنگالوں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ کریڈٹ کارڈ لیجیے پرسنل لون لیجیے ...... کار لیجیے۔"

"کل کے بارے میں ابھی کچھ طے نہیں کیا میں نے کہ مجھے کرنا کیا ہے۔ ابا کا ایک آئیڈیا تھا کہ وہاں شیشم کے جنگلات ہیں۔ ان کو بڑھایا جا سکتا ہے اور عمارتی لکڑی یا فرنیچر کا کارخانہ لگایا جا سکتا ہے۔ زراعت یا فارمنگ ہو سکتی ہے۔ پولٹری فارمنگ' ڈیری فارمنگ یا فش فارمنگ۔ یہ سب دیکھنا ہے مجھے۔ آج یہ حادثہ نہ ہوتا تو ہم کل جا سکتے تھے۔"

راجا نے کہا" ہم جائیں گے رفیق صاحب! بلکہ آپ یوں سمجھیے کہ ہم چلے گئے' اس وقت وہیں موجود ہیں۔ آئی میری بات سمجھ شریف میں؟ نہیں آئی ناں...... شہناز' میری جان! ایک کام کرو...... ذرا فون کرو اپنے رفیق بھائی کے گھر۔"

شہناز خاموشی سے چائے پی رہی تھی اور ہماری باتیں سن رہی تھی۔ وہ چونکی" میں فون کروں؟"

"ہاں' ایک بے ضرر سا جھوٹ بولنا ہے تمہیں۔ اس کے باپ سے کہو کہ راجا اور رفیق بھائی آج دوپہر کے کھانے کے بعد چلے گئے ست بدھائی۔ مجھ سے کہہ گئے تھے کہ گھر والوں کو بتا دینا مگر میرا فون خراب تھا اس لیے ذرا دیر سے اطلاع دے رہی ہوں۔ ہو سکتا ہے دو چار دن لگ جائیں انہیں' آپ پریشان نہ ہوں۔"

"مگر راجا......؟" شہناز نے احتجاج کیا۔

"اگر مگر بعد میں کرنا" راجا بگڑ گیا" یہ معاملات تمہاری سمجھ کے دائرے سے باہر کے ہیں۔ اس لیے جیسا میں کہہ رہا ہوں' ویسا ہی کرو۔"

"جب تک تم مجھے بتاؤ گے نہیں کہ تم مجھ سے جھوٹ کیوں بلوانا چاہتے ہو...... اور وہ بھی رفیق بھائی کے والدین سے...... میں فون نہیں کروں گی۔"

راجا خوشامد پر اتر آیا" کیا میں تم سے کوئی غلط کام

کرا سکتا ہوں؟"

"ہاں' خود تو کرتے ہی ہو' مجھ سے بھی غلط کام کرائے ہیں تم نے...... کہو تو گناؤں؟"

"رانی! اس کی کیا ضرورت ہے" راجا نے کھسیائے ہوئے انداز میں میری طرف دیکھا" دیکھو' جھوٹ اگر مفاد عامہ کے لیے بولا جائے اور اس سے کسی کو فائدہ پہنچے تو کوئی گناہ کی بات نہیں۔ اپنے بھیا کی ظاہری حالت تو تم دیکھ ہی رہی ہو۔ ایسی حالت میں یہ اماں ابا کے سامنے جاتے ہوئے ڈرتا ہے۔ کہیں ان کو ہارٹ اٹیک نہ ہو جائے۔ دادی کی عمر تم جانتی ہو' وہ معمولی سا صدمہ بھی کہاں برداشت کر سکتی ہیں۔ اس کی گاڑی کو بھی خاصا نقصان پہنچا ہے۔ وہ ابا کی گاڑی تھی۔ انہیں دیکھ کے صدمہ ہوگا۔ اس کی اماں کی طرح دن از تھی۔ رفیق کا خیال یہ ہے کہ اب اس کو ٹھکانے لگا دیا جائے۔ جیسے بھینس جو دودھ نہ دے بوچڑ خانے والوں کے حوالے کر دی جاتی ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ اسے بھی کباڑیوں کو دے کر ایک نئی کار خریدے اور ابا کو پیش کر دے۔ کیا اس میں کوئی غلط بات ہے؟"

"اس میں تو کوئی حرج نہیں مگر......"

"یہ صرف تمہارا خیال ہے جو غلط نہیں ہو سکتا کہ دو چار دن میں زخم اور سوجن وغیرہ کے نشانات ختم ہو جائیں گے یا کم ہو جائیں گے۔ تو دو چار دن کی روپوشی کے لیے ہم نے سوچا ہے کہ اس کی جاگیر ہی دیکھ آئیں۔ یہ کام بھی ضروری ہے۔"

"لیکن ابھی تم اس قابل ہی کہاں ہو کہ سفر کرو۔ تمہیں چار پانچ دن اینٹی بایوٹک گولیاں لینی ہوں گی اور درد کی دوائیں......"

راجا نے کہا" وہ ہم اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ باقاعدگی سے کھانے کا بھی وعدہ۔ چلو اب شاباش فون کرو" راجا نے کہا۔

شہناز نے میری طرف دیکھا تو میں نے بھی سر ہلا دیا "انہیں تم ہی مطمئن کر سکتی ہو۔"

مجبوراً شہناز نے فون پر وہ سب کہہ دیا جو ہم چاہتے تھے۔ تاہم اس کی تشویش برقرار رہی۔ اس کی دلی خواہش تھی کہ ہم چند دن گھر سے ہی نہ نکلیں اور باقاعدہ مریض بن کے لیٹے رہیں اور وہ علاج کے ساتھ مکمل تیمارداری کرے مگر نہ اس کی ضرورت تھی اور نہ یہ ہمارے لیے ممکن تھا۔

رات گئے تک ہم باتیں کرتے رہے۔ راجا کا خیال تھا کہ میرے اس اجنبی دشمن کا سراغ لگانا مشکل ضرور ہوگا ناممکن نہیں۔ میرے ذہن میں خلش کا سبب کچھ اور تھا۔ کوشش کے باوجود میں اس خیال کو دل سے نکالنے میں ناکام تھا کہ وہ اجنبی نہیں' اس کی صورت کا کوئی عکس میرے لاشعور میں محفوظ تھا مگر وقت کی گرد سے یاد کا کوئی عنوان ابھر کے پہچان کی روشنی میں نہ آتا تھا۔

ایسی ہر الجھن کا آسان علاج یہی ہوتا ہے کہ اسے بھلا دیا جائے پھر کسی الہامی انداز میں اچانک یاد سے محو ہو جانے والی کوئی بات ایسے وقت میں اپنی تمام جزئیات کے ساتھ ذہن کے پردے پر روشن ہو جاتی ہے جب آپ اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں رہے ہوتے۔

اس رات مجھ پر یہ کیفیت خواب بن کے نازل ہوئی۔ ہر خواب کی طرح یہ خواب بھی غیر منطقی تفصیلات پر مشتمل تھا۔ اس کے واقعات ایک مسلسل فلم کی طرح نہیں تھے بلکہ مختلف فلموں کے ٹکڑوں جیسے تھے جو ایک کہانی سے بھی مربوط نہ ہوں۔ میں لندن کی کسی سڑک پر بارش میں ایک لڑکی کے ساتھ جا رہا تھا اور وہ چھتری کے نیچے ہونے کے بہانے مجھ سے چمٹ رہی تھی۔ اچانک سامنے سے سیاہ رنگ کی ایک میت گاڑی نمودار ہوئی۔ اس دو گھوڑوں والی کوچ کو دو کوچبان چلا رہے تھے جو سامنے خاصی بلندی پر سیاہ لباس اور سیاہ اونچے ہیٹ پہنے بیٹھے تھے۔ یہ شہاب الدین اور گامے شاہ تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھ کے گاڑی روکی۔

"ہم چیف کو دفنانے جا رہے ہیں" شہاب الدین بولا۔

گامے شاہ نے کہا" آج صبح اسے پھانسی دے دی گئی۔"

میں نے بڑی مسرت کا اظہار کیا" ویری گڈ۔ لیکن اس کا جرم کیا تھا؟"

"اس نے ٹائیگر کو شوٹ کر دیا تھا۔ اور اس کی لاش کے ٹکڑے اپنے کتوں کو کھلاتا رہا تھا' دو مہینے تک۔"

گامے شاہ نے کہا" وہ کتے اب آدم خور ہو گئے ہیں۔"

میں نے کہا" اسے گاڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ آخر لندن میں اور بھی تو بھوکے کتے ہوں گے۔"

شہاب الدین نے گامے شاہ کو دیکھا" آئیڈیا برا نہیں۔"

گامے شاہ نے سر ہلایا" ہم چیف کا ڈاگ فوڈ بنا سکتے ہیں۔ ڈبوں میں پیک کر کے بیچنے سے اچھے پیسے ملیں گے۔"

شہاب الدین نے ہیٹ اٹھا کے میرا شکریہ ادا کیا اور میت گاڑی کو موڑ کر واپس لے گیا۔ میں نے اسے دھند میں غائب ہوتے دیکھا پھر میں نے اپنی ہم سفر کی طرف دیکھا

لیکن وہ چھتری کے نیچے نہیں تھی‘ کچھ فاصلے پر ایک پرانے سے مکان کے دروازے پر کھڑی بھیگ رہی تھی۔ میری طرف اس کی پشت تھی۔ جب میں اس کے قریب پہنچا تو وہ ایک دم پلٹی اور میں نے دیکھا کہ وہ کوئی اور ہے۔ اس نے دوپٹے کو سر کے اوپر سے گزار کے ایک کونا یوں منہ میں دبا رکھا تھا کہ اس کا چہرہ ایک طرف سے چھپ گیا تھا۔ اس کے باوجود میں نے اسے پہچان لیا۔

میں نے کہا ”فرخندہ! باہر کھڑی بارش میں کیوں بھیگ رہی ہو؟“

اس نے روتے ہوئے کہا ”اندر کیسے جاؤں...... یہ گھر نہیں‘ قبرستان ہے۔“

وہ ناظم آباد کے علاقے کا خاصا پرانا اور چھوٹا سا مکان تھا جس کی کھڑکیوں کے کھلے پٹ کے سامنے لوہے کی سلاخیں نظر آ رہی تھیں۔ میں نے سلاخوں کے درمیان سے اندر جھانکا۔ اندر اندھیرا تھا مگر مجھے ایک شخص سجدے جیسی حالت میں منجمد نظر آیا۔ غور کرنے پر مجھے اندازہ ہوا کہ اس شخص کا تو سر ہی نہیں ہے۔ چھت کے پنکھے سے بھی ایک شخص لٹکا ہوا تھا لیکن وہ پنکھے کے ساتھ گھوم رہا تھا چنانچہ اس کا چہرہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ اس کے جسم سے نکلنے والے خون کے چھینٹے چاروں طرف کی دیوار پر مسلسل پڑ رہے تھے اور ہر قطرے سے ننھی ننھی سرخ لکیریں نیچے بہہ رہی تھیں۔

جب میں اس دہشت ناک خواب سے جاگا تو میرا جسم کانپ رہا تھا۔ میری سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی اور میں پسینے میں تر تھا۔ خواب کا منظر ہنوز میری آنکھوں میں بسا ہوا تھا۔ میں اس گھر کو دیکھ سکتا تھا۔ اس لڑکی کا چہرہ دیکھ سکتا تھا جس کا نام فرخندہ تھا۔ وہ میرے ماضی کی بھیانک یادوں کے قبرستان سے باہر آ جانے والی لڑکی کسی بدروح کی طرح تھی جو برسوں بعد اچانک مجھے مل گئی تھی۔

اور مجھے سب یاد آ گیا تھا۔

☆☆☆

دس سال پہلے میں تنظیم کا بے حد فعال اور جوشیلا کارکن تھا۔ دو سال کے مختصر عرصے میں جو مقام میں نے حاصل کر لیا تھا وہ کچھ پرانے کارکن دس سال میں بھی حاصل نہ کر پائے تھے لیکن میری یہ ترقی بے سبب نہ تھی۔ سرفروشانہ جذبے کے ساتھ میں نے ایسے کارنامے سرانجام دیے تھے کہ میں بہت جلد اعلیٰ قیادت کی نظروں میں آ گیا تھا۔ میری ایک اور خصوصیت جو مجھے دوسروں پر ممتاز کرتی تھی‘ میری غیر معمولی ذہانت اور فطانت تھی۔ میرے پاس صرف جذبات ہی نہیں تھے‘ راہنمائی کرنے والی عقل بھی تھی۔ میں فول پروف پلاننگ کر سکتا تھا اور ایک ٹیم سے اپنی مرضی کے مطابق کام لے سکتا تھا خواہ اس میں کتنے ہی نااہل لوگ کیوں نہ شامل ہوں‘ جب میری قائدانہ صلاحیت سامنے آئی تو تنظیم کی کمان نے مجھے اوپر کھینچ لیا اور مجھے وہ ذمے داری سونپ دی جو شاید سب سے اہم تھی۔

مجھے شعبۂ نشر و اشاعت اور تعلقات عامہ دے دیا گیا۔ اس شعبے کے نام سے زیادہ اس کے کام کی اہمیت تھی۔ کسی اچھے برے واقعے پر تنظیم کے نقطۂ نظر سے پریس ریلیز جاری کرنا اور اس کی اشاعت یا پریس کانفرنس کے لیے چیف کی تقریر لکھنا تو کبھی کبھار کا کام تھا۔ میرا زیادہ وقت نوجوان کارکنوں کی ذہنی تربیت میں گزرتا تھا۔ میں تنظیم کے ذیلی دفاتر میں جا کے ذمے دار عہدوں پر فائز لوگوں کی کارکردگی کا جائزہ لیتا تھا اور چیف کو رپورٹ دیتا تھا کہ کس کی اصلاح ضروری ہے اور کس کی حوصلہ افزائی۔ کس کو فائن ٹیوننگ کی ضرورت ہے اور کسے گوشمالی کی۔ لوگ مجھ سے ایسے ہی خوف کھاتے تھے جیسے جرمن عوام گستاپو سے ڈرتے تھے۔

تنظیم کی تاریخ زیادہ پرانی نہیں تھی۔ اس کی بنیاد ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں ”سوشلسٹ انقلاب تنظیم“ کے نام سے رکھی گئی تھی اور اس کے مقاصد بھی پیپلز پارٹی کے نعروں سے ہم آہنگ تھے کہ اسلام ہمارا دین ہے‘ سوشلزم ہماری معیشت ہے اور جمہوریت ہماری سیاست ہے۔ اس کا چیئرمین مرزا مقصود احمد ایک اسٹوڈنٹ لیڈر تھا۔ وکالت کا امتحان پاس کرنے کے بعد اس نے مزدور یونین لیڈر کی حیثیت سے شہرت اختیار کی اور انتخابات میں پیپلز پارٹی کے لیے کام کرتا رہا۔ حالات کا رخ دیکھتے ہوئے اس نے ”سوشلسٹ انقلاب تنظیم“ بنائی اور خاصے فائدے بھی حاصل کیے۔ اس کا پیپلز اسٹوڈنٹ فیڈریشن سے قریبی الحاق تھا اور وہ بعد میں ایف ایس ایف جیسی تنظیم کے لیے بھی خدمات سرانجام دیتا رہا۔

پھر حالات نے پلٹا کھایا۔ پی این اے کی تحریک چلی تو مرزا مقصود احمد کے ایک حریف سید مہربان شاہ نے دوراندیشی کا ثبوت دیتے ہوئے تنظیم کے کچھ لوگوں کو اپنے ساتھ ملایا اور ایک طرح کا فارورڈ بلاک بنا لیا۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے ایک افواہ پھیلائی کہ مرزا مقصود احمد درحقیقت قادیانی ہے اور ربوہ میں لوگ اسے بھی ایم ایم احمد کہتے ہیں۔ یہ جھوٹ تھا مگر بڑے منظم طریقے پر بولا گیا تھا اور اس کی تشہیر میں بھٹو مخالف سیاسی جماعتوں سے پوری مدد لی گئی۔

ان دنوں قادیانیوں کے خلاف جذبات عروج پر تھے اور ان کو غیر مسلم قرار دینے کا مطالبہ زور پکڑتا جا رہا تھا۔ مرزا مقصود نے ہر ممکن طریقے سے اس الزام کو مسترد کیا مگر آگ بھڑکنے پر بھی نہیں بجھ چکی تھی۔ جب ایک عدالتی فیصلے کے ذریعے قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دے دیا گیا تو صورت حال اور خراب ہو گئی۔ سید مہربان شاہ نے موقعے سے فائدہ اٹھایا اور ایک رات کچھ اسلام پرست نوجوانوں نے عالم اشتعال میں مرزا مقصود احمد کو قتل کر دیا۔ سید مہربان شاہ نے خود کو تنظیم کا امیر کہلوایا۔

ضیاالحق کے دور میں سید مہربان شاہ نے پارٹی کا نام ”سوشلسٹ انقلاب تنظیم“ سے بدل کر ”اسلامی انقلاب تنظیم“ کر دیا اور تھوڑی بہت سرکاری سرپرستی بھی حاصل کر لی۔ یہ دور ختم ہوا تو تنظیم پھر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوئی۔ سید مہربان شاہ نے خطرہ محسوس کیا تو جان بچا کے ملک سے نکل گیا۔ اس نے اتنی دولت اکٹھی کر لی تھی کہ اسے سیاست میں رہ کے جان کا خطرہ مول لینے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے کسی غیر ملکی عورت سے شادی کی اور آسٹریلیا میں سیٹل ہو گیا۔

جب میں نے تنظیم میں شمولیت اختیار کی تو یہ نہ سوشلسٹ تھی اور نہ اسلامی بلکہ عالمی انقلاب تنظیم تھی اور اس کا صدر مجیب الرحمٰن تھا جو دنیا بھر میں عدم مساوات اور ناانصافی کے نظام کے خلاف نوجوانوں کی انقلابی طاقت کو استعمال کرنے کی تبلیغ کرتا تھا۔ وہ ظلم‘ بدعنوانی‘ استحصال اور غربت دور کرنے کے لیے بیک وقت اسلام کی تعلیمات کے حوالے بھی دیتا تھا‘ چین کے انقلاب کی بات بھی کرتا تھا اور اتاترک سے نیلسن منڈیلا تک سب کا مداح تھا۔ اس کی آتش بیانی سے نوجوان ذہنوں کا متاثر ہونا قدرتی بات تھی۔

پھر مجیب الرحمٰن نے چولا بدلا اور عالمی کے بجائے اسے عوامی انقلاب تحریک بنا دیا اور خود کو چیف کہلوانے لگا۔ اگلے پانچ سال تک اس نے میرے جیسے ناپختہ شعور رکھنے والے بے شمار نوجوانوں کو اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ اس کا فلسفہ یہ تھا کہ اب قانونی جدوجہد سے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ انصاف کے دروازے بند ہو چکے ہیں۔ غریبوں کو اپنی تقدیر بدلنے کے لیے اپنی قوت بازو پر بھروسا کرنا ہوگا۔ ہر خرابی کا علاج خود کرنا ہوگا۔ وہ راست اقدام کے فلسفے کا مبلغ تھا۔ انصاف خود کرو‘ انتقام خود لو‘ خرابی کو خود مٹا دو‘ حق چھین لو۔ اس کا تشدد کا فلسفہ اس دور کے مایوس‘ فرسٹریشن کے شکار‘ بے یقینی اور گمراہی میں مبتلا اینگری ینگ مین کو اپیل کرتا تھا۔

خود میں نے تنظیم کے لیے جو کچھ کیا تھا‘ وہ آج میرے لیے باعث شرم تھا اور میرے ضمیر پر ایک مستقل بوجھ کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ مسمریزم تھا یا کوئی شیطانی جادو‘ جس نے میری عقل پر پٹی باندھ دی تھی اور میرے دماغ کو مسموم کر دیا تھا۔ میرے جیسے سیکڑوں نہیں‘ ہزاروں نوجوان لاقانونیت کے راستے پر چلتے ہوئے مارے گئے۔ جیلوں میں پہنچے یا روپوش ہو گئے۔ دشمنوں کے ہاتھوں اغوا ہوئے یا تباہ ہو گئے۔ چیف مجیب الرحمٰن پر کوئی آنچ نہ آئی۔ جب اس کے دشمن غالب آنے لگے تو وہ دبئی چلا گیا۔ وہاں سے جرمنی پہنچا۔ اس کے دستِ راست سمجھے جانے والے خود اس کے ہاتھوں مارے گئے۔ باقی تتر بتر ہو گئے مگر انہوں نے بلیک میلنگ سے اپنے مذموم مقاصد پر عمل درآمد کا سلسلہ جاری رکھا۔

یہ دس سال پہلے کی بات ہے جب تنظیم کی طاقت اپنے عروج پر تھی۔ چند دن پہلے خفیہ ذرائع نے ایک غدار کی نشاندہی کی تھی جو درپردہ تنظیم کے مفادات کے خلاف کام کر رہا تھا۔ میں یونیورسٹی کے امتحان میں آخری پرچے سے فارغ ہو کے نکلا تو شہر جانے والی بس‘ جسے پوائنٹ کہتے تھے‘ نکل گئی تھی۔ اگلے پوائنٹ کی روانگی میں دیر تھی‘ میں بس اسٹاپ پر کھڑا سوچ ہی رہا تھا کہ اب گیٹ تک پیدل جا کے پبلک ٹرانسپورٹ پکڑوں یا کیفے ٹیریا چلا جاؤں کہ ایک سیاہ رنگ کی کار میرے سامنے آ رکی۔ اس کے شیشے بھی سیاہ تھے مگر میں اس کار کو پہچانتا تھا۔

ونڈ اسکرین کے پیچھے میں نے خوفناک مونچھوں والے شوفر کو بھی دیکھا جس کے چہرے سے جلادوں جیسی خباثت اور بے رحمی ٹپکتی تھی۔ اس کے ساتھ ایک اور شخص کلاشنکوف سنبھالے بیٹھا تھا۔ پیچھے والا دروازہ کھلا تو میں نے اپنے ڈیپارٹمنٹ کی ایک لڑکی ماریا کو دیکھا۔ یہ کار بھی اسی کی تھی‘ اس کا باپ میرا باس اور چیف کا دست راست تھا۔ اس لڑکی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

ماریا نے مسکرا کے کہا ”پوائنٹ نکل گیا تمہارا؟“

میں نے کہا ”ہاں‘ مصروفیت میں وقت کا خیال ہی نہیں رہا۔“

وہ معنی خیز انداز میں ہنسی ”مصروفیت ہو فرخندہ جیسی تو ایسا ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔“

میں نے اس کی بات کا جواب نہ دینا بہتر سمجھا۔ وہ بہت عرصے سے میرے پیچھے پڑی ہوئی تھی اور اپنے باپ کو بھی بتا چکی تھی کہ وہ مجھے پسند کرتی ہے۔ یہ پسند بالکل یک طرفہ تھی اور بہت عرصے تک مجھے بھی اس کا علم نہ تھا۔ پھر جب اس نے

عمل کے اشارے دینے شروع کیے اور مجھ سے ملنے کے بہانے تلاش کرنے لگی تو میں محتاط ہوگیا۔ میں نے واضح بے رخی کا انداز اختیار کیا اور اس سے ملنے سے گریز کرتا رہا لیکن نہ اس نے شکایت کی اور نہ حوصلہ ہارا۔

وہ اچھی لڑکی تھی۔ خوبصورت اور خوب سیرت۔ کچھ لوگ یقیناً اس کا قرب حاصل کرنے کے مواقع کو اپنی خوش نصیبی شمار کرتے مگر میں فرخندہ کو چاہتا تھا اور یہ بات سب ہی جانتے تھے۔ اس کے مقابلے میں فرخندہ کی حیثیت کم تر ہی سمجھی جاتی تھی۔ وہ ماریا کو مقابلۂ حسن میں شکست نہیں دے سکتی تھی۔ فرخندہ کا باپ ایک این جی او کے لیے کام کرتا تھا اور آمدنی کے اعتبار سے میری طرح متوسط طبقے کا آدمی تھا مگر اب نچلے متوسط طبقے میں شامل ہو چکا تھا۔ اس کے مقابلے میں ماریا کے باپ کے پاس تمام ناجائز ذرائع سے حاصل ہونے والی بے حساب دولت تھی۔ وہ بہت بڑا بدمعاش بھی تھا اور چیف کا دستِ راست ہونے کی وجہ سے بے حد اثر رسوخ کا مالک بن گیا تھا۔ ماریا ایک شوخ مزاج' ہلا گلا پسند کرنے والی لڑکی تھی جبکہ فرخندہ طبعاً خاموش اور الگ تھلگ رہنے والی۔

سارا معاملہ تھا دل کا۔ پھر میں کسی ترازو سے تول کے کیسے ماریا کے حق میں فیصلہ کرتا کہ مجھے اس سے محبت کرنی چاہیے۔ بیشتر ہی لڑکے ایسی ہی ترازو ساتھ رکھتے تھے اور خود لڑکیاں بھی اتنی عقلمند ہوگئی تھیں کہ شادی کے لیے عشق کرتے وقت فلمی ہیرو والی صفات کو نظر انداز کر دیتی تھیں۔ ماریا میرے معاملے میں مخلص تھی چنانچہ میں نے اس کی دل شکنی سے گریز کیا۔ اس کی ایک اور وجہ بھی تھی۔ میں اس کے باپ سے ڈرتا تھا۔

مختلف مواقع پر ماریا نے مجھے مطلع کیا کہ اس کے لیے فلاں طرم خان کے بیٹے کا رشتہ آیا تھا یا فلاں امیرزادے کے گھر والے چکر لگا رہے ہیں مگر میں نے صاف انکار کر دیا ہے۔ تنگ آ کے ایک دن میں نے پوچھ لیا کہ تم ایسا کیوں کر رہی ہو اور کر رہی ہو تو مجھے بتانے کا مقصد کیا ہے؟ اس نے صاف کہا ''میں تم سے محبت کرتی ہوں اور تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔''

میں اس اعلان کی توقع نہیں رکھتا تھا' میں نے کہا ''مجھ میں کیا ہے ماریا! میں تمہارے قابل ہرگز نہیں ہوں۔''

''خود کو میری نظر سے دیکھو۔ مگر یہ تمہارے لیے ممکن نہیں ہے۔ تمہاری محبت میں مجھے دل کے ساتھ دماغ کی حمایت بھی حاصل ہے۔''

میں نے کہا ''ماریا! میں تمہیں خوش نہیں رکھ سکتا۔''

''میں نے ابا کو بتا دیا ہے کہ میں صرف تمہارے ساتھ خوش رہ سکتی ہوں'' اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔

میں بھونچکا رہ گیا ''پھر...... انہوں نے کیا کہا؟''

''انہوں نے وہی کہا جس کی مجھے پوری امید تھی۔ انہوں نے کہا کہ ماریا' میری خوشی تمہاری خوشی سے الگ نہیں۔''

میں نے ہمت کر کے کہا ''دیکھو ماریا! تم اچھی طرح جانتی ہو اور یونیورسٹی میں سب ہی جانتے ہیں کہ میں فرخندہ سے محبت کرتا ہوں۔ میں تم سے محبت نہیں کر سکتا۔''

''تو مت کرو۔ میں تو شادی کی بات کر رہی تھی۔ شادی کے بعد میں تمہیں محبت کرنا بھی سکھا دوں گی۔ ابھی تم فرخندہ سے محبت کرتے رہو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں'' اس نے جاتے جاتے کہا۔

یہ ایک واضح دھمکی یا چیلنج تھا۔ محبت کی یہ جنگ فرخندہ بھی ہار جائے گی۔ جنگ جیتنے کے لیے وہ کیا کرے گی' اگر عقل مند ہو تو خود ہی سمجھ لو۔ اس کے باپ کے پاس اتنی طاقت ہے کہ بیٹی کی خوشی ہر قیمت پر اسے فراہم کر سکتا ہے۔

دو دن بعد مجھے اس کے گھر حاضری دینا پڑی۔ مجھے اوپر سے حکم ہوا تھا۔ میں ماریا کے کلفٹن والے دو ہزار گز کے بنگلے میں جانا نہیں چاہتا تھا لیکن ایک کار مجھے لے جانے کے لیے آ گئی۔ اس کار کی شہرت اچھی نہیں تھی۔ کسی کے دروازے پر اس کار کا نظر آنا اتنی ہی دہشت پیدا کرتا تھا جتنی غریب بستی میں آدھی رات کے وقت سی آئی اے والوں کی موبائل کرتی ہے۔ لوگ سہمی نگاہوں سے دیکھتے رہتے کہ وہ کس بدنصیب کے دروازے پر رکتی ہے۔ جو اس میں جاتے تھے کم ہی خیریت سے واپس آتے تھے مگر ملک الموت کی طرح آنے والوں کے ساتھ جانے سے انکار کوئی نہیں کر سکتا تھا۔

ماریا کے گھر میں میرا استقبال قطعی غیر سرکاری انداز میں یعنی بڑی اپنائیت کے ساتھ ہوا۔ اس کے باپ نے مجھے بڑی شفقت کے ساتھ ریسیو کیا اور کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ اس نے میری تعریف کی۔ میرے کام کی تعریف کی۔ یونیورسٹی میں میرے شاندار تعلیمی ریکارڈ کی تعریف کی۔ میرے گھر اور والدین کی تعریف کی۔ وہ اپنی بیٹی کی زبان بول رہا تھا۔ پھر اس کی ماں صدقے واری ہونے کے لیے آ گئی۔ خالص زنانہ انداز میں اپنائیت کا اظہار کرنے کے لیے اس نے کہا کہ بیٹا آ جایا کرو' یہ بھی تو تمہارا ہی گھر ہے۔

ماریا تمہاری بہت تعریف کرتی ہے۔ پھر اس نے ماریا کے اوصاف بیان کرتے ہوئے ایک قصیدہ پڑھا کہ دنیا کی کون سی خوبی ہے جو اس کی بیٹی میں نہیں۔ پھر وہ دونوں اٹھ گئے اور مجھے ماریا کے سپرد کر گئے۔ میں نے خود پر جبر کرتے ہوئے خاموشی اختیار کی۔ میں نے ماریا کے ساتھ چائے پی۔ پھر اس کا گھر اور کمرا دیکھا۔ اس کے بعد فیملی کے ساتھ کھانا کھایا جس میں ماریا کی دو شادی شدہ بہنیں اور دو غیر شادی شدہ بہنوں کے بورڈ نے مجھے اچھے نمبروں سے پاس کر کے بطور بہنوئی میرے تقرر کی منظوری دی۔ بورڈ کے چیئرمین میری دامادی کے کیس پر پہلے ہی سائن کر چکے تھے۔

اگلے دن میں نے یہ سب فرخندہ کو بتا دیا اور اسے درپیش خطرات سے آگاہ کرتے ہوئے پرپوز بھی کر دیا۔

''فرخندہ! ہمیں بلاتاخیر شادی کر لینی چاہیے۔''

وہ گھبرا گئی ''ایسے کیسے...... ابھی تو......''

میں نے کہا ''اگر ہم نکاح کر لیں اور کسی کو نہ بتائیں تو ہماری تعلیم متاثر نہیں ہوگی۔ ویسے یونیورسٹی میں شادی شدہ جوڑوں کے پڑھنے پر کوئی پابندی نہیں۔''

''میرے والدین نہیں مانیں گے رفیق!''

''وہ تو مجھے معلوم ہے۔ میرے والدین بھی نہیں مانیں گے۔ وہ کہیں گے اتنی جلدی کیا ہے؟ یہ کوئی عمر ہے شادی کی' پہلے پڑھ لو' یہی تمہارے اماں ابا کہیں گے۔''

''نہیں......'' اس نے کچھ تذبذب کے ساتھ کہا ''دراصل...... میری منگنی ہو چکی ہے' باقاعدہ...... وہ بیک وقت میرا چچا زاد اور خالہ زاد ہے۔ میرے اور اس کے ماں باپ بھائی بہنیں ہیں۔ قیامت آ جائے گی دونوں گھرانوں میں۔''

''یہ تم نے مجھے آج تک نہیں بتایا تھا! خیر...... اس سے فرق نہیں پڑتا۔ شادی تو ہمیں کرنا ہے فوراً...... ایسا کرتے ہیں' نہ تم کسی کو بتاؤ' نہ میں بتاؤں گا۔ کل نکاح پڑھوا کے رجسٹریشن کرا لیتے ہیں۔''

مجھے یوں لگا جیسے وہ بے ہوش ہو جائے گی ''نہیں...... نہیں رونی' میں یہ نہیں کر سکتی۔''

میں نے اسے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ ''تمہیں میرا ساتھ دینا ہوگا فرخندہ! ہم عاقل و بالغ ہیں۔ دنیا سے لڑ سکتے ہیں۔''

وہ کانپتی رہی اور نہیں نہیں کرتی رہی لیکن بالآخر مجبور ہو گئی۔ تین دن بعد ہم نے شادی کر لی۔ میرے چند دوستوں کی موجودگی میں ہمارا نکاح ایک ہوٹل میں ہوا۔ نکاح پڑھانے والا بھی میرے دوست کا بھائی تھا۔ ہم نے دوپہر کا کھانا ہوٹل میں اکٹھے کھایا۔ اسے میرے دوستوں نے برات کی دعوت قرار دیا۔ اس کے بعد ہم سب اپنے اپنے گھر چلے گئے۔

مجھے نہیں معلوم کہ فرخندہ یا میرے رویے کی کون سی مجرم خاموشی تھی جسے ماریا نے محسوس کر لیا۔ عورت کے اندر کہیں ایک چھٹی حس کی ''چپ'' لگی ہوتی ہے' جس سے وہ خطرے کو سونگھ لیتی ہے۔ ہم سے جو غلطی ہوئی تھی اس کا اندازہ مجھے ایک ہفتے بعد ہوا۔ ماریا نے ایک روز مجھے کینٹے ٹیریا میں پکڑ لیا۔

میں نے مسکراتے ہوئے اسے مدعو کیا ''کیا پیو گی...... چائے یا......؟''

اس نے کہا ''کچھ نہیں' میرے ساتھ چلو۔''

میں بڑی مستعدی سے اٹھ کھڑا ہوا ''مائی پلیژر......''

اس نے مجھے غور سے دیکھا ''کیا بات ہے' آج کل تم بڑے اچھے بچے بنے ہوئے ہو۔ بہت دلجوئی کرتے ہو میری۔ کیا فرخندہ سے لڑائی ہوگئی ہے؟''

میں نے کہا ''نہیں' ایسی تو کوئی بات نہیں'' لیکن میں نے دل ہی دل میں مانا کہ میرا رویہ زیادہ محتاط ہونے سے قابل غور ہو گیا تھا۔ شوہر جب باہر کسی عورت کے ساتھ چکر چلاتا ہے تو گھر میں بیوی کے لیے زیادہ محبت جتانے لگتا ہے۔ ہر بیوی فوراً تاڑ جاتی ہے کہ بدلے بدلے مرے سرکار نظر آتے ہیں' آخر بات کیا ہے؟

''آج کل تم فرخندہ سے ملتے ہی نہیں'' اس نے مجھ پر نظر جما کے کہا۔

''تم کیا میری جاسوسی کرتی ہو؟'' میں نے برہمی سے کہا۔

''کیوں نہ کروں...... حق بنتا ہے میرا؟''

''کس بات کا حق...... کیسا حق؟'' میرا پارا چڑھ گیا۔

اس نے میرے گلے میں اپنی بانہیں ڈال دیں۔ اس وقت ہم یونیورسٹی کینٹے ٹیریا کے باہر کھڑے کم سے کم پچاس لڑکے لڑکیوں کی نظروں میں تھے۔ وہ سب بھی لو برڈز کی طرح کسی نہ کسی بنچ پر رومانٹک پوز میں بیٹھے تھے اور اس بارے میں کسی قسم کے احساس جرم میں مبتلا نہیں تھے مگر اس فلمی اسٹائل میں عشق کی تشہیر میں حد سے نہیں بڑھ رہے تھے۔

میں نے اس کے ہاتھ جھٹک کے اسے دور کر دیا ''کیا تم بالکل ہی پاگل ہوگئی ہو؟''

''ارے یار! جب پیار کیا تو ڈرنا کیا'' اس نے کھسیانی ہنسی کے ساتھ کہا کیونکہ اس کے ساتھ میرے رویے کو سب

نے نوٹ کیا تھا" میں تو یہ کہنے آئی تھی کہ آج رات کا کھانا تم کو ہمارے ساتھ کھانا ہے' ابا نے بلایا ہے۔"

"میں نہیں آ سکتا" میں نے دھاڑ کے کہا۔

اس کی صورت پر شرمندگی کا ردِعمل برہمی کے جذبات کا عکس بن کے نمودار ہوا" ابا تم سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ تم اپنے والدین کو کب لا رہے ہو ہمارے گھر؟"

"وہ کس لیے...... ان کا کیا تعلق تمہارے باپ سے؟"

"پیغام وہی لے کر آئیں گے...... یا یہ کام بھی مجھے کرنا پڑے گا۔ میں آؤں اپنے والدین کے ساتھ......؟"

پتا نہیں کیوں میرا دماغ گھوم گیا اور غصے میں میرے منہ سے وہ بات نکل گئی جو کسی کو معلوم نہیں تھی" دیکھو ماریا! تم بھی سن لو اور اپنے اماں ابا کو بھی بتا دینا' میں تم سے شادی نہیں کر سکتا۔"

"مگر کیوں......؟" وہ غصے میں چلائی۔

میں نے کہہ دیا" اس لیے کہ میں فرخندہ سے شادی کر چکا ہوں۔"

چند لمحے خاموشی رہی۔ اس دوران مجھے احساس ہوا کہ غلطی سے ہی سہی مگر میں نے اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار لی ہے۔ ماریا کو یہ بات سمجھنے میں کچھ دیر لگی۔ وہ میری صورت دیکھتی رہی اور بہت جلد سچ کو سمجھنے میں کامیاب رہی" کیا کہا تم نے' شادی کر چکے ہو؟" اس نے سپاٹ لہجے میں سوال کیا "کب......؟"

اب تردید لاحاصل تھی۔ میں نے کہا "ایک ہفتہ ہو گیا۔"

اس کی صورت کے تاثرات اس حد تک بدل گئے تھے کہ ماریا مجھے ایک اجنبی نظر آنے لگی تھی۔ میں نے اسے ٹھکرا دیا تھا۔ اس کے غرور کے آئینے کو چکنا چور کر دیا تھا۔ اس کی انا کو شکست سے دوچار کر دیا تھا۔ وہ زخم خوردہ ناگن کی طرح اندر ہی اندر بے بسی سے بل کھا رہی تھی مگر اپنے ظاہری رویے سے یہ ظاہر کرنے پر مجبور تھی کہ اس نے فرخندہ کی جیت کو خندہ پیشانی سے قبول کر لیا ہے۔

اس نے اپنے جذبات پر قابو پا کے اپنا ہاتھ بڑھایا "میری طرف سے اسے بھی مبارک باد دینا۔ مجھے امید ہے تم دونوں خوش رہو گے۔"

میں نے کہا" ماریا! آئی ایم سوری!"

وہ مسکرائی" اِٹ از او کے۔ جب دو آدمی جوا کھیلتے ہیں تو ایک ضرور ہارتا ہے۔"

میں نے کہا" تم سے ایک درخواست ہے' ابھی ہم نے کسی کو بھی کچھ نہیں بتایا ہے۔"

وہ جاتے جاتے رک گئی" کیا مطلب...... کورٹ میرج کی ہے تم نے؟"

میں نے کہا" نہیں...... کورٹ میرج تو نہیں' نکاح کر لیا ہے' دو گواہوں کی موجودگی میں...... اور بس!"

اس کے چہرے کی رونق بحال ہو گئی" فکر مت کرو۔ میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔ فرخندہ کو بھی مت بتانا کہ تم نے مجھے شریکِ راز کر لیا ہے۔ اسے اچھا نہیں لگے گا۔"

اس کی بات مجھے معقول لگی۔ میں نے فرخندہ سے کچھ نہیں کہا۔ ابھی اس بات کو ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا کہ مجھے چیف نے طلب کیا۔ یہ چیف سے میری پہلی براہِ راست ملاقات تھی ورنہ اس کے احکامات مجھ تک پہنچ جاتے تھے۔ ایک بار اس نے فون پر مجھے شاباش بھی دی تھی۔ میں ششں و پنج میں پڑ گیا۔ میرے دوستوں کو یقین تھا کہ مجھے تنظیم میں کوئی ذمے داری سونپنے کے لیے طلب کیا گیا ہے کیونکہ میری کارکردگی کا گراف مسلسل اوپر کی طرف جا رہا ہے۔ اس کا اعتراف ہائی کمان کی طرف سے کسی نہ کسی صورت میں ہوتا رہتا تھا۔

چیف سے ملاقات کا عمل بہت پُراسرار اور دشوار تھا۔ مجھے آنکھوں پر پٹی باندھ کر لے جایا گیا۔ ایک گاڑی سے میں دوسری میں سوار ہوا۔ پھر نہ جانے کتنے دروازوں سے گزرا۔ دو سیڑھیاں نیچے اترا' معلوم نہیں اتنی گہرائی میں واقع وہ تہ خانہ کہاں تھا؟

بالآخر ایک کمرے میں پٹی کھول دی گئی۔ اس سے پہلے میری مکمل تلاشی کپڑے اتار کے لی جا چکی تھی۔ یہ کمرا مشکل سے آٹھ فٹ لمبا چوڑا اور اونچا تھا۔ اس کی دیواریں بالکل سپاٹ تھیں۔ دروازہ صرف ایک تھا اور فرش پر دو کرسیوں کے سوا کوئی چیز نہیں تھی۔ ایک کرسی پر چیف پہلے سے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے مصافحہ نہیں کیا۔ اشارے سے مجھے بیٹھنے کے لیے کہا۔ کسی فاشسٹ تنظیم کے لیڈر کی طرح وہ اپنی شخصیت کا ایک دہشت زدہ کرنے والا امیج قائم رکھتا تھا۔

چیف چھ فٹ قد کا گورا چٹا آدمی تھا۔ بہت پہلے جب وہ معمولی اسٹوڈنٹ لیڈر تھا' اس کی داڑھی نہیں تھی۔ اب وہ ہر تصویر میں فرنچ کٹ داڑھی کے ساتھ نظر آتا تھا۔ اس نے میچنگ ٹائی کے ساتھ بہترین سلا ہوا سوٹ پہن رکھا تھا اور کوئی بہت بیش قیمت فرانسیسی خوشبو لگا رکھی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں سرخ شراب کے دو جام تھے۔

ایک اس نے مجھے تھمایا" رفیق احمد! تمہاری صحت کے لیے۔"

میں اتنا بے بس اور مفلوج ہو گیا تھا کہ میں انکار نہ کر سکا حالانکہ میں نے پہلے کبھی شراب نہیں پی تھی مگر میں نے نہ صرف یہ کہ جام لے لیا بلکہ اس کے ساتھ جام اٹھا کے ٹکرایا اور پی گیا۔

"رفیق احمد۔ شعبۂ نشر و اشاعت میں تم بہت اچھا کام کر رہے ہو۔ تنظیم کو عوامی مقبولیت حاصل ہو رہی ہے۔" اس نے اٹھ کے ٹہلتے ہوئے کہا" لیکن تمہاری توجہ ایک پہلو پر نہیں ہے۔"

میں نے کہا" وہ کیا چیف!"

"تم دشمنوں کے مخالف پروپیگنڈے کو رد کرنے کے لیے کچھ نہیں کر رہے ہو۔ کچھ لوگ ہمارے خلاف زہر اگل رہے ہیں۔"

میں نے کہا" کون لوگ چیف؟"

اس نے کہا" گزشتہ ماہ کچھ کتابچے شائع ہوئے ہیں۔ ان میں بہت خطرناک مواد موجود ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ گھر کا کوئی بھیدی لنکا ڈھانا چاہتا ہے۔ یہ انفارمیشن سچ ہے رفیق! کیا تم دیکھو گے؟"

"یس چیف!"

وہ دروازے سے باہر گیا اور چند منٹ میں لوٹ آیا۔ اس نے مجھے تین کتابچے تھما دیے۔" ان کے علاوہ ایک پوسٹر بھی پکڑا گیا ہے۔ ہمارے اندر کے راز ان کی صورت باہر نکل رہے ہیں۔"

"ایسا کون ہو سکتا ہے چیف!" میں نے کتابچے دیکھ کر کہا۔

اس نے سپاٹ لہجے میں کہا" یہ غالباً تم ہو۔"

مجھ پر جیسے بجلی سی گری" میں...... میں چیف!"

"یس' تم حبیب غضنفر کو جانتے ہو؟"

کمرا میری نظروں کے سامنے گھومنے لگا۔ حبیب غضنفر فرخندہ کے والد کا نام تھا۔

چیف نے اپنی بات جاری رکھی" وہ ایک این جی او کے لیے کام کرتا ہے۔ یہ کچھ خواتین کے حقوق کی جدوجہد کا ڈراما ہے۔ وہ ان کے سارے اسکرپٹ لکھتا ہے۔ ابھی ایک تھیٹر پرفارمنس بھی کی تھی۔ اچھا لکھنے والا ہے مگر اسے پیسے بہت کم ملتے ہیں۔ ہم نے اسے پیغام دیا تھا کہ ہمارے لیے لکھے لیکن وہ بدبخت ہمارے دشمنوں کے ساتھ مل گیا۔ ظاہر ہے صرف پیسے کے لیے۔ پیسا تو ہم دس گنا دیتے مگر اسے کچھ نظریاتی اختلاف کا مرض لاحق تھا۔"

میں نے بڑی مشکل سے کہا" اس بات کا کیا ثبوت ہے چیف!"

اس نے کہا" کس بات کا؟"

میں نے کہا" یہی کہ یہ سب انہوں نے لکھا ہے؟"

"اوہ...... میں سمجھا' تم اپنے بارے میں پوچھ رہے ہو۔ اس شخص کے خلاف بہت ثبوت ہیں۔ گواہ بھی ہیں۔ طرزِ تحریر اس کا ہے۔ ہم نے ایک مسودہ بھی پکڑا ہے اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا۔"

میں نے تھوک نگل کے کہا "فرض کیجیے ایسا ہے چیف......"

اس نے میری بات کاٹ دی" فرض کرنے والی کوئی بات نہیں۔ یہ ثابت ہو چکا ہے' کیا اسے اندر کی انفارمیشن تم دیتے ہو؟"

میرا حلق خشک ہونے لگا" یہ غلط ہے چیف!"

"تم اس کی بیٹی سے ملتے ہو نا...... اس سے محبت کرتے ہو؟"

میں نے کہا" یس...... وہ یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔"

"ایڈیٹ...... تمہاری عقل میں یہ معمولی سی بات کیوں نہیں آتی' اس نے اپنی لڑکی کو تمہارے پیچھے لگا دیا ہے۔ وہ تم سے سب اگلوا لیتی ہو گی۔ عشق میں آدمی خود عقل کا دشمن ہو جاتا ہے۔"

میں نے بڑے اصرار سے کہا" نہیں چیف! میں نے آج تک فرخندہ سے سیاسی معاملات پر کوئی بات نہیں کی' مجھے آخر کیا......؟"

"تم کو اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے کچھ کرنا ہو گا رفیق!" اس نے میری بات کاٹ دی" شک براہِ راست تم پر جا رہا ہے۔"

میں نے محسوس کیا کہ چیف کا ذہن میرے خلاف کر دیا گیا ہے۔ وہ مجھ سے بدظن ہے اور میرا اپنی صفائی میں کچھ کہنا اسے قائل نہیں کر سکتا۔ میری تردید سے اس کا موڈ خراب ہو رہا تھا۔ وہ غیر مشروط اطاعت مانگتا تھا اور اختلاف بالکل برداشت نہیں کرتا تھا۔ اس کا مزاج اس حد تک آمرانہ تھا کہ (نعوذ باللہ) وہ اپنی زبان سے نکلے ہوئے ہر لفظ کو حکمِ خداوندی سمجھتا تھا اور یہ چاہتا تھا کہ دوسرے بھی سمجھیں۔

میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا" اپنی بے گناہی کو ثابت کرنے کے لیے مجھے کیا کرنا ہو گا چیف!"

"مسئلہ حبیب غضنفر کا ہے' ختم کر دو۔"

میرا دل ڈوبنے لگا۔ تنظیم کے مسائل کو حل کرنے کا یہی

انداز تھا لیکن یہ انتہائی قدم تھا۔ پہلے وہ اپنے مخالفین کو خبردار کرتے تھے' پھر اغوا کرا کے کسی زیرِ زمین عقوبت خانے میں پہنچا دیتے تھے۔ یہ ٹارچر سیل کہاں تھے اور وہاں کیا ہوتا تھا؟ انہیں کون چلاتا تھا' اس بارے میں میری معلومات سنی سنائی باتوں تک محدود تھیں۔ تنظیم میں ایک شعبے کو دوسرے شعبے کے معاملات میں دخل دینے کی اجازت ہی نہیں تھی۔ ہر شخص اگر اپنے کام سے کام نہیں رکھتا تھا تو سزا پاتا تھا۔ ٹارچر سیلوں کے بارے میں پبلک میں بہت سی باتیں مشہور تھیں۔ یہ باتیں دہشت کی فضا قائم رکھنے کے لیے پھیلائی جاتی تھیں۔

جو لوگ ایک دفعہ کے سمجھانے سے نہیں سمجھتے تھے' ان کو ٹارچر سیل پہنچا دیا جاتا تھا۔ تنظیم کی اصطلاح میں ان کا نام ریفارم سینٹر تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ ریفارم سینٹر میں کتنے لوگ پہنچائے گئے اور وہاں ان پر کیا گزری کیونکہ جو اتنے خوش قسمت ہوتے تھے کہ زندہ سلامت اور بقائمی ہوش وحواس لوٹ آئیں وہ زندگی بھر کی خاموشی کبھی ختم نہیں کرتے تھے۔ جو اصلاح کے عمل کی تاب نہ لاتے ہوئے تنظیم کی اصطلاح میں خرچ ہو جائیں ان کا حساب کسی سے طلب نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جو لوگ غائب ہو جاتے تھے' ان کے بارے میں کوئی کچھ بھی بتانے کی پوزیشن میں نہیں ہوتا تھا۔ لواحقین عدالت عالیہ تک چلے جائیں تو ''قانون نافذ کرنے والے اداروں'' کے سب نمائندے حلف نامے داخل کر دیتے تھے کہ مذکورہ شخص ان کی تحویل میں نہیں ہے۔

''تمہاری اس خاموشی کا کیا مطلب نکالا جائے رفیق!'' چیف کی آواز گونجی۔

میں چونکا ''جی...... کچھ نہیں...... میرا مطلب ہے' اگر آپ کسی طرح حبیب غضنفر کو خبردار کر دیتے...... یا اس کی اصلاح......''

اس نے دہاڑ کے کہا ''شٹ اپ۔ آج تک کسی نے مجھے یہ بتانے کی جرأت نہیں کی کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ یہ تمہاری پہلی غلطی ہے اس لیے معاف کر رہا ہوں۔''

میرے جسم پر خوف سے ٹھنڈا پسینہ بہنے لگا ''چیف......! اس کی بیٹی......''

''وہ تمہاری بیوی ہے'' چیف نے اچانک اپنا لہجہ بدل لیا ''مجھے معلوم ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ تنظیم میں شامل ہو اور تمہاری طرح اپنی کارکردگی ثابت کرے۔ تم نے اس سے شادی کی ہے تو یہ بھی تمہاری ذمے داری ہے۔ اب تم جا سکتے ہو۔''

مجھ پر اس کی اتنی دہشت سوار تھی کہ میں چیف سے یہ بھی نہ کہہ سکا کہ میں فرخندہ کے باپ کو کیسے قتل کر سکتا ہوں۔ اس کا جرم کچھ بھی ہو' یہ میرے بس کی بات نہیں۔ اس بات کا اندازہ تو مجھے ہو ہی گیا تھا کہ یہ شرانگیزی کس نے کی ہوگی۔ ماریا اپنے باپ کے سامنے جا کے روئی ہوگی اور اس کے باپ نے کہا ہوگا کہ بیٹی' اپنے آنسو پونچھ لے' رونے والے وہ ہوں گے جنہوں نے تجھے دکھ دیا۔ اب وہ سکھی نہیں رہ سکتے۔

جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ فرخندہ کے باپ نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ اس نے کوئی کتابچہ نہیں لکھا تھا' نہ تنظیم کے خلاف کوئی تحریر چھاپی تھی۔ چیف نے مجھے جو کتابچے دکھائے ان کا کوئی وجود نہ تھا۔ وہ صرف مجھے دکھانے اور قائل کرنے کے لیے چھاپے گئے تھے اور شاید ان کی ایک ایک کاپی ہوگی جو بعد میں تلف کر دی گئی ہوگی۔

میں تین دن تک سخت ٹینشن میں رہا کہ بلا چوں وچرا چیف کے احکامات پر کیسے عمل درآمد کروں یا کراؤں؟ اصولی طور پر یہ کام میرا نہیں تھا مگر میں چیف کے سامنے ایسا کہتا تو یہ اسے اپنی غلطی کا احساس دلانے کے مترادف اور ایک سنگین جرم ہوتا۔ مجھے رات کو ٹھیک سے نیند نہیں آتی تھی۔ میں یونیورسٹی بھی نہیں گیا تھا تاکہ فرخندہ کا سامنا نہ ہو ورنہ میری حالت دیکھتے ہی وہ تاڑ جائے گی کہ میں کسی پریشانی کا شکار ہوں۔ میں نے سوچا کہ فرخندہ سے بات کروں' اسے تنظیم سے میری وابستگی کا تو اندازہ تھا اور وہ اسے پسند نہیں کرتی تھی مگر اسے یہ علم نہیں تھا کہ اپنی ''کارکردگی'' کی بنا پر میں تنظیم کے اعلیٰ عہدے پر فائز ہوں۔ پھر میں نے اس کے باپ سے براہِ راست معلومات حاصل کرنے اور اسے سمجھانے یا خبردار کرنے کا سوچا۔ اسی شش وپنج میں تین دن گزر گئے۔

خود چیف شاید اتنا بے رحمانہ فیصلہ نہ کرتا۔ وہ میری سابقہ خدمات کے پیشِ نظر میری بیوی کو اس معاملے سے الگ رکھتا مگر اسے بھڑکانے اور انتہائی قدم اٹھانے پر مجبور کرنے والا اس کا دستِ راست ماریا کا باپ تھا۔ اس نے کہا ہوگا کہ یہ لونڈا بغاوت پر آمادہ ہے۔ اس لڑکی کی بات کو آپ کی بات سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ تین دن میں اس نے کچھ نہیں کیا۔ اب آپ کو کچھ ضرور کرنا چاہیے ورنہ کل کو تنظیم کے دوسرے ماتحت اس نافرمانی سے شہ پائیں گے۔ یہ کہا جائے گا کہ اب آپ کی تنظیم پر گرفت مضبوط نہیں رہی۔

چیف کی یہی کمزوری تھی۔ اس نے تنظیم کے تادیبی شعبے کو حکم دیا کہ فرخندہ کے باپ کو ایسی سزا دی جائے جس سے مجھے عبرت حاصل ہو۔ تنظیم کے ڈیتھ اسکواڈ میں انتہائی سفاک' بے ضمیر اور درندہ صفت افراد شامل تھے۔ وہ بربریت

کے مظاہرے سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ خونریزی ان کی سرشت میں چھپے ہوئے حیوان کی بھوک مٹاتی تھی۔ عرفِ عام میں وہ شیطان کے چیلے کہلاتے تھے۔

چوتھے پانچویں دن میں یونیورسٹی گیا تو مجھے احساس ہوا کہ دوست اور کلاس فیلو مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ وہ مجھ سے کترا رہے تھے اور اپنی آنکھوں میں چھپے کسی سوال کو پوچھنے سے گریزپا نظر آتے تھے۔ بالآخر میں نے ایک لڑکے کو پکڑ لیا۔

''یار! کیا میرے سر پر راتوں رات سینگ نکل آئے ہیں؟ ایسی کیا بات ہوئی ہے آخر؟''

اس نے بہت سوچ کے اور میری صورت پر غور کر کے کسی حد تک دکھی' خوف زدہ اور ہمدرد لہجے میں کہا ''تجھے نہیں معلوم؟''

''کیا نہیں معلوم؟''

''یار...... وہ سب جو اخبارات میں شائع ہوا ہے؟'' وہ بھی دامن چھڑا کے بھاگنے لگا۔

''کیا شائع ہوا ہے؟''

''تو خود اخبار دیکھ لے یار!'' وہ راستہ کاٹ کے نکل گیا۔

جب میں نے کیفے ٹیریا میں جا کے اخبار دیکھا تو مجھے لگا جیسے وہاں میرے آنے سے پہلے بھی میں ہی موضوعِ بحث تھا اور اچانک وہاں ایک پراسرار معنی خیز اور بوجھل خاموشی مسلط ہو گئی ہے۔ وہ سب دیکھ رہے تھے کہ میں اخبار دیکھ رہا ہوں۔ چند منٹ میں کیفے ٹیریا خالی ہو گیا۔

لیکن مجھے اس کا پتا نہیں چلا۔ میری نظریں فرخندہ کی لاش پر جم کے رہ گئی تھیں۔ لاش کے حوالے سے ایک خبر صفحۂ اول پر باکس میں لگائی گئی تھی۔ گزشتہ رات نامعلوم افراد نے فلاں ایجنسی کے اسکرپٹ رائٹر کے گھر میں داخل ہو کے اہلِ خانہ کو یرغمال بنایا۔ لوٹ مار کی اور غالباً مزاحمت کرنے پر اسکرپٹ رائٹر کو ذبح کر دیا۔ ان کی بیوی' جس کے جگر کے سرطان کی تشخیص تین ماہ قبل ہو گئی تھی فلاں اسپتال کے آئی سی یو میں داخل ہے۔ ان کی بیٹی کی لاش کمرے میں چھت کے پنکھے سے لٹکی پائی گئی اور پولیس نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ حملہ آوروں نے اس کی اجتماعی آبروریزی کرنے کے بعد اسے بھی قتل کر دیا لیکن اسے خودکشی کا رنگ دینے کی کوشش کی۔ حملہ آور اپنے ساتھ کیا لے گئے۔ یہ بتانے والا کوئی نہیں۔ مرحوم کا ایک بیٹا باہر ہے۔ یہاں وہ ایک ہی لڑکی کے ساتھ رہتے تھے جو یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔ باقی سب وہی بکواس تھی کہ پولیس تفتیش کر رہی ہے اور فلاں نے کہا ہے کہ مجرم بہت جلد گرفتار کر لیے جائیں گے۔ فلاں نے سخت دکھ اور فلاں نے تشویش کا اظہار کیا ہے' وغیرہ وغیرہ۔

اس خبر کی تفصیل میں ایک بات نہیں تھی۔ فرخندہ کے ساتھ اس کا ایک چھوٹا بھائی بھی رہتا تھا جس کی عمر نو دس سال تھی۔ اس کے بارے میں کچھ نہیں تھا کہ وہ واردات کے وقت کہاں تھا۔ نو دس سال کا بچہ کسی اسپتال میں ماں کے پاس نہیں ہو سکتا تھا۔ خصوصاً آئی سی یو۔

میرا خیال تھا کہ میں خودکشی کر لوں گا' پاگل ہو جاؤں گا۔ میں نے سوچا کہ میں پولیس کے پاس جا کے اس قتل کے اسباب اور قاتلوں کو بے نقاب کر دوں۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ چیف کو قتل کر دوں۔ ماریا کے باپ کو مار ڈالوں اور ماریا کی لاش کو اسی طرح پنکھے سے لٹکا دوں۔

لیکن یہ سب ایک خیالی پاگل پن تھا۔ نہ میں کچھ کرنے کی ہمت رکھتا تھا اور نہ کر سکتا تھا۔ چیف تک تو میری رسائی بھی نہ تھی جو بھی اس کے سامنے جاتا تھا اس کے کپڑے اتار کے تلاشی لی جاتی تھی۔ وہ باہر نکلتا تھا تو مسلح محافظوں کے نرغے میں اور سیاہ شیشوں والی گاڑی استعمال کرتا تھا۔ یہ گاڑی بدلتی رہتی تھی۔ ماریا اور اس کے باپ کو قتل کیا جا سکتا تھا۔ میں پولیس یا عدالت میں جا کے اپنا بیان بھی ریکارڈ کرا سکتا تھا مگر یہ خودکشی سے بھی بدتر ہوتا۔ نہ پولیس مجھ پر یقین کرتی نہ عدالت۔ نہ میرے پاس کوئی ثبوت تھا اور نہ گواہ۔ میری کسی بھی جذباتی حماقت کا خمیازہ میرے ساتھ میرا پورا خاندان بھگتنے پر مجبور ہوتا۔

چنانچہ میں کچھ بھی نہ کر سکا۔ سوائے رونے کے۔ میرا دماغ تقریباً خراب ہو گیا تھا۔ ایک آواز میرے اندر سے مجھے اعترافِ جرم پر مجبور کرتی رہتی تھی۔ مان لو کہ فرخندہ کی بے آبرو موت کے ذمے دار تم ہو۔ نہ تم اس سے محبت اور شادی کرتے نہ اس کی جان اور عزت جاتی۔ تم اندازہ کر سکتے تھے کہ ماریا کا ردِعمل کیا ہوگا اور اس کا باپ کیا کر سکتا ہے مگر تم نے اس کے باوجود فرخندہ کو بچانے کے لیے کچھ نہیں کیا۔ کیا تھا اگر تم ماریا کو ٹالتے رہتے۔ مصلحت سے کام لیتے۔ فرخندہ کی جان کو یوں داؤ پر نہ لگاتے۔ اسے چھوڑ دیتے' کہیں لے کر بھاگ جاتے' محبت کرتے تھے تو کچھ کر کے دکھاتے۔

رات کو فرخندہ مجھے تسلی دینے آ جاتی تھی۔ خود کو قصوروار مت سمجھو' اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ پھر میرے سامنے اس کی پنکھے سے جھولتی ہوئی لاش آ جاتی تھی اور میں دہشت زدہ ہو کے اٹھ بیٹھتا تھا۔ اپنے طور پر میں

سکون آور گولیاں نگلنے لگا۔ میں اپنے والدین کو بھی کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا مگر وہ میری حالت سے اتنے پریشان تھے کہ ایک دن مجھے زبردستی ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ ڈاکٹر ابا کے بچپن کا دوست تھا۔ اس نے کہا کہ لڑکے کو میرے پاس چھوڑ جاؤ۔ ایک رات میں اس نے رازداری کے وعدے پر مجھ سے سب اگلوالیا۔

ویسے تو وقت ہر زخم کا مرہم بن جاتا ہے مگر مجھے نارمل زندگی کی طرف لوٹانے میں اس ڈاکٹر کا بہت ہاتھ رہا۔ اس نے دوائیں کم دیں' باتیں زیادہ کرتا رہا۔ وہ میرا حوصلہ بڑھاتا رہا۔ میرے دماغ سے انتقام کی دیوانگی کو نکالتا رہا۔ اچھے مستقبل کے لیے جذبات کے بجائے عقل سے کام لینے کی ترغیب دیتا رہا۔

ایک مہینے بعد میں یونیورسٹی گیا تو دنیا بدل چکی تھی۔ فرخندہ کو سب بھول گئے تھے۔ ایک طرف رشتوں کی زنجیر تھی' دوسری طرف جبر کی۔ میں محض ایک قیدی تھا جو اپنی مرضی سے کچھ کرسکتا تو اس دنیا کو تباہ کردیتا لیکن میں پھر پڑھائی میں لگ گیا اور فرخندہ کو بھلانے کی کوشش بھی کرتا رہا لیکن انتقام کی آگ میرے وجود کے اندر سلگتی رہی۔

میرے ابا کے ڈاکٹر دوست نے یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ رفیق کی زندگی عزیز ہے تو کراچی چھوڑ دو۔ وہ یہاں رہے گا تو اس ماحول سے نجات نہیں ملے گی اور نہ وہ تنظیم کے چنگل سے نکل سکے گا۔ بے شک تنظیم کا دائرہ پاکستان کے دیگر صوبوں تک پھیلا ہوا ہے لیکن یہ لاہور یا اسلام آباد میں اجنبی ہوگا۔ یہاں اسے دباؤ میں رکھنے والے پرانے ساتھی ہیں اور یہ کراچی میں رہا تو انہی کے ہاتھوں مارا جائے گا' جن کے ساتھ اس کا اٹھنا بیٹھنا ہے۔

ابا کو قدیر کا انجام یاد تھا۔ انہوں نے اپنے دوست کی بات مان لی۔ وہ لیکچرار تھے اور محکمۂ تعلیم میں گریڈ اٹھارہ کے ملازم۔ ان کو لاہور ٹرانسفر کرانے میں بڑی دشواریوں کا سامنا ہوا۔ کچھ سفارش اور کچھ رشوت دینے کے بعد ان کی درخواست قبول کرلی گئی لیکن اسلام آباد کے بجائے انہیں لاہور بھیج دیا گیا۔ یہ 1998ء کی بات ہے۔ وہ میرا بی کام آنرز کا آخری سمسٹر تھا۔ ابا اکیلے ہی لاہور گئے۔ وہ ڈاکٹر انکل کو پاور آف اٹارنی دے گئے کہ مکان کو فروخت کرادیں اور چار ماہ بعد میرے فائنل سمسٹر کے امتحانات ختم ہوتے ہی مجھے اور امی کو خاموشی سے لاہور روانہ کردیں۔

ڈاکٹر انکل کے کردار کی عظمت کو میں آج بھی سلام کرتا ہوں۔ وہ میرے والد کے ہی نہیں' میرے بھی سب سے مخلص اور قابل اعتماد دوست ثابت ہوئے۔ انہوں نے میری اور فرخندہ کی محبت یا شادی کے بارے میں بھی کسی کے سامنے ایک لفظ منہ سے نہیں نکالا۔ آج میں محسوس کرتا ہوں کہ نوجوانی کے اندھا کردینے والے جذبات میں ہم کتنا آگے بڑھ گئے تھے۔ میری عمر اس وقت صرف بیس سال اور فرخندہ کی اٹھارہ سے کچھ اوپر تھی چنانچہ ہمیں یہ خوش گمانی بھی تھی کہ اب ہم عاقل و بالغ ہیں اور اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزارنے کا قانونی حق رکھتے ہیں۔ اگر ہم جذبات پر قابو رکھتے' مصلحت کو سمجھتے اور معاملات اپنے والدین کے سپرد کردیتے تو کوئی خرابی نہ ہوتی لیکن یہ خیالات وقت کے ساتھ حاصل ہونے والی شعور کی پختگی کا نتیجہ ہیں اور آٹھ سال گزر جانے کے بعد فرخندہ ماضی کی ایک بھولی بسری یاد بن چکی ہے۔

فرخندہ کی موت نے مجھے بہت بڑا جھٹکا دیا تھا۔ میں اس صدمے سے سنبھل گیا تھا اور میری سوچ میں زندگی بدل دینے والی تبدیلی آگئی تھی۔ مجھے احساس ہوگیا تھا کہ جس راستے پر میں چل رہا ہوں اس میں میرے لیے کوئی کامیاب مستقبل نہیں۔ مجھے اپنا راستہ بدلنا ہوگا' اپنے ماضی کے ہر آسیب سے چھٹکارا حاصل کیے بغیر میں کامیابی حاصل نہیں کرپاؤں گا۔

میں نے سنجیدگی سے تعلیم کی طرف توجہ دی۔ اپنے والدین سے پوری طرح تعاون کیا اور انہیں یقین دلایا کہ آہستہ آہستہ میں خود کو تنظیم سے الگ کرلوں گا۔ میں پھر یونیورسٹی جانے لگا اور وہاں میں نے مشہور کیا کہ والدین مجھے ماسٹرز کی ڈگری کے لیے ہارورڈ بھیج رہے ہیں۔ چھ مہینے بعد میں پاکستان سے چلا جاؤں گا۔ تاہم میں نے تنظیم کو یقین دلایا کہ امریکا میں رہ کے بھی میں تنظیم سے تعاون جاری رکھوں گا اور جب واپس آؤں گا تو میری خدمات تنظیم کے لیے وقف ہوں گی۔

ماریا دو مہینے مجھ سے دور رہی۔ پھر میرا موڈ دیکھتے ہوئے اس نے دوبارہ مجھے محصور کرنے کا پلان بنالیا۔ آہستہ آہستہ وہ میرے قریب آنے لگی اور میں نے بھی یہ ظاہر کیا جیسے میں اس کے ہمدردانہ رویے سے متاثر ہورہا ہوں۔ ایک پلان میرے ذہن میں بھی تھا۔ میں نے ماریا کی حوصلہ افزائی کی لیکن اس سے کہا کہ فرخندہ کی موت کے بعد میں بہت ڈرتا ہوں۔ ہم اپنے تعلق کی تشہیر نہیں کریں گے۔ یونیورسٹی میں ملنا تو درکنار ہم ایک دوسرے سے بات بھی نہیں کریں گے۔ ہمارے درمیان مکمل اجنبیت کی خلیج سب کو نظر آنی چاہیے۔

وہ کسی کو رازدار بنا کے کچھ کہے گی نہ میں کسی کو بتاؤں گا کہ میں ماریا کو چاہنے لگا ہوں۔ لڑکوں کی تو کوئی بات نہیں' ان کا فلسفہ یہ ہے کہ لڑکی اور بس کے مس ہوجانے کی کیا فکر کرنی۔ ایک مس ہوگئی تو دوسری آتی ہوگی مگر لڑکیاں مجھے بہت لعنت ملامت کریں گی' وغیرہ وغیرہ۔ ہم ملیں گے مگر باہر۔ کسی کے سامنے نہیں۔ ماریا میری باتوں میں آگئی۔ وہ مجھے اتنی جلدی دوبارہ حاصل کرلینے پر اتنی خوش تھی کہ اس نے میری ہر بات مان لی۔

ہم شام کو یا رات کو اکٹھے گھومتے تھے۔ ہوٹلوں میں جاتے تھے' لانگ ڈرائیو کرتے تھے اور ساحل سمندر کے کسی کاٹیج میں یا کسی مضافات کے فارم ہاؤس میں پکنک مناتے تھے۔ میرے عشق کے والہانہ پن نے اسے اتنا بےخود کردیا تھا کہ کسی تذبذب یا مزاحمت کے بغیر میں نے جب چاہا اس نے خود کو میرے سپرد کردیا۔ مجھ پر مکمل اختیار کے نشے میں وہ اتنی مدہوش تھی کہ اسے نتائج کی قطعی فکر نہ تھی۔ اس نے مجھ سے اعتراف کرالیا تھا کہ فرخندہ سے محبت اور شادی میری بےوقوفی تھی اور اس لڑکی کے لیے ماریا کو ٹھکرا کے میں نے گناہ کیا تھا۔ اسے کوئی شک نہ تھا کہ سمسٹر ختم ہوتے ہی میں اپنے والدین کے ساتھ ان کے گھر آؤں گا اور ہم نتیجہ آنے سے پہلے ہی رشتہ ازدواج میں منسلک ہوجائیں گے۔ جو ازدواجی تعلقات ہمارے درمیان موجود تھے' اس پر ماریا کسی احساس جرم و ندامت میں مبتلا نہ تھی۔

دوسرے مہینے ہی اس کے پریگننسی ٹیسٹ کی رپورٹ پوزیٹو آگئی تو میں نے اسے تسلی دی کہ ''پریشانی کی کیا بات ہے؟ ہم تو جانتے ہیں ناں کہ بچہ ہمارا ہی ہے۔''

اس نے میرے سینے پر سر رکھ دیا ''لیکن رفیق! دنیا کیا کہے گی۔ اگر شادی کے چار ماہ بعد ہی بچہ ہوگیا؟''

ہم اس وقت ساحل سمندر کے ایک سرکاری گیسٹ ہاؤس میں تھے جہاں ہمیں پوری خلوت میسر تھی۔ میں نے کہا ''دنیا کی ایسی تیسی۔''

اس نے اصرار کرتے ہوئے کہا ''رفیق! ڈیڈی کی عزت کا معاملہ بھی تو ہے۔''

میں نے کہا ''آخر تم کیا چاہتی ہو؟''

''ہم فوراً شادی کرلیں۔''

''میرا خیال ہے یہ مسئلہ دوسرے طریقے سے بھی حل کیا جاسکتا ہے۔ شادی کے بعد ہم باہر چلے جائیں۔''

''اس سے بچے کی پیدائش موخر تو نہیں ہوگی۔ ہمیں واپس تو آنا ہوگا کبھی نہ کبھی۔''

میں نے کہا ''یہ بھی لازمی نہیں' ہم باہر سیٹل ہوسکتے ہیں۔''

''کیا تم اپنے ماں باپ سے ڈرتے ہو؟ وہ نہیں مانیں گے؟''

میں نے کہا ''ہاں...... اور میں ان کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کرسکتا۔ میں اکلوتا بیٹا ہوں۔''

''اگر وہ نہ مانے...... پھر......؟''

میں نے ہنس کے کہا ''یہ ناممکن ہے کہ وہ میری خواہش پوری نہ کریں اور پھر تم جیسی لڑکی انہیں دل و جان سے قبول ہوگی۔ وہ چراغ لے کر ساری دنیا میں تلاش کرتے رہیں تب بھی ایسی بہو کہاں ملے گی انہیں؟''

وہ خوش ہوگئی ''لیکن یہ بچہ...... کیا انہیں صدمہ نہیں ہوگا؟''

میں نے سوچ کے کہا ''چلو یہ مسئلہ ہی ختم کرو' ابارشن کرالو۔''

''ابارشن......؟'' وہ فکرمند ہوگئی ''مگر کیسے...... اور کہاں سے؟''

''یہ انتظام میں کرلوں گا۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوگی۔ فکر کی کوئی بات نہیں' بچے بہت ہوں گے شادی کے بعد۔''

وہ مان گئی اور میں نے ایک پرائیویٹ میٹرنٹی ہوم سے اس کا ڈی این سی کرادیا۔ اس میں میرے دس ہزار خرچ ہوئے لیکن میں نے اسپتال سے وہ ساری رپورٹس لے لیں جن میں ماریا کا اصل نام مع والد کے نام کے موجود تھا۔ میں نے کہا تھا کہ وہ میری بیوی ہے مگر اس کا نام ماریا رفیق نہیں' ماریہ لطیف لکھوایا تھا۔ یہی نام اس کی پریگننسی رپورٹ پر بھی تھا۔

ماریا ایک سہیلی کی شادی کا بہانہ کرکے گھر سے گئی تھی اور صرف ایک رات اسپتال میں گزار کے لوٹ آئی۔ پروگرام کے مطابق میں نے پلان کے آخری مرحلے میں ماریا کے ساتھ آخری رات اسی سرکاری ہٹ میں گزاری لیکن اس رات کے لیے میں نے خصوصی انتظامات کیے تھے۔ نصف شب کے بعد تک ہم سمندر میں نہاتے رہے اور پھر ہٹ میں جو کچھ کرتے رہے' اس کی مخصوص زاویے سے فلم بندی دو خفیہ کیمرے کرتے رہے۔ یہ کیمرے اندھیرے میں بھی اتنی ہی صاف منظرکشی کرسکتے تھے جتنی دن کے اجالے میں اور ایک چھوٹے سے ریموٹ سے کنٹرول ہوتے تھے۔ میرا چہرہ کسی منظر میں کسی زاویے سے سامنے نہ آیا۔

رات کے آخری پہر میں چار افراد دندناتے ہوئے اندر

گھس آئے۔ وہ کوئی ویک اینڈ نہیں تھا جب دوسرے ہٹس بھی آباد ہوتے ہیں۔ اردگرد کے ہر ہٹ میں اندھیرا تھا۔ چوکیدار سوئے پڑے تھے۔ اگر کہیں کوئی موجود بھی ہوتا تو مرنے کے لیے ادھر کا رخ نہ کرتا۔

انہوں نے ماریا کے ساتھ وہی سلوک کیا جس کے لیے میں نے ان کی خدمات حاصل کی تھیں۔ وہ تنظیم کے ہی کارکن تھے اور انہیں معاوضہ بھی مروجہ شرح پر دیا گیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ انہیں ہائی کمان کی طرف سے احکامات موصول ہوئے ہیں لیکن وہ ماریا کو پہچانتے نہیں تھے اور انہیں یہ علم نہیں تھا کہ وہ کس کی بیٹی ہے۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ وہ ایک دشمن کی بیٹی ہے۔

انہوں نے مجھے باندھ کے ایک طرف ڈال دیا اور مزاحمت پر میری جینوئن پٹائی بھی کی۔ میں نے اصرار کیا تھا کہ میرے ساتھ کوئی رعایت نہ کی جائے۔ ایسا نہ ہو کہ ماریا کو ڈرامے کا شک ہو جائے۔ انہوں نے میرے منہ کو ٹیپ سے بند کر دیا کیونکہ میں شور بہت کر رہا تھا۔ میرے ہاتھ انہوں نے زیادہ مضبوطی سے نہیں باندھے تھے چنانچہ میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ ایک ہاتھ سے کیمروں کا ریموٹ کنٹرول استعمال کیا جس کی خبر ان حملہ آوروں کو بھی نہ ہو سکی۔

طلوع آفتاب سے قبل وہ چلے گئے۔ پھر میں نے بڑی کوشش سے اپنے ہاتھوں کو آزاد کیا۔ منہ سے ٹیپ ہٹایا اور پیروں سے لپٹی ہوئی رسی الگ کی۔ ماریا کی حالت غیر تھی۔ حملہ آور بڑے وحشیانہ انداز میں اس کے جسم سے کھیلتے رہے تھے۔

اس کا خیال تھا کہ اب میں اس کی مدد کروں گا۔ اس سے ہمدردی کروں گا اور اسے تسلی دے کر خاموشی سے کسی اسپتال لے جاؤں گا لیکن میں اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

''اب کیا خیال ہے ماریا؟'' میں نے کہا ''تم کیسا محسوس کر رہی ہو؟''

اس نے روتے روتے کہا ''مجھے اپنے ہاتھوں سے مار ڈالو رفیق! میری لاش کو سمندر میں پھینک دو' اب میں تمہارے قابل نہیں رہی۔''

میں نے افسوس سے سر ہلایا ''میرے قابل تو خیر تم کبھی نہ تھیں مگر میں تمہیں قتل نہیں کر سکتا۔ بہتر ہے کہ تم خودکشی کر لو۔''

صدمے سے اس نے ایک چیخ ماری ''رفیق! یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟''

میں نے وہی رسی اسے پیش کی جس سے مجھے باندھا گیا تھا۔ ''اس پنکھے سے لٹک کر خود کو پھانسی دینا چاہو تو میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔''

''کیا......!'' وہ چلائی ''تم چاہتے ہو میں مر جاؤں؟''

میں نے سکون سے کہا ''فرخندہ بھی تو مر گئی تھی۔''

اچانک ایک بھیانک حقیقت کے انکشاف نے ماریا کو مفلوج کر دیا ''تم نے...... تم نے انتقام لیا ہے مجھ سے؟''

''میں تمہیں معاف کیسے کر سکتا تھا۔ جو بے آبروئی کا عذاب اس نے جھیلا تھا' میں نے بھی سہا تھا۔ وہ غیرت مند تھی' اپنی جان پر کھیل گئی۔ میں بے غیرت تھا اسی لیے زندہ رہا۔''

وہ مجھے گالیاں دینے لگی ''کمینے...... شیطان' تم نے میری زندگی برباد کی۔''

میں نے کہا ''یہ تو مکافاتِ عمل ہے۔ تم نے میری زندگی برباد کی تھی اب کفارہ ادا کرنے کے لیے تمہیں مرجانا چاہیے۔''

اس کی آنکھوں میں دہشت اتر آئی ''ورنہ...... تم مجھے مار دو گے؟''

''ابھی تمہیں اندازہ نہیں کہ تمہارے لیے اور تمہارے باپ کے لیے جینا کتنا مشکل ہو جائے گا۔ اگر میں نے اس رات کی فلم ریلیز کر دی۔ اس فلم میں میرا کوئی رول نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ تم خود دیکھ لو۔''

سرکاری ہٹ میں سب کچھ تھا۔ ایک ٹی وی پر ماریا نے خفیہ کیمروں کی عکس بندی کے مناظر دیکھے۔ وہ دیوانہ وار چیخنے لگی اور مجھے گالیاں دینے لگی مگر اس وقت وہاں اس کی آواز سننے والا کون تھا؟

میں نے کہا ''سوچو ذرا یہ فلم پبلک کے لیے ریلیز کر دی گئی تو تم اور تمہارا باپ دنیا کو کیسے منہ دکھائیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ تم کو گولی مار کے خود بھی مر جائے گا۔''

وہ دھاڑیں مار مار کے رونے لگی ''خدا کے لیے ایسا مت کرو۔''

میں نے کہا ''میرے پاس تمہاری رپورٹس بھی ہیں۔ پریگننسی کی اور ابارشن کی۔ اگر وہ اخبار والوں کے ہاتھ لگ گئیں......''

''خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو۔'' وہ چیخنے لگی۔

میں نے اسی بے حسی کے ساتھ کہا ''فرخندہ پر کس نے رحم کیا تھا...... لیکن ایک رعایت میں تمہیں دے سکتا ہوں۔ اگر تم خودکشی کر لو تو نہ یہ فلمیں ریلیز ہوں گی اور نہ تمہارے

کالے کرتوت کی دستاویزات جاری کی جائیں گی۔ تمہارا باپ تمہارے جنازے پر عزت کی چادر ڈالنے کے لیے کوئی کہانی بنا لے گا؟ جیسے فرخندہ کے لیے بنائی گئی تھی کہ ڈاکو تھے' دشمن تھے' شیطان تھے۔ میرے گھر میں گھس آئے۔ ساحل سمندر کے اس کاٹیج میں تمہاری لاش کے پائے جانے والی بات کا حوالہ ہی نہیں آئے گا۔ مرنے کے بعد تمہاری بے آبروئی کے افسانے عام نہیں ہوں گے۔ تمہارا باپ بھی عزت سے جی لے گا۔ کم آن...... اپنی اور اپنے باپ کی عزت پر قربان ہو جاؤ۔''

وہ خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ ''کیا گارنٹی ہے کہ تم اپنے وعدے پر قائم رہو گے؟''

''تمہارے لیے گارنٹی کیا ہے۔ پھر بھی میں یقین دلاتا ہوں کہ اپنے وعدے پر قائم رہوں گا۔''

''تم بچ نہیں سکو گے رفیق!''

میں نے کہا ''میری نہیں' اپنی فکر کرو۔ اس وقت میری یہاں موجودگی کسی طرح ثابت نہیں ہو گی۔ میں حیدر آباد کے ایک گیسٹ ہاؤس میں ہوں جہاں میری موجودگی کے بڑے معتبر گواہ ہیں۔ میرے اور تمہارے تعلق...... بلکہ دوبارہ تعلق کی کسی کو خبر نہیں۔ تمہارے باپ کو بھی نہیں۔ پولیس کو تمہاری لاش کے ساتھ باہر ایک گاڑی ملے گی جو میری نہیں ہو گی۔ اور دستاویزات ملیں گی۔ ان سے تمہارا کسی کے ساتھ ناجائز تعلق ثابت ہو گا مگر تمہارا باپ پولیس سے سب کچھ خرید سکتا ہے۔ معاملے کو دبا سکتا ہے۔ وہ بڑا چالاک اور بااثر آدمی ہے۔''

''اور اگر میں ایسا نہ کروں......؟''

میں نے کہا ''پھر مجبوراً مجھے خود یہ کام کرنا پڑے گا۔ میں تمہیں یہاں لٹکانے کے بعد تمہارے باپ کے پاس جاؤں گا۔ اسے بھی یہ فلمیں دکھاؤں گا اور مشورہ دوں گا کہ خودکشی کر لے۔ ورنہ اسے بھی قتل کر دوں گا۔ اور اس کے بعد فلمیں اور دستاویزات عام کر دوں گا۔ مرنے کے بعد بھی تمہاری اور تمہارے باپ کی کتنی رسوائی ہو گی۔''

ماریا کا دماغی توازن کیسے قائم رہ سکتا تھا۔ اس پر دہشت طاری ہو رہی تھی۔ وہ ایک دم اٹھی اور اس نے میرے ہاتھوں سے رسی جھپٹ لی۔ اس نے میرے سامنے ایک کرسی پر اسٹول رکھا۔ جب وہ اوپر چڑھ کے اپنے گلے میں رسی کا پھندا ڈال رہی تھی تو میں باہر نکل گیا۔ جب میں پھر واپس آیا تو اس کی لاش پنکھے سے لٹکی جھول رہی تھی۔

میں نے وہیں سے ماریا کے باپ کو فون کیا۔ میں نے کہا کہ اس کے لیے ایک بہت بری خبر ہے جو فون پر نہیں بتائی جا سکتی۔ اس کا تعلق ماریا سے ہے۔ وہ فوراً اکیلا اور کسی کو بتائے بغیر سینڈز پٹ کے فلاں ہٹ میں پہنچ جائے تاکہ ہم مل کے صورت حال کو سنبھال لیں۔ اگر یہ بات کسی کو معلوم ہوئی تو اس کی عزت دو کوڑی کی ہو جائے گی اور وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔

وہ بہت گھبرایا لیکن میں نے اسے تفصیل نہیں بتائی اور بار بار یہی کہا کہ وہ مجھ پر بھروسا کرتے ہوئے اکیلا آئے۔ ایک گھنٹے بعد وہ اپنی لینڈ کروزر دوڑاتا ہوا وہاں پہنچا تو اس کی حالت غیر تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ بلڈ پریشر کا اور انجائنا کا مریض ہے۔ کمرے میں قدم رکھتے ہی اس کو جیسے کسی نے گولی مار دی۔ اس نے چلا کے کہا ''ماریا!'' اور پھر ایک کرسی پر گرا' کرسی الٹ گئی اور وہ اوندھے منہ فرش پر گر کے کراہنے لگا۔ اس کا بیمار دل اس صدمے کی کیسے تاب لاتا۔ جب میں ریوالور کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا تو مجھے کوئی شک نہ رہا۔ اس پر ہارٹ اٹیک ہو گیا تھا۔ دس منٹ بعد وہ مر گیا۔ میں نے نیچے جھک کر اس کی کنپٹی پر ریوالور رکھا اور ایک فائر کیا۔ یہ ریوالور میں نے اسی کی جیب سے نکالا تھا اور صاف کر کے اس کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ میں نے وہاں اپنی موجودگی کا ہر ثبوت مٹایا اور تمام فلمیں اور ماریا کو بدکردار ثابت کرنے والی دستاویزات وہاں چھوڑ کے نکل گیا۔

اسٹوری اب مکمل تھی۔ فاحشہ بیٹی نے خودکشی سے پہلے باپ کو فون کیا مگر جب باپ پہنچا تو جو کچھ اس نے دیکھا وہ ناقابلِ برداشت تھا۔ اس نے خود کو گولی مار لی۔

میں نے جعلی نام سے لیے ہوئے ایک موبائل فون سے چند بدنام کرائم رپورٹرز کو اور پولیس کو اس واردات کی اطلاع دی اور اپنے گھر آ کے سکون سے سو گیا۔ اگلے دن کے اخبار میں جو خبر تصویروں کے ساتھ چھپی وہ بالکل ویسی ہی تھی جیسی فرخندہ کی اور اس کے باپ کی شائع ہوئی تھی۔

یہ سفاکی اور درندگی مجھے خود تنظیم نے سکھائی تھی اور جو کچھ میں نے کیا وہ ایک عمل کا ردِعمل تھا۔ یہ انہی کا دیا ہوا ہتھیار تھا جو آج میں نے ایک سفاک درندے کے خلاف استعمال کیا تھا۔ یہ برسوں پرانی بات تھی۔

آج ایک خواب نے جیسے ایک پرانی قبر کو کھول دیا تھا اور اس میں سے ایک ڈھانچا باہر آ گیا تھا۔ پھر اس نے یہ زندہ انسانی صورت اختیار کر لی تھی' یہ صورت فرخندہ کی تھی۔

جس نوجوان نے مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا تھا اس کی صورت مجھے اسی لیے جانی پہچانی لگی تھی کہ اس میں فرخندہ کے نقوش کی

ایک جھلک واضح تھی۔ وہ فرخندہ کا وہی بھائی تھا جو اس کے گھر میں ہونے والی واردات میں زندہ بچ گیا تھا۔ اس رات فرخندہ کی ماں ایک اسپتال کے آئی سی یو میں تھی اور اس کے بچنے کی کوئی امید نہ تھی۔ گھر میں سب جاگ رہے تھے اور دعائیں کر رہے تھے۔

شاید حملہ آوروں نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ ممکن ہے ان کو دیکھتے ہی وہ کہیں چھپ گیا ہو۔ کسی بیڈ کے نیچے گھس گیا ہو۔ اس نے دہشت زدہ کر دینے والی وہ واردات اپنی آنکھوں سے دیکھی ہو۔ اس وقت اس کی عمر نو دس سال تھی۔ اس وقت وہ کیا کرسکتا تھا۔ بڑا ہونے پر اس کو سب معلوم ہوگیا ہوگا۔ اب وہ اٹھارہ انیس سال کا نوجوان تھا۔

آج اگر وہ اپنی بہن اور اپنے باپ کے ساتھ ہونے والے ظلم کا حساب مجھ سے برابر کرنا چاہتا تھا تو یہ ایک فطری بات تھی۔ انتقام میں نے بھی لیا تھا۔ انتقام لینے کا حق اسے بھی حاصل تھا۔

☆☆☆

میں بہت دیر سے جاگ رہا تھا۔ کمرے کی کھڑکیوں کے شیشوں کے سامنے پردے پھیلے ہوئے تھے لیکن ان کے پیچھے سے دن کا اجالا نمایاں تھا۔ گھر کے اندر کی خاموشی یہ ظاہر کرتی تھی کہ مکین ابھی سوئے پڑے ہیں۔ آٹھ بجے کے قریب شہناز کال بیل پر اٹھی۔ غالباً یہ دودھ والا تھا۔ کچھ دیر بعد کچن کے برتنوں کی آوازوں سے میں نے اندازہ کیا کہ اب وہ چائے بنا رہی ہوگی یا ناشتے کی تیاری میں مصروف ہوگی۔

رات بھر کی کسلمندی دور کرنے کے لیے میں نے واش روم کا رخ کیا۔ میرے جسم میں حرکت سے درد اٹھا تو مجھے یاد آیا کہ شہناز نے آٹھ بجے یاد سے دوا کھانے کی تاکید کی تھی۔ وہ تو چاہتی تھی کہ خود ہی مجھے وقت پر دوا دے مگر میں نے وعدہ کیا تھا کہ الارم لگا کے ٹھیک سات بجے دوا کھالوں گا۔ شہناز کی خفگی سے بچنے کے لیے میں نے یہ کام پہلے کیا اور پھر گرم پانی کے ٹب میں اتر گیا۔

اس سے میرا دورانِ خون بحال ہوا اور میرے جسم کو بہت سکون ملا۔ مجھے پھر گزشتہ روز کا حادثہ یاد آیا تو ایک لمحے کے لیے میرے جسم پر کپکپی سی طاری ہوگئی۔ یہ قدرت کا احسان ہی نہیں معجزہ تھا کہ میں ہلاک نہیں ہوا تھا ورنہ مارنے والے نے تو کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔ یہ خیال بڑا دہشت انگیز تھا کہ اس وقت ہم دونوں دوست قبرستان میں ساتھ ساتھ لیٹے ہوتے۔ قبر کی مٹی بھی خشک ہوچکی ہوتی اور اوپر ڈالے جانے والے پھول بھی مرجھا چکے ہوتے۔ کل ہمارا سوئم ہوتا۔

شہناز کی آواز پر میں خیالوں کے پرآسیب چنگل سے چھوٹا۔ وہ دروازہ بجا رہی تھی اور چلا رہی تھی "رفیق بھائی! آپ کی کال ہے لندن سے ڈاکٹر شائستہ......"

میں نے کہا "اس سے پوچھ لو نا کیا بات ہے؟ وہ تم سے بھی تو بات کرسکتی ہے۔"

"اچھا۔ میں کہہ دیتی ہوں کہ نہا رہے ہیں۔" شہناز واپس ہوئی۔

میں دس منٹ بعد باہر نکلا تو شہناز کسی بات پر راجا سے جھگڑ رہی تھی۔ حسب عادت راجا اپنے جھوٹ کو شہناز کے ہر کی قسم کھا کے سچ بنانے میں مصروف تھا۔ شہناز نے چھاپا مار کے راجا کی جیب سے پچاس ہزار روپے برآمد کرلیے تھے اور یہ ماننے پر تیار نہ تھی کہ اسے آفس سے بونس ملا ہے "جو تنخواہ وقت پر نہیں دیتے' ویج بورڈ پر عمل نہیں کرتے' وہ بونس دیں گے؟ راجا' میں معلوم کرلوں گی۔"

راجا نے کہا "کوشش کر کے دیکھو۔ میری سگی بیوی ہوتی تو وہ اخبار والے کچھ نہ بتاتے' تم کون ہوتی ہو۔"

شہناز روہانسی ہوگئی "رفیق بھائی! آپ بتائیں۔"

راجا کی رحم طلب نظریں دیکھ کر مجھے بھی جھوٹ بولنا پڑا "اس نے مجھے یہی بتایا تھا شہناز۔ اب پہلے بتاؤ فون پر کیا کہا ڈاکٹر شائستہ نے؟"

شہناز مطمئن ہوگئی "اچھی خبر ہے آپ کے لیے۔"

میں نے کہا "کیا فریال کا پتا چل گیا؟"

راجا نے دوستانہ انداز میں میرے شانے پر ہاتھ مارا "ابے بتا مت پوچھ۔ وہ تو بقلم خود وارد ہو رہی ہے۔ لیلیٰ خود کھنچی چلی آرہی ہے مجنوں کی طرف۔"

شہناز نے کہا "فریال کینیا سے کل رات کو کراچی پہنچے گی اور پرسوں صبح لاہور۔"

میں نے حیرانی سے کہا "کینیا سے یا لندن سے؟"

شہناز نے کہا "وہ لندن سے نیروبی چلی گئی تھی۔ اب نیروبی سے آرہی ہے۔ اس ڈاکٹر نے کچھ نہیں بتایا کہ وہ نیروبی کیوں گئی تھی۔ عجیب آدم بیزار عورت ہے۔ کہنے لگی کہ مجھے بس اتنا ہی معلوم ہے اور فون بند کردیا۔"

میں نے کہا "وہ ایسی ہی چیز ہے۔"

راجا نے کہا "ابے اس نے چکر دیا ہوگا صفدر سلطان کو۔ اسے براہِ راست فلائٹ پکڑنے میں خطرہ محسوس ہوا ہوگا۔"

میں نے کہا "ہوسکتا ہے ایسا ہی ہو۔ مگر چھپ کر وہ نکل تو آئی ہے' یہاں کب تک چھپی رہ سکتی ہے؟"

"اس کی فکر مت کر فیکے پتر! ایک طریقہ تو بے شرمی کہ اسے بند کردیں شٹل کاک میں۔ صفدر سلطان کالے منہ والا خوردبین سے دیکھے یا ایکس رے کرائے۔ خاک پتا نہیں چلے گا کہ تیرے ساتھ مفرور حسینہ ہے کہ اماں ہیں۔ دوسرا طریقہ فلمی ہے' اس کا حلیہ بدل دیں گے۔ دیو آنند کی فلم ٹیکسی ڈرائیور کا فارمولا جو بعد میں کئی بار آزمایا گیا۔ لڑکی سے لڑکا بنا کے کوٹ پتلون پہنا دیں گے' ضروری ہوا تو داڑھی مونچھ لگا دیں گے۔"

"اب کچھ نہ کچھ تو کریں گے' اس کے لیے رہنے کی کوئی جگہ بھی دیکھنی پڑے گی۔"

"وہ یہاں رہ سکتی ہے رفیق بھائی۔" شہناز نے کھانے کی میز پر ناشتے کی پلیٹیں رکھتے ہوئے کہا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا "اس میں ہم سب کے لیے رسک ہے۔ تمہارے لیے اور خود فریال کے لیے۔"

شہناز پھر کچن میں لوٹ گئی تو راجا نے کہا "یار' آج میرے جھوٹ کی لاج رکھ لی تو نے۔"

"بس مجھے ترس آگیا تیری صورت کی یتیمی دیکھ کے۔"

اس نے کہا "ایک گاڑی منگوائی ہے میں نے۔ پسند آئے گی تو رکھ لیں گے۔ جو قیمت مناسب لگی دے دیں گے۔"

"پے منٹ ابھی کرنی ہوگی۔"

"نہیں یار! ہم اسی گاڑی میں جائیں گے ست بدھائی۔ ٹرائل کے لیے۔ ابھی دو چار دن وہاں رہنے کا پروگرام ملتوی۔ پرسوں صبح فریال کو ریسیو کرنا ہوگا۔ کل رات تک ہم لوٹ آئیں گے۔"

ابھی ہم ناشتا کر ہی رہے تھے کہ گاڑی آگئی۔ یہ تین سال پرانے ماڈل کی کورولا تھی مگر دیکھنے میں بالکل نئی شوروم سے نکلی ہوئی لگتی تھی۔ ڈرائیور صرف چابی دینے آیا تھا۔ میں نے راجا سے کہا کہ کیا یہی ڈرائیور ہمیں ست بدھائی لے جاسکتا ہے۔ گاڑی راجا کے کسی جاننے والے کے شوروم سے آئی تھی۔ اس نے فون پر بات کی مگر یہ مسئلہ حل نہ ہوسکا۔ جسمانی طور پر راجا یا میں بالکل فٹ نہیں تھے کہ اتنی لمبی ڈرائیو کرتے لیکن اب پروگرام بدلا نہیں جاسکتا تھا۔

ہم تیار ہوئے ہی تھے کہ شہناز نے بھی ہمارا ساتھ دینے کا اعلان کردیا۔ "اکیلا تو ہرگز نہیں جانے دوں گی میں تمہیں' اس حالت میں۔"

"شنو رانی! تمہارے مطب میں آنے والے بددعائیں دیں گے۔"

"تم بھول رہے ہو' آج اتوار ہے" شہناز نے کہا۔

راجا نے سر پر ہاتھ مارا "یار' یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ اپنے ہونے والے شوہر پر شک کرنا اور سائے کی طرح اس کے تعاقب میں رہنا۔ ہم کسی غلط جگہ نہیں جارہے ہیں۔"

"تم رفیق بھائی کے ساتھ ہو تو مجھے یہ خطرہ بہرحال نہیں۔ مگر تمہیں کیا پریشانی ہے میرے ساتھ جانے سے؟"

راجا نے کہا "ہم راستے بھر بہت بے شرمی کی مردانہ باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ تم سن کے کیا کرو گی؟"

"میں کان بند کرلوں گی۔ ایر پلگ سے' میں آگے بیٹھ کے ڈرائیونگ کروں گی۔ تم دونوں پیچھے بیٹھ کے باتیں کرنا انگریزی میں' وہ میں نہیں سمجھتی۔"

راجا کے لیے اس کے بعد سر تسلیم خم کیے بنا چارہ نہ تھا۔ جب شہناز نے راستے کے لیے کھانا چائے اور دیگر لوازمات رکھوائے تو مجھے اندازہ ہوگیا کہ اس نے سفر کی تیاری خالص زنانہ انداز میں پہلے ہی کرلی تھی۔

شہناز کی ڈرائیونگ راجا سے اچھی تھی لیکن راجا یہ بات تسلیم نہیں کرتا تھا۔ شہر کے راستوں پر ٹریفک صبح کے وقت کچھ زیادہ تھی۔ ملتان روڈ سے نکلنے میں ہی ہمیں ایک گھنٹا لگ گیا۔ راجا کو میں نے اپنے ساتھ پیچھے بٹھا لیا تھا کیونکہ مجھے اس سے کچھ باتیں کرنی تھیں اس کے لیے میں نے شہناز سے معذرت کرلی تھی۔

راجا نے خود ہی کچھ دیر بعد کہا "میں صبح سے دیکھ رہا ہوں' تو کسی الجھن کا شکار ہے۔ میں نے گھر پر شہناز کے سامنے بات نہیں کی تھی۔"

میں نے شہناز کی طرف دیکھا۔ اس کی ساری توجہ ڈرائیونگ پر تھی "یار راجا! میں نے اس بندے کو پہچان لیا ہے۔"

"کس بندے کو؟"

میں نے کہا "وہی جو ہمیں پریس کلب میں نظر آیا تھا۔"

راجا نے سر ہلایا "کون ہے وہ؟"

میں نے کہا "نام تو معلوم نہیں ہے مجھے اس کا لیکن وہ فرخندہ کا بھائی ہے۔"

اس نے بے خیالی میں کہا "فرخندہ کون؟"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "واقعی...... وہ ایک بھولا بسرا نام ہوگئی ہے۔"

راجا چونکا "وہ......؟ جو یونیورسٹی میں تیرے ساتھ

تھی؟"

میں نے افسردگی سے اقرار میں سر ہلایا "تو بھی بس اتنا ہی جانتا ہے مگر وہ اس سے کہیں زیادہ تھی۔"

راجا کی اور میری دوستی بہت پرانی ہے۔ ہم ایک ہی اسکول میں اور پھر ایک ہی کالج میں رہے مگر اس وقت ہمارے درمیان اعتماد کا یہ رشتہ نہیں تھا۔ کالج میں وہ بہت ایکٹو تھا۔ وہ مباحثوں میں حصہ لیتا تھا اور کالج میگزین کا ایڈیٹر تھا۔ اس میگزین میں زیادہ تر مضامین بھی خود اسی کے لکھے ہوئے ہوتے تھے۔ اس زمانے میں بھی وہ اخباروں کے لیے آرٹیکل وغیرہ لکھتا تھا' جس سے اسے کچھ آمدنی ہوجاتی تھی۔ پھر وہ کسی اخبار میں کام کرنے لگا۔ وہ رات کے وقت کام کرتا تھا تو دن میں کالج اٹینڈ کرنا اس کے لیے مشکل ہوجاتا تھا۔ وہ اکثر کلاس کے دوران میں سوجاتا تھا۔ کچھ پروفیسر اس کے مسئلے کو سمجھتے تھے اور اسے یوں بھی رعایت ملتی تھی کہ وہ ایک ذہین طالب علم تھا۔ کچھ اسے اکثر کلاس سے نکال دیتے تھے۔ وہ کہتا تھا کہ کلاس وہ صرف حاضری پوری کرنے کے لیے اٹینڈ کرتا ہے۔ ورنہ پاس تو وہ امتحان سے کچھ روز قبل خود پڑھ کے بھی ہوجائے گا۔ بعد میں اس کے اور میرے درمیان تعاون باہمی کا سمجھوتا ہوگیا۔ میں کلاس میں اس کی حاضری بول دیتا تھا۔ سوسوا سو لڑکوں کی کلاس میں کسی کو پتا بھی نہیں چلتا تھا کہ آواز کدھر سے آئی۔ لیکن ایک دن میں پکڑا گیا۔ پروفیسر نے مجھے کلاس سے نکال دیا۔

مزید یہ اطلاع میرے والد کو پہنچائی گئی۔ مجھے کلاس سے نکالنے والے پروفیسر میرے والد کے دوست تھے اور وہ پہلے کسی کالج میں ساتھ پڑھا چکے تھے۔ ابا نے مجھ سے پوچھا تو میں نے صاف بتادیا کہ ایسا میں نے کیوں کیا تھا۔ چونکہ اس کے وجود میں پیدائشی طور پر ایک صحافی کی روح موجود تھی اس لیے وہ کسی حد تک "آئین جواں مرداں حق گوئی و بے باکی" والے فلسفے پر عمل کرتا رہتا تھا یعنی عام زبان میں پنگا لینے کا شوقین تھا۔ اسلامیات پڑھانے والے استاد نے ایک مرتبہ راجا کو سوتے ہوئے پکڑا تو سخت برا بھلا کہا کہ واہیات فلمیں ٹی وی پر دیکھتے ہوئے تمہاری آنکھیں بھی کھلی رہتی ہیں اور دماغ بھی مستعد رہتا ہے۔ دین کی باتیں ہوں تو تمہیں نیند آنے لگتی ہے۔ راجا نے بیزاری سے کہہ دیا کہ سر' میں جان بوجھ کے تو ایسا نہیں کرتا۔ بعض فلمیں بھی اتنا ہی بیزار کرتی ہیں جتنا آپ کا لیکچر۔"

بات بڑھ گئی اور پرنسپل تک پہنچی اور اگرچہ راجا نے معافی مانگ لی کہ کسی استاد کی بے عزتی کرنے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا مگر مولوی صاحب اس کے پیچھے پڑ گئے اور بات بے بات پر راجا کو کلاس میں ذلیل کرنے لگے۔ تنگ آ کے راجا نے ان کے خلاف کچھ مواد اکٹھا کیا اور ایک پمفلٹ چھاپ کے سارے کالج میں تقسیم کرادیا۔ اس میں مولوی صاحب کے قول و فعل کے تضادات کے بہت سے حوالے تھے۔ وہ ایک مسجد کمیٹی کے چیئرمین تھے۔ وہاں کے حسابات کا کچا چٹھا تھا۔ یہ انوسٹی گیٹو' رپورٹنگ کا پہلا کارنامہ تھا جو اس نے سرانجام دیا۔ مولوی صاحب اتنے پریشان ہوئے کہ اپنا تبادلہ دوسرے کالج میں کرایا۔ راجا قطعی معصوم اور لاعلم بنا رہا۔

دوسری بار اس نے میرے لیے ایسا کیا۔ جس کالج میں میرے والد پڑھاتے تھے' وہاں پرنسپل کا رویہ اپنے اسٹاف کے ساتھ انتہائی ذلت آمیز تھا۔ کچھ لوگ ذاتی فائدے کے لیے خوشامد میں اس حد تک آگے بڑھ جاتے تھے کہ پرنسپل کے ذاتی کام تک کرتے تھے۔ فنڈز میں خورد برد' بدانتظامی اور نااہلی کے الزامات الگ تھے مگر وہ سفارشی تھے اور ان کے خلاف شکایات کی شنوائی نہ تھی۔ میں نے راجا سے ذکر کیا تو اس نے پتا نہیں کس کس سے مل کے اور کن ذرائع سے اندر کی ساری معلومات حاصل کرکے ایک فیچر بنایا اور اخبار میں چھاپ دیا۔ ابا سے اس کی چپقلش تھی اور ابا ڈر رہے تھے کہ انہیں معطل کردیا جائے گا مگر اس فیچر کے چھپتے ہی معاملات الٹے ہوگئے۔ محکمۂ تعلیم نے ایک انکوائری کمیٹی بٹھادی اور اس نے کالج میں اسٹاف سے تفتیش کی تو مزید خرابیاں سامنے آئیں۔ دوسرے مہینے ہی پرنسپل کا ٹرانسفر ہوگیا۔ وہ ذاتی سفارش کی بنا پر کسی گرلز کالج میں چلا گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہاں اس نے خواتین کو بے حد پریشان کیا۔ نتیجہ یہ کہ ایک دن کالج میں ہنگامہ ہوا۔ کچھ لیکچرار نے اس کی آفس میں سینڈلوں سے تواضع کی۔ وہ باہر بھاگا تو خواتین نے پیچھا کیا اور پرنسپل کی گوشمالی کا منظر طالبات نے بھی دیکھا۔ یہ خبر اخبار میں بھی آئی۔ بعد میں پتا نہیں کیا ہوا۔

راجا کا شکریہ ادا کرنے میں اس کے گھر گیا تو پہلی بار مجھے اس کے افسوس ناک حالات کا علم ہوا۔ اس کی ماں اکیلی رہتی تھی۔ باپ کوئی موٹر سائیکل مکینک تھا اور اچھا خاصا کماتا تھا۔ نہ جانے کیسے وہ ہیروئن کے چکر میں پڑ گیا۔ کام ختم ہوا۔ دکان بک گئی اور روایتی انداز میں اس نے بیوی کے زیور اور گھر کی دوسری چیزوں کو ٹھکانے لگایا۔ جب بیچنے کو کچھ نہ رہا تو اس نے بیوی کو بیچنا چاہا اور بیوی نے جوتے مار کے اسے گھر سے نکال دیا۔ وہ اِدھر اُدھر بھٹکتا پھرا۔ بعض اوقات وہ رات

کو گھر کے دروازے پر آ کے سوجاتا تھا اور کئی کئی دن وہیں پڑا رہتا تھا۔ راجا کی ماں نے وہ گھر اور محلہ چھوڑ دیا۔ وہ میٹرک پاس تھی۔ اسے بارہ سو روپے ماہانہ پر ایک پرائمری اسکول میں ملازمت مل گئی۔ اس نے کئی بار اپنے شوہر کو اِدھر اُدھر فٹ پاتھوں پر پڑا دیکھا۔ کچھ عرصے بعد وہ غائب ہوگیا اور پھر کبھی نظر نہ آیا۔ راجا کی ماں نے سمجھ لیا کہ اب وہ سہاگن نہیں بیوہ ہے۔

راجا میٹرک کا امتحان دے کر آرہا تھا کہ اس نے اپنے باپ کو پھر دیکھا۔ وہ ایک فٹ پاتھ پر چت پڑا تھا اور کچھ لوگ اس کے گرد جمع تھے۔ اس کے تن پر میل کچیل کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ مرچکا تھا۔ راجا نے بھی وہاں رک کے چند منٹ تک مٹی دھول سے اٹے سر اور داڑھی کے بالوں اور کھلی آنکھوں والے مکروہ چہرے کو دیکھا جو کبھی اس کا باپ تھا۔ ایک خوبصورت آدمی سمجھا جاسکتا تھا۔ جو ہر وقت ہنستا رہتا تھا اور ایک ماہر مکینک تھا۔ اس نے اسے نہ پہچاننا ہی بہتر سمجھا اور آگے بڑھ گیا۔ یہ بات اس نے اپنی ماں کو کبھی نہیں بتائی۔

اس کی ماں راجا کے کالج پہنچنے کے بعد بھی اسکول میں پڑھا رہی تھی اور برسوں بعد اس کی تنخواہ صرف پندرہ سو ہوئی تھی۔ راجا چاہتا تھا کہ اب وہ کام کرے اور ماں آرام کرے لیکن ماں کی ایک ہی رٹ تھی۔ تجھے ایم اے کرنا ہے' صحافی بننے کے لیے اس نے عملی جدوجہد کا آغاز تو بہت پہلے کردیا تھا۔ اس کی کمائی سے گھر میں تھوڑی بہت خوشحالی بھی آگئی تھی۔ ماں کی ضد پوری کرنے کے لیے وہ ایم اے بھی کرلیتا لیکن اچانک وہ بیمار ہوئی اور مرگئی۔ اس نے راجا کے بی اے کا رزلٹ آنے کا انتظار بھی نہیں کیا۔ جب ماں ہی نہ رہی تو راجا ایم اے کس کے لیے کرتا۔ صحافت کے میدان میں تو وہ اپنے جھنڈے پہلے ہی گاڑ چکا تھا۔ راجا کی اور میری دوستی کو دائمی بنیادوں پر استوار کرنے والی اس کی ماں ہی تھی۔ وہ ہم دونوں سے کہتی تھی کہ ایک دوسرے کا ساتھ کبھی نہ چھوڑنا۔ دنیا میں اچھا دوست خوش نصیبی سے ہی ملتا ہے۔

اسے ماریا کی مجھ میں دلچسپی کا بھی علم تھا اور صحافی ہونے کے ناتے وہ ماریا کے باپ سے بھی واقف تھا۔ تنظیم سے تعلق کے معاملے میں راجا نے ہمیشہ مجھے آگے بڑھنے سے روکا اور مشکل وقت میں میری مدد بھی کی۔ وہ کھل کر تنظیم کی مخالفت نہیں کرسکتا تھا۔ تنظیم کی منتقمانہ کارروائیوں سے سب ہی ڈرتے تھے۔ لیکن راجا سے میری دوستی نے مختلف مواقع پر مجھے تحفظ فراہم کیا۔ جب میں شعبۂ نشر و اشاعت میں تھا تو راجا کی مدد سے میرا کام آسان ہوجاتا تھا۔

بی کام آنرز کے بعد میں بھی لاہور چلا گیا تو راجا کی اور میری دوستی کا نیا دور شروع ہوا۔ میں نے ایم کام کے لیے پنجاب یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور کچھ عرصہ تنظیم کے معاملات سے لاتعلق رہ کے اس غلط فہمی میں مبتلا ہوگیا کہ میری جان چھوٹ گئی لیکن درحقیقت ایسا نہ تھا۔ بہت جلد لاہور کی تنظیم نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ یہاں میرا باس گامے شاہ تھا جو پنجاب کے کارکنوں کو کنٹرول کرتا تھا۔ پورے پاکستان کے لیے چیف کا نائب شہاب الدین تھا۔ خود چیف اس زمانے میں زیادہ تر دبئی میں رہتا تھا۔

میرے ملک سے فرار کے بعد یہاں بھی حالات نے پلٹا کھایا اور تنظیم کے حریف برسراقتدار آگئے۔ چیف کو روپوشی اختیار کرنی پڑی۔ خود گامے شاہ اور شہاب الدین جیسے سب یا تو پکڑے گئے یا مارے گئے۔ کچھ جیلوں میں پہنچے تو کچھ باہر نکل گئے۔ چیف دبئی سے نکل کے مختلف ملکوں میں پناہ لیتا رہا اور بالآخر لندن پہنچا۔ اب یہ سننے میں آرہا تھا کہ لندن میں بھی اس کے گرد قانون کا حلقہ تنگ ہوتا جارہا ہے اور اس کے دشمن اسے ختم کرنے کے درپے ہیں چنانچہ وہ فرانس میں سیاسی پناہ لینے کی سوچ رہا ہے۔

لاہور سے ست بدھائی تک جی ٹی روڈ پر ایک سو ستر کلومیٹر کے بعد جہلم کا شہر آتا تھا۔ اس کے بعد ایک چھوٹا سا قصبہ "دینہ" یہاں سے بائیں ہاتھ کی سڑک پر دس کلومیٹر کے فاصلے پر رہتا کا قلعہ تھا اور دریائے کہار تھا۔ مزید تیس کلومیٹر کے بعد ٹیلہ جوگیاں ایک گاؤں تھا۔ وہاں تک جانے کے لیے خاصی چڑھائی طے کرنی پڑتی تھی۔ ٹیلہ جوگیاں سے ست بدھائی کا فاصلہ بھی نو دس کلومیٹر تھا۔ اس طرح یہ سارا سفر سوا دو ڈھائی سو کلومیٹر کا تھا۔

گاڑی بہت اچھی تھی اور ڈرائیونگ کرتے ہوئے شہباز نے بھی اس کی تعریف کی مگر اس کے باوجود گوجرانوالہ کو کراس کرتے کرتے ہمیں دوپہر ہوگئی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہم میں سے کسی کو جی ٹی روڈ کے بائی پاس کا اندازہ نہیں تھا ورنہ ہم شہر کی ٹریفک سے بچ کے نکل جاتے۔

ڈیڑھ گھنٹے کے اس سفر میں آہستہ آہستہ میں نے راجا کو وہ سب بتادیا جو اسے آج تک معلوم نہ تھا۔ میں نے اپنی اور فرخندہ کی شادی کا ذکر بھی کیا اور ماریا اور اس کے باپ سے انتقام کا بھی۔ ان کی موت کا ذمے دار میں تھا لیکن میں نے قتل کسی کو نہیں کیا تھا۔ میں نے ماریا کو خودکشی پر مجبور کیا تھا اور جب اس کے باپ کی کنپٹی پر گولی ماری تو وہ پہلے ہی ہارٹ فیل ہونے سے مرچکا تھا۔ راجا نے مجھے بہت گالیاں دیں کہ

دوستی کے سارے دعوؤں کے باوجود میں نے اسے شریک راز کرنے سے گریز کیا۔ اسے اعتماد کے قابل نہیں سمجھا۔ میں نے معافی مانگی کہ یہ معاملات ہی ایسے تھے۔ میں نے انہیں بھلادیا تھا اور ان پر گزرتے وقت کی گرد پڑتی رہی تھی۔ اگر اچانک فرخندہ کا بھائی سامنے نہ آتا تو شاید زندگی میں کبھی ان واقعات کو دہرانے کی ضرورت بھی نہ پڑتی۔

راجا نے کہا ''سوال یہ ہے کہ اس نے مجھے تلاش کیسے کرلیا؟ وہ لاہور کیسے آ گیا؟''

میں نے کہا ''جنون آدمی کے لیے ناممکن کو ممکن کردیتا ہے۔''

راجا نے سرہلایا ''خیر...... پتا چلالیں گے اس کا بھی۔ نام کیا ہے اس کا؟''

میں نے کہا ''یہ تو مجھے معلوم نہیں۔''

راجا نے آگے جھک کر شہناز سے کہا ''کیا حرج ہے میڈم' اگر ہم یہاں کہیں تھوڑی دیر کے لیے رک جائیں اور آپ کی تیار کردہ چائے کے دو جام پی لیں؟''

شہناز مسکرائی ''تم نے تو میرے دل کی بات کہی۔''

راجا نے میری طرف دیکھا ''دیکھے۔ ایسی ہوتی ہے سچی محبت۔''

میں نے بڑی عقیدت سے سرہلایا ''واقعی' آپ کی ہر سچی محبت ایسی ہی ہوتی ہے۔''

شہناز نے گاڑی کو سڑک سے کچھ فاصلے پر رکوالیا۔ وہاں ایک رہٹ سے روایتی طریقے پر آب پاشی کی جارہی تھی۔ بیل ایک دائرے میں گھوم رہا تھا۔ کنویں سے نکلنے والے شفاف ٹھنڈے پانی کے ڈول بڑے سے چکر پر گھومتے اوپر آتے تھے اور سارا پانی ایک پرنالے میں لنڈھا کے الٹے پاؤں واپس پانی میں غوطہ مارنے کنویں کی گہرائی میں اتر جاتے تھے۔ یہ پانی ایک چھوٹے سے نیم پختہ حوض میں جمع ہورہا تھا جس کے دو طرف آمنے سامنے نالیاں بنی ہوئی تھیں۔ اس وقت ایک طرف کی نالی بند تھی۔ پانی دوسری نالی سے بہہ کر سبزیوں کے ایک کھیت کو سیراب کررہا تھا۔

ہم سے کچھ فاصلے پر دو عورتیں کام میں مصروف تھیں۔ ایک چھوٹا سا بچہ درخت کی چھاؤں میں فرش خاک پر سویا پڑا تھا۔ دوسرا سات آٹھ سال کا ننگ دھڑنگ پھر رہا تھا۔ ایک چارپائی پر دھوتی اور بنیان والا ایک شخص حقہ پینے میں مصروف تھا۔ جتنی دیر میں راجا نے اور میں نے جوتے اتارے اور اپنے پاؤں ٹھنڈے پانی کے حوض میں لٹکائے' وہ اٹھ کر ہمارے پاس آ گیا۔ اس نے رسمی طور پر سلام دعا کی' ہم سے پوچھا کہ کدھر جارہے ہیں اور پھر واپس لوٹ گیا۔

شہناز نے اپنے حسن انتظام کا ثبوت دیتے ہوئے ایک صاف کپڑا بچھایا اور سلیقے سے چائے کے برتن لگائے۔ پھر ہاٹ پاٹ میں سے کباب نکالے اور پلیٹوں میں رکھے۔

میں نے اخلاقاً پوچھا ''ڈاکٹر صاحبہ! تم تھکی تو نہیں ہو؟''

وہ مسکرائی ''تھوڑی بہت تھکن تو ہوگی۔''

میں نے کہا ''ذمے داریاں بھی تو بہت سی سنبھال رکھی ہیں تم نے۔ ڈاکٹر کے علاوہ مجروحین کی نرس' پھر شوفر اور اس کے علاوہ خاتون خانہ اور میزبان۔''

راجا نے کہا ''شنو' اب تم پیچھے بیٹھ کے آرام کرو' گاڑی میں چلاؤں گا۔''

''نہیں...... تمہاری صحت......'' شہناز نے کہا۔

راجا نے اس کی بات کاٹ دی ''کچھ نہیں ہوا ہے میری صحت کو۔''

میں نے بھی راجا کی تائید کی ''یہاں سے تین چار گھنٹے کا راستہ باقی ہے۔ ہم باری باری ڈرائیونگ کرلیں گے۔''

ہمارے اصرار یا ہماری ضد پر شہناز پیچھے آرام سے بیٹھ گئی۔ دو بجے ہم نے دریائے جہلم کو عبور کیا اور ایک جگہ دوپہر کے کھانے کے لیے رکے۔ اب ڈرائیونگ سیٹ پر میں بیٹھا۔ شہناز کے مقابلے میں راجا نے بھی تیز رفتاری کا مظاہرہ کیا تھا۔ دینہ کے موڑ پر ایک کوٹھری سے ٹول ٹیکس وصول کرنے والا نمودار ہوا اور کسی رسید کے بغیر اس نے ہم سے دس روپے وصول کیے۔ اس پورے راستے میں ہم چار پانچ شہروں سے گزرنے کا ٹول ٹیکس بھر چکے تھے اور وہاں ہمیں رسید جاری کی گئی تھی۔

آگے سڑک چھوٹی تھی جس پر سامنے سے بھی ٹریفک آجاتی تھی۔ رہتاس کا قلعہ اب ایک کھنڈر ہوگیا تھا۔ اس کی وسعت کا اندازہ ہر طرف نظر آنے والی دیوار کے آثار سے کیا جاسکتا تھا۔ قلعے کے اندر کی آبادی دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ وہ گاؤں سے زیادہ ایک اچھا خاصا ترقی یافتہ قصبہ تھا۔ مجھے ایک گورنمنٹ ہائی اسکول کی بلڈنگ' کئی مساجد' مزارات اور امام بارگاہیں نظر آئیں۔ قصبے میں بجلی تھی اور جدید مغربی تہذیب کی علامت پیپسی کولا کے سائن ہر دکان پر نظر آرہے تھے۔ پرچون کی دکانوں پر وہ سب مل رہا تھا جو شہروں میں تھا۔ چپس' چاکلیٹ' جوس اور منرل واٹر۔

قلعے کے چاروں طرف بھی پہاڑیاں تھیں اور اس کی باقی رہ جانے والی عمارت کے کھنڈر میں ٹورزم اور

آثار قدیمہ والوں نے سیاحوں سے آمدنی کے ذرائع پیدا کرلیے تھے۔ ایک اجڑا ہوا باغ اور سوکھا ہوا لان اسکول' کالج کے لڑکوں اور لڑکیوں سے بھرا ہوا تھا جو قلعے کے کھنڈرات میں قائم اسٹالوں سے خرید کر برگر کھارہے تھے اور بوتلیں پی رہے تھے۔ سیاہ میلی چٹان جیسی دیواروں اور منڈیروں پر خواتین کے ملبوسات کے لال' نیلے' پیلے رنگ بکھر رہے تھے۔ پارکنگ ایریا میں ان کی بسیں اور کاریں صف بستہ تھیں۔

تاریخ سے کسی کو دلچسپی نہ تھی۔ یہ محض ایک تفریح گاہ تھی۔ کھنڈرات کی زبوں حالی سے کسی کو سروکار نہ تھا۔ کسی کو فکر نہ تھی کہ تاریخ کے یہ آثار بھی نہ رہے تو ہمارا ماضی کیسے محفوظ رہے گا۔ قلعے کے اندر آباد گاؤں کی ایک خاتون وہاں انفارمیشن آفیسر تعینات تھیں مگر وہ ایک تاریک حجرے میں مقیم تھیں۔ وہاں آنے والوں کو یہ بتانے والا کوئی نہیں تھا کہ یہ قلعہ شیر شاہ سوری نے تعمیر کیا تھا۔ وہ سہسرام کا رہنے والا تھا اور رہتاس کا قلعہ بھی وہیں تھا۔ جب اس نے ہندوستان فتح کیا تو یہ عظیم الشان قلعہ بنایا اور اس کا نام بھی رہتاس کا قلعہ رکھا۔ اس کی وسعت سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہاں کتنی بڑی فوجی چھاؤنی ہوگی۔ قلعے کے چاروں طرف گہری کھائی تھی۔ فصیل میں توپوں کے دہانے کے لیے موکھے تھے اور اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ اس وقت دریائے کنہار اس کے بالکل نیچے بہتا ہوگا۔ یہ قلعہ اس وقت ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ اس کے اندر تین منزلہ خواب گاہ قائم ضرور تھی مگر اتنی خطرناک حالت میں کہ لگتا تھا کسی بھی وقت گرجائے گی۔ ہر جگہ آثار قدیمہ کا یہی حال ہے۔ جس قوم کو اپنے مستقبل کے تحفظ کی فکر نہ ہو وہ اپنے ماضی اور تاریخی ورثے کی کیسے حفاظت کرسکتی ہے۔

رہتاس سے آگے ٹیلہ جوگیاں تک چڑھائی تھی اور سڑک کی حالت بھی خراب تھی۔ تیس کلومیٹر کا یہ فاصلہ ایک گھنٹے میں طے ہوا۔ اس راستے پر آمدورفت بھی برائے نام تھی۔ ہمیں صرف ایک کار ملی۔ موٹروے اور ہائی وے جیسی سڑکوں کو چھوڑ کر دیگر تمام سڑکوں کی حالت جو مختلف شہروں اور قصبوں کو جوڑتی ہیں' عام طور پر خراب ہے۔ بہت کم چوڑی سڑکوں پر بسوں اور ویگنوں والے یوں دوڑ لگاتے ہیں جیسے صرف ڈرائیور ہی نشے میں دھت نہیں' اس نے گاڑی میں بھی ڈیزل کی جگہ شراب ڈال رکھی ہے۔ سامنے سے آنے والے کو راستہ نہ دینا شان اور آن کا مسئلہ ہے۔ دونوں ڈرائیور آخری وقت تک سڑک کے درمیان میں چلتے رہتے ہیں اور لائٹ چمکاتے رہتے ہیں کہ ہٹ جاؤ اور مجھے راستہ دے دو۔ بالکل آخری چند سیکنڈوں میں جب تصادم یقینی ہوجاتا ہے' کوئی ایک اپنی اور مسافروں کی جان بچانے کے لیے ہار مان لیتا ہے اور کچے میں اتر جاتا ہے۔ بعض اوقات آن پر جان قربان بھی ہوجاتی ہے۔

سامنے سے آنے والی کار کے ڈرائیور نے بھی ایسا ہی کیا۔ وہ بالکل نئے ماڈل کی لشکارے مارتی پرغرور کرولا تھی۔ اس کے ڈرائیور نے کئی بار لائٹ جلا کے راجا کو خبردار کیا کہ سڑک سے ہٹ جائے۔ راجا بھی کسی مہاراجا سے کم نہ تھا۔ اس نے زیرلب ایک گالی دی اور میرے چلّانے کے باوجود بالکل وسط میں چلتا گیا اور جواب میں لائٹ جلاتا بجھاتا رہا کہ مجھے راستہ دے دو۔

دو تین سال پرانی ہی سہی مگر ہمارے پاس بھی نئی نظر آنے والی کرولا تھی جو شاید اس علاقے میں پہلی بار دیکھی گئی تھی۔ معلوم نہیں ایک سیکنڈ بعد کیا ہوجاتا مگر اچانک نئی سفید کرولا کے ڈرائیور نے اسٹیئرنگ گھمایا اور ہم نے ایک معمولی سا دھما کا سنا۔ راجا نے ایک قہقہہ مارا جو شہناز کی چیخ کے بعد سنائی دیا۔

جب میں نے سر گھما کے دیکھا تو سفید کرولا کسی چھوٹے سے درخت سے ٹکرا کے رک گئی تھی اور اس کے ڈرائیور نے نیچے اتر کے گن کا رخ ہماری طرف کردیا تھا مگر پیچھے والی سیٹ پر سے اترنے والے نے اسے فائر کرنے سے روک دیا۔ وہ کلف لگی سفید شلوار قمیص پر سیاہ واسکٹ والا کوئی دراز قد اور صحت مند شخص تھا۔ کوئی مقامی ممبر صوبائی اسمبلی' جس کا یہ حلقہ تھا' کوئی جاگیردار یا سیاسی وڈیرا۔

میں نے راجا سے کہا ''راجا! تو نے بڑی بے وقوفی کی۔ گاڑی روک لے۔ ہمیں اس سے معذرت کرنا چاہیے۔''

''ہاں' اب ہم معذرت کرسکتے ہیں۔ سالے کا غرور تو خاک میں ملادیا ہے میں نے'' راجا نے بریک لگائے۔

''یہ کیا جہالت کی بات ہے راجا! ایک تعلیم یافتہ اور مہذب آدمی کو ایسے نہیں سوچنا چاہیے'' میں نے کہا۔

شہناز نے بھی برہمی کا اظہار کیا ''اس پاگل پن میں ہماری جان بھی جاسکتی تھی۔''

راجا ہنسا ''نہیں ڈاکٹر صاحبہ' زیادہ قیمتی تو اس کی جان تھی۔''

سفید کرولا اب ریورس گیئر میں ہماری طرف آرہی تھی۔ میں نے راجا سے بھی کہا کہ وہ گاڑی کو پیچھے لے جائے مگر اس نے کہا کہ تم چپ بیٹھو' یہ ولایت نہیں پاکستان ہے' یہاں شائستگی کے مظاہرے کو کمزوری سمجھا جاتا ہے۔

ہم سب ایک ساتھ اترے۔ سفید کرولا کے ڈرائیور کے تیور انتہائی جارحانہ تھے۔ اس نے غرا کے کہا "اوئے۔ سڑک کیا تیرے باپ کی ہے؟ خرید رکھی ہے؟"

راجا نے بھی غرا کے جواب دیا "ہاں...... مگر تیرے باپ سے نہیں خریدی تھی۔"

میں فوراً بیچ میں آ گیا۔ میں نے قریب جا کے اس شخص سے ہاتھ ملایا جو مجھے بڑی رعونت سے گھور رہا تھا۔ "میرا نام رفیق احمد ہے۔ آئی ایم سوری کہ آپ کی گاڑی کا نقصان ہوا۔"

اس نے بادل ناخواستہ مصافحہ کیا "ذرا اپنے ڈرائیور کا دماغ ٹھنڈا رکھو۔"

میں نے کہا "یہ میرے ڈرائیور نہیں۔ مشہور صحافی راجا ہیں۔ آپ نے نام سنا ہوگا۔"

اس کی صورت کے تاثرات ایک دم بدل گئے "تم کون ہو؟ میں نے تمہیں پہلے اس علاقے میں نہیں دیکھا۔"

اب راجا نے کہا "یہ ست بدھائی کے مالک ہیں۔ انگلینڈ سے آئے ہیں۔ ہارورڈ کے ایم بی اے ہیں۔ یہاں صنعتی اور زراعتی پروجیکٹس کے علاوہ ایک ہائیڈل پاور کے منصوبے کا جائزہ لینے کے لیے آئے ہیں۔ اب آپ بھی اپنا تعارف کرادیں۔"

میں نے اس شخص کی صورت کے تاثرات میں دوبارہ ایک ڈرامائی تبدیلی دیکھی۔ پہلے اس کی رعونت میں برہمی شامل تھی کیونکہ ہم نے عام لوگ ہونے کے باوجود اس کو راستہ نہ دے کر ایک گستاخی کی تھی۔ راجا کا نام سن کے اس کے اندر کا سیاسی مدبر جاگ اٹھا اور اس نے دوستانہ انداز تو اختیار نہیں کیا لیکن ایک فراخدلانہ اور مربیانہ رویہ اختیار کرلیا کہ تم ہمارے برابر کے تو نہیں ہو مگر صحافی ہو اس لیے تمہیں لفٹ تو کرانی ہی پڑے گی۔ جب راجا نے میرا تعارف کرایا تو اس کی انا پھر جاگ اٹھی۔ راجا نے مجھے اس کے مقابل کھڑا کر دیا تھا اور میرا قد اس سے اونچا ثابت کرنے کی کوشش کی تھی۔ مجھے اس علاقے میں مستقبل کا وی آئی پی تسلیم کرنا اس کے لیے باعث تشویش بھی ہوگیا تھا اور شاید اس نے کچھ سبکی بھی محسوس کی تھی کہ راجا سے نہیں پہچانتا۔

اس نے قدرے پرتمسخر انداز میں کہا "او یار! کمال ہے...... صحافی تو خاندانی لوگوں کا سارا شجرہ یاد رکھتے ہیں۔ بھئی، یہ ہمارا علاقہ ہے، ہم سیکڑوں سال سے اس علاقے کے سب سے بڑے زمیندار ہیں۔ میرا نام رانا رجب علی خیال ہے۔ راجا عجب علی خیال جو پہلے صوبائی اسمبلی کے ممبر تھے، میرے بڑے بھائی تھے۔ والد صاحب، اللہ ان کو جنت نصیب کرے، قومی اسمبلی کے ممبر رہے۔ ان کا نام رانا نسب علی خیال تھا۔"

میں نے کہا "بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کے۔ کیا اب آپ نے سیاست چھوڑ دی ہے؟"

"او نہیں جی...... چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔" اس نے ذرا نخوت سے کہا "اب تو سیاست ہی سیاست ہے۔ بہرحال جی آپ آؤ کسی روز ڈیرے پر سارے معززین حاضری دیتے ہیں۔"

مجھے حاضری کا لفظ سخت ناگوار گزرا "ابھی تو بالکل ٹائم نہیں ہے رانا صاحب، میں اپنے پروجیکٹس کی فیزبلٹی رپورٹس میں مصروف رہوں گا۔ میں نے کچھ ماہرین کو بھی بلوایا ہے جو فارن کوالی فائیڈ ہیں، آپ تو بالکل فارغ ہوں گے، کسی دن چکر لگائیں۔"

اس نے میری بات سنی ان سنی کردی "دیکھو جی، اے رفیق صاحب! ہمیں تو آپ کے سارے منصوبے شیخ چلی کے منصوبے لگتے ہیں۔"

میں نے ناگواری سے کہا "غیر ملکی بینکوں کا ایک کنسورشیم ان کو فنانس کررہا ہے۔"

"اجی چھوڑو...... آپ نئے نئے امریکا سے آئے ہو۔ ولایتی ڈگری ادھر کیا کرے گی۔ یہ امریکا نہیں، پاکستان ہے۔ ان غیر ملکی ماہرین اور غیر ملکی سرمائے نے تو پہلے ہی ملک کا بیڑا غرق کر دیا ہے۔ ہمیں دیکھو، خیر سے اپنے ہی بل پر ایک ٹیکسٹائل مل بھی لگالی ہے۔ ایک گلاس فیکٹری کے بعد......"

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھایا "آپ چاہیں تو گاڑی بنوانے کے بعد بل مجھے بھیج دیں۔"

اس کا چہرہ بگڑ گیا "گاڑی پر خراش بھی آ جائے تو ہم بنواتے نہیں، بدل لیتے ہیں اور وصول کرنا ہوتا تو تمہیں وصول کیے بغیر ادھر سے جانے دیتے۔ تم بل کی بات کرتے ہو۔" وہ ایک دم پلٹا اور اپنی گاڑی میں جا بیٹھا۔ اس کے خراب موڈ کا اندازہ شوفر نے بھی کرلیا تھا چنانچہ ہمیں خشمناک نگاہوں سے گھور کے اس نے حق نمک ادا کیا۔

راجا نے قہقہہ مار کے مجھ سے ہاتھ ملایا "بالکل صحیح جگہ پر مرچیں لگائیں تو نے۔ سالا خاندانی رئیس کی اولاد غیر مصدقہ۔"

شہناز نے ناراضی سے کہا "اب چلو۔ راستے میں رک کے اس جاہل شخص کے منہ لگنے کی کیا ضرورت تھی؟"

راجا نے پھر ڈرائیونگ سنبھالی "وہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ ہم چومن دیگرے نیست۔"

میں نے کہا "اور ہم نے ثابت کیا کہ ہم چومن ڈنگرے نیست۔"

ست بدھائی تک باقی راستہ مزید دشوار گزار تھا۔ شیشم کے جنگلات رفتہ رفتہ گھنے ہوتے جارہے تھے۔ درمیان سے گزرنے والی سڑک کچی تھی جس پر ٹائروں سے زیادہ بیل گاڑیوں اور گھوڑا گاڑیوں کے پہیوں کے نشانات دکھائی دیتے تھے۔ جہاں جنگل نہیں تھا وہاں کھیت تھے اور چند گھروں پر مشتمل گاؤں تھے۔ ان کھیتوں میں کام کرنے والے مزارع اپنی خستہ حالی پر قانع نظر آتے تھے۔ اگر رانا صاحب جدی پشتی رئیس تھے تو وہ جدی پشتی غلام تھے۔ وہ کمی جو اپنی غربت، جہالت اور ذلت کو منجانب اللہ اور نوشتہ تقدیر سمجھنے پر مجبور تھے یا کردیے گئے تھے۔ وہ حیوانی سطح پر جینے والی محنت کش مخلوق تھی۔ ان کے مرد خود کو وڈیروں کے کتوں سے کمتر جانتے تھے۔ ان کی عورتیں عصمت کے تصور سے ناآشنا تھیں۔ ہیومن رائٹس، آزادیٔ نسواں، جمہوریت...... یہ ان کے لیے کسی ناقابلِ فہم اجنبی زبان کے الفاظ تھے۔

کچا راستہ ایک چھوٹی سی پہاڑی کے گرد چکر لگانے کے بعد اچانک ختم ہوگیا۔ آگے دریائے کنہار پر بنا ہوا کہنہ سال چھوٹا سا پل تھا جس کی چوڑائی آٹھ فٹ کے قریب ہوگی اور لمبائی شاید سو گز۔ یہاں اس دریا نے جو درحقیقت بہت چھوٹی سی ندی تھا انگریزی حرف ایس کی شکل میں موڑ کاٹا تھا۔ پہاڑی کے گرد اس کی چوڑائی بہت سمٹ گئی تھی چنانچہ پانی جمع ہو کے کناروں سے کافی اوپر آ گیا تھا مگر پھر بھی پل سے تیس چالیس فٹ نیچے تھا۔ یہ نومبر کا مہینا تھا۔ موسم گرما کے آغاز اور بارشوں کے بعد پانی کا بہاؤ مزید بڑھتا ہوگا تو سطح شاید پل تک بلند ہو جاتی ہوگی۔

پل کے نیچے ستون نہیں تھے۔ لکڑی کے تختوں والے اس پل کو دونوں جانب سے فولادی رسوں نے سنبھال رکھا تھا۔ ایک طرف یہ رسے پہاڑی پر بنے ہوئے سیمنٹ کے چبوتروں میں دفن تھے تو دوسری طرف وہ زنگ آلود فولادی ستونوں سے بندھے ہوئے تھے۔ پل کے کناروں پر کوئی حفاظتی جنگلا نہیں تھا۔ اس پر سے گاڑی گزارنا خطرناک کام تھا۔

شہناز نے سب سے پہلے اپنے خوف کا اظہار کیا "اس پل سے کیسے گزرے گی گاڑی؟"

راجا نے کہا "یا گاڑی گزر جائے گی یا ہم گزر جائیں گے۔ کیا حرج ہے اگر ہم اپنی اپنی مغفرت کی دعا ایڈوانس کرلیں۔"

میں نے کہا "اعمال سب سے اچھے شہناز کے ہیں۔ گاڑی کو اس پل صراط سے وہی گزار سکتی ہے۔"

شہناز نے گھبرا کے کہا "نہیں نہیں، اب کتنی دور جانا ہے ہمیں۔"

راجا نے کہا "خاتون! ست بدھائی آپ کے سامنے ہے۔ ادھر دیکھیے، سیدھے ہاتھ کی طرف۔"

شہناز کے ساتھ میں نے بھی سر گھمایا تو گھنے درختوں میں سے مجھے قدیم حویلی کی ایک جھلک نظر آئی۔ سورج بائیں جانب آ گیا تھا، چنانچہ حویلی پر سائے محیط تھے اور اس کے خدوخال پر بقول ناصر کاظمی، اداسی بال کھولے سو رہی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھ پر عجیب سا اثر ہوا۔ اچانک مجھے یوں لگا جیسے گزرے ہوئے ڈیڑھ سو برسوں کے سارے وارث اپنے نادیدہ وجود کے ساتھ ہر سمت سے نگراں ہیں۔ ان کی خاموش نگاہیں مجھے بڑے معنی خیز انداز میں خوش آمدید کہہ رہی ہیں۔ آؤ، آؤ...... ست بدھائی کی پرآسیب خونی کہانی کا حصہ بن جاؤ۔ ہم بھی جو اس کے مالک تھے، آج تاریخ کا گم شدہ ورق ہیں۔ تم اس میں ایک نئے باب کا اضافہ کرنے آئے ہو۔ یہاں تک پہنچ گئے ہو تو پھر رکنا کیسا؟ اب اگر تم واپس بھی جانا چاہو تو جا نہیں سکتے کیونکہ جو طاقت تمہیں دھکیل کر یہاں تک لائی ہے، تقدیر کہلاتی ہے۔ اس سے لڑنے کی تدبیر کوئی نہیں۔

شہناز نے کہا "راجا! کیا حرج ہے اگر ہم...... واپس چلیں۔ پھر کبھی کسی چھوٹی گاڑی میں آئیں گے۔ ست بدھائی کو دیکھنا تھا، دیکھ لیا۔"

میں نے کہا "نہیں شہناز! ہم آگے جائیں گے۔ آج رات اپنے آبائی محل میں قیام فرمائیں گے۔"

راجا نے گاڑی پھر اسٹارٹ کی اور پیچھے پلٹ کے دیکھتے ہوئے مسکرایا "شنو رانی! شتر مرغ کی طرح آنکھیں بند کرلو۔ جب تک پانی میں گرنے کا چھپاکا سنائی نہ دے کھولنا مت۔"

میں نے کہا "کیوں بلاوجہ ڈرا رہا ہے اسے۔ آٹھ فٹ چوڑے پل پر سے ساڑھے پانچ فٹ چوڑی کار کیوں نہیں گزر سکتی۔ دونوں طرف ایک ایک فٹ جگہ ہوگی۔"

راجا نے کہا "کیا خیال ہے۔ سو میل فی گھنٹا پر دوڑا کے نکل جاؤں۔ ذرا حساب لگا سو گز کتنی دیر میں گزر سکتے ہیں؟"

میں نے کہا "تقریباً دو سیکنڈ۔ اوپر سے نیچے بھی اتنا ہی وقت لگے گا۔"

"راجا! دھیان سے...... آہستہ آہستہ چلو۔ بہت

آہستہ۔" شہباز نے کانپتی آواز میں کہا۔

راجا نے گاڑی کو پل پر اتار دیا۔ گاڑی کی رفتار بہت کم تھی۔ راجا کی ساری توجہ اسٹیئرنگ پر اور گاڑی کو سینٹر سے ایک انچ ادھر ادھر نہ ہونے دینے پر مرتکز تھی لیکن نیچے تختے مل رہے تھے۔ شہباز خاصی بلند آواز میں دعائے قنوت کا ورد کر رہی تھی۔ مجھے زیادہ ڈر کسی تختے کے ٹوٹنے کا تھا۔ اگر ایک بھی تختہ ٹوٹ جاتا تو گاڑی کو جھٹکا لگتا۔ شاید گاڑی پھنس جاتی۔ اسے آگے بڑھانے کے لیے انجن کو ریس دینا ضروری ہو جاتا اور گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھتی تو اسٹیئرنگ کو سنبھالنا زیادہ مشکل ہوتا۔ میں سانس روکے بیٹھا رہا اور شہباز بیچ بیچ آنکھیں بند کیے درود شریف دہراتی رہی۔ آہستہ آہستہ پل نیچے سے گزرتا گیا۔ نصف فاصلہ طے ہوا۔ پھر کنارا سامنے آ گیا۔

گاڑی پل کو عبور کر کے پھر ایک کچے راستے پر چلنے لگی۔ شہباز نے آنکھیں کھول کے کہا "اللہ تیرا شکر ہے۔"

راجا نے کہا "اللہ کے اس نیک بندے کا بھی شکریہ ادا کرو جو تمہیں زندہ سلامت پل صراط سے گزار کے لے آیا۔"

میں نے کہا "راجا، تجھے تو سب معلوم ہوگا راستے کے بارے میں، تو پہلے آ چکا ہے۔"

"ہاں...... اور اسی لیے میں نہیں چاہتا تھا کہ شہباز ساتھ آئے۔ جان نکل رہی تھی اس کی خوف سے۔"

شہباز نے کہا "میرا تو ہارٹ فیل ہو جاتا۔"

میں نے کہا "میری فیملی بھی چکر لگا گئی ہے۔ کیسے آئے تھے وہ سب؟"

"وہ تین چھوٹی گاڑیوں میں آئے تھے۔ اور ان کا بھی ڈر سے برا حال تھا لیکن پل اتنا خطرناک نہیں ہے جتنا نظر آتا ہے۔"

میں نے کہا "راجا صاحب! اس پل کی جگہ ایک نیا اس سے دگنا چوڑا اور مضبوط پل بنوایئے۔ ہوا میں معلق اسٹیل روپ والا جھولتا ہوا پل نہیں، مضبوط بنیادوں پر۔"

"ابھی بنواتا ہوں سر! ذرا وہ جادو کا چراغ عنایت فرمایئے جس کے غلام دو جن ہیں۔"

میں نے کہا "وہ...... محل میں ہوگا ہمارے۔ شاہی خزانے کے محافظ سے مل جائے گا۔"

اب شہباز کا موڈ بھی اچھا ہو گیا تھا۔ وہ ہنسنے لگی "بالکل قصے کہانیوں کی بات لگتی ہے رفیق بھائی کہ یہ جاگیر...... یہ سارا علاقہ اور محل...... اس کے مالک آپ ہیں۔ یہ تو بہت خوبصورت جگہ ہے۔"

"خطرناک بھی ہے۔ ہم ساری دنیا سے کٹ کر رہ گئے ہیں۔ ٹیلی فون یہاں ہے نہیں اور کسی کا موبائل فون کام نہیں کر سکتا۔ سگنل ہی نہیں آتا۔ اب سوچو...... اگر یہ پل ٹوٹ جائے؟"

میں نے کہا "یہاں آنے کا راستہ دوسری طرف سے بھی ہوگا۔"

"ہاں، ویسے تو خدا کی زمین ہے۔ کسی سمت میں بھی نکل جائیں تو کہیں ضرور پہنچ جائیں گے، چلتے چلتے۔"

سڑک نے ایک اور موڑ کاٹا اور ایک شکستہ چار دیواری میں داخل ہو گئی۔ یہاں پہلے کوئی پھاٹک ہوگا لیکن اب نہ پھاٹک کو سہارا دینے والے ستون تھے اور نہ ان کے پٹ۔ سیاہ پتھروں کی ایک حد بندی کے آثار باقی تھے۔ دیوار مشکل سے دو فٹ اونچی ہوگی۔ اس کا مقصد کسی کو داخلے سے روکنا نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ ست بدحالی میں میری جاگیر کی حدود کا تعین کرتی تھی۔ دائیں اور بائیں طرف یہ دیوار خودرو پودوں، جھاڑیوں اور درختوں میں راستہ بناتی ایک دو فرلانگ تک کہیں کہیں دکھائی دے رہی تھی۔

راجا نے گاڑی روک دی اور میں نے اس زمین پر قدم رکھا جس نے مجھے ملکیت کا غرور اور وراثت کا حق دینے کے لیے سات نسلوں کا خونی سفر طے کیا تھا۔ اس وقت مجھے کچھ بھی محسوس نہیں ہوا کیونکہ کسی طرح بھی یہ زمین مختلف نہ تھی۔ ایسی ہی زمین ہر جگہ تھی، جو براعظموں، ملکوں، جزیروں اور شہروں کے حوالے سے الگ الگ نام رکھتی تھی۔

اپنے اپنے وقت پر زمین کو انسان نے اپنا کہا۔ فتح کیا اور اس پر اپنے جھنڈے لہرائے، ہل چلائے، کارخانے ڈیم اور اسکائی اسکیپرز تعمیر کیے۔ محل اور اہرام بنائے۔ پھر نام ختم ہو گیا اور زمین کے مالک دوسرے ہوئے۔ پرانے ملک خاک میں مل کر زمین کا حصہ بنتے گئے۔ سات نسلیں گزر گئیں۔ الارض عنداللہ۔ باقی ہے اللہ کا نام۔ تو میاں رفیق احمد، اس کے مالک تم کب تک رہو گے؟

میں نے اپنے سر سے ان خیالات کو جھٹکنے کی کوشش کی۔ یہ مجھے کیا ہو گیا تھا۔ کیا اس جگہ اس فضا اور ہوا میں کسی آسیب کا اثر ہے؟ لاحول ولاقوۃ۔ آسیب کیا ہوتا ہے، ہر زمین پر زندگی اسی طرح وقت کے محدود دائرے میں یونہی رواں رہتی ہے۔

راجا نے کہا "کیا خیال ہے نواب صاحب، آگے چلیں؟"

میں نے کہا "راجا صاحب، ہمارا استقبال کرنے کوئی

نہیں آیا۔ نہ بگل بجے، نہ کوئی گارڈ آف آنر پیش کیا گیا۔ نہ بس توپوں کی سلامی، رعایا کہاں ہے ہماری؟ درباری کہاں رہ گئے ہیں؟"

شہباز ہمارے ساتھ بڑی مسحور سی کھڑی تھی۔ "راجا...... یہاں سے بتاؤ، رفیق بھائی کی جاگیر کہاں تک ہے؟"

اس نے انگلی کے اشارے سے بتانا شروع کیا "ادھر مشرق کی طرف دیکھو، وہ ایک مسجد کا سفید مینار دکھائی دے رہا ہے، وہ گاؤں ہے جو اسی جاگیر کی حدود میں ہے۔ سامنے جنگل ہے، تمہیں کچھ اندازہ نہیں ہوگا...... تقریباً ایک میل تک کا علاقہ ہے۔ ادھر مغرب کی طرف۔ ہاں...... وہ پہاڑی ہے، اس پر ایک درخت نظر آ رہا ہے۔ اب گھوم جاؤ، مزید بائیں جانب۔"

شہباز کے ساتھ ساتھ میں بھی گھوم رہا تھا۔ میری نظر کچھ زیادہ اپنے پیچھے اس پل تک گھوم گئی جس پر سے ہم گزر کے آئے تھے۔ پل کے ساتھ ہی وہ پہاڑی تھی جس کے گرد دریائے کنہار انگریزی حرف ایس کی شکل بنا رہا تھا۔ اچانک مجھے لگا جیسے اس پہاڑی پر کوئی تھا جو بڑی تیزی سے چھپ گیا ہے۔

میں نے راجا کی طرف دیکھا "کیا تو نے کچھ دیکھا؟"

راجا نے سر ہلایا "ہاں، کوئی اوپر سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔"

"دیکھ رہا تھا تو دیکھتا رہتا۔ ہماری نظر پڑتے ہی چھپ کیوں گیا؟"

میں نے کہا "اس نے کیا اٹھا رکھا تھا؟"

"کیمرا ہو سکتا ہے...... یا دوربین ہو سکتی ہے۔"

"یا بندوق بھی ہو سکتی ہے" میں نے کہا۔

"وہم میں مت پڑ۔ ہوگا کوئی چرواہا۔ وہ بھیڑ بکریاں چراتے پھرتے ہیں۔ ایک لاٹھی بھی رکھتے ہیں اپنے پاس۔"

پہاڑی کے پیچھے نیچے جاتے ہوئے سورج کی روشنی تھی چنانچہ اس شخص کا تاریک سایہ بہت واضح نظر آیا تھا اور میرے ساتھ راجا نے بھی اسے بڑی تیزی سے حرکت کرتے اور غائب ہوتے دیکھا تھا۔ وہ چھلانگ مار کے پیچھے اتر گیا تھا۔

اس بات کو ہم نے زیادہ اہمیت دینا مناسب نہ سمجھا۔ گرد و نواح کا سارا علاقہ آباد تھا۔ وہ کوئی بھی پر تجسس دیہاتی ہو سکتا تھا جس نے لشکارے مارتی سیاہ کار سے اترنے والے شہری لوگوں اور ایک رنگین لباس والی لڑکی میں دلچسپی لی ہو۔ ایسا فرض کرنے کی تو کوئی وجہ نہیں کہ کوئی مسلح شخص ہمارے تعاقب میں تھا اور چھپ کے نگرانی کر رہا تھا۔

قدیم حویلی تک جانے والا راستہ شاید کسی زمانے میں صاف ستھرا ہوگا۔ ممکن ہے اس کے دونوں جانب سرسبز حاشیہ ہو اور اس پر سرخ بجری بچھی رہتی ہو۔ اب اس پر خشک گھاس، پتے اور مٹی پتھر کے ڈھیر پھیلے ہوئے تھے۔ حویلی کا صدر دروازہ پرانی طرز کے محرابی کواڑوں والا تھا اور مسلسل کھلا رہنے سے جام ہو چکا تھا۔ اس پر بھی نہ رنگ و روغن تھا اور نہ پالش۔ دائیں بائیں حویلی کے دو پہلو شاید چار سو فٹ تک پھیلے ہوئے تھے۔ اوپر نیچے رنگین شیشوں والی محرابی کھڑکیوں کی ایک قطار تھی۔ اوپر کی منزل کے شیشے سلامت تھے، نیچے کے زیادہ تر ٹوٹ چکے تھے اور ان کی جگہ گتا یا ٹین لگا کے پرندوں کی آمد و رفت کو روک دیا گیا تھا۔ دیواروں کا پلستر جگہ جگہ سے اکھڑ رہا تھا اور بعض درزوں میں سے نکلنے والے پودوں کو دیکھ کر غالب کا مصرعہ یاد آتا تھا۔ اگ رہا ہے در و دیوار پہ سبزہ غالب۔ اتنا اندازہ اب بھی ہو جاتا تھا کہ اوپر کی منزل کا رنگ باہر سے سرخ تھا اور نیچے نیلا رنگ تھا۔ یہ بڑی عجیب سی کلر اسکیم تھی مگر شاید اس دور میں حویلیاں ایسی ہی شناخت رکھتی ہوں گی۔

گاڑی پھاٹک سے گزری اور ایک صحن میں رک گئی۔ اب حویلی کا پورا نقشہ میرے سامنے تھا۔ اس کے ایک ایکڑ سے زیادہ کے صحن کے وسط میں ٹوٹا پھوٹا خشک تالاب تھا۔ تالاب کے بیچ میں کنول کے پھول کی شکل کا فوارہ بھی اوپر سے ٹوٹ گیا تھا۔ تالاب کے چاروں طرف کسی زمانے میں باغ ہوگا، اب جھاڑ جھنکاڑ تھا۔ باغ کے گرد آٹھ فٹ چوڑی روش تھی جو برآمدے کے ساتھ ساتھ چلتی تھی۔ دائیں طرف کوئی تعمیر نہیں تھی۔ بس ایک دیوار تھی جس کی بلندی بارہ چودہ فٹ ہوگی۔ ایسی ہی دیوار بائیں طرف بھی کھڑی تھی۔ دونوں دیواریں جزوی طور پر منہدم ہو چکی تھیں۔ سامنے والا حصہ چھوٹے موٹے کمروں کی قطار پر مشتمل تھا۔ اس قطار میں پندرہ بیس کمرے تھے جن کے سامنے ایک ہی طویل برآمدہ تھا۔ یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ ہمارے پیچھے کا دو منزلہ حصہ ہی رہائش کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ سامنے والے کمرے ملازموں کی رہائش کے لیے تھے۔

میں نے پیچھے پلٹ کے دیکھا تو پوری عمارت ایک کھنڈر جیسی دکھائی دی۔ شاید گزشتہ نصف صدی میں کسی نے اسے آباد نہیں کیا تھا۔ تاہم اس کے مالکوں نے اسے فراموش بھی نہیں کیا تھا۔ اس کا آخری مالک انگلستان کی سرزمین پر تنہا مفلوج پڑا رہا تھا اور پھر وہیں دفن ہو گیا تھا۔ اس نے جائداد

اور حویلی کی نگرانی کے لیے پرانے ملازموں کو یہاں رہنے دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اب تک حویلی کے دروازوں اور کھڑکیوں کی جگہ خالی دیوار نظر نہیں آ رہی تھی۔ بند حویلی کے اندر کیا تھا اور کیا باقی بچا تھا۔ یہ کوئی نہیں جانتا تھا اور اس کا اندازہ میں بھی نہیں لگا سکتا تھا۔

سامنے والا حصہ جو پہلے شاگرد پیشہ کہلاتا ہوگا لیکن اب اسے سرونٹ کوارٹرز کا نام دیا جا سکتا تھا جو پوری طرح آباد تھا۔ برآمدے میں چارپائیاں پڑی تھیں۔ ڈوریوں پر کپڑے سوکھ رہے تھے اور باہر بچے کھیل رہے تھے۔ معلوم نہیں وہاں کل کتنے افراد اور خاندان رہتے تھے۔ مجھے اپنے سامنے آٹھ دس مختلف عمر کے بچے۔ چار پانچ دیہاتی قسم کی عورتیں اور چار پانچ مرد نظر آ رہے تھے۔ کار کو احاطے میں داخل ہوتا اور پھر اس میں سے ہمیں اترتا دیکھ کے وہ سب جیسے منجمد ہو گئے تھے۔ آہستہ آہستہ ان کے خاموش تماشائیوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ ظاہر ہے وہ اندر سے نکل نکل کے آ رہے تھے یا کہیں پچھلی طرف سے۔ پیچھے یقیناً کھیت ہوں گے اور ان کی کوٹھریوں کے دروازے ادھر بھی نکلتے ہوں گے یا انہوں نے نکال لیے ہوں گے۔

غربت ان سب کی حالت سے عیاں تھی۔ گزشتہ چند ماہ میں یہاں بہت لوگ آئے تھے جو نئے مالک یا ان کے نمائندے تھے۔ ان میں راجا کو شاید وہ پہچان گئے ہوں گے۔ ہمارے بارے میں بھی ان کے دل میں کوئی شک و شبہ نہیں ہوگا کہ ایسی شاندار گاڑی میں اتنے اعتماد کے ساتھ اندر آنے والے نئے مالک کے خاندان والے ہی ہو سکتے تھے۔ کوئی سیاح یا آوارہ گرد یہاں اس طرح داخل نہیں ہو سکتا تھا۔

چند منٹ بعد ایک شخص آگے بڑھا۔ اس کی ایک بغل میں بیساکھی تھی کیونکہ اس کا ایک پاؤں پنجے کے اوپر سے کٹا ہوا تھا۔ وہ پچاس پچپن سال کا دراز قد اور تندرست آدمی تھا۔ اس کے قریب آنے سے پہلے ہی راجا نے بتا دیا ”یہ اکبر خان ہے۔ گزشتہ پچاس برس سے اس کا باپ حویلی کا نگراں تھا۔ مگر وہ بہت بوڑھا ہو گیا ہے۔ اس کے فرائض اب اکبر خان انجام دیتا ہے۔ یہ سب سے بڑا بیٹا ہے۔ جانو یا جان محمد کی تین نسلیں یہاں رہتی ہیں۔“

اکبر خان اتنی دیر میں قریب آ گیا۔ اس نے سلام کے بعد اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھایا تو مجھے اس کی مضبوط گرفت میں گرمجوشی کا خلوص محسوس ہوا۔

”ریٹائرڈ نائب صوبے دار اکبر خان جناب!“ اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”آپ تو پہلے بھی آئے تھے راجا صاحب! آپ غالباً وکیل ہیں۔“

راجا نے کہا ”نہیں۔ ان کا نام بشارت فاروقی تھا۔ اس جگہ کے نئے مالک ہیں رفیق احمد۔ یہ لندن سے آئے ہیں۔“

اکبر خان کی نظریں احترام آمیز انداز میں مجھ پر جم گئیں اور اس نے دوبارہ مجھ سے ہاتھ ملایا ”آپ کا انتظار تھا۔ میں سب کی طرف سے آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔“

میں نے کہا ”تھینک یو اکبر خان! تمہارے والد کہاں ہیں؟“

”ان پر فالج کا اثر ہے' اٹھ نہیں سکتے مگر سب سے زیادہ وہی آپ سے ملاقات کے لیے بے چین تھے۔“

میں نے کہا ”میں خود جا کے ان سے مل لیتا ہوں' چلو۔“

اکبر خان پلٹا ”وہ روز مجھ سے پوچھتے تھے کہ رفیق صاحب آئے؟ جب سے انہیں معلوم ہوا تھا کہ لندن میں مالکوں نے سب کچھ آپ کے حوالے کر دیا ہے وہ آپ کی واپسی کی دعائیں مانگتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ اس فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔“

”کون سا فرض اکبر خان؟“ میں نے کہا۔

”یہی...... اس جگہ کی حفاظت کا۔ وہ کہتے تھے یہ بڑی ذمے داری ہے۔“ وہ بیساکھی کے سہارے چلتا گیا۔

میں نے کہا ”اکبر خان! تمہاری ٹانگ کو کیا ہوا؟“

”ٹانگ شہید ہو گئی سر! سن اکہتر کی جنگ میں۔ میں نے ٹانگ اڑا کے ایک بھارتی ٹینک کو گرانے کی کوشش کی تھی۔ آیئے سر! ادھر سے آیئے۔“ اس نے ہنس کے کہا۔

برآمدے میں اب کم سے کم بیس افراد جمع ہو چکے تھے۔ ان میں نصف بچے تھے۔ عورتوں میں ایک بوڑھی تھی۔ دو ادھیڑ عمر کی تھیں اور دو جوان۔ ان میں سے ایک سولہ سترہ سال کی لڑکی تھی۔ مردوں میں بھی ایک لڑکا اٹھارہ انیس سال کا تھا۔ یقیناً یہ جان محمد کی دوسری اور تیسری نسل کے لوگ تھے۔

اکبر خان مجھے ایک تاریک کمرے میں لے گیا جہاں چارپائی پر ایک ہڈیوں کا ڈھانچا پڑا تھا۔ اس کے سر' داڑھی اور پلکوں کے بال تک سفید ہو گئے تھے۔ میری نظریں تاریکی میں دیکھنے کی عادی ہوئیں تو میں نے چارپائی کی پٹی پر بیٹھ کے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ فرط جذبات سے کانپ رہا تھا اور اس کی بوڑھی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

”آپ آ گئے مالک!“ اس نے کمزور آواز میں کہا ”بڑا اچھا کیا' میں آپ کی امانت آپ کے حوالے کیے بنا مرنا نہیں

چاہتا تھا۔ لندن والے مالک بہت پہلے آئے تھے' عقیل احمد......دس سال پہلے۔''

اکبر خان نے فوراً مداخلت کی ''دس سال پہلے نہیں بابا! وہ ابھی دو سال پہلے آئے تھے۔''

جان محمد نے کہا ''دو سال......اچھا......!''

اکبر نے کہا ''جانو بابا کا دماغ اب کنفیوز ہو جاتا ہے۔ اِدھر کی باتیں اُدھر کر دیتا ہے۔ مالک پہلے آٹھ دس سال میں چکر لگاتے تھے۔''

''یعنی وہ بالکل لاتعلق نہیں تھے۔ آتے رہتے تھے؟'' میں نے حیرانی سے کہا ''وہ تو مفلوج تھے۔''

اکبر خان نے کہا ''وہ وہیل چیئر پر آتے تھے۔ علاقے کے ذمے دار لوگوں سے ملتے تھے۔ یہاں کے پٹواری اور تحصیلدار انہیں جانتے تھے۔ میرا خیال ہے وہ انہیں اتنا دے جاتے تھے کہ وہ بعد میں ہیرا پھیری نہ کریں۔ زمین کے بارے میں ہدایات دیتے تھے اور حویلی کا جائزہ لیتے تھے کہ کوئی چیز اِدھر سے اُدھر تو نہیں ہوئی؟''

میری حیرت بڑھتی جارہی تھی ''حویلی میں کیا تھا؟''

''سب کچھ ہے سر۔ سارے کمروں میں تالے لگے ہوئے ہیں۔ جب مالک آتے تھے تو صفائی ہوتی تھی ورنہ کمرے بند رہتے تھے۔ ساری چابیاں بابا کے پاس ہیں۔''

جان محمد نے کہا ''جا اپنی ماں سے ساری چابیاں لے آ۔''

اکبر خان باہر گیا اور کچھ دیر بعد لوٹا تو اس کے ہاتھ میں دس بارہ چابیوں کا ایک گچھا تھا جو اس نے اپنے باپ کو دے دیا۔ جان محمد نے وہ چابیاں مجھے تھمادیں۔

''مالک! میرا فرض پورا ہوا۔ میری پیدائش اسی حویلی میں ہوئی تھی۔ اب میری عمر ستر سال ہے یا شاید کچھ اوپر۔''

اکبر نے میرے کان میں کہا ''پچاسی سال!''

''آج تک جو کچھ مالکوں نے اپنی مرضی سے دیا' اس کے علاوہ ہم نے ایک تنکا نہیں لیا۔ آپ دیکھ لو گے۔''

میں نے کہا ''بابا! میں آپ کا احسان مند ہوں۔''

''آخری بار جب مالک آئے تھے تو انہوں نے کہا تھا کہ جان محمد! نئے مالک آنے والے ہیں' انہیں سب بتا دینا' ان کا نام رفیق احمد ہے۔''

میں بھونچکا رہ گیا ''انہوں نے ایسا کہا تھا' دو سال پہلے......؟''

''ہاں۔ اکبر کہتا ہے دو سال' تو دو ہی ہوں گے! مجھے تو دس یاد پڑتا ہے۔ یہ زمین ہمیں مالک نے ہی دی تھی' کاشت کے لیے۔ کہتے تھے کہ اس پر جو چاہو اگاؤ' کھاؤ......بازار میں بیچو۔ پیداوار سب تمہاری ہوگی۔ یہ رہنے کی جگہ بھی شروع سے ہے۔''

میں نے اٹھتے ہوئے کہا ''جانو بابا! انشاء اللہ سب ویسا ہی رہے گا۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ کروں گا میں۔ تمہارا حق اس سے کہیں زیادہ ہے لیکن اب تم آرام کرو' تمہاری ذمے داری میں تمہارے بیٹے کے سپرد کر رہا ہوں۔'' میں نے کہا اور چابیاں اکبر خان کے ہاتھ پر رکھ دیں۔

''آپ کی بڑی مہربانی ہے سر!'' اکبر خان جذباتی ہو گیا۔

''آنے والے وقت میں ہمارے تعلقات زیادہ اچھے ہوں گے۔ مجھے یہاں بہت کچھ کرنا ہے اور اس میں مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ کبھی خود کو ملازم مت سمجھنا' تم میرے ساتھی اور دوست ہو۔ تم نے میرے لیے میری عدم موجودگی میں اور مجھے جانے بغیر بہت کچھ کیا۔ اب میری باری ہے۔ مجھے تمہارے لیے بہت زیادہ کرنا ہے۔ آؤ اب چلیں' رات سے پہلے ہمیں قیام کی جگہ بنانی ہے۔ میرے ساتھی انتظار کر رہے ہوں گے۔''

اکبر خان بیساکھی پر کھٹ کھٹ کرتا میرے ساتھ چل پڑا۔ میرے لیے کچھ انکشافات انتہائی حیرت ناک تھے۔ ایک یہ کہ حویلی محض ایک خالی کھنڈر نہیں ہے۔ اس میں میرے آباؤ اجداد کے وقت کی ساری نشانیاں موجود ہیں۔ دوسرے یہ کہ لندن میں مجھے بلانے سے بہت پہلے ہی عقیل احمد نے طے کر لیا تھا کہ ان کا وارث رفیق احمد ہوگا۔ یہ فیصلہ انہوں نے کب اور کس بنیاد پر کیا......؟ میں جتنا اس کے بارے میں سوچتا تھا' میری الجھن بڑھتی جاتی تھی۔

اکبر خان نے کہا ''اس وقت تو آپ کمرے کھلوا کے نہیں دیکھ سکتے۔ اندھیرا ہو جائے گا تھوڑی دیر میں۔''

میں نے کہا ''مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ یہ بتاؤ' یہاں بجلی ہے......حویلی میں؟''

اکبر نے نفی میں سر ہلایا ''بجلی کون لگواتا۔ یہاں کوئی رہتا ہی نہیں تھا۔''

میں نے کہا ''زمین پر کوئی ٹیوب ویل بجلی سے چلتا تھا؟''

''جی سر! اس کے لیے ایک جنریٹر تھا۔ ڈیزل سے چلنے والا۔ وہ بند رہتا تھا کیونکہ ڈیزل بہت دور سے لانا پڑتا تھا۔ اکثر ختم ہو جاتا تھا۔ برسوں ایسے ہی پڑے پڑے ناکارہ ہو گیا تھا۔ چھ سات سال پہلے چوری ہو گیا تھا۔ بابا نے مالکوں کو بتا دیا تھا۔ آپ چاہیں تو بجلی لگوا سکتے ہیں۔ یہاں سے ملتا

لائن زیادہ دور نہیں ہے۔ رانا صاحب کے علاقے سے گزرتی ہے۔''

میں نے کہا ''کون رانا صاحب؟ رانا رجب علی خیال؟''

''آپ انہیں جانتے ہیں سر؟''

''آج ہی ملاقات ہوئی۔ اس کی گاڑی کو ایک معمولی سے حادثے میں نقصان ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ ذمے دار ہم ہیں۔ مگر پھر اسے اندازہ ہو گیا کہ ہم کوئی ایرے غیرے نہیں ہیں۔''

اکبر متفکر ہو گیا ''وہ بڑا خطرناک سانپ ہے سر! بلکہ اژدہا......اس سے ہوشیار رہیں۔''

میں نے کہا ''فی الحال تو ہم یہاں نیا جنریٹر لگادیں گے۔ اب یہ بتاؤ کہ رہنے کے قابل کون سی جگہ ہے؟''

اس نے ہمیں اپنے پیچھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور ہم برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کے ایک بند دروازے کے سامنے رک گئے۔ اکبر خان نے تالا کھولا۔ اندر ابھی سے اندھیرا تھا مگر اکبر نے کہا کہ روشنی کا انتظام ہو جائے گا۔ وہ سب اپنے اپنے گھر میں مٹی کے تیل کی لالٹینیں جلاتے تھے لیکن مالکوں کی اچانک آمد کے لیے انتظامات رکھے جاتے تھے۔ حویلی میں چار پیٹرومیکس لیمپ تھے۔ آئل اسٹوو تھے اور ایک باتھ روم کے حمام میں پانی بھی تھا۔

یہ کمرا تقریباً چالیس فٹ لمبا اور چوڑا تھا۔ چھت کی اونچائی بھی پندرہ فٹ سے زیادہ ہی تھی۔ چھت کی تعمیر میں شیشم کی لکڑی استعمال ہوئی تھی۔ بڑے بڑے شہتیروں کے اوپر نقشین ٹائلوں کا رنگ روغن ذرا بھی ماند نہیں پڑا تھا۔ بلند دروازوں اور لمبی چوڑی کھڑکیوں کے سامنے فرش تک پہنچنے والے پردے تھے جن کا رنگ اڑ چکا تھا۔ دیواروں کی سفیدی میں پیلاہٹ آگئی تھی۔ بائیں طرف چھپرکھٹ اسٹائل کی بھاری بھرکم مسہری تھی جس پر تین افراد آرام سے سو سکتے تھے۔ دوسری طرف دیوار کے ساتھ ساتھ بید کی بنی ہوئی کشن والی کرسیوں کی قطار تھی۔ درمیان میں کاشانی یا اصفہانی ڈیزائن والا اونی قالین تھا۔ کمرے میں محبوس ہوا کی بو تھی اور در و دیوار سے اداس کرنے والی ویرانی کا احساس پھوٹتا تھا۔

میں نے کہا ''اکبر خان۔ چائے' کافی اور کھانے پینے کا سب سامان ہم ساتھ لائے ہیں۔ تم پہلے تو روشنی کا انتظام کرو' پھر کسی سے چائے بنواؤ۔''

اس نے مایوسی سے کہا ''سر! ہم پرانے خدمت گار ہیں' جب بھی پہلے مالک آتے تھے تو انہیں کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ آپ منہ دھونا' غسل کرنا چاہیں تو غسل خانے میں پانی ہے۔ بیٹھنا چاہیں تو میں باہر کرسیاں رکھوا دیتا ہوں۔ چائے آتی ہی ہوگی۔ رات کے کھانے میں آپ کیا پسند کریں گے' صرف حکم کریں۔''

میں شرمندگی میں مبتلا ہو گیا کیونکہ اس کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی ایک نوجوان لڑکا اور ایک عورت ٹرے کے ساتھ نمودار ہوئے۔

''یہ میری بیوی ہے سر! اور یہ میرا بیٹا کبیر خان۔'' اکبر نے کہا۔

انہوں نے ٹرے میز پر رکھ دی اور خاموشی سے سلام کر کے لوٹ گئے۔ ٹرے میں چائے تھی جو کلاسیکل قسم کی انگلش کراکری میں سرو کی گئی تھی۔ دوسری ٹرے میں پکوڑے تھے اور دونوں چیزیں خوب گرم تھیں۔ بلاشبہ وہ مالکوں کی خدمت کے آداب سے پوری طرح واقف تھے۔

رات تک ہمیں ضرورت کی کسی چیز کی فراہمی کے لیے کہنا نہیں پڑا۔ اکبر خان کے علاوہ اس کے بھائی اصغر خان اور ان کی ساری فیملی ہمارے لیے بے حد مستعد رہی۔ اس انداز خدمت گزاری نے ہمیں بے حد متاثر کیا اور ہم اکیسویں صدی میں نمک خواری اور وفاداری کے اس تصور پر حیران ہوتے رہے۔

چائے پینے کے بعد ہم تازہ دم ہو گئے تھے۔ جان محمد کے خاندان نے جس طرح میرے آباؤ اجداد کے ورثے کی حفاظت کی تھی' اس نے میری دلچسپی اور تجسس کو بیدار کر دیا تھا۔ میں حویلی کا جائزہ لینے کے لیے صبح تک انتظار کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

''میں ابھی دیکھنا چاہتا ہوں کہ ان کمروں میں کیا ہے؟'' میں نے کہا۔

راجا بولا ''کمال ہے یار! انہوں نے مجھے یا بشارت فاروقی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔''

شہباز نے کہا ''کیوں بتاتے' وہ جانتے تھے کہ تم مالک نہیں ہو۔ انہیں تو مالک کا نام بھی معلوم تھا۔''

راجا نے کہا ''بعد میں تمہارے خاندان کے سبھی لوگ آتے تھے' سب اسی کمرے میں ٹھہرتے تھے مگر انہیں یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ حویلی کے کمرے خالی نہیں ہیں۔ نہ کسی نے تالا کھلوایا' نہ انہیں چابیاں ملیں۔''

''یہ ان کا احساسِ ذمے داری ہے کہ چابیاں صرف مالک کے حوالے کرنا ضروری سمجھا۔'' میں نے کہا ''یہ تو ایک خاندانی میوزیم ہے راجا!''

''چل اس کا جائزہ لیتے ہیں۔ کیا پتا اندر سونے چاندی کے برتن ہوں۔ اشرفیوں کے توڑے رکھے ہوں' خفیہ تجوریوں میں۔ مجھے تو دیواروں کا اور فرش کا ایکس رے کرا کے دیکھنا چاہیے۔''

میں نے کہا ''یار' جن بھوت بھی تو ہوں گے یہاں۔ فارسی میں کہتے ہیں کہ ویران گھر میں جن بسیرا کرتے ہیں۔''

''جن بھوتوں کے علاوہ چڑیلیں ہوں گی لیکن ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ وہ اپنی ہی فیملی کے لوگ ہوں گے۔'' راجا نے کہا۔

اکبر خان آدھے گھنٹے بعد نمودار ہوا جب ہم اندھیرے سے گھبرا کے باہر نکل آئے تھے۔ ''سوری سر! صرف ایک پیٹرومیکس لیمپ میں تیل تھا۔ لیکن وہ بھی روشن نہیں ہوا۔ دو کے مینٹل ٹوٹ کے جھڑ چکے ہیں۔ بلاشبہ یہ میری کوتاہی ہے۔''

میں نے کہا ''کوئی بات نہیں اکبر خان!''

''کل سب انتظام ہو جائے گا۔ آج آپ کو اسی لالٹین کی روشنی میں گزارہ کرنا ہوگا۔''

''ہم لالٹین کی روشنی میں حویلی کو دیکھیں گے۔''

''جیسی آپ کی مرضی سر!'' اکبر خان نے کہا۔

لیکن اس کے بعد عجیب بات یہ ہوئی کہ اکبر خان کو وہ چابیوں کا گچھا نہیں ملا جو میں نے کچھ دیر پہلے ہی اس کے ہاتھ پر رکھا تھا۔ وہ بہت پریشان ہوا۔ اس نے کہا کہ وہ معلوم کر کے آتا ہے کہ کسی بچے نے یا کسی عورت نے تو چابیاں نہیں اٹھائی ہیں۔ وہ ایک گھنٹے تک نہیں لوٹا اور جب آیا تو اس کے ساتھ کھانا لانے والے تھے۔ انہوں نے بڑے اہتمام سے مرغیاں بھونی تھیں اور پراٹھے تلے تھے۔ اس کے باوجود وہ معذرت کرتے رہے کہ آج ہمیں گزارہ کرنا پڑے گا۔ کل سے ہمیں ہر چیز ہماری مرضی کے مطابق ملے گی۔

ہمارے سونے کے لیے اسی کمرے میں بستر لگا دیے گئے۔ شہناز نے اکیلے مسہری پر سونے سے انکار کر دیا۔ ہم قالین پر ایک قطار میں لیٹ گئے اور باہر سے آنے والی سناٹے کی گونج سنتے رہے۔ اس ماحول میں نیند کا نہ آنا ایک فطری بات تھی۔

آدھی رات کے بعد کسی وقت میں نے محسوس کیا جیسے کھڑکیوں پر روشنی چمکی ہے۔ شاید باہر بادل ہوں گے اور یہ چمک بجلی کی ہوگی۔ میں نے سوچا اور اٹھ کے باہر آیا تو مجھے تاریکی میں دو سائے دکھائی دیے۔ یہ راجا اور شہناز تھے جو خشک تالاب کی منڈیر پر بیٹھے تھے اور اس ماحول کو انجوائے کر رہے تھے۔

صبح میری آنکھ پہلے کھلی۔ میں نے سوچا کہ حویلی سے باہر جا کے جنگل میں طلوع آفتاب کا منظر دیکھوں اور ان پرندوں کو دیکھوں جن کے چہچہانے کی آواز اندر تک آ رہی تھی۔ میں ایک چپل پاؤں میں ڈال کے نکلا جو ہمارے خدمت گزاروں نے فراہم کی تھی۔ برآمدے کی سیڑھیاں اتر کے میں صدر دروازے کی طرف بڑھا۔ اس وقت مخالف سمت میں بنے ہوئے ملازمین کے رہائشی حصے میں خاصی ہلچل شروع ہو گئی تھی۔

دور سے ہی میں نے گاڑی کو دیکھا تو وہ مجھے کچھ نیچے بیٹھی ہوئی لگی۔ اس کے اگلے دونوں ٹائروں میں ہوا نہیں تھی۔ مجھے کچھ پریشانی لاحق ہوئی کیونکہ ہم ایک فلیٹ ٹائر ہی بدل سکتے تھے۔ قریب جا کر دیکھنے پر مجھے پیچھے کے دونوں ٹائر بھی زمین سے لگے نظر آئے۔ اب شک کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ ان ٹائروں کی ہوا نکالی گئی تھی۔ مجھے بچوں پر غصہ آنے لگا۔ یہ حرکت ان کے سوا کون کر سکتا تھا۔ میں نے جھک کر دیکھا تو صورت حال کی سنگینی مجھ پر عیاں ہوئی۔ چاروں ٹائر کٹے ہوئے تھے اور ناقابل استعمال ہو گئے تھے۔ یہ بچوں کا کام نہیں ہو سکتا تھا۔ ٹائر کچن میں عام استعمال کی چھری سے بھی نہیں کاٹے جا سکتے تھے۔

یہ کس کی تخریبی کارروائی تھی؟ اس سوال سے پہلے میرے ذہن میں آنے والا سوال یہ تھا کہ اب ہم کیا کریں گے؟ قابل استعمال ٹائر کہاں سے آئیں گے اور کیسے؟ یہاں فون بھی نہیں تھا اور ہمارے موبائل فون بھی ڈیڈ تھے۔ ہم مدد کے لیے ایس او ایس بھی نہیں کر سکتے تھے۔

میں لوٹ کے کمرے میں گیا تو اندھیرے میں مجھے صرف راجا نظر آیا۔ میں نے اسے جگایا ''راجا...... شہناز کہاں ہے؟''

راجا اٹھ بیٹھا ''ہو گی غسل خانے میں یا ادھر عورتوں میں۔''

میں نے کہا ''یار! رات کو کسی نے ہماری گاڑی کے چاروں ٹائر کاٹ دیے ہیں۔''

راجا گھبرا کے باہر نکلا ''یہ حرامی پن کس نے کیا ہے؟''

اسی وقت اکبر خان نمودار ہوا۔ اس نے شہناز کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا رکھا تھا۔ شہناز بے ہوش تھی۔ ''یہ باہر پڑی تھیں سر! درویش کے مزار پر......''

جو خیال اکبر خان کو اپنے مقابل دیکھ کے آیا تھا وہ کچھ ور تھا مگر میں نے اس کے اظہار کو التوا میں رکھا۔ فوری توجہ طلب مسئلہ شہناز کا تھا جو اکبر خان کے ہاتھوں میں جھول رہی تھی۔ اس کے بازو نیچے لٹکے ہوئے تھے اور گردن پیچھے جھکی ہونے سے کھلے بال پوری لمبائی کے ساتھ فرش کو چھوتے نظر آ رہے تھے۔

اکبر خان نے اسے بڑی احتیاط کے ساتھ مسہری پر لٹا دیا۔ یوں جیسے وہ ریت کی بنی ہوئی عورت ہے جو ذرا سی ٹھیس لگنے سے بکھر جائے گی۔ راجا اس پر جھکا ہوا بڑی مضطرابی کیفیت میں ایک ہی بات دہرائے جا رہا تھا۔ ''شہناز...... کیا ہوا ہے تمہیں' دیکھو میری طرف دیکھو'' لیکن شہناز اپنی آنکھیں بند کیے بالکل بے حس و حرکت لیٹی ہوئی تھی۔

راجا نے اس کی نبض دیکھی۔ نبض کی رفتار سے کوئی اندازہ قائم کرنا صرف ایک ڈاکٹر کے لیے ممکن تھا۔ راجا نے پریشانی سے میری طرف دیکھا ''یار! کیا ہو گیا ہے اسے' یہ بولتی کیوں نہیں؟'' اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر اسے پنکھا جھلنے لگا۔

یہ صورتِ حال زیادہ پریشان کن اس لیے ہو گئی تھی کہ اس علاقے میں دور دور تک کسی ڈاکٹر کی دستیابی کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ شہناز خود ایک ڈاکٹر تھی۔ وہ یہاں موجود ہر شخص کی کچھ نہ کچھ مدد بھی کر سکتی تھی لیکن اس وقت وہ اپنے لیے بھی کچھ کرنے سے قاصر تھی۔

اچانک گاڑی کے ناقابلِ استعمال ہونے کا مسئلہ سنگین صورت اختیار کر گیا تھا۔ شک کی اب کوئی بات نہیں رہی تھی۔ کوئی نادیدہ دشمن یہاں بھی ہمارے تعاقب میں تھا جہاں ہم ساری دنیا سے کٹ کر محصور ہو گئے تھے۔ ہم کسی سے مدد مانگ سکتے تھے اور نہ ہی اس خوش گمانی پر آسرا کر سکتے تھے کہ حسنِ اتفاق سے کچھ ہو جائے گا۔

کچھ دیر پہلے میں سوچ رہا تھا کہ اب ہماری واپسی کی صورت کیا ہوگی۔ کیا گاڑی کو یہیں چھوڑ کے ہم اسی طرح واپس جائیں گے جیسے گاؤں کے لوگ جاتے تھے۔ کسی بیل گاڑی میں سوار ہونے کے لیے بھی ہمیں پیدل چل کے یہ راستہ طے کرنا ہوگا ٹیلا جوگیاں تک آٹھ دس میل کا یہ سفر آسان نہ تھا۔ ٹیلا جوگیاں سے شاید ہمیں کوئی ویگن یا ٹرک گاڑی یا بس مل سکتی تھی۔ وہاں سے ہم فون بھی کر سکتے تھے اور کسی مکینک کو مدد کے لیے بلا سکتے تھے جو ہماری گاڑی کے چاروں ٹائر قریب کے شہر لے جا کے انہیں تبدیل کرا کے واپس سڑک تک بدھائی پہنچ کے گاڑی میں لگائے اور گاڑی کو ہم تک پہنچائے۔

اب مسئلہ زیادہ سنگین ہو گیا تھا۔ شہناز کو فوری طبی امداد کی ضرورت تھی۔ اس کی بے ہوشی سے کچھ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ اس کی وجہ کیا ہے اگر وہ جلد ہوش میں نہ آئی تو اس ویرانے میں کیا ہوگا' جہاں نہ ڈاکٹر' نہ اسپتال۔

میں نے اکبر خان کو دیکھا تو اس کا چہرہ سپاٹ اور ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ وہ پلک جھپکائے بغیر شہناز کو دیکھ رہا تھا لیکن اس کی آنکھیں کہیں اور دیکھ رہی تھیں۔ کچھ اور دیکھ رہی تھیں جو ہم نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اس کا خیال نہ جانے کہاں سرگرداں تھا۔ میرے شک کی تصدیق اس وقت ہوئی جب میں نے اچانک اس سے سوال کیا۔ ''اکبر۔ یہاں آس پاس کوئی ڈاکٹر ہے؟''

وہ چونک پڑا ''یہاں...... یہاں تو کوئی نہیں ہے سر!''

میں نے کہا ''کوئی بیمار ہو جائے تو کیا کرتے ہو؟''

وہ سوچ کے بولا ''یہ تو بیماری پر ہے جی' معمولی بیماری ہو تو خود ہی دوا دارو کر لیتے ہیں۔ آگے پنڈ سخاوت کی مسجد کے مولوی صاحب دم درود کرتے ہیں' وہ حکیم بھی ہیں۔''

میں نے کہا ''اپنے والد کا علاج کس سے کراتے ہو؟''

''کسی سے بھی نہیں۔ اسے کیا ہے' بڑھاپے کا علاج تو کوئی نہیں۔''

میں نے زچ ہو کے کہا ''یار' کوئی سخت بیمار ہو' کسی کی ٹانگ ٹوٹ جائے' کوئی جل جائے' زچگی کا مسئلہ ہو۔''

وہ سادگی سے بولا ''بچے تو خود ہی پیدا ہو جاتے ہیں گھر میں۔ عورتیں سنبھال لیتی ہیں۔ ٹانگ ٹوٹ جائے تو ایک پہلوان ہے ادھر' وہ جراح بھی ہے۔''

میں نے کہا ''اکبر خان، ڈاکٹر کہاں ملے گا؟''

اس نے کہا ''ٹیلا جوگیاں میں سرکاری ڈاکٹر ہے۔ ہفتے میں ایک دو دن آتا ہے حاضری لگانے۔ باقی وقت ادھر ہوتا ہے' روہتاس میں۔''

میں نے کہا ''اچھا وہاں جانے کی کیا صورت ہوگی۔ تم نے دیکھا ہماری گاڑی کے چاروں ٹائر کسی نے کاٹ دیے ہیں۔''

اس نے سر ہلایا ''ہاں جی' ابھی دیکھا میں نے بھی۔''

''تمہارے خیال میں یہ کس کی حرکت ہو سکتی ہے؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا ''میں کیا بتاؤں سر! یہاں تو بس ہم لوگ ہیں' آپ کی رعایا۔''

مجھے یوں لگا جیسے اس کے لہجے میں کچھ طنز ہے مگر میں نے اسے نظر انداز کر دیا ''ڈاکٹر شہناز کو ٹیلا جوگیاں لے جانا ہو

تو کیسے لے جائیں۔"

اس نے کہا "میں کسی کو سائیکل پر بھیج دیتا ہوں۔ اگر ڈاکٹر مل گیا تو اسے لے آئے گا اپنے ساتھ۔"

"کیسے...... سائیکل پر...... لاحول ولاقوۃ پھر مسئلہ ہوگا دوا کا۔ نہیں اکبر خان! کیا ٹیلا جوگیاں سے کوئی گاڑی نہیں مل سکتی۔ کسی قسم کی گاڑی بھی ہو۔"

اچانک راجا چلایا "یار' شہناز ہوش میں آ گئی۔"

میں نے قریب جا کے دیکھا۔ شہناز آنکھیں کھولے چھت کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی صورت پر کسی قسم کے تاثرات نہیں تھے۔ نہ دکھ کے' نہ تکلیف کے پھر اس نے سر گھما کے میری اور راجا کی طرف دیکھا۔

راجا نے اس کا ہاتھ تھام لیا "شہناز...... کیسی ہو تم؟"

اس نے آہستہ سے سر ہلایا "ٹھیک ہوں۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ میرے سر سے پریشانی کا بڑا بوجھ اُتر گیا تھا۔ شہناز کی ذہنی اور جسمانی حالت بہتری کی طرف مائل تھی اور فوری طور پر تشویش کے اسباب دور ہو گئے تھے۔ باقی معاملات فرصت سے نمٹائے جا سکتے تھے۔

اگلے آدھے گھنٹے میں شہناز کی حالت اس حد تک سنبھل گئی کہ اس نے گاڑی میں سے اپنا میڈیکل بیگ منگوایا جس میں ایک ذمے دار خاتون اور ہوشیار ڈاکٹر کی حیثیت سے اس نے ایمرجنسی میں ضرورت پڑنے والی تمام دوائیں بھر لی تھیں۔ اس نے خود ہی اپنے لیے دوا کا انتخاب کیا۔ مجھے بڑی خوشگوار حیرت ہوئی جب راجا نے ایک ماہر کمپاؤنڈر کی طرح سرنج میں دوا بھری اور شہناز کو انٹروینس انجکشن لگا دیا۔

شہناز میری حیرت پر آہستہ سے مسکرانی "دیکھا رفیق بھائی! کیسی تربیت ہے میری؟"

میں نے کہا "اب مجھے امید نظر آتی ہے کہ کسی دن تم اسے انسان بھی بنا لو گی۔"

اکبر خان اس دوران میں خاموشی سے کھسک گیا تھا۔ وہ کچھ دیر بعد نمودار ہوا تو اس کے ساتھ تین عورتیں تھیں۔ ان میں سے ایک کو میں نے گزشتہ رات بھی دیکھا تھا۔ وہ کبیر خان کی ماں اور اکبر خان کی بیوی تھی۔ اپنے میلے کپڑوں الجھے بالوں اور بھاری بدن کے ساتھ آہستہ آہستہ چلنے والی وہ عورت بدحال بیزار اور بیمار نظر آئی تھی۔

دوسری جوان اور خوبصورت عورت تھی جس کی عمر تیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ اس کا رنگ اجلا اور جسم بے حد متناسب تھا۔ جو لباس اس نے پہن رکھا تھا وہ بہت معمولی اور کم قیمت کپڑے کا تھا مگر اس کے بدن پر یوں فٹ تھا جیسے لاہور کے کسی ماہر فن لیڈیز ٹیلر نے سیا ہو۔ عام گھروں کی عورتیں اپنے کپڑے خود سیتی ہیں تو اپنے بدن کی ضرورت کے مطابق ایک ایک ٹانکے سے وہ کمال دکھاتی ہیں کہ ستر پوشی کرنے والا لباس ہی تشہیر حسن کا وسیلہ بن جائے اور دیکھنے والے کی نظر بھی جوہر مستور کے تصور میں اسیر ہو کر رہ جائے۔

یہ عورت بھی ادائے حسن کی فنکاری میں طاق تھی حالانکہ وہ فیشن اور گلیمر کی دنیا سے بہت دور تھی۔ اس نے آتشی گہرے سرخ رنگ کا انتخاب کیا تھا۔ آدھی آستین میں چھپے ہوئے اس کے گداز گورے بازو' کمر کے خم پر تنگ ہو کے نیچے اوپر دائروں میں پھیل جانے والے لباس کا کشادہ گریبان' جو گردن کے آگے پیچھے مخمل جیسے سنہرے نشیب و فراز میں نگاہ کو بہکا لے جاتا تھا اور اس کے بیضوی چہرے پر نمایاں بڑی بڑی سیاہ آنکھیں جن کو اس نے کاجل سے زیادہ اثر انگیز سیاہی دے دی تھی۔ یہ سب اس کے حسن کی قوتِ تسخیر کا اسلحہ تھا اور ہر عورت کی طرح وہ خوب جانتی تھی کہ یہ اسلحہ کب کہاں اور کیسے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

اس نے کسی بیوٹی پارلر سے میک اپ نہیں کروایا تھا اور اسے یہاں کچھ میسر بھی نہ تھا مگر اصل بات یہ تھی کہ اسے کسی سامانِ آرائش کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس ویران حویلی اور اس دور افتادہ' گمنام اور پس ماندہ مقام پر ایسے شاہکار حسن کا نظارہ ایسا ہی تھا جیسے تپتی ریت کے بے آب اور سنسان صحرا میں بھٹکنے والے کو پیپسی کولا کا سائن بورڈ نظر آ جائے۔ جیسا کہ کسی اشتہار میں دکھایا جاتا ہے یا دکھایا جا سکتا ہے۔ اس کو دیکھ کر راجا اور میں دم بخود رہ گئے تو یہ ایک فطری ردِعمل تھا۔

تیسری عورت ابھی تکمیل کے مراحل میں تھی۔ وہ چودہ پندرہ برس کی معمولی صورت اور سانولی رنگت والی لڑکی تھی جس کے بدن کے گلشن میں آغاز شباب کے شگوفے پھوٹ رہے تھے اور جذبے صدا دیتے تھے کہ قیاس کن زا گلستان من بہار من لیکن نظر میں آفتاب ہو تو چاند ستاروں کا وجود ہی کہاں محسوس ہوتا ہے۔

وہ تینوں ہمارے لیے ناشتا لائی تھیں اور جب انہوں نے تمام اسباب کو قرینے سے دسترخوان پر چن دیا تو اکبر خان نے بڑی معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ اعلان کیا "یہ جناب میری دوسری بیوی ہے' نور جہاں۔ اور یہ میری بیٹی ریشماں...... دو بھائی اس سے بڑے ہیں۔ ایک کی شادی ہو چکی ہے' اس سے چھوٹی ایک بہن ہے۔"

میں نے اور راجا نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور سر ہلایا۔ اس وقت تک ہماری آوارہ نگاہی کو شہناز نے بھی

بھانپ لیا تھا اور ایک عام عورت کی طرح اس کا احساسِ کمتری خود بخود برہمی کا انداز بن گیا تھا۔ اسے ہماری غیر ارادی محویت بھی اتنی ہی گراں گزری تھی جتنی نور جہاں کی پُراطمینان مسکراہٹ۔

مجھے اس ادھیڑ عمر کے لنگڑے سابق فوجی کی قسمت پر رشک آیا۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ آخر اس جیسے غربت نصیب شخص کے ہاتھ یہ انمول ہیرا کیسے لگ گیا' جس کا صحیح مقام تو کسی جوہر شناس قدرداں رئیس کے قصرِ عالی شان کی خواب گاہ تھی مگر یہاں ست بدھائی کے ایک سرونٹ کوارٹر میں اسے راستے میں پڑے پتھر کی طرح کوئی دیکھنے والا بھی نہ تھا لیکن ظاہر ہے' میں یہ سوال کرتا تو اپنی حیثیت سے گر جاتا۔

اس صورت حال کو شہناز نے کنٹرول کیا "اکبر خان! اتم جاؤ' ابھی ہمیں کسی چیز کی ضرورت نہیں۔"

اکبر خان کے ساتھ ہی تینوں عورتیں بھی نکل گئیں۔ نور جہاں سب سے پیچھے تھی۔ دروازے سے باہر نکل کے اس نے بڑی ادا کے ساتھ گردن گھمائی اور میں نے محسوس کیا کہ اس کے لبوں کی مسکراہٹ زیادہ روشن اور گہری ہو گئی ہے اور ایک خطرناک چیلنج دینے لگی ہے جو بہت واضح اور عیاں ہے کہ ست بدھائی کی حویلی اور جاگیر کے وارث و مالک! کیا خیال ہے آپ کا اس کنیز کے بارے میں؟

شہناز نے باری باری مجھے اور راجا کو گھورا "کیا اب آپ حضرات ناشتے پر توجہ دیں گے' وہ تو گئی۔"

راجا ہنس پڑا "معاف کرنا شہناز! مجھے کچھ جلنے کی بو آ رہی ہے۔ فیکے پتر! یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے؟"

میں نے آہ بھری "میرے دل سے راجا۔ کیا عورت تھی یار!"

"ایٹم بم سے زیادہ تباہ کن" راجا نے مجھ سے اتفاق کیا۔

شہناز نے خفگی سے کہا "شرم آنی چاہیے تم دونوں کو۔ وہ کسی کی بیوی تھی۔"

"پھر کیا ہوا۔ خوبصورت تصویر کا مالک اگر کوئی کباڑی ہو تو کیا اس کے حسن کا اعتراف نہیں کرنا چاہیے؟" راجا بولا۔

"وہ کوئی شریف عورت نہیں لگتی مجھے" شہناز مزید خفا ہوئی۔

راجا نے سر ہلایا "شرافت کو تم اپنے معیار سے دیکھ رہی ہو شنو۔ اس پر تو خود تمہارے سوا کوئی پورا نہیں اترتا' میں بھی نہیں' رفیق بھی نہیں۔"

شہناز نے ناشتا چھوڑ دیا "اچھا تو تم کرو اس کی باتیں۔ بلا لو اسے' رفیق بھائی' آپ نے بھی ابھی تک یہ نہیں پوچھا کہ شہناز تمہیں کیا ہوا تھا؟" وہ غصے میں آ گئی۔

راجا نے اسے دبوچ لیا "آئی ایم سوری، مگر تم کو مجھ سے یوں بدگمان نہیں ہونا چاہیے۔ میری نظر میں تم سے زیادہ حسین نہ ہے نہ ہوگا۔ کیونکہ تمہارا حسن ہے میری محبت۔"

شہناز نے مچل کے کہا "چھوڑو مجھے' بے شرم......"

"تم جانتی ہو۔ مجھے منانے کا دوسرا طریقہ بھی آتا ہے" راجا نے کہا۔

شہناز نے اسے غصے سے گھورا اور پھر ہنس پڑی۔

میں نے کہا "راجا۔ یہ کردار مجھے بہت پُراسرار لگتا ہے۔"

"کون اکبر خان...... میرا بھی یہی خیال ہے۔"

"کیا تو نے دیکھا' جب وہ شہناز کو اٹھا کے لایا تو کیسے لایا تھا؟ اس نے شہناز کو دونوں ہاتھوں پر اٹھا رکھا تھا۔"

راجا سوچ میں پڑ گیا "واقعی یار......!"

"اس کی بیساکھی کہاں تھی؟ مجھے اس نے بتایا تھا کہ سن اکہتر کی جنگ میں اس کی ٹانگ کٹ گئی تھی۔ میں نے پوچھا تو کہہ رہا تھا کہ میں نے ایک ٹینک کو ٹانگ اڑا کے گرانے کی کوشش کی تھی۔"

"یہ تو بہت بڑا جھوٹ بولا اس نے۔ اس کی موجودہ عمر کتنی ہو گی' پچاس پچپن۔ پینتیس سال پہلے وہ ہوگا بیس سال کا' ایک عام سپاہی۔" راجا بولا۔

میں نے کہا "اور اگر فوج میں بھرتی کے بعد ہی اسے محاذ جنگ پر جانا پڑا تھا جہاں وہ زخمی ہو گیا اور اس کی ایک ٹانگ کاٹ دی گئی تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ نائب صوبے دار کیسے بن گیا۔ عام طور پر ایک سپاہی کو جونیئر کمیشنڈ آفیسر کے عہدے تک پہنچنے کے لیے بیس پچیس سال درکار ہوتے ہیں۔ صوبے دار کے عہدے پر ان کی ریٹائرمنٹ ہو جاتی ہے تاہم کچھ خوش قسمت ایسے ہوتے ہیں جن کو اعلیٰ کارکردگی کے انعام میں اعزازی طور پر کمیشن دے دیا جاتا ہے۔ وہ ریٹائرمنٹ کے بعد خود کو اعزازی لیفٹیننٹ یا کیپٹن لکھتے ہیں۔ اکبر خان کو ایک ٹانگ کٹ جانے کے بعد فوج سے ریٹائر کر دیا گیا ہوگا۔ سوال یہ ہے کہ جو شخص دو چار سال سروس میں رہا وہ نائب صوبے دار کیسے ہو گیا؟"

راجا نے مجھ سے اتفاق کیا "یہ اس سے پوچھا جا سکتا ہے۔"

"لیکن ابھی نہیں' اس کا باپ اور دوسرے گھر والے سب سیدھے سادے لوگ ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ اکبر خان

سے سب ڈرتے ہیں۔ وہ سب پر حکم چلاتا ہے اور انہیں اپنے دباؤ میں رکھتا ہے۔ ابھی ہمارے پاس وقت نہیں ہے ورنہ ہم معلوم کرتے۔''

راجا پھر شہناز کی طرف متوجہ ہوا ''یار' آخر ہم کتنی بار پوچھیں اور کس زبان میں پوچھیں کہ تم آدھی رات کو اکیلی ادھر کیوں گئی تھیں۔ اس درویش کے مزار پر۔ جس کا نام بھی معلوم نہیں کیا ہے؟''

میں نے بھی کہا ''ہاں' اکیلے میں ایسی کون سی منت مانی تھی اور ہمارے لاہور میں جو مزارات ہیں' کیا وہاں حاضری دینے سے تمہارے دل کی مراد بر نہیں آئی تھی۔ کیا یہ کوئی اسپیشلسٹ پیر ہیں؟''

یہ جانتے ہوئے بھی کہ ہم اسے چھیڑ رہے ہیں وہ چپ بیٹھی رہی اور کچھ دیر بعد بولی ''تم مذاق اڑاؤ گے؟''

میں نے کہا ''ہرگز نہیں۔''

''یہ بڑی عجیب سی بات ہے۔'' اس نے قدرے تذبذب کے بعد کہا ''جب ہم سونے کے لیے لیٹ گئے تھے تو مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ مجھ پر حویلی کے پُراسرار ماحول کا اثر تھا۔ بلکہ ایسا لگتا تھا جیسے باہر سے قدموں کی چاپ سنائی دی ہے اور برآمدے میں لوگ چل پھر رہے ہیں۔ میں نے سوچا کہ شاید یہی لوگ ہوں گے جو یہاں رہتے ہیں۔ حویلی کے ملازم' ممکن ہے وہ رات کو باہر پہرا دے رہے ہوں۔ میں نے خوف دور کرنے کے لیے آیت الکرسی اور دعائے قنوت دہرائی۔ اس سے کچھ سکون حاصل ہوا اور نیند آ گئی لیکن پھر آنکھ کھلی تو مجھے یوں لگا جیسے کمرے میں کوئی باتیں کر رہا تھا۔ میں اٹھ بیٹھی۔ کچھ دیر کان لگائے بیٹھی رہی اور پھر دعائیں دم کر کے سو گئی۔ دوسری بار میری آنکھ ایک روشنی سے کھلی جو کھڑکی کے شیشوں پر نظر آئی تھی۔''

میں نے کہا ''روشنی تو میں نے بھی دیکھی تھی۔ میں سمجھا باہر بادل ہیں اور بجلی چمک رہی ہے۔ باہر نکل کے دیکھا تو تم دونوں تالاب کی منڈیر پر پاؤں لٹکائے بیٹھے تھے۔''

راجا نے حیرانی سے میری طرف دیکھا ''میں تو سب سے پہلے سو گیا تھا اور صبح اس وقت جاگا تھا جب تو نے جگایا۔''

''مگر میں نے تمہیں دیکھا تھا۔ تم دونوں باتوں میں مگن تھے۔ میں نے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔''

راجا ہنسا ''تو نے اپنے آباواجداد میں سے کسی لیلیٰ مجنوں کو دیکھا ہو گا فیکے پتر! وہ بیٹھتے ہوں گے وہاں فلمی محبت کا منظر پیش کرنے کے لیے۔ میں تو ہرگز نہ جاؤں' اس اجاڑ جگہ پر شہناز کے ساتھ یہاں مٹی دھول کے سوا کچھ نہیں...... اور یہ ڈرپوک کب جائے گی میرے ساتھ۔''

شہناز نے اس کی تائید کی ''ہاں رفیق بھائی' ہم جاتے تو آپ سے کیوں چھپاتے؟''

میں نے کہا ''کیا عجیب بات ہے۔ میں نے صاف دیکھا تھا تم دونوں کو...... خیر' ابھی اس بحث کو چھوڑو' آگے بتاؤ۔''

''میں بھی یہی سمجھی تھی کہ باہر بجلی چمکی ہو گی۔ اس وقت میں نے دیکھا تو راجا غائب تھا۔''

راجا بولا ''غائب تھا کا کیا مطلب خاتون' وضاحت فرمایئے۔''

''مطلب یہ کہ...... تم وہاں نہیں تھے جہاں سو رہے تھے۔ میں اٹھ کر دروازے تک گئی تو تم برآمدے میں کھڑے سگریٹ پی رہے تھے۔''

راجا اچھلا ''میں سگریٹ پی رہا تھا۔ تمہارا دماغ خراب ہے شنو!''

شہناز نے خفت سے کہا ''مجھے بھی حیرانی ہوئی تھی۔ بلکہ غصہ آیا تھا کہ ایک بری عادت نہیں تھی۔ وہ بھی لگ گئی ہے۔ تم چھپ چھپ کے سگریٹ پینے لگے ہو۔ میں واپس آئی' چپل پہنے' پھر نکلی تو تم برآمدے میں کافی آگے ٹہلتے جا رہے تھے۔ میں تمہارے پیچھے پیچھے گئی۔ تم برآمدے سے نیچے اترے اور باہر جانے والے دروازے کی طرف بڑھے تو مجھے تعجب ہوا پھر میں نے تمہیں آواز دی اور تم نے مڑ کے بھی دیکھا مگر پھر آگے بڑھ گئے۔ میں نے کہا کہ راجا اس وقت کہاں جا رہے ہو تو تم نے کوئی جواب ہی نہیں دیا۔ تم باہر نکل کے الٹے ہاتھ کی طرف گئے۔ وہاں گھنے درخت ہیں اور جھاڑیاں ہیں۔ تم ان کے پیچھے گئے تھے۔ جب میں وہاں گئی تو مجھے تم کہیں دکھائی نہ دیے حالانکہ میرے اور تمہارے درمیان چند قدم ہی کا فاصلہ ہو گا۔ وہاں ایک پختہ قبر تھی۔ اس پر چادریں اور پھول وغیرہ پڑے ہوئے تھے۔ قبر کے گرد چار ستون تھے اور ان پر چھت بھی نظر آ رہی تھی۔ میں نے تمہیں آوازیں دیں اور آگے گئی۔ قبر کے چبوترے کی چار سیڑھیاں تھیں۔ میں نے اوپر چڑھ کے دیکھا تو اس کے بالکل پیچھے ایک جیسی بہت سی قبریں نظر آئیں۔ میں نے ہر طرف دیکھا اور تمہیں آواز دی۔''

راجا نے دخل اندازی کی ''پھر وہاں ایک سبز پوش نمودار ہوئے' لمبی اور لہراتی سفید داڑھی والے' انہوں نے کہا کہ لڑکی' ہم ہیں راجا!''

شہناز نے نفی میں سر ہلایا ''ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ نہ مجھے کوئی روح ملی نہ مجھے کوئی آواز سنائی دی۔''

''شنو! آخر میرے روپ میں تمہیں وہاں لے جانے والا کون تھا؟''

راجا نے کہا ''وہ تمہارے رفیق بھائی کے کوئی پردادا کے پردادا وغیرہ ہی تو تھے۔ میرا روپ بدل کے آ گئے تھے تمہیں ورغلانے۔''

''مجھے تو وہاں عجیب سی خوشبو محسوس ہوئی۔ اسی نے میرے دماغ پر اثر کیا۔''

''یعنی جتنا بھی تھوڑا بہت دماغ ہے...... یا بھوسا ہے۔''

شہناز اس وقت برا ماننے کے موڈ میں نہیں تھی ''مجھے چکر سا آیا' وہ حواس پر طاری ہونے والی خوشبو تھی۔ اس نے جیسے میری ساری طاقت سلب کر لی۔ اب میں کیسے بیان کروں' میڈیکل میں ہم نے ہر قسم کی بو اور خوشبو کا تجزیہ کیا ہے۔ کلورین یا ایمونیا اور کلوروفارم کی بھی تو بو ہی ہوتی ہے جو بے ہوش کر دیتی ہے مگر یہ خوشبو تھی۔ اس کے بعد مجھے کچھ پتا نہیں چلا۔''

میں نے کہا ''چلو ہم فرض کر لیتے ہیں کہ یہ ایک مافوق الفطرت واقعہ تھا لیکن آگے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صبح سویرے اکبر خان ادھر کیا لینے گیا تھا۔ ایسے ہی اور بھی سوالات ہیں جو میں اس سے ضرور پوچھوں گا۔ فی الحال گاڑی کا مسئلہ اہم ہے۔''

''رفیق بھائی! آپ کو کس پر شک ہے' اکبر خان پر؟''

میں نے کہا ''ابھی کوئی بات یقین کے ساتھ کہنا مشکل ہے۔ ممکن ہے کوئی ہمارے پیچھے یہاں تک آیا ہو اور ابھی آس پاس ہی موجود ہو۔ ظاہر ہے صرف گاڑی کے ٹائر کاٹ کے تو وہ مطمئن نہیں ہو گا اگر اس مفروضے کو مان لیا جائے تو پھر ہمیں محتاط ہو کے اپنے دفاع کو مضبوط کرنا ہو گا۔ یہ دشمن کے پلان کا پہلا حصہ تھا۔ ہمیں محصور اور بے بس کرنے کے بعد وہ اگلا قدم اٹھائے گا۔''

''کیا ہو گا یہ اگلا قدم؟'' شہناز نے ڈر کے پوچھا ''اور کون ہو سکتا ہے ایسا دشمن...... تمہارا یا راجا کا؟''

میں نے کہا ''میں نے ایک مفروضے کی بات کی تھی۔''

راجا بولا ''تمہارے تمام سوالات کا جواب ایک تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ میں ہو گا جو عنقریب اپنا کام شروع کر دے گا۔''

میں نے کہا ''میرا دھیان رجب علی کی طرف بھی جاتا ہے۔ یہ اس کینہ پرور شخص کی کارروائی نہ ہو۔''

راجا نے کہا ''یار' مجھے یاد آیا...... جب میں گاڑی سے میڈیکل بیگ نکالنے گیا تھا تو مجھے گیٹ پر ٹائروں کے نشانات نظر آئے تھے۔ جیسے کسی نے گیٹ سے گاڑی کو تھوڑا سا ریورس کیا اور پھر دائرے میں گھما کے لے گیا۔ ہم تو سیدھے اندر آ گئے تھے' چل دیکھتے ہیں۔''

راجا کی نظر نے صحیح مشاہدہ کیا تھا۔ کوئی گاڑی رات کے وقت گیٹ تک آئی تھی۔ یہ بات یوں بھی ثابت ہوتی تھی کہ نرم مٹی میں دو طرح کے ٹائروں کے نشانات بہت واضح تھے۔ ہماری گاڑی میں جنرل کے ریڈیل ٹائر تھے جبکہ دوسری گاڑی میں شاید کوئی غیر ملکی برانڈ کے ٹائر تھے۔ شوقین اور دولت مند اپنی قیمتی گاڑیوں میں ڈنلپ اور گڈایر کے یا کورین ٹائر بھی لگوا رہے تھے۔ ٹائر بالکل نئے تھے چنانچہ ان کا پرنٹ بہت نمایاں تھا۔

راجا نے پل کی طرف دیکھا ''گاڑی اسی پل پر سے گزر کے آئی تھی۔ ہیڈ لائٹس جلائے بغیر یہ کارنامہ سرانجام دینے کا خطرہ کوئی مول نہیں لے سکتا۔''

میں نے کہا ''رائٹ۔ ایک موڑ کاٹتے ہی پل آ جاتا ہے۔ اس موڑ کے بعد گاڑی کی لائٹس کو ذرا سی دیر کے لیے روشن کیا گیا۔ اس کی چمک میں نے بھی شیشے پر دیکھی اور شہناز نے بھی۔ ہم دونوں نے یہی سمجھا کہ باہر بجلی چمکی ہے۔ پل سے یہاں تک لائٹ جلائے بغیر آنا کوئی مشکل کام نہیں۔''

''رات بارش تو ہوئی ہے'' شہناز نے کہا۔

''ہاں...... مگر بہت معمولی اگر زمین نم نہ ہوتی تو ٹائروں کے نشانات کا فرق اتنا نمایاں نہ ہوتا۔ تو دیکھ یہاں کی زمین کچھ سخت اور پتھریلی ہے۔ ہماری گاڑی کے نشان غور سے دیکھے بنا نظر نہیں آتے۔ اس کے علاوہ میری جاسوسی حس یہ بھی بتاتی ہے کہ وہ بڑی گاڑی تھی۔ ٹائروں کا دائرہ دیکھ کے اندازہ ہو جاتا ہے۔''

میں نے کہا ''یہ رجب علی خود کو بڑا خاندانی ظاہر کر رہا تھا مگر ہے بہت کمینہ اور چھوٹا' صرف ٹائر کاٹ کے اس کے دل کو تسلی ہو گئی؟''

راجا نے کہا ''ہو سکتا ہے خود رجب علی نے کچھ نہ کیا ہو۔ اس کے چمچے بھی تو ہوں گے۔ کسی شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار نے کہا ہو گا کہ ان نئے شہری دولت مندوں کا دماغ درست کرنا ضروری ہے جو یوں خاندانی رئیسوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بات کرتے ہیں۔ تو نے اس کے ڈرائیور کا جارحانہ موڈ دیکھا تھا' وہ ایسا ظاہر کر رہا تھا جیسے ہمیں گولیوں سے بھون کے رکھ دے گا۔''

میں نے کہا ''ایک ڈرائیور کی اتنی جرأت نہیں ہو سکتی کہ

مالک کی مرضی کے بغیر اس قسم کی کارروائی کر سکے اگر وہ پکڑا جاتا تو کیا بات رجب علی تک نہ جاتی؟ وہ خود بھی ہمارے رویے پر برہم تھا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ کسی مشیر نے سزا تجویز کی ہو اور اس نے منظوری دے دی ہو کہ چلو انہیں تھوڑا سا سبق سکھا دو مگر خبردار! کوئی پکڑا گیا تو میں ان کے سامنے دس جوتے اضافی لگاؤں گا۔"

راجا نے کہا "چل دفع کر اسے۔ یہ بتا اب کیا کریں؟"

میں نے کہا "ہم سب ٹیلا جوگیاں تک مارچ نہیں کر سکتے۔ ہم میں سے ایک جائے گا۔"

"اور اس ایک کا مطلب ہے میں......" راجا نے ٹھنڈی سانس لی۔

"عقل مند کو اشارہ کافی ہوتا ہے۔"

راجا نے شکایت آمیز نظروں سے شہناز کو دیکھا "تم میرا دل رکھنے کے لیے تو کہہ سکتی ہو کہ تمہارے سنگ میں بھی چلوں گی پیا۔"

"میں یہ پورا گانا سنا سکتی ہوں مگر جاؤں گی نہیں۔ مجھے پیدل چلنے کی بالکل عادت نہیں" شہناز نے کہا۔

"اگر سواری مل جائے۔ اکبر خان کی فیملی کے پاس سائیکل ضرور ہوگی۔ میں تمہیں بٹھا کے لے جا سکتا ہوں۔"

میں نے کہا "ٹیلا جوگیاں میں فون ہوگا۔ ممکن ہے کوئی گاڑی بھی مل جائے۔ قریب ترین شہر جہلم ہے۔ وہاں سے تجھے تین ٹائر خرید کر لانے ہوں گے۔ ٹیوب اور اسٹرپن کے ساتھ۔ چوتھا ہمارے پاس ہے۔ آنے جانے میں تجھے چار پانچ گھنٹے ضرور لگ جائیں گے اور دس ہزار خرچ بھی ہوں گے۔ تو میرا اے ٹی ایم کارڈ لے جا۔"

"کارڈ میرے پاس بھی ہے۔" راجا بولا "پیسوں کا کوئی مسئلہ نہیں۔"

ہم درمیانی صحن کو عبور کر کے سرونٹ کوارٹرز تک گئے۔ ابھی صبح کے دس بجے تھے۔ پانچ سے دس سال کی عمر کے کچھ بچے باہر کھیل رہے تھے۔ یہ کوئی باقاعدہ کھیل بھی نہ تھا۔ ہر روز کی طرح وہ محض وقت گزارنے کے لیے کچھ نہ کچھ کر رہے تھے۔ ان کے کپڑے نامکمل اور بوسیدہ تھے۔ چار سال کی ایک بچی نے کچھ بھی نہیں پہن رکھا تھا۔ دوسری اس سے ذرا بڑی نے صرف قمیص گلے میں ڈال لی تھی۔ سات سال کا ایک لڑکا صرف بنیان میں ملبوس تھا تو اس سے دو بڑے نیکر پہنے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے انہیں کپڑوں کے خراب ہونے کی فکر تھی اور نہ ہی یہ خیال تھا کہ ہاتھ پیر گندے ہو جائیں گے۔ وہ مٹی میں لوٹ رہے تھے' ایک دوسرے کو گرا رہے تھے اور مار پیٹ میں گالیاں بھی دے رہے تھے مگر یہ سب ان کے لیے بھی کھیل تھا اور ان کے ماں باپ کے لیے بھی۔ وہ اسکول نہیں جاتے تھے اور پڑھتے نہیں تھے اور کوئی کام کرنے کے قابل بھی نہ تھے۔ ہر غیر ضروری کام صبح سے رات تک وقت گزارنے کے لیے ضروری تھا۔

اکبر خان کی آؤٹ آف ڈیٹ ہو جانے والی منکوحہ برآمدے میں چارپائی پر بیٹھی ایسے ہی شغل بے کاری کے طور پر اپنی بیٹی کے بالوں میں بڑے انہماک سے کنگھی پھیر رہی تھی۔ ہر بار کنگھی کو تیل میں ڈوبے بالوں سے گزار کے وہ غور سے معائنہ کرتی تھی کہ اس عمل میں کوئی جوں برآمد ہوئی یا نہیں؟ اس کی ٹین ایجر بیٹی فرش پر پاؤں پسارے مکمل سپردگی کے ساتھ بیزار بیٹھی تھی۔ اسے جان چھڑانے کا اچھا موقع ملا۔ وہ بڑی شوخ ہنسی کے ساتھ لہرا کے اٹھی' اس نے فوراً دوپٹا کھینچا اور ہم پر واضح کیا کہ میرے پاس بھی...... کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔

چارپائی سے کچھ فاصلے پر دیوار سے ٹیک لگائے مہاتما بدھ کے آسن میں ایک مجذوب صفت بزرگوار تشریف فرما تھے۔ اس کی عمر تو شاید چالیس بیالیس ہوگی مگر بالوں میں غالب سفیدی نے اسے بزرگی عطا کر دی تھی۔ یہ بال جھاڑ جھنکاڑ داڑھی کی صورت میں بھی پھیلے ہوئے تھے اور شانوں تک آنے والی زلفوں کی شکل میں بھی۔ وہ قدرے پستہ قد اور سیاہ رو تھا لیکن اس کا بدن گٹھا ہوا اور مضبوط تھا۔ خصوصاً اس کی گردن کسی بھینسے جیسی تھی جس میں اس نے کوڑیوں کی مالا پہن رکھی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں چاندی کے کڑے تھے جو ہاتھ کی حرکت سے بجتے تھے۔ اس نے پیروں میں بھی گھنگھرو باندھ رکھے تھے۔ وہ گھٹنوں سے نیچے تک آنے والے نارنجی رنگ کے چغے میں ملبوس تھا جو کثرت استعمال سے انتہائی میلا ہو چکا تھا اور جگہ جگہ سے پھٹ رہا تھا۔

وہ لپک کے برآمدے سے اترا اور ہم سے چند قدم کے فاصلے پر ایک سوالیہ نشان بن کے کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی لال لال میلی آنکھوں سے ہم سب کو باری باری گھورا۔ شہناز ڈر کے راجا کے پیچھے ہو گئی۔

میں نے کہا "تم کون ہو۔"

"حق" اس نے ایک نعرہ لگایا اور اپنی پاٹ دار آواز میں بولا "کیا تو جانتا ہے کہ تو کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ کہاں جائے گا' بول......"

میں نے متانت سے کہا "اکبر کہاں ہے۔"

اس نے ایک دم جھک کے زمین سے مٹی اٹھالی اور

میری طرف ہاتھ پھیلا کے ایک پھونک ماری "اکبر اعظم...... سکندر اعظم' مغل اعظم! سب ایک مٹھی خاک...... میں اور تو...... سب مٹی کے پتلے...... سب مٹی۔"

اگر میں فوراً پیچھے نہ ہٹتا تو ملنگ کی پھونک سے اڑنے والی مٹی میری آنکھوں میں پڑتی۔ خیریت گزری کہ اسی وقت اکبر خان کی بیوی خود کو سنبھالتی ہانپتی کانپتی آگے آ گئی "یہ میرا دیور ہے جی! اکبر خان کا چھوٹا بھائی اصغر۔ بڑا اللہ لوک ہے جی!"

اللہ لوک صاحب نے ایک قہقہہ لگایا "چھوٹا...... بڑا...... اصغر...... اکبر" اور از راہ عنایت واپس تشریف لے گئے۔

میں نے کہا "مجھے اکبر خان سے کام تھا۔"

"وہ باپ بیٹا پیچھے ہوں گے" اس نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا "اس وقت کھیت میں ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا "کسی بچے کو بھجوا کے بلا کر لانے۔"

اس سے پہلے کہ اکبر کی بیوی اپنے شوہر کی طلبی کے لیے کسی ذمے دار تابع دار اور برخوردار کا انتخاب کرتی' برآمدے میں کپڑے نچوڑنے والی خاتون نے چلا کے کہا "بھابی! سنائی نہیں دیتا' اندر الارم بج رہا ہے۔"

چھوٹی بہو کی مراد اپنے سسر محترم جانو بابا سے تھی جو شاید بڑی بہو کو یاد کر رہے تھے "تو پوچھ لے نا اٹھ کے" اکبر کی بیوی نے کہا۔

چھوٹی بہو یعنی مسز اللہ لوک کی وائف نے تڑخ کے جو جواب دیا اس کا مطلب آسان اردو میں یہ نکالا جا سکتا ہے کہ میری جانے ہے جوتی۔ بڈھا مرتا ہے نہ جان چھوڑتا ہے۔ سارا دن پڑا چلاتا رہتا ہے۔ اس صورت حال کو افسوس ناک ضرور کہا جا سکتا تھا مگر اسے بدلا نہیں جا سکتا تھا۔ میں اکبر خان کے انتظار میں کھڑا ماحول کا جائزہ لے رہا تھا کہ اکبر خان کی بیوی اندر گئی اور پھر باہر آئی۔

"صاحب جی! جانو بابا آپ کو بلا رہا ہے۔"

مجھے حیرانی ہوئی کہ اسے میری آمد کا علم کیسے ہوا۔ وہ اونچا سنتا تھا۔ باہر سے میری آواز اس کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ میں نے راجا اور شہناز کو وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور پھر اس تاریک کمرے میں گیا جہاں جانو بابا قید حیات کے آخری ایام گزار رہا تھا۔ اندر ایک ناقابل بیان قسم کی بدبو تھی جس میں سانس لینا بھی دشوار تھا مگر میں ضبط سے کام لیتے ہوئے اس چارپائی کے کنارے پر ٹک گیا جس پر جانو بابا کا خستہ تن ڈھانچا پڑا ہوا تھا۔

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا "اور کون ہے یہاں جناب!"

میں نے اکبر خان کی بیوی کی طرف دیکھا اور وہ میری نگاہوں کا مطلب سمجھتے ہوئے خاموشی سے باہر نکل گئی "اب کوئی نہیں" میں نے کہا۔

"دراصل...... مجھے آپ کو کچھ بتانا تھا جناب! یہ جو میرا بیٹا ہے نا اکبر! آپ نے اس کو چابیاں سونپ کے اچھا نہیں کیا۔"

میں نے حیرانی سے کہا "کیوں جانو بابا!"

"وہ...... کب سے چاہتا تھا کہ میں چابیاں اسے دے دوں۔ مگر میں جانتا تھا' اس کی نیت ٹھیک نہیں اس نے کئی بار سختی کی...... بدبخت ہے وہ۔ اس نے اپنے باپ کو مارا" جانو بابا رونے لگا "مار ڈالتا وہ مجھے اگر اس کی ماں بیچ میں نہ آتی۔ میں نے کبھی نہیں بتایا اسے کہ چابیاں کہاں ہیں۔ وہ کچھ نہ چھوڑتا اگر چابیاں اسے مل جاتیں۔"

میری حیرانی بڑھ گئی "چابیوں میں ایسی کیا خاص بات ہے؟"

"آپ کو نہیں معلوم جناب! انہوں نے آپ کو کچھ نہیں بتایا؟ بڑے مالک نے......"

"عقیل احمد نے؟"

"سرکار...... برا مت مانیں...... میں پرانے وقتوں کا بڈھا آدمی ہوں۔ آپ کے والد اور دادا کا نمک کھایا ہے' ایک بات کہوں......"

میں نے کہا "تم کہو جو کہنا چاہتے ہو۔"

"جناب! یہاں ہم اپنے سے بڑوں کا نام نہیں لیتے۔ آپ چھوٹے مالک ہیں' وہ بڑے مالک ہیں۔ وہ آپ کے دادا ہوتے ہیں۔"

میں نے سخت شرمندگی محسوس کی "تم نے بہت اچھا کیا جانو بابا۔ لندن میں رہ کے میں یہاں کے سارے ادب آداب بھول گیا تھا۔ مجھے دادا ہی کہنا چاہیے انہیں' ان کا نام نہیں لینا چاہیے۔"

"کیا بڑے مالک نے یہ نہیں بتایا کہ یہاں پرانی حویلی اور آبائی زمین کے علاوہ کیا ہے؟"

"نہیں، کیا اس کے علاوہ بھی کچھ ہے؟"

"حویلی کے جو کمرے بند ہیں۔ ان میں ڈیڑھ سو سال میں جمع ہونے والی بہت سی قیمتی چیزیں ہیں۔ آپ کے خاندانی نوادرات کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ میں نے خود آپ کے دادا کی خدمت کی ہے اور ان کے دادا کے زمانے کے چاندی سونے

کے برتن استعمال ہوتے دیکھے ہیں۔ آپ کے والد کے زمانے میں ولایتی چینی کے برتن آ گئے تھے۔ سونے چاندی کے ظروف محفوظ کر دیے گئے تھے۔"

میں دم بخود رہ گیا "اگر وہ سونے چاندی کے برتنوں میں کھاتے تھے تو ہیرے جواہرات اور زیورات بھی ہوں گے۔"

"کیوں نہیں جناب! ان کی بیگمات کیا عام عورتیں تھیں۔ ان کا سارا زیور بھی محفوظ ہے لیکن اس کے بارے میں مجھے زیادہ علم نہیں۔ وہ سب تجوریوں میں رکھا جاتا تھا اور تجوریاں خفیہ ہوتی تھیں۔ صرف مالک جانتے تھے کہ وہ کہاں ہیں اور کیسے کھولی جاسکتی ہیں۔ میں نے کبھی کسی کو تجوری کھولتے نہیں دیکھا۔ دراصل بن بلائے ہم ہر جگہ نہیں جاسکتے تھے۔ خاص طور پر خواب گاہ میں۔ یہ چابیاں ان کی امانت تھیں۔ میرا کام حفاظت کرنا تھا۔ تلاشی لینا نہیں" وہ بولتے بولتے ہانپنے لگا۔

میں نے اس شخص کو دیکھا جس نے اپنی تمام زندگی کتابی اصولوں کے مطابق صراط مستقیم پر چلتے گزار دی تھی' جن کے مطابق وہ خادم تھا تو مالک نہیں ہوسکتا تھا۔ اس نے نمک کھایا تھا تو نمک حرامی نہیں کرسکتا تھا۔ محافظ تھا تو چور نہیں بن سکتا تھا۔ خواہ کوئی دیکھنے والا یا پوچھنے والا یا حساب لینے والا ہو نہ ہو۔ اس نے غربت اور افلاس کو برداشت کیا' سختی جھیلی' دکھ اور بیماری کا مقابلہ کیا مگر اس خزانے میں سے جس پر اسے مکمل اختیار حاصل تھا' اپنے لیے ایک روپیا نہیں لیا۔ ایک عام آدمی زندگی کے ایسے پُرآزمائش دور میں کمزور پڑ جاتا ہے' اس کا ایمان متزلزل ہونے لگتا ہے' شیطان اس پر غلبہ پانے کے لیے لالچ اور ہوس کے ہتھیاروں سے یلغار کرتا ہے۔ اسے ورغلاتا ہے کہ ڈرتے کیوں ہو؟ مالک کہاں ہیں کہ انہیں کچھ پتا چلے اور انہیں پتا چل بھی گیا تو وہ جیل نہیں بھیج دیں گے۔ تمہارے پاس ضرورت کا جواز ہوگا' وہ تمہیں معاف کر دیں گے۔

لیکن وہ پرانے وقتوں کا جاہل بڈھا تمام ترغیبات اور مجبوریوں کے تقاضوں کے سامنے چٹان بن کے کھڑا رہا تھا۔ میرے لیے یقین کرنا دشوار ہو رہا تھا کہ میں اکیسویں صدی میں ایمانداری' خداترسی اور فرض شناسی کا ایسا کامل نمونہ دیکھ رہا ہوں۔ یوٹوپیا جیسی خیالی ریاست کی طرح ایک مثالی فرشتہ سیرت انسان میرے سامنے موجود ہے۔

اب وہ میری حفاظت کا فریضہ پورا کر رہا تھا۔ مجھے سمجھا رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔ مجھے خبردار کر رہا تھا کہ میرے دشمن کون ہیں۔ میں جو مالکوں کی تیسری یا چوتھی نسل سے تعلق رکھتا تھا اس کے لیے اتنا ہی محترم تھا جتنا پہلے والے مالک تھے۔

"ایک بات اور بتا دوں مالک......!"

کچھ دیر کے لیے میرا ذہن اس کی باتوں سے ہٹ گیا تھا۔ معلوم نہیں اتنی دیر میں اس نے کیا کہا' کیا بتایا۔

"اگر آپ کی ملاقات بڑے مالک سے ہو...... یا بات ہو......"

میں نے کہا "جانو بابا! کیا تمہیں معلوم نہیں' مجھے وارث مقرر کرنے کے بعد تمہارے بڑے مالک یعنی میرے دادا عقیل احمد کا انتقال ہو گیا تھا۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہا "آپ نے کیا کہا چھوٹے مالک!"

میں نے کہا "تمہارے بڑے مالک اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ ان کی وفات لندن میں ہی ہو گئی تھی۔"

اس نے آہستہ سے کہا "اناللہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔ کیا انہوں نے کبھی میرا ذکر کیا تھا؟"

جانو بابا کا دل رکھنے کے لیے کہا "ہاں، انہوں نے کہا تھا کہ وہاں ایک شخص ہے جس پر میں سب سے زیادہ اعتماد کرتا ہوں۔ اس کا نام جان محمد ہے۔ وہ تمہیں سب بتا دے گا۔ تم بھی اس پر بھروسا کر سکتے ہو۔"

اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی آئی "ٹھیک کہا تھا انہوں نے مالک۔ اب بڑے اور چھوٹے کی بات تو ختم ہوگئی۔ آپ ہی مالک ہو' جب تک سانس ہے میں آپ کی خدمت کرتا رہوں گا۔ کسی کو یہ بات نہ بتائیں۔ میں اونچا سنتا ہوں اور نہ ہی میرا حافظہ خراب ہے۔ یہ سب میں نے خود کو بچانے کے لیے مشہور کیا تھا۔ اکبر خان مجھے مار بھی نہیں سکتا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ چابیاں میں نے کہیں رکھی ہوں گی۔ مجھے یاد نہیں آ رہا ہے کہ کہاں رکھی تھیں۔ کسی دن یاد آ جائے گا۔ بہت سی باتیں میں سنتا تھا جن سے مجھے اس کی نیت کا اندازہ ہو جاتا تھا مگر میں ظاہر یہی کرتا تھا کہ میں نے کچھ نہیں سنا۔ چابیاں میری بیوی نے کہیں چھپائی تھیں۔ جب آپ کے آنے کی خبر ملی تو اس نے مجھے لا کر دی تھیں۔"

میں نے کہا "تم نے کمال کر دیا جانو بابا۔ اب تم فکر مت کرو۔ تم یہاں نہیں رہو گے۔ تمہارے آرام اور علاج کی ذمے داری میری ہے۔ میں تمہیں شہر کے بہترین اسپتال میں داخل کرا دوں گا۔ تمہاری رہائش کا انتظام بھی شہر میں ہوگا۔ تم نے بہت خدمت کی۔ اب تمہاری خدمت میرا فرض ہے۔ ابھی میں چلتا ہوں' تم سے پھر ملاقات ہوگی۔"

جانو بابا کے چہرے پر خوشی' اطمینان' تشکر اور امید کے ملے جلے جذبات کی روشنی اتر آئی تھی۔ اس نے محبت سے میرا ہاتھ تھام کے اپنی آنکھوں سے لگایا اور چوما۔ اس کے پاس آنسوؤں کے سوا کچھ نہ تھا جس سے وہ میرا شکریہ ادا کر سکتا۔

میں نے اس وفادار جانثار کو یہ نہیں بتایا کہ اکبر کے ہاتھ میں جانے کے بعد چابیاں پراسرار طور پر گم ہوگئی ہیں لیکن باہر نکلتے نکلتے مجھے ایک اور خیال آیا۔ میں نے کہا "بابا! فرض کرو اکبر کسی روز تالے توڑ دیتا......؟"

جانو نے سر ہلایا "ہاں...... وہ ایسا کر سکتا تھا مگر میں نے اسے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ جس روز ایسا ہوا' میں خود اس کے خلاف رپورٹ لکھواؤں گا۔ اور ہم گواہی بھی دیں گے ...... میں اور میری بیوی۔"

میں نے کہا "یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس نے کسی کی مدد سے تالے کھولے ہوں اور کچھ سامان نکال لیا ہو' تمہیں کیا پتا چلے گا؟"

"نہیں مالک، ایسا ہو نہیں سکتا۔ ایک ایک چیز میری دیکھی بھالی ہے۔ مجھے سب یاد ہے کہ کون سی چیز کہاں رکھی تھی۔ وہ وہیں ہونی چاہیے۔ سونے کا ایک چمچہ بھی کم ہوگا تو مجھے پتا چل جائے گا۔ اس کے علاوہ' ابھی تک میں نے دن رات چوکیداری کی ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تک میں وہیں رہتا تھا۔ وہیں سوتا تھا۔ صبح شام تالے چیک کرتا تھا۔"

"اپنی حفاظت کے لیے کیا تھا تمہارے پاس؟...... کوئی پستول یا ریوالور؟"

"ریوالور تھا مالک۔ لائسنس بھی تھا میرے نام پر' گم ہوگیا...... بلکہ چوری ہو گیا۔ میں نے اس کی رپورٹ لکھوا دی تھی۔ مجھے معلوم ہے چور کا نام مگر میرے پاس ثبوت کوئی نہیں تھا۔ میری حفاظت کرتا تھا میرا پوتا کبیر خان۔ وہ باپ پر نہیں' مجھ پر گیا ہے۔ جوانی کی کوئی تصویر ہوتی تو میں آپ کو دکھاتا۔ میں ہو بہو کبیر خان تھا لیکن اصل بات صورت کی نہیں سیرت کی ہوتی ہے مالک۔ آپ اس پر پورا بھروسا کر سکتے ہیں۔"

میں نے کہا "وہ باپ کی مخالفت کرتا ہے؟"

"جو کچھ وہ کر رہا ہے...... اس میں کوئی بھی اکبر خان کا ساتھ نہیں دے سکتا۔"

میں نے کہا "ممکن ہے تمہارا شک درست ہو۔ اس کی نیت میں فتور ہو لیکن ابھی تک تم نے اس کے عزائم پورے نہیں ہونے دیے۔ کیا اس کے علاوہ بھی کوئی بات ہے؟"

"بہت سی باتیں ہیں مالک!" وہ آہ بھر کے بولا "جب سے وہ اس عورت نور جہاں کے چکر میں پڑا ہے' اس نے اپنے بیوی بچوں کو بھلا دیا ہے۔ کبیر خان کوئی بچہ نہیں' چوبیس سال کا نوجوان ہے۔ وہ سب سمجھتا ہے...... مگر کچھ کر نہیں سکتا۔"

میں نے کہا "تھینک یو بابا! آپ نے اچھا کیا کہ مجھے خبردار کر دیا۔ میں محتاط رہوں گا۔"

جب میں باہر آیا تو نہ مجھے راجا دکھائی دیا اور نہ شہناز نظر آئی۔ کچھ فاصلے پر درخت کی ڈالی سے بندھے جھولے پر ایک نوجوان جھول رہا تھا۔ میں نے غور سے دیکھا تو مجھے اس کے لمبے کھلے بال لہراتے نظر آئے۔ یہ ریشماں تھی جس نے مردانہ شرٹ کے ساتھ پرانی جینز کی پتلون پہن رکھی تھی۔ مجھے سخت حیرانی ہوئی کہ یہاں ریشماں کو یہ لباس پہننے کی اجازت کس نے دی۔ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے اسے ماں کے ساتھ سر میں تیل لگواتے دیکھا تھا تو وہ عام قسم کے شلوار قمیص میں تھی۔ میرے بلانے پر وہ قریب آئی تو میں نے کہا "کیا اکبر خان یہاں آیا تھا؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا اور ہنسی "اس وقت تو وہ ہوتا ہے اپنی ایشوریا رائے کے پاس۔"

میں اس کی فلمی مثال پر حیران نہیں ہوا۔ اب گاؤں کی ہر گوری پر شوبزنس کا سارا گلیمر براہِ راست آسمان سے اترتا ہے اور سیٹلائٹ چینل کی جلوہ سامانی سب جگہ وہی ہے۔ کیا شہر اور کیا بن۔ کیا صحرا اور کیا چمن۔

میں نے کہا "اچھا...... وہ جو یہاں کھڑے تھے' ان کا نام راجا ہے۔"

وہ ہنس پڑی "وہ کہاں کے راجا ہیں' یہاں کے راجا تو آپ ہو۔"

میں نے کہا "وہ بہت بڑے صحافی ہیں۔ ان کے ساتھ جو خاتون تھیں ڈاکٹر شہناز!"

وہ ناک سکیڑ کر بولی "وہ...... وہ ڈاکٹر ہے؟ شکل سے تو کچھ اور ہی لگتی ہے" وہ پھر ہنس پڑی۔

میں نے سختی سے کہا "فضول باتیں مت کرو۔ یہ بتاؤ' وہ کہاں گئے ہیں؟ تم نے دیکھا ہے تو بتاؤ۔"

وہ ڈر گئی "وہ جی...... راجا صاحب تو بھائی کے ساتھ سائیکل پر گئے ہیں۔ ڈاکٹر صاحبہ ادھر ہیں" اس نے کھیتوں کی طرف اشارہ کیا۔

جس طرف اس نے اشارہ کیا تھا وہاں فصیل توڑ کے راستہ نکالا گیا تھا۔ باہر کھیت تھے جن میں موسم کی سبزیاں لگی ہوئی تھیں۔ دو نوعمر لڑکے اور تین عمر رسیدہ عورتوں کے علاوہ کچھ بچے کھیتوں میں کام کر رہے تھے یا گھوم رہے تھے۔ تقریباً چار سو گز کے فاصلے پر ایک بیل روایتی قسم کے رہٹ کو گھما رہا تھا

اور کنویں سے نکلنے والا پانی مختلف نالیوں میں بہتا ہوا کیاریوں میں پہنچ رہا تھا۔ کنویں کے ساتھ ہی بنے ہوئے چبوترے پر ایک بوڑھا شخص حقہ پینے میں مصروف تھا۔

شہناز مجھے اکبر خان کی بیوی سے باتیں کرتی نظر آئی۔ اس نے مجھے بتایا کہ یہ سب لوگ جو کھیتوں میں کام کرتے نظر آ رہے ہیں آپس میں رشتے دار ہیں۔ کوئی چچا کا بیٹا تو کوئی ماموں کی بیٹی۔ برسوں سے یہ لوگ یہاں رہتے آئے ہیں۔ ان کے رشتے بھی آپس میں ہوتے رہے تاہم زیادہ تر لوگ یہاں سے شہروں کی طرف ہجرت کر گئے تھے۔ وہ لوٹ کے نہیں آئے۔ انہیں شہروں میں روزگار مل گیا تھا۔

میں نے کہا ”تم لوگ شہر کیوں نہیں گئے؟“

”یہ فیصلے تو مرد کرتے ہیں جناب! جانو بابا نے صاف کہہ دیا تھا کہ سب جاتے ہیں تو جائیں‘ وہ اپنی بیوی کے ساتھ یہیں رہے گا۔ اکبر خان بڑا بیٹا تھا‘ وہ باپ کے ساتھ رہا۔ چھوٹے اصغر کو آپ نے دیکھا ہی ہے۔ یہاں یہی دو بھائی ہیں۔ اصغر کی بیوی کے چھ بچے ہیں، دو لڑکے چار لڑکیاں۔ اس کے اور اکبر کے درمیان دو لڑکے تھے‘ وہ شہر چلے گئے۔ میرے چار بچے تھے‘ دو بیٹیاں بیاہ کے اپنے گھر کی ہوئیں۔ یہاں کبیر خان ہے اور اس کی بہن ریشماں۔ اب یہی لوگ رہ گئے ہیں۔ باقی سب بھی رہتے اگر گزارے کی صورت ہوتی۔ شہر جانے والے خوش حال ہو گئے۔ ہماری گزر بسر مشکل سے ہوتی ہے۔“

اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ بہت زیادہ بول گئی ہے۔ میں نے اس کے خاموش ہونے کے بعد نرمی سے کہا ”انشاءاللہ اب حالات بہت اچھے ہو جائیں گے۔ میں آپ سب کی قدر کرتا ہوں اور مجھے احساس ہے کہ یہاں رہنے والوں کے مجھ پر کیا حقوق ہیں۔ میں انہیں خوش حال دیکھنا چاہتا ہوں۔“

اس کی آنکھوں میں امید کی روشنی ایک خواب بن کے چمکنے لگی۔ دوسرے لمحے اسے پھر مایوسی نے مغلوب کر لیا جو موروثی طور پر اس کی فطرت میں شامل تھی۔ ”ہماری تو عمر گزر گئی جی۔ ہم سے پہلے والے اور ہمارے بعد والے بھی یہی نصیب لے کر آئے تھے۔“

میں نے کہا ”ایسی بات نہیں۔ نصیب بدل بھی جاتے ہیں۔ تمہارے سامنے اس حویلی میں رہنے والوں کی زندگی ہے۔ قدرت نے ہی ان کو دولت مندی عطا کی تھی۔ جب وقت بدلا تو کچھ نہ رہا۔ اب اللہ کی رضا ہے کہ میں کچھ کروں تو میں ولایت سے یہاں آ گیا ہوں اور میرے سامنے بہت سے منصوبے ہیں۔ میں اس جگہ کو ترقی دوں گا۔ یہاں کارخانے لگاؤں گا۔ یہاں ایسی خوشحالی آئے گی کہ شہر جانے والے بھی لوٹ کر آئیں گے اور آپ لوگوں کی قسمت پر رشک کریں گے۔“

”اچھا جی...... کیا ایسا ہوگا؟“ وہ بے یقینی سے بولی۔

میں نے کہا ”ایسا ضرور ہوگا۔ انشاءاللہ۔“

”اللہ آپ کا بھلا کرے جی۔ اللہ آپ کو ہمت دے۔ اللہ آپ کو صحت اور زندگی دے۔“ فرطِ جذبات سے اس کی آواز بدل گئی۔

میں نے کہا ”نور جہاں کل میں نے اکبر خان کو حویلی کی چابیاں دی تھیں۔ پتا نہیں وہ کہاں رکھ کے بھول گیا...... کیا تمہیں......“

اس نے میری بات کاٹ دی ”معاف کرنا مالک! میرا نام نور جہاں نہیں‘ فاطمہ ہے۔“

یہ غلطی میں نے جانتے بوجھتے اس کے ردِعمل کا مشاہدہ کرنے کے لیے کی تھی۔ نور جہاں کے نام پر نفرت اور حسد کا سارا زہر اس کے لہجے میں آ گیا تھا۔ وہ دکھی اور کچھ مشتعل ہو گئی تھی جیسے میں نے اس کی شرافت پر بدکرداری کی تہمت لگا دی ہے۔

میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا ”معاف کرنا۔ میں کچھ کنفیوز ہو گیا۔ نور جہاں تو شاید اس کی دوسری بیوی کا نام ہے۔ وہ مجھے یہاں نظر نہیں آئی۔“

”نظر کیسے آئے گی مالک۔ وہ یہاں رہتی جو نہیں۔ کل پتا نہیں کیوں آ گئی تھی نخرے دکھانے‘ بے حیا!“

میں نے کہا ”اس کا گھر کہاں ہے؟“

”وہ کہیں شہر میں رہتی ہے۔ اس کا گھر میں نے نہیں دیکھا اور دیکھنا بھی نہیں چاہتی۔“ ایک ٹھکرائی ہوئی مظلوم عورت جو سوکن کے درجے پر فائز ہو کے اپنی نظر میں بھی گر گئی تھی اپنے جذبات کے اظہار میں دل کی ساری بھڑاس نکال رہی تھی۔

میں نے کہا ”دراصل اکبر خان نے کہا تھا کہ ممکن ہے چابیاں اس کی بیوی نے اٹھا لی ہوں۔“

”آپ اسی کنجری سے پوچھیں جی۔ بیوی تو اب وہی ہے اکبر خان کی ......اور پتا نہیں کس کس کی“ وہ غصے میں ایک دم پلٹی اور اندر چلی گئی۔

”بے چاری!“ شہناز نے ایک عورت ہونے کے ناتے دکھ بھری آہ کے ساتھ کہا۔

میں نے کہا ”کیا تم سے بھی یہی دکھڑا رو رہی تھی؟“

”نہیں میں نے تو پوچھا تھا کہ گزارہ کیسے ہوتا ہے؟ اس نے بتایا ایک فصل گندم کی ہوتی ہے۔ درمیان میں سبزیاں ہوتے ہیں۔ دینا کے قصبے کا کوئی آڑھتی ہے‘ ہفتے میں ایک بار اس کی پک اپ آتی ہے‘ وہ آس پاس کے سارے علاقے سے پیداوار اٹھاتا ہے۔“

”ان کی مجبوری سے وہ پورا فائدہ اٹھاتا ہوگا۔“

”یہ تو ہوتا ہے، مگر اس کا کہنا تھا کہ وہ اچھا آدمی ہے۔ پیسے اچھے دیتا ہے اور ویسے بھی مدد کرتا رہتا ہے۔ یہ لوگ کبھی عید بقرعید اس کی پک اپ میں بھر کے جہلم چلے جاتے ہیں۔“

اچانک مجھے ریشماں کا خیال آیا ”شہناز! تم نے ریشماں کو دیکھا...... میرا مطلب ہے اس کا حلیہ؟“

”ہاں...... اور اسے دیکھ کے مجھے کچھ اور خیال آیا تھا۔ میں تم کو بتانے ہی والی تھی۔ یہ ہو سکتا ہے کہ میں نے رات کے وقت جسے برآمدے میں سگریٹ پیتے دیکھا تھا‘ وہ راجا نہ ہو۔“

میں نے شہناز کا ہاتھ پکڑا ”یو آر رائٹ۔ کمال ہے کہ یہ خیال مجھے کیوں نہیں آیا۔ اس نے بھی دھاری دار کپڑے کی شرٹ پہن رکھی ہے۔“

شہناز میرے ساتھ چلنے لگی ”اندھیرے میں سفید دھاری تو نظر آتی ہے۔ لال اور نیلے رنگ کا فرق محسوس نہیں ہوتا۔ اس کا قد اپنی عمر کے حساب سے کچھ زیادہ ہے اور جینز راجا ہی پہنتا ہے۔“

ریشماں اب بڑے جوش و خروش سے جھولے کو انتہائی بلندی کی طرف لے جانے کے لیے کوشاں تھی۔ ہر بار جب جھولا انتہائی بلندی تک پہنچتا تھا تو وہ سر کو پیچھے جھکا کے کمان کر لیتی تھی اور اپنے سر کو یوں پیچھے جھکا لیتی تھی کہ اس کے بال فضا میں لہراتے نظر آتے تھے۔ اس کی پوری کوشش ہوتی تھی کہ یہ کرتب دکھاتے ہوئے ہر پہلو سے اس کی نسوانیت کا سارا حسن‘ شباب کی بھرپور تصویر بن جائے۔

جب میں نے اسے اشارے سے بلایا تو وہ بڑی پھرتی سے تقریباً ہوا میں تیرتی ہوئی زمین پر کودی اور اپنا توازن برقرار رکھتے ہوئے اس نے بڑی شرمیلی اور شوخ ہنسی کے ساتھ قمیص کے گریبان کو ایک ہاتھ سے تھام لیا کیونکہ قمیص کے اوپر والے دو بٹن جھولے پر جوانی کے زور میں ٹوٹ گئے تھے۔

جب وہ میرے سامنے آئی تو اس کا سانس اوپر نیچے ہو رہا تھا۔ میرے اور شہناز کے گھورنے سے وہ کچھ نروس ہوئی۔

شہناز نے کہا ”یہ کپڑے تم نے کہاں سے لیے؟“

وہ گھبرائی ”یہ جی...... غنی کے ہیں۔ چاچے اصغر کا بیٹا ہے۔“

میں نے کہا ”اکبر خان اعتراض نہیں کرتا؟“

”وہ...... وہ تو کچھ نہیں کہتا‘ اماں ناراض ہوتی ہے۔“

میں نے کہا ”ناراض ہونے کی تو کوئی بات نہیں۔ آج کل سب لڑکیاں پہن رہی ہیں۔“

شہناز نے میری بات کو آگے بڑھایا ”اور پھر تم پر اتنے اچھے بھی لگ رہے ہیں۔“

وہ خوش ہو گئی ”مگر میرا بھائی کبیر دیکھ لے تو مارتا ہے۔“

میں نے اچانک کہا ”ریشماں! تم سگریٹ بھی پیتی ہو؟“

وہ تقریباً اچھل پڑی ”نہیں جی ...... توبہ توبہ!“

میں نے کہا ”جھوٹ مت بولو۔ کل رات میں نے بھی تمہیں دیکھا تھا۔“

شہناز نے کہا ”تم آدھی رات کے بعد برآمدے میں کھڑی تھیں پھر تم درویش کے مزار کی طرف چلی گئیں۔“

”نہیں جی! آپ کو غلطی لگی ہے“ وہ ہکلانے لگی۔

شہناز نے سخت لہجے میں کہا ”دیکھو۔ میرے پاس ایک انجکشن ہے‘ تمہیں لگا دیا تو تم سوتے میں سچ بولنے لگو گی پھر میں تمہارے بھائی کو اور تمہارے دادا کو سامنے لے آؤں گی‘ وہ بھی سن لیں گے۔“

اس کی حالت غیر ہو گئی ”ڈاکٹر صاحب! خدا کے لیے ایسا مت کریں۔“

”مجھے سچ سچ بتا دو۔ میں نے تمہیں راجا سمجھا تھا اور آوازیں بھی دی تھیں لیکن تم نے پلٹ کے بھی نہیں دیکھا تھا پھر تم غائب ہو گئی تھیں۔“

وہ خوف کے اعصابی دباؤ میں ہونٹ کاٹتی رہی اور پیر کے انگوٹھے سے زمین کریدتی رہی ”وہ جی...... میں ڈر گئی تھی۔“

میں نے کہا ”اس وقت تم نے یہی کپڑے پہن رکھے تھے؟“

اس نے اقرار میں سر ہلایا ”غنی [illegible] اچھے لگتے [illegible]“

”اوہ تم اس سے ملنے درویش کے مزار [illegible] تم محبت کرتی ہو اس سے؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے دوبارہ سر ہلایا ”وہ بہت [illegible] سمن [illegible] جیسی باڈی ہے اس کی۔“

”تم کو وہ کیا کہتا ہے۔ رانی کہ [illegible]“

میں نے افسوس کا اظہار بھی بے معنی سمجھا کیونکہ [illegible] کی یلغار نے پیار کا مفہوم اور محبت کی زبان سب [illegible]

تھا۔

شہناز نے کہا ''کیا سگریٹ کی لت بھی اسی نے لگائی ہے تمہیں؟''

''وہ جی...... بس ایک دو بار۔ اس نے کہا تو میں نے پی......''

''اور اس کے بعد خود پینے لگیں' کیوں......؟'' شہناز نے کہا۔

وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگی ''جی چاہتا تھا...... بے چینی سی ہوتی تھی جناب! سگریٹ کا کش لے کر سکون ملتا ہے۔''

''او مائی گاڈ! تمہارے اس سلمان خان نے تمہیں نشے کی لت لگادی ہے اور تم اسے محبت کہتی ہو بے وقوف لڑکی۔'' شہناز نے برہمی سے کہا۔

میں نے کہا ''ایک بات بتاؤ مجھے' یہ غنی اسی چچا کا لڑکا ہے نا جو بڑا اللہ لوک ہے مگر میں نے اسے دیکھا نہیں' کیا کرتا ہے وہ؟''

''وہ کلینر ہے جی ایک ٹرک کا۔ جہلم سے پشاور اور کراچی تک ہر جگہ جاتا ہے۔ کہتا ہے بہت جلد وہ استاد کی جگہ لے لے گا۔ خود ٹرک چلائے گا پھر ہم شادی کرلیں گے۔ ہم شہر میں رہیں گے۔ میں ٹرک پر اس کے ساتھ ہر جگہ جاؤں گی۔'' اس کی آنکھیں کسی خواب کے مناظر والی فلم دیکھنے لگیں اور وہ نیند میں بولنے والے کی طرح بولتی رہی۔

میں نے سمجھ لیا تھا کہ اس کا محبوب اسے تباہی کے کس راستے پر لے جارہا ہے مگر اسے روکنا ظالم سماج کے بس کی بات ہی نہ تھی چنانچہ میں نے اشارے سے شہناز کو بھی روک دیا ورنہ راجا کی طرح وہ ریشماں کو بھی اصلاحی لیکچر دینے لگتی۔

''تم اس سے ہر رات ملتی ہو؟''

''نہیں جی وہ آتا ہے کبھی دس دن میں۔ کبھی پندرہ دن بعد۔ میرے لیے چیزیں لاتا ہے۔''

میں نے کہا ''دیکھو۔ وہ کوئی غیر نہیں ہے۔ تمہارے چچا کا بیٹا ہے۔ تمہیں اس سے یوں چھپ چھپ کے ملنے کی کیا ضرورت ہے آخر اگر وہ اچھا کماتا ہے اور بقول تمہارے سلمان خان جیسا ہیرو ہے تو تمہارے ماں باپ کو کیا اعتراض ہوسکتا ہے تم دونوں کی شادی پر۔''

''وہ جی...... بات دراصل یہ ہے کہ وہ چچا کا بیٹا ہے...... مگر چچی کا بیٹا نہیں ہے۔''

''اوہ...... اس کی ماں کون ہے' پہلی بیوی یا دوسری......؟''

وہ نروس ہونے لگی ''وہ...... اس نے چاچے پر جادو ٹونا کرادیا تھا۔ یہ چاچا اصغر پہلے ایسا نہیں تھا۔ بڑا سوہنا گبھرو جوان تھا۔ اکھاڑے میں زور بھی کرتا تھا۔ وہ اِدھر کسی زمیندار کے ڈیرے پر ناچنے آئی تھی۔ زمیندار کی بہن کی شادی تھی۔ زمیندار کے گھر میں ہی ٹک گئی۔ چاچا اِدھر زمین پر کام کرنے والے مزارعوں کو قابو رکھتا تھا۔ ایک دن پنڈ سخاوت کے پہلوان سے اس کا جوڑ پڑ گیا۔ چاچا نے اسے چت کردیا۔ مقابلے میں رانا صاحب بھی تھے اور چوہدری صاحب بھی۔''

میں نے چونک کے پوچھا ''کون رانا صاحب! رانا رجب علی؟''

''نہیں' ان کے والد رانا نسب علی' آپ جانتے ہو انہیں؟''

میں نے نفی میں سر ہلادیا ''آگے بولو۔''

''چاچا اصغر جب مٹی سے بھرے بدن کے ساتھ رانا صاحب سے انعام لینے گیا تو اِدھر وہ کنجری بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ چاچا اس کی نظر میں کھب گیا لیکن چاچا اس کے قابو نہیں آیا پھر اس نے کچھ گھول کے پلادیا اور چاچا کی مت ماری گئی۔ وہ اسے لے کر نکل گیا۔ رانا صاحب کی بڑی بے عزتی ہوئی۔ انہوں نے اِدھر اُدھر بہت تلاش کیا' ہر جگہ بندے بھیجے۔ پولیس میں بھی رپورٹ لکھوادی کہ میرا ملازم پچاس ہزار نقد اور تین لاکھ کا زیور لے کر بھاگ گیا ہے۔ پولیس میرے ابا کو بھی اٹھا کر لے گئی' دادا کو بھی۔ سب کو تھانے میں بہت مارا۔ انہیں کچھ معلوم ہوتا تو بتاتے کہ چاچا کہاں ہے؟ پتا نہیں کس نے ولایت میں بڑے مالک کو ٹیلی فون کیا اور انہوں نے یہاں کسی سے بات کی تو تین دن بعد تھانے والوں نے چھوڑا۔''

''پھر چاچا اصغر کیسے واپس آیا؟'' میں نے کہا۔

''وہ ڈیڑھ سال بعد اس کے ساتھ پکڑا گیا۔ رانا صاحب کو اطلاع ملی کہ وہ پنڈی میں ہے۔ انہوں نے اپنے بندے بھیجے۔ وہ چاچا اصغر کو بوری میں ڈال کے لے آئے۔''

''اور وہ عورت؟'' شہناز نے پوچھا۔

''وہ جان بچا کے نکل گئی ورنہ اس کو وہیں ماردیتے۔ شاید چاچے کو کسی طرح خبر مل گئی تھی کہ رانا صاحب کے شکاری کتے پیچھے لگ گئے ہیں۔ اس نے کسی طرح دونوں کو فرار کرادیا۔ اس عورت کو اور اس کے بچے کو۔ ڈیڑھ سال میں وہ ایک بچے کی ماں بن گئی تھی۔ وہ چھ مہینے کے غنی کے ساتھ پنڈ سخاوت پہنچی۔ اسی پہلوان کے پاس جس کو چاچے اصغر نے چت کیا تھا۔''

''وہ تو ایک طرح سے دشمن تھا؟''

''ہاں...... مگر چاچے اصغر نے کہا تھا کہ وہ بڑا دل والا

...ہے۔ اسے میرا اسلام دینا۔ اللہ کے بعد وہی تیری حفاظت ...ہے۔ پہلوان کو چوہدری اللہ دتا کی حمایت حاصل تھی۔ ...نے پوچھا کہ کیا تو نے اصغر سے نکاح کرلیا تھا؟ کنجری نے ...کہ جب بچہ ہوگیا تو وہ نکاح کرنا چاہتے تھے مگر کوئی مولوی ...پر راضی نہ ہوا۔ وہ کہتے تھے کہ تم دونوں گناہ گار ہو اور یہ بچہ ...ہے۔'' اس نے بڑی روانی سے کہا۔

''تم تو بہت کچھ جانتی ہو؟'' میں نے طنز سے کہا۔

''یہ سب چاچے نے خود بتایا تھا۔ پنڈ سخاوت کے اس پہلوان نے اعلان کر کے اس کنجری سے نکاح پڑھوالیا۔''

شہناز نے کہا ''اس کا کوئی نام بھی تو ہوگا۔ بار بار اسے کنجری کیوں کہتی ہو؟''

''زیبو نام تھا جی اس کا۔ چوہدری اللہ دتا کی رانا نسب ...سے پہلے ہی لگتی تھی۔ رانا صاحب نے پیغام بھیجا کہ زیبو کو ...واپس کردیا جائے۔ چوہدری نے جواب دیا کہ اب وہ ہمارے ...کی عزت ہے۔ پہلوان نے کہا کہ میری بیوی کا نام بھی لیا ...نے تو اچھا نہیں ہوگا مگر ہاتھیوں کی لڑائی میں بے چارے ...(مینڈک) ہی مرتے ہیں۔ رانا کے بندوں نے ایک دن ...موقع ملتے ہی زیبو کو ذبح کردیا۔ وہ اس وقت پہلوان کے بیٹے کی ماں بننے والی تھی۔ وہ زیبو کا سر کاٹ لائے اور اسے رانا صاحب کے قدموں میں ڈال دیا۔ چاچے نے بتایا کہ رانا اس ...فٹ بال کی طرح ٹھوکریں مارتا رہا۔''

''اس کے بعد پہلوان نے جوابی کارروائی کی ہوگی؟'' ...نے کہا۔

''آپ کو کیسے پتا جی؟'' ریشماں نے حیرانی سے کہا۔

''ایسا ہی ہوتا ہے ایسی کہانیوں کا انجام'' میں نے کہا۔

ریشماں نے اتفاق کے انداز میں سر ہلایا ''پہلوان اسی ...غائب ہوگیا تھا مگر جانے سے پہلے وہ اپنا بچہ چوہدری اللہ ...کے سپرد کرگیا تھا کہ اب اس یتیم کی پرورش آپ کرنا۔ کئی ...کے بعد پہلوان ایک رات ڈاکوؤں کے ایک گروہ کے ساتھ ...سوار ہوا۔ رانا کے دو محافظ مارے گئے اور تین ڈاکو۔ کسی کو پتا ...نہیں چلا کہ چوتھا ڈاکو حویلی میں ہے۔ وہ رانا نسب علی کے ...میں گھس گیا تھا۔ اور رات بھر وہیں رہا' اس کی بیوی ...کے ساتھ۔ صبح جب پولیس آئی تو وہ پکڑا گیا۔ وہ رانا نسب علی ...کی تیسری بیوی تھی۔ حویلی کے اندر سے پکڑا جانے والا ڈاکو ...وہ پہلوان تھا۔ رانا نے بیوی کو خود قتل کیا اور الزام پہلوان پر ...دیا۔ اسے بعد میں پھانسی ہوگئی۔''

شہناز نے پوچھا ''کیا وہ تیسری بیوی ہی رانا رجب علی ...کی ماں تھی؟''

''نہیں جی' وہ تو پہلی بیوی کا سب سے بڑا بیٹا ہے۔''

''تمہاری معلومات واقعی مکمل ہیں'' میں نے اعتراف کیا ''کیا تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے چاچے کے ساتھ کیا ہوا۔ جب اسے بوری سے نکال کے رانا صاحب کے سامنے پیش کیا گیا؟''

''اسے کاٹ کر کتوں کے سامنے ڈال دیا جاتا لیکن اس کی قسمت اچھی تھی۔ ایک تو جانو بابا نے لندن میں مالکوں کو ٹیلی فون پر بتادیا تھا کہ اصغر نے کیا حرکت کی ہے اور اب وہ لاپتا ہے لیکن جس دن وہ پکڑا گیا' اس دن رانا واقعی اس کی لاش اپنے شکاری کتوں کے آگے ڈال دے گا۔ لندن والے مالک نے جانو بابا سے کہا کہ وہ اصغر کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوادیں۔ پولیس آسانی سے رپورٹ کہاں لکھتی ہے مگر لندن والے مالک کا دباؤ تھا۔ رانا نے تو کوئی رپورٹ نہیں لکھوائی تھی۔ جانو بابا کی رپورٹ لکھ لی گئی۔ جس دن اصغر کو گرفتار کر کے لایا گیا وہاں علاقے کا ایس پی بھی بیٹھا ہوا تھا۔ رانا اس سے خوش نہیں تھا اور بعد میں رانا کی وجہ سے اس کا تبادلہ بھی ہوا مگر ایس پی نے رانا سے کہہ دیا کہ یہ ست بدھائی والوں کا بندہ ہے اور لندن سے مجھے فون آیا تھا کہ اس کا پتا لگایا جائے۔ اب آپ اسے چھوڑ دیں۔ رانا نے انکار کردیا کہ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ مجھے اپنی بے عزتی کا حساب برابر کرنا ہے۔ ایس پی جاتے جاتے دھمکی دے گیا کہ بندہ مجھے آپ سے زندہ سلامت وصول کرنا ہے اگر یہ مر گیا تو آپ کے خلاف قتل کا پرچا میں خود درج کروں گا۔ بس اسی سے چاچا بچ گیا مگر اس کے ساتھ جو سلوک ہوا۔ اس نے چاچا کا حال خراب کردیا۔ اس کو بہت ذلیل کیا گیا اور مارا پیٹا گیا۔ سنا ہے کھانے میں زہر بھی دیا گیا۔ وہ مہینا بھر سے زیادہ رانا صاحب کے پاس رہا تھا۔ اسے کتوں کے ساتھ رکھا گیا تھا۔ لکڑی کے چھوٹے چھوٹے گھر تھے۔ ایک میں اسے بھی بند کردیا گیا تھا۔ اسے وہی کھانا پڑتا تھا جو کتے کھاتے تھے۔ اس کے لیے بھونکنا پڑتا تھا۔ وہ چاروں ہاتھوں پیروں پر چلتا تھا اور رانا صاحب کے قدموں میں لوٹتا تھا۔ وہ باغ میں یا گاؤں اور کھیتوں میں جاتے تھے تو وہ ان کے پیچھے چلتا تھا۔ وہ اس کو بید کی پتلی چھڑی سے مارتے تھے اور اس کی کھال ادھیڑ دیتے تھے۔ اس کے گلے میں پٹا تھا اور اسے زنجیر سے باندھ کے ہر جگہ لے جایا جاتا تھا۔ کتوں کی طرح اس کے تن پر بھی کپڑے نہیں ہوتے تھے۔''

''یہ سب اس نے بتایا؟'' شہناز نے جھرجھری لے کر کہا۔

''ہاں...... اور لوگوں نے بھی۔ جو سب دیکھ رہے

تھے۔ جب وہ واپس آیا تو کتوں کی طرح بھونکتا تھا اور خود کو کتا سمجھتا تھا۔''

''کسی نے اس کا علاج نہیں کرایا؟'' میں نے کہا۔

''علاج کرانے سے یہ ہوا کہ اس نے خود کو انسان سمجھنا شروع کر دیا مگر اس پر دورے پڑنے لگے۔ دورے کی حالت میں وہ کوئی عجیب زبان بولنے لگا جو کسی کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ وہ کئی کئی دن سوتا نہیں تھا پھر کسی قبر میں سویا ہوا ملتا تھا۔ اس نے داڑھی بڑھا لی اور بال بڑھا کے جوگی بن گیا۔ لوگوں کو بتانے لگا کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ وہ سچ بھی ہو گیا۔ ایک عورت پنڈ سخاوت سے آئی تھی۔ اس سے پوچھنے لگا تو کس کی بیوہ ہے؟ اس نے بڑا برا بھلا کہا کہ تو جانتا نہیں' میں کس کی بیوی ہوں۔ وہ کہنے لگا کہ ہاں تو اسی کی بیوہ ہے۔ تین دن بعد اس کے شوہر کو سانپ نے ڈس لیا اور وہ واقعی بیوہ ہو گئی۔ ایک اور بندے سے اس نے پوچھا کہ دوسری شادی کے میٹھے چاول کب کھلاؤ گے؟ وہ سمجھا مذاق کی بات ہے' اس کی شادی کو سال بھی نہیں ہوا تھا۔ ایک ہفتے بعد بچہ جنتے ہوئے اس کی بیوی فوت ہو گئی۔''

''اس کے بعد لوگوں نے اسے پہنچا ہوا سمجھ لیا؟''

''ہاں پہلے کبھی کبھی اسے دورہ پڑتا تھا۔ جب وہ ٹھیک ہوتا تھا تو ویسا ہی رہتا تھا جیسے پہلے تھا۔ رو رو کے چاچی سے اپنی غلطی کی معافی مانگتا تھا۔ بعد میں دورے بڑھتے گئے۔ اب تو وہ ایسے ہی رہتا ہے جیسا آپ نے دیکھا۔''

وہ لڑکی بہت باتونی ہونے کے ساتھ غیر... معمولی طور پر ذہین تھی اور اگر خود نہ بتاتی تو ہمیں کبھی اندازہ نہ ہوتا کہ وہ کبھی اسکول نہیں گئی۔ افسوس کی بات یہ تھی کہ نوجوانی کے جذبات کی رو میں بہہ کے وہ رسوائی اور بدنامی کے راستے کی طرف بڑھ رہی تھی۔

ہمیں اس کی باتیں سنتے ایک گھنٹا ہو گیا تھا۔ دور سے اس کی ماں کی آواز سنائی دی تو وہ ایک دم پلٹی ''ماں نے مجھے اس حلیے میں دیکھا آپ کے سامنے تو بہت مارے گی۔''

میں نے کہا ''ادھر تم کہاں جا رہی ہو؟''

اس نے کہا ''میرے کپڑے ادھر ہیں۔ وہیں جہاں میں رات کے وقت غائب ہوئی تھی۔'' وہ ہنسی اور بھاگ کھڑی ہوئی۔

شہناز نے کہا ''اب یہ پیچھے کی طرف سے جا رہی ہے۔''

میں نے کہا ''چلو دیکھتے ہیں' درویش کے مزار پر کیا ہے؟''

ہم عقبی فصیل کا چکر لگا کے گئے۔ وہاں درویش کا مزار بالکل ویسا ہی تھا جیسا شہناز نے بتایا تھا۔ سرہانے کی طرف ذرا نشیب میں ایک جیسی چھ قبریں تھیں۔ میرا ذہن ایک دم مجھے اپنے ماضی کی سب سے لرزہ خیز اور خونچکاں داستان کی طرف لے گیا۔ یہ چھ قبریں میرے ایک جدامجد قدیر احمد کے چھ جوان بیٹوں کی تھیں جن پر انہیں بڑا غرور تھا۔ وہ سب اس عقیل احمد کے بھائی تھے جس نے مجھے اس جاگیر اور حویلی کا مالک بنا دیا تھا۔ وہ سب اسی درویش کی بددعا سے مختلف حادثات کا شکار ہو کے مرے تھے جو اب اپنے مزار میں آسودۂ خاک تھا۔

شاید یہ کہنا درست نہ ہو کہ قدیر احمد کے بیٹے ایک فقیر کی بددعا سے ہلاک ہوئے۔ انسان کے لیے زندگی اور موت کے وقت کا تعین قدرت کرتی ہے۔ کسی کی دعا سے کوئی ایک سانس اضافی نہیں لے سکتا اور کسی کی بددعا سے فرشتۂ اجل آخری سانس لینے سے پہلے روح قبض کرنے کا اختیار نہیں رکھتا۔ شاید مختلف حادثات کو بددعا سے منسوب رکھنا بھی درست نہ ہو۔ موت کے' کب' کیسے اور کہاں شکار کرتی ہے' یہ سب طے ہے لیکن مجھ تک پہنچنے والی روایات میں بھی غلط کچھ نہ تھا۔ یہ سب تاریخی حقائق تھے جو ناقابل یقین حد تک افسانوی لگتے تھے۔

میں نے درویش کے مزار سے گھوم کے چاروں طرف دیکھا تو مجھے کچھ فاصلے پر ایک چبوترا سا دکھائی دیا۔ میں شہناز کے ساتھ اتر کے نیچے گیا تو مجھے ایک پختہ کمرا سا نظر آیا۔ اچانک اس کمرے میں سے ریشماں نکل آئی۔ اب وہ عام گھریلو کپڑوں میں تھی۔

''تو یہ ہے تمہاری محبت کا آشیانہ؟'' شہناز نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

اس نے کچھ جھینپ کے کہا ''ادھر کوئی نہیں آتا۔''

میں نے کہا ''یہ کیسی جگہ ہے؟'' اور دروازے کے خلا سے تاریکی میں داخل ہو گیا۔ باہر اجلی دھوپ تھی لیکن اس کوٹھری پر ہر سمت سے درخت سایہ فگن تھے۔ تھوڑی بہت روشنی جو چھن کر اندر پہنچ رہی تھی اندر کا منظر واضح کرنے کے لیے قطعی ناکافی تھی۔

جب میری نگاہ اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوئی تو مجھے پرانی سپاٹ دیواروں والا ایک کمرا نظر آیا جو آٹھ فٹ چوڑا اور اتنا ہی اونچا تھا۔ حویلی کی دیواروں کی تعمیر میں پتھر استعمال ہوا تھا یا پھر پرانی طرز کی چھوٹی اینٹوں سے چنائی کی گئی تھی۔ یہ کمرا بہت بعد میں بنا ہوگا۔ باہر سے اس کا پلستر بھی جھڑ رہا تھا اور رنگ ڈھل گیا تھا لیکن اندر سے اس کی حالت اتنی

بری نہیں تھی۔ دیواروں پر تو صاف نظر آتا تھا کہ حال ہی میں سفیدی پھیری گئی ہوگی' اس کے چھینٹے فرش پر گرے تھے۔ فرش بھی حیرت انگیز طور پر صاف تھا اور اس کی وجہ ریشماں کے چہرے کی مسکراہٹ میں دیکھی جا سکتی تھی۔ وہ نادم تھی اور نہ ہی شرمسار۔ وہ اعتراف کر چکی تھی کہ یہاں وہ اپنے محبوب سے ملتی ہے۔ یہ خلوت گاہ ان کے راز عشق کی امین تھی۔ محبت جرم ہے تو جرم کا اقرار کرتے ہیں۔ ان کے خوابوں کا گھر اگر ایک فلم تھی تو یہ اس کا ٹریلر تھا۔ اس کی دیواروں پر رنگ سلمان خان نے کیا تھا تو ایشوریا رائے اسے صاف ستھرا رکھتی تھی۔

شہناز نے ریشماں کو اندر بلایا ''جب وہ یہاں آتا ہے تم اس کے ساتھ رہتی ہو...... رات بھر؟''

اس نے سر جھکا لیا۔

''یہ سلسلہ کب سے چل رہا ہے؟'' شہناز نے پوچھا۔

''ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے'' ریشماں نے بڑی مشکل سے جواب دیا ''پہلے کہیں بھی مل لیتے تھے۔''

''یہاں کیا تھا؟'' میں نے کہا۔

''کچھ نہیں۔ کوڑا کچرا بھرا ہوا تھا۔ جانور رہتے تھے' غنی نے اسے صاف کیا۔''

میں نے کہا ''یہ کمرا آخر بنایا کس مقصد کے لیے گیا تھا؟''

ریشماں نے کہا ''جانو بابا نے ایک بار بتایا تھا کہ یہاں کنواں تھا۔ جواب فرش کے نیچے ہے۔''

''کنواں......؟'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا ''یہ وہی کنواں ہوگا جس میں قدیر احمد نے اپنی تین بیویوں کو گرایا تھا اور پھر منڈیر پر بیٹھ کے خود کو گولی مار لی تھی۔''

''کون قدیر احمد جی!'' ریشماں کی کانپتی ہوئی آواز آئی۔

میں نے کہا ''یہ جولندن والے مالک تھے۔ ان کے اللہ یہ جگہ ان کا مدفن ہے۔ اس فرش کے نیچے ان کے ڈھانچے آج بھی موجود ہوں گے جس کو تم اتنی بے شرمی سے داد عیش دینے کے لیے استعمال کرتے رہے۔''

ریشماں لرزنے لگی ''قسم خدا کی...... مجھے معلوم نہیں تھا' پھر غنی کو کیسے معلوم ہو سکتا تھا۔''

شہناز نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا ''تم میرے ساتھ آؤ۔''

ریشماں نے خود کو چھڑانے کی واجبی سی کوشش کی ''کیوں جی! کہاں لے جائیں گی آپ مجھے...... آپ کو اللہ کا واسطہ۔''

شہناز نے اسے ایک جھٹکا دیا ''بلاوجہ کے واسطے مت دو۔ ابھی میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی۔ جب تک خود مجھے یقین نہ ہو۔''

ریشماں سمجھ گئی ''ایسی کوئی بات نہیں ہو سکتی جی......!''

''کیوں نہیں ہو سکتی۔ تم میاں بیوی کی زندگی گزار رہے ہو کب سے۔ کیا اولاد کا راستہ روک رکھا ہے؟''

ریشماں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس نے اقرار میں سر ہلایا ''غنی کہتا ہے...... جب تک ہم نہ چاہیں کچھ نہیں ہو سکتا۔''

شہناز نے ایک ڈاکٹر کی طرح جرح جاری رکھی ''کیا طریقہ اختیار کرتا ہے وہ۔ تمہیں گولیاں دیتا ہے؟''

اس نے نفی میں سر ہلا کے شہناز کے کان میں کچھ بتایا۔ اب میں دیکھ سکتا تھا کہ شرم' افشائے راز کے خوف اور ہمارے سخت رویے سے اس کی حالت غیر ہو رہی ہے۔ اس کی ساری شوخی اور طراری ختم ہو چکی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق ابھی اس کی عمر سترہ سال سے کم ہی ہوگی لیکن وہ ایک شادی شدہ عورت کی طرح ازدواجی زندگی کے سارے اسرار و رموز سے آشنا ہو چکی تھی۔

میں نے کہا ''یہ تمہارے غنی صاحب رہتے کہاں ہیں؟ والد صاحب تو اسے چوہدری اللہ دتا کے سپرد کر کے پھانسی چڑھ گئے تھے۔''

''اس کی پرورش چوہدری صاحب نے کی تھی لیکن اب وہ ان کا نوکر نہیں ہے۔ وہ آزاد ہے'' ریشماں نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا'' چوہدریوں نے اس کے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔ مار کھانے اور روکھی سوکھی سے پیٹ بھرتے اس نے بچپن تو گزار دیا۔ عقل آئی تو اندازہ ہوا کہ اس کی حیثیت تو غلاموں سے بھی بدتر ہے۔ احسان اپنی جگہ' ہر وقت کی ذلت اور مار پیٹ الگ۔ کمی کمین تک اٹھتے بیٹھتے حرامی کہہ کے بلاتے تھے۔ وہ کب تک برداشت کرتا۔ کاٹھی اس کی بھی باپ جیسی ہے۔ چوہدری اللہ دتا نے ستر برس کی عمر میں چوتھی شادی کی تھی۔ چوتھی کیا چھٹی ہے حساب ہے۔ نئی والی بھی عمر میں چوہدری کی پوتی کے برابر تھی۔ وہ غنی پر ریجھ گئی۔ اس کی مہربانیاں دیکھ کے پرانی والی تاڑ گئیں کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ وہ آپس میں مل گئیں۔ ایک نے چھوٹی والی کو شہ دی کہ پیار کر۔ ڈرتا کیا۔ غنی کے ساتھ نکل جاؤ۔ بساؤ اپنے پیار کی جنت۔ سب نے اسے مواقع فراہم کیے اور ایک دن انہیں رنگے ہاتھوں پکڑوا دیا۔ چوہدری کی نئی نویلی بیوی نے تو فوراً غنی کو مجرم بنا دیا کہ مجھے اکیلا پا کے یہ اندر آ گیا اور زبردستی کرنے

لگا۔ اپنی عزت بچانے کے لیے چوہدری نے اس کے جھوٹ کو سچ مان لیا۔ غنی جائے واردات سے فرار ہوگیا تھا۔ اب وہ اس علاقے میں آتے ہوئے بھی ڈرتا ہے۔''

شہناز نے طنز سے کہا ''بس تمہارے پاس آتے ہوئے نہیں ڈرتا۔ بے وقوف لڑکی! ابھی وقت ہے' سنبھل جاؤ۔ شادی سے پہلے ہی وہ تمہیں بیوی کی طرح استعمال کررہا ہے پھر شادی کرنے کی اسے کیا ضرورت ہے۔ جس دن اس کا دل بھر گیا وہ لوٹ کے ادھر آئے گا ہی نہیں۔ پشاور سے کراچی تک کہیں اور دل لگالے گا۔ اس کا نہ گھر نہ خاندان' تم ماری جاؤ گی۔''

ریشماں کا رنگ فق ہوگیا ''نہیں جی...... ایسا نہیں ہوسکتا' وہ ایسا نہیں ہے۔''

''ابھی تمہیں کیا پتا دنیا کا۔'' میں نے کہا ''اگر کسی روز وہ چوہدری کے انتقام کا نشانہ بن گیا تو تمہیں معلوم ہی نہیں ہوگا۔ اکثر ٹرک ڈرائیور نشہ کرتے ہیں۔ اسے بھی عادت ہوگئی ہے اور اب وہ تمہیں عادی بنا رہا ہے اگر اسے اتنا خیال ہوتا تو کیا وہ تمہیں نشہ کرنے دیتا۔ کون سا ٹرک ڈرائیور ہے جو یہ لت اپنے بیوی بچوں کو خود لگائے۔ عیاش لوگ شراب پی کے اور پلا کے لطف کو دوبالا کرتے ہیں۔ وہ سگریٹ کے کش لگا کے اور لگوا کے سرور کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔''

شہناز نے کہا ''تم اتنی بے باک ہو۔ اس لیے ہم بھی تم سے کھل کے بات کررہے ہیں۔ تمہیں سمجھا رہے ہیں۔ نہیں سمجھنا تو ہماری طرف سے جہنم میں جاؤ۔ بھگتو گی تم خود۔ وہ کتنا سچا ہے' یہ آزمانے کے لیے تمہیں خود اپنے جذبات کو کنٹرول کرنا ہوگا۔ اگلی بار جب وہ تمہیں بلائے تو اس سے صاف کہو کہ دیکھو' کہ اب میں تمہاری خواہشات کی تکمیل تب ہی کروں گی جب تم مجھے شادی کرکے اپنے گھر لے جاؤ گے۔ اس سے کہو کہ مجھے ایک شوہر' ایک گھر اور ایک بچہ چاہیے۔ وہ مرد نہیں جو چھپ کر میرے ساتھ رات گزارے اور صبح کا اجالا ہونے سے پہلے بھاگ جائے۔''

ریشماں کے ضبط کا حوصلہ جواب دے گیا۔ روتے روتے وہ چلانے لگی ''بھونکنا بند کر کتیا۔ میرے غنی اور مجھے کچھ کہنے سے پہلے اپنے آپ کو دیکھ۔ تیرے جیسی عورتیں روز کسی نئے مرد کے ساتھ سوتی ہیں۔ روز بچے گراتی ہیں اور بنی پھرتی ہیں پاک دامن۔ کنواری دوشیزہ۔ تھوکتی پھرتی ہیں دوسروں پر...... یہاں بھی دو چار ساتھ لائی ہے۔''

میں نے اس کے منہ پر ایک تھپڑ رسید کیا۔ وہ چیخی اور دیوار سے ٹکرا کے فرش پر گر گئی۔ شاید میری طرح شہناز کو بھی احساس ہونے لگا تھا کہ ہم معاملات کو بہت آگے لے گئے۔ ریشماں کی ہمارے لیے اتنی اہمیت بہرحال نہیں تھی۔ وہ کیا تھی۔ ایک ملازم کی بیٹی۔ بے شک اسے ضرورت سے زیادہ بولنے کی عادت تھی۔ ہمیں اس کی باتوں میں اتنی دلچسپی ظاہر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ہم اسے سمجھاتے اور جانے دیتے۔ ہم نے اسے بے بس کرکے دیوار سے لگا دیا تھا۔

اب وہ فرش پر الٹی پڑی زور زور سے رو رہی تھی اور اس کا جسم جھٹکے لے رہا تھا۔ تاہم خطرے کی کوئی بات نہ تھی۔ طوفان آ کے گزر گیا تھا اور ریشماں کا کچھ دیر میں نارمل ہوجانا یقینی تھا۔ میں نے شہناز کو چلنے کا اشارہ کیا اور ہم باہر آگئے۔

ابھی تک مجھے یہ خیال نہیں آیا تھا کہ آخر ریشماں نے اپنا حلیہ بدلا تو اتارا ہوا لباس کہاں چھپایا؟ دروازے کے سامنے مجھے فرش پر سگریٹوں کے ٹکڑے نظر آئے۔ میں نے ایک ٹکڑا اٹھایا اور اسے مسل کے سونگھا' مجھے چرس کی مخصوص بو محسوس ہوئی۔

میں نے دوسرا ٹکڑا شہناز کو دیا۔ اس نے میری تقلید کرتے ہوئے اسے توڑ کے سونگھا تو ایک دم اس کی حالت بگڑ گئی۔ اس نے سر جھٹکا اور لڑکھڑائی۔ میں اسے نہ سنبھالتا تو وہ گر جاتی۔

میں نے کہا ''شہناز...... کیا ہوا؟''

وہ لمبے لمبے سانس لینے لگی ''پتا نہیں...... یہ خوشبو......''

میں نے کہا ''کون سی خوشبو۔''

اس نے اقرار میں سر ہلایا ''یہی خوشبو تھی...... جو میں نے کل رات درویش کے مزار پر محسوس کی تھی۔''

یہ بات مجھے عجیب سی لگی کہ وہ چرس کی بو کو خوشبو کہہ رہی تھی۔ شاید یہ انفرادی احساس اور ردِعمل کا مسئلہ تھا۔ کچھ لوگ پیٹرول کی بو کو بھی خوشبو کی طرح اچھا سمجھتے ہیں۔ رات کے وقت سونے سے اٹھ کے باہر آنے اور ریشماں کو لباس کی مشابہت کے باعث اور اندھیرے کی وجہ سے راجا سمجھ لینے کا معاملہ واضح ہوگیا تھا۔ اب یہ بھی سمجھ میں آگیا کہ وہاں شہناز کے حواس پر کون سی خوشبو حملہ آور ہوئی تھی جس نے اسے کچھ دیر کے لیے ہوش سے بیگانا کردیا تھا۔ یقیناً اس وقت ریشماں کے ساتھ غنی اس حجلۂ عروسی میں موجود تھا اور وہ چرس کے سگریٹ پی رہا تھا یا پی رہے تھے۔ اس کا دھواں ہوا کے رخ پر شہناز تک پہنچا جسے وہ برداشت نہ کرسکی۔ غالباً اسے چرس کی بو سے الرجی تھی۔

میں شہناز کو باہر لے آیا۔ وہ لڑکھڑائی اور پھر گرنے لگی مگر اس مرتبہ وجہ مختلف تھی۔ اس کا پیر ایک ناہموار جگہ پر آگیا تھا۔ جہاں ایک چکنے پتھر پر کائی جمی ہوئی تھی۔ شہناز کو بچانے

کے لیے مجھے جھکنا پڑا اور میری نظر جھاڑیوں کے درمیان گئی۔ وہاں مجھے ٹین کا ایک چھوٹا سا بدوضع صندوق دکھائی دیا۔ میں نے شہناز کو چھوڑ کے اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کے صندوق کو باہر کھینچا۔ اس کے پیچھے مجھے ایک اور بنڈل نظر آیا۔ یہ ایک میلی سی دری اور چادر تھی' جس میں ایک تکیہ لپیٹ دیا گیا تھا۔

صندوق میں تالا نہیں تھا۔ میں نے اسے کھولا تو اس کے اندر مجھے مردانہ کپڑوں کے تین جوڑے ملے۔ دو شلوار قمیص سوٹ اور ایک پتلون اور ٹی شرٹ۔ کچھ دیر پہلے ریشماں نے پہن رکھے تھے' وہ ان کے علاوہ تھے۔ باکس میں کچھ عام قسم کا سامان آرائش تھا۔ لپ اسٹک' پاؤڈر اور نیل پالش وغیرہ۔ شیو کا سامان تھا۔ فیملی پلاننگ کے سبز ستارہ کلینک سے ملنے والا سامان دونوں کے استعمال کا تھا۔ سگریٹوں کے ایک استعمال شدہ پیکٹ میں چرس سے بھری چار سگریٹیں تھیں اور ایک خالی پیکٹ میں وہ چرس جو ابھی استعمال نہیں ہوئی تھی۔ صندوق کے اندر سے اٹھنے والی ہر بو پر چرس کی بو غالب تھی۔

شہناز میرے پیچھے گھٹنوں پر ہاتھ رکھے رکوع کے انداز میں کھڑی تھی اور تلاشی کے عمل کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ اچانک وہ مجھ پر گر گئی۔ شک کی اب قطعی گنجائش نہ تھی۔ وہ ایک ڈاکٹر تھی' جس کا تعلیم کے دوران میں لیبارٹری' آپریشن تھیٹر اور مردہ خانوں میں ہر طرح کی ناگوار بو سے واسطہ پڑا ہوگا۔ شاید چرس کی بو اس میں شامل نہ تھی۔ چنانچہ اسے اندازہ نہ تھا کہ اس بو سے وہ الرجک ہے۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ بہت سے لوگ پرفیوم سے بھی الرجک ہوتے ہیں جو عام لوگوں کو بہت پسند ہوتی ہے۔

میں شہناز کو اٹھا کے کمرے میں لے آیا۔ کچھ دیر بعد وہ ہوش میں آگئی۔ اس نے پھر اپنے میڈیکل بیگ سے نکال کے کوئی دوا لی۔

میں نے کہا ''اب تو گزشتہ رات کا پراسرار واقعہ سمجھ میں آگیا؟''

اس نے آہستہ سے کہا ''ہاں' کسی حد تک۔''

''شک کی اب کون سی بات رہ گئی ہے؟''

وہ بولی ''جب میں نے اٹھ کے دیکھا۔ تو راجا وہاں نہیں تھا۔''

میں نے کہا ''ممکن ہے وہ باتھ روم گیا ہو۔''

''اور جو آپ نے دیکھا تھا کہ ہم باہر فوارے کے تالاب پر بیٹھے باتیں کررہے ہیں؟''

میں نے ہنس کے کہا ''وہ ریشماں اور غنی ہوں گے۔''

''کیا وہ ایسے صحن کے بیچ میں بیٹھ کے رومانس کرسکتے ہیں؟''

میں نے کہا ''تو کوئی اور ہوگا۔ یہاں رہنے والے سب لوگوں سے تو ہم نہیں ملے۔''

شہناز خاموش ہوگئی مگر صاف نظر آتا تھا کہ مطمئن نہیں ہوئی۔ حویلی کے ماحول کی پراسراریت اس کے ذہن اور اعصاب پر سوار تھی۔ میں نے طے کیا کہ حویلی میں اسے ساتھ نہ رکھوں۔ مجھے اب اکبر کا انتظار تھا اگر چابیاں نہ ملیں تو ثابت ہوجائے گا کہ میں نے اسے یہ ذمے داری سونپ کے واقعی بہت بڑی غلطی کی تھی اور اس کی نیت میں یقیناً فتور تھا تاہم اس کا سدِباب میرے اختیار میں تھا۔

دوپہر کا کھانا پھر بڑے سلیقے سے لایا گیا اور اس میں میری فرمائش کے مطابق سبزیاں تھیں جو اکبر کی بیوی نے پکائی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں واقعی ذائقہ تھا۔ اکبر خان کی ہنوز کوئی خبر نہ تھی اور مجھے ایسا لگتا تھا کہ شاید اس مختصر دورے میں حویلی کا تفصیلی جائزہ لینا ممکن نہ ہوگا۔ اس کے لیے مجھے دوبارہ زیادہ عرصہ قیام کے لیے آنا ہوگا مگر جانے سے پہلے مجھے کچھ حفاظتی اقدامات کرنے ہوں گے۔ جانو بابا مجھے پہلے ہی خبردار کرچکا تھا اور اب جبکہ چابیاں بھی اکبر خان کے ہاتھ میں آگئی تھیں' وہ تالے کھول کر کچھ بھی غائب کرسکتا تھا۔ حویلی کے کمروں میں کیا محفوظ ہے' اس کا حساب صرف جانو بابا جانتا تھا۔ اس کا ریکارڈ کہیں نہیں تھا۔

شہناز کو اب راجا کی واپسی کا بے چینی سے انتظار تھا۔ راجا کہاں اور کیا کررہا ہے' رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ معلوم نہیں ہوسکتا تھا۔ اطمینان کی صرف ایک بات تھی کہ وہ اکیلا نہیں ہے' اس کے ساتھ کبیر خان تھا اور امید کی جاسکتی تھی کہ شام تک وہ ضرور لوٹ آئے گا اور ہم رات تک لاہور پہنچ جائیں گے۔

میں نے شہناز کو آرام کرنے کا مشورہ دیا مگر وہ اس لق ودق کمرے میں اکیلی رکنے پر راضی نہ ہوئی جہاں کے دیوار و در بھی اسے پراسرار لگتے تھے اور ندیم فرنیچر' قالین پردوں اور سامان آرائش کے تاریخی ماحول میں میرے آباؤاجداد کی روحیں نظر نہ آنے والے سایوں کی طرح سرگرداں محسوس ہوتی تھیں۔

ہم نے نیچے سے اوپر تک راؤنڈ لگایا۔ طویل برآمدے میں دو راہداریاں کھلتی تھیں۔ ہر راہداری میں آمنے سامنے چار کمروں کے دروازے تھے۔ اسی طرح نچلی منزل پر آٹھ کمرے تھے تو ایسے ہی نقشے کے مطابق اوپر بھی آٹھ کمرے بنائے گئے تھے۔ جس کمرے میں ہم نے قیام کیا تھا اس جیسے سات کمرے بند پڑے تھے۔ ان کے مضبوط اور نقشیں

دروازے سیاہ دیودار جیسی کسی لکڑی کو تراش کے بنائے گئے تھے اور ڈیڑھ سو سال گزر جانے کے باوجود اپنی اصل حالت میں موجود تھے۔ یہی حال رنگین شیشوں والی کھڑکیوں کا تھا۔ ہر کھڑکی قد آدم تھی۔ اوپر کے حصوں میں نیم دائروں کی شکل کے روشندان تھے جن میں تکون جیسے رنگین شیشے لگے ہوئے تھے۔ نچلی منزل پر گرد نظر نہیں آتی تھی' اوپر کچھ صفائی کی ضرورت تھی۔

دروازوں میں بھاری بھرکم فولادی کنڈیاں تھیں اور ان میں ایک ایک سیر وزن والے قدیم طرز کے تالے پڑے ہوئے تھے۔ یہ سب ایک جیسے پیتل کے علی گڑھ والے قفل تھے جو یقیناً ماہرین فن نے خصوصی آرڈر پر بنائے ہوں گے۔ انہیں توڑنا یا کسی دوسری چابی سے کھولنا آسان نہ تھا۔ میری یہ خواہش بڑی شدت اختیار کر گئی تھی کہ میں ان دروازوں کے پیچھے پوشیدہ نوادرات اور آبائی خزانوں کا مشاہدہ کروں۔ مجھے سونے، چاندی کے ظروف اور ہیرے جواہرات کی مالیت سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ میری دولت مندی میں مزید ایک دو کروڑ کا اضافہ ہو جانے سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

میری خواہش یہ تھی کہ میں اپنے آبائی تاریخی ورثے کو محفوظ [illegible] اگر اب تک کوئی رجسٹر' اسٹاک بک یا کیٹیلاگ نہیں بنا تھا تو [illegible] جائے جس میں ہر چیز کی ساری تفصیل شامل ہو اگر مل سکے [illegible] حوالہ ہو۔ مالیت کا اندازہ ہو اور ایک رنگین تصویر ہو۔ پہلے [illegible] طرح ریکارڈ رکھنے کی ضرورت کسی نے محسوس نہیں کی تو اس کی بنیادی وجہ یہی ہو سکتی تھی کہ مالک خود یہاں موجود ہوتے تھے اور ان کے نمک خوار ملازم جانو بابا جیسے لوگ تھے چنانچہ کسی چیز کے گم ہونے کا سوال ہی نہ تھا مگر اب ایسا نہیں تھا۔ وقت انیسویں اور بیسویں صدی کی مسافت طے کر کے اکیسویں صدی تک پہنچ گیا تھا اور اس سفر میں بہت کچھ پیچھے رہ گیا تھا۔ ایمانداری' وضع داری' مروت' رشتوں کا احترام۔

اب مجھے اکبر خان کا غائب ہو جانا بھی معنی خیز لگ رہا تھا۔ چابیاں پہلے ہی نہیں مل رہی تھیں اور اب وہ خود نہیں مل رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ شام تک ہم ضرور لوٹ جائیں گے پھر ہم کب آئیں گے۔ یہ غیر یقینی تھا۔ درمیان کی مدت میں اکبر خان کچھ بھی کرنے کے لیے آزاد تھا کیونکہ جانو بابا بیمار اور معذور تھا۔ اکبر خان کو روکنے والا کوئی نہ تھا۔

میں نے فیصلہ کیا کہ اکبر خان سے چابیاں واپس لے کر کبیر خان کو مکمل نگرانی کے اختیارات دے دوں گا۔ ضرورت ہوئی تو اسے اپنا یا راجا کا ریوالور بھی فراہم کر دیا جائے گا اگر اکبر خان اپنی دوسری بیوی کے ساتھ جہلم چلا گیا تھا تو اس کے شام تک واپس آنے کا کوئی امکان نہ تھا لیکن میرا دل کہتا تھا کہ وہ ایسی بے وقوفی نہیں کر سکتا جو اس کا ناقابل معافی جرم بن جائے۔

اکبر خان کی تلاش مجھے اس دفتر کی طرف لے گئی جس کی نشاندہی اکبر خان کی بیوی فاطمہ نے کی تھی۔ شہناز میرے ساتھ سنبھل سنبھل کر سبزی کے کھیتوں کی درمیانی منڈیر پر چلتی رہی۔ اس نے اونچی ایڑی کی سینڈل کبھی استعمال نہیں کی تھی کیونکہ وہ دراز قد تھی اور ہائی ہیل کے ساتھ راجا سے ایک دو انچ زیادہ لمبی لگتی تھی۔ جہاں سبزی کے کھیت ختم ہوتے تھے وہاں سے گندم کی کاشت کا علاقہ شروع ہوتا تھا۔ اکتوبر میں فصل کاٹی جا چکی تھی اور اگلی فصل سے پہلے یہاں سبزی اگانے کے لیے زمین کو ہل چلا کے چھوڑ دیا گیا تھا۔ صبح جو عورتیں بچے یہاں کام کر رہے تھے انہوں نے جھاڑ جھنکاڑ اور جڑیں وغیرہ نکال کے زمین صاف کر دی تھی۔ اگلے مرحلے میں کھاد پڑتی تھی اور پھر ہموار قطعے بنا کے موسم سرما کی سبزیوں کے بیج لگائے جاتے تھے۔

شیشم کے گھنے جنگل میں نظر آنے والی سفید عمارت تک پہنچنے میں میرے اندازے سے زیادہ فاصلہ طے کرنا پڑا۔ جب میں نے پلٹ کے دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے حویلی اور اس کے اردگرد کی زمین پر بھی پہلے جنگل ہی ہوگا۔ درخت صاف کر کے حویلی کی تعمیر کے لیے جگہ نکالی گئی تھی۔ بعد میں مزید درخت کاٹے گئے تھے۔ اب تقریباً دس ایکڑ پر حویلی کے ملازمین کا قبضہ تھا۔ اس پر وہ جتنی گندم اگاتے تھے' وہ سال بھر استعمال کرتے تھے۔ دیگر ضروریات کے لیے سبزیوں کی فروخت سے ہونے والی آمدنی کا سہارا تھا۔ حویلی کے اندر رہنے والوں کی تعداد کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ ان کے گزارے کے لیے آمدنی کم نہیں ہو سکتی اور ان کے حالات اتنے سخت بہرحال نہیں ہیں جتنے نظر آتے ہیں یا وہ ظاہر کرتے ہیں تاہم وہ خوشحالی سے دور تھے اور جاہل تھے۔

درختوں میں گھری ہوئی عمارت ایک بیرک جیسی تھی۔ اس کی طوالت سو سوا سو فٹ تھی اور چوڑائی چالیس فٹ۔ مضبوط دیواروں اور پختہ چھت والی اس عمارت کو تعمیر ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ دیکھنے میں یہ عمارت آفس سے زیادہ گودام لگتی تھی کیونکہ اس کے پچھلے حصے میں لمبائی کے رخ ایک بھی کھڑکی نہ تھی۔ سامنے والے حصے میں بھی دروازہ ایک ہی تھا اور اس کے ساتھ دو کھڑکیاں۔

سامنے کے رخ پر ایک برآمدہ پوری بیرک کی لمبائی کے رخ پھیلا ہوا تھا۔ کھڑکی دروازے سب بند تھے اور مکمل خاموشی کسی بھی انسان کی عدم موجودگی کا پتا دیتی تھی۔ عمارت کے چاروں طرف خاردار تاروں کی باڑھ تھی جس کی اونچائی آٹھ فٹ تھی۔ چار چار انچ کے فاصلے پر لگائے جانے والے تار فولادی کھمبوں سے منسلک

[illegible] ایک کھمبے سے دوسرے کا فاصلہ تقریباً دس فٹ تھا۔ تمام تار [illegible] ٹائٹ تھے اور ان کے درمیان سے کسی کے گزرنے کے [illegible] کو ختم کرنے کے لیے تاروں کا ایک سلسلہ اوپر سے نیچے بھی [illegible] تھا۔ اس طرح پوری باڑھ میں چار انچ چوڑے اور لمبے خانے [illegible] بن گئے تھے۔

یہ حفاظتی انتظام مجھے غیر معمولی لگا۔ مزید یہ کہ ہر کھمبے پر ممنوعہ [illegible] کی تختی بھی آویزاں تھی اور انگریزی اردو میں بھی یہ لکھ دیا گیا تھا کہ بلا اجازت اندر داخل ہونے والے کو گرفتار کر لیا جائے [illegible] مضحکہ خیز بات یہ تھی کہ گرفتار کرنے والا کوئی نظر نہ آتا تھا۔ [illegible] داخلے کا واحد راستہ ایک فولادی گیٹ تھا جو سیمنٹ کے دو مضبوط ستونوں پر قائم تھا۔

بیرک کی چھت پر چاروں طرف روشنی پھیلانے والی بڑی بڑی سرچ لائٹس نصب تھیں۔ یہ میرے لیے بڑی حیرانی کی بات تھی کہ حویلی سے صرف دو فرلانگ کے فاصلے پر بجلی موجود تھی۔ اس کے لیے کھمبے لگا کے نہ جانے کہاں سے لائن فراہم کی گئی تھی لیکن حویلی میں بجلی نہیں تھی۔ مجھے یہ بتایا گیا تھا کہ جو لائن ٹیوب ویل چلانے کے لیے دی گئی تھی' وہ بھی بعد میں کاٹ دی گئی تھی۔ اس کی جگہ ڈیزل جنریٹر لگایا گیا تھا مگر پہلے تو ڈیزل کی عدم فراہمی کے باعث وہ بند پڑا رہا اور پھر چوری ہو گیا۔

ابھی تک اس دفتر میں ہونے والے کام کی نوعیت کا مجھے علم نہیں تھا جس کے لیے عمارت میری زمین پر بنا لی گئی تھی۔ لندن میں میرے دادا عقیل احمد نے اس کا کوئی ذکر نہیں کیا تھا شاید وہ خود بھی اس کی موجودگی سے بے خبر تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ تعمیر ناجائز تھی۔ اس کے لیے قانونی مالکوں سے کوئی اجازت نہیں لی گئی ہوگی اور اگر کسی نے پیسا لے کر اجازت دے دی تھی تو اس کی کوئی قانونی حیثیت نہیں بنتی تھی۔ زمین پر قبضہ کر کے ایک غیر قانونی عمارت کھڑی کر لی گئی تھی تو مجھے پورا اختیار حاصل تھا کہ میں اسے گرا دوں۔

لیکن اپنے تمام اختیارات کے باوجود میں اتنا بے اختیار تھا کہ اس عمارت میں قدم نہیں رکھ سکتا تھا جو میری زمین کا ایک حصہ تھی۔ عقل یہ کہتی تھی کہ یہاں کوئی سرکاری دفتر نہیں ہو سکتا۔ سرکاری دفاتر یوں زمین پر ناجائز قبضہ کر کے نہیں بنائے جاتے۔ اس کے لیے ضابطے کی ایسی کارروائی ہوتی ہے جس میں زمین کی خرید سے تعمیر کے ٹھیکے دینے تک ان گنت مراحل آتے ہیں۔ یہ سب نہ ہوں تو کوئی عمارت کرائے پر حاصل کر لی جاتی ہے۔ اس کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ یہاں کون سا سرکاری دفتر ہو سکتا ہے۔ میری جاگیر پر نہ محکمۂ جنگلات کا عمل دخل تھا اور نہ محکمۂ زراعت کا۔ یہاں نہریں نہیں تھیں کہ آب پاشی والے آ جاتے اور شکار نہیں تھا کہ وائلڈ لائف والے دخل دیتے یہ معاملہ یقیناً کچھ اور تھا۔

گیٹ کے سامنے سے ایک کچا راستہ مخالف سمت میں جاتا نظر آ رہا تھا۔ آگے جا کے یہ راستہ درختوں میں گم ہو گیا تھا۔ اس پر آنے جانے والی گاڑیوں کے نشانات بہت واضح تھے۔ مسلسل آمد و رفت کے باعث ہموار زمین کی جگہ نرم تھی اور دھول نے لے لی تھی۔ بارش میں یہ دھول جب پانی سے ملی تھی تو کیچڑ بنا تھا اور اس میں سے گزرنے والی گاڑیوں نے گہری نالیاں سی بنا دی تھیں۔

شہناز نے بڑی ثابت قدمی سے میرا ساتھ دیا تھا لیکن اب وہ تھکن کا شکار نظر آتی تھی۔ اس کا بار بار کلائی کی گھڑی دیکھنا دلی اضطراب کو ظاہر کرتا تھا۔ راجا کی واپسی کا متوقع وقت قریب تھا اور شہناز نے انتظار میں کاؤنٹ ڈاؤن شروع کر دیا تھا۔ اب وہ واپس جانا چاہتی تھی۔

میں نے کہا "یہاں کے معاملات کی ایک دن میں سمجھ نہیں آ سکتی۔ اس کے لیے مجھے پھر آنا ہوگا بہت جلد۔"

آپ آنے کی بات کر رہے ہیں' آپ تو اب یہیں رہیں گے۔ آپ کے تو بڑے لمبے چوڑے پلان ہیں" شہناز نے کہا۔

"ہاں، اللہ نے چاہا تو وہ سب پورے ہوں گے۔ پہلے میں اس جگہ کا کنٹرول تو حاصل کر لوں۔ ابھی تو یوں لگتا ہے کہ اس زمین کو لاوارث سمجھ لیا گیا تھا۔ معلوم نہیں یہاں کون کیا کر رہا ہے۔ مثلاً اس عمارت ہی کو دیکھو۔ اکبر خان یہاں کیا کرتا ہے۔"

"اس کی بیوی نے کہا تھا کہ وہ چوکیدار ہے۔"

"ایک شخص جو بیساکھی کے سہارے چلتا ہو۔ وہ کیا چوکیداری کرے گا اور اسے چوکیدار کس نے رکھا ہے؟ کس کام کے لیے۔ یہ دفتر کس نے قائم کیا ہے اور کس کی اجازت سے۔ مجھے اپنے وکیل فاروقی سے پوچھنا پڑے گا کہ کیا یہ زمین جس پر عمارت کھڑی ہے کسی کو فروخت کی گئی تھی یا لیز پر دی گئی تھی۔ ایسی بات ہوتی تو وہ مجھے بتانا نہ بھولتا۔ اس کے علاوہ...... یہ جگہ وسط میں ہے اگر زمین کا کوئی قطعہ کسی کو دیا جائے گا تو وہ باہر ہوگا' کسی کنارے پر۔"

"یہ معاملہ واقعی مشکوک ہے" شہناز نے کہا۔

میں نے کہا "اب تم یہ دیکھو۔ یہ میری زمین ہے۔ اس پر بجلی کے کھمبے لگائے گئے ہیں لیکن حویلی میں بجلی نہیں ہے۔ مجھے تو کسی سے اجازت لینے کی بھی ضرورت نہیں۔ یہاں سے میں جہاں تک چاہوں لائن لے جا سکتا ہوں۔"

شہناز نے کچے راستے کی طرف اشارہ کیا "یہ راستہ آخر کدھر جاتا ہے۔"

"یہ ضرور کسی سڑک سے جا ملتا ہوگا۔ میری جغرافیائی حس یہ کہتی ہے کہ ادھر سے کلر کہار تک کوئی سڑک ہوگی۔ وہاں سے

موڑ دے گزرتی ہے۔ آگے کوہستان نمک کا سلسلہ ہے۔ سالٹ رینج، کھیوڑہ یا پنڈ دادن خان ادھر ہی ہوں گے۔ آج وقت نہیں ہے اور پھر جلدی کیسی، سب معلوم ہو جائے گا۔ اکبر خان مل جاتا تو اس سے پوچھا جا سکتا تھا۔"

"مجھے اس عورت پر بھی شک ہے، وہ اکبر کی بیوی نہیں لگتی۔"

"میں نے کہا، معاملات الجھے ہوئے ہیں۔ مجھے بہت جلدی واپس آنا چاہیے۔ سب سے پہلے میں یہاں اپنی سکیورٹی کا انتظام کروں گا۔ جاگیر کی حدود کے ساتھ ساتھ مسلح افراد کا گشت ہونا چاہیے۔ دو چار گارڈ حویلی میں رہیں گے۔ میری اتھارٹی اسی طرح قائم ہو گی پھر یہاں بجلی کی سپلائی ہونی چاہیے۔ فوری طور پر ...... دیگر معاملات اس کے بعد۔ کسی پلان کے مطابق، پہلے کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے۔"

اب شام کے چار بج رہے تھے۔ راجا ابھی تک نہیں لوٹا تھا اور شہباز کچھ نروس ہو رہی تھی۔ سورج مغرب کی جانب ڈھلنے سے پہاڑی کی اوٹ میں چلا گیا تھا اور پہاڑ کا سایہ گردونواح کے جنگل میں روشنی پر یوں حاوی آ رہا تھا کہ سہ پہر پر غروب کے وقت کا گماں ہوتا تھا۔ ہم شکستہ فصیل کی طرف سے حویلی میں داخل ہوئے ہی تھے کہ مجھے سامنے سے اکبر خان صدر دروازے سے گزر کر اپنی طرف آتا نظر آیا۔ اس وقت بھی بیساکھی اس کی بغل میں تھی۔

میں نے اپنے غصے کو کنٹرول رکھتے ہوئے پوچھا "اکبر خان، تم کہاں چلے گئے تھے۔"

اس نے معذرت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا "وہ جی، نور جہاں کو گھر چھوڑنے گیا تھا۔"

میں نے انجان بن کے کہا "اچھا؟ کیا وہ اس گھر میں نہیں رہتی۔"

"وہ کیسے رہ سکتی ہے یہاں سر! صرف آپ کے آنے کا سن کے آ گئی تھی۔ وہ جہلم میں رہتی ہے۔"

"آئی کیسے تھی اور گئی کیسے؟" شہباز نے کہا۔

"صبح سبزی لے جانے والی گاڑی آئی تھی۔ اس میں ٹیلا جوگیاں گئی، وہاں سے ویگن میں دینہ...... اور پھر بس سے جہلم۔"

میں نے کہا "اکبر خان ...... وہ چابیاں ملیں یا نہیں؟ میں سمجھتا تھا کہ تم ذمے دار آدمی ہو۔"

اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا "یہ رہیں چابیاں سر!"

اس سے پہلے کہ میں چابیاں لیتا، شہباز نے ہاتھ بڑھا دیا "یہ کس کے پاس تھیں۔ تم نے کہا تھا کہ بیوی نے اٹھا لی ہوں گی، کیا یہ نور جہاں کے پاس تھیں؟"

میں نے کہا "فاطمہ کے پاس تو نہیں تھیں، ہم نے پوچھا تھا۔"

وہ بولا "میں خود ہی ایک جگہ رکھ کے بھول گیا تھا۔"

میں نے کہا "چابیاں نہ ملنے کی وجہ سے ہم کچھ نہیں کر سکے۔ میں چاہتا تھا کہ جو کمرے بند پڑے ہیں، کھول کر دیکھوں۔ اندر کیا ہے، کیا نہیں ہے؟"

"جو تھا وہ سب ہو گا سر!" اکبر نے کہا۔

میں نے کہا "مگر مجھے تو علم نہیں کہ کیا تھا۔ کیا تمہیں کچھ معلوم ہے؟ اس حویلی کے قیمتی ساز و سامان کا کہیں اندراج ہے۔ اسٹاک رجسٹر وغیرہ میں کوئی اندراج ہے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "بابا نے کبھی ذکر نہیں کیا۔"

میں نے کہا "او کے۔ اب ہم باری باری ہر کمرے کو چیک کریں گے۔ کلر تصاویر لیں گے اور کیٹلاگ بنائیں گے۔ اس کے بعد ذمے داری کسی کیئر ٹیکر کو سونپی جائے گی۔"

اس نے کہا "لیکن آپ تو شام کو واپس جا رہے ہیں۔"

میں نے سکون سے جواب دیا "میں اپنا پروگرام بدل بھی سکتا ہوں۔ اس کے علاوہ آج جانے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ میں برسوں نہیں آؤں گا۔ جیسے کہ پہلے والے مالک کرتے رہے۔ میری رہائش یہاں ہو گی تو مجھے مختلف کاموں کے لیے عملہ درکار ہو گا۔ ابھی تک تو کام جیسے تیسے چل رہا تھا مگر آگے میرے کچھ پلان ہیں۔ میرا اسکریٹری، شوفر، سکیورٹی گارڈ اور گھریلو ملازمین سب تنخواہ دار ہوں گے۔ اکبر خان، تم نے بتایا تھا کہ تمہاری یہ ٹانگ سن اکہتر کی جنگ میں ضائع ہوئی تھی۔"

یہ سوال اچانک کیا گیا تھا، وہ چونک پڑا "یس ...... یس سر!"

میں نے کہا "پینتیس سال پہلے تمہاری کیا عمر تھی؟"

"میری عمر ...... اٹھارہ انیس سال سر!"

میں نے کہا "تم سپاہی بھرتی ہوئے تھے، کتنا عرصہ رہے آرمی میں؟"

اس نے کہا "دو سال سر!"

"دو سال میں تم لانس نائیک یا نائک ہو سکتے تھے۔ جنگ میں کوئی کارنامہ سرانجام دیتے تو شاید حوالدار بن جاتے۔ تم دو سال بعد ہی میڈیکل گراؤنڈ پر فوج کی ملازمت سے فارغ کر دیے گئے تھے۔ کیا دو سال میں نائب صوبے دار کے عہدے تک پہنچ سکتا ہے۔"

اکبر کا رنگ اڑ گیا تھا۔ وہ کچھ دیر بعد بولا "وہ ...... دراصل سر! گھر والوں کو اور دوسرے لوگوں کو متاثر کرنے کے لیے ...... جھوٹ بولا تھا۔"

میں کچھ دیر اسے نظر جما کے دیکھتا رہا "اگر تم سچ نہ بتاتے تو میں تم سے پنشن بک طلب کرتا۔ ایک بات آج ہی سمجھ لو یہاں لوگ بات بے بات جھوٹ بولتے ہیں۔ کسی وجہ اور مقصد کے بغیر جھوٹ بولتے ہیں لیکن میں نے باہر یہ دیکھا ہے کہ جھوٹ کو سب

بڑی خرابی، قابل نفرت عادت اور بہت سنگین اخلاقی جرم سمجھا ہے۔ یہ نہیں کہ چار چھ سال باہر رہ کے میں انگریز بن گیا ہوں۔ میں سو فیصد پاکستانی ہونے پر فخر کرتا ہوں مگر جھوٹ کسی صورت برداشت نہیں کر سکتا۔ صبح تم ڈاکٹر صاحبہ کو درویش کے مزار پر اٹھا کے لائے تھے؟"

"یس سر!"

"اس وقت تمہاری بیساکھی کہاں تھی؟"

خلاف توقع وہ نروس نہیں ہوا "وہ مجھے چھوڑنی پڑی تھی۔"

"کیا مطلب ...... تم اس کے بغیر بھی چل پھر سکتے ہو؟ بلکہ اٹھا سکتے ہو؟" میں نے کہا۔

اس نے پتلون کو تھوڑا سا اوپر اٹھایا "یہ دیکھیے ...... میری ... ٹانگ ہے۔ پنجہ ٹخنے کے پاس سے الگ ہو گیا تھا۔"

میں نے اس کی ٹانگ کو اور جوتوں کو غور سے دیکھا "مصنوعی ... کے ساتھ بیساکھی کیوں استعمال کرتے ہو؟"

"احتیاط کرتا ہوں سر! اونچی نیچی جگہ پر بیلنس بگڑ جائے تو ... سے سنبھل جاتا ہوں۔ مصنوعی ٹانگ قدرتی جیسی تو نہیں ..."

"رائٹ، پھر تم نے ڈاکٹر صاحبہ کو اٹھانے کا رسک لے کر غلطی کی۔ تم خود بھی گرتے اور ڈاکٹر صاحبہ کو بھی گراتے۔ تمہیں ... تھا کہ ہمیں اطلاع دیتے۔ تم کسی دفتر میں چوکیداری کرتے ..."

یہ سوال پھر کچھ غیر متوقع تھا۔ وہ پھر چونکا "ہاں جی ...... کچھ ... ہو جاتی ہے۔"

میں نے کہا "کیا کام ہوتا ہے اس دفتر میں؟"

"مجھے معلوم نہیں سر! میں اندر نہیں جا سکتا۔ باہر گیٹ پر موجود ... ہوں۔"

میں نے کہا "آج تم گیٹ پر نہیں تھے۔ دفتر بھی بند تھا۔ کتنے ... کام کرتے ہیں وہاں؟"

"تین چار لوگ ہیں سر!"

"اچھا۔ کب آتے ہیں؟ ان سے ملنا چاہتا ہوں میں۔"

اکبر نے کہا "ان کے آنے کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے سر!"

میں نے کہا "میری زمین پر یہ آفس کس کی اجازت سے ... کیا گیا ہے؟"

"یہ میں نہیں جانتا سر! انہوں نے کہا کہ یہ ٹاپ سیکرٹ ... کا معاملہ ہے۔ حکومت جس کی زمین چاہے لے سکتی ہے۔ ... مالک آئیں گے تو ان سے اعلیٰ حکام خود بات کر لیں گے۔"

"کب ہوئی تھی یہ بات۔ کس نے کی تھی؟"

"جانو بابا نے پوچھا تھا۔ جب انہوں نے تعمیر شروع کی۔ انہوں نے کہا کہ اسلام آباد جا کے اعلیٰ حکام سے پوچھو۔"

"اس علاقے کے پٹواری، نائب تحصیل دار، پولیس چوکی یا تھانہ انچارج۔ تم نے کسی کو رپورٹ نہیں کی؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"کی تھی سر! انہوں نے کہا کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔"

"پھر انہوں نے تمہیں ملازمت پیش کی اور تم نے قبول کر لی۔ کوئی اپائنٹمنٹ لیٹر ملا تھا تمہیں؟ کون سا گریڈ ملا ہے؟"

وہ گھبرانے لگا۔ "یہ کچی نوکری ہے سر! انہوں نے کہا کہ ہم پندرہ سو مہینا دیں گے۔"

میں نے سر ہلا کے کہا "ٹھیک ہے، میں سب معلوم کر لوں گا کہ یہ کیا چکر ہے۔ آخر میری اجازت کے بغیر یہاں دفتر بنا کیسے؟ اور غضب خدا کا ...... بجلی کی لائن ڈالی گئی، کھمبے لگائے گئے۔ یہ سرکاری زمین تو نہیں تھی۔ تم فی الحال وہیں ملازمت جاری رکھو۔ یہاں کی نگرانی میں تمہارے بیٹے کبیر کے سپرد کر رہا ہوں۔"

پریشانی کے آثار اکبر کے چہرے پر عیاں ہو گئے "سر! میں وہ ملازمت چھوڑ دوں گا۔"

"اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ میرے لیے تم موزوں نہیں رہے۔"

"لیکن کیوں سر!"

میں نے کہا "میں وجہ بتانے کا پابند تو نہیں ہوں مگر تم جاننا چاہتے ہو تو سن لو۔ ایک وجہ تمہاری فٹنس ہے۔ مجھے سو فیصد فٹ آدمی کی ضرورت ہے۔ مجھے جھوٹ سے نفرت ہے اور تم ایک بہت بڑے جھوٹ کو پینتیس سال سے چلا رہے ہو۔"

جو سوال میں پوچھنا نہیں چاہتا تھا، شہباز نے پوچھ لیا "یہ عورت نور جہاں، کیا واقعی یہ تمہاری بیوی ہے، مجھے تو یہ بھی جھوٹ لگتا ہے۔"

اکبر کی صورت کے تاثرات بڑی تیزی سے بدلے "یہ میرا ذاتی معاملہ ہے؟"

میں نے کہا "بالکل ہے۔ تمام معاملات ذاتی ہی ہوتے ہیں اکبر خان، جن میں انسان جھوٹ کا سہارا لیتا ہے۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ نور جہاں کون ہے ...... اب تم جا سکتے ہو۔"

اچھی بات یہ ہوئی کہ اس وقت ایک سوزوکی ہائی روف گاڑی غراتی ہوئی اندر آ گئی۔ اس میں آگے ڈرائیور کے ساتھ راجا بیٹھا ہوا تھا۔ پچھلا دروازہ کھول کے کبیر خان باہر آیا۔ اس کے پیچھے ایک مکینک ٹائپ شخص تھا۔ وہ بڑی مستعدی کے ساتھ ہماری کار کے ٹائر کھولنے اور بدلنے میں مصروف ہو گیا۔

راجا کو دیکھ کے شہباز کے چہرے کی رونق بحال ہو گئی تھی۔

"پانچ بجے تک ہم نکل سکتے ہیں رفیق بھائی!"

راجا نے کہا ''ہاں' ایک ڈیڑھ گھنٹے میں ہم روہتاس پہنچ گئے تو آگے راستہ صاف ہے۔ تم لوگ دن بھر کیا کرتے رہے۔ حویلی کی مالکن کیا ڈاکٹر شہناز ہو گئی ہیں۔ چابیاں تو اکبر خان کے پاس تھیں۔''

میں نے کبیر خان کو چائے بنوانے کی خدمت پر مامور کیا اور مختصراً راجا کو دن بھر کی روداد سنادی۔

وہ متفکر ہو گیا ''حالات مخدوش ہیں فیکے پتر!''

شہناز نے کہا ''رفیق بھائی! یہ چابیاں بھی ڈپلی کیٹ ہیں۔''

میں اچھل پڑا ''ڈپلی کیٹ!''

''جی..... آپ خود ہی دیکھ سکتے ہیں'' اس نے چابیاں مجھے تھما دیں۔

میں نے چابیوں کو غور سے دیکھا ''ڈاکٹر صاحبہ! میں آپ کی تشخیص سے بالکل اتفاق نہیں کر سکتا۔ یہ وہی چابیاں ہیں۔''

شہناز نے کہا ''رفیق بھائی! میں نے دیکھا تھا۔ ان چابیوں کو ایک ساتھ باندھنے کے لیے سفید ڈوری استعمال کی گئی تھی۔ وہ ڈبل تھی' یہ سنگل ہے۔''

میں نے کہا ''اس کا مطلب ہے ڈوری کے دو حصے کیے گئے۔ آدھا پھر چابیوں کو باندھنے میں استعمال ہوا۔''

راجا نے کہا ''باقی آدھا چابیوں کے دوسرے سیٹ کو باندھنے کے کام آیا۔ تمہاری قوت مشاہدہ زبردست ہے شنو۔''

میں نے کہا ''چابیوں کو کھولنے کی ضرورت اسی لیے محسوس کی گئی کہ ڈپلی کیٹ بنوانی تھیں۔ بظاہر چابیاں ایک سی ہیں مگر اب شک کی بات نہیں رہی۔ صبح سے اکبر خان اسی لیے غائب تھا کہ وہ چابیاں بنوانے کے لیے شہر گیا ہوگا۔ خیر' اب میں بندوبست کر لوں گا۔''

''ڈپلی کیٹ چابیوں سے اکبر کچھ کر سکتا ہے۔''

میں نے کہا ''میں کبیر خان اس کے بیٹے کو نگرانی پر مامور کر کے جاؤں گا۔''

راجا نے نفی میں سر ہلا دیا ''وہ باپ کو کیسے روکے گا؟''

میں نے کہا ''اگر نیت ٹھیک رہی تو روک لے گا۔ اس کے مقابلے میں اکبر خان بوڑھا ہے اور معذور ہے۔ میں اسے اپنا ریوالور دے جاؤں گا کہ جو ادھر گڑبڑ کرے اسے گولی مار دے بلا تکلف۔''

''فیکے پتر! بیٹا کیسے گولی مارے گا باپ کو۔ ایسا صرف فلموں میں ہوتا ہے۔''

میں نے کہا ''مہاراجا..... اب کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔''

جب تک ہم چائے پی کر فارغ ہوئے راجا کے ساتھ آنے والے مکینک نے چاروں کٹے ہوئے ٹائروں کی جگہ نئے ٹائر لگا دیے۔ راجا نے بتایا کہ اس کی ورکشاپ وغیرہ کچھ نہیں [...] اصل میں تو وہ سوزوکی ڈرائیور کا بھائی تھا اور وہ دونوں مل کے گاڑی چلاتے تھے اور ایک دوسرے کے معاون تھے۔ برسوں سے یہ کام کرتے کرتے انہیں چھوٹی موٹی خرابی خود ہی دور کرنا آ گیا تھا۔

اب ہم واپسی کے لیے تیار تھے۔ گڑبڑ اس وقت ہوئی جب ہم گاڑی میں بیٹھ گئے اور میں نے چابی گھمائی تو کوئی آواز سنائی [...] گاڑی کی بیٹری نئی تھی اور ایک طویل سفر کے بعد پوری طرح چارج ہو چکی تھی۔ صرف چوبیس گھنٹے میں بیٹری ڈیڈ نہیں ہو سکتی تھی۔ بیٹری کمزور ہونے کی صورت میں سیلف آہستہ آہستہ گھومتا یا پھر کٹ کٹ کی آواز کے سوا کچھ سنائی نہ دیتا۔ ابھی تو ڈائل پر وہ نشانات بھی روشن نہ تھے جو چابی لگاتے ہی نمودار ہو جاتے ہیں۔ بیٹری' آئل' ہینڈ بریک یا دروازہ ٹھیک سے بند نہ ہونے کے۔ میں نے ہارن دبایا' ہارن خاموش رہا تو میں نے بونٹ کھولا اور سوزوکی ڈرائیور نے اندر جھانکا۔

چند سیکنڈ کے بعد اس نے سر ہلایا ''سر جی! ادھر تو معاملہ غائب [...] خراب ہے۔''

میں نے نیچے اتر کے پوچھا ''کیا بات ہے؟''

''آپ خود دیکھ لو۔'' اس نے کہا۔

میں نے انجن پر ایک نظر ڈالی اور سمجھ گیا۔ گزشتہ رات کی تخریبی کارروائی میں صرف ٹائروں کو ہی نقصان نہیں پہنچایا گیا تھا۔ انجن کو ناکارہ کر دیا گیا تھا۔ اس کے تمام تار کاٹ دیے گئے تھے۔ فین بیلٹ نیچے پڑی نظر آ رہی تھی۔ یہ کارروائی کرنے والا پوری تیاری کے ساتھ آیا تھا۔ اس کے پاس وائر کٹر ہی نہیں' فین بیلٹ کو کاٹنے کے لیے آری بھی تھی۔

سوزوکی ڈرائیور نے افسوس سے کہا ''کسی نے پکا کام کیا تھا سر جی! یہ گاڑی ٹھیک تو ہو جائے گی' آپ کو شہر سے مکینک اور سارا سامان لانا پڑے گا۔''

راجا نے پوچھا ''اسے باندھ کر نہیں لے جا سکتے؟''

سوزوکی ڈرائیور نے معذرت کی ''یہ بڑی گاڑی ہے جناب' سوزوکی کھینچ لیتی مگر اس راستے پر مشکل ہے' اترائی چڑھائی بہت ہے۔''

اس کے بھائی نے کہا ''ہمارے پاس نہ مضبوط رسی ہے اور نہ زنجیر۔ بریک بھی پتا نہیں لگتے ہیں یا نہیں؟''

ڈرائیور نے نیچے لیٹ کر دیکھا اور مایوسی سے سر ہلایا ''نامراد نے لائن ہی کاٹ دی ہے۔ کس نے کیا ہے جی یہ حرامی پنا!''

میں نے کہا ''جیسے ہی اس کا پتا چلا ہم اسے توپ دم کر دیں گے۔''

میں نے راجا اور شہناز کے ساتھ ایک ہنگامی میٹنگ کی ''یقین ہے راجا۔ ہم گاڑی چھوڑ کے جا سکتے ہیں لیکن میں اس [...] کے لیے میدان خالی چھوڑنے کا رسک نہیں لے سکتا جو مجھے [...] زدہ کرنا چاہتا ہے۔''

شہناز نے کہا ''آپ نے گاڑی بھی لاک نہیں کی تھی۔''

''میں نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ ورنہ سینٹرل لاک [...] الارم کو کوئی چھیڑتا تو شور سے مردے تک جاگ اٹھتے۔''

''اب تو کیا کرنا چاہتا ہے؟'' راجا بولا۔

میں نے مضبوط لہجے میں کہا ''تو شہناز کے ساتھ سوزوکی میں [...] جا۔ بے شک کل آ جانا' میں یہاں رکوں گا۔''

شہناز نے سخت مخالفت کی ''نہیں رفیق بھائی! آپ [...] اکیلے.....''

میں نے کہا ''نہیں' میں اکیلا ہرگز نہیں ہوں۔'' میں نے [...] جیب پر ہاتھ رکھا ہے۔ ایک ساتھی یہ بھی ہے۔ میں اس کے بغیر ہی [...] اپنی حفاظت خود کر سکتا ہوں اور وہ اوپر والا بھی تو ہے۔''

شہناز نے پھر کہا ''ہم ایسے نہیں جا سکتے۔''

میں نے کہا ''دیکھو..... تمہارا کلینک ہے۔''

راجا نے سوچ کے کہا ''صبح فریال آئے گی۔''

''اس کو ریسیو کرنے کے لیے ذاتی طور پر میرا ایئر پورٹ پر [...] موجود ہونا ہرگز ضروری نہیں۔ تو بھی نہ جائے تو فرق نہیں پڑتا۔ [...] اسے جہاں جانا ہوگا چلی جائے گی۔ اب میری بات غور سے سن۔ [...] ابھی ہم تینوں ایک ساتھ جائیں گے۔ پل کراس کرنے کے بعد [...] پہاڑی کے پیچھے میں اتر جاؤں گا اور اندھیرا ہونے کے بعد خاموشی [...] سے لوٹ آؤں گا۔ میرا خیال ہے آج رات ہی وہ مجرم پکڑا جائے [...] گا جس نے ہمارے لیے یہ پریشانی کے اسباب پیدا کیے ہیں۔ [...] اصل میں تو وہ خود ہمارے آنے سے پریشان ہے۔''

راجا نے مجھ سے اتفاق کیا ''ذرا ہوشیار رہنا۔ فیکے پتر!''

میں نے کہا ''تو فکر ہی نہ کر مہاراجا!''

روانگی سے پہلے میں جانو بابا سے رخصت لینے گیا۔ اس [...] وقت اصغر برآمدے میں جھوم رہا تھا اور ناچتے ہوئے گا رہا تھا۔ ''بڑی بری سرکار بری'' مگر کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔ اس کے پیروں میں بندھے ہوئے گھنگھرو چھن چھن کر رہے تھے اور وہ ایک لمبے موٹے ڈنڈے سے فرش پر تال دیتا جا رہا تھا۔ حضرت بری امام کا مزار اسلام آباد میں نور پور شاہاں میں ہے اور ان کے عقیدت مند ویسے تو ہر جگہ ملتے ہیں لیکن سطح مرتفع پوٹھوہار کے علاقے میں ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔

میں نے جانو بابا سے رخصت لیتے ہوئے یہ تاثر دیا کہ فوری طور پر میرا واپسی کا کوئی ارادہ نہیں ہے اور کچھ عرصے بعد میں [...] سارے انتظام کے ساتھ آؤں گا تو پھر یہیں قیام کروں گا لیکن ظاہر ہے انتظامات چند روز میں نہیں ہو سکتے۔

جانو بابا بہت اداس ہوا ''اچھا مالک۔ دیکھو اب اس دنیا میں ملاقات ہوتی ہے یا نہیں؟''

میں نے کہا ''ارے جانو بابا! ایسی باتیں مت کرو' تم سو سال جیو گے' سارے معاملات تمہیں سنبھالنے ہیں۔''

''میری تو بڑی خواہش تھی کہ آپ کی خدمت بھی کرتا۔ اب دیکھو زندگی کتنی مہلت دیتی ہے۔ ابھی تو میں اٹھ ہی نہیں سکتا۔''

میں نے کہا ''فکر مت کرو۔ تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے' چند دن کے علاج سے۔ گاڑی ٹھیک رہتی تو میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاتا۔''

''میری تو سمجھ میں نہیں آتا مالک! کس کمینے بدبخت نے آپ کی گاڑی کو نقصان پہنچایا۔ کس نے اتنی ہمت کی' مجھے پتا چل جائے تو اپنے ہاتھوں سے اس کو گولی مار دوں۔ میرے لیے بڑی شرم کی بات ہے۔ آپ سمجھتے ہو گے کہ ہم میں سے کوئی ہے' ٹھیک سمجھتے ہو آپ!''

میں نے کہا ''نہیں بابا! کل رات کوئی باہر سے آیا تھا' گاڑی میں۔ یہاں تو سب میرے خیر خواہ ہیں۔''

وہاں سب نے ہی برآمدے سے مجھے' راجا اور شہناز کو سوزوکی میں بیٹھ کے روانہ ہوتے دیکھا۔ صرف کبیر دروازے پر موجود تھا۔ میں نے اسے بتا دیا کہ دو چار دن میں کوئی مکینک پورے سامان کے ساتھ آئے گا اور گاڑی کو ٹھیک کر کے لے جائے گا۔''

سوزوکی پل پر سے گزری تو آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ پہاڑی کا موڑ کاٹنے کے بعد ایک جگہ میں اتر گیا۔ شہناز میرے فیصلے سے بہت پریشان تھی۔ میں نے اسے تسلی دی کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ راجا نے پھر مجھے محتاط رہنے کی تلقین کی پھر سوزوکی غائب ہو گئی۔ میں کچھ دیر کچے راستے پر کھڑا رہا پھر آہستہ آہستہ واپسی کے راستے پر چل پڑا۔

صورت حالات کی ایک مبہم سی تصویر میرے سامنے آ چکی تھی۔ اس میں سب سے مشتبہ کردار اکبر خان کا ہی بنتا تھا لیکن وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے پیچھے کوئی اور بھی تھا۔ رانا رجب علی کی پوزیشن مجھے ان معاملات میں ملوث نہیں لگتی تھی۔ اکبر خان کی حیثیت بھی کچھ نہیں تھی۔ اس کی پشت پناہی کرنے والے وہ لوگ تھے جو سرکاری دفتر کے نام پر میرے ہی علاقے میں کوئی غلط کام کر رہے تھے۔ انہوں نے بہت محفوظ مقام کا انتخاب کیا تھا۔ ست بدھائی کے مالک اور وارث حادثات اور آفات کا شکار رہے تھے۔ حویلی کچھ عرصہ آباد رہتی تھی اور پھر ویران ہو جاتی تھی۔ اس کی نحوست ایک درویش کی بددعا سے منسوب تھی مگر اس کی ڈیڑھ

سوسال کی تاریخ پُرآشوب واقعات کا مجموعہ تھی۔

نصف صدی گزر گئی تھی اور ست بدھائی کی جاگیر اور حویلی کو کسی نے آباد نہیں کیا تھا۔ اس کا آخری مالک چالیس سال مفلوج اور گمنام ہزاروں میل دور ولایت میں کسی زندہ لاش کی طرح پڑا رہا۔ جب وہ پھر زندگی کی طرف لوٹا تو وہیل چیئر پر اس نے اپنی آبائی جاگیر تک صرف اپنا حق ملکیت ثابت کرنے کے لیے سفر کیا۔ وہ آیا اور اپنی زندگی کا ثبوت دے کر لوٹ گیا۔ دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اسی سال کا وہ بوڑھا اکیلا ہے اور اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ اس کی موت کے بعد یہاں کوئی اور مالک بن کر آئے۔

چنانچہ ست بدھائی کو لاوارث سمجھنے والوں نے اپنے پیر پھیلانے شروع کر دیے۔ یہ کون لوگ تھے اور ان کے عزائم کیا تھے۔ یہ بات چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ واپس جاتے ہوئے میں سوچتا رہا کہ آخر وہ کون لوگ ہوں گے؟ اسمگلر، منشیات فروش، ڈاکو، جعلی کرنسی کا غیر قانونی کاروبار کرنے والے، قبضہ گروپ یا پھر ملک دشمن عناصر۔ وہ چند لوگ ہوں گے یا ان کا کوئی گروپ ہوگا۔ پورا نیٹ ورک ہوگا یا بین الاقوامی گروہ۔ بھلا ان کا میرا کیا مقابلہ۔

پھر میں نے ان سب خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا جو بڑے حوصلہ شکن تھے۔ میں نے فرض کیا کہ قانون کی طاقت میرے ساتھ ہے۔ میں آسانی سے ان لوگوں کو اٹھا کے باہر پھینک دوں گا۔ یہ ٹھیک ہے کہ لاقانونیت کی طاقت رکھنے والوں کا جال مضبوط ہوتا ہے مگر میں بھی تنظیم کی سیاست میں رہ کے وہ سارے حربے سیکھ چکا ہوں جن سے معاملات کو دوسرے طریقوں سے سلجھانا ممکن ہو جاتا ہے۔ میں پاکستان میں جی سکتا ہوں۔ میں اس محاورے کو عملی طور پر درست ثابت کر سکتا ہوں کہ روم میں وہی کرو جو رومن کرتے ہیں۔ لوگ سیدھے چلتے ہوں تو سیدھے چلو، الٹے چلتے ہوں تو الٹے چلو۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا اصول چلتا ہو تو لاٹھی اٹھالو۔ ''گل'' یعنی بات گالی اور گولی جیسے بھی کوئی سمجھے اسے سمجھا دو۔

پل کے قریب پہنچ کر میں رک گیا۔ ابھی تاریکی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ آسمان ایک سلیٹی رنگ کی چادر کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ اسی جگہ میں نے گزشتہ روز کسی کا سایہ سا پہاڑی پر دیکھا تھا جو میری نظر پڑتے ہی غائب ہو گیا تھا۔ اس نے کندھے پر کچھ اٹھا رکھا تھا۔ راجا کے خیال میں وہ کوئی چرواہا تھا، جس نے ریوڑ کو ہانکنے والی لاٹھی اٹھا رکھی تھی۔ لیکن وہ چرواہا ہوتا تو اپنی جگہ کھڑا دیکھتا رہتا۔ کیا وہ اکبر خان تھا؟ اس کے کندھے پر جیسا کچھ تھی۔

کسی وجہ کے بغیر میں رک گیا اور میری نظر اسی جگہ گئی۔ وہ پھر وہاں موجود تھا اور اسی پوز میں لیکن جیسے ہی میں نے سر گھمایا وہ پہاڑی کے پیچھے غوطہ مار گیا۔ ایک نامعلوم خطرے کے احساس نے مجھے اپنا ریوالور نکالنے پر مجبور کر دیا۔ میں پلٹ کے اس پہاڑی کی طرف بڑھا۔ اوپر جانے کا کوئی راستہ واضح نہیں تھا۔ دن کے وقت شاید میں کوئی پگڈنڈی بھی تلاش کر لیتا۔ اس وقت اندھیرے میں مجھے اپنا راستہ خود بنانا پڑا۔ میں پیروں کو ناہموار زمین اور پتھروں پر جما کے کسی درخت کی شاخ یا جھاڑی کو پکڑ لیتا تھا اور اوپر چڑھ جاتا تھا۔

دس منٹ بعد ہی مجھے اپنی کوشش لاحاصل محسوس ہونے لگی۔ پہاڑی کی بلندی اتنی کم بھی نہیں تھی۔ اوپر پہنچنے میں مجھے کم سے کم ایک گھنٹا لگ جاتا۔ وہ جو بھی تھا، اب وہاں نہیں تھا اور یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ دوسری طرف دبک کر بیٹھا ہوا مل جائے۔ اگر وہ میرے تعاقب میں ہوگا تو کسی اور مورچے سے میری نقل و حرکت دیکھ رہا ہوگا۔

نیچے اتر کے پھر سڑک پر چلتے ہوئے میں نے خود کو قطعی غیر محفوظ محسوس کیا۔ پہاڑی کی بلندی سے میں کسی ماہر نشانہ باز کے لیے بالکل اوپن ٹارگٹ تھا۔ مجھے اطمینان سے نشانہ بنایا جا سکتا تھا۔ مگر ابھی تک مجھ پر کوئی فائر نہیں ہوا تھا۔ پھر وہ کیا چاہتا تھا؟ وہ میرے ساتھ یہ بلی چوہے کا کھیل کیوں کھیل رہا تھا؟ کہیں یہ محض میرا وہم تو نہیں تھا۔

پل عبور کر کے میں سیدھا حویلی کے دروازے سے اندر نہیں گیا۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ درویش کے مزار کی طرف چلنے لگا۔ دیوار تقریباً سو گز لمبی تھی۔ پھر موڑ آ جاتا تھا اور شمالی فصیل کے بیرونی حصے میں درویش کا مزار بھی شاید اتنے ہی فاصلے پر تھا۔ میں دیوار کے موڑ سے کچھ دور تھا جب میرے کانوں نے ایک آہٹ سنی۔ یہ کسی شاخ کے ٹوٹنے کے علاوہ کچھ گرنے کی آواز تھی۔ میں نے بے اختیار گھوم کے دیکھا مگر ہر سو مکمل تاریکی میں ساکت کھڑے جنگل کے سوا کچھ نہ تھا۔ سرِشام آشیانوں میں لوٹنے والے پرندے بھی اب خاموش تھے۔ کہیں کوئی صدا نہ تھی۔

میں نے الٹے پاؤں چلتے ہوئے باقی فاصلہ طے کیا اور پھر دیوار کی اوٹ میں کھڑا ہو گیا۔ اب میں دیوار کے کونے سے جھانکتے ہوئے پل تک کا منظر صاف دیکھ سکتا تھا۔ معلوم نہیں انتظار میں کتنا وقت گزرا لیکن عین اسی وقت جب میں ناامید ہو رہا تھا وہ اچانک میرے سامنے نمودار ہوا۔

وہ اندھیرے میں بہت احتیاط کے ساتھ آہستہ آہستہ قدم بڑھا رہا تھا۔ دشمن کو دیکھتے ہی میرے مقابلے کی صلاحیت جاگ اٹھی۔ جیسے فضائی حملے کا سائرن بجتے ہی جوابی حملے کا نظام متحرک ہو جائے۔ میں اس کے استقبال کے لیے پوری طرح تیار تھا۔

آٹھ دس فٹ کے فاصلے سے مجھے حریف کی طاقت کا اندازہ ہو گیا۔ وہ چھ فٹ سے کچھ کم اور صحت مند جسم کا مالک تھا۔ اس کے

[ہاتھ] میں کچھ بھی نہیں تھا۔ سوائے ایک خنجر کے جو اس نے بڑے [...]زی پن سے تھام رکھا تھا۔ میرا یہ خیال ایک واہمہ ثابت ہوا تھا کہ پہاڑی پر کھڑے ہوئے شخص کے ہاتھ میں رائفل تھی۔

وہ جیسے ہی میرے مقابل آیا میں نے اسے دبوچ لیا۔ میرا ایک ہاتھ اس کی کلائی پر شکنجے کی طرح جم گیا۔ ایک جھٹکے سے خنجر نیچے گر گیا اور میں نے اس کے بازو کو تھوڑا گھمایا تو وہ گھوم کے میرے سامنے آ گیا۔ میں نے ناپ تول کے اس کی گدی پر کان کے قریب بھرپور وار کیا تو وہ کوئی آواز نکالے بغیر ایسے گر گیا جیسے زلزلے سے کوئی پرانا ستون منہدم ہو جائے۔

میں اسے اٹھا کے درختوں میں چھپے ہوئے اس کمرے میں لے آیا جسے غنی اور ریشماں نے اپنی ہنی مون کا میچ بنا رکھا تھا۔ میں نے اسے فرش پر ڈال دیا اور اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگا۔ کمرے میں کچھ گھٹن محسوس ہونے لگی تو میں باہر آ گیا۔ اس [...] کوئی امکان نہ تھا کہ ہوش میں آنے کے بعد وہ فرار ہونے یا مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش کرے۔

ریشماں اچانک درختوں کی اوٹ سے ہلکے ہلکے گنگناتی اور اٹھلاتی نمودار ہوئی۔ جیسے ہی وہ قریب آئی، میں نے اسے دبوچ لیا۔ اس نے چیخ مارنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے اس پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''ریشماں! چلانے کی کوئی ضرورت ہے اور نہ ڈرنے کی۔ کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ میں یہاں موجود ہوں۔''

اس نے سمجھنے کے انداز میں سر ہلایا اور اس کی آنکھوں میں خوف کی وحشت کم ہوئی تو میں نے اسے آزاد کر دیا۔

''آپ...... آپ تو چلے گئے تھے مالک!'' اس نے اپنی سانس پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا ''ہاں۔ ظاہر میں نے ایسا ہی کیا تھا۔ یہاں کے کچھ معاملات ایسے تھے کہ مجھے یہ ڈراما کرنا پڑا۔ تم کیوں آئی ہو یہاں؟''

''وہ...... میں یہ دیکھنے آئی تھی کہ......''

میں نے کہا ''کیا غنی کو آج آنا تھا؟''

''اس نے کہا تو نہیں تھا لیکن بارہ دن ہو گئے ہیں۔ وہ کسی روز بھی آ سکتا ہے۔'' اس نے شرماتے ہوئے بتایا۔

میں نے کہا ''ذرا اندر جا کے دیکھو۔ کہیں وہ غنی تو نہیں ہے۔''

''کون......؟'' وہ چونکی۔

''جسے میں نے دشمن سمجھ کے اندر لٹا رکھا ہے۔ وہ بے ہوش ہے۔''

''ہائے اللہ۔'' اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کے ہلکی سی چیخ ماری اور اندر لپکی۔ میں کچھ خفت زدہ سا ریشماں کے پیچھے گیا مگر وہ اندر جاتے ہی رک گئی تھی۔ وہ پلٹی تو اس نے مجھے دیکھا ''نہیں مالک۔ یہ غنی نہیں ہے، کون ہے یہ؟''

میں نے اطمینان کا سانس لیا ''پتا چل جائے گا۔ یہ بتاؤ، تم میرے لیے کیا کر سکتی ہو؟''

اس نے کچھ وقت میرے سوال کو سمجھنے میں لیا ''آپ حکم کریں مالک!''

میں نے کہا ''تم بہت سمجھ دار لڑکی ہو۔ آج تم نے خود کو بھروسے کے قابل ثابت کر دیا تو کل تمہیں اس کا جو انعام ملے گا بہت بڑا ہوگا۔ تمہاری اور غنی کی زندگی اس سے بدل جائے گی۔ میں منہ مانگا انعام دوں گا۔''

اس نے زیادہ عزم کے ساتھ کہا ''آپ بتائیں مالک۔ مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

میں نے کہا ''تم یہاں روشنی کا بندوبست کر سکتی ہو؟ کوئی چھوٹی سی موم بتی لا دو یا مٹی کے تیل کا دیا۔ جس کی روشنی باہر دکھائی نہ دے یا ٹارچ ہو...... میں اس شخص کا چہرہ دیکھنا چاہتا ہوں۔''

وہ پلٹ کے باہر گئی۔ میں نے صندوق کھولے جانے کی آواز سنی پھر وہ ایک ٹارچ کے ساتھ نمودار ہوئی ''اور کچھ مالک؟''

میں نے کہا ''اگر ایک رسی مل جائے، جس سے میں ضرورت پڑنے پر اس کو باندھ کے ڈال سکوں۔''

''مالک!'' وہ جاتے جاتے رکی ''غنی کو آپ جیسا سمجھتے ہیں۔ وہ ایسا نہیں ہے۔ وہ دل کا بہت اچھا لڑکا ہے۔ وہ مجھے دھوکا نہیں دے سکتا۔ اس کا گھر کوئی نہیں ہے۔ گھر ہوتا تو وہ مجھے کب کا شادی کر کے لے جاتا۔ آپ کے پاس اللہ کا دیا بہت ہے۔ اتنی بڑی حویلی کے صدقے میں ہمیں ایک چھوٹا سا گھر دے دیں۔ ہم ساری عمر آپ کی غلامی کریں گے۔ آپ کو دعائیں دیں گے۔''

میں نے کہا ''ختم ہو گئی تمہاری بات؟ اب جاؤ، یہ تو وقت آنے پر ہی پتا چلے گا کہ تم خود کو چھوٹے سے گھر کا حق دار ثابت کرتی ہو یا بہت بڑے گھر کا۔''

وہ ہرنی کی طرح قلانچ بھر کے نکل گئی تو میں نے ٹارچ کا رخ فرش کی طرف رکھتے ہوئے روشنی کی۔ یہ درمیانے سائز کی ٹارچ تھی اور اس کے سیل بھی نئے نہیں تھے۔ فرش پر بننے والے دائرے کی روشنی مدھم رہی۔ میں نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کے روشنی کو اس شخص کے چہرے پر مرتکز کیا، وہ ابھی تک بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا۔

پھر میرے ذہن کو ایک زبردست جھٹکا لگا۔ روشنی میں اس چہرے کے نقوش ایک دم نمایاں ہو گئے۔ اس چہرے کو میں تیسری بار دیکھ رہا تھا، پہلی بار وہ مجھے پریس کلب میں نظر آیا تھا۔ دوسری بار میں نے اسے ایکسی ڈنٹ کے بعد دیکھا تھا۔ اس نے فائر کر کے

اگلے ٹائر کو پھاڑ دیا تھا۔ اور گاڑی الٹ گئی تھی لیکن میں بچ گیا تھا اور جب باہر نکلا تھا تو اپنی موٹر سائیکل پر چلا گیا تھا۔ میں نے اس چہرے پر نفرت کی تحریر صاف پڑھی تھی۔

وہ فرخندہ کا بھائی تھا۔ ایک بھولے بسرے رشتے سے میرا سالا مگر آج کے رشتے سے میرے خون کا پیاسا۔ میرے لیے یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ روزِ اول سے وہ سائے کی طرح میرے پیچھے لگا ہوا تھا اور تعاقب کرتا ہوا ست بدھائی تک آ گیا تھا۔ اگر اسے میری جان ہی لینی تھی تو وہ انتظار کیوں کر رہا تھا۔ اسلحہ اس کے پاس تھا اور وہ مجھے کہیں بھی شوٹ کر سکتا تھا۔ پھر اس نے موقع سے فائدہ کیوں نہیں اٹھایا تھا؟

میرا دماغ کنفیوز ہو رہا تھا۔ اب میرے سارے شکوک اس کی طرف منتقل ہو گئے تھے۔ کیا ٹائر اسی نے کاٹے تھے؟ کیا گاڑی کو اسی نے ناقابلِ استعمال بنایا تھا مگر آخر کیوں؟ اتنا تردد اس نے کیوں کیا تھا' اس سوال کا جواب وہ خود ہی دے سکتا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق آدھے گھنٹے میں اسے ہوش میں آ جانا چاہیے تھا مگر وہ ابھی تک ویسے ہی پڑا ہوا تھا۔ اب مجھے فکر ہونے لگی' شاید میری ضرب زیادہ قوت سے پڑی تھی یا پھر اس کی قوت برداشت کم تھی۔

بالآخر اس نے کراہ کر کروٹ لی اور کوشش کر کے اٹھ بیٹھا۔ اس نے اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام کے میری طرف دیکھا۔ اندھیرے میں بھی اس نے یہ دیکھ لیا ہوگا کہ سر پر کھڑے دشمن کو طاقت سے مغلوب نہیں کیا جا سکتا۔ میں اسے اٹھنے کی مہلت بھی نہ دیتا۔ حملہ کرنا تو دور کی بات ہے۔ پھر آہستہ آہستہ میں نے ریوالور نکالا۔ اس کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور نشانہ اس کے سر کی طرف کر دیا۔ ٹارچ میرے بائیں ہاتھ میں تھی۔ میں نے اسے روشن کر دیا۔

وہ کچھ دیر بے حس و حرکت بیٹھا رہا پھر بولا "انتظار کس بات کا کر رہے ہو۔ مار ڈالو مجھے بھی' چلاؤ گولی۔"

میں نے ریوالور اپنی جیب میں رکھ لیا "مگر تمہارے پاس کوئی وجہ تو ہوگی مجھ سے دشمنی کی۔ میں تو تمہیں جانتا بھی نہیں۔"

"جھوٹ بکتے ہو تم" وہ زہر آلود لہجے میں بولا۔

میں نے کہا "یہ سچ ہے' تمہاری صورت دیکھ کے میں صرف اندازہ کر سکتا ہوں کہ تم کون ہو۔ تم فرخندہ کے بھائی ہو نا......؟ تمہارے چہرے میں اس کی جھلک ہے لیکن اسے میں اپنی بدقسمتی ہی کہہ سکتا ہوں کہ نہ میں کبھی پہلے تم سے ملا' نہ کبھی تمہارا نام سنا۔"

"تم تو سب بھول گئے ہو گے لیکن میں نہیں بھولا اپنی بہن کی موت کو۔ وہ زخم آج بھی میرے دل کا ناسور ہے۔"

"کیا تم سمجھتے ہو اسے میں نے قتل کیا تھا؟"

"ہاں......تم ہو اس کے قاتل۔ سارا زمانہ جانتا ہے" وہ چلا کے بولا۔

میں نے کہا "اگر وہ تمہاری بہن تھی تو میری بیوی تھی لیکن یہ بات کسی کو بھی معلوم نہ تھی۔"

"بکواس بند کرو۔ تم اس کی عزت سے کھیلتے رہے اور جب ذمے داری قبول کرنے کا وقت آیا تو تم پیچھے ہٹ گئے۔ اسے بدنامی کا بوجھ اٹھانے کے لیے اکیلا چھوڑ دیا۔ خود اسے قتل کیا اور خودکشی بنا دیا۔ ہمیں دنیا میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ چھوڑا اور خود ملک سے بھاگ گئے۔ تم نے ہم سب کو مار دیا تھا لیکن میں بچ گیا تھا۔ خدا نے مجھے زندہ رکھا تھا۔ تم سے انتقام لینے کے لیے' انصاف کے لیے۔ مجھے سب معلوم ہو گیا تھا اور میں انتظار کر رہا تھا' تمہاری واپسی کا۔"

وہ انتہائی جذباتی ہو رہا تھا اور بات کرتے کرتے رونے لگا تھا۔ برسوں میں جمع ہونے والا نفرت کا لاوا تھا۔ اس نے مجھے گالیاں بھی دیں مگر میں خاموشی سے سب سنتا رہا۔

جب وہ خاموش ہو گیا تو میں نے کہا "دو باتیں ابھی تک تم نے نہیں بتائیں۔ ایک اپنا نام' دوسری یہ کہ موقع ملنے کے باوجود تم نے مجھے اب تک قتل کیوں نہیں کیا تھا؟"

"میں چاہتا تھا کہ پہلے تمہیں سامنے آ کے بتاؤں کہ تمہارا جرم کیا ہے' جس پر میں تم کو سزائے موت دے رہا ہوں......مرتے وقت تمہیں معلوم تو ہو کہ فرخندہ کے بھائی نے بالآخر اپنا بدلا لے لیا۔"

میں نے کہا "یعنی تم انصاف کے تقاضے پورے کیے بغیر مجھے مارتے تو یہ بھی قتل ہوتا۔ یہ تو اچھی بات ہے کہ تم نے انتقام میں بھی اصول کو نظر انداز نہیں کیا۔ تم نے میری فرد جرم سنا دی۔ کیا اب مجھے صفائی کا موقع نہیں دو گے؟ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تم نے اپنا فیصلہ برقرار رکھا تو میں اپنا ریوالور تمہیں دے دوں گا۔ میں اپنی سزا کو قبول کر لوں گا کیونکہ میرے لیے اپیل سننے والی کوئی عدالت نہیں۔ سوائے خدا کی عدالت کے۔ جب یوم سزا جزا آئے گا تو تمہیں بھی معلوم ہو جائے گا کہ تم نے بھی انصاف نہیں کیا تھا' قتل کیا تھا۔ کیونکہ تمہیں حقائق کا علم نہ تھا۔"

میری بات کا اثر ہوا' وہ خاموشی سے مجھے تکتا رہا۔

"اس سے پہلے کہ میں قتل کے الزام کا دفاع کروں۔ میں ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں جواب میرے دل میں کھٹک رہی ہے۔ تم نے کہا کہ مجھے میرا جرم بتائے بغیر تم مجھے قتل کرنا نہیں چاہتے تھے لیکن ایک کوشش تم کر چکے تھے' وہ کامیاب نہیں ہوئی تھی اور میں بچ گیا تھا۔"

وہ چونکا "یہ غلط ہے۔"

"کیوں......؟ کیا تم نے فائر کر کے میری کار کے اگلے ٹائر کو

نہیں پھاڑا تھا؟ اس سے کار الٹ گئی تھی اور ایک کھمبے سے ٹکرا گئی تھی؟"

وہ انکار میں سر ہلانے لگا "میں نے دیکھا تھا وہ حادثہ لیکن گولی چلانے کا کیا سوال۔ میرے پاس ریوالور ہوتا تو تم اب تک زندہ نہ ہوتے۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ تم نے مجھے پہچانا نہیں ہے۔ میں تمہارے پیچھے اس لیے لگا ہوا تھا کہ کہیں تم اکیلے ملو تو میں تمہیں بتاؤں کہ میں کون ہوں اور خنجر کو تمہارے دل میں اتار دوں۔"

مجھے ہنسی آنے لگی۔ "اسی امید میں تم یہاں تک میرا پیچھا کرتے ہوئے آ گئے؟"

"ہاں' مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ تم یہاں آئے ہو۔"

میں نے کہا "کیسے معلوم ہوا تمہیں؟"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں تمہاری نقل و حرکت پر نظر رکھتا تھا۔"

میں نے کہا "اور تمہیں یقین تھا کہ یہاں تمہیں موقع ضرور ملے گا۔ کل رات کو بھی تم دروازے تک آ گئے تھے لیکن اندر آنے کی تمہاری ہمت نہ پڑی۔ تم اپنے خنجر سے میرا گلا تو نہ کاٹ سکے' گاڑی کے ٹائر اور تار کاٹ کے بھاگ گئے۔"

اس کی آنکھوں میں الجھن نظر آنے لگی "یہ تم کیا کہہ رہے ہو' میں تو آج ہی آیا ہوں۔"

"جھوٹ مت بولو۔ میں نے تمہاری گاڑی کے ٹائروں کے نشانات بھی دیکھ لیے تھے۔"

اس نے احتجاجی لہجے میں کہا "میں گاڑی پر نہیں' اپنی موٹر سائیکل پر آیا ہوں اور ایسی کوئی فضول حرکت میں نے نہیں کی۔ نہ میں نے ٹائر کاٹے اور نہ تار۔"

میں اسے حیرانی سے دیکھتا رہا "تم اتنی دور موٹر سائیکل پر آئے ہو؟"

"ہاں۔ کار نہیں ہے میرے پاس۔ مجھے یقین تھا کہ یہاں مجھے موقع ضرور ملے گا۔ کہیں نہ کہیں تمہارا اور میرا سامنا ضرور ہوگا اکیلے میں۔"

میں نے کہا "تمہاری موٹر سائیکل کہاں ہے؟"

"ادھر...... پہاڑی کے پیچھے ایک جگہ چھپا رکھی ہے میں نے۔ میں نے تمہیں سوزوکی سے اترتے دیکھ لیا تھا اور میں نے سوچا کہ یہی وقت ہے۔"

مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ذہنی طور پر ایک نوعمر اور ناپختہ ذہن رکھنے والا لڑکا ہے۔ ایک ٹین ایجر' جوشیلا اور جذباتی۔ وہ بچہ ہی تھا جب اس کے شعور کو ایک شدید جذباتی سانحہ برداشت کرنا پڑا۔ یکلخت اس کے سارے خونی رشتے اور سہارے ختم ہو گئے۔ شدید غم و غصے کے ساتھ بے چارگی کے احساس نے اسے انتقام کے جنون میں جتلا کر دیا اور جیسے جیسے وہ بڑا ہوا' اس کا جنون بھی بڑھتا گیا اور یہ سب غلط فہمی کا نتیجہ تھا۔

میں نے کہا "دیکھو۔ میں تمہارے عزائم جان لینے کے باوجود تم سے کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتا۔ چنانچہ جان بچانے کے لیے مجھے جھوٹ بولنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ جھوٹ بہرحال جھوٹ ہوتا ہے اور چلتا نہیں۔ جب تمہاری فیملی کے ساتھ یہ ٹریجڈی ہوئی تو تم چھوٹے تھے۔ قدرتی طور پر تمہارے ذہن پر اس کا اثر زیادہ ہوا۔ تمہاری جگہ میں ہوتا تو میری کیفیت بھی مختلف نہ ہوتی لیکن وہ سب میں نے نہیں کیا تھا۔ تم کہہ سکتے ہو کہ وہ میری وجہ سے ہوا کیوں کہ اگر میں نے فرخندہ سے شادی نہ کی ہوتی تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ ہاں' یہ سچ ہے۔ ہم شادی کر چکے تھے۔ میرے پاس نکاح نامہ محفوظ ہے۔ اس شادی کے گواہ بھی موجود ہیں۔ ہم نے سوچا تھا کہ امتحانات سے فارغ ہوتے ہی ہم اپنے اپنے گھر والوں کو بتا دیں گے۔ ہمیں یہ ڈر نہیں تھا کہ گھر والے مخالفت کریں گے۔ اصل وجہ کچھ اور تھی۔"

میں نے دیکھا' میری بات توجہ سے سن رہا ہے چنانچہ میں نے اسے اصل وجہ بتا دی۔ یہ بھی بتا دیا کہ اس کے بعد کیا ہوا تھا۔

"فرخندہ کا انتقام میں نے لے لیا تھا اور پھر باہر چلا گیا تھا۔ اگر تم چاہو تو کسی بھی اخبار کے دفتر میں جا کے پرانی فائل نکلوا سکتے ہو۔ تمہیں میری بات کی صداقت کا ثبوت مل جائے گا۔ اپنے دل سے دشمنی کا خیال نکال دو۔ تم مجھ سے بہت چھوٹے ہو۔ میرے چھوٹے بھائی کی طرح ہو۔ کم آن' ہاتھ ملاؤ مجھ سے......اور نام بتاؤ اپنا" میں نے ہاتھ آگے بڑھا کے کہا۔

وہ کچھ دیر تذبذب کی کیفیت میں بیٹھا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کا ہاتھ آگے بڑھا "میرا نام فرخ ہے۔"

میں نے کہا "دیکھو فرخ۔ یہاں میں ایک کام سے رکا ہوں۔ کیا تم جانتے ہو کہ میں اس ساری جگہ کا مالک ہوں۔"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "مجھے سب معلوم ہے۔"

"یہاں مجھے کچھ لوگوں کی مخالفت کا سامنا ہے۔ معلوم نہیں وہ کون لوگ ہیں اور کیوں میرے دشمن ہو رہے ہیں۔ وہ مجھے خوف زدہ کر رہے ہیں اور شاید یہ چاہتے ہیں کہ میں یہاں نہ رہوں۔ انہیں دکھانے کے لیے میں چلا گیا تھا لیکن میں خاموشی سے لوٹ آیا ہوں۔ آج رات میں چھپ کے کچھ کارروائی کرنا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اس کا نتیجہ نکلے گا۔ مجھے جس پر شک ہے وہ پکڑا جائے۔ میرے ڈر کے بھاگ جانے کا تو سوال ہی نہیں۔ مجھے اب یہاں رہنا ہے اور میرے کچھ پلان ہیں' ان پر مجھے عمل کرنا ہے۔"

میری بات ریشماں کے آنے سے ادھوری رہ گئی۔ وہ بڑی خاموشی سے اندر آئی اور مجھے فرخ سے باتیں کرتا دیکھ کے ٹھٹک

گئی۔

میں نے کہا ”تم جس کے لیے چکر لگا رہی ہو' وہ تو آ کے چلا گیا۔“

وہ چونکی ”غنی چلا گیا' کہاں چلا گیا؟“

میں نے کہا ”ایک بہت خوبصورت لڑکی تھی اس کے ساتھ۔ اس نے کہا میں نے اس سے شادی کر لی ہے۔ ریشماں کو بتانے آیا تھا کہ میرا انتظار نہ کرے۔“

وہ ہنسنے لگی ”مالک۔ میں تو آپ کے لیے کھانا لائی تھی۔“

میں نے کہا ”اچھا۔ تو خدمت شروع ہو گئی انعام کے لالچ میں۔ چل ٹھیک ہے' غنی کے حصے کا کھانا ہم مل کے کھا لیں گے۔ یہ میرا چھوٹا بھائی ہے فرخ!“

”بھائی!“ وہ چونکی ”کمال ہے' ایسے ملتے ہیں بھائی؟“

میں نے کہا ”اندر کی کیا خبر ہے؟“

اس نے کہا ”سب سو گئے ہیں۔ یہاں ایسے ہی ہوتا ہے' مغرب کے بعد کھانا کھاتے ہیں اور عشا کی نماز پڑھ کے سو جاتے ہیں۔“

کھانا بہت سادہ اور دو افراد کے لیے ناکافی تھا مگر گزارہ ہو گیا۔ فرخ بالکل خاموش تھا۔ یہ ایک فطری ردِعمل تھا۔ برسوں سے وہ اپنے جذبۂ انتقام کی پرورش جن حقائق کی بنیاد پر کر رہا تھا وہ وقت آنے پر بے بنیاد مفروضات ثابت ہوئے تھے۔

کھانے کے بعد میں گھڑی دیکھ کے اٹھ کھڑا ہوا ”دیکھو فرخ۔ مجھے جانا ہے۔ میری طرف سے تم آزاد ہو۔ چاہو تو یہ رات یہاں گزار لو۔ صبح واپس چلے جانا۔ ابھی جانا چاہو تو تمہاری مرضی اور میرے ساتھ رہنا چاہو تو...... ویلکم۔“

وہ میرے ساتھ ہی اٹھا ”میں...... آپ کے ساتھ چلوں؟“

میں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی ”کم آن' لیکن ذرا احتیاط سے۔ اپنا خنجر بھی اٹھا لو لیکن بلاضرورت استعمال نہ کرنا۔“

وہ میرے پیچھے تھا۔ اگر اس کے جذبات نہ بدلے ہوتے تو وہ اس موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بہ آسانی مجھے قتل کر دیتا لیکن سچ نے اسے قائل کر لیا تھا اور اس نے میرے ساتھ ایک نئے رشتے کو بھی قبول کر لیا تھا۔ یہ شاید عمل کا ردِعمل تھا۔ اپنی غلطی کا کفارہ ادا کرنے کا ایک معقول طریقہ۔ اس انقلاب کی مجھے اتنی جلدی توقع نہ تھی مگر اس عمر کے جذباتی دھاروں کا رخ اسی طرح بدلتا ہے۔

ہم اندھیرے کی پناہ میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے گئے۔ دروازے سے اندر جاتے ہوئے میں نے پورے احاطے کا جائزہ لیا۔ دور سرونٹ کوارٹرز کے ایک کمرے میں لالٹین کی مدھم روشنی تھی۔ کہیں کوئی حرکت نہ تھی۔ کوئی آواز نہ تھی۔ میری گاڑی جسے خریدے ہوئے دو دن بھی نہیں ہوئے تھے' اس مریض کی طرح نظر آتی تھی جو زخمی ہونے کے باوجود کسی سرکاری اسپتال کے برآمدے میں بے بس و لاچار پڑا ہو۔

چابیاں میری جیب میں تھیں۔ میں نے احتیاط سے نیچے والے بیڈ روم کا قفل کھولا۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے اندر جا کے ایک کھڑکی کھولی۔ واپس باہر آیا اور دروازے کو پھر پہلے کی طرح تالا لگا دیا۔ کھڑکی کے راستے اندر جا کے میں نے اسے پھر بند کر دیا۔

اس کمرے میں ہم ایک رات گزار چکے تھے۔ اس کو ہمارے قیام کے لیے صاف کر دیا گیا تھا اور شاید برسوں کی محبوس ہوا میں تازگی پیدا کرنے کے لیے کوئی اسپرے کیا گیا تھا کہ اندر گھٹن محسوس نہیں ہوئی تھی۔ میرے ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال پوری شدت کے ساتھ موجود تھا کہ اکبر خان نے ڈپلی کیٹ چابیاں بنوائی ہیں تو آج رات کسی وقت وہ اپنی بدنیتی کا ثبوت دیتے ہوئے خیانت مجرمانہ کا مرتکب ضرور ہوگا۔ اسے ڈر ہوگا کہ میں اگلے ہی دن واپس نہ آ جاؤں۔ میری گاڑی وہیں تھی اور میں اپنے عزائم کا اظہار کر چکا تھا کہ مستقبل میں میرے سکیورٹی پلان کیا ہوں گے۔

میں اور فرخ اندھیرے میں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ ٹارچ کو ایک بار جلا کے میں نے اسے کمرے کا پورا منظر دکھا دیا تھا۔ اس کے ایک کنارے پر شاہانہ مسہری تھی تو دوسرے حصے میں قدیم طرز کے وکٹورین صوفے رکھے ہوئے تھے۔ ان پر سرخ مخمل تھا جو اپنی کہنہ سالی کے باعث بے رنگ ہو رہا تھا اور اس کے نقشیں شاہ بلوط کی لکڑی کے فریم کی پالش میں چمک نہ رہی تھی۔ یہ سب میں نے گزشتہ روز ہی دیکھا تھا۔

وہ ابھی تک اس صدمے کی کیفیت سے باہر نہیں آیا تھا جو اسے اپنے خود ساختہ مفروضات کے الٹ جانے سے ہوا تھا۔ میں اس سے فرخندہ کی باتیں کرنے لگا۔ آہستہ آہستہ وہ بھی مجھے بتانے لگا۔ اپنے بارے میں' اپنی ماں کے بارے میں' گھر کے بارے میں اور بہن کے بارے میں۔

ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ میرے کانوں نے کسی کی آواز سنی۔ یہ آواز اوپر سے آئی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے اکبر کو آواز دی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ کیا یہ میرے کانوں کا قصور تھا؟

میں نے فرخ سے پوچھا ”تم نے کچھ سنا۔“

”ہاں' کسی نے کہا تھا...... اکبر! یہ اکبر کون ہے؟“ فرخ بولا۔

اب مزید تصدیق کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے کھڑکی کھول کے دیکھا اور باہر آ گیا۔ میں نے فرخ کو وہیں انتظار کرنے کو کہا

اور خود آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا زینے کی طرف گیا۔ کوئی آہٹ کیے بغیر میں نے اوپر چڑھنا شروع کیا۔ مکمل خاموشی کے باوجود کہیں خطرہ تھا جو صرف محسوس ہوتا تھا۔ اسے میرے اعصاب کی کشیدگی کا نتیجہ بھی سمجھا جا سکتا تھا اور میری چھٹی حس کی وارننگ بھی۔ میرے تمام حواس پوری طرح بیدار تھے۔ میں نے اپنا ریوالور نکال لیا۔ اب میں اچانک پیدا ہو جانے والی کسی بھی صورت حال سے نمٹنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔

زینہ مجھے اس کمرے کے دروازے تک لے گیا جو نیچے والے اس کمرے کے عین اوپر تھا جس میں ہم نے قیام کیا تھا۔ خطرہ محسوس کرتے کرتے میری آنکھوں نے اندھیرے میں دیکھنے کی صلاحیت حاصل کر لی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے میرے کان غیر موجود آوازوں کو بھی سننے کے لیے تیار تھے اور میرا جسم فوری ردِعمل کے لیے مستعد تھا۔

یہی وجہ تھی کہ جب تاریکی میں مجھے فرق کا احساس ہوا تو میں نے اسے بھی سمجھ لیا۔ کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور فرش پر دہلیز کے قریب ایک ڈھیر کی صورت میں کچھ پڑا ہوا تھا۔ میں تیزی سے آگے لپکا اور اس ڈھیر کے پاس پہنچ کے رک گیا۔ یہ ڈھیر کسی کا بے حس و حرکت جسم تھا۔ میں نے اسے ہاتھ لگایا تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ بوڑھا لاغر بدن جانو بابا کے سوا کسی اور کا نہیں ہو سکتا۔ نگاہ کھلے دروازے پر رکھتے ہوئے میں نے جانو بابا کی کلائی تھام کے اس کی نبض محسوس کرنے کی ناکام کوشش کی۔ نبض ساکت تھی۔ نیچے جھک کر میں نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھا۔ اس کا دل بھی خاموش تھا اور سانس کی آمد و رفت موقوف تھی۔ جانو بابا مر چکا تھا یا مار دیا گیا تھا۔

اسی لمحے میرے کانوں نے ایک ہلکی سی آہٹ سنی۔ یہ آواز کمرے کے اندر سے آئی تھی۔ میں نے دروازے کی اوٹ میں رہتے ہوئے چلا کے کہا۔

”کون ہے اندر؟“ اس کے ساتھ ہی کوئی برتن فرش پر گرا۔ میں سائڈ سے اندر جھانکنے کے لیے جھکا ہی تھا کہ توپ سے نکلے ہوئے گولے کی طرح کوئی مجھ سے ٹکرا گیا۔

ٹکر اتنی شدید تھی کہ میں سنبھل نہ سکا۔ میں دھکے سے پیچھے ہٹا تو سنبھل نہ سکا کیونکہ میرے بالکل پیچھے جانو بابا کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ ریوالور جو میرے ہاتھ میں تھا' میری گرفت سے نکل گیا۔ میں نے تاریکی میں ایک سائے کو زینے کی سمت لپکتے دیکھا اور خالی ہاتھ رہ جانے کے باوجود چیخ کر کہا ”رک جاؤ' ورنہ گولی مار دوں گا۔“

میرے اٹھنے اور اندھیرے میں ریوالور اٹھانے تک فرار ہونے والے کو کافی مہلت مل گئی تھی۔ پندرہ بیس سیکنڈ میں وہ سیڑھیوں سے اتر گیا تھا۔ میں نے زینے پر اس کے بھاری قدموں کی دھپ دھپ سنی اور اس کے پیچھے بھاگا۔ پھر رک کے پلٹا اور برآمدے کے سامنے والے حصے کی طرف گیا۔ وہاں چھت کے محرابی دروازوں کے نیچے فرش پر تین فٹ اونچے آرائشی پائے لگے ہوئے تھے۔

جب میں نے اوپر سے دیکھا تو وہ صدر دروازے کی طرف بھاگ رہا تھا لیکن وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے تعاقب میں کوئی اور بھی تھا۔ یہ فرخ کے سوا کوئی اور نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے اوپر سے میرے چلانے کی آواز سنی ہوگی اور شاید اوپر آنا چاہتا ہوگا کہ اسے اوپر سے اترنے والا فرار ہوتا نظر آیا۔ سوچے سمجھے بغیر وہ اس کے پیچھے لگ گیا۔

میں نے اوپر سے چلا کے کہا ”فرخ! اسے جانے مت دینا“ اور اس کے ساتھ ہی میں نے نشانہ لے کر آگے والے شخص پر فائر کیا۔ وہ فرخ سے چالیس پچاس قدم آگے تھا اور مجھ سے بھی کم سے کم سو فٹ دور تھا۔ اندھیرے میں کسی متحرک ٹارگٹ کی صورت میں نشانہ خطا جانے کے امکانات بہت زیادہ ہوتے ہیں۔

میرے فائر کا بھاگنے والے پر کوئی اثر نہ ہوا۔ نقصان یہ ہوا کہ فرخ گھبرا گیا کہ کہیں وہ نشانہ نہ بن جائے۔ اس کی رفتار میں ذرا سی دیر کے لیے فرق آیا۔ آگے بھاگنے والے کی رفتار پہلے ہی زیادہ تھی۔

میں نے دوبارہ چلا کے کہا ”فرخ۔ پکڑو اسے“ مگر اس وقت تک وہ دونوں صدر دروازے سے نکل کے غائب ہو گئے تھے۔

میرے فائر نے آشیانوں میں خوابیدہ پرندوں کو بھی جگا دیا تھا اور وہ خوف زدہ آوازیں نکالتے ہوئے درختوں پر چکر لگا رہے تھے۔ دوسری طرف سرونٹ کوارٹرز میں بھی ہلچل نظر آ رہی تھی۔ میں دوڑتا ہوا زینے سے اترا اور فرخ کے تعاقب میں گیا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ بائیں جانب گئے ہوں گے اور پھر درویش کے مزار کی طرف لیکن اندھیرے میں نہ کچھ نظر آتا تھا اور نہ کچھ سنائی دیتا تھا۔ اس تاریک' انجان اور ناہموار راستے پر دوڑنا بھی آسان نہ تھا۔

اچانک مجھے ٹھوکر لگی اور میں رفتار کم رکھنے کے باوجود منہ کے بل گرا۔ میری راہ میں کوئی رکاوٹ حائل ہو گئی تھی۔ یہ فرخ کا جسم تھا جو اس راستے پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔ میں نے اسے ہلا جلا کے دیکھا اور نام لے کر آواز دی تو وہ کراہنے لگا اور پھر اٹھ بیٹھا۔

میں نے کہا ”فرخ' تم ٹھیک ہو نا؟“

”ہاں...... مگر وہ نکل گیا“ اس نے اپنے سر کو دباتے ہوئے کہا ”اس نے پتھر کھینچ مارا مجھ پر۔ ورنہ میں اسے پکڑ لیتا' وہ ادھر ہی گیا ہے۔“

میں نے اسے سہارا دے کر کھڑا کیا ''اچھا' تم اندر جاؤ۔ دیکھو لو پر جانو بابا کی لاش پڑی ہے' میں ابھی آتا ہوں۔''

مزید وقت ضائع کیے بغیر میں آگے بڑھا تاہم اب میں محتاط تھا۔ یہ ہوسکتا تھا کہ مجرم کسی درخت کی اوٹ سے مجھ پر حملہ کردے۔ بھاگتے ہوئے اس کے ہاتھ میں پتھر آ گیا تھا۔ وہ درخت کی کسی موٹی شاخ کو ڈنڈے کے طور پر بھی استعمال کرسکتا تھا۔ ایسی شاخیں یہاں ہر طرف نظر آتی تھیں۔ یہاں درختوں سے ایندھن حاصل کیا جاتا تھا چنانچہ کاٹی جانے والی شاخیں سوکھنے کے لیے ڈال دی جاتی تھیں۔

مجھے دھکے سے گرانے والا یقیناً جوان اور صحت مند شخص تھا لیکن وہ اکبر خان نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ خراب تھی۔ بیساکھی کے بغیر وہ تھوڑا بہت چل تو لیتا تھا مگر ایسے دوڑ نہیں سکتا تھا پھر بھی تصدیق کے لیے میں سبزی کے کھیتوں سے گزر کے اس بیرک تک گیا جہاں اکبر خان چوکیدار کی حیثیت سے ملازمت کرتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس وقت وہاں کوئی نہیں ہوگا۔ اس عمارت میں ایسی کیا چیز ہوسکتی تھی جس کی حفاظت کے لیے رات کو اکبر خان ڈیوٹی دے۔

اس کا کام دن میں گیٹ کھولنے اور بند کرنے یا اوپر کے چھوٹے موٹے کام سرانجام دینے تک محدود ہوگا لیکن بند دروازے کے پیچھے کیبن میں روشنی تھی۔ میں نے سوچے سمجھے بغیر لوہے کے گیٹ پر ریوالور سے دستک دی۔ میرے ہاتھ کو بجلی کا زبردست جھٹکا لگا۔ اس کے ساتھ ہی عمارت کی چھت پر لگی ہوئی تمام سرچ لائٹس روشن ہوگئیں۔ دس دس فٹ کے فاصلے سے لگی ہوئی ان لائٹوں کا رخ ایسے رکھا گیا تھا کہ چاروں طرف کا علاقہ ایک جیسا روشن ہوجائے۔ لائٹ اتنی تیز تھی کہ گردونواح میں سو گز تک چوہا بھی بل سے نکل کے بھاگتا تو نظر آ جاتا۔ لائٹس آن ہوئیں تو اندر یا برآمدے میں کہیں ایک الارم بھی وقفے وقفے سے بیپ بیپ کرنے لگا۔

اکبر خان کیبن میں سے کلاشنکوف کے ساتھ برآمد ہوا۔ اپنے سامنے مجھے پا کے وہ سخت حیران ہوا ''مالک...... آپ؟''

میں نے برہمی سے کہا ''ہاں میں...... ذرا گیٹ کھول کے باہر آؤ۔''

وہ پھر اندر گیا۔ شاید اس نے گیٹ سے بجلی کے کنکشن کا سلسلہ منقطع کیا۔ جب اس نے گیٹ کھولا تو سرچ لائٹس آف ہوگئیں۔ ایسا جدید اور خودکار حفاظتی نظام میرے لیے جتنا غیر متوقع تھا' اتنا ہی میرے شکوک میں اضافے کا سبب بن رہا تھا۔

میں نے کہا ''اکبر خان۔ واٹ از دس...... کیا ہے یہ سب؟''

اس نے پرسکون رہتے ہوئے کہا ''کیا ہے مالک؟''

میں نے کہا ''اس دروازے میں کرنٹ ہے؟ باڑھ کے تاروں میں بھی ہوگا۔''

اس نے مجرمانہ اقرار میں سر ہلایا ''ہے مالک!''

میں نے کہا ''کتنا؟ چار سو چالیس وولٹ۔''

''جی سر!''

میں نے دھاڑ کے کہا ''کیوں؟ کیا ہے یہاں جس کی حفاظت کے لیے ایسے خطرناک اقدامات کیے گئے ہیں؟ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اس سے انسانوں کی ہلاکت کا خطرہ ہے۔ جہاں ایسے انتظامات ہوں وہاں واضح انداز میں وارننگ لکھی جاتی ہے۔ ان پڑھ لوگوں کو خبردار کرنے کے لیے خطرے کی علامت بنائی جاتی ہے۔ جھٹکا مجھے بھی لگا تھا۔''

''اس میں میرا کوئی قصور نہیں مالک!''

میرا پارا اور چڑھ گیا ''مالک کے بچے! اتنے انجان اور بے خبر مت بنو۔ تم اس گاؤں کے رہنے والے جاہل دیہاتی نہیں ہو۔ فوج میں رہے ہو' سب جانتے ہو' مجھے بتاؤ...... یہ سب کیا ہے؟''

''کیا مالک......؟'' وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

''یہ سب کیا ہے۔ اس بیرک میں کیا ہے؟ کیوں نصب کی گئی ہیں یہ سرچ لائٹس؟ الارم سسٹم...... یقیناً خفیہ کیمرے بھی ہوں گے۔ کیا مقصد ہے ان حفاظتی انتظامات کا؟''

''آپ مجھ پر بلاوجہ ناراض ہو رہے ہیں سر! میں ایک معمولی چوکیدار ہوں۔ مجھے اندر جانے کی اجازت نہیں' میں کچھ نہیں بتا سکتا۔''

''او کے۔ میں خود دیکھ لیتا ہوں۔'' میں آگے بڑھا۔

''نہیں مالک! ایسا مت کریں'' وہ میرے سامنے آ گیا۔

''اوہ۔ فرض شناسی کا مظاہرہ کر رہے ہو تم؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں تلخی سے کہا ''مجھے میری ہی زمین پر جانے سے روک رہے ہو؟''

''یہ ممنوعہ علاقہ ہے سر!''

''ممنوعہ علاقہ میرے لیے؟'' میں نے گرج کے کہا ''اس شخص کے لیے جو اس زمین کا مالک ہے؟ اکبر خان! تمہارا سارا خاندان میرا نمک خوار ہے۔''

''لیکن اس وقت میں یہاں ڈیوٹی پر ہوں سر!''

''اب تمہاری حیثیت بھی ایک مجرم جیسی ہے اکبر خان! تم ان کا ساتھ دے رہے ہو جو میرے مجرم ہیں اور قانون کے مجرم ہیں۔ انہوں نے ٹریس پاس کیا ہے۔ ناجائز قبضہ کیا ہے میری زمین پر اور یقیناً یہاں کوئی غیر قانونی کام کر رہے ہیں۔ ان سب کے ساتھ تم بھی جیل جاؤ گے اکبر خان!''

میرے دل میں ایک شدید خواہش اٹھی تھی کہ میں بے خبری

میں اکبر خان کو ناک آؤٹ کردوں۔ اس کی کلاشنکوف چھین لوں اور اندر گھس جاؤں۔ سارے سکیورٹی سسٹم کو اور تالوں کو کلاشنکوف کے برسٹ سے اڑا دوں اور اندر جا کے دیکھوں کہ پوشیدہ طور پر یہاں کون سا غیر قانونی کام جاری ہے مگر میں نے ہوش سے جوش پر قابو پالیا۔ یہ کام میں پورے جائز اور قانونی اختیارات کے ساتھ بھی کرسکتا تھا۔ مجھے قانون کو اپنے ہاتھ میں اور کوئی رسک لینے کی کیا ضرورت تھی؟

واپس چلنے سے پہلے میں نے کہا ''ٹھیک ہے اکبر خان! تم اپنی ڈیوٹی کرو' کل تک چوکیداری کی تنخواہ اور وصول کرلو۔ صبح میں دیکھوں گا یہ عمارت یہاں کیسے کھڑی رہتی ہے اور ہاں' ایک افسوس ناک خبر اور بھی ہے تمہارے لیے۔ تمہارے باپ جان محمد کو کسی نے قتل کردیا ہے۔''

وہ بے خیالی میں بولا ''قتل کردیا ہے...... کس نے......؟''

میں نے کہا ''مجھے صرف اتنا ہی معلوم تھا' باقی گھر آ کے پوچھنا۔''

جب میں واپس حویلی میں پہنچا تو وہاں رونا پیٹنا مچا ہوا تھا۔ جانو بابا کی لاش اٹھا کے لانے کے بعد اس کے کمرے میں چارپائی پر ڈال دی گئی تھی۔ میں نے میت کے گرد حلقہ بنا کے رونے والوں کو باہر نکال دیا۔ صرف مرحوم کی بیوہ اور اس کے پوتے کبیر خان کو وہاں رہنے دیا۔ ایک لالٹین کی روشنی کو نزدیک لا کے میں نے جانو بابا کی لاش کا غور سے معائنہ کیا تو میرے شکوک کی تصدیق ہوگئی۔ پوسٹ مارٹم سے تو بہت کچھ معلوم ہوجاتا مگر میری نظر سے بھی انگلیوں کے وہ نشانات پوشیدہ نہ رہ سکے جو گردن کے گرد ہلکے نیلگوں مائل گلابی حلقوں کی صورت میں دکھائی دے رہے تھے۔

میں نے کہا ''کبیر خان۔ دادا کو وہاں سے تم اٹھا کے لائے تھے؟''

اس نے کہا ''جی مالک!''

میں نے افسوس سے سر ہلایا ''تم نے بڑی غلطی کی۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ طبعی موت نہیں' قتل ہے۔''

''قتل......'' وہ دہشت زدہ ہوگیا۔ جانو بابا کی بیوہ نے بھی ایک چیخ مار کے کہا کہ یہ غلط ہے۔

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی ''افسوس کہ یہ سچ ہے۔ صبح جب پولیس آئے گی......''

کبیر خان نے میری بات کاٹ دی ''پولیس...... نہیں مالک!''

میں نے کہا ''ڈرتے کیوں ہو؟ وہ تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔ قاتل کا پتا چلانا ضروری ہے کبیر خان!''

وہ اپنی بات پر اڑا رہا۔ اس کی دادی بھی ہاتھ جوڑنے لگی

''جانے دیں مالک! مرنے والا تو مر گیا اور کتنے دن جیتا۔ پولیس ہم سب کو پکڑ لے گی یہاں تو اور کوئی بھی نہیں تھا۔''

میں نے کہا ''کبیر! اپنی دادی کو سمجھاؤ۔ اس کو کسی چور نے مارا ہے۔ وہ اوپر والے کمرے میں گھسا ہوا تھا۔ میری مداخلت کی وجہ سے وہ کچھ لے جا تو نہیں سکا اور بھاگ گیا۔''

''جب چور کچھ بھی لے کر نہیں گیا تو پولیس کو بتانے کا کیا فائدہ مالک!'' کبیر خان نے کہا ''پولیس لاش بھی لے جائے گی' ہمیں بھی بند کردے گی۔''

میں نے انہیں بہت سمجھایا کہ میری موجودگی میں پولیس کوئی زور زبردستی نہیں کرے گی۔ کسی کو بلاوجہ نہیں پکڑے گی اور انہیں ڈرنا نہیں چاہیے مگر وہ سب میرے گرد جمع ہوگئے۔ میرے آگے ہاتھ جوڑنے لگے اور میرے پاؤں پکڑنے لگے تو میں مجبور ہوگیا۔ میں نے کبیر کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور لوٹ کے حویلی میں آ گیا۔ فرخ ابھی تک اوپر ہی موجود تھا۔ اس کے پاس ٹارچ بھی تھی لیکن اب اس کی روشنی سیل کمزور پڑنے سے دم توڑ رہی تھی۔

''کیا چور پکڑا گیا؟'' اس نے مجھے دیکھتے ہی سوال کیا۔

میں نے کہا ''نہیں۔ وہ چور ہی نہیں' قاتل بھی ہے۔''

''مجھے بھی شک تھا۔''

میں نے کہا ''شک کی بات ہی نہیں۔ اس کے گلے پر انگلیوں کے نشانات بہت واضح ہیں۔ اسے گلا گھونٹ کے ہلاک کیا گیا ہے۔''

کبیر خان افسردگی سے بولا ''ایسا کون ہوسکتا ہے؟''

میں نے کہا ''پہلے تم میرے ایک سوال کا جواب دو۔ تمہارا دادا تو اٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ یہاں تک کیسے آ گیا؟''

''بس جی۔ قضا لے آئی اسے۔ دادی نے اور میں نے بہت روکا اسے مگر پتا نہیں کیوں وہ ضد پر آ گیا کہ میں پہرا دوں گا۔ سب نے سمجھایا کہ وہ اس قابل نہیں رہا لیکن اس نے نہیں مانی۔ میں خود اسے یہاں لے کر آیا۔ میں اسے اٹھانا چاہتا تھا۔ اس نے منع کردیا۔ بولا میں چل سکتا ہوں۔ بڑی مشکل سے یہاں پہنچا۔ زینہ چڑھا اور دروازے پر بیٹھ گیا۔''

''لیکن کیوں؟''

''پتا نہیں مالک۔ کہنے لگا مالک نہیں ہیں۔ کسی کو ذمے داری سونپ کر بھی نہیں گئے۔ اس سے پہلے انہوں نے اکبر سے پوچھا تھا کہ چابیاں کہاں ہیں۔ ابا نے کہا کہ وہ تو مالک نے واپس لے لیں۔ بعد میں اس نے مجھ سے پوچھا کہ چابیاں کیا تجھے دے گئے ہیں؟ میں نے انکار کیا تو کہنے لگے کہ یہ تو بڑا غلط ہوگیا۔ وہ کل آئیں گے لوٹ کے۔ اپنی گاڑی لے جائیں گے۔ آج کی رات کیا ہوگا؟ میں نے کہا کہ رات کو کیا ہوسکتا ہے؟ وہ کہنے لگے کہ مجھے

کیا ہتا رات کو کیا ہوسکتا ہے۔ میری ساری عمر کی محنت رائیگاں نہ جائے۔ پھر وہ ضد کر کے یہاں آ گئے۔"

مجھے پاگل پن کی حد تک پہنچنے والے اس فرض شناسی کے احساس پر دکھ ہوا جس کی وجہ سے بالآخر جانو بابا کی جان گئی۔ ادائے فرض کے لیے جان قربان کر دینا اور جانثاری میں جان دینا صرف زبانی جمع خرچ کی بات ہے مگر اس خاندانی نمک خوار نے اسے سچ کر دکھایا تھا۔ حفاظت وہ خاک کرتا' سانس لینا بھی اسے دوبھر تھا۔ دستِ قاتل نے بے سبب ہی اس پر قوتِ بازو کو آزمایا۔ ایک جھٹکے میں طائر روح پرواز کر گیا ہوگا جو یوں بھی قفس عنصری سے نکلنے کے لیے پھڑ پھڑا رہا تھا۔ باقی رہ گیا تھا جانو بابا کے فرض کا قرض' جو مجھے کسی نہ کسی طور چکانا تھا۔

"ایک بات پوچھوں مالک!" کبیر خان نے پوچھا۔

میں چونکا "ہاں' کیا بات ہے کبیر؟"

"آپ تو چلے گئے تھے سب کے ساتھ' واپس کیسے آ گئے؟"

کبیر خان کی سوالیہ نظریں فرخ پر ٹھہر گئیں۔

میں نے اس کے سوال میں چھپے ہوئے بے نام سے شک کو محسوس کیا۔ اس کی مجال نہ تھی کہ وہ تفتیش کرنے والوں کے لہجے میں پوچھ سکتا کہ اگر جانو بابا کو قتل کیا گیا تھا تو کیا تم وضاحت کر سکتے ہو کہ جائے واردات پر تم کیا کر رہے تھے؟ کیوں موجود تھے۔ تمہارے ساتھ یہ اجنبی کون ہے جو دن کے وقت نظر نہیں آیا تھا اور آخر تمہارے اس بیان کی صداقت کو تسلیم کرنے کا جواز کیا ہے کہ جانو بابا کا قاتل وہی ہے جو چوری کرنے آیا تھا اور تم دونوں مسلح ہونے کے باوجود اسے پکڑنے میں ناکام رہے؟ اگر میں انہی جیسا عام آدمی ہوتا تو پولیس مجھ سے انہی سوالات کے جوابات مانگتی اور بذریعہ چھتر ول اپنی مرضی کا ہر جواب حاصل کر لیتی مگر میں دولت مند اور بارسوخ تھا۔ اس جاگیر کا ولایت سے آنے والا مالک تھا چنانچہ قانون کی دسترس سے باہر تھا۔

میں نے کہا "کبیر خان! مجھے تمہارے دادا نے خبردار کر دیا تھا کہ یہاں کچھ لوگ قابلِ اعتبار نہیں۔ کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور کانوں سے سنا تو مجھے شک ہوا کہ واقعی معاملات خراب ہیں۔ پھر جو کچھ میری گاڑی کے ساتھ ہوا' تمہیں بھی معلوم ہے۔ چنانچہ سب کے سامنے میں چلا گیا تھا مگر کچھ دور جا کے میں اتر گیا۔ فرخ ادھر سے اپنی موٹر سائیکل پر آ رہا تھا۔ یہ میرا کزن ہے۔ اسے آنا تو ہمارے ساتھ ہی تھا لیکن کسی وجہ سے نہیں آ سکا تھا۔ یہ جوشیلا جوان موٹر سائیکل پر چل پڑا۔ یہ مجھے مل گیا۔ اس نے اپنی موٹر سائیکل چھپا دی اور ہم خاموشی سے یہاں آ کے چھپ گئے۔ افسوس یہ ہے کہ ہمیں دیر ہو گئی۔ ہم نیچے تھے' چور اوپر اپنی کارروائی میں مصروف تھا۔ ہمیں پتا ہی نہیں چلا کہ جانو بابا بھی اوپر بیٹھا ہے۔ جب اس کے چلّانے کی آواز آئی تو ہم اوپر بھاگے اور وہ ہمیں دھکا دے کر نکل گیا۔ میں نے فائر بھی کیا تھا اس پر مگر وہ بچ گیا۔ خیر' بچ کے کہاں جائے گا۔ اب میں اس وقت تک نہیں جاؤں گا جب تک وہ پکڑا نہ جائے اور حالات میرے قابو میں نہ آ جائیں۔"

"کیا اب میں جاؤں؟" کبیر خان نے میرے خاموش ہو جانے کے کچھ دیر بعد پوچھا۔

"ہاں' تم جاؤ" میں نے کلائی کی گھڑی دیکھی جس میں رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔ "لیکن ایک لالٹین دے جاؤ۔"

جب وہ چلا گیا تو فرخ نے جیب میں ہاتھ ڈال کے چابیوں کا ایک گچھا برآمد کیا' "یہ وہاں پڑا تھا۔"

میں نے گچھا لے لیا۔ یہ نئی چابیاں تھیں مگر ان کو پرانی ڈوری سے باندھا گیا تھا۔ شہناز کی آبزرویشن بالکل درست تھی۔ اکبر خان نے اصل چابیوں کی ڈپلی کیٹ بنوالی تھیں۔ اپنی بیوی نورجہاں کو شہر چھوڑنے کے لیے جانے کا تو محض بہانہ تھا۔ درحقیقت وہ چابیاں بنوانے گیا تھا۔ ایک دن پہلے چابیوں کے گم ہو جانے کا معاملہ اب پراسرار نہیں رہا تھا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اکبر خان نے چابیاں بنوا کے کس کو دی تھیں؟ اس کا دوسرا ساتھی کون تھا جس کو وہ پورے اعتماد کے ساتھ شریک جرم کر سکتا تھا؟ کبیر خان کے لالٹین کے ساتھ نمودار ہونے تک میں ایسے ہی سوالات میں الجھا رہا۔

اس وقت حویلی کے ہر کمرے کا تفصیلی جائزہ لینا ممکن نہیں تھا۔ فرخ کے ساتھ میں صرف اس کمرے میں گیا جو کھلا پڑا ہوا تھا۔ میری حیرت اپنی جگہ مگر فرخ کا حال تو الف لیلہ کی کہانی کے کردار الہ دین جیسا تھا جو درزی کا بیٹا تھا۔ قسمت نے اسے قید خانے کے بجائے طلسماتی خزانے تک پہنچا دیا تھا۔ وہ مجھے قتل کرنے آیا تھا اور اب میرا ساتھی بن کے قصے کہانیوں جیسے ماحول والی ایک حویلی میں گھوم رہا تھا جہاں ہر قدم پر اس کے تجسس کو بیدار رکھنے والے اسرار و رموز کی دنیا آباد تھی۔

لالٹین کی روشنی اس کمرے کی وسعت کے لحاظ سے بہت کم تھی جس کی چاروں دیواروں پر فرش سے آٹھ فٹ کی بلندی تک الماریاں اور کیبنٹ بنے ہوئے تھے۔ ان میں جو لکڑی استعمال ہوئی تھی وہ بھی بیش قیمت ہی ہوگی ورنہ صدیوں کے سفر کے بعد ان کی مضبوطی برقرار نہ رہتی۔ اس پر پالش پرانی ہو کے اپنی چمک کھو چکی تھی۔ پٹوں کے شیشے دھندلا گئے تھے اور ہینڈل زنگ آلود ہو گئے تھے۔ نیچے کیبنٹ بند تھے اور لکڑی کے پٹوں سے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔

الماریوں کے اوپر ایک قطار میں آرائشی ظروف اور اشیا رکھی

ہوئی تھیں۔ ان کے اوپر چودہ فٹ کی اونچائی والی چھت تک شکار کیے ہوئے جانوروں کے سروں کی شیلڈ آویزاں تھی۔ ہرن' بارہ سنگھے' چیتل اور پاڑے بھیڑیے اور چیتے۔ عقاب اور پہاڑی طوطے کے سر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر شاید ایک صدی سے شکار میں میرے آباواجداد کی مہارت کا ثبوت فراہم کر رہے تھے۔ وہ آباواجداد جن کی کہانی بھی ایک عبرت کی داستان ہو گئی تھی۔ وہ خونخوار جانوروں کو شکار کرتے رہے۔ پھر موت نے انہیں شکار کیا۔ ان کی ہڈیاں تک خاک کا رزق ہو گئی تھیں۔ شکار ہونے والوں کے سر تاریخ کے کارواں کو گزرتا دیکھ رہے تھے۔

وہ کمرا ایک میوزیم تھا۔ اس کا پُراسرار ماحول کسی حد تک خوفزدہ کرنے والا تھا۔ جو انسان کی لامحدود خواہشات اور فتوحات کے انجام کی تصویر پیش کرتا تھا۔ لالٹین اوپر اٹھا کے میں الماریوں کے سامنے سے گزرا تو گرد آلود شیشوں کے پیچھے مجھے صدی کے سارے مغرور لمحے کسی فرعون کی ممی کی طرح منجمد محسوس ہوئے۔ وہاں ہر قسم کے ظروف تھے۔ عام چینی کے ولایتی برتن' پیتل اور کانسی کے۔ چاندی اور سونے کے۔ پیالوں' قابوں اور خوانوں سے چمچوں' چھریوں اور نازک جاموں تک۔ عطردان' گلاب پاش' سرمے دانیاں' پاندان۔ قدیم نوادرات میں شمار کیے جانے والے سارے ظروف جواب کہیں استعمال نہیں ہوتے۔ ان الماریوں میں مقید تھے۔

آخر میں ایک الماری کھلی ہوئی تھی۔ وہیں فرش پر ایک بوری آدمی بھری ہوئی رکھی تھی۔ اس میں ہر الماری سے نکالے ہوئے سونے چاندی کے منتخب ظروف تھے۔ اتنی کم روشنی میں میرے لیے کسی بھی چیز کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ وہ پیتل کی ہے یا سونے کی بنی ہوئی ہے؟ اسی طرح بھرت اور چاندی کا فرق پتا نہیں چلتا تھا۔ میں جانو بابا کی فراہم کردہ معلومات پر انحصار کرتے ہوئے خود ہی اندازے قائم کر رہا تھا لیکن چور کا معاملہ مختلف ثابت ہو رہا تھا۔ اسے یقینی طور پر علم تھا کہ بلحاظ مالیت کون سی چیز زیادہ قیمتی ہے اور اس نے بوری میں بھرنے کے لیے انہی چیزوں کا انتخاب کیا تھا۔

فرخ بڑا مسحور سا کھڑا تھا اور ہر چیز کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ ایسی تاریخی نوادرات سے بھری قدیم حویلی اس نے شاید صرف فلموں میں دیکھی ہوگی۔ خود میرا یہی حال تھا۔ اگرچہ پاکستان میں بھی پرانے نوابوں اور جاگیرداروں کی حویلیاں ہر جگہ موجود ہیں لیکن میں نے آج تک کسی بھی ایسی حویلی کے اندر قدم نہیں رکھا تھا۔ میرے ذہن میں ان کا تصور پرانے شہنشاہی دور کی داستانوں کی بنیاد پر تھا۔

ابھی وقت نہیں تھا کہ میں تمام چیزوں کا تفصیلی جائزہ لیتا۔ میں نے ہر چیز کو اسی طرح چھوڑا اور دروازے کو قفل لگا دیا۔ ہم لوٹ کے نیچے والے کمرے میں آ گئے۔ فرخ کے ماتھے پر اس پتھر کا نشان تھا جو مجرم نے فرار ہوتے ہوئے اس کا راستہ روکنے کے لیے مارا تھا۔ سامنے سے کھال پھٹ گئی تھی اور خون جم گیا تھا۔ اس کے سر میں درد بھی تھا مگر فی الحال اس کے علاج کی کوئی صورت نہ تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ سو جائے لیکن وہ ذہنی طور پر مجھ سے زیادہ اپ سیٹ تھا۔

ہم باتیں کرتے رہے میں نے اسے اپنے بارے میں اپنے ارادوں کے بارے میں بتلایا۔ اس نے مجھے اپنے بارے میں آگاہ کیا۔ وہ بھی مظلوم تھا ماں باپ کے بعد زمانے نے اس کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔ رات انہی باتوں میں کٹ گئی ۔ میں نے پوچھا "کیا تم اپنے دو پہیوں والے گھوڑے پر ایک طویل سفر کر سکتے ہو......لاہور تک؟"

"بالکل کر سکتا ہوں۔ اس کے لیے صبح کا انتظار کیوں۔ میں ابھی جا سکتا ہوں۔"

میں نے کہا "نہیں۔ اب ایسی ایمرجنسی بھی نہیں ہے کہ کوئی خطرہ مول لیا جائے۔"

"مجھے لاہور جا کے کیا کرنا ہوگا؟"

میں نے کہا "تمہیں ایک نہیں بہت سے کام کرنے ہوں گے۔ اچھا ہوگا اگر اس کے لیے تم کچھ دیر آرام کر لو۔"

"مجھے نیند نہیں آئے گی۔"

"کوئی بات نہیں۔ آنکھیں بند کر کے لیٹے رہنے سے ہی فائدہ ہوگا" میں نے کہا اور وہ آنکھیں بند کر کے قالین پر دراز ہو گیا۔

نیند مجھے بھی نہیں آئی۔ صبح کا اجالا کھڑکیوں کے شیشوں پر نمودار ہوا تو میں اٹھ بیٹھا۔ فرخ کو غائب پا کے مجھے کچھ تشویش ہوئی کہ کہیں وہ حالات سے گھبرا کے یا حوصلہ ہار کے فرار تو نہیں ہو گیا لیکن وہ باہر گھوم رہا تھا۔ اس نے درویش کا مزار اور ملحقہ علاقے سب دیکھ لیے تھے۔

"آپ کی یہ جاگیر کہاں تک ہے؟" اس نے مجھ سے پوچھا۔

"صحیح بات تو یہ ہے کہ ابھی مجھے بھی اس کی حدود کا اندازہ نہیں۔ میں نے خود جا کے کچھ نہیں دیکھا۔ ایک دن میں یہ ممکن نہیں تھا اور پھر یہاں کے معاملات عجیب صورت اختیار کر گئے۔ حویلی میں ہم اس کمرے تک محدود رہے۔ پہلے چابیاں گم ہو گئیں اور پوری حویلی کا جائزہ لینے کا موقع نہیں ملا۔ کل میں نے خاندانی نوادرات والا کمرا بھی تمہارے ساتھ ہی پہلی بار دیکھا۔ کل کا دن ضائع ہوا۔ آج کا بھی ہوگا۔ فرصت ملے گی تو دیکھیں گے کہ اور کیا ہے؟"

وہ بولا "میں تو ایک عجیب ہی دنیا میں آ گیا ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہاں آپ کیا کریں گے اور کیسے کریں گے۔ یہ جگہ اتنی

دور ہے اور الگ ہے۔ کوئی رابطہ نہیں' سہولت نہیں۔"

میں نے کہا" حوصلہ رکھو اور دیکھتے رہو۔ یہ دنیا بدل جائے گی۔ جب کولمبس نے امریکا کی سرزمین پر قدم رکھا تھا تو وہاں کیا تھا؟ آسٹریلیا بھی ایک ویرانہ تھا اور تاریخ کے روز اول انسان نے دنیا کو دیکھا تھا تو یہاں کیا تھا؟"

"ویسے تو یہ روایتی قسم کی تاریخی حویلی ہے۔ جن میں راجے مہاراجے اور نواب رہتے تھے لیکن ایک چیز مجھے نظر نہیں آئی۔"

"وہ کیا ہے؟"

"ایسے محلوں میں خاندانی تصاویر ہوتی ہیں' آباواجداد کی' دادا پردادا اور ان کے دادا پردادا کی۔"

میں نے کہا" بالکل ٹھیک کہا تم نے لیکن ایک تو میرے آباواجداد نواب نہیں تھے۔ خاندانی طور پر وہ عام زراعت پیشہ لوگ تھے۔ جسے یہ جاگیر عطا کی گئی تھی' وہ ایک غریب کسان تھے۔ خاندانی نوابوں کی خوبو اور طور طریقے کئی نسلوں کے بعد آتے ہیں۔ یہاں تو کسی کو آباد ہونے کے لیے عمر کی پوری مہلت ہی نہیں ملی۔ حویلی کی روایات کیسے جنم لیتیں۔ دوسری بات یہ کہ ممکن ہے تصاویر کسی کمرے میں موجود ہوں۔ ابھی میں نے ہر کمرے کو کھولا ہی نہیں ہے۔"

"ان کی سواری کے لیے کیا تھا؟ شاہی سواری کے لیے ہاتھی گھوڑے' رتھ یا بگھی۔"

میں نے کہا" میں نے سنا تھا کہ کچھ پرانی موٹریں تھیں مگر وہ مجھے نظر نہیں آئیں۔ کیسی ہیں اور کس حال میں ہیں' معلوم کروں گا۔ اچھا اب تم بتاؤ' تم تیار ہو؟"

"میں بالکل تیار ہوں۔"

میں نے اسے ایک لمبی فہرست بتائی" یہ سارے کام مشکل نہیں ہیں لیکن وقت طلب ہیں۔ اخراجات کے سلسلے میں راجا سے رجوع کرنا۔"

اس نے کہا" آپ فکر نہ کریں' میں سب کرلوں گا۔"

وہ پیدل روانہ ہوگیا۔ میں اسے پل تک جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر وہ پہاڑی کے موڑ پر غائب ہوگیا جہاں اس نے اپنی موٹر سائیکل کہیں چھپائی تھی۔ فرخ کی مدد بروقت ملی تھی اور میرا کام آسان ہوگیا تھا۔ میں یہاں راجا اور شہناز کے ساتھ ایک دن کے لیے آیا تھا اور یہاں پھنس گیا تھا۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ پہننے کے کپڑے' نہ پیسے۔ نہ رابطے کا ذریعہ' نہ آمدورفت کے وسائل۔ اب حالات سے اندازہ ہوتا تھا کہ اگلے چند دن یا چند ہفتے مجھے یہاں کے معاملات کو درست کرنے میں لگ سکتے ہیں۔

شہر میں ایسا کوئی کام نہیں تھا جو میری ذاتی اور فوری توجہ مانگتا۔ کچھ دیر میں فریال کا جہاز لینڈ کرنے والا تھا۔ اس کی طرف سے میری فکر دور ہوگئی تھی۔ وہ محفوظ تھی اور بحفاظت پاکستان لوٹ آئی تھی۔ وہ کوئی عام قسم کی جذباتی اور زود رنج لڑکی نہیں تھی کہ میں ریسیو کرنے نہ گیا تو وہ روٹھ جائے گی یا آنسو بہانے لگے گی۔ راجا اسے میری غیر حاضری کی وجہ بھی بتادے گا اور اسے کہیں نہ کہیں سیٹل بھی کردے گا۔ سب سے موزوں جگہ تو شہناز کا گھر تھا مگر فریال اپنے معاملات خود اپنے ہاتھ میں رکھتی تھی۔

اپنے گھر والوں کی طرف سے بھی مجھے پورا اطمینان تھا۔ راجا نے انہیں ہر طرح سے مطمئن کردیا ہوگا کہ میں کامل دل جمعی سے جاگیر کے معاملات کو سنبھال رہا ہوں۔ انہوں نے چھ سال تک سات سمندروں کی دوری برداشت کی تھی تو اب عارضی طور پر کچھ عرصہ میری جدائی ان کے لیے کوئی مسئلہ نہ تھی۔ میں پاکستان میں ہی تھا اور چند گھنٹوں میں ادھر سے ادھر آنا جانا کسی کے لیے بھی مشکل نہ تھا۔ تاہم ٹیلی مواصلات کی اتنی ترقی کے باوجود ست بدھائی کا لاہور سے رابطہ نہ ہونا ایک الجھن تھی۔ ایک زمانے میں ٹیلی فون حاصل کرنا بھی اتنا ہی مشکل ہوتا تھا جتنا کسی دشمن ملک کا ویزا لگوانا مگر اب گھر کا ہر فرد اپنا سیل فون جیب میں لیے پھرتا تھا اور ہر وقت ہر جگہ رابطے میں رہتا تھا۔ پرابلم یہاں کسی موبائل فون کمپنی کے سگنل کا موصول نہ ہونے سے پیدا ہوئی تھی۔ یہ پرابلم پاکستان کے دورافتادہ یا پہاڑی علاقوں میں ابھی تک موجود تھی اور اس کا واحد حل سیٹ لائٹ فون تھا۔ میں نے جو چیزیں فرخ کے ذریعے منگوائی تھیں ان میں "تھورایا" کمپنی کا سیٹ لائٹ فون ریسیور بھی تھا۔ یہ رابطے کا مہنگا مگر موثر اور بین الاقوامی ذریعہ تھا۔

ایک مسئلہ جو قطعی غیر اہم تھا' خدمات کی عدم دستیابی تھی۔ جانو بابا کی موت کے باعث سب خدمت گزار اپنے مالک کو بھولے ہوئے تھے لیکن اس وقت مجھے سخت خفت محسوس ہوئی جب فرخ کے جانے کے کچھ دیر بعد کبیر خان میرے لیے ناشتے کی ٹرے کے ساتھ نمودار ہوا۔

میں نے کہا" کبیر خان! اس کی ضرورت نہیں تھی۔"

اس نے ٹرے کو میز پر رکھ دیا" مالک۔ جہاں رشتے دار اور پڑوسی ہوں وہاں یہ ذمے داری سب مل کے اٹھالیتے ہیں۔ سوئم تک گھر میں چولہا نہیں جلتا لیکن یہاں کون ہے...... سب بھوکے تو نہیں بیٹھے رہ سکتے۔ اپنے لیے کیا تو آپ کے لیے بھی کرلیا۔"

میں نے کہا" تھینک یو۔ جنازہ کب اٹھے گا؟"

وہ بولا" آس پاس خبر کردی ہے۔ پنڈ سخاوت سے مولوی آئے گا۔ وہ کفن بھی لاتا ہے۔ غسل بھی دیتا ہے اور جنازہ بھی پڑھاتا ہے۔"

یہ سب کام دوپہر سے پہلے شروع ہوئے۔ میں تمام وقت وہیں موجود رہا۔ میری جیب میں کچھ رقم تھی مگر جانو بابا کے لواحقین نے کچھ بھی لینے سے انکار کردیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ آخری ذمے داری وہ خود پوری کریں گے۔ دوپہر تک گردونواح سے تیس چالیس افراد آگئے اور

جانو بابا کو کچھ فاصلے پر پنڈ سخاوت کے قبرستان میں سپرد خاک کردیا گیا۔ حوالہ تو شرعی تھا کہ تدفین میں تاخیر نہیں ہونی چاہیے مگر میں نے محسوس کیا کہ وہاں ہر شخص عجلت میں ہے۔ ایک کام ہے' جتنی جلد ختم ہو اچھا ہے۔ جانو بابا کی زندگی پوری ہوچکی تھی اور وہ کسی کو بھی اتنا عزیز نہ تھا کہ اس کا مرنا کسی کے لیے ناقابل تلافی نقصان ہوتا۔ کسی نے اس کی کمی کو محسوس ہی نہیں کیا۔ ابتدائی صدمے سے تھوڑے بہت آنسو نکل آنا فطری بات تھی مگر اس کو دفن کرتے ہی جیسے ہر شخص نے اسے فوراً فراموش کردیا۔ اس کا ذکر بھی ضروری نہ رہا۔ زندگی چند گھنٹوں بعد روز کے معمول پر آگئی۔ بچے اپنے کھیل کود میں لگ گئے۔ خواتین نے اپنا کام شروع کردیا۔

اب وقت تھا کہ میں باقی حویلی کا جائزہ لے سکوں۔ اوپر والی منزل کی چھت پر ایک بارہ دری سی بنی ہوئی تھی۔ میں نے اوپر جانے کا زینہ تلاش کیا اور بارہ دری میں پہنچ گیا۔ یہ بیس فٹ لمبا چوڑا کمرا تھا جس میں ہر طرف تین محرابی دروازے بنادیے گئے تھے۔ اس میں ایک وسیع وعریض تخت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ تخت کی لکڑی بھی دھوپ اور بارش سے انتہائی بوسیدہ ہوگئی تھی۔

زمین سے تقریباً اٹھائیس تیس فٹ کی بلندی سے میں نے گردوپیش پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ میرے چاروں طرف گھنا جنگل تھا مگر پہاڑی اور پل کے پیچھے مجھے دریائے کنہار دکھائی دیا۔ یہ میری جاگیر کی مغربی حدود کو چھوتا ہوا گزر رہا تھا۔ اس پر ڈیم بنانے کا آئیڈیا یقیناً قابل عمل تھا لیکن حتمی فیصلہ ماہر انجینئر ہی کرسکتے تھے۔ کیا یہاں ہائیڈل پاور پلانٹ مالی طور پر منفعت بخش ہوگا اور جو بجلی پیدا ہوگی وہ کسی دوسرے پروجیکٹ کے لیے فائدہ مند ہوگی۔ خصوصاً ان حالات میں کہ واپڈا کی لائن بھی موجود تھی۔ یہ معاملہ بھی ماہرین ہی طے کرسکتے تھے کہ ڈیم کا پانی آبپاشی کے لیے استعمال ہوگا تو اس سے علاقے کی پیداوار کتنی بڑھے گی۔ یہاں روزگار کے کتنے مواقع پیدا ہوں گے اور یہ علاقہ ترقی کرے گا یا نہیں؟

میں نے تخت کو کھڑا کیا اور بارہ دری کی چھت پر چڑھ گیا۔ اب میں چالیس فٹ کی اونچائی سے پورے علاقے کا ایریل سروے کرسکتا تھا۔ اگر میرے ہاتھ میں ایک دوربین ہوتی تو میں تمام اطراف میں ہر لوکیشن کو زیادہ تفصیل کے ساتھ دیکھ لیتا۔ مشرق میں پھیلے ہوئے جنگل کے اوپر سے میں نے ایک کھلے حصے میں وقفے وقفے سے حرکت کا مشاہدہ کیا۔ میری آنکھوں تک سورج کی روشنی منعکس ہوکے پہنچی اور غائب ہوگئی۔ نظر جما کے دیکھنے سے مجھے ایک بس متحرک نظر آئی۔ فاصلے کی وجہ سے وہ مجھے چیونٹی کی رفتار سے رینگتی نظر آرہی تھی اور کھلونے جیسی لگتی تھی۔

ادھر یقیناً کوئی سڑک تھی۔ میرا اندازہ درست ثابت ہورہا تھا۔ ادھر سے کوئی راستہ یقیناً جہلم کی طرف نکلتا تھا یا موٹر وے تک جاتا تھا۔ شاید درمیان میں میلوں تک پھیلے ہوئے جنگلات کی وجہ سے سڑک کوئی نہیں تھی اور چھوٹی موٹی آبادیوں کے درمیان کچے راستے پر بیل گاڑیاں اور گھوڑا گاڑیاں آتی جاتی ہوں گی۔ گاڑیوں کے لیے ست بدھائی پہنچنے کا واحد راستہ روہتاس اور ٹیلا جوگیاں کی طرف سے تھا۔ تاہم کچے راستے پر بھی گاڑیوں کی آمدورفت ناممکن نہیں تھی۔ اس کا ثبوت مجھے اپنے علاقے میں تعمیر شدہ بیرک کا جائزہ لیتے ہوئے مل گیا تھا۔ تاہم اس تمام علاقے کا تفصیلی جائزہ لینے کے لیے مجھے ایک فوروہیل ڈرائیو جیپ اور ایک پورے دن کی ضرورت تھی۔

یہ احساس بہت عجیب تھا کہ آج اس لمحے میں خدا کی بنائی ہوئی اس زمین کے اس حصے کی ملکیت رکھتا ہوں جو تاحدِ نظر پھیلی ہوئی ہے اور ساری بات اسی ایک لمحے کے احساس کی ہے جب دنیا کے کروڑوں اربوں انسانوں کے پاس اپنی ایک انچ زمین بھی نہیں۔ بے شک انجام سب کا دو گز زمین پر ہے لیکن آج یہ زمین ہی دولت ہے اور طاقت ہے اور حکومت ہے۔ اگر خدا نے مجھے یہ زمین دی ہے تو پھر مجھے زمین پر رہنے والوں کے لیے کچھ کرنا چاہیے خواہ وہ انسان ہوں۔ پودے درخت یا دوسرے ذی روح۔ ورنہ میرے بعد بھی حویلی رہ جائے گی۔ نام مٹ جائے گا' پرانے وقتوں میں کہا گیا تھا۔

نام مطلوب ہے تو فیض کے اسباب بنا
پل بنا چاہ بنا مسجد وتالاب بنا

یہ آج بھی درست ہے۔ پل پہلے سے ہے۔ تالاب نہ سہی دریائے کنہار ہے۔ چاہ یعنی کنواں بھی ہے' مسجد بھی ہے مگر اور بہت کچھ ہونا چاہیے جو نہیں ہے۔ اس علاقے میں اسکول اسپتال نہیں ہیں۔ روزگار کے مواقع نہیں ہیں۔ صفائی نہیں ہے' گھروں میں بجلی نہیں ہے۔ فون نہیں ہیں۔ اگر یہاں ترقیاتی کام ہو تو بہت کچھ ہوسکتا ہے۔ مرد لکڑی کاٹنے یا فرنیچر بنانے اور کیٹل فارمنگ کے کام کرسکتے ہیں۔ عورتوں کو کاٹیج انڈسٹری میں لگایا جاسکتا ہے۔ دو ڈھائی سو افراد کو روزگار ملے تو خوشحالی آسکتی ہے۔ تعلیم اور صحت کی سہولت کے لیے ایک چھوٹی سی ماڈل کالونی آباد کی جاسکتی ہے۔

یہ شیخ چلی کے خواب نہیں تھے۔ یہ سب کچھ ہوسکتا تھا۔ روم کے لیے کہتے ہیں کہ ایک دن میں نہیں بنا تھا۔ میرے خواب کو تعبیر کے لیے پانچ دس سال لگ سکتے ہیں۔ اس کے لیے وقت' منصوبہ بندی اور وسائل تینوں کا ہونا ضروری ہے۔ خدا نے مجھے عقل دی ہے۔ صلاحیت اور ہمت دی ہے۔ میں کیا کرسکتا ہوں۔

میں زمین سے تیس فٹ اوپر تھا اور میرے خیالات کی پرواز کی حد کوئی نہ تھی۔ نیچے سے سرونٹ کوارٹر میں رہنے والوں نے دیکھا ہوگا کہ مالک اکیلے بارہ دری کی چھت پر کھڑے اتنی دیر سے نہ جانے کیا دیکھ رہے ہیں۔ میں نے نیچے اترنے کا سوچا ہی تھا کہ ایک طرف سے مجھے ریشماں کھانے کا خوان سجائے حویلی کی طرف آتی نظر آئی۔ میں

نے سر کے اشارے سے اس پر واضح کیا کہ میں آرہا ہوں۔ عین اسی وقت حویلی کے صدر دروازے سے ایک گاڑی اندر آگئی۔

میں نے راجا کو ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا دیکھا۔ گاڑی کے رکتے ہی پیچھے والے دروازے سے فریال نے باہر قدم رکھا تو ایک لمحے کے لیے میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ میں نے چھت پر سے جمپ لگانے کی خواہش پر قابو پایا اور زینے سے نیچے بھاگا۔

وہ سراپا ناز' تصویر حسن و شباب اپنے وجود کی ساری تابکاری اور تباہ کاری کے ساتھ میری نظروں کے سامنے تھی۔ انتہائے حیرت اور وفور مسرت نے مجھے بے خود کردیا۔ ایسا ہمیشہ ہوتا تھا۔ جب وہ میرے سامنے آتی تھی تو میری نظر میں اور کچھ نہیں رہتا تھا۔ میں سب کچھ بھول جاتا تھا۔ سوائے اس احساس کے جس کا نام کوئی نہیں اور پھر بھی ان گنت نام ہیں۔ پیار' محبت' عشق' سودا کہیں جنوں کہیں وحشت کہیں جسے۔

اظہار عشق میں فریال ہمیشہ سے بے باک تھی۔ نہ وہ دیکھنے والوں کی پروا کرتی تھی نہ انگشت نمائی کرنے والوں کی اور نہ باتیں بنانے والوں کی۔ اس نے یہاں بھی کچھ نہیں دیکھا۔ کسی کی طرف نہیں دیکھا۔ میں تو قریب پہنچ کے رک گیا تھا مگر وہ نہیں رکی۔ جیسے ایک خاص فاصلے کے بعد لوہے یا مقناطیس کے لیے ممکن ہی نہیں رہتا کہ وہ کشش باہمی سے چپک نہ جائیں۔

وہ ایک دم مجھ سے چمٹ گئی اور رونے لگی۔ میرے لیے بڑی مشکل ہوگئی۔ راجا کے لیے یہ سین بالکل غیر متوقع نہیں تھا مگر کار کا ڈرائیور دم بخود رہ گیا۔ ایسی بے حیائی کا مظاہرہ اس نے صرف ولایتی فلموں میں ہی دیکھا تھا۔ میرے پیچھے کہیں ریشماں تھی جو کھانے کی ٹرے اٹھائے کھڑی تھی' غنی کے ساتھ میدان عشق کی دوڑ میں وہ اپنی کم عمری اور کم مائیگی کے باوجود تمام رکاوٹوں کو عبور کرچکی تھی مگر اس لو سین پر فرط جذبات میں اس کی بھی چیخ نکل گئی۔

میں نے بڑی مشکل سے فریال کو الگ کیا۔ "فری' یہ کیا کررہی ہو۔ سنبھالو خود کو۔ کیوں رو رہی ہو؟" میں نے اسے جھنجوڑ کر کہا لیکن اس پر اثر نہ ہوا۔ وہ اسی طرح ہچکیوں سے روتی رہی۔ گاڑی کے ڈرائیور کے ذہن نے اس بے خود کردینے والے جذباتی منظر کی کوئی وجہ سمجھ لی ہوگی کہ وہ ڈکی کھول کے سامان نکالنے میں مصروف ہوگیا تھا۔ کچھ اسباب گاڑی کی چھت پر تھا جس سے میں نے اندازہ کیا کہ وہ کرائے کی گاڑی ہوگی اور شاید ائرپورٹ سے ہی بک کرلی گئی ہوگی۔

راجا نے مجھے اشارہ کیا "اسے اندر لے جا اور آرام سے لٹادے۔ بہت تھکی ہوئی ہے اور نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہے۔"

میں نے کہا "ہاں۔ اس کے سوا کیا ہوسکتا ہے" اور سسکیاں لیتی فریال کو کھینچ کے اندر لے گیا۔ وہ میرے بازو سے لگی رہی اور اسے سنبھالنے کے لیے مجھے ایک بازو اس کے شانوں کے گرد رکھنا پڑا۔ ریشماں میرے پیچھے پیچھے آگئی۔ شاید وہ خلوت میں کوئی زیادہ جذباتی ان سنسرڈ سین دیکھنے کی امید رکھتی تھی۔ میں نے اسے گھور کے دیکھا تو وہ ٹرے میز پر رکھ کے سٹک گئی۔

فریال کو میں نے بیڈ پر لٹادیا۔ وہ مجھے چھوڑنے پر تیار نہ تھی۔ اس کا سارا بدن کانپ رہا تھا اور ہاتھ ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔ اس کا رنگ زرد تھا اور آنکھوں کے گرد حلقے نظر آرہے تھے۔ اس کی خوف اور وحشت زدہ سی نظریں ہر طرف سرگرداں تھیں جیسے ہر سمت سے نظر نہ آنے والے اور محسوس نہ ہونے والے خطرات اب بھی اس پر یلغار کررہے ہیں۔

میں نے اسے بہت تسلی دی۔ بہت حوصلہ دیا۔ اسے یقین دلایا کہ اب وہ محفوظ ہے اور اسے پانی پلانے کے بعد اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کے بیٹھا رہا۔ آہستہ آہستہ اس کے جسم کی لرزش ختم ہوگئی۔ اس کی سسکیاں رک گئیں اور آنکھوں کے گوشوں سے بہہ کر تکیے میں جذب ہونے والے آنسو بھی تھم گئے۔

میں نے مسکرا کے کہا "پاگل لڑکی! مجھے ہرگز یہ امید نہ تھی کہ تم سیدھی یہاں آجاؤ گی۔"

اس نے پُرملامت لہجے میں کہا "کیوں امید نہیں تھی؟"

میں نے خفت سے کہا "یہ جگہ اتنی دور ہے۔"

"دور ہے؟ کتنی دور ہے؟ میں لندن سے نیروبی اور پھر کراچی سے لاہور تک آگئی۔ آخر کس کے لیے رومیو! تم تک پہنچنے کے لیے اس سے بھی آگے جہاں بھی جانا پڑتا میں جاتی۔" وہ خود کلامی کے انداز میں بولتی رہی۔

میں نے کہا "آئی ایم سوری! تمہیں راجا نے بتادیا ہوگا' میرے نہ آنے کا سبب۔"

"میں شکایت نہیں کررہی تھی؟" وہ سادگی سے بولی۔

اگلے آدھے گھنٹے میں فریال کی حالت بہت بہتر ہوگئی۔ راجا نے ایک عقلمندی یہ کی تھی کہ شہناز کو بھی اپنے ساتھ ائرپورٹ لے گیا تھا۔ اس نے وہیں دیکھ لیا تھا کہ طویل سفر کی تھکن اور شدید جذباتی بحران کے باعث فریال کی کیا حالت ہورہی ہے۔ انہوں نے کوشش کی کہ فریال کو اپنے ساتھ لے جائیں۔ مگر اس کی ایک ہی رٹ رہی کہ "رفیق نہیں آسکا تو کیا ہوا۔ مجھے اس کے پاس لے چلو۔ میں اور کہیں نہیں جاؤں گی" مجبوراً راجا نے ست بدھائی تک کے لیے ٹیکسی ہائر کی۔ شہناز نے راجا کو چند دوائیں لکھ دی تھیں کہ فریال کو دے دینا۔ راجا نے راستے میں وہ دوائیں خرید لی تھیں لیکن فریال نے کھانے سے انکار کردیا تھا۔ راجا نے اصرار نہیں کیا کیونکہ وہ سخت ترین ٹینشن میں تھی اور راجا کو ڈر تھا کہ اس پر نہ پھٹ پڑے۔

اب راجا نے وہ دوائیں میرے حوالے کردیں۔ میں نے

ریشماں سے کہا کہ گرم دودھ لادے۔ فریال نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ اس کی قوتِ مزاحمت کا گراف زیرو پر تھا اور جسمانی قوت بھی جواب دے چکی تھی۔ سکون آور دواؤں کا اثر ظاہر ہونے سے پہلے ہی وہ بے سدھ سوگئی۔

راجا نے کہا "خدا کا شکر ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ ائرپورٹ پر تو نظر نہ آیا تو یہ ناراض ہوگی۔ وہاں تو کچھ نہیں بولی' لیکن اس کے بعد میں نے کہا کہ میرے ساتھ چلو تو چلانے لگی کہ میں کیا تم سے ملنے آئی ہوں۔ کیوں جاؤں میں کہیں اور...... شہناز نے سمجھانا چاہا کہ تم تھکی ہوئی ہو۔ تو اس پر برہم ہوگئی کہ ڈاکٹر صاحب' یورپ سے افریقا اور ایشیا تک ہزاروں میل کے سفر میں نہیں مری تو ڈیڑھ سو میل آگے جانے میں نہیں مروں گی۔ ظاہر ہے اس کے بعد شہناز بھی سمجھ گئی کہ ایسی ذہنی کیفیت میں اس سے ہمدردی کا اثر ہی الٹا ہوگا۔"

میں نے کہا "تیری ملاقات فرخ سے ہوئی؟"

راجا سر کھجانے لگا "یہ زنانہ نام ہے یا مردانہ؟"

میں نے کہا "چل چھوڑ۔ یہ بتا تو نے میرے گھر میں کیا بیان دیا؟"

"میں نے کہا کہ مملکت ست بدھائی کے جلیل القدر فرمانروا نے عنانِ حکومت سنبھالتے ہی حالات کا کنٹرول سنبھالنے کے اقدامات شروع کردیے ہیں اور شب و روز کی مصروفیت کے باعث وہ صرف امور سلطنت پر ساری توجہ مرتکز کررہے ہیں۔ فی الحال وہ اپنے دارالحکومت میں ہی قیام فرمائیں گے' وغیرہ وغیرہ۔ تیرے ابا خوش ہیں لیکن ایک تشویش ہے انہیں۔ پہلے کوئی فون کرکے تجھے پوچھتا رہا۔ انکل کا کہنا تھا کہ کوئی سخت بدتمیز آدمی تھا۔ اسے بتایا کہ وہ نہیں ہیں تو کہنے لگا کہ آخر وہ کب ملتے ہیں۔ جب پوچھا جائے یہی جواب ملتا ہے۔ انکل نے کہا کہ معلوم نہیں' پہلے آپ نے کب فون کیا تھا اور کس نے یہ جواب دیا تھا مگر اس گھر میں جھوٹ کوئی نہیں بولتا۔ اس پر وہ کہنے لگا کہ وہ کہاں گئے ہیں اور کب آئیں گے۔ انکل نے کہا کہ وہ شہر سے باہر ہیں اور ان کی واپسی کا طے نہیں ہے کہ کب ہوگی۔ پھر اس نے موبائل نمبر مانگا۔ انکل نے کہا کہ نمبر تو میں آپ کو دے دوں لیکن اس کا فائدہ کچھ نہیں کیونکہ وہاں رابطہ نہیں ہوتا۔ وہ کہنے لگا کہ کیا ولایت سے واپس آتے ہی آپ کے فرزند ماؤنٹ ایورسٹ پر چڑھ گئے ہیں کہ رابطہ نہیں ہوسکتا۔ ظاہر ہے اس پر انکل نے فون بند کردیا۔"

"ایسا بدتمیز کون تھا؟"

"انکل نے گھر کے دیگر افراد سے معلوم کیا تو رابعہ نے بتایا کہ اس کی بھی کسی سے بات ہوئی تھی۔ اس نے بتایا کہ وہ تو نہیں ہیں۔ وہ پھر مذاق کرنے لگا کہ آخر آپ کے وہ اتنا عرصہ باہر رہ کے لوٹے ہیں۔ اب بھی اندر نہیں رہتے۔ رابعہ نے کہا کہ آپ کو بات کرنے کی تمیز نہیں۔ آپ ہیں کون تو بولا کہ پہلے آپ بتائیں آپ اس کی پہلی بیوی ہیں' دوسری یا تیسری۔ رابعہ نے کہا کہ میں تو ان کی کزن ہوں۔ بیویاں ہوں گی تمہاری بہنیں۔ چوتھی ہے تو اسے بھی بیاہ دو۔"

مجھے ہنسی آئی "کیا خوب فرمایا مس رابعہ نے۔ مگر وہ اُلو کا پٹھا ہے کون' کیا چاہتا ہے؟"

"میرا شک انہی پر جاتا ہے۔ گاہے شاہ پر آج کل تیرے سب پرانے دوستوں کو جلاب لگے ہوئے ہیں۔ چیف صاحب لندن سے فرار ہوگئے ہیں اور غالباً فرانس پہنچ گئے ہیں۔"

"یہ تو اچھی خبر ہے لیکن اچانک کیا ہوا؟"

"لندن میں اس کی رہائش گاہ پر چھاپا پڑا۔ صفائی پر مامور کسی خادمہ نے گمنام فون کرکے اطلاع دی تھی کہ وہاں ایک شخص مفلوج اور معذور پڑا ہوا تھا۔ اب وہ غائب ہے۔ اس نے کچھ عرصہ قبل چیف کو کسی سے بات کرتے سنا تھا کہ اس مصیبت سے کیسے پیچھا چھڑایا جائے؟ وہ کسی سے اس مفلوج شخص کے بارے میں بات کررہا تھا کہ وہ کب سے لاش کی طرح پڑا ہوا ہے' بہتر ہے کہ اس لاش کو ٹھکانے لگادیا جائے۔ سوال یہ ہے کہ کیسے۔ وہ مختلف طریقے ڈسکس کررہے تھے کیونکہ انہیں ڈر تھا' لندن پولیس قتل کا سراغ لگانے میں ماہر ہے اور ان تک پہنچ جائے گی۔"

میں نے کہا "کیا وہ ٹائیگر کے بارے میں ڈسکس کررہے تھے؟"

"غالباً ٹائیگر کو تو نے مار مار کے بھس بھر دیا تھا۔ بھس بھرے ٹائیگر کا وہ کیا کریں گے؟"

"چیف کے برے دن آگئے ہیں ورنہ وہ ایسی بے وقوفی کیوں کرتا۔ خادمہ کی موجودگی میں وہ مرڈر پلان پر بات کررہے تھے۔ دوسرا کون تھا؟"

"پتا نہیں۔ دراصل انہیں دھوکا ہوگیا۔ خادمہ انگریز تھی لیکن پہلے کئی سال پاکستانی سفارت خانے کے کسی اہلکار کے گھر میں کام کرچکی تھی۔ وہ اردو میں بات کررہے تھے۔ اس خیال سے کہ خادمہ کیا سمجھے گی مگر وہ اردو جانتی تھی۔ غالباً اسے وہاں پلانٹ کیا گیا تھا۔ کسی ایجنسی نے رکھوایا ہوگا یا پھر وہ لندن پولیس کی مخبر ہوگی۔ اس نے بتایا کہ ایک تو وہ زندہ لاش اب نظر نہیں آرہی ہے دوسرے فرش کی صفائی کے دوران میں اسے کچھ داغ دھبے بھی دکھائی دیے جو غیر معمولی تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ انہیں صاف کرنے کی پوری کوشش کی گئی تھی مگر خشک ہونے کے بعد وہ پھر جھلک دینے لگے۔ یہ دھبے قالین پر تھے۔ پولیس نے کسی کارپٹ کلینر سے معلوم کیا کہ کیا گزشتہ روز انہوں نے اس علاقے میں کہیں کارپٹ کی صفائی کی تھی' انہوں نے بتادیا۔"

"پھر چیف کیسے بچ کے نکل گیا؟"

"یہ پتا نہیں۔ شاید اسے بھی کسی ذریعے سے پولیس کی کارروائی کی سن گن مل گئی تھی یا اتفاق سے وہ پہلے ہی نکل گیا تھا۔"

"لندن پولیس ایسے اتفاق کی نوبت نہیں آنے دیتی۔ مگر اب اس بات سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ کیسے نکل گیا۔ وہ کسی مافیا کے سرغنہ سے کم تو نہیں۔ اس کا بھی ایک انٹیلی جنس نیٹ ورک ہے۔ پولیس کو وہاں سے کیا ملا؟"

"پلاسٹک کی چھوٹی تھیلیوں میں بند ایک لاش کے ٹکڑے۔ ان سب پر "ڈاگ فوڈ" لکھا ہوا تھا۔ ساری تھیلیاں ایک فریزر میں تھیں۔"

"کیسا عبرت کا مقام ہے راجا! وہ جو ٹائیگر کہلاتا تھا۔ اپنی خوں آشامی کی وجہ سے۔ نہ جانے کتنے انسانوں کا شکار کر چکا تھا۔ خود کتوں کی خوراک بن گیا۔ شاید کتوں نے ٹائیگر کے کچھ گوشت سے پیٹ بھی بھرا ہو۔ چھاپا نہ پڑتا تو وہ پورے کا پورا ہضم ہو کے خارج ہو جاتا۔ اب سوال یہ ہے کہ چیف پر قتل کا الزام آیا تو وہ فرانس میں بھی کیسے رہ سکے گا۔ انٹرپول اسے پکڑ لائے گی۔"

راجا بولا "کچھ لوگ کہہ رہے تھے کہ یہ اسٹوری بنائی گئی ہے۔ چیف کا سابقہ ریکارڈ اسے ایک کرمنل جینکس ثابت کرتا ہے۔ اس کے دامن پر کتنے لوگوں کے خون کے داغ ہیں؟ صحیح حساب کا پتا تو میدان حشر میں ہی چلے گا لیکن یہاں اس کے خلاف ایک بھی قتل کا فرد جرم نہیں۔ جتنے لوگوں کو اس نے خود مارا اس سے دس گنا یا سو گنا کو دوسروں کے ذریعے مروایا...... مگر کیا کبھی وہ پکڑا گیا؟ جب پکڑے گئے یا پکڑوائے گئے بے گناہ تھے' وہ ایک تیر سے دو شکار کرتا رہا۔ ایک باقی کو مارا تو دوسرے کو قتل کے الزام میں تختۂ دار پر پہنچا دیا۔ دیکھ لینا' اب بھی ایسا ہی ہوگا۔ چیف ایسے کام کبھی خود نہیں کرتا' دوسروں سے کراتا ہے۔"

"ٹھیک کہا تو نے۔ وہ پھر بچ جائے گا۔ لندن کے مقابلے میں پیرس ہمیشہ جلا وطنی کے لیے زیادہ محفوظ رہا ہے۔

راجا نے کہا "پریشانی زیادہ ہے نچلے درجے کے کارکنوں کی۔ وہ سب ایک کرمنل ریکارڈ رکھتے ہیں اور بلیک میل بھی ہوتے ہیں۔ دس سال تک یہ لوگ بدمعاشی کی طاقت میں فرعون بنے رہے۔ ظلم و ستم اور لوٹ مار کرتے رہے۔ اب ان کے ہاتھوں زک اٹھانے والے اقتدار میں شریک ہیں۔ بازی پلٹ گئی ہے تو انہیں منہ چھپانے کا ٹھکانا نہیں مل رہا ہے۔ گامے شاہ اور شہاب الدین بھی بھاگنا چاہتے ہیں لیکن راستہ نہیں مل رہا ہے۔ اب وہ بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں اور مرنے مارنے پر آمادہ ہیں کہ ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔ وہ تجھے بھی پریشان کریں گے۔"

میں نے کہا "دیکھی جائے گی یار۔ فون کے علاوہ تو کچھ نہیں کیا انہوں نے۔"

راجا نے کہا "وہ جو تیرا احمق الزماں کزن ہے نا' افضل...... وہ کہہ رہا تھا کہ اسے باہر کچھ لوگوں نے روک کے پوچھا تھا کہ رفیق کہاں ہے' پھر وہ لوگ گھر کے سامنے کھڑے ہوئے دکھائی دیے تھے۔ اس نے یہ بات رابعہ سے کہی تو رابعہ نے کہا کہ اچھا وہ دوبارہ نظر آئیں تو مجھے بتانا۔ کل رات وہ چھت پر ورزش کر رہا تھا۔ آج کل اسے باڈی بلڈنگ کا شوق ہو رہا ہے۔ اس نے اوپر سے دیکھا تو وہ لوگ پھر نظر آئے اور اس نے رابعہ کو اطلاع دی۔ رابعہ نے ذرا ہوشیاری دکھائی۔ گھر میں کہیں کیمرا پڑا تھا اور اس میں فلم بھی تھی۔ اس نے اوپر والی کھڑکی سے فوٹو اتار لی۔ فلیش ہوا تو انہوں نے چونک کے اوپر دیکھا۔ رابعہ نے پھر ایک اسنیپ لے لیا۔

"وہ کیا کرتے ہیں' سامنے آ کے کھڑے ہو جاتے ہیں۔"

"تمہارے گھر کے سامنے دروازے سے ذرا ہٹ کے ایک ہیئر ڈریسر کی دکان ہے۔ وہ وہاں بیٹھے رہتے ہیں۔ جان پہچان بنالی ہوگی۔"

"رابعہ نے بڑی بے وقوفی کی۔ انہیں ہوشیار کر دیا۔ تصویر اتارنی ہی تھی تو فلیش بند رکھتی۔ دن میں اتارتی' خیر...... پہلے یہاں کے معاملات سے نمٹ لیں۔ تو کسی مکینک کو نہیں لایا۔"

"لایا ہوں۔ وہ گاڑی ٹھیک کر رہا ہے۔"

"کون...... یہ ڈرائیور! یہ مکینک بھی ہے۔"

"میرے ایک جاننے والے کی گاڑیاں کرائے پر چلتی ہیں۔ اس کی اپنی ورکشاپ میں کام کرتا ہے۔ اس نے ڈرائیور کی جگہ اسے ساتھ کر دیا کہ یہ تمہاری گاڑی ٹھیک کر کے اپنی گاڑی میں لوٹ آئے گا۔ میں تیرے گھر گیا تو اماں نے تیرے کپڑے ایک سوٹ کیس میں بھر دیے۔ چائے کافی کا سامان اور بسکٹ ڈال دیے کہ وہاں تو کچھ نہیں ملتا جب میں چلنے لگا تو پہلے تیرے ابا نے ایک لفافہ دیا کہ اس میں پچاس ہزار روپے ہیں۔ میں نے کہا کہ وہاں کوئی ضرورت نہیں مگر وہ مصر رہے کہ لے جاؤ۔ ضرورت کا کیا پتا۔ میں نے ایک تو خرید لیا جنریٹر۔ چھوٹا ہے لیکن ہماری ضروریات پوری کرے گا۔ پیٹرول کم خرچ ہوگا۔ وہ بھی پانچ ہزار میں۔"

"پانچ ہزار میں؟ کیا چوری کا مال تھا؟"

"چائنا کو دعائیں دے فیکے پتر! بازار میں ہر چیز کوڑیوں کے دام مل رہی ہے غریبوں کو۔ یہی جنریٹر جاپانی برانڈ ہو تو بیس ہزار کا ہے اور جرمنی کا شاید اس سے بھی دگنا مہنگا ہوگا۔ یہاں وائرنگ تو ہے نہیں میں تار اور بلب ہولڈر وغیرہ اٹھا لایا ہوں۔ ہم اٹھارہ واٹ والے دس انرجی سیور بلب لگا سکتے ہیں۔ پنکھے چلا سکتے ہیں دو۔"

"پنکھے ہیں کہاں؟"

"دو ٹیبل فین لایا ہوں میں۔ مگر اصل چیز یہ ہے" اس نے اپنے بریف کیس میں سے ایک موبائل فون نکالا "سیٹ لائٹ ریسیور فون۔"

میں نے کہا "تو نے بڑی عقل مندی کی لیکن میں نے یہ سب فرخ سے منگوایا تھا۔ اس سے تیری ملاقات نہیں ہوئی؟ اب یہ ساری چیزیں وہ ہی اٹھا لائے گا۔ دو فون ہونے چاہئیں۔ ایک جنریٹر اسٹینڈ بائی رہے گا۔"

"یار' یہ فرخ کا نام پھر لیا تو نے۔ راتوں رات یہ کیا چیز آ گئی تیرے ہاتھ میں؟ کون ہے فرخ!"

میں نے کہا "فرخ وہی ہے۔ جو مجھے قتل کرنا چاہتا تھا۔ یہاں تک اسی لیے آیا تھا۔"

راجا بھونچکا رہ گیا "وہی...... یعنی فرخندہ کا بھائی؟"

میں نے کہا "ہاں۔ مجھے شک تھا کہ اس نے فائر کر کے گاڑی کے اگلے ٹائر کو برسٹ کر دیا تھا۔"

"تو کیا ایسا نہیں تھا؟"

میں نے کہا "نہیں۔" اور پھر اسے تفصیل سے فرخ کے بارے میں بتا دیا کہ اس کی اور میری ملاقات کیسے ہوئی تھی اور اس کے بعد کیا واقعات پیش آئے تھے۔ راجا کے حیرت و استعجاب کی کوئی حد نہ تھی۔ فریال گہری نیند میں تھی۔ چنانچہ ہم اطمینان سے دو گھنٹے باتوں میں مصروف رہے اور اس دوران میں بہت سے کام بھی نمٹا لیے۔ ہم نے اوپر جانے والے زینے پر کمرے میں اور برآمدے میں جہاں ضرورت محسوس کی تاروں کو دیوار کے ساتھ رکھتے ہوئے انرجی سیور لٹکا دیے۔ اب رات کو کسی بھی حصے میں مکمل تاریکی ہونے کا کوئی امکان نہ تھا۔ اصولی طور پر ہم پہلے ہی طے کر چکے تھے کہ اب اولین فرصت میں پوری حویلی کی تزئین نو اور آرائش کی جانے لگی۔ اس رینوویشن پروگرام میں ضروری مرمت' رنگ و روغن' الیکٹرک فٹنگ جیسے کام اولیت رکھتے تھے۔ مین لائن اگر آدھا کلومیٹر کے فاصلے پر موجود تھی اور کھمبے میری جاگیر کے اندر لگے ہوئے تھے تو عارضی انتظام کے طور پر وہاں سے تار جوڑ کے بجلی لینا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ بعد میں دو چار کھمبے لگوائے جا سکتے تھے۔ واپڈا کے اہلکاروں سے پوری امید تھی کہ وہ خود میرے در دولت پر حاضری دیں گے اور پوچھیں گے کہ حضور والا' ہمارے لائق کوئی خدمت۔ تقریباً تمام سرکاری محکموں کی کارکردگی کو گھٹانے بڑھانے میں سکہ رائج الوقت اسی طرح کام کرتا تھا جیسے کار میں ایکسی لریٹر کرتا ہے۔ ابھی چونکہ ترقیاتی منصوبے ایک خیال سے زیادہ کچھ نہ تھے' اس لیے ست بدھائی میں مستقل قیام لاحاصل تھا۔ کسی بھی پروجیکٹ کے لیے زمینی سروے سے فزیبلٹی رپورٹ یعنی قابلِ عمل ہونے کے بارے میں انجینئرز اور اپنے شعبے کے ماہرین کی رپورٹ سے پیپر ورک' ساز و سامان کی فراہمی تنصیب اور منصوبے کی تکمیل تک ان گنت مراحل تھے۔ اس کے لیے وقت سرمایہ اور افرادی قوت سب کو یکجا کرنا آسان کام نہ تھا۔

میں نے راجا کے اس خیال سے اتفاق کیا کہ جلد از جلد کنٹرول سنبھال کے اور سکیورٹی کے انتظامات مکمل کر کے ہم کو واپس شہر چلے جانا چاہیے اور دوبارہ اس وقت آنا چاہیے جب کسی ایک پروجیکٹ پر عملی کام کا آغاز کیا جا سکے۔ وہ یہاں ایک دو دن سے زیادہ قیام کے حق میں نہیں تھا۔

میں نے اس سے پوچھا "آخر اتنی جلدی کیا ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ یہاں کے معاملات ایک دو دن میں نمٹائے جا سکیں۔"

"ایسے کون سے ارجنٹ معاملات ہیں؟"

میں نے کہا "ایک معاملہ تو اکبر خان کا ہے۔"

"ایک صورت تو یہ ہو سکتی تھی کہ اسے پولیس کے حوالے کر دیا جاتا۔ اس کے خلاف نہ ثبوت ہے نہ گواہ کہ اس نے جانو بابا کو قتل کیا اور وہی چور تھا جو قیمتی نوادرات سمیت کر فرار ہونا چاہتا تھا۔"

"پولیس خود معلوم کر لے گی۔"

"بالکل ٹھیک...... لیکن اس کے لیے رپورٹ درج ہوگی۔ تفتیش ہوگی پھر چالان پیش ہوگا۔ تھانہ کہاں ہے اس علاقے کا۔ کیس کون سے ضلع کی عدالت میں جائے گا۔ یہ بڑا لمبا اور فضول چکر ہے فیکے پتر۔ پولیس' وکیل اور عدالت کے اہلکار سب تجھے زچ کر دیں گے۔ بڑا پیسا بھی خرچ ہوگا اور خواری الگ ہوگی۔"

"تو چاہتا ہے میں آنکھیں کان بند کر کے واپس چلا جاؤں؟ کچھ بھی نہ کروں' وہ تو شیر ہو جائے گا۔"

"تو اسے نکال باہر کر۔ چھٹی کر دے اس کی۔ تو نے فرخ سے کہا تھا کہ کسی پرائیویٹ سکیورٹی ایجنسی سے رابطہ کرے۔ مجھے یہ آئیڈیا کچھ قابل عمل نہیں لگتا۔ شہروں میں ایسی بہت سی پرائیویٹ سکیورٹی گارڈز فراہم کرنے والی ایجنسیاں ہیں لیکن کیا وہ اپنے گارڈ یہاں بھیج دیں گی؟ یہاں ان کے کھانے' رہنے اور آنے جانے کے انتظامات کیا ہوں گے؟ اول تو یہاں کوئی آئے گا نہیں۔ آیا تو معاوضہ چار پانچ گنا طلب کرے گا۔ اس کے بعد ہی گارنٹی کوئی نہیں۔ شہر میں خود سکیورٹی گارڈ کتنے بینکوں میں ڈاکے ڈال چکے ہیں۔ کوئی سب کچھ صاف کر کے چلتا بنے گا اور تجھے پتا بھی نہیں چلے گا۔"

"لیکن میں یہ سب ایسے ہی چھوڑ بھی تو نہیں سکتا مہاراجا!"

اس نے کہا "اس کے لیے آسان طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ آج تک اس حویلی اور جاگیر کے محافظ یہی لوگ تھے۔ انہوں نے اپنا فرض بڑی ایمانداری سے ادا کیا۔ ایک اکبر خان ہی نمک حرام نکلا۔ جس پر تجھے شک ہے۔ اس کا بیٹا کبیر خان بھروسے کے قابل ہے تو اسے ذمے دار بنا دے۔ اکبر خان سے کہہ دے کہ وہ جس دفتر میں چوکیداری کرتا ہے' کرتا رہے۔"

"کیا......؟" میں نے برہمی سے کہا "میرا بس چلے تو میں کل اس عمارت کو بلڈوز کر دوں۔ معلوم نہیں وہاں کیا ہو رہا ہے؟"

"ہاں۔ پہلے یہ معلوم کرنا ضروری ہے فیکے پتر کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ یہ کام تو مجھ پر چھوڑ دے۔ مجھے شک ہے کہ وہاں کوئی غیر قانونی

دھندا چل رہا ہے۔ ان لوگوں سے براہِ راست دشمنی مول لینا کوئی عقلمندی نہیں۔ یقیناً ان کے ہاتھ بہت لمبے ہوں گے اور ان کی جڑیں مضبوط ہوں گی۔ معلوم نہیں ان کی پشت پناہی کون کون کر رہا ہے۔ ان پر ہم اس وقت ہاتھ ڈالیں گے جب ہمارے ہاتھ اتنے طاقتور ہوں گے کہ ان سے ٹکر لے سکیں اور انہیں نیست و نابود کر سکیں۔ یہ کام مشکل اور خطرناک ضرور ہے لیکن ناممکن نہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہمارے کچھ کیے بغیر ہی سب کچھ ہو جائے۔“

”ہاں۔ صوفی چچا کوئی جلالی عمل کریں اور ان کے موکل سب کو تہس نہس کر ڈالیں۔ بھسم کر دیں“ میں نے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ تیرے نازل ہونے سے اور تیرے عزائم کی خبر سے ان کو پریشانی تو پہلے ہی لاحق ہوگی۔ وہ خود پسپا ہو جائیں۔ خاموشی سے نکل جائیں۔ ایسے لوگ خود بھی کسی کی نظر میں آنا نہیں چاہتے۔ یہ جگہ لاوارث پڑی تھی۔ پوچھنے والا کوئی نہ تھا تو انہوں نے جگہ پکڑ لی۔ پیسہ خرچ کریں گے‘ کہیں اور سیٹ ہو جائیں گے۔ انہیں تھوڑا سا ٹائم دے کر دیکھ لیتے ہیں۔“

میں نے کہا ”ایسا نہ ہو کہ ابھی میں نظر بچا کے چلا جاؤں‘ بعد میں قانون کی آڑ میں بلیک میل کرنے والے مجھے گھیر لیں کہ تم اپنے علاقے میں کیا کر رہے تھے۔ کیسے دھندے پھیلا رکھے تھے۔ کن لوگوں کی سرپرستی کر رہے تھے۔ یہ جو ایک اصطلاح بن گئی ہے نا...... قانون نافذ کرنے والے ادارے۔ پتا ہی نہیں چلتا کہ نام کے پیچھے کام کیا ہے۔ پورا مافیا جیسا نیٹ ورک ہے ان کا بھی۔“

”تو مجھ پر بھروسا کر۔ تجھ پر آنچ نہیں آئے گی۔“

میں نے کہا ”او کے۔ یہاں کے معاملات کی نگرانی میں کبیر خان کے سپرد کر دیتا ہوں۔ وہ اکیلا کیا کرے گا۔“

”تو اسے ذمے دار بنا اور یہ اختیار دے کہ اپنی مدد کے لیے بھروسے کے کچھ لوگ لے آئے۔ گرد و نواح سے چار چھ افراد کا انتخاب کر لے جن کو وہ جانتا ہو۔ اس کی زندگی یہاں گزری ہے۔ بعد میں ہم کو اسی علاقے سے افرادی قوت درکار ہوگی۔ یہ پہلا مرحلہ ہوگا۔ اس سے گرد و نواح میں سب کو معلوم ہو جائے گا کہ نئے مالک آئے ہیں اور علاقے میں ان کی بھلائی کے کام کرنا چاہتے ہیں۔ تجھے ایک طرح سے پبلک سپورٹ حاصل ہو جائے گی۔“

میں نے کہا ”کیوں نہ ہم علاقے کا دورہ کریں۔ لوگوں سے خود ملیں اور انہیں بتائیں کہ ہم کیا کرنا چاہتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ کل ایک راؤنڈ لگا لیں گے۔ لیکن شام تک یہاں کے معاملات فائنل ہو جائیں تو ہم نکل جائیں گے۔“

میں نے کہا ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تجھے اتنی جلدی کیا ہے واپس جانے کی۔ نوکری کی فکر ہے تجھے؟“

”سمجھ تو نہیں رہا ہے نیکے پتر! ابھی کچھ اور معاملات پر تجھے فوری توجہ دینے کی ضرورت ہے۔“ راجا نے خفگی سے کہا ”ابھی تک میری فریال سے کوئی بات نہیں ہوئی۔ وہ تجھے ہی بتائے گی کہ لندن میں کیا ہوا تھا۔ وہ کیوں اس افراتفری میں فرار ہوئی۔ وہ صفدر سلطان کی آنکھوں میں دھول جھونک کے نکل تو آئی ہے لیکن یہاں بھی محفوظ بہر حال نہیں ہے۔ اس معلوم ہو جائے گا بالآخر کہ فریال تیرے پاس پہنچ گئی ہے۔ یہ اس کے لیے عزت اور غیرت کا مسئلہ بن چکا ہے۔ وہ تجھے معاف کرے گا اور نہ فریال کو۔ لندن میں روپوش رہ کے بھی وہ یہاں تم دونوں پر عرصہ حیات تنگ کر سکتا ہے۔ صفدر سلطان مرزا ایک نام نہیں ایک طاقت ہے۔ لاقانونیت کی علامت ہے۔ تو جانتا ہے وہ کون لوگ ہیں جو دہشت گردی کی ایک ملک گیر مافیا میں شامل ہیں۔ حکومت کی طاقت بھی ان کے سامنے بے بس نظر آتی ہے۔“

”تو کیوں مجھے دہشت زدہ کر رہا ہے مہاراجا!“

”میں تجھے خبردار کر رہا ہوں۔ اس خطرے کو سمجھ۔ اس ویرانے میں تو ذرا بھی محفوظ نہیں ہے۔ تیرے گھر پر گمنام خون کرنے والے کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔ وہ کیوں تیرے گھر کی نگرانی کر رہے ہیں۔ اگر تو لوٹ کر نہ جائے تو کیا وہ مایوس ہو کے لوٹ جائیں گے؟ نہیں‘ وہ تجھے لوٹنے پر مجبور کر دیں گے۔ وہ تیرے گھر پر قبضہ کر لیں گے۔ گھر والوں کو یرغمال بنا لیں گے۔ وہ سب کچھ کر سکتے ہیں نیکے پتر۔ تو یہاں حویلی اور جاگیر کی حفاظت کے لیے فکرمند ہے۔ وہاں کے معاملات کی فکر نہیں ہے تجھے؟“

راجا کی وارننگ نے مجھ پر چودہ طبق روشن کر دیے ”تو بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے راجا۔ یہاں کے معاملات سے بعد میں نمٹا جا سکتا ہے۔“

”ایک بات اور بتاؤں“ راجا کچھ دیر بعد بولا ”تیرے گھر کے اندر بھی حالات ٹھیک نہیں ہیں۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے کہا۔

”رابعہ نے کیا بتایا تھا تجھے۔ تیرے حق وراثت نے رشتوں میں دراڑ ڈال دی ہے۔ ان کے دل میں حسد کی آگ بھڑکا دی ہے۔ تیری چچی نے دھاندلی اور ناانصافی کا ایسا ڈھول پیٹا ہے کہ تجھے ہی نہیں تیرے ساتھ سب کو مجرم اور سازش میں شریک بنا دیا ہے۔ تیرے والدین کو یہاں تک کہ دادی کو......“

”یہ تو بڑی زیادتی ہے۔“

”صرف زیادتی...... یہ کمینگی ہے۔ تیری چچی نے اتنا زہر اگلا کہ پہلے تو ان کی جنگ ہوئی تیری اماں سے۔ پھر انھوں نے صوفی چچا کو اکسایا اور وہ ساری قلندری بھول گئے۔ انھوں نے بڑے بھائی سے مطالبہ کیا کہ آدھی جائیداد پر ان کا حق بنتا ہے۔ اگر وہ انہیں نہ ملی تو......“

”تو کیا؟ انھوں نے دھمکی دی ہے؟“

”بہت کچھ ہوا ہے یار۔ تیرے ابا نے صاف کہا کہ حق کی بات مت کرو۔ تمھیں مل جائے گا کچھ نہ کچھ مگر دھمکیاں مت دو اور بات کرو رنیق سے۔ میرے اختیار میں کچھ نہیں ہے۔ اب تو کھلی دشمنی کی فضا ہے۔ صوفی چچا گھر سے چلے گئے ہیں۔ مجھے لگتا ہے معاملات مزید خراب ہوں گے۔“

باہر مکینک مستعدی سے اپنے کام میں مصروف تھا۔ اس نے بالآخر آواز لگائی کہ صاحب گاڑی تیار ہے۔ اس وقت تک رات کا اندھیرا ہر سو محیط ہونے لگا تھا۔ راجا نے گاڑی میں سے جنریٹر نکالا۔ وہ اپنے ساتھ بیس لیٹر پیٹرول بھی لایا تھا۔ موٹر مکینک نے اسے بھی چالو کیا اور لائٹوں کے کنکشن جوڑ دیا۔ حویلی کی وسعت کے اعتبار سے چند انرجی سیور بلبوں کا اجالا یقیناً ناکافی تھا مگر ایک رات لالٹینوں اور پیٹرومیکس لیمپ کی روشنی میں گزارنے کے بعد ہمیں یہ نیلگوں اجالا بڑا امید افزا اور حوصلہ بڑھانے والا لگا ـــ ایک ضخیم ادبی ناول کا تخلیق کار صفحہ اول پر پہلی سطر لکھ لے۔ تعمیر کا شہکار بنانے والا پہلی اینٹ رکھ دے۔

سہ پہر سے اب تک سرونٹ کوارٹرز کی طرف سے خدمت گزاری کا سلسلہ بڑے تواتر سے چل رہا تھا۔ سب سے ایکٹو ریشماں تھی۔ دو مرتبہ وہ چائے لائی اور اس نے دس بارہ سال کے ایک بچے کی ڈیوٹی دروازے کے باہر لگا دی اور اسے ہمارا ہر حکم سرونٹ کوارٹرز تک پہنچانے کی ذمے داری سونپ دی۔ گزشتہ روز ڈاکٹر شہناز اور آج فریال کی آمد نے اسے بہت پرجوش کر دیا تھا۔ وہ گاؤں کی گوری سے شہر کی چھوری بننے کے لیے بے تاب تھی اور حویلی میں وارد ہونے والی یہ لڑکیاں اس کے لیے رول ماڈل کا درجہ رکھتی تھیں۔ ایک مرتبہ کبیر خان بھی آیا لیکن اکبر خان مجھے جانو بابا کی تدفین میں نظر آنے کے بعد پھر دکھائی نہیں دیا۔ وہ سب کچھ پریشان کچھ اداس اور کچھ ڈرے ہوئے تھے۔ انہیں حالات نے بے یقینی کی طرف دھکیل دیا تھا۔ فریال چار گھنٹے گزر جانے کے بعد بھی اتنی گہری نیند میں تھی کہ اس نے کروٹ تک نہیں بدلی تھی۔ جن حالات میں وہ لندن سے فرار ہوئی تھی اور جس طرح اس نے تن تنہا لندن سے نیروبی‘ پھر کراچی اور لاہور تک ایک طویل دہشت زدہ کرنے والا سفر اختیار کیا تھا‘ اس نے فریال کو جسمانی اور اعصابی شکست ریخت کی آخری حد تک پہنچا دیا تھا۔ سفر ختم ہوا تو وہ اپنی ساری توانائی صرف کر چکی تھی۔ اب یہ نیند سے زیادہ بے ہوشی تھی۔ میرا خیال تھا کہ شاید اب وہ صبح ہی جاگے گی۔ سیٹ لائٹ فون کی بیٹری کا چارج ختم ہونے والا تھا۔ میں نے اپنے گھر میں اماں سے اور ابا سے مختصر بات کی۔ انہیں بتایا کہ میری طرف سے بالکل فکرمند نہ ہوں اور اپنا خیال رکھیں۔ پھر بیٹری ختم ہو گئی۔ دنیا سے رابطہ بحال ہوا تھا تو میرا خیال تھا کہ لندن میں عائشہ سے بھی بات کروں گا تاکہ اس کے پروگرام کا پتا چل سکے۔ میں ا

وکیل فاروقی سے بھی پوچھنا چاہتا تھا کہ میری زمین پر ایک ہیرک کب اور کس کی اجازت سے تعمیر کی گئی تھی۔

رات ہو گئی تھی اور فرخ ابھی تک لوٹ کے نہیں آیا تھا۔ مجھے اس کی طرف سے بھی فکر تھی۔ میں نے راجا کو اپنے ساتھ لے جا کے وہ کمرا دکھایا جو ایک طرح سے ہمارا خاندانی میوزیم تھا اور جہاں گزشتہ رات ایک نامعلوم شخص چوری میں ناکام رہا تھا۔ پہلے جانو بابا اس کے عزائم کی راہ میں حائل ہوا تو اس کے ہاتھوں مارا گیا۔ پھر عین وقت پر میں پہنچ گیا تو وہ مالِ غنیمت کو چھوڑ کے فرار ہونے پر مجبور ہوا۔ اس کی قسمت اچھی تھی کہ نہ وہ پکڑا گیا اور نہ میری گولی کا نشانہ بنا۔

اتنا وقت نہ تھا کہ ہم باقی کمروں کو کھول کے دیکھ سکتے۔ میں کمرے کو مقفل کر رہا تھا کہ اچانک اندھیرا چھا گیا اور نیچے سے سنائی دینے والی جنریٹر کی آواز بند ہو گئی۔ راجا نے کہا کہ وہ جا کے دیکھتا ہے‘ لائٹ کیسے بند ہو گئی۔ جنریٹر کا پیٹرول ٹینک چھوٹا تھا لیکن اتنی جلدی پیٹرول ختم نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے زینے کی طرف قدم بڑھائے ہی تھے کہ گیلری جیسے برآمدے سے میری نظر پل کی طرف گئی۔ کوئی گاڑی پل کی طرف بڑھ رہی تھی۔

شاید فرخ لوٹ آیا ہے میں نے سوچا۔ لیکن اسی وقت میری نظر میں لمحہ بھر کے لیے روشنی کا کوندا سا لپکا۔ یہ روشنی مخالف سمت میں نظر آئی تھی اور ایک لمحہ جھلک دکھا کے غائب ہو گئی تھی۔ میں نے اندھیرے میں نظر جما کے ہیرک کی طرف دیکھا کہ کیا کوئی سرچ لائٹ روشن ہو کے بجھ گئی تھی۔ اس وقت میرے کانوں نے کسی ٹرک کے انجن کی گھوں گھوں سنی۔ خاموشی میں یہ آواز قریب سے آتی محسوس ہوتی تھی۔

چند سیکنڈ میں روشنی پھر چمکی۔ اس بار میں نے مخالف سمت سے آنے والے ٹرک کی ہیڈ لائٹس کو دیکھ لیا جو جلتے ہی بجھ گئی تھیں۔ شاید ڈرائیور نے راستہ دیکھنے کے لیے انہیں آن کیا تھا اور پھر بجھا دیا تھا۔ میں ہیرک کی سمت میں دیکھتا رہا۔ ٹرک کی آواز بہت واضح ہو گئی۔ میرا خیال تھا کہ ٹرک اسی ہیرک میں جائے گا لیکن ٹرک ہیرک کے گرد گھوم کر کچے پر آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ ڈرائیور یقیناً درختوں کے درمیان سے ٹرک گزارنا جانتا تھا۔ اس نے سبزی کے کھیتوں کو بھی پامال نہیں کیا۔

کچھ دیر بعد ٹرک حویلی کے جنوبی حصے کی فصیل کے پیچھے آ گیا جہاں درویش کا مزار تھا۔ پھر وہ گھوم کر صدر دروازے تک آیا۔ میں نے ٹرک کو اندھیرے میں اندر داخل ہوتا دیکھا۔ اس کے رکتے ہی ایک ساتھ کئی افراد نیچے کودے۔

معلوم نہیں کیوں راجا ابھی تک جنریٹر کو پھر سے رواں کرنے کی کوشش میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ باہر ہنوز تاریکی کا راج تھا اور میرے لیے اوپر سے نو واردوں کی صورت دیکھنا بھی محال تھا تو ان کے کردار اور عزائم کا میں کیا اندازہ کرتا۔

میرے پاس صرف ایک ریوالور تھا جو خود میری حفاظت کے لیے بھی ناکافی تھا۔ آنے والوں کے اصل مقاصد جانے بغیر انہیں للکارنا اور ان کے خلاف ایک جارحانہ طرزِ عمل اختیار کرلینا کوئی عقل مندی نہ ہوتی چنانچہ میں اطمینان سے نیچے اترا اور پُراعتماد انداز میں چلتا ہوا ان کے قریب جا کھڑا ہوا۔

وہ تعداد میں پانچ تھے۔ چھٹا میرے سامنے ٹرک ڈرائیور کے کیبن سے کود کے اترا۔ ان سب کی عمریں پچیس سے پینتیس کے درمیان ہوں گی۔ وہ سب ایک جیسے کپڑوں میں تھے۔ سب نے مختلف رنگوں کی شلوار قمیص اور پشاوری سینڈل پہن رکھے تھے اور اپنے کندھوں پر خطرناک قسم کا خودکار اسلحہ لٹکا رکھا تھا۔ ایک نسبتاً پستہ قد اور بھاری بدن شخص سب کے پیچھے خاصی بے تکلفی کے انداز میں کھڑا تھا۔ سب سے آگے دراز قد اور تراشیدہ سیاہ داڑھی والا شخص اپنے انداز کی حاکمیت اور چہرے کے درشت تاثرات سے ان سب کی لیڈری کا دعوے دار نظر آتا تھا۔

''کون ہو تم؟'' دراز قد نے چند سیکنڈ تک مجھے پلک جھپکائے بغیر گھورنے کے بعد کہا''یہاں کیا کررہے ہو؟''

میں نے قدرے سخت لہجہ اختیار کیا''یہ سوال کرنے کا حق مجھے ہے کیونکہ جرم تم نے کیا ہے۔''

وہ تیز ہوکے بولا''کیا جرم کیا ہے ہم نے؟''

میں نے کہا''تم نے ٹریس پاس کیا ہے۔ ٹریس پاس سمجھتے ہو؟ مالک کی اجازت کے بغیر اس کی پراپرٹی کی حدود میں داخل ہونا۔''

وہ کچھ پُرتمسخر انداز میں بولا''مالک......!''

اس کے پیچھے کھڑا ہوا پستہ قد ہنس پڑا' باقی سب مسکرانے لگے۔

میں نے اپنی متانت برقرار رکھی''ہاں...... میں ہی اس جاگیر کا اور حویلی کا مالک اور قانونی وارث ہوں' رفیق احمد!''

دراز قد شبہے میں پڑ گیا''اگر تم مالک ہو تو...... اکبر خان کون ہے؟''

''وہ...... وہ ہمارے خاندانی ملازم کا بیٹا اور خود بھی میرا ملازم ہے'' جانتے بوجھتے میں نے اکبر خان کے بارے میں ایک مالکانہ اور پُرتحقیر رویہ اختیار کیا''سرونٹ کوارٹرز میں رہتا ہے۔''

چند لمحوں کے لیے وہ لاجواب اور پریشان کھڑے رہے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے مشورے کرتے رہے۔ اسی وقت راجا کی کوشش بارآور ہونے سے جنریٹر غرایا اور بجھے ہوئے سارے بلب پھر روشن ہوگئے۔

راجا کمرے سے باہر آیا اور گیٹ کی طرف سے فرخ نمودار ہوا۔ صورت حالات کو موافق پاتے ہوئے میں نے اچانک ریوالور نکال لیا۔ شاید راجا نے میری تقلید میں ایسا کیا اور فرخ نے ہم دونوں کو دیکھ کر۔ یہ کسی پلان کا نتیجہ نہیں تھا لیکن ٹرک سے اترنے والوں نے خود کو تین طرف سے محصور اور گولیوں کی زد میں دیکھا۔ ہم تینوں محض اتفاق سے ایک بہت بڑی مثلث کے تین کونوں کی پوزیشن پر آگئے تھے۔

میں نے غرا کے کہا''اب بتاؤ مجھے کہ تم لوگ کون ہو؟ تمہارا نام کیا ہے؟''

دراز قد نے ناگواری سے کہا''میرا نام پیر بخش ہے لیکن اس طرح ہم پر اسلحہ تان لینے کا کیا مطلب ہے آخر؟''

میں نے کہا''مسلح ہوکے میرے گھر میں تم گھسے ہو۔ کیا مجھے اپنی حفاظت نہیں کرنی چاہیے؟ میں تو سوال کیے بغیر بھی تمہیں شوٹ کرسکتا تھا۔''

اس نے برا سا منہ بنایا''چلو جی' بات بڑھانے کا کیا فائدہ......ہم واپس چلے جاتے ہیں۔''

اس کے اشارے پر باقی لوگ ٹرک کے پچھلے حصے میں چڑھ گئے۔ ٹرک ڈرائیور بھی کیبن میں سوار ہوگیا۔

میں نے کہا''تم ٹھہرو پیر بخش! ان منگل' بدھ' ہفتہ اور اتوار کو جانے دو۔ مجھے بتاؤ کہ اکبر خان سے تمہارا کیا تعلق ہے؟ اس ٹرک میں تم کیا لائے تھے؟''

پیر بخش نے ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھنے کے لیے دروازہ کھولا''میرے متھے مت لگو رفیق صاحب! تم جانتے نہیں کہ میں کون ہوں۔''

میں نے کہا''لیکن تم بہت جلد جان لوگے پیر بخش کہ میں کون ہوں۔ میں نے تم سب کے چہرے دیکھ لیے ہیں اور ٹرک کا نمبر بھی نوٹ کرلیا ہے۔''

پیر بخش نے دھڑ سے دروازہ بند کیا اور ٹرک ریورس گیئر میں تھوڑا سا پیچھے کیا۔ باہر جانے والے راستے کو اس جیپ نے بلاک کر رکھا تھا جس میں خرم واپس آیا تھا۔ یہ 1952ء کی ملٹری ماڈل اور فور وہیل ڈرائیو ولیز جیپ تھی جو نصف صدی گزر جانے کے بعد بھی پاکستان کی سڑکوں پر آج بھی رواں دواں نظر آتی تھی۔ جگاڑ کے ماہر پاکستانی مکینک جدید ترین آٹو انڈسٹری کے انجینئرز سے زیادہ ذہین تھے کہ انہوں نے اس میں ڈیزل انجن فٹ کردیے تھے اور دستیاب نہ ہونے والے ہر پرزے کو خود بنانے کی مہارت بھی حاصل کرلی تھی۔ سیر و شکار' مہم جوئی کے ساتھ یہ کروم پائپ فریم

اور آٹھ آٹھ لائٹوں والی جیپ اب قوت جوش اور کسی حد تک بدمعاشی کی علامت بن گئی تھی۔ اس پر سواری کرنے والے بدمست ہاتھی کی طرح چیلنج کے انداز میں شہر کی سڑکوں پر دوڑاتے پھرتے تھے کہ ہے کسی میں ہمت جو ہم سے ٹکرائے۔

فرخ نے جیپ کو پیچھے ہٹایا تو ٹرک واپس ہوا۔ تھوڑا سا دائیں طرف گھوم کے سیدھا ہوا اور پھر سیدھا نکل گیا۔ میں پھر اوپر گیا تو مجھے ٹرک اسی راستے پر جاتا دکھائی دیا جس پر چل کے آیا تھا لیکن اب اس کی ہیڈ لائٹس روشن تھیں۔ شاید ان کے لیے اب رازداری غیر ضروری ہوگئی تھی۔

راجا اور فرخ نے پہلی فرصت میں تعارف کے رسمی مرحلے طے کرلیے تھے۔ جب میں واپس اتر کے آیا تو فرخ اپنی جیپ کی طرف جارہا تھا۔ وہ جیپ کو ڈرائیو کرکے عین برآمدے کی سیڑھیوں تک لے آیا۔ اس میں وہ تمام سازوسامان لدا ہوا تھا جو میں نے شہر سے منگوایا تھا۔

میں نے کہا''فرخ تم تو موٹر سائیکل پر گئے تھے' یہ شاہی سواری کہاں سے پکڑ لائے؟''

وہ بولا''یہ میرے ایک کزن نے بڑے شوق سے بنوائی تھی۔ ماں باپ کا پیسا بڑی بے دردی سے خرچ کیا تھا۔ پیسے والے لوگ تھے اور وہ اکلوتا تھا۔ پہلے اس کی ہر فرمائش پوری کرتے رہے' بعد میں جب وہ بگڑ گیا اور قابو سے باہر ہوگیا تو بہت پریشان ہوگئے۔ بڑی اچھی کار تھی اس کے پاس مگر وہ پھرتا تھا اس جیپ میں۔ اس کے ساتھ اسی کے جیسے کچھ بے مہار شہزادے ہوتے تھے۔ میرے کزن کا کہنا تو یہ ہے کہ گاڑی کوئی اور چلا رہا تھا لیکن پولیس نے اسی کو پکڑا۔ جیپ کے نیچے سڑک کراس کرنے والا کوئی بوڑھا آ گیا تھا۔ اس کا بیٹا آئی ایس آئی میں میجر تھا۔ باقی سب بھاگ گئے اور بعد میں صاف مکر گئے کہ ہم تو اس کے ساتھ ہی نہیں تھے۔ میرا کزن جیل میں ہے' پولیس نے اس پر دس کیس بنادیے تھے۔ شراب پی کے گاڑی چلانے کا' لائسنس نہ ہونے کا۔ پہلے ہیروئن اور پھر اسلحہ برآمد ہونے کا۔ میرے کزن کا باپ خود اچھا وکیل ہے۔ مل ملا کے کوشش بھی کررہا ہے کہ کیس ختم ہوجائیں لیکن دو چار سال کی سزا لازمی ہے۔ میرے کزن کی ماں نے یہ گاڑی پولیس کی تحویل سے ملتے ہی میرے حوالے کردی تھی کہ اس منحوس گاڑی کو بیچ دو۔ میں نے اسے ایک جاننے والے ڈیلر کے حوالے کردیا مگر میں اپنے کزن سے ملنے جیل گیا تو اس نے مجھے سختی سے تاکید کی کہ میں گاڑی نہ بیچوں۔ میں کیا کرتا۔ میں نے ڈیلر کو روک دیا۔ یہ گاڑی وہاں بے کار کھڑی تھی۔ میں نے سوچا شاید یہاں کام آئے گی۔''

میں نے کہا ''بالکل ٹھیک سوچا تم نے۔ اس علاقے میں پھرنے کے لیے اس سے جاندار سواری کیا ہو سکتی ہے؟''

''اور جو آپ نے کہا تھا وہ سب لے آیا لیکن یہاں تو پہلے ہی بجلی آ چکی ہے۔''

میں نے کہا ''کوئی بات نہیں۔ تم دو کلو واٹ کا بڑا جنریٹر لائے ہو تو یہ استعمال ہوگا۔ چھوٹا جو چل رہا ہے اسٹینڈ بائی رہے گا۔ سیٹلائٹ فون ہم سب کے پاس ہوں گے تو اچھی بات ہے۔ ایک فریال بھی لائی ہے۔''

''اس کی لائن کل تک چالو ہو جائے گی۔ یہ ذرا مہنگا ملا ہے لیکن اس کی ایک اضافی خوبی یہ ہے کہ بیٹری کے علاوہ یہ سولر انرجی سے بھی چل جاتا ہے۔ دھوپ میں بیٹری کے بغیر بھی کام کر سکتا ہے۔ میں دو ہزار میٹر بجلی کا تار لے آیا ہوں۔ سات چوالیس گیج کا۔''

''ویری گڈ! کل ہم ڈائریکٹ پول سے کنکشن لیں گے تو جنریٹر کی ضرورت ہی نہیں رہے گی'' میں نے کہا ''یہاں گیس نہیں ہے۔ کچن کے لیے ہر چیز بجلی سے چلنے والی لائی جا سکتی ہے۔''

فرخ نے اپنی کارکردگی کی رپورٹ جاری رکھی ''میں نے ایک کنسٹرکشن کمپنی سے بات کر لی ہے۔ ان کے بندے کل آئیں گے۔ وہ ہر کام کر سکتے ہیں۔ الیکٹرک فٹنگ اور پلمبرنگ سے لے کر کنسٹرکشن اور رنگ روغن سے ڈیکوریشن تک۔''

میں نے کہا ''تم تو بڑے کام کے آدمی ہو برخوردار! لیکن یہ بتاؤ کہ تم یہاں خنجر لے کر آئے تھے' اب یہ ریوالور کہاں سے لے آئے' اصلی ہے یا نقلی؟''

وہ ہنسنے لگا ''بڑی پہچان ہے آپ کو۔ یہ واقعی نقلی ہے لیکن کام تو کر گیا۔''

راجا نے اس کے کندھے پر تھپکی دی ''ابھی کام چلاؤ۔ بہت جلد تمہیں اصل ریوالور پھر کلاشنکوف اور پھر توپ بھی دلا دیں گے۔''

وہ بولا ''مگر اسے چلائے گا کون؟''

میں نے کہا ''میرے گھر گئے تھے تم؟''

''گیا تھا۔ سارے کام ختم کرنے کے بعد۔'' فرخ نے کہا۔

''کس سے ملاقات ہوئی؟''

''پہلے تو کوئی میری ہی عمر کا ینگ آدمی نکلا تھا۔ وہ کچھ عجیب سا تھا' گھبرایا ہوا...... غیر حاضر۔ مجھے بڑی شک کی نظر سے گھورتا رہا۔ میں نے بتایا کہ مجھے رفیق بھائی نے بھیجا ہے تو پوچھنے لگا کہ کیوں بھیجا ہے۔ وہ خود کیوں نہیں آئے۔ تم کون ہو؟ میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تمہیں۔ سچ بتاؤ' کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں ہے۔ تم ان کے دشمن تو نہیں ہو نا؟ ایک دو سوالوں کے جواب تو میں نے دیے۔ پھر مجھے غصہ آنے لگا کہ یہ کیا جرح کر رہا ہے۔ جب اس نے دوبارہ وہی سوال دہرانے کا سلسلہ شروع کیا تو میں گرم ہو گیا کہ آخر تم ہو کون؟ خدائی فوج دار کہ تھانے دار اور یہ رفیق بھائی کا گھر ہے یا میں غلطی سے تھانے آ گیا ہوں۔ اس کے بعد اندر سے ایک لڑکی نے دروازے سے جھانکا اور پھر باہر آ گئی۔ تھی تو وہ بہت تیز لیکن بڑے قاعدے قرینے سے مجھے اندر لے گئی۔ آپ کے بارے میں پوچھتی رہی کہ کیا کر رہے ہیں اور کیوں کر رہے ہیں' جو بھی کر رہے ہیں۔''

مجھے ہنسی آ گئی ''پہلے تم افضل سے ملے۔ پھر رابعہ سے۔ یہ بتاؤ ابا جی بھی ملے یا نہیں۔''

''ہاں' رابعہ نے اندر جا کے بتایا تو آپ کے ابا اور اماں دونوں آ گئے تھے۔ بڑی محبت سے ملے۔ آپ کے بارے میں پوچھتے رہے۔ میں نے کہا کہ خیریت سے ہیں اور وہاں کے معاملات سنبھال رہے ہیں اس لیے فی الحال آ تو نہیں سکتے۔ وہ کہنے لگے کہ ہاں' دل جمعی سے اپنا کام کرے' آنا جانا تو لگا رہے گا۔''

''یہ سب کچھ وہ مجھ سے بھی معلوم کر چکے تھے'' راجا بولا۔

''ہاں، بعد میں انہوں نے کہا کہ راجا آیا تھا۔ وہ بھی یہی بتا رہا تھا کہ رفیق کے کچھ پروگرام ہیں لیکن پہلے اس جگہ کا انتظام اپنے ہاتھ میں لینا اور صورتِ حالات کو سمجھنا ضروری ہے۔ مجھ سے ہی انہوں نے کہا کہ آدھی صدی سے کوئی والی وارث نہیں تھا۔ یہ تو اللہ کا شکر ہے کہ کوئی قبضہ گروپ جگہ کا مالک نہیں بنا ورنہ دیوانی عدالتوں میں دھکے کھاتے عمر گزر جاتی اور ہم میں سکت کہاں تھی اتنی کہ تھانہ کچہری کر سکتے۔ لاکھوں کا خرچہ کرتے وکیلوں پر اور لاکھوں رشوت میں دیتے۔''

میں نے کہا ''وہ خوش اور مطمئن تھے ناں۔''

''ہاں، بہت خوش تھے کہ تمہارے دماغ پر ولایت کا آسیب سوار نہیں رہا اور تم اپنی صلاحیت کو یہاں خوش حالی کے ترقیاتی منصوبوں پر استعمال کرنے میں سیریس ہو گئے ہو۔ تم نے جو سامان منگوایا تھا وہ انہوں نے راجا کو دے دیا۔ جب میں واپس آ رہا تھا تو وہ لڑکی پھر آ گئی'' ''رابعہ!''

میں نے کہا ''وہ میری کزن ہے' چچا زاد!''

''اور افضل کون ہے' اس کا بھائی؟''

میں نے کہا ''نہیں' میرا خالہ زاد ہے۔ رابعہ پر مرتا ہے۔''

فرخ کا چہرہ کچھ پھیکا پڑا ''اور وہ...... رابعہ...... کیا وہ بھی اسے پسند کرتی ہے۔''

میں نے کہا ''اس بارے میں یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے کہ وہ افضل کو واقعی چاہتی ہے یا اسے اُلو بناتی ہے۔ حالانکہ وہ ایک ریڈی میڈ اُلو ہے۔ مجھے اس رومانٹک افیئر میں کوئی منطقی توازن نہیں لگتا لیکن فرخ صاحب' عشق کا معاملہ ایسا ہی ہے۔ دل جس پر آ جائے' وہ میری بیوی ہو یا چڑیل۔''

فرخ نے سر ہلایا ''مجھے بھی ایسا ہی لگا تھا۔ میرا مطلب ہے ان کے درمیان اتنا فرق ہے۔ وہ لڑکی بہت ذہین' خوش لباس اور خوش مزاج ہے۔ اتنی اچھی باتیں کرتی ہے اور......''

میں نے راجا کی طرف دیکھا تو راجا بھی مسکرا رہا تھا۔

فرخ ایک دم رک گیا ''وہ کہنے لگی کہ آپ اسے بھی اپنے ساتھ لے جائیں۔ افضل کو میں نے کہا کہ یہ کیا کریں گے وہاں جا کے۔ وہ بولی کہ ہاں' یہ تو ٹھیک ہے۔ یہاں بھی یہ کچھ نہیں کرتے لیکن رفیق بھائی' کسی بھی کام پر لگا دیں۔ کلہاڑی دے کر درخت کاٹنے پر۔ کوے اڑانے پر' جن بھوت بھگانے پر۔ حویلی میں بھوت بہت ہوں گے اور افضل ان کی صحبت میں بہت خوش رہتا ہے۔ خود بھی بھوت بننا چاہتا ہے۔''

''وہ بہت باتونی لڑکی ہے۔''

''میں نے کہا کہ رفیق بھائی سے پوچھے بغیر میں کسی کو اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔ آپ خود ان سے بات کر لیں۔ ایک دو دن میں سیٹلائٹ فون کنکشن مل جائے گا تو رابطے کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ یہ سب سامان میں اندر رکھ دوں'' فرخ نے برآمدے میں رکھے ہوئے سامان کو دیکھا۔

راجا نے کہا ''ٹھیکے پتر! میں لکھ کر دینے کو تیار ہوں۔ تیرا سالا تیری کزن پر مرتا ہے۔ یہ لو ایٹ فرسٹ سائٹ کا کیس لگتا ہے مجھے۔''

میں نے کہا ''سیریس کیس!''

ابھی تک ہم باہر ہی کھڑے ہوئے تھے۔ دور سے میں نے اکبر خان کی بیوی کے ساتھ ریشماں کو آتا دیکھا۔ وہ ہمارے لیے رات کا کھانا لے کر آ رہی تھیں۔ رات کے نو بجنے والے تھے۔ میں نے اب فریال کو جگانے کا فیصلہ کیا لیکن میرے ہلانے جلانے سے صرف اتنا ہوا کہ اس نے ایک بار آنکھیں کھول کے مجھے دیکھا اور پھر کروٹ بدل کے سو گئی۔

اکبر کی بیوی کھانا چھوڑ کے جانے لگی تو میں نے اسے روک لیا ''دیکھو۔ کل سے یہ مہمان نوازی کا سلسلہ بند ہو جانا چاہیے۔''

وہ سادگی سے بولی ''کیوں مالک؟ کیا کھانا پسند نہیں آیا؟''

ریشماں نے کہا ''یہ بات نہیں ماں' اب ان کی گھر والی آ گئی ہے...... کل' یہ اسی کے ہاتھ کا پکا ہوا کھائیں گے۔''

میں نے کہا ''یہ میری گھر والی نہیں ہے۔''

''اچھا...... پھر کون ہے؟'' ریشماں نے شوخی سے کہا۔

میں نے کہا ''میری...... دوست ہے۔ ولایت سے آئی ہے۔''

ریشماں نے سر ہلایا ''میں سمجھ گئی۔''

ماں نے ریشماں کو سختی سے گھورا تو وہ چپ ہو گئی۔ اس کے تجسس اور اس کی حیرانی اس معاشرتی سوچ کے پس منظر میں ایک فطری ردِعمل کا نتیجہ تھے۔ جب اس نے معنی خیز انداز میں کہا کہ میں سمجھ گئی تو کچھ کہے بغیر اس نے مجھ سے کہہ دیا کہ ایسی دوستی صرف ولایت کے حوالے سے ممکن ہے ورنہ یہاں کسی بھی غیر شادی شدہ لڑکی کا کسی مرد کے ساتھ دوستی کا دعویٰ ناجائز تعلقات کے زمرے میں آتا ہے۔ اپنی منگیتر کے ساتھ آزادانہ گھومنا پھرنا بے شرمی سمجھا جاتا ہے۔ خواہ وہ کزن ہوں جو پیدائش کے وقت سے ساتھ رہے ہوں تو یہ دوست یہاں کیسے رہے گی؟ میں نے فوراً بات کا رخ بدل دیا ''دراصل میں چاہتا ہوں کہ کل سے تم یہاں کچن کا انتظام سنبھالو۔ صبح سے رات تک کھانے پینے کا مکمل بندوبست کرو۔ ضرورت کی ہر چیز منگوا لو۔ اگر برتن نہیں ہیں تو وہ بھی۔ اب سونے چاندی کے ظروف میں تو ہم کھا نہیں سکتے۔ پرانی کراکری ہے تو نکال لو۔''

اس نے سر ہلایا ''چینی کے برتن بہت ہیں مالک۔''

''اپنی مدد کے لیے تم ریشماں کو ساتھ رکھ سکتی ہو۔ یہ اوپر کا سارا کام کرے گی۔ کھانا لگانا' صفائی اور ہر چیز کی دیکھ بھال۔ جو خرچ ہوگا اس کا حساب کتاب' تم کر لو گی ناں؟''

ریشماں نے پُرجوش لہجے میں کہا ''میں سب کر لوں گی سر!''

''ویری گڈ! تم دونوں کو ماہانہ تنخواہ ملے گی۔ ہم یہاں نہیں ہوں گے تب بھی۔ تین ہزار ریشماں کو' پانچ ہزار تمہیں۔

ٹھیک ہے؟"
ریشماں کا منہ حیرت اور خوشی کی انتہا سے کھلا رہ گیا تھا۔ اس کی ماں بھی پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھتی رہی "تین ہزار!"
میں نے کہا "کیا تنخواہ کم ہے۔ اچھا ریشماں تمہارے بھی پانچ ہزار لیکن تمہیں ماں کا ہاتھ پوری طرح بٹانا ہوگا۔ کھانا تو تم خاک پکاؤ گی۔ یہ کام ماں کو کرنے دو لیکن باقی سب تمہاری ذمے داری۔"
ریشماں نے بڑی مشکل سے کہا "آپ...... مجھے پانچ ہزار دیں گے؟ ہر مہینے۔"
اس کی ماں نے اپنی آنکھوں میں آجانے والے آنسوؤں کو دوپٹے سے صاف کیا اور پھر گلوگیر لہجے میں دعائیں دینے لگی۔ "اللہ آپ کو بہت دے مالک۔ آپ کی نوکری بھی ہماری عزت ہے۔ ہم غریبوں کے پاس دینے کے لیے صرف دعائیں ہیں۔"
ریشماں نے پھر کہا "سچ مالک۔ آپ پانچ ہزار دیں گے۔ یہ تو بہت ہوتے ہیں۔ میں نے کبھی اپنے ہاتھ میں لے کر نہیں دیکھے۔"
میں نے کہا "اکبر خان کہاں ہے؟"
ریشماں کی ماں نے ایک آہ بھری "مجھے کچھ پتا نہیں مالک۔ شاید ہوگا اسی کے ساتھ۔ یہاں وہ بہت کم آتا ہے۔"
میں نے کہا "لیکن وہ تو یہاں چوکیداری کرتا ہے۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ پندرہ سو روپے ملتے ہیں۔"
"ملتے ہوں گے جی!"
"کیوں' وہ تمہیں کچھ نہیں دیتا؟" میں نے کہا۔
وہ اور اداس ہوگئی "دیتا تو ہمارا یہ حال کیوں ہوتا؟"
میں نے کہا "ابھی ایک ٹرک میں کچھ لوگ یہاں آئے تھے' وہ اکبر خان کو پوچھ رہے تھے' کیا تم انہیں جانتی ہو؟"
اس نے نفی میں سر ہلایا "یہ لوگ کبھی مہینے دو مہینے میں آتے ہیں۔ حویلی میں ٹھہرتے ہیں۔ مجھے نہیں معلوم کون لوگ ہیں۔ اکبر خان کہتا ہے میرے دوست ہیں۔"
میرے سوالات سے وہ کچھ پریشان ہونے لگی تھی۔ میں نے اسے جانے کی اجازت دی۔ فرخ بہت تھکا ہوا تھا۔ وہ کھانا کھاتے ہی لیٹ گیا اور خراٹے لینے لگا۔ میں راجا کے ساتھ باہر نکل آیا اور ہم وسیع اجڑے ہوئے چمن کے وسط میں فوارے کی ٹوٹی منڈیر پر بیٹھ گئے۔
میں نے کہا "راجا! پیر بخش اینڈ کمپنی کے بارے میں تیرا کیا خیال ہے۔ ان کا دھندا کیا ہوگا؟ منشیات یا اسلحہ فروشی؟"

راجا نے کہا "تو ان کے بارے میں کیوں سوچ رہا ہے؟ خدا کا شکر ادا کر کہ وہ آسانی سے ٹل گئے۔"
"لیکن مجھے معلوم تو ہونا چاہیے کہ حویلی کو کون کون کس کس غیر قانونی دھندے کے لیے استعمال کررہا ہے؟"
"سب پتا چل جائے گا وقت آنے پر۔ ایک ساتھ سب سے پنگا مت لے فیکے پتر۔ اپنے کام سے کام رکھ۔ اب صرف مجھے ہی نہیں شہناز کو بھی تیرے ترقیاتی منصوبے سے بڑی دلچسپی ہورہی ہے۔"
"راجا' کیا واقعی تو سمجھتا ہے کہ اس علاقے میں کچھ ہوسکتا ہے۔ جس سے ہمیں بھی فائدہ ہو۔ ملک کو بھی اور یہاں کے رہنے والوں کو بھی؟"
"مجھے تیرے عزائم میں شیخ چلی کے خواب والی کوئی بات محسوس نہیں ہوتی۔ کام مشکل سہی' لیکن ہے شاندار۔ یہاں ایک فیکٹری ہو جس میں سب کو روزگار مل جائے۔ ہم فرنیچر ایکسپورٹ کریں۔ ڈیزائن اور کوالٹی ایسی ہو کہ ہمیں زرمبادلہ کی صورت میں منہ مانگی قیمت مل جائے۔ ہمارے کارکن خوش حال ہوں۔ ایک ماڈل رہائشی کالونی ہو جس میں اسکول' اسپتال اور زندگی کی ساری سہولیات موجود ہوں۔ ہم پولٹری فارم قائم کریں' ڈیری فارمنگ کریں۔ دودھ اور اس کی مصنوعات کی مارکیٹ پکڑیں۔ اس کے بعد سب سے گریٹ آئیڈیا ہے ڈیم کا۔ یہ سب ناممکن نہیں ہے فیکے پتر! شہناز بھی کہتی ہے اور معلوم ہے میری اس سے بات ہوئی تو اس نے کیا کہا؟ وہ کہنے لگی کہ میں بھی آجاؤں گی وہاں۔ میں اسپتال چلاؤں گی۔" وہ خوشی سے ہنسا۔
میں نے کہا "مہاراجا۔ خواب دیکھنا اور پھر تعبیر کے جنون میں مبتلا ہونا انسان کی مجبوری ہے لیکن ہر شخص اپنی ہمت کے مطابق خواب دیکھتا ہے۔ مجنوں نے وصلِ لیلیٰ کے خواب کی تعبیر کے لیے بھٹکتے عمر گنوادی۔ سکندرِ اعظم نے دنیا کی تسخیر کا خواب دیکھا تو آج کے سائنس داں نے دنیا سے بھی آگے تسخیر کائنات کی۔ ایسے ہی میں ایک خواب دیکھ رہا ہوں۔"
"ایک عظیم مفکر کا قول ہے کہ آج کی ہر حقیقت کل ایک خواب تھی۔ اور تو کتنا خوش قسمت ہے فیکے پتر کہ وہ عظیم مفکر بقلم خود تیرے سامنے موجود ہے" راجا نے کہا۔
میں نے اپنی بات جاری رکھی "مجھے یوں لگتا ہے جیسے قدرت کا دستِ غیب میرے خواب کی تعبیر کے اسباب فراہم کررہا ہے۔"
راجا کروٹ لے کر بولا "تو بولتا رہ یار۔ بارہ چالیس

نی دس منٹ بعد نیلے خواب میں میری کسی سے اپائنٹمنٹ ہے۔ وہ میں مس نہیں کرسکتا۔ میں فوراً سو رہا ہوں۔" وہ راٹے لینے لگا۔
میں نے اسے ایک لات رسید کی۔ "ایسی آوازیں تو موڑے میں سے اس وقت برآمد ہوتی ہیں جب اسے باسی نے کی دال کھلادی جائے' بہت زیادہ۔"
راجا نے پلٹے بغیر کہا "اور گدھا یوں لاتیں اس وقت چلاتا ہے جب اس کے عقبی حصے کی پرائیویسی کو ڈسٹرب کیا جائے۔"
کچھ دیر بعد میں بھی سوگیا۔ جسمانی تھکن کے ساتھ ذہنی طور پر عدم تحفظ کے احساس اور پریشان خیالی کا شکار میں بھی تھا چنانچہ خواب میں نے بھی دیکھا مگر وہ نہایت اوٹ پٹانگ تھا۔ میں نے تربیلا ڈیم کی تعمیر کے دوران میں جھیل کے ذخیرۂ آب میں سیکڑوں بستیوں کے غرق ہونے کا منظر دیکھا تھا۔ ان بستیوں کے مکینوں کو وہاں سے نکال لیا گیا تھا لیکن کچھ ایسے جذباتی دیوانے بھی تھے جو اپنے آباواجداد کی نشانیوں اور اپنے پیاروں کی قبروں کو چھوڑنے پر رضامند نہ ہوئے اور غرقاب ہوگئے۔
خواب میں بھی میں نے کچھ ایسا ہی سین دیکھا کہ میں دریائے کنہار کی ڈیم سائٹ پر زیرِ تکمیل عظیم منصوبے پر فخر سے سربلند کیے کھڑا ہوں کہ ایک طرف سے گڑگڑاہٹ سنائی دیتی ہے۔ یوں جیسے کوئی پتھریلی زمین پر چاروں ہوا نکلے ہوئے ٹائروں والی جیپ کو دوڑا رہا ہو پھر ایک بیل گاڑی نمودار ہوتی ہے جس کو سانتا کلاز جیسی دو فٹ لمبی سفید لہراتی داڑھی والے بزرگوار ڈرائیو کررہے ہیں۔ سواری اور سوار دونوں کو آؤٹ آف کنٹرول دیکھ کر میں بندر کی طرح الٹی چھلانگ لگاتا ہوں اور ایک درخت پر جا بیٹھتا ہوں۔ آج کل کی ایکشن فلموں کا ہیرو بھی ایسا کرسکتا ہے۔
بزرگوار نے سر پر ایک تھان کا عمامہ لپیٹ رکھا ہے اور مغلِ اعظم کے شاہانہ لباس میں پرتھوی راج کی طرح دہاڑ رہے ہیں "باادب' باملاحظہ ہوشیار! پھر ایک دھماکا ہوتا ہے بیل گاڑی درخت سے ٹکرا کے رک جاتی ہے۔ پیچھے سے کوئی چیز غبارے کی طرح بلند ہوتی ہے اور پھر پیراشوٹ کی طرح اترتی ہے۔ یہ ایک شٹل کاک برقع ہے جس کو ہٹا کے ایک بڑی بی چلانے لگتی ہے "ارے تیرا ستیاناس ہو بڈھے۔ پھر بیل کے بریک فیل ہوگئے یا تجھے جھپکی آگئی' اب کیا ہوا؟"
بزرگوار منمنانے لگا "کچھ نہیں بیگم! وہ دراصل...... بیل

نے غلطی سے میرا چشمہ لگالیا تھا اور میں نے بیل کا۔"
"آئی ایم سوری!" بیل نے سر گھما کے کہا مگر یہ درخت بھی تو بیچ میں آگیا خواہ مخواہ۔"
بیل کی بات پر میں دم بخود رہ گیا۔ جب ٹکر ہوئی تو میں اوپر سے یوں نیچے ٹپک گیا تھا جیسے آندھی سے پکا ہوا آم گرتا ہے۔ میں نے کہا "تم کون ہو اور اس وقت یہاں کیا کررہے ہو؟ تمہیں پتا نہیں کہ ہر ایرے غیرے کو ڈیم پر آنے کی اجازت نہیں۔ یہ سیکیورٹی رسک ہے۔"
بزرگوار نے شائیں شائیں چابک لہرایا "گستاخ! نامعقول' ہمیں ایرا غیرا کہتا ہے۔ ہم سے سوال کرتا ہے کہ ہم کون ہیں؟"
بڑی بی نے پوپلا منہ چلا کے کہا "اجی کیوں ہنٹر چلارہے ہو بے چارے بچے پر! یہ تمہارا غلام نہیں پوتے کے پوتے کا پوتا ہے۔"
میں نے کہا "کیا آپ مسٹر عزت بیگ ہیں؟ میرے دادا نمبر ون؟"
بڑی بی نے خوشی سے تالی بجائی "اوہ یس! اور میں ہوں دادی نمبر ون مسز عزت بیگ۔"
میں نے مسرت سے کہا "آئی سی۔ کیا یہ وہی گاڑی ہے جس کو دوڑا کے یہ ساری زمین گھیری گئی تھی؟"
"آف کورس! اور یہ کارنامہ میں نے سرانجام دیا تھا" بیل غرور سے بولا۔
میں نے کہا "اگر تم کچھ تیز دوڑتے تو دگنی زمین مل جاتی۔"
دادا نمبر ون نے میری بات کاٹ دی "تیز خاک دوڑتا۔ آدھے ہارس پاور کا بیل تھا اور تمہارے دادا نے کبھی ٹیوننگ بھی نہیں کرائی۔ پیٹرول مہنگا تھا' سی این جی پر چلارہے تھے۔"
میں نے ہاتھ بڑھا کے کہا "خیر' کوئی بات نہیں۔ مجھے اپنے خاندان کے آدم وحوا کے بھوت سے مل کر خوشی ہوئی۔ ہاؤ ڈو یو ڈو۔"
دادا نمبر ون نے پھر چابک لہرایا "بدتمیز' بے ہودہ' تم نے سنا زوجہ! یہ ہمیں خبیث کہہ رہا ہے۔ فرنگیوں کی زبان بول رہا ہے۔"
"اجی کیوں جھوٹا الزام لگاتے ہو اس بے چارے پر۔ ویسے تو تمہارے ابا بھی تمہیں خبیث کہتے تھے" دادی نمبر ون نے میری حمایت کی "مگر اس نے نہیں کہا۔"
دادا نمبر ون نے خفگی سے کہا "کیوں...... کیا ابھی اس

نے ہمیں بھوت قرار نہیں دیا۔ بھوت ہوتی ہیں خبیث ارواح۔ جو بھٹکتی پھرتی ہیں۔"

میں نے کہا "آئی ایم سوری۔ میرا مقصد ہرگز آپ کی دلآزاری نہیں تھا۔"

عزت بیگ نے کہا "دراصل ہم آئے تھے کالاباغ...... سوری کنہار ڈیم کے خلاف مظاہرہ کرنے۔"

میں نے حکمرانوں کے لہجے میں کہا "لیکن اس ڈیم کی تعمیر سے خوشحالی آئے گی۔"

خاتون نے اچانک برقعے کے اندر سے ایک بینر نکالا اور اپنے مجازی خدا کو تھما دیا۔ اسے وہ میرے سامنے پھیلا کے کھڑے ہوگئے اور مکے لہرا کے نعرے لگانے لگے "کنہار ڈیم نامنظور۔ کنہار ڈیم ہائے ہائے' کنہار ڈیم مردہ باد۔"

بینر پر لکھا ہوا تھا۔ "سابق مالکان ست بدھائی کی انجمن ارواح ہم اپنی ابدی آرام گاہوں کو تباہ کرنے کی سازش کی پُرزور مذمت کرتے ہیں۔"

میں نے افسوس سے سرہلایا "بزرگو! ضرور آپ کو مرحوم نصراللہ خاں نے بریف کیا ہوگا۔ بھلا مرحومین کو ڈیم سے کیا خطرہ ہوسکتا ہے۔"

میرے دادا ان چیف نے پھر کوزا لہرایا "کیا تم چاہتے ہو کہ صورِ اسرافیل پھونکا جائے تو ہم سوئمنگ کرتے ہوئے میدانِ حشر تک جائیں؟"

دادی ان چیف ناک پر انگلی رکھ کے بولیں "ہائے ہائے' میں تو شرم سے پھر زمین میں گڑ جاؤں گی اگر مجھے ان بے حیا فرنگی میموں کی طرح جانا پڑا جو کیپری اور بالی کے ساحلوں پر تیرتی پھرتی ہیں۔"

یہ خواب ختم ہوا تو مجھے یوں لگا جیسے میں بارش میں کسی پرنالے کے نیچے کھڑا ہوں۔ پھر ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی کیلی سائز کا کروچ اپنی بڑی بڑی مونچھوں سمیت میری ناک میں داخل ہونے کی کوشش کررہا ہے۔ اس کے بعد میرا حلق کڑوا ہوگیا جیسے غلطی سے میں نے چینی کے بجائے نمک پھانک لیا ہو۔

لیکن یہ سب خواب کی کیفیت نہیں تھی۔ جب میں ہڑبڑا کے اٹھا تو مجھے فریال نظر آئی جو میرے قریب بیٹھی ہنس رہی تھی۔ مجھے جگانے کے لیے اس نے میری ناک میں دھاگے کی بتی گھمائی تھی۔ مجھ پر پانی چھڑکا تھا اور کھانے کے برتنوں میں سے نمک دانی اٹھا کے میرے کھلے منہ میں نمک ڈال دیا تھا۔

اس نے اٹھ کے بھاگنا چاہا مگر میں نے اسے یوں دبوچا کہ میرے بازوؤں کی گرفت میں اس کا سانس رک گیا۔ اس کے سانس کے رکنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں نے اس کے ہونٹوں کو اپنے ہونٹوں کے ایک طویل بوسے سے بند کردیا تھا۔ اس کے قرب کی خوشبو نے مجھے مدہوش کردیا تھا۔

وہ بری طرح تڑپی اور بالآخر خود کو چھڑانے میں کامیاب ہوگئی۔ "جنگلی...... بے شرم......" اس نے پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بڑی مشکل سے کہا اور پھر مجھ پر گرگئی۔ جب اس نے رونا شروع کیا تو میں گھبرا گیا۔ فرخ کے ساتھ راجا بھی یا تو بچ بچ سو رہا تھا یا انہوں نے آنکھیں بند رکھنا اور اس انتہائی جذباتی رومانی منظر کو دیکھنا بھی خلاف آداب سمجھا تھا۔ اپنے ساتھ میں نے فریال کے نازک ریشمی اور شاخِ گل جیسے لچک دار وجود کو بھی اٹھایا اور اسے باہر لے آیا۔

باہر کی لائٹس جل رہی تھیں اور جنریٹر چل رہا تھا۔ فی الحال تمام فٹنگ عارضی تھی اور کسی لائٹ کو آن آف کرنے کے لیے سوئچ نہیں لگائے گئے تھے۔ کمرے کے اندر جہاں ہم سو رہے تھے' روشنی کو براہِ راست آنکھوں پر پڑنے سے روکنے کا واحد طریقہ یہی تھا کہ ہولڈر سے بلب کو نکال دیا جائے۔

میں سسکیاں لیتی ہوئی فریال کو ایسے ہی اپنے ساتھ چمٹا کے سنبھالے رہا اور آہستہ آہستہ باہر لے گیا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ دیکھنے والا کوئی نہیں۔ پرائیویسی ہر جگہ تھی لیکن رات کے وقت کھلے آسمان کے نیچے اطمینان سے بیٹھنے کے لیے کوئی صاف یا محفوظ جگہ نہ تھی۔ ہر طرف گھاس' خودرو پودے اور جھاڑیاں کسی جنگل کی طرح اُگے ہوئے تھے۔ ان میں ہر طرح کے کیڑے مکوڑے ہونے لازمی تھے' یہاں تک کہ سانپ' بچھو نکل آنے کے امکان کو مسترد نہیں کیا جاسکتا تھا۔

میں نے گاڑی کے پیچھے والا دروازہ کھولا اور اسے اندر بٹھا دیا۔ یہ اکتوبر کا مہینا تھا چنانچہ رات کے آخری پہر میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ میں دوسری طرف کے دروازے سے اندر گیا۔ فریال پیر سمیٹ کر اور سر کو میری گود میں رکھ کے لیٹ گئی۔ میں آہستہ آہستہ اس کے بالوں کو سہلاتا رہا جو ایک مہکتے ریشمی ڈھیر کی طرح پھیل گئے تھے۔ میں نے اس کے آنسو پونچھے اور اس کو اپنے ساتھ لپٹا کے پیار کرتا رہا۔ آہستہ آہستہ اس کے آنسو تھم گئے۔ میرے حرماں نصیب دل کو بھی اب قرار آگیا تھا۔

میں نے کہا "فری! اب کیا ہے...... اب رونا کیا؟ تم نے اتنی ہمت دکھائی' اکیلے اتنا لمبا سفر کیا اور مجھ تک پہنچ

گئیں۔"

اس نے ایک گہری لمبی سانس لی اور میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا "لیکن مجھے پھر بھی ڈر لگ رہا ہے روفی! مجھ پر ابھی تک دہشت سوار ہے۔"

میں نے کہا "اس کے فرشتے بھی یہاں نہیں پہنچ سکتے۔"

"نہیں روفی! وہ شیطان ہے۔ اس کا توڑ کوئی نہیں۔ وہ ہر جگہ پہنچ سکتا ہے۔" فریال کا جسم آہستہ سے کانپا۔

میں نے جھک کر اس کے رخساروں کو چوما۔ "پُرسکون ہوجاؤ۔ اگر وہ یہاں نظر بھی آیا تو کوئی سوال کیے بغیر میں ...ے گولی ماردوں گا۔ قیامت تک اس کا سراغ بھی نہیں ملے ...ا۔ وہ تمہیں مجھ سے نہیں چھین سکتا۔"

"مجھے ابھی تک اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آتا رومیو کہ ...کے چنگل سے نکل کے میں تمہارے پاس پہنچ گئی ہوں۔ ...نہیں یہ سب کیسے ہوگیا۔ میں ایک انتہائی دہشت ناک ...بے سے گزری ہوں۔"

میں نے کہا "اس کا اندازہ مجھے ہو رہا ہے لیکن اس سے ...ہے کہ میں تمہاری ایڈونچر اسٹوری سنوں...... مجھے یہ بتاؤ کہ ...ہارے لیے کیا لاؤں؟"

وہ مسکرائی "عاشق تو آسمان سے تارے توڑ لاتے ...ہیں۔"

میں نے کہا "اگر ان سے پیٹ بھر سکتا ہے تو میں ابھی ...تا ہوں اگلی ہی خلائی پرواز سے۔ آدھا کلو تارے لے آتا ...ہوں۔"

وہ بولی "روفی! مجھے تو واقعی بھوک لگ رہی ہے۔"

میں نے کہا "جب سے تم آئی ہو' تم نے کچھ بھی نہیں ...کھایا ہے۔ پورے سولہ گھنٹے سوتی رہی ہو۔"

"میں نے کہا تھا ناں...... میں بہت تھک گئی تھی۔ پتا ...نہ یہاں تک میں کیسے زندہ سلامت پہنچ گئی۔ اتنا لمبا ...سفر میں نے کیسے برداشت کرلیا۔ میرے جسم میں توانائی کا ...قطرہ نہیں رہا تھا۔ کاربوریٹر خشک ہوجائے تو انجن بند ...ہوتا ہے مگر گاڑی کچھ دیر رواں رہتی ہے۔ اپنے ہی (MOMENTUM) میں یا تمہاری کشش تھی جو مجھے کھینچ ...لائی۔ یہ بتاؤ' کھانے کے لیے کیا ملے گا اس وقت؟"

میں نے کہا "ویسے تو تمہارے حصے کا بچا ہوا کھانا بھی ...رکھا ہوا ہے۔"

"کہاں سے آتا ہے کھانا؟"

میں نے کہا "ابھی تک یہی لوگ دن رات خدمت ...کر رہے ہیں۔ جو خود کو میرا خاندانی ملازم اور مجھے مالک کہتے ہیں تو مجھے بڑا عجیب لگتا ہے۔ ناشتا' کھانا' چائے' کافی سب مل رہا ہے۔"

"اگر یہ بات ہے تو پھر میرے لیے کافی منگواؤ۔ مجھے لگتا ہے کافی نہ ملی تو میں مرجاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے' مرجاؤ۔ میں آدھی رات کو انہیں جگا کے حکم نہیں دے سکتا کہ میری محبوبۂ دلنواز کے لیے کافی حاضر کرو۔"

وہ ہنسی "کیوں نہیں کہہ سکتے۔ ان سے کہو کہ مالکن کی خواہش پوری نہ کی گئی تو نافرمانی کرنے والوں کے دُرّے مار مار کے کھال کھینچ لی جائے گی۔ ایسے رعب اور جلال سے کہو کہ وہ تھرتھر کانپنے لگیں اور سرِ تسلیم خم کرکے کہیں کہ جو حکم عالی جاہ!"

میں نے ہنس کے کہا "میں نے کبھی کسی اسٹیج ڈرامے میں بھی ایسے ڈائلاگ نہیں بولے...... حالانکہ ڈرامے بہت کیے تھے۔"

"رومیو! آخر تم نواب ابن نواب ہو۔ ایک دم جینوئن!...... اور یہ بالکل رئیل لائف کا رول ہوگا جو تم کروگے۔ اچھا میرے بارے میں کیا پریس ریلیز دی ہے تم نے؟ جھوٹ بولا ہے یا سچ؟"

"میں نے سوچے سمجھے بغیر کہہ دیا کہ تم میری دوست ہو۔ ولایت سے آئی ہو۔ لوگوں نے بے شرمی اور ڈھٹائی کے اس مظاہرے پر دانتوں تلے انگلیاں دبالیں۔ توبہ توبہ کرنے لگے کہ دیکھو لو' یہ ہوتا ہے ولایت میں رہ کے۔ نہ رشتہ نہ ناتا' آگئی ساتھ رہنے۔ کچھ ایسے ہی جذبات کا اظہار ڈاکٹر شہناز کے بارے میں بھی کیا گیا تھا' جب وہ راجا کے ساتھ آئی تھی۔"

فریال ہنسی "یار' کیا حرج ہے اگر صبح ہوتے ہی ہم نکاح پڑھوالیں' سب کے سامنے! کیونکہ یہ تو اب طے ہے کہ میں رخصت ہوکے تمہارے پاس آگئی ہوں' ہمیشہ کے لیے۔ بڈھ تو کیا اب مجھے قبر میں بھی تمہارے ساتھ ہی سونا ہے۔"

میں نے کہا "کچھ خدا کا خوف کرو فریال! یہ انگلستان نہیں پاکستان ہے۔ یہ سب یہاں نہیں چلے گا۔ جس قسم کے کپڑے پہن رکھے ہیں تم نے...... اور جو بے شرمی کا مظاہرہ تم نے سب کے سامنے کیا تھا' یہاں آتے ہی......"

اس نے میری ناک پکڑی "میں سب کو جوتی کی نوک پر رکھتی ہوں فیکے چتر! اس وقت اگر کوئی دیکھ لے کہ ہم گاڑی کی پچھلی سیٹ پر......"

میں نے کہا "لاحول ولاقوۃ۔ میں نے تم سے کھانے کا پوچھا تھا۔"

''سچی بات یہ ہے سویٹ ہارٹ! کہ تمہیں جگانے سے پہلے ہی میں وہ سب کھانا چٹ کر گئی تھی جو میز پر رکھا تھا۔ اب تو میرا جی چاہتا ہے کہ تمہیں کھا جاؤں۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ تم میرے اتنے قریب ہو...... بلکہ میں تمہارے دل کی ہر دھڑکن سن سکتی ہوں۔'' اس نے تھوڑا سا سر اٹھا کے اپنا کان میرے سینے سے لگا دیا۔

میں نے کہا ''اگر اس وقت وہ یہاں آ جائے' تمہارا منگیتر...... صفدر سلطان مرزا...... ایک دم دروازہ کھول کے کہے...... یا کچھ نہ کہے' بس دو فائر کرے...... تمہیں اور مجھے شوٹ کر دے...... پھر؟''

اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں ''کاش! ایسا ہو جائے لیکن ایسا ہوگا نہیں رومیو!''

میں نے کہا ''کیوں؟ کیا تم نے اسے قتل کر دیا ہے؟''

''یہی سمجھ لو۔ اپنی طرف سے میں نے پوری کوشش کی تھی لیکن وہ بچ گیا۔ اس کی قسمت اچھی نہیں تھی' میری قسمت خراب تھی۔''

میں نے کہا ''شروع سے بتاؤ' اس نے فون کر کے مجھ سے پوچھا تھا کہ فریال کہاں ہے؟''

''اس نے فون کیا تھا...... تمہیں؟'' وہ حیرانی سے بولی۔

''ہاں، پہلے تو مجھے سخت غصہ آیا تھا پھر میں تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ مجھے شک ہوا کہ وہ ڈراما کر رہا ہے۔ کسی بات پر مشتعل ہو کے اس نے تمہیں قتل کر دیا ہے۔ لاش کو غائب کر دیا ہے اور اب ہر ایک سے پوچھتا پھر رہا ہے کہ فریال کہاں ہے؟ ادھر تم غائب تھیں۔ میں نے تمہاری آدم بیزار سہیلی ڈاکٹر شائستہ سے فون پر پوچھا تو اسے بھی کچھ معلوم نہیں تھا۔ تم اندازہ نہیں کر سکتیں' میری کیا حالت ہوئی۔''

فریال نے میری گردن میں ہاتھ ڈال کے میرے چہرے کو اپنی طرف کھینچا اور آہستہ سے میرے ہونٹوں کو چوما ''میں اندازہ کر سکتی ہوں رونی!''

میں نے ایک گہری سانس لی ''جب بالآخر یہ معلوم ہوا کہ تم کہیں روپوش ہو تو میری جان میں جان آئی لیکن پھر یہ فکر لاحق ہو گئی کہ ایسے تم کب تک بچ کے رہ سکتی ہو۔''

''تمہیں نازنین کا کیس معلوم ہے؟''

''ہاں، بڑی گرما گرم ماڈل تھی۔ پہلے انڈیا کے کچھ اشتہاروں میں جلوہ گر ہوئی تھی۔ وجہ شہرت اچھی فگر اور کم لباسی۔''

''کم لباسی تو پرانی بات ہے۔ اب تو بہت آگے چلی گئی ہے وہ۔ کچھ ویب سائٹس پر لباس کے بغیر دستیاب تھی پھر اس کی کچھ فلمیں ریلیز ہوئیں۔ بوڑھوں کو اور بچوں کو جوان کرنے والی۔''

میں نے کہا ''کہاں سے مل جاتی ہیں ایسی معلومات تمہیں۔''

''رفیق صاحب! میں ست بدھائی میں نہیں' لندن میں تھی۔ خیر مذکورہ خاتون نے جب ارضِ پاک کا رخ کیا تو اسٹاک مارکیٹ میں بڑی کھلبلی مچی۔ وہ جو نمبر دن سمجھی جاتی تھیں' یہاں دو کوڑی کی ہو گئیں۔ پتا نہیں کہاں اور کیسے اس پر میرے منگیتر کا دل آ گیا۔ یہ تو جانتے ہی ہو تم کہ سلطان ہے اصلی جوہری۔ اس نے یہ کوہ نور ہیرا حاصل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ پہلے اسے عادت کے مطابق ایک فلم میں لیڈ رول دیا پھر کچھ سبز باغ دکھائے اور بالآخر شادی کی پیش کش کر دی۔ یہ ماننا پڑے گا تمہیں بھی کہ تمہارا وہ رقیب ذرا بھی روسیاہ نہیں ہے۔''

میں نے اعتراف کیا ''ہاں' آدمی ہینڈسم ہے مگر مجھ سے زیادہ نہیں۔''

''نازنین کے پاس اوپن چوائس تھی۔ اسے صرف دولت درکار ہوتی تو سلطان سے بڑے خریدار تھے۔ میرا خیال ہے کہ شادی کی پیشکش نے نازنین کو متاثر کیا۔ باقی سب خریدار تھے۔ ایک شخص ازدواجی حیثیت دے رہا تھا۔ اس کے ساتھ تحفظ تھا' اسٹیٹس تھا اور شرط کوئی نہ تھی۔ میں جانتی ہوں سلطان نے اسے کس طرح اپنے خلوص کا یقین دلایا ہوگا۔ اس سے کہا ہوگا کہ میری طرف سے کوئی پابندی نہیں ہوگی کہ تم صرف میری فلموں میں یا میرے لیے کام کرو۔ نازنین نے ہامی بھر لی لیکن وہ بھی کوئی ٹین ایجر نہیں تھی۔ اس نے ایک سادہ سی شرط رکھ دی کہ اتنے ہی مخلص ہو تو آدھی جائیداد میرے نام کر دو۔ شادی کے بعد جو میرا وہ تمہارا اور جو تمہارا وہ میرا۔ سلطان پھنس گیا کیونکہ آسان نظر آنے کے باوجود یہ شرط آسان نہ تھی۔ وہ خاندانی جائیداد کا مالک ضرور تھا لیکن اسے نازنین جیسی عورت کو تحفے میں پیش کر دینے کا مجاز بہرحال نہیں تھا۔''

میں نے کہا ''کیا اس نے نازنین سے بھی منگنی کر لی تھی؟''

فریال ہنسی ''ہاں' یہ تقریب تو اس کے لیے اتنی ہی آسان ہوتی ہے جتنا کسی آنے والی فلم کا مہورت۔ تاہم نازنین نے منگنی کے بعد اپنے پتے بہت ہوشیاری سے چلے۔ شاید اس عرصے میں اسے سلطان کی تمام سابقہ شادیوں کے وعدوں اور منگنیوں کے اعلانات کے بارے میں معلوم ہو گیا

ہوگا۔ اس نے سلطان کو عقد مسنونہ سے قبل شب وصل سے ایک ہاتھ کی دوری پر رکھا اور اس کی آتش شوق کو ایسا بھڑکایا کہ سلطان پاگل ہو گیا۔ اس نے اپنی پہلی اور خاندانی بیوی سے اجازت کے ساتھ نصف جائیداد طلب کی۔''

میں نے کہا ''کیا وہ آدھے کی مالک تھی؟''

''مالک یوں تھی کہ چچا کی بیٹی تھی۔ سلطان کا باپ بڑا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں ہی اکلوتے بیٹے کے لچھن دیکھے تو ایسا پکا بندوبست کر دیا تھا کہ چھوٹے بھائی کی بیٹی بھی محفوظ رہے اور جائیداد بھی۔ ساری جائیداد مشترکہ طور پر دونوں کے نام تھی۔ سلطان کے باپ اور سسر دونوں کو مرے زمانہ ہو گیا۔ سلطان کو عیاشی کے لیے رقم ملتی رہی لیکن وہ دوسری شادی کر سکا اور نہ ہی جائیداد پر مکمل اختیار حاصل کر سکا۔ اب اس نے بیوی سے مطالبہ کیا کہ اس کے حصے کی نصف جائیداد اس کے نام کر دے۔ ظاہر ہے' بیوی نے انکار کیا۔''

''اس کی بیوی کا ایک بھائی بھی تھا' وہ شاید امریکا میں سیٹل ہے۔''

''ہاں' اتفاق سے وہ آیا ہوا تھا۔ اس نے بہن کی حمایت کی اور اسے ڈٹے رہنے کے لیے کہا۔ بیوی نے سلطان سے کہہ دیا کہ شادیاں وہ جتنی چاہے کرے' بیک وقت چار رکھے مگر کسی اور بیوی کو جائیداد میں سے ایک انچ زمین نہیں دی جا سکتی۔ نازنین کا خرچہ وہ خود اٹھائے اور اسے جہاں چاہے رکھے' وہ خاندانی گھر میں نہیں رہے گی۔ اس پر جھگڑا بڑھا اور سلطان نے بیوی کو گلا گھونٹ کے ہلاک کر دیا۔ عام حالات میں شاید وہ اپنی دولت اور اثر رسوخ کی مدد سے اس قتل کو بھی خودکشی یا طبعی موت ثابت کرنے میں کامیاب رہتا لیکن اس کا امریکی سالا جان کا دشمن ہو گیا۔ اس نے کہا کہ بہن کے قتل کے جرم میں اگر بہنوئی صاحب کو پھانسی کے تختے تک نہ پہنچا تو عمر قید کاٹنے کے لیے جیل ضرور پہنچاؤں گا۔ اس نے امریکن سفارت خانے کے اثر رسوخ کو استعمال کیا اور اسلام آباد میں نہ جانے کس کس کو فون کروائے۔ نتیجہ یہ کہ سلطان کے مہرے پٹ گئے۔ وہ تھانے دار' ایس پی اور ڈی آئی جی کی حمایت پر انحصار کر رہا تھا۔ آخری وقت میں انہوں نے سلطان کے سامنے اپنی مجبوری کا اعتراف کر لیا۔ اوپر والوں کی بات نہ مانی تو نوکری جائے گی۔ تاہم انہوں نے سلطان کو فرار کا راستہ دکھا دیا اور موقع بھی فراہم کیا۔''

میں نے کہا ''یہ سب تفصیل تمہیں کس نے بتائی؟''

''یہ فرسٹ ہینڈ رپورٹ ہے رومیو! وہ کیا کہتے ہیں انگریزی میں؟ براہِ راست گھوڑے کے منہ سے...... نازنین میرے پاس آئی تھی۔''

میں بھونچکا رہ گیا ''تم نازنین سے مل چکی ہو؟''

''ہاں، نازنین کے ساتھ بھی وہی ہوا جو میرے ساتھ ہوا تھا۔ سلطان کی منگیتر کے عہدے پر فائز ہوتے ہی وہ خاندانی عزت و وقار کی علامت بن گئی۔ سلطان نے اسے رہنے کے لیے کوٹھی دی اور کار دی اور سکیورٹی فراہم کی۔ پرسنل باڈی گارڈ ہر وقت' ہر جگہ اس کے ساتھ جانے لگے۔ اسے چوبیس گھنٹے کے لیے ایک شوفر فراہم کر دیا گیا۔ جواز یہ دیا گیا کہ اب تم کوئی عام ماڈل نہیں ہو' صفدر سلطان مرزا کی ہونے والی بیوی ہو۔ یہاں جتنے میرے دوست ہیں ان سے زیادہ دشمن ہیں جو تمہیں بھی نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ نازنین عملاً اس کی قیدی بن گئی۔ وہ اپنی مرضی سے کہیں نہیں جا سکتی تھی اور فون پر بات کرنے کی پرائیویسی سے بھی محروم ہو گئی تھی۔ سلطان کا موقف یہی تھا کہ تم ہر طرح سے آزاد ہو لیکن معاشرے کی کچھ اخلاقی حدود بہرحال ہیں جن کا پاس رکھنا ضروری ہے۔ سلطان کی پوزیشن تاخیر کی وجہ سے بھی خراب ہو رہی تھی۔ یا تو وہ نازنین کی شرط پوری کر کے شادی کر لیتا اور پھر پکا خداوند مجازی بن کے اپنی مرضی چلاتا۔ نازنین منہ مانگی قیمت پا کے صبر کرتی۔''

''سلطان کے یہ ٹھاٹ باٹ کیسے قائم ہیں؟ یہ شراب و شباب کی رنگینی کیسے برقرار ہے۔ فلمی دنیا کے جلوے' کوٹھی' کار...... کیا بیوی کا اخراجات پر کوئی کنٹرول نہیں تھا؟''

''نہیں، آمدنی سلطان کے پاس رہتی ہے۔ بیوی صرف زمینوں کی مالک ہے۔ سلطان کچھ بھی بیچ نہیں سکتا۔''

''کتنی ہے یہ زمین؟''

''مجھے کوئی آئیڈیا نہیں لیکن یقیناً لاکھوں ایکڑ میں ہوگی' جس کی آمدنی کروڑوں میں ہے۔ گاؤں کی حویلی کے علاوہ شہروں میں کوٹھیاں ہیں۔ اسلام آباد' لاہور اور کراچی میں۔ جو سلطان کے باپ نے بنائی تھیں۔''

''سب دولت مشترکہ ہے؟''

''یہی تو سلطان کی بے بسی ہے۔ بیوی سب کی ملکیت میں شریک ہے۔ بیوی سے جھگڑے نے طول پکڑا تو نازنین نے بھی ہنگامہ شروع کیا کہ یہ کیا تماشا ہے۔ منگنی کر کے مجھے گھر میں قید کر دیا ہے۔ شادی کے بعد کیا ہوگا اور شادی کب ہوگی؟ مجھے تو اس کے آثار دکھائی نہیں دیتے۔ سلطان نے پہلے ٹالا اور تسلی دی کہ بس چند دن میں سب ٹھیک ہو جائے گا لیکن نازنین کو اتنے عرصے میں سلطان کے فیوڈل مزاج کی پہچان ہو گئی تھی اور وہ سمجھ رہی تھی کہ شاید اس نے کھانے کا

سودا کیا تھا۔ سلطان نے جھوٹ بولا تھا کہ وہ کام کرنے کے لیے آزاد ہوگی۔ وہ تو شاید اسے روایتی انداز میں گھر کی چاردیواری میں محصور کردے گا۔ جھگڑا بڑھا تو نازنین نے صاف کہہ دیا کہ اب وہ شادی کے لیے تیار نہیں اور اس وقت سلطان نے وہی تیور اختیار کیے جو اس کے مزاج کی صحیح عکاسی کرتے ہیں کہ منگنی توڑنا کوئی مذاق نہیں۔ اس کی عزت کا سوال ہے جس کی خاطر وہ جان دے بھی سکتا ہے اور لے بھی سکتا ہے۔ پھر سلطان نے بیوی کو قتل کردیا اور فرار پر مجبور ہوا۔ دس دن اس نے نازنین کے ساتھ اسی کوٹھی میں گزارے۔"

میں نے حیرانی سے کہا "وہ کیسے؟ کسی کو معلوم نہیں ہوا؟"

"نہیں، کوٹھی مقفل رہی۔ باہر صرف ایک مسلح محافظ رہتا تھا۔ ٹیلی فون لائن کاٹ دی گئی تھی۔ کھڑکی دروازے سب بند تھے اور باہر سے دیکھنے والے کو اندر اندھیرا ہی نظر آتا تھا۔ دس دن تک پولیس اس کی تلاش میں ہر جگہ چھاپے مارتی رہی۔"

"مگر پولیس وہاں نہیں گئی جہاں وہ موجود تھی؟"

"ہاں، علاقے کے ایس ایچ او نے چھاپا مارنے سے پہلے خود سلطان سے ملاقات کی اور یہ رپورٹ دی کہ کوٹھی عرصۂ دراز سے غیر آباد ہے۔ ایک چوکیدار کے سوا کوئی وہاں نہیں رہتا۔ ظاہر ہے اسے سلطان کو تحفظ دینے کی اچھی قیمت ملی ہوگی۔ دس دن تک سلطان نے رات دن داد عیش دی۔ وہ کیا کہتے ہیں دن عید تو رات شب برات۔ یوم وصل اور شب وصل میں کوئی فرق نہ رہا۔"

میں نے کہا "باتیں بھی خوبصورت کرنے لگی ہو تم۔ یہ بتاؤ نازنین نے احتجاج نہیں کیا؟"

فریال ہنس پڑی "ایک کمزور اور بے بس عورت کا احتجاج کیا۔ اور پھر وہ کون سی شریف زادی تھی کہ عزت لٹ جانے کا سوگ مناتی۔ اس نے مقابلے کی پالیسی ترک کرکے زنانہ ڈپلومیسی کا راستہ اختیار کیا۔ طاقت سے مقابلہ نہیں ہوسکتا تھا۔ اس نے حسن و شباب اور ناز و انداز کا اسلحہ استعمال کیا۔ سلطان کی عقل اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سلب کرلی۔ اسے بے خود اور دیوانہ بناکے ایک دن ناک آؤٹ کردیا۔ اس نے کہا کہ وہ تو سلطان کو قتل کردیتی لیکن ایک تو مناسب آلۂ قتل نہ ملا۔ گھر میں سوائے کچن کی چھری کے کچھ نہ تھا اور وہ ڈرتی تھی کہ چھری سے وہ کچھ نہ کرپائے گی۔ الٹا سلطان اسے گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دے گا۔ اس نے سوتے میں سلطان کے سر پر ٹیبل لیمپ مار دیا اور پھر اسے چادر پھاڑ کے باندھ دیا۔ اس کے منہ میں بھی کپڑا ٹھونس دیا۔ پھر اس نے اندر سے کھڑکی کھول کے شور مچایا کہ گارڈ...... دیکھو تمہارے صاحب کو کیا ہوگیا ہے؟ انہیں دل کا دورہ پڑا ہے۔ گارڈ بھاگا ہوا اندر آیا تو نازنین نے اس کے سر پر بھی اونکس کا بھاری لیمپ مارا اور اس کا سر پھاڑ دیا۔ نازنین کا خیال تھا کہ سکیورٹی گارڈ مرگیا ہوگا۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ اس وقت تک نازنین کو یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ سلطان نے اپنی بیوی کو قتل کردیا ہے اور اس کے بھائی نے سلطان کے خلاف ایف آئی آر کٹوادی ہے۔ اس نے واپس امریکا جانے کی مدت بھی بڑھوالی ہے اور امریکی سفارت خانے کو مطلع کردیا ہے کہ اسے سکیورٹی چاہیے چنانچہ اپنے شہری کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے سفارت خانہ بھی وزارت داخلہ کو لکھ چکا ہے۔ نازنین نے سب نقد سمیٹا جو سلطان نے روپوشی کی زندگی کے لیے جمع کرلیا تھا۔ اپنا زیور اٹھایا اور فرار ہوگئی۔ فائدہ اسے یہ ہوا کہ پولیس رپورٹ اس کے حق میں تھی۔ علاقے کا تھانہ انچارج کہہ چکا تھا کہ کوٹھی برسوں سے غیر آباد ہے۔ چوکیدار کو کچھ دیر بعد ہوش آیا تو اس نے ہمت سے کام لے کر سلطان کو آزاد کیا جو پہلے ہوش میں آچکا تھا مگر نازنین نے اس کے ہاتھوں پیروں کو یوں باندھا تھا کہ وہ حرکت کرسکتا تھا اور نہ ہی حلق سے کوئی آواز نکال سکتا تھا۔ اس بارے میں نازنین کو بعد میں دیگر ذرائع سے علم ہوا۔ سلطان نے چوکیدار کو اسپتال پہنچایا اور خود روپوش ہوگیا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اسپتال پہنچ کے چوکیدار مرگیا۔"

میں نے کہا "اگر وہ نہ مرتا تو ضرور حیرت کی بات ہوتی۔ اسے مار دیا گیا کیونکہ وہ تفتیش میں بہت سے حقائق پر سے پردہ اٹھا سکتا تھا۔ نہ سلطان اسے زندہ رہنے کی اجازت دے سکتا تھا اور نہ پولیس یہ خطرہ مول لے سکتی تھی۔"

"نازنین کا نروس بریک ڈاؤن ہوگیا۔ وہ ایک بہت وضع دار اور شریف النفس پروڈیوسر کے گھر میں چھپی رہی۔ جب وہ انڈیا سے آئی تھی تو ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی کے لیے سب سے پہلا اشتہار اسی پروڈیوسر کے ساتھ کیا تھا۔ اس نے خاموشی سے نازنین کو دبئی پہنچایا جہاں اس نے ایک اور سہارا تلاش کیا اور سیٹ ہونے لگی تھی کہ سلطان کے کارندے اسے تلاش کرتے ہوئے پہنچ گئے۔ پاکستان کے اخبارات سے نازنین کو معلوم ہوگیا تھا کہ سلطان ابھی تک گرفتار نہیں ہوا ہے لیکن اس کی سکیورٹی پر مامور گارڈ اسپتال جائے مرگیا تھا اور مرنے سے پہلے اس نے اپنے بیان میں نازنین کو قاتل نامزد کردیا تھا۔ یہ جھوٹ تھا لیکن سچ بنادیا گیا تھا۔ اس بیان کی

قانونی اہمیت بہت زیادہ ہوتی ہے جو مقتول اپنی موت سے پہلے دیتا ہے۔"

نازنین اگر خود کو قانون کے حوالے کردے اور عدالت میں پیش ہوجائے......" میں نے کہا۔

"تم کیسی نامعقولیت کی باتیں کررہے ہو فیکے! نازنین جیسی عورت کے ساتھ پولیس کے ادنیٰ سے اعلیٰ افسر تک تفتیش کے نام پر کیا سلوک کریں گے۔ کیا چھ سال ملک سے باہر رہ کے تم بھول گئے ہو کہ تھانوں میں کیا ہوتا ہے؟ عورت بے چاری تو انتہائی کمزور ہوجاتی ہے۔ مجرم ہونے کی وجہ سے نہیں، عورت ہونے کی وجہ سے۔ مرد کو ننگا کیا جائے۔ الٹا لٹکایا جائے اور اس کے سامنے فحش کلامی سے فحاشی تک کچھ بھی کیا جائے وہ سہہ لیتا ہے۔ عورت پر تو تشدد کا آغاز ہی عزت لوٹنے سے ہوتا ہے۔ وہ بھی تھانے کے ماحول...... توبہ میری تو روح کانپ جاتی ہے اس تصور سے ہی۔ خیر...... بات تھی نازنین کی۔ اس کی پوزیشن مزید خراب یوں ہے کہ وہ انڈیا سے پاکستان آئی۔ یہاں کسی قانونی اجازت کے بغیر ماڈلنگ کرتی رہی اور شوبز کا حصہ بن گئی۔ اعلیٰ سطح کے تعلقات کی بنا پر اس کے ویزا کی مدت میں خود بخود توسیع ہوتی گئی اور ایک وقت ایسا آیا جب اس نے ویزا کا تکلف بھی غیر ضروری سمجھا۔ فرض کرلیا کہ بس اب کون پوچھے گا مگر برا وقت آتے کیا دیر لگتی ہے۔ وہ سلطان کی صورت میں نازل ہوا۔ وہ فرار ہوکے دبئی چلی گئی، وہاں یقیناً وہ غیر معینہ مدت تک قیام کرسکتی تھی۔ انڈیا پاکستان کے لوگ مستقل وہیں رہائش رکھتے ہیں اور آنا جانا بھی چلتا رہتا ہے۔ سلطان کے بندے پہنچے تو انہوں نے صاف کہا کہ بی بی، جو کچھ تم نے کیا، اچھا نہیں کیا۔ قانون کو دفع کرو۔ اسے تو کوئی بھی خرید سکتا ہے یا بدل سکتا ہے۔ ہم سے بچ کے تم کہاں جاؤ گی؟ سلطان صاحب کا پیغام ہے کہ بھاگنا چھوڑ دو۔ آرام سے دبئی میں رہو۔ وہ یہاں آکے شادی کرلیں گے۔ انہوں نے تمہیں فی الحال معاف کردیا ہے اور منگنی برقرار ہے۔ نازنین بری طرح ڈر گئی۔ وہ اجنبی صورت سے اور عزائم سے ہی بہت خطرناک لگتے تھے اور ان کی دھمکی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ نہ ان کے خلاف قانونی کارروائی ممکن تھی کیونکہ وہ کسی کا نام پتا تک نہیں جانتی تھی۔ تاہم اس نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ سمجھتی تھی کہ دبئی سے اسے اغوا تو نہیں کیا جاسکتا مگر قتل ضرور کیا جاسکتا ہے۔ وہ کسی طرح سے ویزا حاصل کرکے لندن پہنچ گئی۔ یقیناً اسے میرے بارے میں معلوم تھا۔ جتنا عرصہ وہ سلطان کی منگیتر رہی، بہت سے خیر خواہوں نے اسے خبردار کیا ہوگا کہ سلطان کے دامن ہوس میں نہ پھنسے۔ وہ تو ایک خطرناک مکڑی کی طرح ایسے ہی ہر حسین لڑکی کے لیے جالا بنتا ہے اور جو قریب آتی ہے وہ اس کا شکار ہوجاتی ہے۔ وہ کسی طرح میرا ایڈریس معلوم کرنے میں کامیاب ہوگئی اور ایک دن اچانک میرے فلیٹ پر وارد ہوگئی۔ اس بے وقوف نے یہ نہیں سوچا کہ میں کہاں آزاد ہوں۔ وہ خود چل کے سکیورٹی کے اس حصار میں داخل ہوگئی جو میرے گرد قائم تھا۔ ایک زنداں سے نکل کے دوسرے زنداں میں پہنچ گئی۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ اس کی صورت میں نے کئی اشتہاروں میں دیکھی تھی۔ میں اس کی آمد کے مقصد کو بھی سمجھ گئی تھی لیکن میں نے اسے اپنی بپتا سنانے کا موقع دیا جو کسی طرح بھی خود میری دکھ بھری آپ بیتی سے مختلف نہ تھی۔ اسے خود پر غصہ تھا کہ لاہور میں سلطان کی کوٹھی سے فرار ہوتے وقت اس نے کمزوری کیوں دکھائی۔ وہی وقت تھا جب وہ اپنے مصائب کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کرسکتی تھی۔ اس نے سلطان کو قتل کردیا ہوتا تو اس کے ساتھ دوسروں کی جان بھی چھوٹ جاتی۔ دوسروں سے اس کی مراد مجھ سے ہوگی یا مقتول بیوی کے بھائی سے جو اس کے پیچھے لگا ہوا ہے۔ یہ ایک ہوس پرست شیطان کا صحیح انجام ہوتا جس پر شاید قانون بھی حرکت میں نہ آتا۔ اس کی اولاد ہرگز اپنے باپ کے خون کا بدلہ لینے میدان عمل میں نہ آتی۔ ابھی اس کے بچے چھوٹے ہیں۔ بھائی کوئی ہے نہیں۔ مدعی کون بنتا اور بدلہ کون لیتا۔ کم سے کم نازنین ہر الزام سے محفوظ رہتی۔ میں نے کہا کہ چلو جو غلطی ہوئی سو ہوئی۔ یہ کیا حماقت فرمائی تم نے کہ مجھ سے ملنے آگئیں۔ اب واپس کیسے جاؤ گی۔ اب تک سلطان کو اطلاع مل گئی ہوگی کہ قیدی نمبر دن کے پاس قیدی نمبر ٹو منگیتر خود بخود پہنچ گئی ہے۔ وہ بہت گھبرائی مگر میں نے کہا بیٹھو کچھ سوچتے ہیں پھر میں نے رسک لینے کا فیصلہ کیا۔ میں نے کہا کہ تمہیں یہاں سے باہر نکالنا میری ذمے داری۔ آگے تم خود ذمے دار۔ میں نے شوفر سے کہا کہ پاکستان سے میری دوست آئی ہیں اور ان کو کچھ شاپنگ کرانی ہے اور کچھ لندن کی سیر۔ وہ ہمیں لے گیا۔ ہم نے لنچ باہر کیا۔ کچھ دیر بعد میں نے ظاہر کیا کہ میری طبیعت خراب ہورہی ہے۔ شاید کھانے میں کچھ گڑبڑ تھی پھر نازنین نے بھی متلی اور چکر کی شکایت کی اور ہم ڈاکٹر شائستہ کے پاس چلے گئے۔ شوفر باہر گاڑی میں بیٹھا رہا۔ دو گھنٹے بعد شائستہ کی کار نکلی۔ اسے شائستہ کا شوہر چلا رہا تھا۔ نازنین ڈکی میں باہر نکل گئی۔ کچھ دیر بعد میں باہر آئی تو شوفر گھبرایا۔ اس نے پوچھا تو میں نے کہا کہ میری سہیلی کی طبیعت زیادہ خراب ہورہی تھی شائستہ مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس

نے میری سہیلی کو اپنے شوہر کے ساتھ بھیج دیا۔ وہ کسی اسپتال گئے ہوں گے لیکن جیسا کہ طے تھا بعد میں شائستہ کے شوہر نے کہہ دیا کہ وہ اسپتال نہیں گئی کہنے لگی کہ مجھے میرے گھر پہنچا دوں اور میں نے ایک جگہ ڈراپ کر دیا۔ مجھے کیا معلوم وہ کہاں رہتی تھی۔ ظاہر ہے قیدی نمبر دو کے فرار کی خبر بھی سلطان کو دی گئی ہوگی۔ وہ پہلے سے لندن پرواز کرنے کے لیے تیار تھا۔ ایک ہفتے بعد وہ اچانک نازل ہوگیا۔ اس مرتبہ وہ بالکل مختلف موڈ میں تھا۔ میری توقعات کے برعکس اس نے نہ غصہ دکھایا اور کوئی دھمکی دی۔ اس نے مجھے پکڑ لیا۔ اس نے کہا کہ اب وہ میرے ساتھ زبردستی کرنا نہیں چاہتا کیونکہ اسے نازنین سے واقعی محبت ہوگئی ہے اور یہ ماضی کی ہر محبت سے مختلف ہے۔ اب وہ نازنین سے شادی کر کے صرف اس کا ہو کے رہنا چاہتا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ نازنین راضی نہیں اب اس کے راضی نہ ہونے کی سب سے بڑی وجہ ہو تم۔ اسے معلوم ہوگیا کہ میں نے تمہیں بھی منگنی کر کے پابند کر رکھا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ ایسے ہی تم مجھے قید کر لو گے اور کسی تیسری کے چکر میں پڑ جاؤ گے۔ تیسری کے بعد چوتھی آ جائے گی۔ تمہاری ہوس کی کوئی انتہا نہیں اور تم ایک نفسیاتی مریض بن چکے ہو۔ سلطان نے مجھ سے کہا کہ اگر نازنین مان گئی تو وہ مجھے آزاد کر دے گا پھر میں جس سے چاہوں شادی کر دوں۔''

''اس نے میرا نام نہیں لیا؟'' میں نے پوچھا۔

''پہلی بار نہیں لیا تھا۔ بعد میں لیا۔ وہ کچھ دن ایسے ہی آتا جاتا رہا اور یہ ظاہر کرتا رہا کہ وہ نازنین کے پاس گیا تھا۔ وہ روپوش تھی مگر کسی کا سراغ لگانا اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہوسکتا۔ ایک دن اس نے کہا کہ نازنین نے ایک شرط رکھ دی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ فریال خود آ کے مجھے یقین دلا دے کہ تم نے اسے آزاد کر دیا ہے۔ منگنی ختم ہونے کے بعد وہ پاکستان جا کے رفیق سے شادی کر سکتی ہے۔

''گویا اسے سب علم تھا۔ ہمارے تعلق کا......''

''اس نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔ خود ہی کہا کہ وہ سب جانتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ ہم کب کہاں اور کیسے ملتے رہے تھے لیکن اب وہ خود ہی میرے معاملے سے دستبردار ہو رہا ہے تو اسے کیا کہ میں اپنا مستقبل کس سے وابستہ کرتی ہوں۔ اگر یہ محبت وہ مجھ سے کرتا تو میں کہتی کہ نازنین کو یہاں لے آؤ یا مجھے اس کا فون نمبر بتا دو۔ میں بات کر لیتی ہوں لیکن ہم باہر ایک جگہ لنچ کر رہے تھے جب اس نے یہ بات کہی۔ اس نے کہا کہ نازنین قریب ہی رہتی ہے۔ میں اس کے ساتھ جانے پر راضی ہوگئی۔ وہ جگہ قریب نہیں تھی۔ جب مجھے احساس ہوا کہ گاڑی مضافات کی طرف بڑھ رہی ہے تو میں نے احتجاج کیا پھر اس نے اپنا اصل روپ دکھایا۔ اس نے ریوالور نکال لیا اور مجھے گالیاں دینے لگا کہ اب مجھے نازنین کی مدد کرنے کا خمیازہ بھگتنا ہوگا اور اس جرم میں مدد کی سزا ڈاکٹر شائستہ اور اس کا شوہر بھی بھگتیں گے۔ وہ مجھے ایک کنٹری ہاؤس میں لے گیا جس کے گرد سارے مکانات دور دور تھے اور ہر مکان کے گرد وسیع احاطہ تھا۔ مت پوچھو وہاں میرے ساتھ کیا ہوا۔ اسے یاد کر کے اس وقت بھی مجھ پر خوف سے لرزہ طاری ہو رہا ہے۔''

میں نے اسے اپنے قریب کر لیا۔ ''بھول جاؤ اسے۔ یہاں تم محفوظ ہو۔'' فریال نے کہا۔ ''چلو باہر ٹہلتے ہیں۔ صبح ہونے میں کتنی دیر ہے؟''

میں نے انگلی سے اشارہ کیا۔ ''وہ دیکھو اسے صبح کا ستارہ کہتے ہیں۔''

ہم گاڑی سے نکلے تو میں نے محسوس کیا کہ باہر اچھی خاصی خنکی ہے۔ میں اس کے لیے اندر سے ایک چادر لے آیا جسے اس نے شال کی طرح پہن لیا۔ ہم آہستہ آہستہ گیٹ سے نکل آئے۔ وہ بیس فٹ اونچے محرابی دروازے میں رک کے پیچھے دیکھتی رہی۔ یہاں سے قدیم حویلی اس کے اجڑے باغ اور نوارے کا پورا منظر آخر میں بنے ہوئے سرونٹ کوارٹرز تک دکھائی دیتا تھا۔ وہ اس کی تاریخی روایات اور قدامت کے حسن سے مسحور سی نظر آ رہی تھی۔

میں اسے درویش کے مزار تک لے گیا۔ وہاں ہم چبوترے کی گرد صاف کیے بغیر ٹیک لگا کے بیٹھ گئے۔ ''کتنا عجیب لگتا ہے یہ سب۔ کہاں وہ لندن کا فلیٹ، کہاں یہ حویلی۔ کہاں وہ روشنیوں کا شہر، کہاں یہ ویرانہ۔''

میں نے کہا۔ ''وہ کرائے کا فلیٹ تھا۔ یہ سب تمہارا ہے۔''

وہ ہنس پڑی۔ ''میں اس کرائے کے فلیٹ میں ہوتی تو رات یوں تمہیں کئی بار اپنے ہاتھ سے کافی بنا کے پلاتی۔''

میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ ''میرا خیال ہے کافی بنا کے میں بھی لا سکتا ہوں مالکن۔ چیزیں تو سب ہی آ گئی ہیں۔ اندر جانا پڑے گا۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''میں بیٹھی ہوں یہاں، تم جاؤ۔''

میں نے کہا۔ ''ڈر نہیں لگے گا تمہیں۔''

''ڈرنا چاہیے زندہ انسانوں سے۔ مردے بیچارے کسی کو کیا کہتے ہیں۔''

میں نے اندر جا کے اسباب کے ذخیرے کو دیکھا تو مجھے

ہر چیز مل گئی۔ پانی میں نے ایک آئل اسٹو پر گرم کیا اور اس میں وہ ساشے ڈال دیے جن میں کافی کے ساتھ شوگر اور ملک بھی شامل کر دیا گیا تھا۔ مجھے فریال کی ہمت پر حیرانی تھی۔ انتہائی بزدل لڑکی تھی جو اب میرے آبائی قبرستان میں اکیلی بیٹھی تھی۔ اس کے ہر طرف سنسان جنگل تھا اور مکمل اندھیرا تھا لیکن وہ بڑے سکون سے بیٹھی ہوئی تھی۔ شاید گزشتہ چار سالوں کے ذہنی واعصابی دباؤ۔ شور ہنگامے اور اندیشوں سے معمور زندگی کے بعد اسے یہاں تحفظ کا یقین اور اطمینان حاصل ہوا تھا جس نے اسے پُراعتماد اور پُرسکون کر دیا تھا۔

میں گرم کافی کے دو مگ اٹھائے دس پندرہ منٹ بعد پھر وہیں پہنچا تو فریال کو موجود پا کے میرے دل کی ایک خلش اور ہوگئی جو ایک کوتاہی کے احساس نے پیدا کی تھی کہ مجھے اس کو یوں اکیلا نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔ جن بھوت یا خطرناک جانوروں کے علاوہ سب سے بڑا خطرہ خود سلطان تھا۔ جس سے پناہ کی سو فیصد ضمانت کہیں بھی اور کسی بھی وقت حاصل نہ تھی۔ یہ فرض نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ یہاں نہیں پہنچ سکتا۔

کافی کا مگ لیتے ہوئے وہ مسکرائی۔ ''تم آئی۔ ایس۔ او ISO9000 پر کوالیفائی کرتے ہو۔''

''کس اعتبار سے۔'' میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

''کسی بھی لڑکی کے لیے ایک آئیڈیل شوہر۔ میں آدمی نہیں کہہ رہی ہوں'' وہ ہنسی۔

''آف کورس۔ میں سمجھتا ہوں لیکن اب برا نہ مانو تو یہ بتا دو کہ پھر کیا ہوا۔''

''پھر؟'' اس نے ایک گھونٹ کافی پی کر خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ ہوا جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ ایک درندہ بن گیا۔ اس نے مجھے ریپ کرنے کی دیوانہ وار کوشش کی۔ اس نے مجھے بہت مارا۔ میرے سارے کپڑے تار تار کر کے پھینک دیے۔ وہ اچانک خاموش ہوگئی۔

میں نے کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد سوال کیا۔ ''اور ......کیا وہ جانور اپنے ارادے میں کامیاب ہوگیا۔''

فریال نے چہرہ میری طرف گھمایا اور کچھ دیر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھتی رہی۔ ''ہاں......''

میں نے اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ ''اس کے بارے میں سوچ کر شرمندہ ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔ میرے لیے تم وہی ہو۔ ویسی ہی ہو۔''

فریال نے مجھے دور دھکیل دیا۔ ''تم کیسے آدمی ہو۔ کس مٹی کے بنے ہوئے ہو۔ تمہیں غصہ تک نہیں آیا؟''

میں نے کہا۔ ''میں کبھی ناممکن کی توقع نہیں رکھتا۔''

''عقلی طور پر تمہارا رد یہ درست تھی۔ جذباتی طور پر صحیح نہیں ہے۔ میں اسے نارمل نہیں سمجھتی۔'' اس نے برہمی سے کہا۔

''تم سے محبت میں یقیناً میں نارمل نہیں رہتا۔'' میں نے اعتراف کیا۔

اس نے ایک گہری سانس لی اور اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا۔ ''ایسا کچھ نہیں ہوا رومی۔ میں نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ میں مر جاؤں گی یا مار دوں گی لیکن اس حیوان سے شکست قبول نہیں کروں گی۔ میں نے اس کا بھرپور مقابلہ کیا۔ نشے میں وہ پہلے ہی تھا۔ غصے میں بالکل ہی پاگل ہوگیا۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے مقابلہ کیا۔ اپنے ناخون استعمال کیے۔ اسے لاتیں ماریں۔ دانتوں سے کاٹا۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ وہ کیسا لڑا کا تھا۔ میں خود بھی جانور بن گئی تھی۔ ایک وحشی زخم خوردہ شیرنی سمجھ لو۔ وہ نر شیر کی طرح مجھ پر حاوی آ جانا چاہتا تھا۔ میں مغلوب ہونے کے لیے تیار نہ تھی۔ لباس اس کے جسم پر تھا نہ ہی میرے جسم پر۔ وہ چیخ رہا تھا اور دھاڑ رہا تھا اور گالیاں بک رہا تھا۔ میں غرا رہی تھی اور اسے برابر کی گالیاں دے رہی تھی۔ وہ کئی بار مجھے دبوچ کے بیڈ تک لے گیا۔ میں نے اسے دھکیل دیا۔ پیچھے گرا دیا یا خود اس کی گرفت سے نکل گئی۔ اس کے پُرہوس جذبات تو کب کے ذبح ہو چکے تھے۔ اب وہ میری عزت نہیں میری جان لینا چاہتا تھا۔ اس پر خون سوار ہوگیا تھا۔ وہ میرا گلا دبانا چاہتا تھا یا میرا سر پھاڑنا چاہتا تھا۔ وہ ریوالور سے مجھے شوٹ کر دیتا یا خنجر سے میرے ٹکڑے کر دیتا لیکن اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کا ریوالور گاڑی میں تھا اور گاڑی کافی فاصلے پر کھڑی تھی۔ اس کے چیخنے چلانے کی آواز باہر ڈرائیور تک نہیں پہنچ رہی تھی اور میں نے اسے موقع نہیں دیا کہ وہ دروازے تک بھی جا سکے۔ اب میں سوچتی ہوں کہ وہ سب کیسے ہوگیا؟ مجھ میں اتنی ہمت تو تھی لیکن طاقت کہاں سے آ گئی۔ میں نے ایسے درندہ صفت مرد کا مقابلہ کیسے کر لیا؟ اور یہ تائید غیبی سے ہوا۔ قدرت نے میری مدد کی۔ اور یہ مدد کیسے نہ حاصل ہوتی۔ اللہ ظالم کے ساتھ کیسے ہوتا۔ اس کا مظلوم کو طاقت دینا عین اس کے منصف ہونے کی دلیل ہے۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں کہ یہ جنگ کتنی لمبی تھی۔ کتنے منٹ چلی۔ میرے لیے تو وہ جنگ عظیم سے بھی طویل تر تھا۔ کئی بار اس نے مجھے اٹھا کے نیچے فرش پر پہنچا یا دیوار پر مارنا چاہا اور وہ ایسا نہ کر سکا۔ مجھے صرف ایک موقع ملا۔ میں نے اسے پوری قوت سے دھکا دیا اور وہ سنبھل نہ سکا۔ وہ دیوار کے قریب تھا۔ اس کا سر پہلے لگا۔ وہ چکرا کر

گرا۔ میں پلٹ کر دیکھے بغیر دروازے کی طرف بھاگی۔ میں نے اوپر نیچے کی چٹخنی کھولی اور باہر نکل گئی۔ اس وقت تک وہ سنبھل کے اٹھ گیا تھا۔ وہ میرے پیچھے لپکا۔ میں نے دروازے کو باہر سے بند کیا تو اس کا ایک ہاتھ بیچ میں آگیا مگر میں نے پروانہ کی۔ میں نے باہر سے کنڈی لگائی اور پھر بھاگی۔ گھر کے اندر کا نقشہ میرا دیکھا ہوا نہیں تھا۔ مجھے اس بات کا احساس تھا اور نہ ہی پروا تھی کہ میرے جسم پر کچھ نہیں ہے۔ میں اس حالت میں باہر نکل جاتی اور سڑک پر دوڑتی ہوئی قریب ترین گھر میں پہنچ جاتی۔ مگر جو دروازہ سامنے آیا اس نے مجھے ایک لاؤنج میں پہنچادیا۔ وہاں مجھے سب دروازے بند ملے۔ سلطان نہ جانے کس طرح اور کس طرف سے نکل آیا تھا اور میں اس کی وحشیانہ آواز میں سن سکتی تھی۔ میں اس دروازے سے نکلی جو مجھے کھلا ہوا ملا۔ یہ ایک زینے کا دروازہ تھا۔ میں اوپر کی طرف بھاگی۔ میں فیصلہ کر چکی تھی کہ اوپر سے کود جاؤں گی لیکن گھومتا ہوا زینہ ایک بند دروازے پر ختم ہوگیا۔ معلوم نہیں اس کے اوپر کیا تھا۔ وہاں اندھیرا بھی تھا اور گھٹن بھی۔ میں سلطان کی فحش گالیاں تو سن رہی تھی۔ وہ میرے پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ اس کے اور میرے درمیان چند فٹ کا فرق تھا۔ اس کا ایک فائدہ ہوا۔ میری نظر اس کے آنے تک اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوچکی تھی۔ میں نے دیکھا کہ اوپر جانے والے راستے کے دروازے میں تالا پڑا ہوا ہے۔ وہ خاصا بڑا تھا اور ظاہر ہے میرے پاس ہتھوڑا ہوتا تب بھی میں اسے توڑ نہیں سکتی لیکن میں پھر کہتی ہوں کہ قدرت کو بچانا منظور تھا۔ ورنہ شاید اس وقت میں تمہارے سامنے یہ سب کہنے کے لیے موجود نہ ہوتی۔"

میں نے اس کا چہرہ اپنی طرف کیا۔ "کیوں؟ تم کہاں ہوتیں؟"

اس نے میرا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ "میں مرجاتی رومیو۔ وہیں جان دے دیتی۔ خودکشی کرلیتی۔"

"تم پاگل ہو فری۔ ایسا تم کیسے سوچ سکتی ہو۔"

اس نے کہا۔ "بس ...... کچھ بھی سمجھ لو۔ میں تمہارے لائق نہ رہتی تو پھر جی کے کیا کرتی۔ اس وقت بالکل غیر ارادی اور اضطراری کیفیت میں جب میں نے تالے کو پکڑ کے زور سے ہلایا۔ تو پتا نہیں کیا ہوا۔ تالا کھل گیا اور میرے ہاتھ میں آگیا۔ شاید تالا پہلے ٹھیک سے بند نہیں ہوا تھا یا پرانا ہونے کی وجہ سے اس کے انجر پنجر ڈھیلے ہوگئے تھے۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ میں کنڈی کھول کے اوپر جاتی۔ اور اوپر جا کے بھی کیا ہوتا۔ میں پھر کہیں ٹریپ ہوجاتی۔ پیچھے سے سلطان کسی دیوانے ریچھ کی طرح خرخر کرتا اوپر آرہا تھا۔ اسے تو کچھ دکھائی نہ دیا۔ میں نے تاک کے اور نشانہ لے کر تالا اس کے سر پر کھینچ مارا۔ ظاہر ہے وہ اس کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ وہ چکرایا اور پلٹ کے گرا تو لڑھکتا ہوا پیچھے گیا۔ میں نے اسے فرسٹ فلور کے موڑ تک گرتے سنا۔ وہ کراہ رہا تھا اور سخت اذیت میں تھا پھر اس کی آواز خاموش ہوگئی تو میں نیچے اتری۔ ایک ایک زینہ احتیاط کے ساتھ۔ ڈرتی ہوئی اور جوابی حملے کے لیے پوری طرح چوکس۔ وہ مجھے بے حس و حرکت پڑا نظر آیا۔ میں نے سوچا کہ کاش وہ مر گیا ہو مگر مجھے یہ ڈر بھی لگا کہ کہیں وہ مکر نہ کر رہا ہو اور جب میں اس کے قریب جاؤں تو وہ ایک دم اٹھ کے مجھے پھر دبوچ لے مگر ایسا نہیں ہوا۔ میں اسے پھلانگ کے نکل گئی اور نیچے چلی گئی۔ معلوم نہیں وہ گھر کس کا تھا۔ میرے اپنے کپڑے تو پہننے کے لائق نہیں رہے تھے۔ تلاش کرنے پر مجھے ایک باتھ روم سے اسکرٹ مل گیا جو سائز میں کچھ بڑا تھا۔ نیچے میں نے ایک مردانہ نائٹ سوٹ کا پجامہ پہنا اور اوپر ایک چادر پہن کر باہر آگئی۔ کار کا ڈرائیور سو رہا تھا۔ میں نے قریب جا کے دیکھا تو پچھلی سیٹ پر سلطان کا بریف کیس بھی پڑا تھا اور ریوالور بھی رکھا ہوا تھا۔ میں ایک دم دروازہ کھول کے اندر بیٹھ گئی اور شوفر سے کہا کہ چلو۔ ورنہ میں گولی ماردوں گی۔ وہ انکار کرنے کی پوزیشن میں ہی نہیں رہا تھا۔ ایک ویران جگہ پر گاڑی رکوا کے سامنے اسے اترنے کے لیے کہا اور حکم دیا کہ ناک کی سیدھ میں دیکھتا ہوا چلنا شروع کردے اگر اس نے ایک بار بھی پلٹ کے دیکھا تو گولی اس کی پیشانی میں سوراخ کردے گی۔ میں نے اسے بتادیا کہ کسی خوش فہمی میں نہ رہے۔ میرا نشانہ بہت اچھا ہے۔ ٹارگٹ شوٹنگ کی بہت سی ٹرافیاں ہیں میرے پاس۔ اس نے اپنی جان بچائی اور حکم عدولی کی حماقت نہیں کی۔ جب وہ سو قدم دور چلا گیا تو میں نے گاڑی کو ریس دی اور بھاگی۔ شوفر کے پاس بھی ریوالور تھا۔ اس نے پلٹ کے فائر کیا مگر اس وقت تک میں موڑ کاٹ چکی تھی۔ اس وقت تک میرے اعصاب قابو میں تھے۔ میں نے شائستہ کو فون کر کے بلایا اور وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئی۔ میں ٹراما میں تھی۔ اس نے مجھے نفسیاتی اور جسمانی صدمے کی کیفیت سے بچانے کے لیے چوبیس گھنٹے SEDATION میں رکھا نارمل ہونے کے بعد میں نے اسے بتایا کہ میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ میں پولیس سے رپورٹ کروں لیکن اس سے میں مزید مشکلات میں پڑجاتی۔ میرے پاس نہ سلطان کے خلاف کوئی

ثبوت تھا نہ گواہ مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ لندن میں کہاں ہے اور کس نام سے برطانیہ میں مقیم ہے۔ بے شک میں پولیس کو اس گھر تک لے جاسکتی تھی جہاں سلطان نے مجھے ریپ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس گاڑی کا نمبر دے سکتی تھی جو مجھے اغوا کر کے لے جانے میں استعمال ہوئی اور ان تمام اسباب کی نشاندہی کرسکتی تھی جو ان واقعات کے پس منظر میں تھے لیکن اس سے مجھے کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ میرا چار سالہ کورس اور لندن میں میرے قیام کی مدت ختم ہورہی تھی اور مجھے لوٹ کے پاکستان جانا تھا۔ یہاں میں قانونی مشکلات کا شکار ہوتی تو پاکستان میں غیر قانونی مشکلات کا۔ تاہم میں نے شائستہ کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی حفاظت کے خیال سے غافل نہ ہو۔ اس نے پولیس حکام سے رابطہ کیا کہ اسے سکیورٹی فراہم کی جائے کیونکہ وہ کچھ نامعلوم لوگوں کی طرف سے خطرہ محسوس کرتی ہے جو اسے جان سے مارنے کی دھمکیاں دیتے ہیں۔ اسے نہیں معلوم کہ وہ کون لوگ ہیں اور ایسا کیوں کرتے ہیں۔ وہ برطانوی شہری تھی اسے پوری سکیورٹی مل گئی۔ باقی انتظامات اس نے خود کیے، جس میں کلوز سرکٹ ٹی وی کیمرا۔ خودکار الارم اور الیکٹرانکس SURVEILLANCE جیسے انتظامات شامل تھے۔ اس نے ایک مسلح سکیورٹی گارڈ رکھ لیا جو ہر جگہ ساتھ جاتا تھا۔

"میں سلطان کی طرف سے اگلے قدم کی منتظر تھی۔ یہ معلوم نہیں ہورہا تھا کہ وہ زندہ ہے یا نہیں۔ اس کے بریف کیس میں سے مجھے چوبیس ہزار پونڈ اور گیارہ ہزار ڈالر ملے تھے۔ وہ بریف کیس صرف نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ ظاہر ہے غیر قانونی روپوشی میں اسے رقم اپنے ساتھ رکھنی پڑتی تھی۔ اس میں سلطان کا کوئی پاسپورٹ نہیں تھا اور نہ کوئی سراغ دینے والی دستاویز تھی۔ سیٹ پر ریوالور کے علاوہ ایک سیٹ لائٹ فون ریسیور بھی تھا۔ یہ دونوں چیزیں میں ساتھ لے آئی تھی۔ تیسرے دن مجھے سلطان کی فون کال موصول ہوئی۔ وہ ڈھیٹ اور بے غیرت شخص زندہ تھا۔ میں نے اسے ہیلو نہیں کہا تھا مگر ظاہر ہے اس فون پر میرے سوا کون کال ریسیو کرسکتا تھا۔ وہ براہِ راست مجھے مخاطب کر کے کہنے لگا کہ فریال۔ میں اب بھی تمہیں معاف کرنے کے لیے تیار ہوں۔ میرے حق میں یہی بہتر ہے کہ میں خود کو اس کے حوالے کردوں۔ اس سے شادی کے بعد مجھے تحفظ بھی حاصل ہوگا اور ایک باعزت زندگی بھی ملے گی ورنہ میں کہیں بھی رہوں میرا اور مجھے پناہ یا سہارا دینے والوں کا حشر خراب ہوگا کیونکہ اس کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ میں نے بہت ضبط سے کام لیا اور خاموش رہی حالانکہ میری شدید خواہش تھی کہ میں بھی جواب میں اسے کہہ دوں کہ نامرد کی اولاد۔ آج تک تو میرا کچھ بگاڑ نہیں سکا۔ آیندہ کے لیے بھی سن لے کہ میں نے تجھے کتے کی موت نہ مارا تو میرا بھی نام فریال نہیں لیکن میں نے منہ بند رکھا۔ اور بالآخر فون بند کردیا کیونکہ اس کی بکواس ختم ہونے میں نہیں آرہی تھی۔ اس کے بعد وقفے وقفے سے وہ اس طرح مجھے فون پر ڈراتا دھمکاتا رہا۔ تیسرے دن میں نے وہ گاڑی شائستہ کے گھر کے باہر دیکھ لی جس میں وہ مجھے اغوا کر کے لے گیا تھا۔ شائستہ نے پولیس کو مطلع کیا اور پولیس نے اس گاڑی کو پکڑ لیا لیکن وہ رینٹ اے کار ایجنسی کی گاڑی ثابت ہوئی۔ پولیس نے اس کے ڈرائیور کو پوچھ گچھ کے بعد چھوڑ دیا۔

"اس کے بعد میں نے سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا کہ مجھے فرار ہو کے تمہارے پاس پہنچ جانا چاہیے۔ میں نے اپنے کچھ رابطے استعمال کیے۔ لندن انسٹی ٹیوٹ آف آرٹ اینڈ کرافٹ سے میں نے چار سال کا کورس کیا تھا۔ وہاں دنیا بھر کے طلبہ تھے جو فیشن ڈیزائننگ سے انٹیریئر ڈیکوریشن تک ہر طرح کے کورس کررہے تھے۔ میرے علم میں افریقی ممالک کے کچھ ایسے لوگ تھے جن کے اپنے ملک سے باہر بھی انڈر ورلڈ میں کنکشن تھے۔ بظاہر وہ سب عام سے لوگ تھے اور میرے پاس سنی سنائی باتوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ تاہم میں نے ایک ساؤتھ انڈین لڑکی سے رابطہ کیا تو اس نے مجھے کینیا کے ایک سیاہ فام کا نمبر دیا۔ اس نے کہا کہ دس ہزار پونڈ میں میرے برطانیہ سے کینیا اور وہاں سے پاکستان جانے کا یقینی بندوبست کیا جاسکتا ہے جس کا کسی کو بھی پتا نہیں چلے گا۔ مالِ مفت دلِ بے رحم۔ میں نے سلطان سے ملنے والے دس ہزار پونڈ اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ اسے منہ مانگی رقم مل گئی اور میرا کام ہوگیا بعد میں اس انڈین لڑکی نے مجھے بہت ڈانٹا کہ یہ کیا بے وقوفی کی۔ تمہارا کام پانچ ہزار پونڈ سے کم میں ہوجاتا۔

"میرے پاسپورٹ پر ویزا لگ گیا۔ مجھے کراچی براستہ نیروبی کا ٹکٹ مل گیا اور میں لندن سے ایسے نکل آئی کہ سلطان کے فرشتوں کو خبر نہ ہوئی۔ اسے خیال ضرور آیا ہوگا کہ میں لندن سے پاکستان نہ چلی جاؤں۔ اس کے کارندے کراچی، اسلام آباد اور دبئی کی فلائٹس دیکھ رہے ہوں گے۔ ممکن ہے یورپ کے دوسرے شہروں سے پاکستان جانے والی فلائٹس پر بھی ان کی نظر ہو لیکن کینیا کی ایئر لائن کی طرف ان کا دھیان نہیں جاسکتا تھا۔"

میں نے اس کی پیٹھ تھپکی۔ ''شاباش ہے بی لومڑی۔ تم نے تو واقعی کمال کر دیا۔ شیر کو نکیل ڈال دی۔''

''لیکن سوال یہ ہے رفیق صاحب کہ اب کیا ہوگا۔ یہی سوچ سوچ کے میرے دل میں ہول اٹھتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''پہلے تم اکیلی تھیں۔ اب میں ہوں نا تمہارے ساتھ مرنے کے لیے تیار۔ پھر ڈرنا کیسا۔''

آسمان پر صبح صادق کی سفیدی رفتہ رفتہ اجالے میں ڈھلنے لگی تھی۔ صبح کے ستارے کا سفر تمام ہونے کو تھا۔ آشیانوں میں طیور انگڑائیاں لے کر بیدار ہونے کی تیاری کر رہے تھے۔ اچانک مجھے اپنے پیچھے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے پلٹ کے دیکھا تو ریشماں۔ یہ اڑی اڑی سی رنگت یہ کھلے کھلے سے گیسو...... کی تفسیر بنی کھڑی تھی اور اس کی صبح اس کی رات کا سارا افسانہ کہہ رہی تھی۔

فریال اس کے اچانک نمودار ہونے سے چونک پڑی تھی اور کچھ گھبرا بھی گئی تھی۔ ''تم...... تم یہاں کیا کر رہی ہو۔ اس وقت......''

میں نے سمجھ لیا تھا کہ وہ اپنے حجلۂ عروسی سے برآمد ہوئی ہے ہم یہاں اپنی باتوں میں مصروف تھے۔ وہ شاید منتظر تھی کہ ہم اٹھ کے جائیں تو وہ بھی اپنی محبت کی پناہ گاہ سے نکلے۔ اب صبح ہونے کو تھی۔ وہ کب تک انتظار کرتی۔ کچھ دیر میں اس کے گھر والے جاگ اٹھتے تو وہ کیا بتاتی کہ کہاں سے آ رہی ہے۔ اجالا پھیلنے سے قبل ہی وہ اپنے بستر پر جا کے لیٹ جانا چاہتی ہوگی۔

میں نے کہا۔ ''ریشماں! کچھ کہنا چاہتی ہو؟''

اس نے خواب آلود نظروں سے مجھے دیکھا اور جماہی لے کر مسکرائی۔ ''مالک وہ آپ سے کچھ بات کرنا چاہتی ہے۔''

میں نے سر ہلایا۔ ''ضرور کرے۔ کس نے روکا ہے اسے۔ کہاں ہے وہ، بلاؤ۔''

''وہ یعنی، وہ کچھ دیر بعد آئے گا جی۔'' اور پھر جنگلی ہرنی کی طرح چوکڑیاں بوتی ہوئی دھند لکے میں غائب ہوگئی۔

''یہ لڑکی ایسے کیوں آئی تھی۔'' فریال نے کہا ''چپکے چپکے۔''

میں نے کہا۔ ''وہ کہیں سے نہیں آئی تھی۔ یہیں تھی۔ آؤ میں بتاتا ہوں۔''

اندر آتے آتے میں نے فریال کو ریشماں کی اسٹوری سنائی جو۔ بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق۔ کی عملی تفسیر تھی۔

''جس دن یہ پکڑی گئی رنگے ہاتھ اس دن کیا ہوگا۔'' فریال نے کہا۔

''میرا خیال ہے کچھ نہیں ہوگا۔ باپ کو تو فکر ہے نہیں۔ ماں اس کا ہاتھ تھما دے گی چاہنے والے کے ہاتھ میں۔ لڑکا ٹرک چلاتا ہے۔ اسے کما کے کھلا سکتا ہے۔ محبت کوئی کوالی فیکیشن نہیں ہوتی، کمائی ہوتی ہے۔''

فریال نے کہا۔ ''یا غیرت میں قتل ہو جائے گی۔ یہ بھی تو ہوتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''مگر ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔''

اس وقت صبح کے پونے پانچ بجے تھے۔ فریال کو بالکل نیند نہیں آ رہی تھی مگر میری آنکھیں بوجھل ہو کے بند ہونے لگی تھیں۔ میں نیچے ہی سو گیا اور پھر اٹھا تو نو بج رہے تھے۔ چار گھنٹے کی نیند نے مجھے چارج کر دیا تھا۔ میں کبھی زیادہ سونے کا عادی نہیں تھا۔ عام حالات میں چھ سات گھنٹے بعد اٹھ جاتا تھا ورنہ ایک دو گھنٹے کی نیند بھی کافی ہوتی تھی۔

ناشتے سے فراغت ہوئی تو ہم سب نے مجموعی صورت حال کا جائزہ لیا میں نے کہا۔ ''ویسے تو کسی سے کوئی بھی بات چھپی نہیں رہی۔ جب مجھے والدین نے طلب کیا تھا تو خود مجھ پر اپنے مستقبل کے عزائم واضح نہیں تھے۔ میں سمجھتا تھا کہ میرا فیوچر لندن یا امریکا میں ہے اور جو تعلیم میں نے حاصل کی ہے اس کا یہاں کوئی مصرف نہیں۔ میرا خیال تھا کہ میں اس جاگیر وغیرہ کے چکر میں نہیں پڑوں گا اور اپنے والدین کو قائل کرلوں گا کہ وہ مجھے کامیابی کے اس راستے پر چلنے دیں جو انہوں نے ہی میرے لیے منتخب کیا تھا اور جس پر میں بڑی سعادت مندی خوشی اور مستقل مزاجی کے ساتھ گامزن ہوں۔''

''ہم اسے مان لیتے ہیں'' راجا بولا۔ ''کبھی کبھار آدمی کے قدم صراط مستقیم سے ادھر ادھر بھٹک جائیں تو چلتا ہے۔''

میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''یہاں آ کے میرے خیالات میں جو تبدیلی آئی۔ وہ بڑی غیر متوقع تھی۔ لیکن اب یہ طے ہے کہ میں یہاں رہوں گا اور ایک پلان پر عمل کروں گا جو میرے ذہن میں ہے۔ اور سب جانتے ہیں۔ مجھے اندازہ ہے کہ یہ کوئی آسان کام نہیں ہوگا۔ اس کے لیے بہت کچھ چاہیے۔ سرمایہ، ہمت، وقت اور وسائل۔ میں بتا چکا ہوں کہ یہ کام میں اکیلا نہیں کر سکتا۔''

''تو اکیلا نہیں ہے فیکے پتر! راجا نے میرے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا۔

میں نے کہا۔ ''راجا۔ تو میرے لیے اپنے مستقبل کا

راستہ بدل سکتا ہے!''

''ہمارا راستہ تو ایک ہی رہا ہے یار!'' راجا نے کہا۔

''تو یہاں رہے گا میرے ساتھ۔ سب چھوڑ دے گا؟ امانت کو اور اپنے مشن کو یا ان تمام خطرات کے باوجود جو تیری نظر بھی دیکھ سکتی ہے۔''

راجا نے چڑ کے کہا۔ ''ابے کیا اسٹامپ پیپر لکھ دوں؟ حلف نامہ دوں؟''

میں نے کہا'' برا مت مان مہاراجا...... میں کبھی اس اعتماد کی کمی سے کمزور پڑنے لگتا ہوں تو مجھے کچھ REASSURANCE کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ فرخ! تم نے کیا سوچا ہے؟''

وہ بولا۔ ''سوچنے سے تو کچھ نہیں ہوتا۔ کرنے سے ہوتا ہے اور میں نے آپ کا ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ یہ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔''

''اگر قسمت نے ساتھ دیا تو ہم سب ایک شاندار مستقبل کے شریک سفر ہوں گے لیکن حالات ہماری توقعات کے برعکس بھی ہو سکتے ہیں۔''

وہ مسکرایا۔ ''میں گلہ نہیں کروں گا۔ اور آپ کو الزام نہیں دوں گا۔''

''کل تم نے کسی بلڈنگ کنٹریکٹر سے بات کی تھی۔ وہ آیا کیوں نہیں۔''

فرخ نے کہا۔ ''ابھی وہ سو کے اٹھا ہوگا۔ پہنچ جائے گا دوپہر تک۔''

میں نے کہا۔ ''میں تم کو RENOVATION کے پراجیکٹ کا ڈائریکٹر جنرل مقرر کرتا ہوں۔ اس سے تم ہی ڈیل کرو گے۔''

وہ کچھ اپ سیٹ ہوا۔ ''مجھے بتا دیں کام کیا کرانے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''دیکھو، اس جگہ کو انسانوں کے رہنے کے لائق بنانا ہے۔ یہاں ابھی کچھ بھی نہیں ہے۔ نہ بجلی نہ سیوریج کا نظام اور باتھ روم کی فٹنگ، واٹر سپلائی، رنگ روغن اور مرمت سب کی ضرورت ہے۔ پہلے نیچے والی منزل کا سارا کام ہو جائے۔ اس کے بعد یہاں ان تمام چیزوں کی ضرورت ہوگی جو شہر کی کسی بھی کوٹھی میں ہوتی ہیں۔ ایئر کنڈیشننگ، فرج اور ڈیپ فریزر، ٹی وی اور چھت پر سیٹ لائٹ ریسیور کے لیے ڈش سسٹم، کچن اپلائنسز وغیرہ۔''

فرخ نے سر ہلایا۔ ''میں سمجھ گیا۔ اب آپ یہ سارے معاملات مجھ پر چھوڑ دیں لیکن دیکھتے رہیں اور جہاں کمی بیشی ہو مجھے بتا دیں۔''

''مس فریال، تمہاری ذمے داریاں ایک ہاؤس وائف کی ہیں۔''

فریال نے کہا۔ ''اس کے لیے مجھے لیٹر آف اپائنٹمنٹ چاہیے۔ جسے مقامی لوگ نکاح نامہ بھی کہتے ہیں۔ فی الحال میں وائف ہی نہیں تو ہاؤس وائف کی ڈیوٹی کیسے دے سکتی ہوں۔''

راجا نے کہا'' OBJECTION UPHELD۔''

میں نے کہا'' اوکے، عہدہ تبدیل کیا جاتا ہے۔ تم ہاؤس کیپر۔ ہاؤس میڈ۔ کہلانا پسند کرو گی یا وزیر داخلہ۔ امور خانہ داری تمہارے سپرد ہیں۔ فاطمہ اور اس کی بیٹی ریشماں کو میں نے پہلے ہی تمہاری مدد کے لیے رکھ لیا ہے۔ سارے کام وہ کریں گی۔ تم نگرانی کرو گی۔ اس کے علاوہ تمہیں دو اہم ذمے داریاں دی جا رہی ہیں۔ ایک تو تم فرخ کو بتاؤ گی کہ گھر کو گھر بنانے کے لیے تمہیں کیا کچھ چاہیے۔ دوسرے تم کو فیصلہ کرنا ہے کہ اس حویلی میں جو قدیم فرنیچر ہے یا قالین اور پردے ہیں۔ کیا ان سب کو بدلنا ضروری ہے۔ ہم ایک پرانی تاریخی روایات رکھنے والی حویلی کے ماحول میں رہ سکتے ہیں۔ اس کا اپنا طلسم ہے۔ یا ہمیں اسے جدید انداز میں فرنش کرنا چاہیے۔''

''میرا خیال ہے کہ کوئی بھی اس کے حق میں نہیں ہوگا۔ قدامت کا حسن تو ایک انمول ورثہ ہے۔ اس کی حفاظت کی جانی چاہیے۔'' فریال نے کہا۔

''نو سر! ہم حویلی کا ماحول کیسے بدل سکتے ہیں؟'' راجا نے کہا۔

میں نے کہا۔ ''دراصل کچھ چیزیں بہت پرانی اور ناقابل استعمال ہوں گی مثلاً پردے جن کا رنگ ہی اڑ گیا ہے۔ یا قالین جو بالکل گھس چکے ہیں۔''

فریال نے کہا۔ ''وہ میں کرلوں گی۔ تم مجھے مت سمجھاؤ۔ تم اپنا کام کرو۔''

''راجا میرے ساتھ رہے گا۔ ہم ذرا جاگیر کے معاملات کو درست کرتے ہیں معاملات خاصے بگڑے ہوئے ہیں۔ کچھ سمجھ نہیں آتا کہ کہاں سے شروع کریں۔''

راجا نے کہا۔ ''ہم اکبر علی خاں سے شروع کر سکتے ہیں۔''

''یو آر رائٹ! خرابی اکبر خاں سے شروع ہو کے اکبر خاں پر ختم ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ ملے

گا کہاں؟"

فرخ نے کہا۔ "اگر آپ کو اس علاقے میں پھرنا ہے تو آپ جیپ استعمال کریں۔"

میں نے کہا۔ "تم شہر آنے جانے کے لیے کار اپنے پاس رکھو۔ آج جب وہ بلڈنگ کنٹریکٹر آئے تو پہلے اس سے ایک کام کرالو۔ تار تم کل ہی لے آئے تھے۔ اس سے کہو کہ جیسے بھی ہو بجلی کے کھمبے سے یہاں تک کنکشن فراہم کردے۔ جنریٹر سے گزارہ تو ہو گیا تھا مگر سارے کام نہیں ہو سکتے۔"

"پول سے ڈائریکٹ کنکشن۔ یعنی کنڈا؟ میٹر کے بغیر......؟" راجا نے کہا۔ "دیکھو اگر وہ بلڈنگ کنٹریکٹر ہے تو اس کے لیے کوئی کام مشکل کام نہیں۔ میٹر کیا ٹرانسفارمر بھی لگوا دے گا۔"

میں نے کہا۔ "بے شک یہ غیر قانونی ہے لیکن کھمبے ہماری زمین کی حدود میں نصب ہیں۔ قانونی اعتراض کرنے والا بھی یہاں ہماری اجازت کے بغیر آئے گا تو خود قانون شکنی کا مرتکب ہوگا۔ ہو گا یا نہیں؟"

راجا نے بے تکلفی سے فرخ کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "خود میں اعتماد پیدا کرو برخوردار۔ تم کوئی عام آدمی نہیں۔ ہز ہائی نس نواب رفیق احمد شیرازی آف ست بدھائی اسٹیٹ کے معتمد خاص ہو۔ تمہیں قانون سے نہیں قانون کو تم سے ڈرنا چاہیے۔ خود کو عوام مت سمجھو۔ تم خاص میں شامل ہو بلکہ وی آئی پی ہو۔"

"آپ نے ٹھیک کہا راجا صاحب!" فرخ نے کہا۔

راجا نے قہقہہ مارا۔ "راجا صاحب! یار، تم کیا میری رعایا ہو کہ مجھے راجا صاحب کہو۔ بس راجا کافی ہے۔ مجھے ایک بات بتاؤ فرخ۔ قانون کس کے لیے بنایا جاتا ہے، قانون کمزور کی حفاظت کے لیے بنایا جاتا ہے چنانچہ پاکستان میں جو کمزور نہیں ہے اس کے لیے قانون کوئی چیز نہیں ہے۔"

فریال نے کہا۔ "مگر یہ صحیح رویہ تو نہیں ہے۔"

راجا نے اپنی بات جاری رکھی۔ "فریال بی بی۔ یہ قانون قدرت ہے۔ بقا کمزور کے لیے نہیں ہے خواہ وہ انسان ہو یا حیوان۔ آج کمزور افراد اور اقوام کے لیے جینا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ خصوصاً پاکستان میں جہاں کمزور کی حفاظت قانون بھی نہیں کرتا۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ خود کو کمزور مت سمجھو۔ طاقت حاصل کرو جیسے بھی حاصل ہو اور استعمال کرو۔ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔"

فرخ کے لیے اس منطق سے اختلاف یا اتفاق کرنا مشکل ثابت ہو رہا تھا چنانچہ وہ کام کا بہانہ کر کے بھاگ گیا۔ "میں ذرا وہ تار وغیرہ نکال لوں ٹھیکے دار کے آنے سے پہلے۔"

راجا نے کہا۔ "جذباتی نوجوان ہے۔ غیر عملی سوچ رکھتا ہے۔" میں نے کہا۔ "تو اس کے ذہن کو کنفیوز مت کرا پنے نظریات سے۔"

"یار، میں تو اسے کامیابی سے جینے کے گر سکھا رہا تھا۔"

میں نے کہا۔ "راجا آخر ہمارے سیٹلائٹ فون کب تک ایکٹی ویٹ ہوں گے۔ فون نہ ہونے کی وجہ سے ہم ساری دنیا سے کٹے ہوئے ہیں۔"

"کمپنی نے کہا تھا کہ چوبیس گھنٹے کے اندر۔ انشا اللہ آج کسی بھی وقت ہم کنکٹ ہو جائیں گے۔"

فریال نے کہا۔ "میرے پاس ایک فون ہے اگر تم استعمال کرنا چاہو۔"

"وہی سلطان کا؟" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس میں رسک ہے۔ انٹرنیشنل سیٹ لائٹ فون کی کال ٹریس ہو جاتی ہے۔ یہ پتا چل جاتا ہے کہ کہاں سے کی گئی ہے۔ ملک اور شہر تو کیا اس مقام کی بالکل صحیح نشاندہی ہو جاتی ہے جہاں فون موجود ہو۔ کیا اس نے تمہیں پھر کال کی" میں نے پوچھا۔

"پتا نہیں۔ میں نے فون آف کر دیا ہے۔" فریال بولی۔

"ٹھیک ہے، آف ہی رہنے دو۔ اس کے لیے ہم دوسری سم لے لیں گے۔ کیا تمہارے سامان میں بدلنے کے لیے کپڑے نہیں ہیں؟"

"روفی! میں کسی پلان کے بغیر آئی ہوں۔ جان بچا کے بڑی مشکل سے نکلی تھی ورنہ گھر کا سارا سامان سمیٹ لاتی۔" اس نے ترشی سے کہا۔

"دراصل تمہارے یہ کپڑے۔"

"مجھے معلوم ہے کہ یہ انتہائی نامناسب ہیں اس ماحول میں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تم اس ویرانے میں بیٹھے ہو جہاں کچھ بھی نہیں ملتا۔" وہ مزید خفا ہوئی۔

میں نے کہا۔ "یار! اتنی پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ ویسے تو یہاں لاچار مسائل میں بیڈشیٹ ہی استعمال کی جا سکتی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ تم فی الحال ایک آدھ جوڑا ریشماں سے ادھار مانگ لو۔ مالکن کو زیب تو نہیں دیتا ملازمین کی اترن زیب تن فرمانا۔ لیکن مجبوری میں حرام بھی حلال ہے۔ جب تمہارے لیے شہر سے ملبوسات خریدے جائیں گے تو انہیں ایک کے بدلے دو قیمتی جوڑے بخش دینا۔"

"یہ ٹھیک ہے، ریشماں کی اور میری ساخت میں کوئی

فرق نہیں۔" فریال اٹھ کھڑی ہوئی۔ "آخر وہ ہیں کہاں؟"

"وہیں ہوں گی۔ سرونٹ کوارٹر میں اور کہاں۔"

"میں دیکھ کے آتی ہوں۔ ابھی تک تم نے مجھے حویلی بھی نہیں دکھائی۔ تجسس اور شوق سے میرا برا حال ہو رہا ہے۔"

میں نے اسے چابیوں کا ایک سیٹ تھما دیا۔ "ایسے دو سیٹ ہیں۔ اب فاطمہ یا ریشماں کے ساتھ تم خود جب چاہو حویلی دیکھو۔ فاطمہ سے کہو کہ اکبر خاں کو اوپر بھیج دے۔"

جب وہ چلی گئی تو میں نے راجا کو مختصر الفاظ میں وہ سب بتا دیا جو مجھے گزشتہ رات فریال سے معلوم ہوا تھا۔

"یہ تو بڑی تشویش کی بات ہے۔ راجا نے ساری بات سن کے کہا "یہ بات کب تک چھپی رہ سکتی ہے کہ فریال تیرے پاس پہنچ گئی ہے۔"

میں نے کہا۔ "اس نے مجھ سے بھی پوچھا تھا مگر میں نے انکار کر دیا تھا۔"

"وہ تیرے انکار سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔"

"مجھے اس کا بھی اندازہ ہے لیکن اب فریال سے نہیں اس کا مقابلہ مجھ سے ہوگا۔ فریال میری ذمے داری ہے اب۔"

"اس کا مقابلہ تو کیا جا سکتا ہے لیکن فیکے پتر! اس معاملے کا ایک اخلاقی پہلو بھی ہے۔ وہ یہاں کیسے رہے گی۔ اور جب یہ بات تیرے اماں ابا کو پتا چلے گی تو انہیں کیا جواب دے گا تو۔"

میں نے کہا۔ "اس مسئلے پر بھی غور کیا ہے میں نے۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ میں انہیں سچ بتا دوں۔ ان سے کہوں کہ ان حالات میں یہ میرے لیے ناممکن ہے کہ میں فریال کو اکیلا چھوڑ دوں۔"

"وہ فریال کو بالکل پسند نہیں کرتے لیکن وہ کہہ سکتے ہیں کہ اسے ہمارے پاس چھوڑ دو۔"

میں نے کہا۔ "یہ بہت آسان حل تھا لیکن فریال کے تعاقب میں کتنے خطرات ہیں۔ فریال کے ساتھ ہی ان خطرات کا ٹارگٹ میرا گھر بن جائے گا۔ فریال کی حفاظت میرے والدین کیسے کر سکتے ہیں۔ وہ خود مصیبت میں گرفتار ہو جائیں گے۔ میں جانتے بوجھتے انہیں خطرے میں کیسے دھکیل سکتا ہوں۔"

راجا نے کہا "یہ تو ٹھیک ہے۔"

میں نے کہا "میں انہیں کچھ بتا ہی نہیں سکتا۔ ان کی مجھ سے محبت کا انداز اور پیمانہ بالکل مختلف ہے۔ ان کے لیے صرف میں اہم ہوں۔ میری سلامتی اہم ہے۔ وہ فریال سے میری جذباتی وابستگی کو محسوس ہی نہیں کر سکتے تو سمجھیں گے کیسے۔ ان کا تو یہی مطالبہ ہوگا کہ میں فریال سے لاتعلق ہو جاؤں۔ وہ جانے اور سلطان جانے۔ کون سمجھا سکتا ہے انہیں۔"

"یار، اس کیس کا انجام کیا ہوگا۔ بلکہ اس جنگ میں جیت کس کی ہوگی؟ تیری اور فریال کی یا تیرے ماں باپ کی......؟"

"شاید بالآخر وہی انا کی قربانی دیں گے۔ ماں باپ بڑے مجبور لوگ ہوتے ہیں یار۔ خصوصاً اکلوتے بیٹے کے۔ میری سوچ کا یہ انداز بے رحمانہ حد تک خود غرضی پر مبنی ہے۔" میں نے ایک گہری سانس لی "لیکن یہ ابھی سے سوچ کے پریشان ہونے والا معاملہ نہیں ہے۔"

"فریال کے بارے میں اماں کی رائے مزید خراب ہو جائے گی اگر انہیں معلوم ہوا کہ وہ لندن سے آ کر سیدھی تیرے پاس رہنے چلی آئی ہے۔"

"میں جانتا ہوں لیکن جب تک ممکن ہوگا میں یہ بات ان سے چھپاؤں گا۔ فوری طور پر افشائے راز کا خطرہ کوئی نہیں۔"

"اس کا امکان کم ہے لیکن اچانک کسی کا نازل ہو جانا بالکل ناممکن بھی نہیں ہے۔ تو اسے کہیں اور نہیں رکھ سکتا۔"

"کہاں رکھوں؟ تیرے گھر میں یا شہناز کے پاس۔ سلطان فوراً سراغ لگائے گا اور اس کے ساتھ شہناز کو بھی لے جائے گا۔"

"کوئی ایسی جگہ بھی تو ہو سکتی ہے جہاں سلطان کے فرشتوں کا خیال بھی نہ جائے۔ کسی گمنام سے علاقے میں کوئی گھر۔ وہ کسی فیملی کے ساتھ پے انگ گیسٹ کے طور پر رہے۔ یا کسی کوٹھی کا ایک پورشن ہو۔"

میں نے کہا۔ "دیکھ یار! ہونے کو بہت کچھ ہو سکتا ہے لیکن مجھے تیری وہی اسکیم اپیل کرتی ہے۔"

اس نے سر کھجایا۔ "میں تو ایک سو ایک اور ایک سے ایک شاندار اسکیم کا خالق ہوں۔ پتا نہیں تو کس کی بات کر رہا ہے؟"

میں نے کہا۔ "مجھے ڈر ہے کہ سلطان کے کارندے یہاں بھی پہنچ جائیں گے، کسی دشواری کے بغیر۔ فریال کو ان سے چھپانے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ وہ انہیں یہاں دکھائی نہ دے۔"

"ویری گڈ! ایسا کوئی جادوئی عمل ہے۔"

میں نے کہا۔"ہم اس کی جنس بدل دیں گے۔"

راجا نے چٹکی بجائی۔"رائٹ...... فریال کے بجائے مسٹر فرہاد ہمارے ساتھ رہ سکتے ہیں، بے خوف و خطر۔ وہ پینٹ شرٹ کے مقابلے میں مردانہ شلوار قمیص پہنے گی تو بالکل پتا نہیں چلے گا لیکن ایک مسئلہ ہوگا آواز کا دوسرا بالوں کا۔"

"بالوں کی اسے قربانی دینی ہوگی۔ زلف بنگال ٹائپ بال ہیں۔ شولڈر تک دوبارہ آسانی سے ہو جائیں گے۔ ابھی وہ بوائے کٹ کرالے۔ آواز ممکن ہے کچھ دن مضحکہ خیز لگے مگر یہ کوئی انوکھی بات نہیں سمجھی جائے گی۔ بہت سے لوگوں کی زنانہ آواز ہوتی ہے۔ احتیاط اسے کرنی ہوگی گفتگو میں۔ آتی ہوں، جاتی ہوں سے آتا ہوں، جاتا ہوں وغیرہ بولنا ابتدا میں اس کے لیے مشکل ہوگا۔"

راجا ہنسا"یہ ڈبل رول نبھانا واقعی آسان نہیں ہوگا۔ دن میں مردانہ رول سب کے سامنے، رات کو ہمارے ساتھ زنانہ۔"

"لیکن بچاؤ کی یہی صورت سب سے بہتر ہے۔ جس میں مجھے کوئی رسک نظر نہیں آتا۔"

"فریال مان جائے گی؟"راجا سوچ کے بولا۔

"میں کہوں گا تو کیوں نہیں مانے گی۔ ہمیں یہاں سے کچھ لوگ بھرتی کرنے ہوں گے۔ مختلف کام کرنے والے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ فریال انٹیریر ڈیزائنر ہے، ڈیکوریٹر ہے۔ اسے فرخ کے ساتھ لگایا جا سکتا ہے تاکہ وہ حویلی کے اندر ہی رہے اور اس کا عام لوگوں سے رابطہ نہ ہو۔ اسے کوئی محنت طلب کام بھی نہ کرنا پڑے۔"

"یس' یہ آئیڈیا چلے گا۔ بلکہ دوڑے گا"راجا بولا۔

میں نے کہا"وہ ذہین اور محنتی لڑکی ہے اور حالات سے لڑنے کا جتنا حوصلہ رکھتی ہے۔ وہ شاید مجھ میں بھی نہیں ہے۔"

اسی وقت وہ خاتون نازل ہوئیں جن کی تعریف ہو رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے تو میری نظر دھوکا کھا گئی۔ خود راجا بھونچکا رہ گیا۔ وہ ریشماں سے مانگ کے کوئی جوڑا پہنے گئی تھی اور اب وہ ہمارے سامنے دلہنوں جیسا سرخ ریشمی غرارہ سوٹ پہنے کھڑی تھی۔

"ہیلو......"اس نے راجا کو اور مجھے متوجہ کرنے کے لیے ہاتھ ہلایا"مجھے پتا تھا تم لوگ دم بخود رہ جاؤ گے"اس نے ایک الماری کے قد آدم آئینے کے سامنے دائیں بائیں گھوم کے خود کو دیکھا اور ہنسی"بائی گاڈ! کتنی خوبصورت لگ رہی ہوں میں۔ کیوں رومیو!"

مجھے اور راجا کو ایک دم ہنسی آ گئی"یہ کیا پہن آئی ہو تم؟"

اس نے جز بز ہو کے کہا"اتنا خوبصورت ڈریس ہے۔ کمی کمی کرنے کی کون سی بات ہے راجا!"

راجا نے اپنی ہنسی روک لی"کس نے مشورہ دیا تھا تمہیں یہ دلہنوں والا لال جوڑا پہننے کے لیے۔"

وہ ڈانٹ کے بولی"ریشماں نے اور اس کی ماں نے۔ انہوں نے کہا کہ مجھ پر بہت اچھا لگے گا اور غلط تو نہیں کہا تھا۔"

"فریال! تم نکاح سے پہلے گھر سے بھاگ آنے والی دلہن لگ رہی ہو اور کپڑے نہیں تھے ریشماں کے پاس؟"

"تھے...... مگر جب انہوں نے اتنی محبت سے کہا تو میں کیا انکار کر دیتی؟"فریال خفا ہونے لگی۔

"یعنی اب تم اس مضحکہ خیز حلیے میں پھرو گی؟"میں نے کہا۔

وہ چڑ گئی"ہاں، پھروں گی۔ کسی کی پروا نہیں ہے مجھے۔ مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔"

فریال واک آؤٹ کرنے ہی والی تھی کہ کمرے میں میوزیکل رنگ ٹون گونجنے لگی۔ فریال بری طرح چونکی"میرا خیال تھا کہ فون آف ہے۔"

میں نے کہا"یہ سلطان والا سیل فون ہے۔"

فریال نے اقرار میں سر ہلایا"بجنے دو۔ خود ہی بند ہو جائے گا۔"

میں نے کہا"ایک منٹ...... فون مجھے دو۔"

"وہ پہچان لے گا تمہاری آواز"فریال نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

میں نے ریسیور آن کر دیا۔ لندن میں قیام کے دوران میں نے ایک لینگویج اسکول سے فرنچ سیکھی تھی۔ اس کا مشورہ مجھے عائشہ کے باپ نے دیا تھا۔ دو بین الاقوامی زبانیں جاننے سے کاروباری دنیا میں بہت فائدہ ہوتا ہے اور انگریزی کے بعد سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان فرنچ ہے، ممکن ہے ایک انگریز کی حیثیت سے میں تعصب سے کام لے رہا ہوں۔ شاید فرنچ کے بعد انگلش ہو لیکن یہ مشورہ انتہائی خلوص سے دے رہا ہوں"لارڈ ارنسٹ نے کہا تھا اور بالکل ٹھیک کہا تھا۔ فرنچ میں مہارت میرے بہت کام آئی۔

میں نے فرانسیسی لب و لہجے میں سوال کیا"ہیلو۔ موسیو' ژاں پال سارتر آپ سے مخاطب ہیں۔"

جلدی میں میری زبان پر اس عظیم فرانسیسی ادیب اور مفکر کے سوا کسی کا نام ہی نہ آیا لیکن سلطان ایک جاہل آدمی تھا۔ اسے اردو ادب پتا نہیں تھا تو فرانسیسی نام کیا سمجھ میں

آتا۔ اس نے قدرے حیرانی سے انگریزی میں پوچھا"آپ کون ہیں؟"

میں نے مزید فرنچ چلائی"آپ نے کس نمبر پر رنگ کیا ہے؟"پھر یہی بات ٹوٹی پھوٹی انگلش میں پوچھی۔

اس نے نمبر بتایا پھر بولا"یہ میرا سیل فون ہے۔"

میں نے آواز بنا کے کہا"نہیں موسیو! یہ آپ کا فون کیسے ہو سکتا ہے، یہ میرے پاس ہے۔"

"دیکھو مسٹر! میں اس فون کا مالک ہوں، یہ نمبر میرا ہے۔"

میں نے کہا"یہ کیسی عجیب بات ہے۔ تم اپنے نمبر سے خود کو فون کر رہے ہو اور میرے فون کو اپنا کہہ رہے ہو، کیا تم نشے میں ہو؟"

سلطان نے کہا"لک ہیئر، تمہیں یہ فون کہاں سے ملا؟"

میں نے کہا"ملا کیا مطلب...... میں نے خریدا ہے بے وقوف کے بچے!"

"کس سے...... کہاں......؟"

"تم کیوں پوچھتے ہو؟ کیا تم پولیس مین ہو؟"میں نے کہا۔

"دراصل یہ چوری ہو گیا تھا لیکن میں نے اس کی رپورٹ نہیں کی تھی۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم نے یہ فون کس سے خریدا تھا اور کہاں...... اور اس وقت کہاں سے بات کر رہے ہو؟"

"تمہاری بات سمجھنا میرے لیے مشکل ہو رہا ہے۔ کیا تم پاگل ہو، موسیو! ہر شخص اپنے منہ سے ہی بات کرتا ہے۔"

"اُفوہ! کس شہر میں ہو، کس ملک میں ہو؟"

میں نے کہا"روم میں اور میرا یقین ہے کہ روم ہمیشہ اٹلی میں رہا ہے۔ تم اب یہ پوچھو گے کہ روم کی کون سی سڑک، کون سی گلی......"

وہ جھنجلا کے بولا"نہیں پوچھوں گا یار! یہ تو بتا دو کہ فون تم نے کس سے خریدا تھا؟"

"ہاں، وہ ایک خوبصورت خاتون تھی۔ اس کا نام تو مجھے معلوم نہیں حالانکہ وہ میرے ساتھ سو رہی تھی...... اور......"

وہ چلایا"تمہارے ساتھ سو رہی تھی......"

میں نے سادگی سے کہا"ہاں، اس میں غصہ ہونے والی کوئی بات نہیں۔ میں نے اس سے نہیں کہا تھا کہ آؤ میرے ساتھ سو جاؤ۔"

''کیا...... تم کہہ رہے ہو...... وہ خود آ کے سوگئی؟''
''بس موسیو! خود ہی آ گئی ہوگی۔ دراصل جب میں پہنچا تو وہ پہلے سے سو رہی تھی۔ میں اس کے ساتھ سو گیا۔''
''یو باسٹرڈ!......'' وہ چیخ کر بولا۔
میں نے کہا ''غالباً تم کچھ اور سمجھ رہے ہو۔ وہ ایر پورٹ کا لاؤنج تھا جہاں وہ انتظار کر رہی تھی اور کرسی پر بیٹھے بیٹھے سوگئی تھی۔ میں اس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا اور کوئی کرسی خالی نہ تھی۔ مجھے بھی نیند آ گئی۔ ہم ساتھ سوتے رہے'' راجا اور فریال کا ہنسی ضبط کرنے سے برا حال تھا۔
''کون سے ایر پورٹ کی بات کر رہے ہو؟''
''وہ مجھے بڈاپسٹ میں ملی تھی۔''
وہ حیرانی سے بولا ''رومانیہ میں...... وہاں وہ کیا کر رہی تھی؟''
''اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ٹوکیو جائے گی۔ ہم نے ایک ٹیبل پر کافی ساتھ پی تھی۔ اسے پیسوں کی ضرورت ہوگی۔ اس نے فون مجھے سو ڈالرز میں بیچ دیا...... اور ہاں، بڈاپسٹ، ہنگری میں ہے۔''
''جھوٹ بول رہے ہو تم......'' سلطان نے دہاڑ کے کہا۔
میں نے کہا ''موسیو۔ تم کسی سے بھی معلوم کرلو۔ بڈاپسٹ ہنگری میں ہی ہے، رومانیہ میں نہیں۔ تم کو شرم آنی چاہیے کہ مجھے جھوٹا کہہ رہے ہو۔''
''نہیں...... تم غلط سمجھے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ اسے پیسوں کی ضرورت نہیں ہوسکتی۔ اس کے پاس لاکھوں ڈالرز تھے، چوری کے۔''
''گویا چوری کا موبائل فون بیچ کے اس نے اپنی دولت میں مزید سو ڈالرز بڑھا لیے، ویری گڈ...... اس کی جگہ میں ہوتا تو ایسا ہی کرتا۔''
''کیا تم مجھے اس کا حلیہ بتاؤ گے؟''
''وہ انڈین تھی۔ ساڑی انڈیا کا ڈریس ہے۔ اس کا قد ہوگا پانچ فٹ......''
''نہیں...... تم یاد کرو...... وہ ساڑھے پانچ فٹ سے زاید ہوگی۔''
''اسے میں نے دیکھا تھا یا تم نے؟ وہ پانچ فٹ سے ایک انچ کم ہوسکتی ہے، زیادہ نہیں...... اور وزن اس کا ہوگا ایک سو نوے پچانوے پونڈ کے درمیان۔ رنگ سرینا ولیم جیسا تھا۔ وہ جو بلیک ٹینس اسٹار ہے......''
سلطان نے مجھے ایک گالی دی ''اور تم اسے خوبصورت خاتون کہہ رہے ہو...... اس موٹی کالی بھینس کو۔''
''آف کورس! مجھے ایسی ہی خواتین حسین لگتی ہیں۔''
میں نے اسے جوابی گالی فرنچ میں دی مگر وہ فون بند کر چکا تھا۔
فریال نے ہنسی پر قابو پانے کے بعد کہا ''آواز تو بہت اچھی بنائی تھی تم نے...... لیکن وہ چالاک آدمی ہے۔''
راجا بولا ''فرنچ اور انگریزی کا آملیٹ خوب بنایا تو نے۔ سالا کنفیوز ہوا ہوگا۔''
میں نے کہا ''اب سوچتا رہے کہ فریال سے وہ موبائل اس حسینہ کے پاس کیسے پہنچا جو بڈاپسٹ سے ٹوکیو جا رہی تھی۔ اگر فریال بھی وہاں تھی تو آگے کہاں گئی؟''
''تم نے تو کہا تھا کہ کال ٹریس ہو جاتی ہے۔''
میں نے کہا ''ہاں...... لیکن یہ بہت مشکل اور پیچیدہ آلات کی مدد سے ممکن ہے۔ سٹلائٹ ریسیونگ اسٹیشن پر ہی دیکھا جاسکتا ہے کہ سگنل کی کیا ڈائریکشن ہے۔ وہ بھی اسی وقت جب گفتگو جاری ہو۔''
راجا نے کہا ''لیکن اسے بلاک کیا جاسکتا ہے۔ ہر سیٹ کا ایک مخصوص سیریل نمبر ہوتا ہے۔ اس سے سیٹ کو ناقابل استعمال بنا دیا جاتا ہے۔''
میں نے کہا ''اب سلطان اور کچھ تو کر نہیں سکتا۔ سیٹ کو ضرور بند کرا دے گا۔ اس سے پہلے کہ یہ ہمارے لیے بے مصرف ہو جائے، کیوں نہ میں ایک انٹرنیشنل کال کرلوں۔ پتا نہیں کریڈٹ بیلنس کتنا ہے؟''
فریال نے سیٹ مجھ سے لے لیا اور چیک کرنے کے بعد بتایا ''اب ایک سو گیارہ پونڈز باقی ہیں۔ سلطان کی کال آنے سے پہلے ایک سو چالیس تھے۔''
''یعنی انتیس پونڈز کال ریسیو کرنے میں خرچ ہوگئے۔'' میں نے کہا اور یادداشت کی مدد سے لندن میں عائشہ کا نمبر ملایا۔ زمین سے خلا تک اور پھر خلا سے زمین تک رابطے میں میری آواز نہ جانے کتنے الیکٹرونک راستوں اور وسیلوں سے گزر کے ایک منٹ بعد عائشہ کے فون کی گھنٹی بن گئی۔ رنگ جاتی رہی، جواب کوئی نہ آیا۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ شاید وہ سو رہی ہوگی۔ لندن میں صبح کا آغاز ابھی ہوا ہی ہے۔ آج چھٹی بھی نہیں ہے اور ویسے بھی عائشہ دیر تک سونے کی عادی نہیں ہے۔ پھر کیا بات ہے؟ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ مجھے نمبر بھول گیا ہو۔ یہ نمبر میرے دل پر نقش تھا۔ رات دن استعمال ہوتا تھا۔ اکثر گھنٹی بجتی تھی تو سی ایل آئی اسکرین پر سامنے آتا تھا۔ کہیں اس کا نمبر تو نہیں بدل گیا؟ اس کی ماں

بہت چالاک ہے، مجھ سے رابطے کو منقطع کرانے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہے حالانکہ کسی کا نیا سیل فون نمبر معلوم کرنا کوئی مشکل کام نہیں اور پھر عائشہ کب ایسا ہونے دے گی، یہ نمبر اس کے پاس شروع سے ہے پھر کیا اس نے موبائل بند کر رکھا ہے؟
یہ سب خیالات میرے ذہن سے اس مختصر وقت میں گزر گئے جو نمبر ملانے سے پانچ بار گھنٹی کی آواز سنائی دینے اور کال ڈس کنیکٹ ہونے کے درمیان حائل تھا۔
فریال نے کہا ''چھوڑو، وہ بات کرنا ہی نہیں چاہتی تم سے۔''
میں نے کہا ''وہ نہ چاہے...... میں تو چاہتا ہوں'' اور دوسری بار اس کے باپ لارڈ ارنسٹ کا نمبر ملایا۔ گھنٹی دو بار بجی۔
پھر لارڈ ارنسٹ نے بھاری خوابیدہ آواز میں کہا ''ہیلو!''
میں نے کہا ''گڈ مارننگ سر! رفیق ہیئر...... فرام پاکستان۔''
''اوہ ہیلو...... تم نے صبح صبح کال کیا؟'' لارڈ ارنسٹ نے آواز میں بشاشت پیدا کی ''ایوری تھنگ او کے؟''
''اوہ یس! شاید میں نے تمہیں سونے سے جگا دیا؟''
''اوہ نو...... میں اٹھ گیا تھا۔''
میں نے کہا۔ ''تمہیں کال کرنے سے پہلے میں نے عائشہ کو کال کیا تھا لیکن بات نہیں ہوسکی۔''
اس نے کہا۔ ''ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کا سیل فون نمبر نہیں رہا جو پہلے تھا۔''
میں نے کہا۔ ''اسے نمبر بدلنے کی کیا ضرورت پیش آگئی۔''
''یہ اس کا قصور نہیں تھا۔ دراصل پہلے تو اس کا فون سیٹ کھو گیا تھا۔ خیر اس سے فرق نہیں پڑتا۔ اس نے دوسرا فون لیا اور کمپنی نے اس کا اوریجنل نمبر برقرار رکھا لیکن پھر کچھ یہ ہوا کہ......''
میں نے کہا۔ ''تم رک کیوں گئے؟''
''دراصل کمرے کے اندر آواز کچھ صاف نہیں آ رہی تھی اس لیے میں ذرا باہر آ گیا ہوں۔ میں کہہ رہا تھا عائشہ کو کچھ گمنام کالز آئیں۔ OBNOXIOUS دھمکیاں ملنے لگیں۔''
میں نے کہا۔ ''لندن پولیس کے لیے ان کا پتا چلانا کیا مشکل تھا۔''
''یس...... لیکن پاکستان میں شاید یہ بہت مشکل ہے۔''
میں نے چونک کے کہا۔ ''پاکستان کی کیا بات ہے؟''
''کالز پاکستان سے کی گئی تھیں۔'' لارڈ نے کہا۔
''پاکستان سے...... آر یو شیور......''
وہ بولا۔ ''اس کا ثبوت مل گیا تھا۔ نمبر بھی مل گئے تھے جہاں سے کسی نے کال کیا لیکن مجھے یہ جان کر بہت حیرانی ہوئی جب ان کو ٹریس نہ کیا جاسکا۔ پولیس نے کہا کہ کنکشن جعلی تھے۔ یہ بات پہلے میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ وہاں کونسلیٹ کے ایک رکن نے وضاحت سے مجھے بتایا کہ یہاں لوگ فرضی نام اور پتے سے کنکشن حاصل کر لیتے ہیں۔ عام طور پر جرائم پیشہ افراد اپنی شناخت چھپانے کے لیے ایسا کرتے ہیں۔ حکومت نے کچھ سختی کی مگر اب بھی صورت حال وہی ہے۔ لوگ قومی شناختی کارڈ اور پاسپورٹ وغیرہ میں غلط تفصیلات دیتے ہیں۔ ایک شخص مختلف ناموں سے کئی شناختی کارڈ حاصل کرسکتا ہے۔ شناختی کارڈ جعلی بھی بنائے جاتے ہیں جو اصلی جیسے لگتے ہیں۔ آئی ڈونٹ نو یہ کیسے ہوتا ہے۔ پولیس کے علاوہ دوسرے انٹیلی جنس کے ادارے بھی تو ہوں گے۔''
میں نے کہا۔ ''ان کی بات چھوڑیں۔ پاکستان میں رشوت دے کر آپ ناممکن کو ممکن بنا دیتے ہیں۔''
''عائشہ کو آٹھ کالز موصول ہوئیں جو آٹھ مختلف نمبرز سے کی گئی تھیں۔ کوئی بھی پکڑا نہیں گیا۔ اُلٹا نقصان یہ ہوا کہ کال کرنے والا یا کال کرنے والے عائشہ کو سمجھانے لگے کہ وہ پولیس اور قانون نافذ کرنے والے اداروں پر بھروسا نہ کرے۔ وہ کچھ نہیں کرسکتے کیونکہ وہ سب ان کی مٹھی میں ہیں۔ اسے زیادہ نقصان ہوسکتا ہے۔''
میں نے کہا۔ ''وہ کیا کہتے تھے؟''
''ایک ہی بات، پاکستان آنے کا خیال چھوڑ دو۔ کیا تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ پاکستان میں کتنی لاقانونیت اور دہشت گردی ہے۔ سفید فام یہاں کیسے غیر محفوظ ہیں۔ خودکش حملوں کی کتنی وارداتیں ہوچکی ہیں۔''
''او مائی گاڈ! کیا تم بھی ایسا کہتے ہو؟''
''میں کیا کروں۔ میں تم کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ تمہارے بارے میں میری رائے ہمیشہ بہت اچھی رہی اور بھی بے شمار مسلمان اور پاکستانی نوجوان ہیں۔ سب بہت اچھے ہیں لیکن ایک کنٹری کا امپریشن خراب اس دہشت گردی کو صلیبی جنگ کہہ دے تو پھر جو کچھ عراق، افغانستان یا پاکستان میں ہو رہا ہے۔ اس کے خلاف میرا ردعمل ایسا کیسے

ہوسکتا ہے۔تم تو جانتے ہو میں لامذہب آدمی ہوں۔ کسی بھی مذہب پر یقین نہیں رکھتا لیکن اس سے کیا فرق پڑ سکتا ہے۔ اکثریت تو رکھتی ہے۔"

"کیا تم مجھے وہ نمبر دے سکتے ہو؟"

"کیوں؟ تم کیا کرو گے۔ انہیں تلاش کر کے قتل کرو گے۔ نہ تم سراغرساں ہوں اور نہ تم اس سے زیادہ اثر رسوخ رکھتے ہو جو برٹش کونسلیٹ اور سفارت خانے نے استعمال کیا۔حکومتی سطح پر دباؤ تھا مگر کچھ بھی نہیں ہوا۔اس کے علاوہ میرے پاس وہ نمبر نہیں ہیں۔ شاید پولیس کے پاس ریکارڈ ہوگا۔ چھوڑو ہم نے وہ نمبر بدل دیا اور یہ نیا نمبر بھی آبزرویشن پر رہتا ہے۔ چوبیس گھنٹے ہر بات ریکارڈ ہوتی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ میرے گھر کے یا آفس کے دوسرے نمبرز آبزرویشن پر ہیں یا نہیں۔تم محتاط رہو تو بہتر ہے۔"

میں نے کہا۔"مجھے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے لیکن لارڈ ارنسٹ کیا ان دھمکی دینے والوں نے عائشہ کے خیالات بدل دیے ہیں؟ اس نے پاکستان آنے کا خیال چھوڑ دیا ہے۔"

"ابھی تک ایسا نہیں ہوا لیکن پہلے صرف اس کی ماں مخالف تھی۔اب میں بھی نہیں چاہتا کہ وہ پاکستان جائے۔وہ میری ایک ہی بیٹی ہے۔میں ڈر گیا ہوں۔"

"کیا تم یہ چاہو گے کہ میں بھی اسے روکوں؟"

"شاید یہ تمہارے لیے آسان نہ ہو۔ اس کے علاوہ فیصلہ کرنے والی خود عائشہ ہے۔اگر وہ جانا چاہے تو اسے حکومت بھی نہیں روک سکتی۔"

میں نے کہا۔"لیکن حکومت پاکستان روک سکتی ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"عائشہ کو ویزا نہ دے کر۔"

"تم بھول رہے ہو کہ ویزا وہ لے چکی تھی۔ وہ تمہارے ساتھ جارہی تھی یا نہیں؟ وہ کسی بھی جہاز میں سوار ہوسکتی ہے۔"

میں نے کہا۔"پھر وہ کیوں رکی ہوئی ہے؟"

"اپنی ماں کی وجہ سے۔"لارڈ ارنسٹ نے ایک آہ بھری۔

"جہاں تک مجھے معلوم ہے اس نے کبھی ماں کی پروا نہیں کی۔ماں کی بات کا الٹا اثر ہوتا تھا۔"

"یو آر رائٹ! لیکن ہم سب جذباتی بلیک میلنگ کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔دلیل سے اور الفاظ سے مقابلے پڑتے رہتے ہیں۔سیلیا نے اپنا آخری پتا کھیل دیا ہے۔اب میں نہیں جانتا کہ وہ بازی جیت سکے گی یا نہیں۔اس نے عائشہ کو دھمکی دی کہ اگر اس نے انڈیا...... میرا مطلب ہے پاکستان جانے کا ارادہ ترک نہ کیا تو وہ اپنی جان دے دے گی۔ظاہر ہے عائشہ نے اسے اہمیت نہیں دی تھی۔ سیلیا کو ایسا کرنا پڑا۔"

"کیا مطلب؟ اس نے......"

"یس! اس نے آسان راستہ اختیار کیا۔وہ سلیپنگ پلز کھاتی ہے۔ اس نے بہت زیادہ مقدار میں نگلی ہیں۔ جو عادی نہ ہو وہ نصف مقدار پر ہلاک ہوجاتا۔اسے ڈاکٹروں نے بچالیا لیکن اس کے ذہنی اور اعصابی نظام کو ناقابل تلافی نقصان ہوا۔وہ جزوی طور پر فالج کا شکار ہے۔سہارے کے بغیر چل نہیں سکتی۔ اس کے ہاتھ کانپتے ہیں۔ عجیب قسم کے دورے پڑتے ہیں۔اس کی نظر دھندلا جاتی ہے۔ کچھ پرانے واقعات کو وہ ایسے دیکھتی ہے جیسے سب کچھ ابھی ہو رہا ہو۔کبھی بالکل بلینک ہوجاتی ہے۔بھول جاتی ہے کہ وہ کھانا کھا چکی ہے، پھر کھا لیتی ہے۔"

میں نے کہا۔"مجھے بہت افسوس ہوا یہ سب جان کے۔ مجھے پتا نہیں میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔"

"کچھ نہیں، بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ سب تمہاری وجہ سے ہوا مگر میں ان سے بالکل اتفاق نہیں کرتا۔"

میں نے کہا۔"میں عائشہ سے بات کروں گا۔ مجھے اس کا نمبر بتا دیں۔"

"اس کی ذہنی کیفیت بھی بہت عجیب ہے۔وہ احساس جرم کا شکار ہے مگر یہ بھی سمجھتی ہے کہ ماں اس کے ساتھ دشمنی کر رہی ہے۔ پتا نہیں اس کا انجام کیا ہوگا، تم نمبر لکھو۔"

میں نے نمبر لکھنے کے بعد کہا۔"اس وقت وہ کیا کر رہی ہے؟"

"سو رہی ہوگی لیکن تم سے بات کرنے کے لیے وہ جاگ سکتی ہے اور رفیق! اگر تم اس مسئلے کا کوئی حل نکال سکو تو یہ مجھ پر احسان ہوگا۔ پہلے میں سمجھتا تھا کہ وہ تمہارے ساتھ محفوظ ہوگی مگر اب یہ سوچتا ہوں کہ اس کے ساتھ شاید خود تم بھی غیر محفوظ ہو جاؤ گے۔"

میں نے کہا۔"میرا خیال ہے سر کہ آپ کچھ ضرورت سے زیادہ پریشان ہو رہے ہیں۔ سیاسی اسباب کی بنا پر چند واقعات سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بالکل غلط ہوگا کہ پاکستان میں کوئی غیر ملکی محفوظ نہیں۔ یہاں سیکڑوں نہیں ہزاروں لوگوں کی غیر ملکی بیویاں ہیں۔"

"کیا تم یہ عندیہ دے رہے ہو کہ تم اس سے شادی کرو گے؟"لارڈ ارنسٹ نے کہا۔

"میں نے ایسا نہیں کہا۔"

"ایک غیر ملکی بیوی کی بات مختلف ہوتی ہے۔تمہاری سوسائٹی اسے قبول کر لیتی ہے۔ عائشہ نے تمہارا مذہب بھی اختیار کر لیا ہے لیکن یہ باتیں عام دہشت گرد نہیں جانتا۔"

میں نے کہا۔"میں چاہتا ہوں کہ آپ عائشہ کے ساتھ پاکستان آکے خود صورت حالات کا جائزہ لیں۔ یہ ڈیڑھ سو ملین انسانوں کا ملک ہے۔کراچی میں پندرہ ملین اور لاہور میں دس ملین لوگ رہتے ہیں اور یہ شہر کسی طرح بھی لندن سے کم نہیں۔"

"میں مانتا ہوں لیکن رفیق! یہ عقل اور دلیل کا نہیں، جذبات کا مسئلہ ہے۔"

میں نے ایک گہری سانس لی۔"او کے! میں اسے سمجھاؤں گا۔ پہلے بھی سمجھاتا رہا ہوں۔تمہارے لیے پھر کوشش کروں گا کہ وہ پاکستان نہ آئے۔ حالانکہ پہلے ایک ذاتی وجہ تھی، اب اسے روکنے کا مطلب یہ ہوگا کہ میں ایک غلط موقف کو تسلیم کر رہا ہوں۔ان سب کا ہمنوا بن گیا ہوں جو پاکستان کو دہشت گردی کی آماجگاہ کہتے ہیں۔ یہ میرے یقین کے خلاف ہوگا۔"

"کبھی آدمی کو مصلحت دیکھتے ہوئے جھوٹ بولنا پڑتا ہے۔مجبوری میں اصولوں سے بھی سمجھوتا کرنا پڑتا ہے جیسے ہم نے کیا تھا۔ جب عائشہ نے تمہارے لیے اپنا مذہب، ملک اور خاندان چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔"

"وہ اخلاقی نہیں قانونی مجبوری تھی۔تمہاری بیوی نے تو ابھی تک سمجھوتا نہیں کیا۔ وہ میرے خلاف نفرت کی جنگ لڑ رہی ہے۔تمہارا کیا خیال ہے محبت اور نفرت کی جنگ میں فتح کس کی ہوتی ہے؟ بالآخر۔"

"شاید مجھے کہنا چاہیے کہ محبت کی۔"

میں نے کہا۔"لارڈ ارنسٹ! مجھے شک ہے کہ تمہاری بیوی نے بڑی لمبی جنگ کی حکمتِ عملی بنائی ہے۔وہ ہار کو قبول نہیں کرے گی۔موت کو قبول کر لے گی خواہ موت میری ہو، بیٹی کی یا اس کی اپنی۔"

"میں تم سے اتفاق کرنے پر مجبور ہوں۔وہ ضدی عورت اپنی شکست کبھی تسلیم نہیں کرتی۔ یہ اس کی فطرت ہے جو بدلی نہیں جاسکتی۔"

میں نے کہا۔"اپنی جیت کو یقینی بنانے کے لیے اس نے پہلے بھی سازش کی تھی۔ یہ بھی مجھے اس کی سازش نظر آتی ہے۔ اس نے کسی سے فون کرائے ہوں گے۔ دھمکیاں دلوائی ہوں گی۔"

"لیکن وہ تو پاکستان میں کسی کو نہیں جانتی۔"

"آپ کیسی نادانی کی باتیں کرتے ہیں لارڈ ارنسٹ! ہر ملک میں ہر کام اجرت پر کرنے والے مل جاتے ہیں۔ کرائے کے قاتل دستیاب ہوں تو پھر باقی جرائم کی کیا حیثیت ہے۔تمہاری بیوی اپنی دولت اور اپنا اثر رسوخ دونوں کو مخفی انداز میں استعمال کرنا جانتی ہے۔ممکن ہے یہاں کونسلیٹ میں اس کا کوئی ہمدرد ہو جس نے اس کی مدد کی ہو۔"

"اس طرف میرا دھیان نہیں گیا تھا۔ ایسا ہوسکتا ہے رفیق! کیونکہ ایک شخص ہے جو سیلیا کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔آج بھی......"

مجھے لارڈ ارنسٹ کے لہجے میں رقابت کی بو اور تلخی محسوس ہوئی۔"کون ہے وہ؟"

"اس کا آکسفورڈ کے زمانے کا ایک دوست...... میں معلوم کروں گا اور تمہیں ضرور بتاؤں گا۔"اس نے کہا اور خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔

میں نے پھر چیک کیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ کریڈٹ بیلنس تقریباً ختم ہوگیا ہے۔شاید چند سنٹ بعد لائن خود بخود ڈس کنکٹ ہوجاتی۔اب یہ ممکن نہیں رہا تھا کہ میں عائشہ سے بات کر سکوں۔اس بات کا امکان ہی نہ تھا کہ سلطان دوبارہ فون کرے۔ میں نے فون کو پیچھے سے کھول کر سم نکال دی۔ نیا کنکشن لینے تک یہ فون سیٹ بھی بے کار ہو چکا تھا۔

باہر فرخ کے ساتھ دو اجنبی کھڑے تھے۔ان میں سے ایک نسبتاً عمر رسیدہ اور بھاری بھرکم شخص شلوار قمیص پر کوٹ پہنے ہوئے تھا۔قراقلی ٹوپی اور پشاوری سینڈل کے ساتھ وہ خالص ٹھیکیدارانہ اطوار کا مالک تھا۔ دوسرا جینز اور ٹی شرٹ میں اسمارٹ سالو جوان تھا۔

فرخ نے پہلے میرا تعارف کرایا۔"یہ ہیں رفیق احمد شیرازی۔ اس حویلی اور جاگیر کے مالک، ہاورڈ سے ایم بی اے، لندن سے آئے ہیں اور یہ سردار گل باز خان۔"

گلباز نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔"میں پائیدار کنسٹرکشن کمپنی کا اور پائیدار سیمنٹ فیکٹری کا مالک ہوں اور یہ ہے میرا بیٹا شہباز خان۔ یہ بھی امریکا سے پڑھ کے آیا ہے، انجینئر ہے، اب یہی سارا کام سنبھالتا ہے۔" شہباز نے بھی مجھ سے مصافحہ کیا۔ وہ ایک خوش مزاج اور ذہین آدمی تھا۔ باپ پرانے وقتوں کا آدمی تھا جس نے کسی ڈگری یا ٹریننگ کے بغیر بہت نچلی سطح سے کاروبار شروع کیا ہوگا لیکن اس نے کامیابی کے ساتھ مستقبل کی ایسی پلاننگ کی تھی اور اپنے بیٹے

کو جدید خطوط پر کاروبار چلانے اور پھیلانے کے لیے تیار کرلیا تھا۔

میں نے کہا۔ ''یہ کوئی بہت بڑا پروجیکٹ نہیں ہے۔''

شہباز نے کہا۔ ''لیکن یہ دلچسپ جگہ ہے۔ اس ماحول نے مجھے بہت FASCINATE کیا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''فرخ نے یقیناً تمہیں کام کی نوعیت سمجھادی ہوگی؟''

''یس سر! ہمیں اس تاریخی جگہ کو RENOVATE کرنا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''رائٹ! کسی بھی تاریخی جگہ کی تعمیر نو میں اس بات کی سب سے زیادہ اہمیت ہوتی ہے کہ اس کی اوریجنلٹی برقرار رہے۔''

''میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان میں بھی قدیم عمارات کی ظاہری شکل وصورت کو تبدیل کرنا قانونی جرم ہونا چاہیے۔ جیسا کہ اٹلی اور بعض دوسرے ممالک میں بھی ہے۔'' شہباز نے کہا۔

میں نے کہا۔ ''اگر تم اس کی اہمیت کو سمجھتے ہو تو میرا خیال ہے کہ یو آر دی رائٹ مین فار دس جاب!''

وہ مسکرایا۔ ''بات یہ ہے مسٹر شیرازی کہ پاکستان میں اب وضع دار یا اعلیٰ ذوق کے حامل لوگ نظر نہیں آتے۔ نو دولتیے کسی قدیم حویلی کو کھنڈر سے زیادہ نہیں سمجھتے اور اسے گرا کے ایک جدید انداز کا اسٹیل اور گلاس کا اسٹرکچر کھڑا کردیتے ہیں جیسے کہ شکاگو سے ٹوکیو اور لندن سے سنگاپور تک نظر آتے ہیں۔ اگر روم سے سینٹ پٹرز برگ تک تمام عمارات کو گرادیا جائے تو کیا حسن رہ جائے گا دنیا میں۔''

اس کے باپ نے شہباز کو گھورا۔ ''میرا خیال ہے کہ تمہیں کام کی بات کرنی چاہیے۔''

شہباز نے جلدی سے کہا۔ ''سوری سر! میں شاید کچھ زیادہ بول گیا، تاہم میں نے آپ کا مطلب اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔''

''ہم انشا اللہ بعد میں بھی آپ سے مشورہ کرتے رہیں گے۔ آپ کی رائے زیادہ اہم ہے۔'' گل باز خان نے کہا۔

میں نے کہا۔ ''مجھے امید ہے کہ ہمارے درمیان ایک لونگ ٹرم پارٹنر شپ ہوسکتی ہے۔''

''بالکل ہوسکتی ہے اور ضرور ہوگی۔'' شہباز نے کہا۔

وہ ایک پُراعتماد نوجوان تھا جس کے کامیاب مستقبل کی پیش گوئی کی جاسکتی تھی۔ اس کے باپ نے جائز طور پر اس سے توقعات وابستہ کررکھی تھیں اور وہ ان پر پورا اترنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ میرے نزدیک کاروباری تعلقات کے فروغ میں اس کی تعلیم سے زیادہ اس کی پُرکشش متاثر کرنے والی شخصیت اور اچھے مینرز کی بنیادی اہمیت تھی۔

راجا نے کہا۔ ''دراصل ہمارے مستقبل کے کچھ پلان ہیں۔ مسٹر فرخ آپ کو بتاسکتے ہیں۔''

مجھے اچانک اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ ابھی تک میں نے راجا کو متعارف نہیں کرایا تھا۔ میں نے کہا۔ ''یہ راجا ہیں۔ میرے دوست، دست راست اور سب کچھ......''

''یہ کہاں کے راجا ہیں؟'' گل باز خان کچھ مرعوب ہوکے بولا۔

میں نے کہا۔ ''یہ دنیائے صحافت کے راجا بلکہ مہاراجا ہیں لیکن یہاں میرے تمام معاملات کے نگراں ہیں۔''

شہباز نے ہاتھ ہلا کر کہا۔ ''آپ کا نام تو بہت سنا ہے۔''

فرخ ان باپ بیٹا کو اپنے ساتھ لے گیا۔ فریال اندر غرارہ لہراتی پھر رہی تھی اور تجربہ کار ہوٹل منیجر کی طرح فاطمہ اور اس کی بیٹی ریشماں کو امور خانہ داری کے بارے میں تفصیلی ہدایات دینے کے ساتھ ساتھ نوٹ بک میں کچھ لکھتی جارہی تھی۔

ابھی دوپہر کے بارہ ہی بجے تھے۔ میں نے راجا سے مشورہ کیا۔ ''کیا خیال ہے۔ ہم ریاست کا ایک راؤنڈ لگالیں۔''

راجا نے مجھ سے اتفاق کیا۔ ''اس وقت کا اس سے بہتر مصرف کیا ہوسکتا ہے۔ جیپ لے کر چلتے ہیں۔''

شوق سے بنائی جانے والی جیپ مضبوط اور خوبصورت ہی نہیں کارکردگی میں بھی لاجواب تھی۔ اس کی سیٹیں آرام دہ تھیں۔ اسٹیئرنگ اور سسپنشن بہترین تھے اور انجن بہت جاندار تھا لیکن ایک تو اس کی چھت نہیں تھی، دوسرے یہ کار کی طرح پُرآسایش نہیں تھی۔

میں بلند وبالا صدر دروازے سے نکلا تو مجھے مغرب کی طرف اپنے بالکل سامنے دریائے کنہار کا جھولنے والا پل دکھائی دیا۔ دریا جو اب سمٹ کر ندی سے بھی کم رہ گیا تھا، مشرق کی طرف سے آتا تھا۔ مشرق کی جانب اس کا پاٹ بہت وسیع تھا اور پانی تین دھاروں میں تقسیم ہوکے بہتا تھا۔ درمیان کی خشک سطح پر سنگریزے اور گول پتھر بچھے ہوئے تھے اور کہیں کہیں خودرد پودے بڑھ کر جھاڑیوں کی طرح پھیل گئے تھے۔ پل کے قریب تینوں دھارے سمٹ کر ایک

ہوجاتے تھے۔ یہاں پانی کم تھا چنانچہ گہرائی کچھ زیادہ تھی۔ پل کے نیچے سے گزر کے دریائے کنہار پہاڑی کے گرد چکر لگاتا تھا اور اس کا پاٹ پھر بتدریج پھیلتا جاتا تھا۔

باہر آتے ہی میں نے بائیں جانب کی دیوار کے ساتھ جنوب کی طرف چلنا شروع کیا۔ حویلی کی بیرونی فصیل کے ختم ہوتے ہی سیاہ پتھروں سے بنی ہوئی وہ دیوار شروع ہوجاتی تھی جس کی بلندی کہیں بھی دو فٹ سے زیادہ نہ تھی۔ بعض جگہ یہ اونچائی صرف ایک فٹ رہ گئی تھی۔ امتداد زمانہ کے باعث پرانی دیوار کے پتھر جھڑ گئے تھے۔ یہ دیوار محض حد بندی کے لیے تعمیر کی گئی ہوگی چنانچہ اس کی مضبوطی کو مقدم نہیں سمجھا گیا تھا۔

دیوار کے دونوں جانب آنے والی گھاس پھوس اور جنگلی جھاڑیاں کبھی صاف نہیں کی گئی تھیں چنانچہ حد بندی کی دیوار جگہ جگہ غائب ہوجاتی تھی۔ میں نے اس کے باہر باہر اپنا سفر جاری رکھا۔ وہاں کوئی راستہ نہ تھا۔ سخت زمین تھی جس پر خشک پتوں، کانٹوں اور ٹوٹی ہوئی شاخوں کے ساتھ جنگلی بیر جیسے پھلوں اور خس وخاشاک کا فرش بچھا ہوا تھا۔

جیپ کے ٹائر ایسے ہی دشوار گزار راستوں کے لیے بنائے گئے تھے۔ جیپ چھوٹی موٹی جھاڑیوں اور دوسری رکاوٹوں کو کچلتے ہوئے آگے بڑھتی گئی۔ کئی جگہ لمبے درختوں کے درمیان سے راستہ تلاش کرنا پڑا۔ اس کے لیے کبھی میں دائیں طرف گھوم کے پھر اندازے سے واپس بائیں طرف آجاتا تھا تو بعض اوقات واپس جاکے نئے سرے سے نیا راستہ تلاش کرنا ضروری ہوجاتا تھا۔

کئی جگہ درختوں کی شاخیں اتنی کم بلندی تک آگئی تھیں کہ ہم سر نہ جھکاتے تو چہرے پر خراشیں آتیں۔ راجا کی نظر حد بندی کی دیوار پر تھی جو بالکل سیدھی نہ تھی۔ میری پوری کوشش تھی کہ کہیں بھی جیپ اس دیوار سے زیادہ فاصلے پر نہ ہو۔ عام طور پر ہم بیس سے پچاس فٹ کا فاصلہ برقرار رکھتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ جیپ کی رفتار بھی دس پندرہ کلومیٹر فی گھنٹا سے زیادہ نہ تھی اور اگر ہم مجموعی فاصلے کو دیکھتے تو شاید جیپ پیدل کی اوسط رفتار پر بھی نہیں جارہی تھی۔

سمت بدھائی کی جاگیر بائیں طرف تھی۔ دائیں طرف دریائے کنہار تک کا فاصلہ کہیں آدھا کلومیٹر ہوجاتا تو کہیں اس سے بھی زیادہ۔ میرے اندازے کے مطابق یہ زمین کسی کی ملکیت نہیں ہوسکتی تھی۔ آثار بتاتے تھے کہ یہاں اب گھنا جنگل تھا۔ وہاں پہلے دریا کی گزرگاہ تھی۔ جگہ جگہ نظر آنے والے گول چکنے پتھر اس تبدیلی کے گواہ تھے۔

ایک جگہ مجھے کسی جانور کا ڈھانچا پڑا دکھائی دیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ بلی تھی لیکن راجا نے کسی ماہر حیوانیات کی طرح جیپ سے اتر کے اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کے اس کا معائنہ فرمانے کے بعد یہ رائے دی کہ وہ خرگوش تھا۔

مجھے اپنے مقابل گھنے درختوں اور جھاڑیوں کا ایک سلسلہ دکھائی دیا جو کسی دیوار کی طرح ہماری راہ میں حائل تھی۔ اس قدرتی فصیل سے گزرنے کا کوئی راستہ تلاش کرنے کے لیے ہم نے دائیں جانب پیدل چلنا شروع کیا۔ ہمیں اندازہ ہی نہ ہوا کہ پھر اس راستے سے کتنی دور آچکے ہیں۔

ایک جھاڑی کے پیچھے مجھے سفید دھبا سا دکھائی دیا۔ میں نے قریب جاکر دیکھا تو یہ ایک خرگوش تھا جو بے ہوش اور نیم جاں لگتا تھا۔ جب میں نے اسے اٹھایا تو اس کا نرم گرم جسم میرے ہاتھوں میں کانپنے لگا۔ میں نے اسے ساتھ رکھنے کا فیصلہ کیا۔ میرا خیال تھا کہ تھوڑی سی دیکھ بھال سے وہ ٹھیک ہوجائے گا۔

اسی وقت قریب کی ایک اور جھاڑی سے دوسرا خرگوش اچھل کے بھاگا۔ میں نے پلٹ کے دیکھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے خرگوش کے تعاقب میں کوئی اور جانور بھی تھا جو ہمیں دیکھ کر جھاڑیوں ہی میں رک گیا ہے۔ مجھے ذرا آگے جاکر دیکھنے سے اور جھاڑیوں کی تیز حرکت سے اندازہ ہوا کہ خرگوش کے شکار کے لیے تعاقب میں آنے والا جانور اب واپس جارہا ہے۔ وہ خرگوش ایک جھلک دکھا کے اگلی چھلانگ میں نہ جانے کدھر نکل گیا تھا۔ جو خرگوش میرے ہاتھ میں تھا وہ شاید مرنے والا تھا۔

میں نے کہا۔ ''راجا! کیا یہاں شکار ہوتا ہے؟''

راجا میرے ساتھ آگیا۔ ''شکار ہے تو شکاری بھی ہوں گے۔''

میں نے کہا۔ ''غالباً وہ شکاری کتا تھا۔''

راجا نے نفی میں سر ہلایا۔ ''شکاری کتا ہوتا تو تعاقب ترک کرکے کبھی واپس نہ جاتا۔ وہ خرگوش کا پیچھا نہ چھوڑتا۔ وہ کوئی لومڑی ہوسکتی ہے۔ بھیڑیا بھی ہوسکتا ہے۔''

''بھیڑیے تو انسانوں کے لیے بھی خطرناک ہوتے ہیں۔''

راجا نے کسی ماہر شکاری کی طرح سر ہلایا۔ ''نہیں، جب تک وہ بھوکے نہ ہوں یا محصور نہ ہوجائیں، وہ انسان پر حملہ نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ اکیلا بھیڑیا انسان سے بھاگتا ہے۔ بھیڑیے غول کی صورت میں حملہ کرتے ہیں۔''

لیکن اس کی رائے فوراً غلط ہوگئی۔ دور سے ایک کتے کے بھونکنے کی آواز آئی پھر بہت سے کتے بھونکنے لگے۔ میں نے کہا۔ ''کیا یہ بھیڑیے بھونک رہے ہیں راجا صاحب کتے کی طرح؟''

راجا نے ڈھٹائی سے کہا۔ ''نفیکے پتر!......کیا خرگوشوں کو دھوکا دینے کے لیے بھیڑیا ایسا نہیں کرسکتا۔ وہ ایک مکار جانور ہے۔''

اس وقت تک کتوں کے بھونکنے کی آواز قریب سے آنے لگی تھی۔ فاصلہ کم ہوتا جارہا تھا اور یہ محسوس ہوتا تھا کہ شکاری کتے ہماری طرف ہی بڑھ رہے ہیں۔ کتوں کے ساتھ کچھ انسانی آوازیں بھی شامل ہوگئیں۔ کچھ لوگ حلق سے بے معنی آوازیں نکال رہے تھے جن کا مقصد شور مچانے کے سوا کچھ نہ تھا۔

''یہ ہانکا کرنے والے ہیں۔'' راجا نے کہا۔

میں نے کہا۔ ''راجا! یہ ڈنڈے لے کر جھاڑیوں پر مارتے ہوئے چلتے ہیں اگر کسی درخت یا جھاڑی کی پناہ میں خرگوش چھپا بیٹھا ہوا تو وہ نکل کر بھاگنے پر مجبور ہوتا ہے پھر کتے چھوڑ دیے جاتے ہیں جو اسے دانتوں میں دبوچ کر زندہ پکڑلاتے ہیں اور شکاری کے حوالے کردیتے ہیں۔''

''کون ہوسکتا ہے یہ شکاری؟'' راجا نے کہا۔

میں نے کہا۔ ''ابھی معلوم ہوجائے گا۔''

پھر ایک طرف سے تین اور دوسری جانب سے دو افراد نمودار ہوئے۔ ان کے ایک ہاتھ میں سوٹی یعنی لمبی سی ڈنڈی تھی جس سے وہ جھاڑیوں کو کھنگالتے تھے۔ دوسرے ہاتھ سے انہوں نے ایک دبلے پتلے مگر قد میں اونچے شکاری کتے کی زنجیر تھام رکھی تھی۔ کتے اتنے شہ زور تھے کہ انسان کو اپنے ساتھ کھینچتے جارہے تھے۔ انسان عام دیہاتی تھے۔ سخت جان مگر جسمانی طور پر کمزور نظر آنے والے دیہاتی۔ ان کے گہرے سانولے رنگ دھوپ میں تپ کے سیاہ دکھائی دیتے تھے۔ پسینہ ان کے چہرے پر چمک رہا تھا۔ ان کے جسموں پر میلی اور پھٹی ہوئی بنیانیں تھی اور نیچے انہوں نے خاکی رنگ کی نیکریں پہن رکھی تھیں۔ ان کے پیروں میں کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ کانٹوں بھری سخت زمین پر ننگے پاؤں دوڑ رہے تھے اور انہیں کسی تکلیف کا احساس بھی نہ تھا۔ شاید نیچے سے ان کے پیروں کے تلوے سخت ہوکر چمڑے کا تلا بن چکے تھے۔

کتوں کے اور انہیں سنبھالنے والوں کے تیور دیکھ کر میں نے اور راجا نے واپسی اختیار کرنا بہتر سمجھا۔ یوں لگتا تھا جیسے ہماری دخل اندازی ناگوار گزری ہے۔ جو شخص قیادت کررہا تھا وہ خاصا دراز قد تھا۔ اس کی تیکھی مونچھیں تھیں اور لمبے بالوں کے پٹے تھے۔ میں نے نوٹ کیا کہ پیچھے آنے والوں کے سر بالکل صاف تھے۔

مونچھوں والے دراز قد نے دور ہی سے چلا کے اشارہ کیا۔ ''اوئے بابو! اس کو چھوڑ دو۔ یہ شکار ہے۔''

میں نے کہا۔ ''یہ نہیں ہوسکتا۔ یہ شکار کے قابل نہیں ہے۔''

راجا نے بھی کہا۔ ''یہ بیمار ہے۔''

وہ چیخ کے بولا۔ ''تم کیا اسے اسپتال میں داخل کراؤ گے۔ اسے جانے دو۔ رستم بے قرار ہورہا ہے۔''

رستم غالباً اس خونخوار کتے کا نام تھا جو اس کی گرفت میں اچھل رہا تھا اور خرگوش پر حملہ کرنے کے لیے سخت بے قرار تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ میں اس بے ہوش جانور کو اس درندے کے آگے ڈال دیتا۔ میں نے بھی دھاڑ کے کہا۔ ''دفع ہوجاؤ یہاں سے اور اپنے اس رستم کو بھی لے جاؤ۔''

مونچھوں والا دراز قد اب ہم سے پچاس ساٹھ فٹ کے فاصلے پر آکے رک گیا تھا اور مجھے کینہ توز نظروں سے گھور رہا تھا۔ باقی سب بھی اس کے ساتھ ہی ٹھہر گئے تھے اور اپنے کتوں کو قابو کرنے کی کوشش میں مصروف تھے جو میرے ہاتھ میں خرگوش دیکھ کر رستم کی طرح حملہ کرنا چاہتے تھے۔

''اوئے بابو! میں آخری بار بول رہا ہوں۔ تو نے شکار کو نہ چھوڑا تو میں رستم کو چھوڑ دوں گا۔''

مجھے اندازہ ہوا کہ صورت حال کسی حد تک خطرناک ہوگئی ہے۔ میرے لیے اس معصوم بے زبان جانور کے ساتھ خود کو رستم کے حملے سے بچانا مشکل تھا اگر رستم کے پیچھے اور دوسرے کتے بھی چھوڑ دیے جاتے تو راجا اور میں ان خونخوار درندوں کو ہاتھوں یا لاتوں سے مار کے دور نہیں رکھ سکتے تھے۔

بیک وقت ایک ہی خیال پر متفق ہوکے میں نے اور راجا نے اپنے اپنے ریوالور نکال لیے۔ ''اگر تم نے یہ بے وقوفی کی تو میں رستم کو گولی سے اُڑا دوں گا اور ضرورت پڑی تو تمہیں بھی۔ تمہیں اندازہ نہیں کہ میں کون ہوں۔''

''اور تجھے اندازہ نہیں بابو کہ تو کہاں کھڑا ہے۔'' مونچھوں والے دراز قد نے ایک گالی دے کے کہا۔ اس کے ساتھ ہی وہ جھکا اور اس نے کتے کو اپنی کمر کی بیلٹ سے منسلک زنجیر کی قید سے آزاد کردیا۔

میں تیزی سے ایک درخت کی اوٹ میں ہوگیا۔ شکاری کتا ایک جست لگا کے میری طرف آیا۔ اس نے گھوم کے درخت کے پیچھے آنے کی کوشش کی۔ میرے ریوالور نے

شعلہ اُگلا۔ ایک دھماکا ہوا اور پھر کتے کی وحشیانہ چیخ سنائی دی۔ گولی نے اس کا بھیجا پاش پاش کردیا تھا۔ نیچے گر کے چند منٹ پھڑ کتا رہا پھر ساکت ہوگیا۔

رستم کے اس غیر متوقع انجام نے سب کو سکتے میں ڈال دیا تھا۔ باقی حکم کے غلام جو منتظر تھے کہ انہیں بھی شکاری کتے ہم پر چھوڑنے کا اشارہ ملے، پتھر کے بت بنے کھڑے تھے۔

راجا نے ریوالور سے اشارہ کیا۔ ''تیرا رستم تو مارا گیا۔ چل اب تو خود آجا۔ تیری تو......'' راجا نے اسے جو گالی دی وہ طیش میں خود بخود اس کے منہ سے نکلی تھی۔

رستم کا رکھوالا آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ ''اوئے بابو! یہ تو نے کیا ظلم کردیا۔ رستم کو ماردیا۔''

میں نے کہا۔ ''اور میں کیا کرتا۔ اس کتے کو موقع دیتا کہ وہ میری بھی ہڈیاں چبالے۔''

وہ گھٹنوں کے بل رستم کی لاش پر جھک گیا اور اس کے مردہ جسم پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ ''اوئے ظالم! تو نے میرے رستم کو ماردیا۔ تجھے کیا پتا اس کی قدر کا۔''

میں نے کہا۔ ''کتا تو کتا ہی ہوتا ہے۔ گلی کا ہو یا شکاری اور اس کا نام رستم ہو یا ہیرو۔''

اس نے شعلہ بار نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''تجھے اس کی قیمت چکانی پڑے گی۔ تو رانا صاحب کو نہیں جانتا۔''

رانا کے نام پر میں نے اور راجا نے چونک کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر میں نے مسکرا کے کہا۔ ''لیکن تیرے رانا صاحب مجھے جانتے ہیں۔''

اس نے جیسے میری بات ہی نہیں سنی۔ ''رانا صاحب کا حکم ہے جو شکار خراب کرے اسے بھی شکار کرلو۔''

میں نے اس وقت تہذیب اور شرافت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس غلام ابن غلام ابن غلام سے اسی زبان میں بات کرنے کا فیصلہ کیا جو آسانی سے اس کی سمجھ میں آتی تھی۔

میں نے آگے بڑھ کر اس کی پسلیوں میں ٹھوکر رسید کی۔ ''کتے کی اولاد! اٹھ اپنے باپ کی لاش پر سے۔ تجھے پتا نہیں میں کون ہوں۔ کس کے سامنے بھونک رہا ہے تو۔ میں تین تک گنوں گا پھر تیری لاش ہی پڑی ہوگی یہاں۔''

مونچھوں والا درد سے بلبلایا اور ایک پسلی دبا کے دہرا ہوگیا۔ اس نے آہستہ آہستہ اٹھنے کی کوشش کی۔ اس کے دوسرے ساتھیوں نے جو کچھ فاصلے پر سخت خوفزدہ کھڑے تھے اسے واپس بلانے کی کوشش کی۔

''چل کاموا! ہم رانا صاحب کو بتادیں گے۔''

''تو واپس آجا۔ رانا صاحب خود نمٹ لیں گے اس سے۔''

میں نے کہا۔ ''ایک......'' پھر چند سیکنڈ کے وقفے سے کہا۔ ''دو......''

کاسو اٹھا۔ آگے بڑھا اور پھر رک گیا۔ ''میں کیا بتاؤں رانا صاحب کو۔ رستم کو کس نے مارا؟''

میں نے مسکرا کے کہا۔ ''ان سے کہنا رستم نے ست بدھائی کے نواب رفیق احمد شیرازی پر حملہ کرنے کی گستاخی کی تھی۔''

''یہ ہوسکتا ہے کہ اس گستاخی کا ذمے دار وہ تمہیں قرار دیں۔ اسے تمہاری غلطی اور بے وقوفی سمجھیں۔'' راجا نے کہا۔ ''رستم تمہاری وجہ سے مارا گیا۔''

میں نے کہا۔ ''رانا صاحب کی نظر میں اس کتے کی اوقات تم سے کہیں زیادہ ہوگی۔ جان بچانے کے لیے میں تمہیں ایک جھوٹ بولنے کی اجازت دیتا ہوں۔ تم یہ کہہ سکتے ہو کہ تم نے کچھ نہیں کہا۔ نواب رفیق احمد شیرازی نے خود رستم کے سامنے آنے کی غلطی کی تھی۔ اس کا شکار چھین لیا تھا۔''

''ہم اس جھوٹ کی تردید نہیں کریں گے۔ ہم کہیں گے کہ ایسا ہی ہوا تھا۔'' راجا نے کہا۔

میں نے کہا۔ ''جب ہم ایک خرگوش کی جان بچانے کے لیے یہ سب کرسکتے ہیں تو تم بہرحال ایک انسان ہو۔ نام یاد رہے گا نا۔ کیا بتایا تھا میں نے؟''

کاسو نے سر ہلا کے میرا نام دہرایا۔ ''نواب رفیق احمد شیرازی۔''

راجا نے کہا۔ ''ٹھیک ہے اب تم جاکر رانا صاحب کو بولنا کہ ہم سے مل لیں۔ ہم کتے کی قیمت ادا کردیں گے۔''

کاسو جاتے جاتے پھر رکا۔ ''نواب صاحب! اس جگہ سے چلے جاؤ۔''

''کیوں، کیا یہ تمہارے باپ کی زمین ہے۔'' میں نے کہا۔

راجا نے ریوالور اٹھایا۔ ''تم ہمیں دفع ہونے کا کہہ رہے ہو۔''

کاسو نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ رانا صاحب کا علاقہ ہے۔''

میں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑا کے کہا۔ ''اچھا، شاید ہم بھٹک کر اِدھر آگئے تھے۔ رانا صاحب کہاں ہیں؟''

اس نے ہاتھ کے اشارے سے واضح کیا۔ ''اُدھر دریا کے پار۔''

میں نے کہا۔ ''کیا ان کی زمین دریا کے دونوں طرف

ہے؟''

راجا بولا۔ ''یہ دریا ان کی زمین سے گزرتا ہے؟''

کاسو نے کہا۔ ''جی۔'' پھر سلام کے لیے ہاتھ اٹھایا اور واپس چل پڑا۔ اس کے ساتھ آنے والے بھی کتوں کو کھینچ کر واپس جانے لگے۔ غالباً اپنی جان بچانے کے لیے میں نے کاسو کو جس جھوٹ کی اجازت دی تھی اس نے کاسو کے دل میں میری عزت پیدا کر دی تھی۔

میں نے اپنی گود میں کانپنے والے خرگوش پر محبت سے ہاتھ پھیرا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ مر چکا ہے لیکن میں نے کاسو کے شکاری ٹولے کے سامنے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ جب وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے اور ان کی آوازیں بھی معدوم ہو گئیں تو میں نے خرگوش کے مردہ جسم کو رستم کے برابر لٹا دیا۔ شکار اور شکاری، حاکم اور محکوم، بندۂ صاحب و محتاج و غنی ایک ہوئے۔ تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے۔ ''ڈیتھ دی لیولر'' موت سب کو برابر کر دیتی ہے۔ پھر ہم اپنی جیپ کی طرف چلے گئے۔

راجا نے کچھ تشویش سے کہا۔ ''ہم نے دشمن کی سرزمین پر جا کے جارحیت کا ارتکاب کیا ہے نِکیے پتر۔''

''بے شک ہم نے دانستہ ایسا نہیں کیا لیکن ان کے نزدیک یہ جرم ہی ہوگا۔ کسی خرگوش کی زندگی بچانے کی بات ایک احمقانہ جذباتی جواز ہوگی۔''

''کم سے کم رانا کی نظر میں۔ اس کی نظر میں تو یہ غلام زادے بھی کسی حقیر جانور سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔ اشرف المخلوقات وہ صرف اپنے آپ کو سمجھتا ہوگا۔ ان سب کو حشرات الارض۔''

میں نے کہا۔ ''یہ بڑی خطرناک صورتِ حال ہے راجا! اب رانا چاہے گا کہ ہم رستم کی موت کی تلافی کریں۔ خود اس کی خدمت میں حاضر ہو کے اس تقصیر پر شرمندگی کا اظہار کریں اور معافی مانگیں باضابطہ۔ ہرجانہ یا جرمانہ جو وہ عائد کرے ادا کریں۔''

''ظاہر ہے یہ ناممکن ہوگا۔''

''اس کے بعد ہمارے درمیان باقاعدہ دشمنی کی بنیاد پڑ جائے گی۔ خطرناک بات یہ ہے کہ اس کی اور ہماری زمین کے درمیان کوئی فاصلے نہیں۔ کوئی نو مین لینڈ نہیں۔ انڈیا پاکستان کی طرح ہماری سرحدیں ملتی ہیں۔''

راجا بولا۔ ''دریائے کنہار اس کی زمین سے گزر کے آتا ہے لیکن ہماری زمین پر سے نہیں گزرتا۔''

''کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ پل بھی اس کی زمین پر ہے؟ اس کی زمین دریا کے دونوں طرف ہے تو کیا ست بدھائی کی حویلی کے دروازے تک ہے؟ کیا ہمارا راستہ اس کی زمین پر سے گزرتا ہے؟''

راجا نے کہا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ پل کے بعد پہاڑی کلب ہے اور سڑک ہے۔ وہ رانا کی ملکیت نہیں ہو سکتے۔ یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اس کی ملکیت کہاں تک ہے؟''

''لیکن یہ معلوم کرنا بہت مشکل ہوگا۔''

راجا نے کہا۔ ''اگر یہ ملکی قانون کے تحت سڑک، دریا، پل اور تمام وسائل آمد و رفت سرکاری ملکیت تصور ہوتے ہیں لیکن وہ ہمارے دریائے کنہار پر ڈیم بنانے کے پروجیکٹ کی راہ میں رانا حائل ہو سکتا ہے۔''

''نہیں، یہاں پہلے بھی اسمال ڈیم آرگنائزیشن والوں نے رہتاس میں ڈیم پلان کیا تھا۔ بعد میں وہ منصوبہ کسی وجہ سے سرد خانے میں چلا گیا یا ناقابلِ عمل قرار دے دیا گیا لیکن اس کے نہ بننے کی وجہ رانا کی طرف سے قانونی رکاوٹ نہیں ہو سکتی۔''

''ہاں، مگر وہ غیر قانونی رکاوٹ تو ڈال سکتا ہے۔''

ایک بار پھر ہم نے جیپ کو مخالف سمت میں موڑا اور اپنی حد کے اندر آگے بڑھنے کا راستہ تلاش کرنے میں کامیاب رہے، تاہم یہ احساس ایک سوال بن کے ساتھ رہا کہ کیا ہماری جیپ خطرے کے بارڈر پر چل رہی ہے؟ ابھی میں خود اپنی کیفیت کا تعین کرنے والے قانونی خطوط کے بارے میں واضح نہیں تھا تو میں رانا کی سرحد کا تعین کیسے کر سکتا تھا۔

جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے جاتے تھے، جنگل گھنا ہو رہا تھا۔ درختوں کے درمیان فاصلہ کم ہو رہا تھا اور ہمارے سر کے اوپر شاخوں اور پتوں کا پھیلاؤ ایک ایسی سرسبز چھت بن رہا تھا جس میں سے نیلا اجلا آسمان چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کی شکل میں دکھائی دیتا تھا۔ پھر یہ ٹکڑے بھی کم ہونے لگے اور اس کے نتیجے میں نیچے تک پہنچنے والی روشنی کم ہونے لگی۔ سایہ گہرا ہوتا چلا گیا اور یوں محسوس ہونے لگا جیسے یہ دوپہر کے بعد کا نہیں غروب آفتاب کے بعد کا وقت ہے۔

میرے لیے جیپ کو درختوں کے درمیان سے گزارنا مشکل سے مشکل تر ہونے لگا تھا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ ہم راستہ تلاش کرنے کے لیے بھٹکتے رہے جہاں سے جیپ کو نکالا جا سکے۔ ہر دس بیس گز کے بعد یہ مرحلہ سامنے آ جاتا تھا۔

اس گھنے جنگل میں ہزاروں بلکہ شاید لاکھوں درخت تھے۔ یہ سب شیشم کے درخت تھے جن کی لکڑی تعمیراتی مقاصد کے لیے اعلیٰ سمجھی جاتی تھی اور فرنیچر بنانے کے لیے

بھی۔ یہ دولت زمین کا تحفہ تھا اور ابھی تک اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جا سکا تھا۔

جیپ ایک جگہ بند ہو کے رکی تو میرے کانوں نے ایک آواز سنی۔ یوں جیسے وقفے وقفے سے کوئی درخت پر کلہاڑے سے وار کر رہا ہو۔ میرا ہاتھ جو پھر انجن کو اسٹارٹ کرنے والا تھا، رک گیا۔ گھنے جنگل میں خاموشی کا راج تھا۔ اس خاموشی کا تاثر کبھی کبھی سنائی دینے والی مختلف پرندوں کی آواز سے مجروح ہوتا تھا۔

میری سوالیہ نظروں کے جواب میں راجا نے کہا۔ ''شاید کوئی درخت کاٹ رہا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے بھی حیرت تھی کہ ان لاوارث درختوں پر کسی ٹمبر مافیا کے ٹھیکے داروں کی نظرِ کرم کیوں نہیں ہوئی جس نے مری سے کاغان تک پہاڑوں کو ننگا کر دیا ہے۔''

''چوری تو یہاں بھی جاری ہو گئی لیکن ابھی تک چھوٹے چور اکیلے ہوں گے۔ چل ہم دیکھتے ہیں۔'' راجا نے کہا۔ ''یہ کام تو ہماری حدود میں ہو رہا ہے۔''

یہ ہو سکتا تھا کہ ہم ان مجرموں کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیتے ہیں۔ کامیاب ہو جاتے جو دن دہاڑے درخت چوری کر رہے مگر ایک معمولی سے واقعہ نے خرابی پیدا کر دی۔

جنگل میں حشرات الارض کے علاوہ ہر قسم کے رینگنے والے جانوروں کی بہتات تھی۔ گلہریاں درختوں پر دوڑتی نظر آتی تھیں۔ زمین پر چھپکلی کی نسل کے سارے جانور افراتفری میں بھاگتے دکھائی دیتے تھے۔ ان میں گرگٹ، گوہ، جنگلی چوہے اور نیولے تک سب شامل تھے۔ ایک جگہ مجھے تین چار فٹ لمبا اور میری کلائی سے موٹا سانپ بھی نظر آیا لیکن وہ راستہ کاٹ کے سیدھا گزر گیا۔

میں راجا کے ساتھ جانے کے لیے جیپ سے اتر رہا تھا کہ اچانک اوپر سے کوئی چیز گری۔ اس کے ساتھ ہی راجا نے چلّا کے میرا نام لیا اور پھر فائر کر دیا۔ میں اُچھل کے پلٹا تو مجھے اپنی سیٹ پر ایک سانپ بل کھاتا دکھائی دیا۔ راجا نے اس کا سر اڑا دیا تھا۔ یہ سات آٹھ فٹ لمبا اور میری پنڈلی سے موٹا سیاہ کینچلی والا سانپ تھا۔

راجا نے کہا۔ ''تو بچ گیا نِکیے پتر! ایک سیکنڈ کے فرق سے ورنہ سانپ سیدھا تجھ پر گرتا۔ یہ اوپر سے لٹکا تھا۔''

میں نے خوف کی سرد لہر کو جسم میں اترتا محسوس کیا۔ اگرچہ مجھے بھی معلوم تھا کہ تمام سانپ زہریلے نہیں ہوتے لیکن عام آدمی کی طرح میں بھی زہریلے اور بے ضرر سانپوں میں تفریق نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے سانپوں کی قطعی پہچان نہ تھی۔ میرے نزدیک تو وہ بھی کوبرا تھا۔

راجا نے سانپ کی دم پکڑ کے کھینچا اور اسے نیچے ڈال دیا۔ ابھی تک اس میں جان باقی تھی۔ اس کے خون سے سیٹ خراب ہو گئی تھی۔ میں نے اوپر والے درخت کی اس شاخ کو دیکھا جس سے لٹک کے سانپ نے مجھے ڈسنے کی کوشش کی تھی۔ خطرے کا احساس اب کئی گنا بڑھ گیا تھا۔ پورے جنگل میں نہ سہی اس جگہ سانپ پائے جاتے تھے جہاں ہم انجن کے اتفاقیہ بند ہو جانے سے رکے تھے۔

درخت پر کلہاڑی کے وار کی آوازیں اب نہیں آ رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ فائر کی آواز نے درخت کاٹنے والوں کو چوکنا کر دیا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ بھاگ گئے ہوں۔ میں نے سیٹ کور ہٹا دیا اور اس کی جگہ ایک نٹ بیٹ رکھ کے جیپ کو پھر اسٹارٹ کیا۔

ہمیں اس جنگل میں دو گھنٹے صرف ہو گئے تھے۔ مجھ پر اب تھکن غالب آ رہی تھی۔ ہوا میں درختوں سے خارج ہونے والے بخارات کے باعث حبس تھا اور ہمارے کپڑے پسینے سے بھیگ رہے تھے۔ ہم اپنے ساتھ چائے کافی تو کیا پینے کا پانی تک نہیں لائے تھے۔

راجا نے گھڑی دیکھی۔ ''ساڑھے تین، وقت دیکھ کر تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں بھوک سے فوت ہو جاؤں گا۔''

''واپس گئے تو پھر دو گھنٹے لگ جائیں گے۔ آگے چلتے ہیں۔''

''نہیں یار، یہاں سے نکل ورنہ خرگوش کے بعد شکاریوں ... اور پھر سانپ سے تو ملاقات میں جان بچ گئی۔ آگے آدم خور شیر نہ مل جائے۔''

''شیر اب صرف چڑیا گھر میں رہتا ہے۔ بیف کھاتا ہے۔''

''پھر اسے اجازت کیوں نہیں کہ انسانوں کے ساتھ گھومے پھرے۔'' راجا نے ایک منطقی سوال اٹھایا۔ ''اگر وہ آدم خور نہیں ہے تو ڈر کیسا۔ اسے بند کیوں کیا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''تو کیا شیر کا وکیل ہے؟ وہ خود اعتراض اٹھا سکتا ہے۔''

اب جیپ کے لیے راستہ کشادہ ہونے لگا تھا۔ جنگل پہلے جیسا گھنا نہیں رہا تھا تو روشنی بھی بڑھ گئی تھی۔ دس منٹ بعد ہم مشرق کی طرف طلوع ہوئے جہاں زمین ہموار تھی اور کاشت کے قابل تھی۔ آثار بتاتے تھے کہ اکتوبر میں پک جانے والی فصل کاٹ لی گئی ہے اور زمین کو دم لینے کے لیے

کھلا چھوڑ دیا گیا ہے۔

کٹائی کے دوران میں گر جانے والے گندم کے دانوں پر ہر قسم کے پرندوں نے یلغار کر رکھی تھی۔ وہ ہمیں دیکھ کر پھر سے اڑ گئے۔ اب ہمارے سامنے ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جس میں مشکل سے سو گھر ہوں گے۔ یہ سب مٹی گارے کی دیواروں اور گھاس پھوس کی چھت والے کچے مکان تھے۔ واحد پختہ عمارت ایک چھوٹے سے مینار والی مسجد تھی جس کو عبادت گزاروں نے خود بنایا سنوارا تھا۔ اس پر سفیدی کا اجلا رنگ دھوپ میں چمک رہا تھا۔

ہم سے دو سو گز کے فاصلے پر کنواں تھا۔ اس میں سے رہٹ چلا کے پانی نکالا جا رہا تھا۔ ایک مریل سا بیل سرکاری ملازمت کے انداز میں گھومنے کا فرض پورا کر رہا تھا۔ رہٹ کے ڈول سے گرنے والا پانی بہہ کر ایک تالاب میں جمع ہو رہا تھا۔ وہاں چند عورتیں کپڑے دھونے اور نہانے میں مصروف تھیں۔ دس بارہ سال تک کی عمر کے چند ننگ دھڑنگ لڑکے جو ابھی مرد شمار نہیں ہوئے تھے پانی میں کھیل رہے تھے۔

عورتوں نے جیپ سے مجھے اور راجا کو اترتے دیکھ کر چیخ پکار مچا دی۔ وہ اپنے معمول کے مطابق بہت محفوظ اور باپردہ مقام پر نہا دھو رہی تھیں۔ دہاں کی عورتیں آپس میں شرم و حیا کے تکلف کی قائل نہ تھیں چنانچہ سب نے وہ کپڑے بھی اتار دیے تھے جو وہ گھر سے پہن کر آئی تھیں۔ ان کے پاس کپڑے کم ہونے کی وجہ سے وہ تن کے جوڑے کو پہلے دھو کے پھیلا دیتی تھیں۔ پھر دوسرے کپڑے دھوتی تھیں اور جب تک نہا دھو کے فارغ ہوتی تھیں ان کے اپنے کپڑے سوکھ چکے ہوتے تھے۔ وہ انہیں پھر پہن کر بچوں سمیت گھر کی راہ لیتی تھیں۔

ان کے نہانے دھونے کی جگہ الگ اور خاصی محفوظ تھی۔ مقامی مرد خود اُدھر سے گزرنے سے اجتناب کرتے تھے اور یہ کوئی گزرگاہ عام بھی نہ تھی۔ انہیں گھنی جھاڑیوں کا ایک جھنڈ تحفظ اور تخلیہ فراہم کرتا تھا۔ اس وقت بھی کنویں سے پچاس قدم کے فاصلے پر گاؤں کے کچھ مرد چارپائیں ڈالے سو رہے تھے یا باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ فصل کٹ جانے کے بعد یہ ان کے لیے کام سے فراغت کے دن تھے۔ عورتوں کے چلانے پر سونے والے بھی اٹھ گئے۔ حقہ پینے والے اور تاش کھیلنے والے سب ایک ساتھ اٹھے اور ہماری طرف لپکے۔

ایک بوڑھی عورت جس نے پورے کپڑے پہن رکھے تھے، گالیاں بکتی ہماری طرف آئی۔ ''اوئے بے غیرتو! شرم نہیں آتی تمہیں۔ گھر میں ماں بہن کو بھی ایسے ہی تاکتے ہو جب وہ نہاتی ہیں۔'' اس کی زبان بڑے فراٹے سے چل رہی تھی۔ دیگر خواتین اتنی دیر میں گیلے کپڑے پہن چکی تھیں یا پانی میں چھپ گئی تھیں۔

میں نے راجا سے کہا۔ ''ابے یہ کدھر نکل آئے ہم۔''

''یار، ہمیں کیا معلوم تھا۔ چل اب جیپ کو موڑ لے۔''

لیکن اس وقت تک دیر ہو چکی تھی۔ خواتین کی عزتوں کے رکھوالے مرد خطرناک جارحانہ انداز میں ہماری جانب بھاگے چلے آ رہے تھے۔ دو کے ہاتھ میں لاٹھیاں تھیں۔ ایک کے پاس چمکدار پھل اور لمبی ڈنڈی والی کلہاڑی تھی اور چوتھا اسی حقے کو بطور ہتھیار استعمال کرنے پر کمربستہ تھا جسے وہ تھوڑی دیر پہلے گڑگڑا رہا تھا۔ وہ بوڑھا تھا لیکن باقی تین جوان تھے۔ دو کم عمر کے لڑکے درخت کی سوکھی شاخیں تلوار کی طرح لہراتے شہری نوجوانوں کی بے شرمی کے خلاف جہاد میں شرکت کے لیے پیچھے پیچھے چلاتے آ رہے تھے پھر انہوں نے بہتر سمجھا کہ پتھر مار کے اس کار خیر کا آغاز کریں۔ بڑھا پہلے ہی اشتعال انگیزی کر رہا تھا کہ ان شہری بابوؤں کی فلاں کو فلاں کروں۔ آخر کیا سمجھ رکھا ہے انہوں نے گاؤں والوں کی بہو بیٹیوں کی عزت کو۔

میں نے جیپ روک لی تھی۔ اب ہم زنانہ واش روم والے علاقے سے ایک سو اسی درجے کے زاویے پر گھوم چکے تھے اور پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھ رہے تھے لیکن ارتکاب جرم کر چکے تھے۔ میں نے ہاتھ اٹھا کے حملہ آوروں کو روکنے کی کوشش کی۔ انہیں چلا کے یہ سمجھانا چاہا کہ ہم راستہ نہ جاننے کے سبب وہاں آ نکلے تھے اور اپنی غلطی پر شرمندہ ہیں بہرحال لیکن وہ سننے کے موڈ میں بھی نہ تھے۔

لڑکے جیپ پر پتھر پھینک رہے تھے اور لاٹھی بردار ہمارا سر پھاڑنے کے موڈ میں تھے تو کلہاڑی والا شاید ہماری گردن اتارنا چاہتا تھا۔ میں نے اور راجا نے گھوم کے جیپ کے پیچھے پناہ لی اور پھر انہیں سمجھانا چاہا۔ میں نے دھاڑ کے ان کو خبردار کیا۔ راجا نے بھی روکا مگر بات نہ بنی۔

اس کے بعد ہمارے لیے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ ہم ریوالور نکالیں۔ راجا نے ایک ہوائی فائر کیا۔ دوسرا فائر میں نے کیا اور اس آتشیں زبان کا مطلب فوراً ان کی سمجھ میں آ گیا۔ وہ ایک دم پلٹ کے بھاگے۔ خواتین میں چیخ و پکار کے ساتھ آہ و بکا بلند ہوئی۔ غالباً انہوں نے فرض کر لیا کہ عزتوں کے محافظ ادائے فرض میں شہید ہوئے۔

میں نے سکون کا گہرا سانس لیا۔ ''کیا مصیبت ہے

راجا! شرافت کی زبان کوئی سمجھتا ہی نہیں۔ پہلے دہ کا سو، پھر دہ سانپ اور اب یہ۔''

راجا نے ریوالور کو واپس جیب میں رکھ لیا۔ ''قصور ان کا نہیں ہے یار! اشتعال انگیزی ہم نے کی تھی۔''

میں نے بھی ریوالور جیب میں ڈالا اور پسپا ہونے والوں کی طرف بڑھا جواب بھی ہمیں کھا جانے والی نظروں سے گھور رہے تھے۔ میں نے ہاتھ اٹھا کے اپنے پُرامن دوستانہ عزائم کا اظہار کیا اور انہیں قریب بلا لیا مگر وہ اپنی جگہ کھڑے رہے۔

نزدیک جا کے میں نے بوڑھے سے کہا۔ ''چاچا! یہ تو بڑی غلط بات ہے۔ کسی اجنبی سے بات کیے بغیر اس پر چڑھائی کر دی جائے۔''

بڈھے نے برہمی سے کہا۔ ''اوئے! ہم بے غیرت نہیں ہیں تم شہر والوں کی طرح۔''

میں نے دھاڑ کے کہا۔ ''بکواس بند کرو اپنی، کیا ہم شکل سے بدمعاش لگتے ہیں۔''

ایک نوجوان آگے آیا۔ ''آخر کون ہو تم؟ یہاں کیا کر رہے ہو؟''

میں نے ہاتھ کے اشارے سے پوچھا۔ ''یہ حویلی دیکھی ہے تم نے؟ اکبر خان کو جانتے ہو۔ جانو کے بیٹے کو اور کبیر خان کو۔ وہ سب ملازم ہیں۔ میں مالک ہوں اس حویلی کا اور اس زمین کا جس پر یہ کنواں ہے اور تم فصلیں اُگا رہے ہو۔''

ایک دم ان سب کو سانپ سونگھ گیا۔ عورتیں جو پیچھے سے شور مچا کے مطالبہ کر رہی تھیں کہ ہمیں زندہ گاڑ دیا جائے اور بار بار ہماری ماں بہنوں کے حوالے سے اشتعال انگیز سوالات اٹھا رہی تھیں، یکلخت خاموش ہو گئیں۔ سب کی نظریں مجھ پر مرتکز تھیں اور انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ اب مجرم ہم نہیں وہ ہیں اور ان کا جرم ناقابل معافی ہونے کی حد تک سنگین ہے۔ انہوں نے مالکوں پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔

میں نے کہا۔ ''تم سے بھی نادانستگی میں غلطی ہوئی اس لیے میں تمہیں معاف کرتا ہوں۔''

راجا نے کہا۔ ''معافی ہم نے بھی مانگی تھی مگر تم لوگ سننے کے موڈ میں نہیں تھے۔''

میں نے مکمل خاموشی میں جیسے اپنی حاکمیت کا اعلان کیا۔ ''میرا نام ہے نواب رفیق احمد شیرازی۔''

مجھے خود کو زمین کا مالک، حاکم یا نواب کہتے ہوئے شرم آتی تھی مگر میں مجبور تھا۔ جہاں اپنی بات منوانے کی اور کوئی صورت نہ ہو وہاں اپنی طاقت کے حوالے سے بات کرنی

پڑتی ہے۔ یہ ذہنی طور پر اطاعت پسند لوگ تھے اور جاہل بھی تھے۔

میرے اعلان کے ساتھ ہی صورت حالات میں زبردست انقلاب آیا۔ سب سے پہلے جو بوڑھا اپنا حقہ پھینک کے آگے بڑھا اور اس نے ہاتھ جوڑ کے معافی مانگی۔ ''مالک! غلطی ہوگئی۔'' پھر اس نے میرے پاؤں پکڑنے کی کوشش بھی کی۔ میں نے اس کے ہاتھ پکڑ لیے۔

''چلو چاچا جی! غلطی کی معافی ہم نے بھی مانگ لی اور تم بھی، بات ختم......''

اب نوجوان آگے آئے اور ہمیں بڑی عزت سے اپنے ساتھ لے جا کے چارپائی پر بٹھا دیا پھر وہ خود پیچھے بیٹھ گئے۔ جتنی دیر میں ہم نے اپنی پوزیشن واضح کی اور بتایا کہ ہم اِدھر کیوں اور کیسے آئے ہیں، ہمارے لیے گاؤں سے لسی آ گئی۔ اس خبر نے ہر گھر میں سنسنی پھیلا دی تھی کہ مالک آئے ہیں۔ ان پر حملے کی غلطی اور ان کی فائرنگ کے بعد پیش آنے والے واقعات کی خبر تیزی سے گھر گھر پھیل رہی تھی۔ کچھ دیر بعد ہی یہ اطلاع بھی ملی کہ اب ہماری ضیافت کے خصوصی انتظامات کیے جا رہے ہیں۔

میں نے بوڑھے کو سختی سے منع کیا۔ ''دیکھو چاچا! یہ کھانے پینے کا سلسلہ چلتا رہے گا بعد میں۔ نہ ہم کہیں جا رہے ہیں نہ تم جا رہے ہو۔ ابھی ہم اپنے علاقے کو دیکھنے آئے ہیں۔ ہمیں راستوں کا بھی کچھ اندازہ نہیں تھا اس لیے بھٹکتے ہوئے یہاں آ گئے۔''

بوڑھے نے کہا۔ ''ہم سے بڑی بھول ہوئی مالک!''

میں نے کہا۔ ''چلو اب اس بھول کو بھول جاؤ۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تمہاری عمر کیا ہے اور کب سے تم یہاں ہو لیکن اس سے پہلے مجھے اس گاؤں کا نام بتاؤ۔ کیا یہ پنڈ سخاوت ہے؟''

''جی مالک! یہ پنڈ سخاوت ہی ہے۔'' ایک نوجوان نے کہا۔

بوڑھے نے اسے دخل در معقولات پر گھورا۔ ''اوئے! جب بڑے بات کر رہے ہوں تو چھوٹوں کو منہ بند رکھنا چاہیے۔ مالک عمر تو میری کچھ اوپر چالیس ہے۔''

''چاچا اپنی بات پر بیس سال سے قائم ہے۔'' کسی نے تبصرہ کیا تو لوگ ہنس پڑے۔ ''مرتے دم تک قائم رہے گا۔''

چاچا نے برہمی سے کہا۔ ''یہ کون بکواس کر رہا ہے۔''

سچ بولنے والے نے زیادہ ہمت سے کام لیا۔ ''کیوں جب اپنے جنرل ضیاالحق صاحب کے جہاز کو گرایا گیا تھا تو کیا کہا تھا تو نے سب کے سامنے؟ یہی نا کہ تو کچھ اوپر چالیس کا ہے۔ اٹھارہ سال ہو گئے۔''

کوئی اور بولا۔ ''ہاں، اس دن تیری دوسری شادی کی بات چل رہی تھی۔''

میں نے اس سلسلے کو وہیں روک دیا۔ ''پنڈ سخاوت، یہاں کوئی پڑھا لکھا بندہ ہے۔''

چاچا کی عمر کو چیلنج کرنے والے نوجوان نے کہا۔ ''جناب عالی! اسکول ماسٹر ہے گل شیر، ریٹائرڈ ہے۔ ایف اے پاس ہے، بی اے کہتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''کیا وہ یہاں آ سکتا ہے؟''

''بالکل آ سکتا ہے جناب عالی! چنگا بھلا ہے۔'' نوجوان بولا۔

دوسرے نوجوان نے کہا۔ ''بس ذرا اونچا سنتا ہے اور انگریزی بہت بولتا ہے۔''

پیچھے سے ایک بارہ، چودہ سالہ تماشبین کو کھینچ کر آگے لایا گیا جو نوجوان کی بغل میں سے اجلاس کی کارروائی دیکھ رہا تھا۔ نوجوان نے اس کے پیچھے ایک دھپ رسید کر کے اس کا رُخ گاؤں کی طرف کیا۔ ''جا اوئے! ماسٹر کو اٹھا لا۔'' نوعمر قاصد اس کے باوجود آہستہ آہستہ بے دلی سے گیا۔

میں نے کہا۔ ''یہ اٹھا لانے کی بات تو تھانیدار کرتے ہیں۔''

نوجوان بولا۔ ''اٹھانا تو پڑے گا جی، اس وقت وہ سو جاتا ہے۔''

دوسرے نوجوان نے اضافہ کیا۔ ''تیسری بیوی کے ساتھ۔''

بوڑھا جو حقے کو بطور اسلحہ استعمال کرتے ہوئے ہمیں مارنے دوڑا تھا، اب معاملات نوجوانوں کے ہاتھ میں پا کے پیچھے ہٹ گیا تھا اور غصے میں ٹھنڈا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ میں نے اور راجا نے لسی سے بھرے ہوئے گلاس خالی کرنے کی جدوجہد جاری رکھی۔ وہ گلاس دو لیٹر والی منی بالٹی جیسے تھے۔ راجا نے آخری گھونٹ لینے کے بعد کہا۔ ''مجھے یوں لگتا ہے جیسے میں پریگنینٹ ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''میں بھی...... میرا غالباً ٹوئن کیس ہے۔''

ماسٹر گل شیر ایک دلچسپ کردار ثابت ہوا۔ اس کی عمر تو یقیناً ساٹھ سال سے زائد ہوگی لیکن اس کی کاٹھی مضبوط تھی۔ وہ سیدھا چلتا تھا۔ ہم سے ملنے کے لیے وہ بڑے اہتمام سے سفید شلوار قمیص اور سیاہ واسکٹ کے علاوہ جناح کیپ کے سرکاری تقریب والے لباس میں آیا تھا۔ ٹوپی کے پیچھے جو بال نظر آ رہے تھے وہ سیاہ تھے تو یہ ہیئر کلر کا کرشمہ تھا۔ اس کی

نظر خاصی کمزور ہوگی۔ اس کا اندازہ سیاہ فریم والی عینک کے شیشوں کی موٹائی سے ہو جاتا تھا۔ گزرے ہوئے وقت کی ایک عادت چھڑی کی صورت میں اس کے ساتھ تھی۔

راجا اور میں ایک استاد کو تعظیم دینے کے لیے کھڑے ہوئے تو اس کا چہرہ خوشی سے چمکنے لگا اور اس نے بڑے فخریہ انداز میں حاضرین کی طرف دیکھا جن کی تعداد اب پہلے سے زیادہ ہو گئی تھی۔ اگرچہ سہ پہر تقریباً گزر چلی تھی لیکن اس نے ہاتھ بڑھا کے کہا۔ ''گڈ مارننگ سر! ماسٹر گل شیر بی اے۔''

میں نے ہاتھ ہلا کے کہا۔ ''میرا نام ہے رفیق اور یہ راجا ہیں۔ آپ پلیز ہمیں سر نہ کہیں، ہمیں شرمندگی ہوتی ہے۔''

''جناب عالی! اس نے کچھ نہیں سنا ہوگا۔'' ایک نوجوان نے کہا اور پھر لاؤڈ اسپیکر کی طرح میری بات ماسٹر کے کان تک پہنچانے کی کوشش کی۔

ماسٹر نے سخت خفگی ظاہر کی۔ ''اوئے جاہل! کیوں گلا پھاڑ رہا ہے۔ یہ دیکھ، کیا ہے یہ؟ ہیرنگ ایڈ کہتے ہیں اسے۔ آئی سمجھ شریف میں؟''

نوجوان شرمندہ ہی نہیں سخت حیران بھی ہوا۔ غالباً حاضرین نے ماسٹر کو اس عظیم سائنسی ایجاد کے ساتھ پہلی بار دیکھا تھا جس کی مدد سے وہ عام لوگوں کی طرح ہر آواز سن رہا تھا۔

چند رسمی جملوں کے بعد میں نے پوچھا۔ ''ماسٹر صاحب! آپ تو اسی گاؤں کے رہنے والے ہیں۔''

''ہاں جی، ہم پیدا ہی یہاں ہوئے تھے۔ دفن بھی یہاں ہوں گے، اگر اللہ کو منظور ہوا۔''

میں نے کہا۔ ''اس کا نام پنڈ سخاوت کیسے پڑ گیا۔ کیا یہاں کے لوگ بہت سخی ہیں؟''

''سخاوت شاہ آپ کے بزرگوں میں سے کسی کا منشی تھا۔ اسے اور چند کارندوں کو یہاں رہنے کی اجازت ملی تھی۔ آج یہ لوگ یہاں آباد ہیں، انہی کی اولاد میں ہیں۔ آپس کے رشتوں کا دستور آج بھی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اب کتنے گھر ہیں یہاں؟''

''گھر ہوں گے اسی بیاسی۔ آبادی پوچھو تو شاید چار سو سے اوپر لیکن آپ جا کے دیکھو گے تو اس میں آدھے سے زیادہ بوڑھے نظر آئیں گے میرے جیسے۔ ایک چوتھائی آبادی ادھیڑ عمر لوگوں کی ہے جو بوڑھے ہو رہے ہیں، نوجوان نہیں ہیں، بچے نہیں ہیں۔ ہاں جوان لڑکیاں بیٹھی ہیں گھروں میں۔''

میں نے کہا۔ ''اس کی کیا وجہ ہے؟''

''وجہ......'' وہ سوچ کے بولا۔ ''دِلی کیا کرے گا یہاں رہ کے۔ کیا ہے یہاں، پرانے مالک بھی کبھی آتے تھے۔ انہوں نے اجازت دے رکھی تھی کہ جس کے پاس جتنی زمین ہے اس پر کاشت کرے اور فصل کی ساری پیداوار اپنے پاس رکھے۔''

''پھر کیا مسئلہ تھا؟''

''مسئلہ یہ تھا جناب کہ ہر گھر میں دو کے چار اور چار کے آٹھ افراد ہوتے جاتے تھے۔ پندرہ بیس برس میں ایک خاندان ایک کنبہ بن جاتا تھا مگر زمین اتنی ہی رہتی تھی اور اس کی پیداوار بھی۔ وہ زمین سب کا پیٹ تو نہیں بھر سکتی تھی۔ نوجوان محنت مزدوری کرنے کے لیے نکل گئے شہروں کی طرف۔ کچھ بیویوں کو چھوڑ گئے، کچھ ماں باپ اور بھائی بہن کو، یہاں نہ روزگار ہے اور نہ کوئی زندگی کی سہولت پھر یہ تو ہونا ہی تھا۔ پیچھے رہ گئے انتظار کرنے والے بوڑھے۔ اب بھی کیا ہوتا ہے، چودہ پندرہ سال کا لڑکا گھر چھوڑ جاتا ہے۔ کچھ دن خیال رکھتا ہے ماں باپ کا پھر بھول جاتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''بچے تعلیم حاصل کرنے کہاں جاتے ہیں؟''

''لو جی! تعلیم کی ضرورت کسے ہے۔'' وہ تلخی سے بولا۔ ''سب سے قریبی اسکول بھی ٹیلہ جوگیاں میں ہے۔ اتنی دور کون آئے جائے اور پھر تعلیم کا خرچ، کتابیں کاپیاں، یونیفارم، جوتے، یہ سب کہاں سے آئیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''آپ نے بھی تو پڑھا اور پھر پڑھاتے رہے۔''

''میں بھی گیا تھا محنت مزدوری کے لیے۔ ایک شریف آدمی نے دکان پر رکھ لیا۔ اس کی اولاد نہیں تھی، مجھے پڑھا لکھا دیا پھر وہ مر گیا اور اس کے رشتے داروں نے مجھے مار کے گھر سے نکال دیا۔ میں دینہ کے گورنمنٹ اسکول میں پڑھانے لگا۔ اس وقت میٹرک تھا پھر ایف اے اور بی اے پرائیویٹ کر لیا۔ جب پنشن ہوگئی تو لوٹ آیا گھر۔ ایسا بہت سے بدنصیبوں نے کیا۔ ایک چپراسی تھا۔ دو فوج میں رہے۔ بوڑھے ہو کر واپس آئے۔ ان کے بچے ساتھ نہیں آئے۔ اب یہ بوڑھوں کی بستی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''آپ انہیں پڑھا سکتے تھے۔''

''وہ تو میں پڑھاتا ہوں۔ دو چار بچے روز آتے ہیں لیکن ان کے پاس کچھ نہیں ہوتا۔ نہ کتاب نہ کاپی، سلیٹ اور تختی تک نہیں۔ میں بلیک بورڈ پر لکھتا ہوں، وہ یاد کر لیتے

ہیں۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ بڑے ہوں گے تو وہ بھی نکل جائیں گے کمائی کرنے۔"

"مجھے کچھ نوجوان نظر تو آرہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ہاں کچھ ہیں نکمے، ہڈحرام جو محنت مزدوری ہی کرنا نہیں چاہتے۔ بس آوارہ گردی کرتے ہیں اِدھر اُدھر۔ ان کے کرنے کے لیے کوئی کام بھی نہیں ہے۔ کچھ دور دراز کے گاؤں سے کوئی مرغی پکڑ لاتے ہیں یا بکری، کئی پکڑے بھی جا چکے ہیں۔ پولیس چند دن چھترول کر کے چھوڑ دیتی ہے۔ ان کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔ بالآخر بوڑھے ہو جائیں گے۔ جو بچے ہیں بڑے ہو کے نکل جائیں گے۔ گاؤں خالی ہو جائے گا۔"

ماسٹر کے پیچھے اب کافی لوگ کھڑے تھے لیکن کسی نوجوان نے اس کی تردید نہیں کی۔ بوڑھے خاموش کھڑے رہے۔ مجموعی فضا اتنی مایوس اور سوگوار ہو گئی تھی کہ مجھے بھی افسوس ہونے لگا۔ مجھے اپنی ہر امید خاک میں ملتی نظر آتی تھی کہ ان لوگوں کو روزگار کے مواقع فراہم کر کے میں ان کی زندگی بدل سکتا ہوں۔ وہ کوئی بھی کام کرنے کے اہل نہ تھے۔ نہ ان کے پاس تعلیم تھی اور نہ کوئی ہنر۔ چھوٹی موٹی مزدوری کے سوا وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ وہاں موجود سب لوگ مجھ سے کچھ توقعات رکھتے ہیں۔ جیسے رعایا کسی نئے حکمران سے امیدیں وابستہ کر لیتی ہے کہ شاید وہ ان کی زندگی کے روز و شب کو بدل دے۔ قدرت کی یا قسمت کی مہربانی سے جو شاہی خزانہ اسے ورثے میں ملا ہے اس میں سے خوشحالی کی کچھ خیرات ان کی جھولی میں بھی ڈال دے۔ عزت وہ اب بھی دے رہے تھے مگر خراج میں دینے کے لیے ان کے پاس کچھ نہ بچا تھا۔

لوگوں کی نظریں مجھ پر تھیں۔ ماسٹر نے مجھے سب بتا دیا تھا جو سچ تھا اور اس سچ میں ان سب کی زندگی کی تصویر تھی جو ست بدھائی کے اندر رہتے تھے۔ یہ اس جاگیر کی حدود میں واقع واحد گاؤں تھا جس کے رہنے والے شاید ایک صدی سے اس زمین کے ساتھ اپنی وفاؤں کا رشتہ نبھا رہے تھے لیکن اب ان کی ہمت جواب دے چکی تھی کیونکہ ان کا کوئی والی وارث اور سرپرست نہ تھا۔ انہیں سہارا دینے والا اور سنبھالنے والا کوئی نہ تھا۔

اپنی ذمے داری کا احساس ہو جانے کے بعد میں خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔ میں نے کہا۔ "ماسٹر صاحب! آپ کی بڑی مہربانی کہ آپ نے مجھے یہ سب بتا دیا۔ اب میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اب میں اس جگہ کا مالک ہوں لیکن میں یہاں گھومنے پھرنے اور احکامات جاری کرنے نہیں آیا ہوں۔ میں یہاں آپ سب کے درمیان رہوں گا۔ اللہ نے توفیق دی تو میں یہاں بہت کچھ کروں گا۔ میں نے سوچا ہے کہ یہاں فیکٹری لگاؤں گا۔ اس میں فرنیچر بنے گا۔ میں یہاں گائے، بھینسیں اور بھیڑ بکریاں پالنا چاہتا ہوں بہت وسیع پیمانے پر۔ ان کا دودھ پیک کیا جائے گا۔ دودھ سے کریم اور مکھن نکالا جائے گا۔ انشاء اللہ یہاں دریائے کنہار پر ایک بجلی گھر بنے گا۔ میرے ساتھ وہی لوگ کام کریں گے جو ست بدھائی کے رہنے والے ہیں۔ پہلا حق ان کا ہوگا۔ میں ان کے رہنے کے لیے گھر بناؤں گا۔ ہر گھر میں بجلی ہوگی۔ یہاں اسکول ہوگا اور اسپتال ہوگا بہت جلد!"

میری سیاسی تقریر کا ردِعمل وہی ہوا جو ستر کی دہائی سے پہلے بھٹو کی روٹی، کپڑا اور مکان کے نعرے کا ہوا تھا۔ جذبات کی رو میں بہہ جانے والے یکلخت میرے گرد جمع ہو گئے۔ ان کی امیدیں اور ان کے خواب ان کی آنکھوں میں روشن تھے اور ایسا لگتا تھا جیسے امید کا اجالا پورے گاؤں میں پھیل گیا ہے۔ نئے بادشاہ نے نئی زندگی کی جو نوید دی تھی، لوگوں نے اس پر اعتبار کر لیا تھا۔ اب وہ میرے ہاتھ چوم رہے تھے اور ہاتھ اٹھا کے مجھے دعائیں دے رہے تھے۔

جب ہم یہاں نازل ہوئے تھے تو جذبات کیا تھے اور اب کیا ہو گئے تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے لوگوں کو سمجھا بجھا کے پیچھے ہٹایا۔ راجا اس جذباتی انقلاب پر دم بخود کھڑا رہا۔ وہ خود جذباتی ہو رہا تھا۔

میں نے کہا۔ "ماسٹر صاحب! آپ کسی دن وقت نکالیے۔ آپ کی یہاں کے حالات پر گہری نظر ہے۔ مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہوگی۔"

ماسٹر خوشی سے پھول گیا۔ "آپ حکم کریں جناب! میں ہر خدمت کے لیے حاضر ہوں۔"

میں نے کہا۔ "ابھی مجھے جانا ہے۔ آپ سے پھر تفصیلی گفتگو ہوگی۔"

جب ہم سب سے مصافحہ کر کے رخصت ہوئے تو شام ہو رہی تھی۔ جیپ روانہ ہوئی تو راجا چپ تھا مگر کچھ آنے کے بعد اس نے کہا۔ "رفیق صاحب! یہ کیا حماقت فرمائی آپ نے؟"

اس کے لہجے کی ناراضی پر میں حیران ہوا۔ "کیا؟"

"اس شعبدہ بازی کی کیا ضرورت تھی۔" وہ خفگی سے بولا۔

"اگر تیری مراد اس تقریر سے ہے......"

اس نے میری بات کاٹ دی۔ "ہاں، یہ سیاسی شعبدہ بازی کیوں کی تو نے؟ یہ سب مداریوں جیسی باتیں اس ملک کے حکمران کب سے کر رہے ہیں۔ خوبصورت وعدے اور دعوے سنتے سنتے عوام بھی اتنے تھک چکے ہیں کہ اب مستقبل سے ہی مایوس ہو گئے ہیں۔ اب انہیں ہر بات جھوٹ لگتی ہے۔"

"میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ کیا تو میری نیت اور میرے ارادوں پر اعتبار نہیں رکھتا۔"

"تو نے اپنے ارادوں کی شکست کے امکانات کو مدِنظر نہیں رکھا۔"

"کیا میں نے کہا نہیں تھا کہ اگر اللہ نے توفیق دی۔"

"برا مت مان فیکے پتر! تو نے اپنے ارادوں کو ایک خواب بنا کر ان سب کی آنکھوں میں بھر دیا۔ ابھی اس کی ضرورت نہیں تھی۔ جب کچھ ہوتا تو سامنے آجاتا لیکن معلوم ہے اب کیا ہوگا؟ یہ خواب انہیں دن رات بے قرار رکھیں گے۔ ابھی جو کچھ ہے ہمارے ذہن میں ہے۔ ہم نے اس کا پیپر ورک بھی شروع نہیں کیا۔ ہم نے پلان کو ڈسکس کرنے کے سوا کیا کیا ہے؟ ہمارے پاس بھی ایک خواب کے سوا کچھ نہیں ہے۔ خواب کو تعبیر ملنے تک کتنے مرحلوں سے گزرنا ہے۔ اس کو یہ جاہل اور سیدھے سادے لوگ کیا جانیں؟"

میں نے کہا۔ "مگر ہم تو جانتے ہیں۔"

راجا نے کہا۔ "ہم کیا جانتے ہیں؟ کیا ہم نے کسی ایکسپرٹ سے مشورہ کیا ہے۔ کوئی رپورٹ لی ہے ان منصوبوں کے قابلِ عمل ہونے کے بارے میں۔ یہ سب ممکن ہے یا نہیں، ہمارے پاس نہ بلیو پرنٹ ہے نہ ٹیکنیکل رپورٹ۔ نہ سرکاری منظوری نہ سرمائے کی فراہمی کا بندوبست۔ نہ ماہرین کی خدمات اور نہ......"

میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "یہ سب ہو جائے گا راجا اپنے وقت پر۔"

"یہی تو میں تجھے سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہ سب اپنے وقت پر ہوگا لیکن یہ لوگ جو کچھ نہیں سمجھتے۔ یہ قبل از وقت چکر لگانا شروع کر دیں گے کہ مالک کام کب شروع ہوگا۔ ہمیں نوکری کب ملے گی۔ مہینا پورا گزر گیا۔ ابھی تو کچھ بھی شروع نہیں ہوا۔ دو مہینے ہو گئے آپ نے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ یہاں فیکٹری لگے گی۔ فیکٹری لگ جائے گی تو پھر یہ پوچھیں گے کہ ہماری کالونی کب بنے گی جس میں کتنے بجلی والے گھر ہوں گے؟ اسکول کب بنے گا؟ اسپتال کب بنے گا؟"

"یار راجا! وہ سب اتنے ناامید تھے کہ انہیں دلاسا دینے کے لیے کچھ کہنا ضروری تھا۔ انہیں بعد میں سمجھایا جا سکتا ہے کہ یہ سارے کام جادو کی چراغ سے نہیں ہوتے۔ صبر سے کام لو اور دیکھو پریشان ہونے اور پریشان کرنے سے کچھ نہیں ہوگا اور وہ سمجھ جائیں گے۔"

"تو نے صرف سیاسی فائدہ اٹھایا ہے۔"

"اگر یہ الزام ہے تو مجھے قبول ہے۔ ہاں میں نے سیاسی فائدہ اٹھایا ہے۔ ہر نیا حکمران ایسا کرتا ہے۔ مجھے بھی ان کی حمایت چاہیے۔ ان کی حمایت ہی میری طاقت ہے ورنہ یہاں میں اجنبی ہوں اور مجھے ہر طرف سازشی عناصر نظر آتے ہیں جو میری آمد سے خوش نہیں ہیں۔ ہرگز یہ نہیں چاہتے کہ میں یہاں عملی طور پر اپنا اختیار تسلیم کراؤں۔ پہلے ست بدھائی کے مالک اور وارث ضرور تھے مگر ان کے پاس حق ملکیت کے سوا کچھ نہ تھا اگر وہ یہاں کبھی آتے تو مہمانوں کی طرح۔ صرف یہ دیکھنے کہ ایوری تھنگ از او کے؟ انہیں یقین دلا دیا گیا کہ سب ٹھیک ہے تو وہ واپس ولایت چلے گئے۔ یہ جگہ عملاً سازشی لوگوں کے قبضے میں رہی اور یہاں انہوں نے پتا نہیں کیا دھندے شروع کر دیے جیسے یہ ان کے باپ کی جاگیر ہے۔ اب وہ پریشان ہوں گے۔"

راجا نے کہا۔ "وہ تیرے ہر منصوبے کی راہ میں روڑے اٹکائیں گے۔"

"ان سے نمٹنے کے لیے مجھے ہر قسم کی طاقت چاہیے۔ قانون کی طاقت، دولت کی طاقت، بدمعاشی کی طاقت، ایک طاقت یہ لوگ فراہم کریں گے جو ست بدھائی کے عوام ہیں، عوامی طاقت......"

جیپ راجا چلا رہا تھا اور اب ہم جنوب کی طرف ست بدھائی کی آخری حد سے واپس حویلی کی طرف آرہے تھے۔ شمال کی طرف جانے کا وقت نہ تھا ورنہ ہم دوسری طرف سے آنے جانے کا راستہ ہی دیکھ لیتے۔ جیپ اب اسی کچے راستے پر تھی جس پر چل کے گزشتہ رات بھی ایک ٹرک حویلی تک آیا تھا۔ راستے کے ایک طرف کھیت تھے اور دوسری طرف خاردار تاروں والا وہ علاقہ جو ست بدھائی کی حدود میں ہونے کے باوجود ہمارے لیے علاقہ غیر سے کم نہ تھا۔

راجا نے کہا۔ "میں سمجھتا ہوں کہ یہ جگہ درمیان میں نہیں ہوگی۔ یہ ست بدھائی کی شمالی حد ہے لیکن اس کی قانونی حیثیت کے بارے میں شک کی کوئی بات نہیں۔ یہ قبضہ غیر قانونی ہے۔"

میں نے کہا۔ ''کوئی قانونی قدم اٹھانے سے پہلے میں اپنے وکیل سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ آخر یہ کون لوگ ہیں۔ یہ جگہ کسی کو فروخت کی گئی ہوتی تو فاروقی مجھے ضرور بتاتا۔''

''اس کے علاوہ یہ لوگ یہاں کیا کرر ہے ہیں؟''

''مجھے رہ رہ کے نمک حرام اکبر خان کا رویہ یاد آتا ہے۔ اس نے میرے سامنے کلاشنکوف تان لی تھی۔ پندرہ سو روپے ماہانہ کا چوکیدار کہتا ہے وہ خود کو اور اس کی یہ ہمت؟ معاملہ کچھ اور ہے راجا؟''

''اب تو وہ غائب ہے ورنہ اسی سے پوچھتے۔''

''ایسے وہ کب تک غائب رہے گا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ اس کے خلاف جانو کے قتل کی ایف آئی آر درج کرادوں۔''

راجا نے کہا۔ ''اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔''

میں نے کہا۔ ''میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ وہ چور جو اندھیرے میں مجھے دھکا دے کر نکل گیا تھا، اکبر خان کے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔''

''تیرے یقین کو پولیس بطور ثبوت تسلیم نہیں کرسکتی۔''

میں نے کہا۔ ''وہ جھوٹا اور جعلساز ہے۔ شاید وہ فوج میں بھی نہیں رہا لیکن ایسے اس کو خود کو نائب صوبیدار مشہور کر رکھا تھا اور کتنی جلدی اس نے میرے سامنے اعتراف کرلیا اپنے جرم کا۔ مجھے اس کی مصنوعی ٹانگ پر بھی شک ہے۔ جب پولیس ان تمام معاملات کی تفتیش کرے گی تو سارے حقائق سامنے آجائیں گے۔''

'''خوش فہمی ہے تیری فیکے پتر! مت بھول کہ تو اب پاکستان میں ہے۔ پولیس کو سب پہلے سے معلوم ہوگا۔ ممکن ہے اس کے دھندے میں پولیس برابر کی شریک ہو۔ ایسے سارے غیر قانونی کام پولیس کی سرپرستی کے بغیر نہیں ہوسکتے۔''

میں نے کہا۔ ''آخر یہ خودکار حفاظتی نظام، یہ سکیورٹی سسٹم کس کے لیے ہے یہاں۔ یہ کوئی فوجی انسٹالیشن تو نہیں ہے یا ایٹمی ریسرچ سینٹر تو نہیں ہے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ یہاں کیا ہورہا ہے؟''

''شاید یہ اتنا آسان نہ ہو۔''

''راجا!'' میں نے کہا۔ ''نمک حرام اکبر خان آج گیٹ پر نہیں ہے۔''

راجا بولا۔ ''لیکن اندر کتنے مسلح محافظ ہیں؟''

''نظر تو کوئی بھی نہیں آرہا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ہم بھی مسلح ہیں۔ کیا خیال ہے گیٹ توڑتے ہوئے جیپ کے ساتھ اندر چلے جائیں؟''

راجا بگڑ گیا۔ ''یار تو پاگل ہوگیا ہے۔ آخر جلدی کی کیا ضرورت ہے۔ خدانخواستہ اندر سے فائرنگ ہوگئی پھر گولی ست بدھائی کے نواب صاحب کو دیکھ کر ادب سے رکے گی نہیں۔ تجھے نہ اپنا خیال ہے نہ فریال کا، نہ میرا نہ اپنے ماں باپ کا، کیوں مرنا چاہتا ہے تو؟''

مجھے ایک دم ہوش آگیا۔ ''آئی ایم سوری راجا! اسی لیے تو میں نے تجھے ساتھ رکھا ہے۔ بقول شاعر اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل، ہمیں سوچ سمجھ کر ہر قدم اٹھانا ہوگا۔'' تو نے ٹھیک کیا۔

جیپ رکنے تک راجا بولتا رہا۔ اس کے بعد فریال نے مجھے آڑے ہاتھوں لیا۔ ''آگئے خیر سے بدھولوٹ کے گھر۔'' وہ مجھے دیکھتے ہی چلائی۔

میں نے کہا۔ ''گستاخ! نواب رفیق احمد شیرازی کو بدھو اور حویلی کو گھر کہتی ہے۔''

اس نے گھڑی دکھائی۔ ''چھ گھنٹے سے لاپتا تھے تم۔ مجھے اکیلا چھوڑ کر سیر سپاٹے کے لیے نکل گئے تھے۔'' خوف سے اس کا برا حال تھا۔

''لاحول ولاقوۃ! تم تو بالکل دقیانوسی بیویوں کی طرح بول رہی ہو۔ اکیلی کہاں تھیں تم، فرخ یہاں تھا۔ نوکر چاکر تھے۔ کیا بات ہے تم اتنی پریشان لگ رہی ہو۔'' میں نے اسے غور سے دیکھا۔

وہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ ''تمہیں معلوم ہے بعد میں کیا ہوا؟''

میرا دل ڈوبنے لگا۔ ''فری! کیا ہوا؟'' میں نے اسے بانہوں میں بھرلیا۔

وہ میرے سینے پر سر رکھ کر روتی رہی۔ ''وہ فرخ کو لے گئے۔''

میں نے اس کا سر اٹھایا۔ ''فرخ کو لے گئے، کون؟''

''مجھے نہیں معلوم وہ کون تھے؟'' فریال کا جسم کانپنے لگا۔

''انہوں نے تمہیں پوچھا تھا؟''

راجا میرے ساتھ مجرم بنا کھڑا تھا۔ ''انہوں نے کچھ کہا تو ہوگا؟''

''انہوں نے فرخ سے کہا کہ رفیق صاحب نہیں ہیں تو تم ہو۔ فرخ بھی نہ ہوتا تو شاید وہ مجھے لے جاتے۔'' فریال کا رونا جاری رہا۔

میں نے کہا۔ ''فریال! ڈونٹ بی سلی! مجھے بتاؤ وہ کتنے لوگ تھے۔ کیا چاہتے تھے۔ فرخ کیوں گیا ان کے ساتھ،

جانے سے پہلے فرخ نے کچھ نہیں بتایا؟''

''وہ جیپ میں آئے تھے۔ میں اندر مصروف تھی۔ باہر صرف وہ تھا۔ ٹھیکیدار کا بیٹا شہباز، اس نے بتایا کہ چار افراد تھے، سب نے منہ پر ڈھاٹے باندھ رکھے تھے۔ شہباز نے ان کی گفتگو سنی تھی لیکن اس نے دخل نہیں دیا۔ فرخ نے کہا تھا کہ رفیق صاحب تو نہیں ہیں۔ تم انتظار کرو۔ انہوں نے کہا کہ ہم انتظار نہیں کرسکتے۔ تم چلو ہمارے ساتھ، فرخ نے پوچھا کہاں تو انہوں نے ریوالور نکال لیے اور فرخ کو کھینچ کے گاڑی میں ڈال لیا۔ شہباز اتنا ڈر گیا تھا کہ دم سادھے چپ کھڑا رہا۔ جیپ چلی گئی تو اس نے مجھے بتایا اور پھر خود بھی بھاگ گیا۔ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ یہ کون لوگ تھے؟ میں کیا بتاتی؟''

میں نے کہا۔ ''یہ کب کی بات ہے۔ کتنی دیر پہلے کی؟''

''دو گھنٹے ہوگئے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں۔ کیسے تم سے رابطہ کروں۔ دونوں فون ایکٹی ویٹ ہوگئے ہیں۔ تم سے پوچھے بغیر تو میں کچھ بھی نہیں کرسکتی تھی۔ نہ پولیس کو اطلاع دے سکتی تھی۔ نہ کسی اور کو بتا سکتی تھی۔ مجھے تو ایمرجنسی کا نمبر بھی معلوم نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''او کے او کے! اب ایزی ہوجاؤ۔ میں کرتا ہوں کچھ۔ فرخ کو کچھ نہیں ہوگا۔''

فرخ کے اغوا کی خبر نے مجھے ہلا دیا تھا۔ یہ تو ظاہر تھا کہ اغوا کرنے والوں کا ٹارگٹ میں تھا۔ فرخ سے ان کی کوئی دشمنی نہ تھی۔ وہ یرغمال بنا تھا تاکہ بعد میں اس کی رہائی کے لیے میں اپنے آپ کو پیش کرنے پر مجبور ہوجاؤں۔ یہ بھی ظاہر تھا کہ اغوا کے لیے آنے والے محض حکم کے غلام تھے۔ ان کو یہ حکم دینے والوں نے سمجھا دیا ہوگا کہ خالی ہاتھ واپس نہ آنا۔ اصل بندہ نہ ملے تو کسی اور کو لے آنا' جس کی اتنی اہمیت ہو کہ اسے چھڑانے کے لیے رفیق اپنے پیروں سے چل کر آئے۔ ہمیں پھر نہ جانا پڑے۔

اس میں کوئی شک کی بات نہ تھی کہ فرخ کی جگہ وہ شہباز کو بھی لے جاسکتے تھے اور اندر گھس کر فریال کو بھی اٹھانے میں تامل نہ کرتے۔ مجھے یقین تھا، وہ فرخ کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔

میں نے دیکھ لیا تھا کہ چند گھنٹوں میں بھی فرخ اور شہباز کی ٹیم نے فوری ضرورت کے تمام اہم کام نمٹا لیے ہیں۔ بجلی کے پول سے ڈائریکٹ کنکشن لینے کے بعد انہوں نے تقریباً ہر جگہ عارضی کنکشن فراہم کردیا تھا۔ گھر کے اندر فریال نے ناظرہ اور ریشماں کی مدد سے گھر اور خصوصاً کچن کو قابلِ اطمینان حد تک کارآمد بنالیا تھا۔

ہم اندر جا کے بیٹھے تو فریال نے بھی خود کو سنبھال لیا۔ غالباً لال غرارہ سوٹ سے وہ خود بھی اتنی عاجز آگئی تھی کہ اس نے دوبارہ اپنی جینز کے ساتھ شرٹ پہن لی تھی۔ وہ آنسو پونچھ کے چائے بنانے چلی گئی۔

راجا نے کہا ''تجھے پوچھتا ہوا کون آسکتا ہے؟''

میں نے کہا ''یار' کس کا نام لوں؟ یہ کوئی خفیہ پناہ گاہ تو ہے نہیں جہاں کسی کا پہنچنا محال ہو۔ وہ چیف کے کارندے بھی ہوسکتے ہیں جو مجھے ہراساں کرکے بھگانا چاہتے ہیں۔ پہلے اکبر خان اور کل پیر بخش کا رویہ ظاہر کرتا ہے کہ کچھ جرائم پیشہ عناصر یہاں ہماری موجودگی کو برداشت نہیں کرسکتے۔''

راجا نے مجھ سے اتفاق کیا ''مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔ اگر ایسے حالات پیدا کردیے گئے تو ہمارا ساتھ کون دے گا؟''

''شہباز بھاگ گیا۔ شاید فرخ بھی پیچھے ہٹ جائے۔''

راجا نے کہا ''ہمارے لیے کوئی جان کو خطرے میں کیوں ڈالے گا۔ شہباز کروڑپتی باپ کا اکلوتا بیٹا ہے۔ اسے کیا پڑی ہے پانچ دس لاکھ کے لیے رسک لے۔ فرخ سے بھی ہمارا کیا رشتہ ہے؟''

میں نے کہا ''لیکن ہم اتنی آسانی سے بھاگنے والے نہیں ہیں۔''

''ہاں' لیکن سوال یہ ہے کہ ابھی ہم کیا کریں؟''

فریال کافی کے مگ ایک ٹرے میں رکھ کے لائی۔ ایک اس نے مجھے تھمایا دوسرا راجا کو دیا اور خود تیسرا لے کر فرش پر بیٹھ گئی۔ اس نے کہا ''بیٹھ کے باتیں کرنے سے کچھ نہیں ہوگا' کچھ کرو۔''

''تم بتاؤ کیا کریں؟'' راجا برا مان کے بولا ''ہم تو بے وقوف ہیں۔ سیر سپاٹے کرتے پھر رہے ہیں یا یہاں بیٹھے گپ لگا رہے ہیں۔''

'اور کچھ نہیں تو پولیس کو فون کرو۔''

''پولیس کو کیا تم مجھ سے بہتر سمجھتی ہو؟ دس سال ہوگئے اخبار کی صحافت کرتے۔ دن رات واسطہ پڑتا ہے دونوں سے۔ کیا مجرم اور کیا قانون کے رکھوالے۔ فون کا کیا ہے' میں براہ راست ڈی آئی جی سے بات کرسکتا ہوں۔

''تو پھر کرتے کیوں نہیں؟'' فریال نے غصے سے کہا۔

''اس لیے کہ میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں۔ کیا بتاؤں گا میں اسے کہ میں کہاں سے بات کررہا ہوں۔ ست بدھائی میں کیوں بیٹھا ہوں۔ مجھے کس پر شک ہے؟ چیف کا نام لوں گا

تو مجھے رفیق کے پورے بیک گراؤنڈ کا حوالہ دینا پڑے گا۔ سلطان کا نام لوں گا تو تمہارے بارے میں بتانا ضروری ہوگا...... کیا کروں؟ بتادوں اسے سب؟''

فریال چپ ہوگئی کیونکہ راجا غصے میں آ گیا تھا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے خودکلامی کے انداز میں کہا ''معلوم نہیں فرخ کہاں ہوگا۔ کس حال میں ہوگا بے چارا۔''

فرخ جیسے اسی سوال کے انتظار میں دروازے کے پیچھے تھا۔ وہ جواب سن کر یوں سامنے آیا کہ ہم سب اچھل کے کھڑے ہوگئے۔ غیر ارادی طور پر ہم سب نے چلا کے ایک ہی بات کی ''فرخ۔ تم...... تم ٹھیک تو ہونا؟''

فرخ نے آہستہ سے سرہلایا اور آگے آ کے صوفے پر گر گیا۔ اس کی حالت بظاہر ٹھیک لگتی تھی۔ نہ اس کے جسم یا چہرے پر خون تھا اور نہ کوئی تشدد کی علامت نظر آ رہی تھی لیکن وہ سخت بدحواس اور تھکا ہوا لگتا تھا۔ فریال دوڑ کے اس کے لیے پانی لائی جو اس نے ایک سانس میں یوں پی لیا جیسے وہ کسی صحرا کے سفر سے پیاسا آیا ہے۔

میں نے کہا ''فرخ۔ تم واقعی ٹھیک ہونا۔''

فرخ نے کہا ''ہاں۔ مجھے کچھ نہیں ہوا ہے۔''

فریال نے کہا ''میں تمہارے لیے کافی لاتی ہوں۔ چلو تم یہ لے لو۔'' اس نے اپنا مگ فرخ کو تھما دیا ''میرا ابھی موڈ نہیں۔''

راجا نے کہا ''ہم ابھی کچھ دیر پہلے واپس آئے تو فریال نے بتایا......''

اس نے کافی کا ایک گھونٹ لیا اور پھر اپنے جوتے اتارنے لگا ''میں بہت دور سے پیدل چل کے آ رہا ہوں۔ انہوں نے مجھے جنگل میں چھوڑ دیا تھا۔''

بیک وقت میں نے اور راجا نے کہا ''کس نے؟''

فرخ نے ایک گہری سانس لی ''وہ رجب علی خیال کے بندے تھے۔''

''کیا......؟ تمہیں رانا نے اغوا کرایا تھا...... مگر ...؟'' میں نے کہا۔

فرخ نے اپنے پاؤں سینٹر ٹیبل پر پھیلا دیے ''وہ مجھے ... دھوکے میں لے گئے تھے۔ میری آنکھوں پر پٹی ...''

''اور غلطی کا احساس ہوا تو چھوڑ دیا؟''

''نہیں۔ جب انہوں نے مجھے رانا کے سامنے پیش کیا تو ... کہ اوئے پاگل کے بچو! نہ یہ رفیق ہے اور نہ اس کا دوست ... تم سے کہا بھی تھا کہ حویلی کے کسی ملازم یا ایرے غیرے کو مت اٹھا لانا۔''

''اور رانا نے کہا کہ جانے دو اسے؟'' راجا بولا۔

''نہیں۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ تم کون ہو...... اور میں نے بتا دیا۔''

''کیا بتا دیا؟'' میں نے کہا۔

''وہی جو سچ تھا...... کہ ویسے تو رفیق صاحب دوست ہیں۔ پہلے ایک رشتے سے وہ میرے برادرانِ لا بھی تھے۔''

میں نے کہا ''کیا یہ بتانا ضروری تھا؟''

''میں واضح کرنا چاہتا تھا کہ نہ میں ملازم ہوں اور نہ ایرا غیرا۔''

''تم مشکل میں پڑ سکتے تھے۔''

اس نے نفی میں سرہلایا ''اس کے برعکس...... رانا کا رویہ اچھا ہوگیا۔ اس نے مجھے عزت سے اپنے پاس بٹھایا اور پھر کہا کہ اب تم آ گئے ہو تو اپنے برادران لا کو بتا دینا کہ ہم سے دشمنی مول نہ لے۔ اس کی وجہ سے ہمارا ناقابلِ تلافی نقصان ہوا۔''

میں چونکا ''کیا وہ اپنے کتے کی بات کر رہا تھا؟''

''ہاں...... لیکن مجھے تو کچھ معلوم نہیں تھا۔ میں نے کہا کہ رانا صاحب! یہ پیغام تو آپ کے بندے وہاں بھی دے سکتے تھے۔ رانا نے کہا کہ وہ جو بڑا طرم خان بنا پھرتا ہے۔ صحافیوں کی توپ سمجھتا ہے خود کو...... راجا' ہم اس کو سمجھانا چاہتے تھے کہ ہمارے لیے وہ اتنا ہی بے ضرر ہے جتنی بھنگیوں کی توپ ہوتی تھی۔ اگر وہ چاہے تو اس کو خبر بنا کے شائع کرا دے اور جسے چاہے بلا لے۔ فوٹوگرافرز کو اور اپنے رپورٹرز کو۔ تقریب کی کوریج کے لیے۔''

میں نے کہا ''کیا کتے کی شاہانہ انداز میں تدفین کے لیے کوئی عظیم الشان تقریب ہو رہی ہے؟''

فریال بیچ میں بولی ''یہ کتے کا کیا معاملہ ہے؟''

میں نے کہا ''آج جنگل میں ہمارے ہاتھوں رانا کا ایک کتا مارا گیا تھا' اس کا نام رستم تھا۔''

''اس نے ہم پر حملہ کیا تھا۔'' راجا نے فریال کی صورت کے تاثرات دیکھ کر وضاحت کی۔

''رستم کو واقعی کل بڑے اعزاز کے ساتھ دفن کیا جائے گا۔'' فرخ نے کافی کا خالی مگ رکھ کے بات پھر شروع کی۔ ''لیکن اصل بات کچھ اور ہے۔ رانا اس پر برہم تھا کہ اس غلطی بلکہ سنگین جرم کے بعد آپ دست بستہ رانا صاحب کی خدمت میں معافی کی درخواست پیش کرنے کیوں نہیں گئے۔''

''اس کی تو......'' میں نے کہا اور پھر فریال کی طرف دیکھا ''تم اپنے کان بند کر لو یا کچھ دیر کے لیے باہر چلی جاؤ تاکہ میں جملہ مکمل کروں۔''

فریال مسکرائی ''جملہ تو میں بھی مکمل کر سکتی ہوں لیکن فرخ' تم آگے بولو۔''

''رفیق صاحب نے الٹا یہ کہہ دیا رانا کے غلاموں سے کہ رانا سے کہنا آ کے پیسے لے جائے۔ اس پر وہ بہت چراغ پا تھا کہ اول تو یہ نقصان کوئی پورا نہیں کر سکتا۔ نہ لاکھوں سے' نہ کروڑوں سے...... دوسرے وہ...... اب میں اصل الفاظ استعمال کروں یا مطلب بتاؤں؟''

''اوریجنل ٹیکسٹ سناؤ'' میں نے کہا ''کچھ سنسر کرنے کی ضرورت نہیں۔ فریال اتنی بالغ ہو چکی ہے کہ پنڈت کوکا رام کی بلند پایہ تصانیف سے بھی مستفید ہو سکتی ہے۔''

فریال نے کہا ''یار! وہ تو بچوں کے لیے ہیں۔''

میں نے اپنا سر پیٹ لیا ''یا بے شرمی تیرا ہی آسرا۔ فرخ' تم بولو۔''

''تم نے رانا کی عزت یہ کہہ کر دو کوڑی کی کر دی کہ وہ خود آئے اور تم سے پیسے مانگے۔ یہ کمی کمین' نوکروں کے نوکر جو کتوں کے خادم ہیں' ان کے سامنے رانا صاحب کے لیے ایسے نازیبا الفاظ استعمال کیے اور ایسا ذلت آمیز انداز اختیار کیا۔ اب خیریت مطلوب ہے تو کل تقریب میں سب کے سامنے معافی مانگ لو۔''

''ورنہ وہ فوج کشی کر دیں گے' توپ خانہ لے کر آ جائیں گے' مجھے ہاتھی کے پیروں میں ڈال دیں گے؟ اس سے کہنا تھا کہ کسی روز تو خود بھی کتے کی موت مارا جائے گا۔'' میں نے کہا۔

''افوہ...... کچھ دیر مت بولو ناں...... فرخ کی بات تو سن لو'' فریال جھلائی۔

فرخ نے کہا ''اصل بات ابھی باقی ہے۔ رانا نے تو نہیں بتایا مگر جو لوگ مجھے واپس چھوڑنے آئے تھے انہوں نے تقریب کی وضاحت کی۔ انہوں نے کہا کہ رستم کے ساتھ کاسو کو بھی دفن کیا جائے گا...... زندہ!''

میں بھونچکا رہ گیا ''زندہ دفن کیا جائے گا؟''

''انہوں نے ایسا ہی کہا تھا۔ ممکن ہے وہ مجھے دہشت زدہ کر رہے ہوں۔ کاسو کو پہلے ہی مار دیا گیا ہو۔''

''صرف اس لیے کہ رستم کی موت کا ذمے دار کاسو کو قرار دیا گیا ہوگا؟'' راجا نے برہمی سے کہا۔

میں نے کہا ''کاسو جیسے غلاموں کو بلا تقصیر بھی سزا دی جا سکتی ہے'' میں نے تلخی سے کہا ''لیکن اسے کتے کے ساتھ لٹانا......''

فرخ نے کہا ''جو بات مجھے پریشان کر رہی ہے' وہ مزید ناقابلِ تصور ہے...... مگر وہ یہی کہہ رہے تھے۔''

''انسان کی قبر میں کتے کو دفنانا...... کیا ایسا ہو سکتا ہے'' فریال بولی۔

فرخ نے دکھی چہرے سے فریال کو دیکھا ''وہ زندہ انسان کو ایک مردہ کتے کے ساتھ دفن کرنے کی بات کر رہے تھے۔ خود ہی دہشت زدہ تھے لیکن مجھے بتا رہے تھے کہ ایسا تو ہونا چاہیے۔''

میں نے کہا ''نہیں فرخ' تم نے غلط سمجھا۔''

''میں نے وہی سمجھا جو ان کا مطلب تھا۔ کاسو ابھی زندہ ہے لیکن اس کو سزائے موت سنائی جا چکی ہے اور جیسے انگریز کے زمانے میں باغیوں کی سزا کو عبرت ناک بنانے کے لیے انہیں چوک میں پھانسی دی جاتی تھی اور پھر ان کی لاش کئی کئی دن لٹکتی رہتی تھی۔ ایسے ہی کاسو کا انجام دوسروں کو سبق سکھانے کے لیے ہے۔ شاید کسی نے انعام کے لالچ میں رانا کو بتا دیا کہ رستم کی موت کاسو کی بے وقوفی سے ہوئی۔ اس نے رستم کو حملے کے لیے چھوڑا تھا۔ اس نے دوسری غلطی یہ کی کہ رستم کی لاش وہیں چھوڑ گیا۔''

فریال جیسے کسی دہشت ناک خواب میں چلائی ''مگر ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟''

میں نے اسے اپنے قریب کر لیا ''نہیں' نہیں...... یہ نہیں ہوگا۔''

فرخ نے کہا ''وہ مجھے وہاں لے گئے تھے جہاں رستم کی لاش پڑی ملی تھی۔ تم نے اس کی لاش پر وہ خرگوش رکھ دیا تھا۔''

''ہاں' کیا اس سے رستم کی لاش کی بے حرمتی ہوئی؟'' میں نے تلخی سے کہا۔

''یس۔ رانا ایسا ہی سمجھتا ہے۔ تم نے اس کا مذاق اڑایا۔ یہ پیغام دیا کہ وہ بے بس ہے۔ تم ایک خرگوش کو بچانا چاہو تو رانا صاحب کا رستم کچھ نہیں کر سکتا۔ تم نے رانا کا شکار چھینا۔ اسے چیلنج کیا۔ وہ ایک خطرناک نفسیاتی مریض لگتا ہے مجھے' یہ فرعونیت' یہ تکبر......''

میں نے کہا ''کیا تمہارے ساتھ جا کے انہوں نے لاش اٹھائی؟''

''نہیں۔ لاش وہ پہلے ہی لے گئے تھے۔ مجھے انہوں نے وہ قبر دکھائی جو کھودی جا رہی تھی۔ بالکل اسی جگہ...... اور پھر مجھے چھوڑ دیا۔ میری آنکھوں پر سے پٹی اتار دی۔ وہاں سے میں اندازے سے سمت دیکھ کے چلتا ہوا یہاں پہنچا' کئی جگہ بھٹکا۔''

خاموشی کا ایک طویل اور بوجھل وقفہ آیا جس میں ہم

سب ایک ناممکن محسوس ہونے والے منظر کا تصور کر کے اندر ہی اندر غصے سے بل کھاتے رہے پھر راجا نے کہا ''یار! اگر ایسا ہوا تو......؟''

میں نے کہا ''ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔''

''مگر کیسے؟'' راجا کسی سوچ میں گم تھا۔

میں نے کہا ''ہمیں اس معاملے میں پولیس سے مدد لینی چاہیے۔''

''پولیس یقین نہیں کرے گی۔ قبل از وقت وہ کچھ نہیں کرتے۔ قتل ہونے سے پہلے محض خطرے یا امکان پر کارروائی نہیں ہوسکتی۔''

میں نے بگڑ کے کہا ''راجا' تیرے صحافی ہونے کا کیا فائدہ۔ فون کر' سارے زمانے کو بتا دے۔ پولیس کے اعلیٰ حکام سے بات کر۔''

راجا نے سر ہلایا۔ ''وہ میں کرلوں گا...... لیکن کاسو کو کون بچائے گا؟ فرض کر' پولیس آ گئی حکام بالا کے دباؤ پر۔ یہاں کچھ بھی نہیں ہوگا۔ رانا کہے گا کہ راجا صاحب نے بہت پی لی ہوگی۔ نشے میں آپ لوگوں کو بھی پریشان کیا۔ کاسو کو بھی سب کے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔ بڑے اچھے لباس اور حلیے میں۔ خوش و خرم اور صحت مند۔ ممکن ہے اس سے بیان بھی دلوا دیا جائے کہ رانا صاحب تو محمود و ایاز والی روایتی اسلامی مساوات کا سلوک کرتے ہیں۔ بھائیوں کی طرح رکھتے ہیں۔'' وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوا ''مگر سب کے چلے جانے کے بعد کیا ہوگا؟''

یہ بڑا بے رحم سوال تھا۔ ہاں' کاسو کی زندگی کی کیا ضمانت ہوگی؟ ہم نے سمجھا تھا کہ غالب کے اڑیں گے پرزے۔ دیکھنے ہم بھی گئے تھے پر تماشا نہ ہوا۔ تماشے سے پہلے ایک اور تماشا۔ راجا صاحب کو دیکھو' سالا صحافیوں کی توپ۔ مفت کی ملی ہوگی کہ اتنی پی گیا۔ نشے میں جو چاہا کہہ دیا...... اور آپ لوگ بھی کمال کرتے ہیں کہ تماشا دیکھنے آ گئے۔ بھلا ایسا ہوسکتا ہے اس اکیسویں صدی کے اسلامی جمہوریہ پاکستان میں؟

اور جب راجا کا تماشا بنانے والے ہنستے ہوئے چلے جائیں گے تو اصل تماشا ہوگا۔ کاسو' تیرے نوشتۂ تقدیر کو یہ دو ٹکے کا صحافی کیسے بدل سکتا ہے؟ نہ وہ ولایت پلٹ چھوکرا جو اب خود کو نواب کہتا پھرتا ہے۔ گاڑ دو اس معزز کتے کے ساتھ اس ذلیل غلام کو...... اور غلام سرنگوں ہوجائیں گے۔ جو حکم آقا! یوم حشر کاسو ایک کتے کی قبر سے برآمد ہوگا۔

''پھر کیا کریں راجا؟'' میں نے بالآخر خاموشی کے جمود کو توڑا۔

''کچھ تو کرنا ہی چاہیے'' فرخ نے کہا۔

میں نے کہا ''کیا انہوں نے بتایا تھا کہ تقریب کب ہوگی؟''

''ٹھیک اسی وقت۔ جب رستم کی موت واقع ہوئی تھی۔''

''ٹھیکے پتر!'' راجا نے کہا ''ہم جائیں گے۔ ہم کاسو کو مرنے نہیں دیں گے۔''

فریال نے سکون کا سانس لیا اور میری طرف دیکھا۔ میں بھی جواب میں مسکرایا۔ اس فیصلے نے مجھ بھی سکون دیا تھا۔ اب ہم ایک دوسرے سے نظر ملا سکتے تھے اور اپنے آپ سے بھی شرمسار نہیں تھے۔ پھر فرخ نہانے چلا گیا۔ فریال کھانے کے انتظام میں لگ گئی۔ ایک فون راجا نے لے لیا اور شہناز سے باتوں میں مصروف ہوگیا۔ میں نے سب سے پہلے اپنے گھر کا نمبر ڈائل کیا۔ بیلنس بچانے کے لیے میں نے ابا جی سے کہا کہ وہ میرا نمبر ملائیں۔

ابا جی نے حسب عادت پہلے یہی کہا ''بس اللہ کا شکر ہے بیٹا' سب ٹھیک ہے'' مگر میں نے ان کے لہجے میں پوشیدہ تشویش کو محسوس کرلیا۔

میں نے کہا ''آپ کچھ چھپا رہے ہیں مجھ سے۔ دادی کیسی ہیں؟''

''دادی اور تمہاری امی اللہ کے فضل سے اچھی ہیں۔ تمہیں یاد کرتی ہیں کہ آتے ہی پھر چلے گئے...... مگر......''

میں نے کہا ''مگر کیا ابا جی!''

''ایک چھوٹی سی پریشانی ہے۔'' انہوں نے تھوڑے سے تذبذب کا مظاہرہ کیا ''کچھ لوگ ہیں جو تمہیں پوچھتے ہوئے آئے تھے۔ معلوم نہیں کون ہیں۔ انہوں نے اپنے بارے میں کچھ بتایا نہیں مگر تمہارے دوست نہیں ہوسکتے اتنے بدتمیز!''

میں نے کہا ''میں آپ سے سننا چاہتا تھا ورنہ راجا نے بتا دیا تھا۔ کیا وہ اب بھی پریشان کر رہے ہیں؟''

''ان کی بدمعاشی تو حد سے بڑھتی جا رہی ہے بیٹا۔ کہتے تھے کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ رفیق گھر میں چھپا ہوا ہے۔ میں نے کہا کہ کیا وہ تمہارا مقروض ہے؟ کتنے پیسے چاہئیں' مجھے بتاؤ۔ وہ دو تھے' ایک تو حد سے بڑھ گیا۔ کہنے لگا کہ ہاں' وہ مقروض ہے لیکن پیسے نہیں' ہمیں جان دے کر ہی اس کا قرض ادا ہوگا۔ میں نے ناراض ہو کے کہا کہ اچھا پھر میری جان لے لو۔ کیا مطلب ہے آخر اس فضول بات کا۔ تم دھمکی

دینے آئے ہو؟ اس پر دوسرا اسے لے گیا۔ پھر وہ سامنے پان والے کی دکان پر نظر آنے لگے۔ ایسا لگتا تھا کہ سارا دن دروازے پر نظر رکھتے ہیں۔ تم تو جانتے ہو اس کے پاس ایک سے ایک اوباش ہر وقت موجود رہتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ وہ نشے والے سگریٹ اور پان کے علاوہ پڑیاں بیچتا ہے۔ پولیس کا مخبر بھی ہے۔ راجا نے کہا تھا کہ میں انہیں پکڑوا دیتا ہوں لیکن میں نے روک دیا۔ محلے میں بھی تو رہنا ہے بیٹا! لیکن اب کچھ کرنا پڑے گا' چارہ نہیں اس کے سوا۔''

میں نے کہا ''اب کیا ہوا ہے ابا جی!''

''کل اس نے میرے ساتھ بدتمیزی کی۔ ایک بولا کہ بڈھے طوطے کو نیا سبق پڑھانا ضروری ہے۔ دوسرے نے کہا کہ یار' طوطا نہیں لیکچرر ہے۔ پہلا ہنسنے لگا کہ طوطا اسی کو تو کہتے ہیں جو رٹا رٹا یا بول دیا۔ میں نے برداشت کیا مگر اوپر سے رابعہ دیکھ رہی تھی۔ اس نے افضل کو بھیجا کہ ان بدتمیز لوگوں سے پوچھو کہ آخر یہ چاہتے کیا ہیں؟ انہوں نے افضل کو دھکے دیے کہ دفع ہوجا۔ اس بے وقوف نے کچھ الٹا سیدھا بکا کہ تم مجھے جانتے نہیں' جنات میرے مرید ہیں۔ تمہارے پیچھے لگ گئے تو چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔ اسی میں کچھ گالم گلوچ ہوگئی۔ انہوں نے افضل کو مارا تو افضل جان چھڑا کے بھاگا۔ افضل گھر میں گھسا تو وہ بھی اندر آ گئے۔ اس وقت میں گھر پر نہیں تھا۔ عورتوں کی چیخ پکار پر لوگ آ گئے اور انہیں نکال دیا۔ جاتے جاتے کہہ رہے تھے کہ ہم تو یہ دیکھنے اندر آئے تھے کہ رفیق کس کونے میں چھپا ہوا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا بیٹا! پولیس کے پاس شکایت لے کر جائیں تو معلوم ہے کچھ نہیں ہوگا۔ وہ کہیں گے کہ تم چھپاتے کیوں ہو؟ بتا دو رفیق کہاں ہے؟ ست بدھائی کا پتا ہم دینا نہیں چاہتے۔''

میں نے کہا ''اگر وہ چاہیں گے تو یہاں بھی پہنچ جائیں گے۔ آپ کچھ نہ کریں' کل میں آتا ہوں۔''

''ہاں آ کے یہ قصہ ختم کرو۔ دیکھو وہ کیا چاہتے ہیں؟''

میں نے کہا ''راجا نے بتایا تھا کہ چچا کی فیملی واپس آ گئی ہے؟''

''ہاں' ایک فضول سی بات پر وہ ناراض ہو کے چلے گئے تھے۔ میں تو اسے کوئی اہمیت نہیں دیتا۔''

''کیا تھی وہ فضول سی بات؟''

''کچھ نہیں۔ تم تو جانتے ہو اپنی چچی کو۔ اس کی طبیعت میں دوسروں سے حسد اور لالچ بہت ہے۔ مجھ سے کہہ رہی تھی کہ جائداد کے معاملے میں ان کے ساتھ دھوکا ہوا۔ رفیق نے سب اپنے نام کرالی ورنہ وارث تو بیٹے ہوتے ہیں۔ دونوں بیٹوں کا حق برابر تھا۔ میں نے کہا کہ یہ تو وراثت کا معاملہ ہے' زندگی میں کوئی اپنا سب کچھ جس کو چاہے دے۔ وہ نہیں مانی کہ تم نے ہی رفیق کو پٹی پڑھائی اور اس نے لندن میں بڈھے کو پھانس لیا۔ پتا نہیں کیا جھوٹ بولا اور کیا چکر چلایا کہ اس نے سب رفیق کے نام لکھ دیا۔ پہلے بھی ایسا ہوتا رہا ہے' اسی جائداد کے لیے...... بس اسی پر بات بڑھ گئی۔ میں نے کہا کہ خبردار جو مجھے ملوث کیا۔ جو کہنا ہے رفیق سے کہنا۔ تمہاری دادی نے بھی چچا کو ڈانٹا کہ بیوی کی زبان چل رہی ہے' قینچی کی طرح اور تو بولتا نہیں۔ انہوں نے کہہ دیا کہ سچ بولنے پر کیسے روکوں۔ اس پر دادی بہت غصے میں آ گئیں اور بس...... وہ چلے گئے لیکن پھر نہ جانے کیا دل میں آئی کہ جیسے گئے تھے' ویسے ہی لوٹ آئے۔ معافی بھی مانگ لی مجھ سے اور دادی سے۔''

ان کی بات ختم ہوئی تو شاید رابعہ آس پاس ہی کہیں منڈلا رہی تھی۔ وہ آ گئی لائن پر' کہنے لگی ''بڑے مزے آ رہے ہوں گے نواب صاحب! رعایا کیسی ہے؟ گاؤں کی گوری کوئی دل کو بھائی؟''

میں نے کہا ''یہ سیٹ لائٹ فون ہے۔ اس پر بکواس کرنا اور سننا بہت مہنگا پڑتا ہے۔ کام کی بات کرو۔''

''او کے یور ہائی نس! وہ جو تمہارا ایک بانکا چھبیلا سا دوست آیا تھا کل...... شاہ رخ خان ٹائپ......''

میں نے کہا ''بے وقوف لڑکی! وہ خود شاہ رخ خان تھا۔''

اس نے بڑی ٹھنڈی سانس لی ''ہائے' ایسے نصیب کہاں ہمارے کزن!...... مگر نقل بھی اچھی تھی' نام بھی اچھا تھا فرخ!''

''رابعہ! مجھے دال میں کچھ کالا نظر آ رہا ہے۔ وہ بھی آہیں بھر رہا تھا کہ تمہارے گھر میں وہ رانی مکرجی ٹائپ کون تھی؟''

وہ ہنس پڑی ''بدتمیز...... ایشوریا رائے نہیں کہہ سکتا تھا۔ خیر' میں نے اس سے کہا تھا کہ اس نجر بٹو کو لے جاؤ اپنے ساتھ۔ یہاں تو رہتا ہے جن بھوتوں کے ساتھ۔ کچھ کرتا کراتا نہیں۔ اس کو لگاؤ کسی کام سے۔''

میں نے کہا ''کزن! وہ عشق کرتا ہے تم سے۔ اس سے زیادہ فضول کام یہاں میرے پاس کہاں؟''

''ایک بات بتاؤں......؟'' وہ رازداری سے بولی ''میں نے اس کے عشق کا اکاؤنٹ کلوز کر دیا ہے جیسے بینک والے سیونگ اکاؤنٹ کو کر دیتے ہیں اگر اس میں کچھ نہ ہو۔''

میں نے کہا ''اب کیا فرخ کا نیا کرنٹ اکاؤنٹ کھل گیا ہے تمہارے الیو بینک میں؟''

وہ زور سے ہنسی اور گانے لگی ''یہ الیو الیو کیا ہے......؟''

اور میں نے فون بند کر دیا۔

دوسری کال میں نے عائشہ کو کی اور اتفاق سے وہ گھر میں ہی مل گئی۔ ''ارے رفیق! بے وفا...... بالکل ہی بھول گئے مجھے؟''

میں نے کہا ''ایسا ہو سکتا ہے...... کس کس سے تمہاری خیر خبر نہیں پوچھی میں نے...... لیکن......''

میری خاموشی پر اس کے لہجے کی مصنوعی بشاشت بھی رخصت ہوگئی۔ وہ اداسی سے بولی ''بس رفیق! پتا نہیں کیا ہوگیا تھا مجھے...... لیکن میں اب ٹھیک ہوں۔ اسی ہفتے میں تم دیکھو گے مجھے۔ میں آجاؤں گی تمہارے پاس۔ ساری رکاوٹیں دور کر کے۔''

میں نے کہا ''لیکن تمہاری ماں کی حالت ٹھیک نہیں ہے ابھی۔''

''اس کی ذمے دار وہ خود ہے۔ اس کے لیے میں اپنی زندگی خراب نہیں کر سکتی رفیق! ایک ہی بار تو ملتی ہے زندگی جینے کے لیے۔ اس پر بھی اپنا اختیار نہ ہو تو پھر جینے کا فائدہ!''

میں نے کہا ''آدمی کو اتنا خود غرض نہیں ہونا چاہیے۔''

''یہی میں بھی کہہ رہی ہوں۔ اس نے بڑی خود غرضی سے ہمیشہ اپنی خوشی کو دوسروں سے اہم سمجھا۔ پھر میں بھی ایسا ہی کیوں نہ کروں۔ وہ مرنے کا ڈراما کر رہی ہے۔ مجھے پریشان کرنے کے لیے۔''

''ڈونٹ سے دیٹ عائشہ!''

''میں اسے موقع دے رہی ہوں۔ مرنا ہے تو مر جائے جلدی سے۔ میں غیر معینہ مدت تک انتظار نہیں کر سکتی۔ ایسا نہ ہو میں خود اسے مار دوں۔''

میں بھونچکا رہ گیا ''تم اپنی ماں کو قتل کرنے کی بات کر رہی ہو؟''

''ماں نہیں وہ دشمن ہے میری۔ اچھی طرح جانتے ہو تم بھی پھر کیوں اس کی حمایت کر رہے ہو؟'' وہ چلانے لگی۔ ''یس! آئی ول کل ہر۔''

مجھے سخت طیش آیا' میں نے کہا ''میں پھر بات کروں گا تم سے' ابھی تمہارا دماغ خراب ہو رہا ہے'' اور فون بند کر دیا۔

راجا نے ساری بات سنی تھی اور فریال نے بھی۔ عائشہ کی بات نے مجھے سخت ڈسٹرب کیا تھا۔ میں نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ ایسا لگتا تھا کہ پریشانیوں نے بڑے منظم انداز میں مجھے ہر سمت سے محصور کر لیا ہے۔

فریال نے میرے پاس آ کے کہا ''پریشان ہونے سے کچھ نہیں ہوگا رومیو! انشاءاللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کم آن' تم کو اب سو جانا چاہیے۔''

راجا نے بھی کہا ''فریال ٹھیک کہہ رہی ہے۔ شہباز جو دوائیں چھوڑ گئی تھی' اس میں ایک سکون آور گولی ہے۔''

میں نے کہا ''وہ تو کھا لے' میں ایسے ہی سو جاؤں گا۔''

کھانے کے بعد میں نے سونے کی کوشش بھی کی مگر ذہن پر دیوانہ کرنے والے خیالات کی یلغار تھی۔ فرخ کا کسی بھی معاملے سے براہ راست جذباتی تعلق نہیں تھا اور وہ اتنا تھک گیا تھا کہ لیٹتے ہی سو گیا تھا۔ راجا نے ماحول سازگار کرنے کے لیے باہر کے سوا تمام لائٹس بھی آف کر دیں۔ وہ کچھ دیر کروٹیں بدلتا رہا پھر شاید خواب آور گولی نے کام کیا اور وہ بھی سو گیا۔

میں ایک گھنٹے بعد بھی سیدھا لیٹا چھت کو گھور رہا تھا اور کاسو کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے بچانے کی مجھے ایک ہی صورت نظر آتی تھی کہ ہم عین وقت پر اچانک نمودار ہوں اور گن پوائنٹ پر کاسو کو اس شیطان سے چھین لائیں۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ مسلح محافظوں کے بغیر کہیں نہیں جاتا۔ یہ کام اسی طرح ہو سکتا تھا کہ ہم پہلے محافظوں کو بے بس کریں۔ ان کا اسلحہ رکھوالیں۔ ممکن ہو تو رانا کو یرغمال بنا کے اپنے تحفظ کی ضمانت کے طور پر ساتھ لائیں اور کہیں دور ایسی جگہ چھوڑ دیں جہاں سے اسے پیدل چل کے اپنے گھر جانا پڑے۔ جیسے انہوں نے فرخ کو چھوڑا تھا۔ میرے ذہن میں یہ بھی تھا کہ راجا کسی فوٹوگرافر کے علاوہ کسی پولیس پارٹی کا بندوبست کر لے جو خاموشی سے ہمارے ساتھ پوزیشن سنبھال لے۔ میں یہیں تک سوچا اور پھر میری سوچوں کا رخ فرخ کی طرف مڑ گیا اس سے ہونے والی گفتگو میرے ذہن میں تازہ ہوگئی۔

پہلے وہ مجھے رفیق صاحب کہتا رہا تھا۔ پھر میں نے کہا کہ میں صاحب بالکل نہیں ہوں' چھ سال میں گورے صاحبوں کے ملک میں رہا اور وہاں یہ دیکھا کہ بیٹا بھی باپ کو نام لے کر مخاطب کرتا ہے۔ پوتا اپنے دادا کا اور شاگرد اپنے استاد کا نام لیتا ہے۔ میں گھر کی حد تک رشتوں کی تکریم کا قائل ہوں اور معاشرتی اخلاق کے مطابق غیروں کو عمر کے حساب سے تعظیم دیتا ہوں مگر اپنے ہم عمر تو دوست ہی ہوتے ہیں۔ میں نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ انتہائی بے تکلف دوست مجھے فیکا کہتے ہیں۔

میں نے اسے یہ بھی بتایا کہ میرے فیوچر پلان کیا ہیں اور وہ بڑی دلچسپی سے سنتا رہا۔ اس نے مجھ سے پوچھا ''یہ سب آپ کو کیسا لگتا ہے رفیق صاحب! کہاں امریکا اور لندن' کہاں ست بدھائی۔''

میں نے کہا ''بالکل خواب کی طرح۔ ابھی تک میرے لیے بھی حیران کرنے والا انکشافات کا سلسلہ جاری ہے۔ حالات اور واقعات نیا رخ اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ کچھ پتا نہیں کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔''

''مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔ میں تو کسی اور ہی مقصد سے آیا تھا۔ برسوں کی دشمنی میری کتنی بڑی بھول تھی۔''

میں نے کہا ''اب اس بھول کو بھی بھول جاؤ۔ یہ بتاؤ آگے تمہارے کیا ارادے ہیں؟ مگر اس سے پہلے یہ بتاؤ کہ تم کرتے کیا ہو؟ رہتے کہاں ہو اور کس کے ساتھ؟''

وہ بولا ''آپ تو جانتے ہوں گے رفیق صاحب!''

''پھر وہی صاحب؟'' میں نے اسے ٹوکا۔

وہ مسکرایا ''رفیق بھائی کہوں تو ٹھیک ہے؟ آپ بڑے ہیں مجھ سے۔ جب میرا خاندان نہیں رہا تو گھر میں میرا اکیلے رہنا مشکل ہوگیا تھا۔ میرے کچھ عزیز تھے' ایک چچا' ایک ماموں۔ دو پھوپیاں اور دو خالائیں۔ خالہ اور پھوپی لاتعلق رہنے پر مجبور تھیں کیونکہ ان کے شوہر کوئی اضافی ذمے داری اٹھانے کے لیے تیار نہ تھے۔ ان کے بچے زیادہ تھے۔ آمدنی کم تھی اور گھر چھوٹے تھے۔ بات یہ ہے کہ دل چھوٹے تھے۔ چچا سے میرے والد کی زندگی میں بھی بات چیت بند تھی۔ اس کا سبب ایک مکان تھا جو دونوں بھائیوں نے مل کر بنایا تھا' مل کر رہنے کے لیے لیکن ان کی بیویوں نے ایسا نہ ہونے دیا۔ چچا کی بیوی زیادہ تیز تھی اور چچا یقیناً زیادہ بے وقوف تھے کہ اس کی باتوں میں آ گئے۔ مکان انہوں نے ہتھیا لیا۔ ابا لڑائی جھگڑے سے دور رہنے والے تھے۔ تھانہ کچہری نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے اماں کو بھی خاموش رکھا کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ کتنے سادہ لوح تھے وہ بھی۔ تمام عمر فریب کھاتے رہے اور خود کو بھی فریب دیتے رہے۔ کیا ملا انہیں صبر کا صلہ۔ ان کو کیسی بے آبروئی کی موت ملی۔ حقیقت کچھ بھی سہی۔ دنیا نے صرف تماشا دیکھا۔ صبر کرنے والی بیوی کینسر سے مر گئی۔''

میں نے کہا ''تمہارا تلخ رویہ کسی حد تک ناشکرے پن پر مبنی ہے۔ خدا جب اپنے بندوں کے صبر کا امتحان لیتا ہے تو اس کا پھل دینا بھولتا نہیں۔ اس کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں ہے۔''

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی ''شاید...... اگر میرے لیے ابھی صبر کے امتحان اور بھی ہیں...... تو میں راضی برضا رہنے کے سوا کیا کر سکتا ہوں۔ میری پرورش کی ذمے داری ماموں نے قبول کر لی تھی لیکن جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے' ممانی نے مجھے سوتیلے رشتے کی طرح قبول کیا۔ ان کے اپنے بھی بچے تھے۔ ان کے مقابلے میں میرے ساتھ بہت برا سلوک ہوتا رہا۔ ماموں کہاں تک مجھے بچاتے۔ بیوی سے کتنا لڑتے۔ میں نے آزمائش کے اس دور کو ایک چیلنج سمجھ کے قبول کیا۔ یہ سمجھ لیا کہ مجھے حوصلہ نہیں ہارنا ہے بلکہ کچھ بن کے دکھانا ہے۔ میں ہر چیز خاموشی سے کھاتا رہا' گالیاں' مار' روکھی سوکھی۔ میں نے کبھی احتجاج نہیں کیا۔ بغاوت نہیں کی کیونکہ مجھے ایک مقصد عزیز تھا۔ میرے کزن یعنی ماموں کے بچے سب ایک انگلش میڈیم اسکول میں پڑھتے تھے اور وین سے جاتے تھے۔ میں گورنمنٹ اسکول پیدل جاتا تھا حالانکہ وہ دگنے فاصلے پر تھا۔ میرا تعلیمی ریکارڈ پہلے بھی اچھا تھا۔ اب میں نے برا بنانے والوں کے سامنے خود کو اچھا ثابت کرنے کا عزم کر لیا۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ میں ہر کلاس میں اول آؤں گا۔ آپ سوچیں کہ ایک بچے کا ارادہ کیا کر سکتا ہے؟ ایسا ارادہ تو ہر بچہ کر سکتا ہے۔ سب کے والدین بھی یہی چاہتے ہیں۔ مگر کیا سب بچے محض خواہش اور ارادے سے اول آ سکتے ہیں' میں اول آیا۔ ساتویں سے دسویں تک۔ پھر میٹرک میں مجھے اسکالرشپ مل گئی۔ خوش صرف ماموں ہوئے۔ ممانی حسد میں جلتی رہیں اور الٹی سیدھی باتیں کرتی رہیں کہ میں نقل کر کے پوزیشن لیتا ہوں۔ اندھوں میں کانا راجا ہوں' وغیرہ وغیرہ۔ میں نے میٹرک کیا تو میری عمر چودہ سال تھی۔ میری خواہش تھی کہ انٹر کے بعد میڈیکل کالج میں داخلہ لوں۔ یہ درحقیقت میری ماں کی خواہش تھی۔ جب وہ اسپتال میں تھی۔ وہ سرکاری اسپتال تھا۔ تو وہاں کے ڈاکٹرز کا رویہ انتہائی بے حسی کا تھا۔ کسی حد تک سفاک اور غیر انسانی۔ وہ سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ کینسر کے مریض کے علاج پر پیسہ اور وقت ضائع کرنے کا کیا فائدہ۔ انہیں تو گھر پر آرام سے مرنے کا موقع فراہم کرنا چاہیے۔ میری ماں بھی نرسوں اور ڈاکٹروں کی جھنجلاہٹ اور بے رحمی سے دکھی ہوتی تھی۔ بعض اوقات وہ مریضوں سے یہ بھی کہہ جاتے تھے کہ آخر تم مرتے کیوں نہیں؟ اب کیا رہ گیا ہے کہ جیے جا رہے ہو۔ اس زمانے میں وہ مجھ سے کہتی رہی کہ فرخ' تو ڈاکٹر ضرور بننا مگر ایسا نہیں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ ایک جذباتی سانحہ شوکت خانم جیسا اسپتال بنوا دیتا ہے۔ یہ شاید میری زندگی کی واحد شکست تھی۔ جو وسائل نہ ہونے کی وجہ سے میرے حصے میں آئی۔ ایف ایس سی میں میرے نمبر اتنے اچھے تھے کہ میں کسی بھی میڈیکل کالج میں داخلہ لے سکتا تھا لیکن تعلیمی اخراجات کا بار اٹھانا ماموں کے لیے ممکن نہ تھا۔ ایک دن وہ میرے

سامنے رو پڑے کہ میں اپنی بہن کی آخری خواہش پوری نہیں کرسکتا۔ میں اس زمانے میں ٹیوشن پڑھا کے اپنے اخراجات پورے کرلیتا تھا۔ اگر میں نے ٹیوشن کی آمدنی جمع کی ہوتی تو شاید داخلہ لے لیتا اور پھر ٹیوشن سے بھی پانچ سال کی تعلیمی مکمل کرلیتا لیکن ساری ٹیوشن فیس ممانی وصول کرلیتی تھی کہ اب کمارہے ہوتو خرچہ دو۔ بس اس کے بعد میں بی ایس سی کے سوا کیا کرسکتا تھا؟ میں نے کمپیوٹر سائنس میں داخلہ لیا اور بی سی ایس کرلیا۔ ساتھ ساتھ میں دوسرے کورس بھی کرتا رہا۔ پرائیویٹ اداروں سے میں بزنس ایڈمنسٹریشن پڑھتا رہا اور ایم بی اے بھی کرلیا۔"

میں نے تعریفی انداز میں کہا "تم نے تو ایک قابل فخر مثال قائم کی ہے دوسروں کے لیے۔"

"مجھے بھی یہی غلط فہمی تھی۔ حقیقت سامنے آئی تو معلوم ہوا کہ قابلیت اور صلاحیت کچھ نہیں' جب تک کہ سفارش اور معتبر حوالے نہ ہوں۔ چھ مہینے سے میں اچھی ملازمت کے لیے درخواستیں ارسال کررہا ہوں۔ ایک پاکستانی ادارے میں بارہ ہزار ماہانہ کی نوکری ملی ہے۔ وہاں اوقات کار کی کوئی حد نہیں۔ بارہ گھنٹے تو لازمی ہیں مگر سولہ اٹھارہ گھنٹے بھی کام کرنا پڑتا ہے کیونکہ ان کا بزنس یورپ امریکا سے ہے۔ یہاں دن ہوتو وہاں رات ہوتی ہے۔ دن میں لوکل بزنس' رات کو انٹرنیشنل سرکل۔ کئی کئی دن پوری نیند نصیب نہیں ہوتی۔ زندگی کا کوئی معمول نہیں۔ سوچتا ہوں میری فیملی ہوتی تو کیا ہوتا۔ ان کے لیے میں کہاں سے وقت نکالتا۔ یہ صورت حال یہاں بہت عام ہے۔ بیوی بچوں کو آدمی صرف کمائی دے سکتا ہے۔ توجہ اور وقت نہیں دے سکتا۔"

میں نے کہا تھا "مجھے ایسا لگتا ہے کہ تقدیر نے تمہیں صحیح جگہ پہنچادیا ہے۔ یہ مصائب و حادثات کا پراذیت راستہ تھا مگر جیسا کہ کہتے ہیں۔ انت بھلا سو بھلا۔ اب تمہیں کہیں جانے کی' کسی کی ملازمت کرنے کی ضرورت نہیں' تم میرے ساتھ رہوگے۔ میرے لیے کام کروگے۔" اس نے ہامی بھرلی تھی اور اب وہ میرا ساتھی تھا۔

میں انہی سوچوں میں تھا نہ جانے کتنا وقت گزرا کہ تاریکی میں ایک سایہ سا متحرک دکھائی دیا۔ پھر میرے حواس میں فریال کی خوشبو نے یلغار کی اور اس سے پہلے کہ میں سنبھلتا' وہ بیڈ پر اپنی جگہ بنا کے مجھ سے چمٹ گئی۔

میں نے کہا "فریال! یہ تم کیا کررہی ہو" پھر اس کے وجود کی ریشمی حرارت نے مجھے مسحور اور مفلوج کردیا۔

"رومیو! مجھے پناہ چاہیے۔" اس نے اپنا سر میرے سینے میں چھپالیا "میں بہت تھک گئی ہوں' اکیلے پن سے۔"

میں نے اس کے ہونٹوں کو' رخساروں کو اور بالوں کو چوما۔ "جان! میں خود بے پناہ بھٹک رہا ہوں۔"

اس نے میرے کان میں سرگوشی کی "چلو' ہم اس رات کی پناہ میں نکل جائیں۔ کہیں چلے جائیں۔ میں اب تم سے دور نہیں رہ سکتی۔"

میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں "کاش ایسا ہوسکتا فری!"

"کیا تم میں ہمت نہیں ہے؟"

"یہی سمجھ لو۔ میں رشتوں کی زنجیر کا قیدی ہوں۔ ان زنجیروں کو توڑنا میرے بس کی بات نہیں۔"

"میں کب کہتی ہوں کہ سب کو چھوڑدو...... لیکن مجھے اپنالو پلیز!" فریال فرط جذبات سے بے خود ہونے لگی۔

"نہیں فری! ایسے نہیں......" میں نے کمزور سی مزاحمت کی۔

"ایسے ویسے کو میں نہیں مانتی۔ تمہاری وجہ سے مجبور تھی لیکن وہ اب مجھے کسی کی پروا نہیں۔"

عین اسی وقت جب طوفانی جذبات کا دھارا مجھے تنکے کی طرح بہا کے لے جانے والا تھا' میں نے باہر سے کسی عورت کی چیخ سنی۔ وہ چلا چلا کے مجھے پکار رہی تھی "نواب صاحب ......نواب صاحب!"

اس آگ پر جو ہم دونوں کو جلا کے خاک کرنے والی تھی' جیسے کسی نے یخ بستہ پانی ڈال دیا۔ فریال ایک دم تڑپ کے اٹھی اور بھاگی پھر میں اٹھا...... مگر مجھ سے پہلے راجا اٹھ گیا تھا۔ اس نے فریال کی چوری پکڑلی تھی مگر وہ انجان بن گیا۔ باہر عورت اب بھی چلارہی تھی۔

میں عجلت میں باہر نکلنے لگا تو فریال نے میرا بازو تھام کے مجھے روکا "رونی! ایسے مت جاؤ۔"

میں نے کہا "پھر کیسے جاؤں' زرہ بکتر پہن کے؟"

"پتا نہیں کیا معاملہ ہے۔"

میں نے کہا "حد کرتی ہو تم بھی۔ ایک عورت مدد کے لیے چلارہی ہے۔ ظاہر ہے مصیبت میں ہوگی۔"

"کہیں تم کسی مصیبت میں نہ پڑجاؤ' یہ کوئی چکر نہ ہو۔ یہاں کی عجیب دنیا ہے۔" فریال بدستور میرے بازو سے چمٹی رہی۔

راجا بھی رک گیا تھا لیکن عورت کی آواز پھر مجھے پکارنے لگی "نواب صاحب! آپ کو اللہ کا واسطہ!"

راجا نے کہا "یہ تو آپ کی رعایا ہے نواب صاحب!

اب آپ اپنے محل کے باہر زنجیر عدل بھی لگوالیں۔ جو فریادی آئے' زنجیر کھینچے اور گھنٹا بجے حرم میں۔ اب چلیے' توپ ہے آپ کے محافظ خاص کے پاس۔"

باہر کی لائٹس میں نے پہلے ہی جلا رکھی تھیں۔ فریال میرے منع کرنے کے باوجود باہر آ گئی۔ وہاں میری گاڑی کے قریب ایک اجنبی عورت سال سوا سال کے بچے کو گود میں اٹھائے کھڑی تھی۔ اس کی اصلی عمر یقیناً کم ہوگی۔ سختی حالات اور تلخی ایام نے اس پر قبل از وقت بڑھاپا مسلط کردیا تھا۔ غربت اور افلاس اس کی صورت' اس کی خراب صحت اور اس کے میلے پھٹے پرانے کپڑوں سے عیاں تھے۔

جب وہ قریب آئی تو مجھے اس کی آنکھوں میں خوف کی دہشت نظر آئی اور میں نے اس کے پیر دیکھے' وہ ہمیشہ ننگے پاؤں کنکروں' پتھروں پر اور تپتی دھوپ سے جھلستی زمین پر اور کانٹوں بھرے راستوں پر چلنے کی عادی تھی۔ شاید بچپن سے اب تک زمین پر جوتے پہن کر چلنے کی عیاشی کے بارے میں اس نے سوچا بھی نہ ہوگا۔ اس کے باوجود اس کے پیروں سے خون رس رہا تھا۔

یہ اس تصوراتی عورت کے نازک گلابی اور مخملی جلد والے پیر نہ تھے جن کے لیے شاعر نے کہا تھا دیکھو تو دلفریبی انداز نقش پا۔ موج خرام ناز بھی کیا گل ؟ گئی۔ یہ اس حقیقی عورت کے بدصورت زخمی اور گرد آلود پیر تھے جو آدھی رات کو مظلومیت کی فریاد لے کر دوڑتی ہوئی جنگل سے گزر کے آئی تھی۔

"نواب صاحب!" وہ پُردرد لہجے میں چلائی اور ایک دم میرے قریب آکے اس نے بچے کو میرے قدموں میں ڈال دیا "اس کو یتیم ہونے سے بچالو نواب صاحب! آپ کو اللہ رسول کا واسطہ۔"

میں نے دیکھا کہ وہ بچہ فرش خاک پر لیٹا خاموشی سے آسمان کو دیکھ رہا ہے۔ ابھی اسے کیسے اندازہ ہوسکتا تھا کہ وہ کون ہے' کہاں ہے اور آج جو اس کے ساتھ ہورہا ہے' کیوں ہورہا ہے؟

مجھ سے پہلے فریال نے جھپٹ کر اسے گود میں اٹھالیا "یہ کیا ڈراما کررہی ہو تم؟" اس نے برہمی سے کہا "چلو' سنبھالو اسے۔"

عورت ہاتھ جوڑ کے زار و قطار رونے لگی تھی۔ اس نے بچے کو گود میں لے لیا "اللہ آپ کا سہاگ قائم رکھے بیگم صاحب! مجھے بیوہ ہونے سے بچالو۔ وہ اسے ماردیں گے۔"

میں نے کہا "دیکھو...... مجھے کچھ اندازہ ہورہا ہے کہ تم کون ہو' کیا کاسو تمہارا شوہر ہے...... آرام سے بات کرو' ڈرو نہیں۔"

"جی نواب صاحب! کاسو میرا گھر والا ہے۔"

میں نے کہا "میں کوئی نواب نہیں ہوں' بار بار ایسا مت کہو۔"

فریال نے کہا "آؤ...... اندر آکے بتاؤ۔ ڈرنے اور پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔"

راجا نے بھی کہا "جو ہم سے ہوسکا' ضرور کریں گے۔"

وہ اندر آئی اور فرش پر بیٹھ کے اپنے آنسو صاف کرنے لگی۔ فریال نے اسے ایک گلاس میں پانی دیا تو وہ کچھ پرسکون ہوئی "میں بڑی دور سے آئی ہوں نواب صاحب! چھپ کے...... میرے پاس ٹائم بہت کم ہے۔"

میں نے کہا "کیا چاہتی ہو تم آخر تم؟"

"آپ کاسو کو بچالو۔ کل صبح وہ اسے ماردیں گے۔ رانا نے کہا ہے کہ اسے کتے کے ساتھ زندہ دفن کردیا جائے گا۔" وہ پھر رونے لگی۔

راجا نے کہا "اس کی فکر مت کرو۔ ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ یہ فیصلہ ہم تمہارے آنے سے پہلے ہی کرچکے تھے۔"

میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "ایسا کہنا آسان ہے لیکن قتل تو قتل ہوتا ہے۔ رانا صاحب ہوں یا کوئی اور...... کسی کو زندہ دفن کرکے قانون کی گرفت سے کیسے بچ سکتا ہے۔"

وہ بے چین ہونے لگی "ابھی آپ کو کچھ معلوم نہیں نواب صاحب! قانون اس کا کچھ نہیں بگاڑسکتا اور ہماری تو اوقات ہی کیا ہے۔ ہم کیڑے مکوڑے ہیں' غلام ہیں اس کے۔ اس کے سامنے سر اٹھا کے کھڑے نہیں ہوسکتے' نظر اٹھا کے بات نہیں کرسکتے۔ ہماری کون سنے گا؟"

میں نے کہا "میں تم سے کہہ رہا ہوں نا...... کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں' صبح میں خود پولیس کو لے کر آؤں گا۔"

"اور اخبار والے بھی آجائیں گے۔" فریال نے راجا کی طرف دیکھا۔

"کاسو پھر بھی نہیں بچے گا بیگم صاحبہ!" وہ مایوسی سے بولی۔

راجا نے کہا "اگر اخبار والوں نے تصویر بنالی یا فلم بنالی اور پولیس کو بھیج دی تو پولیس کیسے نہیں پکڑے گی رانا صاحب کو۔"

وہ غصے میں بھرگئی "آپ کیسی باتیں کرتے ہو جی۔ آپ

کے اخبار والوں کی فلم سے کیا ہوگا؟ خبر یا تصویر چھپ جائے گی تو کیا ہوگا؟''

راجا نے خفگی سے کہا ''اگر تم کو بھروسا نہیں ہے ہم پر تو پھر ہمارے پاس کیوں آئی ہو؟''

فریال نے پُرملامت نظروں سے راجا کو گھورا اور عورت کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھ کے کہا ''رانا پکڑا جائے گا' اسے پھانسی ہوجائے گی۔''

عورت زاروقطار رونے لگی ''مگر میرا کاسو تو پہلے ہی گاڑ دیا جائے گا کتے کے ساتھ۔ اس کے دفن کیے جانے کی فلم مجھے بیوہ ہونے سے تو نہیں بچائے گی۔ رانا کو پھانسی کی سزا اس بچے کو یتیم ہونے سے تو نہیں بچائے گی۔''

میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا ''دیکھو! ہماری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ ہماری بات کا یہ مطلب نہیں کہ ہم کاسو کو بچانے کے لیے کچھ نہیں کریں گے۔ رانا نے مجھے بھی چیلنج کیا ہے۔ اس نے مجھے اطلاع دی ہے کہ وہ کاسو کو کیا سزا دینا چاہتا ہے۔ اس نے مجھے بھی بلایا ہے کہ میں یہ تماشا دیکھنے آؤں۔ آخر وہ سمجھتا کیا ہے خود کو۔ ہم ایسا ہونے دیں گے؟''

راجا نے کہا ''میں فون کردوں گا تو اخبار والے صبح ہی پہنچ جائیں گے۔ میں پولیس کے اعلیٰ افسران سے بھی بات کرلوں گا۔ رانا کچھ نہیں کرسکے گا۔ وہ اتنا بے وقوف نہیں ہے کہ پولیس اور اخبار والوں کے سامنے ایسا سنگین جرم کرے۔ وہ اس علاقے کے معزز لوگوں میں شمار ہوتا ہے' اسمبلی کا ممبر ہے۔ وہ اپنے پاؤں پر کلہاڑی بھلا کیونکر مار سکتا ہے؟''

''ہاں' وہ تو اس بات سے بھی مکر جائے گا کہ اس نے کاسو کو زندہ دفن کرنے کی بات کی تھی۔ وہ کوئی اناڑی نہیں ہے۔''

عورت نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا ''معاف کرنا نواب صاحب! میں تو ایک بے وقوف اور جاہل عورت ہوں۔ اسی لیے آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے لیکن آپ کیوں نہیں سمجھ رہے ہیں میری بات!''

سخت جھنجلاہٹ کے باوجود میں نے ضبط سے کام کیا ''او کے' تم پھر سمجھاؤ۔''

عورت نے سو جانے والے بچے کو قالین پر لٹا دیا اور سنبھل سنبھل کے بولنا شروع کیا ''یہ ہوسکتا ہے نواب صاحب!''

''خدا کے لیے یہ نواب صاحب کی رٹ چھوڑ دو۔'' میں نے جھلا کے کہا۔

اس نے اپنی بات جاری رکھی ''ابھی آپ کی وجہ سے کاسو بچ جائے...... لیکن بعد میں کیا ہوگا؟ آج اگر آپ ہماری حمایت میں کھڑے ہوجاؤ گے اور رانا کا ہاتھ پکڑلو گے تو کیا رانا ڈر جائے گا؟ اس کا ہاتھ پھر کبھی نہیں اٹھے گا؟ نہیں نواب صاحب! ہم جیسے زمین کے کیڑوں مکوڑوں کو وہ جب چاہے اپنے پیروں سے کچل سکتا ہے۔''

فریال نے کہا ''دیکھو' ہم تمہارے ساتھ ہیں۔''

وہ نفی میں گردن ہلانے لگی ''کوئی فائدہ نہیں بیگم صاحب! ایسا پہلے بھی ہوا ہے۔ باہر والوں کی حمایت کا الٹا اثر ہوتا ہے۔ جس نے بھی کسی اور پر آسرا کیا' مارا گیا۔ اس کے ساتھ دوسرے بھی مارے گئے۔''

وضاحت کے لیے اس نے دو عبرت آموز واقعات کا حوالہ دیا جن کی وہ خود گواہ تھی۔

☆☆☆

پہلا کیس مولے کا تھا۔ خاندانی طور پر وہ مزارع تھا کیونکہ اس کا باپ بھی رانا کے والد صاحب کا مزارع تھا۔ اس کی پہلی بیوی گاؤں کی لڑکی تھی جو شادی کے دو سال بعد کھیتوں میں بچہ جنتے ہوئے مرگئی تھی۔ اس وقت وہ اکیلی تھی چنانچہ کسی کو پتا بھی نہ چلا اور اگلے دن اس کی لاش ملی تو ساتھ ہی بچہ بھی ملا لیکن یہ ایک معجزہ تھا کہ وہ زندہ رہا۔ مولہ اسے پال نہیں سکتا تھا۔ گاؤں میں کوئی بھی یہ ذمے داری لینے پر راضی نہ ہوا تو کسی نے مولہ سے کہا کہ وہ شہر جائے اور اسے مولانا ستار ایدھی کے حوالے کردے۔ مولہ ستار ایدھی سے بالکل واقف نہ تھا۔ مشورہ دینے والے نے اسے بتایا کہ ان کے گھر کے باہر ایک پالنا رکھا رہتا ہے۔ شہر کی عورتیں تو اس میں حرامی بچے بھی ڈال جاتی ہیں اور مولانا ان کو بھی پالتے ہیں لہٰذا شہر جا کے دیکھ لے۔ معلوم نہیں شہر پہنچنے تک اس نے بچے کو کیسے زندہ رکھا۔ کاسو کی بیوی کا اندازہ تھا کہ بچے کو بکری یا گائے کا دودھ ہی پلا دیا گیا ہوگا۔ شہر میں اس نے کسی سے مولانا ستار صاحب کا پتا پوچھا۔ ایدھی وہ بھول گیا۔ پتا بتانے والے مستی کے موڈ میں تھے۔

ایک نے پوچھا ''کون مولانا ستار؟''

اس نے کہا ''وہی جو...... ایسے بچوں کو لیتے ہیں۔''

بچہ دیکھ کر دوسرے نے سر ہلایا ''اچھا وہ...... مگر یہ بچہ کس کا ہے؟''

شرمندگی سے بچنے کے لیے اس نے کہہ دیا ''جی میرا نہیں ہے مگر میں اسے مولانا صاحب کے پالنے میں ڈالنے کے لیے لایا ہوں۔ اس کی ماں مرچکی ہے' پالنے والا کوئی نہیں۔''

پتا بتانے والے نے ایک مسجد کی طرف اشارہ کردیا ''یار! تم تو صحیح جگہ پہنچے ہو۔ یہی تو ہے مولانا ستار صاحب کے پالنے کی جگہ۔ اندر جاؤ' دروازے کے اندر جہاں صحن شروع ہوتا ہے' پالنا وہیں رکھا ہے۔''

مولہ مسجد میں گیا اور اس نے پالنا بھی دیکھ لیا۔ درحقیقت وہ لکڑی کے بنے ہوئے لمبے لمبے تابوت جیسے ڈبے تھے جن میں نمازی اپنی جوتیاں رکھتے تھے۔ ایسے ڈبے صحن کے علاوہ اندر بھی نظر آرہے تھے۔ نماز کا وقت نہیں تھا چنانچہ ڈبے خالی تھے۔

مولہ اس ڈبے میں بچے کو لٹانے لگا تو اسے اچانک احساس ہوا کہ بچے میں حرکت نہیں ہے۔ وہ بالآخر مرگیا تھا۔ اس نے جھک کر غور سے دیکھا اور شامت اعمال سے اسی وقت موذن آگیا۔ اس نے مولہ کو پکڑلیا اور پولیس کے حوالے کردیا۔

مولہ سال بھر غائب رہا۔ کسی کو معلوم نہ تھا کہ شہر میں اس پر کیا گزری۔ پھر ایک دن وہ اچانک نمودار ہوا تو اس کے ساتھ دو عورتیں تھیں۔ ایک گوری چٹی' قدرے فربہی مائل' گداز بدن والی جس کی عمر مولے سے زیادہ نظر آتی تھی۔ مولہ تیس کا تھا تو وہ پینتیس کی ضرور ہوگی کیونکہ اس کے ساتھ سولہ سترہ برس کی بیٹی بھی تھی جس کے نقوش ماں جیسے تھے لیکن بدن میں کنوارے پن کا کچا پن تھا۔

مولے نے بتایا کہ وہ ایک بیوہ عورت تھی جسے شوہر کی موت کے بعد سسرال والوں نے گھر سے نکال دیا تھا۔ مولے نے اس سے شادی کرلی تھی۔ وہ عورت مولے سے کہاں ملی اور اس سے شادی پر کیسے رضامند ہوگئی اس بارے میں انہوں نے مختلف اوقات میں مختلف لوگوں کے سامنے یکساں بیانات دیے۔ ان سے شکوک پیدا نہیں ہوسکے۔ مولے کے پاس کیا تھا' سال بھر رانا صاحب کے کھیتوں میں کام کرنے کا صلہ مشکل سے اتنا ملتا تھا کہ اپنا پیٹ بھر سکے۔ عید بقرعید رانا صاحب کی اترن بھی اس کے حصے میں آجاتی تھی۔ رہنے کے لیے دو کمروں کا گھر تھا جس میں پہلے اس کے ماں' باپ اپنی زندگی گزار چکے تھے۔

لیکن مولے کے پاس اچھی صورت' مضبوط جسم اور تھوڑی سی عقل کے ساتھ ایک حیوانی کشش تھی جس کو صرف عورتیں ہی محسوس کرسکتی تھیں۔ آغاز شباب سے ہی مولے کو اس کا اندازہ ہوگیا تھا اور شادی سے پہلے اسے جنس مخالف کی طرف سے ہر وقت ہر جگہ دل کھول کے نوازا گیا تھا۔ ان میں نوعمر لڑکیوں سے شادی شدہ عورتیں یہاں تک کہ کچھ خالہ چچی سمجھی جانے والی بزرگ خواتین تک شامل تھیں۔ پکڑا وہ کبھی نہیں گیا کیونکہ اسے آنے اور جانے کے راستے ہمیشہ کھلے ملتے تھے۔

مولے نے خود رانا صاحب کی حویلی میں بھی سیندھ لگائی تھی۔ جب رانا نے دوسری شادی کی تو پہلی کی صرف علامتی حیثیت خاندانی بیوی کی رہ گئی۔ حقوق زوجیت دوسری کو منتقل ہوگئے۔ پہلی کے نصیب میں جو ہر ماہ چند راتوں کی رفاقت رہ گئی تھی وہ بھی نہ رہی تو اس خلا کو مولے نے پُر کیا۔ بڑی بیگم نے کمال ہوشیاری سے مولے کو اپنی ایک کنیز خاص کے ساتھ بیاہ دیا اور یوں مولے کا حویلی میں آنا جانا ہوگیا۔ برسوں بعد زندگی میں وہ سنسنی خیزی لوٹ آئی جو شادی سے پہلے مولے جیسے ایک اور شخص کی رفاقت نے عطا کی تھی اور جو ہر شجر ممنوعہ کے ذائقے میں ہوتی ہے۔

پہلی بیوی سے مولے کو فرق نہیں پڑا تھا۔ کہتے ہیں وہ حویلی کے اندر سب کے پیروں میں آجانے والی پاؤں کی جوتی تھی تاہم بچے کی ولدیت مولے سے منسوب ہوئی۔ وہ مرگئی تب بھی کسی کو فرق نہ پڑا لیکن جب مولے کے ساتھ دوسری آئی تو بہت کچھ بدل گیا۔

مولے سے تعلق استوار رکھنے کے لیے بڑی بیگم نے اس کی دوسری بیوی کو بھی کنیز خاص کا درجہ دے دیا۔ وہ ان کا

بدن دابتی تھی اور غسل سے پہلے مالش کرتی تھی۔ بڑی بیگم کو اندازہ ہوا کہ اس کے ہاتھ مالش کا فن جانتے ہیں۔ ان کے لمس سے جسم کی پور پور میں راحت کا احساس جاگتا تھا۔ سکون اترتا تھا اور توانائی کی لہریں پیدا ہوتی تھیں۔ ان کا وجود لذت سے سرشار ہو جاتا تھا۔

یہ بات رانا صاحب تک پہنچی تو ایک روز انہوں نے بڑی بیگم کی کنیز خاص کو طلب کیا اور اسے مالش کا حکم دیا۔ مرتی کیا نہ کرتی' اس نے رانا صاحب کے سارے بدن پر اپنے ہاتھوں سے ایک گھنٹا مالش کی اور رانا صاحب نے بالکل وہی محسوس کیا۔ شاید اس سے کہیں زیادہ سرور حاصل کیا جو بڑی بیگم کرتی تھیں۔

یہ مولے کی بدبختی کا نقطۂ آغاز تھا۔ اس کے بعد رانا صاحب اکثر اس کی بیوی کو مالش کے لیے طلب کرنے لگے۔ وہ دن میں بیگم صاحبہ کی تھکن اتارتی تھی' رات کو رانا صاحب سارا دن کی تھکن اتروانے لیٹ جاتے تھے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ کسی شرابی کی طرح رانا صاحب اس مالش کے عادی ہو گئے۔

اب مولے کی اپنی بیوی سے ملاقات ہی بہت کم ہوتی تھی۔ وہ اس سے یوں چوری چھپے اور منت سماجت کر کے ذرا سی دیر کے لیے ملتا تھا جیسے وہ کسی اور کی بیوی ہے۔ دوسری طرف بڑی بیگم صاحبہ ہر رات اسے پہلے سے زیادہ بھوکی بے قراری کے ساتھ طلب کرنے لگیں۔ مولے کی جھنجلاہٹ پہلے اعصابی کشیدگی اور پھر غصے میں ڈھلتی گئی۔ یہ صورت حال اس کے لیے ناقابل برداشت ہوتی گئی کہ وہ اور اس کی بیوی ایک ہی حویلی کی چھت کے نیچے الگ الگ کمروں میں مالکوں کی خوشنودی پر قربان ہونے پر مجبور تھے۔

اس کی رگوں میں نسل در نسل منتقل ہونے والا غلام خون بھی خالص نہ تھا۔ اس کم ذات' کم اوقات' کم حیثیت طبقے کے مردوں میں غیرت کا تصور ناپید تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے ان کی عورتوں میں عصمت وعفت کا تصور ناپید تھا۔ وہ صرف حکم کی غلامی اور غیر مشروط اطاعت کے لیے پیدا ہوتے تھے چنانچہ اندر ہی اندر حسد' رقابت اور نفرت کے جذبات کو محسوس کرنے کے باوجود مولے میں اتنی ہمت نہ تھی کہ بڑی بیگم صاحبہ کو انکار کر سکے یا رانا صاحب سے اپنی بیوی واپس مانگ سکے اور وہ حویلی سے نکل کے بھاگ جائیں۔ ایسی بغاوت کے خیال سے ہی وہ کانپ جاتا تھا۔ خود اس کی بیوی نے اس مجبوری کو نوشتہ تقدیر کی طرح قبول کر لیا تھا۔ مالک اور مالکن انہیں انعام واکرام سے نوازتے رہتے تھے اور خوش ہو کے کہتے تھے۔ بھئی خوش رہو' چنانچہ سب خوش تھے سوائے مولے کے۔

خرابی اس وقت پیدا ہوئی جب رانا کا بڑا بیٹا کاروبار کے سلسلے میں ہانگ کانگ اور سنگاپور گیا۔ کاروبار وہ ایک ہی جانتا تھا...... یعنی باپ کے پیسے سے عیاشی۔ سنگاپور میں اس نے مساج گھر دیکھے جہاں ایک سے ایک طرحدار اور تربیت یافتہ حسینہ عیاش مردوں کے جسم اور جذبات سے یوں کھیلتی تھی کہ اس لطف وسرور کے آگے ہر نشہ ہیچ محسوس ہوتا تھا۔ شوقین مزاج سیاح ہر سال انہیں لاکھوں ڈالرز بخش جاتے تھے۔

جب وہ سنگاپور سے لوٹا تو اسے اندازہ ہوا کہ اباجی نے تو اپنے پنڈ میں بہت کم خرچ مساج گھر کھول رکھا ہے چنانچہ یہ مزے تو گھر میں بھی لوٹے جا سکتے ہیں۔ ماں کی جگہ اس نے بیٹی کا انتخاب کیا۔ اس کا یہ عذر رائگاں گیا کہ وہ مالش نہیں جانتی۔ چھوٹے رانا نے کہا کہ کام تو کرنے سے ہی آتا ہے...... اور نہیں آتا تو ماں سے سیکھ لو۔ وہ اتنی زبردست فنکار ہے' حویلی میں حکم عدولی کی گنجائش ہی نہ تھی۔ باپ' بیٹے کے پاس دوسرا حربہ لالچ کا تھا۔ مولے کی بیوی باپ کی داشتہ کے منصب پر فائز ہو کے بہت فائدے میں رہی۔ بیٹی کو چھوٹے رانا کے دل میں جگہ بنانے کی کامیابی راس آ گئی۔

لیکن ایک شوہر اور ایک باپ کی حیثیت میں مولے کا حوصلہ جواب دے گیا۔ اس نے بغاوت کر دی۔ پہلے اس نے دست بستہ رانا صاحب کی خدمت میں گزارش کی کہ وہ اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ شہر جانا چاہتا ہے۔ گزارش مسترد کر دی گئی۔ پھر اس نے کچھ لوگوں کے سامنے باغیانہ بکواس کی۔ وفاداروں اور مخبروں نے فوراً چھوٹے بڑے رانا کو مطلع کیا۔

بغاوت کا شمار انتہائی سنگین جرائم میں کیا جاتا تھا چنانچہ اس کی انتہائی سزا موت بھی ہو سکتی تھی مگر سفارش کام کر گئی اور مولے کو سمجھانے کی کوشش کی گئی۔ سمجھانے کے بھی بہت سے طریقے تھے۔ ہر مرحلے میں عذاب سخت سے سخت تر ہوتا جاتا تھا۔ آخری مرحلے سے گزرنے والا اس جہان سے گزر جاتا تھا اور یہ بات مولے کو معلوم تھی۔

پہلے مرحلے کے عذاب سے گزرنے کے بعد مولے کو اندازہ تو ہو گیا تھا کہ اس کے بعد کیا ہوگا۔ چونکہ اس کے پاس تھوڑی سی عقل تھی اس لیے اس نے ظاہر کیا کہ وہ سمجھنے والی بات سمجھ گیا ہے۔ اس نے ایسا ظاہر کر کے اپنی جان کو مزید عذاب میں نہیں ڈالا اور رانا صاحب کو مطلع کر دیا گیا کہ مولے کی عقل ٹھکانے آ گئی ہے اور وہ اتنا ہی بے ضرر' محکوم اور فرمانبردار بن چکا ہے جتنا اسے ہونا چاہیے۔

رہائی پاتے ہی مولے نے خدا کا شکر ادا کیا اور فرار ہو کے سیدھا شہر پہنچا۔ یہاں اس نے ایک سال میں تھانے سے جیل تک زندگی کے بہت سے روپ دیکھے تھے اور جیسے سونا بھٹی سے گزر کے کندن ہو جاتا ہے' ایسے ہی وہ پینڈو بندہ ان تجربات سے گزر کے بہت سیانا ہو گیا تھا۔ وہ لوٹ کے بھی گاؤں نہ جاتا مگر اچانک اسے ایک عورت مل گئی۔

وہ اپنے جرم بے گناہی کی سزا کاٹ کے جیل سے نکلا تو اس کا ارادہ لوٹ کے گاؤں جانے کے بجائے شہر میں محنت مزدوری کرنے کا تھا۔ تاہم فوری طور پر اس کے پاس رات گزارنے کی جگہ بھی نہ تھی۔ وہ ایک بس کے اڈے پر ویٹنگ روم میں لگی ہوئی بینچ کے پیچھے سو گیا۔ اسے ڈر تھا کہ بینچ پر کوئی اسے رات بھر سونے نہیں دے گا۔

کچھ دیر بعد اس نے دو عورتوں کی گفتگو سنی جو اسی بینچ پر آ کے بیٹھ گئی تھیں اور یہ سمجھتے ہوئے کہ سننے والا کوئی نہیں' آپس میں رازدارانہ تبادلۂ خیالات کر رہی تھیں۔ مولے کو اندازہ ہوا کہ وہ ماں' بیٹی ہیں۔ نیچے سے وہ ان کے پیروں کا قریب سے معائنہ کر کے ان کی عمروں کا تعین کر رہا تھا کہ بیٹی نے کہا "ماں' مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ کہیں پولیس نہ آ جائے۔"

مولہ چونک پڑا مگر دم سادھے لیٹا رہا۔

ماں نے بیٹی کو تسلی دی "حوصلہ رکھ پتر۔ ابھی کسی کو کچھ معلوم نہیں۔"

"کیا پتا کسی نے لاش دیکھ لی ہو۔"

"جھلی نہ بن۔ رات کو اس سے ملنے کون آئے گا۔ صبح تک ہم نکل جائیں گے۔"

"لیکن ماں...... ہم جائیں گے کہاں۔"

"تو فکر نہ کر۔ اللہ کی زمین بہت بڑی ہے۔ کہیں ٹھکانا مل ہی جائے گا۔ جلدی آ جاتے تو کوئی لاری مل جاتی۔ اب رات تو اسی طرح بیٹھ کے گزارنی پڑے گی...... تو سو جا۔"

"نہیں ماں...... نیند کہاں آئے گی مجھے۔" وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

"کچھ کھا لے...... خالی پیٹ ہو تو نیند بھی نہیں آتی۔ دماغ بھی کام نہیں کرتا۔" ماں نے پیار سے کہا۔

بیٹی کچھ دیر بعد بولی "اگر ہم پکڑے گئے...... تو کیا...... پھانسی ہوگی ہمیں؟"

"یا میرے خدا...... لڑکی تو پاگل ہے۔ میں جو کہہ رہی ہوں کہ کچھ نہیں ہوگا۔ ہم پر کسی کا شک نہیں جا سکتا اور ابھی تو دو چار دن خطرے کی کوئی بات نہیں' میں نے باہر سے تالا ڈال دیا ہے۔ کسی کو پتا ہی نہیں چلے گا۔"

"پھر لاش بو دینے لگتی ہے ماں...... کتنے دن بعد؟"

اس سے پہلے کہ ماں جواب دیتی' دم بخود لیٹے ہوئے مولے کی ناک میں مچھر گھس گیا اور اسے ایک دم چھینک آ گئی۔ یہ چھینک ان ماں' بیٹی کے لیے کسی بم کے دھماکے سے کم نہ تھی۔ لڑکی نے ایک ہلکی سی چیخ بھی ماری اور پھر شاید اپنا منہ دبا لیا۔ ماں نے جھک کے نیچے جھانکا مگر اتنی دیر میں مولہ پچھلی طرف کھسک کے باہر آ چکا تھا۔

عورت کا رنگ لاش کی طرح سفید پڑ گیا تھا اور بیٹی تو بے ہوش ہونے کے قریب تھی "تم...... تم کک...... کون ہو؟"

مولے نے آہستہ سے کہا "ڈرو نہیں' میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

عورت کانپنے لگی "اس کا مطلب ہے...... تم نے سب سن لیا ہے؟"

مولہ ان کے ساتھ بینچ پر بیٹھ گیا "اپنے آپ کو سنبھالو بی بی! ابھی میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتا کہ تمہاری مدد ضرور کروں گا لیکن جتنا میں نے غلطی سے سن لیا ہے' وہ میری زبان سے کوئی کبھی نہیں سنے گا۔"

"تم...... تم کیا کر رہے تھے یہاں؟"

"میں بھی چھپا ہوا تھا۔ بینچ پر سوتا تو اڈے والے اٹھا دیتے اور باہر نکال دیتے۔" مولے نے کہا۔

"ہوں...... کوئی گھر نہیں ہے تمہارا بھی......؟" عورت نے کہا۔ لڑکی ماں کے پیچھے چھپی اسے اپنی دہشت زدہ بڑی بڑی آنکھوں سے دیکھتی رہی۔

"نہیں' میں بھی آج بڑے گھر سے نکلا ہوں لیکن ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا تھا' اچھا ایک منٹ رکو...... میں تمہارے لیے چائے لے کر آتا ہوں۔ کینٹین ابھی کھلی ہے۔" مولے نے کہا اور جواب سنے بغیر اٹھ کر گیا اور پھر لوٹ کے آیا "دیکھو' کہیں جانا نہیں۔ ہو سکتا ہے میں تمہارا مسئلہ حل کر دوں۔ تم دونوں عورتیں ہو' تمہارا اکیلے رہنا ٹھیک نہیں۔ تم کسی مصیبت میں نہ پڑ جاؤ۔"

معلوم نہیں مولے کی بات میں اثر تھا یا اس کی شخصیت میں کہ جب وہ واپس آیا تو اسے دونوں عورتیں اپنی جگہ بیٹھی ہوئی ملیں۔ غالباً انہوں نے صلاح مشورے کے بعد طے کیا تھا کہ اب بھاگنا غلط ہوگا۔ اس بندے کو آزمالینا چاہیے۔ سچ تو اسے معلوم ہو ہی گیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ خود کتنا سچا ہے۔

چائے پینے اور بسکٹ کھانے تک ان کے درمیان اعتماد

کی فضا کسی حد تک قائم ہوگئی تھی۔ اس میں مولے کی کوشش کو بہت دخل تھا۔ اس نے دونوں ماں بیٹی کو قائل کرلیا تھا کہ وہ مخلص ہے اور اس پر بھروسا کیا جاسکتا ہے۔ وہ کچھ پُرسکون نظر آنے لگی تھیں۔

ماں نے اعتراف جرم کرتے ہوئے بتایا کہ وہ اپنے شوہر کو قتل کرچکی ہے۔ یہ اس کا دوسرا شوہر تھا جس سے اس نے ایک سال قبل شادی کی تھی۔ اس کا پہلا شوہر اٹھارہ سال ساتھ رہا تھا۔ وہ بلوچستان میں کوئلے کی کان میں کام کرتا تھا۔ زیادہ کمانے کے لیے وہ زیادہ محنت کرتا تھا۔ کان کے اندر کا ماحول اتنا خراب تھا کہ اس کی صحت خراب ہوتی چلی گئی۔ جو خوراک اسے ملنی چاہیے تھی' وہ ٹھیکے دار نے کبھی نہیں دی اور وہ اپنی محدود آمدنی میں نہ اچھی خوراک کھا سکتا تھا اور نہ صحیح علاج کراسکتا تھا۔ اس کے مرنے کے بعد ماں بیٹی کا وہاں رہنا مشکل ہوگیا۔ ان کے پاس کرائے کی کوٹھری تھی۔ شوہر کے جو تھوڑے بہت واجبات تھے' وہ بھی ختم ہوگئے تو فاقہ کشی کی نوبت آگئی۔ ان کے چاروں طرف ہوس کے مارے ہوئے بھوکے گدھ جیسے مردوں کی دنیا تھی جوان کے جسم نوچ لیتے۔ ایک دو باراوباش لوگ رات کے وقت صحن میں بھی کود آئے مگر ان کے شور مچانے پر بھاگ گئے۔ پولیس آئی تو انہیں یوں لگا جیسے خطرہ پہلے سے زیادہ ہوگیا ہے۔ انہوں نے صاف کہا کہ جب مرد نہیں ہے تو دوسرے مردوں کو کب تک روکو گی' پسند کرلو کسی کو بھی۔ مرد تو ہم بھی ہیں اور وردی والے بھی ہیں' کھلائیں گے' پلائیں گے اور خوش بھی رکھیں گے۔

ایسے ہی ایک ٹھیکے دار نے اسے شادی کی پیشکش کی۔ وہ کوئی اچھا آدمی نہیں تھا۔ خود اس کا شوہر اس کی برائیاں کرتا رہتا تھا کہ حرام کھاتا ہے مگر مزدوروں کے پیسے پورے نہیں دیتا۔ مزدوروں کو انسان نہیں سمجھتا۔ شادی کی نہیں ہے' اِدھر اُدھر منہ مارتا پھرتا ہے۔ کسی روز مارا جائے گا۔ یہ سب باتیں بے سبب نہیں ہوں گی مگر شادی کے معاملے میں وہ مخلص نظر آتا تھا اور اسے خود سے زیادہ بیٹی کی فکر تھی۔ اس نے یہ سوچ کے شادی کرلی کہ کم سے کم اس کا گھر تو ہوگا اور باپ سوتیلا سہی' بیٹی کی حفاظت تو کرے گا۔

شادی کے چند ماہ بعد حالات بگڑنے لگے۔ دوسرے شوہر کا اصل چہرہ سامنے آتا گیا۔ اسے شراب کی لت تھی اور نشے میں وہ جانور بن جاتا تھا۔ جوان بیٹی کے سامنے ننگا ہونے میں بھی عار محسوس نہیں کرتا تھا۔ پہلے اس پر ایک قاتلانہ حملہ ہوا مگر وہ بال بال بچ گیا۔ پھر اس کے خلاف غبن کے ایک کیس کی تحقیقات شروع ہوگئیں تو اس نے کچھ دنوں کے لیے روپوش ہوجانے کا فیصلہ کیا۔ وہ کسی کو کچھ بتائے بغیر بیوی اور سوتیلی بیٹی کے ساتھ لاہور آگیا۔ اس نے فرضی نام سے مکان کرائے پر لیا اور کوشش کرتا رہا کہ اس کے خلاف غبن کا کیس دب جائے۔

اس کی شراب نوشی جاری رہی اور بہت جلد یہ بات سامنے آگئی کہ ماں کے ساتھ اس کی نظر سوتیلی بیٹی پر بھی ہے۔ اس روز اس نے نشے میں بیٹی کی آبرو لوٹنے کی کوشش کی۔ ماں اس وقت کچھ سودا سلف لینے بازار چلی گئی تھی۔ وہ اچانک پہنچی تو اسے عجیب منظر دکھائی دیا۔ اس کی بیٹی نیم بے ہوش پڑی تھی۔ اس کے جسم پر لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ ایک حیوان کا مقابلہ کرتے کرتے اس کی ہمت جواب دے گئی تھی اور ماں نہ آتی تو شاید وہ حیوان اس کے ہوش میں آنے کا انتظار بھی نہ کرتا۔ ماں کا دماغ الٹ گیا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' کچن سے نئی چمکتی چھری اٹھا کے اس نے شرابی مرد پر حملہ کیا۔ کسی دشواری کے بغیر شوہر نے بیوی سے چھری چھین لی اور قریب تھا کہ اس سے بیوی کو ذبح کردیتا کہ پیچھے سے بیٹی نے اس کے سر پر ٹیبل لیمپ مارا۔ وہ چکرا کر گرا تو جنون میں مبتلا ماں نے اس کو ذبح کرنے میں دیر نہیں لگائی۔

کچھ دیر رونے دھونے کے بعد جب ان کے ہوش وحواس بحال ہوئے تو انہیں صورت حالات کی سنگینی کا اندازہ ہوا۔ انہوں نے شناخت ظاہر کرنے والے تمام کاغذات نذر آتش کیے۔ جتنا نقد گھر میں تھا ساتھ لیا اور مکان کو تالا ڈال کے نکل کھڑی ہوئیں۔ یہ سوچے بغیر کہ وہ جائیں گی کہاں' وہ بس کے اڈے پر آگئیں۔

جب اس کی باری آئی تو مولے نے پورا سچ نہیں بولا۔ اس نے بتایا کہ اس کی بیوی مرچکی ہے اور چونکہ وہ اپنے نوزائیدہ بچے کو پال نہیں سکتا تھا اس لیے اسے شہر لے آیا تھا کہ کسی یتیم خانے کے سپرد کردے۔ بچے کو اس نے ایدھی ہوم کے باہر رکھے ہوئے جھولے میں ڈال دیا اور رات گزارنے کے لیے قریب کی ایک مسجد میں چھپ کر سوگیا۔ اس کا ارادہ صبح اپنے گاؤں لوٹ جانے کا تھا۔ صبح جب اذان سے پہلے دروازے کھلے تو اس نے باہر نکلنا چاہا۔ بدقسمتی سے گزشتہ رات مسجد سے ایک کلاک چوری ہوگیا تھا۔ موذن نے اسے پکڑلیا اور پولیس کے حوالے کردیا۔ اس کی کسی نے ایک نہیں سنی۔ پولیس نے مار مار کے اسے اعتراف جرم پر مجبور کیا اور دھمکی دی کہ یہ جرم قبول نہ کرنے پر اس کے قبضے سے ہیروئن کی پڑیاں برآمد ہونے کا کیس درج کرلیا جائے گا۔ جان چھڑانے کے لیے اس نے جرم تسلیم کرلیا اور اسے چھ ماہ کی قید

ہوگئی۔ وہ آج ہی جیل سے رہا ہوا تھا اور اب واپس گاؤں جانے کا ارادہ رکھتا تھا۔

صبح تک ہونے والی کانفرنس کے نتیجے میں فریقین کے درمیان اعتماد باہمی کا مضبوط رشتہ قائم ہوگیا۔ مولے نے عورت کو یقین دلایا کہ فرضی نام سے رہائش پذیر اس کے سابق شوہر کی لاش کو لاوارث قرار دے کر دفن کردیا جائے گا۔ پولیس اس کی شناخت میں ناکام رہے گی تو اس کی بیوی اور بیٹی تک کیسے پہنچے گی لیکن یہ ضروری ہے کہ وہ روپوشی کے لیے کسی دور دراز اور گمنام مقام پر چلی جائیں۔ پھر مولے نے انہیں اپنے گاؤں کے بارے میں بتایا جہاں کسی کے خیال کی رسائی بھی ممکن نہ تھی اور انہیں نیک نیتی کے ساتھ تحفظ اور پناہ کی پیش کش کی۔

مولے میں عورتوں کا دل موہ لینے کی خداداد صلاحیت تھی۔ وہ ماں' بیٹی بھی غیر شعوری طور پر اس سے متاثر ہوئیں اور اس کے ساتھ جانے پر تیار ہوگئیں۔ ماں' بیٹی کو وہ بے حد قابلِ اعتماد محسوس ہوا تھا اور چونکہ ان کے سامنے نہ کوئی راستہ تھا اور نہ منزل تھی چنانچہ انہوں نے جان بچانے کے لیے قسمت آزمانے کو ترجیح دی۔ انہوں نے آپس میں طے کیا کہ گاؤں جاکے وہ لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے کیا کہانی سنائیں گے۔ یہ کہانی نصف سچ پر مبنی تھی۔ عورت کی زندگی کے اٹھارہ سال جو پہلے شوہر کے ساتھ گزرے مبنی برحقیقت تھے۔ اگر کوئی تفتیش کرتا' جس کا امکان ایک فی صد بھی نہ تھا۔ تو اس عورت کے بیوہ ہونے کی تصدیق ہوجاتی۔ بس اس کے دوسرے شوہر کی جگہ مولے نے لے لی۔ درمیان میں سے ٹھیکے دار غائب ہوگیا۔ مولے نے اس سے ملاقات کی اور ایک قابل یقین کہانی شادی اور گاؤں میں انہیں میاں بیوی تسلیم کرلیا گیا۔

درحقیقت وہ میاں بیوی اس وقت تک نہیں بن سکتے تھے جب تک عورت اپنی عدت کا زمانہ نہ گزار لیتی۔ ایک ساتھ رہنے میں خرابی ہوتی۔ آگ اور پیٹرول کو اس لیے ساتھ نہیں رکھا جاتا۔ ایک دن بالآخر جذبات کی ایسی طوفانی لہر آئی کہ شرعی' اخلاقی اور قانونی دیوار محفوظ نہ رہ سکی۔ وہ نکاح کے بغیر ہی میاں بیوی کی حیثیت سے زندگی گزارنے لگے اور بیٹی نے ماں کی اس مجبوری کو نظریہ ضرورت کے تحت تسلیم کیا۔

اس غیر اخلاقی زندگی کے راستے کا انجام اگر ان تینوں کے بچھڑنے کی صورت میں نکلا تو یہ گویا اعمال کی سزا تھی۔ ایک منطقی انجام تھا۔

مولہ جب رانا کی قید سے فرار ہوکے دوبارہ شہر پہنچا تو اس کے وجود میں بھڑکنے والی آتش انتقام کسی آتش فشاں کی طرح ہوگئی تھی۔ وہ پاگل ہورہا تھا اور زندگی میں پہلی بار اسے احساس ہورہا تھا کہ محبت کیا ہوتی ہے' کیسے ہوتی ہے' کیسے آدمی کو مجنوں بناتی ہے۔ کیسے مولے کو شہباز سے لڑادیتی ہے اور کس طرح موت کا خوف دل سے نکال دیتی ہے۔ اس کے لیے مرجانا یا ماردینا اس عورت کی جوانی کے مقابلے میں بہت آسان ہوگیا تھا۔ وہ مرد جس کے لیے ہرنئی عورت پانے اور کسی طلب کے بغیر حاصل ہونے والی چیز تھی' ایک پرانی استعمال شدہ عورت پر ساری دنیا کو قربان کرنے کے لیے تیار تھا۔

سابقہ تجربہ اس کے کام آیا۔ وہ ایک اخبار کے دفتر میں پہنچا۔ وہاں سہ پہر کے وقت کوئی بھی نہیں تھا۔ ایک کمرے میں ایک بنی سنوری فلمی ماڈل ٹائپ شوخ میک اپ اور اشتہاری لباس میں کسی رپورٹر سے فلرٹ کے مزے لے رہی تھی۔ فلمی رپورٹر سوچ رہا تھا کہ اسے اپنے بے حد مصروف شیڈول میں کب اور کہاں ایڈجسٹ کرے۔

ایسے میں مولے کی مداخلت ان دونوں کو گراں گزری

لیکن جب مولے نے چھوٹے بڑے رانا صاحب کی سوانح عمری سے چیدہ چیدہ سنسنی خیز واقعات سنانے شروع کیے اور ان کے حرم کی رنگین راتوں کے قصے سنائے تو ان کی ساری کوفت دور ہو گئی۔

رپورٹر نے پولیس کی طرح مولے کو ایک بیان کی تیاری کرائی جو سچ پر مبنی ضرور تھا مگر زیب داستان کے لیے اس میں بہت کچھ بڑھا بھی دیا گیا تھا۔ مولے کے اعتراض پر کہ یہ تو جھوٹ ہے، رپورٹر نے کہا کہ دیکھو بھئی' اینٹ کا جواب پتھر سے دیے بنا بات بنتی نہیں اور وہ کون سا بہت سچا اور ایماندار آدمی ہے کہ تم اتنی ایمان داری سے صرف سچ پر اصرار کر رہے ہو۔

مولہ خاموش ہو گیا اور اخبار کے رپورٹر نے اپنی ہدایات کے مطابق اس کا ایک تہلکہ خیز بیان ریکارڈ کیا۔

''اب تم دیکھنا۔ صبح اخبار میں یہ بیان شائع ہوتے ہی چھوٹے بڑے رانا صاحب کے چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔'' رپورٹر نے کہا۔

مولے نے سر ہلایا ''مجھے میری بیوی تو مل جائے گی جناب؟''

''وہ خود لائیں گے تمہاری بیوی اور سوتیلی بیٹی کو اور تم سے ہاتھ جوڑ کے معافی بھی مانگیں گے۔'' رپورٹر نے کہا ''تلافی کے طور پر تمہیں کچھ نہ کچھ مل جائے گا۔ نقد یا زمین کی صورت میں۔''

''اس کا مطلب ہے مجھے پولیس کے پاس جانے کی ضرورت نہیں؟''

''ارے نہیں یار! پولیس کو بھی تم نے رگڑ دیا ہے اپنے بیان میں کہ انہوں نے تمہاری رپورٹ لکھنے کے بجائے الٹا تمہیں حوالات میں بند کر دیا۔ تمہیں ڈرایا دھمکایا اور تم پر تشدد کیا۔ ان کی نوکریاں جائیں گی۔ آئندہ کسی غریب کی بہو بیٹی کے ساتھ زیادتی نہیں ہو گی۔ تم نے بڑا اچھا کیا جو یہاں آ گئے۔ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ اس وقت یہاں محترمہ بھی تشریف فرما ہیں۔ یہ خواتین کے حقوق کی بہت بڑی چیمپئن ہیں۔ باقی معاملات کو یہ سنبھال لیں گی۔''

محترمہ نے ادائے دلبری کے ساتھ مسکرا کے اور ساڑی کا پلو گرا کے اپنی جلوہ سامانی سے مولے کی نگاہوں کو خیرہ کیا ''اب تم فکر ہی نہ کرو۔ میں کل ہی ایک احتجاجی مظاہرے اور ایک پریس کانفرنس کا انتظام کرتی ہوں۔ اس سے حکومت کے ایوانوں میں زلزلہ آ جائے گا۔ آزادیٔ نسواں کی جدوجہد اسی طرح کامیاب ہو گی۔''

وہ مولے کو اپنے ساتھ لے گئی۔ اس کے جاتے ہی رپورٹر نے رانا صاحب کو فون کیا اور انہیں بتا دیا کہ مولے نے ان کے خلاف اپنے بیان میں ان پر کیا الزامات عائد کیے ہیں اور وہ چاہتا ہے کہ یہ بیان من و عن شائع ہو جائے۔ عورتوں کو مادر پدر آزاد کرنے کی فلاحی تحریک کی کرتا دھرتا یہاں موجود تھی۔ اب وہ مولے کو اپنے ساتھ لے گئی ہے۔

چھوٹے رانا صاحب رات کے وقت اخبار کی کاپی پریس میں جانے سے پہلے رپورٹر کے پاس پہنچے اور اسے اپنی شاندار نئی گاڑی میں بٹھا کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں لے گئے۔ وہاں ڈنر کے بعد اس نے رپورٹر کو پھولوں کا ایک گلدستہ پیش کیا ''یہ والد صاحب نے بھجوایا ہے۔''

رپورٹر نے تاڑنے والی نظر سے گلدستے میں پوشیدہ لفافے کی دبازت کو محسوس کیا اور مسکرا کے تحفہ قبول کر لیا ''ہم تو رانا صاحب کے خیر خواہ ہیں ہمیشہ سے۔ ایک تحفہ ہماری طرف سے بھی پیش خدمت ہے۔'' رپورٹر نے خوبصورت رنگین کاغذ میں لپٹا ہوا ایک چھوٹا سا پیکٹ آگے بڑھایا۔

رانا نے ہاتھ ملائے وہ پیکٹ اپنے بریف کیس میں رکھ لیا۔ اسے معلوم تھا کہ اس میں مولے کا ٹیپ کیا ہوا بیان ہو گا۔ اس خیر خواہ سے یہ اندیشہ بہرحال نہیں تھا کہ اس نے بیان کی کوئی کاپی بنا کے رکھ لی ہو گی۔

عورتوں کو آزادی دلانے والی تنظیم کی چیئرپرسن نے مولے کو حفظ ماتقدم کے طور پر اس رات اپنے بیڈروم میں قید رکھا۔ وہ اکیلی رہتی تھی اور اتنی باعمل تھی کہ روایتی پردے' دقیانوسی لباس' شرم و حیا اور تین شوہروں سے آزادی حاصل کر چکی تھی۔ اس نے مولہ کو اچھی طرح بریف کیا کہ پریس کلب میں صحافیوں کے سامنے اس کو کیا کہنا ہو گا اور ان کے سوالات کے جواب کیسے دینے ہوں گے۔ احتجاجی مارچ میں جو اسمبلی تک ہو گا کیا نعرے لگائے جائیں گے۔ خواتین کے ہاتھوں میں کس قسم کے بینرز ہوں گے اور آخر میں وہ کیا تقریر کرے گا۔ وہ الٹی میٹم دے گا کہ چوبیس گھنٹے میں اس کی بیوی اور بیٹی کو بازیاب نہ کرایا گیا تو وہ گورنر ہاؤس کے سامنے خودسوزی کرے گا۔

ابھی وہ ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ دربان نے کسی ملاقاتی کا کارڈ پیش کیا۔ چھوٹے رانا صاحب کا نام دیکھ کر وہ مسکرائی ''انہیں بٹھاؤ ڈرائنگ روم میں۔''

وہ کچھ دیر بعد پوری تیاری کے ساتھ گئی تو رانا نے ولایت پلٹ ایٹی کیٹس کے ساتھ کھڑے ہو کے اس کا استقبال کیا۔ چائے کے رسمی تکلف کے بعد چھوٹے رانا نے

بڑے احترام سے ایک لفافہ پیش کیا ''یہ والد صاحب نے آپ کے لیے بھجوایا ہے۔ دس لاکھ کا چیک۔ آپ تو اچھی طرح جانتی ہیں وہ خود حقوق نسواں کے کتنے حامی ہیں اور آپ کی تحریک کے ہمیشہ سے معترف رہے ہیں۔''

''ان کا میری طرف سے شکریہ ادا کیجئے گا۔'' خاتون نے چیک وصول کرتے ہوئے ایک خوبصورت مسکراہٹ کے ساتھ اس فوٹوگرافر کے کیمرے کی طرف دیکھا جس نے بروقت اندر آ کے تصویر اتار لی تھی۔

''اخبار میں کب آئے گی یہ تصویر؟'' رانا نے کہا۔

''کل صبح جناب! اور اس بار رنگین ہو گی۔'' فوٹوگرافر بولا۔

چھوٹے رانا نے کہا ''اب میں چلتا ہوں۔''

خاتون نے ایک ادائے ناز سے پلو گرایا ''بہت جلدی میں ہیں آپ...... خیر' اپنی چیز تو لیتے جائیے۔''

اس نے مولے کو اندر بلایا ''لو بھئی' تمہارا کام تو ایسے ہی ہو گیا۔''

چھوٹے رانا نے بے تکلفی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا ''یار! ایسی ناراضی کی تو کوئی بات نہیں تھی۔ تمہاری بیوی اور بیٹی کو ہم لے آئے ہیں۔''

مولے کو یقین نہ آیا ''آپ لے آئے ہیں؟''

''یقین نہیں آتا تو باہر چل کے دیکھ لو۔ وہ بیٹھی ہیں باہر۔''

باہر آ کے مولے کو واقعی یقین آ گیا کہ دنیا گول ہے۔ باہر ایک پولیس وین پہلے سے موجود تھی۔ مولے کو گٹھری بنا کے وین میں پھینک دیا گیا۔ چند گھنٹے بعد وہ پھر وہیں تھا جہاں سے چلا تھا۔ اس کی تشریف آوری کی خوشی میں ایک استقبالیہ تقریب تو پولیس وین میں ہی منعقد ہو گئی تھی۔ جب اسے نیم جاں حالت میں بڑے رانا صاحب کے قدموں میں پھینکا گیا تو مولے کو اپنے انجام کے بارے میں کوئی خوش فہمی نہ تھی۔

رانا صاحب نے اس کی پسلیوں میں پے در پے کئی ٹھوکریں مارنے کے بعد کہا ''ہاں بھئی مولے! تجھے بیوی چاہیے اپنی۔ بیٹی تو خیر تیری ہے نہیں کہ تو مانگے۔ اس کا باپ ہو گا کوئی تو اس سے نمٹ لیں گے بعد میں۔''

اب گڑگڑا کے معافی مانگنا لاحاصل تھا۔ مولے نے درد سے لوٹتے ہوئے کہا ''رانا صاحب میں نے کوئی جرم تو نہیں کیا اپنی بیوی مانگ کے۔''

رانا صاحب حاضرین و ناظرین کی طرف دیکھ کے ہنس پڑے ''لو بھئی' سنو اس کتے کی بات جو شیر کی طرح بھونکتا ہے۔ اوئے تیری بیوی وہ تھی کب؟ بول...... کیا نکاح پڑھوایا تو نے اس سے؟ اور تو مجھ سے پوچھتا ہے کہ تو نے کیا جرم کیا ہے؟ بھئی تھانے دار! اس کو بتاؤ اس کے خلاف جرائم کی فہرست کیا ہے؟''

مولے کو گرفتار کر کے لانے والی پولیس پارٹی کے انچارج اے ایس آئی نے فرفر بولنا شروع کیا۔ ''مولے نے اس عورت سے آشنائی کی۔ پھر اس کے شوہر کو قتل کیا اور لاش گھر میں چھوڑ کے اور تالا لگا کے اس عورت کو بھگا لایا۔'' اس نے تعزیرات پاکستان کی مختلف دفعات کے علاوہ حدود آرڈیننس کی مختلف دفعات کے حوالے سے مولے پر قائم ہونے والے مقدمات کی فہرست پڑھی جن کے تحت اسے ہر جرم پر ایک بار سزائے موت ہو سکتی تھی اور اسے سنگسار کیا جا سکتا تھا۔

تھانے دار خاموش ہوا تو مجمع ایک پرتجسس خاموشی کے ساتھ رانا صاحب کی عدالت کے فیصلے کا انتظار کرنے لگا۔

رانا صاحب کی آواز گونجی ''تو خودسوزی کرنا چاہتا تھا۔ وہ بھی گورنر ہاؤس کے سامنے...... اوئے مورکھ' اس کے لیے اتنی دور جانے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ تو یہاں بھی ہو سکتا تھا۔ اس کے لیے اتنا پاکھنڈ کرنے سے تجھے تو کچھ حاصل نہیں ہوا۔ ہمارے دس بارہ لاکھ کا نقصان ہو گیا۔ ایک لاکھ دینے پڑے اس بلیک میلر کتے رپورٹر کو جو بھونکنے کی دھمکی دیتا تھا۔ دس لاکھ گئے اس کتیا کے پاس جس کی آواز میں آواز ملانے اس جیسی گھروں سے نکل آتی ہیں' کنجریاں...... سب کے پیچھے یہ چھوٹے موٹے بیوروکریٹ' سیاست داں اور .... دم ہلاتے پھرتے ہیں۔''

اچانک رانا صاحب کو احساس ہوا کہ یہ سب مولے سے کہنا قطعی لاحاصل ہے۔ انہیں فیصلہ سنانا چاہیے۔

''چل جا مولے! خودسوزی کرنا چاہتا تھا تو...... کر لے...... مگر دیکھ' ذرا دور جا کے کرنا۔ سنا ہے بڑی گندی بو آتی ہے گندا خون اور گوشت جلنے سے۔'' انہوں نے حقارت سے کہا اور پلٹ گئے۔

مولے کو رانا صاحب کے حکم بردار گھسیٹ کر گاؤں سے باہر لے گئے۔ اسے ببول کے ایک جھاڑ کے ساتھ باندھ دیا گیا۔ مولہ چیختا رہا۔ رحم مانگتا رہا مگر وقت آخر کی توبہ تو خدا کی بارگاہ میں بھی قبول نہیں ہوتی۔ اس پر مٹی کا تیل چھڑکا گیا۔ وہ سر سے پاؤں تک شرابور ہو گیا۔

اس وقت تک غلاموں کا ایک غول اس عورت کو اور اس

کی بیٹی کو گھیر کر لا چکا تھا۔ وہ رو رہی تھیں۔ چلا رہی تھیں اور فریاد کر رہی تھیں۔ وہ شرعی اور قانونی طور پر شوہر نہ سہی' سوتیلا باپ نہ سہی' ایک اچھا آدمی تو تھا جس نے انہیں پناہ دی تھی اور آسرا فراہم کیا تھا۔ انہوں نے بھڑکتے شعلوں میں مولے کی ہر چیخ سنی۔ پھر خاموشی چھا گئی اور فضا میں صرف سرسراتے شعلوں کی صدا باقی رہ گئی۔ پھر وہ بھی نہ رہی۔ ببول کا درخت اور مولے کا جسم راکھ میں تبدیل ہو گئے۔ خودسوزی کے اس واقعے کی خبر کسی اخبار میں شائع نہ ہوئی۔ اس سے صرف غلاموں نے عبرت پکڑی' فہو المطلوب۔

دوسرا واقعہ بھی اتنا ہی عبرت ناک اور اسی سے ملتا جلتا تھا۔ ایسے ہی غیرت میں آ کے ایک غلام نے آقا پر قاتلانہ حملے کی جسارت کی تھی۔ وہ تو عین وقت پر ایک جانثار اپنی گردن کٹانے کے لیے سامنے آ کے قربان ہو گیا ورنہ اس کی کلہاڑی کے وار سے رانا صاحب کا سرعزیز کہیں جا کے گرتا اور دستار خود اپنے لہو سے داغدار ہو کے قدموں میں پڑی ہوتی۔ اس باغی کو فی الفور سزائے موت دی گئی۔ اسے گاؤں کے چوک میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ اس کی لاش نشان عبرت بنی دو دن وہاں لٹکتی رہی۔ تیسرے دن مجرم کی بوڑھی ماں زاروقطار روتی رانا صاحب کے قدموں میں گر گئی تو لاش کو اتار کے دفنانے کی اجازت اس شرط پر دی گئی کہ اسے گاؤں سے دس کوس کے فاصلے پر گاڑا جائے۔

اگلے دن رانا صاحب کے علم میں یہ بات لائی گئی کہ مجرم کے جنازے میں فلاں فلاں نے شرکت کی اور گاؤں کی مسجد کے مولوی نے نہ صرف اسے غسل اور کفن دیا بلکہ اس کی نماز جنازہ بھی پڑھائی۔ رانا صاحب نے مولوی کو طلب کر لیا ''اوئے ملا! غسل اور نماز جنازہ تو ہوتا ہے انسانوں کے لیے' جن کو عزت کی موت نصیب ہو۔ نمک حرام کتوں کے لیے نہیں۔''

مولوی کی کوئی دلیل کام نہ آئی۔ جنازے میں شریک ہونے والوں کو تو معافی مل گئی مگر مولوی کی داڑھی مونچھیں اور بھنوئیں مونڈ کر اور منہ کالا کر کے گدھے پر الٹا بٹھانے کے بعد گاؤں کی گلیوں میں پھرایا گیا اور گاؤں بدر کر دیا گیا۔ اس وارننگ کے ساتھ کہ دوبارہ اس کی شکل نظر آئی تو اس کا جنازہ نہیں ہوگا۔

☆☆☆

اس دلچسپ ترین کہانی کے بقیہ واقعات دوسرے حصے میں ملاحظہ فرمائیں

تاوان

زندگی کی ناہموار ٹھوکروں پر چلتی ہوئی جہانی استاد کی ایک ہنگامہ خیز سرگزشت

ایک انسان کی کہانی جسے حالات کی ٹھوکروں نے شاہ جہاں سے جہانی استاد بننے پر مجبور کر دیا

بڑے بڑے تیس مار خان مجرم اُس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔

قانون کے لمبے ہاتھ اُس کی گردن تک پہنچنے سے معذور تھے۔

لیکن پھر ایک نازک سی لڑکی کی خاطر اُس نے خود کو قانون کے حوالے کر دیا۔

لاہور جیل اور اٹک جیل میں اُس پر تشدد کی انتہا کر دی گئی۔

پھر حالات نے اسے انجانے راستوں پر قدم اُٹھانے پر مجبور کر دیا۔

زندگی جہانی اُستاد سے مزید تاوان کی طلب گار تھی۔

علی میاں پبلیکیشنز ۲۰۔عزیز مارکیٹ اُردو بازار، لاہور
فون: 7247414
E-mail:alimian_publications@yahoo.com

قسمت کے پھیر میں اُلجھے ایک نوجوان کی داستان

اناڑی

احمد اقبال

2

اناڑی دلنا

قسمت کے پھیر میں اُلجھے ایک نوجوان کی کتھا، حالات اور واقعات کا بہاؤ اسے دیارِ غیر لے گیا جہاں وہ اناڑی تھا مگر خود کو کسی کھلاڑی سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ ایسا کھلاڑی جسے کسی بساط پر شکست نہیں دی جاسکتی تھی۔ اس کا اناڑی پن اُسے کھلاڑیوں کے مقابل کامیابیاں دلاتا رہا۔ اُسے پردیس راس آ گیا تھا جہاں کی ہنگامہ خیزیاں اس کا دل لبھاتی تھیں مگر دوسری طرف دیس میں اُس کی لاٹری کھل گئی۔ ایسی لاٹری کہ جس کے بعد اُسے لوٹنا تھا۔ اناڑی کھلاڑی بننے کے بعد...... وہ لوٹا...... تو ہنگامے اور شرارتیں اُس کے ساتھ تھیں۔ قدم قدم پہ آنسو اور لمحہ لمحہ قہقہوں سے لبریز اُس اناڑی کی کہانی جس کا دل دو حصوں میں منقسم تھا۔

خوب صورت وگل رنگ جذبوں سے گندھی ایک تیز رفتار کہانی

کاسو کی بیوی کے سنائے ہوئے واقعات جتنے ناقابل یقین تھے اتنے ہی لرزہ خیز بھی تھے۔ اس نے جو کچھ بتایا اپنی زبان میں بتایا تھا۔ اس کو جیسا میں نے چشم تصور سے دیکھا اور محسوس کیا یہی تھا۔ اس کے حقائق میں نہ کمی بیشی کی اور نہ رنگ آمیزی۔ میں نے اسے صرف اپنے قلم کی زبان سے بیان کر دیا۔

جب کاسو کی بیوی خاموش ہوگئی' فضا بہت بوجھل تھی۔ فریال باقاعدہ آنسو بہا رہی تھی۔ خود راجا کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا اور میں کوشش کر رہا تھا کہ جذبات کی رو میں نہ بہتے ہوئے کوئی فیصلہ کرسکوں۔

بالآخر میں نے کہا "میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان حالات میں تمہاری کیا مدد کی جائے؟"

اس نے پرامید نظروں سے مجھے پھر فریال کو اور راجا کو دیکھا "آپ تو سب کچھ کرسکتے ہیں نواب صاحب! آپ اناڑی نہیں ہیں۔"

مجھے ایسا لگتا تھا کہ نہ چاہنے کے باوجود میں نواب صاحب کے لقب سے ہی پکارا جاؤں گا۔ دراصل اس پورے علاقے میں ایسی تاریخی حویلی اور ایسی جاگیر کسی کی نہ تھی۔ رانا رجب علی جتال جیسے جاگیردار ضرور تھے لیکن انہوں نے سیاسی داؤ پیچ استعمال کر کے اپنا اثر رسوخ بڑھایا تھا اور وہ روایتی فیوڈل ذہن کے مالک تھے۔ اس کے برعکس میرے آباد اجداد کے وقتوں سے یہاں کے رہنے والوں میں ان کے حسن سلوک' انصاف پسندی اور دریا دلی کے بارے میں جو روایات مشہور ہوں گی ان سے میرے خاندانی نواب ہونے کا تاثر ابھرتا ہوگا۔

میں نے کہا "دیکھو' جو واقعات تم نے سنائے ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تمہاری مدد کرنے سے الٹا تمہیں نقصان ہوگا۔"

راجا نے میری تائید کی "رانا پولیس کے سامنے تو کچھ بھی نہیں کرے گا۔ اخبار والوں کے سامنے الٹا ہم پر گرجے گا لہ سے گا کہ آپ لوگ کیوں میری کردار کشی پر تلے ہوئے ہیں۔ ہمیں دشمنوں کا ایجنٹ قرار دے گا جو اس کے خلاف سازش کر کے اسے نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ جب یہاں کچھ بھی نہیں ہوگا اور جن کو ہم نے بڑی کوشش سے بلایا ہوگا وہ ہماری بے وقوفی پر ہنستے ہوئے چلے جائیں گے تو رانا وہی کرے گا جو اسے کرنا ہوگا۔"

میں نے کہا "تمام زندگی کی ذمے داری ہم کیسے لے سکتے ہیں؟ آخر تم کو یہیں رہنا ہے' بعد میں بھی۔"

عورت کی نظریں مجھ پر ٹھہر گئیں ''نہیں نواب صاحب! میں یہی فیصلہ کر کے آئی تھی' مجھے بعد میں رانا کی غلامی میں نہیں رہنا۔ آپ کاسو کو بچالو' پھر ہم ساری زنجیریں توڑ کے آجائیں گے' آپ کی پناہ میں۔''

''میری پناہ میں......؟'' میں نے چونک کر کہا۔

''کیا آپ ہمیں پناہ نہیں دے سکتے نواب صاحب! آپ بھی ڈرتے ہو رانا سے؟'' وہ چیلنج کے انداز میں بولا۔

میں نے برہمی سے کہا ''خدا کے سوا میں کسی سے نہیں ڈرتا۔''

''یہ بات ہے تو پھر میرے ساتھ چلو۔''

''تمہارے ساتھ چلوں...... مگر کہاں؟''

''کاسو کو چھڑانے......'' اس نے قطعی لہجے میں کہا۔

چند لمحے تذبذب اور بے یقینی میں گزر گئے۔ میں نے' راجا نے اور فریال نے نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے سے سوال کیا کہ کیا خیال ہے؟ کیا اس عورت کے لیے کچھ کیا جاسکتا ہے' کیا اس کی بات قابل غور ہے؟

پھر راجا نے کہا ''کاسو کہاں ہے؟''

''رانا کی قید میں' مجھے معلوم ہے۔''

میں نے کہا ''وہ تو ٹھیک ہے مگر ہم کیسے چھڑائیں گے اسے؟''

''میں آپ کو لے کر چلوں گی نواب صاحب! راستہ مجھے معلوم ہے۔ میں نے دیکھی ہے وہ جگہ۔ کاسو کو انہوں نے ایک کوٹھڑی میں بند کر رکھا ہے۔''

میں نے کہا ''اپنی حویلی کے اندر اور تم چاہتی ہو ہم حویلی پر چڑھائی کر دیں؟''

''نہیں نواب صاحب! جہاں رانا کے گھوڑے باندھے جاتے ہیں' وہاں ہے وہ کوٹھڑی' حویلی کے پیچھے۔ اس کے گیٹ پر ایک ہی چوکیدار رہتا ہے۔ بندوق ہوتی ہے اس کے پاس لیکن وہ گیٹ کو تالا لگا کے بے فکر ہو جاتا ہے۔ گیٹ کے باہر چارپائی پر سویا پڑا ہوتا ہے۔''

میں اب اس ایڈونچر کے عملی امکانات کا تجزیہ کر رہا تھا اور غالباً راجا بھی اس کمانڈو ایکشن پر غور کر رہا تھا۔ صرف فریال تھی جو خوف زدہ اور پریشان ہوگئی تھی۔

''اندر بھی تو مسلح محافظ ہوں گے۔'' فریال نے کہا۔

عورت نے نفی میں سر ہلایا ''اصطبل کے اندر کوئی نہیں۔''

''حویلی میں تو ہوں گے۔'' فریال نے پوچھا۔

''وہ تو دور ہے۔ حویلی تک آواز بھی نہیں جاتی...... اور رات کو کس کی ہمت ہے کہ حویلی میں گھسے۔ ایک بار ڈاکو آئے تھے۔ سب مارے گئے۔ اندر خود رانا اور اس کے بیٹوں کے پاس ریوالور ہیں اور وہ ولایتی بندوقیں ہیں جس سے لگاتار گولیاں نکلتی ہیں' خود بخود۔''

اس کی مراد غالباً کلاشنکوف سے تھی۔

اس نے اپنی بات جاری رکھی ''حویلی میں رانا کا چھوٹا بھائی ہے۔ رانا افسر علی! وہ اپنے بڑے بھائی جیسا نہیں ہے۔ اس کے دو جوان بیٹے ہیں۔ وہ پکے بدمعاش ہیں۔ حویلی کی چھت پر چار بندے ہوتے ہیں۔''

میں نے کہا ''اس کا مطلب ہے دس بارہ مسلح افراد ہیں' ان سب سے مقابلہ ہوا تو وہ ہمیں چھلنی کر دیں گے۔''

اس نے نفی میں گردن ہلائی ''نہیں نواب صاحب! کسی کو معلوم نہیں ہو سکتا۔ اصطبل کا راستہ پیچھے سے ہے۔ میں جانتی ہوں' ادھر سے کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ جو بندہ گیٹ کے باہر سو رہا ہوگا' اسے آپ قابو کرلو تو چابیاں اس کی جیب میں ہوں گی۔''

فریال نے بے چینی سے پہلو بدلا ''وہاں کتے بھی تو ہوں گے؟''

''کتے حویلی کے سامنے والے حصے میں پھرتے ہیں۔ پیچھے نہیں آسکتے۔ اصطبل میں کوئی خطرہ نہیں۔''

میں نے کہا ''عجیب بات ہے۔ رانا کے گھوڑے بھی قیمتی ہوں گے۔ ان کی حفاظت کا کوئی انتظام نہیں۔''

''گھوڑے کون لے جاسکتا ہے جی۔ لے کے کہاں جائے گا اور کیسے لے جائے گا؟ کھوجی اس کے سموں کے نشان دیکھتے ہوئے سیدھے وہاں پہنچ سکتے ہیں۔ اصطبل کی دیواریں بہت مضبوط ہیں۔ پہرے دار بھی پرانا بندہ ہے۔ پہلے فوج میں تھا مگر اس کو سوتے میں قابو کرنا کیا مشکل ہے۔''

فریال نے چڑ کے کہا ''تمہارے نزدیک تو کچھ بھی مشکل نہیں۔ اتنا آسان سمجھتی ہو تو خود کیوں نہیں لے آئیں اسے بھی اپنے ساتھ؟''

اس نے فریاد طلب نظروں سے مجھے دیکھا ''میں بھی چھپ کر آئی ہوں۔ کسی نے مجھے نہیں دیکھا۔''

''اچھا فرض کرو' ہم کاسو کو نکال لاتے۔ اس کے بعد...... جب رانا کو پتا چلے گا تو کیا وہ اپنا بندہ واپس نہیں مانگے گا؟''

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی ''ہم آپ کی پناہ میں ہوں گے نواب صاحب۔ کیا وہ ہمیں زبردستی چھین کر لے جاسکتا ہے؟ آپ ہمیں بچا نہیں سکتے؟''

فیصلہ ہم نے بیک وقت کرلیا۔

میں نے گھڑی دیکھی ''دو بجے ہیں' اگر ہم گاڑی میں جائیں۔''

راجا نے کہا ''ہم پیدل جائیں گے۔''

اس عورت نے کہا ''گاڑی کا راستہ لمبا ہے' دور ہے۔''

''کتنی دیر میں پہنچ جائیں گے ہم؟'' میں نے کہا۔

عورت کا چہرہ خوشی سے اور اُمید سے دمکنے لگا ''زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے میں نواب صاحب۔''

میں نے فریال سے کہا ''تم فرخ کو اٹھاؤ۔ ہم مزید وقت ضائع نہیں کر سکتے۔''

فریال نے کہا ''میں بھی چلوں گی تمہارے ساتھ۔''

''بکومت۔ یہ عورتوں کا کام نہیں ہے۔''

فریال نے خفگی سے کہا ''کاسو کی بیوی کیا عورت نہیں ہے اور میں تم سے پوچھ نہیں رہی ہوں' تمہیں بتا رہی ہوں۔''

''دیکھو' تم ابھی ولایت سے آئی ہو۔ اس جنگل میں خطرناک کیڑے مکوڑے' سانپ بچھو بلکہ چیتے' بھیڑیے اور آدم خور شیر......''

اس نے میری بات کاٹتے ہوئے بتیسی نکالی ''ہاں' یہ سب نہیں ہوتے اس جنگل میں...... اسی لیے تو میں چل رہی ہوں تمہارے ساتھ۔''

فرخ نے جاگنے کے بعد صورت حال کو سمجھنے میں دیر نہیں لگائی حالانکہ اس کی صورت سے ایسا لگتا تھا کہ وہ آنکھیں کھلی ہونے کے باوجود سو رہا ہے۔ جتنی دیر میں ہم نے اپنا پلان فائنل کیا اور تیاری مکمل کی' فریال نے اپنا کام کیا۔ اس نے ہماری مستعدی کا لیول بڑھانے کے لیے بلیک کافی بنائی جو فرخ نے زہر قرار دیتے ہوئے مسترد کر دی۔

''میں پیتا ہوں خوب دودھ چینی اور ملائی والی چائے۔ اس کافی سے تو میرا جگر جل جائے گا۔''

صرف کاسو کی بیوی نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی ''کالی چائے بھی جگر جلا دیتی ہے جی۔''

راجا نے کہا ''گویا ہمارے جگر تو کب کے راکھ ہو چکے برخوردار! اس نظریے کے مطابق۔''

میں نے کہا ''راجا۔ تیرے پاس اندھیرے میں دیکھنے والی ایک دوربین تھی۔''

''تھی کا کیا مطلب ہے؟''

میں نے کہا ''وہ سائلنسر والا ریوالور بھی لے لینا۔''

فرخ بولا ''جیپ میں ہم کچھ دور تو جاسکتے ہیں۔''

میں نے کہا ''جیپ میں ہم براہِ راست رانا کے دروازے تک بھی جاسکتے ہیں لیکن ایک تو یہاں کسی کو کچھ معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ دوسرے لائٹس جلائے بغیر ہم اس وقت دس گز بھی نہیں جاسکتے۔ رات کے اندھیرے میں اس کی تیز روشنی میلوں سے نظر آجائے گی۔''

کاسو کی بیوی بہت ہمت والی تھی۔ وہ اکیلی جنگل سے گزر کے آئی تھی۔ اس کے پیروں میں جوتے بھی نہیں تھے' اس کے باوجود وہ پھر ہمارے ساتھ روانہ ہوگئی۔ فریال نے جوگرز پہن رکھے تھے۔ اس نے کوشش کی کہ کاسو کی بیوی کم سے کم اس کے چپل ہی پہن لے مگر وہ راضی نہ ہوئی۔ اس نے کہا ''بیگم صاحب! ہمارے پاؤں جوتوں کے عادی نہیں ہیں۔''

فریال نے انگریزی میں مجھ سے کہا ''رومیو! مجھے سخت احساس جرم ہو رہا ہے۔ بہت شرم آرہی ہے مگر کیا کروں؟''

میں نے کہا ''تم جوتے اتار کے ہاتھ میں پکڑ لو۔ اس سے تمہارے دل کو سکون ملے گا۔''

کاسو کی بیوی آگے تھی۔ اس نے بچے کو بھی گود میں اٹھا رکھا تھا۔ بچہ اب اس کے کندھے پر سر رکھے سو رہا تھا۔ کچھ یہ جینے کی اور اپنے شوہر کو بچانے کی خواہش کا جنون تھا اور کچھ عادت کی بات تھی کہ وہ راستوں کی رکاوٹ اور ہر سختی سے بے نیاز آگے بڑھتی جا رہی تھی۔

فریال نے آدھے گھنٹے تک بڑی ہمت اور جذبے کا مظاہرہ کیا اور گھنے جنگل کے اندھیرے ناہموار راستوں پر سکون سے میرے ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ پھر ایک جگہ اسے ٹھوکر لگی۔ دوسری بار میں نہ سنبھالتا تو وہ فرش خاک پر سجدہ ریز نظر آتی۔

''کیا مصیبت ہے۔'' وہ بڑبڑائی ''کتنا اندھیرا ہے یہاں۔''

میں نے کہا ''سوری۔ اگلی مرتبہ آپ تشریف لائیں گی تو اسٹریٹ لائٹس جل رہی ہوں گی۔ مرکری لیمپ روشن ہوں گے۔''

''یہ عورت کتنے آرام سے راستہ دیکھتی جا رہی ہے۔''

میں نے کہا ''ممکن ہے اس کی آنکھیں بلی کی ہوں۔ پیدائشی طور پر یا اس نے بعد میں لگوالی ہوں۔''

فریال نے کہا ''چاند ہوتا تو اچھی خاصی روشنی ہوتی۔''

میں نے کہا ''اس کے لیے چاند کو اپنا شیڈول بدلنا پڑتا۔ مہینے میں چند دن ایسے ہوتے ہیں جب اس کی چھٹی ہوتی ہے۔''

''خواتین کی طرح۔'' راجا آہستہ سے بولا مگر اس کی بات سے صرف حضرات محظوظ ہوئے' فریال چپ رہی۔

چند منٹ بعد اس کے کپڑے کسی کانٹے دار جھاڑی کی باہر نکلی ہوئی شاخ میں الجھ کے پھٹ گئے۔ ''کون ہے......؟'' اس نے بے اختیار چیخ مار کے کہا اور میرے بازو سے چمٹ گئی۔

ہم سب ایک ساتھ ہنسے تو اس کا موڈ خراب ہو گیا ''میں سمجھی...... کسی کا ہاتھ تھا۔'' فریال نروس لہجے میں بولی ''دانت نکالنا ضروری ہے کیا؟''

راجا نے ہنستے ہوئے کہا ''ایک ہاتھ مجھے بھی نظر آیا تھا۔ ہاتھ کا صرف ڈھانچا' لمبی لمبی انگلیوں کی ہڈیاں' یہ آواز کیسی ہے یار!''

میں نے کہا ''الو بول رہے ہیں۔''

فرخ نے پلٹ کے کہا ''صرف میں خاموش ہوں۔''

فریال پھٹی ہوئی شرٹ کی آستین کو بڑے غور سے دیکھتی رہی ''یہ میں نے ہیرڈز سے لی تھی' چالیس پاؤنڈز میں۔''

''یہ تو چار ہزار سے زیادہ کا نقصان ہو گیا۔'' راجا بولا۔

میں کہا ''لیکن یہ بات ہر ایک کو مت بتانا۔ دراصل یہاں کے لنڈا بازار میں اس سے اچھی نئی شرٹ بیس روپے میں مل جاتی ہے۔''

فریال نے سخت برا مانا ''بدتمیزی مت کرو...... ورنہ......''

''ورنہ کیا' تم کیا کرو گی؟ ناراض ہو کے واپس چلی جاؤ گی؟'' میں نے کہا ''جاؤ اگر ہمت ہے تو۔ اس جنگل میں ہر درخت پر جن بھوت تو خیر ہوتے ہی ہیں' کسی شیر یا چیتے نے تمہیں بریک فاسٹ کے لیے پسند کر لیا تو......''

وہ میرے بازو سے لٹک گئی ''رومی! میں تھک گئی ہوں۔''

میں نے اسے جھٹک دیا ''میں کچھ نہیں کر سکتا۔ اسی لیے کہا تھا کہ آرام سے گھر بیٹھو۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ باقی راستہ میں تمہیں گود میں اٹھا کے لے جاؤں۔''

راجا نے کہا ''آدھے سے زیادہ راستہ تو ہم نے طے کر لیا۔ ہمت کرو۔''

فریال نے ایک چیخ ماری ''سانپ!'' اور پھر مجھ سے چمٹ گئی۔

میں نے جھک کے دیکھا مگر مجھے کوئی حرکت نظر نہ آئی۔ فریال کی چیخ پر ہم بھی بے اختیار راستے سے ہٹ گئے تھے۔

کاسو کی بیوی نے کہا ''سانپ تو ہیں جنگل میں بیگم صاحبہ' دو بار مجھے بھی کاٹ چکے ہیں' ذرا دیکھ کے چلو۔''

''دیکھ کے خاک چلوں...... کچھ نظر آ رہا ہے یہاں؟ پتا نہیں تم کیسے ننگے پاؤں پھرتی ہو۔'' فریال خفگی سے بولی۔

راجا نے اندھیرے میں دیکھنے والی عینک لگائی اور زمین پر سے کچھ اٹھا لیا ''یہ سردس کا سانپ ہے۔'' اس نے ایک پرانے سائیکل ٹائر کے ٹکڑے کو لہرایا اور فریال کی طرف پھینک دیا۔ فریال جھینپ کے ہنسنے لگی۔

جنگل میں اونچے درختوں کے سائے میں جھاڑیاں تھیں اور لمبی لمبی گھاس بھی تھی۔ ان میں مجھے کئی جگہ سرسراہٹ سنائی دی۔ وہ غالباً گرگٹ اور گوہ جیسے جانور ہوں گے۔ خطرناک اور خونخوار سمجھے جانے والے جانور بھی انسان سے اسی طرح بچتے ہیں جیسے انسان ان سے دور رہتا ہے۔ حملہ وہ صرف اس وقت کرتے ہیں جب ان کو حملے کا ڈر ہو یا وہ بھوکے ہوں۔ سانپ بھی راستہ کاٹ کے گزر جاتے ہیں۔ میں نے حوصلہ بڑھانے کے لیے یہ بات فریال کو سمجھائی مگر اس کا خوف کم نہ ہوا۔

بالآخر ایک جگہ کاسو کی بیوی رک گئی ''بس' اب تھوڑی ہی دور ہے وہ جگہ۔'' اس نے ہاتھ کے اشارے سے سمت واضح کی۔

میں نے کہا ''اب باتیں بند۔''

فریال نے کہا ''ایسا نہ ہو تمہارا بچہ رونے لگے۔''

''نہیں بیگم صاحبہ' یہ تو سو رہا ہے۔ جاگا تو میں آواز نکالنے سے پہلے اس کا منہ دبا دوں گی۔'' کاسو کی بیوی نے بڑے عزم سے کہا۔

اچانک رات کی خاموشی میں کتوں کے بھونکنے کی آواز سنائی دینے لگی ''کہیں انہیں ہوا کے ساتھ بو تو نہیں پہنچ گئی؟'' راجا نے کہا۔

''نہیں جی' ہوا کا رخ تو مخالف ہے'' کاسو کی بیوی نے کہا۔

میں نے کہا ''تم آگے چلو۔ ہم کچھ پیچھے چلیں گے۔'' راجا نے کہا ''ہمیں ایک ساتھ نہیں رہنا چاہیے۔''

راجا کی تجویز معقول تھی۔ فریال نے میرے ساتھ تھوڑا سا سیدھے ہاتھ کی طرف راستہ بدل لیا۔ فرخ اور راجا الٹے ہاتھ کی جانب چلنے لگے۔ ہمارے درمیان میں شاید پچاس گز کا فاصلہ ہو گا۔ کاسو کی بیوی بھی اتنے ہی فاصلے سے آگے چل رہی تھی اور ہماری نظر میں تھی۔

درخت اچانک ختم ہو گئے اور کھیت شروع ہو گئے۔ اس سے ایک قدرتی پناہ ختم ہو گئی اور ہم کھلے آسمان کے نیچے بالکل کھلی جگہ پر بہت نمایاں ہو گئے۔ یہ محض تائید غیبی تھی کہ وہ چاند کی آخری تاریخیں تھیں اور ہمارے اردگرد اندھیرا اتنا

گہرا تھا کہ پچاس قدم سے بھی ہم ایک دوسرے کو سائے کی طرح ہی دیکھ سکتے تھے۔

کتے اب خاموش ہو گئے تھے۔ رانا کی حویلی کی فصیل تاریکی میں کسی قلعے کی دیوار کی طرح دائیں بائیں پھیلی ہوئی تھی۔ یہ کسی بھی گاؤں کی روایتی حویلی تھی جس میں طرز تعمیر کے انداز سے زیادہ ضرورت کا خیال رکھا جاتا ہے۔ ایک مضبوط اور بلند بیرونی دیوار جس میں آنے جانے کے لیے ایک ہی پھاٹک رکھا جاتا ہے۔ بڑے بڑے بھاری پٹوں والا بڑا پھاٹک جو ہمیشہ بند رہتا ہے اور ایک دربان اسی وقت کھولتا ہے جب حویلی میں داخلے کا اختیار یا اجازت نامہ رکھنے والا آنا جانا چاہے۔ اندر ایک مردانہ حصہ جس میں ایک دیوان خاص اور دوسرا دیوان عام۔ دیوان خاص وہ جدید طرز کا پرتعیش ڈرائنگ روم ہوتا ہے جہاں وی آئی پی قسم کے مہمانوں کی خاطر مدارات کی جاتی ہے۔ دیوان عام وہ ہال جس میں رعایا' ملازمین اور عام لوگ حاضری دیتے ہیں۔ زنان خانے والے رہائشی حصے میں کمرے ہی کمرے اور دالان ہوتے ہیں اور اس حصے میں پرندہ پر اور چرندہ چر نہیں مار سکتا۔

ہم سب کے چلنے سے کوئی آہٹ نہیں ہو رہی تھی۔ پھر بھی پیر کسی خشک ٹہنی پر آ جاتا تھا تو وہ چیخ جاتی تھی۔ مکمل سکوت میں یہ آواز بھی یوں لگتی تھی جیسے کلاشنکوف کے فائر کی آواز۔ میرے دل کی دھڑکن بھی تیز ہونے لگی تھی چنانچہ بھی اندازہ کر سکتا تھا کہ فریال کی کیفیت کیا ہو گی؟

ہم دیوار سے پچاس قدم دور تھے اور کاسو کی بیوی اب بھی سیدھا چلتی جا رہی تھی۔ یہ مصلحت اس وقت واضح ہوئی جب اس نے بالکل دیوار کے سائے میں اس کے ساتھ چلتے ہوئے رخ بدلا۔ اس طرح ہم پر اوپر سے کسی کی نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔

دیوار ختم ہوئی تو کاسو کی بیوی رک گئی ''یہاں سے مڑنے کے بعد اصطبل کا گیٹ آئے گا' چوکیدار باہر سو رہا ہو گا'' وہ سرگوشی میں بولی۔

پھر وہ ہوا جس کا ڈر تھا۔ بچے نے اچانک کندھے سے سر اٹھا کے ایک آواز نکالی۔ یہ غالباً رونے کا آغاز تھا۔ ہمارے کچھ بولنے سے پہلے ہی کاسو... کی بیوی نے بڑی بے رحمی سے اس کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ بچے نے مزاحمت کی اور پھر خود کو بے بس پا کے چپ ہو گیا۔

پہلے میں اور پھر راجا نے دیوار سے سر نکال کے دیکھا۔ چوکیدار سو نہیں رہا تھا۔ وہ چارپائی پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھا تھا اور حقہ پی رہا تھا۔

''یہ تو بڑی غلط اور غیر اصولی بات ہے۔'' راجا نے آہستہ سے کہا ''کوئی سونے کے ٹائم میں حقہ پیے اور حقہ پینے کے ٹائم پر سو جائے۔''

میں نے کہا ''مہاراجا! کہیں اس کی چھٹی حس نے اسے خبردار تو نہیں کر دیا کہ کچھ ہونے والا ہے۔''

فریال نے ایک مشورہ دیا ''تمہارے پاس سائلنسر والا ریوالور ہے ناں...... شوٹ ہم۔''

''خاتون!'' میں نے کہا ''احمقانہ بات سے خاموشی بہتر ہے۔ پیشہ ور مجرم بھی ناگزیر حالات میں قتل کرتے ہیں' فلموں کی اور بات ہے۔''

راجا نے پھر جھانکنے کے بعد مجھے مطلع کیا ''وہ لیٹ گیا ہے مگر ہمیں اس کے سونے کا انتظار کرنا پڑے گا۔''

''یہ کیسے پتا چلے گا کہ وہ سو گیا ہے؟ ممکن ہے وہ بے خوابی کا مریض ہو یا اس کے پیٹ میں درد ہو۔'' فرخ نے کہا۔

میں نے کہا ''میرے ذہن میں ایک اسکیم ہے۔ ہم پانچوں کا ایک شخص پر یلغار کے لیے ایک ساتھ جانا قطعی غیر ضروری ہے بلکہ پرخطر ہے۔ میں جاتا ہوں۔ زمین پر لیٹ کر رینگتا ہوا۔ فریال اور فرخ کو یہاں سے آگے جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جب میں چوکیدار کو قابو کر لوں گا تو راجا آ جائے گا۔ پھر کاسو کی بیوی کے ساتھ ہم اندر چلے جائیں گے یہ آرڈر ہے میرا۔''

''اور ہم یہاں کیا کریں؟'' فرخ نے کہا ''بیت بازی؟''

فریال نے احتجاجی لہجے میں کہا ''تمہیں آرڈر دینے کا اختیار کس نے دیا؟''

''کسی نے نہیں مس فریال! پاکستان میں اختیار پہلے حاصل کر لیا جاتا ہے۔ قانونی جواز بعد میں مل جاتا ہے۔ رائٹ...... اب میں جاتا ہوں۔''

میں زمین پر ہاتھوں پیروں پر چلتا ہوا آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ میری پیش قدمی کی رفتار سست رہی کیونکہ آگے بڑھنے سے پہلے میں زمین کو ٹٹول کر دیکھتا تھا کہ کہیں کانٹا اور سوکھی ٹہنی یا خشک پتوں پر دباؤ سے آواز تو پیدا نہیں ہو گی۔

ابھی میں نے نصف فاصلہ طے کیا ہو گا کہ چوکیدار اٹھ کھڑا ہوا۔ میں زمین پر سیدھا لیٹ کے ساکت ہو گیا۔ چوکیدار ادھر دیکھ ہی نہیں رہا تھا۔ وہ چارپائی سے اتر کے کچھ فاصلے پر کھیت کی منڈیر تک گیا۔ فصل کٹنے کے بعد زمین میں ہل چلا کے مٹی کو دھوپ لگنے کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا۔ وہ

منڈیر پر کھیت کی طرف منہ کر کے اور دھوتی اٹھا کے اکڑوں بیٹھ گیا تو شک وشبے کی بات ہی نہیں رہی۔ اس کا پیٹ واقعی خراب تھا۔

میں نے چند منٹ کی اس مہلت سے فائدہ اٹھایا اور باقی فاصلہ کسی تیز رفتار گرگٹ کی طرح طے کر کے چارپائی کے نیچے گھس گیا۔ چوکیدار بھی پیٹ میں فساد برپا کرنے والے مواد کو خارج کر کے لوٹا اور چارپائی پر لیٹ گیا۔

غالباً اس نے زیر لب اپنی گھر والی کو کوسا جس نے اسے باسی دال کھلا دی تھی۔ میں آہستہ سے سرک کر چارپائی کے نیچے سے نکلا اور ایک دم چوکیدار پر جا پڑا۔ اگر میں آسمان سے ٹپکتا تب بھی شاید وہ دیکھ لیتا۔ اسے بچاؤ کا موقع ہی نہیں ملا۔ میں نے اس کے منہ کو دبالیا اور اس کی کنپٹی پر ریوالور کا دستہ مارا۔

وہ جاندار آدمی تھا۔ اگر میں دیر کرتا تو وہ خود کو چھڑا لیتا اور صورت حال قابو سے باہر ہو جاتی۔ میں نے ایک ہاتھ اس کے منہ پر رکھ کے کہنی اس کی گردن پر ٹکا دی تھی اور گھٹنا اس کے پیٹ پر رکھ کے جسم کا سارا دباؤ ڈال دیا تھا چنانچہ وہ صرف ٹانگیں چلا سکا۔ ریوالور کا دستہ پڑتے ہی اس کی یہ حرکت بھی ختم ہو گئی اور اس کے ہاتھ' جو مجھے دھکیلنے کے لیے زور لگا رہے تھے' بے جان سے ہو کے نیچے گر گئے۔

اس کے منہ پر سے ہاتھ ہٹا کے میں نے اس کے بے ہوش وحواس ہونے کا یقین کیا اور سیدھا کھڑا ہو کے اندھیرے میں آل کلیئر کا سگنل دیا۔ میری ٹیم کے دیگر ارکان اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے سب دیکھ رہے تھے۔ وہ دوڑے ہوئے آئے۔ فریال اور فرخ نے میرے سخت احکامات کو یکسر نظر انداز کر دیا۔

چوکیدار کی جیب سے چابیاں اور اس کے تکیے کے نیچے سے ایک بھرا ہوا ریوالور برآمد ہوا۔ کاسو کی بیوی اب سخت مضطرب ہو رہی تھی۔ اس کا شوہر کی زندگی بچانے کا مشن کامیابی سے تکمیل کے قریب تھا۔ آگے کے مراحل وہی تھے جو کسی جیل میں سزائے موت کے منتظر قیدی کے لیے ہوتے ہیں جو فرار ہونے میں کامیاب رہے یعنی باقی زندگی پھر قانون اور اجل کی گرفت میں نہ آنا۔ کاسو اور اس کی بیوی نے یہ خطرہ مول لینے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ اپنے حاکم کی حدود فرمانروائی سے بھاگ کے دشمن حکمراں کی پناہ میں چلے جائیں گے۔ زندہ رہنے کے لیے غداری اور نمک حرامی کے الزامات قبول کرنے میں ان کے لیے کوئی ذلت نہ تھی۔ کیونکہ وہ عزت کے مفہوم سے ناآشنا تھے۔ زندگی نے یہاں کیا دیا تھا جو وہاں چھن جانے کا ڈر ہوتا۔

میں نے راجا سے کہا ''اب ہم یہاں بیٹھ کے حقہ پیتے ہیں اور بیت بازی کرتے ہیں۔ مس فریال کاسو کو لے آئیں۔ چاہیں تو فرخ کو بھی اپنے ساتھ لے جائیں ورنہ کیا ضرورت ہے؟''

فریال نے خفگی سے کہا ''مجھے پتا ہوتا کہ میرا ساتھ آنا تمہیں اتنا برا لگے گا تو میں یہ غلطی نہ کرتی۔''

''کتنا اچھا ہوتا اگر تم وہاں برامان جاتیں۔'' میں نے کہا ''مسٹر فرخ' میں نے آپ سے کہا تھا کہ وہیں رہیں۔''

''آئی ایم سوری!'' اس نے فریال کی طرف دیکھا۔

میں نے سخت لہجے میں کہا ''اندر ہم جلوس لے کر نہیں جائیں گے۔ تم چوکیدار کا خیال رکھو...... اور فریال کا بھی۔''

فریال نے ضدی لہجے میں کہا ''میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔''

میں نے نرمی سے کہا ''فریال۔ کچھ عقل سے کام لو۔''

''میرے دماغ میں عقل نہیں بھوسا ہے' عورت ہوں ناں۔''

بحث کرنے میں وقت نہیں ضائع کیا جا سکتا تھا۔ میں نے تین چابیوں میں سے ایک کی مدد سے تالا کھولا اور اندر داخل ہو کے دروازے کو پھر بند کر دیا۔ اب میرے سامنے ایک کشادہ صحن تھا جس کے چاروں طرف نیچی چھت والے کمروں کی قطار تھی۔ دائیں طرف کا حصہ بھینسوں کے لیے وقف تھا۔ گھوڑے بائیں جانب رکھے جاتے تھے۔ سامنے والے حصے کی چوڑائی کم تھی اور یہاں جانوروں کی ضرورت کا سامان خوراک وغیرہ رکھے جاتے تھے۔

کاسو کی بیوی نے صحن کو درمیان سے کراس کیا۔ وہ اب بھاگ رہی تھی۔ یہ ڈیڑھ سو فٹ کا فاصلہ تھا جو ہم نے دو تین منٹ میں طے کر لیا پھر میرے سامنے ایک اور مقفل دروازہ آ گیا۔ کاسو کی بیوی نے ہاتھ کے اشارے سے واضح کیا کہ کاسو اندر ہے۔

میں نے دوسری چابی سے یہ تالا بھی کھول لیا۔ دروازے کے پیچھے مکمل اندھیرا تھا اور ایک ناگوار بو تھی جس سے حلق ہونے لگی تھی۔ یہ بھینسوں کو دی جانے والی خوراک کھل' سوڑی اور ونڈے کے ڈھیر سے اٹھ رہی تھی۔ کاسو کی بیوی سب سے آگے تھی اور اس کا ہاتھ فریال نے پکڑ لیا تھا۔ فریال کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا اور میرا ہاتھ راجا نے تھام رکھا تھا۔

کاسو کی بیوی وسط میں چل رہی تھی۔ چند قدم چلنے کے بعد اس نے رک کے آہستہ سے آواز دی ''کاسو!''

کاسو کی آواز کہیں قریب سے آئی ''زیبو! یہ تو ہے؟''

''ہاں...... آہستہ بول۔ میں تجھے لے جانے آئی ہوں۔'' کاسو کی بیوی آہستہ آہستہ آواز کی سمت بڑھی۔

''نواب صاحب آئے ہیں میرے ساتھ۔''

''نواب صاحب! خود آئے ہیں؟'' کاسو نے پوچھا۔

''ہاں' ان کی بیگم صاحبہ بھی ہیں۔ تو ہے کدھر؟''

کاسو نے کہا ''میرے تو ہاتھ پیر بندھے ہوئے ہیں۔''

اندھیرے میں رسی کی ہر گرہ کھول کے کاسو کے ہاتھوں پیروں کو رہائی دلانا ایک مشکل کام ثابت ہوا۔ میں نے اور راجا نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کے یہ کام کیا۔ کاسو اس تمام عرصے میں میرا ہاتھ پکڑ کے چومنے کی کوشش کرتا رہا۔ ہمیں دعائیں دیتا رہا۔ تمام عمر غلامی کا یقین دلاتا رہا۔ یہ سخت جذباتی وقت تھا۔ کاسو کی بیوی رو رہی تھی اور فریال اسے تسلی دے رہی تھی۔ چند منٹ میں ہم نے کاسو کو آزاد کرا لیا مگر پھر پتا چلا کہ وہ چلنے کے قابل بھی نہیں' قید کی سختی' بھوک پیاس اور مار پیٹ نے اسے نیم مردہ کر دیا تھا۔

اسے سہارا دے کر اٹھایا گیا تو وہ کراہنے لگا۔ مجھے یہ فکر لاحق ہو گئی کہ وہ ہمارے ساتھ اتنی دور پیدل کیسے چلے گا۔ کاسو کی بیوی اسے مسلسل حوصلہ دے رہی تھی ''اب فکر کرنے اور گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ تھوڑی دیر کی بات ہے' حوصلہ رکھو' ہم آزاد ہو جائیں گے۔ نواب صاحب بہت اچھے بندے ہیں' جبھی تو تجھے لینے اتنی دور آئے ہیں۔''

ابھی ہم دروازے سے دور ہی تھے کہ کتے پھر بھونکنے لگے اور اس مرتبہ ان کا انداز زیادہ جارحانہ تھا۔ پھر مجھے یوں لگا جیسے کتے قریب آ رہے ہیں۔ میں نے ایک طرف سے کاسو کو یوں سنبھال رکھا تھا کہ اس کا بایاں بازو میرے شانے پر پھیلا ہوا تھا۔ دوسری طرف سے راجا نے اسے سنبھال رکھا تھا اور وہ ہم دونوں کے درمیان لٹکا ہوا بڑی مشکل سے قدم اٹھا رہا تھا۔

میں نے فریال سے کہا ''ہم آ جائیں گے۔ اگر ہم پکڑے بھی گئے تو وہ ہمیں نقصان نہیں پہنچا سکتے لیکن تم لندن سے فرار ہو کے آئی ہو' تمہاری روپوشی کا راز فاش نہیں ہونا چاہیے۔''

راجا نے کاسو کی بیوی سے کہا ''تم انہیں لے جاؤ۔''

وہ کاسو کی طرف دیکھنے لگی۔ میں نے خفگی سے کہا ''آ جائے گا کاسو بھی۔ تم ساتھ نہیں جاؤ گی تو انہیں راستہ کون بتائے گا؟ اور تم خود بھی پکڑی جاؤ گی۔ جاؤ دیر مت کرو۔ جتنا تیز نکل سکتے ہو یہاں سے نکل جاؤ۔''

جب وہ دور نکل گئے تو مجھے اندازہ ہوا کہ کوئی بات ضرور ہوئی ہے۔ بھونکنے والے کتے اب بہت قریب آ چکے تھے۔ ہم ابھی کمرے کے دروازے سے بھی نہیں نکلے تھے اور ہمارے سامنے کھلے صحن کا ڈیڑھ سو فٹ کا فاصلہ باقی تھا۔ کتوں کی آواز میں اب کم سے کم دو انسانوں کے آپس میں باتیں کرنے کی آوازیں بھی شامل ہو گئی تھیں۔

میں نے کہا ''راجا! ہم کاسو کو ساتھ لے کر نہیں نکل پائیں گے۔''

راجا نے کہا ''رکنے کا کوئی فائدہ نہیں۔''

میں نے کہا ''تو کاسو کے ساتھ جا۔''

''کیا مطلب......؟ تجھے اکیلا چھوڑ جاؤں؟''

میں نے کہا ''راجا۔ میں انہیں روک لوں گا۔ ریوالور ہے میرے پاس۔ خالی ہاتھ بھی میں دو چار سے بہ آسانی نمٹ سکتا ہوں۔''

''اور اگر وہ بھی مسلح ہوئے پھر......؟''

''تو اناڑی سمجھتا ہے مجھے؟ میں سب کو لٹا دوں گا...... جلدی کر' کوئی تجھے نہ دیکھے تو اچھا ہے۔ تو ان کے آنے سے پہلے جا۔''

راجا نے کہا ''اچھا اچھا۔ مگر تو میرا ریوالور رکھ لے۔ اس میں سائلنسر لگا ہوا ہے۔''

راجا ایک دروازے سے باہر گیا ہی تھا کہ کتے دوسرے دروازے پر پہنچ گئے جو مخالف سمت میں تھا اور شاید کہیں رانا کی حویلی میں اندر کی طرف کھلتا تھا۔ میں نے ایک جست لگائی اور دروازہ کھلنے سے پہلے دیوار کے ساتھ لگ کے کھڑا ہو گیا۔

''اوئے اندر کوئی ہے۔'' کسی نے باہر سے تالا کھولتے ہوئے کہا۔

''ہاں' کتے ایسے ہی تو شور نہیں کر رہے ہیں۔'' دوسرے نے کہا۔

دروازے کو کسی نے لات مار کے کھولا اور اس کے ساتھ ہی کمرے میں روشنی پھیل گئی۔ چھت میں لگے ہوئے سو واٹ کے بلب کا سوئچ کہیں باہر ہی تھا۔ دو کتے ایک ساتھ اندر آئے۔ ان کی زنجیریں دو افراد کی بیلٹ کے ساتھ منسلک تھیں۔ وہ دونوں جوان اور تنومند تھے مگر ان کے بھی سر منڈے ہوئے تھے جو ان کے سزا یافتہ غلام ہونے کی دلیل تھی۔

کتے اندر آتے ہی میری طرف لپکنے کے لیے بے تاب

ہوئے اور زور لگانے لگے۔ میں دروازے سے تقریباً دس قدم دور تھا۔ کتوں کو سنبھالنے والے چند فٹ کے فرق سے پیچھے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی ان کے ہاتھ بے اختیار کتوں کی زنجیر کو بیلٹ سے الگ کرنے کے لیے بڑھے۔

میں نے کہا "رک جاؤ۔ اور ان کتوں کو بھی روک لو ورنہ میں سب کو شوٹ کردوں گا۔"

لیکن اس وقت تک وہ کتوں کو آزاد کر چکے تھے۔ کتے زنجیر سمیت مجھ پر حملہ آور ہونے کے لیے لپکے۔ میرے لیے ان سے ایک ساتھ لڑنا مشکل تھا۔ میں نے ایک کے جو کک رسید کی وہ اس کے پیٹ پر نیچے کی طرف لگی۔ وہ ایک چیخ مار کے فرش پر لوٹنے لگا۔ غالباً اس کے دل' جگر' گردے سب اس کک سے ٹوٹ پھوٹ گئے ہوں گے۔

دوسرے پر مجھے فائر کرنا پڑا ورنہ وہ میری گردن میں اپنے دانت گاڑ دیتا۔ گولی اس کے سر میں لگی اور وہ زیادہ بھیانک چیخ مار کے گرا۔ کتوں کے ہمراہ اندر آنے والے اپنی جگہ پر منجمد ہوگئے تھے۔ دو سیکنڈ میں دو محافظ کتوں کی موت نے ان کو دہشت زدہ کردیا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ کاسو پر بھی ایک کتے کی موت کا جرم ثابت ہوا تھا اور سزائے موت اس کا مقدر ہوئی تھی۔ ان دونوں پر بھی دو کتوں کو مروانے کا الزام عائد کیا جائے گا تو وہ کیا صفائی پیش کریں گے؟ غلاموں کو صفائی پیش کرنے کا موقع ہی کہاں دیا جاتا ہے۔

ان میں سے ایک نے میرے پیچھے ایک خالی جگہ کو دیکھا جہاں کاسو کو باندھ کے ڈالا گیا تھا۔ وہ جگہ اب خالی تھی۔ مجھ سے کوئی سوال کیے بغیر وہ سمجھ گئے تھے کہ میں کون ہوں اور میرے وہاں آنے کا مقصد کیا تھا۔

"کاسو! کاسو بھاگ گیا......" ان میں سے ایک نے کہا۔

دوسرے نے میری طرف دیکھا "آپ نے اسے آزاد کرالیا نواب صاحب! اسے بچالیا......؟ اس نے شاید مجھے پہچان لیا تھا۔"

میری شہرت اور عرفیت نواب صاحب ہو چکی تھی اور اب میں مجبور تھی کہ اس انداز تخاطب کو تسلیم کروں۔

میں نے کہا "اگر تم چاہو تو میرے ساتھ چلو۔ تم بھی بچ جاؤ گے۔ ورنہ تمہاری سزا بھی وہی ہوگی۔"

ان دونوں نے خوف زدہ نظروں کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ وفاداری تبدیل کرنے کا اور غداری کا فیصلہ ان کے لیے اتنا آسان نہ تھا کہ وہ ٹاس کرتے اور سکے کا رخ دیکھ کر طے کرلیتے کہ انہیں کیا کرنا چاہیے۔

اب یہ فیصلہ اور بھی دشوار ہوگیا تھا کیونکہ کتوں کے بھونکنے اور پھر مرنے سے پہلے ان کی بھیانک چیخوں نے محافظوں میں کھلبلی مچادی تھی۔ اب یوں محسوس ہوتا تھا جیسے حویلی کے اندر باہر خطرے کی ہنگامی صورت حال کا اعلان کردیا گیا ہے۔

خدا کرے فریال اور اس کے ساتھ باقی لوگ خطرے کی حدود سے باہر جا چکے ہوں۔ میں نے ایک خواہش کو دعا بنالیا۔ پھر میں تیزی سے دروازے کی طرف لپکا۔ دونوں بے بس غلام اپنی بدنصیبی پر قانع مایوسی کی تصویر بنے کھڑے تھے۔ اگر ان میں ہمت ہوتی تو وہ میرا ساتھ دینے کی کوشش ضرور کرتے لیکن جسمانی طور پر ہی نہیں ذہنی طور پر بھی غلامی ان کی فطرت ہوگئی تھی۔

میں نے اچانک پلٹ کے کہا "خبردار! جو کوئی میرے پیچھے آیا۔"

میں دروازے سے نکلا اور صحن عبور کرنے کے لیے پوری رفتار سے دوڑا۔ ابھی میں نے آدھا صحن ہی عبور کیا تھا کہ باہر سے شور سنائی دینے لگا۔ کسی نے چیخ کے کہا "اوئے چوکیدار کو کیا ہوا ہے؟" پھر ہر طرف لائٹس روشن ہونے لگیں۔

میں نے رفتار بڑھانے کے لیے جسم کی ساری طاقت صرف کردی۔ میں کوئی سو میٹر کی دوڑ میں ریکارڈ قائم کرنے والا کھلاڑی نہیں تھا۔ میری ٹانگیں ایک حد تک میرا ساتھ دے سکتی تھیں۔ میں اپنی کوشش میں اس حد تک کامیاب رہا کہ صحن عبور کرنے تک کسی کی گولی کا نشانہ نہیں بنا۔ ریوالور کا رخ سامنے رکھتے ہوئے میں بیرونی گیٹ سے باہر نکلا تو مجھے دو محافظ دکھائی دیے جو بے ہوش چوکیدار کے پاس کھڑے تھے۔

انہوں نے میرا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ پہلا یوں میرے سامنے آیا جیسے کبڈی کھیلنے والا اپنے حریف کا راستہ روکتا ہے۔ میں ایک پاؤں کی ایڑی پر گھوم گیا۔ میرا دوسرا پاؤں اوپر اٹھا تو کسی ہیلی کوپٹر کے گھومتے پنکھے کی طرح اس کی پسلیوں پر پڑا۔ اس نے ہائے کا نعرہ لگایا اور پلٹ کے چوکیدار پر گرا تو وہیں پڑا چیختا رہا۔ اس کی دو چار پسلیاں یقیناً ٹوٹ گئی ہوں گی۔

دوسرا جھپٹ لگا کے مجھ پر آیا۔ ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر میں بیٹھ گیا۔ عین اس وقت جب وہ میرے سر کے اوپر سے گزرنے والا تھا' میں ایک جھٹکے سے کھڑا ہوا تو میرا سر اس کے پیٹ میں لگا۔ وہ اوپر اٹھا اور میرے پیچھے گرا۔ ان کے پاس اسلحہ ہوتا تو وہ مجھے شوٹ کرنے میں دیر نہ لگاتے۔ غالباً بے

ہوش چوکیدار پر جھک کے وہ تکیے کے نیچے سے اس کا ریوالور تلاش کررہے تھے لیکن ریوالور اب میرے پاس تھا۔

میں پھر بھاگا۔ مجھ پر حملہ کرنے والوں نے ایک ہنگامہ برپا کردیا تھا۔ وہ چلا چلا کے دوسرے محافظوں کو طلب کررہے تھے اور انہیں بتا رہے تھے کہ ست بدھائی کے نواب نے چوکیدار کو بھی مار دیا ہے اور وہ کاسو کو بھی لے گیا ہے۔

کھیتوں کی منڈیر پر دوڑنا آسان نہ تھا۔ میں دو بار گرا اور پھر بھاگا۔ یہ کھلی جگہ تھی جہاں ہر طرف سے اوپن ٹارگٹ تھا۔ میری کوشش تھی کہ کسی طرح درختوں کی پناہ میں پہنچ جاؤں لیکن اب یہ ممکن دکھائی نہ دیتا تھا کیونکہ یکے بعد دیگرے دو موٹر سائیکلوں کے اسٹارٹ ہونے کی آواز کے بعد میں نے گھوڑوں کی ٹاپ سنی۔

مجھے اندازہ ہونے لگا کہ مجھے ہر طرف سے محصور کرنے کے لیے ایک منظم حکمت عملی کو بروئے کار لایا جارہا ہے۔ اب محاصرہ توڑ کے یا مقابلہ کرکے فرار ہونے کی کوشش لاحاصل تھی۔ میں نے صورت حال سے نمٹنے کے لیے ایک جوا کھیلنے کا فیصلہ کیا۔

میں ایک درخت کی اوٹ میں رک گیا اور ان آوازوں کو سنتا رہا جو ہر طرف سے قریب ہوتی محسوس ہوتی تھیں۔ مجھے گھیرے میں لینے والوں نے تیز سرچ لائٹس بھی اٹھا رکھی تھیں۔ آخر شب کے سکوت کو موٹر سائیکلوں کی گھن گرج کے ساتھ گھوڑوں کی آوازوں نے بھی منتشر کردیا تھا۔

انسانی آوازوں میں دو فرق محسوس ہوتے تھے۔ ایک آواز حکم دینے والوں کی تھی' دوسری حکم کی تعمیل کرنے والوں کی۔ دس منٹ بعد جو میرے لیے دس گھنٹوں کی طرح تھے' میں نے اپنے سامنے ایک نوجوان کو دیکھا جو بہت خوبصورت سفید گھوڑے پر تھا۔ کندھے پر کلاشنکوف کے علاوہ اس کے ہاتھ میں بڑی طاقتور روشنی دینے والی ٹارچ تھی۔ اس ٹارچ لائٹ میں وہ ہر طرف مفرور مجرم کی یعنی میری تلاش کررہا تھا۔ پھر ایک موٹر سائیکل والا اس کے نزدیک سے گزرا تو اس نے سوال کیا "اوئے' تم ادھر پھر رہے ہو' آگے جاؤ۔"

موٹر سائیکل والا گھوم گیا "جی چھوٹے رانا صاحب!"

اور اسی وقت میں ایک دم درخت کی اوٹ سے نکل کے چھوٹے رانا صاحب کے مقابل آگیا۔ میرے ہاتھ میں سائلنسر لگا ریوالور دیکھ کر اس کی سٹی گم ہوگئی۔ پھر بھی اس نے ٹارچ کی روشنی میرے چہرے پر مرتکز رکھی۔

میں نے انگریزی میں کہا "لائٹ بجھا دو۔ بے شک اس سے مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا لیکن میرا نشانہ خطا نہیں ہوگا' چھوٹے رانا صاحب!"

اس نے بھی انگریزی میں جواب دیا اور لائٹ آف کردی "تم کتے کی موت مارے جاؤ گے۔"

میں نے کہا "گھوڑے سے نیچے اترو' کتے کے بچے!"

چھوٹے رانا کو شاک لگا۔ وہ اس طرح مخاطب کیے جانے کا عادی نہیں تھا "شاید تمہیں اندازہ نہیں کہ تم کس سے بات کررہے ہو؟" وہ غرایا۔

میں نے بھی غرا کے کہا "کیا تمہیں معلوم ہے تم کس سے مخاطب ہو؟"

"میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔" وہ گھوڑے سے اتر آیا۔

میں نے کہا "میں ست بدھائی کا نواب رفیق احمد شیرازی ہوں۔"

چھوٹے رانا نے طنزیہ ہنسی کے ساتھ کہا "دراصل میں نے پہلے کوئی نواب دیکھا نہیں تھا۔ سوائے فلموں کے اور وہ مجھے مسخرے لگتے تھے۔"

میں نے کہا "اپنے محافظوں کو حکم دو کہ واپس آجائیں۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "وہ میرا حکم نہیں مانیں گے کیونکہ حکم دینے والے بڑے رانا صاحب ہیں۔ وہ تمہیں ان کے سامنے پیش کرنے کے پابند ہیں۔"

"میں خود بھی ان سے ملنا چاہتا ہوں...... لیکن ملاقات کیسے ہونی چاہیے' باعزت طریقے پر یا بے عزتی کے ساتھ' اس کا فیصلہ تم کرسکتے ہو۔" میں نے اپنے ریوالور کا رخ رانا کی طرف رکھا۔

وہ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا "آخر تم خود کو سمجھتے کیا ہو؟"

میں نے کہا "اپنا تعارف میں کرا چکا ہوں۔ تم نے ایک تاریخی واقعے کا ذکر ضرور سنا ہوگا۔ جب شکست کے بعد پورس کو قیدی بنا کے پیش کیا گیا تو سکندراعظم نے اس سے پوچھا تھا کہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟ اور اس نے کہا تھا کہ وہی جو بادشاہ' بادشاہوں کے ساتھ کرتے ہیں۔"

"میں یہاں اس حوالے کی ضرورت کو سمجھنے سے قاصر ہوں۔"

"بڑے رانا صاحب سے میری ملاقات پورے پروٹوکول کے ساتھ ہوسکتی ہے۔ جیسے عزت دار لوگ ملتے ہیں یا غیر مہذب طریقے پر جیسے دشمن ملتے ہیں۔"

"تم سمجھتے ہو یہ تمہارے اختیار میں ہے؟"

میں نے کہا "میرے اختیار میں تو یہ بھی ہے کہ یرغمال

بنا کے تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں۔ گولی جب تمہارے دل کے قریب ہوگی تو کون تمہیں بچانے کا رسک لے گا اور کیسے بچائے گا؟ کیا اس کے بعد بڑے رانا صاحب خود چل کے میرے پاس تمہاری رہائی کی درخواست لے کر حاضر نہیں ہوں گے۔ آخر تم ان کے اکلوتے بیٹے ہو' وارث ہو۔''

چھوٹے رانا کی حالت غیر ہونے لگی تھی۔ اسے میرے اعتماد نے بھی بدحواس کر دیا تھا اور اچانک پلٹ جانے والی صورت حال نے بھی۔ کلاشنکوف اس کے کسی کام نہیں آئی تھی۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری ''او کے۔ تم کیا چاہتے ہو؟''

میں نے کہا ''میں گھوڑے پر تمہارے پیچھے بیٹھتا ہوں۔ تم مجھے بڑے رانا صاحب کے پاس لے چلو۔ ریوالور میرے پاس رہے گا چنانچہ تم اس بات کو یقینی بناؤ گے کہ مجھے نواب آف ست بدھائی کا پروٹوکول ملے۔ میرے ساتھ گھر آئے مہمانوں جیسا سلوک ہوگا۔ بات چیت کے بعد تم مجھے خود چھوڑنے جاؤ گے۔''

اس نے بے بسی سے کہا ''کہاں تک؟''

''میری حویلی تک۔'' میں نے کہا ''تمہارے پاس کوئی چوائس نہیں ہے چھوٹے رانا صاحب۔ میں ویسے بھی گھوڑے پر تمہارے پیچھے بیٹھ سکتا ہوں اور تمہیں مجبور کر سکتا ہوں کہ جہاں میں کہوں وہاں چلو۔''

''اس بات کی کیا ضمانت ہوگی کہ...... میری واپسی خیر و عافیت کے ساتھ ہوگی۔'' وہ شکست خوردہ لہجے میں بولا۔

میں نے کہا ''میرا شریفانہ وعدہ۔ خاندانی لوگ زبان کے اعتبار کو قائم رکھتے ہیں۔ بس اتنا بتا دو کہ تم مجھے بڑے رانا صاحب سے ملوانے ابھی لے جاؤ گے یا وہ بعد میں خود آئیں گے' مجھ سے ملنے؟''

چھوٹے رانا نے ایک گہری سانس لی۔ گھوڑے پر بیٹھنے کے بعد اس نے کہا ''بیٹھو میرے پیچھے' یہ تم بتاؤ کہاں جانا ہے؟''

میں اس کے پیچھے گھوڑے پر سوار ہو گیا ''تم میری توقع سے زیادہ معاملہ فہم اور سمجھ دار ثابت ہو رہے ہو۔ بڑے رانا صاحب کی طرف چلو۔''

اس نے گھوڑے کا رخ موڑ دیا۔ جنگل کی طرف ایک موٹر سائیکل کی روشنی دیکھ کر چھوٹے رانا نے اپنی ٹارچ روشن کی اور اسے جلا کے کوئی سگنل دیا۔ موٹر سائیکل ہماری طرف آنے لگی تو اس نے گھوڑے کو روک لیا۔

موٹر سائیکل والا قریب آ کے ٹھہر گیا۔ انتہائے حیرت سے اس کے لیے بولنا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اسے جس مجرم کو نظر آتے ہی گولی مار دینے کا حکم ملا تھا وہ ان کے چھوٹے رانا کے ساتھ انہی کے گھوڑے پر سوار ہے۔

چھوٹے رانا نے کہا ''فافٹ ابا جی کے پاس جا کے بتاؤ کہ ہم ایک مہمان کے ساتھ آ رہے ہیں۔''

وہ ہکلایا ''جی...... جی جناب!''

''ان کے لیے مہمان خانہ کھولا جائے اور ان کی خاطر مدارات کا مناسب انتظام کیا جائے' یہ ابا جی سے وہیں ملیں گے۔''

''جی...... جی چھوٹے رانا صاحب!'' موٹر سائیکل اپنے پیر زمین پر ٹکائے موٹر سائیکل کو ریس دیتا رہا۔

''اب جاؤ...... اور باقی سب کو واپس بلا لو۔'' چھوٹے رانا نے کہا اور پھر مجھ سے انگریزی مخاطب ہوا ''کیا یہ ضروری ہے کہ تم ریوالور کو اتنی سختی سے میری پسلیوں میں گاڑ کے رکھو۔''

میں نے مسکرا کر کہا ''سوری! میرا ارادہ ہرگز تمہیں تکلیف دینے کا نہیں تھا۔''

دس منٹ بعد جب گھوڑا رانا رجب علی کی حویلی کی گیٹ سے گزرا تو خلاف توقع وہاں کوئی دربان نہیں تھا۔ اندر بھی لائٹس جل رہی تھیں مگر دور دور تک کوئی دکھائی نہ دیتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے حویلی کے اندر کوئی نہیں رہتا۔ کچھ دیر پہلے یہاں جتنی ہلچل تھی اب اتنی ہی خاموشی تھی۔ سارے غلام اور محافظ روپوش تھے۔ انہیں حکم دیا گیا ہوگا کہ جب تک طلب نہ کیا جائے' کوئی سامنے نہ آئے۔

میں اندازہ کر سکتا تھا کہ اس حسنِ انتظام کی ضرورت کیوں محسوس کی گئی ہوگی۔ موٹر سائیکل سوار نے جب بڑے رانا صاحب کو چھوٹے رانا صاحب کا پیغام پہنچایا ہوگا تو یہ بھی بتا دیا ہوگا کہ اس نے کیا ناقابلِ یقین منظر خود اپنی گنہگار آنکھوں سے دیکھا تھا۔ بڑے رانا نے اپنی عقل کی عیاری سے فوراً صورتِ حال کو سمجھ لیا ہوگا۔ اپنے ولی عہد بہادر کی زندگی بچانے کے لیے وہ مجھے بطور مہمان ریسیو کرنے پر مجبور ہو گیا تھا مگر وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی بے بسی اور مجبوری کا تماشا تخم کے غلاموں کی نظر میں دیکھے۔ اس نے سب کو دفع ہو جانے کا حکم دیا ہوگا اور پیغام بر موٹر سائیکل والے پر واضح کر دیا ہوگا کہ یہ خبر پھیلی تو مجرم اس کی زبان کو سمجھ جائے گا۔ زبان کاٹی جائے گی یا اس کا سر۔ اس کا فیصلہ بعد میں ہوگا۔

چنانچہ مجھے بڑے رانا نے ریسیو کیا تو نہ کوئی دیکھنے والا تھا اور نہ ہنسنے والا۔ رانا کے لیے یہ ایک پُر تذلیل موقع تھا۔

جب میں اور چھوٹے رانا گھوڑے سے اترے تو اس نے ایک قہر آلود نظر مجھ پر ڈالی اور دوسری پر ملامت نظروں سے اپنے سپوت کو دیکھا جو پورے لاؤ لشکر' ہاتھی گھوڑے اور توپ خانے کے ساتھ ایک محصور دشمن کو گرفتار کرنے گیا تھا مگر خود گرفتار ہو کے لوٹا تھا۔ پھر وہ پلٹ کے چل پڑا۔

مہمان خانہ بہت شاندار تھا مگر ہم میں سے کسی نے بھی مہمانی یا میزبانی کے آداب نہیں نبھائے۔ نہ رانا نے مجھے بیٹھنے کے لیے کہا اور نہ میں نے یہ مناسب جانا۔ چھوٹے رانا کی کلاشنکوف اب میرے کندھے پر تھی لیکن میں اپنے سائلنسر لگے ریوالور پر زیادہ بھروسا کر رہا تھا۔ اس کا رخ چھوٹے رانا کی طرف تھا جو مہمان خانے کے وسط میں پہنچ کے رک گیا تھا۔ میں اس سے دس فٹ کے فاصلے پر تھا۔ رانا رجب علی بھی اتنے ہی فاصلے پر ٹھہر گیا تھا۔ ہم تینوں ایک مثلث کے تین کونوں پر آمنے سامنے کھڑے تھے۔

ہم سب کے جذبات کی نوعیت جدا تھی چنانچہ ردِ عمل بھی مختلف تھے۔ رانا غصے' بے بسی اور احساسِ ذلت سے وہ پریشر ککر بنا ہوا تھا جو پھٹنے کے قریب ہو۔ اس کا بیٹا شرمندگی اور مجبوری کے ساتھ جوان خون کے ابال سے پٹاری میں بند زخم خوردہ ناگ کی طرح اندر ہی اندر بل کھا رہا تھا۔ میں تمام تر اعتماد کے باوجود کسی ناگہانی افتاد یا نظر نہ آنے والی چال سے خائف تھا جو میری فتح کے غرور کو شکست کی تذلیل میں نہ بدل دے۔

پہل رانا نے کی۔ اس نے نفرت کے زہر سے بھرپور لہجے میں کہا ''تو تم آئے ہو نواب آف ست بدھائی بن کے ہم سے ملنے؟''

میں نے سادگی سے کہا ''آپ نے بھی مدعو کیا تھا مجھے۔ اگرچہ مدعو کرنے کا طریقہ انتہائی غلط تھا مگر میں آ گیا۔''

وہ پھٹ پڑا ''تم ایک سرکاری ملازم۔ ایک بے حیثیت استاد کی اولاد۔ پنشن میں گزر اوقات کرنے والے۔ کل تک دس مرلے کے گھروندے میں رہنے والے۔ گلی کے آوارہ کتے کی طرح دربدر پھرنے والے' آج ہماری ہمسری کا دعویٰ کرتے ہو' نواب بن گئے ہو؟''

میں پُرسکون اداکاری کرتے ہوئے پر تمسخر انداز میں مسکراتا رہا۔ میں نے کہا ''رانا! کل کی بات تو جانے دو۔ استاد تو پھر بھی محترم ہوتا ہے۔ کیا پتا تمہارے آباؤ اجداد نے کسی گورے کے جوتے پالش کیے ہوں یا اپنے وطن سے غداری کی ہو اور اس کے انعام میں تمہیں یہ جاگیر ملی ہو۔''

''بکواس بند کرو۔'' رانا دہاڑا۔

میں نے اپنی بات جاری رکھی ''آج کی حقیقت یہ ہے کہ میں واقعی ست بدھائی کا نواب ہوں۔ میری جاگیر آپ کی زمینوں سے زیادہ ہے۔ میری تاریخی حویلی کے سامنے آپ کے اس گھر کی کیا اوقات ہے۔''

رانا کی حالت بگڑنے لگی تھی۔ اس کے بیٹے نے تشویش سے کہا ''ابا جی! آپ ذرا کنٹرول کریں۔ آپ کا بلڈ پریشر زیادہ ہو رہا ہے۔''

رانا نے جیب سے ایک شیشی نکال کے ایک گولی زبان کے نیچے رکھی اور صوفے پر بیٹھ گیا ''مدد علی' اس سے کہو بیٹھ جائے۔''

چھوٹے رانا کا نام مجھے اب معلوم ہوا۔ اس نے میری طرف ملتجی نظروں سے دیکھا۔ ''پلیز' آپ بیٹھ جائیں رفیق صاحب!''

میں نے مسکرا کے سر ہلایا ''تھینکس رانا صاحب!'' اور صوفے پر بیٹھ گیا۔

''ہم آرام سے بات کر سکتے ہیں۔'' مدد علی نے کہا۔

میں نے کہا ''آف کورس! میں بھی ایسا ہی چاہتا

ہوں۔ اگر ماضی کے کسی حوالے کے بغیر ہم مستقبل کو سامنے رکھیں تو ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ شاید آنے والے وقت میں ہم ساتھ ساتھ ہوں گے۔ ہم ہندوستان' پاکستان کی طرح رہ سکتے ہیں یا پاکستان اور چین کی طرح۔ ایک کے لیے دوسرے کے وجود کو تسلیم کیے بنا چارہ نہیں۔"

"تم کبھی ہماری برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔" رجب علی پھر غصے سے بے قابو ہو گیا۔

میں نے کہا "آنے والے وقت کا فیصلہ کیا ہو گا' یہ کوئی نہیں جانتا۔ عزت اور ذلت دینا خدا کے ہاتھ میں ہے۔"

"کل تم نے ہمارے اعلیٰ نسل کے ایک کتے کو مار دیا تھا جو بہت قیمتی تھا اور ہمیں بہت عزیز تھا۔"

میں نے بے رحمی سے کہا "ہو گا...... لیکن میری جگہ آپ ہوتے تو آپ بھی یہی کرتے۔"

"آج پھر تم نے دو کتے مار دیے۔" وہ چلانے لگا "تم کاسو کو نکال لے گئے۔"

میں نے کہا "ہاں...... کتا میرے نزدیک صرف کتا ہے۔ اس کی جو بھی قیمت ہو۔ انسان کی زندگی سے اس کا کیا موازنہ؟ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ تم انہیں کیڑے مکوڑوں کی طرح مار دیتے ہو اور قانون کی گرفت سے بچے رہتے ہو۔ اسی لیے اپنی طاقت کا غرور ہے تمہیں مگر ہر خون ناحق تمہارے نامۂ اعمال میں درج ہو رہا ہے رانا!"

"تم نے کاسو کو اغوا کیا ہے یا نہیں؟" وہ دہاڑا۔

میں نے کہا "میں نے اسے تمہارے ہاتھوں قتل ہونے سے بچا لیا ہے۔ اس کی بیوی میرے پاس پناہ کے لیے آئی تھی۔"

رانا کے منہ سے گالیوں کا ریلا بہہ نکلا "وہ تمہارے پاس گئی تھی؟"

"ہاں، اس نے اپنے بچے کو میرے قدموں میں ڈال دیا۔ مجھے اللہ رسول کا واسطہ دیا پھر میں انکار کیسے کر سکتا تھا۔" میں نے کہا۔

"میرا بندہ واپس کر دے نواب کی اولاد......!" وہ چیخا۔

میں نے کہا "کاسو اور اس کی بیوی بچے اب میری پناہ میں ہیں۔ واپسی کا کیا سوال۔ تو انہیں ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔ وہ بالکل محفوظ ہیں۔ کل تک وہ تیرے غلام تھے' ان کی اوقات تیرے کتوں کے برابر بھی نہ تھی۔ ایک دن آئے گا جب وہ تیرے مقابل ہوں گے۔ کسی عدالت کے کٹہرے میں جہاں تو مجرم ہو گا اور وہ تیرے جرائم کے چشم دید گواہ۔"

"مدد علی...... ! لے جا اس...... کو میرے سامنے سے ورنہ یہ مارا جائے گا میرے ہاتھوں۔" وہ دیوانہ وار چیخا۔

میں نے کہا "میں تو آیا تھا یہ سوچ کر کہ تمام اختلافات کے باوجود یہ ناممکن نہیں ہے کہ ہمارے درمیان دوستانہ تعلقات کی راہ نکل آئے۔"

"لعنت تیری دوستی پر اور تجھ پر۔ مجھے معلوم ہے تو یہاں کیوں آیا ہے اور تیرے کیا ارادے ہیں۔ جو کچھ تو یہاں کہتا پھر رہا ہے۔ سب مجھ تک پہنچ رہا ہے۔ تو یہاں ڈیم بنائے گا' فیکٹری لگائے گا؟ اسکول اور اسپتال بنائے گا۔" وہ چلاتا رہا۔

میں نے مسکرا کے کہا "انشاء اللہ۔"

"تیرا یہ خواب میں کبھی پورا نہیں ہونے دوں گا۔ تیرے اصل مقاصد کو سمجھتا ہوں۔ زندگی گزاری ہے تیرے جیسوں سے نمٹتے۔ تو اس علاقے کے لوگوں کو سبز باغ دکھا رہا ہے۔ میرے خلاف بھڑکا رہا ہے تاکہ وہ تیرے حمایتی بن جائیں۔ مجھے شیطان اور خود کو فرشتہ رحمت ثابت کر کے تو میرے خاندان کی سیاسی ساکھ مٹانا چاہتا ہے۔ اسمبلی میں یہ سیٹ مجھ سے پہلے میرے باپ کی تھی اور میرے بعد میرے بیٹے کی ہو گی۔ تو کبھی اس پر قبضہ نہیں کر سکے گا۔" اس کی آواز بیٹھنے لگی۔

میں اسے یوں دیکھتا رہا جیسے کوئی کسی دیوانے کا تماشا دیکھتا ہے اور مسکراتا رہا "رانا......! ابھی تک میں نے اس پہلو سے نہیں سوچا تھا لیکن اب یہی ہو گا۔ میں یہ چیلنج قبول کرتا ہوں۔"

"بہت مہنگی پڑے گی تجھے ہماری دشمنی نواب زادے! دیکھتا ہوں میں تو ڈیم کیسے بناتا ہے۔ دریا تو میری زمین سے گزرتا ہے۔"

میں نے کہا "تم تو اپنی زمین پر خدائی کے دعوے دار بنے بیٹھے ہو۔ یہ سمجھتے ہو کہ انسانوں کی زندگی اور موت پر بھی تمہارا اختیار ہے۔ یہ بھرم بہت جلد ٹوٹ جائے گا رانا۔ نہ میں تمہارا مزارع ہوں اور نہ غلام۔ جو میں نے کہا ہے' وہ کر کے بھی دکھاؤں گا۔ تم نہ مجھے ڈرا سکتے ہو اور نہ روک سکتے ہو۔ روک تو تم کاسو کو بھی نہیں سکے جسے تم نے قید میں ڈال کے سزائے موت سنا دی تھی۔"

"بہت جلد تجھے معلوم ہو جائے گا بلو گھڑے کہ تو شیر کی نسل سے نہیں ہے' اس لیے دہاڑنے کی کوشش مت کر۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا "چلو مدد علی! بات بڑھانے سے کوئی فائدہ نہیں۔"

رانا چلایا "اسے کہاں لے جا رہے ہو تم؟"

میں نے ریوالور کا رخ اس کی طرف کیا "میں کسی کو نقصان پہنچانا نہیں چاہتا۔ تمہارا بیٹا مجھے چھوڑ کے آ جائے گا۔"

"نہیں...... یہ نہیں جائے گا تمہارے ساتھ۔" وہ زرد ہونے لگا۔

مدد علی نے کہا "ابا جی! حوصلہ رکھو' مجھے کچھ نہیں ہو گا۔"

میں نے کہا "یہاں میں اسی ضمانت پر آیا تھا...... اور میں نے ضمانت دی تھی کہ رانا مدد علی مجھے چھوڑنے جائے گا تو بحفاظت واپس آئے گا' یہ میرا وعدہ ہے۔"

"میں کیسے اعتبار کر لوں تیرے وعدے پر...... مجھے اناڑی سمجھتے ہو؟"

میں نے کہا "اعتبار تو تمہیں کرنا ہی پڑے گا۔ لیکن تمہارے اطمینان کے لیے میں حلف بھی اٹھا سکتا ہوں۔"

رانا نے کہا "جھوٹا حلف اٹھانے والے پر اللہ کا عذاب نازل ہو...... مدد علی......! جا قرآن لے کر آ۔"

مدد علی نے اجازت طلب نظروں سے میری طرف دیکھا "قرآن اسی کمرے میں موجود ہے۔ اس الماری میں۔"

جب میں نے حلف اٹھا لیا تو رانا کے دل کو کچھ اطمینان حاصل ہوا "مدد علی کے ساتھ میں بھی چلوں گا' گاڑی میں۔"

میں نے کہا "مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

ہم ایک ساتھ لیکن آگے پیچھے باہر آئے۔ دیکھنے والا اب بھی کوئی نہ تھا۔ یہ خاموشی اور خانہ ویرانی بے سبب نہیں ہو سکتی تھی۔ مجھے کچھ معلوم نہ تھا کہ اس حویلی کے اندر کتنے لوگ رہتے ہیں۔ رانا رجب علی کی کتنی بیویاں ہیں' کتنے بچے۔ اس کے بھائی بہن ہیں تو کیا صورت حالات سے بے خبر سو رہے ہیں؟ نوکر چاکر اور محافظ کہاں گئے۔ ہر شخص معاملات سے اتنا لاتعلق کیوں ہے؟

صحن میں آگے پیچھے چار گاڑیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ ان میں ایک لینڈ کروزر سب سے آگے تھی۔ سیاہ رنگ کی اس بالکل نئے ماڈل کی گاڑی پر جھنڈا تو نہیں تھا مگر پیتل کے چمکتے حروف سے "ایم پی اے" لکھا ہوا صاف نظر آتا تھا۔ اس کے پیچھے وہ سفید نئی ٹویوٹا کرولا تھی جس سے پہلی بار ستبرھائی آتے ہوئے تصادم ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ تیسری سیاہ شیشوں والی سیاہ ہنڈا سوک تھی۔ آخر میں ایک سوزوکی ہائی روف کھڑی تھی۔ پھر میری نظر نے پانچویں گاڑی کو دیکھا۔ یہ چھوٹی سی آلٹو تھی جو ایک طرف لاوارث کھڑی تھی۔

رانا عادت کے مطابق لینڈ کروزر کی طرف بڑھا تھا مگر میں نے اسے روک دیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اس میں کوئی پہلے سے چھپا بیٹھا ہو یا اسلحہ موجود نہ ہو۔

میں نے کہا "ہم اس آلٹو میں جائیں گے۔"

رانا کا چہرہ ایسے بگڑ گیا جیسے کسی وی آئی پی کے سامنے دعوت میں سوکھی روٹی اور چٹنی رکھ دی جائے "یہ تو نوکروں کی گاڑی ہے۔" وہ بولا۔

میں نے کہا "آج اس میں سفر کر کے دیکھیں۔ آخر گاڑی ہے تو چلتی بھی ہو گی۔"

اب میرے شک کو تقویت حاصل ہوئی۔ شاید میرے پلان کی تبدیلی نے بے عزتی سے زیادہ رانا کے منصوبے پر ناکامی کی مہر ثبت کر دی تھی اور اس کا دکھ ان دونوں باپ بیٹے کی صورت پر مایوسی کا عکس بن گیا تھا۔ لینڈ کروزر میں جاتا تو شاید اپنی حویلی کے بجائے میں عدم آباد پہنچتا۔

رانا کے احکامات ہوں گے کہ ہر گاڑی میں چابی لگی رہے اور ڈرائیور ہمہ وقت تیار ملے۔ ڈرائیور تو غائب ہو گئے تھے یا کر دیے گئے تھے لیکن چابی ہر گاڑی میں موجود تھی۔ آلٹو کے قریب پہنچ کے میں نے انہیں روکا اور پہلے خود پیچھے والی سیٹ پر بیٹھا۔ اس دوران میں وہ مسلسل میرے نشانے پر رہے۔ پھر میں نے بڑے رانا کو اجازت دی کہ وہ آگے والی پسنجر سیٹ پر بیٹھ جائے۔ آخر میں چھوٹے رانا نے ڈرائیونگ سنبھالی۔

آلٹو آٹھ دس سال پرانی ضرور تھی اور اس کی حالت ویسی ہی تھی جیسی نوکروں کے زیر استعمال گاڑی کی ہو سکتی تھی۔ اس کی سیٹیں پھٹی ہوئی تھیں' دروازوں کے پینل الگ ہو رہے تھے۔ ڈیش بورڈ ٹوٹا ہوا تھا اور ڈائل کے نمبر بھی کام نہیں کرتے تھے مگر مدد علی نے چابی گھمائی تو انجن فوراً اسٹارٹ ہو گیا اور انجن کی آواز سے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ گاڑی چلنے میں اچھی ہو گی۔ ان خدمت گاروں کی گاڑی کا چلتے رہنا ہی ان کی زندگی کا ضامن تھا ورنہ کسی روز حقے کا تمباکو یا ادرک جیسی معمولی چیز لینے کے لیے جانے والی گاڑی کہیں رک جاتی تو رانا صاحب اس کوتاہی پر نہ جانے کتنے مجرموں کو گنجا کرا دیتے۔ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا یہ کم سے کم سزا تھی۔ اس سے زیادہ سخت سزا دینی مقصود ہوتی تو مجرم کے چہرے پر پکی کالی سیاہی مل دی جاتی تھی یہ مہینا بھر ضرور برقرار رہتی تھی خواہ مجرم روز منہ دھوئے۔ تیسرے مرحلے میں مجرم کو گلے میں پٹا ڈال کے چاروں ہاتھوں پیروں پر کتے کی طرح چلنا پڑتا تھا۔ کتوں کے ساتھ رہنا پڑتا تھا اور انہی کی

خوراک کھانی پڑتی تھی۔ علی ھذا القیاس۔ آخری سزا کی حد کوئی نہ تھی۔

گاڑی گیٹ سے نکلی تو کہیں پیچھے سے اذانِ فجر کی صدا سنائی دی۔ ابھی تک صبح کے آثار عیاں نہیں ہوئے تھے۔ گاڑی ہیڈ لائٹس کی روشنی میں ان راستوں سے گزر رہی تھی جو میرے لیے اجنبی تھے۔ میں نے مدد علی کو پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ وہ چالاکی اور مکاری سے مجھے دھوکا دینے اور قابو کرنے کی احمقانہ کوشش کرے گا تو مارا جائے گا۔ نہ میں رعایت دوں گا نہ چانس لوں گا۔

آدھے گھنٹے بعد بھی مجھے ست بدھائی کی جانب لے جانے والے کسی راستے سے شناسائی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ جنگل کے پُرپیچ راستے سب ایک جیسے محسوس ہوتے تھے۔ ایک جگہ میں نے اچانک مدد علی کی کلاشنکوف کھڑکی سے باہر پھینک دی۔ ان کی آخری امید بھی دم توڑ گئی کہ شاید اترتے وقت وہ مجھ سے یہ اسلحہ چھین لیں اور مجھے چھلنی کر دیں۔

''یہ تم نے کیا' کیا؟'' رانا نے سر گھمایا۔

میں نے کہا ''اضافی بوجھ تھا' پھینک دیا۔ تم اسی راستے سے واپس بھی جاؤ گے' اٹھا لینا۔''

پہلے پہاڑی نمودار ہوئی پھر اچانک پل آ گیا۔ گاڑی پل کراس کر چکی تھی اور مجھے اپنی حویلی کی روشنیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ اوپر آسمان بھی روشن ہونے لگا تھا۔ میں نے گاڑی رکوالی اور نیچے اتر کے بڑے رانا کی طرف گیا۔

میں نے جھک کے کہا ''رانا صاحب! آپ عمر میں مجھ سے زیادہ ہیں۔ اتنا تو سمجھتے ہوں گے کہ دشمنی اور جنگ یک طرفہ نہیں ہوتی۔ اور حریف کمزور نہ ہو تو نہ کسی کی فتح ہوتی ہے اور نہ شکست۔ دونوں کی بربادی ضرور ہوتی ہے۔''

رانا نے بدمزگی سے کہا ''آخر تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''یہی کہ انا پرستی اور غرور میں خودکشی سے بہتر ہے کہ ہم پُرامن بقائے باہمی کے راستے پر چلتے رہیں۔''

مدد علی نے کہا ''کیا اب ہم جا سکتے ہیں؟''

میں نے کہا ''یقیناً مدد علی! ایک چیز ہوتی ہے انسان کا ضمیر۔ یہ نہ ہو تو کوئی وعدہ' کوئی حلف انسان کو شیطان بننے سے روک نہیں سکتا۔''

گاڑی نے یوٹرن لیا اور واپس روانہ ہو گئی۔ میں نے اسے تقریباً آدھا کلومیٹر تک درختوں میں گم ہوتا دیکھا اور پھر اپنی حویلی کی طرف چل پڑا۔

جیسی کہ مجھے توقع تھی وہاں سب پریشانی میں جاگ رہے تھے۔ ایک دم دروازے میں نمودار ہو کے اور چلا کے میں نے کہا ''ہیلو اینڈ السلام علیکم لیڈیز اینڈ جنٹلمین!'' تو سب سے پہلے فریال چیخ مار کے دوڑی اور مجھ سے لپٹ گئی۔ وہ بیٹھ پر گھٹنوں میں سر دیے رو رہی تھی اور غالباً راجا نے اسے حوصلہ دے کر چپ کرانے کی کوشش ترک کر دی تھی۔ راجا چڑیا گھر کے پنجرے میں مقید لگڑ بگڑ کی طرح کمرے میں گشت کر رہا تھا اور میرا سابق سالا فرخ صوفے پر لیٹا چھت کو گھور رہا تھا۔ کاسو اور اس کی بیوی احساسِ جرم و ندامت میں جتلا ایک گوشے میں سہمے بیٹھے تھے۔

وہ سب فوری طور پر مجھ سے واپسی کے سفر کی روداد سننا چاہتے تھے مگر میرا نیند اور تھکن سے برا حال تھا۔ میں نے کہا ''ایک انگریزی کے محاورے کا صرف ہندی ترجمہ دستیاب ہے جو حسب حال ہے کہ ''انت بھلا سو بھلا'' اللہ کا شکر ہے کہ ہم اپنے مقصد میں کامیاب رہے اور زندہ سلامت لوٹ آئے۔ باقی بات سو کر اٹھنے کے بعد کریں گے۔''

چار گھنٹے بعد سب سے پہلے میری ہی آنکھ کھلی۔ راجا اخبار میں کام کرتا تھا تو صبح سے سہ پہر تک گھوڑے بیچ کے سونے کا عادی تھا۔ فریال کے لیے لندن کے حساب سے صبح کے پانچ بجے تھے۔ کاسو اور اس کی بیوی کے لیے موت کی خانہ بربادی کے خوف سے نجات باعث سکون تھی چنانچہ ان سب کا سوتے رہنا فطری بات تھی۔

صرف فرخ غائب تھا۔ وہ مجھے برآمدے میں چائے پیتا دکھائی دیا۔ معمول کے مطابق ریشماں اور اس کی ماں نے سورج نکلنے سے پہلے ہی کچن سنبھال لیا تھا۔ ریشماں اس کے سامنے کھڑی نہ جانے کیا قصہ سنا رہی تھی۔ وہ اب پہلے کے مقابلے میں زیادہ شوخ اور پُراعتماد ہو گئی تھی۔ حویلی میں اسے نوکری کے ساتھ تحفظ مل گیا تھا اور میری طرف سے یقین دہانی حاصل ہو چکی تھی کہ غنی سے شادی کے بعد میری طرف سے انہیں ایک گھر تحفے میں دیا جائے گا۔

اس نے چہک کے پوچھا ''مالک! آپ کے لیے چائے لاؤں؟''

میں نے کہا ''چائے نہیں' کافی...... مگر پہلے ایک بات بتا' تیرا باپ اکبر خان آیا؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا ''اب وہ نہیں آئے گا جی! آپ لکھ لو میری بات۔''

ریشماں غائب ہو گئی تو فرخ نے مجھے مطلع کیا ''ابھی آٹھ دس بندے آئے تھے' پنڈ سخاوت سے۔''

''کوئی مسئلہ تھا؟'' میں نے کہا۔

''مسئلہ وہی تھا۔ وہ پوچھ رہے تھے کہ نواب صاحب ہم سے کیا خدمت لینا چاہتے ہیں۔ میں نے انہیں سمجھا دیا کہ ہتھیلی پر سرسوں نہیں اگتی۔ نواب صاحب نے جو وعدہ کیا ہے ضرور پورا ہو گا لیکن اس میں وقت لگے گا۔ جب ان کی ضرورت ہو گی انہیں بلا لیا جائے گا۔ وہ سب ان پڑھ اور بے روزگار لوگ تھے۔''

میں نے کہا ''یار فرخ! میں نے واقعی بڑی غلطی کی۔ انہوں نے پھر سے بہت سی توقعات وابستہ کر لی ہیں جبکہ ابھی میرے پاس وعدوں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ دینے کے لیے صرف تسلی ہے اور امید۔''

''دنیا امید پر قائم ہے اور رہے گی۔'' فرخ نے کسی فلسفی کی طرح کہا ''میں نے بھی انہیں ناامید نہیں کیا۔''

دوپہر کے بعد جو ناشتا ہوا وہی لنچ بنا۔ میں نے کاسو اور اس کی بیوی کو کبیر خان کے سپرد کر دیا۔ اس ہدایت کے ساتھ کہ ان کی حفاظت کی جائے۔ فوری طور پر مجھے رانا کی طرف سے جوابی کارروائی کا اندیشہ نہ تھا۔ بعد میں جب اس نے میری باتوں پر غور کیا ہو گا تو اسے سمجھ آ گئی ہو گی کہ میرے جیسے حریف سے مقابلے میں طاقت اور لاقانونیت سے اس کے لیے سنگین مسائل پیدا ہو جائیں گے۔

میری پُرامن بقائے باہمی کی پیشکش بڑی مثبت تھی۔ ست بدھائی میں میرا اختیار و اقتدار مضبوط کرنا رانا کے لیے ایک نئے خطرے کی علامت بن گیا تھا۔ اسے علاقے میں اپنے اقتدار کی بنیادیں ہلتی محسوس ہونے لگی تھیں۔ جیسے بھارت نے پاکستان کے وجود کو دل سے کبھی تسلیم نہیں کیا تھا ایسے ہی رانا مجھے اپنا ہم پلا سمجھنے کے لیے تیار نہ تھا مگر اس کے سوا چارہ بھی نہ تھا۔ مجھے برداشت کرنا اس کی مجبوری بن گیا تھا۔ چنانچہ یہ ہو سکتا تھا کہ ہم روایتی حریفوں کی طرح ساتھ ساتھ رہیں لیکن ہم چین اور پاکستان کی روایتی دوستی اور ہمسائیگی کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔

کھانے کے بعد فریال نے حویلی کے تفصیلی معائنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ وہ جب سے آئی تھی' اس کا اشتیاق اور تجسس سے برا حال تھا۔ ایک جینوئن روایتی طرز کی تاریخی حویلی اور نوادرات کی ملکیت کا تصور اس کے لیے بڑا سحر انگیز تھا۔

میری طرح فریال بھی لوئر مڈل کلاس سے تعلق رکھتی تھی جہاں زندگی بڑی کفایت شعاری کے ساتھ انتہائی محدود خواہشات کی تکمیل کے لیے خواب دیکھنے کی اجازت دیتی ہے۔ بچے گلیوں میں کھیل کے اور گورنمنٹ اسکولوں میں پڑھ کے بی اے کر لیں اور انہیں کسی سرکاری محکمے میں کلرکی مل جائے تو والدین سمجھتے ہیں کہ ان کی زندگی کا ایک مقصد پورا ہوا۔ جو لڑکیاں برقع اوڑھ کے اور تانگوں میں لد کے اسکول سے میٹرک کر لیں وہ تعلیم یافتہ کہلاتی ہیں اور ان کے لیے بھی پکی پنشن ایبل کلرکی کرنے والوں کے رشتے آ جائیں تو زندگی کا دوسرا مقصد بھی پورا ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد جو آخری عمر میں کوئی سر چھپانے کا آسرا کر لیں یا عمرہ کر آئیں وہ خوش نصیبوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ورنہ وہ اگلی نسل کی زندگی کے خاموش تماشائی بن کے پوتوں' نواسوں کی تعداد بڑھتی دیکھتے ہیں اور اللہ اللہ کرتے اللہ کو پیارے ہو جاتے ہیں۔

اس اعتبار سے میں خوش قسمت رہا کہ میری بدقسمتی نے مجھے اعلیٰ تعلیم کے لیے ولایت پہنچا دیا۔ گروہی سیاست کے خونی راستوں پر قدم نہ رکھتا اور جان بچانے کے لیے مجھے جلاوطنی کی راہ نہ اختیار کرنی پڑتی تو میں بھی بی اے ایم اے کر کے درخواست برائے ملازمت لیے پھرتا۔ کلرک نہ سہی استاد ہو جاتا۔ جو پڑھا تھا' وہی پڑھانے لگتا۔ استاد کا روایتی مرتبہ اب محض خیالی بات ہو گئی ہے۔ یہ عام کہا جانے لگا ہے کہ جو کچھ نہیں کر سکتا وہ ٹیچر بن جاتا ہے۔ تنخواہ پہلے بھی برائے نام ہی تھی مگر جو عزت معاشرے میں استاد کو حاصل تھی کسی کو نہ تھی۔

خود فریال کو قدرت نے ذہانت اور جرأت نہ دی ہوتی تو وہ بھی اپنے حسن کی شمع سے کسی کلرک کے خانۂ ویراں کو روشن رکھنے کی کوشش میں گھلتی جاتی۔ اپنے مجازی خدا کی محبت کے ثبوت پیدا کرتے کرتے بیس سال میں چالیس سال کے دکھ جھیلتی اور فوراً نانی دادی کے منصب پر فائز ہو کے بوڑھی شمار کی جاتی لیکن اس نے بغاوت کی۔ اپنی صلاحیت منوانے کے لیے نیک نامی ترک کی اور بدنامی کا طوق گلے میں ڈالے پھری۔

اب اچانک میرے ہاتھ الہ دین کا چراغ لگ گیا تھا۔ خوابوں کا جو سفر فریال نے میرے ساتھ طے کیا تھا' وہ عام عورت کی طرح میرا گھر' میری جنت پر ختم ہو جاتا تھا۔ جیسا کہ رانا نے حقارت سے کہا تھا۔ ایک استاد کا بیٹا نواب بن گیا تھا۔ پنشن میں گزارہ کرنے والوں کی اولاد کروڑوں کی مالک ہو گئی تھی۔ میرے ساتھ فریال کو بھی یہ جاگیر اور حویلی کسی الف لیلوی داستان کی طرح لگتے تھے لیکن ابھی تک ہم یہ فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ الہ دین کے اس چراغ سے کیا کام لیں۔ خواب کو حقیقت میں کیسے بدلیں۔ مشکل یہ تھی کہ میرے خواب اب صرف میرے نہیں رہے تھے۔ اس میں میرے

ساتھ راجا اور فرخ' میرے گھر والے' میرے خدمت گار اور جاں نثار جو خود کو میری رعایا سمجھتے تھے' سب ہی شریک ہو گئے تھے۔

میں نے مستقبل کے لیے ایک پلان بنالیا تھا۔ میرے والدین بھی یہی چاہتے تھے کہ میں الہ دین کے اس چراغ سے فائدہ اٹھاؤں۔ کوئی ایسا کام کروں کہ زمین سونا اگلنے لگے۔ درختوں پر دولت کے پھل پھر جائیں۔ میں کوئی بڑا کام کروں۔ اس کے لیے مجھے مواقع اور امکانات بھی لامحدود نظر آتے تھے اور میرے پلان محض شیخ چلی کا خواب ہوتے تو راجا میرا ساتھ نہ دیتا پھر فرخ نہ آتا' اب شہناز بھی کچھ سوچ رہی تھی اور رابعہ بھی یہاں آنا چاہتی تھی لیکن میرا مسئلہ تھا سرمایہ۔ جو فی الحال میرے پاس نہیں تھا۔

سرمایہ حاصل کرنے کے ذرائع بہت تھے۔ راجا نے بھی مجھے یقین دلایا تھا کہ سرمایہ کاری کے لیے رقم فراہم کرنے والے ادارے ہیں جو مجھے مستقبل کی ضمانت پر قرض دے سکتے ہیں۔ مجھے پلان میں سرمایہ لگانے والے بھی مل جائیں گے۔

فریال کے ساتھ حویلی کا تفصیلی معائنہ کرتے ہوئے ایک بار پھر میں نے اپنے عزائم کو آسمان کی بلندیوں پر محسوس کیا۔ فریال تو اس کمرے کو دیکھ کر حیرت اور خوشی سے پاگل ہو گئی جس میں سونے چاندی کے برتن اور قیمتی نوادرات بھرے پڑے تھے۔ وہ بار بار پوچھتی تھی "رومیو! یہ واقعی اصلی سونا ہے' لگتا تو نہیں۔"

میں نے کہا "اگر کسوٹی ہوتی تو میں پرکھ کے بتا دیتا۔"

"تمہارے خیال میں کتنے قیراط کا ہوگا؟" اس نے ایک سلفچی کو ملاحظہ کرتے ہوئے پوچھا "بائی داوے' یہ کیا چیز ہے؟"

میں نے کہا "اس میں کھانے کے بعد مہمانوں کے ہاتھ دھلوائے جاتے تھے۔ یوں سمجھو یہ ایک واش بیسن ہے' پورٹیبل۔"

وہ دم بخود رہ گئی "یہ ہاتھ دھلوانے کی چیز ہے۔ ایک کلو سونے کی تو ہوگی یہ چلمچی۔"

"سلفچی......" میں نے تصحیح کی "اور یہ آفتابہ!"

وہ ہنس پڑی "یہ تو لوٹا ہے۔ یہ بھی سونا ہے' اصلی چوبیس قیراط۔"

میں نے کہا "مجھے کچھ اندازہ نہیں خاتون' ممکن ہے زیورات خالص سونے کے بنائے جاتے ہوں۔ استعمال کے برتنوں میں تھوڑی بہت ملاوٹ کی جاتی ہو۔ سونا ذرا نرم دھات ہے۔"

اس نے ایک اور چیز اٹھائی "یہ پاندان ہے ناں اور یہ......؟"

میں نے کہا "یہ خاصدان ہے اور یہ عطر دان۔ یہ گلاب پاش۔ اس سے حاضرین محفل پر عرق گلاب چھڑکا جاتا تھا۔ تم اسے آج کی زبان میں ایئر فریشنر کہہ سکتی ہو۔"

ایک سنگھار دان نے فریال کو مسحور کر دیا "یہ جو لال نیلے پتھر نظر آرہے ہیں' کیا یہ میرے جواہرات ہیں...... اصلی؟"

میں نے پھر اپنی کم علمی کا اعتراف کیا "ہو بھی سکتے ہیں۔ نیلم' یاقوت' لعل اور زمرد' میں اس معاملے میں اناڑی ہوں۔"

"او مائی گاڈ! یہ تو انتہائی قیمتی ہوتے ہیں۔"

دو گھنٹے بعد فریال کو اس کمرے سے نکلنے پر مجبور کیا گیا ورنہ اس خزانے کو دیکھنے میں وہ اتنی محو تھی کہ اسے اپنا ہوش نہ تھا۔ شاید عام عورت کی طرح سونا' چاندی اور ہیرے جواہرات اس کی بھی کمزوری ہوں گے۔ جس دنیا سے وہ آئی تھی' وہاں دس گرام سونے کے نرخ لندن کی مارکیٹ سے متعین ہوتے تھے اور پاکستان میں صرافے کے ریٹ ہر روز اخبار میں شائع ہوتے تھے۔ اس کے لیے یہ تصور کرنا محال تھا کہ یہاں وہی قیمتی دھات کلو کے حساب سے موجود ہے۔ وہ بار بار یہ پوچھتی تھی کہ یہ اصلی ہیں تو برتن ہی کروڑوں کے ہوں گے۔

اوپر کے باقی کمروں میں کوئی قابل ذکر چیز نہ تھی۔ ہر کمرے میں پرانا فرنیچر تھا جو کس مپرسی کے باعث برباد ہو رہا تھا لیکن قابل استعمال تھا اور اینٹیک کے اعتبار سے بہت بیش قیمت بھی۔ ہر کمرے کے پردے حریری تھے۔ قالین ایرانی' کاشانی اور اصفہانی ڈیزائن کے تھے اور اپنی قدامت کے باعث قیمتی بھی ہو گئے تھے۔ افسوس کی بات یہ تھی کہ ان کی تاریخ کہیں رقم نہ تھی۔ کوئی ریکارڈ نہ تھا اور کوئی بتانے والا نہ تھا کہ کون سی چیز کس نے کب خریدی اور کس کے استعمال میں رہی تھی؟

نچلی منزل کے پیچھے والے کمروں میں مجھے سنسنی خیزی کا ایک اور تجربہ ہوا۔ ایک کمرے میں مجھے گرد آلود دیواروں پر بہت سی قد آدم روغنی تصاویر نظر آئیں۔ اندر داخل ہوتے ہی مجھے حیرت واستعجاب کا جھٹکا لگا۔ میں کچھ دیر کے لیے زمانہ حال سے نکل کے ایک صدی پہلے کے تاریخی زمانے میں پہنچ گیا۔ وہ سب میرے آباواجداد تھے۔ اپنے زمانے کے

روایتی لباس میں۔ بڑی بڑی پگڑیاں' شیروانیاں اور انگرکھے پہنے ہوئے۔ چوڑی دار پاجاموں میں۔ اس کے بعد ترکی ٹوپی اور برجس میں۔ یہ مصور کا کمال فن تھا کہ وہ آج بھی جیتے جاگتے نظر آتے تھے۔ یہ تصاویر حضرات کی تھیں۔ کسی خاتون کی ایک تصویر بھی نہیں تھی۔ انہیں ایک خاص ترتیب سے دیوار دیوار پر نصب کیا گیا تھا۔ ہر تصویر فرش سے تین فٹ کی بلندی پر تھی۔ ہر فریم کی لمبائی اور چوڑائی چھ فٹ سے کچھ زیادہ اور چوڑائی تین فٹ تھی۔ تصویروں پر گرد پڑی ہوئی تھی' اس کے باوجود تصویر میں لباس کا ہر رنگ نمایاں تھا۔

میں نے پردے ہٹوائے تو ہال نما کمرے میں کچھ روشنی ہو گئی۔ بڑی بڑی کھڑکیوں کے شیشے بھی گرد سے دھندلا چکے تھے۔ راجا نے اور فرخ نے تھوڑی سی کوشش کی تو چٹخنی کھل گئی اور زور لگانے سے پٹ بھی کھل گئے۔ اس سے ہال پوری طرح روشن ہو گیا۔

تاریخ کے صفحات میں ان کرداروں کے نام میں نے ضرور دیکھے تھے۔ اچانک وہ زندگی کے جیتے جاگتے عکس میں میرے سامنے آ گئے تو مجھے یوں لگا جیسے میرے ذہن کا خلا پر ہو گیا ہے۔ اب مجھے تصور پر انحصار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں اپنے آباواجداد کو دیکھ سکتا تھا۔ بالکل ویسے ہی جیسے وہ اپنی زندگی میں نظر آتے تھے۔

پہلی تصویر عزت علی کی تھی جن کو یہ جاگیر عطا ہوئی تھی اور جو ایک طرح سے میرے جدامجد اور اس خاندان کے بانی تھے۔ دوسری تصویر ان کے بیٹے محفوظ علی کی جنہوں نے جاگیر کو منظم کیا تھا۔ اس کے گرد باڑھ لگوائی تھی اور دریائے کنہار سے نہر نکال کے زمین کے لیے پانی حاصل کیا تھا۔ تیسری تصویر میرے پردادا' کے بھائی قدیر احمد کی تھی پھر ان کے ساتھ بیٹوں کی تصویریں تھیں جو روایات کے مطابق درویش کی بددعا سے جوانی میں ہی دنیا سے رخصت ہو گئے تھے پھر کفیل احمد کی جو میرے سوتیلے دادا تھے اور جنہوں نے خود کو عدالت میں جھوٹ بول کے واحد وارث ثابت کیا تھا اور جاگیر کا قبضہ حاصل کر لیا تھا۔ میرے اصل دادا یعنی عزیز احمد کی یہاں کوئی تصویر نہ تھی کیونکہ وہ تلاش معاش میں دہلی چلے گئے تھے اور پھر ایک شہر سے دوسرے شہر پھرتے ہوئے ستر سال بعد لاہور پہنچے تو شاید بھائی کو بھول چکے تھے۔

ظاہر ہے عزیز احمد کے بعد اگر یہاں کسی کی تصویر لگائی جا سکتی تھی تو وہ میرے والد تھے۔ اس کے بعد میں تھا۔ یہ سب مجھے بڑا عجیب' کسی حد تک افسانوی اور پرآسیب محسوس ہوا۔ اس ہجوم رفتگاں میں میرے ابا بھی کھڑے ہوں اور میں بھی نظر آؤں تو کیسا لگے گا؟ باہر سات قبریں تھیں' ایک کنواں تھا جو بند کر دیا گیا تھا۔ ایک تصویر عقیل احمد کی تھی جس کو میں نے عمر کے آخری ایام میں مفلوج دیکھا تھا۔ وہ بہت بوڑھا آدمی تھا مگر یہاں اس کی جوانی کی تصویر نظر آ رہی تھی۔

میری طرح راجا اور فرخ کے علاوہ فریال کا ذہن بھی اس ماحول سے متاثر تھا۔ فریال میرے ساتھ ہر تصویر کے سامنے رک جاتی تھی اور اسے دیکھتی رہتی تھی۔ تصویر کے نیچے نام تھا مگر تاریخ نہ تھی۔ یہ گزرے ہوئے ڈیڑھ سو برسوں کی کہانی کہنے والی تصویریں تھیں جو الگ الگ وقتوں میں بنائی گئی ہوں گی۔ تصویر بنانے والے بھی مختلف ہوں گے لیکن نہ جانے کیوں ان میں ایک پراسرار یکسانیت تھی۔

مجھ پر اس کا اثر زیادہ تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے میرے بزرگوں کی نظریں مجھ پر ہیں۔ ان بے روح تصویروں کی آنکھیں اپنے اپنے انداز میں مجھے دیکھ رہی ہیں۔ مجھے خوش آمدید کہہ رہی ہیں۔ مجھ پر اپنی شفقت اور محبت نچھاور کر رہی ہیں اور مجھ سے ان گنت سوالات کر رہی ہیں جن کا میرے پاس کوئی جواب نہیں۔

اس ماحول کا مجھ پر ایسا اثر ہوا کہ مجھ پر دہشت سی طاری ہونے لگی۔ میں گھبرا کے باہر نکل آیا۔

فریال میرے پیچھے آئی "کیا ہوا...... تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

میں نے کھلی فضا میں گہرے سانس لیے "پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ سب لوگ زندہ ہو گئے ہیں۔"

"تمہارے دماغ پر کچھ زیادہ اثر ہے لیکن مجھے بھی اس ماحول میں ڈر لگا۔ یوں لگا جیسے میں اہرام مصر کی ممیوں کی نمائش دیکھ رہی ہوں لیکن اس ڈر میں بڑی سنسنی خیزی تھی۔ جیسی کہ ہارر فلموں میں ہوتی ہے۔"

"یہ میرا ماضی ہے فریال!"

"کتنی ناقابل یقین بات ہے...... اور کتنی رومانٹک۔ کتنی قابل فخر اور اعتماد دینے والی...... میری تو کوئی تاریخ ہی نہیں۔"

"میں اسے ری ڈیکوریٹ کروں گا۔" میں نے کہا "یہ تو میں بڑے فخر سے یہاں آنے والوں کو دکھا سکتا ہوں۔"

"غیر ملکی سیاح اور تاریخ میں دلچسپی رکھنے والوں کو یہ جگہ بہت FASCINATE کرے گی۔ تم یہاں ایک ہوٹل کھولنے کی کیوں نہیں سوچتے۔ یہ ٹورسٹ اٹریکشن کا

زبردست اسپاٹ ہے۔“

میں نے مسکرا کے کہا ”آئیڈیا اچھا ہے۔ آؤ اب نیچے چلیں۔“

نچلی منزل پر ایک اور حیرت کا سامان تھا۔ جب میں نے عقبی حصے کے ایک کمرے کا تالا کھولا تو مجھے دروازے کی چوڑائی زیادہ لگی۔ اس فرق کو میری نظر پہلے بھی نوٹ کر چکی تھی لیکن اس کی ضرورت یا اہمیت پر میں نے غور ہی نہیں کیا تھا۔ اندر جانے کے بعد بیک وقت ہم سب اپنے اپنے انداز میں اظہار حیرت کیے بنا نہ رہ سکے۔

یہ ایک بہت بڑا ہال تھا جو دو عام کمروں کی وسعت رکھتا تھا۔ اس کے آخری حصے میں ایک پرانے طرز کی بگھی کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ابتدائی دور کی فورڈ ماڈل ٹی جیسی کوئی گاڑی تھی۔ بگھی کے پیچھے جہازی سائز کی شیورلے بیلے تھی (جسے عام طور پر شیورلٹ بیلر بولا جاتا ہے) یہ کنورٹیبل سیلون کار تھی یعنی اس کی چھت کھولی اور بند کی جا سکتی تھی۔ فورڈ ماڈل ٹی کے پیچھے اور شیورلے کے ساتھ انیس سو پچاس ماڈل کی ولیز جیپ کھڑی تھی۔

یہ سب مختلف ادوار کی گاڑیاں تھیں۔ ہر گاڑی اپنے دور میں شاہی سواری کا درجہ رکھتی تھی لیکن آج ان کی حالت کسی کباڑ خانے میں پڑی ہوئی ناکارہ اشیا جیسی ہو گئی تھی۔ بگھی کی سیٹوں پر نصف صدی یا اس سے بھی زیادہ عرصے کی گرد جمع نظر آتی تھی۔ ایسا نہیں تھا کہ اتنے طویل عرصے تک کسی نے اس کی صفائی نہیں کی تھی۔ ممکن ہے گزشتہ بار اس کی صفائی اس وقت کی گئی ہو جب لندن والے مالک آئے تھے لیکن اس بات کو بھی برسوں بیت چکے تھے

اس وقت کا تصور کیا جا سکتا تھا جب بگھی کو دو یا چار سفید گھوڑے کھینچتے ہوں گے اور حویلی کے مالک اس پر ہوا خوری کے لیے نکلتے ہوں گے تو پیچھے پائیدان پر ایک خادم طرّے دار صافہ اور وردی پہنے اٹن شن کھڑا رہتا ہوگا۔ اس کے بعد فورڈ ماڈل ٹی کا دور آ گیا تھا اور یہ بھی رئیسوں کی سواری تھی۔ اب اس کا شمار نوادرات میں ہوتا تھا۔ تقسیم سے پہلے شیورلے کی شان نرالی تھی۔ اس دور کی لمبی چوڑی کاروں میں کیڈلک اور بیوک کے علاوہ پلائی ماؤتھ اور اولڈز موبائل وغیرہ بھی تھیں مگر شیورلے کے دو ماڈل بیلے اور امپالا زیادہ مقبول تھے۔ طبقۂ امرا کی گاڑیاں پیکارڈ یا مرسیڈیز اور رولز رائس سمجھی جاتی تھیں۔ قائداعظم کے زیر استعمال رہنے والی پیکارڈ کو میں مزار کے میوزیم میں دیکھ چکا تھا۔

سب گاڑیاں شاید چلنے کے قابل ہوں گی لیکن ان کو چلانے والا کوئی نہیں تھا تو کئی عشروں سے وہ منجمد کھڑی تھیں۔ ان کا رنگ روغن اصل حالت میں تھا لیکن ٹائروں کی ہوا نکل جانے سے ہر گاڑی فرش پر بیٹھی ہوئی فریاد کناں لگتی تھی۔ اندر سے گاڑی کی سیٹ کے کشن بھی سلامت تھے مگر باہر گرد و غبار کی ایسی تہ جمی ہوئی تھی کہ ہاتھ لگانا بھی مشکل تھا۔

ظاہر ہے آج ان گاڑیوں کا زمانہ نہیں تھا۔ کچھ شوقین مزاج لوگ ان قدیم کاروں کو جمع کرتے تھے۔ یہ اب کلاسک کار کہلاتی تھیں۔ ہر سال انہیں مختلف شہروں میں نمائش کے لیے پیش کیا جاتا تھا۔ ایسی ہی ایک نمائش میں نے بھی دیکھی تو مجھے اندازہ ہوا کہ یہ شوق کتنا مہنگا ہے۔ انہیں اصل حالت میں رکھنے کے لیے مالکان خصوصی آرڈر پر پرزے بنواتے تھے، ان کی ناز برداری پر لاکھوں لٹا دیتے تھے۔

یہ سب میرے بس کی بات کہاں تھی۔ میں زیادہ سے زیادہ ولیز جیپ کو کارآمد بنا سکتا تھا۔ ویسی ہی ایک جیپ فرخ لایا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کی دو سواریاں اپنی بے پناہ مضبوطی کے باعث مقبول ہوئیں۔ ایک موٹر سائیکل جو پہلے پھٹ پھٹی بھی کہلاتی تھی۔ یہ ”ٹرائمف“ کمپنی کی دو ہیکل موٹر سائیکل ملٹری ماڈل کے نام سے مشہور تھی۔ دوسری ولیز جیپ جو پچاس کی دہائی تک بنائی گئی لیکن آج نصف صدی بعد بھی زیر استعمال تھی۔

جب ہم حویلی کے تفصیلی معائنے سے فارغ ہوئے تو شام ہونے لگی تھی۔ ہم سب کے جذبات کی کیفیت بہت عجیب تھی۔ راجا اور فرخ کچھ حیران اور کچھ مرعوب سے نظر آتے تھے۔ فریال کی زبان گنگ تھی اور مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ مجھے اپنا بچپن ابھی کل کی بات لگتا تھا جب میرے ابا ایک اسکول ٹیچر تھے اور ہم ایک پسماندہ بستی کے دو کمروں والے چھوٹے سے کرائے کے گھر میں رہتے تھے جس میں لالٹین جلتی تھی اور میری ماں چولہے میں لکڑیاں پھونکتی تھی تو دھواں گھر میں بھرتا تھا۔ میں گورنمنٹ اسکول تک تین میل پیدل چل کے جاتا تھا اور گلی میں بچوں کے ساتھ کنچے کھیلتا تھا۔ پھر ابا نے ایم اے کر لیا اور کالج میں لیکچرر ہوئے تو ہمارے حالات کچھ بہتر ہو گئے تھے۔

آج اچانک انہی یادوں کے دور سے اٹھا کے کسی طلسماتی ہاتھ نے مجھے ایک پُرشکوہ ماضی کے اس دور میں پہنچا دیا تھا جس پر خود میرے لیے یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ میں اس کا حصہ ہوں۔ یہ راجوں مہاراجوں، نوابوں اور شہنشاہوں کے جاہ و جلال اور شان و شوکت والا ماضی تھا جو محض ایک قصۂ پارینہ نہیں تھا۔ اس ورثے نے یکلخت مجھے

نوابی عطا کر دی تھی۔ بے حساب دولت اور طاقت بخش دی تھی۔

چائے پیتے ہوئے فریال نے شاید سویں بار کہا ہوگا ”یہ کتنا ناقابلِ یقین لگتا ہے رومیو! کسی جادو کی کہانی جیسا۔“

”مگر یہ حقیقت ہے...... اور اب اس سے بڑی حقیقت وہ ہے جس کا سامنا کرنا مجھے زیادہ دشوار لگتا ہے۔“ میں نے کہا۔

فریال نے مجھے غور سے دیکھا ”کون سی حقیقت؟“

میں نے کہا ”فریال، میرا ماضی بہت شاندار تھا۔ یہ میں نے دیکھ لیا اور تسلیم کر لیا۔ میرا مستقبل کیسے شاندار ہوگا، زمانۂ حال وقت کے سنگم پر ہے۔ میں پیچھے دیکھتا ہوں تو فخر سے میرا سر بلند ہوتا ہے مگر مستقبل کی طرف دیکھتے ہوئے مجھے ڈر لگتا ہے، پوچھو کیوں؟“

”او کے۔ میں پوچھ لیتی ہوں، کیوں......؟“

میں نے ایک گہری سانس لی ”اس لیے کہ مستقبل کے لیے میرے پاس صرف منصوبے ہیں لیکن میرے ہاتھ خالی ہیں۔ ٹھیک ہے کل سے بہت امیدیں بھی وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ یہ درخت اور جنگل، یہ دریا اور زمین۔ سب سونا اگل سکتے ہیں لیکن آج...... مجھے بہت کچھ کرنا ہے۔ مجھے اس جاگیر کی حفاظت اور دیکھ بھال کے لیے عملہ چاہیے۔ یہاں کے لوگوں کو مجھ سے تھوڑی توقعات ہیں۔ انہیں میں ملازمت دوں یا کوئی کام تو معاوضہ کہاں سے دوں۔“

راجا نے کہا ”آخر کتنا پیسا چاہیے تجھے نِکّے پتر!“

میں نے کہا ”مہاراجا! کم سے کم ایک کروڑ ہوں تو دس کروڑ اور پھر دس سے سو کروڑ پیدا کرنے کا عمل شروع کیا جا سکتا ہے۔“

فریال نے کہا ”ایک کروڑ تو تمہیں یوں مل جائیں گے۔“ اس نے چٹکی بجا کے کہا ”یہ سارے بھانڈے برتن بیچ دو۔ اب ہم ان سونے چاندی کے برتنوں میں تو کھائیں گے نہیں۔ یہ سب چیزیں تو بے کار ہی ہیں آج کے زمانے میں۔ پاندان، خاص دان، عطردان...... اور پتا نہیں کیا، وہ ہاتھ دھونے والا۔“

میں نے ہنس کے کہا ”آفتابہ اور سلفچی...... یار راجا! کیا ان چیزوں کی اتنی مالیت ہوگی؟“

راجا نے سر کھجایا ”یہ تو مشکل حساب ہے۔“

فرخ بولا ”میں بتاتا ہوں۔ سونا ہے تقریباً آٹھ لاکھ روپے کلو۔ اب ایسا کرتے ہیں کہ ترازو منگوا کے ہر برتن کو تولتے جاتے ہیں۔ بارہ تیرہ کلو سونا ایک کروڑ کا ہوگا۔ میرا اندازہ ہے کہ آپ سب کا وزن کریں تو اس سے کہیں زیادہ ہو جائے گا۔ باقی رہے وہ قیمتی پتھر جو سنگھار دان وغیرہ میں لگے ہوئے ہیں، ان کی مالیت کا اندازہ تو کوئی جوہری ہی کر سکتا ہے۔“

فریال نے کہا ”لو...... فرخ نے تمہارا مسئلہ حل کر دیا۔ تم ایک کروڑ کی فکر کر رہے تھے۔ میرا خیال ہے تمہیں اس سے بہت زیادہ مل جائیں گے، تین چار کروڑ۔“

راجا نے کہا ”باقی چیزیں بعد میں آکشن کریں گے انٹرنیشنل مارکیٹ میں۔ یہ کلاسک کاریں وغیرہ۔“

میں نے کہا ”راجا! اتنا ڈھیروں سونا کون خریدے گا؟“

راجا نے کہا ”خریدار لے گا نِکّے پتر! آفتابے سے

بنے گا کسی حسینہ کا گلو بند۔ سیفٹی ہوگی کسی دلہن کا کنگن۔ لوٹے سے بن جائیں گے کسی کے آویزے۔ میں بلا لیتا ہوں ایک سنار کو۔"

میں نے کہا "کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوگی؟"

"کیوں...... یہ کیا چوری کا مال ہے؟"

میں نے کہا "پھر بھی...... کوئی سرکاری اہلکار نہ آ جائے ٹانگ اڑانے۔"

"اے اناڑی تو ہے راجا نہیں۔ سرکاری اہلکار راجا کو جانتے ہیں۔"

میں نے کہا "راجا! جب میں چھوٹا تھا تو ہماری گلی میں ایک بندہ آتا تھا جو پرانے جوتے، کپڑے لے کر کوئی برتن دے جاتا تھا۔ میری ماں میرے پرانے اور چھوٹے ہو جانے والے کپڑے دے کر کبھی کوئی پیالہ لے لیتی تھی، کبھی پلیٹ۔ وہ ہر پرانی چیز لے جاتا تھا۔ اسے ماں ٹوٹ پھوٹ جانے والے یا ناقابلِ استعمال ہو جانے والے برتن بیچ دیتی تھی۔ لوہے کا بھاؤ الگ تھا۔ سلور کا الگ اور پیتل کا الگ۔ اس سے میری ماں کو کیا ملتا ہوگا؟ چند روپے...... آج میں سونے چاندی کے برتن بیچ کے دولت کے انبار حاصل کرنا چاہتا ہوں تو یہ الف لیلوی کہانی لگتی ہے۔"

"یہ تو اللہ کی دین ہے فیکے پتر...... کہ اس نے تجھے وسیلہ بنایا۔ یہ سب دولت جو خلقِ خدا کی بھلائی کے کام آ سکتی تھی، بے مصرف پڑی تھی۔ یہ قدرت کا فیصلہ تھا۔ اس نے تیرا انتخاب کیا کہ تو اس دولت کا صحیح استعمال کر اور پھر مجھے یہاں بھیج دیا۔"

میں نے کہا "سچ کہا تو نے راجا! میں تو اپنی زندگی سے مطمئن تھا اور مجھے نہ دولت کی خواہش تھی نہ جاگیر کی۔ میں بہت کما رہا تھا اور مزید کمائی کے سارے آپشن میرے سامنے تھے۔ دولت جب مقصد بن جائے تو آدمی سونے کے پہاڑ کو بلند سے بلند تر کرتا جاتا ہے اور اس کے سوا کچھ نہیں کرتا۔ دولت اگر ذریعہ ہو تو یہ خود کو، خاندان اور محلے والوں کو، ملک کو اور دنیا کے انسانوں کو فائدہ پہنچاتی ہے۔ آرام دیتی ہے اور خوشحالی دیتی ہے۔"

فریال نے کہا "مجھے تو سونے چاندی کے برتنوں میں کھانے کا تصور میں بڑا عجیب لگتا ہے۔"

"لیکن پہلے یہ امارت کی شان سمجھی جاتی تھی۔ حالانکہ سونے کے پیالے میں زہر ڈال کے دیا جائے تو وہ امرت نہیں بن جاتا اور مٹی کے ٹوٹے ہوئے پیالے میں شہد کی تاثیر نہیں بدلتی خواہ اسے بادشاہ کھائے یا فقیر۔

ہم بہت دیر تک باتوں میں مصروف رہے اور اپنے پلان کو ترتیب دیتے رہے۔ وسائل کے حصول کا آغاز ہو جانے سے ہم سب کے حوصلے بلند ہو گئے تھے اور اب کوئی منصوبہ کسی کو بھی ناقابلِ عمل نہیں لگتا تھا۔ سب پراعتماد تھے کہ ہم سب کچھ کر سکتے ہیں اور شیخ چلی کے خواب کو بھی تعبیر دی جا سکتی ہے۔ اہمیت ایک مربوط پروگرام میں ترجیحات مقرر کرنے کی تھی کہ پہلے کیا ہونا چاہیے اور کس وقت کیا ممکن ہے؟

رات کو میں نے اپنے گھر فون کیا۔ میں بہت خوش تھا اور اپنے والدین کو بتانا چاہتا تھا کہ انہوں نے میری زندگی کے سارے فیصلے بڑی برکت والے کیے تھے۔ اس وقت بھی جب انہوں نے مجھے اپنے سے دور جلاوطنی اختیار کرنے پر مجبور کیا تھا اور یہ بھی جب انہوں نے مجھے ڈالروں کی سرزمین سے لوٹ کر وطن آنے پر مجبور کیا تھا۔

لیکن میں نے بات شروع کی تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ پریشان ہی نہیں خوف زدہ بھی ہیں۔ اس سے پہلے کہ میں انہیں اپنے پروگرام کے بارے میں بتاتا، انہوں نے کہا "کیا یہ ہو سکتا ہے کہ تم صبح آ جاؤ؟"

میں نے کہا "بات کیا ہے ابا جی!"

انہوں نے کہا "میں یہ سمجھنے پر مجبور ہوں کہ ہمارے لیے کچھ لوگ پریشانی پیدا کر رہے ہیں۔"

میں نے کہا "کون لوگ...... آپ کا تو کوئی دشمن ہی نہیں۔" پھر مجھے اندازہ ہوا کہ میرا سوال ہی غلط تھا۔ ظاہر ہے، وہ میرے دشمن تھے جو دباؤ کے یہ ہتھکنڈے استعمال کر رہے تھے۔

میں نے کہا "یہ وہی لوگ ہیں...... کیا اب کوئی نئی بات ہوئی ہے؟"

"ہمیں دھمکیاں موصول ہو رہی ہیں، ٹیلی فون پر۔" ابا جی نے خوف زدہ لہجے میں کہا "وہ کہتے ہیں تمہارے گھر کو بم سے اڑا دیا جائے گا۔"

میں نے کہا "ابا جی! آپ کے شاگرد تو ہر جگہ بیٹھے ہیں، پولیس میں...... محکمۂ ٹیلی فون میں۔"

ابا جی نے خفگی سے کہا "رفیق! زمانے کو دیکھو، کس کی نگاہ میں شرم ہے؟ میں کیا اپنی بے عزتی کرائے جاؤں؟ پرانے شاگرد نظر چراتے ہیں۔ منہ پر کہہ دیں گے کہ آپ نے پڑھایا تو کون سا احسان کیا، تنخواہ ملتی تھی آپ کو پھر کیا عزت رہ جائے گی میری اپنی نظر میں؟ اور اگر کوئی ایک ایسا مل گیا جس کی آنکھوں میں مروت ہوگی تو وہ کیا کر سکے گا۔ اکیلا چنا

کیا بھاڑ پھوڑ سکتا ہے۔ میں نے تو اب سوچا ہے کہ یہ گھر چھوڑ دوں۔"

"گھر چھوڑ کے آپ جہاں جائیں گے۔ کیا وہ گھر نہیں ہوگا؟ کیا وہاں آپ محفوظ ہو جائیں گے؟"

وہ بگڑ کے بولے "نالائق، کیا تم ہمیں احساس دلا رہے ہو کہ تم بھی کچھ نہیں کر سکتے اگر تم نے وہاں رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو ہم وہاں کیوں نہیں آ سکتے؟"

میں سمجھ گیا کہ وہ سخت غصے میں ہیں ورنہ وہ مجھے گالیاں نہ دیتے۔ ان کی بڑی سے بڑی گالی نالائق اور گدھے سے آگے نہیں جاتی تھی۔ اس وقت ان سے فون پر بحث کرنا لاحاصل تھا۔ میں انہیں کیسے سمجھاتا کہ یہاں کے حالات کا مقابلہ وہ اس عمر میں نہیں کر سکتے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں صبح آ کے بات کروں گا۔ اس وقت اماں نماز پڑھ رہی تھیں ورنہ میرے لیے زیادہ مشکل ہوتی۔ ابا ٹھنڈے اور دھیمے مزاج کے معقول آدمی تھے۔ اماں بے حد جذباتی تھیں جیسے کہ سب مائیں ہوتی ہیں جو دماغ سے نہیں دل سے سوچتی ہیں۔"

میں نے یہ بات راجا کو بتائی "تو کچھ کر سکتا ہے؟"

اس نے سر ہلایا "بہت کچھ کر سکتا ہوں مگر زندگی اور موت کی ضمانت نہیں دے سکتا۔ یہ ذمے داری اوپر والے کی ہے اگر میں اوپر والوں سے بات کروں تو وہ فوری طور پر سکیورٹی کے انتظامات کر دیں گے۔ فون ٹیپ ہونے لگے گا۔ سادہ کپڑوں میں پولیس والے گلی میں آ جائیں گے۔ ممکن ہے گارڈ بھی مل جائے لیکن کتنے دن کے لیے؟"

میں نے کہا "ہاں...... کتنے دن کے لیے؟"

وہ بولا "یہاں تو نے دیکھا ہوگا، کتنے طمطراق سے نکلتی ہے ان کی سواری جو خود کو وی آئی پی کہلواتے ہیں۔ آگے پیچھے درجنوں موبائل گاڑیاں اور مسلح گارڈز۔ سڑک پر عوام تو کیا، خواص تک نہیں آ سکتے۔ لوگ اپنے گھر کی بالکنی میں اور اپنی گلی کے موڑ پر کھڑے نہیں ہو سکتے۔ شاہی گزرگاہ پر کہیں کار پارک کریں تو پولیس اٹھا لے جاتی ہے۔ راستے بند ہو جاتے ہیں۔ ٹریفک جام میں ایمبولینس پھنس جاتی ہے تو فرشتۂ اجل راستے ہی میں دبوچ لیتا ہے لیکن بعد میں یہی لوگ کیسے پھرتے ہیں۔ سابق وی آئی پی۔ اگر کوئی مارنا چاہے تو کیا بعد میں نہیں مار سکتا۔ جب وہ گورنر یا صدر، وزیراعظم یا وزیر سفیر نہیں رہتے مگر بعد میں کون مارا گیا؟"

میں نے کہا "تو سیاسی جذبات میں بہہ گیا ہے مہاراجا!"

"یار! مت کیا کر ایسی بات مجھ سے۔ صبح جا اور ان سب کو یہاں لے آ۔ مریں گے تو ایک ساتھ مریں گے۔ ساتھ جینے کی کوشش ضرور کریں گے۔ میں نے شہناز کو بھی نوٹس دے دیا ہے۔"

"کیا وہ یہاں محفوظ رہے گی؟"

وہ پھٹ پڑا "بکواس مت کر۔ کوئی کہیں محفوظ نہیں ہوتا۔ جب تک خدا حفاظت نہ کرے۔ امریکی صدر بھی نہیں، کیا تجھے خوش فہمی ہے کہ فریال کو تو بچا سکتا ہے؟ ابے مت پڑ ان چکروں میں، جا سو جا۔"

"لیکن یار! ہم اپنی حفاظت کے خیال سے غافل تو نہیں رہ سکتے۔ یہ سوچ کر کہ بچانے والا خدا ہے۔ اپنی عقل کا استعمال ترک تو نہیں کر سکتے۔ بقا کی جنگ سے دستبردار تو نہیں ہو سکتے۔"

اس نے چادر کے نیچے سے جواب دیا "یہ میں نے کب کہا ہے الو کے پٹھے!"

میں باہر جا بیٹھا جہاں فریال سوکھے ہوئے فوارے کی منڈیر پر کسی بھٹکنے والی بدروح کی طرح براجمان تھی۔ مجھے دیکھ کے وہ رومانٹک ہونے لگی۔ "رومیو! جب یہ فوارہ چلے گا، تعمیرِ نو کے بعد...... اردگرد کا باغ آباد ہوگا۔ نئے پودے اور درخت لگائے جائیں گے، سرسبز گھاس ہوگی۔"

"تو ہم کہاں ہوں گے؟ یہ سوال زیادہ اہم ہے۔ آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر...... یا اس کے برعکس۔"

"اگر چودھویں رات کی چاندنی کھلی ہوتی تو تم رومانٹک ہو کے فلمی ڈائلاگ بولتے۔"

میں نے کہا "چاندنی میں سانپ اسی طرح کاٹتا ہے جیسے اندھیری رات میں...... اور تمہیں اغوا کرنے والوں کے لیے تو یہ انتہائی موافق حالات ہیں۔ کیا تم جانتی ہو کہ تم ایک کم ہمت، ڈرپوک اور بے وقوف لڑکی ہو؟"

وہ ہنسی "ہاں، مگر تم جو ہو ہیرو...... پھر ہیروئن یہ سب کیوں سوچے؟"

میں نے کہا "دیکھو...... سیریس ہو جاؤ۔ میں چاہتا ہوں تم مار دھاڑ سیکھ لو۔ یہ تمہاری بدقسمتی ہوگی اگر تم نے وہ سب مجھ سے نہ سیکھا جو میں کر سکتا ہوں۔"

"ڈھنگ سے عشق تو کر نہیں سکتے...... اناڑی!"

"تمہیں مجھ سے جوڈو کراٹے سیکھنا پڑے گا۔" میں نے ڈانٹ کے کہا "نشانہ کیسا ہے تمہارا؟"

اس نے انگلی کو ریوالور کی نال بنا کے میرے دل پر رکھا "اپنے دل سے پوچھو...... یا وہ گانا گاؤں، میرا نشانہ دیکھے

زمانہ......"

اچانک اندھیرے میں کوئی دوڑتا ہوا آیا۔ یہ ریشماں تھی۔ "مالک...... مالک! وہ آ رہا ہے۔" وہ پھولی ہوئی سانس کے ساتھ بولی۔

"کون...... زلزلہ، آدم خور شیر...... یا بھوت؟" میں نے کہا۔

"وہ...... غنی!" ریشماں منکنے لگی "میں نے اسے سب بتا دیا آپ کے بارے میں......"

دروازے میں ایک سایہ سا نمودار ہوا اور آہستہ آہستہ ہمارے سامنے آ کے رک گیا۔ وہ چھ فٹ کا اور کسی اتھلیٹ جیسے جسم والا نوجوان تھا۔ ریشماں مجھے بتا چکی تھی کہ اس کا باپ بھی جوانی میں بڑا خوبرو پہلوان تھا جس پر عورتیں فریفتہ ہو جاتی تھیں لیکن اب وہ حویلی میں مجذوب بنا ہوا تھا۔ اس کا دماغی توازن الٹ چکا تھا اور وہ اس طوائف کو بھی بھول چکا تھا جس کے بلاخیز عشق نے غنی کو جنم دیا تھا۔

میں نے اس سے ہاتھ ملایا "مجھے ریشماں نے تمہارے بارے میں بتایا تھا۔"

اس نے کہا "ریشماں آپ کی بہت تعریف کرتی ہے مالک۔ اس نے مجھے بتایا کہ پیر بخش یہاں ٹرک لے کر آ گیا تھا۔"

میں نے کہا "تم جانتے ہو اسے؟"

"جانتا ہوں مالک، وہ میرے تایا کا بزنس پارٹنر ہے۔"

میں چونکا "تم اکبر خان کی بات کر رہے ہو؟ کیا بزنس ہے ان کا؟"

"ان کے بہت سے خفیہ بزنس ہیں مالک! لیکن اس روز وہ افغانستان سے آئے تھے۔"

میں نے کہا "یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"چھ سال ہو گئے ٹرک چلاتے جناب! انہی سڑکوں پر ہم بھی آتے جاتے ہیں۔ ٹرک ڈرائیوروں کی بہت بڑی برادری ہے۔ انہیں سب معلوم ہوتا ہے کہ کون کیا کر رہا ہے؟"

میں نے کہا "یہ تو ٹھیک کہا تم نے۔ کیا تم یہ بھی جانتے ہو کہ افغانستان سے کیا مال آیا تھا؟"

"وہاں پوست کی کاشت ہوتی ہے مالک! سب ہی جانتے ہیں۔ کچھ عرصہ رک گئی تھی بلکہ کم ہو گئی تھی جب روسی تھے یا بعد میں طالبان تھے۔ اب وہاں کچھ بھی نہیں ہے تو لوگ کیا کریں؟ کچھ پیداوار یہاں پہنچتی ہے، یہاں ہیروئن بنانے اور اسمگل کرنے والے اچھی قیمت دیتے ہیں۔"

"اکبر خان اس کاروبار میں کس طرح شریک ہے؟"

"یہ ٹرک اسی کا تھا۔ اس کے نام پر نہیں ہے۔ کبھی کبھی وہ خود بھی اسے لے جاتا ہے...... جیسے کہ آج کل گیا ہوا ہے۔"

"تمہیں یہ بھی معلوم ہے؟"

وہ مسکرایا "وہ ریشماں کا باپ ہے مالک!"

میں نے ریشماں کی طرف دیکھا تو اس نے نظر جھکا لی "کیا اس کی بیوی کو بھی معلوم ہے؟"

"بیویوں کو سب پتا ہوتا ہے جناب! لیکن وہ چپ رہنے پر مجبور ہوتی ہیں۔ ایسے شوہر کا کیا ہے، کسی وقت بھی چھوڑ دے۔ بے چاری زندگی کے دن پورے کر رہی ہے۔"

میں نے کہا "اس نے دوسری شادی کر لی ہے؟"

"مالک! برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں...... کیا نور جہاں جیسی عورت اس سے شادی کر سکتی ہے؟"

میں نے کہا "یہ بات مجھے بھی ناقابلِ یقین لگی تھی...... کون ہے وہ عورت؟"

"بس جناب! عورت ہے، سب کے کام آ جاتی ہے۔ ہر جگہ کام آ جاتی ہے، کبھی نہ کبھی آپ سے بھی ضرور واسطہ پڑے گا۔"

میں نے کہا "غنی! تم تو بہت کام کے آدمی ہو۔ یہ بتاؤ کہ اکبر خان اس ٹرک پر کیا لے کر گیا ہے؟"

"افغانستان تو بہت مال جاتا ہے جناب، پاکستان کے راستے۔"

میں نے کہا "تمہارا مطلب ہے افغان ٹرانزٹ ٹریڈ؟ کیا وہاں سے اور کچھ بھی آتا ہے؟ میرا مطلب ہے اسلحہ......؟"

"اس کا علم مجھے نہیں ہے سر! نہ یہ معلوم ہے کہ اس کاروبار میں شریک دوسرے لوگ کون ہیں؟ پیر بخش کے علاوہ۔"

میں نے کہا "وہ تو بہت کما رہا ہوگا؟ اس قسم کے کاروبار میں لکھ پتی سے کروڑ پتی بنتے دیر نہیں لگتی لیکن ایسا نظر نہیں آتا۔ میرا مطلب ہے...... یہاں اس کے رہن سہن میں۔"

"وہ یہاں رہتا ہی کب ہے مالک! اس کے باپ جانو بابا......"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "کیا وہ تمہارے دادا نہیں تھے؟"

وہ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد بولا "بالکل تھے جناب! لیکن انہوں نے مجھے پوتا تسلیم نہیں کیا۔ اکبر خان نے ایسا نہیں ہونے دیا کیونکہ وہ اپنے ہی چھوٹے بھائی اصغر سے حسد کرتا تھا۔ یہاں سب میرے سوتیلے رشتے دار تھے۔ میری ماں، بہن بھائی، تایا تائی، کسی نے مجھے اپنا نہیں سمجھا۔ یہاں رہنے بھی نہیں دیا۔"

میں نے کہا "میں سمجھتا ہوں جانو بابا جیسا دوسرا شخص میں نے نہیں دیکھا۔ وہ انسان نہیں فرشتہ تھا۔"

اس نے ایک گہری سانس لی "اسی لیے انسانوں کی دنیا میں نہیں رہ سکا۔ چاہتا تو عیش کرتا مگر اس نے اکبر خان سے صاف کہہ دیا تھا کہ تیری حرام کی کمائی مجھے نہیں چاہیے۔ ریشماں کی ماں نے بھی کہہ دیا تھا کہ اپنا پیسا اپنے پاس رکھ۔ ان کو صحیح علم تو نہیں ہو سکتا تھا کہ اکبر خان کا دھندا کیا ہے لیکن اس کے پاس پیسے کی فراوانی دیکھ کے وہ سمجھ گئے تھے کہ اکبر خان کوئی غیر قانونی کام کر رہا ہے۔ یہ پرانے وقتوں کے سیدھے سادے لوگ ہیں۔ آج بھی ڈرتے ہیں کہ خدا کو کیسے منہ دکھائیں گے۔ جب سے غلط قسم کے لوگوں کا آنا جانا ہوا تھا، جانو بابا محتاط ہو گیا تھا۔ اسے دن رات یہ پریشانی لاحق رہنے لگی تھی کہ کہیں اکبر حویلی میں ڈاکا نہ ڈالے۔ وہ کہتا تھا کہ ساری عمر میں نے اور میرے باپ نے جن مالکوں کا نمک کھایا ہے، ان کے مال میں سے ایک پیسا بھی ادھر ادھر ہو گیا تو میدانِ حشر میں انہیں کیا جواب دوں گا۔ یہ جو کچھ آپ کو یہاں نظر آ رہا ہے، جانو بابا کی وجہ سے ہے۔ وہ نہ ہوتا تو آپ کو اس کھنڈر کے سوا کچھ نہ ملتا۔ آپ کو شاید زمین تک نہ ملتی۔"

میں خاموشی سے سنتا رہا۔ غنی کی بات کا ہر لفظ سچ تھا۔ جانو بابا نے بالآخر ادائے فرض میں جان بھی دے دی تھی۔ زندگی کی آخری سانس بھی اس نے حق نمک ادا کرنے میں صرف کر دی تھی۔ یہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اسے بھی قدرت کا انتقام ہی کہا جا سکتا تھا کہ جو کچھ میرے نصیب میں لکھ دیا گیا تھا، وہ مجھ تک پہنچ گیا۔ میں کچھ دن اور نہ آتا تو حویلی کا خزانہ لٹ جاتا۔ مجھے یہاں پرانے فرنیچر، خاندانی تصاویر اور قدیم ناکارہ سواریوں کے سوا کچھ نہ ملتا۔ اکبر خان کی بدنصیبی کہ اچانک میں آ پہنچا اور میں نے ہر چیز پر مالکانہ قبضہ حاصل کر لیا۔ وہ روتا ہوگا کہ اس نے اپنے عزائم کو عملی جامہ پہنانے میں اتنی دیر کیوں کی؟

غنی اس حویلی کے ملازموں سے بہت مختلف تھا۔ وہ دنیا میں پھرتا تھا چنانچہ اسے دنیا والوں کی خبر تھی۔ جتنی دیر وہ بولتا رہا۔ ریشماں کی نظر اس پر صدقے واری ہوتی رہی۔ وہ واقعی اس کی دیوانی تھی۔ خود غنی کے انداز سے یہ پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ ریشماں کو کس حد تک چاہتا ہے۔"

میں نے کہا "غنی! ایک بات پوچھوں، سچ بتاؤ گے؟"

ریشماں پٹ سے بولی "کیوں نہیں بتائے گا سچ مالک!"

میں نے کہا "ٹرک تو تم بھی چلاتے ہو، کتنا کما لیتے ہو؟"

وہ بولا "کبھی دس، کبھی پندرہ۔ میں تو صرف ڈرائیور ہوں، جو مالک خوشی سے دے، لے لیتا ہوں۔"

میں نے کہا "ٹرک ڈرائیور تو ہر قسم کا مال لے جاتے ہیں اور کراچی سے خیبر تک کے سفر میں ان کے اور چیکنگ کرنے والوں کے درمیان جو گٹھ جوڑ ہوتا ہے وہ انتہائی منافع بخش سمجھا جاتا ہے۔"

"میں سمجھ گیا، آپ کیا کہنا چاہتے ہیں مالک! لیکن ایک تو سارے ٹرک ناجائز دھندوں میں ملوث نہیں ہوتے اور ایسے دھندوں سے پیسا کماتے ہیں تو مالک، ڈرائیور بے چارہ تو ساری عمر ڈرائیور ہی رہتا ہے۔ پکڑا بھی وہی جاتا ہے، جیل بھی اسی کو جانا پڑتا ہے۔ اگر میں ایسے دھندوں میں پڑنے والا ہوتا تو اپنے تایا اکبر خان سے گٹھ جوڑ کر لیتا۔ میری تو کوشش ہے کہ اپنا ٹرک لے لوں لیکن ابھی تک اتنے پیسے ہی جمع نہیں ہوئے، خیر...... اللہ کرے گا کسی دن یہ بھی ہو جائے گا۔"

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد میں نے پوچھا "تم ریشماں کو چاہتے ہو؟"

وہ شاید اس سوال کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے چونک کے کہا "جی...... آپ سے تو کچھ چھپا ہوا نہیں ہے۔"

"پھر شادی کیوں نہیں کر لیتے اس سے؟"

"شادی بھی ہو جائے گی مالک! جب اللہ کو منظور ہوگا۔ ابھی اس کو لے کر کہاں جاؤں گا۔"

"ارے مالک نے کہا تو ہے......" ریشماں شوخی سے بولی۔

"تو چپ کر۔" غنی نے اسے ڈانٹ دیا "گھر مانگے نہیں جاتے، بنائے جاتے ہیں۔"

مجھے اس کی بات اچھی لگی "غنی! ریشماں بہت بولتی ہے۔ اس نے ضرور بتا دیا ہوگا تمہیں کہ میں کیا کرنا چاہتا ہوں؟"

"جی مالک! بتایا تو ہے۔"

میں نے کہا "مجھے تم جیسے قابلِ اعتماد لوگوں کی ضرورت

ہے۔''

''میں تو کچھ بھی نہیں کرسکتا جناب!''

میں نے کہا''میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ جب یہاں کام ہوگا تو ٹرک کی ضرورت بھی ہوگی۔تم میرے لیے کام کرو گے تو نقصان میں نہیں رہو گے۔''

''یہ کرے گا مالک! مجھ سے کہہ رہا تھا کہ میں کچھ بھی کرنے کے لیے تیار ہوں۔ یہاں کہہ رہا ہے میں کچھ نہیں کرسکتا۔کوئی ضروری تو نہیں ہے کہ آدمی ٹرک چلاتا ہے تو ساری عمر ٹرک چلائے۔''ریشماں بولی۔

میں نے مسکرا کے کہا''بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ مجھے بھی ایسا لگتا ہے کہ غنی کو موقع ملے تو یہ بڑی سے بڑی ذمے داری پوری کرسکتا ہے۔ میں اسے یہ موقع ضرور دوں گا۔ یہ بہت ترقی کرے گا۔''

ریشماں کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔غنی کی مسکراہٹ بھی ظاہر کرتی تھی کہ اسے اپنی یہ قدر دانی اچھی لگی ہے۔شاید پہلی بار کسی نے اس کے اچھے مستقبل پر اتنے یقین کا اظہار کیا تھا۔ یہاں تو لوگ کسی کی صلاحیت کا اعتراف کرنے میں بھی تنگ دل ہو جاتے ہیں۔

غنی جانے کے لیے پلٹا ہی تھا کہ میں نے اسے آواز دی۔

وہ رک گیا''جی مالک!''

میں نے کہا''باتوں میں ایک بات پوچھنے کا موقع نہیں ملا۔کیا تمہارا ابا بھی فوج میں رہا ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم مالک۔ وہ نائب صوبے دار ضرور کہلاتا ہے۔''

''وہ بیساکھی کے بغیر چل سکتا ہے۔''میں نے کہا۔

''اس کی مصنوعی ٹانگ اصلی کی طرح ہے جناب! وہ یہاں کچھ اور ہوتا ہے' اصل میں کچھ اور ہے۔ کسی دن آپ کو پتا چل جائے گا۔''

میں یہ کہتے کہتے رک گیا کہ میری نظر اس کی اصلیت تک پہنچ گئی ہے اور میں اسے چور ڈاکو ہی نہیں اپنے باپ کا قاتل بھی سمجھتا ہوں۔

میں نے کہا''یہ جو عمارت ہے' اکبر خان کہتا ہے کہ وہ یہاں چوکیدار ہے۔کیا ہوتا ہے اس دفتر میں؟''

''اس بارے میں کوئی بھی کچھ نہیں جانتا۔ یہ ممنوعہ علاقہ ہے۔آج تک کسی نے اندر جا کے نہیں دیکھا۔''

میں نے کہا''کب سے قائم ہے یہ دفتر؟''

''آٹھ دس سال ہوگئے جناب!''وہ بولا اور سر جھکا کے کھڑا ہوگیا۔میں نے اسے جانے کی اجازت دی۔

مجھے اندازہ ہونے لگا تھا کہ ریشماں اس پر حاوی ہے۔ بظاہر سخت گیر اور بے پروا نظر آنے کے باوجود وہ پوری طرح ریشماں کی گرفت میں ہے۔ وہ اس سے کچھ بھی منوا سکتی ہے۔ کچھ بھی کرا سکتی ہے۔اپنے محبوب پر مکمل اختیار اس نے خود اپنی ہستی کی نفی کرکے حاصل کیا تھا۔اب وہ من تو شدم تو من شدی کے مقام پر تھے۔ جہاں ایک کے بغیر دوسرے کا وجود اتنا ہی ناقابل تصور بن جاتا ہے جیسے زمین کے بغیر آسمان اور آسمان کے بغیر زمین کا تصور ممکن نہیں۔

اس کا ثبوت صبح ملا جب ریشماں بڑے ناز و غرور سے اٹھلاتی نمودار ہوئی۔میری حمایت حاصل ہونے کے بعد اس نے غنی سے اپنے مراسم پر شرمسار یا خوف زدہ نہ ہونے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ پہلے وہ غنی کی پسند کے کپڑے چھپ چھپ کے صرف اسی کو دکھانے کے لیے پہنتی تھی۔اب ایسا نہیں تھا۔غنی اس کے لیے جو نئے کپڑے لایا تھا وہ اس نے بڑے اہتمام سے پہن رکھے تھے۔

جب وہ سلام کرکے سامنے کھڑی ہوگئی تو فریال نے پوچھا''تم کچھ کہنے آئی ہو؟''

اس نے گھڑے جیسا سر ہلایا''وہ جی بیگم صاحبہ! رات کو میں نے غنی سے صاف کہہ دیا۔''

''کیا کہہ دیا؟''

''یہی کہ بس اب دوسروں کی نوکری چھوڑ دے۔ مالک نے کہا ہے کہ میرے ساتھ کام کرو تو پھر دنیا بھر میں بھٹکنے کی کیا ضرورت ہے۔''

فریال نے کہا''پھر......اس نے مانی تمہاری بات یا نہیں؟''

''لو جی' مانتا کیسے نہیں۔ پہلے تو اکڑ گیا کہ جو میری مرضی ہوگی کروں گا۔ میں نے کہا کہ اچھا تو پھر جا' میں بھی وہی کروں گی جو میری مرضی ہوگی۔ تیرا راستہ الگ میرا الگ۔ آگے بتاؤں جی اور کیا کہا تھا میں نے......؟''

فریال ہنسنے لگی''اتنا بتایا ہے تو باقی بھی بتا دو۔''

وہ کچھ جھینپ کے اور شرما کے بولی''میں نے...... میں نے کہا کہ میں روز نئی یاریاں لگاؤں گی۔جس سے دل چاہے گا شادی کروں گی۔ اس کا پارا تو چڑھنا ہی تھا۔اس نے مارا مجھے' کہنے لگا حرام زادی میں قتل کرکے اسی جگہ گاڑ دوں گا۔ میں سمجھ گئی کہ اب کام بن گیا۔ میں نے کہا کہ......خود تیری ماں یہی کرتی تھی۔''

فریال دم بخود رہ گئی''اس نے تو اور مارا ہوگا تمہیں؟''

''ہاں جی، میں نے بھی کہا کہ مار لے جتنا مارنا ہے۔ ختم کردے ابھی مجھے پھر میں گر گئی نیچے اور آنکھیں بند کرکے سانس بھی روک لی۔جسم اکڑا لیا۔بس نکل گئی ساری ہوا۔ گھبرا گیا میری حالت دیکھ کے' میرے ہاتھ پیر ملنے لگا۔ رونے دھونے لگا کہ ریشماں،تو مرگئی تو میں بھی جان دے دوں گا اپنی۔''

فریال کو بے حد ہنسی آئی''ریشماں! بڑی حرافہ ہے تو۔''

ریشماں نے ہنستے ہنستے کہا''کرنا پڑتا ہے جی! ایسے تھوڑی قابو آتے ہیں یہ مرد۔غبارے کی طرح پھول جاتے ہیں غصے میں۔غبارہ جب پھٹ جائے تو کیسا ہو جاتا ہے۔ غصہ نکال کے یہ بھی ایسے ہی ہو جاتے ہیں۔بس اس کے بعد مان گیا میری بات۔ کہنے لگا کہ تجھے کیا پتا میں تو پہلے ہی یہ فیصلہ کرچکا تھا۔اب وہ دو دن بعد جائے گا تو مالکوں کو بتا کے واپس آجائے گا پھر یہیں رہے گا۔ آپ جو کہو گے وہ کرے گا۔آپ اسے کام دو گے ناں مالک!''

راجا اور میں اس کی باتوں سے پوری طرح محظوظ ہو رہے تھے۔ اس نے سوال کرلیا تو جواب دینے سے پہلے مجھے کچھ سوچنا پڑا' پھر میں نے اسے بلوا لیا۔اب میں خود کو اس پوزیشن میں سمجھتا تھا کہ کچھ بھروسے کے لوگوں کو حق خدمت کا معاوضہ بھی دے سکوں۔

میں نے کہا''غنی! ٹرک چلانے کے علاوہ کیا کرسکتے ہو؟''

''محنت مزدوری کے کام بہت کیے ہیں جناب!''

میں نے کہا''ریوالور چلانا آتا ہے؟''

وہ کچھ دیر تذبذب میں مبتلا رہا پھر آہستہ سے اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کے ایک ریوالور نکالا''اپنی حفاظت کے لیے ساتھ رکھنا پڑتا ہے۔ گولی آج تک کسی پر نہیں چلائی' ضرورت ہی نہیں پڑی۔''

''چلانی پڑے تو کیا ہوگا؟ دشمن کو لگے گی یا کسی بے گناہ کو۔ ایک شہزادہ تیر اندازی کررہا تھا تو کوئی مسخرہ ہدف پر جاکے بیٹھ گیا تھا کہ بس یہی جگہ محفوظ نظر آتی ہے مجھے۔ ایسا تمہارے ساتھ تو نہیں ہے ناں۔''میں نے کہا۔

''آپ آزما لیں جناب!''وہ خفت سے مسکرایا۔

راجا بولا''ریشماں! اپنے سر پر سیب رکھ کے کھڑی ہوجا۔ یہ گولی سے سیب کے دو ٹکڑے کرے گا۔ گولی سر میں لگ جائے تو مائنڈ مت کرنا۔''

ریشماں نے ایک چیخ ماری''نہ جی ناں......اسے تو موقع مل جائے گا' یہ پہلے مجھے قتل کرے گا پھر سیب کھائے گا مزے سے۔''

میں نے کہا''غنی! آج میں کام سے شہر جا رہا ہوں۔تم دو دن یہاں ہو تو ذرا خیال رکھنا۔تمہارے علاوہ کبیر خان ہوگا۔ جو لوگ حویلی میں ہیں' ان کی حفاظت تمہاری ذمے داری ہے۔ یہی ڈیوٹی ہوگی تمہاری فی الحال۔کاسو اور اس کی بیوی کا خاص خیال رکھنا۔''

''جیسا آپ کا حکم مالک!''وہ بولا۔

غنی کم گو اور کم آمیز تھا۔اس شرمیلے اور کسی حد تک بے وقوف نظر آنے والے شخص کو دیکھ کر یہ اندازہ نہیں کیا جاسکتا تھا کہ اس کا ارادہ اور کردار بھی اس کے جسم کی طرح مضبوط ہے۔ بظاہر ایسا نظر آتا تھا کہ جو کچھ اس سے کہا جا رہا ہے وہ سمجھ ہی نہیں رہا ہے لیکن اس کا دماغ خاموشی سے مفہوم کو محفوظ کرتا جاتا تھا۔

جب ریشماں اپنے فرماںبردار مالک جسم و جاں کو لے گئی تو ریشم کی ماں جو صورت حالات سے بے خبر نہ تھی' فریادی بن کے آگئی''آپ دیکھ رہے ہیں مالک' میری بیٹی کیا کررہی ہے۔اس کے باپ کو پتا چلا تو......''

میں نے کہا''دیکھو فاطمہ! باپ کی بات چھوڑو۔تمہیں کیا اعتراض ہے غنی کو اپنا داماد بنانے پر۔ سگا نہ سہی' تمہارا بھتیجا ہے۔''

وہ بے وقوف نہیں تھی کہ نظر کا اشارہ نہ سمجھتی۔میرے لہجے سے اس نے جان لیا کہ میری مرضی کیا ہے''بات یہ ہے مالک......اس کی ماں کوئی شریف عورت نہیں تھی' سب جانتے ہیں۔''

میں نے کہا''وہ شریف عورت نہیں تھی لیکن اس نے تمہارے دیور سے نکاح کے بعد شرافت کی زندگی اختیار کرلی تھی اگر اس کے بعد اس کا کردار ویسا ہی رہا جیسا کسی بھی وفادار بیوی کا ہوتا ہے تو تمہیں اس کے ماضی کے حوالے سے بات نہیں کرنا چاہیے۔''

فریال نے کہا''غنی ایک ذمے دار نوجوان ہے اور تمہاری بیٹی کو خوش رکھ سکتا ہے۔ وہ کسی اور کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی۔''

میں نے کہا''اس کے علاوہ......اب غنی کو میں نے کبیر خان کے ساتھ اس حویلی کی حفاظت کی ذمے داری سونپ دی ہے۔''

میرے پاس آنے سے پہلے بھی غنی کے لیے فاطمہ کے جذبات میں عداوت نہیں تھی۔یہ ریشماں جیسی خودسر بے باک

اور چالاک لڑکی کے سامنے ہتھیار ڈال دینے کی مجبوری تھی یا عدم تحفظ کا احساس کہ وہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھی۔ اسے اپنے شوہر کا ڈر تھا۔ یہ ڈر تھا کہ غنی اس کی بیٹی کی عزت سے کھیل کر اور اس کھیل کو تماشا بنا کے نہ نکل جائے اور ریشماں جس نے دنیا دیکھی ہی نہیں تھی' جذبات کی رو میں اس کے ساتھ نہ نکل جائے اور اس کا انجام وہی نہ ہو جو گھر سے بھاگنے والی بے وقوف لڑکیوں کا ہوتا ہے۔

میری بات سن کے اس کے چہرے پر اطمینان اور اعتماد کی رونق آ گئی۔ اس کا خوف دور ہو گیا کیونکہ اب ایک طرح سے میں نے غنی کی ذمے داری سنبھال لی تھی۔ اس نے سر جھکا کے آہستہ سے کہا ''جیسی آپ کی مرضی' مالک!'' اور واپس کچن کی طرف لوٹ گئی۔

میں سرونٹ کوارٹر کی طرف کاسو کو دیکھنے گیا۔ وہ ایک چارپائی پر سیدھا پڑا چھت کو گھور رہا تھا۔ اس کی بیوی فرش پر لیٹ کر بچے کو دودھ پلا رہی تھی اور سلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ انہیں اسی قطار میں ایک کمرا دے دیا گیا تھا جو خستہ حال ہونے کی وجہ سے کسی کے استعمال میں نہ تھا۔

مجھے دیکھتے ہی وہ اٹھ بیٹھا۔ میں نے اسے لیٹے رہنے کے لیے کہا مگر وہ نہ مانا اور مجھے چارپائی پر بٹھا کے خود میرے پیروں کے قریب فرش پر بیٹھ گیا۔

میں نے کہا ''کیسے ہو کاسو!''

وہ ہاتھ جوڑ کے بولا ''آپ کی مہربانی سے زندہ ہوں جی ورنہ اس وقت تو وہ مجھے گاڑ چکے ہوتے۔''

میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا ''دیکھو کاسو! اب تم رانا رجب علی کی حویلی میں نہیں ہو۔ اب تم غلام بھی نہیں ہو۔ یہاں کے طور طریقے کچھ اور ہیں۔ یہاں تم کسی سے کمتر نہیں ہو۔ ہم سب کے برابر ہو۔ تمہاری بھی اتنی ہی عزت ہے جتنی باقی سب کی۔''

کاسو رونے لگا ''ہم ایسا کیسے سمجھ سکتے ہیں نواب صاحب!''

میں نے کہا ''کیوں نہیں سمجھ سکتے۔ اس لیے کہ جب سے تم نے ہوش سنبھالا تم نے اپنے ساتھ ہونے والا جانوروں سے بدتر سلوک دیکھا؟ لیکن کیا تم نے دوسرے انسانوں کو نہیں دیکھا جو تمہارے آس پاس تھے؟ جو اپنی مرضی سے اپنی زندگی جیتے ہیں۔''

''یہ سب نصیب کی بات ہے جناب!''

اس سے بحث کرنا اور اسے انسانوں کی مساوات کا اسلامی اور عالمی فلسفہ سمجھانا مشکل تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ بات خود ہی اس کی سمجھ میں آنے لگی۔ کاسو کو بہت مارا پیٹا گیا تھا۔ ذلت اٹھاتے اور تشدد برداشت کرتے اس نے اپنی زندگی گزاری تھی چنانچہ اس کو اپنی حالت کے خراب ہونے کا اتنا زیادہ احساس بھی نہ تھا۔ اس کی بیوی کی صحت بھی افسوس ناک حد تک خراب تھی اور ماں کی صحت سے بچے کا متاثر ہونا فطری بات تھی۔ انہیں علاج اور اچھی خوراک کی ضرورت تھی۔

میں نے فاطمہ سے کہا کہ وہ کاسو کی خوراک کا خاص خیال رکھے اور اس کی بیوی بچے کا بھی۔ جب میں واپس آنے لگا تو اس کا دیوانہ دیور جو دیوار سے ٹیک لگائے سو رہا تھا' ایک دم نعرۂ مستانہ لگا کے اٹھا۔ اس نے معمول کے مطابق گیردے رنگ کا چغہ پہن رکھا تھا۔ اس کے سر اور داڑھی مونچھوں کے بال بے ترتیب ہو رہے تھے۔

اس کے ایک ہاتھ میں وہی چھ فٹ لمبا اور اس کی بند مٹھی سے موٹا لکڑی کا ڈنڈا تھا جس پر رنگین ربن لپٹے ہوئے تھے اور اوپر نیچے گھنگھرو بندھے ہوئے تھے۔

''رک جا......'' اس نے گرج کے کہا ''اسی جگہ رک جا۔ دیکھ' بس یہی ہے تیری زمین' دیکھ......''

میں رک گیا۔ مجھے اس سے خطرہ کوئی نہیں تھا اگر میں اس کی بات نہ مانتا تو شاید وہ ایسے ہی دہاڑتا رہتا اور میرے پیچھے آتا۔ اس نے نیچے جھک کر اپنی انگلی سے میرے چاروں طرف زمین پر ایک لکیر بنائی۔ اس ٹیڑھے میڑھے دائرے کا قطر شاید چھ فٹ تھا۔

برآمدے میں اب عورتیں بچے کچھ خوف اور کچھ حیرانی سے یہ تماشا دیکھنے کھڑے ہو گئے تھے۔ ان میں اس مجذوب اصغر کی بیوی کے علاوہ جانو بابا کی بوڑھی بیوہ تھی۔ کبیر خان کے بچے تھے اور ریشماں تھی۔ اس کی ماں نے بھی اپنے وجود کو روکنے کی کوشش کی اور پھر کسی بچے کو بھیجا کہ وہ کبیر خان کو بلا لائے۔ وہ فرخ کے ساتھ حویلی کے باہر والے کمروں میں مصروف تھا۔

دائرہ مکمل کرنے کے بعد اس نے میرے چاروں طرف گھوم کے ناچنا شروع کر دیا۔ وہ گول گول بھی گھوم رہا تھا اور دائرے کی لکیر پر بھی حرکت کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ کا بھاری بھرکم ڈنڈا تال دینے کے انداز میں زمین پر ایک تواتر کے ساتھ لگ رہا تھا۔ وہ بہ آواز بلند اپنی بے سری پھٹی ہوئی آواز میں گا رہا تھا یا نعرے لگا رہا تھا ''رب راکھا...... رب راکھا...... رب راکھا'' اس پر مستی کا عالم تھا۔ وہ سر کو دائیں بائیں جھٹکتا جا رہا تھا ''رب...... را...... کھا......'' ہر لفظ کے

ساتھ گھنگھرو بولتے تھے۔ چھم' چھم' چھم۔ ڈنڈا زمین پر تال دیتا تھا دھم' دھم' دھم۔ اس پر وجد کا عالم طاری تھا اور میں بے خود اور مسحور سا کھڑا تھا۔

ایسے مست ملنگ میں نے بہت دیکھے تھے اور ان کا والہانہ انداز بھی دیکھا تھا جس میں وہ اپنے آپ سے بے خبر ہو کے ''رقصِ درویش'' کرتے تھے تو لوگ بڑی عقیدت سے حلقہ بنا لیتے تھے۔ یہاں میں واضح کر دوں کہ رقصِ درویش ترکی میں مولانا جلال الدین رومیؒ کے مزار پر پیش کیا جانے والا مخصوص رقص ہے جسے ساری دنیا کے سیاح اسی طرح دیکھنے آتے ہیں جیسے بکنگھم پیلس پر گارڈز کی تبدیلی کی تقریب دیکھنے والے۔

مقامی ملنگوں کے رقص میں جذب یا الہامی خود وارفتگی کی کیفیت مجھے کبھی محسوس نہ ہوئی تھی۔ نہ میں کسی محفل سماع یا میلے اور عرس کے کسی الہامی رقص سے متاثر ہوا تھا لیکن یہاں میری حالت ہی عجیب ہو گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے اس مجذوب کے ساتھ میرے گرد و پیش کی ہر چیز حرکت کرنے لگی ہے۔ یہ کائنات گھومنے لگی ہے۔ فضا اس کے نعروں سے گونج رہی ہے۔ زمین' آسمان کے درمیان ہر چیز رب راکھا' رب راکھا کی گردان کر رہی ہے۔

یہ عجیب روحانی تجربہ تھا۔ میں اس کی وجدانی کیفیت کو بیان نہیں کر سکتا۔ جو اللہ ہو کا ورد کرتے ہیں' وہ بھی بے خودی میں خود سے غافل ہو جاتے ہیں۔ میرے دل کی دھڑکن نے بھی جیسے لے بدل لی تھی۔ دھک دھک کرنے والا دل اب دھک دھکا دھک کر رہا تھا۔ جیسے رب راکھا' رب راکھا' رب راکھا کی تال پر ناچ رہا ہو۔ عقل کی حد تک ان دو الفاظ کی ہمہ گیری سے کس کو انکار ہو سکتا ہے مگر یہ معاملہ عشق کا بن گیا تھا۔

مجھے نہیں معلوم کہ ایسا کیوں ہوا لیکن جب ہوش آیا تو مجھے پتا چلا کہ اس دائرے کے وسط میں خود میں بھی گھوم رہا تھا۔ رقص کر رہا تھا اور رب راکھا کی گردان میں مصروف تھا اور میرے سامنے والے برآمدے میں کھڑے میرے ملازم بھی مجھے اتنی ہی عجیب نظروں سے دیکھ رہے تھے جتنی حیرت سے حویلی کے برآمدے سے راجا' فریال' فرخ' فاطمہ اور کبیر خان۔

پھر جیسے ایک دھماکے سے کائنات بکھر گئی۔ ایک ہولناک چیخ سنائی دی اور رقص تھم گیا۔ ساری آوازیں تھم گئیں۔ میں نے اس دیوانے مجذوب اصغر کو فرش خاک پر گرا ہوا دیکھا۔ سرخ تازہ لہو اس کے سینے سے ابل رہا تھا اور اس کے گیروا چغے کو لال کرتا جا رہا تھا۔ زمین پر بہہ رہا تھا۔ اس کے چھینٹے مجھ تک بھی پہنچے تھے۔

مجھے صورت حال کو سمجھنے میں چند سیکنڈ ہی لگے ہوں گے۔ اصغر کو کسی نے لانگ رینج رائفل سے گولی ماردی تھی۔ برآمدے میں کھڑے ہوئے لوگ ایک ساتھ آگے آئے۔ اس وقت تک میں گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا تھا۔ میں نے کہا ''اصغر...... اصغر...... یہ کیا ہوا؟''

وہ تکلیف کے باوجود مسکرایا اور اس نے ایک انگلی اوپر آسمان کی طرف اٹھا کے کہا ''رب راضی۔ سب راضی'' اور ساکت ہو گیا۔ حویلی کی طرف سے فریال بھاگی آ رہی تھی۔ اس پر جنون کی کیفیت طاری تھی۔ وہ چیخ رہی تھی۔ ''رومیو، رومیو! تم ٹھیک ہوناں......'' میرے قریب آ کے وہ رک گئی اور دہشت بھری نظروں سے اس شخص کی بے حس و حرکت لاش کو دیکھنے لگی جو کچھ دیر پہلے کسی بگولے کی طرح رقص میں تھا۔

میں نے راجا اور فرخ کو بھی دیکھا جو صورتِ حال کو سمجھنے کے بعد میری طرف آنے کے بجائے مخالف سمت میں ریوالور نکال کے بھاگے تھے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ فائر باہر سے کیا گیا تھا اور نشانہ میں تھا لیکن نہ جانے کیوں اور کیسے ایک مجذوب کے رقص نے میرے گرد کسی الہامی کیفیت میں ایک حفاظتی حصار بنا دیا تھا۔

کیا وہ پہلے سے جان گیا تھا؟ کیا اچانک اس پر الہام ہوا تھا؟ آخر کشف کا یہ لمحہ اس پر کیوں اترا؟ وہ کوئی پہنچا ہوا بزرگ نہیں تھا۔ اللہ کا کوئی مقرب بندہ نہ تھا۔ میرے جیسا گنہگار ہی تھا جو دیوانہ کہلاتا تھا اگر یہ میری زندگی کا معاملہ تھا تو انکشاف مجھ پر کیوں نہ ہوا؟ خبر اسے کیوں دی گئی۔ میں نہیں مان سکتا کہ وہ مجھ پر قربان ہوا۔ ثابت یہ ہوا کہ جس کی آتی ہے' وہی جاتا ہے۔ جس کا رب راکھا اس کا بال بیکا نہیں ہو سکتا۔ بعد میں جب میرا وقت پورا ہوگا تو گولی کسی اور کے سینے میں داخل نہیں ہوگی۔ گولی غلطی نہیں کرتی کیونکہ فرشتۂ اجل سے غلطی ممکن نہیں۔

بعد میں جب اس دیوانے کی لاش اٹھالی گئی۔ فریال مجھے کھینچ کے واپس لے گئی۔ فرخ اور راجا ناکام لوٹ آئے اور عقل و ہوش نے پھر اختیار حاصل کیا تو سوالات کا سلسلہ شروع ہوا۔ کچھ میں نے اپنے آپ سے پوچھے' کچھ فریال نے اور میرے دوستوں نے اور باقی پولیس نے۔

فریال نے کہا ''یہ تمہیں کیا ہو گیا تھا؟''

میں نے کہا ''پتا نہیں لیکن مجھے کچھ نہیں ہوا۔''

''تم اس دیوانے کے ساتھ رقص کیوں کرنے لگے

تھے؟"

میں نے کہا "مجھے نہیں معلوم' کیا میں رقص کر رہا تھا؟"

"سب دیکھ رہے تھے کہ نواب صاحب کو کیا ہو گیا ہے؟"

میں نے کہا "سب نے یہ بھی دیکھ کہ نواب صاحب کو کچھ نہیں ہوا۔"

راجا نے افسوس سے کہا "وہ زندہ رہا جس کے لیے ایک فرعون نے طے کر رکھا تھا کہ اس کو آج مرنا ہوگا۔"

میں نے کہا "ہاں' کاسو زندہ رہا۔ حالانکہ نشانہ اسی کو بنایا گیا تھا۔ وہ ہمارے پیچھے برآمدے میں موجود تھا۔ بالکل سامنے آ گیا تھا۔"

فرخ نے کہا "وہ دیوانہ اس گولی کا راستہ روکتا تو نشانہ خطا نہ ہوتا۔"

"نشانہ کیسے خطا نہ ہوتا۔" میں نے کہا "پھر تو ثابت ہو جاتا کہ زندگی اور موت پر...... نعوذ باللہ' رانا کا اختیار ہے۔ وہ آج صبح کاسو کو زندہ دفن کرانا چاہتا تھا۔ وہ جلادوں کے قبضے سے نکل آیا تو رانا نے شکاری بھیجے کہ جاؤ' اس کی موت کے لیے جو وقت مقرر کیا گیا تھا اسی وقت پر اسے وہیں گولی مار دو جہاں وہ پناہ لینے گیا ہے۔"

فرخ بولا "کیا ہم پولیس کے سامنے بھی یہی بیان دیں گے؟"

راجا نے تلخی سے کہا "نہیں، یہ نامعلوم حملہ آوروں کا کام تھا۔ نشانہ ہم نہیں تھے' کاسو بھی نہیں تھا۔ معلوم نہیں اس دیوانے سے کسی کو کیا دشمنی تھی۔ پولیس ایسے بیان خود لکھ لیتی ہے۔ اس میں ان کے لیے آسانی ہے۔"

میں نے کہا "یہ بات نہیں' پولیس اس کے قتل کو اس کی داستان ماضی سے جوڑ دے گی۔ پولیس کو چوہدریوں سے کچھ پیسا مل جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی سیہ کاری کی داستان اور یہ ایف آئی آر بھی دفن ہو جائے گی۔"

راجا نے کہا "نیکے پتر۔ میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ تو نکل جا فورا......"

میں نے کہا "کیسے نکل جاؤں...... ابھی قانونی کارروائی باقی ہے۔"

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔ قانونی کارروائی شروع ہونے سے پہلے تو جا۔"

"اور یہاں کے معاملات......؟"

"ہم سنبھال لیں گے یار! تیرا نام کسی کی زبان پر نہیں آنا چاہیے۔ نہ تو یہاں تھا' نہ فریال تھی۔"

میں نے کہا "تیری بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آ رہی ہے لیکن مرنے والی کی بیوی ہے...... اور بچے ہیں۔"

"انہیں میں سنبھالوں گا' پریشانی سے بچنا ہے تو مختصر بیان دیں۔ معلوم نہیں کس نے گولی چلائی' کسی نے کچھ نہیں دیکھا۔ سب اندر تھے' باہر کوئی بھی نہیں تھا۔"

"اور اگر وہ نہ مانے...... پھر......؟"

راجا نے کہا "دیکھ' پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ تیری رعایا ہیں۔ ان کی مجال نہیں کہ تیرے خلاف بیان دیں۔ دیں گے تو خود مشکل میں پڑیں گے۔ باقی تیری ہی جائے گی اگر ہم کہیں گے کہ نواب صاحب یہاں نہیں تھے تو بس نہیں تھے۔ دوسری بات یہ کہ ابھی کچھ دن پہلے جالو بابا کا قتل ہوا تھا۔ اس وقت ان لوگوں نے اصرار کیا تھا کہ پوسٹ مارٹم نہیں ہونا چاہیے۔ اب ضرورت محسوس ہوئی تو میں ان کو دھمکی دوں گا کہ اگر کسی نے بیان بدلا تو ہم اکبر خان پر شک ظاہر کر دیں گے اور اصرار کریں گے کہ پہلے کیس کی تفتیش بھی کی جائے۔"

"راجا! یہ غلط ہوگا۔"

"غلط اور صحیح کے چکر میں مت پڑو۔ اگر تو نے سچ بولا تو پھر رانا بھی ملوث ہوگا۔ کاسو کا معاملہ آئے گا۔ ابھی تک فریال کی موجودگی کا ثبوت کوئی نہیں۔ اس کا نام گواہوں میں آ گیا تو مشکل ہو جائے گی۔ تجھے آج ویسے بھی جانا تھا۔ تو فورا چلا جا فریال کو لے کر اور جب تک ہم کلیرنس نہ دیں' لوٹ کے مت آنا۔"

میں نے کہا "پولیس سے تو نمٹ لے گا؟"

"کیا لکھ کے دوں یار! اور دیکھ...... اباجی سے کچھ بھی مت ڈسکس کرنا۔"

میں نے کہا "یار' اب میں اتنا بھی اناڑی نہیں ہوں۔"

صرف آدھے گھنٹے بعد میں اور فریال گاڑی میں شہر کی جانب رواں تھے۔ فریال متفکر اور خاموش تھی۔ وہ لندن سے بھاگ کے آئی تھی اور شاید اس نے خود کو ست بدھائی کے دور افتادہ علاقے میں خود کو بہت محفوظ تصور کیا ہوگا۔ اس گوشۂ عافیت میں اس کے لیے ایک ہی خطرے کا تصور تھا۔ کہیں اپنی انا پر اس کو قربان کرنے والا اس کا منگیتر یہاں تک اس کا تعاقب کرتا ہوا نہ آ جائے۔ اس خطرے کے احساس میں بھی سکون دینے والا خیال تھا کہ یہاں وہ اکیلی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ میں ہوں۔

لیکن ست بدھائی میں پیش آنے والے واقعات نے اسے احساس دلایا تھا کہ یہاں بھی خطرات ہیں گو ان کی نوعیت مختلف ہے۔ اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔

وہ گھبرانے اور خوف زدہ ہونے والی لڑکی نہیں تھی لیکن میری پریشانی سے وہ الگ نہیں رہ سکتی تھی۔

آدھے گھنٹے بعد کار اس صاف سڑک پر آ گئی جو الٹے ہاتھ پر رہتا اس سے گزر کے جی ٹی روڈ تک جاتی تھی۔

میں نے کہا "فریال! تم اپ سیٹ ہو؟"

اس نے پلٹ کے کہا "تم نہیں ہو؟"

"مجھے تو اندازہ تھا یہاں کے مسائل کا۔"

"مجھے اب ہو گیا ہے لیکن رومیو! کیا یہ معاملات ایسے ہی چلیں گے...... میرا مطلب ہے' یہ خون خرابا...... لاقانونیت......؟"

میں نے کہا "تم نے وہ گانا سنا ہے' زندگی ہر قدم ایک نئی جنگ ہے۔ جنگ میں کمزور فریق مارا جاتا ہے۔ ابھی مجھے ثابت کرنا ہے کہ میں کمزور نہیں ہوں۔ لاقانونیت یہاں کا کلچر ہے۔ پہلے بھی تھا لیکن اب بہت زیادہ ہے۔ اس ماحول میں بقا-یعنی SURVIVAL ایک آرٹ نہیں' مارشل آرٹ کی طرح ہے۔ ٹیک اٹ ایزی' کچھ دن میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"تم کہتے ہو تو میں مان لیتی ہوں۔" وہ مسکرائی اور اس نے اپنا سر میرے کندھے پر رکھ دیا۔

میں نے کہا "یہ کیا فحاشی ہے۔ ہم لندن میں نہیں پاکستان میں ہیں خاتون! سیدھی بیٹھو۔"

"عشق تو وہی ہے یہاں ہو یا وہاں۔ اظہار عشق میں تم وہاں بھی اناڑی تھے' یہاں بھی ہو۔" اس نے میرے گال کو چوما۔

"فری...... ایکسی ڈنٹ ہو جائے گا' تنگ مت کرو۔"

"اوکے، جسٹ کس می جسٹ ONCE۔ میری اسپرٹ بہت ڈاؤن ہے۔ مجھے کچھ STIMULANT کی ضرورت ہے۔"

مجبوراً گاڑی روک کے میں نے اس کی خواہش پوری کی۔ باقی راستے وہ آرام سے بیٹھی رہی۔ ہم نے راستے میں دینہ پر گاڑی روک کے وہ مچھلی کھائی جو منگلا ڈیم سے لائی جاتی تھی پھر دو گھنٹے بعد گوجرانوالہ کے قریب چائے پی اور ایک گھنٹے بعد لاہور پہنچے تو شام ہو رہی تھی۔

میں نے کہا "ابھی کہاں جاؤ گی تم؟"

"کہیں نہیں۔ میں تمہارے ساتھ ہوں' جہاں تم وہاں میں۔ آخر میرا سسرال بھی ہے یہاں۔" وہ ہنسی۔

"سسرال جانے کا ویزا نہیں ملا ہے تمہیں ابھی۔"

"کیوں' اس گوری حسینہ کے لیے تو تیاری کر لی تھی تم نے۔"

میں نے کہا "اس کی اور بات ہے۔ دراصل ہمارے گھر میں نسلی تعصب بہت ہے۔ گورے آج بھی حاکم ہیں۔ پہلے سے زیادہ سر پر بٹھائے جاتے ہیں۔ دیسی مال کی قدر کوئی نہیں۔"

"اب کالے حقوق کی جنگ کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور جیت انہی کی ہوگی نواب صاحب قبلہ!"

میں نے کہا "سیریس ہو جاؤ۔ تمہارا اس طرح وہاں رہنا ہرگز خطرے سے خالی نہیں۔ سلطان کے لیے تم ایک اوپن ٹارگٹ ہو۔ وہ سیدھا وہاں پہنچے گا۔"

"اور مجھے تم سے چھین کے لے جائے گا' تم دیکھتے رہو گے۔"

"نہیں نہیں ایسا کرتا ہوں دروازے پر توپ لگا کے بیٹھ جاتا ہوں۔ جیسے ہی رقیب روسیاہ نظر آیا' دھائیں سے گولا داغ دیا۔ اور اس کے بعد راجا' رانی ہنسی خوشی ساتھ رہنے لگے۔"

"اچھا تم بتاؤ' میں کہاں جاؤں؟" وہ منہ پھلا کے بولی۔

میں نے کہا "عقل کی بات ٹھنڈے دماغ سے سنو۔ ابھی میں تم کو چھوڑوں گا شہناز کے پاس۔ وہ بھی چند روز میں ست بدھائی کی طرف ہجرت کرے گی۔ وہ اس علاقے میں ایک کلینک کھولنے پر آمادہ ہے جو بڑی اچھی بات ہے۔ تم اس کے ساتھ آؤ گی لیکن اس حلیے میں نہیں' تمہارے لیے ایک مردانہ گیٹ اپ سب سے موثر صورت ہے بچاؤ کی۔"

"ارے واہ۔ کیا آئیڈیا ہے۔ یہ کس کا آئیڈیا ہے؟"

"ظاہر ہے ایسا اعلیٰ دماغ آپ کے اس ناچیز پرستار کے سوا کس کے پاس ہے؟" میں نے کہا "یہ بالکل سلیمانی ٹوپی جیسی بات ہوگی کہ تم سب کو دیکھو گی مگر کوئی دشمن تمہیں نہ دیکھ پائے گا' وہ سالا......"

"سالا نہیں...... رقیب!" فریال نے تصحیح کی "میں اس کی بہن نہیں ہوں۔"

"رائٹ! وہ یہاں جاسوس چھوڑ دے۔ کیمرے لگا دے۔ رپورٹ اسے یہی ملے گی کہ فریال جیسی کوئی چیز نہیں ہے یہاں۔"

"فریال جیسی کوئی چیز اس جہاں میں نہیں نیکے پتر!"

"دیکھو مجھے کسی سے پوچھنا پڑے گا کہ تم نے مجھے نیکے پتر کے نام سے پکارا تو اب کہیں میں محرم تو نہیں ہو گیا تمہارے لیے......"

''اب تم دیکھنا میرا کمال۔ ڈاکٹر شہناز میری مشیر ومعاون خصوصی ہوگی۔ میک اپ' پلاسٹک سرجری اور اپنی عقل سے میں کیسے جنس بدلتی ہوں۔ اگر تم بھی دھوکا نہ کھا جاؤ تو کہنا...... لیکن یار! ایک بات تو بتاؤ' اس نومولود کا نام کیا ہوگا؟''

میں نے ایک مشہور فلمی ڈائلاگ کی نقل کرتے ہوئے گرج کے کہا ''کیسا نومولود' کس کا ہے یہ نومولود...... کہاں سے آیا ہے یہ نومولود!''

''میرا نیا جنم ہوگا بحیثیت مرد تو مجھے نومولود ہی کہا جائے گا۔ پہلے تو پاٹے خاں' طرم خاں اور تیس مار خاں جیسے نام مقبول تھے۔''

میں نے کہا ''آج کل کے حساب سے فریال گجر' شریف بدمعاش۔''

میں نے فریال کو ڈاکٹر شہناز کے گھر پر اتارا۔ شہناز مصر تھی کہ میں کم سے کم ایک کپ چائے نوش فرماؤں مگر میں نے کہا کہ مجھے پہلے اپنے وکیل سے ملنا چاہیے' صبح وہ کورٹ میں ہوتا ہے۔

فاروقی کی خوبصورت سیکریٹری مجھے دیکھ کے مسکرائی ''آپ کچھ دیر ہمارے پاس بھی تو بیٹھیے نواب صاحب!''

میں نے اسے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے رومانٹک لہجے میں کہا ''کتنا پاس' یہ بھی بتادو؟''

وہ بڑی ادا سے بل کھا کے اٹھی ''اندر ایک کلائنٹ ہے اور آج انٹرکام خراب ہے۔ میں خود بتادیتی ہوں۔''

حسب معمول اس نے اپنے بدن کے سارے گداز کو نمایاں کرنے والی آتشیں گلابی ساری باندھ رکھی تھی۔ جس کا بلاؤز' ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے کی عملی تفسیر تھا چنانچہ کچھ دیر اس کے سراپا کا منظر دیکھنا کسی انتظار کرنے والے کے لیے دلچسپ ہی ہوتا تھا لیکن اندر والا کلائنٹ چند منٹ میں ہی باہر آ گیا تو میں نے ایک حسرت بھری آہ کے ساتھ کہا ''اچھا۔ اب تو جانا ہی پڑے گا۔''

فاروقی نے عادت کے مطابق نعرہ لگا کے میرا استقبال کیا ''اجی آئیے آئیے نواب صاحب! آپ کو تخت نشینی مبارک۔'' اس نے پرجوش انداز میں گلے ملتے ہوئے کہا ''کہیے کچھ حرم وغیرہ آباد کیا یا نہیں؟ سب سے پہلے تو یہی کام ہونا چاہیے۔''

میں نے کہا ''آپ کی دعا سے کچھ لوکل اور امپورٹیڈ کنیزیں فراہم کرنے کا وسیلہ بن گیا ہے۔ چندے میں آپ بھی ایک تو دے ہی سکتے ہیں۔''

وہ میرا مطلب سمجھ کے پھر ہنسا ''کیوں نہیں' کیوں نہیں۔ ایک گھر میں ہے' وہ بھی حاضر ہے' کار خیر کے لیے۔ خیر' اب پہلے فرمائیں کیا چلے گا؟''

میں نے کہا ''کافی ہی کافی ہوگی۔ اگر وہ نظر ملا کے پلائے۔''

اس نے دروازے سے جھانک کے کہا ''بھئی ایک اور پیاسا آ گیا ہے' جسے شراب سے نشہ نہیں ہوتا۔ تمہارے دست نازک سے کافی پی کے مرنا چاہتا ہے تم پر۔''

میں نے کہا ''یا زدہ برامان جائے گی۔ ایسی بھی کیا بے تکلفی!''

''بھیا' وہ ہمیں جانتی بھی ہے اور پہچانتی بھی ہے۔ تم کو فکر میں دبلا ہونے کی ضرورت نہیں ہماری طرح۔'' اپنی بات پر وہ پھر قہقہہ مار کے ہنسا تو اس کے پہاڑ جیسے بدن میں زلزلہ آ گیا۔

کچھ دیر رسمی باتوں کے بعد جب میں نے سیریس بات کا آغاز کیا تو ایک کلائنٹ نمودار ہو گیا۔ اس نے اسے عجلت میں نمٹایا پھر بھی مجھے آدھا گھنٹا اس کی سیکریٹری کے ساتھ دل پشوری میں گزارنا پڑا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ محض خوش ادا ہی نہیں خوش ذوق بھی ہے۔ وہ بھی ست بدھائی کی الف لیلوی کہانی سے بے حد مسحور تھی۔ میں نے اسے دعوت دی کہ وہ فاروقی کے ساتھ وہاں آ کے دیکھے۔

جب دوسرا کلائنٹ نمودار ہوا تو مجھے فکر لاحق ہونے لگی۔ آثار یہ تھے کہ مجھے فاروقی سے فرصت سے بات کرنے کے لیے طویل انتظار کرنا پڑے گا۔ میری مشکل اس وقت آسان ہوئی جب دوسرے کلائنٹ کے رخصت ہوتے ہی وہ بریف کیس لیے باہر آ گیا۔

''اٹھو یار! نکلو یہاں سے...... یہاں تو یہی سلسلہ چلتا رہے گا رات بھر۔ چلو ہم بھاگ چلیں۔'' یہ بات اس نے مجھ سے کہی مگر روئے سخن اپنی سیکریٹری کی طرف رکھا۔

وہ مسکرائی ''بھاگنا تو مشکل ہوگا آپ کے لیے سر!''

اس نے ایک آہ بھری ''اسی لیے تو آج تک یہ بات تم سے چھپائی۔ میں اور نواب صاحب جارہے ہیں کہیں دور۔ جتھے بندہ نہ بندے دی ذات ہووے۔ تم تو اب جھوٹ بولنے کی ماہر ہو گئی ہو۔ جو چاہو کہہ دینا' بیوی پوچھے تو سچ بول دینا کہ کسی کے ساتھ بھاگ گئے ہیں۔''

ہم ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے ریسٹورنٹ میں جا بیٹھے۔ اس نے پھر کافی طلب کر لی۔ اپنی تواضع کا سامان وہ جیب میں لیے پھرتا تھا۔ اس نے ایک چھوٹی سی چپٹی سی بوتل کوٹ

کی جیب سے نکالی اور دو گھونٹ پی کے رکھ لی۔

میں نے کہا ''فاروقی! ایک مسئلہ ہے جس نے مجھے پریشان کر رکھا ہے۔ یہ بتاؤ کہ میری زمین پر اگر کہیں کسی کا ناجائز قبضہ تھا تو تم نے اس بارے میں مجھے کیوں نہیں بتایا؟''

وہ حیرانی سے بولا ''ایسی تو کوئی بات نہیں۔''

''بات کیسے نہیں۔ حویلی سے آدھے کلومیٹر کے فاصلے پر وہ عمارت کس کی ہے' جس پر لکھا ہوا ہے ''علاقۂ ممنوعہ'' جی ایچ کیو سے زیادہ سخت حفاظتی انتظامات ہیں۔ وہاں میں بھی داخل نہیں ہو سکا۔''

''یہ تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟ وہاں ایک ریسرچ اسٹیشن قائم کرنے کی اجازت ضرور دی گئی تھی......''

''کس قسم کا ریسرچ اسٹیشن۔ کوئی دفاعی نوعیت کے ہتھیار وغیرہ ڈیولپ کرنے کے لیے یا ایٹمی توانائی کا......''

وہ ہنسنے لگا ''ایگری کلچر اور ماحولیات کی ریسرچ ہوتی ہے وہاں۔ صحیح نوعیت کا مجھے علم نہیں۔''

میں نے کہا ''کس نے دی تھی یہ اجازت؟''

''انہی مرحوم نے' جنہوں نے تمہیں اپنا وارث مقرر کیا تھا۔''

میں نے کہا ''یہ کب کی بات ہے؟''

''جب وہ آخری بار آئے تھے' کئی سال پہلے...... تو ان کے کسی دوست نے کہا تھا کہ پاکستان میں کوئی ریسرچ اسکالر ہیں' نام اس وقت مجھے یاد نہیں' ان کو تعاون کی ضرورت ہے۔ جب وہ طفیل احمد مرحوم سے ملے' میرا مطلب ہے...... وہ پاکستانی اسکالر' تو معلوم نہیں ان کے درمیان کیا بات ہوئی' مرحوم نے ان کو تعاون کے نام پر کتنا نقد دیا...... یہ جگہ انہیں دی گئی تھی۔''

''کیسے...... تحفے میں؟ کرائے پر یا لیز پر؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا ''وہ ایک طرح کا اجازت نامہ تھا...... اور کچھ نہیں۔''

''کتنے عرصے کے لیے؟''

''یہ طے نہیں تھا...... لیکن اس سے کسی طرح کا حق ملکیت ثابت نہیں ہوتا۔''

میں نے کہا ''اس کا مطلب یہ کہ میں چاہوں تو اس اجازت نامے کو منسوخ بھی کر سکتا ہوں۔ وہ جگہ خالی بھی کرا سکتا ہوں۔''

''اس میں کیا شک کی بات ہے۔''

اچانک میری نظر' کچھ فاصلے پر موجود ایک شخص کی طرف گئی تو مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ پہلے مجھے شبہ ہوا کہ وہ کوئی اور ہے۔ وہ بہترین سوٹ اور ٹائی میں تھا۔ لیکن اس درجہ مشابہت صرف ہمزاد بھائیوں کے علاوہ کہیں نظر نہیں آتی۔ پھر اس کے ساتھ جو ہستی موجود تھی اسے میں کیسے بھول سکتا تھا۔

میں نے فاروقی سے معذرت کی کہ میں ابھی آتا ہوں اور ٹیبل کی طرف بڑھا۔

مجھ سے چند ٹیبل کے فاصلے پر اکبر خان اس حسنِ مجسم نور جہاں کے ساتھ موجود تھا جسے وہ اپنی زوجۂ ثانی قرار دیتا تھا۔ درحقیقت ایسا تھا تو اسے اکبر خان کی خوش نصیبی یا کاتبِ تقدیر کی ستم ظریفی کے سوا کیا کہا جا سکتا تھا۔ پہلوئے حور میں لنگور خدا کی قدرت۔

نور جہاں کو دیکھ کے ہی مجھے یقین آیا کہ نہ وہ اکبر خان کا ہمزاد ہے نہ جڑواں بھائی اور نہ ہم شکل بلکہ خود اکبر خان ہے ورنہ اس کا ظاہری حلیہ اور بدلا ہوا روپ مجھے شک میں مبتلا کر دیتا۔

اکبر خان بہترین بلیو بلیک سوٹ میں تھا اور اس نے کریم کلر کی شرٹ پر سوٹ کے رنگ سے میچ کرنے والی پولکا ڈاٹ ٹائی بھی بہت نفاست سے باندھی تھی۔ مجھے اس کے ہاتھ پر جو گولڈن رسٹ واچ نظر آ رہی تھی' اس کے ڈائل پر ہندسوں کی جگہ نگینے تھے اور ان کی آب و تاب بتاتی تھی کہ وہ ہیرے ہوں گے۔ اکبر خان کے بال بھی سلیقے سے بنے ہوئے تھے اور وہ بڑے پُراعتماد انداز میں بیٹھا ہوا تھا۔

اکبر خان اکیلا نہیں تھا۔ اسی ٹیبل پر مجھے سیاحوں والے مخصوص بے ترتیب اور فضول لباس میں ایک گوری چمڑی والا جوڑا بھی نظر آ رہا تھا۔ وہ برطانوی' امریکی بھی ہو سکتے تھے اور جرمن یا اٹالین بھی۔ مرد کی عمر شاید چالیس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس کے سر پر گھنگھریالے بے ترتیب بالوں کا ڈھیر تھا۔ اس کی مشت بھر سے کچھ کم داڑھی کا سنہرا رنگ بالوں سے میچ کرتا تھا۔ جسم کے بالائی حصے پر اس نے ایک واسکٹ پہن رکھی تھی جو سامنے سے کھلی ہوئی تھی چنانچہ اس کا بالوں سے بھرا ہوا سینہ اور پیٹ دیکھے جا سکتے تھے۔ وہ دراز قد اور پُرگوشت ہونے کی وجہ سے دیوزاد لگتا تھا۔

جس فرنگی حسینہ کو اس نے ہمسفر بنایا تھا وہ ممکن ہے عمر میں اس سے پانچ چھ سال کم ہو لیکن اپنے ساتھی کے برعکس وہ حد درجہ مختصر تھی۔ اپنے پانچ فٹ سے کم قد اور دبلے پتلے سپاٹ جسم کے ساتھ اس نے بالوں کو بھی بوائز کٹ یا کم کرالیا تھا۔ وہ دو بالشت کی مختصر ترین ٹی شرٹ میں تھی اور کسی گڑیا کی

طرح بے حس وحرکت بیٹھی خلا میں دیکھ رہی تھی۔ اس کی صورت کے نقوش جاذبِ نظر تھے مگر اس نے شاید مہینے بھر سے منہ نہیں دھویا تھا۔

رہی نور جہاں تو وہ ناز و انداز حسن کی ساری جلوہ سامانی کے ساتھ مرکزِ نگاہ بنی ہوئی تھی۔ اس کا میک اپ' ہیئر اسٹائل' اسٹار پلس اسٹائل کے بلاؤز اور ساڑی والا لباس نظر کو بہکاتا تھا' اسیر کرتا تھا اور گناہگار بنا دیتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ حسن سے زیادہ اس کا بھرپور تناسب اور لہر در لہر بدن اس کا اثاثہ ہے چنانچہ اس کی نمائش وہ پورے اہتمام کے ساتھ اور غرور کے ساتھ کرتی تھی۔

سب سے پہلے اسی بتِ طناز نے مجھے دیکھا اور ذرا سی دیر کے لیے اس کی نظر میں حیرانی اتر آئی جو اس بات کی علامت تھی کہ اس نے مجھے شناخت کرلیا ہے۔ اس کے سرخ رسیلے ہونٹوں پر سجی چمکیلی مسکراہٹ کی چاندنی غائب ہوگئی اور اس کی سبز نشیلی آنکھوں نے مجھے فوکس کرنے کے بعد اکبر خان کو خبردار کرنے کا واضح اشارہ دیا لیکن اکبر خان نہ جانے کون سے کاروباری یا قانونی مسئلے پر فرنگی جن کے بچے سے بحث میں مگن تھا کہ وہ بے خبر رہا اور میں اچانک اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

میں نے دل ہی دل میں اکبر خان کو سراہا۔ مجھے دیکھ کے نہ وہ چونکا نہ ہراساں ہوا۔ اس نے قطعی لاتعلقی کے ساتھ کسی اجنبی کی طرح میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھتے ہوئے انتہائی پُرسکون رہا اور اس کا اعتماد ایک لمحے کے لیے بھی متزلزل نہیں ہوا۔

اس چند سیکنڈز کی خاموشی کو میں نے ہی توڑا کیونکہ ایک اجنبی کی طرح دخل اندازی میں نے ہی کی تھی "ہیلو اکبر خان!"

اس کا چہرہ سپاٹ رہا اور اس نے بڑی اچھی اداکاری کرتے ہوئے نور جہاں کی طرف بھی سوالیہ نظروں سے دیکھا کہ یہ کون ہے جو مجھے اکبر خان سمجھ رہا ہے پھر اس نے سر ہلایا "آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے' میں اکبر خان نہیں ہوں۔"

اس کی پُر وقار' متانت مجھے چکرا دیتی لیکن میں اتنی آسانی سے چکر میں آنے والا نہیں تھا کیونکہ شناسائی کا اعتراف میں نور جہاں کی صورت پر پہلے ہی نوٹ کر چکا تھا۔

میں نے کہا "اگر تم اکبر خان نہیں ہو تو کیا یہ بھی تمہاری دوسری بیوی نور جہاں نہیں ہے؟"

"یہ کیا بکواس ہے؟" اکبر خان نے برہمی سے کہا "کون ہو تم اور کیا مقصد ہے اس بدتمیزی کا؟"

ناگواری کے آثار اب نور جہاں کی صورت پر بھی نمودار ہوگئے تھے "دیکھیے' آپ شدید غلط فہمی کا شکار ہیں۔"

اکبر خان نے غصے سے کہا "غلط فہمی نہیں' یہ شخص ضرور نشے میں ہے۔ دیکھو' خیریت اسی میں ہے کہ یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ ہمیں ڈسٹرب مت کرو ورنہ میں ویٹر کو بلاتا ہوں۔"

گورے نے اکبر خان کو مخاطب کیا "ہو از ہی....؟"

گوری نے بھی اس کے ساتھ ہی پوچھا "واٹ ڈز ہی وانٹ ڈیئر؟"

میری پوزیشن ایک دم خراب ہوگئی۔ وہاں چلا کے اپنی بات منوانے یا اکبر خان کا گلا دبوچ کے یہ پوچھنے کی گنجائش ہی نہ تھی کہ سالے فراڈ' ایکٹر کی دو نمبر اولاد۔ میرے سامنے ڈراما کرتا ہے۔ اگر میں ایسا کرتا تو بڑی بے عزتی کے ساتھ وہاں سے نکالا جاتا۔ اکبر خان فوراً منیجر سے کہتا اور سکیورٹی والے مجھے اٹھا کے باہر پھینک دیتے۔

چنانچہ میں نے فوراً صورت حال کو سنبھال لیا۔ میں نے انتہائی عاجزی کے ساتھ اظہار ندامت کیا "آئی ایم رئیلی سوری۔ دراصل میرا ایک ملازم چوکیدار تھا' بڑا ڈرامے باز.....اس کی صورت آپ سے بہت ملتی ہے۔"

اگر وہ اکبر خان نہ ہوتا تو میری وضاحت سے مزید خفا ہوتا کہ کیا میں حلیے سے آپ کو چوکیدار لگتا ہوں۔ کیا میں ڈراما کر رہا ہوں؟ لیکن اس نے خاموشی میں عافیت جانی کہ بات زیادہ نہیں بڑھی۔ میں بھی اڑ جاتا کہ تم کیا سمجھتے ہو' مجھے بے وقوف بنا سکتے ہو؟ میں تمہیں اکبر خان ثابت کر کے چھوڑوں گا اگر وہ ہوٹل سکیورٹی اسٹاف کو بلاتا تو میں کہتا کہ ٹھہرو' میں پولیس کو بلاتا ہوں۔

لیکن میں نے ہنگامہ آرائی سے گریز کیا۔ فاروقی نے دور سے سب دیکھا تھا لیکن سنا کچھ نہیں تھا۔ اکبر خان سے میری مختصر گفتگو شرافت کے دائرے میں رہی تھی چنانچہ بالکل ساتھ والی ٹیبل پر بیٹھے ہوئے لوگوں نے ضرور سنی تھی لیکن اسے اہمیت نہیں دی تھی۔

فاروقی کی طرف دیکھے بغیر میں نے باہر کا رخ کیا۔ وہ سمجھا ہوگا کہ مجھے واش روم جانا ہے یا باہر سے فون کرنا ہے۔ وہ اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ اکبر خان نے سمجھا ہوگا کہ میں شرمندہ ہو کے بھاگ گیا لیکن اس کے دل میں ایک خوف نے ضرور جگہ بنالی ہوگی کہ اب نہ جانے میرا اگلا قدم کیا ہوگا۔ کسی کی آنکھوں میں اس طرح دھول بہرحال نہیں جھونکی جاسکتی۔ وہ اکبر خان تھا اور اس کے ساتھ جو عورت تھی وہ نور جہاں تھی۔

اس حقیقت سے انکار وہاں ممکن تھا' ہر جگہ نہیں۔

باہر آ کے میں نے ایک سلپ پر لکھا "میں باہر تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔" اور ایک ویٹر کو اشارے سے بلا کے کہا کہ فاروقی کو دے آئے پھر میں فاروقی کی گاڑی کے پاس رک کے انتظار کرتا رہا۔

فاروقی بل ادا کر کے دس منٹ بعد نمودار ہوا "بھئی رفیق صاحب! یہ کیا.....آپ تو یوں غائب ہوگئے جیسے چور کو دیکھ کر سپاہی بھاگ جاتا ہے۔"

میں نے کہا "صحیح مثال دی تم نے.....لیکن اب اس چور کی خیر نہیں۔"

"آخر کون تھا وہ.....دراصل میں تو اس ہوشربا حسینہ کی طرف زیادہ متوجہ رہا.....بہ خدا کیا چیز تھی!" فاروقی نے گاڑی کھولی۔

میں نے کہا "میں پیچھے بیٹھوں گا۔"

"خیریت! آپ کچھ جلال میں ہیں۔ وہ کیا ہے بہ قول شاعر.....بھنویں تنی ہیں خنجر ہاتھ میں ہے تن کے بیٹھے ہیں۔"

میں نے کہا "تم نے کبھی کسی کا تعاقب کیا ہے؟"

وہ قہقہہ مار کے ہنسا "اجی حضرت! کیا سوال فرمایا ہے آپ نے مجھ.....تعاقب میں ہی تو گزری ہے ساری زندگی۔ چھ سال کی عمر سے یہ کام شروع کیا تھا' اب تک کر رہے ہیں۔"

میں نے کہا "میرا مطلب تھا فلمی جاسوس کے انداز میں' جو گاڑی میں کسی مجرم کا پیچھا کرتے ہیں۔ گاڑی کو جیٹ طیارے کی طرح چلاتے ہیں' الٹے سیدھے' دائیں بائیں' سیکڑوں گاڑیوں سے ٹکراتے.....جمپ لگاتے' راستے کی ہر رکاوٹ سے بچتے بچاتے؟"

اس نے مجھے غور سے دیکھا "میری گاڑی اور زندگی دونوں انشورڈ ہیں مگر اس کے باوجود میں خودکشی کے موڈ میں نہیں ہوں' آخر چکر کیا ہے؟"

میں نے اسے مختصراً اکبر خان کے بارے میں بتایا "اب کچھ دیر بعد وہ باہر تو آئے گا' باہر آنے کا یہی ایک راستہ ہے۔"

"یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ وہ آدھی رات تک وہیں بیٹھا رہے۔"

میں نے کہا "ہمیں بھی فرصت ہی فرصت ہے مسٹر فاروقی!"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "سچ کہتے ہو' تمہاری کوئی گھر والی نہیں اور جو میری ہے اسے اب میرا انتظار ہی نہیں

ہوتا۔ نہ مجھے جلدی ہوتی ہے اس کے پاس پہنچنے کی۔ جو پہلے سال ہوتی تھی۔ وہ کیا ہے کہ بار بار ٹکرانے سے مقناطیس بھی کشش کھو دیتے ہیں۔ بس لوہے کے ٹکڑے بن جاتے ہیں' ٹھنڈے ٹھنڈے۔" وہ اپنی بات پر خود ہی قہقہہ مار کے ہنسا۔

میں نے کہا "وہ پہلے دیکھے گا کہ میں باہر کہیں موجود تو نہیں ہوں۔ ممکن ہے خود نہ نکلے' نور جہاں کو بھیجے۔"

"یہ اس آفت جاں کا نام ہے؟"

"ہاں' وہ بڑی خطرناک عورت ہے فاروقی صاحب!"

"ہم بھی تو خطرات سے کھیلنے کا شوق رکھتے ہیں نواب صاحب! اس کے ساتھ وہ سفید چمڑی والا کون تھا.....اور وہ میم؟"

میں نے کہا "انہیں میں نہیں جانتا لیکن وہ بھی مجھے مشکوک قسم کے کردار لگے۔ ان کا حلیہ ہی آوارہ گردوں والا تھا۔ ایسے ہی لوگ تو ڈرگ مافیا کے کام آتے ہیں۔ امریکی یورپی پاسپورٹ بے حد معتبر اور شک و شبہ سے بالاتر سمجھا جاتا ہے.....اور پیسوں کی خاطر یہ لوگ کچھ بھی کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔"

"سچ کہا تم نے۔ ایک گوری کو میں بھی جانتا ہوں۔ چار سو ڈالر چارج کرتی ہے ایک رات کے۔ دو مہینے سے پہلے اپائنٹمنٹ نہیں ملتی۔ ویٹنگ بڑی لمبی ہے.....اور اب تم سے کیا پردہ.....ہمارا نام بھی لکھا ہوا تو ہے۔"

میں نے کہا "تمہیں شرم آنی چاہیے۔"

"ہاں یار! آتی ہے.....مگر یہ تو کام ہی بے شرمی کا ہے اور ہمیں بدلہ بھی تو لینا ہے ان سے۔ دو سو سال تک یہ ہماری....." وہ ڈھٹائی سے بولا۔

ایک گھنٹے بعد میرے ضبط کا حوصلہ جواب دینے لگا۔ فاروقی کی یہ بات درست ہوتی نظر آتی تھی کہ وہ آدھی رات

تک باہر نہیں آئے گا۔ وہ میرے صبر کو آزمائے گا۔ یہ چاہے گا کہ تنگ آ کے میں کچھ کروں یا وہ کوئی ترکیب چلے گا کہ میری آنکھوں میں دھول جھونک کے نکل جائے۔ بظاہر یہ آسان نہ تھا۔ نہ وہ حلیہ اور چہرہ بدل سکتا تھا اور نہ کوئی خفیہ راستہ نکال سکتا تھا۔

فاروقی نے کہا ''یار! انتظار کسی امید میں ہو تو اور بات ہوتی ہے..... مثلاً وہ جو گلبدن ہے نور جہاں راحت جاں' اگر یہ آس ہو کہ وہ سیدھی آ کے گاڑی میں بیٹھ جائے گی تو ہم بیٹھے رہ سکتے ہیں ساری رات۔''

میں نے کہا ''فی الحال اس کا کوئی چانس نہیں..... اس لیے دوسرا طریقہ اختیار کرتے ہیں' کوئی کاغذ کا پرزہ نکالو اور لکھو۔''

فاروقی نے ایک پاکٹ ڈائری میں سے ایک صفحہ پھاڑا ''کیا لکھوں؟''

''لکھو..... پیر بخش گاڑی میں بیٹھا ہے۔ اپنی گاڑی کا ماڈل رنگ اور نمبر لکھ دو۔''

''کیا وہ اتنا بے وقوف ہے؟''

''نہیں' میں ایک چانس لے رہا ہوں۔ قسمت ساتھ دے تو تُلف بھی کامیاب ہو جاتا ہے۔''

فاروقی نے وہ رقعہ مجھے دیا۔ میں نے اسے بند کر کے دوبارہ ریسٹورنٹ کا رخ کیا۔ کچھ دیر انتظار کے بعد ایک ویٹر کی شکل نظر آئی تو میں نے اسے اشارے سے قریب بلایا ''دیکھو! یہ رقعہ اندر پہنچانا ہے۔'' میں نے اکبر خان کا اور نور جہاں کا حلیہ بتا کے کہا۔

اس نے مجھے مشکوک نظروں سے دیکھا ''آپ خود کیوں نہیں جاتے؟''

میں نے جیب سے ایک ہزار کا نوٹ نکالا ''بات کو سمجھا کرو۔ مجھے اندر نہیں جانا' اسے باہر بلانا ہے۔''

ویٹر نے رقعہ کھول کے پڑھا۔ کچھ دیر سوچتا رہا اور پھر نوٹ پکڑ لیا ''اگر انہوں نے پوچھا.....''

اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی میں نے کہا ''تو تم کہو گے کہ اس حلیے کا آدمی تھا۔ میں نے اسے پیر بخش کا حلیہ سمجھا دیا۔

وہ پھر تذبذب میں پڑ گیا ''سر جی! میں غریب آدمی ہوں۔''

میں نے کہا ''مجھے معلوم ہے۔ اسی لیے تو ہزار دے رہا ہوں۔ کوئی اور غریب شاید یہ کام پانچ سو میں بھی کر دے۔''

وہ سمجھ گیا اور سر ہلا کے غائب ہو گیا تو میں نے فاروقی کو اشارہ کیا کہ گاڑی آگے لے آئے۔ اسی وقت گورا جن کر ریچھ کی طرح بازو ہلاتا گوری کے ساتھ نمودار ہوا۔ گوری سگریٹ پی رہی تھی اور وہ میرے پاس سے گزرے تو مجھے دھوئیں کے مرغولے سے چرس کی بو آئی۔

اکبر اور نور جہاں سے ان کے تعلقات واضح طور پر کسی غلط کاروباری شراکت کی نشاندہی کرتے تھے لیکن میرے پاس کوئی قانونی اختیار نہ تھا کہ میں ان غیر ملکیوں کو روک کے ان سے کچھ پوچھ سکتا۔ ایسے لوگوں پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے خود پولیس سو بار سوچتی ہے۔ پاکستانی شہری کا کوئی مسئلہ نہیں' جسے چاہو ڈک دو اور کوئی بھی فرد جرم لگا دو۔ ثبوت' شہادت' سب کا بندوبست بعد میں ہو جائے گا لیکن غیر ملکی کا معاملہ خطرناک ہو جاتا ہے۔ سفارت خانہ احتجاج کر دے کہ ہمارے شہریوں کو بلاوجہ ہراساں کیا گیا تو نوکری خطرے میں پڑ سکتی ہے۔

دس منٹ بعد مجھے بے چینی ہونے لگی اور مایوسی کے ساتھ خفت غالب آنے لگی کہ شاید میری چال ناکام ہو گئی ہے۔ میں نے اپنی دانست میں بڑی ذہانت سے ایک جال بچھایا تھا مگر اکبر خان جس کی حیثیت ابھی تک میری نظر میں ایک معمولی چوکیدار سے زیادہ نہ تھی' گرفتار ہونے پر تیار نہیں..... شاید میرا پیغام پڑھ کے وہ دل ہی دل میں بہت ہنسا ہو گا اور اس نے نور جہاں کو بھی بتایا ہو گا کہ نواب صاحب قبلہ نے کیا لطیفہ ارسال کیا ہے۔ ممکن ہے اس نے ویٹر کو بھی لالچ یا دھمکی سے سچ بولنے پر مجبور کر دیا ہو۔

فاروقی نے ہارن بجا بجا کے مجھے متوجہ کرنے اور اشارے سے یہ پوچھنے کا سلسلہ الگ شروع کر رکھا تھا کہ کیا ہوا؟ اسے نظر آ رہا تھا کہ کچھ بھی نہیں ہوا لیکن ایک تو اس نے نو پارکنگ ایریا میں گاڑی کھڑی کی ہوئی تھی' دوسرے انتظار کی کوفت میں وہ کوفتہ ہو رہا تھا۔

صرف ایک لمحے کے لیے مجھے خیال آیا کہ کہیں اکبر خان مجھے چکمہ دے کر نہ نکل گیا ہو لیکن یہ ناممکن تھا۔ یہ صرف اس صورت میں ممکن تھا جب وہ سلیمانی ٹوپی اوڑھ لیتا اور اس کی منکوحہ برقع اوڑھ لیتی۔ ریسٹورنٹ میں وہ ان دونوں چیزوں کا آرڈر بھی نہیں دے سکتے تھے۔ یقیناً اس خبیث الزماں نے اس وقت تک اپنی جگہ پر براجمان رہنے کا فیصلہ کر لیا ہو گا جب تک ریسٹورنٹ والے خود ان سے نہ کہیں کہ بس ہو چکی نماز' مصلیٰ اٹھائیے' ہم ریسٹورنٹ بند کر رہے ہیں۔ آپ بھی گھر جائیے۔ اسے یقین ہو گا کہ اتنی دیر انتظار کرنا میرے لیے ممکن نہیں ہو گا۔

یہ بات ٹھیک ہی تھی۔ میں مزید انتظار نہیں کر سکتا تھا۔

اپنی چال کی ناکامی نے مجھے مشتعل کر دیا تھا۔ میں نے فاروقی کی طرف دیکھ کے ہاتھ ہلایا اور اندر چلا گیا۔ میں نے اب اسی جگہ ان سے دوٹوک بات کرنے کی ٹھان لی تھی۔

ہال میں قدم رنجہ فرماتے ہی مجھے حیرت کا پہلا جھٹکا لگا جب اکبر اور نور جہاں کی ٹیبل پر مجھے دو باریش مولانا تشریف فرما نظر آئے۔ غلطی کا امکان ہی نہ تھا۔ میز وہی تھی لیکن لوگ بدل گئے تھے۔ میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ ہال میں تیس چالیس میزوں پر ڈیڑھ سو افراد کے بیٹھنے کی گنجائش تھی اور دو چار کے سوا سب میزیں بھری ہوئی تھیں لیکن اکبر اور نور جہاں ان میں نہیں تھے۔

ہال کے وسط میں کھڑے رہ کر لوگوں کو گھورتے ہوئے میں نے خود کو خاصا احمق محسوس کیا۔ مجھے جھنجلاہٹ بھی تھی اور غصہ بھی تھا کہ وہ دونوں میری توقعات سے بڑھ کر چالاک ثابت ہوئے اور سلیمانی ٹوپی یا برقع کے بغیر ہی غائب ہو گئے۔

ایک ویٹر نے میرے قریب آ کے مودبانہ سوال کیا ''یس سر!''

میں نے ہال پر نگاہ ڈالی اور پوچھا ''باہر جانے کا کوئی دوسرا راستہ بھی ہے؟''

ویٹر نے نفی میں سر ہلایا ''دروازہ تو ایک ہی ہے۔'' اس کی بات کا یہ مطلب نکالا جا سکتا تھا کہ کھڑکی کھول کے کوئی باہر جانا چاہے تو اسے پکڑا یا روکا نہیں جا سکتا کیونکہ یہ جرم نہیں ہو گا۔

کھڑکیاں سب بند تھیں کیونکہ ہال ایرکنڈیشنڈ تھا۔ میری پریشانی دیکھ کے ویٹر نے کہا ''آپ کسے تلاش کر رہے ہیں سر؟''

میں نے کہا ''ابھی کچھ دیر پہلے' جہاں یہ مولانا بیٹھے ہیں' یہاں ایک صاحب بیٹھے تھے۔ ان کے ساتھ ایک بہت حسین خاتون تھیں۔ اتنی حسین کہ تم نے ضرور دیکھا ہو گا۔''

وہ مسکرایا ''وہ تو چلے گئے سر!''

''چلے گئے..... مگر کیسے؟ کس راستے سے..... میں باہر ان کا انتظار کر رہا تھا۔''

ویٹر نے کہا ''آپ منیجر صاحب سے پتا کر لیں سر!''

مجھے یوں لگا جیسے وہ سب جانتا ہے مگر بتا کے مشکل میں پڑنے سے ڈرتا ہے۔ میں نے کونے میں بنے ہوئے کاؤنٹر کا رخ کیا۔ منیجر اپنی صورت اور وضع قطع سے بہت کائیاں بلکہ کسی حد تک خطرناک لگتا تھا۔ اس کا سر گنجا' ناک طوطے کی چونچ جیسی اور مونچھیں تلوار مارکہ تھیں۔

میرے سوال پر وہ زیادہ خطرناک نظر آنے لگا۔ اس نے آنکھیں نکال کے غراتے ہوئے کہا ''آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

میں نے اس کے جارحانہ رویے سے سمجھ لیا کہ ایسے بات نہیں بنے گی۔ میں نے کہنیاں کاؤنٹر پر ٹکا کے کہا ''یہ بات ابھی مجھے بتا دو گے تو زیادہ پریشانی سے بچ جاؤ گے ورنہ.....''

وہ کچھ نرم پڑا ''ورنہ کیا.....؟''

میں نے کہا ''تمہیں انٹیلی جنس بیورو میں حاضر ہو کے بتانا پڑے گا۔ نادانستگی یا بے وقوفی میں تم اعانت مجرمانہ کے مرتکب ہو چکے ہو۔''

''آسان اردو میں بتائیں سر!'' اس نے سر کھجا کے کہا۔

میں نے کہا ''اس ٹیبل پر دو غیر ملکی بھی تھے۔ ایک سنہری داڑھی والا جن اور ایک پورٹیبل قسم کی حسینہ۔ وہ غیر ملکی ایجنٹ کچھ ملک دشمن عناصر سے کام لے رہے ہیں۔ تم نے انہیں فرار کرا دیا۔ کیا معاوضہ ملا تمہیں ان کی مدد کا۔ ایک ہزار ڈالرز یا ایک ہزار یورو؟''

وہ نروس ہو گیا ''آپ کیسی باتیں کرتے ہیں سر!''

میں نے کہا ''ہم کب سے ان پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ تم نے لالچ میں ملک دشمن عناصر کی مدد کر کے ہمارا کام خراب کر دیا۔''

اس کی حالت غیر ہو گئی ''نہیں سر! میں نے کچھ نہیں کیا۔''

''تو کسی ویٹر نے کیا ہو گا.....'' میں نے غرا کے کہا۔

''نہیں سر! وہ آئے تھے میرے پاس..... انہوں نے جھوٹ بولا مجھ سے کہ باہر ہمارے دشمن کھڑے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہم دونوں نے اپنے پسند سے محبت کی شادی کر لی ہے۔ اس پر ہم دونوں کے قبیلے والے ہماری جان کے دشمن ہو رہے ہیں اگر باہر گئے تو وہ ہمیں گولیوں سے چھلنی کر دیں گے۔ بس سر..... مجھے رحم آ گیا۔ میں نے انہیں کچن کی طرف سے نکال دیا۔ اس کا راستہ پیچھے والی گلی میں ہے۔''

میں اسے کچھ دیر یوں دیکھتا رہا جیسے فیصلہ کر رہا ہوں کہ گولی اس کے سر میں ماروں یا دل میں اتاروں؟ خطرناک نظر آنے والا اب سزائے موت کے منتظر مجرم کی طرح زرد پڑ گیا تھا۔ بالآخر میں نے ایک گہری سانس لی اور کاؤنٹر پر ہاتھ مار کے کہا ''ٹھیک ہے' ابھی تو میں جا رہا ہوں لیکن اپنی زبان بند رکھنا۔''

وہ ہکلایا ''جی..... جی سر..... آپ کا نام..... اگر کوئی

بات ہوتو...."

میں نے روانی سے کہا" شاہ رخ خان!"

وہ دم بخود رہ گیا اگر میں خود کو امیتابھ بچن کہہ دیتا تو شاید اس کی حیرانی کچھ کم ہوتی.... "جی سر!"

میں نے متانت سے کہا" کرنل شاہ رخ خان...." اور سیدھا چلتا ہوا باہر نکل گیا۔

فاروقی بہت ہنسا" بھئی' یہ تو خوب ہوئی' یہ مغل اعظم اور ملکہ نور جہاں آخر کیا چکر چلاتے پھر رہے ہیں؟"

میں نے کہا" معلوم ہو جائے گا بہت جلد۔ بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔"

"اجی آپ کس خیال میں ہیں نواب صاحب! وہ پھر نظر آیا تو آپ ہی کو جھوٹا ثابت کرے گا کہ کسی اور کو دیکھا ہوگا آپ نے۔ میں تو ایک غریب چوکیدار ہوں۔ ایسے ہوٹل میں میرا کیا کام.... وہ کچھ نہیں مانے گا۔"

میں نے کہا" اس کا تو باپ بھی مانے گا لیکن منوانے کے لیے مجھے پولیس کا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا۔"

"اچھا اب بتاؤ' پروگرام کیا ہے؟"

"ابھی تک میں گھر نہیں گیا ہوں۔ کل پھر سارا دن تم نہ ملتے اس لیے پہلے ادھر آ گیا تھا۔"

"کب تک قیام رہے گا یہاں۔"

میں نے کہا" کچھ پتا نہیں۔ چند دن تو لگیں گے۔ ابا نے فون پر کچھ پریشانی ظاہر کی تھی۔ کچھ لوگ انہیں تنگ کر رہے ہیں۔"

"کون لوگ ہیں۔ مجھے بتا دیتے۔"

میں نے کہا" نہیں فاروقی' یہ معاملہ قانون اور پولیس کا نہیں ہے۔ میرے ابا سے زیادہ بے ضرر آدمی کون ہوگا۔ تمام عمر ایسی عاجزی سے رہے کہ دشمن کون ہوتا۔ ان کا برا چاہنے والے بھی شرمندہ ہو گئے۔ انہیں مل رہی ہے میرے اعمال کی سزا۔ مجھ پر کسی کا داؤ نہیں چلتا تو انہیں نشانہ بنالیتا ہے۔"

"میری مانو تو انہیں یہاں سے نکال لو اگر تم نے ست بدھائی کو اپنا اسلام آباد بنالیا ہے تو پھر ایوان صدر کو بھی وہیں لے جاؤ ورنہ غائبانہ عذاب تمہارے لیے بھی اور ان کے لیے بھی۔"

"شاید یہی سب سے بہتر ہوگا۔"

فاروقی نے مجھے اپنے آفس کے باہر ڈراپ کیا تو رات کے آٹھ بجے تھے لیکن اس کی سیکریٹری آفس بند کرا کے جا چکی تھی۔ عام دنوں میں وہ رات کے دس بجے تک بیٹھتا تھا اور اس وقت تک چوکیدار آ جاتا تھا۔ آج وہ موجود نہیں تھا۔

فاروقی کا آفس ایک یوشیپ احاطے میں تھا۔ دو کنال کے رقبے پر بنی ہوئی صرف دو منزلہ عمارت تھی جس میں فاروقی واحد وکیل تھا۔ باقی حصے میں دو فارما سیوٹیکل ایک کنسٹرکشن اور دو آفس ایکوپمنٹ سپلائی کمپنی کے دفاتر تھے۔ عمارت کی تیسری منزل برسوں سے نامکمل پڑی تھی اور اس کے سریوں والے پلر آدھے کھڑے تھے۔ عمارت کے اصل مالک کا ارادہ یہاں چھ منزلہ آفس کمپلیکس بنانے کا تھا لیکن ان کا اچانک انتقال ہو جانے سے یہ منصوبہ ادھورا رہ گیا۔ ان کی زندگی میں بھی فاروقی ہی کرایہ داری اور ٹیکس وغیرہ کے سارے معاملات کی نگرانی کرتا تھا۔ بچے پڑھنے کے لیے امریکا گئے تھے تو وہیں سیٹل ہو گئے تھے۔ بیوی یہاں اکیلی رہ کے کیا کرتی۔ وہ بھی فاروقی کو اپنا اٹارنی مقرر کر کے امریکا چلی گئی اور تین سال بعد مر گئی۔ اب عجیب و غریب صورت حال یہ تھی کہ مالک کوئی نہیں تھا۔ جو وارث تھے انہوں نے قانونی طور پر حق ملکیت حاصل نہیں کیا تھا چنانچہ فاروقی کو حاصل اٹارنی کے اختیارات کی بھی قانونی حیثیت باقی نہیں رہی تھی لیکن اصل حالات کا کسی اور کو علم ہی نہ تھا۔ فاروقی صاحب بدستور کرایہ وصول کر رہے تھے اور اسی جوائنٹ اکاؤنٹ میں جمع کرا رہے تھے جس کے دونوں اکاؤنٹ ہولڈر میاں بیوی اس دنیا میں ہی نہیں تھے اور اصولاً ان کا اکاؤنٹ بھی فریز ہو جانا چاہیے تھا۔ فاروقی ٹیکس کے معاملات سے بھی نمٹتا تھا اور ایک طرح سے بلڈنگ کا مالک بنا ہوا تھا۔ کسی نے کبھی اس کی حیثیت کو چیلنج نہیں کیا تھا۔ فاروقی کو امید تھی کہ کسی دن اصل وارث واپس آ کے قانونی طور پر بینک اکاؤنٹ اور دیگر تمام اثاثے اپنی ملکیت میں لیں گے تو یہ چکر ختم ہوگا۔

یوشیپ والے اس احاطے میں انہی لوگوں کی کار پارکنگ تھی جو یہاں کام کرتے تھے یا کسی کام سے آتے تھے۔ اس وقت تمام دفاتر بند تھے تو احاطے میں صرف میری کار کھڑی رہ گئی تھی۔ ہر آفس کے باہر ایک لائٹ ضرور تھی۔ اس سے احاطے میں اندھیرا نہیں تھا۔

گاڑی اسٹارٹ کر کے میں نے ریورس گیئر لگایا تھا کہ گاڑی کو سیدھا گیٹ سے نکالوں۔ پیچھے جگہ بالکل خالی تھی چنانچہ میں نے کچھ تیزی دکھائی لیکن گاڑی کو پیچھے کرنے کے بعد میں نے روکنا چاہا تو وہ نہیں رکی۔ اس کے بریک فیل ہو چکے تھے۔ گاڑی پیچھے ایک آفس کی دیوار سے ٹکرائی اور رک گئی اگر وہ ایک فٹ دائیں جانب جاتی تو بڑے بڑے شیشوں کو توڑتی ہوئی آفس ایکوپمنٹ سپلائی کمپنی کے دفتر

میں گھس جاتی۔ شوکیس میں سجے ہوئے نہ جانے کتنے کمپیوٹر اور پرنٹر بھی تباہ ہوتے تو نقصان بہت زیادہ ہوتا۔

گاڑی کی ٹیل لائٹس ٹوٹی تھیں اور ڈکی اندر دب گئی تھی۔ ظاہر ہے اس وقت صبر کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ کسی پرانی گاڑی کے بریک فیل ہو جانا کوئی ناممکن بات نہیں ہوتی۔ ایسا کہیں بھی اور کسی بھی وقت ہو سکتا ہے۔

گاڑی اب استعمال کے قابل نہیں رہی تھی۔ میں نے اسے اسٹارٹ کیا اور بہت آہستہ آہستہ چلاتے ہوئے دوبارہ وہیں کھڑا کر دیا جہاں یہ پہلے کھڑی ہوئی تھی۔ اتنی کم رفتار پر اسے روکنے کے لیے ہینڈ بریک کافی تھے اور یہ خطرہ نہیں تھا کہ سامنے کی ٹکر سے ہیڈ لائٹس بھی بکھر جائیں گی۔

گیٹ سے باہر آ کے میں نے دائیں بائیں نظر دوڑائی تو مجھے کچھ فاصلے پر ایک ٹیکسی کھڑی دکھائی دی۔ مجھے معلوم تھا کہ ڈاکٹر شہناز کے گھر پر فریال میری واپسی کی منتظر ہوگی لیکن میں نے اپنے گھر جانے کا فیصلہ کیا۔ فریال کو میں فون پر بتا سکتا تھا کہ مجھے دیر ہو گئی تھی۔

ٹیکسی ڈرائیور نے میرے لیے آگے والا گیٹ کھول دیا

"میں پیچھے بیٹھوں گا۔" میں نے کہا۔

"پیچھے کچھ سامان رکھا ہے سر!" ٹیکسی ڈرائیور نے بڑے ادب سے معذرت کی۔" میں اب ٹیکسی بند کرنے گھر جا رہا تھا چلیں آپ کو چھوڑ دیتا ہوں۔ اس وقت یہاں آپ کو دوسری ٹیکسی نہیں ملے گی۔"

میں آگے بیٹھ گیا۔ میں نے دیکھ لیا تھا کہ پچھلی سیٹ پر سیاہ پلاسٹک شیٹ سے ڈھکا ہوا سامان کا ڈھیر پڑا ہوا ہے۔

کچھ دیر میرا ذہن تازہ حادثے میں الجھا رہا پھر خیال کی رو اکبر خان کی طرف پلٹ گئی۔ وہ بڑا حیران کرنے والا کردار تھا۔ اس کے لیے میرے ذہن میں گرگٹ کی تشبیہ آتی تھی جو پل پل رنگ بدلنے کے لیے مشہور ہے اور لوگ اس سے ڈرتے بھی ہیں اور اس سے نفرت بھی کرتے ہیں۔

مجھے احساس ہی نہ ہوا کہ ٹیکسی نے ایک جگہ غلط موڑ کاٹا ہے لیکن کچھ دیر بعد اچانک میں نے دیکھ لیا کہ وہ مجھے کسی اور راستے پر لے جا رہا ہے۔

میں نے کہا" یہ تم کدھر جا رہے ہو؟"

"وہیں جہاں تمہیں جانا چاہیے۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔

اس سے پہلے کہ میں کسی ردِعمل کا اظہار کرتا' پیچھے پلاسٹک شیٹ میں حرکت ہوئی اور مجھے بیک ویو مرر میں ایک چہرے کی جھلک سی دکھائی دی۔ ایسا ڈرائیور کی غلطی سے ہوا۔ اس نے بیک ویو مرر کو ایڈجسٹ نہیں کیا تھا۔ رخ اس کی طرف ہوتا تو مجھے کچھ پتا نہ چلتا۔

لیکن پتا چلنے سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوا۔ میرے حرکت کرنے سے قبل ہی پیچھے سے میرے سر پر وار ہوا۔ یہ ضرب بہت شدید تھی لیکن اس بات کا خیال رکھا گیا تھا کہ میرا سر نہ چٹخے۔ مارنے والے نے ڈنڈے یا پائپ کے اوپر ربڑ چڑھایا تھا یا کپڑا باندھا تھا۔ اس ضرب نے میرے دماغ کے اندر بھیجے کو ہلا دیا۔ مجھے بے حسی کے سمندر ڈوبنے میں چند سیکنڈ بھی نہ لگے۔

دوبارہ ہوش میں آنے کا عمل تکلیف دہ اور طویل تھا۔ پہلے مجھے یوں لگا جیسے روشنی جل بجھ رہی ہے۔ یوں جیسے ٹی وی کے اسکرین پر تصویر آئے اور غائب ہو جائے' میرے سامنے ایک کمرے کا منظر آتا تھا اور اندھیرے میں گم ہو جاتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے میں کسی گھومنے والے جھولے میں ہوں جو کبھی چلتا ہے کبھی رک جاتا ہے۔

معلوم نہیں یہ سلسلہ کتنی دیر جاری رہا۔ بالآخر میری نظر میں ایک منظر ٹھہر گیا۔ یہ کسی کا بیڈ روم تھا۔ میں ڈبل بیڈ پر ترچھا لیٹا ہوا تھا۔ بیڈ سے آگے گہرے نیلے رنگ کا نیا قالین پورے فرش پر پھیلا ہوا تھا۔ دو کھڑکیوں پر جستی پٹی والے ورٹیکل بلائنڈز تھے۔ ایک دروازہ باہر یا کسی دوسرے کمرے میں کھلتا ہوگا۔ دوسرا کم چوڑا باتھ روم کا دروازہ لگتا تھا۔ کمرے میں ایک نیا صوفہ سیٹ تھا۔ ایک کونے میں ٹی وی ٹرالی پر چھوٹا سا فلیٹ اسکرین ٹی وی رکھا ہوا تھا۔ نیچے ڈی وی ڈی تھا اور چند سی ڈیز پڑی ہوئی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے بیڈ روم کی آرائش ہنوز مکمل نہیں ہوئی ہے کیونکہ دیواروں کا رنگ بالکل نیا تھا لیکن ان پر ڈیکوریشن کے لیے کچھ بھی نہیں لگایا گیا تھا۔

میں ہمت کر کے اٹھا تو مجھے یوں لگا جیسے میری گردن پر میرا سر نہیں دس کلو کا تربوز رکھا ہوا ہے جسے میں بیلنس نہیں کر سکتا۔ میں نے سر کو دونوں ہاتھوں میں تھاما تو کچھ دیر بعد یہ احساس ختم ہو گیا مگر سر کے اندر درد کی لہریں اٹھتی رہیں۔ مجھے متلی بھی محسوس ہو رہی تھی اور صاف ظاہر تھا کہ یہ سر کی اندرونی چوٹ Concussion کے اثرات ہیں۔

اپنے پیروں پر کھڑا ہونا بھی ایک مرحلہ تھا جسے میں نے آہستہ آہستہ طے کیا۔ دیوار کا سہارا لے کر قدم بڑھاتا میں دروازے تک گیا۔ اس کے پیچھے واش روم ہی تھا۔ واش بیسن پر جھک کے میں نے نل کھولا اور اپنے منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھپکے مارے۔ اس سے بہت فرق پڑا۔ میری آنکھوں کے

ڈیلوں کا درد غائب ہوگیا اور سر کے درد میں بھی افاقہ ہوا۔

سر کے پچھلے حصے میں جہاں ضرب لگی تھی ہاتھ لگانے سے اب بھی درد ہوتا تھا۔ واپس کمرے میں آنے کے بعد میں نے صوفے پر بیٹھ کے صورت حالات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ مجھے اغوا کرنے والے کون ہو سکتے ہیں؟ یہ سوال سب سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا لیکن اس ایک سوال کا ایک جواب نہیں ہوسکتا تھا۔ میرے دشمن مختلف خانوں میں بٹے ہوئے تھے۔ میرے سیاسی دشمنوں میں تنظیم کے چیف سے شہاب الدین اینڈ کمپنی تک سب شامل تھے۔ وہ سب مجھے اغوا یا قتل کرنے کے اہل تھے۔ میرے جذباتی دشمنوں میں صفدر سلطان مرزا یہ کام کرنے کا اہل تھا اور فریال کے لندن سے فرار کے بعد اس کی حالت زخم خوردہ اژدہے جیسی تھی جو مجھے نگل کے ڈکار بھی نہ لے۔

دشمنی کا نیا رشتہ رجب علی جتال سے استوار ہوا تھا۔ چنانچہ اس سے یہ امید نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ ایسی منصوبہ بندی کے ساتھ اس انتہا تک جائے۔ مجھے عدم آباد میں دیکھنے کی خواہش مند عائشہ کی ماں بھی تھی اور مجھے سفر آخرت پر روانہ کرنے کی ایک ناکام کوشش بھی کر چکی تھی۔ عائشہ پر پاکستان آنے کا بھوت سوار تھا اور ماں اپنے کسی عمل سے اسے اتارنے میں ناکام ہو چکی تھی۔ یہ شواہد مل چکے تھے کہ اس کے لنک یعنی ناجائز تعلقات پاکستان میں بھی تھے۔ سفارتی عملے کا کوئی رکن اس سے عاشقی کا پرانا رشتہ نبھانے میں آج بھی مستعد تھا۔

آخری نام اکبر خان کا تھا۔ وہ ایک خطرناک سازشی شخص تھا جس کا مجھ سے کتنی بار آمنا سامنا ہو چکا تھا۔ اس سے ہر ملاقات انتہائی تلخ یاد رکھتی تھی۔ اس نے پہلی بار مجھ پر بندوق تان لی تھی اور مجھے اس پراسرار دفتر میں داخل نہیں ہونے دیا تھا جو میری ہی زمین پر بنا ہوا تھا۔ دوسری بار میرے یقین کے مطابق سونے چاندی کے نوادرات والے کمرے سے نکل کر بھاگا تھا اور اسی نے جانو بابا کا خون کیا تھا۔ اس کے بعد سے وہ غائب تھا اور آج اس نے جس طرح میری آنکھوں میں دھول جھونکی تھی' وہ میں بھول نہیں سکتا تھا۔

چنانچہ دشمنوں کی اس فہرست میں سے جو نام میں اپنے اندازے سے پہلے دوسرے اور تیسرے نمبر پر رکھتا تھا وہ صفدر سلطان مرزا' پھر شہاب الدین اینڈ کمپنی اور آخر میں اکبر خان کے نام تھے۔ کون معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں۔ یہ بہت جلد آشکار ہونے والا تھا۔

کمرے میں لائٹس جل رہی تھیں۔ اس سے یہی سمجھا جا سکتا تھا کہ باہر بھی رات کا راج ہے مگر یقین سے کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ میرے ہاتھ پر سے کلائی کی گھڑی اتار لی گئی تھی۔ دیوار پر کہیں کوئی کلاک نہ تھا۔ یہ ہوسکتا تھا کہ میری یہ قیام گاہ زیر زمین ہو۔ دن میں بھی جہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے۔ قید تنہائی میں وقت کے احساس کو چھین لینا بھی ذہنی تشدد کی ایک صورت ہے۔

مجھے اچانک ٹی وی کا خیال آیا۔ ٹی وی کے پروگرام دیکھ کے یا خبروں سے دن تاریخ اور وقت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ میں نے ٹی وی کو آن کیا اور ریموٹ کنٹرول کے بٹن دباتا رہا۔ کہیں کوئی تصویر نہ آئی۔ میں نے اس کے پیچھے دیکھا۔ کیبل کا تار موجود تھا مگر اس پر ایک بھی چینل نہیں آ رہا تھا۔ میں نے ٹی وی کو بند کر دیا۔

میری حالت بتدریج سنبھلتی جا رہی تھی۔ بے ہوشی کا وقفہ ختم ہونے کے بعد میرے جسم کا مدافعتی نظام تیزی سے کام کر رہا تھا اور میری جسمانی اور ذہنی صلاحیتیں بحال ہو رہی تھیں۔ چکر اور متلی کی کیفیت باقی نہیں رہی تھی اور کمزوری کا اثر بھی رفتہ رفتہ زائل ہونے لگا تھا۔

اب میں سوچ سکتا تھا۔ میں نے صورت حال کو سمجھ لیا تھا اور اس سے نمٹنے کے عمل کا آغاز ہوگیا تھا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ مجھے کس نے اغوا کیا تھا اور کیوں؟ وہ جو بھی تھا اس نے سازش کا جال بڑی ذہانت سے بچھایا تھا۔ میری گاڑی کے بریک فیل نہیں ہوئے تھے۔ یقیناً کسی نے بریک لائن کاٹ دی تھی۔ رات کا وقت نہ ہوتا تو میں بہہ جانے والے بریک آئل کو بھی دیکھ لیتا۔ اس حرکت کا مقصد مجھے مارنا نہیں تھا۔ قتل کرنا ہوتا تو کوئی بھی ماہر نشانہ باز اطمینان سے میرے سر میں ایک گولی اتار دیتا۔ وہاں نہ کوئی دیکھنے والا تھا اور نہ آنے والا۔

بریک لائن کاٹنے والے کو معلوم تھا کہ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہی مجھے اس خرابی کا پتا چل جائے گا۔ گاڑی سڑک کے کنارے ہوتی تو یہ ہوسکتا تھا کہ میں اسے اسٹارٹ کروں اور ٹریفک کی روانی میں شامل ہو جاؤں۔ جب بریک لگانے کی ضرورت پڑتی تو معلوم ہوتا کہ اب گاڑی کو روکا نہیں جا سکتا۔ انجام ایک حادثہ ہوتا جس میں کوئی گاڑی سے کچلا جاتا' گاڑی کسی تصادم میں تباہ ہوتی یا میں خود مارا جاتا۔ صرف زخمی ہوتا یا معذور۔ یا کچھ بھی نہ ہوتا۔ مجھے اتنی مہلت مل جاتی کہ میں خود گاڑی کو کسی فٹ پاتھ پر چڑھا کے یا کھمبے سے ٹکرا کے روک لوں۔

جہاں گاڑی کھڑی تھی' وہاں میرا واپس آنا یقینی تھا۔ سازش کی منصوبہ بندی کرنے والے جانتے تھے کہ جب میں گاڑی کو ریورس کروں گا تو مجھے بریک سسٹم کے ختم ہو جانے کا پتا چل جائے گا۔ پھر میں گاڑی کو وہیں چھوڑ دوں گا اور کوئی ٹیکسی تلاش کروں گا اور ایسا ہی ہوا تھا۔

میں نے باہر آتے ہی جو ٹیکسی دیکھی اسی میں بیٹھ گیا تھا۔ میرے دشمنوں کا پلان کامیاب ہوگیا تھا۔ یہ پلان فیل بھی ہوسکتا تھا۔ میں اس ٹیکسی میں نہ بیٹھتا یا کوئی دوسری ٹیکسی نمودار ہو جاتی لیکن ٹیکسی ڈرائیور کی بات نے مجھے قائل کر لیا تھا کہ مجھے موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ دوسری ٹیکسی نہ جانے کب ملے اور اکیلے آدمی کو کیا فرق پڑتا ہے اگر پیچھے سامان پڑا ہے' وہ آگے بیٹھ جائے۔

غور طلب سوال یہ تھا کہ آخر کوئی کب سے اور کہاں سے میرے تعاقب میں تھا۔ میرا شہر آنا کسی طے شدہ پروگرام کے مطابق نہیں تھا۔ میں اچانک روانہ ہوا تھا بلکہ کر دیا گیا تھا۔ مجھے اپنی آمد کا کسی کو بتانے کا موقع ہی نہیں ملا تھا پھر فاروقی کے آفس میں میری گاڑی کو کس نے دیکھا؟ کیا یہ اتفاق تھا یا کوئی شہناز کے گھر سے میرا تعاقب کرتا ہوا آیا تھا جہاں میں نے فریال کو اتارا تھا؟ کیا ہر جگہ جہاں میری واپسی متوقع ہو کسی جاسوس کی ڈیوٹی لگا دی گئی تھی؟ میرا اپنا گھر' راجا کا گھر' شہناز کا گھر اور فاروقی کا آفس وہ مقامات تھے جہاں کبھی نہ کبھی مجھے آنا تھا۔

یہ خیال مجھے بعید از امکان لگتا تھا کہ ہر جگہ کی جاسوسی دن رات جاری ہو۔ زیادہ قرین قیاس یہ بات لگتی تھی کہ کوئی ست بدھائی سے میرا تعاقب کرتا ہوا آیا۔ وہ ست بدھائی سے دور رہا اگر وہ راستے میں کہیں موجود ہوتا تب بھی مجھے پتا چل جاتا۔ ست بدھائی سے جی ٹی روڈ پر دنیا تک سڑک پر ٹریفک برائے نام تھی۔ کوئی گاڑی میری گاڑی کے پیچھے آتی تو مجھے فوراً شک ہو جاتا۔

میرا تعاقب دینہ کے موڑ سے شروع ہوا۔ جی ٹی روڈ پر لاہور کی طرف سے ہر قسم کی ٹریفک کا سیل رواں آتا ہے جس میں بسوں اور ویگنوں سے زیادہ کاریں ہوتی ہیں۔ میں کیسے نوٹ کر سکتا تھا کہ کون سی کار میرے پیچھے آ رہی ہے۔ اس ناکا بندی کے لیے کسی گاڑی میں صرف ایک شخص کا موجود رہنا کافی تھا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے فاروقی کے آفس تک پہنچ گیا۔ باقی کام خود میں نے آسان بنا دیا۔ میں نے اپنی گاڑی وہیں چھوڑ دی اور فاروقی کا آفس قبل از وقت بند ہوگیا۔ میرے دشمن اطمینان سے میری واپسی کا انتظار کرتے رہے۔

دوسری صورت یہ ہو سکتی تھی کہ ایک آدمی موبائل فون کے ساتھ ست بدھائی کے قریب موجود رہے اور میرے روانہ ہونے کی اطلاع کر دے۔ باقی کام دوسروں کا لیکن ست بدھائی کے آس پاس دور تک کسی موبائل فون کمپنی کا ٹاور نہیں تھا اور کوئی سگنل موصول نہیں ہوتا تھا۔ خود ہم وہاں سیٹلائٹ ریسیور استعمال کر رہے تھے۔

وقت کے ساتھ ساتھ میری بے چینی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ مجھے یہاں قید کرنے والا سامنے آ کے بات کرے۔ مجھے فریال کا خیال آ رہا تھا۔ اپنے گھر والوں کی فکر تھی' راجا کا شہناز سے رابطہ تھا۔ اس نے بتا دیا ہوگا کہ ہم پہنچنے والے ہیں اور فریال کے پہنچنے پر وہ حیران بھی نہیں ہوئی تھی۔ جیسے یہ سب متوقع تھا۔ میرے لاپتا ہونے کی خبر ایک سے دوسرے تک پہنچے گی تو بڑی خرابی ہوگی۔ راجا یا فریال میں سے کوئی اتنا بے وقوف نہیں کہ میرے گھر والوں کو کچھ بتائے۔ سب جانتے ہیں کہ ایسی خبر کا میرے والدین اور میری دادی پر کیا اثر ہوگا۔

بے چینی کے ساتھ اب مجھے کمزوری بھی محسوس ہو رہی تھی جو بھوک کا نتیجہ تھی۔ پندرہ منٹ سے زیادہ ہو گئے تھے کہ میں بے چارگی کی تصویر بنا بیٹھا صرف سوچ رہا تھا۔ آخر میں نے کیوں فرض کر لیا ہے کہ اس قید سے رہائی میرے بس کی بات نہیں؟ کوشش کیے بغیر یہ شکست خوردہ ذہن کی مایوسی کس لیے؟ میں نے سوچا۔

پھر بھی اٹھا اور میں نے دروازے کو کھولنا چاہا مگر وہ باہر سے بند تھا۔ فلمی اسٹائل میں اسے شانوں کی ٹکر سے توڑنا ناممکن تھا۔ میں نے کھڑکی کھولی مجھے اپنے سامنے ایک تاریک گلی سی دکھائی دی۔ باہر کی خنک اور تازہ ہوا نے مجھے کچھ فرحت اور توانائی عطا کی۔ میں نے گرل سے منہ لگا کے اور چلا کے کہا ''ہیلو......کوئی ہے؟''

میری اپنی آواز سے منتشر ہونے والی خاموشی پھر یوں منجمد ہوگئی جیسے پرسکون تالاب کی سطح پر کسی کنکر سے ذرا سی دیر کے لیے لہروں کے دائرے پھیلیں اور سطح آب پھر شیشے کی طرح ساکت ہو جائے۔ میں کئی بار چلایا مگر سکوت سے جواب کچھ نہ آیا۔

باہر ویسے بھی کوئی آواز نہ تھی۔ نہ کسی گاڑی کے گزرنے کی۔ نہ کسی بلی کتے کی یا پرندے کی۔ نہ وہ آواز جو زندگی اور آبادی کی علامت ہوتی ہے۔ کسی گھر میں برتن گرنے کی۔ کسی بچے کے رونے کی۔ کسی دروازے کے بند ہونے کی۔ ریڈیو' ٹی وی یا ڈیک سے نکلنے والی نغمہ سازی کی۔ ایک مسلسل گہرا اور بے حس سناٹا ہر سمت مسلط تھا۔

غالباً یہ رات ہی تھی۔ معلوم نہیں رات کا کون سا پہر تھا۔ شاید لوگ سوئے پڑے تھے۔ خوابوں کے شبستاں میں گم تھے۔ گھر اور دور ہوں گے۔ بند دروازوں سے گزر کے میری آواز کسی کے کانوں تک کیسے پہنچ سکتی ہے۔ کیا پتا یہ بیڈ روم کوئی تہ خانہ ہو۔

مجھے یہاں چھوڑ کے جانے والے بے وقوف نہ تھے کہ رسک لیتے۔ انہوں نے فرار کے تمام امکانات پر غور کیا ہوگا اور وہ اپنے فول پروف انتظام سے مطمئن ہوں گے۔ میں ان کی واپسی کا انتظار کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔

باہر سے سنائی دینے والے ایک ہارن کی آواز نے میری کوفت کو کچھ کم کیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ گرد و نواح میں آبادی ہے۔ ہارن پھر بولا۔ دوسری بار زیادہ لمبے وقفے تک اس کی آواز آئی پھر کوئی گیٹ کھولا گیا اور انجن کی غراہٹ سے یوں لگا جیسے کوئی گاڑی اندر آئی ہو۔

اس کے بعد پھر خاموشی چھا گئی۔ انتظار کا ایک طویل وقفہ میں نے اٹھتے بیٹھتے اور ادھر سے ادھر ٹہل کر گزارا۔ خود سے زیادہ میں ان سب کے لیے پریشان تھا جو میری اچانک گمشدگی سے پریشان ہوں گے۔ گھڑی ہوتی تو میری نظر بار بار وقت کی رفتار پر جاتی مگر اب مجھے سیکنڈ اور منٹ بھی گھنٹوں کی طرح لگ رہے تھے۔

میں مایوسی کے گرداب میں غوطہ زن تھا کہ اچانک کار کا انجن پھر غرایا۔ کار کا دروازہ بند ہوا۔ میں نے وہ مخصوص آواز سنی جو کار کو ریورس گیئر میں تیز چلانے سے پیدا ہوتی ہے۔ میری امید بکھر جاتی۔ شاید کوئی اسی گھر میں آیا تھا۔ تو کیا اب وہ واپس جا رہا تھا۔ اس کے آنے اور جانے کا مقصد کیا تھا؟ مقصد کچھ بھی ہو۔ مجھے اس کو متوجہ کرنا چاہیے اگر میں باہر کی آوازیں صاف سن سکتا ہوں تو میری آواز کسی کے کان تک کیوں نہیں جائے گی۔

ایک بار پھر میں نے دروازے پر زور زور سے ہاتھ مارے۔ اسے ہلایا بجایا اور چیخ چیخ کے کہا ''ہیلو! کوئی ہے......؟'' لیکن ایک بار پھر میری کوشش رائگاں گئی۔ میں تھک کر صوفے پر گر گیا۔ اسی وقت اچانک باہر سے دروازے کے قفل میں چابی لگائی گئی۔ میرے اٹھنے سے پہلے ہی دروازہ کھلا اور ایک عورت اندر آ گئی۔

وہ تیس سال سے زیادہ عمر کی مگر بہت پرکشش عورت تھی۔ اس کا رنگ اتنا اجلا نہیں تھا مگر کسی ماہر فن میک اپ آرٹسٹ نے اس کے سانولے پن میں برگ گلاب جیسا نکھار پیدا کر دیا تھا۔ فرق کا اندازہ اس کے ہاتھوں کی جلد سے ہوتا تھا جہاں اس کے شانوں تک عریاں بازوؤں کا رنگ سانولا تھا۔ اس کا لباس جینز اور ٹی شرٹ پر مشتمل تھا۔ ٹی شرٹ ہموار کیے ہوئے پیٹ سے جتنی اوپر تھی، پتلون کو بھی پر اتنی ہی نیچے نظر آ رہی تھی۔ اوپر سے چست پتلون بھی گھٹنوں سے ذرا نیچے ختم ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے پر آنکھوں کو بڑی محنت سے سجایا گیا تھا۔ بھنوئیں اور پلکیں سنوارنے کے علاوہ آنکھوں پر نیل پالش اور لپ اسٹک سے میچ کرنے والا رنگ اپنی شوخی پر نازاں تھا تو آنکھوں کے اندر جھیل کے ساکت شفاف پانی میں جھلکتے آسمان کی نیلاہٹ کا تاثر دینے والے کنٹیکٹ لینس فٹ تھے۔ اس کے شانوں تک تراشیدہ بالوں میں براؤن اور سنہرے رنگ کی آمیزش تھی اور چہرے کے گرد ہالہ بناتے یہ ریشم کے سرسراتے پھسلتے ڈھیر جیسے بال چہرے کی ایک ایک حرکت کے ساتھ مسلسل آگے پیچھے جھولتے تھے۔

وہ دراز قد اور سلم تھی اور حسن و رعنائی کے اس نمائشی اہتمام اور ناز و انداز کے اتنے پرتکلف اسباب کے ساتھ وہ عورت سے زیادہ ایک بجی سجائی گڑیا لگتی تھی اگر وہ سارا میک اپ اتار دیتی اور عام لباس پہن لیتی تو شاید پہچانی بھی نہ جاتی۔ میں سمجھ گیا کہ وہ اشتہاری فلموں کو اپنی جلوہ سامانی سے پرکشش بنانے والی ماڈل ہے جو شاید اس وقت بھی ٹی وی کے ناظرین کے لیے کسی پروڈکٹ کی تشہیری فلم میں اپنی جنسی کشش کی بھرپور عکاسی کر کے لوٹی ہے۔

میں یہ دیکھ رہا تھا کہ عورت کے حسن و شباب کو مارکیٹنگ کے بازی گروں نے منافع کمانے کے لیے کتنا بے وقعت بنا دیا ہے۔ کتنا پرتصنع کر دیا ہے اور کتنا بے حجاب کہ اب نسوانیت سے وابستہ شرم و حیا کے تصورات کسی اور دنیا کی کہانی لگتے ہیں۔ وہ یہ سمجھی کہ مجھے اس کے نظارہ جمال نے بے خود کر دیا ہے۔

فتح مندی کا غرور اس کی آنکھوں میں اتر آیا اور اس کی مسکراہٹ میں عیاں ہو گیا ''ہائے۔ میں نادیہ ہوں۔'' اس نے ایک ادائے دلبری کے ساتھ سر کے بالوں کو جھٹکے سے پیچھے کیا اور لہرا کے صوفے پر مجھ سے ایک فٹ دور بیٹھ گئی ''تم رفیق ہو ناں......؟''

اس کے وجود سے خوشبوؤں کا ایک بگولا سا اٹھا اور میرے گرد محیط ہو گیا ''کیا یہ تمہارا گھر ہے؟'' میں نے کہا۔

اس نے عادتاً بالوں کو ہاتھ سے پیچھے کیا مگر وہ ایک سیکنڈ میں پھر چہرے پر آ گئے ''نہیں، تمہاری طرح میں بھی مہمان ہوں۔''

میں اٹھ کھڑا ہوا ''مہمان!'' میں نے تلخی سے کہا ''کیا تم

کو بھی میری طرح لایا گیا ہے؟ ناک آؤٹ کر کے، دھوکے سے؟ کیا مہمانوں کو بھوکا پیاسا اور قید تنہائی یا مقفل دروازے کے پیچھے ڈال دیا جاتا ہے۔''

اس نے اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا ''ٹیک اٹ ایزی۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔''

میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا ''مس نادیہ! مجھے تمہارے مطلب سے کوئی سروکار نہیں۔ تم نے ہی آ کے یہ قفل کھولا ہے ورنہ میں اس کمرے میں بے ہوش پڑا تھا۔ کوئی مجھے پوچھنے نہیں آیا۔ میں مر بھی جاتا تو کسی کو فرق نہ پڑتا۔ اب مجھے بتاؤ کہ تم کون ہو؟ کس نے بھیجا ہے ہیں اور کس لیے؟ تم جیسی لڑکیاں اپنی مرضی سے کچھ نہیں کرتیں۔''

اس کا رنگ کچھ پھیکا پڑ گیا ''تم ...... جانتے ہو مجھے؟''

''اگر تمہاری مراد شناسائی سے ہے تو میرا جواب ہے نہیں۔ نام تمہارا کچھ بھی ہو مجھے فرق نہیں پڑتا۔ ہاں، کام تم ہمیشہ پیسے کے لیے کرتی ہو اور یہ سمجھتی ہو کہ جو معاوضہ ادا کر دیتا ہے اسے اپنی مرضی کے مطابق تم سے کام لینے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ دس از بزنس۔ اس کا اخلاقیات سے کوئی تعلق نہیں۔ تم جیسی لڑکیاں ماڈل، ایکٹریس، کال گرل، سیکریٹ ایجنٹ، کچھ بھی ہو سکتی ہیں اور کچھ بھی کر سکتی ہیں۔''

اس نے مجھے نظر جما کے دیکھا۔ ''یو آر رائٹ۔ میں ایک ماڈل ہوں۔''

''اس وقت کس کے لیے ماڈلنگ کر رہی ہو؟ اس رول کے لیے کس کا اسکرپٹ ہے۔ تمہیں کیا کرنا ہے؟ یہ کس نے بتایا ہے؟ مجھے اس معاوضے سے غرض نہیں جو تمہیں ادا کیا گیا ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تمہیں کس نے ہائر کیا ہے......اور کس برے کام کے لیے؟''

وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر جا بیٹھی اور دوسرے صوفے پر نیم دراز ہو گئی۔ ''اگرچہ تم بہت تلخ ہو رہے ہو......لیکن مجھے تم اچھے لگے۔''

میں نے کہا ''دیٹ از اے گڈ اسٹارٹ۔ کیا اب میں بھی کہوں کہ یو لک بیوٹی فل۔ اینڈ ویری سیکسی۔''

اس نے اپنے ہینڈ بیگ میں سے ایک سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور پھر ایک لائٹر...... ''ڈو یو اسموک۔''

میں نے نفی میں سر ہلا دیا اور اسے پتلے سے سگریٹ کو ہونٹوں میں لگا کے نازک سنہرے لائٹر سے جلاتے دیکھتا رہا۔ اس کا ہاتھ لائٹر کے ساتھ کانپ رہا تھا۔ یہ اعصابی کشیدگی کی علامت تھی یا پھر نشے کی۔

''پلیز ڈونٹ مائنڈ۔'' اس نے ایک کش لے کر دھوئیں کو آہستہ آہستہ فضا میں چھوڑا ''مسٹر رفیق! میری اور تمہاری اپنی اپنی مجبوریاں ہیں جنہوں نے ہمیں اس چھت کے نیچے آج کی رات اکٹھا کر دیا ہے۔ میری مجبوری تو تم نے سمجھ لی... تمہاری مجبوری کیا ہے۔ یہ جاننے سے پہلے مجھے بتاؤ، تم نے کچھ کھایا پیا ہے یا نہیں؟ واٹ کین آئی ڈو فار یو؟''

میں نے برہمی سے کہا ''بات تو تم ایسے کر رہی ہو جیسے سب کچھ کر سکتی ہو۔ خود تمہاری اپنی حیثیت اس گھر میں کیا ہے؟ اگر تم کچھ کرنا چاہتی ہو تو مجھ پر کوئی احسان مت کرو، بس مجھے جانے دو۔''

''احسان تو یہ بھی ہوگا۔'' اس نے ایک گہری سانس لی ''مگر آئی ایم سوری! اس معاملے میں تمہاری طرح میں بھی بے اختیار ہوں۔''

''یعنی تم بھی قید ہو؟''

''ہاں، یہی سمجھ لو۔ جیسے وہ جو قیدیوں کی نگرانی پر مامور ہوتے ہیں۔ وہ بھی تو جیل میں ہی ہوتے ہیں۔''

''کیا مجھے اور تمہیں یہاں قید کرنے والا ایک ہی شخص ہے؟ کون ہے وہ؟'' میں نے کہا۔

''سب معلوم ہو جائے گا۔ اتنی جلدی کیا ہے؟'' اس نے بڑی ہوشیاری سے مجھے ٹال دیا اور آدھی سگریٹ کو میز پر رکھی خوبصورت ایش ٹرے میں مسل دیا۔

میں نے کہا ''قید سے رہائی کی جلدی کسے نہیں ہوتی۔ میں یہاں اطمینان سے بیٹھ کر تم سے دل بستگی کی باتیں کیسے کر سکتا ہوں جبکہ مجھے علم ہے میرے لاپتا ہونے سے کتنے لوگ پریشان ہوں گے۔''

''لیکن رہائی حاصل کرنا بھی تمہارے اختیار میں کہاں ہے؟ یہ سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ جو لوگ تمہیں لائے ہیں، وہ تمہارے ساتھ کوئی عملی مذاق نہیں کر رہے ہیں۔ انہوں نے مجھے بھی ایک مقصد کے تحت بھیجا ہے۔ وہ تمہیں قتل کر کے تمہاری لاش کہیں بھی پھینک سکتے تھے۔'' وہ سمجھانے والے انداز میں بولی۔

''لیکن ان کی بھی کچھ مجبوریاں ہیں مثلاً مجھے زندہ رکھنا؟''

''رائٹ، اگر تم ضرورت محسوس نہیں کرتے کھانے پینے کی، تو ہم باتیں کرتے ہیں۔ ابھی آدھی رات پڑی ہے۔'' اس نے ایک توبہ شکن انگڑائی لی۔

میں نے اس کی بات کاٹ دی ''اگر میں تمہیں بے بس کر کے نکلنا چاہوں تو کیا ہوگا؟ تم مجھے نہیں روک سکو گی مس نادیہ۔''

''تم کہاں تک جاؤ گے؟ زیادہ سے زیادہ باہر والے دروازے تک۔ اس دو بیڈ روم کے گھر سے نکلنے کا وہی ایک راستہ ہے جو بند ہے۔ آس پاس دوسرا کوئی گھر نہیں۔ قریب ترین گھر بھی بہت دور ہے۔ بفرض محال تم ٹارزن کی طرح دروازے کو توڑ دو یا گرل اکھاڑ کے نکل جاؤ تو باہر جانے سے آزاد نہیں ہو جاؤ گے۔ جو لوگ تمہاری نگرانی پر مامور ہیں' وہ تمہیں پھر پکڑ لائیں گے۔ مقابلہ کرو گے تو مارے جاؤ گے' کیا فائدہ؟'' وہ خاموش ہو گئی۔

میں کچھ دیر اسے دیکھتا رہا ''او کے۔ تم کیا بات کرنا چاہتی ہو؟''

اس نے کہا ''مجھے نہیں معلوم تم یہاں کب سے قید ہو۔ یہ ابھی خود تم نے بتایا تھا کہ تم کو ناک آؤٹ کر کے لایا گیا تھا اور تم بھوکے پیاسے پڑے تھے۔''

''میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔''

وہ نرمی سے بولی ''پھر میں تمہارے لیے کچھ لاتی ہوں۔ یہاں سب کچھ ہے۔ بولو' کیا لو گے' اسکاچ...... بیئر' وسکی...... یا پہلے کچھ کھاؤ گے؟''

میں نے کہا ''اگر مل سکے تو کافی' بلیک...... اور جو بھی کھانے کے لیے ہو۔''

وہ بل کھا کے اٹھی ''مجھے دس منٹ دو۔ میں چینج بھی کر لوں۔''

میں نے کہا ''کیا میں...... تمہارے ساتھ آ سکتا ہوں؟''

وہ پلٹی ''آف کورس اگر تم میرے بیڈ روم میں مجھے ڈریس بدلتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہو تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ میرے لیے اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ دن میں پتا نہیں کتنی بار کپڑے اتارتی ہوں۔ میک اپ روم میں کسی کے ہونے سے مجھے فرق نہیں پڑتا۔ میرا جسم دکھانے کے لیے ہی تو ہے۔''

میں نے خفت سے کہا ''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔''

''پھر شاید تم تصدیق کرنا چاہتے ہو کہ میں نے تم سے جھوٹ تو نہیں بولا۔ خود دیکھنا چاہتے ہو کہ رہائی کے لیے تمہاری کوشش کامیاب ہونے کے امکانات کتنے ہیں؟ ٹھیک ہے' گھر میں جہاں چاہو جا کے دیکھ لو۔ پہلی بات تو یہ کہ تمہیں یہاں ایسی کوئی بھی چیز نہیں ملے گی جو خطرناک ہو مثلاً اسلحہ' کچن میں چھری ضرور ہے مگر مجھے قتل کرنے کے لیے تمہیں اس کی کیا ضرورت ہے۔ دوسری بات یہ کہ کسی مقصد کے بغیر خودکشی وہی کرتے ہیں جن کے پاس عقل نام کی کوئی چیز نہ ہو۔''

جب وہ دروازے سے نکل گئی تو میں نے باہر جا کے دیکھا جسے میں نے گیلری سمجھا تھا وہ عقبی حصے کی گیلری تھی۔ اس کی دیواروں پر چھت تک لوہے کی گرل حفاظت کے لیے لگائی گئی تھی۔ دروازہ ایک لاؤنج میں کھلتا تھا جس میں وال ٹو وال کارپٹ تھا۔ بید کے کشن والے صوفے پڑے تھے اور ایک بہت بڑا ایل سی ڈی یا ڈیجیٹل ٹی وی رکھا ہوا تھا۔

میرے دائیں ہاتھ پر بھی ایک بیڈ روم تھا جس میں لائٹ جل رہی تھی۔ نادیہ نے لباس بدلنے کے لیے اس کا دروازہ بند کرنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ میں نے لاؤنج کے ایک حصے میں کچن کو دیکھا اور پھر اس دروازے کو جو باہر سے مقفل تھا۔ نادیہ نے غلط نہیں کہا تھا۔ اسے صرف ٹارزن ہی توڑ سکتا تھا۔ پردے ہٹا کے میں نے کھڑکی کھولی تو گرل سے مجھے باہر کا منظر صاف نظر آنے لگا۔

باہر تاریکی میں دو سائے متحرک تھے۔ وقفے وقفے سے روشن ہونے والی ایک چنگاری وہ سگریٹ تھی جو ایک محافظ پی رہا تھا۔ معلوم نہیں یہ کون سی غیر آباد جگہ تھی یا کوئی نئی آبادی تھی کہ مجھے دوسرا مکان دکھائی نہ دیا۔ نظر آنے والی روشنی صرف ستاروں کی تھی جو رات کا باقی سفر طے کر رہے تھے۔

نادیہ کی بات میری سمجھ میں آنے لگی تھی۔ میں خود کو قائل کرتا رہا کہ ہر خطرناک صورت حال میں دماغ ہی آدمی کا سب سے موثر ہتھیار ہوتا ہے چنانچہ مجھے جوش سے نہیں ہوش سے کام لینا ہوگا۔ نادیہ ہی وہ لڑکی تھی جو مجھے بتا سکتی تھی کہ میرے اغوا کا مقصد کیا تھا لیکن یہ کام سختی اور زور زبردستی سے نہیں ہو سکتا تھا۔ نادیہ جیسی لڑکیوں کو بلیک میلنگ کے لیے استعمال کرنے کا دستور پرانا ہے۔ وہ یقیناً مجھے جذباتی طور پر ایکسپلائٹ کرے گی۔ دیکھنا یہ ہے کہ میں اسے ایکسپلائٹ کر سکتا ہوں یا نہیں؟ بالآخر کون شکار ہوتا ہے اور کون خود کو شکاری ثابت کرتا ہے۔

جب وہ لباس بدل کے برآمد ہوئی تو ایک لمحے کے لیے میں دم بخود رہ گیا۔ دوسرے لمحے میں نے خود کو سنبھال لیا اور محتاط ہو گیا۔ میرے لیے اب شک کی کوئی بات نہیں رہی تھی کہ نادیہ نے مجھے ترغیب کے پرہوس جال میں پھانسنے کی کوشش کا آغاز کر دیا ہے۔ اس نے اب ہلکے زرد رنگ کے نائلون کی تقریباً شفاف نائٹی پہن رکھی تھی جس میں سے اس کا سانولا بدن اپنی تمام حشر سامانی کے ساتھ جھلک دکھاتا تھا۔

مجھے بخوبی اندازہ تھا کہ اب وہ جارحانہ پیش قدمی سے مجھے فتح کرنے کے لیے کیا حربے آزمائے گی لیکن مجھے اپنے

ذہن اور اعصاب پر مکمل اختیار حاصل تھا۔ چنانچہ جب وہ کافی اور سینڈوچ ایک ٹرے میں رکھ کر لائی تو اس کے ساتھ ہی ایک نئی ہیجان خیز خوشبو بھی ساتھ لائی۔ اس نے ٹرے میں سے شیشے کا نازک جام اٹھا لیا جس میں کوئی سرخ رنگ کی شراب تھی۔ وہ میرے سامنے ایک صوفے پر نیم دراز ہو گئی۔

سینڈوچ کھاتے ہوئے میں نے کہا ''نادیہ! تم نے کہا تھا کہ تم ایک ماڈل ہو...... لیکن میں نے تمہیں کبھی نہیں دیکھا۔''

''چلو' کوئی بات نہیں...... اب دیکھ لو۔'' وہ مسکرائی۔

''ایک بات کہوں...... برا تو نہیں مانو گی؟''

''یہاں میں کسی بات کا برا ماننے کے لیے نہیں آئی ہوں۔''

میں نے کہا ''اپنی یہ کوشش چھوڑ دو۔ تم اپنی حیوانی کشش سے مجھے مغلوب نہیں کر سکو گی۔''

''یہ تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہو؟''

''میں خود کو جانتا ہوں۔ مجھے خود پر بھروسا ہے۔'' میں نے کہا۔

''چلو دیکھیں گے...... ابھی تو بہت رات پڑی ہے۔'' اس نے جام خالی کرتے ہوئے چیلنج کے انداز میں کہا۔

میں نے کہا ''جب آگ نظر آ جائے تو اس سے دور رہنے والے کا دامن محفوظ رہتا ہے۔''

''ہاں...... مگر اندر کی آگ نظر کہاں آتی ہے؟'' وہ بولی۔

''میرے دشمن تو مجھے اچھی طرح سے جانتے ہیں۔ اس کے باوجود انہوں نے مجھ پر یہ گھٹیا حربہ آزمایا......'' میں نے افسوس سے سر ہلایا۔

وہ معنی خیز انداز میں ہنسی ''شاید تم اپنے دشمنوں کو اتنی اچھی طرح نہیں جانتے۔ ٹھہرو' میں ایک جام تمہارے لیے بھی لے آؤں۔''

میں نے کہا ''شراب تو مجھ پر تم سے زیادہ حرام ہے۔''

''اچھا میں پی لوں گی تمہارے نام پر۔ کافی اور لو گے؟'' وہ جاتے جاتے رکی۔

''یہ تم نے میرے دل کی بات کہی۔''

اس نے مجھے کافی کا دوسرا مگ لا کر دیا اور خود میرے قریب بیٹھ کے شراب کے جام کو خالی کرنے لگی۔ یہ دوسرا مگ زیادہ تلخ تھا یا پھر مجھے ایسا لگا۔ میں سمٹ کر بیٹھ گیا۔ ''وقت کیا ہوا ہے؟''

وہ خمار آلود لہجے میں بولی ''وقت کی فکر مت کرو۔ رات آدھی گزری ہے تو آدھی ابھی باقی ہے۔ ایک گھنٹا پہلے تاریخ بدل گئی ہے۔ دن بدل گیا ہے' اتوار کی جگہ سوموار آ گیا ہے۔ کیا فرق پڑتا ہے اس سے۔''

اس کی بات نے میری الجھن دور کر دی۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ میری بے ہوشی کا وقفہ چند گھنٹوں پر ہی مشتمل تھا۔ فاروقی کے آفس کے باہر جب میں نے گھڑی دیکھی تھی تو رات کے ساڑھے سات بجے تھے۔ اب ایک بجا تھا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ میں تین چار گھنٹے بعد ہی ہوش میں آ گیا تھا۔

میں نے کہا ''نادیہ! یہ جو تم پی رہی ہو' کیا یہ واقعی شراب ہے' کسی بھی شراب سے اتنی جلدی تو نشہ نہیں ہوتا۔''

''تم نے تو کبھی پی ہی نہیں۔ تمہیں کیا معلوم؟'' وہ جھوم کے بولی۔

میں نے کہا ''ایکٹنگ مت کرو۔ مجھے بتاؤ تمہیں یہاں کس نے بھیجا ہے اور کیوں؟ میرے باری میں تم کیا جانتی ہو؟''

''سب کچھ۔ تم پہلے کیا تھا اور اب کیا ہو؟ تمہارے نام اچانک کروڑوں کی لاٹری نکل آئی ہے۔ تمہارا باپ تو ایک غریب استاد تھا مگر تم ایک ریاست کے نواب بن گئے ہو' ست بدھائی کے نواب۔''

''اور......؟'' میں نے اسے غور سے دیکھا۔

''اور یہ کہ...... تم نے ابھی تک شادی نہیں کی ہے۔ کیونکہ تم بڑے عجیب چکر میں پھنس گئے ہو۔ تم سے محبت کرتی ہے ایشا عرف عائشہ...... جو ایک لارڈ کی بیٹی ہے...... اور بہت خوبصورت بھی ہے۔ تمہارے لیے اپنا گھر' ملک اور مذہب سب چھوڑنے کے لیے تیار ہے...... مگر تم محبت کرتے ہو فریال سے...... لیکن فریال تمہیں مل نہیں سکتی۔''

''کیوں نہیں مل سکتی؟'' میں نے اسے کریدا۔

''اس لیے...... کہ وہ سلطان کی منگیتر ہے۔ صفدر سلطان مرزا کی ہونے والی بیوی ہے۔ لندن میں وہ کس کے گھر میں رہتی تھی؟ صفدر سلطان مرزا کے گھر میں...... اور تم اس سے چھپ چھپ کے ملتے تھے۔''

وہ اب واقعی نشے میں بول رہی تھی لیکن یہ دو جام پینے کا نشہ نہیں تھا۔ یہاں آنے سے پہلے اس نے نہیں پی تھی تو گھر میں آ کے ضرور پی تھی۔

''یہ سب کس نے بتایا ہے تمہیں؟'' میں نے کہا۔

''خود...... خود صفدر سلطان مرزا نے اور کس نے؟''

''یعنی میرا اندازہ درست ہی تھا۔ میں اسی کی سازش کا شکار ہوا ہوں۔'' میں نے کہا ''اور کیا بتایا ہے اس نے؟''

''اس نے مجھ سے کہا کہ تم نے فریال کو اغوا کر لیا ہے اور کہیں چھپا رکھا ہے۔ بتاؤ' کہاں ہے فریال؟''

اچانک مجھے گرمی محسوس ہونے لگی۔ یہ نومبر کا وسط تھا اور نصف شب کے بعد خنکی بڑھ جاتی تھی مگر مجھے یوں لگا جیسے میں جون کی دھوپ میں ہوں۔ میں نے فریال کو اغوا نہیں کیا۔ میرا خیال ہے' خود سلطان نے اسے قتل کر کے اس کی لاش کہیں غائب کر دی ہے۔''

''اچھا...... چلو دفع کرو فریال کو بھی۔ تم مجھ سے شادی کر لو۔ کیا میں ان سے اچھی نہیں ہوں۔ دیکھو...... غور سے دیکھو' دل کی نظر سے دیکھو۔''

میرا جسم اب گرم ہونے لگا تھا۔ یہ بڑی عجیب سی کیفیت تھی جو میں نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے میرے بدن کا ہر حصہ شعلوں کی لپیٹ میں ہے۔ یہ حدت میرے جذبات کو بھڑکا رہی تھی اور اپنی پوری کوشش اور خواہش کے باوجود میں اس اندر کی آگ سے باہر نکلنے میں ناکام تھا۔

وہ اب نائٹی کو بھی اتار کے پھینک چکی تھی اور خود کو ہر زاویے سے میرے سامنے پیش کر رہی تھی۔ میرے اعصاب کے تاروں میں سنسنی سی دوڑ رہی تھی اور میرا وجود ایک آتش فشاں بن گیا تھا۔ رات کی خاموشی میں بھوکے بھیڑیے غرانے لگے تھے۔ اندھیرے سے شیطانی ہیولے نکل کر ہوس کا ننگا رقص کر رہے تھے۔ میری وحشت میں اضافہ ہو رہا تھا۔

''اور دیکھو گے...... ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے۔ دیکھو' یہ میری فلم ہے۔ میں کیا کسی ایشوریا رائے سے کم ہوں۔'' وہ ہنسی۔

اب وہ مجھے ٹیلی وژن کے اسکرین پر نظر آ رہی تھی۔ وہ ادھر بھی تھی اور ادھر بھی۔ اندر بھی تھی اور باہر بھی۔ اس کا ہر انداز مجھے دیوانہ بنا رہا تھا اور میری مزاحمت کی قوت کو تہس نہس کر رہا تھا۔ بالآخر بند ٹوٹ گیا۔ سیلابی ریلا مجھے ایک تنکے کی طرح بہا لے گیا۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنی گاڑی کی پیچھے والی سیٹ پر دراز تھا۔ میں نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول کے دیکھا۔ باہر صبح کی دھوپ جگمگا رہی تھی۔ میں نے گھبرا کے اٹھ بیٹھا۔ میرے جسم پر میرا پورا لباس تھا۔ میری کلائی پر گھڑی بھی بندھی ہوئی تھی۔ گھڑی کی سوئیاں صبح کے سات بجے کا وقت دکھا رہی تھیں۔ یہ انیس نومبر کی تاریخ تھی اور پیر کا دن تھا۔ میں نے اپنی پتلون کی جیب کو دیکھا۔ اس میں میرا پرس بھی تھا۔ میرے کریڈٹ کارڈ' نقد رقم' شناختی کارڈ' سب محفوظ تھے۔

میں نے اپنا سر تھام لیا۔ آخر یہ سب کیا تھا۔ وہ سب جو میں نے دیکھا۔ وہ سب جو مجھ پر بیتی' کیا وہ خواب تھا؟ نہیں' وہ حقیقی زندگی کا تجربہ تھا پھر میں یہاں کیسے آ گیا؟

عمارت کے چوکیدار نے قریب آ کے شیشے پر انگلی سے دستک دی ''صاحب! آپ ادھر گاڑی میں سویا' خیر تو ہے؟''

میں دروازے سے باہر نکلا ''ہاں' دراصل رات کو میری گاڑی کے بریک فیل ہو گئے تھے۔''

چوکیدار کی حیرانی بڑھ گئی ''تو صاحب! آپ نے میرے کو بولنا تھا۔ ہم ادھر گاڑی کا خیال رکھتا' آپ گھر جا کے سوتا۔''

میں نے کہا ''ہاں' یہ بھی ہو سکتا تھا'' اور نیچے جھک کر دیکھا۔

گاڑی کے نیچے بریک آئل پھیلا ہوا تھا۔ اس سے ثابت ہوتا تھا کہ وہ خواب کی بات نہیں تھی۔ مجھے گزری ہوئی رات کا ہر لمحہ یاد تھا اور میں چشم تصور سے ہر لمحے کی تصویر دیکھ سکتا تھا۔ میرا سر گھومنے لگا۔

ابھی تک کسی آفس میں کوئی نہیں آیا تھا۔ میں نے چوکیدار کو بھیجا کہ وہ کسی مکینک کا پتا کرے اور خود پھر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ آہستہ آہستہ میرے اعصاب پر دہشت غالب آ رہی تھی۔ مجھے کچھ اور یاد آ رہا تھا جو خواب کی طرح ہی محسوس ہوتا تھا مگر میں جانتا تھا کہ وہ بھی خواب نہیں ہو سکتا۔

معلوم نہیں رات کے کس پہر میں میری آنکھ کھلی تھی اور میں نے ایک لرزہ خیز منظر دیکھا تھا۔ کمرے کی ہر لائٹ جل رہی تھی۔ وہ ٹی وی جس پر نادیہ کی ایک بلیو فلم چل رہی تھی' اب بھی آن تھا اور ڈی وی ڈی کا خودکار نظام ایک ہی سی ڈی کو بار بار چلا رہا تھا۔

اس بیڈ پر میں تھا۔ آگ میں جلنے والے کی طرح میں نے جسم کے سارے کپڑوں کو اتار پھینکا تھا پھر اس آگ کو نادیہ نے بجھا دیا تھا۔ میرے ساتھ ہی وہ اپنا بے ترتیب جسم لیے پڑی تھی مگر اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور بدن سرد تھا۔ بستر کی شکن آلود چادر پر خون ہی خون تھا۔

پھر...... پھر کیا ہوا تھا اگر میں نے نادیہ کے خون آلود جسم کو اپنے ساتھ پایا تھا تو میں اٹھ کے بھاگا کیوں نہیں تھا؟ بدحواس ہو کے بیڈ سے اترا کیوں نہیں تھا؟ میں پھر کیسے سو گیا تھا؟ یہ کیسے ممکن ہوا کہ یہ سب دیکھنے کے بعد میں نے آنکھیں بند کر لیں اور سوتا رہا؟ کیسے...... کیسے...... کیسے؟ سوچ سوچ کے میرا دماغ ماؤف ہونے لگا۔

کیا یہ آدھی حقیقت تھی آدھا خواب تھا؟ جو کچھ پہلے ہوا

خواب نہیں تھا۔ نادیہ نے دھوکے سے مجھے کافی کے دوسرے مگ میں کوئی دوا ڈال کے پلا دی تھی ورنہ مجھے اپنے حواس اور اعصاب پر پورا قابو تھا۔ اس نے کہا تھا ''یہ تم ابھی سے کیسے کہہ سکتے ہو' ابھی تو بہت رات باقی ہے۔ اس نے مجھے چیلنج کیا تھا۔ اچھا دیکھیں گے کہ تم آگ سے دامن کیسے بچاتے ہو۔

کافی کے دوسرے مگ کا ذائقہ مجھے اسی لیے زیادہ تلخ لگا تھا کہ اس میں کوئی جنسی جذبات میں آگ لگا دینے والی دوا شامل تھی۔ نادیہ جیسی لڑکیاں اپنی پیشہ ورانہ ضروریات کے تقاضوں کو سمجھتی ہیں۔ اسے یقیناً یہ بھی معلوم ہوگا کہ اس دوا کا اثر کتنی دیر بعد ہوگا اور کیا ہوگا؟ درمیانی وقت کو اس نے یوں استعمال کیا جیسے مداری اصل تماشا دکھانے سے پہلے اپنی باتوں سے آتشِ شوق کو بھڑکاتا ہے۔ اس نے اپنے جسم سے ایک چنگاری پیدا کی پھر ٹی وی کی فلم کے مناظر دکھا کے ہوا دی اور وہ آتش فشاں بنا دیا جس نے میری پارسائی کے سارے دعووں کو پھونک ڈالا۔ شاید میری حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی نے میرے غرور کی شکست کا سامان پیدا کیا۔ میں بھول گیا تھا کہ میں نہ فولادی پرزوں سے بنا ہوا روبوٹ ہوں اور نہ فرشتہ۔ میں ایک کمزور خطاکار انسان کے سوا کیا تھا؟

لیکن اس گناہِ آدم کے ارتکاب کے بعد کیا ہوا تھا؟ اپنی جیت کے بعد نادیہ زندگی کی بازی سچ مچ ہار گئی تھی یا وہ محض فریب خیال تھا؟ میرے بہکے ہوئے دماغ کی شرانگیزی تھی یا ایک دہشت ناک خواب تھا؟ اور خیال یا احساس کے ایسے لرزہ خیز تجربے کے بعد یہ کیسے ممکن ہوا تھا کہ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور پھر خوابِ غفلت میں گم ہو گیا۔

وہ نیند بہرحال نہیں تھی' بے ہوشی تھی۔ غالباً ہوش سے بیگانگی کے اس طویل وقفے میں جزوی ہوش کا کوئی مختصر لمحہ آ گیا تھا جب میں نے آنکھیں کھول کے دیکھا تو وہ بھیانک منظر میرے سوئے ہوئے دماغ میں نقش ہو گیا۔ نادیہ نے مجھے ذہن میں شیطانی خیالات جگانے والی جو دوا دی تھی اس کا اثر مرحلہ وار یہی ہوگا۔ پہلے آگ لگانا اور جب آگ سرد پڑ جائے تو دماغ ہر احساس سے بیگانہ ہو کے سو جائے۔

میرا ذہن خواب اور حقیقت کے درمیان عالم برزخ میں تھا۔ مجھے یقین کے اس سراب سے نجات کا راستہ کوئی دکھائی نہ دیتا تھا۔ کیا ہوا تھا' کیا نہیں ہوا تھا۔ کیوں ہوا تھا اور کیسے ہوا تھا؟ یہ سب دماغ میں فتور پیدا کرنے والے سوالات تھے۔

میں نے اپنے ہاتھوں کو دیکھا پھر اپنے کپڑوں کو اور گاڑی کے بیک ویو مرر میں اپنی صورت کو دیکھا۔ احساسِ جرم و گناہ کی خلش میرے دل میں ضرور تھی مگر میرے ہاتھ صاف تھے۔ میرے دامن پر کہیں کوئی داغ نہیں تھا۔ چہرے پر ایک خراش تک نہ تھی۔ اس ایک رات کے دامن میں جتنے آزار تھے کہیں نظر نہ آتے تھے۔ ان کا بار صرف میری روح پر باقی تھا۔

یہ بات بڑی عجیب تھی اگر میں اس لہو میں غرق جسم کے اتنے قریب تھا اور اس خوں رنگ بستر پر موجود رہا تھا تو پھر ایسا کیوں تھا کہ نہ میرے ہاتھوں پر کوئی داغ تھا نہ میرے چہرے پر اگر میرا لباس الگ تھا تو میرے جسم پر کوئی چھینٹا' کوئی دھبا نظر آتا۔ کہیں کوئی خراش ہوتی۔ لہو کا نہ سہی' لبوں کی لالی کا کوئی نقش ہوتا۔ میں اتنا صاف ستھرا اور پاک کیسے ہوں جیسے واقعی خواب میں نادیہ کے ساتھ تھا۔ جبکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔

معاملہ سخت الجھا ہوا تھا۔ یہ یقین کر لینے کے بعد کہ وہ کسی خواب کا بھیانک منظر نہیں تھا جو میرے تصور میں ایسے ٹھہر گیا تھا جیسے ٹی وی پر کسی ویڈیو فلم کا ایک فریم رک جاتا ہے۔ میں یہ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ نادیہ کا قتل کیسے ہوا تھا؟ کیا اسے گولی ماری گئی تھی یا اس کے دل میں خنجر اتار دیا گیا تھا۔ خون اس کے سینے سے نکلا تھا اور اس کے پورے جسم پر اور بستر کی چادر پر پھیل گیا تھا۔

بہت سوچنے پر بھی مجھے کچھ یاد نہ آیا۔ کیا وہ موت کے کرب میں تڑپی تھی' چلائی تھی۔ اس نے مزاحمت کی تھی۔ دست قاتل کو جھٹکا تھا...... یا سوتے میں ہی گولی نے اس کے دل کو پاش پاش کر دیا تھا۔ گولی دور سے نہیں چلائی گئی ہوگی پھر اس کی آواز میں نے کیوں نہیں سنی؟ اگر وہ نیند ہوتی تو میں ضرور جاگ جاتا لیکن میں بے ہوش تھا۔ ایسی بے ہوشی کسی سیکس STIMULANT کا سائڈ ایفکٹ نہیں ہو سکتی۔

یقیناً مجھے بے ہوش کیا گیا تھا اور پھر بے ہوش رکھا گیا تھا۔ دوا کے زیر اثر بے ہوشی عارضی اور ادھوری ہوتی۔ شاید مجھے کوئی انجکشن لگا کے بالکل بے سدھ کر دیا گیا ہوگا۔ اس حد تک کہ نادیہ کو قتل کرنے والوں نے مجھے کپڑے پہنائے اور اٹھا کے واپس یہاں لے آئے مگر مجھے خبر نہ ہوئی۔

ان تمام انتشار پھیلانے والے خیالات پر ایک ہی خیال حاوی تھا۔ کیا اب صفدر سلطان مجھے بلیک میل کرے گا؟ کیا نادیہ کے ساتھ گزرنے والی اس رات کے ہر لمحے کی عکاسی کسی خفیہ کیمرے نے کی ہوگی۔ نادیہ کو اسی مقصد کے لیے بھیجا گیا تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ خود اپنے انجام سے بے خبر تھی۔ اس کے آنے کا مقصد صرف فریال کے بارے

معلومات حاصل کرنا نہیں تھا۔ یہ بات تو ضمنی تھی۔ غیر اہم مہیا ہوئی تھی۔ اسے کہا گیا ہوگا کہ رفیق کے ساتھ تمہاری ایک رات کی فلم بنائی جائے گی۔ اس کا جو معاوضہ چاہو لے لو۔ بس یہ اسے معلوم نہ تھا کہ اس فلم کا آخری سین کیا ہوگا۔ وہ تو آخری سین کی کئی بار عکس بندی کرا چکی تھی۔ اسے کیسے اندازہ ہو سکتا تھا کہ اس بار آخری سین میں ہیرو اظہار محبت کے بعد اس کا خون کر دے گا۔

اگر سلطان نے اس فلم کو میرے خلاف ثبوت کے طور پر استعمال کیا' جو کہ وہ ضرور کرے گا۔ تو میرے خلاف ایک نہیں دو جرم ثابت ہوں گے۔ ایک آبرو باختہ بازاری عورت کے ساتھ شب بسری اور اس کا قتل۔

معلوم نہیں اس فلم کو کہاں کہاں ریلیز کیا جائے گا۔ اسے کون کون دیکھے گا۔ میں کیسے کہہ سکوں گا کہ یہ جھوٹ ہے' غلط ہے' سازش ہے۔ میرا جوش اور جذبہ' میرے جذبات کی شدت اور طلب کی انتہا دیکھ کے کسے یقین آئے گا کہ میں خود وہاں نہیں گیا تھا۔ جو بھی میں نے کیا غیر ارادی تھا۔ اب میں چاہوں بھی تو اس گھر تک دوبارہ نہیں پہنچ سکتا لیکن میں وہاں تھا۔ آخر میں وہاں کیسے پہنچ گیا تھا؟

فلم کے مختلف مناظر میری نظر میں گھوم رہے تھے۔ میں لاؤنج میں کھڑا ہوں۔ وہ ہیجان خیز نائٹی میں سامنے آئی ہے۔ وہ کافی بنا رہی ہے۔ سینڈوچ تیار کر رہی ہے۔ میرے پاس بیٹھی ہے۔ میرے سامنے نیم دراز ہے۔ ہم باتیں کر رہے ہیں' وہ شراب پی رہی ہے۔ او مائی گاڈ!...... اس فلم سے تو یہ بھی ثابت نہیں ہوگا کہ دروازہ باہر سے مقفل ہے اور میں وہاں قید ہوں۔ یہ کہانی بھی جھوٹی لگے گی کہ مجھے ناک آؤٹ کر کے اور کسی ٹیکسی میں وہاں لے جایا گیا تھا۔ ساٹ ساڑھے سات بجے تک فاروقی میرے ساتھ تھا۔ اس نے مجھے اپنے آفس کے سامنے اتار دیا تھا جہاں میری گاڑی موجود تھی۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ اب میں گھر جاؤں گا۔

لیکن میں گھر نہیں گیا تھا۔ میرے والدین کو خبر ہی نہ تھی کہ میں ست بدھائی سے گزشتہ رات ہی لوٹ آیا تھا۔ شہناز جانتی ہے کہ میں نے فریال کو اس کے گھر چھوڑتے ہوئے کیا کہا تھا۔ میں نے کہا تھا کہ پہلے میں فاروقی سے ملوں گا اور پھر اپنے گھر جاؤں گا لیکن میں کہیں اور چلا گیا تھا۔

میرے والدین اور میرے دوست اور جاننے والے سب جانتے تھے کہ میں کون ہوں اور کیا ہوں۔ میرے ظاہر و باطن کا ہر مثبت اور منفی رویہ ان کی نظر سے اوجھل نہ تھا۔ نہ میں فرشتہ تھا اور نہ شیطان۔ ایک وقت تھا جب میں غلط راستے پر غلط لوگوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ وہ آغاز شباب کا دور جنوں تھا۔ میں نے بہت سے غلط کام کیے۔ کچھ اپنی مرضی سے کچھ مجبوری میں۔ میں نے فرخندہ سے عشق اپنی مرضی سے کیا۔ شادی اس کی مرضی سے کی اور پھر اس کے قاتلوں سے انتقام کے جنون میں انسانیت کی ہر حد کو پار کر گیا۔ میں نے جھوٹ بھی بولے' قانون شکنی کا مرتکب بھی ہوا اور اخلاقی جرائم بھی کیے مگر وہ میرا بہت پیچھے رہ جانے والا ماضی تھا۔

لیکن گزشتہ آٹھ برسوں میں' میں نے ماضی کے ہر نقش کو مٹا دیا تھا۔ میں نے ایک نئی زندگی اپنائی تھی جس میں ایک واضح مقصد کے تحت میں نے اپنے کردار کی ازسرنو تعمیر کی تھی۔ میں نے کامیابی کے نئے اہداف حاصل کیے تھے اور اس کے لیے اچھائی اور سچائی کا راستہ اختیار کیا تھا۔ میں نے محبت اور اعتماد' خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ صرف دوست بنائے تھے۔

اب کوئی وجہ نہ تھی کہ کوئی مجھ سے بدگمان ہو۔ میری بات پر اعتبار نہ کرے یا مجھ پر شک کرے۔ اس خیال نے مجھے بڑا حوصلہ دیا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں کسی سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ میں فریال کو خود ہی سب بتا دوں گا اور اپنے دوست راجا کو بھی۔ وہ مجھ پر یقین کریں گے اور میری مدد بھی کریں گے۔ یہ معاملہ صرف اخلاقی اعتبار سے رسوائی کا نہیں تھا اس کے قانونی مضمرات بھی تھے۔

مجھے صفدر سلطان سے نیکی کی توقع کبھی نہ تھی لیکن یہ دام ہمرنگ زمین اس نے بڑی ہوشیاری سے بچھایا تھا۔ اپنی ہوشیاری کے باوجود میں بڑی آسانی سے گرفتار ہو گیا تھا اور اب مجھے اس مشکل سے نکلنا بہت مشکل نظر آ رہا تھا لیکن صرف پریشان ہونے سے کچھ حاصل نہ تھا۔ مجھے اس معاملے میں اپنے دوستوں سے ہر قسم کی مدد درکار تھی۔ اخلاقی بھی اور قانونی بھی۔

میرا وہاں بیٹھ کے سوچتے رہنا وقت ضائع کرنے کے مترادف تھا لیکن مجھے چوکیدار کی واپسی کا انتظار تھا۔ وہ آدھے گھنٹے بعد اکیلا لوٹ آیا۔ ''صاحب جی! ابھی کوئی مستری نہیں ملا۔ خانہ خراب دس بجے دکان کھولتا ہے۔'' اس نے مجھے مطلع کیا۔

میں نے کہا ''اچھا میں یہ گاڑی چھوڑ کے جا رہا ہوں۔ اس کے بریک ٹھیک کرا لینا۔''

میں نے چوکیدار کو ایک ہزار روپے دیے اور خود باہر نکل آیا۔ باہر سڑک وہی تھی جس پر میں گزشتہ رات ٹیکسی تلاش کرنے نکلا تھا تو ٹیکسی مجھے اپنے انتظار میں کھڑی نظر آئی

تھی۔ رات سے اب تک جیسے دنیا بدل گئی تھی۔ ایک عجیب طرح کا انقلاب میرے اندر بھی آیا تھا۔ اب میں پہلے جیسا بے پروا اور پراعتماد نہیں رہا تھا۔ میں محتاط اور چوکنا ہو گیا تھا۔ ایک انجانے خوف کا شکار تھا اور خود کو بہت اکیلا محسوس کر رہا تھا۔

جب میں نے ٹیکسی روکی تو زندگی میں پہلی بار میں نے ڈرائیور کی صورت کو غور سے دیکھا اور ٹیکسی کے نمبر کو بھی۔ مجھے سانپ نے ڈسا تھا چنانچہ میرا رتی سے ڈرنا بالکل فطری تھا۔ میرے عدم اعتماد کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میرے پاس اپنی حفاظت کے لیے کسی قسم کا اسلحہ نہیں تھا۔

ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ کے میں سوچتا رہا کہ آخر یہ سب میں فریال کو کیسے بتاؤں گا۔ بے شک میں ایک سازش کا شکار ہوا تھا اور میں نے جو بھی کیا اس میں میرے ارادے کو دخل نہ تھا لیکن میرے ساتھ پیش آنے والے واقعات شرمناک تھے۔ میرا ارادہ ڈانواں ڈول ہونے لگا۔ میں نے سوچا کہ ابھی سے فریال کے سامنے اعتراف جرم قبل از وقت ہوگا۔ کیوں نہ پہلے راجا سے اور فاروقی سے مشورہ کرلوں۔

اس خیال نے مجھے اتنا قائل کیا کہ میں نے ٹیکسی کو روک لیا اور اسے واپس چلنے کے لیے کہا۔ اسی سڑک پر کچھ پیچھے ایک ذیلی سڑک پر فاروقی کا گھر تھا۔ ابھی صبح کے آٹھ بجے تھے اور میرے خیال میں کورٹ جانے کے لیے وہ ساڑھے آٹھ بجے سے پہلے نہیں نکلتا ہوگا۔

فاروقی مجھے دیکھ کے سخت حیران ہوا ''اجی حضرت نواب صاحب! غریب خانے پر آپ نہار منہ...... اور بقول شاعر...... تیری صبح کہہ رہی ہے تری رات کا فسانہ۔ خیر سے ابھی کسی منکوحہ نے گود نہیں لیا ورنہ ہم پوچھتے کہ کیا اس نے عاق کر کے نکال دیا ہے۔''

میں نے کہا ''فاروقی' مجھے اس لیے آنا پڑا کہ ایک سنگین معاملہ ہے۔''

''ارے بھائی' معاملات اس عمر میں سنگین...... اور رنگین ہی ہوتے ہیں۔ فکر کیسی...... آؤ اندر آؤ۔ یہ بتاؤ میری نظر کا فتور ہے یا پچ فاقے سے ہو؟'' وہ میرے آگے چلتے ہوئے بولتا گیا اور میرے کسی جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے ہانک لگائی۔ ''ارے بھئی زوجہ اول و آخر! ذرا دیکھو تو سہی کون نازل ہوا ہے سویرے سویرے۔'' اس نے ایک قہقہہ لگایا۔

فاروقی کی بیوی کہیں کچن کی طرف سے ہاتھ جھاڑتی ہوئی نمودار ہوئی۔ فاروقی کے ساتھ وہ ہر معاملے میں اس کی ضد لگتی تھی۔ وہ گوشت کا چلتا پھرتا پہاڑ تھا تو بیوی دبلے پن کی حد تک سلم۔ وہ دراز قد تھا تو بیوی کوتاہ قامت۔ وہ منسوڑ تھا تو بیوی متین۔ وہ جتنا بولتا تھا بیوی اتنی ہی چپ رہتی تھی چنانچہ ان کا گزارہ اچھا ہو رہا تھا۔

''بھئی یہ اپنے ست بدھائی کے فرمانروا نواب رفیق احمد شیرازی ہیں' سمجھو برا وقت آ گیا کہ یہ تمہارے در پر سوالی بن کر آئے ہیں۔ ایک پراٹھا ان کے لیے بھی ڈال دو۔ اللہ اجر دے گا۔''

میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا چنانچہ سلام کے بعد میں نے اس کی خیریت پوچھی اور اس نے میری پھر وہ کچن کی طرف لوٹ گئی۔

میں نے کہا ''فاروقی! ناشتے سے پہلے غسل کروں گا۔''

''ہاں کیوں نہیں' آخر یہ غسل خانہ کس لیے بنوایا ہے۔ بیوی بے چاری کر لیتی ہے غسل جنابت بھی۔ ہم تو وہی عید بقرعید پر نہانے والے ہیں۔'' وہ گلا پھاڑ کے ہنسا۔

گرم پانی سے غسل کر کے مجھے کافی سکون ملا اور اپنے وجود کی ناپاکی سے پیدا ہونے والا کراہت کا احساس کم ہو گیا مگر مجھے وہی کپڑے پھر پہننے پڑے تو مجھے یوں لگا جیسے ان کپڑوں سے خون کی بو آ رہی ہے۔ کپڑے بدلنے کا کوئی سوال نہ تھا کیونکہ فاروقی کے کپڑے مجھ سے دگنے سائز کے تھے۔

میں ناشتے کی میز پر پہنچا تو فاروقی ندیدوں کی طرح کھانے میں مصروف تھا ''معاف کرنا' یہ بداخلاقی نہیں مجبوری تھی۔ تمہارا انتظار کرتا تو بھوک سے میرا انتقال پُرملال ہو جاتا۔ کتنی بدنامی ہوتی میری بیوی کی کہ ایک ہی تو شوہر تھا۔ اتنا کما کے لاتا تھا اسے بھی بھوکا مار دیا۔''

اس کی بیوی میری واپسی کی منتظر تھی۔ اس نے کہا ''ان کی باتوں پر نہ جائیں بھائی صاحب! بتائیں کیا لیں گے سلائس مکھن یا انڈا؟''

''ہم تو یار جب سے ہوش سنبھالا ہے' لاتیں کھا رہے ہیں۔ پہلے ابا کی پھر استادوں کی' اب بیوی کی اور صبح بکرے کی۔ لاتوں کے بھوت ہیں۔''

میں نے مسکرا کے کہا ''پائے ہیں تو میں پراٹھا کھاؤں گا۔''

اس کی بیوی نے کہا ''کل پکائے تھے میں نے۔''

ناشتے کے بعد جب فاروقی کی بیوی اٹھ گئی تو چائے پیتے ہوئے میں نے کہا ''فاروقی صاحب! تمہیں جلدی ہوگی کورٹ جانے کی۔''

''اتنی جلدی تو ہم نے بس پیدا ہونے میں کی تھی۔ اماں

کہتی تھیں کہ ساتویں مہینے میں وارد ہو گئے تھے۔ کورٹ کی کیا فکر کرنا۔ ہم نہیں جائیں گے تو کیا انصاف کا عمل رک جائے گا۔ بھئی زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا' تاریخ پڑ جائے گی کسی موکل کی' تم کہو اب کیا ہو گیا ہے؟''

میں نے کہا ''یار فاروقی! مجھ سے ایک قتل ہو گیا ہے۔''

اس نے چائے کا گھونٹ لیا ''ویری گڈ۔ گرتے ہیں شہسواری میدان جنگ میں۔ قتل بھی مرد ہی کرتے ہیں مگر کس کو مارا...... کب مارا' کیسے مارا اور کیوں مارا؟ کھل کے بات کرو۔''

میں نے اسے ان تمام واقعات کی تفصیل سنائی جو گزشتہ بارہ گھنٹوں میں پیش آئے تھے۔ اس وقت سے جب فاروقی نے مجھے اپنے آفس کے قریب چھوڑا تھا' صبح پھر وہیں ہوش میں آنے تک کا وقفہ اتنا ہی تھا۔ آہستہ آہستہ فاروقی سنجیدہ ہوتا گیا۔

میری بات ختم ہوئی تو اس نے کہا ''یار! میں دو چار فون کرلوں پھر غور کرتے ہیں اس واردات پر۔ جو ہونا تھا ہو گیا' بقول غالب...... ایک مرگ ناگہانی اور ہے' پھانسی ہونی ہے تمہیں تو ہو جائے گی' فکر کیسی......''

وہ کسی معاملے میں زیادہ دیر سیریس نہیں رہ سکتا تھا۔ یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ عدالت میں اس کا اپنے کلائنٹ یا جج کے ساتھ رویہ کیسا رہتا تھا' اس کی کامیابی کو دیکھتے ہوئے یہ کہا جا سکتا تھا کہ اس رویے نے اسے نقصان نہیں فائدہ ہی پہنچایا تھا۔ قتل' چوری' ڈکیتی جیسے سنگین جرائم میں بھی قانونی نکات بیان کرتے ہوئے اس کا انداز شگفتہ اور پُرمزاح رہنے سے ماحول کی کشیدگی میں یقیناً کمی آتی ہوگی۔

اس نے پہلے اپنے ماتحت وکیلوں کو ہدایات دیں اور کہا کہ آج اچانک اس نے فوت ہونے کا پروگرام بنالیا ہے اس لیے عدالتوں میں وہ اگلی پیشی کی تاریخ لے کر موکلوں کو سمجھائیں کہ بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے پھر اس نے کسی اعلیٰ پولیس افسر سے بات کی مگر اس وقت میرا ذہن گزشتہ رات کے واقعات سے ہٹ کر اپنے والدین کی طرف ہو گیا تھا۔ ابھی تک انہیں علم ہی نہیں تھا کہ ان کا ہونہار سپوت اپنی ریاست سے چل کے واپس لاہور آ گیا ہے مگر ان کی قدم بوسی کے لیے حاضر نہیں ہو سکا اگر راجا نے یا شہناز نے میرے گھر فون کیا تو وہ کتنے حیران ہوں گے کہ رفیق گزشتہ رات آ گیا تھا تو پھر کہاں گیا۔ وہ گھر کیوں نہیں آیا...... اور اس کے بعد ان سب کی تشویش اور بھاگ دوڑ شروع ہو جائے گی۔

میں نے بہتر سمجھا کہ معاملات کو مزید خراب ہونے سے بچالوں۔ لاؤنج کے دوسرے فون سے میں نے پہلے فریال سے بات کی۔ وہ شہناز کے ساتھ ناشتے میں مصروف تھی۔

''میں تمہیں فون کرنے ہی والی تھی۔'' فریال نے کہا۔

''فریال' میں فاروقی کے ساتھ ہوں۔ کل رات بہت دیر ہو گئی تھی۔ میں گھر نہیں گیا تھا۔ غلطی یہ ہوئی کہ میں نے اپنے گھر فون بھی نہیں کیا۔''

''کیا مطلب......؟ تم رات بھر کیا کرتے رہے۔ جن کتھے گزاری رات وے......'' وہ ہنسنے لگی ''ایسی کیا مصروفیت رہی رات بھر؟''

میں نے کہا ''مجھے ابھی فاروقی کے ساتھ جانا ہے۔ کچھ قانونی معاملات ہیں۔ اس کے بعد ہی گھر جاؤں گا۔ ابھی راجا سے بھی بات کرتا ہوں۔''

''مہاراجا کا فون آیا تھا۔ شہناز سے بات ہوئی تھی۔''

''یار' کہیں اس نے میرے گھر فون نہ کر دیا ہو۔ بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔ میرے والدین سخت پریشان ہوں گے...... اور دکھی بھی۔''

''تو تم ان سے بات کیوں نہیں کر لیتے؟''

میں نے کہا ''میں تمہیں خبردار کرنا چاہتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ تمہارا وہ نامزد شوہر یہاں موجود ہے۔''

''یہ نہیں ہو سکتا' وہ یہاں آئے گا تو پکڑا جائے گا۔ اس پر اپنی بیوی کے قتل کا الزام ہے اور اس کا سالا فرشتہ اجل کی طرح سلطان کے پیچھے لگ گیا ہے۔ ویسے تمہیں یہ غلط فہمی کیوں ہوئی؟''

میں نے کہا ''یہ غلط فہمی نہیں ہے۔ کچھ واقعات ایسے پیش آئے ہیں۔''

اس نے میری بات کاٹ دی ''سسپنس مت پیدا کرو۔''

میں نے کہا ''واقعات کی تفصیل میں فون پر نہیں بتا سکتا۔ ہو سکتا ہے وہ جعلی یا ڈپلی کیٹ پاسپورٹ پر آیا ہو۔ کسی اور نام سے۔ جو کچھ تم نے اس کے ساتھ کیا تھا اس کے بعد وہ جان ہتھیلی پر رکھ کے ہی آ سکتا ہے۔ رہی اس کے سالے کی بات تو وہ امریکی شہری ہے۔ پاکستان میں کتنا عرصہ رک سکتا ہے۔''

''وہ پاکستانی شہری ہی ہے۔''

''دیکھو' بحث مت کرو۔ میرا شک بے سبب نہیں ہے۔ جب تک تم شہناز کے گھر میں ہو' تمہارے ساتھ خود شہناز بھی غیر محفوظ ہے۔''

"پھر تم ہی بتاؤ' پھر میں کیا کروں؟"

"تم اور شہباز' دونوں کہیں شفٹ ہو جاؤ۔ جہاں اس خبیث کے خیال کی رسائی بھی نہ ہو۔"

"رومیو! کیوں نہ واپس ست بدھائی لوٹ جاؤں؟" فریال بولی۔

"یقیناً یہ اچھا آئیڈیا ہے لیکن جانتی ہو' تم میرے ساتھ کیوں آئی تھیں؟ تمہیں اپنا گیٹ اَپ بدلنا تھا۔ یہ کام پہلے کرو۔ شہباز سے مدد لو اس کام میں۔ تمہارا حلیہ ایسا ہونا چاہیے کہ میں بھی نہ پہچان سکوں۔"

وہ کچھ مایوس ہوئی "اس کا مطلب ہے تمہارا کوئی ارادہ نہیں ادھر آنے کا؟"

"جان! میں آج بے حد مصروف ہوں۔ مجھے گھر بھی جانا ہے اور وہاں بھی کچھ مسائل ہیں۔ شہناز کا تو ویسے بھی کچھ ارادہ تھا ست بدھائی جانے کا اور وہاں ایک ڈسپنسری قائم کرنے کا۔ تم دونوں ضرورت کا سامان سمیٹو اور جاؤ۔ میں فرصت ملتے ہی آ جاؤں گا۔"

"اور فرصت کب ملے گی تمہیں؟" وہ جھنجلا کے بولی۔

"یہ میں کیسے کہہ سکتا ہوں۔ مگر میں جلد از جلد آؤں گا۔ تمہارے بغیر اور تم سے دور میں رہ سکتا ہوں؟"

"تم بالکل رہ سکتے ہو۔ مجھے سچ بتاؤ کہیں تمہاری وہ گوری محبوبہ تو یہاں نہیں پہنچ گئی ہے' عائشہ...... میڈ اِن انگلینڈ!" فریال بگڑنے لگی۔

میں نے کہا "پاگل پن کی بات مت کرو۔"

"اگر جھوٹ بولا نا تو اس سے پہلے میں تمہیں قتل کر دوں گی فیکے پتر!" اس نے غصے میں فون بند کر دیا۔

پھر میں نے راجا سے بات کی' وہ خفا ہونے لگا "تو کہاں ہے نواب کی اولاد!"

میں نے کہا "راجا تو نے میرے گھر تو فون نہیں کیا تھا؟"

"صبح کیا تھا۔ تو کیا فریال کے ساتھ ہنی مون منا رہا تھا کسی ہوٹل میں؟"

میں نے کہا "بکواس نہ کر۔ اسے شہباز کے پاس چھوڑ دیا تھا میں نے اور پھر فاروقی کی طرف چلا گیا تھا۔ ابھی تک اسی کے ساتھ ہوں۔ اس کے گھر میں ہوں' میرے گھر میں کیا بات ہوئی؟"

"وہ تو اچھا ہوا تیری اس کزن رابعہ نے فون اٹھا لیا۔ کہنے لگی کہ وہ تو گھر آئے ہی نہیں۔ میں نے کہا کہ گھر نہیں آیا تو پھر کہاں گیا؟ وہ کہنے لگی کہ یہ تو آپ ہی بتائیں۔ میں نے کہا کہ اچھا معلوم کر کے بتاتا ہوں۔ تم ابھی کسی سے ذکر مت کرنا۔"

میں نے کہا "راجا! میں ایک بہت بڑی قانونی مشکل میں گرفتار ہو گیا ہوں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ مجھ پر ایک لڑکی نادیہ کے قتل اور آبروریزی کا کیس بن جائے۔"

"تو مذاق تو نہیں کر رہا ہے؟ یہ نادیہ کون ہے؟"

"کوئی ماڈل ہے۔ تفصیل ابھی نہیں بتا سکتا۔ بس اپنی بے وقوفی سے پھنس گیا تھا میں۔ اب فاروقی کے پاس مدد کے لیے آیا ہوں۔ دیکھیں وہ کیا کرتا ہے؟"

"یار میں بھی بہت کچھ کر سکتا ہوں' تو مجھے کچھ بتا۔"

میں نے کہا "اگر تیری مدد کی ضرورت پڑے گی تو میں تجھے بولوں گا۔ ابھی تو وہیں ٹھہر' تیری ضرورت وہاں ہے۔"

"دیکھ آدمی ادھوری بات سے تو نے میرے لیے بڑی پریشانی پیدا کر دی ہے۔ اب میں یہاں کیسے بیٹھا رہوں۔ تو فاروقی سے میری بات کرا۔"

"فاروقی اندر اپنے گھر کے آفس والے فون پر کسی سے بات کر رہا ہے۔" میں نے کہا مگر اسی وقت فاروقی نے فون رکھا اور باہر آ گیا تو میں نے ریسیور اسے دے دیا۔

عادت کے مطابق فاروقی نے کہا "ارے رنگیلے راجا! آخر خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ تمہاری صحبت کا کچھ تو اثر ہونا تھا۔ نواب صاحب نے بھی کام دکھا دیا۔ بس اب انشا اللہ زندگی اچھی گزرے گی اس راہ راست پر۔" اس نے ایک قہقہہ لگایا۔ "اجی آپ ہم پر چھوڑ دو سب۔ ایک کیا اسے سات خون معاف ہیں۔ باقی رہی آبروریزی والی بات تو راجا جی' اس کی آبرو تھی کہاں؟ اور تھی تو اس نے کون سا نکاح پڑھوا کے جملہ حقوق محفوظ کرا لیے تھے۔" وہ پھر ہنسا "یار' تم کیوں فکرمند ہو۔ بھئی بہتی ندی سے کسی پیاسے نے پانی پی لیا تو کون سا گناہ کیا۔ ندی آخر ہوتی کس لیے ہے۔ ہم تمہارے یار پر حرف نہیں آنے دیں گے۔"

تقریباً دس منٹ تک اس کی راجا سے بات ہوئی۔ بظاہر فاروقی کے لیے پریشانی کی بات کوئی نہیں تھی لیکن راجا مطمئن نہیں تھا۔ فاروقی نے اس سے صرف اتنا ہی کہا تھا کہ ہو سکے تو آئی جی یا ڈی آئی جی سے فون کرا دینا۔ باقی بندوبست ہو گیا ہے مگر راجا نے کہا کہ فون سے کچھ نہیں ہوگا۔ وہ خود آ کے بات کرے گا۔"

اس وقت تقریباً ساڑھے نو بجے تھے' فاروقی نے کہا "چلو رفیق صاحب! تھانے چلتے ہیں۔"

"تھانے......؟" میں نے حیرانی سے کہا "وہ کس لیے؟"

"بھئی قتل کیا ہے تو تھانے جانا ہی پڑے گا۔ بڑی مشکل سے گنجائش نکالی ہے تمہارے لیے ایک تھانے کی حوالات میں' جب جگہ ہاؤس فل تھا۔"

میں نے کہا "میں سمجھا نہیں۔"

اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا "چلو' ہم راستے میں سمجھا دیں گے۔ یہ قانونی چکر ہیں اور ہم سے بڑا چکر باز تمہارا وہ رقیب روسیاہ نہیں ہو سکتا۔"

میں اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا "کیا تم یہ چاہتے ہو کہ پہلے میں رپورٹ لکھوا دوں۔ اس سے پہلے کہ مجھ پر الزام آئے؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "رپورٹ تو لکھی جائے گی تمہارے خلاف نواب صاحب! پہلے یہ بتاؤ' تم کو بالکل آئیڈیا نہیں کہ وہ جگہ کون سی تھی؟"

میں نے کہا "آئیڈیا ہوتا تو میں صبح پہلا کام یہ کرتا کہ وہاں جا کے تصدیق کر لیتا۔"

میں نے راجا سے کہا ہے "وہ معلوم کرے کہ یہ جو ماڈل تھی نادیہ' اس کا کبھی صفدر سلطان سے کوئی تعلق رہا ہے یا نہیں؟"

"اس نے تو خود اعتراف کر لیا تھا تعلق کا۔"

فاروقی نے سر ہلایا "کیا تمہیں اب بھی شک ہے کہ وہ خواب ہو سکتا ہے؟"

میں نے کہا "نہیں' میری چھٹی حس کہتی ہے کہ وہ خواب نہیں تھا۔ نادیہ کا واقعی خون ہو گیا تھا۔ خون کس نے کیا' کب کیا اور کیسے کیا' یہ مجھے بالکل معلوم نہیں ہوا۔ میں بے ہوش تھا۔"

"راجا نے کہا ہے کہ وہ معلوم کر لے گا۔ ایک ماڈل کے قتل کی خبر دوپہر تک سب کو ہو جائے گی اور ظاہر ہے کل کے اخبار میں بھی ہو گی۔"

میں نے کہا "مگر میں کیا کروں گا' اگر اس خبر میں میرا نام بھی آ گیا؟"

"اجی حضرت! وہ کیا ہے کہ بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا۔" فاروقی نے میرے کندھے پر ہاتھ مارا "اتنا تردد جس نے کیا تھا وہ تمہارا ہم جیسا کوئی خیرخواہ تو ہے نہیں۔ خیر سے رقیب روسیاہ کے عہدے پر فائز ہے۔ وہ تو تمہارے کارنامے کا ڈھول پیٹے گا۔"

"پھر کیا ہوگا؟"

"پھر وہی ہوگا جو ہوتا ہے۔ چشم بددور' شک کی بنیاد پر رپورٹ بھی لکھی جائے گی۔ ماشا اللہ تمہارا نام بھی اس میں آئے گا۔ انشا اللہ گرفتاری' تفتیش' عدالت میں پیشی سب ہو گی بقول شاعر...... اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔" اس نے ایک قہقہہ لگایا۔

میں نے کہا "یار! تم ہنس رہے ہو اگر یہ سب ہوگا تو پھر تمہارے ہونے کیا فائدہ۔"

اس نے کہا "الحمدللہ۔ ہم تمہیں مایوس نہیں کریں گے۔ آخر یار ہیں تمہارے۔ خود تمہیں تختہ دار تک پہنچا کے آئیں گے۔ عمر قید ہوئی تو جیل تک چھوڑنے جائیں گے۔" وہ پھر قہقہہ مار کے ہنسا "ارے یار' ایسی شکل مت بناؤ کہ دیکھ کے مجھے بھی رونا آئے۔"

میں نے کہا "روؤں نہ تو اور کیا کروں؟"

"ہمت کرو پیارے ہمت۔ ہمت مرداں مدد خدا۔ مشکلات تو آتی ہیں زندگی میں۔ رونے سے کبھی کوئی مسئلہ حل ہوا ہے؟ بالآخر ہم تمہیں باعزت رہا کرالیں گے۔ قانونی کارروائی تو ہو گی لیکن الزام کوئی نہیں آئے گا تم پر۔ ضمانت پر رہائی بھی ہو جائے گی بالآخر۔"

"بالآخر...... یعنی مجھے حوالات میں اور جیل میں بھی رہنا پڑے گا؟"

وہ ہنسا "بھئی اب کیا کریں۔ دستور ہی کچھ ایسا ہے زمانے کا۔ اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔ فارسی کا مطلب یہ ہوا کہ کام تو تم نے مردوں والا کیا ہے۔"

میں نے مایوسی سے کہا "فاروقی! تمہاری ان باتوں سے تو لگتا ہے کہ مجھے سزا بھی ہو جائے گی۔ تم کچھ نہیں کر سکو گے اگر عدالت میں وہ ویڈیو فلم پیش کر دی گئی تو شبہے کی کون سی بات رہ جائے گی؟"

وہ اچانک سنجیدہ ہو گیا "دیکھو نواب صاحب! یہ قانونی نکات ہیں۔ ان پر اپنی عقل کے گھوڑے مت دوڑاؤ۔ یہ سب ہم پر چھوڑ دو۔ بیس سال کی پریکٹس میں گھاس نہیں کھودی۔ عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں۔ ویڈیو فلم سے کچھ نہیں ہوگا۔ اسے حتمی شہادت کے طور پر قبول نہیں کیا جاتا۔ اس لیے کہ فلم بنائی جاتی ہے' کیمرے کی مدد سے۔ دیکھنے والی آنکھ انسان کی نہیں کیمرے کی ہوتی ہے اور کیمرا چلاتے ہیں کیمرامین۔ وہ کچھ بھی دکھا سکتے ہیں۔ قطرے میں دریا دکھانے کی ایک مثالی فلم تھی فلم JAWS۔ اس میں جو طوفانی منظر اور شارک دکھائے گئے تھے' وہ سب کیمرا ٹرک تھی۔ وہ ایک چھوٹا سا تالاب تھا جو آج بھی یونیورسل اسٹوڈیو میں سیاحوں کی دلچسپی کے لیے محفوظ ہے۔ پھر آج کل تو کمپیوٹر گرافکس اور اسپیشل افیکٹس کا دور ہے۔"

"یہ سب تو ٹھیک ہے...... لیکن میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ مرکزی کردار ادا کرنے والا میں نہیں ہوں۔"

اس نے پھر میرے کندھے پر ہاتھ مارا "یار! کیوں نہیں کہہ سکتا' صاف انکار کہ نادیہ کے ساتھ میں نہیں' حلف اٹھا سکتا

ہوں۔"

"جھوٹا حلف!"

وہ بگڑ گیا "افوہ رفیق صاحب! آپ بھی چشم بد دور۔ بالکل بے دال کے بودم ہیں۔ جسے عرف عام میں اُلو کہا جاتا ہے۔ حضرت' آپ کی جان داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ وہ حرام الدہر نطفہ ناتحقیق نادیہ کی جان تو لے چکا' اب آپ کو تختہ دار کی طرف دھکیل رہا ہے۔ عدالتی قتل پر کمربستہ ہے اور آپ پڑے ہوئے ہیں اخلاقیات کے چکر میں۔ میاں شہزادے' یہاں دن میں دس بار بڑے نمازی پرہیزگار اور بارلیش لوگ جھوٹے حلف اٹھاتے ہیں۔ تمہارے ساتھ دھوکا فریب ہوا۔ تم شرافت اور سچائی کی بات کررہے ہو۔ جو غلط ہے یا حرام ہے وہ بھی جائز اور حلال ہوجاتا ہے اگر معاملہ جان بچانے کا ہو۔"

میں نے آہستہ سے کہا "یہ تو ٹھیک ہے مگر......"

"اگر مگر چھوڑو۔ صاف کہو کہ فلم فراڈ ہے۔ کوئی ایکٹر ہے جسے میک اپ سے مجھ جیسا بنادیا گیا ہے۔ فلم گاندھی میں کیا خود آنجہانی گاندھی دوبارہ مرنے کے لیے اس جہاں میں آئے تھے؟ قائداعظم کا رول کرسٹوفر لی نے کیا تھا۔ سیکڑوں مثالیں دے سکتے ہو تم۔"

"لیکن دیگر ثبوت...... فنگر پرنٹس وغیرہ......"

اس نے تیسری بار میرے کندھے پر ہاتھ مارا "قبلہ نواب صاحب! اپنے اس خادم پر بھروسا رکھیے۔ سارے ثبوت ہم یوں چٹکیوں میں اڑادیں گے۔ باقی ہی نہیں رہنے دیں گے۔ یہ سب پیسے کا کھیل ہے جسے ہم عدالتی نظام کہتے ہیں۔"

میں نے بے چینی سے کہا "چلو فرض کرو' میں نے انکار کردیا...... یہ ثابت کیسے ہوگا کہ...... وہ میں نہیں تھا؟"

"ویری سمپل! تم نادیہ کے ساتھ اس لیے نہیں ہوسکتے کہ ایک آدمی بیک وقت دو جگہ نہیں ہوسکتا۔ ہم اس بات کا ناقابلِ تردید دستاویزی ثبوت بھی فراہم کریں گے کہ اس رات تم جائے واردات سے بہت دور ایسی جگہ تھے جہاں سے نکل کے کہیں جا ہی نہیں سکتے تھے۔"

"ایسی جگہ کون سی ہوگی؟"

"نواب صاحب......"

میں نے جھلا کے کہا "یار فاروقی' میں تنگ آگیا ہوں اس نواب صاحب کی گردان سے۔ تم نام نہیں لے سکتے؟"

وہ گلا پھاڑ کے ہنسا "بھئی نام میں کیا رکھا ہے بقول شیکسپیئر۔ اہمیت ساری اس کی ہے کہ کون کیا ہے؟ تم نے پوچھا تھا جگہ کا نام تو اسے عرف عام میں حوالات کہتے ہیں۔ اس رات تم حوالات میں بند تھے۔"

میں دم بخود رہ گیا "حوالات میں' مگر کیوں؟"

"بھئی' اب سوچتے ہیں کہ تمہیں کس جرم میں اندر کیا جائے؟ یہی بات کررہا تھا میں اوپر والوں سے۔ ایک خانہ ایسا ملا جہاں کل رات سے ابھی تک روزنامچے میں کوئی اندراج نہیں تھا۔ کوئی ایف آئی آر نہیں لکھی گئی تھی۔ تھانے دار سے بات ہوگئی ہے۔ فون میں نے بھی کروادیا ہے اور تمہارے یار نے بھی کیا ہوگا۔ انشا اللہ پکا بندوبست ہوجائے گا۔ کچھ مال ضرور خرچ ہوگا۔"

میں نے کہا "مال کی کوئی بات نہیں فاروقی! لیکن میری عزت کا سوال ہے۔ میں کسی کو کیا منہ دکھاؤں گا؟"

وہ زور سے ہنسا "یہی منہ پیارے جسے اماں کہتی ہوں گی کہ چاند سا مکھڑا۔ میموں نے بھی چوما ہوگا۔ اب رہی عزت کی بات تو وہ آنی جانی ہے۔ آج گئی تو کل روٹھ کر میکے جانے والی بیوی کی طرح واپس آجائے گی۔"

میں اس صورتِ حال سے قطعی مطمئن نہیں تھا لیکن میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ مردہ بدست زندہ۔ گاڑی اب تھانے کی حدود میں داخل ہوچکی تھی جہاں ایک لینڈ کروزر پہلے سے موجود تھی اور اس کی نیلی نمبر پلیٹ پر سنہرے حروف سے "پولیس" لکھا گیا تھا تاکہ خواص اسے جانیں اور عوام سے بچیں۔

ایس ایچ او چوہدری حکم داد ہمارا منتظر تھا۔ وہ روایتی ساخت کا تھانے دار تھا جس کی پتلون اس کی پیٹ پر نہیں ٹکتی اور پیٹ کبھی نہیں بھرتا۔ افسران بالا کی وجہ سے اسے تھانے آکے بیٹھنا پڑا تھا ورنہ وہ رات ہی کو آتا۔ اس کے انداز پذیرائی میں بھی ناگواری کا پہلو نمایاں تھا۔

جب ہم تشریف رکھ چکے اور فاروقی کی فرمائش پر تھانے دار نے "چائے شائے" بھی بادل ناخواستہ منگوالی تو اس نے کہا "ہاں جی' خیر سے آپ ہو ملزم۔"

فاروقی نے کہا "یہ نواب رفیق احمد شیرازی ہیں۔ ہاورڈ سے ایم بی اے کیا پھر لندن میں دو سال لارڈ ارنسٹ کے ساتھ ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں وائس پریذیڈنٹ رہے۔"

تھانے دار مسکرانے لگا "کون سی ریاست کے نواب ہیں جی آپ۔"

میں نے متانت سے کہا "ست بدھائی' یہ رہتاس سے آگے ہے۔"

"سیکڑوں مربع میل کا علاقہ ہے۔" فاروقی بولا۔

تھانے دار بالکل متاثر نہیں ہوا "چلیں دفع کریں جی۔ معاملہ بتائیں بالکل سچ سچ۔"

فاروقی نے کہا "آپ بھی دفع کریں جھوٹ سچ کو۔ یہ کام عدالت کا۔"

تھانے دار کا موڈ خراب ہوگیا "پھر میرے پاس آنے کی کیا ضرورت تھی نواب صاحب کو اور آپ کو۔"

فاروقی پرانا وکیل تھا اور پولیس سے نمٹنے کے سارے گر جانتا تھا۔ اس نے پینترا بدلا۔ "آپ کو کسی نے کچھ نہیں بتایا؟ میری ڈی آئی جی صاحب سے بھی بات ہوگئی تھی۔ شاید آئی جی نے کہا ہوگا ان سے۔ وہ راجا کے کزن یا دوست ہیں۔ راجا کو تو جانتے ہوں گے آپ۔"

تھانے دار کے غبارے کی ہوا کچھ نکل گئی "چھوڑیں سب کی بات آپ فرمائیں ہمارے لیے کیا حکم ہے۔"

فاروقی نے کہا "آپ ایک اندراج کرلیں کہ یہ گزشتہ رات یہاں حوالات میں بند تھے۔ ان کے خلاف کوئی کارروائی ڈال دیں۔ انہیں کسی غلط فہمی میں پکڑلیا گیا تھا۔ پولیس والوں سے زیادتی ہوجاتی ہے کبھی کبھی ادائے فرض میں۔ جب پتا چلا کہ یہ کون ہیں اور ان کی بے گناہی ثابت ہوگئی تو آپ نے خود ایک سوا کسٹھ میں بیان لے کر انہیں چھوڑدیا مگر یہ رات آٹھ بجے سے صبح نو بجے تک بند رہے۔"

تھانے دار نے چائے ہمارے سامنے رکھی "ٹھیک ہے جناب! ہمارا کام تو ہم کرلیں گے۔"

فاروقی اس کا مطلب سمجھ گیا "نواب رفیق احمد شیرازی بڑے دریا دل آدمی ہیں۔ کوئی انہیں تنکا دے تو یہ بانس دیتے ہیں۔"

فاروقی کی بات ایسی ذومعنی تھی کہ میں نے بڑی مشکل سے ہنسی روکی۔ تھانے دار نے محرر کو بلایا اور ایک رجسٹر فاروقی کے سامنے رکھ دیا "یہ ملاحظہ کرلیں' پکا کام کردیا ہے ہم نے۔"

فاروقی نے رپورٹ پڑھی جو ہمارے آنے سے پہلے ہی درج کرلی گئی تھی۔ اس نے سر ہلا کے اطمینان کا اظہار کیا اور رجسٹر میری طرف بڑھایا مگر میرے لیے پولیس کی زبان میں اس تحریر کو پڑھنا بالکل ناممکن تھا۔

میں نے کہا "اس میں کیا لکھا ہے؟"

فاروقی نے کہا "نواب صاحب! اس میں لکھا ہوا ہے کہ گزشتہ رات آپ نے ایک گاڑی چوری کرنے کی کوشش کی تھی۔"

میں نے کہا "لاحول ولاقوۃ۔ یعنی ایک اور بے ہودہ رسوا کن الزام!"

فاروقی بولتا رہا "یہ سب غلط فہمی کی وجہ سے ہوا۔ آپ ایک جگہ اپنی گاڑی کھڑی کرکے گئے۔ وہ ایک شاپنگ ایریا تھا مگر وہاں پارکنگ ممنوع تھی چنانچہ آپ کی گاڑی کو ٹریفک پولیس کا لفٹر اٹھا کر لے گیا۔ اب اتفاق دیکھیے کہ جہاں سے آپ کی گاڑی اٹھائی گئی وہاں دوسری گاڑی آگئی۔ اس کا ماڈل میک اور رنگ وہی تھا جو آپ کی گاڑی کا۔ اس میں چار نوجوان تھے جو وہیں ایک شاپنگ پلازا میں چلے گئے۔ اسی وقت آپ باہر آئے اور آپ نے اپنی چابی سے گاڑی کھول لی تالے پرانے اور چابیاں گھسی ہوئی ہوں تو ایسا ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد آپ نے چابی اگنیشن میں لگائی اور گاڑی اسٹارٹ کرنے میں بھی کامیاب ہوگئے۔ آپ نے زیادہ غور ہی نہیں کیا کہ وہ آپ کی گاڑی نہیں ہے ورنہ آپ کو یقیناً اندازہ ہوجاتا۔ ابھی آپ روانہ ہونے کے لیے گاڑی موڑ رہے تھے کہ وہ چاروں واپس آگئے جو اس گاڑی کے اصل مالک تھے اور انہوں نے دوڑ کے اور شور مچا کے آپ کو روک لیا۔ آپ کی ایک نہیں سنی گئی اور پولیس کی موبائل طلب کرلی گئی۔ وہ چاروں آپ کو تھانے لے آئے اور آپ کے خلاف ایک رپورٹ درج کرلی گئی۔ جب آپ نے اصل صورت حال کی وضاحت کی تو گاڑی تلاش کرنے میں وقت لگا۔ آپ کے دوست اور وکیل فاروقی صاحب آدھی رات کے بعد آئے اور انہوں نے آپ کی گاڑی واپس حاصل کی۔ تاہم اس وقت تک صبح ہونے والی تھی۔ آپ رات بھر حوالات میں رہے۔ صبح ایس ایچ او صاحب کے حکم پر آپ کو چھوڑا گیا۔ فاروقی صاحب نے آپ کی ضمانت دی۔"

"وہ چاروں لڑکے کون تھے جن کی گاڑی میں چوری کرکے لے جارہا تھا؟"

"ان کو دفع کریں۔ ان کے نام پتے سب لکھے ہوئے ہیں مگر آپ کیا کریں گے جان کے۔" تھانے دار نے کہا "اب آپ اپنا بیان لکھ دیں جو وکیل صاحب لکھوائیں گے۔" تھانے دار بولا۔

ایک سادہ کاغذ پر میں نے وہ سب لکھا جو فاروقی نے لکھوایا۔ رسمی کاغذی کارروائی ختم ہوگئی تو فاروقی اور تھانے دار کچھ دیر کے لیے باہر گئے۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ تھانے دار نے پچاس ہزار مانگے تھے مگر فاروقی نے دس پکڑائے کہ رکھنے ہیں تو رکھو ورنہ خدا حافظ۔ جب تھانے دار واپس کمرے میں آیا تو اس کی صورت دیکھ کر ہی اندازہ ہوجاتا تھا کہ وہ ناخوش ہے۔

فاروقی نے میرے کہنے پر اس گاڑی کا نمبر اور مالک کا نام پتا نوٹ کرلیا جس کی چوری کے الزام میں مجھے ایک رات حوالات میں گزارنا پڑی تھی۔ یہ وہی رات تھی جو میں نے نازیہ کے ساتھ بسر کی تھی لیکن فاروقی کی معاملہ فہمی نے قانونی طور پر مجھے ایک مضبوط ڈھال فراہم کردی تھی۔ اب قانون خود میری طرف تھا۔ یہ ثبوت موجود تھا کہ میں اس رات حوالات میں بند تھا

اور وہاں سے نکل ہی نہیں سکتا تھا۔ میری رہائی صبح نو بجے عمل میں آئی تھی جبکہ نادیہ کا قتل اس سے کئی گھنٹے پہلے ہوا تھا۔ دستاویزی ثبوت کی صورت میں وہ رپورٹ موجود تھی جو میرے خلاف لکھوائی گئی تھی اور گواہ تھانے کا عملہ تھا۔ اس سب حسن انتظام کے باوجود میری پریشانی کم نہیں ہوئی تھی۔

اب یہ ممکن نہیں تھا کہ قانونی اور عدالتی طریقہ کار کے سارے مراحل طے کر کے میں بالآخر باعزت طور پر رہا کر دیا جاؤں لیکن اس سے پہلے نادیہ کے ساتھ جانے، رات بھر داد عیش دینے اور پھر اسے قتل کر کے فرار ہونے کی جو رسوا کن کہانی سارے زمانے کو معلوم ہوئی تھی، اس کے تصور سے ہی مجھے پسینہ آجاتا تھا لیکن فاروقی کا کہنا تھا کہ جان اور عزت دونوں کو بچانا ناممکن ہوگا۔

میں فاروقی کے ساتھ باہر آنے ہی والا تھا کہ تھانے دار نے بڑے طنزیہ اور تلخ لہجے میں کہا "نواب صاحب! اس سرکاری مہمان خانے پر بھی ایک نظر کرم ڈال لیں جہاں آپ نے قیام فرمایا تھا۔ ذرا سب کو چہرہ بھی کرادیں۔"

فاروقی نے میرے کان میں کہا "سالا بہت جلا بھنا بیٹھا ہے۔ اب یہ چاہتا ہے کہ کچھ رقم محرر اور ڈیوٹی افسر اور تھانے کے دیگر عملے کو بھی الگ دی جائے۔ اپنے دس ہزار میں سے کچھ دینے کو تیار نہیں۔"

میں نے کہا "پھر کیا کرنا چاہیے؟"

"چلو...... دے دیتے ہیں انہیں بھی کچھ۔ بعد میں انہی کی گواہی ہوگی۔" فاروقی نے کہا "رشوت دے کے جہنم کے حقدار تو بن ہی چکے ہیں۔ جہاں سیر وہاں سوا سیر۔"

فاروقی نے حسب مراتب کچھ مزید نذرانے پیش کیے۔ ایک ہزار ڈیوٹی افسر کو ملے۔ پانچ سو محرر کو کم لگے۔ اس نے اسٹیشنری کی مد میں مزید تین سو وصول کر لیے۔ حوالات کے باہر کھڑے سنتری نے دو سو شکریے کے ساتھ قبول کیے۔ ایک مقصد یہ بھی تھا کہ تھانے کا وہ عملہ جس نے صبح ڈیوٹی پر آجانے کے بعد مجھے رہا کیا تھا، میری صورت دیکھ لے۔

حوالات میں آٹھ قیدی تھے۔ ان میں سے ایک کی حالت کافی خراب تھی۔ غالباً وہ رات بھر زیر تفتیش رہا تھا اور اب مردوں کی طرح پڑا تھا۔ اس کا پھٹا ہوا لباس خون آلود تھا۔ دوسرا گھٹنوں میں سر دیے چلا رہا تھا۔ باقی سب سہمے ہوئے اور پریشان حال بیٹھے تھے۔ ان میں سولہ سترہ سال کا ایک لڑکا بھی تھا جو دیوار کے ساتھ لگا چپ بیٹھا تھا مگر اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

میں پلٹنے ہی والا تھا کہ ایک شخص نے سر اٹھایا اور ایک لمحے کے لیے میری اور اس کی نظریں ملیں۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ گھبرا گیا ہے۔ پھر میرے ذہن کی تاریکی میں روشنی سی چمکی۔ جو بات میرے تحت الشعور میں گم تھی وہ ایک دم شعور کی سطح پر یوں آگئی جیسے پانی میں ڈوبنے والے کی لاش سطح آب پر آجاتی ہے۔

میں نے اسے پھر غور سے دیکھا تو اس نے اپنا چہرہ چادر میں چھپانے کی کوشش کی مگر اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ میں نے اچانک دو نشانیاں دیکھ لی تھیں۔ گزشتہ رات میں جس ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا تھا اس کے ایک کان میں سونے کی چھوٹی سی بالی تھی۔ یہ کان میری طرف تھا۔ اس نے جو لال رنگ کی ٹی شرٹ پہن رکھی تھی اس کے بائیں بازو پر سفید رنگ سے ایک بچھو بنا ہوا تھا، یہ بازو بھی میری طرف تھا۔

یہ اتفاق ہرگز نہیں ہوسکتا تھا۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور کی صورت پر یقیناً غور نہیں کیا تھا مگر دو باتیں میں نے غیر ارادی طور پر نوٹ کی تھیں۔ اس کے منہ چھپانے سے میرا شک یقین میں بدل گیا۔ میں لوٹ کر تھانے دار کے کمرے کی طرف گیا۔ وہ اب روانگی کے لیے اپنی لینڈ کروزر کی طرف جا رہا تھا۔

میں نے فاروقی سے کہا "یار، اسے بلاؤ ایک منٹ کے لیے۔"

فاروقی کچھ حیران ہوا مگر اس نے سوال کیے بغیر تھانے دار کو آواز دی "ذرا ہماری ایک عرض سن لیں چوہدری صاحب!"

تھانے دار نے پلٹ کے دیکھا اور کمرے میں لوٹ آیا "ہاں جی اور کچھ یاد آ گیا نواب صاحب کو۔"

میں نے کہا "چوہدری صاحب! حوالات میں ایک شخص کو دیکھا ہے میں نے۔ اس کے کان میں سونے کی مندری ہے۔ لال ٹی شرٹ ہے۔ اس کے بازو پر سفید بچھو بنا ہوا ہے، ذرا اسے بلائیں۔"

"آخر معاملہ کیا ہے؟ کون ہے وہ؟" تھانے دار بولا۔

میں اتنا جوش میں تھا کہ میں نے اپنا پرس نکالا اور کسی تکلف کے بغیر ہزار ہزار کے پانچ نوٹ میز پر ڈال دیے "اگر یہ میرا بندہ ہوگا تو میں اور دوں گا۔"

خود فاروقی میری اس حرکت کو سمجھ نہیں پایا تھا۔ جب تھانے دار دوبارہ اپنی کرسی پر براجمان ہوگیا تو اس نے پوچھا "کون ہے یہ شخص نواب صاحب!"

میں نے سکون سے کہا "غالباً وہی ٹیکسی ڈرائیور۔"

انتہائے حیرت سے فاروقی کی صورت مضحکہ خیز ہوگئی "وہ جو...... تمہیں لے گیا تھا؟"

میں نے اقرار میں سر ہلایا "ابھی معلوم ہو جائے گا۔"

مطلوبہ ملزم کو حوالات سے نکالا گیا اور ایک کانسٹیبل اسے پیشی کے لیے لا رہا تھا کہ اچانک شور مچ گیا۔ وہ ایک دم باہر کی طرف بھاگا۔ کانسٹیبل نے چیخ کے اسے گالی دی اور اس کے پیچھے دوڑا۔ ملزم تیس سال کا جوان آدمی تھا۔ اس کی صحت زیادہ اچھی نہیں تھی تو خراب بھی نہیں تھی۔ معلوم نہیں یہاں وہ کیوں بند تھا مگر اب اچانک اسے یہ خطرہ محسوس ہوا کہ میں نے اسے شناخت کر لیا ہے تو اس نے بھاگ کر جان بچانے کا رسک لیا۔

مجھے اندازہ تھا کہ کانسٹیبل اسے پکڑ نہ سکا تو پیچھے سے گولی مار دے گا۔ میں تیزی سے لپکا اور گیٹ کی طرف بڑھا۔ تھانے کے اندر اور باہر سخت بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ حوالات سے ملزم کا فرار ہو جانا خود تھانے والوں کو مشکل میں ڈال دیتا۔ تھانے دار خود باہر نکل کے گرجنے لگا۔ "اوئے! مار دے اس کتے کو۔" اس نے گالیوں کی گردان شروع کی۔

گیٹ پر کھڑے سنتری نے اپنی رائفل اٹھائی ہی تھی کہ میں نے چیخ کے کہا 'ٹھہرو' گولی مت چلاؤ' میں اسے پکڑتا ہوں۔"

ملزم کے تعاقب میں جانے والا کانسٹیبل وہی تھا جو اسے حوالات سے نکال کر لایا تھا۔ وہ قدرے عمر رسیدہ اور کمزور آدمی تھا۔ وہ رک گیا تھا اور ملزم گیٹ سے نکل چکا تھا۔ اچانک میرے اندر کا پرانا ایتھلیٹ جاگ اٹھا۔ جب میں دوڑتا ہوا گیٹ سے نکلا تو سنتری نے رائفل نیچے کر لی تھی۔ تھانے دار اب اسے گالیاں دے رہا تھا اور سب کی پیٹی اتروانے کی دھمکی دے رہا تھا۔

میرے اور ملزم کے درمیان شاید پچاس گز کا فاصلہ ہوگا۔ ادھر ادھر گلیاں ہوتیں تو شاید وہ غائب ہو جاتا۔ سیدھی سڑک پر وہ کہاں تک بھاگتا۔ عرصہ ہوا میں نے جاگنگ چھوڑ دی تھی۔ لندن سے واپس آنے کے بعد میرے سارے معمولات بدل چکے تھے لیکن پرانی پریکٹس میرے کام آئی۔ ملزم کے مقابلے میں میرا اسٹیمنا بہت زیادہ تھا۔ تقریباً ایک فرلانگ دوڑنے کے بعد اس کی رفتار کم ہوگئی۔ جب میں نے اسے پکڑا تو وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔

اس نے مجھ پر حملہ آور ہونے کی کوشش بھی کی مگر میں نے اس کا ایک بازو پکڑ کے موڑا تو وہ گھوم گیا۔ بازار میں بہت سے لوگوں نے یہ مختصر سی دلچسپ ریس دیکھی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ وہ کوئی جیب کترا ہوگا جو میری جیب صاف کر کے بھاگا تھا۔

جب وہ میرے قابو میں آ گیا تو میں نے سب کے سامنے اس کی اچھی خاصی دھنائی کی۔ مجھے اپنے غصے کو قابو میں رکھنا پڑا ورنہ جو اذیت مجھے اس شخص کی وجہ سے برداشت کرنا پڑی تھی اس کے خیال سے تو شاید میں اسے مار ڈالتا۔ وہ چلاتا رہا۔ "میں نے کچھ نہیں کیا' میں نے کچھ نہیں کیا" میں اسے لاتیں اور تھپڑ مارتا ہوا واپس تھانے لے گیا۔

مجھے یہ احساس بھی تھا کہ اس کی مجھ سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ وہ فقط ایک سازش میں آلہ کار بنا تھا۔ اپنی کسی مجبوری کی وجہ سے یا لالچ کی وجہ سے لیکن وہ مجھے برباد کرنے کی سازش کا سب سے اہم سراغ تھا۔ اس کا مل جانا میرے نزدیک کوئی اتفاق نہیں تھا۔ یہ انتظام دست غیب تھا۔ قدرت کے نظام عدل کا سلسلہ تھا۔ اس سے ایک رب العالمین کا وجود برحق ثابت ہوتا تھا جو خیر کی قوت کو شر کی ناانصافی سے محفوظ رکھتا تھا۔ ورنہ یہ میرے اختیار کی بات کہاں تھی کہ ایک کروڑ انسانوں کے اس شہر میں وہی مجھے مل جاتا جو ساری خرابی کا نقطہ آغاز تھا۔

جب ہم واپس تھانے پہنچے تو تھانے والوں نے بڑے پرجوش انداز میں ہمارا استقبال کیا مگر میرے اور ملزم کے لیے استقبال کا انداز الگ تھا۔ ڈیوٹی افسر نے تو کہا "واہ جی واہ! آپ تو گھوڑے کی طرح دوڑتے ہو۔" اور ایس ایچ او نے محض تعریفی انداز میں سر ہلا دیا۔ فرار کی کوشش کرنے والے ملزم کو دیگر اہلکاروں نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور لمبا ڈال کے اس کی لاتوں' مکوں' ڈنڈوں اور ٹھڈوں سے ایسی خاطر تواضع کی کہ وہ مرنے کے قریب ہوگیا۔ پولیس کی قومی زبان میں گھن گرج والی گالیوں کے ساتھ میرے کانوں تک اس کی چیخیں بھی پہنچ رہی تھیں اور میرے دل کو بہت سکون حاصل ہو رہا تھا۔

جب مجھے یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ اس یلغار میں وہ کہیں جاں بحق نہ ہو جائے تو میں نے تھانے دار سے کہا "بندہ کہیں پھڑک نہ جائے جناب!"

تھانے دار نے دھاڑ کے کہا "اوئے ادھر لاؤ اس...... کو۔"

ملزم کو گھسیٹ کر لایا گیا اور کھڑا رکھنے کی کوشش کی گئی مگر وہ بے دم ہو کے گر پڑا۔ میرے کہنے پر اسے پینے کے لیے پانی دیا گیا۔

فاروقی نے پوچھا "یہ کس جرم میں بند تھا؟"

اس سوال کے جواب میں روزنامچہ لایا گیا۔ معلوم یہ ہوا کہ ملزم کا نام لطیف عرف طافو تھا۔ گزشتہ رات ملتان روڈ پر ٹھوکر نیاز بیگ کے قریب ایک نئی آبادی میں ڈکیتی کی واردات ہوئی۔ تین ڈاکو ایک گھر میں لوٹ مار کر رہے تھے۔ شامت اعمال کہ جب ڈاکو آئے تو ایک بزرگ فون پر کینیڈا میں اپنے بیٹے سے بات کر رہے تھے۔ انہوں نے آہستہ سے کہا کہ "بیٹا' گھر میں ڈاکو آ گئے ہیں۔" اور ریسیور کو فون سے الگ رکھ دیا مگر ڈاکوؤں نے یہ نوٹ نہیں کیا۔ انہوں نے دھاڑ کے سب کو گن پوائنٹ پر

ہینڈز اپ کرایا اور بزرگ سے کہا کہ وہ دیوار کی طرف منہ کر کے کھڑے ہو جائیں۔ پلٹ کے دیکھا تو دو منٹ میں اوپر بھیج دیں گے پھر انہوں نے بڑی بی سے زیور مانگا۔ بہو سے پوچھا کہ نقد کتنا ہے اور کہاں ہے؟ فوراً سب نکالو ورنہ تمہارے بچے کو نیچے پھینک دیں گے۔"

ڈاکوؤں کی ساری بکواس بیٹے نے کینیڈا میں فون پر سن لی کیونکہ ریسیور الگ تھا اور ہر آواز وصول کر رہا تھا۔ اس نے وہاں سے پاکستان میں کسی کو فون کیا۔ اطلاع ایمرجنسی پولیس تک پہنچی اور ایسے ذریعے سے پہنچی کہ وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔ دس منٹ میں پولیس نے تین موبائلوں کے ساتھ دھاوا بول دیا مگر حسب روایت وہ سائرن بجاتے آئے ...... کہ ہم آ رہے ہیں' ہوشیار ...... خبردار! چور ڈاکو جلدی کریں۔ بھاگنا ہے تو بھاگ جائیں' پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی۔

وہ ڈاکو بھی بھاگے' ان کی گاڑی باہر موجود تھی لیکن اس کا ٹائر فلیٹ تھا۔ انہیں قریب ہی ایک ٹیکسی دکھائی دی۔ ڈرائیور بھی موجود تھا۔ ٹیکسی کی بیٹری ڈیڈ تھی اور ڈرائیور پریشان تھا کہ اس ویرانے میں دھکا لگانے کس سے مدد مانگے۔ جب ڈاکوؤں نے اسے گن پوائنٹ پر مجبور کیا کہ انہیں لے جائے تو اس نے کہا کہ لے جانے میں مجھے کوئی اعتراض نہیں مگر پہلے گاڑی تو چلے۔ گاڑی تب چلے گی جب تم سب مل کے دھکا لگاؤ گے۔ ڈاکوؤں میں سے ایک ڈرائیور کی جگہ بیٹھ گیا۔ انہیں شک تھا کہ اسٹارٹ ہوتے ہی ڈرائیور گاڑی لے کر بھاگ جائے گا۔ انہوں نے ڈرائیور اور اپنے ایک ساتھی سے دھکا لگوایا۔ تیسرا گن لیے کھڑا رہا۔ ابھی گاڑی اسٹارٹ ہوئی تھی کہ پولیس پہنچ گئی۔ ڈاکوؤں نے مقابلہ کیا۔ جو گن لیے کھڑا تھا سب سے پہلے مارا گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور پولیس کو دیکھتے ہی گاڑی کے نیچے گھس گیا تھا۔ جو ڈاکو اس کے ساتھ دھکا لگانے پر مامور تھا زخمی ہوا اور اب اسپتال میں تھا۔ تیسرا جو گاڑی میں بیٹھا تھا' اس کے اسٹارٹ ہوتے ہی نکل گیا' پولیس نے اس پر بھی پیچھے سے گولیاں چلائیں مگر نہ کوئی ٹائر میں لگی اور نہ ڈاکو کے سر میں چنانچہ وہ فرار ہو گیا۔

ٹیکسی ڈرائیور بظاہر ناکردہ گناہ کی پاداش میں پکڑا گیا لیکن دیکھا جائے تو جرم وہ گزشتہ رات کر چکا تھا۔ نادیہ کے قتل میں وہ بالواسطہ طور پر شریک تھا اور ان تمام جرائم میں بھی جن میں مجھے ملوث کیا گیا۔ قدرت کی پکڑ ذرا دیر میں ہوئی۔ فاروقی کے آفس کے باہر ہمارا ملنا انسانی ذہن کی سازش تھی۔ تھانے میں پھر ملنا قسمت کا لکھا تھا۔

ساری کہانی سن کے میں نے کہا "تھانے دار صاحب! میں طافو سے اکیلے میں کچھ پوچھ سکتا ہوں۔"

اس نے مجھے شک بھری نظروں سے دیکھا "ایسی کیا بات ہے جو پولیس کی موجودگی میں نہیں ہو سکتی۔"

فاروقی نے ایک قہقہہ لگایا "ایسی تو بہت باتیں ہوتی ہیں چوہدری صاحب! مثلاً آدمی تھانے میں اظہار خشق نہیں کر سکتا۔"

میں نے کہا "دراصل مجھے شک ہے کہ یہ ایک شخص کو جانتا ہے جس سے مجھے ایک پرانا حساب برابر کرنا ہے۔"

تھانے دار کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے گھڑی دیکھ کے اپنا گھڑے جیسا سر ہلایا "جو مرضی کرو نواب صاحب میں تو اب چلتا ہوں۔ پہلے ہی بڑی دیر ہو گئی ہے۔"

جب کمرے میں طافو کے ساتھ میں اور فاروقی رہ گئے تو میں نے اس سے کہا "ہاں بھئی' پھر کیا خیال ہے؟ سو پیاز اور سو جوتے کھا کے کچھ بتائے گا یا اس کے بغیر ہی۔"

اس نے کہا "میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔"

میں نے کہا "سوال نمبر ایک۔ تو کل رات مجھے کہاں لے گیا تھا؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" وہ ضدی لہجے میں بولا۔

"دوسرا سوال۔ کل تیرے ساتھ ٹیکسی میں کون تھا جس نے مجھ پر حملہ کیا تھا؟"

"مجھے نہیں معلوم۔" وہ کسی طوطے کی طرح بولا' جس کو صرف یہی ایک جملہ رٹایا گیا ہو۔

میں نے کہا "تیسرا سوال۔ صفدر سلطان مرزا کہاں ہے؟"

اس نے وہی سپاٹ لہجہ رکھا "مجھے نہیں معلوم۔"

میں نے کہا "معلوم تو سب ہے بیٹے۔ لیکن شاید تمہارا پہلے کبھی پولیس کے طریقہ تفتیش سے واسطہ نہیں پڑا۔ جہاں پتھروں سے بھی کہا جائے تو وہ گانے لگتے ہیں۔"

اس نے سرکشی سے کہا "میں کچھ نہیں بتاؤں گا خواہ تم مار مار کے میری ہڈیاں توڑ دو' میرے ٹکڑے کر دو۔"

اس کے اعتماد نے چند لمحوں کے لیے مجھے مایوسی میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں نے باہر جا کے فاروقی سے مشورہ کیا اور پھر ڈیوٹی افسر سے بات کی۔

وہ سوچ میں پڑ گیا "آپ اس سے کچھ پوچھ رہے ہو اور وہ حرامی بتاتا نہیں؟ اب آپ چاہتے ہو میں تفتیش کروں۔ کیا اس معاملے کا تعلق ڈکیتی سے ہے؟"

"نہیں یار! ڈکیتی سے تو اس بندے کا بھی تعلق نہیں۔"

"یہ آپ کیسے جانتے ہو؟"

میں نے کہا "اس لیے کہ وہ واقعی ایک ٹیکسی ڈرائیور ہے۔ اس سے صرف ایک شخص صفدر سلطان مرزا کے بارے میں معلوم کرنا ہے۔"

"کون ہے یہ صفدر سلطان مرزا۔ اور وہ اس کے بارے میں بتانا کیوں نہیں چاہتا؟"

میں نے کہا "تم نے تو مجھ سے تفتیش شروع کر دی۔ یہ بندہ میری تحویل میں ہوتا تو میں بھی اس سے پوچھ لیتا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ وہ آج اتفاق سے نظر آیا ہے تو تم نے اسے بند کر رکھا ہے۔"

ڈیوٹی افسر نے رکھائی سے کہا "ہم لوگوں کے ذاتی معاملات کی تفتیش نہیں کرتے تھانے میں۔"

میں نے کہا "دیکھو' اگر تم میری مدد کرو گے تو میں بھی جو کر سکا ضرور کروں گا۔ تعاون کبھی یک طرفہ نہیں ہوتا۔ میں ڈی آئی جی سے ایک فون اور کرا سکتا ہوں۔"

وہ سمجھ دار کیسے نہ ہوتا۔ قاضی کے گھر کے چوہے بھی سیانے ہوتے ہیں۔ اس نے مسکرا کے سر ہلایا اور ملزم کو تفتیش کے لیے ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ غالباً اس نے گزشتہ رات تفتیش کا منظر یا ڈرائنگ روم سے واپس لائے جانے والوں کا حال دیکھا تھا۔ اس کا رنگ زرد پڑ گیا اور اس نے بڑی فریادی نظروں سے مجھے دیکھا۔

چھتر دل سے چیرا لگانے تک پولیس کے پاس تشدد کے ان گنت طریقے ہیں۔ معلوم نہیں فوری نتائج کے لیے ڈیوٹی افسر نے کیا طریقہ اختیار کیا۔ صرف دس منٹ بعد مجھے طلب کیا گیا تو میں نے طافو کو فرش پر ننگا پڑا دیکھا۔ وہ درد اور تکلیف سے تڑپ رہا تھا۔ اس کا پیشاب پاخانہ سب خطا ہو گیا تھا لیکن اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی کیونکہ پولیس نے اس کے ہاتھ کمر کے پیچھے باندھ دیے تھے اور منہ میں کپڑا ٹھونس رکھا تھا۔

"لو جی۔ بندے کو بولنا سکھا دیا ہے ہم نے۔" ڈیوٹی افسر بولا۔

میں نے طافو کے قریب جا کے پوچھا "اب میں تم سے تین سوال کے بجائے صرف ایک سوال پوچھوں گا۔ صفدر سلطان مرزا کہاں ملے گا؟"

ایک کانسٹیبل نے اس کے منہ سے کپڑا نکال دیا۔ وہ زور زور سے چلانے لگا۔ دھاڑیں مار مار کے روتے ہوئے اس نے مجھے ایک سے ایک گندی گالی دی لیکن میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ جیسا کہ مجھے اندازہ ہو رہا تھا' پولیس نے اس کی ناک میں' منہ میں اور نیچے سرخ مرچیں بھر دی تھیں۔ تکلیف سے وہ لوٹنیں لگا رہا تھا مگر کچھ بتانے پر اب بھی تیار نہ تھا۔

میں نے مایوسی سے ماہر تفتیش کی طرف دیکھا تو اس نے مسکراتے ہوئے پھر طافو کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ ایک ماتحت کی مدد سے طافو کو ایک لمبی فولادی میز پر چت لٹا کے باندھ دیا گیا۔ اب وہ اس کے جسم کے نازک اعضا کو الیکٹرک شاک دینے والے تھے۔ میں باہر چلا گیا کیونکہ یہ سب دیکھنا میرے لیے بھی باعث اذیت ہو رہا تھا۔

جب میں دوسری بار اندر گیا تو طافو مجھے نزع جیسی کیفیت میں مبتلا نظر آیا لیکن ماہر تفتیش نے مجھے یقین دلایا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ بندہ بڑا سخت جان ہے۔ مرے گا نہیں' میں نے دوبارہ اپنا سوال دہرایا تو طافو نے پھٹی پھٹی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے اقرار میں سر ہلایا۔

میں نے کہا "طافو! تم صفدر سلطان مرزا سے ڈرتے ہو نا؟ اگر اسے پتا چلا کہ تم نے مجھے اس کا پتا دیا تھا۔ تو وہ تمہارے سارے خاندان کو سزا دے گا۔ فکر مت کرو' یہ میں اسے نہیں بتاؤں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔"

اچانک مجھے یوں لگا جیسے طافو کی آنکھوں میں خوف اور دہشت کی جگہ تھوڑا سا اطمینان اتر آیا ہے۔ اس نے پھر اقرار میں سر ہلایا۔

میں نے اپنا کان اس کے منہ کے قریب کر دیا "آہستہ سے بتا دو۔ کوئی اور نہیں سن رہا ہے۔ صفدر سلطان مرزا کہاں ملے گا؟"

طافو کے منہ سے کپڑا نکالا گیا تو اس نے مجھے پتا بتا دیا۔ اس کے منہ سے الفاظ ٹوٹ کر نکل رہے تھے۔ اس پر لرزہ طاری تھا اور اس کا جسم کسی مرگی کے مریض کی طرح تشنج سے اینٹھ رہا تھا مگر میں نے اس کے الفاظ دہرا کے پتا اچھی طرح ذہن نشین کر لیا۔

"اگر یہ غلط ہوا تو میں پھر آؤں گا طافو!" میں نے کہا "میں تمہاری لاش کو بھی بولنے پر مجبور کر دوں گا۔"

وہ اپنی دہشت بھری آنکھوں سے مجھے تکتا رہا۔ میری بات اب اچھی طرح اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ میں اسے چھوڑ کے واپس ایس ایچ او کے کمرے میں پہنچا تو فاروقی کا ہمیشہ ہنستا مسکراتا چہرہ مجھے متفکر نظر آیا۔ وہ ہر اعتبار سے ایک مخلص دوست ثابت ہو رہا تھا۔ اس نے میری مدد کرنے کے لیے اپنے عدالتی معاملات کو چھوڑ دیا تھا اور قانون کی بھول بھلیوں سے مجھے بحفاظت گزارنے کے لیے اپنی تمام صلاحیت کے ساتھ اپنے اثر رسوخ کو بھی پوری طرح استعمال کر رہا تھا۔

میری صورت پر امید اور کامیابی کی مسکراہٹ دیکھ کے وہ پُرجوش انداز میں اٹھا "یار! کیا ہوا' کچھ پتا چلا؟"

میں نے ہاتھ اس کے ہاتھ پر مار کے کہا "فاروقی صاحب! پتا کیسے نہ چلتا' اللہ مہربان تو مشکل آسان۔"

اس کا چہرہ کھل اٹھا "کیا واقعی۔ یار! یہ تو کمال ہو گیا۔ واللہ کیا قسمت پائی ہے آپ نے۔ ہم تو مان گئے نواب صاحب! بقول شاعر۔ خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھیے احوال۔ کہ آگ

لینے کو جائیں پیمبری مل جائے۔" اس نے اپنے مخصوص انداز میں قہقہہ بلند کیا "ہم نے تو کار چوری کے الزام میں بند کرادیا تھا تمہیں۔ یہاں آ کے مسئلہ ہی حل ہوگیا۔"

میں نے کہا "ابھی ایک مرحلہ باقی ہے فاروقی! جو اصل مرحلہ ہے۔"

ڈیوٹی افسر کو حق محنت کی ادائیگی پھر فاروقی نے کی۔ میں نے حساب لگایا تو اپنی زندگی اور اپنی عزت کو بچانے کی جو قیمت میں نے ادا کی تھی' وہ پچیس ہزار روپے تھی۔ یہ میرے نزدیک ایک پیسے جتنی بھی نہ تھی۔ ایک بازاری لڑکی سے تعلق کے رسواکن الزام اور اس کے قتل کے جرم کی سزا سے بچنے کے لیے میں پچیس لاکھ بھی دیتا اور خدا کا شکر بھی ادا کرتا۔

تاہم ابھی پورے یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ مجھے تحفظ کی مکمل ضمانت حاصل ہوگئی ہے۔ ایک انگریزی محاورے کے مطابق۔ اب تاریک سرنگ کے آخر میں روشنی نظر آ رہی تھی۔

فاروقی بہت جوش میں تھا۔ اس نے کہا "کیا خیال ہے' پولیس کے ساتھ دھاوانہ بولیں؟"

میں نے کہا "پولیس کو ہم بعد میں بلالیں گے اگر ضرورت محسوس ہوئی' پہلے میں خود اس سے بات کرلوں۔"

"وہ خطرناک جانور ہے نواب صاحب!"

میں نے کہا "انسان سے زیادہ خطرناک کوئی جانور نہیں ہوسکتا فاروقی! دراصل میں اسے زیادہ مہلت نہیں دینا چاہتا اگر گزشتہ رات کی کوئی فلم بنائی گئی ہوگی تو ابھی اس کے سوا کسی نے نہیں دیکھی ہوگی۔ ابھی ساڑھے گیارہ بجے ہیں۔ پولیس تو اپنی کارروائی کرچکی ہوگی مگر سلطان اپنا کام سہولت سے کرے گا۔ وہ فلم کی کاپیاں بنوائے گا پھر ثبوت پولیس کو فراہم کرنے سے پہلے وہ مجھ سے سودا کرنے کا سوچے گا۔"

"کیسا سودا؟"

میں نے کہا "فریال کا سودا۔ وہ کہے گا کہ فریال کو چھوڑ دا گر وہ مجھ سے شادی کرلے تو تم بچ جاؤ گے۔ ابھی تک اس نے مجھ سے رابطہ نہیں کیا ہے۔ اس کا مطلب ہے ابھی وہ تیاری کر رہا ہے۔"

"کسی بلیک میلر کی زبان پر بھروسا نہیں کیا جاسکتا نواب صاحب!"

میں نے کہا "رائٹ۔ پہلی بات تو یہ کہ میں بلیک میل ہونے والا نہیں۔ پتا نہیں اس نے کیسے سوچ لیا کہ وہ اس طرح فریال کو مجھ سے بدظن کرسکتا ہے یا مجھے مجبور کرسکتا ہے کہ اس کے عشق سے دستبردار ہوجاؤں۔ بفرض محال یہ ہوجائے' فریال خود مجھے چھوڑ دے یا میں ڈر جاؤں۔ تو اس بات کی کیا ضمانت ہوگی کہ آئندہ کبھی کسی اور موقع پر وہ مجھے پھر بلیک میل نہیں کرے گا۔"

"یہی میں بھی سمجھانا چاہتا تھا تمہیں اگر اس نے تمہیں فلم کی ماسٹر کاپی دے دی۔ تو یہ کیسے پتا چلے گا کہ اس نے کوئی کاپی بنا کے اپنے پاس نہیں رکھی ہے۔ وہ بے وقوف نہیں ہے۔ اسے شک ہوسکتا ہے کہ تمہیں بچانے کے لیے فریال اسے وقتی طور پر قبول کرلے اور جب خطرہ نکل جائے تو چھوڑ دے۔ فلم کی کاپی فریال کے پیروں میں ایک زنجیر ہوگی۔ تم اسے موقع ہی نہ دو کاپی بنانے کا۔"

"ہم سیدھے اس سے ملنے جا رہے ہیں۔ یہ اس کی زندگی کا سب سے بڑا سرپرائز ہوگا۔ وہ بے خبری میں پکڑا جائے گا۔"

"تمہارے پاس اپنی حفاظت کے لیے کیا ہے؟"

میں نے کہا "تم جو ہو میرے ساتھ۔"

"میرا مطلب تھا۔ اسلحہ!"

"اس کا بندوبست بھی تم ہی کرو گے۔" میں نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ وہ سوچ میں پڑا پھر اس کے چہرے پر روشنی آ گئی۔ اس نے موبائل سے کوئی نمبر ملایا اور بلاتوقف شروع ہوگیا۔ رائج الوقت گالیوں کا اسٹاک ختم ہونے پر اس نے کام کی بات کی پھر خاموشی سے کچھ سنتا رہا "تمہارے پاس صرف دس منٹ ہیں اور ہم اس وقت تھانے سے باہر آئے ہیں تو بھی یہیں آ جا۔"

یوں دس منٹ بعد میرے پاس ایک ریوالور آ چکا تھا۔ آنے والا ٹرابی تھا کہ اسی وقت فاروقی کے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ فون راجا کا تھا۔ وہ فرخ کے ساتھ اس کی جیپ میں لاہور پہنچ گیا تھا۔ میں نے اسے مختصراً تھانے کے واقعات بتا دیے۔ "اب میں فاروقی کے ساتھ صفدر سلطان سے ملاقات کرنے جا رہا ہوں۔"

"مجھے اس کا پتا سمجھا' ہم بھی آتے ہیں۔"

میں نے کہا "اس سے ملنے میں اکیلا جاؤں گا۔ فاروقی کے ساتھ تم اور فرخ باہر انتظار کرو گے۔ ضرورت پڑے گی تو میں تمہیں بلالوں گا۔"

"ویکھے پتر! فاروقی اور فرخ باہر رہیں گے۔ میں تیرے ساتھ جاؤں گا۔" راجا نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "یہ شہناز اور فریال کہاں ہیں؟"

میں نے کہا "وہ نکل گئی ہوں گی۔ ست بدھائی جانے کے لیے۔ میں نے فریال سے کہا تھا کہ اس گھر میں وہ محفوظ نہیں ہیں۔ فریال کو اپنا حلیہ بدل کے جانا تھا۔"

"تو نے اپنے گھر والوں سے بات کی؟"

میں نے کہا "ابھی کرلیتا ہوں۔ صبح سے موقع کہاں ملا تھا؟"

فاروقی نے پتا سمجھ لیا تھا۔ یہ گلبرگ تھری کے علاقے میں کوئی گھر تھا۔ آٹھ سال میں یہ سارا علاقہ بہت بدل گیا تھا مگر فاروقی سارے راستوں سے واقف تھا۔ وہ گاڑی چلاتا رہا۔ میں نے اس کی بیوی سے بات کی اور اس سے کہا کہ وہ رابعہ کو فون کرے۔ دو منٹ بعد فاروقی کے موبائل فون پر رابعہ آ گئی۔

میں نے کہا "ہیلو کزن! ہاؤ ڈو یو ڈو؟"

وہ بگڑ گئی "مجھ سے میرا حال پوچھ رہے ہو۔ تم ہو کہاں نواب صاحب! زمین کے نیچے یا آسمان کے اوپر۔ کل سے اب تک تمہاری کوئی خیر خبر نہیں۔ کیا سچ مچ کے نواب بن گئے ہو کزن! ریاست کے معاملات سے فرصت نہیں ملتی۔ شہر تشریف لاتے ہو تو یہاں کی مصروفیات میں ہم سب غیر اہم ہوجاتے ہیں۔ والدین کی باری بھی نہیں آتی شرف ملاقات کے لیے' مجھ پر تو بھیجو لعنت۔"

میں نے کہا "جو تم پر لعنت بھیجے' اس پر سو بار ہزار بار لعنت۔ قسم خدا کی ایک تم ہی تو ہو جس پر میں سب سے زیادہ بھروسا کرتا ہوں۔ یہ بتاؤ' گھر میں تو سب ٹھیک ہے ناں؟"

"ابھی تک تو میں نے کسی کو نہیں بتایا۔ مگر۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی "مگر کیا۔ انشاء اللہ آج رات تک میں ضرور آ جاؤں گا۔"

وہ چیخ کے بولی "نہیں نہیں' کیا ضرورت ہے رات کو بھی ہمارے غریب خانے میں قدم رنجہ فرمانے کی۔ وہیں رہیے جہاں گزشتہ رات رونق افروز تھے' عیش کیجیے۔"

میں نے آہ بھر کے کہا "خدا کے لیے ایسی بددعا مت دو۔ تمہیں کیا معلوم کل رات مجھ پر کیا قیامت گزری؟"

"اور تمہیں کیا معلوم کتنی مشکل سے میں نے سب کو روکا تھا۔ سب تمہیں فون کرنا چاہتے تھے۔ وہ جو تمہارا سالا ہے فرخ! اس سے کہا کہ فون آئے تو کوئی بہانہ کردینا' وہ بے چارہ مان گیا۔"

"بہت خوب! وہ میرا تو ہے سالا اور تمہارے لیے بے چارہ۔ ارے کزن! میں سب جانتا ہوں اس کی بے چارگی کیا ہے؟ اگر وہ بے چارہ ہے تو تم بے چاری ہو۔"

"بک بک نہ کر۔ اب گھر جا۔ جلدی آ۔" وہ ہنستے ہوئے اردو کے پہلے قاعدے کا سبق دہرانے لگی۔ میں نے فون بند کردیا۔

جو پتا طانو نے سمجھایا تھا وہ ایک بہت وسیع کوٹھی کا تھا جو شاید آٹھ کنال کے پلاٹ پر تھی۔ اس کے چاروں طرف وسیع باغ تھا۔ درمیان میں کوٹھی زیادہ بڑی نہیں تھی۔ میں نے فاروقی سے کہا کہ وہ سیدھا گزر جائے۔ کوٹھی کے گیٹ پر کسی سکیورٹی ایجنسی کا وردی والا مسلح موجود تھا۔ ایک اور محافظ کی موجودگی اندر کے کیبن میں ثابت ہوتی تھی۔ اس کا انٹرکام پر کوٹھی کے اندر رہنے والوں سے رابطہ ہوگا۔

ابھی ہم مشکل سے سو گز آگے گئے تھے کہ مخالف سمت سے مجھے فرخ کی جیپ اپنی طرف بڑھتی نظر آئی۔ سائڈ میں ایک خالی پلاٹ پر کچھ تعمیراتی سامان ڈھیر تھا۔ فاروقی نے گاڑی کو موڑ کے روک لیا۔ فرخ نے اپنی جیپ برابر میں لا کھڑی کی۔ ہمارے درمیان ایک مختصری میٹنگ ہوئی پھر میں فرخ کے ساتھ پیچھے والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اس نے مجھے گیٹ سے کچھ پیچھے اتارا اور جیپ کو عین گیٹ کے سامنے لے گیا۔

"سنتری بادشاہ! اپنے صفدر صاحب ہیں۔" فرخ نے دوستانہ لہجے میں پوچھا۔

محض تصدیق کے لیے سنتری نے کہا "کون صفدر صاحب!"

فرخ بولا "اپنے صفدر سلطان مرزا صاحب! انہوں نے بلایا تھا مجھے۔"

سنتری اسے غور سے دیکھ ہی رہا تھا کہ میں نے دبے پاؤں آگے بڑھ کر اسے یوں دبوچا کہ اس کے حلق سے کوئی آواز بھی نہ نکل سکی۔ میرا ایک ہاتھ اس کے منہ پر جم گیا تھا۔ دوسرے ہاتھ کی مدد سے میں نے اسے پیچھے کھینچ لیا۔

اب فرخ نے لوہے کے بھاری بھرکم گیٹ کو بجانا شروع کیا۔ اندر والا گارڈ اپنے کمرے سے نکلا "کیا بات ہے؟"

"بات کیا ہے' اندر جانا ہے' گیٹ کھولو۔" فرخ نے کہا۔

وہ آگے آیا "اس کے لیے گیٹ توڑو گے؟ باہر گارڈ کھڑا ہے' اس سے بات کرو۔"

فرخ نے کہا "باہر تو صرف میں کھڑا ہوں اور میں گارڈ نہیں ہوں۔ مجھے صفدر سلطان مرزا کو دس لاکھ دینے کے لیے بھیجا گیا ہے۔"

"کہاں ہیں دس لاکھ۔" دوسرے گارڈ نے گیٹ کے اوپر سے جھانکا "ادھر جو بندہ ڈیوٹی پر تھا' وہ کدھر گیا؟"

"او جی' میں نے تو نہ بندہ دیکھا نہ بندے دا پتر۔ رقم پڑی ہے گاڑی میں۔ بے شک آپ لے جاکے دے دو۔ صفدر صاحب سے بولو مجھ سے فون پر بات کرلیں۔ وہ اندر ہیں ناں؟"

گارڈ نے اقرار میں سر ہلایا جو اس بات کا اقرار تھا کہ صفدر سلطان موجود ہے اور یہ بھی کہ وہ رقم اندر پہنچادے گا مگر اسے زیادہ تشویش اس بات پر تھی کہ ڈیوٹی پر موجود سکیورٹی گارڈ کچھ بتائے بغیر کہاں غائب ہوگیا۔ وہ گیٹ کھول کر یہی دیکھنے باہر نکلا

تھا کہ میں نے اسے بھی قابو کرلیا۔ وہ فرخ کی طرف اور جیپ کی طرف متوجہ تھا کیونکہ فرخ نے جیپ میں سے فاروقی کا بریف کیس نکال لیا تھا۔

سڑک عام طور پر سنسان رہتی تھی۔ یہاں رہنے والوں کے سوا اس سڑک پر سے کوئی اور گاڑی نہیں گزرتی تھی۔ یہ بڑی بڑی کوٹھیاں ویسے بھی دور دور بنی ہوئی تھیں اور جو کچھ ایک گھر میں ہوتا تھا بعض اوقات اس کی خبر خود اس گھر میں رہنے والوں کو بھی نہیں ہوتی تھی تو پڑوس والوں کو کیا پتا چلتا چنانچہ یہاں کے مکین خدا پر کم اور سکیورٹی کمپنی کے حفاظتی انتظام پر زیادہ بھروسا کرتے تھے۔

میں نے اور فرخ نے دونوں محافظوں کو کیبن میں منتقل کردیا۔ فرخ کی جیپ میں نائلون کی بڑی مضبوط نئی رسی تھی جو خرابی کی صورت میں گاڑی کو دوسری گاڑی سے باندھ کر لے جانے کے لیے تھی۔ وہ دونوں سکیورٹی گارڈز کو باندھنے میں کام آئی۔

دور سے راجا نے گرین سگنل کا انتظار کیا۔ میں نے باہر جاکے اشارے سے واضح کیا کہ راستہ صاف ہے اور فرخ کے ساتھ آگے بڑھا۔ گیٹ کے بعد تقریباً پچاس ساٹھ گز کی سرخ بجری والی سڑک تھی جو آگے جاکے دوشاخہ بن جاتی تھی۔ ایک نسبتاً کم چوڑی سڑک سیدھی گیراجوں کی طرف چلی جاتی تھی۔ دوسری پورچ کے نیچے سے گھوم کے سامنے والے وسیع بیضوی لان اور باغ کا چکر لگانے کے بعد پھر اسی گیٹ پر پہنچ جاتی تھی جس سے ہم آئے تھے۔ یہ غالباً حفاظتی بندوبست تھا کہ اتنی بڑی کوٹھی میں آنے اور جانے کے لیے دو گیٹ نہیں رکھے گئے تھے۔

میں اور فرخ اطمینان سے چلتے ہوئے پورچ تک گئے جہاں ایک شاہانہ لینڈ کروزر کے اسٹیرنگ وہیل پر سر رکھے باوردی ڈرائیور سو رہا تھا۔ اب ہمارے سامنے چند سیڑھیوں کے بعد بلند و بالا اور منقش شیشم کی کھڑکی کا دروازہ تھا۔

اچانک اندر سے سفید وردی والا چپراسی یا ملازم دروازہ کھول کے باہر آیا۔ اس نے ہمیں سلام کیا اور ہمارے لیے دروازے کا ایک پٹ تھام کے کھڑا ہوگیا۔ اس کے لیے ہم ملاقاتی یا مہمان تھے جو سکیورٹی کے تمام مراحل طے کرنے کے بعد ہی یہاں تک پہنچ پائے تھے۔

میں نے سرسری انداز میں کہا "صفدر صاحب کدھر ہیں؟"

اس نے اندر آکے وسیع گول لاؤنج میں دائیں جانب کی سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا "اوپر شاہ جی کے کمرے میں۔"

شاہ جی غالباً اس کوٹھی کے مالک تھے۔ گیٹ پر مجھے کسی کے نام کی تختی نظر نہیں آئی تھی۔ میں نے ایک سنگ مرمر کی تختی پر "شاہ کا محل" اور سن تعمیر انیس سو چورانوے لکھا ہوا ضرور دیکھا تھا۔ اندر سے اسے دیکھ کر دل سے یہ دعا نکلی تھی کہ یہ کا محل یعنی جھونپڑی ہے تو اللہ پاکستان کے ہر غریب کو یہ جھونپڑی دے۔

لاؤنج کے اوپر گول گیلری تھی جس میں پیتل کی خوبصورت ریلنگ سونے کی طرح چمک رہی تھی۔ اس گیلری کے پیچھے متعدد کمرے اور ان کے دروازے کھڑکیاں تھے۔ دو ملازم مجھے عقبی حصے کے کسی زینے سے اوپر آتے اور نیچے جاتے دکھائی دیے۔ وہ زینہ غالباً کچن کی طرف اترتا ہوگا۔

مگر ہم ہر دروازہ کھول کے جھانکتے اور صفدر کو تلاش کرتے تو خرابی بھی ہوسکتی تھی۔ کیا پتا وہ کس کا بیڈروم ہوتا۔ وہاں باپردہ خواتین ہوتیں تو ان کی چیخ الارم کی طرح گونجتی۔ میں نے ایک ملازم کو اشارے سے بلا کے پوچھا "صفدر صاحب کہاں ہیں اس وقت؟"

اس نے ہاتھ سے اشارہ کردیا مگر اس سوال سے شک میں پڑ گیا کہ یہ اجنبی کون ہیں جو پہلے دیکھے نہیں گئے مگر آج یہاں تک پہنچ گئے ہیں۔ اس نے پوچھا "کیا کام ہے جی آپ کو ان سے۔ کون ہیں آپ؟" مگر میں نے مسکرا کے ہاتھ ہلا دینا کافی سمجھا اور دروازہ کھول کے اندر داخل ہوگیا۔

میرا خیال ہے کوئی دولھا حجلۂ عروسی میں بیڈ پر لال جوڑے والی دلہن کی جگہ آدم خور شیر کو بیٹھا دیکھ کے اتنا حیران، بدحواس اور خوف زدہ نہ ہوتا جتنا صفدر سلطان مرزا مجھے اپنے سامنے پا کے ہوا۔ وہ ایک دم اٹھا اور اس نے اِدھر اُدھر دیکھا پھر منہ کھولنا ہی چاہتا تھا کہ اسے میرے ہاتھ میں سائلنسر لگا ہوا ریوالور نظر آگیا۔ فرخ نے دروازے کو اندر سے مقفل کردیا تو میں نے کہا "آرام سے بیٹھ جاؤ صفدر سلطان مرزا! مقابلے کی یا کسی کو مدد کے لیے پکارنے کی غلطی مت کرنا۔"

یہ بھی ملاقاتیوں کا کمرا تھا جہاں شاید قریبی دوست عزیز اور مخصوص لوگوں کی رسائی ہوگی۔ شاہانہ انداز میں سجائے گئے ہال میں صوفے اسی طرح لگائے گئے تھے کہ زیادہ افراد ہوں تو گروپ کی صورت میں الگ بھی بیٹھ جائیں اور ایک کی گفتگو سے دوسرا ڈسٹرب نہ ہو۔ صفدر سلطان ایک صوفے پر بہت سے کاغذات اور فائلیں پھیلائے بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے ایک بریف کیس کھلا ہوا تھا۔ دوسرا اس کے قریب ہی صوفے پر بند پڑا تھا۔

"تم یہاں تک کیسے آئے؟" صفدر نے بالآخر اپنے حواس پر قابو پا کے سخت لہجے میں کہا۔

میں اس کے مقابل بیٹھ گیا "زیادہ اہم یہ سوال ہونا چاہیے کہ میں یہاں کیوں آیا؟ اب میں آگیا ہوں تو ظاہر ہے

تمہارے ساتھ لوڈو کھیلنے نہیں آیا۔ میں تم سے بات کرنے آیا ہوں۔"

"تمہیں کس نے بتایا کہ میں یہاں ملوں گا؟" وہ تند لہجے میں بولا۔

"غیر ضروری سوالات کیوں کرتے ہو۔ میں جواب نہیں دوں گا' تمہیں خود سمجھ لینا چاہیے کہ تمہارا کسی فرشتے سے معلوم نہیں ہوا ہوگا۔ راستہ بتانے والے اور راستہ دینے والے تمہارے اپنے ہی بندے تھے۔ پولیس کو بلانے کی دھمکی بھی مت دینا۔ پولیس آئے گی تو ہمارے ساتھ تمہیں بھی لے جائے گی۔"

اس نے برہمی سے کہا "کام کی بات کرو رفیق!"

میں نے کہا "دیکھو سلطان! نہ میں دھمکی دینے آیا ہوں اور نہ تمہیں کوئی نقصان پہنچانے۔ میں برابری کی بنیاد پر ایک سودا کرنا چاہتا ہوں بلکہ یوں سمجھو کہ میرے پاس تمہارے لیے ایک آفر ہے۔"

"کیسی آفر؟"

"اگر تم مجھے یہ بتادو کہ فریال کہاں ہے؟ تو میں تمہارے سالے کو یہ نہیں بتاؤں گا کہ تم یہاں ہو۔ تم جانتے ہو اپنی بہن کے قتل پر کتنا مشتعل ہے اور ایک معزز امریکن شہری کی حیثیت سے اپنا پورا اثر رسوخ تمہارے خلاف مقدمہ قتل کو آگے بڑھانے میں صرف کررہا ہے۔"

سلطان مجھے گھورتا رہا "فریال کا پتا تم مجھ سے پوچھ رہے ہو؟ تم نے ہی اسے اغوا کیا ہے اور پاکستان لے آئے ہو۔ حالانکہ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ وہ میری منگیتر ہے۔ کہاں چھپا رکھا ہے تم نے؟"

میں نے کہا "ڈراما مت کرو سلطان! جب تم نے فون کرکے مجھ سے پوچھا تھا کہ فریال کہاں ہے' اسی وقت میں سمجھ گیا تھا کہ تم نے اسے اغوا کرکے کہیں حبس بے جا میں رکھا ہے۔ میں نے اسے قتل کرکے اس کی لاش بھی غائب کردی ہے۔"

"بند کرو اپنی یہ بکواس! مجھے معلوم ہے وہ لندن میں تم سے کیسے ملتی تھی۔ وہ طبیعت کی خرابی کا بہانہ کرکے جاتی تھی ڈاکٹر شائستہ کے گھر اور وہاں سے اس کی گاڑی میں نکل جاتی تھی۔ میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں رفیق!"

میں نے کہا "میں بھی نہیں چھوڑوں گا تمہیں سلطان۔ لندن میں وہ تمہارے فلیٹ میں رہتی تھی۔ اس کا ملازم اور ڈرائیور تمہارا خاص آدمی تھا جو اس کے فون بھی سنتا تھا۔ سائے کی طرح اس کا تعاقب کرتا تھا۔"

"کیوں نہ کرتا۔ وہ میری ہونے والی بیوی تھی۔"

میں نے کہا "تمہاری ایک اور ہونے والی بیوی نازنین تھی۔"

سلطان کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے بدلا "اگر وہ فاحشہ ایسا کہتی ہے تو مجھے پروا نہیں۔"

"تم پروا کرو گے سلطان! اس نے فریال کو آخری بار تمہارے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ تمہارے ساتھ گاڑی میں کہیں گئی تھی۔ سوچو ذرا کہ میں نے تمہارے خلاف لندن میں فریال کے قتل کا کیس کردیا تو تم کہاں جاؤ گے؟ یہاں تو پہلے ہی تمہارے خلاف اپنی بیوی کے قتل کا کیس ہے اور اس کا امریکن بھائی تمہاری جان کا دشمن ہورہا ہے۔ وہ نہ ہوتا تو تم اس کیس کو آسانی سے دبا دیتے لیکن تمہیں جان بچانے کے لیے فرار ہونا پڑا۔ تم جعلی شناختی کارڈ سے دوسرا پاسپورٹ بنوا کے گئے تھے اور اسی پر لوٹ کے پاکستان آئے ہو۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ لندن میں میرے تعلقات کیسے ہیں؟"

"ناجائز تعلقات کیوں نہیں کہتے۔"

میں نے کہا "لارڈ ارنسٹ میری بہت عزت کرتا ہے۔ اس نے فون کرکے مجھے بتایا ہے کہ اس کی بیٹی عائشہ پاکستان آرہی ہے اور میں نے اسے یقین دلا دیا ہے کہ یہاں وہ بالکل محفوظ ہوگی۔"

"تم نے فریال کو اپنی اسی ریاست میں چھپا رکھا ہے جس کے تم نواب بن گئے ہو۔" اس نے غصے میں میری بات کاٹ دی۔

میں نے کہا "کیا تمہارے کسی جاسوس یا مخبر نے اسے وہاں دیکھا تھا' ست بدھائی کی حویلی میں آتے جاتے؟ میں تمہیں آفر کرتا ہوں' تم خود آکے دیکھو۔ لیکن اس آفر کا تعلق اصل آفر سے نہیں ہے۔"

باہر سے کسی نے دروازہ بجایا تو سلطان نے کہا "کیا بات ہے؟"

کسی نے باہر ہی سے پوچھا "جناب عالی! آپ سے ملنے کوئی آیا ہے؟"

میں نے ریوالور کو گود میں رکھ لیا "فرخ! دروازہ کھولو۔" میں نے کہا اور پھر سلطان کو اشارہ کیا "ایک ملازم کو ہم پر شک ہوگیا تھا۔ اسے بتاؤ کہ ہم پرانے ملاقاتی ہیں بلکہ ہمارے لیے چائے بھی منگواؤ۔"

فرخ نے دروازہ کھولا تو وہی ملازم اندر آگیا۔ اس نے ہمیں مشکوک نظروں سے دیکھا اور سر ہلانے لگا "یہی بندے تھے جناب!"

سلطان نے کہا "ٹھیک ہے تم جاؤ۔ کسی سے کہو چائے بھیج دے۔"

وہ پھر بھی اپنی جگہ کھڑا رہا۔ "وہ۔ جناب عالی! معاملہ گڑبڑ ہے کچھ۔ باہر ہمارے گارڈ بندھے پڑے تھے۔ میں نے کمپنی کو اطلاع دی پھر پولیس کو۔"

سلطان نے کہا "اچھا کیا۔ اب جاؤ' ہمیں ڈسٹرب مت کرنا۔"

وہ ملازم غالباً دوسرے ملازموں کا داروغہ یا حویلی کے اندر کے معاملات کا نگراں وغیرہ ہوگا مگر وہ مالکوں کی مرضی کا پابند تھا۔

میں نے کہا "یہ تم نے اچھا کیا کہ نہ اپنے لیے پریشانی پیدا کی اور نہ ہمارے لیے۔ اب یہ بتاؤ' وہ فلم کہاں ہے؟"

سلطان بری طرح چونکا "کون سی فلم؟"

میں نے کہا "واقعی' تم نے تو اتنی فلمیں بنائی ہیں کہ سب کے نام یاد نہیں رہتے ہوں گے مگر میں ایک بے نام فلم کی بات کررہا تھا۔"

حقیقت یہ تھی کہ سلطان نے کئی سال پہلے تین فلمیں بنائی تھیں۔ ایک اردو' ایک پنجابی اور ایک پشتو۔ تینوں بری طرح فلاپ ہوئی تھیں۔ ہر فلم میں اس نے ایک نئی ہیروئن کو متعارف کرایا تھا اور وہ ان کی پہلی اور آخری فلم ثابت ہوئی تھی کیونکہ صفدر سلطان مرزا صرف پروڈیوسر ہی نہیں ہر فلم کا مصنف اور ہدایت کار بھی تھا۔ اس کے بعد وہ نئی نئی لڑکیوں کو چانس دینے کے لیے فلموں کا اعلان کرتا رہا۔ کچھ کے مہورت بھی ہوئے مگر فلموں تک کوئی نہ پہنچی۔ لالی وڈ میں یہ ایک سنہرا جال تھا جس میں وہ اپنی عیاشی کے لیے نت نئی لڑکیوں کو پھانستا رہتا تھا۔ ایسے ہی فریال اس جال میں گرفتار ہوئی تھی اور ایسے ہی نازنین۔

اس نے انجان بننے کی کوشش کی "کون سی بے نام فلم؟"

میں نے کہا "جس کی شوٹنگ گزشتہ شب ہوئی۔ اس کی ہیروئن تھی نادیہ۔ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے لیکن ہیرو تمہارے سامنے موجود ہے۔"

"میں سمجھا نہیں تم کیا کہہ رہے ہو؟"

میں نے کہا "سلطان! کل رات ایک ٹیکسی میں مجھے اغوا کیا گیا۔ ایک پلان کے تحت میری گاڑی کی بریک لائن کاٹی گئی پھر تمہارا بندہ ٹیکسی لے کر آگیا۔ اس میں دوسرا بندہ پیچھے موجود تھا جس نے مجھے ناک آؤٹ کیا اور وہ مجھے کسی نامعلوم جگہ لے گئے۔ تم نے نادیہ کو وہاں بھیجا کہ مجھ سے فریال کا پتا پوچھے مگر درحقیقت وہ کسی اور مقصد سے وہاں آئی تھی۔ رات کو جو کچھ ہوا اس کی فلم بنائی گئی۔ وہ سب مجھ سے کرایا گیا تھا۔ نادیہ آلہ کار بنی تھی۔ اسے قتل کردیا گیا۔"

"اور تم سمجھتے ہو یہ سب میں نے کرایا تھا؟"

"سلطان! مجھے وہ فلم چاہیے۔" میں نے کہا "جواب تک تمہارے پاس پہنچ گئی ہوگی۔ تمہارا مجھے بلیک میل کرنے کا پلان فیل ہوچکا ہے۔ خدا نے مجھے بچالیا۔ مجھے کوئی نقصان نہیں ہوا اس لیے میں ایک آفر کررہا ہوں' جس میں ہم دونوں کی بہتری ہے۔ تم وہ اوریجنل فلم میرے حوالے کردو اور اگر اس کی کوئی کاپی ہے تو وہ بھی ورنہ۔"

"ورنہ تم کیا کرو گے؟"

"ایک آدمی جس کی عزت اور زندگی داؤ پر لگی ہوئی ہو۔ سب کچھ کرسکتا ہے اس لیے میں ایک آسان آفر لے کر آیا ہوں۔ فلم میرے حوالے کردو۔ میں جیسے آیا تھا' ایسے ہی واپس چلا جاؤں گا۔ یہاں میں اکیلا نہیں آیا تھا۔ میرے کچھ ساتھی باہر موجود ہیں۔ ان میں ایک بہت نامی گرامی وکیل ہے اور ایک مہا حرامی صحافی۔ میرے ایک اشارے پر وہ پولیس کو بلالیں گے۔ تم گرفتار ہوجاؤ گے۔ اس آفر سے فائدہ اٹھاؤ۔ اپنے اور میرے لیے پریشانی کے اسباب مت پیدا کرو۔ ورنہ بعد میں جو ہوگا وہ ہم بھگت ہی لیں گے' میں بھی اور تم بھی۔"

میں سلطان کے چہرے کے تاثرات کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا اور آہستہ آہستہ مجھے یقین آرہا تھا کہ خوش نصیبی نے میرے ہاتھ میں جو ٹرمپ کارڈ تھما دیا تھا' وہ کام کرگیا ہے۔ شکست خوردگی کے آثار سلطان کی صورت پر نمودار ہونے لگے تھے۔

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا جس میں سلطان اعصابی کشیدگی میں اپنے ہونٹ کاٹتا رہا اور اپنی انگلیاں چٹختاتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا "اوکے' اٹ از اے ڈیل۔ فلم لو اور یہاں سے دفع ہوجاؤ۔"

اس نے صوفے پر رکھا ہوا بریف کیس کھولا اور اس میں سے ایک وڈیو فلم نکال کے میری طرف بڑھائی۔ "ایک بات میں واضح کردوں' جو کچھ فریال نے میرے ساتھ کیا ہے' اس کے بعد میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔"

میں نے کہا "اس سے زیادہ تم کیا کرو گے؟ قتل تو کردیا ہے تم نے اسے۔"

"نہیں' ابھی وہ زندہ ہے۔"

"تو پھر میرا ابھی چیلنج ہے۔ تم اسے قتل نہیں کرسکو گے۔ فلمی زبان میں کہوں۔ اس کے لیے تمہیں میری لاش پر سے گزرنا پڑے گا۔ وہ میری محبت ہے سلطان۔ اس کی حفاظت مجھ پر فرض ہے۔"

"اور وہ میری عزت ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ تمہیں مل جائے لیکن اس کی شادی پہلے مجھ سے ہوگی۔ پہلی شب عروسی

میرے ساتھ گزارے گی پھر میں فریال تمہیں بخش دوں گا۔'' وہ غصے اور بے بسی سے پاگل ہو رہا تھا۔

میں نے کہا ''اگر وہ تمہیں مل جائے تو یہ چیلنج اسے بھی دے دینا۔ وہ بھی یہی کہ اس کے لیے تمہیں میری لاش پر سے گزرنا پڑے گا۔''

''تمہارا کیا خیال ہے۔ فریال کہاں جا سکتی ہے؟'' وہ بولا۔

میں نے کہا ''تمہارا کیا خیال ہے فریال کہاں جا سکتی ہے؟''

وہ چڑ گیا ''صفدر سلطان سے بھاگ کے وہ کہیں نہیں جا سکتی۔''

میں نے کہا ''میں تم پر اعتبار نہیں کر سکتا۔ میں اس فلم کو چیک کروں گا۔''

اس نے ایک طرف رکھے ہوئے ہوم تھیٹر کی طرف اشارہ کیا ''اپنے کرتوت اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔''

میں نے ریوالور فرخ کو دیا ''امید ہے تم صرف صفدر سلطان پر نظر رکھو گے۔''

فرخ نے سر ہلایا اور اچھے بچے کی طرح اس نے نظر کو بھٹکنے نہیں دیا۔ میں نے فلم کو فاسٹ فارورڈ کر کے چیک کیا۔ درمیان کے مناظر میرے لیے جتنے شرم ناک تھے آخری مناظر اتنے ہی دردناک تھے۔ مجھے اس بد بخت لڑکی کے انجام پر شدید دکھ ہوا۔ اس نے جسم کی پوری قیمت وصول کی تھی لیکن جان اس نے بے دام گنوا دی تھی۔ اس کی زندگی رائگاں گئی تھی اور اب کوئی نہ تھا جو اس کی جواں مرگ پر دو آنسو بہاتا۔ اس کی مغفرت کے لیے دست دعا اٹھانے کی سوچتا یا اس کا خون بہا طلب کرتا.... درمیان میں کیمرا آف کر دیا گیا ہوگا چنانچہ میں نے کسی قاتل کا چہرہ نہیں دیکھا۔ ایک منظر میں وہ ایک خوبصورت جیتا جاگتا زندگی کی حرارت سے معمور جسم تھی' منظر بدلا تو وہ ایک سرد لاش تھی۔

ایک گہری سانس لے کر میں نے فلم نکال لی۔ صبح سات بجے سے ہوش میں آنے کے بعد سے اب تک میں نے چھ گھنٹے چھ صدیوں کے عذاب میں گزارے تھے۔ معلوم نہیں میری کون سی نیکی میرے کام آئی' کس کی دعا تھی جو مستجاب ہوئی۔ کس کے لیے خدا نے مجھے سرخرو کیا۔ میری اذیت اور آزمائش ختم ہوئی۔

میں اس سزائے موت پانے والے قیدی کی طرح لوٹا جس کو تختہ دار پر پہنچا کے اتار لیا گیا ہو کہ تمہیں معافی کے ساتھ رہائی مل گئی ہے۔ سلطان احساس شکست کی ذلت اور بے بسی کے ساتھ دیکھتا رہا اور میں پورے اعتماد کے ساتھ دشمن کے حصار سے بحفاظت نکل آیا۔ گیٹ پر وہ گارڈ بھی تھے جن کو میں نے اپنے راستے سے ہٹا دیا تھا۔ پولیس بھی تھی جوان سے تفتیش کے لیے آئی تھی لیکن وہ پابند تھے کہ انگلی اٹھاتا تو درکنار نظر اٹھا کے بھی ہماری طرف نہ دیکھیں۔

واپسی پر میں راجا کے ساتھ فاروقی کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ فاروقی نے راجا کو تمام واقعات کی تفصیل بتا دی تھی۔ خوشی' طمانیت اور شکر گزاری کے جذبات نے سب کو یکساں مغلوب کر رکھا تھا۔

فاروقی نے کہا ''نواب صاحب! مانا کہ آپ کی قسمت بہت اچھی ہے لیکن پہلی فرصت میں دو نفل شکرانے کے ادا کرنا اور صدقہ ضرور اتارنا۔''

راجا نے کہا ''چل یار رفت گزشت۔ ہم اس موضوع پر کوئی بات نہیں کریں گے۔''

میں نے کہا ''میں اب گھر جاؤں گا۔''

راجا نے کہا ''میں اور فرخ واپس جائیں گے۔ ایسا نہ ہو کہ فریال اور شہناز ہم سے پہلے پہنچ جائیں۔''

جب میں گھر پہنچا تو میری ذہنی کیفیت سچ مچ ایسی ہو رہی تھی۔ جیسے میں موت کی دہلیز چوم کے آیا ہوں۔ میں اپنے والدین سے گلے ملا تو اپنے آنسو نہ روک سکا اور وہ بہت حیران ہوئے کیونکہ جب میں آٹھ سال مجبوری کی جلاوطنی کے بعد گھر لوٹا تھا تب بھی ایسے نہ رویا تھا۔ میں انہیں کیسے بتاتا کہ پچھلے چوبیس گھنٹے میں نے کیسے گزارے تھے۔ میری ماں بھی رونے لگی۔ ابا نے ضبط سے کام لیا اور مجھے حوصلے کی تلقین کرتے رہے۔ دادی بار بار پوچھتی رہیں ''اے کچھ بتا تو سہی نمونے۔ کیوں رو رہا ہے' وہاں سب ٹھیک ہے ناں؟''

میں نے سب کو یقین دلایا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ جھوٹ بولا کہ یہ تو خوشی کے آنسو ہیں کیونکہ وہ حویلی اور جاگیر تو اس سے کہیں زیادہ ہے جتنا ہم سب کا خیال تھا۔ وہاں تو نوادرات کے خزانے ہیں جو انمول ہیں۔ وہ سب خوشی کے دمکتے چہروں کے ساتھ کہتے رہے۔ یہ سب اللہ کی دین ہے وہ جسے چاہے نواز دے۔ مقام شکر ہے' اسی کا احسان ہے۔''

ایسی باتیں کہنے والوں میں نذیر چچا اور ان کی بیوی بھی شامل تھے مگر ان کے لیے اپنے حسد اور ملال کے جذبات کو چھپانا مشکل ہو رہا تھا۔ ان کی خوشی جھوٹ کے ملمع سے ریاکاری نظر آتی تھی۔ یہ دکھ ان کی مصنوعی مسکراہٹ سے عیاں تھا کہ میری خوش نصیبی انہیں درحقیقت اپنی حق تلفی محسوس ہوتی ہے لیکن وہ مجھ سے کچھ مانگ بھی نہیں سکتے۔ ایک رابعہ تھی جو میرے آنسوؤں میں چھپی اصل کہانی جاننے کے لیے فکر مند تھی۔

دوپہر کے کھانے کا وقت گزر گیا تھا۔ پریشانی میں مجھے بھوک کا احساس بھی نہ ہوا تھا۔ اب اچانک زندگی نارمل ہوئی تو یہ احساس جاگ اٹھا۔ باقی سب کھانے سے فارغ ہو چکے تھے۔ صرف رابعہ جانتی تھی کہ میری تشریف آوری کسی بھی وقت ممکن ہے۔ اس نے انتظار کیا تھا۔ وہ کھانا گرم کر کے لائی تو میرے ساتھ شریک ہوگئی۔ رابعہ کی یہ ادا مجھے اس کے خلوص کی وجہ سے اچھی لگی تو اس کی ماں کو کسی اور وجہ سے۔

باتوں کا سلسلہ شام تک جاری رہا۔ میں نے انہیں کچھ بتایا مگر بہت کچھ نہیں بتایا۔ میں نے کاسو والا واقعہ بتایا لیکن اپنی زندگی پر ہونے والے اس حملے کا ذکر نہیں کیا جس میں ایک دیوانہ مجھ پر قربان ہو گیا تھا۔ میں نے اکبر خان کے دوغلے کردار کا ذکر کیا۔ جالو کی موت کے بارے میں بتایا مگر فریال کا ذکر نہیں کیا۔ میں نے اپنے پلان بتائے۔ یہ بتایا کہ اب شہناز بھی اس علاقے میں ڈسپنسری کھولنا چاہتی ہے مگر میں نے فرخ کے بارے میں اور اس سے اپنے رشتے کے بارے میں نہیں بتایا۔

اباجی سب سنتے رہے اور عادت کے مطابق ''اللہ کا احسان ہے۔'' کہتے رہے۔ بالآخر انہوں نے کہا ''بس بیٹا! اب ہم بھی چلیں گے تمہارے ساتھ اور پھر وہیں رہیں گے۔''

میں نے کہا ''کیوں نہیں اباجی۔ لیکن۔''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔ آٹھ سال گزار لیے تم سے دور رہ کے۔ اب یہاں رہ کے بھی تم وہاں اور ہم یہاں۔ آخر کیا ضرورت ہے اس کی؟''

اماں نے کہا ''تمہاری تو مجبوری ہے کہ تمہارا کام ہے وہاں۔ ہم کیوں اکیلے پڑے ہیں اس گھر میں؟۔ اور کب تک۔''

میں نے کہا ''آپ ضرور چلیں میرے ساتھ۔ جب تک جی چاہے رہیں لیکن آپ کا وہاں مستقل قیام شاید ممکن نہ ہو۔ ابھی وہاں کچھ بھی نہیں ہے جنگل کے سوا۔ حویلی بھی کھنڈر ہے کچھ ملتا نہیں۔''

''دیکھو' آخر تم بھی تو رہو گے وہاں۔ ہماری ایسی کون سی ضرورت ہے جو پوری نہیں ہوگی۔ آس پاس آبادی ہے۔ ٹیلہ جوگیاں اور دنیا کتنی دور ہیں' وہاں سب مل جاتا ہے۔''

''بس اب یہ طے ہے۔ ہم تمہارے ساتھ ہی رہیں گے۔ سب کی یہی رائے ہے۔'' اماں نے کہا۔

''سب کی رائے ہے؟ لیکن اماں۔ دادی کو اس ویرانے میں رکھنا ٹھیک نہیں۔ وقت بے وقت ضرورت پڑ جائے تو ڈاکٹر نہیں ملتا۔ ڈاکٹر ہو تو دوا نہیں ملتی۔'' میں نے کہا۔

اب دادی کی باری تھی۔ ''ارے کیا ضرورت ہے مجھے دوا کی۔ کون سی بیماری ہے مجھے نموتے! ایک بڑھاپا ہے تو اس کا علاج یہاں بھی نہیں۔ ڈاکٹر تو وہ ہے ناں۔ کیا نام ہے اس کا۔؟ شہناز' وہ جا رہی ہے پھر کیا مسئلہ ہے؟''

میں نے کہا ''مسئلہ کوئی نہیں۔''

''بس تو فیصلہ ہو گیا۔'' ابا نے کہا۔

دادی نے کہا ''میں نے تو بہت پہلے فیصلہ کر لیا تھا کہ مجھے یہاں نہیں مرنا۔ وہ میری حویلی ہے' میری جاگیر ہے' میرے پرکھوں کی ساری نشانیاں ہیں وہاں۔ مجھے وہیں دفن ہونا ہے۔'' دادی نے کہا۔

''ارے دادی' ابھی آپ کو سو سال جینا ہے۔ ایسی باتیں مت کریں۔'' میں نے ان کے گلے میں بانہیں ڈال کے کہا۔

انہوں نے غصے سے میرے بال کھینچے ''کیا کروں گی میں سو سال جی کے! آٹھ سال گزار لیے تیری واپسی کے انتظار میں۔ اور کتنا انتظار کرائے گا مجھے' کیا میرے مرنے کے بعد شادی کرے گا؟''

میں نے کہا ''دادی! ایک نہیں چار شادیاں کرا دو' پر ایک ساتھ۔ لیکن ہوں سب تمہاری جیسی۔ مجھے تو ابھی تک ایک بھی نہیں ملی۔''

یہ بڑا جذباتی موضوع تھا۔ اس پر اماں خود اپنی ساس کی ہمنوا ہو جاتی تھیں تو مجھے پیچھا چھڑانا مشکل ہوتا تھا۔ میرے والدین کی یہ خواہش بالکل فطری تھی۔ ان کے حساب سے تو میں بہت پہلے شادی کے لیے کوالیفائی کر چکا تھا۔ دیکھی جاتی ہے عمر تو وہ بزرگوں کے نزدیک دس سال زیادہ ہو چکی تھی۔ لڑکے کا بالغ ہونا کافی ہوتا ہے۔ تعلیم میں نے باہر جا کے بھی مکمل کر لی تھی۔ آمدنی میری بقول دادی۔ کے صدر پاکستان سے پہلے بھی زیادہ تھی۔ اور اب تو خدا نے چھپر پھاڑ کے سچ مچ چھپن کروڑ کی چوتھائی بخش دی تھی تو پھر بہانے بازی کیسی؟ مس یونیورس پر بھی ہاتھ رکھ دوں تو وہ خوشی سے ناچنے لگے کیونکہ مسٹر یونیورس میرے سوا کون ہو سکتا تھا؟

میں جانتا تھا کہ میرے والدین فریال کو پسند نہیں کرتے۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ میری سوئی فریال پر اٹکی ہوئی ہے۔ میری پسند کو وہ سب پر مقدم سمجھتے تھے اور میری خوشی کو اپنی خوشی مانتے تھے۔ فریال کی حیثیت اگر عرب اسرائیل تنازعے جیسی نہ ہوتی تو بہت پہلے وہ اسے اپنی بہو بنا لیتے اور آج شاید دو چار پوتے پوتیوں میں مجھے بھی بھولے ہوئے ہوتے مگر موجودہ صورتِ حال میں وہ ڈرتے تھے۔ وہ میرے مستقبل کو محفوظ دیکھنا چاہتے تھے اور بس۔ ابھی تک انہوں نے ایلشا یعنی عائشہ کا ذکر سنا تھا۔ اسے دیکھا نہیں تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ میں کہتا تو وہ اسے قبول کرنے میں دیر نہ لگاتے۔ وہ خوبصورت تعلیم یافتہ اور خاندانی تھی اور

سب سے بڑھ کر یہ کہ اسلام اس نے میری خاطر قبول کیا تھا اور میرے ساتھ پاکستان میں بھی رہنے کے لیے تیار تھی۔ ان کے نقطہ نظر سے پرکھا جاتا تو شاید فریال کے مقابلے میں عائشہ کے نمبر زیادہ ہو جاتے۔

شام کو فاروقی کا ڈرائیور میری گاڑی چھوڑ گیا۔ میں بہت تھکا ہوا تھا اور کچھ دیر آرام کرنے کے لیے لیٹا تھا کہ رابعہ چابی دینے کے بہانے وارد ہوگئی۔

''تم ابھی کیسے سو سکتے ہو کزن! کیا تمہیں اندازہ نہیں کہ میں کس قدر بے چین ہوں تمہاری بپتا سننے کے لیے۔'' وہ میز پر ٹک گئی۔

میں اٹھ بیٹھا ''جو کچھ مجھ پر بیتی۔ وہ تمہیں نہیں بتا سکتا۔''

''ایسی کیا بات ہے؟''

میں نے کہا ''اس میں سخت قابلِ اعتراض مناظر ہیں۔ واقعات ہیں جو سنسر کی زد میں آتے ہیں۔''

''یہ تو کوئی بات نہیں۔ میں چھپ کر انٹرنیٹ پر بہت کچھ دیکھ لیتی ہوں۔ یہ بھی چھپ کر سن لوں گی آخر بالغ ہوں میں۔''

''مجھے پتا ہے تم کتنی بے شرم ہو۔ شرم مجھے آرہی ہے سناتے ہوئے۔ اس لیے کچھ اور سن لو۔''

وہ غرائی ''تم مجھے مجبور کر رہے ہو کہ میں تمہیں بلیک میل کروں۔''

میں نے کہا ''اوکے۔ میں ٹوٹے نکال دیتا ہوں۔ باقی سن لو لیکن یہ ایسا ہی ہوگا جیسے جوس نکال دیا جائے اور باقی سیب کھا لیا جائے۔ میرے ایک دشمن نے رقابت میں...''

''یعنی صفدر سلطان مرزا نے؟'' وہ بیچ میں بولی۔

میں نے اپنے سر پر ہاتھ مارا ''یہ بھی جانتی ہو تم۔''

وہ ہنسی۔ ''میری ناقص معلومات کے مطابق تمہارا ایک ہی تو رقیب ہے۔ ویسے دو ہوتے یا نہیں۔ ایک اسٹینڈ بائی۔ آگے بولو۔''

''اس نے پہلے تو مجھے اغوا کیا۔ اور پھر میرے ساتھ زیادتی کی۔''

''کزن۔ کیا تم بھول رہے ہو کہ تم لڑکی نہیں ہو۔؟''

میں نے کہا۔ ''نہیں۔ لیکن ہوا میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی کل تم اخبار میں دیکھ ہی لو گی اس لیے بتا رہا ہوں۔ وہ ایک ماڈل تھی۔ نادیہ۔ اس نے مجھے ٹریپ کر لیا۔''

اس نے کھنکھار کے کہا۔ ذرا اس کی وضاحت فرمایئے۔''

''بھئی باقی تم فرض کر سکتی ہو۔ اماں حوا کے زمانے سے تم عورتوں نے یہ سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ بھولے بھالے مردوں کی مت مار دیتی ہو۔ جب مجھے ہوش آیا تو اس کے گھر میں تھا۔

اس نے بڑی ہمدردی دکھائی۔''

''ہمدردی قابلِ غور لفظ ہے۔ خیر۔ بولو میں سن رہی ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''اس نے کافی میں مجھے کچھ پلا دیا۔''

''کزن۔ وہ شعر تو کچھ یوں ہے کہ۔ ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں۔ آر یو شیور کہ وہ کافی تھی؟۔'' وہ پھر بیچ میں بولی۔

میں نے کہا۔ ''کیا تم مانو گی کہ اتنا عرصے میں باہر رہا امریکا۔ برطانیہ میں.....''

''اور شراب نہیں پی؟ چلو میں مان لیتی ہوں تمہارا دل رکھنے کے لیے۔'' اس نے میری بات کاٹ کے کہا۔ ''کافی پینے کے بعد کیا ہوا۔''

''بہت برا ہوا۔ اتنا برا ہوا کہ میں تمہیں بتا نہیں سکتا۔''

اس نے شرارت سے ٹھنڈی سانس لی۔ ''میں سمجھ سکتی ہوں کزن۔ چلو مت بتاؤ۔ کہو آگے کیا ہوا۔''

''رات کو کسی نے اسے قتل کر دیا۔ مجھے واقعی پتا نہیں چلا۔ میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ جب میں نے دیکھا تو اس کی خون آلود لاش پڑی تھی وہاں۔''

اب رابعہ سے جان چھڑانا مشکل تھا۔ مجھے کسی حد تک اسے حقیقت حال بتانی پڑی۔ وہ دم بخود سنتی رہی۔

میں نے کہا۔ ''سوچو کیا ہوتا میرا انجام کزن۔''

وہ سر ہلانے لگی۔ ''تم سوچو کیا ہوگا تمہارا انجام۔ اگر تم فریال کے چکر سے نہ نکلے۔''

میں نے کہا۔ ''کیا یہ کسی کے اختیار میں ہوتا ہے بے وقوف لڑکی۔''

''اتنی بڑی بے وقوفی آپ فرما رہے ہیں۔ اس کو وہاں کب تک رکھو گے تم اور کب تک۔ خدا کے لیے اس کو نکالو وہاں سے۔''

''وہ نکلنے والی کہاں ہے۔ اب تو جو ہو سو ہو۔''

''کمال کرتے ہو تم بھی۔ جب یہ سارا خاندان وہاں پہنچے گا تو معلوم ہوگا کہ بہو تو پہلے ہی رخصت ہو کے آگئی ہے۔ خیر۔ نکاح وغیرہ کا تکلف بھی نہیں کیا گیا۔ واہ واہ۔ کتنے خوش ہوں گے ماں باپ اپنے ہونہار سپوت کے اس کارنامے پر۔ دادا [illegible] نہال ہو جائیں گی۔''

''رابعہ ابھی میں کسی کو نہیں لے جا رہا ہوں۔''

''تم نہ لے جاؤ۔ وہ خود پہنچ جائیں گے پھر کیا کرو گے۔ یہاں تو پوری تیاری ہے۔ حد تو یہ ہے کہ میرے ابا و [illegible] مریدی کا سلسلہ شروع کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ ان کا [illegible] ہے کہ گاؤں دیہات اس کاروبار کے لیے زیادہ منافع بخش ثابت ہوں گے۔ انہوں نے معلوم کر لیا ہے۔ اس علاقے میں دور دور تک کوئی پیر اور ماہر عملیات نہیں ہے۔''

''میں یہ چکر نہیں چلانے دوں گا۔''

''اصل بات کو سمجھو کزن۔ اماں تو صدمے سے پاگل ہو گئی ہیں۔ عجیب باتیں کرنے لگی ہیں۔ چچا سے کہتی ہیں کہ تم کوئی عمل کرو۔ وظیفہ پڑھو۔ اپنے جنات سے کہو۔''

''رک کیوں گئیں۔؟''

رابعہ نے ایک آہ بھری۔ وہ چاہتی ہیں۔ جیسے بھی ہو جائیداد میں ان کو حصہ مل جائے ان کو حق تلفی کا سخت صدمہ ہے کہ آدھی جائیداد دونوں بھائیوں میں کیوں تقسیم نہیں ہوئی۔ دونوں کا برابر حق تھا۔ انہوں نے ابا کو بہت اکسایا کہ کیس کرو۔ بیٹوں کے ہوتے کسی ایک پوتے کو ساری جائیداد کیسے مل گئی۔ ابا نے سمجھایا کہ یہ قانون وراثت کا مسئلہ نہیں ہے۔ دینے والا اپنی زندگی میں جسے چاہے دے جائے۔ وارثوں کو نہ دے کسی خیراتی ادارے کو دے کر مر جائے۔ وہ نفسیاتی مریض بن گئی ہیں۔ اس کا اثر ابا پر بھی ہوا ہے۔ دن رات اماں کی باتیں سننے سے وہ بھی ایسا ہی سوچنے لگے ہیں۔ میری تو اماں سے بول چال بند ہے۔''

''وہ کیوں؟''

اس نے پھر ایک آہ بھری۔ ''کیا بتاؤں کزن۔ وہ چاہتی ہیں میں تمہیں پھانس لوں۔ اس کے لیے بے شرمی کی جس انتہا تک جا سکتی ہوں جاؤں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ سب میرے فائدے کی بات ہے۔ وہ خود کتنے دن جئیں گی۔ تم خود سوچو۔ کیا ایک ماں اپنی بیٹی سے کہہ سکتی ہے کہ رات کو جاؤ اس کے کمرے میں۔ آخر وہ جوان مرد ہے۔ جسم میں خون نہیں پیٹرول بھرا ہوتا ہے اس عمر میں اور عورت کا جسم ہوتا ہے آگ۔ مجھے ایسے مت دیکھو۔ میں تمہیں سچ بتا رہی ہوں وہ پاگل ہو گئی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ دو چار بار موقع دے اسے اور پھر مجھ پر چھوڑ دے۔ میں دیکھتی ہوں پھر وہ بچ کے کہاں جاتا ہے۔ کیسے شادی نہیں کرے گا تم سے جب میں مشہور کروں گی۔''

میں نے کہا۔ ''میں سمجھ گیا۔ وہ واقعی پاگل ہو گئی ہیں۔''

''میری بہت لڑائی ہوئی اس بات پر۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ رفیق اگر خود بھی مجھ سے شادی کرنا چاہے تو میں انکار کر دوں گی۔ میں لعنت بھیجتی ہوں اس پر اور اس کی دولت پر۔''

میں نے کہا۔ ''کیا واقعی کزن، میں اتنا برا ہوں؟''

''بہت۔ مگر ایک تو مجھے سب معلوم ہے۔ تم فریال کو کتنا چاہتے ہو۔ دوسرے یہ کہ مجھے بھی تم سے محبت ابھی نہیں ہوئی۔ دولت یقیناً اہم ہے میرے لیے مگر اس کے لیے میں طوائف نہیں بن سکتی۔ کسی کی داشتہ بن کے نہیں رہ سکتی۔ تمہارا تو مجھے پتا ہے نہ تم لالچی ہو اور نہ خود غرض۔ بالآخر سب میں بانٹ دو گے۔ مجھے بھی بہت مل جائے گا۔''

میں نے کہا۔ ''یو آر رائٹ۔ یہ ہم سب کے لیے بہت ہے۔''

''مگر ان کے دل میں تو پھانس چبھی ہوئی ہے کہ آدھا ان کا تھا اب وہ پورے کی پلاننگ کر رہی ہیں دن رات۔ ابا سے عمل کراتی ہیں کہ رابعہ کا دل پلٹ جائے رفیق کی طرف۔ مجھ سے پوچھتی ہیں کہ تو کس کے لیے بیٹھی ہے؟ کون ہے وہ اگر رفیق نہیں ہے۔ ابا ان کی مانتے ہیں۔ وظیفے سے سفلی عمل تک سب کر رہے ہیں کہ تمہاری شادی مجھ سے ہو جائے۔ آدھا نہیں سارا مل جائے۔ ان کا بس چلے تو فریال کو زہر دے دیں۔ عائشہ کو بھی۔''

''یہ تو واقعی خطرناک معاملہ ہے۔''

''اب تم خود سوچ لو کہ ست بدھائی جا کے یہ لوگ کیا کریں گے۔ میرے ماں باپ۔ ایک عجیب دیوانگی ہے۔ ابا کا خیال ہے کہ وہاں عمل کیا جائے گا تو کارگر ہوگا۔''

میں نے کہا ''رابعہ۔ تم نے اچھا کیا یہ سب مجھے بتا دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ تم میری سب سے قابلِ اعتماد دوست ہو۔ تمہارے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

''میری مانو تو دادی سے بات کرو۔ دادی کی بھی ان سے بول چال بند ہے۔ دراصل انہوں نے دادی پر بہت دباؤ ڈالا تھا کہ وہ میری تمہاری شادی کرا دیں۔ دادی نے پہلے سمجھایا۔ پھر ایک دن بہو کے ایسے لتے لیے کہ ہوش ٹھکانے آگئے۔ انہوں نے بیٹے کو بھی ذلیل کیا۔ ظاہر ہے تمہارے والدین سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں۔ گھر میں شدید ٹینشن ہے۔ ظاہر کوئی نہیں کرتا۔''

''میں دادی سے کیا بات کروں؟''

''ان سے صاف کہہ دو کہ میں شادی کروں گا تو صرف فریال سے۔ ورنہ نہیں کروں گا۔ وہ تمہاری مانیں گی۔ تمہارے اماں ابا سے بھی منوا لیں گی۔ اس کے بعد تم کو دیر کرنے کی ضرورت نہیں۔ فوراً نکاح پڑھوا لو۔ کر لو شادی۔''

میں نے کہا۔ ''یار رابعہ۔ یہ سب اتنی جلدی کیسے ہو سکتا ہے؟''

''ہو سکتا ہے کزن۔ کیا فریال نہیں مانے گی۔؟''

''فریال تو یہی چاہتی ہے۔ مگر میں ایسا نہیں کر سکتا ابھی۔''

''اچھا بات تو کرو دادی سے۔ میرے ماں باپ مایوس ہو جائیں گے کہ یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی۔ تو مایوس ہو کے کوشش بھی چھوڑ دیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''اوکے۔ یہ میں کر سکتا ہوں۔''

''دوسری بات۔ اپنے چچا اور چچی کو بہلانے کے لیے کچھ دے دو۔ جس سے ان کے دل کو قرار آجائے۔''

میں نے کہا۔ ''ابھی کیا ہے میرے پاس۔ جب ہوگا تب

دے دوں گا۔"

"سنو میری بات۔ اپنے والدین کو لے جاؤ ساتھ۔ اکیلے وہ یہاں رہیں گے نہیں۔ اور ان کا رہنا کچھ خطرناک بھی ہوتا جا رہا ہے۔ یہ مکان انہیں دے دو۔ ان کے نام کرا دو۔ اور ان سے کہو کہ وہ یہیں رہیں۔"

میں دم بخود رہ گیا۔ "رابعہ تم تو بہت عقلمند ہو۔ تمہیں تو میرا مشیر خاص ہونا چاہیے۔ یہ خیال کیسے آیا تمہیں۔"

"بس کزن۔ سوچتی میں بھی رہتی ہوں کہ کیا کرنا چاہیے۔ دلدل تو ایک ہی ہے جس میں ہم سب ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ باہر نکلنے کے لیے۔"

رات کو مجھے دادی سے بات کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔ کھانے کے بعد ابا جی نے کہا۔ "اپنے کمرے میں چلو مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔"

اگرچہ کھانا سب نے ایک ہی دسترخوان پر کھایا تھا مگر کسی سرائے میں قیام کرنے والے اجنبیوں کی طرح۔ صوفی چچا کسی سوچ میں مستغرق تھے۔ ان کی بیگم ضرورت سے زیادہ اپنائیت کے اظہار میں مصروف رہیں مگر صاف نظر آتا تھا کہ ان کی یہ حرکات سب کو ناگوار گزر رہی ہیں۔ ان کی تیز مزاجی اور زبان درازی کی وجہ سے میری اماں اور دادی ان کے منہ لگتے ہوئے گھبراتی تھیں۔ سب جانتے تھے کہ ان کے دماغ میں آج کل کیا فتور سمایا ہوا ہے۔ ابا کی بات پر چچی نے اپنا ردِعمل ظاہر کیا۔ انہوں نے کہا "ایسی کون سی باتیں ہیں جو سب کے بیچ میں نہیں ہو سکتیں۔"

ابا نے کہا۔ "ہوتی ہیں بھابی۔ کیا آپ ہر بات سب کے بیچ میں کرتی ہیں۔"

اس جواب کے بعد وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئیں لیکن ان کے دل میں کھد بد ہوتی رہی۔ مجھے ان کے چہرے کے تاثرات ان کی آنکھوں اور ان کی اضطراری حرکات سے یوں لگا جیسے وہ ایبنارمل ہو گئی ہیں۔ ان کے لب ہلتے رہے جیسے اب بھی وہ کچھ کہہ رہی ہیں مگر یہ خود کلامی کا سا انداز تھا۔ ان کے خیالات تھے جو سنے نہ جانے والے الفاظ بن کر لبوں پر آ رہے تھے۔

ابا نے دروازہ بند کر کے کہا۔ "رفیق! اب ہمارا یہاں رہنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہوتا جا رہا ہے۔"

میں نے کہا۔ "آپ ضرورت سے زیادہ پریشان ہیں۔"

"نہیں۔ میں نے تمہیں بتایا تھا۔ پہلے گمنام فون آتے تھے۔ دھمکیوں والے۔ پھر کچھ لوگ پریشان کرنے آ گئے تھے۔"

میں نے کہا۔ "میں نمٹ لوں گا ان سب سے۔"

"کیسے نمٹو گے تم۔ کیا تم جانتے ہو انہیں؟۔ معلوم نہیں وہ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔ تمہیں ان سے الجھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ خطرناک لوگ ہیں بیٹا۔"

میں نے کہا۔ "ایسے بھاگ جانے سے تو مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ اگر کوئی زبردستی گلے پڑتا ہے تو اس سے بہرحال نمٹنا ضروری ہو جاتا ہے۔ کیا وہ پھر آئے تھے؟"

"اب تو کئی دن سے نہیں آئے۔ مگر جانتے ہو انہوں نے کیا حرکت کی؟ میں نے کسی کو بھی نہیں بتایا۔ انہوں نے میرے نام ڈاک سے ایک پارسل بھیجا۔ اس پر نام تمہارا لکھا ہوا تھا۔ میں نے اپنے کمرے میں لا کے اسے کھولا تو اندر سے نکلا ایک پھٹا ہوا جوتا اور ایک مرا ہوا چوہا۔ چوہے کے گلے میں ایک ٹیگ تھا اور اس پر تمہارا نام لکھا ہوا تھا۔"

مجھے سخت طیش آیا۔ "ان کا تو کچھ کرنا ہی پڑے گا۔"

"اور سنو۔ شام کو کسی نے فون کیا اور کہا۔ بڈھے۔ ہم اس پارسل میں بم بھی بھیج سکتے تھے۔"

میں نے کہا۔ "یہ تو ٹھیک ہے۔ آج کل دیکھے بغیر کوئی چیز نہیں لینی چاہیے۔"

"رفیق بیٹا۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگتا ہے جیسے کچھ ہونے والا ہے جو اچھا نہیں ہو گا تم اسے میرا وہم کہو گے لیکن۔ یہ جو بابا کہتا۔ یہ بھینٹ لیتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "چھوڑیں ابا جی۔ آپ تو پڑھے لکھے آدمی ہیں ایسی باتوں کا مذاق اڑاتے رہے ہیں۔ اب کیا ہو گیا ہے آپ کو۔؟"

"میں۔ ڈرنے لگا ہوں۔ ڈر میرے دل میں گھس کے بیٹھ گیا ہے کل رات میں نے ایک ڈراؤنا خواب دیکھا ایک فقیر تھا۔ گیروے چغے میں۔ جھاڑ جھنکار داڑھی اور بالوں والا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بہت موٹا ڈنڈا تھا۔ اس میں گھنگھرو بندھے ہوئے تھے اور وہ ناچ رہا تھا۔ اور کہہ رہا تھا۔ مایا لے لے۔ بیٹا دے دے۔"

میں نے ان کی بات کاٹ دی۔ "آپ نے اس دیوانے کو دیکھا تھا جو ست بدھائی کی حویلی میں رہتا ہے۔"

"ہاں۔ بالکل وہی تھا۔ ٹھیک کہتے ہو تم۔"

میں نے کہا۔ "سارا قصور آپ کے خوف کا ہے جو لاشعور میں بیٹھ گیا ہے آپ پریشان ہیں۔ اسی لیے الٹے سیدھے خواب دیکھنے لگے ہیں۔"

"شاید۔ ایسا ہی ہو۔ لیکن تمہیں معلوم ہے گھر کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ کیسی سازشیں ہو رہی ہیں۔"

"مجھے رابعہ نے بتایا ہے سب۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بھائی سے کیسے کہوں۔ یہاں سے چلا جائے۔ وہ چلا گیا تھا۔ پھر لوٹ آیا۔ اور اب عجیب و غریب باتیں ہو رہی ہیں یہاں۔ عملیات اور وظائف۔ جادو اور سفلی عمل۔ معلوم ہے کس لیے۔ تمہیں قابو کرنے کے لیے۔ تمہاری ماں سخت پریشان رہتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "ابا جی۔ زندگی موت۔ دکھ، بیماری، سلامتی، غربت یا امارت یہ سب تو اللہ کی طرف سے ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔ ہم سب جانتے ہیں مگر تم ماں باپ کے دل کو نہیں جانتے۔ یہ جاگیر ہمیں نہیں چاہیے اگر اس کے بدلے ہمیں کچھ کھونا پڑے۔ ہمارے پاس اب ہے ہی کیا کھونے کے لیے۔ اس جاگیر نے پہلے بھی قربانیاں لی ہیں۔ اس کی نحوست کی تاریخ سے واقف ہو تم۔"

میں نے کہا۔ "حوصلہ رکھیں ابا جی۔ کسی کی باتوں میں نہ آئیں سنی سنائی پر یقین مت کریں۔ مجھے تو حیرانی ہے کہ آپ نے اتنے اصرار سے مجھے بلایا تھا۔ بڑے پلان بنائے تھے۔"

"شاید وہ۔ میرا خیال ہے۔ وہ میری غلطی تھی۔"

"نہیں۔ غلطی اب کریں گے آپ اگر کوئی کمزوری دکھائیں گے۔ آپ مجھے صرف ایک ہفتہ دیں۔"

"ایک ہفتے بعد کیا ہو گا؟۔"

میں نے کہا۔ "میں آپ کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ لیکن میں صوفی چچا اور ان کی فیملی کو نہیں لے جاؤں گا۔ دادی ہمارے ساتھ ہوں گی۔ میری ایک تجویز ہے۔ یہ مکان آپ ان کے نام کر دیں۔"

ابا جی چونکے۔ "یہ خیال کیسے آیا تمہیں۔؟"

میں نے کہا۔ "اس سے ان کی کچھ تسلی ہو جائے گی۔ ابھی میرے پاس انہیں دینے کے لیے سوائے جاگیر کے کچھ بھی نہیں ہے۔ اگر انہیں صدمہ ہے کہ ان کی حق تلفی ہوئی ہے تو میں بعد میں ان کو بہت کچھ دے دوں گا۔"

"یہ ٹھیک ہے۔ میں بھی نہیں چاہتا کہ وہاں جا کے بھی یہی چکر چلتے رہیں۔ ہم سکون سے رہنا چاہتے ہیں تمہارے ساتھ۔ بھابی تو بیچ بیچ پاگل ہو رہی ہیں۔ ان کی بیٹی بہت اچھی ہے۔ ماشاءاللہ میری بھتیجی ہے اور مجھے بڑی خوشی ہوتی اس رشتے سے۔ لیکن اس کی ماں ایک مصیبت ہے نہ اس کی کبھی میری ماں سے بنی نہ تمہاری ماں سے۔ تمہاری شادی۔"

میں نے کہا۔ "ابا جی۔ ابھی اس موضوع کو رہنے دیں۔ رات بہت ہو گئی ہے۔"

اس رات مجھے بے چینی رہی۔ اتنی تھکن کے باوجود میں گھوڑے بیچ کے نہ سو سکا۔ رات کو ایک بار میری آنکھ کھلی تو مجھے عجیب سی خوشبو کا احساس ہوا۔ میں نے باہر نکل کے دیکھا تو روشنی

صرف صوفی چچا کے کمرے میں تھی۔ ان کا دروازہ بند تھا لیکن ایک روشن لکیر نیچے دکھائی دیتی تھی۔ دوسری بار مجھے یوں لگا جیسے ابھی ابھی کوئی کمرے سے نکلا ہے۔ میں نے پھر اٹھ کے باہر جھانکا مگر باہر کوئی بھی نہیں تھا۔ تیسری بار میرے کانوں میں کسی کے بولنے کی آواز آئی۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی بلند آواز میں کتاب پڑھ رہا ہے۔ میں کنڈی کھول کے باہر آیا تو آواز بند ہو گئی۔ کیا صوفی چچا کوئی عمل کر رہے ہیں؟ یہ ان کا وظیفہ تھا؟ میں نے افسوس سے سوچا۔ اس گھر کے لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ جب کچھ نہیں تھا تو کتنے پیار محبت سے رہتے تھے۔ کتنی اپنائیت تھی۔ رشتوں کا احترام تھا۔ دیکھتے دیکھتے سب بدل گیا ہے مجھے ابا جی کی بات یاد آ گئی۔ دولت بھینٹ مانگتی ہے۔ لاحول ولاقوۃ۔ میرا بھی دماغ خراب ہونے لگا ہے۔

صبح میں دیر سے جاگا۔ وہ بھی رابعہ کے جگانے پر۔ اس نے کہا۔ "اپنے دوستوں سے نہیں ملو گے۔"

میں نے کہا۔ "یار صبح صبح کون دوست آ گیا۔" اور پھر سونے کی کوشش کی۔

"کزن! وہ دونوں لوفر موجود ہیں گھر کے سامنے۔ انہوں نے بہت پریشان کر رکھا تھا۔ آخر یہ لوگ چاہتے کیا ہیں۔ ذرا پوچھو۔"

میں سخت طیش میں اٹھا اور کھڑکی تک گیا۔ گلی میں گھر کے سامنے ایک پان سگریٹ والے کا کیبن تھا۔ وہ خود پیچھے والے گھر میں رہتا تھا۔ وہاں اس وقت چار افراد کھڑے تھے۔ ان میں سے دو کو میں جانتا تھا۔

رابعہ نے میرے پیچھے آ کے کندھے پر سے جھانکا۔ "پہچانا انہیں؟"

میں نے کہا۔ "ان میں سے تو کوئی بھی مجھے مشکوک نہیں لگتا۔ اپنی ہی گلی کے لوگ ہیں۔"

اس نے کہا۔ "یار نائی کی دکان میں دیکھو۔"

ہیئر ڈریسر کی دکان میں دو افراد کرسیوں پر سرنگوں بیٹھے بال کٹوا رہے تھے۔ دو اخبار دیکھ رہے تھے اور عام گاہکوں کی طرح اپنی باری کے انتظار میں لگے تھے مگر ان پر نظر پڑتے ہی میں انہیں پہچان گیا۔ اسی وقت ان میں سے ایک نے نظر اٹھا کے اوپر دیکھا اور غالباً اپنے ساتھی کو میری طرف متوجہ کیا۔ واضح طور پر ان کا ردِعمل چونکنے کا تھا۔

میں نے ان دونوں کو پہچان لیا اور مجھے سخت غصہ آیا۔ وہ تنظیم میں بہت نچلی سطح کے اراکین تھے جن کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ وہ بہت معمولی درجے کے بدمعاش تھے مگر جب تنظیم کی حمایت حاصل ہوئی تو وہ نامی گرامی غنڈے بن گئے۔ ان کا کام

اپنے مخالفین کو دہشت زدہ کرنا تھا۔ اوپر سے اس غنڈا فورس کو ہدایات ملتی تھیں تو وہ کسی حریف کو اغوا کرلاتے تھے۔ کسی وکیل یا صحافی کے دماغ سے قانون اور آئینی طور پر حاصل آزادی تحریر و تقریر کا غرور نکال دیتے تھے۔ کبھی ان کے گھر پر فائرنگ کر کے یا دفتر میں توڑ پھوڑ مچا کے۔ وہ مخالف سیاست دانوں کے جلسے خراب کرتے تھے اور دہشت گردی سے تنظیم کی مخالفت کرنے والوں کو ہراساں کرتے تھے۔ ضرورت پڑنے پر وہ قتل بھی کرتے تھے۔ ان میں کچھ پیشہ ور قاتل بھی تھے۔ ظاہر ہے تنظیم ان کو تحفظ فراہم کرتی تھی اور پولیس ان کی غیر قانونی سرگرمیوں کے خلاف عام آدمی کی فریاد نہیں سنتی تھی۔

غصہ مجھے یوں آیا کہ مجھے ہراساں کرنے کے لیے میرے گھر ایسے لوگوں کو بھیجا گیا جو ایک زمانے میں میرے حکم کے غلام تھے۔ انتظامی سطح پر میری حیثیت بہت بلند تھی اور ان جیسے تھرڈ کلاس غنڈے میرے آفس کے باہر مجھے سلام کرنے اور کسی عنایت کے منتظر کھڑے رہتے تھے۔

رابعہ نے مجھ سے پوچھا۔ ''لگتا ہے دوست ہیں تمہارے۔''

میں نے کہا۔ ''میں ابھی جا کے ان کی ایسی تیسی کرتا ہوں۔''

''ارے کزن۔ کیا غصے میں ان بدمعاشوں سے مار پیٹ کرتے اچھے لگو گے۔ ان کی نہ سہی تمہاری تو عزت ہے۔ اب پہچان لیا ہے انہیں تو جا کے پوچھ لینا مزاج اور کہنا کہ مجھے پوچھ رہے تھے نا تو میں آگیا ہوں۔''

''یہ ہی ٹھیک کہا تم نے۔ مجھے ان کے منہ لگنا ہی نہیں چاہیے۔''

''میں دیکھ رہی ہوں کہ تم ابھی تک اَپ سیٹ ہو۔ تمہارے مزاج میں غصہ اور جھنجھلاہٹ ہے۔ ہنسی مذاق تو بھول ہی گئے ہو۔''

''یار کیا کروں۔ حالات ایسے ہیں۔''

''ٹیک اٹ ایزی۔ حالات ہمیشہ ایسے نہیں رہیں گے۔ حالات درست کرنے کے لیے بھی دماغ کو ٹھنڈا رکھنا پڑے گا۔''

میں نے کہا۔ ''میں پھر کہتا ہوں کزن۔ تمہیں تو پاسبان عقل کی طرح میرے ساتھ رہنا چاہیے۔ وہ یقیناً خوش قسمت ہوگا جو تمہیں اپنی زندگی کے سفر میں شریک پائے گا۔ لیکن ابھی تک تو تم نے کسی کو پسند ہی نہیں کیا۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''معاملہ اس کے برعکس یہ ہے سر کہ ابھی تک کسی نے مجھے اس قابل کہاں سمجھا ہے۔ تم جیسے سادے [illegible] اندھے ڈھونڈتے پھرتے ہیں حور پری۔ حد تو یہ ہے کہ خود تم نے آج تک مجھے اخلاقاً بھی حسین نہیں کہا۔''

میں نے کہا۔ ''فرخ کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

وہ چونکی۔ ''اس کا ذکر اس وقت کیسے آگیا۔ کیا اس نے کچھ کہا ہے تم سے۔ میرا مطلب ہے۔''

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ ''تم لال کیوں ہو رہی ہو۔ کیا اس نے کچھ کہا ہے تم سے۔؟''

وہ منہ میں انگلی دبا کر بولی۔ ''ایک پرابلم ہے کزن۔ مجھے تمہاری مدد چاہیے۔''

میں نے ہنس کے کہا۔ ''بولو مس رابعہ۔''

وہ باہر جھانک کر بولی۔ ''مجھے اپنے ساتھ لے چلو کسی بہانے سے۔''

میں بھونچکا رہ گیا۔ ''کہاں لے چلوں، ست بدھائی۔''

''ارے نہیں یار۔ مجھے اس سے ملنے جانا ہے۔ کوئی بہانہ نہیں سوجھ رہا ہے۔''

میں نے سر پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ ''یا میرے خدا۔ فرخ سے ملنے جانا ہے تو وہ ست بدھائی میں ہے۔''

وہ ہنسی۔ ''اونہوں۔ وہ یہیں ہے۔ کل رات فون پر بات بھی ہوئی تھی میری۔''

میں پھر بھونچکا رہ گیا۔ ''وہ یہاں ہے؟ مگر وہ تو راجا کے ساتھ گیا تھا۔''

وہ پھر ہنسی۔ ''نہیں گیا۔ بولو مجھے لے چلو گے نا؟۔''

میں نے کہا۔ ''تم اس کے گھر جاؤ گی؟ یہ تو کچھ مناسب نہیں لگتا۔ اگر وہ خود آجاتا۔''

''وہ گیارہ سے بارہ بجے تک میرا انتظار کرے گا۔ لکشمی چوک پر جہاں پہلے کنگ سرکل ریسٹورنٹ تھا۔ جب تم واپس آؤ تو مجھے فون کر دینا۔ وہ پہنچا دے گا۔ جہاں تم کہو گے۔ کسی کو شک بھی نہیں ہوگا۔''

''او کے۔ اگر پروگرام پہلے سے طے ہے تو میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں کزن۔'' میں نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا۔ ''عیش کرو۔''

ابھی میں ناشتے سے فارغ ہی ہوا تھا کہ راجا کا فون آگیا۔ اس نے مجھے بتایا۔ ''فریال کے ساتھ شہناز آگئی ہے۔''

''تو اس میں پریشان ہونے والی کون سی بات ہے۔''

''اب وہ واقعی سنجیدہ ہے۔ یہاں ایک عوامی اسپتال بنانا چاہتی ہے اور اس کا مطلب ہے یہیں رہے گی۔ میں تو مارا گیا۔''

''تجھے خوش ہونا چاہیے۔''

''وہ خوش رہنے دے گی مجھے۔ ہر وقت کی پہرے داری۔

کر دو مت کرو۔'' محبوبہ سے زیادہ تو وہ اماں ہے میری۔ پتا نہیں میں اسے برداشت کیوں کرتا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''تیرے جیسے بگڑے ہوئے بچے کو ایسی ہی عورت ٹھیک رکھ سکتی ہے اور تو اسے برداشت بھی اسی لیے کرتا ہے مہاراجا۔''

''تو کب آرہا ہے، خیر جب بھی آنا ہو اس مجنوں کو لے آنا اپنے ساتھ۔ فرخ کو۔''

میں نے کہا۔ ''لے آؤں گا اگر آیا۔ ابھی تو میں اس کی لیلیٰ کو اس سے ملوانے لے جا رہا ہوں۔ کمال ہے ان دونوں کے معاملات دو دن میں اتنے آگے بڑھ گئے۔ ہمیں پتا ہی نہیں چلا۔''

''یہ تیز رفتاری کا زمانہ ہے فیکے پتر۔ فاسٹ فوڈ۔ فاسٹ میوزک۔ فاسٹ عشق۔ ایک دن ملاقات دوسرے دن منگنی۔ تیسرے دن شادی۔ چوتھے دن بچہ۔ یہ وقت بھی آجائے گا۔''

میں نے کہا۔ ''باہر تو چوتھے دن طلاق اور اپنا اپنا راستہ لینے کا دستور ہے۔''

رابعہ سے فون فریال نے لے لیا، کہنے لگی ''فرخ سے کہو رابعہ کو بھی بھگا کر لے آئے ورنہ یہاں جنگلوں میں اداس روتا پھرے گا۔''

میں نے کہا۔ ''رابعہ خود آرہی ہے مع اہل و عیال۔ تمہارے لیے تشویش ناک خبر ہے۔''

''تشویش تو مجھے رات بھر رہی۔ لیکن کسی اور وجہ سے۔ راجا نے کچھ کھل کے بات نہیں کی۔ تم سلطان سے ملنے گئے تھے؟''

''ہاں۔ جانا پڑا تھا۔ تفصیل بقلم خود بتاؤں گا واپسی پر۔'' میں نے کہا۔

''اور واپسی کب ہوگی جناب کی۔ اب کیا کام ہے تمہارا وہاں۔''

میں نے کہا۔ ''اب میں تمہیں کیا بتاؤں میرے گھر کے اندر بہت کچھ ہو رہا ہے۔ سیاسی انتشار اور خانہ جنگی جیسی کیفیت ہے۔ اور سارے مسائل کا حل مجھے بھی یہی نظر آتا ہے کہ ایک فریق مقابلے سے دستبردار ہو کے، اس گھر سے چلا جائے۔ ہم نے یہ گھر چچا کو دینے کا فیصلہ کیا ہے۔''

''اور باقی لوگ کہاں جائیں گے؟''

''باقی لوگ کون۔ میرے والدین میرے ساتھ رہیں گے۔ انہیں اکیلا رہنا بھی نہیں چاہیے اور یہی میرے لیے پریشانی کی بات ہے۔''

''کیوں؟۔ تم ان کی وجہ سے پریشان ہو۔'' وہ بولا۔

''نہیں فری۔ میں تمہاری وجہ سے پریشان ہوں۔ تم کہاں رہو گی؟''

''میں تمہارے ساتھ رہوں گی اور کہاں۔؟''

میں نے کہا۔ ''کیسی باتیں کرتی ہو۔ وہ کیا سمجھیں گے۔''

''دیکھو رومیو۔ انہیں سمجھانا تمہارا کام ہے۔ میں تمہیں چھوڑ کے کہیں نہیں جاؤں گی۔ تم شادی کرو یا نہ کرو۔ میں زبردستی تو نہیں کر سکتی تمہارے ساتھ۔'' وہ چلانے لگی تو میں نے فون بند کر دیا۔

بے شک فریال نے اپنا گیٹ اپ بدل لیا ہوگا۔ مردانہ حلیے میں کوئی اسے پہچان نہیں پائے گا اور وہ دشمنوں کی نظر سے محفوظ رہے گی لیکن ایسی تبدیلی ان کی نظر کو دھوکا نہیں دے سکتی جو چوبیس گھنٹے اس حویلی میں فریال کے ساتھ ہوں گے۔ اس مسئلے کا مجھے اور کوئی حل نظر نہیں آتا تھا۔ سوائے شادی کے۔ رابعہ کا خیال بالکل ٹھیک تھا۔ اس پہاڑ کو سر کرنے میں صرف دادی ہی اپنے لاڈلے پوتے کی مدد کر سکتی تھیں۔ ان کی حمایت حاصل ہو جاتی تو اماں ابا کی مخالفت کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے آج رات ان سے مدد لینے کا فیصلہ کر لیا۔

میرے ساتھ جانے کے لیے رابعہ نے بڑا اہتمام کیا تھا۔ ایسی تیاری اس نے پہلے کبھی نہیں کی تھی حالانکہ میرے ساتھ وہ ہر جگہ آتی جاتی تھی۔ اماں کو نہ شک ہوا نہ اعتراض لیکن رابعہ کی ماں نے اس کا غلط مطلب نکال لیا۔ نہ جانے کسے سنانے کے لیے انہوں نے کہا ''اللہ نظر بد سے بچائے۔ کتنی پیاری لگ رہی ہے رابعہ۔ میں تو کہتی ہوں اس سے کہ تیرے جیسی حسین لڑکی تو ہندوستان پاکستان میں کوئی نہیں۔ ذرا کچھ خیال رکھ اپنا۔ اسے کوئی شوق ہی نہیں لڑکیوں کی طرح بننے سنورنے کا۔ ٹھہر ذرا میں دم کیا ہوا پانی پلا دوں۔''

رابعہ نے تنگ کے کہا ''رہنے دو اماں۔ دیر ہو رہی ہے۔''

''اچھا اچھا۔ جاؤ۔'' دم کر کے انہوں نے مجھ پر اور پھر رابعہ پر پھونک ماری۔ کتنے اچھے لگ رہے ہیں دونوں جیسے چاند سورج کی جوڑی۔''

جب میں رابعہ کے ساتھ گاڑی میں بیٹھا تو وہ دونوں مجھے نظر نہ آئے جو منکر نکیر کی طرح نائی کی دکان میں موجود تھے۔ مجھے کچھ مایوسی ہوئی تھی میں گلی سے نکلا تو ایک گرے کلر کی نسان سنی میرے پیچھے لگ گئی۔ اس میں وہ دونوں صاف نظر آرہے تھے۔ میں نے رابعہ کو بتایا تو وہ تشویش میں مبتلا ہوگئی۔

''آخر کیا چاہتے ہیں یہ لوگ۔ تم بات کر لو۔''

میں نے ہنس کے کہا۔ ''ان کی فکر چھوڑو۔ یہ سوچو اس بے چارے پر کیا گزرے گی۔ کیا بنے گا اس کا کزن۔''

''یہ تم کس کی بات کر رہے ہو۔'' وہ انجان بن کر بولی۔

''اسی کی۔ جس کے قتل کا اتنا سامان کیا ہے تم نے۔ زخمی تو وہ پہلے ہی ہو چکا تھا۔ آج مر جائے گا۔''

رابعہ نے پیچھے دیکھا۔ ''مجھے ڈر لگ رہا ہے رفیق۔''

میں نے موبائل فون نکالا ''ابھی میں کرتا ہوں ان کا بندوبست۔'' گاڑی چلاتے ہوئے میں نے ... شہاب الدین کا نمبر ملایا مگر وہ بزی تھا۔ پھر میں نے غلام محمد کا نمبر تلاش کیا اس نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا ''ہیلو جی سلاما لیکم۔''

میں نے کہا۔ ''غلام محمد۔ میں رفیق احمد بول رہا ہوں۔''

وہ جوشیلے انداز میں بولا۔ ''او جی خیر ہووے۔ اپنے بابو رفیق ولایت والے۔ کی حال! اے جناب ہم تو آپ کی دید کو ترس گئے۔''

میں نے کہا۔ ''تم کہاں ملو گے۔ میں ابھی تم سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''جناب جم جم آؤ۔ سو بار آؤ۔ ہم ادھر ہی جدھر ہوتے تھے۔ ہم نے کدھر جانا ہے جی۔''

میں نے کہا۔ ''غلام محمد۔ میں ایک شرط پر آؤں گا۔ یہ جو دو کتے میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں انہیں بلالو ورنہ یہ مارے جائیں گے میرے ہاتھوں۔''

''ہیں جی، کون کتے۔ آپ کس کی بات کرر ہے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''تم اچھی طرح جانتے ہو میں کس کی بات کرر ہا ہوں۔ تمہاری مرضی کے بغیر ان کی مجال نہیں تھی کہ میرا پیچھا کرتے۔ اگر پانچ منٹ میں یہ نہ رکے تو پھر میں انہیں روک کے ان کی مزاج پرسی کردوں گا۔''

''او جناب عالی۔ ناراض کیوں ہوتے ہو۔''

''ناراض ہونے کی تو بات ہے۔ کیا اب یہ اوقات رہ گئی ہے میری کہ دو دو ٹکے کے بدمعاش مجھے ہراساں کریں گے۔ یہی میری بے عزتی ہے غلام محمد۔ مجھے چیف سے پیرس میں بات کرنی پڑے گی۔''

''اچھا اچھا۔ میں کچھ کرتا ہوں۔ آپ تشریف لاؤ پہلے۔'' اس نے کہا۔ ''غصہ تھوک دو۔''

میں نے کہا۔ ''نہیں۔ پہلے انہیں بلاؤ۔ انہیں دفع کرو۔''

رابعہ نے میرے کان میں کہا۔ وہ دفع ہو چکے ہیں کزن۔''

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ پیچھے آنے والی گرے سی نسان کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ غالبًا مجھ سے بات کرتے کرتے غلام محمد نے کسی اور کو اشارے سے کہا کہ تعاقب کرنے والوں کو روکا جائے اور اس نے موبائل فون پر تنظیم کے صوبائی صدر کا حکم ان دونوں کو پہنچا دیا۔

میں ایبٹ روڈ کی طرف سے گیا تھا چنانچہ جیسے ہی میں نے گاڑی روکی میں نے فرخ کو دیکھ لیا۔ کنگ سرکل ریسٹورنٹ بہت پرانا حوالہ تھا۔ وہاں آج کل ایک بینک کی برانچ تھی۔ فرخ نے پہلے رابعہ کو دیکھا تو اس کا چہرہ روشن ہوا پھر اس کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ جھینپ کر مسکرانے لگا۔ میں نے رابعہ سے کہا ''ہیوا ے نائس ڈے۔ اور فرخ کو ہاتھ ہلا کے سیدھا نکل گیا۔

غلام محمد کا پرانا آفس بسنت روڈ پر ہی تھا لیکن اب اندر باہر سے اس کا نقشہ بدلا ہوا نظر آرہا تھا۔ اپنے پرانے حوالوں سے وہ ایک بدمعاش کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس نے میٹرک سے پہلے ہی اسکول چھوڑ دیا تھا لیکن وہ روانی سے انگریزی بول سکتا تھا۔ انگلش میں بات کرنے کے لیے اس نے پہلے ایک لینگویج اسکول میں چھ مہینے لگائے تھے جو دعوے کرتے تھے کہ صرف تین ماہ میں آپ انگریزوں سے بہتر انگلش بولیں گے۔ بعد میں کسی عقلمند کے مشورے سے اس نے ایک اینگلو انڈین سیکریٹری رکھ لی جو تھرڈ ان دن ثابت ہوئی۔ سیکریٹری کے ساتھ وہ غلام محمد کی داشتہ بھی بڑے دھڑلے سے بنی اور اسے انگریزی بولنا بھی سکھاتی رہی۔ وہ واجبی شکل صورت کی مگر بہت ذہین اور سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔ غلام محمد اس کے جال میں ایسا گرفتار ہوا کہ پھر نکل نہ سکا۔ اس لڑکی نے اپنی شرائط پر غلام محمد سے شادی کر لی۔ غلام محمد کی ایک ہی شرط تھی جو اس نے پوری کر دی۔ وہ مسلمان ہوگئی۔ لیکن اس نے گھر کی چار دیواری کی قید قبول نہیں کی۔ وہ بدستور آفس میں سیکریٹری کے فرائض سرانجام دیتی رہی۔ وہ ہر جگہ اس کے ساتھ جاتی تھی اور اس کا ہر کام سنبھالتی تھی۔ اس نے غلام محمد کو یہ موقع ہی نہیں دیا کہ اسے بیوی بنانے کے بعد وہ پھر کوئی سیکریٹری رکھے۔ مالکن کا رتبہ حاصل کر لینے کے بعد دفتر بھی پوری طرح اس کے کنٹرول میں آگیا۔

میں نے اسے پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ میں نے کہا۔ ''میرا نام رفیق احمد ہے۔ مجھے غلام محمد سے ملنا ہے۔''

وہ بڑی شائستگی سے مسکرائی۔ ''جائیے۔ وہ آپ ہی کا انتظار کرر ہے ہیں۔'' اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

غلام محمد پہلے سے زیادہ موٹا گنجا اور بدشکل ہوگیا تھا۔ اس کے سارے اعمال اس کی صورت پر بدکرداری کی چھاپ بن کے نمایاں ہو گئے تھے۔ وہ بڑی گرمجوشی سے گلے ملا۔ یہ اس کی فطرت کا خاص پہلو تھا وہ اسی دوستانہ طریقے پر مسکراتے ہوئے گلے لگا کر میرے سینے میں خنجر بھی اتار سکتا تھا۔ وہ ایک خطرناک آدمی تھا اور میں اس سے بگاڑ مول لے کر اپنی پریشانیوں میں اضافہ کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ ہم صوفے پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔

''لو جی اب پہلے بتاؤ ولایت سے لوٹے ہو تو چائے کافی

چلے گی یا اپنے بیڈفارورڈ والی لسی۔'' اس نے خوش دلی سے کہا ''پیڑے ڈال کے۔''

میں نے کہا۔ ''لسی کی اب عادت نہیں رہی۔ چائے ہی لوں گا۔''

''اچھا ہور سناؤ۔''

میں نے کہا۔ ''اور کیا سناؤں۔ غلام محمد یہ کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ اور کیوں؟ تم نے بندے لگا رکھے ہیں میرے پیچھے۔ وہ میرے گھر والوں کو تنگ کرتے ہیں۔ بدمعاشی دکھاتے ہیں۔''

''دیکھو یار رفیق۔ تم بھی ٹھیک نہیں کرر ہے ہو۔ تم نے ہمیں لفٹ کرانا چھوڑ دی ہے۔ ہم نے پہلے فون کیے۔ پھر بندے بھیجے۔ تم ٹرخاتے رہے۔''

میں نے کہا۔ ''یہ غلط ہے۔ میں یہاں تھا ہی نہیں۔''

''غلط بات مت کرو۔ تم منہ چھپار ہے تھے۔ چیف نے تم سے ایک کام کہا تھا۔ تمہیں کراچی میں اترتے ہی شہاب الدین نے بتا دیا تھا۔'' اس نے مجھے گالی دی۔

گالی پر میرا دماغ گھوم گیا۔ میں نے کہا۔ ''غلام محمد۔ آرام سے بات کرو۔ یہاں میں تمہاری گالیاں کھانے نہیں آیا ہوں۔ میں تمہارا ماتحت نہیں ہوں۔''

''تم میرے ماتحت نہیں ہو تو کیا میں تمہارا ماتحت ہوں۔ کیا تم جانتے نہیں کہ میں پنجاب کا صدر ہوں۔ چیف نے میرا تقرر کیا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''کیا ہوگا۔ لیکن جب وہ چیف ہی نہیں تو پھر تم میرے صدر کیسے ہو سکتے ہو۔؟''

''کیا مطلب؟'' وہ غرایا۔ ''تم بغاوت اور غداری کرر ہے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''میرا اب تنظیم سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں۔''

''اس کا لہجہ کچھ بدلا۔ ''دیکھو رفیق۔ تم نے تنظیم کے لیے کچھ ایسے کام کیے تھے اس لیے چیف کو تمہارا بہت خیال ہے۔ ورنہ۔''

''ورنہ کیا۔ وہ وقت گزر گیا غلام محمد جب چیف کے نام کی دہشت تھی۔ اب وہ خود جان بچاتا پھر رہا ہے۔ وہ پاکستان سے بھاگا تو دبئی گیا۔ دبئی سے اسے لندن جانا پڑا۔ اب وہ پیرس فرار ہوگیا ہے۔ تم خود شہاب الدین کے ساتھ ملک سے بھاگنا چاہتے ہو۔ تمہیں برطانیہ میں سیاسی پناہ چاہیے۔ لیکن میں تمہیں صاف بتا دینا چاہتا ہوں۔ میں یہ کام نہیں کروں گا۔''

وہ خاموشی سے سنتا رہا اور پلک جھپکائے بغیر مجھے گھورتا رہا۔ ''تم یہ کام کرو گے بابو رفیق۔ تو فائدے میں رہو گے۔ ورنہ بہت نقصان ہوگا۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں لارڈ ارنسٹ کو بلیک میل نہیں کر سکتا۔ عائشہ کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ نفع نقصان کی بات چھوڑ دو۔''

اس نے غصے کو کنٹرول کیا اور چائے بنا کے میرے سامنے رکھی۔ ''میرا خیال ہے کہ تمہیں کسی نے بہکایا ہے۔ یا پھر تمہیں کوئی غلط فہمی ہوگئی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں غلام محمد۔ اب وہ وقت نہیں رہا جب تم نے مجھے ایکسپلائٹ کیا تھا۔''

''وقت وہی ہے رفیق۔ اچھا برا وقت آتا جاتا رہتا ہے۔'' اس نے ایک سگریٹ جلائی اور کش لے کر دھواں چھت کی طرف چھوڑا۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ آج اقتدار میں وہ ہیں جو ہمارے دشمن تھے۔''

''تم نے بہت ظلم کیا تھا ان پر۔ آج تمہارے ساتھ ہو رہا ہے اور تم روتے ہو۔''

''کبھی کے دن بڑے کبھی کی راتیں۔ سیاست میں تو یہ چلتا رہتا ہے۔ کیا تمہیں یاد ہے کہ تم بھی ظلم کرنے والوں میں شامل تھے۔؟''

''مگر اب نہیں ہوں۔''

وہ مسکرایا۔ ''تمہیں غضنفر علی یاد ہے۔ بھولا تو وہ بھی نہیں ہوگا تمہیں۔ آج کل وہ صوبائی وزیر ہے۔ تم نے اس کے دفتر میں فائرنگ کروائی تھی۔ اس کے دو خاص بندے مارے گئے تھے۔ وہ بچ گیا تھا۔''

''فائرنگ میں نے نہیں کی تھی۔''

''فائرنگ کرنے والوں کو اس نے تلاش کر لیا تھا۔ ان پر مقدمات قائم ہوئے۔ وہ تھانوں میں اور پھر جیل میں تشدد برداشت کرتے رہے۔ بڑی اذیت کے ساتھ مرے۔ انہوں نے یقینا تمہارا نام بھی لیا ہوگا۔ لیکن تم باہر تھے اس لیے محفوظ رہے۔''

میں نے کہا۔ ''میں اس سے خود مل لوں گا۔ اسے بتا دوں گا کہ میں مجبور تھا۔ معافی مانگ لوں گا۔''

وہ ہنسا۔ ''اور کس کس سے معافی مانگو گے بابو رفیق۔ کون معاف کرے گا تمہیں آج۔ آخری وقت کی توبہ تو اب قبول نہیں ہوتی۔ وزیر اعلیٰ کا مشیر ہے مخدوم الوری۔ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ یاد ہے؟''

''مجھے سب یاد تھا۔ اسے اغوا کیا گیا تھا اور ایک ٹارچ سیل میں رکھا گیا تھا اس کے ساتھ وہاں تین افراد اور تھے جو ایک ایک کر کے گئے تھے۔ انوری مکاری سے بچ گیا تھا اسے مردہ سمجھ کر اس کے گھر کے سامنے پھینک دیا گیا تھا۔ یہ سب یاد کر کے مجھے

پسینہ آ گیا۔

غلام محمد نے اور کئی نام لیے۔ آج وہ سب مختلف صوبائی وزیر یا مشیر تھے۔ جب ان کا وقت آیا تو انہوں نے سب کا حساب برابر کیا ان کے پاس اپنے ہر دشمن کا کچا چٹھا تھا۔ انہوں نے سب کو تلاش کیا اور اپنا بدلہ لیا۔ جو ملک سے بھاگ گئے وہ بچ گئے۔

"تم پریشان ہو گئے؟" غلام محمد نے کہا۔ "فکر مت کرو۔ ابھی تک ہمارے سوا کسی کو بھی تمہاری واپسی کا علم نہیں۔ چیف کے علاوہ یہ بات میں جانتا ہوں یا شہاب الدین۔"

میرا سارا غصہ سمندر کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ مجھے اپنی بے بسی کا احساس ہو رہا تھا۔ یہ میرے لیے آگے کنواں پیچھے کھائی والی صورت حال تھی۔ غلام محمد مزے لے لے کر پرانے واقعات دہرا رہا تھا۔ درمیان میں رک کر اس نے اپنی بیوی اور سیکریٹری سے میری فائل منگوائی۔ اس میں کچھ تصاویر تھیں اور دیگر دستاویزی ثبوت تھے جو میرے خلاف عدالت میں استعمال کیے جاتے تو شاید مجھے کئی الزامات میں عمر قید ہو جاتی۔

"چلو چھوڑو اپنے رفیق صاحب۔" غلام محمد نے گھڑی دیکھ کر کہا "آؤ کھانا کھاتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "مجھے بالکل بھوک نہیں ہے۔"

"او چھوڑو یار۔ تمہاری بھابی نے مچھلی منگوائی ہے ادھر سردارے کی دکان سے۔ خوشبو سے ہی بھوک چمک اٹھتی ہے۔"

کھانا اس کی بیوی نے اندر ہی لگایا اور خود بھی شریک رہی۔

میں اب سخت متفکر اور بے چین تھا۔ غلام محمد نے پرانے حوالے چھوڑ کے آنے والے دنوں کی بات شروع کر دی۔ "اپنے رفیق صاحب۔ حالات تو ساری دنیا کے بدل رہے ہیں۔ آپ کو سب معلوم ہوگا۔ سیاست کا اونٹ یہاں کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ پتا چل جائے گا اگلے سال جب الیکشن ہوں گے۔ ایک بات کا شاید تمہیں پتا نہیں۔ اپنا چیف پیرس نہیں گیا۔ یہ تو بات مشہور کی گئی ہے۔"

میں نے کہا۔ "پھر کہاں گیا ہے؟"

اس نے ایک قہقہہ مارا۔ "جانا کدھر ہے جی۔ ادھر ہی ہے۔ پاکستان میں۔ اس کی کچھ بات چل رہی ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں۔ ڈیل ہو رہی ہے۔ بیوروکریسی سے معاملات طے ہو گئے تو سمجھو پانسہ پلٹ جائے گا۔ ہاں۔ یہ جو ہمارے دشمن ہیں ان کی کرسیاں ہل رہی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "صورتِ حال اس کے برعکس بھی تو ہو سکتی ہے۔"

"دیکھو اپنے بابو رفیق۔ اپنا ڈائریکٹ چیف کے ساتھ ٹانکا ملا ہوا ہے۔ اس سے میں نے یہی بات کی تھی تو جو کچھ اس نے کہا وہی جواب ہے آپ کی بات کا۔" اس نے کہا۔ "بے وقوف انسان۔ اگر حالات موافق نہ ہوتے تو کیا میں آ سکتا تھا۔ آپ کو پتا ہے۔ اپنے بھٹو صاحب کے زمانے میں ادھر وہ آیا تھا۔ امریکی وزیرِ خارجہ۔ ہنری کسنجر۔ اور ادھر سے وہ غائب ہو گیا تھا۔ وہ چین چلا گیا تھا۔ کسی کے فرشتوں کو خبر نہیں ہوئی تھی۔ اب حالات موافق نہ ہوتے تو کیا وہ چین جا سکتا تھا۔ بس ایسے ہی چیف لندن سے غائب ہوا ہے اور ادھر پہنچا ہے تو سمجھو معاملہ فائنل ہی ہوگا۔ ہمیں تو ہدایات مل گئی ہیں کہ تیاری پکڑو۔ خیر تم کو اب اس سے کیا۔ ہمارے ساتھ نہ رہے تو منسٹری کے ساتھ۔"

میں نے کہا۔ "پکی ہوتی ہے صرف چپراسی یا کلرک کی نوکری۔ وزیر آتے جاتے رہتے ہیں۔"

"تمہارے ذمے ایک چھوٹا سا کام تھا۔ تمہیں تو کچھ بھی نہیں کرنا ہے جو کرے گا س لڑکی کا ابا کرے گا۔ کیا نام ہے اس کا۔ عائشہ کے باپ ہ۔ ہاں لارڈ ارنسٹ۔ سنا ہے وہ پاکستان آ رہی ہے۔"

میں نے کہا۔ "غلط سنا ہے تم نے۔ اور یہ بھی میں بتا دوں کہ برطانیہ میں اور پاکستان میں بڑا فرق ہے۔ وہاں برطانوی وزیرِاعظم بھی خلاف قانون کچھ نہیں کر سکتا۔"

"یار ہمیں سب پتا ہے۔ قانون میں لچک تو ہر جگہ ہوتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "نہیں۔ وہاں کی پولیس کا یہ مقولہ ہے کہ قانون میں لچک پیدا کی جائے تو وہ ٹوٹ جاتا ہے۔"

WHEN THE LAW BENDS.IT BREAKS

"سیاسی پناہ تو ہر ملک دیتا ہے۔ کیس ہمارا بالکل جینین ہے۔ ایک غیر مسلم فرقے کے لوگ ہزاروں کی تعداد میں جرمنی میں آباد ہو گئے۔ اپنے پیپلز پارٹی والے ضیاالحق کے دور میں نکل گئے۔ ہم بھی مظلوم ہیں یار۔"

میں نے کہا۔ "میں کوشش کر سکتا ہوں۔ وعدہ نہیں۔"

یہ الفاظ ہی میرے لیے کسی اعترافِ شکست سے زیادہ باعث شرمندگی ہو گئے تھے۔ یہاں میں بڑے جارحانہ عزائم کے ساتھ آیا تھا اور غلام محمد نے مجھے میرے ماضی کا آئینہ دکھا کے خوف زدہ کر دیا تھا۔

اپنی بے بسی کا یہ احساس بھی میرے لیے بہت باعث آزار تھا۔ مجھے پھر ایسا لگتا تھا کہ آٹھ برس گزر جانے کے باوجود فرق نہیں پڑا ہے۔ میں آج بھی دست و پابستہ ہوں اور خود اپنے اعمال کی زنجیروں میں اتنا ہی جکڑا ہوا ہوں۔

یہ بڑی حوصلہ شکن صورت حال تھی۔ میرے سارے خواب میرے پلان اور ارادے لاحاصل تھے کیونکہ میرا مستقبل آج بھی ماضی کے قرض پر ہی رکھا ہوا تھا۔ اسے میں چھڑا نہیں سکتا تھا

کیونکہ یہ قرض سود در سود کے ساتھ کبھی ختم ہونے والا نہیں تھا۔

آہستہ آہستہ میرا مایوس ذہن باغی ہو رہا تھا۔ یہ ایک فطری ردِعمل تھا۔ درد کا حد سے گزرنا بے دوا ہو جائے۔ جو شخص زندگی سے مایوس ہوا اس کا درماں موت ہو جاتی ہے۔ سارے راستے بند ہوں تو ایک راستہ بہرحال کھلا رہتا ہے۔ مرنے کا یا مارنے کا۔ جو قرض خواہ کے چنگل سے نکلنے کی جدوجہد کے باوجود بار بار قرض میں ڈوبتا چلا جائے وہ بالآخر کیا کرتا ہے۔ قرض ختم نہیں ہوتا تو قرض خواہ کو ہی ختم کر دیتا ہے۔

شاید میرے لیے بھی ماضی کے قرض سے نجات کی اور کوئی راہ نہ تھی۔ ہر جنگ کی حکمت عملی میں بنیادی اہمیت پہلی چال کی ہے۔ اسی لیے کہا جاتا ہے کہ جارحیت سے بہتر کوئی دفاع نہیں۔ میرے یہ پرانے دشمن تو ہمیشہ مجھے بلیک میل کرتے رہیں گے۔ اس عذاب کا خاتمہ تب ہوگا جب میں ان کا خاتمہ کروں گا۔ سرفہرست دو ہی نام تھے۔ ایک شہاب الدین کا اور دوسرا غلام محمد کا۔ میرے خلاف سارے ثبوت ان کی تحویل میں تھے۔ اگر کسی طرح میں یہ سارے ثبوت حاصل کر لوں اور ان دونوں کا خاتمہ کر دوں؟

اس سوال نے مجھے بہت ڈسٹرب کیا۔ یہ کام مجھے تنہا ناگزیر لگتا تھا اتنا ہی ناممکن بھی نظر آتا تھا لیکن میرا یقین ہر دلیل کے ساتھ پختہ ہوتا جاتا تھا کہ جب تک میں اپنے راستے کی اس رکاوٹ کو دور نہیں کروں گا میرے لیے آگے بڑھنے کے خواب دیکھنا ہی ممکن نہ ہوگا۔

شام ابھی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے رابعہ کو فون کیا تو اس نے کہا۔ "آپ فارغ ہو گئے سارے کام نمٹا لیے۔"

مجھے اس کے لہجے میں چھپی ہوئی خواہش کا اندازہ ہو گیا۔ "کزن میں کچھ اور کام نکال لیتا ہوں۔ جب تک تم خود نہیں بلاؤ گی میں رنگ میں بھنگ ڈالنے نہیں آؤں گا۔ ہیو اے نائس ٹائم۔"

میں نے سوچا کہ فاروقی کے آفس جا کے وہ معاہدہ دیکھوں جس کی رو سے ست بدھائی کی جاگیر پر کسی کو ریسرچ اسٹیشن قائم کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔ اگر ممکن ہو تو اس اجازت نامے کو منسوخ کروں اور نئی شرائط کے ساتھ نیا معاہدہ کروں جس کی ایک بنیادی شق یہ ہو کہ مجھے کسی بھی وقت اندر جا کے یہ دیکھنے کا حق حاصل ہوگا کہ وہاں کوئی کام خلاف قانون تو نہیں ہو رہا ہے اگر جگہ کے غلط استعمال کا ثبوت ہے تو میں کسی نوٹس کے بغیر اجازت نامہ منسوخ کر دوں۔

میں آدھے راستے میں ہی تھا جب پولیس کی کچھ گاڑیاں بڑی تیز رفتاری سے سائرن بجاتی میرے پاس سے گزر گئیں۔ جی پی او تک سب نارمل تھا اور ٹریفک چل رہی تھی۔ مزنگ کی طرف گاڑی موڑنے کے کچھ دیر بعد مجھے گڑبڑ کا احساس ہوا۔

آگے راستہ بند تھا۔ پولیس کی گاڑیاں سڑک پر اپنی لائٹس چمکا رہی تھیں اور ٹریفک دونوں طرف سے روک دی گئی تھی۔

مسلح پولیس نے ایک جگہ کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ کچھ لوگ اپنی گاڑیاں کنارے پر لگا کے تماشا دیکھنے لگے تھے۔ میں نے اپنی گاڑی کو فٹ پاتھ کے ساتھ کھڑا کیا اور نیچے اتر کے پولیس کی کارروائی دیکھنے لگا۔ ایک ریڑھی والے نے مجھے بتایا کہ سامنے والے اسٹور میں ڈاکو ہیں۔

اچانک فائرنگ شروع ہوئی۔ پولیس اندھا دھند فائرنگ کر رہی تھی اور اندر سے پولیس پر گولیاں چلائی جا رہی تھیں۔ اوپر رہنے والے کھڑکیوں اور بالکونیوں سے اصلی پولیس مقابلہ بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ اصل بات کسی کو معلوم نہ تھا کہ ڈاکو کتنے ہیں۔ ان کی تعداد ہر ایک اپنی مرضی سے بتا رہا تھا۔ پھر پولیس نے لاؤڈ اسپیکر پر اعلان نشر کیا۔ ڈاکوؤں سے کہا گیا تھا کہ وہ خود کو قانون کے حوالے کر دیں۔ ڈاکوؤں نے اندر کچھ لوگوں کو یرغمال بنا رکھا تھا اور وہ پولیس سے یہ ضمانت چاہتے تھے کہ ہتھیار ڈالنے کے بعد انہیں ہلاک نہیں کیا جائے گا۔

یہ ڈراما تقریباً آدھے گھنٹے چلا اور اس عرصے میں دونوں طرف گاڑیوں کی لائنیں لگ گئیں۔ سڑک پر اور فٹ پاتھ پر ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا جسے منتشر کرنے کے لیے مزید پولیس منگوائی گئی اور وہاں ہلکا سا لاٹھی چارج بھی ہوا۔ لیکن بالآخر سڑک چھوڑ دی گئی۔

جیت بالآخر پولیس کی ہوئی۔ ڈاکوؤں کے لیے فرار کے سارے راستے بند تھے۔ پولیس کو یرغمال بنائے جانے والوں کی فکر نہ ہوتی تو وہ کب کا انہیں پکڑ چکے ہوتے۔ بالآخر پولیس یرغمالیوں کو چھڑانے میں کامیاب رہی۔ پھر ڈاکو گرفتار کر کے لائے گئے۔ وہ تعداد میں دو تھے اور جوان آدمی تھے۔ پولیس نے گرفتار کرنے کے بعد انہیں اتنا مارا تھا کہ وہ لہولہان ہو گئے تھے۔ ان میں سے ایک شاید پہلے ہی زخمی ہو چکا تھا۔

پولیس انہیں گھسیٹتی ہوئی باہر لائی۔ انہیں گاڑی میں سوار کرایا جا رہا تھا کہ میری ان پر نظر پڑی اور مجھے ان کے چہرے دیکھے ہوئے لگے۔ اسی وقت ایک ڈاکو نے مجھے دیکھا۔

وہ چلانے لگا۔ چیخ چیخ کر میری طرف اشارہ کرنے لگا۔ "یہ ہے مجھے ڈاکو بنانے والا۔ یہ شریف زادہ۔ اس کو پکڑو؟" وہ اب گالیاں بک رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ایک دم پولیس کے علاوہ لوگوں کی نگاہوں کا مرکز میری ذات بن گئی ہے۔

ایک انسپکٹر میری طرف بڑھا۔

وہ روایتی قسم کا تھانے دار تھا۔ چہرے کی درشتی سے بلیکو جان کا سالا اور آنکھوں کی سفاکی سے فرشتۂ اجل کا برادر ان لا نظر آنے والا جس کی سرکاری پتلون اس کی توند کے گنبد سے پھسل کر ہر دم قدم بوسی کے لیے آمادہ نظر آتی تھی۔ اس کے جارحانہ عزائم کو دیکھتے ہوئے ہر شریف آدمی کی طرح میں بھی گھبرایا اور ایک قدم پیچھے ہو گیا مگر اس نے ایک دم جھپٹ کر میری کلائی تھام لی اور مجھے آگے گھسیٹنے لگا۔

میں نے ہاتھ چھڑانے کی واجبی سی کوشش کی ''یہ کیا کر رہے ہیں آپ تھانے دار صاحب!''

اس نے میری بات کا جواب دینے کے بجائے ڈاکو سے سوال کیا ''اوئے' یہی ہے تیرا استاد!''

ڈاکو موبائل میں دھاڑیں مار مار کے رو رہا تھا ''یہی ہے مجھے اس راستے پر چلنے کے لیے مجبور کرنے والا۔ اسی کی وجہ سے آج میرا بھائی مارا گیا۔''

دوسرے انسپکٹر نے کہا ''ڈالو اسے بھی گاڑی میں۔''

میں نے صورتِ حال کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا پھر میں نے انگریزی میں دھاڑ کے کہا ''واٹ از آل دس نان سنس۔ کیا میں تمہیں اس ڈاکو کا ساتھی نظر آتا ہوں؟''

انسپکٹر نے غرا کے کہا ''پھر یہ تمہارا ہی نام کیوں لے رہا ہے؟''

''یہ اسی سے پوچھو۔ میں ایک معزز آدمی ہوں' لندن سے آیا ہوں۔''

اس نے پھر مجھے پکڑ لیا ''یہ سب تھانے چل کے بتانا۔ ہم ادھر عدالت نہیں لگا سکتے۔''

میں نے محسوس کیا کہ میری مزاحمت لاحاصل ہے تو وہ مجھ پر مقابلے کا الزام عائد کر سکتے تھے۔ میرے ساتھ مجرموں جیسا سلوک کرتے ہوئے مجھے تشدد کا نشانہ بنا سکتے تھے اور گاڑی میں ڈال کے اسی طرح لے جا سکتے تھے جیسے ڈاکو کو لے گئے تھے۔ دوسرے ڈاکو کی لاش وہیں پڑی رہ گئی تھی۔ گرفتار ہونے والے ڈاکو نے اسے اپنا بھائی قرار دیا تھا۔ وہ اپنی گرفتاری پر جتنا مشتعل تھا' اپنے بھائی کی موت پر اتنا ہی دکھی تھا۔

میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس نے مجھے شریکِ جرم... کیوں بنا دیا تھا۔ وہاں بہت سے راہگیر یہ تماشا دیکھنے کے لیے رک گئے تھے یا میری طرح راستہ بند ہونے کی وجہ سے کھڑے تھے۔ تھانے دار کا سوال جائز تھا۔ آخر اس نے میری طرف ہی اشارہ کیوں کیا؟ یہ سوال لوگوں کی نظروں میں بھی تھا۔

حاضرین و ناظرین کی بھیڑ اب منتشر ہو رہی تھی۔ ایک حقیقی پولیس مقابلے کا اختتام ہو چکا تھا۔ انہوں نے زندگی کے ڈرامے کا ایک سین اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ اصلی ڈاکو' اصلی پولیس' اصلی گولیاں' ایکشن میں ایک ڈاکو کی اصلی موت اور دوسرے کی گرفتاری۔ اب دیکھنے کو کچھ نہیں رہا تھا۔ وہ جلد از جلد اس سنسنی خیز واردات کا آنکھوں دیکھا حال دوسروں کو سنانا چاہتے تھے۔

مجھے بہت مایوسی ہوئی جب پبلک کی طرف سے میری حمایت میں آواز بھی نہ اٹھی۔ غالباً ان میں سے نصف نے ڈاکو کے الزام کو درست تسلیم کر لیا تھا۔ زمانہ ہی ایسا ہے جی۔ کسی کی صورت سے کیا پتا چلتا ہے۔ باقی نصف نے اگر مجھے شک کا فائدہ دیا تھا تو طے کر لیا ہوگا کہ تھانے جا کے میں اپنی شرافت اور بے گناہی ثابت کر ہی دوں گا۔ پولیس کا کیا ہے ہر واردات کے بعد اسی طرح نفری بڑھاتی ہے۔ کمک مکا کر کے سب نکل آتے ہیں بعد میں۔

سب انسپکٹر کی مدد کے لیے چار مسلح پولیس کانسٹیبل مجھے گھیرے میں لے چکے تھے اور انتہائی ذلت آمیز طریقے پر دھکے دے کر پولیس کی دوسری موبائل کی طرف لے جا رہے تھے۔ کوئی میری ایک نہیں سن رہا تھا۔ ایک حوالدار نے تو مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے اپنی ماہرانہ رائے بھی صادر فرما دی تھی کہ سرغنہ یہی لگتا ہے...... آخر ہمارا بھی تجربہ ہے' بندہ پہچانتے ہیں۔

مزاحمت لاحاصل تھی۔ اب میری صرف یہ خواہش تھی کہ پولیس مجھ سے بدسلوکی نہ کرے اور مجھے ڈاکو کا ساتھی مانتے ہوئے تھانے ضرور لے جائے مگر راستے میں ہی تفتیش کے عمل کا آغاز نہ کرے۔ مجھے انہوں نے موقع ہی نہیں دیا تھا کہ اس ڈاکو سے پوچھ سکتا کہ آخر اس نے بلاوجہ مجھے کیوں اپنے جرائم میں ملوث کر لیا؟

تاہم خود میں سوفی صد یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ ایسا بلاوجہ ہوا۔ وجہ غلط سہی مگر ہوگی۔ انگریزی محاورے کے مطابق دھواں وہیں سے اٹھتا ہے جہاں آگ ہو۔ اب یہ وجہ تھانے جا کر ہی معلوم ہو سکتی تھی۔

میری قسمت اچھی تھی کہ اچانک وہاں ایک افسرِ اعلیٰ کی گاڑی نمودار ہو گئی۔ ہر فرض شناس افسر کی طرح وہ بھی جائے واردات پر اس وقت پہنچا تھا جب کیس تمام ہو چکا تھا اور اس کی تشریف آوری محض حاضری کی سرکاری خانہ پری کے سوا کچھ نہ تھی۔ اب سرکار سے ملنے والی برائے نام تنخواہ کو حلال

کرنے کے لیے کسی افسر سے یہ توقع رکھنا تو زیادتی کی بات ہے کہ وہ ساری ذاتی مصروفیات چھوڑ کے جان ہتھیلی پر رکھے اور جائے واردات پر جا پہنچے جہاں دنادن گولیاں چل رہی ہوں۔

مجھے ایک موقع ملا کہ میں خود کو چھڑا کے افسرِ اعلیٰ کی گاڑی کا راستہ روک لوں۔ وہ نوجوان افسر تھا جو پولیس سروس میں براہِ راست بھرتی کیے جاتے ہیں۔

میں نے چلا کے انگریزی میں کہا ''اے ایس پی صاحب! یہ لوگ مجھے بلاوجہ شک میں پکڑ کے لے جا رہے ہیں۔ میں ایک عزت دار اور اعلیٰ تعلیم یافتہ آدمی ہوں۔ فارن کوالی فائڈ ہوں اور ایک جاگیردار ہوں۔''

غالباً ایک سانس میں کی جانے والی اس تقریر کا آخری جملہ کام کر گیا۔ اے ایس پی نے محض گردن ہلا کے اشارہ کیا اور مجھے پھر دبوچنے والے پیچھے ہٹ گئے۔

''یہ کیا معاملہ ہے؟'' اس نے متانت آمیز رعونت سے پوچھا۔

انسپکٹر پتلون سنبھالتا قریب آیا ''سر! جو ڈاکو پکڑا گیا ہے، اس نے سب کے سامنے کہا تھا کہ یہ سرغنہ ہے۔''

''غلط...... اس نے کہا تھا کہ میں نے اسے ڈاکو بنایا ہے۔ الفاظ مت بدلو۔'' میں نے کہا۔

''اس نے یہ بھی کیوں کہا؟'' اے ایس پی نے کہا۔

میں نے کہا ''میں پولیس اسٹیشن جا کے ہر وضاحت کر سکتا ہوں لیکن میرے ساتھ مجرموں جیسا برتاؤ کیوں ہو رہا ہے۔ میں اپنی گاڑی میں چلتا ہوں، پولیس ساتھ چلے، میں کوئی عام آدمی نہیں ہوں سر!''

اے ایس پی کو غالباً میرے اندازِ گفتگو اور رویے نے میری صداقت کا قائل کیا۔ اس نے انسپکٹر کو حکم دیا ''تم ساتھ جاؤ۔ اور خیال رکھو کہ ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہو۔''

میں نے سکون کا سانس لیا۔ افسرِ اعلیٰ کی گاڑی آگے بڑھ گئی مگر میرے ساتھ پولیس کا رویہ بالکل بدل گیا۔ میں واپس اس جگہ تک گیا جہاں میری گاڑی پارک تھی۔ اب مجھے موقع ملا۔ میں نے انسپکٹر کو جھاڑا ''عمر سے تم کافی تجربے کار نظر آتے ہو۔ کیا فائدہ اس تجربے کا اگر تمہیں ایک معزز آدمی اور ایک ڈاکو کی پہچان نہ ہو؟''

اس نے اپنے دفاع میں وہی دلیل دی کہ کسی کی صورت پر شرافت کی سند ہوتی ہے نہ خباثت کی...... اور میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ اس کی یا میری حفاظت کے لیے دو ماتحت پیچھے فٹ ہو گئے۔ تھانے تک راستے میں مجھے اپنا تفصیلی تعارف کرانے

کی مہلت مل گئی۔ میں نے یہ ثابت کر دیا کہ میں وی آئی پی ہوں اور مجھ پر ہاتھ ڈالنے کی احمقانہ عجلت پولیس کو مہنگی پڑے گی۔ میں نے راجا کا حوالہ بھی دیا اور فاروقی کا بھی۔ انسپکٹر قطعی مرعوب نہیں ہوا۔ اس کی نوکری پکی تھی اور کھال موٹی تھی۔

تھانے میں مجھے جو منظر دیکھنے کو ملا وہ بالکل مختلف تھا۔ میرا خیال تھا کہ میرے قدم رنجہ فرمانے تک پولیس نے بڑی مستعدی سے تفتیش کے عمل کا آغاز کر دیا ہوگا۔ کپڑے اتارنے کے بعد ڈاکو کو بکرے کی طرح الٹا لٹکا کے اس کی کھال اتاری جا رہی ہوگی اور جدید آلاتِ تفتیش مثلاً سرخ مرچ اور اسے اوپر نیچے کے ہر سوراخ میں کوٹ کوٹ کر بھرنے والا ڈنڈا، استعمال کیے جا رہے ہوں گے۔

وہاں بڑا دوستانہ مہمان نوازی کا ماحول تھا۔ ڈاکو ایک کمرے میں کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے بیٹھا ہوا سب انسپکٹر اور دو ماتحت اسے پانی پلا کے تسلی دے رہے تھے اور صبرِ جمیل کی تلقین کر رہے تھے۔ تیسرا ماتحت اس کے سامنے چائے کی پیالی رکھ رہا تھا۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ ڈاکو کے ساتھ یہ وی آئی پی ٹریٹ منٹ ہر تھانے کی روایت ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ وہ بھی بہت پیسے والے ہوتے ہیں اور عام طور پر سابق سیاست دانوں، بیوروکریٹس اور بیشتر معززین کو ان کی دولت مندی کے باعث ڈاکو ہی کہا اور سمجھا جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ڈاکو طاقتور ہوتے ہیں اور اثر رسوخ رکھتے ہیں۔ ان کے تعلقات کا سلسلہ اوپر تک جاتا ہے۔

میرے ساتھ گاڑی میں آنے والا انسپکٹر تھانہ انچارج بھی ثابت ہوا۔ اس کے ہاتھ بیک وقت دو مستند وی آئی پی لگ گئے تھے اور ان کے ساتھ حسنِ اخلاق سے پیش آنا ایک کاروباری ضرورت بن گیا تھا۔ اس نے ہمیں ایک جیسا پروٹوکول دیا اور آمنے سامنے بٹھا دیا۔

اب میں نے اس ڈاکو کہلانے والے مگر حلیے سے عام بے ضرر انسان نظر آنے والے کو دیکھا۔ اس کا ابتدائی جوش

وخروش سرد پڑ گیا تھا۔ واردات میں ناکامی کا یہ انجام اس کے لیے غیر متوقع نہیں ہوگا۔ وہ خود بھی مارا جا سکتا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے اس کا بھائی گولی کا نشانہ بن گیا تھا۔ وہ سخت ڈپریشن کا شکار تھا۔

میں نے کہا ”کون ہو تم؟ نام کیا ہے تمہارا؟“

اس نے ٹھنڈی سانس لی ”میرا نام ہے حارث۔ وارث میرا چھوٹا بھائی تھا۔“

”میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا......“ میں نے کہا۔

”ضرور دیکھا ہوگا۔“ وہ تلخی سے بولا ”لیکن تمہیں یاد نہیں......خود میں نے تمہیں برسوں بعد دیکھا ہے۔“

میں نے کہا ”میں تو ملک سے باہر تھا۔ چھ سال امریکا میں اعلیٰ تعلیم کے لیے رہا پھر دو سال برطانیہ میں رہا۔ میں لارڈ ارنسٹ کی فرم کا وائس پریذیڈنٹ تھا۔“

وہ چلا کے بولا ”یہ سب مجھے کیوں بتا رہے ہو؟“

”اس لیے کہ تم نے سب کے سامنے میرا نام لیا تھا۔ بکواس کی تھی کہ تمہیں ڈاکو بنانے والا میں ہوں۔“

”یہ بکواس نہیں تھی، سچ تھا۔“ وہ بولا۔

میں نے کہا ”یہ جھوٹ تھا۔ میں ثابت کر سکتا ہوں کہ آٹھ سال سے میں لاہور میں نہیں تھا، پاکستان میں نہیں تھا، میں تو تمہیں جانتا بھی نہیں۔“

”لیکن میں تمہیں جانتا ہوں۔“ اس نے میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی کہا ”مجھے بتاؤ کیا تمہارا نام رفیق احمد نہیں ہے؟“

میں نے کہا ”ہاں۔“

”کیا آٹھ سال پہلے تم تنظیم میں نہیں تھے؟“ اس نے کسی وکیلِ استغاثہ کی طرح پوچھا۔

میں نے برہمی سے کہا ”مگر اب میرا کسی تنظیم سے کوئی تعلق نہیں۔“

اس نے میری بات سنی اَن سنی کر دی ”تم چیف کے خاص بندے تھے یا نہیں تھے؟ اسے تقریریں لکھ کے دیتے تھے، کتابیں اور پمفلٹ لکھتے تھے۔“

میں نے کہا ”یہ ٹھیک ہے کہ میں آٹھ سال پہلے شعبۂ نشرواشاعت کا انچارج تھا۔“

”مگر کیا...... تمہارے حکم پر تمہاری غنڈا فورس اپنے مخالفین کے ساتھ کیا کرتی تھی۔ یہ تم کیسے بھول سکتے ہو، میں اس وقت ایک اسٹوڈنٹ لیڈر تھا۔ کالج میں پڑھتا تھا۔“

تھانے دار ابھی تک ٹینس کے ریفری کی طرح ہر سوال کی بال کے ساتھ اپنے سر کو دائیں بائیں گھما رہا تھا۔ اب اس نے گیم روکنے کے لیے سیٹی بجائی۔ اس نے ہمیں یاد دلایا کہ ہم ملزمان ہیں چنانچہ ہمارا براہِ راست ایک دوسرے پر الزام عائد کرنا فاؤل ہے۔

وہ خفگی سے بولا ”بند کرو اپنی بک بک۔ یہ تھانہ ہے، یہاں سوال جواب، تفتیش اور بیان لینا پولیس کی ذمے داری ہے۔“

میں نے کہا ”آپ پوری کریں اپنی ذمے داری۔ کس نے روکا ہے، مجھے اجازت دیں۔“

وہ سخت خفا ہوا ”اوئے اجازت کے گھوڑے۔ ابھی تو رپورٹ بھی نہیں لکھی گئی۔“

میں نے کہا ”اگر آپ کو بیان لینا ہے میرا......“

وہ دھاڑ کے بولا ”پہلے ایف آئی آر درج ہوگی۔ اس میں تمہارا نام بھی ہوگا۔ کیونکہ سو بندوں کے سامنے ملزم نے تمہیں اپنا ساتھی بتایا تھا۔“

میں سمجھ گیا کہ تھانے دار کیا چاہتا ہے۔ میں نے کہا ”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ میں بھی زیرِ حراست ہوں۔ مجھے بھی شاملِ تفتیش کیا جائے گا اور آپ قانون کے مطابق چودہ دن کا ریمانڈ بھی لیں گے۔ اس سے پہلے تو میں ضمانت پر رہائی کے لیے درخواست بھی نہیں دے سکتا۔“

اس نے بے نیازی سے کہا ”قانونی کارروائی تو ہوگی۔“

میں نے کہا ”کیا قانونی کارروائی کو روکنے کی صورت کوئی نہیں ہے۔“

اس نے برا سا منہ بنا کے کہا ”ہاں، ایک صورت ہے۔ پولیس کا محکمہ بند کرا دیں۔ ہم تھانے میں تالے ڈال کے چلے جاتے ہیں گھر۔“

میں نے سر ہلایا ”عام لوگوں کا خیال یہی ہے کہ تھانے نہ ہوں تو جرائم بھی نہیں رہیں گے مگر میں ان سے اتفاق نہیں کرتا۔“

”کیونکہ آپ عام لوگوں میں نہیں ہو؟“ وہ طنز سے بولا۔

میں نے کہا ”یہ بات نہیں، میرا خیال ہے کہ پھر پولیس والے بھی اپنی آمدنی کے لیے کچھ تو کریں گے۔ اپنا گینگ بنائیں گے یا باقاعدہ کسی گروہ میں شامل ہو جائیں گے۔ جرائم میں کئی گنا اضافہ ہوگا۔“

اس نے میز پر مکا مارا ”زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔“

میں نے مسکرا کے کہا ”ایک فون تو کر سکتا ہوں۔“

اس نے رکھائی سے کہا ”یہ سرکاری فون ہے۔ پرائیویٹ کال میں بھی نہیں کرتا۔“

میں نے کہا ”واہ وا...... آپ نے تو حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی یاد تازہ کر دی۔ ذاتی گفتگو کرتے وقت وہ چراغ بجھا دیتے تھے جس میں سرکاری بیت المال کا تیل ہو۔ میرے پاس موبائل فون ہے۔“

”کس کو فون کرنے لگے ہو؟“

میں نے سادگی سے کہا ”آپ ضرور جانتے ہوں گے راجا کو۔ بس اسے اطلاع دینی ہے کہ آج رات میں سرکاری مہمان ہوں۔“

وہ خون کے گھونٹ پی کے رہ گیا۔ راجا نے کال ریسیو کرتے ہی سوال کیا ”کہاں ہے تو...... اپنے گھر میں؟“

میں نے کہا ”نہیں، بڑے گھر میں۔ وہیں جہاں مجھے ہونا چاہیے۔ صبح موقع نہیں ملا تھا اس لیے دوبارہ کوشش کر کے آ گیا ہوں یہاں۔“

”کیا مطلب؟“

میں نے کہا ”صبح قتل کا الزام تھا۔ اب ڈکیتی کا ہے، مجھے ایک ڈاکو کا ساتھی ہونے کے جرم میں پکڑ لیا گیا ہے کیونکہ اتفاق سے میں جائے واردات پر موجود تھا۔“

”یہ کیا بکواس ہے؟“

”بکواس نہیں یار! وہاں میرے علاوہ سیکڑوں لوگ تھے مگر میں کیا کروں، تھانے دار صاحب کو میں ہی پسند آیا، اتفاق سے۔“

”اس نے تجھے پسند کیا ہوگا اپنی بہن کے لیے۔ کون ہے سالا تھانیدار!“ راجا بگڑ گیا ”اور اس قسم کے اتفاقات تیرے ساتھ ہی کیوں ہو رہے ہیں فیکے پتر! تھانے کو سسرال بنا لیا ہے۔ صبح شام کے چکر ختم کر۔ وہیں رہ آرام سے۔“

”رہنا پڑے گا راجا! ان کا خیال ہے کہ ایف آئی آر میں میرا اسمِ شریف بھی شامل کر لیا جائے۔“

راجا نے ایک گالی دی ”فون دے اسے۔“

میں نے فون تھانے دار کی خدمت میں پیش کیا مگر اس کا الٹا نقصان ہوا۔ راجا نے غصے میں اسے کچھ کہہ دیا۔ تھانے دار گرم ہو گیا کہ تڑی مت دو، ہم نے بہت دیکھے ہیں تم جیسے بلیک میلر صحافی! نہ جانے کتنے وڈیروں اور وزرائے اعظموں کا دماغ درست کر دیا ہے۔

میرا خیال ہے اپنی عمر اور جسامت کی وجہ سے تھانے دار کچھ بلڈ پریشر کا مریض ہوگا۔ وہ غصے میں آ گیا اور گالیاں بکتے ہوئے اس نے فون میری طرف پھینکا۔ میں پُرسکون رہا اور مسکراتا رہا کیونکہ مجھے معلوم تھا، اس کے بعد کیا ہوگا۔

تھانے دار نے احکامات صادر کیے کہ فوری طور پر ایف آئی آر کاٹ کے مجھے بھی ڈاکو کے ساتھ حوالات میں ڈال دیا جائے لیکن ان احکامات پر عمل درآمد کی نوبت آنے سے پہلے کوئی فون آ گیا۔ تھانے دار نے فون اٹھایا اور پھر کھڑا ہو گیا۔ یک طرفہ گفتگو میں اس کے ہونٹوں سے یس سر کے علاوہ کچھ نہ نکلا۔ اس کے وضاحتی جملے نامکمل رہے۔

پھر وہ اس غبارے کی طرح چھت سے فرش پر آ گیا جس میں سے گیس کم ہو گئی ہو۔ اس نے بڑی عیاری اور بے شرمی کے ساتھ اپنے ہونٹوں پر ایک خوشامدانہ مسکراہٹ طاری کی اور خودی کو پست کر کے بولا ”آپ بھی کمال کرتے ہو جناب عالی! آپ نے بتایا کیوں نہیں کہ خیر سے نواب شیرازی آپ کا نام ہے۔ اس ماں کے خصم نے کہا رفیق احمد تو آپ نے بھی ہاں کہہ دیا......“

میں نے بڑی مربیانہ مسکراہٹ سے کام لیا ”دراصل میرا پورا نام تو نواب رفیق احمد شیرازی ہے۔“

تھانے دار کی ہزیمت اور خفت کا سارا نزلہ اب ڈاکو پر گرا۔ اس نے حکم دیا کہ نواب صاحب پر الزام تراشی کے جرم میں اس کی خصوصی چھترول کا فوری انتظام کیا جائے۔ ڈاکو نے بھی سمجھ لیا تھا کہ پانسا پلٹ گیا ہے۔ پہلے بھی وہ کمزور تھا۔ میرے مقابلے میں آج بھی کمزور ہے۔ اس کے سچ کا بول بالا نہیں ہوگا، اسی کا منہ کالا ہوگا۔

ڈاکو میں میری دلچسپی اب صرف اسی حد تک رہ گئی تھی کہ میں اس کی کہانی سننا چاہتا تھا۔ آخر وہ ایسا کیوں سمجھتا تھا کہ اسے ڈاکو بنانے والا میں تھا۔ آٹھ سال پہلے کیا ہوا تھا جس کا ذمے دار میں تھا۔ غلام محمد سے ملاقات کے دوران میں مجھے اندازہ تو ہو گیا تھا کہ سیاست کی روایت کے مطابق گنگا الٹی بہنے لگی ہے۔ چنانچہ جو معتوب و مردود تھے، اب وہی مقتدر اور معزز ہو گئے ہیں۔ محکوم اور مظلوم آج حاکم و ظالم ہیں جیسے پہلے ہم تھے چنانچہ اب وہ پرانے حساب بے باق کر رہے تھے تو یہ قانونِ فطرت کے مطابق تھا۔ کھیل وہی تھا، کھلاڑی بھی وہی تھے مگر بازی بدل گئی تھی تو سیاہ و سفید کا حوالہ ہی بدل گیا تھا۔

غالباً یہ ڈاکو بھی اسی دور کا مردم گزیدہ تھا جب تنظیم نشہ اقتدار میں بدمست ظلم کرنے کے ہر عمل کو انصاف قرار دیتی تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس دور میں کتنے گھر برباد ہوئے، کتنے نوجوانوں کے مستقبل داؤ پر لگے اور کتنی زندگی کے چراغ گل ہوئے۔ شاید ان کی تعداد لاکھوں میں تھی۔ بدقسمتی سے

خود میں جبر و استبداد کی قوتوں کا علمبردار بن گیا تھا۔ پہلے اپنی بے وقوفی کے باعث اور پھر مجبوراً۔ اپنی مرضی سے میں نے کچھ نہیں کیا تھا۔ مجھے اوپر والوں نے حکم دیا تو میں نے اعتراض کو جرم اور اختلاف کو بغاوت قرار دیتے ہوئے ڈسپلن کے نام پر بہت کچھ کیا تھا جو آج ظلم قرار دیا جا چکا تھا چنانچہ میں بہت سے لوگوں کے نزدیک مجرم تھا۔

میں تھانے سے نکلا تو میرے دل میں ایک پھانس سی چبھی ہوئی تھی۔ جنگ عظیم کے بعد نازی افواج اور ان کا ساتھ دینے والوں کے خلاف نیورمبرگ کی بین الاقوامی عدالت میں جنگی جرائم پر مقدمات چلے تھے۔ ہر مجرم کو اس کے جرم کی سنگینی کے اعتبار سے سزا دی گئی تھی مگر بہت سے مجرم جو نازی دور میں فوج اور حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہونے کی وجہ سے انسانی قتل عام کے ذمے دار سمجھے جاتے تھے، غائب ہو گئے تھے۔ دو برسوں روپوش رہے اور انصاف کرنے والے انہیں ڈھونڈ کر انصاف کے کٹہرے میں لاتے رہے۔ تلاش کا یہ سلسلہ جنگ عظیم ختم ہونے کے پچاس سال بعد تک جاری رہا۔

اب میں محسوس کرتا تھا کہ خود میری حیثیت ایک مفرور جنگی مجرم جیسی ہو گئی تھی۔ میں آٹھ سال روپوش رہا۔ میں ان سب کے نزدیک مفرور تھا جو تنظیم کے مظالم کا نشانہ بنے تھے۔ میرا یہ کہنا کہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے گیا تھا میری صفائی کی دلیل نہیں بنتا تھا۔

اگر مجھے صفائی پیش کرنے کا موقع دیا جاتا تو میں بتاتا کہ میں خود کس طرح تنظیم کے ہاتھوں بلیک میل ہوتا رہا تھا اور درحقیقت میرا ملک سے نکل جانا ایک بغاوت ہی تھی۔ یہ ناممکن تھا کہ یہاں رہتے ہوئے میں تنظیم سے لاتعلقی کا اعلان کردوں۔ ایسے لوگوں سے تنظیم کی فاشسٹ قیادت جینے کا حق چھین لیتی تھی...... لیکن وہ عدالت تھی کہاں جس کے سامنے میں اپنی صفائی کے لیے کچھ کہہ سکتا، خود تنظیم کسی کو بھی اپنی صفائی پیش کرنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔

چنانچہ پرانے پاپی میرے خلاف بھی حکم صادر کردیں گے کہ مفرور مجرم رفیق احمد کو اس کی فرد جرم کے مطابق سزائے موت دی جاتی ہے۔ کسی اپیل کے حق اور رحم کی درخواست کے بغیر تنظیم کے جلاد اس حکم پر عمل درآمد میں ذرا دیر نہیں لگائیں گے۔

ان حالات میں اگر میں نے غلام محمد اور شہاب الدین کی مدد کی تو میں کیسے کہہ سکوں گا کہ میرے تنظیم سے اختلافات تھے اور میں بغاوت کر کے فرار ہوا تھا اگر ایسا تھا تو پھر آج میں ان سے پرانے عہد وفا کو کیوں نبھا رہا ہوں، میں نے دوبارہ ان سے مراسم کیوں استوار کیے ہیں اور انہیں برطانیہ میں سیاسی پناہ دلانے کی کوشش کا کیا مقصد ہے؟ میرے لیے یہ ثابت کرنا محال ہوگا کہ مجھے پھر بلیک میل کیا جا رہا ہے۔

پس...... میں نے خود سے کہا۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ میں تنظیم کے جرم کا شکار اور بے بس تھا، مجھے اس کے برعکس کچھ کر کے دکھانا چاہیے جو میں کر رہا ہوں، ساری زندگی کون بلیک میل ہوتا ہے۔

پہلے یہ ایک وقتی احساس کا ردِعمل تھا۔ میں سخت جھنجلاہٹ اور فرسٹریشن میں مبتلا تھا۔ اپنی بزدلی اور کمزوری کا خیال مجھے شرمندہ کر رہا تھا اور اس شرمندگی کا نتیجہ میرے دل میں نفرت اور اشتعال کے جذبات تھے۔ میں نے سوچا تھا کہ شہاب الدین اور غلام محمد کو جان سے ماردوں کیونکہ اس کے سوا ان سے جان چھڑانے کی کوئی صورت نہیں۔

اب یہ خیال میرے دل میں جڑ پکڑ رہا تھا کہ ایسا کرنا میری مجبوری ہی نہیں ضرورت بھی ہے اگر میں دنیا سے ان کے ناپاک وجود کو حرفِ غلط کی طرح مٹادوں تو یہ بات میرے حق میں جائے گی اور میں دعوے سے کہہ سکوں گا کہ میرے واپس آنے کے بعد انہوں نے پھر مجھے اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہا اور اس کے لیے پھر مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کی تو میرے لیے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ انہیں قتل کر کے اپنے عذاب سے نجات پاؤں ورنہ وہ پیرِ تسمہ پا کی طرح تمام عمر مجھ پر سوار رہتے۔ یہ ایک فطری ردعمل سمجھا جائے گا۔

میرا ذہن اس دفاعی حکمتِ عملی کی افادیت کو تسلیم کر چکا تھا۔ بعض اوقات جارحیت ہی سلامتی اور بقا کی ضامن بن جاتی ہے۔ سانپ اور بچھو کو آدمی دیکھتے ہی مار دیتا ہے۔ ان کی نیت میں فتور ظاہر ہونے کا انتظار نہیں کرتا لیکن ظاہر ہے کہ یہ آسان کام نہیں تھا۔ آج میرے مخالفین یہ کہہ سکتے تھے کہ میرے ایما پر بہت سے قتل ہوئے مگر ان میں میری مرضی شامل نہ تھی۔ میں بھی تعمیل کر رہا تھا۔ نہ میں نے خود کسی کو قتل کیا تھا اور نہ میں ارتکاب جرم کرنے والوں کے ساتھ تھا۔ میں نے تو کسی کے قتل کی پلاننگ میں بھی حصہ نہیں لیا تھا۔

پھر میں غلام محمد اور شہاب الدین کو کیسے قتل کروں گا؟ یہ بڑا مشکل سوال تھا۔ چنانچہ میں نے اسے ذہن سے جھٹک دیا۔ مجھے اب رابعہ کا خیال آ رہا تھا۔ سارا دن گزر گیا تھا اور اب رات کا اندھیرا غالب آ رہا تھا مگر مجھے اس کی طرف سے کوئی پیغام نہیں ملا تھا کہ دونوں کہاں ہیں اور میں واپسی کے لیے انہیں کس جگہ ملوں؟ ظاہر ہے عشق کی بے خودی اور وارفتگی میں انہیں احساس بھی نہ ہوگا کہ وقت کتنا گزر گیا ہے۔

مجھے رابعہ پر غصہ آنے لگا۔ بے وقوف لڑکی، اسے احساس کیوں نہیں کہ گھر بھی جانا ہے۔ وہاں تو سب یہی فرض کیے بیٹھے ہوں گے اور بہت مطمئن ہوں گے کہ وہ میرے ساتھ ہے۔ شاید غلطی میری ہی ہے۔ مجھے ان دونوں کو اس طرح کھلی چھٹی نہیں دینی چاہیے تھی کہ جا کر عیش کرو۔ بے شک میں ان دونوں کو ذمے دار اور قابلِ اعتماد سمجھتا تھا اور ان سے کسی غلطی کی توقع نہیں رکھتا تھا مگر غلطی انسان اپنے ارادے سے کب کرتا ہے۔ غلطی تو شیطان کراتا ہے اور اس کے لیے ترغیب کا سامان بھی فراہم کر دیتا ہے۔

میں نے موبائل فون کو چیک کیا۔ اس میں نہ کوئی مس کال تھی اور نہ ایس ایم ایس موصول ہوا تھا۔ موبائل فون رابعہ کے پاس بھی تھا لیکن مجھے اس کا نمبر ہی یاد نہ تھا۔ میں نے فرخ کے نمبر پر کوشش کی اور ناکام رہا۔ ایک آواز نے مجھے مطلع کیا کہ مطلوبہ نمبر سے جواب موصول نہیں ہو رہا ہے۔

یہ میرے لیے بڑی پریشانی کی بات تھی۔ رابعہ کے بغیر اکیلا میں بھی گھر نہیں جا سکتا تھا۔ دروازے پر پہلا سوال مجھ سے یہی کیا جاتا کہ رابعہ کہاں ہے؟ اگر میں اپنے گھر فون کرتا اور کسی سے رابعہ کا نمبر معلوم کرنے کی کوشش کرتا تب بھی صورت حال مختلف نہ ہوتی۔ مجھ سے پوچھا جاتا کہ کیا وہ تمہارے ساتھ نہیں ہے، میں عجیب مشکل میں پھنس گیا تھا۔

آدھے گھنٹے تک میں گاڑی میں بیٹھا جز بز ہوتا رہا اور سوچتا رہا کہ کیا کروں؟ بالآخر میرے دماغ نے ایک ترکیب نکالی۔ میں نے فریال کو فون کیا۔

میری آواز سنتے ہی اس نے ایک آہ بھری "تم کہاں ہو میرے رومیو! تمہیں کیا پتا، آج کی شام تمہاری جیولیٹ کے لیے کتنی اداس تھی۔"

میں نے کہا "میری بات سنو۔"

"نہیں، پہلے تم میرے ڈائیلاگ سن لو۔ میں نے بڑی محنت سے سوچ کے رکھے تھے کہ تم فون کرو گے تو بولوں گی۔"

میں نے بھنا کے کہا "یار بھاڑ میں گئے تمہارے ڈائیلاگ۔ میں نے کسی پریشانی میں فون کیا ہے تمہیں۔"

اس نے خفگی سے کہا "تمہارا تو یہ معمول بن گیا ہے۔ پریشان ہو کے فون کرنا۔ کبھی جذباتی ہو کے بھی فون کر لیا کرو۔ اب کیا ہوا ہے؟"

میں نے کہا "وہ کہاں ہے، ڈاکٹر شہباز؟"

"مجھ سے دس فٹ کے فاصلے پر...... لیکن وہ فارغ نہیں ہے۔"

"کیا کر رہی ہے، اسے کہو ایک ضروری کام ہے۔"

"یار! وہ بھی ضروری کام میں مصروف ہے۔ راجا پر ثابت کر رہی ہے کہ دنیا میں اس سے زیادہ فضول انسان کوئی نہیں۔ یہ بڑی غلط بات ہے، آخر تم بھی تو ہو۔" وہ ہنسی۔

میں نے کہا "خدا کے لیے فریال......!"

"او کے، ایک بار کہو آئی لو یو۔"

یہ کہے بنا چارہ نہ تھا۔ فریال نے مجھے ایک وائرلیس بوسے کی آواز سنائی اور شہباز کو بلا دیا۔ اس نے میری بات توجہ سے سنی "میں تمہارے گھر فون کر کے کیا کہوں؟"

"کہنا رابعہ سے بات کرنی ہے۔ چچی بتائیں گی کہ وہ تو نکلی ہوئی ہے صبح سے رفیق کے ساتھ پھر تم رابعہ کا موبائل نمبر مانگ لینا کہ مجھے اس سے کچھ ضروری بات کرنی تھی۔ یہ نمبر مجھے ایس ایم ایس کر دینا۔ رائٹ، میں انتظار کر رہا ہوں۔"

نمبر مجھے چند منٹ کے بعد موصول ہو گیا لیکن اس سے کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ میں نے رابعہ سے بات کرنے کی کوشش کی تو پھر وہی ریکارڈ چل پڑا۔ آپ کے مطلوبہ نمبر سے رابطہ فی الحال ممکن نہیں۔ نیٹ ورک بزی ہونے کی صورت میں بھی ایسا ہو جاتا ہے چنانچہ میں نے پھر کوشش کی اور مایوس ہو کے فون بند کر دیا۔

آدھے گھنٹے تک میں شدید کوفت میں مبتلا رہا اور میرا غصہ بڑھتا گیا۔ بے شک غلطی میری تھی کہ میں نے انہیں بے مہار چھوڑ دیا مگر رابعہ کے ساتھ تو میں نے نیکی ہی کی تھی۔ اسے کیوں احساس نہیں کہ میں اسے اپنی ذمے داری پر ساتھ لایا تھا اور سب کے سامنے جواب دہ میں ہوتا۔ مجھے فرخ پر بھی طیش آنے لگا۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے اور لیلیٰ مجنوں بھول گئے دنیا کو۔ عشق ان کا مصیبت میری۔ اب میں کہاں جاؤں۔"

اچانک مجھے فرخ کے گھر کا خیال آیا۔ جہاں فرخندہ رہتی تھی۔ اس کے گھر اور اس کی گلی کا راستہ میں بھولا نہیں تھا۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور برسوں بعد پھر اسی رہگزر پر چل نکلا۔ دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے۔ فرخندہ کی یاد نے پھر تصور کے تصویر خانے کو روشن کیا لیکن اس وقت میرا ذہن دوسری الجھن میں گرفتار تھا۔

فرخ کے گھر کا دروازہ بند پا کے میری پریشانی میں اضافہ ہو گیا۔ اب رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ ہمیں گھر سے نکلے تو دس گھنٹے ہو گئے تھے۔ آخر ہم کتنی دیر باہر رہ سکتے تھے، مزید دو گھنٹے۔ زیادہ سے زیادہ رات گیارہ بجے تک۔ اس

کے بعد صرف خیریت جاننے کے لیے کسی نے مجھے فون کر دیا پھر......

فون جیسے اسی خیال کا منتظر تھا۔ اچانک بول اٹھا۔ ایک لمحے کے لیے میں نروس ہوا کیونکہ ابھی تک تو میں نے کوئی معقول جواب بھی نہیں سوچا تھا پھر میں نے روشن اسکرین کے نمبروں کو دیکھا اور اطمینان کا سانس لیا۔

رابعہ کے بولنے سے پہلے ہی میں نے اس پر چڑھائی کر دی ''رابعہ۔ خیال آ گیا تمہیں میرا۔ کچھ اندازہ ہے تمہیں کہ وقت کیا ہوا ہے؟ کب سے پریشان ہو رہا ہوں میں اور فون بھی بند کر رکھا تھا تم نے، تم دونوں نے۔''

اس نے ہکلا کے کہا ''آئی ایم سوری...... کزن!''

''شٹ اپ، سوری نہیں تم بہت خوش ہو۔ بے وقوفی میری تھی کہ تمہیں یوں کھلی چھٹی دے دی اپنی ذمے داری پر...... کہاں ہے وہ اُلو کا پٹھا۔''

''میں نے کہا ناں...... میں آ رہی ہوں۔'' وہ رونے پر آ گئی۔

مجھے اچانک اپنی زیادتی کا احساس ہوا ''اچھا اچھا۔ رونے کی ضرورت نہیں۔ یہ بتاؤ کہاں ہو؟ کہاں سے پک کروں تمہیں۔''

وہ بولی ''میں گھر کے قریب ہوں۔''

''کیا...... تم گھر جا رہی تھیں، اکیلی......؟'' مجھے پھر طیش آ گیا۔

''نہیں، اکیلی کیسے جا سکتی تھی، ابھی رکشا چھوڑا ہے۔ تم بتاؤ، کہاں آ جاؤں؟'' وہ میرے غصے سے سخت خوف زدہ ہو رہی تھی۔

میں نے وہیں ایک جگہ رک کر انتظار کرنے کے لیے کہا اور فون بند کیا ہی تھا کہ وہ پھر بجنے لگا۔ گاڑی گھما کے میں نے پھر دیکھا تو نمبر اپنے ہی گھر کا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اب میں صحیح جواب دے سکتا ہوں۔

بات کرنے والی چچی تھیں۔ میرے سلام پر انہوں نے کہا ''جیتے رہو، میں نے سوچا پوچھ لوں کہاں ہیں دونوں لیلیٰ مجنوں، دن گزار لیا ساتھ۔ کیا رات بھی گزارو گے۔'' وہ عجیب شیطانی انداز میں ہنسیں۔

ایسی بے ہودہ بات پر مجھے غصہ آنا جائز تھا ''آپ کیسی باتیں کرتی ہیں چچی جان! ہم آ رہے ہیں۔''

''آئے ہائے میں واپس آنے کو کب کہہ رہی ہوں۔ میں کون ہوتی ہوں تمہارے بیچ آ کے رنگ میں بھنگ ڈالنے والی، موج کرو۔''

میں نے فون بند کر دیا۔ چچی کا دماغ واقعی خراب ہو رہا تھا اور اب وقت آ گیا تھا کہ اسے ٹھیک کیا جائے۔ شاک ٹریٹمنٹ اس کا ایک طریقہ تھا۔ یہ شاک انہیں میں ہی پہنچاؤں گا، انشاء اللہ۔ میں نے ادھر ادھر نظریں ڈالتے ہوئے سوچا۔

رابعہ مجھے ایک سائن بورڈ کے ساتھ ہی کھڑی نظر آ گئی۔ میں نے گاڑی روکی ہی تھی کہ وہ دروازہ کھول کے میرے ساتھ آ بیٹھی اور بولی ''چلو۔''

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ سخت بدحواس اور سراسیمہ تھی۔ پہلے میں یہ سمجھا کہ شاید وہ مجھ سے خوف زدہ ہے کہ میں اس پر مزید غصہ اتاروں گا لیکن یہ بات نہیں تھی۔ رابعہ کی صورت پر عجیب سی وحشت تھی اور میری طرف دیکھنے سے کترا رہی تھی۔ وہ سیدھا سامنے دیکھ رہی تھی۔ یوں جیسے خلا میں گھور رہی ہو۔ اس کی آنکھوں سے ایسا لگتا تھا جیسے وہ روتی رہی تھی اور اس وقت بھی آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ نکلنے کے لیے مچل رہے ہیں۔

میں نے نرمی سے کہا ''کزن۔ کیا بات ہے، دیکھو اتنا دکھی اور ناراض ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں اس لیے خفا ہوا تھا کہ...... میں واقعی پریشان تھا۔ تمہارے بغیر میں گھر کیسے جاتا۔ بولا، چلو اب اپنا موڈ ٹھیک کر لو۔ آخر ہم اچھے دوست ہیں ایک دوسرے کے مددگار اور ایک دوسرے کے راز دار ہیں۔''

لیکن میری باتوں کا کچھ اثر نہیں ہوا۔ میں نے کوشش چھوڑ دی۔ مجھے پھر غصہ آنے لگا تھا کہ غلطی اپنی ہے اور نخرے بھی مجھے دکھا رہی ہے بلاوجہ۔ اسی وقت تک گھر بھی آ گیا تھا۔ شامت اعمال کہ دروازے سے اندر قدم رکھتے ہی چچی نے استقبال کیا۔

انہوں نے پوری ہنسی کی نمائش کرتے ہوئے بلائیں لیں ''ارے بھئی، آؤ...... آج تو خوب عیش کی۔ کہاں کہاں گئے، خیر سے بڑے خوش نظر آ رہے ہو دونوں؟'' پھر انہیں اندازہ ہوا کہ اصل صورت حال یہ نہیں ہے۔

رابعہ کا موڈ سخت خراب تھا۔ وہ کسی کی طرف دیکھے بغیر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں بھی اوپر جانے لگا تو چچی نے مجھے روکا ''ارے بیٹا، کیا بات ہے۔ لڑائی ہو گئی ہے آپس میں۔ یہ تو ہوتا ہی ہے پیار میں۔ بھئی اندر جا کے منالو اسے۔''

میں نے پلٹ کے کہا ''یہ آپ اسی سے پوچھیں کہ کیا ہوا ہے۔ نہ میرا جھگڑا ہوا ہے اور نہ مجھے کوئی ضرورت ہے اسے منانے کی۔''

اس وقت تک مجھے بالکل اندازہ نہ تھا کہ حالات کیا رخ اختیار کرنے والے ہیں۔ اپنے کمرے میں پہنچ کے میں نے لباس بدلا ہی تھا کہ اماں نمودار ہوئیں۔ وہ اوپر بہت کم آتی تھیں۔ ان کی صورت دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ وہ ناخوش ہیں۔

میں نے کہا ''اماں!''

انہوں نے خفگی سے کہا ''رابعہ کو اپنے ساتھ کہاں لے گئے تھے...... اور کیوں؟''

میں نے سر کھجا کے کہا ''کیوں کا میں کیا جواب دوں۔ اس کو بازار سے کچھ چیزیں لینی تھیں۔ اپنی کسی سہیلی سے ملنا تھا۔''

''میں پوچھ رہی ہوں کہ تمہارے ساتھ وہ کیوں گئی تھی۔ وہ جاتی رہتی ہے بازار۔ اس کو کسی سے ملنے سے کبھی کسی نے نہیں روکا پھر وہ تمہارے ساتھ کیوں چپک گئی؟ کہاں رہے تم دونوں آج سارا دن؟'' اماں کی خفگی برقرار رہی۔

میں نے انہیں غور سے دیکھا ''اماں، کیا بات ہے؟ آپ مجھ پر شک کر رہی ہیں۔''

''شک میں نہیں کر رہی ہوں، اس کی ماں کر رہی ہے۔''

''چچی کا تو دماغ چل گیا ہے۔'' میں نے برہمی سے کہا۔

''دماغ تمہارا خراب ہے۔ کیا تم جانتے نہیں کہ وہ عورت کیا چاہتی ہے؟ تم اسے موقع فراہم کر رہے ہو الزام تراشی کا۔ وہ رابعہ کو تم پر تھوپ دے گی رفیق۔ وہ ماں بیٹی مل کے سازش کا جال پھیلا رہی ہیں اور تم اس میں گرفتار ہوتے جا رہے ہو۔ جا کے دیکھو نیچے کیا ڈراما ہو رہا ہے۔''

میں چونکا ''کیا ڈراما ہو رہا ہے۔''

''اس کی ماں الٹی سیدھی باتیں کر رہی ہے۔ رابعہ کچھ بولتی نہیں۔ بس روئے جا رہی ہے۔ یہ کیا چکر ہے رفیق!'' اماں ناراض ہی نہیں دکھی بھی تھیں۔

میرا ماتھا ٹھنکا۔ رابعہ کا رونا میرے لیے ناقابلِ فہم تھا۔ اس کی وجہ میرے نزدیک ایک ہی ہو سکتی تھی۔ ان کے درمیان کوئی غلط فہمی ہو گئی تھی پھر فرخ نے اس کے اور میرے اعتماد کو مجروح کیا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اچانک رابعہ کی طویل غیر حاضری اور اس کا دہشت زدہ انداز سب میری سمجھ میں آنے لگے۔ میرے جسم کا سارا خون کھنچ کر میرے چہرے پر آ گیا۔ اگر ایسا ہوا تو فرخ کی خیر نہیں۔

میں نے اماں کے سامنے خود کو بڑی کوشش سے پرسکون کیا ''آپ فکر نہ کریں اماں۔ میں پوچھتا ہوں رابعہ سے۔ ابا کہاں ہیں؟''

''وہ گئے ہیں نماز پڑھنے مسجد۔ انہوں نے سنیں تمہاری چچی کی باتیں تو قیامت آ جائے گی۔ وہ پہلے ہی بھرے بیٹھے ہیں ان کی باتوں سے۔''

میں نے اماں کو تسلی دی اور نیچے گیا۔ چچی مجھے زینے کے پاس ہی مل گئیں۔ وہ شاید اوپر آ کے ہنگامہ کرنا چاہتی تھیں۔ انہوں نے ایک دم چلانا شروع کر دیا ''ارے رفیق! یہ کیا ہو گیا ہے میری رابعہ کو؟ کہاں لے گیا تھا تو اسے؟ مجھ سے تو اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ ہائے ہائے، کیا، کیا ہے تو نے اس معصوم کے ساتھ؟''

میرا دماغ گھوم گیا۔ میں نے پوری آواز سے دہاڑ کے کہا ''بند کرو یہ تماشا! کچھ نہیں ہوا ہے رابعہ کو۔ خبردار جواب فضول بات منہ سے نکالی۔''

چچی کی آواز بند ہو گئی۔ آج سے پہلے میں نے کسی سے بھی اتنی اونچی آواز میں بات نہیں کی تھی۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں ہمیشہ ہنسنے ہنسانے والا نرم خو اور منکسر مزاج انسان کسی آتش فشاں کی طرح ایک دھماکے سے پھٹ بھی سکتا ہوں۔ میری شخصیت کا یہ روپ ان کے لیے ایک الیکٹرک شاک بن گیا تھا مگر چچی نے فوراً خود کو سنبھال لیا ''اے رفیق بیٹا! میں کوئی تم پر الزام تو نہیں لگا رہی ہوں لیکن کچھ تو ہوا ہے جو وہ رو رہی ہے۔ حالت خراب ہے اس کی۔''

میں نے کہا ''میں بات کرتا ہوں اس سے لیکن اندر کوئی نہیں آئے گا۔''

کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے رابعہ کو دیکھا۔ وہ بیڈ پر الٹی لیٹی رو رہی تھی۔ میں نے جذبات سے عاری سپاٹ لہجے میں کہا ''دیکھو۔ تمہاری اس بے وقوفی نے گھر میں بلاوجہ ایک طوفان کھڑا کر دیا ہے۔ تمہاری ماں اس کا بالکل غلط مطلب نکال رہی ہے۔ آخر یہ سب کیا ہے۔ کیا ہوا ہے تمہیں، کس بات کا رونا ہے اگر یہاں بتانا نہیں چاہتیں تو میرے پاس آ جاؤ۔ میرے کمرے میں، تمہاری ماں سے میں کہہ دوں گا کہ وہ کسی سے بات کرنا نہیں چاہتی، سوائے میرے۔''

باہر آ کے میں نے کہا کہ رابعہ کو میں نے منالیا ہے اور اوپر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ کچھ دیر بعد آئی مگر اس وقت تک ہاتھ منہ دھو کے اس نے اپنی ظاہری حالت کو بہتر بنا لیا تھا اور کسی حد تک پرسکون بھی ہو گئی تھی۔ وہ میرے سامنے آ کے کرسی پر بیٹھ گئی۔ تاہم وہ اب بھی مجھ سے نظر نہیں ملا رہی تھی۔

میں نے کہا ''رابعہ، میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔ سچ سچ بتاؤ گی۔''

اس نے اقرار میں سرہلایا۔

''آج سارا دن تم فرخ کے ساتھ تھیں یا فرخ سے مل کے کہیں اور بھی گئی تھیں۔''

وہ قالین کو پیر کے انگوٹھے سے کریدنے لگی ''اور کہاں جاتی؟''

''کیا کرتے رہے تم دونوں سارا دن...... کہاں گئے تھے؟''

وہ کچھ دیر اپنی ہمت مجتمع کرتی رہی ''وہ...... وہ مجھے اپنے گھر لے گیا تھا۔''

میں نے غصے کو قابو میں رکھا ''اور تم چلی گئی تھیں، کیا تمہیں معلوم نہیں تھا کہ اس گھر میں فرخ کے سوا کوئی اور نہیں ہوتا۔ مجھے شروع سے بتاؤ، جب میں تمہیں چھوڑ کر گیا تھا۔ اس کے بعد کیا ہوا۔''

آہستہ آہستہ رک رک کر رابعہ نے سب بتادیا۔ فرخ نے وہی کیا تھا جو ایک ہوشیار ہوس پیشہ مرد ایک بے وقوف جذباتی لڑکی کے ساتھ کرتا ہے۔ انہوں نے پہلے کھانا کھایا پھر گھومنے پھرنے جلو پارک چلے گئے۔ وہاں فرخ زیادہ رومانٹک ہوگیا۔ اس نے رابعہ کو شادی کی پیشکش کی اور اپنی محبت کا ایسا یقین دلایا کہ رابعہ نے ہتھیار ڈال دیے۔ وہ رابعہ کو شادی کے بعد کی زندگی کے خواب دکھاتا رہا۔ پھر اپنے گھر لے گیا۔ رابعہ پورے اعتماد کے ساتھ چلی گئی۔ اپنا گھر دیکھنے...... اور وہاں فرخ نے بڑی آسانی سے اسے اسیر کرلیا۔ اس کی مزاحمت رائگاں گئی۔

اب وہ رو رہی تھی اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں؟ ایسی جذباتی کمزوری کا جتنا نقصان وہ اٹھا سکتی تھی، اٹھا چکی تھی اور اس کی تلافی آنسوؤں سے نہیں ہوسکتی تھی۔ اب یہ ایک سنگین مسئلہ تھا جس کا فوری طور پر کوئی ایسا حل تلاش کرنا ضروری تھا جس سے مستقبل میں ہونے والے زیادہ تباہ کن نقصانات کو روکا جائے۔

صاف نظر آتا تھا کہ رابعہ پر گزرنے والے حادثے کا اثر جتنا خود اس کی زندگی پر پڑے گا، اس سے کہیں زیادہ میرے مستقبل کو متاثر کرے گا۔ اس سے میرے بچنے کی ایک صورت یہ ہوسکتی تھی کہ جس سچ کا اعتراف رابعہ نے میرے سامنے کیا تھا وہی اپنی ماں کو بھی بتادے۔ ایسی صورت میں مجھ پر آنے والے الزام کی مجرمانہ نوعیت ضرور بدل جاتی تھی۔ مجھ پر یہ الزام تو نہ رہتا کہ میں بھیڑیا ہوں لیکن یہ الزام ضرور آتا کہ میں نے رابعہ کو ایک بھیڑیے کے حوالے کیا چنانچہ اس کی ساری ذمے داری مجھ پر عائد کی جاسکتی ہے۔

میں نے ڈاکا تو نہیں ڈالا لیکن ڈاکو کی مدد کی۔ لوٹی ہوئی دولت واپس مل سکتی ہے، لٹ جانے والی عزت کیسے واپس آئے گی؟

چچی کے دل کی مراد تو اس وقت بر آتی جب فرد جرم براہ راست مجھ پر عائد ہوتی۔ ڈاکو میں ثابت ہوتا، ان کی تو عین خواہش یہی تھی کہ کسی طرح ان کی بیٹی کے ساتھ میرا نام آئے۔ آئے تو کسی بر سر الزام ہی آئے۔ انہوں نے بے شرمی کی انتہا کردی تھی۔ خود بیٹی کو پٹی پڑھائی تھی کہ رات کو میرے پاس اکیلے میں جاکے اپنے دام ترغیب میں پھانس لے اگر وہ اس مقصد میں کامیاب رہی تو باقی معاملات وہ خود سنبھال لیں گی۔ ان کی بدقسمتی کہ رابعہ نے ان کے عزائم کا ساتھ نہیں دیا اور سب کچھ مجھے بتادیا۔

ابھی تو وہ دل ہی دل میں بہت خوش ہوں گی کہ ان کی چال کامیاب رہی۔ میں نے موقع پاتے ہی ان کی بیٹی کی عزت لوٹ لی اور پھنس گیا، اس چوہے کی طرح جو چوہے دان میں لگے روٹی کے ٹکڑے کی طرف لپکتا ہے۔ اب وہ قانونی، اخلاقی اور شرعی دعوے سے مطالبہ کریں گی کہ میں رابعہ کو اپناؤں اور اس کے بچے کو جو طے شدہ طور پر رحم مادر میں اپنی زندگی کے سفر کا آغاز کرچکا۔ ان کا قانونی حق انہیں دوں ورنہ قانونی کارروائی اور اس کے نتیجے میں ہونے والے تمام نقصانات برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں۔

اگر الزام کی نوعیت بدل جائے تب بھی میرے جرم کی سنگینی کم نہیں ہوتی۔ میں نے رابعہ کی زندگی برباد کی۔ اب میں اس کی فرخ سے شادی کرادوں اور اس نقصان کی تلافی کے طور پر نصف جائداد رابعہ کے نام کروں۔ چونکہ ان کی ساری خواہشات کا حاصل جائداد تھی جس پر وہ بیٹی کو کسی آبرو باختہ عورت کی طرح میرے پاس بھیجنے کے لیے بھی تیار تھیں اس لیے ہر صورت میں ان کے مطالبے کی تان نصف جائداد پر ہی ٹوٹتی کہ رابعہ کے لیے تو کروڑپتی ہر وقت دست بستہ قطار باندھے کھڑے رہتے تھے۔ اس کی شادی کرنی پڑی، فرخ جیسے نکھٹو اور بدکردار سے، کتنا نقصان ہوا رابعہ کو۔ اس کی تلافی وہی کرے گا جو ذمے دار تھا۔

چنانچہ سچ بولنا بھی اتنا ہی خطرناک تھا جتنا نہ بولنا۔ جتنی دیر رابعہ بولتی رہی، میں جھوٹ اور سچ کے عواقب کو تولتا رہا اور اس دلدل سے نکلنے کی ایسی ترکیب سوچتا رہا جس سے نہ میرے دامن پر کوئی داغ آئے اور نہ رابعہ کسی مشکل میں پڑے۔ رابعہ کے چپ ہوجانے کے بعد بھی میں کچھ دیر کمرے میں ٹہلتا رہا۔ رابعہ پر غصہ ہونے یا اسے مطعون اور

شرمندہ کرنے سے اب کچھ حاصل نہ ہوتا۔ یہ اس کی غلطی تھی یا ایک حادثہ تھا۔ ہر صورت میں وہ ہمدردی اور دست گیری کی مستحق تھی۔

میں نے اس کے پاس رک کے محبت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ پھر پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ میں نے اس کے آنسو پونچھے اور اسے تسلی دی۔

''دیکھو رابعہ! جو ہونا تھا ہوگیا۔ اسے میں تمہاری غلطی بھی نہیں سمجھتا۔ غلطی میری تھی' فرخ سے میں بعد میں نمٹوں گا۔ اس کا جرم ناقابلِ معافی ہے لیکن ابھی خود کو سنبھالو ورنہ تمہارے ساتھ میں بھی بڑی مشکل میں پڑ جاؤں گا۔ تم نے چچی کو تو یہ سب نہیں بتایا تھا ناں......؟''

اس نے آہستہ سے نفی میں سرہلایا۔

میں نے کہا ''یہ بھی جانتی ہو تم...... کہ انہیں شک بھی ہوگیا تو مجرم وہ مجھے بنادیں گی۔ تمہارے رویے نے یہ شک پیدا ضرور کردیا ہے لیکن ابھی تک اس کی تصدیق نہیں ہوئی۔ وہ بہت خطرناک خاتون ہیں اور ان کے عزائم اس سے بھی زیادہ خطرناک ہیں اگر تم نے تصدیق نہ کی تو وہ دیگر ذرائع اختیار کرنے سے چوکنے والی نہیں ہیں۔ میرا مطلب ہے میڈیکل چیک اپ' وہ تمہیں اس کے لیے مجبور کریں گی۔''

رابعہ نے سہمی ہوئی سوالیہ نظر اٹھا کے کہا ''میں...... میں کیا کروں؟''

میں نے کہا ''میری بات دھیان سے سنو۔ اسی میں ہم دونوں کی نجات بھی ہے اور اس خاندان کی بھلائی بھی ہے۔ اس وقت سچ سے بہت خرابی پیدا ہوئی۔ قصوروار تمہیں نہیں مجھے سمجھا جائے گا کہ میں نے تمہیں جانتے بوجھتے فرخ کے پاس چھوڑا۔ وہ میرا دوست تھا' مجھے ضرور معلوم ہوگا کہ وہ کس قماش کا آدمی ہے۔ چچی مجھے کفارہ یا تاوان ادا کرنے پر مجبور کریں گی یعنی وہی آدھی جائداد۔ یہ بات تو تم بھی اچھی طرح سمجھتی ہو۔''

رابعہ نے پھر کہا ''پھر میں کیا کروں۔''

میں نے کہا ''میں بتاتا ہوں' تم کو جھوٹ بولنا پڑے گا۔ تمہیں بھی اور مجھے بھی۔''

''جھوٹ؟''

''ہاں' وہ جو کہتے ہیں کہ راستی فتنہ انگیز سے دروغ مصلحت آمیز برا نہیں ہے۔ اس پر عمل نہ کیا تو یہ جو آج کی چھوٹی خرابی ہے۔ میرا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ خرابی واقعی چھوٹی ہے۔ نہیں' خرابی بہت بڑی ہوئی ہے لیکن ہم آگے کی ہزار گنا بڑی خرابی سے تو بچ سکتے ہیں۔''

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے۔''

''دیکھو' اس وقت تمہاری عقل کام نہیں کررہی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ عقل سے کام لیا ہوتا تم نے تو یہ مصیبت ہی کیوں آتی' خیر...... فکر آگے کی کرنی چاہیے۔ مجھے ایک بات بتاؤ' بالکل ایمانداری سے...... تم کو فرخ اچھا لگتا ہے...... یا تم اس سے محبت کرنے لگی ہو؟''

اس نے نظر جھکا کے کہا ''دونوں باتیں ہیں۔''

''اوکے...... اور فرخ' کیا اسے بھی محبت ہے تم سے...... یا جتنی محبت تھی آج نکل گئی؟''

رابعہ کا چہرہ سرخ پڑ گیا ''ایسی بات نہیں۔''

''یعنی وہ محبت کرتا رہے گا تم سے۔ کیا گارنٹی ہے اس کی؟ صرف اس کی بکواس سن کے یقین کرلیا ہے تم نے...... یا وہ شادی کرنے پر راضی ہے؟ میرا مطلب ہے کیا اس نے فیصلہ کرلیا ہے...... ذرا کھل کے بات کرو کزن! میں تمہارا دوست اور ہمدرد ہوں' تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔''

اس نے سر اٹھایا ''فرخ...... بہت شرمندہ تھا۔ دراصل غلطی میری بھی تھی۔ مجھے اس کے ساتھ نہیں جانا چاہیے تھا یا جب وہ حد سے بڑھا تو میں اسے روک دیتی۔ بعد میں وہ مجھ سے معافی مانگتا رہا۔ اس نے کہا کہ وہ بہت جلد مجھ سے شادی کرلے گا۔ اس نے تمہارا حوالہ دیا۔ کہا کہ میرا تو ان کے سوا دنیا میں کوئی ہے نہیں' وہ بڑے بھائی کی جگہ ہیں۔''

''حرام زادہ! الو کا پٹھا! میرے سامنے آئے تو سہی وہ۔ اس نے دھوکا دیا میرے اعتماد کو اور اب کہتا ہے بڑا بھائی۔ وہ ہے کہاں؟'' میں نے غصے میں کہا ''میں ابھی بات کرتا ہوں اس سے بھی۔''

رابعہ نے نفی میں سرہلایا ''مجھے نہیں معلوم۔ اس نے کہا تھا کہ آپ اس کی مدد کریں۔ اس کی طرف سے بات کریں ورنہ کون سنے گا اس کی' جس کا خاندان ہی نہ ہو۔''

''اب تو اسے کرنی ہوگی شادی ورنہ میں اسے شوٹ کردوں گا۔ یہ محض دھمکی نہیں ہے۔''

''اس نے قرآن ہاتھ میں لے کر قسم کھائی تھی میرے سامنے۔ کہہ دیا تھا کہ میرے گھر والے نہ مانے تو وہ مجھے لے جائے گا۔''

''کہاں؟ کورٹ میں......'' میں نے بگڑ کے کہا ''سور کا بچہ......!''

رابعہ کے لبوں پر پہلی بار خفیف سی مسکراہٹ آئی ''نہیں، وہ ستہ بدھائی کی بات کررہا تھا۔''

''چلو' ایسا ہے تو ٹھیک ہے۔'' میں نے کچھ سکون محسوس

کیا مگر اس میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔ دیر سے نقصان ہوسکتا ہے۔ تم میری بات سمجھ رہی ہوناں کزن! یہ ضروری تو نہیں لیکن کیا پتا...... کچھ ہوجائے۔ خیر اس پر ہم بعد میں بات کرسکتے ہیں اور ہمارے پاس ڈاکٹر شہباز ہے۔ اس کی مدد پر بھروسا کیا جاسکتا ہے۔''

رابعہ کی صورت پھر لال ہوگئی ''ابھی...... میں کیا کہوں۔''

''ہاں...... ابھی تم کہو...... کہ ہم سارا دن گھومے پھرے۔ پہلے گئے چڑیا گھر پھر گئے جلو پارک' سمجھ لو فرخ کی جگہ میں تھا۔ اس کے بعد میں تمہیں لے گیا فلم دکھانے۔ یہ بھی طے کرلیتے ہیں کہ ہم نے کون سی فلم دیکھی۔ فلم دیکھ کر نکلے تو چلے گئے ریسٹورنٹ میں چائے پینے' رائٹ...... جب واپس آرہے تھے تو کسی بات پر ہمارا جھگڑا شروع ہوا۔''

''جھگڑا...... لیکن ایسی کیا بات ہوسکتی ہے؟''

''وہ بھی سوچ لیتے ہیں۔ فرض کرو' فرض کرو...... میں نے سوچتے ہوئے کہا''فرض کرو' میں نے چچی کو کچھ کہا مثلاً لالچی کہا اور تمہارے ابا کو فراڈ قرار دیا۔ تم نے برا مانا اور ان کا دفاع کیا۔ اس پر بات بڑھ گئی۔ تم نے مجھے کمینہ اور خودغرض کہہ دیا۔ اس میں بات اتنی بڑھ گئی کہ تم نے کہا میں تھوکتی ہوں تمہاری دولت پر اور تم پر...... اور تم نے غصے میں سچ مچ تھوک دیا۔ بس اس کے بعد میں نے تمہارے جھانپڑ مار دیا اور...... کیا اتنا کافی نہیں ہے۔''

''یہ تو کافی سے بھی بہت زیادہ ہے۔''

''جس موڈ میں تم میرے ساتھ آئی تھیں' اس کی وجہ ایسی ہونی چاہیے' کوئی بہت بڑی بات نہ ہوتی تو تم اتنا رونا دھونا کیوں کرتیں؟ اور ہاں کو بہت پوچھنے پر تم نے کچھ نہیں بتایا۔ اس کی وجہ بھی یہی تھی۔ تم انہیں کیسے بتا سکتی تھیں کہ میں نے ان کے بارے میں کتنے غلط الفاظ استعمال کیے تھے۔''

رابعہ نے کہا''تم مانو گے کہ تم نے ایسا کہا تھا؟''

''مجبوری تو خیر ہے...... مگر یہ سچ بھی ہے۔ اب تم جھگڑا پھر شروع کرسکتی ہو۔''

وہ دھیرے سے مسکرائی''لیکن...... میں وہ سب نہیں کہہ سکتی۔''

''ہم دونوں نے جو کہا' غصے میں کہا۔ اس کی معافی مانگی جاسکتی ہے' ٹھیک......؟''

آدھے گھنٹے بعد جس عدالت نے یہ مقدمہ سنا اس میں جج میرے اور رابعہ کے والدین تھے اور چیف جسٹس دادی تھیں۔ رابعہ نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ اتنی روانی اور اعتماد کے ساتھ جھوٹ نہیں بول پائے گی۔ اس لیے بھی کہ اس کا حقیقی احساس جرم و گناہ الگ اس کی زبان پکڑے گا۔ چنانچہ یہ ذمے داری میں نے نبھائی۔ میں نے سب بتایا کہ کیا ہوا' کیسے ہوا؟ ہم کہاں گئے؟ کہاں پھرتے رہے' کیا باتیں کرتے رہے۔ چائے کہاں پی' آئس کریم کہاں کھائی' فلم کون سی دیکھی...... اور واپسی میں جھگڑا کیسے شروع ہوا؟

ایک جھوٹی کہانی کو سچ کے روپ میں پیش کرنے کے لیے مجھے بہت محنت اور اداکاری کرنی پڑی لیکن خود کو الزام سے بچانے کے لیے یہ سب ناگزیر تھا۔ رابعہ پہلے تو چپ رہی لیکن پھر اس کی ہمت بڑھی تو اس نے بیچ بیچ میں مجھے ٹوکنا شروع کیا کہ یہ غلط ہے۔ یہ میں نے نہیں کہا تھا۔ تم خود جھوٹے' تم نے ایسے نہیں ایسے کہا تھا۔

نتیجہ یہ کہ عدالت کے روبرو ہم لڑنے لگے اور میں نے کہا کہ ایک جھانپڑ اور دوں گا ابھی تو رابعہ نے بھی چلا کے کہا کہ کسی دھوکے میں مت رہنا۔ میں بھی جوتی کھینچ کے ماروں گی منہ پر۔

ظاہر ہے اس کے بعد بڑے ہم دونوں پر چلانے لگے کہ شرم نہیں آتی ایسی باتیں کرتے ہوئے۔ دادی نے سچ مچ جوتی اٹھا کے میری طرف پھینکی اور پھر رابعہ کو دھکا دیا کہ چل دفع ہوجا یہاں سے۔ انہوں نے اور بہت کچھ کہا جس کا مطلب یہ تھا کہ نئی نسل نے سب کچھ چوپٹ کردیا ہے۔ نہ آپس کا لحاظ ہے نہ بڑوں کا خیال...... زبان خراب' نیت خراب' اخلاق خراب۔

چچی کو خاصی مایوسی ہوئی۔ غالباً اس وجہ سے کہ ان کے اندازے اور اندیشے غلط ثابت ہوگئے لیکن میں نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ بہت بڑی مصیبت ٹل گئی۔ اس اطمینان کے باوجود اس رات میری نیند مجھ سے روٹھی رہی۔ پہلے تو بہت دیر تک میں کروٹیں بدلتا رہا اور ذہن سے پریشان کن خیالات کو جھٹکنے کی کوشش ناکام میں مصروف رہا۔

ایک طرف مجھے فرخ پر غصہ تھا تو دوسری طرف رابعہ کی فکر تھی۔ رہ رہ کے مجھے یہ خیال آتا تھا کہ خدانخواستہ اس حادثے کے نتیجے میں کچھ عرصے بعد معلوم ہو کہ وہ امید سے ہے تو کیا ہوگا؟ یہ سب قسمت کے کھیل ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی ظاہری یا باطنی نقص نہ ہونے کے باوجود مہینوں گزر جاتے ہیں اور کوئی امید بر نہیں آتی والی کیفیت جاری رہتی ہے۔ اس کے برعکس بعض اوقات ایک سانحہ ہی اپنا نقش چھوڑ جاتا ہے۔ چچی بڑی تاڑنے والی نظر رکھتی ہیں۔ وہ فوراً سمجھ جائیں گی کہ ہم دونوں نے بڑی ہوشیاری سے اپنے جرم

پر پردہ ڈال دیا تھا۔ اس وقت کوئی دلیل ہونی کو انہونی نہیں کرسکے گی۔

پھر...... کیا رابعہ کو اپنا چیک اپ کرانا چاہیے؟ اور اگر کوئی خطرہ ہو تو اس سے نجات حاصل کرلینی چاہیے؟ لیکن یہ سوچنے والا میں کون؟ یہ فیصلہ مجھے نہیں کرنا' میں تو رابعہ سے ایسی بات بھی نہیں کرسکتا۔ ہاں' شہباز سے یقیناً مدد لی جاسکتی ہے۔ اس سے پہلے مجھے فرخ کو گردن سے پکڑ کے لانا چاہیے اور اس کی شادی رابعہ سے طے کردینی چاہیے لیکن اس میں بھی میری مرضی کہاں چلے گی۔ کیا چچی میری جگہ اسے آسانی سے قبول کرلیں گی؟ ہرگز نہیں۔ میرے پاس تو کروڑوں ہیں جو چچا اور چچی کو اپنے نظر آتے ہیں۔ وہ فرخ جیسے کنگلے کو بیٹی دیں گے؟ بیٹی تو ان کے لیے خوش بختی کے خزانے کی کنجی ہے۔ میاں بیوی کے راضی ہونے سے بھی فرق نہیں پڑے گا۔ انجام کار وہ بھاگ کے ست بدھائی آجائیں گے اور پھر مجھے ہی قاضی بننا پڑے گا۔ عذاب پھر میرے لیے۔ گناہ پھر میرا...... یا میرے خدا! آخر میں کیا کروں؟

رابعہ کے خیال سے پیچھا چھڑاتا تھا تو اس ڈاکو کی صورت سامنے آجاتی تھی' جس نے کہا تھا کہ اسے ڈاکو بنانے والا میں ہوں۔ براہِ راست نہ سہی شاید بالواسطہ طور پر میں ایسے حالات پیدا کرنے کا ذمے دار تھا جن کی وجہ سے ایک عام نوجوان جو صرف اسٹوڈنٹ لیڈر رہا تھا' ڈاکو بن گیا۔ میں تنظیم میں شامل تھا۔ چیف کا ساتھی سمجھا جاتا تھا۔ ہائی کمان کا حصہ تھا۔ نہ جانے اس دور میں تنظیم نے کس کس کے ساتھ زیادتی کی۔ غلام محمد نے مجھے ایک فائل دکھائی تھی' اس میں بہت سے نام تھے۔ وہ سب آج مجھے تباہ کرسکتے ہیں۔ یہ ماضی کی وہ فصل تھی جسے آج کاٹنے کی سزا میرا مقدر ہورہی تھی۔

مجھے احساس ہونے لگا تھا کہ پاکستان واپس آکے میں نے یہ عذاب خود مول لیا ہے۔ کیا مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہاں میرے لیے وہی دلدل موجود ہے جس سے میں نکل بھاگا تھا۔ ست بدھائی کی جائداد نے مجھے کھینچ لیا تھا۔ نہیں' ابا نے مجھے مجبور کردیا تھا اور اب وہ دلدل پھر مجھے کھینچ رہی ہے' اس سے میں کیسے نکلوں گا؟

شاید عافیت فرار میں ہے۔ مقابلہ میرے بس کی بات نہیں اور کیا ضرورت ہے مجھے اپنے ساتھ دوسروں کو خطرات کی آگ میں جھونکنے کی۔ مجھے بھاگ جانا چاہیے۔ ست بدھائی کی جائداد کو ٹھکانے لگا کے واپس لندن لوٹ جانا چاہیے۔ لندن میں کتنی عافیت تھی۔ کتنا سکون تھا اور زندگی میں کتنا لطف تھا۔

بالآخر مجھے نیند آئی تو میرے لاشعور نے اپنا کھیل شروع کیا۔ پہلے میں نے خواب میں اس بھائی کو دیکھا جو مجھے بھائیوں سے زیادہ عزیز تھا مگر برسوں سے اپنے مدفن میں رزق خاک ہورہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہ ایک جلوس میں نعرے لگاتا آگے آگے جارہا ہے۔ اچانک تین موٹر سائیکل والے نمودار ہوئے اور انہوں نے تین طرف سے قدیر پر گولیاں برسائیں۔ وہ نیچے گرا تو مرچکا تھا مگر اس کا خون سڑک پر بہتا جارہا تھا۔

میں گھبرا کے اٹھا اور پھر بہت دیر جاگتا رہا۔ دوسری بار رات کے آخری پہر میں آنکھ لگی تو لاشعور کے نہاں خانوں سے ایک اور آسیب نکل آیا۔ گزر جانے والے وقت کا ہر لمحہ ایک عکس نما کیمرے کی طرح آنکھیں جو کچھ دیکھتی رہی تھیں' ایک تصویر بنا کے ذہن تک پہنچا رہا تھا اور برسوں بعد بہت سی پرانی یادوں کے نقش مٹ گئے تھے مگر کچھ یادیں نیچے دب گئی تھیں' ان کے اوپر نئے ماہ و سال کے عکس آگئے تھے۔

جب ذہن نے کھنگالا تو وہ تصویر نہ ملی مگر سونے کے بعد لاشعور نے وہ گم شدہ تصویر پیش کردی جس کی مجھے تلاش تھی۔ یہ اسی ڈاکو کی تصویر تھی جس سے صورت آشنائی کا احساس تھا مگر یاد کچھ نہ آتا تھا کہ وہ کون ہے؟ میں خواب سے جاگا تو مجھے سب یاد آگیا۔

آٹھ دس سال پہلے وہ واقعی ایک اسٹوڈنٹ لیڈر تھا۔ ایک آتش بیاں مقرر تھا اور اس کے پاس زبان کے ساتھ قلم کا ہتھیار بھی تھا۔ وہ مقامی اخبار میں بڑے انقلابی اور فکر انگیز کالم لکھتا تھا۔ بدقسمتی سے فکری طور پر وہ ایک ایسی جماعت کا کارکن بن گیا تھا جو نظریاتی طور پر ہماری سخت مخالف تھی۔

تنظیم کے ساتھ اس جماعت کا براہ راست کسی معاملے میں تصادم نہ تھا مگر روز اول سے ہر برسر اقتدار حکومت سے محاذ آرائی اس جماعت کا انداز سیاست رہا تھا۔ وہ عوام میں اتنی مقبول کبھی نہ تھی کہ اکثریت کے ووٹ لیتی مگر کچھ لوگ بہرحال ان کے ہم خیال تھے۔ خبروں میں زندہ رہنے اور سیاسی دکان چلانے کے لیے وہ مخالفت اور ہنگامہ آرائی کے ہر ایشو کو اٹھا لیتے تھے۔

چیف نے ایک روز اس خواہش کا اظہار کیا کہ ذیشان کو تنظیم میں شمولیت کی دعوت دی جائے تو اس سے بہت فائدہ ہوسکتا ہے''ہمیں نشر و اشاعت اور پروپیگنڈے کے لیے اس جیسے لوگوں کی ضرورت ہے۔'' ذیشان اس لڑکے کا نام تھا۔

یہ شعبہ میری کمان میں تھا چنانچہ میں نے اس خیال کی

مخالفت کی "چیف! میرا خیال ہے یہ ناممکن ہوگا۔ وہ اپنی جماعت کے نظریات کا کٹر مقلد ہے۔"

چیف نے کہا "اس کی جماعت کا کوئی نظریہ بھی ہے؟ نظریۂ ضرورت اور نظریۂ مخالفت کے علاوہ۔"

میں نے کہا "وہ کمٹ منٹ والا آدمی ہے۔"

چیف ہنسنے لگا "تم جیسے ذہین آدمی کو ایسی بات نہیں کہنی چاہیے۔ آج کل کون کمٹ منٹ کے چکر میں پڑتا ہے۔ سب سے بڑی کمٹ منٹ ہے ذاتی مفاد۔ نیچے سے اوپر تک۔ دائیں بازو سے بائیں بازو تک۔ ذیشان کی نجی زندگی اس کے نظریات کے بالکل برعکس ہے۔ جیسے ہم سب کی ہے۔"

میں نے کہا "مجھے اس کا علم نہیں۔"

"مگر مجھے ہے۔ نجی محفلوں میں وہ شراب وشباب کا رسیا اور صرف ایک عقیدے کا قائل ہے۔ بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست۔ تم اس سے ملو' اسے اچھی آفر دو۔ پاکستان میں ہر شخص قابلِ خرید وفروخت ہے۔ کم یا زیادہ قیمت پر۔ وہ جو تمہارے ساتھ ایک نئی لڑکی آئی ہے۔ بڑی باادب' باملاحظہ ہوشیار قسم کی۔ سب کو آنکھیں دکھاتی ہے۔ بڑی نشیلی قسم کی اور فیشن ایبل طرح دار قسم کا برقع پہنتی ہے' صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں والا۔"

میں نے کہا "اس کا نام درِشہوار ہے۔"

"جو بھی ہے۔ اسے بھیج دو ذیشان کے پاس۔ وہ فدا ہوجائے گا اگر یہ گوہر نایاب اپنی آب وتاب سے اس پر بجلی گرا سکے۔"

میں نے کہا "سر! وہ ایسی لڑکی نہیں ہے۔ وہ ہماری تنظیم کے لٹریچر سے متاثر ہوکے آئی ہے۔ اچھی فیملی کی اور پڑھی لکھی ہے۔"

"یار مجھے تو لگتا ہے تم زیادہ متاثر ہوگئے ہو اس سے۔ خیر' اس میں کوئی حرج بھی نہیں مگر تمہارے لیے پارٹی کے مفادات زیادہ اہم ہونے چاہئیں۔"

میں نے اندازہ کرلیا کہ چیف کو میری بات بری لگی ہے' میں نے کہا "سر! میرا کوئی انٹرسٹ نہیں اس میں...... لیکن یہ بات میں اس سے کیسے کہوں؟ وہ تو بدک جائے گی' مانے گی نہیں۔"

"میاں افلاطون! ہر کام ایک طریقے سے کیا جاتا ہے' جو سیدھی طرح نہ مانے اسے ٹیڑھے طریقے سے منوایا جاسکتا ہے۔ تم ایک معمولی لڑکی کو لائن پر نہیں لگا سکتے تو اس ریوڑ کو اپنے راستے پر کیسے چلاؤ گے جسے قوم کہا جاتا ہے۔ تم خیر سے خوبرو ہو' جوان ہو اور یہ آرٹ بھی جانتے ہوگے۔ لڑکیاں پٹانے کا' تمہیں کوئی مشکل نہیں ہونی چاہیے۔ وہ تمہارے ساتھ ہی ہوتی ہے دن میں۔ رات کا ساتھ بھی ہوجائے تو سمجھو' جہاں تم کہو گے جائے گی...... اور ہاں' یہ مت سمجھنا کہ اپنی کارکردگی دکھانے کا جو موقع تمہیں دیا جارہا ہے وہ کسی اور کو نہیں دیا جاسکتا۔"

میں اس شخص کی فطرت کو سمجھتا تھا چنانچہ اس کے الفاظ میں پوشیدہ معانی کو بھی سمجھتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ذیشان کو درِشہوار کے ذریعے بلیک میل کیا جائے اگر درِشہوار اس کام پر راضی نہ ہو تو پہلے میں اسے بلیک میل کرنے کے لیے محبت کے جال میں پھانسوں اور پھر اس کام کے لیے مجبور کروں۔ اس نے مجھے واضح الفاظ میں دھمکی بھی دے دی تھی کہ میں نااہل ثابت ہوا تو مجھے فارغ بھی کیا جاسکتا ہے۔ تنظیم میں نااہلی اتنا ہی سنگین جرم سمجھی جاتی تھی جتنی حکم عدولی اور اس کی سزا ہمیشہ عبرت ناک ہوتی تھی۔

تنظیم میں شامل ہونے کے بعد ہی مجھے اندازہ تو ہوگیا تھا کہ ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ۔ دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا۔ تنظیم کے نعرے کتنے پرفریب ہیں اور عزائم کتنے مکروہ مگر اس وقت تک میں دلدل میں اتر چکا تھا اور اس سے نکلنے کی کوشش میں وقت کے ساتھ میں اور دھنستا چلا جارہا تھا۔ اختلافات بڑھتے جارہے تھے مگر مجھ میں اظہار کی ہمت نہ تھی کیونکہ میں آئے دن دوسروں کے انجام سے عبرت پکڑتا رہتا تھا۔ یہ صورتِ حال عام تھی اور ہر سطح پر نفرت کو جنم دے رہی تھی۔

ذیشان کے معاملے میں چیف کے پلان پر عمل کرنا میرے لیے ممکن نہ رہا۔ میں نے سوچا کہ آخر میں کیا کررہا ہوں اور کیوں کررہا ہوں؟ کیا میں بالکل ہی شیطان کا پیروکار بن گیا ہوں۔ ضمیر نام کی کوئی چیز میرے پاس نہیں رہی۔ جس نظرفریب راستے پر چل کے میں تباہی کا شکار ہوا آج اسی راہ پر ایک شریف گھر کی پڑھی لکھی لڑکی کو دھکیل دوں جس کی عقل پر نوعمری اور ناتجربے کاری کے جذبات کا غلبہ ہے اور جو خوش نما نعروں اور پرکشش منشور کے پیچھے چھپی ہوئی مکروہ حقیقت اور شیطانی عزائم کو نہیں دیکھ سکتی۔

میں نے طے کیا کہ میں ایسا نہیں ہونے دوں گا بلکہ پوری کوشش کروں گا کہ درِشہوار کو حقائق سے خبردار کردوں اور سمجھادوں کہ اپنی اور خاندان والوں کی عزت اور سلامتی عزیز ہے تو ابھی وقت ہے۔ وہ واپس جاسکتی ہے۔

چیف نے ایک بات غلط نہیں کہی تھی۔ میرے لیے درِشہوار کا اعتماد حاصل کرنا' چیف کے الفاظ میں اسے پٹانا' مشکل نہیں تھا۔ یہ عمر' حالات اور مواقع کی بات تھی۔ اس کے حسن سے جو پردہ داری کے اہتمام کے باوجود اپنی آب وتاب دکھاتا تھا' کسی بھی نوجوان کا متاثر ہونا فطری بات تھی۔ اسے بھی میری شخصیت میں کشش کے سارے عناصر نظر آئے ہوں گے۔ وجاہت' ذہانت' شرافت اور میری حیثیت۔ جب میں نے کوشش کی تو صرف تین دن میں وہ میرے قریب آگئی۔

لڑکیوں کے معاملے میں میرا ذاتی تجربہ بہت عجیب رہا ہے۔ بعد میں اس کی تصدیق مشاہدے سے بھی ہوتی رہی کہ وہ جتنی ریزرو' لیے دیے اور دور دور رہنے والی نظر آتی ہیں' دل لگی یا دل لگانے کے معاملات میں جتنی کم ہمت' خوف زدہ یا گریزپا نظر آتی ہیں' جب کسی کے التفات کو قبول کرلیتی ہیں تو پھر اس کے بالکل برعکس ثابت ہوتی ہیں۔ ان کی ظاہری شخصیت بالکل مختلف ہوتی ہے۔

ایسا ہی درِشہوار کے معاملے میں ہوا۔ جسے میں اس کی شرافت اور شرم وحیا سمجھتا تھا' وہ محض فریب خیال ونظر تھا۔ میری طرف سے اشارہ ملا تو اس نے مثبت جواب دینے میں کچھ دیر ضرور لگائی' شاید وہ مجھے اور میری نیت کو جانچتی پرکھتی رہی مگر اس کے بعد جب اس نے عشق کا ایکسی لریٹر دبایا تو اس کی تیز رفتاری نے مجھے پریشان کردیا۔

پہلے دن میں نے روایتی انداز اختیار کیا۔ وہ آفس سے جانے کے لیے تیار ہوئی تو میں بھی چند منٹ بعد اٹھ گیا۔ وہ بس اسٹاپ تک بھی نہیں پہنچی تھی کہ میں نے اس کے قریب جاکے اسے لفٹ کی آفر کی۔ جو اس نے تھوڑے سے تامل کے بعد قبول کرلی۔ پہلا مرحلہ میں نے جیت لیا پھر میں نے دوسرے مرحلے کی طرف قدم بڑھائے اور ذرا مختلف انداز میں اس کی تعریف کی۔ میں کہتا کہ تم بے حد حسین ہو تو یہ عامیانہ بات ہوتی۔ میں نے کہا کہ آپ عام لڑکیوں سے بالکل مختلف ہیں۔ آپ کی شخصیت میں بڑا وقار ہے اور شائستگی ہے۔ میں نے اس کے اندازِ گفتگو' اس کی ذہانت اور اس کے رکھ رکھاؤ کی تعریف کی۔

وہ پہلے شرمائی' پھر مسکرائی پھر اس نے چہرے سے نقاب ہٹادیا اور میں نے پہلی بار دیکھا کہ آنکھیں جس چہرے کا حصہ ہیں وہ بھی کم حسین نہیں۔ میں نے جھوٹ بولا کہ میں بھی ادھر ہی ذرا آگے رہتا ہوں اور میرے لیے روز اسے ڈراپ کرنا کوئی پرابلم نہیں ہوگی۔ بسوں میں شریفوں کے ساتھ لوفر بھی ہوتے ہیں۔ انسانوں کو بھیڑ بکری کی طرح ٹھونس دیا جاتا ہے۔ بسوں کی حالت اتنی خراب ہے' وغیرہ وغیرہ۔

اگلے روز اس نے خود ہی کہا "رفیق صاحب! چلیں؟"

میں نے فوراً اٹھ کھڑا ہوا حالانکہ ابھی چھٹی کا وقت نہیں ہوا تھا۔ میں نے کہا "آج میرے پاس بھی کام نہیں ہے' چلیے۔"

پلان کے مطابق میں نے راستے میں کہا "آج کچھ سر میں درد ہے اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو کہیں ایک کپ کافی کا پی لیں......"

اس نے تردد یا تکلف سے زیادہ تشویش کا اظہار کیا "آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا، میرے پاس سر درد کی گولی رہتی ہے کہاں چلیں گے؟ میرا خیال ہے پی سی چلتے ہیں وہ ذرا محفوظ اور پرسکون جگہ ہے۔"

دوسرا مرحلہ بھی میں نے جیت لیا یا اس نے خود ہار دیا کیونکہ وہ مجھے واک اوور دینا چاہتی تھی۔ پی سی کا انتخاب خوب تھا وہاں وہ واقعی محفوظ تھی مگر جب اس نے برقع گاڑی میں چھوڑا تو میں دم بخود رہ گیا۔

"برقع پوش لڑکی کو ایسے دیکھتے ہیں لوگ...... ایسی جگہ پر جیسے کوئی عجوبہ......" اس نے کچھ شرما کے اور مسکرا کے کہا۔

ایک گھنٹے میں وہ بالکل کھل گئی وہ اپنے گھر والوں کی خصوصاً خالہ اور بھائیوں کے رویے کی شکایت کرنے لگی۔ "بڑا سخت مذہبی ماحول ہے ہمارے گھر میں چلو پردے کی تو کوئی بات نہیں لیکن ہر چیز منع ہے ہمارے گھر میں ٹی وی نہیں ہے ابا اسے بھی ام الخبائث کہتے ہیں آج کل کے زمانے میں جب ہر شخص کے بیڈ روم میں اپنا ٹی وی ہوتا ہے۔"

میں نے اس سے ہمدردی کی "یہ تو واقعی زیادتی ہے۔"

"یہی نہیں، کمپیوٹر بھی مخرب اخلاق ہے اب آپ بتائیں کمپیوٹر کے بغیر گزارہ ہے کہیں ہم گانے نہیں سن سکتے۔ ٹیپ ریکارڈر یا ڈیک نہیں ہے ایک ریڈیو ہے تو اس پر ابا کی مرضی سے خبریں سنی جاسکتی ہیں یا پھر مذہبی پروگرام، نعتیں وغیرہ...... حد یہ ہے کہ گھر میں زنانہ رسالے تک نہیں آسکتے اس لیے کہ ان میں بھی عشق محبت کی کہانیاں بھری پڑی ہوتی ہیں اخبار کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ خبریں ریڈیو سنا دیتا ہے اخبار میں تو تصویریں بھی ہوتی ہیں ایکٹریسوں کی اور جنسی وارداتوں کی بڑی تفصیل دی جاتی ہے۔ بڑا بھائی ان کا ہم خیال ہے چھوٹا ایسا نہیں ہے۔ ان کی چلتی نہیں۔"

میں نے محسوس کیا کہ شاید یہ اسی بے جا سختی اور پابندی کا نتیجہ تھا کہ درِشہوار کا ذہن چور دروازے سے نکالنے میں بہت آگے تھا اور اس کا رویہ اپنے ماحول سے کھلی بغاوت کا آئینہ دار تھا وہ رات تک میرے ساتھ بیٹھی رہی اور بولتی رہی۔

میں نے کہا "تمہارے گھر والے پریشان نہیں ہوں گے۔ آج تمہیں دیر ہوگئی ہے۔"

وہ ہنسی۔ "دراصل جمعے کو واپسی پر میں ایک جگہ درس کے لیے جاتی ہوں مگر اب چلیں۔" اس نے کلائی کی گھڑی دیکھ کے کہا "درس نماز مغرب سے پہلے ختم ہوجاتا ہے۔"

اس سے اگلی شام وہ میرے ساتھ ڈنر تک رکی۔ ہم ڈیفنس

کے علاقے میں ایم ایم عالم روڈ کے ایک اطالوی ریسٹورنٹ میں گئے تھے گزشتہ روز کی طرح اس نے برقع گاڑی میں اتارا تو میں اس کی سج دھج دیکھ کے حیران رہ گیا اندر اس کا لباس اور اس کی آرائش کا انداز وہی تھا جو اس ریسٹورنٹ میں بیٹھی ہوئی دوسری لڑکیوں کا۔

میں نے کہا ''تم تو آج قیامت ڈھا رہی ہو۔ ہر نظر گھوم کے تم پر ٹھہر گئی تھی جب تم نے اندر قدم رکھا تھا۔''

وہ خوش ہوئی ''میری بہن کہتی ہے کہ میں رانی مکھرجی جیسی لگتی ہوں کیا یہ سچ ہے؟''

میں نے کہا ''یہ جھوٹ ہے۔''

اس کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ ''کیا وہ زیادہ خوب صورت لگتی ہے تمہیں؟''

''نہیں، رانی مکھرجی تم جیسی لگے تو پھر خوب صورت کہلائے۔''

اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ ''معلوم ہے آج کیا بہانہ کیا میں نے؟ میں نے کہا کہ میری ایک سہیلی کے گھر محفل میلاد ہے۔''

''سہیلی کون ہے، میرا مطلب ہے قابلِ اعتماد ہے۔''

''ہاں، ضرورت پڑتی ہے تو وہ میرا نام استعمال کرتی ہے میں نے تو پہلی بار کیا ہے۔''

مجھے اس کا اعتبار تو نہ تھا مگر میں نے اظہار نہیں کیا ''کتنی دیر چلے گی یہ محفل میلاد۔''

وہ ہنسی...... ''جب تک تم چاہو سہیلی۔''

اس نے مجھے اپنا موبائل فون نمبر دیا ''یہ اپنے موبائل فون میں ڈال لو، مگر دن میں کبھی فون مت کرنا مجھے۔''

میں نے کہا ''دل چاہے تب بھی نہیں۔''

وہ بولی ''دن میں اسے بند رکھتی ہوں، ابا کو تھوڑی ہی معلوم ہے انہیں پتا چل جائے تو جان سے مار ڈالیں مجھے۔''

''اور کسے معلوم ہے؟''

''کسی کو بھی نہیں، رات کو جب سونے کے لیے اپنے بیڈروم میں جاتی ہوں تو یہ تکیے کے نیچے ہوتا ہے ورنہ باتھ روم میں جا کے استعمال کر لیتی ہوں۔''

''کس سے بات کرتی ہو؟''

''اپنی کسی سہیلی سے، اب تم سے کروں گی۔'' وہ بولی۔

اور ایسا ہی ہوا، وہ رات کو فون پر مجھ سے بھی باتیں کرنے لگی اور اس کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کتنی فرسٹریشن کا شکار ہے یہ ضروری تھا کہ اب اس کی فوراً شادی کر دی جائے ورنہ اس کے بہکے ہوئے جذبات اسے تباہی کے راستے پر ہی لے جا سکتے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ رات کو فون پر چیٹنگ کرتی ہوگی۔

رانگ نمبر ملاتی ہوگی۔ چھپ چھپ کے قابلِ اعتراض لٹریچر پڑھتی ہوگی وہ چاہتی تھی کہ میں اس سے فلمی ہیرو والا عشق ایک بچہ کی طرح کروں جیسے آج کل کی فلموں میں ہوتا ہے اسے کسی عدالت میں لے جانا بہت آسان تھا وہ بھاگ کر میرے ساتھ کورٹ میرج تک کر لیتی لیکن یہ سب میری خام خیالی تھی اور ایک ابتدائی اندازہ تھا جو بعد میں بالکل غلط ثابت ہوا۔ وہ جو کچھ کر رہی تھی ایک سوچے سمجھے مقصد کے تحت کر رہی تھی۔

یہ میری زندگی کا وہ دور تھا جب مجھے فرخندہ سے عشق نہیں ہوا تھا بلکہ میں دورِ شباب کے اس ہنگامہ خیز دور سے گزر رہا تھا اب عاشقانہ جذبات کا منہ زور دھارا مجھے تنکے کی طرح ہر سمت میں بہا کے لے جاتا تھا۔ ہر ناز و انداز دکھانے فیشن اور میک اپ کرنے والی لڑکی کوہ قاف کی پری لگتی تھی اور ہر عشق سچا عشق لگتا تھا جب تک کہ نیا عشق نہ ہو جائے۔

اب مجھے درشہوار سے بھی سچ مچ کا عشق ہونے لگا تھا اور میرے جذبات و احساسات اور خیالات پر وہ پوری طرح چھائی ہوئی تھی وہ بلاشبہ اس معاملے میں بہت ہوشیار تھی اور آتشِ شوق کو بھڑکانا جانتی تھی مگر اس آگ میں خود جل کے خاک نہ ہونے کی سمجھ اس سے کہیں زیادہ رکھتی تھی۔ جب میں نے اسے آسان حاصل سمجھ کے اپنے ساتھ اکیلے میں کہیں لے جانے کی کوشش کی تو وہ بڑی خوب صورتی سے ٹال گئی۔

میری طلب اور میری ضد بڑھتی گئی اس نے میری کمزوری کو اپنی شہ زوری بنا لیا اور بلاشبہ مجھے اپنے اشاروں پر نچاتی رہی اس کے حصول کی شرط پوری کرنے کے لیے میں نے جو کچھ کیا اس کی داستان بہت طولانی ہے اور تفصیل لاحاصل۔

انجام یہ ہوا کہ مجھے چیف نے طلب کر لیا اس کی برہمی کا اندازہ اس کی صورت سے کبھی نہیں ہوتا تھا اس نے کہا ''سر، آپ تو اتنے مصروف ہو گئے ہیں کہ ہم جیسے شرفِ ملاقات کا انتظار ہی کرتے رہتے ہیں۔''

میں نے کہا ''ایسی تو کوئی بات نہیں سر۔''

''بہت خوب، یعنی اطلاعات غلط ہیں یا پھر ہم ہی عقل سے پیدل ہیں کہ سنی سنائی کو سچ مان لیتے ہیں۔''

میں نروس ہو گیا ''میں اپنا کام کر رہا ہوں چیف۔''

''دریں چہ شک، آپ اپنا ہی کام کر رہے ہیں، آپ اپنا الو سیدھا کر رہے ہیں اور ہمیں الو بنا رہے ہیں کیونکہ آپ الو کے پٹھے ہیں۔''

اس وقت بولنا لاحاصل تھا اسے میری مصروفیات کی پوری رپورٹ مل چکی تھی جسے میں جھٹلا نہیں سکتا تھا اس نے مجھے ایک ہفتے کی مہلت دی۔ اس کے موڈ اور الفاظ سے میں نے اندازہ کر

لیا تھا کہ میں نے خود کو کیسی مشکل میں ڈال لیا ہے ابھی تک میں نے کچھ بھی نہیں کیا تھا چیف نے بھروسا کرتے ہوئے ایک کام میرے سپرد کیا تھا لیکن میں دوسرے کاموں میں پڑ گیا تھا یہ چیف کے اعتماد کو دھوکا دینے کے مترادف اور ایک سنگین جرم تھا۔

میں پریشان تھا کہ جو کام ایک مہینے میں شروع ہی نہیں ہوا ایک ہفتے میں پورا کیسے ہوگا۔ درشہوار سے میری پریشانی چھپی نہیں رہ سکتی تھی جب اس نے بار بار پوچھا تو میں نے اسے سب سچ بتا دیا۔

وہ کچھ دیر سوچتی رہی ''تو یہ کام لیا تھا تمہیں مجھ سے، یہ تھی عشق کی اصلی حقیقت۔'' اس نے تلخی سے کہا۔

میں نے کہا ''خدا کے لیے غلط مت سمجھو، میں نے تمہیں غلط سمجھا تھا اس وقت تمہارے لیے میرے یہ جذبات ہی نہیں تھے جو آج ہیں۔''

''اب تم نہیں چاہتے کہ میں ذیشان سے ملوں؟''

''میں ایسا سوچ ہی نہیں سکتا۔''

وہ مجھے دیکھتی رہی ''لیکن میں ایسا کرنے کی سوچ رہی ہوں۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب وہی جو تھا اور جو ہے تمہارے لیے میں یہ کام کروں گی۔'' وہ ہنس کے بولی۔

اس وقت ہم ریس کورس گراؤنڈ کے پارک میں بیٹھے ہوئے تھے اور شام ڈھلنے لگی تھی۔ میں نے کہا ''ہرگز نہیں، میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔''

''میرے مجنوں...... کام تو کام ہوتا ہے تمہاری پریشانی کا حل میرے پاس ہے میں یہ کام کر سکتی ہوں تو کیوں نہ کروں؟''

''میں کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا۔''

''خطرہ میں کب مول لیتی ہوں، چلو اب رونی صورت مت بناؤ مگر ایک ہفتے بعد وہ خود تمہارے ساتھ جا کے تنظیم میں شامل ہونے کا اعلان نہ کرے تو کہنا۔''

میں بھونچکا رہ گیا ''تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو؟''

''اس بات کو چھوڑو، یہ میرے پیار کی آزمائش ہے تو یوں ہی سہی۔''

اس کی بات پر میں اتنا جذباتی ہوا کہ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا ''اگر اتنا پیار کرتی ہو مجھ سے تو پھر اتنا تڑپاتی کیوں ہو؟''

اس نے ہاتھ چھڑا لیا ''پاگل مت بنو ہم پارک میں ہیں۔''

''میری بات کا جواب دو، آخر یہ دوری کیوں؟ تم بھاگتی کیوں ہو مجھ سے آج میں تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گا میرے ایک دوست نے انوائٹ کیا ہے شکار پر، تم میرے ساتھ چلو گی۔''

''ضرور چلوں گی مگر شادی کے بعد۔'' وہ ہنس کے بولی۔

''افوہ، شادی بھی ہو جائے گی ہزار بار قسمیں کھا کے تمہیں یقین دلا چکا ہوں ابھی میری تعلیم مکمل نہیں ہوئی میرے ماں باپ کہاں مانیں گے۔''

''دیکھو میں نہیں چاہتی کہ شادی سے پہلے...... ماں بن جاؤں۔''

میں نے کہا ''کیسی باتیں کرتی ہو آج کل اس کا ایک فیصد بھی امکان نہیں رہا ایسے طریقے ہیں...... تم تو جانتی ہو۔''

''میں کچھ نہیں جانتی، اگر کچھ ہو گیا تو کون ذمے دار ہوگا۔''

''ظاہر ہے میں۔''

وہ سوچ میں پڑ گئی ''اچھا، میں گھر جا کے کوئی بہانہ کر دوں۔''

یہ اس سے میری آخری ملاقات تھی میں فرطِ اشتیاق اور وفورِ جذبات سے تڑپتا پھڑکتا اور سلگتا رات تک اس جگہ انتظار کرتا رہا جہاں اس کو آنا تھا مگر وہ نہیں آئی ایسا دو بار پہلے بھی ہو چکا تھا۔ یہ اس کا خاص انداز تھا کہ میری آہ و زاری سے پگھل کر مان جاتی تھی اور جب میرے جذبات کا آتش فشاں جاگ اٹھتا تھا تو وہ وعدہ شکنی کی برف ڈال کر اسے سرد کر دیتی تھی۔ ایک مرتبہ میں نے اس کی آس پر ہوٹل میں کمرا بک کرایا اور وہاں ساری رات اکیلا پڑا کروٹیں بدلتا رہا، اس نے اماں کی طبیعت کی خرابی کا بہانہ کر دیا پھر کچھ عرصہ اس نے یہ کہتے گزار دیا کہ ابھی موقع نہیں...... دوسرا موقع آیا تو میں ایک دوست کے خالی گھر میں رات بھر جاگ کر اسے گالیاں دیتا رہا، دوست کے گھر والے کسی شادی میں گئے ہوئے تھے اگلے روز وہ لوٹ آئے۔ درشہوار نے اس بار اپنی طبیعت کی خرابی بتا دی۔ ظاہر ہے میں اسے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

تیسری بار وہ مایوس ہونے کے بعد میں نے غصے میں سوچ لیا تھا کہ اب اس کے جھوٹے وعدوں پر اعتبار نہیں کروں گا۔ اگلی مرتبہ خواہ اسے زبردستی لے جاؤں یا دھوکے سے بے ہوش کر کے مگر اسے چھوڑوں گا نہیں۔ وہ میرے ساتھ بلی چوہے کا کھیل رہی ہے یہ میری شرافت ہے کمزوری نہیں۔

لیکن وہ پھر ملی ہی نہیں۔ اچانک مجھ پر ایک خوفناک انکشاف یہ ہوا کہ اس نے تنظیم سے بھی کنارہ کشی اختیار کر لی اور اب وہ ذیشان کے ساتھ ہے پہلے یہ بات میری سمجھ میں بھی نہیں آئی تھی میں نے یہی سمجھا کہ شاید وہ مجھے خوش کرنے کے لیے اپنے پلان پر عمل کر رہی ہے لیکن جب میں نے اس سے بات کرنے کی کوشش کی تو مجھے ناکامی ہوئی۔

چند دن بعد ذیشان نے ہمارے خلاف ایک بیان میں کچھ

ایسی باتیں کہیں جو تنظیم کی بدنامی کا باعث ہوسکتی تھیں۔ یہ اندر کی باتیں تھیں جن کو صرف اندر کے لوگ جانتے تھے۔ تنظیم میں اس سے تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ ابھی ان معاملات کی تردید شائع ہوئی تھی کہ کچھ زیادہ سنگین معاملات اٹھائے گئے۔ ذیشان نے تنظیم کے ظاہر و باطن میں فرق کا راز فاش کرنے کے لیے کچھ ثبوت پیش کردیے۔ اس سے بڑی کھلبلی مچی اور سب کو لینے کے دینے پڑ گئے۔

تنظیم نے جوابی کارروائی کی مگر اخبارات میں بڑی لے دے شروع ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی ذیشان کے حملوں میں تندی آگئی۔ بڑی دوڑ بھاگ اور تحقیق و تفتیش کے نتیجے میں یہ خوفناک حقیقت سامنے آئی کہ درشہوار تو درحقیقت ذیشان کی ایجنٹ تھی جسے بطور خاص مجھے پھانسنے کے لیے بھیجا گیا تھا یعنی جو کام تنظیم اس سے لینا چاہتی تھی۔ وہ اسی مقصد کے تحت تنظیم میں شامل ہوئی تھی اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہی تھی۔

یہ انکشاف ایٹم بم کے دھماکے سے کم نہ تھا لیکن جنگ میں پہل ہی فتح دلاتی ہے۔ جو ہم نے بعد میں سوچا وہ ہمارے حریف پہلے طے کرچکے تھے۔ یہ دشمن کو بے وقوف اور کمزور سمجھنے کا شاخسانہ تھا درشہوار نے مجھے پوری طرح استعمال کیا تھا میری جذباتی کمزوری کے ہر لمحے کا پورا فائدہ اٹھایا تھا۔ مجھ سے وہ باتیں معلوم کرلی تھیں جو عام نہ تھیں۔ کچھ اعتماد تھا کچھ عشق کا نشہ۔ کچھ جذبات کی وارفتگی ...... وہ مجبوری یا کمزوری جس سے ہر خوب صورت عورت ہمیشہ فائدہ اٹھاتی رہی ہے اگر وہ ذہین بھی ہو اس کی رسائی تمام حوالوں تک تھی تمام دستاویزات تک رہی اور ہر راز اس کے لیے راز نہ رہا۔

ذمے دار صرف مجھے سمجھا گیا حالانکہ میں درشہوار کو تنظیم کے سیکریٹریٹ میں نہیں لایا تھا۔ قصور وار وہ تھے جنہوں نے اس کے بارے میں مکمل کوائف جمع کیے پھر اسے میرے ساتھ نتھی کردیا۔ شعبہ نشر و اشاعت سب سے حساس اور خطرناک اس لیے سمجھا جاتا تھا کہ وہاں سب کا کچا چٹھا محفوظ تھا اپنوں کا بھی اور پرائے کا بھی۔ وہ سب کچھ لے گئی۔

جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ اس کا نام درشہوار تھا اور نہ اس کا تعلق کسی مذہبی گھرانے سے تھا۔ وہ ذیشان کا خفیہ ہتھیار تھی جسے اس نے بڑی مہارت سے استعمال کیا اس نے یہ ہتھیار ہمارے ہاتھ میں دے دیا مگر ہم نے اسے چلانا چاہا تو اس نے بیک فائر کردیا۔

تنظیم کا سارا عتاب مجھ پر نازل ہوا۔ چیف نے اپنی غلطی تسلیم نہیں کی کہ درشہوار کے حسن و ذہانت کی دودھاری تلوار اسی نے میرے ہاتھ میں دی تھی اور یہ کہا تھا کہ اسے کس کے خلاف استعمال کرنا ہے۔ مجھے معزول کردیا گیا۔

کچھ عرصہ بعد سیاسی صورت حال میں بھی تبدیلی آئی جس سے میرے خلاف تادیبی کارروائی میں خلل پڑا لیکن چیف نے ذیشان کے ہاتھوں زک اٹھانے کو ذاتی انا کا مسئلہ بنالیا۔ ذیشان نے کچھ عرصے بعد وہ جماعت بھی چھوڑ دی اور ایک عوامی پارٹی کے دور اقتدار میں شریک ہوگیا۔

مجھے اس کی تفصیل معلوم نہیں تھی کہ ذیشان کے ساتھ کیا ظلم ہوا تھا جب ایک پارٹی کسی فرد کے خلاف ہوجائے تو مقابلہ برابر کا نہیں سمجھا جاسکتا اور جب پارٹی برسراقتدار ہو تو کسی فرد کو کیا کسی جماعت یا ادارے کو بھی ختم کرسکتی ہے۔ ذیشان نے بعد میں درشہوار سے شادی کرلی تھی اس کا علم مجھے ہوگیا تھا لیکن بعد کے حالات سے میں بے خبر رہا۔

میں اندازہ کرسکتا تھا کہ بعد میں ذیشان کے ساتھ ریاستی دہشت گردی کیسے کی گئی ہوگی اس کے خلاف مقدمات بنے ہوں گے۔ اسے جیل میں ڈالا گیا ہوگا۔ اس پر تشدد کیا گیا ہوگا۔ اس کا گھر بار اور کاروبار سب تباہ کردیا گیا ہوگا۔ آج وہ ایک ڈاکو تھا ایک سیاسی لیڈر بننے کی آرزو رکھنے والا اسٹوڈنٹ لیڈر لاقانونیت کے راستے پر چل نکلا تھا یا چلنے پر مجبور کردیا گیا تھا۔

افسوسناک بات یہ تھی کہ اس کا ذمے دار وہ مجھے سمجھ رہا تھا کیونکہ درشہوار نے جواب اس کی بیوی تھی میرے کندھے پر رکھ کر بندوق چلائی تھی۔ چنانچہ بندوق سے جوابی فائر کرنے والا میرے سوا کون ہوگا جیسے مجھے اس کے بارے میں کوئی خبر نہ تھی۔ ایسے ہی وہ اس بات سے بے خبر ہوگا کہ میں پاکستان میں تھا ہی نہیں اور اس کی وجہ یہ تھی کہ میں تنظیم کے عتاب اور عذاب سے بچنے کے لیے ملک سے فرار نہ ہوتا تو آج زندہ نظر نہ آتا۔

اس کے اور میرے درمیان درشہوار کا رشتہ تھا۔ ذیشان میرے لیے صرف ایک نام تھا۔ اسے میں نے دیکھا بھی تھا لیکن صرف دو چار مرتبہ دور سے۔ درشہوار جس کا اصل نام ثریا فاطمہ تھا میرے لیے ایک یاد کی کسک تھی، ایک نوک خار تھی جو ٹوٹ کے دل ہی میں رہ گئی تھی۔ وہ ایک ایسی شکست کی ندامت تھی جسے میں فتح کا غرور سمجھتا تھا۔ وہ زہر ہلاہل تھی جسے میں زیست کا سامان سمجھ کے خوش تھا۔ اس کے چلے جانے کے بعد بھی مجھے یقین نہ آتا تھا کہ اس کی محبت ایک دام فریب تھی اگر اس کا پیار ایک سراب نہ ہوتا تو شاید میں ہمیشہ کے لیے اپنی وفا اس کے نام کردیتا پھر وہ سب نام کہاں ہوتے جو میری زندگی میں شامل ہوئے۔ فرخندہ، فریال، عائشہ میں یقیناً اسے اپنا لیتا اور اس کا ہو جاتا میں آج بھی ایسا سوچتا ہوں جو یوں ہوتا تو کیا ہوتا نہ ہوتا یوں تو کیا ہوتا۔ ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا......!

خواب میں ذیشان کو دیکھتے ہی یادوں کا وہ سلسلہ پھر درشہوار سے جا ملا اور اس پہلی شکست کی تذلیل کے خیال نے میرے حلق میں پھر کڑواہٹ بھر دی۔ رات ابھی باقی تھی مگر میری نیند اڑ گئی تھی۔ اندھیرے میں اپنے بستر پر لیٹ کر میں نے درشہوار کے بارے میں سوچا اب وہ کہاں ہوگی، کیسی ہوگی، اس کے بھی سارے خواب خاک میں مل گئے تھے۔ آج وہ ایک ڈاکو کی بیوی تھی ایسا تو اس نے نہ سوچا ہوگا نہ چاہا ہوگا۔ وہ بھی یہی سمجھتی ہوگی کہ اس کے مستقبل کی تباہی کا ذمے دار میں ہوں لیکن وہ خود کو بھی اپنی تباہی کا اتنا ہی ذمے دار سمجھتی ہوگی۔ محبت کے نام پر یہ کھیل اس نے شروع کیا تھا مگر اس کا یہ انجام ہوگا یہ اس کے خیال میں بھی نہ تھا۔

میں پھر اٹھا تو صبح ہونے والی تھی۔ نئی اور روشن صبح جس کا چمکیلا اجالا ہر سو پھیلا ہوا تھا .... گزشتہ رات میں نے سوچا تھا کہ مجھے بھاگ جانا چاہیے۔ ست بدھائی کی جائداد بیچ کے اور سب کو اپنے ساتھ لے کر لندن میں سیٹل ہو جانا چاہیے یہ میرے لیے بہت آسان تھا۔

اب اچانک مجھے اپنی بزدلی پر ندامت ہوئی۔ میں نے خود کو دلیل دی کہ مسائل اور مشکلات کے بغیر زندگی کیا ہے؟ صحرا کا سفر ..... خطرات اور چیلنج نہ ہوں تو جدوجہد بے معنی ..... بقول شاعر نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا ..... جب میں نے نیچے کچن میں جا کے اپنے لیے کافی بنائی تو میرے خیالات یکسر بدل گئے تھے۔ میری ذہنی شکست خوردگی اور مایوسی کے جذبات کی جگہ یقین اور عزم نو نے لے لی تھی۔

میں نے اماں کے کمرے میں جھانکا تو وہ مصلے پر قرآن سامنے رکھے تلاوت میں مصروف تھیں۔ ابا ابھی مسجد سے نہیں لوٹے تھے میں دادی کے کمرے میں گیا تو وہ بھی نماز سے فراغت کے بعد تسبیح پر زیرلب کچھ پڑھ رہی تھیں۔ انہوں نے مجھے اشارے سے بیٹھنے کے لیے کہا میں ان کے بیڈ پر سٹ کر بیٹھ گیا اور کافی پیتے ہوئے انہیں غور سے دیکھتا رہا۔ اسی برس سے زیادہ عمر کی دادی کے چہرے پر بڑا سکون اور ٹھہراؤ تھا بزرگانہ شفقت کا پیکر تھیں ان کا وجود اس گھر پر کسی سائبان کی طرح تھا جو نظر نہیں آتا تھا مگر محسوس کیا جا سکتا تھا۔

کچھ دیر بعد انہوں نے تسبیح رکھ دی اور عینک لگا کے میری طرف دیکھا ''کیا بات ہے رفیق ..... تو کچھ کہنا چاہتا ہے کوئی پریشانی ہے؟''

میں نے کہا ''نہیں دادی ..... وہ تو بس .....''

''دیکھ جھوٹ بولنا نہیں آتا تجھے اوروں کے سامنے بولتا ہوگا تو چل جاتا ہوگا مگر مجھے جانتا ہے نا تیرے باپ کو بھی میں نے ہی پیدا کیا تھا نمونے .....''

میں نے نفس کر ان کے کندھے پر سر رکھ دیا ''آپ کو کیا پتا دادی میں کتنے جھوٹ بولتا ہوں اور آپ کو خاک پتا نہیں چلتا۔''

''چل ہٹ، پتا مجھے سب چل جاتا ہے مگر میں بولتی نہیں۔ میری نظر خراب ہوئی ہے۔ دماغ خراب نہیں ہوا ہے۔ جو کچھ ہو رہا ہے اس گھر میں، سب سمجھ رہی ہوں۔ تو بتا کن چکروں میں ہے۔''

میں نے کہا ''دادی! کوئی ایک چکر ہو تو بتاؤں۔ یہاں تو چکر در چکر ہیں۔ ایک سے نکلتا ہوں تو دوسرا پھر تیسرا۔ میں تو چکرا گیا ہوں، ان چکروں میں۔ آپ نے سنی تھیں جو باتیں کل رات ہوئیں۔''

''ہاں، سب سنی تھیں، جھوٹ تم دونوں کی شکل پر لکھا ہوا نظر آ رہا تھا مگر میں اسے سچ نہ کہتی تو مصیبت میں نہ پڑ جاتا تو۔''

''بالکل ٹھیک کہا آپ نے دادی۔ سچ ہے ہم سب پر بڑی تباہی آتی۔ چچی نے تو کسر کوئی نہیں چھوڑی تھی مجھے مجرم بنانے میں۔''

دادی نے مجھے غور سے دیکھا ''مجرم تو نہیں تھا؟''

''نہیں دادی، مجرم میں نہیں تھا، میں ہر قسم کھا سکتا ہوں مگر اس سے کچھ نہیں ہوگا۔''

دادی نے سر ہلایا ''پھر جھوٹ کیوں بولا تو نے؟''

''سچ میں کیسے بولتا۔ رابعہ کی زندگی کا سوال تھا۔ اسے ساتھ لے کر جانے والا تو میں ہی تھا۔''

''آخر کہاں لے گیا تھا تو اسے، کون ہے وہ؟''

میں نے کہا ''بس غلطی ہو گئی تھی مجھ سے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔''

وہ کچھ دیر بعد بولیں ''کون ہے وہ؟''

میں نے کہا ''اب میں آپ کو کیا بتاؤں، ہے کوئی ..... رابعہ سے شادی کرنا بھی چاہتا ہے۔''

''چل رہنے دے نمونے۔ اسے کیا پڑی ہے شادی کرنے کی اب .....؟'' دادی نے برہمی سے کہا۔

میں نے کہا ''نہیں دادی! وہ انکار نہیں کر سکتا۔''

''ارے انکار کے بچے! کب ہوگی یہ شادی؟ جب بچہ خود اپنے باپ کی برات میں شامل ہونے کے قابل ہوگا؟ ہم سب کے منہ پر کالک ملنے کے بعد .....؟''

''آپ خفا نہ ہوں دادی۔ میں سب سنبھال لوں گا۔ بھروسا رکھیں مجھ پر ..... لیکن مجھے آپ کی مدد چاہیے۔ چچی نہیں مانیں گی اس شادی پر۔ نہ چچا مانیں گے، وہ تو رابعہ کو میرے سر منڈھنا چاہتے ہیں۔''

''جب اس میں کوئی زبردستی نہیں ہو سکتی کیونکہ تیرے ماں باپ بھی راضی نہیں ..... تو رابعہ کے ساتھ زبردستی کیسے ہو سکتی ہے۔ اس کے ماں باپ میری کب مانیں گے۔''

''یہ بات میں ان سے نہیں کہہ سکتا۔ آپ سمجھا سکتی ہیں نہیں کہ انکار سے کچھ نہیں ہوگا۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ بیٹی کو جس ایرے غیرے کے ساتھ چاہا رخصت کر دیا۔ اب لڑکیوں کی مرضی دیکھنی پڑتی ہے۔ نہ دیکھو تو وہ خود گھر سے نکل جاتی ہیں اور کورٹ جا کے شادی کر لیتی ہیں۔''

دادی نے ایک ہاتھ سینے پر رکھ لیا ''ہائے ہائے۔ تو کیا رابعہ بھی ایسا ہی کرے گی؟''

''دادی، کر سکتی ہے اگر اس کی نہ مانی گئی ..... لیکن ابھی آپ اس بات کو جانے دیں۔''

''ارے یہ تو کیا کہہ رہا ہے نمونے! کیسے جانے دوں، رابعہ سوچ رہی ہے کسی کے ساتھ بھاگ کر شادی رچانے کی۔''

میں نے کہا ''ابھی ایسا کچھ نہیں ہو رہا ہے دادی! اور نہ ہوگا اگر بندوبست پہلے سے کر لیا جائے، چچی کی نظر ہے مجھ پر۔''

دادی نے ایک آہ بھری ''خوش بختی کے ساتھ بدبختی یوں آتی ہے۔ تجھ میں کوئی گن نہ ہوتے تو چھوٹی دلہن ایسا سوچتی؟ یا تو لوٹ کے ہی نہ آتا تو کیا اس کی شادی افضل سے نہ کرتی؟ وہ تو اس کاٹھ کے الو کو گھر داماد بنانا چاہتی تھی۔ ساری عمر کا غلام۔''

میں نے کہا ''اب تو ان کی نظر مجھ پر نہیں، اس دولت پر ہے جو ان کے خیال میں چالاکی سے ہتھیا لی ہے میں نے۔''

''ہاں رفیق! وہ آدھا مانگتی ہے۔ نذیر کو بھی یہی روگ لگ گیا ہے۔ اللہ تجھے ہر بلا سے بچائے۔ ماں باپ کو تیری خوشیاں دیکھنی نصیب کرے، وہ تیری دشمن ہو رہی ہے۔''

میں نے کہا ''دادی! مجھے احساس ہے کہ ان کے ساتھ زیادتی ہوئی لیکن زیادتی میں نے نہیں کی تھی۔ اب نہ ان کا کوئی قانونی حق بنتا ہے اور نہ شرعی مگر میں انہیں دے دوں گا۔ جتنا وہ چاہتے ہیں۔''

دادی نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا ''یہ تو میں نے بھی کہا تھا ان سے کہ میرا رفیق کسی کے ساتھ زیادتی کرنے والا نہیں ہے۔ اس کا دل بہت بڑا ہے کیونکہ آخر وہ میرا پوتا ہے۔ وہ تمہیں بہت دے دے گا مگر اسے تو حق اور ناحق نے پاگل کر دیا ہے۔ وہ سمجھتی ہے رابعہ سے تیری شادی ہو جائے گی تو اسے اپنا حق مل جائے گا۔''

میں نے کہا ''رابعہ سے میری شادی تو ناممکن ہے۔ ایسا نہ میں چاہتا ہوں، نہ رابعہ نہ کوئی اور۔ چچی کے پاگل پن کا تو بس ایک ہی علاج ہے۔''

''وہ کیا؟''

میں نے کہا ''آپ میری شادی کرا دیں۔''

''اے تیرے منہ میں گھی شکر۔ اللہ میاں کیسا اچھا دن ہے۔ کہ اس نمونے کے منہ سے ایسی مبارک بات سنی میں نے۔'' وہ آسمان کی طرف دونوں ہاتھ اٹھا کے بولیں ''میرے تو کلیجے میں ٹھنڈک پڑ گئی۔ تیرے اماں ابا سنیں گے تو نہال ہو جائیں گے۔''

''ڈیئر گرینڈ ما! کاش یہ سب اتنا آسان ہوتا۔'' میں نے ایک بہت لمبی ٹھنڈی سانس لی ''اس مشکل کو خدا کے بعد کوئی آسان کر سکتا ہے تو وہ ہے آپ کی ذات بابرکات۔ ہم سب ایک سونامی کی زد میں ہیں جسے آپ ایسے روک سکتی ہیں جیسے ٹارزن ایک ہاتھ سے توپ کے گولے کو روک سکتا ہے۔''

''اب میں ماروں گی تجھے نمونے۔ پتا نہیں کیا بولتا جا رہا ہے۔ کیا مشکل ہے تیری شادی میں؟''

میں نے ان کا ہاتھ تھام لیا ''بتا دوں؟ آپ اپنے مظلوم اور مجبور اور معصوم اور مجہول اکلوتے پوتے کی مدد کریں گی، وعدہ کریں۔''

انہوں نے میرے ایک دو ہتڑ رسید کیے ''ارے، کچھ منہ سے پھوٹ۔''

میں نے چند سیکنڈ کے توقف کے بعد کہا ''دادی۔ میں فریال سے شادی کروں گا۔''

ایک لمحے کے لیے دادی کا چہرہ بجھ گیا۔ کچھ دیر خاموش رہی۔ میں دادی کو دیکھتا رہا، دادی خلا میں دیکھتی رہیں۔

''کیوں دادی! اچھی نہیں لگی میری بات؟'' میں نے کہا۔

انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی ''تو جانتا ہے یہ کتنا مشکل ہوگا؟''

''مشکل نہ ہوتی تو آپ کو مشکل کشا کیوں بناتا دادی! فریال اتنی بری لڑکی تو نہیں ہے۔''

''وہ خود تو بہت اچھی ہے مگر تو جانتا ہے برائی کہاں ہے؟ کیوں اپنی اور ہم سب کو آزمائش میں ڈالتا ہے نمونے!''

میں نے کہا ''دیکھو دادی! یہ میری زندگی کا سوال ہے۔ تم کو اور اماں ابا کو اس کے سوا کچھ نہیں سوچنا چاہیے۔ آپ انہیں صاف بتا دیں، میں فریال کے سوا کسی سے شادی نہیں کروں گا۔ اس کے علاوہ .....''

''رک کیوں گیا، کہہ دے باقی بات بھی؟'' وہ تلخی سے بولیں۔

''اگر کوئی نہیں مانے گا تو میں خود اس سے شادی کر لوں گا۔'' میں نے دل کڑا کر کے کہہ دیا اور اٹھ کھڑا ہوا ''دوسری بات یہ کہ ..... میں انتظار نہیں کر سکتا۔ سب کے ارمان اپنی جگہ، ابھی

دھوم دھام کا موقع نہیں۔ شادی ایک ہفتے میں ہوگی، آپ سب کو سمجھا دیں۔ میں چاہتا ہوں یہ کام سب کی مرضی سے ہو، سب کی دعائیں میرے ساتھ ہوں۔"

"ارے کہاں جا رہا ہے شوشہ چھوڑ کے نمونے! بیٹھ ذرا، مجھے بتا شادی کے بعد کیا ہوگا؟"

"شادی کے بعد کیا ہوتا ہے دادی۔ یہ میں بتاؤں...... مجھے تو شرم آتی ہے۔" میں نے اپنا منہ چھپالیا۔

دادی نے میرے ایک اور دھمو کا رسید کیا "حرامی نہ ہو تو۔ مجھے یہ بتا اس کا کیا ہوگا، وہ جو اس کا منگیتر ہے۔ کیا نام ہے اس کا......؟"

"سلطان۔" میں نے کہا "اس کی ایسی تیسی۔"

"تیرے کہنے سے ہو جائے گا سب۔ وہ بڑا خطرناک آدمی ہے۔"

"خاک خطرناک ہے دادی! وہ تو اب پاکستان لوٹ کے بھی نہیں آسکتا۔ بیوی کو قتل کر کے بھاگا ہے۔ آیا تو پھانسی چڑھے گا۔ اس کی کوئی فکر نہیں۔"

"پھر یہ جلدی کیوں؟"

"جلدی ہے چچی کی وجہ سے۔ بہت سی وجوہات ہیں دادی۔ اسی لیے میں نے آپ کو بتایا ہے۔ آپ کو تو اعتراض نہیں ہے ناں......؟"

"اگر تو خوش ہے تو میں خوش ہوں نمونے۔ تو نے مجھے بتا دیا ہے۔ اب مجھ پر چھوڑ دے۔ میں منالوں گی سب کو۔ اللہ کا بڑا احسان ہے، میری بات کوئی ٹال نہیں سکتا۔" دادی نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا "تو فکر نہ کر۔"

میں نے کہا "یو آر گریٹ دادی! آج میں گھر سے بھاگ جاؤں گا۔"

"کیا؟" دادی نے چلا کے کہا "ارے میں کہہ رہی ہوں کہ تو جیسا چاہتا ہے ویسا ہی ہوگا پھر بھاگنے کی بات کیوں کرتا ہے؟"

میں ہنس پڑا "دادی! جب آپ بات کریں گی تو گھر میں ایک طوفان کھڑا ہوگا۔ میں دو دن بعد واپس آؤں گا۔ اس وقت تک معاملہ ٹھنڈا ہو جائے گا لیکن میرا فیصلہ اٹل ہے۔ واپس آکے میں کسی جھگڑے میں نہیں پڑوں گا۔"

میں نے ایک بہت بڑا مرحلہ سر کرلیا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ اب گھر میں ہنگامہ ہوا تو وہ رابعہ کے ماں باپ کی طرف سے ہوگا۔ میرے ماں باپ نہ میرے فیصلے پر کسی شدید ردِعمل کا اظہار کریں گے اور نہ دادی سے اختلاف کریں گے۔ انہیں اگر دکھ ہوگا تو ایسے ہی خاموشی سے شادی کرنے کا۔ ان کی خواہش تو یہی تھی کہ میری شادی جب بھی ہو دھوم دھام سے ہو۔ ایسے کہ سارا زمانہ دیکھے۔

اب سورج نکل آیا تھا اور گھر میں ناشتے کے لیے تیاری ہو رہی تھی۔ میں نے رابعہ کو دیکھا، وہ کچن میں اماں کے ساتھ ان کا ہاتھ بٹا رہی تھی اور ان دونوں کے درمیان نہ جانے کس موضوع پر باتوں کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ رابعہ اپنے والدین سے مختلف تھی، خصوصاً ماں کی فطرت اور عادات میں وہ برعکس تھی۔ ماں ابتدا سے خود غرض اور سازشی ذہن کی مالک تھی اور اس کے ساتھ ہی بدلحاظ بھی چنانچہ بلائے بے درماں کی طرح سب اس سے پناہ مانگتے تھے۔ رابعہ ذہین اور معاملہ فہم ہونے کے ساتھ ہنس کھ، فراخ دل اور سب کے کام آنے والی تھی چنانچہ اماں بھی اسے پسند کرتی تھیں۔ یہ صرف اس کی ماں کا خوف تھا کہ انہوں نے یا ابا نے رابعہ کو بہو بنانے کا خطرہ مول نہیں لیا۔

چچا اور چچی اوپر کے حصے میں مقیم تھے۔ اوپر کی منزل کا صرف ایک کمرا میری تحویل میں تھا۔ رابعہ کو نیچے کا کمرا دیا گیا تھا۔ یہ ایک انتظامی قسم کی ضرورت تھی۔ وہ رات کو دادی کا خیال رکھتی تھی اور دن میں اماں کی مدد کرتی تھی ورنہ ٹی وی دیکھتی رہتی تھی جو اوپر نہیں تھا۔ نیچے ٹی وی ڈرائنگ روم میں رکھ دیا گیا تھا کیونکہ اماں کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور ابا کے لیے بیڈروم میں چھوٹا ٹی وی تھا جس پر وہ بیڈ پر نیم دراز اپنی پسند کے پروگرام دیکھتے تھے۔ رابعہ کو اسٹار پلس کے ڈرامے، انڈین فلمیں اور میوزک وڈیو دیکھنے کی پوری آزادی حاصل رہتی تھی جو اس کے والد کے نزدیک سخت ترین غیر شرعی اور انتہائی مخرب اخلاق پروگرام تھے۔

ابھی اوپر کے حصے میں مکمل خاموشی تھی۔ چچی بھی صبح کی نماز کے وقت ہی اٹھتی تھیں مگر اس کے بعد وہ گھنٹوں درود وظائف میں نہ جانے کیا کچھ پڑھتی رہتی تھیں۔ صوفی چچا کا معمول الٹا تھا، وہ رات کو عملیات کا سلسلہ جاری رکھتے تھے جو کبھی آدھی رات تک اور کبھی صبح تک طول پکڑ لیتا تھا۔ اس کے باوجود وہ دیر تک نہیں سوتے تھے۔ چچی نے تو مشہور کر رکھا تھا کہ وہ کئی سال سے ایک پل کے لیے نہیں سوئے۔ یہ ایک کراماتی شہرت تھی جو ان کے جاہل اور کمزور عقل و ایمان والے مریدوں کو متاثر کرتی تھی۔

مجھے اندازہ تھا کہ یہ خاموشی ایک طوفان کا پیش خیمہ ہے جو میرے جانے کے بعد آئے گا۔ اماں ایک بار دادی کو چائے دینے آئی تھیں تو سمجھ گئی تھیں کہ میرے اور دادی کے درمیان خفیہ نوعیت کے مذاکرات ہو رہے ہیں۔ غالباً ابا نے بھی اسی لیے دخل اندازی سے گریز کیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ میرا اور دادی کا گٹھ جوڑ ہے اور میں ہر پوتے کی طرح دادی کا بھرپور جذباتی استحصال کرتا

ہوں۔ کوئی بھی بات منوانے کے لیے۔

ناشتے کی میز پر میں نے سرسری انداز میں اعلان کیا "میرا خیال ہے کہ ایک چکر ست بدھائی کا لگالوں۔"

ابا نے کہا "چکر کیا، بس اب ایک ساتھ ہی چلیں گے۔"

میں نے کہا "یہاں کا مسئلہ تو میں نے حل کر دیا ہے۔ آپ کو اب کوئی پریشان نہیں کرے گا۔ ان لوگوں کا بندوبست کر دیا ہے میں نے۔"

ابا بولے "چلو اچھا کیا لیکن ہمیں اکیلے نہیں رہنا یہاں۔"

میں نے کہا "بالکل...... آپ رہیں اپنی آبائی جاگیر پر۔ خاندانی محل میں لیکن پہلے میں کچھ انتظامات کرلوں۔ میں آجاؤں گا دو چار دن میں پھر سب کو لے جاؤں گا۔"

ابا خاموش ہو گئے "ٹھیک ہے، ہم تیاری کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "یہ تو طے ہو گیا ہے کہ آپ مکان چچا کو دیں گے۔"

اماں نے کہا "یہ اچھا فیصلہ ہے مگر اس کے علاوہ بھی ان کے لیے کچھ کرو بیٹا!"

"آپ بتائیں اور کیا کروں؟"

"چھوٹی بھابی کو سخت رنج ہے۔ وہ سمجھتی ہے، اس کے ساتھ تم نے زیادتی کی اور اسے جائداد سے محروم کر دیا۔"

"آپ جانتی ہیں میں نے کچھ نہیں کیا۔"

"مگر اس کے دماغ میں تو یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ آدھی جائداد اس کی تھی جو تم نے ہتھیالی۔ مجھے ڈر ہے اس پاگل پن میں وہ کچھ کر نہ بیٹھے۔"

میں نے ہنس کے کہا "اماں، وہ کچھ نہیں کریں گی۔"

"نہیں رفیق بیٹا! وہ تمہیں بھی نقصان پہنچا سکتی ہے۔ اس کے نام کچھ کر دو۔ جس سے اس کی تسلی ہو جائے۔ مکان کافی نہیں ہے۔"

"اگر میں حویلی ان کے نام کر دوں تب بھی ان کی تسلی نہیں ہوگی۔"

ابا نے کہا "حویلی کو رہنے دو۔ انہیں زمین دے دو۔"

"زمین ان کے کسی کام کی نہیں۔ جب تک کہ اس سے فائدہ نہ اٹھایا جائے۔" میں نے کہا۔

"پھر وہ جو چاہیں کریں، بیچنا چاہیں تو بیچ دیں۔"

میں نے کہا "وہ بیچنے سے انہیں کیا ملے گا، نہ وہ شہری زمین ہے اور نہ زرعی۔ وہاں تو کوئی ترقیاتی اسکیم ہی نہیں۔"

"یہ سب سوچنا تمہارا کام نہیں۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے، میں ایک چوتھائی زمین ان کو دے دوں گا۔"

ابا نے نفی میں سر ہلایا "ان کی تسلی تو ایک تہائی سے بھی نہیں ہوگی۔"

میں نے کہا "چلیے، میں آدھی ان کے نام کر دیتا ہوں۔ ان کو برابر کا شریک کرلیتا ہوں مگر یہ حق انہیں حاصل نہیں ہوگا کہ اپنا حصہ کسی اور کو بیچ دیں۔ اس طرح تو میرے سارے پلان ادھورے رہ جائیں گے۔ قیمت وہ مجھ سے لے سکتی ہیں لیکن ابھی فوراً نہیں۔ میں انہیں بیس سال میں پوری ادائیگی کر دوں گا۔"

"شاید یہ شرط انہیں منظور نہ ہو۔"

میں نے کہا "ابا، انگریزی محاورہ کیا ہے۔ مانگنے والوں کو پسند ناپسند کا اختیار نہیں ملتا۔ صرف اس شرط پر وہ حصے دار بن سکتے ہیں۔ اس میں غیر قانونی یا غیر اخلاقی بات کوئی نہیں۔"

دادی نے گویا فیصلہ صادر کیا "یہ اپنی مرضی سے دے رہا ہے۔ وہ نہیں لیتا اس کی مرضی۔"

میں نے کہا "ایسی صورت میں یہ مکان بھی اپنے پاس رکھیں۔"

اماں نے فوراً میری تائید کی "ہاں اور کیا...... اس پر کیا حق ہے ان کا۔ یہ تمہاری کمائی سے بنا ہے۔ ساری عمر نوکری کی تھی تب جا کے ریٹائر ہونے پر یہ رقم ملی تھی۔ انہوں نے تو زندگی میں کبھی کوئی کام نہیں کیا۔ الٹے سیدھے دھندوں میں پڑے رہے۔"

میں نے کہا "وہ تو بس ایک صورت تھی ان کی تسلی کی اگر وہ اس سے مطمئن نہیں ہوتے اور نصف جائداد پر پہلے دعوے کو نہیں چھوڑتے تو پھر رہنے دیں۔"

اماں نے چمک کے کہا "ویسے بھی کسی کا کیا حق ہے اس پر۔ مکان تو ہے میرے نام۔"

ابا نے آہستہ سے کہا "بھئی، ان کے رہنے کا آسرا ہو جاتا۔"

"اور ہم کہاں رہیں گے اگر کبھی واپس آنا پڑا۔ ویسے بھی ہمیشہ کے لیے تو شہر چھوڑ کے جنگل میں کون آباد ہوتا ہے، آنا جانا رہے گا۔"

دادی نے پھر فیصلہ سنایا "دلہن ٹھیک کہتی ہے۔ گھر میں رہنا ہے رہو، یہاں رہو یا وہاں رہو۔ زمین پر ساتھ مل کے کام کرو تو ٹھیک ہے ورنہ گھر بیٹھو اور کرو یہی کام جن بھوت بھگانے کے...... اور منافع لیتے رہو۔ ہاتھ پیر ہلائے بغیر۔"

دادی بہت جلد ہر بات کی تہ تک پہنچ جاتی تھیں۔ بالکل غیر جذباتی انداز میں منطقی فیصلہ کرتی تھیں لیکن میرے معاملے میں جانب دار ہو کے ڈنڈی مار جاتی تھیں۔ اس وقت بھی یہی ہوا۔ انہوں نے چیف جسٹس کی طرح میرے حق میں فیصلہ صادر کر دیا۔

میں نے کہا" یہ بالکل ٹھیک ہے۔ صوفی چچا بہادر ہیں۔ اپنے گھر میں انہوں نے جو پیری مریدی کا دھندا چلا رکھا ہے، چلاتے رہیں۔ ست بدھائی میں یہ چکر نہ چلائیں۔ رہنے کے لیے یہ گھر ہے۔ میں ان کا حصہ ہر سال دیتا رہوں گا۔ وہ چاہیں تو سہ ماہی بنیاد پر لے سکتے ہیں یا ماہانہ لیکن وہ ادائیگی دو سال بعد شروع ہوگی۔ جب آمدنی شروع ہوگی۔"

"ارے یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے نمونے! آمدنی نہیں ہوگی تو کیا اپنی جیب سے دے گا تو۔ زمین بیچنے کا کوئی سوال نہیں۔ ایسا سوچنا بھی مت۔" دادی نے کہا۔

ابا نے ناراضی کا اظہار نہیں کیا۔ شاید انہیں کچھ مایوسی ہوئی ہو کیونکہ وہ بھائی کی محبت میں اس کے لیے کچھ کرنا چاہتے تھے۔ تاکہ اس کی شکایت دور ہو جائے۔ اماں سوفی صد اپنی ساس کے فیصلے سے متفق اور خوش تھیں۔ میں نے تیاری کے بہانے اجازت لی اور اپنے کمرے میں آ گیا۔

رابعہ اس تمام گفتگو میں قطعی غیر جانبداری اور لاتعلقی کے ساتھ خاموش بیٹھی رہی تھی۔ اب دادی نے کہا "لڑکی! یہ تیرے ماں باپ آج ابھی تک عرش سے فرش پر نہیں اترے۔ کیا کر رہے ہیں اوپر...... جا دیکھ۔"

میرے پیچھے پیچھے رابعہ بھی آ گئی مگر ماں باپ کی طرف جانے سے پہلے وہ میرے پاس رک گئی۔ اس کی صورت سے صاف لگتا تھا کہ وہ رات کو ٹھیک سے سو نہیں پائی ہے اور شاید روتی بھی رہی ہے۔ ایسا ہونا بالکل فطری تھا۔ اب بھی اس کے چہرے پر پریشانی کے تاریک سائے تھے۔

میں نے مسکرا کے کہا "کزن! بس اب فکر چھوڑ دو۔ میں سب ٹھیک کروں گا۔ تم جیسا چاہو گی، ویسا ہی ہوگا۔ ناؤ بی اے گڈ گرل۔ اسمائل!"

اس نے دیوار سے ٹیک لگا کے کہا "میں یہاں نہیں رہوں گی۔"

"رائٹ، تم اپنے گھر میں رہو گی۔ شادی کے بعد سب رہتی ہیں۔"

"میں ست بدھائی چلوں گی۔"

"سوری، میں تمہیں اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

"کون مانگ رہا ہے تم سے اجازت۔ میں بتا رہی ہوں تمہیں۔ مجھے راستہ معلوم ہے۔" وہ جھلا کے بولی۔

"آل رائٹ۔ آل رائٹ۔ اس کی بھی کوئی صورت نکالوں گا میں مگر پہلے مجھے اس الو کے پٹھے سے بات تو کرنے دو۔"

"رات اس کا فون آیا تھا۔"

میں چونکا "اچھا...... کیا فرمایا پھر انہوں نے؟"

"وہ ابھی آ رہا ہے...... یہاں۔" رابعہ نے مجھے مطلع کیا۔

"ابھی آ رہا ہے یہاں...... مجھ سے جوتے کھانے؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"وہ چاہتا ہے...... آج نکاح پڑھوا دیا جائے۔"

میں دم بخود رہ گیا "رابعہ! اس کا دماغ خراب ہے اور تمہارا بھی...... سوچو ذرا، یہ کام ایسے ہو سکتا ہے...... تمہارے ماں باپ مانیں گے؟"

"نہ مانیں پھر ہم خود کر لیں گے...... جو کرنا ہے۔"

میں نے کہا "رابعہ! چلی جاؤ یہاں سے ورنہ میں چھانپڑ مار دوں گا۔ یہی کرنا ہے تو میرے جانے کے بعد کرنا۔ خود بھگتنا۔ میں اس لغوے میں بالکل نہیں پڑوں گا۔ تم جیسے چاہو نمٹ لینا۔"

ابھی میری بات پوری بھی نہیں ہوئی تھی کہ نیچے سے ابا نے آواز لگائی "رفیق! تمہارا دوست فرخ آیا ہے۔"

میں بیٹھ گیا "غصے کا اب کوئی فائدہ نہیں تھا۔ رابعہ دیوار سے ٹیک لگائے بت بنی کھڑی تھی۔ میں نے ایک گہری سانس لی "کزن! تم مجھے پہلے نہیں بتا سکتی تھیں؟"

اس کے ہونٹوں پر ڈری ڈری شرمیلی سی مسکراہٹ آئی "وہ تمہارے آسرے پر آیا ہے، اس کی مدد کرو گے ناں......؟"

میں نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا۔ رابعہ نے آگے جھک کر میرے سر کو چوما "تھینک یو کزن!" اور باہر نکل گئی۔ ظاہر اس کی جذباتی حرکت نے مجھے بالکل ہی موم کر دیا۔ میں نیچے گیا تو فرخ ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔

مجھے دیکھتے ہی وہ کھڑا ہو گیا اور کھڑا رہا۔ اس کی نظریں بھی میرے چہرے پر میرے جذبات کا ردِعمل دیکھنے میں مصروف رہیں۔ اس کا چہرہ ایک مجرم کا چہرہ تھا جو خود کو قانون کے حوالے کرنے آیا ہو۔ وہ خوف زدہ تھا۔ نادم تھا، بیک وقت پُرامید اور مایوس تھا۔

میں نے طنزیہ تلخ لہجے میں کہا "تشریف رکھیے۔"

وہ بیٹھ گیا "رفیق بھائی! آئی ایم سوری!"

"رئیلی! بڑی مہربانی ہے آپ کی۔ آپ سوری بھی نہ کہتے تو کیا بگاڑ لیتا میں تمہارا۔ انگریزی نے مسئلے کو کتنا آسان بنا دیا ہے۔ جو چاہو کرو اور پھر ایک لفظ بول دو۔ تم بہت چالاک ہو فرخ! بے غیرت بن کے یہاں آ گئے کہ یہاں کوئی کیا کہے گا۔ تماشا بنے گا تو ہماری عزت کا۔"

اس نے بڑی مشکل سے کہا "میں ایک درخواست لے کر آیا تھا۔"

میں نے کہا "شٹ اپ، تم کو جو کہنا ہے بعد میں کہنا۔ ابھی

تو تم میرے ساتھ ست بدھائی چل رہے ہو۔"

"آپ...... میری بات تو سن لیں۔"

میں نے کہا "مجھے معلوم ہے تم کیا کہنا چاہتے ہو لیکن وہ اتنا آسان نہیں ہے جتنا تم نے سمجھ لیا ہے۔ تم ایک بات اچھی طرح سمجھ لو تو اچھا ہے، میری بہن تو کوئی نہیں ہے اگر ہے تو رابعہ..."

"لیکن میری ایک بہن تھی......" اس نے سر اٹھا کے کہا۔

مجھے یوں لگا جیسے اس نے میرے منہ پر تھپڑ مار دیا ہے۔ میرا سارا جوش سمندر کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ یکلخت اس نے میری حیثیت مدعی کے بجائے ملزم جیسی کر دی۔ مجھے یہ احساس دلا دیا کہ جس کے دامن پر کسی کے لہو کے داغ ہوں اسے دوسرے کے دامن پر کیچڑ کے داغ کی طرف انگلی اٹھانے کا کیا اختیار؟ لیکن یہ صرف ایک لمحے کی بات تھی۔ دوسرے لمحے میرے اندر جیسے آگ بھڑک اٹھی۔

میں نے آگے بڑھ کر اسے مارنے کی خواہش پر بڑی مشکل سے قابو پایا "بکواس کرتے ہو میرے سامنے۔ تمہاری بہن کے ساتھ میں نے وہ ذلالت نہیں کی تھی جو تم نے میری بہن کے ساتھ کی۔"

وہ آہستہ سے بولا "میں بھی محبت کرتا ہوں رابعہ سے۔"

"دھوکا دیتے ہو تم اپنے آپ کو۔ انسان جس سے محبت کرتا ہے، اسے بے آبرو نہیں کرتا۔ اس کی عزت کی حفاظت کرتا ہے۔" میں نے دانت پیس کے کہا "تم نے محبت کی ایک جانور کی طرح۔"

وہ ایک دم اٹھا اور اس نے میرے پاؤں پکڑ لیے "میں آپ کا مجرم ہوں۔"

میں بڑی مشکل میں پڑ گیا۔ اس وقت اندر سے کوئی آ جاتا تو اس صورتِ حال کی وضاحت ایک طوفان کو جنم دیتی جس سے بچ کے میں فرار ہو رہا تھا۔ میں نے اپنے پیر چھڑا کے اسے دھکیلا "ابھی کسی کو کچھ معلوم نہیں میرے سوا...... اور میں نہیں چاہتا کہ کسی کو کچھ پتا چلے۔ سیدھی طرح بیٹھو۔ ہم راستے میں بات کریں گے، میں آتا ہوں تیار ہو کے۔"

رابعہ نے مجھے ڈرائنگ روم سے آتے دیکھا اور شاید میرا غصے سے لال چہرہ بھی دیکھا۔ اس کی نظروں میں جو سوال تھا وہ بہت واضح تھا مگر میں منہ پھیر کے نکل گیا۔ وہ سخت مضطرب تھی۔ سامان اٹھا کے میں نکلنے ہی والا تھا کہ وہ پھر آ گئی۔ میں نے اس کی صورت دیکھی تو مجھے اس پر ترس آ گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بڑی مشکل سے رکے ہوئے تھے۔

میں نے اسے گلے لگا کے کہا "کزن! ٹیک اٹ ایزی ناؤ۔"

وہ رو پڑی "میں کیا کروں کزن؟"

"تم کچھ مت کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ مجھ پر بھروسا رکھو۔ میں ہوں ناں...... معاملات کو سنبھالنے کے لیے۔ چلو یہ رونا دھونا بند کرو اور بالکل ویسے ہی رہو، جیسے رہتی ہو۔ مسکراؤ...... شاباش۔"

"تم کب آؤ گے پھر......" اس نے خود کو سنبھال لیا۔

میں نے کہا "یہی دو چار دن میں مگر جانے سے پہلے مجھے مسکرا کے دکھاؤ۔"

ست بدھائی کے راستے میں فرخ سے میری جو بات ہوئی اس کے نتیجے میں غبار چھٹ گیا۔ جو مجھے کہنا تھا، میں نے کہا۔ فرخ کی وضاحت کافی تو نہیں سمجھی جا سکتی تھی لیکن اس سے مجھ پر یہ واضح ہوا کہ بے قصور رابعہ بھی نہیں۔ فرخ نے اسے مجبور نہیں کیا تھا اگر وہ اس کے ساتھ گھر جانے سے انکار کر دیتی یا اس کے عزائم واضح ہوتے ہی اسے سختی سے روک دیتی تو کچھ نہ ہوتا۔ فرخ کے منہ پر ایک تھپڑ پڑتا تو وہ ہوش میں آ جاتا لیکن وہ خود اپنی کمزوری کا شکار ہوئی اور مجرم فرخ بنا۔ تالی بہرحال ایک ہاتھ سے نہیں بجتی پھر کسی ایک ہاتھ کو الزام کیسے دیا جا سکتا ہے؟

پرابلم ہمارے معاشرتی رویے کی ہے جس میں لڑکا شادی تک ہمیشہ مستند کنوارا رہتا ہے خواہ ان لڑکیوں کا شمار نہ ہو جن سے اس نے تعلق استوار کیا۔ لڑکی صرف ایک مجبوری کا شکار ہو کے بھی کنواری نہیں رہتی اور خود اپنی نظر سے گر جاتی ہے۔ عفت و عصمت کے سارے تصورات ہی یک طرفہ ہیں اور اس کی سزا بھی صرف عورت کے لیے ہے۔ یہی بن بیاہی ماں کہلاتی ہے، بن بیاہا باپ کوئی نہیں بنتا۔

ست بدھائی پہنچنے سے پہلے میں نے فرخ کو بتا دیا کہ اس شادی کی راہ میں کیا رکاوٹیں ہیں۔ انہیں کیسے دور کیا جا سکتا ہے اور اس کے لیے مجھے کتنا وقت درکار ہوگا۔ تاہم شادی اب ضروری ہے اور اسے غیر معینہ مدت کے لیے ٹالا بھی نہیں جا سکتا ورنہ اس کے رسواکن عواقب مزید مسائل پیدا کریں گے۔

اس نے صرف ایک درخواست کی۔ میں اس بارے میں کسی کو بھی کچھ نہ بتاؤں ورنہ اس کے لیے سب کا سامنا کرنا مشکل ہو جائے گا۔ خود میں نے یہی بہتر سمجھا کہ اب اس کی عزتِ نفس پر حرف نہ آنے دوں۔ وہ بہرحال رابعہ کا ہونے والا شوہر تھا۔

دوپہر کے بعد میری گاڑی حویلی کے صدر دروازے پر پہنچی تو مجھے وہاں ایک گارڈ نظر آیا جو گن لیے کھڑا تھا۔ اس نے بلیک یونیفارم پہن رکھی تھی۔ اس پر کسی سکیورٹی کمپنی کا نام یا مونوگرام

نہیں تھا۔ راستہ روکنے کے لیے ایک عارضی بیریر بھی لگا دیا گیا تھا۔ یہ کوئی پرانا کھمبا تھا جس کے ایک سرے پر پتھر باندھ دیا گیا تھا۔

گارڈ نے مجھے پہچان لیا۔ وہ یقیناً اسی علاقے کا کوئی نوجوان تھا۔ اس نے مجھے سلیوٹ کیا اور بیریر اٹھا دیا۔ یہ انتظام مجھے پسند آیا۔ میری عدم موجودگی میں راجا بے کار نہیں بیٹھا تھا۔ میں گاڑی سے اترا تو مجھے ڈاکٹر شہناز نظر آئی۔ وہ اپنا میڈیکل بیگ اٹھائے سرونٹ کوارٹرز کی طرف سے آ رہی تھی اور کچھ تھکی ہوئی لگتی تھی۔

میں نے کہا "ہیلو ڈاکٹر! ویلکم ٹو ست بدھائی، کیسی لگی تمہیں ہماری ریاست؟"

وہ مسکرائی "بے حد افسانوی اور اتنی ہی چیلنج دینے والی۔"

"پھر کیا سوچا ہے تم نے؟ اس کے افسانوی ماحول کی خوبصورتی سے لطف اندوز ہو کے لوٹ جاؤ گی یا اس کے چیلنج کو قبول کرو گی؟"

وہ بال سمیٹ کے بولی "میں سب کے ساتھ ہوں۔ آخر تم نے بھی تو یہ چیلنج قبول کیا ہے ورنہ سب کچھ بیچ کے مال سمیٹتے اور لوٹ جاتے لندن!"

"میں تمہاری قربانی کی بڑی قدر کرتا ہوں۔ تم ایک ڈاکٹر ہو۔ راجا ایک کامیاب جرنلسٹ ہے۔ تم اپنے پیشے میں کامیاب تھے۔ تم دونوں میرا ساتھ دے رہے ہو۔ ایک نئی دنیا بنانے کے خواب میں شریک ہو۔ اللہ نے چاہا تو ہم ست بدھائی کو ترقی دے کر ایک ماڈل کمیونٹی بنا دیں گے۔ جدید اور ترقی یافتہ۔ ان سے ملی ہو تم، یہ فرخ ہے۔"

شہناز نے اس سے ہاتھ ملایا "اتنا سن چکی ہوں ان کے بارے میں کہ بس دیکھنا ہی باقی تھا۔"

فرخ نے کہا "غائبانہ طور پر میں آپ سے بہت متاثر تھا۔ آپ سے بڑی انسپائریشن ملی ہے مجھے۔ میں واقعی ایسا محسوس کرتا ہوں جیسے اب میرا ایک گھر ہے اور یہ میری فیملی ہے۔"

"آف کورس۔ ہم ایک فیملی ہیں۔" شہناز اس کی تعریف سے خوش ہوئی۔

میں نے کہا "وہ کہاں ہے، ست بدھائی کا مہاراجا!"

"سب اندر ہیں۔ کسی نہ کسی کام میں مصروف ہیں۔ میں صبح سے ان لوگوں کا چیک اپ کر رہی تھی۔" اس نے سرونٹ کوارٹرز کی طرف اشارہ کیا "بری حالت ہے سب کی۔ سب کی صحت خراب ہے۔ زیادہ وجہ ہے ماحول اور ان کی عادات ...... لیکن ٹھیک ہو جائے گا سب۔ وقت لگے گا۔ ابھی آس پاس کا علاقہ نہیں دیکھا۔ مگر یہی صورت حال ہو گی ہر جگہ۔" وہ اندر جاتے ہوئے مجھ سے باتیں کرتی رہی۔

حویلی کی مختلف حصوں سے سنائی دینے والی آوازوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ اندر باہر بہت سے لوگ کام کر رہے ہیں۔ کم سے کم چار جگہ راج مستری اور مزدور چھت اور دیواروں کے خراب ہو جانے والے رنگ اور پلاسٹر کو کھرچ کے صاف کرنے میں مصروف تھے۔ وہ ایک کمرے میں کام کر رہے تھے اور راجا بھی وہیں موجود تھا۔

"آ گیا تو مصیبت کے مارے دکھیارے نواب!" وہ بولا۔

"آنا پڑا یار! وہ جو محاورہ ہے ناں ...... گیدڑ کی شامت آتی ہے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے۔ وہ مجھ پر صادق آتا ہے۔ میں وہاں سے بھاگ کے آیا ہوں اور اب میرے باپ کی بھی توبہ جو لوٹ کے جاؤں۔ فریال کہاں ہے؟"

"تو ملا نہیں اس سے؟ اندر ہی تھی۔ فرنیچر، پردے اور قالین اس کا شعبہ ہیں۔ میں مرمت اور رنگ روغن کرا رہا ہوں۔ کام کو ہم نے پورے گھر میں نہیں پھیلایا۔ ایک وقت میں ایک کمرا خالی ہو گا۔ جب وہاں کام ختم ہو گا تو پھر دوسرا کمرا خالی کریں گے۔ اس میں وقت ضرور زیادہ لگے گا مگر ایک تو ہمارے معمولات ڈسٹرب نہیں ہوں گے۔ دوسرے نگرانی آسان ہو گی۔"

"جیسے آپ کی مرضی سر!"

"دوسرا کام میں ادھر شروع کراؤں گا۔ سرونٹ کوارٹرز کی طرف۔ شہناز اور فریال نے رپورٹ دی ہے کہ ادھر دس سرونٹ کوارٹرز ہیں۔ ان میں سے صرف چار آباد ہیں۔ باقی رہائش کے قابل نہیں رہے۔ اندر کچھ فرش ٹوٹا پڑا ہے۔ دیواروں کا پلستر ہے اور چھت کی مرمت کا تھوڑا سا کام ہے پھر رنگ ہو جائے تو وہ سب آباد ہو سکتے ہیں۔"

"یہ تو اچھی بات ہے۔ ہمیں اپنے اسٹاف کے لیے ضرورت پڑے گی۔"

راجا نے کہا "اس وقت ادھر دو ہی باتھ روم ہیں۔ شہناز کا کہنا ہے کہ درمیان کے ایک کمرے کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا جائے تو باتھ روم بنائے جا سکتے ہیں۔ یہ لوگ روایتی طور پر باتھ روم کو الگ رکھتے ہیں۔ صفائی کا انتظام بہت خراب ہے۔"

میں نے کہا "میں فریال سے مل کے آتا ہوں۔"

"ابے میں نے کیا تجھے روک رکھا ہے؟" راجا بولا۔

میں نے نچلی منزل کے سارے کمروں میں جھانکا۔ آبادکاری پروگرام کے تحت اب زنانہ اور مردانہ رہائشی حصے الگ ہو گئے تھے۔ ہال جیسے ایک بیڈ روم میں حضرات یعنی میں، فرخ اور راجا کی رہائش کا بندوبست تھا۔ دوسرے میں شہناز اور فریال نے ڈیرا ڈال لیا تھا۔ نیچے ایسے چھ کمرے تھے۔ ان میں سے

ایک ہی میں مرمت کا کام جاری تھا۔ باقی دو ابھی بند پڑے تھے۔ ڈرائنگ روم ان سے تین گنا بڑا ہال تھا اور اس سے ملحق کھانے کا کمرا بھی استعمال ہو رہا تھا۔ یہ عارضی انتظام ہماری ضرورت کے لیے مناسب اور کافی تھا۔ فی الحال نیچے والے باقی کمروں کو یا اوپر کی منزل کو کھولنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔

کھانے کے کمرے میں فاطمہ اپنی بیٹی ریشم کے ساتھ کھانے کے برتن لگا رہی تھی۔ ریشماں کو ہم سب بھی اس کی ماں کی طرح ریشم ہی کہنے لگے تھے۔ اس کی حالت میں بڑی تیزی سے ایک خوشگوار تبدیلی آ رہی تھی۔ اس کو نوکر سے زیادہ ہمارے گھر کے ایک فرد کی حیثیت الگ حاصل ہو گئی تھی اور اسے تین ہزار روپے ماہانہ ملنے لگے تھے جو اس کے لیے ناقابل تصور حد تک بڑی رقم تھی۔ صرف یہی نہیں، اسے اپنے مستقبل کے سنہرے خوابوں کی تعبیر بھی مل گئی تھی۔ غنی کے ساتھ اس کے تعلق کو اب جرم کی حیثیت حاصل نہیں رہی تھی۔ اس نے ہمارے ساتھ کام کی ہامی بھر لی تھی اور میری ضمانت پر ریشم کی ماں نے اسے بطور داماد قبول کرنے پر رضامندی ظاہر کر دی تھی۔

شوخ اور طرار ریشم کے لیے زندگی کے روز و شب اب عید اور شب برات جیسے پُرمسرت ہو گئے تھے۔ اس کو ہر نوجوان لڑکی کی طرح اچھے کپڑے پہننے اور بننے سنورنے کا شوق تھا۔ اب اس کی تسکین کے سامان بھی فراہم ہو رہے تھے۔ فریال اس کا آئیڈیل ہو گئی تھی۔ ریشم اس سے طور طریقے سیکھ رہی تھی۔ اس کا لباس اور میک اپ ماڈرن ہونے لگا تھا اور جیسا کہ مجھے فریال نے بعد میں بتایا۔ وہ پڑھنا چاہتی تھی اور انگریزی میں بات کرنا چاہتی تھی۔

ایسا ہی خوشگوار انقلاب فاطمہ کی زندگی میں رونما ہوا تھا۔ اس کی ساری زندگی غربت و عسرت کی سختیاں جھیلتے گزری تھی۔ اس کے شوہر اکبر خان نے اسے تنگ دستی اور محتاجی کے سوا کچھ نہیں دیا تھا۔ رفتہ رفتہ وہ گھر سے لاتعلق ہوتا گیا یہاں تک کہ وہ صرف نام کا شوہر رہ گیا۔ اس نے باہر زندگی کا جو انداز اپنا لیا تھا وہ واضح طور پر مجرمانہ تھا اور وہ ایک ایسی عورت کے ساتھ غیر اخلاقی زندگی بسر کر رہا تھا جس کے اطوار ہی اسے بدکردار ثابت کرنے کے لیے کافی تھے۔ یہاں کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ اکبر خان کی بیوی ہے تو کیسے اور نہیں ہے تو اس کے ساتھ کیوں رہتی ہے؟ ایک تو میرے لیے شک کی کوئی بات ہی نہیں رہی تھی۔ اکبر خان کا پراسرار نظر آنے والا کردار آخری ملاقات کے بعد میرے لیے ایک خطرناک چیلنج بن گیا تھا۔

فاطمہ نے مجھے سلام کیا تو میں سر کے اشارے سے جواب دیتا گزر گیا۔ ایک کمرے میں دو افراد فرش پر بیٹھے کچھ ڈسکس کر رہے تھے۔ بھاری بھرکم جسم اور شلوار قمیص والا ایک رجسٹر میں کچھ لکھ رہا تھا یا کوئی حساب سمجھا رہا تھا۔ جینز کی جیکٹ والے کی میری طرف پشت تھی۔ میں سیدھا گزر گیا اور گھوم پھر کے دوبارہ اسی کمرے میں آ گیا جہاں راجا مزدوروں کے کسی مسئلے پر غور کر رہا تھا۔

راج ٹائپ ایک شخص نے کہا "سر اندر لائٹ کم ہے اگر ایک سرچ لائٹ ہو تو ہم رات تک کام کر سکتے ہیں۔ یہاں شام ہوتے ہی اندھیرا ہو جاتا ہے۔"

"ٹھیک ہے کل گاڑی جائے گی تو سرچ لائٹ آ جائے گی ...... لیکن کام کی رفتار بہت سست ہے۔ ایسے تو سال لگ جائے گا۔"

"نہیں سر! تین مہینے کی ذمے داری ہے ہماری اور لیبر لگا دیں گے اگر ضرورت ہو گی۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ اب تم لوگ بھی کھانا کھا لو۔" وہ بولا اور پھر میری طرف دیکھ کے میرے ساتھ چل پڑا۔

میں نے کہا "فریال نظر نہیں آئی مجھے۔"

"من کی آنکھیں کھول کیکے پتر! محبوب کا جلوہ ایسے دکھائی نہیں دیتا۔ تو نے اوپر دیکھا؟"

"کیا اوپر بھی کام ہو رہا ہے؟"

"کام ابھی تو نہیں ہو رہا ہے لیکن بغیر کام کے اوپر جانا منع ہے۔ شہناز اور وہ بدروحوں کی طرح بھٹکتی پھرتی ہیں سارے میں۔ تیرے آباواجداد کی تصاویر اور خاندانی نوادرات نے تو ان کی مت مار رکھی ہے۔ چل اوپر چلتے ہیں۔" راجا بولا۔

مگر اسی وقت کھانے کے کمرے کی طرف سے ریشم نے ہانک لگائی "سر لنچ از ریڈی۔ پلیز ...... لیڈیز اینڈ جنٹلمین!" اس نے ایک تالی بجانی شروع کی۔

میں نے کہا "یہ تو فر فر انگریزی بولنے لگی ہے۔"

راجا ہنسا "ہاں' تھینک یو ...... سوری' ویری گڈ پہلے ہی جانتی تھی۔ اب فریال سے جملے سیکھ کے رٹتی ہے۔"

کھانے کے کمرے میں قدم رکھتے ہی میرے ذہن کو زبردست جھٹکا لگا۔ ابھی میں جس کمرے سے گزرا تھا وہاں جینز کی جیکٹ میں خود فریال تھی مگر میری طرف اس کا چہرہ نہیں تھا چنانچہ میں نے اسے نظرانداز کر دیا تھا۔ فرش پر بیٹھ کے وہی اس بھاری بھرکم شخص کی بات سن رہی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ میں اسے بالکل نہ پہچان سکا تھا۔ جینز کی جیکٹ کے ساتھ فریال نے اسی رنگ کی پتلون بھی پہن رکھی تھی لیکن اصل تبدیلی اس کے ہیئر اسٹائل سے آئی تھی۔ اس نے بوائز کٹ ہیئر اسٹائل بنا لیا تھا اور مردانہ شرٹ کے ساتھ مردانہ جوتے پہن کے وہ ایک خوبصورت

نوجوان لڑکا نظر آتی تھی۔

راجا نے ایک قہقہہ مارا تو میں چونکا "یار! تم نے تو کمال کر دیا۔"

پیچھے سے شہناز نے کہا "کمال میرا بھی ہے رفیق بھائی! میں اس کے ساتھ تھی بطور مشیر خاص۔ جنس بدلنے کا یہ آپریشن کامیاب رہا یا نہیں؟"

فریال کمر پر ہاتھ رکھے مسکرا رہی تھی اور اپنی کامیابی پر مسرور تھی کہ اس کا مردانہ روپ خود میرے لیے آزمائش ثابت ہوا "کیسی رہی رومیو!"

"زبردست!" میں نے کہا "دل تو چاہتا ہے کہ اب میں جیولیٹ بن جاؤں تمہاری۔"

فریال نے جیب سے ایک عینک نکال کے آنکھوں پر لگالی "اب دیکھو غور سے دیکھو...... کوئی پہچان سکتا ہے مجھے؟"

میں نے سر ہلایا "جب میں دھوکا کھا گیا تو دوسروں کی کیا بات ہے۔"

"کمی ہے صرف مونچھوں کی۔" راجا نے کہا "اس کے بغیر بات نہیں بنتی۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا "چہرے کی جلد اتنی صاف نہیں ہوسکتی اس عمر کے کسی مرد کی۔"

شہناز نے کہا "ہوسکتی ہے۔ یہ مسئلہ تو ہارمونز کا ہے۔ چینی اور جاپانی مردوں کو دیکھو ان کے داڑھی مونچھیں کہاں ہوتی ہیں۔ بہت زیادہ عمر میں کچھ مردوں کے داڑھی کے چند بال نکل آتے ہیں۔"

راجا بولا "ڈاکٹر صاحب، ہم پاکستان میں ہیں، یہاں کی بات کرو۔"

"یہاں ایسے کیس کم ہیں مگر ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس کچھ عورتوں میں ہارمون کا مسئلہ چہرے اور جسم پر بال زیادہ اگاتا ہے۔" شہناز نے کہا۔

میں نے کہا "دوسرا مسئلہ ہے آواز کا۔"

راجا نے کہا "وہ کوئی ایسی بات نہیں۔ یہاں پتلی نسوانی آواز والے مرد عام طور مذاق کا نشانہ بنتے ہیں۔ یہ بھی وہی ہارمون پرابلم ہے۔"

"او کے! لیکن مونچھیں ہوتیں تو اچھا تھا۔"

"دیکھو مصنوعی گیٹ اپ سے مشکلات پیدا ہوں گی۔" شہناز نے وضاحت کی "میں شرط لگا سکتی ہوں کہ فریال ہم سب کے درمیان ہو اور ہم اس کے ساتھ ایسے ہی پیش آ رہے ہوں جیسے یہ مرد ہے تو کسی کا ذہن دوسری طرف جا ہی نہیں سکتا۔ یہ ایک نفسیاتی ایڈوانٹیج ہوگا۔ خود فریال مردوں کی طرح بولے اور بی ہیو کرے تو شناخت ناممکن۔"

"اس کا پتا بہت جلد چل جائے گا۔ جب میرے والدین آئیں گے یہاں۔"

"وہ مہمان ہوں گے چند روز۔"

میں نے کہا "نہیں، وہ مستقل طور پر رہنے آ رہے ہیں۔"

راجا نے آہستہ سے سیٹی بجائی "اوہ، یہ تو سیریس معاملہ ہے۔"

میں نے کہا "اس سے تو بعد میں نمٹیں گے۔ ابھی یہ بتاؤ کہ تم نے یہاں اس صورت حال سے کیسے ڈیل کیا ہے؟"

"یہاں سب ٹھیک ہے۔ میں آئی تھی شہناز کے ساتھ اور کوئی بھی مجھے دیکھ کے چونکا نہیں تھا۔ سب سے تیز تو ریشم کی نظر ہے۔ اسے بھی شک نہیں ہوا۔ شہناز نے بتایا کہ میرا چھوٹا بھائی ہے۔ پوچھنے لگی یہ بھی ڈاکٹر ہے؟ اس نے کہا کہ نہیں، یہ ڈیزائنر ہے۔" فریال قہقہہ مار کے ہنسی۔

"تمہیں یقین ہے اس نے مان لیا تھا؟"

"ہاں، وہ مجھ سے کہہ رہی تھی کہ ڈاکٹر صاحبہ آپ کا بھائی تو بڑا خوبصورت ہے۔" شہناز نے کہا "اس پر تو بہت لڑکیاں مرتی ہوں گی۔"

"پوری بات کرو۔ اس نے کہا تھا آپ کی طرح...... اور یہ بھی کہ صورت بھی بہت ملتی ہے آپ سے۔" راجا بولا۔

"اور اس کی ماں؟"

"ماں تو سیدھی سادی عورت ہے۔ ریشم نے دبے دبے لہجے میں پوچھا تھا کہ ان کی آواز کیسی ہے لڑکیوں جیسی۔ تو میں نے کہا کہ بھئی یہ تو اللہ کی دین ہے۔ بدلی نہیں جاسکتی۔ ہارمون والی تھیوری تو اس کی سمجھ میں نہیں آسکتی تھی۔ کہنے لگی کہ ہاں ادھر چوہدریوں کے گاؤں میں بھی ایک بندہ ہے۔ اچھا لمبا چوڑا موٹا اور مونچھوں والا۔ اس کی آواز پر سب ہنستے ہیں۔" میں نے کہا کچھ عورتوں کی آواز بھی تو بھاری ہوتی ہے مردوں کی طرح۔ کہنے لگی کہ ہاں، میری اپنی رشتے کی خالہ تھی۔" شہناز نے کہا۔

میں نے کہا "چلو ٹھیک ہے۔ ایک طرف سے تو اطمینان ہوا۔ فریال کو کسی سے خطرہ نہیں۔"

"اس کو سلطان کے علاوہ کس سے خطرہ ہوسکتا ہے...... اور یہ ہم جانتے ہیں کہ ابھی تک وہ کنفیوژن کا شکار ہے کہ فریال لندن سے غائب ہوئی تو گئی کہاں؟ اسے صرف شک ہے کہ وہ بھاگ کر تیرے پاس آئی ہوگی اور تو نے اسے چھپا رکھا ہے۔"

میں نے کہا "یہ شک بالکل فطری ہے۔"

"وہ ایسے مطمئن ہو کے بیٹھنے والا نہیں ہے نیکے پتر۔" جنات کو تو پیچھے لگا ہی چکا ہوگا، خود بھی ایجنٹ زیرو زیرو سیون بن

کے پتا لگانے کی کوشش جاری رکھے گا۔"

میں نے کہا "ہاں ہاں، جس کا دل چاہے آ کے دیکھے۔ فریال تو یہاں ہے نہیں۔ ویسے آپ کون ہیں؟"

فریال ہنسی "آپ کو نہیں معلوم...... ہم ہیں عبدالرؤف لیکن ہمیں سب رونی کہتے ہیں۔ جو کبھی کبھی فریال آپ کو کہتی تھی۔"

میں نے کہا "چلو، یہ سب تو ٹھیک ہے مگر ان سب کو تم نے کیسے مطمئن کیا ہے جو فریال کو یہاں دیکھ چکے تھے؟"

"یار، یہ سب واقعی رعایا ہیں۔ نہ اپنی سوچ رکھتے ہیں نہ مرضی۔ مالک سیاہ کو سفید کہیں تو مان لیتے ہیں۔ ان سے میں نے کہا کہ فریال لندن سے آئی تھی، واپس لندن چلی گئی۔ رفیق صاحب اسے چھوڑنے ہی تو گئے ہیں۔ ریشم کو کچھ افسوس تھا کیونکہ وہ اس کے ساتھ عقیدت مندی کا رشتہ استوار کر چکی تھی۔ ہر معاملے میں اس کو فالو کرتی تھی۔"

میں نے کہا "اب شہناز کو کرسکتی ہے۔"

اسی وقت ریشم اپنی ماں کے ساتھ اندر آئی اور کھانے کے برتن اٹھانے لگی تو سب خاموش ہو گئے پھر فریال نے کہا "اپنے فرخ صاحب کیوں چپ چپ ہیں؟"

راجا نے کہا "ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں۔ ورنہ کیا بات کر نہیں آتی۔"

شعر اس کی ذہنی کیفیت پر چسپاں ہوگیا تھا۔ فرخ نے جھینپ کر مصنوعی مسکراہٹ کا سہارا لیا "بڑوں کی بات میں بچے دخل نہیں دیتے۔"

راجا نے اس کے بے تکلفی سے ہاتھ رسید کیا "سبحان اللہ، آپ خود کو ابھی تک بچہ سمجھتے ہیں گویا...... حرکتیں بڑوں سے بھی بڑی ہیں۔"

اتنے میں یہ فرخ پر دوسرا وار ہوگیا۔ اس کی گلوخلاصی یوں ہوئی کہ باہر سے کسی نے راجا کو پکارنا شروع کیا تو فریال کو بھی یاد آیا کہ وہ ڈیزائنر کو ہدایات دے رہی تھی۔ میرے کہنے پر راجا اپنے ساتھ فرخ کو لے گیا۔ راج مستریوں کے کام کی نگرانی اس کے سپرد کی جاسکتی تھی۔ مجھ پر ایک عجیب سی ذہنی اور جسمانی تکان غالب تھی۔ شہر میں چند روز میرے لیے توقعات سے بڑھ کر ہنگامہ پرور ثابت ہوئے تھے۔ یہاں آ کے میرے کشیدہ اعصاب کو کچھ سکون ملا۔ یہ ایک قدرتی احساس تحفظ تھا جو بہت ریلیکس کرتا تھا۔ مجھے نیند آنے لگی اور میں آسانی سے لیٹتے ہی گہری بے خواب نیند میں گم ہوگیا۔

میں جاگا تو رات کا اندھیرا غالب آ چکا تھا۔ باہر ایک گہرا سکوت تھا۔ ایسی خاموشی تھی جو لاہور جیسے شہر کے پرشور ماحول کے بالکل برعکس تھی جس میں نہ کسی رکشے کی سمع خراش نرنر تھی، نہ کسی ہارن کی آواز۔ نہ گھر گھر سے سنائی دینے والی ریڈیو ٹی وی اور انسانوں کی چیخ پکار۔ رات ہوتے ہی پرندے تک آشیانوں میں چپ ہو گئے تھے جیسے جنگل کے قانون کے مطابق دوسروں کی نیند میں خلل اندازی کرنا نہیں چاہتے۔

جو آوازیں باہر سے سنائی دے رہی تھیں، وہ سب مہرباں آوازیں تھیں۔ دل کو خوشی اور اعتماد دینے والی۔ دوستوں کی وہ آوازیں جو ایک امید اور ایک خواب کو شیئر کر رہے تھے اور ساری دنیا سے کٹ کر اس ویرانے میں ایک دوسرے کی رفاقت پر قانع اور مطمئن تھے۔

میں اٹھ کے باہر آیا تو ان سب کو باہر فوارے کی دیوار پر بےفکری سے بیٹھے دیکھا۔ وہ چائے پی چکے تھے۔ میرے لیے ریشم تازہ چائے بنا کے لائی۔ وہ بے حد مستعد لڑکی تھی اور ہر کام بڑی دلچسپی سے کرتی تھی۔ وہ اپنے اپنے پلان اسی طرح ڈسکس کرتے تھے۔ اس وقت باغ کی نئے سرے سے تعمیر اور تزئین کا مسئلہ درپیش تھا۔ فریال اور شہناز کی متفقہ رائے تھی کہ اس کام کے لیے ایک مالی بھی رکھ لیا جائے۔ یہاں کے زراعت پیشہ لوگ درختوں اور پودوں، فصلوں اور پھولوں کے ساتھ پیدائشی طور پر ایک قدرتی وابستگی رکھتے ہیں چنانچہ جسے بھی یہ ذمے داری سونپ دی گئی، اس کے لیے یہ آسان کام ہوگا جو وہ معمولی معاوضے پر ہنسی خوشی کرے گا۔ فرخ اور راجا یہ سمجھتے تھے کہ ابھی دوسرے کاموں پر اخراجات ہو رہے ہیں تو باغ کو ایسے ہی رہنے دیا جائے۔ میرا کاسٹنگ ووٹ خواتین کے حق میں گیا تو فیصلہ ہوگیا۔

راجا نے مجھے مطلع کیا کہ اس نے تین گارڈ رکھے ہیں۔ ابھی ایک مین گیٹ پر رہتا ہے لیکن بعد میں گیٹ بند ہوگا تو اس کی وہاں ضرورت نہیں رہے گی۔ گیٹ کو چند روز میں اس قابل کر دیا جائے گا۔ نصف صدی یا اس سے بھی زیادہ عرصے تک اس کے بھاری بھرکم پٹ کھلے رہے تو جام ہو گئے۔ کچھ صفائی نیچے ہوگی اور کچھ قبضوں کو تیل دیا جائے گا تو انہیں کھولنا اور بند کرنا آسان ہوگا پھر مین گیٹ کے باہر تک انٹرکام سے رابطہ رہے گا۔ باقی دو گارڈ باری باری ڈیوٹی دیتے ہیں۔ ان میں سے ایک پچھلی طرف چکر لگاتا ہے۔ راجا کا ارادہ تھا کہ آمدورفت کے لیے استعمال ہونے والے دیگر تمام راستوں کو بند کر دیا جائے۔ یہاں رہنے والوں نے اپنی سہولت کے لیے دیوار میں سے شارٹ کٹ نکال لیے تھے اور ایک دو جگہ شگاف تھے۔ ان سب کو بند کرنے کی ضرورت تھی۔ پیچھے جانے کے لیے ایک باقاعدہ چھوٹا گیٹ بنایا جاسکتا تھا جو رات کے وقت بند رہے۔ اس کے پروگرام میں چاروں طرف سرچ لائٹس کی تنصیب اور دیواروں پر

خاردار تار لگانا بھی شامل تھا مگر وہ بڑی احتیاط سے آہستہ آہستہ ترجیح کے اعتبار سے آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ بلاشبہ ایک اچھے جرنلسٹ اور دوست کے ساتھ ایک ہوشیار پلانر اور منتظم ثابت ہو رہا تھا۔

ظاہر ہے مجھے اس کے کسی پروگرام سے اختلاف نہیں ہوسکتا تھا۔ دونوں لڑکیاں ہماری گفتگو میں کوئی نئی بات نہ پا کے اٹھ گئیں۔ ان کے اپنے پلان نے جس میں ہماری دخل اندازی کی ضرورت نہیں تھی۔ اس وقت انہیں یاد آ گیا تھا کہ کچن شیڈول بھی ان کی ذمے داری میں شامل ہے چنانچہ وہ رات کے کھانے کا مینو دیکھنے اور آیندہ کا طے کرنے چلی گئیں۔ کچن فاطمہ کی نگرانی میں بہت کامیابی سے چل رہا تھا۔ اس کی معاون خصوصی ریشم تھی لیکن میں نے کاسو کی بیوی کو بھی اندر معروف دیکھا۔ وہ اوپر کے سارے کام بڑی دل جمعی سے کررہی تھی جن میں صفائی بھی شامل تھی۔

راجا نے لاجسٹک کو نظر انداز نہیں کیا تھا۔ ست بدھائی ویسے تو اکیسویں صدی میں اور پاکستان جیسے ترقی یافتہ ملک میں تھی اور اس کا فاصلہ لاہور یا جہلم جیسے شہروں سے بھی زیادہ نہیں تھا مگر وسائل کی دستیابی کے اعتبار سے یہ ہنوز دوصدی پیچھے کی دور افتادہ دنیا تھی جہاں جدید دور کی کوئی سہولت میسر نہ تھی۔ بجلی کو ہم کھینچ کر لائے تھے ورنہ ہمارے کچن میں بھی لکڑی یا کوئلا بطور ایندھن استعمال ہوتے کیونکہ گیس نہیں تھی۔ یہاں ٹیلی فون کی لائن قریب سے بھی نہیں گزری تھی اور کسی موبائل فون کمپنی کا ٹاور نہیں تھا۔ سیلائٹ فون جیسی انقلابی ایجاد نہ ہوتی تو ہمارا کسی سے رابطہ محال ہو جاتا۔ یہاں ریڈیو' ٹی وی' اخبار کچھ بھی لوگوں کی ضرورت میں شامل نہ تھے۔ ریڈیو اور ٹی وی کو راجا نے ضروریات کی فہرست میں درج کر رکھا تھا۔ ریڈیو کی نشریات تو خیر زمین سے آسمان تک ہر جگہ سنی جاسکتی ہیں۔ ٹی وی کی تصویر کا یہاں تک پہنچنا عین ممکن تھا خواہ اس کے لیے اونچے لمبے اینٹینا لگانے ضروری ہوں۔ ڈش کے ذریعے سیلائٹ نشریات موصول کرنا بھی بہت آسان تھا لیکن بات ترجیح کی تھی۔

ایک مشکل ٹرانسپورٹ کی تھی۔ اس کا حل راجا نے بڑا اچھا نکالا تھا۔ ہمارے پاس اب شہباز کی گاڑی آ جانے سے تین گاڑیاں ہوگئی تھیں۔ راجا نے اکبر خان کے بیٹے کبیر خان کو جیپ دے دی تھی اور وہ ضرورت کی ہر چیز کی فراہمی پر مامور تھا۔ ہر روز اسے ایک فہرست تھما دی جاتی تھی اور وہ جیپ لے کر لاہور یا جہلم کی طرف جاتا تھا تو ہر چیز خرید لاتا تھا۔ کچھ چیزیں اسے دینہ سے ملتی تھیں اور کچھ نیلہ جوگیاں سے بھی دستیاب تھیں چنانچہ اس کے ایک دو چھوٹے چکر بھی ہو جاتے تھے۔

میں نے فرخ سے وعدہ تو کرلیا تھا کہ اس کی مجرمانہ غلطی کا ذکر کسی سے نہیں کروں گا مگر یہ ایسی بات نہ تھی جو بلاآخر معلوم نہ ہوتی اور پھر راجا جیسے دوست سے یا فریال اور شہناز سے آپس کے معاملات کی پردہ داری کا مطلب عدم اعتماد ہوتا جو کوئی اچھی بات نہیں تھی۔

میں اسی سوچ میں گم تھا کہ راجا نے مجھے ٹوکا "کیا بات ہے' تو میری بکواس سننے کے بجائے کچھ اور سوچ رہا ہے؟"

میں نے کہا "ہاں یار! معاملہ فرخ کا تھا۔"

"اب فرخ کا کیا معاملہ ہوگیا؟ اس نے کچھ کہا ہے؟"

میں نے کہا "اس کا تعلق پرانے معاملات سے نہیں ہے' وہ بات تو ختم ہوئی' بات رابعہ کی ہے۔"

"کیا ان کے درمیان خفیہ خفیہ کچھ ہوا ہے؟ یہ تو کوئی نئی خبر نہیں فیکے پتر!"

میں نے کہا "یار' وہ معاملات میں حد سے آگے بڑھ گئے۔"

راجا چونکا "کون سی حد؟"

میں نے اسے تفصیل سے سب بتایا تو وہ گرم ہوگیا "تو نے مارا نہیں سالے کو۔"

"میں ضرور مارتا لیکن یار...... ! رابعہ کوئی بچی نہیں' نہ وہ اسے اپنے ساتھ گن پوائنٹ پر لے گیا تھا' نہ نشہ پلا کے۔ وہ بھی تو اپنی مرضی سے ہی ساتھ گئی تھی ناں...... جوان مرد کتنی مزاحمت رکھتا ہے۔ ہر آدمی کمزور اور خطا کار ہے۔ شیطان سب کو ورغلاتا ہے۔"

"کیا اس کی کوئی ذمے داری نہیں تھی؟ فرخ کو سوچنا چاہیے تھا کہ وہ تیرے اعتماد کو بھی دھوکا دے گا تو......"

"وہ سب ٹھیک ہے، میں نے بھی ایسے ہی سوچا تھا اور میں بہت مشتعل ہی تھا مگر وہ آ کے میرے پیروں میں گر گیا تو میں کیا کرتا۔ جو کہنا تھا وہ میں نے رابعہ سے بھی کہا' بڑی مشکل سے اس صورت حال کو سنبھالا ورنہ میں تو پھنس گیا تھا۔"

"اب ان کی شادی فوراً ہونی چاہیے ورنہ......"

"ہاں' ابھی کچھ دن دیکھتے ہیں۔ شہناز دیکھے گی کہ آگے کیا ہوتا ہے۔ سب نارمل رہا تو اچھا ہے' بصورت دیگر...... اس کے پیریڈ رک گئے تو دو ہی آپشن رہ جائیں گے...... فوراً شادی یا نجات کی وہ صورت جو شاید ناپسندیدہ ہوگی' خود رابعہ کے لیے۔"

"شادی میں کیا قباحت ہے؟"

"کوئی نہیں اگر اس کے ماں باپ مان جائیں...... اور مجھے نہیں لگتا کہ وہ اتنی آسانی سے فرخ کو قبول کریں' ان کی نظر تو مجھ پر ہے لیکن اس کی پیش بندی میں کر کے آیا ہوں۔"

میں نے راجا کو اس گفتگو سے آگاہ کیا جو میرے اور رابعہ کے درمیان پہلے ہی ہو چکی تھی "اس نے ہی مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں دادی کو قائل کروں اور میرے والدین کے مستقل طور پر یہاں آنے سے پہلے فریال کی اور میری شادی ہو جائے۔ دادی کو منانا کیا مشکل تھا۔ میری ضد کے آگے ان کی نہیں چلتی۔ انہوں نے مان لیا۔ میرے ماں باپ کو وہ منالیں گی خواہ ان سے زبردستی منوانا پڑے۔"

"اگر وہ یہاں رہنے کے لیے آنا چاہتے ہیں تو پھر فریال کے یہاں رہنے کی اور کوئی صورت نہیں مگر بعد میں کیا ہوگا۔"

"تیرا مطلب ہے' سلطان کیا کرے گا۔"

"ہاں' ابھی تو اسے شک ہے۔ اس کے باوجود وہ پاگل ہو رہا ہے۔ جب یہ پتا چلے گا کہ اس کا شک درست تھا اور تو نے اس کی منگیتر کو اپنی منکوحہ بنالیا ہے۔ تو وہ آتش فشاں کی طرح پھٹ جائے گا۔"

"پھٹ جائے یار!"

راجا نے نفی میں سر ہلایا "تو خودکشی افورڈ نہیں کرسکتا فیکے پتر! تیرے ماں باپ کی دوسری اولاد نہیں ہے۔"

"پھر میں کیا کروں یار!"

"پہلے سلطان سے معاملہ طے کر۔ وہ جو کہتے ہیں ناں کہ جنگ اور محبت میں سب جائز ہے۔ تو یہ بیک وقت محبت بھی ہے اور جنگ بھی۔ تو یہاں بیٹھ کے انتظار کیوں کرتا ہے کہ وہ وار کرے۔ اس دفاعی حصار میں تو کب تک رہ سکتا ہے۔"

"شاید تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔"

"میں یقیناً ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ عملی بات کررہا ہوں۔ کل دی باسٹرڈ...... اس سے پہلے کہ وہ تجھے مارے' موذی کا سر کچل دینا ہی سب سے موثر دفاع ہوتا ہے۔ اسے موقع ہی کیوں دیں۔"

"یہ کام کیسے ہوگا راجا؟"

"جیسے وہ کرے گا۔ کیا فرق ہے اس میں اور تجھ میں؟ ایک ہی ہے دونوں کی پوزیشن۔ ایک ہی عورت کے لیے دو مرد کیسے فیصلہ کرتے تھے۔ ڈوئیل لڑتے تھے' ایک مارا جاتا تھا دوسرے کو عورت قبول کرلیتی تھی۔ ہیلن آف ٹرائے کے لیے ایک تاریخی جنگ کا حوالہ دیا جاتا ہے مگر یہاں تو ہر عورت ہیلن آف ٹرائے بن جاتی ہے۔ خواہ اس کا نام فریال ہو...... مجھے یقین ہے کہ جیت تیری ہوگی۔"

"تو میرا دوست ہے اس لیے ایسا سمجھتا ہے۔ شکست یا موت کسی کا بھی انتخاب کرسکتی ہے۔"

"میرے یقین کے اسباب ہیں۔ ایک جذباتی وجہ کو چھوڑ دے کہ تیری محبت سچی ہے اس لیے فتح یاب ہوگی۔ دوسرے اسباب کو دیکھ۔ اسے تجھ پر کیا برتری حاصل ہے؟ کیا یہ کشتی کا مقابلہ ہے کہ وہ تجھے چت کردے گا۔ کیا وہ زیادہ دولت مند ہے اس لیے فتح خرید لے گا؟ کیا اس کے پاس اچھا اسلحہ ہے اس لیے تجھے ماردے گا؟ نہیں' مقابلہ طاقت کا نہیں' عقل کا ہے۔ وہ تیرے پاس ہے' کتنی ہے ...... یہ میں جانتا ہوں۔"

"تو مجھے قتل پر اکسا رہا ہے؟"

"یس...... کولڈ بلڈ مرڈر۔ سوچ کے' پلان کے مطابق مگر اس کا موازنہ کسی قتل عمد سے نہیں کیا جاسکتا جو زر' زمین یا زن کے لیے کیا جائے۔ یہ حق کی جنگ ہے۔ اپنا حق حاصل کرنے کے لیے جو کبھی ایک قوم کی جنگ ہوتی ہے' کبھی ایک ملک کی' تو کبھی ایک فرد کی۔"

"تیرے فلسفیانہ خیال سے میرے جرم کی سنگینی کم نہیں ہوئی۔"

"یہ جرم نہیں ہے فیکے پتر۔ یہ جنگ تو ہر روز ہر جگہ ہوتی ہے۔ کیا تو نے سنا ہے کہ جنرل ضیا الحق نے کیا کہا تھا؟ اس نے کہا تھا کہ قبر ایک ہے اور دفن ہونے والے دو یا میں یا بھٹو اس نے زیادہ عیاری سے کام لیا اور بھٹو جیسا ذہین بندہ مارا گیا۔ ضیا الحق کو رعایت خود اس نے دی تھی۔ یہ تو ایک مثال تھی' عملی زندگی میں ایسی مثالیں سامنے آتی رہتی ہیں۔ سمجھ لے تو نے سلطان کے الٹی میٹم کو قبول کرلیا ہے۔ کیا سوچ رہا ہے؟"

میں نے کہا "تو واقعی یہ سمجھتا ہے کہ مجھے ابھی شادی نہیں کرنی چاہیے۔"

راجا نے کہا "میرے چاند! شادی ایک بار نہیں چار بار کر۔ روز دولھا بن اور گھوڑی چڑھ سہرا باندھ کے مگر یہ مرنے والے کام نہ کر۔ اس سے کرنی ہے شادی تو پہلے اپنا حق ملکیت تسلیم کرالے جو ابھی متنازعہ ہے۔ خرابی تو آج بھی ہے۔ بعد میں کتنی خرابی ہوگی یہ سوچ۔ بفرض محال...... دشمن کے منہ میں خاک۔ تو اللہ کو پیارا ہوگیا تو تیرا قصہ تو ہوگیا ختم۔ فریال کا کیا ہوگا جو بیوہ ہو کے پھر پہنچے گی اسی کینہ پرور بھیڑیے کے پاس۔ تیرے ماں باپ روئیں گے اس دن کو جب انہوں نے تیری ضد کے آگے سر جھکایا تھا پھر ہم کیا کرلیں گے' تیرا بدلہ لینے سے تو واپس نہیں آئے گا۔"

"یار! کیوں اتنا دہشت زدہ کررہا ہے مجھے۔"

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا "دیکھ' فریال کہیں بھاگی نہیں جارہی۔ سلطان زبردستی تو اس کا شوہر نہیں بن سکتا۔ وہ مزاحمت کرتی رہے گی۔ لڑتی رہے گی۔ ہم بھی کوشش کرتے ہیں کہ سلطان ضد چھوڑ دے۔ سمجھ لے کہ اس کا کوئی نہیں' وہ کسی بھی لڑکی کو اٹھا سکتا ہے۔ بے آبرو کرسکتا ہے اور مار سکتا ہے مگر اسے

بیوی بنا کے نہیں رکھ سکتا۔ اسے لڑکیوں کی کیا کمی ہے' وہ فریال کے معاملے میں اپنے دعوے سے دستبردار ہو جائے۔"

"ابے چھوڑ...... وہ ایسا سمجھنے والا ہوتا تو بات ہی کیا تھی۔"

راجا نے کہا "پھر یہ اس کا اپنا چوائس ہوگا۔ وہی فلمی ڈائیلاگ چلے گا کہ فریال تک پہنچنے کے لیے تمہیں میری لاش پر سے گزرنا ہوگا لیکن گرنے والی لاش تمہاری بھی ہو سکتی ہے۔ یہ اس کو بھی سمجھ لینا چاہیے۔ فیصلہ تلوار سے ہوتا ہے تو تلوار سے ہوگا۔"

راجا کی بات نے میری سوچ کا رخ بدل دیا تھا۔ جتنا میں نے اس پر غور کیا اس دلیل کی معقولیت کا قائل ہوتا گیا۔ یہ عجیب بات تھی کہ حالات مجھے گھیر کے ایک ایسی بند گلی میں پہنچا دیتے تھے جہاں نہ واپسی میرے بس کی بات رہتی تھی اور نہ میرے سامنے دوسرا کوئی راستہ بچتا تھا۔ غلام محمد اور شہاب الدین کے معاملے میں بھی نے خود کو اتنا ہی بے بس محسوس کیا تھا۔ جو دلائل آج راجا سلطان کے خلاف دے رہا تھا' وہی خود میرے ذہن میں آئے تھے۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ ان کو ختم کیے بنا چارہ نہیں کیونکہ یہ بقا کی جنگ ہے' آج یہی بات راجا مجھے سمجھا رہا تھا۔

یا تم نہیں یا ہم نہیں۔ کیا اب یہی ہوگا؟ انصاف اور قانون کے سارے پیمانے بدل جائیں گے؟ جینے کا حق اور پانے کا حق صرف اس کو ملے گا جو زندہ رہ سکے گا۔ دوسرے حریف کو ختم کرنے کے قابل ہوگا۔ اندر سے ریشم نے تالی بجانی شروع کی۔

راجا نے کہا "چل اٹھ، فکر کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔"

میں نے کہا "راجا، ایک بات بتا مجھے' میں تو سارے معاملات طے کرنا چاہتا تھا' دادی ہر بات منوا لیں گی پھر میں انکار کیسے کروں گا۔"

"یار! بہانے کرنے نہیں آتے تجھے؟ تیرے ماں باپ ہنسی خوشی ماننے والے نہیں ہیں۔ وہ پھر سمجھائیں گے تجھے۔ بس مان لینا ان کی بات اور ہاں...... فریال کو یہ مت بتانا۔"

"کیا نہ بتاؤں؟"

"اسے کچھ مت بتانا۔ صورت حال کو جوں کی توں رکھ۔ جسے انگریزی میں کہتے ہیں۔ STATUS QUO کہ گھر والے نہیں مانتے۔"

"مگر وہ مستقل رہائش کے لیے آ رہے ہیں یہاں۔ ان کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔ انہیں پتا چلا کہ فریال یہاں ایسے رہتی ہے تو انہیں بہت دکھ ہوگا۔"

"اتنا خیال ہے ان کا تو فریال کو رخصت کر۔"

میں نے برہمی سے کہا "یہ کیا کہہ رہا ہے تو' وہ کہاں رہے گی؟"

راجا نے سرسری انداز میں کہا "وہ لندن میں اکیلی رہ چکی ہے۔ ہر جگہ اکیلی رہ سکتی ہے۔ یہاں سے تو اسے جانا پڑے گا اگر وہ چاہے تو لاہور میں فاروقی کے ساتھ رہ سکتی ہے' کام بھی کر سکتی ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ وہ اتنا رسک لے کر میرے پاس آئی ہے اس لیے کہ لندن میں نہیں رہ سکتی تھی۔"

"ایسے بھیس بدل کے رہنے میں اس کے لیے یہاں کوئی خطرہ نہیں تو فاروقی کے ساتھ کیا خطرہ ہوگا نیکے پتر!"

میں نے کہا "مہاراجا! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اب تو آ گیا ہے اور شہناز آ گئی ہے۔ ہم ایک مقصد اور ایک مشن کے لیے مل کر کام کر رہے ہیں اور فریال اس میں برابر کی شریک ہے۔ اسے میں نکال باہر کروں کہ یہاں تمہارے لیے جگہ نہیں ہے' تم جاؤ۔"

"اچھا تو پھر رکھ اسے اپنے ساتھ۔ اماں ابا پر بھید کھل جائے تو انہیں بتا دینا کہ اب یہ کوئی معیوب بات نہیں سمجھی جاتی۔ لندن میں تو لوگ ایسے ہی مشترکہ خاندان بنا کے رہتے ہیں' شادی کے بغیر۔ الو کا پٹھا' بات کو سمجھتا ہی نہیں۔" راجا اٹھ کھڑا ہوا۔

"مسئلے کا کوئی حل نکل آئے گا راجا!"

اندر سے ریشم نے پھر تالی بجانی شروع کی اور پھر برآمدے میں آ کے آواز لگانے لگی "لیڈیز اینڈ جنٹلمین! ڈنر از ریڈی۔"

رات گئے تک میں اور فریال باہر پھرتے رہے اور پیدل ہی پل تک گئے۔ اوپر چاند چمک رہا تھا۔ نیچے دریائے کنہار کا پانی پتھروں سے ٹکراتا گزر رہا تھا۔ فریال مجھ سے چمٹی ہوئی تھی۔ اس پر چاندنی میں پھیلے ہوئے منظر کی خوبصورتی سے زیادہ سنسان جنگل کا خوف طاری تھا۔ میں نے اسے رابعہ اور فرخ کے معاملات کی پوری رپورٹ دی کہ کس طرح چند روز میں انہوں نے عشق کے آغاز کو انجام تک پہنچا دیا۔

"بہادر لڑکی ہے۔" فریال نے تبصرہ کیا۔

میں نے کہا "بہادر نہیں' بے وقوف لڑکی ہے۔"

"عقل کا دل کے معاملات میں دخل ہونا بھی نہیں چاہیے۔"

میں نے کہا "اور فرخ پیچھے ہٹ گیا' پھر......؟"

"پھر کیا...... اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں لیکن اسے بھروسا ہوگا فرخ پر اور خود پر...... جیسے مجھے ہے' وہ قتل کر دے گی فرخ کو۔"

"تم قتل کر سکتی ہو مجھے؟"

"تم نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔ ناحق خون کیوں کروں گی مگر ہاں...... تم نے چھوڑا مجھے تو میں چھوڑوں گی نہیں تمہیں۔ یہ تو تم اچھی طرح سمجھتے ہو۔"

میں نے کہا "سلطان کو قتل کیوں نہیں کیا اتنی بہادر ہو تو؟"

اس نے ٹھنڈی سانس لی "واقعی یار! اچھا موقع ملا تھا' چوک ہو گئی۔"

میں نے کہا "اب کر دو۔ میں ریوالور دیتا ہوں اور اس کے پاس بھی لے جاتا ہوں' مجھے معلوم ہے وہ کہاں ملے گا؟"

"اصولاً یہ کام تمہیں کرنا چاہیے۔ باقی داؤ' اگر رابعہ والا معاملہ تمہارے گلے پڑ جاتا تو تم کیا کرتے؟"

"تمہیں ایک شعر سناؤں......

تھی شب تاریک چور آئے جو کچھ تھا لے گئے
کر ہی کیا سکتا تھا بندہ کھانس لینے کے سوا

وہ ہنسی "یعنی تم انکار نہ کرتے۔ پہلی رابعہ' دوسری فریال' تیسری عائشہ' چوتھی جو اللہ دے۔"

میں نے کہا "میرے اماں ابا آ رہے ہیں یہاں اور یہیں رہیں گے۔"

"رہیں...... بہت جگہ ہے تمہارے محل میں۔"

میں نے کہا "پھر تم کیسے رہو گی یہاں؟"

"جیسے اب رہتی ہوں' مجھے کیا فرق پڑتا ہے کسی کے آنے سے۔"

میں نے کہا "یہ لندن نہیں ہے۔ یہاں شادی کیے بغیر لڑکی آ جائے سسرال تو......"

"تو کیا ہوتا ہے؟ کوئی ایسا کیس ہے تمہاری نالج میں؟"

"فری! بی سیریس!"

"او کے پھر ہم شادی کر لیتے ہیں ان کے آنے سے پہلے ہی۔ صبح راجا کسی مولوی کو پکڑ لائے گا' کیا خیال ہے؟"

"تم جانتی ہو یہ نہیں ہو سکتا۔ صرف اس لیے کہ تم نے بہت پہلے میرے منع کرنے کے باوجود اس عیاش اور انا پرست شیطان سے منگنی رچا لی تھی' وہ مجھے قتل کر دے گا۔"

"رومیو! تم مرنے سے ڈرتے ہو...... ویری بیڈ!"

میں نے چلا کے کہا "ہاں، میں اس لیے ڈرتا ہوں کہ میرے ماں باپ زندہ ہیں پھر وہ بھی مر جائیں گے۔ صرف تم زندہ رہو گی بیوہ بن کے۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا "نو...... میں وعدہ کرتی ہوں کہ فوراً خودکشی کر لوں گی مگر میں سلطان کو قتل کر کے پکڑی جاتی اور مجھے پھانسی ہو جاتی تو تم کچھ نہ کرتے۔ آئی نو' مرد ایسے ہی ہوتے ہیں۔"

ہم پل کی ریلنگ پر جھکے پانی میں چاندنی کی جھلمل کو دیکھ رہے تھے کہ ہمارے پیچھے کہیں دور سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آنے لگیں۔ اس جنگل میں لومڑیاں اور گیدڑ تو عام تھے اور کبھی کبھی رات کو گیدڑوں کے چلانے کی آواز قریب بھی آ جاتی تھی مگر کتے نہیں تھے۔ کتوں کے بھونکنے کے ساتھ اب میں موٹر سائیکلوں کی آواز بھی سن رہا تھا۔ کتے کچھ دیر میں قریب آ گئے۔ گیٹ کی طرف سے سکیورٹی گارڈ ہماری طرف دوڑتا ہوا آیا "سر! آپ اندر آ جائیں۔ رات کے وقت اس طرح پھرنا ٹھیک نہیں۔"

میں نے کہا "یہ کتے کس کے ہیں؟"

"رانا صاحب کے۔ وہ ادھر ہی آئیں گے۔ ہوا کے رخ پر انہوں نے آپ کی بو محسوس کر لی ہوگی۔"

فریال مجھے کھینچنے لگی "چلو، مجھے ویسے بھی ڈر لگ رہا ہے یہاں۔"

میں اس کے ساتھ واپس چل پڑا "کتے اس وقت ادھر کیوں آتے ہیں۔ یہ شکار کا وقت تو نہیں ہے۔"

گارڈ نے پلٹ کے دیکھا "پتا نہیں جی' مگر آتے روز ہیں۔"

جب ہم گیٹ سے اندر گئے تو میں نے کاسو کو دیکھا۔ وہ مجھے پہلے سے زیادہ متوحش اور سراسیمہ لگا۔ ہماری امان میں آ جانے کے باوجود اس کے رگ و پے میں سمائی ہوئی رانا صاحب کی دہشت ختم نہیں ہوئی تھی۔ وہ اب بھی احساسِ عدم تحفظ اور بے یقینی کا شکار تھا۔

وہ چند قدم آگے آیا "نواب صاحب! رانا کے کتوں کو کتا نہ سمجھیں۔"

میں نے غیر سنجیدہ لہجے میں کہا "اور پھر کیا سمجھوں؟ آدم خور شیر!"

"وہ ایسے ہی ہیں جناب! آپ نے نہیں دیکھا' میں نے دیکھا ہے انہیں' جیتے جاگتے بندے کو چیر پھاڑ کے کھاتے ہوئے۔" اس نے ایک جھرجھری لی۔

"فکر نہیں کرو۔ وہ مجھے نہیں کھائیں گے۔ جیسے پہلے دو مارے گئے تھے' ایسے ہی باقی بھی میرے ہاتھوں مارے جائیں گے مگر وہ اس وقت ادھر کیوں آتے ہیں۔"

"نواب صاحب! ان کتوں کو خاص طور سے انسانی شکار کے لیے بھی سدھایا گیا ہے۔ جب انہیں کسی کا خون چٹا دیا جائے تو وہ اس کے خون کے پیاسے بن جاتے ہیں۔ جب بھی وہ بو محسوس کریں گے' اس انسان پر ٹوٹ پڑیں گے۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا "یہاں کس کا خون چاٹا ہے انہوں نے۔"

"میرا جناب! میری بیوی کا...... بچے کا۔" وہ لرز کے بولا۔

"مگر کیسے ...... اور کب......؟"

"یہ تو دستور ہے نواب صاحب! ہر غلام کا خون کتے چاٹتے ہیں۔ اس کے جسم سے نکلنے والا تازہ خون۔ جو زخموں سے بہتا ہے۔"

فریال سہم کر مجھ سے چمٹ گئی "کیسے زخم؟"

"زخم تو بیگم صاحبہ ملتے رہتے ہیں۔ کوڑوں کی مار سے' زنجیروں سے۔"

میں نے کہا "لیکن تمہاری بیوی...... اور بچہ......"

"ان کا خون چیرا لگا کے نکالا گیا تھا۔"

فریال نے ایک چیخ ماری "او مائی گاڈ! اس بچے کا بھی......"

میں نے فریال کے شانے پر تھپکی دی "کاسو، تمہارے پاس اپنی حفاظت کے لیے کیا ہے؟ ویسے تو کتے اندر نہیں آ سکتے۔"

"ہاں جی! مگر وہ دروازے تک آ جاتے ہیں۔ میں ہر روز کمرا بند کر کے سوتا ہوں۔ باہر نکلتا ہی نہیں' ہاں کسی روز وہ اندر آ گئے پھر......"

میں نے کہا "میں گارڈ سے کہہ دوں گا کہ کوئی اندر آنے کی کوشش کرے تو کتا ہو یا رانا کا بندہ بے دریغ گولی مار دیں اور تم اپنے پاس ریوالور رکھو میں دوں گا......"

"نہیں جناب، میں گولی نہیں چلا سکتا۔" وہ کانپنے لگا۔

"کاسو، کل سے تمہاری ٹریننگ ہو گی۔ تم گولی چلانا اور نشانہ لینا سیکھو گے یہ حکم ہے میرا۔" میں نے کہا اور گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

کتے اب بہت قریب آ گئے تھے۔ میں نے چار کتوں کو بل پر سے لپکتا دیکھا ان کی زنجیریں انہی غلاموں کے ہاتھوں میں تھیں جن کو میں نے رانا کی حویلی میں دیکھا تھا منڈے ہوئے سر۔ بنیان اور نیکر کے ساتھ ننگے پاؤں وہ کتوں کے ساتھ دوڑ رہے تھے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ کتے انہیں کھینچ رہے تھے کیونکہ کتے زیادہ طاقتور تھے ان کے پیچھے دو موٹر سائیکلوں والے تھے۔

میں نے گارڈ سے کہا "یہ تماشا ہر روز ہوتا ہے!"

"جی سر، وہ گیٹ تک آتے ہیں پھر گھوم کے ادھر نکل جاتے ہیں۔" گارڈ نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

"ٹھیک ہے، باہر تو ہم انہیں نہیں روک سکتے مگر ان میں سے کوئی کتا یا انسان دروازے کی حد کراس کرے تو اسے گولی مار دو ایک ہوں یا چار۔" میں نے کہا۔

کاسو پھر میرے پیچھے آ گیا۔ "نواب صاحب، اس کتے کو انہوں نے رکھا ہوا ہے بھس بھر کے۔"

میں نے پلٹ کے پوچھا "کس کتے کو۔"

"جسے آپ نے پہلے مارا تھا جس کے ساتھ رانا صاحب مجھے دفن کرنا چاہتے تھے۔"

میں نے کہا "اسے اسٹف کرا کے رکھا ہے کیوں؟"

"میرے ساتھ دفنانے کے لیے نواب صاحب۔"

میرے دل میں غصے اور نفرت کا غبار سا اٹھا۔ یہ کس قسم کے فرعون بے ساماں ہیں جو آج اکیسویں صدی میں بھی غلاموں کو اپنے کتوں کے ساتھ زندہ دفن کرنے کی سفاک رسم کو باعث تفاخر جانتے ہیں کیا یہ وقت کی بساط کے پلٹنے کا تصور ہی نہیں کر سکتے کہ اگر کسی انقلاب نے یہی اختیار غلاموں کو دے دیا تو کیا ہو گا؟ ظالم کی رسی دراز کہاں تک ہو گی بالآخر مکافاتِ عمل اسی زندگی میں ہے۔

کتے دروازے کے قریب تک آئے میں نے اونچے قد اور پتلی کمر والے ان خون آشام کتوں کی بھیانک تھوتھنی دیکھی۔ وہ اپنی لمبی لمبی زبانیں نکالے ہانپ رہے تھے اور زور لگا رہے تھے ان کے پیچھے چلنے والے غلاموں کے ننگے جسموں سے پسینہ بہہ رہا تھا۔ وہ کتوں سے زیادہ ہانپ رہے تھے اور ان کے ننگے پیروں کو جنگل میں بچھے ہوئے خس و خاشاک، خشک ٹہنیاں اور کانٹے کنکر اور پتھر زخمی کر رہے تھے۔

ان غلاموں کے نگراں سیاہ ٹریک سوٹ میں تھے۔ تنومند اور درشت چہروں والے جوان لوگ تھے جنہوں نے اپنے چہروں کو زیادہ ہیبت ناک بنانے کے لیے بڑی بڑی نوکیلی مونچھیں بھی پالی ہوئی تھیں۔ جب وہ گیٹ کے سامنے سے گزرے تو ان کے چہروں پر ایک پر خباثت مسکراہٹ تھی۔

ایک نے کہا "اوئے آج تو خیر سے نواب صاحب بھی سلام کرنے کو کھڑے ہیں۔"

دوسرے نے قہقہہ لگایا "تو سلامی دے دے نا۔" اور کوئی سکہ میری طرف اچھالا۔ "اٹھا لے اٹھا لے کنگلے نواب۔"

گارڈ نے مشتعل ہو کے گن اتاری۔ "تمہاری تو ماں کی......"

میں نے اسے روک لیا۔ "انسان اور کتے میں بھی فرق ہوتا ہے۔ کتا بھونکے تو جواب میں آدمی نہیں بھونکتا۔"

اشتعال انگیزی کے اس لاحاصل مظاہرے نے مجھے رات بہت دیر تک بے چین رکھا۔ رانا رجب علی کے عزائم واضح تھے وہ کینہ پرور شخص پھر سے عداوت پال رہا تھا۔ میں نے اس کے اختیار کو چیلنج کرنے کی جرأت یا حماقت کی تھی مجھے اس کی سزا دیے بغیر وہ چین سے بیٹھنے والا نہیں تھا۔ تاہم صبح تک میں نے یہ بات بھلا دی اس کی دیگر مسائل کے سامنے کوئی اہمیت نہیں تھی۔

حویلی میں معمول کے مطابق کام جاری تھا۔ راجا کا نگرانی والا کام اب ثریا نے سنبھال لیا تھا شہناز نے مجھے ایک طویل المیعاد منصوبے کی تفصیل بتائی۔ فی الحال وہ حویلی کے ملازمین اور آنے جانے والوں کی صحت کو دیکھ رہی تھی۔ چند روز میں گرد و نواح کے حالات کا جائزہ لے گی اور پھر حویلی میں ایک فری ڈسپنسری قائم کرے گی جہاں معائنہ مفت ہو گا اور ٹیکے بھی لگائے جائیں گے۔ عام دوائیں شہر سے منگوائی جائیں گی۔ کچھ میڈیکل ریپ فراہم کریں گے کچھ راجا مختلف این جی اوز کے ذریعے حاصل کرے گا۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ جتنی دواؤں کی ضرورت ہو گی ان کی فراہمی ریاست ست بھرائی کی ذمے داری ہو گی۔ شہناز کے پلان بہت آگے تک تھے۔ وہ یہاں ایکسرے اور الٹرا ساؤنڈ مشین لگانا چاہتی تھی۔ ڈسپنسری کو کلینک اور میٹرنٹی ہوم کے بعد اسپتال بنانے کا ارادہ رکھتی تھی۔

موقع پاتے ہی میں نے راجا پر اپنی تشویش کا اظہار کر دیا "مہاراجا میری نوابی کیسے چلے گی خالی خزانے کے ساتھ۔ یہ سارے کام کیسے ہوں گے؟"

"تو کیوں فکر کرتا ہے یار۔ میں نے سب پلان کر لیا ہے۔" راجا بولا "ابھی کام چل رہا ہے تیرا میرا اور ہم سب کا مشترکہ سرمایہ کوئی تمیں لاکھ روپے بنتا ہے جو دستیاب ہے۔"

"اس کے بعد ہم زمینیں بیچیں گے؟"

"تیرے خاندانی نوادرات کی فروخت سے ہمیں حاصل ہوں گے تقریباً تین کروڑ روپے۔ میری بات ہو گئی ہے۔"

"اوہ، یہ تو میں بالکل بھولا ہوا تھا۔"

"جیولرز کا ایک وفد آج کل میں یہاں آ رہا ہے۔ اس میں تین ڈیلرز ہیں جو تمام سونے چاندی کے برتن اور دوسری چیزیں خریدیں گے ان کی قیمت کا تعین ہو گا پھر ادائیگی۔"

میں نے کہا "یار برتن تو خیر ہمارے کسی کام کے نہیں لیکن کچھ تاریخی چیزیں ہوں گی جن کو رکھنا چاہیے۔"

"انہیں ہم الگ کر لیں گے۔ پرانی گاڑیاں بھی بے مصرف ہیں ہمارے لیے۔ ہم نہ انہیں چلا سکتے ہیں اور نہ مینٹین کر سکتے ہیں۔ یہ کلاسک کاروں کے شوقین رکھتے ہیں ان سے زیادہ ملنے کی امید نہیں مگر یہاں ان کی حیثیت کباڑ جیسی ہے میرا خیال ہے کہ تینوں گاڑیوں کے تیس سے چالیس لاکھ ملیں گے اگر ہم انٹرنیشنل مارکیٹ میں جائیں کسی ویب سائٹ پر تو رقم دگنی بھی ہو سکتی ہے لیکن اس میں بہت دردسر ہے۔ اتنا وقت نہیں ہے ہمارے پاس ہمارے لیے ساڑھے تین کروڑ بہت ہیں فی الحال۔ اس کے بعد ترقیاتی منصوبوں کے لیے ہم فنانسر تلاش کریں گے۔ انوسٹرز کو بلائیں گے یا لون لیں گے...... منی از نو پرابلم نواب صاحب۔"

"ویری گڈ، ہم خوش ہوئے تمہاری کارکردگی سے۔"

"ایک پرابلم ہے اس آفس کی...... یہاں کوئی غلط کام ہو رہا ہے اس میں تو شک کی کوئی بات نہیں۔ پرسوں رات بھی دو ٹرک آئے تھے۔"

میں نے کہا "اس کی قانونی پوزیشن واضح ہو گئی ہے ہم اسے خالی کرا لیں گے۔ میں معاہدے کی نقل لے آیا ہوں یہ جگہ نہ کرائے پر دی گئی ہے نہ لیز پر۔ معاہدہ پرانے مالکوں سے ہوا تھا میں اسے ختم کرتا ہوں۔"

راجا نے سر ہلایا "یہ آسان کام نہیں ہے مگر خیر کچھ کرتے ہیں معاہدہ کس سے ہوا تھا۔"

میں نے بریف کیس میں سے معاہدے کی نقل نکال کے دیکھی۔ "کوئی ڈاکٹر اشرف چوہدری تھا۔ چیئرمین ریسرچ سینٹر۔"

"کس چیز کا ریسرچ سینٹر......"

میں نے کہا "یہی تو خوبی ہے اس معاہدے کی۔ اس میں ریسرچ کی نوعیت نہیں بتائی گئی۔ یہ لکھا ہے کہ یہاں سائنسی ماحولیات اور زراعتی شعبے میں ریسرچ اسٹیشن ماہرین کی زیرِ نگرانی کام کرے گا اور تحقیق کے اعلیٰ مواقع فراہم کرے گا ماہرین کون ہیں، مواقع کیسے فراہم ہوں گے سب گول ہے۔"

"میرا خیال ہے تیرے وہ جدِ امجد اور محسن جنہوں نے تجھے اس جاگیر کا وارث بنایا خود بھی زیادہ دلچسپی لینے سے قاصر تھے ایک تو وہ آتے تھے برسوں کے بعد پھر وہ مفلوج تھے۔ ممکن ہے باتوں میں اشرف چوہدری نے انہیں قائل کر لیا ہو کہ اس ریسرچ اسٹیشن کی کتنی افادیت ہے۔ جب معاہدہ لکھا گیا تو کچھ واضح نہیں کیا گیا اور انہوں نے اعتماد میں دیکھے بغیر دستخط کر دیے۔ بہت سے قانونی نکات رہ گئے مثلاً یہ کہ معاہدہ کتنے سال کے لیے ہے اس کی منسوخی یا تجدید کا طریقہ کیا ہو گا۔"

میں نے کہا "کیا حرج ہے اگر آج ہم مسلح افواج کے ساتھ چڑھائی کریں۔ اندر جا کے دیکھیں۔"

راجا نے مجھ سے اتفاق کیا تو میں نے تینوں سکیورٹی گارڈز کو طلب کر لیا۔ ہمارے ساتھ فرح بیٹھ گیا کبیر خان نے جیپ ڈرائیو کی اور تینوں گارڈ کے ساتھ آگے گیا...... چند منٹ میں ہم اس گیٹ پر پہنچ گئے جہاں پہلی بار مجھے اکبر خان نے روکا تھا اور واپسی پر مجبور کر دیا تھا۔

گیٹ پر اب دوسرا گارڈ موجود تھا اس نے گیٹ کھولنے سے صاف انکار کر دیا۔ "اندر جانے کی اجازت کسی کو نہیں ہے۔"

میں نے کہا "ہم چیئرمین اشرف چوہدری سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"میں کسی اشرف چوہدری کو نہیں جانتا۔" گارڈ بولا۔

"آخر کوئی تو ہوگا ذمے دار...... تمہارا سر۔" راجا بولا۔

گارڈ اپنی جگہ کھڑا رہا "اس وقت کوئی نہیں۔"

اب میں نے کہا "دیکھو، یہ جگہ میری ہے میں مالک ہوں ۔ جا کیر کا تم مجھے نہیں روک سکتے میرا نام ہے نواب رفیق احمد ...یرازی۔"

...نکل متاثر نہیں ہوا۔ "مجھے آرڈر ہے۔"

اب کبیر نے گرمی دکھائی "اوئے آرڈر کے بچے ہم زبردستی گھس جائیں گے کھول دروازہ نہیں تو جیپ گزار دوں گا تیرے اوپر سے۔"

میرے تینوں گارڈز نے اپنی اپنی رائفلوں کو تیار کرلیا۔ اندر کھڑے ہوئے گارڈ کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس نے کہا "اچھا ٹھہرو، میں پوچھتا ہوں۔"

اس نے ایک کیبن میں سے کہیں فون کیا اور ساری صورت حال بتائی۔ معلوم نہیں جواب میں اس سے کیا کہا گیا، جب وہ باہر نکلا تو اس کے ہونٹوں پر ایک جارحانہ مسکراہٹ تھی۔

اس نے کہا "تم اندر نہیں جاسکتے۔"

میرے گارڈز نے ایک بار پھر رائفلیں تان لیں۔ لیکن اسی وقت ایک عجیب بات ہوئی گارڈ نے پلٹ کے اوپر دیکھا اس کے ساتھ ہی میری نظر نے بیرک کی چھت پر ایک گن مین کو دیکھا جو آخری حصے میں نمودار ہوا تھا اور اب چھت پر لیٹ چکا تھا۔ اس کے پاس جو کلاشنکوف تھی اس کا رخ ہماری طرف تھا دیکھتے دیکھتے دوسرا محافظ دوسرے حصے میں نمودار ہوا۔ پھر میں نے دو رائفلوں کو بیرک کی دیوار کے پیچھے سے جھانکتا پایا۔ کم سے کم آٹھ مسلح افراد اس بیرک کے چاروں طرف مورچہ بند ہو چکے تھے۔

یہ ناقابل یقین صورت حال تھی۔ اس پرطیش میں آنے کا مطلب جان گنوانا تھا میں نے راجا کی طرف دیکھا اور ہم واپس کار میں بیٹھ گئے۔ میں نے کبیر خان اور اپنے گارڈز کو بھی واپسی کا حکم دیا۔ چند منٹ میں ہم جس راستے سے آئے تھے اسی پر لوٹ کے جارہے تھے۔

راجا نے کہا "یہ معاملہ ایسے طے نہیں ہوگا۔ اس کے لیے ہمیں پولیس کی مدد لینا ہوگی۔"

"ہاں، ہم آج ہی اس کی رپورٹ لکھوائیں گے۔" میں نے کہا۔

"میں بات کرتا ہوں ابھی۔" راجا نے کہا وہ گہری سوچ میں گم تھا۔

راجا نے بہت سے لوگوں سے بات کی۔ ان میں کچھ اس کے اخباری ساتھی تھے۔ کچھ پولیس کے اعلیٰ افسران۔ وہ ایک گھنٹا مصروف رہا پھر اس نے خوش دلی سے میرے کندھے پر ہاتھ مارا "چلیے نواب صاحب ذرا جہلم تک۔"

میں نے کہا "وزیر با تدبیر جہلم تو غالباً ایک دریا ہے کیا ہمیں تیر کر گزرنا ہوگا؟"

"آپ ڈوب کے ہی گزر سکتے ہیں نواب صاحب، اس دنیا سے مگر ہم تو جارہے ہیں جہلم شہر۔"

میں نے کہا "وہی نام دریا کا وہی شہر کا۔ اس سے تو بڑا کنفیوژن پھیلتا ہوگا دنیا میں ایسی گڑبڑ کہیں اور کیوں نہیں۔"

راجا نے باہر آ کے کہا "واقعی یار، وادی چناب یا سندھ۔ گنگا جمنا۔ کہیں کوئی شہر دریا کے نام پر نہیں۔"

میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ "لندن میں ٹیمز ہے تو اپنے پنڈی میں مقابلے پر ہے نالہ لئی۔ ملتا جلتا نام رکھنا ہو تو جہلم کے نیچے دو نقطے لگا کے شہر کو موسوم کیا جاسکتا ہے۔ تو نے اجازت لے لی ہے اپنی گھر والی سے۔"

راجا نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے غیر موجود مونچھوں کو تاؤ دیا "ابے ہم کوئی زن مرید ہیں...... تیری طرح۔"

شہناز اچانک نمودار ہوئی۔ "کہاں چل دیے مہاراجا۔"

راجا نے منمنا کے کہا "وہ ذرا جہلم تک۔"

شہناز نے ماتھے پر بل ڈال کے کہا "ایسے چوروں کی طرح کیوں بھاگ رہے تھے۔ بتا کے جانا چاہیے تا کہ کچھ منگوانا ہو تو......"

"بتاؤ کیا لانا ہے؟" راجا بولا۔

شہناز آگے آئی...... اس کے ہاتھ میں ایک فہرست تھی جس میں کدو، کریلے سے اینٹی بایوٹک ادویات تک سب لکھا ہوا تھا۔

"پیسے ہیں ناں؟"

"کمال کرتی ہو تم بھی...... سب تو نکال لیے تھے۔ راجا خفت سے بولا۔

شہناز نے مجھے نوٹ تھما دیے۔ "تمہیں دوں گی تو اڑا دو گے کہیں۔ جو چیز خریدو رسید ضرور لینا اور کچھ بھولنا نہیں، تمہارا دماغ بہت بے مہار ہو رہا ہے آ......"

ہم باہر نکلے تو مجھے ہنسی آئی۔ "بڑی اکڑفوں دکھا رہا تھا۔"

راجا نے جز بز ہو کے کہا "یار کیا کروں اس الو کی پٹھی کے سامنے پتا نہیں کیا ہو جاتا ہے مجھے۔ ساری طرم خانی دھری رہ جاتی ہے۔"

جیسے ہر فرعون کے لیے ایک موسیٰ ہے ایسے ہی ہر راجا کے لیے ایک ایسی ہی رانی......"

جہلم کا سفر ڈھائی گھنٹے میں طے ہوا۔ ہم پولیس ہیڈکوارٹر پہنچے تو بڑے صاحب کی گاڑی دفتر کے سامنے لگی ہوئی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ روانہ ہو رہے ہیں، سارے ماتحت باادب

باملاحظہ ہوشیار کی تصویر بنے کھڑے تھے۔ اس نے بڑی مربیانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا "آیئے راجا صاحب میں تو جارہا تھا لنچ کرنے بہت دیر کردی آپ نے۔"

راجا نے ہاتھ ملایا "ہاں، اتنا ٹائم تو لگتا ہے ست بدھائی سے...... لنچ آپ ہمارے ساتھ کیوں نہیں کرتے......"

اس نے فوراً ہماری دعوت قبول کرلی۔ دریا کے کنارے بنے ہوئے خوب صورت اور جدید "ٹیولپ" ہوٹل کے ایک گوشے میں بیٹھ کر لنچ کے دوران راجا نے اور میں نے اسے ست بدھائی کے تاریخی جغرافیے سے آگاہ کیا اور پھر اصل مسئلہ بیان کیا۔

دیگر معاملات سے ایس پی کو دلچسپی نہیں تھی۔ وہ ویسے بھی یہاں عارضی طور پر اپنے دن پورے کررہا تھا۔ کچھ عرصے قبل وہ ملتان میں تھا۔ اسے بیک وقت تمام گردیزی اور خاکوانی قسم کے وڈیروں کی خوشنودی حاصل کرنے کا فن آتا تھا اور حد امن کفیل رب کے ساتھ وہ ترقی کرتا جارہا تھا پھر غلط فہمی سے زیادہ غلط بیانی کے باعث اس نے ڈاکوؤں کے ایک گروہ کا قلع قمع کرنے کا ڈراما رچایا اور علاقے کی بہت سی وارداتوں کو مارے جانے والے ڈاکوؤں سے منسوب کرکے دہرا فائدہ حاصل کیا۔ ان کیسز کی فائل بند کرادی اور اپنی اعلیٰ کارکردگی کی سند پر ترقی کے لیے سفارش مانگی۔ وہ تقریباً کامیاب ہوگیا تھا کہ اخبار والوں نے بھانڈا پھوڑ دیا۔ مرنے والے ڈاکو کیا چور بھی نہیں تھے۔ وہ لاوارث دیہاتی تھے۔ ان کے فرار، مقابلے اور مارے جانے کی ساری کہانی خودساختہ تھی۔ مرنے والوں کے پاس اسلحہ تو کیا تن پر پورے کپڑے تک نہ تھے۔ معاملہ کچھ این جی اوز اور وکیلوں کی مدد سے عدالت عالیہ تک گیا اور ماتحت پکڑے گئے۔ ایس پی صاحب وقتی طور پر معطل ہوئے پھر بطور سزا انہیں جہلم بھیج دیا گیا۔

وہ اخبار والوں سے جتنا ناراض تھا اتنا ہی ان سے بنا کر رکھنے پر مجبور تھا اور اسے راجا کی گڈول کا بخوبی اندازہ تھا۔ اس نے سرسری طور پر ہم سے معلومات حاصل کرنے کے بعد کہا کہ علاقہ مذکورہ غالباً نیلہ جوگیاں تھانے کی حدود میں ہے چنانچہ اس وقت تو کچھ نہیں ہوسکتا۔ اگلی صبح ایک ڈی ایس پی کی قیادت میں مسلح پولیس فورس کسی خون خرابے کے امکان کو روکنے کے لیے روانہ کی جائے گی۔ اندیشہ نقص امن کے تحت اس کارروائی کے علاوہ پولیس کسی معاملے میں دخل اندازی نہیں کرے گی۔

راجا نے کہا "ہم فوری کارروائی چاہتے تھے۔"

ایس پی نے بڑی عیاری سے کہا "یہ فوری کارروائی ہی تو ہے آپ ابھی واپس جائیں تو رپورٹ درج کرادیں۔"

"پولیس ہمارے ساتھ کیوں نہیں جاسکتی؟" میں نے کہا۔

"سرجی، آپ کا کیا خیال ہے ڈی ایس پی ادھر فارغ بیٹھا رہتا ہے اور نفری انتظار میں رہتی ہے کہ آپ جیسا کوئی نواب تشریف لائے تو وہ جھٹ کس کے چل پڑیں۔ کچھ وقت تو لگتا ہے فورس تشکیل دینے میں۔"

میں نے راجا کی طرف دیکھا تو اس نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ افسر اعلیٰ کے مزاج کو برہم کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر وہ اڑ جائے تو ضابطے کی کارروائی میں کئی دن ہمیں ٹال سکتا ہے۔ الٹی سیدھی رپورٹ سے خود ہمارے لیے پریشانی کے اسباب پیدا کرسکتا ہے اور بنانے کے بجائے بات کو بگاڑ سکتا ہے۔ شعر تو کچھ یوں ہے کہ حسینوں سے فقط صاحب سلامت دور کی اچھی، نہ ان کی دوستی اچھی نہ ان کی دشمنی اچھی...... فی زمانہ لوگ اس کا اطلاق پولیس پر بھی کرتے ہیں۔

ایس پی بھی جہاندیدہ اور نظر شناس تھا۔ اس نے اندازہ کر لیا کہ ہمیں اس کی عدم دلچسپی ناگوار گزری ہے۔ اس نے اپنا لہجہ بدل کے کہا "ابھی تک مجھے یہ اندازہ بھی ٹھیک سے نہیں ہوا کہ آخر معاملہ کیا ہے اگر تو صرف کرایہ داری کا جھگڑا ہے......"

میں نے سپاٹ لہجے میں کہا "اس کے لیے بیرسٹر فاروقی ہمارے قانونی مشیر ہیں۔"

"آخر کون لوگ ہیں وہ، ناجائز قبضہ ہے ان کا۔"

راجا نے کہا "اگر آپ کی زمین پر کوئی اسی طرح بیٹھ جاتا اور آپ کو قدم نہ رکھنے دیتا آپ جاتے تو اسلحہ تان لیتا۔ پھر آپ اسے کیا کہتے؟"

"مگر آپ نے ان سے معاہدہ کیا تھا۔"

"میں نے نہیں، میرے دادا نے...... وہ لندن سے آئے تھے انہوں نے سائنسی تحقیق کے لیے ایک ریسرچ سینٹر قائم کرنے کی اجازت دی تھی۔"

"قانون کے مطابق آپ اسے ختم کر سکتے ہیں۔ لیکن نواب صاحب ایک چھوٹے سے زمین کے ٹکڑے پر کوئی کام ہو رہا ہے تو چھوڑیں۔"

میں نے برہمی سے کہا "نہ مجھے زمین چاہیے اور نہ میں سائنسی تحقیق کے کام کو روکنا چاہتا ہوں مگر یہ سب کیا ہے؟ مجھے وہاں جانے کی اجازت کیوں نہیں؟"

"اجازت کے بغیر میں بھی اپنے کرائے دار کے گھر میں نہیں گھس سکتا۔"

"مگر وہ کرائے دار نہیں ہیں اور اس قسم کے حفاظتی انتظامات آخر کس لیے؟"

"اپنی حفاظت کے لیے کوئی ایسے انتظامات کرنا چاہے تو کر

سکتا ہے پھر سائنسی تحقیق کے اداروں میں تو سکیورٹی ایسی ہی ہوتی ہے۔"

راجا نے کہا "ایس پی صاحب میں شرط لگا سکتا ہوں کہ وہاں سائنسی تحقیق نہیں ہو رہی ہے۔"

"پھر کیا ہو رہا ہے؟"

راجا نے کہا "میرا خیال ہے کہ وہاں منشیات کا دھندا ہو رہا ہے۔"

ایس پی چونکا۔ "ڈرگز......"

راجا نے کہا "چونکنے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ آپ کے لیے کوئی بڑا انکشاف ہے آخر یہ آپ ہی کا علاقہ ہے۔ آپ کی مرضی کے بغیر یہاں کوئی پودینے کی کاشت ہی کر سکتا ہے؟ مرمرے بیچ سکتا ہے؟"

ایس پی نے کہا "آپ مجھ پر الزام لگا رہے ہیں کہ یہ سب میرے علم میں ہونے کے باوجود ہو رہا ہے۔"

"الزام میں نہیں لگا رہا ہوں۔ پورا پاکستان لگا رہا ہے۔ اٹھا کے دیکھ لیں آج کا کوئی بھی اخبار، ایک آدھ خبر میں پولیس کا نام نامی ضرور ہوگا۔ کسی نہ کسی کالم میں ذکر خیر مل جائے گا...... عدالتیں چلا رہی ہیں۔"

وہ کچھ نرم پڑا۔ "دیکھیے...... میں مانتا ہوں کہ کچھ کالی بھیڑیں تو ہیں اس محکمے میں......"

راجا نے تلخی سے کہا "غالباً آپ ہی واحد سفید بھیڑ ہوں گے ہر پولیس افسر انٹرویو میں ایسا ہی تاثر دیتا ہے اپنے بارے میں۔ خیر اس بحث سے کیا حاصل۔ یہ آپ کا علاقہ ہے کل کو اگر یہاں کوئی منشیات فروشی کا اڈا دریافت ہوتا ہے تو نواب صاحب نہیں پکڑے جائیں گے یہ یہاں تھے ہی نہیں...... امریکا اور لندن میں بھی ڈرگز نہیں بیچ رہے تھے...... آپ کی طرح یہ بھی ابھی آئے ہیں...... مگر آپ اور آپ سے پہلے والے ذمے داری سے نہیں بچ پائیں گے۔"

"او کے...... او کے راجا صاحب، اب آپ نے کھل کے بتا دیا ہے کہ وہاں منشیات کا اڈا ہو سکتا ہے تو میں خود آتا ہوں ریڈ کرنے...... آپ مجھے تھوڑا ٹائم دیں۔ دو گھنٹے، مجھے کچھ قابل اعتماد بندے منتخب کرنے ہوں گے یہ سارا آپریشن سیکرٹ ہوگا۔ اس لیے اب آپ ٹیلہ جوگیاں جا کے کوئی رپورٹ درج نہ کرائیں۔"

اس کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے بات روک کے کہا "ہیلو...... اور پھر دوسری طرف والے کی بات سنتا رہا فون بند کر کے اس نے برا سا منہ بنایا...... لو جی ہو گیا سب کھیل ختم...... اس ملک میں بندہ کیا کارکردگی دکھائے۔"

راجا نے کہا "کیا آپ کا ٹرانسفر واپس ملتان ہو گیا؟"

"او نہیں جی، سکیورٹی ڈیوٹی آ گئی ہے ادھر سے وی وی آئی پی موومنٹ ہے میں چلتا ہوں...... مگر صبح نو بجے کا چھاپا پکا......"

اس نے اپنی کیپ سر پر جما کے ہم سے ہاتھ ملایا اور نکل گیا۔

میں نے کہا "کیا واقعی ادھر سے وی وی آئی پی موومنٹ ہے۔"

راجا نے کہا "پتا چل جائے گا۔ اگر اس نے گڑبڑ کی ہے تو اس کی تو......"

حسب توقع ہم سے بل کی رقم نہیں لی گئی۔ منیجر نے یہ نہیں کہا کہ ایس پی صاحب ہمارے مہمان ہوتے ہیں۔ اس نے کہا کہ بل تو ایس پی صاحب نے جاتے ہوئے ادا کر دیا...... وہ بلاشبہ ایک سمجھدار آدمی تھا۔

واپسی میں راجا نے اس طویل فہرست کے مطابق جہلم سے خریداری کی ہم واپس پہنچے تو شام ڈھل چکی تھی اسی رات کھانے کے بعد میں نے راجا سے کہا "یار کیا تو صحافت کے میدان سے بالکل دستبردار ہو جائے گا؟"

"تو کیا چاہتا ہے نیکے پتر......" وہ بولا۔

میں نے کہا "پتر تیرا اثر رسوخ اسی صحافت کی وجہ سے ہے جو ہمارے کام آ جاتا ہے۔"

وہ بولا "فکر نہ کر، ایک تو میں تعلق ختم نہیں کروں گا۔"

"یہاں رہ کے صحافت کیسے کرے گا؟"

"اب میں کالم لکھوں گا۔ پہلے بھی لکھتا تھا تو جانتا ہے کرائم رپورٹر کے مقابلے میں کالم لکھنے والے کی پہنچ اسلام آباد تک ہو جاتی ہے۔"

صبح میں فون پر رابعہ سے گھر والوں کی خیریت معلوم کر رہا تھا کہ ریشم بدحواس نمودار ہوئی۔ "نواب صاحب، نواب صاحب پولیس آ گئی پولیس......"

میں نے بات جاری رکھی اور اشارے سے اس پر واضح کر دیا کہ میں نے اس کی بات سن اور سمجھ لی ہے مگر اس کی اضطرابی کیفیت کم نہ ہوئی۔ "سر...... وہ آپ کو بلا رہے ہیں...... جی تھانیدار...... تھانیدار صاحب......"

فون بند کر کے میں نے کہا "تم تو ایسے گھبرا رہی ہو جیسے آدم خور شیر آ گیا ہے اور مجھے ناشتے میں کھانے کے لیے بلا رہا ہے۔"

"نو سر، لیکن آپ کو گرفتار کر لیا اس نے...... پھر...... یو نو جیل......"

میں نے ہنس کر کہا "اتنی انگریزی تو میری سمجھ میں بھی نہیں آتی۔ ویسے کیا یہ تمہارا فرض نہیں ہے کہ میری جگہ جیل جاؤ...... اگر جانا پڑے...... وفاداری یہی ہے۔"

"می سر......" اس نے چیخ مار کے سینے پر ہاتھ رکھا۔ "نو، نو مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا...... میں جیل کیوں جاؤں؟"

"کیا تو میں نے بھی کچھ نہیں ہے۔ پھر میں کیوں جیل جاؤں۔ بولو۔" میں نے کہا اور اسے لاجواب چھوڑ کے باہر نکل آیا۔

باہر ایک حیرت انگیز تھانیدار یوں سگریٹ کا دھواں نکال رہا تھا کہ لگتا تھا آگ اس کے دل میں لگی ہے۔ حیرت مجھے اس کا طول و عرض دیکھ کے ہوئی۔ عموماً تھانیدار کدو کی طرح زمین کے ساتھ پھیلتے ہیں...... وہ اوپر جا رہا تھا اور جیسے لوہے کی موٹی سلاخ کو کھینچ کر تار بنا دیا جائے وہ بے حد لاغر بھی تھا...... وردی اس کے ہینگر جیسے جسم پر ٹنگی ہوئی تھی۔

میں نے اس کے قریب جا کے پوچھا "کیا بات ہے تھانیدار صاحب......"

اس نے انگلیوں میں پھنسے سگریٹ کا سوٹا لگا کے ناراضی کا اظہار کیا "اوے تمہیں کیا بتاؤں...... بات کے پتر...... نواب صاحب کو بلاؤ......"

میں نے کہا "نواب رفیق احمد شیرازی میں ہی ہوں......"

وہ ایسے اچھلا جیسے اسے گردن پر بھڑ نے کاٹ لیا ہو۔ اس نے ایک دم سگریٹ پھینک کے جوتے سے مسلی "آپ...... سوری جناب والا...... ویری سوری...... میری آنکھوں کی غلطی تھی......"

غالباً اس کے ذہن میں نواب سے کچھ فلمی اور افسانوی تصورات وابستہ تھے کہ پہلے چوبدار باادب باملاحظہ ہوشیار کی صدا لگاتا آئے گا پھر نواب ریشمی پاجامے انگرکھے اور مرصع پگڑی کے ساتھ سلیم شاہی جوتی پہنے اور گلے میں ہیرے جواہرات لٹکائے نمودار ہوگا۔

میں نے کہا "کہیے صبح صبح کیسے تکلیف کی؟"

اس کا چہرہ نقش فریادی بن گیا۔ اس نے گلوگیر آواز میں کہا "نواب صاحب...... آپ نے افسران اعلیٰ سے شکایت فرما دی۔ ٹھیک ہے ہم نچلے درجے کے افسر ہیں لیکن آپ قواعد و ضوابط کو ملحوظ رکھتے ہوئے پہلے ہمیں مطلع فرماتے۔"

میں نے کہا "میں نے تو تمہاری کوئی شکایت نہیں کی۔"

"حضور والا یہ شکایت نہیں تو اور کیا ہے آپ اتنی دور جہلم تشریف لے گئے ایس پی صاحب کو یہ بتانے کہ میرے علاقے کے منشیات فروش موجود ہیں میں خود ان کی سرکوبی کرتا...... آپ نصف شب کو آ کے بتاتے تو ناچیز اپنی فورس کے ہمراہ روانہ ہو جاتا...... یہ تو ہماری نااہلی سمجھی جائے گی جناب کہ افسران اعلیٰ کو ریڈ کے لیے آنا پڑا۔ اگر یہی کارروائی ہم کرتے تو ہماری بھی ایک درجہ ترقی منظور ہوتی......"

میں نے کہا "اب میں سمجھا، لیکن تھانیدار صاحب یہ تمہارے بس کی بات نہیں تھی۔ تمہارے پاس ڈھائی بندوں کی نفری ہوگی اور ان کے پاس ہوں گی گوروں کے وقت کی رائفلیں جن کا پتا نہیں ہوتا کہ گولی آگے سے نکلے گی کہ پیچھے سے...... وہ جتنے خطرناک لوگ ہیں اس سے زیادہ خطرناک اسلحہ ہے ان کے پاس......"

اس کا چہرہ دکھ سے تاریک ہو گیا...... "سر جی، ضرورت پڑنے پر ہم لاہور سے بھنگیوں کی توپ لا سکتے تھے...... ایک بم بھی پڑا ہے تھانے میں...... ہمارا بندہ پینسٹھ کی جنگ میں سیالکوٹ سے لایا تھا۔ اس کے علاوہ سروس ریوالور ہے میرا۔ اس سے پتا نہیں کتنی لومڑیاں ماری ہیں......"

اس کی گہر افشانی بیچ میں ہی رہ گئی۔ پل کی طرف سے ایس پی کا شاہی کاررواں نمودار ہوا۔ آگے والی جیپ پر نیلی لائٹ گھوم رہی تھی اور اس کے ساتھ مسلح گارڈ بیٹھے تھے...... پیچھے موبائل کہلانے والی دو پک اپ تھیں جن میں چھاپا مار جوان بیٹھے تھے......

تھانیدار کی فرط ادب سے حالت غیر ہو گئی۔ وہ سلیوٹ کے پوز میں منجمد ہو گیا، اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھر گئیں مگر جسم بانس کی طرح لرزتا رہا۔ مجھے اندیشہ یہ تھا کہ افسری کے رعب سے اس کی پتلون گیلی نہ ہو جائے۔ وہ گاؤں دیہات میں لاکھ پھنے خان ہوں ایک نواب اور ایک ایس پی کے سامنے سخت احساس کمتری میں گرفتار تھا۔

ایس پی نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی اور پھر مجھ سے ہاتھ ملا کے بولا "پانچ منٹ ہیں نواب صاحب۔"

تھانیدار یوں نظر انداز کیے جانے پر سخت دکھی تھا۔ آہستہ آہستہ اس کا سلیوٹ والا ہاتھ نیچے آ گیا افسر اعلیٰ نے اس کا جواب بھی نہیں دیا تھا۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھا کے پھر سلیوٹ کیا "سر، اے ایس آئی نبی داد کے لیے کیا حکم ہے۔" اس نے کانپتی آواز میں کہا۔

"تم میگا فون لو...... اور آگے جاؤ۔ حکم دو کہ دروازے کھول دیں اور باہر آ جائیں۔"

میں نے پھر غور کیا۔ تھانیدار کی پتلون ابھی تک خشک تھی مگر یہ حکم اس نے سزائے موت کے فیصلے کی طرح سنا تھا۔ افسر اعلیٰ اسے گولی کھانے کے لیے آگے کر رہا تھا مگر نوکری تو نوکری ہے۔ وہ اسی لرزہ براندام طریقے پر پیچھے ہٹ گیا شاید اسے بلاوجہ آگے جا کے اپنی جان خود داؤ پر لگانے کا صدمہ الگ ہوگا۔

میں نے ایک گارڈ سے کہا کہ وہ جیپ ڈرائیو کرے...... فرخ آگے، میں پچھلی سیٹ پر راجا کے ساتھ بیٹھ گیا اس وقت حویلی میں خواتین کے جذبات کچھ ایسے ہی تھے جیسے لاڈلے رومان پسند شہزادہ خرم عرف جہانگیر کو میدانِ جنگ پر روانہ کرتے وقت جودھا بائی اور اس کی دیگر منکوحات کے ہوں گے۔ بس انہوں نے امام ضامن ہمارے ہاتھ پر نہیں باندھا مگر آنسو بھری آنکھوں سے ہمیں جو وداع کیا جیسے اب میدان حشر سے پہلے ہمارا منہ نظر آنے کی کوئی امید نہیں۔

چند منٹ میں ہم نے درمیانی فاصلہ طے کیا سب انسپکٹر نبی داد کو میگافون کے ساتھ آگے جانا پڑا۔ اس نے جب اعلان شروع کیا تو اس کی آواز ہی نہیں نکلی۔ پتا چلا اس نے یہ آلہ کبھی استعمال نہیں کیا تھا وہ اسے آن کرنا نہیں جانتا تھا پھر جو اس کی آواز نکلی وہ اتنی مضحکہ خیز تھی کہ جہلم شہر سے آنے والی فورس کے لبوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔

چونکہ یہ اندیشہ ہر لحظہ موجود تھا کہ ڈرگ مافیا کے خطرناک رکن پہلا فائر اسی پر کریں گے اور اوپن ایریا میں وہ...... انگریزی محاورے کے مطابق...... لنگڑی بطخ کی طرح نشانے پر تھا چنانچہ اس کی آرزو تھی کہ مرتے وقت اس کے لبوں پر کلمہ ضرور ہو وہ بے ترتیب الفاظ پر مشتمل ہر اعلان کے بعد زیر لب کلمہ دہراتا تھا جو میگافون پر صاف سنا جاتا تھا۔

ایس پی کی ہدایت کے مطابق ہم پیچھے تھے تا کہ بھاگنے میں آسانی ہو اور گولی اس وقت ہم تک پہنچے جب ساری فوج شہید ہو جائے لیکن ایک کے بعد دو منٹ گزر گئے پھر پانچ منٹ...... اندر کوئی نقل و حرکت نہ ہوئی...... آج گیٹ پر بھی وہ گستاخ اور جان لیوا دربان نہیں تھا چنانچہ ایس پی نے کاؤنٹ ڈاؤن کا حکم دیا دس سے الٹی گنتی شروع ہوئی۔

زیرو پر فورس نے یلغار کی...... اندر جاتے ہی انہوں نے کود کود کے چاروں طرف پوزیشن سنبھال لی اور الٹے لیٹ کر اپنی بندوقوں کا رخ بیرک کی طرف کر دیا سب انسپکٹر نبی داد نے ایک بار پھر میگافون پر مجرموں کو حکم دیا کہ وہ شرافت سے باہر آ جائیں۔

اب ایک مجرم باہر آیا۔ لیکن وہ پچاس ساٹھ برس کا سفید بالوں، عینک اور کلین شیو چہرے کے ساتھ تھا۔ اس نے پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی۔ وہ حیرانی سے ہماری طرف دیکھتا رہا۔ اسے ہر طرف سے خطرناک رائفلوں کی نالیاں اپنی طرف نظر آ رہی تھیں۔ پولیس کو دیکھ کر وہ ایسے حیران تھا جیسے وہ مریخ کی مخلوق ہو......

ایس پی آگے بڑھا تو اس کے دائیں بائیں دو کلاشنکوف بردار محافظ بھی آگے بڑھے "اپنے ہاتھ اٹھا لو اوپر......"

اس شخص نے ہاتھ اٹھا لیے "واٹ از آل دس......"

سپاہیوں نے اسے دبوچ لیا اور اس کی تلاشی لینے لگے۔ اس کی جیب میں سے ایک رومال، کنگھا اور والٹ برآمد ہوا۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" وہ چلایا۔

"اندر کون ہے؟" ایس پی نے گرج کے پوچھا۔

"اندر سب ہیں۔ جو ہر روز ہوتے ہیں مگر پولیس یہاں کیا کر رہی ہے، مجھے کیوں پکڑ رکھا ہے؟" وہ شور مچانے لگا۔

"کون ہو تم......؟" ایس پی نے پوچھا۔

"میں اظہر رضوی ہوں، کام کرتا ہوں یہاں......"

"کیا کام کرتے ہو؟" ایس پی کچھ کنفیوز ہوا۔

"وہی جو میرا کام ہے۔ ریسرچ کرتا ہوں۔ آپ نے تو ایسے ریڈ کی ہے جیسے یہ منشیات فروشی کا اڈا ہے۔" اظہر رضوی بولا۔

ایس پی نے اشارہ کیا "انہیں چھوڑ دو......" اور پھر ہمیں آگے بلا کے کہا "نواب صاحب، یہ بندہ کیا کہہ رہا ہے؟"

میں آگے گیا "اظہر صاحب، اندر آپ کے علاوہ کتنے لوگ ہیں اس وقت، ہم دیکھنا چاہتے ہیں یہاں کیا کام ہو رہا ہے۔"

"کس اتھارٹی پر، وارنٹ لائے ہیں آپ لوگ؟"

میں نے کہا "میں مالک ہوں اس جگہ کا، نواب رفیق احمد شیرازی۔"

"آپ پولیس کے بغیر بھی آ سکتے تھے۔" وہ تلخی سے بولا۔

میں نے کہا "کوشش کی تھی میں نے...... دو بار...... لیکن یہاں مسلح گارڈ نے انہوں نے اندر نہیں جانے دیا۔"

اس نے کہا "ٹھیک ہے، آپ اندر آ جائیں...... ہمارے چیئرمین تو ہیں نہیں لیکن ڈائریکٹر ہیں، میں انہیں مطلع کر دیتا ہوں۔"

راجا نے میری طرف اور میں نے راجا کی طرف دیکھا اور نظروں ہی نظروں میں سوال کیا۔ یہ کیا ڈراما ہو رہا ہے یہاں؟ مگر ایس پی کی نظریں کچھ اور ہی سوال کر رہی تھیں۔ وہ اس صورت حال سے سخت ناخوش نظر آتا تھا۔ اس کے ماتحتوں کی نظر میں اس کا آپریشن ایٹم بم ایک پھس ہو جانے والا پٹاخہ ثابت ہو رہا تھا۔ میں اناڑی تھا لیکن وہ خود کو کھلاڑی سمجھتا تھا۔

ہم اندر گئے تو اظہر رضوی نے ہماری رہنمائی کی۔ اندر بڑے بڑے شیشوں والے ہال تھے۔ ان کے پیچھے ماربل ٹاپ میزوں پر سائنسی تحقیق کے آلات کمپیوٹر اور عجیب و غریب چیزیں رکھی تھیں۔ ہر ہال کا منظر تقریبا ایک ہی تھا۔ اندر تیزاب، اسپرٹ اور ایسے ہی کیمیائی محلول کی بو بھری ہوئی تھی۔ ہر ہال میں

دو چار افراد گاؤن پہنے سچ مچ تحقیق کرتے نظر آ رہے تھے۔ وہ سب شکلوں، عینکوں اور حلیوں سے پروفیسر ٹائپ لوگ تھے۔

میری عقل خبط ہونے لگی۔ ایس پی کی نظر میں میری اوقات اس شرابی جیسی ہو گئی جس نے رسی دیکھی ہو اور گاؤں میں دہشت پھیلا دی ہو کہ پچاس فٹ لمبا اور پانچ فٹ موٹا اژدھا لوگوں کو کھا رہا ہے۔ وہ سب جو ہم نے دیکھا تھا کسی خواب پریشاں جیسا بن گیا تھا۔ نہ یہاں مسلح محافظ تھے اور نہ خطرناک مجرم۔ سکیورٹی کے انتظامات اپنی جگہ تھے مگر ان کو قابل اعتراض یا غیر قانونی قرار نہیں دیا جا سکتا تھا......

میری عقل خبط ہو رہی تھی کہ وہ سب میری نظر کا دھوکا تھا جو پہلے دیکھا تھا یا اب جو کچھ دیکھ رہا ہوں وہ عقل کا فریب ہے کہیں نہ کہیں گڑبڑ ضرور تھی۔ ایک حقیقت تھی جس پر بڑی ہوشیاری سے پردہ ڈالا گیا تھا اور ظاہر ہے یہ کھیل راتوں رات رچایا گیا تھا۔

اظہر رضوی جس کے بارے میں بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ریسرچ اسکالر ہے ہمیں ڈائریکٹر کے کمرے میں لے گیا۔ اس کے کمرے کے باہر دروازے پر جو نام کی تختی لگی ہوئی تھی اس پر فضل کریم عباسی کے بعد ڈائریکٹر ریسرچ سینٹر اور پھر اس کی بہت سی ڈگریاں درج تھیں۔ ان میں ایک امریکی یونیورسٹی کی تھی، دوسری آسٹریلیا کی وہ ساٹھ سال کے قریب عمر کا لمبا چوڑا گورا چٹا اور خوش پوش شخص تھا۔

وہ پولیس کارروائی سے سخت خفا تھا۔ "یہ ایک غیر قانونی اقدام ہے پولیس جہاں چاہے نہیں گھس سکتی۔"

ایس پی نے خود کو بچایا "ہمیں نواب رفیق احمد شیرازی نے کچھ اور اسٹوری سنائی تھی۔"

"یہ کون نواب ہے۔"

میں نے کہا "یہ میرا نام ہے میں اس سارے علاقے کا مالک ہوں جس پر یہ سینٹر موجود ہے ہارورڈ سے ایم بی اے کرنے کے بعد دو سال لارڈ ارنسٹ کی فرم میں وائس پریذیڈنٹ رہا۔ پھر یہاں آنا پڑا۔"

وہ کچھ متاثر ہوا۔ "آپ کو شکایت تھی تو میرے پاس آتے۔"

ایک بار پھر میں نے اس کو مختصراً وہ سب بتایا جو میں نے دیکھا تھا اور تجربہ کیا تھا۔ "اب کوئی کہے کہ میں نشہ کرتا ہوں یا میں نے خواب دیکھا تھا تو میں تسلیم نہیں کروں گا۔ حقیقت کیا ہے معلوم ہو جائے گا۔"

"آپ کی نظر کے سامنے ہے جو ہے۔" وہ بولا۔

میں نے کہا "میں آپ سے کچھ پوچھ سکتا ہوں۔ اپنی معلومات کے لیے اسے آپ تفتیش سمجھ کر جواب نہ دینا چاہیں تو آپ کی مرضی۔"

"پوچھیے نواب صاحب، آپ کو مطمئن رکھنا میری ذمے داری ہے۔"

میں نے کہا "یہاں آپ کس قسم کی ریسرچ کرتے ہیں؟"

"ماحولیات اور زراعت ہمارا خصوصی شعبہ ہے۔ زراعت میں جینیٹک انجینئرنگ...... آپ نے دیکھا ہو گا اب آم کے درخت اوپر نہیں جاتے، نیچے پھیلتے ہیں۔ تربوز چھوٹے آنے لگے ہیں۔ کینو میں بیج کم ہیں، خربوزے کی دو فصلیں ہوتی ہیں......"

میں نے کہا "میں سمجھ گیا کیا یہ کوئی حکومتی ادارہ ہے۔"

"نو سر۔"

میں نے کہا "پھر کیا ہے۔ ریسرچ کے لیے فنڈ کہاں سے آتے ہیں۔"

وہ بولا "یہ آؤٹ کا سوال ہے۔ ہم پرائیویٹ سیکٹر کے فنڈ سے آپریٹ کرتے ہیں۔"

"آپ نے بطور خاص اس جگہ کو کیوں منتخب کیا تھا؟"

"یہ اعتراض تو ہر جگہ ہو سکتا تھا۔" وہ بولا "ایک شخص نے ہمیں جگہ دی...... دوسرے نے ایکوپمنٹ دے دیا۔"

میں نے کہا "زمین دینے والے عقیل احمد مرحوم میرے دادا تھے وہ برطانیہ سے آئے تھے۔"

"ریسرچ میں تعاون کرنے والے انسان دوست تو خیر ہوتے ہیں ملک دوست بھی ہوتے ہیں اور علم دوست بھی۔"

میں نے کہا "اگر آپ کی سرگرمیاں درحقیقت وہی ہوں جو آپ بتا رہے ہیں اور نظر بھی آ رہی ہیں تو میں مزید تعاون کروں گا۔ لیکن سینٹر کو کسی اور مقصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے تو شاید میں یہ سہولت واپس لوں گا۔"

"ہم ایک معاہدے کی رو سے بیٹھے ہیں یہاں۔ غیر قانونی قبضہ نہیں کیا ہے ہم نے...... نہ ہم کرائے دار ہیں۔" وہ گرمی دکھانے لگا۔

میں نے کہا "آپ کے پاس لیز بھی نہیں ہے۔ یہ ایک سہولت ہے جو اس وقت تک برقرار رہے گی جب تک یہاں کوئی غلط کام نہیں ہو گا بصورت دیگر میں معاہدہ منسوخ بھی کر سکتا ہوں۔"

"اس کے لیے آپ ہمارے چیئرمین سے بات کریں یہ ایک قانونی معاملہ ہے۔"

"رائٹ، بیرسٹر فاروقی کی طرف سے آپ کو نوٹس ملے گا۔ کہ سابقہ مالکان کے انتقال کے بعد وہ معاہدہ کالعدم ہو گیا ہے آپ نیا معاہدہ مجھ سے کریں گے۔ نئی شرائط کے ساتھ۔ آپ کا

یہ کام جاری رہے گا مگر مجھے بھی کچھ حقوق حاصل ہوں گے خصوصاً اس لیے کہ اب میں یہاں ہوں اور یہ جگہ بہرحال میری ملکیت ہے۔ میرے کچھ پلان ہیں اور کچھ پروجیکٹس پر کام بھی شروع ہو گیا ہے۔ اسکول، اسپتال۔ ایک پاور پروجیکٹ دریائے کنہار پر۔ ایک انڈسٹریل اسٹیٹ۔''

ایس پی اور ڈائریکٹر خاموشی سے سنتے رہے۔ انہیں اندازہ ہو رہا تھا کہ میں صرف نام کا نواب یا روایتی جاگیردار نہیں ہوں۔ میں نے ان سے معذرت کی کہ غلط فہمی کی بنا پر انہیں زحمت ہوئی۔ ایک گھنٹے بعد ہم چائے پی کر نکلے تو میری الجھن کم نہیں ہوئی تھی بڑھ گئی تھی۔

ایس پی نے چلتے چلتے کہا ''نواب صاحب، یہ گورنمنٹ کا ٹائم تھا جو اس بے مقصد کارروائی کی نذر ہو گیا۔''

راجا نے کہا ''مجھے معلوم ہے اس وقت بھی کئی بامقصد کارروائی آپ اپنے آفس میں بیٹھ کے کرتے۔''

میں نے بات کو آگے بڑھایا ''اس کے علاوہ، جو کچھ میں نے کہا تھا اور جو آپ کو نظر آیا...... اس پر میں شرمندہ نہیں...... کنفیوز ہوں یہاں کوئی گڑبڑ ہوئی ہے ہمارے ساتھ گیم کھیلا ہے کسی نے۔''

ایس پی بولا ''مجھے تو کوئی گیم نظر نہیں آتا۔''

راجا بولا ''جب ہمارے پاس ثبوت ہوگا تو ہم بتائیں گے کہ گیم کیا تھا کسی نے راتوں رات جھرلو پھیرا ہے پورا سیٹ بدل دیا گیا ہے۔''

میں نے کہا ''براڈوے میں گھومنے والے اسٹیج کے پیچھے بالکل مختلف سین ہوتا ہے۔ لائٹ آف ہو کے چند سیکنڈ میں آن ہوتی ہے تو پیچھے کا منظر سامنے آجاتا ہے۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی جادو دکھایا گیا ہے۔''

''ہم معلوم کرلیں گے۔'' راجا نے ہاتھ ملایا۔ ''پولیس ریڈ اکثر ناکام ہو جاتے ہیں اور ایسا اناڑی پن سے نہیں ہوتا۔''

اس کا موڈ خراب ہوا۔ ''آپ کا مطلب ہے مخبری ہوگئی۔ ریڈ کی بات لیک آؤٹ ہوگئی۔ میں نے تو روانگی سے پہلے کسی ماتحت کو نہیں بتایا تھا۔''

''سوائے سب انسپکٹر نبی داد کے...... وہ آپ سے پہلے روتا پیٹتا آگیا تھا کہ ہم نے اس کی شکایت کیوں کی۔ بائی دا وے ایس پی صاحب کل کس وی وی آئی پی کی موومنٹ تھی۔ کون جا رہا تھا ادھر سے اور کہاں...... آپ کی ڈیوٹی تھی...... آپ کو تو معلوم ہو گا......''

ایس پی غصے میں جیپ میں بیٹھ گیا ''اتنے توپ صحافی ہو تم معلوم کرلو......''

راجا نے اس کے جانے کے بعد اسے گالی دی۔ ''میرے سامنے ڈراما کرتا ہے میں شرط لگا سکتا ہوں کہ اس نے ہمیں ٹالا تو اس نے ٹائم لیا تھا ایسے ہی کسی پچویشن کو کیش کرایا جاتا ہے۔''

میں نے کہا ''میں آج ہی فاروقی سے نوٹس جاری کراتا ہوں۔''

''اس سے کچھ نہیں ہوگا نیکے پتر...... ہمارے مقابل اناڑی نہیں ہیں وہ معاملے کو عدالت میں کھینچتے رہیں گے سالہا سال...... ہائی کورٹ سے سپریم کورٹ تک لے جائیں گے۔ قانون کی کمزوری سے شہ زور ہی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ آج کل...... مزید جان جلانے سے کچھ حاصل نہیں۔''

اس کے باوجود ہم سارا دن خون جلاتے رہے۔ ان تمام واقعات کو یاد کر کے جو آج صبح کی بوگس کارروائی سے پیش آئے تھے۔ شہناز اپنے کام میں زیادہ معروف تھی۔ وہ سرونٹ کوارٹرز کے سارے مکینوں کا مکمل چیک اپ کر رہی تھی اور ان کو حفاظتی ٹیکے لگانے کا تہیہ کر چکی تھی۔

فریال نسبتاً فارغ تھی۔ اس نے ہمارا خاصا مذاق بنایا۔ پہلے دوپہر کے کھانے کے وقت اس نے پوچھا...... راجا جی، آپ بھی اسی سے شوق کرتے ہیں۔''

راجا نے بے خیالی میں کہا ''کس سے؟''

''مجھے کیا معلوم، وہی جس کا دماغ پر اثر ہو تو آدمی کو ایسے ڈراؤنے مناظر نظر آتے ہیں۔ ریسرچ اسکالر لگتے ہیں ڈرگ ڈیلر...... کلاشنکوف اور مشین گن والے دکھائی دیتے ہیں۔''

میں نے کہا ''ہاں، ہم دونوں ایک ہی نشہ کرتے ہیں۔ اس لیے ہمیں تم جیسی بھی حور پری لگتی ہے۔''

''یار تم تو برا مان گئے۔ پرسنل ہونے کی کیا ضرورت ہے۔'' وہ ہنسی۔ ''تم دیکھنا اب یہ ایس پی تمہارے ساتھ کیا کرتا ہے۔''

راجا نے بھنا کے کہا ''کیا کرے گا...... پھانسی لگا دے گا۔''

''آف کورس...... انصاف آپ کی دہلیز پر...... وہ یہاں آکے پھانسی دے گا آپ کو...... حکومت آپ کی فلاح چاہتی ہے۔''

میں نے کہا ''فلاح چاہتی تو تم جیسی خطرناک چیزوں کو معصوم نوجوانوں سے دور رکھتی۔ تم کیا ہیروئین سے کم تباہ کن ہو۔''

''میں ہیروئین ہوں مگر فلمی...... کیوں نیکے پتر۔ جولی رابرٹس کیا بیچتی ہے میرے آگے......''

''اسے چار اڑا ڈالنا چاہیے تمہارے سامنے کیونکہ تم اللہ میاں کی دیسی گائے ہو...... مرکھنی گائے۔''

ہم کچھ دیر خاموش رہے تو فریال نے پھر چھیڑ خانی شروع کی۔ اس نے شہناز کو مخاطب کیا۔ ''ڈاکٹر صاحب...... آپ نے وہ تین بندر دیکھے ہیں؟''

شہناز نے کہا ''کون سے تین بندر؟''

فریال نے میری، راجا اور فرخ کی طرف دیکھا۔ ''وہ تین بندر جو مشہور ہیں برا مت بولو...... برا مت سنو...... برا مت دیکھو......''

شہناز نے کہا ''انسان پہلے بندر تھا...... ڈارون کہتا ہے۔''

میں نے ایک آہ بھری...... ''انسان بندر ہی رہتا تو اچھا تھا۔''

راجا بولا ''ہاں یار...... عشق کے چکر میں آدمی جوکر بن جاتا ہے۔''

''اور بالآخر شوہر......'' میں نے کہا۔

رات تک یہی سلسلہ چلتا رہا...... رات کو میں اور راجا آئندہ کے لائحہ عمل پر غور کر رہے تھے کہ گیٹ والا گارڈ اندر آیا۔

''نواب صاحب آپ سے کوئی ملنے آیا ہے...... بہت لمبی سیاہ گاڑی ہے ایک بہت خوب صورت خاتون ہیں۔ وردی والا ڈرائیور ہے۔''

میں نے کہا ''نام نہیں پوچھا تم نے۔''

''گاڑی تو اندر آگئی ہے نواب صاب۔'' ڈرائیور نے سر کھجا کے کہا۔

جب میں باہر نکلا تو اکبر خان اتر چکا تھا اور نازنین کے لیے دروازہ کھول رہا تھا...... میں نے روشنی میں آنکھیں پھاڑ کے دیکھا مگر شک کی گنجائش ہی نہ تھی۔ اکبر خان بہترین سوٹ میں تھا اور ٹائی لگا رکھی تھی۔

اس نے قریب آکے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ ''نواب صاحب، میں بات کرنے حاضر ہوا تھا اس سینٹر کے بارے میں......''

میں اس کے ہاتھ کو دیکھتا رہا۔

اکبر خان کے آگے بڑھے ہوئے ہاتھ کی طرف دیکھتے ہوئے میرے دل میں کراہت اور نفرت کے ایسے جذبات پیدا ہوئے جیسے وہ کسی دوغلے سانپ کا پھن ہے یا کسی بھنگی کا گٹر کی غلاظت میں لتھڑا ہوا ہاتھ ہے۔

پھر مجھے خیال آیا کہ بھنگی بھی تو انسان ہوتا ہے اور اکبر خان ایک نمک حرام ملازم، ایک خطرناک مجرم اور باپ کا قاتل سہی مگر اس وقت وہ میرے دروازے پر کھڑا ہے اور اس کی حیثیت مہمان جیسی ہے۔

لیکن ذہن نے اس خیال کو فوراً مسترد کر دیا۔ ایسا شخص کسی عزت کا مستحق نہیں سمجھا جا سکتا اور نہ میرا مہمان ہو سکتا ہے۔ اس کے ساتھ تذلیل کا رویہ اختیار کرنا اور اسے اپنی اوقات یاد دلانا کوئی غیر اخلاقی بات نہیں بلکہ دیکھا جائے تو یہ ایک معاشرتی ذمے داری ہے کہ ایسے لوگوں کو بے عزت سمجھا جائے۔

میرے تذبذب نے اکبر خان کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنا ہاتھ واپس کھینچ لے۔ اس کے ساتھ بزنس پروموشن کی پی آر چلانے والی نازنین اپنے حسن و شباب اور ناز و انداز کے سارے ناکارہ اسلحے سے لیس ہو کے آئی تھی۔ یہ فرض کرنا مشکل تھا کہ یہ تیاری اس نے مجھے متاثر کرنے کے لیے کی ہوگی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ میں اس قماش کا آدمی نہیں ہوں۔ اس کا یہ خودنمائی کا انداز ایک عادت بن چکا تھا۔

میں نے اکبر خان کو اندر آنے کی دعوت نہیں دی۔ میں نے اپنے چہرے پر زیادہ رعونت اور ناگواری کے جذبات طاری کیے اور دروازے کو اپنے پیچھے بند کر دیا پھر میں نے کہا ''کیوں اکبر خان! یہ تم نے کیسے فرض کر لیا کہ اپنی جاگیر کے معاملات پر میں تم سے بات کروں گا۔ کیا سوچ کے تم نے یہ بات کہی؟''

اس نے خفت سے کہا ''دیکھیے...... میں آپ سے ایسی بداخلاقی کی توقع نہیں رکھتا۔''

''کیوں، اب یہ سوٹ پہن کے اور اس کار سے اتر کے کیا تم میری نظر میں معزز ہو جاؤ گے۔ یہ توقع تھی تمہیں؟ میں بھول جاؤں گا کہ تم میرے جدی پشتی ملازم تھے، جس کی زندگی اس سرونٹ کوارٹر میں گزری...... میرا نمک کھاتے۔''

''نواب صاحب! یہ آپ کے فائدے کی بات تھی۔''

میں نے کہا ''شٹ اَپ! اپنا نفع نقصان میں خود سمجھتا ہوں اور مجھے مشورہ دینے والے مخلص دوستوں کی کمی نہیں۔ ابھی مجھ پر اتنا برا وقت نہیں آیا کہ میں تم جیسے منشیات فروشوں کے کتے، باپ کے قاتل، چور اور ڈاکو سے کوئی مشورہ لوں۔''

اب نازنین نے صورتِ حال سنبھالنے کے لیے انگریزی کا سہارا لیا اور بڑی ادا سے آنچل گرا کے اور بالوں کو جھٹک کے آگے آئی ''سر! جانے دیں اکبر خان کو، کیا میں کچھ کہہ سکتی ہوں؟''

میں نے اسے اردو میں جواب دیا ''خاتون! میں آپ کو صرف اکبر خان کی بیوی کی حیثیت سے ہی جانتا ہوں اور اکبر خان کی بیوی سے مشورہ کرنا ہو تو یہاں اس کی پہلی وفادار بیوی موجود ہے جو میرے لیے زیادہ قابلِ احترام ہے۔''

''آپ میری انسلٹ کر رہے ہیں؟'' وہ ناراض لہجے

میں بولی۔

میں نے کہا ''ایسی تو کوئی بات نہیں، جو میں دیکھ رہا ہوں اور سن رہا ہوں، اس کی بنیاد پر میں آپ کو بتا دوں کہ میری نظر میں آپ کیا ہیں۔ پھر آپ کو یقیناً بے عزتی محسوس ہوگی۔''

اچانک راجا باہر آ گیا شاید اس نے میری آواز کے بعد نازنین کی گفتگو سن لی تھی۔ اس کے لیے بھی اکبر خان کے ساتھ نازنین کو ایسے دیکھنا حیرانی کا سبب بنا ''کیا بات ہے، کیوں آئے ہیں یہ لوگ؟'' وہ بولا۔

میں نے تلخی سے کہا ''ملاحظہ ہو ذرا اس شخص کی جسارت۔ باہر تو جو ڈرامے کرتا پھرتا ہے اپنی جگہ، یہاں یہ مجھ سے ریسرچ سینٹر کے معاملات پر بات کرنے آیا ہے، میرا سابق چوکیدار۔''

اکبر خان نے کچھ فریاد اور کچھ احتجاج آمیز لہجے میں کہا ''راجا صاحب، ویسے میں آپ کے ہی فائدے کی بات کرنے آیا تھا۔''

''اتنا نقصان پہنچانے کے بعد؟'' میں نے دھاڑ کے کہا ''تمہارے فائدے میں یہی ہے کہ نکل جاؤ یہاں سے۔ دفع ہو جاؤ، اس سے پہلے کہ میں......''

راجا نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھا ''ایک منٹ نواب صاحب!'' پھر وہ اکبر خان سے مخاطب ہوا ''بولو، کیا کہنا چاہتے ہو؟''

اکبر خان کا رنگ کچھ بحال ہوا ''میں لگی لپٹی بات نہیں کروں گا، آپ اس ریسرچ سینٹر کو خالی نہیں کرا سکتے۔''

راجا نے کہا ''ہمیں اپنے قانونی اختیارات کا علم ہے۔''

''آپ شاید معاہدے پر انحصار کریں گے اور کورٹ میں جائیں گے۔''

راجا نے کہا ''کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے۔''

''اس سے کچھ بھی نہیں ہوگا۔'' اکبر خان نے کہا ''آپ کا بہت وقت اور پیسا ضائع ہوگا۔''

''وقت بھی ہمارا ہے اور پیسا بھی ہمارا۔'' میں نے کہا ''تم اپنی فکر کرو، فراڈیے...... ڈرامے باز۔'' میں نے دھاڑ کر کہا۔

راجا نے کہا ''اپنی بات کہہ دی تم نے...... اب تم جا سکتے ہو۔'' نازنین کا چہرہ احساسِ تذلیل سے زرد پڑ گیا تھا ''چلو، یہ لوگ سمجھنا ہی نہیں چاہتے، اپنی بے عزتی کرانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔''

میں نے غصے سے کہا ''بے عزتی ہوتی ہے عزت داروں کی۔ جیسے طوائف کی عصمت نہیں ہوتی، ایسے ہی کسی دلّال کی عزت نہیں ہوتی۔''

اکبر خان کا چہرہ سرخ پڑ گیا اور کسی جگہ یہ گالی برداشت نہ کرتا لیکن اسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ یہاں اس کی اوقات دھوبی کے کتے سے بھی بدتر ہے اور میں اس کے ساتھ رسمی اخلاق کا مظاہرہ کرنے پر بھی تیار نہیں۔ نازنین پہلے تڑپ کے پلٹی اور گاڑی میں جا بیٹھی۔

اکبر خان نے خود پر قابو پا کے اپنی عزت بچائی اور ایک آخری کوشش کی ''جو لوگ یہ جگہ استعمال کر رہے ہیں، وہ اس جگہ کو استعمال کرنے کا بہت اچھا معاوضہ ادا کرنے کے لیے تیار ہیں۔''

اس سے پہلے کہ میں کسی ردِعمل کا اظہار کرتا راجا نے مجھے پھر روک لیا ''کون لوگ ہیں وہ؟''

''آپ انہیں نہیں جانتے، وہ انتہائی بااثر اور خطرناک ہیں۔''

راجا نے سر ہلایا ''تمہارا ان کے ساتھ کیا تعلق ہے، تم ان کے ملازم ہو یا پارٹنر؟''

''میں ایک پارٹنر ہوں۔''

راجا نے کہا ''اس لیے ان کے بارے میں جان گئے ہو کہ وہ بااثر ہیں اور خطرناک ہیں اگر تم کچھ عرصہ ہمارے ساتھ رہتے تو تمہیں اندازہ ہو جاتا کہ کون زیادہ بااثر اور خطرناک ہے...... ہم یا وہ...... خیر، تم فائدے کی بات کر رہے تھے، فائدے کی وضاحت کرو۔''

اکبر خان کا حوصلہ بڑھ گیا ''آپ کے کچھ فلاحی منصوبے ہیں، وہ ان کے لیے سرمایہ فراہم کر سکتے ہیں، سامنے آئے بغیر۔''

''ہوں......'' راجا نے سوچتے ہوئے کہا ''کتنا سرمایہ؟''

''ایک کروڑ سالانہ تک۔''

راجا نے ایک مصنوعی انداز میں منہ گول کر کے سیٹی بجائی ''مائی گڈنس...... ایک کروڑ! اور اس کے عوض وہ کیا توقع رکھتے ہیں؟''

''کچھ نہیں۔ آپ اپنا کام کریں، ان کے کام میں دخل نہ دیں۔''

''اور اگر ہم یہ آفر قبول نہ کریں تو......؟''

''ان کی تائید و حمایت کے بغیر...... آپ یہاں کچھ نہیں کر سکتے۔''

میں نے بگڑ کے کہا ''بس راجا! بہت ہو گئی، جوتے مار کے نکال دے اسے۔''

راجا نے کہا ''اکبر خان! تین منٹ میں یہاں سے نکل جاؤ...... اور دوبارہ اپنی صورت دکھانے یہاں مت آنا ورنہ مارے جاؤ گے کتے کی موت۔''

اکبر خان گاڑی میں جا بیٹھا۔ تین منٹ پورے ہونے سے پہلے ہی گاڑی گیٹ سے نکل گئی پھر میں نے دیکھا تو مجھے اپنے پیچھے فرخ نظر آیا۔ اس کے پیچھے کھلے دروازے میں زریاب موجود تھی اور اس کے ساتھ شہناز کھڑی تھی۔ انہوں نے بھی اکبر خان کے ساتھ ہونے والی ساری گفتگو سنی تھی۔ جذباتی کیفیت سب کی ایک جیسی تھی۔ ایک کروڑ کے عوض منشیات فروشی کے اس اڈے کو لائسنس دینے کا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

سوچنے کی بات یہ تھی کہ اکبر خان نے جن لوگوں کا حوالہ دیا تھا کہ وہ بااثر اور خطرناک ہیں۔ کیا واقعی وہ ہمیں نقصان پہنچا سکتے تھے اور کیا واقعی ان کی تائید و حمایت کے بغیر ہم اپنے پروگرام پر عمل نہیں کر سکتے تھے؟

اس دھمکی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ بدقسمتی سے گزشتہ نصف صدی کے دوران میں رفتہ رفتہ دولت مندی نے تمام اخلاقی، قانونی اور مذہبی یا معاشرتی قدروں پر بالادستی حاصل کر لی تھی۔ ایک بہت بڑا طبقہ ایسا پیدا ہو چکا تھا جو تمام ناجائز ذرائع سے حاصل ہونے والی دولت کے بل پر فرعون کی طرح خدائی کا دعوے دار سمجھا جاتا ہے۔ جو سیاہ و سفید کا مالک تھا اور ملک میں جنگل کے بادشاہ کی طرح کسی کو بھی شکار کر سکتا تھا۔ قانون کو، انسانوں کو، اصولوں کو، حکومتوں کو۔ ان کی مطلق العنانی شیطان کی طرح تھی جس سے سب پناہ مانگتے تھے۔ اس کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا تھا۔

صبح میں نے یہ محسوس کیا کہ ایک کروڑ کی طاقت نے کسی حد تک سب کی مزاحمت کو کم کیا ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ میری طرح راجا کے خیالات نہیں بدل سکتے۔ رات کو ہم نے اتفاق رائے سے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا تھا اور سکون سے سو گئے تھے، کم سے کم میرا یہی خیال تھا۔

لیکن ایسا نہیں تھا، سونے سے پہلے سب اکبر خان کے بارے میں سوچتے رہے تھے۔ اس کا کردار ابتدا سے ڈرامائی تھا۔ وقفے وقفے سے اس کی شخصیت کسی نئے روپ میں نمودار ہو کے حیران کرتی رہی تھی۔ وہ مجھے روپوشی کے بعد ایک ٹاپ کلاس ریسٹورنٹ میں نازنین کے ساتھ نظر آیا تھا تو اس کی ٹیبل پر دو غیر ملکی بھی بیٹھے تھے لیکن میں نے اس سے بات کرنے کی کوشش کی تو اس نے مجھے پہچاننے سے بھی انکار کر دیا تھا اور اکبر خان ہونے سے بھی پھر وہ میری ہوشیاری اور جاسوسی کے باوجود چکمہ دے کر فرار ہونے میں کامیاب رہا تھا۔

آج وہ پھر بڑی شان سے نمودار ہوا تھا۔ یہ ناقابلِ تصور سی بات لگتی تھی کہ اکبر خان اسی حویلی کے سرونٹ کوارٹر میں رہتا تھا۔ اگر اس کے روابط ایک کروڑ سالانہ دے کر منشیات فروشی کے ٹھکانے پر قبضہ برقرار رکھنے والے کسی گروہ سے تھے اور وہ ان کا شریکِ کار تھا تو اس سرونٹ کوارٹر میں کیوں تھا؟ وہ ریسرچ سینٹر میں چوکیدار بن کر کیوں ڈیوٹی دے رہا تھا؟

چوکیداری والی بات تو سمجھ میں آتی تھی، اس طرح وہ مجھے روکنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ مجھے پہچانتا تھا اور شاید میری تشریف آوری کے زمانے میں یہاں اس لیے موجود تھا کہ میرے عزائم کا اندازہ لگائے اور اوپر والوں کو باخبر رکھے۔ سرونٹ کوارٹر میں اس کی رہائش ناقابلِ فہم تھی۔

رفتہ رفتہ میرے ارادے بھی واضح ہو گئے تھے اور اکبر خان کی پراسرار شخصیت کا راز بھی فاش ہو گیا تھا۔ معلوم نہیں اس کا رابطہ منشیات فروشوں کے گروہ سے کب اور کیسے ہوا؟ میں صرف اندازہ کر سکتا تھا کہ نصف صدی سے زائد عرصے تک لاوارث اور غیر آباد رہنے والی یہ جاگیر اور حویلی نہ جانے کس کس کی نظر میں ہوگی۔ کون کون اسے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہوگا اور اس پر غاصبانہ قبضہ کرنے کی فکر میں ہوگا۔ پاکستان میں غریب کی جھونپڑی سے ایوانِ صدر تک کسی بھی جگہ پر غاصبانہ قبضے کی روایت پرانی ہے۔ یہ جگہ بھی خفیہ اڈا چلانے کے لیے ہر لحاظ سے موزوں تھی۔ منشیات فروشوں کی نگاہ میں آئی تو انہوں نے اکبر خان کا اسی طرح انتخاب کیا جیسے امریکی اپنے عزائم کی تکمیل کے لیے پاکستان میں حکمراں کا انتخاب کرتے ہیں اور اکبر خان ان کی توقعات پر پورا اترا تو مالا مال بھی ہو گیا۔

یہ اس کی ترقی کا نقطۂ عروج تھا کہ آج وہ برابری کی بنیاد پر مجھ سے ایک سودا کرنے آیا تھا۔ میرے سامنے اس نے ایک کروڑ کی آفر رکھی تھی۔ محمود و ایاز کی مساوات تاریخ کا افسانہ تھی۔ یہاں ایاز نے محمود کو چیلنج کر دیا تھا کہ وہ اس سے زیادہ طاقتور ہے۔ پرانے وقتوں کے لوگ ایسے ہی موقع پر کہتے تھے۔ موری کی اینٹ چوبارے چڑھی۔ یہاں موری کی اینٹ پورا چوبارہ بن رہی تھی۔

اکبر خان کی شخصیت کے کئی روپ تھے۔ اس لیے مجھے خیال آیا کہ کیا اس کے نام بھی مختلف ہوں گے۔ مایا تیرے

تین نام۔ پرسا پرسو پرس رام۔ اکبرے وہ اکبر خان ہوا، اب چوہدری اکبر خان صاحب ہوگیا۔ دنیا کی نظر کا معیار اب کچھ اور ہے۔ عزت کا پیمانہ بھی دولت ہے۔ حسابی قاعدے سے ہر چیز کی پیمائش ہوتی ہے۔ زمین اور خلا کے فاصلے، رفتار یا وزن کی طرح عزت کو بھی اعداد و شمار سے ڈالرز میں بتایا جاسکتا ہے۔ فلاں کی عزت ایک کروڑ ڈالرز، فلاں کی ایک ارب...... اور سب کچھ نہیں، علم، تقویٰ و پارسائی، بزرگی، کمال فن......ان کی کیا عزت!

رات کی صبح ہوئی تو مجھے یہ جان کر افسوس سے زیادہ حیرانی ہوئی کہ باقی لوگوں کے خیالات میں کس حد تک تبدیلی رونما ہوئی ہے۔ اس کا اظہار سب سے پہلے فرخ کی طرف سے ہوا۔

اس نے موقع پا کے کہا ''رفیق بھائی! اکبر خان کی پیشکش کے بارے میں آپ نے کیا سوچا؟''

میں نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا ''فضول باتوں پر سوچنے کے لیے میں اپنے دماغ کو زحمت نہیں دیتا۔''

اس نے قدرے توقف کے بعد کہا ''کیا آپ میری بات سنیں گے؟''

میں نے کہا ''میرے کان کھلے ہوئے ہیں۔''

''اور تمہارے لب بولنے کے لیے آزاد ہیں؟'' فریال نے کہا۔

''میری رائے یہ ہے کہ اس پیشکش پر غور کیا جائے۔''

''ساٹھ سال سے تمام ملکی مسائل پر غور ہو رہا ہے، صرف غور...... چنانچہ مسائل میں ماشاءاللہ خوب اضافہ ہوا ہے۔'' راجا بولا۔

پھر فریال نے کہا ''فرخ کا مطلب ہے ہمیں اس پیشکش کو قبول کر لینا چاہیے۔''

راجا نے کسی فلسفی کی طرح ارشاد کیا ''معاشیات کو اخلاقیات سے الگ رکھنا پڑتا ہے۔''

''اخلاقیات کو بھی جذبات سے الگ رکھنا چاہیے۔'' فریال بولی۔

میں نے چائے کا مگ خالی کر کے رکھا ''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ صرف پیسا کمانا چاہیے، اس کے جائز اور ناجائز ذرائع کی کوئی اہمیت نہیں؟''

''کالا دھن اور سفید دھن...... سب آدمی کے دماغ میں ہوتے ہیں۔ دولت کا کوئی رنگ نہیں ہوتا۔'' فریال نے کہا۔

''پھر کیا خیال ہے، ہم سب کو ایک گروہ بنا لینا چاہیے۔ ہم ڈاکے ڈالیں، تاوان کے لیے لوگوں کو اغوا کریں یا اکبر خان کے گروہ میں شامل ہو جائیں، کارِ خیر اپنی جگہ!''

راجا نے کہا ''فیکے پتر! کیا دنیا میں ایسا نہیں ہو رہا ہے؟ بھارت نے کشمیر کو غصب کیا۔ یہودیوں نے فلسطین کو۔ کیا دنیا نے انہیں مطعون کر کے ان کا حقہ پانی بند کیا؟ خود اپنے پاکستان میں کیا نظر آتا ہے ہر طرف! جمہوریت، اسلام، انصاف......ان سب کے ٹھیکے دار کون ہیں؟''

فریال نے کہا ''تم بات کو گھما کے حقیقت سے نظر چرانا چاہتے ہو۔ ہم چوری، ڈکیتی کرنے کی بات نہیں کر رہے تھے۔''

میں نے برہمی سے کہا ''میری سمجھ میں نہیں آتا، اکبر خان چاہتا ہے اسے یہاں ایک خلافِ قانون کام کرنے دیا جائے۔ وہ ایک کروڑ دے گا، تم چاہتے ہو میں اس کی مدد کروں؟ کیا مجرم کی پردہ پوشی جرم نہیں ہے؟''

راجا نے کہا ''مجبوری کو مصلحت کا نام دے کر قبول کرنا بھی پڑتا ہے۔ نظریۂ ضرورت ایسے ہی وقت میں کام آتا ہے۔''

''میں نہیں مانتا۔''

''تیرے نہ ماننے سے وہ سب غیر موجود نہیں ہوسکتا جو حقیقت ہے۔ تاریخ بن چکا ہے، پاکستان کی تاریخ۔ اب اسے غلط کہنے سے بھی کیا حاصل ہوگا۔ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے اسباب پر ہم آج خود کو ذمے دار کہتے ہیں، اب اس سے کیا فائدہ؟'' راجا بولا۔

''یار راجا! تجھ سے مجھے یہ امید نہیں تھی۔'' میں نے کہا۔

راجا بولا ''حالانکہ مجھ سے ہی تجھے ایسی امید رکھنی چاہیے کیونکہ میں حالات کو جذبات کی عینک لگا کے نہیں دیکھتا۔ یہ نہیں کہتا کہ کیا ہونا چاہیے، یہ بتاتا ہوں کہ کیا ہے؟ تجھے اپنی بے عزتی محسوس ہوتی ہے کہ تیرے ٹکڑوں پر پلنے والا معمولی چوکیدار تجھ سے برابری کی سطح پر بات کرنے آگیا تھا۔''

''کوہ قاف کی پری کے ساتھ، جو تمہارے خواب میں بھی آنا پسند نہیں کرتی۔'' فریال نے کہا ''تمہیں گزارہ کرنا پڑتا ہے ہمارے ساتھ، رال ٹپکتی ہے ایشوریا رائے پر۔''

''آف کورس، یہ ایک مجبوری ہے۔'' راجا نے کہا ''مگر ہماری حق گوئی سے دل شکستہ ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''اپنی صورتوں پر غور فرمایا ہے کبھی آپ نے؟'' شہناز نے کہا۔

''اصل صدمے کی یہی بات ہے خاتون! کہ ہم تو ہیں شاہ رخ خان اور سلمان خان جیسے پھر یہ تقدیر کی ستم ظریفی نہیں تو اور کیا ہے۔'' راجا بولا ''مگر خیر...... بات ہو رہی تھی ایک کروڑ کی۔''

میں نے کہا ''میں اس پر غور کرنے کے لیے بھی تیار نہیں۔ باقی رہی یہ بات کہ میں اس سے بات کرتے ہوئے کمپلیکس کا شکار تھا، تو یہ ٹھیک ہے۔ اس لیے نہیں کہ وہ میرا ملازم یا غریب آدمی تھا۔ میرے آس پاس جتنے لوگ ہیں، وہ سب میرے لیے قابلِ احترام ہیں لیکن اکبر خان نہیں۔ کیونکہ وہ ایک مجرم ہے، بدکردار شخص ہے اور بے ضمیر ہے۔ دیکھو، اس نے اپنی بیوی کو اور اپنے بچوں کو کس حال میں رکھا...... اور اس طوائف کو کس شان سے رکھتا ہے۔''

راجا نے کہا ''میں تیری کسی بات کو غلط نہیں کہتا۔ اکبر خان واقعی شیطان ہے لیکن اپنے اخلاق و کردار کا ذمے دار وہ خود ہے، اس کے ساتھ دنیا و آخرت میں جو ہونا ہے، ہوگا۔ جائے جہنم میں ہمیں کیا...... مگر جذبات کی رو میں بہہ کے ہمیں اپنا نقصان نہیں کرنا چاہیے۔''

''اس کے ایک کروڑ کی ہمیں ضرورت نہیں۔''

راجا نے اپنی بات جاری رکھی ''دیکھو بچے! بات صرف ایک کڑور لینے یا نہ لینے کی نہیں ہے۔ مسئلہ ہے، اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے یا نہ مارنے کا۔ تو اس معاملے میں فاروقی سے بات کر کے دیکھ لے۔ اس کا جواب بھی یہی ہوگا کہ قانونی طور پر ریسرچ سینٹر کا معاہدہ منسوخ کرنا اور اس کا قبضہ حاصل کرنا بہت مشکل ہوگا۔ ایک لمبی قانونی جنگ اور اس کے اخراجات اپنی جگہ۔ جو نقصان ان لوگوں کی دشمنی سے ہوگا، اس کا اندازہ ممکن نہیں۔ وہ سب کچھ کر سکتے ہیں اور کرا سکتے ہیں۔ ہم کیا کریں، اپنا کام چھوڑ کے اس جنگ میں پھنس جائیں، نقصان اٹھائیں، ایسی کی تیسی کرالیں سارے پروگرام کی؟''

''کیا ہم اتنے کمزور ہیں؟''

''نہیں، ہم بڑے شہ زور ہیں۔'' راجا تلخی سے بولا ''پھر کیا اپنا سارا زور اس جنگ پر لگا دیں۔ ایٹم بم ہمارے پاس بھی ہے اور بھارت کے پاس بھی، تو کیا جنگ چھیڑ کے استعمال کر لیں؟ نہیں، دونوں ملک اب جنگ سے بھاگ رہے ہیں۔ ہم جنگ کی عیاشی کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ جنگ دیوالا نکال دیتی ہے، یہی ہمارے ساتھ بھی ہوگا۔ سارے ترقیاتی منصوبے دھرے رہ جائیں گے۔ اس کے علاوہ اگر یہ دشمن مل گئے دوسری طرف کے دشمنوں سے...... اکبر خان اینڈ کمپنی نے اتحاد کر لیا رانا رجب علی جتال سے، پھر بات ایک طرف بھارت دوسری طرف افغانستان۔ ایسی صورت حال ہو تو پاکستان کس دشمن سے لڑے گا؟''

میں نے کہا ''یہ تو ٹھیک ہے مگر......''

''اگر مگر چھوڑ۔ یہ سوچ کہ اکبر خان اینڈ کمپنی کی طاقت ہمارے ساتھ ہو تو رانا جیسے دشمنوں کو آنکھ دکھا سکتے ہیں۔ یہ طاقت اور بدمعاشی کا زمانہ ہے فیکے پتر! اصول پرستی اور قانون پرستی کا نہیں۔ کلاشنکوف کلچر میں قانون بھی زبردست کے ساتھ ہے۔ وڈیرے ڈاکو پالتے ہیں، حکومت بدمعاش کرتے ہیں۔ بات طاقت سے منوائی جاتی ہے۔ شرافت کا راگ اب کوئی نہیں سنتا۔ پوپ کا زمانہ ہے، پاپ کا دور ہے۔''

''تم سب چاہتے ہو کہ میں اکبر خان سے تعاون کروں؟'' میں نے بے بسی سے کہا۔

''ہمارے ساتھ ان کا تعاون آج ضروری ہے۔''

میں نے کہا ''اور کل وہ قانون کی گرفت میں آگئے...... پھر؟''

راجا ہنسا ''تو واقعی بالکل اناڑی ہے۔ اب قانون ان کے ساتھ ہے بلکہ یہی لوگ قانون ہیں۔ قانون وہ نہیں جو کتابوں میں لکھا ہے۔ کالے کوٹ والے وکیل اور عدالت میں بیٹھا ہوا جج محض علامتی کردار ہیں۔ قانون صرف ایک نظریاتی تصور ہے۔ خدا ترسی، خالص شہد اور جمہوریت کی طرح نایاب۔ یہ چیزیں پہلے ہوں گی، اب نہیں ہیں۔''

میں نے کہا ''تم سب لوگ ہم خیال ہو، ایکا کر چکے ہو......شہناز تم بھی......؟''

شہناز چپ تھی۔ خاموشی کو نیم رضامندی سمجھے بنا چارہ نہ تھا۔ اس نے بڑی ڈپلومیسی سے کہا ''رفیق بھائی، میں تو کام کرنے آئی تھی۔''

''یعنی تم بھی اسی خیال سے متفق ہو کہ مجرم اور بدمعاش اگر کارِ خیر میں ساتھ دے تو اسے ضرور خوش آمدید کہنا چاہیے، تمہاری کیا رائے ہے؟''

''میری رائے...... وہی جو سب کی۔''

سب کی خاموشی شہناز کی رائے کی تائید کرتی تھی۔ میرے لیے چارہ نہ رہا کہ میں بحث چھوڑ کے اندر جاؤں، میں کسی ڈکٹیٹر کی طرح اپنی رائے سب پر مسلط نہیں کر سکتا تھا۔ وہ میرے دوست تھے، ماتحت نہیں۔ ان کے بغیر میں کچھ نہیں تھا۔ شہناز نے واضح کر دیا تھا کہ کام نہیں ہوگا تو وہ واپس چلی جائے گی۔ آغازِ سفر میں ہی ہم سفر ساتھ چھوڑنے کی بات کرنے لگیں تو عزمِ سفر ہی بے معنی ہو کر رہ جاتا۔ میں نے بہتر سمجھا کہ فی الحال مسئلے کو چھیڑا ہی نہ جائے۔

معمول کے مطابق راج مزدور اپنے کام کا آغاز کر چکے

تھے۔ شہباز نے بھی ریشم کے ساتھ سرونٹ کوارٹرز کا رخ کیا۔ اس کا پروگرام آج اپنے ''ویکسی نیشن'' شیڈول کو مرتب کرنے کا تھا۔ حفاظتی ٹیکے یہاں دستیاب نہیں تھے۔ ٹیکے محکمۂ صحت سے ملتے اور انہیں لانے، رکھنے کے خصوصی انتظامات لازمی ہوتے، اسے یہ حساب کرنا تھا کہ کتنے افراد کو کتنی قسم کے ٹیکے لگیں گے اور گردونواح سے ہمارے ساتھ کام کرنے والوں کی ضرورت کیا ہوگی؟

ریشم کو اب شہباز نے اپنا اسسٹنٹ مقرر کرلیا تھا اور اس ترقی پر وہ بے حد خوش اور مغرور تھی۔ ماں کے ساتھ گھر کے کام کاج کے مقابلے میں ایک ڈاکٹر کے ساتھ رہنے میں بڑی عزت تھی۔ اس شوخ لڑکی کی ذہانت قابل رشک تھی۔ وہ سیکھنے کی بے پناہ خواہش اور صلاحیت رکھتی تھی۔ وہ صرف فیشن ہی نہیں سیکھ رہی تھی، انگریزی بولنا بھی سیکھ رہی تھی اور مجھے یقین تھا کہ کوشش کرتی رہی تو وہ آئندہ تین ماہ میں انگریزی بولے گی۔ لکھنا آئے نہ آئے، اس نے شہباز سے سوال کیا تھا کہ کیا اس کے ساتھ رہ کے وہ ڈاکٹری سیکھ جائے گی؟ آخر مستری اور مکینک کے ساتھ کام کرنے والا چھوٹا بھی تو استاد بن ہی جاتا ہے۔

فرخ نے گزشتہ رات کسی وقت بین الاقوامی ریٹ پر سیلائٹ فون سے رابعہ سے بات کی ہوگی اور جیسا کہ ہوتا ہے اور ہونا چاہیے، عشق کی وارفتگی میں وقت کے گزرنے کا حساب نہ رہا۔ نتیجہ یہ کہ صبح مجھے ایک فون کا کریڈٹ بیلنس صفر ملا مگر میں نے اسے اتنا مہنگا عشق کرنے پر روکا نہیں، کارڈ لینے شہر بھیج دیا۔ وہ بڑی خوشی خوشی گیا۔ وہ رات کو لوٹا تو اس نے رابعہ سے ملاقات کا اعتراف جرم بھی کیا۔ فون کے ساتھ اس کے دل کا کریڈٹ بیلنس بھی اتنا بڑھ گیا تھا کہ چند دن آرام سے گزر جائیں۔

فریال کے پاس مصروفیت بہت کم تھی چنانچہ اس نے تاریخی نوادرات کی صفائی اور جھاڑ پونچھ شروع کرادی تھی اور خاندانی تصاویر والی گیلری کو نئے سرے سے ڈیکوریٹ کرنے میں لگ گئی تھی۔ میں راجا کے ساتھ اوپر کی منزل پر دیگر نوادرات کا انتخاب کرتا رہا۔ راجا نے مجھے بتایا تھا کہ آج کچھ سونے کے تاجر اور جیولرز آئیں گے۔

میرے والدین اور گھر کے دیگر افراد نے جاگیر اور حویلی کی وسعت دیکھی تھی اور باہر ہی سے اس کی شان وشوکت کا نظارہ کیا تھا۔ جانو بابا نے ان کے لیے بند دروازے نہیں کھولے تھے۔ میں جانتا تھا کہ ابا کو اپنے آباؤاجداد کی تاریخی نشانیاں دیکھ کر کتنا فخر اور غرور محسوس ہوگا۔ زندگی ساری تو کالجوں میں لیکچر دیتے گزر گئی۔ تیس برس کی کمائی کا حاصل پنشن تھی۔ پہلے وہ سفید پوشی کا بھرم رکھتے رہے۔ بعد میں پنشن سے بہ مشکل تمام گزارہ کیا لیکن وہ ہمیشہ قانع اور مطمئن رہے۔ دل کے خوش رکھنے کو یہی خیال کافی تھا کہ انہوں نے عزت کمائی اور رزق حلال پایا۔

عمر کے آخری دور میں دولت ان کو چھپر پھاڑ کے ملی تھی جب ان کے لیے اس کا کوئی مصرف نہ رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ بھی سونے چاندی کے یہ ظروف دیکھتے جن میں ان کے دادا، پردادا ما حضر تناول فرماتے رہے تھے لیکن میں نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ خاموشی سے انہیں کیش کرالوں۔ یہ برتن قابل استعمال نہ تھے لیکن چچی اور خاندان کی دوسری خواتین تو میرا گھیراؤ کرلیتیں۔ 'ہائے بیٹا! اس لوٹے کا میکلس سیٹ بنوالوں۔ اب تو لوٹا ہی کہتے ہیں سب۔ آفتابہ کون جانتا ہے۔ سلیقے سے رابعہ کی شادی کے لیے سارے زیور نکل آئیں گے۔' اتنا سونا دیکھ کے ان کی حالت غیر ہوجاتی۔

پھر اس معاملے کا دوسرا پہلو بھی تھا۔ چچا یا چچی ایک قانونی جھگڑا کھڑا کرسکتے تھے کہ چلو جاگیر اور حویلی تو رفیق نے دھاندلی اور چالاکی سے اپنے نام کرالی۔ اس خزانے پر اس کا حق کیسے ہوگیا جس کا وصیت میں ذکر نہیں۔ سونے چاندی کے برتن ہوں، کہیں اشرفیاں دفن ہوں، ہیرے جواہرات ملیں تو ان پر سب کا قانونی اور شرع کے مطابق حق جائز ہوگا۔

فساد کرنے والوں کو یہ کون سمجھاتا کہ جب حویلی ملی تو اس کے اندر کی ہر چیز ازخود میری ہوگئی جیسے جاگیر ملی تو اس پر موجود تمام درخت میری ملکیت بن گئے۔ یہ سب سوچتے ہوئے میں نے بہتر یہی سمجھا کہ کسی کے علم میں آنے سے پہلے یہ سونے چاندی کے بے مصرف ڈھیر کسی کام آجائیں۔ ابتدائی ضروریات کے لیے سرمایہ فراہم ہوجائے تو کام چلتا رہے۔

تاہم کچھ چیزوں کو میں نے الگ کرلیا مثلاً سونے کے میڈل اور کپ۔ ایک سونے کا خنجر جس پر میرے پردادا کا نام تھا اور یہ لکھا ہوا تھا کہ 1912ء کے دہلی دربار میں شہنشاہ معظم کو نذر کرنے کے لیے بنوایا گیا تھا مگر اس کی نوبت نہ آئی۔ ایک ٹرافی میرے پردادا کو جارج پنجم کی طرف سے ملی تھی۔ انہوں نے تلوار کے ایک وار سے شیر کا سر الگ کردیا تھا۔

ہم انہی چیزوں کا انتخاب کرنے میں مصروف تھے کہ

گارڈ نے اوپر آ کے کسی کے آنے کی اطلاع دی ''چار گاڑیاں ہیں نواب صاحب! دو کاریں ہیں، ایک جیپ میں گارڈ ہیں، ایک ٹینک جیسی گاڑی ہے۔''

راجا مسکرایا ''کیش لے جانے والی بکتر بند گاڑی ہوگی۔''

میں نے کہا ''کہاں ہیں یہ لوگ؟''

''باہر جناب عالی! اب گیٹ بند رہتا ہے۔ میں اندر ہی سے کھڑکی کھول کے پوچھ لیتا ہوں۔''

جب میں نیچے گیا تو جیولر اور سونے کے تاجر ڈرائنگ روم میں بڑے مرعوب سے بیٹھے قدیم حویلی کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ میرے آنے پر وہ بیٹھے رہے۔ میں نے خود ہر ایک سے مصافحہ کیا۔

پھر راجا نے کہا ''یہی ہیں نواب رفیق احمد شیرازی۔''

وہ سب چونکے اور پھر خفت سے مسکرانے لگے ''معاف کیجیے، ہمارے ذہن میں ایسی تاریخی حویلی میں رہنے والے نواب کا تصور مختلف تھا۔'' ان میں سے ایک نے سب کی طرف سے معذرت کی۔

میں نے مسکرا کے کہا ''میرا خیال ہے میں نواب سراج الدولہ والا ڈریس بنوا ہی لوں۔ لوگوں کے جذبات مجروح ہوتے ہیں مجھے جینز میں دیکھ کر۔''

آنے والوں میں سے ایک خود کو سونے کا تاجر سمجھتا تھا اور دوسرا جیولر۔ حلیے کے اعتبار سے دونوں روایتی سیٹھ تھے۔ دونوں بھاری بھرکم تھے۔ دونوں نے شلوار قمیص پر کوٹ پہن رکھے تھے اور ٹوپیاں لگا رکھی تھیں۔ دونوں کروڑپتی تھے اور میرے جیسے دس نوابوں کو خرید لینے کی استطاعت رکھتے ہوں گے مگر میرے سامنے ان کا وہی رویہ تھا جو کسی بھی خاندانی نواب کے سامنے کسی خاندانی سنار کا رہتا ہوگا۔

دونوں کے ساتھ ان کے معاون انہی کے بیٹے تھے۔ دوسری نسل کے لوگ جوان تھے اور مختلف انداز و اطوار رکھتے تھے۔ ان میں سے ایک بہت اچھے سلے ہوئے سفاری سوٹ میں ملبوس تھا۔ دوسرے نے بھی پینٹ شرٹ بہت سلیقے سے پہنی تھی۔ وہ تعلیم یافتہ بھی نظر آتے تھے۔ یہ کامیابی اور ترقی کا نسخہ تھا۔ پرانی نسل کے پاس تجربہ تھا، نئی نسل کاروبار کے نئے تقاضوں کو سمجھتی تھی۔

کاروباری معاملات سارا دن جاری رہے۔ سیٹھ بڑے کائیاں بنتے تھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے بیٹے نہ ہوتے تو بات نہ بنتی۔ انہوں نے پہلے مال کا معائنہ کیا۔ ان کی زندگی کھرے کھوٹے کی پہچان کرتے گزری تھی۔ انہوں نے ایک ایک برتن کو اپنی کسوٹی پر پرکھا۔ اس کے خالص ناخالص ہونے کے معیار کو جانچا، بیس قیراط الگ، بائیس الگ۔ چوبیس قیراط کا خالص سونا الگ۔ چاندی کے برتن الگ۔ بیٹے کیلکولیٹر سنبھالے جمع تفریق میں مصروف رہے۔ ساری دوپہر گزر گئی۔ چائے وہیں پی گئی۔ کھانا وہیں کھایا گیا۔ تمام قابل فروخت ظروف کا مجموعی وزن بڑھتا گیا۔

بڑے سیٹھ اپنی حیرانی، پریشانی اور خوشی کے جذبات کو پوری طرح چھپا نہیں سکتے تھے۔ پرانے وقتوں کے ایسے خزانے اب نایاب و نایافت ہوچکے تھے۔ نہ کسی کی بادشاہت رہی تھی نہ نوابی۔ جو خاندانی لوگ کہلاتے تھے، حوادث زمانہ کے باعث خوار و زبوں تھے۔ ان کے پاس بیچنے کو عزت ہی رہ گئی تھی۔ سنارا سے اپنی خوش قسمتی سمجھتے تھے کہ میں نے انہیں موقع دیا۔ ڈرتے تھے کہ کوئی گڑبڑ نہ ہوجائے، دھوکا نہ ہوجائے، قانونی مشکل پیدا نہ ہوجائے۔ یہ خواہش بھی رکھتے تھے کہ سونے چاندی کے برتن بھی اسی طرح لے جائیں جیسے گلی محلوں میں پھرنے والے ٹین ڈبے خریدتے ہیں۔

بیٹے نسبتاً پرسکون اور محتاط رہے۔ جب تمام قابل خرید اشیا کا حساب ہوگیا تو بھاؤ تاؤ شروع ہوا۔ میرا خیال تھا کہ ان دونوں سیٹھوں کا ایک ساتھ آنا کاروباری مصلحت کے خلاف تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ دونوں بھائی تھے۔ پہلے باپ کا ایک ہی کاروبار تھا، اب ٹیکس بچانے کے لیے دونوں نے الگ کرلیا تھا چنانچہ ان کی پیش کش میں فرق نہ تھا۔

یہ سارے معاملات راجا نے طے کیے تھے۔ ایک ہی فیملی کے دو ممبرز کو بلانے کی مصلحت وہی جانتا تھا۔ میں اس معاملے میں بالکل اناڑی تھا۔ میری نہ کسی سے جان پہچان تھی اور نہ مجھے سونے چاندی کے بھاؤ کا علم تھا۔ شام تک ہونے والے مذاکرات کے نتیجے میں یہ بات سامنے آگئی کہ فیئر ڈیل میں ان کی ساکھ سب سے بہتر ہے۔

بالآخر انہوں نے اعلان کیا ''تین کروڑ چالیس لاکھ۔''

راجا نے کچھ دیر بعد کہا ''راؤنڈ فگر...... ساڑھے تین۔''

انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا ''ہماری آفر باقی رہے گی۔ آپ کل کسی اور سے قیمت لگوالیں۔''

''سودے بازی کرنی ہوتی تو ہم آپ کو کیوں بلاتے؟'' راجا نے کہا۔

''نہیں، سودے بازی کرنی چاہیے۔ ایسے سودے جلدی میں نہیں ہوتے۔ آپ کا اطمینان ضروری ہے۔''

راجا نے کہا ''دس لاکھ زیادہ تو نہیں ہوتے۔''

''آپ نے ہمیں سب بتا دیا تھا۔ ہم دس لاکھ اس

علاقے میں اسکول اسپتال بنانے کے لیے دے سکتے ہیں لیکن قیمت نہیں بڑھا سکتے۔ یہ اصول کی بات ہے۔"

اب میں نے کہا" او کے، ہمیں منظور ہے۔"

"ہم نقد رقم لائے ہیں کیونکہ آپ نے کہا تھا۔" ایک سیٹھ نے مجھ سے ہاتھ ملا کے کہا، وہ بڑا سیٹھ تھا۔

" حالانکہ ہمیں بہت مشکل ہوئی۔" دوسرے نے راجا سے ہاتھ ملایا" آپ کو بھی مشکل ضرور ہوگی، اتنی بڑی رقم ہے، آپ کیسے رکھیں گے یہاں؟"

میں نے کہا" ویسے تو سونا بھی اتنی ہی مالیت کا تھا اور سوسال یہاں پڑا رہا۔"

" آپ کی بات درست ہے جناب! مگر چور ڈاکو نقد پر لپکتے ہیں۔"

میں نے کہا" کیا اس علاقے میں ڈاکو بہت ایکٹو ہیں؟"

بڑا سیٹھ مسکرایا" یہ تو آپ مجھ سے بہتر جانتے ہوں گے نواب صاحب! آپ کا علاقہ ہے۔"

میں نے کہا" میں یہاں نہیں تھا۔"

راجا نے سرہلایا" کوئی بہت زیادہ بدنام علاقہ نہیں ہے۔ کسی خاص گروہ کی کارروائی کے بارے میں سنا نہیں۔"

بڑے سیٹھ نے کہا" بس جی! اللہ برے وقت سے بچائے۔ ان لالچی کتوں کو کرنسی کی خوشبو بڑی جلدی پہنچتی ہے۔"

دوسرے نے کہا" جب تک کانوں میں نہ پڑے کسی کے ٹھیک ہے۔"

میں نے کہا" یہاں آپ کے اور ہمارے سوا کون ہے؟"

راجا نے بھی کہا" ہاں، ایک ہی رات کی تو بات ہے۔"

بڑے سیٹھ کے بیٹے نے پہلو بدلا" میاں جی، نواب صاحب کوئی بچے تو نہیں ہیں۔"

لیکن بڑا سیٹھ اپنی عادت سے مجبور تھا۔ وہ پرانے وقتوں کا آدمی مارے خلوص کے ہمارے لیے فکر مند تھا" او نہیں پتر! یہ بھی اپنے بچوں کی طرح ہیں اور پھر ساری عمر ولایت میں رہے ہیں۔ ان کو آگاہ کردینا چاہیے پھر آگے جو ان کی مرضی۔"

میں نے کہا" ہم اتنی رقم یہاں نہیں رکھیں گے۔ بینک کے حوالے ہی کریں گے۔"

" وہ تو ہے جی! مگر یہاں کون سا بینک ہے۔ آپ واپس لاہور ہی لے جاؤ گے ناں..... اس وقت کون سا کھلا ہوگا۔ کل آپ رقم کیسے لے جاؤ گے؟"

چھوٹے سیٹھ نے سرہلایا" ہاں جی، ہم نے تو کیش لانے کے لیے کمپنی کو ٹھیکا دیا تھا۔ برنکس والوں کو اور پوری رقم کی انشورنس تھی۔"

میں نے کہا" ان کی خدمات سے ہم بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔"

" بالکل اٹھا سکتے ہیں لیکن کنٹریکٹ تو ان کے آفس جا کے ہوگا۔ یہ بیچارے ڈرائیور اور گن مین تو ملازم ہیں، کمپنی کا آفس صبح کھلے گا۔"

میں نے کہا" آپ کیا کہتے ہیں، کیا کرنا چاہیے؟"

" دیکھو جی، آپ چاہو تو ہمارے ساتھ چلو۔ چار سوٹ کیس ہوں گے۔ ہر ایک میں ہزار ہزار کے نوٹوں کی گڈیاں ہیں۔ تین ہی ہیں سو سو گڈیاں۔ یہ ہوگئے تین کروڑ۔ چوتھے میں ہم ڈال دیں گے چالیس گڈیاں۔ اب جیسا آپ کہو۔"

میں نے کہا" دیکھیے۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ سودا کل کیا جائے۔ ہم بھی کیش والی گاڑی منگالیں۔"

بڑے سیٹھ نے سنبھل کے کہا" جناب نواب صاحب! برا مت ماننا میری بات کا۔ کاروبار کے بہت سے اصول ہم نے ہندو بنیوں سے سیکھے تھے۔ ایک یہ کہ دان لاکھ کا کرو۔ مال کی قیمت ایک پائی زیادہ مت دو۔ ایسے ہی ہم کاروباری لین دین میں اعتبار کے قائل نہیں۔"

میں نے کہا" دنیا کا سارا کاروبار تو زبان پر ہی چلتا ہے۔"

" دیکھو جی۔ اگر میں کہوں کہ مال ہم اٹھا لیتے ہیں۔ پے منٹ کل شہر آ کے ہی لے لینا۔ ابھی ہم واپس لے جاتے ہیں، آپ مالو گے۔"

میں نے کہا" یہ تو ادھار کی بات ہوگئی۔"

" ہاں جی! ادھار ہم بھی نہیں کرتے۔ کل صبح پھر آ کے سب تولنا پڑے گا۔ پھر حساب کتاب ہوگا۔ پھر وہی ٹائم ہوجائے گا۔"

میں سمجھ گیا جیسے ہم یہ خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے کہ ساڑھے تین کروڑ کا مال ان کے حوالے کردیں اور قیمت اگلے دن میں۔ ایسے ہی وہ خورد برد کا خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھے۔ وہ اگلے دن انکار کردیتے کہ کیسے ساڑھے تین کروڑ۔ ہم تو ادائیگی کر کے آئے تھے یا صاف کہتے کہ ہمارا تو سودا ہی نہیں ہوا۔ تو ہم ان کا کیا بگاڑ لیتے۔ کاروباری ساکھ اپنی جگہ۔ شرافت اور ایمانداری اپنی جگہ۔ ساڑھے تین کروڑ کے لیے کسی کا ایمان خراب ہوجائے۔ آج کے دور میں کسی کی

ضمانت نہیں دی جاسکتی۔"

چھوٹے سیٹھ کے بیٹے نے کہا" معاف کیجیے گا نواب صاحب! آج کے دور میں اتنی بڑی ٹرانزیکشن کوئی کیش نہیں کرتا۔"

میں نے کہا" یہ مجھے مت سمجھاؤ۔ میں لندن کی ایک کمپنی میں وائس پریذیڈنٹ تھا اور ایم بی اے میں نے ہارورڈ سے کیا تھا۔ چیک سے جتنے مالیاتی مسائل ہمارے لیے پیدا ہوتے اس سے زیادہ تمہارے لیے ہوتے۔"

راجا نے کہا" اس کے علاوہ۔ ہمارے لیے پرابلم ہوتی کہ اس گولڈ کی ملکیت کے دستاویزی ثبوت لائیں۔ کہاں سے آیا، کیسے آیا۔ آپ لوگوں کو بھی حساب دینا پڑتا، ٹیکس الگ ہوتا۔"

بڑے سیٹھ نے بیٹے کو غصے سے گھورا اور پھر ہم سے مخاطب ہوا" چلو جی نواب صاحب! ہم پے منٹ دیتے ہیں اور مال اٹھاتے ہیں۔"

جب سیٹھوں کے بیٹے گاڑی سے سوٹ کیس لانے گئے ہوئے تھے اور ان کے ساتھ آنے والے دو ملازم مال اٹھا رہے تھے تو میں نے راجا سے مشورہ لیا" اگر میں ان کے ساتھ چلا جاؤں اور آج رات یہ رقم کسی محفوظ جگہ پہنچادوں۔"

راجا نے کہا" شہر تو جنگل سے زیادہ غیر محفوظ ہیں نکے پتر!"

" یہ بھی سچ کہا تو نے مہاراجا! چل پھر اللہ مالک ہے۔ ایک ہی رات کی تو بات ہے۔ ڈاکوؤں سے بھی نمٹ لیں گے اگر انہوں نے آج ہی زحمت کی، ہم چوڑیاں پہن کے نہیں بیٹھیں گے۔"

" رات بھر جاگتے رہیں گے۔ آواز لگاتے رہیں گے جاگتے رہو۔" راجا ہنسا" امید ہے ڈاکو ڈر جائیں گے۔"

میں نے کہا" میرا خیال ہے، چالیس لاکھ یہاں روک لے جائیں۔ تین کروڑ بینک پہنچادیں۔"

" اتنی بڑی رقم بینک میں ڈالنا بھی مسائل پیدا کرسکتا ہے۔"

" اسے تقسیم کردیتے ہیں، میرا تیرا، فریال کا اور شہباز کا اکاؤنٹ ہے۔ کچھ نئے اکاؤنٹ کھولے جاسکتے ہیں، مختلف بینکوں میں۔"

آدھے گھنٹے بعد سیٹھ لوگ رخصت ہوگئے۔ ایک صدی سے زائد عرصے تک سرمایہ غرور رہنے والا خزانہ بھٹی میں پگھل کے زیورات میں ڈھلنے گیا۔ اس کے بدلے کاغذی نوٹوں

سے بھرے ہوئے چار سوٹ کیس رہ گئے۔ پانچواں شخص فرخ تھا جسے ہم نے اس راز میں شریک کیا کہ آج رات ہمارے پاس ساڑھے تین کروڑ کی خطیر رقم ہے اگر ڈاکوؤں کو اطلاع مل جائے تو وہ ٹینک اور بکتر بند گاڑیوں کے ساتھ ہمارے صرف ایک گرینڈ آپریشن کے لیے متحد بھی ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ ہمیں بھی چوکس رہنا ہوگا۔

میری تجویز تھی کہ سوٹ کیس مختلف کونوں کھدروں میں کباڑ کے ساتھ ڈال دیے جائیں مثلاً قدیم گاڑیوں کی ڈکی میں۔ سب سے اوپر والی بارہ دری کی چھت پر۔ خونی کنویں والے کمرے میں۔ چار مختلف مقامات پر ہم مل کے پہرا دیں۔ یہ تجویز غیر سنجیدگی سے مسترد کردی گئی۔

فریال نے کہا ''نواب صاحب قبلہ! آپ اپنی خاندانی تجوری کا استعمال فرمائیں۔ اس کا پتا آپ کو بھی نہیں تو چور ڈاکو وہاں کیسے پہنچ سکتے ہیں۔''

راجا بولا ''ڈاکو اپنے ساتھ کرین لائیں تو تجوری کے ساتھ ہمیں بھی اٹھا کے لے جائیں۔ میرا خیال ہے کہ ٹیکنالوجی کے استعمال میں وہ بہت آگے ہیں۔''

''نہیں، تجوری کو اٹھا کر لے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہاں وہ حویلی اٹھا کے لے جائیں تو اور بات ہے۔'' فریال بولی۔

میں نے سر کھجا کے کہا ''نورچشم، کیا ہم کورچشم ہیں۔ ایسی کوئی تجوری ہمیں کیوں نظر نہ آئی۔''

فریال ہنسی ''ہر عظیم دریافت اتفاق کا نتیجہ ہوتی ہے۔ وہ تجوری تمہارے آباؤاجداد کی تصاویر کی گیلری میں ہے۔ اس کی صفائی اور رینوویشن کے کام کو آغاز کرتے ہوئے میں نے سوچا کہ پہلے کس پینٹنگ کو اتاروں۔ ان پر اتنی گرد ہے اور جالے ہیں کہ اصل رنگ دب گئے ہیں۔ فریم تک خراب ہو رہے ہیں۔ بس ایسے ہی میں نے طے کیا کہ پہلی تصویر سب سے پہلے۔ وہ اس خاندان کے بانی عزت بیگ کی ہو سکتی تھی۔ جب میں نے اسے اتروایا تو بہت سے انکشافات ہوئے۔ یہ ایک الگ ریسرچ کا موضوع ہے مثلاً مجھے پتا چلا کہ یہ تمام تصاویر انیسویں صدی کے آخر میں بنوائی گئی تھیں۔ یہ کام 1890ء سے 1897ء تک یعنی سات سال میں مکمل ہوا۔ مصور کوئی ''لاثانی'' تھا مگر اس نے اپنا نام انگریزی میں یوں لکھا ہے کہ ایل اے یعنی لا الگ ہے۔ جو فرنچ میں دی کی طرح استعمال ہوتا ہے اور پھر ایس اے این آئی۔ اصل نام معلوم نہیں۔ ہر تصویر کے نیچے نام کے ساتھ اس نے ایک تاریخ بھی ڈالی ہے۔ پہلی تصویر ستمبر 90 میں مکمل ہوئی یعنی اٹھارہ سو نوے میں۔ آخری پر جون 97 کی تاریخ ہے۔''

''تم نے تو اچھی خاصی ریسرچ کرلی ہے۔''

''اسے ریسرچ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ تو نظر آتا ہے۔ ریسرچ یہ جاننے کے لیے ضروری ہے کہ ''لاثانی'' کون تھا۔ مصور میں نہیں ہوں مگر تم جانتے ہو کہ مصوری کو سمجھتی ضرور ہوں۔ یہ ایک خداداد صلاحیت ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی بچپن سے شاعر، کرکٹر یا موسیقار ہوتا ہے۔ کسی کے کان سروں کو سمجھتے ہیں، میری آنکھ رنگوں کے حسن کو پہچانتی ہے۔ لاثانی کوئی عام مصور نہیں تھا۔ اس فرق کو یوں سمجھو کہ پورٹریٹ ہر سنیما کے باہر بھی نظر آتے ہیں، جو سنیما کے ملازم پینٹر بناتے ہیں اور پورٹریٹ اقبال مہدی نے بھی بنائے ہیں۔ جو ایک بین الاقوامی شہرت یافتہ مصور ہیں۔ یہ لاثانی بھی فنکار تھا۔ ریسرچ کی جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ وہ کہاں سے آیا تھا۔ اس نے کیا معاوضہ لیا تھا، وغیرہ وغیرہ۔''

میں نے کہا ''جیسے ہی فراغت ہوئی، میں اس لائبریری کو کھنگالوں گا جس میں کتابوں کے علاوہ بھی بہت کچھ بھرا پڑا ہے۔ شاید کوئی ڈائری نکل آئے جس میں یہ سب ہو۔''

فریال نے کہا ''خیر...... ابھی ذکر تھا تجوری کا۔ اس پہلی تصویر کے پیچھے تجوری تھی۔ جو دیوار میں بنائی گئی تھی۔''

''یہ تو بڑا سنسنی خیز انکشاف ہے خاتون!'' راجا ہاتھ ہل کے بولا ''کیا آپ نے اسے کھولا؟''

''ہاں، میں نے کہا کھل جا سم سم اور اس کا فولادی دروازہ ہٹ گیا۔ اب جو میں نے دیکھا تو میری نظروں کے سامنے کوہ نور ہیرا دمک رہا تھا، بالکل اصلی۔ ملکہ برطانیہ کے تاج میں ضرور نقلی ہوگا۔''

راجا نے خفت سے کہا ''میرا مطلب تھا، کیا تجوری مقفل تھی؟''

میں نے کہا ''مہاراجا! کیا ہر احمقانہ سوال تو کرے گا، مجھے بھی موقع دے۔ تو مس فریال! آپ لوٹ کر اپنے بیان پر جائیں کہ ہمیں یہ رقم اپنی خاندانی تجوری میں رکھنی چاہیے اور پھر یہ بتائیں کہ کیسے؟''

''اس سوال کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔'' فریال ہنسی ''یہ آپ خود معلوم کریں کہ تجوری کیسے کھولی جا سکتی ہے اور پھر بند کیسے ہوگی؟''

میں نے کہا ''یہ کیا مشکل ہے اگر میں اپنے کسی دادا کے پردادا کی روح کو بلالوں تو ان سے پوچھا جا سکتا ہے۔ راجا، تو روحوں کو بلا سکتا ہے؟''

''یار، مجھے تو معاف ہی رکھ۔ ایک بدروح پہلے ہی میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔'' راجا نے شہباز کی طرف دیکھ کے کہا۔

''راجا جی! ڈاکٹرز سے ڈرنا چاہیے۔ پیار سے ہنستے ہنستے کوئی انجکشن لگا دے تو پتا چلے جنس بدل گئی۔ نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے۔'' میں نے کہا۔

راجا نے ہیجڑوں کی طرح تالی بجا کے اور ہاتھ نچا کے کہا ''آئے ہائے، وہ تو کب کا لگا چکی شہباز۔ اللہ قسم سچ بول رہی ہوں میں، تو بھی لگوا لے۔''

رقم کی بہ حفاظت تحویل کے بارے میں سنجیدگی سے کوئی فکر نہ تھا۔ سب کو یہ اطمینان تھا کہ جب تک خود رقم کی ادائیگی کرنے والے گروپ کے مخبر نہ ہوں، یہاں ڈاکو کیسے آسکتے ہیں۔ سونے کے تاجر خاندانی طور پر نیک نام تھے۔ اس کے باوجود میرے دل میں ایک نامعلوم سی خلش خطرے کا احساس بن کر موجود رہی۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ انہوں نے کسی سے اتنے بڑے سودے کا ذکر کیا ہو اور انہوں نے اپنے بیوی بچوں کے علاوہ نہ جانے کتنے لوگوں سے بات کی ہوگی جن پر وہ اعتماد رکھتے ہوں گے۔ کچھ بھروسے کے لوگوں سے مشورہ بھی کیا ہوگا۔ جو بات ایک سے زیادہ لوگوں کو معلوم ہو جائے وہ راز نہیں رہتی۔ ہونٹوں نکلی کوٹھوں چڑھی۔ عورتیں تو بہت بدنام ہیں کہ ہزار قسمیں دے کر بتاتی ہیں کہ کسی کو مت بتانا اور ہزار قسمیں کھانے والی بات بالکل اسی طرح آگے پہنچاتی ہے۔ کان تو دیواروں کے بھی ہوتے ہیں اور چور ڈاکوؤں تک سن گن لینے والے ہی خبر پہنچاتے ہیں۔

تاہم رات کو جب ہم سونے لگے تو فرخ نے تجویز پیش کی کہ ہم سب نوٹوں والے سوٹ کیس سر کے نیچے رکھ کے سوئیں اور اپنا اسلحہ ایمرجنسی میں استعمال کے لیے تیار رکھیں۔ ظاہر ہے اس سے کسے اختلاف ہوتا۔ میں نے، راجا نے اور فرخ نے ایک ایک سوٹ کیس سرہانے کی جگہ رکھ لیا۔ یہ چھوٹے سوٹ کیس یا کچھ بڑے بریف کیس تھے چنانچہ بطور تکیا استعمال کیے جا سکتے تھے۔

میں نے کہا ''سر کے نیچے ایک کروڑ روپے ہوں تو خواب کیسے آتے ہیں۔ آج اس کا تجربہ ہوگا۔''

فریال نے چوتھا سوٹ کیس سر کے نیچے رکھ لیا تھا ''صبح بتاؤں گی کہ چالیس لاکھ کا دماغ پر کیا اثر ہوتا ہے۔''

میرا ذہن سب کے سو جانے کے بعد بھی ممکن اور ناممکن تصورات میں الجھا رہا۔ فریال نے تجوری کا ذکر کر کے ایک اور شوشہ چھوڑ دیا تھا۔ اب رہ رہ کے مجھے اس کو کھولنے کا خیال آ رہا تھا۔ کیا وہ چابی سے کھلنے والی تجوری ہوگی؟ ایک کے بعد دوسری اور پھر تیسری چابی لگائے بغیر نہیں کھلتی ہوگی۔ احتیاط کو ملحوظ رکھنے والے اپنے پاس ایک چابی رکھتے تھے۔ دوسری بیوی کو دیتے تھے تو تیسری کسی محرم راز معتمد خصوصی کو جس کی حیثیت سیکریٹری جیسی ہوتی تھی۔ آج بھی بینک اپنے والٹ ایسے ہی آپریٹ کرتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تجوری نمبروں سے کھلتی ہو۔ چابیوں کا جھنجٹ ہی نہ ہو۔ چابیاں تو شاید کہیں ڈھونڈنے سے مل جائیں، نمبر کون بتائے گا؟''

دوسرا اہم سوال تجوری کے اندر کی اشیا اور ان کی مالیت سے تعلق رکھتا تھا۔ فریال نے تو مذاق میں کہا تھا کہ اس میں کوہ نور ہیرا پڑا تھا مگر خیال خود بخود ہیرے جواہرات کی طرف جاتا تھا۔ وہ لوگ جو سونے چاندی کے برتن کھانے پینے میں استعمال کرتے تھے، بلاشبہ رئیس تھے اور رئیسوں کی بیگمات عام عورت کی طرح گزارے لائق زیورات پر کہاں اکتفا کرتی ہوں گی۔ وہ بھی سیروں سونے میں لدی رہتی ہوں گی اور ہیرے موتی، قیمتی پتھر اور جواہرات سے مرصع زیور ان کے شوق ہوں گے۔

حویلی میں سب کچھ موجود تھا۔ سوائے زیورات کے۔ یہ تو سوچا نہیں جا سکتا تھا کہ تجوری خالی چھوڑ دی گئی ہو اگر وہ بھری ہوئی تھی تو کس چیز سے؟ اور خالی ہوئی تو کیسے؟ ممکن ہے اس میں اشرفیاں ہوں جو سونے کا سکہ تھا اور آج اگر ہزار ہزار کے نوٹ بطور کیش گھر میں رکھے جاتے ہیں تو اس زمانے میں نقد رقم اشرفیوں کی صورت میں رکھی جاتی ہوگی۔

فریال کی بات نے میرے تجسس کو بیدار کر دیا تھا اور میں یہ سمجھنے میں حق بجانب تھا کہ باقی سب کی سوچ بھی مختلف نہ ہوگی۔ مجھے اپنے پروجیکٹ کو چلانے کے لیے وافر رقم مل گئی تھی اور باہر سے انویسٹمنٹ آنے تک میں اپنے ترقیاتی منصوبوں پر دل جمعی سے کام جاری رکھ سکتا تھا اگر تجوری میں سے اتنی ہی رقم کا مزید بندوبست ہو جائے تو پھر قرض لینے کی بھی ضرورت کہاں رہے گی۔

میں کروڑوں کے بارے میں سوچتا تھا تو میرا دماغ گھومنے لگتا تھا۔ میں جو اپنے سر کے نیچے ایک کروڑ دبائے لیٹا تھا، جب اسکول جاتا تھا تو مجھے جیب خرچ کے لیے ایک روپیا ملتا تھا۔ وہاں اکثریت ایسے بچوں کی تھی جو دس بیس سے کہیں زیادہ خرچ کرتے تھے۔ پچاس سے سو روپے تک پاکٹ منی پانے والوں سے بڑھ کر ایسے شہزادے بھی تھے جو سیکڑوں لٹا دیتے تھے۔ اس وقت مجھے اس معاشی تفریق سے محض احساس کمتری ہوتا تھا۔ میں یہ نہیں جانتا تھا کہ کرپشن یا ڈرگ ٹریفکنگ سے ناجائز دولت کیسے آتی ہے اور کیا رنگ دکھاتی

ہے۔ جب میں اپنے والدین سے سوال کرتا تھا تو وہ مجھے قسمت کے فلسفے سے مطمئن کرنے کی کوشش کرتے یا مستقبل کے کسی خواب سے۔ جب تم پڑھ لکھ کے بڑے آدمی بنو گے تو تمہارے پاس اس سے زیادہ پیسے ہوں گے۔

میرا باپ ساری عمر سائیکل پر یا بس سے سفر کر کے کالج جاتا رہا اور ہر مہینے تنخواہ کی صورت میں تگی بندھی رقم لاتا رہا۔ میری ماں اس رقم کو بڑے کمال سے پورے مہینے کے اخراجات پورے کرنے کے لیے استعمال کرتی رہی اور اس میں سے نامعلوم طور پر اتنی بچت کرتی رہی جو عید بقر عید اور شادی بیاہ کی کسی تقریب میں ہماری خوشی اور عزت کا بھرم رکھے۔ ظاہر ہے اس وقت میں بھی سوچ سکتا تھا۔ بہ زبان شاعر

زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں

اور آج صورتِ حال یوں پلٹ گئی تھی جیسے کاتب تقدیر نے کہیں لکھ دیا تھا کہ زندگی کے فلاں لمحے تک ایسے ہی رہے گا پھر سب بدل جائے گا۔ غربت امارت میں بدل جائے گی، غریب خانہ حویلی میں بدل جائے گا، سونا مٹی میں بدل جائے گا۔ خواب حقیقت میں بدل جائیں گے اور جب وہ لمحہ آیا تو دست غیب حرکت میں آیا۔ اس نے جادو کی چھڑی گھمائی اور فقیر زادے کو شہزادے کا نصیب دے دیا۔

ایسا ہوتا آیا ہے۔ ایسا ہوتا رہے گا۔ کسی کے نام کروڑوں کی لاٹری نکل آتی ہے، کسی کو کروڑوں کا پرائز بانڈ مل جاتا ہے۔ کسی کو ست بدھائی کی جاگیر اور حویلی مل جاتی ہے۔

یہ ایسے ہی خیالوں میں بھٹکنے کا نتیجہ تھا کہ میں نے ایک بے سروپا خواب دیکھا مگر خواب تو ہوتے ہی بے سروپا ہیں۔ یہ درحقیقت اُس خواب کا پارٹ تو تھا جو میں پہلے دیکھ چکا تھا۔

میں کنہار ڈیم کے پاور پلانٹ پر اکیلا کھڑا چاروں طرف پھیلے ہوئے ست بدھائی کے جدید ٹاؤن کو دیکھ رہا تھا جو روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ اچانک میرے پیچھے شور سنائی دیا۔ ایک گدھا کسی پوپ سنگر کی طرح بے سری آواز میں رینکنے لگا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کمپیوٹر سے ریکارڈنگ کرنے والے اس آواز سے بھی ایک البم تیار کر کے ریلیز کر سکتے ہیں اور ہر میوزک چینل سے نشر کیا جائے تو وہ ہٹ ہو سکتا ہے۔ ٹاپ آف دی چارٹ بھی بن سکتا ہے۔

پھر میں نے اندھیرے میں سے نمودار ہونے والی گدھا گاڑی کو دیکھا جو سیدھی میری طرف بڑھتی چلی آ رہی تھی۔ اس پر ایک بزرگوار اسی طرح چابک لیے کھڑے تھے جیسے فلم ''بن حر'' میں چارلٹن ہیسٹن رتھ پر کھڑا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ بزرگوار نے لمبوتری سی مضحکہ خیز ٹوپی لگا رکھی تھی اور ایک لمبا سا ریشمی چغہ پہن رکھا تھا۔ گاڑی کے پیچھے والے حصے میں سفید لٹھے کے شٹل کاک برقع میں کوئی روپوش خاتون سوار تھیں جو گاڑی کے جھٹکوں سے بار بار غبارے کی طرح بلند ہوتی تھیں۔ گدھا گاڑی کا پہیہ ایک گڑھے میں سے گزرا تو غبارہ اتنا اوپر اچھل گیا کہ پھر نیچے آنے تک گدھا گاڑی آگے نکل گئی تھی۔

نتیجہ یہ کہ برقع میں روپوش خاتون ایک چیخ کے ساتھ فرش پر گری۔ پائلٹ نے فوراً گدھے کو ایمرجنسی بریک لگائے۔

برقع میں خاتون واویلا مچا رہی تھی ''ارے ستیاناس ہو تیرا۔ پھر پٹخ دیا مجھے سڑک پر۔''

بزرگوار جمپ لگا کے اترے ''تم نے بھی تو سیفٹی بیلٹ نہ باندھنے کی قسم کھا رکھی ہے۔''

بڑی بی کمر پکڑ کے کراہتی اٹھیں ''ہزار بار کہا ہے کہ گاڑی کے شاک آبزاربر صحیح کرا لو، ہائے میری کمر پھر ٹوٹ گئی۔''

''اجی، اس نامعقول کو اتنا بڑا گڑھا نظر نہیں آیا۔''

بڑے میاں نے بڑی بی کو پھر سوار کر دیا۔

گدھے نے سر گھما کے کہا ''تم جانتے ہو اس عمر میں نظر کمزور ہو جاتی ہے، مجھے چشمے کی ضرورت ہے۔''

گدھے کو باتیں کرتا دیکھ کے میں دم بخود رہ گیا۔

بزرگوار نے ناراضی کا اظہار کیا ''اب تم کام چور بھی ہو گئے ہو۔ چلتے ہو کہ رینگتے ہو۔''

گدھے نے ترکی بہ ترکی جواب دیا ''نیا گدھا آدھے ہارس پاور کا ہوتا ہے۔ میں اٹھارہ سو اسی ماڈل کا ہوں۔''

میں نے کہا ''آپ کون ہیں جناب! یہاں کیا کر رہے ہیں؟''

بزرگ پھر جمپ لگا کے اترے۔ انہوں نے چابک لہرا کے کہا ''نامعقول، گستاخ، ناخلف، ہم سے پوچھتا ہے ہم کون ہیں؟''

میں نے کہا ''یہ ہائی سیکیورٹی زون ہے۔ ہر ایرا غیرا نہیں آ سکتا یہاں۔''

بزرگوار نے چیخ مار کے کہا ''اجی سنتی ہو۔ ہمیں تمہارا پڑپوتا کیا کہہ رہا ہے؟ ایرا غیرا......'' انہوں نے چابک

گھما کے میری ٹانگوں پر مارا۔

میں اچھلا ''یہ کیا کر رہے ہیں آپ......؟''

''ہم دماغ درست کر رہے ہیں تیرا۔ دیکھتی ہو، یہ گوروں کی طرح نیکر پہنے کھڑا ہے ننگے سر ہمارے سامنے۔'' انہوں نے پھر چابک رسید کی۔

میں اچھل کے پیچھے ہٹا ''حضرت، یہ کیا مار پیٹ کر رہے ہیں آپ۔ نیکر نہیں برمودا شارٹس ہیں۔ آپ جیسی جوکروں والی ٹوپی آج کل کوئی نہیں پہنتا۔ کچھ بتایئے تو سہی، آپ کون ہیں؟''

وہ پھر اچھل کے آگے آئے ''ہم مالک ہیں اس جاگیر اور حویلی کے اور تو ہمارے پوتے کے پوتے کا پوتا ہمیں نہیں جانتا۔''

بڑی بی نے برقع میں سے ہانک لگائی ''اجی بتاتے کیوں نہیں کہ ہم عزت بیگ ہیں اور بیٹا، میں ہوں تیری دادی کی پردادی۔''

''اوہ۔ معاف کیجیے گا، میں پہچان نہیں پایا، کیسے آنا ہوا؟''

دادا نے چابک لہرایا ''بالکل سیدھا کھڑا ہو جا نامعقول۔ ہم آئے ہیں تجھے سزا دینے۔ آباواجداد کی نشانیوں کو بیچ کھایا تو نے؟''

چابک پھر میری ٹانگوں پر پڑا تو میں چیخ مار کے اچھلا ''دادا جی، میں نے تو ایسا کچھ نہیں کیا۔''

وہ چابک لے کر میرے پیچھے لپکے ''جھوٹ، صریح جھوٹ، سفید جھوٹ۔ کیا تو نے خاندانی نوادرات فروخت نہیں کیے آج، بول......''

گدھے نے حمایت میں کہا ''وہ تو سونے کے برتن تھے۔''

دادی نے چلا کے کہا ''کم بخت، اس میں میرے جہیز کا سامان بھی تھا۔ ہائے میرا آفتابہ......'' انہوں نے سینے پر دوہتڑ مارا۔

پردادا نے پھر چابک رسید کیا ''میرا وضو کا لوٹا۔ میرا پانی پینے کا پیالہ۔ سب بیچ دیا خبیث! گھر کے برتن بیچنے کی نوبت آ گئی اتنی جلدی......''

اب صورتِ حال یہ تھی کہ پردادا میرے پیچھے تھے اور میں آگے۔ دادی برقع کے اندر اچھل اچھل کے اپنے مجازی خدا کو شہ دے رہی تھیں۔ مارو، اور مارو اسے۔ خدائی خوار! جو سو سال میں نہ ہوا، اس حرامی نے دو دن میں کر دیا۔''

میں چلا رہا تھا ''ہائے مر گیا۔ آہ......اف!'' جب راجا نے مجھے جھنجھوڑ کے بیدار کیا۔

''ابے یہ کیا شور مچا رکھا ہے، کون مار رہا ہے تجھے۔ مارتا کیوں نہیں اس سالے کو؟''

میں نے کہا ''دادا جی۔ آہ، اللہ کی قسم بڑی زور کی لگی ہے۔''

راجا نے کہا ''ابے دادا کے پوتے، ہوش میں آ۔''

میں اٹھ بیٹھا۔ راجا میری حالت پر ہنس رہا تھا لیکن اچھی بات یہ تھی کہ میری آواز زنان خانے تک نہیں پہنچی تھی ورنہ میرا بہت مذاق بنتا۔

میں نے کہا ''یار، خدا کا شکر ہے یہ خواب تھا ورنہ پردادا صاحب تو میری کھال ادھیڑ کر رکھ دیتے، اس کھال کے جوتے بنوا دیتے۔''

''اور انہی جوتوں سے میں تیری چندیا گنجی کر دیتا......'' راجا نے کہا اور منہ ٹیڑھا کر کے بولا ''وہ پھر آ گئے خواب میں؟''

میں نے کہا ''ہاں یار! ایک تو وہ نمودار ہوتے ہیں اپنی اسی تاریخی گدھا گاڑی میں، جس کو دوڑا کے انہوں نے ڈیڑھ صدی قبل ست بدھائی کی زمین گھیری تھی اور انگریز حاکم سے قبضہ لیا تھا پھر اپنی منکوحہ یعنی پردادی صاحبہ کو ضرور ساتھ لاتے ہیں۔ وہ شٹل کاک برقع کے اندر اچھلتی رہتی ہیں اور شور کرتی رہتی ہیں۔ شکل ان کی آج تک نہیں دیکھی، پٹوالی بہت ہیں۔''

ابھی میں پھر لیٹا ہی تھا کہ لائٹ چلی گئی۔ شہناز اور فریال اپنے بیڈروم میں زیرو واٹ کا بلب جلائے رکھتی تھیں۔ ہمارے بیڈروم میں اندھیرا رہتا تھا لیکن باہر کے حصے میں کچھ سرچ لائٹس لگا دی گئی تھیں جو صحن یا باغ کو اور حویلی کے آس پاس کے علاقے کو چاروں طرف سے روشن رکھتی تھیں۔ ان کا تھوڑا بہت اجالا پردے پڑے ہونے کے باوجود کھڑکیوں اور روشندانوں سے اندر تک محسوس ہوتا تھا۔ اب اچانک گھپ اندھیرا چھا گیا۔

بجلی کا آنا جانا پاکستان میں روزمرہ کا معمول ہے جس پر کوئی بھی پریشان نہیں ہوتا۔ لوگ بڑے صبر سے بجلی کے پھر آنے کا انتظار کرنے کے عادی بن گئے ہیں کیونکہ تجربے سے وہ جان گئے ہیں کہ شکوہ یا ہنگامہ کرنے سے نظام میں بہتری نہیں آتی۔ بہت سی انتظامی خرابیوں مثلاً بس میں لٹک کے سفر کرنے یا گندا پانی پینے کو بھی عوام نے نوشتہ تقدیر سمجھ کے قبول کر لیا ہے۔ جان جلانے سے کچھ نہیں حاصل۔ اللہ بہرحال صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

چونکہ گرمی نہیں تھی اس لیے راجا نے بھی اٹھ کے جنریٹر

چلانے کی ضرورت کونظرانداز کردیا ورنہ پنکھے بند ہوجانے کے بعد سونا محال ہوجاتا مگر اس کے ساتھ ہی باہر کچھ شور ہوا۔ پہلے کسی نے دروازے پر پتھر مارا، پتھر یقیناً بڑا ہوگا کہ رات کی خاموشی میں اس کی آواز بم کے دھماکے کی طرح محسوس ہوئی۔

ہم سب ایک ساتھ اٹھ بیٹھے۔ میں نے گارڈ کو اندر سے چلاتے سنا۔ وہ بڑا پھاٹک کھولنے سے انکار کررہا تھا۔

فرخ نے کہا ''اس وقت کون آ گیا؟''

میرے کچھ بولنے سے قبل ہی دروازے پر مسلسل دھماکے ہونے لگے۔ اس پر بڑے بڑے پتھر مارے جارہے تھے یا پھر سریے اور ڈنڈے مگر یہ دروازہ ایسے ٹوٹنے والا نہیں تھا۔

راجا نے کہا ''میں جنریٹر چلاتا ہوں۔''

میں اور فرخ ریوالور لے کر اس کے ساتھ ہی باہر نکلے۔ شور نے فریال اور شہناز کی نیند بھی اڑادی تھی۔ وہ بدحواس تو نہیں تھیں لیکن خوفزدہ ہوکے باہر آ گئی تھیں ''رفیق بھائی! یہ کیا ہورہا ہے؟'' شہناز نے پوچھا۔

فریال نے کہا ''یہ کون لوگ دروازہ توڑ کے آنا چاہتے ہیں؟''

فرخ کی بے وقوفی کہ اس نے وہ بات منہ سے کہہ دی جو میرے اور راجا کے دل میں بھی سب سے پہلے آئی تھی ''ایسے زبردستی کرنے والے تو ڈاکو ہی ہوسکتے ہیں۔''

ان دونوں نے کورس میں چیخ ماری ''ڈاکو!''

اچانک باہر سے فائرنگ ہونے لگی پھر مجھے بھی شک نہ رہا کہ آدھی رات کے بعد حملہ کرنے والے ڈاکو ہی ہوسکتے ہیں۔ یہ سوچنے کا وقت ہی نہ تھا کہ ان تک حویلی میں ساڑھے تین کروڑ موجود ہونے کی خبر کیسے پہنچی۔ میں نے چلا کے گارڈ کو حکم دیا کہ وہ گیٹ سے ہٹ کے اوپر چلا جائے۔ ایک گارڈ زیادہ عقل مند ثابت ہوا۔ فائرنگ کی آواز سنتے ہی وہ چھت پر چلا گیا اور اس نے وہاں سے حملہ آوروں کو نشانہ بنانے کی کوشش کی۔

اس ہنگامہ آرائی کی وجہ سے سرونٹ کوارٹرز میں بھی خوف وہراس پھیل گیا تھا۔ گیٹ توڑنے کی کوشش اب بھی جاری تھی لیکن یہ صاف محسوس ہوتا تھا کہ جوابی حملے نے حملہ آوروں کو پسپا ہونے پر مجبور کردیا ہے۔

راجا ابھی تک جنریٹر اسٹارٹ کرنے کی کوشش میں ناکام تھا۔ میں نے فرخ سے کہا ''تم گاڑیوں کو اسٹارٹ کرکے ہیڈ لائٹس آن رکھو، گاڑیوں کا رخ بدل کے لائٹ پھیلا دو۔''

''میں چابیاں لاتا ہوں۔'' فرخ اندر لپکا۔

میں ٹارچ لے کر اوپر جارہا تھا کہ فریال سامنے آ گئی ''تم کہاں جارہے ہو؟''

میں نے کہا ''اوپر...... تم جاؤ سرونٹ کوارٹرز کی طرف، عورتوں بچوں کو خاموش کراؤ۔''

اس نے صاف انکار کردیا ''میں تمہارے ساتھ جاؤں گی۔''

شہناز نے کہا ''رفیق بھائی، میں جاتی ہوں ادھر۔''

لیکن اتنی دیر میں حملہ آور پسپائی اختیار کرچکے تھے۔ فائرنگ کی شدت میں کمی آ گئی تھی اور آوازیں بھی دور سے آنے لگی تھیں۔ اصل خرابی یہ ہوئی کہ راجا کی انتہائی کوشش کے باوجود جنریٹر اسٹارٹ نہیں ہوا۔ ہمارے پاس ابتدا ہی سے دو جنریٹر آ گئے تھے۔ پہلے ہمارا خیال تھا کہ ان میں سے ایک کو اسٹینڈ بائی رکھیں گے لیکن بعد میں راجا نے اسے ٹیوب ویل چلانے پر لگادیا تھا۔ اس سے ٹیوب ویل تو نہیں چلا اس کی موٹر بڑی تھی۔ جنریٹر جل گیا۔ اب ایک جنریٹر تھا وہ حویلی کے اندر باہر کی لائٹوں کا سارا لوڈ برداشت کررہا تھا مگر سرچ لائٹس اس سے نہیں جلائی جاسکتی تھیں۔ اس میں سرکٹ بریکر کا خودکار سسٹم تھا۔ زیادہ لوڈ پر وہ اسٹارٹ ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس وقت وہ راجا کے بس کی بات نہیں تھی کہ وہ سرچ لائٹس کا کنکشن الگ کرے۔ جب تک یہ ہوا ڈاکو فرار ہوچکے تھے۔ فرخ نے اس سے پہلے ہی تینوں گاڑیوں کی ہیڈ لائٹس آن کرکے انہیں ایسے زاویے پر کھڑا کردیا تھا کہ حویلی کے اندر کا حصہ مکمل تاریکی میں نہیں رہا تھا۔

میں نے گارڈز سے کہا کہ وہ اپنی اپنی جگہ ڈیوٹی پر چلے جائیں پھر میں نے پھاٹک کھولنے کا حکم دیا۔ باہر مکمل خاموشی اس بات کا ثبوت تھی کہ ڈاکو ناکام لوٹ گئے ہیں۔

راجا نے کہا ''یار، جلدی کیا ہے، صبح ہونے دے۔''

فریال نے اس کی تائید کی ''کیا پتا وہ جنگل میں چھپے بیٹھے ہوں۔ گیٹ کھلتے ہی پھر آ جائیں؟''

''ہمیں ان کا پیچھا کرنا چاہیے۔'' میں نے کہا۔

''کوئی ضرورت نہیں ایسی بہادری دکھانے کی۔'' فریال بولی۔

راجا نے کہا ''ابھی کچھ دیر میں لائٹ آ جائے گی تو سرچ لائٹس روشن ہوجائیں گی، پھر دیکھ لیں گے۔''

رات کے باقی حصے میں سونے کی کوشش کرنا ہی لاحاصل تھا۔ روشنی پھیلنے تک ڈھائی گھنٹے سب نے جاگ کے گزارے۔ اپنے اپنے طور پر سب نے ڈاکوؤں کے حملے کو مخبری کا نتیجہ قرار دیا۔ اس خیال پر سب کا اتفاق تھا کہ ڈاکوؤں تک انفارمیشن براہِ راست سونا خریدنے والوں نے نہیں پہنچائی تو ان کی ...

... سے پہنچی۔ انہوں نے زمانے بھر میں اس سودے کا ... یا اور کسی نہ کسی کے وسیلے سے ڈاکوؤں کو پتا چل گیا۔

عام خیال یہ تھا کہ چوری ڈکیتی کی بڑھتی ہوئی وارداتیں صرف پولیس کی ناکامی نہیں، ایسا ان کے تعاون سے ہورہا ہے۔ وہ تمام وارداتوں میں حصے دار بنتے ہیں اور جرم کرنے والوں کو کھلا لائسنس دیتے ہیں کہ پبلک کے ساتھ جو چاہو کرو۔ یہاں بھی کوتوال اب ڈر کا ہے کا۔ چنانچہ جوئے، سٹے کے سارے اڈے منشیات کا دھندا، جگا ٹیکس اور بھتا مافیا۔ سب براہ راست پولیس کی سرپرستی کا شاخسانہ ہیں۔

راجا ہم سب سے زیادہ باخبر تھا کیونکہ وہ کرائم رپورٹر تھا ''اب تو ایسی خبریں بھی ملتی ہیں کہ پولیس والے براہِ راست کسی واردات میں شریک تھے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ مجرموں نے پولیس کی وردی پہن رکھی تھی۔ ہر گلی محلے میں بالکل بے ضرر نظر آنے والے لوگ پولیس کے مخبر ہیں۔ گھروں کے اندر کام کرنے والی ماسیاں اور دوسرے ملازم انفارمیشن پاس کردیتے ہیں۔''

میں نے کہا ''ان کے لیے گھر کا بھیدی کی اصطلاح بہت پہلے بن گئی تھی۔''

شہناز نے کہا ''راجا! یہ سب ہمیں بھی معلوم ہے۔ تم کچھ کرسکتے ہو تو پتا کرو یہ کس کی حرکت تھی؟''

''کیا مطلب...... ابھی نکل جاؤں، سراغ رسی کرنے؟''

''یہ تو میں نے نہیں کہا مگر غلطی تم سے بھی ہوئی۔'' شہناز بولی ''تم ہی ان سیٹھوں کو لائے تھے، جو ذرا بھی قابلِ اعتماد نہیں تھے۔''

''لاحول ولاقوۃ۔ تم کیا سمجھتی ہو، خود انہوں نے ڈاکوؤں کو بھیجا تھا؟ پھر تو مجھے بھی کہا جاسکتا ہے کہ میں ان سے مل گیا۔'' راجا بگڑ کے بولا۔

''ایسی باتیں کرکے تم بری الذمہ نہیں ہوسکتے۔''

راجا کی خفگی بڑھ گئی ''شہناز! میرے باپ دادا سنار نہیں تھے، میں نے ان کا انتخاب صرف ان کی نیک نامی پر کیا تھا۔ اس لیے کہ مجھ سے کہا گیا تھا۔ کوئی اور کرلیتا یہ کام۔''

''مطلب یہ کہ تم کچھ نہیں کروگے، ان سے پوچھو گے بھی نہیں؟'' شہناز سوالیہ انداز میں بولی۔

راجا نے ہاتھ جوڑے ''خدا کے واسطے شہناز! بلاوجہ میرے پیچھے مت پڑجایا کرو۔ میں پوچھوں گا کہ انہوں نے کس کس کے سامنے بات کی تھی، یہاں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ بینک سے کوئی بڑی رقم لے کر نکلے تو ڈاکو پیچھے لگ جاتے ہیں۔ بینک کا کوئی بندہ انہیں مطلع کردیتا ہے۔ اسی لیے اب بینکوں کے اندر موبائل فون استعمال کرنے کی اجازت نہیں۔ کوئی گاڑی بیچے یا مکان کا سودا کرے، بروکر سے اطلاع لوٹنے والوں تک پہنچنے کا ڈر رہتا ہے۔''

شہناز نے کہا ''تمہارے پولیس میں اتنے مراسم ہیں آخر۔''

''یار! کچھ عقل سے کام لو۔ میں کیا کروں، پولیس کے محکمے کو اس واردات کے پیچھے لگادوں جو ہوئی ہی نہیں۔''

میں نے انہیں مزید لڑنے سے روکا۔ زیادتی شہناز کی تھی جو راجا کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی تھی۔ عام طور پر مرد ایسی عورتوں سے بھاگتے ہیں۔ راجا کا عجیب کیس تھا۔ وہ گلہ بھی کرتا تھا کہ شہناز محبوبہ نہیں، اماں ہے میری۔ ہر وقت میرے اخلاق و کردار کو سدھارنے کے لیے لیکچر دیتی رہتی ہے لیکن دوسری طرف راجا کو عشق تھا تو صرف ایک شہناز سے۔ محبت وہ کرتا ہی رہتا تھا جو دو چار مہینے چلتی بھی رہتی تھی۔

ابھی اندر ہمیں صبح کا اجالا پھیلنے کا احساس بھی نہیں ہوا تھا کہ ایک گارڈ نے اطلاع دی ''سر! باہر ایک بندہ مرا پڑا ہے اور ایک کتا، میں نے اوپر سے دیکھا ہے۔''

ہم سب کے لیے یہ ایک سنسنی خیز اطلاع تھی۔ میں نے باہر آ کے گیٹ کھلوایا پھر ہم مسلح ہوکے جیپ میں باہر نکلے۔ رات ختم ہوگئی تھی لیکن ابھی جنگل گہرے دھندلکے میں ڈوبا ہوا تھا۔ گاڑی فرخ ڈرائیو کررہا تھا۔ میں ایک گارڈ اور راجا بڑی مستعدی سے چاروں طرف نظر رکھے بیٹھے تھے۔ کسی طرف خفیف سی بھی مشتبہ حرکت نظر آتی تو ہم بے دریغ فائر کردیتے۔

جس شخص کو مردہ فرض کرلیا گیا تھا وہ زخمی تھا۔ کسی گارڈ کی گولی اس کے پیٹ میں لگی تھی۔ گولی نے دل، جگر کو نقصان پہنچایا ہوتا تو وہ اتنی دیر میں مرچکا ہوتا۔ اس کا خون بہت بہہ چکا تھا اور اس کی حالت خراب تھی۔ ہم نے اسے جیپ میں ڈالا اور شہناز کے پاس بھیج دیا۔ اس وقت وہی اس کی جان بچانے کی کچھ کوشش کرسکتی تھی۔ قانونی چکر میں پڑتے تو پہلے واردات کی رپورٹ لکھواتے اور پھر اسے کسی سرکاری اسپتال لے جاتے جہاں کوئی میڈیکولیگل افسر ہوتا۔

اس شخص کو دیکھتے ہی ڈاکوؤں کے حملے کا نظریہ ازخود باطل ہوگیا تھا۔ اس کا سر گنجا تھا اور وہ صرف خاکی رنگ کی نیکر میں ملبوس تھا۔ اس کے پیروں کی کھال پھٹی ہوئی تھی اور اس کے جوان مگر فاقہ زدہ جسم پر مندمل ہوجانے والے زخموں کے کئی نشان تھے۔ وہ رانا رجب علی جتال کا غلام تھا۔ اس کا یہ حلیہ ہی اس کی پہچان تھی۔

کتے کی لاش دیکھ کر مجھے ایک شاک لگا۔ وہ شکاری کتا تھا اس جیسے دو کتوں کی ہلاکت کا صدمہ رانا پہلے اٹھا چکا تھا۔ یہ تیسرا تھا اور شاید زخمی حالت میں ملنے والا اسی کتے کا رکھوالا بلکہ خدمت گار تھا۔ وہ کتے کے ساتھ ننگے پاؤں دوڑتا آیا ہوگا کتے کی زنجیر اس کی کمر کے گرد لپٹی ہوئی چمڑے کی بیلٹ سے منسلک ہوگی۔ وہ بیلٹ اب بھی اس کی نیکر کے اوپر والے حصے پر موجود تھی۔ یہاں آ کے اس نے کتے کو آزاد کیا ہوگا اور اسی وقت اوپر سے آنے والی کسی گارڈ کی ایک گولی نے خادم کو نشانہ بنایا تو دوسری گولی نے مخدوم کو۔ ناکام لشکر جاتے وقت اپنے زخمی اور لاشیں نہ اٹھا سکا۔

زیادہ حیرانی مجھے اس بات پر تھی کہ اگر حملہ آور کتوں کے ساتھ آئے تھے جیسا کہ ان کا معمول بنتا جا رہا تھا، تو مجھے کتوں کے بھونکنے کی آواز کیوں سنائی نہ دی۔ جب وہ بھونکتے غراتے آتے تھے تو ان کے پیچھے موٹر سائیکلوں پر رانا کے خاص آدمی بھی آتے تھے۔ وہ مسلح ہوتے تھے اور جائزہ لیتے تھے کہ حویلی کے اندر گھس کر اپنے شکار کو دبوچنے کے لیے حالات کس حد تک موافق ہیں۔ سخت حفاظتی انتظامات کے باعث ابھی تک ان کو موقع نہیں ملا تھا۔ یقیناً رانا نے اس پر جھنجلاہٹ اور برہمی کا اظہار کیا ہوگا کہ ایسے کب تک چکر لگاؤ گے۔ روز جاتے ہو اور شکل دکھا کے آ جاتے ہو۔

آج آدھی رات کے بعد ایک نئے پلان کے مطابق حملہ کیا گیا تھا۔ وہ مرنے مارنے کے ارادے سے آئے تھے۔ اگر انہیں دروازہ کھلا ملتا تو وہ گارڈز کو نشانہ بنا کے سیدھے اندر آتے۔ ان کی راہ میں جو آتا، مارا جاتا اور وہ سرونٹ کوارٹرز تک پہنچ جاتے جہاں کاسو اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ موجود تھا۔ وہ کاسو کو اٹھا کے لے جاتے۔

لیکن پھاٹک جو ہمیشہ کھلا رہتا تھا اور شاید سو سال سے کھلا پڑا تھا، ایک دن پہلے ہی بند ہوا تھا۔ اس کے بھاری پٹ کوڑے کرکٹ اور دونوں طرف جمع ہو جانے والی مٹی میں پھنسے ہوئے تھے اور اس کے قبضے جام تھے۔ فرخ نے اپنی نگرانی میں سارا کام کرایا تھا اور پٹ بند کرا دیے تھے۔ اب گارڈ انہیں آسانی سے کھول بھی سکتا تھا۔ حملہ آور اسے کھلوانے میں بھی ناکام رہے تھے اور توڑنے میں بھی۔ اگر انہیں علم ہوتا کہ حویلی میں داخلے کا راستہ یوں بند ملے گا تو شاید وہ اپنے ساتھ بلڈوزر بھی لے آتے جو پھاٹک کو گرا دیتا۔

اسی طرح اندر آنے کے دوسرے تمام راستے جو دیواروں میں شگاف ڈال کے شارٹ کٹ اختیار کرنے کے لیے بنائے گئے تھے، بند ہو چکے تھے۔ مزید یہ کہ پیچھے اور سامنے مسلح گارڈ متعین کر دیے گئے تھے۔ سرچ لائٹس کا سدِباب تو انہوں [illegible] یوں کیا ہوگا کہ بجلی کے تار کاٹ کے سپلائی روک دی [illegible] گارڈز کی جوابی فائرنگ کے لیے وہ تیار نہ تھے۔

یہ تمام خیالات چند منٹ کی پیداوار تھے۔ خود را[illegible] بھی ان سے مختلف نتائج اخذ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے [illegible] "ہم نے کتے کے بھونکنے کی آواز کیوں نہیں سنی۔"

میں نے نیچے اتر کے کتے پر ٹارچ کی روشنی ڈالی تو [illegible] کے سوال کا جواب مل گیا "اس کے منہ پر جالی ہے، تاروں [illegible] بنی ہوئی۔"

راجا نے جھک کر دیکھا "اوہ مائی گاڈ! ان کا پلان خاموشی سے کتے کو اندر لانے کا تھا اگر انہیں پچھلی طرف سے راستہ [illegible] جاتا تو کتا انہیں سیدھا کاسو کی کوٹھڑی میں لے جاتا۔"

"جب ادھر سے راستہ بند ملا تو وہ گیٹ کی طرف آئے۔"

راجا نے افسوس سے سر ہلایا "کتنے دکھ اور شرم کی بات ہے۔ رانا ایک معمولی حیثیت کے غلام کی خاطر یہ کینہ پروری کر رہا ہے۔ وہ بھول نہیں سکتا کہ غلام نے بغاوت کی اور اس کی قید سے بھاگ گیا۔"

"وہ کیسے بھولے؟" میں نے کہا "رانا کے بنائے ہوئے نظام میں یہ ممکن نہیں اگر وہ نافرمانوں اور باغیوں کو ایسی عبرت ناک سزائیں نہ دے تو دوسرے غلام بھی اس کے نقشِ قدم پر چلنے کا سوچیں۔ اپنی حاکمیت برقرار رکھنے کے لیے غلام کے لیے معافی نہیں ہونی چاہیے۔ رعایت نہیں ہونی چاہیے۔"

"مگر یہ بڑی تشویش کی بات ہے، آخر ہم کب تک بچائیں گے کاسو کو۔" راجا متفکر ہو گیا۔

"ہم اسے رانا کے حوالے بھی نہیں کر سکتے۔ خود رانا قرآن ہاتھ میں لے کے حلف اٹھائے کہ کاسو کو معاف کر دے گا۔" میں نے کہا "کیا ہم پولیس کو بتائیں؟"

"ہم کاسو کو غائب تو کر سکتے ہیں۔ کہیں بھیج سکتے ہیں، جہاں رانا کے کتوں کی رسائی نہ ہو۔" میں نے کہا "اس مسئلے کا اور کوئی حل نہیں۔"

اب دھوپ چڑھ گئی تھی۔ واپس اندر جا کے میں نے ایک گارڈ کو بھیج کے کتے کی لاش منگوائی۔ وہ اسے رسی سے باندھ کے گھسیٹتا ہوا لایا اور صحن میں ڈال دیا۔ اس عرصے میں یہ خبر عام ہو گئی تھی کہ رات حملہ کرنے والے ڈاکو نہیں تھے رانا کے آدمی تھے۔

کاسو نے کتے کو دیکھا تو کانپنے لگا۔ اس کی بیوی نے اپنے بچے کو سینے سے لگا لیا اور رونے لگی "یہ وہی کتا ہے نواب صاحب!"

میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا "وہی...... یعنی جس کو تمہارے بچے کا خون چٹایا گیا تھا؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "یہ اندر آ جاتا تو میرے بچے کو کھا جاتا یا منہ میں دبوچ کے لے جاتا۔ میں پہچانتی ہوں اس جانور کو۔"

میں نے اسے تسلی دی "چلو، اب یہ خطرہ تو نہیں رہا۔ تمہارا بچہ محفوظ رہے گا۔ کوئی کتا اسے کھانے نہیں لپکے گا۔"

خلا میں گھورنے والے کاسو نے کہا "خطرہ میرے ہوتے ختم نہیں ہو سکتا نواب صاحب! اگر آج یہ جانور میرے بچے کو کھا جاتا تو کیا ہوتا یا کل اگر دوسرا کتا میری بیوی کو کھانے آ گیا تو کیا ہوگا؟"

میں نے کہا "کاسو، حوصلہ رکھو۔"

"میرے بیوی بچوں کی زندگی میری وجہ سے محفوظ نہیں۔ میرے جیسے شوہر اور میرے جیسے باپ سے زیادہ خود غرض اور کمینہ کوئی ہو سکتا ہے، اپنی زندگی کے لیے میں نے ان دونوں کی زندگی کو داؤ پر لگا دیا ہے۔ نہیں نواب صاحب، میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔ میں خود کو رانا کے حوالے کر دوں گا۔"

راجا نے اسے ڈانٹا "بے وقوفی کی بات مت کرو۔ یہ سب پہلے کیوں نہیں سوچا تھا، ہمت نہیں تھی تو ایسا قدم ہی کیوں اٹھایا تھا؟ اب ہم نے تمہارے لیے رانا کی دشمنی مول لی ہے تو تم پیٹھ دکھا رہے ہو؟"

"راجا صاحب! میں نے غلطی کی تھی۔ میری وجہ سے آپ بھی مصیبت میں پڑے، میں رانا کے پاس چلا جاؤں گا تو......"

اس کی بیوی نے چیخ ماری "وہ تجھے دفن کر دے گا اس کتے کے ساتھ۔"

"کر دے۔ میری زندگی کیا ہے، نہیں چاہیے ایسی زندگی مجھے۔"

"تیری زندگی مجھے چاہیے۔ اس بچے کو چاہیے۔" کاسو کی بیوی دہاڑیں مار مار کے رونے لگی۔

"میری زندگی تیری موت ہے پاگل، اس بچے کی موت ہے۔"

"بکواس مت کر...... تو مجھے بیوہ کرنا چاہتا ہے۔ اس بچے کو یتیم کرنا چاہتا ہے کمینے......" وہ چلاتی رہی "اکیلا کیوں مرنا چاہتا ہے؟"

میں نے انہیں خاموش کیا "دیکھو، ہم پر بھروسا رکھو۔ ہم کچھ نہ کچھ کر لیں گے، تم جاؤ سکون سے بیٹھو۔"

شہناز یا فریال نے ان واقعات کا زیادہ اثر نہیں لیا تھا یا پھر وہ اپنی پریشانی ظاہر کر کے ہماری پریشانی میں مزید اضافہ کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ ذہنی طور پر انہوں نے اس حقیقت سے پہلے ہی سمجھوتا کر لیا تھا کہ ست بدھائی میں ان کی زندگی پھولوں کی سیج نہیں، کانٹوں کا بستر ہوگی۔ یہاں شہر کی آسانیاں نہیں ہوں گی۔ مشکلات کا سامنا ہر قدم پر ہوگا اور زندگی ایک مسلسل چیلنج ہوگی۔

فریال کے لیے لندن میں زندگی جتنی پُرکیف تھی، اتنی ہی صبر آزما بھی رہی تھی۔ سلطان اپنی موجودگی کا ہر لمحہ احساس دلاتا تھا اور اسے بھولنے نہیں دیتا تھا کہ بالآخر اس کو سلطان کی ملکیت بننا ہوگا۔ اس کے لیے یہ احساس یہاں بھی تھا مگر وہ میرے ساتھ تھی اور اپنے فیصلے میں بہت واضح تھی کہ وہ مار دے گی یا مر جائے گی مگر سلطان کو اپنے جسم کا قبضہ نہیں دے گی۔ اس نے تمام خطرات کو قبول کر رکھا تھا۔

کچھ ایسی ہی کیفیت شہناز کی تھی۔ اس نے راجا کو یوں اپنی تحویل میں لے رکھا تھا جیسے کوئی بیوہ عورت اکلوتے بیٹے سے اپنے مستقبل کی تمام امیدوں کو وابستہ کر کے صرف اسے حاصل زندگی بنا لیتی ہے۔ اسے میں راجا کی خوش قسمتی سمجھتا تھا کہ اس کا ہر گھڑی خیال رکھنے والی شہناز جیسی مخلص، سمجھدار اور بے غرض عورت تھی۔ یہ بات مجھے ہمیشہ حیران کرتی تھی کہ راجا جیسے لاابالی اور فطرتاً باغی شخص نے اس کی اطاعت کیسے قبول کر لی تھی لیکن تاریخ میں ایک نام "ایوا براؤن" کا ہے جو ہٹلر کے دل و دماغ پر حکومت کرتی تھی۔ ایسا ہی کردار نور جہاں کا تھا جس نے جہانگیر کو سنبھالا اور اس سے پہلے تاریخ میں کلوپیٹرا کا نام تھا جو سیزر جیسے حکمراں پر حاکم تھی۔ جب راجا نے مستقل میرے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا تو پھر شہناز کے لیے بھی لاہور میں رہنا ممکن نہ رہا۔ وہ راجا کو کہیں کسی کے ساتھ الگ نہیں چھوڑ سکتی تھی اور نہ خود اس کے بغیر رہ سکتی تھی۔

اس طرح ہم سب ست بدھائی کی زندگی کو اس کے تمام خدشات، خطرات اور آفات کے ساتھ اختیار کر چکے تھے اور ہم نے ڈرنا، فکر کرنا چھوڑ دیا تھا۔ رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج، غالب نے ٹھیک کہا تھا۔

ناشتے کے دوران میں راجا کی شہناز سے لڑائی جاری رہی۔ راجا نے کہا "تم کب یہ سمجھنا چھوڑو گی کہ دنیا کا سب سے غیر ذمے دار، بے وقوف اور ناکارہ شخص میں ہوں؟"

شہناز نے کہا "میں نے ایسا کبھی نہیں کہا۔"

"کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم اپنے رویے سے ثابت کرتی رہتی ہو۔ تم تو ڈاکٹر ہو، میرے سر کا آپریشن کر کے چیک کر لو کہ اس میں بھوسا ہے صرف یا کچھ عقل بھی ہے؟"

''افوہ...... ایسی کیا بات ہوگئی آخر۔'' شہناز خفت میں بولی۔

''آخر کیسے فرض کرلیا تھا تم نے کہ جن سونے کے خریداروں کا میں نے انتخاب کیا تھا، وہ ڈاکوؤں سے ملے ہوئے تھے؟ ڈاکو تو آئے ہی نہیں تھے۔'' راجا بولا۔

''میں نے تو صرف امکان کی طرف اشارہ کیا تھا۔''

''واہ! کیا خوب اشارہ تھا۔ آپ نے قصوروار بنادیا تھا مجھے کہ میں نے ایسے لوگوں کو بلالیا تھا جو قابلِ اعتماد نہیں تھے۔ تحقیق نہیں کی تھی، ان کی نیک نامی اور خاندانی ساکھ کے بارے میں جھوٹ بولا تھا۔''

میں نے کہا ''یار، کیوں شہناز کے پیچھے پڑگیا ہے۔ چل، ہوگئی اس سے غلطی۔''

''غلطی ہوگئی تو کہے سوری!''

شہناز نے کہا ''اچھا بھئی آئی ایم سوری۔'' اور ناشتے کی میز سے اٹھ کے اندر چلی گئی۔

راجا اس کے پیچھے لپکا ''کیا مصیبت ہے۔ اب مجھے سوری کہنا پڑے گا۔''

اس دوران میں میرا ذہن کاسو کے مسئلے میں الجھا رہا تھا۔ نظر آتا تھا کہ کاسو پر رانا کی دہشت طاری ہے۔ اس کی بیوی باہمت تھی کہ اسے نکال لائی تھی۔ کاسو کا حوصلہ رانا کی کینہ پروری کے مسلسل مظاہرے سے پست ہوتا جارہا تھا۔ اس مسئلے کا ایک حل تو یہی تھا کہ کاسو کو کہیں بھیج دیا جائے لیکن سوال یہ بھی تھا کہ کہاں؟ رانا کے جارحانہ طرزِ عمل پر مجھے بھی طیش آنے لگا تھا۔ کاسو اگر پہلے اس کا غلام تھا تو اب میرا ملازم تھا۔ میری تحویل اور پناہ میں تھا۔ نہ میرے پاس آکے کاسو نے کوئی جرم کیا تھا اور نہ اسے سہارا فراہم کرکے میں نے۔ ایک انسان کی حیثیت سے کاسو کو یہ حق حاصل تھا کہ جہاں چاہے رہے لیکن رانا کی نظر میں یہ جرم تھا اور اس جرم کی سزا وہ مجھے بھی دے رہا تھا۔ اس کے کارندے اور وحشی کتے ست بدھائی کا طواف اور حویلی میں رہنے والوں کو ہراساں کررہے تھے۔ یہ میرے نزدیک اشتعال انگیزی تھی اور اس کا جواب نہ دینا خود اپنی کمزوری کا اعتراف کرنے کے مترادف تھا۔

ان سب حالات کو ذہن میں رکھ کے میں نے ایک فیصلہ کیا۔ اس فیصلے کا اعلان میں پہلے سے کردیتا تو مخالفت میں بحث چھڑ جاتی۔ جب تین کروڑ کی رقم بینک میں رکھوانے کے لیے میں لاہور جانے لگا تو میں نے راجا کو بھی ساتھ لے لیا۔ ہم دونوں پیچھے بیٹھے اور رقم کے سوٹ کیس ہمارے درمیان رہے۔ ڈرائیونگ اکبر خان نے کی اور اس کے ساتھ ایک مسلح گارڈ بیٹھا۔ ہم چاروں کا مسلح ہونا ایک حفاظتی ضرورت تھی۔

ست بدھائی کا پل کراس کرنے کے بعد میں نے راجا کو اپنے عزائم سے آگاہ کردیا ''میں رانا رجب علی جتال سے ملنا چاہتا ہوں، ابھی۔''

''ابھی......؟''

''ہاں ابھی۔ اپنا احتجاج ریکارڈ کرانے کے لیے اور اسے وارننگ دینے کے لیے اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو اسے غلط فہمی ہوجائے گی کہ ہم ڈر گئے۔ ہم نے اس کی بالادستی کو قبول کرلیا اور وہ اپنی بدمعاشی جاری رکھ سکتا ہے۔''

راجا نے سر ہلایا ''ٹھیک کہا تو نے۔ اسے روکا نہ گیا تو اس کی بدمعاشی بڑھتی جائے گی۔''

''ہاں، کل رات حویلی پر حملہ میری اتھارٹی کو چیلنج کرنے والی حرکت تھی۔ اس کو روکنا ضروری ہے ورنہ اگلی مرتبہ وہ پھاٹک توڑ کے یا دیواریں گرا کے گھس آئے گا۔ آخر وہ خود کو سمجھتا کیا ہے، علاقے کی سپر پاور!''

''ہم امریکا جیسی سپر پاور سے بھی احتجاج کرتے ہیں کہ اس کے طیارے ہمارے علاقے میں گھس آئے یا غلطی سے ان کا میزائل ہماری سرحد کے اندر آگرا...... لیکن فیکے پتر! جلدی کی ضرورت نہیں۔''

''جلدی کی ضرورت ہے مہاراجا! دیر کا مطلب یہ بھی لیا جائے گا کہ ہم مشتعل نہیں ہوئے۔ تذبذب کا شکار ہیں۔ رات کو ایک واقعہ پیش آیا۔ صبح ہم پوچھنے آگئے کہ ایسا کیوں ہوا؟ جب کوئی بے عزت کرنے کے لیے آپ کو تھپڑ مارے تو آپ سوچتے نہیں، فوراً جوابی تھپڑ ماردیتے ہیں۔ یہ فوری ردِعمل آپ کی ہمت کو ظاہر کرتا ہے۔ اپنے آپ پر کنٹرول وہی رکھتا ہے جو ڈرتا ہو کہ مزید نقصان نہ ہوجائے۔''

راجا نے ڈرائیور کو گاڑی کا رخ پنڈ جتال کی طرف موڑنے کا حکم دیا۔ بیس منٹ بعد ہم اسی حویلی کے گیٹ پر تھے جہاں اس سے پہلے میں صرف ایک بار آیا تھا اور وہ بھی آدھی رات کے بعد۔ دن کے اجالے میں یہ حویلی اتنی متاثر کن نہیں لگ رہی تھی۔ یہ پرانی طرز کی کوٹھی تھی جس کو وسعت دے کر حویلی بنانے کی بڑی بھونڈی کوشش کی گئی تھی۔ اس میں تعمیراتی حسن کہاں سے آتا؟

ابھی ہم سو گز دور ہی تھے کہ حویلی میں خبر ہوگئی۔ دروازہ جو پہلے کھلا ہوا تھا بند کردیا گیا۔ چار مسلح محافظ بندوقوں کا رخ ہماری طرف کرکے کھڑے ہوگئے۔ اِدھر اُدھر مختلف کام کرنے والے کام چھوڑ کے یوں ہماری طرف متوجہ ہوگئے جیسے کوئی خونی مقابلہ ہوگا جس میں ہماری لاشیں گریں گی۔

جیپ تقریباً دس گز کے فاصلے پر رکی تو ایک محافظ نے غرا کے پوچھا ''کیوں آئے ہو یہاں، کیا کام ہے؟''

میں نے کہا ''تمیز سے بات کرو، جاکے بڑے رانا صاحب کو بتاؤ کہ ست بدھائی کے نواب رفیق احمد شیرازی ملاقات کے لیے آئے ہیں۔''

میں نے آواز کو بارعب بنالیا تھا اور محافظ کے ساتھ ایک حقارت آمیز حاکمانہ رویہ اختیار کیا تھا۔ اس کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ ایک محافظ اندر گیا۔ باقی تین نے بہتر سمجھا کہ بندوقیں نیچی کرلی جائیں ہم پرغرور انداز لاتعلقی کے ساتھ بیٹھے رہے۔ مجھے خیال آیا کہ اس وقفے میں ہم سگار یا پائپ پیتے، اس کا بھی اچھا اثر پڑتا۔

اندر جانے والا محافظ تقریباً پانچ منٹ بعد لوٹا تو ہمارے لیے گیٹ کھول دیا گیا۔ جیپ اندر گئی۔ احاطے کا منظر وہی تھا۔ سامنے رانا کے ذاتی استعمال والی لینڈ کروزر کھڑی تھی۔ اس کے پیچھے دو گاڑیاں تھیں۔ ایک سفید رنگ کی ٹویوٹا کرولا اور دوسری بلیک ہنڈا سوک۔ بائیں طرف کے آخری حصے میں ملازموں کی زیرِ استعمال سرخ رنگ کی مہران موجود تھی۔

رانا رجب علی نے ہمیں بڑی رعونت کے ساتھ مہمان خانے میں ریسیو کیا۔ اچھی بات یہ تھی کہ اس نے کم ظرف دشمن کی طرح ہمارے ساتھ اہانت آمیز سلوک نہیں کیا۔ شاید اسے یہ خیال بھی ہوگا کہ میرے ساتھ آنے والا ایک صحافی ہے جو کچھ غلط سلط لکھ دے تو اس کی پبلک لائف کے امیج کو نقصان پہنچ سکتا ہے چنانچہ منافقت سے کام لینا ہی سیاست ہے۔

اس نے خوش دلی سے پوچھا ''کیا پسند کریں گے جناب نواب صاحب! چائے یا ٹھنڈا؟''

میں نے کہا ''رانا صاحب! خاطر تواضع کی بات دوستانہ ماحول میں اچھی لگتی ہے۔ میں صرف پوچھنے آیا تھا کہ کل رات تمہارے بندوں کی جسارت حد سے بڑھ گئی۔ پہلے وہ شکاری کتوں کے ساتھ گیٹ تک آکے لوٹ جاتے تھے۔ کل انہوں نے حویلی میں داخل ہونے کی کوشش کی، وہ دروازہ توڑنا چاہتے تھے۔''

وہ عیاری سے مسکرایا ''اچھا! مجھے تو پتا نہیں۔''

میں نے کہا ''اب تو پتا چل گیا؟ آئندہ ایسا نہیں ہونا چاہیے...... ورنہ......''

رانا نے مجھے گھورتے ہوئے پُرتمسخر انداز میں مونچھوں کو تاؤ دیا ''ورنہ کیا جی......؟''

میں نے کہا ''ورنہ ہم جوابی کارروائی کریں گے۔''

وہ مسکرادیا ''جوابی کارروائی کے لیے کیا ہے تمہارے پاس؟ یہی رائفل، بندوق، توپ۔ نئے نئے نواب بنے ہو ناں...... خاندانی لوگوں کی طرح نہ غلام ہیں تمہارے پاس نہ شکاری کتے، نہ اعلیٰ نسل کے گھوڑے۔''

راجا نے کہا ''خاندانی طوائف جتنا غرور چاہے کرے، کسی شریف اور تعلیم یافتہ عورت سے برتر تسلیم نہیں کی جاتی۔''

رانا کا چہرہ غصے سے سرخ ہوا مگر وہ ٹال گیا ''اپنی کمزوری کو اگر شرافت نہ کہے عام آدمی تو کیا کہے؟''

میں نے کہا ''جو کچھ آپ نے کیا......''

''میں نے...... میں نے کچھ کیا ہے؟'' وہ بولا۔

میں نے کہا ''جو آپ کے حکم پر آپ کے بندوں نے کیا، وہ سنگین جرم ہے۔''

''زیادہ بولنے کی کیا ضرورت ہے نواب!'' وہ جارحانہ لہجے میں بولا ''پہلے اپنے گریبان میں جھانک لو۔ یہ سلسلہ تم نے شروع کیا تھا۔ کاسو کو تم اغوا کرکے لے گئے تھے۔''

میں نے کہا ''اگر ہم اپنے ساتھ پولیس کو لاتے تو یہ کاسو کی حبس بے جا سے برآمدگی کہلاتی، تمہارے خلاف مقدمہ بنتا۔''

''مقدمہ!'' وہ تلخی سے ہنسا ''آج تک تو کسی مائی کے لال کی ایسی جرأت ہوئی نہیں کہ رانا کے خلاف مقدمہ کھڑا کرے اور آئندہ بھی نہیں ہوگی، ولایتی نواب! کرلو تم بھی کوشش۔''

میں نے ضبط سے کام لیا ''دیکھو رانا! میں چاہتا ہوں کہ تم اصل صورتِ حال کو سمجھ لو اور قبول کرلو۔ میں یہاں تم سے یا حالات سے ڈر کے جانے کے لیے نہیں آیا ہوں۔ میں یہاں رہوں گا خواہ تم کچھ بھی کرلو۔ تم کو اگر غرور ہے اپنی خاندانی جاگیر پر تو وہ میرے پاس زیادہ ہے۔ تمہارا سیاسی اثر رسوخ ہے تو میرے تعلقات کا دائرہ لندن اور امریکا تک ہے۔ اس کے علاوہ میرے پاس دولت کی طاقت ہے۔ عقل، ذہانت اور تعلیم ہے۔ تم کنویں کے مینڈک ہو۔ میں نے دنیا دیکھی ہے۔ پرانے وقتوں کو بھول جاؤ، میں نئے زمانے کا آدمی ہوں، تمہارا وقت گزر گیا۔ آنے والا زمانہ میرا ہے۔''

معلوم نہیں اس نے میری اتنی لمبی بات کیوں سن لی ''ایسی باتوں کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا اگر تمہاری بات ختم ہوگئی ہے تو تم جاسکتے ہو۔''

میں نے کہا ''نہیں ابھی میری بات ختم نہیں ہوئی۔ مجھے تم سے یہ بھی کہنا ہے کہ محاذ آرائی اور دشمنی سے کچھ حاصل نہیں۔ ابھی وقت ہے کہ اچھے ہمسائے کی طرح رہنے کے لیے سمجھوتا کرلو۔''

اس نے سر ہلایا ''بات تو بڑی سونے کی آپ نے...... مگر

اس کے لیے آپ کو کچھ کرنا پڑے گا نواب صاحب!''

راجا نے کہا ''آپ شرائط پیش کرر ہے ہیں؟''

اس نے غور کر کے اقرار میں سر ہلایا ''یہی سمجھ لو۔ صلح کا معاہدہ کرنا ہے تو شرائط بھی تسلیم کرنا پڑیں گی۔''

میں نے کہا ''آپ اپنی شرائط بتائیں، تسلیم کرنا نہ کرنا میری مرضی۔''

وہ اٹھ کے کچھ دیر ٹہلتا رہا ''پہلی شرط تو یہی ہے، آپ ہمارے بندے کو اغوا کر کے لے گئے تھے، اسے واپس کردیں۔''

میں نے تلخی سے کہا ''تا کہ آپ اسے زندہ گاڑ دیں؟''

''پھر آپ نے ہمارا جو نقصان کیا ہے آج تک، اس کی تلافی تو نہیں ہوسکتی، جرمانہ ادا کرو۔'' اس نے اپنی بات جاری رکھی۔

میں نے طنزیہ انداز میں کہا ''ذرا اس کی تفصیل بتادیں۔''

وہ بولا ''تین نایاب نسل کے کتے تم نے مار ڈالے۔ ان کی قیمت نہیں لگائی جاسکتی۔ ہم نے بڑی محنت سے ان کو تربیت دی تھی۔ دس لاکھ ایک کتے کو ہلاک کرنے کا جرمانہ۔''

''بہت خوب......اور فرمایئے۔'' راجا نے کہا۔

''آخری بات۔ تمہارے علاقے میں ایک سائنس ریسرچ سینٹر چل رہا ہے، اسے چلنے دو۔ جو آفرا کبر خان لے کر آیا تھا، وہ قبول کرلو۔''

ریسرچ سینٹر کی بات پر میں اور راجا ایک ساتھ چونکے تھے۔ اکبر خان کی بات نے مجھے دم بخود کر دیا۔ میں نے خاصی کوشش سے غصے کو قابو میں رکھا، شاید میں اسے اچھا خاصا ذلیل کرتا، مجھے راجا نے بھی اشارہ کر دیا تھا کہ میں طیش میں نہ آؤں۔

راجا نے کہا ''پہلی شرط انسانیت کی تذلیل ہے۔ ہم کسی انسان کو ایک مردہ کتے کے ساتھ دفن کرنے کے لیے تمہارے حوالے کریں۔ ایسا اسی صورت میں ممکن تھا جب ہمارا ضمیر زندہ نہ ہو۔ پھر یہ کتنا سنگین جرم ہے۔''

میں نے کہا ''دوسری شرط ہماری تذلیل ہے۔ تمہارا کتا صرف ایک کتا تھا۔ گلی کا کتا بھی ہم پر حملہ کرتا تو ایسے ہی مارا جاتا۔ اس پر جرمانہ ادا کرنے کا کیا سوال۔ اب رہی تیسری اور آخری بات تو رانا صاحب! وہ جگہ میری ہے، اس کے استعمال کے لیے آپ ہدایت دینے والے کون ہوتے ہیں۔ ریسرچ سینٹر میں کیا ہورہا ہے۔ مجھے معلوم ہو چکا ہے۔ اب میں اسے بلڈوزنہ کردوں تو میرا نام بھی رفیق احمد نہیں۔ اکبر خان میرا ملازم تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ منشیات کے کاروبار میں وہ تمہارا پارٹنر ہے۔ تم اس کی سفارش کرر ہے ہو؟ اس کے لیے مجھ پر دباؤ ڈال رہے ہو۔''

رانا نے دھاڑ کے کہا ''اوئے کوئی ہے۔ نواب صاحب کو باہر کا راستہ دکھاؤ۔''

راجا اور میں اٹھ کھڑے ہوئے ''ہم اپنا راستہ جانتے ہیں۔'' راجا بولا۔

میں نے کہا ''ابھی وقت ہے کہ تم بھی سیدھے راستے پر آجاؤ۔''

ہم کو رانا نے اپنی دانست میں بہت بے آبرو کر کے نکالا تھا مگر ہم مطمئن تھے کہ ہم جو کہنا چاہتے تھے وہ ہم نے کہہ دیا۔ ہمیں رانا کی نیت اور عزائم کا پتا بھی چل گیا اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ سائنس ریسرچ سینٹر کے نام پر جو منشیات فروشی کا اڈا چل رہا ہے، اس میں اکبر خان کا ایک پارٹنر رانا رجب علی جتال بھی ہے۔

''ایک آخری بات سن لو میری۔'' رانا کی آواز پیچھے سے آئی۔

میں رک گیا ''آخری کیوں رانا صاحب! اپنی زندگی سے اتنے مایوس ہوگئے آپ......ابھی سے؟''

''زبان بہت چلتی ہے تمہاری۔ دماغ بھی بہت چلتا ہے مگر ادھر حکم چلتا ہے رانا رجب علی کا۔'' وہ مشتعل ہو کے بولا ''گھر آئے مہمان تو ہم چل کر جاتے ہیں اسے لینے۔ دشمن آجائے تو خود چل کے نہیں جاتا۔ جو کچھ تم سوچ رہے ہو اور کرنا چاہتے ہو، رانا کی مرضی کے بغیر نہیں ہوسکتا۔''

''آپ خدائی کا دعویٰ کرر ہے ہو رانا صاحب! اللہ کے آگے آپ کی کیا مرضی؟''

وہ بولتا رہا ''تمہارے جتنے منصوبے ہیں نا......اس علاقے کی کایا پلٹنے کے، سب شیخ چلی کے خواب ہیں۔ اسکول، کالج......اسپتال۔ ڈیم اور کارخانے، یہ سب بنانے کے لیے تمہیں رانا رجب علی کا تعاون درکار ہوگا۔ ہم اس علاقے کے نمائندے ہیں۔ کئی سو سال سے یہاں ہماری حکومت ہے۔ لوگ تمہاری چکنی چپڑی باتوں میں آنے والے نہیں ہیں۔''

''مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ ابھی سے تمہیں پریشانی لاحق ہوگئی ہے کہ تمہاری سیٹ مجھے مل جائے گی۔ لوگ مجھے ووٹ دے کر اسمبلی میں بھیج دیں گے۔ فکر مت کرو رانا! میں سیاست کو دور سے سات سلام کرتا ہوں، لعنت بھیجتا ہوں اس سیاست پر جس کا یہاں چلن ہے لیکن باقی کام ضرور ہوں گے ان شاء اللہ۔ تم بھی دیکھو گے۔'' میں نے کہا اور باہر نکل گیا۔

میں نے رانا کے سامنے تہذیب اور شائستگی کے سارے

تقاضوں کو بالائے طاق رکھ دیا تھا اور اس کو نیچا دکھانے کے لیے خوب بڑ ماری تھی کہ میں کون ہوں اور کیا کرسکتا ہوں؟ وہ ایسی ہی زبان میں بات کرنے کا اور سننے کا عادی تھا۔ اسے یہ احساس دلانا ضروری تھا کہ وقت کی تبدیلی کی لہر آتی ہے تو صدیوں سے قائم فرعونیت کے حصار ایسے ہی گرتے ہیں۔ انسانی غلامی کے تاریک دور کو بالآخر ختم ہونا ہے اگر اس مقصد کے لیے خدا نے میرا انتخاب کیا ہے تو وہ مجھے روک نہیں سکے گا۔ جتنی جلدی وہ اس حقیقت سے سمجھوتا کرلے اتنا ہی اس کے حق میں بہتر ہوگا۔

راجا بھی رانا کے رویے سے سخت خفا تھا۔ پنڈ جتال کی حدود سے دور آنے کے بعد اس نے کہا ''مجھے اب احساس ہورہا ہے کہ یہاں آ کے ہم نے کوئی عقلمندی نہیں کی۔''

''ہاں، بس ایک کوشش ضروری تھی کہ شاید حالات میں بہتری آئے لیکن یہ صدیوں کی سوچ ہے، جس نے رانا کے دماغ کو جکڑ رکھا ہے۔ اسے صرف دلائل سے نہیں بدلا جاسکتا۔ اس پر کتے کی دم والی مثال صادق آتی ہے۔ اسے سیدھا کرنے کی کوشش میں صرف وقت ضایع ہوگا۔''

کچھ دیر سوچ کے راجا نے کہا ''اب کچھ کرنا ہی پڑے گا نیکے پتر!''

میں نے کہا ''آخر تیرے ذہن میں کیا ہے مہاراجا!''

''ہم کاسو کا مسئلہ حل نہیں کرسکتے۔ مذاکرات سے اور نہ قانون کی مدد سے۔ اس کا یہ حل بھی نہیں کہ کاسو کو اتنی دور بھیج دیا جائے جہاں رانا کے کتوں کی رسائی نہ ہو۔ جیسے ان لوگوں کو باہر بھیج دیا جاتا ہے جن کو یہاں تحفظ حاصل نہ ہو۔ یہ تو بھاگ جانے کے مترادف ہوگا۔''

میں نے کہا ''مگر یہ آسان طریقہ ہے۔ رانا ہاتھ ملتا رہ جائے گا۔''

''نہیں، ہم کاسو کو استعمال کریں گے۔ یہ جو خاندانی برتری کے کمپلیکس کا مریض ہے، اس کو ایسا ذلیل کیا جائے کہ ایک طرف تو اس کی عزت کی پرانی دیوار میں شگاف پڑے، دوسری طرف اسے احساس ہو کہ ہم جو مملکت کا چوتھا ستون شمار ہوتے ہیں، تو ایسے ہی نہیں ہوتے۔''

''تو کیا کرے گا۔ کاسو کو پریس کے سامنے لے جائے گا؟''

''رائٹ! میں سب کو اکٹھا کرلوں گا اور کاسو کو پیش کردوں گا۔ وہ اپنی کہانی خود سنائے گا۔ وہ بھی جو اس پر بیتی اور وہ بھی جو دوسروں کے ساتھ ہوا۔ جس کا وہ چشم دید گواہ تھا۔''

میں نے کہا ''رہنے دے یہ بلند بانگ دعوے، پہلے بھی کچھ نہیں ہوا تھا۔ کیا کاسو نے پہلے صاف انکار نہیں کردیا تھا۔''

راجا نے میری بات کاٹ دی ''اب اسے ہماری بات ماننی پڑے گی۔ جو مولا کے کیس میں ہوا تھا اس بار نہیں ہوگا۔ یہ میری ذمے داری کہ کاسو کی کہانی ہر اخبار میں نمایاں طور اور تفصیل سے شایع ہوگی۔ ممکن ہے کچھ غیر معروف اور بدنام اخبارات کے مالکان اور مدیروں کو وہ خرید لے جن کی کمائی کا ذریعہ ہی بلیک میلنگ ہے لیکن نیشنل پریس میں اس کے ظلم وتشدد کی یہ داستان ضرور شایع ہوگی۔''

میں نے کہا ''مگر اس سے کیا ہوگا راجا۔ کچھ بھی نہیں، ایسی کہانیاں تو آتی ہی رہتی ہیں۔ نجی جیلیں اسی طرح قائم ہیں۔ بردہ فروش اسی طرح بچوں، عورتوں کو اغوا کر کے بیچ رہے ہیں۔ چند دن بیانات آئیں گے، شاید دو چار کالم بھی لکھیں جائیں پھر بات ختم ہو جائے گی۔ یہ توقع کرنا لاحاصل ہے کہ صدر مملکت ہمارے منتخب وزیر اعظم یا وزیر داخلہ اس خبر کی اشاعت پر کوئی حکم جاری کردیں گے کہ رانا کو درس عبرت بنادیا جائے۔''

''میں مانتا ہوں، یہ سب پہلے نہیں ہوا۔ قرضے کھا جانے والوں کے اور سرکاری خزانے کو لوٹنے والے بڑے بڑے ڈاکوؤں کا سارا کچا چٹھا اخباروں نے چھاپا مگر کارروائی اگر ہوئی تو صرف سیاسی بنیاد پر۔ مخالفین کے خلاف۔ نیب جیسا ادارہ بھی یہی کرتا رہا۔ کسی کا کچھ نہیں بگڑا۔ وہی لوگ اب بھی لوٹ مار کرر ہے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم برائی کو برائی کہنا چھوڑ دیں۔ ایک شکست خوردہ ذہنیت پر سمجھوتا کر کے خرابی کو برداشت کرنے کی عادت ڈال لیں۔''

میں نے کہا ''مسئلہ کاسو کو بچانے کا ہے۔ اسے استعمال کرنے کا نہیں۔''

''کاسو کو ہم بچالیں گے۔ آج کل عدالتِ عظمٰی از خود ایسے واقعات کا نوٹس لے رہی ہے۔ عین ممکن ہے اس کیس میں بھی رپورٹ طلب کرے ورنہ میں خود کاسو کی طرف سے اپیل دائر کرادوں گا۔ اس کے بعد خود قانون پر اسے تحفظ فراہم کرنے کی ذمے داری عائد ہو جائے گی۔ پریس اور این جی اوز کے درمیان ایک ورکنگ ریلیشن شپ ہے۔ پیشہ ورانہ ہم آہنگی، ہم ان کے کاز کو پروموٹ کرتے ہیں، وہ ہمارے ایشوز کو آگے بڑھاتے ہیں۔ میں انہیں بھی رانا کے پیچھے لگادوں گا۔ ایک کتے اور ایک انسان کو زندہ دفن کرنے کی کہانی ایسی لرزہ خیز ہے کہ اسے میڈیا خود اٹھائے گا۔''

''مگر اس سے کچھ ہوگا نہیں۔''

''ہوگا۔ مختاراں مائی اور ڈاکٹر شازیہ کے کیس میں کیا ہوا؟ اس کے بعد بھی کسی جوڑے کا کیس تھا۔ انہیں باہر بھیج دیا

گیا تھا۔ یہاں ان کی جان کو خطرہ تھا۔ کاسو بھی باہر چلا جائے گا۔ بیوی بچوں کے ساتھ لیکن یہ کیس رانا کے لیے بہت بڑا جھٹکا ہوگا۔ اس کی پبلک لائف کے امیج کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔ شاید اس کے خلاف مقدمات بن جائیں گے۔"

"جو کچھ عرصے بعد دب جائیں گے۔"

"ہاں، اسے جیل ہوگی نہ پھانسی...... لیکن اس کی سیاسی ساکھ کتنی خراب ہوگی، اس علاقے میں اس کے ووٹر کیا سوچیں گے، رانا کو فکر لاحق ہوگی کہ اس کا ووٹ بینک متاثر ہو رہا ہے۔ ایسا نہ ہو اسمبلی میں اس کی خاندانی سیٹ خطرے میں پڑ جائے۔"

"ایسا کہاں ہوتا ہے راجا! ہر جگہ سے وہی لوگ منتخب ہو جاتے ہیں جن کا اثر رسوخ ہو۔"

"تیرا کہنا سو فی صد درست نہیں۔ 1970ء کے انتخابات اس کا ثبوت ہیں، جب بڑے بڑے برج گر گئے تھے۔ رانا ابھی سے یہ محسوس کرنے لگا ہے کہ نواب رفیق احمد شیرازی کہیں اس کا سیاسی حریف نہ بن جائے اگر ایک طرف ہمارے ترقیاتی منصوبوں کا آغاز ہوگیا اور دوسری طرف رانا کی بدنامی کا تو اس کے لیے خطرہ بڑھ جائے گا۔ اسے اندازہ ہو جائے گا کہ جن سے اس نے پنگا لیا ہے وہ معمولی حریف نہیں ہیں۔ طاقتور دشمن ہو تو اس سے نمٹنے کے لیے دو ہی طریقے ہوتے ہیں۔ اس کے وجود کو ختم کر دیا جائے یا اس سے دشمنی ختم کر دی جائے۔ پہلا طریقہ ممکن نہیں، رانا دوسرا طریقہ اختیار کرنے پر مجبور ہوگا، تو دیکھ لینا۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔" میں نے کہا "مگر اس کا انحصار کاسو کی ہمت پر ہے۔"

"وہ ہمت کرے گا۔ ہمت نہیں کرے گا تو کیا کرے گا؟ مارا جائے گا۔"

رانا کے رویے نے مجھے جتنا مایوس کیا تھا، اس سے زیادہ مشتعل کیا تھا۔ وہ ہمارے ساتھ ایسے پیش آ رہا تھا جیسے ہم اس کے زیردست ہیں اور وہ بہت زبردست ہے۔ یہ اس کی بے وقوفی تھی یا اس کا غرور کہ اس نے ہمارے سامنے ایسی شرائط رکھ دیں جن کو قبول کیا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ اب میری بھی دلی خواہش تھی کہ اس کے غرور کا سر نیچا ہو۔

ہمارے دینہ پہنچتے تک دوپہر ہونے والی تھی۔ بازار سے گزرتے ہوئے میں نے دو بینکوں کی برانچ دیکھی تو مجھے خیال آیا کہ ہم اپنی رقم لاہور کے بینک اکاؤنٹ میں کیوں رکھیں جبکہ ہماری آئے دن کی ضروریات کے لیے دینہ آسان مسافت پر تھا۔"

راجا نے مجھ سے اتفاق کیا "بینک تو وہی ہے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ لاہور، کراچی میں ہو یا دینہ میں؟"

"ہر بار کیش کی ضرورت کے لیے لاہور تک دوڑ لگانا مشکل ہوگا۔ خصوصاً اس وقت جب میرے والدین بھی یہاں آ جائیں گے۔"

راجا نے کہا "میری ایک تجویز ہے جو درحقیقت فریال کے ذہن کی پیداوار ہے۔ اس نے شہباز سے کہا تھا، شہباز نے مجھ سے کہا۔"

"یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ کیا فریال خود مجھ سے ڈسکس نہیں کر سکتی تھی؟"

"بالکل کر سکتی تھی لیکن ایک تو وہ تیرے مالی معاملات میں دخل دینے سے گریز کرتی ہے، دوسرے اسے کچھ یقین نہیں تھا کہ یہ تجویز احمقانہ نہیں ہے۔ اس نے شہباز سے اسی لیے بات کی کہ وہ اپنی رائے دے۔ کہیں یہ نہ ہو کہ خواتین کو ناقص العقل قرار دیتے ہوئے کہا جائے کہ یہ معاملات آپ لوگوں کے سمجھنے کے نہیں ہیں اور ہم ان کا مذاق اڑائیں۔"

"یار، ہم اتنے تنگ نظر یا متعصب تو نہیں ہیں۔"

"مگر وہ سمجھتی ہیں۔ یہ تمام خواتین کا مشترکہ نسلی کمپلیکس ہے کہ مرد ہمیں ناقص العقل سمجھتے ہیں۔ شہباز کی تائید سے فریال کو اطمینان ہوا۔ شاید آج کل میں وہ خود تجھ سے بات کر لیتی مگر اسے موقع نہیں ملا، شہباز نے مجھ سے بات کی تو میں فوراً قائل ہوگیا۔ تاہم اس کے سامنے میں نے یہ اعتراف نہیں کیا کہ یہ بہت معقول خیال ہے۔ اس کے سامنے تو میں نے وہی کہا جو کہنا ضروری تھا کہ تم اپنے دماغ پر زیادہ زور مت ڈالو۔ تم صنف نازک ہو، دماغ بھی نازک ہے، کہیں نقصان نہ ہو جائے۔"

میں نے ہنس کے کہا "مردوں کی بالادستی قائم رکھنا بھی ضروری تھا۔"

وہ بولا "تجویز یہ تھی کہ یہ رقم اور اس کے بعد حاصل ہونے والے فنڈ کسی کے پرسنل اکاؤنٹ میں نہ ہوں یعنی پرسنل اکاؤنٹ ویسے ہی چلتے رہیں جیسے پہلے تھے، ترقیاتی منصوبوں کے اکاؤنٹ کو الگ رکھا جائے۔ یہ نہ ہو کہ کبھی میں نے چیک کاٹ دیا، کبھی تیرے اکاؤنٹ سے لے لیا۔"

"یار! اتنی معقول بات ہمارے دماغ کو کیوں نہیں سوجھی؟"

"شہباز نے اس بات کو مجھ سے ڈسکس کیا تو اس میں ایک اور مفید تجویز شامل کی۔ اس نے کہا کہ الگ اکاؤنٹ کو ایک ایسا ٹائٹل دیا جائے جو بعد میں معاون ہو مثلاً است بدھانی

ڈیولپمنٹ پروجیکٹ فنڈ۔"

میں تقریباً اچھل پڑا "کیا زبردست آئیڈیا ہے یہ راجا!"

"بس یار! اس لڑکی کے پاس ایک تو بہت مخلص دل ہے جس میں کسی کے لیے برائی آتی ہی نہیں۔ بس اچھائی آتی ہے۔ دوسرے اس کا دماغ بھی بہت میچنگ ہے۔ بڑی واضح سوچ رکھنے والا...... اور متوازن۔"

میں نے کہا "یار! اگر ہم اس نام سے اکاؤنٹ رکھتے ہیں تو اس کے یقیناً بہت فائدے ہیں۔ ایک تو حساب کتاب آسان ہوگا اور کسی کنفیوژن کا امکان باقی نہیں رہے گا۔ دوسرے اس فنڈ کا آڈٹ ہوگا تو رپورٹ ہم دوسرے مالیاتی اداروں کے سامنے رکھ سکیں گے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ ہمیں ترقیاتی منصوبوں کے لیے آسان شرائط پر سرمایہ فراہم ہو جائے یا ہمارے ویلفیئر پروجیکٹس کو کسی عالمی ادارے یا این جی او سے فنڈ مل جائیں۔ وہ کسی کے پرسنل اکاؤنٹ میں تو نہیں ڈالے جا سکتے اور نہ کسی فرد کو دیے جائیں گے۔"

دوپہر کا کھانا ہم نے دینہ کے ایک ہوٹل میں کھایا اور اس دوران میں یہی ڈسکس کرتے رہے۔ اب سے چند سال پہلے دینہ جیسے قصبے میں جس کا نام بھی پاکستان کے دوسرے صوبوں میں رہنے والے نہیں جانتے، ایسے کسی ریسٹورنٹ کا تصور ناممکن تھا لیکن صورت حال تیزی سے بدلی تھی۔ چھوٹے قصبوں اور دیہات کے لوگ باہر سے دولت کما کے لائے تھے تو انہوں نے اپنے اپنے علاقے کی ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ اسکول، اسپتال یا مسجد بنانا تو کارِ خیر میں شمار ہوتا تھا۔ انہوں نے معاشی ترقی اور خوش حالی کے مواقع بھی پیدا کیے تھے۔ وہ دنیا دیکھنے کے بعد عقل، مشاہدے اور تجربے کی دولت بھی ساتھ لائے تھے۔ یہ ریسٹورنٹ اس کا ثبوت تھا جو کسی طرح بھی کسی فائیو اسٹار ہوٹل کے ڈائننگ ہال سے کم نہ تھا۔ نہ سجاوٹ کے انداز میں، نہ مینو کے اعتبار سے اور سروس کے معیار پر۔

کھانے کے بعد ہم اپنی تجویز کے ساتھ ایک بینک میں گئے تو اس قصبے کی برانچ کے منیجر نے تعارف کے بعد ہمیں ایک وی آئی پی جیسا ٹریٹ منٹ دیا۔ اس نے ہماری بات بڑی پرجوش دلچسپی کے ساتھ سنی۔

"سر، یہ تو میری بھی خوش قسمتی ہوگی اگر مجھے ...... میرا مطلب ہے ہمارے بینک کو یہ موقع ملے کہ ہم آپ کے ترقیاتی منصوبوں میں شامل ہوں۔ بتائیے میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟"

میں نے کہا "آپ یہ اکاؤنٹ کھول لیں۔"

"دیکھیے ...... پرسنل اکاؤنٹ کے لیے بھی ریفرنس تو ضروری ہوتا ہے۔ کسی اکاؤنٹ ہولڈر کا انٹروڈکشن اور شناختی کارڈ وغیرہ۔ اس اکاؤنٹ کی بھی کچھ قانونی ضروریات ہیں۔"

راجا نے کہا "وہ آپ بتا دیں۔"

"ایک تو یہی کہ جوائنٹ اکاؤنٹ کون آپریٹ کرے گا۔ ایم ڈی یا چیئرمین کا نام اور دیگر تفصیلات اگر ڈائریکٹرز ہیں تو ان کے بارے میں معلومات۔ قانونی مشیر کا نام۔ آڈیٹرز کا نام، یہ سب چاہیے۔"

میں نے کہا "قانونی مشیر تو بیرسٹر فاروق ہوں گے۔ کیا آپ نے ان کا نام سنا ہے؟"

"بالکل سنا ہے۔ وہ کارپوریٹ لائر ہیں۔ سینٹرل بورڈ آف ریونیو کے اور مالیاتی امور کے کیس لیتے ہیں۔"

"آڈیٹر وغیرہ ان ہی کے مشورے سے مقرر ہوں گے۔ یہ تمام تفصیلات آپ کو مہیا کر دی جائیں گی لیکن ابھی ہم کیا کریں؟"

"نو پرابلم! آپ ابھی یہ رقم پرسنل اکاؤنٹ میں ڈال دیں، بعد میں ٹرانسفر کر دیں۔"

"لیکن ہم اس وقت انٹروڈکشن کس کا دیں۔ ایک دوسرے کا؟"

وہ بولا "اس کی آپ فکر نہ کریں۔ میں کر دیتا ہوں لیکن احتیاط کا تقاضا ہے کہ آپ کسی سے فی الحال ذکر نہ کریں۔ یو سی...... اتنی بڑی رقم کو ہم یہاں نہیں رکھ سکتے۔ اسے آپ یوں ساتھ لیے پھر رہے تھے۔ یہ بہت بڑا رسک تھا۔ شام کو ہماری کیش لے جانے والی گاڑی آئے گی۔ اس کے بعد کوئی خطرہ نہیں۔"

جب ہم بینک سے باہر آئے تو ایک بہت بڑا بوجھ ہمارے سر سے اتر گیا تھا۔ بینک منیجر نے غلط نہیں کہا تھا۔ تین کروڑ کی رقم کو کسی حفاظتی بندوبست کے بغیر اپنے ساتھ رکھنا بہت بڑا خطرہ تھا۔ ہمارے اطمینان کی بات یہ تھی کہ اس کا علم کسی کو نہیں۔ اس کے باوجود جی ٹی روڈ پر ہمارا کسی حادثے یا واردات کا شکار ہو جانا بعید از امکان نہیں سمجھا جا سکتا تھا اگر ایسا ہو جاتا تو ہمارے سارے پلان دھرے کے دھرے رہ جاتے۔

چونکہ شام قریب تھی اس لیے میں نے راجا کے ساتھ لاہور جانے کا پروگرام مزید ایک دن کے لیے موخر کر دیا۔ راجا چاہتا تھا کہ اخبار سے اپنے تعلق تو برقرار رکھے مگر کرائم رپورٹنگ چھوڑ دے۔ ہر روز شہر کے تمام تھانوں سے جرائم کی صورت حال معلوم کرنا اب اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ کام کسی اور کے سپرد کر دے اور خود سیاسی، معاشی اور معاشرتی مسائل پر ٹائم دے۔ اس کے لیے وہ دیگر اخبارات سے بھی

بات کرنا چاہتا تھا۔ وہ کاسو کو پریس کے سامنے موثر انداز سے پیش کرنے کی حکمت عملی بھی طے کرنا چاہتا تھا۔ اس کے منصوبے کا قبل از وقت انکشاف اس کی ناکامی کا سبب بن سکتا تھا۔ یہ اطلاع رانا تک پہنچادی جاتی تو راجا کا پلان فیل ہوجاتا۔ ابھی وہ مخصوص اور قابل اعتماد ساتھیوں کے سوا کسی کو کچھ بتانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے آیندہ چند روز میں یہ دھما کا کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

میں اپنے گھر والوں کو تسلی دے کر آیا تھا کہ دو چار دن میں واپس آ کے انہیں لے جاؤں گا لیکن فی الحال یہ ممکن نہیں تھا۔ پہلے واپس جا کے مجھے اپنی بات کا ردِعمل دیکھنا تھا جو میں نے دادی سے کی تھی۔ راجا کی رائے اس کے برعکس تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ سلطان کا کانٹا نکلے بغیر میرا فریال سے شادی کرنا زیادہ خرابی کا باعث ہوگا۔ یہ جھگڑا پہلے ختم ہونا چاہیے ورنہ میری زندگی تو خیر تباہ ہوگی، میرے ساتھ والدین بھی اس فساد کی لپیٹ میں آئیں گے مگر فریال سے شادی کیے بغیر میں اسے اور اپنے والدین کو ایک ہی چھت کے نیچے نہیں رکھ سکتا تھا۔

میں نے بہتر سمجھا کہ اس مسئلے پر فریال سے پھر بات کروں۔ میں اپنے والدین کی یہاں آ کر رہنے کی ''خواہش'' کو زیادہ عرصہ ٹال نہیں سکتا تھا اگر وہ زیادہ پریشان ہوتے تو خود کسی دن یہاں پہنچ کے اعلان کرسکتے تھے کہ اب ہم آ گئے ہیں تو واپس نہیں جائیں گے۔ وہ پرانے وقتوں کی اخلاقی قدروں پر یقین رکھتے تھے اور دل سے لڑکے لڑکیوں کا آزادانہ میل جول انہیں ناپسند تھا مگر بدلے ہوئے وقت کے تقاضوں سے لڑ کے وہ معاشرتی تبدیلی کے عمل کو نہیں روک سکتے تھے، انہوں نے فریال کے لیے میرے جذبات پر قدغن نہیں لگائی تھی اور اس سے میرے میل جول کو بھی ناگزیر سمجھتے ہوئے تسلیم کرلیا تھا۔ جب میں لندن اور امریکا گیا تو گویا ساری حدیں بے معنی ہوگئیں۔ یہاں بیٹھ کے وہ صرف نصیحت کرسکتے تھے یا دعا کہ ان کا ہونہار سپوت ولایتی ڈگریوں کے ساتھ کوئی میم لے کر نہ لوٹے۔ یہ خوف پچھلی نسل کے تمام والدین کا مسئلہ تھا۔

امریکا یا لندن میں میرے روز و شب کی انہیں کیا خبر ہوتی۔ میں بڑے خشوع و خضوع سے انہیں مطلع کرتا رہا کہ آپ کا فرزندار جمند دیار فرنگ کی تمام ایمان خراب کرنے والی خرابیوں سے اسی طرح محفوظ ہے جیسے محاورے کے مطابق زبان بتیس دانتوں کے درمیان محفوظ رہتی ہے۔ جو والدین جانتے ہوں کہ مذکورہ فرزند خیر سے ہینڈسم ہیرو ہے، اعلیٰ تعلیم حاصل کرچکا ہے اور اب کمائی بھی خوب کررہا ہے، وہ صدق دل سے کیسے مان سکتے ہیں کہ وہ لہو ولعب سے کوسوں دور ہے

اور اگر ایسا کہتا ہے تو سچ کہتا ہے مگر ان کے پاس یقین کرنے کے سوا چارہ بھی کہاں ہوتا ہے؟

عائشہ سے میرے مراسم کی بھنک تو ان کے کانوں میں پڑ گئی تھی لیکن معاملات کی سنگینی کا اندازہ انہیں میرے واپس آنے کے بعد ہوا۔ انہیں ہر حال میں میری خوشی درکار تھی چنانچہ روایتی انداز میں انہوں نے اپنی مرضی مسلط نہیں کی۔ مجھے اپنے معاملات میں مکمل خودمختاری دی اور مجھ پر بھروسا کیا۔ وہ عائشہ کو بھی اسی طرح قبول کرلیتے جیسے انہوں نے فریال کو کیا تھا۔ فریال کا مسئلہ اس وقت خراب ہوا جب اس نے اپنی بے وقوفی سے سلطان کو بے وقوف بنانے کی کوشش کی۔ وہ پیشہ ور شکاری ہر خوبصورت لڑکی کو فلم میں ہیروئن بنانے کی آفر دے کر پھانستا تھا۔ فریال نے پھنسنے کا ڈراما رچا کے اسے پھانسنا چاہا اور منگنی کی شرط رکھ دی۔ سلطان کے لیے منگنی کیا تھی، اپنا مطلب نکل جاتا تو وہ اپنی ڈائری سے فریال کا نام بھی کاٹ دیتا۔ خود فریال نے سوچا تھا کہ فلم ریلیز ہونے تک وہ سلطان کو ٹالتی رہے گی جب فلم ہٹ ہوجائے گی اور اس کے دروازے پر فلمساز لائن لگانے آجائیں گے تو کیسی منگنی، کہاں کی منگنی۔ وہ سلطان کو دودھ سے مکھی کی طرح نکال باہر پھینکے گی لیکن معاملہ الٹا اس کے گلے پڑ گیا۔ فلم تو بنی نہیں، سلطان نے اس کے حصول کو اپنی انا کا مسئلہ بنالیا۔

اب اگر میرے والدین فریال کو حویلی میں میرے ساتھ قیام پذیر دیکھتے تو انہیں سخت صدمہ ہوتا۔ یہ ناممکن تھا کہ فریال مردانہ گیٹ اپ سے ان کو نظر کا دھوکا دے سکتی۔ چوبیس گھنٹے میں ہی یہ راز کھل جاتا۔ دوسرا مسئلہ شہباز کا کھڑا ہوجاتا۔ میرے والدین جانتے تھے کہ ان کے درمیان جذباتی تعلق کی نوعیت کیا ہے اور یہ سوال بھی کرتی تھے کہ آخر وہ شادی کیوں نہیں کرلیتے لیکن ایک تو یہ معاملہ ان کے گھر کا نہیں تھا، دوسرے شہر میں راجا اور شہباز الگ اپنے اپنے گھر میں رہتے تھے۔ حویلی میں ان کو اکٹھا دیکھ کے وہ اعتراض کرتے کہ ہمارے گھر میں ہماری نظروں کے سامنے یہ کیا بے حیائی کا مظاہرہ ہورہا ہے۔ اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ان کے آنے سے پہلے نکالنا ضروری تھا۔

جب ہم نے واپسی پر پل کراس کیا تو خلاف توقع مجھے حویلی کے اندر باہر اندھیرا نظر آیا ''بجلی کا بریک ڈاؤن ابھی تک جاری ہے۔ سارا دن گزر گیا۔'' میں نے کہا۔

راجا نے کہا ''اگر بجلی نہیں آئی تو جنریٹر کیوں نہیں چلایا گیا؟''

''خدا خیر کرے۔'' میں نے کہا اور گاڑی کو گیٹ پر روک

دیا۔

راجا نے سلیوٹ کر کے دروازہ کھولنے والے سنتری سے پوچھا ''اندر و باہر کی لائٹس کیوں آف ہیں؟''

اس نے سر ہلایا ''بجلی نہیں ہے سر!''

ظاہر ہے وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ میں نے گاڑی اندر کھڑی کی تو مجھے برآمدے کے پیچھے لالٹین اور موم بتی کا دھندلا سا اجالا دکھائی دیا۔ گاڑی کی آواز سن کے فرخ باہر آ گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ بجلی کا کنکشن کاٹ دیا گیا ہے۔

''کیا مطلب؟ کنکشن کس نے کاٹ دیا ہے؟'' میں نے کہا۔

''رات کو بجلی کا بریک ڈاؤن نہیں ہوا تھا۔ پول سے یہاں تک آنے والا تار ڈس کنکٹ کیا گیا تھا۔'' فرخ نے بتایا۔

''یہ کس کی کارروائی ہوسکتی ہے؟'' میں نے کہا۔

''آج تمہارے جانے کے بعد ایک جیپ میں چار افراد آئے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ وہ واپڈا کا ایس ڈی او ہے اور کنکشن اس لیے کاٹا گیا ہے کہ ہم نے غیر قانونی طور پر بجلی حاصل کی تھی، میٹر کے بغیر۔''

راجا نے کہا ''اس کے لیے انہیں آدھی رات کو کارروائی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''میں نے بھی کہا تھا کہ آپ پہلے ہم سے بات تو کرتے۔ وہ بولا کہ ہم نے مخبری پر چھاپا مارا تھا۔ نواب رفیق احمد شیرازی تو باہر سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے آئے ہیں اور کسی نے بھی انہیں نہیں بتایا کہ یہ بجلی کی چوری ہے۔ کنڈا ڈال کے بجلی حاصل کرنا جرم ہے۔''

راجا نے اسے گالی دی ''سالا ایمانداری کی اولاد! تم نے اس کا شناختی کارڈ دیکھا تھا؟''

''شناختی کارڈ تو نہیں دیکھا۔ گاڑی واپڈا کی تھی۔ اس نے کہا کہ وہ چوری میں استعمال ہونے والا تار ضبط کر کے لے جارہے ہیں اور یہ نوٹس دے دیا۔'' فرخ نے جیب سے ایک کاغذ برآمد کیا۔

''یہ کیا نوٹس ہے؟'' میں نے کاغذ لے لیا ''تم نے پڑھا ہے؟''

''ہاں، اس میں آپ کو ایک ہفتے کے اندر اندر وضاحت کرنے کے لیے کہا گیا ہے کہ کیوں نہ آپ کے خلاف قانونی کارروائی کی جائے۔ میں نے پوچھا کہ اگر اس سلسلے میں بات کرنی ہو تو کس سے کی جائے، وہ بڑی اکڑفوں دکھا رہا تھا۔ کہنے لگا کہ یہ سب مجھے نہیں معلوم۔ نوٹس میں سب لکھا ہے، دیکھ لینا۔ میں نے بڑی کوشش کی کہ وہ خود اکیلے میں مجھ سے بات کرلے۔ وہ اور بگڑ گیا کہ اکیلے میں تم رشوت دے کر مجھ سے معاملہ طے کرنا چاہتے ہو تو یہ سمجھ لو کہ میں اس قسم کا افسر نہیں ہوں۔ نہ میں غلط کام کرتا ہوں نہ کرنے دیتا ہوں۔ بس اس کے بعد وہ چلا گیا۔''

میں نے کہا ''دفع کرو اسے۔ یہ بتاؤ جنریٹر کیوں نہیں چلایا؟''

''اس کا پلگ شارٹ تھا۔ میں نے سوچا باہر والے جنریٹر کا پلگ نکال لاؤں۔ وہ جنریٹر تو خراب پڑا ہے۔ پلگ کام آ جائے گا مگر جا کے دیکھا تو وہ جنریٹر غائب ہے۔''

''غائب ہے...... یعنی چوری ہوگیا؟''

''مجھے شک ہوا کہ وہی لوگ لے گئے ہوں گے جو تار کاٹ کر لے گئے تھے۔ گارڈ نے ادھر ادھر کے لوگوں سے پوچھا۔ کسی نے کچھ نہیں دیکھا۔ اس وقت اور کیا ہوسکتا تھا۔ جنریٹر کے پلگ کا سائز چھوٹا ہے۔ غلطی ہماری ہے، ہمیں ایک اسپیئر پلگ رکھنا چاہیے یہاں۔''

میں نے کہا ''چلو کوئی بات نہیں۔ ایک رات بجلی کے بغیر ہی گزاری جاسکتی ہے۔ کل انتظام کرلیں گے۔''

فرخ بولا ''مجھے تو شک ہے کہ پلگ شارٹ ہوا نہیں، کیا گیا ہے۔''

''کیا مطلب......؟'' راجا نے کہا۔

''میں نے پلگ نکال کے دیکھا تھا۔ میری موٹر سائیکل کا پلگ بھی شارٹ ہوجاتا تھا۔ اس پر کاربن جم جاتا ہے۔ اس کی نوک ٹوٹی ہوئی ہے۔ نوک ٹوٹ نہیں سکتی۔ جب تک کہ اسے توڑا نہ جائے۔ نوک توڑنے کے لیے پلگ کو کھول کے نکالنا بھی ضروری ہے۔ یہ وہی کرسکتا ہے جس کا اندر آنا جانا ہو۔ جنریٹر ہم نے آخری حصے میں لگا رکھا ہے تاکہ شور کم سے کم آئے۔''

میں نے کہا ''یہ تو بڑی عجیب بات بتائی تم نے۔ ایسا کون ہوسکتا ہے؟''

راجا کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا ''یہ سب مجھے ایک ہی سازش کا حصہ لگتا ہے۔ جس نے بجلی چوری کی خبر دی۔ اسی نے باہر والا جنریٹر چوری کرایا اور کسی کو اس تخریبی کارروائی پر مامور کیا کہ وہ اندر والے جنریٹر کو بھی ناکارہ بنادے۔''

میں نے کہا ''لیکن وہ شخص اندر کیسے پہنچ گیا؟''

''وہ اندر ہی کا آدمی ہے بھلے پتر! آج کل تو باہر کے کاریگر بھی اندر کام کرنے کے لیے روز آتے ہیں۔ ممکن ہے ان میں سے کسی کو خرید لیا گیا ہو، ہم معلوم کرلیں گے۔''

میں نے کہا ''یہ بڑی فضول اور احمقانہ سازش کی ہے کسی نے۔ ہم جنریٹر ٹھیک کرلیں گے، کل دوسرا جنریٹر خرید لائیں

گے۔"

"کنکشن بھی بحال ہو جائے گا کل ہی انشاءاللہ۔" راجا نے کہا "ہم ہیں تو کیا غم ہے۔"

ہم ابھی تک باہر کھڑے باتیں کر رہے تھے لیکن باتوں کی آواز سن کے نہ شہباز باہر آئی تھی اور نہ فریال۔ اندر بھی مکمل خاموشی تھی۔ میرے پوچھنے پر فرخ نے بتایا کہ وہ سرونٹ کوارٹرز کی طرف گئی ہیں۔ پتا نہیں کیا معاملہ تھا، وہ لڑکی ریشم بڑی گھبراہٹ میں آئی تھی اور انہیں بلا کے لے گئی تھی۔"

وہ کچھ دیر بعد واپس آئیں تو اپ سیٹ تھیں۔ میں نے پوچھا تو شہباز نے پرتفکر لہجے میں کہا "کاسو کا ڈیپریشن شدید ہوتا جا رہا ہے اور ایک بیماری بن گیا ہے۔"

"تمہارے پاس سکون آور دوائیں تو ہوں گی؟" راجا بولا۔

"سکون اور دوا کا اثر وقتی ہوتا ہے۔ فکر یا پریشانی کے عارضی اثر کو ختم کرنے کے لیے مگر ڈپریشن کی بیماری میں علاج لمبا ہوتا ہے اور دوا سے زیادہ مریض کے تعاون سے بہتری آتی ہے۔ ان حالات کو ٹھیک کرنا ضروری ہوتا ہے جو بیماری کا سبب بنتے ہیں۔"

میں نے کہا "یہاں کچھ نہیں ہو سکتا۔ کاسو کے حالات کو ٹھیک کرنا کسی کے اختیار میں نہیں ہے۔"

"بہتر یہی ہے کہ اسے شہر بھیج دیا جائے تاکہ جو خوف اس کے اعصاب پر سوار ہے وہ دور ہو ورنہ وہ خودکشی کر لے گا۔" شہباز بولی۔

میں نے کہا "کیا اس نے ایسی کوشش کی تھی؟"

"ابھی تک تو نہیں کی...... لیکن یہ بات اس کے دماغ میں بیٹھ گئی ہے کہ اس کا زندہ رہنا ہی اس کے بیوی بچوں کے لیے عذاب کا سبب بن گیا ہے اگر وہ خود کو رانا کے حوالے کر دے تو کم سے کم ان کی جان بچ جائے گی۔ یہ خودکشی نہیں تو اور کیا ہے؟" شہباز بولی "کیا وہ جانتا نہیں کہ رانا کیا کرے گا؟"

فریال نے افسوس سے سر ہلایا "ابھی وہ جانا چاہتا تھا۔ بیوی کو سمجھانے لگا کہ اسی میں سب کی سلامتی ہے۔ قصوروار میں ہوں۔ میری وجہ سے تم دونوں بھی مارے جاؤ گے۔ میں جا کے رانا صاحب کے پاؤں پکڑ لیتا ہوں۔ شاید وہ میری غلطی معاف کر دیں، بیوی رونے پیٹنے لگی کہ کیا تو پاگل ہو گیا ہے۔ رانا نے کبھی کسی کو معاف کیا ہے؟ اور تیرے معاملے میں تو اس کو ضد ہو گئی ہے کہ تجھے کتے کے ساتھ دفن کرنا ہے۔ کتا نہیں رہا مگر اس کی کھال میں بھس بھروا کے کیوں رکھا ہے اس نے؟ صرف اسی لیے کہ جس دن تو ان کے ہاتھ لگ گیا اسی دن تجھے زندہ گاڑ دے۔ جب کاسو نہیں مانا تو اس کی بیوی چیخنے چلانے لگی پھر فاطمہ ہمیں بلا کے لے گئی۔ ہمارے سمجھانے سے ابھی وہ مان گیا مگر مجھے لگتا ہے کہ اس کا دماغ نہیں بدلا ہے۔"

میں نے کہا "چلو چھوڑو۔ کوئی اور بات کرو۔"

راجا نے کہا "اور بھی غم ہیں زمانے میں کاسو کے سوا۔ بلکہ دیکھا جائے تو غم ہی غم ہیں۔ خوشی تو آنے والے دن کا خواب بن گئی ہے جو نہ جانے کب آئے گا۔"

رات کا کھانا فریال نے کینڈل لائٹ ڈنر میں تبدیل کر دیا۔ یہ اس کی طرف سے ماحول کو خوشگوار بنانے کی ایک کوشش تھی جو زیادہ کامیاب نہ ہو سکی کیونکہ مسلسل حادثات اور ناخوشگوار واقعات نے ہر شخص کے حوصلے اور امید کو مایوسی اور افسردگی میں بدل رکھا تھا۔ ہر سمت محیط ہو جانے والی تاریکی اور خاموشی نے حویلی کے ماحول کو مزید گھمبیر کر دیا تھا۔ سب زبردست خوش دلی کا مظاہرہ کرتے رہے اور بے دلی سے ہنستے رہے۔

میرے مسائل میں بہ تدریج اضافہ ہوا تھا۔ جب میں پاکستان لوٹا تھا تو میرے سامنے ایک ہی مسئلے کے دو پہلو تھے۔ حالات کے حوالے سے دیکھا جاتا تو حالات نے مجھے اسی ازلی و ابدی مثلث میں شامل کر دیا تھا، جس کے ایک کونے پر میں تھا تو دوسرے دو کونوں پر ایشا یعنی عائشہ اور فریال تھیں۔ دونوں بڑی مستقل مزاجی سے قائم و دائم تھیں اور ایسی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی کہ ہار جیت کا فیصلہ سکہ اچھال کر کر لیا جائے یا ایک رفیق کی تقسیم ممکن نہیں تو دوسرا رفیق احمد فراہم ہو جائے۔

لندن سے واپس آتے ہی دوسرا مسئلہ ان لوگوں نے کھڑا کیا جن سے میں اپنی سیاسی وابستگی ختم کر چکا تھا یا کم سے کم میں ایسا سمجھتا تھا۔ حقیقت اس کے برعکس یہ تھی کہ میں نے کمبل کو چھوڑا تھا، کمبل نے مجھے نہیں چھوڑا تھا۔ میں پھر بلیک میل ہو رہا تھا۔ چیف نے تنظیم کے غنڈوں کو پھر میرے پیچھے لگا دیا تھا اور وہ میرے ساتھ گھر والوں کی جان کے دشمن ہو رہے تھے۔ فریال کی وجہ سے سلطان کی انا سخت مجروح ہوئی تھی اور وہ میرا دشمن ہو رہا تھا۔ ایک نئی مصیبت رانا کی صورت میں نازل ہوئی تھی جو محسوس کرتا تھا کہ ہماری وجہ سے اس کی خاندانی سیاسی پوزیشن خطرے میں پڑ سکتی ہے اور وہ ہم سے عناد کو بڑھا رہا تھا۔ اس کا میری جاگیر کے اندر منشیات کے کاروبار میں میرے ہی ایک نمک حرام ملازم سے اشتراک تھا اور یہ میرے لیے الگ ایک چیلنج تھا تو گھر کے اندر میرے چچا اور چچی کا احساس محرومی بھی ایک ایسا بحران پیدا کر رہا تھا جس کی لپیٹ میں میرے والدین بھی آ گئے تھے۔

میں اور راجا بہت دیر تک صورتِ حال پر بات کرتے رہے۔ پھر شہباز نے ہمیں بڑی محبت اور خلوص سے ڈانٹا کہ کیا رات بھر جاگ کے باتیں کرتے رہو گے اور صرف باتیں کرنے سے مسائل حل ہو جائیں گے؟ مسائل سے نمٹنے کے لیے ذہنی اور جسمانی توانائی کا لیول برقرار رکھنا چاہیے اور اس کے لیے پوری نیند بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی مناسب خوراک۔ ظاہر ہے اس لیکچر کے حقائق کی نفی نہیں کی جا سکتی تھی اور شہباز کی نیک نیتی کے جذبات کو انکار سے مجروح کرنا بھی اچھی بات نہ ہوتی چنانچہ راجا کے ساتھ میں بھی اچھے بچوں کی طرح اٹھا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔

یہ الگ بات ہے کہ میرا ذہن کسی گم شدہ بچے کی طرح خیالوں کے جنگل میں بھٹکتا رہا اور نیند اپنی جھلک دکھا کے غائب ہوتی رہی۔ اچانک ایک اچھا خاصا بڑا کنکر یا چھوٹا سا پتھر میرے سر پر یوں لگا کہ بے اختیار میرے حلق سے آہ جیسی آواز نکلی اور میں اچھل کے بیٹھ گیا۔ اندھیرے میں ایک سایہ سا لہرایا اور فریال کی خوشبو کے ساتھ اس کی شریر ہنسی سنائی دی۔ الو کی پٹھی۔ میں نے دل ہی دل میں اسے ایک گالی دی اور اٹھ کے باہر گیا تو وہ ہاتھ میں کافی کے دو مگ لیے کھڑی تھی۔ اس نے ایک مجھے تھما دیا۔

میں نے کہا "نشانہ بڑا پکا ہے تمہارا...... لیکن سر کی چوٹ سے میری یادداشت چلی جاتی پھر......؟"

وہ ہنسی "پھر میں فلمی علاج کرتی، دوسرا پتھر مارتی...... یادداشت واپس آ جاتی۔"

"ہاں، یادداشت آ جاتی، جان چلی جاتی۔"

"مجھے پتا تھا تم جاگ رہے ہو اور تمہیں کافی اور میری ضرورت ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟" وہ میرا ہاتھ تھام کے برآمدے سے اتر گئی اور آگے بڑھتی گئی۔

میں نے سچ کا اعتراف کر لیا "نہیں، ففٹی پرسنٹ کافی کی خواہش تھی، ففٹی پرسنٹ تمہاری۔"

وہ فوارے کی منڈیر پر بیٹھ گئی "بڑے کمینے ہو۔ مجھے کچھ تو کافی سے زیادہ نمبر دے سکتے تھے۔ کیا آدمی جس سے محبت کرتا ہے اس کی اہمیت بس اتنی ہی ہوتی ہے، کافی کے ایک مگ جتنی؟"

میں نے کسی فلسفی کی طرح ارشاد کیا "وقت وقت کی بات ہے محترمہ! تین دن کا ناغہ ہو تو مس ورلڈ سے زیادہ ایک روٹی حسین لگتی ہے۔ وہ جو شاعر نے فرمایا تھا 'انساں کو چاند میں نظر آتی ہیں روٹیاں......'"

"چاند...... کہاں ہے چاند؟ میرا موڈ سخت رومانٹک ہے رومیو! مجھے چاندنی چاہیے۔"

"ڈیئر جولیٹ۔ میں ابھی چاند کو فون کرتا ہوں۔ ایمرجنسی ڈیوٹی پر حاضر ہو جائے ورنہ وہ تو نظر آئے گا دو چار دن بعد۔"

وہ فوارے کی تین فٹ اونچی منڈیر سے اندر اتر گئی۔ فوارے کے گرد ایک دائرے کی صورت میں بنی ہوئی اس دیوار کے باہر سرخ پتھر تھا مگر اندر کی طرف فرش کے رنگ کا سنگ مرمر لگا دیا گیا تھا۔ غالباً فرخ نے باغ کی صفائی اور آرائش پر کسی کو مامور کر دیا ہوگا کہ اندر سے برسوں کا جمع شدہ کوڑا کرکٹ نکال دیا گیا تھا اور فرش کو رگڑ رگڑ کے صاف کیا گیا تھا کہ اب سنگ مرمر کا اُجلا پن تاریکی میں بھی محسوس ہوتا تھا۔

میں نے بھی جوتے باہر چھوڑے اور ننگے پاؤں تالاب کے ٹھنڈے فرش پر اتر گیا "جب اس میں پانی آئے گا اور فوارہ چلنے لگے گا تو یہ جگہ کتنی مختلف لگے گی۔ یہ باغ آباد ہو جائے گا۔"

وہ تالاب کے اندر والی منڈیر سے ٹیک لگا کے اور پیر پھیلا کے بیٹھ گئی "ہاں، یہ خواب تو میں بھی دیکھتی ہوں۔ یہاں گھاس کے سرسبز تختے ہیں، رنگین پھولوں کی کیاریاں ہیں، روشوں پر سرخ بجری بچھی ہوئی ہے۔ باغ میں ہمارے پالتو ہرن پھر رہے ہیں اور اجلے سفید سارس کھڑے ہیں۔ فوارے کی پھوار ہوا کے ساتھ دور تک پھیل رہی ہے۔ بچے تالاب کے پانی میں کنکر پھینک رہے ہیں۔"

"بچے! کس کے بچے......" میں نے خفگی سے کہا۔

"یار! ہمارے اور کس کے، چھ بچے، تین لڑکے تین لڑکیاں۔"

"واٹ نان سنس! ہمیں کیا بچوں کا چڑیا گھر بنانا ہے۔ بچے دو ہی اچھے۔ یہ سرکار کی پالیسی ہے۔"

"کون سے دو۔ پہلے والے یا بعد والے...... یا درمیان والے؟ اور یہ سرکار کون ہوتی ہے جی ہمارے گھر کے معاملات میں دخل دینے والی۔ سرکار کا اپنا تو ایک بھی بچہ نہیں ہے۔"

میں نے کہا "سرکار کی ابھی شادی نہیں ہوئی ہے مگر تم مجھے یہ بتاؤ کہ چھ بچے اگر تالاب میں کنکر پھینکنے لگے تو......"

"بچے پتھر پھینکیں گے۔" اس نے میری بات کاٹ دی۔

"میں ہرگز اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

"اجازت میں نے دی ہے۔" وہ غصے سے بولی۔

میں نے چلا کے کہا "اتنی قیمتی سنہری مچھلیاں ڈالی ہیں تالاب میں۔ وہ مر جائیں گی، وہ تمہارے باپ نے جہیز میں

نہیں دی تھیں۔"

"باپ تک مت جاؤ...... ورنہ......"

"ورنہ کیا...... تم میکے چلی جاؤ گی...... جاؤ، ابھی جاؤ، میں دوسری شادی کرلوں گا۔"

"اس کے بھی چھ بچے ہوں گے۔ وہ بھی تالاب میں کنکر ڈالیں گے، پھر کیا کرو گے؟" وہ ایک دم ہنس پڑی۔ ہنستے ہنستے بے حال ہوگئی۔

مجھے بھی ہنسی آ گئی "دیٹ واز اے گڈ ایکٹ۔"

وہ میری گود میں سر رکھ کے لیٹ گئی "سچ، بڑا مزہ آیا یہ لڑائی کا سین پیش کر کے۔ کیا واقعی، ہم ایسے ہی لڑیں گے۔"

"محبت کو زندہ رکھنے کے لیے لڑائی اتنی ہی ضروری ہے جتنی بہار کے پھول کھلانے کے لیے گوبر کی کھاد۔"

"ایسا کیوں ہے رومیو! تمہارے سارے خواب میں کیوں دیکھتی ہوں۔" اس نے ایک انگلی سے میری ناک کو چھوا۔

میں نے آہستہ آہستہ سے اس کے لبوں کو چوما "صرف خواب دیکھنے سے کچھ نہیں ہوگا فری۔ ہمیں حقیقت سے نظر چرانے کی عادت پڑ جائے گی۔"

"میں تو اپنی ساری کشتیاں جلا کے آ گئی ہوں۔ تم ہی تذبذب میں پڑے ہوئے ہو۔"

میں نے کہا "زندگی کے فیصلے سوچے سمجھے بغیر نہیں کیے جاسکتے۔"

"یوں سوچتے رہیں گے تو عمر گزر جائے گی۔"

میں نے کہا "جلد بازی میں جو فیصلہ تم نے کیا تھا۔"

"اس فیصلے کو میں کب کا منسوخ کرچکی۔ اس کی اب کیا حیثیت ہے۔" فریال نے تمتما کے کہا۔

"تمہارے نزدیک نہیں ہے، سلطان کے لیے ہے۔"

"وہ جائے بھاڑ میں۔" وہ غصے سے بولی "وہ کون ہوتا ہے......"

میں نے کہا "وہ سمجھتا ہے کہ تمہیں یک طرفہ طور پر یہ فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل ہی نہیں ہے۔"

"رفیق! یہ کیا بحث چھیڑ دی ہے تم نے۔ اپنی زندگی کے فیصلے کرنے کا قانونی اور شرعی حق مجھے حاصل ہے۔ یہ میری زندگی ہے۔"

"مگر اب وہ تمہیں بھی اپنی ملکیت سمجھتا ہے۔ اس کے لیے یہ مسئلہ قانونی نہیں، سماجی ہے۔ سارا جھگڑا یہی ہے۔"

"ہم شادی کرلیں گے تو جھگڑا خود بخود ختم ہوجائے گا۔"

میں نے کہا "یہ خام خیالی ہے تمہاری۔"

وہ مجھے گھورتی رہی "تم اتنا ڈرتے ہو اس سے؟"

"کیا مجھے ڈرنا نہیں چاہیے اگر ایک خواب کی تعبیر یہ ہو کسی دلہن کے ہاتھوں پر مہندی کی "لالی" کا اور عروسی جوڑے کا رنگ لہو کی سرخی میں ڈوب جائے۔ تالاب کے پانی میں کنکریاں پھینکنے والے بچے وجود کی روشنی پانے سے پہلے ہی تاریکی میں تحلیل ہوجائیں۔ ہم قبروں میں گم ہوجائیں۔"

"خدا کے لیے رفیق! ایسا نہیں ہوگا۔" وہ چلائی۔

"ایسا ہوسکتا ہے فریال! یہ ناممکن نہیں ہے۔ سلطان سب کچھ کرسکتا ہے اور اگر بات صرف میری تمہاری ہوتی تو میں نہ ڈرتا، میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر کہیں نکل جاتا جہاں اس کے خیال کی رسائی بھی نہ ہوتی۔ یہ دنیا بہت بڑی ہے۔ میں تمہارے ساتھ مر بھی جاتا لیکن میری زندگی صرف میری نہیں ہے جان! اس پر میرے ماں باپ کا بھی حق ہے۔"

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا جس میں فریال اپنے ہاتھوں کے ناخنوں کو دانتوں سے کترتی رہی پھر اس نے دل زدہ لہجے میں کہا "پھر مجھے کیا کرنا چاہیے، مر جانا چاہیے؟ کیونکہ یہ تیسرا راستہ ہی نجات کا راستہ ہے۔"

"فضول بات مت کرو۔"

وہ ہسٹریا زدہ لہجے میں بولی "فضول بات نہیں۔ یہ حقیقت ہے۔ ایک راستہ سلطان کے حرم کی طرف جاتا ہے دوسرا تمہاری حویلی کی طرف۔ ایک مجھے منظور ہے، دوسرا تم بند کررہے ہو۔ تیسرا عافیت کا جو راستہ قبر کی طرف جاتا ہے، مجھے اس پر جانا ہوگا، سب کی بہتری کے لیے۔"

"فریال! میری بات دھیان سے سنو۔" میں نے اسے شانوں سے پکڑ کے جھنجوڑا "میں نے تم سے شادی کا فیصلہ کرلیا ہے۔ کیا تم اس کے لیے تیار ہو؟"

وہ مجھے یوں دیکھتی رہی جیسے میں نے اس سے جرمن یا روسی زبان میں سوال کرلیا ہو۔ اسے ہرگز توقع نہیں رہی ہوگی کہ میں یوں براہ راست اس سے یہ سوال کروں گا۔ "تم اپنے حواس میں ہو...... تمہارے والدین تمہیں اس کی اجازت دے دیں گے۔" اس کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔

میں نے کہا "ہاں فریال! میں نے اپنے گھر میں بتادیا تھا۔ ابھی چند روز پہلے جب میں واپس آیا تھا۔"

"مگر تم نے مجھے یہ بات کیوں نہیں بتائی تھی؟"

"اس کی بھی ایک وجہ تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ میرے والدین اس پر راضی نہیں ہوں گے۔"

"پھر...... کیا اب وہ مان گئے ہیں؟"

میں نے کہا "انہیں دادی منالیں گی۔ دراصل دادی

میری کوئی بات ٹالتی نہیں ہیں۔ میں نے ان سے کہا تھا، میرے یہاں آنے کے بعد انہوں نے بات کی ہوگی۔"

"اور...... اگر تمہارے والدین نے پھر بھی انکار کیا؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا "دادی کے آگے ان کی نہیں چلتی۔"

خوشی سے بے قابو ہو کے فریال مجھ سے لپٹ گئی "مجھے یقین نہیں آ تا رومیو! ابھی تم کچھ اور کہہ رہے تھے۔"

میں نے اسے بانہوں میں بھرلیا "وہ بھی غلط نہیں تھا۔ سلطان ایک مسئلہ بلکہ خطرہ تو ہے لیکن اس کے ساتھ ہی کچھ اور معاملات ایسے ہوگئے تھے کہ مجھے فوری فیصلہ کرنا پڑا۔"

"ایسے معاملات...... ان کا ہماری شادی سے کیا تعلق؟"

"تعلق بن گیا تھا فری...... ایک مسئلہ رابعہ کا تھا، میری کزن کا۔ اس کے ماں باپ زبردستی اسے میرے سر تھوپنا چاہتے تھے۔"

"وہ خود بھی ایسا ہی چاہتی ہوگی؟"

"میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ وہ ایسی لڑکی نہیں ہے۔ وہ بہت سمجھ دار لڑکی ہے اور میرے ساتھ بہت مخلص ہے۔ اسے میری دولت سے بھی کوئی دلچسپی نہیں۔ یہ دیوانگی طاری ہے میرے چچا اور چچی پر۔ انہیں سخت صدمہ ہے اپنی حق تلفی کا اور وہ سمجھتے ہیں کہ اب میری دولت اسی صورت میں ان کی ہوسکتی ہے جب ان کی بیٹی میری ہوجائے۔ ایک تو یہ جھگڑا ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائے گا شادی کے بعد۔"

وہ روٹھ کے بولی "یعنی مجھ سے تم صرف اس لیے شادی کررہے ہو کہ رابعہ سے جان چھڑانے کی اور کوئی صورت نہیں۔ میری محبت کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں۔ تمہاری چاہت کی کوئی مجبوری نہیں؟"

"فری! میں جھانپڑ رسید کردوں گا۔ ایسا ہوتا تو میں شادی کرلیتا عائشہ سے۔ بڑے فائدے میں رہتا۔ برطانوی شہریت ملتی اور اس کے لارڈ باپ کی ساری دولت۔ وہ خود کیا کسی سے کم ہے، کیا بگاڑ لیتیں تم میرا۔"

"میں اسے قتل کردیتی...... اور تمہیں بھی۔"

"تم کچھ نہیں کرسکتی تھیں، صبر کے سوا۔ جیسے وہ تیار تھی میری دوسری بیوی بننے کو، تم بھی تیار ہوجاتیں۔ تمہارے اور اس کے جذبات سے کھیلتے رہنا میرے لیے کیا مشکل تھا مگر تمہارے لیے خوار ہوتے مجھے کتنے برس بیت گئے اور تم ایسی فضول بات کرتی ہو آج کہ مجھے تمہاری محبت کا خیال نہیں۔"

میں نے خفگی سے کہا "الزام لگا رہی ہو مجھ پر؟"

اس نے میرے چہرے پر کئی بوسے ثبت کردیے "مجھے معاف کردو رومیو! محبت کے پاگل پن میں ایسی بات کہہ جاتی ہوں میں۔"

میں نے اس کا سر اپنے شانے پر رکھ لیا "ایک اور مسئلہ یہ تھا کہ میرے والدین اب یہاں آ کے رہنے کا فیصلہ کرچکے ہیں اور میں انہیں روک نہیں سکتا۔ یہاں آ کے وہ تمہیں پہلے سے موجود پاتے تو انہیں سخت صدمہ ہوتا۔ وہ پرانی اخلاقی قدروں پر ایمان رکھنے والے لوگ ہیں۔ ان کا ذہن یہ قبول کرہی نہیں سکتا کہ لڑکا لڑکی دوست بن کر ساتھ رہ سکتے ہیں۔ گرل فرینڈ اور فرینڈ کا تصور ان کے نزدیک ناقابلِ فہم ہے۔ ان کے نزدیک آگ اور پیٹرول بہ حفاظت ایک ساتھ نہیں ہوسکتے۔ یہ ناممکن ہے کہ دھماکا نہ ہو اور وہ اپنے بیٹے سے اس قسم کی بے حیائی کی توقع نہیں کرسکتے۔"

فریال ہنسنے لگی "ولایت پلٹ ہونے کے باوجود؟"

"دراصل انہیں اپنی تربیت پر ناز ہے اگر ان کے اعتماد کو شکست ہونا تو وہ سمجھتے ہیں، ان کی ساری زندگی کی محنت ضائع ہوئی۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ ان کو ایسا صدمہ نہ پہنچے۔ وہ بیٹے کو فرشتہ سمجھتے ہیں تو انہیں وہ کبھی خطاکار انسان دکھائی نہ دے۔"

"میرا خیال ہے کہ تم انہیں غلط سمجھتے ہو۔ وہ اتنے خیال پرست کیسے ہوسکتے ہیں۔ انہیں معلوم ہے لندن اور امریکا میں سوسائٹی کتنی لبرل ہے اور تم لندن میں تھے تو میں بھی تھی اور ہمیں روکنے والا کوئی نہ تھا۔"

"دیکھو، یہ بات ہے یہاں کی۔ وہ اپنی آنکھوں سے وہ سب نہیں دیکھ سکتے تھے جو وہاں ہوتا ہے۔ ممکن ہے اس کے تصور سے بھی انہیں پریشانی لاحق ہو مگر لندن میں وہ موجود نہیں تھے اگر یہاں میں ان کی موجودگی کو نظر انداز کردوں تو یہ ان کی سخت بے عزتی ہوگی۔ بے شک، دنیا کو دھوکا دینے کے لیے تم نے اپنی وضع قطع مردانہ بنالی ہے۔"

"کسی کو دھوکا دینے کے لیے نہیں۔ اپنی جان بچانے کے لیے۔"

"چلو، یوں سہی...... لیکن یہاں رہتے ہوئے تم اپنی شناخت کو ان سے پوشیدہ کیسے رکھ سکتی ہو؟"

"یار، مجھے تو شک ہے کہ ریشم کی نظر نے بھی مجھے پہچان لیا ہے مگر وہ چپ رہنے پر مجبور ہے۔" وہ فکرمندی سے بولی۔

"کیا......؟ کیا اس نے کچھ کہا تم سے؟" میں نے پوچھا۔

"کہا تو نہیں، اپنی ماں سے بات کررہی تھی کہ یہ ڈاکٹر شہناز کے بھائی ہیں مگر ان کی صورت فریال بی بی سے کتنی ملتی

ہے۔"

"پھر ماں نے کیا کہا؟"

"ماں نے ڈانٹ دیا اسے کہ خبردار، جو پھر کبھی ایسی بات کی۔" ماں کے لہجے سے مجھے لگا کہ وہ بھی حقیقت جان گئی ہے مگر ظاہر کرنا نہیں چاہتی۔

"پھر تم خود ہی سوچو کہ میرے والدین سے کوئی بات کیسے چھپی رہ سکتی ہے؟" میں نے کہا۔

"پھر کیا کروں میں؟"

"میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا، تم یہاں نہیں رہوگی۔"

وہ متفکر ہوگئی "میں کہاں جاؤں گی، کہاں رہوں گی؟"

"اس کا بندوبست ہو جائے گا، صرف ایک ہفتے کی بات ہے۔ تم فرخ کے گھر میں رہ سکتی ہو۔ وہ خالی پڑا ہے ورنہ فاروقی کے گھر چلی جاؤ۔"

ابھی فریال کا ردِعمل سامنے نہیں آیا تھا کہ باہر سے کوئی عورت چلا چلا کے کاسو کو پکارنے لگی۔ فریال کے ساتھ میں ہڑبڑا کے اٹھا تو مجھے کاسو کی بیوی چیختی چلاتی دروازے کی طرف لپکتی نظر آئی۔ بچہ اس کی گود میں تھا "ارے، یہ تو نے کیا، کیا رے...... مجھے چھوڑ گیا اکیلا؟"

میں ایک دم سمجھ گیا کہ وہ کیوں چلا رہی ہے، ابھی کچھ دیر پہلے میں نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی تھی۔ یقیناً وہ کاسو تھا جو باہر گیا تھا اور اس میں شک کی بات ہی نہ تھی کہ وہ کہاں گیا ہوگا۔ وہ ہم سب کے سمجھانے کے باوجود لوٹ کر رانا کے پاس چلا گیا تھا۔ اپنے بیوی بچوں کو رانا کے عتاب سے محفوظ کرنے کے لیے کاسو نے خود کو رانا کے حوالے کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا اور موقع پاتے ہی اس پر عمل کر چکا تھا۔

میں ایک جست میں باہر نکلا مگر اتنی دیر میں کاسو کی بیوی گیٹ کھول کے باہر جا چکی تھی۔ گارڈ سے کچھ کہنا بے کار تھا۔ وہاں وہ اس لیے کھڑا تھا کہ باہر سے کوئی غیر متعلقہ شخص اندر نہ آنے پائے۔ اندر رہنے والوں کو باہر جانے سے روکنا اس کے فرائض میں شامل نہیں تھا۔

میں دوڑتا ہوا اندر گیا۔ فریال میرے پیچھے پیچھے آئی۔ میں نے راجا کو بیدار کیا۔ وہ آنکھیں ملتا اٹھا "یار! کیا مصیبت ہے۔"

میں نے کہا "راجا، وہ کاسو بھاگ گیا۔"

راجا کی نیند کافور ہوگئی "کہاں بھاگ گیا، تیرا مطلب ہے......"

"ہاں...... وہ حرام زادہ سمجھانے کے باوجود رانا کے پاس پہنچ گیا۔"

راجا نے برہمی سے کہا "پھر ہم کیا کریں، مرنے دیں سالے کو؟"

میں نے کہا "یہ بات نہیں، اس کی بیوی کو ذرا دیر سے پتہ چلا مگر وہ بھی نکل گئی ہے اس کے پیچھے، اپنے بچے کے ساتھ۔ ہم انہیں تو واپس لا سکتے ہیں۔"

راجا چھلانگ مار کے بیڈ سے اترا۔ ہم ایک ساتھ باہر نکلے۔ جیپ اسٹارٹ کر کے باہر نکلنے میں ہمیں چند منٹ ہی لگے۔ گیٹ پر میں نے گارڈ سے پوچھا تو اس نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ کے اشارے سے بتایا "اس راستے سے گئی ہے جی وہ۔"

میں نے جیپ کو کچے راستے پر ڈال دیا۔ ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی، گھنے جنگل میں ایک محدود فاصلے کے بعد رک جاتی تھی۔ باری باری میں نے اور راجا نے کاسو کو پکارا۔ میں درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان سے جیپ کو گزارنے کی جدوجہد میں مصروف رہا۔ جیپ کا رخ راجا کے گاؤں کی طرف تھا۔ کاسو کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ اتنی دیر میں بہت آگے جا چکا ہوگا۔ وہ رانا کی حویلی میں ہوگا یا اس کے نزدیک، اسے واپس لانا ممکن نہیں تھا لیکن کاسو کی بیوی اور اس کے بچے کو بچایا جا سکتا تھا۔

رات کے وقت جیپ کو جنگل سے گزارنا زیادہ دشوار ثابت ہو رہا تھا۔ جیپ اچھل رہی تھی اور میں اسٹیئرنگ سے لڑتے ہوئے اسے دائیں بائیں کرتا جا رہا تھا۔ چھوٹی جھاڑیاں، ناہموار زمین، گڑھے اور پتھر جیپ کی راہ میں حائل تھے اور بعض جگہ درختوں کا درمیانی فاصلہ اتنا کم ہو جاتا تھا کہ مجھے رخ بدلنا پڑتا تھا، اس کے باوجود میں نے اندازے کی بنیاد پر سمت ایک ہی رکھی۔

بالآخر میرے کانوں نے ایک ہلکی سی آواز سنی۔ یہ کاسو کی بیوی کی نہیں، اس کے بچے کی آواز تھی جس کی نیند خراب ہوگئی تھی اور ماں کی گود میں بھی اس کے لیے بے آرامی تھی۔

راجا نے بھی یہ آواز سنی اور جیپ سے کود گیا۔ جیپ کی رفتار اتنی کم تھی کہ اس کے مقابلے میں خود دوڑ کے کاسو کی بیوی کو پکڑنا آسان تھا۔ راجا میری نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ میں اسی سمت میں جیپ بڑھاتا گیا۔ دس منٹ بعد میں نے راجا کی آواز سنی۔ وہ کاسو کی بیوی سے کہہ رہا تھا "رک جاؤ...... میری بات سنو۔"

جواب میں کاسو کی بیوی نے کہا "نہیں راجا صاحب! مجھے جانے دو، میں کاسو کے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

بالآخر وہ روشنی میں آگئے۔ راجا نے کاسو کی بیوی کو پکڑ لیا تھا۔ وہ خود کو چھڑانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی اور رو رہی تھی۔ میں نے جیپ روکی مگر انجن کو بند نہیں کیا۔ راجا اب کاسو کی بیوی کو کلائی سے پکڑے کھینچتا ہوا لا رہا تھا۔

جب وہ میرے سامنے آئی تو میں نے کہا "یہ کیا بے وقوفی کر رہی ہو تم، کہاں جا رہی ہو اس وقت؟"

"میں کاسو کے پاس جا رہی ہوں نواب صاحب!" وہ دھاڑیں مار کے رونے لگی۔

میں نے نرمی سے کہا "کیوں؟ تاکہ وہ کاسو کے ساتھ تمہیں اور تمہارے بچے کو بھی مار ڈالے؟"

راجا نے اسے آگے دھکیلا "چلو بیٹھو جیپ میں۔ کاسو کو ہم واپس لائیں گے۔"

کاسو کی بیوی نے مزاحمت ختم کردی "آپ واپس لاؤ گے اسے...... کب لاؤ گے نواب صاحب! صبح تک وہ اسے مار دیں گے۔"

میں نے کہا "میں ابھی جاتا ہوں رانا کے پاس!"

"پھر آپ جلدی کرو جناب!"

میں نے راجا کی طرف دیکھا "راجا! میں جاتا ہوں۔"

"تو اکیلا جائے گا؟" راجا متفکر ہوگیا۔

"میری فکر مت کرو۔ رانا میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، تو اسے لے جا۔"

"ریوالور ہے تیرے پاس؟" راجا نے کہا۔

میں نے کہا "یار، مجھے کوئی جنگ نہیں لڑنی ہے۔ اسلحہ میری کیا مدد کر سکتا ہے رانا کے قلعے میں داخل ہونے کے بعد۔ میں صرف بات کروں گا۔"

"یار، وہ باتوں سے ماننے والا نہیں ہے۔"

"میں اسے الٹی میٹم دے دوں گا کہ کاسو کو کچھ ہوا تو یہ معاملہ بہت اوپر تک جائے گا۔"

راجا نے سر ہلایا "ٹھیک ہے، تو جا...... میں بھی کرتا ہوں کچھ۔"

میں پھر جیپ میں بیٹھا اور اندازے کے مطابق رانا کی حویلی کی طرف چل پڑا۔ کاسو کی بیوی چپ چاپ راجا کے ساتھ واپس ہوگئی۔ وہ حویلی سے زیادہ دور نہیں آئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ دس پندرہ منٹ میں وہ حویلی پہنچ جائیں گے۔

ابتدا میں مجھے راستہ تلاش کرنے میں کچھ دشواری پیش آئی مگر پھر مجھے اچانک وہ کچا راستہ مل گیا جو پنڈ جتال تک آنے جانے میں استعمال ہوتا تھا۔ پندرہ منٹ بعد میں رانا کی حویلی کے دروازے پر تھا۔ یہ عجیب اتفاق تھا کہ چوبیس گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے کہ میں دوسری بار یہاں آنے پر مجبور ہوا تھا۔

حسب توقع وہاں کاسو کی واپسی نے کچھ ہلچل پیدا کی تھی۔ محافظوں نے دور ہی سے جیپ کی ہیڈ لائٹس کو بھی قریب آتا دیکھ لیا ہوگا۔ وہ ہتھیار اٹھائے مستعد کھڑے تھے۔ گیٹ پر ہی نہیں فصیل جیسی دیوار پر بھی تمام سرچ لائٹس روشن تھیں اور ان کا رخ باہر کی طرف ہونے سے گرد و نواح میں سو ڈیڑھ سو گز تک ہر قسم کی نقل و حرکت صاف دیکھی جا سکتی تھی۔

یقیناً رانا کو جگا کے یہ خوش خبری دی گئی ہوگی کہ مفرور مجرم نے واپس آ کے خود کو ان کے حوالے کر دیا ہے۔ میں نے جیپ روک کے رانا سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی تو کسی نے یہ نہیں کہا کہ یہ وقت ان کے سونے کا ہے اور انہیں جگایا نہیں جا سکتا۔

وہ دیوان خانے میں میرا استقبال کرنے کے لیے موجود نہیں تھا۔ مجھے کچھ دیر انتظار کرنا پڑا۔ جب رانا اندر آیا تو میں سمجھ گیا کہ یہ وقت اس نے لباس بدلنے میں صرف کیا تھا۔ وہ میرے سامنے شب خوابی کے بے ترتیب لباس اور حلیے میں نہیں آنا چاہتا تھا۔

اس نے ایک فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملایا "مجھے یقین تھا کہ آپ ضرور آؤ گے...... لیکن اس وقت امید نہیں تھی۔"

میں نے کہا "پھر تو آپ یہ بھی سمجھ گئے ہوں گے کہ میرے آنے کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟"

"یہ آپ خود ہی بتا دو۔"

میں نے کہا "کاسو بھاگ کے یہاں آ گیا ہے۔"

اس نے اقرار میں سر ہلایا "یہاں سے بھی وہ بھاگ کر ہی گیا تھا۔ بلکہ آپ سچ کا برا نہ مانو تو کہوں...... آپ اسے بھگا کر لے گئے تھے۔ واپس وہ اپنی مرضی سے آیا ہے۔ اپنے پیروں پر چل کے۔"

میں نے کہا "آپ نے اسے اتنا دہشت زدہ کر دیا تھا کہ وہ مجبور ہوگیا۔"

"اس کو سمجھ آ گئی ہوگی کہ نواب رفیق احمد شیرازی اس کی حفاظت نہیں کر سکتے۔" وہ رعونت سے بولا۔

"رانا صاحب، میں بحث کرنے نہیں آیا۔ میں چاہتا ہوں آپ کاسو کو واپس میرے حوالے کر دیں۔"

اس کا چہرہ بگڑ گیا "واپس...... واپسی تو وہ میرے پاس آیا ہے...... جیسے تم اسے لے گئے تھے، ایسے میں کاسو کو اغوا کر کے نہیں لایا ہوں۔"

میں نے کہا "اس نے اپنی بیوی بچوں کو بچانے کے لیے اپنی زندگی کی قربانی دینے کا فیصلہ کیا تھا...... اگر اسے کچھ ہوا تو......"

رانا نے دھاڑ کر میری بات کاٹ دی ''اوئے خیراتی نواب! ادھر رانا کی حویلی میں بیٹھ کے رانا کو دھمکی مت دو۔ میں چاہتا تو تمہیں باہر ہی سے واپس کرا دیتا۔ میرے بندے تمہیں اٹھا کے واپس پھینک آتے ...... مگر میں گھر آئے مہمان کے ساتھ بدسلوکی نہیں کرتا۔ جب تک مہمان اپنی اوقات میں رہے۔''

میں نے کہا ''رانا صاحب! کاسو ایک جیتا جاگتا انسان ہے۔ وہ نہ میرا بندہ ہے اور نہ آپ کا۔ وہ خدا کا بندہ ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے میں اور آپ......''

''بند کرو اپنی یہ بکواس! یہ کتابی باتوں والا لیکچر۔''

میں نے کہا ''رانا صاحب! ابھی وقت ہے۔ ہوش میں آ جاؤ۔ آنکھیں کھول کے دیکھو زمانہ کتنا بدل گیا ہے۔ کاسو کا معاملہ قانون کے لیے، حکومت کے لیے اور عالمی ضمیر کے لیے مختاراں مائی کا کیس نہ بن جائے اگر یہ معاملہ تمہاری زرخرید مقامی پولیس کے دائرۂ اختیار سے آگے نکل گیا اور اخبارات کی سرخی بن گیا تو عین ممکن ہے سپریم کورٹ ازخود اس واقعے کا نوٹس لے۔ تم جانتے ہو آج کل ایسا ہی ہو رہا ہے پھر کون بچائے گا تمہیں جیل جانے سے؟''

خلاف توقع رانا کسی آتش فشاں کی طرح دھماکے سے نہیں پھٹا، مجھے اس کی آنکھوں میں فکرمندی اور تشویش کے آثار دکھائی دیے لیکن اس نے اپنی صورت سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا، وہ مجھے گھورتا رہا۔

میں نے اپنی بات جاری رکھی ''میں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس کیس میں خواہ مجھے کتنا بھی نقصان کیوں نہ ہو جائے، میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔ میں کاسو کی بیوی اور بچے کو قومی پریس کے سامنے پیش کروں گا۔ وہ ساری دنیا کو بتائیں گے کہ پہلے تم کیا کرتے رہے ہو اور اب کیا کرنے جا رہے ہو؟ وہ اعلان کرے گی کہ کاسو کو کچھ ہوا تو وہ سپریم کورٹ کے سامنے خود کو اور اپنے بچے کو آگ لگا لے گی۔ اس کی طرف سے اپیلیں شایع ہوں گی۔ فرنٹ پیج پر، صدر اور مملکت اور وزیراعظم کے نام۔''

رانا نے ہاتھ اٹھایا ''بس نواب صاحب! بہت بول چکے تم۔ تم کو جو کرنا ہے بعد میں کرنا، پہلے کاسو سے پوچھ لو کہ وہ تمہارے ساتھ جانا چاہتا ہے یا نہیں۔ ایسا نہ ہو تمہارا سارا کھیل الٹا ہو جائے۔ کاسو قومی پریس کے سامنے تم کو جھوٹا کر دے۔ الٹا تم پر الزام عائد کر دے کہ تم اسے اور اس کے بیوی بچوں کو اغوا کر کے لے گئے تھے۔ تم نے انہیں اپنی قید میں رکھا اور موقع ملتے ہی وہ بھاگ آیا مگر اس کے بیوی بچے ابھی تک آزاد نہیں ہوئے۔ وہ تم سے ان کی واپسی کا مطالبہ کرے۔''

میں نے کہا ''کاسو مجبور ضرور ہے، پاگل نہیں ہے کہ ایسا کہے۔''

''اگر وہ خود تمہارے ساتھ جانے پر راضی ہو تو اسے ابھی لے جاؤ۔ میں اسے نہیں روکوں گا۔''

''وہ ہے کہاں؟''

رانا اٹھا ''آؤ میرے ساتھ۔''

میں رانا کے ساتھ باہر نکلا۔ ہم نے ایک طویل راہداری جیسا برآمدہ کراس کیا پھر رانا نے ایک دروازہ کھولا۔ دروازے کے پیچھے زینہ نیچے جا رہا تھا۔ وہ آگے چلتا گیا۔ ایک موڑ کے بعد زینہ ختم ہو گیا۔ رانا نے تہ خانے کا دروازہ کھولا۔ اندر ایک چارپائی پر کاسو اپنے گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا تھا۔ کمرا بالکل خالی تھا اور کسی زنداں کا کمرا لگتا تھا۔ اس کی دیواریں میلی اور سپاٹ تھیں۔ چھت میں لگا ہوا بلب شاید پچیس واٹ کا ہوگا۔ اس کی روشنی ماحول کی ویرانی کا تاثر ختم کرنے میں ناکام تھی۔

مجھے رانا کے ساتھ دیکھ کر کاسو ایک دم اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف اور وحشت بڑھ گئی۔ وہ کانپنے لگا۔

رانا نے کہا ''کاسو، یہ نواب رفیق احمد شیرازی تمہیں اپنے ساتھ واپس لے جانا چاہتے ہیں، تم جاؤ گے؟''

کاسو نفی میں سر ہلانے لگا اور ہاتھ جوڑنے لگا ''نہیں مائی باپ، میں ان کے ساتھ نہیں جاؤں گا، میری غلطی کو معاف کر دیں۔''

میں نے کہا ''کاسو، ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔''

''میں نہیں جاؤں گا جی، میری غلطی کو معاف کر دیں۔''

رانا کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی ''جی مالک، اپنی مرضی سے آیا ہوں۔''

''لیکن تمہارے بیوی بچے تو وہیں ہیں۔ کیا تم ان کے پاس جانا نہیں چاہتے؟''

''میری غلطی کو معاف کر دیں جناب! میں انہیں بھی بلانا چاہتا ہوں۔''

رانا بولا ''تم تو اپنی خوشی سے گئے تھے۔''

''نہیں مالک! نواب صاحب ہمیں زبردستی لے گئے تھے۔''

میں سمجھ گیا تھا کہ رانا کے سامنے کاسو کی زبان سے اور کچھ نہیں نکلے گا۔ میں نے کہا ''رانا صاحب! اگر آپ اجازت دیں تو میں کاسو سے اکیلے میں چند منٹ بات کر لوں؟''

''چند منٹ کیوں جی ...... جب تک دل چاہے بات کرو۔'' وہ پلٹا اور مسکراتا ہوا باہر نکل گیا۔

میں نے کہا ''کاسو! یہ تم نے کیا بے وقوفی کی؟''

وہ اپنے سامنے دیوار کو تکتا رہا ''میں نے ٹھیک کیا جناب!''

''کیا ٹھیک کیا، تم جانتے ہو یہاں تمہارے ساتھ کیا ہوگا؟''

''وہی جو میرے نصیب میں ہے۔''

میں نے کہا ''نصیب کو الزام مت دو، میرے ساتھ چلو۔''

''نہیں نواب صاحب! آپ کی بڑی مہربانی۔ اللہ آپ کو اس کا اجر دے۔ آپ نے بڑی کوشش کی لیکن تقدیر سے کوئی نہیں لڑ سکتا۔''

میں نے کہا ''رانا تمہیں زندہ دفن کرادے گا۔ اس کتے کے ساتھ اور تمہارے مرنے کے بعد تمہاری بیوی پر کیا گزرے گی؟ وہ بیوہ ہوجائے گی۔ تمہارا بچہ یتیم کہلائے گا، تمہیں کسی کا خیال نہیں؟''

''انہی کو بچانے کے لیے تو میں اپنی جان دینے آیا ہوں۔''

''کاسو! میں تم سب کو شہر بھجوادوں گا۔''

وہ نفی میں سر ہلانے لگا ''اس سے کچھ نہیں ہوگا۔ اگر آپ کو کچھ کرنا ہے تو میری بیوی کو اور میرے بچے کو بچالو۔ انہیں شہر بھیج دو اگر آپ کچھ کرسکتے ہو نواب صاحب، تو ان کے جینے کا بندوبست کردو۔'' وہ بات کرتے کرتے رونے لگا۔

آدھے گھنٹے تک میں سر کھپاتا رہا مگر کاسو کی نہ کو ہاں میں نہ بدل سکا۔ مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ ظاہر ہے اس کے بعد میرے لیے مایوس لوٹنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ میرا غصہ کرنا یا چیخنا چلانا بے سود تھا۔ میں کاسو کو زبردستی کھینچ کے اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتا تھا۔ جو آدمی مرنے کا تہیہ کرچکا ہو اسے زندگی کی طرف لے جانے کی کوشش کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوسکتا۔ اسے جب موقع ملے گا وہ موت کو گلے لگالے گا اور کاسو کا تو معاملہ ہی مختلف تھا۔ اس کے سامنے ایک مقصد تھا جس کے لیے وہ جان دینا چاہتا تھا۔

جب بالآخر میں نے واپس جانا چاہا تو مجھے پتا چلا کہ دروازہ باہر سے بند ہے۔ میں نے دروازے کو بجایا۔ اس پر زور زور سے ہاتھ مارے اور چلا چلا کے آوازیں دیں مگر دروازہ نہ کھلا۔ اپنی بے وقوفی کے باعث اب میں بھی کاسو کے ساتھ رانا کی قید میں تھا۔ میں بھی اپنے پیروں پر چل کے اس زنداں تک آیا تھا اور میں نے خود ہی رانا کو موقع فراہم کیا تھا کہ وہ مجھے چھوڑ کے چلا جائے۔

یہ انتہائی غیر متوقع صورتِ حال تھی۔ مجھے معلوم تو ... میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ نہ وہ مجھے غائب کرسکتا ہے ... ہے اور نہ غیر محدود عرصے تک مجھے قید میں رکھ سکتا ہے ... ہونے سے پہلے ہی سمجھ جائے گا کہ میرا واپس نہ آنا کس بات کی علامت ہے۔ وہ مجھے قید سے نکال لے گا لیکن اس کے لیے ... کو بہت پاپڑ بیلنے پڑیں گے۔ اسے قانون کی نااہل اور ... مشینری کو حرکت میں لانے کے لیے اثر رسوخ اور پیسے کا بے ... زور صرف کرنا پڑے گا۔ اس کے باوجود میری رہائی کب ... میں آئے گی، یہ بالکل غیر یقینی بات تھی۔

اب مجھے جتنا غصہ کاسو کی بے وقوفی پر آرہا تھا اس سے زیادہ اپنی جذباتی جلد بازی پر آرہا تھا۔ یہ اپنے آپ پر ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کا نتیجہ تھا کہ میں یہاں تنہا اور خالی ہاتھ آیا تھا اور چوہے دان میں داخل ہونے والے چوہے کی طرح گرفتار ہوگیا تھا۔

اب اس خالی کمرے میں مقید چمگادڑ کی طرح چکر کاٹنے کے سوا میں کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔ رانا شاید واپس اپنی خواب گاہ میں پہنچ کے ایک بہت بڑی کامیابی کے نشے میں چور ہو کر سو گیا ہوگا۔ اس نے اپنے غلاموں اور محافظوں کو بتادیا ہوگا کہ انہیں کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔ کیا کہنا ہے اور کیا نہیں کہنا ہے۔ رانا کو کسی بات کی جلدی یا بے اطمینانی نہیں ہوگی۔ سب کچھ اس کے کنٹرول میں ہے۔ فکر کی کوئی بات ہی نہیں۔

میں اپنی کوتاہ اندیشی اور کم عقلی پر ماتم کرتا رہا۔ بار بار گھڑی دیکھتا رہا جس کی سوئیاں اپنی مقررہ رفتار سے حرکت کررہی تھیں مگر مجھے لگتا تھا کہ رک گئی ہیں۔ صبح کے پونے چار بجے سے میری قید شروع ہوئی تھی۔ اس وقت سے صبح ہونے تک میں نے کمرے کے اندر چلتے ہوئے کتنا فاصلہ طے کیا اس کا اندازہ مجھے تب ہوا جب میں تھک کر چارپائی پر کاسو کے ساتھ بیٹھ گیا۔

''آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا نواب صاحب!'' وہ ڈرتے ڈرتے بولا۔

میں نے اسے غصے سے دیکھا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ جواب میں اس کے ایک جھانپڑ رسید کردوں۔ اس کی وجہ سے میں اس مشکل میں گرفتار ہوا تھا اور وہی مجھ سے کہہ رہا تھا کہ میں نے غلطی کی تھی۔

یہ میرے لیے بڑا اچھا سبق تھا۔ شاید مجھے بھی اسی طرح سے سوچنا چاہیے جیسے رانا سوچتا ہے۔ ردم میں وہی کرد جو ردمن کرتے ہیں۔ انسانی مساوات، ہیومن رائٹس، عدل و انصاف، طبقاتی امتیاز، مجھے سب کچھ بھلا دینا چاہیے۔ مجھے حاکم کی سطح پر

بلند ہو کے محکوم انسانوں کو یوں دیکھنا چاہیے جیسے وہ حشرات الارض ہیں، یہی یہاں کا چلن ہے۔

کاسو کی آواز پر میں چونکا ''مجھے معاف کردیں نواب صاحب!''

''نواب صاحب!'' میں نے تلخی سے کہا ''میں اور تم دونوں رانا کے قیدی ہیں۔ معاف تو میں اپنے آپ کو بھی نہیں کرسکتا۔''

میرا ذہن اب اپنے زنداں سے باہر بھٹک رہا تھا۔ کسی ٹی وی چینل کے نمائندے کی طرح میرے سامنے وہ مناظر پیش کررہا تھا جو میری نظر نہیں دیکھ سکتی تھی اور میرے تصور میں تصویر بدلتی جارہی تھی۔ راجا ضرور آیا ہوگا۔ رانا نے اس سے کیا کہا ہوگا؟ یہی کہ نواب صاحب تو یہاں تشریف نہیں لائے کاسو کو چھڑانے کے لیے لیکن کاسو تو انہی کے پاس تھا۔ انہی کی حویلی میں تھا۔ نہیں، کاسو بھی یہاں نہیں آیا۔

اس کے بعد راجا کیا کرے گا؟ اپنا سارا اثر رسوخ استعمال کرکے رانا کے خلاف ایک رپورٹ لکھوادے گا۔ پولیس یہاں رسمی کارروائی کے لیے آئے گی اور لوٹ جائے گی۔ رانا صاف انکار کردے گا۔ خانہ تلاشی کے وارنٹ ہوں گے تو وہ حویلی بھی دکھادے گا۔ کہیں وہ جیپ ملے گی، جس پر میں آیا تھا، اور نہ ہی میرا سراغ ملے گا۔ رانا جیپ کو بھی غائب کرسکتا ہے۔ مجھے بھی غائب کرسکتا ہے۔ ہر سراغ مٹا سکتا ہے۔ ثبوت اور شہادت کے بغیر رانا پر کوئی بھی عدالت فرد جرم عائد نہیں کرسکتی۔ اس کا اثر رسوخ کم نہیں۔ وہ صوبائی اسمبلی کا رکن ہے۔ استحقاق مجروح ہونے پر تحریک التوا لاسکتا ہے۔ الٹا راجا پر ہتک عزت کا کیس بناسکتا ہے۔ اس کے پاس پیسے کی کمی نہیں۔ وہ بڑے سے بڑا وکیل کرسکتا ہے۔

میرا دماغ مایوس اور حوصلہ شکن خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ مجھے اس قید سے رہائی کی کوئی صورت نظر نہ آتی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ پاکستان میں آئے دن لوگ کیسے غائب ہوجاتے ہیں۔ کوئی حکومتی ادارہ کسی عدالت عالیہ کا حکم ان کی برآمدگی میں معاون نہیں ہوتا۔ بڑے بڑے نامور لوگ یوں غائب ہوجاتے ہیں جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔ ان کے اہلِ خانہ تمام عمر روتے ہیں، تلاش کرتے ہیں، انتظار کرتے رہتے ہیں۔

میرے ماں باپ کا بھی یہی ہوگا۔ وہ ہر جگہ جائیں گے، ہر دروازے پر دستک دیں گے۔ ہر ایک کے سامنے جھولی پھیلائیں گے۔ رانا کے پیروں پر سر رکھ کے گڑگڑائیں گے، ہمیں اپنا بیٹا دے دو، وہ ہمارا ایک ہی سہارا تھا جینے کے لیے۔ دادی مجھے پکارتی مرجائے گی۔ کون کون روئے گا؟ لیکن کب تک... فریال، عائشہ، راجا، سب بالآخر اپنی اپنی زندگی کے معمولات میں نواب رفیق احمد شیرازی کو بھول جائیں گے۔ ست بدھائی ڈیولپمنٹ پراجیکٹ کے خواب بکھر جائیں گے۔ یہ جاگیر، حویلی، اس کا خزانہ، اس کی ملکیت کا غرور، حق وراثت، یہ سب کس کے پاس جائے گا؟

وقت گزرتا جارہا تھا۔ میری مایوسی بڑھتی جارہی تھی۔ اپنی بے بسی کا احساس شدید سے شدید تر ہوتا جارہا تھا لیکن میں کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ سوائے سوچنے کے۔ گھڑی دیکھنے کے اور اس تہ خانے کی دیواروں میں کسی بدروح کی طرح بھٹکنے کے یا ان سے سر ٹکرا کے مرنے کے۔ یہاں قید میں ڈالنے والے تو جیسے مجھے بھول چکے تھے۔

یہ عذاب کی رات کا صرف ایک حصہ تھا۔ ساٹھ منٹ جو مجھ پر عمر قید کی طرح گراں گزرے۔ وہ زنداں نہ کھلا۔ میری امید جواب دینے لگی۔ کیا میں یہاں اسی طرح بھوکا پیاسا مرجاؤں گا، پاگل ہو کے؟ نہیں، ایسا کیسے ہوسکتا ہے، میرا خدا مجھے کسی گناہ کی ایسی سزا نہیں دے گا۔

اور اس لمحے وہ معجزہ ظہور میں آیا جس پر میرا اعتقاد نہ تھا یا تھا تو بہت کمزور تھا کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ یہ معجزوں کی صدی نہیں ہے۔ باہر قدموں کی بھاری چاپ سنائی دی اور پھر کسی نے بند دروازہ کھول دیا۔ دو مسلح گارڈ اندر آئے۔ رانا ان کے پیچھے تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یوں لگا جیسے یہ نظر کا دھوکا ہے یا فریب آرزو ہے، میری خواہش کا طلسم ہے جو پلک جھپکتے میں ٹوٹ جائے گا۔

لیکن رانا اپنے ہونٹوں پر وہی طنزیہ، فاتحانہ اور عیار مسکراہٹ سجائے اندر آیا تو مجھے احساس ہوا کہ میں بھی کاسو کی طرح دہشت زدہ کھڑا ہوں اور میرے اعصاب پر مسلط ہوجانے والا اندیشوں کا دباؤ میری صورت سے عیاں ہورہا ہے۔ رانا اس خوف کے احساس سے لطف اندوز ہورہا ہے جس نے صرف ایک گھنٹے میں میرے یقین اور اعتماد کو احساس شکست اور مایوسی کے عذاب میں مبتلا کردیا تھا جس کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے وہم پرست اور کمزور شخص سنسان رات میں قبرستان سے گزرے تو اسے یوں لگے جیسے ہر قبر سے نکلنے والے مردے اس کا تعاقب کررہے ہیں۔ اس کا راستہ روک رہے ہیں اور اسے زندہ دفن کرنا چاہتے ہیں اور اچانک انسانوں سے آباد دنیا میں پہنچ کے اسے یقین کرنا پڑے کہ وہ سب اس کے اپنے خوف کی کرشمہ سازی تھی۔

رانا آگے آ کے مسکرانے لگا ''کیا بات ہے نواب صاحب! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟''

میں چونکا تو مجھے مزید خفت ہوئی کہ اس طرح میں نے رانا پر اپنی ایک کمزوری کا راز عیاں کر دیا۔ اس گیم میں رانا نے ایک پوائنٹ کی برتری حاصل کر لی۔ اس نے جان لیا کہ بڑے طرم خاں بننے والے نواب رفیق احمد شیرازی کا دم خم کیا ہے۔ مجھے اتنا وقت ہی نہ ملا کہ میں اپنی صورت کے تاثرات پر قابو پالیتا۔

میں نے کہا "یہ دروازہ باہر سے کیوں بند تھا؟"

وہ مسکراتا رہا "لو جی! ہم نے آپ کو تخلیہ فراہم کیا تھا، سب کو تاکید کر دی تھی کہ ادھر کوئی نہ آئے۔ نواب صاحب اکیلے میں کاسو سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ میرے اندیشے درست ثابت ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ جو میں نے سوچا تھا، وہ حقیقت کا روپ بھی دھار سکتا تھا اگر ایسا نہیں ہوا تھا تو اس کی بھی کوئی وجہ ضرور تھی۔

"کیا کاسو آپ کے ساتھ جانے پر راضی ہو گیا ہے نواب صاحب؟" رانا نے کہا۔

میں نے خطرے کی حدود سے باہر نکلنے تک رانا کو سخت جواب دینے سے گریز کیا اور صرف نفی میں سر ہلا دیا "جو شخص ذہنی طور پر مر چکا ہو اور جسمانی طور پر غلام ہو اسے کچھ بھی نہیں سمجھایا جا سکتا۔"

رانا نے کہا "کیوں بھئی کاسو! تو کیوں نہیں چلا جاتا، نواب صاحب خود تجھے لے جانے کے لیے تشریف لائے تھے۔ جا عیش سے رہ حویلی میں، وہاں تیرے بیوی بچے بھی ہیں۔"

کاسو کا جسم لرزنے لگا "میری غلطی کو معاف کر دیں رانا صاحب!"

اپنی غلطی کی معافی مانگنے کے سوا اس کے منہ سے کوئی بات نہیں نکلتی تھی۔ میرے سامنے بھی وہ دس بار ایسا کر چکا تھا۔ شاید وہ سمجھتا تھا کہ اسی کلمے کا ورد کرنے میں اس کی نجات ہے۔

"تم اپنے بیوی بچوں کو یہاں لانا چاہتے ہو نا......"

کاسو نے اقرار میں سر ہلایا "وہ یہاں آنا چاہتے ہیں مائی باپ!"

رانا نے کہا "پھر آئے کیوں نہیں، آخر تم بھی تو آ گئے واپس......؟"

"ان کو نواب صاحب نے قید کر رکھا ہے۔" کاسو بولا۔

میں نے کہا "کیوں کہلوا رہے ہیں وہی بات بار بار رانا صاحب! اس کی زبان اور کچھ کہنے کے قابل ہی نہیں رہی۔ میرا خیال ہے مجھے چلنا چاہیے۔"

ایک بار پھر ہم زینہ چڑھ کے اوپر والے دروازے سے گزرے تو میری ذہنی کیفیت بدل چکی تھی۔ میں اپنی ناکامی سے مایوس اور بددل تھا۔ مجھ پر اس احساس کا غلبہ تھا کہ جذبات کی رو میں بہہ کے میں نے خود کو مشکل میں ڈال دیا تھا اور کسی دست غیب کی امداد شامل نہ ہوتی تو زنداں کا دروازہ کبھی نہ کھلتا۔

دیوان خانے میں پہنچ کے میں نے راجا کو دیکھا تو مجھے اپنی رہائی کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ وہ اپنے سیٹلائٹ فون پر کسی کو صورت حالات کی رپورٹ دے رہا تھا "نہیں سر! میرا خیال ہے ابھی اس معاملے میں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ بھی میرے دوست اور کرم فرما ہیں، آپ کی طرح۔"

مجھے دیکھتے ہی اس نے فون بند کر دیا۔ میں نے کہا "تو کب آیا؟"

"مجھے ایک گھنٹا ہو گیا۔ تو اتنی دیر سے کیا بحث کر رہا تھا کاسو سے؟ وہ نہیں آیا تیرے ساتھ؟"

میں نے کہا "اپنا وقت ضائع کیا میں نے۔ اس کے دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ رانا صاحب کے کتے کے ساتھ دفن ہونا اس کے نصیب میں لکھا ہے۔"

رانا معنی خیز لہجے میں بولا "نصیب کے لکھے کو بھلا کون مٹا سکتا ہے مگر ایسا لگتا ہے کہ آپ اس کو نہیں مانتے۔"

چند منٹ بعد ہم باہر تھے۔ صبح کاذب کے اولین آثار افق پر عیاں ہو چکے تھے۔ نہ جانے کس مسجد سے لاؤڈ اسپیکر کے بغیر ہی موذن کی صدا سنائی دے رہی تھی۔ جیپ میں فرخ کے ساتھ ایک گارڈ آگے بیٹھا ہوا تھا دوسرا پیچھے موجود تھا۔ جیپ واپس روانہ ہوئی تو مجھ پر ناکامی کا احساس غالب تھا کیونکہ کاسو میرے ساتھ نہیں آیا تھا۔ میں خود کو اس خیال سے مطمئن نہیں کر سکتا تھا کہ جو کاسو کے ساتھ ہوا یا اب ہوگا وہ اس کا نوشتہ تقدیر تھا۔ جو سوال میرے دل میں نوک خار کی طرح خلش پیدا کر رہا تھا، یہ تھا کہ کیا اب واقعی کاسو کو ایک کتے کی بھس بھری کھال کے ساتھ زندہ گاڑ دیا جائے گا؟ اور کوئی کچھ نہیں کر پائے گا؟ نہ میں، نہ نظام انصاف، نہ معاشرہ نہ کوئی سپر پاور۔ نہ اقوام متحدہ؟ ہے کہاں روز مکافاتِ اے خدائے دارو گیر۔

میں نے وہ سب خاموشی سے سنا جو مجھ سے راجا نے کہا، فریال نے کہا اور ان سب نے کہا جن کی جذباتی وابستگی میرے ساتھ تھی، کاسو کے ساتھ نہیں لیکن اس سے میری خلش آزار کم نہ ہوئی۔ راجا کو میرے جانے کے بعد ہی احساس ہو گیا تھا کہ میری حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی کا نتیجہ اس کے برعکس نکل سکتا ہے اور اس جذباتی غلطی سے ناقابل تلافی نقصان بھی

ہو سکتا ہے۔ وہ کاسو کی بیوی کو حویلی میں چھوڑتے ہی فرخ کے ساتھ دو مسلح گارڈز لے کر روانہ ہو گیا تھا اور آدھے گھنٹے بعد رانا کی حویلی پہنچ گیا تھا۔

رانا نے مجھے تو کاسو کے ساتھ تہ خانے میں قید کر دیا تھا لیکن اسے میری جیپ غائب کرنے کا موقع نہیں ملا تھا ورنہ وہ انکار کر دیتا کہ نواب رفیق احمد شیرازی تو یہاں تشریف ہی نہیں لائے۔ راجا نے اپنے خدشات کے پیش نظر کچھ لوگوں سے قانونی اور غیر قانونی کارروائی کے امکانات پر بات بھی کر لی تھی لیکن اس کی ضرورت نہیں پڑی۔ رانا کو کچھ وقت مل جاتا تو شاید راجا کے سارے انتظامات بھی بے سود رہتے۔

میری تو ساری رات ہی جاگتے گزری تھی چنانچہ میں نے زیادہ بات نہیں کی اور سونے چلا گیا۔ دماغی اور جسمانی تکان سے میری حالت غیر ہو رہی تھی۔ شہناز کے مشورے پر میں نے ایک سکون آور گولی نگل لی۔ اس کے باوجود میں آنکھیں بند کرتے ہی سونے کی کوشش میں ناکام تھا۔ فریال بھی رات بھر جاگی تھی مگر اس نے کہا کہ ابھی اسے نیند نہیں آ رہی ہے۔ وہ میرے پاس بیٹھی رہی۔ میں چاہتا تھا کہ اس سے باتیں کروں لیکن اس نے مجھے روک دیا۔ وہ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے بیٹھی رہی اور میں اسے دیکھتا رہا۔

چار گھنٹے بعد میں جاگا تو فریال اسی طرح میرا ہاتھ تھامے بیٹھی تھی اور اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں تھی کہ کہیں اس سے میری نیند میں خلل نہ پڑے۔ شاید سکون آور گولی سے زیادہ اس کی قربت تھی جس نے مجھے راحت دی تھی۔ اسے ذرا بھی پروا نہ تھی کہ عشق میں دیوانگی کے مظاہرے پر وہ لوگ کیا سمجھتے ہیں اور کیا کہتے ہیں جو اس کے آس پاس موجود ہیں۔ وہ اپنی محبت پر اعتماد رکھتی تھی۔ غرور کرتی تھی۔ وہ "پیار کیا تو ڈرنا کیا" کی جیتی جاگتی تفسیر تھی۔

سب کے دیر سے جاگنے کا نتیجہ ناشتے میں تاخیر کی صورت میں برآمد ہوا۔ اس کے بعد ہی سب پر ایک عمومی بیزاری اور بے دلی کا غلبہ رہا۔ حویلی کے اندر مرمت اور صفائی پر مامور کارکن اپنے وقت پر آئے تھے لیکن اندر اندھیرا تھا چنانچہ وہ واپس لوٹ گئے۔ بجلی کی بحالی فوری مسئلہ تھی۔ فی الحال مین لائن سے کنکشن لینے کی کوئی صورت نہ تھی چنانچہ فرخ کو جیپ میں شہر روانہ کر دیا گیا۔ ایک خراب شدہ جنریٹر کے لیے صرف پلگ درکار تھا مگر وہ گرد و نواح کے کسی قصبے سے بھی نہیں مل سکتا تھا۔ اس کے ذمے یہ ڈیوٹی لگائی گئی کہ وہ کم سے کم پانچ کلوواٹ کا ایک جنریٹر اور خرید لائے ورنہ ممکن ہو تو دس کلوواٹ کا ڈیزل جنریٹر دیکھے۔ یہ عارضی ضرورت پوری کرنے کا انتظام تھا۔ اس سے حویلی کے اندر باہر صرف روشنی کی جا سکتی تھی۔ ڈیزل کی مسلسل سپلائی اپنی جگہ ایک مسئلہ تھی کیونکہ پانچ کلوواٹ کے جنریٹر کو چلانے کے لیے بھی کم سے کم دو لیٹر فی گھنٹا کے حساب سے روزانہ پچاس لیٹر ڈیزل درکار ہوتا۔ یہاں سے قریب ترین پیٹرول پمپ بھی ایک گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ مین لائن سے بجلی کی فراہمی کا سلسلہ جوڑ توڑ کے بغیر بحال نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ ذمے داری راجا نے قبول کی اور وہ فرخ کے ساتھ چلا گیا۔ اس کا خیال تھا کہ واپڈا کے حکام سے مل ملا کے اور کچھ دے دلا کے وہ عارضی کنکشن کی اجازت حاصل کر لے گا پھر حویلی تک باقاعدہ کنکشن کی کارروائی بھی شروع کی جا سکتی ہے۔

میری واپسی مزید ایک دن کے لیے موخر ہوئی تھی۔ میں نے اپنے گھر فون کیا تو مجھے اباجی کے رویے سے کچھ مایوسی اور کچھ ناراضی کا اندازہ ہوا۔ وہ ہر بات کے جواب میں کہتے رہے "بھئی، جیسی تمہاری مرضی۔" میں سمجھ گیا کہ یہ دو باتوں کا ردعمل ہے۔ دادی نے ان پر دباؤ ڈال کے انہیں قائل کر لیا ہوگا کہ میری شادی بلا تاخیر فریال سے کر دی جائے۔ دوسری وجہ شاید یہ تھی کہ ان کے بار بار اپنی خواہش ظاہر کرنے کے باوجود میں انہیں ست بدھائی کی حویلی میں لانے سے گریز کر رہا تھا۔ میں انہیں یہ کیسے بتاتا کہ میں ایسا کیوں کر رہا ہوں۔

دوپہر سے قبل شہناز مجھے اپنے ساتھ سرونٹ کوارٹر کی طرف لے گئی "مجھے کاسو کی بیوی کی حالت پر تشویش ہے۔"

"کیا اسے معلوم ہو گیا ہے۔"

"اس نے تمہارے آتے ہی پوچھا تھا کہ کاسو کیوں نہیں آیا؟"

"پھر...... تم نے کیا کہا؟"

"میں نے نہیں، فرخ نے بتا دیا کہ کاسو نے واپس آنے سے انکار کر دیا تھا۔" شہناز بولی۔

"فرخ بے وقوف ہے۔ کہہ دیتا وہ بعد میں آئے گا۔"

"اب وہ گم صم بیٹھی ہے۔ اس نے کھانا پینا چھوڑ رکھا ہے۔ بچے کی طرف بھی اس کا دھیان نہیں۔ خاموشی سے خلا میں گھور رہی ہے۔ اس کیفیت میں پتا نہیں کیا کر بیٹھے۔"

میں نے کہا "تم ڈاکٹر ہو، کچھ کرو۔"

"میں کیا کروں، نہ وہ گولی کھاتی ہے نہ انجکشن لگوانے پر راضی ہے۔ زبردستی کرنی پڑے گی۔"

کاسو کی بیوی نیم تاریک کمرے کے فرش پر ساکت بیٹھی تھی۔ اس کا بچہ قریب ہی فرش پر لیٹا انگوٹھا چوس رہا تھا۔ میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ میں نے کہا "دیکھو...... کاسو آ جائے گا چند دن بعد۔ اس نے وعدہ کیا ہے۔"

اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک پیدا ہوئی۔ میں ان نظروں کی تاب نہ لا سکا۔ ان میں غصے اور نفرت کی آگ دہک رہی تھی "جھوٹ مت بولو نواب صاحب! مجھے معلوم ہے وہ نہیں آ سکتا۔"

میں نے کہا "میں نے اسے بہت سمجھایا تھا۔"

"جو بیوی کو کچھ نہ سمجھے۔ بیٹے کو کچھ نہ سمجھے۔ وہ تمہاری بات کیا سمجھے گا۔ میں نے تو اس سے کہا تھا کہ چلو ہم حویلی سے بھی نکل جاتے ہیں۔ کہیں چلے جاتے ہیں مگر اس میں اتنی ہمت ہی نہ تھی۔ وہ بھاگ گیا اپنی قبر میں دفن ہونے کے لیے۔ کاسو کتے کے ساتھ۔"

میں نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی "دیکھو، یہ قربانی بھی تو اس نے تمہارے لیے ہی دی۔ اپنی جان دینا آسان نہیں ہوتا۔"

"نہیں جی! یہ تو بہت ہی آسان ہے۔ آدمی منہ چھپانے کے لیے دنیا ہی چھوڑ دے۔ یہ تو میں بھی کر سکتی ہوں۔ آج مر جاؤں اگر اس بچے کا خیال نہ ہو۔ اسے خیال ہوتا کہ بعد میں بیوی بچوں پر کیا گزرے گی تو ہمیں چھوڑ کے جاتا۔ وہ لڑتا ہمارے لیے، مقابلہ کرتا ہر مشکل کا پھر مارا جاتا تو میں سمجھتی اس نے ہمارے لیے جان کی بازی لگا دی۔"

اب وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ صدمے سے طاری ہونے والی سکتے کی کیفیت ختم ہو گئی تھی۔ مجھے دیکھ کے وہ بند ٹوٹ گیا تھا جو اس نے اشکوں کے سیلاب پر باندھ رکھا تھا۔ مجھے اس بے بس عورت کی حالت پر بہت ترس آیا جو ایک بچے کے لیے زندہ رہنے اور سخت حالات جھیلنے پر مجبور تھی مگر اکیلی رہ گئی تھی۔ بچہ پیدا کرنے والا اس کا شریک حیات جو مرد تھا اور عورت کا محافظ ہو سکتا تھا اس کا ساتھ چھوڑ گیا تھا۔

کاسو کے المیے نے ہم سب کو ایک عجیب سی فرسٹریشن میں مبتلا کر دیا تھا۔ زندگی ایسے ہی حادثات سے عبارت ہے اور دنیا میں کروڑوں انسان ہر روز کاسو کی طرح جیتے مرتے ہیں مگر وہ جن سے براہ راست تعلق بن جائے ان کے عذاب کا بوجھ اپنے احساس کے کندھوں پر زیادہ محسوس ہوتا ہے۔ مجھے بھی یوں لگتا تھا جیسے کاسو کو میرے جرم کی سزا ملی۔ صرف اس لیے کہ پھانسی کا پھندا اس کی کمزور گردن میں فٹ ہوتا تھا۔ رانا کے اس کتے کو میں نے شوٹ کیا تھا جس کی قدر و قیمت کاسو کی زندگی سے بڑھ کر تھی مگر رانا مجھے سزائے موت نہیں دے سکتا تھا۔

میں نے کاسو کی بیوی کو یقین دلایا کہ حویلی میں اسے مکمل تحفظ فراہم کیا جائے گا اور ہر سہولت حاصل رہے گی۔ اس کے بچے کی پرورش کی ساری ذمے داری اب میری ہے لیکن ان باتوں سے اس عورت کے آنسو کیسے تھم سکتے تھے جسے شوہر بیوگی کا تحفہ دے کر چھوڑ گیا ہو۔

میں اٹھنے ہی والا تھا کہ فاطمہ نے جھک کر میرے کان میں سرگوشی کی "نواب صاحب! آپ سے ملنے کوئی آیا ہے، باہر کھڑا ہے۔"

میں نے گارڈ سے پوچھا تو اس نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا "سر، وہ نام نہیں بتاتا، کہتا ہے صرف نواب صاحب سے بات کروں گا۔"

میرا خیال تھا میں نے اسے اندر بلا لوں۔ وہ عام دیہاتی تھا جس نے خود کو سوتی کھیس میں اس طرح لپیٹ رکھا تھا کہ آنکھوں کے سوا اس کا سارا چہرہ چھپ گیا تھا۔

فریال نے سخت ناراضی کا اظہار کیا "یوں ہر شخص اندر آ سکتا ہے تو پھر دروازہ بند رکھنے کی کیا ضرورت ہے، گارڈ کو بھی ہٹا لو۔"

"مجھے وہ کوئی غریب ضرورت مند لگتا ہے۔"

"اور اگر اس نے چادر کے اندر سے دستی بم نکال لیا پھر......؟"

میں نے سر کھجا کے کہا "یعنی وہ خود کش حملہ آور بھی ہو سکتا ہے۔ یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ خیر، میں محتاط رہوں گا۔"

فریال نے کہا "نہیں، گارڈ سے کہو پہلے اس کی تلاشی لے بلکہ میں خود کہہ دیتی ہوں کہ آئندہ کسی اجنبی کو تلاشی کے بغیر اندر نہ آنے دے۔"

"یار، اللہ پر بھروسا رکھو۔"

"کمال کرتے ہو تم بھی۔ معلوم نہیں کون تھا جس نے اندر آ کے جنریٹر خراب کر دیا۔ اللہ پر بھروسا رکھنے کا یہ مطلب کیسے ہوا کہ آنکھیں بند کر کے چلو، سڑک کے بیچ میں۔"

گارڈ تھوڑی دیر بعد متوحش چہرے کے ساتھ نمودار ہوا "سر وہ کہتا ہے نواب صاحب کو بولو، شامی ملنا چاہتا ہے۔"

میں نے کہا "کون شامی؟"

گارڈ نے ہونٹوں پر زبان پھیری "جناب عالی! اس علاقے کا خطرناک ڈاکو تھا۔"

"تھا کیا مطلب، اب تائب ہو گیا ہے.... میرا مطلب ہے یہ دھندا چھوڑ چکا ہے یا ہجرت کر گیا ہے، امریکا .... کینیڈا؟"

"اس کے بارے میں مشہور ہوا تھا کہ مارا گیا پھر پتا نہیں کہاں سے آ گیا۔ آپ مل لیں اس سے۔ میں نے تلاشی لی بات کی تو گالیاں دینے لگا مجھے۔ ویسے آپ کی مرضی۔" گارڈ سخت کنفیوژن کا شکار تھا۔

میں نے کہا "او کے، اسے اندر لے آؤ۔"

فریال نے کہا "آر یو میڈ ..... ؟"

میں نے کہا "ایک ڈاکو سے مجھے کیا خطرہ سویٹ ہارٹ، وہ دن کے اجالے میں مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ اکیلا آیا ہے، خطرناک تو رانا جیسے شریف اور خاندانی سمجھے جانے والے ہوتے ہیں۔"

جب شامی میرے سامنے آیا تو میں کسی بھی غیر متوقع صورت حال سے نمٹنے کے لیے تیار تھا۔ ریوالور میری دسترس میں صوفہ کشن کے نیچے موجود تھا مگر شامی کی نظر سے اوجھل تھا۔ اندر آ کے اس نے چادر اتاری تو میں اس کی صورت دیکھ کے حیران رہ گیا۔ اس میں خطرناک ڈاکوؤں والی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ اس کی فرنچ کٹ داڑھی تھی۔ بال سلیقے سے بنے ہوئے تھے مگر چادر کی وجہ سے بکھر گئے تھے۔ وہ چالیس بیالیس سال کا اور درمیانے قد و قامت کا شریف صورت شخص تھا جس کے خدوخال میں نہ سفاکی تھی اور نہ درشتی۔ الٹا اس کی آنکھوں سے متاثر کرنے والی انکساری جھلکتی تھی۔

میں نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا تو وہ بیٹھ گیا "میرا نام شامی ہے۔"

میں نے کہا "ہاں، ابھی گارڈ نے مجھے تمہارے بارے میں بتایا۔ تم مجھے لوٹنے کے لیے تو آئے نہیں ہو، کہو کیا کام ہے؟"

وہ سپاٹ لہجے میں بولا "مجھے کاسو کا پیغام ملا تھا، آج صبح۔"

میں بھونچکا رہ گیا "اس سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

"میں اس کا مقروض ہوں۔ قرض اتارنے آیا ہوں۔"

میری حیرانی بڑھ گئی "کھل کے بات کرو۔ پہیلیاں مت بجھاؤ۔"

اس نے کہا "تین سال پہلے کاسو نے میری جان بچائی تھی۔"

میں نے کہا "وہ تو خود اپنے لیے بھی کچھ نہیں کر سکتا۔"

اس نے چند لمحے توقف کیا "شاید یہ توفیق کی بات ہے، جو اللہ دیتا ہے۔ آپ نے بھی چوہے اور شیر والی کہانی ضرور سنی ہو گی۔ شیر جال میں پھنس گیا تھا اور چوہے نے جال کتر کے اس کی جان بچائی تھی۔"

میں نے کہا "تم مجھے تعلیم یافتہ لگتے ہو۔"

اس کے ماتھے پر ناگواری کی شکن آ گئی "میں جانتا ہوں، یہ آپ کا اگلا سوال کیا ہو گا۔ آپ پوچھیں گے کہ پھر میں ڈاکو کیسے بن گیا۔ میں صرف لگتا ہی نہیں، واقعی تعلیم یافتہ ہوں۔ میں نے کیمسٹری میں ایم ایس سی کی ڈگری لی تھی۔ محنت کر کے، پڑھ کے، نقل کر کے نہیں۔ پیسے خرچ کر کے بھی نہیں۔ اس جواب سے پیدا ہونے والے دوسرے سوال کا جواب یوں ہو گا کہ تعلیم میں نے والدین کی مرضی سے حاصل کی تھی، پیشہ میں اپنی مرضی سے ریسرچ سائنس داں کا اپنانا چاہتا تھا لیکن انگریزی میں کہتے ہیں ناں......

MAN PROPOSES GOD DISPOSED یہ ہے مختصر بات۔ اس وقت میں آپ کو اپنی داستان حیات سنانے نہیں آیا ہوں۔"

میں نے کہا "تم نے کہا تھا کہ تم کاسو کا قرض چکانے آئے ہو۔ اس نے تمہاری جان بچائی تھی۔ اب تم اس کی جان بچانا چاہتے ہو......رائٹ!"

اس کے جواب دینے سے پہلے فریال نے کہا "تم بڑے وقت پر آئے مگر کیا تم بتاؤ گے کہ اس نے تمہاری جان کیسے بچائی تھی؟"

اس نے فریال کو غور سے دیکھا "اس علاقے میں ایک واردات کے دوران میں مجھے گولی لگی تھی۔ میرے سارے ساتھی مارے گئے تھے۔ بھاگتے ہوئے میں چھپنے کے لیے جھاڑیوں میں گھسا۔

ان کے پیچھے ایک گڑھا تھا۔ میں اس میں گر گیا۔ تلاش کرنے والے میرے آس پاس پھرتے رہے مگر مجھے نہ دیکھ سکے۔ انہیں شک بھی ہو جاتا تو وہ اوپر سے ہی مجھ پر گولیاں برسا کے چلے جاتے۔ گولی میرے پیٹ کے ایسے حصے میں لگی تھی کہ اندر نقصان نہیں ہوا تھا۔ گولی پچھلی طرف سے باہر نکل گئی تھی لیکن اس سے خون بہت بہا تھا۔ میں نے اپنی قمیص اتار کے پھاڑی اور زخموں پر ایسے باندھ لی کہ خون نہیں رکا گیا۔ دو دن میں وہیں چھپا رہا کیونکہ پولیس کو اور علاقے کے لوگوں کو میری لاش کی تلاش تھی۔ میرے تمام ساتھیوں کی لاشیں انہوں نے جنگل سے اٹھالی تھیں۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ میرے ساتھ کتنے بندے تھے۔ وہ سمجھے کہ میرے باقی ساتھی مجھے نکال لے گئے۔ دو دن بعد کاسو ادھر سے گزرا تو اس نے میرے کراہنے کی آواز سنی۔ اس نے مجھے گڑھے سے نکالا۔ وہ مجھے پہچانتا نہیں تھا۔ اس نے مجھے پانی پلایا تو مجھے ہوش آیا۔ میں نے اس سے درخواست کی کہ مجھے اسی گڑھے میں پڑا رہنے دے اور میرے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتائے۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ جتنی رقم چاہے مانگ لے۔ دس ہزار، پچاس ہزار..... ایک لاکھ۔"

"یہ رقم تمہارے پاس تھی؟" فریال بولی۔

"نہیں، میں نے اس کو بتایا کہ لوٹا ہوا مال کہاں پڑا ہے۔ وہ ایک چمڑے کا بیگ تھا جو میرے کندھے پر تھا۔ میں نے اسے ایک دھنسی ہوئی قبر میں پھینک دیا تھا۔ اس بوجھ کو ساتھ رکھتا تو بھاگ نہیں سکتا تھا۔"

فریال انتہائے تجسس میں چپ نہیں بیٹھ سکتی تھی "شامی صاحب! ایک سوال پوچھوں، یہ واردات آپ نے کہاں کی تھی؟"

"رانا کے علاقے میں...... بلکہ اس کی حویلی میں۔"

فریال نے مطمئن انداز میں سرہلایا "بیان جاری رکھیے۔"

وہ بولا "کاسو، میری ہدایات کے مطابق گیا اور بیگ اٹھا لایا۔ اس میں نقد رقم تو زیادہ نہیں تھی۔ لاکھوں کے زیورات تھے۔ میں نے کاسو سے کہا کہ جو چاہو لے لو۔ نقد رقم ایک لاکھ سے اوپر ہی ہوگی مگر اس نے انکار کردیا۔"

"ویری گڈ۔ اس نے کہا ہوگا کہ جناب، یہ تو میرا اخلاقی فرض تھا۔" فریال پرمزاح لہجے میں بولی۔

"نہیں، اس نے کہا کہ میں اس کا کیا کروں گا۔ یہ سب بے کار ہے میرے لیے۔"

فریال کا منہ حیرت سے کھل گیا پھر وہ افسوس سے سرہلانے لگی "کیسی عجیب بات ہے، کچھ لوگ بدبختی میں بھی مطمئن رہتے ہیں۔"

"میں نے کاسو سے کہا کہ پھر تم میری مدد کیوں کررہے ہو تم معلوم ہے، اس نے کیا جواب دیا۔ اس نے کہا کہ تم نے ایک اچھا کام کیا ہے۔ رانا کو لوٹنا اس کے نزدیک بڑی نیکی تھی۔ دراصل وہ رانا سے اپنی نفرت کا اظہار بھی کررہا تھا اور اس کے ساتھ ہی اپنی بے بسی کا اعتراف بھی۔ جیسے آدمی سمجھتا ہے کہ اس کا سب سے بڑا دشمن شیطان ہے۔ مگر وہ اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ میں نے رانا کو نقصان پہنچایا تھا۔ وہ اس پر خوش تھا۔ اگر میں رانا کو قتل کردیتا تو وہ میرا احسان مند ہوتا۔ اس نے میری مدد کی۔ میں اس گڑھے میں تین دن چھپا رہا۔ اس نے مجھے کھانا پینا فراہم کیا۔ ضرورت کی ہر چیز جو وہ لاسکتا تھا، چھپ چھپ کے لاتا رہا پھر میں اس قابل ہوگیا کہ خود کہیں جاسکوں۔ معلوم نہیں کہاں سے وہ ایک گھوڑا لے آیا۔ چلتے وقت میں نے پھر اس سے کہا کہ یہ سارا بیگ رکھ لو مگر وہ ڈرتا تھا۔ کہنے لگا کہ یہ سب میرے لیے بے کار ہے۔ میں نے کہا کہ اچھا تم میرے ساتھ چلو، یہ بھی اس نے نہیں مانا۔ کہنے لگا کہ بس اتنی مہربانی کرنا کہ کسی کو میرے بارے میں کچھ مت بتانا کہ میں نے تمہاری مدد کی تھی۔ میں نے کہا کہ اچھا زندگی میں کبھی میری مدد کی ضرورت ہو تو مجھے بتادینا۔"

"کیا کبھی اس نے تم سے رابطہ کیا؟" فریال بولی۔

"نہیں۔ دراصل اس کے بعد میں نے یہ علاقہ ہی چھوڑ دیا تھا۔ میرا گروہ ختم ہوگیا تھا۔ میں اکیلا کیا کرتا، میں سندھ کی طرف چلا گیا تھا۔ وہاں میں چانڈیو گروپ میں شامل رہا پھر اپنا گروہ بنالیا لیکن ابھی دو ہفتے پہلے وہاں ایک بڑی کارروائی ہوئی۔ پولیس اور رینجرز نے کچے کے علاقے کا محاصرہ کیا۔ دراصل اسی علاقے کے دوسرے گروہ نے ایک وڈیرے کے بیٹے کو اغوا کرلیا تھا اور تاوان کے معاملے میں پولیس نے معاملہ خراب کردیا تھا۔ میں فرار نہ ہوتا تو پکڑا جاتا۔ میں دو ہفتے پہلے ہی یہاں آگیا تھا۔ یہاں لوگ مجھے بھول چکے تھے۔ میں نے کچھ پرانے یاروں سے رابطہ کیا۔ پھر مجھے کاسو کا خیال آیا۔ سوچا اس کی خبر ہی لے لوں۔ معلوم کیا تو کسی نے بتایا کہ وہ یہاں ہے۔"

میں نے کہا "کل تک وہ یہاں تھا۔ اس کی بیوی بچے تو یہیں ہیں مگر وہ چلا گیا ہے۔"

"مرنے کے لیے۔ بیوی بچوں کو چھوڑ کر۔" فریال تلخی سے بولی۔

شامی نے کہا "کیا وہ مصیبت میں ہے۔"

میں نے کہا "اس کی زندگی خطرے میں ہے۔"

میں نے اسے مختصراً تمام حالات بتائے۔ فریال نے اتنی دیر میں چائے کا بندوبست کرلیا۔ شامی کچھ پرسکون ہوگیا اس نے ساری بات اطمینان سے سنی۔

"اگر تم کچھ کرسکتے ہو تو دیر مت کرو۔" میں نے کہا۔

اس نے اقرار میں سرہلا دیا مگر وہ سوچ میں ڈوبا ہوا تھا پھر اس نے کہا "نواب صاحب! کیا میں فون استعمال کرسکتا ہوں؟"

میں نے کہا "ہم یہاں سیٹلائٹ فون استعمال کرتے ہیں۔ آپ کس سے بات کریں گے؟"

"بس جی، ابھی کچھ پرانے بندے ہیں جن پر بھروسا کیا جاسکتا ہے۔ شامی نے جتنے دشمن بنائے ہیں، اس سے زیادہ دوست بنائے ہیں۔ ایک بات اور بھی کہہ سکتا ہوں میں۔ بات تعداد کی بھی نہیں ہوتی، ایک مخلص اور سیانا دوست ساتھ دینے والا ہو تو سو دشمن کچھ نہیں کرسکتے۔"

میں نے کہا "اور اس کے برعکس ہو پھر...... سو بے وقوف دوست ہوں اور ایک سیانا دشمن؟"

"پھر بندہ کچھ نہیں کرسکتا۔"

میں نے اسے فون لاکر دیا تو اس نے پہلا فون کسی پولیس

تھانے دار کو کیا۔ رسمی سلام دعا کے بعد اس نے کہا "سر جی! ایک چھوٹا سا کام تھا آپ سے۔ اس وقت آپ کے علاقے میں ہیں تو اور کس سے کہہ سکتے ہیں۔ حکم نہیں جناب عالی، گزارش ہے۔ وہ ادھر ایک بڑا اپانے خاں ہے۔ سرکاری سیاسی بھی ہے۔ رانا رجب علی جتال...... اوئیں جی! ہمارا تو ایسے ہی نام بدنام ہوا۔" وہ ہنسنے لگا اور پھر بولا "اس کے ڈیرے پر ایک کمی ہے، کاسو نام ہے اس کا۔ اسے ایک پیغام پہنچانا ہے۔ ہاں، جی کام مشکل ہے اس لیے تو آپ کو بولا ہے۔ اس سے کہنا ہے کہ فکر نہ کرے۔ بس اتنا کافی ہے۔ ہاں جی، پکی بات ہے ناں جی! بس ٹھیک ہے۔"

وہ میری اور فریال کی طرف دیکھ کے مسکرایا اور دوسرا فون ملانے لگا "یار، ایک کارروائی کرنی ہے۔ ہاں، میرا ہی علاقہ ہے۔ آج، بس مسئلہ ہی کچھ ایسا ہے۔ ٹائم نہیں ہے، میں راکٹ شاہ سے بھی بات کرلیتا ہوں۔ تو خود بھی بات کرسکتا ہے۔ ہاں، میں بھی آؤں گا لیکن تجھے پہلے سے بتارہا ہوں۔"

اس نے بات ختم کی اور فون مجھے تھمادیا "اب میں چلتا ہوں نواب صاحب!"

میں نے کہا "تم آئے کس طرح تھے۔ میرا مطلب ہے...... میں تم کو اپنی گاڑی میں چھوڑ سکتا ہوں۔"

اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا "نہیں سر! آپ کو یہ خطرہ مول لینے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ نے اتنی عزت دی، یہی کافی ہے۔ میرے ساتھی باہر موجود ہیں۔ میں انہی کے ساتھ آیا تھا۔"

جب وہ چلا گیا تو ہم بہت دیر تک اس کے بارے میں بات کرتے رہے۔ وہ واقعی عجیب آدمی تھا۔ فریال اس سے متاثر بھی ہوئی تھی اور اس پر افسوس بھی کررہی تھی۔ آدمی کیا بننا چاہتا ہے، حالات کیا بنادیتے ہیں؟

میں نے کہا "اور یہ حالات ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ سب کسی انتقامی ردِعمل میں مجرم بنتے ہیں۔ کسی ظلم کے خلاف بغاوت کرتے ہیں، کسی ناانصافی کا بدلہ لیتے ہیں۔"

"ذرا سوچو اگر یہ شخص ڈاکو نہ بنتا تو کیا ہوتا؟"

"کیا فائدہ؟ ایسے ہزاروں ہرجگہ موجود ہیں۔ زندگی مواقع فراہم کرتی تو وہ ادیب فنکار موسیقار یا سائنس داں ہوتے۔ حادثات انسانوں کی زندگی کا رخ بدل دیتے ہیں۔"

شام سے پہلے ہی راجا اور فرخ لوٹ آئے۔ ان کے ساتھ دس کلوواٹ کا ڈیزل جنریٹر بھی تھا جسے وہ ایک ٹرک پر لوڈ کراکے لائے تھے۔ کمپنی نے اسے لگانے کے لیے اپنا ایک انجینئر بھی بھیجا تھا۔ راجا نے اس اس کے لیے ڈیزل کی فراہمی کا انتظام بھی کرلیا تھا۔ دینہ کے کسی ڈرائیور نے ہر روز سو لیٹر ڈیزل اپنی سوزوکی پک اپ پر سپلائی کرنے کا ٹھیکا لے لیا تھا۔ تاہم یہ انتظام صرف حویلی کی ضروریات پوری کرتا تھا۔ یہاں گیس نہیں تھی۔ چنانچہ سارے کام بجلی سے ہوتے تھے۔ اس میں کھانا پکانا بھی شامل تھا۔ ترقیاتی کام کرنے کے لیے جتنی مقدار میں بجلی درکار تھی اس کے لیے پورا پاور ہاؤس درکار تھا لیکن پاور ہاؤس لگانا اور چلانا آسان کام نہ تھا۔ راجا نے واپڈا کے کچھ اہلکاروں سے بات کی تھی لیکن ان کا کہنا تھا کہ پہلے نواب رفیق احمد شیرازی کو اپنے خلاف قانونی معاملہ طے کرنا چاہیے۔ وہ کیس اعلیٰ حکام ختم کرسکتے ہیں۔ اس کے بعد پاور سپلائی کا مرحلہ آسانی سے طے ہوجائے گا۔ راجا کا خیال تھا کہ رانا نے ان لوگوں کو پہلے ہی خرید رکھا تھا ورنہ وہ اس لہجے میں بات نہ کرتے۔ رانا پوری کوشش کرے گا کہ ہمیں کنکشن نہ ملے۔ وہ اپنے رکن اسمبلی ہونے کا فائدہ اٹھائے گا۔ اس کے اشارے پر کوئی رکن وقفہ سوالات میں پوچھ سکتا ہے کہ ست بدھائی میں غیرقانونی کنکشن دینے والوں اور لینے والوں کے خلاف کیا کارروائی ہوئی۔ وہ کسی ممبر واپڈا یا خود پانی اور بجلی کے وزیر سے بات کرسکتا ہے۔

ابھی ہم اس صورتِ حال پر بات کرہی رہے تھے کہ مجھے گارڈ نے کسی ملاقاتی کے آنے کی خبر بڑے پراسرار انداز میں دی "نواب صاحب! وہ ایک جعلا فقیر ہے۔"

میں نے خفگی سے کہا "یار، وہ کیا چاہتا ہے۔ کچھ دے دلا کے رخصت کرو۔ ہر ملاقاتی کا مجھے بتانے کیوں آجاتے ہو؟"

اس نے کہا "یہ بات نہیں جناب! دراصل وہ پولیس کا مخبر ہے۔"

"اچھا، ہے تو پھر...... میں کیوں ملوں اس سے؟"

"سر، وہ آپ کو کچھ بتانا چاہتا ہے۔" گارڈ بضد رہا۔

میں نے کہا "او کے، آنے دو اسے بھی۔"

فریال نے مجھے ٹوک دیا "کوئی ضرورت نہیں اسے اندر لانے کی۔ باہر جا کے پوچھ لو، وہ کیا کہنا چاہتا ہے؟"

اس کی بات معقول تھی۔ میں گیٹ تک گیا، اس وقت تک باہر اندھیرا پھیل گیا تھا۔ مجھے اپنے سامنے ایک لمبا تڑنگا شخص نظر آیا جس نے چیتھڑوں کا لباس پہن رکھا تھا۔ اس کا سر منڈا ہوا تھا اور داڑھی اتنی گھنی تھی کہ پورے سینے پر پھیلی ہوئی تھی۔

مجھے دیکھ کر وہ بڑی تیزی سے حرکت میں آیا۔ اس نے کوئی چیز میری طرف پھینکی، میں ایک دم جھکا۔

خود کو بچانے کے لیے میں ایک دم جھکا اور سنبھلنے کی کوشش میں گرتے گرتے بچا۔ اس مجذوب [illegible] کے

ہاتھ میں کچھ بھی نہیں تھا۔

اس نے ایک قہقہہ لگایا...... ''ہاہاہا...... ڈر گیا...... ڈر گیا...... سورما ہوا سے ڈر گیا...... نواب ایک فقیر سے ڈر گیا......''

میں نے برہمی سے کہا۔ ''بند کرو اپنا یہ ڈراما...... اور دفع ہو جاؤ......''

اس نے کڑک کے جواب دیا۔ ''اونچا مت بول...... مت بول فقیر سے......''

میں نے کہا۔ ''سنتری...... دیکھو...... اسے کچھ دے دلا کر رخصت کرو۔''

اس نے ہاتھ اٹھایا...... ''رک جا...... کیا تو بھول گیا......؟ بول......''

میں رک گیا اور سوالیہ نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''تو بھول گیا...... ایک فقیر پہلے بھی آیا تھا اس دروازے پر......''

میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔

''یاد کر...... جب وہ گیا تھا تو کتنے گئے تھے......؟'' وہ جلالی لہجے میں بولا۔

یہ میرے خاندان کی گزشتہ صدی کا ایک تاریخی حوالہ تھا۔ میرے پردادا کے دادا قدیر احمد کی حویلی کے پائیں باغ میں ان کی اجازت کے بغیر ایک فقیر نے ڈیرا ڈال لیا تھا۔ انہوں نے اپنے سات جوان بیٹوں کو حکم دیا تھا کہ اسے اٹھا کر باہر پھینک دیا جائے مگر اس سے پہلے کہ وہ کڑیل بدن والے جوان اس فقیر کے خستہ تن کو ہاتھ لگاتے۔ اس نے کہا۔ ''ہم تو ایسے ہی چلے جائیں گے مگر تیرے بھی سب جائیں گے۔'' پھر وہ زمین پر لیٹا اور مر گیا......

زندگی اور موت پر خدا کا اختیار برحق...... لیکن ایک عجیب اتفاق یہ ہوا کہ اس فقیر کی بددعا کے نتیجے میں قدیر احمد کے چھ جوان بیٹے یکے بعد دیگرے مختلف حادثات کا شکار ہو کے مر گئے۔ جب ایک عقیل احمد باقی بچا تو باپ نے عالم دیوانگی میں اسے موت سے محفوظ رکھنے کے لیے لندن بھیج دیا۔ موت سے کس کو رستگاری ہے...... عقیل احمد کا جہاز سمندر میں گرا اور اطلاع یہی ملی کہ مسافر کوئی نہیں بچا......

قدیر احمد نے وحشت اور جنون میں پہلے تین بیویوں کو گولی مار کے کنوئیں میں ڈالا اور پھر خود کو گولی مار کے اسی کنوئیں میں ڈوب گئے تھے۔ وہ خونی کنواں آج بھی حویلی کے [illegible] موجود تھا۔ وہیں اس فقیر کا مزار تھا اور سرہانے کی طرف قدیر احمد کے چھ بیٹوں کی قبریں تھیں۔

سمندر میں گرنے والے جہاز کے واحد بچ جانے والے مسافر میرے دادا عقیل احمد تھے۔ اس معجزے سے قدرت نے یہ ثبوت فراہم کر دیا تھا کہ قادر مطلق صرف خدا کی ذات ہے۔ عقیل احمد پینتیس سال لندن میں خود سے بے خبر ذہنی اور جسمانی طور پر مفلوج پڑے رہے پھر دوسرا معجزہ رونما ہوا۔ وہ ہوش میں آگئے اور مرنے سے پہلے انہوں نے میرا اپنا چلا کے ست بدھائی کی ساری جائیداد اور جاگیر میرے حوالے کر دی...... اب وہ لندن کی خاک میں آسودہ تھے۔

اس فقیر کی بات نے میرے غرور پر ضرب کاری لگائی تھی۔ فقیر کی بددعا سے منسوب روایت پرانے لوگوں سے نسل در نسل منتقل ہو کے اس فقیر تک پہنچی ہوگی...... اسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ میں اسی قدیر احمد کا پڑپوتا ہوں...... اس نے مجھے یاد دلایا کہ لہجے کی رعونت اور انداز تکبر نے اس حویلی اور جاگیر کے ایک پرانے مالک کو کیسے عبرت آموز انجام سے دوچار کیا تھا۔

میں کمزور عقیدے کا یا توہم پرست آدمی نہیں ہوں......

میرا ایمان ہے کہ خدا ہم گنہگاروں کی دعا سے کسی کو زندگی کی ایک اضافی سانس کی مہلت عطا کرتا ہے اور نہ ہم جیسے خطاروں کی بددعا سے کسی کو قبل از وقت مارتا ہے...... اب زندگی کے اتفاقات سے کوئی نتیجہ اخذ کرتا ہے تو...... یہ اس کی مرضی۔ میرے نزدیک میری خاندانی تاریخ کا ایک المیہ بھی کاتب تقدیر کا فیصلہ رہا ہوگا۔

اس کے باوجود میری طرف انگلی اٹھا کے اس خراب حال فقیر نے بہ آواز بلند مجھے ٹوکا تو میں ڈر گیا لیکن صرف ایک لمحے کے لیے۔

پھر میں نے دھاڑ کے کہا...... ''پاگل کے بچے...... بند کرو اپنی بکواس اور چلے جاؤ یہاں سے ورنہ......؟''

فقیر زور زور سے ہنسنے لگا۔ ''ورنہ کیا؟...... کیا ہوگا نواب؟ تو مجھے توپ دم کرا دے گا؟......''

میرے گارڈ نے آہستہ سے کہا۔ ''جناب عالی...... میری بات سنیں...... ایک منٹ کے لیے۔'' وہ مجھے کچھ دور لے گیا۔

میں نے کہا۔ ''تم اسے جانتے ہو؟''

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''یہ بڑا اللہ لوک ہے جی......''

میں نے کہا۔ ''یہ اور کچھ نہیں...... پاگل ہے...... جو کھلا پھر رہا ہے۔''

گارڈ خوف زدہ ہو گیا...... ''سر، ایسا مت کہیں...... گناہ ہوتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''شٹ اَپ...... گناہ کرتے ہیں تم جیسے کم عقل اور جاہل...... جو یہ سمجھتے ہیں کہ نعوذ باللہ...... ست بدھائی میں بھٹکنے والے یہ مخبوط الحواس شخص خدا کا مشیر خصوصی ہے...... خدا اس سے پوچھ کے فیصلے کرتا ہے کہ بندوں کے ساتھ دنیا میں کیا کرنا ہے...... کسے عزت دینی ہے کسے ذلت...... یہ چاہے تو زندگی ملتی ہے یہ کہے تو موت آتی ہے......''

گارڈ میرے غصے سے ڈر گیا...... ''غلطی ہو گئی جناب۔''

میں نے کہا۔ تم اسے اللہ لوک بھی سمجھتے ہو اور پولیس کا مخبر بھی بتاتے ہو۔ ایسے دھوکے بازوں کے لیے میرا وقت کیوں ضائع کرتے ہو۔''

فقیر نے شاید یہ بات سن لی۔ اس کا لہجہ بدل گیا۔ ''اللہ تیری حکمرانی قائم رکھے...... سخی داتا...... کیا فقیر تیرے در سے صرف گالیاں کھا کے جائے گا؟''

میں نے کہا۔ ''گارڈ...... غالباً یہ بھوکا ہے...... اسے کھانا کھلوا دو......'' پھر میں نے اسے سو کا ایک نوٹ بھی پکڑا دیا۔ ''یہ دے دینا اسے۔''

''گارڈ نے کہا۔ ''جی جناب عالی......''

''اور دیکھو...... تم اس بات کا خیال رکھو کہ میں ہرایرے غیرے سے نہیں مل سکتا۔''

اس نے سپاٹ لہجے میں پھر کہا۔ ''جی جناب عالی......''

صاف نظر آتا تھا کہ فقیر کے ساتھ میرے رویے کو اس نے پسند نہیں کیا تھا۔ وہ ان پڑھ دیہاتی آدمی تھا۔ اس کی پرورش اس معاشرے میں ہوئی تھی جو بیک وقت غربت اور جہالت کے چنگل میں گرفتار تھا۔ کراچی، لاہور یا اسلام آباد میں بڑی دھوم دھام سے وارد ہونے والی اکیسویں صدی یہاں سے سیکڑوں سال دور تھی۔

میں نے دوستانہ انداز میں گارڈ کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''تم عجیب سکیورٹی گارڈ ہو...... کبھی کسی ڈاکو سے ڈر جاتے ہو کبھی فقیر سے...... بندے کو صرف خدا سے ڈرنا چاہیے......؟''

کئی مرتبہ اس کے منہ سے ''جی جناب عالی'' سننے کے بعد میں اندر آیا تو فریال ایک ہاتھ کمر پر رکھے دروازے میں کھڑی تھی۔ ''یہ کس پر عتاب شاہی نازل ہو رہا تھا...... کیا ڈراما چل رہا تھا؟''

میں نے اسے بتایا۔ ''ایک سے بڑھ کر ایک کریکٹر ہے یہاں۔''

وہ ہنسنے لگی۔ ''جیسی روح ویسے فرشتے...... سب تمہاری رعایا ہیں اور تم ان کے حاکم ہو...... مگر قبلہ نواب صاحب...... کنیز کچھ عرض کرنا چاہتی ہے۔''

میں نے مغل اعظم کی آواز لہجہ بنا کے کہا۔ ''ہم نے تمہیں جان کی امان دی کنیز...... کہو کیا کہنا چاہتی ہو۔''

''ظل الٰہی...... آپ کو بدخواہوں اور حاسدوں سے ہوشیار رہنا چاہیے۔ ہماری جان آپ پر قربان...... اگر اس ناہنجار کی مٹھی خالی نہ ہوتی......''

''کنیز...... ہم کچھ سمجھے نہیں۔''

وہ چلا کے بولی۔ ''یار کیا ہو گیا تمہاری عقل کو...... شکر کرو اس نے کچھ پھینکا نہیں...... کیا وہ پھینک نہیں سکتا تھا...... دستی بم...... تیزاب...... یا پسی ہوئی سرخ مرچ...... تم تو بالکل اناڑی ہو۔''

میں نے ہاتھ پیچھے باندھ کر ٹہلتے ہوئے کہا۔ ''ہوں...... تمہاری دانائی اور دوراندیشی کو ما بدولت نے پسند فرمایا انارکلی خطاب تو ہم سلیم کی گرل فرینڈ کو عطا فرما چکے...... انار سے تربوز بڑا ہوتا ہے ہم تمہیں تربوز کلی کا لقب دیتے ہیں۔''

میرے کچھ کہنے سے پہلے گارڈ پھر نمودار ہوا...... ''نواب صاحب جب وہ چلا گیا تو میں نے دیکھا...... یہ پڑا تھا وہاں......''

اس نے میری طرف کاغذ کا ایک پرزہ بڑھایا۔ اس پر پنسل سے ٹیڑھے میڑھے حروف میں ایک جملہ لکھا ہوا تھا...... ''کاسو کو آج وہیں دفن کر دیا جائے گا...... مغرب کے بعد......''

فریال نے میری صورت کے تاثرات دیکھتے ہوئے وہ کاغذ مجھ سے لے لیا جو شاید کوڑے کچرے میں سے اٹھا لیا گیا تھا۔ ''تم کیوں کھڑے ہو...... جاؤ۔'' فریال نے گارڈ سے کہا۔ وہ فوراً پلٹ گیا۔

''وہ واقعی پولیس کا مخبر تھا شامی نے پولیس سے رابطہ کیا تھا کہ کاسو کی خیر خبر چاہیے۔ انہوں نے اس فقیر کے ذریعے اطلاع دے دی۔'' میں نے سوچتے ہوئے کہا ''کہ یہ پوزیشن ہے۔''

''تم سمجھتے ہو یہ اطلاع مستند ہے؟''

''اسے غیر مستند قرار دے کر میں کچھ نہ کروں۔ یہ بھی نہیں ہو سکتا۔''

''یار تم کیوں کرو...... پولیس جانتی ہے تو اسے کچھ کرنا چاہیے۔''

میں نے کہا۔ ''یہی تو المیہ ہے اس ملک کا سوئٹ

ہارٹ...... جو ہونا چاہیے نہیں ہو رہا ہے...... اور جو نہیں ہونا چاہیے وہ ہو رہا ہے...... انجام سب کو نظر آ رہا ہے۔ انجام پر بحث بھی سب کر رہے ہیں مگر انجام سے بچنے کے لیے کوئی بھی کچھ نہیں کر رہا ہے۔ خیر یہ تو ہوگئی ذرا فلسفیانہ بات...... سوال یہ ہے کہ اب قذاق شامی سے کیسے رجوع کیا جائے؟"

"اسی نامہ بر کے ذریعے اور کیسے...... جو یہ پیغام لایا تھا وہی تمہارا پیغام بھی پہنچا سکتا ہے...... سمپل۔"

"اور نامہ بر کو کہاں تلاش کیا جائے۔ میں نے تو بھگا دیا اسے۔"

"گارڈ اس سے عقیدت رکھتا ہے۔" فریال نے مسئلے کا حل بھی پیش کیا۔ "اسے حکم دو کہ مسٹر اللہ لوک کو حاضر کرے۔"

یہ طریقہ مؤثر ثابت ہوا۔ میں نے اسی کاغذ پر فریال سے لکھوایا۔ "شامی شام سے پہلے ملے۔" اور یہ جوابی تار اپنے گارڈ کے حوالے کر دیا کہ اللہ لوک مذکور کو تلاش کر کے پیغام اسے پہنچا دے۔

فریال نے پوچھا۔ "تمہیں اس کا پتا ٹھکانا معلوم ہے؟"

گارڈ نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "وہ گواچی گاں ہے جناب۔"

فریال دم بخود رہ گئی۔ "واٹ؟ یہ کیا چیز ہوتی ہے۔ کس زبان کا لفظ ہے؟"

"افسوس کہ ولایت میں رہ کر تم نے اپنی مادری زبان کو بھلا دیا۔ گمشدہ گائے...... بھٹکتی روح...... طیور آوارہ...... جس کا ٹھکانا نہ ہو۔" میں نے کہا۔

اس نے سر ہلایا۔ "گواچی گاں بھی ایک محدود دائرے میں رہتی ہے ایسا نہیں ہوسکتا کہ چک جھمرہ میں گم ہونے والی گائے گھومتی پھرتی پنڈ دادن خان چلی جائے۔ گارڈ کسی جاسوس کی طرح سراغ لگائے تو صرف ایک گھنٹے میں مسٹر اللہ لوک کو تلاش کر سکتا ہے۔ وہ مل جائے گا کہیں نہ کہیں۔"

گارڈ نے اقرار کیا کہ ایسا ہوسکتا ہے لیکن اس کی ڈیوٹی کا کیا بنے گا۔ "ایسے تو کوئی بھی اندر آ جائے گا۔"

میں نے کہا۔ "جب تم ڈیوٹی پر تھے تب بھی یہی صورت حال تھی۔ تم جاؤ۔"

گارڈ چلا گیا تو میری بے چینی بڑھ گئی۔ وقت بہت کم تھا۔ مغرب کے بعد سے کچھ واضح نہیں ہوتا تھا۔ وہیں کا مطلب بھی میرے سوا کوئی نہیں جان سکتا تھا۔ فریال نے مختلف نا قابلِ عمل تجاویز پیش کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ مثلاً کہ راجا واپسی میں اپنے ہمراہ پولیس فورس لے آئے...... یا رانا کی حویلی پر کمانڈو ایکشن کرتے ہوئے کاسو کو بازیاب کرا لیا جائے یا اس حویلی کا ہر طرف سے محاصرہ کر لیا جائے۔

میں نے جھلا کے کہا۔ "کیوں نہ ہم ٹینک میں بیٹھ کے جائیں اور ان کی حویلی کو مسمار کرتے ہوئے سیدھے اندر پہنچ جائیں...... یا گن شپ ہیلی کاپٹر میں پرواز کر کے پیراشوٹ سے حویلی کے صحن میں اتر جائیں۔ کبھی غلطی سے ہی عقل کی کوئی بات کر لو۔"

"تم کو بڑا ناز ہے اپنی عقل پر۔" اس نے غصے میں مجھے تکیے سے مارنا شروع کیا۔ "سوچے سمجھے بغیر کام خود کرتے ہو۔ گئے تھے پہلے بھی کاسو کو پکڑنے اور قید ہو گئے تھے چوہے کی طرح......"

میں نے ہنستے ہنستے خود کو بچایا۔ "میں چوہا تو تم کیا ہو...... ٹام...... زندگی ہے یا ٹام اینڈ جیری شو......"

وہ مجھے تکیے سے مارتی رہی۔ "اب ان ڈاکوؤں کے ساتھ جاؤ گے۔ ایسی کی تیسی تمہاری۔"

میں نے اسے ایک دم دبوچ لیا اور اپنی بانہوں میں جکڑ کے بے بس کر دیا۔ وہ شاید یہی چاہتی تھی۔ وہ میری آغوش میں سمٹ کر ہنسنے لگی مگر اس سے پہلے کہ میرے لب اسے چومتے باہر سے فاطمہ کمرے میں آ گئی...... کسی حساب کتاب میں مصروف شہناز اپنے کمرے سے نکلی تو بدحواسی میں اندر آتی ریشم سے ٹکرا گئی۔

شہناز نے اسے پکڑ لیا۔ "کیا ہوا ریشم...... کوئی بھوت دیکھ لیا ہے کیا؟"

ریشم کی انگلی باہر کی طرف اٹھی...... "وہ جی ڈاکٹر صاحب...... شی ڈیڈ...... کاسوز وائف......"

"کاسو کی بیوی...... مر گئی......" فریال چلائی۔

"کیسے مر گئی؟" شہناز نے ریشم کو جھنجھوڑا۔

وہ نفی میں سر ہلانے لگی۔ "وہ...... اس نے پھانسی...... خود کو پھانسی لگالی تھی...... ماں نے دیکھ لیا...... وہ بچ گئی۔"

"حد کرتی ہو ریشم...... اپنی غلط انگریزی سے تم نے تو اسے مار دیا تھا۔" شہناز نے ناراضی سے کہا۔

پھر ہم سب سرونٹ کوارٹر کی طرف بھاگے۔ ریشم کی رپورٹ غلط نہ تھی۔ مایوسی دکھ اور پریشانی کی انتہا کو پہنچ کے کاسو کی بیوی نے بھی وہی قدم اٹھایا تھا۔ جس پر وہ کاسو کو برا بھلا کہہ چکی تھی کہ حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے مارا جاتا تو پتا چلتا کہ اسے بیوی بچوں سے کتنی محبت تھی۔ وہ بزدلوں کی طرح مرنے چلا گیا...... اب خود اس کی بیوی نے بچے کو دنیا کے رحم و کرم پر چھوڑ کر اپنی زندگی ختم کرنے کی کوشش کی تھی......

یہ اتفاق تھا کہ کسی بچے نے اسے درخت پر چڑھتے دیکھ لیا۔ اوپر جا کے وہ رسی کا پھندا گلے میں ڈالتی اور کود پڑتی مگر اس سے پہلے ہی اکبر خان کا بیٹا کبیر خان دوڑ پڑا...... وہ نہ ہوتا تو عورتیں شور مچانے کے سوا کچھ نہ کر پاتیں...... کاسو کی بیوی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ راز افشا ہو گیا ہے۔ اس نے جلدی سے رسی کا پھندا ٹھیک سے نہیں باندھا اور چھلانگ لگا دی...... رسی کچھ لمبی رہ گئی اور وہ زمین پر گری۔ کبیر خان اسے کیچ نہ کر سکا...... اگر رسی چھوٹی ہوتی تو اپنے ہی وزن کے جھٹکے سے کاسو کی بیوی کی گردن ٹوٹ جاتی۔

نیچے گرنے سے اسے چوٹ ضرور آئی مگر وہ بچ گئی۔ شہناز کے کہنے پر کبیر خان اسے اٹھا کے اندر لے گیا۔ اس نے مزاحمت نہیں کی۔ وہ چلا چلا کے بین کرتی رہی اور اس کے اندر کی بے بسی آنسوؤں میں ڈھل کے بہتی رہی۔ اس کیفیت میں جب اس کا دماغ کام ہی نہیں کر رہا تھا اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کرنا بھی فضول ہوتا...... شہناز نے اس کی مرہم پٹی کی اور ہر ممکن تسلی دی...... پھر اسے سکون بخش انجکشن لگا دیا اور وہ اپنے بچے کو سینے سے لگا کے روتے روتے غنودگی کی طرف بڑھی اور پھر سو گئی۔

شہناز نے بچے کو ایک عورت کے سپرد کر دیا اور تاکید کی کہ اس کی ماں کو کسی صورت نہ جگایا جائے...... باہر آ کے اس نے افسوس سے سر ہلایا۔ "اس طرح انجکشن لگا لگا کر ہم اسے کب تک سلا سکتے ہیں؟"

فریال نے بھی اس سے اتفاق کیا۔ "وہ ہوش میں آتے ہی پھر اس پاگل پن کا مظاہرہ کرے گی۔"

میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ اب ایسا نہیں ہوگا۔ اس کے اندر جو آتش فشاں مدت سے پک رہا تھا وہ پھٹ گیا...... شکر ہے اس سے کوئی نا قابلِ تلافی نقصان نہیں ہوا۔ اندر کی آگ سرد تو نہیں پڑی لیکن اب وہ کچھ پرسکون ہو جائے گی اور اپنے دماغ سے بھی کام لینے کے قابل ہو جائے گی۔"

فریال نے کہا۔ "اگر کاسو کو واپس لانے کی کوشش کامیاب ہوتی ہے تو ان دونوں کو راتوں رات یہاں سے رخصت کر دینا چاہیے۔"

"یہ تو طے ہے۔" میں نے کہا۔

"لیکن اس کی بازیابی کے لیے آپ کوئی کارنامہ سرانجام نہیں دیں گے۔ کسی مہم میں شامل نہیں ہوں گے۔" فریال نے کہا۔

میں نے سلیوٹ کیا۔ "یس سر۔"

"ہم سب کی زندگی کا یہی ایک مقصد نہیں رہ گیا ہے۔"

میں نے پھر سلیوٹ کیا۔ "یس سر۔"

"اگر کاسو نہیں آتا تب بھی اس کی بیوی کو یہاں رکھنا ایک مستقل پریشانی ہوگی۔ اسے بھیج دو کہیں بھی......" فریال نے کہا۔

میں نے تیسرا سلیوٹ مارا۔ "یس سر۔"

راجا اور فرخ نے بڑی محنت سے جنریٹر لگوا کے اسٹارٹ کرا دیا تھا۔ حویلی کی روشنی واپس آ گئی تھی۔ الیکٹرک اپلائنس جو کچن میں استعمال ہوتے تھے پھر کارآمد ہو گئے تھے اور فاطمہ کو لکڑیاں جلا کے کھانے پکانے کی مشکل سے نجات حاصل ہو گئی تھی۔ وہ تمام عمر یہی ایندھن استعمال کرتی رہی تھی لیکن اس کے گھر اور حویلی کے کچن کی ضروریات میں بہت فرق تھا۔ کمپنی کی طرف سے جو انجینئر یہ جنریٹر لگا کے چلانے آیا تھا، وہ فارغ تھا اور اب اس کی واپسی کا مرحلہ درپیش تھا اگر ڈیزل سپلائی کرنے والی گاڑی نہ آتی تو کسی کو اسے چھوڑنے دین تک ضرور جانا پڑتا۔

ایک بار اندر کے کسی چھپے ہوئے دشمن کے ہاتھوں جنریٹر خراب ہو چکا تھا...... دوسری مرتبہ یہ بڑا جنریٹر لگایا تو وہیں گیا تھا مگر اس دروازے کو لاک کر دیا گیا تھا جس سے گزر کر جنریٹر تک پہنچا جا سکتا تھا۔ اپنے طور پر فرخ نے اور راجا نے طے کیا تھا کہ وہ دن میں کام کرنے والے کاریگروں پر بھی نظر رکھیں گے اور ان پر بھی جو کسی وجہ کے بغیر حویلی میں پائے گئے۔ سرونٹ کوارٹرز کے بہت سے مکین خود کو حویلی کا باسی سمجھتے تھے اور بلا روک ٹوک آنے جانے کی سہولت سے فائدہ اٹھاتے تھے۔

مجھے اس گارڈ کی واپسی کا انتظار تھا جو کاسو کے بارے میں ایک اطلاع لایا تھا اور پولیس کا مخبر سمجھا جاتا تھا...... اگر یہ اطلاع خود پولیس نے فراہم کی تھی کہ کاسو کو مغرب کے بعد کتے کے ساتھ گاڑ دیا جائے گا تو یہ انتہائی دکھ اور افسوس کی بات تھی کہ پولیس اس سفاکانہ قتل کو روکنے کی کوئی کوشش نہیں کر رہی تھی۔ وہ رانا کے نمک خوار تھے اور قانون کی عمل داری قائم کرنے کے لیے اس کے خلاف کارروائی کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

گارڈ نے واپس آ کے مجھے مطلع کیا کہ مسٹر اللہ لوک کی تلاش کامیاب رہی۔ "وہ قبرستان کے نکڑ پر بھنگ پی رہا تھا۔"

"پھر تم نے اسے میرا پیغام دیا؟"

"دے دیا جناب عالی۔" گارڈ چپ ہو گیا۔

"آگے بول۔" میں نے جھلا کے کہا۔

"وہ جی...... اس نے گالیاں دیں مجھے اور کہا کہ شامی

ری کیا کرسکتا ہے...... رانا سیانا سب کچھ کرسکتا ہے۔''

''تم نے کہا تھا کہ شامی فوراً مجھ سے ملے۔''

گارڈ نے ٹوپی اتار کے سر جھکایا...... ''کہا تھا جناب اس نے پتھر کھینچ کے مارا۔'' اس نے ایک گومڑ کی نشاندہی کی۔ ''لوگ کہتے ہیں جس کو وہ پتھر مارے وہ خوش قسمت ہوتا ہے...... اسے پیسا ملتا ہے۔''

میں نے خفگی سے کہا۔ ''جاؤ پھر اسے موقع دو کہ تمہیں اور پتھر مارے۔ سر ٹوٹ جائے مٹی کے خالی برتن کی طرح مگر دولت تو حاصل ہو جائے گی۔ مزار بنوالینا اپنا۔''

فریال نے اندر سے مجھے ڈانٹا ''کیوں بلاوجہ سر کھپاتے ہو ان جاہلوں کے ساتھ۔ تم ان کے عقائد نہیں بدل سکتے جو صدیوں سے خون میں شامل ہیں۔''

میں نے دھاڑ کے کہا۔ ''میں گارڈ تو بدل سکتا ہوں۔''

''جو اس کی جگہ آئے گا وہ بھی ایسا ہی ہوگا۔''

میں نے کہا۔ ''میں گارڈ امپورٹ کرلوں گا۔ یار کوئی کام کرو...... میرا دماغ مت کھاؤ...... ورنہ میں دماغ بھی امپورٹ کرلوں گا سب کے لیے۔''

میرے چڑچڑے پن کی وجہ ایک اعصابی دباؤ تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ میری ساری خواہش اور کوشش رائیگاں گئی۔ اندھیرا پھیلے دیر ہوگئی تھی اور ایک خوف کی سرگوشی کہتی تھی کہ دن کی روشنی کے ساتھ ہی کاسو کی زندگی کا چراغ بھی گل ہوگیا...... کوئی کچھ نہیں کرسکا...... نہ میں...... نہ قانون...... نہ اس کا مقروض ڈاکو دوست...... اس کی موت اتنی ہی غیر اہم رہی جتنی جنگل کے راستے پر پیروں میں آجانے والے چیونٹے کی موت......

راجا اپنی سوچ میں بہت مختلف نظر آتا تھا لیکن اندر سے وہ بھی میرے جیسا ہی تھا۔ اس کے برعکس خواتین کی سوچ کے انداز میں مماثلت تھی کہ اس کی شہناز سے چخ چخ چل رہی تھی۔ فرخ کسی غیر جانبدار مبصر کی طرح چپ چاپ سب دیکھ اور سن رہا تھا مگر یہ اس کی بے حسی نہیں بے بسی تھی...... وہ محسوس کرنے کے سوا کیا کرسکتا تھا......

میں نے اب گھڑی دیکھنا ہی چھوڑ دیا تھا اور اپنی شکست تسلیم کرلی تھی۔ میں خود کو یہ سمجھانے میں مصروف تھا کہ میں کوشش ہی کرسکتا تھا اور کوشش میں کوئی کمی میں نے نہیں چھوڑی۔ اچانک گارڈ نے ڈرتے ڈرتے اپنی شکل دکھائی اور شامی کی آمد کی اطلاع دی۔ ''وہ باہر کھڑا ہے جناب۔''

میں نے کہا۔ ''باہر کیوں کھڑا ہے؟''

''آپ کا آرڈر تھا جناب۔''

''ابے آرڈر کے بچے...... اسے اندر لا......'' راجا نے اسے کہا تو وہ گیا اور پھر لوٹ آیا۔ ''جناب وہ کہتا ہے نائم نہیں ہے...... چلیں۔''

فریال چونکی۔ ''کہاں چلیں؟''

شہناز نے بھی راجا سے کہا۔ ''تم بیٹھو آرام سے۔''

لیکن ہم تینوں ایسے اچھل کے کھڑے ہوگئے تھے جیسے ہمارے نیچے اسپرنگ لگے ہوں۔ فریال تو میری صورت سے میرے موڈ کا اندازہ کرچکی تھی کہ اس نے سامنے آکے بھی میرا راستہ روکا تو میں اسے دھکیل کر ہٹادوں گا اور نکل جاؤں گا۔ شہناز پیچھے پیچھے آئی اور اس نے راجا کو روکنے کی کوشش آخری وقت تک کی...... مجھے بڑی خوشی ہوئی جب راجا نے اس کی بات کا نوٹس ہی نہیں لیا اور جیپ میں میرے ساتھ بیٹھ گیا......

جب جیپ باہر گئی تو خواتین کی صورتیں قابل دید ہورہی تھیں...... کچھ غصے سے...... کچھ خفت سے اور کچھ فکرمندی سے۔

میں نے کہا۔ ''ویل ڈن راجا...... تو نے ثابت کردیا کہ تو زن مرید نہیں ہے۔''

''کاش ایسا ہوتا فیکے پتر۔'' اس نے گہری سانس لی...... ''میں ابھی سے ڈر رہا ہوں کہ واپسی پر وہ میرا کیا حشر کرے گی؟''

''راجا...... تم اتنا ڈرتے کیوں ہو اس سے؟'' فرخ نے پوچھ لیا۔

راجا نے بھنا کر کہا۔ ''کیونکہ میں...... ہوں۔ تم جیسا سورما نہیں جو اکیلی لڑکی کے ساتھ......''

راجا کو بروقت احساس ہوگیا کہ غصے میں اس نے خود کو گالی دی وہ جائز سہی مگر جو اس نے فرخ کو کہا وہ منہ پر تھپڑ مارنے کے مترادف تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے لگا کہ فرخ بھڑک اٹھے گا لیکن اس نے یہ ذلت برداشت کرلی اور اپنے غصے پر قابو پالیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس کے ماتھے کی ایک پھولی ہوئی رگ پھڑک رہی ہے اور اسٹیئرنگ پر اس کی گرفت کتنی سخت ہے۔ اس نے مٹھی بند کرکے ڈیش بورڈ پر مکا مارا تو میں نے نرمی سے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔

راجا نے فوراً کہا۔ ''آئی ایم سوری فرخ۔ میرا وہ مطلب نہیں تھا۔'' لیکن منہ سے نکلے ہوئے الفاظ کا اور کمان سے نکلے ہوئے تیر کا زخم ایک جیسا ہوتا ہے۔ ایک جیسی اذیت دیتا ہے اور محض ''سوری'' کہہ دینے سے اس کی ٹیس ختم نہیں

دی۔

ل کے پار پہاڑی کی اوٹ میں مجھے سائے سے متحرک کھائی دیتے رہے تھے۔ یہ شامی اور اس کے ساتھی تھے۔ ڈاکوؤں کے روایتی حلیے میں انہوں نے سیاہ شلوار قمیص پہن کے اپنے چہرے سیاہ ڈھاٹوں سے چھپائے تھے۔ وہ کل آٹھ آدمی تھے جو چار گھوڑوں پر سوار تھے۔ انہوں نے اپنی رائفلیں کندھوں پر لٹکا رکھی تھیں۔

شامی گھوڑے سے اتر کر ایک قدم آگے آیا۔ ''نواب صاحب...... کیا تم جیپ میں جاؤ گے؟''

میں نے کہا۔ ''مجبوری ہے...... ہمارے پاس گھوڑے نہیں ہیں۔''

''ہوتے بھی تو وہ ہمیں چلاتے۔'' راجا بولا۔

شامی نے سوچ کے کہا۔ ''اسلحہ ہے؟''

میں نے کہا۔ ''ریوالور ہیں۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''جیپ کو چھوڑ دو...... گھوڑے پر سوار ہو جاؤ۔''

میں شش و پنج میں پڑ گیا۔ ''تین آدمی ایک گھوڑے پر......؟''

اس نے پلٹ کے دیکھا ہی تھا کہ تین گھوڑوں پر سے تین افراد کود کے اتر گئے۔ ''چلو بیٹھو۔'' شامی نے کہا۔

میں ایک ڈاکو کے پیچھے بیٹھ گیا تو راجا نے کہا۔ ''اس جیپ کا ہم کیا کریں؟''

''چھوڑ دو یہیں...... وقت بہت کم ہے۔'' شامی نے تیز لہجے میں کہا۔ ''چوری نہیں ہوگی...... مل جائے گی اسی جگہ مگر کاسو زندہ نہ ملا پھر......؟''

اس کے بعد کسی کو یہ سوال کرنے کی ہمت نہ پڑی کہ گھوڑوں سے اترنے والے تین افراد اب کیا کریں گے۔ یہ بات فوراً ہی معلوم بھی ہوگئی جب گھوڑوں سے اترنے والوں نے پیچھے دوڑنا شروع کیا...... چار ٹانگوں والے جانور کے ساتھ دو ٹانگوں والا اتنی ہی مستعدی سے بھاگ رہا تھا۔ یہ میرے لیے حیرانی کی بات بھی تھی کہ سوار...... سواری اور پیدل اندھیرے میں جنگل کے راستوں کو ایک جیسی مہارت سے دیکھ رہے تھے اور آگے بڑھتے جارہے تھے۔

ڈاکوؤں کی نظر تاریکی میں دیکھنے کی عادی تھی اور گھوڑے ان کے وفادار ساتھی تھے۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد گھوڑے زیادہ محتاط قدموں سے چلنے لگے۔ مجھے یوں لگا جیسے انسانوں کی رفاقت میں جانوروں کی حس بھی تیز ہوگئی ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ کہاں انہیں پھونک پھونک کر قدم رکھنا چاہیے اور کہاں بے خوف ہو کے دوڑنا چاہیے۔

یہ وہی جنگل تھا جس میں سے گزرتے ہوئے میں بھٹک جاتا تھا۔ میرے لیے گھنے درختوں میں راستہ تلاش کرنا ایک مشکل مرحلہ بن جاتا تھا۔ ڈاکو اس جنگل کو جانتے تھے۔ ان کے گھوڑے دائیں بائیں مڑتے آگے بڑھتے جارہے تھے ایک جگہ پہنچ کے گھوڑے رک گئے۔ شامی کے سارے ساتھی اتر گئے اور انہوں نے گھوڑوں کو درختوں کے ساتھ باندھ دیا۔

شامی نے مجھ سے کہا۔ ''یہی ہے وہ جگہ جہاں تمہارے ہاتھوں رانا کا کتا مارا گیا تھا۔''

میں نے الو کی طرح آنکھیں گھما کے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ''میں یقین سے نہیں کہہ سکتا...... ہوگی...... مجھے تو سارا جنگل ایک جیسا لگتا ہے اور اندھیرے میں کچھ پتا بھی نہیں چلتا۔''

''میں تم سے پوچھ نہیں رہا ہوں۔ تمہیں بتا رہا ہوں۔'' شامی نے کہا۔

''کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ اسی جگہ آئیں گے؟''

''میری انفارمیشن یہی ہے۔'' شامی نے کہا۔

''یہ کام انہوں نے دن کے اجالے میں کیوں نہیں کیا؟ میرا مطلب ہے رانا کو کس کا ڈر تھا؟''

شامی نے کہا۔ ''تم اور تمہارا یہ دوست اسے دھمکی دے آئے تھے...... تم نے کہا تھا کہ کاسو کا کیس مائی مختاراں سے بڑا بن جائے گا۔ تم اسے قومی پریس میں اچھالو گے اور سپریم کورٹ خود اس کا نوٹس لے گی۔''

میں نے حیرانی سے کہا۔ ''بے شک میں نے اسے یہ دھمکی دی تھی مگر اس کا تمہیں کیسے علم ہوا؟''

''سب معلوم ہو جاتا ہے نواب صاحب...... ہمارے بھی رابطے ہیں۔ اندر باہر...... ہر جگہ...... رانا نے ہدایت کی تھی کہ کام کرو مگر کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ اسے خاموشی سے رات کے وقت لے جاکے گاڑ آؤ...... ورنہ کہیں اس اخبار والے کے کانوں میں بات پڑ گئی تو وہ سب کو اکٹھا کرلے گا یا جنگل میں لگادے گا کیمرے۔''

راجا نے کہا۔ ''اس کا ڈر جائز تھا۔ میں ایسا ہی کرتا۔''

میں نے کہا۔ ''اتنا بڑے بننے والا آدمی اندر سے کتنا چھوٹا ہے۔ اس میں حوصلہ نہیں ہے ایک حقیر غلام کو معاف کرنے کا...... کتنا احساسِ کمتری ہے اسے...... وہ سمجھتا ہے کہ اس نے اپنی ضد پوری نہ کی تو اس کی ناک کٹ جائے گی۔ کوئی عزت نہیں رہے گی...... افسوس۔''

خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا۔ شامی اور اس کے ساتھی

بڑے چوکس کھڑے تھے۔ ان کے کان کوئی سگنل موصول کرنے کے لیے تیار تھے۔ ان کی آنکھیں نائٹ وژن دوربین کی طرح ہر سمت دیکھ رہی تھیں۔ اچانک سکوت کو کسی اُلو کی آواز نے توڑا لیکن یہ آواز کسی انسان نے خبردار کرنے کے لیے نکالی تھی...... اس فرق کو راجا یا میں خاک سمجھتے...... ڈاکو ایک دم مستعد ہو گئے۔ وہ بندر کی طرح اردگرد کے درختوں پر چڑھے اور غائب ہو گئے۔

میں نے راجا کی طرف دیکھا۔ ''کیا ہم استقبالیہ کمیٹی کے اراکین ہیں...... مہمانوں کو ریسیو کریں گے؟''

راجا نے کہا۔ ''شامی صاحب سے پوچھو۔''

شامی نے کہا۔ ''چھپ جاؤ تم بھی کسی درخت کی اوٹ میں۔''

''اور تم...... کھڑے رہو گے ایسے ہی؟'' راجا نے کہا۔

''مجھے چھپ شاہ کا انتظار ہے۔'' وہ بولا۔

میں نے کہا۔ ''یہ چھپ شاہ کون ہے؟''

''وہی جو تمہارے لیے پیغام لایا تھا اور پھر وہ پیغام مجھے پہنچانے آیا تھا۔ ابھی اُلو کی آواز اسی نے نکالی تھی۔ یہ بتانے کے لیے کہ وہ آرہے ہیں۔''

''اسے چھپ شاہ کیوں کہتے ہیں؟''

''اسے یہ نام پولیس نے دیا ہے...... وہ چھپ کے بہت کچھ کرتا ہے۔ ہر بات سنتا ہے...... سب کچھ دیکھتا ہے اور چھپ چھپا کے ہر خبر آگے پہنچا دیتا ہے...... پولیس کو...... وہ نہ دیوانہ ہے نہ بے وقوف بڑا اچھا پارٹنر ہے۔''

''پھر تو اچھا ہے اس کے لیے یہ نام۔''

چھپ شاہ اسی وقت یوں نمودار ہوا جیسے زمین سے اُگا ہو۔ اس کا حلیہ وہی مجذوبوں والا تھا لیکن انداز بدلے ہوئے تھے۔ اس نے ہاتھ اٹھا کے کہا۔ ''او جی خیر ہووے حاکماں دی...... خیر شامی بادشاہ دی۔''

''چھپ شاہ...... بندے کتنے ہیں؟'' شامی نے پوچھا۔

''پانچ شامی بادشاہ...... چھٹا ہمارا یار کاسو ہے...... میں اب چلتا ہوں...... کسی کو شک نہ ہو جائے۔''

شامی نے جیب میں ہاتھ ڈال کے نکالا تو اس کے ہاتھوں میں سو کے نوٹوں کی ایک گڈی تھی۔ ''یہ تمہارا انعام ہے۔''

اس نے ہاتھ اٹھا کے شامی کو دعا دی۔ ''بخی دے کوٹھے وسدے رہیں...... فقیراں دے ڈیرے آباد رہیں''

شامی نے چٹکی بجا کے کہا۔ ''چل پھٹ...... زیادہ ڈراما مت کر میرے سامنے۔''

وہ جنگل میں غائب ہو گیا تو میں نے حیرانی سے کہا۔ ''تو بڑا ایکٹر ہے۔''

راجا بولا۔ ''ایسے بہت سے کردار ہر شہر میں نظر آتے ہیں کچھ لوگ انہیں ملنگ اور درویش سمجھتے ہیں تو کچھ لوگ پولیس کے مخبر یا سی آئی ڈی کا بندہ۔''

''اور واقعی وہ ہوتے ہیں...... سب کے بیچ میں نیک نام بن کے رہتے ہیں اور سن گن لے کے انفارمیشن پاس کرتے رہتے ہیں۔'' شامی بولا۔

میں نے کہا۔ ''شامی...... یہ اتنے پیسوں کا کیا کرے گا۔ تن پر کپڑے تو پورے ہیں نہیں۔''

''یہ بڑا ڈونگا بندہ ہے جی...... پنڈی میں اس کا گھر ہے...... بیوی بچے ہیں۔ ادھر جا کے دیکھو اسے تو پہچان نہیں سکو گے۔ ان سے کہتا ہے کہ نوکری دبئی میں ہے۔ مہینے میں ایک دن پنڈی پہنچ جاتا ہے۔ باقی دن پھرتا رہتا ہے دیوانہ بن کے...... پنڈی سے جہلم تک لوگ اسے جانتے ہیں...... اس سے من کی مرادیں مانگتے ہیں۔''

''اصل دیوانے تو وہ عقلمند ہیں جو اس سے مانگتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''یہ اس علاقے کے چپے چپے سے واقف ہے...... ہمارے بھی بہت کام کرتا تھا...... پولیس کے بھی۔''

راجا بولا۔ ''مالِ غنیمت میں سے بھی اپنا حصہ وصول کرتا ہوگا۔''

''حصہ کیا...... مل جاتا ہے اس کو بھی تھوڑا بہت۔'' شامی نے ایک کان کے پیچھے ہاتھ رکھ کے کچھ سننے کی کوشش کی اور پھر بولا۔ ''وہ آ گئے ہیں۔''

فرخ موقع پا کے ایک درخت پر چڑھ گیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ خوف زدہ تھا۔ جب اس نے میرا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تھا تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ یہاں اس قسم کے حالات سے بھی واسطہ پڑ سکتا ہے۔ میں نے اس کے سامنے ست بدھائی میں ترقیاتی منصوبوں کے اور ترقی کے مواقع کے بارے میں بتایا تھا مگر یہاں کے معاملات دوسرا ہی رخ اختیار کر رہے تھے۔ اس وقت خود میں یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ مجھے بھی انسانوں اور کتوں کے ایک ساتھ دفن کیے جانے کے خلاف کسی کارروائی میں ڈاکوؤں کے ساتھ مل کر شریک ہونا پڑے گا۔

شامی نے مجھے ایک بڑے تنے والے درخت کے پیچھے چھپا دیا اور راجا کو دوسرے درخت کے پیچھے۔ پھر وہ خود بھی

ایک درخت پر چڑھ گیا...... رفتہ رفتہ آگے بڑھنے والے قدموں کی آواز واضح ہوتی گئی۔ سوکھے پتے اور خشک ٹہنیاں چٹخنے کی آواز بھی اس خاموشی میں سنی جا سکتی تھی۔ وہ آپس میں باتیں بھی کر رہے تھے۔

جب وہ سامنے آئے تو پانچ نہیں چھ تھے۔ ان میں سے چار تو رانا کے مخصوص سزا یافتہ غلاموں کے حلیے میں تھے۔ منڈے ہوئے سر...... خاکی نیکر اور ننگے پاؤں...... ان میں سے ایک نے کاسو کو اپنے کندھے پر بے جان لاش کی طرح ڈال رکھا تھا...... اس کے ہاتھ آگے کی طرف جھول رہے تھے اور کمر سے نیچے ٹانگوں والا حصہ پیچھے تھا۔ وہ کوئی آواز نکال رہا تھا اور نہ کوئی حرکت نہیں کر رہا تھا۔ مجھے شبہ ہوا کہ اسے یہاں لانے سے پہلے ہی مار دیا گیا ہے یا انجکشن لگا کے بے ہوش کر دیا گیا ہے لیکن اس کی یہ حالت دہشت سے تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔

چار غلاموں کے ساتھ دو محافظ تھے۔ ان کو میں دو بار دیکھ چکا تھا۔ وہ کتوں کے ساتھ دوڑنے والے غلاموں کے پیچھے موٹر سائیکلوں پر آتے تھے اور رانا کی حویلی کے آس پاس کے علاقے میں گشت کرتے تھے۔ ان کے پاس خطرناک قسم کا خودکار اسلحہ ہوتا تھا اور وہ خود بھی گھن گرج رکھنے والی موٹر سائیکلوں جیسے بھاری بھر کم تھے۔

کاسو کو ایک غلام نے کندھے پر سے یوں گرا دیا جیسے وہ انسان نہیں۔ شاید وہ خود بھی انسان نہیں تعمیل حکم کرنے والا دو ٹانگوں کا جانور تھا جسے اپنا دماغ صرف اس حد تک استعمال کرنے کی اجازت تھی کہ وہ حکم کو سمجھ سکے۔

کاسو کراہنے لگا۔ ''اوئے...... ظالمو...... اوئے رحم کرو مجھ پر۔''

لیکن ان کے دل اس رحم کی اپیل سے متاثر نہیں ہو سکتے تھے جو کاسو کو دی جانے والی سزائے موت کے فیصلے پر عمل درآمد کرانے کے ذمے دار تھے۔

ایک محافظ نے ٹارچ روشن کی اور زمین کو دیکھا...... بہ ظاہر وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

''ٹھیک ہے...... یہی ہے وہ جگہ۔''

دوسرے محافظ نے اس سے اتفاق کیا۔ ''ہاں...... انہی دو درختوں کے بیچ میں کھودنا شروع کرو۔''

میرے خیال میں انتظار لا حاصل تھا۔ ہم سات افراد بہ آسانی دو محافظوں کو قابو کر سکتے تھے لیکن اس آپریشن کی کمان شامی کے ہاتھ میں تھی اور وہ معلوم نہیں کس موقعے کا انتظار کر رہا تھا۔ ایک محافظ نے ٹارچ روشن رکھی اور دو غلام کدالوں سے زمین کھودنے لگے...... اس وقت جب وہ قبر تیار کر رہے تھے میں سوچ رہا تھا کہ ان کی ذہنی کیفیت کیا ہو گی...... وہ کیا محسوس کر رہے ہوں گے کہ کچھ دیر بعد انہی جیسا ایک جیتا جاگتا زندہ انسان ایک بھس بھرے کے ساتھ مٹی میں دبا دیا جائے گا۔ وہ خود بھی تو انسان ہیں۔ کیا انہیں دکھ نہیں ہوگا...... نفرت نہیں ہوگی...... اس نظام سے۔ رانا سے اور خود اپنے آپ سے کہ وہ بول نہیں سکتے۔ احتجاج نہیں کر سکتے۔ ایسا خود ان کے ساتھ بھی تو ہو سکتا ہے۔

دونوں محافظوں میں سے ایک بے پروائی سے سگریٹ پی رہا تھا اور چار ٹانگوں پر قائم بھس بھری کھال والے کتے کی شکل جیسے وجود کے پاس کھڑا تھا۔ دوسرا ایک پتھر پر بیٹھ گیا تھا جہاں تک کاسو کا تعلق تھا تو وہ پہلے ہی نیم مردہ تھا۔ اس میں اٹھ کے بھاگنے کی کیا ہمت ہوتی۔ وہ رو پیٹ ہی نہیں رہا تھا فریاد بھی نہیں کر رہا تھا۔ منت سماجت فریاد...... شاید وہ سب کر کے دیکھ چکا تھا اور جانتا تھا کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔

خود میرے دل کی عجیب کیفیت تھی۔ مجھے یقین کرنا مشکل ہوتا تھا کہ جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں وہ حقیقی ہے اور اسی اکیسویں صدی کے پاکستان میں ہو رہا ہے جس کا شمار واحد ایٹمی قوت رکھنے والے ملک کی حیثیت سے ترقی یافتہ ممالک میں کیا جاتا ہے...... میں لندن اور امریکا میں رہا تھا مگر پاکستان کے حالات کا موازنہ اس دنیا سے نہیں کرتا تھا۔ میں کراچی، لاہور اور اسلام آباد جیسے شہروں کی ثقافت دیکھتا تھا تو مجھے ست بدھائی جیسے ہزاروں دور افتادہ مقامات پر رہنے والے انسانوں کی زندگی اشرف المخلوقات سے زیادہ حشرات الارض کی زندگی لگتی تھی۔ آج ایک کاسو کو بچانے سے کوئی انقلاب برپا نہیں ہونا تھا جس سے انسانوں کو انسانوں کا درجہ حاصل ہو جائے...... یہ سب ایسے ہی چلتا آ رہا تھا اور شاید اگلی صدی تک یا اس سے اگلی صدی تک ایسے ہی چلے گا۔

قبر تین فٹ گہری ہو چکی تھی اب اس میں ایک شخص اترا ہوا تھا۔ دوسرا تھک کے آرام کر رہا تھا۔ اچانک سگریٹ پینے والے محافظ نے اپنے ساتھی کو مخاطب کیا۔ ''اوئے کیا سوچ رہا ہے تو؟''

''سوچ رہا تھا...... کاسو کو گاڑنا تو ہے۔ پہلے مار کیوں نہ دیں۔''

دوسرے نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''رانا کو پتا چل جائے گا۔''

قبر کھودنے والے نے سر اٹھایا۔ ''نہیں معلوم ہو گا جی۔''

دوسرے غلام نے کہا۔ ''کوئی نہیں بتائے گا رانا صاحب کو...... اسے ماردو...... اس کی تکلیف کم ہوجائے گی۔''

محافظ نے اپنے ساتھی کی طرف دیکھا۔ ''اور اگر کسی نے بک دیا۔''

''ثبوت کیا ہوگا...... ہم صاف انکار کردیں گے کہ جھوٹ ہے اور...... پھر اس کی خیر نہیں جس نے بکواس کی۔'' محافظ بولا۔

اب مزید تاخیر ممکن نہ تھی۔ ان سب کے دل میں کاسو کے لیے رحم کی رمق جاگ اٹھی تھی۔ وہ اسے پُر اذیت موت سے بچانے پر متفق ہوگئے تھے اور اس کی لاش کو دفن کرنا چاہتے تھے پھر ایک اور اتفاق یہ ہوا کہ فرخ نے چھینک مار دی۔ وہ جس درخت پر چڑھا ہوا تھا اس پر خارش پھیلانے والے پھول تھے اور ان پر خاص قسم کے کیڑے تھے جو فرخ کو پریشان کررہے تھے۔

اس کے بعد صورتِ حال ایک سیکنڈ میں بدل گئی۔ ایک درخت پر سے ایک ڈاکو نے محافظ پر چھلانگ لگائی اور وہ دونوں ایک ساتھ گرے پھر باقی ڈاکو درختوں سے کود گئے اور اچانک کاسو کو دفن کرنے والوں نے خود کو ہر طرف سے سیاہ لباس والے ڈاکوؤں کے نرغے میں پایا جن کے خطرناک اسلحے کا رخ ان کی طرف تھا۔

جب مزاحمت یا مقابلے کی نوبت ہی نہ آئی تو میں نے ...تر سمجھا کہ اس وقت اپنی صورت نہ دکھاؤں۔ میں نے چند ...ٹ دور کھڑے راجا کو بھی اشارہ کردیا کہ سامنے نہ آئے اور ...رخت پر چڑھے ہوئے فرخ نے ہم دونوں کی روپوشی کا ...نصد سمجھ لیا۔ چھینک مارنے کے باوجود وہ اوپر سے نہیں ...ترا۔ رانا کے غلاموں اور محافظوں نے یہی فرض کیا ہوگا کہ ...رخت پر بھی کوئی ڈاکو موجود ہے جو اوپر سے ان کو نشانے پر ...ے بیٹھا تھا۔

شامی کو دیکھتے ہی محافظوں کی حالت غیر ہوگئی تھی۔ ...نھوں نے اپنا اسلحہ نیچے رکھ دیا۔ ''شامی بادشاہ...... ہمارا کوئی ...ور نہیں۔''

شامی انہیں گالیاں دیتا رہا۔ ''بے غیرت بلانو...... سوچو تم کیا کررہے تھے...... ایک انسان کو زندہ گاڑ رہے تھے...... کیا میں گاڑ دوں تمہیں؟''

غلام دم بخود کھڑے دیکھتے رہے۔ وہ جانتے تھے کہ ...ی ایک ایسا ڈاکو ہے جس کی سارے علاقے میں دہشت ...ے مگر وہ کاسو کی جان بچانے کیسے آگیا اور کیوں آگیا...... یہ ...ت ان کی سمجھ میں نہیں آسکتی تھی۔ ان کی صورت کے

تاثرات اور ان کا پُراطمینان انداز دیکھ کے لگتا تھا کہ وہ تائیدایزدی کا روپ دھار کے نمودار ہونے والے شامی کی کارروائی سے خوش ہیں۔

دونوں محافظ شامی کے پیر چھو چکے تھے۔ ''رانا صاحب ہمیں مار ڈالیں گے شامی بادشاہ۔'' ایک نے کہا۔

''ہم اسے کیا بتائیں گے......؟'' دوسرے نے لجاجت سے کہا۔

''اس کو وہی بتادینا جو ہوا اور میرا پیغام بھی دے دینا کہ کاسو کو شامی لے گیا ہے۔ وہ کاسو کا پیچھا چھوڑ دے۔ اسے کچھ ہوا تو رانا کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ چلو بس اب جاؤ......'' شامی نے کہا۔

دوسرے محافظ نے کہا۔ ''شامی بادشاہ...... رانا کو ہم کیسے یقین دلا سکتے ہیں کہ کاسو کو تم لے گئے...... وہ نہیں مانے گا...... وہ اناڑی نہیں ہے۔''

اب پہلے محافظ نے بھی تائید میں سر ہلایا۔ ''وہ سمجھے گا ہم نے کاسو کو فرار کرادیا...... ہماری شامت آئے گی۔''

شامی نے گرج کے کہا۔ ''بک بک میں وقت ضائع نہ کرو...... رانا کو اس کا ثبوت کل مل جائے گا۔''

شامی کے ساتھ ہی اس کے ساتھیوں نے اسلحہ تان لیا۔ رانا کے نمک خوار مرے مرے قدموں سے آگے بڑھے۔ ان کی عقل بھی چکرا گئی تھی کہ شامی جیسے نامی گرامی ڈاکو نے کاسو کی خاطر اتنی تکلیف کیوں اٹھائی۔ ان کے درمیان کیا تعلق تھا جس نے شامی کو بروقت پہنچنے پر مجبور کردیا۔ وہ کاسو کو اپنا آدمی کیوں کہہ رہا تھا۔

جب وہ جنگل میں غائب ہوگئے تو راجا کے ساتھ میں بھی درخت کی اوٹ سے نکل آیا اور فرخ بھی نیچے اتر گیا۔ کاسو ابھی تک زمین پر بے سدھ پڑا ہوا تھا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان ڈاکوؤں کو دیکھ رہا تھا جو سیاہ پوش فرشتوں کی طرح غیب سے نمودار ہوئے تھے اور اسے موت کے منہ سے نکال کرلے جارہے تھے۔

میں نے جھک کر اسے اٹھایا۔ ''کاسو...... اٹھو...... دیکھو شامی تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آیا ہے

کاسو بڑی مشکل سے کھڑا ہوا۔ ''شامی......!''

شامی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''ہاں...... ایک بار تم نے میری جان بچائی تھی۔ اللہ نے مجھے موقع دیا کہ آج وہ قرض اتار دوں...... چلو میرے ساتھ۔''

کاسو اس کا ہاتھ چوم کے رونے لگا۔ ''شامی بادشاہ...... میں تمہارے ساتھ نہیں جاسکتا۔ میں اپنے بیوی بچوں کو اس

ظالم کے حوالے نہیں کرسکتا وہ بعد میں ان کو مار ڈالے گا۔''

شامی نے کہا۔ ''وہ بھی ہمارے ساتھ چلیں گے۔ رانا تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔''

کاسو کو ایک ڈاکو نے اپنے ساتھ بٹھالیا۔ میں شامی کے پیچھے بیٹھا...... راجا اور فرخ کو بھی دو ڈاکوؤں نے بٹھالیا۔ چار ڈاکو ہمارے پیچھے دوڑنے لگے۔ وہ جسمانی طور پر بھی مضبوط لوگ تھے۔ واپسی کے سفر میں وقت بچانے کے لیے شامی نے گھوڑے کو خاصی رفتار سے دوڑایا اس کے ساتھی جنگل کے دشوار گزار اور تاریک راستے پر ساتھ ساتھ دوڑتے رہے حالانکہ ان کے کندھوں پر اسلحے کا بوجھ بھی تھا۔

پل کے پاس ہماری جیپ اسی طرح موجود تھی...... زندگی بچ جانے کے ساتھ بیوی بچوں سے پھر ملنے کی خوشی نے کاسو کو بڑا حوصلہ دیا تھا...... پانی کے چند گھونٹ پی کے اس کی حالت سنبھل گئی تھی۔ اب وہ شامی کا شکریہ ادا کرنے کی کوشش کررہا تھا اور اپنے جذبہ احسان مندی کے اظہار میں مصروف تھا۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ ایک بدنام ڈاکو احسان کا قرض اتارنے کیوں آگیا...... ڈاکو تو بہت برے سمجھے جاتے ہیں اور بے حد سفاک ہوتے ہیں۔ اس میں یہ شرافت کہاں سے آگئی جو خاندانی شریف سمجھے جانے والے رانا صاحب میں نہ تھی۔ اسے کون سمجھاتا کہ اب شرافت اور عزت کے معیار الٹ گئے ہیں۔ اندھیرا اب چراغ تلے نہیں چراغ کے اوپر ہوتا ہے۔

فرخ جیپ لے کر کاسو کی بیوی کو لانے چلا گیا تو میں نے شامی سے کہا۔ ''مجھے معلوم نہیں کہ تم سے پھر ملاقات ہوگی یا نہیں...... اس لیے ابھی تمہارا شکریہ ادا کردوں...... جو کچھ تم نے میرے لیے کیا۔''

وہ حیرانی سے بولا۔ ''آپ کے لیے؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں...... کاسو کو میں لایا تھا۔ لیکن میں اپنی ذمے داری پوری کرنے میں ناکام ہوگیا تھا۔ تم مدد نہ کرتے تو کاسو آج مارا جاتا اور پھر پتا نہیں اس کی بیوی کا کیا ہوتا...... مجھے ساری عمر ملال رہتا۔''

شامی نے کہا۔ ''نواب صاحب...... توفیق دینے والا خدا ہے۔ اس نے کاسو جیسے شخص کو میری مدد کے لیے بھیجا تھا۔ اسی نے مجھے بروقت یہاں بھیج دیا حالانکہ یہ میرا علاقہ نہیں ہے میں خود یہاں بھاگ کر آیا تھا۔ اپنی جان بچانے کے لیے۔ مجھے ان دوستوں پر بھروسا تھا اور انہوں نے یاری نبھانے میں کمی نہیں کی۔''

میں نے کہا۔ ''یہ سب تمہارے گروہ میں تھے؟''

''نہیں نواب صاحب۔ میرا گروہ تو ختم ہوگیا تھا۔ بس یہی لوگ بچے تھے۔ ایک نے سات سال کی جیل کاٹی اور ابھی دو مہینے پہلے باہر آیا ہے۔ دوسرا ہمارا پرانا مددگار تھا۔ پولیس سے نکال دیا گیا تھا۔ ہمارا رشتہ تو بس دوستی کا ہے۔ اس سے غرض نہیں کہ کون کیا کرتا ہے۔''

''شامی بادشاہ۔'' میں نے کہا۔ ''تم مجھے بھی اپنے دوستوں میں شامل کرسکتے ہو۔ پھر کبھی آنا ہو تو ضرور ملنا۔''

اس نے خوش ہو کے ہاتھ ملایا۔ ''آپ بھی اچھے بندے ہو اپنے نواب صاحب...... ایسے نواب میں نے نہیں دیکھے۔''

میں نے ہنس کے کہا۔ ''تم جیسے ڈاکو بھی کہاں ہوتے ہیں؟''

جیپ جو کاسو کی بیوی اور بچے کو لانے کے لیے گئی تھی دس منٹ میں لوٹ آئی۔ اسے کون سا سامانِ سفر باندھنا تھا کہ دیر لگتی۔ جیپ ہمارے قریب آکے رکی تو اس کی پچھلی سیٹ پر فریال اور شہناز کو دیکھ کر مجھے بڑی حیرانی ہوئی۔ انسان دوست اور شریف النفس ڈاکوؤں کے قصے انہوں نے بھی سنے تھے مثلاً رابن ہڈ اور بہرام ڈاکو...... یہ ان کی زندگی کا ایک سنسنی خیز تجربہ تھا کہ ایسے ہی ایک ڈاکو بلکہ اس کے پورے گروہ سے ان کا براہِ راست واسطہ پڑا تھا۔ ان کے خوف اور دہشت کی جگہ احترام اور تجسس نے لے لی تھی۔ اس نیک دل اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ڈاکو سے ملنے کے شوق کے علاوہ ان کو کاسو کی بیوی کو رخصت کرنے کا جذبہ بھی کھینچ لایا تھا۔

کاسو کی بیوی سب سے پہلے اتری۔ بچہ اس کی گود میں تھا۔ وہ زور زور سے روتی ہوئی بھاگی اور کاسو سے ایسے چمٹ گئی جیسے آج کی فلموں کے بچھڑے ہوئے پریمی ملتے ہیں۔ یہ بے اختیار کردینے والا جذبہ تھا۔ عام حالات میں وہ دوسروں کے سامنے شوہر سے ایسے نہ ملتی۔ کاسو نے اپنے انداز سے اس کے سر کو اور گالوں کو چوما۔ فلمی انداز میں کس نہیں کیا۔ وہ روتی رہی اور اسے کوستی بھی رہی۔ ''تو ہمیں چھوڑ گیا تھا...... تیرا ستیاناس ہو...... تو نے میرا بھی خیال نہیں کیا...... اس بچے کے لیے نہیں سوچا۔''

کاسو کی آنکھوں سے بھی آنسو بہتے رہے۔ ''میرا دماغ خراب ہوگیا تھا۔ مجھے معاف کردے۔''

''تو مرجاتا تو کیا میں زندہ رہتی۔ میں نے تو تجھ سے پہلے مرنے کی کوشش کی تھی۔ پھانسی لگائی تھی خود کو مگر مر نہ سکی۔''

کاسو نے بچے کو گود میں لے کر بیوی کو الگ کیا۔ ''شامی بادشاہ کو دعائیں دے۔ اس نے بچالیا ہمیں۔''

کاسو کی بیوی ہاتھ جوڑ کے شامی کی طرف گھوم گئی۔ ''شامی بادشاہ، تم نے مجھے میرا سہاگ دے دیا۔ میں تمہیں کیا دوں۔ میرے پاس کیا ہے۔''

شامی کو بھی اس سین نے جذباتی کر دیا تھا۔ اس نے کاسو کی بیوی کے سر پر ہاتھ رکھا...... اس نے اوپر انگلی اٹھالی۔ ''جو کرتا ہے اوپر والا کرتا ہے...... چل اب دیر نہ کر......''

جذباتی میں بھی ہو گیا تھا اور میرے ساتھ راجا بھی مگر خواتین کا تو برا حال تھا...... وہ باقاعدہ رو رہی تھیں۔ جب کاسو کی بیوی ان کی طرف پلٹی تو یہ رخصتی کا روایتی سین بن گیا۔

کاسو کی بیوی نے فریال سے گلے مل کے کہا۔ ''بیگم صاحبہ...... آپ کا احسان میں ساری عمر نہیں بھولوں گی۔''

فریال نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔ ''جاؤ اللہ تمہیں خوش رکھے۔''

پھر یہی شہناز نے کہا۔ کاسو نے میرے پاؤں چھونے کی کوشش کی۔ میں نے اسے روک لیا اور گلے مل کے کہا۔ ''کاسو...... خدا نے تمہیں پھر موقع دیا ہے کہ اپنی مرضی سے زندگی گزارو ورنہ تم تو مرنے چلے گئے تھے۔ جاؤ محبت اور محنت سے خود بھی جیو اور اپنے بیوی بچوں کو بھی خوشی دو۔''

راجا اپنے ساتھ کچھ رقم بھی لے آیا تھا۔ وہ اس نے کاسو کو دینے کی کوشش کی مگر شامی نے روک دیا۔ ''اس کی ضرورت نہیں راجا صاحب...... زندگی میں یہ کاغذ کے ٹکڑے کام نہیں آتے۔ میرے پاس بہت پڑے ہیں۔''

''لیکن یہ ہم اپنی طرف سے کاسو کو دے رہے ہیں۔'' فریال نے کہا۔ ''ہم تو ان کے لیے کچھ نہیں کر سکے تھے۔ جو کیا آپ نے کیا شامی بھائی۔''

جب فریال نے بھائی کہہ دیا تو وہ ڈاکو متاثر کیسے نہ ہوتا۔ اس نے فریال کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ''اچھا بہن...... اگر تیری خوشی ہے تو......''

اب شہناز کہاں پیچھے رہنے والی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سونے کے کنگن اتارے اور کاسو کی بیوی کو پہنا دیے...... ''یہ میری نشانی...... یہ تمہیں ہماری یاد دلائے گی۔''

اس کے بعد مزید رونا دھونا ہوا اور بالآخر ہم نے باری باری سب ڈاکوؤں سے ہاتھ ملا کے انہیں رخصت کیا۔ کاسو صحت مند ہوتا تو ایک گھوڑے پر بیوی کو پیچھے بٹھا لیتا مگر وہ تو خود بیٹھنے کے قابل نہ تھا۔ ایک ڈاکو نے اسے اپنے پیچھے بٹھا کے کہا کہ اس کی کمر کو ہاتھ ڈال کے مضبوطی سے پکڑ لے۔ کاسو کی بیوی کو شامی نے اپنے ساتھ رکھا۔

ہم سب ان کو رات کی پناہ میں غائب ہوتا دیکھتے رہے۔ وہ سب سایوں کی طرح اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ کچھ دیر گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی پھر وہ بھی نہ رہی۔ اداسی کا تاثر بے حد وقتی تھا اور عارضی...... اصل خوشی اس کامیابی کی تھی جو اندر سے ابلنے کے لیے بے تاب تھی۔ ہم فتح یاب ہوئے تھے اور بجا طور پر کہہ سکتے تھے کہ یہ باطل کی رسوائی اور حق کی فتح تھی۔ ہم نے خالص انسانی ہمدردی کی بنیاد پر کاسو کی زندگی بچانے کے لیے رانا سے ٹکر لی تھی۔ خدا نے ہمیں کامیابی اس لیے بھی دی تھی کہ رانا کے غرور کو شکست ہو جو خود کو اللہ کے بندوں کی زندگی اور موت پر قادر سمجھنے لگا تھا۔

راجا نے اچانک پلٹ کے میرے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ ''وہ مارا اس غرور والے کو...... اب رانا بگاڑ لے جو بگاڑ سکتا ہے۔''

یہ بات اس نے ذرا مختلف انداز میں کہی تھی۔ فرطِ جذبات اور جوش میں وہ بھول گیا تھا کہ وہاں شریف اور معزز خواتین بھی موجود ہیں جو بہرحال ''اکھاڑنے'' کا مطلب سمجھتی ہیں۔ وہ کھی کھی کر کے ہنستی ہوئی جیپ میں سوار ہو گئیں۔ جیپ واپس ہوئی۔ مخالف سمت میں گھوڑے پر سوار کاسو کی فیملی ہر لمحہ دور ہوتی جا رہی تھی۔ ہمارے لیے یہ اطمینان ہی کافی تھا کہ اب ان کا ہر قدم محفوظ اور سلامتی کی طرف ہے۔

اپنی فتح اور رانا کی شکست کا جشن مسرت کچھ دیر جاری رہا۔ اس کا اصلی سہرا شامی کے سر باندھا گیا جس نے اپنے کردار سے سب کو متاثر کیا تھا۔ اسے ڈاکو بنانے والے حالات کچھ بھی ہوں کاسو کو بچانے کے لیے اس کا جذبہ اور اس کی جدوجہد ثابت کرتے تھے کہ مجبوری میں جرم و گناہ کی زندگی اختیار کرنے والے کا احساس زندہ رہتا ہے۔ کاسو جیسے شخص کی کیا اوقات کہ اس کی مدد کو شامی بادشاہ ایک بار احسان سمجھے اور اس کا قرضہ چکانے کی ذمے داری کو یاد رکھے۔

رات کے کھانے پر بھی یہی ذکر چلتا رہا۔ پھر اس کامیابی کے احساس سے منسلک دیگر عوامل کی بات چلی۔ راجا نے کہا۔ ''کیا رانا مان لے گا کہ اس کے غلام جھوٹ نہیں بول رہے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''اسے ماننا پڑے گا۔ غلام اتنا بڑا جھوٹ بولنے کی ہمت نہیں کر سکتے پھر محافظ اس کا اعتماد رکھنے والے لوگ ہیں۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے شامی ڈاکو اور اس

کے پورے گروہ کو دیکھا۔ ان سے بات کی۔''

راجا بولا۔ ''اس کے دل میں یہ خیال ضرور آئے گا کہ کہیں غلاموں اور محافظوں نے کاسو پر رحم کھاتے ہوئے اسے فرار نہ کرا دیا ہو۔''

''ہاں...... خیال ضرور آئے گا اور وہ بچ جانے کے لیے ان کی کھال بھی ضرور ادھیڑے گا...... اپنی ناکامی کا سارا غصہ انہی پر نکالے گا لیکن بالآخر اس سچ کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائے گا...... اسے پہلے سے علم ہو گا کہ شامی اس علاقے میں موجود ہے۔ شامی کو روپوشی اور پناہ کے لیے دوستوں کی مدد کے ساتھ پولیس کا تعاون بھی حاصل ہو گا اور اس نے پولیس کو تعاون کی اچھی قیمت بھی ادا کی ہو گی مگر پولیس دوسری طرف رانا کی خیر خواہ اور خدمت گزار بھی ہے...... انہوں نے برسبیل تذکرہ کہہ دیا ہو گا کہ سنا ہے شامی ڈاکو سندھ سے بھاگ کر پھر یہاں روپوش ہے...... آپ ذرا احتیاط رہیں......''

''ہاں...... چور کے بھی خیر خواہ کوتوال سے بھی وفادار۔''

میں نے کہا۔ ''اگر ابھی تک رانا کو یہ بات معلوم نہیں تو وہ معلوم کرا لے گا کہ میرے غلام کہتے ہیں شامی ڈاکو پھر اس علاقے میں سرگرم ہے...... اور پولیس ڈھکے چھپے الفاظ میں تصدیق کر دے گی کہ ہمیں بھی مصدقہ ذرائع سے یہ اطلاع ملی ہے مگر ابھی تک اس کے ٹھکانے کا علم نہیں ہوا۔''

فرخ بولا۔ ''کیا وہ بتائے گا نہیں کہ شامی بادشاہ نے اس کے ساتھ کیا واردات کی؟''

''نہیں...... اصل بات وہ کیسے بتا سکتا ہے۔ وہ کہہ دے گا کہ اسے بڑی حویلی کے آس پاس دیکھا گیا ہے۔'' راجا ہنسا۔

میں نے کہا۔ ''اس کے بعد رانا کے سامنے دو بڑے سوال ہوں گے۔ ایک یہ کہ شامی ڈاکو نے کاسو کو کیوں اغوا کیا؟ وہ عین وقت پر اس کی جان بچانے کیسے پہنچا اور کیوں؟ یقیناً کسی نے مخبری کی۔ ڈاکو تو ڈاکے ڈالتے ہیں اسی لیے ڈاکو کہلاتے ہیں۔ وہ کاسو جیسے مظلوم اور بے کس انسانوں کی جان بچاتے نہیں پھرتے۔ فی سبیل اللہ انسانیت کی خدمت کا یہ کارِ خیر نہیں کرتے...... انہیں ضرور کسی نے بلایا...... کاسو کے بلانے پر وہ کیوں آتے اور کاسو نہیں بلاتا بھی کیسے...... یہ چکر کسی اور نے چلایا۔''

راجا بولا۔ ''کسی اور کا مطلب نواب رفیق احمد شیرازی اور ہمنوا۔''

''بس...... وہ سوچے گا اور کوئی تعلق نکال لے گا۔ کاسو کے مسئلے پر جنگ ہمارے اور اس کے درمیان تھی۔ ہم نے بیرونی امداد حاصل کی۔ جیسے امریکی کرائے کے فوجی MERCENARIES ہر جگہ حریت پسندوں یا جمہوری قوتوں کی مدد کے لیے پہنچ جاتے ہیں۔ یہ ڈاکو ہماری مدد کے لیے آ گئے۔ اس کے لیے بے روزگاری کا زمانہ تھا۔ نواب رفیق کو کسی نے بتایا کہ شامی ڈاکو اس علاقے میں پھر موجود ہے۔ یہ بتایا کہ پہلے اس کی یہاں کتنی دہشت تھی اور اسے مشورہ دیا کہ آپ اپنی حفاظت کے اقدامات کو مزید سخت کر دیں تو اس ولایت کے پرانے نواب نے ایک سیاسی چال چلی۔ اس نے کہا کہ شامی کو بلاؤ ہم اس سے ملنا چاہتے ہیں۔ اس سے ایک خاص کام لینا چاہتے ہیں۔ شامی پہنچ گیا۔ وہ سندھ سے آیا ہے جہاں سنا ہے وڈیرا اس وقت تک وڈیرا تسلیم نہیں کیا جاتا جب تک دو چار ڈاکو نہ پال لے۔ جتنا بڑا نام اتنے بڑے ڈاکو اس کے درباری۔ اس نے سوچا ہو گا کہ اس نئے نواب کا حاشیہ بردار بننے میں فائدہ ہے۔ نواب نے اسے مال پیش کیا کہ ہمیں لوٹنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے حلیف بن جاؤ رانا رجب علی جتال کے خلاف...... اور پہلا کام اس کے سپرد یہ کیا کہ ڈراما کرو۔ پوری تیاری کے ساتھ...... کاسو کو نکال کر لے جاؤ اور پھر ایسا ہی ہوا۔ سیاسی اور جنگی چالیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔''

راجا کے ساتھ سب نے میرے تجزیے کو بڑے غور سے سنا تھا۔ اس سے حالات کی پوری تصویر واضح ہو گئی تھی۔ راجا نے کہا۔ ''تو نے بالکل ٹھیک کہا۔ رانا یہی نتیجہ نکالے گا۔ اس کی تصدیق یوں بھی ہو گی کہ کاسو کے ساتھ اس کے بیوی بچے بھی نکل گئے۔ وہ تو یہاں تھے۔ ہماری حفاظتی تحویل میں۔ وہ حویلی سے کیسے گئے؟ کیا ہم نے انہیں کہیں ڈلیور کیا یا وہ ڈاکو خود حویلی میں آئے اور نواب صاحب سے درخواست کی کہ کاسو کے بیوی بچے ان کے حوالے کیے جائیں اور نواب صاحب نے اس درخواست کو شرفِ قبولیت بخشا...... نہیں فیکے پتر...... وہ فوراً سمجھ لے گا کہ یہ ملی بھگت سے ہوا۔''

فرخ نے کہا۔ ''اگر وہ ایسا سمجھے تو اس میں ہمارا کیا نقصان ہے؟''

میں نے کہا۔ ''نقصان کیا...... فائدہ یہ ہے کہ رانا کی پریشانی میں اضافہ ہو گا۔ یہ سوچ کر کہ اب ہمیں ڈاکوؤں کے ایک گروہ کی حمایت بھی حاصل ہے۔ یہ فکرمندی ایسی ہی ہو گی جیسی بھارت یا پاکستان کی سیاسی قیادت کو اس وقت لاحق ہوتی ہے جب کوئی ایک اضافی جنگی صلاحیت حاصل کر لے...... کسی دور مار میزائل کا تجربہ ہو۔ کوئی جدید فوجی

طیارہ مل جائے۔ فوراً دوسرا پریشان ہو کے شور مچاتا ہے کہ خطے میں طاقت کا توازن نہیں رہا۔"

راجا بولا۔ "اور پھر توازن پیدا کرنے کے لیے اپنا دفاعی بجٹ بڑھا دیتا ہے۔"

"اسباب کچھ بھی ہوں۔ شکست اسے ہوگئی۔ اس پر وہ بہت تلملائے گا۔ وہ ایک کی کو جان سے مارنا چاہتا تھا۔ یہ اس کی خاندانی روایت تھی اور وہ انہیں حق سمجھتا تھا۔ ہم نے اس حق کو چیلنج کر دیا اور کاسو جیسے بے حیثیت انسان کی زندگی کے حق کی بات کی۔ ہم جیت گئے۔ یہ اس کے لیے خطرے کی بہت بڑی گھنٹی ہے۔ رانا جیسے لوگ کسی ڈاکو سے...... اژدھے اور شیر...... شاہ جنات سے اور ایٹم بم سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا حق اور انصاف کی بات کرنے والوں سے ڈرتے ہیں۔ مساوات کی بات کرنے والوں سے ڈرتے ہیں۔ جب یہ بات پھیلے گی کہ رانا صاحب ایک غلام کو سزا نہ دے سکے۔ ایک نئے زمانے کے پڑھے لکھے نواب کی وجہ سے۔ جو کاسو کی حمایت میں اٹھ کھڑا ہوا تو ان کی کتنی سبکی ہوگی۔ لوگ کہیں گے رانا صاحب کے اختیار کا زمانہ نہیں رہا...... رانا صاحب پہلے ہی خطرہ محسوس کر چکے ہیں کہ کہیں آیندہ انتخابات میں نواب رفیق احمد شیرازی ان کا حریف بن کے نہ آ جائے۔ اب انہیں کوئی شک نہیں رہے گا کہ کاسو کی حمایت ایک سیاسی کھیل تھی جس کا مقصد ان کے علاقے کے غریبوں کے ووٹ حاصل کرنے کے سوا کچھ نہیں۔"

راجا نے کہا۔ "ابھی چاہے وہ اسے ڈراما کہے یا سیاسی چال قرار دے...... مگر یار...... بالآخر ایسا ہوگا...... جب ہم اس علاقے میں خوش حالی لانے کا پروگرام شروع کریں گے۔ اسکول، اسپتال اور جدید سہولتوں سے آراستہ بستی بنائیں گے۔ غریبوں کو روزگار کے ساتھ عزت بھی دیں گے۔ تو غریب پھر رانا کو ووٹ کیوں دیں گے۔ ایسا ہے تو پھر ایسا ہی سہی۔"

فریال نے مکا لہرایا۔ "غریبوں کا نمایندہ...... نواب رفیق۔" راجا نے کہا۔ "ڈاکوؤں کا نمایندہ ...... نواب رفیق۔"

صبح ہم سب پرسکون تھے۔ کاسو کا ہمارے ذہن پر کوئی بوجھ نہیں رہا تھا۔ وہ جہاں بھی تھا ہماری ذمے داری نہیں رہا تھا اور خطرے سے بہت دور تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اب مجھے لوٹ کر لاہور میں اپنے گھر جانا چاہیے وہاں میرے والدین سخت بے چین تھے کہ میرے ساتھ ست بدھائی ہجرت کر جائیں اور اپنی بقیہ عمر اپنے جدی پشتی گھر میں بسر کریں۔ اس احساس تفاخر کے ساتھ کہ یہ حویلی اور یہ جاگیر انہی کا حق تھی جو بالآخر انہیں مل گئی۔ دادی تو واضح الفاظ میں کہہ چکی تھی کہ میں اپنے پرکھوں کی زمین میں دفن ہونا چاہتی ہوں۔

انہیں یہاں لانے سے پہلے مجھے بہت کچھ کرنا تھا۔ کسی حد تک میں حالات کو موافق کر چکا تھا مگر اس بندوبست میں کچھ دیر لگی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس تاخیر سے میرے والدین کو کچھ بدگمانی ہو رہی ہے کہ شاید میں انہیں اپنے ساتھ لانے سے گریز کر رہا ہوں...... جتنا ان کا اصرار زیادہ ہو رہا ہے میں انہیں ٹالنے کے بہانے ایجاد کرتا جا رہا ہوں۔ ظاہر ہے حقیقت یہ نہیں تھی۔ دیگر معاملات سے میں نے انہیں بے خبر رکھا تھا جن کا ان کی ذات سے براہِ راست کوئی تعلق بھی نہیں بنتا تھا۔ ان کے اور میرے درمیان اصل مسئلہ فریال تھی۔ اور میں فریال کو حویلی سے نکال سکتا تھا اور نہ اس کی موجودگی میں اپنے بزرگوں کو لانے کی ہمت رکھتا تھا۔

اس مسئلے کا حل بھی میں نے نکال لیا تھا۔ ست بدھائی آنے سے پہلے میں نے اپنا مطالبہ دادی کے سامنے رکھ دیا تھا کہ میں فوراً اور بلاتاخیر فریال سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ یہاں میں نے فریال کو قائل کر لیا تھا کہ عارضی طور پر وہ یہاں سے رخصت ہو جائے۔ دو ہفتے میں وہ باقاعدہ رخصت ہو کے یہاں آ جائے گی۔ ظاہر ہے اس انتظام سے فریال بہت خوش تھی۔

مسئلہ یہ تھا کہ یہاں سے جا کے وہ کہاں رہے گی۔ میرا گھر...... راجا کا گھر یا شہناز کا گھر اس کے لیے محفوظ نہ تھے۔ سلطان ابھی تک اس کی تلاش میں ناکام تھا مگر اس نے ہمت ہار کے تلاش ترک نہیں کی تھی...... فریال کو کسی اجنبی جگہ پر اکیلا بھی نہیں چھوڑا جا سکتا تھا چنانچہ اتفاقِ رائے فاروقی کے نام پر ہوا تھا۔ دو ہفتے وہ فاروقی کے گھر میں رہے گی اور وہیں سے اس کی رخصتی ہوگی۔

صرف راجا نے اس کی سخت مخالفت کی تھی۔ اس کے نزدیک فریال سے شادی کا واضح مطلب یہ تھا کہ آ بیل مجھے مار...... یہ سلطان کی رقابت کی آگ پر پیٹرول ڈالنے کے مترادف تھا۔ وہ دشمنی میں اندھا اور پاگل ہو کے صرف فریال کو ہی نہیں مجھے بھی نقصان پہنچا سکتا تھا۔ اس نقصان کا نقصان میرے بوڑھے والدین برداشت کرتے اور زندگی کی آخری سرحد پر کھڑی دادی اٹھاتی۔ کیا یہ سعادت مندی ہے؟ کیا نیک اولاد والدین کو ان کی تمام عمر کی قربانیوں کا یہی صلہ دیتی ہے؟ اس عمر میں وہ اکلوتے بیٹے سے محرومی کا صدمہ

اٹھائیں...... کیا یہی ان کا مقدر ہے؟

راجا کا کہنا یہ تھا کہ فریال سے شادی دراصل اقدام خودکشی ہے۔ ایسا کرنے سے پہلے مجھے سلطان کا معاملہ ختم کرنا چاہیے۔ اسے قائل یا مجبور کرنا چاہیے کہ وہ فریال پر اپنے زبردستی کے حق ملکیت سے دستبردار ہو جائے...... اور وہ نہ مانے تو پھر انتہائی قدم اٹھانا بھی جائز ہوگا۔ یعنی اس کو اپنے راستے سے ہٹا دینا۔ یہ اس سے بہتر ہوگا کہ فریال سے شادی رچا کے میں موت کو دعوت دوں۔ اپنے لیے بھی اور والدین کے لیے بھی۔ عشق ہے تو پھر حد سے گزرنے کی بھی حد کوئی نہیں۔ جو ہاتھ تمہاری محبت کی طرف اور تمہاری زندگی کی طرف بری نیت سے اٹھنے کا ڈر ہو اس ہاتھ کو کاٹ دو...... اٹھنے سے پہلے ہی کاٹ دو۔ سانپ کو پھن اٹھانے سے پہلے ہی کچل ڈالو......

راجا کا فلسفہ منطقی اور عملی تھا۔ میں اس کے درست ہونے کی حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ میں تسلیم کرنے پر مجبور تھا کہ فریال کو اپنانے کا جو راستہ میں عجلت میں اختیار کر رہا ہوں اس میں خطرہ سامنے ہے۔ اس سے بعد میں بچنے کی صورت کوئی نہیں ہوگی۔ یہ ضروری ہے کہ سلطان خود میرے راستے سے ہٹ جائے...... یا پھر میں اسے ہٹا دوں......

میں نے فریال سے آدھی بات کی تھی کہ میرے ساتھ وہ شادی کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ اب شادی ناگزیر ہے میں نے اسے اپنے اندیشوں کے بارے میں نہیں بتایا تھا کہ میں اس آغاز کے انجام سے ڈرتا ہوں...... یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ سلطان کے جھگڑے کو پہلے ختم کر دیا جائے۔ اگر میں ایسا کہتا تو وہ سمجھتی کہ میں اسے بہلا کے ٹال رہا ہوں...... چنانچہ میں نے بہتر سمجھا کہ فی الحال خاموشی اختیار کروں...... یہ بات فاروقی کے گھر میں بھی کی جا سکتی ہے۔

مجھے شہر میں بہت سے کام تھے۔ مجھے واپڈا کی عدالت میں پیش ہو کے اپنی صفائی پیش کرنی تھی کہ میں نے غیر قانونی طور پر کنڈا ڈال کے بجلی کیوں حاصل کی۔ مجھے کنکشن حاصل کرنے کے لیے واپڈا کے حکام سے ساز باز کرنی تھی۔ یہ کام رشوت اور سفارش کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ مجھے فاروقی سے کہنا تھا کہ وہ میری زمین پر قائم سائنس ریسرچ سینٹر کی جگہ خالی کرانے کے لیے قانونی کارروائی کا آغاز کرے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے گھر کے اندر کے معاملات نمٹانے تھے۔ یہ دیکھنا تھا کہ میرے فریال سے شادی کے فیصلے کا ردعمل کیا ہے۔ میرے والدین کیا کہتے ہیں۔ دادی اپنی کوشش میں کس حد تک کامیاب ہوئیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ چچا اور چچی پر اس اعلان کا کیا اثر ہوا ہے۔ مجھے جائیداد کی تقسیم کا کوئی ایسا فارمولا پیش کرنا تھا جو انہیں مطمئن کر سکے اور ان کا یہ شکوہ دور ہو جائے کہ میں نے چالاکی سے سب ہتھیا لیا۔ اس کے بعد مجھے والدین کے ساتھ ست بدھائی میں آباد ہونے کے لیے لوٹ آنا تھا۔

سوچا تو میں نے یہی تھا کہ صبح دس گیارہ بجے تک نکل جاؤں گا تو ایک دو بجے تک لاہور پہنچ جاؤں گا مگر پہلے تو مجھے راجا نے روک لیا۔ وہ صبح سے کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ نام لیے بغیر رانا رجب علی جتال کی وڈیرا شاہی پر کالم لکھ رہا تھا۔ اس میں ان تمام مظالم کا ذکر تھا جو عرصہ دراز سے اس علاقے میں کمی سمجھے جانے والوں پر توڑے جا رہے تھے۔ انہیں غلام بنا کے رکھا جاتا تھا۔ انسانیت سوز تشدد کیا جاتا تھا اور بیڑیاں ڈال کے قید میں رکھا جاتا تھا۔ جو سزا یافتہ تھے ان کے سر مونڈھ کر انہیں صرف خاکی نیکر پہنا دی جاتی تھی اور ان کی حیثیت جانوروں سے بدتر تھی۔ ایک وڈیرے نے جو صوبائی اسمبلی کی سیٹ کو اپنی آبائی جاگیر سمجھتا تھا ظلم کی نئی روایت قائم کی تھی۔ وہ باغی اور نافرمانوں کو کتوں کی طرح کتوں کے ساتھ رکھتا تھا۔ ان کے گلے میں زنجیر ڈال دی جاتی تھی۔ انہیں چاروں ہاتھوں پیروں پر چلنے کے لیے مجبور کیا جاتا تھا۔ وہ کتوں کے ساتھ انہی کی خوراک کھاتے تھے اور انہی کی طرح بھونکتے تھے۔ علاقے میں یہ بات بھی مشہور تھی کہ ایک کتے کی ہلاکت کا ذمے دار ایک غلام کو سمجھا گیا تو بطور سزا اسے کتے کے ساتھ زندہ گاڑ دیا گیا۔ آخر میں یہ کہ...... دروغ برگردن راوی......

یہ کالم میں نے راستے میں پڑھا...... بلاشبہ یہ رانا کے لیے خطرے کی دوسری گھنٹی تھی کہ اب اس کے خلاف محاذ کھول دیا گیا ہے۔ جب یہ کالم چھپے گا تو موضوع سخن بھی بنے گا۔ کچھ کھوج لگانے والے نام کی کھوج لگانے کے لیے پنڈ جتال تک پہنچ جائیں گے۔ فی الحال ان کو منہ بند رکھنے کی قیمت ادا کی جا سکتی ہے مگر کچھ سر پھرے اصول پرست ایسے بھی ہوتے ہیں جو صحافت کو مشن سمجھتے ہیں اور بکنے سے انکار کر دیتے ہیں۔

میں نے یہ کالم فریال کو سنایا تو وہ متفکر ہوگئی۔ "غالباً اس کو پنگا لینا کہا جاتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "آف کورس...... پنگا لینا آج کی ضرورت ہے۔ ہمارے شاعر مشرق نے فارسی میں فرمایا تھا...... جو میں اردو میں پیش کرتا ہوں۔ کہ زمانہ میرے ساتھ بنا کے نہیں رکھتا تو زمانے سے لڑ...... ہم یہی کر رہے ہیں۔"

''لڑنا بہت ضروری ہے؟''

میں نے کہا۔ ''ہماری امن پسندی کو رانا نے ہماری کمزوری سمجھ لیا تھا۔ چنانچہ اب طاقت کا مظاہرہ ضروری ہے..... وہ عقلمندی سے کام لے گا تو مصلحت اور مصالحت کا راستہ اپنائے گا لیکن اس کا امکان کم نظر آتا ہے کیونکہ صدیوں کی حاکمیت کا خناس بہرحال دماغ سے آسانی سے نہیں نکلتا..... سو پیاز اور پھر سو جوتے نوش فرمانے کے بعد رانا صاحب ان کی عقل ٹھکانے آجائے گی مگر اس وقت تک ہمارا دماغ خراب ہوجائے گا..... انشا اللہ۔''

''پھر تم کیا کرو گے؟ وہی جو رانا کرتا ہے؟''

میں نے غرور سے کہا۔ ''آ ہو کڑیے..... پھر ہم سیاست میں قدم رنجہ فرمائیں گے۔ الیکشن لڑیں گے اور اسمبلی میں پہنچ جائیں گے۔ ایک ہوشیار لوٹے کی طرح ہم لڑھکتے رہے تو تم دیکھو گی بیس تیس سال میں ہم کہاں پہنچتے ہیں۔ پرائم منسٹر ہاؤس میں یا ایوان صدر.....''

فریال ہنس پڑی۔ ''بس..... واپس آجاؤ حقائق کی دنیا میں مسٹر شیخ چلی..... یہ سب تمہارے بس کی بات نہیں ہے اور میری بات غور سے سنو۔''

وہ اچانک سنجیدہ ہوگئی۔ ''ایک بات بتاؤں تمہیں..... جواب تک میں نے چھپائی تھی تم سے.....''

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ ''کیا تم کوئی فلمی ڈرامائی انکشاف کرو گی؟''

وہ سیریس رہی۔ ''سلطان نے ست بدھائی فون کیے تھے۔''

''فرض کرو میں اچھل پڑا..... ڈرائیونگ کرتے ہوئے مشکل ہے۔''

وہ بگڑنے لگی۔ ''میں مذاق نہیں کررہی ہوں..... پہلی بار فون ریسیو کیا تھا فرخ نے..... اس نے کہا کہ مجھے فریال سے بات کرنی ہے تو فرخ کچھ پریشان ہوا..... میں وہیں موجود تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا تو میں نے اشارے سے سمجھایا کہ جواب نہ دے۔ اس نے فون بند کردیا۔ میں نے پوچھا کہ کون تھا تو کہنے لگا کہ آواز میں نے پہلے نہیں سنی مگر تھا کوئی بدتمیز..... میں نے کہا کہ دوبارہ فون کرے تو صاف کہہ دینا کہ یہاں کوئی فریال نہیں..... فون پھر آیا اور فرخ نے وہی کہا جو میں نے بتایا تھا کہ یہ رانگ نمبر ہے مسٹر..... کیوں بار بار فون کررہے ہو..... میں نے اس کے ہاتھ سے فون لے لیا..... دوسری طرف سے سلطان کی آواز آرہی تھی..... وہ کہہ رہا تھا کہ جھوٹ بولتے ہو تم..... مجھے معلوم ہے کہ وہ یہاں ہے یہ اسی کا فون نمبر ہے۔''

''تمہارے نمبر پر تو اس نے پہلے بھی فون کیے تھے اور میں نے اسے ایک اسٹوری سنادی تھی کہ فون مجھے نیروبی کے ایر پورٹ پر ایک خاتون نے دیا تھا۔''

''ہاں..... مگر وہ اناڑی نہیں ہے۔ اس نے یقین کہاں کیا ہوگا..... اس ٹوہ میں ہوگا کہ فون سے سراغ مل جائے۔''

میں نے کہا۔ ''یہ اتنا آسان نہیں ہوتا۔''

''اس کے لیے کچھ مشکل نہیں۔''

''فرخ نے بھی مجھے نہیں بتایا۔'' میں نے کہا۔

''اسے میں نے منع کردیا تھا کہ تمہیں پریشانی ہوگی لیکن اس کے بعد میں نے اپنا فون آف رکھا..... مجھے ڈر تھا کہ وہ بار بار فون کر کے سگنل ٹریس کرالے..... کال ریکارڈ کرا لے..... تم جانتے ہو موبائل فون کمپنیوں کی مدد سے پولیس یہ کام کرسکتی ہے..... اغوا برائے تاوان کے مجرم اور دہشت گرد پکڑ لیے جاتے ہیں.....''

میں نے کہا۔ ''یہ بات بیک وقت باعث تشویش بھی ہے میرے لیے اور باعث اطمینان بھی..... اب پوچھو وہ کیسے..... خیر میں پوچھے بغیر ہی بتا دیتا ہوں..... تشویش کا پہلو یہ ہے کہ ایسا واقعی ہوسکتا ہے..... موبائل فون کال کا ریکارڈ آسانی سے ہر ایک کو نہیں ملتا مگر اس کا ملنا ناممکن نہیں..... تم نے بڑی دوراندیشی کا ثبوت دیا کہ فون بند کردیا..... اب اسے بند ہی رکھنا۔''

اس نے فون میرے حوالے کردیا۔ ''تم رکھو اسے اپنے پاس۔''

میں نے کہا۔ ''جب ہم پل پر سے گزریں گے تو اسے غرق دریا کردیں گے مگر مس فریال..... ممکن ہے جو نقصان ہونا تھا ہوگیا ہو۔ فون کا سراغ لگانے کے لیے تو ایک کال بھی کافی ہوتی ہے..... تم بروقت ست بدھائی سے نکل آئی ہو۔ اب وہ وہاں پہنچا تو مایوسی کے سوا اس کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔''

''یہ تو ہوئی باعث تشویش بات اور وہ باعث مسرت کیا بات تھی؟''

میں نے کہا۔ ''اس فون کال سے ثابت ہوا کہ اسے تمہاری ست بدھائی میں موجودگی کا یقین نہیں تھا۔ یقین ہوتا تو وہ فون کر کے تصدیق نہ کرتا۔ خود پہنچ جاتا۔ اگلے دو ہفتے میں وہ آئے گا تو ہم اس کا استقبال کریں گے..... حویلی کا گوشہ گوشہ دکھائیں گے کہ اپنا اطمینان کرلے۔''

''اور وہ تمہاری عدم موجودگی میں پہنچ گیا پھر؟''

''پھر کیا..... راجا اور فرخ ہیں نا..... وہ کہیں گے کہ دوربین سے دیکھو یا خوردبین سے..... فریال نام کی کوئی چیز

نظر آئے تو ہمیں بھی بتانا...... مجھے امید ہے اس کے بعد وہ ادھر کا رخ نہیں کرے گا لیکن میں یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ ہمت ہار کے بیٹھنے والا نہیں ہے۔''

جب ہم لاہور پہنچے تو دو بج چکے تھے۔ میری خواہش تھی کہ میں لنچ پر اپنے گھر پہنچ کے سب کو حیران کر دوں مگر مجھے دیر ہو گئی تھی۔ ایک پرانے دستور کے مطابق وہ دن کا کھانا نماز ظہر کے بعد اور رات کا کھانا عشا کی نماز پڑھتے ہی کھا لیتے تھے۔

فریال نے کہا۔ ''لنچ پر تم مجھے کہاں انوائٹ کر رہے ہو؟''

''دیکھو...... یہ پاکستان ہے لندن نہیں...... اور نہ تم میری گرل فرینڈ ہو۔''

''کیا مطلب...... یہاں منگیتر یا شادی کے بعد بیوی کو انوائٹ نہیں کیا جاتا۔ سارا رومانس ختم ہو جاتا ہے؟''

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ''یس...... شادی رومانس کی موت ہوتی ہے...... عورت یا محبوبہ ہو سکتی ہے یا بیوی۔''

''بکواس فرماتے ہیں آپ۔''

''ایک شاعر فرماتا ہے۔

عاشقی قید شریعت میں جب آ جاتی ہے
جلوۂ کثرت اولاد دکھا جاتی ہے

وہ ہنسنے لگی۔ ''پھر تو ہمیں شادی کرنی ہی نہیں چاہیے ابھی۔''

میں کہتے کہتے رک گیا کہ حالات کا تقاضا بھی یہی ہے۔ کسی غیر متوقع صورتِ حال سے بچنے کے لیے میں نے اچھے ہوٹل اور وہ ریسٹورنٹ چھوڑ دیے جہاں کسی کے ملنے کا امکان تھا۔ فریال کو پیزا پسند تھا۔ میں اسے پیزا ہٹ لے گیا جہاں سہ پہر تین بجے آنے والے کم تھے...... چار بجے تک ہم ایک الگ تھلگ کونے میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔

پھر میں فریال کو فاروقی کے گھر لے گیا۔ اس وقت گھر پر اس کی بیوی کے سوا کوئی نہ تھا۔ فاروقی صبح نو بجے نکلتا تھا تو سہ پہر تک کورٹ میں مصروف رہتا تھا۔ کورٹ سے وہ سیدھا اپنے آفس چلا جاتا تھا۔ لنچ آفس میں کرتا تھا اور پھر اپنے چیمبر ہی میں کچھ دیر آرام کر لیتا تھا۔ پانچ بجے سے اس کے کلائنٹ آنا شروع ہو جاتے تھے۔ اس کی واپسی رات نو بجے سے پہلے نہیں ہوتی تھی۔

فاروقی کی بیوی ہمیں دیکھ کر حیران بھی ہوئی اور خوش بھی۔ اس کی شادی کو گیارہ سال ہو چکے تھے لیکن وہ اولاد سے محروم رہی تھی اور اب اسے نوشتۂ تقدیر سمجھ کے صبر کر چکی تھی۔ اچھی بات یہ تھی کہ اسے شوہر کی طرف سے کوئی خطرہ نہ تھا۔ اسے آزمانے کے لیے خود بیوی نے ایک بار یہ کہا تھا کہ وہ دوسری شادی کر لے۔ اس بات پر فاروقی اتنا ناراض ہوا تھا کہ اس نے مہینا بھر بیوی سے بات نہیں کی تھی اور گھر آنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ وہ آفس میں سو جاتا تھا اور کسی کام سے دن میں گھر جانا پڑے تو کام کر کے لوٹ جاتا تھا۔ بیوی کے لیے اس کو منانا مشکل ہو گیا تھا۔ تاہم ایک عورت کی حیثیت سے شوہر کی ناراضی نے اسے بڑا سکون بھی دیا تھا۔ اسے یہ یقین حاصل ہو گیا تھا کہ کوئی عورت اس کے لیے خطرہ نہیں بن سکتی۔

''آپ لوگ اچانک کیسے؟'' وہ بولی۔ ''آئیں...... اندر آئیں۔''

میں نے کہا۔ ''میں یہ امانت آپ کے سپرد کرنے آیا تھا۔ اس کی رسید بنا دیں۔ مجھے ایسی ہی ملنی چاہیے۔''

وہ ہنسنے لگی۔ ''بھائی صاحب...... ہم امانت میں خیانت کر سکتے ہیں؟ وہ بھی آپ کے ساتھ...... لیکن آپ باہر سے نہیں جا سکتے...... چائے تو پئیں۔''

میں نے کہا۔ ''آج نہیں بھابی...... میں آؤں گا پندرہ دن بعد۔ مکھڑے پہ سہرا ڈالے...... بینڈ باجے کے ساتھ...... گھوڑے پر سوار ہو کے۔''

''نہیں! اچھا جی...... گویا دولہا دلہن نے سب طے کر لیا اور اب باراتیوں کو مطلع کرنے لگے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''نہیں بھابی...... دلہن جلدی میں سسرال پہنچ گئی تھی پہلے...... اسے واپس میکے لایا ہوں۔''

''اچھا جی...... آپ نے تو مجھے دلہن کی ماں بنا دیا یعنی اپنی ساس تسلیم کر لیا...... کیا میں اتنی پرانی ہوں؟ یعنی اولڈ......؟''

میں نے کہا۔ ''اولڈ از گولڈ...... رات کو سنار سے میرا سلام کہنا...... آج نہیں تو کل اس سے میں ضرور ملوں گا...... گواہ وہی ہوگا...... چور کا گواہ ڈاکو۔''

وہ پھر ہنسی۔ ''اور قاضی؟''

میں نے سر پر ہاتھ مارا...... ''اوہ...... اسے تو میں بھول ہی گیا تھا...... دماغ میں یہ رہا کہ میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی...... خیر اب میں چلتا ہوں...... آپ دونوں کا تو غائبانہ تعارف ہے نا...... باقی خود کرائیں...... خدا حافظ۔''

فریال کی پہلے فاروقی کی بیوی سے ملاقات نہیں ہوئی تھی مگر مجھے یقین تھا کہ جب وہ مل بیٹھیں گی تو ان کے

حقیقت میں اس سے زیادہ بے تکلفی آ جائے گی جتنی کہ مجھ میں اور فاروقی میں تھی...... میں خود کچھ عرصہ قبل فاروقی کو نہیں جانتا تھا لیکن اب اسے اپنے بے تکلف اور قابل اعتماد دوستوں میں شمار کر سکتا تھا...... اس کی بیوی سے بھی خود صرف پردہ رہا تھا لیکن وہ عادت کی اتنی اچھی تھی کہ ہمارے درمیان تکلف نہیں رہا تھا۔

جب میں گھر پہنچا تو شام ہو رہی تھی...... دروازہ رابعہ نے کھولا اور کچھ دیر مجھے پہچاننے کی ایکٹنگ کرتی رہی......

''جی کس سے ملنا ہے؟''

میں نے سر کھجا کے کہا۔ ''غالباً میں یہاں رہتا ہوں۔''

وہ بولی۔ ''ہاں مجھے بھی آپ کی صورت شناسا لگتی ہے۔ کہیں آپ وہ لندن پلٹ نواب تو نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''کزن...... اتنی جلدی بھول گئیں تم مجھے؟''

''جلدی...... تمہیں شرم آنا چاہیے...... جلدی آنے کا کہہ کر ضرور گئے تھے مگر آج آ رہے ہو...... خیر آ جاؤ......'' وہ اس کے پیچھے ہٹ گئی۔

ابا مجھے سامنے ہی مل گئے...... میرے سلام کے جواب میں انہوں نے دعا دی اور بولے۔ ''بھئی بہت دن لگا دیے؟''

میں نے کہا۔ ''کیا کروں ابا...... وہاں کے جھنجھٹ ہی ایسے ہیں...... آپ ساتھ چل کر دیکھیں گے تو اندازہ ہو جائے گا۔''

''ہم تو آس لگائے بیٹھے ہیں کب سے...... تمہاری اماں کہتی تھیں کہ چھوڑو انتظار...... بس چلتے ہیں سامان اٹھا کے...... اپنا ہی گھر ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اس میں کیا شک ہے...... آپ جاتے...... کہاں ہیں اماں؟''

''وہ نماز پڑھنے کھڑی ہوئی ہیں...... تم دادی کو سلام کر لو۔''

دادی نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ ''تو آ گیا نمونے...... کچھ بعد میں کرنا پہلے جوتی دے مجھے...... تیری کچھ تواضع کروں......''

میں نے جوتی ان کے ہاتھ میں پکڑا دی اور سر جھکائے بیٹھ گیا۔ ''دادی...... آپ کی مار میرے لیے آپ کی دعا سے بڑھ کے ہے...... خوش قسمتی ہے میری۔''

وہ میرے سر پر ہاتھ پھیرنے لگیں...... ''پہلے تو ولایت سے نہیں آتا تھا۔ آیا ہے تو باہر نہ جانے کن چکروں میں پڑا ہوا ہے۔ آنکھیں ترستی رہتی ہیں تیری صورت دیکھنے کے لیے۔''

میں نے کہا۔ ''بس دادی اب آ گیا ہوں تو آپ کو لے کر ہی جاؤں گا۔''

''ہاں رفیق...... اب اور انتظار نہیں ہوتا مجھ سے...... لے چل مجھے اپنے ساتھ...... کہیں ایسا نہ ہو مجھے کوئی اور تجھ سے پہلے لے جائے۔''

میں سمجھ گیا تھا کہ کسی اور سے ان کی مراد فرشتہ اجل ہے مگر میں نے بات کو پلٹ دیا۔ ''یہ بات تو آپ دادا سے کہتی ہوں گی...... شادی سے پہلے۔''

انہوں نے میری کمر پر زور سے دھپ رسید کیا۔ ''اپنی دادی سے مخول کرتا ہے نمونے......''

میں نے ان کی گود میں سر رکھ دیا۔ ''دادی نہیں آپ میری گرل فرینڈ ہیں۔''

''گرل فرینڈ...... وہ کون ہوتی ہے؟'' وہ سادگی سے بولیں۔

میں نے کہا۔ ''آج کل لڑکے جن لڑکیوں سے دوستی کرتے ہیں...... محبوبہ......''

انہوں نے میرے ایک اور دھموکا رسید کیا۔ ''بے شرم...... میں تیری دوست ہوں...... یہ بتا اتنے دن کہاں لگا دیے۔ کب لے کر چلے گا تو مجھے وہاں؟''

''توبہ...... کتنا ارمان ہوتا ہے لڑکیوں کو...... اپنے سسرال جانے کا۔''

خلاف توقع انہوں نے مجھے نہیں مارا۔ ''سچ کہا تو نے...... وہ سسرال ہی تو ہے میرے لیے...... جلاوطنی میں ساری زندگی گزار دی۔ ان کے ساتھ ایک بار بھی اپنے گھر نہیں گئی...... جاتی بھی کیسے...... ایک صدی کا بن باس اب ختم ہوا ہے تو جی چاہتا ہے اڑ کے چلی جاؤں۔''

میں نے کہا۔ ''بس دادی...... سامان باندھ لیں اور تیار ہو جائیں چلنے کے لیے۔''

وہ جیسے خواب میں بولتی رہیں۔ ''اللہ کا کتنا بڑا احسان ہے مجھ پر...... مجھے اس مٹی میں دفن ہونا نصیب ہوگا۔''

میں نے مصنوعی خفگی سے کہا۔ ''دادی...... مت کریں ایسی باتیں...... اچھی اچھی باتیں کریں۔ آپ کو وہ گھر آباد کرنا ہے۔ اپنی دلہن لے جانی ہے اور اپنی دلہن کی دلہن اور پھر اپنے بچوں کے بچوں کے بچوں کو گود میں کھلانا ہے۔ آپ جائیں گی تو وہ آئیں گے۔''

دادی میرے سر پر ہاتھ پھیرتی رہیں۔ ''ارے نمونے اتنا وقت نہیں ہے میرے پاس...... اتنی خوش قسمت کہاں

ہوں میں۔''

میں اٹھ کھڑا ہوا...... ''میں ذرا اماں سے مل لوں۔''

اماں نماز سے فارغ ہی ہوئی تھیں کہ میں نے سلام کیا اور مصلے پر ان کے پاس بیٹھ گیا۔ انہوں نے کہا۔ ''فرصت مل گئی تمہیں گھر آنے کی۔ دنیا کے کام میں ایسے الجھے ہو ماں باپ بھی یاد نہیں رہے۔'' انہوں نے پیار بھری ناراضی کا اظہار کیا۔

میں نے کہا۔ ''دنیا میں رہ کے دنیا کے کام چھوڑے تو نہیں جا سکتے اماں ...... اور پھر ان کاموں میں مجھے الجھایا بھی تو آپ نے ہی ہے۔''

''یہ تو ٹھیک کہا تم نے۔ ہم خود ہی الجھ گئے پتا نہیں کیسے چکروں میں ...... یہ حویلی اور جاگیر نہیں تھی تو دل کا سکون تو تھا۔'' انہوں نے مصلے سمیٹا۔

میں نے کہا۔ ''آپ کچھ پریشان ہیں اماں؟''

انہوں نے بات ٹال دی۔ ''پریشانیاں تو زندگی کے ساتھ لگی ہوئی ہیں بیٹا۔''

میں نے کہا۔ ''بس اب خوش ہو جائیں کہ...... بعد مغرب ہم سب چلے جائیں گے ست بدھائی ...... اپنی حویلی میں ...... ٹھاٹھ سے رہیں گی حاکم بن کے ...... معلوم ہے وہاں کیا کہتے ہیں لوگ مجھے ...... نواب صاحب ......''

اماں مسکرائیں۔ ''تو چاہتا ہوگا؟''

میں نے کہا۔ ''تمہاری قسم اماں۔ میں نے تو بہت منع کیا ...... مگر نہ جانے کیسے ہر ایک کی زبان پر یہ نام چڑھ گیا ...... اب آپ چل کے دیکھیں گی تو حیران رہ جائیں گی۔ کایا پلٹ گئی ہے اس گھر کی ...... رنگ روغن اور مرمت کا کام چل رہا ہے۔ حویلی کو جھاڑ پونچھ کے چمکا دیا گیا ہے باغ صاف ہو گیا ہے ...... پھول پودے لگائے جا رہے ہیں ...... بہت جلد فوارہ بھی چلنے لگے گا ...... ہر کام کے لیے نوکر چاکر ہیں ...... بجلی لگ گئی ہے ......''

میں نے دیکھا کہ اماں کے چہرے پر مسکراہٹ کا رنگ بدل گیا ہے ...... پہلے یہ رنگ خفگی کا تھا ...... پھر کچھ مایوسی اور آزردگی بھی شامل ہو گئی مگر اب اس مسکراہٹ میں پرمسرت خوابوں کے رنگ نمایاں تھے ...... ابھی تک مجھے کسی کے رویے سے اندازہ نہیں ہوا تھا کہ میرے مطالبے کے حق میں دادی کی وکالت کا نتیجہ کیا نکلا ہے۔ ابھی خود میں یہ ذکر چھیڑنا نہیں چاہتا تھا۔

چچی کچھ دیر بعد اتر کے آئیں تو رابعہ سب کے لیے لاؤنج میں چائے لگا رہی تھی۔ خلاف معمول وہ بڑی پرتپاک مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف آئیں۔

''لو مجھے پتا ہی نہیں ...... میرا شہزادہ آیا ہے۔'' انہوں نے میرا ماتھا چوم کے میرے سر کی بلائیں لیتے ہوئے کہا۔ ''اور کسی نے بتایا بھی نہیں ہے۔''

ابا نے کہا۔ ''آپ تو مغرب کی نماز کے بعد وظیفہ پڑھتی ہیں بھابی ...... اسی لیے کسی نے ڈسٹرب نہیں کیا۔''

''اب ایسا بھی کیا ...... میں تو وظیفہ چھوڑ بھاگی چلی آتی۔ میرے کانوں میں اس کے بولنے کی آواز آئی ...... میں نے سمجھا کان بج رہے ہیں ...... رفیق یہاں کہاں ...... اس کا خیال آتا تھا دن میں کئی بار ...... تو یوں لگتا تھا جیسے وہ گھر میں ہی کہیں بول رہا ہے ...... قسم اللہ کی روز اسے خواب میں دیکھتی رہی۔''

چچی کا یہ پیار اور ان کے رویے کی یہ گرمجوشی میرے لیے ایک غیر معمولی تجربہ تھی جس نے مجھے چونکا دیا ...... محبت میں واری صدقے جانے کا یہ انداز اتنا مصنوعی تھا کہ مضحکہ خیز لگتا تھا۔ اس سے رابعہ کی پوزیشن خراب ہو رہی تھی۔ اماں کا موڈ بگڑ گیا تھا مگر ابا مسکرا رہے تھے۔ چچی ہمیشہ سے بدزبان تھیں ...... بہت کم کسی کی تعریف کرتی تھیں۔ عیب جوئی اور غیبت میں ان کی برابری کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ ان کا بغض اور حسد مشہور تھا۔ وہ عام بات بھی طنزیہ انداز میں کرتی تھیں اور جب تلخ بولتی تھیں تو ان کی زہر افشانی سے چھوٹا بڑا کوئی محفوظ نہ رہتا تھا ...... یہی وجہ تھی کہ جب وہ کسی سے پیار بھرے میٹھے لہجے میں مخاطب ہوتی تھیں تو سامنے والا فوراً محتاط ہو جاتا تھا کہ معلوم نہیں اس کے پیچھے کیا غرض پوشیدہ ہے۔

چچی کی زبان اسی طرح چلتی رہی ...... انہیں بالکل پروا نہ تھی کہ کوئی کیا سوچ رہا ہے اور دیکھنے والوں کی نظر کیا کہہ رہی ہے۔ ان کی بے تکان جاری رہنے والی بات میں نہ کوئی مفہوم تھا اور نہ ربط ...... اس کا واحد مقصد مجھے اپنی بے پناہ محبت کا یقین دلانا تھا اور مجھے قائل کرنا کہ وہ مجھے میرے والدین سے بھی زیادہ چاہتی ہیں اور سگی اولاد سے زیادہ عزیز سمجھتی ہیں ...... اس گفتگو میں دیوانگی کے واضح آثار تھے۔ صاف نظر آتا تھا کہ نہ انہیں اپنے خیالات پر کنٹرول ہے اور نہ زبان پر ......

بالآخر اماں نے کہا۔ ''بھابی کسی اور کو بھی بولنے دو۔''

وہ چمک کے بولیں۔ ''اے لو ...... میں نے کیا کسی کی زبان پکڑی ہے۔ وہ اتنی دیر سے آیا ہے جب میں نماز پڑھ رہی تھی تو تم ہی باتیں کر رہی تھیں۔ کیا میں نے ٹوکا ...... میرا بھی تو دل تڑپ رہا تھا اسے دیکھنے کو۔ اس سے باتیں

کرنے کو ...... اب تم تو حق جتاؤ گی کہ میرا بیٹا ہے ...... تمہارا بیٹا ہے تو کیا میرا کچھ نہیں ہے؟''

رابعہ نے برہمی سے کہا۔ ''اماں چپ ہو جاؤ۔''

وہ رابعہ پر چلانے لگیں۔ ''تو چپ کر اور جا یہاں سے ...... کتنی خوشی کا موقع ہے ...... رفیق آیا ہے مجھے ساتھ لے جانے کے لیے ...... میں خود جا کے حویلی سجاؤں گی ...... اس کی شادی جو ہو رہی ہے ...... تم دیکھنا میں گانے گاؤں گی ...... ناچوں گی۔''

ابا ایک دم اٹھے اور کمرے میں چلے گئے۔ چچی کی زبان رک نہیں جا سکتی تھی ...... جس موضوع پر میں ابھی بات کرنے سے گریز کر رہا تھا وہ انہوں نے چھیڑ دیا تھا اور میری پریشانی بڑھ گئی تھی۔ چچی کا یہ رویہ ایک ذہنی صدمے کا منفی ردعمل تھا۔ یہ خوشی نہیں دکھ کا جذبہ تھا جو مسخ ہو کے سامنے آ رہا تھا۔

بدمزگی سے بچنے کے لیے اماں بھی چائے کی پیالی چھوڑ کے اٹھ گئیں ...... رابعہ نے ایک بار پھر ماں کو روکنے کی ناکام کوشش کی۔ شرمندگی اور غصے سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا مگر ہنگامہ وہ بھی نہیں چاہتی تھی اس نے آنکھ سے مجھے اشارہ کیا کہ میں بھی چلا جاؤں ...... میں نے عجلت میں چائے کا آخری گھونٹ حلق میں انڈیلا اور اٹھ کھڑا ہوا ...... اگر میں چچی کی زبان رکنے کا انتظار کرتا تو یہ موقع مجھے نہ ملتا۔

میں نے کہا۔ ''مجھے ایک ضروری فون کرنا ہے۔'' اور چچی کا جواب سنے بغیر بھاگا۔ ایک پرلطف شام کی چائے کا ستیاناس ہو گیا تھا ...... ایک دوسرے سے گپ شپ میں اچھا وقت گزارنے کی حسرت دل میں رہ گئی تھی پھر بھی میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ صورتِ حال زیادہ ناخوشگوار نہیں ہوئی ...... سب نے میدان چھوڑ کے بھاگ لینے میں ہی عافیت جانی ...... چچی کو زبردستی روکنے کی کوشش کرتے تو نہ جانے کیا ہوتا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے سکون کا سانس لیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ چچی کے جذباتی بحران کا یہ سلسلہ کہاں جا کے ختم ہوگا ...... ناکامیاں اور مایوسیاں ہر شخص کی زندگی میں آتی ہیں۔ حادثات انسان کے خوابوں کو چکنا چور کر دیتے ہیں اور تقدیر کی ہر ناانصافی اس کو خون کے آنسو رلاتی ہے مگر وہ سب کچھ برداشت کرتا ہے۔ چچی کے اعصاب اس جذباتی بحران میں شکست سے دوچار ہو چکے تھے۔ ان کے دماغ کا توازن اتنا بگڑ گیا تھا کہ وہ پاگل پن کی سرحد کے قریب تھیں۔

مجھے یہ احساس بھی تھا کہ اپنی بدبختی کا ذمے دار وہ مجھے سمجھتی تھیں۔ حقیقت اس کے برعکس تھی مگر وہ حقیقت کے ادراک کی صلاحیت سے محروم ہو چکی تھیں۔ انہوں نے اپنے طور پر فیصلہ کر لیا تھا کہ رابعہ کی شادی مجھ سے ہوگی۔ یہ سوچے بغیر کہ دوسروں کی زندگی پر اپنے فیصلے مسلط کرنے کا ان کے پاس کوئی اختیار ہی نہیں۔ بفرض محال وہ رابعہ پر زبردستی کرتیں تو مجھ پر کیسے کرتیں یا ان کے سازشی ذہن نے اپنے پلان کی کامیابی کو نوشتۂ تقدیر سمجھ لیا تھا چنانچہ ناکامی نے ان کی بے بنیاد امیدوں کے محل کو کھنڈر کر دیا۔

دوسرا صدمہ جس نے ان کا دماغ الٹا اس دولت جائیداد سے محرومی کا تھا جس کے بارے میں ان کو یقین کامل تھا کہ میں نے چالاکی اور عیاری سے ہتھیا لی ورنہ اس پر ان کا بھی برابر کا حق تھا۔ رابعہ کے ذریعے انہوں نے اس کا حق ملکیت حاصل کرنے کی جو کوشش کی وہ بھی ناکام ہو گئی تو اس صدمے نے ان کو بالکل ہی پاگل کر دیا۔

ابھی میں ان کی افسوسناک حالت کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ رابعہ اوپر آ گئی ...... اس کا چہرہ اترا ہوا تھا اور یہ اندازہ کرنا مشکل نہ تھا کہ اس کی اپنی ماں سے سخت جھڑپ ہوئی ہے ...... وہ میرے پاس بیٹھ گئی۔

میں نے کہا۔ ''رابعہ ...... یہ رونی شکل کیوں بنا رکھی ہے؟''

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''رفیق ...... میں کیا کروں؟''

میں نے اس کو اپنے قریب کر لیا اور اس کے آنسو پونچھے۔ ''ٹیک اٹ ایزی رابعہ ...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''کچھ بھی ٹھیک نہیں ہو رہا ہے کزن ...... تم نے اماں کی حالت دیکھی۔ دن بدن بگڑتی جا رہی ہے۔'' وہ میرے کندھے پر سر رکھ کے رونے لگی۔ ''میں ان کو نہیں سنبھال سکتی ...... کہیں ایسا نہ ہو انہیں پاگل خانے میں داخل کرانا پڑے۔''

میں نے اسے تسلی دی۔ ''نہیں رابعہ ...... وہ ٹھیک ہو جائیں گی۔''

''کیسے ٹھیک ہو جائیں گی ...... جب سے دادی نے بتایا ہے کہ تمہاری شادی فریال سے طے ہو گئی ہے وہ ہوش و حواس کھو بیٹھی ہیں ...... تین راتوں سے وہ سوئی نہیں ہیں ...... کھانا پینا چھوڑ رکھا ہے۔''

''تم نے ڈاکٹر کو نہیں دکھایا؟''

''میں انہیں اٹھا کے تو نہیں لے جا سکتی ...... خواب آور دوا لکھوانے گئی تھی۔ ڈاکٹر نے انکار کر دیا۔ وہ سمجھا ہوگا کہ

ماں کا۔ نام لے کر میں خود استعمال کرنا چاہتی ہوں...... محبت میں ناکامی پر خودکشی میرے جیسی لڑکیاں ہی تو کرتی ہیں۔ میں نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب اگر مجھے مرنا ہوگا تو گھر میں کھیاں مچھر مارنے والی دوا بھی ہے اور تیزاب بھی...... وہ پی لوں گی...... کہنے لگا کہ مریض کو یہاں لے آؤ...... میرے پاس تو گھر جانے کا ٹائم نہیں ہے...... پھر میں نے تایا سے کہا اور انہوں نے کسی ڈاکٹر سے لکھوا کے گولیاں بھی لا دیں...... وہ اماں نے پھینک دیں۔"

"آخر تمہارے ابا کیا کر رہے ہیں؟"

"وہی جو کرتے آئے ہیں...... الٹے سیدھے عمل...... جھاڑ پھونک اور وظیفے...... پرانے گھر میں زیادہ وقت گزارتے ہیں اماں نے ان سے بہت غلط کام کرائے تھے...... سفلی عمل اور جادو ٹونے...... حاصل کچھ بھی نہیں ہوا۔ اماں نے انہیں بھی ہدف بنالیا۔ دھوکے باز اور فراڈ کہا...... وہ سخت بددل ہوگئے ہیں اب گھر بھی کم ہی آتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "فکر مت کرو کزن...... اب میں ہی سب ٹھیک کروں گا کیونکہ یہ ساری خرابی بہرحال میری وجہ سے ہوئی ہے۔"

"ایسا کیوں کہتے ہو...... تم نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔"

میں نے کہا۔ "ہاں...... میں نے واقعی نہیں کیا مگر وجہ تو میں ہی بنا۔ ان کے ایک دکھ کا علاج میں کرسکتا ہوں...... میں آدھی جائداد ان کے نام کردوں گا۔ ورنہ یہ بوجھ میرے ضمیر پر رہے گا کہ میں نے وہ بھی نہیں کیا جو میرے اختیار میں تھا۔"

"اب اس کا کوئی فائدہ نہیں۔"

میں نے کہا۔ "میں انہیں بھی اپنے ساتھ ست بدھائی لے جاؤں گا...... تمہیں بھی اور اپنے والدین کو بھی...... وہاں ڈاکٹر شہناز ہے...... وہ چچی کا علاج کرسکتی ہے۔ ان کی ایسی حالت نہیں کہ کسی ماہر نفسیات کی ضرورت پڑے...... کچھ دن میں وہ نارمل ہوجائیں گی۔"

وہ دانتوں سے اپنے ناخن کترتی رہی۔ "تم اپنے مسائل میں اضافہ نہ کرو۔"

میں نے کہا۔ "کیا وہ میرے اپنے نہیں ہیں؟ کیا تمہاری پریشانی دور کرنے کے لیے مجھے کچھ نہیں کرنا چاہیے؟ چچا نذیر بھی تو اسی ماں کے بیٹے ہیں...... دادی کا دل ان کی حالت پر کتنا دکھی ہوگا...... یہ جاگیر کیا چیز ہے کزن...... کل تک نہیں تھی...... آج ہے اور کل پھر میری نہیں ہوگی......"

وہ مجھے دیکھتی رہی...... "تمہارا دل بہت بڑا ہے۔"

میں نے کہا۔ "یہ جو ہمارے بزرگ ہیں...... ان کی کتنی زندگی رہ گئی ہے؟ آخر کتنے دن یہ ہمارے ساتھ ہوں گے......؟ دادی کی عمر دیکھو...... اپنے اور میرے والدین کی عمر دیکھو...... کیا فرق پڑتا ہے اگر حق ملکیت کے کاغذات میں میری جگہ ان دونوں بھائیوں کا نام لکھوایا جائے...... رہے گی تو وہ ہماری...... پہنچے گی بالآخر ہمارے پاس...... جو کرنا ہے ہم ہی کریں گے۔"

"میں تمہارے ساتھ ہوں کزن...... میری نیک خواہشات تمہارے ساتھ ہیں۔"

میں نے اسے تھپکی دی۔ "ناؤ چیئر اپ...... اللہ نے چاہا تو ہم مل کے سب ٹھیک کرلیں گے ست بدھائی جا کے۔ اب یہ بتاؤ تمہارے معاملات کہاں تک پہنچے ہیں...... وہ آیا تھا...... تم سے بھی ملا تھا۔"

رابعہ نے نظر جھکا کر کہا۔ "وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں نے کہا کہ ابھی تو حالات ہی ایسے نہیں...... انتظار کرو۔"

"پھر اس نے کیا کہا؟"

"کچھ نہیں...... وہ بولا کہ انتظار تو کر ہی رہا ہوں میں...... اور ساری عمر کرسکتا ہوں لیکن ایسا نہ ہو......" وہ بات کرتے کرتے خاموش ہوگئی۔

میں سمجھ گیا کہ وہ کیا بات ہوسکتی ہے جو زبان پر لانے کی اس میں اخلاقی جرأت نہیں ہے۔ فرخ کو فکر یہ ہوگی کہ کہیں ان کی ایک جذباتی غلطی کے نتائج ظاہر ہونے کا وقت آگیا تو رابعہ کی ماں طوفان کھڑا کردے گی اور میں بلاوجہ اس کی لپیٹ میں آجاؤں گا۔

میں نے کہا۔ "کوئی پریشانی کی بات تو نہیں ہے نا۔"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "ابھی تک تو نہیں ہے۔ ہوگی تو میں اس سے نمٹ لوں گی۔"

میں نے کہا۔ "کزن! کوئی بے وقوفی مت کرنا۔ دیکھو...... ہم اچھے دوست ہیں۔ دوست ایک دوسرے کے رازدار بھی ہوتے ہیں مددگار بھی۔ وعدہ کرو تم جو قدم اٹھاؤ گی مجھے پہلے بتاؤ گی۔"

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کچھ دیر وہ اپنی پریشانیوں کا ذکر کرتی رہی، جو کسی اور نے نہیں خود اس کے ماں باپ نے پیدا کر رکھی تھیں۔ جب دادی نے یہ اعلان کیا کہ رفیق فوری طور پر فریال سے شادی کرنا چاہتا ہے تو حسب توقع اس کے مختلف ردعمل سامنے آئے۔ اماں نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار یوں کیا کہ مجھے پتا تھا یہ ہوگا۔ اس لڑکی نے ایسا جادو کیا ہے

میرے بیٹے پر کہ وہ اس کی قید سے نکل ہی نہیں سکتا۔ اس کے پیچھے پیچھے وہ لندن پہنچ گئی اور وہ پاکستان آیا تو یہاں بھی آگئی۔ اماں کی رائے فریال کے بارے میں ابھی اچھی نہ تھی اگر درمیان میں وہ سلطان سے منگنی کا ڈراما نہ رچاتی تو شاید اماں کے لیے بھی قابل قبول رہتی۔

فریال نے تو سلطان کی فلم میں ہیروئن کا چانس پکا کرنے کے لیے مجھے بتا کے منگنی پر بھی آمادگی ظاہر کردی تھی۔ میری مخالفت کو اس نے اہمیت نہیں دی تھی کہ میں تو اسے الو بنا رہی ہوں...... فلم ریلیز ہونے تک قریب نہیں پھٹکنے دوں گی اور اس کے بعد چھٹی کردوں گی۔ سلطان جیسے پیشہ ور شکاری کے ساتھ یہ کھیل سب کو بہت مہنگا پڑا۔ فلم تو بنی نہیں فریال پھنس گئی۔ سلطان نے اسے انا کا مسئلہ بنالیا۔ اس سے فریال کے لیے اور میرے لیے جو پریشانی کے اسباب پیدا ہوئے سو ہوئے میرے والدین کی فریال کے بارے میں رائے خراب ہوگئی۔

میں انہیں کیسے قائل کرتا کہ فریال نے بے وقوفی ضرور کی تھی لیکن وہ آج بھی میرے لیے وہی فریال ہے جو پہلے تھی۔ انہیں معلوم تھا کہ فلمی دنیا میں جانے والی لڑکیاں کیسی ہوتی ہیں اور وہاں ان کے ساتھ کیا ہوتا ہے چنانچہ ان کا یقین کامل تھا کہ فریال بھی ویسی ہی ہے۔ اس نے مجھ پر ڈورے ڈالے...... مجھ سے پہلے نہ جانے کس کس کو بے وقوف بنایا ہوگا پھر سلطان کے ساتھ چلی گئی اور دھکے کھا کے اور سب کچھ لٹا کے واپس آئی تو پھر مجھے پھانس لیا۔ اماں کی نظر میں تو ان کا بیٹا بہت سادہ لوح نیک اور احمق تھا۔ ابا کا نظریہ بھی مختلف نہ تھا۔ وہ مجھے تو بے وقوف نہیں سمجھتے تھے لیکن دنیا کو سمجھتے تھے...... فریال جیسی عورتوں کے آگے بڑے بڑے سورما اور سیانے چت ہوجاتے ہیں۔ ان کے پاس ان گنت مثالیں تھیں۔

ایسی لڑکی کس طرح ان کی بہو بن سکتی تھی۔ میں نے فریال کے معاملے میں جتنی صفائی پیش کی۔ اس کی مجھ سے وفاداری اور کردار کی مضبوطی کے حق میں جتنے دلائل دیے، ان کے ذہن نے قبول نہیں کیے۔ ان کا یقین راسخ ہوگیا کہ یہ فریال کا جادو ہے جو سر چڑھ کے بول رہا ہے۔ میری مت ماری گئی ہے۔ مجھے کچھ نظر آ ہی نہیں سکتا کیونکہ میرے دل اور دماغ پر تو اس کے جادو کا اثر ہے۔

مجھے نہیں معلوم کہ دادی نے میری حمایت کیوں کی...... یا تو واقعی انہوں نے میری بات کا یقین کرلیا تھا۔ یا پھر وہ مجبور تھیں۔ میں سمجھتا ہوں دونوں باتیں تھیں۔ دادی اس عمر میں بھی سوچنے سمجھنے کی حیرت انگیز صلاحیت رکھتی تھیں اور بعض اوقات اپنی معاملہ فہمی سے حیران کردیتی تھیں۔ وہ خاموشی سے صورت حال پر نظر رکھتی تھیں اور تجزیہ کرتی رہتی تھیں پھر وہ کوئی نتیجہ اخذ کرتی تھیں یا کوئی حل نکالتی تھیں۔ کوئی مشورہ دیتی تھیں یا فیصلہ صادر کرتی تھیں وہ غلط نہیں ہوتا تھا۔ ایسا بارہا ہوا تھا...... بعد کے حالات نے انہیں درست ثابت کیا تھا۔

ان کے قائل ہونے کی دوسری وجہ بھی بہت مضبوط تھی...... ہر دادا دادی کی طرح اولاد کی اولاد کے آگے وہ بے بس ہوجاتی تھیں۔ اصل سے سود پیارا ہوتا ہے۔ یہ بات بلاوجہ مشہور نہیں ہوئی۔ عملی زندگی میں خود میں نے اس کے ان گنت مظاہرے دیکھے تھے۔ وہ ماں باپ جو اولاد کی تربیت کے معاملے میں سخت گیر تھے پوتے پوتیوں کے معاملے میں ایسی جذباتی کمزوری کا شکار ہوتے تھے کہ دیکھنے والے حیران ہوتے تھے اور بچوں کے والدین پریشان کہ دادا دادی لاڈ پیار میں ان کے بچوں کو بگاڑ رہے ہیں۔

چنانچہ دادی نے میرا کیس لڑا تھا اور سب کی مخالفت کے باوجود اپنا فیصلہ صادر کردیا تھا کہ رفیق کو تم لوگ غلط سمجھ رہے ہو...... وہ ایسا ہوتا تو ولایت میں اسی لارڈ کی بیٹی سے بیاہ رچا کے بیٹھ جاتا۔ اپنا فائدہ دیکھتا تو تمہارے کہنے پر سب کچھ چھوڑ کے نہ آتا۔ وہ جو کر رہا ہے ٹھیک کر رہا ہے۔ تم صرف سنی سنائی پر اعتبار کرکے فریال کے خلاف ہوگئے ہو۔ جو رفیق کہہ رہا ہے۔ مانتے کیوں نہیں۔ اور آخری بات اس ٹیپ کا بند...... اس کی سعادت مندی ہے کہ تمہاری رضا چاہتا ہے۔ خوشی خوشی اجازت نہیں دو گے تو وہ کرے گا اپنی مرضی۔ پھر کیا کرو گے؟ قبول تو کرنا ہی پڑے گا۔

اور نتیجہ یہ کہ اماں ابا کو ماننا پڑا۔ اگر میں یہ کہوں کہ وہ بھی مجبور تھے تو غلط نہیں ہوگا لیکن چچا اور چچی کے لیے یہ ایٹم بم کا دھماکا ثابت ہوا جس کے بعد جاپا کو شکست ہوگئی تھی۔ دادی اور چچی کے درمیان ساس بہو کا روایتی رشتہ ابتدا سے تھا۔ کتے بلی کے بیر والا۔ چچی کی فطرت ایسی ہی تھی چنانچہ ان کے درمیان بات چیت بن تھی۔ میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد اگر انہیں بالواسطہ طور پر ایک دوسرے کو مخاطب کرتے دیکھا تو برا بھلا کہنے کے لیے۔ جلی کٹی سنانے کے لیے اور زہر افشانی کے لیے...... دادی کا پلہ بھاری تھا۔ ان کی جنگ میں وہی محاورہ صادق آتا تھا۔ سو سنار کی ایک لوہار کی۔ دادی لوہار والا وار کرتی تھیں۔ چچا ہمیشہ کے دبو تھے۔ جائز کو جائز اور غلط کو غلط کہنے کا حوصلہ ہی نہ رکھتے تھے چنانچہ کان لپیٹ کے بھاگ لیتے تھے۔

رابعہ نے مجھے بتایا کہ اس فیصلے کے خلاف بھی چچی نے

بہت زور لگایا۔ چچا بھی بہت بولے۔ ماں کو اور بھائی کو سمجھاتے رہے کہ رونا پڑے گا سر پر ہاتھ رکھ کے...... وہ لڑکی اس گھر کی بہو بن کے آگئی تو سب کو دو کوڑی کا کر دے گی مگر فیصلہ پھر بھی ہو گیا تو وہ بے بس ہو گئے۔ خون کے گھونٹ پی کر چپ ہو جانے کے سوا ان کے پاس چارہ بھی کیا تھا۔ نہ بیٹا ان کا نہ معاملہ ان کا۔

انہوں نے ابتدائی صدمے کو یوں برداشت کیا جیسے کوئی سزائے موت سے پہلے فیصلے کو برداشت کرتا ہے۔ سمجھتا ہے بازی ختم ہوئی اور اب کرنے کو کچھ نہیں رہا مگر پھر امید سہارا دیتی ہے تو ناامیدی بے معنی لگتی ہے۔ یہ تو ماتحت عدالت کا فیصلہ ہے۔ بڑا وکیل اسے ہائی کورٹ میں ختم کرا دے گا۔ چچا اور چچی نے بھی مقابلہ جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔

انہوں نے سب سے پہلے رابعہ پر دباؤ ڈالا کہ وہ ان کا ساتھ دے۔ دلیل وہی تھی کہ ہم تو سب تیرے بھلے کے لیے کر رہے ہیں۔ چچی کی حکمتِ عملی انتہائی گھٹیا سوچ پر مبنی تھی مگر وہ سمجھتی تھیں کہ جنگ اور محبت میں سب جائز ہے۔ کیا اخلاقی اور کیا غیر اخلاقی۔ رابعہ مجھے پھانسے...... بدنام کرے...... بلیک میل کرے اور فریال سے بدظن کرے...... رابعہ نے پھر انکار کر دیا تو چچی نے دوبارہ شیطانی قوتوں سے رجوع کیا۔ کوئی صورت ایسی ہو کہ میرا دل فریال سے پھر جائے۔ میں رابعہ پر فریفتہ ہو جاؤں۔ فریال پاگل ہو جائے...... مر جائے...... اسے کینسر ہو جائے یا وہ ٹرک کے نیچے آ جائے...... ہر کام کے لیے ایک سفلی عمل تھا مصیبت یہ تھی کہ فریال تک رسائی نہ تھی۔ ورنہ چچی اسے زہر دینے میں بھی تامل نہ کرتیں۔

چچی نے صرف اپنے پیر شوہر ہی پر تکیہ نہیں کیا۔ وہ شہر میں نہ جانے کون کون سے عاملوں کے پاس چکر لگاتی رہیں...... جادو ٹونے تعویذ گنڈے لاتی رہیں اور بے وقوف بن کر لٹتی رہیں...... مگر الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا...... چچی پاگل پن کی سرحد تک پہنچ چکی تھیں اور چچا مایوس ہو کے گھر سے ہی بھاگ گئے تھے۔ چچی نے ان کو زندگی میں پہلے بھی کون سے سکھ دیے تھے...... اب اٹھتے بیٹھتے طعنہ دینے لگیں کہ وہ فراڈ ہیں۔ ان کے عملیات اور وظیفے جھوٹے ہیں۔ پیری ایک ڈھونگ ہے۔ وہ اپنے لیے اور اپنی بیٹی کے لیے کچھ نہیں کر سکے تو دوسروں کے لیے کیا کریں گے۔ چچا نے فرار ہو کے خانقاہ میں گوشہ نشینی اختیار کر لی۔

رابعہ کی رپورٹ بڑی جامع تھی۔ اس نے میرے والدین کو کچھ نہیں بتایا تھا مگر جو گھر میں ہو رہا تھا سب دیکھ رہے تھے اور اس کا سبب بھی جانتے تھے۔ رابعہ نے مجھے خبردار کیا کہ میں محتاط رہوں۔ اپنے پاگل پن میں چچی کسی بھی انتہا تک جا سکتی ہیں ابھی ہم باتیں کر رہی رہے تھے کہ نیچے سے اماں نے کھانے کے لیے بلا لیا۔ میں نے محسوس کیا کہ جانتے بوجھتے سب لوگ پھر سے اصل موضوع پر بات کرنے سے کترا رہے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ کوئی بھی کھانے کی میز پر ایک ناخوشگوار بحث میں الجھنا نہیں چاہتا تھا۔

ابا مجھ سے ست بدھائی کے بارے میں پوچھتے رہے کہ کیا پروگریس ہے اور میں انہیں پلان سمجھاتا رہا۔ میں نے تمام مسائل کا ذکر گول کر دیا۔ مخالف حالات کی کوئی بات نہیں کی اور اپنی باتوں سے حوصلہ افزا تاثر قائم کیا کہ سب اچھا ہے اور مزید بہتر ہو گا۔ سننے والے بھی ''انشاءاللہ'' سے میرا حوصلہ بڑھانے کی باتیں کرتے رہے اور جو کچھ ہم کر چکے تھے اس پر ماشاءاللہ اور الحمدللہ کہتے رہے۔ یہ ایک طے شدہ حکمتِ عملی تھی۔ وہ سب مجھ سے فرداً فرداً اکیلے میں بات کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ اجلاس عام میں صورتِ حال بگڑ جانے کا ڈر تھا حد تو یہ ہے کہ چچی بھی نارمل نظر آئیں...... یوں لگتا تھا جیسے ان پر کسی دورے کا اثر تھا جواب گزر گیا ہے تو وہ نارمل ہو گئی ہیں۔

میں اناڑی نہیں تھا۔ ایک منجھے ہوئے سیاست داں کی طرح میں نے اپنے سارے پتے سنبھال کر رکھے ہوئے تھے اور ان کو سوچ سمجھ کے استعمال کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ میں نے کسی کو یہ نہیں بتایا تھا کہ میں نے ست بدھائی ڈیولپمنٹ فنڈ میں کتنے پیسے جمع کرائے ہیں اور وہ کہاں سے آئے تھے۔ اس پنڈورا باکس کو چھیڑنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ میں نے اپنے تمام ترقیاتی منصوبوں کی کامیابی کے لیے مالی وسائل کے ذرائع بتا دیے تھے۔ کچھ فارمنگ کریں گے...... جنگلات کے ٹھیکے ہوں گے...... عمارتی لکڑی ملے گی۔ فرنیچر کے کارخانے ہوں گے...... بینکوں سے فنانس حاصل کریں گے وغیرہ وغیرہ۔

کھانے کی میز پر چچا نہیں تھے مگر ابھی کھانا ختم نہیں ہوا تھا کہ وہ اچانک نمودار ہو گئے۔ مجھے شک تھا کہ انہیں میری آمد کی اطلاع دی گئی ہو گی۔ اس کی تصدیق خود چچا نے کر دی۔ ''بھئی ماشاءاللہ اپنے رفیق میاں آئے ہیں...... ہمیں اطلاع ملی تھی۔''

چچی نے فوراً کہا، ''تمہارے مؤکلوں نے خبر دی ہو گی۔''

اگر اس بات میں طنز اور تمسخر کا کوئی پہلو تھا تو چچا نے سے نظر انداز کر دیا۔ ''ہاں بھئی...... پتا چل ہی جاتا ہے ہمیں۔''

میں نے نوٹ کیا کہ صوفی چچا کا حلیہ کچھ زیادہ ہی صوفیانہ ہو گیا ہے۔ وہ اپنی ڈاڑھی کو تراش خراش کر کے رکھتے تھے مگر اب وہ توجہ سے محروم نظر آتی تھی۔ بال ان کے پہلے بھی بڑے تھے۔ اب وہ ان کو پٹے بنانے کے موڈ میں تھے لیکن سب سے بڑی تبدیلی ان کے لباس میں آئی تھی۔ انہوں نے ایک سبز جبہ پہن لیا تھا۔ کسر صرف گلے میں رنگین منکوں والے ہار اور بالاؤں کی تھی ورنہ وہ روایتی چلے والے ملنگ نظر آتے۔ شاید اب انہوں نے پیری مریدی کے روحانی کاروبار کو بڑھانے اور زیادہ وقت دینے کا فیصلہ کیا تھا اور اس کے لیے یہ گیٹ اپ ایک ضرورت تھی۔

اب کورم پورا تھا چنانچہ میں نے بازی کھیلنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے موقع پاتے ہی کہا۔ ''صوفی چچا...... سنا ہے آپ بہت مصروف ہو گئے ہیں؟''

''ہاں میاں...... تھان کے قریب پہنچ کے گھوڑا بھی تیز دوڑنے لگتا ہے۔ دنیاوی زندگی کے سفر کی منزل قریب ہے تو آخرت کے سفر کے لیے زادِ راہ کی طلب بڑھ گئی ہے۔'' انہوں نے صوفیانہ زبان اور لہجے میں ایک متاثر کرنے والا جواب دیا۔

میں نے کہا۔ ''نہیں چچا...... یہ سب نہیں چلے گا...... آپ کو ہم سب کے ساتھ ست بدھائی چلنا ہے۔''

اس سے پہلے کہ میری بات کا کوئی ردِعمل سامنے آتا ابا نے کہا۔ ''رفیق میرے ساتھ آؤ...... مجھے تم سے ضروری بات کرنی ہے۔''

اس کے ساتھ ہی وہ کھڑے ہو گئے تھے چنانچہ مجھے بھی اٹھنا پڑا۔ میری طرح باقی لوگوں کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ ابا مجھے ٹوک سکتے تھے اور نہ میری بات کی مخالفت کر کے برائی مول لینا چاہتے تھے۔ انہوں نے بڑی ہوشیاری سے محفل بھی برخواست کر دی تھی۔ ظاہر ہے میری عدم موجودگی میں باقی لوگ آپس میں کوئی بات جاری نہیں رکھ سکتے تھے......

کمرے میں پہنچ کے ابا نے کہا۔ ''اگر کوئی بات کرنے سے پہلے تم باپ سے مشورہ کر لو گے تو کیا تمہاری شان گھٹ جائے گی؟''

میں سمجھ گیا کہ وہ کتنے خفا ہیں ورنہ وہ اس لہجے میں بات نہ کرتے۔ میں نے کہا۔ ''اباجی...... ایسا تو میں سوچ ہی نہیں سکتا۔ آپ کی مرضی اور منشا کے خلاف کوئی قدم اٹھاؤں۔''

انہوں نے کہا۔ ''بیٹھو......'' اور خود بھی میرے سامنے بیٹھ گئے۔

میں نے کہا۔ ''کیا میری بات غلط تھی؟''

''رفیق...... کیا تم دیکھ نہیں رہے...... گھر کا کیا ماحول ہو رہا ہے؟'' اباجی نے ایک گہری سانس لے کر غصے پر قابو پایا۔

میں نے کہا۔ ''میں اسی کو ٹھیک کرنا چاہتا ہوں۔''

''ایسے؟ تم تو اس ماحول کو اپنے اور ہمارے ساتھ یہاں سے ست بدھائی لے جانا چاہتے ہو...... یہ چاہتے ہو کہ وہاں بھی ہم سکون سے نہ رہیں۔''

میں نے کہا۔ ''میں تو چاہتا تھا کہ چچا اور چچی کی رنجش دور ہو جائے۔ ان کی شکایت کا ازالہ ہو جائے۔''

''وہ کیسے؟...... کیا تم وہ کر سکتے ہو...... جو وہ چاہتے ہیں...... رابعہ سے شادی کرو گے...... بولو؟''

میں نے کہا۔ ''آپ جانتے ہیں یہ ناممکن ہے۔''

''میں جانتا ہوں پھر یہ کیا عذاب مول لے رہے ہو اپنے لیے اور ہم سب کے لیے...... خدا کے لیے کچھ عقل سے کام لو......!''

میں نے کہا۔ ''اباجی آپ میری بات سن لیں۔''

''بات کیا سنوں...... دادی سے کیا کہہ کر گئے تھے۔ تم...... اور کر کیا رہے ہو؟ ہمارے ساتھ ایسا مت کرو...... ہم پہلے ہی بہت دباؤ...... تمہاری کسی بات کو نہ ماننا ہمارے اختیار میں پہلے بھی نہیں تھا...... پھر یہ پریشر TACTIC کس لیے...... تم نے دادی کو استعمال کیا اپنی بات منوانے کے لیے......''

میں نے کہا۔ ''آئی ایم سوری اباجی...... آپ کو ایسا نہیں سوچنا چاہیے میرے بارے میں۔ دراصل مجھ میں ہمت نہیں تھی آپ سے بات کرنے کی...... دادی کو میں استعمال کروں...... پریشر ڈالنے کے لیے...... اتنا ناخلف اور گرا ہوا نہیں ہوں میں...... مجھے رابعہ نے گھر کے حالات کی پوری رپورٹ دے دی ہے میں نے چچا سے جو کہا وہ حالات پر قابو پانے کی ایک کوشش تھی۔''

''مگر ان کے ساتھ جانے سے حالت مزید خراب ہوں گے۔''

میں نے کہا۔ ''چچا اور چچی کے دو مسائل ہیں...... رابعہ کا مسئلہ میرے اختیار سے باہر ہے لیکن میں سمجھتا ہوں اس کی بنیاد دوسرے مسئلے پر ہے۔ ان کو صدمہ ہے کہ جائداد پر آدھا حق ان کا بھی تھا۔ وہ میں نے غصب کر لیا...... رابعہ کو ذریعہ بنا کے وہ اپنا حق لینا چاہتے تھے۔''

''پھر تو سب انہی کا ہو جاتا۔''

''میں نے کسی کا حق غصب نہیں کیا مگر میں کسی کی بددعا

بھی نہیں لینا چاہتا...... مجھے کوئی ہوس نہیں اس جائداد کی۔ چچا نذیر آپ کے بھائی ہیں آپ دونوں ایک ہی ماں کے بیٹے ہیں...... بہت سوچ بچار کے بعد میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اپنے نام کچھ نہ رکھوں۔ نہ حویلی نہ جاگیر......"

"کیا مطلب؟" ابا چونکے۔ "تم کہیں واپس جانے کا تو نہیں سوچ رہے ہو؟"

میں نے کہا۔ "جی نہیں...... ہر چیز ویسی ہی رہے گی جیسی ہے۔ بس میں چاہتا ہوں کہ حق ملکیت آپ دونوں کے نام ہو جائے۔ نام سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہمارا سب کچھ ہمارا ہی رہتا ہے۔ جاگیر کا انتظام چلانا نہ آپ کے بس کی بات ہے نہ چچا کے...... جو کام جیسے ہو رہا ہے ہوتا رہے گا۔"

ابا نے خوش ہو کے کہا۔ "رفیق...... یہ تو تم نے میرے دل کی بات کی۔ میں خود تم سے کہتا کہ وہ تھوڑے بہت سے مطمئن نہیں ہوں گے۔ ان کا حصہ انہیں دے دو۔ ہمارے پاس پھر بھی بہت ہوگا لیکن اس کے لیے جو طریقہ تم اختیار کر رہے ہو...... اس سے مجھے اتفاق نہیں......"

میں نے کہا۔ "آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"رفیق...... جذباتی فیصلے ہمیشہ نقصان کا باعث ہوتے ہیں۔" ابا جی نے زندگی بھر کی عادت کے مطابق کلاس روم لیکچر کے انداز میں سمجھانا شروع کیا۔ "تمہاری نیت کے خلوص کی میں قدر کرتا ہوں۔ بلاشبہ دادی بھی یہ بات سن کر بہت خوش ہوں گی کہ تم نے خاندان میں نفاق ختم کرنے کے لیے بہت فراخ دلی کا ثبوت دیا۔ سب کو متحد کرایا اور ایک گلہ کر دیا...... لیکن یہ جو تم سوچ رہے ہو کہ تمہارے منصوبے اسی طرح چلتے رہیں گے۔ یہ تمہاری خام خیالی ہے۔"

میں نے کہا۔ "اس میں سب کا فائدہ ہی ہوگا۔"

"دیکھو...... میں اپنے بھائی کو اچھی طرح جانتا ہوں...... بیوی نے اس کی حیثیت صفر کر دی ہے...... یہ جو پیری مریدی کا دھندا ہے نا...... اگر مجھ سے پوچھو تو یہ ایک فراڈ ہے...... ایک منفی ردعمل ہے دوسروں سے وہ عزت اور اہمیت حاصل کرنے کی جو اسے گھر میں کبھی نہ ہوئی۔ کام اس نے زندگی میں جم کے کوئی نہیں کیا۔ کچھ تو تعلیم کی کمی اس کی وجہ تھی مگر ایک وجہ کام چوری کی عادت بھی تھی۔ اس کا دماغ ادھر چل گیا۔ جہاں محنت کم ہو اور آمدنی زیادہ...... فراڈ کے ہر کاروبار کی بنیاد ایسی ہی ہوتی ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے وہ ست بدھائی نہیں جائیں گے۔ اپنا یہ دھندا نہیں چھوڑیں گے؟"

"مشکل ہے...... مگر اپنا حصہ وہ ضرور لے گا۔"

"پھر تو اور اچھا ہے...... آپ ہی مالک کل ہوں گے۔" میں نے کہا۔

"مجھے تو تم اس جھمیلے میں مت ڈالو...... جو میرا ہے وہ تمہارا ہی ہے اس کی ملکیت لے کر مجھے کیا ملے گا لیکن دوسری طرف یہ ہوگا کہ عملی طور پر مالک مختار ہو گی تمہاری چچی...... سب سے پہلے تو وہ کھنڈت ڈالے گی تقسیم کے وقت...... وہ ہر چیز اپنی مرضی کی مانگے گی...... یہ ذہن میں رکھو۔ وہ ہمیں دو...... آدھی زمین کے ساتھ وہ آدھی حویلی بھی مانگے گی۔"

میں نے کہا۔ "حویلی تقسیم نہیں ہو سکتی۔"

"اسے ایک بہانہ ہاتھ آ جائے گا فساد کا...... چلو یہ بھی چھوڑو اگر آدھے کی مالک وہ بن گئی تمہارے صوفی چچا کی جگہ...... تو اس بات کی کوئی گارنٹی ہے کہ وہ اپنے حصے کی آدھی زمین کو ٹھکانے لگا کے واپس شہر نہیں آئے گی؟ پھر کیا ہوگا تمہارے ترقیاتی پروگرام کا؟"

میں نے فکرمندی سے کہا۔ "یہ شرط رکھی جا سکتی ہے۔"

ابا نے نفی میں سر ہلایا۔ "ملکیت ہمیشہ غیر مشروط ہوتی ہے۔ یہ میرا گھر ہے تو میں اس کا جو چاہوں کروں...... اس کو بیچتے وقت کیا میں خریدار کو پابند کر سکتا ہوں کہ وہ اسے کبھی نہ بیچے یا کرائے پر نہ اٹھائے خود رہے...... تمہارا سارا پروگرام چوپٹ ہو جائے گا رفیق...... اور فرض کرو وہ زمین فروخت نہیں کرتے...... تمہارے ترقیاتی پروگرام میں شامل رہتے ہیں...... تو ہر قدم پر وہ اپنی ٹانگ اڑائے گی۔ ذرا سوچو...... اگر تمہارے ساتھ برابر کا اختیار رکھنے والی چچی جیسی عورت ہو۔ تو کیا تم کام کر سکتے ہو؟"

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

"مالک تو ہوں گے تمہارے چچا...... مختار کل ہو گی اس کی جاہل اور فتنہ انگیز بیوی...... وہ تو تمہیں وہاں سے بھاگنے پر مجبور کر دے گی...... کام تم خاک کرو گے...... جو شرانگیزی یہاں ہے ست بدھائی میں شروع ہو جائے گی۔"

میں نے کہا۔ "واقعی یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔"

"اب وہ آ گئے تمہارے صوفی چچا...... تو ہو سکتا ہے وہ اپنا پیری مریدی کا دھندا وہاں بھی شروع کر دیں۔ پھر تمہارا کمیونٹی ڈیولپمنٹ پروگرام تو گیا چولہے میں...... وہاں قوالیاں عرس اور نذر نیاز کے اجتماع ہوں گے...... تم سوچ رہے ہو اسکول اور اسپتال اور ماڈل ولیج بنانے کی...... کارخانے اور ڈیم تعمیر کرنے کی......"

میں نے کہا۔ "آپ نے تو بروقت مجھے خطرے سے آگاہ کر دیا ابا جی...... بتایئے اب میں کیا کروں؟"

"تم ان کو آمدنی میں سے حصہ دو...... بس...... نہ جائداد تقسیم ہو گی نہ حویلی۔ تمہارے کہنے کے مطابق یہ مکان میں نذیر کو دے دوں گا...... ہاں اگر تم چاہو تو رابعہ کو پارٹنر بنا لو...... اس سے مجھے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا...... ابھی تو اخراجات درپیش ہیں...... آمدنی ابھی کہاں...... تم محنت کرو گے تو وسائل پیدا ہوں گے۔ رابعہ تمہارا ساتھ دے سکتی ہے۔"

"مجھے بعض اوقات بڑی حیرت ہوتی ہے۔ رابعہ کسی طرح ان کی بیٹی نہیں لگتی۔"

"اس میں ہماری خاندانی صفات آئی ہیں۔ اب میں کیا کہوں کہ اس بات کا ہم سب کو کتنا افسوس ہے۔ تمہاری دادی کو بھی ماں کو بھی اور مجھے بھی۔ وہ تمہاری مثالی شریک حیات ثابت ہوتی۔ مگر اس کی ماں کی وجہ سے یہ ممکن نہ ہوا۔ وہ تمہاری زندگی عذاب کر دیتی۔ خیر...... اب جو قدم اٹھاؤ سوچ سمجھ کے۔ تمہارا دوست فاروقی بڑا اچھا وکیل ہے۔ اس سے مشورہ کر لو...... کوئی ایسا معاہدہ ہو کہ تمہارا مقصد بھی پورا ہو جائے...... ان کو حق مل جائے مگر ان کی مداخلت کا ڈر نہ رہے...... تم نے رابعہ کو پارٹنر بنایا تو وہ رابعہ کے ذریعے دخل دے گی۔ کم از کم اس کی کوشش ضرور کرے گی......"

میں نے کہا۔ "رابعہ سے وہ کچھ نہیں منوا سکتی۔"

"تم ماں باپ کو رابعہ کے ساتھ رہنے سے تو نہیں روک سکتے۔ اس عورت کے شر سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے اسے دور رکھو۔ رابعہ کی شادی بھی بالآخر ہو گی۔ اس کے حصے کے فوائد اس کو تمام عمر حاصل ہوں گے۔ یہ بھی ذہن میں رکھنا کہ رابعہ شادی کے بعد خود مختار نہیں ہو گی۔ اس کے اختیارات شوہر استعمال کرے گا۔ جو بھی ہو۔ معلوم نہیں وہ بلحاظ فطرت کیسا ہو۔ دو چار سال بعد تمہارے لیے نیا مسئلہ کھڑا ہو جائے......"

اس رات جتنا میں نے ابا جی کی باتوں پر غور کیا اتنا ہی ان کی دور اندیشی کا قائل ہوتا گیا۔ ان کے مشورے میں عمر کا تجربہ شامل تھا جو کسی غیر ملکی اعلیٰ تعلیمی ڈگری سے حاصل نہیں ہوتا۔ ان کی باتوں میں مشاہدے کی دانائی تھی اور عملی استدلال تھا جبکہ میں جوش اور جذبات سے مغلوب ہو گیا تھا۔ یہ بہت اچھا ہوا کہ میں نے اپنے کسی فیصلے کا اعلان نہیں کیا تھا۔ اس معاملے میں فاروقی کی رائے ضروری تھی لیکن بنیادی نکتہ یہ تھا کہ میں جاگیر کی تقسیم اور کسی قسم کی حصے داری کے چکر میں نہ پڑوں...... ابا جی نے یہ نکتہ بہت واضح کر دیا تھا۔ جتنا چاہو دو مگر اپنی خود مختاری کو متاثر نہ ہونے دو ورنہ تمہارے سارے پروگرام دھرے رہ جائیں گے۔

صبح میری آنکھ تو جلدی کھل گئی تھی۔ اماں مجھے روکتی رہ گئیں مگر میں نے کہا کہ ناشتا میں فاروقی کے ساتھ کر لوں گا۔ اس کے کورٹ جانے سے پہلے میں اسے نہ پکڑتا تو پھر اس سے شام کو دفتر ہی میں ملاقات ہوتی...... دفتر میں کلائنٹ اسے گھیرے رہتے تھے اور مجھے اطمینان سے اپنے ذاتی معاملات ڈسکس کرنے کے لیے رات تک اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرنا پڑتا۔

وہ کرسی پر ٹانگیں سمیٹ کر بیٹھا ہوا اونگھ رہا تھا۔ صبح بیڈ ٹی پیے بغیر اس کی آنکھ ہی نہیں کھلتی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ خوش ہوا۔ اس نے ہاتھ ملا کے کہا۔ "آؤ بھئی نواب صاحب...... چائے تو پیو گے نا......؟"

میں نے کہا۔ "نہیں...... ناشتا کروں گا۔"

"اچھا پھر انتظار کرو...... اور چاہو تو چلے جاؤ حجلہ عروسی میں۔" اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔

اس کی بیوی نے چائے کا ایک مگ اسے اور دوسرا مجھے تھما دیا۔ "ابھی سے کہاں حجلہ عروسی۔"

"کیوں...... بھئی جہاں دلہن وہ حجلہ عروسی...... جانے دو اس ہجر کے مارے کو...... دیکھو صورت پر کیسی یتیمی برس رہی ہے۔ سویا نہیں رات بھر......"

"اونہوں...... دلہن کے پاس صرف دولہا جا سکتا ہے۔ اور ابھی یہ دولہا نہیں بنے۔ ہم تو اس معاملے میں بڑے وضعدار ہیں جناب...... لڑکی کو پردہ کرائیں گے...... رخصتی تک۔" اس کی بیوی نے جاتے جاتے کہا۔

فاروقی کچھ دیر بعد بولا۔ "یار کیا واقعی تم نے خودکشی کا فیصلہ کر لیا ہے...... آزادی کی زندگی چھوڑ کے غلامی کا طوق گلے میں ڈالے بغیر گزارا نہیں؟"

میں نے کہا۔ "یار فاروقی...... ابھی کچھ طے نہیں اس معاملے پر پھر بات کریں گے۔"

اس نے مجھے حیرانی سے دیکھا۔ "فریال تو بہت خوش ہے۔ اسے پورا یقین ہے۔ کیا تو[illegible]"

میں نے کہا۔ "مجبوری تھی یار...... میرے والدین میرے ساتھ جائیں گے...... وہ فریال کو وہاں دیکھتے تو بڑی خرابی ہوتی...... میں اسے یہاں لے آیا۔"

"خرابی اب نہیں ہو گی...... جب فریال کو معلوم ہو گا کہ تو نے جھوٹ بولا تھا؟ میں کہتا ہوں آخر قباحت کیا ہے اس میں...... مجھے تو پتا چلا ہے کہ اب کوئی رکاوٹ نہیں...... تیرے گھر والے بھی مان گئے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "یار سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

سلطان...... جب تک اس سے جان نہ چھوٹے...... یہ قدم اٹھا ناسنگین مسائل پیدا کرسکتا ہے سب کے لیے...... جب تک سلطان اپنے حق سے دستبردار نہ ہو......"

"یہ بات خیر ٹھیک ہے...... مگر سلطان کبھی این او سی نہیں دے گا پھر تو فریال سے کیا کہے گا...... وہ کتنی مایوس ہوگی۔"

میں نے کہا۔ "اس کی تو فکر مت کر...... میں سمجھا لوں گا اسے...... مایوس ہونے والی چیز وہ ہے نہیں۔"

"اچھا پھر اس وقت اپنی تشریف آوری کا مقصد بیان کیجیے۔"

میں نے مختصراً اسے اپنا مسئلہ بتایا۔ "یہ تیرا خصوصی شعبہ ہے...... کوئی ایسا ایگریمنٹ بنا دے کہ چچا کی فیملی کو برابر کے مالی فوائد حاصل ہو جائیں مگر ان کا انتظامی امور میں عمل دخل نہ ہو۔"

"کیا اس سے وہ مطمئن ہو جائیں گے؟"

میں نے کہا۔ "انگریزی کا محاورہ ہے کہ بھیک اپنی مرضی کی نہیں ملتی...... اسے میں ہرگز خیرات نہیں کہتا۔ وہ اپنا حق سمجھتے ہیں تو یہ بھی ان کا حق ہے مگر ان کو ملکیت میں شریک کرنا بہت بڑا رسک ہوگا۔ میرے سارے پلان دھرے رہ جائیں گے۔ زبردستی وہ مجھ سے کچھ نہیں لے سکتے۔ جتنا میں دوں گا انہیں اتنا ہی لینا پڑے گا۔ انکار وہ کرنہیں سکتے۔"

"میرا خیال ہے میں تیرا مطلب سمجھ گیا مگر مجھے اس کے لیے وقت چاہیے...... کم سے کم ایک ہفتہ۔"

میں نے کہا۔ "تو اطمینان سے کام کر۔ مجھے بتا میں انہیں کیا لائن دوں؟"

"میرا مشورہ ہے کہ تو بات ہی نہ کر۔ میں انہیں سمجھا دوں گا کہ رفیق انہیں حق سے محروم کرنا نہیں چاہتا لیکن وہ کوئی قانونی مطالبہ نہیں کر سکتے۔ اخلاقی دباؤ کی وجہ سے وہ برابر کا فائدہ دینے کے لیے تیار ہے جو نسل در نسل ان کو حاصل ہوتا رہے گا اگر انہیں منظور ہے تو اسے ایک قانونی معاہدے کی شکل بھی دی جا سکتی ہے۔"

"بالکل ٹھیک...... ان کا ردعمل سامنے آنے کے بعد باقی بات بعد میں ہوگی۔" میں نے کہا۔ "تجھے میری طرف سے مکمل اختیارات حاصل ہیں۔"

گزشتہ رات فریال اور فاروقی کی بیوی دیر تک باتیں کرتی رہی تھیں چنانچہ فریال ابھی سو رہی تھی۔ ناشتے کی میز پر ہم تینوں ہی تھے۔ میں نے سائنس ریسرچ سینٹر کے معاملے پر اپنی پریشانی کا ذکر کیا۔ اسے وہ تمام واقعات بتائے جو میری پریشانی کا سبب بنے تھے۔ وہ تشویش سے سنتا رہا۔

"میں چاہتا ہوں وہ جگہ خالی کرائی جائے۔ اس کے لیے جو بھی قانونی چارہ جوئی ہے اس کا آغاز کر دیا جائے۔"

"بیٹے یہ بہت لمبی اور مشکل جنگ ہوگی۔" فاروقی بولا۔ "اور اس میں قانون سے زیادہ غیر قانونی اقدامات کا خطرہ لاحق ہوگا۔"

"تو کیا چاہتا ہے میں ڈر جاؤں؟"

"ایسی بہادری کا کیا فائدہ جس میں اپنا ہی نقصان ہو۔"

میں نے کہا۔ "یار فاروقی...... کیا حالات اتنے خراب اور مایوس کن ہیں کہ کسی کو قانون کی مدد سے اپنا حق حاصل کرنے کی کوشش ہی نہیں کرنا چاہیے؟ عدالتیں اتنی بے بس ہیں۔ انصاف اٹھ گیا ہے؟"

"کیا تو نہیں جانتا؟ یہاں تو جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ ہماری تاریخ اس کے سوا کچھ ہے؟ کتابوں میں جو کچھ لکھا ہے وہ سیاسی تقریروں میں حوالے کے لیے ہے...... عملی طور پر یہاں قانون کمزور کو دبانے اور طاقتور کو فائدہ پہنچانے کے لیے ہے۔"

"نہ میں کمزور ہوں اور نہ غریب...... جتنا پیسا خرچ کرنا پڑے میں کروں گا۔"

"ہم نیک و بد حضور کو سمجھانا چاہتے ہیں...... آگے تیری مرضی...... وہ سینٹر ایک معاہدے کے تحت بنا تھا۔ معاہدہ یک طرفہ طور پر منسوخ نہیں کیا جا سکتا...... اگر تو عدالت کے حکم سے منسوخ کرانا چاہتا ہے تو تجھے عدالت کو قائل کرنا پڑے گا کہ وہاں غیر قانونی کاروبار ہو رہا ہے۔ ثبوت فراہم کرنے ہوں گے یہ کیسے ثابت ہوگا کہ وہاں سائنس پر کوئی ریسرچ نہیں ہو رہی ہے۔ منشیات فروشی ہو رہی ہے۔ تو خود بھگت چکا ہے۔ پولیس کے ساتھ چھاپا مارا تھا تو کیا دیکھا تھا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔"

"تو کچھ نہیں کر پائے گا...... وہ عدالت میں ثبوت پیش کر دیں گے کہ وہاں کیا ریسرچ ہو چکی ہے اور کیا ہو رہی ہے...... سائنس داں خود پیش ہو جائیں گے...... میری مان سو پیاز اور سو جوتے مت کھا...... اکبر خان کی پیشکش قبول کر لے۔ اسے انا کا مسئلہ مت بنا۔"

مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ "تو بھی یہی کہہ رہا ہے؟"

"جو تجھ سے مخلص ہوگا یہی کہے گا...... کام کرنا ہے تو پنگے مت لے۔ اپنی طاقت بڑھا...... طاقت کو ضائع مت کر فضول باتوں میں...... بدمعاشوں کو ساتھ ملا...... ڈاکو پال...... رشوت اور سفارش پر بھروسا کر...... تیرے سارے کام ہوتے چلے جائیں گے...... ورنہ الجھانے والے تجھے ایسا الجھائیں

گے کہ تو کان پکڑے گا اور بالآخر بھاگ جائے گا اس ملک سے۔"

میں نے کہا۔ "میں مفاد پرست بن جاؤں...... اصول پرستی چھوڑ دوں؟"

"ہاں...... یہی عقلمندی کی دلیل سمجھی جاتی ہے۔ جو کامیاب ہیں وہ یہی کرتے ہیں اگر کوئی مثال ہے کہ شرافت، قابلیت اور دیانت کی وجہ سے کسی نے ترقی کی ہو...... تو مجھے بتا...... اکبر خان دو کروڑ سالانہ دینے پر تیار ہے۔ اس سے چار مانگ...... وہ تین دے دے گا۔ اس سے تیرا اسپتال تو چل ہی جائے گا۔ بصورت دیگر وہ تجھے ایک قدم نہیں چلنے دیں گے تو دیکھ چکا ہے کہ اکبر خان کے ساتھ تیرا دوسرا حریف رانا رجب علی بھی ملا ہوا ہے...... ایسے اور نہ جانے کتنے ہوں گے۔"

جب میں فاروقی کے گھر سے نکلا تو میرے عزائم کے غبارے کی ہوا کافی نکل چکی تھی۔ اب میں شاہین کی پرواز سے بہت نیچے آ گیا تھا...... میرے لیے ممکن نہ رہا تھا کہ فاروقی کے مشورے کو یکسر نظر انداز کر دوں۔ وہ سب جو میرے ساتھ مخلص تھے ایک رائے رکھتے تھے۔ ان سب سے اختلاف کا مطلب ہوتا ہٹ دھرمی......

میں نے سوچا کہ مجھے کیا مقصد سامنے رکھ کے چلنا چاہیے۔ صرف اصول پرستی اور اس کی خاطر سب کچھ گنوا دینا چاہیے؟ میں نہ سقراط نہ حسین کہ راہ حق میں جان دے دوں اور دنیا مجھے یاد رکھے...... مجھے کام کرنا ہے تو فضول کاموں میں اپنا وقت اپنی توانائی اور اپنا سرمایہ کیوں ضایع کروں۔ ایک بات مشہور ہے کہ جب سرسید خان مسلم یونیورسٹی کے لیے مالی وسائل اکٹھے کر رہے تھے تو کچھ پیسا طوائفوں نے بھی دیا تھا۔ اعتراض یہ اٹھا کہ ان کی کمائی کو تعلیم جیسے نیک مقصد میں لگانا جائز نہیں۔ وہ عملی آدمی تھے۔ انہوں نے معترضین سے کہا کہ بھئی یونیورسٹی میں صرف کلاس روم ہی تو نہیں ہوتے۔ بیت الخلا بھی ہوتے ہیں...... یہ رقم ان کی تعمیر میں صرف ہوگی۔

اسی طرح میں اکبر خان کی دشمنی میں لاکھوں کروڑوں گنوا دوں کیا اس سے یہ بہتر نہیں ہوگا کہ میں اس سے جتنا وصول کر سکتا ہوں کر لوں...... بس ذرا مجھے اپنی مونچھ نیچی کرنی پڑے گی کیونکہ وہ میرا ادنیٰ ملازم تھا اور میں آقا کے منصب اعلیٰ پر فائز تھا مگر ایسا تو ہوتا ہے۔ خاندان غلاماں کا دور حکومت آیا تھا تو سارے ہندوستان نے ان کی اطاعت نہیں کی تھی۔ ان میں امرا اور درباری شامل نہیں تھے؟

میں نے فاروقی سے بجلی والے معاملے کا ذکر کیا تو اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں اس معاملے کو آج ہی ختم کرنے کی کوشش کروں۔ اس نے مجھے ایک دو نام بتائے جو معتبر تھے...... ان سے مجھے مدد حاصل ہو سکتی تھی...... اس نے مجھے واپڈا ہاؤس کے سامنے اتار دیا۔

میں وہ نوٹس اپنے ساتھ نہیں لایا تھا جس میں مجھے بجلی کے بلوں کے سلسلے میں آج پیش ہونے کا حکم دیا گیا تھا۔ ایک بار ساتویں فلور...... پھر چوتھے اور بالآخر فرسٹ فلور پر دھکے کھانے کے بعد مجھے اس کلرک بادشاہ سے ملاقات کا شرف حاصل ہو گیا جو میرے کیس سے ڈیل کر رہا تھا اگر میں اس سے بات کر لیتا تو وہیں مک مکا ہو جاتا۔ میں نے افسر سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ نتیجہ یہ کہ مجھے انتظار فرمانے کے لیے تشریف رکھنے کا مشورہ دیا گیا۔ صاحب میٹنگ میں ہیں۔

میٹنگ بہت اچھی تھی۔ جب وہ صاحب کے کمرے سے برآمد ہوئی تو میں نے بھی دیکھا۔ جاتے جاتے اس نے مجھ پر بڑی ادائے دلبری سے ایک شکایتی نگاہ ڈالی کہ آخر تم جیسے سائل اپنے مسائل کی گٹھڑی کے ساتھ افسران اعلیٰ کے دفتری اوقات میں رنگ میں بھنگ ڈالنے کیوں پہنچ جاتے ہیں۔ ملاقاتی اور بھی تھے جن میں بلحاظ سینیارٹی میرا نمبر ایک تھا مگر تین کو ترجیح دیتے ہوئے پہلے بھیج دیا گیا تو میں نے احتجاج کیا۔ خوش اندام سیکریٹری نے بڑی نخوت سے بتایا کہ وہ اپائنٹمنٹ لے کر آئے تھے اور میں آ گیا ہوں منہ اٹھائے...... چنانچہ میں صبر اختیار کروں...... اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

جب بالآخر اپنی باری پر میں اندر گیا تو مجھے عالی شان کمرے میں عالی شان میز کے پیچھے ایک چیئرمین ٹائپ کا مگر خرانٹ بیوروکریٹ نظر آیا جس کی گردن میں سریا تھا۔ اس نے ہاتھ ملانے سے گریز کیا اور مجھے سر کی جنبش سے بیٹھنے کی اجازت دی۔

میرے تعارف کے دوران اس نے کیس سمری دیکھی اور اس بات پر توجہ نہیں دی کہ میں کون ہوں اور کیا کہہ رہا ہوں...... اس نے کہا۔ "آپ بلاوجہ مجھے اپنی باہر کی ڈگریوں سے متاثر کر رہے ہیں...... جرم آپ نے وہی کیا ہے جو یہاں کا ان پڑھ عام آدمی کرتا ہے...... آپ جانتے ہیں اس کی سزا کیا ہے؟"

میں نے کہا۔ "یہ آپ بتا دیں۔"

اس نے انٹرکام پر سیکریٹری سے صرف اپنے لیے چائے منگوائی اور پھر مجھے بتایا کہ مجھے کتنی قید ہو سکتی ہے کتنا جرمانہ...... دونوں سزائیں بھی ہو سکتی ہیں۔

میں نے کہا۔ ''میں جرمانہ ادا کرنے کے لیے تیار ہوں۔''

اس نے افسوس سے سرہلایا۔ ''جرمانہ عدالت کرتی ہے اگر میں نے آپ کا کیس عدالت کو بھیج دیا ہوتا......''

اس کے توہین آمیز رویے پر مجھے طیش آرہا تھا۔ ''پھر آپ نے بھیجا کیوں نہیں؟ اس لیے کہ آپ مجھے کک مکا کا موقع دینا چاہتے تھے؟''

وہ برہم ہوگیا۔ ''اس بات پر میں تمہیں کہوں کہ گیٹ آؤٹ۔''

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ''تو میں چلا جاؤں گا...... اس نوٹس کے جواب میں میرے وکیل فاروقی صاحب ہوں گے۔ ان کا جواب آپ کو مل جائے گا۔ اس کے بعد یہ کیس میں اخبار والوں کے سپرد کردوں گا۔ راجا میرا بھائی ہے اور یہ ہے اس کا آنے والا کالم......'' میں نے راجا کے دیے ہوئے صفحات لہرا کے کہا۔ پھر میں نے ان تینوں ناموں کا حوالہ دیا جو مجھے فاروقی نے بتائے تھے۔ ''اگلا کالم آپ کے بارے میں بھی ہو سکتا ہے۔''

افسر اعلیٰ کا رویّہ ایک دم بدلا۔ ''میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ سرکاری معاملات ایسے طے نہیں ہوتے۔ آپ بیٹھیے......''

میں پھر بیٹھ گیا۔ ''اس وقت آپ کے کان بند تھے جب میں بتا رہا تھا کہ میں عام آدمی نہیں ہوں...... میں ست بدھائی کا جاگیردار نواب رفیق احمد شیرازی آیندہ انتخابات میں اسمبلی میں نظر آؤں گا۔ ایک پبلک سرونٹ کی حیثیت سے آپ نے میرے ساتھ انتہائی ہتک آمیز رویہ اختیار کیا ہے......''

اس کی حالت غیر ہوگئی...... ''آئی ایم سوری شیرازی صاحب۔ دراصل پبلک ڈیلنگ ایک مشکل کام ہے۔ دماغ خراب کردیتے ہیں لوگ...... اب میں آپ کو کیا بتاؤں کہ اس معاملے میں ہم پر سیاسی دباؤ ہے...... یوں سمجھ لیجیے کہ خود چیئرمین نے فون کیا تھا کہ کیس عدالت کو بھیج دیا جائے اور بجلی ہرگز بحال نہ کی جائے۔ تجربے کی بنا پر میں کہہ سکتا ہوں کہ مجسٹریٹ پر بھی دباؤ ہوگا کہ آپ کو زیادہ سے زیادہ سزا دے۔ قید اور جرمانہ...... دونوں......''

میں نے کہا۔ ''دباؤ کس کا ہے؟''

اس نے فائل دیکھی...... ''آپ کے خلاف شکایت موصول ہوئی تھی کسی اکبر خان کی طرف سے...... کون ہے یہ اکبر خان؟''

میں صدمے اور غصے سے سُن ہوگیا۔ میرے خلاف میرے ہی ایک نمک خوار نے کیس کیا تھا۔ وہ نطفہ ناتحقیق جو نہ جانے کتنی بدکاریوں اور کتنے جرائم میں ملوث تھا۔ جسے میں دو ٹکے کا آدمی سمجھ کے منہ نہیں لگاتا تھا...... وہ فیصل آباد کا گھر گھر بن گیا تھا...... ہر راستے پر میرے سامنے آجاتا تھا......

میں نے کہا۔ ''جانے دیں اس بات کو...... وہ ہے ایک دشمن۔''

''اس کا کوئی بندوبست کریں...... آپ نے اچھا کیا کہ مقررہ تاریخ پر آگئے ورنہ یہ کیس آج چلا جاتا آگے۔''

میں نے کہا۔ ''اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

''سب سے پہلے تو آپ ضمانت قبل از گرفتاری کرالیں...... کہ مجھ پر بجلی کی چوری کا جھوٹا مقدمہ سیاسی بنیادوں پر میرے مخالفین نے بنوایا ہے...... اس کے بعد آج دفتر بند ہونے تک اپنا اثر رسوخ استعمال کریں کہ یہ معاملہ یہیں ختم ہوجائے...... اگر آج آپ نے کچھ نہ کیا تو میں یہ کیس کورٹ میں بھیجنے پر مجبور ہوجاؤں گا...... میری تو ملازمت ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اور کنکشن کی بحالی...... یا قانونی فراہمی۔''

''وہ کیا مشکل ہے...... سب ہوجائے گا بعد میں۔'' اس نے کہا اور اپنی سیکریٹری کو حکم دیا کہ اب دو افراد کے لیے کافی بھیجے۔ میرے انکار کے باوجود اس نے مجھے بیٹھنے پر مجبور کیا۔ جتنی دیر میں نے کافی پی اس نے مجھ سے صفحات لے کر وہ کالم پڑھا جو راجا نے گزشتہ روز لکھا تھا مگر ابھی تک میرے پاس تھا۔

کالم پڑھ کے یقیناً اس پر چودہ طبق روشن ہوگئے ہوں گے۔ ایسا کوئی کالم اس کے چیئرمین کی میٹنگ میں بھی ہوسکتا تھا ایک کرائم رپورٹر کی حیثیت سے راجا شیطان کی طرح مشہور پہلے ہی تھا...... کالم کی صدائے بازگشت اسلام آباد تک پہنچتی تھی...... افسر اعلیٰ متفکر نظر آنے لگا۔

جب میں جانے کے لیے اٹھا تو اس نے کہا۔ ''نواب صاحب...... میں کوشش کرتا ہوں بات کر کے کیس کو یہیں روکنے کی...... لیکن آپ اپنا کام ضرور کرلیں۔''

اس نظام کو بدلنا میرے بس کی بات کہاں تھی جسے خدا رسول کے احکامات، قانون کا خوف اور مارشل لا بگڑنے سے نہ روک سکے۔ واپسی پر میں پھر سیکریٹری کے کمرے سے گزرا تو اس کی مسکراہٹ کا انداز بھی بدلا ہوا پایا۔ غالباً باس کے کافی طلب کرنے سے سارا فرق پڑا تھا پھر جب میں آفس کے سیکشن سے گزرنے لگا تو متعلقہ کلرک میری طرف لپکا۔

''سر...... ایک منٹ۔''

میں رک گیا۔ وہ مجھے اپنی سیٹ پر لے گیا اور مجھے اپنے سامنے رکھی ہوئی واحد کرسی پر تشریف رکھنے کے لیے کہا پھر اس نے بڑے دوستانہ طریقے سے رازداری سے کہا۔ ''سر آپ کا کام ہوجائے گا۔''

میں نے کہا۔ ''کون سا کام؟''

''دونوں کام...... کیس ابھی صاحب کے پاس ہے۔ انہوں نے کوئی رپورٹ نہیں دی ہے اور وہ رپورٹ پر صرف چڑیا بناتے ہیں۔ رپورٹ تو میں بناتا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ویری گڈ۔''

اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''میں کیس ختم کرسکتا ہوں۔ یہ لکھ سکتا ہوں کہ شکایت بے بنیاد تھی...... اسے پھاڑ کے پھینک سکتا ہوں...... فائل سے نکال کے آپ کو دے سکتا ہوں...... آپ خود پھاڑ دیں۔''

میں نے کہا۔ ''یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔''

اس نے کہا۔ ''یہ کیس نہیں ہوگا تو آپ کو قانونی طور پر کنکشن بھی فوراً مل جائے گا۔''

''کتنے عرصے میں؟''

''یہ تو آپ پر منحصر ہے...... آپ کیس کو کس رفتار سے آگے بڑھاتے ہیں۔ سرکاری گاڑی کا ایکسی لریٹر آپ دبائیں گے...... آگے چڑھائی ہے۔'' وہ معنی خیز انداز میں مسکراتا رہا۔

میں نے کہا۔ ''اور اگر میں کچھ نہ کروں تو؟''

''تو گاڑی پیچھے جائے گی...... نشیب کی طرف...... لیکن آپ سمجھدار آدمی ہیں ایسا کام نہیں کرسکتے جس میں اپنا نقصان ہو...... کام وہ کرنا چاہیے جس میں سب کا فائدہ ہو......!''

میں نے کہا۔ ''چلو بہت دیر ہوگئی تمہیں ذومعنی ڈائیلاگ بولتے...... صاف بات کرو۔ کتنے پیسے لگیں گے؟''

وہ کچھ جھینپ کر خفت سے مسکراتا رہا اور میز پر پنسل بجاتا رہا۔ ''ایک کام میرا ہے۔ کیس ختم کرنا۔ اس کے ریٹ فکس ہیں۔ پانچ لاکھ۔''

میں دم بخود رہ گیا۔ ''پانچ لاکھ؟''

''یس سر...... سب کو منانا پڑے گا۔ اوپر والے تین چوتھائی لے جائیں گے۔ ایک چوتھائی میں غریب گزارا کریں گے۔ وہ جنہوں نے کارروائی کی تھی۔ ڈس کنکشن کی۔ پانچ افراد کی ٹیم تھی۔ وہ ضبط کیا ہوا تار بھی آپ کو واپس کردیں گے۔''

میں حیرانی سے اس کی شکل دیکھتا رہا۔ ''وہ کنکشن پھر جوڑ سکتے ہیں؟''

''اس کی بات آپ انہی سے کریں۔ پاکستان میں سب ہوجاتا ہے سر۔'' اس نے ڈھٹائی سے کہا۔ ''کیا کریں مہنگائی اتنی بڑھ گئی ہے۔ تنخواہ میں سوکھی روٹی بھی کھانا مشکل ہے۔''

میں نے کہا۔ ''میں آٹھ سال باہر رہ کے آیا ہوں۔ یہاں کے حالات سے بالکل بے خبر ہوں۔ تم ذرا مجھے بریف کرو۔ وہ کیا نذرانہ لیں گے۔ ریٹ تو ان کا بھی فکس ہوگا؟''

''ریٹ ہر جگہ فکس ہیں سر...... وہ دس لیں گے۔''

''دس لاکھ؟'' میں نے کہا۔

وہ ہنسنے لگا۔ ''دس ہزار سر...... آپ کا کام ہوجائے گا ابھی پھر کنکشن کے لیے اپلائی کردیں۔''

''کنکشن کتنے عرصے میں لگ جائے گا؟''

''ہتھیلی پر سرسوں بھی جمائی جاسکتی ہے سر...... ایک دن ایک ہفتہ یا ایک سال...... چوائس آپ کی ہوگی۔ ایک...... پانچ اور دس...... ریٹ میں آپ کو بتا رہا ہوں حالانکہ کام میرا نہیں ہے۔''

''دس ہزار میں کنکشن ایک دن میں منظور بھی ہوجائے گا۔ لگ بھی جائے گا۔ وَنڈرفل...... بڑی زبردست ایفی شنسی ہے مگر یہ بتاؤ کہ تم سے میری جتنی گفتگو ہوئی ہے اگر یہ سب رپورٹ ہوجائے پریس میں؟''

وہ حیرانی سے پلکیں جھپکانے لگا۔ ''آپ صحافی ہو؟''

میں نے کہا۔ ''ابھی ایک کالم دیکھ کر تمہارے افسر اعلیٰ کی سٹی گم ہوگئی تھی۔ وہ کالم راجا نے لکھا تھا کسی اور کے خلاف۔''

وہ ہنسنے لگا۔ ''کالم تو روز آتے ہیں سر...... نوکری سب کی پکی ہے۔ میری بھی...... افسر اعلیٰ کی بھی۔ یہ خوش فہمی ہے آپ کی کہ اس کی سٹی گم ہوگئی تھی۔ ماننا تو پڑتا ہے پاٹے خان بننے والے کو...... مگر اس کے بعد پاٹے خان کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔''

''کیا ہوتا ہے؟''

''وہ سو پیاز کھاتا ہے پھر سو جوتے...... اور روتا ہوا آتا ہے پھر ہمارے پاس ریٹ دگنے ہوتے ہیں۔''

''دگنے ریٹ بھی فکس ہیں؟'' میں نے کہا۔

''بالکل فکس ہیں سر...... آپ آزمالیں...... کبھی بھی۔''

چونکہ مجھ میں اب آزمانے کا چیلنج قبول کرنے کا حوصلہ ہی نہیں رہا تھا اس لیے میں نے کلرک بادشاہ سے دوستانہ انداز میں ہاتھ ملایا اور پھر حاضر ہونے کا وعدہ کر کے نیچے اتر آیا۔ ابھی میری جیب میں پانچ لاکھ نہیں تھے اور وہ چیک قبول کرنے پر تیار نہ تھا۔

میں نے صرف سوچا کہ میں محکمہ انسداد رشوت ستانی والوں کے پاس جاؤں اور پانچ لاکھ کے نشان زدہ نوٹ دے کر اس کلرک بادشاہ کو پکڑوا دوں مگر پھر مجھے خیال آیا کہ اس طرح ریٹ ڈبل ہو جائیں گے۔ انسداد رشوت ستانی والوں کے ریٹ بھی فکس ہوں گے اور اس کیس میں میرا کیس مزید خراب ہوگا۔ میرا سارا وقت عدالتوں میں گزرے گا۔ وکیل کرتے...... پیشیاں بھگتنے کے چکر میں۔ رشوتیں دیتے...... خوار ہوتے۔"

چنانچہ میں نے پانچ لاکھ نکلوائے اور کلرک بادشاہ سے کہا کہ لبیک ...... میں حاضر ہوں۔ وہ اطمینان سے ایک ریسٹورنٹ میں پہنچا۔ ہم نے ایک ساتھ چائے پی۔ اس نے پانچ لاکھ وصول کیے پھر اس نے اکبرخان کی میرے خلاف دی جانے والی درخواست کی اوریجنل کاپی میرے حوالے کی اور ہاتھ ملا کے رخصت ہوگیا۔ میں وہاں سے اٹھ کے اخبار کے دفتر گیا اور وہ کاغذات ایڈیٹر صاحب کی میز پر ڈال دیے جو راجا نے بڑی محنت سے لکھے تھے۔ میرا خیال اب یہ تھا کہ اس نے محض اپنا وقت ضائع کیا تھا مگر ایسا نہیں تھا۔ راجا ایسے ہی کالموں کے سبب راجا تھا اس کی کسی رپورٹ یا کالم سے سسٹم تو نہیں بدلتا تھا مگر دباؤ کام کر جاتا تھا۔ نچلی سطح پر وہ اپنا ہر کام نکال لیتا تھا...... یہ دباؤ بھی بلیک میلنگ کی ایک قسم تھی جس کا اعتراف خود راجا برملا کرتا تھا۔ سرکاری محکموں سے وابستہ ہر قسم کے لوگوں سے جان چھڑانے کے لیے اور بلاوجہ کی پریشانی سے بچنے کے لیے ہر صحافی کا کام بھی اسی طرح کر دیتے تھے جیسے کسی وردی والے کا۔ دس میں سے نو تو رشوت دینے والے ہوتے ہیں دسواں مفت خورا سہی۔

اس کام سے فارغ ہو کے میں نے راجا کو فون کیا اور اسے ایک سو ایک گالیاں دیں۔ "کچھ فائدہ نہیں تیری صحافت کی طرح پالنے خان کا...... مجھے پانچ لاکھ رشوت دینی پڑی۔"

وہ ہنسنے لگا۔ "دیکھ پتر...... ایک زمانہ تھا کہ لوگ بدنامی سے ڈرتے تھے اور اخبار میں خبر چھپتی تھی تو محکمہ ہل جاتا تھا۔ اب صحیح معنوں میں آزادی ہے۔ جس کا جو دل چاہے کرے اور کسی سے نہ ڈرے۔"

"ہمارے خلاف بھی چوری کی شکایت کرنے والا کون ہے۔ وہی حرام زادہ اکبرخان۔"

"تو دیکھ لے...... اس کے ہاتھ کتنے لمبے ہوگئے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "اور فاروقی بھی کہتا ہے کہ اس کے خلاف محاذ مت کھولو...... اس سے جو ملتا ہے لے لو۔"

"ہر عقلمند تجھے یہی مشورہ دے گا۔ ہماری بات پر تو گری کھا گیا تھا۔"

میں نے کہا۔ "ایک بات بتانی ضروری تھی جو فریال نے مجھ سے چھپائی تھی۔ کل راستے میں بتائی۔ سلطان نے اسے فون کیا تھا۔ اس کے پرانے نمبر پر۔ فرخ نے ریسیو کیا اور کہہ دیا کہ سوری رانگ نمبر...... مگر اس نے گالیاں دیں اور کہا کہ مجھے سب پتا ہے...... تم جھوٹ بول رہے ہو......"

"اس کا مطلب ہے وہ میرا وہم نہیں تھا۔" راجا بولا۔

"کیا وہم نہیں تھا؟"

"ابھی کچھ دیر پہلے کوئی فیملی آئی تھی۔ انہوں نے کہا کہ وہ آئے تو تھے رہتاس کا قلعہ دیکھنے...... اس کے بعد ٹلہ جوگیاں پہنچے تو معلوم ہوا یہاں بھی کوئی تاریخی حویلی ہے...... وہ حویلی دیکھنا چاہتے تھے۔ میں نے سوچا کہ کیا حرج ہے۔ فیملی میں دو عورتیں تھیں۔ دو مرد تھے۔ انہوں نے گھوم پھر کے ہر جگہ دیکھی۔ شہناز ان کے ساتھ رہی۔ فرخ بھی رہا۔ وہ بڑی دلچسپی سے سوالات کرتے رہے۔ چھپانے والی کوئی بات نہیں تھی۔ جو ہم جانتے تھے انہیں بتاتے رہے۔ انہوں نے آرٹ گیلری بھی دیکھی۔ تیرے بزرگوں کی تصاویر سے بہت متاثر ہوئے۔ پرانی گاڑیاں دیکھ کے بھی حیران ہوئے۔ ہم نے انہیں چائے بھی پلائی لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ انہوں نے جھوٹ بولا تھا۔"

"کیا مطلب؟"

"انہوں نے بتایا تھا کہ وہ اسلام آباد سے آئے ہیں۔ ان کی گاڑی کی رجسٹریشن اسلام آباد کی تھی۔ خیر یہ کوئی ایسی بات نہیں مگر مردوں نے تعارف کے وقت اپنے نام غلط بتائے تھے۔ بعد میں وہ بھول گئے۔ ایک نے اپنا نام مسعود بتایا تھا دوسرے نے حامد۔ بعد میں الٹ گئے۔ جو مسعود تھا وہ حامد ہو گیا مجھ سے تعارف کے وقت۔ میں بعد میں پہنچا تھا۔ فرخ نے نوٹ کرلیا۔ فرخ نے یہ بھی بتایا کہ مرد حویلی میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔ یہ جاننے میں زیادہ دلچسپی رکھتے تھے کہ یہاں کتنے لوگ رہتے ہیں۔ ان میں سے ایک نے کہہ دیا کہ ہمیں معلوم ہوا تھا اس حویلی کے مالک باہر سے آئے ہیں۔ فرخ نے کہا کہ ہاں وہ آٹھ سال باہر رہے۔ اس پر ایک شخص نے پوچھا کہ ان کی بیگم بھی لندن سے آئی ہیں۔ اس سے فرخ کا شک بڑھا۔ لندن کی بات ہی نہیں ہوئی تھی پھر انہوں نے کیسے فرض کرلیا کہ نواب صاحب شادی شدہ ہیں۔ ان کی بیگم کا تو حوالہ ہی نہیں آیا تھا۔"

"تجھے شک ہے وہ فریال کی تلاش میں آئے تھے؟"

"شک نہیں مجھے یقین ہے۔ یہ سلطان کی چھاپا مار پارٹی

تھی۔ ٹورسٹ بن کے انہوں نے حویلی کا چپہ چپہ دیکھ لیا۔ ان کے جانے کے بعد شہناز نے بھی اپنے شک کا اظہار کیا کہ خواتین نے بھی یہی سوالات کیے تھے۔ وہ لندن سے آنے والے نواب صاحب اور ان کی بیگم سے ملنے کی مشتاق تھیں۔"

"یہ تو مشہور ہے آس پاس کے لوگوں میں کہ نواب صاحب باہر تھے مگر فریال کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا۔ سب جانتے ہیں کہ نواب رفیق احمد شیرازی کی شادی نہیں ہوئی۔"

راجا بولا۔ "اور سن...... ان کی گاڑی کا ایک ڈرائیور بھی تھا۔ وہ باہر گاڑی میں بیٹھا رہا تھا۔ گاڑی اندر نہیں آئی تھی۔ اس نے گارڈ سے پوچھا کہ کیا نواب صاحب کی بیگم انگریز ہے۔ گارڈ نے کہا کہ ان کی تو شادی ہی نہیں ہوئی...... ڈرائیور نے کہا کہ وہ جو لندن سے میم آئی ہے وہ کون ہے۔ گارڈ نے کہا کہ یہاں تو لندن سے کوئی میم بھی نہیں آئی مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو۔ اس نے ٹال دیا کہ لوگوں سے سنا تھا۔ جب اس نے یہ بات ان کے جانے کے بعد ہمیں بتائی تو شک کی گنجائش ہی نہ رہی۔ سلطان نے بڑی عیاری دکھائی...... اگر آج فریال یہاں ہوتی تو چھپی نہ رہتی۔ وہ شہناز سے بڑھ کر ان کے ساتھ رہتی۔ وہ پتا نہیں کتنی تصویریں اتار لیتے۔"

"انہوں نے تصویریں بھی اتاریں؟"

"ہاں...... ہم نے بھی منع نہیں کیا لیکن اب آیندہ سب کا داخلہ بند۔ آج تو بس قسمت نے بچالیا۔ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا۔ اب سلطان کو مفصل رپورٹ مل جائے گی کہ حویلی میں فریال کہیں نہیں ہے۔ اس کا وجود بھی ثابت نہیں ہوا۔ تو اندازہ کرلے سلطان کس طرح فریال کے پیچھے لگا ہوا ہے اور ان حالات میں تو سوچ رہا ہے اس سے شادی کرنے کی؟"

میں نے کہا۔ "ایسا لگتا ہے کہ پہلے سلطان سے نمٹنا ضروری ہوگا۔"

اب شام ہو رہی تھی۔ میرا آدھا کام تو ہوگیا تھا۔ بجلی کی چوری کا کیس نمٹ گیا تھا اور باقاعدہ کنکشن کی منظوری اور فراہمی تک پرانے انتظام کے مطابق بجلی کی سپلائی بھی یقینی ہو گئی تھی۔ کلرک بادشاہ نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ میرا اچھا یا مارٹیم سے رابطہ کرا دے گا۔ شام کے وقت وہ چھٹی کر کے نکلا تو میں اسے باہر ہی مل گیا۔

"میری بات ہوگئی ہے سر۔" اس نے مجھے خوش خبری دی۔

"یہ بتاؤ بجلی کب بحال ہوگی؟"

اس نے کہا۔ "انشاءاللہ کل۔" اور دونوں ہاتھوں کی پانچ پانچ انگلیاں پھیلا کے اس خدمت کا معاوضہ واضح کیا۔ "آپ بے فکر ہو جائیں۔ وہ خود پہنچ جائیں گے آپ کے پاس۔"

"یعنی کنواں خود پیاسے کے پاس پہنچے گا۔ کیا بات ہے؟" میں نے کہا۔

"ریگولر کنکشن کے لیے آپ ایکس ای این سے مل لیں۔" اس نے مجھے نام بتایا۔ "آپ کا کام ہو جائے گا۔ تب تک ایسے ہی گزارا کریں۔"

میں نے کہا۔ "اور کسی نے پھر شکایت پہنچادی پھر؟"

"آپ کیوں فکر کرتے ہیں سر...... شکایت آئے گی تو میرے پاس۔" اس نے مجھے اطمینان دلایا۔ "ویسے یہ کون ہے۔ اکبرخان۔ میری مانیں تو اس سے بھی بات کرلیں۔ آخر وہ چاہتا کیا ہے؟"

ایک لمحے کے لیے غصے میں میرے دماغ کا فیوز اڑ گیا تھا۔ انتہا یہ تھی کہ ایک رشوت خور سرکاری محکمے کا معمولی کلرک بھی مجھے یہی مشورہ دے رہا تھا کہ میں اکبرخان سے مصالحت کرلوں۔ اپنے پرانے دوست دشمن سب نے جیسے مل کے میرا گھیراؤ کرلیا تھا اور مجھے مجبور کر رہے تھے کہ میں اکبرخان کے سامنے جھک جاؤں۔

خودی کو بلند رکھنے کا دور گزر گیا۔ ضرورت پڑنے پر گدھے کو باپ بنا لینے کا زمانہ ہے...... سب سے بڑا مفتی پیسا ہے۔ حرام کو حلال کر دیتا ہے اور ناجائز کو جائز۔ پیسے کی عدالت نے مجھے بری کر دیا تھا۔ براہ راست کنڈا ڈال کے بجلی حاصل کرنے کی سزا ختم کر دی تھی اور مجھے لائسنس عطا کر دیا تھا کہ اب وہ جرم نہیں رہا۔

یہ میرے لیے ممکن نہیں تھا کہ میں ضمیر کی بات سنوں اور اصول کی خاطر جیل چلا جاؤں۔ یہ طے تھا کہ میرا کیس مجسٹریٹ کے پاس بھیج دیا جائے گا۔ میں یہاں نہ جھکتا تو مجسٹریٹ کے سامنے جھکتا۔ ہر قدم پر رشوت دیے بغیر گزارہ ناممکن تھا۔ قانون پرستی کی مجھے ایسی سزا ملتی کہ میرے ہوش ٹھکانے آجاتے۔

رشوت ایک عالمی وبا ہے چھوت سے لگنے والا مرض ہے جو ایک سے دوسرے کو لاحق ہوتا جا رہا ہے اور اس کے خلاف کوئی مدافعتی ٹیکہ نہیں۔ اب کوئی ایک لمحے کے لیے نہیں سوچتا کہ یہ گناہ یا جرم ہے۔ حج کے لیے پاسپورٹ بنوانا ہو یا عمرے کے لیے ویزا لینا ہو۔ لوگ رشوت سے کام کرتے ہیں اور وقت بچاتے ہیں۔ خالص مذہبی نوعیت کی تقریب کے لیے لائن مین کنڈا ڈال کے بجلی فراہم کرتا ہے اور منتظم مطمئن ہو

جاتے ہیں کہ اب دل کھول کے چراغاں کیا جا سکتا ہے۔

میں جب فاروقی کے گھر پہنچا تو فرسٹریشن سے سخت اندرونی کرب کا شکار تھا لیکن دل کو تسلی دے رہا تھا کہ یہاں رہوں گا تو آہستہ آہستہ اس نظام کا عادی ہو جاؤں گا پھر خرابی میں کسی خرابی کا احساس تک نہ ہوگا۔ رنج سے خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج...... مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں۔ خوش رہو مرزا غالب۔ کیا بصیرت پائی تھی تم نے بھی کہ آنے والے وقت کی تصویر کھینچ دی تھی۔

فریال زندگی سے سخت بیزار بیٹھی تھی۔ ست بدھائی میں اس کے لیے مصروفیت تھی۔ اس سے پہلے لندن میں اس کی زندگی کے چار سال بڑی ایکشوئی میں گزرے تھے۔ فاروقی کے گھر میں وہ اس کی بیوی سے کتنی باتیں کرتی۔ مجھے دیکھ کے وہ کھل اٹھی۔

''مجھے کہیں باہر لے چلو۔ میں تیار ہو جاتی ہوں۔'' وہ بولی۔

میں نے کہا۔ ''ہاں چلو۔ مجھے بتا دو کہ سلطان کہاں ملے گا؟''

''یہ سلطان کا ذکر کہاں سے آ گیا؟''

میں نے کہا۔ ''بھئی منگیتر ہے تمہارا۔ تمہیں تلاش کرتا ہوا ست بدھائی پہنچ گیا تھا۔ اس کی پریشانی ختم ہو...... میری اور تمہاری سب کی مشکل آسان ہو۔ میں خود پہنچا دوں تمہیں اس کے پاس۔'' میں نے بھنا کے کہا۔

''کیا بات ہے۔ بڑے جلے بھنے آ رہے ہو۔ کیا کہیں اس سے آمنا سامنا ہو گیا؟''

میں نے کہا۔ ''بس یہی باقی ہے۔ قسمت اچھی تھی کہ نکل آئے وہاں سے ورنہ ختم ہو جاتا کھیل۔''

وہ میرے پاس بیٹھ گئی۔ ''تم بہت اپ سیٹ ہو۔ مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے اچھا ٹھہرو...... میں تمہارے لیے چائے بنا کے لاتی ہوں۔''

''میں نے کافی بنالی۔'' فاروقی کی بیوی نے کچن سے جھانک کر کہا۔

ہم باہر لان پر پڑی کرسیوں پر جا بیٹھے۔ گھاس بہت سبز اور ہموار تھی۔ اسے دن میں پانی دیا گیا تھا۔ اب مٹی سے اٹھنے والی خوشبو سے اور اردگرد پھیلے ہوئے پھولوں کے شوخ رنگ دیکھ کر مجھے بہت سکون ملا۔ مجھے فریال بھی اچھی لگنے لگی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا۔

''تم نے نئے کپڑے خرید لیے...... اچھا کیا۔ اس خالص پاکستانی لباس میں تم اتنی حسین لگ رہی ہو کہ میں نئے سرے سے تم پر فریفتہ ہو سکتا ہوں۔''

وہ ہنسی۔ ''یہ بھابی کے کپڑے ہیں۔ انہوں نے مجھے بہت ڈانٹا کہ یہ اپنا کیا حلیہ بنا رکھا ہے۔ اب میں بال بھی بڑھاؤں گی۔ مہندی بھی لگاؤں گی اور سرمہ بھی۔''

''ابھی تم پاکستان کی شہری لڑکی بنی ہو مگر رہتی ہو تم ست بدھائی جیسے گاؤں میں۔ دیہی کلچر کچھ اور ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے وہ دیہی کلچر جو فلموں میں نظر آتا ہے۔ جس کی کامیاب نمائندگی فردوس اور انجمن کرتی ہیں؟'' وہ ہنسنے لگی۔

''یس، ہمارے پنڈ کی مٹیار کا ڈریس۔ ریشمی کرتا اینڈ لاچا...... اتنا سیکسی تو منی اسکرٹ بھی نہیں ہوتا۔''

''سلطان راہی جیسا ہیرو بھی کہاں ہوتا ہے۔'' فاروقی کی بیوی نے ہنستے ہوئے کہا اور کافی کے لوازمات میز پر سجانے لگی۔

میں نے کہا۔ ''بھابی...... یہ سب آپ نے خود بنایا۔ کوئی ملازم نہیں ہے آپ کی مدد کے لیے۔ اتنا بڑا گھر ہے۔''

وہ بولی۔ ''ہاں...... گھر تو بڑا ہے مگر اس میں رہنے والے تو ہم دو ہی ہیں۔ بچے ہوں تو گھر میں کام بڑھتا ہے۔ اب تو جو چیز جہاں ہے وہیں رکھی رہتی ہے۔ ایک ملازمہ آتی ہے صبح صفائی اور جھاڑ پونچھ کے لیے۔ کھانے پکانے کے لیے بھی نوکر رکھ لوں تو خود سارا دن کیا کروں۔ فاروقی کہتے ہیں موٹی ہو رہی ہو بیٹھ بیٹھ کے۔ کچھ کرو۔''

مجھے معلوم تھا ان کے بچے نہیں ہیں لیکن یہ ایسا موضوع تھا جس پر بات کرنے سے میں بچنا چاہتا تھا۔ میری اور فاروقی کی دوستی پرانی نہیں تھی۔ لندن سے آنے کے بعد اس سے ملاقات ہوئی تھی اور یہ اس کی بے تکلف ہو جانے کی عادت اور ہنسوڑ طبیعت تھی جس نے اتنے کم وقت میں ہماری دوستی کو اتنا آگے بڑھا دیا، میں اس کے گھر میں یوں آنے جانے لگا جیسے میرا برسوں سے آنا جانا ہے۔ عجیب بات یہ تھی کہ ابھی تک مجھے اس کی بیوی کا نام تک معلوم نہ تھا۔ میں اسے بھابی کہہ کے کام چلا رہا تھا۔ وہ ایک سیدھی سادی عورت تھی اور فاروقی کی پریکٹس کی وجہ سے شہر چھوڑ کے نہیں جا سکتی تھی ورنہ میں اسے کہتا کہ ست بدھائی میں ہمارے ساتھ کام کرے۔

میں نے محسوس کیا کہ یہاں بھی فریال کو تحفظ کی سو فیصد ضمانت حاصل نہیں ہے۔ سلطان نے جس مستقل مزاجی سے اس کا پیچھا شروع کر رکھا ہے اسے دیکھتے ہوئے اس امکان کو مسترد نہیں کیا جا سکتا تھا کہ کسی روز کوئی یہاں بھی آ پہنچے۔ فاروقی سے میرا تعلق کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہی تھی۔

فریال اور فاروقی کی بیوی اب سوشل سروس کے وہ کام ڈسکس کر رہی تھیں جو فارغ وقت میں کیے جا سکتے تھے۔ میرا ذہن سلطان کی تازہ ترین کارروائی میں اُلجھا ہوا تھا۔

فریال نے اچانک پوچھ لیا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے؟''

میں چونکا۔ ''کس بارے میں؟ معاف کرنا میں خواتین کی پرائیویٹ باتیں نہیں سنتا۔ میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔''

''وہ میں دیکھ رہی ہوں...... تم کچھ پریشان ہو؟''

میں نے کہا۔ ''بھابی...... شاید میں نے فریال کو آپ کی ذمے داری بنا کے اچھا نہیں کیا۔''

وہ کچھ مایوس ہوئی۔ ''ایسا کیوں سوچتے ہو تم۔''

میں نے کہا۔ ''اس لیے نہیں کہ یہاں کسی بات کی کمی ہے۔ سب سے بڑھ کر تو آپ کا خلوص تھا جس پر مجھے اعتماد تھا مگر کسی کے خلوص کے بدلے میں اسے غیر محفوظ کر دینا زیادتی ہے۔ میں نے آپ کو بھی خطرے میں ڈال دیا ہے۔''

وہ بولی۔ ''اس کی فکر مت کرو۔ یہاں کوئی نہیں آ سکتا۔ یہ ایک وکیل کا گھر ہے۔''

''آپ سلطان کو نہیں جانتیں۔''

''سب بتا دیا ہے مجھے فریال نے...... فاروقی کہہ رہے تھے کہ گارڈ ہونا چاہیے دروازے کے باہر۔ میں نے کہا تھا کہ آپ تو پولیس گارڈ ہی لے سکتے ہیں مگر وہ ہنسنے لگے کہ پولیس گارڈ ہوگی تو پھر زیادہ غیر محفوظ ہو جائیں گے کسی پرائیویٹ سکیورٹی کمپنی سے بات کروں گا۔''

میں نے کہا۔ ''یہ سب ہماری وجہ سے کرنا پڑ رہا ہے۔''

''دیکھو، ایسی غیریت کی بات مت کرو۔ تم فریال کو یہاں لائے مجھے بہت اچھا لگا۔ گھر میں رونق ہو گئی اور اس کی رخصتی یہاں سے ہوگی تو ہمارا یہ رشتہ زیادہ مضبوط ہو جائے گا۔ یہ گھر فریال کا میکہ بن جائے گا نا...... لیکن برا نہ مانو تو ایک بات کہوں...... بڑی بہن کی حیثیت سے۔''

میں نے کہا۔ ''کیا ایسا پوچھنا غیریت نہیں ہے۔ آپ کہیں۔''

''میں نے فریال سے بھی کہا تھا۔ پہلے یہ سلطان کا قصہ ختم کرو...... ورنہ یہ سلسلہ یونہی جاری رہا تو کیا کرو گے۔ کہاں بھاگو گے اور کہاں چھپو گے...... زندگی عذاب میں رہے گی۔''

میں نے کہا۔ ''آپ بھی ایسا سمجھتی ہیں تو اسے سمجھائیں۔''

''مجھے کچھ سمجھانے کی ضرورت نہیں۔ میں کون سی مری جا رہی ہوں شادی کے لیے...... لیکن کیسے حل ہوگا یہ مسئلہ؟''

میں نے کہا۔ ''میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ اس سے دوٹوک بات کرنی پڑے گی۔''

''تم تو ایسے کہہ رہے ہو جیسے ایک سہ فریقی کانفرنس بلاؤ گے اور ہم آمنے سامنے بیٹھ کے بات کریں گے تو وہ مان جائے گا۔ یہ کشمیر سے زیادہ مشکل مسئلہ ہے مگر اب اسے میں حل کروں گی۔''

''تم کیسے حل کرو گی؟'' میں نے کہا۔

''جیسے تم کرنا چاہتے تھے۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''میں اسے قتل کروں گی...... تم نہیں...... میں نے طے کر لیا ہے۔''

وہ ایک دم پلٹی اور اندر چلی گئی۔ فاروقی کی بیوی نے بھی اسے روکنے کی کوشش کی مگر اس نے پلٹ کے نہیں دیکھا۔

میں نے کہا۔ ''یہ ایسی ہی سرپھری لڑکی ہے بھابی...... کچھ بھی کر سکتی ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے۔ جو یہ کہہ رہی ہے وہ کر سکتی ہے۔'' خوف اور بے یقینی سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ ''یہ تو بڑی خطرناک بات ہے اور تم اسے اتنے نارمل طریقے پر لے رہے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''آپ فکرمند نہ ہوں۔ وہ آخری آپشن کی بات کر رہی تھی۔''

''یعنی آپشن ہے؟ مجھے یقین نہیں آتا کہ تم پڑھے لکھے مہذب اور قانون پسند ہونے کے باوجود ایسے آپشن ذہن میں رکھتے ہو۔ قتل کرنے کی بات کرتے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''کچھ باتیں زور بیان میں بھی منہ سے نکل جاتی ہیں یا آدمی غصے میں کہہ دیتا ہے۔ آپ اسے سمجھا سکتی ہیں۔ میں اب چلتا ہوں۔''

سارا دن باہر رہنے کے بعد میں گھر پہنچا تو وہاں کا ماحول مجھے کچھ بدلا ہوا لگا۔ ایک زمانہ تھا جب ابا اور چچا کہیں بھی شطرنج کی بساط بچھا کے بیٹھ جاتے تھے اور پھر دنیا کو بھول جاتے تھے۔ مجھے یاد تھا کہ ایک بار انہیں کھانا وہیں پہنچا دیا گیا اور انہوں نے بازی جاری رکھتے ہوئے کھا لیا پھر باقی لوگ سونے چلے گئے اور جب صبح ہوئی تو جاگنے والوں نے دیکھا کہ وہ اسی طرح مکمل استغراق کی کیفیت میں بازی جمائے بیٹھے ہیں۔ انہیں رات گزرنے کی خبر نہ ہوئی تھی پھر وقت کے ساتھ سب کچھ بدل گیا۔ چچا پیری مریدی کی طرف نکل گئے۔ ابا درس و تدریس سے فارغ ہوئے تو اپنی کتابوں کی دنیا میں کھو گئے۔

آج وہ پھر نظریں مہروں پر جمائے بیٹھے تھے اور دنیا و مافیہا سے بے خبر تھے۔ اماں کے ساتھ خالو کرامت نے محفل

جمار کھی تھی۔ وہ اپنے بے بال سر کی وجہ سے آلو کرامت مشہور تھے۔ میں نے سنا تھا کہ ان کی ویزا لاٹری نکل آئی ہے اور وہ اپنی فیملی کے ساتھ کینیڈا شفٹ ہو رہے ہیں۔ وہ اپنی پوری فیملی کے ساتھ موجود تھے اور بہت چہک رہے تھے۔

میرا استقبال انہوں نے بڑے جوش و خروش سے کیا۔ ''میاں نواب رفیق احمد شیرازی۔ تم تو عید کا چاند ہو گئے۔''

میں نے کہا۔ ''کچھ مصروفیت ہی ایسی رہی۔''

''ہاں بھئی ہم نے بھی سنا ہے تمہارے لمبے چوڑے منصوبے ہیں۔ ست بدھائی آتے تو دیکھتے مگر میاں ہم تو چلے پردیس۔''

میں نے کہا۔ ''وطن چھوڑنے پر آپ کو مبارک باد نہ دی تو آپ کچھ اور سمجھیں گے۔ خدا کرے ہجرت آپ کو راس آئے۔''

''بھئی یہ تو سنت رسول ہے۔'' انہوں نے کہنا شروع کیا اور پھر یہ ثابت کرنے میں مصروف ہو گئے کہ ویزا لاٹری اس سے کہیں زیادہ خوش بختی اور خوش حالی کی گارنٹی ہے جو مجھے ست بدھائی کی حویلی اور جاگیر ملنے سے حاصل ہوئی۔ ظاہر ہے میں نے ان سے اتفاق کیا۔

خلاف معمول کچن میں چچی نے رابعہ کے ساتھ کھانے پکانے کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا اور ماں بیٹی بے حد مصروف تھیں۔ کچن کی طرف سے آنے والی ہر خوشبو سے اندازہ ہو جاتا تھا کہ دعوت کا مینو کیا ہوگا۔ اماں نے مجھے بتایا کہ آج کی دعوت کا خصوصی انتظام چچا اور چچی کی طرف سے ہے۔ یہ خالو کرامت کے اعزاز میں الوداعی تقریب ایک فیملی گیٹ ٹوگیدر بھی ہے۔

یہ سب مجھے بہت اچھا لگا۔ خصوصاً اس وقت جب چچی نے بڑی خوشدلی سے مجھے کچن میں دیکھ کے کہا۔ ''بھوک لگی ہے؟ بس تھوڑی دیر اور۔'' اور پھر رابعہ کو حکم دیا۔ ''ذرا جلدی ہاتھ چلا...... برتن لگا دے۔''

میں نے کہا۔ ''چچی میں کچھ مدد کروں۔''

''مدد کرنے والے کیا پوچھتے ہیں؟'' وہ بولیں۔

چچی کا مزاج اور رویہ اب تک گھر میں بڑی ٹینشن کا سبب بنا ہوا تھا۔ مشکل یہ تھی کہ ان کی فطرت میں ٹھہراؤ نہیں تھا۔ وہ گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ کی مثال تھیں۔ ان کے موڈ کی تبدیلی سے گھر کا ماحول متاثر ہوتا تھا اور جیسے ان کا موڈ اچھا ہونے کی وجہ نہیں ہوتی تھی ایسے ہی خراب ہونے کی وجہ کا بھی پتا نہیں چلتا تھا۔ اب تو بہت عرصے سے میں نے انہیں مسکراتے بھی نہیں دیکھا تھا۔

آج سب کو ہنستے بولتے دیکھ کر میں خوش بھی ہوا اور کنفیوز بھی۔ رابعہ کے ساتھ دسترخوان پر برتن رکھتے ہوئے میں نے آہستہ سے پوچھا۔ ''کزن...... یہ سب کیا ہے۔ بقول شاعر...... یہ دو دن میں کیا ماجرا ہو گیا کہ جنگل کا جنگل ہرا ہو گیا۔ میں گیا تھا تو آتش فشاں ابل رہے تھے۔ واپس آیا ہوں تو بہار کی برسات چل رہی ہے۔''

وہ ہنسی۔ ''بتاؤں گی۔''

دعوت بہت شاندار رہی۔ چچی نے بہت اہتمام کیا تھا اور بہت محنت کی تھی۔ پرانے وقت کی خاتون خانہ تھیں جن کی زندگی کا سارا تجربہ کچن سے شروع ہو کے کچن میں ہی ختم ہوتا تھا۔ یہ مہارت ان کے کھانے کے ذائقے میں بولتی تھی۔ وہ آگے بڑھ بڑھ کے ہر ایک کو کھلاتی رہیں اور تعریف سن کے خوش ہوتی رہیں۔ اس انقلاب نے میرے لیے تھوڑی سی پریشانی بھی پیدا کی کہ کہیں یہ کسی نئے طوفان کا پیش خیمہ تو نہیں۔ میں جانتا تھا کہ ایسا ہی اماں اور ابا بھی سوچ رہے تھے۔ اماں کے لبوں کی معنی خیز مسکراہٹ سے یہی ظاہر ہوتا تھا۔

کھانا یقیناً بہت پُرلطف تھا۔ جب مہمان رخصت ہو گئے تو اماں نے عشا کی قضا نماز شروع کی جو کافی لمبی ہوتی تھی۔ ابا اور چچا فراغت سے ملکی اور سیاسی حالات پر باتوں میں مصروف ہو گئے تو میں نے اپنے کمرے کا رخ کیا۔ رابعہ کچن میں برتن دھلوانے میں ماں کا ہاتھ بٹا رہی تھی۔ وہ کچھ دیر بعد نمودار ہوئی۔ اس کے کپڑوں پر داغ تھے اور اس کے پاس سے ان تمام مصالحہ جات کی بو آ رہی تھی جو کھانوں میں استعمال ہوئے تھے۔

میں نے کہا۔ ''کزن...... آپ ذرا دور ہو کے بیٹھیں۔ یہ ادرک لہسن کی بو میری طبع نازک پر گراں گزر رہی ہے۔''

''کھاتے وقت تو ہاتھ چومنے کی بات کر رہے تھے۔'' اس نے کہا اور میرا سوٹ کیس کھول کے پرفیوم کی بوتلیں نکالنے لگی۔ کمرا خوشبوؤں سے بھر گیا۔

میں نے کہا۔ ''اف مال مفت دل بے رحم۔ نادان لڑکی یہ تو یہاں ملیں گی بھی نہیں۔''

اس نے دو بوتلیں الگ کر لیں۔ ''یہ مجھے اچھی لگیں۔ میں نے لے لیں آپ کو خدانخواستہ کوئی اعتراض تو نہیں؟''

میں نے کہا۔ ''کزن...... یہ سب تمہاری دوستی پر نثار...... مگر مجھے بتاؤ آج یہ کیسا انقلاب آ گیا اچانک۔''

وہ صوفے پر لمبائی کے رخ لیٹ گئی۔ ''میں اتنی تھک گئی ہوں کہ بتا نہیں سکتی۔ کل تم نے ابا سے کیا بات کی تھی۔''

''چار شادیوں کے موضوع پر؟''

''حکومت...... جائداد کی تقسیم کے مسئلے پر...... اُف...... برا دل چاہتا ہے کوئی مجھے گرم گرم کافی بنا کے لا دے۔''

''کمال ہے۔ بھئی خواہش میری بھی تھی۔ دیکھو اللہ غیب سے کیا انتظام کرتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کوئی فرشتہ آ جائے دو کپ اٹھائے۔''

''تایا نے کیا کہا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''انہوں نے میری اس تجویز کی مخالفت کی تھی کہ آدھی جائداد میں چچا کے نام کر دوں۔ ان کا خیال تھا کہ اس سے میرے سارے پلان کی ایسی تیسی ہو جائے گی۔''

''بالکل ٹھیک کہا تھا انہوں نے۔''

''انہوں نے ایک متبادل طریقہ بتایا تھا کہ جائداد کی آمدنی میں سے آدھا چچا کے لیے مختص کر دیا جائے۔ ایک قانونی معاہدے کے مطابق اور یہ آمدنی ان کے بعد تمہیں اور پھر تمہارے بچوں کو ملے...... کتنے بچے ہوں گے تمہارے کزن؟''

وہ چونک کے ہنسی...... ''بچے دو ہی اچھے...... مگر کل ایک تصویر اور خبر تھی...... چار ایک ساتھ ہو گئے تھے۔''

''اللہ تمہیں توفیق دے اس سے زیادہ کی...... ابا کا خیال تھا کہ جائداد کے انتظام و انصرام میں چچا اور ان کی اولاد کو دخل در معقولات کا چانس نہ دیا جائے ورنہ نہ انتظام رہے گا نہ انصرام...... انتقام اور انہدام رہ جائے گا۔''

''اور انضمام...... پھر اختتام...... لیکن آج تایا نے وہی بات میرے ابا سے کی اور پتا ہے ابا نے کیا کہا۔ انہوں نے کہا کہ وہ تو ہو چکے ہیں تارک الدنیا...... انہیں جاگیر اور حویلی کچھ نہیں چاہیے۔''

''اچھا، اور آپ کی والدہ نے کیا فرمایا؟''

''یہی وہ انقلاب ہے جس پر تم حیران ہو۔ اماں نے کہا کہ بھائی صاحب۔ مجھے رات کو خواب میں بشارت ہوئی۔ خواجہ صاحبؒ نے کہا کہ بدگمانی چھوڑ تیرے پاس فرصت کم ہے۔ آخرت کی فکر کر...... جائداد میں سے تجھے حصہ ملا تو تیرے کس کام آئے گا۔ وہ بیٹی کے نصیب میں لکھ دیا گیا ہے۔ رزق خود اسے دے گا......''

میں دم بخود رہ گیا۔ ''یہ چچی نے کہا؟''

''ہاں...... اور مجھے یقین ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہی تھیں۔ انہوں نے صاف کہا کہ مجھے اب اطمینان ہے رابعہ کو آپ اس کا حق ضرور دیں گے۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے...... بس اس کے بعد سب بدل گیا۔ ابا نے میرے سر پر ہاتھ رکھا کہ جو [illegible] آ[illegible]نی اس کی ہوگی۔ چنانچہ کزن...... دل صاف ہو گئے۔ جھگڑے ختم ہو گئے۔ نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔''

''خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے...... کیا اب میں بات کروں؟''

''کیا میں نے تمہیں بات کرنے سے روکا ہے؟''

''میرا مطلب تھا...... فریال کی بات کروں یا تم خود کرو گی...... تمہاری اماں پتا نہیں کیا مطلب نکالیں۔''

''وہ اب کوئی غلط مطلب نہیں نکالیں گی۔ انہوں نے کہہ دیا ہے کہ میرے حج پر جانے کا بندوبست کرو...... ابا بھی جائیں گے ظاہر ہے اور یہ ایک اچھا موقع ہوگا۔ وہ اپنی دنیاوی ذمے داری پوری کر جائیں۔ یہ ان کی خواہش بھی ہو گی۔''

''ابا پہلے تو مخالف تھے کہ ہم سب ست بدھائی جائیں۔''

''مجھے تو جانا ہی پڑے گا۔'' وہ کچھ شرما کے بولی۔

میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''ہاں...... مجبوری ہے کزن، تم سے پیچھا نہیں چھوٹے گا ہمارا۔''

وہ اٹھ کھڑی ہوئی...... ''میں برا مان کے جا رہی ہوں...... سونے......''

''میں آپ سے دفع ہونے کی گزارش کرنے ہی والا تھا۔'' میں نے کہا۔

میں خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ ایک بہت بڑا جھگڑا ختم ہو گیا تھا۔ میری مشکلات کچھ کم ہو گئی تھیں۔ اب واقعی ایسا لگتا تھا کہ ہم سب ایک ماں کے دو بیٹے...... سکون سے ست بدھائی میں مل کے رہ لیں گے۔ میں انہی خوش آئند خیالات میں محو تھا کہ اچانک چچی نمودار ہوئیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک کپ تھا۔

میں نے کہا۔ ''ارے چچی...... اب کیا لے آئیں؟''

''یہ سب قہوہ ہے۔ الائچی والا...... ہاضم ہوتا ہے۔''

میں نے کپ لے لیا۔ ''اب اس کی کیا ضرورت تھی چچی۔ اتنا تو کر لیا تھا آج آپ نے......''

وہ میرے سامنے بیٹھ گئیں۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی بات شروع کرتیں میں نے دروازے میں دادی کو دیکھا۔ ان کا میرے کمرے میں آنا اتنی غیر متوقع بات تھی کہ میں گھبرا کے کھڑا ہو گیا۔ میں نے کہا۔ ''دادی...... آپ؟''

وہ بڑی مشکل سے زینہ چڑھ کے آئی تھیں۔ ان کی سانس پھول گئی تھی۔ میں نے انہیں بیڈ پر بٹھا دیا۔ ''آپ نے مجھے کیوں نہیں بلوایا؟''

دادی نے چچی کی طرف دیکھا۔ ''چھوٹی دلہن...... مجھے

اس نمونے سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔''

چچی کے لیے بھی یہ انتہائی حیرانی کی بات تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے انہیں دادی کا آنا بہت برا لگا ہے۔ وہ کچھ دیر انہیں دیکھتی رہیں۔ معلوم نہیں ان کے ذہن میں کیا تھا۔ وہ مجھ سے کیا بات کرنا چاہتی تھیں جو دادی کی آمد سے رہ گئی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ پلٹ کے دروازے کی طرف بڑھیں۔ دروازے پر رُک کے انہوں نے پھر دادی کو عجیب سی نظروں سے دیکھا۔ میں ان کی صورت کے تاثرات اور ان کی آنکھوں کے جذبات کو سمجھ نہ سکا۔ معلوم نہیں ان میں دادی کے لیے غصہ تھا یا نفرت تھی۔ جب وہ چلی گئیں تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

''یہ کیوں آئی تھی یہاں...... کیا کہہ رہی تھی؟'' دادی نے کہا۔

میں نے کہا۔ ''وہ میرے لیے سبز قہوہ بنا کے لائی تھیں۔ ابھی بات کوئی نہیں کی تھی۔''

''اچھا...... تو سچ کہہ رہا ہے نا؟''

میں نے کہا۔ ''یہ لیجیے...... ابھی قہوہ گرم ہے۔ آپ پی لیں۔ میں آپ سے جھوٹ بول سکتا ہوں دادی؟''

انہوں نے قہوے کا کپ اٹھا لیا۔ ''جب سے تو آیا ہے تجھ سے بات کرنے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''ایسی کوئی جلدی بھی نہیں تھی۔''

وہ قہوہ پینے لگیں۔ ''تیرے اماں ابا کو بڑی مشکل سے راضی کیا میں نے۔ مگر وہ خوش نہیں ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''ان کی ناراضی کے ساتھ میں کوئی کام نہیں کر سکتا۔''

''انہیں لڑکی پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ جو تیری پسند......''

میں نے کہا۔ ''مگر وہ ڈرتے ہیں کہ بعد میں کوئی مصیبت نہ آئے۔''

''ہاں، ڈرنے کی بات بھی ہے۔ وہ ایک چھٹا ہوا بدمعاش ہے اس کی دشمنی مول لینا ہمارے...... یہ قہوہ کیسا بنایا ہے چھوٹی دلہن نے؟''

میں نے کہا۔ ''ذائقہ اچھا نہیں تو چھوڑ دیں۔''

انہوں نے تین چوتھائی کپ خالی کر دیا تھا۔ ''ہاں کچھ عجیب سا ہے...... تو میں یہ کہہ رہی تھی کہ وہ...... کیا نام ہے اس کا...... سلطان...... وہ تیرا دشمن ہو رہا ہے پہلے ہی۔''

میں نے کہا۔ ''وہ سب فریال کی بے وقوفی سے ہوا۔''

''مگر یہ مشکل کیسے آسان ہوگی نمونے...... منگنی کسی اور سے...... شادی کسی اور سے...... پھر فساد کیسے نہ ہو؟''

میں نے کہا۔ ''دادی...... میں نے بعد میں سوچا یہ مسئلہ پہلے طے ہو جانا چاہیے۔''

''اللہ تجھے خوش رکھے...... تیرے ماں باپ بڑے مجبور لوگ ہیں بیٹا۔ میرے تو دو تھے ان کا تیرے سوا کون ہے؟''

''فریال بہت اچھی لڑکی ہے دادی۔''

''اچھی کیوں نہیں ہوگی۔ جب ساری دنیا میں تجھے وہی ایک اچھی لگی مگر دودھ میں مکھی پڑی ہو نمونے۔ تو کس کام کا......'' انہوں نے اوپر دیکھا۔ ''ذرا یہ پنکھا چلا دے۔''

''اچھا...... گرمی لگ رہی ہے آپ کو؟'' میں نے پنکھا آہستہ رفتار پر چلا دیا۔

''تو مجھے لے چل اس کے پاس۔'' دادی نے کہا۔ ''میں بات کرتی ہوں اس سے۔''

''کس سے سلطان سے؟''

''ہاں، میرے سفید بالوں کا کچھ تو لحاظ کرے گا۔ میں جھولی پھیلا کے......'' ان کی آواز کانپنے لگی۔

میں نے کہا۔ ''دادی...... طبیعت تو ٹھیک ہے نا آپ کی؟''

انہوں نے بے چینی سے ہاتھ پھیلائے۔ ''پتا نہیں کیا ہو رہا ہے مجھے تو نے...... لائٹ کیوں بجھا دی۔''

''لائٹ...... لائٹ تو جل رہی ہے۔ آپ لیٹ جائیں۔'' میں نے انہیں لٹا دیا۔

میں نے محسوس کیا کہ دادی کی حالت تیزی سے بگڑ رہی ہے۔ ان کے جسم پر پسینا بہہ رہا تھا اور انہیں سانس لینے میں دقت ہو رہی تھی۔ انہوں نے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔

''دیکھ...... نمونے......''

میں نے ان کا ہاتھ تھاما تو وہ بالکل سرد تھا۔ ''دادی......'' میں نے کہا۔ لیکن دادی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اچانک میری نظر ان کے ہونٹوں پر گئی۔ وہ نیلے ہو رہے تھے۔

''پانی...... پانی۔'' دادی نے منہ کھولا۔ ''میرے اندر...... آگ۔''

میں نے چلا کے آواز دی۔ ''ابا جی...... ابا جی...... ادھر آئیں فوراً۔'' پھر میں پانی لینے لپکا لیکن جب تک میں واپس پہنچا دادی کی آنکھیں چھت پر ٹھہر گئی تھیں۔ ان کا ایک ہاتھ بیڈ سے نیچے لٹک رہا تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی کہ ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی ہے۔

جب ابا جی میری آواز پر آئے تو سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ انہوں نے وحشت زدہ نظروں سے دادی کے بے جان جسم کو دیکھا۔ ''رفیق کیا ہوا......''

میں نے دادی کے ہاتھ پاؤں سیدھے کیے اور ان کی آنکھیں بند کر دیں...... آنسو خود بخود میری آنکھوں سے بہہ نکلے۔ ''دادی ہمیں چھوڑ گئیں ابا جی......''

ابا جی ساکت کھڑے رہے۔ ''یہ کیسے ہو گیا رفیق...... اچانک؟''

اس سوال نے ایک دم میرے ذہن کو جھنجھوڑ دیا۔ ''پتا نہیں...... بات کر رہی تھیں مجھ سے اور قہوہ پی رہی تھیں۔''

میری نظر اس پیالی پر ٹھہر گئی جس میں ایک چوتھائی قہوہ ابھی تک موجود تھا۔ پلک جھپکتے میں میری آنکھوں پر پڑے ہوئے سارے پردے ہٹ گئے۔ ہر بات کھل کر سامنے آتی گئی۔ چچی کا خواب...... ان کی کایا پلٹ...... قناعت پسندی اور جائداد سے لاتعلقی...... ان کا بدلا ہوا رویہ۔ دعوت کے لیے ان کا اہتمام...... اور آخر میں قہوہ...... صرف میرے لیے......

ابا اب چھوٹے بھائی کو آوازیں دے رہے تھے۔ ''نذیر...... نذیر آ کے دیکھو...... اماں گزر گئیں۔''

اس وقت میں نے ہوش سے کام لیا۔ میں نے قہوے کی پیالی اٹھائی اور الماری میں بند کر دی...... اس میں اب بھی ایک گھونٹ باقی تھا۔ یہ معلوم ہو سکتا تھا کہ اس میں کون سا زہر شامل کیا گیا تھا۔

پھر اس وقت جب گھر کے سارے لوگ اماں کے گرد جمع تھے میں نیچے گیا کیونکہ چچی اوپر نہیں آئی تھیں۔ اس نے خود کو باتھ روم میں بند کر لیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ جو زہر وہ مجھے دینا چاہتی تھی وہ دادی نے پی لیا ہے۔ دادی اپنے نمونے پر قربان ہو گئی تھیں۔ میں نے زور زور سے دروازہ بجایا اس وقت مجھ پر وحشت سوار تھی۔ ''باہر نکل خبیث عورت۔'' میں نے چیخ کر کہا۔

اس نے دروازہ نہیں کھولا۔ وہ کسی خوف زدہ جانور کی طرح کہیں اندر دبکی بیٹھی ہوگی۔ اس کو بہت پہلے معلوم ہو گیا تھا کہ اس نے تو مجھے نشانہ بنایا تھا مگر قضائے خیر کا رخ دادی کی طرف تھا۔ دادی کے وہاں آنے پر وہ جتنی حیران تھی اس سے زیادہ پریشان اس وقت ہوئی تھی۔ جب میں نے خود پینے کے بجائے زہر آلود سبز قہوہ دادی کو پیش کر دیا تھا اور انہوں نے بلا حجت قبول بھی کر لیا تھا۔ چچی کی صورت اور اس کی آنکھوں کے وحشت ناک تاثرات میں نے دیکھے تھے مگر اس وقت میں کچھ نہیں سمجھا تھا۔

چچی اگر چاہتیں تو بروقت کوئی قدم اٹھا کے قہوے کو ضایع کر سکتی تھیں لیکن ایک تو وہ دور تھیں اور دوسرے اس کا ذہن ماؤف تھا۔ وہ دادی سے یہ نہیں کہہ سکتی تھیں کہ قہوہ نہ پئیں......

وہ قہوہ رفیق کے لیے تھا۔ آپ کو میں دوسرا کپ لا دیتی ہوں۔ پھر میں کہتا کہ دوسرا کپ میں پی لوں گا، نتیجہ یہ کہ چچی وہاں سے فرار ہوئی اور غسل خانے میں چھپ گئی۔ اسے یقیناً علم ہوگا کہ کتنی دیر میں دادی پر زہر کا اثر ہوگا۔

میں نے پھر دروازہ زور زور سے بجایا مگر نہ اس نے کنڈی کھولی اور نہ کوئی آواز نکالی۔ مجھ پر جنون سوار تھا۔ میں باہر آیا اور لاؤنج کا فون اٹھا کے ایمرجنسی پولیس کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے کسی اونگھتے ہوئے ڈیوٹی افسر نے ریسیور اٹھایا۔

میں نے کہا۔ ''دیکھو یہاں ایک قتل ہو گیا ہے۔''

اس کی نیند اُڑ گئی۔ ''اچھا جی...... پھر آپ تھانے سے رجوع کریں قتل ہونے سے پہلے ہمیں بتاتے تو ہم کچھ کرتے۔ ویسے قتل کس کا ہوا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''جب تمہیں کچھ کرنا ہی نہیں تو پھر بتانے کا فائدہ۔'' میں نے لائن کاٹ کے دوسرا نمبر ملایا۔

وہاں بھی مستعدی کا وہی عالم تھا۔ میری بات سن کے ڈیوٹی افسر نے کہا۔ ''اچھا جی...... کس کا قتل ہوا ہے...... کس نے کیا ہے اور کیوں؟......''

میرے جواب پر اس نے مجھے ریسیور رکھنے کے لیے کہا۔ چند سیکنڈ میں گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو مجھ سے کہا گیا۔ ''اپنا نام پتا لکھواؤ...... ٹھیک ٹھیک......''

میں نے پتا لکھوایا ہی تھا کہ اوپر سے ابا جی کے ساتھ صوفی چچا اترے اور انہوں نے میرے ہاتھ سے ریسیور چھین لیا۔ ''یہ کیا کر رہے ہو؟'' صوفی چچا نے کہا۔

میں نے کہا۔ ''پولیس کو بلایا ہے میں نے۔ دادی کے قاتل کی گرفتاری کے لیے۔''

صوفی چچا نے کہا۔ ''بغیر کسی ثبوت کے...... کیا کہو گے تم ان سے؟''

''یہی کہ چچی نے دادی کو زہر دیا۔ وہ مجھے مارنا چاہتی تھیں۔''

صوفی چچا کی حالت غیر ہو گئی۔ ''یہ غلط ہے...... ناممکن ہے۔''

ابا نے کہا۔ ''جو حقیقت ہوگی سامنے آ جائے گی۔''

''بھائی صاحب...... اماں کی اتنی عمر تھی...... کیا پتا انہیں دل کا دورہ پڑا ہو۔'' صوفی چچا نے منت کی۔

''اس کا بھی پتا چل جائے گا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں۔'' ابا بولے۔

''کیا؟ تم اماں کا پوسٹ مارٹم کراؤ گے؟''

''ہاں، وہ میری بھی ماں تھی۔'' ابا کی آنکھوں سے آنسو

بہتے رہے۔

"ٹھہرو...... میں اس سے پوچھ لیتا ہوں۔" صوفی چچا بولے۔

"وہ باتھ روم سے باہر نہیں آرہی ہے...... میں دروازہ توڑ دیتا لیکن پھر میں اسے مار دیتا۔ میں نے یہ کام پولیس کے لیے چھوڑ دیا ہے۔" میں نے کہا۔

گھر میں ایک کہرام برپا ہوگیا تھا۔ اوپر سے رابعہ کے زور زور سے رونے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ چچا نے باتھ روم کا دروازہ بجانا شروع کیا۔

"بیگم...... باہر آؤ...... میری بات سنو......"

اب اندر سے چچی کی آواز سنائی دی۔ "میں نے کچھ نہیں کیا۔"

"مجھے پتا ہے تم نے کچھ نہیں کیا۔" چچا نے روتے ہوئے کہا۔ "مگر باہر آکے سب کو بتا دو۔"

"وہ مجھے مار ڈالے گا...... رفیق......" اس کی آواز میں خوف تھا اور دہشت تھی۔

"نہیں مارے گا...... میں ہوناں......" چچا نے کہا۔

"میں نے تمہاری ماں کو نہیں مارا۔ اس نے مارا ہے۔"

ابا نے کہا۔ "تم رفیق کو مارنا چاہتی تھیں۔ بولو...... اسے زہر دیا تھا تم نے چائے میں۔"

اندر خاموشی رہی۔ چچا بولتے رہے۔ "دیکھو تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ وہ بہت بوڑھی تھیں۔ ہم کہہ دیں گے ان کا ہارٹ فیل ہوگیا۔ ہم تمہیں بچا لیں گے۔" چچا نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے ہمیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

دروازے کی کنڈی کھلی اور دہشت زدہ چچی کا چہرہ نمودار ہوا مگر پھر وہ ہوا جس کے لیے ہم میں سے کوئی بھی تیار نہ تھا پلک جھپکتے میں صوفی چچا نے اس کی گردن دبوچ لی۔ وہ چلانے لگے۔ "میری ماں کو مار دیا تو نے۔ زہر دیا بول...... کیا بگاڑا تھا اس نے تیرا؟"

چچی تڑپی...... اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر آنے لگیں۔ ابا نے چلا کے کہا۔ "نذیر...... یہ کیا کر رہے ہو؟" مگر چچا پر جنون سوار تھا۔ انہوں نے چچی کو چھوڑا نہیں اور اس کا گلا دباتے گئے۔ وہ تڑپی مگر خود کو چھڑا نہ سکی۔ میں نے صوفی چچا کو پیچھے کھینچا مگر میرے لیے ممکن نہ تھا کہ میں ان کے ہاتھوں کی گرفت سے چچی کی گردن چھڑانے کے لیے کچھ کر سکتا۔ وہ باتھ روم کے دروازے میں کھڑے ہوئے تھے اور ڈھائی فٹ چوڑا راستہ بلاک کر رکھا تھا۔

اچانک انہوں نے ایک قہقہہ لگایا۔ "مر گئی...... خود ہی مر گئی...... ہاہاہا کتنا اچھا ہوا...... میرے ہاتھوں مر گئی...... ورنہ پھانسی کے تختے پر لٹکتی......"

چچی کی بے جان لاش باتھ روم کے فرش پر گر گئی۔ میں اور ابا صدمے سے بے حال کھڑے رہے۔ صوفی چچا کا دماغ چل گیا تھا۔ وہ اپنی بیوی کو قتل کر کے قہقہے لگا رہے تھے۔ اب اسے کوئی گرفتار نہیں کر سکتا۔ یہ کسی عدالت میں پیش نہیں ہو گی۔ کوئی اسے سزائے موت نہیں دے سکتا۔ میں نے اس کی مشکل آسان کر دی۔ سب کی مشکل آسان کر دی۔"

باہر سے کسی نے گھنٹی بجانی شروع کی۔ پھر دروازہ پیٹا تو میں سمجھ گیا کہ یہ پولیس ہی ہوگی۔ جو گھر کچھ دیر پہلے دسترخوان پر موجود لوگوں کے قہقہوں سے گونج رہا تھا وہاں اب ایک دیوانے مجذوب کے قہقہے سنائی دے رہے تھے اور دو لاشیں پڑی تھیں۔ قاتل صرف ایک چچا تھا...... دوسرا خود مقتول ہوگیا تھا۔ ابھی رات کے بارہ نہیں بجے تھے۔ تاریخ نہیں بدلی تھی مگر اس خاندان کی تاریخ میں دو خونی واقعات کا اضافہ ہوگیا تھا۔ ست بدھائی کی حویلی اور جاگیر نے پھر دو جانوں کا نذرانہ لے لیا تھا۔

اس کے بعد جو ہوا سب ضابطے کی کارروائی تھی۔ پولیس نے دادی کے ساتھ چچی کی لاش کو بھی قبضے میں لیا اور ایک ہی ایمبولینس میں روانہ کر دیا۔ ساس بہو...... قاتل و مقتول...... اپنی ہوس کا شکار اور صرف محبت کی طلب گار...... ایک ببول کی طرح خاردار...... دوسری شجر سایہ دار...... تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے۔ ڈیتھ دی لیولر...... سب کو برابر کر دینے والی موت......!

ذہنی توازن کھو دینے والے صوفی چچا کو پولیس نے حوالات میں بند کر دیا۔ وہ وہاں بھی بولتے رہے اور قہقہے لگاتے رہے۔ میں اور ابا اپنا بیان اور ایف آئی آر درج کراتے ہوئے ان کی لایعنی بکواس سنتے رہے اور اپنے آنسو پونچھتے رہے۔ تھانے میں چچا کی آواز گونج رہی تھی۔ "بدبختو...... میرے موکل تم کو فنا کر دیں گے۔ راکھ ہو جاؤ گے...... ایسا عمل کروں گا کہ سب کچھ مٹا دوں گا...... تباہ کر دوں گا۔ کافر کے بچو...... اسرائیل کے گماشتو...... امریکی سامراج کے چمچو......"

پوسٹ مارٹم کے بعد لاشیں حاصل کرنا بھی ایک تکلیف دہ عمل بن جاتا اگر اس میں راجا کی مدد شامل نہ ہوتی۔ سرکاری اسپتال میں لاشوں کے سوداگر اتنے بے حس ہو چکے تھے کہ وہ مرضی کی پوسٹ مارٹم رپورٹ بنوا کر دینے کا معاوضہ مانگ رہے تھے۔ وہاں میری لڑائی ہوئی۔ پھر لاشیں واپس ورثا کے حوالے کرنے پر محض پریشان کرنے کے لیے اعتراضات دائر کیے گئے۔ تاخیر پر تاخیر کے حربے اختیار کیے گئے تاکہ ہم کسی بے ضمیر کے ہاتھ پر نوٹ رکھیں اور ہماری مشکل آسان ہو۔

☆☆☆

ہم دوپہر تک برآمدوں میں خوار ہوتے رہے۔ میں نے ابا جی کو ایک بینچ پر بٹھا دیا۔ صدمے نے ان کی حالت خراب کر دی تھی۔ ماں تو خیر گئی تھی۔ بھائی بھی دیوانہ ہوگیا تھا۔ اور قاتل کی حیثیت سے حوالات میں تھا۔ وہ رات بھر سوئے بھی نہیں تھے۔ بڑی مشکل سے میں نے ان کو چائے پلائی۔ چائے کے ساتھ انہوں نے کچھ کھانے سے انکار کر دیا۔

بالآخر کاغذی کارروائی مکمل ہوئی۔ لاشیں ہمارے حوالے کر دی گئیں اور ہم انہیں ایمبولینس میں گھر لے گئے۔ اس کے بعد ایک نیا بحران کھڑا ہوا۔ ابا چاہتے تھے کہ ہم انہیں ست بدھائی لے جائیں۔

میں نے کہا۔ "ست بدھائی میں صرف دادی کی تدفین ہوگی۔ یہ ان کی خواہش تھی ان کی قاتل کے لیے وہاں کوئی جگہ نہیں۔"

اماں نے کہا۔ "اب جانے دے بیٹا۔"

میں نے کہا۔ "یہ ہرگز نہیں ہوگا۔ میں بتا رہا ہوں۔"

ابا نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ "رفیق بیٹا۔ مرنے والوں کی نیکی بدی ان کے ساتھ گئی...... سزا جزا سب یوم حساب کے لیے ہے۔"

میں نے کہا۔ "ابا...... دادی کے ساتھ اس کی قاتل کو جگہ نہیں دی جا سکتی۔"

ابا نے آہستہ سے کہا۔ "رفیق...... اس یتیم بچی رابعہ کا کچھ خیال کرو...... وہ اب ہماری ذمے داری ہے۔ بے چاری کی ماں رہی نہ باپ رہا۔"

رابعہ اچانک ہاتھ جوڑ کے سامنے آگئی۔ وہ شاید ہماری گفتگو سن رہی تھی۔ اس نے زار و قطار روتے ہوئے کہا "کزن...... میری ماں کو جو سزا ملنی تھی مل گئی...... کیا اب تم اسے معاف نہیں کر سکتے۔"

ایک دم میرا پتھر جیسا بے حس وجود پانی بن گیا۔ مجھے اپنے آپ سے شرم آئی۔ میں نے رابعہ کے ہاتھ تھام لیے۔ "مجھے معاف کر دو رابعہ۔ میرا دماغ ٹھکانے نہیں ہے۔ چلو ہم ست بدھائی چلتے ہیں۔"

ایک ایمبولینس اور چند کاروں پر مشتمل قافلہ تین بجے نکلا اور ڈھائی گھنٹے میں منزل پر پہنچ گیا۔ حویلی میں یہ خبر پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔ حویلی میں رہنے اور کام کرنے والوں کے علاوہ آس پاس کے علاقے سے بھی کچھ لوگ وہاں موجود تھے۔ وہاں ایک اور میٹنگ ہوئی۔ میری جذباتی خواہش تھی کہ دادی کو حویلی کے صحن میں جگہ دی جائے۔ ابا جی نے مجھے سمجھایا کہ گھر کو قبرستان نہیں بنانا چاہیے اور شہر خموشاں میں رہنا نہیں چاہیے۔

بالآخر ہم نے باہر ہی جگہ منتخب کی جہاں ایک درویش کی قبر کے پیچھے کچھ قبریں ایک قطار میں بنی ہوئی تھیں۔ آخر میں ابا جی نے میری ایک بات مان لی۔ درویش کی قبر کے احاطے میں ایک قبر کی جگہ نکلتی تھی۔ وہاں فرش توڑ کے قبر کھودی گئی اور یہ جگہ دادی کو ملی۔ چچی کے لیے پیچھے والی چھ قبروں کے ساتھ ساتویں قبر بنائی گئی۔

نماز جنازہ شروع ہونے والی تھی کہ راجا نے میرے پاس آکے کہا۔ "تھوڑی دیر رک جاؤ۔"

میں نے کہا۔ "مغرب کا وقت قریب ہے۔"

راجا نے کہا۔ "صوفی چچا آرہے ہیں۔ پولیس انہیں لا رہی ہے۔"

ابا جی نے کہا۔ "کیا وہ ہوش میں ہے؟"

"انہوں نے خواہش ظاہر کی تھی۔ کسی مرید نے سفارش پہنچا دی اب انتظار تو کرنا ہی پڑے گا۔" راجا نے بتایا۔

میں نے کہا۔ "ہم دادی کی تدفین کر سکتے ہیں۔"

ابا جی نے ناگواری سے کہا۔ "وہ نذیر کی بھی ماں ہے۔"

کچھ لوگ چلے گئے۔ کچھ موجود رہے۔ شام سے رات ہوگئی۔ لاہور سے ست بدھائی تک آنے میں ڈھائی تین گھنٹے لگ ہی جاتے تھے۔ پولیس کی ایک جیپ ساڑھے سات بجے صوفی چچا کو لائی۔ وہ اب پاگل نہ...... میں چیخ چلا نہیں رہے

تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں جو اباجی کے کہنے پر کھول دی گئیں۔ ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ اباجی سے گلے مل کے ہچکیاں لیتے رہے۔ یہ ایک ایسا سبق تھا جس نے سب کو افسردہ کر دیا۔

بالآخر دادی کو قبر میں اتارا گیا۔ اردگرد کھڑے لوگوں میں سب شناسا صورتیں تھیں۔ شہر سے آنے والوں میں فاروقی کے سوا کوئی نہ تھا۔ اس کی گاڑی میں فریال کے ساتھ فاروقی کی بیوی بھی آگئی تھی۔ باقی وہی لوگ تھے جن کو میں ہر روز دیکھتا تھا۔

پھر اچانک میری نظر ایک ایسی صورت پر جم گئی جس کی یہاں موجودگی کا کوئی جواز نہ تھا۔ وہ سب کے پیچھے تھا اور خود کو چھپائے رکھنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ مجھ سے نظر ملی تو وہ پیچھے ہٹا۔

اگرچہ میں نے اسے فوراً ہی پہچان لیا تھا مگر یہ ممکن نہ تھا کہ میں تدفین کی آخری رسم سے پہلے اپنی جگہ چھوڑ کے اسے پکڑنے کی کارروائی شروع کر سکوں۔ جب ہماری نظر ملی تو اس نے یہی سمجھا تھا کہ میں نے اسے پہچان لیا ہے اور اس نے ایک دفاعی حکمت عملی کے تحت پیچھے ہٹنا شروع کیا تاکہ ضرورت پڑے تو وہ فرار کی راہ اختیار کر سکے۔

میں نے یہ ظاہر کیا جیسے اس پر نظر پڑنا محض ایک اتفاق تھا۔ میں نے وہاں موجود سب لوگوں کی طرح اسے بھی دیکھا تو اس کے لیے چونکنے کی وجہ کوئی نہیں۔ دوسرے لمحے میں نے نظر ہٹائی اور باقی لوگوں کو بے خیالی میں دیکھتا رہا۔ اس سے وہ مطمئن ہو گیا۔

فرخ بالکل میرے ساتھ کھڑا تھا۔ اس کی طرف سر.....

..... گھمائے اور دیکھے بغیر میں نے کہا۔ ''چوکس ہوئے بغیر ایک شخص کو دیکھو۔ اسے معلوم نہ ہو کہ تم اسے دیکھ رہے ہو۔''

فرخ نے سرگوشی میں جواب دیا۔ ''کون شخص ہے؟''

میں نے کہا۔ ''وہ لیمن کلر کی شرٹ اور گرے پتلون میں ہے اس پر نظر رکھو وہ جانے نہ پائے۔''

فرخ کچھ نہیں بولا۔ بہت آہستہ آواز میں کی جانے والی بات اس نے سن لی تھی اور سمجھ لی تھی۔ چند سیکنڈ بعد وہ تھوڑا سا پیچھے ہٹا اور لڑکھڑایا تو اپنے پیچھے موجود کسی شخص سے ٹکرا گیا۔ اس نے آہستہ سے کہا ''سوری'' اور وہیں رک گیا۔

تدفین ختم ہوئی تو لوگوں کے ساتھ میں نے بھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ جنازوں میں سیکڑوں بھی شریک ہوتے ہیں، ہزاروں اور لاکھوں بھی مگر یہ حقیقت ہے کہ صدقِ دل سے دعا انہی کے دل سے نکلتی ہے جن کا دل جدائی کے صدمے سے خون کے آنسو رو رہا ہوتا ہے۔

میری کیفیت کچھ ایسی ہی تھی۔ مجھے یہ بڑا عجیب لگ رہا تھا کہ دادی سفید کفن میں لپٹ کے زیرزمین روپوش ہو گئی ہے۔ میری نظر میں ان کی زندگی کے سارے چہرے یوں آرہے تھے جیسے ٹی وی اسکرین پر ایک کے بعد دوسرا عکس روشن ہوتا جائے۔ ہر چہرہ ایک جذبے کا آئینہ دار تھا۔ پیار..... غصے..... فکرمندی..... ناراضی..... میں نے ہر عکس ساری سچائی کے ساتھ ان کے چہرے پر دیکھا تھا کیونکہ منافقت ان کے بس کی بات ہی نہ تھی۔ دل میں کچھ ہو..... زبان پر کچھ اور آئے..... ایسا کرنا دادی کے لیے اتنا ہی مشکل اور ناممکن تھا جتنا کمپیوٹر کو آن یا آف کرنا..... ریموٹ کنٹرول آپریٹ کر کے ٹی وی کو ٹیون کرنا۔ میں ان سے کہتا تھا کہ دادی..... اِدھر آئیں آپ کو کمپیوٹر چلانا سکھاؤں..... اور وہ جھنجھلا کے ہاتھ ہلاتی تھیں۔ چل ہٹ نمونے..... مجھے نہیں چلانا یہ شیطانی چکر..... کبھی وہ مجھے آواز دے کر کہتی تھیں..... اوئے نمونے..... دیکھ یہ کیا ہو گیا ٹی وی کو..... جہاں وہ ڈاڑھی والے مولانا درس دیتے تھے..... وہاں تو ایک کم بخت لڑکی ناچ رہی ہے توبہ توبہ..... چھوٹی سی چڈی پہن کے۔

اتنے دُکھ میں بھی میرے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ کیبل والے نے اِدھر کا چینل اُدھر کر دیا تھا اور دادی ریموٹ کا بٹن تو دبا سکتی تھیں۔ چینل کو ٹیون کیسے کرتیں۔

ابا نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''چلو رفیق۔''

میں چونکا۔ ''باقی لوگ شاید منتظر تھے کہ میں چلوں تو وہ بھی چلیں۔ مجھے فرخ کہیں دکھائی دیا اور نہ وہ شخص..... وہ شہاب الدین کا سیکریٹری تھا۔ شہاب الدین کراچی میں چیف کا دستِ راست تھا اور لندن سے واپس آتے ہی اس نے مجھے ایک حکم دیا تھا یہ حکم چیف کا حکم تھا جو ٹالا نہیں جا سکتا تھا۔

لاہور میں مجھے غلام محمد نے اپنے مخصوص انداز میں یاددہانی کرا دی تھی کہ میں چیف کے حکم کی تعمیل میں غیرضروری تاخیر نہ کروں..... میرے معمولات کو دیکھتے ہوئے ایسا لگتا تھا کہ میں کچھ غفلت یا تساہل کا مرتکب ہو رہا ہوں..... جو کام مجھے سونپا گیا تھا وہ میرا فرض اولین ہونا چاہیے اور بہت جلد ہو جانا چاہیے۔ ورنہ.....

اس ورنہ کے آگے غلام محمد کو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ آگے کے جملے طے شدہ طور پر وہی رہتے تھے عبرتناک انجام کی خبر دینے والے۔ شہاب الدین اگر چیف کا دستِ راست تھا تو غلام محمد کو پاکستان میں شہاب الدین کا دستِ

راست تسلیم کیا جاتا تھا۔ چنانچہ یہ ممکن نہیں تھا کہ میں اس کی وارننگ کو نظرانداز کر دوں۔

تاہم میری طرف سے تاخیر ہو رہی تھی۔ اس سے کسی کو غرض نہ تھی کہ تاخیر کے اسباب کیا ہیں۔ تنظیم میں ایک فاشسٹ ڈسپلن کا تقاضا تھا کہ آپ اپنے تمام ذاتی معاملات اور مسائل کو ثانوی حیثیت دیں۔ تنظیم کی طرف سے عائد کردہ ذمے داری اولین ترجیح ہونی چاہیے۔ یہی وجہ تھی کہ شہاب الدین نے یہاں اپنے نمائندہ خصوصی کو مجھ پر دباؤ ڈالنے کے لیے روانہ کر دیا تھا۔ ان کے پاس یقیناً میرے بارے میں مفصل معلومات ہوں گی کہ میں کہاں ہوں اور کیا کر رہا ہوں۔

بدقسمتی سے وہ ایک ایسے وقت پہنچا جب میں ایک شدید جذباتی سانحے سے گزر رہا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس ذہنی کیفیت میں اس سے کوئی بات کروں جبکہ وہ عجلت میں ہو گا۔ میں یہ بھی جاننا نہیں چاہتا تھا کہ فرخ نے اسے کیسے ڈیل کیا..... رات تک مجھے دونوں کی صورت دکھائی نہ دی۔

راجا نے ڈپلومیسی کے ساتھ رشوت چلا کے صوفی چچا کو لانے والی پولیس پارٹی سے بات کر لی تھی چنانچہ تدفین کے بعد انہوں نے فوراً واپسی پر اصرار نہیں کیا۔ صوفی چچا نے اس دوران کسی قسم کے ذہنی عدم توازن کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ ہم سب کے ساتھ وہ بڑے ہال میں دوزانو مراقبے کی سی کیفیت میں بیٹھے رہے اور جھومتے رہے۔ کبھی کبھی وہ سر کو دائیں بائیں جھٹکتے ہوئے حق اللہ کا ورد کرنے لگتے تھے۔ پھر خود ہی چپ ہو جاتے تھے۔ ظاہر ہے ان کی اس حالت پر سب کو دکھ تھا مگر یہ خودکردہ را علاجے نیست والا معاملہ تھا۔

معلوم نہیں کھانے کا انتظام کس کی طرف سے ہوا۔ وہاں ہمارے لیے کام کرنے والوں کے ساتھ ست بدھائی کے اردگرد نواح کے کچھ دیہات سے بھی لوگ آگئے تھے اور یہ سلسلہ رات تک چل رہا تھا۔ ان میں ایک ریٹائرڈ صوبیدار تھا..... ایک کسی پرائمری اسکول کا سابق ہیڈ ماسٹر تھا۔ وہ سب غمگساری کا معاشرتی فریضہ پورا کرنے آئے تھے۔ انہیں میں اباجی سے بھی ملوا دیتا تھا۔

حویلی کے اندر والے حصے میں خواتین نے رابعہ کو اور اماں کو گھیرے میں لے رکھا تھا مگر ان سیدھی سادی عورتوں کے پاس کہنے کے لیے رسمی الفاظ کے سوا کچھ نہ تھا۔ بحیثیت عمومی حویلی ایک سوگوار خاموشی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جب عشا کی اذان ہوئی تو مسجد کے پیش امام صاحب نے باہر صحن میں ہی نماز باجماعت کرا دی۔

اسی وقت ایک سوزوکی اندر آئی جس پر تین دیگیں لدی ہوئی تھیں۔ کبیر خان، غنی اور حویلی کے دوسرے ملازموں نے دیگیں اتروائیں اور اندر کھانا لگانے کا بندوبست کرنے لگے۔ حویلی میں قورمے بریانی کی خوشبو پھیل گئی۔ مجھے موت کی کسی تقریب میں پرتکلف دعوت کا اہتمام زہر لگتا تھا مگر میں مجبور تھا۔ یہاں یہ آداب معاشرت کا قصہ تھا۔ جو لوگ یہ اہتمام کرتے تھے ان کے خلوص کی نیت میں شک نہیں کیا جا سکتا تھا۔

ابھی کھانا شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ گیٹ سے شاہی ہاتھی جیسی لینڈ کروزر اندر آئی۔ اس کے آگے پیچھے دو گاڑیاں تھیں۔ ایک میں رانا صاحب کے باڈی گارڈ تھے۔ دوسری میں ان کا بڑا بیٹا آیا تھا۔ گارڈ نے مجھے مطلع کیا کہ رانا صاحب تعزیت کے لیے تشریف لائے ہیں تو میں اخلاقاً باہر گیا۔

میرے نزدیک یہ کھلی منافقت کے سوا کچھ نہ تھا۔ ایک طرف آپ کا ذاتی کردار خباثت بدباطنی اور عداوت کی عکاسی کرتا ہو دوسری طرف آپ شرعی اور معاشرتی حسن اخلاق کے مظاہرے میں اتنی فراخدلی دکھائیں کہ دشمن کے غم میں شریک ہونے پہنچ جائیں۔ لیکن ہماری پوری سوسائٹی ایسی بدترین منافقت کا شکار تھی۔ صبح سے شام تک ہر قدم پر ہر جگہ ایسا ہی ہو رہا تھا۔

رانا اور اس کا بیٹا بڑے کروفر سے اترے اور بڑی انکساری سے اباجی کے پاس بیٹھ گئے۔ ایک بار پھر تعزیت کے رسمی الفاظ دہرائے گئے اور رانا صاحب نے سب کے ساتھ دعائے مغفرت کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ مجھے یہ سب انتہائی گراں گزر رہا تھا مگر برداشت بھی کرنا پڑ رہا تھا۔ اباجی کو رانا صاحب کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا چنانچہ وہ انہیں سادگی سے اپنے اور میرے بارے میں بتا رہے تھے۔

جب کھانا شروع ہوا تو انکار کسی کے لیے ممکن نہ رہا۔ کھانا کھلانے والے ہم سب کے پیچھے پڑ گئے اور وہی باتیں دہرانے لگے کہ مرنے والے کے ساتھ کوئی نہیں مرتا اور ماں کسی کی ہمیشہ رہتی ہے..... وغیرہ وغیرہ۔ اپنی طبیعت پر جبر کر کے مجھے بھی کھانا پڑا۔ کھانا کسی ماہر باورچی سے پکوایا گیا تھا۔ قورمہ اور بریانی کے بعد زردے تک ہر چیز انتہائی مرغن اور شاندار تھی۔ میں نے دیکھا کہ گاؤں کے سب لوگوں کے ساتھ میرے اپنے ملازم بھی اس دعوت سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ ایسا کھانا شادی بیاہ کے علاوہ رئیسوں کی موت کے موقع پر بھی صرف انہی خوش نصیبوں کو میسر آتا تھا جن کو دعوت میں شرکت کا اعزاز حاصل ہو۔

کھانے کے بعد رانا صاحب نے اجازت طلب کی تو اباجی کے ساتھ میں بھی اخلاقاً انہیں باہر تک چھوڑنے گیا۔ وہ

رسما کہتے رہے کہ آپ تکلف نہ کریں مگر یہ جاننے کے بعد کہ وہ ساتھ والے گاؤں کے رئیس اور اسمبلی کے ممبر ہیں ابا جی ان کے ظاہری اخلاق کے مظاہرے سے بے حد متاثر نظر آ رہے تھے اور جواب میں کسی بد اخلاقی کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

اسی وقت پولیس کا سب انسپکٹر میرے پاس آیا۔ ''سر اب ہمیں اجازت ہے صوفی صاحب کو لے جائیں؟''

میں سمجھ گیا کہ وہ صوفی چچا کو واپس لے جانا چاہتے ہیں۔ میں نے سر کے اشارے سے اجازت دی اور پھر اس کا شکریہ ادا کیا۔ ''تھینک یو انسپکٹر۔''

''نہیں جناب نواب صاحب...... یہ تو اخلاق فرض تھا ہمارا۔'' وہ بولا۔

رانا صاحب نے افسوس سے سر ہلایا۔ ''یہ بھائی ہے آپ کا۔''

ابا جی نے سر جھکا لیا۔ پولیس پارٹی صوفی چچا کو پھر ہتھکڑی ڈال کے جیپ میں سوار کرانا چاہتی تھی اور وہ مزاحمت کر رہے تھے۔ ان پر دوبارہ دیوانگی کا دورہ پڑ گیا تھا۔ وہ چلا چلا کے کہہ رہے تھے ''بھائی صاحب...... سمجھا لو ان سور کے بچوں کو...... قسم اللہ پاک کی بھسم کر دوں گا...... مجھے زنجیروں سے باندھتے ہو بدبختو تمہارے گلے میں لعنت کا طوق پڑے گا۔ جہنم کا ایندھن بنو گے......''

ابا جی نے کہا۔ ''نذیر...... ہوش میں آؤ...... کیوں تماشا بنا رہے ہو ہمیں سب کے سامنے۔''

رانا نے مجھ سے پوچھا۔ ''تمہارا یہی چچا قاتل ہے نا؟''

میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''آپ سب کچھ جانتے ہیں تو پھر پوچھ کیوں رہے ہیں۔''

رانا کا لہجہ معتدل رہا۔ ''پاگل ہو گیا بے چارا...... اللہ رحم کرے اسے تو پاگل خانے ہی بھیجنا پڑے گا۔''

''اللہ اپنا فضل کرے گا۔'' ابا جی نے عادت کے مطابق کہا۔

''آپ فکر مت کریں اپنے پروفیسر صاحب۔'' اس نے دوستانہ بلکہ مربیانہ انداز میں ابا جی کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھا۔ ''آپ کے بھائی کو پھانسی نہیں ہو گی۔''

میں نے برہمی سے کہا۔ ''بہتر ہے آپ ان معاملات پر بات نہ کریں۔ یہ ہمارے گھر کا معاملہ ہے۔''

''وہ تو ہے جی...... مگر قانونی معاملہ بھی تو ہے۔''

ابا جی نے کہا۔ ''ہم جانتے ہیں اس کی ذہنی حالت کو دیکھتے ہوئے قانون کتنی رعایت دے گا۔''

''او نہیں جی پروفیسر صاحب...... رعایت تو لینی پڑتی ہے۔ دیتا کوئی نہیں۔ آپ کہیں تو میں پنجاب کے وزیر داخلہ سے بات کروں...... اگلے اجلاس میں......''

میں نے کہا۔ ''آپ کچھ مت کریں۔ اپنے کام سے کام رکھیں رانا صاحب...... ہمیں کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔''

''اچھا جی آپ کی مرضی۔'' اس نے ابا جی سے ہاتھ ملایا اور بولا۔ ''سوئم جمعرات کو پڑے گا۔''

ابا جی نے بے بسی سے کہا۔ ''غالباً...... پرسوں۔''

''ٹھیک ہے...... کھانے کا انتظام اس دن بھی میرا ہو گا۔'' وہ لینڈ کروزر میں بیٹھنے کے بعد بولا۔

یکلخت مجھے یوں لگا جیسے بے خبری میں کسی نے مجھے لحم خنزیر جیسی حرام شے کھلا دی ہے...... بلاشبہ اللہ کی عطا کردہ کسی نعمت کے لیے ایسا سوچنا گناہ سمجھا جا سکتا ہے مگر یہ میرے اس وقت کے جذبات کا منفی ردِعمل تھا اگر مجھے قبل از وقت معلوم ہو جاتا تو پتا نہیں میرا کیا ردِعمل ہوتا۔ شاید میں غصے کی کیفیت میں کھانے کی دیگ کو دروازے سے لوٹا دیتا۔ شاید ابا جی کی وجہ سے میں بے بس ہو جاتا اور کچھ نہ کر پاتا۔ ابا جی تو یہی کہتے کہ کسی دشمن کی نیکی بھی نیکی ہی ہوتی ہے۔ اس وقت میں کیسے سمجھاتا کہ رانا صاحب سے نیکی کی توقع رکھنا اتنا ہی عبث ہے جتنا شیطان سے خیر کی امید رکھنا۔

لیکن اب معاملہ میری برداشت سے باہر ہو گیا...... میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''رانا صاحب...... ہم جاہلیت کی ان رسموں کے قائل نہیں ہیں کہ کسی کے مرنے پر جشن جیسی دعوت کا اہتمام ہو اگر مجھے پہلے معلوم ہو جاتا تو میں آپ کو منع کر دیتا...... لیکن اب ہرگز اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔''

''اجی نواب صاحب...... یہ تو معاشرتی ذمے داری ہے ہم سب کی...... آخر ہم پڑوسی ہیں۔''

''مجھے معلوم ہے آپ کیسے پڑوسی ہیں۔'' میں غصے میں کہہ گیا۔ ''آپ نے اپنا فرض پورا کر لیا...... اتنا کافی ہے۔''

ابا جی نے مجھے گھورا...... ''رفیق۔''

میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''آپ کا شکریہ...... کہ آپ تشریف لائے۔''

رانا نے یہ ظاہر کیا جیسے میرے رویے کا اس نے بالکل برا نہیں مانا کیونکہ میری تو ذہنی حالت ہی نارمل نہیں ہے اور یہ بات وہ سمجھتا ہے۔ وہ ہاتھ ملا کے رخصت ہو گیا۔ اس کا بیٹا مجیب علی جتال نیم چڑھا کڑوا کریلا تھا اور باپ سے زیادہ بد خو اور بد اخلاق ہو گا مگر اسے رانا سمجھا بجھا کے لایا تھا کہ وہ اپنے غصے پر قابو رکھے ایک تو موقع ایسا نہیں ہم نے نیکی کا جو احسان ان پر لادنا ہے وہ ضائع جائے گا پھر دشمن کے قلعے میں عزت

کی حفاظت میں طاقت نہیں منافقت کام آتی ہے۔

ان کے جاتے ہی ابا جی نے خفگی سے کہا۔ ''رفیق یہ کیا وطیرہ ہے؟''

''میں نے کہا۔'' ابا جی...... میں آپ کو بعد میں سمجھاؤں گا۔ آپ اس شخص کو نہیں جانتے...... میں جانتا ہوں۔''

سب لوگ گزشتہ رات کے جاگے ہوئے تھے سارا دن شدید ذہنی اور جسمانی اذیت میں گزرا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ کہیں ابا اور اماں کی طبیعت نہ بگڑ جائے مگر مجھ سے بڑھ کر ان کا خیال رکھنے والی ڈاکٹر شہناز تھی۔ فاروقی واپس گیا تو اپنے ساتھ فریال کو بھی لے گیا تھا۔ اس طرح کسی کو بھی یہ شک نہ ہوا کہ وہ اس حویلی میں میرے ساتھ تھی۔

میں نے رات دس بجے شہناز سے پوچھا تو اس نے مجھے بتایا کہ وہ اماں اور ابا کو ایک سکون آور گولی زبردستی کھلا چکی ہے۔ ''وہ صبح سو کر اٹھیں گے تو ٹھیک ہوں گے۔''

''ہاں...... کل دوسرا دن ہو جائے گا۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ دنیا ایسے ہی چلتی ہے۔''

''اب اگر تم بھی اچھے بچوں کی طرح ایک گولی کھا لو۔''

میں نے انکار کر دیا۔ ''میں ٹھیک ہوں۔''

''میں کب کہہ رہی ہوں کہ ٹھیک نہیں ہو۔ حالانکہ یہ فیصلہ ایک ڈاکٹر کو کرنا چاہیے...... چلو خدمت کرو۔'' اس نے گولی میرے ہاتھ پر رکھ کے پانی کا گلاس تھما دیا۔

مجھے گولی نگلنا پڑی۔ ''راجا کہاں ہے؟''

''ہو گا کسی کام میں مصروف...... بلکہ یاد آیا...... وہ سونے چلا گیا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اور فرخ؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اسے میں نے نہیں دیکھا۔''

میں بھی شہناز کے پیچھے اندر جا کے دیکھنا چاہتا تھا کہ ابا اور اماں سونے کے لیے لیٹ گئے ہیں یا نہیں ویسے تو ان کا خیال رکھنے والی رابعہ بھی تھی لیکن اس کی حالت سب سے زیادہ قابل رحم تھی۔ جتنا صدمہ مجھے دادی کی مرگ ناگہاں کا تھا اتنا ہی اسے بھی تھا شاید گزشتہ آٹھ برسوں میں جب میں ملک سے باہر تھا اس کی جذباتی قربت دادی سے بہت زیادہ رہی ہو گی کیونکہ ایک طرح سے وہ اکلوتی پوتی رہ گئی تھی مگر اس کے ساتھ ہی اچانک اس نے والدین بھی کھو دیے تھے...... ماں جیسی بھی تھی اس کی ماں تھی۔ وہ حالات جتنے دردناک تھے اتنے ہی رابعہ کے لیے باعثِ ندامت بھی ہو گئے تھے۔ جن میں اس کی ماں پر قاتل ہونے کا الزام آ گیا تھا بے شک اس نے یہ قتل دیوانگی میں کیا تھا مگر الزام کا یہ داغ اس کے مارے جانے کے باوجود ختم نہیں ہوا تھا رابعہ زندگی بھر کے لیے ایک قاتل ماں کی بیٹی بن گئی تھی اس کی مزید رسوائی کا سبب باپ بنا تھا جس نے اپنی زندگی میں بھی عزت نہیں کمائی تھی اب وہ پاگل تھا اور اس پر اپنی بیوی کے قتل کا الزام بھی تھا ان سارے الزامات کی رسوائی اور شرمندگی کا بار صرف رابعہ کے لیے تھا۔

اندر والے کمرے میں اماں چادر میں سر لپیٹے پڑی تھیں۔ ابا تکیے پر ہاتھ سر کے نیچے رکھے آنکھیں بند کیے لیٹے ہوئے تھے۔ صرف رابعہ تھی جو ان کے درمیان اپنا سر گھٹنوں پر ٹکائے چپ بیٹھی تھی اور اپنے سامنے دیوار کو گھور رہی تھی۔ غالباً اسے میرے اماں ابا نے اپنے درمیان سونے کے لیے لٹایا ہو گا جتنا وہ اماں ابا کا خیال رکھ رہی تھی اب میرے اماں ابا اس سے زیادہ اپنی یتیم بھتیجی کے لیے ہلکان ہو رہے تھے۔

مجھے دیکھ کے اس نے سر گھمایا تو میں نے اسے اشارے سے باہر بلا لیا۔ وہ کچھ دیر مجھے خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہی۔ پھر آہستہ سے اٹھی اور نیند میں چلنے والے کی طرح قدم اٹھاتی میرے پیچھے آ گئی۔

وہ برآمدے میں میرے قریب آ کے کھڑی ہو گئی۔ میں نے کہا۔ ''کیا بات ہے نیند نہیں آ رہی ہے؟''

''تم بھی تو پھر رہے ہو اِدھر اُدھر۔''

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ہم آہستہ آہستہ برآمدے سے اترے اور صحن کے وسط میں فوارے کے خالی تالاب تک پہنچ گئے اس کی منڈیر پر بیٹھ گئے۔ باہر بڑی پرسکون رات تھی وہ میرے کندھے پر سر رکھ کے رونے لگی...... میں اس کے سر کو محبت سے تھپکتا رہا۔ جذباتی طور پر وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ چکی تھی اور سب کے درمیان ہوتے ہوئے بھی تنہا تھی۔ زندگی کی ضرورت کا احساس اور اعتماد بحال کرنے کے لیے اسے الفاظ کی نہیں حقیقی سہارے کی ضرورت تھی جذباتی یقین کی ضرورت تھی۔

جب تک وہ روتی رہی میں نے اسے کچھ نہیں کہا۔ کچھ دیر بعد وہ خود ہی چپ ہو گئی پھر وہ بولنے لگی۔ ''یہ سب کتنا عجیب اور بھیانک لگتا ہے کزن...... کتنا ناقابلِ یقین...... کہ کل رات اس وقت دادی زندہ تھی...... میری ماں زندہ تھی...... ہم سب ہنس بول رہے تھے ایک خاندان کی ساری قربت کے ساتھ دسترخوان پر جمع تھے...... کون جانتا تھا کہ ہم آخری بار اکٹھے ہوئے ہیں اور اب دیکھو......'' اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ''ادھر ایک قبر کی گہرائی میں دادی لیٹی ہوئی ہے...... اس کے پیچھے میری ماں ہے...... اور میرا باپ بہت دور حوالات کی سلاخوں کے پیچھے دکھ اور ملال...... ندامت اور

خوف کے ہر احساس پر دیوانگی کا پردہ ڈالے تماشا بنا ہوا ہے......" وہ پھر رو پڑی۔

جب وہ چپ ہوگئی تو میں نے آہستہ سے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ "رابعہ تمہارے دکھ کو میں اتنا ہی محسوس کر رہا ہوں جتنا تم کرتی ہو...... اگر میں ایسا کہوں تو شاید یہ سچ نہیں ہوگا۔"

"تایا اور تائی کو میں نے دیکھا...... وہ اپنا غم بھلا کے میرے لیے پریشان ہو رہے ہیں۔"

"دیکھو یہ سارے دکھ اور سارے سکھ...... ہمیں اپنی مرضی سے نہیں ملے...... ہم اپنے نوشتہ تقدیر کو قبول کرنے پر مجبور ہیں...... اسی ایمان میں تم کو بھی سکون مل سکتا ہے...... حالات آہستہ آہستہ خود ایک سمت اختیار کرتے گئے......اور ہم کچھ نہ کر سکے۔"

"کوئی بھی کچھ نہیں کر سکا...... وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

"ہاں...... قصور وار نہ تم ہو نہ میں...... کیا یہ اطمینان ہمارے لیے کافی نہیں ہے کہ ہمارے درمیان کوئی غلط فہمی رنجش اور بدگمانی نہیں...... تم آج بھی ایسا تو نہیں سمجھتی ہو نا کہ جو کچھ ہوا اس کا ذمے دار میں ہوں؟"

"ایسا میں کیسے سوچ سکتی ہوں؟"

"یہی تمہاری وہ اچھائی ہے جو تمہیں میرے قریب کرتی ہے۔ تمہارا دکھ تو میں کم نہیں کر سکتا۔ اس کا علاج صبر ہے جو وقت کے ساتھ آئے گا...... لیکن میں تمہیں یقین دلا سکتا ہوں کہ تمہیں ہر پریشانی سے دور رکھنا تمہاری حفاظت کرنا اور تمہاری ہر خوشی کو مقدم سمجھنا...... میری ذمے داری رہے گی...... ہمیشہ۔"

"میں جانتی ہوں کزن......"

"میرے ماں باپ تمہارے والدین کا نعم البدل نہیں ہو سکتے لیکن وہ بھی کوشش ضرور کریں گے کہ جتنا پیار دے سکتے ہیں......"

"رسمی باتیں مت کرو۔"

میں نے کہا۔ "یہ رسمی باتیں نہیں ہیں...... بس میں تمہیں یقین دلانے کے لیے الفاظ کا سہارا لینے پر مجبور ہوں۔ میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ مجھے تمہارے لیے اس سے زیادہ کرنا چاہیے جتنا میں کرتا ہوں...... چلو چھوڑو یہ باتیں اب جا کے سو جاؤ اپنا خیال رکھو۔"

"وہ کھڑی ہوگئی...... "رفیق......"

میں نے کہا۔ "بولو...... کہہ دو جو کہنا ہے۔"

"میں واپس جانا نہیں چاہتی...... اس گھر سے مجھے ڈر لگتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "تو کس نے کہا ہے کہ واپس جاؤ۔ تم رہو یہاں یہاں جو کچھ ہے اس پر تمہارا اتنا ہی حق ہے جتنا میرا...... تم یہاں مہمان نہیں ہو کہ تمہیں جانا پڑے...... تم مالک ہو برابر کی...... اور یہ مت سمجھنا کہ اچانک میرے دل میں تم سے ہمدردی کے جذبات اُبل پڑے ہیں۔ تم جانتی ہو یہ فیصلہ میں پہلے ہی کر چکا تھا کہ تمہارا حق ملکیت میرے برابر ہوگا۔"

"مجھے کسی چیز کی ضرورت نہیں کزن...... میری ماں کو بڑی فکر تھی کہ یہ سب اسے کیوں نہیں ملا...... یہ سب تو یہیں رہ جاتا ہے بالآخر...... مجھے تمہارا سہارا ہی بہت ہے...... مجھے دوسرے جھمیلوں میں نہیں پڑنا۔" وہ پلٹ کے بولی۔

اس وقت رابعہ کے جذبات پر قنوطیت کا غلبہ تھا۔ میں اسے آہستہ آہستہ اندر جاتا دیکھتا رہا۔ وہ بہت مضبوط اعصاب کی لڑکی ثابت ہو رہی تھی...... وہ حالات کی سفاکی کا مقابلہ کر رہی تھی اور اپنے اندر کے طوفان سے لڑ رہی تھی۔ خود کو بکھرنے سے بچا رہی تھی اور مستقبل سے وابستہ امیدوں کو زندہ رکھنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ کوئی کمزور لڑکی ہوتی تو ان صدمات سے پاگل ہو جاتی۔

رابعہ کے مستقبل کے بارے میں سوچتے ہوئے میرا ذہن فرخ کی طرف گیا...... میری طرح رابعہ اس کی ذمے داری بھی تھی اور شاید زندگی کے سفر میں خدا کے بعد سب سے بڑا سہارا فرخ ہو سکتا تھا مگر وہ معلوم نہیں کہاں تھا...... میں نے سارا دن میں اسے ایک بار بھی رابعہ کی دل جوئی کرتے نہیں دیکھا تھا۔ اس کا موقع ہی نہ تھا۔ رابعہ اندر خواتین کے ساتھ تھی فرخ باہر مصروف تھا۔

اب مجھے پھر خیال آیا کہ میں نے ایک کام اس کے سپرد کیا تھا وہ اتنا غیر ذمے دار نہیں تھا کہ میری بات سنتا اور کچھ نہ کرتا لیکن اس نے بعد میں مجھے کچھ نہیں بتایا تھا۔ شہناز کو اس کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا رابعہ نے بھی کوئی بات نہیں کی تھی آخر وہ گیا کہاں...... میں نے سوچا اور پھر گیٹ کی طرف گیا جہاں گارڈ بے حد مستعد کھڑا تھا۔

میں نے کہا۔ "کیا تم رات بھر کھڑے رہتے ہو؟"

"جی سر...... ڈیوٹی ہے...... سو نہیں سکتے۔"

میں نے کہا۔ "بیٹھ تو سکتے ہو...... اپنے لیے ایک کرسی رکھو۔"

"یس سر...... بڑی مہربانی ہے آپ کی۔"

میں نے کہا۔ "کیا فرخ صاحب کہیں باہر گئے ہیں۔"

"نہیں جناب عالی...... وہ ادھر ہیں۔" اس نے سرونٹ کوارٹرز کی طرف اشارہ کیا۔ "اس بندے کے ساتھ۔"

میں نے کہا۔ "وہ بندہ بھی وہیں ہے؟"

"جی جناب عالی...... اس کی گاڑی باہر کھڑی ہے۔"

میں نے گارڈ سے دروازہ کھولنے کو کہا۔ باہر کچھ فاصلے پر ایک سوزوکی خیبر کار کھڑی تھی۔ میں نے قریب جا کے چیک کیا تو اس کے دروازے لاک نہیں تھے۔ گلوز کمپارٹمنٹ میں گاڑی کے کاغذات موجود تھے ان میں مالک کا نام طفیل لکھا ہوا تھا۔

گارڈ نے مجھے مطلع کیا۔ "یہ بندہ بھاگ جاتا اگر فرخ صاحب قابو نہ کرتے۔"

"فرخ نے اس کو کیسے قابو کیا؟"

"دوڑ کے پیچھے سے پکڑا جناب عالی...... پھر میں پہنچ گیا اس کے سر پر رائفل ماری...... ورنہ ریوالور نکال لیا تھا اس نے...... کون ہے جی یہ بدمعاش۔"

میں نے کہا۔ "ایسے تو بہت آ سکتے ہیں۔ بس تم ہوشیار رہو۔"

صحن عبور کر کے میں سرونٹ کوارٹرز تک گیا۔ وہاں فرخ برآمدے کے فرش پر سویا پڑا تھا۔ اس کے پاس نہ چادر تھی اور نہ تکیہ تھا۔ وہ عین اس کمرے کے سامنے لیٹا ہوا تھا جو پہلے کاسو اور اس کی بیوی کا کمرا تھا۔ دروازے میں قفل دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ فرخ نے اس میں اپنے قیدی کو بند کر رکھا ہے۔

کمرے کے اندر بھی خاموشی تھی۔ معلوم نہیں فرخ نے قیدی کو خاموش رکھنے کے لیے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کے منہ میں کپڑا ٹھونسا تھا ناک آؤٹ کر کے لٹا دیا تھا یا شہناز کی مدد سے کوئی انجکشن دے کر سلا دیا تھا۔ آخری طریقہ سب سے آسان تھا مگر ایسا ہوتا تو شہناز مجھے ضرور بتا دیتی۔ بہرصورت فرخ نے اپنا کام بڑی عمدگی سے کیا تھا۔ اسے کمرے میں مقفل کرنے کے بعد وہ عین دروازے کے مقابل سو گیا تھا۔

رات کے ساڑھے گیارہ بجے میرا قیدی سے پوچھ گچھ کا بالکل موڈ نہ تھا۔ فرخ کی بے خبری کی نیند سے بھی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ تھکن سے چور ہے ورنہ برآمدے کے ننگے فرش پر یوں نہ پڑا ہوتا۔ اس نے اپنی کارروائی کی کسی کو خبر نہیں ہونے دی تھی اور ملزم کو کسی ہنگامہ آرائی کے بغیر گرفتار کر کے یہاں مقفل کر دیا تھا۔ یہ جگہ حویلی کے آخری کنارے پر تھی اور ہوش میں آ جانے کے بعد ملزم شور کرتا تب بھی اس کی آواز کسی کے کانوں تک نہ پہنچتی۔

میں بھی جلدی میں نہ تھا۔ ملزم سے اگلے روز بھی پوچھا جا سکتا تھا کہ وہ حویلی کے اندر کیا کر رہا تھا۔ جہاں صرف خاندان کے سوگوار تھے یا وہ جو اس سانحے میں ہمدردی اور غمگساری کے لیے شریک تھے۔ وہ نہ سوگواروں میں تھا نہ غمگساروں میں۔ اس نے موقعے سے فائدہ اٹھایا تھا اور اپنی شناخت ظاہر کیے بغیر اندر پہنچ گیا تھا گارڈ کے بیان کے مطابق اس نے فرار ہونے کی ناکام کوشش کے بعد ریوالور سے فرخ پر فائر کرنے کے لیے ریوالور بھی نکالا تھا۔

میں واپسی کے لیے پلٹا ہی تھا کہ اندر سے کوئی چیز دروازے سے ٹکرائی۔ فرخ ہڑبڑا کے اٹھا۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھ کر اپنا اطمینان کیا کہ قفل اپنی جگہ موجود ہے پھر اس نے مجھے دیکھا اور اپنے کپڑے جھاڑنے لگا۔

میں نے کہا۔ "اندر وہی ہے...... طفیل؟"

میری بات کا جواب اندر سے ایک اور دھماکے کی صورت میں آیا۔ طفیل اندر سے دروازے کو ٹکریں مار رہا تھا۔

"اسے میں نے باندھ کے ڈالا تھا۔" فرخ بولا۔ "شاید اس نے خود کو آزاد کر لیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "دروازہ کھولو لیکن ذرا احتیاط سے۔"

فرخ نے چابی لگا کے تالا کھولا۔ پھر کنڈی کھولی اور دروازے کو تھوڑا سا زور لگا کے پیچھے دھکیلا۔ وہ شاید دروازے کے پیچھے ہی موجود تھا لیکن اس نے دروازہ کھول کے فرخ پر حملہ کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ وہ دروازے کو باہر کی طرف دھکیل رہا تھا۔ مجھے یہ ایک پرفریب حکمتِ عملی لگی۔ اگر وہ اچانک پیچھے سے ہٹ جاتا تو فرخ اپنے ہی زور میں اندر جا کے منہ کے بل اس کے قدموں میں گرتا میں نے فرخ کو اس دھوکے سے خبردار کیا لیکن خود بھی اس کے پیچھے تیار رہا۔

فرخ نے جھنجھلا کے کہا۔ "اوئے دروازہ کیوں نہیں کھولنے دیتا؟"

اندر خاموشی رہی...... فرخ کے دھکا دینے سے دروازہ تھوڑا سا پیچھے ہوتا تھا اور پھر اپنی جگہ آ جاتا تھا اندر کنڈی لگی ہوتی تو دروازہ بالکل نہ ہلتا۔

فرخ نے تیسری کوشش میں ناکام ہو کے کہا۔ "طفیل...... ہم بات کرنا چاہتے ہیں تم سے...... دروازے کے پیچھے سے ہٹ جاؤ۔"

میں نے کہا۔ "چالاکی سے کچھ نہیں ہوگا تم بھاگ کے کہیں نہیں جا سکتے...... میں ریوالور لیے کھڑا ہوں اور گیٹ پر گارڈ موجود ہے۔"

فرخ نے کہا۔ "یہ معاملہ کچھ اور ہے۔"

اس کا خیال درست تھا۔ جب ہم دونوں نے مل کے دھکا لگایا تو پٹ کھل گئے طفیل لاش کی طرح دروازے کے پیچھے پڑا تھا۔ اس کے وزن نے دروازے کو روک رکھا تھا...... فرخ نے محتاط رہتے ہوئے جھک کر اسے سیدھا کیا۔

میں نے کہا۔ ''کیا یہ مر گیا ہے؟''

فرخ نے اس کی نبض دیکھی اور پھر انکار میں سر ہلا دیا۔ ''سانس نارمل ہے...... نبض بھی ٹھیک لگتی ہے یہ بے ہوش ہے۔''

میں نے کہا۔ ''کیا تم نے اسے مارا تھا؟''

''نہیں...... یعنی اسے قابو کرنے کے لیے گارڈ نے سر پر رائفل کا بٹ ضرور مارا تھا۔ وہ ایسا نہ کرتا تو یہ مجھے شوٹ کر دیتا۔ اس نے ریوالور نکال لیا تھا۔''

''گارڈ نے مجھے بتایا ہے کہ یہ فرار ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔''

''کوشش میں کامیاب بھی ہو گیا تھا...... اس نے لوٹ کر لیا تھا کہ تم اسے دیکھ چکے ہو۔'' فرخ نے کہا۔

''آخر یہ وہاں کیوں موجود تھا۔''

فرخ نے کہا۔ ''جب تم نے مجھ سے کہا کہ اسے پکڑو تو یہ بات بھی اس سے پوشیدہ نہیں رہی تھی۔ وہ پیچھے ہٹ کے خاموشی سے نکل جانا چاہتا تھا۔ جب اس کو اندازہ ہوا کہ میں اس کے پیچھے لگ گیا ہوں تو وہ بھاگا...... تدفین حویلی کے پیچھے ہو رہی تھی پہلا موڑ کاٹتے ہی یہ دوڑا تو کسی نے بھی نہیں دیکھا۔ میں اس کے پیچھے بھاگا میں نے اسے دھمکی ضرور دی کہ رُک جاؤ ورنہ گولی مار دوں گا لیکن حقیقت یہ ہے کہ میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ یہ کار کے قریب پہنچا ہی تھا کہ میں نے اسے پکڑ لیا اور اس وقت مجھ سے پیچھا چھڑانے کے لیے اس نے ریوالور نکال لیا تھا مگر میری خوش قسمتی کہ گارڈ نے صورت حال کو بروقت سمجھ کے کارروائی کی اور اسے ناک آؤٹ کر دیا۔ میں اسے یہاں لے آیا۔''

''اس کے بعد...... کیا یہ ہوش میں نہیں آیا؟''

''یہ آدھے گھنٹے میں نارمل ہو گیا تھا۔ اس نے کہا کہ سر میں درد ہے تو میں نے اس کے لیے اسپرین کی گولیاں منگوائیں۔ ریشم نے چائے بھی لا کر دی۔ میں نے پوچھا کہ کون ہو تم اس نے کہا کہ رفیق مجھے جانتا ہے اس کے سوا میں کسی سے بات نہیں کروں گا۔ اس کا لہجہ اتنا خراب تھا کہ مجھے اور غصہ آیا میں نے اس کا دماغ کچھ درست کیا۔''

''تم نے اسے مارا؟''

''ہاں...... میں نے کہا کہ رفیق صاحب کا نام عزت سے لو...... انہیں نواب رفیق شیرازی کہو...... اس پر وہ بڑے ذلت آمیز طریقے پر ہنسنے لگا اور اس نے مزید اشتعال انگیزی کی۔''

''مجھے بتاؤ اس نے کیا کہا؟''

اس نے کہا۔ ''وہ سالا گنگو تیلی کی اولاد آج خود کو راجا بھوج کہتا ہے...... کون سے نواب کا نطفہ ہے وہ...... ہم جانتے ہیں اس کی اوقات...... ظاہر ہے اس کے بعد میں نے اس پر پولیس والا تھرڈ ڈگری کا طریقہ آزمایا۔''

میں نے کہا۔ ''اس سے کوئی فائدہ ہوا؟''

فرخ نے خفت سے نفی میں سر ہلایا۔ ''اس کا لہجہ ضرور بدلا مگر وہ اپنی بات پر اڑا رہا کہ میں کسی اور سے بات نہیں کروں گا میں یہاں صرف بات کرنے آیا تھا مگر جو سلوک تم نے میرے ساتھ کیا ہے اس کے بعد مشکل میں پڑیں گے تمہارے نواب صاحب...... اور تم...... میں نے کہا کہ تمہارے دماغ کا سارا خناس میں...... کے راستے نکال دوں گا اس کوٹھڑی میں گاڑ دیا تو قیامت تک پتا نہیں چلے گا کہ تم گئے کہاں۔''

میں نے کہا۔ ''اگر یہ بات ہی کرنے آیا تھا تو بات کرنے کے لیے وہ رکا کیوں نہیں؟''

''میرا خیال ہے کہ یہ بکواس کر رہا تھا...... میں نے پوچھا کہ بات کرنے سے تمہیں کس نے روکا تھا...... کہنے لگا کہ بات کرنے کا موقع نہیں تھا...... پھر میں نے پوچھا کہ تم بھاگے کیوں؟ وہ ہنسنے لگا کہ جب کتا پیچھے لگ جائے تو آدمی کیا کرتا ہے...... جان بچانے کے لیے بھاگتا ہے یا پھر کتے کو گولی مار دیتا ہے۔''

میں نے تشویش سے کہا۔ ''اس کو بعد میں تو کوئی ایسی چوٹ نہیں لگی؟ ہوش میں آنے کے بعد۔''

فرخ مجرم بن گیا۔ ''بالکل نہیں...... میں غصے میں ضرور تھا لیکن میں نے ایسے نہیں مارا تھا کہ اسے کوئی نقصان ہو...... مجھے آپ کی ہدایات کا خیال تھا...... آپ نے کہا تھا کہ اس پر نظر رکھو...... کوئی زیادتی میں کیسے کر سکتا تھا...... آپ مجھ پر یقین کریں۔''

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ ''یہ کہنے کی بالکل ضرورت نہیں...... تم سے زیادہ قابلِ اعتبار کون ہو سکتا ہے جس کے سپرد میں یہ کام کرتا۔''

''ابھی کچھ دیر پہلے تک...... میرا خیال ہے دس بجے تک یہ ہوش میں تھا اس نے کھانا بھی کھایا تھا تھوڑا سا...... میں باہر بیٹھا تھا لیٹا تو آنکھ لگ گئی۔''

میں نے کہا۔ ''یہ سر کی چوٹ کا نتیجہ نہ ہو...... اس کے [illegible]ات بعض اوقات دیر سے ظاہر ہوتے ہیں۔ چوبیس گھنٹے [illegible] تک۔''

فرخ نے رسی سے اس کے ہاتھ کمرے کے پیچھے [illegible]دھے تھے پھر اسی رسی سے پیر باندھے تھے اور رسی کے باقی [illegible]ے کو پیچھے کی مضبوط سلاخوں والی کھڑکی سے باندھ دیا تھا۔ طفیل [illegible]ے لیے اپنے ہاتھوں یا پیروں کو آزاد کرانا ممکن نہ تھا مگر وہ کسی [illegible]رح کھڑکی سے بندھی ہوئی رسی کو کھینچ کر ڈھیلا کرنے میں [illegible]میاب رہا تھا اور لڑھکتا ہوا یا کھسکتا ہوا دروازے تک آ گیا [illegible]۔ اس نے دروازے پر لاتیں ماری تھیں یا خود دروازے [illegible]ے ٹکرایا تھا۔ یہ دھماکے میں نے بھی سنے تھے مگر اس کے بعد [illegible] بے ہوش ہو گیا تھا۔

میں نے فرخ سے کہا کہ وہ طفیل کے ہاتھ پیر کھول دے [illegible]ور خود شہناز کو جگانے چلا گیا۔ شہناز بھی تھکن سے بے حال [illegible]ہری نیند میں تھی مگر میری آواز پر فوراً اٹھ بیٹھی۔ میں نے [illegible]ے خاموشی سے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور سرونٹ کوارٹر [illegible]جانے تک اسے ساری بات سمجھا دی۔ آدھے راستے سے وہ [illegible]ٹ کر گئی اور چند منٹ بعد اپنا میڈیکل بیگ اٹھا کے لائی۔

''میں کوشش کرتی ہوں مگر مجھے امید بہت کم ہے۔ اس [illegible]ے تشویش سے کہا۔ ''سر کی چوٹ اگر پچھلے حصے پر لگے تو اس کے اثرات دماغ کے اندر زیادہ خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ [illegible]ین ہیمرج کے نتیجے میں خون کہیں بھی جم جاتا ہے۔ اس کی [illegible]تشخیص میں نہیں کر سکتی۔ اس کا سی ٹی اسکین سے ہی پتا چلتا ہے [illegible]ور اکثر علاج کچھ نہیں ہوتا۔ بعض صورتوں میں نیورو سرجن [illegible]خون کے انجماد سے پیدا ہونے والے CLOT کو دور کر [illegible]ے تو کامیابی جزوی ہوتی ہے مریض ہوش میں آنے کے [illegible]بعد تمام عمر مفلوج رہے...... اس کی یادداشت ختم ہو جائے وہ [illegible]ول نہ سکے یا دیکھ نہ سکے۔''

''ایسا ہوا تو بڑی خرابی ہو گی شہناز۔'' میں نے تشویش سے کہا۔

''اللہ مالک ہے۔'' شہناز نے کہا۔ ''مگر یہ کیس بن گیا [illegible] مصیبت ہو جائے گی۔ اس سے جان چھڑانا آسان نہیں ہو [illegible]گا۔''

فرش پر گھٹنوں کے بل بیٹھ کے شہناز نے طفیل کا معائنہ [illegible]کیا۔ اس نے روایتی انداز میں اس کے ریفلکس چیک [illegible]یے۔ آنکھوں کے پپوٹے اٹھا کے دیکھا۔ بی پی اور پلس ریٹ [illegible]لیا اور پھر کچھ سوچتی رہی۔ ''بہت کم ری ایکشن ہے مگر ہے...... [illegible]یہ بھی امید افزا بات ہے...... وائٹل سائن بھی ٹھیک محسوس

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوتے ہیں...... لیکن میرے پاس تو ایسی کوئی دوا بھی نہیں ہے جس سے فائدے کی امید ہو۔''

میں نے کہا۔''دوا کہاں ملے گی؟''

''دوا شہر میں ملے گی...... مگر ہر جگہ نہیں ملے گی...... یہ مخصوص انجکشن ہیں جو شعبہ حادثات یا نیورولوجی والے منگواتے ہیں عام استعمال کی چیز ہوتی تو میں بھی رکھتی۔''

''پھر اب کیا کریں؟'' فرخ بولا جو اس صورت حال سے بہت زیادہ اپ سیٹ تھا۔

''دیکھو...... ہم انتظار کرنے کا رسک نہیں لے سکتے۔ یہ ہوش میں آ بھی سکتا ہے...... مر بھی سکتا ہے...... اسے آبزرویشن میں رکھنا ضروری ہے۔''

''مطلب یہ کہ اسپتال لے جائیں اسے۔'' فرخ بولا۔

''بس ابھی اور اسی وقت۔'' شہناز فیصلہ سنا کے کھڑی ہوگئی۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد میں نے کہا۔''او کے...... ہم اسے لے جاتے ہیں۔''

فرخ نے کہا۔''تم نہیں جاؤ گے...... میں اپنے ساتھ کسی کو لے جاؤں گا۔''

شہناز نے کہا۔''تمہارے ساتھ میں جاؤں گی۔''

''نہیں باجی...... راجا اور غنی ہیں...... کبیر خان ہے۔''

شہناز نے سختی سے کہا۔''یہ سب ڈاکٹر نہیں ہیں میں ڈاکٹر ہوں کسی اسپتال میں صورتِ حال کو تم کیسے سنبھال سکتے ہو...... منہ سے کوئی ایسی ویسی بات نکل گئی تو پولیس وہیں دھر لے گی...... یہ کیس عام اسپتال نہیں لے گا...... ہمیں جانا پڑے گا میو اسپتال...... وہاں ایمرجنسی میں ہر وقت پولیس موجود رہتی ہے...... ایم ایل او...... میڈیکو لیگل برانچ سے نمٹنا تمہارے بس کی بات نہیں۔''

فرخ نے مری مری آواز میں کہا۔''ہم کیا کہیں گے؟''

''کیا ہم اسے حادثہ بتائیں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''دیکھو میری نالج میں بہت کیس ہیں میں نے ایمرجنسی میں ہاؤس جاب بھی کیا تھا اور کچھ عرصہ میری ڈیوٹی وہیں تھی۔ مجھے معلوم ہے کہ لوگوں نے کیا کہہ کے جان چھڑائی۔ ہم جھوٹ بولیں گے جھوٹ کے سوا بچنے کی کوئی صورت نہیں...... میں اور فرخ یہ بیان دیں گے کہ ہم پنڈی سے لاہور آ رہے تھے کہ ایک جگہ ہمیں سڑک کے کنارے یہ شخص پڑا ہوا دکھائی دیا۔ ہم اسے اٹھا لائے...... میں بتاؤں گی کہ میں ڈاکٹر ہوں اور مجھے یہ ایکسیڈنٹ کا کیس لگتا ہے...... غالباً سر کی چوٹ ہے۔''

''کیا تمہیں پہچاننے والا کوئی نہیں ہوگا؟''

''پانچ سال بعد اس کا امکان نہیں...... میرے ساتھ کے ڈاکٹر سب باہر نکل گئے پھر شعبہ حادثات اور ایمرجنسی میں روز ڈاکٹر بدلتے ہیں...... میں اپنا نام بھی غلط بتاؤں گی...... مجھے کہنا پڑے گا کہ فرخ میرا شوہر ہے...... اپنا پتا فون نمبر سب غلط دے کر میں نکل آؤں گی...... ہم فرار ہوں گے مگر اس طرح کہ کسی کو شک نہیں ہوگا...... ہم معتبر تسلیم کیے جائیں گے اس لیے پولیس بھی ہمارے بیان کو تسلیم کر لے گی...... ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹرز سے میری بات ہوگی تو وہ بھی مجھے ڈاکٹر ماننے پر مجبور ہوں گے۔''

میں نے کہا۔''شہناز...... کیا واقعی تم یہ سب کر سکتی ہو۔''

''مجھے کرنا پڑے گا۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔

''ہم کسی نئی مشکل میں نہیں پڑ سکتے۔''

میں نے کہا۔''بعد کے معاملات سے میں نمٹ لوں گا...... یہ ہوش میں آ کے کچھ بھی کہے...... لیکن مجھے معلوم ہے یہ کچھ نہیں کہے گا...... خود کو اسپتال میں پا کے اور ایکسیڈنٹ والی اسٹوری سن کر یہ سمجھ لے گا کہ ہم اسے یہاں پھینک کے بھاگ گئے مگر ایسے لوگوں کے ساتھ ایسا ہونا چاہیے؟''

''تمہیں یقین ہے کہ بعد میں تم پر مصیبت نہیں آئے گی؟'' وہ بولی۔

میں نے کہا۔''بعد کی بعد میں دیکھیں گے...... تم جاؤ۔''

دس منٹ بعد فرخ نے ڈاکٹر شہناز کی کار سامنے لا کے کھڑی کی۔ میں نے طفیل کو اس کی پچھلی سیٹ پر لٹایا۔ شہناز آگے بیٹھی اور فرخ گاڑی چلا کے نکل گیا۔ اس وقت رات کے سوا بارہ بجے تھے اس وقت شہناز کی عجلت اور اس کے جذبے نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ وہ بھی بری طرح تھکی ہوئی تھی لیکن وہ آدھی رات کو اٹھ کے چل پڑی تھی اس نے مجھے ایک مشکل صورت حال سے بچانے کے لیے ایک بہت مشکل ذمے داری قبول کر لی تھی۔ یہ ایک خطرناک چیلنج تھا جس کو شہناز نے اس لیے قبول کیا تھا کہ وہ میرا ساتھ دے رہی تھی۔ راجا کا ساتھ دے رہی تھی ہم سب اِدھر اُدھر سے آ کے یہاں ایک مقصد پر یکجا ہو گئے تھے اور ایک فیملی بن گئے تھے۔

میں نے واپس آ کے دیکھا تو غم زدہ اور خوف زدہ رابعہ میرے اماں ابا کے درمیان سمٹی سہمی پڑی تھی۔ عافیت اپنایت اور تحفظ کے یقین نے اس کی آنکھوں کو نیند لوٹا دی تھی۔ میں راجا کے ساتھ لیٹ گیا اور سونے کی کوشش میں مصروف ہو گیا جو گولی مجھے شہناز نے دی تھی وہ بے اثر ثابت ہو رہی تھی۔ میرا ذہن حالات کے گورکھ دھندے میں الجھا ہوا تھا۔ گزشتہ

چوبیس گھنٹوں کے واقعات کی بنتی بگڑتی تصویریں میرے تصور میں پھر ہلچل پیدا کر رہی تھیں۔ میں نے صوفی چچا کے بارے میں سوچا کہ وہ اس وقت حوالات کی سلاخوں کے پیچھے کیا سوچ رہے ہوں گے اور کیا کر رہے ہوں گے پھر میرا ذہن فرخ اور شہناز کی طرف چلا گیا وہ کہاں ہوں گے...... اگر سب کچھ ویسے ہی نہ ہوا جیسے شہناز نے سوچا تھا کوئی بات توقع کے خلاف ہو گئی تو کیا ہوگا۔

انہی خیالوں میں بھٹکتے ہوئے میں بھی کچھ دیر کے لیے سونے میں کامیاب ہو گیا۔ ابھی صبح کا اجالا پوری طرح اترا بھی نہیں تھا کہ میری آنکھ کھل گئی میں نے دیکھا کہ اماں معمول کے مطابق جائے نماز پر آنکھیں بند کیے بیٹھی ہیں انہوں نے مصلا باہر برآمدے میں بچھا لیا تھا اور نماز کے بعد اپنے وظیفے میں مصروف تھیں لیکن ابا کے ساتھ رابعہ بھی اپنی جگہ سے غائب تھی۔

میں اٹھ کے باہر گیا تو مجھے گیٹ بھی کھلا ہوا نظر آیا۔ گارڈ نے مجھے بتایا کہ بڑے صاحب ادھر گئے ہیں اس کا اشارہ مشرقی دیوار کے باہر والے حصے کی طرف تھا جہاں دو قبروں کا اضافہ ہونے سے اس جگہ نے ایک خاندانی قبرستان جیسی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ باہر ہوا ساکت تھی اور فضا چڑیوں کی چہکار سے گونج رہی تھی۔ میں گیٹ سے بائیں جانب مڑ کے حویلی کی فصیل کے ساتھ چلتا ہوا موڑ تک گیا تو مجھے ابا جی کے ساتھ رابعہ نظر آ گئی۔ وہ دونوں سر جھکائے بڑے خشوع اور خضوع سے تلاوت میں مصروف تھے۔ ابا جی کے سر پر کروشیا سے بنی ہوئی ٹوپی تھی جو وہ ہر نماز کے وقت پہن کے مسجد جاتے تھے۔ ان سے لگ کر بیٹھی ہوئی رابعہ نے دوپٹے کو چہرے کے گرد اور سر پر لپیٹ رکھا تھا۔ یہ ایسا روح پرور اور طمانیت دینے والا نظارہ تھا کہ میں نے انہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

میرے والدین نے پہلے بھی ایک لاوارث کو اپنایا تھا اور بڑی ایمانداری کے ساتھ اسے اپنی نصف پدری محبت دے دی تھی جس پر پہلے صرف میرا حق تھا۔ ایک حادثے کے نتیجے میں ان کی محبت کی تمام سرمایہ کاری ڈوب گئی۔ وہ جسے میں بھی سگے بھائی کی طرح سمجھتا تھا دہشت گردی کا شکار ہو گیا تھا۔ رابعہ تو ان کے بھائی کی بیٹی تھی جس کو پہلے بھی ان کی شفقت حاصل تھی۔ اب اچانک وہ ان کی ذمے داری بن گئی تھی۔ جسے وہ بیٹی جیسا سمجھتے تھے وہ ایک اور حادثے کے نتیجے میں ان کی مکمل بیٹی ہو گئی تھی۔ ایک ایسی بیٹی جس کو یقیناً ان کے بیٹے پر ترجیح حاصل تھی۔ ان کی محبت اور شفقت پر دوسری بار صرف میری اجارہ داری باقی نہیں رہی تھی۔ اس پر پہلا حق رابعہ کا ہو گیا تھا۔

واپس لوٹتے ہوئے لاشعور کی گہرائی سے ایک سوال بڑے باغیانہ سرکشی کے ساتھ میرے سامنے آ کھڑا ہوا۔ حالانکہ اس وقت میں ایسے کسی سوال کا سامنا کرنے کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ مجھے سخت تعجب ہوا کہ میں نے ایسا کیوں سوچا۔ یہ ایسی سوچ کا وقت ہی نہ تھا مگر سوچ پر پہرا نہیں بٹھایا جا سکتا۔

مجھے خیال آیا کہ پہلے تو میرے والدین کو رابعہ اپنی تمام خوبیوں کے باوجود اس لیے قبول نہ تھی کہ اس کے ساتھ چچی جیسی عورت سے دہرا تعلق میرے لیے زیادہ مسائل پیدا کرتا تھا۔ اب چچی نہیں رہی تھیں تو وہ کیا کریں گے؟ ان کے نزدیک میرے لیے رابعہ سے اچھی شریک حیات ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اس خیال کا اظہار وہ بارہا کر چکے تھے کیا اب وہ رابعہ کو تحفظ کی ضمانت فراہم کرنے کے لیے مجھ سے قربانی کے طلبگار ہوں گے؟ یا توقع رکھیں گے کہ میں یہ فرض نبھاؤں؟ بے شک دادی کے ذریعے ان تک میری خواہش پہنچ گئی تھی اور دادی نے انہیں پابند کر دیا تھا کہ وہ میری پسند پر اپنی پسند کو مسلط نہ کریں مگر اب وہ حالات نہیں رہے تھے۔ دادی نے میرا فیصلہ آگے پہنچایا تھا اور میں اپنے فیصلے کو بدلوں تو دادی کی روح کو تکلیف نہیں ہوگی...... یہ ان کی وصیت نہیں تھی کہ فریال سے شادی کرنا...... انہوں نے میری خواہش کو بہ امر مجبوری قبول کیا تھا اگر اب میں رابعہ کی ذمے داری قبول کرتا ہوں تو اس سے جتنی طمانیت اور خوشی میرے والدین کو ملے گی اتنی ہی تسکین دادی کی روح بھی پائے گی۔

لیکن اماں ابا نے مجھے مجبور کیا تو کیا یہ دادی سے کیے ہوئے وعدے کی خلاف ورزی نہیں ہوگی...... وہ زندہ ہوتیں تو میرے ساتھ یہ زبردستی ہو سکتی تھی کہ اپنے عشق کی قربانی دو اور اپنا فرض نبھاؤ...... نہیں...... نہ دادی ایسا ہونے دیتی اور نہ اب ہوگا...... رابعہ میری ذمے داری یقیناً ہے جو کچھ میرا ہے اس میں نصف رابعہ کا ہے لیکن میری محبت فریال کی امانت ہے بالکل اسی طرح جیسے رابعہ کی محبت فرخ کی امانت ہے...... ابھی یہ بات میرے والدین کو معلوم نہیں مگر معلوم ہوگی تو میری جگہ فرخ کو دینا ان کے لیے اتنا ہی ناپسندیدہ ہوگا جتنا فریال کو قبول کرنا تھا...... تاہم یہ ان کے بعد والی نسل کی زندگی ہے جس پر انہیں اپنا اختیار استعمال کرتے ہوئے سوچنا پڑے گا کہ وہ اپنے بچوں کے مستقبل کو خوشی کے نام پر عذاب دے کر تو نہیں جا رہے ہیں۔

راجا اٹھا تو میں برآمدے میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ ریشم

اور اس کی ماں ہمارے غم میں برابر کی شریک تھیں مگر اس کے ساتھ ہی پوری طرح مستعد بھی تھیں۔ انہوں نے سب کے آرام اور ضرورت کا پورا خیال رکھا تھا۔ غنی وعدے کے مطابق اپنی ملازمت چھوڑ کے آ گیا تھا اور اب اپنے چچازاد کبیر خان کے ساتھ باہر کے سارے معاملات سنبھالنے میں پوری طرح ایکٹیو تھا۔

جیسے مجھے ریشم نے بن مانگے چائے پیش کر دی تھی ایسے ہی وہ راجا کے لیے چائے کا مگ لیے نمودار ہوئی۔ ''بیڈ ٹی سر......''

راجا نے مسکرا کے اسے دیکھا۔ ''تھینک یو۔''

''یو آر ویلکم سر۔'' انگریزی بولنے کی شوقین ریشم نے متانت سے کہا اور اسے چائے دے کر لوٹ گئی روزمرہ کی گفتگو کے یہ سارے جملے اس نے فریال اور شہناز سے سیکھے تھے اور وہ انتہائی لگن سے فرفر انگریزی بولنے کے لیے دن رات ایک کر رہی تھی۔ مجھے پورا یقین تھا کہ آئندہ چند ماہ میں وہ اسی طرح انگریزی میں گفتگو کرے گی جیسے گوروں کے دیس میں ہر کالا بولتا ہے خواہ اس کے پاس پرائمری تعلیم کی ڈگری بھی نہ ہو۔

''باقی سب لوگ کہاں ہیں؟'' راجا نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''ابا کو میں ابھی دیکھ کر آیا ہوں...... وہ رابعہ کے ساتھ دادی اور چچی کی قبر کے سرہانے قرآن پڑھ رہے ہیں۔''

''اور شہناز۔''

''وہ فرخ کے ساتھ لاہور گئی ہے۔''

راجا نے کچھ بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔ ''صبح صبح...... ایسا کیا کام پڑ گیا تھا؟''

میں نے اسے بتایا۔ ''وہ کل رات گئے تھے۔ سوا بارہ بجے۔''

راجا سنتا رہا۔ اس کی صورت پر تشویش کے جذبات رفتہ رفتہ برہمی میں بدل رہے تھے۔ ''یار شہناز کا تو دماغ خراب ہے۔ اسے کیا ضرورت تھی اس ایڈونچر کی۔''

''اور کیا ہو سکتا تھا راجا وہ ڈاکٹر ہے۔''

''ڈاکٹر ہے تو کیا ہوا...... ایسے معاملات اس کے بس کے نہیں...... اور جانا ضروری تھا تو مجھے ساتھ لے جاتی...... وہ بےوقوف فرخ کیا کرے گا۔''

''وہ بےوقوف نہیں ہے اور تو اس وقت سو رہا تھا۔''

راجا نے میری دلیل کو مسترد کر دیا۔ ''فرخ کیسے بچائے گا شہناز کو اور معاملہ بگڑ گیا...... وہ تو شہناز کے ساتھ ہی پکڑا جائے گا میں کم سے کم اپنے رابطے استعمال کر سکتا تھا۔''

''تو خوامخواہ پریشان ہو رہا ہے...... وہ طفیل کو ایمرجنسی وارڈ میں چھوڑ کے آ جائے گی۔''

''میں کہتا ہوں یہ رسک لینے کی بھی کیا ضرورت تھی...... کہ اسے میو اسپتال پہنچایا جائے...... باقاعدہ کسی ڈیوٹی ڈاکٹر کے حوالے کیا جائے اسے وہ اسپتال کے کسی بھی وارڈ میں...... کسی بینچ پر یا برآمدے میں لٹا کے آ جاتے...... بہت خیال تھا اس کا تو کسی پرائیویٹ اسپتال کے گیٹ پر یا کسی پولیس اسٹیشن کے نزدیک فٹ پاتھ پر لٹا دیتے پہنچانے والے خود پہنچا دیتے اسے میو اسپتال کی ایمرجنسی میں...... وہ خود بتاتا رہتا بعد میں کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا ہمارا کیا لگتا تھا وہ کہ ہم اس کے لیے اتنا تردد کریں...... سالے کو راستے میں ہی کہیں بھی پھینک کے لوٹ آتے۔''

راجا سخت غصے میں تھا اور مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کی ناراضی بالکل بے سبب بھی نہیں۔ ''شاید...... تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔''

راجا نے ایک گہری سانس لی...... ''میرا خیال ہے تھکن اور پریشانی میں تیرا دماغ بھی اس وقت صحیح کام نہیں کر رہا تھ...... ورنہ تو انہیں نہ جانے دیتا خود اسے لے جا کے کہیں پھینک آتا...... مرتا تو مر جاتا۔ ہماری مشکل آسان ہوتی اور بعد میں وہ کچھ بھی کہتا...... ہم صاف مکر جاتے کہ یہاں تو وہ آیا ہی نہیں تھا۔ حد ہے بےوقوفی کی کہ ڈاکٹر صاحبہ اسے میو اسپتال لے گئی ہیں...... وہاں جا کے اتنا بڑا اور خطرناک جھوٹ بولیں گی...... اس سے آسان تھا کہ ہم بعد میں جھوٹ بول دیتے کہ وہ بکواس کرتا ہے ہم تو اسے جانتے ہی نہیں۔''

میں نے خفت سے کہا۔ ''آئی ایم سوری راجا...... مجھ سے بڑی غلطی ہوئی۔''

راجا نے گھڑی دیکھی۔ ''میرے حساب سے انہیں ایک گھنٹے میں آ جانا چاہیے۔''

میں نے کہا۔ ''وہ نہ آئے تو پھر ہم جا کے دیکھیں گے۔''

''مجھے لگتا ہے وہ ضرور کسی مشکل میں پڑ گئے ہیں...... ورنہ فون تو کر دیتے۔''

میں نے کہا۔ ''بہت سی باتیں میری سمجھ میں نہیں آئیں...... اگر اسے غلام محمد نے مجھ سے کوئی بات کرنے کے لیے بھیجا تھا تو وہ بات کرنے کے لیے رکا کیوں نہیں...... جب میں نے اسے شناخت کیا تو وہ کیوں بھاگا؟''

''ممکن ہے وہ صرف بات کرنے نہ آیا ہو۔ اس کے عزائم زیادہ خطرناک ہوں۔ یہ تو اس سے بات کر کے ہی اندازہ ہوتا۔''

''غلام محمد جب کسی کو دھمکی دیتا ہے تو اس پر عمل بھی کرتا ہے۔ وہ چیف کا نمائندہ ہے اور تنظیم کی دہشت گردی میں پیش پیش رہتا تھا۔ اس نے کسی کو شریفانہ پیغام دے کر نہیں بھیجا ہوگا۔''

''پھر اس نے اپنا کام کیوں نہیں کیا؟''

میں نے کہا۔ ''شاید اسے موقع نہیں ملا۔ اسے خدشہ لاحق ہو گیا کہ کچھ کرنے سے پہلے وہ پکڑا نہ جائے۔ پھر اس نے بھاگنے کی کوشش کی اور کامیاب نہ ہو سکا۔ وہ فرخ کو گولی مار کے بھی بھاگ جاتا مگر ہمارے سکیورٹی گارڈ نے سر پر رائفل کا بٹ مار کے اسے ناک آؤٹ کر دیا۔''

''وہ آیا کیسے تھا؟ میرا مطلب ہے اس کی گاڑی کہاں ہے؟''

میں نے کہا ''گاڑی تو باہر کھڑی ہے۔ اس میں کچھ بھی نہیں ہے۔''

راجا اٹھ کھڑا ہوا۔ ''ذرا دن کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔''

طفیل کی خیبر کار وہیں موجود تھی جہاں میں نے اسے دیکھا تھا۔ راجا نے اس کا دروازہ کھول کے اندر جھانکا اور ایک سرسری نظر ڈالی۔ معلوم نہیں اسے کیا شک تھا یا اس کی کرائم رپورٹر والی چھٹی حس کون سے خطرے کی نشاندہی کر رہی تھی کہ اس نے سیٹوں کے نیچے جھانکا۔ پچھلی سیٹ کے پیچھے خالی جگہ کو دیکھا جہاں سی این جی کا سلنڈر فٹ تھا اور ڈکی میں بہت کم جگہ باقی رہ گئی تھی۔ پھر اس نے ڈکی کو پیچھے سے کھولا اور سلنڈر کے نیچے رکھے ہوئے اسپیئر وہیل کو جھک کر دیکھا۔

میں نے کہا ''یہاں تو کچھ بھی نہیں۔''

اس نے سر گھما کے مجھے دیکھا ''فیکے پتر، ادھر آؤ۔''

میں اس کے ساتھ ہی رکوع میں چلا گیا ''کیا ہے؟''

اس نے انگلی سے ایک بالکل نئے سفید رنگ کے تار کی طرف اشارہ کیا ''یہ کیا ہے، پرانی گاڑی میں یہ نئی وائرنگ؟''

اور میں نے بھی غور کیا تو مجھے یہ بات ذرا عجیب لگی۔ پیچھے والی ہیڈلائٹ کی اور سلنڈر کے اوپر بورڈ میں لگے ہوئے اسپیکرز کے تار واضح طور پر خاصے پرانے تھے اور ان کے لال پیلے کالے رنگ کی پلاسٹک کوٹنگ گرد میں دب گئی تھی مگر یہ نیا سفید رنگ کا تار چمک رہا تھا۔

راجا نے پھر آگے والا دروازہ کھولا اور پیچھے والی سیٹ کے پیروں کی جگہ سے کارپٹ کو احتیاط سے اوپر اٹھایا۔ وہ سفید اور خاصا موٹا تار پیچھے سے آگے کی طرف جا رہا تھا۔ اس کی موٹائی کا سبب یہ تھا کہ ایک بڑے کوٹنگ میں دو یا اس سے زیادہ تار ہوں گے۔ یہ سنگل کور وائر ایک طرح سے ڈبل انسولیشن فراہم کرتے ہیں۔ ان کے شارٹ ہونے کا امکان کم ہو جاتا ہے۔

اب میں نے آگے والی سیٹ کا میٹ اور کارپیٹ اٹھایا تو وہ سفید تار مجھے پھر نظر آیا۔ اس کا سی این جی کٹ کے کنکشن سے بھی کوئی تعلق نہ تھا۔ راجا نے بونٹ کا تار کھینچا اور میں نے بونٹ اٹھایا تو مجھ پر چودہ طبق روشن ہو گئے۔ خوف کی ایک سرد لہر میرے وجود کو مفلوج کرنے لگی۔

مجھے اندازہ تھا کہ کسی پرانی گاڑی کے اندر کی وائرنگ کیسی ہوتی ہے۔ ایسے تار ہر انجن میں نظر آتے ہیں۔ سی این جی کٹ کی وائرنگ بالکل الگ تھی اور پہچانی جاتی تھی مگر اس سفید نئے تار کا وجود گرد چکنائی اور میل سے سیاہ نظر آنے والے انجن میں یوں محسوس ہوتا تھا جیسے فقیروں کے درمیان کوئی خوش پوش ماڈل۔

اس ایک سفید تار میں سے چار مختلف رنگوں کے پتلے تار نکل کر ایک انجن میں پھیل گئے تھے۔ نیلے لال اور کالے کے علاوہ ایک پیلے رنگ کا تار تھا اور یہ سارے تار مختلف جگہ جوڑے لگتے تھے۔ لال تار کا کنکشن سیلف اسٹارٹر سے تھا۔ کالے تار کا ڈسٹری بیوٹر کیپ کے درمیان والے کیبل سے۔ نیلا اور پیلا تار کہیں نیچے چلے گئے تھے۔

راجا نے احتیاط سے بونٹ کو سپورٹ دے کر کھڑا کیا اور زمین پر لیٹ کے نیچے جھانکنے لگا۔ اس وقت تک یہ خوفناک حقیقت مجھ پر آشکار ہو چکی تھی کہ گاڑی میں کوئی تباہ کن ڈیوائس لگی ہوئی ہے۔ اس میں بم یا طاقتور ایکسپلوسو موجود تھے۔ ایسے کار بم دنیا کے ساتھ پاکستان میں بھی استعمال ہو رہے تھے اور مجھے معلوم تھا کہ انہیں استعمال کرنے کے لیے دو طریقے رائج ہیں۔ انہیں واشنگ مشین کے ٹائمر، الیکٹرانک ڈیٹونیٹر سے جوڑ دیا جاتا ہے اور مقررہ وقت پر بم سے تباہی پھیل جاتی ہے لیکن ایسے ٹائمر ایک گھنٹے کے اندر اندر کام کرتے ہیں۔ کسی واشنگ مشین کو چلانے کے لیے ایک گھنٹے سے زیادہ کا ٹائمر لگایا ہی نہیں جاتا۔ اگر خصوصی ٹائمر ہوں تو وہ بھی بارہ گھنٹے سے زیادہ وقت کے لیے کارآمد نہیں ہوتے کیونکہ گھڑی کی سوئی بھی بارہ گھنٹے کے بعد پھر وہیں پہنچ جاتی ہے جہاں سے چلی تھی۔

گاڑی کو وہاں کھڑے بارہ گھنٹے سے زائد ہو گئے تھے چنانچہ کلاک ٹائمر کی موجودگی کا امکان خارج ہو چکا ہوتا۔ ایسی صورت میں دوسرا طریقہ رہ جاتا تھا کہ کار کے ساتھ ریموٹ کنٹرول بم نصب ہو۔ ریموٹ کنٹرول بہت عام تھے۔ ہر گھر

کا ٹی دی اور ڈیک اسی سے کام کررہے تھے۔ گاڑیاں گھر یا دفتر الیکٹرانک ریموٹ کنٹرول سے کھولے اور بند کیے جارہے تھے۔ انہیں حسب ضرورت ایک بٹن دبا کے دور سے بھی استعمال کیا جاسکتا تھا۔ کاروں میں نصب بم کو اڑانے کے لیے موبائل فون کا سگنل بھی کام کرتا تھا۔ یہ آسان طریقہ نہ تھا مگر مشکل کام کرنے والوں کی دسترس میں باہر کی ساری الیکٹرانک ٹیکنالوجی تھی۔

راجا کے ساتھ دوسری طرف لیٹ کر میں نے بھی دیکھا۔ کار کے نچلے حصے میں فرش سے ایک سلنڈر چپکا ہوا تھا۔ سلنڈر تقریباً ایک فٹ لمبا اور چار پانچ انچ موٹا تھا۔ سلنڈر کے خول میں یقیناً مقناطیسی صلاحیت تھی کہ اس نے کار کے فولادی فرش کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ اسی سلنڈر سے نکلنے والے دو تار بالکل عقبی حصے میں موجود دوسرے سلنڈر سے منسلک تھے۔ دوسرا سلنڈر بھی مقناطیسی کشش سے چپکا ہوا تھا اور عین اس جگہ کے نیچے تھا جس کے اوپر ڈکی میں سی این جی کا بیاس کے جی والا سلنڈر لگا ہوا تھا۔

راجا کپڑے جھاڑ کے اٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ دیر ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے، کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ ہم دونوں پر ساری تباہ کن صورتِ حال پوری طرح واضح ہوچکی تھی۔

بالآخر راجا نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا ''ہم سب کو یہ دوسری زندگی مبارک ہو نیکے پتر!''

میں نے کہا ''مہاراجا! کیا یہ مبارک باد قبل از وقت نہیں ہے؟''

''میرا خیال ہے قدرت نے ہمیں بروقت خبردار کردیا ہے۔ اب مسئلہ ہے اس کار بم سے نجات پانے کا۔''

میں نے کہا ''کیا اس کے لیے بم ڈسپوزل والوں کو بلانا پڑے گا۔''

''اصولاً تو یہ انہی کا کام ہے۔''

دور سے ابا جی کے ساتھ رابعہ نمودار ہوئی۔ رابعہ سیدھی اندر چلی گئی۔ ابا جی ہمارے قریب آ کے رک گئے ''ہاں بھئی، کیا ہورہا ہے، کس کی ہے یہ گاڑی؟''

میں نے کہا ''کل جنازے میں ایک شخص آیا تھا۔ وہی چھوڑ گیا ہے۔''

''تو تم کیا معائنہ کررہے ہو اس کا؟'' انہوں نے کھلے بونٹ کی طرف دیکھا۔

میں نے کہا ''گاڑی خراب تھی، راجا چیک کررہا تھا۔''

انہوں نے کہا ''ارے تم کیا دیکھو گے۔ چلو ہٹو، ہم تو پرانی گاڑیاں استعمال کرتے رہے، آدھے مکینک ہوگئے ہیں۔''

میں نے جلدی سے بونٹ بند کیا ''چھوڑیں ابا جی! مکینک خود دیکھ لے گا۔''

''یہاں مکینک ہے کوئی؟'' وہ بولے۔

راجا نے فوراً کہا ''ہاں، وہ غنی ہے ناں...... ٹرک ڈرائیور تھا، آپ چلیں، اندر چل کے چائے پئیں۔''

''بس اب ناشتا ہی کریں گے، سب کے ساتھ۔'' وہ میرے ساتھ چلنے لگے ''یہ اپنی ڈاکٹر شہناز مجھے نظر نہیں آئی۔''

میں نے کہا ''وہ ذرا فرخ کے ساتھ گئی ہے۔ آپ تو جانتے ہیں اس علاقے میں دور دور تک ڈاکٹر نہیں ملتا۔ شہناز کی شہرت ہوگئی ہے۔ اس نے ٹیکے لگانے شروع کیے ہیں۔ کچھ مفت علاج کی وجہ سے۔''

''تو کوئی ایمرجنسی ہوگئی تھی؟''

میں نے مزید جھوٹ بولا ''جی...... میں نے تو روکا تھا مگر وہ رکنے والی کہاں ہے۔ کہنے لگی کہ کسی کی زندگی کا سوال ہو اور میں اپنی بے آرامی کے خیال سے بہانہ کردوں۔''

''اللہ اسے جزا دے گا۔ وہ یہاں جو کچھ کررہی ہے، صدقہ جاریہ ہے۔ آج کل کے زمانے میں جب ڈاکٹر اتنے لالچی ہوگئے ہیں......'' ابا جی اندر پہنچنے تک بولتے رہے۔

میں نے موقع پا کے راجا سے پوچھا ''ایسا نہ ہو کوئی اس گاڑی کو چھیڑے۔''

''میں نے گارڈ سے کہہ دیا ہے، کسی کو قریب نہ جانے دے اور خود بھی نہ جائے۔'' راجا نے سرگوشی کی۔

''راجا! دھماکا اب بھی ہوسکتا ہے۔''

''دھماکا کرنے والا نہیں رہا۔ اس لیے امکان بھی نہیں رہا۔ ریموٹ اسی کے پاس ہوگا۔''

میں نے کہا ''وہ تو اپنے موبائل فون سے بھی دھماکا کرسکتا ہے۔''

''ہاں...... مگر وہ ہوش میں کہاں ہے؟''

میری پریشانی کم نہ ہوئی ''وہ کسی وقت بھی ہوش میں آ کے موبائل فون استعمال کرسکتا ہے۔''

''یار، موبائل فون کا سگنل کہاں موصول ہوتا ہے یہاں؟'' راجا چڑ کے بولا ''مجھے تو ان دونوں کی فکر زیادہ ہورہی ہے۔''

''کیا ہم ان تاروں کو الگ نہیں کرسکتے؟''

''اس میں ففٹی ففٹی چانس ہیں کہ دھماکا ہوجائے۔ تار شارٹ ہونے سے، خودکشی کرنی ہے تو بتا۔''

''کیوں نہ ہم گاڑی کو کہیں دور لے جائیں، اسٹارٹ کیے بغیر۔'' میں نے کہا۔

''یہی کرنا پڑے گا۔''

ابا جی نے ہماری کانا پھوسی کو نوٹ کرلیا ''بھئی، یہ کیا باتیں ہورہی ہیں چپکے چپکے۔ پہلے ناشتا تو کرلو اطمینان سے۔''

انہیں ہم اپنی نئی پریشانی کے بارے میں کیا بتاتے۔ ناشتا نہ مجھ سے ہورہا تھا نہ راجا سے۔ فریال ہوتی تو اس سے کچھ چھپانا مشکل ہوجاتا مگر رابعہ نے بھی ہماری صورت سے پریشانی کو تاڑ لیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ تجسس سے مجبور ہو کے کچھ پوچھتی، ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''ایک ضروری کام ہے۔'' میں نے کہا۔

ابا جی نے ڈانٹا ''ایسا کون سا ضروری کام ہے کہ ڈھنگ سے ناشتا بھی نہیں کیا اور بھاگ رہے ہو۔ بیٹھو، مجھے ایک ضروری بات کرنی ہے۔''

مجھے پھر بیٹھنا پڑا۔ راجا بھی بیٹھ گیا لیکن اس کی بے چینی کا یہ حال تھا کہ وہ ایک منٹ میں دو بار گھڑی دیکھتا تھا۔ شہناز کے بارے میں کوئی خبر نہ ملنے سے اس پر وحشت سوار تھی۔ وحشت کی دوسری وجہ باہر کار بم کی صورت میں موجود تھی۔ دو منٹ بعد وہ معذرت کر کے اٹھا اور باہر نکل گیا۔

ابا جی نے کہا ''بھئی ہم واپس جانا چاہتے ہیں فوراً۔''

میں نے کہا ''کہاں...... لاہور...... لیکن دادی کا سوئم......''

''بھئی رفیق! تم تو جانتے ہو سارے جاننے والے لاہور میں ہیں۔ انہیں کچھ پتا نہیں، سوئم وہاں کریں گے تاکہ کسی کو شکایت نہ ہو۔''

اماں جو اس سانحے کے بعد بالکل خاموش ہوگئی تھیں تائید میں بولیں ''تعزیت کرنے والے وہیں آئیں گے۔''

میں نے کہا ''آپ نے ٹھیک کہا، جب آپ تیار ہوجائیں تو مجھے بتادیں، رابعہ تو شاید جانا نہیں چاہتی۔''

ابا نے رابعہ کی طرف دیکھا ''کوئی حرج نہیں۔ وہ رہے یہاں مگر میرا جانا اس لیے بھی ضروری ہے کہ مجھے نذیر کے لیے کچھ کرنا ہے۔ اس کو رہا کرانے کے لیے۔''

میں نے چند لمحے بعد کہا ''ابا، ان کی رہائی ابھی سے میرا مطلب ہے، کیسے ممکن ہے۔''

''مجھے اس کے لیے کسی اچھے وکیل سے بات کرنی ہے۔ تمہارا وہ دوست فاروقی کچھ کرسکتا ہے؟''

میں نے کہا ''وہ فوج داری مقدمات نہیں لیتا، کارپوریٹ لائر ہے۔''

''بتا تو سکتا ہے کہ کون اچھا ہے، بھروسے کے قابل۔''

میں نے کہا ''دیکھیے...... ابھی تو پولیس انہیں زیرِ تفتیش رکھے گی۔ عدالت سے ریمانڈ لے گی کم سے کم چودہ دن کا۔ پھر چالان پیش ہوگا، اس کے بعد ہی ضمانت پر رہائی کی کوشش کی جاسکتی ہے۔''

''یہ سب میں جانتا ہوں۔'' ابا جی نے ناگواری سے کہا ''لیکن ضمانت پر رہائی تک اس کی دیکھ بھال تو کرنی ہوگی۔ ہم اسے تھانے کی حوالات میں لاوارث پڑا رہنے دیں، یہ بھی تو نہیں ہوسکتا۔''

میں کہنا چاہتا تھا کہ جس شخص کی ذہنی حالت ٹھیک نہ ہو اسے کون سی عدالت ضمانت پر چھوڑے گی۔ اس کا کیس میڈیکل رپورٹ نے کسی ماہرِ نفسیات یا بورڈ کے پاس جائے گا اور وہ بھی ان کو کسی نفسیاتی اسپتال ہی میں رکھنے کی سفارش کریں گے لیکن رابعہ کی موجودگی کا خیال کرتے ہوئے میں خاموش رہا۔

یہ رابعہ نے خود پوچھا ''تایا، کیا انہیں پاگل خانے بھیج دیا جائے گا؟''

ابا نے اس کے سر پر ہاتھ رکھا ''ارے نہیں بیٹا! ہم ان کا علاج کرائیں گے۔ دیکھنا، وہ بالکل ٹھیک ہوجائیں گے۔''

''انہیں سزا بھی تو ہوسکتی ہے تایا!'' رابعہ رونے لگی۔

''سزا کیوں ہوگی۔ عدالت حالات کو دیکھتی ہے۔''

''انہیں سزا سے بچانے کے لیے وکیل یہی ثابت کرے گا ناں...... کہ انہوں نے ذہنی عدم توازن کے باعث بیوی کو قتل کیا۔'' رابعہ اپنی تسلی کے لیے وضاحت چاہتی تھی ''ان کو پاگل ثابت کرنے سے ہی ابا کی جان بچے گی۔''

اب میں نے کہا ''دیکھو رابعہ! بعض اوقات آدمی پاگل نہیں ہوتا، چچا بھی نہیں تھے۔ کوئی واقعہ آدمی کے ذہن پر اتنا اثر انداز ہوتا ہے کہ وہ پاگل ہوجاتا ہے اور چچا کے ساتھ یہی ہوا تھا۔ چچی نے ان کی ضعیف ماں کو زہر دے کر مار ڈالا تھا۔ غصے اور صدمے نے ان سے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت چھین لی۔ انہوں نے سخت اشتعال کی کیفیت میں بیوی کو مار ڈالا اور پھر اس صدمے کا ایسا اثر ہوا کہ وہ ہوش کھو بیٹھے۔ یہ ہوگا چچا کے دفاع کے لیے ہمارا کیس۔''

ابا نے شکر گزاری کے انداز میں میری تعریف کی ''رفیق نے بالکل ٹھیک کہا۔ ہمارا یہی موقف ہوگا اور اس پر عدالت انہیں صاف بری کردے گی۔''

''اور...... ایسا نہ ہوا تو......''

''ایسا ہی ہوگا بیٹا! انہیں سزا نہیں ہوگی۔'' ابا نے اسے

یقین دلایا "رہی پاگل خانے ...... میرا مطلب ہے نفسیاتی اسپتال بھیجنے کی بات تو اس کی تمام ذمے داری ہم قبول کریں گے۔ سرکاری اسپتال کو پاگل خانہ کہا جاتا ہے اور وہاں جاتے ہیں لاوارث، جن کا علاج کرانے والا کوئی نہ ہو۔ ہم یہاں اس کا بہترین علاج کراسکتے ہیں۔ سب سے اچھے اسپتال میں۔ باہر بھی لے جاسکتے ہیں۔ آخر وہ میرا چھوٹا بھائی ہے۔ میں اس کے باپ کی جگہ ہوں۔ اب اور کون باقی ہے اس کی خبر گیری کرنے والا، اس کا خیال رکھنے والا۔ تو بالکل فکر نہ کر بیٹا، تھوڑے دن کی بات ہے، پھر وہ ہمارے ساتھ ہوں گے۔"

مجھے ابا کے جذبات کا اندازہ تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ ہم اس سانحے کے باوجود صوفی چچا کے خلاف گواہ بن جائیں۔ انہیں سزا دلوانے کے لیے سرگرم ہوجائیں، جو نقصان ہونا تھا، ہو چکا تھا۔ ہم مزید نقصان اٹھانے کی سکت نہیں رکھتے تھے۔ معاملہ کسی غیر کا نہیں، ابا کے سگے چھوٹے بھائی کا تھا۔

میری بے قراری میں ہر گزرتے لمحے کے ساتھ اضافہ ہورہا تھا۔ ابھی تک نہ شہباز اور فرخ واپس آئے تھے، نہ انہوں نے اپنی خیریت کی خبر دی تھی۔ میں نے ابا جی سے کہا کہ وہ چلنے کی تیاری کریں اور تیزی سے باہر گیا۔ وہ گاڑی اب اپنی جگہ موجود نہ تھی جس میں تباہ کن اور دھماکا خیز مواد موجود تھا۔ گارڈ نے مجھے بتایا کہ راجا صاحب کچھ لوگوں کی مدد سے گاڑی کو دھکا لگا کے لے گئے ہیں۔ گارڈ نے پل کی طرف اشارہ نہیں کیا تھا۔ راجا اتنا بے وقوف نہیں تھا کہ اس کار کو پل کے قریب لے جانے کا رسک لیتا جس میں بم نصب تھا۔ پل اڑ جاتا تو ہمارا دنیا سے براہِ راست رابطہ منقطع ہوجاتا پھر ہمیں نہ جانے کہاں سے اور کتنے مشکل راستے سے جانا پڑتا۔

میں گارڈ کے اشارے پر چل پڑا۔ کچھ دور جا کے مجھے اندازہ ہوگیا کہ راجا اس گاڑی کو کہاں لے گیا ہوگا۔ وہ دریا کے کنارے کی طرف گئے تھے۔ گھنی جھاڑیوں کے درمیان ٹائروں کے نشان نظر آرہے تھے اور کچلی ہوئی گھاس اس راستے کا پتا دے رہی تھی۔ اب پل بائیں جانب رہ گیا تھا اور دریا موڑ کے بعد سیدھا بہہ رہا تھا۔ دس منٹ بعد میں نے گاڑی کو دیکھ لیا۔ چھ افراد اسے دھکا لگا رہے تھے اور راجا اندر اسٹیئرنگ سنبھالے بیٹھا تھا۔ وہ لوگ مخالف سمت میں پل سے دوسو گز دور پہنچ گئے تھے۔ وہاں زمین قدرے ناہموار تھی مگر چڑھائی شروع ہوگئی تھی۔

گاڑی کو اوپر دھکیلنے والے بری طرح ہانپ رہے تھے۔ اس کے باوجود جب میں نے ان کے ساتھ مل کر گاڑی کو دھکا لگانا شروع کیا تو انہوں نے بہ یک آواز ہو کے احتجاج کیا۔

نواب صاحب آپ ہٹ جائیں۔ جناب، آپ تکلیف نہ کریں۔ یہ آپ کا کام نہیں ہے سر، ایسی بہت سی آوازیں ایک ساتھ سنائی دیں لیکن میں پیچھے نہیں ہٹا۔ زورِ خطابت میں محمود و ایاز کے ایک صف میں کھڑے ہونے کا حوالہ سب دیتے ہیں اور سننے والے بھی سن لیتے ہیں مگر عملی زندگی میں ایسا نہیں ہوسکتا۔ یہ بھی سب جانتے ہیں اور مانتے ہیں ممکن ہے کسی نے دل میں سمجھا ہو کہ نواب صاحب سیاسی ڈراما کررہے ہیں مگر میں نے اپنی کوشش ترک نہیں کی۔ میں چاہتا تھا کہ مستقبل میں بھی اپنے رویے سے اور عملی طور پر انسانی مساوات پر اپنے یقین کا ثبوت دوں۔ رفتہ رفتہ وقت گزرنے کے ساتھ لوگ دل سے تسلیم کریں گے کہ یہ منافقت نہیں تھی۔

تقریباً سو گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد جو ہموار سطح پر ہزار گز ہوتا تب بھی آسان ہوتا گاڑی بالآخر دریا کے کنارے ایک ایسی جگہ پہنچ گئی جہاں تقریباً پچاس گز نیچے دریا بہہ رہا تھا۔ راجا نے ساری معلومات ان لوگوں سے حاصل کرلی تھیں جو دریائے کنہار کو اسی طرح جانتے تھے جیسے اپنے گھر کو یا اپنے عزیز و اقارب کو۔

یہاں نشیب کا راستہ بالکل صاف تھا۔ اس پر نہ کوئی چٹان تھی اور نہ جھاڑی۔ اگر یہاں سے گاڑی کو دھکیل کر چھوڑ دیا جاتا تو وہ بڑی ہموار رفتار سے دوڑتی ہوئی جاتی اور دریا میں یوں غرق ہوجاتی جیسے وہ خود اپنی مرضی سے یہاں خودکشی کرنے آئی تھی۔ پھر جب تک اس پر سے کنہار کا پانی رواں رہتا اور دریا اپنا رخ نہ بدلتا کسی کو زیرِ آب اس کے مدفن کا نشاں نہ ملتا۔ تب تک اس کا خوبصورت وجود گل کے زنگ خوردہ لوہے کے ایک بدصورت پنجر میں تبدیل ہوجاتا۔ جیسے انسان اپنی قبر میں ہڈیوں کا ڈھانچا بن جاتا ہے۔

دھکا لگانے والوں کا سانس اکھڑ رہا تھا اور ان کے جسم پر پسینہ پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔ راجا گاڑی سے نیچے اترا تو اس نے مجھے دیکھا۔ اس نے کہا "آپ سب کی بڑی مہربانی، اب آپ لوگ جائیں۔"

وہ کچھ حیران ہوئے کہ آخر اس مشقت کا مقصد کیا تھا جس میں خود نواب صاحب بھی شریک تھے لیکن کچھ بولے بغیر وہ لوٹ گئے۔

میں نے کہا "تیرے خیال میں یہ ٹھیک ہے۔"

"ٹھیکے پتر! تو اپنی عقل کے گھوڑے دوڑا کر دیکھ۔ مجھے اور کچھ نہیں سوجھتا۔ ہم اسے گہرائی کی طرف دھکیل دیں گے۔ اس کے بعد کیا ہوگا، اس پر صرف ٹاس کیا جاسکتا ہے۔ عقل کی مدد سے فیصلہ نہیں ہوسکتا یا دھماکا ہوگا یا نہیں ہوگا۔"

میں نے کہا "ایک انڈین ٹی وی سریل کا کردار بن کے میں کہہ سکتا ہوں کہ گاڑی پانی میں جائے گی تو دو باتیں ہوں گی، یا یہ غرق ہوگی یا نہیں ہوگی۔ غرق نہ ہونے کا سوال ہی نہیں، غرق ہوئی تو دو باتیں ہوں گی، دھماکا ہوگا یا نہیں ہوگا۔ دھماکا نہ ہوا تو کوئی بات نہیں، دھماکا ہوا تو پھر دو باتیں ہوں گی، یا ہم بھی کسی کو کچھ بتانے کے لیے موجود نہیں ہوں گے یا ہوں گے۔ نہ ہوئے تو کوئی بات نہیں، ہوئے تو دو باتیں ہوں گی۔ یا تو ہم آدھے ادھورے لنگڑے لولے اور معذور ہوں گے، نہ تیری شادی ہوگی نہ میری......"

راجا نے کہا "بند کر اپنی بکواس! تار الگ کرکے بم کو ناکارہ بنانے میں رسک بہت زیادہ تھا۔ پانی میں دھماکا ہونے کے چانس بہت کم ہیں۔ ایکسپلوسو گیلے ہوکے ناکارہ ہوسکتے ہیں مگر یہ چانس بھی ہے کہ پانی ان کو شارٹ کردے۔ گاڑی کو نیچے پش کرتے ہی ہم نشیب کی طرف مخالف سمت میں دوڑ لگائیں گے۔ پانچ سیکنڈ میں گاڑی نیچے جائے، پانچ سیکنڈ بعد ہم دوسری طرف نیچے گر جائیں گے۔ اگر دھماکا ہوا تو پانی میں ہوگا۔ اس کے اثرات محدود رہیں گے۔ ممکن ہے دریا کا کنارا اُڑ جائے یا نیچے گڑھا بن جائے۔ عام طور پر بم پھٹنے سے نیچے ہی گڑھا بنتا ہے مگر اس کے اجزا اور شاک ویو ہر طرف تباہی پھیلاتے ہیں۔ ہمارے اور کار کے درمیان جتنی زمین کی بلندی حائل ہے وہ ہمارے لیے ایک ڈھال بن جائے گی۔ آئی بات عقل شریف میں؟"

میں نے سر ہلایا "کون سی بات...... معاف کرنا، میرا دھیان کہیں اور تھا۔ میں نے آپ کی بات نہیں سنی۔ میں ریما کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اس کی شکل فریال سے کتنی ملتی ہے۔ تیری نظر میں ہے کوئی جو بہ وقت ضرورت شہناز کی جگہ لے سکے؟"

"ہاں ہے، ایشوریا رائے، چل دھکا لگا۔"

"آخری بار گلے تو مل لے مہاراجا! رخصت اے بزمِ جہاں......"

گاڑی آہستہ آہستہ آگے کھسکی۔ ہم نے صرف دو سیکنڈ انتظار کیا اور پلٹ کر نشیب کی طرف دوڑے۔ ہمیں پانچ سیکنڈ گن کر خود زمیں بوس ہونے کی ضرورت نہیں پڑی۔ میں خود بریک فیل ہونے والی گاڑی کی طرح الٹ کے گرا۔ راجا میرے پیچھے تھا۔ وہ مجھ سے ٹکرا کے مجھ پر گرا۔ کچھ دیر ہم سانس روکے پڑے رہے۔ مجھے کسی نے سیکنڈ شمار کرنے کا طریقہ بتایا تھا۔ حق اللہ ہو، حق اللہ ہو، حق اللہ ہو۔ آدمی ایک سیکنڈ میں حق اللہ ہو کہتا ہے۔ دس بار حق اللہ ہو کہنے کے بعد میں نے سر اٹھا کے راجا کی طرف دیکھا۔ "مہاراجا! کیا دھماکا ہوگیا؟"

وہ بولا "ہاں۔ کچھ پھٹنے کی آواز تو آئی تھی۔ پتا نہیں وہ بم تھا یا تیری کوئی چیز۔"

ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے ہاتھ ملا کے راجا کو مبارک باد دی "تو جہنم رسید ہونے سے بچ گیا۔"

"دھماکا ہونے کے امکانات سو فی صد ختم نہیں ہوئے۔" وہ تیزی سے واپسی کے راستے پر دوڑنے لگا "اور شاید ہمیشہ باقی رہیں گے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ دھماکا کرنے کا سارا نظام واٹر پروف ہو۔ آج کل میں کسی وقت کوئی اس کے ریموٹ کنٹرول کو استعمال کرنا چاہے تو کرسکتا ہے۔"

میں کچھ اور راجا کا ساتھ دینے کے بعد رک گیا "راجا! وہ سور کا بچہ حویلی کو اور ہم سب کو دھماکے سے اڑانے آیا تھا۔ پھر اس نے ایسا کیوں نہیں کیا؟"

"میرا خیال ہے اسے موقع نہیں ملا۔ وہ چاہتا ہوگا کہ گاڑی کو اندر لے جائے مگر گارڈ نے گاڑی کو باہر ہی روک دیا پھر اس نے سوچا ہوگا کہ اندر آکے تجھ سے ملے اور گاڑی اندر لانے کی اجازت طلب کرے لیکن اندر کے حالات کا اسے اندازہ نہ تھا۔ اندر تدفین جاری تھی۔ اس نے انتظار نہیں کیا۔ وہ پیچھے ہٹا اور باہر جانے لگا۔ اس نے فیصلہ کیا ہوگا کہ گاڑی کو حویلی کے جتنا قریب لے جانا ممکن ہو لے جائے۔ گیٹ ذرا دور ہے۔ وہ گاڑی کو تھوڑا سا گھما کے وہاں لے آتا جہاں تدفین ہورہی تھی۔ وہ جگہ حویلی سے ملی ہوئی ہے اور اسی وقت سب لوگ ایک ہی جگہ موجود تھے اگر وہ گاڑی کو بیس تیس گز دور لے آتا تو کسی کو اعتراض نہ ہوتا۔ پھر وہ واپس جاتا اور دو چار سو گز دور جا کے ریموٹ استعمال کرتا۔ شاید پل کراس کرنے کے بعد...... مگر فرخ اس کے پیچھے لگ گیا۔ وہ بھاگا تو فرخ نے اسے بھاگنے نہ دیا اور وہ گاڑی تک نہ پہنچ سکا۔ اس سے پہلے ہی گارڈ نے اسے ناک آؤٹ کردیا۔"

راجا کی وضاحت مجھے زیادہ سے زیادہ قابلِ قبول لگی۔ اب اس پر دماغ سوزی لاحاصل تھی کہ جو ہوسکتا تھا، وہ کیوں ہورہا تھا۔ مقامِ شکر یہ تھا کہ اللہ نے بہت بڑی تباہی سے بچالیا۔ ایک دشمن کا پلان فیل ہوگیا تو اس کو ہماری کوشش کی کامیابی نہیں سمجھا جاسکتا۔ جو بچانا چاہتا تھا اس نے بچانے کے اسباب فراہم کردیے۔

اب آئندہ کیا ہوگا؟ یہ زیادہ اہم تھا۔ ہم اسی طرح کسی غیبی ہاتھ کی مدد پر بھروسا کرتے ہوئے آنکھیں بند کرکے نہیں بیٹھ سکتے تھے۔ خدا ان کی کیسے مدد کرسکتا ہے جو اپنی مدد آپ

کرنے کی کوشش بھی نہ کریں۔ راجا اس معاملے میں میرا ہم خیال تھا کہ حفاظتی انتظامات کو مزید سخت کرنا ضروری ہوگا۔

فوری طور پر راجا کی فکرمندی کا مرکز و محور شہناز کی سلامتی بن گئی تھی۔ اگر اس کار بم کے ڈسپوزل کا معاملہ فوری توجہ کا تقاضا نہ کرتا مجنوں کب کا اپنی لیلیٰ کے لیے شہر کی راہگور پر نکل گیا ہوتا۔ ہم لوٹ کر حویلی میں آئے تو ساڑھے نو بجے تھے۔ ایک گھنٹا اور گزر چکا تھا۔ لو دس گھنٹے بعد بھی شہناز اور فرخ کی طرف سے کسی خیریت کی خبر کا نہ ملنا ہمارے خدشات کے درست ہونے کی تصدیق کرتا تھا اور ہمارے شکوک ایک یقین کی صورت اختیار کر گئے تھے کہ وہ ضرور کسی مصیبت میں گرفتار ہو چکے ہیں۔

اماں اور ابا کی تیاری کچھ نہ تھی۔ وہ چلنے کے لیے ہماری راہ دیکھ رہے تھے۔ ابا نے کچھ ناراضی بھی ظاہر کی کہ ہم کن چکروں میں پڑے ہوئے ہیں اور کہاں پھر رہے ہیں۔ رابعہ نے مجھے بتا دیا تھا کہ وہ لوٹ کر اس گھر میں نہیں جانا چاہتی لیکن اسے حویلی میں چھوڑتے ہوئے مجھے تردد محسوس ہونے لگا تھا۔ فرخ پہلے ہی چلا گیا تھا۔ اب میرے ساتھ راجا بھی جا رہا تھا۔ فریال اور شہناز کی عدم موجودگی میں رابعہ کا یہاں اکیلے رہنا کچھ ٹھیک نہیں لگتا تھا۔

اس نے میری دلیل کو مسترد کر دیا "اکیلی کہاں ہوں میں۔ حویلی میں اتنے لوگ ہیں۔ آپ لوگ جائیں، ڈاکٹر شہناز اور فرخ آ جائیں گے۔"

میں نے کہا "ہاں، مگر کیا پتا انہیں کتنی دیر لگ جائے؟"

ابا جی نے خاصی تشویش کا اظہار کیا "بھئی آخر وہ گئی کہاں ہے؟ ایسا کیا کیس ہو گیا؟"

میں نے کہا "ابا جی، ان عورتوں کے کیس ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ٹائم لگ جاتا ہے۔"

اماں نے کہا "اور کیا...... اب وہ مریض کو چھوڑ کے تو نہیں آ سکتی۔ پتا نہیں اس بے چاری کی کیا حالت ہو۔"

میں بہت زیادہ تفصیل میں نہیں جا سکتا تھا۔ ان حالات کا حوالہ نہیں دے سکتا تھا جن سے میں دوچار رہتا تھا۔ کسی خطرے کی بات نہیں کر سکتا تھا جو اکبر خان، رانا رجب علی جتال، سلطان یا غلام محمد کی طرف سے لاحق ہو سکتا تھا۔

میں نے کہا "دیکھو، ہم ایک دو دن میں واپس آ جائیں گے۔"

"تو ایک دو دن میں یہاں کون سی قیامت آ رہی ہے۔ یہاں ریشم اور اس کی ماں ہیں، کبیر خان اور غنی ہیں۔"

راجا نے کہا "ابھی بجلی کا سارا نظام جنریٹر پر چل رہا ہے۔ وہ بند ہو جائے تو......؟"

"تو یہاں لالٹین ہوگی، موم بتی ہوگی، مجھے کون سے ٹی وی یا اے سی چلانے ہیں۔ تم جاؤ، مجھے مجبور مت کرو۔ میں یہاں سکون سے رہوں گی۔ قرآن خوانی کرتی رہوں گی۔ شہناز کے ساتھ کام میں مصروف رہنے کی کوشش کروں گی۔ وہاں جانے کی ہمت نہیں ہے مجھ میں۔" وہ بگڑنے لگی۔

"اچھا...... اچھا، جیسی تمہاری مرضی۔" ابا نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کے کہا "ہم بھی آ جائیں گے دو چار دن میں۔ اللہ ہماری پریشانی دور کرے۔ اگر یہ اس کی آزمائش ہے تو ہم کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کیونکہ وہ اپنے نیک بندوں کو ہی آزماتا ہے۔"

میں نے جانے سے پہلے سکیورٹی گارڈز کو بریف کیا کہ وہ گیٹ بند رکھیں اور کسی کو بھی اندر نہ جانے دیں۔ رابعہ بی بی اگر ماں اور دادی کی قبر پر جا کے قرآن خوانی کریں تو دو مسلح محافظ ان کے قریب موجود رہیں۔ میں نے ریشم، اس کی ماں اور غنی سے بھی بات کی اور کسی حد تک مطمئن بھی ہو گیا۔

لاہور تک کا سفر ایک اعصاب شکن تجربہ تھا جس میں ہم سب کی ذہنی اذیت کے اسباب جدا تھے۔ شہناز کے لیے راجا کی پریشانی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ یہ اندازہ مجھے پہلے بھی بارہا ہوا تھا کہ شہناز کے لیے راجا کی محبت اور اس کے جذبات کی شدت دیوانگی کی سرحدوں کو چھوتی ہے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ دائمی اور پیدائشی حسن پرست اور عاشق پیشہ راجا اپنی زندگی میں نہ جانے کتنی لڑکیوں کو اپنی سچی محبت کا یقین دلا چکا تھا لیکن محبت اسے شہناز کے سوا کسی سے نہیں ہوئی تھی۔ شہناز، جو عام سی شکل صورت والی عمر میں راجا سے ایک دو برس زیادہ، قد میں اس سے نکلتی ہوئی اور محبت میں راجا پر اپنے حق ملکیت کے مقابلے میں خاصی سخت گیر یا POSSESIVE لڑکی تھی، راجا کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ اس کے سامنے وہ قطعی بے بس اور مجبور ہو جاتا تھا اور اگر یہ کہا جاتا کہ شہناز کے بغیر راجا زندہ نہیں رہ سکتا تھا تو یہ محض ایک جذباتی بات اور فلمی ڈائلاگ نہیں حقیقت ہوتی۔

میں جتنا شہناز اور فرخ کے پراسرار طور پر لاپتا ہونے سے اَپ سیٹ تھا اس سے زیادہ راجا کی پریشانی سے شرمندہ تھا کیونکہ بالواسطہ طور پر میں ایک غلط فیصلے میں شامل تھا۔ راجا کی اس بات سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا تھا کہ طفیل جیسے شخص کے لیے جو مجرمانہ عزائم کے ساتھ آیا تھا، ہمیں اتنی ہمدردی دکھانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی کہ اسے میو اسپتال پہنچایا جائے۔ اسے کہیں بھی چھوڑا جا سکتا تھا جہاں سے وہ خود بہ خود

کسی ذریعے سے اسپتال پہنچ جاتا۔ نہ پہنچتا اور مر جاتا تو خس کم جہاں پاک والی بات ہوتی۔ مجھے فرخ اور شہناز کو روکنا چاہیے تھا مگر اس وقت میں نے شہناز کی تشویش کو جائز سمجھ لیا۔

اب ابا جی اپنے بھائی کے لیے پریشان تھے۔ مر جانے والوں کا صدمہ جھیل کر صبر اختیار کرنے کے سوا ان کے پاس چارہ نہ تھا۔ چھوٹا بھائی ان کے لیے مجرم نہیں رہا تھا۔ ایک جذباتی ذمے داری بن گیا تھا۔ اس رشتے کو وہ تمام ذہنی وجسمانی توانائی صرف کر کے محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔

ہم نے اماں کو گھر چھوڑا اور پھر سیدھے پولیس اسٹیشن گئے۔ راجا کا اثر رسوخ اور ہمارا پیسا ہی چچا کے ایام اسیری کو کم سے کم تکلیف دہ بنا سکتا تھا۔ راجا نے مختصر بات کی۔ معاملات طے کرانے میں ایک افسر اعلیٰ کا ٹیلی فون اور دس ہزار روپے کافی ثابت ہوئے۔ ایس ایچ او نے ہمیں یقین دلایا کہ صوفی صاحب کے ساتھ تھانے میں وی آئی پی گیسٹ جیسا سلوک ہوگا۔

راجا تھانے سے شہناز کا پتا چلانے کی کوشش میں مصروف ہو گیا۔ وہ ادھر ادھر ٹیلی فون گھما رہا تھا۔ میں نے اس مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حوالات کا رخ کیا۔ ابا جی حوالات کی سلاخوں کو تھامے اپنے دیوانے بھائی کو بڑی محبت سے دیکھ رہے تھے اور ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ بالکل بھول چکے تھے کہ اس بھائی نے ان کی ماں کا خون کیا تھا۔ آدمی کے جذبات کو سمجھنا بھی آسان نہیں۔

تھانے کا ماحول ویسا ہی تھا جیسا ہر عقوبت خانے کا ہوتا ہے۔ نیم تاریک، آسیب زدہ، پرخوف اور گھٹا ہوا۔ ایک حوالاتی فرش پر تقریباً ننگا الٹا پڑا ہوا تھا اور قطعی بے حس و حرکت تھا۔ وہ غالباً گزری ہوئی رات میں تفتیش کے عمل سے گزرا تھا اور حوالات کے دوسرے باسیوں کے لیے اس کا داغ داغ جسم عبرت کا نشان بن گیا تھا۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ ملزم کو تھانے میں ہی سزائے موت ہو گئی ہے یا وہ مزید تفتیش جھیلنے کے لیے زندہ ہے مگر وہ اسے ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتے تھے۔

باقی چار حوالاتی دیوار سے ٹیک لگائے خلا میں گھور رہے تھے۔ ان میں صوفی چچا بھی تھے۔ ان کے بال پریشان تھے۔ داڑھی میں خاک تھی اور آنکھوں میں وحشت۔ ان کی خاموشی ان کے دیوانے پن کی ہنسی یا بے سروپا باتوں سے زیادہ باعث آزار تھی۔ جیسے دھنسی ہوئی کچی قبر کسی سنگ مرمر اور چمکتے ٹائلوں والی قبر سے زیادہ باعث عبرت ہوتی ہے۔

ابا کہہ رہے تھے۔ "نذیر! دیکھو کسی بات کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں تمہیں رہا کرا لوں گا جو ہونا تھا ہو گیا۔ اسے بھول جاؤ، اللہ ساری خطائیں معاف کرنے والا ہے۔" لیکن نذیر چچا ان کی طرف دیکھ بھی نہ رہے تھے۔ شاید وہ کچھ سن بھی نہیں رہے تھے کیونکہ وہ اپنے خیالوں کی دنیا میں گم تھے۔ شاید اپنی ماں کے ساتھ تھے۔ کسی بچے کی طرح ان کی گود میں، کسی لڑکے کی طرح ڈھٹائی سے مار کھاتے، کسی نوجوان کی طرح ان سے جھوٹ بولتے اور پھر معافی مانگتے یا وہ اپنی بیوی کے ساتھ تھے۔ شادی کی پہلی رات حجلۂ عروسی میں یا پہلے بچے کی پیدائش کے وقت، لڑتے جھگڑتے، روٹھتے مناتے۔ جب کچھ نہ رہے تو بس یادیں رہ جاتی ہیں۔

میں نے نرمی سے ابا جی کے کندھے پر ہاتھ رکھا "چلیں ابا جی! ان سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔"

ابا جی نے میرا ہاتھ جھٹک دیا "تم جاؤ، میں ابھی یہاں رکوں گا۔"

میں نے کہا "وہ آپ کی مرضی لیکن ان کو یہاں کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی۔ ان کے لیے گھر سے کھانا آئے گا۔ کپڑے بھیج دیے جائیں گے۔"

"تم پہلے وکیل کا بندوبست کرو۔"

میں نے کہا۔ "کل انہیں عدالت میں پیش کیا جائے گا۔ ان پر قتل عمد کی دفعہ نہیں لگائی گئی۔ اشتعال اور دیوانگی میں قتل کا کیس درج ہوا ہے مگر اس کے لیے گواہ چاہئیں یا میڈیکل ایکسپرٹ کی رائے۔"

"گواہی ہم دیں گے۔" ابا جی نے بے خیالی میں کہا۔

"ظاہر ہے، وہاں صرف ہم تھے لیکن ہماری گواہی ان کو دیوانہ ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں۔ اگر یہ عدالت میں اعتراف کر لیں کہ انہوں نے شدید اشتعال کی کیفیت میں بیوی کو مارا تو پھر تفتیش کے لیے۔ ریمانڈ کی اہمیت نہیں رہتی۔ میں پراسیکیوشن سے بات کرتا ہوں۔ انہیں جیوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا جائے۔ وہاں یہ زیادہ آرام سے رہ سکتے ہیں۔"

"اچھا تو پھر جاؤ...... جو کرنا ہے جلدی کرو۔"

"آپ کب تک کھڑے رہیں گے یہاں...... ایسا نہ ہو آپ کی طبیعت بگڑ جائے۔" میں نے کہا۔

"مجھے کچھ نہیں ہوگا...... میں کچھ دیر میں گھر آ جاؤں گا...... اپنی اماں کو بتا دینا کہ فکر نہ کریں اور دیکھو...... کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ نذیر کو حوالات سے نکال کے کسی کمرے میں رکھا جائے۔"

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "یہ ہو سکتا تھا بشرطیکہ صوفی چچا ہوش میں ہوتے...... ایسی ذہنی کیفیت میں یہ رسک کوئی

نہیں لے گا۔''

میرے پیچھے آ کے راجا نے کہا۔ ''صوفی چچا کے سارے معاملات طے کر دیے ہیں میں نے...... کل انہیں جیل بھیج دیا جائے گا وہاں جیلر سے بات کر لیں گے تو ان کے آرام سے رہنے کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔''

''اور اس میں پیسا کتنا خرچ ہوگا؟'' ابا جی نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''پیسے کی بات مت کریں...... جتنا مانگا جائے گا ہم اس سے دگنا ہی دے دیں گے آپ بالکل مطمئن اور بے فکر ہو جائیں۔''

ابا جی کو وہیں چھوڑ کے ہم تھانے سے نکلے تو راجا نے مجھے بتایا کہ گزشتہ رات کوئی لیڈی ڈاکٹر میو اسپتال میں کسی کو ایمرجنسی وارڈ میں نہیں لائی ایسا کوئی کیس رجسٹر ہی نہیں ہوا جس میں کسی کے سر پر چوٹ ہو اور وہ بے ہوش پڑا ہو۔''

میں نے کہا۔ ''کیا پتا وہ کسی اور اسپتال میں لے گئے ہوں اسے۔''

''وہ سالا گیا بھاڑ میں...... سوال یہ ہے کہ شہناز کہاں گئی...... فرخ کہاں گیا۔'' راجا بولا۔ ''وہ اپنے گھر میں نہیں ہے...... فرخ کے گھر کے فون پر جواب نہیں مل رہا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ہم معلوم کر لیں گے تو گھبرا مت۔''

''کہاں سے معلوم کر لیں گے؟ میں نے ہر تھانے اسپتال سے پوچھ لیا۔'' راجا مایوسی سے بولا۔

''خود چل کے دیکھتے ہیں۔'' میں نے اسے تسلی دی۔

شام تک ہم نے شہر کے تقریباً سارے چھوٹے بڑے اسپتال دیکھ لیے...... ہمیں یہ معلوم تھا کہ طفیل کو اصلی نام سے داخل نہیں کیا گیا ہوگا چنانچہ ہم نے علامات بتائیں اور نیورولوجی کے وارڈ دیکھے...... یہ بات ہر جگہ شک پیدا کرنے کا سبب بنتی تھی کہ ہم کو مریض کے نام کا پتا نہیں تو ہم اسے کیوں تلاش کر رہے ہیں...... راجا کا رپورٹر ہونا کام آتا تھا...... وہ اپنا پریس کارڈ دکھا کے ہر جگہ ایک ہی کہانی سناتا رہا کہ ہم اس شخص کا نام تو نہیں جانتے لیکن یہ معلوم ہے کہ وہ سر کی چوٹ کی وجہ سے بے ہوش تھا اور اسے پراسرار طور پر غائب کر دیا گیا ہے۔ ہر جگہ راجا کو پہلے یہی جواب ملتا تھا کہ وہ مستند حوالے کے بغیر ایسا کیس نہیں لیتے لیکن راجا کو وارڈوں میں دیکھنے کی اجازت مل جاتی تھی۔

راجا سخت مایوس اور دل زدہ تھا۔ اس کی شہناز لاپتا ہو گئی تھی اور یہ شک انجام اور یقین میں بدل گیا تھا کہ اسے طفیل کے ساتھی اغوا کر کے لے گئے۔ یہ ساتھی کون تھے...... اس بارے میں بھی شبہ کوئی نہ تھا...... طفیل کو غلام محمد نے بھیجا تھا شہناز کو اغوا کر کے غلام محمد کے پاس پہنچا دیا گیا ہوگا غلام محمد نے اس سے معلوم کر لیا ہوگا کہ طفیل کی یہ حالت کیسے ہوئی...... شہناز عورت تھی اس کے لیے تفتیش کے ابتدائی مرحلے میں ہی زبان بند رکھنا ممکن نہ تھا۔

میں راجا کو تسلی دے کر مطمئن رکھنے کی ناکام کوشش کرتا رہا لیکن وہ مجرموں کی نفسیات کو مجھ سے بہتر سمجھتا تھا۔ یہ جانتا تھا کہ ڈاکٹر شہناز پر کیا بیتی ہوگی...... کیا بیت رہی ہوگی اور آگے چل کے کیا بیتے گی...... ایسا صرف ایک جذباتی حماقت کے باعث ہوا تھا جس میں فرخ اور شہناز کے ساتھ میں بھی شامل تھا۔

راجا ہمت ہار کے بیٹھ جانے والا آدمی نہیں تھا۔ وہ مایوس ہونا نہیں جانتا تھا۔ شہناز کے لیے اس کے جذبات کی نوعیت اور شدت نے اسے کمزور نہیں کیا تھا اس کے برعکس اس کا ذہن ایک انتقامی ردِعمل کا شکار ہو کے زیادہ مستعد ہو گیا تھا۔ وہ شہناز کا سراغ لگانے کے لیے تمام دستیاب وسائل کو بروئے کار لانے پر تل گیا تھا۔

شام کو میں اسے زبردستی ایک جگہ کافی پلانے لے گیا اور اسے مجبور کر دیا کہ وہ کچھ کھا لے۔ صبح سے ہم مارے مارے پھر رہے تھے اور ہمارا تھکن سے برا حال تھا میں نے کہا۔ ''راجا...... پیٹ خالی ہو تو دماغ بھی کام نہیں کرتا۔''

راجا نے جیسے یہ بات سنی ہی نہیں۔ ''شہناز یقیناً غلام محمد کے قبضے میں ہے۔''

میں نے کہا۔ ''میں اس سے معلوم کر لوں گا۔''

''کیا اتنی آسانی سے وہ مان لے گا۔'' راجا تلخی سے بولا۔

''نہیں...... میں غلام محمد کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ اس نے مجھے سزا دینے کے لیے طفیل کو بھیجا تھا۔ تنظیم کا طریقہ یہی ہے باغی اور نافرمان کا صفحۂ ہستی سے یوں نشان مٹا دو کہ دوسروں کو عبرت ہو۔ تمہیں معلوم ہو گیا تھا کہ ست بدھائی کی جاگیر کا مالک بن جانے کے بعد میں خود کو ان کے قبضہ اختیار سے بالاتر سمجھنے لگا ہوں...... مجھے ایک کام سونپا گیا تھا وہ میں نے نہیں کیا۔ اس کی سزا یہ تجویز کی گئی ہوگی کہ مجھے، میرے خاندان کو اور اس جاگیر کو جو میری سرکشی کا سبب تھی فنا کر دیا جائے۔ طفیل کو اس مشن کا ذمے دار بنایا گیا تھا لیکن وہ نامعلوم وجوہ کی بنا پر اپنے مقصد میں ناکام رہا۔ یہاں غلام محمد اس خبر کے انتظار میں رہا کہ نہ ست بدھائی کی جاگیر رہی اور نہ اس کے مالک نواب رفیق احمد شیرازی کا وجود رہا۔ یہ تشویش کی بات تھی اس نے طفیل کی ناکامی کے اسباب معلوم کرنے

کے لیے کچھ اور لوگوں کو روانہ کیا ہوگا...... فرخ اور ڈاکٹر شہناز انہی کے ہتھے چڑھ گئے۔''

راجا خاموشی سے سنتا رہا پھر بولا۔ ''یہ ایک مفروضے کے سوا کیا ہے۔ ہم کچھ بھی ثابت نہیں کر سکتے۔''

میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''شہناز کی رہائی کا صرف ایک ہی طریقہ ہے راجا...... میں غلام محمد سے اپنی کوتاہی کی معافی مانگ لوں...... وعدہ کروں کہ جو ذمے داری مجھے سونپی گئی تھی وہ میں پوری کروں گا...... شہناز کی رہائی اس کے بعد ہی ممکن ہوگی۔''

''اور تب تک شہناز یرغمال رہے گی۔'' راجا تلخی سے بولا۔

''میں کچھ نہیں کہہ سکتا...... میں کوشش پوری کروں گا کہ میرے وعدے پر اعتبار کرتے ہوئے شہناز کو رہائی مل جائے۔''

''اب کیوں اعتبار کریں گے وہ تجھ پر...... اور پھر کیا یہ تیرے اختیار میں ہے؟ غلام محمد اور شہاب الدین کو برطانیہ میں سیاسی پناہ کیسے مل سکتی ہے۔ اب وہ حالات ہی نہیں رہے۔''

''میں سب جانتا ہوں راجا کہ یہ بہت مشکل ہوگا...... لیکن کوشش کیے بغیر چارہ بھی تو نہیں...... مجھے یقیناً اپنا تھوکا ہوا چاٹنا پڑے گا وہی کرنا پڑے گا جو میں کبھی نہ کرتا...... اگر معاملہ میری جان کا ہوتا...... لیکن شہناز کو بچانے کے لیے مجھے عائشہ کو استعمال کرنا پڑے گا۔''

''تو ایسا نہیں کرے گا۔'' وہ خفگی سے بولا۔

''مجبوری ہے راجا...... اگر وہ میرے ماں باپ کو یرغمال بنا لیتے...... تو میں کسے بچاتا...... اپنے ضمیر کو یا ان کی زندگی کو...... انجام یہی ہوگا نا کہ عائشہ مجھ سے بدگمان ہو کے مجھ سے نفرت کرنے لگے گی...... شہناز کی جان کے بدلے یہ قیمت کچھ بھی نہیں۔''

راجا نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''میں بھی شہناز کو قربان کر سکتا ہوں۔''

''بکواس مت کر...... جو تو کر سکتا ہے میں نہیں کر سکتا...... ایسے جذباتی ڈائیلاگ زندگی کے حقائق کی نفی نہیں کرتے...... اب اور کوئی راستہ نہیں رہا۔''

''ہم راستہ نکال لیں گے۔ شہناز کو برآمد کر لیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''میری بات دھیان سے سن...... اب میں غلام محمد سے ملاقات کے لیے جاؤں گا...... اس سے کہوں گا کہ شہناز کو چھوڑ دو...... تمہارا کام ہو جائے گا۔ وہ جواب میں کہے گا کہ میرا کام کر دو شہناز تمہیں مل جائے گی۔ مجبوری دونوں طرف ہے میں کہوں گا کہ پہلے اسے واپس کرو...... وہ کہے گا کہ نہیں پہلے ہمیں برطانیہ میں قیام کی اجازت دلاؤ...... دونوں طرف سے کوئی ضمانت قابل قبول نہیں...... بداعتمادی ایک جیسی...... لیکن میں سمجھتا ہوں میرا پلّا بھاری رہے گا میں انہیں ایک بند گلی میں چھوڑ کے آ سکتا ہوں۔''

''وہ کیسے؟'' راجا نے سوچتے ہوئے کہا۔

''میں معاملہ ختم کر سکتا ہوں کہ ٹھیک ہے تم شہناز کو رکھو اس کے ساتھ جو سلوک چاہو کرو...... مار ڈالو بالآخر اسے...... میں اس کے انجام پر صبر کر لوں گا فاتحہ پڑھ لوں گا...... لیکن تم کیا کرو گے اسے مارنے کے بعد...... میرے انتقام سے کیسے بچو گے میں تمہارے لیے فرار کے سب راستے بند کر دوں گا...... تمہارے لیے صرف ایک ہی راستہ کھلا رہ جائے گا جہنم کا راستہ۔ میں تمہیں وہاں پہنچا کے دم لوں گا۔''

راجا نے کہا۔ ''یہ دباؤ کام کر سکتا ہے۔''

''وہ بہت DESPERATE ہے۔ شہناز کا اغوا بھی ایسا ہی ایک قدم ہے میں تو سمجھتا ہوں طفیل کو بھی اس لیے نہیں بھیجا گیا تھا کہ کار بم سے سب کچھ ختم کر دے۔ وہ ایک طریقہ تھا مجھے دہشت زدہ کرنے کا...... مجھے مار کے انہیں کچھ حاصل نہیں ہو سکتا کیونکہ ان کی ساری امیدیں اب میری کوشش کی کامیابی سے وابستہ ہیں۔ وہ خود سب کچھ کر چکے...... ہر طریقہ آزما چکے...... اگر طفیل دھماکا کرتا تو وہ معمولی نوعیت کا ہوتا...... محض ایک وارننگ فائر...... ایک دھمکی کہ اگلا دھماکا کیا ہوگا۔ یہ اس کا نمونہ ہے۔ اصل فلم کا ٹریلر۔''

راجا نے کہا۔ ''تیری بات سمجھ میں آتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''چل پھر اٹھ...... میں جاتا ہوں غلام محمد کے پاس تو دور سے مجھ پر نظر رکھ...... میری بہ حفاظت واپسی کو یقینی بنا۔ غلام محمد اچھی طرح جانتا ہے کہ پہلے میں کیا کرتا رہا ہوں اور کیا کر سکتا ہوں۔ وہ میری دھمکی کو زبانی جمع خرچ سمجھ کے نظر انداز نہیں کرے گا وہ مجھے ایک چانس اور دے گا۔''

میری دلیل نے راجا کو قائل کر لیا۔ ''چل پھر دیر مت کر۔''

وہ ڈرائیونگ سیٹ پر اور میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

''راجا میں جا رہا ہوں دشمن کے قلعے میں...... یہ بات تیرے سوا کوئی نہیں جانتا۔''

''پھر؟ کیا میں سب کو بتا دوں؟ ہر مسجد سے اعلان کرا دوں؟''

میں نے کہا۔ ''میرا مطلب تھا کہ باہر کے مسائل تو

سنبھال۔ مثلاً میرے گھر والوں سے کوئی جھوٹ بول دینا۔ کہہ دینا کہ ہم صوفی چچا کے لیے بھاگ دوڑ کررہے ہیں۔“

”اور فریدں سے کیا کہوں؟ اگر وہ پوچھے۔“

”اسے کیا معلوم کہ میں ست بدھائی میں نہیں لاہور میں ہوں۔ اگر میری واپسی میں دیر ہو۔“

اس نے گاڑی روک دی۔”یار تو جا...... مجھے بچوں کی طرح مت بتا کہ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔“

میں نے غلام محمد کے گھر تک باقی فاصلہ پیدل طے کیا۔

اس کے آفس کے طور پر استعمال ہونے والے کمرے میں وہی اینگلو انڈین لڑکی موجود تھی جو غلام محمد کو انگریزی میں گفتگو اور ہائی سوسائٹی میں موو کرنے کے ایٹی کیٹس سکھانے کے علاوہ دیگر تمام دفتری امور بھی سنبھالتی تھی وہ ایک ذہین اور باہمت لڑکی تھی۔

آفس میں دو مسلح محافظ اپنی مونچھوں، بندوقوں اور ڈیل ڈول کی بدمعاشی کا مظاہرہ کرنے کے لیے موجود تھے۔ ایسے معدودے چند ہی لوگ تھے جو بلا روک ٹوک اور تلاشی کے عمل سے گزرے بغیر غلام محمد تک پہنچ جائیں...... بدقسمتی سے اب میں ان میں شامل نہ تھا۔

سیکریٹری نے خوش دلی سے مسکرا کے میرا حال پوچھا۔ ”کہاں ہو تم رفیق...... کیا حال ہے تمہارا...... نظر ہی نہیں آتے۔“

میری اس کی تھوڑی سی بے تکلفی تھی جسے وہ پسند کرتی تھی۔ میں نے مسکرا کے کہا۔”تم دیکھ سکتی ہو کہ تم سے دور رہ کے میرا کیا حال ہے لیکن تمہاری نظر اب مجھ پر ٹھہرتی ہی کہاں ہے...... صرف اس لیے کہ تم اب پہلے سے زیادہ خوب صورت ہوگئی ہو۔“

وہ ہنس پڑی...... ”تم نہیں بدلو گے غلام محمد سے ملنے آئے ہو؟“

میں نے کہا۔”نہیں...... اس سے ملنے کے بہانے تم پر ڈورے ڈالنے آیا ہوں۔“

وہ پھر ہنسی اور اندر چلی گئی۔ محافظوں نے اس کے اشارے پر میری جامہ تلاشی کی رسمی کارروائی پوری کی۔ وہ بھی جانتے تھے کہ میں کون ہوں ان کا رویّہ ہمیشہ معذرت خواہانہ ہوتا تھا کہ سر ہماری مجبوری ہے اور میں دوستانہ انداز میں ہنس کر بات کو ٹال دیتا تھا۔

چند منٹ بعد سیکریٹری نے واپس آ کے مجھے کلیئرنس دی۔”جاؤ وہ منتظر ہے تمہارا...... معلوم ہے نا کہ کدھر جانا ہے...... اِدھر اُدھر مت نکل جانا مارے جاؤ گے...... اس نے حال ہی میں نئی شادی کی ہے۔“ اس نے ایک آنکھ دبائی۔

یہ میرے لیے ایک اطلاع تھی۔ محافظ ان پڑھ تھے۔ انہیں خالص کانونٹ کے لہجے میں ہونے والی اس گفتگو کا ایک لفظ سمجھ میں نہیں آیا مگر انہوں نے سیکریٹری کو آنکھ مارتے دیکھا تو اپنی ناگواری کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکے۔”کنجری نہ ہووے تے......“ ان میں سے ایک بڑبڑایا۔

صحن کے بائیں جانب ملاقاتیوں کے وسیع ہال جیسے کمرے میں غلام محمد پہلے سے موجود تھا۔ اس کی مسکراہٹ سے فاتحانہ انداز سے بھی ظاہر تھا کہ وہ میری تشریف آوری سے حیران نہیں ہوا۔ اس نے بڑے دوستانہ انداز میں بے تکلفی سے میرا استقبال کیا۔

”اوے بلے بلے...... اپنے رفیق صاحب کی سواری آئی ہے۔“ اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا اور پھر کھینچ لیا۔”لو...... میں تو بھول ہی گیا تھا کہ اب تم نواب رفیق احمد شیرازی ہو اور نوابوں کے سامنے تو جھک کر کورنش بجالانا چاہیے۔“

میں نے کہا۔”تمہیں اس سے کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیے۔“

اس نے قہقہہ لگایا۔”یار یہ بھی سچ کہا تم نے...... پرانے بیلی تو بس یار ہوتے ہیں کیا حال ہے تمہارا...... کہاں ہو خیر سے...... کیا کررہے ہو۔“

میں بیٹھ گیا۔”تم میرے ہر پل کی خبر رکھتے ہو...... پھر ان سوالات کا مقصد؟“

وہ میرے سامنے بیٹھ گیا۔”چلو چھوڑو...... پہلے بتاؤ کیا چلے گا وہی جگر ساڑنے والی ولایتی کافی پیو گے یا لسی منگواؤں پرانی انارکلی سے۔“

میں نے کہا۔”غلام محمد...... فضول باتوں میں وقت ضائع کرنے سے کچھ حاصل نہیں...... تم جانتے ہو کہ میں تمہاری میزبانی سے لطف اندوز ہونے نہیں آیا۔“

اس نے ایک ڈکار لی۔”اچھا؟ پھر کس لیے آئے ہو۔“

میں نے کہا۔”ڈاکٹر شہناز اور فرخ کہاں ہیں؟“

”ڈاکٹر شہناز اور فرخ......“ اس نے یوں کہا جیسے یہ نام پہلی بار سنے ہوں۔

میں نے کہا۔”انجان بننے کا ڈراما مت کرو۔“

وہ یکلخت سیریس ہوگیا ”فرض کرو...... وہ ہمارے پاس ہیں۔“

”تم نے کیا سلوک کیا ہے ان کے ساتھ؟“

اس نے مسکرا کے جواب دیا۔”وہی جو ہم اپنے مہمانوں کے ساتھ کرتے ہیں۔“

میں نے کہا۔”کیا وہ ٹھیک ہیں؟“

”ہاں...... ابھی تک تو سب ٹھیک ہے اپنے نواب صاحب...... آگے کا حال اللہ جانتا ہے۔“

میں نے کچھ سکون کا سانس لیا۔”کیا میں ان سے مل سکتا ہوں؟“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے جو کسی شاعر نے کہا ہے نا کہ ہم بچھڑ جائیں گے اور پھر خوابوں میں ملیں گے...... زندگی ہوگی تو ملاقات بھی ضرور ہوگی...... ورنہ ایک دن سارے بچھڑے ہوئے میدانِ حشر میں ملیں گے۔“

اس کا انکار بہت واضح تھا۔ میں نے کہا۔”تم نے طفیل کو کیوں بھیجا تھا؟“

”بس تمہیں یاد دلانے کے لیے کہ ہم تمہیں بھولے نہیں ہیں اور تمہیں بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ تمہارے سپرد ایک کام کیا گیا تھا۔“

”وہ کام میں بھولا نہیں تھا...... اور یاد دلانے کا یہ کون سا طریقہ تھا کہ تم نے کار بم سے حویلی کو اور مجھے اڑانے کا فیصلہ کرلیا۔“

”او نہیں اپنے نواب صاحب...... بم شم کوئی نہیں تھا وہ تو بس ایک پٹاخہ تھا۔ تمہیں بتانے کے لیے کہ ہمارے پاس بم بھی ہے۔ ایٹم بم بھی ہے۔“

میں نے کہا۔”اس گاڑی کو ہم نے دریا میں غرق کر دیا۔“

”اچھا کیا...... لیکن یار تم نے ہمارے بندے کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا...... تھوڑا سا دماغ تھا اس کے پاس...... وہ بھی ضائع کردیا۔ اب سوچو ذرا کہ ہم تمہاری اس نازک سی لیڈی ڈاکٹر کا سر توڑ کے اندر سے ڈاکٹری کا سارا علم نکال لیں تو باقی کیا بچے گا۔“

میں نے کہا۔”غلام محمد...... ایسے حربے استعمال کر کے تم اپنا مقصد حاصل نہیں کرسکتے۔“

وہ مسکرانے لگا۔”وہ کیا فرمایا ہے تمہارے چاچا غالب صاحب نے...... کہ ابھی تو ابتدا ہے...... آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔“

میں نے ضبط سے کام لیا۔”دیکھو...... میں بھی سمجھانے آیا ہوں کہ ایسے حربے کارگر نہیں ہوں گے۔ تم کیا کرسکتے ہو۔ یہ میں جانتا ہوں تم سمجھتے ہو کہ اس طرح میں تمہارے دباؤ میں آجاؤں گا۔“

”اس کا فیصلہ تو وقت کرے گا۔“

میں نے کہا۔”نہیں...... میں یہی بتانے آیا ہوں۔ تم شوق سے ان پر تشدد کرو...... مار ڈالو انہیں بے آبرو کر کے...... اذیت سے تڑپا کے...... میں نے اپنا دل سخت کرلیا ہے میں تم سے رحم کی بھیک نہیں مانگوں گا۔ میں صبر کرلوں گا کہ ان کی موت ایسے ہی لکھی تھی۔ کرلو جو تمہارا دل چاہے مگر اس کے بعد دیکھنا میں کیا کرتا ہوں۔“

اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔”تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟“

”یس...... کھلی دھمکی دے رہا ہوں میں...... ابھی وقت ہے بات کرنے کا...... یہ وقت ہاتھ سے نکل گیا تو نقصان تمہیں بھی ہوگا...... اچھی طرح سمجھ لو کہ میں وہ پرانا رفیق نہیں ہوں جو بے بس اور کمزور تھا۔ جس کے آگے پیچھے کوئی نہیں تھا اور جس کی اپنی کوئی ضمانت نہیں تھی۔ وہ وقت بہت پیچھے رہ گیا ہے غلام محمد۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ آج میں تم سے بڑا بدمعاش ہوں لیکن یہ حقیقت ہے کہ اب مجھے طاقت حاصل ہوگئی ہے۔ وہ طاقت جو ہر طاقت کو خرید سکتی ہے...... دولت کی طاقت...... جس سے میں تم جیسے بدمعاش خرید سکتا ہوں۔ خیر سے ہمارے پیارے پاکستان کی مارکیٹ میں سب کچھ آسانی سے مل جاتا ہے۔ ہر قسم کا اسلحہ...... راکٹ اور دستی بم...... کرائے کے قاتل اور دہشت گرد...... مجھے یقین ہے کہ میری بات تمہاری سمجھ میں آرہی ہوگی کیونکہ یہ وہی زبان ہے جو تم استعمال کرتے آئے ہو...... میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا؟“

غلام محمد ایک عیار شخص تھا اور اچھا ایکٹر بھی...... اسے گرگٹ کی طرح رنگ بدلنا بھی آتا تھا اور سانپ کی طرح کینچلی بدلنا بھی...... اس نے اپنے لہجے یا رویے سے بالکل ظاہر نہیں ہونے دیا کہ وہ میری باتوں سے ڈر گیا ہے یا متاثر ہوا ہے۔ وہ میری بات بظاہر بڑے اطمینان کے ساتھ سن رہا تھا اور درمیان میں اس نے ایک بوتل سے اپنے لیے شراب انڈیل کر ایک گھونٹ بھی لیا تھا اگر وہ عقلمندی سے کام لیتا تو یہ سہارا نہ لیتا اور مجھ پر ظاہر نہ ہونے دیتا کہ اندر سے وہ کمزور پڑ رہا ہے۔

اس نے اچانک خالی گلاس کو دیوار پر کھینچ کر مارا۔

”بند کر اپنی بکواس...... نواب کے تخم...... ورنہ ساری بدمعاشی اِدھر ہی ناک کے راستے نکال دوں گا۔“

میں مسکراتا رہا۔”میں یہاں خالی ہاتھ ضرور آیا تھا لیکن اپنی حفاظت کا بندوبست میں نے پورا کیا تھا۔ میں برابری کی سطح پر بات کرسکتا ہوں غلام محمد۔ کوئی دھمکی نہیں...... کوئی بدمعاشی نہیں...... سودا کرنا چاہتے ہو تو کرسکتے ہو ابھی......“

اس کا لہجہ کچھ بدلا۔”کیسا سودا؟“

میں نے کہا۔ ''تمہیں برطانیہ میں سیاسی پناہ چاہیے۔ میں گارنٹی نہیں دے سکتا لیکن کوشش ضرور کر سکتا ہوں۔ ایک شرط پر...... ڈاکٹر شہناز اور فرخ کو میرے حوالے کر دو۔''

''زیادہ چالاک بننے کی ضرورت نہیں...... میں تمہاری کوئی شرط قبول نہیں کر سکتا۔'' وہ تیز لہجے میں بولا۔

میں کھڑا ہو گیا۔ ''تمہاری مرضی...... اب تم جوابی کارروائی کے لیے تیار ہو جاؤ۔ میں دیکھتا ہوں تم میری مدد کے بغیر کیسے نکلتے ہو یہاں سے۔ تم پر زمین تو پہلے ہی تنگ ہوتی جا رہی ہے۔ تمہارے دشمن غالب آ رہے ہیں آج سے مجھے بھی اپنا دشمن سمجھو۔ آج اگر تم نے میرے دو بندے اغوا کر کے مار دیے تو کل میں تمہارے دو بندے مار دوں گا...... یہ سلسلہ ایسے ہی چلے گا غلام محمد...... میں تمہارا چیلنج قبول کرتا ہوں۔''

اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''اچھا بیٹھو...... آرام سے بات کرو۔''

میں بیٹھ گیا۔ ''تم بدمعاشی سے اپنا کام نہیں کرا سکتے غلام محمد...... ڈاکٹر شہناز اور فرخ کو یرغمال رکھو گے تو میں کسی سے بات بھی نہیں کروں گا...... اُلٹا میں لارڈ ارنسٹ سے کہوں گا کہ تمہیں بلیک لسٹ کرا دے...... تمہاری تصاویر اور اعمالنامہ ان کو میں فراہم کروں گا کہ وہاں قدم رکھتے ہی پولیس تمہارا استقبال کرے اور تم کو واپس ارسال کر دے۔''

اس کی حالت غیر ہونے لگی۔ ''دیکھو...... ان کی رہائی کا کوئی سوال نہیں...... میں تمہیں ان سے ملوا سکتا ہوں...... تم خود دیکھ لو کہ وہ بالکل خیریت سے ہیں لیکن یہ بھی اس وقت ممکن ہو گا جب تم میرے سامنے عائشہ سے بات کرو...... یا اس کے باپ سے۔'' اس نے فون اٹھا کے میرے سامنے رکھ دیا۔

میں نے فون اٹھا کے دور پھینک دیا۔ ''ان سے ملنے کے بعد میں اس امکان پر غور کر سکتا ہوں۔''

کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے میں خود تمہیں لے جاؤں گا اپنی گاڑی میں ابھی۔''

میری چال کامیاب رہی تھی۔ میں نے اپنی رضامندی ظاہر کر دی۔ ''مجھے منظور ہے۔''

''لیکن ایک شرط ہے۔ تمہاری آنکھوں پر پٹی ہو گی۔''

میں نے پہلے انکار کرنے کا سوچا مگر پھر یہ رسک لینے کا فیصلہ کیا۔ میں اپنی آنکھوں سے ڈاکٹر شہناز اور فرخ کو دیکھنا اور ان سے مل کے اپنی تسلی کرنا چاہتا تھا کہ ان کے ساتھ کسی قسم کی بدسلوکی نہیں ہوئی...... اگر میں اس شرط کو منظور نہ کرتا تو شاید بات ختم ہو جاتی کسی کو تاوان کے لیے اغوا کرنے والے مجرم ہوں یا اسامہ بن لادن جیسے مجاہد...... جب وہ کسی کو اپنے خفیہ ٹھکانے پر لے جاتے ہیں تو ایسے ہی طریقے استعمال کرتے ہیں...... اس مقصد کے لیے ایسی گاڑی بھی استعمال کی جاتی ہے جس کے شیشے سیاہ ہوں اور آگے پیچھے کے حصوں کے درمیان کوئی پارٹیشن ہو جس سے نہ ڈرائیور دکھائی دے اور نہ ونڈ اسکرین کے آگے کا منظر۔ سب سے آسان آنکھوں پر پٹی باندھ کے لے جانا ہے۔ آدمی اندھا ہو جاتا ہے اسے پتا ہی نہیں چلتا کہ گاڑی کتنی دیر اور کتنی رفتار سے چلتی رہی۔ کس راستے پر چلتی رہی۔ اس نے کتنا فاصلہ طے کیا اور کس سمت میں۔ گاڑی شہر میں ہی گھومتی رہی یا واقعی شہر سے دور گئی۔

مصلحت کے تحت میں نے غلام محمد کی شرط مان لی۔ اس کی گاڑی اندر لائی گئی مجھے پچھلی سیٹ پر درمیان میں بٹھایا گیا۔ میرے دائیں بائیں وہی دونوں مسلح محافظ بیٹھ گئے جنہوں نے میری جامہ تلاشی لی تھی۔ غلام محمد آگے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا۔ میرے ہاتھ آزاد تھے لیکن میں چار مسلح افراد پر قابو نہیں پا سکتا تھا میری معمولی سی غلط حرکت پر وہ بندوقوں کے کندے مار کے مجھے ناک آؤٹ کر دیتے۔

میری آنکھوں پر پٹی باندھنے کے بعد میرے سر پر ایک سیاہ رومال بھی ڈال دیا گیا جیسا کہ پھانسی دینے سے پہلے مجرموں کے چہرے کو چھپانے کے لیے ڈالا جاتا ہے۔ اس دہرے انتظام کا مقصد واضح تھا اگر میں پھرتی دکھاتا تو پٹی کھولنے سے پہلے مجھے اپنے ہاتھوں سے وہ سیاہ رومال اپنے سر سے اتارنا پڑتا۔ غلام محمد نے مجھے خبردار کیا کہ میں خودکشی کرنا چاہوں تو اور بات ہے ورنہ میں چپ چاپ سیدھا بیٹھا رہوں۔ ان کے لیے مجھے مار کے میری لاش باہر پھینکنا مشکل نہیں ہو گا۔

گاڑی نکلی تو باہر کی آوازوں کا تھوڑا سا شور میرے کانوں تک پہنچا۔ یہ بالکل نئے ماڈل کی لینڈ کروزر تھی جس کے شیشے ساؤنڈ پروف تھے اور اے سی چلتا تھا تو باہر کی حرارت کے ساتھ ٹریفک کا شور بھی رک جاتا تھا۔ مزید احتیاط کے لیے اس کے سی ڈی پلیئر پر پاپ میوزک کا شور شروع کر دیا گیا۔ اس کے اسپیکر بہت طاقت ور تھے اور مجھے ان کی دھمک کے ساتھ وہ بے سرا ہنگامہ برداشت کرنا پڑ رہا تھا جسے جدید موسیقی قرار دیا جاتا تھا۔

چونکہ میں گھڑی نہیں دیکھ سکتا تھا اس لیے وقت کا اندازہ ہی نہیں کر سکتا تھا۔ گاڑی بالآخر رکی اور مجھے محافظوں نے اسی طرح اتار کے ساتھ چلایا جیسے سچ مچ مجھے پھانسی دینے

لے جا رہے ہوں...... جب پٹی اتاری گئی تو میں نے خود کو ایک واجبی انداز میں آراستہ ڈرائنگ روم میں پایا۔ یہ بتانا بالکل ناممکن تھا کہ وہ غلام محمد کے گھر سے پچاس قدم دور تھی یا پچاس کلومیٹر کے فاصلے پر...... مجھے اب فرخ اور ڈاکٹر شہناز سے ملاقات کی بے چینی تھی۔

گھر کے اندر کا سکوت ظاہر کرتا تھا کہ وہاں کوئی نہیں رہتا۔ اس غیر آباد گھر کو شہناز اور فرخ کے زنداں کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔ کمرے میں دو خاصی بڑی کھڑکیاں تھیں جن پر بھاری پردے پڑے ہوئے تھے اگر میں انہیں کھول کے دیکھتا تو شاید باہر کے منظر سے مجھے گھر کے محل وقوع کا تعین کرنے میں کچھ مدد ملتی لیکن ایک تو اتنی مہلت ملنے کا امکان نہیں تھا دوسرے باہر اب رات کا اندھیرا غالب آ گیا تھا۔ گرد و پیش کی یاد رکھنے والی نشانیاں دکھائی ہی نہ دیتیں۔ ان کھڑکیوں کے علاوہ کمرے میں تین دروازے تھے۔ ایک چھوٹا دروازہ باتھ روم کا تھا۔ دوسرے سے مجھے اندر لایا گیا تھا۔ تیسرے کے بارے میں صرف فرض کیا جا سکتا تھا کہ وہ کسی برآمدے یا لاؤنج میں کھلتا ہو گا۔

میں نے کمرے کی آرائش کا جائزہ لیا تو مجھے وہاں دیگر اشیا کے علاوہ دو تصاویر نظر آئیں۔ ایک بہت پرانی تصویر کسی خاندانی بزرگ کی تھی جو میرے اندازے کے مطابق سو سال پرانے لباس میں تھے۔ چوڑی دار پاجاما...... شیروانی اور صافہ والے یہ باریش بزرگ ایک عصا تھامے بڑے جلال اور طمطراق کے ساتھ ایک شاہانہ انداز کی کرسی پر براجمان تھے۔ میں نے قریب جا کے دیکھا تو اس پر خان بہادر علی قلی خاں ڈپٹی کلکٹر لکھا ہوا تھا۔ ان کے ساتھ والی کرسی پر ان کی رفیقہ حیات کے سوا کون ہو سکتا تھا۔ وہ ڈپٹی صاحب سے خاصی کم عمر اور بے حد خوب صورت تھیں...... انہوں نے غرارہ سوٹ پہن رکھا تھا اور دوپٹے کو بڑے اہتمام سے سر پر رکھا تھا۔

تصویر کے پیچھے ڈپٹی صاحب کے بارے میں ایک مفید اطلاع یہ تھی کہ وہ ریاست کپورتھلا میں 19 جون 1866ء میں پیدا ہوئے اور 20 جون 1936ء کو دہلی میں انتقال فرما گئے۔ گویا ستر سال کے ہوتے ہی...... دوسری تصویر اگلی نسل کی تھی۔ چالیس پینتالیس سال کا ایک اسمارٹ شخص ایئر فورس کی یونیفارم میں ایک کرسی کے پیچھے کھڑا مسکرا رہا تھا۔ کرسی پر اس کی انگریز بیوی بیٹھی تھی۔ اس کا لباس اپنے زمانے کے مطابق ضرور فیشن ایبل ہو گا لیکن پورا تھا۔ اسکرٹ گھٹنوں سے ایک بالشت نیچا تھا...... گریبان یعنی گلا شریفانہ حد تک کھلا ہوا تھا اور اس کے سر پر زنانہ ہیٹ تھا جس میں مرغی کا یا کسی پرندے کا پر لگا ہوا تھا۔ اس کے نیچے لکھا تھا۔ ونگ کمانڈر احمد علی رائل انڈین ایئر فورس...... پیدائش دہلی۔ کیم اکتوبر 1892ء۔ وفات پلین کریش 22 مارچ 1937ء...... اور گریس احمد علی...... پیدائش نارفاک برطانیہ 28 جولائی 1914ء۔ وفات راولپنڈی 13 مئی 1963ء۔ تصویروں کے رنگ اڑ چکے تھے۔ بلیک اینڈ وائٹ تصویر اب لال نظر آتی تھی۔

میں واپس آ کے بیٹھ گیا۔ ان تفصیلات کو میں نے ذہن نشین کر لیا تھا۔ ونگ کمانڈر احمد علی اگر ڈپٹی علی قلی کا بیٹا تھا تو اس کی بیوی گریس عمر میں اس سے بائیس سال چھوٹی تھی۔ غالباً یہ لو میرج تھی اور صرف تین چار سال ہی رہی۔ پھر پلین کریش میں شوہر مارا گیا اور تقسیم کے بعد وہ پاکستان آئی تو راولپنڈی میں رہی۔ اس کی اپنی فیملی نارفاک انگلینڈ میں تھی۔ یہاں ضرور وہ کسی بیٹے یا بیٹی کے ساتھ آئی تھی...... کوشش کر کے یہ معلوم کیا جا سکتا تھا کہ ڈپٹی کلکٹر علی قلی کے بیٹے احمد علی کی بیوہ گریس علی راولپنڈی میں کہاں رہی۔ وہ اپنے شوہر کی پنشن لیتی ہو گی۔ پنشن آفس کے پاس اس کا ریکارڈ ہو گا۔ تین چار سال کی شادی میں اس کی ایک ہی اولاد ہو گی۔ کوئی لڑکا یا لڑکی جس کے ساتھ وہ تقسیم کے بعد پاکستان آئی۔ کیا یہ اسی کا گھر تھا۔

میں اس ذہنی مشق سے اکتا گیا تھا اور انتظار سے بھی۔ تاہم کچھ تفصیلات بعد میں اس گھر میں رہنے والوں کا سراغ لگانے میں مددگار ثابت ہو سکتی تھیں۔ میں اس خیال سے بھی پریشان تھا کہ کہیں رضاکارانہ طور پر تو یہاں قید ہونے نہیں آ گیا ہوں...... مجھے یہاں لانے والے واپس جا چکے ہوں اور میرا پرسان حال کوئی نہ ہو...... کسی پر الہام تو ہونے سے رہا کہ میں کہاں ہوں میرا حوصلہ بڑھانے والا کوئی امید افزا خیال تھا تو راجا کا جسے میں اپنی بحفاظت واپسی کا ذمے دار بنا کے آیا تھا لیکن کیا وہ میرا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک آیا ہو گا؟ شاید نہیں...... جو گاڑی اس نے غلام محمد کے گھر سے برآمد ہوتے ضرور دیکھی ہو گی مگر کیا اسے یہ خیال آیا ہو گا کہ اس میں نواب رفیق احمد شیرازی کی سواری جا رہی ہے۔

فرخ ایک دم اندر آ گیا۔ معلوم نہیں اسے کیا بتایا گیا تھا مگر مجھے دیکھ کر وہ چونکا اور اس کی صورت پر نظر آنے والے تفکر اور پریشانی کے آثار یکلخت حیرت اور مسرت میں بدل گئے وہ مجھ سے ملنے لپکا۔

میں نے کھڑے ہو کے اسے گلے لگایا۔ ''کیسے ہو فرخ؟''

''تم یہاں کیسے؟......'' وہ بڑی مشکل سے بولا۔

میں نے کہا۔ ’’یہی سوال میں تم سے کرتا ہوں...... تم پہلے آئے ہو جواب پہلے تمہیں دینا چاہیے۔‘‘

اس کے مزید کچھ بولنے سے پہلے شہناز آ گئی۔ اس نے میری آواز باہر ہی سے سن لی تھی وہ دیوانہ وار لپکی اور مجھ سے لپٹ کے رونے لگی۔ میں نے بڑی مشکل سے اس کو چپ کرایا۔ اس وقت تک کمرے میں اور کوئی نہیں تھا مگر میں جانتا تھا کہ کہیں نہ کہیں سے وہ ہماری نگرانی کر رہے ہوں گے۔ ان کی آنکھیں ہمیں دیکھ رہی ہوں گی اور ان کے کان ہمارے لبوں سے نکلنے والے ہر لفظ کو سن رہے ہوں گے۔

میں نے کہا۔ ’’بس اب آرام سے بیٹھ کے مجھے بتاؤ یہ سب کیسے ہوا...... مجھے نہیں معلوم کہ اس ملاقات کے لیے کتنی مہلت حاصل ہو گی۔‘‘

غلام محمد جیسے اسی سوال کا منتظر تھا۔ وہ ایک دم اندر آ گیا۔ ’’لو جی ہم نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ آپ نے ملاقات کے لیے کہا تھا...... ہو گئی ملاقات...... آپ نے دیکھ لیا کہ بندے ٹھیک ٹھاک ہیں...... بس اب چلو۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’ابھی تو کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔‘‘

’’بات کرنے کی بات نہیں ہوئی تھی اپنے نواب صاحب۔‘‘ وہ رکھائی سے بولا۔

اس کے دونوں محافظ ایک ساتھ داخل ہوئے۔ ان کی مشین گنوں کا رخ بڑے جارحانہ انداز میں میری طرف تھا۔ میں نے خود کو انتہائی بے بس محسوس کیا۔ یہ بات یقینی تھی کہ یہاں ان کے علاوہ بھی لوگ ہوں گے۔

میرا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ میں اس صورت حال کو اپنے حق میں کرنے کے لیے کسی قسم کا خطرہ مول لوں...... نتائج کی پروا کیے بغیر مسلح محافظوں پر ٹوٹ پڑوں اور ان سے اسلحہ چھین کے اپنی ہار کو جیت میں بدل لوں۔ میرے نزدیک ایسا کرنا بہادری نہیں خودکشی کے مترادف تھا۔ انسان کے مقابلے میں گولی کی ہزار گنا رفتار تیز ہوتی ہے اس سے پہلے کہ میں کسی کی طرف جارحانہ انداز میں ایک قدم بھی بڑھاتا تو نہ جانے کتنی گولیاں میرے جسم میں اتر جاتیں۔ محافظ روبوٹ ہوتے ہیں وہ سوچتے نہیں کہ مصلحت کیا ہے اور اجازت کے لیے کسی کی طرف دیکھتے نہیں۔ وہ جس کے نمک خوار ہوں اسے بچانے کے لیے جان لینے یا دینے کا فرض کسی خودکار مشین کی طرح سرانجام دیتے ہیں۔

میں نے یہ سوچا تک نہیں کہ کسی ایک محافظ سے اس کا اسلحہ لے کر دوسرے کو ختم کر دوں یا غلام محمد کو دبوچ کے اپنے بس میں کر لوں اور اسے ڈھال بنا کے اپنے ساتھیوں سمیت باہر نکل جاؤں۔ ایسا کرنے میں میرے ساتھ سب کی جان جا سکتی تھی۔

لیکن فرخ کے دماغ میں کیا ہے۔ اس کا اندازہ میں نہ کر سکا۔ بظاہر وہ بہت پرسکون اور خاموش تھا لیکن اس کے ذہن میں ایک خطرناک منصوبہ تکمیل کے مراحل طے کر چکا تھا۔ ٹائم بم کی طرح ایک کلاک اس کے دماغ میں بھی چل پڑا تھا اور سیکنڈ کی سوئی مسلسل زیرو کی جانب بڑھ رہی تھی۔ جب وہ وقت آیا اور وقت تب آیا جب میں نے انہیں خدا حافظ کہنے کے لیے سر ہلایا۔

میرے لبوں سے خدا حافظ کے الفاظ نکلے بھی نہ تھے کہ فرخ نے چیتے کی طرح جست لگائی۔ جیسا کہ اس نے بعد میں بتایا اس کے لیے وہ بڑی خاموشی سے آہستہ آہستہ ایک ایک انچ سرکتا ہوا اس مقام تک پہنچ گیا تھا جہاں سے حصول مقصد میں ناکامی کے امکانات کم سے کم ہو جاتے تھے۔ جیسے نشانہ باز طے کرتا ہے کہ ہر زاویے اور پہلو سے ایک نقطہ ہے جس پر ٹھہر کے وہ فائر کرے تو ہدف کا زد میں ہونا یقینی بن جاتا ہے۔

اس نے تقریباً ہوا میں اُڑتے ہوئے ایک محافظ کو یوں ٹکر ماری جیسے نائن الیون کو خودکش طیارے نے ورلڈ ٹریڈ ٹاور کو ہٹ کیا تھا۔ اس کی طرف سے یہ حملہ کچھ غیر متوقع ثابت ہوا۔ غلام محمد محتاط تھا تو میری طرف سے۔ محافظ مجھے خطرناک سمجھتے تھے۔ یہ سب ہی جانتے تھے کہ میں نے لندن میں شوقیہ مارشل آرٹ کی تربیت لی تھی اور بلیک بیلٹ نہ ہونے کے باوجود خالی ہاتھوں سے اپنا دفاع کرنے میں میری مہارت اس حد تک تسلیم شدہ تھی کہ چار چھ سورما میرے مقابلے پر ٹھہر نہیں سکتے تھے۔

فرخ صورت سے معصوم اور کسی حد تک احمق نظر آنے والا...... سیدھا سادہ اور بے ضرر نوجوان تھا۔ نہ اس کے تیور جارحانہ تھے اور نہ اس کے مزاج میں آتش فشانی تھی...... یہی غلط فہمی تھی جس کی بنا پر محافظوں نے اس کی طرف کم توجہ رکھی۔ وہ ایک محافظ سے پوری قوت کے ساتھ ٹکرایا تو دوسرے ورلڈ ٹریڈ ٹاور کی طرح ساتھ کھڑا ہوا دوسرا محافظ بھی اپنے قدموں پر کھڑا نہ رہ سکا۔

اس ایکشن فلم کے پہلے سیکنڈ کے آغاز میں میرے دماغ نے ایک سگنل دے دیا اور میرا جسم ٹریگر کے دباؤ سے نکلنے والی گولی کی طرح حرکت میں آ گیا۔ دونوں محافظوں کے ساتھ فرخ بھی گر گیا تھا مگر محافظ تربیت یافتہ کمانڈوز تھے وہ پلک جھپکنے میں پلٹے اور ابھی اٹھنے ہی والے تھے کہ میرے بوٹ کی بھرپور کک نے ایک کی گردن موڑ دی۔ جس طرح وہ گرا اس سے یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ اب وہ پھر نہ اٹھ سکے گا اس کی گردن ٹوٹ چکی تھی۔

دوسرے نے پلٹتے ہی گن کو فائر کے لیے اٹھا لیا تھا لیکن ہماری خوش قسمتی کہ پہلا محافظ الٹ کر اس کی گن پر گر گیا۔ اس کی گن سے نکلنے والی گولیوں کا رخ بدل گیا ایک گولی نے پردے کے پیچھے کھڑکی کے شیشے کو پاش پاش کیا اور نہ جانے کدھر نکل گئی۔ تین گولیوں نے چھت کو ادھیڑا...... ایک گولی سے وہ ہک ٹوٹا جس سے پنکھا معلق تھا اور پنکھا نیچے گرا...... شہناز بال بال بچی۔

فرخ کو اندازہ تھا کہ اس کی پہلی حرکت کے ردِعمل میں میرا عمل کیا ہو گا۔ میں دم بخود اور ساکت نہیں رہوں گا شاید شہناز بھی چیخ مار کے صرف بے ہوش ہونے والی نہیں تھی۔ حسب توفیق وہ بھی بعد میں کچھ ضرور کرے گی خواہ کسی کو اپنی جوتی ہی کھینچ مارے...... فرخ نے کچھ حساب لگا لیا تھا کہ اس کی بسم اللہ کے بعد میں کس کو انا للہ کہوں گا...... اس کا اخذ کردہ نتیجہ غلط بھی ثابت ہو سکتا تھا مگر حسابی قاعدے سے نکالے جانے والے نتائج بھی دو اور دو چار کی طرح نکلتے ہیں۔

میں نے خطرناک محاذ پر فرخ کی مدد کی۔ میں نے غیر محفوظ رہ جانے والے غلام محمد پر حملہ نہیں کیا۔ میں نے پہلے اسلحہ برداروں کو ختم کیا جو اس کی اصل طاقت تھے۔ وہ نعوذ باللہ...... خدا سے زیادہ ان پر بھروسا کرتا تھا۔ وہ خود بھی اسلحہ ساتھ لیے بغیر کہیں جاتا نہیں تھا لیکن میرے ساتھ آتے ہوئے وہ انتہائی پراعتماد تھا۔ وہ اپنے محفوظ قلعے سے اپنی بکتر بند گاڑی جیسی لینڈ کروزر میں سوار ہوا۔ اسے راستے میں کسی جگہ رکنا نہیں تھا اور جہاں جانا تھا وہ بھی حفاظتی انتظامات کے اعتبار سے دوسرا قلعہ تھا۔

لیکن اس کے پاس اپنا ریوالور ہوتا تب بھی اس کے کام نہ آتا فرخ نے ٹکر مار کے دونوں محافظوں کو گرانے کے بعد ان سے نمٹنے کی ذمے داری مجھ پر چھوڑی اور خود غلام محمد کی طرف پلٹ گیا۔ غلام محمد کی نظر محافظوں پر تھی اور وہ منتظر تھا کہ اس کے انتہائی مستعد تربیت یافتہ اور جانثار محافظ فرخ کے جسم کو چھلنی کرنے میں کتنی دیر لگاتے ہیں۔ فرخ اسکواش کورٹ کی ری باؤنڈ ہونے والی بال جیسی تیزی کے ساتھ اس کی طرف گیا تو وہ جہانگیر خان جیسا ریٹرن شاٹ نہ کھیل سکا۔

جتنی دیر میں دوسرے محافظ کو میری دوسری کک نے بے کار اور بے جان کیا اتنی دیر میں فرخ اور غلام محمد کی فری اسٹائل ریسلنگ شروع ہو چکی تھی غلام محمد بے خبری میں نہیں گرا تھا۔ اس نے فرخ کو اپنی جانب بڑھتا دیکھ لیا تھا اور چیختے چلاتے ہوئے اس نے اپنا دفاع کرنے کی کوشش کی تھی۔

فرخ کے پہلے حملے کے بعد ہی غلام محمد نے باہر سے امداد کی پکار نشر کرنا شروع کر دی تھی باہر یقیناً دوسرے مسلح محافظ بھی تھے جن کو وہ چیخ چیخ کے بلا رہا تھا۔ غلام محمد کمزور نہیں تھا۔ اس کا جسمانی ڈیل ڈول اچھا تھا اور ایک زمانے میں اسے اکھاڑے میں زور کرنے کا شوق بھی رہا تھا یہ طاقتوری کی لگن بعد میں بدمعاشی کی طاقت بن گئی اور اپنے جسم کی قوت سے زیادہ اس کا انحصار اسلحے پر محافظوں پر اور ان پر ہو گیا جو اس کے حکم کے غلام ہو جاتے تھے۔

اس نے فرخ کا مقابلہ ضرور کیا مگر اس کے بڑھاپے کی جانب مائل روبہ زوال جسم کو عیاشی نے بھی کمزور کر دیا تھا۔ شراب و شباب کے نشے نے رہی سہی کسر پوری کر دی تھی۔ وہ فرخ کے ہاتھوں بری طرح پٹ رہا تھا اور خود کو چھڑانے کی جدوجہد کے ساتھ فوجی امداد کے لیے مسلسل ایس او ایس بھی بھیج رہا تھا۔ فرخ پر قید و بند کی مجبوری کا عذاب ختم ہونے سے جنون سوار تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ غلام محمد کو اس کے سارے جرائم پر سزائے موت دیے بغیر معاف نہیں کرے گا۔

میں باہر سے بھگدڑ کی آوازیں سن رہا تھا۔ دوسرے محافظ سے گن چھینتے ہی میں نے اس کا رخ دروازے کی طرف کر دیا اور فرخ سے چلا کے کہا۔ ’’فرخ ہوش میں آؤ۔‘‘

فرخ نے شہناز کی موجودگی کا خیال کیے بغیر غلام محمد کو گالیاں دینا اور بے رحمی سے مارنا جاری رکھا۔ میں نے شہناز کو آواز دی۔ ’’شہناز اسے روکو وہ خوف زدہ کھڑی تھر تھر کانپنے میں مصروف تھی اور بہت غنیمت تھا کہ ابھی تک بے ہوش ہو کے نہیں گری تھی۔ میری آواز پر وہ فرخ کی طرف لپکی۔

میں نے باہر قدموں کی آواز سنی تو ایک وارننگ فائر کیا۔ ’’خبردار اندر کوئی نہ آئے......‘‘ پھر میں تیزی سے کھلے دروازے کی طرف گیا اور تھوڑا سا جھانک کر دیکھا تو مجھے کوریڈور میں دو افراد نظر آئے...... ان میں سے صرف ایک کے پاس گن تھی۔ دوسرا اس کے پیچھے ڈانگ لیے کھڑا تھا۔ گن والا پستہ قد اور ادھیڑ عمر کا سابق فوجی لگتا تھا...... ڈانگ والا دراز قد دبلا پتلا نوجوان صرف احمق لگتا تھا۔

میں نے گن باہر نکال کے دو فائر کیے۔ ’’پیچھے ہٹ جاؤ ورنہ غلام محمد سے پہلے تم مارے جاؤ گے۔‘‘

شہناز نے فرخ کو بالوں سے پکڑ کر پیچھے کھینچ لیا تھا اور اب اسے ڈانٹ رہی تھی۔ ’’پاگل ہو گئے ہو کیا...... رفیق کی آواز نہیں سنائی دیتی...... خون سوار ہے تم پر؟‘‘ وہ ڈانٹنے کی ماہر تھی اور اس وقت ٹینشن میں بھی تھی۔

فرخ لمبے لمبے سانس لے رہا تھا...... غلام محمد آہستہ آہستہ کراہتا ہوا اپنے قدموں پر کھڑا ہوا...... اس کا ایک ہونٹ کٹ گیا تھا۔ اس کی ناک سے بھی خون کی لکیر باہر آ رہی تھی۔ بازی ہار دینے کے بعد وہ خاموش ہو گیا تھا۔

میں نے کہا۔ ''اسے آگے لاؤ۔''

فرخ نے اسے آگے دھکیل دیا۔ میں گن کے ساتھ اس کے بالکل پیچھے آ گیا۔ پھر دوسری گن فرخ نے اٹھالی اور میرے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ میں نے غلام محمد سے کہا۔ ''چلو آگے..... اور اپنے کتوں کو سمجھا دو کہ تمہاری جان کے دشمن نہ بنیں۔''

غلام محمد کے نمودار ہوتے ہی اس کے اسلحہ بردار محافظ بے وقوفوں کی طرح کھڑے رہ گئے تھے۔ بادشاہ سلامت دشمن کے قیدی بن گئے تھے تو اب سپاہی کیا کرتے۔ غلام محمد نے صرف ہاتھ کے اشارے سے انہیں دفع ہونے کے لیے کہا تھا اور وہ بڑی فرمانبرداری سے دفع ہو گئے۔

میں نے فرخ سے کہا۔ ''تم قیدی کا خیال رکھو میں دیکھتا ہوں باہر اور کون ہے۔''

غلام محمد نے متانت سے کہا۔ ''اور کوئی نہیں ہے۔''

فرخ نے اس کی گدی پر ایک ہاتھ رسید کیا۔ ''تجھ سے پوچھا ہے کسی نے؟''

غلام محمد غرایا..... ''اپنے پلے کو سمجھا لو رفیق...... ابھی اسے بھونکنا بھی نہیں آتا...... یہ کاٹنے کی کوشش کر رہا ہے۔''

میں نے باہر نکل کے گرد و پیش کا جائزہ لیا، یہ کسی کم آباد علاقے میں بنی ہوئی پرانی کوٹھی تھی۔ اس کی دوسری منزل پر مکمل تاریکی تھی۔ پیچھے والے ایک حصے میں روشنی سے کچھ زندگی اور آبادی کا احساس ہوتا تھا ورنہ یوں لگتا تھا جیسے یہاں کوئی نہیں رہتا۔ مختصر سے لان اور باغ کی بدحالی بھی یہی تاثر دیتی تھی۔ باہر سے اندر آنے والے راستے پر صرف وہی لینڈ کروزر کھڑی تھی جس میں مجھے آنکھوں پر پٹی باندھ کے لایا گیا تھا۔ اس کا ڈرائیور سیٹ پر بیٹھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اس نے اندر سے آنے والی فائرنگ کی آوازیں بھی ضرور سنی ہوں گی شاید اس کے لیے احکامات ہوں گے کہ آن ڈیوٹی وہ اپنی جگہ نہ چھوڑے۔

میرے ہاتھ میں گن دیکھ کے وہ تیزی سے ایک طرف جھکا..... کسی چھٹی حس نے مجھے بروقت خبردار کر دیا کہ وہ گلوز کمپارٹمنٹ یا کسی خفیہ خانے سے ریوالور نکالنا چاہتا ہے۔ میں نے ایک برسٹ مارا اور لینڈ کروزر کا ونڈ اسکرین دھماکے سے بکھر گیا۔ ڈرائیور ایک دم سیدھا ہو گیا۔ اس کا سر جسم کھلی جگہ میں ایک اوپن ٹارگٹ تھا۔ وہ چلانے لگا۔ ''مجھے مت مارو۔''

میں نے کہا۔ ''نیچے اترو...... ہاتھ سر پر۔''

اس نے مظلومیت سے کہا۔ ''دروازہ کیسے کھولوں گا اگر ہاتھ سر پر رکھے۔''

میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور اسے باہر کھینچ لیا۔ وہ سمٹ کر فرش پر گرا اور ہاتھوں کو سر پر رکھ کے کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس کی تلاشی لی۔ اس کے پاس کوئی خطرناک چیز نہیں تھی۔ گلوز کمپارٹمنٹ کے اندر سے مجھے 38 بور کا ایک آٹومیٹک ریوالور ملا۔ دروازہ کھلا رہنے سے چھت کی لائٹ جل گئی تھی۔ اس روشنی میں مجھے ڈرائیور کی سیٹ کے پیچھے ایک البم دکھائی دی۔ اس میں بے حد قابل دید اور قابل غور تصاویر تھیں جن کا وہ فراغت سے تفصیلی جائزہ لے رہا تھا۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ''یہ کس کی کوٹھی ہے؟''

''غلام محمد صاحب کی سر...... وہ کہاں ہیں؟''

میں نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔ ''بھول جاؤ انہیں۔ وہ پہنچ گئے جہنم میں...... اپنے ٹھکانے پر...... اب میں تمہارا مالک اور آقا ہوں...... یہ کون سی جگہ ہے؟''

''شاہدرے سے آگے...... کالا شاہ کاکو کے قریب۔''

میں نے کہا۔ ''جی ٹی روڈ یہاں سے کتنی دور ہے؟''

''دو میل جناب...... وہ لائٹس سہگل والوں کے کارخانے کی ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''آس پاس کون لوگ رہتے ہیں؟''

''کوئی نہیں جناب، غلام محمد صاحب کی زمین سے آس پاس آگے ایک کرنل صاحب کا فارم ہے۔ پولٹری فارم...... ادھر گودام ہیں۔'' اس نے ہاتھ کے اشارے سے سمت بتائی۔

میں نے کہا۔ ''اس کوٹھی میں کتنے لوگ کام کرتے ہیں؟''

''ایک چوکیدار...... ایک گن مین...... ایک عورت صبح آتی ہے شام تک رہتی ہے...... صفائی کرتی ہے اور کھانا بناتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''کوئی گاڑی نہیں ہے ان کے پاس؟''

''ہے جناب...... ادھر ایک گیراج میں کھڑی ہے اس نے ہاتھ کے اشارے سے ایک گلی دکھائی۔

میں نے اسے آگے چلنے کے لیے کہا۔ آٹھ فٹ چوڑی گلی کے آخری حصے میں گیراج کا دروازہ سامنے آتا تھا۔ اس نے مجھے دروازہ کھول کے دکھایا۔ اندر ایک جیپ کھڑی تھی۔ جیپ کی چابیاں سوئچ میں لگی ہوئی تھیں۔ میں ڈرائیور کو اندر لے آیا وہ چالیس پینتالیس سال کا اور درمیانی قد و قامت والا

باریش شخص تھا۔ اندر ایک کمرے میں ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز...... والا منظر تھا۔ غلام محمد کی کوٹھی کا گن مین اور چوکیدار ایک ہی دیوار کے ساتھ کھڑے تھے۔ ڈرائیور رضا کارانہ طور پر اس صف میں شامل ہو گیا۔

جنگی قیدیوں کے مقابل ایک صوفے پر فرخ کسی فاتح جنرل جیسی شان کے ساتھ ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھا تھا۔ اس کی گن ہاتھ میں تھی۔

میں نے کہا۔ ''شہناز کہاں ہے؟''

''میں ان کی خاطر تواضع کر رہا ہوں۔ وہ ہماری خاطر تواضع میں لگی ہوئی ہے۔ کچن سے چائے بنا کے لا رہی ہے۔''

میں فرخ کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ''تم نے راجا کو فون کیا؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''شہناز نے کر دیا ہے۔ وہ آتے ہی ہوں گے...... یہ جگہ زیادہ دور نہیں ہے انہیں پتا سمجھا دیا گیا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ہاں...... ایک ڈیڑھ گھنٹے میں ہم لاہور سے صرف آٹھ نو میل آئے...... ایک لینڈ کروزر میں...... حیرت ہے۔''

فرخ نے مجھے بتایا۔ ''ہم اسی کمرے میں قید تھے کل رات سے۔''

''یہ بھی بتا دو وہ تمہارے ساتھ یہاں کوئی برا سلوک نہیں ہوا۔ تمہیں کسی قسم کی تکلیف نہیں دی گئی۔'' غلام محمد تلخی سے بولا۔

شہناز ایک ٹرے اٹھائے اندر آ گئی۔ ''اس میں تو کوئی شک نہیں...... بس ہم اس کمرے سے باہر نہیں جا سکتے تھے۔ کسی سے رابطے کا ذریعہ کوئی نہیں تھا۔ مسلح گارڈ ہر وقت بندوق تانے موجود رہتا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''غلام محمد...... یہ تمہارے حق میں اچھا ہوا۔ دیکھ لو بازی پلٹتے دیر نہیں لگتی۔ میں بھی تمہارے ساتھ بدسلوکی نہیں کروں گا۔ آؤ یہاں بیٹھو...... چائے پیو۔''

وہ آہستہ آہستہ آگے آیا اور ایک صوفے پر گر گیا۔ ''میں نے تمہارے وعدے پر اعتماد کیا تھا۔''

''لیکن اس سے پہلے تم بہت کچھ کر چکے تھے۔ اور مجھے معلوم نہیں کہ آگے چل کے تم اپنی اس ذلت اور ناکامی کا بدلہ مجھ سے کس طرح لو گے۔ ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ بہت وقت گزارا تھا اس لیے میں جانتا ہوں کہ تم آج کی ذلت اور شکست کو بھلا نہیں سکو گے۔ تم مجھ سے بدلہ ضرور لو گے۔ تمہیں چھوڑنا ایسے ہی ہوگا جیسے کوئی گھر کے اندر موذی سانپ کو پکڑے اور رحم کھا کے پھر گھر میں چھوڑ دے۔ ایسی بے وقوفی میں نہیں کر سکتا۔ رہی وعدے کی بات تو وعدے کا پاس شرافت کی روایت ہے۔ میرا وعدہ محض ایک جنگی چال تھا۔''

شہناز نے چائے کا ایک کپ اس کے سامنے رکھ دیا۔ وہ جتنا فرخ کی مار سے اذیت میں تھا اس سے کہیں زیادہ احساس شکست کی ذلت میں مبتلا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ مسلح محافظ جن پر اسے پورا ابھر وسا تھا، وقت آنے پر یوں مارے جائیں گے اور ان کے ساتھ وہ بھی قیدی بن جائے گا۔

تاہم اپنی طاقت پر اس کا غرور ابھی سلامت تھا۔ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''مجھے مار کے تم بچ نہیں سکتے رفیق۔''

میں نے کہا۔ ''یہ بڑی مضحکہ خیز بات ہے۔ تمہارے مر جانے کے بعد کیا ہوگا اس بارے میں تم کیوں فکرمند ہو۔ ویسے بھی میرا تمہیں مارنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ تم میری حفاظتی تحویل میں رہو گے...... بطور ضمانت۔''

''کس بات کی ضمانت؟''

''اپنے تحفظ کی ضمانت...... اگر تنظیم کے لیے تمہاری کوئی اہمیت ہے...... لندن میں بیٹھا ہوا چیف اور اس کا نائب شہاب الدین واقعی چاہتے ہیں کہ تم کو بحفاظت ملک سے نکال کے لندن پہنچا دیا جائے تو انہیں یہ ضمانت فراہم کرنا ہوگی کہ آئندہ وہ مجھ پر...... میرے عزیز و اقارب اور خاندان والوں کے خلاف کوئی جارحانہ کارروائی نہیں کریں گے۔''

''یعنی تم اپنے وعدے پر قائم ہو۔''

''میں کوشش ضرور کروں گا کہ تمہیں اور شہاب الدین کو لندن میں سیاسی پناہ مل جائے۔ اس کی گارنٹی نہیں دے سکتا۔ حالات اب بہت مختلف ہیں مجھ پر دباؤ ڈال کے تنظیم مجھ سے کوئی کام نہیں کرا سکتی...... اگر کسی نے مجھے ہراساں کیا اور مجھے کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو اس کی سزا تم بھگتو گے۔''

اس کی صورت پر کچھ اطمینان کے آثار نمودار ہوئے۔ ''میں شہاب الدین کو سمجھانے کی کوشش کروں گا۔''

میں نے کہا۔ ''اسے میں بھی سمجھا سکتا ہوں...... بالکل اسی طرح جیسے تمہیں سمجھایا ہے...... اور ضروری ہوا تو میں اسے بھی تمہارے پاس لے آؤں گا...... خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو......''

''تمہیں اپنے بارے میں شدید غلط فہمی ہو گئی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اور تم ابھی تک اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کہ رفیق پر تمہاری وہی بالادستی قائم ہے۔ بہت جلد یہ بھی دور ہو جائے گی۔''

باہر سے اندر آنے والی کسی کار کی تیز روشنی کھڑکی پر

جھلملائی...... پھر گاڑی کے بریک لگانے کی آواز کے ساتھ ہی کار کا دروازہ بند ہوا۔ شہناز بے تاب ہو کے اٹھی اور پھر جھجک کے رکی...... میں نے کہا۔ ''جاؤ اسے لے آؤ...... راجا صاحب آگئے ہیں۔''

فرخ اٹھتے اٹھتے رہ گیا۔ شہناز باہر نکل گئی۔ مجھے اندازہ تھا کہ یہاں سب کے سامنے ان بچھڑے ہوئے لیلیٰ مجنوں کے لیے اپنے جذبات کی یلغار پر قابو پانا مشکل ہوگا اور سارے تکلفات آداب اور شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ کے جذبات کا اظہار اس سے بھی زیادہ مشکل ہو جائے گا۔

چند منٹ بعد جب وہ اندر آئے تو نارمل نظر آنے کی کوشش ضرور کر رہے تھے مگر ان کی آنکھوں میں نمی باقی تھی۔ ان کے چہرے تمتما رہے تھے اور ان کی صورت پر ان کی چاہت کا سارا ماجرا ایک مسکراہٹ میں آگیا تھا جس میں ایک دوسرے کو کھو کے پا لینے کی ساری خوشی اور طمانیت تھی۔

شہناز نے سب کی نظر بچا کے راجا کے پیچھے رہتے ہوئے پلکوں پر آجانے والے آنسوؤں کو صاف کیا۔ راجا نے ایک نظر اس منظر پر ڈالی جو اس کے سامنے تھا اور پھر فرخ سے گلے ملا۔ ''ٹھیک ہے نا بچے؟'' وہ بڑی شفقت اور اپنائیت سے اس کا کندھا تھپک کے بولا۔

''یس باس......'' فرخ مسکرایا۔

راجا نے میری طرف دیکھا۔ ''قبلہ نواب صاحب غلام آپ سے تخلیہ میں کچھ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہے۔''

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ''ہم نے اجازت دی غلام۔''

راجا نے باہر آ کے پوچھا۔ ''یہ تو بعد میں پولیس پوچھے گی کہ کیا ہوا کیسے ہوا اور کیوں ہوا...... پہلے یہ بتا کہ کرنا کیا ہے اب۔''

میں نے کہا۔ ''بس تیرا انتظار تھا۔ چلتے ہیں جنگی قیدیوں کو لے کر۔''

''انہیں کہاں لے جائیں گے...... کیا سب کو لے جانا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں...... بعد میں آنے والوں کو کچھ بتانے والا کوئی نہیں رہے گا...... ان سب کو ست بدھائی میں قید رکھا جائے گا۔''

راجا کچھ تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ ''کیا یہ درد سر مول لینا ضروری ہے۔''

''ہاں...... میں ایسا ہی سمجھتا ہوں۔ دو کو میں باندھ کے ڈکی میں ڈالوں گا...... ایک غلام محمد کو اور دوسرے اس کے محافظ کو...... وہ یہاں مامور تھا...... وہ دونوں جو غلام محمد کے ساتھ آئے تھے اندر مرے پڑے ہیں...... باقی دو میں سے ایک غلام محمد کا ڈرائیور ہے...... دوسرا یہاں کا چوکیدار...... وہ اتنے خطرناک نہیں ہیں۔ ان کو بھی باندھنا ضروری ہوگا۔ وہ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر رہیں گے۔ شہناز کو ریوالور سے فائر کرنا آتا ہے نا؟''

راجا نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ صرف اداؤں کے تیر چلا سکتی ہے۔''

''او کے...... ڈرائیونگ اس کے سپرد کر دے...... تو یہ ریوالور لے کر بیٹھ جا......'' میں نے لینڈ کروزر میں سے ملنے والا ہتھیار اسے تھما دیا۔

''تیرا کیا پروگرام ہے؟''

میں نے کہا۔ ''میں فرخ کے ساتھ جیپ میں آتا ہوں۔ جیپ کو ہم مخالف سمت میں لے جائیں گے اور گوجرانوالہ کے قریب کہیں چھوڑ دیں گے۔ وہاں سے ہم کرائے کی گاڑی یا ٹیکسی پکڑ کے ایک گھنٹے میں لاہور پہنچ جائیں گے۔ فرخ کی مرضی وہ رات میرے گھر میں گزارے اور صبح ست بدھائی پہنچ جائے۔ میں ابھی نہیں آسکتا...... کل دادی کا سوئم ہوگا...... چچی کا بھی...... میں جھوٹ بول کے نکلا تھا کہ صوفی چچا کے لیے وکیل کا بندوبست کر رہا ہوں...... مجھے یہ کام بھی کرنا ہے کل۔''

ہم نے پہلے غلام محمد کو بے دست و پا کیا۔ اس نے بہت شور مچایا...... گالیاں اور دھمکیاں دیں مگر سوائے ایک جھانپڑ مارنے کے میں نے کچھ نہیں کیا۔ گھر میں تلاش کرنے پر ایک رسی ملی۔ باقی ضرورت روایتی انداز میں چادر سے پھاڑ کے پوری کی گئیں جو پٹی میری آنکھوں پر باندھی گئی تھی وہی میں نے غلام محمد کی آنکھوں پر باندھی جب راجا اور میں اس کارروائی میں مصروف تھے تو غلام محمد کے نمک خوار بڑے دکھ اور خوف کے ساتھ بے بس کھڑے دیکھ رہے تھے لیکن وہ کچھ بھی کرنے سے قاصر تھے۔

ہم نے غلام محمد کو ڈکی میں ڈالا تو اس کا غصہ اپنی انتہا پر دیوانگی بن گیا تھا۔ وہ مسلسل گالیاں اور دھمکیاں دے رہا تھا جو ہم سن ہی نہیں رہے تھے۔ پھر اس کا منہ میں نے یوں بند کیا کہ اس میں ایک کپڑے کا گولا ٹھونس دیا۔ اس کے محافظ نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ وہ دونوں ڈکی میں لاک ہو گئے تو میں نے راجا سے کہا کہ وہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے ڈکی کھول کر ان کی حالت دیکھتا رہے۔ غلام محمد کا کچھ پتا نہیں بلڈ پریشر کا مریض ہو...... ہارٹ فیل ہونے سے مر جائے۔

غلام محمد کے چوکیدار اور ڈرائیور حد سے زیادہ

فرمانبرداری دکھا رہے تھے۔ انہوں نے مجھے یقین دلانے کی پوری کوشش کی کہ وہ کوئی گڑبڑ نہیں کریں گے لیکن ان کی زبان کے وعدے پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ انہیں بھی ہاتھ پیر باندھ کے گاڑی کی پیچھے والی سیٹ پر ڈال دیا گیا۔ پھر شہناز نے بڑے اعتماد کے ڈرائیونگ سنبھالی اور اس کے ساتھ راجا ریوالور لے کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنا رخ پیچھے کی طرف رکھا اور قیدیوں کو بتا دیا کہ ان کی ایک غلط حرکت انہیں جینے کے حق سے محروم کر دے گی۔ وہ لاش کہیں بھی پھینک کر نکل جائیں گے۔

ان کے جانے کے بعد میں نے اور فرخ نے گھوم پھر کے کوٹھی کا جائزہ لیا۔ آثار بتاتے تھے کہ اس ویرانے میں یہ کوٹھی رہائش کے لیے استعمال نہیں ہوتی تھی یہ ایک عشرت کدہ تھا۔ اوپر پیچھے کے کمروں میں شراب کی بوتلیں پڑی تھیں۔ کچھ فاصلے خالی کچھ آدھی اور باقی بھری ہوئی۔

دوسری منزل کے سارے کمرے مقفل پڑے تھے۔ میں نے انہیں کھول کر دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اوپر سے دور دور تک کا منظر دکھائی دیتا تھا۔ کہیں کہیں چمکنے والی روشنی سے اندازہ ہوتا تھا کہ مجموعی طور پر یہ سارا علاقہ غیر آباد ہے۔ کوہ نور کیمیکل فیکٹری کی لائٹس تو بہت دور تھیں۔ آگے پیچھے سیکڑوں گز کے فاصلے سے اِکا دُکا تعمیرات دکھائی دیتی تھیں یہ زیادہ تر چھوٹے موٹے کارخانے اور گودام تھے۔ ان کے درمیان رابطے کے لیے کوئی سڑک نہیں تھی۔ آنے جانے والوں کے لیے کچا راستہ تھا جو گاڑیوں کی مسلسل آمدورفت سے بن گیا تھا۔ اس راستے پر گرد اڑتی تھی۔ گڑھے تھے اور بارش کے موسم میں پانی میں کیچڑ کی افراط سے یہ جگہ جی ٹی روڈ سے بھی کٹ جاتی ہوگی۔ جی ٹی روڈ دونوں جانب رواں ٹریفک کی متحرک روشنیوں کو غور سے دیکھنے پر نظر آتی تھی۔

واپس نیچے آ کے فرخ نے جیپ کو گیراج سے نکالا۔ یہ وہی 1952ء کی ملٹری ماڈل جیپ تھی جو دوسری جنگ عظیم میں دشت و صحرا میں اپنی افادیت ثابت کر چکی تھی اور اب پاکستان کے اختراع پسند موٹر مکینکس کی ماہرانہ کاوش سے دیہی اور شہری علاقوں میں دندناتی پھر رہی تھی۔ اس میں اوریجنل کوئی چیز تھی تو وہ اس کی ناقابل شکست فولادی باڈی تھی۔ اب شوقین نوابوں نے اس میں نئے ڈیزل انجن فٹ کرائے تھے۔ اسپورٹس کاروں کے ٹائر لگا دیے تھے۔ کروم کی چمک والے پائپ۔ فینسی لائٹس اور شوخ لال نیلے پیلے رنگ سے سجانے کے بعد اسے بگڑے رئیس زادے شہر کی سڑکوں پر بحر ظلمات کے گھوڑوں کی طرح دوڑا رہے تھے۔ یہ ایک طرح سے نو دولتیوں کی شان طاقت اور بدمعاشی کی علامت ہوگئی تھی۔

فرخ نے جیپ کی تعریف یوں کی۔ ''بالکل منہ زور گھوڑے اور مغرور حسینہ کی طرح ہے جسے زیر کر کے مزہ آئے۔''

میں نے کہا۔ ''ہاں...... فتح یاب ہونے کی سنسنی کو محسوس کرنے کا اپنا اپنا انداز ہے۔ جب ارشمیدس نے کثافت اضافی کا اصول دریافت کیا تھا تو وہ بھول گیا تھا کہ نہا رہا ہے وہ کپڑے پہنے بغیر شاہی محل کی طرف یہ چلاتا ہوا دوڑا تھا کہ یوریکا...... یوریکا...... میں نے پالیا...... ایسی ہی سنسنی ماؤنٹ ایورسٹ پر پہلی بار قدم رکھنے والے ایڈمنڈ ہلیری نے بھی محسوس کی ہوگی۔''

جیپ راہ کی ساری رکاوٹوں کو عبور کرتی چند منٹ میں جی ٹی روڈ پر دوڑنے لگی۔ رات کے بارہ بجے بھی لاہور سے گوجرانوالہ جانے والی کاروں، ٹرکوں اور بسوں کا سلسلہ جاری تھا۔ یہی حال مخالف سمت میں پنڈی، اسلام آباد کی طرف سے آنے والی ٹریفک کا تھا۔

جیپ کو ہم نے کاموں کے اور مریدکے کے درمیان سڑک سے ایک کلومیٹر دور کچے راستے پر اتار لیا۔ ہاں تا حد نظر آبادی کا نشان نہ تھا...... تاریکی نے گرد و پیش کے ہر منظر کو نگل لیا تھا۔ فرخ نے ایک جذباتی انتقامی خواہش کا اظہار کیا کہ واپس جانے سے پہلے جیپ کو آگ لگا دی جائے مگر میں نے منع کیا۔ شعلوں کا منظر سڑک سے گزرنے والوں کو ادھر لا سکتا تھا۔ اس نے چابی نکال لی اور واپسی کے راستے پر ایک تالاب جیسے گڑھے میں پھینک دی۔ گڑھے میں بارش کا پانی بھرا ہوا تھا۔

اس ناہموار کچے راستے پر جی ٹی روڈ تک کا سفر پون گھنٹے میں طے ہوا۔ اس دوران فرخ نے اپنے اغوا کی کہانی سنائی۔

''وہ حرامزادہ...... طفیل...... اتنا بڑا مکار ایکٹر میں نے زندگی میں نہیں دیکھا۔ کیا تم مانو گے کہ وہ بے ہوش نہیں تھا۔''

میں چلتے چلتے رک گیا۔ ''کیا؟ وہ مکر کر رہا تھا۔''

''سو فیصد...... اور دیکھو اس نے کتنا لمبا ڈراما کیا۔ کتنی دیر ہمیں دھوکے میں رکھا...... میں نے اسے باندھ کے ڈالا تھا۔ کسی طرح کھینچا تانی میں رسی کا ایک سرا ڈھیلا ہو کے کھل گیا جو میں نے کھڑکی کی سلاخوں سے باندھا تھا۔ تاہم اس کے ہاتھ پیچھے کی طرف مضبوطی سے بندھے ہوئے تھے اس نے کوشش ضرور کی ہوگی لیکن وہ آزاد نہ ہو سکا۔ وہ لڑھکتا کھسکتا دروازے

تک آیا اور اس سے ٹکرا کے سامنے ہی لیٹ گیا...... یوں جیسے وہ بے ہوش ہے...... کتنی آسانی سے ہم دھوکا کھا گئے۔''

میں نے کہا۔ ''آسانی سے تو نہیں...... شہناز نے بھی چیک کیا تھا۔''

''یہی تو اس کی مکاری کا کمال تھا۔ وہ سب دیکھتا رہا اور سنتا رہا اور بے سدھ پڑا موقع کا انتظار کرتا رہا۔ شہناز نے اس کو ٹھوک بجا کے جب ریفلکس ایکشن دیکھے تو وہ ذہنی طور پر تیار تھا۔ اس نے کسی ردِعمل کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ ضبط کا یہ مظاہرہ صرف ہوش مند آدمی کر سکتا ہے مگر شہناز نے اس سے جو نتیجہ اخذ کیا کہ وہ واقعی بے ہوش ہے بعد کی ساری گفتگو بھی اس نے سنی اور اسے اپنی کامیابی کا یقین آنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''راجا اس پر بہت ناراض تھا کہ ہم نے جذباتیت کا مظاہرہ کیا۔ وہ مرتا تھا تو مر جاتا...... اسے اسپتال لے جانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ جان چھڑانے کے لیے اسے دور لے جا کے کہیں بھی پھینکا جا سکتا تھا۔''

''راجا ٹھیک کہتا ہے اور جب ہم وہاں سے چلے تو یہ خیال مجھے بھی آیا تھا...... دراصل ایک تو شہناز عورت ہے اور پھر ڈاکٹر...... یعنی بیک وقت جذباتی فرض شناس اور باضمیر...... میں نے کہا کہ میو اسپتال جا کے ہم پھنس نہ جائیں...... اتنی لمبی اور جھوٹی کہانی سنانے سے بہتر یہی ہوگا کہ ہم اسے بیچ جی ٹی روڈ پر ڈال دیں۔ یہ کیوں کہیں کہ ہم نے اسے بے ہوش پڑا پایا تھا۔ کوئی اور بھی تو ایسا کر سکتا ہے۔ پولیس یا کوئی موٹر والا اسے اٹھا لے گا اور کہیں نہ کہیں ضرور پہنچا دے گا۔ جو کچھ وہ کہے گا سچ ہی ہوگا۔''

''پھر کیا شہناز نہیں مانی؟''

''نہیں...... وہ مان گئی...... وہ سالا پیچھے چپکا پڑا سب سنتا رہا اور جب اسے یقین ہو گیا کہ ہم نے اسے لاہور لے جانے کا پلان بدل دیا ہے تو وہ ایک دم اٹھا اور اس نے پیچھے سے ہاتھ ڈال کے شہناز کی گردن دبوچ لی۔''

میں نے کہا۔ ''یہ کہاں ہوا؟''

''دینہ سے ذرا آگے...... جی ٹی روڈ پر پہنچنے سے پہلے...... شہناز ویسے ہی کچھ ہلکی پھلکی اور دھان پان ہے۔ اس نے تو ایک جھٹکے میں شہناز کو پیچھے کھینچ لیا۔ میں ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ میں نے گاڑی روکی۔ شہناز کی چیخ پر یہ میرا بالکل فطری ردِعمل تھا۔ اس نے مجھے گالی دے کے کہا کہ چلو...... جہاں میں کہوں...... اگر ذرا بھی گڑبڑ کی تو میں ڈاکٹر صاحب کی گردن توڑ دوں گا اور چلتی گاڑی سے کود کے نکل جاؤں گا۔ تمہارا باپ بھی میری گرد کو نہیں پہنچ سکے گا۔ میں نے فوراً ہتھیار ڈال دیے۔ میں نے کہا میں بالکل ویسا ہی کروں گا جیسا تم چاہو گے لیکن شہناز کو چھوڑ دو...... اس نے شہناز کو چھوڑ دیا۔ مطلب یہ کہ اس کی گردن آزاد کر دی۔ جی ٹی روڈ پر پہنچنے تک اور پھر لاہور کے راستے پر میں نے بہت سوچا کہ کیا کروں مگر شہناز کی زندگی خطرے میں تھی۔ جو کچھ وہ کہہ رہا تھا کر بھی سکتا تھا۔ شہناز بالکل بے بس تھی۔ ریوالور میری جیب میں ضرور تھا لیکن اسے میں کیسے نکالتا۔ میں ڈرائیونگ کر رہا تھا اور میری ہر حرکت پر اس کی نظر تھی۔ بس...... یہی ہے ساری کہانی۔ وہ ہدایات دیتا گیا ادھر چلو ادھر چلو۔ میں تعمیل کرتا گیا۔ لاہور میں مجھے اتفاق سے کوئی موقع ملنے کی امید تھی......

میں نے سوچا تھا کہ میں گاڑی ایک دم کسی تھانے میں موڑ لوں گا۔ خطرہ اس میں بھی تھا گاڑی رکنے سے پہلے وہ شہناز کا کام تمام کر کے بھاگ جاتا تو میں پولیس کو کیا بتاتا؟ آخری ترکیب میرے دماغ میں یہ آئی تھی کہ گاڑی کسی پولیس کی گاڑی سے ٹکرا دوں گا۔ ہائی وے پولیس اسے کہاں فرار ہونے دے گی۔ لیکن میری بدقسمتی کہ جی ٹی روڈ پر جب مجھے ہائی وے پولیس کی گشت کرنے والی گاڑی نے اوورٹیک کیا تو درمیان میں ایک بس حائل تھی۔ دوسری گاڑی مخالف سمت سے نمودار ہوئی تو درمیان میں پھر ٹریفک کی رکاوٹ تھی۔ میں ایک دم گاڑی موڑتا تو پہلے دوسری گاڑیوں سے ٹکراتا اور وہ خبیث نکل کے بھاگ جاتا۔ اس پلان کی کامیابی کے لیے سڑک کا خالی ملنا اور صرف پولیس کار کا سامنے سے آنا ضروری تھا۔ مزید بدقسمتی کہ اس نے لاہور کو بائی پاس کیا ہم شہر کے باہر باہر سے گوجرانوالہ کی طرف نکل آئے اور اس کے بعد یہاں پہنچے۔ وہ جگہ تم نے دیکھ ہی لی۔''

''تمہارے ساتھ کوئی زیادتی...... یا بدتمیزی تو نہیں ہوئی۔''

''زیادتی کا مطلب اگر تشدد اور مار پیٹ ہے تو نہیں...... لیکن بدتمیزی بہرحال ہوئی...... رات کو ہم یہاں پہنچے تو غلام محمد نے فون کیا تھا۔ اس نے تمہیں بہت کچھ کہا۔ گالیاں دیں اور دھمکیاں...... میں کیوں لحاظ کرتا...... گالیاں میں نے بھی دیں۔ وہ سور کا بچہ...... طفیل...... کچھ مار پیٹ کے موڈ میں تھا۔ پہلے شہناز نے اسے روک لیا کہ ہم تو تمہیں اسپتال لے جا رہے تھے۔ تمہیں ہمارا احسان مند ہونا چاہیے ورنہ کیا میں تمہیں کوئی زہر کا انجکشن نہیں لگا سکتی تھی۔ کسی کو پتا بھی نہ چلتا اور پھر گاڑ دیتے تمہیں کہیں بھی...... پھر شاید غلام محمد نے اسے کہا کہ ان لوگوں کو اپنا مہمان سمجھو...... صبح وہ خود آیا تھا۔ ویسے تو بڑی شرافت سے بات کرتا رہا مگر اس کی بدمعاشی

کا ایسا ہی انداز ہے۔ اس نے کہا کہ یہ رفیق کی وعدہ خلافی کی سزا ہے اور اگر اس کا دماغ درست نہ ہوا تو آگے بھی بہت کچھ ہوگا۔ وہ آئے گا ضرور میرے پاس...... لیکن جب وہ یہاں آئے تو تم لوگ بھی اسے سمجھانا کہ جس کام کی اس نے ذمے داری قبول کی تھی وہ کر دے ورنہ بہت برا ہوگا۔''

آدھی رات کے وقت جی ٹی روڈ پر ٹریفک ضرور تھی لیکن کرائے کی کوئی گاڑی دستیاب نہ تھی۔ میں اور فرخ آتی جاتی گاڑیوں کو ہاتھ دیتے رہے جو بس پنڈی کی طرف سے آتی تھی وہ ہمارے لیے ٹھہرتی نہیں تھی اور پرائیویٹ کاروں والے عام طور پر رات کے وقت کسی اجنبی کو لفٹ دینے کا خطرہ مول نہیں لیتے لیکن بالآخر ایک بس رکی تو ہم دوڑ کے اس میں سوار ہو گئے۔

اس بس نے ڈیڑھ گھنٹے بعد ہمیں مینار پاکستان کے اڈے پر اتار دیا۔ فرخ تذبذب میں مبتلا تھا کہ رات میرے گھر گزار کے ست بدھائی جائے یا پہلی دستیاب بس سے واپس روانہ ہو جائے...... جہاں سے ہم بس میں سوار ہوئے تھے وہ جگہ تقریباً وسط میں تھی۔ ہ ڈیڑھ گھنٹا مخالف سمت میں سفر کرتا تو دینہ پہنچ جاتا مگر وہاں کوئی اسلام آباد جانے والی بس ایک سواری بٹھانے کے لیے نہیں رکتی تھی اور اگر رک جاتی تو اسے صبح ہونے تک دینہ میں انتظار کرنا پڑتا۔ دینہ میں ٹلیہ جوگیاں کی سڑک پر رات کے وقت کوئی ٹریفک نہیں ہوتی تھی۔

میں نے فرخ کو اپنے ساتھ ہی رکھا حالانکہ وہ بہت متفکر تھا کہ نہ جانے راجا اکیلا ان چار قیدیوں کے معاملے سے کیسے نمٹے گا۔ میں نے اسے تسلی دی کہ راجا اکیلا نہیں ہے حویلی کے اندر اس کے مددگار اور محافظ بہت ہیں۔ رکشا سے گھر پہنچنے میں مزید آدھا گھنٹا صرف ہو گیا۔ جب بالآخر میں نے اپنے گھر کی کال بیل بجائی تو میرے ذہن پر ایک احساسِ جرم کا بار تھا۔

یہ صرف دو دن پہلے کی بات تھی جواب ماضی کا حوالہ ہو گئی تھی کہ یہ گھر شاد و آباد تھا۔ یہاں تین نسلیں رہتی تھیں۔ ایک ماں کے دو بیٹے۔ دو بہوئیں اور دو پوتے۔ دو بھائی اور ان کی بیویاں...... اور ان کے بچے۔ رشتوں کے اعتبار سے وہاں درجن بھر افراد کی رہائش تھی مگر ان کی تعداد نصف تھی۔ اب دادی مجھ پر اپنی جان قربان کر کے راہی ملک عدم ہو گئی تھی۔ دادی کے ایک بیٹے نے اپنی شریک حیات کو مار ڈالا تھا اور خود پاگل ہو کے حوالات میں پڑا تھا۔ یتیم ہو جانے والی پوتی اس گھر کی ویرانی سے خوف زدہ تھی اور اس کی پرآسیب فضا سے نکل گئی تھی۔

میں سارا دن غائب رہا تھا۔ اس گھر کی سنسان تنہائی میں صرف دو بوڑھے لوگ زندگی کے وہ تقاضے پورے کرنے میں مصروف رہے تھے جو رسم دنیا کا حصہ تھے۔ ایک زمانہ تھا جب میں رات کو وقت ناوقت لوٹ کے آتا تھا تو رابعہ دروازہ کھولنے کے لیے جاگتی رہتی تھی۔ نہ جانے کیسے وہ دروازے پر خفیف سی آہٹ اور معمولی سی دستک کی آواز بھی سن لیتی تھی کسی کو معلوم نہیں ہوتا تھا اور میں دبے پاؤں اپنے کمرے میں جا کے سو جاتا تھا۔

اب میرے لیے دروازہ کھولنے خود اباجی اٹھ کر آئے تو میں نے سخت ندامت محسوس کی۔ انہوں نے تقریباً پوری رات میری واپسی کا انتظار کرتے گزاری تھی۔ فرخ کو میرے ساتھ دیکھ کر وہ کچھ بولے نہیں۔ انہوں نے ایک نظر گھڑی پر ڈالی اور اندر لوٹ گئے۔ میں فرخ کو اپنے بیڈروم میں پہنچا کر واپس آیا تو سیدھا ان کے کمرے میں چلا گیا۔

اماں بہت کم بولتی تھیں۔ انہوں نے صرف اتنا کہا کہ ''خیال آ گیا تمہیں لوٹ کے گھر آنے کا؟''

میں نے خفت سے کہا۔ ''کیا بتاؤں اماں...... ایسی مصروفیت میں پھنس گیا تھا......''

اب اباجی پھٹ پڑے۔ ''رفیق...... میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کن چکروں میں پڑے ہوئے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''آپ تو جانتے ہیں اباجی۔''

اباجی نے میری بات کاٹ دی۔ ''جانتا ہوں اسی لیے تو پوچھ رہا ہوں کہ تم کہاں رہے۔ کیا ضرورت ہے تمہیں یہ جھوٹ بولنے کی کہ تم صوفی چچا کے قانونی معاملات نمٹانے میں مصروف تھے۔ آج تم کسی وکیل سے نہیں ملے۔ تم فاروقی کی طرف بھی نہیں گئے۔ میری بات ہوئی تھی اس سے۔ وہ فون کر کے مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ رفیق کہاں ہے۔ میں کیا بتاتا اسے؟''

میں نے سر جھکا کے کہا۔ ''اباجی...... میں نے کبھی آپ سے جھوٹ بولا ہے؟''

''نہیں بولا۔ اسی لیے تو پوچھ رہا ہوں کہ تم کن چکروں میں ہو؟''

میں نے ان کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ''کچھ ایسے چکر ہیں اباجی...... مجبوری یہ ہے کہ ابھی میں آپ کو کچھ بھی نہیں بتا سکتا۔''

اماں نے کچھ دکھی لہجے میں کہا۔ ''کیا ہم بھی قابل اعتبار نہیں رہے رفیق؟''

میں نے کہا۔ ''اماں ...... ایسی باتیں نہ کریں ...... میں جانتا ہوں آپ کتنے دکھی ہیں۔ اس میں آپ کی پریشانیوں میں مزید اضافہ کرنا نہیں چاہتا۔''

ابا جی نے کہا۔ ''آج سارا دن تعزیت کرنے والے آتے رہے سب نے تمہارے بارے میں پوچھا۔ بہت سے لوگ اخبار میں خبر دیکھ کر آئے تھے۔''

''یہ اخبار میں بھی آگیا؟''

''کیوں نہ آتا ...... قتل کی ہر واردات میں کرائم رپورٹرز کی دلچسپی ہوتی ہے۔ خصوصاً شام کے اخبار انہیں سنسنی خیز بنا کے چھاپتے ہیں مجھے تو پتا ہی نہیں چلا اسپتال میں پوسٹ مارٹم کے بعد تصویریں کس نے بنائیں۔'' ابا جی نے تین اخبارات مجھے تھما دیے۔

میں نے شام کے ان اخباروں میں دادی کا چہرہ بھی دیکھا۔ چچی کا بھی اور حوالات کی سلاخوں کے پیچھے صوفی چچا کا بھی۔ اخبار والوں نے جو بھی لکھا تھا اپنے نقطہ نظر سے لکھا تھا ...... ایسی خبریں پہلے بھی شائع ہوتی تھیں لیکن ان کا تعلق دوسروں سے ہوتا تھا۔ آج اخباروں میں میرے گھر کی خونی روداد آئی تھی تو مجھے سخت طیش آرہا تھا۔

ایک اخبار نے لکھا تھا کہ دہرے قتل کی یہ واردات خاندانی جاگیر کی تقسیم پر تنازعہ کا شاخسانہ تھی۔ نہ جانے کہاں سے اخبار نے یہ تفصیل حاصل کرلی تھی کہ ست بدھائی کی کروڑوں کی جاگیر اور حویلی پر دو بھائیوں کا حق تھا مگر نامعلوم وجوہ کی بنا پر ایک بھائی کی اولاد اس پر قابض ہوگئی۔ دوسرے بھائی کی بیوی نے قابض ہونے والے شخص رفیق احمد کو زہر دینے کی کوشش کی مگر جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے ...... وہ زہر دونوں بھائیوں کی ماں نے پی لیا۔ صوفی نذیر نے اس پر اپنی بیوی کو گلا گھونٹ کے مار ڈالا۔ جاگیر کا مالک رفیق احمد ایک ریٹائرڈ کالج کے لیکچرار کا بیٹا ہے جو بیرون ملک سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر چکا ہے۔ ملزم نذیر احمد کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ وہ پہلے سے ذہنی عدم توازن کا شکار تھا اور عامل مشہور تھا وہ جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈے کر کے کمزور عقیدہ لوگوں کو بے وقوف بناتا تھا اس کا ذریعہ آمدنی کوئی نہیں۔ ڈاکٹروں نے پوسٹ مارٹم رپورٹ محفوظ کرلی ہے۔ پولیس مزید تحقیق کر رہی ہے ...... وغیرہ وغیرہ۔

یہ خبر تھوڑے بہت فرق کے ساتھ دیگر اخباروں میں بھی تھی جرائم کی خبریں ایسے ہی جھوٹ سچ کا ملغوبہ ہوتی ہیں۔ رپورٹر نے کچھ پولیس سے پوچھا۔ کچھ لوگوں سے سنا۔ تصدیق تفتیش کیے بنا چھاپ دیا۔ کون انہیں چیلنج کرے۔ کون نوٹس دے کہ یہ کیسے لکھا ...... ہر روز اخبارات ایسی خبروں سے بھرے پڑے ہوتے ہیں۔ اگلے دن ان کے لیے رپورٹر نئی اسٹوری بناتا ہے کوئی نہ غور کرتا ہے نہ یاد رکھتا ہے کہ کب کیا ہوا تھا کس کے ساتھ ہوا تھا اور کیوں ہوا تھا۔

میں نے بھی اخبار پڑھ کے ایک طرف رکھ دیے۔

''اخبار والوں کی فکر نہ کریں ابا جی ...... ان کا تو یہ کام ہے۔''

ابا جی نے دکھی لہجے میں کہا۔ ''تمہارے دوست راجا نے کچھ نہیں کیا؟''

میں نے کہا۔ ''وہ کیا کرتا ابا جی۔ کوئی پریس کانفرنس بلاتا یا پریس ریلیز جاری کرتا ...... اس سے ذرا فرق نہ پڑتا۔''

''سارا دن آنے والے سوال کرتے رہے بڑا عذاب تھا ان کے سامنے بار بار وضاحت پیش کرنا۔''

اماں کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ ''ہمدردی کرنے والے کم تھے ...... ہمارا مذاق اڑانے والے زیادہ ...... جاگیر اور حویلی تو ایک طعنہ بن گئی ہمارے لیے۔''

میں نے انہیں تسلی دی۔ ''اماں ...... چلیں اب آپ سو جائیں۔''

ابا نے کہا۔ ''اب کیسا سونا رفیق میاں ...... صبح ہونے والی ہے آج سوئم میں پھر وہی کہانی ہوگی۔ وہی باتیں دہرائی جائیں گی۔''

میں نے کہا۔ ''آپ کسی کے سامنے نہ آئیں۔ میں کہہ دوں گا کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ سب سے میں مل لوں گا۔''

ابا جی بولتے رہے۔ ''اوروں کی بات چھوڑو ...... تمہارے خالو عنایت اپنے بن کر آئے تھے کھانے کا انتظام بھی کیا۔ مگر سب سے زیادہ دل دکھانے والی باتیں اسی شخص نے کیں۔ مت پوچھو کیا کہتا رہا وہ ...... موقع نہیں تھا اس لیے میں چپ رہا۔ کیا اس کا فرض نہیں تھا کہ ایک رات رک جاتا۔ مگر کہنے لگا کہ بھئی ہمیں جانا ہے امریکا ...... تھوڑے دن رہ گئے ہیں ...... کام بہت ہیں گھر میں۔''

اماں نے کہا۔ ''وہ سدا کا بے مروت ہے۔''

''ہاں ...... اور اب تو اسے کسی کی پروا نہیں رہی ...... سارے رشتے بے معنی ہوگئے ہیں اس کے لیے ...... سارے ناتے توڑ کے جا رہا ہے۔''

میری مجبوری یہ تھی کہ میرے پاس کوئی سکون آور گولی نہیں تھی جو میں ان بے سکون بوڑھوں کو دے سکتا۔ نیند ان کی آنکھوں سے روٹھ گئی تھی۔ ان کے دل مجروح تھے۔ لوگوں کی باتوں نے ان کے زخموں پر نمک چھڑکا تھا۔ بے شک سب غمگسار اتنے بے رحم نہیں تھے مگر جو تھے وہ اپنا کام کر گئے تھے۔

بالآخر صبح طلوع ہوئی۔ میں نے خود چائے بنائی اور اماں ابا کو ناشتا کرایا۔ وہ اتنے تھکے ہوئے تھے کہ تھوڑی دیر کے لیے سو گئے۔ کچھ دیر بعد ایک ہمسائے بڑا پرتکلف ناشتا لائے تو یہ جان کر سخت مایوس اور کچھ ناراض بھی ہوئے کہ ناشتے کی کسی کو ضرورت نہیں۔ سب ناشتا کر چکے ہیں۔ میرے تیور دیکھ کر وہ کچھ بولے نہیں مگر ان کا احتجاجی انداز صاف بولتا تھا کہ رفیق میاں، ہم نے ہی غلطی کی۔ ہمیں سوچنا چاہیے تھا کہ تم کس کے بیٹے ہو۔ ابا ایک تعلیم یافتہ شخص تھے جو اپنے سیدھے سادے دینی عقائد پر سختی سے کاربند رہتے تھے اور بدعت کی حیثیت اختیار کرلینے والی معاشرتی رسموں کے سخت خلاف تھے۔

خالو عنایت دوپہر سے کچھ پہلے پھر نمودار ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ سوئم میں بڑی دھوم دھام ہوگی۔ شامیانے لگائے جائیں گے۔ قورمے بریانی کی دیگیں آئیں گی اور تقریب کروڑوں کی جاگیر کے نواب رفیق احمد شیرازی بن جانے والے کے شایان شان رہے گی۔ میں نے انہیں سخت مایوس کیا اور صاف بتا دیا کہ جو آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں۔ ہمارا خیر خواہ ہے تو دعائے مغفرت کرے۔ چاہے تو قرآن پڑھ کر یہاں بخشے ورنہ اپنے گھر جا کے بھی یہ کار خیر کرنے میں کوئی قباحت نہیں۔

ظاہر ہے اس کے بعد خالو عنایت سے میری جو بحث ہوئی وہ تلخ کلامی پر تمام ہوئی اور وہ اپنی امریکن برانڈ اختیار کرلینے والی فیملی کے ساتھ احتجاجی انداز میں تعلقات کے خاتمے کا اعلان کر کے واک آؤٹ کر گئے۔ کسی نے انہیں نہیں روکا۔

نماز ظہر کے بعد شروع ہونے والی قرآن خوانی کا سلسلہ مغرب تک جاری رہا۔ آنے والوں میں دوست احباب کے ساتھ مجھے کچھ اجنبی چہرے بھی دکھائی دیے لیکن کسی سے پوچھا نہیں جا سکتا تھا کہ آپ کون ہیں۔ اپنی شناخت کرائیں۔ مغرب کی نماز کے بعد گھر میں کوئی نہیں رہا تھا لیکن دروازہ کھلا ہوا تھا اور ڈائننگ روم میں ابھی تک چاندنی بچھی ہوئی تھی۔

فاروقی اپنی بیوی کے ساتھ آیا تھا۔ اس نے آج عدالت میں صوفی چچا کی پیشی کو ایک دن کے لیے ملتوی کرا لیا تھا اور ابتدائی مرحلے میں سماعت کے لیے اپنے ایک ماتحت وکیل کو سمجھا دیا تھا۔ یہ محض ضابطے کی کارروائی تھی۔ باقاعدہ سماعت پر وکالت کے لیے اس فوجداری مقدمات کے دو ماہر وکلا سے بات کرلی تھی اور انہیں یقین دلا دیا تھا کہ انہیں پوری فیس ادا کی جائے گی۔ تاہم فاروقی اپنے اثر رسوخ کے باوجود صوفی چچا کو سوئم میں شرکت کے لیے لانے میں ناکام رہا تھا۔ وہ پولیس والوں سے تو اجازت نامہ خرید لیتا لیکن خود صوفی چچا کی حالت ایسی نہ تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ فریال کو خود اس نے نہیں آنے دیا۔ اس بات کا خطرہ تھا کہ اخبار میں خبر شائع ہونے کے بعد سلطان کے کارندے تعزیت کرنے والوں میں شامل ہو کے اندر پہنچ جائیں۔ ان میں خواتین بھی ہوں جو تصدیق کر دیں کہ فریال یہیں ہے۔

میرا خیال تھا کہ اب کوئی نہیں آئے گا۔ گھنٹی بجی تو میں نے باہر جا کے دیکھا۔ وہاں چار افراد بڑے پراسرار انداز میں منہ سر کو چادر میں لپیٹے کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے چادر ہٹا کے کہا ''نواب صاحب! سلام۔'' تو میں نے کاسو کو پہچانا۔ پھر اس کے ساتھ آنے والوں نے بھی چہرہ دکھایا تو میں حیران رہ گیا۔ یہ شامی تھا جو اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ اظہار تعزیت کے لیے آیا تھا۔

میں اسے اندر لے آیا۔ شامی نے پہلے رسم دنیا نباہتے ہوئے اس سانحے پر دلی رنج کا اظہار کیا اور پھر سب کے ساتھ دعائے مغفرت کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔

میں نے کہا ''تم یہاں کیسے پہنچے؟''

شامی نے کہا ''میں نے اخبار میں خبر پڑھ لی تھی۔ ہم آپ کی حویلی پہنچے تھے۔ وہاں سے پتا چلا کہ آپ یہاں ہو۔''

میں نے ان کا شکریہ ادا کرنے کے بعد پوچھا ''وہاں کون ملا تھا؟''

''وہاں جی راجا صاحب تھے۔'' کاسو نے کہا۔

میں نے کہا ''راجا نے کوئی خاص بات تو نہیں کی؟''

''نہیں جی۔ یہ بتایا تھا کہ تعزیت کے لیے رانا صاحب تشریف لائے تھے اور مہمانوں کے کھانے کا انتظام بھی ان کی طرف سے ہوا تھا۔'' شامی بولا۔

میں نے بات کو ٹال دیا اور پوچھا ''کاسو۔ کیا کر رہے ہو تم آج کل۔ تمہاری بیوی اور بچہ کیسے ہیں؟''

کاسو کی حالت بہت بہتر تھی۔ اس کی صحت میں نمایاں تبدیلی آگئی تھی اور اس نے صاف ستھرے کپڑے پہن رکھے تھے۔ ''ابھی تو شامی بادشاہ کے ساتھ ہوں جناب عالی! ان کی خدمت کرتا ہوں، اللہ کا بڑا شکر ہے اور آپ کا احسان ہے۔''

''رانا نے میرے پیچھے پولیس لگا دی ہے۔ باقاعدہ شکایت کی ہے کہ شامی آج کل سندھ سے فرار ہو کے پنجاب میں وارداتیں کر رہا ہے اور میرے علاقے میں دیکھا گیا ہے۔ میرا واپس جانے کا ارادہ ہے۔ کاسو کا بندوبست کراچی میں ہو جائے گا۔ اسے کام بھی مل جائے گا اور رہنے کے لیے گھر

بھی۔"

میں نے کچھ سوچ کے کہا "شامی بادشاہ! آج کچھ کہنے کا موقع تو نہیں مگر حالات ایسے ہیں کہ ......" بات کرتے کرتے میں نے رک کے باقی دو افراد کی طرف دیکھا جن کے چہرے میرے لیے اجنبی تھے۔

"نواب صاحب! یہ اپنے بجن بیلی ہیں۔ بھروسے کے قابل نہ ہوتے تو میں ان کے ساتھ کیوں آتا، آپ بولو۔"

میں نے کہا "ایک کام تھا، جو تم ہی کر سکتے ہو۔"

"آپ بتاؤ، آپ کا بھی قرض ہے مجھ پر۔ آپ نے میرے محسن کو بچایا۔ اس شخص کے لیے رانا سے دشمنی مول لی جس کی مدد سے مجھے نئی زندگی ملی تھی۔"

میں نے کہا "احسان کی بات مت کرو۔"

"نواب صاحب، یہ ہمارا اصول ہے۔ جو ہمارے لیے کچھ کرے ہم ساری زندگی اس کے لیے ہمیشہ کچھ کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ کسی کی نیکی کو بھولتے نہیں۔ آپ نے مجھے بڑی عزت دی تھی۔ اپنا دوست کہا تھا۔ پھر تکلف کیسا؟" شامی ایک پڑھا لکھا آدمی تھا جو ڈاکو بن گیا تھا۔

میں نے کہا "شامی! یہ بات بہت پرانی ہے۔ سمجھ لو دس بارہ سال پہلے جب میں نوجوان تھا اور کالج میں پڑھتا تھا تو جذبات کی رو میں بہہ کے میں نے تنظیم کا رکن بن گیا تھا۔ مجیب الرحمن اس تنظیم کا سربراہ تھا۔"

"جو دبئی سے لندن فرار ہوا اور اب پیرس میں روپوش ہے؟"

میں نے کہا "تمہاری حالات حاضرہ پر معلومات مکمل اور اپ ڈیٹ ہیں۔"

"ایک عادت بچپن سے ہے، صبح اخبار دیکھنے کی۔"

میں نے کہا "میں اسی شخص کی بات کر رہا تھا۔ اس کا حوالہ عام طور پر چیف کے طور پر دیا جاتا ہے۔ اس کی جوشیلی تقریروں میں صرف منافقت تھی جسے ہم جیسے جذباتی عمر کے نوجوان سمجھ نہیں پاتے۔ میں نے بھی تنظیم میں شامل ہو کے بہت سے غلط کام کیے اور بہت نقصان اٹھایا۔ پھر بلیک میل ہوتا رہا۔ تنظیم کے لیے ہر غیر قانونی ذمے داری قبول کرنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ تنظیم سے علیحدگی اختیار کرنا غداری سمجھا جاتا تھا اور اس کی سزا موت تھی۔"

"ہر فاشسٹ تنظیم میں ایسا ہی ڈسپلن نافذ رہتا ہے۔"

"میرے والدین نے مجھے بچانے کے لیے امریکا بھیج دیا۔ میں نے چھ سال وہاں تعلیم حاصل کی۔ پھر لندن آ گیا اور دو سال لارڈ ارنسٹ کی فرم میں ملازمت کی۔ میری آمدنی بہت اچھی تھی اور عہدے میں بھی ترقی ہو چکی تھی۔ اگر میں وہاں رہتا تو کمپنی کا وائس پریذیڈنٹ بن جاتا۔ وہاں چیئرمین لارڈ ارنسٹ کی بیٹی ایلیشیا میری محبت میں گرفتار ہو گئی۔ یہ بات ذہن میں رکھنا۔ میں اس کی محبت میں گرفتار نہیں ہوا، وہ ہوئی۔ اگر مجھے کسی اور سے محبت نہ ہوتی پہلے سے، تو شاید میں سوچتا۔ وہ مجھ سے شادی کرنے کے چکر میں مسلمان بھی ہو گئی تھی۔ اس کا نام اب عائشہ ہے۔ اس کا باپ دارالامرا کا رکن ہے اور ایشیائی امور کی کمیٹی برائے عمومی تعلقات کا چیئرمین بھی ہے۔ یہ کمیٹی برطانیہ میں مقیم پاکستانیوں کے مفادات کے تحفظ میں رابطے کا ذریعہ ہے۔ یہ تھا معاملے کا ایک پہلو۔ میں وہیں تھا کہ میرے ایک بزرگ نے جن کے میں نام سے بھی واقف نہ تھا مجھے طلب کیا اور یہ ساری جاگیر اور حویلی میرے نام کر دی۔ رشتے میں وہ میرے پردادا بنتے تھے۔ چالیس سال سے مفلوج پڑے تھے اور انہیں مرحوم فرض کر لیا گیا تھا۔"

شامی نے سر ہلایا "اس کا حوالہ آج اخبارات نے دیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "یہ جاگیر مجھے سونپنے کے کچھ عرصے بعد ہی وہ انتقال کر گئے اور اب لندن میں مدفون ہیں۔ میرے والدین نے مجھے مجبور کیا کہ میں نوکری چھوڑ کے واپس وطن آ جاؤں اور جاگیر سنبھالو۔ میں ان کا اکلوتا بیٹا ہوں، پہلے میری جدائی برداشت کرنا ایک مجبوری تھی۔ اب مجھے نوکری کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ ان کے اصرار پر میں واپس آ گیا۔ ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ وہ خود لندن میں نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ پاکستان نہیں چھوڑ سکتے۔ میرا خیال تھا کہ تنظیم سے تعلق کا معاملہ ختم ہوا۔ اب خطرے کی کوئی بات نہیں مگر یہاں آ کے میں پھر مشکل میں پڑ گیا۔ تمہیں یہ ضرور معلوم ہوگا کہ آج کل تنظیم کے باغی گروہ نے اقتدار تک رسائی حاصل کر لی ہے چنانچہ پرانے لوگ مشکل میں ہیں، کچھ اندر ہیں۔ کچھ فرار ہو گئے ہیں اور کچھ زیرِ عتاب ہیں۔ ایسے ہی دو پرانے پاپی ہیں شہاب الدین اور غلام محمد۔ پہلا چیف کا قائم مقام ہے۔ دوسرا پنجاب میں اب بھی اپنی بدمعاشی کی حکومت چلا رہا ہے۔"

"میں اسے جانتا ہوں۔" شامی نے مختصراً کہا۔

"ان دونوں نے مجھ سے کہا کہ میں برطانیہ میں ان کو سیاسی پناہ دلوانے میں ان کی مدد کروں۔ ان کے دو مخالفوں کے معاملات زیرِ غور ہیں۔ ان کی درخواست مسترد اور ان کا کیس منظور کرانے میں اپنا اثر رسوخ استعمال کروں۔ عائشہ کی ماں میری سخت دشمن ہے۔ تنظیم نے کہا کہ میں عائشہ سے

شادی کا ارادہ ظاہر کروں۔ اس طرح عائشہ کی ماں پر دباؤ ہوگا۔ میں اسے بلیک میل کروں، یہ کہوں کہ وہ اپنے شوہر کو مجبور کرے اور ان دونوں بدمعاشوں کو برطانیہ میں سیاسی پناہ دلوا دے۔ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو میں اس کی بیٹی عائشہ کو شادی کر کے پاکستان لے آؤں گا جس کے لیے عائشہ ہر وقت تیار ہے لیکن اس نے میرا کام کر دیا تو میں عائشہ کو چھوڑ دوں گا۔ میں محبت کے نام پر عائشہ کو دھوکا نہیں دے سکتا تھا۔ میں نے انکار کیا تو وہ میرے دشمن ہو گئے۔ مجھے دھمکی ملنے لگی کہ میرے عزیز و اقارب دوست اور والدین کی خیر نہیں۔ دو روز قبل انہوں نے دادی کی تدفین کے موقع پر حویلی کو آتش گیر مادے سے بھری کار کے ذریعے تباہ کرنے کی سازش کی مگر سازش ناکام رہی لیکن وہ دھوکے سے دو افراد کو اغوا کر کے لے گئے، ایک فرخ کو، دوسرے شہناز کو جس سے راجا کو شادی کرنی ہے۔"

"لیکن شہناز تو وہاں تھی ......" شامی بولا۔

میں نے کہا "ہاں، گزشتہ رات میں غلام محمد کے گھر گیا۔ میں نے وعدہ کیا کہ اس کا کام ہو جائے گا لیکن وہ پہلے شہناز اور فرخ کو رہا کرے۔ اس نے کہا کہ وہ مجھے ان سے ملوا سکتا ہے مگر کام ہونے تک رہا نہیں کر سکتا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے گیا اور وہاں حالات کچھ ایسے بن گئے کہ غلام محمد کے دو محافظ مارے گئے اور ہم نے اسے پکڑ لیا۔ راجا میرے ساتھ تھا۔ غلام محمد اور اس کے تین ساتھیوں کو وہ قیدی بنا کے ست بدھائی لے گیا، وہ وہیں اسیر ہیں۔"

"پھر اب میری مدد کی کیا ضرورت رہ گئی؟" شامی مسکرا دیا۔

میں نے کہا "اب تک چیف کے قائم مقام شہاب الدین کو اور پیرس میں چیف کو پوری رپورٹ مل گئی ہوگی۔ جوابی کارروائی میرے خلاف ہوگی۔ اگر تم چاہو تو اس معاملے کا رخ بدل سکتے ہو۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں؟"

"دیکھو۔ ڈاکو بااثر اور دولت مند لوگوں کو اغوا کرنے کے لیے بدنام ہیں۔ سندھ میں رہ کے تم نے سب دیکھا ہوگا؟"

شامی کے ایک ساتھی نے پہلی بار لب کھولے۔ "او جی اپنا تو یہ کام ہے۔"

علی مسکرایا۔ "تاوان کی نصف رقم ہمیں مل جاتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "اور آدھی کہاں جاتی ہے۔"

"اوپر والوں کے پاس...... جو ہماری حفاظت کرتے ہیں۔ اور خود ہماری حفاظت میں رہتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "کیا یہ ہو سکتا ہے کہ اس واردات کو تم اغوا برائے تاوان کی واردات بتاؤ۔"

"لو جی یہ کیا مشکل ہے...... میں تو سمجھا تھا آپ کوئی بڑا کام بتاؤ گے۔" شامی ہنسا۔

میں نے کہا۔ "بڑا کام یہ ہو سکتا ہے کہ تم شہاب الدین کو اٹھا لو۔ اور اسے بھی یہاں لے آؤ۔"

شامی نے سر ہلایا۔ "سمجھو آپ کا یہ کام بھی ہو گیا۔"

میں نے کہا۔ "اب تم جاؤ ست بدھائی ...... وہاں سے راجا کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤ اور شہناز کو بھی ...... یا ان کو ہم غائب کر دیں گے۔ تم غلام محمد اور اس کے تین ساتھیوں کو لے جاؤ ...... اور تاوان کا مطالبہ کر دو۔ ہم شور مچا دیں گے کہ ایک صحافی اور ایک ڈاکٹر کو ڈاکو اغوا کر کے لے گئے کچھ عرصے بعد ان کی بازیابی دکھا دیں گے۔ غلام محمد کو اپنی تحویل میں رکھو...... اس طرح شہاب الدین چکر میں پڑ جائے گا کہ اسے دی جانے والی معلومات غلط تھیں۔ اپنے ساتھیوں کے علاوہ غلام محمد کو لے جانے والا رفیق نہیں یہ کام تو ڈاکوؤں نے کیا ہے۔"

"میں سمجھ گیا۔"

میں نے کہا۔ "پیسا آپ جتنا چاہو مانگ لو۔ مل جائے گا میری جان بچ جائے گی۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "ٹھیک ہے نواب صاحب۔"

میں نے کہا۔ "اب دوستی ہے تو یہ سب نہیں چلے گا۔ تم شامی ہو اور میں رفیق۔"

اس نے ایک ساتھی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس کے ساتھی نے بغل میں سے ایک چادر برآمد کی۔ اس وقت میں نے غور کیا کہ وہ سب ایک جیسی چادریں اوڑھ کے آئے تھے۔ اس نے چادر کو کھولا اور میرے شانوں پر پھیلا دیا۔ "اب تم ہماری برادری میں ہو۔" شامی نے کہا "ہمارے دکھ سکھ سانجھے ہیں۔"

میں دم بخود کھڑا رہا۔ میں نواب رفیق احمد شیرازی...... ایک انتہائی نیک نام پروفیسر کا بیٹا۔ ہارورڈ کا پڑھا ہوا...... اعلیٰ تعلیم یافتہ...... ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل ہو گیا تھا۔

ابھی میں کسی ردِعمل کا اظہار بھی نہیں کر پایا تھا کہ باہر والا دروازہ ایک دھماکے سے کھلا اور کوئی توپ سے نکلے ہوئے گولے کی طرح اندر گھس آیا۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔

یہ صوفی چچا تھے اور ان کے پیچھے کوئی اجنبی تھا جو بلاارادہ ہی اندر چلا آیا تھا۔ شاید اس نے صوفی چچا کو اندر داخل ہونے سے روکنے کی کوشش کی ہوگی کہ یہ کون دیوانہ ہے جو اندر گھسا چلا جا رہا ہے۔

صوفی چچا تو مجھے اور شامی دونوں کو ایک طرف دھکا دے کر سیدھے اندر کی طرف دوڑے...... وہ اجنبی رُک گیا...... میں نے اسے سوالیہ نظروں سے گھورا تو وہ کچھ نروس ہوا۔

شامی نے کہا۔ ''یہ اپنا ہی بندہ ہے جی۔ اسے باہر کھڑا کیا تھا کہ خطرے کی کوئی بات ہو تو خبردار کر دے...... یہ طریقہ ہے ہمارا۔''

میں نے کہا۔ ''معلوم نہیں صوفی چچا کیسے آ گئے۔''

''مجھے تو لگتا ہے فرار ہو کے آئے ہیں۔ مجھے اب چلنا چاہیے۔'' شامی اور اس کے ساتھیوں نے پھر اپنے چہرے چادروں میں چھپا لیے۔

''اب تمہارا ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں۔'' میں نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ''اگر صوفی چچا بھاگ کے آئے ہیں تو پولیس ان کے تعاقب میں ہوگی۔''

شامی نے مجھے گلے لگایا۔ ''اچھا جی...... رب راکھا۔''

میں نے بھی کہا۔ ''رب راکھا شامی بادشاہ۔''

میں نے باہر تک ان کے ساتھ جانا چاہا مگر شامی نے مجھے روک دیا۔ میں نے دروازے کو اندر سے لاک کیا اور لوٹ کے اندر گیا۔ صوفی چچا بیڈ کے نیچے گھس گئے تھے اور اباجی گھٹنوں کے بل جھک کر انہیں باہر نکلنے کے لیے کہہ رہے تھے۔ اماں سخت پریشانی کے عالم میں بیڈ سے اتر کر دور جا کھڑی ہوئی تھیں۔

ابا نے بڑے پیار سے کہا۔ ''نذیر...... بیٹا باہر آؤ۔''

ابا اور صوفی چچا میں تقریباً دس برس کا فرق تھا چنانچہ محبت میں ابا نہیں کبھی کبھی بیٹا بھی کہہ دیتے تھے۔

''بھائی صاحب...... وہ آ رہے ہیں...... وہ مجھے پھانسی دینے کے لیے لے جائیں گے۔'' صوفی چچا نے نیچے سے کہا۔

''نہیں نذیر...... تم نے کچھ نہیں کیا۔''

''میں نے قتل کیے ہیں۔ بہت قتل کیے ہیں۔'' ان کی آواز لرز رہی تھی۔ ''اپنی بیوی کو قتل کیا...... رابعہ کی ماں کو قتل کیا...... تمہاری بھابی کو قتل کیا...... رفیق کی چچی کو قتل کیا۔'' وہ عالم دیوانگی میں بولتے گئے۔ ''وہ جو میری اور تمہاری ماں تھی اس کی بہو کو قتل کیا...... یہ کتنے قتل ہو گئے۔''

ابا نے انہیں سمجھانا جاری رکھا، ''نذیر وہ ایک ہی عورت تھی۔''

''نہیں بھائی صاحب...... اس سے پہلے میں ہر روز قتل کرتا تھا۔'' وہ خوف زدہ سرگوشی میں بولے۔ ''میں نے لوگوں کے اعتماد کا خون کیا۔ دھوکے سے...... میں نے اپنے ایمان کا خون کیا...... خودفریبی سے...... میں نے اپنے ضمیر کا خون کیا۔ لالچ سے...... میں نے خود کو مارا...... جھوٹ سے...... دھوکا فریب لالچ اور جھوٹ...... کیسے کیسے خطرناک ہتھیار تھے میرے پاس...... مجھے تو ہر روز پھانسی ہوگی۔''

اماں نے کہا۔ ''آپ کس کے ساتھ دماغ کھپا رہے ہیں۔''

ابا نے خفگی سے کہا، ''بار بار مجھے احساس دلانے کی کیا ضرورت ہے کہ میرا بھائی پاگل ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اباجی...... انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ یہ ضرور کسی طرح پولیس کی تحویل سے نکل بھاگے ہیں وہ آتے ہی ہوں گے انہیں پھر پکڑنے کے لیے۔''

اباجی کی آواز میں رقت اور دُکھ شامل ہو گیا۔ ''رفیق...... کچھ کرو۔''

میں نے اباجی کو نرمی سے بازو پکڑ کر اٹھا لیا۔ ''بس آج کی رات ہے کل ان کو جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا جائے گا۔ فاروقی نے سارا بندوبست کر لیا ہے۔ وہاں انہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔''

اباجی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ''کل ضمانت پر رہائی نہیں ہو سکتی؟''

میں نے کہا۔ ''آپ تو سب سمجھتے ہیں اباجی۔ ابھی چالان بھی پیش نہیں ہوا۔ پہلی سماعت پر ہم سیشن کورٹ سے ضمانت منظور کرا لیں گے۔ یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔''

میری بات مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ دروازہ بجا۔ دستک کا جارحانہ انداز ہی بتاتا تھا کہ یہ پولیس ہے۔ میں نے دروازہ کھولا تو مجھے چار پولیس والے نظر آئے...... ان میں سے دو مسلح تھے اور ہنگامی صورتِ حال میں وہ کسی ٹیکسی کو بیگار میں پکڑ لائے تھے۔ ان کی سربراہی ایک بڈھا اے ایس آئی کر رہا تھا۔ اس نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو میں نے اسے روک دیا۔

''کیا بات ہے؟'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔

''اوئے ڈراما مت کرو...... وہ پاگل آیا ہے یہاں تھانے سے بھاگ کے...... ہمارے راستے سے ہٹ جاؤ۔''

میں نے اپنے قدم مضبوطی سے جما لیے۔ ''کیا ثبوت ہے تمہارے پاس؟''

اس نے مجھے دھکا دینا چاہا۔ ''تم ہٹ جاؤ...... قانون

کے راستے میں رکاوٹ ڈالنا جرم ہے۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے قانون مت پڑھاؤ...... یہ بتاؤ وارنٹ لائے ہو میرے گھر میں داخل ہونے کے لیے۔''

اس کا جارحانہ موڈ بدل گیا۔ ''ہماری اطلاع کے مطابق وہ پاگل......''

میں نے کہا۔ ''میرے چچا کے بارے میں بات کرتے ہوئے خیال رکھو کہ میں کوئی عام آدمی نہیں ہوں۔ یہ نواب رفیق احمد شیرازی کا گھر ہے۔ تم کو کس نے بتایا ہے کہ وہ پاگل ہیں...... اور تمہارے کہنے سے کسی کو بھی پاگل تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔''

سب انسپکٹر کی اپنے ماتحتوں کے سامنے بے عزتی ہو رہی تھی۔ میں اس کی اتھارٹی کی راہ میں رکاوٹ بن گیا تھا لیکن وہ پرانا پاپی تھا۔ حالات کے مطابق انسان کو کتا بنا دینا اور حالات بدل جائیں تو کتے کو باپ بنا لینا اس کے لیے مشکل نہ تھا۔

اس نے ایک گہری سانس لی اور اپنا رویہ ایک دم بدل لیا۔ ''نواب صاحب...... آپ بتا دیں کیا حوالات سے فرار ہو کے صوفی نذیر یہاں آیا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں...... میں انہیں لے کر آتا ہوں...... مگر تم اس دہلیز کو عبور کرنے کی کوشش بھی مت کرنا ورنہ اس عمر میں معطلی ہو گئی تو بحالی مشکل ہو جائے گی۔''

معلوم نہیں سب انسپکٹر کیوں مرعوب ہو گیا۔ یہاں تو پولیس کی لاقانونیت اور فرعونیت ایک عام بات ہے...... کیسا احترام چادر اور چار دیواری کا انسانی اقدار کا یا بنیادی آئینی حقوق کا...... وہ دندناتے ہوئے کسی بھی گھر میں گھس کے مار پیٹ، لوٹ مار، بچوں عورتوں اور بوڑھوں پر تشدد سب کچھ کرتے ہیں اور پھر متاثرین پریس کلب جائیں یا عدالت...... کسی کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔ شاید اس کی جگہ کوئی جوان اور گرم خون والا افسر ہوتا تو مجھے دھکا دے کر کہتا کہ تیری تو نوابی کی ایسی تیسی...... نواب ایسے کھنچر حال میں اور ایسے گھروں میں رہتے ہیں...... پھر وہ اندر جا کے صوفی چچا کو گھسیٹ کر نکالتے اور لاتیں ٹھڈے مارتے گالیوں سے نوازتے لے جاتے...... رسوائی کا یہ تماشا سب دیکھتے اور کوئی دم نہ مارتا۔

میں نے اندر جا کے بیڈ کے پاس جھک کر کہا۔ ''صوفی چچا...... آپ کو دادی بلا رہی ہیں۔''

وہ چونکے اور انہوں نے وحشت زدہ آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ ''اماں بلا رہی ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں...... باہر آیئے۔''

''کہاں ہیں اماں؟'' وہ چکرا گئے تھے۔

''اپنے کمرے میں اور کہاں۔'' میں نے نارمل طریقے سے کہا۔

''تم...... جھوٹ بولتے ہو۔''

میں نے محسوس کیا کہ میرا اندھیرے میں چلایا ہوا تیر نشانے پر لگ گیا ہے...... ان کا دماغ اُلجھن میں گرفتار ہو گیا تھا کہ میری ماں تو مر چکی تھی...... گزرے ہوئے واقعات ان کے ذہن میں آئے ہوں گے...... وہ ذہنی عدم توازن کا شکار تھے یہ سوچنے لگے کہ کیا وہ میرا وہم تھا؟ بے بنیاد خیال تھا...... مفروضہ تھا......

میں نے کہا۔ ''جلدی آئیں چچا...... ورنہ وہ ناراض ہوں گی۔''

وہ باہر نکل آئے۔ انہوں نے وحشت بھری نظروں سے مجھے دیکھا۔ پھر ابا کو...... ''کیا رفیق ٹھیک کہہ رہا ہے؟''

ابا نے سر ہلا دیا۔ ''ہاں۔''

''پھر...... مجھے کیوں شک ہو گیا تھا کہ اماں کو زہر دے دیا تھا...... میری بیوی نے۔'' وہ داڑھی کھجانے لگے۔ ''میں نے کیوں قتل کر دیا تھا اسے۔''

''کسے قتل کر دیا تھا؟'' میں نے کہا۔

''تمہاری چچی کو اور کسے۔''

میں نے کہا۔ ''ایسی تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ آپ آئیں میرے ساتھ۔''

چچا آگے بڑھے۔ ''رفیق...... پھر پولیس نے مجھے کیوں بند کر رکھا تھا؟''

میں نے کہا۔ ''آپ اُلٹی سیدھی باتیں جو کر رہے تھے اور حرکتیں بھی۔''

میں انہیں دروازے تک لے گیا۔ انہوں نے یہ نہیں پوچھا کہ تم مجھے ادھر کہاں لے جا رہے ہو...... اماں کا کمرا تو ادھر نہیں ہے۔ یہی ان کی دیوانگی کی دلیل تھی۔ مجھے کوئی شک نہ رہا کہ ان کا دماغ بالکل الٹ چکا ہے۔ وہ سوچ تو سکتے ہیں...... سمجھتے کچھ نہیں۔''

دروازے کے باہر موجود پولیس نے انہیں دبوچنے میں دیر نہیں لگائی۔ چچا چلا کے مجھے گالیاں دینے لگے...... پولیس کو دھمکیاں مارنے لگے۔ ''میں تم سب کو دیکھ لوں گا...... تباہ کر دوں گا...... ایسا عمل کروں گا کہ جل کے راکھ ہو جاؤ گے کم بختو...... شیطان کے بچو......''

کچھ لوگوں نے یہ تماشائے عبرت ضرور دیکھا مگر پھر پولیس نے ان کو ٹیکسی میں ٹھونسا اور اپنے ساتھ لے گئے۔

ابا جی سخت دکھی تھے ضبط کے باوجود ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ تھانے جا کر دیکھنا چاہتے تھے کہ صوفی چچا کو فرار ہونے کے جرم کی کیا سزا ملتی ہے۔ وہ میری یقین دہانی سے مطمئن نہیں تھے کہ کچھ نہیں ہوگا۔

''وہ ماریں گے اسے۔ وحشیانہ طریقے سے۔''

میں نے کہا۔''ابا جی...... ان کو بہت پیسا دیا ہے ہم نے...... اسی رعایت کے لیے...... مزید دے سکتے ہیں...... وہ جانتے ہیں کہ صوفی چچا پاگل ہیں۔''

''میں جا کے دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''آپ کے جانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ آپ کو تھانے نہیں جانا چاہیے بار بار...... خود کو اذیت دینے کی ضرورت نہیں۔''

''اچھا تو تم جاؤ...... دیکھو وہ کیسے بھاگ آیا تھا۔''

میں نے کہا۔''ٹھیک ہے...... میں جاتا ہوں مگر آپ چلیں میرے ساتھ۔ میں آپ کو یہاں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ اس گھر میں اب آپ کا رہنا بالکل ٹھیک نہیں۔''

''اس وقت کہاں جائیں گے ہم؟'' اماں نے دبے دبے لہجے میں کہا۔

''میں آپ کو فاروقی کے گھر لے جا رہا ہوں۔ ہم یہاں سوئم کے لیے آئے تھے نا...... کل واپس چلے جائیں گے ست بدھائی لیکن یہاں ایک رات رہنا بھی ٹھیک نہیں آپ بے سکون رہیں گے۔''

ابا نے ایک گہری سانس لی۔''دیکھو رفیق میاں...... تقدیر کے کھیل کیا ہوتے ہیں...... ساری عمر عزت کی کمائی میں گزاری...... عزت کے اثاثے کو سنبھال کے رکھا...... دولت کی ہوس نے کبھی مغلوب نہیں کیا مگر آخری عمر میں ساری عمر کی کمائی گنوا دی۔''

میں نے کہا۔''اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں۔''

''قصور کون دیکھتا ہے...... سب تماشا دیکھتے ہیں۔ جس محلے اور شہر میں پروفیسر صاحب کے علم کی قدر تھی وہاں آج لوگوں کی زبان پر کیا چرچے ہیں؟ اخباروں کی خبر نے کیسی منفی شہرت کر دی ہے۔ پرانے وقتوں سے ایسا ہی دستور تھا...... علم کی عزت ملے گی یا دنیا کی دولت...... دیکھ لو خاندانی دولت آئی تو عزت کا جنازہ اٹھ گیا۔''

میں نے کہا۔''ابا جی...... ایسی مایوسی کی باتیں مت کریں۔''

''میں نے کیا غلط کہا۔ اس محلے میں آج لوگ کیا کہتے ہوں گے جہاں آدمی عمر گزر گئی...... میں کسی سے نظر ملا کے بات نہیں کر سکتا...... واقعی کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہا۔ اب یہاں کیسے رہ سکتے ہیں ہم۔'' ابا جی نے اپنے آنسو پونچھ لیے۔

''اللہ جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ آپ ہمیشہ مجھے سمجھاتے تھے۔ ہم ست بدھائی میں رہیں گے...... وہ بھی تو آپ ہی کا گھر ہے۔''

''کتنا اچھا ہوتا اگر وہ ہم سب کا گھر ہوتا۔ وہاں وہ سب رہ سکتے جو اس گھر میں رہتے تھے۔'' ابا جی نے آہ بھری۔

اماں نے کہا۔''بس اب خود کو زیادہ دکھی مت کرو۔ رفیق ٹھیک کہتا ہے۔ ہمیں اس آسیب زدہ گھر کی نحوست سے نکل جانا چاہیے۔''

اس وقت ہم اپنے ساتھ کیا لے جا سکتے ہیں...... گھر کا سارا سامان بے مصرف ہو گیا تھا۔ دادی کا کمرا بند پڑا تھا۔ چچا اور چچی کے کمرے مقفل تھے گھر میں ایک سناٹا تھا اور مہیب ویرانی...... اماں چاہتی تھیں کہ کم سے کم پہننے کے کپڑے اور زیورات وغیرہ ایک سوٹ کیس میں بھر لیں۔ ابا تمام اہم دستاویزات اپنے ساتھ رکھنا چاہتے تھے لیکن میں اس کی اجازت دیتا تو وہ زیادہ سوگوار ہوتے...... سامان پیک کرنے سے رخصتی کا ماحول پیدا ہوتا اور ہمیشہ کے لیے اس گھر سے رخصتی کا خیال انہیں زیادہ غم زدہ کرتا۔ میں نے کہا کہ فی الحال وہ کچھ بھی نہ کریں۔ اس کے باوجود گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے میں نے دروازہ مقفل کیا تو وہ اس گھر کو الوداعی نظروں سے دیکھتے رہے۔

گاڑی اس گلی سے نکل گئی تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ میرے دماغ پر بوجھ کافی کم ہو گیا تھا۔ اس گھر میں رہنا اب واقعی ناممکن تھا تمام ناخوشگوار اور دکھ دینے والی یادوں سے نجات پانے کا سب سے مؤثر طریقہ یہی ہو سکتا تھا کہ اس ماحول سے نجات حاصل کر لی جائے۔

فاروقی میرے ساتھ اماں ابا کو دیکھ کے جتنا حیران ہوا اتنا ہی میرے فیصلے سے خوش بھی ہوا۔ فریال اور فاروقی کی بیوی کچن میں کھانے کی تیاری کر رہی تھیں۔ میری آواز سن کر فریال بھاگی ہوئی آئی تو عادت کے مطابق ایزی ڈریس میں تھی۔ نیچے جینز اوپر ایک سلیولیس مردانہ کالر والی شرٹ اور بس...... اماں ابا کو دیکھتے ہی وہ بوکھلا کے واپس بھاگی۔ دوپٹا فاروقی کی بیوی کے گلے میں بھی نہیں تھا مگر اس نے فوراً تلاش کر لیا اور فریال چند منٹ بعد دوبارہ نمودار ہوئی تو بزرگوں کے سامنے سلام کے لیے حاضری دینے کے شریفانہ حلیے میں تھی۔ اس نے فوراً شلوار قمیص اور دوپٹے والا روایتی لباس بدل لیا تھا۔ رکھ رکھاؤ کا مظاہرہ خواہ نمائشی ہو مگر بزرگ اسے پسند کرتے ہیں۔

میں نے فاروقی سے کہا۔''اماں ابا آج رات یہیں رہیں گے۔''

''آج رات کا کیا مطلب...... یہ اب یہیں رہیں گے۔'' وہ بولا۔''مگر تو کہاں بھاگا جا رہا ہے؟''

میں نے کہا۔''تفصیل ابا جی سے سن لینا۔''

اس کی بیوی شور کرنے لگی۔''میں کھانا لگا رہی ہوں رفیق بھائی۔'' لیکن میں اس کی سنے بغیر نکل گیا۔

پولیس اسٹیشن کے باہر گاڑی روک کے میں سیدھا حوالات کی طرف گیا لیکن صوفی چچا وہاں نہیں تھے۔ میرے اندازے کے مطابق انہیں ایک گھنٹا قبل ہی یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ پہرے پر کاہلی سے کھڑے ہوئے کانسٹیبل نے پہلے قطعی لاعلمی کا اظہار کیا اور پھر مجبوراً ڈیوٹی افسر سے رجوع کرنے کے لیے کہا۔ ڈیوٹی افسر نے مزید بے رخی برتی اور مجھ سے بیٹھنے کے لیے بھی نہیں کہا تو مجھے طیش آیا۔

میں نے کہا۔''آخر یہ کیا معاملہ ہے؟'' اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

''دیکھو جی...... گرمی کھانے کی ضرورت نہیں۔ انچارج صاحب سے بات کرو'' وہ مشتعل ہو کے بولا۔''میں ابھی آیا ہوں...... آٹھ بجے۔''

میں نے کہا۔''انچارج صاحب سے بھی بات ہو جائے گی مگر پہلے تم بتاؤ کہ تم نے چارج لیا تو حوالات میں کتنے قیدی تھے؟''

''تم کیا میرے افسر ہو کہ تمہیں بتاؤں؟''

مجھے رویے کی یہ تبدیلی کھٹکنے لگی۔ یقیناً کوئی ایسی بات ہوئی تھی جس نے میرے اثر رسوخ اور میرے کھلائے ہوئے رشوت کے پیسے کو بے اثر کر دیا تھا۔ صوفی چچا کے تھانے سے فرار ہو جانے کا واقعہ قانونی طور پر ایک سنگین جرم تھا لیکن اس سے تھانے والوں کا زاویہ نہیں بدل سکتا تھا...... وہ جانتے تھے کہ ابھی ان کا مجھ سے واسطہ رہے گا اور صوفی چچا کے لیے مراعات کا سلسلہ ان کے لیے معقول آمدنی کا ضامن ہوگا۔

میں نے کہا۔''انچارج صاحب کہاں ہیں؟''

اس نے بے اعتنائی سے کہا۔''گشت پر۔''

عقل مند کے لیے یہ اشارہ کافی ہوتا ہے کہ انچارج صاحب بادشاہ ہیں۔ کب آئیں گے...... آئیں گے یا نہیں آئیں گے...... ان کی مرضی...... میں اٹھ کر باہر آ گیا۔ اپنے موبائل فون سے ست بدھائی میں راجا سے رابطہ ممکن نہ تھا۔

میں کچھ دیر سوچتا رہا پھر میں نے فاروقی کا نمبر ڈائل کیا۔

فاروقی کو ابا جی سے گزشتہ ایک گھنٹے کے واقعات کی رپورٹ مل چکی تھی۔ اس نے کہا کہ وہ معلوم کر کے بتائے گا۔ میں دس پندرہ منٹ تھانے کے باہر ہی ٹہلتا رہا۔ میری چھٹی حس کہتی تھی کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے صوفی چچا عام حوالاتی نہیں تھے۔ فرار کے بعد دوبارہ گرفتاری سے صورت حال اس حد تک خراب نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ ذہنی عدم توازن کا شکار تھے۔ ان کی یہ حرکت کوئی سنگین بحران کھڑا نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے علاوہ ان کے ساتھ اچھے سلوک کی پوری قیمت ادا کر دی گئی تھی۔ انہیں صبح جوڈیشل مجسٹریٹ کے سامنے پیش کرنے میں بارہ چودہ گھنٹے کی دیر تھی پھر تھانے والوں کا معاملہ ختم ہو جاتا۔ بعد کے معاملات جیل حکام سے طے ہوتے۔

سیل فون کی گھنٹی بجی تو میں نے ریسیور کان سے لگا لیا۔

''ہاں، کیا پتا چلا؟''

فاروقی نے کہا۔''پتا صرف یہ چلا ہے کہ صوفی چچا کو سی آئی اے تھانے لے جایا جا رہا تھا کہ وہ راستے میں کسی طرح سے فرار ہو گئے۔''

میں دم بخود رہ گیا۔''سی آئی اے تھانے؟''

''میں خود حیران ہوں۔ فرار والی بات بھی میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ جسے دوسرے تھانے میں منتقل کیا جاتا ہے خصوصاً قتل کے ملزم کو تو اسے تھانے سے ہتھکڑی لگا کے لے جاتے ہیں...... پھر صوفی چچا کیسے نکل گئے۔ ان کے ساتھ مسلح محافظ بھی گئے ہوں گے...... یہ اسٹوری کچھ گڑبڑ ہے۔''

میں نے پریشانی سے کہا۔''پھر اب میں کیا کروں؟ سی آئی اے تھانے جاؤں؟''

''ابھی وہاں کوئی کچھ نہیں بتائے گا۔ مجھے بھی کورا جواب دے دیا کہ ہمیں کسی صوفی نذیر کے بارے میں علم نہیں۔ علاقہ اے ایس پی سے رابطہ نہیں ہوا۔ ڈی ایس پی کا موبائل بند ہے۔ تھانہ انچارج سے بات ہوئی ہے اس نے کچھ اشارہ دیا ہے کہ نواب صاحب اگر مجھ سے مل لیں۔''

''وہ ہے کہاں؟''

''کسی شادی کی تقریب میں...... تو پی سی چلا جا اور فکر مت کر...... میں دیکھتا ہوں اور کسی سے رابطہ ہو جائے۔''

پی سی ہوٹل کے اندر پارکنگ کی کوئی جگہ نہ تھی۔ کافی لمبا چکر کاٹ کے میں دوسری طرف کی سروس روڈ پر گیا اور ایک جگہ گاڑی پھنسانے میں کامیاب رہا۔ واپس پی سی تک آنے کے لیے مجھے تقریباً آدھا کلومیٹر تک پیدل چلنے کے بعد سڑک عبور کرنی پڑی۔ ٹریفک کے ازدحام کا مسئلہ لاہور میں سنگین

سے سنگین تر ہوتا جا رہا تھا۔ کاروں کے سیل رواں کو دیکھ کر یہ لگتا تھا جیسے اب لاہور میں ہر شخص نے گاڑی خرید لی ہے۔ یہ لیزنگ کے کاروبار کا کمال تھا ورنہ حقیقت یہی تھی کہ ابھی تک پچانوے فیصد سے بھی زائد لوگ بسوں ویگنوں میں خوار پھرتے تھے...... جوتیاں چٹخاتے نظر آتے تھے...... تانگوں اور رکشاؤں میں دھکے کھا رہے تھے۔

شادی کی تقریب کے مہمانوں میں تھانہ انچارج سے بات کرنا مشکل ہو گیا۔ وہ دلہن کا قریبی عزیز تھا چنانچہ رخصتی کے آخری مراحل میں اسٹیج پر بے حد مصروف تھا۔ میں اس کے سامنے نقشِ فریادی بنا کھڑا رہا۔ وہاں دیگر قریبی عزیزوں کا مجمع تھا جن میں میرا وجود ایک اجنبی کی طرح واضح محسوس ہوتا تھا مگر اس ہڑبونگ میں کسی کو اپنا ہوش بھی نہ تھا...... خصوصاً خواتین کو...... تھانیدار نے میری موجودگی کو نوٹ کیا مگر اسٹیج سے اتر کے نہیں آیا۔

ملاقات کی سعادت مجھے ایک گھنٹے بعد حاصل ہوئی جب دلہن پیا کے گھر سدھار گئی۔ اپنی گاڑی کی طرف جاتے ہوئے اس نے کہا۔ ”معاف کرنا اپنے نواب صاحب...... زیادہ ٹائم تو نہیں ہے میرے پاس...... میری گھر والی گاڑی میں بیٹھی ہے اپنی ساری پیداوار کے ساتھ۔“

میں نے کہا۔ ”مجھ سے فاروقی نے کہا تھا۔“

”ہاں...... وہ بس اتفاق ہے کہ میں باتھ روم میں تھا ورنہ فون کی گھنٹی کہاں سنائی دیتی۔ اب آپ کے صوفی صاحب کا معاملہ کچھ نکل گیا ہے ہمارے ہاتھ سے...... ورنہ ہم نے تو شکایت کا موقع نہیں دیا۔“

میں نے کہا۔ ”انہیں سی آئی اے کے حوالے کیوں کیا گیا ہے؟“

”اوپر سے آرڈر ملے تھے۔“

میں نے کہا۔ ”عجیب بات ہے...... اس کیس میں سی آئی اے کیا تفتیش کرے گی...... ملزم کا تو ذہنی توازن ہی درست نہیں ہے۔“

”تفتیش تو یہ بھی ہو سکتی ہے کہ بندہ قتل کر کے پاگل بن گیا ہے...... یا سچ مچ پاگل ہے...... مگر مسئلہ کچھ اور ہے۔“

”اگر وہ پولیس کی تحویل سے نکل بھاگے تھے۔“

”او نئیں جی...... بھاگ کے کہاں جانا تھا بندے نے...... وہ تو پھر پکڑ لیا ہم نے آدھے گھنٹے میں۔“

میں نے کہا۔ ”یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی تھانیدار صاحب کہ جب صوفی چچا کو آپ کے تھانے سے منتقل کیا جا رہا تھا تو کیا ان کو ہتھکڑیاں نہیں لگائی تھیں۔“

وہ خفگی سے بولا۔ ”آپ بھی کمال کرتے ہو جی...... یہ ہم نے آپ کی وجہ سے کیا تھا۔ آپ اسے ہمارا قصور بتا رہے ہو۔“

میں نے معاملے کو سنبھال لیا۔ ”میں آپ کو الزام نہیں دے رہا ہوں۔“

اس نے گھڑی دیکھ کے میری بات کاٹ دی۔ ”چلو جی دفع کرو...... یہ کاسو کون ہے؟“

اگر وہ میرے کان کے قریب فائر کر دیتا تب بھی میں یوں نہ اچھلتا جیسے کاسو کا نام سن کے اچھلا۔ ”کاسو؟“

”ہاں...... کاسو...... صوفی سے میں نے خود پوچھا تھا یہ بھی سمجھایا تھا کہ اپنے لیے مشکل پیدا نہ کریں...... تھوڑی سی سختی بھی کی تھی...... لیکن اس نے کوئی تعاون نہیں کیا...... وہ بتا دیتا کہ کاسو کہاں ہے۔“

میں نے برہمی سے کہا۔ ”اگر تم راہ چلتے آدمی سے پوچھو گے تو وہ کیا بتائے گا کہ کاسو کوئی آدمی ہے برتن...... یا کوئی جڑی بوٹی۔“

تھانیدار کا موڈ آف ہو گیا۔ ”دیکھو جی نواب صاحب...... تمہارا چاچا ممکن ہے پاگل ہو مگر تفتیش کرنے والے پاگل نہیں ہیں کہ چوزے سے انڈے میں گھسنے کا طریقہ واردات معلوم کرنے میں لگ جائیں اور نہ وہ پاگل ہیں جو یہ بات جاننا چاہتے ہیں۔“

میرے کان کھڑے ہوئے۔ ”یہ کون جاننا چاہتا ہے؟“

”اب اگر مجھے سی آئی اے والے اپنے طریقے سے میرے مرنے تک پوچھتے رہیں تو بھی میں یہی کہوں گا کہ مجھے نہیں معلوم۔“

”تمہیں کس کا حکم موصول ہوا تھا؟“ میں نے سوال بدل دیا۔

”افسرانِ بالا کا۔“ اس نے عیاری سے مسکرا کے کہا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کے نکل گیا۔

اس عالی شان ہوٹل کے باہر دور دور تک صف بستہ بہت سی عالی شان اور مغرور کاروں کے درمیان میں بے بسی سے اکیلا کھڑا رہ گیا۔ کاسو کے حوالے سے ہی ساری صورت حال یوں کھل کے سامنے آ گئی تھی جیسے ”کھل جا سم سم“ کہتے ہی طلسماتی غار کا پورا منظر علی بابا کی نظروں کے سامنے آ گیا تھا۔

مجھے رجب علی کی بات یاد آ رہی تھی۔ اس نے بڑے طمطراق سے کہا تھا کہ وہ صوفی چچا کی رہائی کے لیے اسمبلی کے سیشن میں صوبائی وزیر داخلہ سے بات کر سکتا ہے۔ اس نے قانون پر میرے اعتماد کا مذاق اڑایا تھا کہ قانونی رعایت ملتی

نہیں لینی پڑتی ہے۔ اس کی آمد حقِ ہمسائیگی اور ہمدردی کے پردے میں بہت سے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے تھی۔ وہ مجھے میری ہی نظر میں ذلیل کرنے آیا تھا۔ شاید اس کا آنا یہ اشارہ بھی رکھتا تھا کہ وہ معاملہ جسے میں اپنا خاندانی معاملہ قرار دے کر رانا کو اس سے دور رکھنے کی بات کر رہا ہوں اتنا ذاتی بھی نہیں۔ اس کا پتا وقت آنے پر چلے گا اور آج وہ وقت آ گیا تھا۔

کاسو کو چھین کر میں نے رانا کے اختیار اور اقتدار کو چیلنج کیا تھا۔ کمی کمینوں کے سامنے اس کی بگ ہیٹی کی تھی۔ اس نے سخت بے عزتی محسوس کی تھی کہ ولایت پلٹ کل کا نوجوان دولت و امارت میں ہی نہیں خاندانی شرافت اور حکومت میں بھی اس کے مقابل کھڑا ہو جائے ایسا تو کبھی کسی نے سوچا بھی نہ ہو گا۔

رانا کی گاؤں کی مسجد کے غلام پیش امام کے بارے میں مجھے کاسو نے ہی بتایا تھا کہ اس نے رانا کی عدالت سے سزائے موت پانے والے ایک باغی کی نماز جنازہ پڑھانے سے نہ صرف انکار کیا تھا بلکہ فتویٰ بھی جاری کر دیا تھا کہ اس میں شریک ہونے والا دائرہ اسلام سے خارج سمجھا جائے گا۔ اس پیش امام نے کہا ہو گا کہ رانا صاحب یہ تو قربِ قیامت کی نشانی ہے...... جب حاکم کے پاس یہ اختیار بھی نہ رہے کہ وہ محکوم کو سزائے موت دے سکے۔ کاسو کو زندہ دفن کرنا تو آپ پر واجب ہے۔

ظلم کے روایتی ہتھکنڈوں سے رانا ایک بار کاسو کو مجبور کر چکا تھا کہ وہ دست بستہ خود اس کے سامنے حاضر ہو کے اعترافِ جرم کرے اب بیوی بچوں کی زندگی بچانے کے لیے ایک کتے کے ساتھ زندہ دفنائے جانے کی سزا کو قبول کر لے۔

ایک ڈاکو شامی نے بروقت نمودار ہو کے کاسو کو بچا لیا تھا۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تائیدِ ایزدی کے سوا کچھ نہ تھا۔ شامی نے کاسو کو اپنا محسن مان لیا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ وہ مقروض تھا۔ وہ کاسو کو اس کی بیوی بچوں سمیت نکال کر لے گیا تھا مگر رانا اتنا احمق نہیں تھا کہ اس سازش کے پیچھے میرے ہاتھ کو نہ پہچانتا...... اسے یہ بھی علم نہ تھا کہ شاہ بادشاہ پر کاسو جیسے فقیر کے احسان کا کون سا قرض تھا۔ رانا نے فرض کر لیا کہ شامی کو میں نے بلایا اکسایا اور معاوضہ دے کر بھیجا تو وہ کاسو اور اس کے بیوی بچوں کو نکال لے گیا...... کاسو رانا کی قید میں تھا مگر اس کے بیوی بچے تو میری حویلی میں تھے۔ ان کو میں نے ہی شامی کے حوالے کیا ہو گا۔

پھر یہ کاسو کی بدقسمتی یا قدرت کی ستم ظریفی کہ جب دادی اور چچی کی حویلی کے قبرستان میں تدفین ہوئی تو گویا رانا کے ہاتھ میں پھر ایک موقع آ گیا جس سے وہ فائدہ اٹھا سکتا تھا اور اس نے بڑی ہوشیاری سے چال چلی۔ میرے لاشعور میں اس کا پُرغرور خندہ تحقیر گونج رہا تھا کہ اب بولو نواب صاحب قبلہ...... انسانی مساوات بنیادی حقوق اور انصاف کے کتابی دعوے کیسے بچائیں گے؟ کاسو کو یا تمہارے صوفی چچا کو؟ کس کی بنیادیں زیادہ مضبوط ہیں؟ ہمارے جدی پشتی نظام کی یا تمہارے نظامِ عدل کی؟

بال پھر میرے کورٹ میں تھی اور یہ بال تھی کاسو کی ذات...... اسے ایک طرف سے میں مارتا تھا تو وہ مخالف کھلاڑی کے کورٹ میں پہنچ جاتی تھی۔ ادھر سے شاٹ لگتی تھی تو وہ میری طرف لوٹ آتی تھی۔ ہار کس کی ہو گی اور جیت کس کی...... یہ بال سے کون پوچھتا ہے۔ گلا کسی کا کٹا کیسے کٹا تلوار کیا جانے...... نہ جانے کیوں اس وقت مجھے نصف صدی پرانی فلم ”پرچھائیں“ کی ایک غزل کے یہ بول یاد آئے جو طلعت محمود نے گائی تھی۔

شکست خوردہ قدموں سے اپنی گاڑی کی طرف جاتے ہوئے میں جتنا دکھی تھا اس سے زیادہ مشتعل تھا۔ میرے تصور میں انتہائی لرزہ خیز مناظر آ رہے تھے۔ میں نے سی آئی اے کے عقوبت خانوں کے بارے میں بہت کچھ سنا اور پڑھا تھا جس کے آگے جہنم کا عذاب آسان لگتا تھا۔ ایک شاعر نے کشمیر کے لیے کہا تھا کہ دنیا میں کہیں جنت ہے تو یہی...... شاید سی آئی اے کے ٹارچر سیل کے بارے میں کہا جا سکتا تھا کہ دنیا میں جہنم کا نمونہ ہے تو یہی۔

اور اس وقت صوفی چچا اس جہنم میں تھے۔ جن کو اپنا ہوش نہ تھا۔ جو عقل سے بیگانہ ہو چکے تھے۔ ان سے پوچھا جا رہا تھا کہ کاسو کہاں ہے جہنم میں انسان سے اس گناہ کا حساب تو نہیں مانگا جائے گا جو اس نے نہیں کیا مگر انسان ایسا کر رہے تھے۔ وہ صوفی چچا کو اس جرم کی سزا دے رہے تھے جس کے بارے میں ان کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی اور ان کے اس عذاب کا میں ذمے دار تھا۔

ایک سوال اچانک میرے سامنے انصاف کا ترازو بن گیا تھا۔ تم کس پلڑے میں اپنے ضمیر کا وزن ڈالو گے؟ مصلحت...... ڈپلومیسی...... انکار...... درمیانی راستے...... تاخیر...... التوا...... سب کو بھول جاؤ...... ابھی اس وقت دوٹوک فیصلہ کرو۔ ادھر یا ادھر۔ ہاں یا نہ...... کاسو یا صوفی چچا...... ایک غریب لاوارث جس کی حمایت میں تم بڑے یقین سے کھڑے ہوئے تھے یا ایک شخص جو کچھ نہیں جانتا......

جو عقل و ہوش نہیں رکھتا...... جسے یہ بھی علم نہیں کہ تم وہ جانتے ہو جو اس سے پوچھا جا رہا ہے اور وہ تمہارا چچا بھی ہے...... تمہارے غم کے پہاڑ سے دبے ہوئے باپ کا چھوٹا بھائی بھی ہے...... اس کا ایسا جذباتی اثاثہ بھی ہے جس کو وہ تمہاری اصول پرستی کی بھینٹ چڑھائے گا تو خود مر جائے گا۔

یہ سب اور اس سے کہیں زیادہ میں نے اپنی گاڑی تک پہنچنے والے فاصلے کو طے کرتے ہوئے سوچا۔ متضاد اور متحارب خیالات کی اس خانہ جنگی کا مقابلہ میرے ذہن نے بڑی استقامت سے کیا۔ میرا دماغ تمام جذباتی انتشار میں بھی کام کرتا رہا۔ آدمی کی اصل طاقت اس کی عقل ہے۔ انسان کو شرف اس کے شعور سے ہے ورنہ وہ جانور ہی ہے۔ اللہ کی طرف سے کسی کو ملنے والا سب سے بڑا تحفہ اس کی ذہانت ہی ہو سکتی ہے جو ہر کامیابی کی ضامن ہو جاتی ہے...... لیکن اس آزمائش کے لمحے میں، میں نے خود کو انتہائی بے بس اور کمزور محسوس کیا۔

مجھے علم نہ تھا کہ شاہ بادشاہ کہاں ہے جو مجھے کاسو کا پتا بتا سکتا تھا اگر یہ معلوم ہو جاتا تب بھی یہ ممکن نہ تھا کہ میں کاسو کو واپس حاصل کر سکوں اور رانا صاحب کے سامنے پیش کر کے التجا کروں کہ اب ازراہ بندہ پروری میرے چچا کو رہائی دلوائیے...... میری خطا معاف فرمائیے...... کاسو کو اپنے کتے کی ڈمی کے ساتھ دفن کروا دیجیے...... میں آپ کے پاؤں پڑتا ہوں۔

اور ایک قہقہہ لگا کے رانا میرے سر پر غرور کو ٹھوکر مارے اور کہے اب یہ کام تو کرے گا...... تب ہی تیری خطا معاف ہو گی۔ کسی نواب کے نطفۂ ناتحقیق۔

اور میں کہوں...... ”جو حکم میرے آقا۔“

اچانک نہ جانے کہاں سے نکل کے ایک کتے کا بچہ سڑک پر آ گیا۔ میں نے ایک دم بریک لگائے اور میرے خیال میں چلنے والا ایک رسوا کن منظر غائب ہو گیا۔ یہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں نے سوچا۔ بریک گاڑی سے پہلے مجھے دماغ کو لگانی چاہیے۔

ابھی کچھ دیر پہلے کاسو میرے سامنے تھا۔ میں نے اسے شامی کے ساتھ رخصت کیا تھا لیکن اب میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں ہو گا۔ میں نے کاسو کے سپرد ایک اور کام کیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ غلام محمد اور اس کے ساتھیوں کے اغوا کی ذمے داری بھی قبول کر لے گا اور تاوان کا مطالبہ بھی لواحقین تک پہنچا دے گا وہ راجا کے ساتھ شہناز کو بھی لے جائے گا اور بعد میں شہاب الدین کو بھی اٹھائے گا مگر اس کارروائی سے وہ مسئلہ تو حل نہیں ہو گا جو ایک چیلنج بن کے میرے سامنے آ گیا ہے۔

اس وقت یہ ضروری تھا کہ میں راجا سے مشورہ کروں اور ہم شامی سے رابطہ کریں۔ راجا سے رابطے کی کوئی صورت نہ تھی۔ اس کے سوا کہ میں خود ست بدھائی چلا جاؤں۔ صبح ہونے سے پہلے وہاں پہنچ جاؤں ورنہ شامی ان سب کو لے جائے گا۔ آج رات میں صوفی چچا کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مجھ میں ہمت نہ تھی کہ میں سی آئی اے سینٹر جا کے ان کی حالت دیکھوں۔ اگر میں ایسا کرتا تو یہ عین رانا کی خواہش کے مطابق ہوتا۔ وہاں اس کے زرخرید بڑے اہتمام سے مجھے تفتیش کے عمل کا نظارہ کراتے۔ صوفی چچا کسی ذبح کیے ہوئے بکرے کی طرح الٹے لٹکے ہوتے اور ان کی کھال کھینچنے والے یہ کارروائی میرے سامنے زیادہ جوش و خروش سے کرتے۔

ایک خیال مجھے یہ بھی آیا کہ شاید سی آئی اے سینٹر میں میری ملاقات رانا سے ہو جائے۔ وہ بھی میری تشریف آوری کا منتظر ہو اور حکم کے غلام اس کے اشارے کے منتظر ہوں کہ تماشائی آ گئے۔ کیا اب کھیل شروع کیا جائے...... نہیں...... خیر وہاں نہ جانا ہی بہتر ہو گا۔

ست بدھائی میں ٹیلی فون اور سیل فون کی عدم دستیابی بہت بڑا مسئلہ بن گئی تھی۔ مجھے خیال نہیں رہا تھا کہ سیٹلائٹ فون ساتھ لاؤں۔ یہ فون بھی دو ہی رہ گئے تھے...... تیسرا جو فریال کا تھا وہ میں نے ضائع کر دیا تھا کیونکہ اس پر سلطان نے پیغامات اور دھمکیوں کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ سیٹلائٹ فون کی ضرورت ست بدھائی میں زیادہ تھی مگر اس وقت مجھے محسوس ہو رہی تھی...... آدھی رات کے وقت مجھے شہر میں یہ فون کہاں مل سکتا تھا۔

گاڑی کو فاروقی کے گھر میں روکنے کے بعد میں نے یہی بہتر سمجھا کہ اس معاملے میں فاروقی سے مدد لوں۔ میرے لیے گیٹ چوکیدار نے کھولا تھا لیکن اندر فریال کو میری آمد کا پتا چل گیا تھا...... وہ میرے گاڑی سے اترنے سے پہلے ہی باہر نکل آئی۔ وہ اسی مشرقی لڑکی کے روایتی لباس میں تھی۔

پورچ کی روشنی میں اس نے مجھے غور سے دیکھا۔

”رومیو...... تم تو لگتا ہے بھوت دیکھ کے آ رہے ہو؟“

میں نے سر جھٹکا۔ ”اماں ابا کیا کر رہے ہیں؟“

”وہ سو رہے ہیں بڑے آرام سے...... سب سو رہے ہیں۔“

میں برآمدے میں پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ”فاروقی بھی؟“

”کیا یہ کوئی پوچھنے کی بات ہے...... وقت دیکھو......؟“

وہ میرے پاس بیٹھ گئی۔ ”تم کہاں سے آ رہے ہو۔ صوفی چچا تو ٹھیک ہیں نا؟“

میں نے کہا۔ ”فری...... ایک کپ کافی کا لا دو پہلے...... ڈسپرین کے ساتھ۔“

اس نے تشویش سے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ ”بخار تو خیر نہیں ہے یہ بتاؤ تم نے کچھ کھایا ہے۔“

میں نے سر پیچھے لگا کے آنکھیں بند کیں۔ ”میں بہت پریشان ہوں۔“

”وہ تو نظر آ رہا ہے مجھے...... اچھا ٹھہرو...... پہلے میں تمہارے لیے کافی لے آؤں...... تم جوتے اتارو، ایزی ہو جاؤ، منہ دھو لو اگر چاہو...... اچھا اٹھو اندر چلو میرے ساتھ......“ اس نے مجھے کھینچ لیا۔

میں اس کے بیڈ روم میں اس کے بیڈ پر جوتوں سمیت لیٹ گیا۔ اس نے پھر مجھے کھینچ کے اٹھایا اور زبردستی واش روم میں دھکیل کر منہ دھونے پر مجبور کیا۔ ٹھنڈے پانی سے منہ دھو کے میں نے کچھ بہتر محسوس کیا۔ اس نے مجھے لٹا کے میرے جوتے کھولنے کی کوشش کی مگر میں نے اسے روک دیا۔

دس منٹ میں وہ کافی کی ٹرے کے ساتھ واپس آئی تو ٹرے میں کھانے کے لیے کافی چیزیں تھیں مگر میرا کچھ بھی کھانے کو دل نہیں چاہا۔ فریال نے زبردستی کی اور مجھے ایک سینڈوچ نگلنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے اسے کم سے کم الفاظ میں سب بتا دیا۔

”میں بڑی آزمائش میں پڑ گیا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”آخر میں کیا کروں صوفی چچا پر جو بیتے گی اسے نظر انداز کر دوں؟ یا یہ سمجھ لوں کہ وہ کچھ بتا ہی نہیں سکتے تو ان پر تشدد سے کیا ہو گا۔ وہ تشدد کہاں تک برداشت کریں گے اگر وہ مر گئے تو ابا مجھے کبھی معاف نہیں کریں گے شاید یہ صدمہ وہ جھیل نہ پائیں۔“

”دوسری صورت بھی اتنی ہی ناممکن ہے...... کاسو کو رانا کے حوالے کیسے کیا جا سکتا ہے۔ میرا خیال ہے تم فاروقی سے بات کرو...... وہ معلوم کرے کہ صوفی چچا کو سی آئی اے سینٹر بھیجنے کے احکامات کس نے دیے تھے۔“

”اس سے کیا ہو گا؟“

”ممکن ہے رانا سے مذاکرات کی کوئی صورت نکل آئے۔ صبح تک...... یا وہ خود کسی سے بات کرے۔“

خود میرے ذہن میں فوری طور پر مسئلے کا کوئی حل نہ تھا۔ فریال کے جگانے پر فاروقی آنکھیں ملتا آیا اور میرے سامنے بیٹھ گیا۔ نیند سے یوں اٹھنا اسے بہت گراں گزرا تھا۔ ”ابے یار نہ خود چین سے سوتا ہے نہ سونے دیتا ہے...... اب کیا ہو گیا جو شکل پر بھی بارہ بجے ہوئے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”تھانے والوں نے صوفی چچا کو سی آئی اے سینٹر منتقل کر دیا ہے۔“

”سی آئی اے سینٹر...... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“ وہ چونکا۔

”تو جانتا ہے یہاں سب کچھ ہو سکتا ہے۔“ میں نے تلخی سے کہا۔

”لیکن صوفی چچا کی صبح پیشی تھی۔“

”پیشی اگر نہیں ہو گی تو کیا تھانیدار کی پیٹی اتر جائے گی؟ تو کیا کرے گا...... زیادہ سے زیادہ عدالت سے ایک نوٹس جاری کرا دے گا...... وہ اعلیٰ عدالتوں کو خاطر میں نہیں لاتے...... آئے دن عدالتیں برہم ہو کے ان کے وارنٹ جاری کرتی رہتی ہیں۔“

”لیکن ایسا کرنے کی وجہ بھی تو ہو۔“

میں نے اسے وجہ بتا دی۔ ”اسے رانا صاحب کے ایما پر لے جایا گیا ہے کاسو کا پتا پوچھنے کے لیے...... وہ کاسو کے نام سے واقف نہیں۔“

”یہ تو بہت برا ہوا۔“ فاروقی تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ ”خیر تو فکر مت کر...... میں معلوم کرتا ہوں۔“

اس نے دو نمبر ملا کے بات کی مگر اسے ایک ہی جواب ملا۔ نہیں جی وہ تو نہیں ہیں...... پتا نہیں کہاں گئے ہیں...... پتا نہیں کب آئیں گے...... کوئی کچھ بتانا تو دور کی بات ہے، بات کرنے کا روادار نہ تھا...... اس نے مایوس ہو کے ریسیور رکھ دیا۔

میں نے کہا۔ ”فون سے کچھ نہیں ہو گا۔“

”اس وقت کوئی کچھ نہیں کرے گا۔ میرے کچھ تعلقات ہیں مگر آدھی رات کو انہیں جگانا لاحاصل ہے۔ ایسا کوئی نہیں جو اٹھ کے میرے ساتھ سی آئی اے سینٹر چل پڑے۔ وہاں سے کسی کو بازیاب کرانا کسی کے بس کی بات نہیں...... عدالت عالیہ کے بیلف کے چھاپا مارنے سے بھی کچھ نہیں ہوتا۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے اندازہ ہے...... لیکن سفارش کے ساتھ پیسا تو لیا ہے...... یہاں دس خرچ ہوں تو وہاں سو ہوتے ہیں۔“

”مجھے معلوم نہیں رانا نے کس سے کام لیا ہے مگر کچا کام اس نے بھی نہیں کیا ہو گا...... بعض اوقات پیسا ہی نہیں چلتا...... فرض کر انہوں نے صوفی چچا کو غائب کر دیا...... تو جانتا ہے یہاں کتنے لوگ ہر سال ایسے ہی غائب ہو جاتے ہیں...... ان کا کہیں سراغ نہیں ملتا۔ ہر سکیورٹی ایجنسی...... قانون نافذ کرنے والے سارے ادارے...... سرکاری وکیل

راہلکار حلف نامے داخل کر دیتے ہیں کہ وہ ہماری تحویل میں بن...... برسوں سے لوگ لاپتا ہیں...... وہ کہہ سکتے ہیں کہ م فرار ہوگیا......"

میں نے کہا۔ "یہ غلط بھی نہیں ہوگا۔"

"کیا مطلب؟" وہ چونکا۔

"صوفی چچا کچھ دیر پہلے فرار ہو کے گھر آ گئے تھے۔ یس پھر پکڑ کے لے گئی۔" میں نے کہا۔

فاروقی نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ "پھر تو فاتحہ پڑھ لے ان پر...... وہ فرار نہیں ہوئے ہوں گے انہیں فرار کرایا گیا گا اب تو بس ایک ہی راستہ ہے فیکے پتر...... رانا سے بات ر لے......"

"اپنی تذلیل کرانے کے لیے...... کیا تجھے اندازہ نہیں کہ وہ کیا کہے گا؟" میں نے برہمی سے کہا۔

"تیرے لیے کاسوزیادہ اہم ہے تو پھر ٹھیک ہے...... بتا ینا اباجی کو کہ اپنے بھائی پر بھی فاتحہ پڑھ لیں۔"

"یہ نہیں ہوسکتا فاروقی...... مجھے کچھ کرنا ہوگا۔"

"کیا کرے گا تو؟ رانا کے چچا کو اٹھالائے گا؟" فاروقی تلخی سے بولا۔ "ٹینک اور توپ خانہ لے کر اس کے قلعے میں گھس جائے گا...... عقل سے کام لے یار...... اپنے لیے اور باقی سب کے لیے مزید پریشانی مت پیدا کر...... ابھی کچھ نہیں بگڑا...... تو کاسو کو رانا کے حوالے کرنے کی بات تو کر...... اپنی ناک نیچی کرنے میں کوئی بے عزتی نہیں...... رانا کو خوش ہونے دے کہ اس کا شملہ اونچا ہوگیا۔"

"اس سے بات کیے بغیر کچھ نہیں ہوگا۔" فریال نے بھی لب کھولے وہ ابھی تک خاموش بیٹھی تھی۔

"ہم پہلے صوفی چچا کو بچالیں...... ان کا پتا چل جائے...... اور ضروری ہو تو قیدیوں کا تبادلہ بھی عمل میں آ جائے۔"

میں نے کہا۔ "فاروقی یہ نہیں ہوسکتا۔"

"بکواس بند کر اپنی...... دنیا میں سب ہوتا ہے اور ہوسکتا ہے...... صوفی چچا کے مارے جانے کے بعد بھی وہ کاسو کو بھولے گا نہیں...... لیکن صوفی چچا کی موت بھی اتنی آسان نہیں ہوگی۔ تو بتا مجھے...... اگر انہوں نے اباجی سے بات کی یا ان پر دباؤ ڈالا۔ انہیں فون پر بھائی کے چیخنے چلانے کی آواز سنوا دی یا کوئی فلم بنا کے بھیج دی...... پھر کیا ہوگا؟ کیسے انکار کرے گا تو اباجی کو؟"

میں نے اپنا سر تھام لیا۔ "فاروقی...... صبح میں اباجی کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔"

"وہ بھائی کے ساتھ کورٹ جانا چاہیں گے کیسے روکے گا تو؟" فاروقی نے کہا۔

"جھوٹ بول کے؟"

"چل ٹھیک ہے اور ست بدھائی میں کیا انہیں قیدی بنا کے رکھے گا۔ ان کا کسی سے رابطہ نہ ہو۔ ان سے کوئی نہ ملے؟ وہ فون پر کسی سے بات نہ کریں...... بھائی کے لیے نہ پوچھیں...... جو تو سوچ رہا ہے ناممکن ہے...... میری مان جھوٹ بولنا ہے تو رانا سے بول...... اس سے وعدہ کر کہ کاسو کو واپس کر دیا جائے گا...... مگر صوفی چچا کو کچھ نہیں ہونا چاہیے...... تو معاملے کی سنگینی کو سمجھ نہیں رہا ہے ان کے خلاف ایک ایف آئی آر ہے...... رانا انہیں پولیس کی تحویل سے نکال کر تیرے حوالے نہیں کر سکتا...... لیکن انہیں مروایا جا سکتا ہے...... ہر وقت...... ہر جگہ...... تھانے میں یا جیل میں...... کسی بھی بہانے...... پولیس مقابلوں میں کتنے لوگ مارے جاتے ہیں کتنے حوالات میں خودکشی کر لیتے ہیں۔ صوفی چچا تو ویسے ہی پاگل ہیں...... کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ایک سنتری کی رائفل چھین کے افسر پر گولی چلائی...... مگر افسر بچ گیا ان کے خلاف ایک اور پرچا...... جوابی فائرنگ سے ان کا کام تمام......" وہ بات کرتے کرتے رک گیا۔

فریال نے کہا۔ "اندر فون کی گھنٹی بج رہی ہے۔ میں دیکھتی ہوں۔"

"یہ فون صوفی چچا کے بارے میں ہوگا۔ تو لکھ لے...... اتنی رات کو اور کسی کا فون نہیں آ سکتا۔"

میں نے کمزور سے لہجے میں کہا۔ "رانگ نمبر بھی تو ہوسکتا ہے۔"

فریال کارڈلیس فون کا ریسیور لیے نمودار ہوئی تو اس کی صورت دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ فاروقی کی پیش گوئی غلط نہیں تھی۔ اس کا چہرہ پیلا پڑا ہوا تھا کچھ کہے بغیر اس نے ریسیور میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے دل کو مضبوط کر کے کہا۔ "ہیلو......"

دوسری طرف سے رانا کی آواز سنائی دی۔ "اپنے نواب صاحب...... تم نے کچھ سوچا؟"

فریال اور فاروقی نے ریسیور سے کان لگا دیے اور میرے ایک کندھے پر دونوں طرف سے دباؤ ڈالتے رہے۔

ایزی...... ایزی...... انہوں نے اشارے سے کہا۔

میں نے کہا۔ "ابھی میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچا۔"

"تمہارے پاس دو گھنٹے ہیں۔" رانا نے کہا۔

"میرے لیے دو گھنٹے میں کاسو سے رابطہ ناممکن ہے۔"

رانا نے کہا۔ "وہ ڈاکو آج تم سے ملنے آیا تھا۔ تمہارے گھر تعزیت کے لیے پہنچا تھا...... تمہارا دوست اور ہمدرد ہے۔"

"آپ اسی سے پوچھ لیتے۔ کاسو برآمد ہو جاتا۔"

"بس ہمیں اطلاع ملنے میں کچھ دیر ہوگئی وہ نکل گیا۔ اب تو اجرک بھی پہنا گیا ہے تمہیں...... تم اس کی برادری میں شامل ہو چکے ہو۔ کیا وہ تمہاری بات نہیں مانے گا۔"

"مجھے نہیں معلوم وہ کہاں ہوگا۔"

"اسے فون کرو...... اور یہ مت کہنا کہ تمہارے پاس اس کا فون نمبر بھی نہیں ہے۔"

"کاسو مل جائے گا لیکن اتنی جلدی نہیں۔"

"دو گھنٹے بعد میں پھر فون کروں گا...... نمبر دوسرا ہوگا...... یہ موبائل فون اس کال کے بعد ضایع کر دیا جائے گا۔ یہ میرا نہیں ہے۔"

دو گھنٹے لاحاصل سوچ بچار اور بے مقصد پلان بناتے گزر گئے...... میری آنکھوں میں نیند کہاں سے آتی۔ میرے ساتھ فاروقی اور فریال بھی اتنے ہی اَپ سیٹ تھے۔ سوال صرف یہ تھا کہ دو گھنٹے بعد میں اس سے کیا کہوں گا...... صرف یہ کہ میں کاسو کو حاضر کرنے کا وعدہ ضرور کر سکتا ہوں مگر اسے حاضر نہیں کر سکتا۔ شامی سے میرا رابطہ ایک دیوانے مجذوب کے ذریعے تھا جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ پولیس کا مخبر ہے...... مختلف ذرائع سے پیغام شامی تک ضرور پہنچ جاتا تھا مگر اس کے لیے ضروری تھا کہ میں ست بدھائی جاؤں...... اس مجذوب کو تلاش کروں اور پیغام دوں کہ شامی مجھ سے فوراً ملے۔

یہ ہوسکتا تھا کہ شامی سے میری ملاقات ہو جائے۔ اسی دن یا اگلے دن...... وہ غلام محمد کے ساتھیوں کو لے جانے کے لیے خود ہی آ سکتا تھا...... ورنہ اپنے ساتھیوں کو بھیج سکتا تھا بہرصورت مجھے وقت درکار تھا۔ دو گھنٹے میرے ست بدھائی پہنچنے کے لیے بھی ناکافی تھے۔

میری نظر اب گھڑی پر تھی۔ ان دو گھنٹوں میں، میں نے کافی کے دو مگ اور خالی کر دیے تھے ایک کمرے میں ہم تین افراد اپنے اپنے خیالات کا عذاب جھیل رہے تھے۔ اسی گھر میں تین افراد نیند کی بے خبری میں گم تھے۔ دو گھنٹے کی ڈیڈ لائن پوری ہو رہی تھی۔ بالآخر ہم نے طے کیا تھا کہ اب فون آئے گا تو بات میں نہیں کروں گا...... بات فاروقی کرے گا۔ وہ رانا سے مہلت مانگے گا اور اسے ہر قسم کی ضمانت فراہم کرے گا کہ کاسو کو واپس کر دیا جائے گا لیکن اس کے بعد کیا ہوگا...... اس کی گارنٹی نہیں دی جا سکتی...... دونوں فریق اس معاملے میں اپنی مرضی سے کچھ بھی کرنے کے لیے آزاد ہوں گے۔

یہ کوئی اطمینان بخش حل نہیں تھا مگر صورت حال اتنی پیچیدہ تھی کہ کوئی حل آسان نہ تھا۔ میرے بس میں ہوتا تو میں خباثت کے اس مظاہرے پر رانا کو ایک بار نہیں دس بار ناقابل تصور اذیت اور ذلت کے ساتھ ہلاک کرتا مگر میری بے بسی ہی خود میرا عذاب بن گئی تھی۔ یہ فرض اور محبت کی کشمکش کی پرانی کہانی تھی۔ عقل اور جذبات کی کشمکش کے ایسے مرحلے ہر شخص کی طرح میری زندگی میں بھی آئے تھے مگر وہ ایسے نہ تھے۔ اگر یہ فلمی کہانی والی سچویشن ہوتی تو میں ہیرو کی طرح محبت کو فرض پر قربان کر کے سرخرو ہوتا مگر نہ میں ہیرو تھا اور نہ یہ تصوراتی افسانہ تھا...... یہ حقیقی زندگی تھی...... میں کمزور پڑ چکا تھا اور مجھے اپنی ہار سامنے نظر آ رہی تھی۔ خواہ اس کے بعد میں رانا پر ایٹم بم پھینک دوں مگر پہلے مجھے اپنی شکست تسلیم کرتے ہوئے کاسو کو رانا کے حوالے کرنا ہی پڑے گا۔ مجھ میں ہرگز اتنا دم خم نہ تھا کہ میں صوفی چچا کو قاتلوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دوں اور پھر اس صدمے سے اپنے باپ کو مرتے دیکھوں اور اس کے نتیجے میں اپنی ماں کو بیوگی کی سند عطا کروں۔

فریال نے اچانک کہا۔ "اس نے فون نہیں کیا۔"

میری نظر گھڑی پر گئی۔ دو بج کر دس منٹ ہو گئے تھے۔ ٹھیک دو گھنٹے پہلے رانا نے میری سنے بغیر فون بند کر دیا تھا۔ ان دو گھنٹوں میں ہم نے کچھ نہیں کیا تھا نہ ہم نے پولیس سے رابطہ کیا تھا نہ فون ٹیپ کرنے کا بندوبست نہ رانا کو ٹریپ کرنے کا کوئی پلان بنایا تھا۔

دروازے پر آہستہ سے دستک ہوئی۔ یہ فاروقی کی بیوی ہوتی تو بند دروازہ دیکھ کر اجازت طلب نہ کرتی۔ باہر سے چوکیدار نے کہا۔ "سر"

فاروقی نے دروازہ کھول کے دیکھا۔ "کیا بات ہے خان۔"

"سر...... آپ سے ملنے آیا ہے کوئی۔"

"کون ہے...... اندر لاؤ اسے۔" فاروقی نے کہا۔

"وہ بولتا ہے آپ باہر آ جاؤ...... ٹائم نہیں ہے۔" چوکیدار بولا۔

"تم نے پہلے کبھی دیکھا ہے اسے؟"

چوکیدار نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "نہیں سر۔"

اس وقت کسی کا آنا بے سبب ہرگز نہیں ہوسکتا تھا۔ رانا ہوشیار آدمی تھا۔ اس نے کہا تھا کہ فون کرے گا مگر اس نے

فون نہیں کیا تھا شاید کسی نامہ بر کو بھیج دیا تھا۔ اس بات کو بھی خارج از امکان قرار نہیں دیا جا سکتا تھا کہ وہ خود آ گیا ہو۔

فاروقی باہر گیا تھا تو اس کے پیچھے میں تھا اور میرا ریوالور ہاتھ میں نہیں تھا مگر میری دسترس میں بالکل تیار تھا۔ میری نظر گیٹ سے باہر کھڑی ہوئی گاڑی پر گئی تو میں نے ملاقات کے لیے آنے والے کو پہچان لیا۔ پرانی رنگ کی اس ہونڈا سوک میں تھانیدار کچھ دیر پہلے ہی اپنی فیملی کے ساتھ بیٹھ کر گیا تھا۔

''بہت خوب تھانیدار صاحب...... رانا نے آپ کو سفیر بنایا ہے۔'' میں نے تلخی سے کہا۔

وہ گاڑی سے باہر آیا۔ ''آپ میری مجبوری کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ میں سرکاری مشینری کا بہت حقیر پرزہ ہوں۔ حکم کا غلام۔''

''اچھا بولو کیا پیغام لائے ہو؟'' فاروقی نے تحمل سے کام لیا۔

''نواب صاحب کو میرے ساتھ جانا ہوگا...... اکیلے۔''

''کیا نواب صاحب تمہیں اتنے احمق لگتے ہیں اور یہ تم نے کیسے فرض کر لیا کہ میں انہیں جانے دوں گا۔'' فاروقی بگڑ کے بولا۔

تھانیدار نے کہا۔ ''وکیل صاحب...... میں اکیلا آیا ہوں...... نواب صاحب کی حفاظت کی ذمے داری میری ہے...... آپ مجھ پر بھروسا کریں۔''

''پولیس پر بھروسا......'' فاروقی بولا۔ ''کیا ضمانت ہے اس بات کی کہ آگے کہیں رانا کی غنڈا فورس موجود نہیں ہوگی۔ اس وقت اغوا کا ڈراما دیکھنے والا بھی کوئی نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے کہاں جانا ہوگا؟''

میرے پیچھے سے فریال چلائی۔ ''تم کہیں نہیں جاؤ گے۔''

تھانیدار نے کہا۔ ''ابھی معاملات میرے ہاتھ میں ہیں۔ صوفی کو صبح معمول کے مطابق عدالت میں پیش کر دیا جائے گا۔''

''مجھ سے تم نے کہا تھا وہ سی آئی اے سینٹر میں ہیں۔''

''ابھی ان کو واپس لایا جا سکتا ہے۔ زندہ سلامت...... کوئی ہے درمیان میں جو ضامن بننے کے لیے تیار ہے۔ بشرطیکہ آپ خود چل کے بات کر لیں۔ صبح کیا ہوگا یہ میں بھی نہیں جانتا مگر اچھا نہیں ہوگا نواب صاحب...... کسی کے لیے بھی۔ میرا معطل ہونا تو لازمی ہے...... کیا پتا برطرفی یا اس سے بھی آگے معاملہ چلا جائے...... ہاتھیوں کی لڑائی میں بے چارے مینڈک پس جاتے ہیں۔ آپ بھی مجھے چھوڑیں گے تو نہیں۔''

تھانیدار کی باتوں میں کسی عیار اور منجھے ہوئے ڈپلومیٹ کی گہرائی تھی۔ ایک طرف اس نے خود کو حقیر مینڈک قرار دیا تھا اور مجھے ہاتھی تو دوسری طرف یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ ابھی معاملات اس کے ہاتھ میں ہیں۔ اس نے بتا دیا تھا کہ ابھی صوفی چچا کو سی آئی اے سینٹر سے واپس لایا جا سکتا ہے اور اس کے ساتھ زندہ سلامت کے الفاظ جوڑ کر دھمکی بھی دے دی تھی کہ ممکن ہے صوفی چچا کی سی آئی اے سینٹر سے واپسی ہی نہ ہو یا ہو تو لاش کی صورت میں...... پھر جس کا جتنا دل چاہے اخبار میں شور کرے...... مظاہرے کرے یا کیس کرے۔

سوچنے کے لیے وقت کم تھا۔ میں اور فاروقی ایک ہی نتیجے پر پہنچے اور آنکھوں آنکھوں میں ہم نے تھانیدار کی ثالثی قبول کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

میں نے کہا۔ ''مجھے کہاں جانا ہوگا...... اور کس کے پاس؟''

''آپ میرے ساتھ جائیں گے اور میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔''

فریال نے پھر احتجاج کیا۔ ''تم کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ ان کے اکیلے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

میں نے کہا۔ ''آخر معاملے کو اتنا پراسرار بنانے کی کیا ضرورت ہے؟ تم جانتے تو ہو ہمیں جانا کہاں ہے؟''

''کیوں نہیں جناب...... جانا تو ہے جی او آر کالونی...... وہ کوئی خطرناک جگہ نہیں ہے حکومت کے اعلیٰ افسران رہتے ہیں۔''

''مجھے کسی اعلیٰ افسر نے طلب کیا ہے اور کیوں؟''

اس نے پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ ''مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ کوٹھی حکومت پنجاب کے وزارت داخلہ کے کسی ڈپٹی سیکریٹری کے نام الاٹ ہے لیکن ان کی اپنی فیملی تو ہے لندن میں۔''

''نئی فیملی......؟'' میں نے کہا۔ ''دوسری سوشل وائف۔''

''دوسری تیسری کا تو مجھے علم نہیں...... صاحب کے بارے میں سنا ہے کہ وہ عموماً وہ کے ٹی پی ہوسٹل میں رہتے ہیں ویک اینڈ پر چلے جاتے ہیں لندن۔''

''جب اتنا جانتے ہو تو ان کا نام بتانے میں کیا حرج ہے۔'' فریال نے ناراضی سے کہا۔

''قریشی صاحب...... اے وائی قریشی...... یا شاید اے آر قریشی...... کوٹھی میں ان کے کوئی عزیز رہتے ہیں۔''

فاروقی نے کہا۔ ''کوٹھی کرائے پر اٹھانے والے بھی

کہتے ہیں...... مگر خیر...... یہ بتاؤ کہ میرے ساتھ جانے پر تمہیں اعتراض ہے اگر میں پیچھے رہوں اپنی گاڑی میں۔''

''مال روڈ پر میری اجارہ داری تو نہیں ہے۔ آگے پیچھے کوئی بھی ہو مگر یہ تو آپ کو بھی پتا ہوگا کہ اس وقت اندر جانے کی اجازت ہر ایک کو نہیں ملتی۔''

''مجھے کوئی نہیں روکے گا۔''

''ٹھیک ہے وکیل صاحب...... آپ کوٹھی کے باہر سڑک پر اپنی گاڑی میں بیٹھ کے انتظار کرنا چاہتے ہو تو آپ کی مرضی۔'' وہ بیزاری سے بولا۔

بحث میں مزید وقت ضایع کرنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ تھانے دار کے آنے سے مایوسی کے اندھیرے میں اُمید کی ایک کرن ضرور روشن ہو گئی تھی۔ اگر میں اس موقع سے فائدہ نہ اٹھاتا تو مجھے ہمیشہ یہ ملال رہتا کہ میں نے بزدلی دکھائی اور صوفی چچا کی زندگی بچانے کا چانس ضایع کر دیا۔

تھانیدار اس وقت ذاتی گاڑیاں میں آیا تھا۔ اس کو ڈرائیو بھی وہ خود ہی کر رہا تھا۔ گاڑی فاروقی کی کوٹھی سے نکلی تو اس کے پیچھے پیچھے فاروقی کی گاڑی بھی روانہ ہوئی۔ فریال کی حالت اس وقت ایسی ہو رہی تھی جیسے میں جان ہتھیلی پر رکھ کے خودکش حملہ کرنے کے لیے دشمن کے قلعے میں جانے والا مجاہد ہوں جس کی واپسی کا کوئی امکان نہیں کیونکہ بعد از شہادت اسے سید ھا جنت کا ٹکٹ کٹانا ہے۔

تھانیدار کی باتوں نے کسی حد تک مجھے مطمئن کر دیا تھا۔ کسی ناگہانی آفت میں گرفتار ہونے کا امکان اب کم تھا کیونکہ اس کے ساتھ میرے جانے کا ایک اہم گواہ خود فاروقی تھا جو کوئی عام وکیل نہیں تھا۔ اپنے پیشے میں اس کی ناموری اور ساکھ بیس برس کی محنت کا ثمر تھی۔ کوئی عدالت اس کی بات کو محض عدم ثبوت کی بنا پر مسترد نہیں کر سکتی تھی۔

رانا کی یہ چال بہت خطرناک تھی۔ اس سے بازی تو مات نہیں ہوتی تھی لیکن دشمنی کی اس بساط پر میرے وہ مہرے مارے جاتے جن کے بغیر زندگی کی بازی میں ہار جیت کی کوئی اہمیت ہی نہ تھی تو میرے لیے اس کھیل کو جاری رکھنے کا جواز بھی ختم ہو جاتا تھا۔

رات کے وقت شہر کی سڑکوں پر ویرانی کا راج تھا۔ دن میں گاڑیوں کا اژدھام اور ٹریفک جام منٹوں کے سفر کو گھنٹوں میں بدل دیتا تھا۔ اس کے مقابلے میں سامنے اور پیچھے سے آنے والی اِکا دُکا گاڑیوں کی کوئی اہمیت نہ تھی لیکن مجھے یوں لگتا تھا کہ اس وقت اپنی خواب گاہوں میں سکون اور عاقبت کی نیند کی قربانی دینے والے سب میرے جیسے مجبور اور بے بس لوگ ہیں۔ ان کی مجبوری کی نوعیت مختلف ہوگی۔ کوئی اسپتال جانے کے لیے مجبور ہوگا تو کوئی فلائٹ پکڑنے کے لیے ائرپورٹ پہنچنا چاہتا ہوگا لیکن پھر ہم نے ایک گاڑی کو کراس کیا تو میرا یہ خیال غلط ہو گیا۔

اس گاڑی میں ایک مرد اور ایک عورت رفاقت کے لمحات سے مسرت کشید کرنے میں گم تھے۔ وہ رات کی خاموشی اور خلوت سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ مرد گاڑی کو خراماں خراماں آگے بڑھا رہا تھا اسے کوئی جلدی نہیں تھی۔ وہ فاصلے اور وقت کے احساس سے بے نیاز تھا۔ اس کے لبوں پر فتح مندی کی مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں نشہ تھا۔ کیونکہ عورت بہت خوب صورت تھی اور اس کے بہت قریب تھی وہ اٹھلا کے ہنسی۔ اس نے بالوں کو ایک ادائے ناز سے جھٹکا اور اپنا سر مرد کے کندھوں پر ٹکا دیا۔

اچانک تھانیدار نے کہا۔ ''نواب صاحب یہ صوفی صاحب واقعی آپ کے چچا ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''اس فضول سوال کا مقصد؟''

''میں نے سنا ہے وہ کچھ مشکوک قسم کے دھندے کرتے ہیں آپ تو خیر سے خاندانی لوگ ہو۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ۔''

''یہ بتاؤ پولیس کے نزدیک کون سا دھندا مشکوک نہیں ہے؟''

''دیکھو جی...... جو پیری مریدی والے لوگ ہیں۔ جن کے اشتہار آپ شہر کی ہر دیوار پر دیکھتے ہو...... آج کل تو پورے پورے صفحے کے اشتہار نظر آنے لگے ہیں ہر اخبار، رسالے میں...... فلانہ بنگالی...... فلانہ عامل...... پہلے گارنٹی نہیں ہوتی تھی۔ اب تو دعوے کرتے ہیں کہ چٹکی بجاتے میں آپ کے دل کی مراد پوری نہ ہو تو......''

میں نے کہا۔ ''صوفی چچا یہ سب نہیں کرتے۔''

وہ ہنسنے لگا۔ ''اس لیے کہ وہ آپ کے چچا ہیں...... پیری مریدی میں آج کل کیا ہو رہا ہے۔ ہزاروں جعلی پیروں فقیروں کے مزار ہیں...... خانقاہیں بن گئی ہیں...... خوب عرس اور میلے ہوتے ہیں...... وہاں کیا ہوتا ہے سوائے فراڈ کے۔ ہمیں تو معلوم ہے کہ جوا منشیات اور بردہ فروشی...... سب۔''

میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''تم کیا کہنا چاہتے ہو...... صوفی چچا بھی یہی کرتے ہیں؟''

''مجھے کیا پتا...... مگر کیس تو بن جائیں گے...... اگر ضرورت پڑی۔''

''تم مجھے دھمکی دے رہے ہو۔''

وہ مسکرانے لگا۔ ''ان پر کیس بنانے میں میرا کوئی انٹرسٹ نہیں اگر کچھ نہیں ہوگا تو آپ سے ویسے ہی لے لوں گا۔''

''پھر کس کا انٹرسٹ ہے؟''

''یہ آپ کو اچھی طرح معلوم ہے نواب صاحب...... پھر آپ جانتے بوجھتے انجان کیوں بن رہے ہو...... برا نہ مانیں تو میں آپ کو ایک مشورہ دوں...... آپ مصالحت کرلیں۔''

''کس سے؟'' میں نے اسے غور سے دیکھا۔

''اپنے دشمن سے اور کس سے...... تھوڑا سا پیچھے ہٹ جائیں سارے اصولوں سے۔''

میں نے کہا۔ ''ورنہ کیا ہوگا؟''

''دیکھو جناب...... آپ ولایت میں رہ کے آئے ہو...... آپ کے مقابلے میں تو ہم ان پڑھ ہیں لیکن ہم زندگی کا وہ تجربہ رکھتے ہیں جو آپ کے پاس نہیں ہے۔ آپ کتنا عرصہ باہر رہے ہو؟''

''آٹھ سال۔'' میں نے کہا۔

''آپ شاید یہ سمجھتے ہو کہ آٹھ سال پہلے جتنی خرابی تھی وہ بہت کم ہوگئی ہے...... کیونکہ ہم اکیسویں صدی میں داخل ہو گئے ہیں؟ اور ٹی وی پر حکومت کے وزیر یہی راگ الاپتے رہتے ہیں کہ اب نہ بدعنوانی ہے نہ غربت، نہ مہنگائی اور نہ بے روزگاری۔ لوگ بہت خوش اور مطمئن زندگی گزار رہے ہیں اور اس حکومت کی ہر پالیسی کامیاب ہے۔ وزیراعظم اور صدر نے اپنا ہر وعدہ پورا کر دیا ہے چنانچہ ان کو تاحیات اس عہدے پر رہنے کا حق حاصل ہے۔''

میں نے حیرانی سے کہا۔ ''یہ آج تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟''

''میں ایک عام پاکستانی شہری کی زبان بول رہا ہوں اس لیے آپ کو کچھ عجیب لگ رہا ہوگا۔ کبھی کبھی ہمارا ضمیر بھی ہمیں سچ بولنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ ایک آدمی محض اس لیے نقصان اٹھا رہا ہے کہ وہ کتابی باتیں کرتا ہے۔ خیالی دنیا میں رہتا ہے۔ کسی خوب صورت جھیل کے کنارے کاٹج میں بیٹھ کے کافی پیتے اور موسیقی سنتے ہوئے طلوع آفتاب کا منظر دیکھتے ہوئے زندگی میں صرف خوب صورتی نظر آتی ہے لیکن میں رہتا ہوں بڑی بدصورتی اور بدکرداری کی دلدل میں۔''

''تم بھی کتابی زبان میں بات کر رہے ہو۔''

''سرجی...... میری صورت پر اور وردی پر نہ جائیں...... دس سال پہلے میں نے بھی اُردو میں ایم اے کیا تھا۔ میں لکھنے پڑھنے والا آدمی تھا۔ مقابلے کا امتحان بھی پاس کرلیا تھا مگر پھر کچھ حالات ایسے بنے کہ میں پولیس میں آگیا...... میرے والد بھی پولیس کے اعلیٰ افسر تھے انہوں نے مجھے ڈائریکٹ اے ایس آئی بھرتی کرا دیا۔ بس اس کے بعد وہی ہوا جو ہونا تھا۔ میں تھانیدار بن گیا۔ بھول گیا اردو ادب کو...... فارسی میں کہتے ہیں ہر کہ درکان نمک رفت نمک شد...... یعنی نمک کی کان میں جو گیا نمک ہوگیا تو میں بھی پولیس کے محکمے میں وہی ہوگیا جو سب ہیں۔''

''مجھے واقعی افسوس ہے کہ تم نے خود کو ضایع کیا۔''

''افسوس تو مجھے بھی ہوتا ہے کبھی کبھی۔ افسوس آپ کو بھی ہوگا اگر آج آپ نے میری بات نہ سنی۔ مجھ پر انسانیت کا دورہ بہت عرصے بعد پڑا ہے پہلے روز پڑتا تھا پھر نوکری کی مجبوری نے قائل کرلیا کہ شرافت اور جرائم کی دنیا کے تقاضے ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ کوئی بیک وقت اچھا انسان اور اچھا تھانیدار ہونا بھی چاہے تو نہیں ہوسکتا۔ اب میں اچھا تھانیدار اور برا آدمی کہلاتا ہوں تو کام چل رہا ہے۔ میرا بھی...... سرکار کا بھی...... نام ہے میرا رحمدل خان آفریدی۔''

میں نے دلچسپی سے کہا۔ ''گویا آر کے آفریدی کی تفصیل یوں ہے۔''

''ہاں...... لیکن میں سنگدل خان آفریدی مشہور ہوں۔ اب جو میں کہہ رہا ہوں وہ غور سے سنو۔''

''میں سن رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''اگر تم نے اس موقع سے فائدہ نہ اٹھایا تو صبح ختم ہونے والی بات کبھی ختم نہیں ہوگی۔''

''کیا مطلب؟''

''اوپر سے آرڈر موصول ہوئے ہیں۔ ایسے آرڈر ہمیشہ زبانی دیے جاتے ہیں کہ صوفی کے خلاف تفتیش کو لمبا کر دو۔''

''یعنی صبح عدالت صوفی چچا کو جوڈیشل ریمانڈ پر جیل نہیں بھیجے گی۔ پولیس کو ان کا جسمانی ریمانڈ دے دیا جائے گا۔''

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''فی الحال چودہ دن کا۔''

''اور چودہ دن تک ان پر تشدد کر کے تم ہم پر دباؤ ڈالتے رہو گے...... ہم نہ مانے تو انہیں مار دو گے؟'' میں نے برہمی سے کہا۔

''مارنا تو بہت دور کی بات ہے سرجی...... ان پر کیس ڈالے جائیں گے۔''

گاڑی جی او آر کے بیریر پر رکی تو تھانیدار کی زبان بھی

رک گئی۔ گارڈ آگے آیا اور اس نے جھک کر سوال کیا۔ ''کہاں جانا ہے سر؟'' پھر اس کی نظر نے تھانیدار کو دیکھا اور اس کی صورت کا تاثر ایک دم معذرت خواہانہ ہوگیا اس نے کہا۔ ''سوری سر...... آپ جائیں۔''

''یہ پہلے پولیس میں ملازم تھا۔ ایمانداری کے ایک کیس میں برطرف ہوا۔ میں نے یہاں رکھوا دیا تھا۔'' آفریدی نے وضاحت کی۔

میں نے اپنے پیچھے دیکھا۔ فاروقی کی گاڑی کو روک لیا گیا تھا۔ وہ سکیورٹی گارڈ سے بحث میں مصروف تھا۔ میں نے کہا۔ ''گاڑی روک لو...... فاروقی بھی آجائے۔''

''وہ آجائیں گے نواب صاحب...... تسلی رکھیں۔''

''کیسے آجائیں گے...... کیا انہیں معلوم ہے کہ ہم کہاں جارہے ہیں؟''

تھانیدار نے سکون سے جواب دیا۔ ''گارڈ بتا دے گا۔''

گورنمنٹ آفیسرز ریذیڈنسی کو مختصراً جی او آر کہا جاتا تھا اور یہ مال پر واقع پرانی لیکن سب سے زیادہ رُعب و دبدبہ رکھنے والی کالونی تھی جہاں رہنے والے ملک کے سیاہ و سفید کے مالک سمجھے جاتے تھے۔ صاف ستھری کشادہ اور سرسبز گلیوں میں خاموشی کا انداز بھی انتہائی پر ہیبت تھا۔ ہر گیٹ پر مسلح محافظ مستعد کھڑے تھے اور ان کے پاس کسی بھی مشکوک نظر آنے والے شخص کو گولی مار دینے کا اختیار تھا۔

گاڑی نے دو ٹرن لیے اور پھر ایک کوٹھی کے دروازے پر رک گئی۔ مجھے فاروقی کی طرف سے تشویش لاحق تھی۔ ''کیا گارڈ کو معلوم تھا کہ تمہیں کس کوٹھی میں جانا ہے؟''

''معلوم نہ ہوتا تو وہ مجھ سے بھی پوچھتا۔'' تھانیدار نے سرسری انداز میں کہا۔

اس کے جواب نے مجھے مطمئن نہیں کیا تھا لیکن گاڑی اب گیٹ کے اندر پہنچ گئی تھی۔ اس نے انجن بند کیا اور نیچے اتر گیا۔ میں نے دیکھا کہ میرے پیچھے گیٹ بند کر دیا گیا ہے۔

''تم نے مجھے چکر دیا ہے نا؟''

تھانیدار نے کہا۔ ''آپ ناحق پریشان ہو رہے ہیں۔ آیئے ہم بیٹھتے ہیں وہ آجائیں گے۔''

ایک انتہائی روشن اور آراستہ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کے میں نے فاروقی سے موبائل پر رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ وہ زیادہ پیچھے نہیں تھا۔ چند منٹ کے فرق سے اسے بھی آجانا چاہیے تھا مگر ایسا لگتا تھا کہ عمداً اسے روک لیا گیا ہے۔ اس کے موبائل فون سے میرا رابطہ نہیں ہوا۔ میرا فون کام ہی نہیں کر رہا تھا۔ اس میں عجیب سا شور سنائی دے رہا تھا۔

تھانیدار میرے سامنے بیٹھ گیا۔ ''چھوڑیں نواب صاحب۔''

میں نے کہا۔ ''کیا میرا فون جام کر دیا گیا ہے؟''

''ہوسکتا ہے...... یہاں سکیورٹی رسک پر سب کچھ ممکن ہے۔''

''مطلب یہ کہ فاروقی نہیں آئے گا؟''

''وہ کھڑا ہوگا باہر...... میں نے تو اسے بتا دیا تھا وہ اندر نہیں آسکتا۔''

''کیا مجھے یہاں تفتیش کے لیے لایا گیا ہے؟ میں زیرحراست ہوں؟''

''ہرگز نہیں......''

''جھوٹ بولتے ہو تم۔'' میں نے برہمی سے کہا۔

''جھوٹ سچ کا اندازہ آپ کو ہو جائے گا۔ ابھی کچھ ٹائم ہے ہمارے پاس۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ معاملہ کافی پے چیدہ ہوگیا ہے۔'' وہ عیاری سے بولا۔ ''یہ معلوم ہوا ہے کہ صوفی نذیر کے آستانے پر کچھ مشکوک لوگوں کا آنا جانا تھا۔''

میں نے تلخی سے کہا۔ ''تم مجھے بتا رہے ہو کہ ان کے خلاف کیا کیس بنائے جائیں گے۔''

''جب رپورٹ ملے تو تفتیش کرنی ہی پڑتی ہے سر۔''

میں نے کہا۔ ''کون تھے یہ مشکوک لوگ؟''

''پتا چل جائے گا۔'' وہ خالص تھانیداری انداز میں بولا۔ ''ہمارے مخبروں نے پہلے بھی بتایا تھا کہ وہاں خفیہ طور پر ایک اڈا چل رہا ہے۔''

''کس چیز کا؟ بدکاری کا؟''

''وہ تو گھر گھر چل رہے ہیں جناب...... اور اڈا کسی بھی چیز کا ہوسکتا ہے جھوٹ سچ بعد میں سامنے آتا ہے کہ صوفی صاحب کیا کرتے تھے...... چھاپا مار کے ہم کچھ بھی برآمد کر سکتے ہیں۔ اعلیٰ درجے کی ہیروئن جس کی مالیت کروڑوں میں ہو...... اصلی ہیروئن بھی مل جاتی ہے ثبوت کے لیے...... مگر آٹے میدے سے بھی کام چل جاتا ہے...... صحافی اپنے ہی بندے ہوتے ہیں...... ثبوت نہیں مانگتے۔''

میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''اس کے علاوہ؟''

''اس کے علاوہ کچھ درخواستیں موصول ہوئی تھیں۔ صوفی صاحب نے مراد پانے کے لیے آنے والی لڑکیوں کے ساتھ کیا چکر چلائے۔ جن اتارنے...... اولاد کی خواہش...... شوہر کو تابع رکھنے یا ساس کی موت کے لیے عمل کرانے عورتیں ہی آتی ہیں...... مرد تو بس نوکری کی مراد مانگتے ہیں...... یا

زیادہ سے زیادہ محبوب کو اپنے قدموں میں......"

"تھانیدار کچھ خدا کا خوف کرو۔"

وہ بے رحمی سے ہنسا۔ "ان اللہ لوک بندوں کو اللہ کا ڈر نہیں تو مجھے کیوں ڈراتے ہو...... دو چار کیس کافی ہوں گے صوفی صاحب کی اصلیت سامنے لانے کے لیے...... بدقسمتی آپ کی یہ ہے کہ وہ آپ کے چچا ہیں۔ داؤ پر تو آپ کی عزت لگ رہی ہے اور آپ کے اباجی کی...... جو ساری عمر نونہالان وطن کو زیور تعلیم سے آراستہ کرتے رہے۔ بڑا فخر تھا ان کو اپنی عزت پر۔"

میں نے کہا۔ "ہماری عزت محفوظ رہے گی۔ صوفی چچا کے لیے صفائی کے گواہ بہت ہیں...... اس کے علاوہ کیا عدالت یہ نہیں دیکھے گی کہ وہ پاگل ہیں۔"

"عدالت؟" وہ ایسے حیران ہوا جیسے یہ لفظ اس نے پہلی بار سنا ہو۔ "ابھی سے آپ عدالت کہاں پہنچ گئے۔ ابھی تو سی آئی اے سینٹر میں تفتیش کے دوران یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ صوفی پاگل نہیں ہے۔ ڈبرے قتل کے الزام میں پھانسی کا پھندا پڑا ہے گلے میں تو پاگل بن گیا ہے۔"

"رائے تمہاری نہیں ماہر ڈاکٹروں کی ہوگی۔"

"کون سے ماہر ڈاکٹر...... جب وقت آئے گا تو سرکاری اسپتال کا ڈاکٹر وہی رپورٹ دے گا جس کا حکم ملے گا وہ بھی بہت معمولی سرکاری ملازم ہی ہوتا ہے پھر آپ کرنا اپیل...... ہائی کورٹ میں...... ہائی کورٹ ایک میڈیکل بورڈ تشکیل دے گی...... آپ کو ایک راز کی بات بتاؤں؟ یہ جو سی آئی اے سینٹر والے ہیں یہ بڑے کاریگر لوگ ہوتے ہیں کیا پتا میڈیکل بورڈ میں کون ہو۔ زمانہ ایسا ہے کہ دین ایمان کسی کا سلامت نہیں خوف خدا اٹھ گیا ہے...... اگر بورڈ نے بھی رپورٹ دے دی کہ صوفی صاحب تو پرانے ڈرامے باز ہیں ان کا دماغ بہت تیز ہے اور ہم سب سے بہتر ہے...... پھر کیا ہوگا؟ یہ بھی سمجھ لو کہ اس ساری کارروائی میں دو مہینے بھی لگ سکتے ہیں اور دو سال بھی۔"

جیسے جیسے میں اس کی بات کو سمجھ رہا تھا میرے اندر کا سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ رہا تھا۔ میری مزاحمت کی خواہش دم توڑ رہی تھی اور میرا مقابلے کا حوصلہ کسی طوطا چشم ساتھی کی طرح ساتھ چھوڑ رہا تھا۔

معلوم نہیں تھانیدار کتنی دیر بولتا رہا اور کیا کہتا رہا پھر اس نے مجھ سے کوئی سوال کیا تو میں چونکا۔ "کیا پوچھا تم نے؟"

وہ خباثت سے ہنسا۔ "میں نے ایک سیدھا سا سوال کیا تھا کہ آپ کے والد نے ساری عمر عزت کمائی۔ یہی ان کا سارا اثاثہ تھا یا پھر خونی رشتے تھے...... اب کیا ہے ان کے پاس؟ مانا آپ کے پاس بہت دولت ہے مگر کیا وہ دولت کو اتنی ہی اہمیت دیتے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "میں تمہاری ساری بات سمجھ رہا ہوں تم مجھے بلیک میل کر رہے ہو۔"

"میری آپ سے کیا دشمنی ہے نواب صاحب۔"

"چلو الفاظ بدل دو...... تم میرے کسی دشمن کی طرف سے مجھے بلیک میل کرنے کی دھمکی پہنچا رہے ہو...... ابھی تم نے شاید یہ بھی کہا تھا کہ قتل کی اصل کہانی کچھ اور تھی۔"

"اصل کہانی وہی تھی جو آپ نے بتائی...... مگر جیسے کسی ناول پر مبنی فلم میں ضرورت کے تحت تبدیلی کر دی جاتی ہے ایسے ہی یہ کہانی نظریہ ضرورت کے تحت بدلی جا سکتی ہے یہ نظریہ ضرورت بھی کمال کی چیز ہے ہر مرض کی دوا...... یہ حکومت پر غاصبانہ قبضے کو جواز عطا کرتا ہے...... چور ڈاکو کو مظلوم بنا دیتا ہے...... چوری میرا پیشہ تھا نہ میرا فرض...... یہ بھی نظریہ ضرورت کا فلسفہ ہے...... تو فرض کرو کہانی یوں کر دی جائے کہ تمہارے صوفی صاحب کے پاس لگی بندھی آمدنی کا ذریعہ بھی نہ تھا۔ پیری مریدی کے نام پر عیاشی بھی کرتے رہے...... ایسے میں بیوی بھی ادھر ادھر جانے لگی۔"

میں نے چلا کے کہا۔ "شٹ اپ۔"

"حوصلہ نواب صاحب حوصلہ...... ہر فلمی کہانی جھوٹ پر مبنی ہوتی ہے پھر بھی آپ شوق سے دیکھتے ہو۔ دادی پرانے وقتوں کی عورت...... بہو کو بہت روکتی ٹوکتی تھی لیکن بیٹے کو بتاتے ہوئے ڈرتی تھی کہ نہ جانے غصے میں کیا کر گزرے...... انتہا اس وقت ہوئی جب ماں نے بیٹی کو بھی ایسے راستے پر چلانا چاہا...... اور دھمکی دی کہ اب پانی سر سے گزر گیا...... مجھے نذیر کو بتانا ہی پڑے گا بس اس کے بعد بہو نے ساس کو زہر دے کر اس کا پتا تو صاف کر دیا مگر دوسری بہو، سب جانتی تھی اس نے اپنے میاں کو بتایا...... یعنی تمہارے والد کو...... انہوں نے بھائی کو ذلیل اور بے غیرت کہا...... بھائی نے بیوی کو مار ڈالا۔"

معلوم نہیں مجھے کیا ہوا...... میں نے پاگل کتے کی طرح غرا کے تھانیدار پر حملہ کیا۔ وہ یہی چاہتا تھا اور اس کے لیے بالکل تیار تھا۔ اس نے میرے منہ پر پوری قوت کے ساتھ گھونسا مارا۔ میں پلٹ کے پیچھے گرا تو اس نے ریوالور نکال لیا۔

میری دیوانگی کا ابال سوڈے کی بوتل جیسا تھا۔ نیچے گرتے ہی مجھے ہوش آ گیا۔ میں سنبھل کے آہستہ آہستہ اٹھا۔

میرے دانت اور جبڑے تو سلامت رہے تھے لیکن منہ سے خون رسنے لگا تھا۔ زیادہ اچھی بات یہ تھی کہ میری عقل ٹھکانے آ گئی تھی۔ میں اس قابل تھا کہ تھانیدار جیسے چار کو چت کر دوں مگر مجھے ٹھنڈا کرنے کے لیے دو انچ کی ایک گولی کافی تھی جو ریوالور کی نالی کے اندر انگلی کے ایک اشارے کی منتظر بیٹھی تھی۔

"جاؤ منہ دھو لو۔" تھانیدار نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "اب تمہاری ملاقات کراتے ہیں۔ جس کے لیے میں نے تمہیں بریف کیا ہے۔ دو بڑوں کی فیصلہ کن میٹنگ سے پہلے ایسی بریفنگ ہو جائے تو تصفیہ طلب امور پر ضروری بحث میں وقت ضائع نہیں ہوتا۔"

منہ دھونے کے بعد مجھے بائیں جبڑے میں درد کے ساتھ سوجن کا احساس ہوا۔ اب یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو چکی تھی کہ تھانیدار بڑی ہوشیاری سے مجھے گھیر لایا ہے۔ اسے نہ حراست کہا جا سکتا تھا نہ اغوا، میں اپنی خوشی سے آیا تھا اور کچھ ثابت نہیں کر سکتا تھا لیکن مجھ پر واپسی کے راستے بند کر دیے گئے تھے۔ میں صرف اس صورت میں واپس جا سکتا تھا کہ اپنے دشمنوں کی شرائط پر صلح نامہ کروں ورنہ فاروقی جیسے دس وکیل اور شرلاک ہومز جیسے دس سراغ رساں کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

تھانیدار نے کہا۔ "آئی ایم سوری نواب صاحب۔"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے، یہ بتاؤ مجھے رانا صاحب کے سامنے کب پیش کیا جائے گا؟"

اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا۔ "آپ کبھی مجھے اپنے دشمنوں یا بدخواہوں میں شمار نہ کریں۔ میں درحقیقت ایک ایسے ثالث کا رول ادا کر رہا ہوں جو سیز فائر کرانے کے لیے دونوں متحارب فریقوں کو سمجھاتا ہے کہ جنگ میں نہ ہار ہوتی ہے اور نہ جیت...... صرف تباہی ہوتی ہے۔ میں اب چلتا ہوں۔"

میں نے اس سے ہاتھ نہیں ملایا مگر اس نے کوئی خفت محسوس نہیں کی۔ وہ اس دروازے سے باہر چلا گیا جس سے ہم اندر آئے تھے اور عین اسی وقت بالکل ڈرامائی انداز میں دوسرا دروازہ کھلا اور دوسرے ایکٹ کے پہلے سین میں ایک لڑکی نے انٹری دی۔ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا وہ ایک خادمہ تھی۔ ویسی ہی جیسی اس قسم کی کوٹھی میں یا ایسے لوگوں کی ہوتی ہے...... جوان...... خوب صورت...... اسمارٹ اور ہر خدمت کے لیے تیار...... ملٹی پرپز...... بھروسے کے قابل اور معاملہ فہم...... اسے سیکریٹری کا معزز نام دیا جا سکتا ہے۔

جو کچھ اس گھر میں اور میرے ساتھ ہو رہا تھا اسے دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے یہ سب کاروبار حیات کا حصہ اور زندگی کا معمول ہے۔ جیسے کوئی عام بزنس ڈیل یا طے شدہ میٹنگ...... اور اس وقت جو گھڑی تین بجا رہی ہے تو یہ رات کا نہیں صبح کا وقت ہے۔

سیکریٹری نے بڑی شائستہ مسکراہٹ کے ساتھ مجھے مدعو کیا۔ "تشریف لائیے سر۔"

مردہ بدست زندہ...... اپنی مرضی سے میں انکار بھی نہیں کر سکتا تھا اور اس کا فائدہ بھی کچھ نہ تھا میں نے اپنی متانت اور اعتماد کے اظہار میں فرق نہیں آنے دیا اور یوں دروازے کی طرف بڑھا جیسے نہ میں حیران ہوں نہ پریشان...... نہ برہم ہوں اور نہ خوف زدہ...... لیکن دروازے سے گزرتے ہی مجھے جو جھٹکا لگا وہ بالکل غیر متوقع تھا۔

ذہنی طور پر نہ جانے کیوں میں نے فرض کر لیا تھا کہ مجھے شرف ملاقات عطا کرنے کے لیے رانا نے طلب کیا ہے مگر یہاں میرے سامنے ایک صوفے پر اکبر خان براجمان تھا۔ اس کے بدن پر شب خوابی کا لباس بہت بہترین سوٹ تھا۔ اس نے ٹائی بھی لگا رکھی تھی اور عینک بھی۔ اس حلیے میں وہ ایک معتبر بزنس مین یا بیوروکریٹ لگتا تھا اگر میں کسی سے کہتا کہ یہ میرا اجدی پشتی ملازم اور چوکیدار تھا جو کچھ عرصہ قبل میری حویلی کے ایک سرونٹ کوارٹر میں رہتا تھا جہاں اس کی بیوی اور بچے آج بھی موجود ہیں تو یہ بات سننے والا میری ذہنی صحت کے بارے میں شکوک کا شکار ہو جاتا۔

اکبر خان بڑے اعتماد سے اٹھا۔ "آیئے نواب صاحب...... تشریف رکھیے۔"

ابتدائی صدمے سے سنبھل جانے کے بعد میں پرسکون ہو کے بیٹھ گیا۔ اب مالک اور ملازم کے پرانے رشتے کی بات بھی پرانی ہو گئی تھی۔ ماضی کے حوالے سے غم و غصہ لاحاصل تھا۔ اکبر خان کے ساتھ حقارت آمیز سلوک روا رکھنے اور اسے اپنی اوقات یاد دلا کے ذلیل کرنے میں کوئی فائدہ نہ تھا حالات کا تقاضا تھا کہ حقائق کتنے ہی تلخ سنگین اور ناقابل قبول کیوں نہ ہوں...... انہیں تسلیم کیا جائے۔

کوٹھی کی آرائش کا انداز شاہانہ سے بھی بڑھ کر مرعوب کن تھا۔ مجھے سوچنے کے لیے وقت ہی نہیں ملا تھا کہ اکبر خان کے سامنے میرا رویہ کیسا ہونا چاہیے۔ میں رانا کا سامنا کرنے آیا تھا اور اسی حساب سے سوال جواب کے لیے تیار تھا۔

اکبر خان نے خود ہی چند سیکنڈ کے بعد کہا۔ "یہ میری کوٹھی نہیں ہے۔"

میں نے رُکھائی سے کہا۔ ''ہوتی بھی تو مجھے فرق نہیں پڑتا..... مجھے آفریدی نے سب بتا دیا ہے یہ بتاؤ مجھے کیوں بلایا ہے۔''

''دیکھیے نواب صاحب..... میں آج بھی آپ کی اتنی ہی عزت کرتا ہوں جتنی پہلے کرتا تھا۔''

میں نے طنز سے کہا۔ ''جس طرح مجھے لایا گیا ہے وہ یقیناً اس کا ثبوت ہے۔ تم بلاتمہید بات کرو۔''

''میں چند منٹ لوں گا۔ صورت حال کی وضاحت کے لیے اور پھر ان معاملات کی طرف آتے ہیں۔ جو حل طلب ہیں۔'' اس نے کرسٹل ٹاپ ٹیبل پر سے ایک بلوریں جام اٹھا کے بڑے ارسٹوکریٹک انداز میں ایک چسکی لی۔

چند سیکنڈ کے وقفے کے بعد اس نے بولنا شروع کیا۔

''میرا خیال ہے کہ پرانے وقتوں کا رشتہ اب بے وجود ہو چکا ہے چنانچہ ہم بات کریں گے برابری کی سطح پر..... کل میں کیا تھا اور آپ کیا تھے..... یہ قطعی غیر اہم ہے..... آج اگر آپ کی تعلیم زیادہ ہے تو میری عمر زیادہ ہے۔ دولت مندی میں مقابلہ بھی فضول ہوگا۔''

''میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ تمہید کی ضرورت نہیں۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''میرے نزدیک یہ تمہید ضروری تھی۔ خیر آپ کو انسپکٹر آفریدی نے اچھی طرح بریف کر دیا ہے۔ اب آپ کیا چاہتے ہیں؟''

''میرے چاہنے سے کچھ نہیں ہو سکتا..... تم کیا چاہتے ہو؟''

اس نے کہا۔ ''کیا آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے چچا صوفی نذیر کو صبح عدالت میں پیش کر دیا جائے؟ عدالت ان کو جوڈیشل کسٹڈی پر جیل بھیج دے پھر ذہنی صحت کی خرابی کے عذر پر ان کی ضمانت پر رہائی ہو جائے اور ان پر جو کیس ہیں وہ خاموشی سے نمٹا دیے جائیں۔''

''یا وہ سب ہو جو مجھے انسپکٹر آفریدی نے سمجھا دیا ہے؟'' میں نے تلخی سے کہا۔

''انتخاب آپ کا ہے۔'' اس نے گھڑی کی طرف دیکھا۔

''لیکن شرط رانا کی ہے میں کاسو کو زندہ دفن کرنے کے لیے واپس کر دوں؟''

''ہاں..... ظاہر ہے آپ جیسے آدمی کے لیے فیصلہ آسان نہیں۔ ایک طرف چچا اور والد کی عزت..... بلکہ پورے خاندان کی عزت..... دوسری طرف آپ کے اصول..... انسانی مساوات..... بنیادی حقوق..... انصاف اور ضمیر وغیرہ..... میں آپ کو جانتا ہوں اس لیے آپ کی مشکل کو سمجھتا ہوں۔''

''لیکن کچھ کر نہیں سکتا۔'' میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''یہ بات نہیں..... ایسا ہوتا تو میں آپ سے بات ہی کیوں کرتا۔ وہ تھانیدار آپ سے پوچھ لیتا کہ نواب صاحب..... یس یا نو..... آپ کے انکار کو اقرار میں بدلنا اس کے لیے مشکل نہ ہوتا..... آپ کی اور آپ کے والد کی قوت برداشت بہت جلد جواب دے جاتی۔ آپ لوگوں نے صرف سنا ہے کہ کیس بنائے کس طرح جاتے ہیں۔ عام آدمی سے بے نظیر بھٹو یا نواز شریف تک..... ان معاملات میں سرکاری مشینری کیسے استعمال ہوتی ہے اور کس قسم کی کارکردگی کا مظاہرہ کرتی ہے اور معاملہ بھٹو کی پھانسی کا ہو یا کسی لیڈر کی اسیری کا..... دنیا کچھ نہیں کر سکتی۔''

''میں حیران ہوں کہ یہ میرا چوکیدار بول رہا ہے۔''

''میں نے کہا تھا کہ پرانے حوالے سے بات نہیں ہو گی۔'' اس نے طیش کا مظاہرہ کرنے کے لیے شیشے کا جام دیوار پر کھینچ مارا۔

میں مسکراتا رہا۔ ''میری مجبوری یہ بھی ہے اکبر خان کہ میں تمہاری عزت نہیں کر سکتا..... اس لیے نہیں کہ تم میرے ملازم تھے..... میرے خاکروب کا بیٹا بھی پڑھ لکھ کر ڈاکٹر پروفیسر یا ادیب بن جائے تو میرے دل میں اس کے لیے احترام ہوگا..... اس سے کہیں زیادہ ہوگا جو کسی جنرل بیوروکریٹ یا صنعت کار کے نامور بیٹے کے لیے ہوگا..... مگر جو تم ہو..... یا بن گئے ہو۔''

اس نے میری بات کاٹ دی۔ ''مجھے بھی تم سے عزت احترام نہیں چاہیے تم کون سے خاندانی نواب ہو..... کل تک خود تمہاری اوقات کیا تھی ذرا سوچو تم اس ملک سے فرار ہوئے تھے۔ کیا ریکارڈ تھا اس سے پہلے تمہارا..... تم ایک بدنام زمانہ تنظیم کے لیے کیا کرتے تھے؟ میری زبان مت کھلواؤ مسٹر رفیق..... میرے پاس بھی پوری رپورٹ ہے اس میں تمہارا سب کچا چٹھا ہے..... اس وقت مشکل میں تم ہو..... میں نہیں ہوں..... مانگنے والے تم ہو.....'' غصے میں اس کی آواز بلند سے بلند ہوتی گئی۔

''میں نے تم سے کچھ نہیں مانگا۔''

''خود کو دھوکا مت دو..... تم نواب نہیں بھکاری ہو۔ تمہیں اپنے چچا کی زندگی چاہیے..... اپنی عزت کی ضمانت چاہیے..... چاہیے یا نہیں؟ کیا کرو گے تم اگر میں جوتے مار کے تمہیں نکال دوں..... ساری اکڑفوں بھول جاؤ گے دو دن میں۔'' اس نے ایک اور جام بھرا اور حلق میں انڈیل لیا۔

میں نے اپنی سخت ذلت محسوس کی لیکن میں نے خود پر قابو رکھا۔ میں نے خود کو قائل کیا کہ یہ وقت جوش سے نہیں ہوش سے کام لینے کا ہے اور میرے مقابل بے ضمیر عیار اور بدکردار لوگ ہیں تو ان کے ساتھ معاملات میں اصول اور شرافت کام نہیں آ سکتی۔

اکبر خان نے صوفے کی پشت کا سہارا لے کر آنکھیں بند کرتے ہوئے ایک گہری سانس لی۔ ''آئی ایم سوری نواب صاحب..... میں نے طے کیا تھا کہ غصے پر قابو رکھوں گا..... مگر خود پر قابو نہ رکھ سکا..... کیا آپ میری ایک درخواست قبول کریں گے۔''

''اس کا انحصار درخواست کی نوعیت پر ہے۔'' میں نے کہا۔

''آپ میرے ساتھ ایک کپ کافی پی لیں۔ پلیز..... یہ میرے لیے اعزاز کی بات ہوگی۔''

وہ غالباً کچھ نشے میں تھا اس کے باوجود میں اس کی درخواست کو مسترد نہ کر سکا..... یہاں بہرحال ایک مسئلہ حل کرنے آیا تھا..... میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے اکبر خان۔''

''تھینک یو سر..... میرا خیال ہے اس سے میرا دماغ بھی ٹھکانے آ جائے گا میں آج کچھ زیادہ پی گیا۔'' اس نے ایک انٹرکام کا بٹن دبا کے کسی سے کافی لانے کے لیے کہا۔

میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ''تمہارے پاس میرے مسئلے کا کیا حل ہے؟''

اس نے کہا۔ ''کافی ختم ہونے تک ہم کچھ اور بات کریں گے تاکہ کچھ ماحول بدل جائے۔ چلیں آج میں آپ کو اپنے بارے میں بتاتا ہوں..... آپ کے بارے میں تو ڈھکی چھپی کوئی بات نہیں..... آپ یقیناً میرے دہرے روپ پر حیران ہوں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میرا خاندان ایک صدی سے آپ کا نمک خوار تھا میں بھی رہتا اگر میں وہاں سے نہ نکلتا..... یہ تو بڑی لمبی کہانی ہے کہ میں کیسے نکلا اور کب نکلا..... بس یوں سمجھ لیں کہ بیس سال میں ادھر ادھر کی ٹھوکریں کھاتا بالآخر میں کامیاب ہو گیا۔''

''تمہارے نزدیک دولت مندی ہی کامیابی ہے۔''

''ساری دنیا کے لیے ہے..... جائز ناجائز..... حلال حرام کے چکر میں پڑنے والے وہی ہیں جو مجبور ہیں۔ کچھ کر نہیں سکتے..... نہ صلاحیت ہے نہ ہمت چنانچہ تقدیر کا نام دے کر اپنی بے بسی کو قبول کر لیتے ہیں۔ آپ نے تو ساری دنیا دیکھی ہے یہ بات مجھ سے بہتر سمجھتے ہوں گے نوے فیصد اس دنیا میں کچھ نہیں کر سکتے تو دوسری دنیا کے خواب دیکھتے عمر بتا دیتے ہیں۔''

''تم دوسری دنیا پر اعتقاد نہیں رکھتے۔''

وہ سٹپٹایا ''اس کے بغیر تو ایمان کامل نہیں ہوتا مگر کیا کیا جائے..... اس دنیا کو بھی چھوڑا نہیں جاتا..... جب آپ ولایت سے لوٹے تو مجھے خاص طور پر وہاں بھیجا گیا تھا..... ست بدھائی..... یہ جاننے کے لیے کہ نئے مالک کیسے ہیں برسوں سے میں نے اپنے گھر والوں کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر بہت حیران ہوئے..... میں نے کہا کہ اب میں لوٹ آیا ہوں اور انہی کے ساتھ رہوں گا لیکن کچھ گڑبڑ ہو گئی۔''

''نور جہاں کی وجہ سے۔''

''یہی سمجھ لیں..... زیادہ خطرہ مجھے اپنے باپ جالو بابا سے تھا وہ مجھے دھمکی دیتا تھا کہ میرے بارے میں مالکوں کو بتا دے گا۔ اس نے بھی مجھ پر اعتبار نہیں کیا تھا اس کا خیال تھا کہ میرے اصل عزائم کچھ اور ہیں۔''

''چنانچہ تم نے اسے قتل کر دیا۔''

اس نے جواب دینے میں کچھ وقت لیا۔ ''میں نے پڑھا تو نہیں..... سنا ہے سارے بادشاہ ایسا ہی کرتے رہے۔ باپ کو مروا دیا..... بھائیوں کو قتل کرا دیا..... اقتدار..... اختیار..... دولت اور جاگیر کے لیے سب ہوتا ہے..... وہ اپنی عمر پوری کر چکا تھا..... اور میرے راستے میں نہ آتا تو زندہ رہتا۔''

''اس نے تمہیں ڈاکا نہیں ڈالنے دیا..... یہی جرم تھا اس کا۔''

''مجھے کوئی خاص ضرورت نہیں تھی اس سونے چاندی کی..... جب ضرورت تھی تو میرا باپ اس خزانے پر سانپ بن کے پہرا دیتا رہا..... کیا ملا اسے وفاداری کا صلہ..... دو گز زمین..... اس کی بیوی اور بیٹی آج بھی آپ کی غلام ہیں ان سب کے خون میں غلامی اتنی روح بس گئی ہے کہ وہ اور کچھ کر ہی نہیں سکتے..... اس وقت میرا ایک بھاری نقصان ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا اس سے پورا کر لوں مگر میرے باپ نے گڑبڑ کر دی..... قسمت خراب تھی اس کی..... وہ میرے ہاتھوں مارا گیا اور مجھے اپنا کھیل ختم کر کے بھاگنا پڑا۔ بیس برسوں کی ساری کہانی سناؤں تو بیس دن بھی کم ہوں گے..... آپ دیکھ چکے ہیں کہ اب میری حیثیت کیا ہے۔''

''نور جہاں واقعی تمہاری بیوی ہے؟''

وہ مسکرایا۔ ''ہاں...... مگر اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے دوست اور مددگار...... بزنس پارٹنر...... ہے نا بالکل ناقابل یقین بات...... لیکن دولت آتی ہے تو سب آ جاتا ہے۔ سب مل جاتا ہے...... عزت...... محبت...... عیش و آرام...... اور نور جہاں جیسی بیوی...... جہانگیر کو بھی نور جہاں بڑی مشکل سے ملی تھی...... بادشاہ بننے کے بعد...... اس سے پہلے تو وہ کسی اور کی بیوی تھی...... اس نے نور جہاں کے شوہر کو قتل کرا دیا تھا...... میری طرح...... چونکیے نہیں نواب صاحب...... اللہ مہربان تو گھمر پہلوان...... اس نے مجھے واقعی جہانگیر بنایا...... بادشاہت میرے پاس تھی لیکن مجھے بادشاہوں کی طرح رہنا نہیں آتا تھا...... نور جہاں نے مجھے بھی سب سکھایا...... اٹھنے بیٹھنے...... بات کرنے...... کپڑے پہننے اور جینے کا سلیقہ...... اس نے خود کچھ نہیں کیا...... نوکر رکھے...... ٹیوٹر استاد گورنس...... عقل اور ذہانت میرے پاس تھی...... میں نے سب سیکھ لیا...... میں تو چار جماعت پاس تھا مگر آپ سے میں انگریزی میں بات کر سکتا ہوں...... ذرا لکھنے میں مار کھاتا ہوں تو اس کے لیے سیکریٹری جو ہے...... ابھی آپ نے دیکھا ہوگا اسے...... وہی کافی لائی تھی۔''

میں نے کہا۔ ''کیا اب ہم کام کی بات کریں۔''

''آف کورس...... یہ تو ایک مختصر وقفہ تھا۔ حالات کو بہتر بنانے کے لیے...... میں نے اپنا بیک گراؤنڈ اسی لیے بتا دیا۔''

''کہ میں تمہیں کمتر سمجھنے کی غلطی پھر نہ کروں۔'' میں نے طنز سے کہا۔

''آپ نے بات کی تھی رانا صاحب کی شرط کی۔''

میں نے کہا۔ ''رانا سے تمہارا کیا تعلق ہے؟''

''یہ بتانا بالکل بھی ضروری نہیں...... آپ خود سمجھ سکتے ہو کہ تعلق مضبوط ہے اور بھروسے کے قابل...... اسی لیے میں رانا کی طرف سے بات کر رہا ہوں۔ آپ کے لیے ایک پیشکش ہے بلکہ ایک تحفہ ہے...... رانا صاحب کی طرف سے۔''

''کیسا تحفہ؟''

اس نے آواز لگائی۔ ''سویٹی۔''

''یس سر۔'' سویٹی مسکراتی ہوئی نمودار ہوئی۔ یہ اس کا نام تھا یا پھر اکبر خان نے محض دوستانہ بے تکلفی میں اسے یوں پکارا تھا۔ وہ اسے ہنی...... ڈارلنگ...... ڈیئر...... کچھ بھی کہہ سکتا تھا اور وہ تھی بھی اس قابل...... ظاہر ہے جس کی بیوی نور جہاں جیسی آفت کی پرکالہ ہو اس کی سیکریٹری انارکلی بھی ہو سکتی ہے...... حسن کی عشوہ طرازی اور شباب کی غارت گری کے سارے اسباب اس نے اکبر کے لیے وقف کر رکھے تھے اور یقیناً اس کے عوض خوش حالی کے راستے پر بڑھتی جا رہی تھی۔

''دیکھو...... وہ گفٹ لاؤ۔'' اکبر خان نے کہا۔ ''جو ہم نے بطور خاص نواب صاحب کے لیے پیک کرایا تھا۔''

''یس سر۔'' وہ لہرا کے پلٹ گئی۔

حقیقت یہ ہے کہ میرا ذہن سخت کنفیوژن کا شکار تھا۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ ایسا تحفہ کیا ہو سکتا ہے جسے قبول کرنے سے صورت حال بدل جائے۔ رانا کے پاس ایسی کیا چیز ہو گی...... یہ بادشاہوں کا زمانہ نہیں تھا کہ ہیرے جواہرات کے خوان تحفے میں آتے۔ رانا اچھی طرح جانتا تھا کہ نئے کرنسی نوٹ...... ڈالر پاؤنڈ یا یورو سے بھرے ہوئے سوٹ کیس بھجوا کے مجھے خریدا نہیں جا سکتا۔

جب سویٹی وہ تحفہ اپنی گود میں بڑے پیار سے اٹھا کے لائی تو میں بھونچکا رہ گیا...... اس نے نیچے جھک کر تحفے کو میرے سامنے رکھا تو میری نظر ان گہرائیوں میں پھسل کے بے لگام نہیں ہوئی جو سویٹی کے کھلے گریبان سے اپنی طرف کھینچتی تھیں...... اس تحفے کو دیکھ کر میری عقل مفلوج ہو گئی تھی۔

یہ وہی بھس بھرا کتا تھا جس کو میں نے ہلاک کر دیا تھا۔ وہ رانا کا سب سے قیمتی اور عزیز از جان کتا تھا جو میری گولی کا نشانہ بن گیا تھا اس کے جبڑوں سے ایک معصوم خرگوش کو چھڑانے کے لیے میں نے اس شکاری کتے کو شوٹ کر دیا تھا مگر اس ''قتل'' کا الزام کاسو کی کوتاہی پر آیا تھا۔ رانا صاحب نے اس کتے کی حفاظت دیکھ بھال اور تربیت کی ذمے داری کاسو کو سونپ رکھی تھی۔ جب کتا مارا گیا تو کاسو کو مجرم ٹھہرایا گیا اور اسے سزائے موت سنا دی گئی لیکن اس سزا کو دوسروں کے لیے عبرتناک بنانا بھی ضروری تھا۔ چنانچہ حکم دیا گیا کہ کتے کی لاش کے ساتھ کاسو کو بھی زندہ دفنا دیا جائے...... میں نے یہ بھی نہ ہونے دیا اور کاسو کو اس کی بیوی بچوں سمیت رانا کی قید سے نکال لایا۔

اس کے بعد سے کاسو کی موت کے فیصلے پر عمل درآمد کی جنگ جاری تھی۔ رانا نے کتے کی کھال میں بھس بھروا کے اسے STUFF کرا لیا تھا اور گویا تہیہ کر لیا تھا کہ جس دن کاسو اس کے ہاتھ لگا وہ اسے اپنے عہد کے مطابق بھس بھرے کتے کے ساتھ زندہ گاڑے گا۔ ابھی تک میں نے یہ نہیں ہونے دیا تھا۔ کاسو اور اس کے بیوی بچے اب مشہور

ڈاکو شاہی بادشاہ کی حفاظتی تحویل میں تھے اور انہیں صرف میں ہی واپس لا سکتا تھا۔ رانا کے لیے یہ انا کا مسئلہ تھا تو میرے لیے ایک انسانی زندگی کا۔

اکبر خان کی آواز پر میں چونکا۔ ''اپنے نواب صاحب...... کیسا ہے یہ تحفہ؟''

میں نے کہا۔ ''یہ تحفہ قبول کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ رانا صاحب نے کاسو کی واپسی کی شرط ختم کر دی۔''

''آپ ذہین آدمی ہیں۔''

''انہوں نے کاسو کو زندہ دفن کرنے کی قسم بھی توڑ دی۔''

''سودے ایسے ہی ہوتے ہیں...... کچھ دو اور کچھ لو کی بنیاد پر...... ایک صورت یہ تھی کہ آپ کاسو کو لائیں...... اور اپنے صوفی چچا کو لے جائیں۔''

''اور دوسری صورت کیا ہوگی؟''

''میرا خیال تھا کہ آپ سمجھ جائیں گے...... خیر...... میں صاف بات کرتا ہوں...... آپ میرے ساتھ ایک ایگریمنٹ کریں گے...... ہزاروں یا شاید لاکھوں ایکڑ پر پھیلی ہوئی ست بدھائی کی جاگیر میں سے آپ دس ایکڑ میرے نام کر دیں گے تو یہ ایسے ہی ہوگا جیسے کوئی سمندر میں سے ایک بالٹی بھر پانی نکال لے۔''

میں نے کہا۔ ''اور یہ ایک لوٹا پانی جو دس ایکڑ زمین کے برابر ہے...... صوفی چچا کی باعزت رہائی اور ہم سب کی عزت کی قیمت بن جائے گا۔''

''کیا یہ قیمت بہت کم نہیں ہے نواب صاحب۔''

''یہ میرے ضمیر کی قیمت لگائی ہے تم نے...... تم چاہتے ہو میں سائنس ریسرچ سینٹر کی رعایت واپس لینے کے لیے قانونی کارروائی روک دوں تاکہ تم وہاں اپنا غیر قانونی کاروبار بلا خوف و خطر جاری رکھ سکو۔''

''فیصلہ آپ کو کرنا ہے۔''

''نہیں فیصلہ تمہارا ہے جو مجھے قبول کرنا ہے...... میرے پاس چوائس کہاں ہے...... آگے کنواں پیچھے کھائی...... میں کہاں جا سکتا ہوں۔''

''زندگی میں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے...... سب کے ساتھ ہو سکتا ہے...... کیا میں یہ تحفہ اس گاڑی میں رکھوا دوں جو آپ کو واپس لے جائے گی؟''

''اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اس کے بعد کاسو کی زندگی محفوظ ہو جائے گی؟'' میں نے کہا۔

وہ بولا۔ ''یہ سارا کھیل اعتماد کا ہے نواب صاحب...... میں آپ کے وعدے پر اعتماد کروں گا کہ آپ سائنس ریسرچ سینٹر کے حقوق ملکیت میرے نام کر دیں گے...... صرف آپ کے اقرار سے تو کچھ نہیں ہوتا...... اس کو قانونی حیثیت دینے کے لیے عدالتی کارروائی ضروری ہو گی...... اگر آپ نے بدعہدی کی تو ہمارے لیے صوفی نذیر کو پھر سی آئی اے سینٹر منتقل کر دینا کیا مشکل ہوگا...... کاسو تو پہلے ہی محفوظ ہے...... آپ نے اسے غائب کرا دیا ہے اسے واپس لانے کا ذریعہ آپ کے صوفی چچا ہی ہوں گے آپ ایک کو بچا سکتے ہیں...... دونوں کو نہیں...... مجھے یقین ہے کہ سائنس ریسرچ سینٹر کی دس کنال زمین کی قیمت یقیناً آپ کے چچا کی زندگی اور اس تمام رسوائی اور بے عزتی کے مقابلے میں کچھ نہیں جس کا آپ کے خاندان کو سامنا ہوگا...... انسپکٹر آفریدی نے آپ کو تفصیل سے سب سمجھا دیا ہوگا۔''

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے...... میں یہ تحفہ قبول کرتا ہوں...... میرا وکیل اس دس کنال زمین کے سلسلے میں ضروری کلھو، وائی کا آغاز کل ہی کر دے گا۔''

''آپ کے صوفی چچا کو پولیس صبح عدالت میں پیش کر دے گی...... سب کچھ ویسے ہی ہوگا جیسے آپ چاہتے ہیں۔''

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ''کیا اب مجھے اجازت ہے؟''

وہ میرے ساتھ باہر تک آیا۔ باہر اس کی گاڑی تیار تھی میرے پاس چارہ ہی نہ تھا کہ اس کی آفر کو قبول نہ کروں...... تھانیدار سنگدل خان اپنا فرض ادا کر کے اور اس کی قیمت وصول کر کے جا چکا تھا...... فاروقی کو مجھ تک پہنچنے ہی نہیں دیا گیا تھا اور اس کا رابطہ بھی منقطع کر دیا گیا تھا...... اتنی رات گئے یہاں سے مجھے سواری بھی نہ ملتی۔

باہر آتے ہی میں نے اپنا موبائل فون چیک کیا۔ اس میں سنائی دینے والا شور ختم ہو گیا تھا اور سگنل بھی پورے موصول ہو رہے تھے۔ میں نے فاروقی کا نمبر ملایا تو کال مل گئی۔

''بھائی کہاں ہیں آپ؟'' وہ پریشانی سے بولا۔

میں نے کہا۔ ''پہلے بتاؤ تم کہاں ہو؟''

''میں باہر کھڑا ہوں...... جی او آر کے گیٹ کے قریب۔''

میں نے کہا۔ ''میں آ رہا ہوں دو منٹ میں۔''

دو منٹ بعد میں نے اس کی گاڑی دیکھ لی۔ اکبر خان نے میرے کہنے پر گاڑی روک لی۔ میرے ساتھ نیچے اتر کے اس نے ڈکی کھولی اور وہ تحفہ برآمد کیا جو میں نے بہ حالت مجبوری قبول کر لیا تھا...... مصلحت کا تقاضا تھا کہ میں اسے

ساتھ لے جانے سے انکار نہ کروں۔

فاروقی نے حیرانی سے کہا۔ ''یہ کیا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''تم اکبر خان سے تو واقف ہو؟''

فاروقی نے سر ہلایا۔ ''بہت اچھی طرح۔''

''یہ ان ہی کا تحفہ ہے۔'' میں نے کہا۔

فاروقی بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا مگر میں نے اس کتے کی ڈی کوڈ کی میں منتقل کیا اور اکبر خان سے ہاتھ ملا کے فاروقی کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس وقت صبح کے چار بجے تھے لیکن صبح بہت دور تھی۔ سڑکوں پر تاریکی کا راج تھا اور سناٹا تھا۔ اگلے چند منٹ میں، میں نے فاروقی کو وہ سب بتا دیا جو تھانیدار نے مجھ سے کہا تھا اور وہ بھی جس کا تعلق اکبر خان کے تحفے سے تھا۔

''یار میں سخت پریشان تھا۔ پہلے تو سکیورٹی والوں نے مجھے اندر جانے سے روکا...... انہوں نے پوچھا کہ مجھے کس کے گھر جانا ہے...... وہ تصدیق کیے بغیر کسی کو اندر نہیں جانے دیتے۔ عام طور پر میرے ساتھ ایسا نہیں ہوتا لیکن اس وقت گارڈ کسی حوالے سے مطمئن ہونے پر آمادہ نہ تھا۔''

''یہ سب پہلے سے طے تھا۔'' میں نے کہا۔

''بالآخر میں نے ایک جوائنٹ سیکریٹری کا نام لیا...... وہ مجھے اچھی طرح جانتا ہے بس...... لیکن ان کو فون کیا گیا تو جواب موصول نہیں ہوا۔ وہ سو رہے ہوں گے اور اگر جواب مل جاتا تب بھی کچھ حاصل نہ ہوتا جب میں نے تجھ سے موبائل فون پر رابطہ کیا تو جواب یہ ملا کہ رابطہ ممکن نہیں۔''

''میرا فون جام کر دیا گیا تھا۔''

''میں کیا کر سکتا تھا سوائے انتظار کرنے کے...... میرے لیے طے کرنا مشکل تھا کہ میں پولیس سے رابطہ کروں یا نہ کروں۔''

''پولیس مجھے کہاں تلاش کرتی...... یہ کوئی عوامی بستی نہیں ہے جہاں وہ جس گھر میں چاہیں گھس جائیں اور جسے چاہیں پکڑ لیں۔''

''مجھے معلوم تھا کہ پولیس کچھ نہیں کرے گی ادھر فریال فون پر فون کر رہی تھی۔''

''تو نے کیا کہا اس سے؟''

''جھوٹ بولا کہ فکر کی کوئی بات نہیں...... ہم آتے ہیں تھوڑی دیر میں...... لیکن نواب صاحب آپ کو خیر و عافیت کے ساتھ لوٹ آنے پر شکرانے کے دو نفل پڑھنے چاہئیں اور صدقہ دینا چاہیے۔''

''صوفی چچا کی وجہ سے صورت حال بڑی پیچیدہ ہو گئی ہے یار۔'' میں نے کہا۔

''بس یار ہمیں بھی سمجھنا چاہیے کہ قدرت کی طرف سے ہر آزمائش ہوتی ہے اور آدمی کو حوصلہ نہیں ہارنا چاہیے۔''

''اور یہ سمجھنا چاہیے کہ اللہ اپنے نیک بندوں ہی کو آزماتا ہے۔''

گاڑی پورچ میں رکی تو ہیڈ لائٹس کی روشنی فریال کے چہرے پر پڑی۔ وہ پورچ میں آرام کرسی پر بیٹھے بیٹھے انتظار سے تھک کر سو گئی تھی...... مجھے اس پر ترس بھی آیا اور پیار بھی۔ باقی سب سکون کی نیند میں تھے۔ ایسی پریشانی میں وہ اکیلی تھی اور بے یقینی کے ساتھ لاعلمی اور بے خبری کا سارا عذاب صرف اسی کے لیے تھا۔

لائٹ پڑتے ہی وہ چونک کر اٹھی اور میری طرف لپکی۔ جذبات کے اظہار میں وہ کسی جھجک یا قدغن کی قائل نہ تھی۔ لندن میں رہ کے وہ کچھ زیادہ ہی بے باک ہو گئی تھی، چنانچہ میں بار بار اسے یاد دلاتا تھا کہ اب ہم پاکستان میں ہیں لیکن کوئی جذباتی بحران پیدا ہوتا تھا تو وہ سب کچھ بھول جاتی تھی۔ اس وقت بھی وہ فاروقی کی موجودگی کا خیال کیے بغیر مجھ سے چمٹ گئی۔

''کہاں رہ گئے تھے تم رومیو؟'' وہ رونے لگی۔

اس وقت میرا جذباتی فرض بنتا تھا کہ میں اسے چوم کے تسلی دوں۔ اگر میں ایسا کرتا تو فاروقی کو بھی اعتراض نہ ہوتا۔ اس کے سوا ہمیں دیکھنے والا بھی کون تھا مگر میں نے آہستگی سے فریال کو الگ کیا۔

''خاتون...... سنسر شپ کے قوانین کا کچھ تو خیال فرمائیے۔ قانون کا ایک نمائندہ ہمیں دیکھ رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

فاروقی ہنسنے لگا۔ ''سنسر بورڈ کو قطعی اعتراض نہیں اور قانون کی آنکھیں بند ہیں۔''

فریال مجھے اندر لے گئی یا شاید میں اسے اندر لے گیا کیونکہ وہ تو مجھ پر جھکی ہوئی مجھ سے الگ ہونے کو تیار نہ تھی اور میں نے کمر میں ہاتھ ڈال کے اسے سنبھال رکھا تھا...... اپنے کمرے میں لے جا کے اس نے مجھے اپنے بیڈ پر لٹا دیا۔ میری خواہش بھی تھی کہ میں دو چار گھنٹے سو لوں...... صبح مجھے صوفی چچا کی پیشی کے سلسلے میں ابا کے ساتھ عدالت جا کے نہ جانے کتنی دیر خوار ہونا تھا مگر میرے دماغ کی مشین جو پوری رفتار سے چل رہی تھی اتنی گرم تھی کہ نیند کی صرف خواہش کی جا سکتی تھی۔

چند سیکنڈ کے لیے میں نے آنکھیں بند کی تھیں کہ فریال نے میرے پیر اوپر کیے اور پھر جوتے اتارنے لگی۔ میں نے

پیر کھینچ لیے۔ ''یہ کیا کر رہی ہو؟''

''چپکے لیٹے رہو۔'' اس نے پھر میرے پاؤں سیدھے کیے۔ ''ورنہ ماروں گی۔''

میں نے مسکرا کے کہا۔ ''لڑکی...... تم شرما کے اور لجا کے بھی تو کہہ سکتی تھیں کہ جی یہ تو میرا فرض ہے۔''

''میں وہ بہشتی زیور ماڈل بیوی نہیں بن سکتی۔ میرا کہنا نہیں مانو گے تو دماغ درست کر دوں گی۔'' اس نے جوتے اتار کے نیچے ڈال دیے۔

''اب بتاؤ کیا تیر مار کے آئے ہو؟''

''کیا بتاؤں فری...... میرے سر پر تفکرات اور پریشانیوں کا ایک پہاڑ رکھا ہوا ہے اور اس کا بوجھ بڑھتا جا رہا ہے۔''

وہ میرا سر دبانے لگی۔ ''سر میں درد ہے؟ کافی لاؤں؟''

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''نہیں...... ایسے ہی بہت سکون مل رہا ہے۔''

میں نے محض ایک جذباتی رومانی ڈائیلاگ نہیں بولا تھا جو راحت فریال کے ہاتھوں کے نرم محبت بھرے لمس سے میرے وجود میں منتقل ہو رہی تھی وہ میری اعصابی کشیدگی کو کسی روحانی عمل یا جادو کی طرح تحلیل کر رہی تھی۔ کسی گولی میں یہ اثر کہاں سے آتا...... نتیجہ یہ کہ اس سے پہلے کہ میں فریال کو کچھ بتاتا مجھے نیند نے مغلوب کر لیا۔

وہ یقیناً چاہتی ہو گی کہ میں اسے بھی شریک راز کروں۔ یہاں وہ اکیلی میری واپسی کے انتظار میں جاگتی رہی تھی اور اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا رہی تھی۔ اسے تسلی دینے والا اور اس کا حوصلہ بحال رکھنے والا بھی کوئی نہ تھا۔ چاہت میں دیوانگی کا یہ انداز صرف مشرق کی روایت تھی۔ مغرب کی عورت اسے کیسے سمجھ سکتی تھی جو محبت میں بھی دل سے نہیں دماغ سے سوچتی ہے۔

نیند سب سے محفوظ پناہ گاہ تھی کیونکہ ابھی میں کچھ سوچنا نہیں چاہتا تھا، کچھ کہنا اور کچھ سننا بھی نہیں چاہتا تھا...... اگر میں فریال کو بتاتا کہ کیا قیامت تھی جو نازل ہوتے ہوتے رہ گئی...... اذیت و ذلت کا کیسا عذاب تھا جو ہمارے خاندان پر آتے آتے ٹل گیا اور کیسی جان لیوا مجبوریاں جن کی وجہ سے مجھے رانا جیسے دشمن کا تحفہ بھی قبول کرنا پڑا۔ تو میں مزید اپ سیٹ ہوتا...... یہ فریال کی بے غرضی اور اپنایت تھی کہ اس نے میرے سکون کو فوری اور اہم سمجھا۔ اپنے تجسس کو مؤخر کر دیا۔ اس کے لیے یہی اطمینان کافی تھا کہ میں خیر و عافیت کے ساتھ واپس اس کے پاس آ گیا تھا۔

تاہم اس محبت کے خلوص کا خمیازہ مجھے بھی بھگتنا پڑا اور فریال کو بھی...... جب دروازہ بجانے سے میری آنکھ کھلی تو صورت حال کو سمجھنے میں مجھے چند سیکنڈ لگے پھر مجھے اندازہ ہوا کہ میں فریال کے بیڈ روم میں ہی نہیں اس کے ساتھ اسی کے بیڈ پر سو رہا تھا اور جیسا کہ فطری تھا...... سوتے میں ہم اتنے قریب ہو گئے تھے کہ یک جان دو قالب کی تصویر بن گئے تھے۔ فطری میں نے اس لیے کہا کہ لوہے کے ساتھ مقناطیس ہو تو کیسے ممکن ہے کہ کشش انہیں نہ جوڑے۔

شرمندگی کی انتہا سے مجھے پسینا آ گیا۔ فریال ابھی تک بے سدھ پڑی تھی اور اگرچہ نہ اس کی قربت کا مجھے احساس تھا اور نہ ایسا عمداً ہوا تھا شاید فریال بھی میرا سر دباتے دباتے نیند سے مغلوب ہو کے گر گئی تھی لیکن دیکھنے والی نظر معصومیت اور معصیت کے درمیان نظر نہ آنے والی حد کو کیسے دیکھ سکتی تھی۔

مجھے یہ اندازہ بھی نہ تھا کہ جب میری آنکھ لگی تو دروازہ بند تھا یا نہیں اور سوتے وقت فریال نے بھی دروازہ بند کیا تھا یا ایسے ہی کھلا چھوڑ دیا تھا اگر دروازہ کھلا رہ گیا ہو گا تو نہ جانے کسی نے ہمیں ایسے ساتھ ساتھ سوتے دیکھا ہو گا جیسے شادی شدہ جوڑے بھی خواب گاہ کے دروازے مقفل کیے بنا نہیں سوتے۔

معلوم نہیں دروازہ بجا کر مجھے بیدار کرنے والا کون تھا...... شرم سے میری وہ حالت تھی کہ مجھ میں باہر جا کے دیکھنے کی ہمت نہ تھی...... اماں سب سے پہلے بیدار ہوتی تھی...... کیا انہوں نے دروازے سے یہ اپنے اکلوتے ہونہار بیٹے کی بے شرمی کا یہ افسوسناک منظر دیکھا ہو گا اور پھر دل پر پتھر اور آنکھوں پر ہاتھ رکھ کے دروازہ بند کر دیا ہو گا؟ یا یہ سین ابا کی آنکھوں کو دیکھنا پڑا ہو گا کہ ان کا ولایت پلٹ بیٹا اور ولایت پلٹ ہونے والی بہو کیسے نکاح کے شرعی تقاضوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ایک ساتھ سو رہے ہیں...... بے شرمی کے اس مظاہرے کی ہمت کرتے ہوئے انہوں نے یہ بھی نہیں سوچا کہ اس گھر میں اور لوگ بھی ہیں۔ ان کے ماں باپ بھی ہیں جو ایسی بے حیائی کا تصور تک نہیں کر سکتے...... لیکن ان کی ہونے والی بہو اور ان کے بیٹے کے لیے شاید یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ وہ لندن میں ایسے ہی رہتے تھے یہاں کب تک برداشت کرتے۔

میں نے جھنجوڑ کر فریال کو جگایا۔ ''فریال...... یہ تم نے کیا غضب کر دیا؟''

وہ گھبرا کے اٹھی۔ ''کیا ہو گیا؟''

''یہ پوچھو کیا نہیں ہوا؟ تم کو کیا ضرورت تھی یہاں

میرے ساتھ سونے کی؟"

اس کی حالت غیر ہوگئی۔ "میں...... میں نے جان بوجھ کے ایسا نہیں کیا...... میری بات کا یقین کرو۔"

"میں تو یقین کرلوں گا...... لیکن اب کس منہ سے جائیں گے ہم سب کے سامنے...... تم نے دروازہ بند کیا تھا؟"

اس نے پریشانی میں سرہلایا۔ "یاد نہیں...... مگر تمہیں تو یاد ہوگا جب تم یہاں آئے تھے تو کیا تم نے دروازہ بند کیا تھا؟"

"نہیں۔"

"مجھے بھی کب نیند آئی مجھے پتا ہی نہیں چلا۔"

"مروادیا تم نے فریال...... پتا نہیں کسی نے ہمیں دیکھا...... آخر کیا ضرورت تھی تمہیں مجھ کو یہاں لانے کی۔" میں نے بگڑ کے کہا۔ "کیوں کیا تم نے ایسا؟"

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے...... "پتا نہیں۔"

"کیا پتا نہیں...... میں اپنے کمرے میں جا کے سو جاتا...... اب بتاؤ میں کیا جواب دوں گا اماں کو اور ابا کو...... دروازہ انہوں نے ہی بند کیا ہوگا کہ ان کی آنکھوں میں تو شرم وحیات ہے نہیں۔"

"تمہیں کیسے پتا؟"

"فریال کچھ عقل سے کام لو...... منظر سونے گیا تھا صبح چار بجے کے بعد وہ جلدی نہیں اٹھ سکتا۔ اس کی بیوی بھی آٹھ بجے سے پہلے کہاں جاگتی ہوگی۔"

"وہ اٹھتی ہے فجر کی نماز کے لیے۔"

میں نے نفی میں سرہلایا۔ "نہیں فریال...... اماں سب سے پہلے اٹھتی ہیں یہ بہت ہی برا ہوا...... یہ تم جانتی ہو اور میں جانتا ہوں یا اللہ جانتا ہے کہ ہم نے قربت میں بھی ایک حد خاص کو کبھی عبور نہیں کیا مگر کیا کوئی یقین کرے گا؟ اماں یا ابا اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے بعد مانیں گے کہ...... ہم بے گناہ ہیں۔"

فریال نے خفگی سے کہا۔ "اچھا اب جاؤ...... اتنا بھی ڈرنے کی ضرورت نہیں...... کوئی تمہیں پھانسی نہیں چڑھا دے گا اور چڑھائے تو چڑھ جانا...... میں بھی چڑھ جاؤں گی تمہارے ساتھ۔"

"تمہارا دماغ خراب ہے۔"

"ہاں...... دماغ تمہارا مجھ سے زیادہ خراب ہے مسٹر پارسا...... یار جب کیا کچھ نہیں تو ڈرتے کیوں ہو...... کوئی مانے یا نہ مانے...... نہ مان کے کوئی ہمارا کیا بگاڑ لے گا۔"

"فری...... میرے ماں باپ کو بہت دکھ ہوگا۔"

"دکھ کوئی ایک ہے...... میری تمہاری اور ہم سب کی زندگی میں دکھ ہی دکھ ہیں...... سکھ تو ابھی آنے والے کل کا سپنا ہے اور کل کس نے دیکھی ہے۔" فریال نے مجھے باہر دھکیل دیا۔

باہر کوئی نہیں تھا...... جس نے بھی دروازہ بجایا تھا وہ اپنا فرض پورا کر کے سامنے سے ہٹ گیا تھا اب مجھے اس کے سامنے جانے کا مرحلہ درپیش تھا جو میری بے شرمی کے گناہ کا چشم دید گواہ بن گیا تھا مگر اپنی مرضی سے نہیں...... یہ ایک حادثہ تھا جو بدنصیبی کی علامت تھا۔ دیکھنے والے کو صدمہ ہوگا کہ کاش اس نے کچھ نہ دیکھا ہوتا۔

اماں کی طرف جاتے ہوئے میری وہی حالت ہو رہی تھی جو پھانسی گھاٹ کی طرف جاتے ہوئے سزائے موت کے مجرم کی ہوتی ہے میں نے اماں کو جائے نماز پر دیکھا...... رحل پر قرآن مجید ان کے سامنے کھلا ہوا تھا...... میں نے ان کا چہرہ غور سے دیکھا...... اس پر مجھے کوئی دکھ صدمہ غصے یا پشیمانی کا جذبہ دکھائی نہ دیا۔ ان کی صورت پر وہی سکون تھا جو ہمیشہ ہوتا تھا میرے دل کو کچھ اطمینان ملا شاید انہوں نے کچھ نہیں دیکھا...... دیکھا ہوتا تو وہ سخت ڈسٹرب ہوتیں...... شاید چپکے چپکے رو رہی ہوتیں۔

میں نے دیکھا ابا جی باہر باغیچے میں ٹہل رہے ہیں اور کچھ سوچ رہے ہیں میں کھڑکی سے دیکھتا رہا۔ میں اپنے ماں باپ کے چہرے پڑھ سکتا ہوں...... بالکل کھلی کتاب کی طرح...... انہیں منافقت نہیں آتی چنانچہ ہر جذبہ ان کی صورت پر بے نقاب عیاں ہوتا ہے۔ میرے دل کو کچھ قرار آنے لگا نہیں ابا جی نے بھی کچھ نہیں دیکھا...... دیکھا ہوتا تو وہ اتنے پُرسکون نہ ہوتے اور باغیچے میں نہ ٹہل رہے ہوتے۔ وہ کرسی پر بیٹھے انگلیاں چٹخا رہے ہوتے یا اضطرابی کیفیت میں پہلو بدل رہے ہوتے اور ان کا چہرہ تاریک ہوتا۔

کیا تاکا جھانکی ہو رہی ہے بنے میاں۔" میرے پیچھے سے فاروقی کی بیوی بولی۔ میں اچھل پڑا۔ "بھابی آپ؟"

"ہاں میں...... خیر سے دلہن کیا ابھی تک سو رہی ہیں۔" وہ طنزیہ اور کچھ پُرتمسخر انداز میں بولی مگر اس کی آواز میں خفگی تھی۔ "دس بج رہے ہیں۔"

میں نے مجرمانہ کھسیاہٹ سے سر جھکا کے کہا۔

"بھابی...... کیا آپ نے؟"

"شکر کرو میں نے ہی دیکھا...... تم دونوں نے بھی حد کردی...... میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔"

میں نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ "قسم خدا کی بھابی......

یہ سب ہم نے دانستہ نہیں کیا۔"

"نادانستہ کچھ نہیں ہوتا بھائی صاحب...... وہ تو ابا جی نے مجھ سے کہا کہ دلہن ذرا رفیق کو جگاؤ کیا کورٹ نہیں جانا ہے...... وہ خود جگانے آتے پھر کیا ہوتا؟"

میری جان میں جان آئی۔ "پرانے بزرگ تو جہاں محسوس کرتے تھے کہ لونڈا آوارہ ہو رہا ہے جھٹ اس کی شادی کر دیتے تھے۔"

"بزرگ تو وہ پرانے ہیں مگر لونڈا قابو میں نہیں ہے...... ولایتی لچھن ہیں اس کے...... دلہن ساتھ لے آیا ہے اور عمل کر رہا ہے اس مقولے پر کہ میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی...... ایک تو آپ اسے ساتھ لیے پھرتے ہیں۔ ست بدھائی میں وہ آپ کے ساتھ تھی اور اب یہاں علی الاعلان ایک ہی بیڈروم میں......"

میں نے کہا۔ "اب میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں کہ وہ بات ہرگز نہیں جو آپ سمجھ رہی ہیں۔"

"میری بات مت کرو...... تمہارے والدین کو کتنا صدمہ ہوتا۔ وہ تو پہلے ہی تیار ہیں تم دونوں کی شادی پر...... دادی نے انہیں قائل کر لیا تھا ابھی ان کو گزرے جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے...... تھوڑا صبر کرلو......" وہ غصے میں بڑبڑاتی کچن کی طرف چلی گئی۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ معاملہ فاروقی کی بیوی تک محدود رہا۔ جان بچی سو لاکھوں پائے۔ نہاتے ہوئے مجھے یہ خیال بھی آیا کہ ہم بے گناہ تھے شاید اسی لیے خدا نے ہمیں رسوائی سے محروم رکھا...... جیسے میرے والدین کو علم نہ تھا کہ گزشتہ رات کا بیشتر حصہ میں نے جاگتے ہوئے گزارا ہے ایسے ہی فاروقی کی بیوی یہ سمجھ رہی تھی کہ فریال ساری رات میرے ساتھ ایسے ہی سوتی رہی ہے...... فی الحال اپنی صفائی پیش کرنا ہی لاحاصل تھا۔ وہ فاروقی سے بات کرے گی تو فاروقی خود ہی اسے بتا دے گا کہ بھئی اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں...... جو محبت کرتے ہیں پہلے بھی پکڑے جاتے تھے اب بھی ان کی چوری کبھی نہ کبھی پکڑی جاتی ہے...... انہیں معاف کر دینا چاہیے یا دونوں کو فوراً عمر قید کی سزا سنا دینی چاہیے سرعام...... قاضی کے ذریعے......

فاروقی بھی دیر سے اٹھا...... نیند کی کمی سے اس کا برا حال تھا۔ اس نے فون کر کے پیشی کا وقت گیارہ بجے کے بعد رکھوا لیا تھا یہی وجہ تھی کہ ہم بھی دس بجے تک پڑے سوتے رہے۔ چار پانچ گھنٹے کی نیند سے مجھے خاصا فرق پڑا تھا۔ غسل کے بعد میں نے خود کو بے حد تازہ دم محسوس کیا...... گزشتہ شب کے واقعات ابھی تک کسی ڈراؤنے خواب کی طرح میرے ذہن میں تازہ تھے...... ناشتے کی میز پر فاروقی بھی خلاف عادت خاموش رہا۔ فاروقی کی بیوی البتہ اپنے ذومعنی جملوں سے فریال کو اور مجھے نشانہ بناتی رہی۔

ہم سیدھے کورٹ گئے۔ ابا جی پریشانی میں فاروقی سے بار بار پوچھ رہے تھے کہ سب ٹھیک تو ہو جائے گا نا؟ تم نے سب سے بات کر لی ہے؟ سب کے منہ بند کر دیے ہیں ناں؟ ان لالچی کتوں کے منہ بہت کھلے ہوئے ہیں کوئی بھونکنے تو نہیں لگے گا...... پھر وہ مجھ سے پوچھتے تھے کہ پیسے کافی لائے ہو ناں...... کورٹ کچہری کی تو دنیا ہی نرالی ہے...... قدم قدم پر پیسا نہ پھینکو تو بھونکنے والے کتے کاٹنے پر اتر آتے ہیں۔

تھانے کی طرف سے انسپکٹر آفریدی خود نہیں آیا تھا۔ اس نے اپنے ماتحت سب انسپکٹر کو بھیج دیا تھا۔ اس سے مل کے مجھے حیرت ہوئی۔ وہ مشکل سے بائیس چوبیس سال کا خوش شکل اور خوش اطوار لڑکا تھا۔ بعد میں اس نے بتایا کہ وہ کسی کرنل کا بیٹا ہے اس نے ایک بہت اچھے اسکول سے اے لیول کیا مگر پھر باپ نے اسے براہِ راست اے ایس آئی بھرتی کرا دیا اور وہ بجائے ملٹری اکیڈمی کے...... جیسا کہ اس کی ماں کی خواہش تھی وہ شہداد پور کے پولیس ٹریننگ سینٹر چلا گیا۔ اس کا باپ ایک عملی سوچ رکھنے والا آدمی تھا۔

جب گیارہ بج گئے اور تھانے سے کوئی پارٹی صوفی چچا کو لے کر نہیں آئی تو مجھے تشویش ہونے لگی۔ فاروقی کسی پیشی کے سلسلے میں ہائی کورٹ چلا گیا تھا۔ اس کا ایک ماتحت وکیل رسمی کارروائی کے لیے حاضر تھا۔ اس کے فون کرنے سے کچھ پتا نہیں چلا۔ ابا جی سخت مضطرب تھے اور مجھ پر خفا ہو رہے تھے کہ میں دیر تک سوتا رہا ورنہ ہم تھانے جاتے اور نذیر کے ساتھ ہی آتے۔ سب انسپکٹر کو اصولاً ملزم کے ساتھ آنا چاہیے تھا مگر وہ گھر سے آیا تھا۔ اس نے کچھ دیر تو ٹالا کہ دیر سویر ہو جاتی ہے۔

ساڑھے گیارہ بج گئے تو وکیل نے پیشکار کے ہاتھ میں کچھ نوٹ تھمائے اور پیشی کا وقت بڑھوا لیا۔ سب انسپکٹر اپنی موٹر سائیکل پر بیٹھ کے تھانے چلا گیا۔ ابا جی کا اضطراب بڑھ گیا۔ وہ بار بار مجھ سے پوچھتے تھے کہ رفیق...... دیر کیوں ہو رہی ہے...... سب ٹھیک تو ہے نا...... تم رات کو صوفی چچا سے ملے تھے تو وہ ٹھیک تھے؟"

میں انہیں تسلی بھی دیتا رہا لیکن اندر ہی اندر میری پریشانی میں اضافہ ہو گیا کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ تھی۔ صوفی چچا کو تھانے سے نہیں سی آئی اے سینٹر سے آنا تھا کہیں معاملات

طے پانے سے قبل ہی تو ان پر مشقِ ستم کا آغاز نہیں کر دیا گیا تھا۔

صوفی چچا کو لانے والی پولیس پارٹی بارہ بجے نمودار ہوئی۔ ان کے نرغے میں صوفی چچا بہت قابلِ رحم لگ رہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تو خیر ایک قانونی ضرورت کے تحت لگائی گئی تھیں مگر ان کے پیروں میں بھی بیڑیاں ڈال دی گئی تھیں۔ ان کا چلنا مشکل ہو رہا تھا۔ ان کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ داڑھی بے ترتیب ہو رہی تھی اور کپڑے جو ہم نے گھر سے پہنچائے تھے میلے اور پھٹے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

وکیل کی کوشش کے باوجود ہمیں ان سے ملنے نہیں دیا گیا۔ وہ سب انسپکٹر بھی سخت قانون پرست بن گیا۔ اس نے میری ہر پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ اس طرزِ عمل کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ میں فاروقی کے ماتحت وکیل پر برس پڑا کہ وہ نااہل ہے...... فاروقی ہوتا تو سب کر لیتا۔ اس نے مجھے سمجھایا کہ ماتحت عدالتوں کے ایسے کسی کیس میں فاروقی جیسا کوئی بڑا وکیل پیش نہیں ہوتا۔

میں نے کہا۔ ''تم نے معلوم کیا۔ صوفی چچا کو بیڑیاں کیوں ڈالی گئی ہیں؟''

''پولیس کا کہنا ہے کہ دیوانگی میں وہ بے قابو ہو جاتے ہیں۔''

اصل صورت حال ایسی نہیں تھی۔ صوفی چچا کسی سہمے ہوئے جنگلی جانور کی طرح نظر آ رہے تھے۔ وہ بالکل چپ تھے اور اپنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہر طرف دیکھ رہے تھے مگر میں ان کے سامنے گیا تو انہوں نے مجھے نہیں پہچانا...... وہ ابا کو دیکھ کر بھی اجنبی بنے رہے...... ابا جی بہت دُکھی ہوئے۔

مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے معاملات اس نہج پر نہیں جا رہے ہیں جس پر میں چلانا چاہتا تھا اور مطمئن تھا کہ میرے انتظامات تسلی بخش ہیں...... پیسا لیے بغیر نیچے سے اوپر تک کا اہلکار ایک قدم نہیں اٹھاتا تھا۔ فائل کا ایک صفحہ نہیں پلٹتا تھا اور ایک لفظ نہیں لکھتا تھا...... ہر کام کرانے کے لیے خواہ وہ کتنا ہی قانونی کیوں نہ ہو رشوت کا ایک ریٹ مقرر تھا مگر حرام خور اہلکاروں کی رشوت کشید کرنے کی حس اتنی تیز ہو جاتی تھی کہ وہ اسامی تاڑ لیتے تھے کہ کس سے ایک کے دو یا دس بھی وصول کیے جا سکتے ہیں اور بدقسمتی سے میں پریشانی ناتجربہ کاری یا فطری کشادہ دلی کے باعث ان کے نرغے میں ایسا پھنسا تھا کہ وہ نواب صاحب نواب صاحب کہہ کے مجھے خوب لوٹ رہے تھے۔

بالآخر صوفی چچا کی آواز لگی اور انہیں جوڈیشل مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ یہاں جوڈیشل مجسٹریٹ یا اس کی عدالت کے ماحول پر تبصرہ کرنا شاید توہینِ عدالت کے زمرے میں آ جائے...... لیکن مجھے امریکا اور برطانیہ کے عدالتی ماحول کے مقابلے میں ایسا لگتا تھا جیسے میں کمیلے میں کھڑا ہوں اور میرے آس پاس قصاب ہیں جو خون آلود چھرے اور بگدے لہرا رہے ہیں...... رسمی کارروائی کو سمجھنا بھی میرے بس کی بات نہ تھی۔ وکیل نے کچھ کہا...... پولیس کے پراسیکیوٹر نے بھی کچھ کہا۔ انجام کار مجھے پتا چلا کہ وہ نہیں ہوا جس کی مجھے اُمید تھی۔

پولیس نے صوفی چچا کا چودہ دن کا جسمانی ریمانڈ لے لیا تھا اور انہیں جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیجنے کی درخواست مسترد ہو گئی تھی۔ غصے اور صدمے سے میرا برا حال ہو گیا۔ اتنا پیسا لٹانے اور اتنی بھاگ دوڑ کرنے کے بعد بھی ناکامی کے سوا مجھے کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔ فاروقی ہوتا تو میں اس سے لڑ پڑتا۔ انسپکٹر رحمل خان آفریدی عرف سنگدل خان آفریدی بھی غائب تھا جس نے گزشتہ شب مجھے اغوا کر کے اکبر خان کے پاس پہنچایا تھا اور تمام معاملات طے کرائے تھے۔

ابا سخت مایوس تھے اور مجھ پر غصہ ہو رہے تھے کہ میں نے کچھ نہیں کیا اور کیا تو جھک ماری۔ میرا ان کو تسلی دینا بھی رائیگاں گیا۔ وہ یہی کہتے رہے کہ کوشش سے کچھ نہیں ہوگا۔ تقدیر کے ستارے گردش میں ہوں تو ہر تدبیر الٹی ہو جاتی ہے۔ ماں کو آخری عمر میں طبعی موت نصیب نہ ہوئی۔ بھائی کے ہاتھوں بیوی کا قتل ہوا...... پھر بھائی پاگل ہو گیا...... اب اتنا پیسا خرچ کر کے بھی حاصل کیا ہوا۔ پولیس نے تفتیش کا چکر چلا دیا وہ اس پر تشدد کریں گے...... مار ڈالیں گے نذیر کو اور کہہ دیں گے اس نے خودکشی کی...... یہی ہوتا ہے۔''

ان کا ڈپریشن جائز تھا۔ میں نے سمجھا بجھا کے انہیں گھر چھوڑا اور تھانے پہنچا مگر ایس ایچ او صاحب حسبِ معمول گشت پر تھے۔ فاروقی کا موبائل فون بھی بند تھا وہ کسی عدالت میں ہوگا۔ شام سے پہلے اس سے بھی رابطے کی صورت نہ تھی۔

میں نے ایک پی سی او کے ذریعے ست بدھائی میں راجا سے سیٹلائٹ فون پر رابطہ قائم کیا۔ گھنٹی بجتی رہی اور میں مایوس ہو چکا تھا کہ شاید قریب میں سننے والا کوئی نہیں جب فرخ نے ہیلو کہا۔

میں نے کہا۔ ''فرخ...... راجا کہاں ہے...... اسے بلاؤ فوراً۔''

''راجا تو گیا...... راجا بھی اور ڈاکٹر شہباز بھی۔''

''وہ دونوں کہاں چلے گئے؟''

فرخ نے کہا۔ ''وہ چلے گئے شامی بادشاہ کے ساتھ...... اغوا ہو گئے۔''

''اوہ...... یہ کب کی بات ہے؟''

''ابھی کچھ دیر پہلے کی...... شامی یہاں آیا تھا اور اس نے راجا کو بتا دیا تھا کہ اس کی آپ سے کیا بات ہوئی ہے...... ساری گفتگو میرے سامنے ہوئی تھی...... رابعہ بھی موجود تھی۔''

''کچھ پتا ہے شامی انہیں کہاں لے گیا ہے؟''

''نہیں...... یہ تو کسی نے بھی نہیں پوچھا۔ شامی کے ساتھ دو بندے تھے۔ وہ سب ایک گاڑی میں چلے گئے۔ کل تک شہاب الدین کو تاوان کی ادئیگی کا نوٹس مل جائے گا۔ دو کروڑ ادا کرو اور اپنے بندے لے لو۔ ڈاکٹر شہباز اور مشہور صحافی راجا کے اغوا کیے جانے کی خبر الگ ہوگی۔''

''وہ تو خیر ٹھیک ہے مگر راجا سے رابطہ کیسے ہوگا؟''

''یہ تو وہ خود ہی بتائیں گے کہ کہاں ہیں۔ وہ خود رابطہ کریں گے آپ سے...... خود بتائیں گے کہ کہاں روپوش ہیں۔''

''یار بات کو سمجھا کرو...... مجھے ابھی اسی وقت بات کرنی ہو تو میں کیا کروں؟'' میں نے جھنجلا کر کہا۔

''میں کیا بتاؤں...... ابھی تو شامی سے رابطہ کرنا بھی ٹھیک نہیں ہوگا اور وہ بھی کہہ کر گیا ہے کہ جب شہاب الدین سے پورے دو کروڑ مل جائیں گے اس کے بعد ہی بات ہو گی۔''

''رابعہ سے پوچھو شاید ڈاکٹر شہباز نے کچھ کہا ہو۔''

رابعہ شاید وہیں موجود تھی۔ اس نے ریسیور لیتے ہی پہلے اپنے ابا کی خیریت دریافت کی۔ میں نے اسے مطمئن کر دیا۔ ''ان کا ہر طرح سے خیال رکھا جا رہا ہے ابھی رہائی کا تو کوئی امکان نہیں۔''

''ہاں...... اس کا اندازہ تو کر سکتی ہوں میں۔'' وہ آہ بھر کے بولی۔

میں نے کہا۔ ''کزن...... شہباز نے جاتے وقت تمہیں کچھ بتایا تھا کہ اگر ہنگامی صورت حال میں رابطہ کرنا ہو...... تو وہ کہاں ہوگی...... کہاں ملے گی۔''

رابعہ نے کہا۔ ''اس نے تو مجھے قسم دی تھی کزن...... مگر میں قسم توڑ کے تمہیں بتا رہی ہوں...... ایک نمبر ہے اس کی کسی سہیلی کا جو لندن میں ہے۔''

''میں سمجھ گیا ڈاکٹر شائستہ۔''

''تم جانتے ہو اسے؟ وہ تمہارا پیغام آگے پہنچا سکتی ہے۔''

میں نے لائن کاٹ دی اور لندن میں ڈاکٹر شائستہ کا نمبر ملانے کے لیے کہا۔ لندن کے مقامی وقت کے مطابق دوپہر کے بارہ بجے تھے۔ شائستہ نے ریسیور اٹھا کے پہلے خاصی بیزاری اور اجنبیت کے ساتھ میرے بارے میں پوچھا حالانکہ وہ مجھے اچھی طرح جانتی تھی مگر عادت سے مجبور تھی۔

''اچھا فرمائیے آپ نے کس سلسلے میں فون کیا ہے مجھے؟''

میں نے کہا۔ ''لاہور کی ڈاکٹر شہباز کو آپ جانتی ہیں...... وہ فریال کی دوست تھی۔''

اس نے کہا۔ ''میں کبھی اس سے ملی نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''وہ آپ کو فون کرے گی۔''

''وہ مجھے کیوں فون کرے گی...... میری اور اس کی شناسائی تھی وہ بھی فریال کی وجہ سے...... آج تک میری اس کی ملاقات نہیں ہوئی۔ نہ کبھی اس نے فون کرنے کی ضرورت محسوس کی نہ میں نے۔''

میں نے ضبط سے کام لیا۔ ''آپ پہلے میری گزارش سن لیں...... وہ ایک ضرورت کے تحت آپ کو فون کرے گی۔ یہ فریال نے کہا ہے آپ اگر چاہیں تو فریال سے تصدیق کر لیں۔''

''ابھی میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔''

''اس کا فون آئے تو ازراہِ عنایت اسے میرا پیغام دے دیں۔''

''دیکھیے...... میں ڈاکٹر ہوں...... میں نے کوئی شادی دفتر نہیں کھول رکھا ہے اور آپ تو فریال سے شادی کرنے والے تھے...... اب اس ڈاکٹر شہباز کے لیے پیغام کیوں دے رہے ہیں؟ فریال کی سہیلی پسند آ گئی ہے اب؟''

مجھے غصہ آ گیا۔ ''آپ غلط سوچتی ہیں غلط سمجھتی ہیں اور غلط بولتی ہیں ڈاکٹر صاحبہ...... پیغام سے میری مراد تھی میسج...... ایک بات کہنی تھی۔''

''یہ بات آپ خود کیوں نہیں کہتے؟ آخر وہ بھی پاکستان میں ہے تو براستہ لندن پیغام رسانی کا کیا مطلب ہے؟''

''لاحول ولاقوۃ...... مطلب سمجھاؤں گا تو دو گھنٹے کی کال ہو جائے گی...... صرف اتنا سمجھ لیں کہ کوئی مجبوری ہے۔''

''کیا بتائیے کیا کہنا ہے؟''

''اس سے کہیں کہ راجا مجھ سے بات کرے۔ آپ شہباز کا نمبر بھی نوٹ کر لیں۔ میں آپ سے پوچھ لوں گا۔''

اس سے پہلے کہ وہ جھکی اور خبطی عورت کچھ کہتی میں نے فون بند کر دیا۔ دنیا میں پیش آنے والے بہت سے پراسرار اور ناقابلِ فہم واقعات کی طرح فریال اور ڈاکٹر شائستہ کی دوستی کو بھی میں آج تک سمجھ نہیں پایا۔ ان کے مزاج اور عادات میں بعد قطبین تھا...... اس کے باوجود وہ بے تکلف سہیلیاں تھیں۔ لندن میں فریال سے میری ملاقات کا وسیلہ ڈاکٹر شائستہ ہی تھی اور اسی کی مدد سے فریال فرار ہو کے پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہوئی تھی۔ ایک بار میں نے چھپ کر ان کی گفتگو سنی تھی تو دم بخود رہ گیا تھا۔ ہمیشہ آدم بیزار...... بڑیل مزاج اور خبطی نظر آنے والی شائستہ بھی خوب ہنس رہی تھی۔ یہ بتانے میں بھی کوئی حرج نہیں کہ وہ بڑی گندی باتیں کر رہی تھیں۔ توبہ توبہ۔

مجھے کچھ اطمینان ہوا تو میں نے ایک بار پھر تھانیدار آفریدی سے ملاقات کا سوچا مگر اس کا گشت ہنوز جاری تھا۔ جیسے ہر صاحب یا تو میٹنگ میں ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔ ایسے ہی ہر ایس ایچ او یا گشت پر ہوتا ہے یا نہیں ہوتا۔ کسی سائل کو اس کا اپنے کمرے میں مل جانا محض ایک خوشگوار اتفاق ہو سکتا ہے۔ شیر جنگل کا بادشاہ ہے تو اسے کون پابند کر سکتا ہے کہ وہ ہر روز ایک ہی جگہ ملے۔

میں نے گھڑی دیکھی اور فاروقی کے آفس کی طرف چل پڑا۔ وہ ابھی آ کے بیٹھا ہی تھا۔ کوئی نصف درجن کلائنٹ اس سے پہلے ہی ملاقات کے لیے حاضر ہو چکے تھے۔ اس کی سیکریٹری مجھے دیکھ کے شوخی سے مسکرائی۔ وہ ایک حسین اور پرکشش بیوہ تھی۔ اس کی عمر چالیس سے تو کم ہی ہوگی مگر وہ اپنے رکھ رکھاؤ سے تیس کی بھی نہیں لگتی تھی۔ دس سال کم کی نظر آنے کے لیے وہ یقیناً غذا اور ورزش کا سہارا لیتی ہوگی۔ اس کے باوجود وہ آج کل کسی ماڈل جیسی نہیں تھی جو ہڈیوں پر صرف کھال پہنے پھرتی ہیں۔ اس کا جسم بھرا بھرا تھا اور وہ ساڑی اتنی خوب صورتی سے پہنتی تھی کہ جو نظر اٹھتی تھی اس کے سراپا میں الجھ کے رہ جاتی تھی۔

اگر میں پہلے سے منتظر لوگوں کو نظر انداز کرتے ہوئے بیل کی طرح دروازے کو ٹکر مار کے اندر چلا جاتا تو یہ بڑی بداخلاقی ہوتی۔ میں نے کاؤنٹر جیسی میز کے قریب جا کے ایک رقعہ لکھا۔ ”اگر تم مجھے فوراً فاروقی سے ملوا دو تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ آج رات تمہارے خواب میں آ کے وہ نہیں کروں گا جو روز کرتا ہوں۔“

یہ چٹ میں نے خاموشی سے سیکریٹری کے سامنے رکھی اور پھر ایک خالی کرسی پر معصوم صورت بنا کے بیٹھ گیا۔

سیکریٹری نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی کو ضبط کیا ورنہ لوگ نہ جانے کیا سمجھتے۔ وہ اندر گئی اور چند منٹ بعد واپس آ کے اس نے مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ معلوم نہیں باقی لوگوں سے اس نے کیا کہا۔ یہ کلائنٹ نہیں فاروقی صاحب کے سالے تھے۔ یا بہنوئی۔

فاروقی میری دی ہوئی چٹ کو پڑھ رہا تھا۔ ”تو باز نہیں آئے گا حرامی پن سے...... کیوں تنگ کرتا ہے اسے۔“

میں نے کہا۔ ”یار میں نے ایسا کیا لکھ دیا ہے آخر۔“

”کیا کرتا ہے تو اس کے خواب میں جا کے؟“ فاروقی ہنسنے لگا۔

”میں گھنٹی بجا کے سلام کرتا ہوں۔ پوچھتا ہوں اندر آ جاؤں۔ وہ دھڑ سے دروازہ بند کر دیتی ہے...... اور بس۔“

”اچھا...... جلدی بول۔“

میں نے کہا۔ ”اس اُلو کے پٹھے آفریدی نے وعدہ خلافی کی۔“

”مجھے سب پتا چل گیا تھا۔ اس نے کچھ نہیں کیا۔ اسے اوپر والوں سے یہی ہدایات ملی تھیں۔“

”ہم سے سب طے ہو گیا تھا۔ قیمت بھی وصول کر لی تھی اس نے۔“

”اس وقت اکبر خان سے تیرا کوئی معاہدہ نہیں ہوا تھا۔ اس نے فون کر کے مجھے بتایا ہے کہ چودہ دن میں معاہدہ ہو گیا تو صوفی نذیر کو عدالت جیل بھیج دے گی ان کی ذہنی صحت کے بارے میں بھی صحیح رپورٹ مل جائے گی اور اس کے بعد عدالت ضمانت پر رہائی ہو جائے گی۔“

”اور اگر میں ایسا نہ کروں؟ رات تو میں مجبور تھا۔ جو بھی کہا جاتا میں مانتا...... لیکن ایسے کسی معاہدے کی قانونی حیثیت کیا ہوتی ہے جو جبر کے تحت کیا جائے۔“

”قانون کی بات مت کر نیکے پتر...... ورنہ صوفی چچا کے ساتھ بھی جو ہوگا قانون کے مطابق ہی ہوگا۔“

”یار میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا...... کیا کروں کیا نہ کروں...... نہ ہی کاسو کو اس بے ضمیر قاتل کے حوالے کر سکتا ہوں۔ نہ اکبر خان کو وہ زمین ہمیشہ کے لیے دے سکتا ہوں۔“

”تجھے سوچنے کے لیے ہی تو چودہ دن ملے ہیں اگر تیری نیت اور ارادوں میں فتور کا شبہ ہوگا تو اس کا ردِعمل صوفی چچا کے ساتھ تھانے والوں کے سلوک میں نظر آئے گا...... چودہ دن میں وہ چودہ کیس تیار کر لیں گے...... اس بارے میں مجھے کوئی خوش فہمی نہیں ہونی چاہیے...... صوفی چچا کو ایک لیور کے طور پر استعمال کیا جائے گا...... تجھے دبانے کے لیے۔“

”صرف ایک حد تک۔“

”ابھی تک ان کا ایک ہی مطالبہ ہے اور اس میں بھی تیری ہے لیکن انکار کی گنجائش بہرحال نہیں ہے۔“

”میں واقعی پھنس گیا ہوں۔“

”اللہ پر بھروسا رکھ...... نکل بھی جائے گا...... فی الحال تو میرے آفس سے نکل جا میرے پاس فالتو لوگوں کی فضول باتوں کے لیے وقت نہیں ہے۔“

میں نے کہا۔ ”بداخلاقی کا میں برا نہیں مانتا...... لیکن آپ کو کم سے کم چائے کے لیے پوچھنا چاہیے۔“

اس نے پانچ کا ایک سکہ میرے سامنے رکھ دیا۔ ”سیڑھیوں سے اتر کے جائیں تو بابو کا کھوکھا ہے...... اچھی چائے بناتا ہے۔“

میں باہر آیا اور اسی کرسی پر بیٹھ گیا جو ایک کلائنٹ کے اندر جانے سے خالی ہوئی تھی۔ یہ سیکریٹری کی میز کے ساتھ پہلی کرسی تھی۔

”امید ہے اب آپ اپنا وعدہ نبھائیں گے۔“ وہ بولی۔

میں نے کہا۔ ”وعدہ صرف آج کا تھا۔ آج ویسے بھی میں مصروف ہوں مجھے ایشوریا رائے کے خواب میں جانا تھا لیکن کل ضرور آؤں گا یا پھر تم مجھے کافی پلا دو تو کل کی بھی گارنٹی......“

کافی پی کے میں باہر نکلا تو سوچنے لگا کہ اب کدھر جاؤں...... گزشتہ شب سے اب تک کی بھاگ دوڑ اور حالات کے دباؤ نے میرا کچومر نکال دیا تھا میں نے ہمت نہیں ہاری تھی مگر میری ذہنی اور جسمانی قوت برداشت زیرو کے نشان کو چھو رہی تھی۔ مجھے کسی خوشگوار بریک کی ضرورت تھی جو میری توانائی بحال کر سکے۔ تھوڑی سی تفریح...... تھوڑا سا آرام...... کوئی دلچسپ مصروفیت...... ورنہ خود میرا بریک ڈاؤن ہو سکتا تھا۔

میں نے گھر جانے کا سوچا لیکن وہاں ابا کے پاس اپنے بھائی کی فکر اور پریشانی کے سوا نہ کوئی کام تھا نہ کوئی موضوع...... اماں سدا کی خاموش رہنے والی ان مصائب میں الجھ کے بالکل ہی گوشہ نشین ہو چکی تھیں اور ہر وقت مصلے پر نظر آتی تھیں۔

فی الحال میرے پاس اباجی کو سنانے کے لیے کوئی امید افزا خبر نہ تھی۔ میں انہیں اس تفصیل سے آگاہ نہیں کر سکتا تھا جس سے انہیں معلوم ہو جائے کہ ان کے بھائی کو آج چودہ دن کے جسمانی ریمانڈ پر پولیس کے حوالے کیوں کیا گیا ہے اور اگلے چودہ دنوں میں ان کے ساتھ اور ہم سب کے ساتھ

کیا ہو سکتا ہے اگر میں نے اکبر خان کی طرف سے پیش کی جانے والی دو میں سے کسی ایک شرط کو پورا نہ کیا...... وہ کہتے پھر اب تم کیا سوچ رہے ہو؟ تذبذب میں کیوں مبتلا ہو...... بے شک کاسو کو زندہ دفن کرنے کے لیے رانا کے حوالے کرنا مشکل تھا بلکہ ناممکن تھا مگر یہ تو بہت آسانی ہو گئی دس ایکڑ کی کیا وقعت ہے؟ تم اپنے چچا کے لیے...... میرے بھائی کے لیے یہ معمولی سی خیرات بھی نہیں دے سکتے؟ مفت میں ملنے والی ہزاروں ایکڑ زمین میں سے سائنس سینٹر کے لیے دس ایکڑ دے کر کیا تم غریب ہو جاؤ گے؟ غریب تو ہم تھے میری ماں کو کیا ملا؟ دو گز زمین کے سوا۔ اس جاگیر میں سے جس کی وہ مالک تھی...... مجھے کیا ملے گا اور تمہیں کیا ملے گا؟

گھبرا کے میں نے فاروقی کے گھر فون کیا۔ میں چاہتا تھا کہ اباجی کو سارے جھمیلوں سے دور رکھوں...... انہیں سائنس سینٹر کے معاملات کا علم ہوگا تو میرے حصے کی کشمکش کا عذاب ان پر بھی مسلط ہو جائے گا۔ کاش کسی صورت میں انہیں ست بدھائی پہنچا سکوں جہاں وہ باقی زندگی سکون سے گزار سکیں۔

میرے کان گھنٹی کی آواز سنتے رہے۔ پھر خود فریال نے فون اٹھا لیا۔ ”اتنی دیر سے گھنٹی بج رہی تھی۔“

”ہاں تو بج رہی تھی!“

”سب لوگ کیا کانوں میں روئی ڈال کے بیٹھے ہیں؟“

”ہم باہر باغ میں چائے پی رہے تھے اور اباجی کا دل بہلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ بہت اُداس ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”میرا دل کون بہلائے گا؟ جو اس وقت بہت اداس ہے۔“

وہ ہنسی۔ ”تلاش کر لو کوئی۔“

”تلاش تو بہت پہلے کر لی تھی مگر اسے اب میری پروا نہیں رہی گھر کی مرغی جو ہو گئی۔“

”تم مرغی کب سے ہو گئے...... محاورے میں ترمیم کر لو...... گھر کا مرغا ساگ برابر۔“

”میرا دل اس وقت دال کے لیے مچل رہا ہے...... گھر کی مرغی کو یاد کر رہا ہے کیا تم آ سکتی ہو؟“

وہ خوش ہوئی۔ ”مگر تم ہو کہاں؟“

”اچھا ڈائیلاگ یہ ہو سکتا ہے کہ تمہارے دل کی دھڑکن میں...... مگر باہر نکل کے دیکھو...... میں نظر آ جاؤں گا۔“

”یہ بات ہے؟ تو میں ٹھیک سات منٹ چھبیس سیکنڈ بعد تمہارے سامنے نظر آؤں گی۔“

گویا ایک گھنٹا سات منٹ تک میں آہیں بھرتا رہوں...... لباس...... میک اپ اور ٹیک آف کے لیے اتنا

وقت تو چاہیے تمہیں...... زنانہ ٹائم کے مطابق۔"

لیکن حیرت انگیز طور پر وہ ٹھیک سات منٹ بعد باہر آگئی۔ میں اس وقت گیٹ سے کچھ فاصلے پر آ کے رکا ہی تھا۔ اس نے میرے ساتھ بیٹھتے ہی کہا۔ "اب آیندہ کے لیے مان لو...... خواتین بھی پانچ منٹ میں تیار ہو سکتی ہیں۔"

میں نے عیاری سے کہا۔ "مجھے یقین ہے کہ تم کہیں جانے کے لیے پہلے سے تیار تھیں اور نکلنے ہی والی تھیں۔"

"ہاں میری منگیتر کے ساتھ ڈیٹ تھی۔ تم بڑے کمینے ہو رومیو...... اچھا اب یہ بتاؤ جانا کہاں ہے؟"

"بقول فلمی شاعر...... جتھے بندہ نہ بندے دی ذات ہووے...... جہاں میرے تمہارے سوا کوئی نہ ہو...... بحرالکاہل کی تہ میں...... ماؤنٹ ایورسٹ پر...... چاند پر...... مریخ پر...... کچھ ایسا ہو کہ یہ گاڑی بن جائے اڑن کھٹولا۔"

"کھٹولا وہ کیا ہوتا ہے؟...... اڑن طشتری تو ہوتی ہے۔"

میں نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ "کر دیا سادے رومانس کا بیڑا غرق...... اچھا اس کی جگہ سمجھو...... اسپیس شپ...... ہم زمین کی کشش سے آزاد ہو جائیں۔"

"نو...... مجھے یہ بالکل منظور نہیں...... ساری عمر خلا میں زمین کے گرد چکر لگاتے رہیں...... زمین پر سوئٹزر لینڈ ہے...... کیری آئی لینڈ ہے...... جنوبی فرانس میں بحیرہ روم کا ساحل ہے...... خلا میں کیا ہے؟"

میں نے جی ٹی روڈ پکڑ لی۔ گاڑی ایک کنارے پر سست رفتاری سے چلتی گئی۔ ہم باتیں کرتے رہے...... پرانے وقتوں کی...... لندن کی شاموں کی اور پیرس کی صبحوں کی جو تمام فکر و غم سے آزاد ہم نے سلطان کے ڈر سے چوری چھپے ایک ساتھ گزاری تھیں...... چوری کیے ہوئے پھل کتنے میٹھے لگتے ہیں...... انگریز ٹھیک ہی تو کہتے ہیں خرید کر کھانے میں وہ مزہ کہاں۔

دو گھنٹے بعد فریال نے کہا۔ "مجھے بھوک لگی ہے۔ واپس چلو۔"

میں نے ایک آہ بھری۔ "کاش واپسی کی مجبوری نہ ہوتی۔ ہم چلے جاتے...... اسلام آباد سے آگے مری...... نتھیا گلی پہنچ جاتے۔"

"سنو...... یہ سامنے کیا ہے؟"

میں نے کہا۔ "ڈھابا...... جنگلی ہوٹل...... کیفے ڈی پھونس...... ڈرائیور ہوٹل...... یہ سب ایسے ہی روڈ سائیڈ ہوٹلوں کے نام ہیں۔"

"پھر کیا خیال ہے؟"

میں نے کہا۔ "ان کی دال ماش فرائی کے مقابلے میں کسی فائیو اسٹار ہوٹل کے مینو کی کوئی حیثیت نہیں۔"

وہ ہوٹل پیٹرول پمپ کے ساتھ ہی تھا...... کھلی جگہ میں بان کی پرانی چارپائیاں لگی ہوئی تھیں اور ان پر بہت سے لوگ بے تکلفی سے بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ کچھ ایک بس کے مسافر تھے اکثریت ٹرک ڈرائیورز کی تھی مگر ایک کار بھی پہلے سے موجود تھی اور کوئی فیملی اس ماحول کو انجوائے کر رہی تھی جو شہر کے کسی ریسٹورنٹ سے یکسر مختلف تھا۔

ہم ایک کنارے پر لگی آخری چارپائی پر بیٹھ گئے۔ مشرق سے طلوع ہونے والا چاند تقریباً ہمارے سر کے اوپر آ گیا تھا اور اس کی چاندنی کا سحر گرد و پیش کی ویرانی میں دھند کی طرح پھیلا ہوا تھا جس میں سارا ماحول خواب جیسا لگتا تھا۔ آسمان کے کینوس پر پھیلے ہوئے گھنے درختوں کا ساکت عکس کسی بہت بڑی پینٹنگ کی طرح لگتا تھا۔ زمین پر تاحد نگاہ پھیلے ہوئے کھیتوں پر سے رات کی ہوا ہولے ہولے گزر رہی تھی۔ ان کے پیچھے گاؤں کے تاریک گھروں میں ان کھیتوں کو بونے سینچنے اور کاٹنے والے سوئے پڑے تھے۔ جی ٹی روڈ پر صرف یہ ہوٹل آباد تھا جس کی رونق کا انحصار اس سڑک پر سے گزرنے والی گاڑیوں پر تھا۔

فریال اس ماحول میں مسحور سی بیٹھی رہی...... "یہ کتنی مختلف دنیا ہے رومیو...... اس دنیا سے جس میں ہم ایک غیر آسودہ زندگی گزارتے ہیں...... سب کچھ پا لینے کے باوجود ہم قناعت کے سکون سے محروم ہیں۔"

"ہاں...... ہم اس دنیا کے باسی ہوتے تو ہماری زندگی کتنی سادہ اور ہماری خواہشات کتنی محدود ہوتیں...... وہاں ہم صبح سے شام تک جتنی تگ و دو کرتے ہیں اس کے بعد کیا پاتے ہیں؟ بے اطمینانی...... بے سکون زندگی کے غم اور ایک تھکا دینے والی خواہشات کی دوڑ۔"

پیٹرومیکس لیمپ کی روشنی میں ہم نے دال ماش کے ساتھ تندور سے نکلنے والی خوشبودار گرما گرم روٹیاں کھائیں اور پھر دودھ میں ابالی ہوئی چورا چائے کے دو کپ خالی کیے۔ فریال کے لیے یہ ایک انوکھا تجربہ تھا۔ وہ بہت خوش تھی کیونکہ لندن کی روشنیوں سے جگمگاتی خوشبوؤں سے مہکتی اور فیشن کے رنگوں سے سجی پرہجوم دکانوں، ریسٹورنٹس اور بازار کے مقابلے میں اس چارپائی والے نیم تاریک دیسی ہوٹل کے ماحول میں بڑی خلوت تھی اور اپنائیت تھی۔

اس ماحول کے طلسم کو میرے موبائل فون کی گھنٹی نے

توڑا۔ اس آواز نے یکلخت مجھے اسی دنیا میں کھینچ لیا جس سے میں نے وقتی فرار حاصل کر کے فریال کے ساتھ محبت کی خلوت کے چند لمحے گزارے تھے...... میں نے فون کے روشن اسکرین کو دیکھا۔ اس پر دکھائی دینے والا نمبر میرے لیے اجنبی تھا مگر فوراً سے شروع ہوتا تھا۔ ڈبل زیرو کے ساتھ یہ لندن کی کال ڈاکٹر شائستہ کے سوا کسی کی نہیں ہو سکتی تھی۔

میری ہیلو کے جواب میں اس نے کہا۔ "رفیق صاحب...... میں آپ کو ڈاکٹر شہناز کا فون نمبر ایس ایم ایس کر رہی ہوں۔" اور اس سے پہلے کہ میں کوئی بات کرتا لائن کٹ گئی۔ چند سیکنڈ بعد ایس ایم ایس آیا۔ یہ پاکستان ہی کا نمبر تھا اور لاہور کے ریجن کا تھا لیکن جب میں نے یہ نمبر ملا کے شہناز سے بات کرنی چاہی تو مجھے ناکامی ہوئی...... قرب و جوار میں اس موبائل فون کمپنی کا ٹاور نہ ہونے سے میری کال تھرو نہ ہو پائی۔ شہناز کی کال کسی سیٹلائٹ فون کے ذریعے سات سمندر پار سے آ گئی تھی مگر اپنے ہی ملک میں میرا رابطہ سو سوا سو میل کے فاصلے پر موجود راجا سے نہیں ہو رہا تھا۔

اس کال نے میرے رومانی موڈ کا بیڑا غرق کر دیا۔ میں نے فریال سے کہا۔ "مجھے اسی کال کا انتظار تھا۔"

اس نے کہا۔ "ذرا یہ فون مجھے دو۔"

میں نے فون اسے تھما دیا۔ "یہاں سے کال نہیں مل رہی ہے۔"

"بھاڑ میں گئی کال...... تمہیں یہ فون اپنے ساتھ لانا ہی نہیں چاہیے تھا۔ ایک کال نے تمہارا سکون چھین لیا۔" اس نے فون کو پیچھے سے کھولا اور اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھتا اس نے بیٹری نکال لی۔

"یہ کیا کر رہی ہو؟"

"اب بیٹھے رہو آرام سے۔" اس نے بیٹری کو ہاتھ گھما کے دور پھینک دیا۔ کسی چاکلیٹ جتنی بڑی بیٹری کھیت میں کھڑی فصل کے درمیان گم ہو گئی۔

میں آرام سے بیٹھا رہا۔ فریال نے ٹھیک کہا تھا۔ اخبار، فون، ریڈیو اور ٹی وی جیسی چیزیں ساتھ ہوں تو پہاڑوں کی سرسبز وادیوں اور برف پوش چوٹیوں پر بنی مون منانے والا بھی دنیا کے جھمیلوں سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ مکمل سکون مکمل خلوت سے ہی ملتا ہے۔

رات کے بارہ بجے جب ہم لوگوں کی مشکوک نظروں کا نشانہ بننے لگے تو واپسی ناگزیر ہو گئی...... اب سڑک پر ویرانی بڑھ گئی تھی اور دونوں طرف سے آنے والی ٹریفک اتنی کم ہو گئی تھی کہ گاڑی چلاتے ہوئے بھی میں نے فریال پر عملی طور پر اپنی محبت کا اظہار اسی شدت جذبات کے ساتھ کیا جیسے لندن کی آزاد فضا میں ممکن تھا چند گھنٹوں کی آزاد قربت نے ہماری تمام کلفت دور کر دی تھی۔ دوری کا وہ احساس ختم کر دیا تھا جو یہاں کے مشرقی آداب کی پاسداری سے پیدا ہوا تھا۔

جب ہم پھر لاہور کی حدود میں داخل ہوئے تو گویا پھر تفکرات کے حصار میں آ گئے۔ میں نے ایک پی سی او سے شہناز کا نمبر ملایا جو مجھے یاد رہ گیا تھا ورنہ بیٹری کے بغیر موبائل فون کی میموری سے نہیں مل سکتا تھا۔ کال کسی بھاری آواز والی خاتون نے وصول کی۔

اس نے پہلے صاف انکار کر دیا۔ "یہاں تو کوئی شہناز نہیں ہوتی۔"

میں نے کہا۔ "ہوتی ہے...... میں نے یہ نمبر لندن سے حاصل کیا ہے میں رفیق ہوں...... رفیق احمد...... اگر وہ سو رہی ہے تو اسے جگا دو۔"

کچھ دیر خاموشی رہی پھر شہناز کی آواز آئی۔ "تو آپ نے تلاش کر ہی لیا مجھے۔"

ایک فلمی شعر عرض ہے۔ وہ جو چاہنے والے ہیں تیرے صنم تجھے ڈھونڈ ہی لیں گے کہیں نہ کہیں۔"

"میں نے رابعہ کو قسم دی تھی۔"

"میں نے بھی قسم دے دی تھی کہ اپنی قسم توڑ دو...... میری قسم پتھر کی تھی...... تمہاری شیشے جیسی...... یہ موٹی بھینس جیسی آواز والی کون تھی جس نے جھوٹ بول کے مجھے ٹالنے کی کوشش کی تھی۔"

شہناز ہنسنے لگی۔ "وہ میری ایک سہیلی کی بڑی بہن ہے۔ اس نے جو کیا میری ہدایت پر کیا۔ آپ جانتے ہیں میں اغوا ہو گئی ہوں۔"

"اغوا ہونے میں تو کوئی حرج نہیں...... لیکن تم ہو کہاں؟"

"سوری...... فی الحال یہ ٹاپ سیکرٹ ہے۔ ہمیں سرگرمی سے تلاش کیا جا رہا ہے۔"

میں نے کہا۔ "مجھے راجا سے بات کرنی تھی۔"

"مجھے نہیں معلوم وہ کہاں ہے۔ صبح آئے گا تو میں بتا دوں گی۔ ویسے سب پلان کے مطابق جا رہا ہے۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ کل صبح کا اخبار ضرور پڑھ لینا اور بار بار فون کرنے کی یا لمبی بات کرنے کی ضرورت نہیں...... اس میں کال ٹریس ہونے کا رسک ہے اس لیے شب بخیر اور خدا حافظ۔" شہناز نے کہا اور فون بند کر دیا۔

مجھے کچھ مایوسی ہوئی کہ راجا سے بات نہ ہو سکی لیکن ایک

امید بھی پیدا ہوگئی کہ اب راجا سے بھی رابطہ ہو جائے گا۔ شاہی بادشاہ ایک ڈاکو تھا لیکن اس میں انسانیت کی وہ رمق زندہ تھی جو راناجیسے خاندانی شریفوں کے خون میں بھی نہ تھی۔ کاسو جیسے بے وقعت شخص نے اس کی زندگی بچائی تھی تو شاہی اس کے احسان کو بھولا نہیں تھا پھر میں نے کاسو کی زندگی بچائی تو اس نے یہ ہمارا احسان بھی قبول کر لیا...... ان کے اور میرے درمیان یہی تعلق ...... بے غرض دوستی کے ایک رشتے میں ڈھل رہا تھا اگر وہ میری مدد نہ کرتا تو غلام محمد اور شہاب الدین جیسے بدمعاش میرا جینا دوبھر کر دیتے......غلام محمد اپنے محافظوں اور ساتھیوں سمیت شاہی بادشاہ کی قید میں تھا اور شہاب الدین کو دو کروڑ کے تاوان کا مطالبہ ارسال کر دیا گیا تھا۔ ڈاکٹر شہباز کے ساتھ راجا کے اغوا کا ڈراما اس لیے رچایا گیا تھا کہ اخباروں میں ایک صحافی اور ایک ڈاکٹر کے اغوا کیے جانے کی خبر سے کچھ ہلچل پیدا ہو۔

پروگرام کے مطابق شاہی بادشاہ کچھ عرصے بعد راجا کو بھی رہا کر دیتا اور شہباز کو بھی...... پھر میں شہاب الدین سے رابطہ کرتا کہ تمہیں اگر غلام محمد اور اس کے ساتھیوں کو رہا کرانا ہے تو مجھ سے بات کرو...... شاہی بادشاہ میرا دوست ہے۔ وہ میری بات نہیں ٹال سکتا۔ اس سے دو فائدے ہوتے...... ایک تو تنظیم پر میری دہشت قائم ہو جاتی کہ میں اب وہ پہلے والا لاوارث رفیق نہیں ہوں۔ میں واقعی نواب رفیق احمد شیرازی ہوں جس کے پاس دولت کی طاقت کے ساتھ شاہی بادشاہ کے گروہ کی حمایت بھی ہے چنانچہ اپنی بدمعاشی کے داؤ مجھ پر نہ آزمائیں...... دوسرا فائدہ یہ تھا کہ تاوان کے دو کروڑ شاہی بادشاہ کی وساطت سے بالآخر ہمیں ملتے اور ست بدھائی ڈیولپمنٹ فنڈ میں شکریے کے ساتھ قبول کیے جاتے۔

رات کے دو بجے ہم چوروں کی طرح گھر میں داخل ہوئے پھر بھی پکڑے گئے...... فاروقی کی بیوی جاگ رہی تھی اور آہٹ پر نکل آئی۔ ''آ گئے تم دونوں آوارہ گردی کر کے۔''

میں نے کہا۔ ''بھابی...... میں نے تو تمہیں راز دار بنایا تھا تم تو بن گئی ہو ہمارے اخلاق و کردار کی محتسب۔''

''دیکھو...... اگر تمہارے والدین یہاں نہ ہوتے تو میں کچھ نہ بولتی۔ تم عاقل و بالغ ہو...... اپنا برا بھلا سمجھتے ہو مگر تمہیں یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ تمہارے ماں باپ پرانے وقتوں کے شریف لوگ ہیں۔ وہ اس قسم کی صورت حال کو قبول کر ہی نہیں سکتے۔''

''یہ تو آپ نے صحیح فرمایا...... مگر۔''

''مگر کیا...... فریال کو تم یہاں لائے تھے تو کیا کہا تھا؟ اس کی رخصتی یہاں سے ہوگی...... کہا تھا یا نہیں؟''

میں نے اقرار جرم کیا۔ ''کہا تھا۔''

''تمہاری مرحومہ دادی نے تمہارے کہنے پر اپنی بات منوائی تھی تمہارے والدین نے تمہاری خوشی دیکھتے ہوئے یا ان سے تمہاری شادی منظور کر لی تھی۔ اسے وہ اپنی ہونے والی بہو کی نظر سے دیکھتے ہیں اور ہونے والی بہو سے وہ ایسی بے شرمی کی ہرگز توقع نہیں رکھتے...... وہ اتنے آزاد خیال کیسے ہو سکتے ہیں...... کل رات تم بڑے بحران سے بچ گئے...... مانا اس میں تمہاری نیت کا قصور نہیں تھا مگر آج فریال بنا بتائے چپکے سے غائب ہو گئی۔ کم سے کم مجھے ہی بتا جاتی...... تمہیں کیا معلوم وہ کتنے پریشان تھے۔ مجھے جھوٹ بولنا پڑا کہ اسے ڈاکٹر شہباز نے بلایا تھا۔''

''ڈاکٹر شہباز نے؟'' میں نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔

''کیوں...... کیا ہوا...... اور کس کا نام لیتی میں؟ تمہارا؟'' وہ خفگی سے بولی۔ ''خدا کے لیے کچھ محتاط رہو...... کچھ ان کا خیال کرو...... وہ بہت دکھی ہیں ان کو اپنی حرکتوں سے اور دکھی کیوں کرتے ہو۔''

میں نے اس کی بات کا قطعی برا نہیں مانا کیونکہ جو کچھ وہ کہہ رہی تھی خلوص اور محبت میں کہہ رہی تھی اور اس کی بات کسی پہلو سے غلط نہ تھی مگر فریال کا ردعمل ناخوشگوار رہا...... اس بھاوج کی طرح جو نند کی صحیح بات کو بھی اپنی نجی زندگی میں مداخلت کی طرح سمجھتی ہے اس نے ساری زندگی آزادانہ زندگی گزاری تھی اور اپنی مرضی کی تھی اس کا نقصان بھی ہوا تھا۔ صفدر سلطان کو اس نے میری اور دوسرے بہت سے بہی خواہوں کے مشورے کو نظر انداز کرتے ہوئے قبول کیا تھا اور اب اسی عذاب کو بھگت رہی تھی۔

وہ منہ بنا کے چلی گئی تو میں نے فاروقی کی بیوی سے معذرت کی۔ ''یہ ذرا موڈی ہے۔''

وہ مسکرائی۔ ''مجھے معلوم ہے۔ اتنے دن میں اسے بہت اچھی طرح سمجھ لیا ہے میں نے۔ میں اس کی کسی بات کا برا نہیں مانوں گی مگر رفیق۔''

میں بجاتے جاتے رُک گیا۔ ''جی...... کچھ کہنا چاہتی تھیں آپ؟''

''ہاں...... اب تم برا مت ماننا کبھی تم نے سوچا ہے کہ یہ لڑکی تمہارے گھر میں کیسے رہے گی میرا مطلب ہے...... جوائنٹ فیملی سسٹم میں تمہارے والدین کے ساتھ...... یہاں تو بزرگوں کے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچے اس کے لیے بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''میرا خیال ہے میرے والدین خاصے کشادہ دل ہیں۔''

''یعنی تم ان سے توقع رکھتے ہو کہ وہی سب کچھ برداشت کرتے رہیں...... تمہاری خوشی کس بات میں ہے اس کا خیال وہ رکھیں۔ ایسا سوچتے ہو تو تمہاری مرضی۔'' وہ پلٹی اور اپنے بیڈ روم میں غائب ہو گئی۔

اس طرح تو میں نے واقعی پہلے نہیں سوچا تھا۔ تمام عمر والدین میرے لیے ہر قسم کی قربانی دیتے آئے تھے کیا آئندہ بھی ایسے ہی ہونا چاہیے...... کیا اب یہ ان کا حق نہیں بنتا کہ ہم انہیں خوش رکھیں...... جیسے بھی وہ چاہیں کسی کو خوشی دینے کے لیے تھوڑی بہت قربانی تو دینی ہی پڑتی ہے۔

ابھی میں جوتے اتار ہی رہا تھا کہ فریال نمودار ہوئی۔ ''میں نے بھابی کی بات سن لی ہے۔''

میرا ہاتھ رک گیا۔ ''تمہیں ناگوار گزری ہوگی۔''

''نہیں...... میرا خیال ہے میرا رویہ غلط تھا...... صبح میں ان سے معافی مانگ لوں گی وہ میرا خیال بڑی بہن کی طرح رکھتی ہیں۔''

میں نے جوتے نیچے رکھ کے اس کا ہاتھ پکڑ کے اپنی طرف کھینچا اور اپنی آغوش میں بھر کے چوم لیا۔ ''تم نے میرے دل کی خلش دور کر دی...... تم واقعی فریال ہو...... جو صرف ایک ہی ہو سکتی تھی۔''

صبح پھر میں دیر سے اٹھا۔ ابا جی مجھے باغ میں اخبار پڑھتے نظر آئے۔ میں سلام کر کے ان کے پاس بیٹھا تو انہوں نے اخبار رکھ دیا۔ ''ابھی میری فاروقی سے تفصیلی بات ہوئی اس نے مجھے یقین دلایا ہے کہ نذیر کا معاملہ ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ چودہ دن کا ریمانڈ محض خانہ پری ہے۔''

''بالکل...... آپ کو اس سلسلے میں بالکل متفکر ہونے کی ضرورت نہیں۔'' میں نے کہا۔

''اس نے تو کہا ہے کہ میڈیکل رپورٹ ملتے ہی عدالت سے اس کی ضمانت پر رہائی کی درخواست منظور ہو جائے گی۔'' ابا جی خاصے مطمئن تھے۔

''فاروقی غلط نہیں کہتا وہ بہت بڑا وکیل ہے۔''

''اللہ اسے خوش رکھے...... اس کی بیوی بھی اتنا خیال رکھتی ہے ہمارا کہ احساس نہیں ہوتا ہم اپنے گھر میں نہیں ہیں پھر بھی رفیق یہاں کب تک رہیں گے ہم۔''

میں نے کہا۔ ''میرا خیال ہے آپ کو ست بدھائی واپس چلے جانا چاہیے۔''

وہ پھر فاروقی کی بات پر آ گئے۔ ''فاروقی کہہ رہا تھا کہ ضمانت منظور ہو جانے کے بعد ہم اپنی ذمے داری پر اسے کسی بھی نفسیاتی اسپتال میں رکھ سکتے ہیں۔ سرکاری پاگل خانے بھیجنا قطعی ضروری نہیں۔''

''میں نے تو پہلے ہی بتایا تھا آپ کو۔''

''وہ تو اس حد تک کہہ رہا تھا کہ ہم عدالت کو مطمئن کر دیں تو نذیر کو اپنے ساتھ ہی رکھ سکتے ہیں۔ ست بدھائی میں۔''

میں سمجھ گیا کہ ابا جی کی فکر دور کرنے کے لیے فاروقی نے بہت بڑھ چڑھ کے باتیں کی ہیں۔ میں نے کہا۔ ''بالکل...... حفاظتی انتظام ایسا ہونا چاہیے کہ کسی کو خطرہ نہ ہو۔''

''رفیق بیٹا...... وہ اتنا خطرناک پاگل تو نہیں ہے کہ اپنوں کو اس سے خطرہ ہو۔''

میں نے جلدی سے کہا۔ ''وہ بس ایک رسمی کارروائی ہو گی۔ ہم عدالت کو مطمئن کر دیں گے کہ ان کی رہائش الگ ہو گی جہاں کوئی نگرانی کرنے والا بھی ہوگا علاج کے لیے ڈاکٹر باقاعدگی سے آئے گا۔''

''دیکھو بیٹا...... زمانہ ایسا ہے کہ سفارش اور رشوت کے بغیر بنتے کام بگڑ جاتے ہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی ناخوش ہو کے ٹانگ اڑا دے اور جیسا ہم چاہتے ہیں ویسا نہ ہو۔''

میں نے کہا۔ ''آپ مجھ پر بھروسا رکھیں ایک کی جگہ دس نہیں سو خرچ کیے جاسکتے ہیں۔''

انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ''قرب قیامت کی نشانیاں تو لوگ ہر دور میں دیکھتے آئے ہیں لیکن جو میں دیکھ رہا ہوں وہ قیامت سے کیا کم ہے ایسا وقت بھی آئے گا رفیق میاں کہ کسی کو سلام کرو گے تو وہ ہاتھ پھیلائے گا کہ پہلے پیسے اور پھر سلام کا جواب دوں گا۔''

فاروقی کی بیوی نے ابا جی کو ایک کپ چائے باغ میں ہی پہنچا دی تھی۔ اب وہ انہیں ناشتے کے لیے بلانے لگی تو ابا جی اخبار چھوڑ کے اٹھ گئے اخبار میں نے اٹھایا ہی تھا کہ وہ مجھے پکارنے لگی۔ ''نواب صاحب قبلہ آپ بھی تشریف لے آیئے۔'' اور میں اندر گیا تو مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ناشتا بنانے اور لگانے میں فریال پوری طرح مدد کررہی تھی۔ دوپٹا اس کے سر پر تھا اور وہ ایک خدمت گزار بہو کی طرح میرے والدین کو سرو کررہی تھی۔ یہ انہیں امپریس کرنے والی اداکاری نہیں تھی...... فریال کی فطرت میں منافقت کبھی نہ تھی...... غالباً گزشتہ شب فاروقی کی بیوی نے جو بات مجھ سے کہی تھی وہ اس کے دل کو لگی تھی۔

میں گزشتہ رات زیادہ کھا گیا تھا۔ کچھ تو بھوک کی وجہ سے تھا لیکن کچھ اس ماحول کا اثر تھا جس میں میری طبیعت بہت بشاش تھی اب تڑکے والی ماش کی دال اپنا اثر دکھا رہی تھی۔ میں نے صرف چائے لی اور پھر باہر باغ میں آکے بیٹھ گیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ ڈاکٹر شہناز کے ساتھ راجا کے اغوا کی خبر کو کیسے ڈیلے کیا گیا ہے۔

خبر اندر والے دوسرے صفحے پر تھی اور ابا جی نے ابھی پہلا ہی صفحہ دیکھا تھا جس پر عالمی اور ملکی اہمیت کی حامل خبریں ہوتی ہیں ورنہ وہ راجا اور شہناز کی تصویر پر متوجہ ہو کے خبر بھی دیکھ لیتے...... خبر میں دی گئی تفصیل کے مطابق مشہور صحافی راجا کو ان کی منگیتر کے ساتھ اغوا کرلیا گیا ہے اور پولیس نے خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ کارروائی پیشہ ور ڈاکوؤں کے کسی گروہ کی ہے۔ اس بات کے شواہد ملے ہیں کہ انہیں کالا شاہ کاکو کے نزدیک ایک فارم ہاؤس سے اغوا کیا گیا۔ جہاں وہ تنظیم کی پنجاب شاخ کے نگراں غلام محمد سے انٹرویو کے لیے گئے تھے۔ غلام محمد کے محافظ اور ملازم بھی لاپتا ہیں اور پولیس تاحال غلام محمد سے رابطہ قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکی۔ ان کی سیکریٹری نے بتایا کہ وہ تنظیم کے ایک سابق کارکن رفیق احمد کے ہمراہ کہیں گئے تھے لیکن اس کے بعد سے لاپتا ہیں۔ پولیس رفیق احمد کو تلاش کررہی ہے۔

خبر میں اپنا نام دیکھ کر میرا تشویش میں مبتلا ہونا جائز تھا۔ پولیس کو معلومات یقیناً اس کی اینگلو انڈین سیکریٹری نے دی ہو گی۔ یہ میرے لیے خطرے کی گھنٹی تھی۔ پولیس مجھے بڑی آسانی سے تلاش کرلے گی۔ ممکن ہے وہ ہمارے گھر بھی پہنچے ہوں اور محلے والوں نے انہیں بتایا ہو کہ پروفیسر صاحب کی فیملی تو یہاں سے چلی گئی ہے۔ پولیس کو یہ علم بھی ہوجائے گا کہ میری فیملی کے ساتھ کیا ٹریجڈی ہوئی تھی جس کی وجہ سے ہم نے اپنا گھر چھوڑا لیکن انہیں کسی سے پوچھنا نہیں پڑے گا کہ گھر چھوڑ کے گھر والے کہاں گیے...... وہ گئے ہیں ست بدھائی جہاں ان کی آبائی جاگیر اور حویلی ہے اور جہاں دو مقتولین کو دفن کیا گیا ہے۔

اس کے بعد پولیس کے سامنے بہت سے سوالات آئیں گے سب سے پہلے یہی کہ میں غلام محمد سے ملنے کیوں گیا تھا؟ اگر اب تنظیم سے میرا کوئی تعلق نہیں تو اس ملاقات کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ غلام محمد کے ساتھ میں کہاں گیا تھا اور کیوں...... میں نے اسے کہاں چھوڑا تھا اور کس وقت۔

تفتیش کا دوسرا پہلو یہ ہوگا کہ اغوا ہونے والی ڈاکٹر شہناز اور راجا میرے دوست تھے اور ست بدھائی میں تھے۔ وہ غلام محمد کا انٹرویو لینے اس کے فارم ہاؤس کیوں گئے؟ اور اگر وہ اغوا ہوئے تھے تو یہ بات مجھے کیوں معلوم نہیں تھی؟

ان سوالات کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں نے ایک بیان تیار کیا۔ بلاشبہ تنظیم سے میرا تعلق ختم ہوئے آٹھ سال ہو گئے۔ میں نے امریکا میں چھ سال گزارے اور ایم بی اے کیا۔ پھر دو سال لارڈ ارنسٹ کی فرم میں کام کیا اور اس کے بعد ست بدھائی کی جاگیر سنبھالنے واپس پاکستان آگیا۔ مجھے کیا ضرورت تھی تنظیم کے چکر میں پڑنے کی۔ ہاں غلام محمد سے میں ضرور ملا تھا یہ محض ایک رسمی ملاقات تھی۔ کرٹسی کال...... اس نے بلایا تھا میں چلا گیا وہ مجھے کھانا کھلانے باہر لے گیا...... کھانا ہم نے کہاں کھایا؟ فوڈ اسٹریٹ میں...... گوالمنڈی والی فوڈ اسٹریٹ میں...... اس کے بعد میں اپنے گھر آگیا آج کل میں بیرسٹر فاروقی کے ساتھ مقیم ہوں۔ میرے والدین بھی میرے ساتھ ہیں۔ فاروقی سے میرے تعلقات صرف پیشہ ورانہ نہیں...... ہمارے گھریلو مراسم پہلے سے ہیں۔

اب رہا سوال راجا اور ڈاکٹر شہناز کے اغوا کی واردات سے میری بے خبری کا تو مجھے بھی اخبار سے علم ہوا۔ ظاہر ہے اغوا کرنے والے تو مجھے مطلع کرنے سے رہے۔ راجا خود ہی بتا سکتا ہے کہ وہ غلام محمد سے ملنے فارم ہاؤس کیوں گیا تھا اور

اپنے ساتھ شہناز کو کیوں لے گیا تھا۔ میرا تو اس سے رابطہ نہیں ہوا۔

اندر جا کے میں نے فاروقی کی بیوی سے پوچھا کہ کیا اس وقت فاروقی سے رابطے کی کوئی صورت ہے؟

''اس وقت وہ ہوں گے کسی نہ کسی عدالت میں۔''

''موبائل فون بھی بند ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''لیکن ایک نمبر ہے۔'' وہ مسکرائی۔ ''جس پر میرے سوا کوئی فون نہیں کرسکتا اسے وہ کھلا رکھتے ہیں کہ خدانخواستہ مجھے ایمرجنسی درپیش ہو تو میں بات کرلوں۔''

''کیا آپ ایمرجنسی کی تعریف کریں گی؟ فرض کریں ابھی مجھے ہوجائے ہارٹ اٹیک......''

''رفیق بھائی......'' وہ گھبرا کے بولی۔ ''کیسی باتیں کرتے ہیں۔'' اور ایک نمبر ملا کے ریسیور مجھے تھما دیا۔

گھنٹی چار بار بجی پھر فاروقی نے حواس باختہ لہجے میں کہا۔ ''کیوں بلبل...... خیریت ہے نا؟''

میں نے کہا۔ ''میں بلبل نہیں بلبلا ہوں وکیل صاحب...... اس وقت آپ اندر ہیں کہ باہر...... میرا مطلب ہے عدالت سے؟''

''جلدی بول...... میں پیشی کے لیے تیار کھڑا ہوں۔''

میں نے مختصر بات کی اور اسے بتا دیا کہ میرا پولیس کو کیا بیان دینے کا ارادہ ہے...... اس نے میرے بیان کو اوکے کر دیا۔ انشا اللہ اس سے تو اندر ہوجائے گا...... ممکن ہے بعد میں پھانسی بھی چڑھ جائے۔ یہی بیان رکھنا۔'' اس نے کہا اور فون بند کردیا۔

اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ میں دوسروں کو بھی شریک راز کروں۔ وہ بھی خبر پڑھ کے سخت پریشان ہوئے۔ ''آخر یہ کیا ہو رہا ہے ہمارے ساتھ رفیق؟''

میں نے کہا۔ ''دنیا میں بہت کچھ ہوتا ہے ابا جی...... اور وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے...... آپ فکر نہ کریں۔''

''فکر کیسے نہ کروں...... اس میں تمہارا ذکر خیر بھی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''

''کیوں...... پولیس تم سے نہیں پوچھے گی۔''

میں نے کہا۔ ''کل تو میں نہ جانے کس کس سے ملا تھا ان میں سے تو کوئی غائب نہیں ہوا...... غلام محمد لاپتا ہوگیا تو اس میں میرا کیا قصور؟''

''مگر تم اس سے ملے ہی کیوں تھے؟'' وہ خفگی سے بولے۔

''ایک کام تھا ابا جی...... میرا نہیں...... اس کا...... میں نے انکار کر دیا اور بس۔''

ابا جی...... مطمئن نہیں ہوئے۔ ''پولیس ہمارے گھر پہنچی ہوگی؟''

میں نے کہا۔ ''ست بدھائی بھی گئی ہوگی۔ لیکن اس میں پریشانی کی کون سی بات ہے وہ میرا بیان تو لیں گے نا...... بیان میں خود جا کے دے آتا ہوں۔ میں نے فاروقی سے بات کرلی ہے۔''

آدھے گھنٹے بعد بھی میں انہیں مطمئن کرنے میں پوری طرح کامیاب نہیں تھا مگر میں گاڑی لے کر نکل گیا...... میں نے ایک چکر تھانے کا لگایا صوفی چچا حوالات کے فرش پر سو رہے تھے میں نے ان کو بستر کی سہولت فراہم کرانے کے لیے بھاری نذرانہ دیا اس کے باوجود صرف یہ کہا گیا کہ بستر رات کے وقت تو دیا جاسکتا ہے دن میں ممکن نہیں۔

تھانے سے نکل کے میں اپنے پرانے گھر کی طرف گیا۔ ایک خیال یہ تھا کہ وہاں سے میں شہاب الدین کی خیریت پوچھوں اور اس کا ردِعمل دیکھوں۔ اگر اسے خود کو شاہی بادشاہ کی طرف سے تاوان کی ادائیگی کا نوٹس مل چکا ہوگا تو وہ سخت مشتعل ہوگا۔ وہ مجھ سے وضاحت مانگے گا کہ تم کیوں اغوا نہیں ہوئے اور غلام محمد کہاں ہے تم نے اسے قتل کر کے کہیں پھینک تو نہیں دیا ہے۔

دوسرا مقصد محلے والوں سے یہ پوچھنا تھا کہ پولیس مجھے پوچھتی ہوئی تو وہاں نہیں آئی تھی۔ ابھی میں گلی کے موڑ پر دور تھا کہ میرے فون کی گھنٹی گنگنانے لگی۔

اجنبی نمبر دیکھ کے میں نے پوچھا۔ ''ہیلو؟''

جواب میں راجا نے کہا۔ ''کیا حال ہے تیرا ٹیکے پتر؟''

میں نے گاڑی ایک طرف روک لی۔ ''ابے مہاراجا...... مبارک ہو یار...... تیری اور تیری جورو کی تصویریں اخبار میں شائع ہوئی ہیں۔''

اس نے عاجزی سے کہا۔ ''بس یار...... بڑے لوگ ہی اغوا ہوتے ہیں۔ تیرے جیسے حقیر فقیر کو اٹھانے والا کون ہوگا دیکھ کتنی قیمت لگی ہے ہماری۔''

''کوئی جواب ملا؟''

''ابھی کہاں یار شہاب الدین پہلے تو تفتیش کرائے گا کہ تاوان کا خط اصلی ہے یا کسی نے مذاق کیا ہے۔ اس کے بعد معاملہ اٹھے گا دو کروڑ کا۔ وہ خود تو غلام محمد کے لیے دو روپے بھی نہ دے۔ پوچھے گا اپنے باپ نمبر دو سے...... وہ پیرس میں روپوش ہے پتا نہیں اس کے پاس مال ہے یا نہیں اور مال ہو تب بھی اصل بات ہے غلام محمد کی جان کی قیمت کی...... کیا وہ

دو کروڑ کا ہے۔ چیف کے نزدیک انسان کی زندگی کی کوئی قیمت نہیں۔"

"لیکن غلام محمد اور شہاب الدین...... اب بھی دو تو باقی رہ گئے ہیں اس کے حامی...... جن پر وہ بھروسا کر سکتا ہے۔"

راجا نے کہا۔ "دیکھو پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "تو کب تک روپوش رہے گا۔"

"ابھی تو چھٹی منا رہے ہیں ہم...... ہفتہ بھر ایسے ہی...... سیر سپاٹے کریں گے...... پھر آ جائیں گے کسی روز پریس کلب...... بیان پولیس دے گی کہ انہوں نے کتنی جانفشانی سے دن رات ایک کر کے ہمیں بازیاب کیا۔ تاوان ایک پیسہ نہیں دیا۔ ان کے لیے اچھا موقع ہوگا نمبر بنانے کا۔ دو چار کی پروموشن ہو جائے گی میں ہر طرح کا کام لیتا ہوں ان سے...... کبھی ان کے لیے بھی کچھ کرنا چاہیے...... تجھے نہیں پکڑا ابھی تک پولیس نے؟"

"پکڑے گی...... مگر میرا بیان تیار ہے...... فاروقی نے منظوری دی ہے میرا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔"

"فیکے پتر شہاب الدین سے ہوشیار رہ۔ تو نے پہلے بھی کئی بار غلام محمد کو تڑی دی تھی اور تو نے ان کا کام بھی نہیں کیا۔ بے شک آج وہ اقتدار میں نہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ طاقتور بھی نہیں۔"

"میرا خیال ہے مجھے ان سے فی الحال کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا مگر ابا جی سخت پریشان ہیں میں انہیں کیا بتاؤں کہ یہ کیا ڈراما ہے۔"

"انہیں تسلی دیتا رہ کہ مذاکرات چل رہے ہیں۔ سندھ کے کچھ بااثر لوگ بیچ میں ہیں...... کچھ خفیہ ایجنسی والے ہیں۔"

"شامی بادشاہ کا شکریہ ادا کر دینا میری طرف سے۔ اچھا ہے اسے......؟ مل جائیں گے۔"

"میرا کوئی رابطہ نہیں اس سے...... صوفی چچا کیس کا کیا ہوا؟"

میں نے اسے اکبر خان سے ہونے والی ڈیل کے بارے میں بتا دیا۔ میری اس کی گفتگو ایک گھنٹا چلی۔ درمیان میں کئی بار اس نے کال بند کی اور پھر دوسرے نمبر سے ملائی۔ یہ احتیاط کا تقاضا تھا اس نے کہا کہ وہ ایک سم استعمال کر کے پھینک دیتا ہے اور دوسری لگا لیتا ہے۔ اس طرح کال ٹریس ہونے کے چانس ختم تو نہیں ہوتے مگر کم ہو جاتے ہیں۔

ابھی ہماری گفتگو جاری ہی تھی کہ بیٹری جواب دے گئی۔ گزشتہ رات میں نے نئی بیٹری خریدی تھی لیکن اسے چارج نہیں کیا تھا۔ اس میں جتنا چارج تھا وہ ختم ہو گیا تو فون ڈیڈ ہو گیا۔ میں نے موبائل فون کو ڈیش بورڈ پر رکھا تو میری نظر اس شخص پر گئی جو فٹ پاتھ پر کھڑا منتظر تھا کہ میں اپنی بات ختم کروں تو وہ بولے۔ میں اسے پہچانتا تھا وہ میرے ابا کے کالج کے ایک کولیگ کا بیٹا تھا۔ دو سال پہلے ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے بھی اسی گلی میں ہمارے گھر سے کچھ فاصلے پر مکان خرید لیا تھا۔

"رفیق بھائی......" وہ آگے آیا۔ "کہاں ہیں آپ؟"

میں نے کہا۔ "معاف کرنا میں نے گفتگو کی مصروفیت میں آپ کو نہیں دیکھا۔ کب سے کھڑے تھے آپ؟"

"کافی دیر سے۔" وہ میرے ساتھ بیٹھ گیا

میں نے کہا۔ "خیریت؟ کوئی خاص بات؟"

اس نے عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھا۔ "کہاں سے آ رہے ہیں آپ؟"

میں نے کہا۔ "ہمارے دوست ہیں بیرسٹر فاروقی...... اماں ابا یہاں گھبرا رہے تھے اتنا بڑا سانحہ ہو گیا اب وہ رہنا ہی نہیں چاہتے اس گھر میں...... میں انہیں فاروقی کے گھر لے گیا تھا وہیں سے آ رہا ہوں۔"

گویا آپ کو کچھ پتا ہی نہیں؟"

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ "کس بات کا پتا نہیں؟"

اس نے کہا۔ "اچھا چلیے...... اب میں کیا بتاؤں...... آپ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ گھر کی طرف ہی جا رہے تھے نا آپ؟"

"ہاں...... لیکن معاملہ کیا ہے؟ میں نے گاڑی آگے بڑھائی۔

"پتا چل جائے گا آپ کو؟" یوں لگتا تھا جیسے کوئی بہت بری خبر تھی جو وہ بتانے سے گریز کر رہا تھا۔

گاڑی اتنی دیر میں گلی کے ایک کنارے سے اندر داخل ہوئی، وہاں سے ہمارا گھر ساتواں تھا۔ جو منظر میری نظر کے سامنے آیا اس نے خود بخود بریک پر میرے پاؤں جما دیے...... گاڑی ایک دم رک گئی۔

میں نے بے یقینی سے اس گھر کے ملبے کو دیکھا جو کل تک میرا گھر تھا۔ اس کی جگہ اب ایک جلا ہوا ڈھانچہ تھا جو آدھے سے زیادہ منہدم ہو گیا تھا۔ دھوئیں کی کالک نے اس کے ساتھ پڑوس کے گھر کی دیواروں پر بھی قبضہ جما لیا تھا۔ گلی میں سامان بکھرا پڑا تھا بہت سے لوگ چلتے چلتے رک کر دیکھتے تھے اور افسوس سے سر ہلا کے آگے نکل جاتے تھے۔ گلی میں پڑے

ہوئے سامان کو پڑوسی اٹھا کر واپس اندر لے جا رہے تھے۔ یہ ان کا اپنا سامان تھا جب آگ لگی ہوگی تو بیوی بچوں کے بعد انہوں نے قیمتی سامان بچایا ہوگا۔

دو چار لوگ مجھے دیکھ کر آگے آئے...... "حد کر دی آپ نے بھی رفیق صاحب...... آپ کا گھر جل گیا اور آپ اب آئے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "دیکھیے مجھے کسی نے نہیں بتایا۔"

"کہاں بتاتے اور کیسے بتاتے؟" دوسرا پڑوسی بولا۔ "ہمیں خود اپنی پڑی ہوئی تھی۔"

"وہ تو کمال یہ ہوا کہ کسی نے فائر بریگیڈ کو فون کیا اور وہ وقت پر پہنچ گئے ایسا کہاں ہوتا ہے۔"

"ان کی وجہ سے ہم سب کے گھر جلنے سے بچ گئے ورنہ آگ سب کو لپیٹ میں لے لیتی...... چھت سے چھت ملی ہوئی ہے۔"

میں نے کہا۔ "یہ سب کیسے ہوا...... آپ میں سے کوئی بتا سکتا ہے؟"

ایک پڑوسی کے والد نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "ہمیں خود پتا نہیں بیٹا کہ آگ کیسے لگی۔"

میں نے کہا۔ "کیا دھماکا ہوا تھا کوئی؟"

"دھماکے سے تمہاری مراد ہے بم کا دھماکا...... تو ایسا کچھ نہیں ہوا پولیس آئی تھی۔ انہوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ شاید آگ شارٹ سرکٹ سے لگی...... پرانے تاروں میں۔"

"وہ تو ایسے ہی ٹامک ٹوئیاں مار رہے تھے۔ یہ بھی کہہ رہے تھے کہ گیس کھلی رہ گئی ہوگی...... سب جل کے خاک ہو گیا کچھ نہیں بچا۔"

میں نے کہا۔ "کمال ہے...... ابھی میں تھانے سے آ رہا ہوں...... کسی نے مجھ سے ذکر تک نہیں کیا۔"

"وہ رات کی ڈیوٹی والے [illegible] ہوں گے...... لیکن بیٹا کسی کی نظر لگ گئی ہے تمہارے گھر کو۔"

میں نے کہا۔ "میں سمجھتا ہوں کہ آزمائش اور آسائش...... عزت اور ذلت سب منجانب اللہ ہے۔"

گھر کے اندر باہر پانی ہی پانی تھا۔ کیچڑ اور ملبے سے گزر کے اندر جانا ممکن نہیں تھا۔ اندر جانے کا فائدہ بھی کچھ نہ تھا۔ وہاں کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ اگر آگ نے کچھ چھوڑا ہوگا تو وہ بے ضمیر اٹھا لے گئے ہوں گے جو کوئی موقع نہیں چھوڑتے۔ جو حادثے میں مرنے والے کے ہاتھ سے گھڑی اتار لیتے ہیں۔ ٹرین کا حادثہ ہو تو امداد کرنے والوں میں شامل ہو کے عورتوں کی لاشوں کے ہاتھ کاٹ کر زیور کھینچ لیتے ہیں...... ایسے ان گنت شرمناک واقعات تاریخ کا حصہ تھے۔ اور کچھ لوگوں کے ایسے بیان بھی کہ ایسا کام کوئی مسلمان نہیں کر سکتا...... کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا۔

کچھ لوگ مجھ سے ہمدردی کر رہے تھے۔ یہ پوچھ رہے تھے کہ میرے والدین کہاں ہیں اس بات پر خدا کا شکر ادا کر رہے تھے کہ خدا نے ہمیں بچا لیا ورنہ ہم اندر ہوتے تو...... اللہ توبہ...... پہلے وادی گئی...... پھر چچی...... چچا پاگل ہو گئے...... رفیق میاں صدقہ خیرات کرو...... اللہ آفات کو ٹالے۔"

میرا ذہن اس وقت اپنے ہی خیالوں میں الجھا ہوا تھا۔ آگ لگنا کسی حادثے کا نتیجہ نہیں ہو سکتا تھا۔ گھر کی وائرنگ بالکل ٹھیک تھی۔ اس کے شارٹ سرکٹ ہونے کا کوئی سوال نہ تھا۔ گھر میں کوئی تھا ہی نہیں چنانچہ کسی قسم کے بجلی کے آلات بھی استعمال نہیں ہو رہے تھے اور گیس بھی آن نہیں تھی۔ گیس معمولی سی لیک کرے تو بو سارے میں پھیل جاتی ہے اور پھر گیس خود بخود تو آگ نہیں پکڑتی...... بند اور خالی گھر میں آگ لگی نہیں لگائی گئی۔

چنانچہ دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ یہ کارروائی کس نے کی...... اگر میں انگلیوں پر شمار کرتا تو گن نہ پاتا۔ ماضی کے حوالے سے میرے دشمن بہت تھے لیکن ایسی کارروائی ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔ دشمنوں کو دیکھتا تو میرے ذہن میں پہلا نام تنظیم کے حوالے سے غلام محمد اینڈ کمپنی کا آتا تھا۔ صفدر سلطان بھی ایسی تخریبی کارروائی سے مجھے سزا دینے کا اہل تھا مگر رانا رجب علی کی ذات پر شک مشکل تھا۔ اب پولیس جتنی تفتیش چاہے کرے۔ نتیجہ کوئی سامنے آنے والا نہیں تھا۔

میں نے اس گھر کو "رائٹ آف" کر دیا۔ اردو میں اس کا مطلب کچھ یوں ہوگا کہ اس کے وجود کو بھلا دیا۔ اس نقصان کو ناقابل تلافی تسلیم کر لیا اور مان لیا کہ صبر کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ اسے پھر آباد کرنے کون آئے گا اور کون اس ملبے کا یا اس قطعہ زمین کا دعوے دار ہوگا۔

مجھے اب اپنے والدین کو اس شہر سے بھی دور لے جانا تھا۔ میری وجہ سے وہ یہاں غیر محفوظ تھے۔ اس سے پہلے کہ انہیں یہ پتا چلے کہ بدبختی نے ان کے آشیاں کو بھی جلا کے خاکستر کر دیا ہے میں انہیں اس خبر کے صدمے سے بچا کے دور لے جاؤں...... جہاں انہیں کبھی یہ معلوم نہ ہو کہ ان کے نکل آنے کے بعد اس گھر پر کیا گزری۔ ان کی یادوں اور تصور میں وہ گھر آباد اور سلامت رہے۔

میں پلٹا ہی تھا کہ گلی کے دوسرے کنارے سے ایک

جیپ اندر آئی۔ یہ پولیس کی جیپ تھی۔ میرے قریب آ کے جیپ رک گئی اور اس میں سے انسپکٹر آر کے آفریدی نے زمین پر قدم رنجہ فرمایا۔

میں نے کہا۔ ''میں تمہاری ایلی شناسی کی داد دیتا ہوں۔ ابھی میں تھانے گیا تھا تو مجھے کسی نے کچھ نہیں بتایا...... تم اب خبر دینے آئے ہو۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں...... میں تو تمہیں گرفتار کرنے آیا ہوں۔''

''ویری گڈ...... یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا...... حالانکہ مجھے سوچنا چاہیے تھا کہ یہاں کا ایسا ہی چلن ہے۔ تم نے ایف آئی آر بھی لکھ لی ہوگی کہ میں نے اپنے گھر کو آگ لگائی۔ یا اس میں بم رکھنے کا ذکر ہے۔''

اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''ہمیں یہاں سے ایک لاش ملی ہے۔''

میرے ذہن کو جھٹکا لگا۔ ''لاش...... کس کی لاش؟''

''یہ تو پتا چلے گا...... لاش بالکل جلی ہوئی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''کسی محلے والے نے مجھے یہ نہیں بتایا۔''

''کیا میرا بتانا کافی نہیں......'' اس نے ترشی سے کہا اور اپنے ساتھ آنے والوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے مجھے پکڑ کے میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی۔

''انسپکٹر آفریدی...... یہ کیا نیا چکر چلایا ہے تم نے......؟'' میں نے برہمی سے کہا۔ ''تم مجھے کیسے گرفتار کر سکتے ہو؟''

اس نے ایک کاغذ لہرایا۔ ''میرے پاس وارنٹ ہے۔''

''لیکن میں خود اپنے گھر کو آگ کیوں لگاؤں گا؟''

''ہمیں شک ہے کہ وہ لاش غلام محمد کی ہے پرسوں رات تم اس کے ساتھ تھے وہ پلٹ کے نہیں آیا۔ غائب ہے پرسوں سے۔''

میں نے کہا۔ ''تمہارا مطلب ہے میں نے اسے قتل کر دیا۔''

''یس...... اور اس جرم کو چھپانے کے لیے غلام محمد کی لاش یہاں لا کر ڈالی اور پھر گھر کو آگ لگا دی۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ کل رات تم کہاں تھے؟''

کل رات میں کہاں تھا؟ کس کے ساتھ تھا؟ کیا میں یہ سب بتا سکتا ہوں۔ کیا پولیس فریال کی گواہی مانے گی؟ اور فریال گواہی دے گی کیسے؟

میں آہستہ آہستہ پولیس کی جیپ کی طرف بڑھا۔

اس دلچسپ ترین کہانی کے بقیہ واقعات تیسرے حصے میں ملاحظہ فرمائیں

تاوان

زندگی کی ناہموار [illegible] پر چلتی ہوئی جہانی استاد کی ایک [illegible]

ایک انسان کی کہانی جسے حالات کی ٹھوکروں نے شاہ جہاں سے جہانی استاد بننے پر مجبور کر دیا۔

بڑے بڑے تیس مار خان مجرم اُس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔

قانون کے لمبے ہاتھ اُس کی گردن تک پہنچنے سے معذور تھے۔

لیکن پھر ایک نازک سی لڑکی کی خاطر اُس نے خود کو قانون کے حوالے کر دیا۔

لاہور جیل اور اٹک جیل میں اُس پر تشدد کی انتہا کر دی گئی۔

پھر حالات نے اسے انجانے راستوں پر قدم اُٹھانے پر مجبور کر دیا۔

زندگی جہانی اُستاد سے مزید تاوان کی طلب گار تھی۔

علی میاں پبلیکیشنز ۲۰۔ عزیز مارکیٹ اُردو بازار، لاہور
فون: 7247414
E-mail:alimian_publications@yahoo.com

قسمت کے پھیر میں اُلجھے ایک نوجوان کی داستان

اناڑی

احمد اقبال

3

اناڑی

قسمت کے پھیر میں اُلجھے ایک نوجوان کی کتھا، حالات اور واقعات کا بہاؤ اسے دیارِ غیر لے گیا جہاں وہ اناڑی تھا مگر خود کو کسی کھلاڑی سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ ایسا کھلاڑی جسے کسی بساط پر شکست نہیں دی جا سکتی تھی۔ اس کا اناڑی پن اُسے کھلاڑیوں کے مقابل کامیابیاں دلاتا رہا۔ اُسے پردیس راس آ گیا تھا جہاں کی ہنگامہ خیزیاں اس کا دل لبھاتی تھیں مگر دوسری طرف دیس میں اُس کی لاٹری کھل گئی، ایسی لاٹری کہ جس کے بعد اُسے لوٹنا تھا۔ اناڑی سے کھلاڑی بننے کے بعد...... وہ لوٹا...... تو ہنگامے اور شرارتیں اُس کے ساتھ تھیں۔ قدم قدم پر آنسو اور لمحہ لمحہ قہقہوں سے لبریز اُس اناڑی کی کہانی جس کا دل دو حصوں میں منقسم تھا۔

خوب صورت و گل رنگ جذبوں سے گندھی ایک تیز رفتار کہانی

یہ ایسی صورتِ حال تھی جس پر میں بیک وقت رو بھی سکتا تھا اور ہنس بھی سکتا تھا۔

رونے کی بات قتل جیسے سنگین الزام میں گرفتاری تھی جس میں صوفی چچا پہلے ہی بند تھے اور اب ان کا ہونہار بھتیجا انہیں حوالات میں کمپنی دینے آ رہا تھا۔ ضمانت پر رہائی نہ ان کی ہوئی تھی نہ میری ہو گی۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔

ہنسی اس بات پر آئی تھی کہ میں نے کسی کو بھی قتل نہیں کیا تھا۔ وہ لاش کسی کی بھی ہو...... غلام محمد کی نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ وہ بہ حفاظت شامی بادشاہ کی تحویل میں سو فیصد زندہ سلامت موجود تھا اور اس کی خیر و عافیت کے ساتھ واپسی کے لیے دو کروڑ کے تاوان کا مطالبہ بھی شہاب الدین تک پہنچا دیا گیا تھا...... لیکن مجھے ثابت کرنا تو دور کی بات تھی میں یہ بات کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔

میں یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ یہ خبر اخبار والوں کو کب ملے گی...... ملے گی بھی یا نہیں...... ڈاکٹر شہناز اور نامور صحافی راجا کے اغوا کی خبر تو اخبار میں آ گئی تھی مگر شہاب الدین کی طرف سے مکمل خاموشی یہ ظاہر کرتی تھی کہ تاوان کی ادائیگی کا معاملہ ہنوز زیرِ غور ہے۔

غلام محمد کا شہاب الدین سے کوئی براہِ راست جذباتی تعلق نہیں تھا کہ وہ دو کروڑ ادا کرنے یا تاوان کی رقم کم کرانے کے لیے ڈاکوؤں سے رابطے کرتا...... غلام محمد اہم تھا تو صرف تنظیم کے لیے چنانچہ تاوان ادا کرنے کا فیصلہ بھی پارٹی کی ہائی کمان کو کرنا تھا۔ ہائی کمان پیرس میں روپوش تھی اور موجودہ حالات میں ان کے لیے اتنی بڑی رقم کا بندوبست کرنا مشکل نظر آتا تھا۔ غلام محمد اہم ضرور تھا مگر ناگزیر نہیں تھا چنانچہ تنظیم کا یہ مشکل فیصلہ ضرور تھا...... ناممکن یا غیر متوقع نہیں کہ وہ غلام محمد کی زندگی کے لیے جدوجہد سے دستبرداری قبول کر لیں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ تنظیم کے لیے بہت سے وفاداروں کی طرح اس نے بھی جان کی قربانی دی۔ اللہ اس کی مغفرت کرے۔

مجھے یقین تھا کہ تنظیم نے اغوا برائے تاوان کی اس واردات پر پولیس سے، ڈاکوؤں سے یا پریس سے رجوع نہ کیا تو راجا خود انتظام کرا دے گا کہ خبر لگوا دی جائے۔ ظاہر

ہے اس کے ساتھ ہی میری گرفتاری بے جواز ہو جاتی مگر اس کے لیے ضروری تھا کہ مجھ پر غلام محمد کے قتل کے الزام کی خبر... راجا کو ملے۔ وہ اس خبر کو عام کرے گا تو میری رہائی عمل میں آئے گی۔ اس کے لیے کم سے کم مزید چوبیس گھنٹے مجھے اس الزام کے ساتھ حوالات میں گزارنے تھے۔

پولیس کی جیپ میں بیٹھنے تک میرے ذہن سے خیالات کا ایک ریلا گزر گیا۔ انکار یا مزاحمت سے کچھ حاصل نہ ہوتا...... میں نے پُرسکون اور پُراعتماد رہتے ہوئے اور مسکراتے ہوئے تھانیدار سے کہا۔ ”یہاں میں اپنی گاڑی میں آیا تھا۔“

تھانیدار نے کہا۔ ”لیکن حضور نواب صاحب آپ سرکار کے مہمان ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”کیا حرج ہے اگر ہم سب اسی میں چلیں...... وہ بہرحال اس جیپ سے بہتر ہے۔ ایئر کنڈیشنڈ بھی ہے۔“

اس نے عیاری سے کہا۔ ”ٹھیک ہے......تم جیپ میں بیٹھو اور گاڑی کی چابی مجھے دو...... گاڑی میں لے آتا ہوں۔“

میں یہی چاہتا تھا کہ گاڑی تھانے پہنچ جائے۔ مجھے یہ علم نہیں تھا کہ اب صوفی چچا پولیس کی تحویل میں ہیں یا سی آئی اے کی۔ خود اپنے بارے میں بھی مجھے اندازہ نہ تھا کہ مجھے حوالات میں بند کیا جائے گا یا تفتیش کے لیے کہیں اور لے جایا جائے گا لیکن ایک بات یقینی تھی کہ ابا جی اپنے بھائی سے ملنے آئیں گے تو میری گاڑی دیکھ لیں گے پھر وہ خود پوچھیں گے کہ رفیق کی گاڑی یہاں موجود ہے تو رفیق کہاں ہے......پھر یہ اطلاع فاروقی تک اور فریال کے ذریعے راجا تک پہنچنے میں دیر نہیں لگے گی کہ مجھے کس جرم میں پکڑا گیا تھا۔

جب جیپ روانہ ہوئی تو میرے بہت سے ہمدرد پڑوسی اس عبرتناک منظر کو خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔ یہ سب پروفیسر صاحب کے گھرانے کو برسوں سے جانتے تھے۔ ابا کی صرف محلے میں ہی نہیں شہر میں بھی عزت تھی۔ ان کی زندگی کا اثاثہ ہی عزت تھی جس کی حفاظت وہ تمام عمر کرتے رہے۔ لیکن جب دولت آئی تو اس کے ساتھ وہ نحوست بھی آئی جس نے کچھ بھی باقی نہ رہنے دیا پہلے گھر کے مکینوں کا جنازہ اٹھا پھر عزت کا جنازہ نکلا......اس کے بعد گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے......سب ختم ہو گیا......باقی رہے اللہ کا نام۔

مجھے اب کسی کی پروا نہ تھی۔ یہ میرا ماضی تھا جس سے اب میرا ہر ناتا ٹوٹ چکا تھا......توہم پرست اگر سمجھتے ہیں کہ ست بدھائی کی جاگیر اور حویلی کی نحوست بھری تاریخ نے اب میرے گھر کو شکار کر لیا ہے تو سوچتے رہیں...... میں اپنے عقیدے میں راسخ تھا کہ سب کچھ منجانب اللہ ہے...... جب اس کا اشارہ ہو گا تو آفات و آزمائش کا یہ سلسلہ خود ختم ہو جائے گا۔ قدرت کو ناانصافی کا الزام نہیں دیا جا سکتا... کیونکہ وہ اس کائنات کا خالق و مالک رحمٰن اور رحیم ہے۔ عدل اس کی سب سے بڑی صفت ہے۔

جیپ آدھے راستے میں رک گئی۔ اس میں پیٹرول ختم ہو گیا تھا۔ اس سے بڑی مضحکہ خیز صورتِ حال پیدا ہوئی۔ ایک بندہ ڈرائیونگ کر رہا تھا دو ملزم کے ساتھ پچھلی سیٹ پر دائیں بائیں بیٹھے تھے۔

میں نے کہا۔ ”پیٹرول پمپ تو سامنے نظر آ رہا ہے۔“

ڈرائیور نے پریشانی سے کہا۔ ”ہاں...... مگر گاڑی تو یہاں کھڑی ہو گئی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”تم جاؤ اور ڈبے میں پیٹرول لے آؤ...... اگر ڈبا ہے......“

اس نے قدرے افسوس کے ساتھ کہا۔ ”بات ڈبے کی نہیں جناب۔ اس کمپنی نے پولیس کی گاڑیوں کو پیٹرول دینا بند کر دیا ہے۔“

”چلو آج نقد ڈلوا لو......“

اس نے فوراً ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ ”اچھا جی...... لاؤ دو سو روپے۔“

میں نے کہا۔ ”میری گاڑی کا ٹینک پیٹرول سے بھرا ہوا تھا۔ سرکاری گاڑی میں تم لائے ہو تو پیسے مجھ سے کیوں مانگتے ہو؟“

”پھر ہم تمہیں پیدل لے جائیں گے۔“

یہ دھمکی مؤثر ثابت ہوئی۔ ہتھکڑی کے ساتھ تھانے تک مارچ کرنے کا خیال ہی شرمناک تھا۔ میں نے کہا۔ ”اچھا چلو......سو روپے دوں گا میں۔“

ڈرائیور نے راہ چلتے لوگوں کو پکڑا۔ وہ باری باری جیپ کو دھکیلتے ہوئے پیٹرول پمپ تک لے گئے۔ مجھے نیویارک پولیس کی یاد آئی جن کے پاس جدید ترین کاریں تھیں اور وہ پیغام ملنے کے بعد تین منٹ کے اندر جائے واردات پر پہنچ سکتے تھے۔ لندن پولیس کی کارکردگی کا معیار بھی ایسا ہی تھا اور یہاں جو کچھ میں دیکھ رہا تھا وہ افسوسناک اور مضحکہ خیز تھا۔ امریکا اور یورپ کی پولیس کے لیے یہ کسی بے سروپا کامیڈی کے سین کی طرح تھا۔

جب بالآخر میں تھانے پہنچا تو انسپکٹر سنگدل خان کا شک یقین میں بدل چکا تھا کہ قاتل یعنی میں پولیس کی تحویل سے

فرار ہو گیا یا فرار کرا دیا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ میرے پاس خالی ہاتھوں سے مسلح پولیس کو ناک آؤٹ کرنے کی طاقت بھی ہے اور خالی ہاتھوں کو نوٹوں سے بھر دینے کی طاقت بھی۔ مجھے دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی۔ ماتحتوں سے اپنی مادری زبان میں خطاب فرمانے کے بعد اس نے مجھے حوالات میں ڈال دینے کی نیت رکھنے والوں کو حکم دیا کہ ملزم کو اس کے سامنے پیش کیا جائے۔

اس کے کمرے میں میری ہتھکڑی کھول دی گئی اور اس نے مجھے کرسی پر تشریف رکھنے کے لیے کہا۔ ”آپ ٹھنڈا پیو گے یا گرم؟“

مراعات کا یہ سلسلہ طبعی شرافت یا خدا ترسی کا نتیجہ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ قانونی مسائل کو سمجھنے اور حل کرنے میں میری سمجھ بوجھ اچھی ہے۔ میں نام کا ہی نواب نہیں بخشش انعام یا رشوت دینے کے معاملے میں بھی دریا دلی سے کام لیتا ہوں۔

تھانے کی چائے پر میں نے کولڈ ڈرنک کو ترجیح دی...... پھر میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”تھانیدار صاحب...... یہ کیا چکر ہے......میرا مطلب ہے کیا میرے گھر میں سے واقعی کوئی جلی ہوئی لاش ملی ہے......؟“

”لاش تمہیں دکھا دی جائے گی...... پوسٹ مارٹم کے بعد۔“

”وہ تو ٹھیک ہے......مگر کس بدبخت کو وہاں لا کر ڈالا گیا۔ جو کہیں اور جلا تھا یا وہاں ڈال کر جلا دیا گیا۔“

”ایسی کوئی بات نہیں۔“ وہ برہمی سے بولا۔ ”لاش سب کے سامنے برآمد کی گئی تھی۔“

میں نے کہا۔ ”اچھا؟ کس کی لاش تھی وہ......“

”غلام محمد کی......“ اس نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔

”انسپکٹر آفریدی......تم اچھی طرح جانتے ہو کہ غلام محمد قد کاٹھ میں کیسا ہے؟“

”وہ لاش جل کر کوئلہ ہو چکی تھی۔“

”لیکن اس کے قد و قامت کا اندازہ تمہیں ضرور ہو گا۔“

”نو کمنٹس۔“ اس نے عیاری سے کہا۔ ”لیکن آپ سے ایک سوال کا جواب مجھے چاہیے...... اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ وہ غلام محمد نہیں تھا۔“

میں نے کہا۔ ”اگر مگر کا کیا سوال ہے اس میں......غلام محمد کوئی غیر معروف شخص نہیں تھا......سیکڑوں ہزاروں لوگ اسے جانتے تھے۔“

”اس حالت میں اسے تم بھی نہیں پہچان سکتے...... حالانکہ تم اس کے بہت قریب تھے۔“

میں نے کہا۔ ”مجھ سے زیادہ قریب اس کی بیوی تھی...... اور وہ سیکریٹری جس نے اس کو میرے ساتھ جاتے دیکھا تھا......اسے بلاؤ......“

اس نے دھڑ سے میز پر مکا مارا۔ ”مجھے تفتیش مت سکھاؤ اور یہ مت بھولو کہ یہاں تمہاری حیثیت ایک ملزم کی ہے۔“

میں کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ ”میری حیثیت تم سے ڈھکی چھپی نہیں...... اگر تمہیں اپنی مالی حالت کو مزید بہتر بنانے کا ایک اور موقع ملا ہے تو اسے ضائع مت کرو۔“

اس کے ایک ماتحت نے دو ٹھنڈی بوتلیں سامنے لا کے رکھیں اور ایک زبردست چھینک ماری۔ ”معاف کرنا جناب۔“ وہ بولا۔ ”ٹھنڈ لگ گئی ہے مجھے۔“

تھانیدار نے ایک گالی سے اسے مخاطب کیا۔ ”گرمی میں ٹھنڈی بوتل پکڑنے سے تجھے ٹھنڈ لگ گئی۔ نمونیہ کیوں نہیں ہوا......باہر جا کے نہیں چھینک سکتا تھا۔“

اس نے فریاد طلب نظروں سے میری طرف دیکھا کہ آپ ہی بتائیے......عشق اور چھینک پر کسی کا کنٹرول ہے...... اور پھر باہر چلا گیا۔

میں نے کہا۔ ”تم نے میری بات پر غور کیا؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”ہاں...... مگر مجھے تفتیش بھی تو کرنی ہے......ضابطے کی کارروائی ضروری ہوتی ہے......مگر خیر...... آپ اچھے بندے ہو نواب صاحب...... میں نے گزشتہ چند دن میں آپ کو اچھی طرح جان لیا ہے۔“

”اچھے لوگ ایسے کسی کو قتل نہیں کرتے نا۔“

وہ عیاری سے بولا۔ ”میں دراصل کچھ اور سوچ رہا تھا......اب آپ پوچھو کس کے بارے میں۔“

میں نے کہا۔ ”او کے...... میں پوچھ لیتا ہوں......تم کس کے بارے میں سوچ رہے تھے اور کیا سوچ رہے تھے؟“

وہ بولا۔ ”آپ نے یہ جو نئی کرولا آئی ہے......وہ دیکھی ہے؟“

میں نے کہا۔ ”ماڈل دو ہزار تین؟ کچھ لوگ اس پر فریفتہ ہیں...... مجھے اس سے پہلے والا ماڈل ہی پسند ہے۔“

”مگر میں فریفتہ ہونے والوں میں شامل ہوں۔“ وہ آہ بھر کے بولا۔ ”روز سوچتا ہوں پرانے ماڈل کے بدلے وہ لے لوں......مگر فرق بہت زیادہ ہے...... کچھ زیور ہے میری بیوی کا...... وہ کہتی ہے بیچ دو...... اسے بھی شوق ہے نئے ماڈل کا......“

میں نے اس کا مطلب سمجھ کے کہا۔ ”شوق کا مول کوئی

نہیں۔"

"لیکن سب کچھ کر کے بھی ایک لاکھ کم پڑتے ہیں۔" اس نے کہا۔

"یہ خالص پیشہ ور بھکاریوں والا انداز تھا جو سڑکوں پر اپنی درد بھری آواز میں بیمار بچے کی دوا کے لیے ڈاکٹر کا نسخہ دکھا کے دوا کے لیے پیسے مانگتے ہیں یا آنسوؤں سے روتے ہوئے بتاتے ہیں کہ اس کے گھر میں دو دن سے چولہا نہیں جلا...... اور لوگ سچ جھوٹ سمجھنے کے باوجود کچھ دے دیتے ہیں کہ ہمیں جھوٹ سچ سے کیا۔

میں نے بھی ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ "یار دل چھوٹا مت کرو...... باقی میں کر دوں گا...... آپس کا معاملہ ہے۔"

اس نے بڑی شکر گزاری سے مجھے دیکھا اور پھر کہا۔ "آپ چنگے بندے ہو نواب صاحب...... اب کیا خیال ہے کچھ تفتیش تم کی خانہ پری بھی کر لیں......؟"

میں نے کہا۔ "ہاں...... ڈیوٹی از ڈیوٹی۔"

اس نے کہا۔ "آپ کا کہنا ہے کہ وہ لاش غلام محمد کی نہیں ہو سکتی؟"

میں نے کہا۔ "ہاں...... اور تم دیکھ لینا...... کل تک یہ ثابت بھی ہو جائے گا پوسٹ مارٹم سے نہیں...... وہ خود سامنے آ جائے گا۔"

"یہ آپ اتنے یقین سے کہہ رہے ہو...... جیسے آپ کو پتا ہے کہ غلام محمد کہاں روپوش ہے۔"

میں نے کہا۔ "یہ میری چھٹی حس کہہ رہی ہے۔"

وہ آگے جھک کر بولا۔ "پھر وہ لاش کس کی ہے؟"

میں نے کہا۔ "یہ معلوم کرنا تمہارا کام ہے۔"

اس نے پیچھے ہٹ کر ایک گہری سانس لی...... "نواب صاحب...... آپ کیوں مجھے تفتیش پر مجبور کر رہے ہو۔"

میں نے کہا۔ "دیکھو...... نہ وہ میرے گھر کا کوئی فرد ہے نہ محلے کا کوئی آدمی...... یہ ہو سکتا تھا کہ جب آگ لگی تو کسی نے سوچا کہ موقع سے فائدہ اٹھا کے گھر میں سے کوئی کام کی چیز نکال لی جائے۔"

"ہاں...... اور ایسا ہوتا ہے...... کچھ لوگ لوٹ مار کرنے لگتے ہیں۔"

"مگر وہ محلے کا بندہ ہوتا تو اب تک پتا چل جاتا۔ اس کی گمشدگی کی رپورٹ ہوتی...... مجھے شک ہے کہ آگ لگی نہیں...... لگائی گئی تھی۔"

"یہ شک تو مجھے بھی ہے...... چنانچہ میرا اگلا سوال یہ ہو گا کہ آگ کیوں لگائی گئی...... آپ کی کسی سے دشمنی تھی؟"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "دشمنی کسی سے نہیں...... تم اچھی طرح جانتے ہو۔"

"پھر وہ بندہ کون تھا؟"

میں نے کہا۔ "یہی تو ہے تفتیش کے لیے اصل نکتہ...... اور تم اتنے تجربہ کار ہو...... اتنے ذہین ہو کہ اس کا سراغ ضرور لگا لو گے۔"

اس نے سوچتے ہوئے سر ہلایا۔ "یہ تو مجھے یقین ہے کہ وہ آگ لگانے نہیں آیا تھا۔"

"اس یقین کی وجہ......؟"

"نواب صاحب جو خودکش دھماکا کرتا ہے...... وہ یقیناً مرتا ہے مگر جو آگ لگانے جاتا ہے وہ اپنا کام کر کے آرام سے نکل جاتا ہے۔ آگ ایک دم نہیں پھیلتی۔"

"تمہارا کیا خیال ہے؟" میں نے اسے سوچ میں گم دیکھ کر پوچھا۔

"نئے ماڈل کی کرولا کے بارے میں؟" وہ چونکا۔

میں نے کہا۔ "نہیں...... وہ تو تم بتا چکے۔" میں نے کہا۔ "تمہیں نقد یا چیک مل جائے گا...... فکر مت کرو۔"

"مجھے اعتبار ہے آپ پر جناب...... اس بندے کے بارے میں میری چھٹی حس کچھ اور کہتی ہے۔"

"ایک تھانیدار کی چھٹی حس غلط نہیں ہو سکتی۔"

"وہ کوئی مفرور مجرم ہو سکتا ہے۔" وہ عیاری سے بولا۔ "میری تفتیش کے نتیجے میں یہ بات سامنے آ سکتی ہے کہ کل رات ہماری گشت پر مامور ایک پارٹی نے ایک مشکوک شخص کو روکا مگر رکنے کے بجائے وہ بھاگ کھڑا ہوا...... گشتی پارٹی نے اس کا تعاقب کیا مگر گلی میں اندھیرا تھا۔ وہ شخص کہیں چھپ گیا اور بہت تلاش کرنے کے بعد بھی نہیں ملا...... وہ کسی ڈرین پائپ کے سہارے چھت پر چڑھ گیا یا کسی گھر کی کھڑکی کھلی پا کے اندر کود گیا...... آپ نے مجھے بتایا کہ گزشتہ رات آپ اپنے گھر میں نہیں تھے۔"

میں نے کہا۔ "گھر میں کوئی بھی نہیں تھا۔"

اس نے مسکرا کر کہا۔ "کہاں تھے آپ؟"

"میں نے بتایا نا...... بیرسٹر فاروقی کے گھر میں۔"

"آپ کے والدین بھی گھر میں نہیں ہوں گے؟" وہ بولا۔

میں نے کہا۔ "نہیں...... انہیں میں اپنے ساتھ ہی لے گیا تھا۔ دراصل اس گھر میں کچھ ایسے افسوسناک واقعات پیش آئے تھے کہ وہاں رہنا ہمارے لیے ناممکن ہو گیا تھا...... میرے والدین وہاں بڑی ذہنی اذیت محسوس کرتے تھے

چنانچہ میں نے انہیں عارضی طور پر فاروقی کے گھر شفٹ کر دیا...... فاروقی صاحب سے میرے گھریلو تعلقات ہیں...... وہاں وہ بہت ایزی رہے...... میرا خیال تھا کہ آج ہم ست بدھائی چلے جائیں گے اور پھر وہیں رہیں گے۔"

"یعنی آپ نے وہ گھر ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا تھا۔"

"بالکل...... میرے والدین بھی مان گئے تھے۔"

"یہ بات کتنے لوگوں کو معلوم تھی؟" وہ بولا۔

"بہت سے لوگ یہ بات جانتے تھے۔ میری چچی اور دادی کے سوئم میں آنے والے بہت لوگ تھے۔ کچھ رشتے دار...... کچھ دوست...... سب کو بتا دیا تھا میں نے کہ ہم مستقل طور پر ست بدھائی شفٹ ہو جائیں گے۔"

"سنا ہے وہاں آپ کی بہت بڑی جاگیر اور حویلی ہے۔ پھر کیا ضرورت ہے آپ کو اس چھوٹے سے گھر میں رہنے کی...... لیکن نواب صاحب...... نئی کرولا خریدنے میں فرق ایک لاکھ سے زیادہ کا ہوا...... پھر؟"

میں نے کہا۔ "مرد ہو اتنی پریشانی کی کیا بات ہے...... فرق بھی پورا ہو جائے گا۔"

اس نے اطمینان کی سانس لی۔ "تو اسٹوری اب کچھ یہ بنتی ہے نواب صاحب کہ جب آپ گھر سے رخصت ہوئے تو پریشانی میں ایک کھڑکی کھلی چھوڑ گئے یا جلدی میں رہ گئی اور وہ مشکوک نظر آنے والا شخص اسی کھڑکی سے اندر چلا گیا۔ کھڑکی بند کی اور چھپ کے بیٹھ گیا۔ پولیس کی گشتی پارٹی ہر گھر میں تو اسے تلاش نہیں کر سکتی تھی وہ مایوس ہو کے واپس چلے گئے...... بعد میں اس مفرور مجرم نے......"

"جو متعدد وارداتوں میں مطلوب تھا۔" میں نے یاد دلایا۔

"رائٹ...... اسے اندازہ ہوا کہ قسمت اس پر مہربان ہے...... گھر میں کوئی بھی نہیں...... اس نے اطمینان سے گھوم پھر کے دیکھا...... ممکن ہے تلاشی لے کر یہ بھی سوچ لیا ہو کہ جاتے وقت کیا لے جائے گا...... مگر وہ غالباً بہت تھکا ہوا تھا اور جلدی بھی کوئی نہیں تھی...... وہ ایک بستر پر لیٹا اور سو گیا۔"

"کیا اسے ڈر نہیں تھا کہ گھر والے آ گئے تو وہ پکڑا جائے گا...... چور جلدی میں ہوتے ہیں ایسے بے فکری سے نہیں سو جاتے...... آپ اسے نشے میں یا ہیروئن کا عادی کیوں نہیں دکھاتے۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "دکھا تو سکتے ہیں مگر اچھا ہے اس کی موت کے ساتھ کچھ پرانی فائلیں بھی بند ہو جائیں۔ چوری ڈکیتی کے کچھ کیس ختم ہوں...... میں مطلوب مجرموں کی فہرست میں سے کوئی نام نکال لوں گا۔"

"اور وہ زندہ مل گیا بعد میں...... تو۔"

تھانیدار ہنسنے لگا۔ "آپ اس کی فکر مت کرو...... یہ ہمارا کام ہے۔ ہم سے پوچھے گا کون؟ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ اندازہ تھا۔ اندازے غلط بھی ہو جاتے ہیں...... تو ہوا یوں کہ مفرور اس مطلوب عادی مجرم نے فریج میں سے کچھ نکال کے کھایا پیا...... ممکن ہے اس نے چائے بنانے کا سوچا ہو۔ کیتلی میں پانی رکھا۔ چولہا جلایا اور بستر پر لیٹا تو نیند غالب آ گئی...... پانی ابل کے گرا تو چولہا بجھ گیا لیکن گیس خارج ہوتی رہی۔"

"اور جب وہ جاگا تو اس نے جلائی سگریٹ۔"

تھانیدار ہنسنے لگا۔ "کمال ہے...... آپ کو کیسے معلوم ہوا۔"

میں نے کہا۔ "پاکستانی فلموں کی کہانی کا انجام تو بچہ بھی سمجھ لیتا ہے فلم شروع ہوتے ہی...... اور پولیس کی ایسی کہانیاں آتی رہتی ہیں...... پولیس مقابلے...... خودکشی...... چھاپے اور فرار کے واقعات پر مبنی سنسنی خیز مگر ایک جیسی کہانیاں...... خیر...... یہ تمہاری فلم ہے...... اس کا اسکرین پلے تم جیسے چاہو لکھو...... مجھے اجازت دو...... رقم تمہیں شام سے پہلے مل جائے گی۔"

اس نے مجھے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ "بیٹھو نواب صاحب...... ذرا میں آپ کا بیان تو لکھوا دوں۔ اس نے محرر کو نام کے بجائے بڑے دلچسپ خطاب سے پکارا...... سگ نہیں خنزیر...... اور محرر نے بالکل برا نہیں منایا کیونکہ وہ صورت سے واقعی بلڈاگ جیسا تھا......

میرا بیان مکمل ہونے کے بعد بھی مجھے رہائی نہیں ملی......

اس نے کہا۔ "گواہی بھی تو چاہیے سر جی۔"

میں نے کہا۔ "کیسی گواہی؟"

"آپ نے فرمایا ہے کہ گزشتہ رات آپ بیرسٹر فاروقی صاحب کے گھر میں تھے۔" وہ بولا۔

"میں نے کہا...... "ہاں شک کی کون سی بات ہے اس میں؟"

"کیا کرتے رہے آپ شام سے رات تک؟"

"لوڈو کھیلتے رہے۔" میں نے خفگی سے کہا۔ "قوالیاں سنتے رہے جو تمہارا دل چاہے لکھ دو۔"

"ان کا بیان تو چاہیے نواب صاحب...... گواہ وہی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "وہ اس وقت کورٹ میں ہوں گے۔"

"کوئی بات نہیں...... ان کے دستخط تو دیکھے ہوں گے

آپ نے ......کیا مشکل ہیں......''

میں نے کہا۔''زیادہ مشکل تو نہیں......''

تھانیدار نے محرر کو حکم دیا۔''چل بھئی فاروقی صاحب کا بیان لکھ۔''

۔اس کا زکام سے حال خراب تھا اس نے لیس اور سر کے درمیان بھی ایک چھینک ماری......پھر فاروقی کا بیان لکھا......پھر بیان میری طرف بڑھا دیا......''لو جی......کر دو دستخط......بسم اللہ کر کے۔''

میں نے کہا۔''میں دستخط کر دوں۔ فاروقی کے بیان پر؟''

''اس کے لیے وکیل صاحب کو تکلیف دینے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ انکار تو نہیں کریں گے کہ دستخط میں نے نہیں کیے۔''

''مگر......وہ کورٹ میں ہوں گے اس وقت۔''

''یہ بیان انہوں نے کورٹ جاتے وقت دیا تھا......صبح......''

میں اس جعلی کارروائی میں شریک نہ ہوتا تو اپنے لیے سنگین مسائل پیدا کرتا اس نظام کو جس کی بنیادوں میں لاقانونیت اور بدعنوانی نیچے تک سرائیت کر چکی تھی بدلنا حاکم وقت کے بس کی بات نہیں تھی یا مرضی نہ تھی......تو میرے جیسا کوئی بندہ کیا کر سکتا تھا اگر میں ایسی کوشش کرتا تو یہ نظریاتی طور پر جہاد ہوتا......عملی طور پر خودکشی کہلاتا......آج کل ایسی بے وقوفی بچہ بھی نہیں کرتا۔

میں اپنے اور گواہ کے بیان پر دستخط کرنے ہی والا تھا کہ مجھے فاروقی سے مشورے کا خیال آ گیا''میں چاہتا ہوں کہ یہ بیان فاروقی دیکھ لے۔ آخر وہ وکیل ہے میرا۔''

انسپکٹر آفریدی کچھ خفا اور کچھ مایوس ہوا''آپ کی مرضی ہے۔ سارا دن رہو تھانے میں۔ وہ تو آئیں گے کچہری سے نمٹ کے۔''

''نہیں......میں اسے بیان پڑھ کے سنا دیتا ہوں......فون پر۔''

''کیا مجھ پر اعتبار نہیں ہے آپ کو؟ میں آپ کی جس طرح مدد کر رہا ہوں، کیا وہ کافی نہیں؟''

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا ''کیونکہ میں بھی تم سے پورا تعاون کر رہا ہوں۔ نئے ماڈل کی کرولا کی خرید کے لیے۔''

تھانیدار نے محرر کو دفع ہو جانے کا حکم دیا اور بیان کو اپنی طرف کھینچ لیا۔''چلو جی آپ کی مرضی......آپ حوالات میں تشریف رکھو......شام کو جو بیان آپ کا وکیل لکھوائے اس پر دستخط کر دینا۔''

میں بھی اٹھ کھڑا ہوا......''مجھے کوئی اعتراض نہیں۔''

اچانک اس کے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے ریسیور اٹھا کے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ شاید اسے مجھ سے اس ردِعمل کی امید نہیں تھی۔ فون اس کے کسی افسرِ اعلیٰ کا تھا۔ وہ کچھ دیر یس سر یس سر کرتا رہا اور پھر فون رکھ دیا۔

''نواب صاحب......''اس نے کچھ دیر مجھے دیکھنے کے بعد کہا۔''آپ کا معاملہ میرے ہاتھ سے نکل جائے گا اگر آپ نے دیر کی......یہ ایس پی صاحب کا فون تھا۔''

''کیا وہ مجھے پوچھ رہے تھے؟''میں نے طنز سے کہا۔

''غلام محمد کی سیکریٹری اس کے پاس بیٹھی ہے......تم اچھی طرح جانتے ہو گے وہ کس قماش کی عورت ہے......اس کی پہنچ کہاں تک ہے اور وہ کیا کر سکتی ہے۔''اپنی ذومعنی بات پر وہ مسکرایا۔

''کیا وہ میرے خلاف مقدمہ درج کرانے گئی ہے؟''

اس نے کہا۔''کل تم غلام محمد سے ملنے گئے تھے......اس نے غلام محمد کو تمہارے ساتھ جاتے دیکھا تھا...... یہ بیان وہ دے چکی ہے۔''

''یہ تو اخبار میں بھی ہے۔''

''اس سے ملنے والے تم آخری شخص تھے۔ وہ تمہارے ساتھ گیا تو واپس نہیں لوٹا۔ وہ چاہتی ہے کہ تم سے پوچھ گچھ کی جائے۔ ایس پی صاحب پوچھ رہے تھے کہ کیا مجھے تمہارے بارے میں کچھ علم ہے؟''

''پھر تم نے کیا کہا؟''

''میں نے ابھی کہہ دیا ہے کہ مجھے علم نہیں......''وہ مسکرایا۔

''تو کیا یہ پوچھ گچھ تم کرو گے؟''

''نہیں......ایس پی صاحب نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ ممکن ہے وہ کوئی خصوصی تفتیشی ٹیم بنا دیں۔ غلام محمد عام آدمی نہیں تھا۔''

میں نے کہا۔''عام آدمی میں بھی نہیں ہوں۔''

''دیکھ لو نواب صاحب۔''وہ مجھے خبردار کرنے کے انداز میں بولا۔''ایک کنجری کے تعلقات کا مقابلہ ایک شریف آدمی نہیں کر سکتا......ویسے آپ کیوں گئے تھے غلام محمد سے ملنے؟''

''اس نے مجھے بلایا تھا۔''

''اب تو آپ کے اس سے وہ مراسم نہیں تھے......جو

پہلے تھے۔''

میں نے کہا۔''یہ تو ٹھیک ہے کہ ہمارے راستے جدا ہو گئے تھے۔ میرا اب سیاست سے کوئی تعلق نہیں۔ آٹھ سال میں ملک سے باہر تھا لیکن پرانے لوگ مل جائیں تو سلام دعا ہو جاتی ہے۔ وہ کئی بار کہہ چکا تھا کہ کبھی ملو......اتنی بے مروتی اچھی نہیں......میں ادھر سے گزرا تو خیال آ گیا کہ مل لوں۔''

''پھر آپ کہاں گئے تھے اس کے ساتھ؟''

''وہ مجھے کھانا کھلانے لے گیا تھا......میں اس کے اصرار سے مجبور ہو گیا اور ہم چلے گئے فوڈ اسٹریٹ۔ کھانا کھا کے وہ گیا اپنے راستے......میں چلا گیا فاروقی کے گھر۔''

''یہ کتنے بجے کی بات ہے؟''

''میرا خیال ہے گیارہ بجے میں گھر پہنچا تھا۔''میں نے کہا۔

''مگر غلام محمد جسے آپ اپنے ساتھ لے گئے تھے......ابھی تک اپنے گھر نہیں پہنچا......ابھی وقت ہے نواب صاحب......اچھی طرح سوچ لو سمجھ لو......معاملہ بہت سنگین ہے اگر ایس پی کی خصوصی ٹیم نے آپ سے تفتیش کی تو آپ کی جان اتنی آسانی سے نہیں چھوٹے گی۔ آپ کے صوفی چچا یہاں بند ہیں اگر آپ بھی اندر ہو گئے تو آپ کے والدین پر کیا گزرے گی۔''

میں نے کہا۔''انسپکٹر آفریدی......مجھے صرف چوبیس گھنٹے کی مہلت چاہیے۔''

''اس کے بعد کیا ہو گا؟''

میں نے کہا۔''یہ ثابت ہو جائے گا کہ غلام محمد کے اغوا میں میرا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔''

وہ چونکا۔''اغوا؟ کیا اسے اغوا کیا گیا ہے۔''

زبان سے بلا ارادہ نکل جانے والے لفظ کو تھانیدار نے فوراً پکڑ لیا تھا......میں نے سر پر ہاتھ مار کے کہا۔''میرا مطلب تھا اس کے غائب ہوتے ہی......وہ مل جائے گا......ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا کیا پتا وہ اپنی مرضی سے کہیں گیا ہو اور کسی کو کچھ بتانا مناسب نہ سمجھتا ہو۔''

''دیکھو......کل بھی میں نے تمہیں جو مشورہ دیا تھا......بڑا عملی تھا اور میری وجہ سے تم بہت بڑی پریشانی سے بچ گئے ابھی وہ مسئلہ ختم نہیں ہوا تمہارے صوفی چچا کا معاملہ اس وقت ٹھیک ہو گا جب تک اس معاہدے پر عمل کرو گے۔''

میں نے تلخی سے کہا۔''کھل کے بات کیوں نہیں کرتے انسپکٹر آفریدی......تم دونوں طرف کے سارے معاملات کو اچھی طرح جانتے ہو۔''

''تمہیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ تمہیں ایک اچھے ثالثی کرانے والے کی خدمات حاصل ہیں۔''وہ عیاری سے بولا۔

''ثالث نہیں......تم ایک بروکر ہو......دونوں طرف سے اپنا کمیشن لے رہے ہو۔ پورا فائدہ اٹھا رہے ہو ان حالات سے۔''

''اگر میں ایسا نہ کروں تو یہ پرلے درجے کی بے وقوفی ہے۔ موقع سے فائدہ کون نہیں اٹھاتا......خواہ وہ وردی والا ہو یا بغیر وردی کا......اور کیا اس میں فائدہ صرف مجھے ہو رہا ہے؟ ہم آپ کے خیر خواہ ہیں نواب صاحب۔ یہ بات آپ کو سمجھ لینی چاہیے اور مان لینی چاہیے۔ ابھی آپ نے مہلت کی بات کی ہے......مہلت میں دے سکتا ہوں۔''

''لیکن اس کی بھی قیمت ہو گی؟''میں نے طنز کیا۔

''مفت میں صرف خیرات ملتی ہے سر......اور آپ جیسے نواب خیرات دیتے ہیں......لیتے نہیں۔ خیرات لینے والے ہم جیسے فقیر ہوتے ہیں جو ہر وقت ہاتھ پھیلائے رکھتے ہیں اور بہت ذلیل سمجھے جاتے ہیں آپ جیسے اشراف کی نظر میں......اگر آپ غور فرمائیں تو مہلت میں پہلے ہی دے چکا ہوں آپ کو......اس امید میں کہ قیمت آپ بعد میں ادا کر دیں گے۔''

میں نے کہا۔''اب تم کیا چاہتے ہو؟''

وہ کرسی پر پھیل کے بیٹھ گیا۔''نواب صاحب......ابھی جب ایس پی صاحب نے آپ کے بارے میں پوچھا تھا تو میں نے جھوٹ بولا......میں کہہ سکتا تھا کہ جس بندے کی آپ کو تلاش ہے وہ تو میرے سامنے بیٹھا ہے......وہ مجھے حکم دیتے کہ اسے مسلح محافظوں کی نگرانی میں میرے پاس پہنچا دو......افسرِ اعلیٰ کا حکم میں ٹال نہیں سکتا تھا۔''

میں نے ایک گہری سانس لی۔''او کے......تمہارے اس احسان کا بدلہ میں کیسے چکا سکتا ہوں؟''

وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔''یہ جو نئی کرولا ہے......دو ہزار تین کا ماڈل......اگر یہ کسی شوروم سے لی جائے تو فوراً مل جاتی ہے......مگر ایک ڈیڑھ لاکھ آن منی دینے کے بعد......دس کی جگہ بارہ خرچ کرنے پڑتے ہیں ورنہ گاڑی بک کرائی جائے تو سال بھر بعد ملتی ہے۔''

مجھے سخت طیش آیا۔''ایک ڈیڑھ لاکھ سے بڑھ کر تم دس بارہ پر آ گئے۔''

''زبردستی کوئی نہیں سر......یہ تو مرضی کا سودا ہے۔ یہ موقع تو آپ کو صرف میں دے سکتا ہوں۔ مونوپولی پرائس

ہے...... اجارہ داری والی قیمت...... آپ کو منظور نہیں تو میں ایس پی صاحب کو فون کر دیتا ہوں کہ نواب رفیق احمد شیرازی آ گئے ہیں میرے پاس...... فرمائیے کیا حکم ہے۔"

دل ہی دل میں اسے ایک سو ایک گالیاں دینے کے باوجود میں نے مجبوراً خاموشی سے سر ہلا دیا۔ "گاڑی تمہارے گھر پہنچ جائے گی۔"

"میری بیوی کو بلیک کلر پسند ہے۔"

"اور تمہیں؟" میں نے جل کے کہا۔

"مجھے اپنی بیوی کا کلر پسند ہے۔" وہ ہنسا۔ "غصے میں وہ لال پیلی ہو جاتی ہے...... خوش ہو تو گلاب کی طرح کھل اٹھتی ہے...... مجھ سے شادی سے پہلے وہ ایک ماڈل تھی۔ شادی کے دس سال بعد وہ مجھے پہلے سے زیادہ اچھی لگتی ہے...... مگر گاڑی کی رجسٹریشن اس کے نام پر مت کرانا...... میرے سالے کا نام ہے گل فراز خان...... مردان میں اس کی ایک چھوٹی سی شوگر مل ہے۔"

"یہ سب تم خود کر لینا...... یا کرا لینا...... میں رقم ادا کر دوں گا...... کیا اب میں جاؤں؟"

"ایک منٹ سر......" اس نے بیانات میرے سامنے رکھے۔ "یہ تو آپ بھولے جا رہے ہیں۔"

میں نے جلدی جلدی اپنے بیان پر دستخط ثبت کیے اور پھر فاروقی کی گواہی والے بیان پر اندازے سے اس کے دستخط بنائے جو اطمینان بخش حد تک ٹھیک بنے...... میں اس کام سے فارغ ہوا ہی تھا کہ مجھے باہر سے اباجی کی آواز سنائی دی۔ اس نے مجھے نروس کر دیا۔

میں نے کہا۔ "ایک مہربانی اور کرو مجھ پر...... اباجی کو کچھ پتا نہیں چلنا چاہیے۔ انہیں تو یہ بھی علم نہیں کہ ان کے گھر کو آگ نے راکھ بنا دیا ہے۔"

تھانیدار نے سر ہلایا۔ "چلو جی یہ رعایت آپ کو بونس میں دیتے ہیں مگر آپ ان سے کیسے چھپاؤ گے اور کب تک۔"

"یہ میرا کام ہے۔" میں نے کہا۔

اسی وقت اباجی اندر آ گئے۔ "تم یہاں ہو؟"

میں نے کہا۔ "لیکن آپ یہاں کیسے؟"

"میں تو آیا تھا نذیر کو دیکھنے...... دیکھا باہر تمہاری گاڑی کھڑی ہے۔ کیا راجا کا کچھ پتا چلا۔ اور شہناز کا......" وہ کرسی پر بیٹھ گئے۔

میں نے اپنی بدقسمتی کو کوسا...... اباجی نے ایک نئی بات چھیڑ دی تھی اور یہ سب میری کوتاہی تھی۔ میں معاملات کو نمٹانے میں اتنی دیر نہ لگاتا تو کچھ بھی نہ ہوتا۔

میں نے کہا۔ "اباجی میں نکل رہا تھا۔"

انہوں نے کہا۔ "ہاں چلتے ہیں۔"

تھانیدار مکاری سے بولا۔ "یہ راجا تو آپ کے بیٹے کا سب سے قریبی دوست ہے اور یہ ڈاکٹر شہناز......"

"یہ اس کی منگیتر ہے۔" اباجی نے کہا۔

"کیسی عجیب بات ہے۔" تھانیدار بولا۔ "وہ گئے تھے غلام محمد کے فارم پر اس کا انٹرویو کرنے...... اور اغوا ہو گئے...... ادھر غلام محمد غائب ہے۔"

"اچھا۔" اباجی نے سخت حیرانی کا اظہار کیا۔ "عجیب اتفاق ہے۔"

"ہم اتفاق...... پر زیادہ یقین نہیں رکھتے۔" تھانیدار ہنسا۔

"کیا مطلب؟" اباجی نے سادگی سے پوچھا۔

"یہ ہو سکتا ہے کہ غلام محمد کو بھی اغوا کر لیا گیا ہو لیکن ابھی یہ خبر صیغہ راز میں ہو۔"

اباجی نے تائید میں سر ہلایا۔ "وہ سیاسی آدمی ہے اور سیاسی کھیل میری سمجھ میں نہیں آتے لیکن راجا کے اغوا کا کیا مقصد ہو سکتا ہے آخر؟"

میں نے کہا۔ "اباجی...... صحافی بھی اغوا ہوتے ہیں...... اب آپ اٹھیں مجھے کچھ ضروری کام ہیں۔"

تھانیدار مکاری سے بولا۔ "بھئی اباجی کو ہم نے چائے کے لیے بھی نہیں پوچھا۔"

"اس کی ضرورت نہیں...... بس تم نذیر کا خیال رکھنا۔" اباجی اٹھے۔

"آپ فکر نہ کریں...... جو کچھ میرے اختیار میں ہے وہ میں ضرور کروں گا۔"

باہر آتے ہی میں نے اباجی کو گاڑی کی طرف کھینچ لیا ورنہ وہ پھر بھائی سے ملنا چاہتے تھے...... "ایسی کیا آفت آ رہی ہے آخر۔" وہ بولے۔

میں نے کہا۔ "اباجی...... مجھے فوراً جانا ہے بلکہ ہم سب کو ابھی جانا ہے ست بدھائی۔"

"جانا تو خیر ہے...... مگر میں سوچ رہا تھا اپنے گھر کی طرف ہو لیتا اپنے علوی صاحب پراپرٹی کا کام کرتے ہیں وہ کسی کو کرائے پر اٹھا دیں یا سودا کرا دیں۔"

میں نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ "وہ سب بھی کر لوں گا...... ابھی تو ہمیں فوراً نکلنے کی فکر کرنی چاہیے۔"

اباجی نے غور سے میری طرف دیکھا۔ "رفیق...... خدانخواستہ کوئی ایسی پریشانی کی بات ہے تو مجھ سے مت

چھپاؤ۔"

میں نے کہا۔ "میں آپ سے کچھ بھی نہیں چھپا رہا ہوں۔"

"کیا فائدہ جھوٹ بولنے سے...... کیا میں تمہارا چہرہ پڑھ نہیں سکتا...... میرا چہرہ بھی تو ایک کتاب ہوتا ہے اور میں ہوں پروفیسر۔"

میں نے کہا۔ "بات یہ ہے اباجی کہ وہاں ست بدھائی میں فرخ کو کسی نے پیغام دیا ہے جو میرے لیے تھا کہ راجا اور شہناز کے اغوا کے معاملے میں پولیس کچھ نہیں کر سکتی۔"

اباجی گھبرا کے بولے۔ "کیا وہ تاوان چاہتے ہیں؟"

"غالباً...... بلکہ یقیناً مگر اس کا مطالبہ صرف مجھ سے کر سکتے ہیں حکومت تو کچھ دے گی نہیں۔ مجرموں کو پکڑنے کی کوشش میں وقت ضائع کرے گی۔ راجا کا یہ شہناز کا دنیا میں اور کوئی ہے نہیں۔"

"نہیں راجا اتنا مشہور صحافی ہے۔"

"ہاں...... صحافی بہت شور ہنگامہ کریں گے مظاہرے ہوں گے اور حکومت پر دباؤ ڈالا جائے گا لیکن اغوا کرنے والے مجھ سے بات کرنا چاہتے ہیں تو مجھے دیر نہیں کرنا چاہیے۔"

"اگر انہوں نے تاوان مانگا...... تو کتنا ہو گا؟"

"کیا پتا...... انہیں معلوم ہو گا کہ راجا کی دوستی مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے تو راجا کو شہناز اتنی ہی عزیز ہے ان کی زندگی کی قیمت اور کوئی نہیں دے سکتا...... میں دے سکتا ہوں...... ان سے بات کر کے معلوم ہو گا کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔"

"اللہ اپنا فضل کرے گا۔" اباجی نے عادتاً کہا "وہ خیر و عافیت سے لوٹ آئیں...... یہی سب سے اہم ہے مگر رفیق...... اس واردات نے میری پریشانی میں بہت اضافہ کر دیا ہے اگر تمہاری اماں کو معلوم ہوا تو ان کی حالت خراب ہو جائے گی۔"

میں نے کہا۔ "ان کو کچھ نہ بتائیں۔"

"نہیں بتاؤں گا مگر اس سے یہ خطرہ تو نہیں لگتا...... کہ کل کو ان کا نشانہ تم ہو سکتے ہو...... اغوا برائے تاوان کی وارداتیں کتنی بڑھ گئی ہیں۔ میں نے اخبار میں کئی بار دیکھا کہ بچوں کے اغوا اور پھر قتل میں خود ان کے عزیز ملوث نکلے کبھی ماں کبھی چچا...... استغفر اللہ...... انسان کا ضمیر مر جائے تو وہ انسان کہاں رہتا ہے...... درندہ بن جاتا ہے۔"

"میں حفاظتی انتظامات زیادہ سخت کر دوں گا آپ پریشان نہ ہوں۔"

اباجی کی پریشانی ایسی باتوں سے دور نہیں ہو سکتی تھی ابھی میں یہ چاہتا تھا کہ انہیں اس جگہ سے دور لے جاؤں۔ ست بدھائی تک کوئی اخبار نہیں پہنچتا تھا انہیں کبھی معلوم نہیں ہو گا کہ ان کا گھر اب جلے ہوئے ملبے کا ڈھیر ہے کچھ عرصے بعد میں انہیں بتا دوں گا کہ میں نے اسے فروخت کر دیا ہے ان کا ویسے بھی لوٹ کر جانے کا کوئی ارادہ نہ تھا۔

میں اپنے والدین کو دیگر معاملات سے بھی بے خبر رکھنا چاہتا تھا ایک معاملہ صوفی چچا کا تھا ان کی ضمانت پر اور بالآخر میڈیکل گراؤنڈ پر رہائی کا انحصار اس ڈیل کی کامیابی پر تھا جو میرے اور اکبر خان کے درمیان ہوئی تھی۔ ست بدھائی میں سائنس ریسرچ سینٹر کے حقوق ملکیت اکبر خان کے نام کرنے کی قانونی کارروائی مکمل ہونے کے بعد مجھے پورا یقین تھا کہ صوفی چچا پر کوئی کیس نہیں بنے گا بلکہ بیوی کو قتل کرنے کا کیس بھی ذہنی عدم توازن کے باعث ختم کر دیا جائے گا۔ مجھے صوفی چچا کے نام پر خوب بلیک میل کیا گیا تھا اور اباجی کی وجہ سے میں مجبور ہو گیا تھا کہ بلیک میل کرنے والوں کی ہر بات مان لوں۔

دس لاکھ سے زیادہ دے کر میں نے انسپکٹر آفریدی سے چوبیس گھنٹے کی مہلت حاصل کر لی تھی۔ راجا سے اور شہناز سے میرا رابطہ تھا۔ غلام محمد کے بارے میں بھی مجھے علم تھا کہ اب تک دو کروڑ کے تاوان کا مطالبہ تنظیم تک پہنچ گیا ہے اور اگلے دن کے اخباروں میں بھی اس کا ذکر ہو گا۔ پھر مجھ پر سے یہ الزام خود بخود ہٹ جائے گا کہ میرے گھر سے ملنے والی جلی ہوئی لاش غلام محمد کی تھی...... وہ سب سچ مان لیا جائے گا جو میں نے غلام محمد کے بارے میں بتایا تھا تو میرے لیے خطرے کی بات کوئی نہیں ہو گی اگر اس کے اغوا کے معاملے میں کوئی مصنوعی تفتیشی ٹیم بنائی گئی تو ان کے سامنے بھی میرا بیان یہی رہے گا کہ وہ میرے ساتھ ضرور تھا مگر فوڈ اسٹریٹ میں کھانے کے بعد ہم اپنے اپنے راستے پر چلے گئے تھے۔ نہ یہ کہا جا سکتا تھا کہ میں نے اسے اغوا کرایا...... نہ یہ کہ میرا اغوا کرنے والوں سے کوئی تعلق تھا...... میری شرافت کی سند کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا تھا...... میں اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا اور مجھے دولت کی کوئی کمی نہیں تھی۔

گھر پہنچ کر جب میں نے فوری طور پر ست بدھائی جانے اور اپنے ساتھ والدین کو لے جانے کا اعلان کیا تو سب سے زیادہ شور فاروقی کی بیوی نے کیا۔ "آخر مجھے بھی تو پتا چلے کہ ایسی کون سی قیامت آ رہی ہے۔"

میں نے کہا۔ ''لیلیٰ بھابی...... یہ اپنے مجنوں میاں سے پوچھ لینا۔ وہ سب بتا دیں گے۔''

فاروقی کی بیوی کا اصل نام لیلیٰ نہیں تھا۔ فاروقی نے اس سے جو بہت دھوم دھڑا کے والا عشق کیا تھا جس میں تین سال تک بہت گرما گرمی ہوئی اور بہت ہنگامہ خیزی رہی مگر بالآخر لڑکی کے گھر والوں کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ یونیورسٹی میں وہ لیلیٰ مجنوں ہی مشہور تھے کیونکہ خود فاروقی یہ کہتا تھا...... شادی کے بعد بھی فاروقی نے بیوی کو پیار سے لیلیٰ کہنے کا سلسلہ جاری رکھا اور اب یہی اس کا نام ہو گیا تھا۔

اس نے چمک کے کہا۔ ''آخر تم کیوں نہیں بتا سکتے؟''

اباجی نے کہا۔ ''بھئی میں بتاتا ہوں...... کچھ مجبوری ہے۔''

مجھے فوری طور پر فاروقی سے مشورہ کرنا تھا اور اسے تازہ ترین صورت حال سے مطلع کرنے کے بعد یہ بتانا تھا کہ میرا پروگرام کیا ہے۔ میں اپنے کمرے میں گیا تو اپنے بیڈ پر ایک شعلہ مجسم کو محو استراحت دیکھ کر ٹھٹکا جس کے آتشیں گلابی پیرہن کو دیکھ کر میر کا شعر یاد آتا تھا کہ...... گلشن میں آگ لگ رہی تھی رنگ گل سے میر...... بلبل پکاری دیکھ کے صاحب پرے پرے...... اس کے سیاہ ریشمی بالوں کا ڈھیر تکیے پر یوں پھیلا ہوا تھا جیسے آسمان پر گھرے سیاہ بادل محیط ہوں۔

قدموں کی آہٹ پر اس نے کروٹ لے کر میری طرف دیکھا تو میں بھونچکا رہ گیا۔ وہ شاخ گل کی طرح لچک کے اور لہرا کے اٹھی اور پھر میری صورت پر ٹھہری ہوئی حیرانی کو دیکھ کر ہنسی...... یہ فریال تھی کوئی اور نہیں۔

''میں نے کہا۔ ''یہ...... تم ہو؟''

وہ ہاتھ پھیلا کے رقص کے انداز میں گھومی۔

''یوں...... کیسی لگ رہی ہوں میں؟''

''ایک فتنہ محشر...... جو کہ تم ہو...... مگر میرے سپنوں کی رانی...... میرے نواسوں کی ...... یہ سب کیا ہے؟'' میں نے سنبھل کے کہا۔

''تمہاری نظر دھوکا کھا گئی نا؟''

میں نے سر ہلایا۔ ''یہ حیدر آبادی لباس عروسی......''

''یہ لیلیٰ بھابی کا ہے...... وہ مجھے شادی کے کپڑے دکھا رہی تھیں...... کہنے لگیں کہ اب تو مجھے آتے ہی نہیں...... شادی کے وقت میں تمہارے جیسی نازک اور سلم تھی۔''

''اور تم نے فوراً پسند کر لیا اور پہن لیا۔''

''انہوں نے کہا کہ تم پہن کے دیکھو...... مجھے اچھا لگا۔''

میں نے کہا۔ ''مگر تمہیں تو آتشیں گلابی اور لال رنگ سے ہی نفرت تھی اور یہ زلف بنگال ہیئر آئل کے اشتہاری بال۔''

''یہ وگ ہے......'' اس نے خود کو آئینے میں دیکھا۔

''اب میں اپنے بال بڑھاؤں گی...... بڑی غلطی کی تھی میں نے بال کٹوا کے...... بھابی کہہ رہی تھیں کہ اگر میں توجہ دوں تو ایک سال میں میرے بال ایسے ہو سکتے ہیں۔ ان کے پاس بال بڑھانے کا کوئی خاندانی نسخہ ہے۔''

میں نے کہا۔ ''خدا کے لیے عقل سے کام لو فریال...... بال موروثی طور پر گھنے یا لمبے...... براؤن یا بلیک ہوتے ہیں۔ کسی نسخہ کیمیا سے بال اگائے یا بڑھائے جا سکتے تو کوئی گنجا نہ ہوتا اور ہر عورت کی زلف ساون کی گھٹا ہوتی...... وگ ایجاد ہی نہ ہوتی۔''

اس نے مایوسی سے کہا۔ ''صاف کہو نا کہ اچھی نہیں لگ رہی ہوں تمہیں۔''

''لاحول ولاقوۃ...... تم سے اچھا کون ہے...... مگر تم جیسی ہو ویسی ہی سب سے اچھی لگتی ہو۔ ان مصنوعی سہاروں کی تمہیں ضرورت نہیں۔ ویسے بھی حسن تو دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے اور میری نظر میں حسین تم ہو...... صرف اور صرف تم۔''

''لفاظی میں تو ماہر ہو تم...... خیر یہ بتاؤ سواری کہاں سے آرہی ہے؟''

''سواری جا رہی ہے ست بدھائی۔'' میں نے فون پر فاروقی کا نمبر ملاتے ہوئے کہا۔ ''ابھی اور اسی وقت...... خدا حافظ اور الوداع۔''

''یار اتنی جلدی کیا ہے...... کیا آفت آرہی ہے۔''

''آفت نہیں پولیس آرہی ہے۔'' میں نے کہا اور پھر فاروقی کی ہیلو سنی...... ''مسٹر فاروقی...... میں نے کچھ مزید سنگین جرائم کیے ہیں۔''

وہ بولا۔ ''کوئی بات نہیں...... پھانسی ایک ہی بار ہوتی ہے۔''

''آج ایک بیان پر میں نے تیرے دستخط کیے ہیں اور پکڑا نہیں گیا۔ کل تیرے چیک سائن کر کے فراڈ کروں گا...... فی الحال میں فرار ہو رہا ہوں۔'' ''میں بھی یہی کہنے والا تھا۔ تیری حیثیت ایک مفرور اور مطلوب مجرم کی ہے اس وقت...... غلام محمد کیس میں پولیس تجھے تلاش کر رہی ہے ایس پی نے ایک بہت چالاک انسپکٹر کو تفتیشی افسر مقرر کیا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اسی لیے میں جا رہا تھا مت بدھائی۔''

''تو سیدھا جیل کیوں نہیں چلا جاتا......'' وہ بگڑ کر بولا۔

''پولیس تیرے گھر گئی تھی۔''

''وہاں اب کیا ہے دوست...... خاک آشیاں ہے اور بس۔'' میں نے آہ بھری۔

''اب پولیس پارٹی بھیجی گئی ہے ست بدھائی...... ہو سکتا ہے وہ میرے گھر بھی آئیں۔''

میں نے کہا۔ ''یار پھر میں کیا کروں...... گرفتاری دے دوں یا پولیس مقابلے میں دن دن گولیاں چلا کے سب کو لٹا دوں۔''

''خدا کے لیے ابھی تو کچھ مت کر۔ فون میری بیوی کو دے۔ میں اسے سمجھا دیتا ہوں۔''

''وہ کیا کر سکتی ہے یار۔''

''قاضی کے گھر کے چوہے بھی سیانے ہوتے ہیں فیکے پتر۔''

''ہاں...... مگر وہ تو چوہیا ہے۔''

''تیری رائے سے میں اسے آگاہ کر دوں گا...... اگر پولیس پارٹی تیرا پتا پوچھتی میرے دروازے تک آئی تو وہ وہیں سے لوٹا دے گی...... کسی کی مجال نہیں کہ اندر جھانک بھی سکے...... میری صحبت میں پوری نہ سہی وہ آدھی وکیل ہو گئی ہے۔''

''صحبت کا لفظ بیوی کے ساتھ فحاشی کے زمرے میں آتا ہے فاروقی صاحب۔'' میں نے کہا اور فون اس کی بیوی کو دینے کے لیے باہر نکل گیا...... وہ میز پر کھانا لگا رہی تھی۔

''آپ لوگ شروع کریں۔'' اس نے کہا اور فون کے ساتھ اندر چلی گئی۔

ابھی دو منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ باہر سے کسی نے کال بیل بجائی۔ 'کیا پولیس اتنی جلدی آگئی......' میں نے سوچا...... گھنٹی پھر بجی...... اباجی نے میری طرف دیکھا۔ ''بھئی جا کے دیکھو۔''

میرے جواب دینے سے پہلے موبائل فون کان سے لگائے فاروقی کی بیوی اندر سے نکلی اور دروازے کی طرف لپکی...... آپ لوگ کھانا جاری رکھیں...... میں دیکھتی ہوں۔'' اس نے کہا اور پھر اپنے میاں کی ہدایات پر سر ہلاتی باہر چلی گئی۔

ابا نے کہا۔ ''سامان تو تیار ہے نا...... بس کھانا کھا کے نکلتے ہیں۔''

اماں نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''اب میرا بھی دل نہیں لگ رہا ہے یہاں...... رابعہ وہاں اکیلی ہے۔''

''بھئی اکیلی وہ کیسے ہوئی...... حویلی میں اتنے لوگ ہیں...... اور وہ خود اپنی مرضی سے ہمارے ساتھ نہیں آئی تھی لیکن خیر...... چلتے ہیں......'' اباجی نے کہا۔

میں نے کہا۔ ''وہ اباجی...... آج جانا مشکل ہے۔''

ابا چونکے۔ ''رفیق میاں...... یہ پل بھر میں کیا ماجرا ہو گیا ابھی راستے میں تم کیا کہہ رہے تھے...... اب کیا کہہ رہے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''دراصل ابھی فاروقی سے بات ہوئی تو اس نے کہا کہ کچھ قانونی دستاویزات ہیں...... ان پر آج ہی میرے دستخط ہونے ضروری ہیں۔''

''تو ایسا کرتے ہیں...... جاتے ہوئے کچھ دیر کے لیے اس کے آفس میں رک جاتے ہیں...... دستخط کرنے میں کتنا وقت لگتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''وہ دستاویزات تیار کرا رہا ہے...... رات کو زیادہ دیر سے نکلنا مناسب نہیں...... کل چلیں گے۔''

ظاہر ہے اس کے بعد وہ کیا بحث کرتے۔ لیلیٰ بھابی دس منٹ گزر جانے کے بعد بھی نہیں لوٹی تھی اس سے مجھے کچھ پریشانی لاحق ہو گئی تھی۔ کیا پولیس اندر آنے پر بضد تھی؟ اس نے یقیناً سب سے پہلے وارنٹ کی بات کی ہو گی۔ کیا پولیس وارنٹ لائی ہو گی؟ ظاہر ہے فاروقی جیسے وکیل کے گھر میں زبردستی گھسنے کی ہمت کوئی نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد سوال اٹھے گا لیڈی سرچ پولیس کا...... کیا پتا وہ بھی ساتھ ہو......

فاروقی کی بیوی مسکراتی ہوئی نمودار ہوئی...... ''معاف کرنا میں آپ لوگوں کے ساتھ کھانے میں شریک نہیں ہو سکی۔ رفیق بھائی سے مجھے پوچھنا ہے کہ آخر یہاں کیا تکلیف ہے آپ کو...... وہ ابھی اسی وقت آپ کو اپنے ساتھ ست بدھائی لے جانا چاہتے ہیں...... آخر کیوں۔''

میں نے کہا۔ ''ارے نہیں...... یہاں تو اپنے گھر سے زیادہ آرام ملا ہمیں...... مگر کیا کریں اس بن ماں باپ کی بچی کو بھی دیکھنا ہے۔''

اباجی بولے...... ''لیکن تم کہتی ہو تو ہم آج اور رک جاتے ہیں...... کل چلے جائیں گے...... میرا تو خیال ہے کہ تم بھی ساتھ چلو۔''

میں نے کہا۔ ''آپ نے میرے دل کی بات کی...... بھابی کو فاروقی ابھی تک ایک بار بھی وہاں نہیں لے گیا خود کتنی بار جا چکا ہے۔''

''ذرا چل کے دیکھو...... ہماری وہ خاندانی حویلی بڑی تاریخی چیز ہے۔'' اباجی نے کہا۔ ''تمہارے لیے ایک بالکل نیا تجربہ ہو گا۔''

میں نے کہا۔ ''جاگیر میں کوئی سپاٹ میدان نہیں ہے...... دریا ہے اور گھنا جنگل ہے...... تم بہت انجوائے کرو گی۔''

''میں ضرور چلوں گی......'' فاروقی کی بیوی بولی ''مگر......؟''

''مگر کیا...... میاں مجنوں سے جدائی منظور نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''لیلیٰ بھابی اسے رہنے دیں کچھ دن اکیلا...... آپ اتنا خیال رکھتی ہیں کہ عادتیں خراب ہو گئی ہیں اس کی...... وہ کبھی نہیں لے کر گیا آپ کو خودغرض آدمی......''

وہ ہنسنے لگی۔ ''میں فریال کے بارے میں سوچ رہی تھی۔''

''لو...... یہ بھی کوئی سوچنے کی بات ہے...... فریال ساتھ چلے گی...... ہم کیا اسے یہاں چھوڑنے کا کہہ رہے ہیں۔'' اباجی نے کہا۔

فریال نے میری طرف دیکھ کر آنکھ ماری اور مسکرائی۔ میں نے گھبرا کے اماں ابا کی طرف دیکھا۔ وہ ایسی لوفرانہ حرکت دیکھ لیتے تو......؟ میں نے وارننگ دینے کے لیے اسے میز کے نیچے سے ٹھوکر ماری...... میز کے نیچے سے ایک بلی نکل کے بھاگی۔ فریال چلانے لگی۔ ''یہ کیا بدتمیزی ہے؟''

اماں نے کہا۔ ''کیا ہوا بیٹی؟''

''دیکھیے نا......'' فریال نے میری طرف دیکھا۔ ''بے چاری بلی آرام سے بیٹھی تھی۔ لات ماردی بے زبان کو۔''

ابا کے ساتھ اماں نے مجھے لتاڑا...... میں انہیں کیا بتاتا کہ فریال جھوٹ بول رہی تھی۔ میری لات بلی کو بالکل نہیں لگی تھی...... بلی کو اس نے لات ماری تھی جب میں نے فریال کی طرف دیکھا تو اس نے پھر مجھے آنکھ ماری اور دو انگلیاں ہونٹوں پر رکھ کے میری طرف ایک فلائنگ کس بھی ارسال کیا...... اماں ابا اب فاروقی کی بیوی کو قائل کر رہے تھے کہ وہ دو چار دن نہیں ایک مہینے کے لیے ساتھ چلے۔ یہ شرمناک حرکت انہوں نے نہیں دیکھی۔

کھانے کے بعد میں نے سوچا کہ کچھ دیر آرام کرلوں کیونکہ آج میں باہر نہیں نکل سکتا تھا...... کوشش کر کے میں نے لندن میں ڈاکٹر شائستہ سے رابطہ کیا اور حسب عادت اس جھکی عورت نے بہت سی فضول باتیں کرنے کے بعد مجھے شہناز کا نیا نمبر دے دیا۔ کال راجا نے وصول کی۔

میں نے کہا۔ ''یار یہ کیا ہے...... روز نمبر بدلنے کی کیا ضرورت ہے؟''

''ضرورت ہے بیکے پتر...... ایک توپ قسم کے صحافی اور ایک ڈاکٹر کے اغوا نے بڑا طوفان کھڑا کیا ہے...... میرے لیے صحافتی تنظیموں نے بیان ہی نہیں داغے...... مظاہرے کیے ہیں اور حکومت کو نوٹس دیا ہے کہ راجا کو چوبیس گھنٹے میں بازیاب نہ کرایا گیا تو کل صحافی پارلیمنٹ سے واک آؤٹ کریں گے...... سرکاری تقریبات کا بائیکاٹ کردیا جائے گا۔''

میں نے کہا۔ ''ہاں یہ سب تو ہوتا ہے۔''

''انفارمیشن منسٹر پر دباؤ پڑا تو اس نے وزارت داخلہ پر دباؤ ڈالا ہے۔ پولیس کو مشکل پڑ گئی ہے...... یہ احتیاط اس لیے ضروری ہے کہ ہماری جعلی روپوشی اور اغوا کے ڈرامے کا راز فاش نہ ہو...... آج کل موبائل فون کی کالوں کا ریکارڈ حاصل کرنا مشکل نہیں ہوتا۔''

''تم دونوں ہو کہاں؟''

''غالب کی زبان میں...... ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی...... کچھ ہماری خبر نہیں آتی...... گوا چی گاں اور گمشدہ بیل کی طرح پھر رہے ہیں۔''

''اور پولیس تمہیں کب بازیاب کرے گی؟''

''اس سلسلے میں بات ہو گئی ہے...... انشاءاللہ جمعرات کو...... آج ہے منگل...... یعنی پرسوں...... ایک اچھا بندہ ہے پولیس میں۔''

''اللہ کا شکر ہے کہ ایک تو ہے۔''

''میں نے سوچا یہ کارنامہ اس کو سرانجام دینے کا موقع ملنا چاہیے ورنہ اس کی ترقی تو رکی ہوئی ہے کئی سال سے...... افسران بالا جو ناخوش ہیں...... اس کی ایمانداری اور فرض شناسی سے...... وہاں کیا ہو رہا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''وہ سب ہو رہا ہے جو نہیں ہونا چاہیے...... اور جو نہیں ہونا چاہیے وہ ہو رہا ہے آپ کی دعا سے...... دیگر احوال یہ ہے کہ......''

فاروقی کی بیوی توپ سے نکلے گولے کی طرح اندر داخل ہوئی اور میرے ہاتھ سے موبائل چھین لیا۔ ''میں بتاتی ہوں احوال تمہیں۔''

میں نے کہا۔ ''ارے بھابی...... میں راجا سے بات کر رہا تھا۔''

''دیور جی پہلے مجھ سے بات کرو...... یہ کیا چکر چلا رکھا ہے تم نے؟''

''دیکھیے میں حالات حاضرہ پر قوم سے خطاب فرماتا ہوں...... آپ بھی سنیں اور راجا صاحب بھی دور بیٹھے مستفید ہوں...... موبائل فون عنایت کریں۔'' میں نے ہاتھ بڑھا کے کہا۔

''پہلے تم دونوں میری سن لو......'' اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا اور پھر ایک ساتھ ان تمام فریقوں کو لتاڑنا شروع کیا جو اس کے خیال میں بدمعاشی سے فحاشی تک اپنی اور دوسروں کی بربادی کے لیے سب کچھ کر رہے تھے۔ کچھ نہیں کر رہے تھے تو ایک پرسکون زندگی کے لیے خانہ آبادی کی فکر...... ادھر میں نے فریال کے ساتھ اور دوسری طرف راجا نے شہناز کے ساتھ یہ خطبہ بڑی ڈھٹائی کے ساتھ سنا اگر ہم بولتے تو جتنا سنا اس سے زیادہ سنتے...... راجا کا قول تھا کہ کان بند...... آنکھیں بند...... اور زبان بند ہو تو اچھی بات کرنے والا خود شرمندہ ہو کے چپ ہو جاتا ہے اور یہی ہوا۔

وہ ریسیور میرے سامنے پھینک کے چلی گئی تو میں نے پوچھا ''کیوں بیٹے کیا اثر ہوا۔''

''ہاں یار...... بالکل شہناز کی طرح بول رہی تھی...... بلکہ اس کی اماں لگ رہی تھی۔'' راجا ہنس پڑا۔

میں نے کہا۔ ''اب کچھ میری بھی سن لے ورنہ کارڈ ختم ہو جائے گا۔ آدھا بیلنس تو مجنوں کی لیلیٰ کھا گئی۔''

اور ایسا ہی ہوا...... حالانکہ میں نے یہاں کے معاملات کی رپورٹ دینے میں خاصے اختصار سے کام لیا تھا۔ ''سوئٹ ہارٹ ذرا اپنا موبائل فون دو گی؟'' میں نے کہا۔

فریال نے بڑی شرافت سے کہا۔ ''کیوں نہیں۔'' اپنا موبائل فون لا کے مجھے پیش کیا اور معصوم صورت بنا کے بیٹھ گئی۔ یہ مجھے کال ملانے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ بھی خالی ہے۔ میری صورت دیکھ کے فریال ہنسنے لگی تو میں نے اس کا موبائل فون کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔

وہ تلملا کے اٹھی۔ ''میں بلاتی ہوں پاگل خانے والوں کو...... بندہ گھر کی قیمتی چیزیں اٹھا اٹھا کر باہر پھینک رہا ہے۔''

''قیمتی نہیں ناکارہ...... اب مجھے پھینکنے والا ہے...... یہ بھی بتا دینا۔''

فاروقی کی بیوی نے زیادہ سرد مہری دکھائی اور صاف انکار کر دیا۔ ''میرے پاس کوئی موبائل فون نہیں ہے۔''

''اتنا جھوٹ تو مت بولو۔''

''پھر کتنا بولوں...... جتنا تم بولتے ہو...... ابھی تمہاری خاطر اتنا جھوٹ بولنا پڑا...... پولیس آئی تھی تمہیں پکڑنے...... کوئی بڑا ہی کمینہ افسر تھا...... بجو کے منہ والا...... کہنے لگا کہ ہم تو سونگھ کے بتا سکتے ہیں کہ مجرم اندر چھپا ہوا ہے یا نہیں...... میں نے کہا کہ ہاں ایک جانور کی ناک بہت تیز ہوتی ہے۔

اس کی ناک بھی چہرے پر بہت بڑی لگتی تھی...... ایک ماتحت میری بات پر ہنسنے لگا تو اس سے کہنے لگا کہ ہاں میں لایا ہوں اسے اپنے ساتھ۔"

میں نے کہا۔ "آپ نے تو واقعی کمال کر دیا۔ فاروقی نے بالکل ٹھیک کہا تھا کہ آپ چوہیا ہیں۔"

وہ چونکی۔ "چوہیا کہا تھا مجھے...... بکومت۔"

"آپ کے سر کی قسم...... کہہ رہا تھا قاضی کے گھر کی چوہیا بھی سیانی ہوتی ہے۔ آپ واقعی بہت سیانی ہیں۔"

وہ ہنسنے لگی۔ "اب خیریت اسی میں ہے کہ باہر مت جانا بلکہ کسی کھڑکی میں بھی اپنا چہرہ مت دکھانا کسی کو۔"

"کیوں؟ کیا وہ باہر مورچہ لگائے بیٹھے ہیں۔"

"کیا پتا...... وہ بجو کہہ رہا تھا کہ کیا کریں۔ بیرسٹر صاحب کا گھر ہے ورنہ بندہ تو برآمد ہو جاتا ہماری بھی ہزار آنکھیں ہیں...... کب تک چھپ کر رہے گا میں نے کہہ دیا کہ جا کے اپنے گھر میں دیکھو...... کہیں ایسا نہ ہو کہ بچہ بغل میں ڈھنڈورا شہر میں......"

شام کو جب ہم چائے پی رہے تھے تو خلاف معمول فاروقی آ گیا۔ اس نے گاڑی باہر ہی چھوڑ دی تھی۔ اس کی بیوی نے پوچھا۔ "کیا ہوا؟ آج آفس نہیں گئے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

وہ ہنسا۔ "تمہیں دیکھ کر ٹھیک ہو گئی ہے۔"

"کیا سر میں درد ہے۔" وہ بہ دستور تشویش میں مبتلا رہی۔

"نہیں...... درد دل ہے اور اس کی دوا ہو تم...... یہ بتاؤ پولیس آئی تھی؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "آئی تھی...... بہت بک بک کر رہا تھا ایک بجو کی شکل والا انسپکٹر...... میں نے کہا دفع ہو جاؤ ورنہ گولی مار دوں گی۔"

"بڑی رعایت کی آپ نے اس کے ساتھ...... ورنہ مارنے کے لیے گولا بھی تھا آپ کے پاس۔" میں نے فاروقی کی طرف اشارہ کیا۔

فریال نے بڑی مسرت سے اطلاع دی۔ "ہم سب کل صبح جا رہے ہیں ست بدھائی...... اور اپنے ساتھ لیلیٰ بھابی کو بھی لے جا رہے ہیں۔ اب یہ وہیں رہیں گی ہمارے ساتھ...... آپ کو اعتراض تو نہیں؟"

"بس اس جیسی دوسری چھوڑ جانا میرے لیے پھر مجھے کوئی اعتراض نہیں...... میں بھی لے جا رہا ہوں تمہارے رومیو کو اپنے ساتھ...... امید ہے تمہیں بھی اس جیسا دوسرا مل جائے گا۔ کہتے ہیں ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔ چل اٹھ نیکے پتر۔"

میں نے کہا۔ "کہاں جانا ہے؟"

"وہیں جو تیری منزل ہے...... جہاں تجھے ساری عمر گزارنی ہے چکی پیستے۔" فاروقی اٹھ کھڑا ہوا...... "میں تجھے لے جانے کے لیے ہی تو آیا تھا۔"

وہ نہ جانے کس کی گاڑی لے کر آیا تھا۔ اس کے شیشے کالے تھے۔ اندر کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ کالے شیشوں کا استعمال خلاف قانون تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے رشوت لینا خلاف قانون تھا۔ فاروقی نے یہ بندوبست مجھے بہ حفاظت نکال لے جانے کے لیے کیا تھا۔ اس وقت میرے والدین اندر مغرب کی نماز میں مصروف تھے۔

میں نے گاڑی میں پیچھے بیٹھنے کے بعد کہا۔ "اس وقت اچانک میری کیا ضرورت پڑ گئی۔"

فاروقی بگڑنے لگا۔ "مجھے تو لگتا ہے کہ بہت جلد میرا سارا وقت تیرے مقدمات سے نمٹنے میں لگے گا۔ باقی سب مؤکلوں کی چھٹی ہو جائے گی۔ ایک ساتھ اتنے بکھیڑے پھیلا لیے ہیں تو نے۔"

"مجھے کیا شوق ہے۔"

اس نے میری بات کاٹ دی۔ "ہاں شوق ہے تجھے...... اب اس وقت یہ اغوا کا ڈراما کرنے کی کیا ضرورت تھی...... وہ تیرا دوست جرنلسٹ کی دم...... اس نے بھی تجھے منع نہیں کیا...... الٹا تیرے ساتھ اس بے وقوفی کے کھیل میں شامل ہو گیا...... معلوم ہے غلام محمد کے نہ ملنے سے کتنی خرابی پیدا ہو گئی۔"

میں نے کہا۔ "یار وہ ضروری تھی۔"

"کیوں ضروری تھی؟"

"اس لیے کہ غلام محمد اور اس کے ناجائز باپ نے میری زندگی عذاب کر رکھی تھی۔ وہ مجھے ڈرا رہے تھے۔ بلیک میل کر رہے تھے...... میرے گھر تک پہنچ گئے تھے...... اب اس کی ساری بدمعاشی...... کے راستے نکل جائے گی۔"

"یہ سب بعد میں بھی ہو سکتا تھا۔" فاروقی نے کہا۔ "پہلے ہم اس صوفی چچا والے معاملے سے نمٹ لیتے۔ اب دیکھ کہ ایک جھگڑا ختم ہونے سے تیری کتنی پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔ صوفی چچا کا کیس اتنا آسان ہو جائے گا کہ وہ چار مہینے میں ختم...... میڈیکل رپورٹ مل جائے گی کہ انہوں نے جب قتل کیا تو وہ ذہنی عدم توازن کا شکار تھے...... انہیں بھیج دیا جائے گا۔ دماغی امراض کے اسپتال۔ وہاں سے ہم انہیں

پیرول پر رہا کرا لیں گے۔ علاج کے لیے کسی اچھے نفسیاتی کلینک شفٹ کر دیں گے۔"

"مجھے ایسا ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔"

"مایوس مت ہو...... یہ دیکھ کہ سائنس ریسرچ سینٹر اکبر خان کے حوالے کرنے سے کتنے معاملات ختم ہوتے ہیں...... کاسو کا جھگڑا ختم...... رانا کی عداوت ختم...... اکبر خان کا مسئلہ ختم۔"

میں نے تلخی سے کہا۔ "اور میں ایسا نہ کروں تو؟"

"تو...... خود سمجھ لے کہ صوفی چچا کے ساتھ کیا ہوگا۔ پھر تیرے ابا پر کیا بیتے گی...... اکبر خان ایک عذاب بن کر تجھ پر مسلط رہے گا...... سائنس ریسرچ سینٹر کو واپس لینا...... بند کرنا...... بلڈوز کرنا...... یہ سب تیرے بس کی بات نہیں۔ تو سب کرے گا تو روگ پالے گا...... دشمنی بڑھ جائے گا...... اکبر خان کی دشمنی الگ...... رانا کی الگ...... اور یہ میں کلیئر کر دوں...... کسی خوش فہمی میں مت رہنا بیٹے...... قانون کچھ نہیں...... جو کچھ ہے لاقانونیت ہے تو کاسو کو نہیں بچا سکتا۔"

"بکواس مت کر...... زندگی اور موت کیا، رانا کے ہاتھ میں ہے......" میں نے برہمی سے کہا۔

"ان جھگڑوں میں پڑے گا نیکے پتر تو ست بدھائی میں خاک کام کرے گا...... تیرا ڈیویلپمنٹ پروجیکٹ ایک دیوانے کا خواب بن جائے گا...... کچھ نہیں بنے گا وہاں...... سوائے مزید قبروں کے۔"

وہ سخت غصے میں تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی تلخ مگر حقیقت پسندانہ باتوں نے مجھے جتنا مایوس کیا اتنا ہی حالات کو سمجھنے کی راہ دکھائی۔ جب میں اس کے پیچھے آفس میں پہنچا تو خلاف معمول وہاں ایک بھی کلائنٹ نہیں تھا۔ اس کی سیکریٹری فراغت سے بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی جو انتظار گاہ میں اسی لیے لگایا گیا تھا کہ لوگ بور نہ ہوں مگر میں نے اسے کبھی چلتا ہوا نہیں دیکھا تھا۔

ہمیں دیکھ کر اس نے ٹی وی بند کر دیا اور پھر میری طرف دیکھ کر متوقع انداز میں مسکرائی کہ میں اسے چھیڑنے کا سلسلہ شروع کروں مگر میں نے صرف اسے آنکھ مارنے پر اکتفا کیا اور فاروقی کے ساتھ اندر چلا گیا۔ ظاہر ہے سیکریٹری کیسے کریکس نہ ہوتی۔

"آج میں نے کہہ دیا تھا کہ میں نہیں آؤں گا۔" فاروقی نے کوٹ اتار کے کرسی کی پشت پر ڈالا اور پھر کافی طلب کی۔ "میری طبیعت خراب ہے۔"

"میری وجہ سے یہ بہانہ کرنا پڑا۔"

"ہاں...... میں نے اکبر خان کو بلا لیا ہے۔ تو یہ ایگریمنٹ دیکھ لے......" اس نے دراز میں سے لیگل پیپرز والی ایک فائل نکالی۔

"میں کیا دیکھوں...... وکیل تو ہے یا میں...... مجھے بتا دے کہ کیا لکھا ہے اس میں اور مجھے دستخط کہاں کرنے ہیں...... مگر یار...... یہ جو کچھ ہوگا اس کا بوجھ میرے ضمیر پر ہے۔ یہ میں کرنا نہیں چاہتا۔"

اس نے نرمی سے کہا۔ "بات نہ تیرے چاہنے کی ہے اور نہ تیرے ضمیر کی...... یہ جینے کی مجبوری ہے...... ہم سب کے لیے۔"

میں نے کہا۔ "فاروقی...... کیا یہ ایگریمنٹ واقعی ایک گارنٹی ثابت ہوگا...... یقینی طور پر مجھے تمام اندیشوں سے تحفظ فراہم کرنے کی۔"

"گارنٹی کیا چیز ہوتی ہے نیکے پتر...... آدمی کی کیا گارنٹی ہے کہ وہ آنے والے سال مہینے یا وقت کے ایک لمحے کی گارنٹی دے سکے...... بندہ یہی کہہ سکتا ہے کہ انشاء اللہ۔"

"یعنی یہ امکان بہرحال موجود ہے کہ اس ایگریمنٹ کو سائن کرنے کے بعد جب میرے اختیار میں کچھ نہ رہے تو رانا پھر یہ مطالبہ لے کر کھڑا ہو جائے کہ کاسو کو میرے حوالے کر دو۔"

"ایک تجربے کی بات بتاؤں...... تمام قانونی معاہدوں، تحریری دستاویزات اور شریفانہ عہد و پیمان یا بڑی بڑی قسموں اور بھاری بھرکم حلف ناموں کے مقابلے میں ان سب کے وعدے زیادہ قابل اعتماد اور پکے ہوتے ہیں جو بدمعاشی کے غیر قانونی دھندے کرتے ہیں۔ چور ڈاکو مال غنیمت کی تقسیم بڑی ایمانداری سے کرتے ہیں۔ رشوت خور اوپر تک سب کا حصہ بڑی خدا ترسی کے ساتھ پہنچاتے ہیں۔ وہ آیا کیوں نہیں ابھی تک۔" فاروقی نے گھڑی کی طرف دیکھا۔

میں نے کہا۔ "کیا لکھا ہے اس معاہدے میں تو نے؟"

"یہ پرانے معاہدے کی جگہ ہوگا...... پہلے کچھ ابہام تھا اب ہر بات واضح کر دی گئی ہے...... تو نے یہ جگہ سائنس ریسرچ سینٹر کے تاحیات چیئرمین اکبر خان کو دے دی ہے۔"

"اکبر خان...... سائنس ریسرچ سینٹر کا چیئرمین؟ جو انگلش میں سائنس کا لفظ تک لکھنا نہیں جانتا۔"

"مت پڑ ان جھمیلوں میں...... اگر اس نے تجھے نیوکلیئر فزکس یا جینیٹک انجینئرنگ میں ریسرچ پر دی جانے والی

ڈاکٹریٹ کی سند دکھادی پھر تو کیا کرے گا...... کیا تو جانتا نہیں کہ اسناد خریدی جا سکتی ہیں...... صرف پاکستان کی مارکیٹ سے نہیں...... باہر سے بھی...... تو کیسے چیلنج کرے گا اسے؟ کیسے تصدیق کرائے گا؟''

فاروقی ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میں نے خود اخبار میں دیکھا تھا کہ اسپین اور لاطینی امریکا سے افریقی ممالک تک ان گنت یونیورسٹیاں ہیں جن کا کسی نے نام نہیں سنا اور وہ خود تحقیقی مقالے تیار کر کے آپ کو ڈاکٹریٹ عطا کر دیتی ہیں۔ آپ صرف قیمت ادا کرتے ہیں۔

''بھول جا کہ وہاں کیا ہوتا تھا، آئندہ کیا ہوگا۔ پہلے جگہ تیرے جدامجد نے جس کو دی تھی وہ کون تھا کیا کوالی فکیشن رکھتا تھا کچھ نہیں ملے گا ایسی تحقیق سے۔ تیرا وقت ضائع ہوگا یا تو خود سمجھ لے کہ ریسرچ سینٹر سے نہ تیرا تعلق تھا نہ ہے اور نہ ہو گا۔ تو اپنا کام کر جو تیرے منصوبے ہیں پورے کر...... اکبر خان نے سالانہ دو کروڑ کی رائلٹی ادا کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ اس رقم سے کچھ بنا۔''

''پتا نہیں کیوں...... میرا دل یا میری چھٹی حس مجھے کہتی ہے کہ یہ میں اچھا نہیں کر رہا ہوں...... اور جو اچھا کام نہ ہو اس کا نتیجہ اچھا نہیں نکل سکتا۔''

''یہ سب پرانے وقتوں کے عقائد ہیں۔ آج وہ سب کامیاب ہیں جو برے کام کر رہے ہیں ہمارے اخلاقی یا مذہبی معیار سے۔''

اس کی بات فون کی لائٹ کے جلنے بجھنے سے ادھوری رہ گئی۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ سیکریٹری نے کوئی فون وصول کیا ہے اور لائن اندر دے دی ہے۔ فاروقی نے ایک بٹن دبا کے کہا۔ ''اگر میری بیوی بھی بھاگ جائے تو مجھے مت بتانا۔''

میں نے کہا۔ ''وہ بھاگے گی تو میرے ساتھ...... اور مجھے تو بھگا کے لے آیا ہے یہاں۔''

فاروقی نے کہا۔ ''اکبر خان کے آنے سے پہلے ایک اور بات بتا دوں تجھے...... باقی سب کو جانے دے مت بدھائی...... فریال لے جائے گی...... تجھے کل صبح میرے ساتھ چل کے پیش ہونا ہے ایس پی کے سامنے۔''

میں نے کہا۔ ''صبح یہ خبر آجائے گی کہ اغوا کرنے والوں نے دو کروڑ کا تاوان طلب کیا ہے۔''

''اس سے تیری پوزیشن کلیئر نہیں ہوتی۔ یہ ثابت نہیں ہوتا کہ تو اس میں شامل ہے۔''

سیکریٹری اندر آئی۔ ''سر...... آپ کال لے لیں۔''

فاروقی نے اس کی صورت دیکھی۔ پھر جلتے بجھتے بلب کو دیکھا اور ریسیور اٹھا لیا۔ ''کیا اکبر خان کو کچھ ہو گیا۔'' اس نے زیرلب کہا اور پھر بولا۔ ''ہیلو...... ہاں...... کس کو؟ اچھا...... وہ کیسے؟...... کتنی دیر ہوئی...... ایک بات صاف صاف بتا دو مجھے...... یہ کوئی حرامی پن تو نہیں ہوا؟ دیکھو میں بتا رہا ہوں میں سب کو اندر کرا دوں گا۔ تم مجھے جانتے ہونا...... ہاں میں کھلی دھمکی دے رہا ہوں تمہیں انسپکٹر رحمدل خان آفریدی۔'' اس نے دھڑ سے ریسیور رکھ دیا اور ایک گہری سانس لی۔

میں نے کہا۔ ''کیا ہوا؟''

اس نے میز پر رکھا ہوا پانی کا گلاس ایک سانس میں انڈیلا اور کھڑا ہو گیا۔ ''چل اٹھ...... اکبر خان نہیں آیا تو جائے جہنم میں۔''

''تو اتنا پریشان کیوں ہے۔ کہاں جانا ہے ہمیں؟''

''اسپتال...... صوفی نذیر کو دیکھنے......'' وہ بریف کیس اٹھا کے باہر نکلا اور سیکریٹری کو ہدایات دینے لگا کہ وہ آفس بند کرا کے جائے۔''

میں اس کے پیچھے لپکا۔ ''صوفی چچا کو کیا ہوا ہے؟''

''ہارٹ اٹیک......'' اس نے گاڑی کھولتے ہوئے کہا۔

''ہارٹ اٹیک۔'' میں نے چلا کے کہا۔ ''انہیں تو ایسی کوئی بھی پرابلم نہیں تھی۔''

''یہ اکثر لوگوں کو پتا نہیں ہوتا...... دل کا دورہ پڑنے سے پہلے۔''

میں نے کہا۔ ''یہ بکواس ہے...... جھوٹ ہے پولیس کا...... وہ ایسے ہی مار ڈالتے ہیں کسی کو بھی اور کچھ بھی کہہ دیتے ہیں۔''

فاروقی نے اپنی نظر سامنے رکھی ''اسپتال پہنچ کر دیکھ لیں گے یار...... ڈاکٹروں سے معلوم ہو جائے گا۔''

''ایم ایل او وہی بتاتا ہے جو پولیس چاہتی ہے۔''

''مجھے بچہ یا بے وقوف مت سمجھ ٹیکے پتر۔'' اس نے میرے گھٹنے کو تھپکی دی۔

سرکاری اسپتال میں کچھ بھی مختلف نہیں تھا...... افراتفری...... بدانتظامی...... کسمپرسی...... بے حسی...... وارڈ میں گنجائش سے زیادہ مریض بھرے پڑے تھے۔ ان کے تیماردار دواؤں کے لیے یا ڈاکٹر کی توجہ کے لیے بھاگے پھر رہے تھے۔ برآمدوں میں کھڑے تھے اور باہر کھلے آسمان کے نیچے پڑے تھے۔ ان کی منت سماجت رونا دھونا چیخ پکار سب بے اثر تھے کیونکہ عملے کے لیے یہ روز کا معمول تھا۔

تھوڑی سی خواری کے بعد ہم اس وارڈ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے جہاں پولیس نے صوفی چچا کو داخل کرایا تھا۔ ان کا بیڈ خالی تھا۔ کرسی پر ایک خستہ تن اور خستہ جاں کانسٹیبل رائفل کو دونوں ٹانگوں کے درمیان دبوچے اونگھ رہا تھا۔ وہ تھانے سے ملزم کی نگرانی کے لیے آیا تھا۔ فاروقی کے ہلانے سے وہ ہڑبڑا کے اٹھا۔

''یہ صوفی نذیر کا بیڈ ہے؟'' فاروقی بولا۔

''جی سر...... لیکن ڈاکٹر ان کو لے گئے ہیں...... علاج کے لیے۔'' وہ بولا۔

اس بیڈ پر بھی وہ تفریح کے لیے نہیں لٹائے گئے تھے مگر اس کانسٹیبل کی مراد غالباً آئی سی یو سے تھی۔ ظاہر ہے وہاں اسے ملزم کے ساتھ جانے کی اجازت نہ تھی۔ انتہائی نگہداشت کے شعبے میں جونیئر ڈاکٹر مصروف تھے اور سینئر ہمیں گھاس ڈالنے پر تیار نہ تھے۔ مجبوراً مجھے راجا کا حوالہ دینا پڑا اور یہ جھوٹ بولنا پڑا کہ صوفی نذیر اس کے والد تھے۔

اس سے فرق پڑا...... ہمیں پہلے اندر لے جا کے صوفی چچا کا دیدار کرایا گیا۔ وہ دوسرے مریضوں کی طرح آنکھیں بند کیے ساکت لیٹے تھے اور خواب آور دواؤں کے زیراثر تھے۔ ان کے سرہانے لگے ہوئے مختلف مانیٹر ان کے دل کی حالت کے گراف اور بدلتے اعداد و شمار دکھا رہے تھے۔ انہیں ہم کیا سمجھتے۔ ایک ڈاکٹر نے صرف اتنی وضاحت کی کہ مریض کی کنڈیشن ابھی STABLE نہیں ہے اور اگلے چوبیس گھنٹے گزرنے سے پہلے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

آئی سی یو سے باہر آ کے میں نے ایک نسبتاً خوش اخلاق ڈاکٹر سے پوچھا۔ ''ڈاکٹر صاحب...... انہیں تو ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔''

وہ مسکرایا۔ ''مسئلہ جب پیدا ہوتا ہے تب ہی پتا چلتا ہے ورنہ آدمی چلتا رہے تو کوئی چیک کرانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کرتا۔

میں نے کہا۔ ''پھر بھی...... دل کے دورے کی وجہ۔''

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''ینگ مین...... تم پڑھے لکھے ہو...... پھر ایسے سوال کیوں کرتے ہو...... مریض کی عمر دیکھو...... حالت دیکھو...... کیا کبھی کسی نے ان کا بلڈ پریشر دیکھا...... کولیسٹرول چیک کرایا...... ہم سارے ٹیسٹ کرا رہے ہیں اس کے بعد ہی وجہ معلوم ہوگی مگر وجہ معلوم ہونا اہم نہیں...... اہم ہے علاج۔''

اب فاروقی نے کہا۔ ''پلیز برا مت مانیے گا...... ایک سوال ہے بالکل آف دی ریکارڈ...... یہ پولیس کے تشدد کا نتیجہ تو نہیں؟''

اس کا ردعمل فوری تھا۔ ''بالکل نہیں...... کم سے کم مجھے ایسی کوئی بھی علامت نظر نہیں آئی معائنے کے دوران۔''

ظاہر ہے اس کے بعد شک کی کوئی گنجائش نہ تھی اور ہمارے وہاں رکنے کا جواز بھی نہ رہا تھا۔ میری طرح فاروقی بھی متفکر تھا۔

میں نے کہا۔ ''میں رک جاتا ہوں یہاں...... تو جا۔''

فاروقی نے سر ہلایا۔ ''انکل کو کیا بتاؤں؟''

''کچھ نہیں...... بتانے سے زیادہ خرابی ہوگی۔ وہ یہاں آ جائیں گے کر تو کچھ سکتے نہیں۔''

''وہ تیرے بارے میں پوچھیں گے۔''

''کہہ دینا راجا کے معاملے میں کسی سے بات کرنے گیا ہے۔ دیر سے آئے گا وہ سو جائیں...... فریال کو حقیقت بتا دینا۔ وہ کور کر لے گی...... صبح جیسے بھی ہو ان کو ست بدھائی روانہ کر دینا۔''

''اور بعد میں کچھ ہوا تو؟''

میں نے کہا۔ ''اللہ خیر کرے گا...... ابھی یہی مناسب ہے۔''

فاروقی نے سر ہلایا اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''سب ٹھیک ہو جائے گا ٹیکے پتر...... حوصلہ رکھ اور یہ بھی رکھ۔'' اس نے بریف کیس میں سے کچھ نوٹ نکالے اور زبردستی مجھے تھما دیے۔

میں نے کہا۔ ''یار پانچ ہزار تھے میرے پاس۔''

''ضرورت کا کچھ پتا نہیں ہوتا اور کام پیسے کے بغیر نہیں چلتے۔'' وہ بولا اور رخصت ہو گیا۔

آئی سی یو کے باہر نہ کسی کو ٹھہرنے کی اجازت تھی اور نہ بیٹھنے کی کوئی جگہ تھی۔ میں برآمدے میں دیوار سے ٹیک لگائے بہت سے لوگوں کی صف میں شامل ہو گیا پھر کچھ دیر باہر ٹہلتا رہا۔ میں نے پھیری لگا کے شیشے کے گلاس میں چائے بیچنے والے سے لے کر چائے پی...... میرا ذہن خیالوں کی خانہ جنگی کا شکار تھا۔ ایک طرف یہ خیال تھا کہ صوفی چچا مر گئے تو یہ اباجی کے لیے ایک اور ناقابلِ تلافی نقصان ہوگا۔ کیا وہ اس صدمے کو برداشت کر پائیں گے؟ دوسری طرف کے خیالات بالکل مختلف تھے...... اگر صوفی چچا نہ رہے تو میرے دشمن کیا کریں گے؟ وہ مجھ پر کیسے دباؤ ڈالیں گے کہ یا تو کاسو کو ہمارے حوالے کرو ورنہ سائنس ریسرچ سینٹر اکبر خان کے حوالے کرو۔''

ابھی تک میں نے ایگریمنٹ پر دستخط نہیں کیے تھے۔

اکبر خان وقت پر پہنچ جاتا تو شاید میں اپنے ضمیر کی آواز کو دبا کے یہ کام کر چکا ہوتا میں نے انسپکٹر آفریدی سے بھی دس بارہ لاکھ میں ایک سودا کیا تھا لیکن ابھی تک اسے کچھ دیا نہیں تھا۔ اب وہ اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ صوفی چچا کو سی آئی اے سینٹر لے جانے کی اور ان پر کیس ڈالنے کی دھمکی دے سکے۔

پھر اچانک مجھ پر شرمندگی غالب آنے لگی تھی...... آخر میں ایسے کیوں سوچ رہا ہوں کہ صوفی چچا کی موت میرے لیے باعث نجات ہوگی کیونکہ انہی کے ذریعے مجھ پر دباؤ ڈالا جا رہا تھا اور میں بلیک میل ہونے پر مجبور تھا۔ میرے انکار کے ساتھ ہی صوفی چچا پر نئے مقدمات کے سلسلے کا آغاز ہو جاتا۔ دھوکا دہی...... فراڈ...... پیری مریدی کی آڑ میں بدکاری کا اڈا چلانا...... آبروریزی سے منشیات فروشی تک۔ ان پر نہ جانے کتنے مقدمات بنا دیے جاتے اور تفتیش کے لیے سی آئی اے سینٹر میں ان پر جو انسانیت سوز تشدد ہوتا وہ ابا کو دکھایا جاتا کہ ایسا تمہارے بیٹے کے انکار کی وجہ سے ہو رہا ہے...... اگر بھائی کو بچانا ہے تو بیٹے سے کہو ہماری شرائط تسلیم کر لے...... کاسو کو رانا صاحب کے حوالے کر دے۔ کاسو کیا لگتا ہے اس کا؟ اسے آپ کے اور اپنے چچا کے بارے میں سوچنا چاہیے اور یہ منظور نہیں تو چلو سائنس ریسرچ سینٹر کی دس بارہ ایکڑ زمین اکبر خان کے نام کر دے۔ اس سے تو وہ غریب نہیں ہو جاتا؟

پھر خیال آتا تھا کہ صوفی چچا نہ رہیں تو دشمنوں کے ہاتھ میں ایک مؤثر ہتھیار نہیں رہے گا۔ ان کی موت طبعی ہوگی تو ابا کو صدمہ ضرور ہوگا لیکن یہ دکھ نہیں ہوگا کہ میں نے اپنی انا پر انہیں قربان کر دیا اور ان کی جان میری اصول پرستی نے لی۔ مجھے اپنے اصول اپنے چچا کی زندگی سے زیادہ عزیز ہیں مجھے بالکل پروا نہیں ہونی چاہیے کہ ابا کا ایک ہی چھوٹا بھائی باقی رہ گیا ہے۔ دشمن تو مجھے زیر نہیں کر سکے...... یہ اہم ہے۔

چنانچہ یہ خیال کہ صوفی چچا کا ہارٹ فیل ہونا میرے دشمنوں کے عزائم کی شکست کا سبب بن جائے گا ایک تکلیف دہ احساس ضرور تھا۔ میں ہرگز ان کی موت کا خواہاں نہیں تھا لیکن ان کی زندگی سے جڑی ہوئی شرائط کو قبول کرنا بھی میرے لیے اتنا ہی مشکل تھا۔ میں سوچنے لگتا تھا کہ صوفی چچا بچ گئے تو ان کی زندگی بھی کیا زندگی ہوگی...... احساس جرم نے انہیں پہلے ہی پاگل کر دیا ہے نہ جانے یہ پاگل پن کہاں تک بڑھے گا۔ عمر کے ساتھ ان کے جنون میں شدت آ گئی اور وہ لوگوں کو یا خود کو نقصان پہنچانے لگے تو انہیں پاگل خانے میں بھی زنجیروں سے باندھا جائے گا۔ کیا یہ ابا کے لیے کم دکھ کی بات ہوگی؟ اور اسی دیوانگی میں کسی روز کوئی ان کے ہاتھوں مارا گیا یا وہ خود جان سے گزر گئے تو یہ حادثہ کیا کم المناک ہوگا؟ اس سے تو بہتر ہے کہ وہ ابھی عزت سے مر جائیں تاکہ ان کی مشکل بھی آسان ہو اور دوسروں کی بھی۔

دوبارہ میرا ذہن پٹری بدلتا تھا تو میں سوچنے لگتا تھا کہ یہ میری بے حسی اور خودغرضی ہے...... ابھی اگر میرے ابا چاہتے ہیں کہ بھائی رہا ہو جائے تو ان کے جذبات کا خیال رکھنا میرا فرض ہے۔ اپنے اصولوں کی قربانی دینے سے تکلیف ہوتی ہے تو مجھے اٹھانی چاہیے...... ایک ناخلف بیٹے کی طرح بڑھاپے میں باپ کو تکلیف میں مبتلا نہیں کرنا چاہیے۔

خیالات کی اسی کشمکش میں آدھی رات بیت گئی۔ میں نے دوبارہ آئی سی یو میں جا کے چچا کی خیریت دریافت کی تھی۔ ان کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی...... ان کا بی پی کبھی بہت نیچے چلا جاتا تھا تو کبھی نارمل کے قریب آ جاتا تھا۔ یہی کیفیت نبض کی تھی جو کبھی ڈوبنے لگتی تھی۔ لگتا تھا وہ گزر گئے۔ ای سی جی کی روشن لکیر اوپر نیچے ہوتی بائیں سے دائیں حرکت کر رہی تھی۔ ایک ڈاکٹر نے نوک زباں پر رکا ہوا جواب دیا۔ ابھی ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔

باہر نہ بیٹھنے کی جگہ تھی نہ لیٹنے کی۔ میں نے سوچا کہ اسپتال کی کینٹین تک جا کے کچھ کھا پی لوں مگر ہمت نہ پڑی۔ کینٹین دور تھی اور جو کچھ وہاں ملتا تھا وہ شاید میرا معدہ قبول نہ کرتا...... میں سڑک پر ٹہل رہا تھا اور میرے قریب سے ہارٹ اٹیک کے مریضوں کو لانے والی ایمبولینس گزرتی تھی تو اس کا ہولناک سائرن موت کی پکار لگتا تھا...... میں نے کم سے کم تین کیس دیکھے جن کو طبی امداد کے بغیر واپس کر دیا گیا کیونکہ وہ وہاں لائے جانے سے قبل ہی مر چکے تھے۔ لواحقین کی آہ و بکا الگ میرا دماغ خراب کر رہی تھی۔

اچانک سڑک پر ایک شبیہ یوں نمودار ہوئی جیسے صحرا میں سراب دکھائی دیتا ہے۔ میں نے فریال کو دیکھا۔ وہ اپنی مخصوص دلربائی اور مستانہ چال کے ساتھ آگے بڑھتی آ رہی تھی۔ میں نے آنکھیں مل کے دیکھا کہ کہیں یہ فریب آرزو تو نہیں۔ پھر وہ قریب آ گئی۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ تھی اور ہاتھ میں ایک بیگ...... وہ شلوار قمیص کے ساتھ دوپٹا لہراتی بڑے پروقار انداز میں لوگوں کے پاس سے گزرتی تھی تو اعتراف حسن کی کیفیت دیکھنے والوں کی خود فراموشی میں نظر آتی تھی۔

میرے سامنے آ کے وہ رکی تو کچھ دیر میں بول ہی نہ سکا۔ میں اسے دیکھتا رہا۔ اس نے کہا "ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟"

میں نے کہا۔ "کہیں تم میری آنکھوں کا دھوکا تو نہیں۔ میں خواب تو نہیں دیکھ رہا جاگتے میں۔"

وہ ہنسی۔ "صوفی چچا کیسے ہیں؟"

"ویسے ہی...... مگر تم اس وقت یہاں کیسے؟"

وہ بولی۔ "چلو کہیں بیٹھتے ہیں۔ میں کھانا لائی ہوں تمہارے لیے...... میں نے بھی نہیں کھایا۔"

ہم ایک بنچ کے پیچھے بیٹھ گئے۔ بنچ پر کوئی سو رہا تھا۔ ہم سے چند فٹ کے فاصلے پر دائیں بائیں آگے پیچھے مریضوں کے لواحقین سو رہے تھے یا رو رہے تھے۔ اس نے شاپنگ بیگ میں سے لنچ باکس نکالا۔ پھر ایک تھرماس فلاسک...... شاپنگ بیگ کو بچھا کے اس نے دسترخوان بنا لیا۔ میں پلک جھپکائے بغیر اسے دیکھتا رہا۔

"چلو کھاؤ......" اس نے مجھے حکم دیا۔

میں نے بے وقوفوں کی طرح کہا۔ "تمہیں کیسے خیال آیا کہ مجھے بھوک لگی ہے اور کافی کی ضرورت ہے۔"

"اور بھی ہیں تمہارے چاہنے والے...... لیلیٰ بھابی نے سب پیک کیا اور کہا جاؤ...... ابا اور اماں سو گئے تھے ورنہ مجھے کہاں آنے دیتے...... تمہارا دوست بھی کہہ رہا تھا کہ وہ ایک رات میں مرے گا نہیں...... کھا لے گا کچھ وہیں سے لے کر...... میں نے کہا میں تو جا رہی ہوں۔"

"آئی لو یو فری...... جی چاہتا ہے تمہیں چوم لوں۔"

وہ گھبرائی۔ "ارے ایسا غضب مت کرنا...... یہ اسپتال ہے کوئی پارک نہیں ہے لندن کا۔"

وہ مشکل سے ایک گھنٹا رکی پھر چلی گئی۔ اب میں بہت فریش اور پُراعتماد تھا میں نے اسپتال کی باؤنڈری وال پر لوگوں کو سوتا دیکھا۔ یہ دیوار تین فٹ اونچی اور ایک فٹ چوڑی ہوگی۔ اس پر میں نے ایک خالی جگہ تلاش کی اور ہاتھ سینے پر باندھ کے توازن قائم رکھتے ہوئے سیدھا لیٹ گیا۔ میرے اوپر کھلا آسمان تھا جس میں ستارے دمک رہے تھے اور مجھے بڑی حیرانی سے دیکھ رہے تھے کہ یہ جو شخص دیوار پر فقیروں کے ساتھ لیٹا ہے کیا یہی وہ نواب رفیق احمد شیرازی ہے جس نے ہاورڈ سے ایم بی اے کیا اور پھر لندن میں لارڈ ارنسٹ کی فرم میں رہا...... پھر مجھے عائشہ کا خیال آیا۔

یہ ناقابل یقین سی بات لگتی ہے کہ میں وہاں مردے کی طرح سیدھا لیٹے لیٹے سو گیا مگر مکھیوں نے تنگ کیا اور میں نے آنکھیں کھولیں تو رات کے اندھیرے پر ہلکا ہلکا اجالا غالب آ چکا تھا۔ میری کمر اکڑ گئی تھی چنانچہ دیوار سے اترتے ہوئے میں گرتے گرتے بچا۔

آٹھ بجے فاروقی ایک ہاتھ میں بریف کیس اور دوسرے میں وہی شاپنگ بیگ لیے آیا۔ اس نے بیگ مجھے تھمایا۔ "نوش فرمایئے آپ کی زوجہ نے بریک فاسٹ دے کر بھیجا ہے مجھے...... کافی کے ساتھ۔"

میں نے کہا۔ "تو جل گیا فریال کی محبت دیکھ کر کیا تیری بیوی نے کبھی تیرا اتنا خیال رکھا؟"

وہ میرے پاس کھڑا رہا۔ اس کا بس چلتا تو تو تھ برش کیا باتھ روم بھی بھیج دیتی مگر تو زیادہ خوش مت ہو نیکے پتر...... لڑکیوں کی ساری ناز برداریاں شادی سے پہلے ہی ہوتی ہیں۔ بعد میں تو بھی ہو جائے گا جورو کا غلام...... صبح کھڑا ہوگا میری طرح بیڈ ٹی لے کر کہ بیگم آنکھیں کھولو۔"

میں نے کہا۔ "ہاں...... اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔"

"چل اب باتیں چھوڑ...... ناشتا کر میں دیکھ کے آتا ہوں صوفی چچا کو...... پھر چلتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "ان کی حالت ویسی ہی ہے میں نے ابھی آدھا گھنٹا پہلے دیکھا تھا۔"

وہ مطمئن ہو کے دیوار پر بیٹھ گیا۔ "میری ایک کزن ہے پنجاب کارڈیالوجی سینٹر میں...... آج کسی وقت وہ یہاں آ کے دیکھے گی اور پھر صحیح رپورٹ دے گی۔"

"ابا جی کو شک تو نہیں ہوا۔"

"شک کیسے ہوتا...... میری بیوی نے کہا رات دیر سے آئے تھے رفیق بھائی صبح جلدی چلے گئے۔ فریال دس گیارہ بجے تک سب کو لے جائے گی...... یہ اخبار دیکھ لے...... ٹھیک نو بجے ہمیں ایس پی سے ملنا ہے۔"

میں نے وہ خبر دوسرے صفحے پر دیکھ لی جس کی مجھے تلاش تھی۔ غلام محمد کی رہائی کے لیے سندھ میں ڈاکوؤں کے ایک گروہ نے دو کروڑ مانگے تھے...... شہاب الدین نے ایک پریس کانفرنس میں اس کی تصدیق کر دی تھی جس میں خود ڈی آئی جی صاحب موجود تھے۔ پولیس نے ہالا میں کچے کے علاقے میں موجود ڈاکوؤں کے ایک گروہ پر شک کا اظہار کیا تھا جس کا سرغنہ شامی بادشاہ کہلاتا تھا کچھ عرصہ قبل رینجرز کی کارروائی میں اس کے بہت سے ساتھی مارے گئے تھے تو وہ پنجاب کی طرف فرار ہو گیا تھا۔ شامی بادشاہ غالباً اب بھی وہیں تھا اور اس نے غلام محمد کو اغوا کر کے اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچا دیا تھا۔ پولیس کو یقین تھا کہ غلام محمد کو تاوان ادا کیے بغیر بازیاب کرا لیا جائے گا۔ اس سلسلے میں سندھ کی کچھ بااثر شخصیات سے بھی مدد کی درخواست کی جا رہی ہے۔

اس خبر نے میری پوزیشن کلیئر کر دی تھی۔ شاہی بادشاہ نے یاری کا حق ادا کرتے ہوئے غلام محمد کو ایسا غائب کیا تھا کہ تنظیم کے کرتا دھرتا اپنی ساری بدمعاشی کی طاقت بھول گئے تھے۔ شہاب الدین پولیس پر گرجا برسا تھا اور پیرس سے جاری ہونے والے چیف کے بیان میں اسے دشمنوں کی انتقامی کارروائی قرار دیا گیا تھا جو خود بھی ڈاکو ہی تھے اور ڈاکوؤں کی مدد سے اقتدار میں آئے تھے۔

یہ اندازہ مجھے بھی نہیں تھا کہ شاہی بادشاہ کہاں ہوگا اور اس نے غلام محمد اینڈ کمپنی کو کہاں رکھا ہوگا۔ اس نے میرا کام کر دیا تھا لیکن مجھے اس معاملے سے نمٹنے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ راجا اور ڈاکٹر شہناز کے اغوا پر مختلف صحافتی تنظیموں کے ساتھ این جی اوز نے بہت واویلا مچا رکھا تھا۔ وزیر اطلاعات ڈپلومیسی سے کام لے رہے تھے اور پولیس اِدھر اُدھر چھاپے مار کے اپنی کارکردگی کا ڈراما رچا رہی تھی۔ وہ ایک دو دن میں خود سامنے آ کے سنسنی خیز انکشافات کرنے والا تھا کہ اسے کس نے اٹھایا کب اٹھایا اور کیوں اٹھایا۔ وہ کیسے اور کس کی کوشش سے رہا ہوا...... وغیرہ وغیرہ۔

ایس پی کے آفس میں خصوصی تفتیشی ٹیم کا وہ سب انسپکٹر بھی مجھے نظر آیا جس کو فاروقی کی بیوی نے بجّو کا ہم شکل قرار دیا تھا۔ وہ خاصا مایوس تھا کہ بروقت مجھے گرفتار کرنے کا کریڈٹ نہ لے سکا۔ غلام محمد کے اغوا کا راز افشا ہو جانے کے بعد قدرتی طور پر ایس پی کے آفس میں میرے ساتھ مشکوک افراد جیسا سلوک نہیں ہوا...... پھر فاروقی بھی میرے ساتھ تھا چنانچہ تفتیش کے حوالے سے جو گفتگو ہوئی اس میں شائستگی کا عنصر غالب رہا۔

ایس پی نے کہا۔ ’’نواب صاحب...... یہ تفتیش نہیں ہے آپ سے کچھ انفارمیشن لینا ضروری تھی۔ جو آپ ہی دے سکتے ہیں۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’میں بھی اپنی پوزیشن کلیئر کرنے ہی آیا ہوں۔ آج اخبارات میں شائع ہونے والی ایک خبر نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ غلام محمد اگر لاپتا ہے تو اسے اغوا کرنے والے ڈاکو تھے جو اب اس کی رہائی کے لیے تاوان طلب کر رہے ہیں۔ غالباً دو کروڑ...... لیکن کل تک ایسا لگتا تھا کہ یہ سب میرا کیا دھرا ہے۔‘‘

ایس پی نے کہا۔ ’’آپ کی شکایت بجا ہے لیکن اتفاق سے آپ ہی وہ شخص تھے جو آخری بار اس کے ساتھ دیکھے گئے تھے اس کے بعد وہ لاپتا ہو گیا تھا۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’آپ کے پاس کوئی ثبوت یا گواہ ہے؟‘‘

’’کیوں نہیں...... غلام محمد کی سیکریٹری نے ہی پولیس کو بتایا تھا۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’آپ نے غلط سمجھا...... اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ میں غلام محمد سے ملنے والا آخری آدمی تھا...... یہ تو خود میں نے بتایا تھا کہ ہم فوڈ اسٹریٹ گئے تھے میں کہہ سکتا تھا کہ اس نے مجھے پانچ منٹ بعد لکشمی چوک پر اپنی گاڑی سے اتار دیا تھا اس کی کسی سے ارجنٹ میٹنگ طے تھی...... پھر آپ کیا کرتے...... اسے کیسے تلاش کرتے جس سے اس کی میٹنگ تھی۔‘‘

فاروقی نے تعریفی انداز میں سر ہلایا۔ ’’نواب رفیق احمد شیرازی نے وہی کہا جو حقیقت تھا۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’رات دس سوا دس بجے ہم کھانا کھا کے فارغ ہوئے...... پھر میں اپنے راستے گیا وہ اپنے راستے...... میں تو گیا بیرسٹر فاروقی صاحب کے گھر جہاں میں اپنے والدین کے ساتھ مقیم ہوں۔‘‘

بجّو کی شکل والے انسپکٹر نے فریاد کی۔ ’’لیکن کل مجھے وکیل صاحب کی بیگم نے بے عزت کر کے دروازے سے دوڑا دیا کہ وہ یہاں نہیں ہیں۔‘‘

میں نے سکون سے کہا۔ ’’ہاں...... اس وقت میں موجود نہیں تھا۔ لیکن ایک گھنٹے بعد آ گیا تھا...... تمہارا کیا مطلب ہے میں آپ کے استقبال کے لیے موجود رہتا...... جبکہ آپ کی تشریف آوری کا کوئی اعلان بھی نہیں کیا گیا تھا۔ نہ ٹی وی پر نہ اخبار میں۔‘‘

فاروقی نے عادت کے مطابق ایک قہقہہ لگایا۔ ’’قسمت اچھی ہے تمہاری کہ میری بیوی نے اندر سے کچھ کھینچ کے نہیں مارا...... جیسے وہ غصے میں مجھے مارتی رہتی ہے...... جو چیز ہاتھ میں آئے...... لوٹا...... چمٹا...... چائے دانی۔‘‘

ایس پی مسکرانے لگا۔ ’’آپ دلچسپ آدمی ہیں۔‘‘

میں نے اپنی بات پھر شروع کی۔ ’’آپ کوئی گواہ لائیے کوئی ثبوت پیش کیجیے کہ فوڈ اسٹریٹ میں مجھ سے ملنے کے بعد وہ کسی سے نہیں ملا...... اس کا اغوا کتنے بجے ہوا تھا؟‘‘

’’وقت تو نہیں معلوم......‘‘

’’فوڈ اسٹریٹ میں تو نہیں ہوا تھا نا...... اندازہ یہ ہے کہ وہ اپنے فارم ہاؤس جا رہا تھا کہ اغوا ہو گیا...... رائٹ؟ وہ فارم ہاؤس پہنچ جاتا تو راجا سے ملتا اور انٹرویو بھی دیتا...... مگر ایسا نہیں ہوا...... راجا اور ڈاکٹر شہناز کو واپسی میں اغوا کیا گیا...... اس کا ثبوت یہ ہے کہ وہ جس وقت اغوا ہوئے...... غلام محمد اس سے پہلے ہی اغوا ہوا ہوگا نا۔‘‘

ایس پی نے کہا۔ ’’چلیے اب چھوڑیے...... آپ اس اتفاق کو کیا کہیں گے کہ راجا آپ کا دوست اور پارٹنر ہے...... ست بدھائی میں آپ کے ساتھ ہے۔‘‘

’’اسے ہرگز اتفاق نہیں کہا جا سکتا۔‘‘ میں نے کہا۔

’’میرا مطلب ہے...... آپ غلام محمد سے ملے...... آپ کا دوست گیا اس کا انٹرویو کرنے...... کیا آپ کو اس کے پروگرام کا علم تھا۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’کیا آپ اپنے پیشہ ورانہ فرائض کے پروگرام اپنے عزیز دوستوں کے مشورے سے بناتے ہیں؟‘‘

فاروقی خوش ہوا۔ ’’بھئی ایس پی صاحب...... اپنے نواب صاحب بھی پورے وکیل ہیں۔‘‘

ایس پی نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔ ’’کیا یہ عجیب بات نہیں ہے کہ آپ کے دوست نامور صحافی راجا اور ان کی منگیتر ڈاکٹر شہناز کا اغوا اسی جگہ سے ہوا...... جہاں سے غلام محمد کا......‘‘

فاروقی نے کہا۔ ’’کیا یہ ثابت ہو گیا ہے؟‘‘

ایس پی لاجواب ہو گیا۔ ’’یہ ہمارا اندازہ ہے۔‘‘

’’یعنی ایک مفروضہ...... صحیح بات تو بازیابی کے بعد خود اغوا ہونے والے ہی بتا سکتے ہیں۔‘‘ میں نے کہا۔

ایس پی اب برہمی کا شکار تھا۔ ’’وہ ایک ہی تاریخ اور وقت کے علاوہ ایک ہی جگہ سے اغوا کیے گئے۔ اغوا کرنے والے جانتے تھے کہ وہ کہاں ملیں گے۔ غلام محمد کے لیے تو تاوان مانگ لیا گیا ہے راجا اور ڈاکٹر شہناز کے اغوا کا کیا مقصد ہو سکتا ہے؟‘‘

’’یہ میں کیسے بتا سکتا ہوں...... میں نے انہیں اغوا نہیں کیا۔‘‘

’’آپ کو سیریس ہو جانا چاہیے نواب صاحب......‘‘ ایس پی بگڑ گیا۔

میں نے کہا۔ ’’آپ کے سوالات انتہائی نان سیریس ہیں...... آپ نے کیوں فرض کر لیا ہے کہ راجا اور شہناز کو اغوا کرنے والے وہی ہیں جنہوں نے غلام محمد کو اغوا کیا۔‘‘

’’آپ بتا دیں یہ کس کا کام ہو سکتا ہے؟‘‘

میں نے کہا۔ ’’عام طور پر صحافیوں کے اغوا میں ایجنسیاں ملوث ہوتی ہیں۔ راجا کی ذاتی دشمنی کسی سے نہیں تھی۔ شہناز تو محض اس کے ساتھ تھی اس لیے ساتھ ہی گئی...... اور ساتھ ہی واپس بھی آ جائے گی۔‘‘

’’غلام محمد کے لیے تاوان کا مطالبہ سندھ کے ڈاکوؤں نے کیا ہے؟‘‘

میں نے ایس پی کی بات کاٹ دی۔ ’’یہ ایک اور غور طلب نکتہ ہے۔ بندہ اغوا ہوا لاہور کے مضافات سے...... پہنچ گیا سندھ کے اندر۔‘‘

فاروقی بولا۔ ’’یار مال کہیں بھی پڑا ہو...... سودا کوئی بھی کر سکتا ہے۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’اس پہلو پر بھی غور کرنا چاہیے کہ کہیں غلام محمد اسی علاقے میں تو موجود نہیں تھا۔ وہ وہاں کیوں گیا کیسے گیا؟‘‘

ایس پی نے دونوں ہاتھ میز پر مارے۔ ’’اٹ از ٹو مچ جنٹلمین۔ ایسا لگتا ہے کہ آپ لوگ مجھے تفتیش سکھا رہے ہیں۔ فی الحال آپ جا سکتے ہیں لیکن مسٹر رفیق شیرازی...... میں آپ کو اس کیس میں شامل تفتیش کر رہا ہوں...... یہ کیس ختم ہونے تک آپ شہر چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔‘‘

فاروقی نے احتجاج کیا۔ ’’آپ یہ حکم نہیں دے سکتے۔‘‘

’’میں جسے چاہوں تفتیش کے لیے روک سکتا ہوں...... شبہے کی بنیاد پر پولیس کی تحویل میں دے سکتا ہوں۔‘‘

’’غیر قانونی طور پر آپ مجھے بھی حراست میں لے سکتے ہیں ایس پی صاحب لیکن حبسِ بے جا کی غیر قانونی حیثیت کو چیلنج کرنا میرا حق ہے۔‘‘ فاروقی بولا۔

ایس پی کچھ نرم پڑ گیا۔ ’’یہ گرفتاری نہیں ہے۔‘‘

’’نقل و حرکت کو محدود کرنے کا حکم نامہ بھی تحریری ہونا چاہیے۔ میرا موکل زبانی احکامات کو ماننے کا پابند نہیں۔‘‘

’’تحریری احکامات بھی دیے جا سکتے ہیں وکیل صاحب۔‘‘

’’عدالت انہیں آج ہی ختم کر دے گی...... یہ میرا چیلنج ہے۔‘‘ فاروقی بولا۔

ایس پی مسکرانے لگا۔ ’’دیکھیے...... قانون سے تعاون کرنا چاہیے آپ کو...... ایک ذمے دار شہری کی حیثیت سے۔‘‘

’’پولیس جو چاہے کرے کسی قانونی اختیار کے بغیر...... کل پولیس نے میرے گھر پر چھاپا مارا تھا۔ ان کے پاس نہ گرفتاری کا وارنٹ تھا اور نہ خانہ تلاشی کا۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’اور یہ شخص وکیل صاحب کی بیوی سے بدتمیزی کرتا رہا۔‘‘ میں نے بجّو کی شکل والے کی طرف اشارہ کیا۔

وہ ایسے اُچھلا جیسے میں نے اسے گالی دے دی ہو۔ ’’آپ یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ میں تھا...... جبکہ آپ موجود ہی نہیں تھے۔‘‘

''میری بیوی نے اس کا حلیہ بتادیا تھا۔'' فاروقی بولا۔
میں نے کہا۔ ''بعد میں ایک تصویری خاکہ بھی جاری کر دیا تھا۔''

فاروقی بولا۔ ''وہ بہت اچھی آرٹسٹ ہے۔''

ایس پی آفس کے باہر مجھے انسپکٹر رحمدل جان آفریدی اپنا منتظر ملا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ اپنی صفائی پیش کرے گا اور پھر مجھے میرے وعدے یاد دلائے گا جو میں نے اس کی بیوی کی پسند کی نئی بلیک کرولا کی خریداری کو ممکن بنانے کے لیے کیے تھے۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا۔ میں نے کہا۔ ''انسپکٹر آفریدی...... یہ تم نے اچھا نہیں کیا صوفی چچا کے ساتھ۔''

اس نے فوراً تردید کی۔ ''نواب صاحب...... اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں۔''

''وہ زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہیں...... یہ دل کا دورہ ان پر ہونے والے ذہنی اور جسمانی تشدد کا نتیجہ ہے۔''

''تھانے میں ان کے ساتھ مہمانوں جیسا سلوک کیا گیا تھا۔''

''ڈاکٹرز کی رائے کچھ اور ہے...... ابھی تو خیر وہ آئی سی یو میں ہیں مگر خدانخواستہ انہیں کچھ ہو گیا تو ذمے دار تم ہو گے۔ تم نے دھمکی دی تھی کہ ان پر کیس بنا دیے جائیں گے تم نے انہیں سی آئی اے سینٹر بھیجا تھا۔ مہمانوں کے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہو تم۔''

فاروقی نے کہا۔ ''یہ بڑی زیادتی ہے...... ایک شخص جس کا ذہنی توازن بھی درست نہیں تم نے دو ہفتے کا جسمانی ریمانڈ کیوں لیا تھا...... اعترافِ جرم تو وہ پہلے ہی کر چکا تھا؟''

''تم نے مجھے بھی غلام محمد کے اغوا میں شریک مجرم بنانے کی پوری کوشش کی تھی۔ آج کا اخبار دیکھا ہے تم نے...... تم نے تو مجھے بتایا تھا کہ میرے گھر کے ملبے سے جس شخص کی جلی ہوئی لاش ملی ہے وہ غلام محمد ہے۔''

آفریدی سمجھ گیا کہ اب اس کے ہاتھ میں کچھ نہیں رہا۔ نئے ماڈل کی بلیک کرولا کے سلسلے میں مجھے ادھار کی رعایت دینا اس کی غلطی تھی یہ ادھار ڈوب گیا تھا تاہم وہ ہمت ہارنے والا شخص نہیں تھا۔ اس نے کہا۔ ''صوفی نذیر کی حالت سنبھلتے ہی ہم اسے پولیس کے اسپتال میں شفٹ کر دیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''ابھی تو وہ آئی سی یو میں ہیں اگر انہیں کچھ ہوا تو میں ذمے داروں کے خلاف قتلِ عمد کا کیس درج کراؤں گا خواہ اس کے لیے مجھے ہائی کورٹ سے حکمنامہ حاصل کرنا پڑے۔ میں جانتا ہوں کہ وہ کبھی ہارٹ پیشنٹ نہیں تھے۔''

اس کا موڈ سخت خراب ہو گیا۔ ''یہاں میں صرف یہ بتانے آیا تھا کہ اکبر خان کسی مصروفیت کی وجہ سے کل نہیں آسکا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''انسپکٹر آفریدی...... تم اس معاملے سے دور رہو تو اچھا ہے...... کیا تعلق ہے تمہارا اکبر خان سے...... کیوں تم اس کیس میں اتنا انٹرسٹ لے رہے ہو کہ صرف یہ پیغام دینے آئے۔ کیا وہ خود فون پر نہیں بتا سکتا تھا...... خیر اب تم آئے ہو تو میرا جواب بھی سن لو...... اس سے کہنا کہ صوفی چچا کی صحت یابی تک کچھ نہیں ہو سکتا۔''

''اس سے کہنا کہ ایگریمنٹ فی الحال مؤخر کر دیا گیا ہے۔'' فاروقی نے کہا۔

ہم انسپکٹر آفریدی کو مایوس اور مشتعل چھوڑ کر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ہمارا رویہ اس کے لیے غیر متوقع نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ شریفانہ معاہدے ہوتے ہیں جن میں زبان کا پاس رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ اکبر خان کے ساتھ ایگریمنٹ بلیک میلنگ کا نتیجہ تھا۔ جب وہ حالات ہی نہ رہیں جس میں کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے تو پھر کہاں کا وعدہ کیسا وعدہ...... وعدہ کرنے والوں کا حافظہ ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔ وہ وعدہ یا وعدے کرنے والے کو پہچانتے تک نہیں۔

فاروقی مجھے اسپتال میں چھوڑ کر کورٹ چلا گیا۔ میں نے آئی سی یو کے ایک جونیئر ڈاکٹر سے دوستی گانٹھی۔ وہ خوش مزاج اور بے تکلف نوجوان تھا جو آئی سی یو کے انتہائی سنجیدہ بلکہ ہیبت ناک ماحول میں بھی اپنا کام ہنستے کھیلتے کرتا تھا۔ اگر وہ غیر ذمے دار ہوتا تو اس کی ڈیوٹی آئی سی یو میں کیوں ہوتی بس دوسرے سینئر ڈاکٹروں کی طرح اس کا چہرہ لٹکا ہوا یا اپنے ہم عمر ڈاکٹروں کی طرح بیزاری کا نمونہ نہیں لگتا تھا۔

اس نے مجھے قواعد و ضوابط کی خلاف ورزی کرتے ہوئے صوفی چچا کی حالت کے بارے میں تفصیلی رپورٹ دی۔ ہوا یوں کہ مجھے واش روم جانے کی ضرورت محسوس ہوئی اور کسی نے مجھے عملے میں شامل سمجھتے ہوئے ڈاکٹروں کے لیے مخصوص واش روم میں بھیج دیا۔ دروازہ کھول کے اندر داخل ہوتے ہی جو سین میں نے دیکھا وہ قطعی غیر متوقع تھا۔ ایک ڈاکٹر اور ایک نرس انگلش فلم کے اسٹائل میں یک جان دو قالب ہوئے لب سے لب پیوست کیے کھڑے تھے۔

نرس تو چیخ مار کے الگ ہوئی اور ڈاکٹر پر خفا ہوتی نکل گئی کہ اس نے گیٹ کو اندر سے لاک کیوں نہیں کیا تھا...... ڈاکٹر ہنس پڑا اور ہونٹ صاف کرتے ہوئے بولا۔ ''یہ لڑکیاں بھی خوب ہوتی ہیں خود آئی تھی میرے پیچھے پیچھے......''

میں نے کہا۔ ''آئی ایم سوری...... میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔''

اس نے باہر جھانکا۔ ''تمہارے پیچھے کوئی نہیں؟ کمال ہے۔''

میں نے کہا۔ ''میں یہاں اسی کام کے لیے آیا تھا جس کے لیے یہ جگہ مخصوص ہے۔''

وہ ہنس پڑا۔ ''چلو پھر باجماعت کر لیتے ہیں...... تم کیا نئے ہو...... میں نے پہلے تمہیں نہیں دیکھا۔''

میں نے کہا۔ ''میں ڈاکٹر نہیں ہوں۔''

وہ مسکرانے لگا۔ ''لگتے ضرور ہو...... اسی لیے کسی نے تمہیں روکا نہیں۔''

میں نے موقع سے فائدہ اٹھایا...... ''ڈاکٹر...... کیا میں آپ سے بیڈ نمبر سیون کے بارے میں معلوم کر سکتا ہوں۔''

وہ چونکا۔ ''وہ...... جسے پولیس لائی تھی؟''

میں نے کہا۔ ''یس...... وہ میرے انکل ہیں۔''

''کیا یہ درست ہے کہ اس نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا تھا؟''

میں نے کہا۔ ''یہ درست ہے۔''

''اور قتل کرنے کے بعد وہ پاگل بن گیا؟''

میں نے کہا۔ ''یہ درست نہیں ہے۔''

اس نے کہا۔ ''جھوٹ سچ سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں لیکن اچھا ہوا تم سے ملاقات ہو گئی۔ اتفاقیہ سہی...... ورنہ میں خود تم سے بات کرتا...... میرے ساتھ آؤ۔''

میں اس کے پیچھے چل پڑا۔ وہ مجھے ایک کمرے میں لے گیا جہاں دیوار کے ساتھ ساتھ صوفے لگے ہوئے تھے۔ صوفے میلے اور پرانے تھے۔ کمرے میں صفائی کی مجموعی حالت کی خرابی دیکھ کر افسوس ہوتا تھا۔ دو ڈاکٹر وہاں پہلے ہی موجود تھے اور مگ میں کچھ پی رہے تھے۔

''تم کیا لو گے؟'' اس نے کہا۔ ''یہاں سیلف سروس ہے...... میں اپنے لیے کافی بناؤں گا...... بلیک مگر چینی کے ساتھ۔''

میں نے کہا۔ ''پھر ایک کی جگہ دو مگ بنالیں...... کیا میں آپ کی مدد کروں۔''

اس نے مجھے اشارہ کیا۔ ''تم بیٹھو۔''

ایک کونے میں لگی ہوئی ٹیبل پر چائے کافی کے لوازمات موجود تھے۔ ٹی بیگ...... مگس اور الیکٹرک واٹر ہیٹر...... اس نے ٹونٹی کھول کے مگ میں ابلتا پانی ڈالا اور میرے ساتھ آ بیٹھا۔

اس نے ایک مگ میرے سامنے رکھا۔ ''کل رات دس بجے آیا تھا میں...... ڈبل ڈیوٹی دے رہا ہوں...... میرا ریلیور نہیں آیا......''

''آپ کیا بات کرنا چاہتے تھے مجھ سے؟''

''کل رات بیڈ نمبر سیون کی حالت سنبھل گئی تھی...... بارہ بجے کے بعد وہ ہوش میں تھا......'' اس نے مگ سے ایک گھونٹ لیا۔ ''میں نے کہا چچا کیا حال ہے...... آئی ڈونٹ نو وہ کیوں رونے لگا...... یہاں مریض ایسے ہی بی ہیو کرتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ آخری وقت آ گیا...... رات ہی ایک مریض کو موت کا فرشتہ بیڈ سائٹ پر نظر آ رہا تھا جبکہ وہاں کوئی نہیں تھا۔ تمہارے انکل نے بھی یہی کیا۔ میں نے اس کا حوصلہ بڑھایا کہ ایسی کوئی بات نہیں...... صبح ہم آپ کو جنرل وارڈ میں شفٹ کر دیں گے دو دن میں آپ گھر چلے جائیں گے۔''

''آپ ایسی باتیں سب سے کہتے ہیں۔''

''آف کورس...... یہ ضروری ہوتا ہے تمہارے انکل نے پوچھا کہ یہاں کون ہے...... میرا بھائی یا میرا بھتیجا...... میں نے کہا کہ نام بتاؤ...... میں معلوم کراتا ہوں...... باہر برآمدے میں بہت سے لوگ ہیں...... یہاں ایک عجیب خلوص اور ہمدردی کا مظاہرہ دیکھنے میں آتا ہے...... لوگ ایک دوسرے کے لیے کچھ کرنے کو تیار رہتے ہیں سب کے جذبات ایک جیسے ہوتے ہیں...... میں نے ایک نوجوان سے کہا کہ ذرا معلوم کرو...... کیا نام ہے تمہارا...... رفیق......''

میں نے کہا۔ ''رائٹ۔''

''وہ نوجوان برآمدے میں آواز لگانے لگا۔ اور لوگ باہر جا کر پکارتے رہے۔''

''میں یہاں نہیں تھا۔'' میں نے شرمندگی سے کہا۔

''میں نے بیڈ سیون سے پوچھا کہ کیا بات ہے...... اس نے مجھے ایک فون نمبر دیا کہ میرے بھائی سے کہو...... آ جائے...... ابھی اور اسی وقت...... وہ عمر میں مجھ سے زیادہ ہے...... اس نے رفیق کو چھوڑا ہوگا یہاں...... وہ شاید چلا گیا ہوگا کسی کام سے...... خیر میں نے وارڈ سے فون ملایا مگر وہاں گھنٹی بجتی رہی۔''

میں نے چشمِ تصور سے دیکھا۔ جلے ہوئے گھر کے کسی کونے میں فون رکھا ہوا ہے جو جلنے سے بچ گیا ہوگا۔ باہر سے آنے والے تار پر بھی آگ کا اثر نہیں ہوا ہوگا۔ گھنٹی تاریکی اور ویرانی میں گونجتی رہی ہوگی۔ اس ایس او ایس کی طرح جو فضا اور خلا کی لاتعداد آوازوں میں سے گزرے مگر کسی کے کانوں تک نہ پہنچے...... کہیں کسی کو سنائی نہ دے...... صدا بہ صحرا......

ڈاکٹر کی آواز مجھے پھر حقائق کی دنیا میں لے آئی۔ ''میں نے اسے بتا دیا کہ فون کوئی ریسیو نہیں کر رہا ہے شاید گھر میں کوئی ہے نہیں...... وہ بہت پُر یقین تھا کہ گھر والے کہیں نہیں جا سکتے...... رفیق ضرور یہاں ہوگا...... ممکن ہے چائے پینے کے لیے چلا گیا ہو یا باتھ روم...... ذرا ایک مرتبہ اور معلوم کر لیں۔ اس نے اتنی لجاجت سے کہا تھا کہ میں نے پھر ایک شخص سے کہا۔

میں نے کہا۔ ''یہی میری نالائقی ہے...... میں کمپاؤنڈ وال پر لیٹ کے سو گیا تھا۔ ورنہ آواز ضرور سن لیتا۔''

''عجیب بات یہ ہے کہ پولیس نے اسے پاگل قرار دیا تھا لیکن وہ انتہائی معقول تھا۔ اس کا رویہ ایک پرسنٹ بھی ابنارمل نہیں تھا وہ میری منت سماجت کرتا رہا کہ ایک مرتبہ اور فون کرو میرے گھر...... میرا بھائی آجائے...... مجھے اس سے کچھ کہنا تھا میں نے اسے اپنا موبائل فون دے دیا کہ بابا میں بہت مصروف ہوں...... تم نمبر ملاتے رہو...... وہ بھی کوشش کرتا رہا۔''

میں نے کہا۔ ''میرے والدین گھر پر نہیں تھے...... اب آپ کو کیا بتاؤں میری چچی نے میری دادی کو زہر دیا...... چچا نے بیوی کو مار ڈالا۔ وہ واقعی پاگل ہو گئے تھے۔ میرے والد کے لیے اس گھر میں رہنا مشکل ہو گیا تھا۔ انہیں میں نے اپنے دوست کے گھر شفٹ کر دیا تھا اور یہ بھی خدا نے اچھا کیا کہ بعد میں وہ گھر جل گیا...... شارٹ سرکٹ ہونے سے...... اب وہاں راکھ اور ملبہ ہے۔''

''اوہ...... دیٹ از رئیلی سیڈ...... رات کے دو بجے تمہارے انکل نے مجھے بلایا اور کہا کہ میرا ایک کام کر دو گے...... جب میرا بھائی آئے یا رفیق آئے تو ان سے ہاتھ جوڑ کے معافی مانگ لینا میری طرف سے۔''

مجھے اس بات نے شدید دکھ دیا۔ ''پھر آپ نے کیا کہا؟''

''وہی...... جو مجھے کہنا چاہیے تھا کہ بابا وہ آجائیں گے تو تم خود کہہ دینا جو کہنا ہو...... صبح وہ ضرور آئیں گے وہ کیوں تم سے معافی مانگنا چاہتے تھے آخر؟''

''میرا خیال ہے...... احساس جرم دگناہ ہر شخص کو ہوتا ہے۔ ایسی جگہ اور اس حالت میں۔''

''میں نے دیکھا...... وہ صبح تک فون ملاتا رہا۔ درمیان میں میری کال آئی تو میں نے بات کی...... مگر نہ جانے کیوں میں نے پھر فون اسے دے دیا۔ اسی کے پاس رہنے دیا۔ صبح تک وہ بالکل نارمل لیکن بہت اپ سیٹ تھا کال نہ ملنے اور کسی کے نہ آنے پر...... تاہم یہ کوئی اچھی علامت نہیں تھی...... ہم اس کی کنڈیشن مانیٹر کر رہے تھے اس کی حالت خراب ہوتی جا رہی تھی۔''

''اب وہ کیسے ہیں؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نو ہوپ...... لیکن وہ زندہ ہیں...... تمہارے والد کہاں ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''وہ تو...... بہت دور ہیں۔''

''میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ انہیں لے آؤ...... ایسا لگتا ہے کہ مریض محض اپنی قوت ارادی سے زندگی کی جنگ لڑ رہا ہے...... بھائی کے آنے تک زندہ رہنے کے لیے۔''

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں والد کو صدمے سے بچانا چاہتا تھا۔ انہیں تو علم ہی نہیں کہ بھائی یہاں ہے...... وہ سمجھ رہے ہیں حوالات میں ہوگا۔''

''بہتر ہے انہیں ذہنی طور پر صدمے کے لیے تیار کر دو...... ٹھیک ہے اب میرے بریک کا وقت ختم ہوا...... ڈو یو وانٹ ٹو سی ہم۔''

میں نے اقرار میں سر ہلایا تو وہ مجھے اپنے ساتھ آئی سی یو لے گیا چچا بے حس و حرکت پڑے تھے میں نے مانیٹرز کو دیکھا ای سی جی کو سمجھنا میرے لیے مشکل تھا مگر میں بلڈ پریشر اور نبض کی حالت دیکھ سکتا تھا۔ چچا واقعی موت سے لڑ رہے تھے۔

باہر جانے سے پہلے میں نے پوچھا۔ ''ڈاکٹر...... جانے سے پہلے ایک بات پوچھوں...... شاید آپ کو عجیب لگے۔''

''ایسی کیا بات ہے۔''

میں نے کہا۔ ''میں تفصیل میں نہیں جا سکتا۔ کیا ایسی کوئی علامت ہے کہ ان پر جسمانی تشدد کیا گیا ہو۔''

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''یہ شک کیوں ہے تمہیں؟''

''پولیس کا رویہ کچھ ایسا تھا۔ میں وضاحت کرنے سے قاصر ہوں۔''

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا پھر مجھے اشارہ کیا کہ میں باہر ملوں۔ میں برآمدے میں بے چینی سے ٹہلتا رہا۔ وہ تقریباً دس منٹ بعد نمودار ہوا اور مجھے اپنے ساتھ ایک کمرے میں لے گیا۔ معلوم نہیں کیوں مجھے احساس ہوا کہ ڈاکٹر راز داری سے کوئی بات کہنا چاہتا ہے۔

میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ اس کمرے میں جو درحقیقت اسٹور کے طور پر استعمال ہو رہا تھا ناکارہ فرنیچر، مشینری اور دواؤں کے کارٹن بھرے پڑے تھے۔ ''مسٹر رفیق...... ایک بات میں نے سنی تھی ہمارے سینئر کارڈیالوجسٹ نے مجھ سے نہیں کہی تھی...... دوسرے سینئر سے کہی تھی لیکن جب میں نے

پوچھا تو انہوں نے مجھے جھاڑ دیا کہ بے وقوفی کی باتیں مت کرو میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔''

''وہ کیا بات تھی؟'' میں نے کہا۔

''پہلے تم مجھے بتاؤ...... تمہاری فیملی ہسٹری ہے...... ہارٹ پرابلم کی؟''

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''میرے سارے بزرگ طویل عمر پا کے مرے...... سوائے چند ایک کے جن کی موت حادثاتی تھی۔''

''بلڈ پریشر...... شوگر...... کچھ نہیں؟''

میں نے کہا۔ ''کسی کو نہیں...... چچا بھی بالکل فٹ تھے۔ میری دادی نوے سال سے زیادہ کی تھیں۔ سو کے قریب۔''

وہ سوچتا رہا۔ ''یہی کنفیوژ کرنے والی بات ہے۔ ان کے سارے ٹیسٹ نارمل آئے۔ LIPID پروفائل میں کچھ نہیں تھا۔ میرے پروفیسر نے ایک شک ظاہر کیا تھا کہ اس میں فاؤل پلے ہے۔''

''کیا مطلب؟ انہیں کچھ دیا گیا۔ جس سے ہارٹ اٹیک ہوا۔ کوئی دوا یا زہر۔ آپ کیا سمجھتے ہیں؟'' میں نے صدمے سے سنبھل کے کہا۔

''بدقسمتی سے میری ٹریننگ نہیں ہے اس فیلڈ میں...... بہت سی ایسی دوائیں ہیں جن کے ری ایکشن ہو سکتے ہیں سائیڈ ایفیکٹ ہیں۔ زہر بھی ہیں جن سے بالکل ہارٹ اٹیک جیسی علامات پیدا ہوتی ہیں لیکن ان کا مجھے پورا علم نہیں تو عام آدمی کیا جانے۔''

''لیکن ایک میڈیکل اسپیشلسٹ جانتا ہے...... میں اس پروفیسر سے بات کروں؟''

''آر یو میڈ...... میں نے اس لیے بتایا ہے تمہیں؟'' وہ خفگی سے بولا۔ ''میں صاف انکار کر دوں گا...... پروفیسر میرا کیریئر تباہ کر دے گا۔''

''پھر آپ ہی بتائیں میں کیا کروں؟''

وہ باہر نکلتے نکلتے بولا۔ ''لیک اے چانس...... پوسٹ مارٹم میں معلوم ہو سکتا ہے...... اگر کوشش کی جائے۔''

میں بڑے عذاب میں مبتلا ہو گیا۔ ادھر چچا نزع کے عالم میں تھے۔ ابا جی کو میں نے جھوٹ بول کے ست بدھائی روانہ کر دیا تھا۔ اب پیچھے پیچھے میں جاؤں اور انہیں بتاؤں کہ آپ کے بھائی آپ کو یاد کر رہے ہیں۔ ان کا آخری وقت آ گیا ہے۔ کیا پتا اتنی دیر میں آخری وقت آ چکا ہو۔ ابا جی سے کچھ چھپانا بھی ناممکن ہے۔ انہیں بتانا بھی خطرے سے خالی نہیں۔ میرے جھوٹ کا پتا چلا تو وہ مجھے کبھی معاف نہیں کریں گے۔ اس پر مستزاد میں کہوں کہ غالباً ان کو مارا گیا ہے۔ وہ پوچھیں گے کس نے مارا؟ کیوں مارا؟ پولیس کے خلاف مقدمہ کر دو...... پولیس صاف انکار کرے گی...... ہم کیسے مار سکتے ہیں۔

اچانک تیس پینتیس سال کی ایک اسمارٹ سی عورت نمودار ہوئی۔ اس نے غور سے مجھے دیکھا۔ ''آر یو رفیق؟''

میں نے کہا۔ ''یس...... لیکن میں نے پہچانا نہیں آپ کو۔''

''میں فاروقی کی کزن ہوں...... غزالہ...... پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیالوجی سے آئی ہوں۔'' اس نے مجھ سے مصافحہ کیا۔ ''میں تمہارے انکل کو دیکھ آؤں؟''

میں نے اسے روک لیا۔ ''کوئی فائدہ نہیں اب...... لیکن میں چاہتا ہوں کہ انہیں شفٹ کر دیا جائے...... آپ کے ادارے میں۔''

''جب فائدہ کوئی نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''میں چاہتا ہوں پوسٹ مارٹم آپ کریں۔''

وہ چونک کے پیچھے ہٹی...... ''از ہی ڈیڈ؟''

میں نے کہا۔ ''نہیں...... اگر وہ یہاں مر گئے تو پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بھی یہی ڈاکٹر بنائیں گے...... مجھے شک ہے وہ ٹھیک نہیں ہو گی...... غلط دی جائے گی۔''

اس نے سر پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ ''معلوم نہیں تم کیا کہہ رہے ہو؟''

میں نے کم سے کم الفاظ میں اسے ساری بات سمجھا دی۔ ڈاکٹر سے اپنی گفتگو اور اس کے خدشات کے بارے میں بھی بتا دیا۔ ''یہ پولیس کیس ہے وہ شفٹ نہیں ہونے دیں گے۔''

معلوم نہیں وہ کس کشمکش و پیچ میں تھی مگر اچانک اس نے فیصلہ کر لیا۔ ''میرا میاں ایس پی ہے...... میں کر لوں گی...... مگر۔''

میں نے کہا۔ ''آپ ڈرتی ہیں کہ وہ راستے میں ہی نہ مر جائیں۔ شفٹ کرنے کے باعث...... میں یہ رسک لوں گا...... اپنی ذمے داری پر۔''

''اوکے...... مگر ایک بات بتاؤں...... پوسٹ مارٹم میں خود نہیں کروں گی لیکن کرا دوں گی۔ اس میں جو ہوگا سامنے آ جائے گا۔''

اِدھر وہ اندر گئی اُدھر میں باہر بھاگا۔ اپنی گاڑی نکالنے کے بعد میں نے کچھ نہیں دیکھا نہ ٹریفک کے اصولوں کو نہ سگنل کو...... میرے دماغ پر ایک ہی دھن سوار تھی کسی طرح ابا جی کو لے آؤں اور بھائی سے ملوا دوں...... کوشش کرنے سے ہی

میرے جرم کی تلافی ہوگی۔ آگے جو اللہ کو منظور۔ صوفی چچا اپنی جدوجہد جاری رکھتے ہیں یا نہیں...... ابا جی کا انتظار کرتے ہیں یا مایوس ہو کے رخصت ہو جاتے ہیں۔

ایک جگہ راستہ بہت بڑے ٹریلر نے روک رکھا تھا۔ اس کی وجہ سے ساری ٹریفک رکی ہوئی تھی۔ اچانک میں نے ایک ہاکر لڑکے کو دیکھا وہ اخبار لہرا کے اور چلا کے اعلان کر رہا تھا۔ مل گئے...... مل گئے...... راجا اور رانی مل گئے۔ ڈاکٹر شہباز کو بازیاب کرا لیا گیا...... میں نے اسے آواز دی مگر وہ شور مچاتا دور نکل گیا۔ وہ کسی اخبار کا ضمیمہ یا کوئی ایوننگ پیپر بیچ رہا تھا۔

اس ٹریفک جام سے نکلنے تک مجھے دوسرا ہاکر دکھائی نہیں دیا۔ پھر شاہدرہ میں مجھے ایک ہاکر ملا۔ میں نے اپنے مطلب کی خبر دیکھی...... مشہور صحافی راجا اور ان کی منگیتر ڈاکٹر شہباز ڈاکوؤں کے قبضے سے رہا ہو کے پریس کلب پہنچ گئے۔ میں نے گاڑی چلاتے ہوئے ذیلی سرخی دیکھی لیکن اتنی معمولی غفلت ایک بہت بڑے حادثے کا سبب بنتے بنتے رہ گئی۔ بائیں جانب کی اسٹریٹ سے ایک موٹر سائیکل تیزی سے نکلی جس پر تین بے فکرے نوجوان سوار تھے۔ ان کے خیال میں گلی سے سڑک پر آتے ہوئے رفتار کم کرنا یا رکنا قطعی غیر ضروری تھا کیونکہ ان کی آمد کے لیے سڑک پر ٹریفک تو پہلے ہی روک دی گئی تھی۔

میں نے انہیں بچانے کی کوشش میں گاڑی کے اسٹیئرنگ کو پورا گھما دیا اور میری گاڑی کرب اسٹون کو توڑتی ہوئی درمیانی آئی لینڈ پر چڑھ گئی۔ ان نوجوانوں کو کچھ اندازہ نہیں ہوا کہ ان کی جان کیسے بچی۔ وہ درمیانی کٹ سے گزر کے مخالف سمت کی ٹریفک میں گم ہو چکے تھے۔

اس حادثے نے میری گاڑی کے فرنٹ سسپنشن کو بالکل تباہ کر دیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ گاڑی الٹی نہیں ورنہ معلوم نہیں میرا کیا ہوتا...... اگر میں بچ جاتا تب بھی کسی اسپتال ضرور پہنچتا۔ لوگ جمع ہو کے ان نوجوانوں کو برا بھلا کہتے رہے۔ میں انہیں کیا بتاتا کہ بے وقوفی میری بھی تھی کہ ذہنی طور پر پریشان ہونے کے ساتھ میں نے اخبار دیکھنے کی کوشش بھی کی تھی اور چند ثانیوں کے لیے میری توجہ سڑک پر نہیں تھی۔

میرے پاس ضائع کرنے کے لیے وقت ہی نہ تھا۔ گاڑی کو وہیں چھوڑ کے میں نے فاروقی کو فون کیا اور اسے بتایا کہ مجھے ست بدھائی جانے کے لیے گاڑی چاہیے۔ مختصراً اسے میں نے ست بدھائی جانے کی فوری ضرورت سے بھی آگاہ کر دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ صوفی چچا کو میرے کہنے پر اس کی کزن پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیالوجی لے گئی ہے باقی تفصیل وہ بتا سکتی ہے۔

فاروقی کی گاڑی بیس منٹ بعد آ گئی۔ پولیس کارروائی اور لوگوں کے تجسس سے بچنے کے لیے میں رکشا میں بیٹھ کے وہاں سے نکل گیا تھا اور کچہری روڈ کے سامنے والے بس اسٹاپ پر کھڑا ہو گیا تھا۔ فاروقی نے مجھے دیکھ لیا۔ گاڑی میرے قریب آ کے رک گئی۔

"تو ٹھیک ہے نا۔" اس نے میرے بیٹھنے کے بعد کہا۔

میں نے کہا۔ "چوٹیں تو آئی ہیں مگر معمولی ہیں۔ میں گاڑی چلا سکتا ہوں۔"

"بیٹھا رہ آرام سے میں چلتا ہوں تیرے ساتھ۔"

میں نے کہا۔ "یار تیرا کام متاثر ہو رہا ہے...... میری وجہ سے۔"

"فکر نہ کر پتر...... جس دن میں نہ رہا اس دن بھی عدالتی کام اسی طرح چلتے رہیں گے۔ آدمی کو خوش گمانی میں نہیں رہنا چاہیے وہ دنیا کے لیے ناگزیر ہے...... میرے ماتحت سارے معاملات سنبھال لیتے ہیں۔"

"میری گاڑی کا کیا ہوگا؟"

"لے جائے گی پولیس...... تو اپنی فکر کر...... کیا پہلے تیرا چیک اپ کرا لوں۔"

"میں ٹھیک ہوں یار۔" میں نے ایک گہری سانس لی۔ "تیرے آنے سے بڑا حوصلہ ملا ہے مجھے۔"

"تو نے دیکھا...... وہ سالا ڈرامے باز راجا آ گیا۔"

"وہی تو دیکھ رہا تھا...... ایک سیکنڈ میں حادثہ ہو گیا۔ تو ذرا فون کر اپنی کزن کو...... نمبر ہے نا تیرے پاس۔"

اس نے موبائل مجھے تھما دیا۔ "غزالہ دیکھ اور نمبر ملا کے مجھے دے۔"

غزالہ ایک ہی تھی...... رنگ سنتے ہی میں نے فون اسے دے دیا۔ "بات کر......"

عادت کے مطابق اس نے کہا۔ "جان غزل...... ارے ہم وہی ہیں تمہارے پرانے چاہنے والے...... دنیا کے دل دیکھتی ہو کبھی ہمارے دل بیمار کو نہ دیکھا۔" وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔ "میں نے بھی اسی بیمار کے لیے فون کیا ہے جس کے ساتھ تم ایمبولینس میں ہو...... رفیق میرے ساتھ ہے...... ہاں...... حالت سنبھل گئی ہے تو اچھی بات ہے...... ہم آئیں گے شام تک...... کسی طرح اسے زندہ رکھنا...... ہاں ویسے تو سب اللہ کے ہاتھ میں ہے مگر کوشش۔" وہ کچھ دیر سنتا رہا اور پھر بولا۔ "یو آر گریٹ...... آخر کزن کس کی ہو...... اپنے

موچھو والے میاں کا بھی شکریہ ادا کر دینا حالانکہ ہے تو وہ میرا رقیب روسیاہ۔"

فون بند کر کے اس نے میری طرف دیکھا۔ "غزالہ کے ایس پی میاں کی مداخلت سے بات بنی...... وہ اسے لے گئی۔"

تین گھنٹے کا سفر فاروقی کو ساری روداد سنانے کے لیے بہت کافی تھا۔ "ڈاکٹر نے صاف کہا تھا کہ یہ فاؤل پلے ہے مگر ثابت کرنا میرا کام ہے۔"

"فاؤل پلے کس کا؟" فاروقی بولا۔ "پولیس کے لیے زندہ صوفی نذیر فائدہ مند تھا۔ ان کا مر جانا نقصان کی بات ہے۔"

"یہی میں بھی سوچ رہا تھا۔ اب ان کے ہاتھ میں کیا ہے مجھ پر دباؤ ڈالنے کے لیے...... صوفی چچا پر جھوٹے مقدمات کیسے قائم ہوں گے...... جن کی دھمکی انسپکٹر آفریدی نے دی تھی۔"

"یہ بات واقعی سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ ہے تو بڑی سفاک بات مگر حقیقت ہے کہ صوفی چچا کی موت تیرے حق میں باعث رحمت ہوگی۔ اب تو صاف انکار کر سکتا ہے اس حرام الدہر اکبر خان کو بھی...... اور رانا کو بھی۔"

میں نے کہا۔ "ہاں نہ میں کاسو کو واپس کروں گا نہ ایگریمنٹ سائن کروں گا۔"

"بے شک بعد میں وہ کوئی اور طریقہ اختیار کریں گے لیکن ابھی تو ان کا پلان فیل ہو گیا کسی کی مداخلت سے۔"

میں نے کہا۔ "کس کی مداخلت سے...... میرا ایسا پردہ حمایتی کون تھا۔"

"تیرا حمایتی نہیں...... اس کا دشمن...... جس کا مقصد تیری مشکل آسان کرنا نہیں تھا۔ رانا کے لیے مشکل پیدا کرنا تھا۔ جسے سب معلوم تھا...... اور جس کے لیے رانا کے خلاف سازش کرنے کی ہمت ہی نہیں...... طاقت بھی اور وسائل بھی...... یہ آسان کام نہیں تھا دیکھے پتر...... پولیس کسٹڈی میں اتنے مکمل طریقے سے قتل کرانا...... اس کو یہ راستہ دکھانے والا کوئی ڈاکٹر ہوگا۔"

میں نے کہا۔ "وہ FORENSIC میڈیسن سے پوری آگاہی رکھتا تھا پھر تھانے کے اندر بھی کسی نے تعاون کیا...... ظاہر ہے بھاری قیمت لے کر۔"

"ابھی تو وہ زندہ ہیں...... خدا کرے زندہ رہیں۔ ورنہ رپورٹ ملے گی تو حقیقت سامنے آئے گی...... لیکن۔"

میں نے کہا۔ "تو کیا کہتے کہتے رک گیا۔"

"کیا ایسی رپورٹ لینے سے کچھ حاصل ہوگا۔ تیرے ابا جی کے لیے ایک اور صدمہ کہ بھائی کو حوالات میں قتل کیا گیا...... کیا سوچیں گے وہ کہ ایسا کس نے کیا؟"

میں نے کہا۔ "تو ٹھیک کہتا ہے...... ان کو ہم کچھ نہیں بتائیں گے۔ لیکن ہمیں تو معلوم ہونا چاہیے۔"

"نہیں یار...... قتل کی وجہ جان کے ہمیں بھی کیا ملے گا۔ زیادہ اہم ہے قاتل کا پتا چلانا۔"

"یہ ہمارے لیے تو بہت مشکل ہوگا لیکن جو اس سے متاثر ہوئے...... وہ شاید اسے آسانی سے پکڑ لیں گے۔ وہ یقیناً گھر کا بھیدی ہوگا...... کوئی ایسا شخص جس پر انہیں اعتماد تھا...... ان کے ہاتھ سے ہتھیار چھن گیا...... وہ معلوم ضرور کریں گے کہ ایسا مار آستین کون ہے۔"

فاروقی نے کہا۔ "ہاں...... بشرطیکہ انہیں شک ہوا...... اگر انہوں نے اسے طبعی موت تسلیم کر لیا اور کوئی وجہ نہیں کہ نہ کریں جو بات اتفاق سے تجھے معلوم ہو گئی ہے انہیں نہیں معلوم۔"

"رائٹ...... اور معلوم ہونی بھی نہیں چاہیے۔" میں نے کہا۔ "اپنی کزن کو سمجھا سکتا ہے تو یہ بات...... کہ ہمارے لیے اس کی کیا اہمیت ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ میں اب بھی اسے ایکسپلائٹ کر سکتا ہوں۔" فاروقی ہنسا۔ "پتا نہیں کیوں ایک زمانے میں وہ مجھ پر مرتی تھی۔"

ست بدھائی میں میری اچانک آمد پر پہلا ردعمل فطری طور پر حیرانی اور خوشی کا تھا جو چند لمحے بعد خوف اور اندیشوں کے جذبات میں ڈھل گیا اور ایک سوالیہ نشان کی صورت میں سب کے چہروں پر ٹھہر گیا۔

فریال اس وقت فاروقی کی بیوی کے ساتھ حویلی کے بیرونی حصے میں موجود تھی اور کسی اچھے گائیڈ کی طرح حویلی کے تاریخی اور جغرافیائی پس منظر پر تقریر کر رہی تھی۔ فاروقی کی بیوی یہاں پہلی دفعہ آئی تھی۔ قدرتی طور پر اس کی دلچسپی بہت زیادہ تھی۔

گاڑی گیٹ سے اندر داخل ہوئی تو میرے باہر آنے سے پہلے ہی فریال نے خوشی سے چیخ ماری۔ "ارے آپ لوگ اچانک۔"

فاروقی کی بیوی نے بھی کہا۔ "آپ یہاں کیسے...... خیریت تو ہے نا؟"

میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "فریال...... اماں اور ابا کہاں ہیں؟"

''وہ کھانا کھا کے سو گئے ہیں۔'' وہ ایک دم سیریس ہو گئی۔ ''سب ٹھیک ہے نا؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں...... کچھ بھی ٹھیک نہیں ہے۔''

لیلیٰ بھابی نے کہا۔ ''بتاتے کیوں نہیں...... کیا ہوا ہے؟''

فریال بولی۔ ''خدانخواستہ...... راجا یا شہباز۔''

میں نے کہا۔ ''صوفی چچا پر دل کا دورہ پڑا تھا۔ حالت تشویش ناک ہے۔ وہ بھائی کو یاد کر رہے ہیں۔''

''اوہ مائی گاڈ...... یہ اچانک ہارٹ اٹیک کیسے ہو گیا۔''

میں نے کہا۔ ''ہارٹ اٹیک ایسے ہی ہوتا ہے۔ آدمی کی زندگی ہو تو بچ جاتا ہے...... علاج اور احتیاط کرے تو زندہ بھی رہتا ہے۔''

فاروقی نے کہا۔ ''صوفی چچا کی عمر خاصی ہے...... چیک اپ کبھی کرایا نہیں...... کوئی بھی نہیں کراتا۔''

اس کی بیوی نے تشویش سے کہا۔ ''ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟''

''ڈاکٹروں نے صاف جواب دے دیا ہے...... ہم اباجی کو لینے آئے ہیں...... صوفی چچا نے بلایا ہے۔''

فریال نے کہا۔ ''اباجی یہ صدمہ کیسے برداشت کریں گے میں تو یہی سوچ کے پریشان ہوں۔''

''میں انہیں جگاتی ہوں۔'' فاروقی کی بیوی نے کہا۔ ''تم لوا تنی دیر میں منہ دھو لو...... ابھی تمہیں واپس جانا ہوگا...... تم لوگوں نے کچھ کھایا بھی نہیں ہوگا۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے بالکل بھوک نہیں ہے۔''

''لیلیٰ بھابی...... آپ رابعہ کو بھی بتا دیں...... وہ بھی جانا چاہے گی...... میں کچھ کھانے کو لاتی ہوں۔''

اباجی مجھے دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ ان کی روانگی کے چند گھنٹے بعد میرا آنا بے سبب نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے کہا۔ ''رفیق...... کیا بات ہے؟''

میں نے کہا۔ ''اباجی...... آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہے۔''

''کیوں؟ کیا ہوا ہے نذیر کو...... پولیس نے مار دیا ہے اسے...... یا خودکشی کر لی ہے اس نے؟'' ان کا چہرہ متغیر ہو گیا۔

میں نے کہا۔ ''ایسی کوئی بات نہیں اباجی...... بس ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ وہ آپ کو یاد کر رہے ہیں۔''

وہ برہمی سے بولے۔ ''کیا ہوا ہے اس کی طبیعت کو؟''

فاروقی نے کہا۔ ''انکل...... حوصلہ رکھیے...... ان کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا...... وہ اسپتال میں داخل ہیں۔''

''دیکھو تم لوگ جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو نا؟'' میں تیار ہوں اس کی موت کا صدمہ برداشت کرنے کے لیے۔''

میں نے کہا۔ ''بے شک ان کی حالت تشویشناک ہے، وہ آئی سی یو میں ہیں لیکن وہ زندہ ہیں۔''

فریال نے ایک ٹرے ہمارے سامنے رکھ دی۔ اس میں کھانے کے لیے بہت کچھ تھا لیکن ہم نے چند بسکٹ لیے اور کافی ختم کی۔ اس وقت تک رابعہ بھی آ گئی تھی...... وہ ہمارے ساتھ جانا چاہتی تھی اور رو رہی تھی۔

اباجی نے پوچھا۔ ''نذیر کہاں ہے...... کس اسپتال میں؟''

میں نے کہا۔ ''پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیالوجی...... وہاں فاروقی کی کزن ہے...... بہت اچھی دیکھ بھال ہو رہی ہے۔''

''تم ذرا اس سے معلوم کرو...... اس کا کیا حال ہے؟'' اباجی بولے۔

میں نے کہا۔ ''ایسے رابطہ ممکن نہیں...... آپ چلیں۔''

صرف آدھے گھنٹے بعد ہمارا واپسی کا سفر شروع ہو گیا۔ ڈرائیونگ اب میں نے سنبھال لی تھی۔ فاروقی میرے ساتھ تھا۔ اباجی کے ساتھ رابعہ پیچھے والی سیٹ پر خاموشی سے آنسو بہاتی رہی۔ اسے تسلی دینے کے لیے اباجی نے بڑے صبر سکون کا مظاہرہ کیا اور اسے تسلی دیتے رہے لیکن ایسا لگتا تھا کہ اسے نہ مجھ پر اعتبار ہے نہ فاروقی پر...... مجھ سے اس نے کچھ نہیں کہا مگر فریال کے سامنے اس اندیشے کا اظہار کر دیا تھا کہ جو ہونا تھا ہو چکا ہے یہ لوگ بتا نہیں رہے ہیں۔

جب ہم لاہور پہنچے تو شام ختم ہو رہی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ پہلے خود جا کے صورت حال دیکھ لوں مگر نہ اباجی رکنے کو تیار تھے نہ رابعہ رکی...... اسپتال میں عام مریضوں سے ملاقات کا وقت بھی ختم ہونے والا تھا۔ آئی سی یو میں جانے کی اجازت کسی کو نہ تھی۔ ہم سب ایک ویٹنگ روم میں بیٹھ گئے۔ فاروقی نے اپنی کزن غزالہ کو پوچھا۔ اس کی ڈیوٹی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی وہ فاروقی کے ساتھ دس منٹ بعد نمودار ہوئی اور ان کی صورت دیکھتے ہی میں سمجھ گیا کہ ہمیں دیر ہو گئی اور دل ہی دل میں میں نے اناللہ وانا الیہ راجعون بھی پڑھ لیا۔

''مجھے بہت افسوس ہے۔'' غزالہ نے کہا۔ ''ہم انہیں بچا نہیں سکے۔''

اباجی نے غالباً رابعہ کی وجہ سے یہ خبر بڑے حوصلے کے ساتھ سنی اور اناللہ پڑھنے کے بعد خاموش ہو گئے مگر رابعہ

پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ اباجی نے اسے گلے لگا کے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''صبر بیٹا صبر...... اللہ کو ہمارا امتحان لینا منظور ہے۔ اس کی رضا کے سامنے سر جھکانا ہی ہوگا۔''

ویٹنگ روم میں یہ نظارہ نیا نہیں تھا۔ جو یہاں کسی کو لاتے تھے ذہنی طور پر اس حقیقت سے سمجھوتا کر لیتے تھے کہ اب دوا سے زیادہ دعا کارگر ہوگی۔ دوسرے کسی وارڈ کے مقابلے میں بیماری دل کے ساتھ آئی سی یو سے شفایابی کے ساتھ لوٹ کر گھر جانے والوں کا تناسب ہر جگہ کم رہتا ہے۔

مجھے انتہائی قلق تھا کہ صوفی چچا کی آخری خواہش پوری نہ ہو سکی۔ کسی حد تک میں خود کو اس کوتاہی کا ذمے دار سمجھنے پر مجبور تھا اگر میں گزشتہ رات برآمدے میں موجود رہتا اور آخری جھے کی کمپاؤنڈ وال پر جا کے نہ لیٹتا تو بار بار پکارے جانے پر اپنا نام ضرور سن لیتا۔

میں نے بہت قائل کرنا چاہا کہ اباجی رابعہ کے ساتھ جائیں کیونکہ یہاں ابھی ڈیتھ سرٹیفکیٹ کے حصول اور ڈیڈ باڈی کو لے جانے والی ایمبولینس کا انتظام کرنے کے مسائل تھے لیکن وہ وہیں بیٹھے رہے۔ میں جانتا تھا کہ ضبط سے ان کے دل پر کیا بیت رہی ہوگی مگر خود سے زیادہ انہیں رابعہ کا خیال تھا جو باپ سے بھی محروم ہو گئی تھی۔

فاروقی اپنی کزن کے ساتھ چلا گیا تو میں نے باہر جا کے اِدھر اُدھر صحافت سے تعلق رکھنے والے بہت سے لوگوں کو فون کیے۔ ایک اخبار کے دفتر سے بالآخر مجھے راجا کا نمبر مل گیا۔ دوپہر کے بعد اس نے شہباز کے ساتھ پریس کلب میں کانفرنس کی تھی اور اپنے اغوا سے رہائی تک کی سوچی سمجھی کہانی پوری تفصیلات کے ساتھ سنا دی تھی پھر وہ پولیس کے ساتھ ضابطے کی کارروائی میں مصروف رہا تھا اور اب ست بدھائی جانے کے لیے روانہ ہوا ہی تھا کہ اسے میرا فون ملا۔

فون پر نہ وہ مجھے ساری تفصیل بتا سکتا تھا اور نہ اس کا موقع تھا۔ اس نے میری بات سن کے کہا کہ وہ اسپتال پہنچ رہا ہے۔ ''تمہیں کتنی دیر لگے گی وہاں؟'' وہ بولا۔

میں نے کہا۔ ''شاید ایک گھنٹا۔''

''کیوں...... صوفی چچا کا انتقال کب ہوا تھا؟'' وہ بولا۔

میں نے کہا۔ ''ہمارے پہنچنے سے ایک گھنٹا قبل۔''

''اتنی دیر میں ایک ڈیتھ سرٹیفکیٹ نہیں بنا؟ جب تو اباجی کو لینے گیا تھا تو کیا تجھے معلوم نہیں تھا کہ ہم آ گئے ہیں۔''

''میں نے اخبار دیکھ لیا تھا لیکن نہ میرے پاس تیرا نمبر تھا نہ اس کی فوری ضرورت تھی...... دیر کا اصل سبب ہے پوسٹ مارٹم رپورٹ۔''

''پوسٹ مارٹم؟ وہ کس لیے؟'' وہ چونکا۔

''یہ فون پر نہیں بتا سکتا...... ہم نے اپنے طور پر انتظام کیا ہے...... شک یہ تھا کہ صوفی چچا کا ہارٹ اٹیک قدرتی نہیں تھا...... مطلب یہ کہ کسی بیماری معذوری کا نتیجہ نہیں تھا۔''

''پھر کیا تھا؟''

میں نے کہا۔ ''انہیں کچھ دیا گیا جس کا نتیجہ ہارٹ اٹیک کی صورت میں نکلا...... ابھی تصدیق ہونی باقی ہے۔''

''یہ شک تجھے کیسے ہو گیا؟''

''شک ایک ڈاکٹر نے ظاہر کیا تھا مگر وہ ذمے داری قبول کرنے کو تیار نہیں اگر اس کا ثبوت مل گیا تو پھر ہم اسپتال سے رپورٹ لے کر جائیں گے میو اسپتال...... ایم ایل او کے پاس...... سرکاری پوسٹ مارٹم رپورٹ لیں گے اور اس کے بعد کیس کریں گے پولیس پر۔''

راجا کوئی پون گھنٹے میں شہباز کے ساتھ پہنچا...... شہباز کو دیکھ کر رابعہ نے پھر رونا شروع کیا...... شہباز اسے چپ کرانے کی کوشش میں خود اس سے زیادہ روتی رہی۔

اباجی نے مجھ سے اچانک کہا۔ ''رفیق...... کل رات تم تھے کہاں؟''

''جی...... میں ہی لایا تھا انہیں۔''

''ان سے کوئی بات ہوئی تھی تمہاری؟''

میں نے کہا۔ ''ایک بار...... کچھ دیر کے لیے ہوش آیا تھا انہیں...... آج صبح ڈاکٹر نے مجھے بلا لیا...... صوفی چچا نے کہا......''

''کیا کہا...... بولو۔'' اباجی برہمی سے بولے۔

''انہوں نے کہا کہ بھائی صاحب کو بلاؤ...... میں نے کہا کہ وہ تو یہاں نہیں ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اچھا جا کے لے آؤ...... لیکن دیر ہو جائے تو تم میری طرف سے کہنا کہ مجھے معاف کر دیں...... ہاتھ جوڑ کے معافی مانگ لینا...... کیا پتا مجھے اتنی مہلت نہ ملے...... اس وقت ڈاکٹر نے مجھے بتا دیا تھا کہ کوئی امید نہیں...... ہوش کا یہ وقفہ عارضی ہے...... میں اسی وقت روانہ ہو گیا تھا...... حیرانی کی بات یہ ہے اباجی کہ وہ بالکل نارمل تھے...... بہت پُرسکون تھے......'' میں بولتا رہا اور وہ سنتے رہے۔

تمام انتظامات مکمل ہونے میں دو گھنٹے لگ گئے۔ اصل وجہ پوسٹ مارٹم رپورٹ کی وجہ سے ہونے والی تاخیر تھی۔ یہ رپورٹ سب سے پہلے فاروقی نے دیکھی۔ اس میں ابتدائی شکوک کی تصدیق کر دی گئی تھی۔ صورتِ حال اب مختلف ہو گئی۔

ڈاکٹر غزالہ نے کہا۔ ’’یہ رپورٹ آفیشل نہیں ہے۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’کیا سرکاری اسپتال کی رپورٹ مختلف ہو گی؟‘‘

فاروقی نے کہا۔ ’’اگر یہ رپورٹ غلط نہیں ہے تو ہم اسے استعمال کیوں نہیں کر سکتے؟‘‘

غزالہ نے کہا۔ ’’یہ میں نے حاصل کر لی ہے۔ تمہارے کہنے پر۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’اگر وارث کی حیثیت سے کوئی درخواست دی جاتی...... پھر؟‘‘

’’پھر میری پوزیشن محفوظ ہوتی۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’یہاں مرحوم کے بڑے بھائی موجود ہیں۔ ان کی بیٹی ہے۔ ان کے سوا کوئی قانونی وارث نہیں...... اگر میں ان سے درخواست لے لوں۔‘‘

ڈاکٹر غزالہ نے فاروقی کی طرف دیکھا۔ ’’ٹھیک ہے...... درخواست لا دو میں انٹری کرا دیتی ہوں...... بیٹی سائن کر دے۔‘‘

درخواست فاروقی نے لکھی اور رابعہ کے پاس لے گیا۔ رابعہ کی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ پڑھتی...... اسے فاروقی پر پورا اعتماد تھا۔ اس نے دیکھے بغیر دستخط کر دیے۔

ڈاکٹر غزالہ نے اس درخواست کی وصولی کے وقت کا اندراج دو گھنٹے پہلے کا کر دیا۔ صوفی چچا کی وفات کا تقریباً یہی وقت تھا۔ اس درخواست کے مطابق مرحوم کی بیٹی نے کسی شک کی بنا پر انتقال کے فوراً بعد اسپتال کی انتظامیہ سے پوسٹ مارٹم رپورٹ مانگی تھی۔ حالانکہ رابعہ اس وقت یہاں موجود ہی نہیں تھی...... وہ ست بدھائی کے راستے میں تھی۔

اگلا مرحلہ زیادہ مشکل تھا۔ اباجی کے ساتھ رابعہ ایمبولینس میں میت لے کر ست بدھائی جانے کے لیے تیار تھے جبکہ ہمیں لاش کو میو اسپتال لے جانا تھا اور میڈیکولیگل افسر سے مل ملا کے وہ سرکاری رپورٹ حاصل کرنی تھی جو قانونی طور پر مستند تسلیم کی جائے۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد راجا نے کہا۔ ’’انہیں سچ بتانے میں کیا حرج ہے۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’یہ ناممکن ہے...... رابعہ کو یا اباجی کو کچھ معلوم نہیں کہ صوفی چچا کو پولیس نے کیسے بطور ہتھیار استعمال کیا ہے۔‘‘

فاروقی بولا۔ ’’پولیس نے نہیں...... اکبر خان اور رجب علی رانا نے مل کر۔‘‘

’’پھر انہیں کاسو کے سارے معاملے سے اور سائنس ریسرچ سینٹر کے فراڈ کی تفصیلات بھی بتانی پڑیں گی۔ بہتر ہے انہیں تمام اندیشوں سے دور رکھا جائے۔‘‘

راجا بولا۔ ’’وہ ست بدھائی میں رہیں گے تو کبھی نہ کبھی ہر بات انہیں معلوم ہو جائے گی۔ ایک جھوٹ کو چھپانے کے لیے دس جھوٹ بولنے ضروری ہوں گے اور جب سچ ان کے سامنے آئے گا تو انہیں دکھ زیادہ ہوگا۔‘‘

’’تو غلط نہیں کہتا لیکن ابھی وہ اتنے دکھی ہیں کہ ساری سچائیوں کے انکشاف کا نتیجہ الٹا نکل سکتا ہے بعد میں آہستہ آہستہ سب بتایا جا سکتا ہے۔‘‘

’’سوال یہ ہے کہ اب کیا کریں؟‘‘ فاروقی بولا۔

ترکیب بھی راجا ہی نے بتائی۔ ’’ہم کہہ دیتے ہیں کہ فوری طور پر یہاں ایمبولینس دستیاب نہیں۔‘‘

’’وہ کہیں گے پرائیویٹ ایمبولینس منگوالو...... کوئی کمی نہیں۔‘‘

’’ٹھیک ہے...... میں ان کے سامنے فون کر دوں گا یا جاؤں گا ایمبولینس بک کرانے۔ کچھ دیر بعد آ کے بتا دوں گا کہ ایمبولینس آنے والی ہے۔ آدھے گھنٹے بعد کہوں گا کہ وہ ایمبولینس راستے میں خراب ہو گئی۔‘‘

فاروقی نے کہا۔ ’’اس کھیل کا فائدہ؟‘‘

’’میری بات سن لو...... مقصد ہوگا تاخیر...... ساڑھے آٹھ تو ہو رہے ہیں۔ ساڑھے نو بجے میں انہیں قائل کر دوں گا کہ اس وقت میت لے کر جانا کوئی عقلمندی کی بات نہیں۔ ہم آدھی رات کے وقت ست بدھائی پہنچیں گے...... راستہ خراب ہے...... کوئی بھی ایمبولینس ہو...... راستے میں معمولی خرابی سے رک جائے تو مکینک نہیں ملے گا۔ رات بھر کہاں کھڑے رہیں گے میت کے ساتھ...... ویسے بھی تدفین تو کل صبح ہی ہوگی...... ست بدھائی میں نہ اے سی ہے نہ برف کا انتظام...... بہتر ہے کہ ہم صبح فجر کی نماز کے بعد نکل جائیں...... رات بھر کے لیے میں میت کو یہاں کولڈ اسٹوریج میں رکھوا دیتا ہوں۔ وہ فاروقی کے ساتھ گھر جائیں اور آرام کریں۔‘‘

راجا کی اسکیم کام کر گئی...... اباجی نے پہلے مخالفت کی۔ پھر مان گئے۔ فاروقی انہیں اپنے ساتھ لے گیا۔ اس کے گھر میں کوئی بھی نہیں تھا مگر اس نے کہا کہ وہ دونوں کو سنبھال لے گا۔ کچھ نہ کچھ کھلا پلا کے سلا بھی دے گا۔ میں چاہتا تھا کہ شہناز بھی ساتھ چلی جائے لیکن راجا نے کہا کہ سرکاری اسپتال میں اس کی موجودگی فائدہ مند ہوگی۔ اس کا کوئی تعلق بھی نکل آئے گا اور وہ ڈاکٹروں سے وہ بات بھی کر سکے گی جو ہم نہیں کر سکتے۔

جاتے جاتے اچانک رابعہ نے کہا۔ ’’مجھے ابا کی شکل تو دکھا دو۔‘‘

میں نے ٹالنے کی کوشش کی۔ ’’اس کے لیے وہاں جانا پڑے گا...... کولڈ اسٹوریج میں وہاں اور بھی ڈیڈ باڈیز ہوتی ہیں۔‘‘

راجا نے کہا۔ ’’وہ بڑی ہولناک جگہ ہے رابعہ۔‘‘

’’میں صرف ابا کو دیکھوں گی۔‘‘ وہ بولی۔

میری یہ مشکل ابا نے آسان کی۔ انہوں نے کندھے پر ہاتھ رکھ کے رابعہ کو سمیٹ لیا۔ ’’بس بیٹا...... صبح دیکھ لینا...... دیکھ میں بھی تو صبر سے کام لے رہا ہوں اس عمر میں...... تمہارے ساتھ میں بھی جاؤں گا تو برداشت نہیں کر پاؤں گا۔‘‘

رابعہ سر جھکا کے ان کے ساتھ ہولی۔ ’’فاروقی انہیں لے گیا تو دس منٹ بعد ہم ڈیڈ باڈی کے ساتھ میو اسپتال کی طرف روانہ ہو گئے...... وہاں ہمیں ایک طویل صبر آزما اور تکلیف دہ پروسیجر سے گزرنا پڑا اور بہت سے سوالات کا سامنا کرنا پڑا۔ ہمیں کیا شک ہے؟ کس پر شک ہے اور کیوں......؟ کیا ہم نے کوئی پولیس رپورٹ لکھوائی ہے...... نہیں تو پھر پوسٹ مارٹم رپورٹ کا مقصد کیا ہے؟

ان تمام مشکل مرحلوں سے گزرنے میں کچھ راجا کے تعلقات نے کام کیا...... کچھ شہناز کے دو پرانے ساتھیوں نے جو پانچ سال اس کے ساتھ پڑھ چکے تھے اور بعد میں ساتھ کام بھی کر چکے تھے۔ پولیس کا تعاون سکہ رائج الوقت سے حاصل ہوا...... ہمارے پاس وقت کم تھا ایمرجنسی میں رات کے وقت پوسٹ مارٹم رپورٹ نکلوانا جوئے شیر لانے سے کم مشکل نہ تھا۔

صبح تک ہم نے یہ معرکہ سر کر لیا...... جب پوسٹ مارٹم رپورٹ ہمارے ہاتھ میں آ گئی تو اس کے مندرجات مختلف نہ تھے۔ شہناز نے اپنے شک کا اظہار کرنے کے ساتھ پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیالوجی والوں کی رپورٹ بھی دکھا دی تھی...... شاید پوسٹ مارٹم کرنے والوں نے محنت سے بچنے اور اپنی ایک کولیگ کو زیادہ بار احسان کرانے کے لیے مکھی پر مکھی ماری یعنی جو ہم چاہتے تھے وہی رپورٹ میں لکھ دیا...... ہماری محنت وصول ہو گئی۔

صبح ہم میت لے کر ست بدھائی چلے گئے مگر فاروقی ساتھ نہ جا سکا۔ اسے انسپکٹر رحمل خان آفریدی سے نمٹنا تھا اور جیسا کہ اس نے بعد میں بتایا...... تھانے میں محرر نے اپنے انچارج صاحب کے خلاف ایف آئی آر درج کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اس وقت فاروقی نے انسپکٹر آفریدی سے جھگڑا نہیں کیا۔ اس نے اپنی شکایت کے ساتھ پوسٹ مارٹم رپورٹ کی مصدقہ نقل لگائی اور شکایت ایس پی کے آفس میں وصول کرا دی۔ اس کی ایک نقل ہائی کورٹ کے رجسٹرار آفس میں دینے کے بعد وہ ست بدھائی پہنچا تو نماز جنازہ ہو چکی تھی اور صوفی چچا کو اسی بیوی کے ساتھ یوم حشر تک لٹانے کا بندوبست ہو گیا تھا جس کا انہوں نے اپنے ہاتھوں سے گلا گھونٹ دیا تھا۔

ان کی تدفین کے بعد دعا کے وقت مجھے ایک سوال کی بازگشت مسلسل پریشان کرتی رہی۔ اس حویلی کی نحوست سے آباد ہونے والے قبرستان میں اگلی قبر کس کی ہوگی...... دولت جائیداد اور جاگیر ملنے کے بعد بہت مختصر وقت میں یہاں تین قبروں کا اضافہ ہو گیا تھا۔ توہم پرست اور کمزور عقیدے کا نہ میں تھا نہ میرا باپ لیکن بدبختی کے واقعات کا سلسلہ ریاضی کے اصولوں جیسی اٹل کہانی کے ساتھ مجھے لاجواب کرتا تھا۔

خوشی کو تو لو اور پھر غم کو تو لو...... کرنسی ویلیو میں ان کی قیمت لگاؤ...... بیلنس شیٹ تیار کرو اور نفع نقصان کا حساب کر کے بتاؤ کہ اس جاگیر اور حویلی کے مالک بننے کے بعد تم کتنے فائدے میں رہے۔ ثابت ہو جائے گا کہ سب سراسر گھاٹے کا سودا ہے۔ دیکھو تم نے کیا کچھ گنوا دیا...... کس کی آرزو رکھتے تھے جو نہیں پایا...... کب تم زیادہ خوش تھے۔ اس وقت جب اعلیٰ تعلیم سے سرفراز ہو کے لندن میں نوکری کر رہے تھے یا آج جب تم نواب رفیق احمد شیرازی کہلاتے ہو...... دکھوں کے ساتھ فکروں کو تو لو...... اندیشوں کو تو لو...... خطرات کو تو لو...... پھر توقعات کو دیکھو......

کچھ عرصے کے لیے زندگی ٹھہر سی گئی۔ یوں جیسے چلتے چلتے تیز رفتار گاڑی پٹری سے اتر جائے۔ اسے پھر پٹری پر چڑھانے میں وقت تو لگتا ہے۔ ابھی بات یہ تھی کہ وہاں سب ہی دوسروں کی طرف اپنی ذمے داری کے بوجھ کو اٹھانا چاہتے تھے۔ مثلاً سب سے زیادہ میرے خیال میں اباجی دکھی تھے۔ یکلخت وہ تنہا ہو گئے تھے۔ ان کے خاندان کا وجود ایسے مٹ گیا تھا جیسے زلزلے میں بستیاں ختم ہوتی ہیں۔ آخری جذباتی سہارے کا کام دینے والا بھائی جیسا بھی پاگل یا مجرم تھا ان کے لیے زندہ تھا اور وہ اسے زندہ رکھنے کی آرزو رکھتے تھے۔

اب انہوں نے محسوس کیا کہ اپنے غم میں ڈوب کر وہ رابعہ کی ذمے داری نہیں نبھا پائیں گے جو ان کے بھائی کی آخری نشانی تھی۔ انہوں نے اپنی ساری جدوجہد کا رخ رابعہ

کو جذباتی سہارا فراہم کرنے کی طرف موڑ دیا اور صرف اس لیے صبر وشکر کا راستہ اختیار کیا کہ وہ رابعہ کو اپنے ساتھ لے کر چل سکیں۔ ایک روز میں نے سنا وہ رابعہ سے کہہ رہے تھے کہ جذباتی رشتوں سے محرومی آزمائش ہوتی ہے۔ کم ہمت لوگ غم کے سمندر میں ڈوب جاتے ہیں ہمت والے اسے ایک چیلنج بناتے ہیں کہ اب خود ہی تیر کے پار اترنا ہے...... تم تو ابھی جوان ہو اور اتنی صلاحیت ہے تم میں ...... مجھے دیکھو...... اس عمر میں بھی بہت کچھ کرنا چاہتا ہوں۔

اندر سے ان کی روح کتنی زخمی تھی۔ یہ رابعہ بھی جانتی ہو گی لیکن خود اس نے اباجی کے لیے ہمت پکڑ لی...... اس نے بھی اپنی ذمے داری کو اتنا ہی محسوس کیا اور آہستہ آہستہ خود کو زندگی کے معمولات کی طرف لانے لگی۔ اس میں رابعہ کی جو مدد فریال...... ڈاکٹر شہناز یا فاروقی کی بیوی کر سکتی تھیں، وہ انہوں نے بڑی سمجھداری سے مل کے کی...... فاروقی کی بیوی سارا دن گھر میں اکیلی بےکار اور بیزار پڑی رہتی تھی۔ شوہر صبح کا گیا رات کو سونے کے لیے آتا تھا۔ یہاں اسے معروفیت بھی نظر آئی اور ایک تعلیم یافتہ فیملی کے گھر کا دوستانہ ماحول بھی ملا جس میں سب ایک دوسرے سے مخلص بھی تھے اور بے تکلف بھی...... اس کا دل لگ گیا تو باقی سب نے اسے ایسا پھانسا کہ فاروقی سر دھنتا رہ گیا کہ میری اکلوتی بیوی نے بھی بن باس لے لیا...... بیوی نے صاف کہا کہ پہلے بھی سنڈے کے سنڈے ہی ملتے تھے دور لگتا ہے تو دوسری گھر لو اور شہر میں رہو...... وہ جانتی تھی کہ مجنوں کو اپنی لیلیٰ کے ساتھ صحرا بھی عبور کر کے آنا پڑے تو آئے گا۔

دو ہفتے کے بعد ہم رات کے وقت باہر بیٹھے ڈاکٹر شہناز کے توسیعی پلان کو ڈسکس کر رہے تھے۔ وہ ایک بار پھر حویلی کے مشرقی حصے میں کلینک اور ڈسپنسری کے ساتھ بچوں عورتوں کا خصوصی تربیتی مرکز قائم کرنا چاہتی تھی۔ خصوصاً حاملہ عورتوں اور دودھ پلانے والی ماؤں کی آگاہی اس کی اولین ترجیح تھی۔ گرد و نواح کی عورتوں کی ذہنی اور جسمانی حالت پر وہ بہت کڑھتی تھی۔ ظاہر ہے اس کام میں شہناز کو سب کی تائید حاصل تھی ریشم پہلے ہی اس کی معاون خصوصی تھی اب رابعہ بھی اس کے ساتھ شریک ہو گئی۔

اس مرحلے پر فاروقی کی بیوی نے کہا۔ ''میرے ذہن میں کچھ اور ہے۔'' سب کی توجہ ادھر ہو گئی۔ ''ارشاد......''

''صحت کا مسئلہ یقیناً اہم ہے...... لیکن ہم سب ایک ہی کام میں لگ جائیں...... اتنا کام ابھی ہو گا نہیں...... میں کچھ پڑھانے کا سلسلہ کرنا چاہتی ہوں...... تعلیم بالغاں۔''

راجا نے کہا۔ ''پہلے اسے تو پڑھا لو...... تم نے جو شوہر پال رکھا ہے۔''

وہ خفگی سے بولی۔ ''پال رکھا ہے...... کیا بندر کہہ رہے ہو اسے؟''

راجا نے کہا۔ ''ہرگز نہیں...... ایسا کہا تو بندر برا مانیں گے۔''

فاروقی بولا۔ ''پڑھاتی تو ہے مجھے بھی...... مگر ہمارا نائٹ کالج ہے۔''

ریشم منہ دبا کے ہنسی کرنے لگی۔ شہناز نے اسے گھورا تو وہ چپ ہو گئی۔ ''تعلیم بالغاں کس کے لیے۔''

''سب کے لیے...... جو بھی آجائے۔''

''لکھ لو یہاں گدھے گھوڑے بھی نہیں آئیں گے۔'' راجا بولا۔ ''یہاں آج بھی تسلیم کیا جاتا ہے کہ تعلیم حاصل کرتے ہی عورت فوراً سب سے پہلے لو لیٹر لکھتی ہے اور پھر کورٹ میرج کر لیتی ہے۔''

''اور مرد کیا کرتے ہیں۔'' رابعہ نے کہا۔

''وہ...... جو مردوں کو کرنا چاہیے وہی...... حکم چلانا...... خدمت کرانا...... عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھنا...... شرفا یہی کرتے ہیں۔'' راجا بولا۔

فاروقی نے آہ بھری۔ ''کاش ہم بھی شرفا ہوتے مہاراجا...... پیدائشی طور پر میں تو ہوں جورو کا غلام...... اور تم سب کی بھی ایسی ہی اوقات ہو گی بچو۔''

''بددعائیں مت دے ہمیں...... کام کی بات کرنے دے۔'' میں نے کہا۔

اب یہ طے ہوا کہ شہناز کی مدد کرے گی فریال...... دیسی حضرات وخواتین سے مغز ماری اس کے بس کی بات نہ تھی...... لیلیٰ بھابی کے ساتھ ہو گی رابعہ...... حضرات کا اس اسکیم میں کوئی عمل دخل نہ تھا...... سوائے باہر کے معاملات سے نمٹنے کے۔ جگہ کی کمی نہ تھی...... فنڈز کا مسئلہ نہیں تھا...... گاڑیاں تھیں شہر آنے جانے کے لیے...... پہلے ایک ڈرائیور کبیر خان تھا اب اس کے ساتھ غنی کی ڈیوٹی بھی لگ گئی تھی۔

فاروقی نے صوفی چچا کی موت کو پولیس کا قتل قرار دینے کے لیے عدالت میں درخواست لگا دی تھی کہ اس کی ایف آئی آر انسپکٹر آفریدی کے خلاف درج کی جائے مگر ظاہر ہے یہ کام آسان نہ تھا...... پولیس کا سارا محکمہ اپنے بھئی بند بھائی کو بچانے کے لیے سرگرم ہو جاتا ہے...... فاروقی کا مقصد اس پر

قتل عمد کا کیس بنانا نہیں تھا...... قتل آفریدی نے نہیں کیا تھا۔ یہ کام اس کی یا عملے کی غفلت سے فائدہ اٹھا کے کسی اور نے کیا تھا۔ اصل مقصد آفریدی کو دباؤ میں رکھنا تھا۔

صوفی چچا کی موت کے ساتھ ہی اکبر خان نے بھی چپ سادھ لی تھی۔ ظاہر ہے وہ اب میرے اگلے اقدام کا منتظر تھا لیکن میں فوری طور پر کسی سے کوئی پنگا لینے کے موڈ میں نہیں تھا۔ راجا اب کالم لکھتا تھا اور ایک کالم میں اس نے اپنے اغوا کی پوری کہانی سنائی تھی۔ جو ایک سو ایک فیصد جھوٹ پر مبنی ہونے کے باوجود سچ مان لی گئی تھی۔

راجا نے لکھا تھا کہ اس کا غلام محمد کے انٹرویو کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ غلام محمد کی کچھ عرصہ پہلے سیاسی اہمیت ضرور تھی لیکن تنظیم پہلی ہی انتخابی کامیابی کے بعد نشہ اقتدار میں بدمست ہوئی تو اس کے قائدین نے منشور کو بھول کر ایک فسطائی ایجنڈا اپنا لیا اور اپنے حریفوں کے خلاف سیاسی انتقام کا سلسلہ شروع کر دیا۔ خود پارٹی کے اندر جمہوری اصول پامال ہوئے اور کارکنوں کے لیے جزا وسزا کا وہی معیار مقرر کیا گیا جو ہٹلر کی فاشسٹ پارٹی میں تھا بس چیف کی اطاعت...... وہ سیاہ کو سفید کہے تو تسلیم کرنے والا وفادار ورنہ غدار۔ نتیجہ یہ کہ خوشامدی اور نااہل برسر اقتدار آگئے اور انہوں نے بدعنوانی لوٹ مار اور ظلم کی انتہا کر دی۔

یہ صورتِ حال کب تک چل سکتی تھی۔ کارکن اغوا اور قتل ہونے لگے۔ وفادار کہلانے والے نااہل مقامی حکومت کا انتظام چلانے میں ناکام رہے۔ ان کا زیادہ وقت عیش و عشرت میں اور اپنے مخالفین کے خلاف انتقامی کارروائی کرنے میں صرف ہوتا تھا۔ لوکل باڈیز کے اگلے انتخاب میں بھی ان کا عبرتناک انجام ہوا اور ان کے مخالفین برسر اقتدار آئے تو تنظیم کے عہدیدار بشمول چیف روپوشی کی زندگی اختیار کرنے پر مجبور ہوئے۔ کچھ حریفوں کے انتقام کا نشانہ بنے تو کچھ جان بچا کے بیرون ملک سیاسی پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔

تنظیم کا سربراہ مجیب الرحمان جو چیف کے نام سے مشہور ہے فرار ہو کے دبئی گیا تھا۔ وہاں جان کو خطرہ محسوس ہوا تو لندن بھاگ گیا اور جھوٹ بولا کہ پاکستان میں مذہبی اقلیت ہونے کے باعث مجھے جان کا خطرہ ہے۔ اسے سیاسی پناہ مل گئی کچھ عرصہ لندن میں اس نے شاہانہ زندگی بسر کی۔ اس کے سیاسی حلقہ بگوش اسے بھاری رقوم ارسال کرتے رہے جو وہ لوٹ مار اور بدمعاشی کے سارے ہتھکنڈے استعمال کر کے جمع کرتے تھے۔ خود اس کے پاس دولت کی کمی نہ تھی۔ دبئی میں بھی اس نے کسی شیخ کو کنگال کیا تھا۔ لندن میں بیٹھ کے وہ اپنے سازشی ذہن کی مدد سے پھر اقتدار حاصل کرنے کے تانے بانے بنتا رہا لیکن اس کے ہاتھوں ایک قتل ہوا جس کی خبر برطانوی پولیس تک پہنچ گئی۔ اس نے پہلے بھی قتل کیے تھے۔ جو اس کے اندھے عقیدت مندوں نے چھپا لیے تھے۔ وہ کسی شیطانی فرقے کے روحانی پیشوا کی طرح ہے جو اپنے پیروکاروں پر جادو ہپناٹزم یا کسی مافوق الفطرت طاقت کے ذریعے اتنا کنٹرول رکھتا ہے کہ اس کے حکم پر وہ خوشی خوشی ہر ناجائز کام کرنے پر راضی ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ماں اور بہن کو قتل کر کے اس کا زیور بھی چیف کے قدموں میں ڈال سکتے ہیں۔

قتل کے الزام میں گرفتاری کے ڈر سے چیف نے لندن سے پیرس کا رخ کیا اور کوئی چکر چلا کے پناہ حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ اب وہ اپنے خاص لوگوں کو یورپ میں جمع کر رہا تھا انہیں جرمنی ہالینڈ برطانیہ اور فرانس میں سیاسی پناہ دلوا رہا تھا۔ معلوم نہیں اس شیطانی لشکر DEVILS BRIGADE کو جمع کرنے کے اس کے مقاصد کیا تھے۔

یہ افواہ سن کر کہ چیف چھپ کے پاکستان آیا ہوا ہے اور کالا شاہ کاکو کے نزدیک غلام محمد کے ایک فارم ہاؤس میں

موجود ہے۔ میں اس کا انٹرویو لینے رات کے وقت وہاں پہنچ گیا۔ میرے ساتھ ڈاکٹر شہناز بھی تھیں جو مشہور سوشل ورکر بھی ہیں اور میری ہونے والی رفیق حیات بھی۔ وہاں غلام محمد تو نہیں ملا...... واپسی پر ہمیں ڈاکوؤں نے اغوا کرلیا۔ وہ ہمیں آنکھوں پر پٹی باندھ کر لے گئے۔ ہم نے چوبیس گھنٹے سفر کیا۔ کچھ گاڑیوں میں اور کچھ پیدل...... ہمیں نہیں معلوم وہ ہمیں کہاں لے گئے تھے۔ جب ہماری پٹی کھولی گئی تو ہم ایک تہ خانے میں تھے۔ وہاں سے فرار اتنا ہی ناممکن تھا جتنا مردے کا قبر سے۔

تاہم انہوں نے ہمارے ساتھ ناروا سلوک نہیں کیا۔ ان کے گروہ میں عورتیں بھی تھیں۔ میرے خیال میں وہ جگا پہلوان کا گروہ تھا۔ وزیر آباد کے علاقے کا یہ پہلوان پہلے مزدوری کرتا تھا مگر پھر سرکاری اہلکاروں نے اسے جھوٹے مقدمات میں ملوث کر کے بدمعاش بنا دیا۔ اب وہ جن شاہ بھی کہلاتا ہے اور عزرائیل شاہ بھی...... قصہ مختصر...... اس کے کارندے ہمیں غلطی سے اٹھا لائے تھے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ صحافی ہوں غلام محمد نہیں...... میں تو وہاں چیف سے ملنے گیا تھا اور ناکام لوٹ رہا تھا اس پر ہمارے میزبان نے معذرت کی اور کہا کہ وہ صحافیوں اور پروفیسروں کی بہت عزت کرتا ہے، اس کا باپ صحافی اور پروفیسر تھا۔

اس ڈاکو نے اپنی غلط فہمی کی بنا پر ہونے والی زیادتی کا ازالہ یوں کیا کہ ہمیں اپنا مہمان رکھا۔ ہمیں شکار کرایا...... اپنے علاقے کا دورہ کرایا۔ دوسرے ساتھیوں سے ملوایا اور واپسی پر تحفے تحائف دے کر رخصت کیا اس نے یہی بیان پریس کلب میں بھی دیا تھا۔

اس بیان نے پولیس کو بوکھلا دیا کیونکہ ان کے علم میں ڈاکوؤں کا ایسا کوئی گروہ نہیں تھا مگر وہ اس کے وجود سے انکار کیسے کرتے۔ ایک مستند صحافی اور اس کی ڈاکٹر منگیتر...... جس پر اس نے سوشل ورکر کا لیبل بھی چسپاں کر دیا تھا سب سے مل کر آئے تھے۔ انہیں جھٹلانے کی گنجائش ہی نہ تھی۔ انہوں نے ڈاکوؤں کے بارے میں تفصیل سے بتایا تھا کہ ان کا سلوک کیسا تھا مگر ان کے ٹھکانے سے قطعی لاعلمی ظاہر کی تھی اور ان کے حلیے بیان کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا کہ ہم اپنے محسنوں کے خلاف پولیس میں بیان نہیں دے سکتے...... وہ لاکھ ڈاکو سہی...... ان کا کردار پولیس سے بہت بہتر تھا۔

غلام محمد بھی اسی رات ''اغوا'' ہوا تھا۔ پولیس محکمے میں گرفتار ہوگئی۔ اب اس ڈاکو عزرائیل شاہ کا ٹھکانا کہاں تلاش کرے۔ دوسری پریشانی یہ کہ غلام محمد اور اس کے ساتھیوں کے لیے دو کروڑ کے تاوان کی ادائیگی کا مطالبہ سندھ میں شہاب الدین کو موصول ہوا تھا۔ اس کیس میں ذمے داری سندھ پولیس پر آگئی تھی جو ایک ہفتے بعد بھی کسی کا پتا سراغ معلوم کرنے میں ناکام تھی۔ اب تفتیش ایک نئے پہلو سے شروع ہوئی۔ کیا پنجاب کے ڈاکو عزرائیل شاہ نے ہی تاوان کا مطالبہ ارسال کیا تھا یا اس نے غلام محمد کو اس کے ساتھیوں سمیت سندھ کے کسی گروہ کے ہاتھ بیچ دیا تھا اور قیمت کھری کرلی تھی۔ آگے وہ دگنا مال بنائیں یا چوگنا...... ان کی مرضی اور ان کی قسمت۔

میں خود صورتِ حال سے مطمئن تھا گزرے ہوئے ایک ہفتے میں میری ساری توجہ دوسرے امور کی طرف رہی تھی۔ میں اتنا اپ سیٹ تھا کہ غلام محمد کے مسئلے پر کیا سوچتا...... میرے لیے یہی کافی تھا کہ فی الحال میری جان اس کے دباؤ اور اس کی دھمکیوں سے چھوٹ گئی تھی۔

ایک دن صبح ناشتے کے بعد میں فرخ کے ساتھ اپنی زمین پر لکڑی کاٹنے اور فرنیچر بنانے کے لیے کارخانے کی تعمیر ڈسکس کر رہا تھا۔ فرخ ایک سول انجینئر تھا۔ پہلا مرحلہ صحیح جگہ پر عمارت کھڑی کرنے کا تھا۔ عمارت کتنی بڑی ہو...... کیسی ہو...... مستقبل کی ضروریات کے لیے توسیع کی کتنی گنجائش ہو۔ اس میں مشینیں لگائی جائیں یا ہینڈ میڈ فرنیچر ڈیزائن کیا جائے۔ اس کے لیے لوگوں کو روزگار ملے گا...... وغیرہ وغیرہ۔ فرنیچر کی مارکیٹنگ ہنوز دور کی بات تھی۔

غنی اور کبیر خان کے ساتھ مل کر راجا دوسرے پروجیکٹ کی فیزیبلٹی بنا رہا تھا۔ اپنی زمین کی صحیح حد بندی کا انتظام تاکہ ناجائز طور پر درخت کاٹنے والوں کو روکا جائے۔ درخت شماری اور آئندہ دس سال میں کم ہونے والے درختوں سے دگنے درخت کھڑے کرنا...... علاقے کی ترقی اور خوش حالی کا دارومدار ایسے ہی منصوبوں پر تھا۔ دریائے کنہار پر ڈیم بنا کے بجلی پیدا کرنے کا منصوبہ فی الحال خواب تھا۔ بجلی ہمیں واپڈا ہی سے لینا تھی اور ایمرجنسی کے لیے ڈیزل جنریٹر نصب کرنے تھے۔ کم سے کم سو میگا واٹ بجلی پیدا کرنے والے۔

اچانک گھنٹا بجا۔ اس گھنٹے کی بھی دلچسپ کہانی تھی۔ یہ راجا کی ذہنی اختراع تھی۔ اس نے کہا کہ کال بیل عام گھروں پر لگتی ہے۔ یہ ہے ایک نواب کی خاندانی حویلی۔ یہاں عدل جہانگیر والا گھنٹا لگایا جائے گا۔ جو ملاقاتی آئے گا وہ زنجیر کھینچے گا تو اندر گھنٹا بجنے لگے گا۔ اس خیال کی بھی ایک وجہ تھی۔ فاروقی کی بیوی کے ساتھ قدیم کمروں میں نوادرات سے کاٹھ کباڑ تک ہر چیز کا جائزہ لیتے ہوئے فریال نے یہ پیتل کا گھنٹا

دریافت کیا۔ معلوم نہیں پہلے یہ کسی چرچ میں استعمال ہوتا تھا یا مندر میں۔ اب ہر کمرے کی صفائی ہو رہی تھی اور ناکارہ چیزوں کو نکالا جا رہا تھا۔ اس میں یہ گھنٹا نکلا تو راجا صاحب کو سوجھ گئی کہ یہ کال بیل ہوگی۔

حویلی کے اندر باہر اب سکیورٹی گارڈ پہلے کے مقابلے میں بہت بڑھا دیے گئے تھے۔ گارڈ بھی پوری طرح سیکھ گئے تھے کہ حویلی میں آنے جانے والوں کے ساتھ کیسا پروٹوکول برتا جاتا ہے۔

ڈیوٹی پر موجود گارڈ نے میرے قریب آکے سلیوٹ مارا۔ ''سر ایک ملاقاتی ہے...... نام شہاب الدین بتاتا ہے۔ بولتا ہے کراچی سے آئے ہیں۔''

میں چونک پڑا۔ ''شہاب الدین...... اکیلا ہے؟''

''نو سر...... ایک ڈرائیور ہے...... پیچھے وہ اکیلا ہے مگر آگے گن مین ہے۔'' گارڈ نے رپورٹ دی۔

میں نے کہا۔ ''صرف شہاب الدین کو اندر آنے دو...... لیکن پوری تلاشی کے بعد...... اس کے لیے دو گارڈ ساتھ لے جاؤ۔''

''یس سر......'' گارڈ واپس ہوا۔

میں نے کہا۔ ''ایک بات اور سنو...... اسے اندر لا کے بٹھا۔ نہ اس کی گاڑی اندر آئے گی...... نہ اس کے ساتھی آئیں گے۔ اسے ایک گھنٹا انتظار کرنے دو...... چائے پانی سے تواضع کرو...... لیکن یہ تمہارا کام نہیں...... میں ریشم سے کہہ دوں گا۔''

ایک گھنٹے تک میں فرخ سے اپنے پلان کو ڈسکس کرتا رہا اور خوش ہوتا رہا کہ شہاب الدین دل ہی دل میں کتنی بے عزتی محسوس کر رہا ہوگا اور بے بسی بھی محسوس کر رہا ہوگا۔ اسے بالکل اندازہ نہ ہوگا کہ رفیق اب سچ مچ کا نواب بن گیا ہے۔ ایک گھنٹے میں اس کی ساری اکڑفوں جھاگ کی طرح بیٹھ جائے گی اور وہ بات کرتے وقت محتاط ہوگا۔

ایک گھنٹے بعد میں کمرے میں داخل ہوا تو بیزاری اور انتظار کی کوفت سے شہاب الدین کا حال ناگفتہ بہ تھا۔ میں نے بڑی متانت سے ہاتھ ملا کے معذرت کی۔ ''معاف کرنا میں ایک اہم معاملے میں الجھا ہوا تھا...... تمہیں انتظار کرنا پڑا۔ چائے پی تم نے۔'' میں اس کے مقابل بیٹھ گیا۔

وہ برہمی سے بولا۔ ''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہاں میرے ساتھ ایسا سلوک کیا جائے گا۔''

میں نے کہا۔ ''اگر کسی نے تمہاری بے عزتی کی ہے۔''

وہ بات کاٹ کر بولا۔ ''یہ بے عزتی نہیں تو اور کیا ہے...... میری گاڑی باہر روک لی گئی۔ میرے ساتھ آنے والوں کو روکا گیا۔ میری تلاشی لی گئی اور مجھ سے اسلحہ لے لیا گیا...... جیسے خدانخواستہ میں تمہیں شوٹ کر دوں گا۔''

میں نے سپاٹ لہجہ رکھا۔ ''یہ یہاں کا اسٹینڈرڈ پروسیجر ہے۔''

''پروسیجر آدمی کی حیثیت دیکھ کر فالو کیے جاتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''پہلی بات تو یہ کہ تم بن بلائے اور پیشگی اطلاع دیے بغیر آئے...... مجھے علم ہوتا تو میں تمہیں مہمانوں کی طرح ریسیو کرتا۔ یہ سب نہ ہوتا جس کا تم نے برا منایا۔ دوسری بات یہ کہ تم لاہور یا کراچی میں نہیں ست بدھائی اسٹیٹ میں ہو۔''

''اسٹیٹ؟ مائی فٹ، وہ پُرتحیر انداز میں بولا۔ ''ڈھائی بوٹے تے پھتو باغبان...... اب تم خود کو کہو گے یہاں کا حکمراں۔''

''یہاں لوگ مجھے نواب رفیق احمد شیرازی کی حیثیت ہی سے جانتے ہیں شہاب الدین۔ یہ ڈیڑھ سو سال پرانی ریاست ہے جس کا میں قانونی وارث ہوں۔''

وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ ''واہ...... پھر تو ریاست کا خزانہ بھی ہوگا...... فوج بھی ہوگی نواب صاحب۔''

میں نے طے شدہ پروگرام کے مطابق تالی بجائی۔ دو مسلح محافظوں نے اندر آکے سلیوٹ کیا۔ ''یس سر......''

میں نے کہا۔ ''مہمان کو باہر گاڑی تک پہنچا دو...... یہ جانا چاہتے ہیں۔''

شہاب الدین کا رنگ اڑ گیا۔ ''ایک منٹ...... ایک منٹ...... ابھی تو میں نے بات شروع بھی نہیں کی۔''

میں نے کہا۔ ''باتیں بہت کی ہیں تم نے شہاب الدین...... کام کی کوئی بات نہیں تھی اور فضول باتوں کے لیے میرے پاس وقت نہیں ہے۔''

''اوکے...... اوکے...... ہم بات کرتے ہیں۔''

میں نے محافظوں کو جانے کا اشارہ کیا اور پھر بیٹھ گیا۔ ''بولو کیا بات ہے؟''

شہاب الدین مسلسل خون کے گھونٹ پینے پر مجبور تھا۔ ''میں غلام محمد کے سلسلے میں بات کرنے آیا تھا۔''

عمداً میں نے بے خیالی کا مظاہرہ کیا۔ ''کون غلام محمد...... کہیں تم اس لاہور والے بدمعاش کی بات تو نہیں کر رہے ہو...... کہاں ہے وہ؟''

شہاب الدین نے یہ بھی برداشت کیا۔ ''اتنے انجان مت بنو...... کیا تمہیں علم نہیں کہ اسے ڈاکوؤں نے اغوا کرلیا

تھا۔‘‘

میں نے کہا۔’’مجھے کیسے علم ہوسکتا ہے؟‘‘

’’کیوں...... تم ساری دنیا سے لاتعلق ہو...... اخبار نہیں پڑھتے...... ٹی وی نہیں دیکھتے؟‘‘

میں نے نفی میں سر ہلایا۔’’یہاں یہ سب نہیں ہے شہاب الدین...... ابھی تو فون بھی نہیں ہے۔ نہ سرکاری نہ موبائل فون...... آس پاس کہیں ٹاور نہیں ہے تو سگنل نہیں آتا۔‘‘

اس نے بے یقینی سے پوچھا۔’’پھر دنیا سے تمہارا رابطہ کیسے ہے؟‘‘

’’سیٹلائٹ فون سے...... بجلی بھی نہیں ہے یہاں...... ہم اپنی پیدا کر رہے ہیں۔‘‘

’’تو پھر...... تم یہاں کیا کر رہے ہو...... جنگل میں منگل منا رہے ہو۔‘‘

میں نے کہا۔’’تم غلام محمد کی بات کر رہے تھے۔ اسے ڈاکوؤں نے اغوا کرلیا ہے تو پولیس کے پاس جاؤ...... یہاں مجھے کیا بتا رہے ہو؟‘‘

اس نے جھنجلاہٹ اور غصہ ضبط کرنے کے لیے ایک گہری سانس لے کر کہا۔’’وہ دو کروڑ مانگ رہے ہیں۔‘‘

’’آئی سی...... اگر تم یہ توقع لے کر آئے ہو میرے پاس کہ دو کروڑ میں دے سکتا ہوں...... تو تم سے بڑا بے وقوف کوئی نہیں ہوسکتا...... میں اب دو روپے بھی اس کی رہائی کے لیے دینے کو تیار نہیں۔‘‘

’’تم بھول رہے ہو کہ وہ تمہارا باس تھا اور اس کے لیے تم کہاں کہاں سے بھتے چندے وصول کرتے تھے۔‘‘

’’دیکھو شہاب الدین...... میں آخری بار تمہیں وارننگ دے رہا ہوں...... حقیقت کو دیکھو...... سمجھو...... وقت کسی طوائف سے بھی جلدی نظر پھیر لیتا ہے اور کسی سے وفا نہیں کرتا...... تم دیکھ ہی رہے ہو۔‘‘

شہاب الدین کے ماتھے پر پسینا آگیا۔’’مجھے اس لیے آنا پڑا کہ تم سے رابطے کی کوئی صورت نہیں تھی۔ غلام محمد کی بازیابی کے لیے پولیس پوری کوشش کر رہی ہے۔‘‘

میں نے کہا۔’’تم دو کروڑ دے کیوں نہیں دیتے۔ اس کی اتنی قیمت تو ہونی چاہیے تنظیم کے لیے۔‘‘

’’میں کہاں سے لاؤں؟‘‘

’’ہاں...... وہ کون سا باپ تھا تمہارا...... اور تھا بھی تو دو کروڑ تم اپنی جیب سے کیوں دو...... تنظیم دے...... تم نے چیف سے بات کی؟‘‘

’’ہاں...... اس نے کہا تھا سودا کرو...... مگر ڈاکو سودا کرنے پر بالکل راضی نہیں...... حالانکہ اغوا برائے تاوان کی وارداتوں میں جتنی رقم وہ مانگتے ہیں بعد میں اس کی چوتھائی قبول کرلیتے ہیں۔‘‘

میں نے کہا۔’’پھر تو مجبوری ہے تنظیم کی...... لیکن شہاب الدین...... آج اگر غلام محمد مارا گیا۔ محض تاوان ادا نہ ہونے کے باعث...... تو کیا تمہارے لیے خطرے کی گھنٹی نہیں ہے تنظیم کل کو دو کروڑ کے لیے تمہیں بھی مر جانے دے گی۔ اتنی کم قیمت تو نہیں ہوسکتی تمہاری...... اور ان تمام قربانیوں کی جو تم نے تنظیم اور چیف کے لیے دی تھیں۔‘‘

’’اگر تم نے ہمیں برطانیہ پہنچانے اور سیاسی پناہ دلوانے کے معاملات میں دلچسپی لی ہوتی تو...... یہ نوبت ہی نہ آتی۔‘‘

’’میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم ذہنی طور پر معذور ہو چکے ہو یا اندھے کہ نہ کچھ دیکھتے ہو نہ سوچتے ہو...... نائن الیون کے بعد برطانیہ جانا اتنا مشکل نہیں ہوا تھا جتنا سیون سیون کے بم دھماکوں نے بنا دیا ہے۔ اب تو خود ہوم منسٹر کی سفارش بھی کام نہیں کرتی۔ اسٹوڈنٹ اور ٹورسٹ ویزا ملنے میں مہینوں لگ جاتے ہیں۔ وہ بے وقوف غلام محمد مجھے بدمعاشی دکھاتا تھا...... بتاؤ میں کیا کروں؟‘‘

’’تمہارے پاس ایک طریقہ تھا۔‘‘

’’وہ بھی میں ٹرائی کرتا مگر وہ آئی ہی نہیں...... میں نے کہا۔

’’اب تو آرہی ہے...... اپنی ماں کے ساتھ۔‘‘

یہ میرے لیے چونکا دینے والی خبر تھی مگر میں کسی نہ کسی طرح اپنے ردعمل کو کنٹرول کرنے میں کامیاب رہا۔’’وہ تو...... معلوم ہے مجھے۔‘‘

’’اس وقت میرے آنے کا مقصد کچھ اور ہے...... میری بالکل سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ ڈاکو تمہیں بیچ میں کیوں ڈالنا چاہتے ہیں۔‘‘

اب میں نے چونکنے کی اداکاری کی۔’’مجھے؟‘‘

’’ہاں تمہیں...... وہ کہتے ہیں کہ رہائی تمہارے ذریعے ہوگی اور ادائی بھی...... یہ سب کیا ہے رفیق؟‘‘ وہ تلخی سے بولا۔

’’خبر تم لائے ہو تو مطلب بھی تم بتاؤ۔‘‘ میں نے برہمی سے کہا۔

’’پولیس نے بہت سے بااثر لوگوں کو بیچ میں ڈالا۔ مخبروں کی خدمات بھی حاصل کرکے دیکھا۔ وہ کہتے ہیں نواب رفیق احمد شیرازی کے سوا کسی کی ثالثی قبول نہیں۔ میری تو عقل کام نہیں کرتی۔ سندھ کے وڈیرے سب ڈاکوؤں کو جانتے ہیں۔ ڈاکو انہیں مانتے ہیں۔ پولیس کے رابطے بھی ہوتے ہیں۔ تمہیں وہاں کوئی جانتا ہے تو کیسے؟ کس نے سنا ہے ست بدھائی کا نام؟ نواب رفیق احمد شیرازی کا نام۔‘‘

’’یہ بھی انہی سے پوچھ لیتے۔‘‘ میں نے طنز سے کہا۔

’’میں عجیب مشکل میں گرفتار ہوں۔ مجھے دھمکی دی گئی ہے کہ میں نے یہ نام پولیس کو بتایا یا میری زبان سے کسی اور کے سامنے ادا ہوا تو اگلے دن غلام محمد کی لاش وصول کرلینا۔‘‘

’’یہ معاملہ تو میرے لیے بھی ناقابل فہم ہے۔ بتاؤ اب میں کیا کروں۔ مجھ سے تو کسی نے رابطہ کیا نہیں سوائے تمہارے...... اگر مذاکرات طے ہوتے کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں ڈنر ٹیبل پر...... تو میں چلتا تمہارے ساتھ اور معاملات خوش اسلوبی سے طے پا جاتے...... مجھے کہاں لے جاؤ گے تم...... بولو۔‘‘

وہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتا رہا۔ یوں لگتا تھا کہ کچھ دیر میں وہ پاگل ہو کے اپنے سر کے بال نوچنے لگے گا۔ ’’تم جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو؟‘‘

’’شہاب الدین...... میں تم سے ڈرتا نہیں ہوں...... میں ڈاکوؤں سے اکیلا جا کے بھی بات کرسکتا ہوں میرا کوئی نقصان نہیں اس میں۔‘‘

’’وہ ضرور رابطہ کریں گے تم سے...... شاید میں جلدی آگیا۔ میں واپس کراچی نہیں جاسکتا۔ یہاں لاہور میں انتظار کروں گا۔ تنظیم کے ذیلی دفتر میں تم مجھ سے مل سکتے ہو۔‘‘ وہ بہت اپ سیٹ تھا۔

’’تم دو کروڑ دینے کے لیے تیار ہو؟‘‘

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔’’وہ کیش چاہتے ہیں۔ کیش موجود ہے میرے پاس۔‘‘

’’اگر کسی نے مجھ سے رابطہ کیا۔ تو میں تمہیں بتا دوں گا یا ان کا فون تمہیں موصول ہو تو تم کہہ دینا کہ نواب صاحب بیچ میں پڑنے کے لیے تیار ہیں۔‘‘

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔’’میں انتظار کروں گا تمہارا...... یہ جاگیر کتنی وسیع ہے تمہاری۔‘‘

میں نے کہا۔’’اتنی ہے کہ ابھی میں جائزہ لے رہا ہوں۔ ویسے یہ دریا بھی اسی جاگیر کی حدود سے گزرتا ہے۔ ایک زمانے میں اسمال ڈیم آرگنائزیشن نے یہاں کبھار ڈیم کی فیزیبلٹی بنائی تھی۔ چھوٹا ڈیم بن سکتا تھا۔ معلوم نہیں کیوں وہ منصوبہ ترک کردیا گیا اب میرا پروگرام ہے۔‘‘

اس کی آنکھیں بے یقینی سے پھیل گئیں۔’’کیا؟ ڈیم بناؤ گے تم؟‘‘

میں نے مسکرا کے کہا۔’’نہیں...... بنائیں گے تو انجینئر...... ہمیں مالی امداد فراہم کرنے والوں کا کوئی کنسورشیم ہوگا۔ لیکن فوائد ست بدھائی کو حاصل ہوں گے۔ یہ جو پہاڑ تم نے آتے ہوئے دیکھے ہوں گے۔ سڑک انہی کے درمیان سے گزرتی ہے۔ پہاڑ کیا پہاڑیاں ہیں...... لیکن یہی ڈیم کی سائٹ ہوگی۔ اس سے یہاں بہت سے ڈیولپمنٹ پراجیکٹ شروع ہوں گے۔ گرد و نواح کا سارا جنگل میرا ہے۔ یہاں بہت کچھ ہوسکتا ہے۔‘‘

میرا ارادہ شہاب الدین کو مرعوب کرنے کا تھا تو میں اس میں بے حد کامیاب رہا۔ اس کی آنکھیں یہ تفصیلات جان کے کھلی رہ گئیں۔ اس کے لیے بھی یہ سب کچھ طلسم ہوشربا سے کم نہ تھا۔ یہ عالی شان تاریخی حویلی...... گرد و پیش کا ماحول اور میرے پلان...... گنگو تیلی اچانک راجا بھوج ہوگیا تھا۔ قسمت بننے کے افسانوی واقعات اس نے سنے ہوں گے...... دیکھنے کا یہ پہلا اتفاق تھا...... وہ کالج لیکچرر کا لونڈا جو کل تک تنظیم کے ادنیٰ کارکنوں میں شمار ہوتا تھا اشارہ ابرو پر سارے جائز ناجائز کام کرنے پر مجبور تھا۔ اعلیٰ تعلیم کے بہانے ملک ہی چھوڑ کے بھاگ گیا تھا۔ اللہ نے کیسے اس کے دن پھیرے...... وہ پچ پچ کا نواب ہے۔ دولت اور طاقت۔ عزت اور شہرت۔ حاکمیت اور شان و شوکت سب کچھ رکھنے والا۔ الہ دین جسے چراغ مل گیا اور چراغ کے جن نے اسے سب دلوا دیا۔

شہاب الدین کو پورے پروٹوکول کے ساتھ رخصت کیا گیا۔ وہ سخت امپریس ہوا اور جاتے وقت اس کے رویے کی ساری رعونت ختم ہوچکی تھی۔ اپنے ڈائیلاگ اور اپنی اداکاری پر میں سب کے ساتھ بہت دیر ہنستا رہا لیکن اباجی کے خیال سے ہم نے آواز بلند نہیں کی۔ جب رابعہ آئی تو ہم سب خاموش ہوگئے۔

حویلی کے اندر کام جاری تھا۔ اندر کی مرمت اور رنگ روغن ختم ہوجانے کے بعد فریال نے کمروں کو رہائش کے لائق بنانے کے لیے آراستہ کرنا بھی شروع کردیا تھا۔ دیکھا جاتا تو صبح سے شام تک وہ سب سے زیادہ مصروف رہتی تھی۔ معمول کے مطابق شہناز تو اپنی اسسٹنٹ ریشم کے ساتھ بیگ اٹھا کے گرد و نواح میں رہنے والوں کو دیکھنے نکل جاتی تھی۔ اس کے کام میں بک بک زیادہ تھی۔ دیہاتی بچوں کو ٹیکے لگوانے کے قائل نہیں تھے۔ انگریزی دوائیں نہیں کھاتے تھے کہ گرم ہوتی ہیں۔ خاندانی ٹوٹکے اور حکیمی نسخے ان کے نزدیک ہر مرض کا علاج تھے اور مرض لاعلاج ہوجائے تو پھر

دم کیا ہوا پانی، جھاڑ پھونک، فلاں کا تعویذ اور فلاں پیر کے آستانے کی خاک۔ یہ ان کے لیے صدیوں کے آزمودہ علاج تھے جن کو ترک کرنے پر وہ آسانی سے راضی نہیں ہوتے تھے مگر شہناز بھی ہمت ہارنے والی نہیں تھی۔ وہ اپنا کام مستقل مزاجی سے کر رہی تھی اور اسے یقین تھا کہ حالات بالآخر اس کے حق میں ہو جائیں گے۔ جب بیماریاں دور ہوں اور گھر میں صحت نظر آنے لگے گی۔ بچوں کی تعداد کم رکھنے کے متنازع مسئلے کو اس نے ابھی نہیں چھیڑا تھا۔ ''جب لوگ میری ماننے لگیں گے، تب یہ بات کروں گی۔'' وہ کہتی تھی۔

فریال ہر صبح غنی کو آرڈر لکھواتی تھی۔ اس میں ہر کمرے کے آرائش کے لیے ضروریات کی فہرست ہوتی تھی۔ سب سے پہلے اس نے اماں اور ابا کو ان کے بیڈروم میں شفٹ کیا تو وہ حیران رہ گئے۔ وہاں ان کے آرام و آسائش کی ہر چیز موجود تھی۔ ایک چھوٹا سا فریج، ایک ٹی وی، ضروری فرنیچر۔ باہر سے پلمبروں نے لائنوں کو درست کر دیا تھا چنانچہ باتھ روم سیٹ ہو گئے تھے۔ پانی کی نکاسی کے لیے یہاں سیوریج لائن تو تھی نہیں۔ فرخ نے خاصے فاصلے پر سیپٹک ٹینک بنوا دیے تھے۔ بجلی ہنوز براہِ راست پول سے آ رہی تھی اور واپڈا کے ایک اہلکار کے ذریعے مجھے یہ ''خوش خبری'' ملی تھی کہ بہت جلد میٹر بھی لگ جائے گا لیکن نواب صاحب فکر نہ کریں، ہم جو ہیں ان کے خادم۔ بجلی دس ہزار کی جلائیں یا بیس کی، میٹر ایک چوتھائی شو کرے گا۔ ایک چوتھائی ہمارا انعام، آدھے کی بچت۔

پہلے فریال کا ساتھ رابعہ دے رہی تھی، اب وہ کچھ بددلی کا شکار تھی لیکن فاروقی کی بیوی اسے کسی نہ کسی کام میں لگائے رکھتی تھی۔ حویلی کی انتظامی تقسیم فاروقی کی بیوی نے اماں اور ابا کی راہنمائی کے مطابق ایسے کی تھی کہ ایک حصہ خود بخود زنانہ رہائش گاہ بن گیا تھا۔ دوسرا مردانہ۔ اصل حد ایک اخلاقی ذمے داری سے متعین ہوتی تھی۔ ابتدا میں اماں اور ابا ہمارے رشتوں کی بے تکلفی سے کچھ مطمئن نہیں تھے مگر آہستہ آہستہ انہیں بھی یقین آ گیا کہ کوئی بھی دوستی میں اعتماد کی حد کو پار کرنے کا قائل نہیں۔ پھر مجبوراً ہی سہی مگر انہوں نے صورت حالات کو قبول کر لیا۔

فریال نے اسی طرح تمام نیچے والے رہائشی حصے کی آرائش میں دن رات ایک کیا تھا۔ دیکھتے دیکھتے حویلی کا نقشہ بدل رہا تھا۔ باہر سے مرمت اور آرائش کا کام نہیں زیادہ مشکل اور طویل تھا مگر اندر کا حصہ سب کی روز و شب کی محنت سے بارونق ہو گیا تھا۔ درمیان میں گھاس گھنی ہونے لگی تھی۔ پودے بڑھ رہے تھے۔ فوارے کی مرمت ہو گئی تھی کو اس میں پانی چلانے کا مسئلہ حل نہیں ہوا تھا۔ اس کام میں ہر شخص کی دلچسپی ایک جیسی تھی۔ غنی نہ جانے کہاں سے ایک ہرن کا بچہ پکڑ لایا۔ اسے درمیان میں چھوڑ دیا گیا۔ پھر کبیر کیوں پیچھے رہتا۔ وہ بطخیں لے آیا۔ دیکھتے دیکھتے وہ اجاڑ مٹی دھواں اور خس و خاشاک سے بھرا میدان ایک باغ میں ڈھلنے لگا۔

اوپر والی منزل کو ہنوز کسی نے نہیں چھوا تھا۔ نیچے والے حصے میں کھڑی ہوئی قدیم کاروں کو صاف کر کے چمکانے کی ذمے داری ریشم نے غنی کو سونپی اور اس نے وہ کام کیا کہ خود میں ایک دن دیکھ کے دنگ رہ گیا۔ ایک دن میں اباجی کا دل بہلانے کے لیے اپنے ساتھ لے گیا۔ اس سے پہلے وہ جگہ اس قابل ہی نہ تھی کہ میں انہیں لے جاتا۔ ان قدیم کاروں کو دیکھ کر اباجی کی عجیب حالت ہوئی۔ وہ ان پر پیار سے ہاتھ پھیرتے رہے اور فخر کے جذبات ان کی آنکھوں سے غرور بن کر چھلکنے لگے۔

میں نے کہا ''اباجی! یہ کاریں جو ہمارے آباواجداد کے زیرِ استعمال رہیں اب نوادرات میں شامل ہیں۔ اینٹیک کاریں نیلامی کے لیے پیش کی جائیں تو دنیا بھر سے بولی آتی ہے۔''

اچانک اباجی کا چہرہ تاریک ہو گیا ''نیلامی...... رفیق! کیا تمہیں مزید دولت کی ضرورت ہے ابھی؟''

میں سمجھ گیا کہ کاروں کی نیلامی کا سن کے انہیں شدید دکھ ہوا ہے۔ میں نے کہا ''اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا کہ میں انہیں بیچوں گا۔''

ان کی صورت پر اطمینان آ گیا ''یہ نشانیاں ہیں ہمارے آباواجداد کی رفیق! کیا ہم انہیں کباڑ سمجھ کے بیچ سکتے ہیں؟ ایک خاندانی نواب اور ایک کباڑی میں پھر کیا فرق رہ جائے گا۔ تم وارث ہو اس تاریخ کے۔''

اس دن پہلی بار اباجی نے خود اپنی زبان سے مجھے خاندانی نواب کہا تو میرا سر بھی فخر سے اٹھ گیا۔ میں نے کہا ''آپ ان گاڑیوں میں دورہ کریں گے اپنی ریاست کا؟''

''مگر یہ چلتی کہاں ہیں؟'' انہوں نے خوش ہو کے کہا۔

''غنی چلا دے گا۔ یہ جینوئن کنڈیشن میں ہیں۔''

یہ صوفی چچا کے انتقال کے ایک ہفتے بعد کی بات تھی۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی میرے ساتھ چلے گئے تھے لیکن اس کے بعد میں نے انہیں خوش دیکھا تو مجھے اپنی کوشش کی کامیابی کا اندازہ ہوا۔ اسی شام وہ اماں کے ساتھ وہاں پھر گئے۔ اماں

بےچاری اینٹیک کاروں کی قدر و منزلت اور قیمت کو کیا جانیں مگر ان کے لیے یہ سب خاندانی خزانے تھے۔ وہ خوش کیسے نہ ہوتیں۔ اب میرے ہاتھ ایک طریقہ آ گیا تھا کہ ان کا غم کیسے غلط کیا جا سکتا ہے؟

دوسرے تیسرے دن ایک اور ایسی ہی بات ہو گئی تھی۔ اباجی اپنا زیادہ وقت قبروں کے سرہانے تلاوت میں گزارتے تھے یا پھر اپنے کمرے میں چپ بیٹھے رہتے تھے۔ یہی کیفیت اماں کی تھی۔ ہر نماز کے بعد تلاوت اور زیرِ لب وظیفے کرتی تھیں۔ وہ گھنٹوں جائے نماز پر بیٹھ کے گزار دیتی تھیں۔ کوئی بھی ان سے کیسے کہہ سکتا تھا کہ وہ ہنسیں بولیں۔ گرد و پیش میں دلچسپی لیں۔ ان کا غم ہنوز تازہ تھا اور یہ صرف رابعہ تھی جس کا حوصلہ بڑھانے کے لیے وہ کچھ دیر کے لیے باہر آ جاتے تھے۔

ایک رات پہلے فاروقی آ گیا تھا۔ اس کی آسانی کے لیے ہم نے یہ آفر کی تھی کہ ہفتے کی شام غنی بس سے لاہور پہنچے اور اسے لے آئے اور پھر پیر کی صبح اسے لے جائے لیکن اس نے کہا کہ ایک ڈرائیور رکھنے کے معاملے پر تو وہ پہلے بھی سنجیدگی سے غور کر رہا تھا کیونکہ لاہور کی ٹریفک میں ڈرائیونگ ایک آزمائش بنتی جا رہی ہے۔ دن بھر عدالتوں میں بحث کرنے، قانونی جنگ لڑنے اور شام کو موکلوں سے سر کھپانے میں اس کا دماغ خرچ ہو جاتا تھا۔ ڈرائیونگ بیک وقت جسمانی اور حاضر دماغی کا کام تھا۔

وہ ڈرائیور کے ساتھ شام ہوتے پہنچ جاتا تھا۔ اس نے ہفتے کو دفتر کے اوقات کار ختم کر دیے تھے۔ سب اس کا مذاق اڑاتے تھے تو وہ تسلیم کرتا تھا کہ بیوی کی وجہ سے اس نے اپنا معمول زندگی میں پہلی بار بدلا ہے اور ہو سکتا ہے کچھ عرصے بعد پیشہ بھی بدل دے۔ ست بدھائی میں وکالت کی پریکٹس تو ممکن نہیں۔ راج مزدور یا ترکھان کا کام شروع کر دے۔ عشق میں بندہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ گھاس کھودنے سے گھاس کھانے تک۔

اس کے آنے سے بڑی رونق آ جاتی تھی۔ وہ سدا کا منہ پھٹ تھا اور کسی سے کچھ بھی کہہ دیتا تھا۔ اسے نہ کسی کا لحاظ تھا نہ ڈر۔ کوئی اس کی بات کا برا بھی نہیں مانتا تھا۔ گزشتہ رات ہم باغ میں دریاں بچھا کے بیٹھے رہے تھے اور چاند کی روشنی میں رات کا کھانا بھی کھایا تھا۔ اس سے اباجی کی طبیعت کچھ فرحاں شاداں تھی۔

صبح فریال نے ناشتے کے بعد اباجی سے پوچھا ''آپ نے اپنی خاندانی گیلری نہیں دیکھی ابھی تک؟''

اباجی نے کہا ''سنا تو تھا کہ کوئی گیلری ہے۔''

میں نے کہا ''فریال نے اس پر بہت محنت کی ہے۔ پورے ہال کو ری ڈیکوریٹ کیا ہے۔ ساری تصویروں پر سے گرد جالے صاف کر دیے ہیں۔''

فریال بولی ''آئیے آپ کو دکھائیں۔''

خاندانی کاریں دیکھنے کے بعد اباجی کی دلچسپی اپنے آباواجداد کے تاریخی ورثے میں بڑھ گئی تھی۔ وہ فوراً تیار ہو گئے۔ ابھی تک دنیا کے جھمیلوں میں اور حویلی کے کاموں میں کسی کا دھیان بھی آرٹ گیلری کی طرف نہیں گیا تھا۔ فریال نے تحریک چلائی تو رابعہ کی دلچسپی بھی جاگی اور فاروقی بھی اپنی بیوی کے ساتھ چل پڑا۔

جب فریال نے اس وسیع و عریض ہال کا دروازہ کھول کے لائٹس آن کیں تو ایک دم روشن ہو کے سامنے آ جانے والے منظر نے کچھ دیر کے لیے اباجی کو مبہوت کر دیا۔ خود فاروقی اور اس کی بیوی اس منظر سے مسحور سے ہو گئے۔ ہر تصویر کے اوپر اسپاٹ لائٹ اس زاویے سے لگائی گئی تھی کہ بلب دکھائی نہیں دیتا تھا۔ روشنی پوری تصویروں کو اوپر سے نیچے تک نمایاں کر دیتی تھی۔ سر کے اوپر ایک پوائنٹ سے پھیلنے والی لائٹ ہر فریم کے نچلے حصے تک تقریباً آٹھ فٹ لمبی مستطیل بناتی تھی اور پھر فرش پر اتر جاتی تھی۔ ہر دیوار کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک ایسی تکوین روشنی کے آبشار کی طرح لگتی تھیں جو اوپر سے پھوٹا ہو، اس کے علاوہ ہال میں کوئی روشنی نہیں تھی۔

اباجی آہستہ آہستہ آگے بڑھے۔ ابھی تک ان کی نظر پورے ہال کے منظر کو دیکھ رہی تھی۔ اب انہوں نے باری باری ہر تصویر کو دیکھنا شروع کیا۔ تصویر پر ان کے کسی جدِ امجد کا نام تھا۔ اس کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات۔ وہ جیسے حال سے ماضی میں چلے گئے۔ فریال انہیں بتاتی رہی۔ وہ سب جو اسے معلوم تھا لیکن یہ خاندانی تاریخ کا وہ گمشدہ سبق تھا جس کی تفصیل سے وہ بھی آگاہ تھے۔

خود اماں کی عجیب کیفیت تھی۔ وہ سب جو ایک نام سے زیادہ نہ تھے۔ آج ایک واضح اور حقیقی شکل میں یوں ان کے سامنے آ گئے تھے جیسے وہ زندگی میں تھے۔ اب انہیں تصور کی آنکھ سے دیکھنا ضروری نہیں تھا۔ وہ ہم سب کو اسی طرح دیکھ رہے تھے جیسے ہم انہیں اور اباجی تو جیسے ہم سے الگ ہو کے انہی کے ساتھ چلے گئے تھے۔ انہی سے ہم کلام تھے۔ انہی کے وقت میں پہنچے ہوئے تھے۔

فاروقی اور اس کی بیوی کی دلچسپی محدود تھی۔ ان کا کسی نقشِ ماضی سے جذبات کا ذاتی رشتہ نہیں تھا۔ ان تصویروں کو

وہ ایسے ہی دیکھ رہے تھے جیسے میوزیم میں آنے والے پرانی چیزوں کو دیکھتے ہیں۔ رابعہ کا انہاک کچھ زیادہ تھا اور اماں بھی حیرت سے ماضی کے نقش دیکھنے میں مگن تھیں لیکن ابا جی کی جذباتی کیفیت کو بیان نہیں کیا جاسکتا۔ وہ جیسے خود سے باتیں کررہے تھے یا اپنے بزرگوں سے مخاطب تھے۔ ان کی آنکھوں سے وفورِ جذبات سے آنسو بہہ رہے تھے۔ کبھی وہ مجھ سے کچھ کہتے تھے کبھی اماں سے تو کبھی اماں سے تو کبھی رابعہ سے۔ فریال قدم قدم ان کے ساتھ تھی۔ کسی میں اتنی اخلاقی جرأت نہ تھی کہ ان سے جلدی کرنے کو کہتا۔

فاروقی اور اس کی بیوی سب سے پہلے کھسکے تھے۔ کچھ دیر بعد رابعہ نے میرے کان میں آہستہ سے کہا "میرا دل گھبرا رہا ہے یہاں کزن! میں جاؤں؟"

میں نے سر ہلایا "جاؤ۔ دیکھو فرخ شاید چھت پر ڈش انٹینا لگوا رہا ہے۔"

اچانک ابا جی میری طرف پلٹے۔ "یہ سب نذیر نے نہیں دیکھا۔ تم نے اسے دکھانے کی کوشش بھی نہیں کی۔" ان کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

میں نے جھوٹ موٹ بہتر سمجھا "اس وقت تک مجھے بھی علم نہیں تھا ابا جی!"

"کیسی بدنصیبی کی بات ہے۔ تمہاری دادی کے نصیب میں یہ خوشی نہ تھی۔ اس کو صرف اس جگہ کی مٹی ملی۔"

میں نے انہیں تسلی دی "یہ سب اللہ کی مرضی ہے ابا جی!"

"اچھا اب تم لوگ جانا چاہو تو جاؤ۔ میں ابھی یہاں رہوں گا۔ کچھ دیر بعد آؤں گا۔"

اماں نے مجھے چلنے کا اشارہ کیا "تم مجھے تو کمرے تک چھوڑ آؤ پہلے، میں زیادہ دیر کھڑی نہیں رہ سکتی۔" پھر انہوں نے فریال سے کہا "تم جاکے رابعہ کو دیکھو۔ وہ اکیلی بیٹھی رو رہی ہوگی۔"

یہ کہنے کی بات نہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اماں کے جذبات وہ نہیں تھے جو میرے یا ابا جی کے تھے۔ ہو بھی نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے ایک عمر جو اس گھر کے روایتی ماحول میں گزاری، کسی طرح بھی قابلِ رشک نہ تھی۔ دادی ان کے لیے ساس تھیں جو بیٹے یا پوتے کے لیے مجسم محبت اور شفقت بنی رہیں مگر اس رشتے کی وجہ سے جو ان کے اور اماں کے درمیان قائم تھا، لحاظ اور مروت کے جذبات کبھی محبت اور اپنایت کے اس درجے تک نہ پہنچے جو بیٹی کے لیے دل میں قدرتی طور پر ہوتے ہیں۔ زبان سے لاکھ دعوے ہوں اور دنیا میں سو فیصد کا کلیہ کہیں درست نہیں ہوتا مگر غریب اور جاہل عورت سے لے کر وزیرِاعظم اندرا گاندھی اور ملکہ برطانیہ تک ساس بہو کے رشتے میں کشیدگی ہر جگہ محسوس ہوئی۔ شاید یہ فطری بات اور فطرت بدلی نہیں جاسکتی۔

اماں اور چچی کے تعلقات دکھاوے کے لیے بھی اچھے نہ ہوئے اور ان کے درمیان ہر وقت ہر جگہ جاری رہنے والی سرد جنگ آئے دن کھلی جنگ میں تبدیل ہوجاتی تھی۔ اس میں قصوروار چچی کی تند مزاجی تھی لیکن عفو و درگزر کی صلاحیت اماں میں بھی نہ تھی۔ ان کا فطری ردِعمل یہ ہوتا تھا کہ بڑی میں ہوں، میں کیوں دب کے رہوں؟

اب رہے صوفی چچا تو سدا کے نکھٹو۔ زن مرید اور ابا کے مقابلے میں کوئی قابلِ ذکر کردار نہ رکھنے والے۔ ابا کی اپنے ماں جائے سے محبت کی جڑیں پیدائش سے خونی رشتوں پر استوار تھیں اور ابا کا دل اتنا بڑا تھا کہ وہ چچی کو بھی محبت کا سائبان فراہم کرتے تھے۔

اب یہی وجہ تھی کہ اماں کے اور ابا کے جذبات میں زمین آسمان کا فرق نظر آتا تھا۔ اماں یہ سمجھتی تھیں کہ خاندان کے حق میں جو برا ہوا سو برا ان کے حق میں تو اچھا ہی ہوا۔ اگر انہیں افسوس ہوگا تو قدرت کے فیصلے میں تاخیر کا۔ ساری زندگی تو رشتوں کا بھرم رکھنے میں گزر گئی۔ اب زندگی کی ساری خوشیاں ملیں تو کیا ملیں۔

جس روز شہاب الدین آیا، اسی روز رات کے وقت کھانے کے بعد میری راجا سے بات ہوئی۔ اب شامی بادشاہ سے رابطہ ضروری تھا۔ راجا کو امید تھی کہ رابطہ وہ خود کرے گا۔ عجیب بات تھی کہ اس تک پیغام رسانی کا ذریعہ وہی مجذوب دیوانہ تھا جسے یہاں کچھ لوگ پہنچا ہوا سمجھتے تھے مگر وہ اللہ لوک درحقیقت پولیس کا مخبر تھا۔ اس کے بارے میں بھی یقین سے نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ کس وقت کہاں ملے گا۔ میرے ایک سکیورٹی گارڈ نے جو اس سے بے حد عقیدت رکھتا تھا، پہلے بھی اسے تلاش کرلیا تھا۔ اب پھر یہ خدمت اس کے سپرد کردی گئی تھی۔

فی الحال ہر محاذ پر ایک وقتی سکون کا وقفہ آگیا تھا۔ یہ صوفی چچا کے نہ رہنے سے ہوا تھا۔ رانا کاکاسو کی واپسی کا مطالبہ دب گیا تھا کیونکہ اس نے اکبر خان کے ذریعے ایک پیشکش کی تھی۔ کسی وجہ سے اکبر خان نہیں پہنچا اور وہ ایگریمنٹ کھٹائی میں پڑ گیا جس کی رو سے سائنس ریسرچ سینٹر ہمیشہ کے لیے انہیں مل جاتا اور میری طرف سے سارے اندیشوں کا سدِباب ہوجاتا۔ اب شاید وہ کچھ اور سوچ رہے تھے۔ غلام محمد کی بدمعاشی کا راستہ خود میں نے بند کردیا تھا اور

شہاب الدین بھاگا ہوا میرے پاس آیا تھا تو اس کتے کی طرح دم دبا کے بھاگا تھا جو غرا کے حملہ کرنے آئے مگر سر پر ڈنڈا پڑے تو چیاؤں چیاؤں کرتا پلٹ جائے۔ بہ ظاہر سلطان بھی فریال کی تلاش میں وقتی ناکامی کے زیرِ اثر کوئی نئی حکمتِ عملی وضع کرنے میں مصروف تھا، چنانچہ امن تھا۔

رات کو میں فریال کے ساتھ ٹہلتے ٹہلتے باہر نکل گیا۔ جنگل کی خاموشی میں مجھے یوں لگا جیسے کوئی عورت گا رہی ہے۔ میں فریال کے ساتھ آواز کی سمت بڑھا جو قبرستان کی طرف سے آرہی تھی۔ ہم دبے پاؤں چلتے ہوئے قریب پہنچے تو شک کی کوئی بات ہی نہ رہی۔

آواز اس کمرے میں سے آرہی تھی جو خونی کنویں کو بند کرکے بنایا گیا تھا۔ غنی اور ریشم نے نہایت ڈھٹائی بلکہ بے ثری کے ساتھ اسے اپنی خلوت گاہ بنا رکھا تھا۔ کمرے کی ایک دیوار کی اینٹ نکلی ہوئی تھی۔ میں نے اور فریال گھٹنوں کے بل جھک کے دیکھا تو غنی فرش پر دراز نظر آیا۔ ریشم اس کے سامنے ایک فلمی رقص پیش کررہی تھی اور اپنی بے سری آواز میں گا بھی رہی تھی۔ فنی اعتبار سے رقص و موسیقی کا یہ مظاہرہ کتنا ہی بے ہودہ سہی۔ جسے خوش کرنے کے لیے ریشم ناچ رہی تھی، وہ اس کی اداؤں پر ریشہ خطمی ہوا جارہا تھا اور اس کی نظروں میں ایسی وارفتگی تھی کہ بیان نہیں کی جاسکتی۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنے پہلو سے شراب کی بوتل نکال کے گھونٹ بھرا تو وارفتگی کا سبب سمجھ میں آیا۔

یہ گانا ختم ہوا تو ریشم بگڑ گئی "یو شرابی، ہاؤ مائی ڈانس، یو ناٹ کی۔"

غنی بولا "اچھا، یہ ڈانس تھا۔ پہلے کیوں نہیں بتایا؟"

ریشم لال پیلی ہوگئی "اور کیا میری شلوار میں تتیوڑیاں گھسی ہوئی تھیں کمینے!"

"کیا پتا...... اتار کے دیکھ۔" وہ بے شرمی سے ہنسا۔

"تیری خاطر اتنی محنت کی تھی میں نے...... حرامی، بی بی کمانے اتنی تعریف کی تھی میری۔"

فریال کی ہنسی چھوٹ گئی، ریشم کو جیسے کرنٹ لگ گیا۔ وہ ہڑبڑا کے باہر بھاگی۔ غنی نے بدحواسی میں بوتل چھپائی اور لائٹ آف کردی۔ جب ہم نے دوسری طرف منہ کرکے دیکھا تو ریشم اندھیرے میں دوڑتی جارہی تھی۔ غنی باہر ہی نہیں نکلا۔

اندر جاکے فریال نے ایک اور ڈراما دیکھا۔ تاریکی سے نکل کے ریشم اچانک اپنے دونوں کان پکڑے سامنے آگئی "میڈم! وری سوری۔"

فریال نے کہا "سوری کس بات پر؟"

"وہ میڈم، جو آپ نے دیکھا...... وری بیڈ۔"

"چھوڑو اپنے کان، پاگل...... ڈانس ہی کررہی تھیں نا تم۔ معافی کس بات کی مانگ رہی ہو۔" فریال نے کہا "تمہیں شوق ہے ڈانس کرنے کا؟"

ریشم خوش ہوگئی "شوق تو ہے میڈم! آئی ڈانس ان فلم۔ غنی ناٹ لائک ڈانس۔"

"اگر ایسی بات ہے تو پھر چھوڑ دو یہ خیال۔ زندگی تو تمہیں اسی کے ساتھ گزارنی ہے۔"

اس کا چہرہ لٹک گیا "یس میڈم! یہ مجبوری تو ہے۔ میں نے تو دھمکی دے کر بھی دیکھا۔ وہ کہتا ہے مجھے تم سے ڈانس نہیں کرانا ہے شادی کے بعد۔ گھر کا کام کرانا ہے۔"

"میں سمجھاؤں گی اسے۔ اگر تم صرف شوق کی خاطر گھر میں ڈانس کرتی ہو تو اسے اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔"

"وہ کہتا ہے، بچوں کے سامنے ناچوگی...... اور اس کے بعد بہوؤں کے سامنے، پوتوں کے سامنے۔"

فریال کے ساتھ مجھے بھی ہنسی آگئی "اتنی دور کی ابھی سے فکر ہے؟"

اندر سے رابعہ نکلی۔ اس نے اشارے سے مجھے بلایا۔ میں قریب پہنچا تو وہ اتر کے نیچے آگئی۔ "میں عدالتِ عالیہ کا سمن لائی ہوں کزن!" بہت دن بعد اس کی پرانی شوخی مجھے اچھی لگی۔

"یار! معاملہ کیا ہے؟"

"وہ بھی پتا چل جائے گا...... لیکن پہلے پکچر دیکھو۔"

میں نے کہا "کس کی...... اور کیوں کر؟ رشتہ آیا ہے میرے لیے کسی کا؟"

وہ ہنسی "ٹی وی کی پکچر دیکھو عقلمند۔ فرخ نے خود ڈشوں کو سیٹ کیا ہے۔ سارا دن ہلکان ہوتا رہا ہے چھت پر۔"

"اوہو ہو...... بے چارا انہیں کہا تم نے؟"

"اس کی تعریف تو کوئی کرتا نہیں، ہر طرف فریال فریال ہوتی رہتی ہے۔"

"تو یہ بات ہے۔ اب تم چاہتی ہو، میں اس کی تعریف کروں۔ خواہ پکچر کیسی بھی آرہی ہو۔ کیوں نہ ہم سب ایک دائرے میں بیٹھ جائیں کزن۔ فرخ کو بیچ میں اونچائی پر بٹھالیں اور پھر باری باری اس کی تعریف کے پل باندھیں۔"

اس نے مجھے دھکا دیا "اب جاؤ، ورنہ وہ سمجھیں گے تم دونوں پھر غائب ہو۔ پراسرار طور پر۔"

میں اندر گیا تو فرخ ہال میں رکھے ٹی وی کے چینل بدل رہا تھا۔ میں نے کہا ''بھئی کیا چیز ہے یہ۔ دیکھنے میں ٹی وی لگتا ہے بالکل مگر اس میں تو غالباً تصویر نظر آتی ہے۔''

اس نے خفگی سے دو تین چینل بدلے ''یہ تصویر نہیں ہے؟''

میں نے کہا ''سبحان اللہ۔ کیا نظر نواز تصویر ہے۔ اندھے بھینگے، کانے اور آنکھوں والے، سب کو ایک جیسی ہی دکھائی دے گی۔''

وہ مسکرانے لگا ''آج کا پورا لگ گیا۔ تین ڈشیں لگانے کے بعد ڈائریکشن سیٹ کرنے کی کوشش میں پاگل ہو گیا۔''

''ہاں رابعہ بھی کہہ رہی تھی ...... روشن اسکرین کے سامنے بیٹھا ہے، کہتا ہے جو فلم چاہو تصور میں دیکھ لو۔''

''رفیق بھائی! کوئی کر کے دکھا دے یہ کام۔ دھوپ میں ٹی وی رکھو تو تصویر دکھائی ہی نہیں دیتی۔ ایک سوت اِدھر اُدھر ہو جائے ڈش تو غائب، دوسری کو سیٹ کرو تو ٹی وی اٹھا کے دوسری طرف لے جاؤ۔ اسے ٹیون کر کے دیکھو تو پہلی بھی گئی۔ ہوا چل رہی ہے آندھی جیسی۔''

میں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی ''کنگ رابرٹ، اس مکڑی کی مثال سامنے رکھو جو بار بار گر کے پھر کوشش کرتی تھی۔''

''ہاں، کنگ رابرٹ ہیں دیکھنے والے۔ مکڑی ہوں میں۔ کامیاب ہو بھی گیا تو تعریف کون کرے گا۔ سب کے دل تنگ ہیں۔'' وہ پھر خفا ہو گیا۔

میں نے کہا ''سوائے رابعہ کے۔ جس میں تم رچے ہو۔ اسی نے تو مجھے مجبور کیا تھا کہ تمہاری تعریف کروں۔ اب میں راجا کو بھیجتا ہوں۔''

اس نے ہاتھ جوڑے ''معاف کریں مجھے...... میں نالائق ہی ٹھیک، کچھ نہیں کر سکتا، کسی کام کا نہیں۔''

میں نے اندر جاتے ہوئے کہا ''سچ کا اعتراف خود ہی کر لیا تم نے۔ ویسے رابعہ کی رائے بھی یہی تھی تمہارے بارے میں۔ منہ پر کچھ بھی کہتی ہو۔''

کمرے میں اماں، ابا خاصے مطمئن انداز میں اپنے ٹی وی پر کوئی چینل دیکھ رہے تھے جو اتفاق سے صاف آ رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی ابا نے ریموٹ سے ٹی وی بند کر دیا اور بولے ''بیٹھو رفیق میاں! تم سے کچھ بات کرنی تھی۔''

میں بیڈ کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا ''کوئی ضروری بات تھی؟''

''میں کیا غیر ضروری باتیں بھی کرتا ہوں۔'' وہ بولے ''آج دن میں ہم نے اپنے بزرگوں کی جو روغنی تصاویر دیکھی ہیں۔ اس کے بعد سے عجیب کیفیت ہے دل کی۔ لگتا ہے سب سے عالم ارواح میں مل کے آئے ہیں۔''

اماں نے ناراضی سے کہا ''اجی کیسی باتیں کرتے ہو۔''

ابا بولے ''بھئی، ایک مثال تھی۔ مطلب یہ تو نہیں کہ ہم فوت ہو کے سب سے ملنے اوپر گئے اور پھر لوٹ آئے۔''

میں نے کہا ''پورٹریٹ بنانے والا ماہر فن تھا۔ ہر تصویر زندہ لگتی ہے۔''

''بلاشبہ...... ہمیں تو افسوس ہے کہ اب تک ہم اس تصویر خانے سے بے خبر تھے۔''

میں نے کہا ''انشاء اللہ، آپ کی اور صوفی چچا کی تصویر بھی کوئی ماہر فن بنائے گا۔ انہی کے ساتھ لگائی جائیں گی۔''

اماں نے ناراضی سے کہا ''ہاں۔ پہلے والے بھی اپنی تصویر چھوڑ گئے آنے والی نسلوں کے لیے۔ ان کو نہیں پوچھ جنہوں نے جنا تھا...... کسی نے گھر والی کی تصویر نہیں لگائی گھر میں۔''

ابا ہنسنے لگے ''بھئی، جگہ کا مسئلہ بن جاتا۔ چار چار تو بیویاں ہوتی ہی تھیں۔ ایک ہم ہیں کہ خاندانی روایت بھی نہ نبھا سکے...... لیکن بھئی رفیق میاں! اب تم درست کرو۔''

میں نے کہا ''کس کام میں ابا جی؟''

''نیک کام میں۔'' وہ مسکرا کے بولے ''فریال بہت اچھی لڑکی ہے، حد تو یہ ہے کہ تمہاری اماں کی زبان اس کی تعریف کرتے نہیں تھکتی۔ میں تو کہتا ہوں کہ جو بولو سوچ سمجھ کے بولو۔ کل کو ساس بن کے سیاست دانوں کی طرح سارے پرانے بیانات کی تردید کرتی پھرو گی۔''

''چھوڑو جی! نہ میں ایسی بہو تھی، نہ ایسی ساس بنوں گی۔''

''دریں چہ شک۔ ازل سے ہر عورت یہی دعوے کرتی آئی ہے مگر مذاق کی بات نہیں رفیق! ہم پر اس کے گن یہاں آ کے کھلے۔ جب ہم نے اسے حویلی میں کام کرتے دیکھا۔ بھئی کس کس کام کا ذکر کریں۔ وہ تو گھن چکر بنی رہتی ہے سارا دن۔ کون سا کام اس کی نظر سے چوک سکتا ہے۔ ابھی یہاں ابھی وہاں۔ یہ جو ہم اتنے مزے سے یہاں بیٹھے ہیں، سب اسی کا کمال ہے۔''

مجھے فریال کے بارے میں ابا جی کی اتنی اچھی رائے سن کر جتنی خوشی ہوئی اس سے زیادہ حیرانی ہوئی۔ مجھے یقین نہ تھا کہ اگر یہ سب میں فریال کو بتاؤں تو وہ کبھی یقین نہیں کرے گی۔ وہ سمجھے گی میں جھوٹ بول رہا ہوں اور اسے بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ صرف کوشش ...... کیونکہ بے وقوف نہ وہ تھی اور نہ اسے بنایا جا سکتا تھا۔ کمال کی بات یہ بھی ہوئی کہ اماں کے چہرے سے اختلاف کے جذبات تک ظاہر نہیں ہو رہے تھے۔ وہ خاموشی کی زبان میں ابا کے بیان کی تائید نہیں کر رہی تھیں تو تردید بھی نہیں کر رہی تھیں۔

ابا کا بیان جاری تھا ''اب یہ نگار خانے کو ہی لو۔''

میں نے کہا ''نگار خانہ اچھا نام دیا آپ نے۔''

''میں نے ...... نہیں بھئی، یہ بھی فریال نے تجویز کیا ہے۔ میں تو آرٹ گیلری کے خلاف تھا۔ تصویر خانہ کہا میں نے تو وہ بولی کہ نگار خانہ کیسا رہے گا۔ میں نے کہا کہ بھئی یہاں تو جو کام تم نے دکھایا ہے اس پر تمہیں ملنا چاہیے تمغۂ حسن کارکردگی۔ یہ لڑکی ویسے تو ولایت میں رہی ...... اور بہت آزاد خیال بھی تھی ہمارے نزدیک...... لیکن بڑی صلاحیت دیکھی ہم نے اس میں خود کو حالات کے مطابق بدلنے کی۔''

''چلو اب بس بھی کرو۔ بہت ہو چکی تعریف۔ کام کی بات کرو۔'' اماں نے تسبیح گھماتے گھماتے کہا۔

میں نے کہا ''یہ بات دن میں فرصت سے بھی ہو سکتی ہے۔''

''دن میں کرتے ہم ...... لیکن اس وقت تمہارا کوئی ملاقاتی بیٹھا تھا۔ رابعہ نے بتایا، کون آیا تھا...... یہ وہی شہاب الدین تو نہیں تھا؟''

میں نے محتاط ہو کے کہا ''آپ کو کس نے بتایا؟''

''اسی نے ...... رابعہ نے۔ سنا ہو گا تمہاری زبان سے نام۔''

اماں نے تردید کی ''ریشم نے سنا تھا۔ ہاں، وہ چائے لے کر گئی تھی۔''

میں نے کہا ''خیر...... یہ ایک ٹھیکے دار تھا۔ مشورہ دے رہا تھا کہ ہم جاگیر کے گرد پرانی دیوار کو پھر کھڑا نہ کریں۔ خاردار تاروں والی باڑھ لگا لیں جس میں کرنٹ چھوڑ دیا جائے۔''

''لاحول ولا قوۃ۔ ایسی خطرناک باڑھ کا فائدہ۔ ہمارے جانور ہی مریں گے ہر روز۔ جسے آنا ہو گا وہ تو پھاند کے یا کاٹ کے بھی اندر آ جائے گا۔''

میں نے بھی اسی لیے انکار کر دیا تھا۔

میری شادی کے موضوع پر بات آگے بڑھنے سے پہلے رابعہ نے جھانک کے کہا ''نواب صاحب قبلہ! کوئی ملاقاتی شرف باریابی چاہتا ہے۔''

میں نے گھڑی دیکھی ''اس وقت؟''

''جی، آپ نواب ہیں تو وہ ہے شامی بادشاہ۔ کیا شام میں بادشاہت ہے کزن؟''

میں اٹھ کھڑا ہوا ''شام کا صدر ہو گا نادان لڑکی!''

ابا جی کو میں نے موقع ہی نہیں دیا کہ وہ شامی بادشاہ کے بارے میں کوئی سوال کرتے۔ میں باہر آیا تو وہ اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ کھڑا تھا۔ اس نے مجھے بڑی گرم جوشی سے گلے لگایا۔ ''کیسے ہو نواب رفیق!''

میں نے کہا ''اچھا ہوں ...... تمہیں دیکھ کر واقعی خوشی ہوئی۔ امید نہیں تھی کہ اتنی جلدی میرا پیغام تمہیں پہنچ جائے گا۔ آؤ، اندر آؤ۔''

میں اسے بیٹھک میں لے گیا۔ شامی اور اس کے ساتھی عام لوگوں کی طرح شلوار قمیص میں تھے۔ بس شلوار قمیص وہ گھوڑا بوسکی کے تھے ان کے کاندھوں پر اجرک تھی۔ ویسی ہی جیسی مجھے اڑھائی گئی تھی اور ان کے ہاتھوں میں قیمتی راڈو گھڑیاں چمک رہی تھیں۔ یہ سب ڈاکوؤں کا مخصوص گیٹ اپ تھا۔ ان کی شناخت بن گیا تھا۔

میں نے کہا ''کہاں سے آ رہے ہو۔ بلاتکلف بتاؤ کھانا کھاؤ گے۔''

''نہیں دوست، کھانا کھا کے چلے تھے۔ کوئی تکلف نہیں یاروں کے ساتھ۔ بھوکے ہوتے تو خود کہتے۔''

''اچھا پھر چائے پی لو۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا ''ٹائم نہیں ہے۔''

میں نے کہا ''ٹائم ہو نہ ہو۔ یہ ناممکن ہے کہ تم دوست کے گھر آ کے چائے کا ایک کپ پیے بغیر چلے جاؤ۔''

''اچھا پھر منگا لو...... لیکن ہمیں صبح کا اجالا پھیلنے سے پہلے نکل جانا ہے۔ ہمارے خلاف دشمن بہت چوکس ہیں آج کل۔''

میں نے کہا ''وہ بھی میری وجہ سے۔''

''اب وجہ جو ہے سو ہے۔ ہم دوستی نبھانا بھی جانتے ہیں اور دشمنی بھی۔''

میں نے کہا ''کاسو کیسا ہے؟''

''بہت خوش۔ خود دیکھ لینا۔ یہ بتاؤ شہاب الدین آیا تھا؟''

میں نے کہا ''ہاں، آج صبح، اسے تمہارا پیغام مل گیا تھا۔''

''کیا کہہ رہا تھا۔ دو کروڑ دے گا یا ہم بکرا قربان کر دیں؟''

میں نے کہا ''وہ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ سودا کرا دو۔''

''غلام محمد کو زیادہ دن رکھنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ تم چلو اور معاملہ ختم کراؤ۔''

میں نے کہا ''معاملہ ایسے ختم ہونا چاہیے کہ ان پر میری دہشت قائم ہو جائے۔ شہاب الدین کی ہوا تو میں نے آج نکال دی۔ سالا غبارے کی اولاد...... بڑی اونچی ہوا میں اڑ رہا تھا۔''

''دوسرے کی بھی ایک دھماکے سے نکلے گی۔ تم دیکھتے جاؤ۔ میں نے پکا بندوبست کیا ہے۔ وہ دو کروڑ بھی دیں گے اور تمہیں سلام بھی کریں گے۔''

ایک ڈاکو نے اس کے کان میں کچھ کہا۔

شامی نے سر ہلایا ''مجھے پتا چلا تھا۔ تمہارے چچا فوت ہو گئے۔ وہ بڑے پہنچے ہوئے پیر بھی تھے؟''

میں نے کہا ''بہت افسوسناک حالات میں ان کی موت واقع ہوئی۔ تفصیل تمہیں پھر بتاؤں گا۔''

اس نے فاتحہ خوانی کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ اس کے باقی ساتھیوں نے اسی کی تقلید کی۔ ریشم چائے لے کر اندر آئی۔ اس نے شامی بادشاہ اور اس کے ساتھیوں کی صورت کو باری باری دیکھا۔ پھر اس کی نظر سوالیہ انداز میں میری طرف اٹھی۔ مجھے شک ہوا کہ ریشم شامی بادشاہ کو پہچانتی ہے اور اسے یوں ست بدحالی میں دیکھ کے حیران ہے۔ یہ خیال بے چینی پیدا کرنے والا تھا۔ اباجی کے سامنے رابعہ پہلے ہی شامی بادشاہ کا نام لے چکی تھی۔ اگر ریشم نے اپنی معلومات کی بنا پر شامی بادشاہ کے خلاف کوئی پریس ریلیز جاری کر دیا تو پرابلم ہو جائے گی۔

منہ پر ہاتھ پھیر کے میں اٹھا ''میں ابھی آیا شامی بادشاہ!''

ریشم کو میں نے دروازے سے لگا پکڑ لیا۔ وہ چھپ کر ہماری گفتگو سنتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑی گئی۔ اسے بالکل توقع نہ تھی کہ میں اچانک اٹھ کے آ جاؤں گا۔ وہ بری طرح اچھلی اور چوری پکڑے جانے کے خیال سے اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ میں اسے کلائی سے پکڑ کے دور لے گیا۔

''تم یہ بھی کرتی ہو۔ مجھے معلوم نہیں تھا۔'' میں نے غصے سے کہا۔

وہ کانپ رہی تھی، اب رونے لگی ''یقین کریں مالک، میں نے کبھی یہ نہیں کیا۔ مجھے معاف کر دیں۔''

''تم شامی بادشاہ کو جانتی ہو؟''

اس نے اقرار میں سر ہلایا ''مجھے غنی نے بتایا تھا۔''

میرے پیچھے سے رابعہ نے کہا ''کون ہے یہ شامی بادشاہ، کزن!''

میں بوکھلا کے پلٹا ''میں بعد میں بتاؤں گا۔''

''میں ابھی جاننا چاہتی ہوں۔'' رابعہ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''او کے، تمہیں ریشم بتا دے گی بعد میں لیکن تم دونوں ایک بات کا خیال رکھو گی۔ اماں اور ابا کے سامنے یہ نام نہیں لو گی۔'' میں نے ریشم کی کلائی چھوڑی اور لوٹ کے ہال میں آ گیا۔

میرے مہمان چائے پی کر فارغ ہو چکے تھے۔ شامی نے کہا ''چلیں۔''

میں نے کہا ''شامی بادشاہ! اس وقت میرا تمہارے ساتھ جانا کچھ مسائل پیدا کرے گا۔ میرے والدین ہیں یہاں۔''

''میں سمجھ گیا۔ ایک پروفیسر کا بیٹا ایک ڈاکو کے ساتھ کیوں گیا۔ وہ پوچھیں گے۔'' شامی نے تلخی سے کہا۔

میں نے کہا ''یہ بات نہیں، وہ تمہارے نام سے بھی واقف نہیں۔''

''تمہیں اپنی عزت کا بھی خیال ہے۔''

میں نے کہا ''شامی بادشاہ۔ دوستی بھی کرتے ہو اور ذلیل بھی کرتے ہو۔ میں ایک مجبوری بیان کر رہا تھا۔''

اس نے مسکرا کے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا ''چل پھر ہم جاتے ہیں، تو بعد میں آ جانا۔''

میں نے کہا ''میں صبح آ جاؤں گا، بتاؤ کہاں ملوں؟''

''جہاں دل چاہے آ جانا۔ ہم راستے میں کہیں بھی مل جائیں گے لیکن اکیلے آنا۔''

میں نے کہا ''لیکن جانا کہاں ہو گا؟''

وہ ہنسا ''یہاں سے تو ایک ہی سڑک جاتی ہے۔''

میں سمجھ گیا کہ وہ اپنا کوئی ٹھکانا بتانا نہیں چاہتا یا اس کا کوئی ٹھکانا ہے ہی نہیں۔ میں اسے رخصت کر کے واپس آیا تو اماں، ابا کے ساتھ باقی لوگ بھی سو چکے تھے۔ شہناز کو سب سے پہلے سونے کی عادت تھی۔ وہ دن بھر میں اتنی تھک جاتی کہ کھانے کے فوراً بعد پڑ جاتی تھی۔ کچھ ایسی ہی کیفیت فریال کی تھی۔ فاروقی اپنی بیوی کے ساتھ الگ بیڈ روم میں تھا، صرف رابعہ تھی جسے نیند آتی ہی نہیں تھی۔ لاہور میں بھی دیر سے آنے پر ہمیشہ وہ مجھے دروازہ کھولنے کے لیے جاگتی ملتی تھی۔ پہلے راجا کا معمول رات کو جاگنے کا تھا مگر اس کے لیے بند عادت کی بات نہ تھی، وہ کسی بھی وقت کہیں بھی سو سکتا تھا۔

میں نے بہتر سمجھا کہ چپکے سے جا کے اپنے بیڈ پر لیٹ جاؤں۔ اماں، ابا کی باتوں نے مجھے بڑی خوشی دی تھی۔ فریال سے میرے تعلق کو وہ برسوں سے برا سمجھتے آئے تھے اور ہرگز یہ نہیں چاہتے تھے کہ میری شادی اس لڑکی سے ہو جو شوقین مزاج، فیشنی اور آزاد خیالی میں سب کو پیچھے چھوڑ دینے کو ہی معراج سمجھتی ہو۔ اس نے فلمی دنیا میں نام (یا بدنامی) کمانے کے لیے جتنے جتن کیے اور پھر جس طرح سلطان کو پھانس کے خود پھنسی...... وہ سب ان پر عیاں تھا۔ خانہ خرابی میں کوئی کسر باقی رہی تو وہ اس نے لندن جا کے پوری کی۔ فیشن ڈیزائننگ، انٹیریئر ڈیکوریشن اور فائن آرٹ جیسے کورس تو محض بہانہ تھے۔ درحقیقت تو وہ آزادی کے مزے لوٹنے کے لیے میرے پیچھے نکلی تھی اور لندن جیسے شہر میں وہی کرتی رہی جو اس جیسی لڑکی کر سکتی تھی۔ کوئی شریف زادی نہیں، وغیرہ وغیرہ۔

یہ تھی میرے والدین کی فریال کے بارے میں حتمی رائے۔ دادی پر دباؤ ڈال کے اور اکلوتا بیٹا ہونے کی پوزیشن سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے ان سے اپنا مطالبہ تو منوا لیا تھا مگر وہ فریال سے میری شادی پر اسی طرح راضی ہوئے تھے جیسے پولیس کی تحویل میں بے گناہ اعتراف جرم پر راضی ہوتا ہے۔ تھرڈ ڈگری کا طریقہ صرف جسمانی نہیں ہوتا، ذہنی بھی ہوتا ہے۔

اب ان کی رائے بدلی تو ایسی کہ دوسری انتہا پر پہنچ گئی۔ فرق صرف یہ رہا کہ پہلے وہ فریال کی کسی خرابی کے چشم دید گواہ نہیں تھے۔ یہ محض ایک ذہنی تعصب تھا جس کی بنیاد مخصوص واقعات پر تھی اور وہ بدگمانی کی عینک لگا کے دیکھتے تھے تو انہیں فریال میں برائی کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا لیکن اب جو انہوں نے دیکھا اور محسوس کیا تھا، ایک ذاتی تجربہ تھا۔ حقیقت اور مشاہدے پر مبنی۔ ایک ایسی سچائی جس نے انہیں مجبور کر دیا کہ وہ اپنی غلطی کو تسلیم کریں جو ان سے فریال کو سمجھنے میں ہوئی تھی۔ یہ ان کی فراخ دلی تھی کہ انہوں نے اس کا اعتراف سب کے سامنے کیا۔

میں بہت خوش تھا کہ بالآخر میری پسند کی جیت ہوئی۔ کسی کی وکالت کے بغیر فریال نے ثابت کر دیا کہ اہلیت کے معیار پر اس سے بہتر کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس نے جانتے بوجھتے کچھ نہیں کیا۔ وہ جیسی تھی، ویسی ہی ان کے سامنے آئی اور خود کو منوا لیا۔

میں سوچ رہا تھا کہ صبح جب فریال کو یہ بات بتاؤں گی تو اسے کتنی مشکل سے اعتبار آئے گا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر راجا محو خواب تھا۔ اس کے بعد فرخ کا بیڈ تھا۔ کمرے میں اندھیرا تھا اور میں سونے کی کوشش کر رہا تھا کہ اچانک روشنی کی ایک لکیر مجھ پر پڑی۔ کسی نے دروازہ کھولا تھا تو کاریڈور کی لائٹ بیڈ تک آ گئی تھی۔

میں نے آنکھیں کھول کے دیکھا۔ یہ رابعہ تھی۔ اس نے اشارے سے مجھے بلایا اور دروازہ بند کر دیا۔ میں خاموشی سے اٹھ کے باہر گیا تو وہ برآمدے میں تھی۔ میں برآمدے میں پہنچا تو اس نے ایک بار پلٹ کے دیکھا اور سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔ میں اس کے سامنے جا بیٹھا۔

''اگر تمہیں نیند نہیں آ رہی ہے کزن تو سزا مجھے کیوں...؟''

اس نے میری طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے ''جو سزا مجھے مل رہی ہے۔ وہ مجھے ہی کیوں، اس کا جواب دے سکتے ہو؟''

میں نے اسے قریب کر کے اس کا سر اپنے کندھے پر رکھ لیا ''بے شک ہم سب پر تمہارا دکھ بھاری ہے۔''

''یہ صرف میرا دکھ ہے۔'' اس کے آنسو میرے شانے پر آستین کو تر کرنے لگے ''بتاؤ، میں کیا کروں؟''

میں نے اس کا چہرہ اپنی طرف کیا ''تم کس دکھ کی بات کر رہی ہو کزن؟''

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی اور آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ گرتے رہے ''میں نے ابھی تک کسی کو بھی نہیں بتایا، فرخ کو بھی نہیں۔''

میرا دل دھڑکا ''کیا نہیں بتایا؟''

''یہی...... کہ میں ماں بننے والی ہوں......'' وہ دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کے رونے لگی۔

میں کچھ دیر اس انکشاف کے صدمے سے سنبھلنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر میں نے کہا ''تمہیں یقین ہے...... میرا مطلب ہے...... تم ڈاکٹر شہناز سے بات کرو۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا ''میں مر جاؤں گی کزن! خودکشی کر لوں گی، تایا کو پتا چلا تو......''

''بے وقوفی کی بات مت کرو۔ میں بات کروں گا فرخ سے...... اور ڈاکٹر شہناز سے۔ مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل نکل آئے گا۔ چلو رونا بند کرو۔''

اچانک دروازہ کھلا اور فریال باہر آ گئی۔ ہمیں دیکھ کر وہ ٹھٹکی ''یہ تم دونوں کیا کر رہے ہو؟''

میں نے اسے اشارے سے قریب بلایا۔ وہ آہستہ آہستہ آگے آئی، اس کے ہاتھ میں سیلائٹ فون تھا" کال ہے تمہاری۔ کسی عورت کی......"

میں بھونچکا رہ گیا "عورت کی کال...... اس وقت......؟"

"تمہارے چاہنے والوں کے لیے وقت کی کیا قید......"

وہ رابعہ کے پاس بیٹھ گئی "خاتون! آپ رونے سے شغل فرما رہی تھیں۔ یہ تو سونے کا وقت ہے؟"

میں نے کچھ فاصلے پر جاکے کہا "ہیلو۔ کون صاحبہ ہیں؟"

دوسری طرف سے ایک اجنبی آواز سنائی دی۔ کسی نے ایک ٹھنڈی سانس لی "ہم نے اتنا کیا آپ کے لیے...... اور آپ پوچھتے ہیں، ہم کون ہیں...... کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟"

میں نے کہا "دیکھیے...... ڈراما مت کیجئے۔"

وہ ہنسی "ڈراما تو کل ہوگا جناب عالی! جس کے دو ہی کردار ہوں گے۔ نور جہاں، انارکلی اور سلیم۔ حسن اور عشق کے نام بہت ہیں۔"

میں نے کہا "کیا مطلب ہے اس فضول بات کا۔ کیا چاہتی ہو تم؟"

"قیمت...... صرف قیمت، اپنی نہیں...... جو ہم نے آپ کے لیے کیا، اس کی قیمت۔" وہ جیسے نشے میں ہنسی۔

میں نے بہتر سمجھا کہ فون بند کردوں۔ میں کچھ سوچنے پر مجبور ہوگیا تھا۔

کسی لاؤڈ اسپیکر سے سنائی دینے والی آواز کی طرح فون پر بھی انسان کی اصلی آواز میں لہجے کا فرق آجاتا ہے...... اس اجنبی خاتون کے لہجے میں مجھے آشنائی کا مبہم سا احساس ہوا...... میرے دماغ میں قدرت کے نصب کردہ کمپیوٹر نے اس آواز کا تجزیہ کیا اور چند نتائج میرے سامنے رکھ دیے۔

پہلا یہ کہ یہ عورت نشے میں تھی اور نشہ شراب کا تھا یا پھر وہ جانتے بوجھتے آواز کو نشیلی بنا کے بات کر رہی تھی۔ تاہم اس کا امکان کم تھا...... اگر اسے اپنی شناخت کو ظاہر کرنے میں کوئی عذر در پیش تھا تو محض لہجہ یا آواز بدل لینا کافی تھا۔ یہ ضروری نہیں تھا کہ آواز میں نشے کا انداز بھی نمایاں کیا جائے۔

دوسرا یہ کہ آواز سے عیاں ہونے والا نشہ اصلی تھا اور اس کے مدہوش ہونے کی چغلی کھاتا تھا...... چنانچہ غور طلب بات یہ بھی تھی کہ رات دو بجے اگر وہ جاگ رہی تھی...... جاگنے کے اسباب ان گنت ہوسکتے ہیں اور ان کو قابل اعتراض بھی نہیں سمجھا جاسکتا...... مگر وہ پی کیوں رہی تھی؟

مے نوشی سوسائٹی کے دو طبقوں میں اپنے اپنے انداز سے رائج ہے...... ممنوع اور حرام ہونے کے باوجود...... نچلا طبقہ غم غلط کرنے کے لیے پیتا ہے اور کسی آداب مے کشی کو نہیں جانتا...... جب ملے جیسی ملے حلق سے اتار لیتا ہے...... اس طبقے کو بقول غالب......

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

اخباروں میں زہریلی شراب پی کے مرنے والوں کی خبریں بھی اسی طبقے کی اس زندگی کی عکاسی کرتی ہیں جو جینے کے قابل ہی نہیں۔

دوسرا بالائی طبقہ "مے سے غرض نشاط ہے" کے فلسفے پر عمل کرتا ہے...... وہ مے نوشی کے ادب آداب جانتے ہیں اور ہر وقت یا ہر تقریب کی مناسبت سے شراب کا انتخاب کرنے کے ساتھ اس کی حد کو بھی ملحوظ رکھتے ہیں...... کہ کب کتنی پینی چاہیے اور کیا پینی چاہیے۔

چنانچہ رات دو بجے جو عورت پی رہی تھی یا مدہوش تھی وہ یا تو عادی مے نوش تھی...... یا پھر نشہ شراب میں اپنے کسی غم کو ڈبو رہی تھی...... اور اسے ڈوبنے سے بچانے والا کوئی نہیں تھا۔

غالباً رابعہ نے فریال سے اپنی پریشانی چھپالی تھی۔ اس نے کچھ دیر پہلے ہی اعتراف کیا تھا کہ یہ بات ابھی تک کسی کے علم میں نہیں۔ اس کے اور میرے درمیان اعتماد کا رشتہ ہمیشہ سے تھا مگر اب اس کی نوعیت کچھ بدل گئی تھی فیصلہ قدرت کا تھا...... اسے بھائی نہیں ملا تھا مجھے بہن نہیں ملی تھی...... ایک اس کا احساس محرومی تھا دوسرا میرا...... بالکل لاشعوری اور فطری طور پر ہم نے ایک دوسرے کی محرومی کو دور کیا اور اپنی اپنی زندگی کے خلا کو پُر کیا...... ریاضی کے قاعدے کے مطابق دو نیگٹو کا حاصل ایک پازیٹو ہوتا ہے...... چنانچہ کسی اقرار میں اظہار کے بغیر ہمارے درمیان بھائی بہن کا رشتہ بالکل حقیقی انداز میں استوار ہوگیا...... ایسا کیوں ہوا اور کب ہوا...... یہ غیر اہم تھا...... یہ ہم دونوں کی ضرورت تھا۔ اہمیت صرف اس احساس کی تھی۔

فریال نے سمجھا ہوگا کہ وہ ماں باپ کو یاد کرکے رو رہی تھی۔ وہ اسے پیار سے تسلی دے کے اور سمجھا بجھا کے اندر لے گئی...... وہ صرف مجھ سے مشورہ اور مدد چاہتی تھی...... اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا یا کرتا پہلے فریال آگئی...... پھر ایک پُراسرار کال آگئی...... رابعہ کی بات بیچ میں ہی رہ گئی۔

میں پھر اندر جاکے لیٹا تو میرا ذہن اس عورت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ صبح فریال ضرور سوال کرے گی کہ وہ کون تھی...... میں خود نہیں جانتا تھا کہ وہ کون تھی مگر رفتہ رفتہ اس کی پُراسراریت کی گہری دھند سے ایک چہرہ ابھرنے لگا تھا۔

اس نے میرے لیے کچھ کیا تھا...... اور بالکل کاروباری انداز میں اس نے کہہ دیا تھا کہ اسے قیمت چاہیے لیکن یہ کاروباری انداز بڑا جذباتی تھا...... اس سے خود بخود عیاں ہوتا تھا کہ قیمت کا سکہ رائج الوقت سے کوئی تعلق نہیں۔ جس کے لیے کچھ کیا جائے وہ شکریہ ادا کرسکتا ہے...... یہ بھی قیمت ہی ہوگی۔ وہ کچھ کرکے بھی قیمت چکا سکتا ہے...... قیمت کی ایک صورت التفات ہوسکتا ہے...... ایک شب کی رفاقت ہوسکتی ہے...... روح یا جسم کی تسکین کا سامان فراہم کردینا بھی قیمت ہوجاتا ہے...... اور غالباً...... بلکہ یقیناً وہ ایسی ہی قیمت مانگ رہی تھی۔

کیونکہ اس نے کہا تھا...... حسن اور عشق کے بہت نام ہیں...... یہ کون نہیں جانتا...... اگر وہ فلمی حوالے سے انارکلی اور سلیم کے نام لیتی تو معاملہ واضح نہ ہوتا...... لیلیٰ مجنوں سے رومیو جیولیٹ تک ہر ملک اور ہر زبان میں ایسے افسانے بہت ہیں...... لیکن اس نے تیسرا نام نور جہاں کا لیا تھا...... انارکلی اور نور جہاں کسی ایک ہی داستان عشق کے کردار نہیں تھے...... بے شک ان میں جہانگیر کا نام مشترک تھا لیکن انارکلی ایک کنیز تھی اور اس کا عشق کہانی...... نور جہاں ایک حقیقت تھی...... ملکہ ہندوستان شہنشاہ ہند جس کا اطاعت گزار تھا۔

چنانچہ یہ بھی انارکلی نہیں تھی...... نور جہاں تھی...... یہ نام اس کی زبان سے روانی میں نکل گیا...... اب اس کا سراپا میری نظر میں تھا۔ یہ نور جہاں جس کے ناز و انداز اور حسن بے مثال نے میری نظر کو خیرہ کردیا تھا اکبر خان کی بیوی تھی اور جب پہلی بار میں نے اسے دیکھا تھا تو اکبر خان میری نظر میں صرف ایک چوکیدار تھا...... اس کے باپ دادا میرے باپ دادا کے کمترین حیثیت رکھنے والے ملازم تھے اور حویلی کے سرونٹ کوارٹر میں رہتے تھے چنانچہ یہ میرے لیے بڑے اچنبھے کی بات تھی کہ نور جہاں جیسی عورت آخر اس کی بیوی کیسے بنی۔

وقت کے ساتھ ساتھ پردے اٹھتے گئے اور اسرار کھلتے گئے...... اکبر خان کی شخصیت وہ نہ رہی جو میری نظر دیکھتی تھی...... ہر بار وہ ایک نئے روپ میں میرے سامنے آیا جو پہلے سے زیادہ حیران کن ثابت ہوا...... نور جہاں ہر جگہ اس کے ساتھ ساتھ تھی...... ہر تقریب رونمائی میں اس کے حسن و شباب کی دلکشی نئی تھی۔ انداز دلربائی میں نیا بانکپن تھا۔ اس کے لباس کی تراش خراش اور میک اپ سے ناز و انداز تک ہر بات میں ایسی جمال آفرینی تھی جو دل پر اثر کرتی تھی...... چنانچہ ہر بار حیرانی سوال کرتی تھی کہ وہ اکبر خان کے ساتھ کیوں ہے اور کیسے ہے۔

جواب کسی اوپن سیکرٹ کی طرح تھا۔ وہ اکبر خان کی زرخرید تھی۔ دنیا کا ہر اکبر خان کسی نہ کسی نور جہاں کو دولت مندی کی قوت تسخیر سے حاصل کرتا ہے۔ یقیناً اس کوہ نور ہیرے کو اپنی ملکیت بنانے کے لیے اکبر خان نے زر کثیر صرف کیا ہوگا۔ نور جہاں جیسی عورت ضرورت مند سے منہ مانگی قیمت وصول کرنے کی طاقت رکھتی ہے...... اب قانونی اور شرعی طور پر تو وہ اس کی بیوی تھی چنانچہ حقوق زوجیت بھی ادا کرتی ہوگی...... کاروباری طور پر اس کی سیکریٹری تھی اور افسر تعلقات عامہ تھی...... شاید بزنس پارٹنر بھی ہو...... خود اکبر خان نے اعتراف کیا تھا کہ نور جہاں اس کی کوچ اتالیق اور استاد بھی تھی۔ اسے گرُدم کرکے کلچرڈ اور مہذب سوسائٹی کے ایٹی کیٹس سکھانے کی ذمے دار بھی نور جہاں تھی۔

یہ فرض کرنے کی بات نہیں تھی۔ کارپوریٹ کلچر میں اخلاقیات کے سارے اصول معاشیات کے تابع ہوتے ہیں۔ نور جہاں یقیناً اکبر خان کے لیے اور بھی بہت کچھ کرتی ہوگی۔ وہ بند راستے کھلوانے کے لیے کسی بند کمرے میں پورے اعتماد سے جاتی ہوگی۔ وہ رکاوٹوں کو عبور کرنے میں سیڑھی بن کے اکبر خان کی مدد کرتی ہوگی اور جہاں پیپر کرنسی یا مال و زر بے اثر ہوں وہاں دل جیتنے کی رشوت کے طور پر قبول کی جاتی ہوگی......

پھر یہ کیسے ممکن ہوسکتا تھا کہ وہ اکبر خان کے دشمنوں کی مدد کرے...... کیا ایسا ہوسکتا ہے کہ اکبر خان اور نور جہاں کے کاروباری معاہدے میں رخنہ پڑ گیا ہو یا...... نہیں...... نور جہاں اچھی طرح جانتی ہوگی کہ اکبر خان جیسے لوگوں سے منہ مانگی قیمت پر معاہدہ تو کیا جاسکتا ہے مگر کسی بھی اختلاف کی بنا پر معاہدہ ختم نہیں کیا جاسکتا...... ایسے لوگوں کے لیے غیر مشروط تابعداری اور وفاداری پہلی شرط ہوتی ہے...... کسی بھی معاملے میں اختلاف یا انکار کا مطلب ہے بغاوت اور اس کی کم سے کم سزا موت کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔

چنانچہ کافی دیر غور و خوض فرمانے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ فون کرنے والی گمنام خاتون کو نور جہاں فرض کرنا محض میری خوش خیالی ہے...... فریال تو کسی سفاک مسیحا کی طرح

میری تحلیل نفسی کر دے گی کہ حضرت ایسا سوچنا آپ کی لاشعوری خواہش کے سوا کچھ نہیں...... آپ چاہتے ہیں کہ نور جہاں آپ کے لیے کچھ کرے...... جیسا کہ وہ سب کچھ کر رہی ہے آپ کے دشمن یا رقیب روسیاہ اکبر خان کے لیے...... اور بفرض محال اس نے آپ پر نظر کرم کی ناپاک جسارت کی تو سمجھ لینا کہ اس کا خون ہو گا میرے ہاتھوں سے...... آئی بات سمجھ میں؟

بات سمجھ میں آتے ہی میں سو گیا...... میرے اگلے دن کے شیڈول کی مصروفیات میں سرفہرست فرخ سے دوٹوک بات کرنا تھا کہ اسے اب پہلی فرصت میں رابعہ سے شادی کر لینی چاہیے۔ میرے ذہن میں ایک واضح لائحہ عمل تھا اور مجھے یقین تھا کہ کچھ مشکلات کے باوجود ہم سب کی کوشش سے یہ مسئلہ حل کیا جا سکتا ہے۔

میری خواہش تھی کہ صبح دیر تک سوتا رہوں اور کم سے کم چھ گھنٹے کی نیند پوری کروں مگر مختلف النوع حادثات اور واقعات کے ساتھ متعدد درپیش مسائل کے باعث میرے دماغ کی حالت جیسی ہو رہی تھی جہاں کوئی حکومت نہ ہو کوئی قانون نہ چلتا ہو...... خانہ جنگی اور لوٹ مار ہو اور خاص و عام صرف مسائل پیدا کرتے ہوں...... حل نہ کوئی کرتا ہو نہ کرنے دیتا ہو۔

چنانچہ میرا ذہن منتشر تھا اور اس کا نتیجہ بار بار آنکھ کھلنے اور بے سروپا خواب نظر آنے کی صورت میں ظاہر ہوتا رہا۔ یاد وہی رہتا ہے جو آنکھ کھلنے سے پہلے جاری ہو...... میرے جدامجد عزت بیگ دو بار اپنی منکوحہ محترمہ کے ساتھ میرے خواب میں تشریف لا چکے تھے مگر اب عرصہ دراز سے انہوں نے رابطہ منقطع کر رکھا تھا...... رات کے آخری پہر میں وہ پھر نمودار ہوئے۔

میں نے خود کو دیکھا کہ گھوڑے پر سوار ہوں۔ میرے جسم پر وہ لباس ہے جو گزشتہ صدی کے شرفا بلکہ رئیسوں کا پہناوا تھا اور نگار خانے کے ہر پورٹریٹ میں نظر آتا تھا یعنی پاجامہ۔ زربفت کی زرق برق شیروانی اور طرے والی پگڑی میں...... تاہم کچھ چیزیں اضافی اور مضحکہ خیز تھیں مثلاً میری مونچھیں جو کلوں کے دونوں جانب چار چار انچ تک پھیلی ہوئی اور بے حد گھنی تھیں...... میرے شانوں پر وہ اجرک تھی جو شاہی بادشاہ نے مجھے اپنی برادری کی اعزازی رکنیت عطا کرنے کے لیے پہنائی تھی...... میرے ایک ہاتھ میں کلاشنکوف تھی اور دوسرے ہاتھ میں کوک کی بوتل...... وقت رات کا تھا اور پھر چودھویں کا پورا چاند روشن تھا اور میں سلطان راہی اسٹائل میں قہقہے لگاتے ہوئے چلا رہا تھا......

لو اس سور کے بچے کو...... میرے سامنے لا کے مرغا بنا دو...... آج اس الو کے پٹھے کی خیر نہیں...... مارا جائے گا میرے ہاتھوں کتے کی موت...... گیدڑ کی شامت آتی ہے تو بدھائی کا رخ کرتا ہے...... ہمارے مقابلے کی جسارت کی ہے اس اولاد خر نے...... ہم مار مار کے اسے دنبہ بنا دیں گے۔

اچانک جنگل میں ہر طرف سے خادم نمودار ہوئے جو ویسے ہی حلیے میں تھے جیسے رانا کے غلام ہوتے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کے ساتھ کوئی جانور تھا...... ایک سور کو کھینچ رہا تھا...... دوسرا گدھے کو...... تیسرے نے مرغا اٹھا رکھا تھا۔ چوتھے کے کندھے پر الو بیٹھا تھا...... ایک کے ہاتھ میں کتے کی زنجیر تھی تو دوسرا دنبے کو دھکیل رہا تھا...... آخری شخص کے ساتھ گیدڑ تھا۔

قریب آ کے وہ سب کورنش بجا لائے۔ ''حضور والا...... وہ سب جانور حاضر ہیں جن کو آپ نے زبان مبارک سے یاد فرمایا۔''

میں نے غصے سے تھر تھر کانپنا اور دھاڑنا شروع کیا۔ ''ان...... کیسے بے عقل ہو تم سب...... جی چاہتا ہے سب کو توپ دم کر دوں...... افسوس کہ توپ ساتھ نہیں...... یہ کیا چڑیا گھر پکڑ لائے ہو...... میں اکبر خان کی بات کر رہا تھا...... وہ کہاں ہے۔''

ایک خادم پھر کورنش بجا لایا۔ ''حضور نواب صاحب...... وہ تو آپ کے پیچھے موجود ہے۔''

ایک دم پلٹ کر دیکھنے کے لیے میں نے گھوڑے کا اسٹیئرنگ پورا گھمایا تو اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا اور بھدے سے نیچے گرا...... میں خفت سے کپڑے جھاڑ کے اٹھا تو میرے کانوں میں ایک مترنم ہنسی کی آواز آئی۔ نور جہاں کو بالی وڈ کی کسی سنسنی خیز فلم ڈانسر کے لباس میں دیکھ کے مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا...... وہ آغوش محبت وا کیے مجھے دعوت وصل دے رہی تھی۔ میں مدہوش سا آگے بڑھ رہا تھا کہ ایک دم زلزلہ آ گیا...... نور جہاں چیخ مار کے جنگل میں روپوش ہو گئی۔

مخالف سمت سے ایک بیل گاڑی نمودار ہوئی جس کو میرے جدامجد عزت بیگ اسی طرح ڈرائیو کر رہے تھے جیسے چارلٹن ہیسٹن نے فلم بن حر میں رتھ دوڑایا تھا...... وہ باگ تھامے سیدھے کھڑے کھڑے چابک لہراتے ہوئے حلق سے عجیب عجیب آوازیں نکال رہے تھے...... ان کے پیچھے ایک بہت بڑا سفید غبارہ رکھا ہوا تھا...... درحقیقت یہ ان کی منکوحہ تھیں جن کے شٹل کاک برقعے میں ہوا بھر گئی تھی اور وہ

برقعے پر اچھل اچھل کے کچھ کہہ رہی تھیں۔

''امی میں کہتی ہوں بریک لگاؤ...... دیکھو تو سہی یہ نمونہ کون ہے...... مجھے تو اپنا فیکا لگتا ہے۔''

عزت بیگ نے پوری قوت سے بریک لگائے۔ بیلوں نے حلق سے بالکل وہی آواز برآمد کی جو ٹائروں کی سڑک پر رگڑ سے پیدا ہوتی ہے...... دادی جھٹکے سے آگے گئیں اور بیلوں کے سامنے گریں مگر فوراً ہی برقع سنبھال کے اٹھ کھڑی ہوئیں...... انہوں نے چلانا شروع کیا۔ ''ہائے ہائے...... آج پھر پٹخ دیا...... ارے نہیں آتی اگر ڈرائیونگ تو بیلوں کو اتنا ایکسی لریٹر کیوں دیتے ہو...... اوور اسپیڈنگ میں چالان ہونا چاہیے تمہارا......''

دادا جمپ لگا کے نیچے اُترے...... ''آئی ایم سوری اہلیہ محترمہ...... دراصل بیل ابھی اوورہال ہوئے ہیں نا...... نئے رِنگ پسٹن ڈالنے کے بعد ان کی پک اپ بہت بڑھ گئی ہے۔''

میں نے کلاشنکوف کا رُخ آسمان کی طرف کر کے پورا برسٹ چلا دیا۔ ''یہ نمونہ کس کو کہا ہے آپ نے پردادی اماں۔''

''ارے تجھے اور کسے۔'' دادی نے برقعے کے اندر سے اُچھل کے کہا۔ ''تیری دادی ٹھیک کہتی تھی...... اس حلیے میں تو نمونہ ہی لگ رہا ہے...... اور یہ منہ سے بوتل لگا کے کیا پی رہا ہے تو...... شراب۔''

میں نے جزبز ہو کے کہا۔ ''لاحول ولاقوۃ...... یہ کوک ہے۔''

''اچھا...... لا مجھے دے......'' پردادا نے بوتل مجھ سے چھین کر ایک گھونٹ لیا اور دادی سے مخاطب ہو کے بولے۔ ''ٹھیک کہتا ہے فیکا...... یہ کوک ہی ہے مگر یہ تو نے اپنا حلیہ کیا بنا رکھا ہے نامعقول......'' انہوں نے پرانی عادت کے مطابق بید کی چھڑی لہرا کے میری ٹانگوں پر رسید کی۔

''آہ۔'' میں اُچھلا۔ ''قبلہ...... یہ آپ زیادتی فرما رہے ہیں۔''

عزت بیگ نے پھر چھڑی رسید کی۔ ''کیا تو ڈاکو ہو گیا ہے؟ بول...... یہ کلاشنکوف...... یہ سوا بالشت کی مونچھیں...... یہ اجرک...... اس لباس فاخرہ کے ساتھ......''

''کم بخت...... ذرا خیال نہیں تجھے کہ یہ خاندانی نوابوں کا لباس ہے......'' دادی نے چلا کے کہا۔ ''اور تو کہلانا چاہتا ہے ڈاکو......''

پردادا نے پے در پے چھڑی سے میری ٹانگوں پر کئی وار کیے۔ ''چل اُتار...... اتار یہ لباس فاخرہ...... تو ہرگز اس لائق نہیں......''

میں نے بلبلا کے کہا۔ ''اچھا اچھا...... اتارتا ہوں...... لیکن آپ یہ تشدد تو بند کریں...... یہ ہیومن رائٹس کی خلاف ورزی ہے۔''

''سب کچھ مل گیا تجھے نامعقول...... پھر ڈاکو بننے کی کیا ضرورت تھی؟...... اچھا نام روشن کیا ہمارا...... ادھر دے شیروانی......'' انہوں نے بید کو شائیں سے لہرا کے کہا۔ ''ہم پہن کر دیکھتے ہیں۔''

شیروانی کے نیچے میں نے کچھ نہیں پہنا تھا...... بید میری کمر پر لگی تو میں بلبلا کے چیخ پڑا...... ''آہ پردادا...... اب انہیں اور کیا چاہیے۔''

پردادا محترم نے میری شیروانی زیب تن کرنے کے بعد اپنی نصف بہتر کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھا...... ''بھئی کیسے لگ رہے ہیں ہم......''

''بالکل سچ مچ کے نواب......'' دادی نے برقعے میں سے فرمایا۔

پردادا نے یکلخت گھوم کر مجھ پر ایک اور وار کیا۔ ''تو کیا کھڑا ہے نامعقول...... چل باقی لباس بھی ہمارے حوالے کر۔''

میں نے چیخ کر کہا۔ ''کیا مطلب...... یہ پجامہ بھی آپ کو دے دوں...... اور خود گھر کیسے جاؤں......؟ ویسے ہی جیسے دنیا میں آیا تھا......''

پردادا نے اس صورتِ حال پر غور کیا...... ''سنو جی......

لگتا ہے اس نمونے نے پجامے کے نیچے بھی کچھ نہیں پہنا ہے۔''

میں نے واویلا کیا۔ ''آپ کو ایک خاندانی نواب کی عزت اُتارتے ہوئے شرم آنی چاہیے۔''

پردادا نے شائیں شائیں چھڑی لہرائی..... ''اجی سن رہی ہو..... یہ کہتا ہے شرم ہمیں آنا چاہیے..... اپنے کرتوت نہیں دیکھتا۔''

میں مرغ بسمل کی طرح فرش خاک پر تڑپنے لگا۔ ''دادی کا دل پسیجا۔ ''اجی اب بس بھی کرو..... بچے کی کیا جان لو گے..... چل اٹھ نمونے..... پجاما چھوڑ..... بس تو یہ مونچھیں مجھے دے دے۔''

میں نے فوراً مونچھیں ان کے حوالے کر دیں۔ ''یہ لیجیے..... آپ کے سرتاج اپنے روئے مبارک پر سجالیں.....''

''اور یہ کلاشنکوف.....؟'' دادی نے کہا۔

میں نے احتجاج کیا۔ ''یہ آپ کے کام کی چیز نہیں۔''

''چل دے مجھے.....'' دادی نے ڈانٹ کے کہا۔ ''میں اپنے برقعے میں چھپالوں گی۔''

پردادا مرحوم اس وقت میری مونچھیں اپنے چہرے پر لگانے میں مگن تھے۔ ''موبائل فون بھی انہوں نے برقعے میں ہی چھپا رکھا تھا۔''

دادی نے کلاشنکوف برقعے میں کھینچ لی۔ ''دراصل ہم جارہے ہیں کراچی..... وہاں کسی نے موبائل چھیننے کی کوشش کی تو چھلنی کر دوں گی حرامی کو.....''

''اب ہم چلتے ہیں..... پردادا اچھل کے پھر بیل گاڑی میں سوار ہو گئے۔ ''لیکن یہ مت سمجھنا کہ ہم بے خبر ہیں..... واپسی میں ہم پھر آئیں گے۔''

دادی نے کہا۔ ''پیٹرول تو ہے نا جی بیلوں میں.....؟''

''اوہ..... بھئی ہماری گاڑی سی این جی ہے..... بیلوں کے گیئر بھی آٹومیٹک ہیں۔''

خواب سارے بے سروپا ہوتے ہیں اور لاشعور سے تفکرات کی خانہ جنگی ہو تو مزید اوٹ پٹانگ ہو جاتے ہیں۔ معلوم نہیں اپنے آباؤاجداد سے ملاقات کا اگلا سین کتنا مضحکہ خیز ہوتا لیکن اس خواب کا خاتمہ فریال نے بھی بڑی ستم ظریفی سے کیا۔ وہ چپکے سے اندر آئی اور ایک ٹی اسپون کافی میرے منہ میں ڈال دی۔

میں ہڑبڑا کے اُٹھا کیونکہ میری زبان جل گئی تھی..... پھر میں نے فریال کو دیکھا جو کچھ دور کھڑی ہنس رہی تھی۔ ''ایک چمچہ کیا پورا مگ انڈیل دیا ہوتا حلق میں.....'' میں نے خفت اور خفگی سے کہا۔

فریال کا ہنسی سے برا حال تھا۔ ''مجھے بتاؤ..... آخر تم آنکھ کھول کے کیوں سوتے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''اپنا اپنا اسٹائل ہے..... تم اتنی گھن گرج سے خراٹے کیوں لیتی ہو؟''

''وہ چلائی۔ ''کیا؟ میں خراٹے لیتی ہوں..... کچھ خدا کا خوف کرو نواب صاحب۔''

''لو..... ہاتھ کنگن کو آرسی کیا..... کسی دن تمہیں جگا کے سنوادوں گا.....'' میں نے اس کے ہاتھ سے کافی کا مگ لے لیا۔

وہ کچھ فاصلے پر بیٹھ گئی..... ''جھوٹے منہ سے تھینکس ہی کہہ دو۔''

''آنکھ کھولتے ہی بیڈٹی حاضر کرنا تمہارے فرائض میں شامل ہے لڑکی لیکن جو طریقہ تم نے اپنے سرتاج من سلامت باشد کو جگانے کے لیے استعمال کیا اس پر تم سے یوم حساب پرسش ضرور ہوگی۔''

''صحیح طریقہ کیا ہوتا ہے سرتاج صاحب۔''

''بھئی تھوڑا سا گنگنا کے..... گدگدا کے..... مسکرا کے..... لجا کے اور شرما کے.....''

''گستاخی معاف..... کیا ہماری ساس صاحبہ ہمارے سسر محترم کو بیدار کرنے کے لیے اسی فارمولے پر عمل کرتی تھیں؟''

''بزرگوں کی بات مت کرو.....''

''او کے..... بزرگ کیا بات کر رہے تھے اس ناچیز کے بارے میں..... کل رات.....'' وہ رازداری سے آگے جھک کر بولی۔

میں چونکا۔ ''کچھ نہیں.....''

اس نے تکیہ اٹھا کے مجھے مارا۔ ''جھوٹ مت بولو..... اپنی ہونے والی بہو کے بارے میں انہوں نے بہت اچھے خیالات کا اظہار کیا تھا۔''

میں نے سر پر ہاتھ مارا..... ''کیا تم نے سب سنا؟''

وہ ہنسی۔ ''آف کورس..... بہ قلم خود سنا۔''

''اور میرا خیال تھا کہ تمہیں سرپرائز دوں گا.....'' میں نے افسوس سے سر ہلایا۔

''پھر اب کیا خیال ہے سوئٹ ہارٹ۔'' اس نے ایک دم میرے گلے میں باہیں ڈال کے مجھے چوم لیا۔

میں نے گھبرا کے اسے دھکا دیا۔ ''یا بے شرمی تیرا آسرا ابھی کوئی دیکھ لیتا تو..... حد کرتی ہو تم بھی۔''

''نہیں دیکھا کسی نے.....'' اس نے مجھے ڈانٹا۔ ''آخر اتنا ڈرتے کیوں ہو تم..... میں تو آئی تھی صبح صبح تمہارا منہ میٹھا کرانے..... اب تمہاری باری ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں چوکنا ہو گیا۔

''مطلب پھر میں بتاؤں.....'' وہ غرائی۔ ''کیا تمہیں یاد ہے کہ آخری بار تم نے مجھے کب کس کیا تھا..... دروازہ بند کر دیا تھا میں نے..... مجھے پتا ہے سب سو رہے ہیں ابھی.....''

میں نے اسے نرمی سے اور پھر جذبات کی پوری شدت کے ساتھ چوما..... وہ میری گود میں سر رکھ کے آنکھیں بند کیے لیٹی رہی..... ''دیکھو بالآخر ہم جیت گئے۔''

''ہاں..... ہماری محبت جیت گئی۔'' میں نے کہا۔

''کتنا انتظار اور کتنا صبر کیا ہم نے۔'' وہ خوابناک لہجے میں بولی۔ ''بس اب تھوڑے دن کی بات ہے فری.....''

''پھر ہم نکلیں گے ہنی مون کے لیے..... کہاں جائیں گے ہم؟''

میں نے کہا۔ ''جہاں تم کہو گی..... ویسے تو ہنی مون کے لیے صرف ایک ہی شرط ہوتی ہے.....''

''کون سی ایک شرط؟''

''بس دو پیار کرنے والے ہونے چاہئیں..... پھر وہ ہمالیہ کی چوٹی پر چلے جائیں..... افریقا کے صحرا میں یا سمندر کی تہ میں..... وہ جگہ کو نہیں دیکھتے..... صرف ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔''

''مجھے آج دادی بہت یاد آرہی ہیں۔'' وہ بولی۔

''ہاں..... وہ ہوتیں تو انہیں کتنی خوشی ہوتی۔'' میں نے کہا۔

''یہ سب انہی کی کوشش سے ہوا۔''

میں نے کہا۔ ''شاید ایسا نہیں ہے..... یہ ٹھیک ہے کہ میری خوشی کے لیے وہ سب کچھ کر سکتی تھیں اور میں ان سے ہر جائز و ناجائز بات منوالیتا تھا..... لیکن کل رات جو کچھ میرے لال ابا نے کہا.....''

''اور میں نے چھپ کر سنا۔'' وہ ہنسی۔

''وہ سب تمہارا کمال تھا..... دادی کا حکم انہوں نے سعادت مندی میں مان لیا تھا اور میری ضد کے آگے بھی ہتھیار ڈال دیے لیکن تم نے ان کا دل جیت لیا۔ وہ تعریف کے الفاظ ان کے دل کی آواز تھی.....''

''یہ میری چالاکی بھی تو ہو سکتی تھی..... انہیں متاثر کرنے کے لیے ایکٹنگ کی میں نے.....''

میں نے اس کی ناک پکڑ کے ہلائی۔ ''اتنے سیدھے اور سادہ لوح بھی نہیں ہیں۔ میرے والدین..... خصوصاً ابا..... تم جیسے اور میرے جیسے سیکڑوں کے استاد تھے..... وہ سب دیکھتے رہے..... محسوس کرتے رہے..... سمجھتے رہے..... اور پرکھتے رہے..... اور انہوں نے بڑی فراخدلی سے اعتراف کر لیا تمہاری صلاحیتوں کا.....''

خوشی سے فریال کا چہرہ دمکنے لگا۔ ''رومیو ہمیں زندگی کتنی مہلت دے گی؟''

میں نے حیرانی سے کہا۔ ''کس بات کے لیے؟''

''ایک دوسرے کی رفاقت کے لیے..... پیار کے لیے.....''

میں نے ہنس کے کہا۔ ''تم پاگل ہو..... بالکل پاگل۔''

وہ اٹھ بیٹھی۔ ''دیکھو نا..... کتنے سال سے ہم مل کے بھی مل نہیں پائے..... خوف خطرات پریشانی اور مشکلات کا کتنا لمبا دور تھا..... کہاں سے شروع ہوا تھا.....''

''چھوڑو اب گزرے ہوئے وقت کو یاد کرنے سے کیا حاصل۔''

''بس ایسے ہی میں سوچ رہی تھی..... دو آرزو میں کٹ گئے دو انتظار میں..... خوشی کے کتنے دن ہوں گے..... خواہشوں کا ایک سراب شروع ہوگا..... خوابوں کی تعبیر کا دور.....''

میں نے کہا۔ ''خواب کبھی ختم نہیں ہوتے۔''

''ہو جاتے ہیں رومیو..... ٹوٹ جاتے ہیں..... میں مر گئی..... یا تم نے مجھے چھوڑ دیا.....''

''اب میں تمہیں ماروں گا۔''

جذبات کی یلغار میں فریال کی ذہنی رو بہک گئی تھی۔ ایسا ہوتا ہے۔ جب غیر متوقع اور بافراط خوشی کا خزانہ مل جائے تو خوف گھیر لیتا ہے کہ یہ سب چھن نہ جائے..... آدمی اپنی ہی خوش نصیبی سے ڈر جاتا ہے۔

دروازے پر اچانک ہونے والی دستک نے فریال کی اس ہسٹریا جیسی کیفیت کا خاتمہ کر دیا..... وہ ہڑبڑا کے اٹھی..... پریشان صرف میں ہوا..... فریال پکڑے جانے یا بدنامی سے گھبرانے والی چیز نہیں تھی..... اس کی آنکھوں میں ایک شوخ سوال اور لبوں پر شریر مسکراہٹ آگئی..... کہ یہ کون ہو سکتا ہے؟

میں نے ہاتھ جوڑ کے اسے اشاروں کی زبان میں چھپنے کے لیے کہا تو وہ بیڈ کے نیچے گھس گئی..... دستک دوبارہ سنائی دی تو میں نے یہ ظاہر کیا جیسے میں گہری نیند میں تھا..... میں

نے غنودگی والی آواز میں کہا۔ ''کون ہے بھئی صبح صبح...... آرہا ہوں۔''

بیڈ کے نیچے فریال میری مکاری والی ایکٹنگ پر منہ دبا کے ہنسی...... ''اُلو کی پٹھی......'' میں نے پلٹ کے غصے سے دیکھا اور پھر دروازہ کھول دیا۔ یہ فاروقی تھا...... وہ میرے پاس سے سیدھا گزر گیا...... ''اتنی دیر کیوں لگی آخر دروازہ کھولنے میں۔'' اس نے ڈانٹ کے کہا۔

''یہ شرفا کے سونے کا وقت ہے۔''

اس نے ناک سے سوں سوں کی...... ''ابے ہم خوب جانتے ہیں تیرے جیسے شرفا کو...... مجھے کچھ خوشبو محسوس ہو رہی ہے۔''

''میں نے رات کو ایئر فریشنر کا اسپرے کیا تھا۔''

اس نے زور زور سے نفی میں سر ہلایا۔ ''ابے یہ زنانہ خوشبو ہے...... کتے کی ناک ہے میری ٹیکے چتر...... ابھی بتاتا ہوں تجھے کہ یہ پرفیوم کون لگاتا ہے...... بلکہ لگاتی ہے......''

میں نے کہا۔ ''سر...... آپ کو کیا ضرورت ہے اس سراغرسانی کی؟''

وہ چونکا۔ ''یہ آواز سنی تو نے...... جیسے چوڑیاں بجی ہوں۔''

''تیرے کان بج رہے ہیں...... ناک کتے کی ہے کان گدھے کے لگوالے......''

اس نے ایک دم کافی کا مگ اٹھالیا...... ''تو سو رہا تھا...... تو یہ کون پی رہا تھا...... کپ اب بھی گرم ہے۔''

اسی وقت فریال نیچے سے نکل آئی...... ''بھائی صاحب...... اب آپ نے چوری پکڑ ہی لی ہے تو اعتراف کر لینا چاہیے ہمیں۔''

میں نے سر پکڑ لیا...... ''قسم خدا کی...... یہ خود آئی تھی۔''

وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''جب وہ انکار نہیں کر رہی ہے تو قسم کھا کے گنہگار کیوں ہوتا ہے...... کاکی...... جا میرے لیے بھی کافی لا...... وہ میری ذاتی گھر والی تو یہاں آ کے دو کوڑی کی ہوگئی...... صبح اٹھ کے اس وقت تک ناشتا سامنے رکھ دیتی تھی...... اب اسے پروا ہی نہیں میری۔''

میں نے کہا۔ ''یار موقعے سے فائدہ اٹھا...... دوسری کر لے۔''

''یعنی پہلی کو قتل کر دوں؟ اچھا پروپوزل ہے تیرا...... اور اس کے بغیر دوسری ممکن بھی نہیں...... دیکھ یار...... میں اس جنگل میں منگل بدھ تو منا سکتا ہوں لیکن وکالت نہیں کر سکتا...... میری ساری پریکٹس چوپٹ ہو جائے گی اگر دفتر کو ماتحتوں پر چھوڑ دیا۔''

''جب تیری گھر والی کو تیری پروا نہیں تو ہمیں کیا...... جا......''

''میں تو جا رہا ہوں شب غم گزار کے...... ایک عقل کی بات تجھے سمجھانا تھی...... ذرا سیریس ہو جا۔''

''پہلے میں کچھ عرض کر دوں...... کل رات مجھے ایک پراسرار خاتون نے فون کیا تھا...... رات دو بجے...... اس وقت میں رابعہ کے ساتھ باہر بیٹھا تھا۔''

''فریال کے ساتھ......'' اس نے تصحیح کی۔

''نہیں...... رابعہ کے ساتھ...... فریال نے مجھے فون لا کے دیا...... اس عورت نے اپنا نام تو خیر نہیں بتایا...... یہ کہا کہ اس نے جو کچھ میرے لیے کیا ہے...... وہ اس کی قیمت چاہتی ہے۔''

''تیرے لیے کسی عورت نے کیا کیا ہے...... یہ تو خود بہتر جانتا ہوگا ٹیکے چتر......'' اس نے فریال سے کافی لے لی۔

میں نے کہا۔ ''اب کھڑی کیوں ہو...... جاؤ...... یہ باتیں تمہارے سننے کی نہیں ہیں۔''

''اگر میں اس عورت سے کہہ دیتی رانگ نمبر...... یا جھاڑ لگاتی اسے کہ کون ہو تم بی بی...... اتنی رات گئے تمہیں رفیق کیسے یاد آ گیا...... یہ میری شرافت تھی۔''

میں نے عاجزی سے کہا۔ ''آپ تشریف رکھیں مس شرافت النسا۔''

''وہ نور جہاں تھی......'' فریال ایک ہاتھ کو پیر پر رکھ کر بولی۔

میں چونک پڑا۔ ''یہ تم اتنے یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتی ہو...... مجھے تو صرف شک تھا۔''

''کیوں شک تھا؟'' فاروقی سوچتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا۔ ''ایک تو اس نے پی رکھی تھی...... ایسی کسی عورت سے میں واقف نہیں جو رات دو بجے فون کر کے مجھے کہے کہ جو میں نے آپ کے لیے کیا مجھے اس کی قیمت چاہیے...... قیمت تو مجھ سے سب ہی مانگ رہے ہیں...... وہ سالا تھانیدار چاہتا تھا کہ میں نئی کرولا خرید کے اس کے گھر پہنچا دوں...... جس سے واسطہ پڑتا ہے وہ پہلے قیمت مانگتا ہے۔''

''لیکن یہ عورت بعد میں مانگ رہی تھی۔'' فاروقی بولا۔

میں نے کہا۔ ''میں نے نام پوچھا تو...... کہنے لگی کہ نام میں کیا رکھا ہے...... سلطانہ، کلی...... نور جہاں...... کچھ بھی سمجھ لو...... اس سے مجھے شک ہوا۔''

فریال نے بڑی سادگی سے پوچھا۔ ''کتنی قیمت مانگ رہی تھی؟''

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کا ذہن دوسری طرف نہیں گیا ورنہ وہ پوچھتی کہ کیا قیمت مانگ رہی تھی......

اب میں نے بڑے اعتماد سے جھوٹ بولا۔ ''ایک کروڑ...... اس نے کہا اور پھر فون بند کر دیا۔'' ''شاید کوئی آ گیا تھا...... دوبارہ فون کر کے بتائے گی کہ رقم کہاں اور کیسے دی جائے۔''

فاروقی بولا۔ ''وہ ایسی ہی عورت ہے...... اکبر خان نے بہت بڑی قیمت ادا کی ہوگی۔''

''لیکن اس نے کیا نیکی کی ہے ایسی۔'' فریال بولی۔

فاروقی نے سر ہلایا۔ ''اگر وہ نور جہاں تھی۔''

''وہ نور جہاں تھی۔'' فریال نے اصرار کیا۔

فاروقی نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''میرا گمان ہے کہ...... وہ نیکی اس نے ہم سب کے ساتھ کی...... شاید سب سے زیادہ صوفی چچا کے ساتھ کی...... اس نے انہیں زندگی کے عذاب سے نجات دلا دی...... اور اس عذاب سے جو وہ زندہ رہنے کی صورت میں جھیلتے...... اور ان کی وجہ سے ہم جھیلتے۔''

خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد فریال بولی۔

''لیکن...... ہمارے حال پر یہ مہربانی کس لیے؟''

فاروقی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اس کا جواب تو وہ خود بھی نہیں دے گی۔''

''اکبر خان کے دشمنوں کی مدد...... ان کے لیے رحم دلی کا اظہار...... کیا یہ جرم بے وفائی اور غداری نہیں ہوگا۔'' میں نے کہا۔

فریال بولی۔ ''یقیناً ہے...... مگر کیا پتا اس نے ایسا کیوں کیا؟''

''ایک کروڑ کے لالچ میں اور کس لیے...... اس نے جوا کھیلا...... یہ سوچ کر کہ اکبر خان کو کبھی کچھ معلوم نہیں ہو سکتا کہ ایک کروڑ اس کے بینک اکاؤنٹ میں کیسے آ گئے...... وہ بہت چالاک عورت ہے...... اور بلاشبہ ایسی سازش صرف وہ ہی کر سکتی تھی...... اس نے کسی ڈاکٹر کو استعمال کیا جو زہریلی ادویات کا ماہر تھا...... FORENSIC میڈیسن...... اس کا کوئی چاہنے والا بھی تو یہ خدمت بجا لا سکتا تھا...... چاہنے والے بہت ہوں گے۔''

''جی...... فہرست کے آخر میں تو اب رفیق احمد شیرازی کے نام کا اضافہ ہوا ہے۔'' فریال نے کہا۔

''شٹ اپ...... میرا نام سینیارٹی لسٹ میں بہت اوپر ہے...... تمہارا نیچے چلا گیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''پھر اس نے تھانے کی حوالات تک رسائی حاصل کی...... اور اس ڈاکٹر نے صوفی چچا کو آزاد کر دیا...... قید حیات و بند سے۔ اس نے کوئی انجکشن دیا یا گولی کھلائی...... صوفی چچا کی پوسٹ مارٹم رپورٹ یہی بتاتی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن اب میں کیا کروں؟''

''تو اپنا کام کر...... شادی کر...... پل بنا چاہ بنا مسجد و تالاب بنا اور لوگوں کی بیویوں کو گمراہ کر...... کہ وہ شہر چھوڑ کے جنگل میں رہیں...... ایک سامنے موجود ہے...... پھر شہناز ہے...... فریال ہے...... میری لیلیٰ ہے۔''

میں نے کہا۔ ''میرا مطلب تھا اسے دے دوں ایک کروڑ......''

''وہ تیری مرضی...... بلیک میل کرنے والوں کو دے رہا ہے تو مددگاروں کو بھی دے دے...... کیا پتا کل کوئی اور کام پڑ جائے اس سے...... گھر کا بھیدی لنکا ڈھانے میں کام آتا ہے...... وہ فضہ کالم ہو ہماری تو اکبر خان کو تباہی سے کون بچا سکتا ہے...... لیکن میں تجھے دوسرا مشورہ دینے آیا تھا جو بیچ میں ہی رہ گیا۔''

فریال کی موجودگی کی وجہ سے میں نے فاروقی سے بھی جھوٹ بول دیا تھا کہ وہ عورت ایک کروڑ مانگ رہی تھی اور یہ جھوٹ چل گیا تھا...... میرے دل میں شک کا کانٹا برقرار تھا کہ نور جہاں کچھ اور چاہتی تھی۔ اس کے لہجے کی لگاوٹ چغلی کھاتی تھی کہ وہ قیمت میں خود مجھے مانگے گی...... اور اسے یقین ہوگا کہ اس بار بھی وہ منہ مانگی قیمت وصول کرنے میں کامیاب ہوگی...... ایسے مرد کہاں جو اس کو انکار کر سکیں۔

فاروقی نے کہا۔ ''دیکھ...... صوفی نذیر چچا کے لیے عذاب تو ختم ہوا ہے لیکن تیرے لیے وہ مسئلہ ابھی باقی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''سائنس ریسرچ سینٹر کا؟''

''ہاں...... بے شک وقتی طور پر تو دباؤ سے آزاد ہو گیا ہے لیکن ٹیکے چتر دشمن کو کمتر سمجھنا UNDERESTIMATE کرنا...... عقلمندی نہیں ہوتی...... اس کا ایک وار خالی گیا...... ترکش کا ایک تیر ضائع ہوا...... اس سے مطمئن یا خوش ہونا بے وقوفی ہوگی...... نہ جانے ان کے پاس اور کتنے ہتھیار ہوں گے...... ان کا اگلا وار کیا ہوگا...... اس سے بچنے کے لیے۔''

میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''میں سائنس ریسرچ سینٹر اس کے حوالے کر دوں...... یہ کبھی نہیں ہوگا فاروقی صاحب۔''

''ابے غصہ مت دکھا...... دماغ ٹھنڈا رکھ...... سمجھ لے

کہ یہ صدقہ ہے...... خیرات ہے...... ان پریشانیوں سے بچنے کے لیے جو آ سکتی ہیں...... تجھے بہت کام ہیں...... ان کی زیادہ اہمیت ہے۔''

میں نے کہا۔ ''صوفی چچا کے معاملے میں میری مجبوری صرف میری مجبوری نہیں تھی...... وہ خود قابل رحم تھے...... ان کے ساتھ رابعہ کا اور میرے والد کا تعلق میرے پاؤں کی زنجیر بنا ہوا تھا ورنہ میں پہلے بھی اکبر خان سے رعایت نہ کرتا۔''

فاروقی نے کہا۔ ''یار تو اپنا نفع نقصان دیکھ۔''

میں نے کہا۔ ''میرا ضمیر پہلے بھی مطمئن نہیں تھا...... میں وہ کنٹریکٹ نہیں سائن کرنا چاہتا تھا...... یہ بات صرف تھوڑی سی زمین کی نہیں...... اس سے دس گنا زمین میں اکبر خان کو دینے کے لیے تیار ہوں...... لیکن جو کام سائنس ریسرچ سینٹر کے نام پر ہو رہا ہے...... وہ کوئی غلط کام ہے...... غیر قانونی ہے یا غیر اخلاقی ہے جس سے کچھ لوگوں کے خزانے بھر رہے ہیں مگر اس کا خمیازہ نہ جانے کتنے لوگ بھگت رہے ہیں...... میرے وطن کے لوگ یا میرے عہد کے لوگ...... اکبر خان کو اس کام کی اجازت دے کر میں بھی اس کے جرم میں شریک ہو جاؤں...... ایک طرف ست بدھائی میں نیکی کماؤں...... دوسری طرف میرے نامہ اعمال میں انسانیت کے خلاف جرائم شامل ہوتے رہیں...... نہیں فاروقی صاحب...... صرف خود کو پریشانی سے بچانے کے لیے میں اکبر خان کو یہ لائسنس نہیں دوں گا۔''

فاروقی چپ ہو گیا...... رابعہ بھی خاموش کھڑی رہی۔

''میرا خیال ہے کہ میں جذبات کی رو میں بہہ کے کچھ زیادہ ہی بول گیا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ میں نے غلط نہیں کہا تھا۔''

میں خاموش ہوا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ریشم کھانے کے کمرے میں بڑے جوش و خروش سے گھنٹی بجا رہی تھی اور اعلان کر رہی تھی ''بریک فاسٹ ریڈی...... لیڈیز اینڈ جنٹلمین...... بریک فاسٹ ریڈی......'' اس کا انگریزی بولنے کا جنون برقرار تھا اور وہ سارا دن اپنی غلط سلط انگلش سے سب کو محظوظ کرتی رہتی تھی مگر باز نہیں آتی تھی۔ اس کی لگن رنگ لا رہی تھی۔ وہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ روانی سے انگریزی بولنے لگی تھی۔ اس نے فیشن میں بھی بہت ترقی کی تھی۔ فریال اور شہناز کی رفاقت میں وہ بہت کچھ سیکھ رہی تھی اور بعض اوقات مجھے اس کی شخصیت میں رونما ہونے والی تبدیلی کو دیکھ کر حیرانی ہوتی تھی۔ اب وہ کسی طرح بھی ست بدھائی جیسے گاؤں کی کوئی دیہاتی لڑکی نہیں لگتی تھی...... وہ ہم جیسی نظر آتی تھی اور اس انقلاب کو دیکھ دیکھ کر سب سے زیادہ خوش وہی ہوتا تھا جو اس کو سب سے زیادہ چاہتا تھا...... یعنی مسٹر عبدالغنی۔

ناشتے کے بعد فاروقی جانے لگا تو اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''میں تجھ سے خفا نہیں فیکے پتر...... خوش ہوں کہ تو نے میرا غلط مشورہ نہیں مانا...... اپنی بیوی کو میں تیری اجازت سے لے جا رہا ہوں دو چار دن کے لیے۔''

''میں تیرے خلوص کی قدر کرتا ہوں۔''

''خلوص کی اپنے پاس کوئی کمی نہیں...... ڈٹ جا مقابلے پر...... ہم تیرے ساتھ ہیں...... جینے کے لیے بھی اور مرنے کے لیے بھی...... خدا حافظ۔''

اس وقت فریال میرے پاس کھڑی تھی...... فاروقی کے جانے کے بعد اس نے میری طرف دیکھا۔ ''اگر تم اس کی بات مان لیتے تو مجھے دکھ ہوتا یقیناً...... لیکن اب فخر ہے۔''

میں نے گھڑی دیکھی۔ ''اب میں آپ سے وداع لیتا ہوں...... میں ایک خطرناک مشن پر جا رہا ہوں...... آنسوؤں میں ڈوبی مسکراہٹ اور دعاؤں کے ساتھ مجھے رخصت کریں...... زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔''

''کون سا قلعہ فتح کرنے جا رہے ہیں حضور؟''

میں نے کہا۔ ''تمہیں سیکرٹ ایجنٹ زیرو زیرو سیون مس ریشم نے انگلش میں بتا دیا ہوگا...... جب شاہی بادشاہ مجھ سے ملنے آیا تھا تو وہ دروازے سے لگی چھپ کر ہماری باتیں سن رہی تھی۔ میں نے اسے پکڑ لیا تھا۔''

''تم شاہی بادشاہ کے ساتھ جا رہے ہو؟''

''ہاں...... وہ معاملہ کچھ ایسا ہے۔''

''معاملہ تو مجھے معلوم ہے...... لیکن تم اکیلے کیوں جا رہے ہو۔'' فریال نے میری بات کاٹ دی۔ ''اور وہ خود ہے کہاں؟''

''وہ جان ہتھیلی پر رکھ کے چھپتا چھپاتا آیا تھا...... اب پتا نہیں کہاں ملے گا۔''

''کیا مطلب؟''

''اس نے کہا تھا کہ ہم خود مل جائیں گے آپ کو راستے میں کہیں بھی...... رہی اکیلے جانے کی بات تو میں کیا بینڈ باجا لے کر جاؤں۔''

''راجا کو لے جاؤ اپنے ساتھ۔''

میں نے کہا۔ ''یہاں کے معاملات سنبھالنے کے لیے اس کا یہاں رہنا ضروری ہے...... خدانخواستہ کوئی ایسی ویسی بات ہو جائے۔''

وہ گھبرائی۔ ''ایسی ویسی بات کیا ہو سکتی ہے...... تم مجھ

سے کچھ چھپا رہے ہو رومیو...... تمہیں میری قسم۔''

''یار سمجھا کرو...... ایسے جاہل عورتوں کی طرح بات بے بات اپنی قسم دو گی تو پھر کام کیسے چلے گا۔'' میں نے بگڑ کے کہا۔

''میں کچھ نہیں جانتی...... میں جاہل ہوں تو جاہل ہی سہی...... لیکن ویسے تم کو اکیلا ہرگز نہیں جانے دوں گی۔''

''پھر کیا کرو گی تم...... رونا شروع کر دو گی۔''

''میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔'' اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''میرے ساتھ...... تم پاگل ہو...... اماں ابا کیا کہیں گے؟''

اس نے لجاجت سے کہا۔ ''دیکھو رومیو...... انہیں پتا ہی نہیں چلے گا...... ابھی لیلیٰ بھابی گئی ہیں...... ریشم انہیں بتا دے گی کہ وہ مجھے بھی ساتھ لے گئے ہیں...... واپس آ جاؤں گی میں ان کے ساتھ۔''

میں نے کہا۔ ''فریال......''

''پلیز...... مجھے ساتھ لے چلو...... آخر اس میں حرج ہی کیا ہے...... ہم شاہی بادشاہ کے ساتھ ہوں گے تو ہماری حفاظت کی ذمے داری اس کی ہوگی...... مجھے بڑا شوق ہے ڈاکوؤں کا کوئی ڈیرا دیکھنے کا۔'' وہ میرے گلے میں جھول گئی۔

اس کے بعد میری مزاحمت ختم ہو گئی...... میں نے سوچا کہ فریال کچھ غلط بھی نہیں کہہ رہی ہے...... یہ معاملہ نمٹانے کے لیے سہ فریقی مذاکرات میں زیادہ وقت نہیں لگنا چاہیے...... شہاب الدین تاوان کی رقم دے گا...... وہ میں شاہی بادشاہ کے حوالے کر دوں گا...... شاہی بادشاہ کی تحویل سے غلام محمد کو چھڑا کے شہاب الدین کے حوالے کروں گا...... بات ختم...... اب یہ سارا ڈراما کیسے ہوتا ہے اور کہاں ہوتا ہے...... اس میں صرف اسکرپٹ میرا ہے...... ڈائریکشن شاہی بادشاہ کی ہے...... وہ جیسے چاہے کرے۔

''اب کیا سوچ میں پڑ گئے...... میں تیار ہوں۔'' فریال بولی۔

میں نے اسے اوپر سے نیچے تک ملاحظہ کیا۔ ''اچھا...... پھر تم یوں کرو کہ گاڑی میں بیٹھو...... میں آتا ہوں...... ابا کہاں ہیں؟''

''اپنے کمرے میں...... کوئی پرانی فلم آ رہی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''میں انہیں بتا دوں...... اور راجا کو بھی ہدایت کر دوں۔''

ابا کو میرے آنے کی خبر نہیں ہوئی۔ وہ فلم میں اتنے منہمک تھے۔ حیرانی مجھے اماں کو دیکھ کر ہوئی۔ فلم کا سین دیکھ کے اور گانا سن کے ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

میرے سلام پر ابا جی چونکے۔ ''آؤ بھئی رفیق...... بیٹھو۔''

میں نے کہا۔ ''ابا جی میں بیٹھنے نہیں آیا...... اجازت لینے آیا تھا۔''

''کہیں جا رہے ہو؟''

''جی...... لاہور میں کچھ معاملات نمٹانے تھے۔''

ان کی نظر اسکرین پر رہی۔ ''جھگڑے پھیلانے تو نہیں جا رہے ہو نا۔''

میں نے کہا۔ ''ارے نہیں ابا جی۔''

وہ بولے۔ ''بھئی یہ فلم ہے سنسار...... بلیک اینڈ وائٹ دور کی...... ہم نے سینما جا کے دیکھی تھی۔''

''یعنی اماں نے بھی۔'' میں نے ٹی وی کی طرف دیکھا تو اس پر دو بچے...... ایک آٹھ دس سال کا لڑکا اور دوسری کچھ کم عمر کی لڑکی...... ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے گا رہے تھے...... ''اماں روٹی دے...... بابا روٹی دے......''

گانا ختم ہوا تو اماں نے دوپٹے سے آنسو پونچھے۔

ابا نے کہا۔ ''اس وقت ہم راولپنڈی میں تھے۔ پچاس سال پہلے کی بات ہوگی...... تاج محل سینما میں لگی تھی فلم...... جیوپیٹر ایک کمپنی تھی...... اس نے بنائی تھی...... تعریف سنی تو ہم بھی چلے گئے...... مجھے یاد ہے تمہاری اماں سینما ہال میں بھی اس گانے پر بہت روئی تھیں۔ سب عورتیں روتی تھیں۔'' ابا میری معلومات میں اضافے کے ساتھ فلم میں مگن رہے۔

اماں نے کہا۔ ''بیٹا...... وہ فریال نظر نہیں آئی بہت دیر سے...... چائے لے کر آئی ہے تمہارے ابا کے لیے۔''

میں نے کہا۔ ''وہ تو چلی گئی فاروقی کے ساتھ۔''

''چلی گئی۔'' اماں نے چونک کے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''ہاں...... لیلیٰ بھابی اپنے ساتھ لے گئیں۔ کوئی کام تھا انہیں...... شام تک آ جائیں گی۔''

''وہ تو ٹھیک ہے...... مگر ہمیں بتا دیتی۔''

میں نے کہا۔ ''وہ آئی تھی بتانے...... لیکن آپ لوگوں کی محویت دیکھی تو شاید ڈسٹرب نہیں کیا۔ میں کہہ دیتا ہوں ریشم سے چائے کے لیے۔''

''اور تمہاری واپسی کب تک ہوگی۔''

میں نے کہا۔ ''اُمید ہے رات تک۔''

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ حالات موافق رہے۔ وہ

فلم میں مگن نہ ہوتے تو یہ جھوٹ نہ چلتا اور فریال کی ضد نہ چلتی۔ راجا نے اس پر سخت احتجاج کیا۔ "یار تیری مت ماری گئی ہے۔"

"آف کورس مہاراجا...... میری مت اس لڑکی نے بہت پہلے ماردی تھی......" میں نے اعتراف کیا۔

"قبل از نکاح تو جورو کا غلام ہو گیا ہے لکھے پتر۔"

میں نے کہا۔ "میں تیرے نقشِ قدم پر چل رہا ہوں اور انشاءاللہ ایسی ہی ذلت اٹھاؤں گا...... جتنی تو اٹھاتا ہے شہناز کے ہاتھوں۔"

"بکواس مت کر...... میری خودی بلند رہتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "خاک دھول...... وہ جب آپ کو بے نقط سناتی ہے تو آپ کی بولتی بند ہو جاتی ہے...... میں لکھ کر دینے کو تیار ہوں...... بعد میں وہ تجھے جھاڑو سے جھاڑے گی...... صبح دوپہر شام...... ابھی زبانی جھاڑتی ہے۔"

"دیکھیے...... میں بالکل شرم پروف ہوں...... آپ تشریف لے جاسکتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "یار کوئی ایسی ویسی بات ہو...... تو سنبھال لینا۔"

"کیا سنبھال لوں؟ اس ریاست کا نظم و نسق...... میں تیرا قانونی وارث نہیں ہوں اور ایسی ویسی بات سے تیری کیا مراد ہے۔"

میں نے کہا۔ "یار میں خطرناک ڈاکوؤں کے ساتھ جارہا ہوں۔"

وہ بولا۔ "یہ تو بڑی اچھی بات ہے...... میں تو کہتا ہوں واپس آنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں...... تیرے لیے خطرات یہاں بھی ہیں وہاں بھی مگر یار ڈاکوؤں کے گروہ کے سردار کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے...... دیکھ لے شاہی بادشاہ کو...... لوگ نام سے تھر تھر کانپتے ہیں...... رانا جیسے بھی چین سے سو نہیں سکتے...... ست بدھائی کے نواب کی کیا اوقات ہے شاہی بادشاہ کے سامنے...... مال سب اپنا خواہ کسی بھی تجوری میں ہو۔"

اگر میں فوراً نہ چل پڑتا تو راجا کی بکواس جاری رہتی...... مجھے اب یہ اطمینان ضرور تھا کہ ساری صورتِ حال راجا کے علم میں ہے...... گاڑی میں فریال کچھ فکر مند ہو رہی تھی کہ دیر کیوں ہو رہی ہے...... اسے ڈر ہو گا کہ اماں ابا مجھے رخصت کرنے کے لیے باہر نہ آجائیں...... خود کو چھپانے کے لیے وہ گاڑی کی پیچھے والی سیٹ پر لیٹ گئی تھی۔

گاڑی حویلی سے نکلی تو وہ میرے ساتھ آبیٹھی...... اس کا موڈ اب بہت اچھا تھا...... میں نے کہا۔ "تم تو اتنی خوش ہو جیسے ہم کسی پکنک پر جارہے ہیں۔"

وہ ہنسی۔ "میرے لیے یہ پکنک سے بھی زیادہ ہے۔ رومیو...... بڑا مزہ آتا ہے ایسے جھوٹ بول کے چوری چوری تمہارے ساتھ جانے میں۔"

میں نے کہا۔ "انگریزی میں کہتے ہیں نا...... چوری کے پھل زیادہ میٹھے لگتے ہیں۔"

"بعد میں یہ مزہ کہاں...... آخر ایسا کیوں ہوتا ہے رومیو...... عشق کی یہ سنسنی خیزی شادی کے بعد باقی کیوں نہیں رہتی۔"

میں نے کہا۔ "اس سوال کا جواب آج تک کوئی نہیں دے سکا جانِ من۔"

اس نے ایک خانے میں رکھی ہوئی سی ڈی کو دیکھا اور برا سا منہ بنایا۔ "یہ کیا ریں ریں کرتے گانے جمع کر رکھے ہیں۔ مہدی حسن...... عابدہ پروین...... یہ پھر مہدی حسن۔"

"خاتون...... یہ گانے نہیں...... غزلیں ہیں اور اگر تم نے کوئی گستاخی کی مہدی حسن کی شان میں تو تمہیں اٹھا کے باہر پھینک دوں گا۔"

وہ بولی۔ "پاپ کوئی نہیں...... مائیکل جیکسن...... برٹنی اسپیئرز...... جینٹ جیکسن...... خیر یہ غنیمت ہے۔" اس نے قلم تال کی سی ڈی لگادی۔ "رات کو اپنی کزن سے کیا راز و نیاز چل رہے تھے۔"

میں نے کہا۔ "اس نے نہیں بتایا...... کہ وہ کیوں رو رہی تھی۔"

"نہیں...... میں تو سمجھی وہ ماں باپ کو یاد کر کے رو رہی ہوگی میں تسلی دیتی رہی۔"

"وہ بڑی پرابلم میں ہے...... فرخ کی وجہ سے۔"

"کیا وہ نظریں بدل رہا ہے...... اس کا تو آسان علاج ہے...... اسے قتل کردو...... یہاں تو بہت آسان ہے۔"

میں نے کہا۔ "شی از پریگننٹ۔"

فریال نے سی ڈی بند کر دی۔ "کیا!...... یہ اس نے بتایا۔"

"اور کیا میں نے چیک اپ سے پتا چلایا۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہی...... "پھر...... وہ کیا چاہتی ہے؟"

"اگر تمہارا مطلب ہے ابارشن...... تو یقیناً تو......"

"کیسی بے وقوف کزن ہے تمہاری...... اس میں رونے والی کون سی بات تھی...... اور تم کیا کر سکتے ہو اس کیس

میں...... یا بات کرتی ڈاکٹر شہناز سے ورنہ فرخ سے...... وہ شادی سے انکار تو نہیں کرے گا۔"

"ان کی شادی اب فوراً ہو جانی چاہیے۔"

"اور ہماری؟" اس نے اپنا سر میرے کندھے پر رکھ دیا۔

اسی وقت ایک شخص سڑک کے درمیان میں آ گیا۔ معلوم نہیں وہ کسی درخت پر سے کودا تھا یا کسی جھاڑی میں سے باہر آیا تھا۔ میری توجہ چند سیکنڈ کے لیے فریال کی طرف ہوئی تھی۔ پھر دیکھا تو وہ ہماری طرف رخ کیے کھڑا تھا۔ شک و شبہے کی بات ہی نہیں تھی۔ وہ شاہی کا ساتھی تھا جو اسی ڈیوٹی پر مامور تھا کہ سڑک پر نگاہ رکھے اور جیسے ہی میری گاڑی دکھائی دے مجھے اپنے ساتھ لے آئے۔

میں نے گاڑی اس کے سامنے لے جا کے روکی۔ وہ اپنی جگہ سے ایک انچ نہیں ہلا...... اس کا حلیہ وہی تھا جو گزشتہ شب شاہی کے ساتھ آنے والوں کا تھا...... وہ سب ایک جیسے ہی لگتے تھے میں اسے پہچان نہیں سکا۔ دن کے اجالے میں اس نے چہرے کو زیادہ احتیاط سے چھپایا تھا۔ میں صرف اس کی آنکھیں دیکھ سکتا تھا یا وہ رائفل جو اس کے ہاتھ میں تھی۔

آہستہ آہستہ اس کا ہاتھ سلام کے لیے اٹھا اور وہ میری طرف آ گیا۔ "مجھے شاہی بادشاہ نے بھیجا ہے جناب آپ کو لانے کے لیے۔"

میں نے مسکرا کے کہا۔ "مجھے معلوم ہے...... بیٹھو......"

وہ پیچھے بیٹھ گیا۔ فریال اب خاموش ہو گئی تھی لیکن خوف زدہ بالکل نہیں تھی۔ میرا خیال ہے وہ اس ایڈونچر کو انجوائے کر رہی تھی۔ ہم رہتاس سے گزر چکے تھے اور اب دینہ کی جانب بڑھ رہے تھے کہ ایک جگہ اس نے کہا۔ "جناب عالی...... یہاں سے سیدھے ہاتھ پر چلیں۔"

مجھے سیدھے ہاتھ پر نہ کوئی گلی نظر آ رہی تھی نہ سڑک۔ "سیدھے ہاتھ پر کدھر......"

"یہ جو خانقاہ پر جھنڈا نظر آ رہا ہے۔" اس نے دائیں جانب ہاتھ کے اشارے سے واضح کیا۔ "کچا راستہ ہے۔"

جس جھنڈے کی طرف اس نے اشارہ کیا تھا وہ میرے اندازے کے مطابق دو کلومیٹر کے فاصلے پر تھا لیکن وہاں تک جانے کے لیے اس نے جس کچے راستے کا ذکر کیا تھا وہ کہیں دکھائی نہ دیتا تھا...... ایسے کچے راستے عام طور پر بیل گاڑیوں، تانگوں یا ریڑھوں کے مسلسل گزرنے سے وجود میں آتے ہیں۔ اور چھوٹے چھوٹے دیہات کے درمیان سڑک کا کام دیتے ہیں۔

مجبوراً میں نے گاڑی کو خشک پتھریلی اور کانٹے دار جھاڑیوں والی زمین پر اتار دیا اور جھنڈے کی ڈائریکشن میں چلتے ہوئے گاڑی کو ایسے راستوں سے گزارتا رہا جہاں میرے خیال میں راستے کا وجود ہی نہیں تھا۔ اس پورے علاقے میں کیکر اور ببول جیسے چھوٹے درختوں کا جنگل اگا ہوا تھا...... کبھی یوں لگتا تھا کہ بس اب آگے جانا ممکن نہیں ہو گا لیکن پھر کبھی دائیں طرف تو کبھی بائیں طرف اتنی جگہ مل جاتی تھی کہ گاڑی گزر سکے...... کئی جگہ کانٹے والی شاخوں نے گاڑی کی چھت اور باڈی سے رگڑ کھائی...... مجھے یقین تھا کہ گاڑی کے صاف اجلے پینٹ پر خراشوں کا جال پھیل گیا ہو گا۔

مجھے شاہی بادشاہ کے پروٹوکول افسر پر بھی طیش آ رہا تھا۔ وہ میری بالکل رہنمائی نہیں کر رہا تھا اور پیچھے اتنے سکون سے بیٹھا تھا جیسے میں اس کا شوفر ہوں اور اسے بتائی ہوئی جگہ تک پہنچانا میرا کام ہے۔ میں راستہ خود تلاش کروں۔ آخر اللہ نے آنکھیں کس لیے دی ہیں۔

فریال مجھ سے زیادہ اپ سیٹ تھی۔ ایک بار اس نے کہا بھی کہ یہ کیا راستہ ہے تو میں نے چڑ کے جواب دیا کہ محترمہ ہم پکنک منانے کے لیے نہیں نکلے تھے...... پھر مجھے افسوس ہوا......

دوسری بار اس نے کہا۔ "یہاں تو ٹائر فلیٹ ہو جائے گا۔"

میں نے مسکرا کے کہا۔ "انشا اللہ۔ اگر اللہ نے چاہا...... بلکہ مجھے تو پوری اُمید ہے کہ چاروں ٹائر بیٹھ جائیں گے اور وہ جو اسپیئر ہے...... اس میں بھی ہوا نہیں ہو گی...... کبھی بدلا نہیں گیا۔"

"پھر ہم کیا کریں گے؟"

"پھر ہم بھی بیٹھ جائیں گے یہاں...... دعا کریں گے کہ اللہ غیب سے امداد بھیجے۔"

جھنڈا جو دور سے درگاہ کے گنبد پر لہراتا نظر آ رہا تھا میری نظر سے اوجھل ہو چکا تھا اور میں اندازے کی بنیاد پر سفر جاری رکھنے پر مجبور تھا۔ اب پیچھے جانا آگے کے سفر سے زیادہ مشکل تھا۔ چنانچہ جب اچانک ایک جھنڈ سے طلوع ہو کے میں نے خانقاہ کو اپنے مقابل دیکھا تو میرا دل باغ باغ ہو گیا فریال نے بھی لمبی سانس کھینچ کے کہا۔ "خدا کا شکر ہے۔"

معلوم نہیں وہ کس پیر فقیر کی درگاہ یا خانقاہ تھی۔ سندھ ور پنجاب کے تمام دور افتادہ مقامات پر بھی ایسے ان گنت چھوٹے بڑے اور گمنام پیروں کے ڈیرے یا مزارات ہیں جن کا نام دس بیس کوس کے بعد کوئی نہیں جانتا...... دوسرے سائیں بابا یا پیر صاحب کا علاقہ ہوتا ہے...... تھانوں کی حدود کی طرح ان لوکل پیروں نے بھی علاقہ بانٹ لیا ہے کہ اللہ کے بندوں کی اتنی آبادی کے اولاد یا اولادِ نرینہ...... روزگار، شادی اور خاندانی جھگڑوں کے معاملات کا ٹھیکا ہمارا...... آگے کا تمہارا...... سنا ہے جیب کترے، چور ڈاکو بھی ایسے ہی علاقے بانٹ لیتے ہیں۔

گاڑی رُکی تو شاہی کا سفیر بڑی مستعدی سے اترا۔ میں نے خانقاہ کی عمارت کا جائزہ لیا۔ یہ صرف ایک ہال کمرے پر مشتمل تھی جس کی چنائی اینٹوں سے کی گئی تھی مگر صاف لگتا تھا کہ چنائی کرنے والا پہلے جوتے گانٹھتا تھا یا ترکھان تھا۔ اینٹوں پر پلستر نہیں تھا مگر چونا تھوپ دیا گیا تھا۔ اُوپر والے گنبد کو گول تسلیم کیے بنا چارہ نہ تھا کیونکہ وہ چوکور یا تکون بھی نہیں تھا۔ اس عمارت کے گرد درختوں پر بہت سے چھوٹے رنگین جھنڈے بھی تھے۔ سب جھنڈے دھوپ بارش میں گل کے پھٹ گئے تھے۔ پیر کی آمدنی غالباً اتنی کم تھی کہ وہ پبلسٹی کے لیے نئے رنگین جھنڈے تک افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔

شاہی بادشاہ اچانک ایک دروازے سے نکل آیا۔ ہال میں داخل ہونے کا یہ واحد دروازہ بند نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس میں پٹ ہی نہیں تھے۔ وہ مجھ سے مصافحہ کرنے کے لیے پُرجوش انداز میں آگے بڑھا تھا پھر اس کی نظر فریال پر گئی تو اس کی مسکراہٹ بجھ گئی۔

"یہ تم کسے اپنے ساتھ لے آئے دوست......؟"

میں نے بڑی روانی سے جھوٹ بولا۔ "بھئی بھابی ہیں تمہاری۔"

"وہ تو خیر ٹھیک ہے...... مگر......"

"مگر کیا......؟" میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا۔

"ڈاکوؤں کے ڈیرے پر عورتوں کا جانا خطرناک ہوتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "جب ہم تمہارے مہمان ہیں تو پھر خطرہ کیسا؟"

اس نے سر ہلایا۔ "دراصل ہر ڈیرے کی کچھ روایات ہوتی ہیں۔ وڈیرے کے ڈیرے کی یا طوائف کے ڈیرے کی طرح ڈاکوؤں کے ڈیرے پر کچھ باتوں کا خیال رکھا جاتا ہے۔ وہاں کوئی عورت نہیں جا سکتی۔"

میں نے کہا۔ "پھر میں کیا کروں...... واپس جاؤں...... اسے چھوڑ کے پھر آؤں؟...... وہ بہت مایوس ہو گی...... مایوسی مجھے بھی ہو گی۔"

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "نہیں دوست...... ہم تمہیں مایوس نہیں کریں گے...... تم مہمان بھی ہو اور مہمان کو مایوس لوٹانا بھی ہماری روایت نہیں...... آؤ اندر آؤ۔"

میں نے کہا۔ "مجھے معلوم ہوتا کہ اس سے تمہارے لیے مشکل پیدا ہو گی۔"

"مشکل کوئی نہیں...... دراصل اس پابندی کا بھی ایک مقصد ہے کوئی اپنے ساتھ عیاشی کے لیے عورت نہ لائے...... گھر انے کے بھی ہوتے ہیں لیکن ظاہر ہے گھر کی ماں، بہن اور بیٹیوں کو ڈیرے پر کیوں لائے گا...... مگر کوئی کسی کو اٹھا لائے اغوا کر کے...... یا طوائف کو لے آئے...... ہوتے تو ڈاکو ہی ہیں...... نقد اور زیور لوٹ کے لاتے ہیں...... عورت انہی پر رجھتی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے مہمان پر پابندیاں نہیں۔"

اس نے سوچ کے کہا۔ "میں یہی کہوں گا کہ مہمانوں کو پتا نہیں تھا...... ایک بات اور بھی ہے دوست...... برا مت ماننا...... عورت ذات ہوتی ہے کانوں کی کچی اور اس کے پیٹ میں بات رُکتی نہیں...... یہ تعصب کی بات نہیں تجربے کی بات ہے۔"

میں نے کہا۔ "کچھ لوگ تو آج بھی عورت کو ناقص العقل مانتے ہیں۔"

"تم نہیں مانتے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "میرا خیال ہے اللہ سے کوئی ناانصافی نہیں منسوب کی جا سکتی۔"

وہ ہنسنے لگا۔ "یہ بات نہیں، اللہ نے عورت کو حسن دے دیا...... جیسے شیر چیتے کو طاقت دی مگر ہوشیار بنا دیا لومڑی کو...... یہ دیکھو دنیا میں سیکڑوں سائنسداں اور موجد گزرے ہیں کسی عورت کی ایک ایجاد بتا دو...... سائنسداں بھی بس ایک تھی...... میڈم کیوری...... ایسا کیوں......؟"

میں نے ہنس کے کہا۔ "کیا ہم آج ہی یہ فیصلہ کر لیں گے...... یہاں کھڑے کھڑے۔"

"اندر بیٹھنے کی جگہ صرف فرش ہے...... بھابی گاڑی میں آرام سے ہے۔" اس نے معذرت کی۔

"ہم کس کا انتظار کر رہے ہیں؟"

"کلیئرنس مل جائے تو چلتے ہیں...... ایک جگہ ناکا لگا تھا کل رات...... کسی نے مخبری کر دی تھی؟" وہ بولا۔

مجھے کچھ فکر ہوئی۔ "یہ تو خطرناک بات ہے۔"

"نہیں...... تھوڑی دیر میں راستہ کھل جائے گا...... ورنہ

دوسری طرف سے چلیں گے۔"

میں نے کہا۔ "ہمیں جانا کہاں ہے؟"

"تمہیں میرے ساتھ جانا ہے..... کیا یہ اطمینان کافی نہیں..... ہم اپنا ٹھکانا اپنوں سے بھی چھپاتے ہیں دوست..... یہ بات غلط نہیں ہے کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں..... ایسا نہ ہوتا تو کل مخبری کیسے ہوتی۔"

"یہ مخبری کیا ہوئی تھی؟ یہ کہ تم مجھ سے ملنے آئے تھے؟"

"نہیں..... اتنا معلوم ہوتا تو رات کو ہی کھیل ختم ہو جاتا..... خبر یہ ملی ہوگی کہ شامی بادشاہ اس علاقے میں ہے..... یہ جو مخبر ہوتے ہیں نا..... یہ جنگل کے چھوٹے جانوروں جیسے ہوتے ہیں۔ شیر کا چھوڑا ہوا کھاتے ہیں شیر سے دور رہتے ہیں..... مگر اس کی بو سونگھ لیتے ہیں ہوامیں۔"

اچانک فریال نے انجن بند کر دیا اور گاڑی سے اتر آئی..... وہ غالباً اکیلے بیٹھے بیٹھے بیزار ہو گئی تھی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ ہم صرف باتیں کر رہے ہیں قریب آ کے اس نے شامی کو سلام کیا۔

شامی بادشاہ نے کہا۔ "کیسی ہو بھرجائی....."

وہ اس طرز تخاطب پر میری طرف دیکھ کے مسکرائی۔

"اچھی ہوں..... آپ کیسے ہو شامی بھائی..... کیا پروگرام ہے۔" یہ اس نے مجھ سے مخاطب ہو کے کہا۔

میں نے کہا۔ "بس چلتے ہیں۔"

"میں..... یہ اندر سے دیکھوں گی....." اس نے خانقاہ کی طرف اشارہ کیا۔

"کیوں نہیں..... آؤ۔" شامی نے خوش اخلاقی سے کہا۔

دیکھنے کے لیے اندر کچھ بھی نہیں تھا..... سوائے ایک قبر کے جس پر بہت پرانا سبز غلاف پڑا ہوا تھا۔ اس کا رنگ اڑ گیا تھا اور پر لگا ہوا گوٹا اپنی چمک کھو چکا تھا..... لوح مزار پر لکھا ہوا نام بھی پڑھا نہیں جاتا تھا..... سرہانے کی طرف پگھلے ہوئے موم کے ڈھیر سے بن گئے تھے..... ایک چبوترے پر مٹی کا ایک بہت بڑا دیا رکھا ہوا تھا مگر اس میں تیل نہیں تھا..... اس کے ساتھ ہی بہت سے چھوٹے چھوٹے دیے پڑے تھے..... غالباً اب یہاں کوئی منت مراد مانگنے والا بھی نہیں آتا تھا..... ایسا کیوں ہوا؟ میں نے سوچا..... کیا پیر صاحب کی کوئی سفارش منظور نہیں ہوئی..... کسی کا بگڑا ہوا کام نہیں بنا..... گڈول خراب ہو گئی؟ یا پھر مزار چلانے والا کوئی نہیں رہا۔ اس قسم کے مزارات تو دکان کی طرح چلائے جاتے ہیں..... دکانداری میں سیل پروموشن اور مارکیٹنگ کے اپنے اپنے طریقے رائج ہیں۔

فریال نے میرے ساتھ قبر کے گرد ایک چکر لگایا..... ہال شاید تیس فٹ لمبا اور چوڑا تھا..... اس کی بلندی زیادہ نہیں تھی..... گنبد کا وسطی حصہ فرش سے تیس فٹ اونچا ہوگا..... اوپر تاریکی تھی لیکن میں چمگادڑوں کو الٹا لٹکتا ہوا دیکھ سکتا تھا۔

میں نے چلتے چلتے پوچھا۔ "شامی بادشاہ..... یہ کس کا مزار ہے؟"

"کسی کا بھی نہیں..... جو سچ پوچھو۔"

فریال نے چونک کے کہا۔ "کیا مطلب..... یہ قبر....."

"یہ ایسے ہی ہے بھرجائی..... ایسے کچھ ٹھکانے ہیں اپنے بھی..... سب کے ہوتے ہیں..... وہاں اپنے بندے بھی رہتے ہیں..... ان کا اپنا کام الگ چلتا رہتا ہے ہمارا ساتھ دیتے ہیں تو انہیں ہم سے بھی ملتا رہتا ہے۔"

"کیا یہ بات پولیس نہیں جانتی؟" فریال بولی۔

"جاننے والے سب جانتے ہیں..... مگر ہم انہیں بھی حصہ پہنچاتے ہیں..... کام مل جل کے ہوتا ہے بھرجائی۔"

ابھی وہ خاموش ہی ہوا تھا کہ باہر سے اس کا ایک ساتھی اندر آیا..... اس کے ہاتھ میں وائرلیس سیٹ تھا..... شامی نے ریسیور لے لیا اور باہر چلا گیا..... میں سمجھ گیا کہ وہ فریال کی موجودگی میں بات نہیں کرنا چاہتا۔

"مجھے شدت سے احساس ہو رہا ہے کہ تمہیں ساتھ لا کے میں نے بے وقوفی کی۔" میں نے کہا۔

"اور آپ کر بھی کیا سکتے تھے جناب..... مجھے تو بڑا مزہ آ رہا ہے۔"

میں نے کہا۔ "پتا چلے گا مزے کا جب پولیس مقابلہ ہوگا۔"

اس کا رنگ اُڑ گیا..... "یہ کس نے کہا؟"

"یہ میں کہہ رہا ہوں..... پولیس مقابلہ کیا ہوتے نہیں؟ سوچو کیسی رسوائی ہوگی اگر مرنے والوں میں اپنا نام ہوا..... ڈاکوؤں کے ساتھ۔"

"ایسی باتوں سے میں ڈرنے والی نہیں ہوں..... لیکن ایک بات بتاؤ..... بس یہاں آنا تھا ہمیں..... یہی ہے ان کا ڈیرا؟"

میں نے کہا۔ "یہ تو ایک اسٹاپ اوور ہے..... جیسے لندن کی فلائٹ دبئی میں ٹھہرتی ہے۔"

"یہ فلائٹ کب تک رُکے گی ہاں..... اور کہاں ختم ہوگی بالآخر؟"

"یہ میں بھی نہیں جانتا تو تمہیں کیا بتاؤں؟"

اسی وقت شامی اندر آ گیا..... ایک سیکنڈ کے لیے میں نے اندر آتے وقت اس کے چہرے پر تشویش اور پریشانی کے آثار دیکھے..... دوسرے ہی لمحے وہ پُرسکون اور پُراعتماد ہو گیا..... شاید ہمیں مطمئن دیکھنے کے لیے..... اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "چلو بھرجائی..... دل پکا ہے نا؟..... آپ جا رہے ہو ڈاکوؤں کے ڈیرے پر۔"

انہوں نے بہت ڈرایا تھا مجھے..... تاکہ میں رُک جاؤں پیچھے لیکن میں نے کہا کہ ساتھ تو میں نے چھوڑنا نہیں ہے....." وہ بولی۔ "باقی اللہ مالک ہے۔"

"چلو جی پھر آپ اپنی گاڑی پکڑو..... ایک بندہ آپ کے ساتھ ہوگا وہی جو آپ کو لایا تھا۔"

"آپ ہمارے ساتھ نہیں جاؤ گے؟" فریال بولی۔

"لو جی..... ایسے قافلہ بنا کے تو ہم نہیں جا سکتے..... آپ کو اس بندے کی ہدایات پر عمل کرنا ہے..... وہی کرنا ہے جو وہ کہے..... اپنی عقل کے گھوڑے نہیں دوڑانے ہیں..... ٹھیک؟ اور اس سے کوئی سوال مت کرنا۔ یہ کچھ نہیں بتائے گا۔"

میں نے انگوٹھا دکھا کے کہا۔ "یس باس۔"

"آگے ملاقات ہوگی ڈیرے پر..... اگر اللہ کو منظور ہوا..... اب تم نکلو۔" وہ ایک دم پلٹ گیا۔

حیرانی مجھے یہ تھی کہ اس ویران مقبرے میں شامی بادشاہ کے سوا کوئی موجود نہ تھا لیکن وہ اتنا مطمئن تھا جیسے اس کے سب ساتھی اس کے ساتھ ہیں اور مجھے یہ احساس رہا کہ باقی لوگ اس جنگل میں کہیں آس پاس چھپ کر بیٹھے ہوئے تھے اور سب دیکھ رہے تھے..... انہوں نے اپنے سردار کے گرد ایک حفاظتی حصار قائم کر رکھا تھا جسے توڑ کے جانے والے کو ان کی لاشوں پر سے گزرنا پڑتا..... مجھے ہر درخت اور جھاڑی سے دو آنکھیں اپنی جانب نگراں دکھائی دیں اور ایک بندوق کی نالی کا رخ اپنی جانب نظر آیا حالانکہ ظاہر میں کچھ بھی نہ تھا۔

ہمیں لانے والے نے ڈرائیونگ سنبھال لی تھی۔ کوئی اعتراض کیے بغیر ہم پیچھے بیٹھ گئے تھے کہ اس نے کہا۔ "جناب عالی..... آپ آگے تشریف لاؤ۔"

میں آگے تشریف لے گیا..... گاڑی مخالف سمت میں گئی۔ یہ راستہ بھی ویسا ہی تھا جس پر میں گاڑی چلا کے لایا تھا۔ لیکن میرے مقابلے میں وہ ڈرائیور بہت ایزی تھا اور گاڑی کو یوں دوڑا رہا تھا جیسے نیچے ہموار سڑک ہے..... وہ دائیں بائیں دیکھے بغیر موڑ کاٹتا تھا اور یہ اندازہ کرنا محال تھا کہ وہ کدھر جا رہا ہے۔

آدھے گھنٹے بعد ایک سڑک آ گئی تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ اس سڑک پر ٹریفک بالکل نہیں تھا۔ سڑک کی حالت بتاتی تھی کہ اس کی مرمت کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی گئی..... گاڑی وہاں رک گئی..... ڈرائیور نے ہم سے کہا کہ ہم کچھ پینا چاہیں تو پی لیں۔

"ہم تو اپنے ساتھ پانی بھی لے کر نہیں چلے تھے۔" فریال بولی۔

"آپ حکم کرو..... ٹھنڈا چاہیے یا گرم؟"

صرف اسے آزمانے کے لیے میں نے کہا۔ "مجھے کافی چاہیے..... بیگم صاحبہ کو کولڈ ڈرنک....."

وہ اُتر کے پیچھے گیا۔ ڈکی کھولی اور دو منٹ بعد اس نے مجھے گرم کافی کا مگ تھما دیا اور فریال کو آئس کولڈ پیپسی پکڑا دی۔ پھر وہ گاڑی کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا..... میری عقل خبط ہو گئی..... یہ شامی بادشاہ کا حسن انتظام تھا اس جنگل بیابان میں یہ سب کہاں سے آیا کیسے آیا؟ اس کا جواب کوئی نہیں تھا..... فریال نے بھی گویا تسلیم کر لیا کہ آگے ایسے واقعات یا اس سے بھی زیادہ حیران کرنے والے واقعات پیش آ سکتے ہیں۔

میں نے اسے سمجھا دیا تھا کہ وہ محتاط رہے اور کسی قسم کے سوال جواب بالکل نہ کرے جس سے یہ شک ہو کہ وہ تجسس کا شکار ہے اور ایسی معلومات حاصل کرنا چاہتی ہے جو ڈاکوؤں کے نزدیک "کلاسیفائیڈ" یا ٹاپ سیکرٹ ہونے کی وجہ سے سیکیورٹی رسک سمجھی جاتی ہیں۔ خود میں نے اپنے گائیڈ سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ آخر ہم یہاں کب تک رکے رہیں گے اور صرف آدھے گھنٹے بعد یہ ریفریشمنٹ کا وقفہ چہ معنی دارد۔

یہ راز جلد ہی کھل گیا..... پیچھے سے ایک بکتر بند گاڑی جیسی جیپ نمودار ہوئی۔ اس کی ظاہری حالت جانتے بوجھتے خراب کی گئی تھی ورنہ یہ نئے ماڈل کی فور وہیل ڈرائیو گاڑی تھی۔ گاڑی ہمارے پاس رکی تو ہمیں یہاں تک لانے والے نے کہا۔ "اب آپ اس میں سوار ہو جائیں۔"

میں نے تعمیل کی۔ اس گاڑی کو چلانے والا پولیس کی وردی میں تھا اور گاڑی پر نمبر پلیٹ بھی پنجاب پولیس کی تھی۔ میری گاڑی وہیں کھڑی رہ گئی..... میں نے آگے والی سیٹ پر بیٹھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ فریال میرے ساتھ بیچ والی سیٹ پر رہی۔ میری گاڑی چلا کر لانے والا آگے بیٹھ گیا۔ گاڑی کے شیشے سیاہ تھے اور ان سے باہر کا منظر بالکل دکھائی نہیں دیتا تھا۔ تاہم اپنے سامنے ونڈ اسکرین سے میں راستہ دیکھ سکتا تھا۔

پانچ منٹ بعد اچانک راستہ غائب ہوگیا۔ ہمارے اور ڈرائیور کے درمیان ایک سیاہ پردہ حائل ہوگیا تھا۔ میں نے پیچھے مڑ کے دیکھا تو پیچھے والے شیشے کو بھی ایسے ہی سیاہ پردے نے چھپالیا تھا۔ اب ہم ایک تاریک کیبن میں تھے جہاں صرف اندھیرا تھا۔ فریال نے میرا ہاتھ پکڑلیا...... اس کا ہاتھ سرد ہو رہا تھا۔ وہ خوف زدہ تھی۔ میں نے آہستہ سے اس کا سر اپنے کندھے پر رکھ کے اسے تھپکی دی۔ ''اٹ از او کے۔'' میں نے آہستہ سے اس کے کان میں کہا۔ اس نے سر کی خفیف سی جنبش سے واضح کیا کہ وہ سمجھتی ہے...... رازداری شرطِ اول ہے...... سوال کوئی نہیں کرنا ہے۔

اندر سے گاڑی بہت آرام دہ تھی۔ اس کا اے سی بہترین کام کررہا تھا اور رفتار زیادہ ہونے کے باوجود اندر خفیف سا جھٹکا بھی محسوس نہیں ہوتا تھا۔

اغوا کیے جانے کا میں ایک ذاتی تجربہ رکھتا تھا مجھے آنکھوں پر پٹی باندھ کر لے جانے کے علاوہ میری گھڑی لے لی گئی تھی جس سے مجھے فاصلے کا اندازہ ہوا تھا نہ سمت کا اور نہ وقت کا...... یہ بھی اسی نوعیت کا سفر تھا لیکن ہمیں ساتھ لے جانے والے دوست تھے۔ انہوں نے منزل کا اندازہ تو نہ ہونے دیا لیکن وقت کے حساب سے باخبر رکھنے والی گھڑی چھوڑ دی۔ تاریکی میں بھی میری رسٹ واچ کے ہندسے چمکتے تھے اور سوئیوں کی پوزیشن دیکھی جاسکتی تھی۔

پہلے آدھے گھنٹے میں پندرہ بار فریال نے وقت پوچھا ہو گا اور پندرہ بار میں نے دیکھا ہوگا چنانچہ ایک ایک منٹ بعد میں گھڑی دیکھتا رہا۔ دوسرے گھنٹے کے آغاز تک ہماری خوف اور اضطراب کی کیفیت پہلے جیسی نہیں رہی۔ ہماری نظر تاریکی میں دیکھنے کے قابل ہوگئی۔ مکمل خلوت کا احساس ہوا تو فریال نے حسبِ عادت جذباتی جارحیت کا آغاز کیا۔ میں نے اشاروں میں اسے احساس دلایا کہ پردے کے اُدھر اغیار بیٹھے ہیں۔

''اغیار کو معلوم ہے کہ ہم غیر نہیں...... میاں بیوی ہیں۔''

''میاں بیوی بھی دُنیا کی شرم کرتے ہیں۔''

''تم تو جانتے ہو میں کتنی بے شرم ہوں۔'' وہ میری گود میں سر رکھ کے اور سمٹ کے لیٹ گئی۔ ''جس نے کی شرم اس کے پھوٹے کرم۔''

''اگر انہوں نے پردہ ہٹادیا؟''

''تو کون سی قیامت آجائے گی اور یہ کوئی قابلِ اعتراض سین بھی نہیں ہوگا جو وہ دیکھیں گے...... پھر اس کی اجازت خود تم نے دی ہے۔''

''میں نے؟...... کس بات کی اجازت دی ہے؟''

''جو ایک شوہر کی طرف سے بیوی کو ہر وقت حاصل رہتی ہے...... قربت کی اور بے تکلفی کی...... کیا تم نے خود کو میرا شوہر ڈیکلیئر نہیں کیا تھا؟''

کچھ دیر بعد وہ سوگئی۔ ایک گھنٹا اور گزر گیا۔ اب دوپہر بھی گزر چکی تھی۔ فاصلے اور سمت کا اندازہ کرنے کی میں نے کوشش ہی نہیں کی۔ یہ ناممکن نہیں تھا...... عین ممکن تھا کہ گاڑی چند کلومیٹر کے دائرے میں دائیں بائیں گھوم رہی ہو اور یہ بھی ہوسکتا تھا کہ ہم اس جگہ سے بہت دور آگئے ہوں جہاں سے چلے تھے۔

دو گھنٹے بعد گاڑی رُک گئی۔ فریال اُٹھ بیٹھی۔ ''کیا ڈیرا آگیا؟ وقت کیا ہوا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''ہوسکتا ہے لنچ بریک ہو۔''

میری مذاق میں کہی گئی بات دُرست ہوگئی۔ دس منٹ تک کچھ نہ ہوا...... دونوں ڈرائیور نیچے اتر کے نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔ فریال نے میرے منع کرنے کے باوجود پردہ ہٹا کے دیکھا۔ ''یار بڑا مزہ آرہا ہے۔ بڑا سین ہے مگر کچھ ایکشن بھی ہونا چاہیے...... ایڈونچر تب ہوگا۔''

میں نے کہا۔ ''ایکشن میں کروں...... گاڑی لے کر فرار ہوجاؤں...... وہ پیچھے سے چلائیں دنا دن گولیاں...... ہیروئن دہشت زدہ ہوکے ہیرو سے چمٹ جائے لیکن ہیرو گاڑی کو نکال لے جائے۔''

اسی وقت دروازہ کھلا اور پہلے والے ڈرائیور نے کہا۔

''جنابِ عالی...... کھانا کھالیں۔''

میں نے باہر دیکھا تو منظر بالکل بدلا ہوا تھا۔ کانٹے دار جھاڑیوں کی جگہ سرسبز اور گھنے درخت تھے اور کنکر پتھر والی زمین کی جگہ ہری گھاس کا فرش بچھا ہوا تھا۔ یہ کوئی باغ یا فارم ہاؤس تھا...... گاڑی ایک چھوٹی سی نہر کے کنارے کھڑی تھی اور کچھ فاصلے پر دسترخوان بچھا کے کھانا چُن دیا گیا تھا۔ دونوں ڈرائیور میرے کہنے کے باوجود کھانے میں شریک نہیں ہوئے۔ وہ ٹہلتے ہوئے درختوں کے جھنڈ میں کہیں غائب ہوگئے۔ غالباً معزز مہمانوں کے برابر دسترخوان پر بیٹھنا ان کے ضابطہ اخلاق کے خلاف تھا یا انہیں اس کی اجازت نہیں تھی۔

فریال سخت حیران ہوئی۔ ''یہ شامی بادشاہ تو جادوگر ہے...... کیا زبردست انتظام کیا ہے اس نے۔''

میں نے خوش ہو کے کہا۔ ''آخر دوست بھی تو نواب رفیق احمد شیرازی کا ہے۔''

''نواب صاحب...... آپ اس ڈاکو سے ہی کچھ سیکھو...... ایسا لگتا ہے ہم پکنک منا رہے ہیں...... کیسی جگہ منتخب کی ہے لنچ سرو کرنے کے لیے اور کھانے کا اہتمام دیکھو...... یہ کس نے پکایا ہوگا؟''

''ظاہر ہے اس کی بیوی نے...... تم نے تو کبھی انڈا نہیں اُبالا۔''

''اور اُبالوں گی بھی نہیں...... یہاں تو تم مردوں نے عورت کو باورچن...... دھوبن...... صفائی کرنے والی ماسی اور بچے پیدا کرنے کی مشین بنا رکھا ہے...... ویسے آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ کھانا بازار کا ہے...... کھائیے۔''

کھانا مغلئی تھا۔ پلاؤ قورمہ اور کباب...... اس کے ساتھ زعفرانی فیرنی...... ہاٹ باکس میں سے نکالی جانے والی ہر چیز گرم تھی۔ فیرنی ٹھنڈی تھی کھانے کے برتن بہت نفیس تھے...... غالباً یہ خصوصی اہتمام ست بدھائی کی حویلی میں رہنے والے نواب رفیق احمد شیرازی کو یہ احساس دلانے کے لیے تھا کہ مہمان نوازی کو شایانِ شان بنانے میں دوست نے کسر نہیں چھوڑی...... دوست دربدر ہے...... ڈاکو ہے...... بے گھر ہے اور خاندانی نہیں تو کیا...... تاہم یہ سب میرے لیے بھی انتہائی غیر متوقع تھا۔

اب فریال کا موڈ مزید خوشگوار ہوگیا تھا۔ ایک پُرخطر سمجھا جانے والا سفر پُرلطف پکنک میں بدل گیا تھا۔ آگے کیا ہوگا اس سسپنس کا لطف باقی تھا۔ وہ کھانے کے بعد نہر کے پانی میں پاؤں لٹکا کے بیٹھی رہی اور مسلسل بولتی رہی...... ہنستی رہی...... اتنا خوش میں نے اسے بہت عرصے بعد دیکھا تھا۔

تقریباً پون گھنٹے بعد ہمارے راہبر، محافظ...... ڈرائیور اور خادم پھر نمودار ہوئے اور سفر پہلے کی طرح شروع ہوگیا۔ گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے ہم سے پوچھا گیا کہ ہمیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟ کافی چائے یا کولڈ ڈرنک ان کے پاس گاڑی کے اگلے حصے میں ہر چیز موجود تھی۔ کھانا اتنا پُرلطف تھا کہ سفر پھر شروع ہوا تو فریال پھر سوگئی اور مجھ پر بھی غنودگی طاری ہونے لگی۔ دراصل انتہائی آرام دہ ماحول، تاریکی اور خاموش رہنے کی مجبوری نے نیند کو ہم پر مسلط کردیا۔

میں لیٹ نہیں سکتا تھا۔ سیٹ کی پشت سے سر لگا کے میں نے آنکھیں بند کرلیں اور پھر کھولیں تو گاڑی رُکی ہوئی تھی۔ گاڑی رُکنے سے ہی میں جاگا تھا۔ گھڑی دیکھی تو مزید ڈیڑھ گھنٹا گزر گیا تھا۔ ہم سے باہر تشریف لانے کی درخواست کی گئی۔ تاریکی میں سے روشنی میں آ کے میں نے گرد و پیش پر نظر ڈالی تو سب کچھ پھر بدل گیا تھا۔

میرے سامنے کسی چھوٹے سے دیہی ریلوے اسٹیشن کی ویران عمارت تھی جو صرف ایک کمرے اور برآمدے پر مشتمل تھی۔ کمرے کی چھت موجود تھی مگر کھڑکی دروازے غائب تھے۔ برآمدے کی چادروں والی چھت میں زنگ نے ان گنت سوراخ کردیے تھے۔ صاف نظر آتا تھا کہ اس ریلوے اسٹیشن کو بند ہوئے زمانہ ہوگیا اور شاید اب کوئی ہفتہ وار ٹرین بھی اِدھر نہیں آتی۔ زرد رنگ کی عمارت کے اوپر ایک سفید دائرے میں اس کا سن تعمیر 1911ء درج تھا۔ اس کے پیچھے لکھے ہوئے نام کے حروف دھندلے پڑ گئے تھے مگر پڑھے جاسکتے تھے۔ یہ سہسرام کا اسٹیشن تھا۔ میری معلومات کے مطابق یہ سابق مشرقی پاکستان کا ایک قصبہ تھا اور غالباً شیر شاہ سوری کا تعلق اسی علاقے سے تھا۔ اسی شیر شاہ سوری نے جرنیلی سڑک بنائی تھی جو ایک روایت کے مطابق پشاور سے کلکتہ جاتی تھی اور فی زمانہ جی ٹی روڈ تھی۔ مزید یہ کہ اسی شیر شاہ نے اصل رہتاس کا قلعہ جو بنگال میں تھا پنجاب فتح کرنے کے بعد جہلم کے قریب بھی بنایا...... یہ دنیا سے آگے تھا اور ست بدھائی کے راستے میں پڑتا تھا۔

چنانچہ سہسرام کا نام یہاں دیکھ کے مجھے بہت کچھ یاد آیا اور میں اس اتفاق پر حیران بھی ہوا...... اسٹیشن کے نیم پختہ پلیٹ فارم پر جگہ جگہ نوکیلے پتوں والی گھاس اگ آئی تھی۔ اس کے سامنے سے گزرنے والی چھوٹے گیج کی لائن کے آثار مٹ گئے تھے۔ اس پر جمع ہو جانے والی مٹی پر بارش نے گھاس اگادی تھی۔ لائن کہیں کہیں نظر آرہی تھی۔

اگرچہ مجھے اس جگہ کے محل وقوع کے بارے میں زیادہ تجسس نہیں تھا مگر یہ خیال میرے ذہن میں ضرور آیا کہ میں چاہوں تو ریلوے ریکارڈ پر ریسرچ کر کے اس سہسرام تک دوبارہ بھی آسکتا ہوں۔ کوئی نہ کوئی ضرور بتادے گا کہ چھوٹے گیج کی لائن پر اس نام کا اسٹیشن کہاں تھا۔ تاہم اس کی ضرورت نہ تھی نہ ہوسکتی تھی۔

ہمیں یہاں لانے والے میری جغرافیائی دلچسپی سے خوش نظر نہیں آتے تھے۔ پولیس کی وردی والے نے کہا۔ ''اب چلیں سر۔''

فریال بھی میری طرح آس پاس کا نظارہ دیکھ رہی تھی۔ آس پاس شیشم کے علاوہ دریک تھے، جنگل بہت گھنا نہیں تھا۔ ایسے علاقے پنجاب کے میدانوں میں بہت عام تھے۔ زمین شور زدہ تھی اور جگہ جگہ سفید چونا سا پھیلا ہوا تھا۔ ظاہر

ہے یہاں کاشت نہیں ہوسکتی تھی۔

چند قدم کے فاصلے پر ایک شکستہ حال کیبن دکھائی دے رہا تھا۔ سگنل کا صرف پول باقی تھا۔ ہم اپنے رہبروں کے پیچھے چلتے ہوئے کیبن کے پیچھے والے حصے میں گئے۔ وہاں ملبے کا ایک ڈھیر تھا اور درختوں کے جھنڈ نے کیبن کو کیموفلاج کر دیا تھا۔ وہ ایک زینہ اترنے لگے...... زینہ پہلے موڑ تک کچھ روشن تھا۔ دوسرے موڑ پر تاریک ہوگیا۔ فریال میرا ہاتھ تھام کے احتیاط سے ایک ایک سیڑھی اُتری۔

آگے جانے والوں نے کسی دروازے پر دستک دی۔ ایک دروازہ کھل گیا۔ یہ باب طلسمات تھا۔ اس کے پیچھے کوئی شہر طلسمات تو نہیں تھا لیکن ایک ایسی جگہ تھی جس کا اوپر سہسرام اسٹیشن کی ویرانی کو دیکھتے ہوئے تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔

ہم ایک زیرزمین کمرے میں داخل ہوئے جہاں دن میں بھی رات تھی۔ کمرا مشکل سے آٹھ فٹ لمبا اور چوڑا ہوگا۔ یہاں لکڑی کی دو بنچوں پر دو افراد کلاشنکوف کے ساتھ بیٹھے تھے۔ انہوں نے ہم سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ غالبًا انہیں پہلے ہی انفارمیشن مل گئی تھی کہ سردار کے خاص مہمان آرہے ہیں اور ان میں ایک عورت بھی ہے۔ وہ کوئی نواب ہیں اور ان کی ولایت سے آنے والی بیگم ہیں چنانچہ ڈیرے کی روایت میں خصوصی گنجائش پیدا کی گئی ہے۔

اگلا دروازہ کھلا تو ہم نے شامی بادشاہ کو استقبال کے انداز میں اپنے سامنے پایا۔ وہ ہم سے پہلے کیسے پہنچ گیا۔ یہ اتنا آسان سوال تھا کہ فریال نے بھی نہیں کیا۔ نہ اس وقت نہ بعد میں ظاہر ہے ہم کسی طویل اور پرپیچ راستے سے لائے گئے تھے۔ وہ کسی شارٹ کٹ سے آیا تھا۔

''کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی راستے میں دوست؟'' وہ بولا اور میرے ساتھ چلنے لگا۔

''تکلیف؟ ہم تو ایسی شاہانہ پکنک کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ تم نے اتنا اہتمام کیا۔''

فریال بولی۔ ''یہ پوچھو کیسے کیا؟''

شامی مسکرانے لگا۔ ''سب ہوجاتا ہے بھرجائی...... اب دیکھو آپ نے کبھی سوچا تھا کہ ڈاکوؤں کے ڈیرے پر جانا ہوگا۔ لوگ تو ڈاکو کا نام سنتے ہی دہشت زدہ ہوجاتے ہیں۔''

''سچی بات یہ ہے کہ دہشت زدہ تو میں بھی ہوں۔'' فریال بولی۔

''آپ مہمان ہو جی...... حوصلہ رکھو...... آپ کی حفاظت کے لیے وہ سب جان بھی دے سکتے ہیں جو یہاں موجود ہیں۔''

یہ دوسرا کمرا خاصا بڑا تھا اس کی دیواریں پختہ اینٹوں سے چنی گئی تھیں مگر ان پر پلستر نہیں ہوا تھا۔ چھت مشکل سے سات فٹ کی بلندی پر تھی اور اس میں شہتیروں کی جگہ ریلوے لائن کے ٹکڑے استعمال کیے گئے تھے۔ ان کے اوپر سیمنٹ کے سلیب تھے اور ظاہر ہے زمین سے سات آٹھ فٹ نیچے بنایا جانے والا اسٹرکچر اتنا مضبوط تھا کہ چھت پر سیکڑوں من مٹی کا بوجھ سہار سکے۔ اس کے باوجود دل میں اندیشہ ضرور تھا کہ چھت بیٹھ گئی تو روزِ حشر سے پہلے کسی کو سراغ نہیں ملے گا کہ نواب رفیق احمد شیرازی معہ اپنی نامزد زوجہ کے کہاں مدفون تھے۔

کمرے میں روشنی کے لیے بجلی کا ہونا بھی حیرت کی بات تھی۔ ہر کمرے میں ٹیوب لائٹس نے دن کا اجالا کر رکھا تھا۔ اس سے بھی زیادہ تعجب زیرزمین ہوا کی ٹھنڈک اور تازگی تھی۔ یہ ایرکنڈیشننگ کے بغیر ممکن نہ تھی۔ غور کرنے پر مجھے ڈیڑھ یا دو ٹن کے ایرکنڈیشنر کی جالی نظر آگئی۔

فرش پر بہت دبیز قالین تھا اور فرنیچر نام کی کوئی چیز سرے سے موجود نہ تھی۔ فریال کے لیے تو یہ سب ایڈونچر تھا۔ ایک نئی دنیا کی سیر تھی اور فلمی کہانی جیسی صورتِ حال تھی۔ وہ ایلس ان ونڈر لینڈ کا کردار بنی ہر چیز کو دیکھنے میں اتنی محو تھی کہ خود کو بھی بھولی ہوئی تھی۔

اس کمرے میں ہم تین کے سوا کوئی نہ تھا مگر آگے دوسرے دروازے کو دیکھ کر یہ فرض کیا جاسکتا تھا کہ اس زمین دوز پناہ گاہ کا سلسلہ دیگر کمروں تک پھیلا ہوگا۔ فرش پر اطمینان سے بیٹھنے کے بعد میں تو اپنے تجسس پر قابو پانے میں کامیاب رہا مگر فریال ضبط نہ کرسکی۔

''شامی بھائی...... ویسے تو آپ نے سوال کرنے سے منع کر دیا تھا اور میں نے راستے بھر کسی سے کچھ نہیں پوچھا۔'' وہ بولی۔

میں نے سر ہلا کے تصدیق کی۔ اتنی دیر خاموش رہنے سے اس کے پیٹ میں مروڑ اُٹھ رہے تھے۔

شامی ہنسنے لگا۔ ''میں ویسے ہی بتا دیتا ہوں۔ یہ ٹھکانا ہم نے ابھی دو سال پہلے بنایا ہے۔ اس سے پہلے ہم دوسری جگہ تھے۔ اب یہاں سے بھی جانے کا طے کرلیا ہے۔ اتنا لمبا عرصہ کسی جگہ بیٹھنے میں رسک ہوتا ہے۔''

''اسے بنانے میں کتنا وقت لگا تھا؟'' فریال بولی۔

''نئی جگہ پر کام جاری ہے۔ چھ مہینے لگ جاتے ہیں...... ادھر کوئی نہیں آتا مگر ساری بات اچھے برے وقت کی ہے۔ آج کل میرے نصیب کے ستارے گردش میں ہیں۔ کچھ پتا

نہیں کون لالچ میں غداری کر دے۔ زمانہ بہت بدل گیا ہے۔ کسی کے وعدے پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ سب کا ایمان پیسا ہوگیا ہے۔ خیر یہ تو میں دوسری طرف نکل گیا۔ اس جگہ کو دیکھ کر آپ حیران ہو...... یہاں بجلی کیسے آئی؟''

میں نے کہا۔ ''مجھے کسی جنریٹر کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی۔''

''بجلی کی لائن ہے یہاں...... ایک میل دور سے لی ہے۔ زمین کے نیچے سے یہ رشوت کی برکت ہے...... واپڈا کے کچھ حرام کھانے والے ہیں۔ ان کا وظیفہ لگا ہوا ہے...... یہاں روشنی بھی ہے۔ اے سی بھی چل رہے ہیں۔ ہر جگہ یہ ممکن نہیں ہوتا۔''

فریال نے کچھ دیر بعد پوچھا۔ ''جو گاڑی ہمیں لائی...... کیا وہ پولیس کی تھی؟''

میں نے اسے گھورا۔ ''یہ سوال نصاب سے خارج ہے۔''

شاہ مسکرایا۔ ''او جی بھرجائی...... یہ کھیل ایسے ہی چلتا ہے۔ کبھی ہم پولیس کی وردی پہن لیتے ہیں۔ کبھی پولیس ہمارا روپ دھار لیتی ہے لوگ کہتے ہیں کام تو دونوں کا ایک ہی ہے...... یہ کہنا غلط ہے کہ سارے پولیس والے ڈاکو ہوتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''پولیس کا ہر افسرِ اعلیٰ یہی فرماتا ہے ٹی وی پر آکے یا پریس کانفرنس میں...... کہ چند کالی بھیڑیں ہیں...... اسے کہنا چاہیے کہ چند سفید ہیں۔''

شامی نے بڑی صفائی سے فریال کے سوال کا جواب گول کر دیا تھا۔ وہ بھی سمجھ گئی...... کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد میں نے کہا۔ ''دوست...... جس کام کے لیے ہم آئے تھے۔''

اس نے کہا۔ ''اتنی جلدی کیا ہے کام کی؟''

میں نے کہا۔ ''ہمیں واپس بھی جانا ہے۔''

وہ ہنسا۔ ''لو جی...... کیا آپ نے سنی نہیں وہ بات...... کہ آنا اپنی مرضی سے ہوتا ہے جانا دوسرے کی مرضی سے۔''

فریال بولی۔ ''مجھے تو کوئی جلدی نہیں واپسی کی۔''

میں نے کہا۔ ''تم رہو اپنے میکے میں جب تک جی چاہے...... مجھے تو جانا ہے میرے والدین پریشان ہوں گے۔''

شامی بولا۔ ''کوئی نہیں ہوتا پریشان...... یار اب تم ننھے بچے تو نہیں ہو۔''

''میں تو رہ سکتی ہوں یہاں مزے سے۔''

میں نے کہا۔ ''شامی بادشاہ...... اسے اپنے گروہ میں شامل کرلیں میری سفارش پر۔''

اسی وقت دروازہ کھلا اور ایک لڑکی چائے کی ٹرالی کے ساتھ اندر آگئی۔ اس کی یہاں موجودگی بھی اتنی ہی باعث حیرت تھی جتنی ایک غار میں شہری زندگی کی جدید سہولیات کی فراہمی...... وہ چوبیس پچیس سال کی دراز قد گوری چٹی اور کچھ مائل بہ فربہی لیکن سو فیصد شہری لڑکی تھی۔ اس کے لباس کا فیشن اور اس کا ہیئر اسٹائل ویسا ہی تھا جیسا رابعہ یا شہناز جیسی ہر لڑکی کا ہوسکتا تھا...... وہ بڑے اعتماد سے مسکراتی ہوئی آگے آئی اور اس نے مجھے تو سر کے اشارے سے سلام کیا مگر فریال سے ہاتھ ملایا۔ ''میرا نام پروین ہے۔''

شامی نے کہا۔ ''اسے میں نے آپ سے ملوانے کے لیے خاص طور پر بلوایا ہے بھرجائی...... یہ یہاں نہیں رہتی۔''

''میں فریال ہوں۔'' فریال بولی۔

''مجھے پتا ہے......'' پروین وہیں بیٹھ کے چائے بنانے لگی۔

''پروین نے بھی ایم اے کیا ہے۔'' شامی بولا۔

''ایم ایس سی۔'' پروین نے تصحیح کی۔

''ابھی ہنی ایم ایس سی...... ایک گرلز کالج میں اس کا اپائنٹمنٹ بھی ہوچکا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اصل بات ابھی تک تم نے نہیں بتائی۔ یہ یہاں کیوں ہیں؟''

شامی مسکرایا۔ ''پارو اور میں ایک دن شادی کرلیں گے۔''

''شادی ایک دن ہی ہوتی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مگر وہ دن کب آئے گا؟''

''اگر یہی سوال میں تم سے کروں دوست؟'' شامی میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بولا۔

فریال کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ ''شامی بھائی...... میں نے نہیں کہا تھا ان سے کہ جھوٹ بولو۔''

شامی ہنسنے لگا۔ ''یہ جھوٹ کہاں تھا بھرجائی...... جھوٹ بدنیتی سے بولا جاتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''وہ تو بس ایک بےضرر سی خواہش۔ ایک امید اور یقین کا اظہار تھا...... جیسے ابھی تم نے کہا۔ ویسے ہی میں بھی کہتا...... مگر میں ایک قدم آگے چلا گیا۔ کیا یہ جھوٹ سمجھا جائے گا بھرجائی۔''

پروین اس کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہ گھبرائی۔ ''جی...... پتا نہیں جی۔''

میں نے کہا۔ ''ہمارے سوال کا جواب یہ ہوسکتا ہے کہ شاید وہ ایک ہی دن ہو...... بلکہ میری تو دعا ہوگی یہی کہ ایک ہو۔''

چائے کا دور ختم ہوا تو پارو نے برتن سمیٹے۔ میں نے پھر گھڑی میں وقت دیکھا تو شامی اٹھ کھڑا ہوا۔ ''لو بھئی اب تم دونوں غیبت کی پریکٹس کرو...... ہم کچھ کام کرلیں۔''

میں نے کہا۔ ''ہاں...... آج نہیں تو کل یہ کام تمہیں کرنا ہی ہے۔''

فریال نے احتجاج کیا۔ ''آپ لوگ بڑے کارخیر کرنے جارہے ہیں۔''

یہ براہِ راست حملہ تھا۔ شامی کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے بدلا...... پھر وہ فریال کی بات کو پی گیا...... ''یہ تو مذاق تھا بھرجائی۔''

میں نے کہا۔ ''کیا غلام محمد یہاں ہے؟''

شامی نے کہا۔ ''آؤ میرے ساتھ۔''

وہ مجھے اسی دروازے سے اندر لے گیا جس سے گزر کے پرودین آئی تھی۔ پہلے ایک کمرا تھا جو کچن کے طور پر استعمال ہورہا تھا۔ اس سے گزر کے ہم جس کمرے میں پہنچے وہاں دو مسلح افراد کلاشنکوف لیے زمین پر بیٹھے تاش کے پتوں سے دل بہلا رہے تھے۔ وہ شامی کو دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے...... کچھ فاصلے پر ایک شخص اپنا ہاتھ سر کے نیچے رکھے دائیں کروٹ پر سورہا تھا...... یہ غلام محمد تھا۔

اس کی یہ حالت دیکھ کر مجھے ایک سفاک سی خوشی حاصل ہوئی۔ یہی وہ شخص تھا جس کی فرعونیت اور خون آشامی نے نہ جانے کتنے گھروں کے چراغ گل کیے تھے۔ جو ایک زمانے میں یہ سمجھتا تھا کہ وہ زندگی اور موت کے پروانے جاری کرسکتا ہے۔ میں نے اس کی شقاوت قلبی کے ان گنت مظاہرے دیکھے تھے اور خود بھی اس تنظیم کے جبر و تشدد کا نشانہ بن چکا تھا جس کو اس جیسے چند لوگ کمان کرتے تھے اور وہ سب چیف جیسے شیطان کے تابع تھے۔ آج وقت اپنا انتقام لے رہا تھا تو چیف کو روپوشی کے لیے زمین تنگ محسوس ہوتی تھی۔ وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ پناہ کے لیے بھٹک رہا تھا اور اس کے حواری فرار کے راستے مانگ رہے تھے۔

غلام محمد نے مجھے ڈرانے دھمکانے اور بلیک میل کرنے کے سارے طریقے آزمائے تھے اور مجھے مجبور کرنے میں کامیاب رہا تھا کہ میں اس کو برطانیہ میں سیاسی پناہ دلوانے کے لیے عائشہ کو استعمال کروں۔ اس کی محبت کو اپنی طاقت بنا کے اس کے والدین پر دباؤ ڈالوں میں عائشہ کی ماں کو دھمکی دوں کہ اس نے دو افراد کو برطانیہ میں سیاسی پناہ دلوانے کے لیے اپنے شوہر لارڈ ارنسٹ پر دباؤ نہ ڈالا اور لارڈ ارنسٹ نے اپنا اثر و رسوخ اس مقصد کے لیے استعمال نہ کیا تو میں عائشہ سے شادی کرلوں گا۔ وہ اس کے لیے تیار نہیں تھی...... مگر اس کی ماں کو اس خیال سے ہی دحشت ہوتی تھی کہ ان کی اکلوتی ناز پروردہ بیٹی ایک رنگ دار آدمی کی بیوی بن کر پاکستان میں رہے...... ایک مسلمان کی دوسری تیسری یا چوتھی بیوی ہو۔

غلام محمد نے مجھے دھمکی دی تھی کہ میں نے اسے اور شہاب الدین کو برطانیہ میں سیاسی پناہ نہ دلوائی تو مجھے اپنے ماضی کے سارے جرائم کا خمیازہ بھگتنا ہوگا جن کا اس کے پاس سارا ریکارڈ تھا۔ میرے ساتھ یہ سزا میرے والدین کو بھی ملے گی۔ غلام محمد کچھ عرصے سے یہ دھمکیاں بڑے جارحانہ انداز میں مجھ تک پہنچا رہا تھا...... اس نے میرے گھر والوں کو ہراساں کرنا شروع کردیا تھا۔

پھر قدرت کی طرف سے مجھے ایک موقع ملا اور شامی بادشاہ نے میری مدد کی۔ آج نمرود کی خدائی کا دعوے دار فرش خاک پر کسی غلام قیدی جیسی حالت میں پڑا درس عبرت دے رہا تھا۔ اس کے ایک پاؤں میں بیڑی تھی او زنجیر کا دوسرا سرا دیوار کی گہرائی میں پیوست تھا۔ قید میں اس کا بھاری بھرکم مرغن کھانوں، شراب اور عیش و آرام کے اسباب کا عادی جسم تیزی سے گھلا تھا۔ اس کے مقابلے میں کوئی محنت کش فاقوں کا عادی ہوتا تو اتنی جلدی کم نہ ہوتا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا یہ بے ہوش ہے؟''

شامی نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں...... سورہا ہے۔''

میری آواز پر اس نے سر گھما کے دیکھا اور پھر منہ پھیر کے آنکھیں بند کرلیں۔ اس نے مجھے اپنے خیال کا فریب سمجھا ہوگا۔ قید کی اذیت میں واہمے اور خوف اسی طرح ستاتے ہیں۔

میں نے اسے آواز دی۔ ''غلام محمد...... کیا تم نے پہچانا نہیں مجھے؟''

اب وہ چونک کر اٹھا۔ ''تم؟''

میں نے کہا۔ ''تمہیں یقین نہیں آرہا ہے...... کیوں؟''

وہ مجھے پلک جھپکائے بغیر دیکھتا رہا۔ جیسے میری آواز بھی میرے وجود کی طرح سراب ہے اور جیسے میں اچانک دکھائی دیا تھا ایسے ہی اچانک غائب ہو جاؤں گا...... پھر اس نے کہا۔ ''رفیق...... یہ تم نے کیا میرے ساتھ......؟''

''اگر میں کرسکتا تو بہت پہلے کرتا...... اس سے برا کرنا میرے اختیار میں ہوتا تو وہ بھی کرتا۔''

''تم جھوٹ بول رہے ہو...... اس اغوا میں تمہارا ہاتھ ہوگا...... تم نے پیسے دیے ہوں گے ان ڈاکوؤں کو......'' وہ چلانے لگا۔

شامی نے بڑی پھرتی سے اس کے لات رسید کی۔ ''کتوں کو ہمارے معزز مہمانوں پر بھونکنے کی اجازت نہیں ہے۔''

غلام محمد گر کے پھر اٹھا۔ لات اس کے سینے پر پڑی تھی۔ وہ کچھ دیر سینے کو ملتا رہا اور آہستہ آہستہ کراہتا رہا۔ ''رفیق یہ سب کیا ہے؟ تم یہاں کیا کررہے ہو؟''

''کیا ایک لات میں بات سمجھ میں نہیں آئی؟'' شامی نے اس کے دوسری لات ماری...... ''نواب رفیق احمد نیرازی ہمارے مہمان اور دوست ہیں۔''

وہ پھر گر گیا اور کافی دیر ساکت پڑا لمبے لمبے سانس لیتا رہا، پھر اس نے سر اٹھا کے مجھے دیکھا۔ ''اگر تم مجھے مرتا ہوا دیکھنے آئے ہو...... تو ختم کردو یہ کھیل۔''

میں نے کہا۔ ''تم تو بہت کم حوصلہ رکھتے ہو غلام محمد...... بھول گئے کہ کتنے بے گناہوں کو تم نے تڑپا تڑپا کے مارا تھا...... ان کی اذیت کو لمبا کیا تھا...... مگر جو تم سمجھ رہے ہو ایسی بات نہیں ہے...... میں تو تمہیں رہائی دلانے کے لیے آیا ہوں۔''

اس نے بے یقینی سے کہا۔ ''ایسی نیکی...... میرے ساتھ......؟''

میں نے کہا۔ ''تمہارے ساتھ کسی نیکی کے گناہ کا ارتکاب میں نہیں کرسکتا غلام محمد...... تمہاری رہائی کے لیے دو کروڑ کا تاوان مانگا گیا تھا۔''

''مجھے معلوم ہے...... مگر دو کروڑ۔''

میں نے کہا۔ ''شہاب الدین نے دو کروڑ کا انتظام کرلیا ہے۔''

اس کے چہرے پر کچھ رونق آئی۔ ''تم سچ کہہ رہے ہو؟''

''جھوٹ سچ کا ذمے دار میں نہیں...... وہ آیا تھا میرے پاس اور اس نے مجھے بتایا کہ چیف نے تاوان کی رقم کی ادائیگی منظور کرلی ہے۔ تم واقعی بڑے خوش قسمت ہو...... ورنہ تنظیم نے انسانوں کی اتنی قیمت کبھی نہیں لگائی...... چیف کی نظر میں آج بھی تمہاری قدر ہے۔''

''کہاں ہے شہاب الدین...... کیا وہ تمہارے ساتھ آیا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''نہیں...... اس نے کہا کہ شامی بادشاہ میری وساطت سے یہ معاملہ طے کرنا چاہتا ہے۔ اب تم پوچھو گے کہ میں ہی کیوں...... تو جواب بہت سمپل ہے...... مجھے شامی بادشاہ قابل اعتماد سمجھتا ہے...... میری عزت ہے اس کی نظر میں...... ویسے بھی بہت سے اغوا برائے تاوان کے معاملات بیچ میں پڑنے والے ہی طے کراتے ہیں اور وہ عام لوگ نہیں ہوتے۔ یہ بات تم اچھی طرح جانتے ہوگے...... سندھ کے ڈاکو اہم سیاسی شخصیات کی مداخلت پر چھوڑ دیتے ہیں...... تاوان لینے کے بعد...... پولیس کچھ نہیں کرسکتی۔''

''اگر پولیس بیچ میں آئی تو تمہیں بچانے والا کوئی نہیں ہوگا۔ یہ سمجھ لو...... ہم نے بہت سے بندے اِدھر اُدھر گاڑ دیے ہیں۔ خود ہمیں بھی یاد نہیں کہ کہاں......'' شامی سینے پر ہاتھ باندھ کے ٹہلتا رہا۔

''رفیق...... خدا کے لیے میری جان چھڑا دو۔''

میں نے کہا۔ ''چلو تمہیں خدا یاد تو آیا...... لیکن اس معاملے میں میری حیثیت صرف ثالث کی ہے...... میں شامی بادشاہ کے کہنے پر آگیا ہوں...... کسی اور کے کہنے پر ہرگز نہ آتا...... میں شہاب الدین سے دو کروڑ لوں گا اور یہاں پہنچا دوں گا...... اس کے بعد تمہیں شہاب الدین کے حوالے کر دوں گا۔''

''لیکن کب؟''

''جیسے ہی ڈیل ہوئی...... شہاب الدین کو بتا دیا جائے گا کہ رقم کہاں لانی ہے...... میں نے اسے بتا دیا تھا کہ غلام محمد کو مروانا چاہتے ہو تو ابھی بتا دو...... میں اپنا وقت ضائع نہ کروں...... ورنہ سیدھے سیدھے چلنا...... جیسے تم سے کہا جائے ویسے ہی کرنا...... اپنی چالاکی یا طاقت پر خوش گمانی تمہیں بھی مروا دے گی اور غلام محمد کو بھی...... دو کروڑ بچاؤ گے تو دو گز زمین ملے گی...... کفن کا پتا بھی ملے گا یا نہیں۔''

''پھر کیا کہا اس نے...... وہ کہاں ہے اس وقت؟''

''مجھے نہیں معلوم...... اس سے میری کوئی بات نہیں ہوئی۔ یہ لوگ اسے خود ہدایات دیں گے اور مجھے بتا دیں گے کہ کیا طے ہوا ہے۔ میں جاؤں گا اور اس نے شرافت سے رقم دے دی تو لے آؤں گا...... پھر تمہیں لے جاؤں گا...... یہ سارا انتظام کرنے والا میں نہیں ہوں۔''

''ہم نے بلوالیا ہے اسے......'' شامی بادشاہ نے کہا۔ ''اور ہمارے خاص لوگ اس پر نظر رکھے ہوئے ہیں۔ آج ہی ہمارے محترم نواب صاحب اس سے ملیں گے...... آگے تمہاری قسمت......''

غلام محمد نروس ہوا۔ ''میری بات کرا دو شہاب الدین

ہے۔"

"کیوں؟ تم کیا کہو گے اس سے؟"

"یہی...... کہ وہ میری جان سے نہ کھیلے...... رقم دے دے۔"

میں نے کہا۔ "دیکھو...... اس کے دماغ میں کیا ہے...... یہ کوئی نہیں جانتا...... جو اسے کرنا ہوگا وہ کرے گا...... میرے تمہارے یا شامی کے کہنے سے کچھ نہیں ہوگا...... اسے ابھی اندازہ نہیں ہے کہ اس کا واسطہ کس سے پڑا ہے۔"

شامی بولا۔ "یہ تو خوش قسمتی ہے تمہاری کہ نواب صاحب مان گئے۔"

غلام محمد کی حالت دیدنی تھی۔ اندرونی اضطراب خوف اور بے یقینی کا عذاب بہت سخت تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ آنے والے دن کا سورج اس کی بے نام ونشان قبر پر طلوع ہوگا یا وہ خود لوٹ کے اپنی دنیا میں جا سکے گا...... وہ تنظیم کا خاص آدمی تھا چنانچہ لوگوں کے باطن سے بھی واقف تھا...... شہاب الدین کی جگہ وہ خود ہوتا تو ایک بندے پر اتنی دولت ضایع نہ کرتا...... بندہ ضائع کرنے میں اسے عار نہ ہوتی...... اب معاملہ اس کی زندگی کا تھا اور فیصلہ کرنے والے اس کے جانے پہچانے لوگ تھے...... چنانچہ وہ مایوس تھا۔

میں نے کہا۔ "اب میں چلتا ہوں...... خدا سے دعا مانگو کہ وہ تمہارے ساتھی کے دل میں برائی نہ ڈالے...... مرنے کا خیال کیسا لگتا ہے تمہیں غلام محمد......"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن اس کا چہرہ لاش کی طرح سفید پڑ گیا...... اس کی آنکھوں میں دھنسی ہوئی قبروں جیسی ویرانی اتر آئی۔ اس کی نظریں مجھ پر ٹھہر گئی تھیں...... ان میں التجا تھی۔ رحم کی اپیل تھی اور پچھتاوا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ وقت آخر کی توبہ کبھی قبول نہیں ہوتی...... رحم خود اس نے کبھی نہیں کیا تو اس پر بھی نہ ہوگا۔

ہم باہر آ گئے...... پارو کے ساتھ فریال کی دوستی نے بے تکلفی کے وہ سارے مراحل طے کر لیے تھے جو دو ہفتوں مہینوں کی رفاقت کے بعد بھی نہیں کر پاتے...... وہ اپنی باتوں میں اتنی منہمک تھیں کہ انہوں نے ہماری طرف نظر اٹھا کے دیکھنا بھی تضیع اوقات سمجھا۔

میں نے شامی سے پوچھا۔ "قیدی کے ساتھ تم نے کیا سلوک کیا؟"

"ہم اسے مہمانوں کا درجہ تو نہیں دے سکتے تھے...... اذیت اگر تھی تو صرف پابہ زنجیر رہنے کی...... اگر وہ شرافت دکھاتا تو شاید یہ بھی نہ ہوتا مگر وہ تو جنگل سے پکڑے جانے والے درندے کی طرح خونخوار ہو رہا تھا...... اپنے لیے خرابی خود اس نے پیدا کی۔ اس نے محافظوں پر حملہ کیا۔ انہیں گالیاں دیتا رہا...... کھانے کو ٹھوکر مارتا رہا...... پھر بھی اس پر کسی قسم کا تشدد نہیں ہوا...... زنجیر سے باندھ کے رکھنا ضروری تھا۔ کھانا پینا وہی تھا جو ہمارا...... لیکن قید کی اذیت بہرحال تھی۔"

میں نے کہا۔ "کیا تم نے شہاب الدین سے رابطہ کیا ہے؟"

"ہاں...... اور اس کا جواب بھی مل گیا ہے...... میرا خیال ہے کہ ہمیں چلنا چاہیے۔" اس نے گھڑی دیکھی اور مجھے اشارہ کیا۔ "آؤ......"

میں نے کہا۔ "کتنی دیر میں واپسی ہوگی ہماری......"

"اگر سب ٹھیک رہا تو دو گھنٹے میں......" شامی بولا اور پھر خواتین سے مخاطب ہو کے بولا۔ "ہم ابھی آتے ہیں۔"

پارو چپ رہی۔ فریال نے کہا۔ "کہاں جا رہے ہو...... میں بھی چلوں گی۔"

شامی نے سکون سے کہا۔ "بھئی یہاں آپ اپنی باتیں کرو...... ہم تھوڑا سا ٹہل لیں...... کچھ کام کی باتیں کر لیں۔"

پارو نے اسے ہاتھ پکڑ کے بٹھا لیا۔ "جانے دو...... ہم ان کے ساتھ جا کے کیا کریں گے۔"

جو گاڑی مجھے اور فریال کو یہاں لائی تھی وہ اسی وقت واپس ہو گئی تھی۔ میں نے یہ نہیں پوچھا کہ گاڑیاں کہاں کھڑی ہوتی ہیں۔ جن لوگوں نے ایسا محفوظ اور مضبوط ٹھکانا زیر زمین بنایا تھا انہوں نے کہیں گیراج بھی بنایا ہوگا...... میں نے فلمی مناظر اور قصے کہانیوں میں ڈاکوؤں کو ہمیشہ گھوڑوں پر سوار آتے دیکھا اور پڑھا تھا۔ اب زندگی کا ہر شعبہ مشین کی تیز رفتاری کے فوائد سے بہرہ ور ہو رہا تھا تو ڈاکو بھی جیپ اور پجیرو جیسی فور وہیل ڈرائیو گاڑیاں دوڑاتے پھرتے تھے۔

میرا دل چاہتا تھا کہ شامی سے سوال کروں لیکن میں خاموش ہو جاتا تھا کہ اسے مجھ پر بھروسا ہے تو جتنا مجھ سے چھپانا ضروری نہیں ہوگا خود ہی سامنے آ جائے گا...... ہر شخص اپنی ہر بات بہرحال نہیں بتاتا اور ڈاکوؤں کے لیے احتیاط ان کی زندگی کی ضمانت ہوتی ہے۔ اندر کے سارے راز افشا نہ ہونے دینا ان کی ضرورت اور مجبوری ہے۔

تہ خانے سے سطح زمین پر آتے ہی میں نے بے اختیار ایک لمبا گہرا سانس لیا۔ نیچے نہ گھٹن تھی اور نہ بند دیواروں میں محبوس ہونے کی ذہنی پریشانی۔ بس ایک لاشعوری احساس تھا کہ میں زمین کے نیچے ہوں...... زمین کی گہرائی میں ہونے

کا خیال قبر سے وابستہ رہتا ہے...... سرنگ ہو یا لندن کی زیر زمین ریلوے کا چمکتا دمکتا روشن پلیٹ فارم...... جب آدمی باہر نکلتا ہے تو آزاد فضا کھلے آسمان اور درختوں کو دیکھ کے اس کی جذباتی کیفیت وہی ہوتی ہے جو اس وقت میری تھی۔

باہر ایک جیپ پہلے سے موجود تھی۔ یہ وہی 1952ء کی ملٹری ماڈل جیپ تھی جو نصف صدی سے زیادہ گزر جانے کے باوجود پاکستان کے ہر دشوار گزار علاقے قصبوں اور شہروں میں اسی طرح دوڑ رہی تھی جیسے نئی نویلی نازک اور سبک رفتار جاپانی کاریں...... بس ان میں ڈیزل انجن یوں ڈال دیا گیا ہے جیسے ڈاکٹر ناکارہ ہو جانے والے دل گردے بدل دیتے ہیں۔

ڈرائیونگ خود شامی نے سنبھالی۔ خلاف توقع نہ ہمارے ساتھ کوئی مسلح محافظ تھا اور نہ شامی نے کسی رازداری کی ضرورت محسوس کی۔ جیپ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلتی گئی۔ کہیں یہ دو پٹڑیوں کے درمیان آ جاتی تھی تو مٹی میں مدفون سلیپروں پر گاڑی کے جھٹکے بڑھ جاتے تھے۔ یوں جیسے ملیریا سے کانپنے والے کو تشنج کا دورہ پڑتا ہے...... پٹڑی کے ساتھ والی زمین قدرے ہموار تھی۔

ایک گھنٹے میں ہم نے مشکل سے دس میل طے کیے ہوں گے مگر میری جسمانی تھکن ایسی تھی جیسے میں نے سو میل کا سفر کیا ہو...... شامی نے اپنی کلاشنکوف پیچھے ڈال دی تھی...... وہ مجھ سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا...... لندن اور اس سے پہلے امریکا میں قیام کے واقعات...... اپنے حالات زندگی سناتا رہا۔ اس کے مطمئن انداز سے واقعی ایسا لگتا تھا جیسے ہم تفریح کے لیے نکلے ہوں۔

اچانک ایک پل آ گیا...... یہ شاید پچاس گز لمبا پل تھا جس کے دونوں جانب کوئی سپورٹ نہیں تھی۔ اس کے نیچے سے کوئی برساتی نالہ گزر رہا تھا یا صرف کھائی تھی۔ جب پٹڑی استعمال ہوتی تھی تو پل کی دیکھ بھال بھی کی جاتی ہوگی۔ اب درمیان سے سلیپر غائب ہو گئے تھے تو جگہ جگہ خلا نمودار ہو گیا تھا۔ اس خلا سے گزرنے والا سیدھا برساتی نالے میں اترتا...... ظاہر ہے اس پل صراط پر سے جیپ نہیں گزاری جا سکتی تھی۔

شامی نے جیپ کو ڈھلوان پر اُتار دیا۔ میں دونوں ہاتھوں سے ڈیش بورڈ کو نہ دھکیلتا تو آگے اُلٹ جاتا...... دائیں بائیں کے جھٹکے الگ تھے...... اوپر نیچے ہونے کا عمل اضافی تھا۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے پیٹ کے اندر تمام اعضائے رئیسہ دل، جگر، گردے وغیرہ اپنی جگہ سے الگ ہو کے معدے میں گر گئے ہیں۔

بالآخر جیپ برساتی نالے کی رہگزر پر ٹھہر گئی۔ ممکن ہے بارشوں کے موسم میں پرنالہ جوش میں آ کے چھوٹی سی ندی بن جاتا ہو...... ابھی یہ خشک تھا اور اس میں چھوٹے چھوٹے چکنے گول پتھروں کا فرش بچھا ہوا تھا۔ نیچے اُترنے سے پہلے شامی نے کسی خانے میں سے ایک ریوالور نکال کے مجھے دیا۔

میں نے کہا۔ "میرے پاس اپنا ریوالور ہے۔"

"مجھے معلوم ہے...... ایک ریوالور کی گولیاں بعض اوقات کم پڑ جاتی ہیں...... اضافی اسلحہ ہو تو کام آتا ہے۔"

میں نے ریوالور کو الٹ پلٹ کے دیکھا۔ "شامی بادشاہ...... یہاں کسی نے مجھ سے اسلحہ نہیں لیا۔ تلاشی بھی نہیں ہوئی۔"

وہ نیچے اُترا...... "دوست...... تم سردار کے مہمان ہو۔"

میں نے پیچھے اُتر کے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ پل کے نیچے پانچ محرابی دروازے تھے۔ ہر دروازہ پچیس تیس فٹ چوڑا ہوگا۔ ان کے ستون پہلے ہر گزرنے والی ٹرین اور اس کے مسافروں کا سارا وزن باآسانی سہار لیتے ہوں گے...... اب ان کی خستہ حالی بتاتی تھی کہ پیرانہ سالی کے باعث وہ ایک ریلوے انجن کا بوجھ بھی برداشت نہ کر پائیں گے۔

سورج مغرب کی طرف ہونے کو تھا۔ پل کے نیچے سائے اتنے گہرے تھے کہ غروب آفتاب کے بعد کا وقت محسوس ہوتا تھا۔ ابھی تک مجھے یہاں اپنے سوا کوئی ذی روح دکھائی دیا تھا تو وہ پرندے تھے جو شام کے بعد اپنے آشیانوں کو لوٹ رہے تھے۔ قید گلہریاں اور ایک لومڑی جیسا جانور...... بالآخر میری قوت برداشت جواب دے گئی۔

میں نے کہا۔ "شامی بادشاہ...... یہی ہے جائے ملاقات۔"

اس نے سر ہلایا۔ "ہاں...... کیسی ہے؟"

میں نے کہا۔ "یہاں تو صرف ہماری ملاقات چل رہی ہے۔"

وہ ہنسا۔ "ایسا نہیں ہے...... تم دیکھ نہیں سکتے انہیں لیکن میرے ساتھی ہر طرف پہلے سے موجود ہیں۔"

"اور فریق ثانی۔"

اس نے گھڑی دیکھی۔ "اسے بھی آ جانا چاہیے لیکن شہر والوں کو دیر ہو جاتی ہے۔ کچھ لوگ وقت کی پابندی کے عادی بھی نہیں ہوتے۔"

میں نے کہا۔ "وہ خود پہنچ جائے گا یہاں؟"

''راستہ اسے سمجھا دیا گیا تھا...... اور اس نے سمجھ لیا تھا۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں نہیں پہنچ سکتا تھا...... یہ تو ویران جنگل ہے۔ نہ کوئی سڑک نہ راستہ۔''

''فکر مت کرو...... وہ تلاش کرے گا...... اگر چاہے گا۔''

''اور...... مال جس کی ہم قیمت وصول کرنے آئے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''مال کی ڈلیوری تم دو گے...... ابھی۔''

اچانک میرے کانوں نے سوت میں ایک صدا سنی۔ یہ کسی گاڑی کے انجن کی آواز تھی جو آہستہ آہستہ قریب آ رہی تھی۔ میں گوش برآواز رہا۔ گاڑی نزدیک آئی۔ اس کا دروازہ بند ہوا...... چند منٹ اور گزر گئے...... پھر میری حیران نظروں نے ایک سایہ سا دیکھا جو آہستہ آہستہ نیچے اتر رہا تھا۔ پل کی ڈھلوان پر قدم جماتا شہاب الدین ایک سوٹ کیس کا وزن بڑی مشکل سے سنبھال رہا تھا۔

نیچے آ کے اس نے پتلون کی جیب سے رومال نکالا اور پسینا پونچھا...... اس کی متجسس متلاشی نظریں ہر طرف سرگرداں تھیں...... ظاہر ہے وہ بہت نروس تھا۔ اس نے کچھ دیر بعد آواز دی۔ ''رفیق...... کیا تم یہاں ہو......؟''

شامی نے میرے کندھے پر تھپکی دی۔ ''جاؤ۔''

میں نے خشک حلق کو تھوک نگل کے تر کیا۔ ''جاؤں؟''

''جاؤ ڈرنے کی کوئی بات نہیں...... میں کھڑا ہوں یہاں...... تمہاری حفاظت کرنے والے ہر طرف ہیں۔''

''اور غلام محمد۔''

''جب تم ندی کے اس کنارے سے سوٹ کیس لے کر واپس چلو گے تو ادھر سے غلام محمد روانہ ہو گا۔ تم ایک دوسرے کو درمیان میں کراس کرو گے سوٹ کیس چیک کر لینا۔''

شہاب الدین نے پھر مجھے پکارا۔ ''رفیق...... میں آ گیا ہوں۔''

میں اس کے سامنے آ گیا۔ ''تمہارے ساتھ اور کوئی تو نہیں آیا ہے نا؟''

''نہیں......''

''رقم پوری ہے...... کوئی دھوکا تو نہیں ہے؟''

''یہ تم خود دیکھ لو گے...... مگر غلام محمد کہاں ہے؟''

میں نے کہا۔ ''وہ بھی ہے یہاں...... تاوان پہلے ادا ہو گا۔''

''یہ ذمے داری تمہاری ہے؟''

میں آگے بڑھا۔ ''تمہیں اعتبار نہیں تو واپس لوٹ جاؤ...... تمہیں کوئی نہیں روکے گا...... ورنہ کیا تم سے یہ سوٹ کیس چھینا نہیں جا سکتا۔''

ہمارے درمیان سو قدم سے کچھ زیادہ فاصلہ تھا۔ مجھے چکنے پتھروں پر قدم جما کے چلنا پڑ رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ دو کروڑ روپے کتنے بھاری ہوں گے مجھے واپسی میں یہ وزن بھی اٹھا کے لانا تھا۔ میری نظر شہاب الدین پر تھی۔ ریوالور میرے دائیں ہاتھ میں تھا۔ اگر مجھے ذرا بھی شک ہوتا تو میں اسے شوٹ کرنے میں دیر نہ لگاتا۔

یہ مصافحہ کرنے کا کوئی موقع نہ تھا مگر شہاب الدین نے خود ہاتھ بڑھا دیا۔ اس کا ہاتھ سرد اور نم تھا۔ مجھے اس میں خفیف سی لرزش کا احساس بھی ہوا۔ اس نے نیچے رکھے ہوئے سوٹ کیس کی طرف اشارہ کیا۔ ''رقم پوری ہے مگر تم دیکھ لو۔''

میں نے نیچے بیٹھ کے سوٹ کیس کو ان لاک کیا اور ڈھکنا اٹھا کے دیکھا۔ اس میں ہزار ہزار کے نوٹ تھے اور دو سو گڈیاں تھیں۔ یہ سارا حساب میں پہلے ہی لگا چکا تھا...... میں نے پہلے اتنی بڑی رقم دیکھی بھی نہ تھی۔ نوٹ گنے ضرور تھے مگر تولنے کا خیال کبھی نہیں آیا تھا۔ اب میں نے فرض کیا کہ ایک گڈی کا وزن کم سے کم سو گرام ہو تو دو کروڑ کی کرنسی بیس کلو ہو گی...... شاید زیادہ...... سوٹ کیس کا وزن الگ۔ واپسی میں مجھے ندی کے پاٹ پر کم سے کم تیس کلو وزن کے ساتھ پتھروں پر چلنا تھا...... (میرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے)۔

میں نے سوٹ کیس لیا۔ بچھے ہوئے نوٹوں کو دیکھا۔ چند گڈیوں کو چیک کیا کہ اوپر نوٹ اور نیچے سادہ کاغذ تو نہیں ہیں اور سوٹ کیس بند کر کے کھڑا ہو گیا...... ''ٹھیک ہے شہاب الدین...... تم اسی جگہ انتظار کرو...... غلام محمد تمہیں زندہ سلامت صحیح سالم ملے گا...... اپنے پیروں سے چل کے آئے گا۔''

شہاب الدین کے دل کی بات بالآخر زبان پر آ گئی۔ ''رفیق...... مجھے اندازہ نہیں تھا...... کہ تم یہ بھی کر سکتے ہو...... تم کیسے جانتے ہو شامی بادشاہ کو؟''

میں نے کہا۔ ''غالباً اس سوال کا جواب میں ایک بار پہلے دے چکا ہوں مگر پھر سن لو...... میں اسے نہیں جانتا تھا۔ وہ مجھے جانتا تھا اب ہم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور اچھے دوست ہیں۔ دوست ہیں اسی لیے ایک دوسرے پر اعتماد بھی کرتے ہیں۔''

وہ اب پہلے کے مقابلے میں کچھ پرسکون تھا۔ ''مجھے تو

لگتا ہے تم نے لندن جا کے وقت ضائع کیا۔''

میں نے کہا۔ ''ایسا نہ کرتا تو یہاں خود ضائع ہو جاتا۔''

''یہ دونوں دھندے بڑے منافع بخش ہیں...... نوابی اور...... ڈکیتی...... پڑھ لکھ کے لوگ نوکری کرتے ہیں......''

اس نے ہاتھ پھر آگے بڑھایا...... ''اندھیرا ہو رہا ہے مجھے واپس بھی جانا ہے پھر ملیں گے۔''

میں نے واپسی کے راستے پر گن کے چار قدم لیے تھے کہ پہلا فائر ہوا...... مجھے کچھ اندازہ نہ ہوا کہ فائر کس نے کیا اور کدھر سے ہوا۔ دوسرا فائر ہونے سے پہلے ہی میں سوٹ کیس پھینک کے دوڑا...... بعد میں مجھے شامی نے بہت ڈانٹا کہ تم تو عقل سے بالکل ہی پیدل ہو...... ایسے اندھا دھند اُلٹے بھاگے...... میری آواز تک نہیں سنی...... اس نے چیخ چیخ کے کہا تھا کہ لیٹ جاؤ۔

میں محراب دار پل کے نیچے پناہ لینے کے لیے بھاگا تھا اور جب اس کی چھت کے نیچے جا کے منہ کے بل گرا تو ہر طرف فائر گونج رہے تھے۔ کسی نہ کسی کی طرف سے وعدہ خلافی ہوئی تھی۔ شامی بادشاہ سے میں یہ اُمید نہیں کر سکتا تھا...... شہاب الدین سے کچھ بعید نہ تھا...... دھوکے بازی اس کی فطرت تھی۔

میرے منہ کے بل گرنے کی وجہ پتھروں کا ایک چھوٹا سا ڈھیر تھا۔ یہ سلیپروں کے درمیان بچھائے جانے والے پتھر تھے جو اوپر سے پھسلے تھے۔ اس رکاوٹ کے باعث گزشتہ بارشوں میں جو پانی کا ریلا گزرا وہ تقسیم ہوا اور ایک طرف گڑھا بن گیا۔ میں اسی گڑھے میں سجدہ ریز ہوا۔ اس سے میری جان بچ گئی۔

مجھے وقت کے گزرنے کا کیا اندازہ ہوتا...... میں تو اپنی ہر سانس کو شمار کر رہا تھا۔ مجھے صرف گولیوں کی گونج سنائی دے رہی تھی جس میں وقفے وقفے سے کسی نشانہ بن جانے والے کی چیخ بھی شامل ہو جاتی تھی۔ دو ریوالور میں کیسے استعمال کرتا...... مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ کون کس پر گولی چلا رہا ہے۔ سامنے کوئی نہیں تھا...... نہ دوست نہ دشمن...... یہ مقابلہ نہ ہوشیاری کا تھا نہ بہادری کا...... مقابلہ زندگی اور موت کا تھا...... جس کے نصیب میں جو ہو۔

میرے حواس بحال ہونے تک فیصلہ ہو چکا تھا۔ گولیوں کی آتش بازی کا شور ختم گیا تھا۔ اس کے بعد سارے ماحول کو اپنی گرفت میں لینے والا موت کا مہیب سناٹا تھا جس میں صرف دہشت زدہ پرندے نوحہ خواں تھے مگر عجیب بات یہ تھی کہ ان کا شور سنائی نہ دیتا تھا۔

بالآخر میں نے شامی کی آواز سنی۔ وہ مجھے پکار رہا تھا۔ میں اپنی بزدلی پر بلاوجہ شرمسار تھا۔ گولی سے بچ کے کوئی کہاں جا سکتا ہے۔ اس کی رفتار کا کیسے مقابلہ کر سکتا ہے مگر اس کے باوجود اس قسم کی صورتِ حال میں اور کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا۔

میں پل کی محراب سے نکلا تو میری نظر نے میدان کارزار کو دیکھا۔ شہاب الدین جہاں کھڑا تھا وہیں مرا پڑا تھا۔ معلوم نہیں کتنی گولیوں نے اس کے جسم پر جگہ بنائی تھی۔ اس سے کچھ فاصلے پر دو کروڑ پڑے تھے...... شامی میری طرف دوڑتا ہوا آیا۔ وہ مخالف سمت سے نمودار ہوا تھا۔ اس نے مجھے واپس اندر کھینچ لیا۔ ''دوست...... تم ٹھیک تو ہو نا......؟''

میں نے سر ہلایا۔ ''بدعہدی کس نے کی؟''

''کیا تم مجھ سے یہ توقع رکھ سکتے ہو......'' اس نے شہاب الدین کی لاش کو دیکھا جو بڑے بے ڈھنگے پن سے پڑی تھی اور اس کا خون ندی میں بہہ رہا تھا۔ پتھروں کو لہو کی سرخی دے رہا تھا۔ آنے والے بارشوں کے موسم میں پانی کا پہلا ریلا منجمد خون کے خشک سیاہ داغ کو دھو ڈالے گا...... پھر میری نظر دوسری طرف گئی...... غلام محمد زندگی کی مسافت کے چند قدم طے کر پایا تھا پھر اسے موت نے آ لیا...... رہائی ملی تو یوں ملی......

''یہ اپنے ساتھ پولیس کو لایا تھا۔'' شامی نے افسوس سے سر ہلایا۔ ''وہ ہم سے بھی پہلے چھپ کے پوزیشن لے چکے تھے۔''

میں نے کہا۔ ''یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی...... اگر شہاب الدین کو دو کروڑ بچانے ہوتے تو وہ اتنی دور مرنے کیوں آتا...... صاف انکار کر دیتا کہ غلام محمد کے لیے تنظیم فاتحہ پڑھ چکی۔

''ہر آدمی جب ضرورت سے زیادہ چالاک بنتا ہے تو ایسی ہی بےوقوفی ضرور کرتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''نہیں دوست...... یہ کام کسی اور نے کیا ہے۔''

''تمہارے دشمن نے یا میرے دشمن نے......؟''

''بس کسی نے ایک تیر سے دو شکار کیے...... ان دونوں کو مروا دیا جن کی اب ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔''

''تمہارا مطلب ہے اسی نے...... جو چیف کے نام سے مشہور ہے۔'' میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''کبھی یہ اس کے دست راست تھے۔ اس کے خاص آدمی تھے۔ لیکن آج وقت بدل گیا ہے...... چیف کو یہ ڈر ہو گا کہ ان میں سے کوئی دشمنوں کے ہاتھ بک نہ جائے...... چیف کے دشمن بھی آج برسرِاقتدار

جماعت کے اتحادی ہیں...... اگر یہ وعدہ معاف گواہ بن جاتے تو چیف کے خلاف پاکستان میں سارے مقدمات کی فائلیں پھر کھل جاتیں۔ یہ امکان بھی پیدا ہو جاتا کہ انٹرپول کے ذریعے اسے واپس لایا جائے...... بہت سے ممالک کے ساتھ پاکستان کا مجرموں کی تحویل اور تبادلے کا معاہدہ بھی ہے۔

صرف ایک وعدہ معاف گواہ نے پاکستان کے منتخب وزیراعظم کو تختہ دار تک پہنچا دیا تھا۔ یہ دونوں چیف کو اسی انجام تک پہنچانے کا وسیلہ بن جاتے...... اس نے پوری کوشش کی کہ انہیں بھی ملک سے فرار کرا دے۔ وہ چاہتا تھا کہ انہیں برطانیہ میں سیاسی پناہ مل جائے لیکن ایسا ممکن ہوتا نظر نہیں آتا تھا...... اس نے دوسرا راستہ اختیار کرنے کا بھی سوچا ہوگا لیکن غلام محمد اور شہاب الدین دونوں پیچھے ہٹ گئے تھے اور پبلک میں آتے ہی نہیں تھے۔ وہ اپنی حفاظت کے خیال سے بھی غافل نہ تھے...... انہیں ٹھکانے لگانا آسان نہ تھا۔ اچانک یہ بہانہ بن گیا...... چیف کے شاطرانہ ذہن نے فوراً ایک طریقہ سوچ لیا۔"

ہم اندھیرے میں خاموش کھڑے رہے۔ میرے دونوں بدترین دشمن مارے گئے تھے۔ یہ بات میرے لیے باعث سکون تھی مگر میں ان کی موت پر خوش نہیں تھا دشمن مرے تے خوشی نہ کرئے سجناں وی مر جانا...... یہ اب ایک کہاوت ہے اور بنیادی حقیقت۔

کچھ دیر بعد میں نے کہا۔ "کیا پولیس نے محاصرہ کر رکھا ہے؟"

"ابھی کچھ نہیں معلوم۔"

میں نے کہا۔ "ہم کب تک یہاں چھپے رہیں گے؟ تمہارے ساتھی کہاں ہیں؟"

"انہوں نے اچھا مقابلہ کیا۔ چلو ہم چلتے ہیں۔ ادھر سے نہیں۔ کیا پتا پولیس گھات میں ہو...... پیچھے سے آؤ۔"

مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن شامی کسی چیتے اور بھیڑیے کی طرح تاریکی میں آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ...... پوری طرح چوکس...... پھونک پھونک کے قدم رکھتا...... جوابی حملے کے لیے مستعد...... میں اس کے پیچھے تھا۔ ہم دونوں مسلح تھے اور ہمارے اعصاب اتنے کشیدہ تھے کہ ایک جگہ خفیف سی آہٹ پر شامی نے مجھے اپنے ساتھ کھینچ کے زمین پر گرا لیا اور ہم سانس روکے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے اندھیرے میں کچھ دیکھنے کی کوشش کرتے رہے مگر وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

وہ نہ جانے کون سے راستے سے مجھے واپس لے گیا۔ ایک لمبا چکر کاٹ کے ہم پل کے آغاز سے بہت پہلے پٹڑی تک پہنچے۔ وہ بار بار رک کے کچھ سنتا تھا اور پھر چل پڑتا تھا...... ایک بار میں نے بھی الو کی آواز سنی اور اسے سر ہلاتے محسوس کیا پھر یہ آواز بار بار سنائی دینے لگی۔

میں نے کہا۔ "یہ واقعی الو بول رہے ہیں؟"

"یہ میرے ساتھی ہیں......" شامی نے کہا۔

اچانک ایک درخت کی اوٹ سے الو بولا۔ شامی رک گیا۔ ایک سایہ اس کے سامنے آ گیا۔ "مقابلہ ختم ہو گیا سردار۔" وہ بولا۔

"کتنے مارے گئے؟" شامی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"ہمارے تین...... وہ پہلے ہی راؤنڈ میں شہید ہو گئے تھے۔"

"کون کون۔" شامی نے دکھی لہجے میں پوچھا۔

"مجیدا...... بالا اور خانو۔"

خاموشی کا ایک بوجھل سوگوار وقفہ آیا۔ شامی نے دوسری طرف سے مرنے والوں کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا۔ ہمت کر کے میں نے پوچھا۔ "کیا محاصرہ اٹھا لیا گیا ہے؟"

"اللہ نے انہیں اٹھا لیا...... سب مارے گئے۔"

میں نے کہا۔ "وہ کتنے تھے؟"

شامی نے برہمی سے کہا۔ "دوست...... اس کی کیا اہمیت ہے......؟ ہم دشمنوں کی لاشیں کیوں شمار کریں...... ہمارا ایک بھی جان سے جائے تو اس کا صدمہ بہت بڑا ہوتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "آئی ایم سوری۔"

اس نے میرے کندھے پر تھپکی دی۔ "آؤ چلیں۔"

واپسی کا سفر ہم نے پرانی پٹڑی پر پیدل طے کیا۔ ہر طرف سنسان جنگل میں موت کی بازگشت محسوس ہوتی تھی۔ مجھے ایک احساس جرم نے گھیر لیا تھا کہ یہ سب میری وجہ سے ہوا...... شامی بادشاہ کے تین ساتھیوں کی موت کا ذمے دار میں ہوں۔ میں نے ہی شامی سے کہا تھا کہ وہ غلام محمد کو اٹھا لے۔"

معلوم نہیں کیسے شامی نے میرے خیالات کو پڑھ لیا...... شاید میری مجرم خاموشی سے...... اس نے کہا۔ "دوست...... زندگی اور موت کا کھیل ایسے ہی چلتا ہے...... بہانہ کچھ بھی بن جاتا ہے جس کی نہ آئی ہو وہ میری طرح بھی بچ جاتا ہے۔ مجھے کا سوچیے کمترین غلام نے بچایا تھا۔"

ہم ڈیرے پر پہنچے تو وہاں ایک سوگ کا سماں تھا۔ شامی کے ساتھی اپنے تین ساتھیوں کی لاشیں اٹھا لائے تھے اور اب ان کے گرد حلقہ بنائے کھڑے تھے۔ ان سے کچھ فاصلے پر دو لاشیں الگ پڑی تھیں۔ یہ غلام محمد اور شہاب الدین تھے۔ محاصرہ کرنے والے کسی پولیس مین کی لاش انہوں نے نہیں اٹھائی تھی۔

شامی نے ہاتھ اٹھائے...... ان کے ساتھ میں نے بھی...... ہم نے مرنے والوں کے حق میں دعائے مغفرت کی تو مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ یہ آدمی کے اپنے جذبات ہوتے ہیں جو حرف دعا بن کے لب پر آ جاتے ہیں ورنہ کون شہید کے درجے پر فائز ہوا...... کون جہنم رسید ہوا...... کس کی مغفرت ہو گی...... کس کی نہیں...... یہ کون جانتا ہے...... جب یوم حساب آئے گا تو سب اپنے اپنے فرد عمل سنبھالیں گے۔

پھر شامی نے کہا۔ "چلو میرے شیرو...... مٹی کی امانت مٹی کے سپرد کرو...... اور صبح ہونے سے پہلے نکل جاؤ۔"

"سردار...... ان کا کیا کریں؟" شامی کے ایک ساتھی نے الگ پڑی دو لاشوں کی طرف اشارہ کیا۔

"مرنے کے بعد دوست دشمن میں فرق نہیں کرنا چاہیے۔ ہم زندہ ہیں یہ مردہ...... بس یہی فرق ہے...... مردے کو دفنانا زندوں کی ذمے داری ہوتی ہے انہیں بھی دبا دو بلکہ سب کو ایک ہی جگہ دفنا دو...... وقت کم ہے ہمارے پاس۔"

قبریں پانچ ہوں یا ایک ہو...... بالآخر سب کو مٹی میں مل جانا ہے۔"

"سردار......" ان میں سے ایک بولا۔ "اسے بھی دیکھ لو۔"

شامی نے سوٹ کیس کی طرف دیکھا جو اسی طرح بند تھا۔ "کیا ہے اس میں۔"

"سب جعلی نوٹ ہیں۔" اس نے سوٹ کیس کھول دیا اور ایک ٹارچ کی روشنی اندر ڈالی۔

میرے لیے یہ انکشاف بم کے دھماکے جیسا تھا۔ یکلخت مجھے غصے کی شدت نے مغلوب کر لیا...... میں اخلاق و آداب تہذیب اور شائستگی کے سارے تقاضے بھول گیا کہ مرنے والوں کو گالی نہیں دیتے...... ان کی نیکی بدی ان کے ساتھ...... اب وہ جانے اور خدا جانے......

میں نے کہا۔ "پھر تو ٹھیک ہی ہوا...... دونوں مارے گئے کتے کی موت۔"

شامی نے جھک کر ایک گڈی اٹھائی...... پھر دوسری اور اقرار میں سر ہلایا۔ جو فرق میری نظر نہ دیکھ سکی وہ شامی نے فوراً نوٹ کر لیا۔ یہ سب صرف کاغذ کے بے مصرف ٹکڑے تھے۔ ہزار کا نوٹ لکھنے سے ان کی حیثیت میں فرق نہیں پڑ سکتا تھا۔

فرق نہیں پڑا تھا جن کی نیت میں فتور تھا اور اعمال غلط تھے...... وہ اپنے اسی انجام کو پہنچے تھے جس کے مستحق تھے۔ فرق مجھے پڑا تھا جس کے دو جانی دشمن اٹھا لیے گئے تھے...... فرق شامی کو پڑا تھا جس کے تین جانثار مارے گئے تھے۔ تقدیر کے ہاتھوں میں کھلونا ہے آدمی......

شامی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا تو میں چونکا۔ "چلو دوست جو ہونا تھا ہو گیا...... اللہ کی مرضی...... عورتوں کو کچھ معلوم نہیں ہونا چاہیے ہماری صورت سے۔"

ہم سیڑھیاں اتر کے نیچے گئے تو اپنی انتہائی کوشش کے باوجود میں اپنا ہمیشہ جیسا رویہ برقرار نہ رکھ سکا۔ میرے دل پر ایک بوجھ تھا...... میرا دماغ ماؤف ہو رہا تھا...... ایسے میں فریال کے سامنے نارمل رہنا میرے بس کی بات نہ تھی...... شامی کے لیے بھی مزاج کی شگفتگی برقرار رکھنا مشکل ہو رہا تھا...... اس فرق کو پروین نے زیادہ نوٹ کیا ہوگا مگر وہ خاموش رہی...... اسے شامی کے موڈ کے مطابق اپنے رویے کو ایڈجسٹ کرنا آتا تھا۔

فریال چپ نہ رہ سکی۔ "کیا کوئی گڑبڑ ہوئی ہے؟"

میں نے کہا۔ "نہیں تو......"

"جھوٹ مت بولو...... تم اپ سیٹ ہو۔"

میں نے بات نبھانے کے لیے کہا۔ "ارے یار دھوکا ہو گیا ہمارے ساتھ...... وہ جعلی کرنسی تھما گئے۔"

شامی نے اطمینان کا سانس لیا۔ "ہم دو کروڑ کے ردی کاغذوں کا بوجھ اٹھا لائے۔"

فریال ہنسنے لگی۔ "استادوں کے ساتھ استادی ہو گئی...... کہاں ہیں وہ جعلی نوٹ...... میں دیکھنا چاہتی ہوں۔"

"اس کا فائدہ؟"

"میں اندازہ تو کروں کہ دو کروڑ کے نوٹ کتنے ہوتے ہیں۔ اصلی نہ سہی نقلی سہی۔"

میں نے کہا۔ "وہ ہم نے وہیں چھوڑ دیے تھے۔"

"ہم آج رات واپس نہیں جا سکتے......" فریال بولی۔

میں نے کہا۔ "ہم آج ہی واپس جائیں گے...... بلکہ ابھی۔"

"آج رات ہمیں یہ ڈیرا چھوڑنا تھا...... پہلے سے طے تھا۔" شامی بادشاہ نے کہا۔ "ورنہ ہم دو چار دن مہمان رکھتے۔"

ہم نے زبردستی کھانا کھایا اور روانگی کے لیے تیار ہو گئے۔ شامی نے ہمیں باہر آ کے رخصت کیا تو میں نے کہا۔

''دوست مجھے معاف کر دینا...... میں یہ نہیں بھول سکتا کہ تمہارے تین ساتھی میری مدد کرنے کے چکر میں مارے گئے۔''

''اس بات کو یہیں بھول جاؤ نواب صاحب...... زندگی میں اور ایسے موقعے آئیں گے جب ہم کچھ اور سوچیں گے...... ہو گا کچھ اور...... میں بھی تمہارے ساتھ جاتا...... لیکن ایک تو مجھے اپنے ساتھیوں کی نماز جنازہ پڑھانی ہے اور انہیں دفن کرنا ہے...... دوسرے اپنے ساتھیوں کو ہدایات دینی ہیں...... اس میں دو گھنٹے لگ جائیں گے...... جاؤ رب راکھا۔''

فریال نے پروین کو ست بدھائی مدعو کیا اور ہم اسی گاڑی میں پھر سوار ہو گئے جس میں یہاں تک آئے تھے...... باہر آنے پر مجھے کہیں کچھ دکھائی نہ دیا۔ نہ وہاں تین ڈاکوؤں کی لاشیں تھیں...... نہ غلام محمد اور شہاب الدین کی۔ اس وقت رات کے دس بجے تھے جب ہم نے واپسی کے سفر کا آغاز کیا...... جنگل میں چاندنی کا دھندلکا تھا جو مجھے پر آسیب لگ رہا تھا اور فریال کو خواب ناک...... فرق اندر سے پڑتا ہے...... اچھے موسم...... خوب صورت منظر...... دلکش گیت...... سب جذبات کی بات ہے......

بالآخر فریال نے مجھے پکڑ لیا۔ ''رومیو...... تم بہت دیر سے مجھے بے وقوف بنانے کی ناکام کوشش میں مصروف ہو...... آخر کیوں؟''

میں نے کہا۔ ''تمہیں جیسا بنایا خدا نے بنایا۔''

''بکومت...... یہ دو کروڑ کی جعلی کرنسی کا صدمہ نہیں ہے...... میں جانتی ہوں۔''

پھر میں نے اسے سب بتا دیا۔ میں اس کی گود میں سر رکھ کے لیٹ گیا اور بولتا رہا۔ آہستہ آہستہ میرے سر کے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیرتی رہی۔ میری پیشانی کو چومتی رہی اور مجھے تسلی دیتی رہی۔ ''تمہارا کیا قصور ہے اس میں سب اپنے اپنے اعمال کی سزا ہے۔''

میں نے چشم تصور سے خواب کی طرح ایک منظر دیکھا۔ جنگل میں فرش خاک پر پانچ لاشیں پڑی ہیں...... ادھر کے اور ادھر کے مرنے والے سب ایک صف میں لیٹے ہوئے ہیں...... سب کو ایک ہی قبر میں سونا ہے...... کون قاتل کون مقتول...... کون ظالم کون مظلوم...... ڈاکو اور سیاستداں...... شریف اور بدمعاش...... موت نے سب فرق مٹا دیے...... ڈیتھ دی لیولر...... شامی کے پیچھے کچھ لوگ صف بستہ ہیں...... مر جانے والوں کو زندہ رہ جانے والے ہی دفن کرنے کے ذمے دار ہوتے ہیں...... نماز جنازہ تمام ہوئی...... قبر ختم ہے...... ایک کے بعد دوسرا...... باری باری سب پر مٹی گرتی ہے...... بس ایک ڈھیر ہو گا جو رہے گا...... پھر وہ بھی برابر ہو جائے گا...... کل صبح کا سورج نکلے گا تو کچھ نہ ہو گا...... ذرا خالی ہو گا...... زمین آسمان...... درخت اور پرندے کسی فرق کو محسوس نہ کریں گے۔

کچھ دیر کے لیے میری آنکھ لگ گئی۔ فریال نے مجھے جگایا تو گاڑی رکی ہوئی تھی۔ سفر کا پہلا مرحلہ طے ہو گیا تھا۔ میں اترا تو مجھے اپنی گاڑی نظر آ گئی لیکن گاڑی اب وہاں نہیں تھی جہاں میں نے اسے چھوڑا تھا۔ گاڑی سڑک کے کنارے پر کھڑی تھی اور اس سڑک پر مسلسل ٹریفک گزر رہی تھی۔ فریال کے باہر آتے ہی پجیرو آگے بڑھ گئی...... ڈرائیور نے مجھ سے بات کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔

مطلب صاف ظاہر تھا...... یہاں سے اپنے گھر جانے کے لیے مجھے کسی گائیڈ یا ڈرائیور کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے تھوڑا سا غور کیا تو ٹریفک کی ڈائریکشن سے راستہ میری سمجھ میں آ گیا۔ یہ جی ٹی روڈ تھا۔ سامنے سے آنے والی ٹریفک لاہور کی سمت میں رواں تھی۔ میری گاڑی جس رخ پر کھڑی تھی یہ لاہور سے اسلام آباد جانے کا راستہ تھا...... اس کا مطلب یہ تھا کہ ہم سیدھے چلتے جائیں گے تو دینہ کے موڑ تک پہنچ جائیں گے...... ممکن ہے اس سے پہلے دوسرے شہر آ جائیں...... گجرات...... وزیر آباد...... لالہ موسیٰ یا گوجرانوالہ......

گاڑی میں چابی لگی ہوئی تھی...... جب میں نے اسے اسٹارٹ کیا تو اس کے پیٹرول کا کانٹا فل پر آ گیا۔ پھر میں نے گھڑی دیکھی تو رات کے بارہ بجے تھے۔

فریال نے کہا۔ ''یہ جگہ دیکھا تو نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''نہیں...... ہمیں دوسرے راستے سے گھما پھرا کے لے جایا گیا تھا۔''

''ہاں جاتے ہوئے چار گھنٹے لگے تھے......'' فریال بولی۔ ''واپسی دو گھنٹے میں ہوئی مگر اس وقت ہم ہیں کہاں؟''

میں نے کہا۔ ''تھوڑا آگے جا کے معلوم ہو گا...... لیکن اس وقت ہمارا لوٹ کے ست بدھائی جانا کچھ مناسب نہیں۔''

''ہاں تمہیں ایک جھوٹ اور بولنا پڑے گا کہ یہ تمہارے ساتھ کیسے آ گئی...... اسے تو فاروقی لے گیا تھا۔''

میں نے گاڑی موڑ لی۔ آدھے گھنٹے بعد ہی مجھے اپنی

پوزیشن کا صحیح اندازہ ہو گیا۔ ہم گجرات اور گوجرانوالہ کے درمیان تھے۔ فاصلہ دونوں طرف ہی برابر تھا۔ ہمیں یہاں چھوڑنے والوں نے ہمیں درمیان میں چھوڑ دیا تھا کہ چاہیں تو لاہور جائیں ورنہ واپس اپنے ٹھکانے ست بدھائی......

جاتے ہوئے ہماری خاطر مدارات کا پورا اہتمام تھا...... واپسی میں حالات مختلف تھے...... ایک غیر متوقع سانحے نے مہمان اور میزبان دونوں کو ڈسٹرب کر دیا تھا...... مجھے نیند نہیں آ رہی تھی لیکن میرا سر بھاری ہو رہا تھا اور مجھے چائے یا کافی کی سخت طلب محسوس ہو رہی تھی۔ رات کے وقت صرف وہ روڈ سائیڈ ریسٹورنٹ آباد تھے جہاں مسافر، بس اور ٹرک وقفہ کرتے تھے۔ لوگ بان کی چارپائیوں پر یا لکڑی کی بھاری بھرکم کرسیوں پر بیٹھ کے خوب ابالی ہوئی بہت زیادہ دودھ چینی والی چائے پیتے تھے...... یہاں کافی ملنے کا سوال بھی نہ تھا۔

ایک قدرے بہتر اور پرسکون جگہ پر میں نے گاڑی روکی اور جتنی دیر میں چائے لائی گئی میں نے ایک ڈرم میں بھرے ہوئے پانی سے منہ دھویا۔ ڈرم اینٹوں کے ایک چبوترے پر رکھا ہوا تھا اور اس کے نچلے حصے میں پیتل کی ٹونٹی تھی نتیجہ یہ کہ میں نے رکوع میں جا کے منہ دھویا تو سارے چھینٹے میرے گرد آلود جوتوں پر اور میری خراب حال پتلون کے پائنچوں پر پڑے۔

چائے کے دو گرم گرم کپ حلق سے اتار کے میں نے بہت بہتر محسوس کیا۔ اب فریال بھی سنجیدہ اور خاموش تھی۔ میرا ذہن نتائج کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ غلام محمد اور شہاب الدین کی موت کا راز تو شاید کبھی فاش نہ ہو لیکن ان کا یوں غائب ہو جانا ایک پراسرار معاملہ نہیں رہے گا۔ جب تک پولیس پر فیملی کا یا تنظیم کا دباؤ رہے گا پولیس بھی تفتیش میں مستعدی دکھانے پر مجبور ہو گی۔ تب تک اس کیس میں میرا نام بھی لیا جائے گا...... غلام محمد کے اغوا کا معاملہ اٹھا تھا تو راجا اور میرا نام خبروں کی زینت بنا تھا۔

ڈاکوؤں نے غلام محمد کی رہائی کے عوض دو کروڑ کا تاوان طلب کیا تھا تو میری پوزیشن کلیئر ہو گئی تھی کہ میرا اس کے اغوا سے دور کا بھی تعلق نہیں...... پھر شہاب الدین نے مجھے بتایا کہ ڈاکو میرے ذریعے معاملہ طے کرنا چاہتے ہیں...... یہ بات کسی کو معلوم نہیں تھی...... شہاب الدین نے کہا تھا کہ اس معاملے میں پولیس یا کسی اور کو ڈالنے کا مطلب ہو گا غلام محمد کی موت۔ چنانچہ اس نے یہ بات کسی کو نہیں بتائی تھی۔

اب شہاب الدین بھی مارا گیا تھا اور غلام محمد بھی۔ انہیں

مروانے والوں نے بڑی مضبوط پلاننگ کی تھی۔ ایک طرف انہوں نے شہاب الدین کو دو کروڑ کی جعلی کرنسی پکڑا دی تھی کہ جاؤ غلام محمد کو چھڑا لو...... دوسری طرف انہوں نے پولیس کو شہاب الدین کے پیچھے لگا دیا تھا۔

مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ مقابلے میں کتنے پولیس والے ہلاک ہوئے...... سب مارے گئے یا کچھ جان بچا کے نکل گئے لیکن یہ معمولی واقعہ نہیں...... پولیس پارٹی جو شہاب الدین کا تعاقب کرتی ڈاکوؤں کی کمین گاہ تک پہنچ گئی تھی ضابطے کی پوری کارروائی مکمل ہونے کے بعد اور افسران اعلیٰ کی منظوری سے گئی ہوگی...... جب یہ سنسنی خیز خبر اخبارات میں شائع ہوگی تو پولیس کا پورا محکمہ حرکت میں آ جائے گا...... ڈاکو کون تھے۔ کہاں گئے...... غلام محمد کیوں بازیاب نہیں ہوا...... مقابلے میں جو ڈاکو مارے گئے ان کی لاشیں کہاں ہیں...... پولیس کی نفری کم کیوں تھی...... ان کے پاس ڈاکوؤں سے مقابلے کے لیے کیا اسلحہ تھا...... اس سانحے کا ذمے دار کون ہے...... مخبری کرنے والا کون تھا...... تاوان کی رقم لے کر جانے والا شہاب الدین کہاں گیا؟ کیا اسے بھی ڈاکو لے گئے...... دو کروڑ بھی گئے...... دو بندے بھی......

اس واردات کے ہزار مختلف پہلو ہوں گے لیکن میرے لیے باعث تشویش شامی بادشاہ سے تعلق تھا...... اگر اس کی بھنک بھی پولیس کے کانوں میں پڑ گئی کہ تاوان کی ادائیگی اور غلام محمد کی واپسی کے لیے ڈاکوؤں نے میری خدمات حاصل کی تھیں تو میں سخت مشکل میں پڑ جاؤں گا۔

اس معاملے کا ایک اور زیادہ خطرناک پہلو وہ سازش تھی جس کے نتیجے میں چیف نے اپنے دو رازدار ختم کرا دیے تھے...... ان دونوں کے پاس تنظیم کے ایسے راز تھے جن کا افشا ہونا خود چیف کے گلے کا پھندا بن سکتا تھا...... وہ اپنی جان بچانے کے لیے دبئی سے لندن اور پیرس تک ہر ملک میں روپوشی اختیار کر رہا تھا مگر ابھی تک نہ اسے کسی ملک میں سیاسی پناہ ملی تھی نہ کسی ملک کی شہریت حاصل ہوئی تھی...... اس کے مخالفین اور دشمن کم نہ تھے...... غلام محمد یا شہاب الدین میں سے کوئی ان سے ساز باز کر لیتا اور اپنی وفاداری کا سودا کر لیتا تو چیف مارا جاتا۔

اب اتفاق سے اس کے ہاتھ یہ موقع لگا تو اس کے شاطر ذہن نے ایک فریب کا جال بچھایا...... بہت ہوشیار بننے والے غلام محمد اور شہاب الدین اس کی چال کو نہ سمجھ سکے اور اعتماد کے دھوکے میں جان گنوا بیٹھے...... مجھے تو شک تھا کہ چیف نے تیسرا شکار مجھے چنا ہوگا...... اس کی سمجھ میں یہ بات تو خیر نہیں آئی ہوگی کہ رفیق جواب خوبی تقدیر سے نواب رفیق احمد شیرازی ہو گیا ہے ڈاکوؤں کے اور غلام محمد کے بیچ میں معاملات طے کرانے والا کیسے بن گیا لیکن اس نے سوچا ضرور ہوگا کہ اس صورت حال میں اگر رفیق کا پتا بھی صاف ہو جائے تو کیا حرج ہے۔

شہاب الدین نے اسے بتایا ہوگا کہ ڈاکوؤں کا سردار شامی بادشاہ خود کو نواب رفیق احمد شیرازی کا دوست کہتا ہے...... چیف نے کہا ہوگا کہ چلو یہ تو اچھی بات ہے...... رفیق بھی اپنا ہی آدمی ہے پھر اس نے کسی ذریعے سے شہاب الدین کو دو کروڑ روپے پہنچائے...... اتنی جعلی کرنسی وہ فوراً نہیں چھپوا سکتا تھا...... یہ اس کے پاس پہلے سے ہوگی...... تنظیم میں کوئی جعلی نوٹ چھاپنے کا ماہر بھی ہوگا جس کے ذریعے چیف کی اور تنظیم کی مالی ضروریات پوری ہو رہی ہوں گی...... یہ ایک الگ جرائم پیشہ گروہ کی کارگزاری ہے جو کبھی نہ کبھی ضرور پکڑا جائے گا...... اتنی مقدار میں جعلی کرنسی پھیلائی جائے تو وہ پوشیدہ نہیں رہتی۔

چیف نے شہاب الدین کو دو کروڑ دے کر یہ بھی ثابت کیا کہ اس کی اور غلام محمد کی قدر و قیمت آج بھی دو کروڑ سے زیادہ ہے اور ان دونوں کا چیف کی قدر دانی پر اعتماد بڑھ گیا...... لیکن دوسری طرف چیف نے ساری تفصیل پولیس کے گوش گزار کرا دی...... کسی مخبر نے سب بتا دیا کہ شہاب الدین کب کہاں کس کے ساتھ جائے گا...... اپنی طرف سے شہاب الدین نے کسی پر یہ راز افشا نہ کیا ہو مگر پولیس اس کے ساتھ سائے کی طرح لگی ہوگی...... شاید مرتے وقت اسے صرف حیرانی ہوگی کہ یہ کیسے ہوا اور کیوں ہوا اور پولیس کی گولی کا نشانہ بنا یا ڈاکوؤں کی...... چیف کی فریب کاری کی طرف اس کا دھیان ہی نہیں گیا ہوگا۔

اب خطرہ میرے لیے تھا...... اس امکان کو یکسر مسترد نہیں کیا جا سکتا تھا کہ شہاب الدین نے کسی سے نواب رفیق احمد شیرازی کی بات کر دی ہو کہ وہ معاملہ طے کرا رہے ہیں...... یا خود چیف نے اپنے مخبر سے کہا ہو اور پولیس تک یہ بات بھی پہنچ گئی ہو......

یہ میرے لیے بہت بڑی پریشانی کی بات بن سکتی تھی...... لاہور پہنچنے تک میرا دماغ اسی الجھن میں مبتلا رہا۔ دو رات نہیں صبح کے ساڑھے تین بجے تھے جب ہم فاروقی کے گھر میں وارد ہوئے۔ گیٹ پر مجھے پرانے چوکیدار کی جگہ کسی سکیورٹی کمپنی کا باوردی گارڈ نظر آیا، وہ مجھے نہیں پہچانتا تھا چنانچہ اس نے مجھے روک لیا...... وہ اپنی ڈیوٹی کر رہا تھا اور غلط نہیں کر رہا تھا لیکن میرے اعصاب اتنے کشیدہ تھے کہ میں اس سے لڑ پڑا۔

فریال نے مجھے روکا اور موبائل فون پر لیلیٰ بھابی سے بات کی...... ظاہر ہے اسے نیند سے بیدار ہونے میں دیر لگی۔ کسی موبائل فون کی رنگ سے گہری نیند سونے والا فوراً کہاں جاگتا ہے...... میں سخت طیش میں بیٹھا رہا اور سکیورٹی گارڈ اپنی گن کا رخ گاڑی کی طرف کیے کھڑا رہا۔ بالآخر بھابی نے کال ریسیو کی...... پھر فریال نے موبائل فون گارڈ کو دیا اور سکیورٹی کلیئرنس ملی تو اس نے گاڑی کو اندر لے جانے کے لیے گیٹ کھول دیا۔

"کس قدر بدتمیز آدمی ہے...... سوری تک نہیں کہا۔" میں نے گاڑی اندر رول کی۔

"اس کے لیے تم اجنبی تھے...... اب نہیں رہے...... مگر جو پہلی بار آئے گا اس کے ساتھ وہ ایسا کرے گا تو غلط نہیں ہو گا...... اسے یہاں اسی لیے کھڑا کیا گیا ہے کہ کسی اجنبی کو اندر نہ آنے دے۔"

لیلیٰ بھابی سخت حیران پریشان پورچ میں نمودار ہوئی۔ "کہاں سے آ رہے ہو تم لوگ اس وقت...... خیریت تو ہے نا؟"

فریال نے کہا۔ "سب خیریت ہے۔"

میں نے کہا۔ "خاک خیریت ہے...... بھابی اسے اٹھاؤ۔"

"انہوں نے کہا ہے...... صبح بات کریں گے۔" لیلیٰ نے کہا۔ "میرا خیال ہے ابھی تم لوگ بھی آرام کرو۔"

"بھابی...... معاملہ سیریس ہے...... آپ نہیں اٹھاؤ گی تو میں خود آپ کے بیڈ روم میں جا کے اسے باہر کھینچ لاؤں گا۔"

فریال نے مجھے ڈانٹا...... "اتنا بھی بے قابو ہونے کی ضرورت نہیں...... تم چلو میرے ساتھ...... دو چار گھنٹے میں کوئی بات نہیں آ رہی...... جائیں لیلیٰ بھابی آپ سو جائیں...... ان کو میں سنبھال لوں گی۔"

فریال کا یہ رویہ میرے لیے بالکل غیر متوقع تھا مگر اس نے بڑی ہوشیاری سے میرا کنٹرول اپنے ہاتھ میں لے لیا اور میں نے بھی مزاحمت لاحاصل سمجھتے ہوئے اس سے تعاون کو ترجیح دی...... مجھے نیند تو برائے نام ہی آئی مگر تھوڑی دیر آرام سے میری حالت میں بہتری آئی...... صبح غسل کے بعد میں کافی فریش ہو گیا۔ جب فاروقی چائے کے مگ سے چسکیاں لیتا نمودار ہوا تو میں تقریباً نارمل تھا...... فریال میرے لیے چائے لینے گئی ہوئی تھی۔

"یار آخر میں نے کیا بگاڑا ہے تیرا...... تو کیوں بھوت بن کے میری ازدواجی زندگی کا بھٹا بٹھانے پر تل گیا ہے......" وہ باتھ گاؤن میں میرے بیڈ پر بیٹھ گیا۔

میں نے کہا۔ "یار میں نے ایسا کیا کر دیا ہے۔"

"تو نے میری اکلوتی بیوی کو ورغلایا ہے......" وہ بولا۔

"تجھے شرم آنی چاہیے ایسی بات کہتے ہوئے......" میں نے کہا۔

"شرم تجھے آنی چاہیے...... خود تو شادی کی نہیں...... مجھے کیا پتا بیوی کی لت کیسی ہوتی ہے...... نشے کی لت سے زیادہ بے بس کر دینے والی...... صبح سے شام تک ایک قدم نہیں چل سکتا میں اس کے بغیر......"

"تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟"

"تیرا قصور یہ ہے کہ تو اسے لے گیا ست بدھائی اور وہاں باقی سب کے ساتھ اس کا دل ایسا لگا کہ اب وہ یہاں رہنے کو تیار نہیں...... مجھ سے زیادہ اسے ڈاکٹر شہناز اور فریال کی جدائی شاق گزر رہی ہے...... باتیں کرتی ہے تو انہی کی...... فکر ہے تو ان کے معاملات کی...... میری فکر ہی نہیں...... دس سال سے خوش تھی میرے ساتھ...... دن رات خدمت کر کے مجھے عادی بنا دیا ناز برداری کا...... پہلے میں سب کچھ کر لیتا تھا مگر اب یہ سب میرے بس کی بات نہیں...... پاجامے میں ازار بند ڈالنا...... اپنے کپڑے خود استری کرنا...... روز ناشتے میں ڈبل روٹی کھانا...... مجھے چاہئیں اس کے ہاتھ کے کرکرے پراٹھے...... مگر وہ رہنا چاہتی ہے ست بدھائی میں۔"

"یار تو شوہر ہے...... مت جانے دے اسے کہیں...... اس پر تیرا اختیار ہے۔"

اس نے ایک آہ بھری...... یہی تو مشکل ہے پتر کہ میں شوہر نہیں مجنوں ہوں...... پہلے میری لیلیٰ ہے پھر بیوی...... اختیار اس کا چلتا ہے...... میرا نہیں...... بے شک یہ میری مردانہ کمزوری ہے ورنہ شوہر تو دیکھے ہیں ہم نے کہ دو دو کو ایسا کنٹرول کرتے ہیں جیسے ہمارے لیڈر صاحبان عوام اور خواص دونوں کو...... مجال ہے کوئی خرابی پیدا ہو...... یا کوئی قابو سے باہر ہو۔"

میں نے کہا۔ "اگر آپ اپنی بکواس فرما چکے ہوں تو یہ ناچیز بھی کچھ عرض کرے۔"

"یار معاف کرنا...... یہ بکواس بھی بے مقصد نہیں تھی...... میں چاہتا تھا پہلے تیری ٹینشن دور ہو جائے...... پھر بات کی جائے...... مجھے پتا چلا رات تو سب کو کاٹنے کو دوڑ رہا

تھا...... وہ تو فریال لے گئی تجھے چکار کے۔"

میں نے کہا۔ "معاملہ بھی کچھ ایسا تھا وکیل صاحب۔" فریال نے اندر آ کے کافی کا مگ مجھے تھمایا مگر بیٹھی نہیں...... "میں ذرا لیلیٰ بھابی کے ساتھ مصروف ہوں۔"

"ہاں بھئی...... تم اور تمہاری لیلیٰ بھابی...... ہم بھلا کس کھاتے میں...... لیکن خاتون...... آخر ایسی کیا شرمناک حرکت فرمائی تھی آپ دونوں نے کہ گھر والوں نے آدھی رات کو جوتے مار کے نکال باہر کیا...... یا بس ایسے ہی دل چاہا گھر سے بھاگنے کو...... لو اسٹوری میں سنسنی پیدا کرنے کے لیے......"

فریال ہنس کے پلٹ گئی۔ "یہ آپ انہی سے پوچھیے۔" میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں بات کہاں سے شروع کروں کیونکہ ابھی تک فاروقی کو میری صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ ہی نہ تھا...... بالآخر میں نے کہا۔ "رات ہم گھر سے نہیں بھاگے تھے...... ہم جان بچا کے بھاگے تھے......"

"کس دشمن سے...... خیر سے دشمن بھی بہت ہیں۔"

میں نے کہا۔ "ہم شاہی بادشاہ کے ڈیرے پر گئے تھے۔"

"یہ جمع کا صیغہ کس لیے......؟" اس نے مجھے غور سے دیکھا۔

"فریال میرے ساتھ تھی۔"

"تو فریال کو لے گیا تھا...... ڈاکوؤں کے ڈیرے پر......"

میں نے سر کھجا کے کہا...... "یار...... وہ پیچھے پڑ گئی...... کہنے لگی کہ اکیلے نہیں جانے دوں گی...... میں انکار نہ کر سکا...... غلطی مانتا ہوں میں...... لیکن وہاں جو ہوا اس کی بہرحال مجھے توقع نہیں تھی...... میں گیا تھا تاوان کی رقم وصول کر کے آگے پہنچانے...... اور غلام محمد کو رہا کرانے...... وہاں گڑبڑ ہو گئی۔"

"کیا گڑبڑ ہو گئی؟"

"شہاب الدین رقم لے کر آیا تھا...... پورے دو کروڑ...... لیکن وہ سب جعلی کرنسی تھی۔"

"پھر......؟ ڈاکوؤں کو پتا چل گیا...... انہوں نے مار دیا اسے۔"

میں نے کہا۔ "نہیں...... اسے ڈاکوؤں نے نہیں مارا...... پولیس نے مارا تھا۔"

وہ چونکا۔ "پولیس نے......"

"ہاں...... اسے بھی اور غلام محمد کو بھی۔" میں نے کہا اور پھر اسے اول تا آخر سب بتا دیا۔

فاروقی کی بڑی خوبی یہ تھی کہ بڑی سے بڑی مشکل پڑنے پر بھی اس پر نہ بدحواسی طاری ہوتی تھی نہ پریشانی...... اس کا دماغ اتنا شاک پروف تھا کہ ہر صدمہ برداشت کر سکتا تھا...... اور اس کی کارکردگی پر ذرا اثر نہیں پڑتا تھا جس وجہ سے میرا نروس بریک ڈاؤن ہونے کے قریب تھا اس کا فاروقی نے کوئی خاص نوٹس ہی نہیں لیا...... اس کے قانونی دماغ کا کمپیوٹر یقیناً اس کا حل نکالنے میں مصروف ہو گیا ہو گا مگر اس کے ظاہری بے نیازی کے رویے میں کوئی فرق نہیں آیا۔

اپنی بات ختم ہوئی تو میں نے کہا۔ "اب بتا میں کیا کروں؟"

"پھر اب تیرے کرنے کے لیے کیا رہ گیا ہے...... تیرے دشمنوں کا کام تو خود بہ خود تمام ہو گیا...... اور فلمی ہیرو کی طرح تو ہیروئن کا ہاتھ تھام کے گولیوں کی بوچھاڑ سے زندہ سلامت مسکراتا ہوا نکل آیا۔"

"لیکن اس پولیس مقابلے میں بہ طور ریفری میرا کردار سامنے آ گیا پھر......" میں نے کہا۔

"کیا تو ڈھول بجا کے گیا تھا یہ کارِ خیر کرنے؟"

"خود میں نے کسی کو نہیں بتایا تھا...... آف کورس تجھے معلوم تھا...... راجا کو...... اور فریال میرے ساتھ تھی۔"

"تجھے کس سے خطرہ ہے کہ ان میں سے کوئی تیرے خلاف وعدہ معاف گواہ بنے گا۔"

"یار یہ جو بھی ہوا...... سازش تھی...... کیا سازش کرنے والوں نے یہ نہیں بتایا ہو گا کہ نواب رفیق احمد شیرازی بہ نفسِ نفیس خود تصفیہ کرانے تشریف لا رہے ہیں...... ممکن ہے پروگرام میں میرا خاتمہ بھی شامل ہو لیکن جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔"

"اب تو یہی کہا جا سکتا ہے بیٹے۔"

"جان تو بچ گئی...... مگر کیس میں میرا نام آ گیا تو کیا ہو گا پہلے ہی غلام محمد کے اغوا میں مجھ پر شک کیا گیا تھا...... اب یہ ثابت ہو گیا کہ جب وہ مارا گیا تو میں بھی ڈاکوؤں کی طرف سے شریک تھا۔"

"یہ کیسے ثابت ہو گا؟"

"پولیس کے پاس پوری انفارمیشن ہو گی...... مخبری کرنے والے باخبر لوگ تھے۔"

فاروقی نے میرے کندھے پر ہاتھ مارا۔ "ابے خاندانی نواب...... کوئی میرے بارے میں بھی یہ کہہ دے تو کیا میں مجرم ہو جاؤں گا...... بکنے دے جس کو بکنا ہے...... تو صاف انکار کر...... سیاسی بیان دے کہ میرے مخالفین میری کردار کشی کے لیے ایسی الزام تراشی کرتے رہتے ہیں۔"

"میرے انکار کو پولیس تسلیم کر لے گی؟"

"ابے یہ کیا مشکل ہے...... اگر یہ ثابت ہو جائے کہ کل رات تو جائے واردات سے بہت دور...... اتنی دور تھا کہ وہاں تیرے خیال کی رسائی بھی نہ تھی۔"

"ایسی کون سی جگہ ہو سکتی ہے۔"

"یہ ابھی سوچتے ہیں...... کل رات عدالت عالیہ کے ایک جج کی بیٹی کی شادی تھی۔ مجھے اس میں مدعو کیا گیا تھا لیکن میں کیسے جاتا...... میں ست بدھائی کی جیل میں تھا...... تو کہہ سکتا ہے کہ میں وہاں تھا۔"

"جہاں مجھے مدعو ہی نہیں کیا گیا وہاں تھا؟" میں نے طنز سے کہا۔

"تیرے لیے دعوت نامہ مجھے ملا تھا۔"

"یار کیسی باتیں کر رہا ہے...... میں کسی عدالت عالیہ کے جج کو نہیں جانتا...... وہ مجھے کیوں بلائے گا اپنی بیٹی کی شادی میں۔"

"نیکے پتر...... دعوت نامے پر تیرا نام ہو گا تو کس کی مجال ہے اس جج سے پوچھے کہ نواب رفیق احمد شیرازی کو آپ نے کیوں بلایا تھا؟ سارے معزز لوگ ہی تھے وہاں۔"

میں نے کہا۔ "مگر اب یہ دعوت نامہ کہاں سے ملے گا۔"

اس نے کہا۔ "اس کی تو فکر نہ کر...... آ میرے ساتھ...... اچھا ٹھہر...... میں لے کر آتا ہوں۔"

وہ گیا اور چند منٹ بعد لوٹا تو اس کے پاس ایک بہت خوب صورت اور بیش قیمت دعوت نامہ تھا...... اس پر کسی کا نام نہیں لکھا ہوا تھا...... اس نے میرے سامنے اس پر میرا نام لکھ دیا اور مجھے تھما دیا...... "دراصل جج صاحب نے مجھے کچھ بلینک کارڈ دیے تھے کہ بار کونسل کے جو سینئر ممبر رہ گئے ہیں انہیں خود دے دوں...... انہی میں ایک کارڈ میرے لیے تھا...... جج صاحب نے کہا کہ بھئی اس پر اپنا نام خود لکھ لینا۔"

میں نے کہا۔ "لیکن...... بفرضِ محال...... مجھ سے پوچھا گیا کہ وہاں آپ کی موجودگی کا گواہ کون ہے؟"

"یار وکیلوں کو گواہی کا مسئلہ نہیں ہوتا...... چل تیری بھابی پکار رہی ہے ناشتے کے لیے...... کارڈ سنبھال کے رکھ...... ویسے تو چاہے تو ایک اور بندوبست بھی ہو سکتا ہے۔"

"وہ کیا؟" میں نے کہا۔

"ابھی صبح کا وقت ہے کسی تھانے میں بند کرایا جا سکتا تھا تجھے...... صرف دس ہزار میں تیرے خلاف کوئی بے ضرر سا پرچا درج ہو جائے گا...... کسی بے وقوف گشتی پارٹی نے تجھے پکڑا اور لا کے حوالات میں بند کر دیا...... یہ تو ہو جاتا ہے اگر کسی کو بچانا مقصود ہو...... کسی چھوٹے موٹے جرم سے۔ کسی تھانے سے معلوم کرنا پڑے گا کہ کس کے روزنامچے میں گنجائش ہے...... صبح سے ابھی تک نیا کوئی اندراج نہیں ہوا...... پھر ہو گی پیسوں کی بات۔"

میں نے کہا۔ "بات پیسوں کی نہیں...... کون سا راستہ محفوظ ہے؟"

"تو دونوں طرح محفوظ ہے نیکے پتر...... غم نہ کر یار جب ہم ہیں تو پھر کیسا غم جو تیرا جی چاہے کر...... نہ ہم تجھے پھانسی چڑھنے دیں گے...... نہ جیل جانے دیں گے...... گارنٹی ہے اپنی۔"

"پھر میں یہ دعوت نامہ ہی قبول کر لیتا ہوں۔"

اس دن وکیل پولیس کی کسی زیادتی کے خلاف احتجاج کر رہے تھے چنانچہ کورٹس میں کام معطل تھا۔ ناشتے کے بعد میں اور فاروقی اس کے آفس میں بیٹھ کے دوسرے معاملات ڈسکس کرتے رہے...... صوفی چچا مرحوم کا معاملہ ایسا تھا کہ ہم پولیس کے خلاف کیس کر سکتے تھے مگر فاروقی اس کے حق میں نہیں تھا۔

"یہ تو ثابت ہو گیا کہ صوفی چچا کو زہر دیا گیا تھا۔ مگر زہر کس نے دیا...... یہ کیسے معلوم ہو گا......" فاروقی نے کہا۔ "تھانیدار کا تو اس میں بال بیکا نہیں ہوتا...... زیادہ سے زیادہ حوالات کے باہر پہرے پر مامور کوئی کانسٹیبل غفلت کے الزام میں معطل ہو جائے گا...... ہاں تھانیدار کو ہر پیشی بھگتنے کے لیے جانا پڑے گا...... وہ بھی کئی سمن خالی دے گا...... جب ناقابلِ ضمانت وارنٹ کی نوبت آئے گی تو ایک حاضری لگا دے گا عدالت میں بھی...... اس سے بہتر ہے تو کیس کے بدلے کیس کا سودا کر لے۔"

"کون سے کیس کا سودا؟"

"دیکھ تیرے گھر میں آگ لگی...... یا لگائی گئی...... صرف آگ لگنے کا معاملہ ہوتا تو کیس ہی نہ بنتا لیکن وہاں سے برآمد ہوئی ایک ناقابلِ شناخت جلی ہوئی لاش...... وہ لاش کس کی تھی؟ یہ کیس چلا تو مالک مکان یعنی آپ کے والد صاحب کو جواب دینے کے لیے بلایا جائے گا...... تو یہ کیس ختم کرا سکتا ہے...... یہاں کے معاملات کو طول دینے سے محض وقت ضائع ہو گا اور تو ڈسٹرب رہے گا وہاں رہ کے دل جمعی سے اپنا کام کر......"

"میں تیری رائے سے سو فیصد اتفاق کرتا ہوں...... لیکن تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے...... اگر میں کمبل کو چھوڑ دوں مگر کمبل مجھے نہ چھوڑے...... پھر؟ میرے گھر میں آگ خود بہ خود نہیں لگی تھی...... لگوائی گئی تھی...... کیا مقصد تھا اس کا...... مجھے ہراساں کرنا یا اس کے علاوہ بھی کچھ......؟ ظاہر ہے یہ مالی نقصان میرے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا میرے والدین کے لیے ایک جذباتی سانحہ ضرور ہوگا...... لیکن کیا میں ایسا سوچنے میں حق بہ جانب نہیں ہوں کہ آگ لگانے کا مقصد گھر کو نہیں گھر والوں کو جلا کے خاک کرنا تھا۔"

"ایسا بالکل ممکن ہے۔"

"تو کیا میرے خاموش ہو جانے سے وہ بھی چپ بیٹھنے پر تیار ہوں گے؟ میرا خیال ہے نہیں۔"

"ایک کوشش کر کے دیکھ لیتے ہیں کیا حرج ہے۔"

"ابھی تو یہ معلوم نہیں کہ آگ لگانے والا کون تھا...... کس نے اسے مرنے کے لیے وہاں بھیجا تھا۔"

"اس معاملے میں مجھے پولیس کی تھیوری سے اتفاق ہے۔ وہ ایسے ہی مارا گیا...... کوئی چور آوارہ گرد جو گھر میں گھس آیا کوئی ہیروئنچی جو خالی گھر میں رات گزارنے لیٹ گیا...... ابھی تک اس کا کوئی والی وارث سامنے نہیں آیا...... پوسٹ مارٹم کی خانہ پری کے بعد لاوارث قرار دے کر اسے کہیں گاڑ دیا گیا ہوگا...... آگ لگانے والا اپنا کام کر کے نکل گیا۔"

"تو اس کے مشن کی ناکامی کے بعد کیا دوسرے پلان پر عمل نہیں ہوگا...... اگر یہ کام تھا تنظیم کا تو اب نہ غلام محمد ہے...... نہ شہاب الدین......"

"لیکن مجیب الرحمٰن عرف چیف صاحب ہے۔"

"میرا خیال ہے اب اسے خود کو بچانے کی زیادہ فکر ہے...... یہاں سے تو اس کا بوریا بستر گول ہو گیا...... اس کے نام لیوا مارے گئے بھاگ گئے یا دشمنوں سے مل گئے...... لیکن یہاں میرے دو طاقتور دشمن ہیں جن کو میری موت راس آتی ہے میری زندگی ان کی نظر میں کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے۔"

"تیرا میں بھی ہوں ٹیکے پتر......" فاروقی بولا۔

میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "پہلا ہے میرا پرانا دشمن سلطان...... دوسرا ہے اکبر خان...... میں نہ رہوں تو فریال تک پہنچنے میں اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہتی وہ احمق یہ نہیں سمجھ سکتا کہ فریال اسے کبھی نہیں مل سکتی...... ایک فلمی ڈائیلاگ پیش کرتا ہوں...... ہمارا جنم مرن کا ساتھ ہے۔"

"یعنی آپ کو دنیا سے رخصت نہ کیا گیا تو وہ خود خودکشی اختیار کر لے گی؟...... بے شک عشقِ صادق کی کہانیوں میں ایسا ہوتا آیا ہے...... لیکن مجھے شک ہے کہ صورتِ حال اس کے برعکس ہو جائے...... آپ بھی خودکشی فرما لیں گے۔"

میں نے کہا۔ "یہ وقت بتائے گا...... میرا دوسرا جانی دشمن ہے اکبر خان...... میں نہ رہوں تو ست بدھائی کی وارث بنتی ہے رابعہ...... اور میرے مقابلے میں اس سے دباؤ کے ذریعے ہر بات منوانا ان کے لیے بہت آسان ہو جاتا ہے...... یہ دونوں دشمن ایک گھر جلا کے چین سے بیٹھنے والے نہیں ہیں۔"

"دیکھ ٹیکے پتر...... یہ دنیا جیو اور جینے دو کے اصول پر چلے تو سب کا فائدہ ہے...... کچھ دو اور کچھ لو...... آگے بڑھنے کے لیے مصالحت سے تو کام لینا پڑے گا۔"

"مصالحت اور منافقت میں فرق ہے۔"

"ہے بھی...... اور نہیں بھی...... اپنی اپنی سوچ اور سمجھ کی بات ہے۔"

"فریال پر کمپرومائز کیسے ممکن ہے...... یہ فرمائیے...... میں اور سلطان اسے کیسے شیئر کریں...... جیسے سندھ طاس معاہدے کے تحت انڈیا پاکستان دریا کا پانی شیئر کرتے ہیں؟ ٹاس کر لیں شرافت سے یا آمنے سامنے ڈوئل لڑیں...... یا ہم نہیں یا تم نہیں...... فریال اس کی جو بچ جائے۔"

"میری مراد اکبر خان سے تھی...... جواب رانا کا حلیف ہو گیا ہے...... ان سے محاذ آرائی ختم کرنے کا راستہ نکالا جا سکتا ہے۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "ابھی تو میں پکڑتا ہوں گھر کا راستہ۔ فریال تمہارے ساتھ آئی تھی...... وہ تمہارے ساتھ ہی واپس جائے گی۔"

"اس سچ کو تسلیم کیے بنا چارہ نہیں...... لیکن تجھے کس بات کی جلدی ہے...... آج مجھے بھی فراغت ہے...... آرام سے بیٹھ کے گپ لگائیں گے یا چلیں گے کہیں پکنک منانے۔"

میں نے کہا۔ "میں اپنے گھر تو خیریت کی اطلاع دے دوں۔"

پہلے میری بات راجا سے ہوئی۔ اسے تفصیل بتانے کا موقع نہ تھا...... میں نے اس سے کہا کہ وہ معلوم کرے گزشتہ رات کہیں پولیس مقابلہ ہوا تھا...... اگر ہوا تھا تو اس میں کتنے ڈاکو مارے گئے اور کتنے پولیس والے...... اس دن فاروقی نے بھی اپنے ذرائع سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی

مگر کوئی کامیابی نہیں ہوئی...... پولیس کے قابلِ اعتماد ذرائع نے بھی لاعلمی ظاہر کی...... اگر کوئی آپریشن پلان کیا جاتا تو بات چھپی نہ رہتی۔

پہلی کامیابی شام کے وقت راجا کو ہوئی۔ دریائے چناب کے اوپری حصے میں گجرات سے اسی کلو میٹر دور ایک گاؤں جات سڑل کے قریب دیہاتیوں نے چار پولیس والوں کی لاشیں دریافت کر کے قریبی تھانے والوں کو مطلع کیا۔ انہوں نے وہاں سے ایک جیپ بھی برآمد کی جو جھاڑیوں میں چھپائی گئی تھی...... تازہ ترین اطلاعات کے مطابق مرنے والے پولیس کی وردی میں ضرور تھے مگر پولیس مین نہیں تھے...... ان کے پاس سے کوئی شناختی کارڈ نہیں ملا...... انہوں نے کوئی پولیس بیلٹ نہیں باندھ رکھی تھی جس پر ایک نمبر ہوتا ہے...... جیپ پر لگی ہوئی نمبر پلیٹ بھی جعلی ثابت ہوئی...... بہ ظاہر یہ دو مخالف گروہوں کی لڑائی تھی...... وہ ڈاکو تھے یا کوئی اور...... مزید تفتیش کے بعد ہی معلوم ہوگا۔

اس سے میرے شکوک کی تصدیق ہو گئی...... پولیس کی وردی پہن کے کچھ لوگوں کو محض اس لیے بھیجا گیا تھا کہ وہ غلام محمد کے ساتھ شہاب الدین کو اور مجھے ٹھکانے لگا دیں...... غالباً ان کو اس بات سے بے خبر رکھا گیا تھا کہ وہاں وہ خود بھی ڈاکوؤں کے گروہ کی گولیوں کا نشانہ بن سکتے ہیں۔ شاید عمداً ایسا کیا گیا تا کہ کوئی نہ بچے...... نہ قاتل نہ مقتول...... نہ گواہ نہ ثبوت...... ایسی پلاننگ صرف چیف ہی کر سکتا تھا۔

اس خبر نے مجھے خاصا پُرسکون کیا۔ فاروقی نے ایک ڈپلومیسی یہ دکھائی کہ اس رات انسپکٹر رحمدل خان کو بلا لیا۔ ہم ایک بڑے ہوٹل میں کھانے کی میز پر ملے...... فاروقی اپنے پلان کے مطابق معاملات کو ختم کرانا چاہتا تھا...... کل کی باتوں پر مٹی ڈالو...... صوفی چچا کیسے مرے کیوں مرے...... اب کیا فرق پڑتا ہے...... کوئی نامعلوم شخص میرے گھر کی آگ میں جل مرا...... اللہ دونوں کو غریقِ رحمت کرے...... دونوں کی پوسٹ مارٹم رپورٹوں کی اب کیا اہمیت ہے۔

تاہم تھانیدار میری توقع سے زیادہ چالاک ثابت ہوا...... اسے مجھ سے نئے ماڈل کی بلیک کرولا نہ ملنے کا سخت صدمہ تھا...... اس نے بڑی عیاری سے کہا۔ "نواب صاحب...... یہ اتنا آسان نہیں ہے میرے لیے...... ایف آئی آر کیسے ختم ہو سکتی ہے...... آپ دیکھو چار سال پرانی ایف آئی آر نے بھٹو صاحب کو پھانسی کے تختے پر پہنچا دیا تھا۔"

"وہ ایک سیاسی معاملہ تھا...... بعض لوگوں کے نزدیک جوڈیشل مرڈر۔" فاروقی نے کہا۔

"وکیل صاحب...... جو بندہ جل کے مر گیا...... بے شک اس کا والی وارث کوئی نہیں...... ابھی تک مدعی سامنے نہیں آیا لیکن مدعا علیہ تو ہیں...... ابھی تک ہم نے ان کے والد صاحب کو زحمت نہیں دی۔ ان کا بیان بھی نہیں لیا ایک بار تو انہیں عدالت میں حاضر ہونا ہی پڑے گا۔"

فاروقی نے کہا۔ "چھوڑ دیار...... تم نے ابھی تک چالان کہاں پیش کیا ہے...... سیکڑوں قتل کی فائلیں ہر سال کولڈ اسٹوریج میں چلی جاتی ہیں۔

اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ "دوسرا معاملہ صوفی صاحب کا ہے تو اس میں جو پوسٹ مارٹم رپورٹ آپ نے لی ہے...... اس کی قانونی حیثیت تو کچھ بھی نہیں۔"

میں نے کہا۔ "وہ سرکاری اسپتال کی رپورٹ ہے اور اس میں صاف لکھا ہے کہ موت زہر خورانی کا نتیجہ ہے...... کس نے زہر دیا انہیں حوالات میں؟"

"یہ بھی تفتیش میں سامنے آ سکتا ہے...... مگر میں بات کر رہا تھا قانونی پوزیشن کی...... آپ نے الٹا راستہ اختیار کیا...... طریقہ یہ ہے کہ پہلے آپ رپورٹ لکھواتے...... اپنے

شک کا اظہار کرتے...... پھر عدالت سے درخواست کرتے کہ میرے چچا کا پوسٹ مارٹم کرایا جائے...... عدالت کے حکم پر یہ کام ہوتا...... عدالت حکم دیتی تو قبر کھود کے لاش نکالی جاتی...... مگر آپ نے تو خود ہی یہ کام کرلیا...... فاتنٹ...... دفن کرنے سے پہلے ہی...... ایسے تو ہر شخص اپنی مرضی کی رپورٹ لے کر آجائے گا...... کسی کے خلاف بھی۔"

میں نے کہا۔ "دیکھو...... تمہاری بیوی کو نئے ماڈل کی بلیک کرولا پسند ہے نا...... فی الحال یہ تحفہ اسے میری طرف سے ملنے کا کوئی چانس نہیں رہا۔"

وہ ہنسنے لگا۔ "نواب صاحب...... آپ میرے جیسے غریب تھانیدار کی تھوڑی بہت مدد ضرور فرما سکتے ہیں۔"

تھوڑی بہت کا معاملہ آدھی قیمت سے شروع ہو کے ایک تہائی پر ختم ہوا...... سودے بازی میں تھانیدار ہم سے بہت آگے تھا...... فاروقی نے اس وقت تو چار لاکھ دے کر ہی گلوخلاصی کا سودا کرنے سے انکار کر دیا تھا مگر بعد میں خود میرے کہنے سے بات بگڑتے بگڑتے بن گئی...... فاروقی نے اسے بہت گالیاں دیں کہ بدمعاش دیکھو...... ایک معمولی تھانیدار کتنی ڈھٹائی سے میرے جیسے نامور وکیل کے سامنے بیٹھ کے چار لاکھ وصول کر لیتا ہے...... سرکار نے بنا رکھا ہے محکمہ انسداد رشوت ستانی...... اینٹی کرپشن...... احتساب بیورو...... مولوی صاحب لاؤڈ اسپیکر پر چلاتے رہتے ہیں کہ رشوت لینے والا اور دینے والا دونوں جہنمی...... یار آخر جنت میں جانے والے کتنے ہوں گے؟"

صبح میں ست بدھائی روانہ ہوا تو خاصا پُرسکون تھا۔ جو خبر مجھے راجا سے ملی تھی وہ چند اخبارات میں بھی شائع ہوگئی تھی...... بظاہر اس کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی تھی لیکن "تفتیش جاری ہے...... مزید سنسنی خیز انکشافات کی توقع ہے۔" سب کا اختتامی جملہ تھا...... لیلیٰ بھابی نے بتا دیا تھا کہ آج نہیں تو کل وہ بھی واپس آجائیں گی...... اب ان کا دل یہاں نہیں لگ رہا تھا...... ست بدھائی میں ان کو مصروفیت مل گئی تھی...... یہاں وہ بیکاری کی بیزاری سے عاجز تھیں۔

ابھی میں راستے میں ہی تھا کہ مجھے راجا کا فون موصول ہوا۔ "تو کہاں ہے اس وقت؟"

میں نے کہا۔ "راستے میں ہوں۔"

"میں نے فاروقی کے گھر فون کیا تھا اس نے بتایا کہ تو نکل گیا ہے۔"

"یہ کس نمبر سے بات کر رہا ہے تو؟"

وہ بولا۔ "یہاں ٹیلے جوگیاں سے ایک پی سی او سے۔"

"کیوں...... ہمارے سیٹلائٹ فون کیا ہوئے؟"

"پتا نہیں مواصلاتی رابطے کا بریک ڈاؤن ہے...... کوئی فنی خرابی ہوگئی کہ فون کام نہیں کر رہے ہیں۔"

"سب خیریت ہے نا...... ٹیلے جوگیاں آ کے فون کرنے کی کیا ضرورت پیش آگئی تجھے؟"

"وہ بس اباجی کو پریشانی تھی کہ پوچھو رفیق کہاں ہے؟"

میں نے کہا۔ "کل رات ہی تو میری بات ہوئی تھی ان سے۔" میں نے کہا۔

"ہاں...... فریال کیا تیرے ساتھ ہے؟"

میں نے کہا۔ "نہیں...... وہ شاید کل آئے گی...... کیا اباجی کو شک ہوگیا تھا فاروقی کے گھر سے تو کسی نے کچھ نہیں کہہ دیا۔"

"نہیں یار تو آجا پھر بات کریں گے۔" اس نے فون بند کر دیا۔

اس وقت تک میں جی ٹی روڈ پر تھا اور میرا موبائل بھی کام کر رہا تھا۔ موڑ کاٹنے کے بعد سگنل غائب ہوگیا اور کوشش کے باوجود میرا راجا سے پھر رابطہ نہ ہوا...... یہ بات مجھے کھٹک رہی تھی کہ صرف میری خیریت پوچھنے کے لیے راجا نے ٹیلے جوگیاں کے پی سی او سے بات کی؟ صرف یہ پوچھنے کے لیے کہ میں کہاں ہوں حالانکہ فاروقی کے گھر سے اسے بتا دیا گیا تھا کہ میں روانہ ہوگیا ہوں۔

ڈیڑھ گھنٹے بعد جب میں اپنی حویلی کے پھاٹک سے گزرا اس وقت تک سب نارمل تھا...... مجھے سنتری نے سلیوٹ کیا اور میری گاڑی گزار کے پھاٹک دوبارہ بند کر دیا۔ احاطے میں خلافِ معمول ویرانی اور خاموشی تھی۔ حویلی میں نارمل چہل پہل نظر نہ آنا کوئی چوکنا کرنے والی بات نہ تھی...... اس وقت سب ہی لوگ اپنے اپنے کام میں مصروف ہوتے تھے۔

گاڑی کی آواز پر راجا سب سے پہلے باہر آیا۔ وہ میرے انتظار میں تھا اور شاید باہر ملتا تو مجھے روک لیتا لیکن کسی وجہ سے وہ اندر گیا اور اسے یہ موقع نہیں ملا...... وہ شہناز سے بات کر رہا تھا اور خود راجا کے چہرے سے اتنی تشویش یا پریشانی ظاہر نہیں ہو رہی تھی جتنی شہناز کی صورت پر عیاں تھی...... پھر یہ ہوا کہ اباجی کے کمرے سے ریشم برآمد ہوئی۔ اس کے وجود میں پارے کی طرح بے چینی بھری ہوئی تھی...... وہ چلتے ہوئے بھی شوخی سے ڈانس کرتی نظر آتی تھی اور بات بے بات مسکراتی رہتی تھی...... وہ بھی خاموشی سے سلام کر کے

میرے پاس سے گزر گئی تو میرا شک یقین میں بدل گیا۔

میں نے کہا۔ "راجا...... کیا ہوا ہے یہاں...... سب کی شکلیں کیوں اتری ہوئی ہیں؟"

راجا نے گھبرا کے اباجی کے کمرے کی طرف دیکھا۔ "بتاتا ہوں یار۔"

میں نے برہمی سے کہا۔ "جھوٹ بولا تھا تو نے مجھ سے کہ سب خیریت ہے۔"

میرا اتنا کہنا ہی کافی ہوا...... اباجی نے میری آواز سنی اور دروازے میں نمودار ہوئے...... "آگئے تم رفیق میاں...... آؤ ہم بتاتے ہیں تمہیں سارا ماجرا کہ یہاں کیا تماشا ہوا۔"

راجا نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ اس سے معمولی سی کوتاہی ہوئی تھی ورنہ وہ مجھے باہر روک کے بریف کر دیتا...... غالباً اس کی ذمے دار ڈاکٹر شہناز تھی جس نے اسے اندر بلایا کیونکہ اب وہ اسے غصے سے گھور رہا تھا...... میں اباجی کے پیچھے اندر گیا تو اماں کے ہاتھ میں تسبیح تھی۔ اس کے دانے ایک تواتر کے ساتھ گر رہے تھے مگر خود ان کی نظر دیوار کو دیکھ رہی تھی۔

پریشانی اور فکرمندی اباجی کے چہرے سے عیاں تھی...... میں ان کے پاس بیٹھ گیا۔ "اب جلدی سے مجھے بتا دیں اپنی پریشانی کی وجہ۔"

اماں کی نظر گھوم کے مجھ پر ٹھہر گئی۔ "ٹھہرو جی...... پہلے اس سے پوچھ لو کہ وجہ معلوم ہونے کے بعد یہ کچھ کرے گا...... ورنہ کیا فائدہ۔"

ابا نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روکا۔ "رفیق میاں...... صبح کچھ لوگ آئے تھے ایک گاڑی میں۔"

"کون لوگ؟" میں نے کہا۔

"وہ گاڑی تھی بالکل تمہاری گاڑی جیسی...... اس پر نمبر تک وہی تھا...... گارڈ نے دور سے گاڑی دیکھ کے گیٹ کھول دیا...... سلیوٹ بھی کیا بے چارے نے...... گاڑی اندر آگئی...... اس میں پانچ افراد تھے...... سب مسلح...... وہ سیدھے اندر گھس آئے...... ہر طرف پھیل گئے...... ان کے ہاتھوں میں بڑی خطرناک قسم کی چیزیں تھیں...... میں تو پہچانتا بھی نہیں آج کل کے اسلحے کو...... راجا نے بعد میں بتایا کہ ان کے پاس ریپیٹر "REPEATOR" تھے۔"

"آخر وہ کون لوگ تھے...... کیا چاہتے تھے؟" میں نے کہا۔

راجا نے میرے پیچھے سے کہا۔ "پہلے پوری بات سن لو اباجی کی......" اب میں نے دیکھا تو راجا کے پیچھے شہناز تھی...... اس کے ساتھ رابعہ......

"رفیق میاں...... ان سب نے ایک جیسے کپڑے پہن رکھے تھے اور چہروں پر نقاب چڑھا رکھے تھے...... میں سمجھا ڈاکو ہوں گے...... میں نے کہا کہ دیکھو تمہیں جو چاہیے بتا دو...... یا خود لے لو...... ان میں سے ایک نے کہا کہ ہمیں صرف ایک چیز چاہیے...... وہ ہم تلاش کریں گے...... بس تم چپ بیٹھے رہو...... انہوں نے دوسرے کمروں میں جا کے سب کو قابو کرلیا...... سب سے اسلحہ رکھوالیا...... وہ ہر کمرے میں گئے...... اوپر نیچے...... کوئی جگہ نہیں چھوڑی...... ہمارے دونوں فون انہوں نے زمین پر مار کے توڑ دیے۔"

میں نے کہا۔ "انہوں نے کسی کو نہیں بتایا کہ انہیں کس چیز کی تلاش تھی؟"

"بتایا بیٹے۔" اماں نے تلخی سے کہا۔ "ہمیں تو نہیں بتایا...... باہر سے کمرے کی کنڈی لگا دی۔"

"میں بتا رہا ہوں نا۔" ابا نے چڑ کے کہا۔ "ہمارے ساتھ انہوں نے کوئی بدتمیزی نہیں کی...... یہ کہا کہ بزرگو...... ہم آپ کو نقصان پہنچانا نہیں چاہتے۔ بس آپ ادھر ہی بیٹھے رہو جب تک کوئی خود باہر سے دروازہ نہ کھولے...... ایک گھنٹے میں انہوں نے سرونٹ کوارٹر تک دیکھ لیے...... مار پیٹ کسی کے ساتھ نہیں کی۔ گارڈز سے بھی انہوں نے اسلحہ لے لیا اور ان سب کو ایک کمرے میں بند کر دیا...... جب وہ چلے گئے تو رابعہ نے کنڈی کھولی اور ہمیں بتایا کہ وہ فریال کو پوچھ رہے تھے۔"

میرے ہاتھوں میں جیسے بم پھٹ گیا۔ "فریال کو......"

"ہاں...... وہ ہماری بہو کو لے جانا چاہتے تھے اپنے ساتھ۔" اماں نے تلخی سے کہا۔ "ہماری ہونے والی بہو کو...... جس کی اتنی تعریف کرتے تھے تمہارے ابا۔"

"تم بھی حد کرتی ہو...... فریال کا اس میں کیا قصور......؟"

"اور کس کا قصور ہے پھر......" اماں سخت ناراض تھیں۔ "اسی کا پھیلایا ہوا تو سب چکر ہے...... کئی سال سے ایک ساتھ دو کو بے وقوف بنا رہی ہے...... ایک سے منگنی رچائی...... شادی کے لیے دوسرے کو پھانس لیا...... ایک وڈیرا تھا دوسرا نواب مل گیا۔"

ابا نے چڑ کے کہا۔ "خاموش ہو جاؤ...... جو منہ میں آتا ہے بولتی چلی جاتی ہو۔"

میں نے بہتر سمجھا کہ صورتِ حال کی پوری رپورٹ راجا

سے لوں اماں کے مخالفانہ جذبات بھڑک اٹھے تھے اور فریال کا جرم اچانک پھر نا قابل معافی ہو گیا تھا...... وہ پھر نا قابل قبول ہو گئی تھی۔

میں نے کہا۔ ''آپ لوگ آپس میں نہ لڑیں...... میں راجا سے پوچھ لیتا ہوں۔''

راجا خود یہی چاہتا تھا۔ شہناز کے علاوہ رابعہ اماں اور ابا کو سنبھالنے کے لیے موجود تھی...... ہم باہر کے برآمدے میں کرسیاں ڈال کے بیٹھ گئے۔

''راجا خود صفدر سلطان آیا تھا یہاں...... یا اس کے غنڈے تھے؟'' میں نے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ صفدر سلطان بھی ان میں شامل تھا...... ان کو جو حکم جاری کر رہا تھا وہ سلطان ہو سکتا تھا...... لیکن سب کے چہروں پر ایک سے نقاب تھے...... قد و قامت بھی برابر تھے...... شناخت کا کوئی ذریعہ نہیں تھا...... انہوں نے سب سے ایک ہی سوال کیا...... فریال کہاں ہے؟ شہناز، رابعہ اور ریشم تو سب جانتی ہیں...... فرخ کو بھی سب پتا ہے اور غنی کو بھی...... ان سب نے کہا کہ وہ یہاں کبھی نہیں آئیں...... لیکن خوش قسمتی سے ریشم کی ماں فاطمہ کو موقع مل گیا...... وہ کچن میں سے نکل گئی...... اس نے سرونٹ کوارٹر میں جا کے ہر ایک کو کہہ دیا کہ نواب صاحب کے کچھ دشمن فریال بی بی کو اغوا کرنے آئے ہیں۔ خبردار جو کسی نے کہا کہ وہ یہاں رہتی ہیں اور وکیل صاحب کے ساتھ گئی ہیں...... ایک ہی بات کہنی ہے سب کو...... یہاں کوئی فریال نام کی عورت کبھی نہیں آئی...... جب وہ لوگ سرونٹ کوارٹر میں پہنچے تو انہوں نے باری باری ہر ایک سے سوال کیا...... فریال کا حلیہ بتایا...... اس کی تصویر دکھائی...... کہ غور سے دیکھو...... سب اپنی بات پر قائم رہے کہ اسے یہاں کسی نے نہیں دیکھا...... وہ سختی کرتے تو پتا نہیں کیا ہوتا لیکن سرونٹ کوارٹر میں رہنے والوں کا رویہ ایسا تھا کہ انہیں شک نہیں ہوا...... اس کے علاوہ کوئی ایسی بات تھی کہ وہ جلدی میں تھے...... ایک گھنٹے میں تلاشی لے کر وہ چلے گئے...... جاتے ہوئے ہر چیز ساتھ لے گئے...... سب کا اسلحہ...... فون جو ناکارہ ہو گئے تھے۔''

میں نے کہا۔ ''کیا انہوں نے تجھے نہیں پہچانا؟''

''ایک نے کہا کہ راجا صاحب...... اس کی خبر دینا چاہو تو ضرور دے دینا۔''

''وہ ضرور خود صفدر سلطان ہو گا۔''

''کیا پتا...... وہ بیوی کے قتل میں ملوث ہونے کے بعد گرفتاری کے خوف سے بھاگ گیا تھا...... اس کا سالا امریکن نیشنل ہے...... وہ اپنی بہن کا بدلہ لینے واپس امریکا نہیں گیا...... اس کے پیچھے لگا ہوا ہے ان حالات میں سلطان یہاں آنے کا رسک نہیں لے سکتا۔''

''وہ مختلف ناموں کے شناختی کارڈ اور پاسپورٹ استعمال کر سکتا ہے...... اس کا پیسا چلتا ہے اور بدمعاشی چلتی ہے۔ کیا اس نے مجھے نہیں پوچھا؟''

''پوچھا تھا...... میرا خیال ہے تو مل جاتا تو وہ تجھے ساتھ لے جاتے...... میں نے بھی وہی کہا جو سب نے کہا...... وہ بیرسٹر فاروقی کے ساتھ لاہور میں ہیں اور کوئی بات تھی کہ وہ رکے نہیں...... مجھے تو پریشانی سے جلاب لگ گئے تھے کہ کہیں شامت اعمال سے تو فریال کے ساتھ نمودار نہ ہو جائے کیا تجھے راستے میں ایسی کوئی کار نظر نہیں آئی...... اپنے جیسی۔''

میں نے کہا۔ ''نہیں...... شاید وہ نکل گئے تھے جب میں دینہ والی سڑک پر آیا...... ورنہ ناممکن تھا کہ آمنا سامنا نہ ہوتا۔''

''اب فکر کر فریال کی...... میں نے فون پر فاروقی کو خبردار کر دیا تھا اور اس نے کہا تھا کہ وہ فریال کو ابھی دوسری جگہ پہنچا دیتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''یہ تیسری بار ہے کہ فریال اتفاق سے بچ گئی...... کل اس نے میرے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا...... بالکل اچانک...... اور میں نے بھی مان لی اس کی بات...... ہم جھوٹ بول کے نکل گئے۔''

''سب سے بڑی بات یہ کہ انہوں نے اماں ابا کے سامنے نہیں کہا کہ وہ فریال کو تلاش کر رہے ہیں...... اگر ان سے پوچھتے تو سب چوپٹ ہو جاتا...... ظاہر ہے اماں سب سے پہلے بتاتیں...... ابا جی بھی کیوں چھپاتے...... وہ سچ بتا دیتے کہ فریال کہاں ہے...... انہوں نے کچھ عمر کا لحاظ کیا...... یہ سوچا کہ دوسروں سے پتا چل ہی جائے گا۔''

''انہوں نے مان لیا تھا کہ فریال یہاں کبھی نہیں آئی۔''

''مان ہی لیا ہو گا...... ورنہ سختی سے پوچھ گچھ کرتے...... شاید انہیں پہلے ہی یقین نہیں تھا کہ فریال یہاں ہے...... دوبار انہیں رپورٹ مل چکی تھی کہ وہ نہیں ہے...... شاید اسی لیے وہ چلے گئے...... جاتے وقت مجھ سے کہا...... اسی نے جس پر مجھے شک ہے کہ صفدر سلطان ہو گا کہ نواب صاحب سے کہہ دینا کہ کچھ بوڑھے ماں باپ کا خیال کریں...... لڑکی فریال سے اچھی اور مل جائے گی...... ماں باپ نہیں ملیں گے...... ان سے بھی کہنا بیٹے کے لیے کوئی اور دیکھ لیں...... ضد کا انجام اچھا نہیں ہو گا۔''

کچھ دیر خاموشی رہی...... راجا کے اور میرے ذہن میں ایک ہی بات تھی...... فریال کا مستقبل کیا ہو گا...... وہ یہاں کیسے آئے گی...... کیسے رہے گی...... فی الحال اس رشتے کا امکان صفر فیصد بھی نہیں رہا تھا جس کے لیے میں نے دادی کو بنایا تھا اور دادی نے میرے ابا کو راضی کر لیا تھا تو اماں بھی زبان کو قبول کرنے پر مجبور ہو گئی تھیں...... فریال کے بارے میں ابا اماں کے جو خوشگوار تاثرات تھے ان کی کوئی حیثیت نہیں رہی تھی...... اپنی تمام خوبیوں کے باوجود جس کا ابا نے اعتراف کیا تھا وہ متنازعہ ہو گئی تھی...... اس کا وجود ہم سب کے لیے پرخطر ہو گیا تھا...... اماں کے اور اس کے درمیان جنریشن گیپ پہلے ہی بہت زیادہ تھا...... اماں کے اور اس کے وقت میں فرق اپنی جگہ...... اصل فرق دونوں کی شخصیت اور مزاج میں تھا...... اماں پرانے وقتوں کی سیدھی سادی وہ گھریلو عورت تھیں جس کا باہر کی دنیا سے کبھی تعلق نہ رہا۔ تعلیم بھی انہوں نے خاندانی ماحول کے مطابق بس واجبی حاصل کی۔ آٹھویں پاس کی تو بزرگوں نے کہا کہ بس بہت ہے...... میٹرک کر کے کیا لڑکی سے نوکری کرانی ہے؟ آٹھ جماعت پاس لڑکی تعلیم یافتہ چاہے نہ سمجھی جائے جوان ضرور سمجھی جاتی تھی اور ماں باپ کی عزت کے لیے خطرہ بن کے اس وقت تک ان کی چھاتی پر سوار رہتی تھی جب تک ڈولی چڑھ کے اپنے گھر نہ چلی جائے...... ابا پڑھنے لکھنے والے مگر بیوی ان کے نزدیک بھی وہی اچھی جو گرہستن ہو...... سگھڑ...... سلیقہ شعار اور گھر ہی کو اپنی ساری دنیا سمجھنے والی...... اماں ان کے لیے ایک مثالی بیوی ثابت ہوئیں......

آج بھی فریال کی جگہ کوئی عام گھریلو لڑکی ہوتی تو اس کے بی اے ایم اے پاس ہونے اور فیشن ایبل ہونے سے اتنا فرق نہ پڑتا...... پرابلم یہ تھی کہ فریال دوسری انتہا پر تھی...... ایک ایسی لڑکی جس کا گھر گرہستی سے کبھی تعلق ہی نہیں رہا...... اس کے شوق اور مشاغل۔ دلچسپی اور مصروفیات سب گھر سے باہر کی دنیا سے نسبت رکھتے تھے اور کچھ کر دکھانے کی لگن نے فریال کو اس انتہا تک پہنچا دیا تھا جہاں نیک نامی سے زیادہ بدنامی حصے میں آتی ہے...... ماں بچپن میں ہی مر گئی تھی...... باپ اسے سنبھال نہ سکا بقول اماں...... اس کی کمائی سے عیاشی کے خواب دیکھنے لگا اور اسے بے سہارا چھوڑ دیا...... اس کے مرنے کے بعد فریال نے فلمی دنیا میں قدم رنجہ فرمایا اور پہلے ہی قدم پر سلطان کے شکنجے میں ایسی پھنسی کہ اب تک پھڑ پھڑا رہی تھی مگر نجات حاصل کرنے میں ناکام تھی...... رہی سہی کسر اس نے مجھے پھانس کے اور پھر میرے پیچھے لندن میں اکیلے رہ کے پوری کر دی...... اماں اسے کیسے قبول کر لیتیں...... یہ انتہائی مشکل تھا جتنا ایک عام آدمی کو قائل کرنا کہ کوئلہ درحقیقت ہیرا ہے۔

میری ضد...... دادی کے حکم اور شوہر کی مرضی نے ان کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا تھا کہ چلو جسے زندگی گزارنی ہے وہ خوش ہے تو کرے شادی...... کہیں دل میں ان کے وہ یقین برقرار ہو گا کہ یہ فیصلہ غلط ہے...... اس لڑکی نے میری مت مار دی ہے اور شادی کے بعد عشق کا بھوت اترے گا تو میں سر پر ہاتھ رکھ کے رونے کے سوا کچھ نہ کر پاؤں گا...... مگر اس وقت ہم بھی کہاں ہوں گے کہ کچھ کریں گے۔

چھ برس بعد ایک امید پیدا ہوئی تھی کہ فریال بہو بن کے حویلی میں آ جائے گی وہ چھ دن بھی نہ رہی...... دادی خلد آشیانی کی روح کو بھی دکھ ہو گا کہ لاڈلا پھر دکھی ہے اور وہ اس کی مدد کے لیے دنیا میں موجود نہیں...... مجھے بعض اوقات اپنا اکلوتا ہونا خوش نصیبی سے زیادہ بدنصیبی کا احساس دلاتا تھا

کیونکہ اس نے مجھے زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا...... مجھ پر بہت سی ایسی ذمے داریوں کا بوجھ لاد رکھا تھا جو دوسرے بھائیوں کی موجودگی میں شیئر ہو جاتا ہے...... اگر اور بھائی ہوتے تو میں لندن سے لوٹ کر ہی کیوں آتا اور وہیں فریال سے کورٹ میرج کر کے آباد ہو جاتا...... اکلوتا بیٹا تو کچھ بھی نہیں کر سکتا...... ہر وقت ماں باپ کا خیال اس کے پاؤں کی زنجیر بنا رہتا ہے۔

اتفاق رائے سے میں نے اور راجا نے طے کیا کہ فی الحال فریال کی واپسی کو التوا میں رکھا جائے...... اس مسئلے کا حل بعد میں سوچیں گے...... فوری طور پر تو اس کو فاروقی کے گھر سے بھی زیادہ کسی محفوظ مقام پر منتقل کرنا ضروری تھا ورنہ دن میں وہی ڈراما فاروقی کے گھر میں بھی دہرایا جا سکتا تھا جو یہاں ہوا تھا...... اکیلا سکیورٹی گارڈ اتنے حملہ آوروں کو کیسے روک سکتا ہے...... کچھ دن بعد فاروقی چاہے تو پھر اس کی ذمے داری قبول کرے...... مجھے اور راجا کو گھر کے اندر کے ماحول اور انتظامی مسائل کو ٹھیک کرنے کی ضرورت کو اولیت دینی ہوگی۔

رات کو میں خاصے ڈپریشن کا شکار تھا اور خود کو سب کے درمیان بھی اکیلا محسوس کر رہا تھا...... ایسا لگتا تھا جیسے فریال بہت دور چلی گئی ہے...... کسی پہاڑ کے دوسری طرف جسے سر کرنا میرے بس کی بات نہیں...... اس کے باوجود راجا کے ساتھ مل کے میں رابعہ اور شہناز کے ساتھ گپ لگاتے رہے...... ہنسی مذاق کرتے رہے اور انہیں یقین دلاتے رہے کہ فریال چند روز میں پھر آ جائے گی اور یہ جو واقعہ صبح پیش آیا تھا یہ ایسی کوئی بڑی پریشانی کی بات بھی نہیں...... تاہم اس سے سب پہلے جیسا نہیں ہو سکتا تھا...... وہ خود میرا دل بہلانے کے لیے ایسا ہی پرامید رویہ اختیار کرنے پر مجبور تھیں...... ہم سب ایک دوسرے سے جھوٹ بول رہے تھے کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔

فون نہ رہے تو ہمارا جیسے ساری دنیا سے رابطہ ٹوٹ گیا...... موبائل فون سب کے پاس تھے لیکن بے کار تھے کیونکہ قرب و جوار میں کہیں کسی کمپنی کا ٹاور نہ تھا...... اگر دینہ سے آگے رہتاس میں ایک ٹاور نصیب ہو جاتا یا زیادہ بلندی پر ٹیلہ جوگیاں میں تو گرد و نواح کا علاقہ دس کلو میٹر کے دائرے میں کنکٹ ہو سکتا تھا...... اس کے لیے صرف خواہش کی جا سکتی تھی اور خواہش کی تکمیل کے لیے دعا۔

رات کو کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میں نے راجا کو اعتماد میں لیا۔ ''مہاراجا...... مجھے فریال سے بات کرنی ہے۔''

''کل تک صبر کر لے...... میں نے فرخ کو فوراً روانہ کر دیا تھا کہ کیش نکلوائے...... پہلے تین سیلائٹ فون لے۔''

میں نے کہا۔ ''یار یہ THORAYA والے بھی نہ ہوتے تو ہم کیا کرتے...... وائرلیس سیٹ لیے پھرتے۔''

''کچھ تو ضرور کرتے...... میں نے ٹیلہ جوگیاں میں سنا تھا کہ کوئی موبائل کمپنی ٹاور لگانے کی سائٹ کے لیے سروے کر چکی ہے۔''

میں اٹھ بیٹھا۔ ''تیرے منہ میں گھی شکر...... آج میں یہ سوچ رہا تھا مگر میرے لخت جگر...... میرے نور چشم...... فریال سے ابھی بات نہ کی تو میرا دل پھٹ جائے گا...... میرا خون ہو گا تیری گردن پر۔''

''ساری خرابی تیرے دل کی ہے...... اسے پھٹ جانے دے ٹیکے پتر ہم تجھے نیا لگوا دیں گے...... یہ دل نہیں رہے گا تو فریال کی محبت بھی نہیں رہے گی۔''

''اور جو دل میرے لگایا جائے گا اس میں بھی تو کسی کی محبت ہوگی...... اس بدبخت کا کیا ہوگا...... وہ دیوانہ ہوا کا جل کا تو اسے دیوگن مجھے مار ڈالے گا...... اس لیے میں جا رہا ہوں دوست...... فی امان اللہ۔''

وہ گھبرایا۔ ''ابے کہاں جا رہا ہے اس وقت مجنوں کے گھوڑے۔''

''مجنوں کا گھوڑا جو عشق میں دوڑنے جا رہا ہے...... براستے ٹیلہ جوگیاں وہاں کسی پی سی او پر میرے درد دل کی دوا مل جائے گی...... اماں ابا کو بہلا لینا کسی جھوٹ سے کہ کھیتوں کی طرف گیا ہے...... رفع حاجت کے لیے یہ کوئی غلط بھی نہ ہوگا...... معنی کے اعتبار سے۔''

راجا نے سر ہلایا۔ ''مگر غنی کے ساتھ جا...... تیرا ریوالور ہے نا؟''

''ایک نہیں دو ہیں میرے پاس...... ایک شامی بادشاہ نے دیا تھا...... واپس کرنا یاد نہیں رہا۔'' میں نے کہا۔

میں نے ایک ریوالور غنی کو دیا تو اس نے گلوز کمپارٹمنٹ میں رکھ دیا۔ ''میرے پاس اپنا ہے سر۔''

''کیوں تم سے کسی نے چھینا نہیں۔''

''میں ساتھ نہیں لیے پھرتا سر...... اور چھینتے تو میں ایک کی جگہ دو لے آتا...... ٹرک لے کر لنڈی کوتل سے کراچی تک ایک پھیرے میں کتنا اسلحہ اِدھر سے اُدھر آتا تھا...... آپ اندازہ نہیں کر سکتے...... اور اس میں کیا نہیں ہوتا تھا کلاشنکوف سے راکٹ لانچر تک۔

میں نے کہا۔ ''تم اتنی خطرناک اسمگلنگ کرتے تھے؟''

''نہیں سر...... میں تو بس ٹرک چلاتا تھا...... مال جس کا تھا وہ کیا لوڈ کرتا ہے...... میرا اس سے کیا سروکار......''

''کبھی پکڑے جاتے تو؟''

''کون پکڑے گا سر...... سب مالکوں کے زرخرید تھے...... آج بھی آپ حکم کریں سر...... چاروں طرف راکٹ لانچر لگا دیں۔''

میں نے ہنس کے کہا۔ ''اس کی کیا ضرورت ہے؟''

''ضرورت ہے سر...... یہ جو...... آج صبح گھس آئے تھے۔'' وہ جوش اور غصے میں گالی دے گیا۔ ''معاف کرنا سر...... ان کی ساری بدمعاشی نکل جاتی اگر ایک کلاشنکوف ہوتی۔''

''ہم کشت و خون نہیں چاہتے غنی۔''

''وہ جی...... انڈیا پاکستان میں طاقت کے توازن کی بات ہوتی ہے...... وہ بہت ضروری ہے امن کے لیے...... اُدھر ایٹم بم تو اِدھر ہمارے پاس بھی ایٹم بم...... آ کر لو مقابلہ...... کسی کی ہمت نہیں پڑتی اگر معلوم ہو کہ سامنے والے کے پاس بھی کھلونے نہیں ہیں...... اگر علاقے میں دہشت قائم نہ ہو تو سارے چڑھائی کرنے لگتے ہیں۔''

جب میں نے بعد میں غور کیا تو غنی کی طاقت کے توازن والی بات مجھے صحیح لگی۔ قانونی اور غیر قانونی کو پوچھنے والا کون ہے...... خطرناک اسلحہ ہر ایک کے پاس ہے...... سیاسی لیڈر، مذہبی لیڈر، بدمعاش سب اسلحے کی نمائش کرتے ہیں...... اسلحے کی نمائش پر پابندی کا قانون اپنی جگہ...... پولیس رات کو ادھر ادھر سے لاوارث بندے اٹھاتی پھرتی ہے تو کسی سے پڑیا برآمد کر لیتی ہے...... کسی سے اسلحہ...... معمولی ریوالور...... توپ والا گزرتا ہے تو سلام کرتے ہوئے پتلون بھی گیلی ہو جاتی ہے۔

میں نے پی سی او سے فاروقی کا نمبر ملایا تو لیلیٰ بھابی سے واسطہ پڑا۔ ''اچھا اچھا...... آپ ہیں منے میاں...... بڑے دعوے سے لائے تھے فریال کو یہاں کہ بارات آئے گی تو رخصتی ہوگی...... لیکن شریفانہ طریقے سے کوئی کام نہ آپ کو راس آتا ہے نہ اسے...... یہ اچھی محبت ہے جس کی سزا دوسروں کو مل رہی ہے۔''

میں خاموشی سے سنتا رہا...... جواب دینے یا بحث کرنے کا فائدہ کوئی نہیں تھا...... کچھ دیر دل کی بھڑاس نکالنے کے بعد ان کو شک ہوا کہ میں نے فون بند کر دیا ہے...... انہوں نے کہا۔ ''ہیلو......''

میں نے کہا۔ ''آپ بولیے...... میں ہمہ تن گوش ہوں...... آپ کی آواز میں جو شہد ہے اور ترنم ہے...... نغمگی ہے اور مٹھاس ہے......''

وہ ہنسنے لگی...... ''بہت چالاک ہو دیور جی...... لیکن اس وقت میں تمہاری مدد نہیں کر سکتی...... میرے میاں نے کہا ہے کہ پہلے اس کو سو پیاز اور سو جوتے کھانے ہوں گے۔''

میں نے کہا۔ ''پیاز کی بوری اور جوتوں کا کارٹن روانہ کر دیں...... میں خود کھا لوں گا صبح دوپہر شام۔''

''ایک بات اور سن لو...... وہ بھی آتش فشاں بنی ہوئی ہے...... میری ایک سہیلی کے گھر میں ہے...... ایسی بے نقط سنائے گی تمہیں کہ بس۔''

''کیوں؟ میں نے کیا کیا ہے بھابی؟''

''نمبر لکھ لو...... وہ خود تمہیں بتا دے گی کہ تمہارا قصور کیا ہے۔''

فریال کو یقیناً میرے فون کا بے چینی سے انتظار تھا۔ فرصت مل گئی جناب کو...... سارا دن گزر گیا تو......'' وہ خفگی سے بولی۔

میں نے کہا۔ ''دیکھو...... میں ست بدھائی سے ٹیلے جوگیاں آیا ہوں اتنی رات کو...... سارا دن سب کی سنتا رہا ہوں...... تم سیدھے منہ بات نہیں کرو گی تو میں فون بند کر دوں گا۔''

''میں بہت اپ سیٹ ہوں...... اور کوئی مجھے تسلی دینے والا بھی نہیں رومیو......'' اس کی آواز بھرا گئی۔ ''یہ سب میرے ساتھ ہی کیوں ہو رہا ہے؟''

''فری خدا کے لیے رونا مت۔''

مگر وہ رونے لگی...... ''میں در بدر ہو رہی ہوں...... میرا کوئی گھر نہیں...... لندن سے بڑی امیدیں لے کر آئی تھی یہاں...... تم جانتے ہو کتنی مشکل سے پہنچی تھی اور جب سے آئی ہوں کیا ہو رہا ہے...... کبھی بھیس بدل کے رہتی ہوں...... کبھی چھپ کے...... آج یہاں...... کل وہاں۔''

''آئی ایم سوری فری...... آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''نہیں رومیو...... کچھ بھی ٹھیک نہیں ہوگا تم سے...... تم کچھ نہیں کر سکتے...... میں تمہاری پہلی ترجیح نہیں ہوں۔''

''یہ غلط ہے۔''

''یہ بالکل صحیح ہے...... تمہاری پہلی ترجیح تمہارے ماں باپ ہیں...... اس کے بعد وہ ریاست ہے جس کے تم بے تاج بادشاہ ہو...... پھر تمہاری رعایا کے لیے فلاح و بہبود کے

منصوبے ہیں...... میں تو پتا نہیں اس PRIORITY لسٹ میں چوتھے نمبر پر بھی ہوں یا نہیں۔''

''تم مجھے اتنا غلط سمجھتی ہو؟ چھ سال آزمانے کے بعد بھی۔''

''چھ سال نہیں ساٹھ سال گزر جائیں گے اسی طرح اور تم کچھ نہیں کرو گے...... دوسروں کی بات میں نہیں کرتی...... سلطان کے خلاف تم نے ہمیشہ ایک دفاعی انداز اختیار کیا...... اس نے مجھے قید میں رکھا...... تم نے اس صورتِ حال کو برداشت کیا اور ہم لندن میں چھپ چھپ کر ملتے رہے...... وہ مجھے ڈراتا دھمکاتا دہشت زدہ کرتا تھا اور تم...... تم کیا کرتے تھے۔''

''فریال...... پلیز میری بات بھی سنو۔''

''اور کیا سنوں...... کب تک سنوں...... باتیں ہی تو سن رہی ہوں تمہاری...... جذباتی رومانی اور کتابی باتیں...... ایک پڑھے لکھے مہذب SOPHISTICATED شریف آدمی کی باتیں...... جو تمہارے مقابلے پر ہے وہ ہے بدمعاش...... طاقت اور لاقانونیت کی زبان میں بات کرنے والا۔'' وہ چلاتی رہی۔

''او کے...... مجھے بتاؤ میں کیا کروں؟''

''نہیں...... تم کچھ مت کرو...... تمہیں کرنا ہوتا تو بہت پہلے کر چکے ہوتے...... میں نے تو کہا تھا کہ جان سے مار دو اسے...... کل دیٹ باسٹرڈ...... تنظیم میں تم نے کیا نہیں کیا۔''

''وہ میری مجبوری تھی۔''

''اور عشق تمہاری مجبوری نہیں ہے؟ میرے معاملے میں یہ اختیار حاصل ہے تمہیں کہ جتنا چاہو میرے جذبات سے کھیلو...... جہاں تک چاہو اس کھیل کو جاری رکھو...... لیکن میں نے اب طے کر لیا ہے۔''

''کیا طے کر لیا ہے فری؟''

وہ مضبوط لہجے میں بولی۔ ''یہی کہ جو تم نہیں کر پاتے وہ اب میں کروں گی تم میں ہمت نہیں ہے یا تمہیں فرصت نہیں ہے تو پھر دوسرا کون سا راستہ رہ جاتا ہے میرے پاس۔''

میں نے کہا۔ ''بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔''

وہ طنز سے ہنسی۔ ''ہاں...... ایک بہت عقلمند نواب...... ولایت پلٹ اور ایک بے وقوف جذباتی عورت جسے شادی کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں...... جو پھرتی ہے پیچھے پیچھے کہ رومیو مجھ سے شادی کر لو...... اور اب تو شادی کا امکان مجھے یوں بھی نظر نہیں آتا کہ میری ساس محترمہ نے مجھے ہر طرف سے مجبور ہو کے قبول کیا تھا...... اب تو خود صفدر سلطان آ کے میرا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دے تب بھی میں قبولیت کا شرف حاصل نہیں کر سکتی...... مگر میں مزید ذلت برداشت نہیں کر سکتی۔''

''کیا یہ گفتگو ہم کل کر سکتے ہیں...... آمنے سامنے بیٹھ کے۔''

''گفتگو...... مذاکرات...... کانفرنس...... یہ سیاسی اصطلاحات تم معاملات عشق طے کرنے کے لیے استعمال کرر ہے ہو؟ یہ نہیں کہہ سکتے کہ فریال اب جو ہو سو ہو...... کل میں تم کو اپنا لوں گا...... پھر جو ہو سو ہو۔''

''ایسا بھی ہو سکتا ہے...... پلیز کام ڈاؤن۔''

''نہیں رومیو...... میں تم پر دباؤ ڈال کے تمہیں مجبور نہیں کروں گی۔ اب ہم نہیں ملیں گے۔''

''واٹ نان سنس فری۔''

''میں یہ معاملہ خود نمٹاؤں گی...... خود بات کروں گی سلطان...... کہ میرا خیال چھوڑ دے...... اعلان کر دے کہ اس نے مجھ سے نسبت ختم کر دی ہے اور اپنے حق سے دستبردار ہو رہا ہے...... اس نے انکار کیا تو میں اسے گولی مار دوں گی...... اس کو تلاش کرنا مشکل ضرور ہے ناممکن نہیں...... وہ مجھے جہاں بھی ملا میں خود فیصلہ کروں گی...... ادھر یا ادھر۔''

''فری تم پاگل ہو رہی ہو؟''

''ہاں...... میرا پاگل پن چھ سال سے جاری ہے...... یہ اس کی انتہا ہے...... نہ سہی وصل تو حسرت ہی سہی...... تم نہ ملے تو میں سمجھ لوں گی کہ یہ نصیب کا لکھا تھا جسے میں نہ مٹا پائی۔''

''دیکھو...... میں صبح آ رہا ہوں تمہارے پاس۔''

''کوئی فائدہ نہیں...... میں ابھی کہہ دوں گی لیلیٰ بھابی سے کہ تمہیں میرا پتا نہ بتائیں...... اور انہوں نے بتا دیا تب بھی میں تم سے نہیں ملوں گی...... میں نکل جاؤں گی یہاں سے بھی...... سلطان کی تلاش میں...... اس کے بعد کیا ہو گا...... یہ میں نہیں جانتی...... میں بالکل ناامید نہیں ہوں...... شاید میں آزادی کا پروانہ لے کر تمہارے پاس لوٹ آؤں...... یا کبھی نہ آؤں...... میرا انجام تختہ دار پر ہو یا میری زندگی جیل میں گزر جائے......'' اس نے فون بند کر دیا۔

وہ شدید ہسٹریا میں مبتلا تھی۔ اس وقت فریال سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا...... وہ میری سن ہی نہیں رہی تھی اور اسے پھر فون کرتا تو شاید وہ نمبر مجھے ساری رات بزی ملتا...... اس نے لائن کاٹنے کے بعد ریسیور الگ رکھ دیا ہو گا۔

جب میں واپس آیا تو رات کے بارہ بج چکے تھے۔ صرف راجا میرے انتظار میں باہر ٹہل رہا تھا۔ فریال کی باتوں نے مجھے شدید ڈیپریشن میں مبتلا کر دیا تھا مجھے احساس ہو رہا تھا کہ فریال کی عائد کردہ فردِ جرم بے بنیاد نہیں ہے میں واقعی بزدلی کا مظاہرہ کرتا رہا...... افلاطونیت میں مبتلا رہا۔ میں نے واقعی سلطان سے ایسے نہیں نمٹا جیسے نمٹنا ضروری تھا۔

راجا نے میری بات بڑے تحمل سے سنی...... معلوم نہیں ایسا عادت کی وجہ سے تھا یا کوئی اور بات تھی...... لندن اور اس سے پہلے نیویارک میں رہ کے میں بہت زیادہ کافی کا عادی ہو گیا تھا...... یہاں لوگ گلہ کرتے تھے کہ کافی سے ان کی نیند اڑ جاتی ہے...... مجھے کافی سکون دیتی تھی...... یہ ایک نشے جیسی عادت تھی...... ہیروئن کے عادی کو بھی ہیروئن ہی سکون دیتی ہے...... غنیمت یہ ہے کہ باہر رہ کے مجھے شراب کی عادت نہیں ہوئی ورنہ میں یہاں بھی سکون کا علاج شراب میں تلاش کرتا...... باتوں کے دوران ہی میں نے کچن میں جا کے اپنے لیے کافی بنائی۔

راجا کے نزدیک صورتِ حال گمبھیر تھی مگر پریشانی کی بات بہر حال نہیں تھی۔ ''ابھی اس کی حالت نروس بریک ڈاؤن جیسی ہے...... یہاں ہوتی تو شہناز کچھ کرتی...... وہاں وہ مہمان ہے...... معلوم نہیں لیلیٰ بھابی کی کون سی سہیلی ہے اور اس گھر کا ماحول کیسا ہے۔''

''اس لیے کچھ سوچ کے ہی فریال کو وہاں رکھا ہے...... فون اس کے کمرے میں تھا اور اسے کسی نے ڈسٹرب نہیں کیا...... وہ اتنا بولی۔ چیخی چلائی مگر کوئی نہیں آیا۔''

''اب وہ ٹھیک ہو جائے گی...... اس کے دل کا غبار نکل گیا ہے...... تو بھی آرام سے سو جا۔''

''راجا اگر اس نے وہی کیا...... جو کہہ رہی تھی؟''

''ارے نہیں...... باتوں پر مت جاؤ غصے میں آدمی بہت کچھ کہہ جاتا ہے لیکن مجھے اب واقعی کچھ کرنا چاہیے...... مجھے اس لڑکی سے ہمدردی محسوس ہوتی ہے۔'' راجا نے کہا۔

''یار میرے والدین...... خصوصاً اماں۔''

''دیکھ نیکے پتر...... تیرے ابا نے ایک کے بعد ایک کتنے صدمے برداشت کر لیے...... تو ڈرتا تھا کہ انہیں کچھ ہو جائے گا...... یہ جو انسان ہے نا یہ بڑی سخت جان چیز ہے...... زندگی سے اتنا پیار ہوتا ہے کہ کوئی ایسے صدمات سے نہیں مرتا...... تیری اماں بھی جھیل جائیں گی یہ صدمہ...... تو ہمت کر کے قدم اٹھا...... صاف کہہ دے کہ میں فریال سے شادی کروں گا...... آپ کریں تو اچھا ہے ورنہ میں چلا...... ایک قاضی اور دو گواہوں سے بھی گزارا کر لوں گا۔''

''یہ آسان نہیں ہے میرے لیے۔''

''آسان کیا ہوتا ہے...... عشق کرنا آسان سمجھتا ہے تو الو کے پٹھے...... ہمت نہیں تو صاف کہہ دے فریال سے کہ میں نامرد ہوں...... اپنے لیے دیکھ لے کوئی مرد...... اور تو نے کچھ نہ کیا تو میں بھی خاموش تماشائی بن کے نہیں بیٹھوں گا...... ایسی دوستی پر لعنت جس میں آدمی دوست کے لیے کچھ نہ کرے...... کل میں ایک کام ضرور کروں گا...... یا میں تیرے ابا اور اماں سے صاف بات کروں گا یا فریال سے کہوں گا کہ چلو میں چلتا ہوں تمہارے ساتھ...... صفدر سلطان کا جھگڑا میں ختم کراتا ہوں...... گولی تم کیوں مارو جب میں ہوں۔''

میں نے راجا کا ہاتھ تھام لیا۔ ''راجا...... مجھے اور شرمندہ مت کر...... میں وہی کروں گا جو تو کہے گا۔''

وہ بولا۔ ''اچھا...... یہ بات ہے تو پھر جا کے سو جا......'' اور خود بھی اندر غائب ہو گیا۔

اس کی بات مانتے ہوئے میں بھی بستر پر لیٹ گیا حالانکہ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس حالت میں سونا میرے لیے ناممکن ہو گا...... میرے کانوں میں فریال کی آواز گونج رہی تھی...... اس کی باتوں نے خود اپنی نظروں میں مجھے بے وقعت کر دیا تھا...... اس کا سچ اتنا کڑوا تھا کہ اس کی تلخی ناقابلِ برداشت تھی۔

اس وقت میں ہرگز اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ کسی اور کے لیے کچھ کر سکوں...... میں تو خود اپنے لیے مدد کا طلب گار تھا لیکن رابعہ چپکے سے اندر آ کے میرے پاس بیٹھ گئی تو میں نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور اٹھ بیٹھا...... میں سمجھ گیا تھا کہ وہ پھر اپنا مسئلہ لے کر آئی ہے۔

میں نے کہا۔ ''کزن...... کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم صبح بات کریں۔''

''مجھے پتا ہے کہ تم اَپ سیٹ ہو۔'' وہ بولی۔ ''میں تو یہ خط تمہارے حوالے کرنے آئی تھی۔''

میں نے لفافہ لے لیا۔ ''یہ کس کا خط ہے؟''

''فرخ کا...... وہ جاتے وقت چھوڑ گیا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''اسے خط لکھنے کی کیا ضرورت تھی...... کیا وہ شہر سے واپس نہیں لوٹا...... وہ فون خریدنے گیا تھا۔''

''شاید رات زیادہ ہو گئی تھی اس لیے نہیں آیا۔''

میں نے لفافہ کھول کے اندر سے فرخ کا خط نکالا...... یہ مجھے مخاطب کر کے لکھا گیا تھا۔ اسے پڑھ کر مجھے یوں لگا جیسے میں کسی اندھے کنویں میں گر گیا ہوں اور گرتا چلا جا رہا ہوں۔ رابعہ پیر کے انگوٹھے سے پختہ فرش کو کریدنے اور دانتوں سے ناخن کاٹنے کی اضطرابی کیفیت میں مبتلا سامنے والی دیوار پر نہ جانے کیا دیکھ رہی تھی۔ اس چھپکلی کو جو بڑی مکاری سے دم سادھے ایک چھوٹے سے ٹڈے پر جھپٹنے اور پلک جھپکتے ہی دیوار سے اٹھا کے اپنے پیٹ میں پہنچانے کے لیے تیار بیٹھی تھی یا اس ٹڈے کو جو یا تو اتنا احمق تھا کہ موت کو اتنا قریب محسوس کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا یا اتنا ہوشیار تھا کہ چھپکلی کے ساتھ گیم کھیل رہا تھا۔ اِدھر وہ جھپٹتی اُدھر وہ ٹیک آف کر جاتا۔

چنانچہ رابعہ نے میری صورت کے تاثرات نہیں دیکھے ورنہ میرے محتاط ہونے سے سوال کر بیٹھتی کہ کیا ہوا۔ خط میں ایسی کیا بات لکھی ہے فرخ نے...... پھر میں جھوٹ بولتا اور شاید اس کوشش میں ناکام رہتا۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا تم نے یہ خط کھولا تھا؟''

اس نے کہا۔ ''خط تمہارے لیے تھا۔ میں کیوں کھولتی۔''

میں نے کہا۔ ''اِدھر میری طرف دیکھو۔ مجھ سے نظر ملا کے بات کرو۔''

اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''ٹھیک ہے خط میں نے پڑھا۔ کیا میں نے غلطی کی؟''

''نہیں، ہم ایک دوسرے کے راز دار ہیں کزن، آپس میں سب شیئر کرتے ہیں۔ پھر تم مجھ سے اپنے جذبات کیوں چھپا رہی ہو۔''

''مجھے کیا کرنا چاہیے کزن؟'' وہ ایک آہ بھر کے بولی۔

''وہی جو تم اب تک کرتی آئی ہو۔ تم روتی تھیں، میرے کندھے پر سر رکھ کے آنسو بہاتی تھیں۔ تم تو ایسے ظاہر کر رہی ہو جیسے اس خط۔ ہمارا کوئی تعلق ہی نہیں۔''

''کوئی فائدہ نہیں کزن۔'' وہ دونوں ہاتھوں کو آپس میں رگڑتی رہی۔ ''بہت رو چکی میں۔ بہت آنسو بہا چکی۔''

''اس سے دل ہلکا ہو جاتا ہے۔''

''ہاں، وقتی طور پر مگر اپنا دُکھ اپنا ہی رہتا ہے۔ کسی کے ساتھ بانٹا جا سکتا تو کیا مسئلہ تھا۔ آدمی سب دوسروں کو دے کر فارغ ہو جاتا۔ میں نے بھی اب طے کر لیا ہے کہ آنسو نہیں بہاؤں گی۔ میں حالات کا مقابلہ کروں گی اور جیوں گی۔ جو کچھ میرے ساتھ ہو چکا اس سے زیادہ برا آخر کیا ہوگا۔'' اس نے ٹھہر ٹھہر کے کہنا شروع کیا۔ ''میری ماں کو میرے باپ نے قتل کر دیا۔ باپ کو پولیس نے مار دیا۔ محبت کے نام پر میرے ساتھ اتنا بڑا دھوکا ہوا۔ رُسوائی کا صدمہ میں بھی اٹھا لوں گی۔ میں کوئی کم ہمت، بے وقوف اور بزدل لڑکی نہیں ہوں کہ رو کے مر جاؤں، خودکشی کر لوں۔ اکیلی ہوں تو کیا......''

میں نے بے اختیار اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں تھام کے اس کی پیشانی پہ بوسہ دیا۔ ''نہیں رابعہ! خود کو اکیلا کبھی مت سمجھنا۔ میں ہوں نا تیرے ساتھ تیرا بڑا بھائی۔ جو باپ کی جگہ ہی ہوتا ہے۔ دیکھا جائے تو تجھے میری بہن ہونے کی وجہ سے ہی یہ سزا ملی لیکن تو تو بالکل فکر نہ کر۔ بالکل پریشان مت ہو۔''

اب وہ میری گود میں سر رکھ کے پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔ ''ایسا کیوں کیا فرخ نے میرے ساتھ کزن...... میں نے واقعی محبت کی تھی اس سے...... اور وہ مجھے سزا دے رہا تھا؟ مجھ سے انتقام لے رہا تھا؟ ایسا تو میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی...... مجھے اب بھی یقین نہیں آتا...... لگتا ہے یہ سب ایک ڈراؤنا خواب ہے...... آنکھ کھلے گی تو سب وہی ہوگا...... ویسا ہی ہوگا...... جیسا تھا...... اور میں فرخ کو بتاؤں گی تو وہ بہت ہنسے گا، بہت مذاق اُڑائے گا میرا کہ آخر لڑکیاں اتنی بے وقوف اور جذباتی کیوں ہوتی ہیں۔ ایسا نہیں ہے کزن......''

میں نے چونک کر کہا۔ ''کیا؟ یعنی یہ خواب کیوں لگتا ہے؟'' ''نہیں، لڑکیاں اتنی بے وقوف اور جذباتی کیوں ہوتی ہیں۔ خوبصورت لفظوں سے بنے گئے جال میں پھنس کر اپنا سب کچھ گنوا دیتی ہیں۔ سراب کو حقیقت کیوں سمجھ لیتی ہیں اور پھر اعتماد کی سزا پاتی ہیں۔''

''شاید ایسا نہیں ہے۔ محبت تو نام ہی اعتماد کا ہے لیکن کبھی کبھی زندگی امتحان لیتی ہے۔ راہرو کے بھیس میں راہزن مل جاتے ہیں۔ فرخ جیسے لڑکے شرافت کی نقاب ڈال کر کسی رابعہ کو لوٹ لیتے ہیں اور بھاگ جاتے ہیں مگر بھاگ کے کوئی کہاں جا سکتا ہے۔ یہ دنیا تو بہت چھوٹی جگہ ہے۔ کسی دن وہ مجھے مل جائے گا۔ میں اسے تلاش کر لوں گا کزن، وہ واپس آئے گا۔''

وہ اُٹھ بیٹھی اور اپنے بال سمیٹنے لگی۔ ''کوئی فائدہ نہیں اسے پکڑ کے واپس لانے کا۔ وہ پھر بھاگ جائے گا۔ جو مجھ سے محبت ہی نہیں کرتا اس پر میں زبردستی اپنی محبت نہیں تھوپ سکتی۔''

''اسے تم سے شادی کرنی پڑے گی۔''

''کیا واقعی یہ شادی ہوگی۔ زندگی کسی جیل ہی کی ایک ہی کوٹھڑی میں رہنے والے عمر قید کے دو مجرموں کی طرح ساتھ گزارنے سے بہتر ہے کہ میں اپنی آزاد زندگی اپنی مرضی سے جیوں۔ دیواروں اور زنجیروں میں باندھنے سے وہ میرا جیون ساتھی نہیں بنے گا۔ لعنت بھیجو اس پر۔ اب نہ میں آنسو بہاؤں گی اس کے لیے نہ اسے یاد کروں گی۔''

''میں نے اس کے گالوں پر چٹکی لی۔ ''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میری چھوٹی بہن مجھ سے زیادہ بہادر اور باہمت ہے۔''

''اسے یقین ہوگا کہ یہ خط پڑھ کے میں صدمے سے پاگل ہو جاؤں گی۔ خودکشی کر لوں گی۔ ذرا دیکھو اس کمینے نے کیسے وقت میں خنجر گھونپا میرے دل میں۔ جب میرا دل ویسے ہی اپنوں سے جدائی کے غم میں لہولہان تھا۔ بڑی محبت سے وہ مجھے تباہی اور بربادی کے اندھے غار تک لایا۔ سہارا دے کر نہیں دھکیل کر...... اور پھر چپکے سے غائب ہو گیا۔ یہ سوچ کر کہ اب اسے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ میرے قتل کا الزام کیوں لے۔ باقی کام میں خود کر لوں گی۔ اس جذباتی بحران میں یہ صدمہ مجھ سے برداشت نہیں ہوگا۔ رُسوائی اور جدائی کے صدمے سے مایوس اور دلبرداشتہ ہو کے میں اپنی جان خود ہی لے لوں گی۔''

میں نے نرمی سے کہا۔ ''ایسا کبھی سوچنا بھی مت۔ تم کو سب سے پہلے اپنے لیے جینا ہے پھر میرے لیے، ہم سب کے لیے۔''

''اور اس بچے کے لیے، اپنے بچے کے لیے۔''

میں نے رُک کے کہا۔ ''وہ تو ابھی وجود کا محتاج ہے۔''

وہ برہمی سے بولی۔ ''ایسا مت کہو کزن۔ اس کا میرا وجود الگ تو نہیں ہے۔ ایک حصہ ہے وہ میرے وجود کا۔ اس کی ماں ہوں میں۔ اسے جنم دینا اور پالنا میری ذمے داری ہے۔''

''اور تم نے طے کر لیا ہے یہ ذمے داری کا بار اٹھانے کا۔''

''لیس۔ تم کیا سمجھتے ہو میں کسی کے وجود کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دوں گی...... نہیں کزن...... میں اس کے وجود کو غلط نہیں سمجھتی کیونکہ میں اپنی محبت کو غلط نہیں سمجھتی تھی۔''

''دیکھو، تم جذبات سے مغلوب ہو۔ تم نے ان مشکلات پر غور نہیں کیا ہے جن کا تمہیں سامنا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

وہ بولی۔ ''سب سوچ لیا ہے میں نے۔ مشکلات سے ڈر کے میں اپنی اولاد کو قتل نہیں کروں گی۔ ابارشن تو بہت آسان ہے کیونکہ میری مددگار ڈاکٹر شہناز ہو سکتی ہے لیکن میں ایسا نہیں کر سکتی۔ یہ ناممکن ہے کہ باپ کے جرم کی سزا بیٹے کو ملے۔ خود اس کی ماں کے ہاتھوں۔ مجھے معلوم ہے یہ فیصلہ مجھے کتنا مہنگا پڑے گا۔ مجھے تمام دنیا کی انگشت نمائی کا سامنا

ہوگا۔ میری محبت کلنک کا ٹیکا بن کر ہر جگہ مجھے رُسوا کرے گی۔''

''یہ صرف تمہارا مسئلہ نہیں ہوگا۔ دوسروں کا بھی ہوگا۔''

وہ پھر تیز لہجے میں بولی۔ ''کون دوسرے۔ تم کزن؟ یا وہ سب جن سے میری رشتے داری ہے۔ میں سب کو چھوڑ دوں گی۔''

''یہ مسئلہ تو تمہارے بیٹے کا بھی ہوگا۔''

''کیا مطلب؟''

''تم اسے کیا بتاؤ گی؟'' میں نے کہا۔

''وہی جو سچ ہے کیونکہ میرے جھوٹ کا راز کبھی نہ کبھی ضرور فاش ہو جائے گا۔ یہ دنیا بڑی بے رحم ہے۔ جن کے دل سیاہ ہیں، اعمال سیاہ ہیں وہ اپنی روسیاہی کو چھپانے کے لیے دوسرے کے دامن کا داغ دکھاتے ہیں پھر میری کیا عزت رہ جائے گی میرے بیٹے کی نظر میں جب اسے پتا چلے گا کہ ماں بھی جھوٹ بولتی رہی۔''

میں نے کہا۔ ''اور سچ جان لینے کے بعد؟ کیا وہ تمہاری زیادہ عزت کرنے لگے گا؟ نہیں کزن، بدنامی کے جس عذاب کا بوجھ اٹھا کے تم جیو گی وہ تم سے زیادہ اٹھائے گا۔ عزت اگر تمہارا مسئلہ ہے تو اس کا بھی ہوگا۔ اگر وہ تمہیں چھوڑ کے دنیا کے ساتھ صفِ دشمناں میں جا کھڑا ہوا پھر؟ یہ سوال کرنے لگا کہ ماں تم نے ایسا کیوں کیا تھا؟ اور اگر تم ایک جذباتی غلطی کر بیٹھی تھیں۔ بے عقلی اور ناتجربہ کاری میں انتقام کا نشانہ بن گئی تھیں۔ دھوکا ہوا تھا تمہارے ساتھ تو اس کے بعد تمہیں عقل کیوں نہ آئی۔ مجھے کیوں پیدا کیا۔''

وہ ہسٹریائی لہجے میں چلائی۔ ''ایسا نہیں ہو سکتا۔''

''کیا ہو سکتا ہے اور کیا نہیں اس کا فیصلہ میں یا تم اسی وقت یہاں بیٹھ کے نہیں کر سکتے۔ ابھی تم بھی شدید جذباتی ہو رہی ہو اور میں بھی بہت تھکا ہوں۔ جاؤ سو جاؤ ہم پھر بات کریں گے جب ہمارا دماغ ٹھنڈا اور پُرسکون ہوگا۔ بس ایک بات ذہن میں رکھنا کہ اگر تمہارا مجھ پر اعتماد ہے تو میں تمہارے ساتھ ہوں۔ خواہ تمہارا فیصلہ کچھ بھی ہو۔''

اس نے آہستہ سے سر ہلایا اور مسکرانے کی کوشش کی۔ وہ میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کے کچھ دیر خاموش بیٹھی کچھ سوچتی رہی جیسے الفاظ پر یقین کے ساتھ میرے سہارے کی عملی قوت کو بھی محسوس کرنا چاہتی ہو پھر وہ نیند میں چلنے والے کی طرح دروازے تک گئی اور پلٹ کے بولی۔ ''شب بخیر کزن۔''

''شب بخیر لٹل گرل!'' میں نے مسکرا کے جواب دیا۔

یہ نئی اُفتاد تھی۔ کچھ دیر پہلے میرے خیالات پر فریال کی باتوں کا اثر تھا۔ وہ سخت خفا تھی اور غصے میں اس نے مجھے بہت

کچھ سنا دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ محبت کے معاملے میں میرا رویہ چھ سال سے مصلحت کی بے عملی کا شکار تھا۔ میں ایک دفاعی انداز اختیار کرنے کے نتیجے میں بے عمل اور بزدل ہو گیا تھا۔ میں نے محبت کے معاملے میں صورت حال جوں کی توں رکھنے کی عادت بنالی تھی اور خود کو مجبور اور بے بس تسلیم کر لیا تھا۔ اہمیت اور ترجیح کے اعتبار سے دوسرے معاملات اوپر آ گئے تھے جن میں میرے ماں باپ اور خاندان کا تحفظ، ست بدھائی کے ترقیاتی منصوبے اور ان سے جڑے ہوئے دوستی دشمنی کے مسائل پر میری توجہ تھی۔ فریال کو اپنانے کے لیے میں نے کچھ نہیں کیا تھا سلطان کی رقابت اور اس کے جارحانہ عزائم بڑھتے جا رہے تھے اور میں صرف پسپا ہو رہا تھا۔ مسئلے کا فریال کے نزدیک ایک ہی حل تھا۔ سلطان کا خاتمہ۔ وہ میری اور فریال کی جان کے درپے تھا مگر میں نے اسے ٹھکانے لگانے، قتل کرانے یا خود قتل کرنے کے بارے میں سوچا تک نہیں تھا چنانچہ اب وہ خود یہ کام کرے گی۔

غصے میں فریال نے جو بھی کہا تھا اس نے مجھے خاصا اپ سیٹ کیا تھا مگر راجا کے خیال میں وہ سوڈے کی بوتل سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ فریال ایسی حماقت کر ہی نہیں سکتی تھی کہ اکیلی سلطان کو تلاش کر کے جان سے مارنے کے لیے نکل کھڑی ہوتی لیکن اس پاگل لڑکی سے کچھ بعید نہ تھا۔ اس کے دماغ کا فیوز اُڑ جاتا تو وہ خودکش حملہ آوروں کی طرح نکل کھڑی ہوتی۔

رابعہ کے آنے سے پہلے میں اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا اور یہ طے کر لیا تھا کہ صبح لیلیٰ بھابی سے بات کروں گا کہ فریال کے دماغ کے پیچ ٹائٹ کرے تاکہ وہ کوئی بے وقوفی کا قدم نہ اٹھائے پھر رابعہ آئی تو فریال کا خیال پیچھے چلا گیا اور اب میرا دماغ غصے سے سائیں سائیں کر رہا تھا۔ فرخ کی شیطانی خباثت کا وار اتنا غیر متوقع تھا کہ اپنی بے بسی پر اندر ہی اندر پیچ و تاب کھانے کے سوا میں کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے انتقام مجھ سے لیا تھا لیکن اس کا نشانہ رابعہ بنی تھی۔

فرخ جتنا خاموش طبع اور سادہ مزاج نظر آتا تھا اتنا ہی عیار اور سفاک مزاج تھا۔ اس نے جو کچھ کیا تھا بہت پلاننگ کے ساتھ کیا تھا اور ہم سب کا اعتماد حاصل کرنے کے بعد پیٹھ میں چھرا گھونپ کے نکل گیا تھا۔ اس کے لیے اس نے مناسب موقع کا انتظار کیا تھا اور اب یقیناً وہ اپنی کامیابی پر بہت خوش، کسی محفوظ مقام پر اس یقین کے ساتھ موجود ہوگا کہ نواب صاحب اپنی ساری دولت، راجا اپنے تمام اثر رسوخ اور تعلقات اور شامی بادشاہ اپنی ساری دہشت کے باوجود اس کا سراغ لگا پائیں گے اور نہ اس کا کچھ بگاڑ سکیں گے۔

رہی رابعہ تو خودکشی کے سوا اس کے سامنے کون سا راستہ ہوگا؟ اب تک وہ دوپٹے کا پھندا گلے میں ڈال کے کسی پنکھے سے لٹک چکی ہوگی یا ڈاکٹر شہباز کے میڈیکل بیگ سے خواب آور گولیاں چرا کر ہمیشہ کی نیند سونے کا فیصلہ کر چکی ہو گی..... ایک عزت دار خاندان کی لڑکی کے لیے شادی سے پہلے بچے کو جنم دینے کا مرحلہ آ جائے تو سارے خاندان کو رسوائی سے بچانے کے لیے یا تو وہ خود مر جاتی ہے ورنہ اسے مار دیا جاتا ہے۔

یہ فرخ نے سوچا نہ ہوگا کہ رابعہ وہ کرے گی جو اس نے نہیں سوچا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے فرخ نے وہ کیا جو رابعہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی..... اور آگے چل کے میں کیا کروں گا ابھی نہ رابعہ سوچ سکتی ہے اور نہ فرخ سوچ سکتا ہے..... دنیا بہت چھوٹی جگہ ہے فرخ..... میں نے بے چینی سے کروٹ بدلی..... تمہیں تلاش کر کے کیفر کردار تک پہنچانے میں مجھے وقت تو لگے گا مگر زندگی نے مہلت دی تو ایک دن تم مجھے اچانک کسی بند گلی میں اپنے سامنے پاؤ گے۔ اسے تم اپنی بدقسمتی سمجھو گے مگر یہ قدرت کا نظام عدل و انصاف ہے جس سے کوئی بھی بچ نہیں سکتا۔

کسی دُھواں دیتے اور پھٹنے کے قریب آتش فشاں کی طرح میرے وجود میں آگ سی بھر گئی تھی۔ ایسے میں پرسکون نیند کی خواہش بھی ساتھ چھوڑ چکی تھی..... ایک بار پھر میں نے فرخ کے خط کو نکال کے پڑھا حالانکہ اس کا ہر لفظ میرے ذہن میں نقش ہو چکا تھا۔ اس نے لکھا تھا۔

نام کے نواب.....

آج میں بہت خوش ہوں۔ مجھے یقین ہے دوسری دنیا میں میری مرحوم اور مظلوم بہن کی روح بھی خوش ہوگی کہ بالآخر اس کے بھائی نے انتقام کا عہد پورا کر لیا..... دیکھا جائے تو یہ انتقام نہیں..... وہ سزا ہے جس کے تم مستحق تھے..... جو کچھ تم نے میری بہن کے ساتھ کیا تھا وہی میں نے تمہاری بہن کے ساتھ کیا..... قانون کی گرفت میں تم کبھی نہیں آئے تھے..... میں بھی نہیں آ سکتا..... پھر تم بھی فرار ہوئے تھے..... میں بھی یہی کروں گا.....

چھ سال تم مغرور رہے..... میری حیثیت نہ تھی کہ تمہارے پیچھے امریکا یا لندن آتا..... میں نے تمہاری پوری خبر رکھی..... مجھے یقین تھا کہ ایک دن جب شامتِ اعمال تمہیں آواز دے گی تم واپس ضرور آؤ گے تمہارے ماں باپ

یہاں تھے۔ سارے رشتے دار یہاں تھے۔

میری توقعات غلط نہیں تھیں۔ تقدیر تمہیں واپس کھینچ لائی..... تم نے تو اسے خوش قسمتی کی انتہا سمجھا ہوگا کہ اناڑی میں ست بدھائی کی ریاست مل گئی مگر غور کرو تو خود مان لو گے کہ یہ صرف بدبختی تھی..... انگلیوں پر گنو یا ان قبروں کو شمار کر لو جو تمہاری حویلی کے اندر بنائی گئیں..... تم نے کس کس کو گنوا دیا..... اب اس خاندانی نوابوں کے قبرستان میں ایک قبر کا اضافہ ہوگا..... یہ رابعہ کی قبر ہوگی جسے تم اپنی بہن مانتے ہو..... اور اس میں کوئی شک نہیں..... میں نے دیکھا تھا کہ اس کے لیے تمہارے جذبات وہی ہیں جو میرے اپنی بہن کے لیے تھے۔

میں مانتا ہوں کہ رابعہ کے ساتھ ظلم ہوا لیکن یہی ظلم میری بہن کے ساتھ بھی ہوا تھا..... جب وہ خودکشی کرے گی تو تم خود اسے قبر میں اتارو گے..... اس وقت تمہارے جذبات کیا ہوں گے یہ سوچ کے میرے دل کو بہت تسکین ملتی ہے..... بہن کے ساتھ میں نے بھانجے کو بھی دفن کیا تھا..... ایسا ہی تم بھی کرو گے فیکے ماموں..... تمہاری بہن پر زندگی کے سارے راستے بند ہیں..... بے عزتی اور رسوائی کے ساتھ نہ وہ زندہ رہ سکتی ہے نہ تمہارے عزت دار ماں باپ..... جواب اس کے ماں باپ بھی ہیں..... اس کی نجات صرف موت میں ہے..... سنو تم اسے مرنے سے روک سکتے ہو نہ بچا سکتے ہو..... آخر کب تک وہ اپنے گناہ کا بوجھ اٹھا کے جیے گی؟ اس کے پاس خودکشی کے بہت طریقے ہیں تمہارے واپس آنے کے بعد میرے انتقامی جذبات کا آتش فشاں پھر بھڑک اٹھا تھا..... اس وقت میں نے تمہیں دو بار قتل کرنے کی کوشش کی مگر تم بچ گئے..... پھر تم نے میرے سامنے صورت حالات کی ایسی تصویر پیش کی جس سے تمہاری بے گناہی ثابت ہو جائے..... مجھے اعتراف ہے کہ وقتی طور پر میں تمہارے دلائل سے متاثر ہو گیا تھا..... میں نے مان لیا تھا کہ میری طرح تم بھی مظلوم ہو اور اپنا انتقام لے چکے ہو..... میرا دل تمہاری طرف سے صاف ہو گیا تھا۔

یہ احساس مجھے کچھ عرصے بعد ہوا کہ حقیقت نہیں بدلی۔ تم نے اپنی چرب زبانی سے میرے جذبات کا رخ موڑ دیا ہے اور میں حقائق کو تمہاری نظر سے دیکھنے لگا ہوں..... بے شک تم نے اپنا انتقام لے لیا تھا لیکن وہ میرا انتقام کیسے ہو گیا؟ تمہارے جذبات کی آگ بجھ گئی..... میرے جذبات تو راکھ نہیں ہوئے..... تمہارے دکھ کا مداوا ہو گیا..... میرے زخم تو ویسے ہی ہیں..... تم نے کہا کہ میں نے اپنی بیوی کے قتل کا انتقام لے لیا..... اس کے قاتلوں کو سزا دے دی..... میں نے اپنی بہن کی موت کے ذمے دار کو کیا سزا دی؟ چھ سال میں بدلہ لینے کی آرزو میں دن رات جلتا رہا اور اس کے بعد کیا ہوا؟ تم نے چھ منٹ میں ثابت کر دیا کہ اب میرے کرنے کے لیے کچھ نہیں بچا..... یہ میری لاعلمی اور بے وقوفی تھی کہ میں چھ سال تم سے انتقام لینے کی خواہش دل میں لیے پھرتا رہا..... جو سزا کے مستحق تھے انہیں تم چھ سال پہلے ہی سزا دے چکے..... اب میرے کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں۔

جب میں نے عقل سے سوچا تو تمہاری چالاکی اور عیاری مجھ پر عیاں ہو گئی..... اس وقت تک تم مجھے باتوں کے جال میں الجھا کے میرا اعتماد حاصل کر چکے تھے۔ میں سوچتا رہا کہ اب کیا کرنا چاہیے اور آہستہ آہستہ میری سمجھ میں آ گیا کہ ادلے کا بدلہ کیا ہو سکتا ہے..... قصاص یہی ہے..... آنکھ کے بدلے آنکھ..... جان کے بدلے جان..... اس کے بعد میں نے منصوبہ بندی کی..... افسوس صرف اس بات کا ہے کہ رابعہ تمہاری سگی بہن نہیں..... کاش وہ سب جو میں نے رابعہ کے ساتھ کیا تمہاری سگی بہن کے ساتھ کر سکتا..... اس کے لیے تمہارے جذبات کچھ بھی ہوں..... سگی بہن..... منہ بولی بہن..... ان سب کے رشتے کی نوعیت ایک جیسی نہیں ہو سکتی..... خونی اور خود ساختہ رشتے میں اصلی نقلی کا فرق نظر نہ آئے مگر ہوتا ہے۔

اس خلش کے باوجود کہ تمہاری سزا کی اذیت سگی بہن کے معاملے میں کچھ اور ہوتی..... اتنی ہی ہوتی جتنی میری تھی..... میں مطمئن ہوں کہ میں نے چھ سال بعد اپنا انتقام لے لیا..... اگر میں تمہیں قتل کر دیتا تو سزا تمہارے ماں باپ کو ملتی..... تم کو تو پتا بھی نہ چلتا کہ جس گولی نے تم سے زندگی کے احساس کو چند منٹ میں چھین لیا وہ کس نے چلائی تھی اور کیوں؟ لیکن اب تم اسی عذاب سے گزرو گے جس سے میں گزرا تھا..... اور بہت جلد..... کیا پتا صبح کا سورج طلوع ہونے سے پہلے رابعہ میری بہن کے پاس پہنچ جائے..... مجھے معلوم ہے وہ کتنی بے وقوف اور جذباتی لڑکی ہے۔ ایسی ہی میری بہن بھی تھی ورنہ تم جیسے کھلاڑی کے جال میں کیسے پھنستی۔

میں نے ثابت کر دیا ہے کہ اناڑی میں بھی نہیں..... میں صرف تمہاری بہن کی عزت اور تمہاری عزت ہی لوٹ کر نہیں جا رہا ہوں..... اور بھی بہت کچھ لے کر جا رہا ہوں..... تم جب تک جیو گے مجھے یاد رکھو گے..... یہی تمہاری سزا ہے چھ سال میں نے تمہارا انتظار کیا تھا..... چھ سال تم بھی مجھے

ڈھونڈو...... مگر میں تمہارے ہاتھ آنے والا نہیں ہوں نواب صاحب...... میری پلاننگ بڑی مکمل تھی...... تم جانو گے تو مانو گے کہ میرے مقابلے میں اناڑی تم تھے...... لیکن میں تمہیں کچھ بتانے والا نہیں ہوں...... تمہارا کبھی ہاتھ نہ آنے والا ایک اور ''دشمن۔''

ذہن ایسے پراگندہ خیالات کی یلغار میں ہو تو نیند آنے کا کیا سوال...... کبھی میں رابعہ کے بارے میں سوچتے سوچتے کہ اس کا مستقبل کیا ہوگا نہ جانے کب فریال کے ماضی حال اور مستقبل کے تصورات میں گم ہو جاتا تھا۔ پھر کروٹ لیتا تھا تو دماغ کی رو بھٹک کے فرخ کی طرف ہو جاتی تھی...... پھر احساس ہوتا تھا کہ میں تو سلطان کے بارے میں سوچ رہا ہوں...... پھر بھی میں آنکھیں بند کیے پڑا رہا اور نیند کے لیے جدوجہد کرتا رہا جو قطعی لاحاصل ثابت ہوئی۔ ایک بار مجھے یہ خیال بھی آیا کہ میں ڈاکٹر شہناز کو جگا کے پوچھوں کہ کیا اس کے پاس خواب آور گولیاں بھی ہیں...... آخر وہ ایسی ہی ضرورت میں کام آتی ہیں۔

سحر کا اجالا اترا تو میں نے سونے کی کوشش ہی ترک کر دی۔ رات بھر کی کسلمندی کو دور کرنے کے لیے میں نے تھوڑی سی ورزش کی اور پھر نہانے چلا گیا...... اس سے میری ذہنی و جسمانی حالت میں خاصی بہتری آئی۔ مجھے معلوم تھا کہ اماں اور ابا بہت پہلے اٹھ چکے ہوں گے۔ ان کے کمرے کے بند دروازے کے پیچھے روشنی کی لکیر دکھائی دے رہی تھی لیکن اندر مکمل خاموشی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اندر اماں مُصلیٰ بچھائے تسبیح ہاتھ میں درود و وظائف میں محو ہوں گی اور ابا اپنے سامنے قرآن باتفسیر کھولے اس کے مطالعے میں غرق ہوں گے۔

ایک اچھے بیٹے کی طرح مجھ پر واجب تھا کہ میں صبح اٹھ کے سب سے پہلے انہیں سلام کر کے ان کی دعائیں لوں مگر گزشتہ روز کے افسوسناک واقعات کے بعد مجھ میں ان کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ میں سیدھا گزر گیا...... میرا ارادہ تھا کہ کچن میں جا کے ریشم یا اس کی ماں سے کافی کا کہوں اور وہ نہ ہوں تو خود اپنے لیے کافی بناؤں...... چھ سال یورپ امریکا میں رہ کے مجھے کافی کی عادت نہیں لت پڑ گئی تھی اور صبح ایک مگ کافی حلق سے اُتارے بغیر نہ میری آنکھیں کھلتی تھیں اور نہ ذہن بیدار ہوتا تھا۔

رابعہ کے کمرے کا بند دروازہ دیکھ کر میرے قدم رُک گئے۔ نہ جانے کیا سوچ کے میں نے آہستہ سے ڈور لاک کا ہینڈل گھمایا اور آہستہ سے دروازے کو دھکیلا...... اس وقت میرا ذہن ایک لاشعوری خوف کی گرفت میں تھا...... دروازہ معمولی سا چرچرایا...... میں نے ڈرتے ڈرتے اندر جھانکا اور یہ دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا کہ رابعہ اپنے بیڈ پر ہاتھ کو سر کے نیچے تکیے پر رکھے بے خبر سو رہی ہے...... دوپٹے کا پھندا گلے میں ڈالے پنکھے سے نہیں لٹک رہی ہے...... میں نے دروازے کو پھر بند کیا تو وہ پہلے سے زیادہ چرچرایا۔ میں نے حیرانی سے سوچا کہ کیا رابعہ واقعی ویسے سکون سے سو رہی ہے یا یہ محض مجھے مطمئن کرنے کے لیے سونے کی اداکاری ہے۔

کاش فرخ یہ دیکھ سکتا...... مجھے کچن کی طرف جاتے ہوئے خیال آیا کہ اس کے خط کا اثر الٹا ہوا ہے...... رابعہ نے خودکشی نہیں کی اور نہ کرے گی...... اگر وہ اسے بتا کے یا اس کے نام ایک سطر کا پیغام چھوڑ کے نکل جاتا کہ میں جا رہا ہوں اور اب کبھی لوٹ کے نہیں آؤں گا تو شاید رابعہ کی ذہنی کیفیت مختلف ہوتی مگر میرے نام خط پڑھنے کے بعد رابعہ کا ردِعمل تبدیل ہو گیا دُکھ اور احساسِ ذلت سے زیادہ وہ ضد...... اشتعال اور انتقام کے جذبات کا شکار ہو گئی۔ فرخ نے مجھ سے انتقام لینے کے لیے اسے استعمال کیا تھا یہ فرض کر لیا تھا کہ رابعہ یقیناً خود اپنی جان لے گی...... مگر اس نے طے کیا کہ وہ ایسا نہیں کرے گی۔ وہ فرخ کی توقعات کو غلط ثابت کرے گی...... اس کی انتقام کی خواہش کو پورا نہیں ہونے دے گی۔ وہ دنیا سے لڑے گی...... حالات کا مقابلہ کرے گی...... اپنے ساتھ مجھے بچائے گی...... اور انتظار کرے گی...... اس کے دل میں بھی یقین کی یہ روشنی ضرور ہوتی کہ کسی نہ کسی دن فرخ سامنے آئے گا...... یا لایا جائے گا...... اس کی شامتِ اعمال لائے گی یا اس کا بھائی لائے گا...... پھر وہ کہے گی کہ اب میری باری ہے فرخ صاحب...... تم اپنی سزا کے لیے تیار ہو جاؤ۔

ابھی ریشم کچن میں اکیلی تھی...... اس کی ماں کی عمر تو اتنی زیادہ نہیں تھی مگر تلخی حالات صدمات نے اسے تھکا دیا تھا اور چالیس سال میں اسّی سال کی بڑھیا بنا دیا تھا وہ صبح ناشتے کے بعد آنے لگی تھی۔ دونوں ماں بیٹی کی ذمے داری کچن تک محدود تھی لیکن یہ بھی کم کام نہیں تھا۔ دن میں ریشم جب ڈاکٹر شہناز کا بیگ اٹھا کے اس کے اسسٹنٹ کی حیثیت سے چلی جاتی تھی تو فاطمہ کو اکیلے ہی سب کچھ کرنا پڑتا تھا۔ تاہم دونوں ماں بیٹیاں اپنی تنخواہ سے زیادہ اس عزت سے بہت خوش اور مطمئن تھیں جو انہیں حویلی میں حاصل تھی۔ ان کے ساتھ سب کا سلوک ایک فیملی ممبر جیسا تھا۔

ریشم کی پیٹھ میری طرف تھی۔ اسے میرے آنے کا پتا

نہیں چلا اور وہ بڑی ترنگ میں گاتی رہی۔ ''ترچھی ٹوپی والے...... بابو بھولے بھالے......'' گانے کے ساتھ وہ برتن صاف کرتے ہوئے تھرک بھی رہی تھی۔ اس لڑکی میں شوخی اور شوقین مزاجی کے ساتھ ذہانت تھی۔ آگے بڑھنے کی اُمنگ تھی اور ایک ایکسٹرا انرجی بھری ہوئی تھی جو اسے پارے کی طرح متحرک رکھتی تھی۔ اس نے فریال کو رول ماڈل بنا لیا تھا اس کے فیشن اور اطوار اپنانے کے ساتھ اسی کی طرح انگریزی بولنا ریشم کا خواب تھا۔ شروع شروع میں اس کی مضحکہ خیز نقالی پر سب ہنستے تھے مگر دیکھتے دیکھتے ریشم کا دیہاتی پن غائب ہو گیا تھا اور وہ اپنے اطوار میں شہناز، فریال یا رابعہ کی طرح ہو گئی تھی۔

پیچھے سے دیکھ کر میں اسے نہ پہچان پاتا کیونکہ اس نے رابعہ کا دیا ہوا سوٹ پہن رکھا تھا۔ میرے قدموں کی آہٹ پر وہ چونکی اور پلٹ کے مجھے دیکھا تو خفت سے مسکرائی۔

''گڈ مارننگ سر...... ہاؤ ڈو یو ڈو۔''

میں نے کہا۔ ''کیا حال ہے تمہارا ریشم۔''

''فائن سر...... یو وانٹ کافی؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں...... اگر مل جائے۔''

''ون منٹ سر...... یو رائز ارلی...... ہیلتھی اینڈ وائز۔''

اس نے الیکٹرک کیتل کا پلگ لگا دیا۔ ''ہیلتھی تو آپ ہو۔''

میں نے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے ہیلتھی اور وائز نہیں ہوں؟ غریب اور بے وقوف ہوں؟''

وہ بوکھلا گئی۔ ''نو...... نو سر...... یہ ڈاکٹر شہناز نے بتایا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''دو کافی...... میرے ساتھ راجا بھی ہے۔''

حویلی کا اُجاڑ صحن دیکھتے دیکھتے ایک خوب صورت چمن کی صورت اختیار کر گیا تھا۔ یہ کچھ زمین کی قوتِ نمو تھی کچھ موسم کی مہربانی لیکن سب سے زیادہ مالی کے طور پر کام کرنے والوں کی لگن اور محنت کہ جھاڑ جھنکاڑ کی جگہ سرسبز گھاس اُگ آئی تھی اور ہموار قالین جیسے لان کی صورت عیاں ہونے لگی تھی۔ موسمی اور سدابہار پودوں میں پھول کھلنے لگے تھے اور ویرانی پر ہریالی غالب آ گئی تھی...... فوارہ میں پانی اُچھلتا نہیں تھا مگر اس کے اردگرد بنے ہوئے تالاب کی صفائی کر دی گئی تھی اور صاف پانی بھر دیا گیا تھا جس میں آسمان کی نیلاہٹ جھلکتی تھی۔ غنی پہلے بطخوں کے جوڑے لایا تھا پھر کہیں سے اسے ایک ہرن مل گیا۔

راجا تالاب کی منڈیر پر پہلے سے موجود تھا اور نہ جانے کس سے فون پر بات کر رہا تھا...... آسمان سورج نکل آنے سے روشن ہو گیا تھا مگر ابھی دھوپ لان پر نہیں اُتری تھی۔ اس کی راہ میں حویلی کی عمارت حائل تھی۔

مجھے دیکھ کر راجا نے فون بند کر دیا۔ ''پولیس نے وہ جعلی کرنسی پکڑ لی ہے جو غلام محمد کا تاوان ادا کرنے کے لیے شہاب الدین لایا تھا۔''

''کیسے پکڑا؟'' میں نے کہا۔

''پکڑا کسی کو نہیں...... اور شاید پکڑیں گے بھی نہیں...... پولیس کا کہنا ہے کہ ایک سوٹ کیس میں ڈیڑھ کروڑ تھے۔''

''گویا پچاس لاکھ انہوں نے پہلے ہی رکھ لیے۔''

''ہاں...... اور اب تک چلا بھی دیے ہوں گے...... باقی بعد میں تفتیش کے دوران تقسیم ہو جائیں گے...... کون یاد رکھتا ہے ایسے معاملات کو...... مہینے بھر بعد کیس فائلوں میں دب جائے گا۔''

''پکڑا کوئی بھی نہیں جائے گا؟''

''بالکل نہیں...... یہ سیانے لوگ جعلی کرنسی کو دبا کے رکھتے ہیں...... تھوڑا تھوڑا کر کے مارکیٹ میں پھیلاتے ہیں اور اپنی پوزیشن سے بھی فائدہ اُٹھاتے ہیں...... یہ جعلی نوٹ دیں تو لینے والا دیکھتا بھی نہیں کہ پولیس کے پاس جعلی کرنسی نہیں ہو سکتی...... اور یہ جسے چاہیں پکڑ لیں کہ رشوت میں جعلی نوٹ دیے تھے تیری تو ایسی کی تیسی...... استادوں سے استادی کرتا ہے...... اور وہ بے چارا مجبور ہوتا ہے کہ جھوٹ کو سچ مانے...... جس کام کے لیے رشوت دی تھی وہ تو ہوگا نہیں...... ایک کیس اور نہ بن جائے۔''

ریشم نے کافی کسی اچھی ایرلائن کی اچھی ایر ہوسٹس کی طرح دلفریب مسکراہٹ کے ساتھ پیش کی...... میرے تھینک یو کے جواب میں اس نے بل کھا کے ''یو آر ویلکم سر'' کہا اور پلٹ کے کمر لچکاتی چلی گئی۔

''تو کس خیال میں گم ہے فیکے پتر......'' راجا نے کہا۔

''کیوں...... کیا ہوا؟''

''میں اکیلا بکواس فرما رہا تھا...... تو نہیں سن رہا تھا۔ تیرا دھیان کہیں اور تھا۔''

میں نے خفت سے کہا۔ ''نہیں...... ایسی تو کوئی بات نہیں۔''

اس نے مجھے غور سے دیکھا۔ ''پھر بتا کیا پوچھا تھا میں نے؟ ریشم کے آنے سے پہلے۔''

''تو...... جعلی نوٹوں کی بات کر رہا تھا؟''

راجا ہنسا۔ ''تیری صبح کہہ رہی ہے تیری رات کا

فسانہ... کہ تو رات بھر سویا نہیں...... فریال کے بارے میں سوچتا رہا۔"

میں نے کافی کا ایک گھونٹ لے کر کہا۔ "پہلے فریال ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا...... پھر رابعہ آ گئی...... اس کا مسئلہ بہت سنگین صورت اختیار کر گیا ہے۔"

"شہناز نے بھی کہا تھا مجھ سے کہ رابعہ کچھ اکھڑی اکھڑی سی ہے...... میں نے کہا کہ ابھی دن ہی کتنے ہوئے ہیں اس کے ماں باپ کو بچھڑے ہوئے...... شہناز نے کہا کہ نہیں...... کوئی اور بات ہے۔"

"اس کا مطلب ہے...... اس نے شہناز کو بھی کچھ نہیں بتایا؟"

"کیا نہیں بتایا؟"

میں نے کہا۔ "فرخ کی وجہ سے وہ مشکل میں پڑ گئی ہے۔"

"کیا مطلب؟ خدانخواستہ......"

میں نے کہا۔ "ہاں...... شی از پریگننٹ۔"

راجا چونکا۔ "اچھا؟ کب سے...... میرا مطلب ہے کیا بعد میں بھی۔"

میں نے کہا۔ "بعد میں کچھ نہیں ہوا...... بعض اوقات ایک ہی غلطی بہت مہنگی پڑ جاتی ہے...... اور اگر دیکھا جائے تو اس حادثے کی ذمے داری مجھ پر ہی عائد ہوتی ہے۔ میں لے گیا تھا رابعہ کو فرخ سے ملوانے...... اس خیال سے کہ چلو دو محبت کرنے والے تھوڑا گھوم پھر لیں...... ہنسیں بولیں...... مجھے دونوں پر بھی اعتماد تھا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ فرخ اسے ورغلا کے اپنے ساتھ لے جائے گا...... اور وہ چلی جائے گی۔"

"یہ اس نے بتایا تجھے۔"

"ہاں......"

"شہناز کو کیوں نہیں بتایا...... وہ ڈاکٹر ہے۔"

میں نے کہا۔ "اس کا مجھ پر زیادہ اعتبار ہے کوئی بہن ہوتی رابعہ کی تو اسے شریکِ راز کرتی۔"

"پھر کیا مشورہ دیا تو نے اسے؟ وہ خود کیا چاہتی ہے؟ اگر فوراً ان کی شادی کر دی جائے......" راجا سوچتے ہوئے بولا۔

میں نے کہا۔ "شادی فوراً ہو سکتی تو مہینے دو مہینے کے فرق کو کسی نہ کسی طرح کور کیا جا سکتا تھا۔"

"کیوں؟ شادی میں کیا رکاوٹ ہے...... جب میاں بیوی راضی۔"

میں نے جیب سے فرخ کا خط نکال کے اس کی طرف بڑھا دیا۔ جتنی دیر وہ خط پڑھتا رہا میں کافی پیتا رہا اور اس کی صورت پر جذبات کے تغیرات کو دیکھتا رہا...... راجا کو وہ خط پڑھنے میں دو منٹ بھی نہیں لگے۔

اس کے منہ سے غصے میں بے اختیار گالیاں نکلیں...

میں نے کافی کا خالی مگ عوض کی دیوار پر اپنے قریب رکھ دیا...... راجا نے خط کو دوبارہ پڑھا اور فرخ کو مزید گالیاں دیں...... اس کا چہرہ غصے میں لال ہو رہا تھا۔

میں نے کہا۔ "کوئی فائدہ نہیں گالیاں دینے کا راجا۔"

"وہ بچ کر کہاں جائے گا؟"

میں نے کہا۔ "جہاں بھی جائے گا...... ابھی تو وار کر کے نکل گیا مگر راجا...... یہ جو اس نے لکھا ہے کہ میں اور بھی بہت کچھ لے کر جا رہا ہوں۔"

"ایک تو دس لاکھ کا چیک تھا...... بیرر چیک...... کل میں نے دستخط کر کے دیا تھا...... اس سے پہلے بھی گڑبڑ کی ہوگی اس نے...... بے شک جوائنٹ اکاؤنٹ سے وہ اپنے دستخط کر کے کچھ نہیں نکلوا سکتا تھا لیکن چیک بک اس کی دسترس میں تھی۔ وہ میرے یا تیرے...... فریال یا شہناز...... کسی کے بھی دستخط بنا سکتا تھا...... میرے دستخط سب سے آسان تھے۔"

"جو فراڈ کرنا چاہے وہ مشکل دستخط بھی کر لیتا ہے...... پھر بینک والے اسے جانتے ہیں...... کیش وہی لاتا ہے...... اس پر کسی کو شک بھی نہیں ہوگا۔"

راجا نے کہا۔ "ابھی بینک کھلے گا تو پتا چل جائے گا۔"

"دیکھنا پڑے گا کہ اور وہ کیا لے گیا۔"

راجا نے کہا۔ "ایسی کوئی چیز وہ نہیں لے گیا ہوگا جو اسے بازار میں فروخت کرنی پڑے۔ اس نے یہ رسک نہیں لیا ہوگا۔ میرا خیال ہے جس پلاننگ کی وہ بات کر رہا ہے...... اس کا تعلق روپوشی اور فرار سے ہوگا۔"

"یعنی ملک سے باہر نکل جائے گا۔"

"یار تو نے بھی تو یہی کیا تھا۔ فرخ کے ہاتھ میں پیسا ہے اسے مہلت بھی ملی انتظام کرنے کی۔ یورپ امریکا کا ویزا ملنا مشکل ضرور ہے...... ناممکن نہیں ہے...... لوگ کسی بھی کالج یونیورسٹی میں داخلہ لے کر نکل جاتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "ہاں...... وہاں بھی ایسے تعلیمی ادارے بہت ہیں جو پسماندہ ممالک میں خوب پبلسٹی کرتے ہیں لیکن درحقیقت صرف پیسے کماتے ہیں...... غیر ملکی طلبہ سے منہ مانگی فیسیں وصول کرتے ہیں اور ڈگری بھی جاری کر دیتے ہیں...... فرخ بھی ایسے ہی نکلا ہوگا اور وہاں پہنچ گیا تو پھر

غائب ہو جائے گا۔"

"غائب کون ہو سکتا ہے...... اسے بھی ہم تلاش کر لیں گے...... ہو سکتا ہے اس میں وقت لگے۔"

"وقت ہی کا سارا مسئلہ ہے راجا۔"

"رابعہ کو کھل کے بات کرنی چاہیے شہناز سے...... یہ ایسا کوئی مسئلہ نہیں۔"

میں نے کہا۔ "یہی تو پریشانی کی بات ہے راجا...... میں نے بھی اسے یہی مشورہ دیا تھا...... ڈھکے چھپے لفظوں میں واضح کر دیا تھا کہ پریشانی سے بچنے کا بس ایک ہی طریقہ ہے مگر وہ بگڑ گئی کہ ایسا میں ہرگز نہیں کروں گی۔"

"پھر کیا کرے گی؟"

"کہتی ہے اسے پالوں گی...... میرے سمجھانے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا...... مجھے فکر ہے اماں ابا کی...... ہم اگر حقیقت پسندی سے کام لیں تو رابعہ کی اس جذباتی کیفیت سے بھی سمجھوتا کر سکتے ہیں۔ وہ پرانے وقتوں کے لوگ کتنے دکھی ہوں گے...... ذلت، رسوائی برداشت کرنے کی ایک حد ہوتی ہے۔ ماں کیسے گئی۔ اس کے بعد بھائی کی بیوی اور پھر بھائی کا کیا انجام ہوا...... اب ان کی بیٹی کے بارے میں پتا چلے گا۔"

"یار ابھی سے مت فکر کر...... شہناز اسے سمجھا لے گی۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اسے ماننی ہوتی تو میری مان لیتی۔ وہ ضد پر اڑ گئی ہے کہ وہ یہ سب نہیں ہونے دے گی جو فرخ نے سوچا تھا۔"

راجا نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "گولی کڑوی ہو تو اس پر شوگر کوٹنگ کر دیتے ہیں...... لیکن بعض اوقات خود مریض اڑ جاتا ہے دوا نہیں کھاتا تو جو مخلص اور ہمدرد ہوتے ہیں وہ مجبور ہو جاتے ہیں کہ مرض کا علاج کرنے کے لیے دھوکے سے دوا کھلا دیں...... وہ جھوٹ اور سازش کے حربے اختیار کرتے ہیں...... کیونکہ بہتری اسی میں ہوتی ہے

میں نے اس غور سے دیکھا۔ "کیا تو کہہ رہا ہے۔"

"ہاں...... میں وہی کہہ رہا ہوں جو تو نے سمجھا ہے۔ ابھی کسی کے سامنے اس مسئلے کو چھیڑنے کی ضرورت ہی نہیں۔ سمجھ لے کہ جو رابعہ نے تجھے بتایا وہ تو نے مجھے نہیں بتایا...... تو اسے مکمل مورال سپورٹ دے...... یہ یقین دلا کہ تو پوری طرح اس کے ساتھ ہے اور تمام معاملات کو سنبھال سکتا ہے بس ابھی رابعہ خاموش رہے۔"

"اس سے کیا ہوگا؟"

"وہی جو ہونا چاہیے...... مسئلے کا حل...... شہناز بھی خاموشی سے سب کرے گی...... اس طرح کہ رابعہ کو شک بھی نہیں ہوگا۔"

"راجا...... یہ خطرناک بات ہوگی...... رابعہ بے وقوف نہیں ہے۔"

"ہم سب بھی بے وقوف نہیں ہیں...... رابعہ کی عقل کام نہیں کر رہی ہے لیکن ہمارا دماغ ٹھکانے پر ہے...... وہ اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنا چاہتی ہے اپنا مستقبل تباہ کرنا چاہتی ہے...... کیا ہم اسے کرنے دیں؟ ایک روگ پالنے دیں تمام عمر کے لیے...... چل اب اٹھ۔"

میں نے کہا۔ "راجا...... مجھ سے پوچھے بغیر شہناز کوئی قدم نہیں اٹھائے گی۔"

"اٹھائے گی ٹھیکے پتر...... وہ بھی بے وقوف نہیں ہے...... ذرمت۔"

لیکن ڈر میرے دل میں بیٹھ گیا تھا۔ راجا کی بات کا مطلب بہت واضح تھا کہ رابعہ کو پتا ہی نہیں چلے گا اور شہناز اسے کوئی دوا دے کر مسئلہ ختم کر دے گی۔ رابعہ اس ابارشن کو ایک قدرتی حادثہ سمجھے گی جیسا کہ ابتدائی ایام میں کسی بھی عورت کے ساتھ پیش آ سکتا ہے...... خصوصاً پہلی پریگننسی میں...... صدمہ ہر عورت کو ہوتا ہے مگر حادثہ قدرت کا فیصلہ لگے تو اسے برداشت کرنا اور بھلا دینا آسان ہو جاتا ہے اور احساس گناہ بھی پریشان نہیں کرتا۔

عقلی طور پر راجا کا فیصلہ درست تھا مگر اس کے دیگر اخلاقی مذہبی اور قانونی پہلو بھی تھے۔ میں سخت مشکل میں پڑ گیا کہ اسے قبول کروں یا نہ کروں...... خاموش رہ کے سازش میں شریک ہو جاؤں یا رابعہ کو خبردار کر کے خود کو الزام سے بچا لوں۔ دماغ اس اقدام کو نظریۂ ضرورت کا جواز فراہم کرتا تھا...... جھوٹ، سچ جائز و ناجائز سب اضافی مسئلے ہیں جن کا تعلق حالات سے ہے...... ناگزیر حالات میں حرام بھی حلال ہو جاتا ہے...... مگر یہ دلیل مجھے مطمئن کرنے کے لیے ناکافی تھی۔ میں نے بہتر سمجھا کہ فوری طور پر کچھ بھی نہ کروں...... کچھ کرنے سے پہلے اور سوچ لوں۔

راجا پوری کوششیں کرتا رہا کہ ماحول سے کشیدگی دور کرے...... فی الحال فریال کا حوالہ بھی نہ آئے۔ سلطان نے حویلی کے اندر بدمعاشی کا جو مظاہرہ کیا تھا اس کے بعد میرے والدین کے لیے فریال قطعی ناقابل قبول ہو چکی تھی لیکن وہ بھی وقتی طور پر مصلحت سے کام لے رہے تھے اور خاموش تھے۔ انہوں نے مجھ سے مطالبہ نہیں کیا کہ میں فوری طور پر فریال سے ہمیشہ کے لیے قطع تعلق کا اعلان کروں۔ ان کے سر کی قسم

کھا کے کہوں کہ میں آیندہ اس کا نام بھی نہیں لوں گا۔ وہ جانتے تھے کہ یہ میرے لیے کتنی بڑی آزمایش بن جائے گی..... شاید میں ایسا نہ کرسکوں..... چنانچہ انہوں نے بھی مجھے آزمایش میں نہیں ڈالا اور جھوٹی قسم کھانے سے بچالیا..... ہر جذباتی مسئلے کا حل صبر سکون اور تحمل کے ساتھ تلاش کرنا چاہیے..... وقت کے ساتھ حالات کو بدلنے کی کوشش جاری رکھنی چاہیے..... ایک دم کچھ بھی نہیں ہوتا..... سوائے خرابی کے..... یہی سوچ میری بھی تھی جیسے میرے والدین کو امید تھی کہ بالآخر وہ مجھ سے اپنی بات منوالیں گے ایسے ہی میں بھی توقع رکھتا تھا کہ بالآخر میں پھر انہیں قائل کرسکوں گا کہ میری پسند میں ضد کا کوئی پہلو نہیں اور فریال کے ساتھ میری زندگی کو سلطان کے ہاتھوں گزند پہنچنے کا کوئی امکان نہیں۔

شہناز زیادہ بولتی رہی۔ گردونواح کے دیہات کے رہنے والوں کو ''بچے دو ہی اچھے'' کی عملی افادیت سے قائل کرنا سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ ایک جگہ وہ بڑی مشکل میں پھنس گئی تھی..... کوئی مولوی صاحب اس سے مناظرے پر تل گئے تھے وہ بحث کرتی تو اندیشہ یہ تھا کہ جو تھوڑے بہت لوگ فیملی پلاننگ پر ایمان لائے تھے وہ بھی برگشتہ ہو جاتے۔ وہ مولانا تو حفاظتی ٹیکوں کے بھی خلاف تھے کہ بیماری اور موت منجانب اللہ ہے۔ بندہ اس کے خلاف کیا کرسکتا ہے جو تقدیر میں لکھا ہو..... پھر انہوں نے اس شک کا اظہار بھی کردیا کہ یہ سب امریکی ایجنڈا ہے۔ پولیو کے قطرے اور حفاظتی ٹیکے درحقیقت برتھ کنٹرول کے طریقے ہیں۔

فریال کی عدم موجودگی سب کو محسوس ہو رہی تھی۔ وہ تھی تو زندگی میں حرکت اور توانائی کا احساس پیدا ہوتا تھا۔ وہ میرے والدین کی خوشی اور دلچسپی۔ ضرورت اور موڈ کا خیال رکھتی تھی اور بیک وقت ہر جگہ نظر آتی تھی..... کبھی رابعہ کی دلجوئی میں مصروف تو کبھی حویلی کے اندر کچھ کرتی ہوئی..... حویلی کی صفائی..... تعمیر نو اور آرایش میں اس کی ان تھک محنت اور ذاتی توجہ کے ثبوت آج ہر قدم پر نظر آتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میرے والدین اس کی خوبیوں کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوئے تھے۔

اب وہ نہیں تھی تو اس کا خلا سب کو محسوس ہو رہا تھا یہ الگ بات تھی کہ اس ٹھہراؤ یا جمود کے دیگر اسباب بھی پیدا ہو گئے تھے۔ ایک طرف میں فریال کی دھمکی سے متفکر تھا تو دوسری طرف رابعہ کا مسئلہ میرے دماغ میں اٹک کے رہ گیا تھا۔ رابعہ کی خاموشی اور افسردگی کا اصل سبب مجھے معلوم تھا یا راجا کو مگر باقی سب لوگ اسے ماں باپ کی جدائی سے منسوب کرتے تھے۔ رابعہ کوشش کے باوجود اپنی فطری شوخی اور شگفتگی برقرار رکھنے میں ناکام تھی۔ خود میرے والدین پرسکون نظر آنے کی سعی لاحاصل میں مصروف تھے۔ حویلی میں جواب ہمارا گھر تھی سارا ماحول مصنوعی ہو گیا تھا۔

بالآخر شہناز اپنے روز کے کام کا بہانہ کر کے نکل گئی۔ وہ رابعہ کو بھی ساتھ لے جانا چاہتی تھی مگر اس نے انکار کردیا۔ گھر میں بہت کام ہیں۔ اس نے کہا..... میرے والدین بھی اپنے کمرے کے حصار میں خلوت نشیں ہو گئے۔ ابھی تک انہوں نے فرخ کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا راجا نے اور میں نے بھی موقع غنیمت جانا اور گاڑی لے کر نکل جانے کا فیصلہ کیا۔ فوری طور پر ہمارے لیے دو کام ضروری ہو گئے تھے۔ ایک فرخ کا سراغ لگانا اور یہ معلوم کرنا کہ وہ کتنی رقم خورد برد کر کے فرار ہوا ہے۔ دوسرے سلطان کے بارے میں معلومات حاصل کرنا کہ وہ پاکستان میں ہے تو کہاں ہے اور کہاں روپوش ہوگا..... یہ دوسرا کام کسی گمشدہ سوئی کا بھوسے کے ڈھیر میں سراغ لگانے سے زیادہ مشکل تھا لیکن راجا کے ذہن میں کوئی منصوبہ تھا جس کی کامیابی کا انحصار تعلقات کے ایک وسیع نیٹ ورک کی کارکردگی پر تھا۔

راجا پرانا صحافی تھا اور ملک بھر کے صحافیوں کی اکثریت اسے جانتی تھی۔ صحافی ایک بہت وسیع اور فعال برادری ہے کراچی لاہور یا اسلام آباد جیسے شہروں سے لے کر چھوٹے چھوٹے قصبوں تک صحافی ہر جگہ موجود تھے۔ تمام شہروں کے معتبر اور مستند اخباروں کی تعداد ہی سیکڑوں تک پہنچتی تھی ان کے علاوہ سیکڑوں ایوننگ پیپرز تھے۔ ایسے اخبار تھے جو کوئی نہیں پڑھتا تھا مگر وہ شائع ہوتے تھے۔ عرف عام میں انہیں چیتھڑے کہا جاتا تھا۔ اتنی ہی تعداد خبرناموں کی تھی۔ کوئی تاجروں کی نمائندگی کا دعوے دار تھا تو کوئی ٹرانسپورٹ کے شعبے کا۔ میں نے ایک ایسا ہفت روزہ بھی دیکھا جو پاکستان کے لاکھوں ہیئر ڈریسرز کی خبریں اور مسائل کی ترجمانی کرتا تھا۔ ممکن ہے ہر پیشے کے ایسے ہی خبرنامے ہوں۔ سماجی تنظیموں کے خبرنامے الگ تھے ہفت روزوں کے علاوہ پندرہ روزہ رسائل تھے جو سب صحافت کے علمبردار تھے۔ اگر چھوٹے قصبوں کے مقامی اخباروں کو شامل کیا جائے تو یقیناً ان سب کی مجموعی تعداد لاکھوں میں نہیں تو ہزاروں میں ضرور ہوگی۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ ''جنگ'' یا ''ڈان'' جیسے جغادری اخباروں کے ساتھ ''صدائے بینکار'' تک ہر جگہ کام کرنے والے خود کو عامل صحافی کہتے تھے۔ ان میں چیف ایڈیٹر سے لے کر رپورٹر تک لاکھوں افراد ''پریس'' کارڈ لیے پھرتے

تھے۔ ان کی عقابی نظریں ہر وقت ہر جگہ خبر کو شکار کرنے کے لیے سرگرداں تھیں اور ان سے کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی تھی خواہ وہ کسی قصبے کے کسی گلی کی کوئی واردات ہو یا کسی گاؤں کا قضیہ..... یہ صحافی پولیس سے زیادہ مستعد تھے اور ہر جگہ اندر تک اپنے حمایتی رکھتے تھے جو انہیں اندر کی ہر بات پہنچاتے تھے اور اسے وہ اپنی ناموری کے لیے پوری طرح کیش کراتے تھے۔

راجا اس صحافی فورس کا ایک بڑا نام تھا۔ جیسے لاکھوں کی پولیس فورس میں کسی شہر کا ایس پی پورے پاکستان کے ہر تھانے کی نفری سے کام لے سکتا ہے اور ہر پولیس چوکی تک پیغام پہنچا سکتا ہے ایسے ہی راجا ہر باخبر صحافی سے رابطہ کرسکتا تھا اور یہ سراغ رساں صحافی ہر گلی کوچے کی رپورٹ دے سکتے تھے۔ چنانچہ سلطان کا سراغ لگانا صبر آزما اور طویل تلاش کا مرحلہ ہوسکتا تھا مگر صحافی فورس کے نیٹ ورک سے نتائج ملنا یقینی تھا۔

جانے سے پہلے میں نے رابعہ کو سمجھا دیا کہ ہم کس مقصد سے جا رہے ہیں۔ ''تم ابھی کسی سے کوئی بات مت کرنا۔''

''کس معاملے میں؟''

''کسی بھی معاملے میں..... ہم شام تک واپس آجائیں گے..... فرخ کے پاس ایک چیک تھا دس لاکھ کا مگر اندیشہ یہ ہے کہ وہ اس سے بھی زیادہ سمیٹ کر لے گیا ہوگا۔ بینک سے پتا چلے گا۔''

''اب نہ تمہیں پیسا ملے گا نہ وہ ذلیل ڈاکو جس نے اپنے ہی گھر کو لوٹا..... وہ نکل گیا ہوگا کسی جہاز پر بیٹھ کے.....'' رابعہ نے نفرت کے زہر آلود لہجے میں کہا۔

میں نے کہا۔ ''پتا چل جائے گا۔''

باہر غنی گاڑی کے پاس کھڑا تھا۔ ''سر مجھے کچھ کہنا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''کہو۔''

''سر..... آپ برا مت مانیں..... آپ مالک ہیں اور تمام معاملات کو مجھ سے بہتر سمجھتے ہیں..... میں آپ کو کیا مشورہ دوں..... چھوٹا منہ بڑی بات۔''

میں نے کہا۔ ''عقل کی بات کوئی بھی کرسکتا ہے غنی۔''

اس نے کہا۔ ''جناب یہاں جو کچھ ہوا۔ کچھ لوگ اندر گھس آئے تھے دندناتے پھرے ہر جگہ..... اور پھر بچ کے نکل گئے۔ اتنا خوف و ہراس پھیلایا حویلی میں..... یہ سب اس لیے ہوا کہ ہمارے حفاظتی انتظامات کافی نہیں۔ یہ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا۔''

''تمہاری بات سو فیصد دُرست ہے..... تم بتاؤ اور کیا ہونا چاہیے؟''

وہ بولا۔ ''سر..... میں نے تو کہا تھا کہ آپ کی اجازت چاہیے۔ میں حویلی کو فوجی قلعہ بنا دوں۔ چاروں طرف توپیں لگوا دوں..... راکٹ لانچر لے آؤں۔''

میں نے کہا۔ ''غنی ہمیں گھر سے باہر بھی جانا ہوتا ہے۔''

''وہ ٹھیک ہے جناب..... لیکن حملہ گھر پر ہوا۔ اللہ نے بچایا فریال بی بی کو..... آپ کو اور بزرگوں کو۔''

''اللہ ہی بچانے والا ہے لیکن تم کیا کرنا چاہتے ہو؟''

وہ بولا۔ ''سر..... ایک تو گارڈ کم ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''دس آدمی ہیں..... پانچ دن میں ڈیوٹی دیتے ہیں پانچ رات میں۔''

''نہیں سر..... صحیح ڈیوٹی دینے والے صرف چار ہیں۔ ایک گیٹ پر رہتا ہے..... دوسرا پیچھے گشت کرتا ہے۔ اس گشت سے کوئی فائدہ نہیں وہ گن لیے ٹہلتا رہتا ہے..... ہر طرف کا خیال کیسے رکھ سکتا ہے۔ ایک راؤنڈ پورا کرے تو ڈیڑھ دو میل چلنا پڑتا ہے..... ایک گھنٹا ضرور لگتا ہے..... چاروں طرف کچا راستہ ہے اور جنگل ہے..... بارہ گھنٹے کی ڈیوٹی میں کوئی بارہ راؤنڈ کرے تو کم سے کم اٹھارہ میل چلنا پڑتا ہے چنانچہ وہ باری باری کام کرتے ہیں..... ایک پھرتا ہے باقی آرام کرتے ہیں۔''

میں نے تعریفی انداز میں کہا۔ ''یہ تو بالکل صحیح کہا تم نے..... کیا ہم گارڈز کی تعداد بڑھا دیں۔''

''صرف تعداد بڑھانے سے کیا فائدہ جناب..... گنوں کی ضرورت بھی ہوگی..... اس طرف دو ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''تمہارے خیال میں کتنی ہونی چاہئیں؟''

''کم سے کم پانچ سر..... اور ایسے گشت کرنے کا بھی فائدہ نہیں۔ چار گارڈ گن لے کر چھت کے چار کونوں پر ہوں۔ ہر طرف نظر رکھیں..... آس پاس سو گز کا علاقہ صاف ہونا چاہیے..... جھاڑیاں اور درخت کٹوا دیں۔ جو حویلی کی طرف رخ کرے صاف نظر آئے اور اسے روکا بھی جاسکے۔ رات کو اندھیرا ہوتا ہے..... چاروں کونوں پر دو سرچ لائٹس لگوائیں..... ان سے سارا علاقہ روشن ہو جائے گا۔ ایک کا رخ دائیں طرف دوسری کا بائیں طرف۔''

میں نے کہا۔ ''یہ سب کہاں دیکھا تم نے غنی..... تم تو ٹرک چلاتے تھے..... تم سکیورٹی کے انتظامات کے ماہر کی طرح بات کر رہے ہو۔''

وہ عاجزی سے مسکرایا..... ''سر جن لوگوں کے لیے میں کام کرتا رہا تھا..... جن کا مال اِدھر سے اُدھر لاتا تھا وہ اسمگلر

تھے...... افغانستان، ایران، انڈیا...... ہر بارڈر سے مال لانے لے جانے والے...... گھی، آٹے، چینی سے ہیروئن اور چرس...... کلاشنکوف سے مارٹر...... لائٹ مشین گن اور راکٹ لانچر...... سب اسمگل ہوتا ہے سرحدوں پر...... یہ سب کروڑ پتی ارب پتی لوگ کیسے رہتے ہیں یہ بھی دیکھا ہے میں نے...... خیبر ایجنسی میں آفریدی ہاؤس کے علاوہ دوسرے علاقوں میں ان کے محلات بالکل قلعے کی طرح ہیں۔"

میں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔ "تم تو بڑے کام کے آدمی ہو غنی۔"

وہ خوش ہوا۔ "بس آپ مجھے اجازت دیں سر...... یہ جو دس بندے تنخواہ پوری لے رہے ہیں اور ڈیوٹی کے نام پر مزے کر رہے ہیں ان کو میں ٹائٹ کرتا ہوں...... سب کو گن دے کر بٹھاتا ہوں چھت پر مورچہ بنا کے...... سب کے لیے اسلحے کی فراہمی میری ذمے داری۔"

میں نے کہا۔ "اس معاملے میں میری طرف سے تمہیں مکمل آزادی حاصل ہے غنی...... جیسے چاہو کرو...... آج سے تم سکیورٹی کے انچارج ہو...... جو چیز چاہو لے آؤ...... جتنے پیسوں کی ضرورت ہو گی تمہیں مل جائیں گے۔"

"ایک اور گزارش ہے میری سر...... آپ ایسے اکیلے مت پھریں...... اکبر خان کی فیملی آپ کے ساتھ بہت مخلص ہے...... آپ اکبر خان کو ساتھ رکھیں۔ گاڑی وہ چلائے اور اس کے پاس آپ کی حفاظت کے لیے اسلحہ ہونا چاہیے۔ میں صرف ایک ٹرک چلاتا تھا لیکن اسلحہ میرے پاس بھی ہوتا تھا اور مال لے کر روانہ ہونے سے پہلے میں اسے اچھی طرح چیک کرتا تھا اوپر نیچے سے...... کہ کہیں دشمن نے بم تو نہیں لگا دیا...... سفر میں کسی کو ٹرک کے قریب نہیں آنے دیتا تھا۔ یہ آپ کے ڈرائیور کی ذمے داری ہونی چاہیے۔

میں نے کہا۔ "میں سمجھ گیا آج تو میں راجا کے ساتھ جا رہا ہوں لیکن آئندہ سب ویسے ہی ہوگا جیسے تم چاہو گے۔"

راجا اب تک خاموش تھا مگر غنی کی بات دھیان سے سن رہا تھا اور توصیفی جذبات اس کے چہرے سے بھی عیاں تھے۔

اس نے کہا۔ "غنی...... تمہارے بارے میں ہم سب کی رائے بہت مختلف تھی ہمارا خیال تھا کہ تم ایک جاہل اجڈ ٹرک ڈرائیور کے سوا کچھ نہیں۔ جو نشہ کرتا ہے اور ایک بے وقوف کم عمر اور ناتجربہ کار لڑکی تمہارے جال میں پھنس گئی ہے...... وہ برباد ہو جائے گی۔"

وہ سر جھکا کے بولا۔ "نہیں جی...... ریشم سے مجھے محبت ہے...... آپ تو سب سمجھتے ہو...... ہم جیسے ٹرک ڈرائیوروں کی زندگی کیا ہوتی ہے۔ آج یہاں کل وہاں۔ ٹرک ہی اپنا گھر بن جاتا ہے...... راستے میں جہاں پڑاؤ آتا ہے وہاں بھی سب اپنے ہی جیسے لوگ ہوتے ہیں ہر قسم کا نشہ کرنے والے...... چرس سے شراب تک سب ایک ضرورت بن جاتی ہے۔ ہر قسم کی عورتیں بھی ان کی زندگی میں آتی جاتی رہتی ہیں...... پیسا بھی اچھا کما لیتے ہیں ہیرا پھیری میں۔"

"پھر یہ سب کیوں چھوڑ دیا تم نے...... صرف پانچ ہزار کے لیے؟"

"بس جناب...... لاکھوں جوڑ لیے تھے کہ اپنا ٹرک خریدوں گا مگر یہ کوئی اچھی زندگی نہیں تھی نہ عزت نہ سکون...... ہر وقت خوف مارے جانے کا...... جب ریشم ملی تو اس نے میرے دل میں گھر کا خیال پیدا کیا۔ آہستہ آہستہ ریشم کے ساتھ کسی گھر میں رہنا میرا خواب بن گیا جب آپ نے موقع دیا تو میں نے ریشم کے لیے سب کچھ چھوڑ دیا۔"

میں نے کہا۔ "آج سے تمہاری تنخواہ دگنی۔ اب دس ہزار تمہیں ملیں گے...... پانچ ریشم کو...... چاہو تو شادی کے بعد ہمارے ساتھ رہو...... ورنہ تمہارے الگ گھر کی ذمے داری میں نے پہلے ہی قبول کر لی ہے۔"

اس نے ہاتھ اُٹھا کے سلام کیا۔ "آپ کی مہربانی ہے جناب مگر ہم آپ کے ساتھ ہی خوش رہیں گے۔"

بعد میں جب ہم دینہ جا رہے تھے راجا نے کہا۔ "بعض اوقات انسان کی عقل اور نظر...... اس کا علم اور تجربہ کتنا ناقابلِ اعتبار ہو جاتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "اگر آدمی کے سارے اندازے درست ہونے لگیں تو خوش فہمی اسے...... نعوذ باللہ...... خدائی کے غرور میں مبتلا کر دے...... نہ وہ دھوکا کھائے اور نہ نقصان اٹھائے۔"

"اب ان دونوں کے معاملے کو لو...... فرخ پر سب نے کتنا اعتماد کیا اور اسے کتنی عزت دی۔ رابعہ کا تو یہ ہے کہ محبت نے اس کی آنکھوں پر جذبات کی پٹی باندھ رکھی تھی۔ لیکن ہم سب اس کے بارے میں کتنی اچھی رائے رکھتے تھے۔ اس کے برعکس ثابت ہوا وہ...... اور یہ غنی...... خاموش افیونی سا...... ڈھیلا ڈھالا اور بے وقوف نظر آنے والا...... ابھی اس کی بات نے مجھے حیران کر دیا۔"

میں نے کہا۔ "مجھے بھی...... ریشم واقعی خوش قسمت ہے رابعہ کے مقابلے میں...... حالانکہ محبت میں دھوکا کھانے کا امکان ریشم کے لیے زیادہ تھا رابعہ کے لیے کم تھا۔"

دینہ کا بینک منیجر ایک تعلیم یافتہ نوجوان تھا ہم نے اس

چھوٹے سے قصبے کی برانچ میں کروڑوں کا اکاؤنٹ کھول کے اس کے نصیب کھول دیے تھے۔ اسے ترقی مل گئی تھی اور انعام میں اچھا خاصا بونس بھی ملا تھا۔ اس لیے بڑی گرمجوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ ایک تو وہ میری نوابی سے متاثر تھا کیونکہ میں محض نام کا نواب نہیں تھا...... میری دولت مندی اور جاگیر بھی اس کا ثبوت تھی۔ پھر وہ ''ست بدھائی ترقیاتی فنڈ'' کے حوالے سے بھی مرعوب تھا۔ ہم نے اسے بتایا تھا کہ بعد میں ان منصوبوں کے لیے بین الاقوامی سرمایہ کاری کے امکانات بہت روشن تھے اور کروڑوں ڈالر لگانے والے اگر ان کی افادیت کے قائل ہو جاتے تو جاپان، کوریا سے بھی آسکتے تھے مڈل ایسٹ اور یورپ سے بھی......

''آپ بڑے وقت پر آئے نواب صاحب۔'' اس نے پُرجوش مصافحہ کرنے کے بعد کہا۔ ''تشریف رکھیے راجا صاحب۔''

ایک کرسی پر پہلے سے موجود سوٹ والے نوجوان نے خاصی دلچسپی سے نواب اور راجا کے خطابات رکھنے والوں کو دیکھا۔ لیکن اس دلچسپی میں غیر سنجیدگی کا عنصر نمایاں تھا۔

پھر بینک منیجر نے ہمارا تعارف کرایا۔ ''نواب صاحب یہ عارف خواجہ صاحب ہیں۔ اور خواجہ صاحب...... یہ نواب رفیق احمد شیرازی ہیں اور یہ ہیں نامور صحافی راجا۔''

خواجہ نے شائستگی سے ہاتھ ملا کے کہا۔ ''بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔''

بینک منیجر رسمی تعارف سے مطمئن ہو کے نہیں بیٹھا۔ اس نے پہلے خواجہ صاحب کو میرے اور ست بدھائی کے بیک گراؤنڈ سے آگاہ کیا پھر ست بدھائی ترقیاتی منصوبوں کی تفصیل دی۔ آہستہ آہستہ خواجہ متاثر نظر آنے لگا۔ جب اس نے راجا کے بارے میں بتانا چاہا تو خواجہ نے کہا۔ ''انہیں کون نہیں جانتا۔ آج کل یہ بڑے سنسنی خیز انکشافات والے کالم لکھ رہے ہیں۔''

راجا نے کہا۔ ''آپ کیا کرتے ہیں خواجہ صاحب۔''

خواجہ صاحب کے جواب دینے سے پہلے ہی منیجر بول پڑا۔ ''بڑی مشکل آسان کر دی ہے انہوں نے اس علاقے میں رہنے والوں کی...... دینہ سے آگے رہتاس اور ٹیلہ جوگیاں تک سیل فون سروس نہیں تھی...... رہتاس میں تھوڑے بہت سگنل موصول ہو جاتے تھے مگر آگے پرابلم تھی۔''

میں نے چونک کے کہا۔ ''آپ موبائل فون کا ٹاور نصیب کرا رہے ہیں ٹیلہ جوگیاں میں؟''

خواجہ مسکرایا۔ ''کرا رہے ہیں کیا نواب صاحب کرا چکے۔''

''یہ تو بڑی اچھی خبر ہے ہمارے لیے...... ہم سیلائٹ فون سے رابطہ رکھنے پر مجبور تھے۔'' میں نے کہا۔ ''کب لانچ ہوگی سروس؟''

''کل انشاء اللہ...... ایک چھوٹی سی تقریب کر رہے ہیں ہم...... ایک انعامی پیکیج بھی دیں گے پبلسٹی کے لیے...... مقامی لوگوں کو...... ایک موبائل فون شاپ والا بھی اسپانسر کر رہا ہے وہ ڈسکاؤنٹ دے گا۔''

منیجر نے کہا۔ ''آپ کی تشریف آوری سے پہلے یہ مجھ سے پوچھ رہے تھے کہ تقریب کا مہمان خصوصی کسے بنایا جائے۔ یہ مجھے مجبور کر رہے تھے لیکن آپ کے ہوتے میں یہ گستاخی کیسے کر سکتا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''آئی ایم سوری...... میں سیاسی آدمی نہیں ہوں۔''

''انہیں بھی غیر سیاسی شخصیت کی تلاش تھی۔ اس علاقے میں آپ سے بڑھ کر کون ہو سکتا ہے۔ بس اب طے ہو گیا کہ آپ ہوں گے مہمان خصوصی۔''

خواجہ نے بھی پرجوش لہجے میں کہا۔ ''دیکھیے نواب صاحب...... انکار مت کیجیے آخر یہ بھی تو ایک ترقیاتی منصوبہ ہی ہے۔ ترقی کے سفر میں ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ یہ تو درحقیقت پاکستان کی ترقی ہے۔'' وہ کسی اشتہاری مہم کے انداز میں بولنے لگا۔

میں ابھی شش و پنج میں ہی تھا کہ نیچے سے راجا نے میرا پاؤں دبایا۔ ''آپ کا جذبہ قابل قدر ہے خواجہ صاحب...... لیکن اس علاقے کی سب سے معزز شخصیت تو رانا رجب علی کو سمجھا جاتا ہے وہ اتنے بڑے زمیندار اور جدی پشتی سیاستداں ہیں۔''

خواجہ نے پہلو بدل کے کہا۔ ''جب تک نواب صاحب کے بارے میں معلوم نہیں تھا میرے سامنے رانا صاحب ہی تھے لیکن سچ یہ ہے کہ...... میں ان جدی پشتی قسم کے وڈیرے سیاستدانوں سے سخت نفرت کرتا ہوں جو اپنے علاقے میں کوئی ترقیاتی کام نہیں ہونے دیتے۔ ایک اسکول کھولتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں کہ بچے پڑھ لکھ گئے تو ان کی حاکمیت خطرے میں پڑ جائے گی۔''

بینک منیجر نے اتفاق رائے میں سر ہلایا۔ ''جو کچھ نواب صاحب کرنے کا سوچ رہے ہیں وہ تو حکومت کے پروگرام میں بھی شامل نہیں۔ میں آپ کو بتاؤں...... میں اسی علاقے کا رہنے والا ہوں...... رہتاس میں آج بھی ہمارے قریبی عزیز

رہتے ہیں مگر ہم جہلم آگئے ہیں۔ ایک زمانے میں دریائے کہار پر ڈیم بنانے کا منصوبہ منظور ہو گیا تھا...... اسمال ڈیم آرگنائزیشن اس علاقے میں آبپاشی اور بجلی پیدا کرنے کے لیے کہار کے پانی کو استعمال کرنا چاہتی تھی۔ میں نے سنا ہے اس منصوبے کو ختم کرانے میں رانا فیملی کا بڑا ہاتھ تھا۔''

خواجہ بولا۔ ''یہ لوگ اپنے علاقے کے لوگوں کو جو انہیں ووٹ دے کر اسمبلی میں پہنچاتے ہیں جدید زندگی کی ہر سہولت سے محروم رکھنا چاہتے ہیں۔ علاقے میں ترقی ہوگی تو تعلیم ہو گی۔ گھر گھر ٹی وی آیا تو لوگوں کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ شعور و آگہی پیدا ہو گی...... پھر وہ غلامی کہاں قبول کریں گے۔''

راجا نے کہا۔ ''چلیے طے ہو گیا...... نواب صاحب پوری طرح آپ کو سپورٹ کریں گے۔''

خواجہ اور بینک منیجر دونوں ہی شہروں کے رہنے والے اور جدید دور کی نمائندگی کرنے والے تعلیم یافتہ لوگ تھے جو ذرائع ابلاغ کی وسعت سے رونما ہونے والے ذہنی و فکری انقلاب کو ترقی کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ خواجہ کو بھی میری ریاست یا نوابی سے زیادہ اس بات نے متاثر کیا تھا کہ یورپ اور امریکا میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے اور شاندار مستقبل کی ضمانت رکھنے کے باوجود میں نے اس دور افتادہ اور پسماندہ علاقے میں رہائش کو ترجیح دی اور اب اس کی ترقی کے لیے کوشاں ہوں...... بہت سے پاکستانی نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ اپنے وطن کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتے ہیں مگر یہاں کا روایتی فیوڈل سسٹم...... بیورو کریسی اور رجعت پسند ملاؤں کا اتحاد ان کے خلاف سازش کا ایسا جال بچھاتا ہے کہ وہ جان چھڑا کے بھاگتے ہیں تو خدا کا شکر ادا کرتے ہیں اور آئندہ کے لیے حب الوطنی کے مقابلے میں غداری کو ترجیح دیتے ہیں...... غداری کا انعام تو ملتا ہے۔

خواجہ کے جانے کے بعد میں نے اپنی آمد کا اصل مدعا بیان کیا۔ ''کل آپ نے کوئی چیک وصول کیا تھا۔''

''یس...... مسٹر فرخ نے ایک چیک تو دس لاکھ کا پیش کیا تھا۔'' اس نے کسی کو بلانے کے لیے گھنٹی بجائی۔

''اور دوسرا؟'' میں نے کہا۔

''غالباً سترہ لاکھ پچاس ہزار...... میں دیکھتا ہوں۔''

کچھ دیر بعد دوسرا چیک ہم نے بھی دیکھ لیا۔ اس پر میرے دستخط بڑی مہارت سے کیے گئے تھے اور دو روز پہلے کی تاریخ تھی۔ یہ کوئی بہت پرانی بات نہیں تھی۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ آخری چیک میں نے ایک ہفتے پہلے جاری کیا تھا۔

اگر فرخ چیک پر میرے دستخط کر سکتا تھا تو باقی تین کے بھی کر سکتا تھا۔ سب سے مشکل اور پیچیدہ میرے ہی دستخط تھے۔

جب مکمل صورت حال ہمارے سامنے آئی تو اندازہ ہوا کہ ایک مہینے میں فرخ نے جعلی دستخطوں سے پچپن لاکھ نکلوائے تھے۔ یقیناً وہ اس سے زیادہ بھی نکلوا سکتا تھا مگر وہ محتاط تھا چیک بک فریال کے پاس رہتی تھی اور وہ روز چیک پھاڑ کے شک پیدا کرنا نہیں چاہتا ہوگا۔ ایک ماہ میں یہ رقم بھی بہت تھی مگر اتنی نہیں تھی کہ بینک منیجر ہمیں مطلع کرتا...... ایک ماہ پہلے ہی اس نے طے کیا ہوگا کہ اب اسے نکل جانا چاہیے ورنہ شادی کا پھندا اس کے گلے میں ڈال دیا جائے گا اور انکار ممکن نہیں ہوگا۔

بینک منیجر نے ہماری صورتوں سے اندازہ کر لیا کہ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ ''نواب صاحب...... آپ کچھ پریشان دکھائی دیتے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''جی...... دراصل کچھ رقم جعلی دستخط بنا کے نکال لی گئی ہے۔''

منیجر کا رنگ اُڑ گیا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے سر؟''

''یہ ہو گیا ہے منیجر صاحب۔'' راجا نے کہا۔ ''لیکن آپ پریشان نہ ہوں...... ہم آپ کے خلاف کوئی رپورٹ نہیں کریں گے۔ نہ پولیس کو اور نہ آپ کے ہیڈ آفس کو۔''

میں نے کہا۔ ''میں بھی سمجھتا ہوں قصور آپ کا یا عملے کے کسی فرد کا نہیں۔ دستخط اتنی مہارت سے بنائے گئے ہیں کہ خود میں اصل اور نقل میں تمیز نہیں کر سکتا...... چونکہ مجھے علم ہے کہ میں نے کتنی رقم کا چیک کب جاری کیا۔ راجا کو بھی معلوم ہے...... خواتین نے کوئی چیک نہیں لکھا۔''

منیجر نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''یہ کس نے کیا سر؟''

''ظاہر ہے اسی نے جو چیک لاتا تھا۔ فرخ ہمارے اندازے کے مطابق پچپن لاکھ کا غبن کر کے فرار ہو گیا۔'' راجا بولا۔

''فرار ہو گیا ہے...... کہاں؟'' منیجر کے ماتھے پر پسینا آگیا۔

میں نے کہا۔ ''ابھی کچھ معلوم نہیں۔''

''آپ اس کے خلاف رپورٹ کریں گے تو لپیٹ میں ہم ضرور آئیں گے۔'' وہ بولا۔

''ہم اس کے خلاف بھی کوئی قانونی کارروائی ضروری نہیں سمجھتے۔''

اسے کچھ اطمینان ہوا۔ ''لیکن سر...... یہ ہوا کیسے......

میرا مطلب ہے وہ تو آپ کا خاص آدمی تھا اور بہت سلجھا ہوا...... شریف صورت اور مہذب نو جوان تھا۔"

میں نے کہا۔"ہم نے اسے سمجھنے میں غلطی کی۔ اور اسی لیے محتاط بھی نہیں تھے۔ ورنہ چیک بک اس کے ہاتھ نہ لگتی۔ غنیمت ہے کہ وہ پچپن لاکھ ہی لے گیا یہ اتنی بڑی رقم نہیں۔"

منیجر بھونچکا رہ گیا۔"آپ کہہ رہے ہیں یہ بڑی رقم نہیں...... غبن تو ایک لاکھ کا بھی بہت سنگین جرم ہوتا ہے...... میری نوکری جائے نہ جائے مگر اس کیشیئر کی تو جا سکتی ہے جس نے دستخط پہچاننے میں غلطی کی۔ اب آیندہ کے لیے کیا حکم ہے سر؟"

میں نے راجا کی طرف دیکھا۔"میرا خیال ہے ایسا پھر نہیں ہوگا۔"

راجا نے کہا۔"پھر بھی...... آیندہ چیک پر ایک کے نہیں کم سے کم دو کے دستخط ہوں گے۔"

ہم پچپن لاکھ کو اس لحاظ سے بڑی رقم نہیں کہہ رہے تھے کہ یہ رقم ایک کروڑ بھی ہو سکتی تھی اور اس سے زیادہ بھی لیکن فرخ ڈر گیا اس کے لیے پچپن لاکھ بھی بہت بڑی رقم تھی اس نے باہر جانے کے لیے اس کے نصف سے بھی کم خرچ کیے ہوں گے، باقی وہ ڈالرز کی صورت میں ساتھ لے گیا ہوگا۔ پچاس ساٹھ ہزار ڈالر کے ساتھ امریکا یا کینیڈا اُترنے والے نوجوان کو کسی افسوسناک معاشی صورت حال کا سامنا نہیں ہو سکتا۔ اس کا مستقبل محفوظ ہوتا ہے۔

منیجر کے سامنے پریشانی کے اظہار سے کوئی فائدہ نہ تھا لیکن یہ اتنی بڑی رقم تھی کہ راجا کے اور میرے دل میں فرخ کے خلاف غصے کے جذبات کا آتش فشاں پھر بھڑک اٹھا تھا اس کا دوسرا جرم قطعی ناقابل معافی تھا۔ رابعہ سے دغا بازی کے مقابلے میں کسی مالی نقصان کی اہمیت نہ تھی لیکن اس کے یوں پیٹھ میں خنجر گھونپ کے فاتحانہ انداز میں نکل جانے کی اذیت بہت زیادہ تھی۔ قانونی کارروائی سے رسوائی اور جگ ہنسائی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوتا۔ ہم نے لاہور پہنچنے سے پہلے فرخ کا سراغ لگانے، اسے گرفتار کر کے واپس لانے اور درسِ عبرت بنانے کا فیصلہ متفقہ طور پر کر لیا تھا۔

ہم نے تین بجے لاہور میں کھانا کھایا۔ پھر راجا کے اور میرے راستے الگ ہو گئے۔ اس نے ایک واضح حکمت عملی مرتب کر لی تھی۔ اسے اپنی صحافی فورس کی بھرپور مدد سے پہلے معلوم کرنا تھا کہ فرخ کے نام سے کتنے لوگوں نے بیرون ملک سفر کیا ہے یا سفر کے لیے بکنگ حاصل کی ہے۔ اگر کی ہے تو کس ملک کے لیے اور کس فلائٹ سے۔ کس تاریخ کے لیے اور کون سے ایئر پورٹ سے۔ یہ تمام معلومات ویسے تو بکنگ یا فلائٹ انکوائری کے کمپیوٹرائزڈ نظام سے فوراً مل جاتی ہیں لیکن فرخ نے جس شاندار پلاننگ پر غرور کا اظہار کیا تھا اس سے بخوبی اندازہ ہو جاتا تھا کہ اس کا سراغ اتنی آسانی سے لگانا ممکن نہیں ہوگا۔ یہ عین ممکن تھا کہ وہ نام بدل کے سفر کرے۔ شناختی کارڈ والے لاکھ دعوے کریں کہ کمپیوٹر سے جاری کیے جانے والے کارڈ جعلی نہیں ہو سکتے...... عملی صورت حال اس کے برعکس یہ تھی کہ پیسا خرچ کر کے ایک نہیں دس شناختی کارڈ بنوائے جا سکتے تھے۔ غیر ملکی افغان برمی اور بنگلا دیشی یہاں غیر قانونی سکونت اختیار کرتے ہوئے نہ صرف یہ کہ شناختی کارڈ بنواتے تھے بلکہ پاسپورٹ بھی حاصل کر لیتے تھے۔ حج اور عمرے کرنے والوں میں سے کچھ پکڑے جاتے تھے تو جعلسازی کا انکشاف ہوتا تھا مگر اس سے فرق کچھ نہیں پڑتا تھا۔ جو پکڑا جائے وہی چور...... نہ پکڑے جانے والے آٹے کے برابر تھے تو پکڑے جانے والے نمک کے برابر۔

راجا کو دوسرا کام اپنی صحافی برادری کی جاسوس فورس سے یہ لینا تھا کہ سلطان کو تلاش کیا جائے اور محاورے کے مطابق ہر گلی، محلے، قصبے اور شہر کے کنوؤں میں ڈول ڈالے جائیں۔ ویسے تو پندرہ کروڑ کی آبادی میں ایک آدمی کو ڈھونڈنے کے مقابلے میں وہ انگوٹھی تلاش کرنا آسان ہوتا جو صحرائے اعظم کی ریت میں گم ہو جائے یا جہاز سے بحراوقیانوس میں جا گرے...... مگر وہ آدمی عام آدمی نہیں تھا اور گمنام نہیں تھا۔ اسے ہر جگہ خودنمائی کا شوق تھا اور وہ ہر جگہ اپنی موجودگی کے ثبوت اسی طرح چھوڑتا تھا جیسے میگنی ملاحظہ فرمائے کسی شاعر نے فیصلہ صادر کر دیا تھا کہ...... گیا ہے اونٹ کوئی اس طرف سے......

میں نے راجا سے پوچھا۔"تو اب کدھر جائے گا؟"

"ملا کی دوڑ مسجد تک...... اپنا ٹھکانا پریس کلب...... وہیں سے سرچ آپریشن کا آغاز کیا جا سکتا ہے...... تو جائے گا سیدھا کوئے لیلیٰ۔"

میں نے کہا۔"کسی مجنوں سے ایسا سوال کرنا ہی بے وقوفی ہے مگر دوست...... ڈر بہت لگ رہا ہے بہت غصے میں تھی وہ۔"

"درود شریف پڑھ کے پھر اور خودی کو بلند رکھ۔ کیا ہوگا زیادہ سے زیادہ جوتے مارے گی چار...... دیکھنے والا کوئی نہیں ہوگا۔"

میں نے کہا۔"ڈر یہ ہے کہ وہ نہار منہ توپ خانے لے کر سلطان کی سرکوبی کے لیے نہ نکل کھڑی ہوئی ہو۔ جیسا کہ اس

نے اعلان بھی کیا تھا۔"

راجا نے افسوس سے سر ہلایا۔"یہ عجیب عشق ہے۔ ایک کا عاشق دوڑ گیا پیسے لے کر...... دوسرے کی معشوقہ قابو میں نہیں...... اب ہمیں دیکھو...... کیسے پیچھے پیچھے پھرتی ہے۔"

"ہاں...... ڈنڈا لے کر پیچھے پھرتی ہے...... پیچھے ہی خطرہ ہے آپ کے لیے۔" میں نے کہا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ کوشش میں نے کئی بار کی تھی مگر صبح سے اب تک فریال سے فون پر میرا رابطہ نہیں ہو سکا تھا...... شاید وہ فون کے اسکرین پر میرا نمبر دیکھتی تھی تو ریسیور نہیں اٹھاتی تھی یا پھر وہ اس نمبر پر دستیاب ہی نہیں تھی۔ مجھے یہ خیال ڈراتا ضرور تھا کہ اپنے فطری پاگل پن کے باعث وہ لڑکی سچ مچ سلطان سے خود نمٹنے کے لیے نکل نہ کھڑی ہو لیکن عقل کو ایسا ہونا غیر عملی لگتا تھا کہ رات کو فریال مجھے دھمکی دے اور صبح اس پر عمل کر دکھانے کی نیت سے روانہ ہو جائے۔ سلطان کا پتا ٹھکانا تو کوئی تھا نہیں۔ اس پر بیوی کے قتل کا الزام تھا۔ چنانچہ گرفتاری سے بچنے کے لیے وہ بھاگا پھر رہا تھا...... کبھی لندن...... کبھی کراچی تو کبھی دبئی...... اس کے انتہائی قریبی اور معتمد خاص بھی یقین کے ساتھ نہیں بتا سکتے تھے کہ کس وقت وہ کہاں ملے گا...... اور سلطان پر یہ برا وقت اس کے امریکی شہریت رکھنے والے سالے کی وجہ سے آیا تھا جو بہن کے قتل کے وقت پاکستان میں موجود تھا اور اس کے قاتل بہنوئی کو قانون کی گرفت میں لانے کے لیے یہیں رُک گیا تھا...... وہ امریکن شہری نہ ہوتا تو اس کی بھی کوئی سنتا...... سلطان نے قتل پہلے بھی کیے تھے اور معاملات کو دبانے میں کامیاب رہا تھا۔

فاروقی کی بیوی نے سلطان کی کارروائی کے پیش نظر اسے اپنے گھر سے بھی کسی نامعلوم جگہ پر منتقل کر دیا تھا۔ سلطان کا بھروسا نہیں تھا کہ ست بدھائی میں ناکامی کے بعد لاہور میں فاروقی کے گھر کا رُخ کرے۔ صرف ایک سیکورٹی گارڈ اس کی قاتل فورس کے حملے کو نہیں روک سکتا تھا۔ سلطان کو اس کے مخبروں نے یہ اطلاع تو پہلے ہی فراہم کر دی ہوگی کہ فریال جب لاہور میں ہوتی ہے تو کہاں پائی جاتی ہے۔

سیکورٹی گارڈ نے مجھے نہیں روکا لیکن مجھے داخلے کے راستے پر ایک تبدیلی نظر آئی۔ پہلے آنے جانے کے لیے بڑے گیٹ میں بنایا ہوا چھوٹا گیٹ کھول دیا جاتا تھا۔ اس میں الیکٹرانک ڈور لاک تھا جس کا کنٹرول اندر انٹر کام سے تھا۔ یہ انتظام تقریباً ہر گھر میں نظر آتا تھا لیکن آج مجھے دوسرے چھوٹے دروازے سے اندر جانا پڑا۔ یہ تین فٹ چوڑا گیٹ اس آٹھ فٹ چوڑے گیٹ کے ساتھ ہی تھا جس کو صرف گاڑی گزارنے کے لیے کھولا جاتا تھا۔

چھوٹے گیٹ کو اندر سے اس وقت کھولا گیا جب باہر سے گارڈ نے کلیئرنس دیا۔ اس گیٹ سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ گیٹ کے دونوں پلر آپس میں ملا دیے گئے ہیں۔ اضافہ گیٹ کی چوڑائی کے برابر ایک فولادی پٹی کا تھا جو شاید چار انچ موٹی تھی۔ اسے لگانے کے لیے دونوں طرف کے پلر کاٹے گئے تھے اور پٹی کو درمیان میں پہنچانے کے بعد کھدی ہوئی جگہ کو سیمنٹ بھر کے برابر کر دیا گیا تھا۔ اگر اس پر پلر جیسا رنگ ہو جاتا تو کسی کا فرق کو احساس بھی نہ ہوتا۔ خصوصاً نئے آنے والے کو۔ مجھے معلوم تھا کہ وہاں تین پلر ہیں۔ دو نے بڑے فولادی گیٹ کو سپورٹ کیا ہے اور تیسرے سے چھوٹا گیٹ لگا ہوا ہے۔ اس کی کنڈی درمیان والے پلر میں تھی۔ اس کے اوپر کچھ بھی نہیں تھا جیسے بڑے گیٹ پر کچھ نہیں تھا۔

میں سمجھ گیا کہ اوپر الیکٹرانک ہکیٹر لگایا گیا ہے۔ جو بھی اس کے نیچے سے گزرے گا اس کی تصویر خود بخود ایک انفراریڈ کیمرے کے ذریعے ریکارڈ ہو جائے گی۔ بڑے گیٹ سے اب صرف فاروقی کی گاڑی گزر کے اندر جا سکتی تھی۔ باقی سب کے لیے لازمی تھا کہ گاڑی باہر پارک کریں اور پھر چھوٹے گیٹ سے گزر کے اندر جائیں۔ یہ حفاظتی انتظام ہر اہم مقام پر سیکورٹی سسٹم کا حصہ ہے جہاں آنے جانے والوں پر نظر رکھنا ضروری ہو۔ فاروقی کو پہلے کبھی کسی سے خطرہ محسوس نہیں ہوا تھا۔ وہ کارپوریٹ سیکٹر کا وکیل تھا اور اس کا دشمن کوئی نہیں تھا۔ اس جیسے بے فکرے، خوش باش اور حال مست شخص کا دشمن ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

یہ مجھ سے دوستی کا شاخسانہ تھا کہ اس کا گھر بھی غیر محفوظ ہو چکا تھا۔ اگر وہ اس حد تک دوست دار اور مخلص نہ ہوتا تو مجھ سے صاف کہہ دیتا کہ نواب صاحب، میں باز آیا محبت سے، اُٹھاؤ پاندان اپنا لیکن قانونی معاملات سے شروع ہونے والا تعلق دیکھتے دیکھتے دوستی کے اتنے مضبوط رشتے کی شکل اختیار کر گیا تھا کہ وہ میاں بیوی میرے گھر اور خاندان کا حصہ بن گئے تھے اور اس کے گھر کو لاہور میں ہمارے دوسرے گھر کی حیثیت حاصل ہو چکی تھی جہاں ہم خود کو محفوظ تصور کرتے تھے۔

لیلیٰ بھابی کو میری تشریف آوری کی خبر مل چکی تھی اور جب میں اندر پہنچا تو وہ کچن سے برآمد ہوئی تھی اور اس کے ہاتھ میں چمٹا تھا جو اس نے کسی ہتھیار کی طرح اٹھا رکھا تھا۔ وہ کمر پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی اور صاف نظر آتا تھا کہ اس کے

تیور جارحانہ ہیں۔

میں نے چونکنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ ''ارے لیلیٰ بھابی! یہ آپ ہیں۔ کمال ہے میں فکر میں پڑ گیا تھا کہ کون لڑکی ہے۔''

''کیا مطلب؟ تمہاری نظر خراب ہوگئی ہے یا میرے سینگ نکل آئے ہیں دیور جی۔''

''نہیں، وہ دراصل...... یہ کپڑے جو آپ نے آج پہنے ہیں ان میں آپ بالکل اس کی طرح لگ رہی ہیں۔ کیا نام ہے اس کا۔ ہاں ریما...... دراصل ایک اشتہار میں وہ بالکل ایسی ہی نظر آتی ہے۔''

لیلیٰ بھابی عورت کی روایتی کمزوری سے مار کھا گئی۔

''کون سے اشتہار میں؟'' وہ غصہ بھول کے بولی۔

''ہے ایک صابن کا اشتہار۔ لاحول ولاقوۃ۔''

''اب لاحول کس پر بھیج رہی ہو۔''

''خود پر بھابی۔ میرے دل میں کیسا غلط اور منحوس خیال آیا تھا۔ میں سمجھا فاروقی نے اس سے شادی کر لی۔ دوسری کے چکر میں تو وہ فرار ہوا ہے۔''

وہ کچھ پریشان ہوئی مگر چمٹا اٹھا کے بولی۔ ''ریما سے کرے گا وہ دوسری شادی۔ ریما پر اتنا برا وقت بھی نہیں آیا ہے ابھی۔''

''ارے نہیں بھابی، کوئی اور ہے ریما جیسی۔'' میں نے اس کے ساتھ ہنستے ہوئے کہا۔ ''آج کل اسے سیکریٹری رکھنے کے چکر میں ہے۔ وہ کیا کہتے ہیں رسم دنیا ہے موقع بھی ہے دستور بھی ہے۔ اس کی سیکریٹری بڑی اچھی تھی۔ بہت شریف عورت تھی مگر اب وہ جا رہی ہے۔''

''کہاں جا رہی ہے؟'' لیلیٰ بھابی تشویش میں مبتلا ہوگئی۔

''پیا گھر اور کہاں۔ شادی ہو رہی ہے اس کی۔ فاروقی نے بتایا نہیں آپ کو۔ سیکریٹری کے بغیر گزارا بھی نہیں ہوتا اس کا۔ آخر آپ کیوں نہ سنبھال لیتیں یہ ذمے داری؟ صلاحیت بھی ہے آپ میں۔ ایک مصروفیت بھی مل جائے گی آپ کو مگر مجھے چائے ملے گی؟''

وہ نہ جانے کیا سوچ رہی تھی کہ چونکی۔ ''چائے ہاں، کیوں نہیں۔ تم بیٹھو میں لاتی ہوں۔''

وہ کافی لے کر آئی تو میں ایک اخبار دیکھ رہا تھا جس میں جعلی کرنسی ملنے کی خبر پوری تفصیلات کے ساتھ موجود تھی۔ یہ تفصیلات پولیس نے بڑی ہوشیاری سے گھڑ کے اخبار والوں کو فراہم کی تھیں۔ ان کے مطابق جعلی کرنسی کے بارے میں یہ افواہ غلط تھی کہ ہزار ہزار کے جعلی نوٹوں سے بھرا ہوا سوٹ کیس کچھ دیہاتیوں نے جنگل میں دریافت کیا تھا۔ ''حقیقت'' یہ تھی کہ پولیس نے مستند ذرائع سے ملنے والی اطلاعات پر کارروائی کی اور جعلی کرنسی چھاپنے والوں کے ایک گروہ کے ٹھکانے پر چھاپا مارا۔ اس کارروائی میں پولیس نے ایک کروڑ چالیس لاکھ ستر ہزار مالیت کی کرنسی کے علاوہ نوٹ بنانے کی مشین، مخصوص کاغذ اور سیاہی، ڈائز اور کیمیکل وغیرہ بھی برآمد کیے تاہم مجرم فرار ہونے میں کامیاب رہے۔ پولیس سرگرمی سے تفتیش کر رہی ہے۔ خبر کے ساتھ ضبط شدہ کرنسی اور جعلی کرنسی چھاپنے میں کام آنے والی تمام چیزوں کی تصویر لی تھی۔

یہ پولیس کا خاص اسٹائل تھا۔ وہ کسی بھی واقعے کو اپنی کارروائی بتا کے کامیابی کا پورا کریڈٹ لینے میں مہارت رکھتے تھے۔ مشکوک افراد کی گرفتاری کو پبلک کے سامنے پیش کرنے کے لیے وہ صحافیوں کی خدمات حاصل کرتے تھے۔ ملزمان کو پریس کانفرنس میں پیش کرتے وقت وہ ان سے ''برآمد'' ہونے والا سارا اسلحہ بڑی خوبصورتی سے سجاتے تھے۔ چوری ڈکیتی کی بے شمار وارداتوں کو ان سے منسوب کر دیتے تھے اور تعریفی اسناد کے ساتھ اعلیٰ افسران سے ترقی بھی حاصل کر لیتے تھے۔ بعد میں کون یاد رکھتا تھا کہ وہ ڈراما جھوٹا تھا۔ ہر قسم کا اسلحہ، چرس اور ہیروئن کے بیگ، مال مسروقہ معہ کرنسی، ان کے اسٹور یا مال خانے میں ہر وقت موجود ہوتا تھا کہ سند رہے اور بوقت ضرورت کام آتے۔ اب انہوں نے جعلی نوٹ چھاپنے کے ساز و سامان کی تصاویر بھی جاری کر دی تھیں تو خبر مستند ہوگئی تھی۔ یہ کون چیلنج کر سکتا تھا کہ یہ پہلے بھی جاری کی جانے والی تصویر نہیں ہے۔

دو کروڑ میں سے پولیس نے تقریباً ساٹھ لاکھ غائب کیے تھے۔ انہوں نے جائے واردات کو شرق سے مغرب میں کئی سو کلومیٹر دور دکھا دیا تھا اور پولیس کی وردی میں مارے جانے والوں کے کیس کو جعلی کرنسی کے کیس سے بالکل الگ کر دیا تھا۔ جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے۔ حقائق جاننے والے سر پیٹنے کے سوا کیا کر سکتے تھے۔

لیلیٰ بھابی نے کہا۔ ''ایسی کیا خبر مل گئی ہے کہ کافی کو بھول گئے ہو۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔''

میں نے اخبار ایک طرف رکھ دیا۔ ''بڑی دردناک خبر ہے۔ رانی مکرجی شادی کر رہی ہے امیتابھ کے بیٹے سے۔ اب وہ میرے خوابوں میں کیسے آئے گی۔''

بھابی کے چہرے پر مسکراہٹ تک نہیں آئی۔ ''ان کی جو سیکریٹری تھی کب ہو رہی ہے اس کی شادی؟''

میں سمجھ گیا کہ میری بات بھابی کے دل میں کانٹے کی طرح چبھ گئی ہے۔ ''بھابی! میں رانی مکرجی کی شادی کی بات کر رہا تھا۔''

''بکومت! اس نئی سیکریٹری کو دیکھا ہے تم نے۔''

مجھے ہنسی آ گئی۔ ''معاف کرنا بھابی! وہ سب بکواس کی تھی میں نے۔ جھوٹ بولا تھا آپ کے غصے کے سیلاب کا رُخ دوسری طرف موڑنے کے لیے۔''

وہ خفت سے مسکرائی مگر اس کے چہرے پر اطمینان کی کیفیت آ گئی۔ ''بہت بدمعاش ہو دیور جی۔ میں واقعی بہت غصے میں تھی۔''

میں نے کہا۔ ''ایک فلمی گانا عرض ہے۔ پیاری بھابی، بھابی بہن تو میری ماں ہے۔ مجھے فریال سے ملوا دو ماں۔ نہیں تو میں تڑپ کے جان دے دوں گا تمہارے قدموں میں۔''

میں نے رقت کے ساتھ یہ ڈائیلاگ بولتے ہوئے بڑی دردناک اداکاری بھی کی تھی مگر لیلیٰ بھابی نے نوٹس نہیں لیا۔ ''فریال کو بھول جاؤ فی الحال۔''

''یہ ناممکن ہے۔ اتنی کٹھور مت بنو بھابی۔''

''ڈرامے سے کچھ نہیں ہوگا۔ تمہاری ہماری اور سب کی بھلائی اسی میں ہے۔ جو کچھ حویلی میں گھس کے سلطان نے کیا۔ کیا وہ کافی نہیں ہے تمہاری آنکھیں کھولنے کے لیے۔ اپنے ماں باپ پر کچھ رحم کرو...... ان کی زندگی کا سوال ہے۔''

''یہ میری زندگی کا سوال ہے۔''

''پھر؟ تم ان کی زندگی کو قربان کر دو گے اپنی زندگی پر۔ ایسے ہی ہوتے ہیں اچھے بیٹے۔'' وہ تلخی سے بولی۔

''آپ زیادتی کر رہی ہیں۔ جو بھی سلطان نے کیا اس کی ذمے دار فریال ہے۔'' میں نے کہا۔

''جتنی وہ ذمے دار ہے اتنے ہی تم بھی ہو۔'' لیلیٰ بھابی کا وہ سارا غصہ پھر لوٹ آیا تھا جسے میں نے وقتی طور پر دبا دیا تھا۔ ''ان حالات میں تم فریال سے شادی کا سوچ بھی کیسے سکتے ہو۔ جب تک یہ فیصلہ نہ ہو جائے کہ ایسا کرنا سلطان کی دشمنی کی آگ پر تیل ڈالنے کے مترادف ہوگا۔''

میں نے کہا۔ ''بالکل ٹھیک کہا آپ نے مگر ابھی میں شادی کا بالکل نہیں سوچ رہا ہوں۔ مجھے پریشانی لاحق ہے فریال کی طرف سے۔ معلوم ہے کل رات اس نے مجھ سے کیا کہا۔''

''معلوم ہے۔ صبح اس نے بتا دیا تھا مجھے۔''

''وہ پاگل ہوگئی ہے۔ خود جا کر سلطان سے نمٹنے کا سوچ رہی ہے۔ اسے قتل کرنے کی بات کر رہی تھی۔''

''جب تم کچھ نہیں کرو گے تو وہ کب تک انتظار کرے گی۔ اس کی حیثیت تو رسہ کشی کے رسے جیسی ہوگئی۔ ایک طرف سے تم کھینچ رہے ہو۔ دوسری طرف سے سلطان زور لگا رہا ہے۔''

''سلطان کا قضیہ میں نمٹا دوں گا مگر پہلے اسے تو سمجھا دوں کہ کوئی بے وقوفی کی حرکت نہ کرے۔''

''اسے سمجھا دیا ہے میں نے۔ تم فکر مت کرو۔ وہ کچھ نہیں کرے گی مگر ابھی تک اس سے نہیں مل سکتے۔''

''میرے ملنے میں کیا ہے؟''

''خطرہ ہے اور کیا ہے۔'' وہ جھلا کے بولی۔ ''بڑی مشکل سے میں نے اسے ایک ایسی جگہ رکھا ہے جہاں وہ محفوظ ہے۔ اس کے اور تمہارے دشمن وہاں نہیں پہنچ سکتے لیکن تم جاؤ گے تو وہ تمہارا پیچھا کرتے ہوئے پہنچ جائیں گے۔ نا بابا، میں یہ رسک نہیں لے سکتی۔ میرے میاں نے بھی سختی سے منع کیا ہے مجھے۔''

''اس اُلو کے پٹھے سے تو نمٹ لوں گا میں۔''

''ہاں نمٹ لو پہلے۔ اس سے پوچھ لو فریال کا پتا؟''

میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''دیکھو بھابی! جانتا ہوں کہ فریال کی وجہ سے جو کچھ حویلی میں ہوا واقعی بہت برا ہوا مگر اس سے میرے والدین کی وہ رائے تو نہیں بدلنی چاہیے جس کا اظہار انہوں نے چند دن پہلے کیا تھا۔ اگر فریال اچھی ہے تو اچھی ہے۔''

''ایک مینگنی پڑ جائے دودھ اور شہد کے تالاب میں تو کون پیے گا اس میں سے ایک گھونٹ بھی۔''

''غلط مثال دی ہے آپ نے۔ فریال کی ذات میں کوئی عیب نہیں۔ اگر مسئلہ ہے سلطان کا تو اس کو حل کیا جا سکتا ہے۔''

''کب اور کیسے؟''

''اگر سلطان کا جھگڑا ختم ہو جائے پھر تو کسی کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ یہ میرا وعدہ ہے کہ اس سے پہلے شادی کا نام بھی نہیں لوں گا۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ فریال کو برا نہ سمجھا جائے۔ وہ جیسی کل تھی ویسی ہی آج بھی ہے۔ اسے حویلی میں رہنا چاہیے پہلے کی طرح۔''

''یہ کیا بے وقوفی کی بات ہے۔''

''نہیں بھابی! ذرا ٹھنڈے دماغ سے سوچیں۔ اگر یہ برا ہوا تو اس میں ایک اچھائی کا پہلو بھی ہے۔ پہلے سلطان کے مخبر آئے تھے۔ انہوں نے رپورٹ دی کہ فریال یہاں

نہیں ہے۔ اب سلطان خود آیا۔ اگر فریال وہاں ہوتی یا میں ہوتا تو کیا ہوتا۔ کیا وہ فریال کو لے جاتا؟ نہیں، وہ مارا جاتا یا میں لیکن ہماری خوش قسمتی کہ ہم اندر نہیں تھے۔ سلطان نے ہر طرح اپنا اطمینان کر لیا کہ فریال حویلی میں نہ تھی نہ ہے۔ اس نے لوگوں سے پوچھا۔ پوری تصدیق تفتیش کی اور اندر والوں نے جیسے بھی اس سے نمٹا مگر اسے یقین دلا دیا کہ فریال کبھی حویلی میں نہیں آئی۔ وہ مطمئن ہو کر واپس چلا گیا۔ اب دوبارہ وہ اِدھر کا رُخ نہیں کرے گا۔ وہ فریال کو تلاش ضرور کرے گا مگر کہیں اور۔''

''اور اسے پھر بھی شک ہو گیا۔''

میں نے کہا۔ ''ایک بار وہ اس کے اندر پہنچ گیا اور زندہ سلامت واپس بھی چلا گیا کہ ہمارے حفاظتی انتظامات کمزور تھے اور اس نے بے خبری میں دھاوا بول دیا تھا۔ دوبارہ آ کے دیکھے۔ کتے کی موت مارا جائے گا خواہ پورا لشکر لے کر آئے۔''

''تم کچھ بھی کہو، اپنے میاں کی مرضی کے بغیر میں فریال کا پتا نہیں بتا سکتی۔''

''اچھا فون پر بات کرا دو۔''

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''اس نے غصے میں تار الگ کر دیا تھا۔ تم فون کرو گے تو ایسا لگے گا کہ گھنٹی بج رہی ہے مگر وہ ریسیور نہیں اٹھا رہی ہے۔ اور غصہ آئے گا تمہیں۔''

''آخر اور لوگ بھی تو ہوں گے گھر میں۔ اس نے فون کیسے بند کر دیا۔''

''وہ گھر کی انیکسی ہے۔ مہمان خانہ سمجھ لو۔ دو بیڈ روم، کچن باتھ۔ فون بھی الگ ہے۔ کوٹھی کے عقبی حصے میں وہ جگہ بہت محفوظ ہے۔ ایک بات اور بتا دوں میری سہیلی کا شوہر پولیس کا اعلیٰ افسر ہے۔ پرندہ پر نہیں مار سکتا وہاں اجازت کے بغیر۔''

''میں پرندہ نہیں ہوں۔ دو ٹانگوں والا جانور ہوں۔'' میں نے بھنا کے کہا۔

''تو کیا تم ٹانگ مارو گے پر کے بجائے۔'' وہ ہنسی۔

میرے لیے صورتِ حال بڑی مایوس کن تھی۔ میں ان سب سے لڑ بھی نہیں سکتا تھا جو میرے خیر خواہ تھے۔ میں نے فون پر راجا سے بات کی مگر اسے ابھی تک اپنے مقصد میں کوئی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ اتنی جلدی کسی کامیابی کی توقع رکھنا بھی غلط تھا۔ میں نے سوچا کہ فاروقی سے اس کے آفس میں ملاقات کروں مگر یہ وقت اس کے لیے بڑی مصروفیت کا ہوتا تھا۔ اس کے کلائنٹس اپنے اپنے قانونی مسائل لے کر آتے تھے۔ وہ مجھ سے فریال کے معاملے پر ہرگز بات نہ کرتا۔ میں گاڑی لے کر نکلا تو اپنے پرانے محلے گیا۔ وہاں میرا اجلا ہوا گھر ایک کھنڈر کی صورت میں موجود تھا اور زبانِ حال سے کہتا تھا۔ دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو۔

گھر کے سامنے والی دیواریں سلامت کھڑی تھیں لیکن آگ کی حدت سے تڑخ گئی تھیں۔ پلاسٹر جگہ جگہ سے اکھڑ گیا تھا اور اس پر مکڑی کے جالے جیسی لکیریں پھیلی ہوئی تھیں۔ دھوئیں کی سیاہی دیواروں کے اصل رنگ پر غالب آ گئی تھی۔ دیواروں اور کھڑکیوں کی جگہ محض خلا رہ گیا تھا۔ مجموعی طور پر عمارت اپنے اصل نقشے کے ساتھ برقرار تھی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی تعمیر چالیس سال پہلے اچھے وقتوں میں ہوئی تھی جب ٹھیکے دار سرکاری عمارتوں میں بھی مضبوطی کا خیال رکھتے تھے اور کام کی نگرانی کرنے والے افسر بھی دیکھتے تھے کہ تعمیر طے شدہ معیار کے مطابق کی جا رہی ہے یا نہیں۔ کماتے وہ بھی تھے لیکن ایک حد میں رہ کے۔ آج کی طرح نہیں تھا کہ سیمنٹ کی جگہ ریت اور کم سے کم سریا ڈال کے عمارت کھڑی کر دو، پیسے وصول کرو اور بھاگ لو۔ بعد میں کچھ بھی ہو اپنی بلا سے۔ نتیجہ یہ کہ قومی اسمبلی کی چھت ٹپکتی ہے۔ سپریم کورٹ کی عمارت میں دراڑیں نمودار ہو جاتی ہیں۔ پل بہہ جاتے ہیں ایک ہی بارش میں اور سڑکیں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتی ہیں لیکن ذمے داروں سے کوئی نہیں پوچھتا۔ اول تو ذمے داری کا تعین نہیں ہوتا اور ہو تو وہ ہاتھ نہیں آتے۔

میرے آس پاس کے سارے گھر جس ٹھیکے دار نے تعمیر کیے تھے وہ آج بھی موجود تھا۔ پہلے وہ مکان بناتا تھا۔ اب سڑکوں، پلوں اور سرکاری تعمیرات کے ٹھیکے لیتا تھا اور دولت مندی کے بل پر سینیٹ میں پہنچ گیا تھا چنانچہ اس کی گرفت نہ تھی۔ میں حیران ہوتا تھا کہ یہ کیسی ترقی ہے۔ جیسے جیسے دولت آتی ہے آدمی کی ہوس بڑھتی جاتی ہے اور وہ زیادہ سے زیادہ بے ایمان ہوتا جاتا ہے۔ مکان بنانے والے ٹھیکے دار، تاجر، صنعت کار سب نیک نامی یا گڈول بنانے کے لیے پہلے محنت کرتے ہیں۔ کامیاب ہوتے ہیں تو خود تو بہت دولت مند ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد کیا رہ جاتا ہے جس کے لیے بے ایمانی کا راستہ اختیار کریں مگر پھر وہ محنت کیے بغیر ناجائز ذرائع، رشوت، بے ایمانی اور فراڈ سے دولت کے ذخیرے پہاڑی اور پہاڑی کو پہاڑ بنانے میں آخرت، خوفِ خدا اور انسانیت سب کو بھول جاتے ہیں۔ رشوت لینے، غبن کرنے، قرضے معاف کرانے اور ناجائز یا غیر اخلاقی راستوں سے

ایک کمپنی سے گروپ اور نیشنل سے ملٹی نیشنل کاروبار کی طرف بڑھتے وقت پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتے کہ وہ جو ہم میں تھوڑی بہت شرافت اور ایمانداری تھی جو ہماری کامیابی کی بنیاد بنی تھی وہ کہاں گئی؟

گھر کے جلے ہوئے سامان کے درمیان ایک کمرے سے دوسرے میں جاتے ہوئے وقت کی بہت سی یادوں نے میرے دل میں درد جگایا۔ کہاں کیا تھا جواب نہیں ہے۔ کچھ جل کے خاک ہو گیا تھا۔ کچھ ناکارہ ہو گیا تھا مگر لوٹنے والے اسے بھی لے گئے تھے۔ یہ میرے باپ کی خون پسینے کی کمائی سے بنا ہوا گھر تھا۔ وہ پورا مہینا بچوں کو علم دیتا تھا۔ اس کے بدلے سرکار اسے ہر مہینے کی بندھی تنخواہ دیتی تھی۔ اسی سے اس نے سب کچھ بنایا تھا۔ گھر بھی، گھر کا اسباب بھی، گھر والوں کا کردار بھی۔

آج وہ سب نہیں رہا تھا جس کا میں وارث ہوتا لیکن میرے خدا نے مجھے اس سے کئی لاکھ گنا دے دیا تھا۔ اگر میرے نام ست بدھائی کی جاگیر اور حویلی نہ ہوتی تو میرے والدین اسی گھر میں سکون سے آباد ہوتے۔ میں یہیں نوکری کرتا۔ وہ نوکری بھی بہت بڑی تھی۔ پاکستان آتا تو میری کوالیفکیشن اور تجربے کی بنا پر کسی بینک یا کاروباری ادارے میں اعلیٰ ترین عہدہ پیش کیا جاتا۔ ویسا کہ جس کا خواب سارے ماں باپ اپنی اولاد کے لیے دیکھتے ہیں ورنہ میں آتا تو اسی گھر میں ٹھہرتا پھر بھی ہم ماڈل ٹاؤن بھی چلے جاتے۔ اب دولت اتنی مل گئی تھی کہ فکرِ معاش تو دور کی بات تھی مجھے کچھ کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی پھر اب میں یہ کروں اس دولت کو دُگنا، تین گنا یا دس گنا کرنے کی دوڑ میں شامل ہو جاؤں۔ پہلے بہتر خاندان مشہور ہوئے پھر بائیس کا ذکر ہوا۔ اب تو شمار ہی نہیں کیا جا سکتا کہ ارب پتی کھرب پتی سیکڑوں ہیں یا ہزاروں۔ یا بے ایمانی تیرا ہی آسرا۔ میرے لیے یہ ناقابلِ فہم تھا کہ اب مجھے ملک کو لوٹنے کی اور ضمیر فروشی کی کیا ضرورت ہے۔

میں اپنے خیالوں میں محو اپنے گھر کی سوختہ سامانی میں کسی بھوت کی طرح سرگرداں تھا کہ کسی نے ڈانٹ کے کہا۔ ''اوئے کون ہے اندر؟'' اسے اندر کے اندھیرے میں میری صورت نظر نہیں آ رہی تھی مگر تھا وہ کوئی پرانا محلے دار یا خیر خواہ جو آج بھی اپنا اخلاقی فرض سمجھتا تھا کہ پروفیسر صاحب کے کھنڈر پر نظر رکھے۔ وہ خود یہاں نہیں تو کیا ہوا۔

میں نے باہر آ کے کہا۔ ''یہ میں ہوں جی رفیق۔''

کھمبے کی روشنی میں ایک بزرگ نے کہا۔ ''اچھا اچھا، پتر میں جا رہا تھا اِدھر سے نماز کے لیے۔ نظر پڑ گئی۔ میں نے کہا کوئی چور کچھ اٹھا رہا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''چاچا جی! اب کیا رہ گیا ہے کسی کے لیے یہاں۔''

''اونہیں پتر رفیق، یہ بدمعاش ہیروئنچی دن میں کم رات کو زیادہ چکر لگاتے ہیں۔ کچھ بھی مل جائے جو کباڑی کو بیچ دیں مگر اچھا ہوا تم سے ملاقات ہو گئی۔ پروفیسر صاحب کا کیا حال ہے۔''

''شکر ہے جی اللہ کا۔ راضی خوشی ہیں۔''

''وہ ایک بات بتانی تھی تمہیں۔ میں نے سنا تھا کہ تمہارا ارادہ ہے جگہ کو بیچنے کا۔'' انہوں نے ایک آہ بھری۔ ''میاں، ضرورت بھی کیا ہے تمہیں لوٹ کر اِدھر آنے کی۔ مولا بیٹھا ہے دکان پر۔ اس سے مل لینا۔ کوئی گاہک ہے اس کے پاس۔ اچھا پروفیسر صاحب کو سلام دینا میرا۔ مجھے نماز میں دیر ہو رہی ہے۔''

بزرگوار کو میں اپنے بچپن سے جانتا تھا۔ محلے میں ان کی پرچون کی دُکان تھی۔ جب میں چھوٹا تھا تو چھوٹی موٹی چیزیں انہی کی دُکان سے لاتا تھا اور وہ چیز دے کر اس کا اندراج ایک رجسٹر میں ہمارے گھر کے حساب میں کر لیتے تھے۔ مہینا گزرنے کے بعد ابا تنخواہ لاتے تو سب سے پہلے اسی دُکان پر جا کے مہینے بھر کے اُدھار کا حساب برابر کرتے تھے۔ اگلے دن سے یہ سلسلہ پھر شروع ہو جاتا تھا۔ دوسرے بچوں سے میں نے بھی سیکھ لیا تھا کہ اس حساب میں سے کبھی کبھار اپنے لیے بسکٹ کے پیکٹ یا ٹھنڈی بوتل کی گنجائش نکالی جا سکتی ہے۔ اس کے باوجود مجھے یاد نہیں پڑتا کہ کبھی ابا نے ٹوٹل چیک کیا ہو یا اماں نے اعتراض کیا ہو کہ فلاں چیز تو آئی ہی نہیں ہمارے گھر میں یا حاجی صاحب نے اس چیز کی قیمت زیادہ لگا دی ہے۔ وہ دُکانداری میں ایمانداری اور ایمانداری میں فلاحِ دارین کے اُصول کا دور تھا۔ حاجی صاحب کی جگہ ان کے فرزند جانشین ہوئے تو سب چوپٹ ہو گیا۔ پرانے کھاتے دار شور مچانے لگے کہ میاں یہ کیا گڑبڑ ہے ہمارے حساب میں۔ یہ قیمت کیا لگا دی ہے۔ کیا بلیک میں فروخت کر رہے ہو۔ تول مول اور سلوک میں فرق آیا تو کھاتے بند ہونے لگے۔ خریدار دوسری طرف چلے گئے۔ حاجی صاحب نے تیس چالیس برس میں جو ساکھ بنائی تھی وہ تین چار ہفتوں میں ختم ہو گئی اور دُکان بند ہو گئی۔

برخوردار یہی چاہتے بھی تھے۔ آٹا، دال، چاول تولنا اور دو ٹکے کے لوگوں کی بک بک برداشت کرنا اس کے بس کی

بات نہیں تھی۔ ابا نے دکانداری کا ہنر ہندو بنیے سے سیکھا تھا جو گاہک کو ان داتا مانتا تھا۔ بہت سے ناکام تجربات کے بعد اب وہاں اسٹیٹ ایجنسی بن رہی تھی جسے حاجی صاحب دلالی کہتے تھے۔ تاہم لڑکا دوسروں کی جائدادیں کرائے پر اٹھانے یا ٹھکانے لگانے کے کام میں اچھا کمار ہا تھا اس لیے اچھا تھا۔

حاجی صاحب اسے پاجی کہتے تھے۔ ابا کی نیک نامی کا فائدہ اٹھانے کے لیے اس نے دُکان پر ''حاجی اسٹیٹ'' کا بورڈ لگوادیا تھا۔ پہلے دن کسی نے کہا کہ ''پاجی، اپنا نام کیوں نہیں لکھا؟'' تو مار پیٹ ہوگئی۔ مار کھانے والے نے معصومیت سے کہا۔ ''میں تو پاجی کہہ رہا تھا۔'' اب یہ مقامی تلفظ کی بات ہے۔ بھاجی سننے میں ''پاجی'' لگتا ہے۔ غالباً اسی بندے نے ایک رات یہ کارروائی کی کہ ''حا'' کو تھوڑا سا مٹا کے نیچے تین نقطے لگادیے۔ وہ بندہ میں تھا۔

برسوں بعد اسٹیٹ ایجنسی کے ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر میں دم بخود رہ گیا۔ بڑے بڑے شیشوں، شاندار پردوں، خوبصورت قالینوں کے ساتھ چمکتا دمکتا فرنیچر، ایئر کنڈیشنڈ آفس کے ایک حصے میں چلبلی منک اور ناز نخرے سے آراستہ ماڈل ٹائپ سیکریٹری اور الگ پارٹیشن میں بڑی افسرانہ شان سے بیٹھا ہوا وہی پاجی۔ باہر اس کی شاندار لمبی کار لشکارے مار رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ بڑی بے تکلفی سے گلے ملا۔ ہم جیسے بھی تھے بچپن کے یار تھے۔ ''او یار فیکے، سنا ہے تو نواب ہوگیا ہے۔''

''تو بھی تو پاجی سے ایم ڈی حاجی اینڈ سنز، رئیل اسٹیٹ اینڈ کنسٹرکشن بھاجی ہے۔'' میں نے کہا۔

کچھ دیر ہم اِدھر اُدھر کی پرانی باتیں کرتے رہے۔ فلاں کدھر ہے۔ فلاں کیا کر رہا ہے۔ اس نے میری ترقی اور ست بدھائی کے بارے میں سوالات کیے اور میں نے اسے اخلاقاً مدعو کیا۔ اس نے میرے خاندان کے افسوسناک حالات پر تعزیت کی۔

پھر میں نے اپنے آنے کا مقصد بتایا۔ ''حاجی صاحب نے کہا تھا کہ ہمارے مکان کا خریدار ہے کوئی۔''

''اوئے ہاں یار، لینا تو بہت لوگ چاہتے تھے۔ تمہارے دونوں پڑوسی بہت اُچھل رہے تھے کہ زمین مل جائے تو مکان دو پلاٹوں پر بن جائے۔ ایک گھر میں سب تنگی سے رہتے ہیں۔ دو بیٹے، دو بہوئیں اور ان کی پیداوار۔ قیمت کے معاملے میں بھی مقابلہ کررہے تھے لیکن تیز دونوں میں نہیں تھا۔ دونوں چاہتے تھے کہ پروفیسر صاحب کی شرافت اور مروت کا فائدہ اٹھائیں۔ کچھ ابھی دے دیں باقی بعد میں۔ اُدھار چلتا تھا ہماری پرچون کی دکان میں۔ اب یہ حاجی دی ہٹی نہیں پاجی کا بزنس ہے۔'' اس نے قہقہہ مار کے مجھ سے ہاتھ ملایا۔

میں نے ہاتھ ملا کے کہا۔ ''تجھے یاد ہے وہ بات۔ مانتا ہے کہ تو پاجی ہے۔''

''یار تھا کیا مطلب۔ ہوں آج بھی۔ ایک دو بندے قیمت صحیح لگا کے گئے مگر کہتے تھے کہ ملبہ صاف کرا کے دو خالی زمین، پھر ایک پاگل آ گیا۔ میں تو پاگل ہی کہوں گا اسے۔ میں نے دس لاکھ زیادہ بولے کہ وہ لم ضرور کرائے گا۔ اس نے کہا مجھے منظور ہے۔ دوسری بات ہی نہیں کی۔ میں نے کہا کہ مالکوں سے بات کرلوں۔ ایک ہفتے بعد وہ آیا تو میں نے ایسے ہی کہہ دیا کہ مالک راضی نہیں۔ اس نے فٹ کہہ دیا کہ دس بڑھادوں۔ میں تو حیران رہ گیا۔ ایسے دیکھے نہیں۔ سوچ یار فیکے! وہ بیس لاکھ زیادہ دے رہا ہے مارکیٹ سے۔''

''کیوں دے رہا ہے؟'' میں نے کہا۔

وہ ہنسا۔ ''پاگل ہے اس لیے۔ سودا تو میں نے پکا کرلیا اسی وقت۔ اب تو جا کے پیسے وصول کرلے۔ ہم ایسا کرتے ہیں کہ کسی کو پارٹی کے پاس بھیج دیں مگر تو باہر ہی رہنا۔'' اس نے پھر مجھے یاد دلایا۔

''میں کہاں جاؤں؟''

اس نے مجھے ایک کاغذ پر فون نمبر لکھ کے دیا۔ بڑا کھڑ پیچ ہے کہنے لگا کہ مالک بات کرلے پھر سے اور آ جائے کاغذات لے کر۔ میں اسی وقت چیک بنادوں گا۔ کاغذات کی تصدیق کی بات اس نے نہیں کہ میں نے کہا تھا۔ پرانے محلے دار ہیں۔ شریف لوگ ہیں۔''

میں نے وہیں سے نمبر ملایا تو کسی ملازمہ کے لہجے والی عورت نے اٹھایا اور بولی۔ ''آپ کون ہو جی! کس سے بات کرو گے؟''

میں نے کہا۔ ''مالک سے یا مالکن سے۔''

انتظار کے ایک مختصر وقفے کے بعد کسی مالکن کے لہجے کی شائستگی اور اعتماد کے ساتھ آواز آئی۔ ''ہیلو!''

میں نے کہا۔ ''دیکھیے، میں رفیق احمد شیرازی ہوں۔'' اس نے انگریزی میں کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ میں آپ کو نہیں جانتی۔''

''دراصل کوئی صاحب میرا مکان بلکہ پلاٹ خریدنے آئے تھے۔ وہ اپنا فون نمبر دے گئے تھے۔ وہ آگ سے تباہ ہو جانے والا مکان ہے۔ سمن آباد میں۔ قیمت کا معاملہ طے ہو گیا تھا۔''

''اچھا ابھی، پھر ایسا کریں، آپ آ جائیں۔'' وہ بولی۔

میں نے کہا۔ ''ابھی آ جاؤں؟''

''اگر آنا چاہیں ورنہ کسی دن شام کے بعد، رات تک۔''

میں سمجھ گیا کہ دن میں وہ نہیں ملتی۔ ''ٹھیک ہے میں ابھی آ جاتا ہوں۔ آپ مجھے پتا سمجھا دیں۔''

جو پتا اس نے سمجھایا وہ میں نے لکھ لیا۔ پتا بہت آسان اور ماڈل ٹاؤن کے انتہائی پوش علاقے کا تھا۔ اپنی گاڑی میں اس پتے پر پہنچنا آدھے پونے گھنٹے کی بات تھی۔

پاجی نے الماری میں سے اصل کاغذات ملکیت کی فائل نکال کر مجھے دی۔ ''اوئے مبارک! بندہ ابھی تک سودے پر قائم ہے۔ مجھے تو ڈر تھا کہ کہیں اس کا نشہ نہ اتر گیا ہو۔ تیری قسمت بڑی اُونچی جارہی ہے فیکے۔ عیش کر، کیش ہے تو عیش کر۔'' پتا تلاش کرنا میری توقع سے زیادہ مشکل ثابت ہوا۔ ایک تو وہاں نمبر بے ترتیب تھے پھر سڑکوں پر سناٹا تھا۔ گاڑیاں ضرور گزر رہی تھیں لیکن پتا بتانے والا کوئی نہیں نظر آتا تھا۔ دروازوں پر استادہ مسلح دربان وہاں کے رہنے والے نہیں تھے کہ میری مدد کر سکتے۔ میں گاڑی روک کر ایک جگہ اتر کر دیکھتا کہ نمبر کیا ہے۔ قیاس کی بنیاد پر آگے پیچھے جاتا۔ وہ رومن طرزِ تعمیر والا کچھ وائٹ ہاؤس جیسا مکان اچانک سامنے آ گیا۔ سامنے نمبر دیکھا تو وہی تھا جو مجھے بتایا گیا تھا۔

میں حیران ہوں کہ ایسے دس کنال کے رقبے پر بنے ہوئے قصرِ عالی شان کے مکین کو سمن آباد میں دس مرلے کا جلا ہوا مکان خریدنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی۔ دربان نے انٹرکام پر اندر کسی سے بات کی اور میرا نام کسی کو پہنچایا۔ میں نے اتنی دیر میں یہ فرض کرنا مناسب سمجھا کہ اس محل کا مالک اپنے کسی نمک خوار کو اس کی خدمت کے بدلے میں کوئی چھوٹا سا گھر دینا چاہتا ہوگا۔ بالکل اسی طرح جیسے میں نے رشیم اور نفی سے کہا تھا۔

اس خیال میں کھٹکنے والی بات وہی تھی کہ آخر اسے بیس لاکھ زیادہ دینے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ وہ کھنڈر کہیں فلاتو نہیں جارہا تھا۔ اس میں ایسی کیا خاص بات تھی جو اس کی دلچسپی کا سبب بنی۔ جس نے اتنی پُرشکوہ کوٹھی بنانے کے لیے دولت کمائی وہ بے وقوف کاروباری ذہن کا مالک تو نہیں ہوسکتا کہ کسی وجہ کے بغیر بیس لاکھ پھینک دے۔

اس سے پہلے جس احساس نے میرے لاشعور میں خلش جگائی تھی۔ پتا سمجھانے والی عورت کی آواز تھی جو مجھے سنی ہوئی لگتی تھی لیکن میری میموری سے دماغ کے اسکرین پر کوئی نام نمایاں نہیں ہوتا تھا۔ کسی مقام، وقت یا واقعے سے یاد کا کوئی کنکشن نہ مل سکا تو میں نے کوشش ہی کو لاحاصل سمجھا اور اسے محض اتفاق مان لیا۔ آواز میں صورتیں، خیالات یا زندگی کے تجربات میں مطابقت کوئی انہونی یا انوکھی بات نہیں۔

دروازہ کھٹاک سے کھل گیا اور دربان نے مجھے ہاتھ اور سر کے اشارے سے کہا کہ آپ تشریف لے جاسکتے ہیں۔ میرے اندر داخل ہوتے ہی خودکار دروازہ پھر لاک ہوگیا۔ میرا چارج ایک مظلوم صورت سانولی سی کمزور اور سیدھی سادی لڑکی نے لے لیا جس کا لباس بھی بہت سادہ تھا۔ اس کے پیچھے چلتے ہوئے میں نے تقریباً دو سوفٹ کا ماربل ٹائل والا راستہ طے کیا۔ اس راستے کی قوس کے ایک طرف بڑا لان تھا جس کے وسط میں فوارہ چل رہا تھا۔ کچھ فاصلے پر رنگین گارڈن امبریلا کے نیچے سر سبز قالین جیسے گھاس کے فرش پر اُجلی بے داغ کرسیاں رکھی تھیں۔ دوسری طرف کا لان نسبتاً چھوٹا اور اس کے چاروں طرف ایک جالی تھی۔ جالی کے اندر ہرنوں کا ایک جوڑا ہکا بکا کھڑا تھا۔ ان کا برخوردار بلاوجہ اِدھر سے اُدھر کود مچا رہا تھا۔

ڈرائیو وے کے اختتام پر وہ پورچ تھا جس میں دو گاڑیاں موجود تھیں۔ ایک پراڈو اور دوسری مرسیڈیز۔ پورچ میں ابھی مزید چار گاڑیاں کھڑی کی جاسکتی تھیں۔ خادمہ اندر گئی تو مجھے اپنے سامنے طویل کاریڈور دکھائی دیا جس میں لائن سے فانوس روشن تھے۔ آگے کوئی ہال جیسی جگہ تھی مگر چند قدم چلنے کے بعد ہی خادمہ میرے لیے ایک دروازہ کھول کے کھڑی ہوگئی۔

میں اس وسیع و عریض ڈرائنگ روم کے ایک گوشے میں بیٹھ گیا۔ اس میں الگ الگ گروپ کی صورت میں صوفے یوں لگے ہوئے تھے کہ مہمان زیادہ ہوں تو جلسے کا سماں پیدا نہ ہو۔ حضرات اور خواتین جیسے چاہیں اپنی الگ محفل بنائیں۔ ظاہر ہے اس مہمان گاہ کی شان و شوکت کسی طرح بھی شاہی دربار سے کم نہ تھی۔ پردوں کی وجہ سے اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ دروازے کتنے ہیں اور کہاں ہیں۔ چنانچہ مجھے شاہی سواری کی آمد کا پتا اس وقت چلا جب میری مشامِ جاں سے خوشبو کا ایک جھونکا ٹکرایا۔ یہ کوئی عام خوشبو نہ تھی۔ اس کی مہک از خود اپنے اعلیٰ و ارفع اور فرانس کے دل پیرس سے نسبت ہونے کا اعلان کرتی تھی۔

وہ میرے پیچھے سے پردہ ہٹا کے نمودار ہوئی تھی۔ میں نے سر گھما کے دیکھا تو ایک لمحے کے لیے میری نگاہ اس

آفتابِ جمال کی درخشندگی سے خیرہ ہوگئی پھر میں حیرانی سے زیادہ غصے اور پشیمانی سے مغلوب ہو کے اٹھا..... آخر میری عقل نے یہ موٹی سی بات کیوں نہ سمجھائی کہ تیس لاکھ پھینکنے والے نے روپیا نہیں شکار کو ترغیب دلانے والا دانہ پھینکا ہے۔

میرے مقابل نور جہاں تھی۔ اس رعنائی حسن و شباب کے ساتھ جس کا جادو ذہن اور اعصاب کو اپنی ساحری سے مفلوج اور معطل کر دیتا تھا۔ اس کے جمال بے مثال پر شاعر پورا دیوان لکھ سکتا تھا تو اس کے سراپا کو بیان کرنے والا نثر نگار بھی شاعر کا لقب پا سکتا تھا۔ رہی سہی کسر وہ اپنے عشوہ و غمزہ و ادا سے پوری کرتی تھی اور اپنے لباس سے پوری کرتی تھی جو اس کے مجسم کے ہر پیچ و خم ہر نشیب و فراز کی عکاسی کسی آئینے کی طرح کرتا تھا۔ جو ہر چند نہیں ہے کہ نہیں ہے..... کی تفسیر بن جاتا تھا۔ اس میں بے حجابی کا پہلو کسی طرح عریانی کی حد کو نہیں چھوتا تھا پھر بھی کچھ چھپاتا نہیں تھا..... پہلی نظر میں سب دکھا دیتا تھا۔

مجھے اعتراف کر لینا چاہیے کہ میرے غصے یا حیرانی کی لہر کو اس کے جلوہ بے ساماں کی دید نے یوں دبا دیا کہ میرے سامنے صرف وہ رہ گئی..... اور کچھ نہ رہا..... خوب صورتی اپنا سحر رکھتی ہے اور عورت کا ایسا روپ کسی مرد کو متاثر نہ کرے..... یہ ناممکن تھا..... بعد میں ایک بار میں نے یہ سوچا تھا کہ کیا شسمیتا سین اور کیا ایشوریا رائے..... نور جہاں ایک بار جاتی تو عالمی مقابلہ حسن کے سارے جج اسے دیکھتے تو پھر کسی کو نہ دیکھتے..... مس یونیورس کا تاج اس کے سر پر سجا دیتے۔

نور جہاں میری بے خودی پر فاتحانہ انداز میں مسکرائی۔ ''تشریف رکھیے نواب صاحب۔''

میں ایک دم سنبھل گیا۔ ''مجھے سمجھ لینا چاہیے تھا کہ یہ جال کوئی اور نہیں پھیلا سکتا۔''

وہ میرے مقابل بیٹھ گئی۔ ''ویسے میرے بلانے سے آپ کہاں آتے سرکار..... آخر اتنے خفا کیوں ہیں آپ مجھ سے..... نفرت کی وجہ بھی ہو کوئی۔''

میں نے کہا۔ ''لاحول ولا قوۃ..... نفرت محبت سے مجھے کیا..... اگر میرا اختلاف ہے تو آپ کے شوہر سے..... کیا وہ گیا تھا خریدار بن کر۔''

''اسے میں کہیں بھی بھیج سکتی ہوں..... اس سے کچھ بھی کرا سکتی ہوں..... ایسا فرمانبردار شوہر ہے۔'' وہ ہنسی۔

میں نے کہا۔ ''دیکھیے..... جس کام کے لیے میں آیا تھا.....''

''جی چھوڑیے کام کی بات..... یہ بتائیے آپ نے اپنا قرض اتارنے کے بارے میں کیا سوچا ہے؟''

''قرض؟..... کس کا قرض.....؟''

''میرا اور کس کا؟'' وہ سادگی سے بولی۔ ''اب قرض صرف روپے پیسے ہی کا تو نہیں ہوتا نواب صاحب..... احسان کا قرض بھی تو ہوتا ہے۔''

میں نے محتاط ہو کے کہا۔ ''اگر تم نے کیا ہے کوئی احسان مجھ پر تو میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ..... مجھ پہ احسان جو نہ کرتے تو یہ احسان ہوتا۔''

بے تکلفی میں ایک قدم آگے بڑھنے کا موقع خود میں نے ''تم'' کہہ کے فراہم کر دیا تھا..... وہ ہنسی۔ ''باتیں تو ہوتی رہیں گی..... پہلے بتاؤ کیا لو گے؟ کافی..... چائے..... سرد گرم..... یا کچھ اور.....'' اس نے ایک خاص ادا سے کہا۔

''کچھ نہیں..... یہ بتاؤ اس طرح مجھے دھوکے سے بلانے کا مقصد کیا ہے آخر؟''

وہ لہرا کے اُٹھی۔ ''وہ بھی بتا دوں گی..... پہلے کافی پی لو..... میری خوشی کے لیے۔'' حقیقت یہ ہے کہ اس وقت مجھ پر ایک کمزوری غالب نہ آتی تو میں اٹھتا اور نکل جاتا لیکن ایک خیال نے مجھ سے کہا کہ ایسی بد اخلاقی کا مظاہرہ کرنے کی کیا ضرورت ہے..... وہ مجھے کھا تو نہیں جائے گی۔

اب وہ میرے ساتھ آ بیٹھی اور اس کے قرب سے اُٹھنے والی ہیجان خیز خوشبو میرے حواس پر حملہ آور ہوئی۔ ''ایک دن فون کیا تھا میں نے تمہیں۔''

میں نے کہا۔ ''آدھی رات کے وقت؟ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ تم ہو۔''

اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''یہ یاد دلانے کے لیے کہ تم میرے مقروض ہو..... اور قرض ہے احسان کا اگر تم مانو..... نہ مانو تو کچھ بھی نہیں..... مگر مجھے پتا ہے کہ نہ تم اتنے بد اخلاق ہو نہ کم ظرف۔''

میں نے کہا۔ ''میرے چچا صوفی نذیر کی جان تم نے چھڑوائی تھی؟ پولیس کی تحویل سے..... ان کی جان لے کر۔''

وہ چونکی۔ ''تمہیں معلوم ہے؟''

میں نے کہا۔ ''اور اسے تم احسان کہتی ہو.....؟ تم نے انہیں مروایا..... کسی نے انہیں زہر دیا اس کے نتیجے میں صوفی چچا کا ہارٹ فیل ہوا.....''

اس نے بے اختیار میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''کس نے بتایا تمہیں یہ سب..... بولو..... یا تم کوئی گیم کھیل رہے ہو میرے ساتھ..... ہوشیاری دکھا رہے ہو؟''

میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ''کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

وہ پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھتی رہی..... ''تم نے ٹھیک سمجھا۔'' وہ آہستہ سے بولی۔

''مجھے کسی نے کچھ نہیں بتایا نور جہاں..... لیکن تمہارے سوا یہ کوئی سوچ نہیں سکتا تھا سوچتا تو صوفی چچا تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا تھا..... سوائے تمہارے..... تم سب کچھ کر سکتی ہو۔''

وہ صوفے کی پشت سے سر لگا کے بولی۔ ''تم میری توقع سے زیادہ ذہین ہو..... خطرناک حد تک۔''

''لیکن تم سے کم..... مجھے بتاؤ ایسا کیوں کیا تم نے؟'' میں نے تلخی سے کہا۔

وہ اُٹھ کر میری طرف جھکی اور میرے اتنے قریب ہوگئی کہ اس کی سانس میری گردن پر محسوس ہونے لگی..... اس نے دونوں ہاتھوں سے میرا بازو تھام لیا۔ ''دیکھو..... سچ بتاؤ کیا میں نے اچھا نہیں کیا تھا بولو.....؟''

''شٹ اَپ۔'' میں نے خود کو چھڑا لیا اور ہٹ کر دوسرے صوفے پر جا بیٹھا۔

''میں نے تمہیں اس خون چوسنے والے تھانے دار کے ہاتھوں بلیک میل ہونے سے بچایا..... مجھے معلوم تھا وہ صوفی چچا کے ذریعے تم پر کتنا دباؤ ڈال رہا ہے..... اور تم دباؤ میں آ گئے ننھے رفیق..... بتاؤ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں.....؟ یہ اکبر خان کا پلان تھا شوہر کہلاتا ہے میرا۔''

میں نے تلخی سے کہا۔ ''کہلاتا ہے کیا مطلب..... وہ تمہارا شوہر ہے۔''

اس کے لبوں پر ایک اداس مجبور اور زہر آلود مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''ذرا میری طرف دیکھو..... تم سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے اس CHARADE کو..... اس کی اصلیت کیا ہے..... یہ تم جانتے ہو..... تم ایسا سوچ بھی کیسے سکتے ہو کہ میرے جیسی عورت اس کو قبول کر سکتی ہے۔''

''دنیا وہی تسلیم کرتی ہے جو نظر آتا ہے..... خیر چھوڑو یہ بات۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں شدید دباؤ میں آ گیا تھا اور.....''

ایک ملازم شیف کے لباس میں اندر آیا اور ٹرالی نور جہاں کے سامنے چھوڑ کے جھکا۔ ''کافی بنا دوں میڈم؟''

''نہیں..... میں بنا لوں گی..... تم جاؤ۔'' نور جہاں نے کہا۔

خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا جس میں اس نے کافی بنائی اور میں سوچتا رہا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اس نے مجھے دھوکے سے بلایا تھا اور مقصد مجھ پر پہلے سے عیاں تھا..... ایسی صورت میں کیا مجھے کافی پینی چاہیے..... وہ دھوکے سے کافی میں مجھے کچھ بھی دے سکتی ہے..... اس کی تلخی میں کسی ہوش گم کرنے والی یا مدہوش کرنے والی دوا کا ذائقہ دب جاتا ہے..... اس وقت نور جہاں نے ایک سوال کر کے مجھے حیران کر دیا۔ ''تمہارے دل میں کیا ہے..... میں جانتی ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''کیا ہے؟''

''تم سوچ رہے ہو میں کافی میں کچھ ملا نہ دوں؟ رائٹ۔''

''کیا میں غلط سوچ رہا ہوں؟'' میں نے کہا۔

''بالکل غلط.....'' وہ شوخی سے مسکرائی اور میں نے محسوس کیا کہ نہ چاہتے ہوئے بھی میں کمزور پڑ رہا ہوں..... ٹریپ ہوتا جا رہا ہوں..... اس نے کافی کا مگ میری طرف بڑھایا تو میں نے ہپناٹائز ہو جانے والے شخص کی طرح مگ لے لیا۔

اس نے اپنے مگ سے ایک گھونٹ لیا۔ ''اس کی ضرورت نہیں ہے مجھے۔''

میں نے اپنے مگ سے ایک سپ لی..... پھر میرے دماغ نے مجھے پہلی وارننگ دی۔ میں نے مگ اس کی طرف بڑھا دیا۔ ''یہ تم پیو گی۔''

وہ آہستہ سے ہنسی..... اتنا ڈرتے ہو تم نواب صاحب۔'' اس نے مگ میری طرف بڑھا دیا۔ ایک دوسرے کا جھوٹا پئیں گے ہم..... چلو جیسی تمہاری مرضی..... مگر تم میرا احسان مانتے ہو نا کہ میں تمہاری مدد نہ کرتی تو تم اکبر خان کے چنگل سے نکل نہیں سکتے تھے..... تمہیں اس کی بات ماننی پڑتی۔''

وہ اس مگ سے کافی پینا شروع کر چکی تھی جو اب میرے ہاتھ میں تھا چنانچہ میں مطمئن تھا کہ اس میں کچھ اور شامل نہیں ہو سکتا..... میں نے کافی کا گھونٹ لے کر کہا۔ ''اگر سچ کہوں..... تو اب تسلیم کیے بنا چارہ نہیں کہ ان کا مر جانا سب کے لیے باعث نجات ہوا۔ میرے لیے..... میرے والد کے لیے..... اور خود صوفی چچا کے لیے۔''

اس کا چہرہ خوشی کے اجالے سے دمکنے لگا۔ ''تو تم مانتے ہو کہ میں نے احسان کیا تھا تم پر..... اور میری اس نیکی کے قرض دار ہو تم۔''

میں نے کہا۔ ''دیکھو..... نہ وہ نیکی تھی اور نہ مجھ پر

احسان..... جرم تو جرم ہی رہتا ہے خواہ نیت کچھ بھی ہو..... اور قتل کے نتیجے میں کوئی مسئلے کا حل دیکھے یا کسی کا فائدہ..... وہ قتل ہی رہتا ہے..... نا قابل علاج مریض جو چند سانس کے مہمان ہوں..... انہیں نزع کے عذاب سے چھٹکارا دلانے کے لیے خواب آور انجکشن لگا کے موت کی نیند سلا دینا بھی قتل کہلاتا ہے اور دوا علاج سے محروم کر دینا بھی۔"

"تم مجھے احساس جرم میں مبتلا کر رہے ہو۔"

"بات یہ ہے میڈم کہ ویسے تو میں نے پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی لے لی تھی..... اس سے ثابت ہو گیا تھا کہ صوفی چچا کی موت طبعی نہیں تھی..... نہ انہیں دل کی تکلیف تھی..... کسی نے انہیں بڑی مہارت سے قتل کیا تھا..... میں نے سوچا تھا کہ پولیس پر کیس کر دوں..... قتل ان کی تحویل میں ہوا تھا..... لیکن ثابت کچھ نہ ہوتا..... الزام کسی پر نہ آتا..... مرنے والے کی بیٹی زیادہ دکھی ہوتی..... اس کا بھائی بھی مزید دکھی ہوتا..... مرنے والے کو نہ جینے سے فرق پڑتا تھا نہ مرنے سے پڑا..... چنانچہ میں نے بھی فرض کر لیا کہ جو ہوا ٹھیک ہوا بس اللہ کی رضا..... یہی رہ جاتا ہے صبر کرنے والوں کے لیے ایک بہانہ..... لیکن اب تم نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا ہے تو یہ بھی بتا دو کہ تم نے یہ کیسے کیا؟"

اس نے اُنگلیوں سے چہرے پر پھسل آنے والے بالوں کو پیچھے کیا۔ "خود میں نے کچھ نہیں کیا..... طریقہ ایک ڈاکٹر نے بتایا..... انجکشن بھی اسی نے فراہم کیا۔"

"وہ بھی ہو گا تمہارے حکم پر آنکھیں بند کر کے صرف تعمیل کرنے والا کوئی پرستار..... جس نے معاوضے میں تمہارے ساتھ ایک رات مانگی ہو گی۔"

"نواب صاحب..... اتنی چیپ نہیں ہوں میں..... جو کام پیسا پھینک کے ہو جائے اس کے لیے میں خود کو پیش کر دوں۔" وہ برہمی سے بولی۔

"یعنی پیسا اہم نہیں ہے تمہارے لیے۔" میں ہنس پڑا۔

"اب نہیں ہے۔" وہ آہستہ سے بولی۔ "اب میری مرضی اہم ہے۔"

"معاوضہ تھانے دار نے بھی وصول کیا ہو گا۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں نے ایک غریب کانسٹیبل کی مدد کرنا بہتر سمجھا..... دس ہزار لے کر وہ خوش ہو گیا۔"

"جانے سے پہلے ایک آخری سوال..... یہ سب کیوں کیا تم نے؟"

وہ کچھ دیر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھتی رہی۔ "تم جیسے ذہین آدمی کو یہ سوال نہیں پوچھنا چاہیے..... یا تم خود میری زبان سے اعتراف سن کے خوش ہونا چاہتے ہو کہ میں نے صرف تمہارے لیے یہ سب کیا..... دل کے ہاتھوں مجبور ہو کے۔"

میں اٹھنے لگا۔ "تم کو اندازہ ہے کہ اکبر خان کو معلوم ہو گا تو وہ کیا کرے گا؟ کتنا بڑا خطرہ مول لیا ہے تم نے میرے لیے اور اپنے لیے۔"

وہ میرے گلے میں جھول گئی۔ "کچھ نہیں کر سکتا وہ..... اس کی حیثیت ایک پالتو کتے جیسی ہے..... جو میرے اشاروں پر چلتا ہے..... مگر وہ کراچی گیا ہوا ہے۔"

میں نے آہستہ سے اس کے ہاتھوں کو الگ کیا..... اس کی قربت اور یہ وارفتگی اب مجھ پر بھی اثر انداز ہو رہی تھی۔ اس کے ریشمی لمس کی حرارت میرے جسم میں بھی آتش شوق کو بھڑکا رہی تھی۔ میں یہ اعتراف کرنے پر مجبور ہوں کہ نور جہاں جیسی حسین اور پُرکشش عورت میں نے اپنی ساری زندگی میں نہیں دیکھی اور مقابلے پر میں ایک عام مرد تھا جسے نہ زاہد پارسا ہونے کا دعویٰ تھا اور نہ نفس کشی پر اختیار رکھنے والے مرد خود آگاہ کا۔

اس کے ساتھ یہ حالات اور ماحول کا اثر تھا جس میں میری مدافعت مکڑی کے جال میں پھنس جانے والی مکھی کی طرح کمزور پڑتی جا رہی تھی۔ اس گھر میں حکومت تھی نور جہاں از خود اپنے آپ کو میرے حوالے کر رہی تھی اور یہ یقین دلا چکی تھی کہ اکبر خان کی طرف سے بھی رخنہ اندازی کا کوئی خوف نہیں۔ اس کے باوجود جذبات کے بھنور میں گھری ہوئی عقل چلا چلا کے مجھے روکنے کی کوشش کر رہی تھی کہ دیکھو رفیق..... ایسا پہلے بھی ہوا ہے..... ہمیشہ ہوا ہے اور سب کے ساتھ ہو چکا ہے..... خوب صورت عورت وہ ہتھیار ہے جس کی تباہ کاری جیت کو ہار میں بدل سکتی ہے۔

میں نے کہا۔ "نور جہاں..... اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہارے حسن و شباب کی طاقت کے آگے کوئی مرد ہتھیار ڈالنے پر مجبور نہ ہو..... ایسا ہو نہیں سکتا لیکن۔"

"لیکن کیا۔" وہ تیز سانسوں کے ساتھ سرگوشی میں بولی۔

"میں ڈرتا ہوں کہ یہ کوئی سازش نہ ہو۔"

وہ مجھ پر گر گئی۔ "تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں..... یہ ٹھیک ہے میں کوئی شریف زادی نہیں ہوں..... لیکن دل تو میرا بھی ہے..... جذبات تو میرے بھی ہیں..... میں نے جب تمہیں

دیکھا تھا تو تم آنکھوں سے میرے دل میں اُتر گئے تھے۔ میں ریجھ گئی تھی تم پر۔"

"آئی ایم سوری نور جہاں...... تم بے حد حسین ہو...... میں نے بھی پہلی بار تمہیں دیکھا تھا تو مسحور ہو گیا تھا...... ساری دنیا گھوی ہے میں نے...... تم جیسی مکمل عورت نہیں دیکھی...... مگر......"

"یہ کیا اگر مگر لگا رکھی ہے۔" وہ بڑے ناز سے بولی۔

"میں پہلے بھی نقصان اُٹھا چکا ہوں۔"

"تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میں تمہیں بلیک میل کروں گی؟"

میں نے کہا۔ "سانپ کے کاٹے کو رسی سے ڈرنا چاہیے۔"

وہ میرا ہاتھ پکڑ کے کھڑی ہو گئی۔ "اچھا...... آؤ میرے ساتھ۔"

اس وقت تک میری ساری مزاحمت ختم ہو چکی تھی اور اس نے بری طرح مجھ پر غلبہ حاصل کر لیا تھا...... اسے شیطان ہی کہا جا سکتا ہے جو گناہ آدم پر اُکساتا ہے اور اس کی ترغیب دیتا ہے تو عقل کے سارے فرمان عواقب کے تمام اندیشے مجبوری کی سب زنجیریں اسے روکنے میں ناکام رہتی ہیں۔

نور جہاں کو میں روز اول سے ہی شاہکار حسن تسلیم کر چکا تھا۔ آج وہ خود میری دسترس میں تھی تو میرا دماغ مجھے اُلٹی پٹی پڑھا رہا تھا۔ یہ فریال سے بے وفائی ہرگز نہیں ہے...... وہ محبت ہے یہ صرف ہوس...... وہ زندگی بھر کا رشتہ ہے یہ صرف ایک رات کا تعلق...... یہ موقع پھر نہیں آئے گا...... یہ گناہ ہے تو کیا تم نے پہلے زندگی میں کوئی گناہ نہیں کیا؟ اور آئندہ نہیں کرو گے؟ ڈر ہے تمہیں افشائے راز کا...... اگر یہ ڈر بھی نہ ہو پھر...... اگر کسی کو معلوم نہ ہو پھر؟"

میں اس کے ساتھ چلتے ہوئے ایسی بے خودی کا شکار تھا جو بے بسی بن گئی تھی۔ کسی شراب کے نشے سے کہیں زیادہ طاقتور اس کی قربت کا نشہ تھا جو میرے حواس پر چھا گیا تھا...... آدمی اپنی طاقتوری اور فتح کا ذکر کر سکتا ہے تو اسے اپنی کمزوری اور شکست کو بھی تسلیم کر لینا چاہیے کیونکہ انسان نہ ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے ورنہ سدا ناکام...

چنانچہ وہ وقت جب میں نور جہاں کے ساتھ ہی رہا تھا ایسا ہی تھا کہ میں اپنے اعمال پر عقل کے اختیار سے محرومی کو قبول کر چکا تھا...... اس کے ساتھ میں نے اس عمل کا کچھ حصہ دیکھا...... اس نے جان لیا تھا کہ وہ جیت چکی ہے اور میں اپنی ہار پر بھی مسرور و مخمور ہوں...... میں اس کے ساتھ یوں چل رہا تھا کہ وہ میری طرف جھکی ہوئی تھی اور میں نے اس کی ریشمی کمر کو ایک ہاتھ کے حلقے میں سمیٹ کر اسے اپنے ساتھ جوڑ رکھا تھا۔

"دیکھو...... یہ ہے میرا بیڈ روم......" اس نے ایک دروازہ کھول کے دکھایا...... اس کا منظر کسی عشرت کدے کی تصوراتی تصویر سے بھی بڑھ کر تھا۔ چھت اور دیواروں پر عکس کو ہر زاویے سے دکھانے والے آئینے...... ہر زاویے کو نمایاں کرنے والی اسپاٹ لائٹس...... آہستگی سے مسلسل گھومتے رہنے والا گول واٹر بیڈ...... جس پر انسان خود کو ہوا کے دوش پر کسی پر کی طرح تیرتا ہوا محسوس کرتا ہے۔

"بے شک یہ جگہ محفوظ نہیں...... یہاں کیمرے بھی ہیں...... یہاں بہت سے ایسے کمرے ہیں...... خواب گاہیں اور نشست گاہیں...... جہاں ہر حرکت ریکارڈ کی جا سکتی ہے اور ہر بات سنی جا سکتی ہے...... یہ میں خود تمہیں بتا رہی ہوں تاکہ تمہارا وہم دور ہو جائے کہ میں نے تمہیں کسی اور کے کہنے پر بلیک میل کرنے کے لیے بلایا ہے۔"

میں نے کہا۔ "مجھے یہ ڈر ہر جگہ رہے گا۔"

وہ میری طرف پلٹی...... "اچھا...... تو پھر تم کہیں لے چلو...... میں تمہارے ساتھ جانے سے نہیں ڈرتی...... بولو کہاں چلیں؟"

اس نے ایک ہوٹل کا نام لیا...... یہ مجھے زیادہ خطرناک لگا...... وہاں میرے یا نور جہاں کے کسی کی نظر میں آجانے کا احتمال زیادہ تھے کیونکہ ہم دونوں ہی گوشہ گمنامی میں رہنے والے لوگ نہیں تھے...... ہمیں پتا بھی نہ چلتا اور ہم کسی کی نگاہ میں آجاتے...... میں نے انکار کر دیا...... میرے وجود میں ایک ہیجان بپا تھا لیکن وہ پُرسکون تھی...... اس نے کسی عامل جادوگر کی طرح مجھ پر پورا کنٹرول حاصل کر لیا تھا اور میں اس کے چنگل سے نکلنے کی نہ کوشش کر رہا تھا نہ خواہش رکھتا تھا...... میں مکمل طور پر شیطانی اور نفسانی خواہشات کے زیر اثر تھا اور اس عورت پر اپنے تصرف کے لطف و انبساط سے پوری طرح مغلوب تھا۔

اب اس رات کی تفصیل میں جاتے ہوئے بھی مجھے شرم و خجالت سے پسینا آجاتا ہے اور احساس جرم و گناہ سے میرا ضمیر مجھے کچوکے دیتا ہے مگر زندگی ایسے حادثات سے یکسر خالی نہیں ہوتی۔ اس کے ساتھ میں نے عیش و نشاط کی ایک شب کے ہر لمحے سے لذت کشید کی...... اس نے کہا...... مجھ پر اعتبار کرو...... میں نے کر لیا...... میں وقت کو بھی بھول گیا......

نہ جانے رات کے کس پہر میں اس نے مجھے ایک جام دیا اور اپنی قسم دی...... میں نے وہ جام پی لیا...... خمار ملنے سے آتش شوق کیسے نہ بھڑکتی...... اور کیسے نہ بجھتی۔

میری زندگی کی طرح ہر شخص کی زندگی میں نشیب و فراز آتے ہیں۔ وہ سیدا سپاٹ راستے پر نہیں چلتا۔ کبھی بلندی کی طرف اُٹھتا ہے تو کبھی گڑھے میں بھی گر جاتا ہے...... بچہ ماں باپ سے نظر بچا کے پیسے چراتا ہے اور اپنی عمر کے مطابق عیش کی سنسنی خیزی کا تجربہ کرتا ہے...... نوجوان شجر ممنوعہ کو چیلنج سمجھ لیتے ہیں اور تمام حدود پھلانگ لینے کو مردانگی...... رئیس زادے کاریں چرا کے ایڈونچر کی سنسنی خیزی کو انجوائے کرتے ہیں۔ KICK کے لیے ہر تجربہ کرتے ہیں...... شاید اس رات میں نے بھی یہی کیا تھا کیونکہ زندگی کی مسلسل پُرتفکر یکسانیت سے میرے اعصاب شکستگی کی آخری حد پر تھے اور مجھے شکست ہو گئی...... نور جہاں نے اپنی بھرپور قوت کے ساتھ حملہ ایسے وقت میں کیا جب میں مزاحمت کی سکت ہی نہیں رکھتا تھا۔

صبح میں رُخصت ہوا تو اس نے کہا۔ "تم پھر نہیں آؤ گے؟"

میں نے کہا۔ "کبھی نہیں۔"

وہ ہنسی۔ "تم انسان ہو فرشتے نہیں...... ایسے دعوے مت کرو۔"

"میں شیطان بھی نہیں ہوں۔"

وہ ہنسی۔ "وہ لذت گناہ کو نہیں سمجھتا...... جو گناہ کرانے والا ہے...... میں نے خود کو اس جھمیلے سے آزاد کرا لیا ہے...... میں نے خوشی کو اپنے اختیار میں کر لیا ہے اور اس پر مطمئن ہوں...... تم بھی ہو جاؤ۔"

"میں ہمیشہ بار ندامت اٹھاؤں گا...... اور یہ احساس مجھے نظر اٹھا کے بات کرنے سے روکے گا...... سب کے سامنے۔"

"کون سب؟ سب کیا سپرمین ہیں...... بس تم ان کی زندگی میں جھانک نہیں سکتے اس لیے سمجھتے ہو کہ گناہ گار صرف تم ہی ہو...... یہ سب بکواس ہے...... کچھ دن میں تم بالکل نارمل ہو جاؤ گے...... سب بھول کر۔"

میں نے کہا۔ "یہ تم نے اچھا نہیں کیا نور جہاں۔"

وہ ہنسی۔ "میرا خیال اس کے برعکس یہ ہے کہ میں نے بہت اچھا کیا۔ جب میں نے تمہیں دیکھا تھا تو تم مجھے اچھے لگے تھے...... آہستہ آہستہ تمہاری کشش مضبوط ہونے لگی...... ایک وقت آیا جب میں نے سوچا کہ تمہیں کیسے حاصل کیا جائے...... یہ میرا جنون بن گیا...... میرا OBSESSION...... اس کے بغیر مجھے زندگی کی ہر خوشی ادھوری لگنے لگی...... مشکل یہ تھی کہ میں تمہیں حاصل نہیں کر سکتی تھی...... تم کسی اور کی ملکیت تھے۔ دوسری عورت کے تصرف میں تھے۔"

"اسے تصرف کہنا غلط ہے۔"

"چلو محبت کہہ لیتے ہیں...... تم اس کے ساتھ زندگی گزارنے کا فیصلہ کر چکے تھے...... بیوی بنا کے اس سے بچے پیدا کرنے اور اس کے ساتھ ہر رات گزرنے کے روایتی معمول سے ہٹ نہیں سکتے تھے...... وفاداری اور خاندان کی ضرورت اور اپنا گھر...... اس میں عافیت سمجھتے تھے۔"

"یہ دنیا کا اخلاقی نظام ایسا ہی ہے۔"

"ہاں...... مگر میرا نہیں...... میں نے سوچا کہ چلو ہمیشہ کے لیے نہ سہی...... ایک رات کے لیے تو تم کو حاصل کیا جا سکتا ہے...... اور میں نے کر لیا...... میں بہت خوش ہوں...... میرے دل کے دروازے کھلے ہیں تمہارے لیے...... دستک دینے کی ضرورت بھی نہیں۔"

کسی حد تک اس نے ٹھیک کہا تھا شادمانی کی شب گزری تو پشیمانی کا دن زیادہ آزار کے ساتھ طلوع ہوا...... لیکن یہ احساس جرم وقت کی گرد میں دفن ہوتا گیا...... اس روز میں باہر نکلا تو مجھے لگا کہ دنیا بدل گئی ہے لیکن ایسا صرف میں محسوس کر رہا تھا...... میں وہ نہیں رہا تھا جو گزشتہ روز تھا۔

اس روز میں نے بہت جھوٹ بولے...... اور بڑے اعتماد کے ساتھ اور بہت اچھی رواداری کے ساتھ...... کسی کو مجھ پر شک کیسے ہو سکتا تھا...... میں خود پچھتاتا اور جھنجھلاتا رہا...... آخر میں نے ایسا کیوں کیا...... اس سوال کی تکرار سے بچنے کی ناکام کوشش کرتا رہا...... میری نظر میں اپنی خود اعتمادی صفر ہو گئی اور یہ خیال جم گیا کہ میں افسوسناک حد تک کمزور اور بے بس ہوں چنانچہ پھر کوئی ترغیب ہو گی تو میں آسانی سے شکار ہو جاؤں گا۔

میری غیر حاضری بلا اطلاع تھی چنانچہ میرے لواحقین کی پریشانی جائز تھی...... راجا رات کو دیر سے فاروقی کے گھر پہنچا تو مجھے غیر موجود پا کے پریشان ہوا۔ اس نے سٹ بدحالی میں رابعہ سے پوچھا۔ اس خیال سے کہ شاید کسی ایمرجنسی میں مجھے واپس جانا پڑا ہو...... اس نے رابعہ کو تاکید کی کہ وہ میری گمشدگی پر کسی کے سامنے تشویش ظاہر نہ کرے...... لیلیٰ بھابی نے اپنی سہیلی کو جگا کے فریال کو فون پر بلایا مگر وہ کیا بتاتی۔

جب میں پہنچا تو فاروقی کورٹ جا چکا تھا۔ راجا نے مجھے آڑے ہاتھ لیا۔ ''کس شان سے چلے آرہے ہیں نواب صاحب..... مسکراتے ہوئے.....''

میں نے کہا۔ ''آئی ایم سوری یار..... میں ایسی جگہ پھنس گیا تھا کہ کسی کو کچھ بھی نہیں بتا سکتا تھا۔'' (یہ بیان سو فیصد مبنی برحقیقت تھا)

کیوں دیور جی..... کیا کسی چڑیل کے چنگل میں پھنس گئے تھے..... یا جادو کردیا تھا کسی نے۔'' لیلیٰ بھابی نے خالص زنانہ انداز میں پوچھا۔

نور جہاں میرے لیے حور پری تھی..... حقیقت جان لیتیں تو اسے وہ چڑیل یا جادوگرنی ہی کہتیں..... میں نے مذاق میں بات ٹالنی چاہی۔ ''ایسی ہماری قسمت کہاں بھابی..... ویسے میں فریال کو بتا دوں گا کہ اسے آپ کیا سمجھتی ہیں۔''

''یکومت۔'' لیلیٰ بھابی نے کفگیر لہرایا جس سے وہ ناشتے کے لیے انڈے فرائی کررہی تھیں۔ ''سچ سچ بتاؤ کہاں تھے رات۔''

کچن کے سلیب پر ٹانگیں لٹکا کے بیٹھا ہوا راجا ایک ٹرے کو بجا کے گانے لگا۔ ''ہاں بتا دے چندا..... چنا کتھے گزاری آرات دے۔''

میں اس وقت بھی متضاد جذبات کی یلغار میں تھا۔ ایک طرف شب گزشتہ کے نشاط آفریں لمحات کا نشہ تھا تو دوسری طرف خجالت اور اپنی گمراہ سوچ کی اذیت..... یہ احساس کہ میرے سامنے بہت سادہ اور مخلص لوگ ہیں جو پریشان ضرور تھے مگر بدگمان نہیں ہوسکتے..... وہ اعتبار کرنے والے اور سچے لوگ شک کرنا جانتے ہی نہیں..... وہ میرے ہر جھوٹ کو نیک نیتی کے ساتھ تسلیم کرلیں گے..... اس کے بعد اگر خود نور جہاں یہاں آکے انہیں بتائے کہ سچ کیا ہے تو وہ یقین کرنے سے انکار کردیں گے۔

میں نے ایک معتبر جھوٹ راستے میں ہی ایجاد کرلیا تھا۔ ''آئی ایم سوری..... شام کو یہاں سے نکلا تو مجھ خیال آیا کہ اپنے پرانے گھر کی خیر خبر لوں..... وہاں ایک ہمسائے حاجی صاحب مل گئے۔ انہوں نے بتایا کہ مکان کے لیے ایک اچھی آفر ہے..... ان کا بیٹا میرے ساتھ کا کھیلا ہوا ہے..... اسٹیٹ ایجنسی ہے اس کی وہیں..... میں اس کے پاس چلا گیا..... وہاں سے نکلا تو خیال آیا کہ فرخ کا بھی تو ایک مکان تھا۔''

''ہاں تھا۔'' راجا نے سر ہلایا۔

''میں نے گاڑی ادھر موڑ لی..... یہ دیکھنے کے لیے کہ اسے بھی وہ بیچ گیا ہے یا ٹھکانا ہے جہاں اس کے لوٹ آنے کا امکان ہو..... ادھر ادھر سے معلوم کیا تو اس کے پڑوس میں رہنے والی ایک بڑی بی نے تصدیق کی کہ وہ آیا تھا کل..... بڑی جلدی میں تھا..... کہہ رہا تھا کہ خالہ باہر جارہا ہوں..... پتا نہیں پھر کب آنا ہو..... اس سے زیادہ کچھ نہیں بتایا۔''

''تو نے پوچھا ہی نہیں۔'' راجا بولا۔

''میں نے پوچھا کہ فرخ نے کیا کہا تھا..... کہاں جارہا تھا..... بڑی بی نے کہا کہ امریکا ہی گیا ہوگا..... آج کل تو جسے دیکھو وہیں کی دھن سوار ہے۔ یہ نہیں دیکھتے کہ وہاں کیا سلوک ہورہا ہے مسلمانوں کے ساتھ۔ خاص طور پر پاکستانیوں کے ساتھ..... میں نے پوچھا کہ کب روانگی ہے اس کی..... اس پر خالہ نے ایک ایسی بات بتائی جو بڑے کام کی تھی..... انہوں نے کہا کہ فلائٹ اس کی آج رات ہی ہے اسلام آباد سے۔''

''چنانچہ آپ نے دوڑ لگائی منجانب اسلام آباد۔''

میں نے کہا۔ ''ظاہر ہے..... سارا مسئلہ وقت کا تھا۔ مت پوچھ میں نے کیسے گاڑی دوڑائی..... چار گھنٹے میں اسلام آباد..... رات کے بارہ بجے..... عام طور پر یو کے والی فلائٹس نصف شب کے بعد ہوتی ہیں..... صبح تک انٹرنیشنل ڈیپارچر لاؤنج کے سامنے چوکنا کھڑا رہا۔''

راجا بولا۔ ''ایک ٹانگ پر..... ہلا نہیں اپنی جگہ سے یہ بھی کہہ۔''

لیلیٰ بھابی نے ناشتا لگاتے لگاتے فرمایا۔ ''سوال صرف یہ ہے آپ سے قبلہ نواب صاحب..... کہ آپ کچھ ہمارا خیال فرماتے..... ایک فون کردیتے تو کیا آپ کی شان میں فرق آجاتا۔''

اس جھوٹ نے میرے اعتماد کو دوچند کردیا تھا..... میں نے کہا۔ ''کوشش کی تھی بھابی..... آپ کے سرعزیز کی قسم..... کامیاب نہیں ہوئی..... دراصل یہ راستہ ہی ایسا ہے..... میں نے فون کیا تھا نکلتے ہی مگر پہاڑیاں ہیں اور سگنل کہیں آتا ہے کہیں نہیں۔'' میں نے کہا۔

''اچھا چلو باقی جھوٹ ناشتے کے بعد بولنا۔'' بھابی نے کہا۔

''کمال کرتی ہیں آپ بھی..... آپ کے سر کی قسم کھائی پھر بھی آپ کو اعتبار نہیں۔'' میں نے کہا۔

''میرے سر کو چھوڑو..... وکیل صاحب کہتے ہیں اس کی وقعت کیا ہے..... خالی برتن کی..... جس میں تھوڑا سا بھوسا ہے اور بس۔''

راجا نے کہا۔ ''رات بھر برے برے خیالات آتے رہے..... جو دوسرے نقطۂ نظر سے اچھے تھے یقیناً..... کہ کہیں تو مجرا دیکھنے نہ چلا گیا ہو کسی کوٹھے پر..... اس کوہ قاف کی پری نور جہاں نے تجھے اغوا نہ کرالیا ہو.....'' راجا نے میز پر بیٹھنے کے بعد کہا۔

میرا دل دھک سے رہ گیا..... آخر یہ کیا ہورہا تھا..... میرا احساس جرم کیسے اتفاقات کو سامنے لا رہا تھا۔ بڑی کوشش سے میں نے اپنے چہرے تک ایسے خیالات کا عکس نہ آنے دیا اور ظاہری بے نیازی سے کہا۔ ''اگر میں کہوں کہ حقیقت تو یہی تھی..... کہ میں نور جہاں کی خواب گاہ میں تھا۔''

''مگر اکبر خان کے ساتھ..... ہر پری کا محافظ کالا دیو ہوتا ہے اور شہزادے کے ساتھ وہ سلوک کرتا ہے جو بھی بیان نہیں کیا جاسکتا..... کم سے کم محترم بھابی صاحبہ کے سامنے.....'' راجا بولا۔

بھابی نے چائے بناتے ہوئے کہا۔ ''کتنی پریشانی اٹھائی ہم سب نے رات بھر..... پتا نہیں کہاں کہاں معلوم کیا..... کیسے برے برے خیال آتے رہے۔''

میں نے کہا۔ ''اماں ابا کو تو معلوم نہیں ہوا؟''

راجا نے کہا۔ ''شکر ہے رابعہ کے پاس عقل ہے..... عورت ہونے کے باوجود۔''

''بڑے کمینے ہو تم بھی۔'' لیلیٰ بھابی نے خفگی سے کہا۔

''اس بے چاری نے رات دو بار فون کیا..... جاگتی رہی رات بھر۔'' راجا نے پوچھا۔

''کم سے کم سو بار..... بالآخر جھوٹ بولنا پڑا تیری خاطر..... کیا کرتا کہہ دیا کہ اس کا فون ابھی آیا تھا..... کہہ رہا تھا رات کو نہیں اب صبح آؤں گا..... کسی کام میں اُلجھا ہوا تھا کہنے لگا کہ آکے بتاؤں گا..... تم سو جاؤ آرام سے لیکن بیگمات..... بیویاں ہوں یا ہونے والی بیویاں..... شوہروں یا نامزد شوہروں کے معاملے میں ان کی ناک کتے سے بھی زیادہ حساس ہوجاتی ہے..... میرا مطلب ہے جھوٹ کو سونگھنے میں۔''

''اور تم لوگ پھر بھی باز نہیں آتے۔'' لیلیٰ بھابی بولیں۔

''اب اس سے زیادہ غلطی کیا کریں..... فریال بھی مطمئن نہیں ہوئی تھی..... جرح کررہی تھی کہ اچانک ایسا کیا کام نکل آیا..... فون پر پوچھ نہیں سکتے تھے..... میں نے کہا کہ لائن کٹ گئی..... کارڈ ختم ہوگیا یا بیٹری جواب دے گئی..... ناشتا کرلے جلدی سے اور مزید ذلت اٹھانے کے لیے تیار ہوجا..... وہ آسکتی ہے کسی بھی وقت زلزلے کی طرح۔''

اور کرنا خدا کا یوں ہوا کہ ادھر بات اس کے منہ سے نکلی ادھر فریال نمودار ہوئی۔ میں نے اچانک اسے دروازے کے فریم میں کسی تصویر کی طرح دیکھا..... اُداسی پریشانی اور پژمردگی..... خوف مایوسی اور بے خوابی کی بدحالی کی جیتی جاگتی تصویر۔

میں اٹھا ہی تھا کہ وہ کوئی بات کیے بغیر دوڑ کے مجھ سے چمٹ گئی اور ایسے رونے لگی کہ سنبھالنا مشکل ہوگیا۔ اپنے جذبات کے اظہار میں وہ کسی کی موجودگی کا لحاظ کرنے کی کبھی قائل نہ تھی۔ پیار ہو یا غصہ..... اس کے جذبات اسی طرح عیاں ہوتے تھے۔ رسمی تکلفات اور شرم و حیا کے تقاضے اسے روک نہیں پاتے تھے۔

ایک ہسٹریائی کیفیت میں اس نے مجھے مارا۔ انگریزی اور اردو میں ایسی سنائیں کہ شریف گھریلو بیبیاں سن لیں تو دانتوں میں انگلی دبالیں مگر اس کی فطرت میں آتش فشانی کا اور سیلابی ریلے کا کنٹرول میں نہ آنے والا انداز ہمیشہ سے ایسا ہی تھا۔ اس کیفیت کو روایتی انداز میں ختم کرنے کے لیے لازم تھا کہ میں اس کے ایک زوردار جھانپڑ رسید کروں مگر وہ مجھے چھوڑتی تو میں کچھ کرتا..... اس مشکل مرحلے میں لیلیٰ بھابی نے میری مدد کی۔ اس نے فریج سے یخ ٹھنڈا پانی نکالا اور مگ بھر کے فریال کے منہ پر پھینک دیا۔

اسے ایک جھٹکا لگا..... اس نے سسکی لی اور منہ کھول کے کچھ کہنا چاہا..... پھر اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا اور وہ گرنے لگی تو میں اسے سنبھال کے اندر لے گیا۔ یخ بستہ پانی مجھ پر بھی آیا تھا اور میرے کپڑے بھی گیلے ہوئے تھے میں جتنی دیر میں جسم خشک کرکے اور لباس تبدیل کرکے آیا لیلیٰ بھابی نے فریال کو بھی اپنا ایک جوڑا پہنا دیا تھا اور اب وہ سیدھی ساکت لیٹی تھی۔

لیلیٰ بھابی کافی بنانے چلی گئیں اور میں بیڈ پر اس کا ہاتھ تھام کے اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ ''فریال یہ کیا پاگل پن کا مظاہرہ کرتی ہو تم؟''

وہ کچھ نہیں بولی۔ آنسو خاموشی سے اس کی آنکھوں کے گوشوں سے بہہ کر تکیے میں جذب ہوتے رہے..... راجا بھی عمداً منظر سے غائب رہا۔ وہ جانتا تھا کہ اس جذباتی بحران کے بعد خلوت ضروری ہے۔

میں بولتا رہا۔ ''اگر میں کسی وجہ سے آنہیں سکا اور اطلاع بھی نہ دے سکا تو اس میں اتنا رونے دھونے کی کون سی

بات تھی۔ آدمی بعض وقات ایسی سچویشن میں پھنس جاتا ہے۔"

وہ سنتی رہی۔ پھر ایک دم بولی۔ "میں تمہارے ساتھ چلوں گی رومیو...... میں وہیں رہوں گی...... ست بدھائی میں۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ "تم تو مجھ سے ملنے کے لیے تیار نہیں تھیں۔"

"جس کا جو دل چاہے کہے...... جو چاہے سمجھے...... میں مر جاؤں گی مگر تم کو نہیں چھوڑوں گی...... سنا تم نے...... تمہارے ماں باپ کی ہی عزت کرتی ہوں...... جانتی ہوں تمہاری زندگی میں ان کی اہمیت کیا ہے مگر انہیں بھی ماننا ہوگا میری اہمیت کو...... وہ مجھے ایسے تم سے دور نہیں کر سکتے۔"

میں نے کہا۔ "انہوں نے تم سے نہیں کہا تھا جانے کو۔"

وہ اُٹھ بیٹھی۔ "پھر کیا تم نے ایسا کہا تھا۔ میں خطرہ بن گئی تھی ان کے لیے...... اس لیے؟ میری وجہ سے وہ مارے جاتے...... یہ فکر تھی تمہیں...... میری فکر نہیں تھی...... یہ خیال نہیں تھا کہ تم سے دور کسی اجنبی گھر میں قید ہوں...... اکیلی ہوں اگر سلطان کا اتنا ہی ڈر ہے تو انہیں منتقل کر دو کہیں...... کسی تہ خانے میں رکھ دو...... توپیں لگا دو ہر طرف...... انہیں صرف تمہاری فکر ہے...... میری فکر کسی کو نہیں۔"

میں نے کہا۔ "ایزی...... ایزی...... تم پھر ہسٹریا کی طرف جا رہی ہو۔"

لیلیٰ بھابی بروقت نمودار ہوئیں۔ "چلو بھئی بند کرو یہ ڈراما...... کافی پیو اور کوئی اچھی بات کرو۔"

اس کے ساتھ ہی راجا نے انٹری دی۔ "میں فریال کے مطالبات کو سپورٹ کرتا ہوں...... اور اس کے حق میں مظاہرہ بھی کروں گا...... ست بدھائی میں۔"

"یہ میں پہلے ہی طے کر چکا تھا...... فریال ہمارے ساتھ جائے گی...... اماں ابا کو میں سنبھال لوں گا۔" میں نے کہا۔ "مظاہرے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

فریال کے اداس چہرے پر بشاشت آ گئی۔ ایک دم ماحول کا تناؤ ختم ہو گیا...... میں نے لیلیٰ بھابی سے کہا۔ "ہم آپ کو بھی لے جائیں گے اپنے ساتھ...... زبردستی۔"

"میرے میاں کو جانتے ہو نا...... اغوا کے کیس میں بند کرا دے گا۔" لیلیٰ بھابی نے کہا۔ "سوتی بیوی ہوں اس کی۔"

"ہم اسے بھی اغوا کر لیں گے۔" راجا بولا۔

میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "دیکھو لیلیٰ بھابی...... کسی خوش فہمی میں مت رہنا...... اسے بس بہانہ چاہیے...... اب جونئی سیکریٹری رکھنا چاہتا ہے میں نے بتایا تھا نا کہ پرانی کی شادی ہو رہی ہے۔"

وہ ہنسنے لگی۔ "ہاں بتایا تھا...... ایک روز میں آفس گئی تھی تو اس نے مجھے بہت کچھ بتایا تھا تمہارے بارے میں...... کیسے لائن مارتے ہو تم اس پر...... کہنے کو مذاق ہوتا ہے مگر نیت کو وہ خوب سمجھتی ہے۔"

"بھابی مذاق چھوڑو...... چلنے کی تیاری کرو...... فاروقی سے میں نمٹ لوں گا۔"

"وہ میری خوشی میں خوش ہیں...... میں تو خود آج کل میں آ ہی جاتی۔ وہاں میرا دل لگا ہوا تھا...... یہاں پھر دن سارا دن اکیلی رہتی ہوں تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں...... کوئی بات کرنے والا نہیں ہوتا۔"

میں نے کہا۔ "تمہارے بغیر ست بدھائی میں رونق نہیں رہی۔ ایک ساتھ تم اور فریال نکل آئے...... مجھے تو کل کچھ ایسا لگا تھا جیسے اماں ابا بھی فریال کو مس کر رہے ہیں...... زبان سے تو نہیں کہا انہوں نے...... لیکن وہ کچھ عادی ہو چکے تھے فریال کی توجہ کے۔"

میرا خیال اس سہ پہر درست ثابت ہوا۔ ہم دو گاڑیوں میں پہنچے تو اس وقت وہ سو رہے تھے۔ رابعہ تو فریال کو دیکھ کے کھل اٹھی۔ وہ اکیلی باغ میں ہرن کے بچے کو ہتھیلی پر دانہ رکھ کے کھلا رہی تھی۔

وہ بھاگی ہوئی آئی اور فریال سے لپٹ گئی۔ "یہ تم نے بہت اچھا کیا کہ خود آ گئی ہو...... میں سوچ رہی تھی تایا سے کہوں۔"

فریال نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ "ڈاکٹر صاحبہ کہاں ہیں؟"

"کسی ولادت کے سلسلے میں گئی ہیں۔ آتی ہی ہوں گی۔"

معمول کے مطابق ابا ٹھیک ساڑھے چار بجے سو کے اٹھے...... وضو کر کے انہوں نے نماز پڑھی۔ اماں کی نماز ابھی جاری تھی کہ میں نے حاضری دی۔ انہوں نے سلام کے جواب میں دعا دی۔ اسی وقت اسکرپٹ کے مطابق فریال نے انٹری دی۔ وہ چائے لے کر اندر آئی تو میری نظر ابا کے ردِعمل پر تھی اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ان کے چہرے پر مسکراہٹ آ گئی تھی جو خوشی کی غماز تھی۔

انہوں نے شفقت سے فریال کے سر پر ہاتھ رکھا۔

"اچھا کیا تم لوٹ آئیں...... ہمیں بعد میں اپنی زیادتی کا احساس ہوا...... جو کچھ یہاں ہوا اس میں تمہارا تو قصور نہیں تھا۔"

اماں نے جائے نماز سے اٹھتے ہی جوابی گولا داغا۔ "ہوا تو اس کی وجہ سے ہی تھا۔"

خلاف توقع جواب مجھے نہیں دینا پڑا۔ ابا نے کہا۔ "تم بھی کمال کرتی ہو جی...... کیا اس بے چاری نے بلایا تھا اسے...... ہم سوچتے رہے بعد میں کہ اس پر غصہ کیسا...... یہ تو اب ہماری ذمے داری ہے نا کہ اس کی حفاظت کریں...... نہ یہ کہ اسے چلتا کریں کہ جاؤ کہیں اور ٹھکانا کرو کیونکہ تمہاری وجہ سے ہماری جان کو خطرہ ہے۔"

"تو کیا نہیں ہے؟" اماں نے دبے دبے لہجے میں احتجاج جاری رکھا۔

"وہ تو سب کو ہے ایک جیسا...... ہمیں تو اس بدمعاش سلطان کو کہنا چاہیے کہ خبردار جو اس کی طرف آنکھ اٹھا کے بھی دیکھا۔ آخر یہ ہماری ہونے والی بہو ہے۔" ابا نے پھر اس کے سر پر دست شفقت رکھا۔

اب اس موقع پر مشرقی روایات کے مطابق فریال پر لازم تھا کہ شرم سے منہ چھپا کے بھاگ جاتی مگر مجال ہے جو اس نے ذرا بھی اثر لیا ہو۔ الٹا اس کی مسکراہٹ ٹوتھ پیسٹ کے اشتہار والی ہو گئی بلکہ اس نے یہ ضرور کہا کہ "آپ بہت اچھے ہیں ابا جی۔" مگر اس کا فریق ثانی کے حق میں الٹا مطلب ہو گیا کہ اماں اچھی نہیں ہیں...... اس سے پہلے کہ اماں کا ردِعمل سامنے آتا فریال نے خود ہی محسوس کر لیا کہ جملہ غلط ہو گیا۔

اس نے کہا۔ "امی بھی غلط تو نہیں کہہ رہی ہیں۔"

آگے بات میں نے سنبھال لی۔ "امی کو بالکل فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں وہ ایک انتظامی کوتاہی تھی جس کا اس نے فائدہ اٹھا لیا۔ اب میں نے...... میں نے کیا غنی نے حفاظتی انتظامات کی ذمے داری سنبھالی ہے پھر ادھر کا رخ کیا تو مارا جائے گا کتے کی موت۔ نزدیک نہیں پھٹک سکتا۔"

"چلو یہ تو اچھا ہے...... اللہ ہم سب کو اپنی امان میں رکھے مگر رفیق میاں...... یہ کوئی اطمینان بخش صورت حال نہیں ہو سکتی...... مانا کہ ہم اس حویلی کو ایک ناقابل تسخیر قلعہ بنا سکتے ہیں لیکن اس میں قید ہو کے رہنا ممکن ہے...... ہماری بات چھوڑو...... تم لوگ تو باہر ہی رہتے ہو...... تم کیا کرو گے...... صدر مملکت کی طرح تمہاری گاڑی کے آگے پیچھے اسکورٹ تو رہے گا نہیں۔"

میں نے کہا۔ "اس کا بھی کچھ کر لیں گے۔"

"نہیں مجھے بتاؤ کیا کر لو گے...... اس مسئلے کا حل تو بس ایک ہے۔"

میں نے کہا۔ "وہ کیا؟"

"اس سے بات کی جائے معقولیت کے ساتھ...... کہ میاں زبردستی چھوڑو...... تمہیں کون سی کمی ہے لڑکیوں کی...... حرم آباد کر لیتے ہو ہر جگہ...... اس کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو۔"

میں نے کہا۔ "وہ معقول بات سنتا تو پھر بات ہی کیا تھی۔"

"اس کا تو باپ بھی سنے گا جب ہم خود بات کریں گے۔"

میرا خیال ہے کہ ہم سب اچھل پڑے...... عملاً نہ سہی محاورتاً...... میں نے کہا۔ "آپ بات کریں گے۔"

"ہاں...... وہ تمہاری نہیں سنتا کیونکہ تم خود سیر کے مقابلے میں سوا سیر ہو...... اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے تو جنگ چلتی ہے۔ مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ بات کرنا ایک آرٹ ہے رفیق میاں...... سامنے والے کو دیکھ کر بات آگے بڑھائی جاتی ہے...... شطرنج کی چال کی طرح سوچ سمجھ کے...... اور ہم کچھ ہوں نہ ہوں...... بات سمجھانا جانتے ہیں۔ کالج میں اور کیا کرتے تھے۔ بات ہی سمجھاتے تھے ہر قسم کے لڑکے ہوتے تھے کلاس میں...... محنتی اور کام چور...... ذہین اور کند ذہن...... شریف اور بدمعاش...... سب سمجھ لیتے تھے بالآخر...... تم دیکھنا وہ بڑا خونخوار شیر بنتا ہے نا...... ہم اسے کان سے پکڑ کے لے آئیں گے یہاں میمنے کی طرح اور وہ خود تسلیم کر لے گا کہ اس کی سوچ اور اس کا رویہ غلط تھا۔"

میں نے راجا کی طرف اور راجا نے فریال کی طرف دیکھا۔ سب کی نظر کا مدعا ایک ہی تھا۔ بحث اور اختلاف کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو...... سادہ لوح اور اچھا سوچنے والے۔ آج کی دنیا کو گزرے وقت کے آئینے میں دیکھنے والے...... سلطان ان کا شاگرد نہیں تھا اور ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ اب تو شاگرد بھی دونمبر آ رہے ہیں۔ کیونکہ استاد بھی دونمبر ہیں...... جو ان کے وقت میں تھا اب نہیں ہے۔

راجا نے کہا۔ "میں آپ سے بالکل متفق ہوں۔"

میں نے فوراً بات بدل دی۔ "لیکن ابھی تو آپ تیار ہو جائیں۔"

"کیوں بھئی...... کہاں جانا ہے۔" وہ بولے۔

میں نے کہا۔ "ایک تقریب ہے جس میں ہم سب گھر

مدعو کیا گیا ہے۔ راجا نے کہا۔ ''یہ نواب صاحب اس کے مہمان خصوصی ہیں۔ اب آپ خود سوچ لیں کہ وہ کیا تقریب ہو گی جس میں اور کوئی مہمان خصوصی ہی نہ ملے۔''

ابا جی مسکرانے لگے۔ ''کوئی شادی ہے۔''

''آپ بھی کمال کرتے ہیں..... شادی میں تو مہمان خصوصی ہوتا ہے دُلہا..... یہاں ایک موبائل فون کمپنی نے اپنا ٹاور نصب کیا ہے..... ٹیلہ جوگیاں میں۔''

''اچھا..... بھئی یہ تو بہت ہی اچھا ہوا۔'' وہ بولے۔

میں نے کہا۔ ''بڑی آسانی ہو جائے گی اس سے..... میں چاہتا ہوں وہاں آپ ایک اعلان کریں۔''

ابا جی گھبرائے۔ ''کس قسم کا اعلان؟''

میں نے کہا۔ ''آپ کمپنی سے کہیں کہ یہاں ست بدھائی میں دوسرا ٹاور لگائے..... ٹیلہ جوگیاں کا فاصلہ دس کلو میٹر تو ہو گا..... کنٹر فلائی..... بیچ میں رکاوٹ بھی ہے پہاڑی کی۔''

''وہ میرے کہنے سے کہاں مانیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''آپ آفر کریں کہ ٹاور کے لیے جگہ ہم فراہم کریں گے بلکہ معاوضہ کمپنی شہروں میں تیس ہزار ماہانہ تک کرایہ دیتی ہے اور اگر بات ہے اخراجات یا فیزبلیٹی کی..... تو ٹاور کی تنصیب کا سارا خرچہ ہمارا..... یہ ست بدھائی ترقیاتی منصوبے کا پہلا پروجیکٹ ہو گا..... جو کامیاب ہو گیا اور کوئی وجہ نہیں کہ کامیاب نہ ہو..... تو دھاک بیٹھ جائے گی گرد و نواح میں دور دور تک۔''

ابا جی کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ ''بھئی یہ تو واقعی بڑی بات ہو گی۔''

میں نے کہا۔ ''آپ اچانک اعلان کریں گے تو زبردست سرپرائز ہو گا۔''

تقریب کا وقت پانچ بجے رکھا گیا تھا مگر غنی کے انفارمیشن نیٹ ورک نے اطلاع دی کہ پاکستانی روایات کے مطابق ہم سب پابندی وقت کا خیال رکھتے ہوئے ساڑھے چھ سات کے درمیان تشریف لائیں..... اس نے پہلی قطار میں ہمارے لیے دس وی آئی پی سیٹوں کو ریزرو کرا لیا گارڈ کھڑے تھے جو نواب صاحب کی فیملی کی جگہ کے قریب کسی کو نہیں آنے دے رہے تھے۔

ہمارا قافلہ بھی تین گاڑیوں میں اس شان سے پہنچا کہ آگے وہ جیپ تھی جسے فرخ کو چھوڑ کر جانا پڑا تھا۔ اس روز وہ خراب تھی اور غنی کی تحویل میں تھی۔ اس جیپ سے چار اسلحہ بردار گارڈ اترے۔ پیچھے والی گاڑی سے میرے ساتھ راجا اور ابا جی برآمد ہوئے۔ دوسری گاڑی کو فریال ڈرائیو کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ شہناز رابعہ اور لیلیٰ بھابی تھیں۔ تیسری گاڑی اکبر خان چلا رہا تھا اور اس میں اس کی ماں اور بہن تھی۔ ریشم جس شان اور خوشی سے دمکتے چمکتے چہرے کے ساتھ اتری اس نے لوگوں کو دم بخود کر دیا۔ وہ اب ڈاکٹر شہناز کی اسسٹنٹ کے طور پر جانی جاتی تھی اور ڈاکٹر سے زیادہ انگریزی بولتی تھی یہ ایک ملازم پیشہ خاندان کی ایسی عزت افزائی تھی جو یہاں کی فیوڈل جاگیردارانہ سوچ کے خلاف ایک انقلاب کا سگنل بن گئی تھی۔

کمپنی کا ایگزیکٹو خواجہ استقبال کے لیے بھاگا ہوا آیا۔ وہاں کئی شامیانے لگے ہوئے تھے جن کے پیچھے کم و بیش پانچ سو افراد کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ بن بلائے تماشائی شامیانے کے گرد ہجوم بنائے کھڑے تھے۔ میں نے ابا جی کا تعارف کرایا اور ہمیں بڑے تزک و احتشام کے ساتھ آگے صوفوں پر لے جا کے بٹھا دیا گیا۔

خواتین نے الگ ایک سنسنی پھیلائی۔ ان کے جدید ترین شہری وضع کے فیشن نے غریب اور سیدھے سادے لوگوں کی آنکھوں میں چکاچوند پیدا کر دی۔ وہاں جو گنی چنی خواتین ایک گوشے میں ہر وضع کے برقعوں میں یا چادروں میں اور سیدھے سادے لباس میں پہلے سے موجود تھیں۔ انہوں نے سخت برا منایا جب وہ ان کے ساتھ بیٹھنے کے بجائے پہلی نشست میں ہمارے ساتھ براجمان ہوئیں..... جیسا کہ مجھے بعد میں رپورٹ ملی سب سے زیادہ باتیں ریشم کے خلاف بنائی گئیں جو محاورے کے مطابق..... موری کی اینٹ چوبارے میں جڑی..... کل تک خوار پھرتی تھی فقیروں جیسے حلیے میں..... آج کیسی چٹک مٹک کے ساتھ آئی ہے..... انگریزی بولتی ہے اور بیٹھی ہے پہلی قطار میں مالکوں کے ساتھ..... کیا زمانہ آ گیا ہے۔

رانا کو میں نے بعد میں دیکھا۔ شامیانہ دو حصوں میں تھا۔ درمیان میں راستہ تھا جس پر قالین بچھایا گیا تھا وہ دوسری طرف کی پہلی قطار میں اپنے خاندان کے ساتھ موجود تھا لیکن اس میں خواتین شامل نہ تھیں۔ وہ معزز خواتین پبلک میں نہیں آتی تھیں۔ اور اس بے حیائی کے ساتھ تو سوال ہی نہیں..... اپنے اعلیٰ اخلاق کا عوامی مظاہرہ کرنے کے لیے میں ابا جی کے ساتھ رانا کے پاس گیا اور اس سے ہاتھ بھی ملایا۔

خواجہ نے مصلحت سے کام لیتے ہوئے کسی مہمان خصوصی کے نام کا اعلان نہیں کیا تھا۔ اگر میرے نام کا پتا چل

جاتا تو رانا صاحب لازمی طور پر تقریب کا بائیکاٹ فرما دیتے۔ پریس کوریج کا بندوبست خود کمپنی نے بہت اچھا کیا تھا۔ بزنس پروموشن کے لیے ہر موبائل فون کمپنی پورے زور و شور سے پبلسٹی کے مقابلے میں شریک تھی اور اپنا ڈھول دوسرے سے زیادہ اونچی آواز میں پیٹا جا رہا تھا۔ جب صحافی پہنچے تو راجا کو دیکھ کر حیران بھی ہوئے اور خوش بھی۔ اس کے بعد سازش مکمل ہو گئی رانا کو سرسری کوریج دی جائے گی۔ کیمرا نواب صاحب اور ان کی فیملی پر فوکس رہے گا اور انہی کو پراجیکٹ کرے گا۔

جب مہمان خصوصی کے طور پر مجھے افتتاح کے لیے بلایا گیا تو رانا کی تو بے عزتی خراب ہو گئی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ ہو گا کہ اس کی جدی پشتی امارت اور سیاسی اہمیت کو یوں نظر انداز کر دیا جائے گا۔ بقول ان کے کل کا لونڈا..... اور وہ لیا۔ ایک معمولی تنخواہ دار پروفیسر کی اولاد زیادہ اہم ہو جائے گا۔ بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے!

بات اگر اسی پر ختم ہو جاتی تو بھی کچھ نہ ہوتا..... خواجہ نے پہلے یہ غضب کیا کہ ست بدھائی ترقیاتی پروجیکٹ کے بارے میں جو بینک منیجر سے سنا تھا وہ سب دہرا دیا کہ یہاں اسکول، کالج، اسپتال تو خیر بنیں گے فیکٹری لگے گی مزدوروں کے لیے کالونی ہو گی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ڈیم ہو گا جس سے بجلی ملے گی اور فصلوں کے لیے پانی..... اس نے مزید کہا کہ کاش ہمارے سب نوجوان پاکستانی جو باہر بھاگ رہے ہیں نواب صاحب کی طرح سوچیں..... باہر سے اعلیٰ تعلیم حاصل کریں اور پھر پاکستان کے لیے کچھ کریں۔

جب میں جواب دینے گیا تو ظاہر ہے میں نے بہت عاجزی اور انکساری دکھائی کہ میں کیا اور میری اوقات کیا..... عزت ذلت دینے والا اللہ ہے..... وہی توفیق دیتا ہے اور وہی سب کراتا ہے..... میں اپنے مقابل بیٹھے ہوئے رانا اینڈ کمپنی کے ہر شخص کی صورت کے تغیرات کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہے تھے اور میرا خیال ہے کہ کچھ جوشیلے نمک خواروں نے اجازت چاہی کہ نواب صاحب کا اور اس تقریب کا بینڈ بجا دیا جائے مگر رانا پریس کے سامنے مزید تماشا نہیں بننا چاہتا تھا..... اس لیے سب کو منع کر دیا۔

آخری کام یہ ہوا کہ میں نے اپنے والد کو بلا لیا کہ وہ ایک اعلان کرنا چاہتے ہیں اور اس سے پہلے یہ بتایا وہ پروفیسر تھے اور استاد خواہ مدرسے کا ہو پرائمری اسکول کا یا یونیورسٹی کا..... انسان کا روحانی باپ ہوتا ہے اور ان کے کردار کی تعمیر کرتا ہے جو قوم کے معمار کہلاتے ہیں۔

وہ خود میرے لیے ایک انتہائی جذباتی منظر تھا جب ابا جی خوشی سے آنکھوں میں آنسو لیے اٹھے اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے آگے آئے..... وہ بیمار بھی نہیں رہے تھے مگر اپنی صحت کے اعتبار سے جسیم اور قد آور بھی نہیں تھے..... جیسے کہ یہاں موجود دیہات کے رہنے والوں کی اکثریت تھی..... وہ دبلے پتلے تھے اور اب پہلے سے زیادہ کمزور ہو گئے تھے..... میں ان کو ہاتھ پکڑ کے اسٹیج تک لایا..... وہ فرط جذبات سے کانپ رہے تھے۔

ایک دم سارے کیمرے ان پر فوکس ہو گئے..... تالیوں کا شور اٹھا اور مجھے ڈر ہوا کہ کہیں ابا جی بے ہوش نہ ہو جائیں..... جوش میں طلب سے بڑھ کر ریشم تھی جو تالیاں پیٹتے ہوئے کھڑی ہو گئی تھی۔ ایسی عزت افزائی کا ابا جی تصور بھی نہیں کر سکتے تھے بڑی مشکل سے ان کی آواز نکلی۔ انہوں نے سب کا شکریہ ادا کر کے وہ اعلان کر دیا جو میں نے بتایا تھا۔ اس پر دوبارہ شور اٹھا۔ میں نے ریشم کو دیکھا۔ وہ کرسی پر چڑھ کے اور منہ میں انگلیاں ڈال کے سیٹی بجا رہی تھی اور تالیاں پیٹ رہی تھی۔ اسے شہناز نے بڑی درشتی سے کھینچا اور کچھ کہا جس کے بعد وہ کچھ شرافت سے بیٹھی رہی۔

خواجہ نے آخر میں رانا صاحب کو بھی مدعو کیا مگر اس کا موڈ اس وقت تک اتنا خراب ہو چکا تھا کہ اس نے انکار کر دیا۔ کھانے پینے کا عوامی انتظام تو ہلڑ بازی اور لوٹ مار کی نذر ہو گیا۔ بن بلائے مہمان بزور بازو کامیاب رہے اور سب کچھ کھا گئے..... خصوصی انتظام والے حصے میں چائے پیتے ہوئے مجھے معلوم ہوا کہ رانا صاحب اپنی فیملی کے ساتھ جا چکے ہیں۔

خطرے کی گھنٹی تو پہلے ہی بج گئی تھی۔ اب رانا نے محسوس کیا ہو گا کہ طبل جنگ بج گیا۔ نواب رفیق احمد شیرازی کے سیاسی کھیل کا آغاز ایک کمیں..... کتوں کا کتا..... کاسو کی کھلم کھلا حمایت اور اسے بغاوت پر اکسانے سے ہوا تھا۔ اس پہلے راؤنڈ میں یہ لاٹری نکلنے سے نواب بننے والا بازی جیت گیا تھا۔ ساری دھمکیوں..... طاقت کے مظاہروں اور سازشوں کے باوجود کاسو واپس نہیں آیا تھا۔ اس کی بڑی سبکی ہو رہی تھی..... کاسو کو مر جانے والے کتے کے ساتھ زندہ دفن کرنے کے اعلانات دھرے رہ گئے تھے۔ دوسرے راؤنڈ میں کاسو کا سودا کرنے کی کوشش کی گئی تھی اس کی جان بخش دی جائے گی اگر سائنس ریسرچ سینٹر کا معاملہ نہ اٹھایا جائے۔ وہ

بات بھی پوری نہ ہوئی۔ رانا نے کتے کی کھال میں بھس بھروا کے رکھ لیا تھا کہ ایک نہ ایک دن اسے کاسو کے ساتھ گاڑا جائے گا مگر وہ کتے کی ڈمی اب فاروقی کے گھر کے کسی اسٹور میں پڑی تھی کاسو ان کی دسترس سے بہت دور محفوظ زندگی گزار رہا تھا۔

آج رانا کو تیسری ہزیمت اٹھانی پڑی جو سب سے بڑی تھی۔ مجمع عام نے ان کی بے توقیری کا تماشائے عبرت دیکھا۔ گویا ڈھنڈورا پٹ گیا کہ رانا صاحب کو اب کس کس کی پرسد کہ جیسا کون ہو...... اب دور آیا ہے نواب رفیق احمد شیرازی کا...... زمانے نے دیکھا کہ اس کا نام موبائل کمپنی کے ٹاور سے بھی اونچا ہوا اور خاندانی نجابت کے اجارہ دار جدی پشتی رئیس اور اسمبلی کی سیٹ کے موروثی حقدار کو ان سب کی طرح نظر انداز کر دیا گیا جو وہاں موجود تھے۔ اس وقت کے تماشائی تھے۔

اس رات حویلی میں جشن کا سماں رہا۔ صرف لیلیٰ بھابی افسوس کرتی رہیں کہ اس موقع پر فاروقی ساتھ نہیں تھا جب ہم واپس پہنچے تو وہ حویلی میں اکیلا بیٹھا انتظار کی گھڑیاں گن رہا تھا۔ اسے گیٹ پر موجود چوکیدار نے صرف اتنا بتایا تھا کہ سب گاڑیوں میں بھر کے کہیں گئے ہیں وہ اندازہ نہ کر سکا کہ ہم آخر کہاں جا سکتے ہیں۔ شام کے وقت پکنک منانے کون نکلتا ہے...... ظاہر ہے جب ہم نے اسے واپسی میں دیکھا تو وہ غصے میں اسٹیم بھرے بوائلر کی طرح شوں شوں کر رہا تھا اور جنگل سے پکڑے جانے والے شیر کی طرح پنجرے میں ٹہل رہا تھا۔

ہم ہنستے ہوئے داخل ہوئے تو اس کا پارا اور چڑھا...... قدرتی طور پر بیوی اس کا پہلا ہدف بنی۔ ''اسے تم سپریم کورٹ کا نوٹس سمجھو اور وضاحت کرو کہ اپنے اکلوتے شوہر سے این او سی حاصل کیے بغیر تم ان دونوں لفنگوں کے ساتھ گھر سے کیسے فرار ہو گئیں۔''

''کیا بات ہے...... غصے میں جھوٹ بھی بولتے ہو...... لاؤ بھئی کوئی ان پر ٹھنڈا پانی ڈالو۔'' لیلیٰ بھابی نے کہا۔

''ایسی آواز نکلے گی جیسے جلتے کوئلوں پر پانی ڈالنے سے نکلتی ہے۔'' راجا نے کہا۔ ''اور سارا دھواں نکل جائے گا۔''

''سائیلنسر سے۔'' میں نے آہستہ سے اضافہ کیا لیکن پھر بھی سب نے سن لیا اور خواتین نے ہنسنا شروع کیا تو فاروقی بھی ہنسنے لگا۔

''یہی تو مصیبت ہے۔ جب میں آیا تھا تو تین طرح کا غصہ میرے اندر آتش فشاں کی طرح بھرا ہوا تھا...... ایک اس خاتون پر جس کا میں اکلوتا مجازی خدا ہوں مگر یہ مجھے گھاس بھی نہیں ڈالتی...... جب چاہتی ہے چھوڑ کر بھاگ جاتی ہے۔''

لیلیٰ بھابی نے کہا۔ ''میں ابھی منگواتی ہوں بالکل تازہ گھاس...... صبح شام ڈالوں گی۔''

فاروقی بولتا رہا۔ ''پھر یہ دونوں لفنگے...... ایک نواب اور دوسرا راجا نہ جورو نہ جاتا اللہ میاں سے ناتا...... میری بیوی کو بھگا لائے...... اور اب غصہ تھا مجھے سب پر کہ سب ایک ساتھ کیا کشمیر فتح کرنے چلے گئے مگر تم سب مجھے ہنسا دیتے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''یار آج بڑا فن مس کیا تو نے۔''

لیلیٰ بھابی نے بھی کہا۔ ''سچ تم ہوتے تو آج دیکھتے رانا کا تماشا۔''

''تم رانا کا تماشا دیکھنے گئے تھے...... اس نے ڈانس کیا تھا کہیں۔''

ہم سب چائے تو پی کر آئے تھے مگر فاروقی کی فرمائش پر ایک دور اور چلا...... ریشم بڑی ہائی اسپرٹ میں تھی۔ وہ ہرنی کی طرح کلیل کرتی کچن کی طرف دوڑ گئی...... ساری بات سن کے فاروقی کے گلا پھاڑ قہقہے حویلی کے اندر گونجنے لگے۔ اچانک میری نظر رابعہ پر گئی۔ وہ بالکل چپ بیٹھی ان سب کو دیکھ رہی تھی جو خوش تھے اور ہنس سکتے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے اس کی خاموش آنکھیں جتنی دکھی اور حیران ہیں اس سے زیادہ اپنوں کی بے حسی پر شکوہ کناں ہیں کہ آخر وہ اس کے غم میں اسی اجتماعی طاقت کے ساتھ شریک کیوں نہیں؟

اگلی صبح میں نے اسے باغ میں ایک بنچ پر تنہا دیکھا۔ میں تو خیر ہمیشہ سے سحر خیز ہوں مگر اس کے بارے میں مجھے معلوم تھا کہ گھوڑے بیچ کے سوتی ہے...... جب وہ چھوٹی تھی تب بھی اسے میری مثال سے روز شرمندہ کیا جاتا تھا کہ رفیق کو دیکھو...... اسکول جانے کے لیے اسے اٹھانا نہیں پڑتا اور اٹھاؤ تو ایک آواز میں اٹھ جاتا ہے...... رابعہ کو جگانے سے پیروں پر کھڑا کرنے کے عمل میں پچی کو پیار سے چیخ پکار اور بالآخر جوتم پیزار تک سارے مرحلے روز طے کرنے پڑتے تھے۔ چھٹی والے دن اس سے بھی زیادہ ہوتا تھا جب وہ دوپہر تک پڑی رہتی تھی۔

میں قریب گیا تو دیکھا وہ رو رہی تھی۔ ہرن کا بچہ جو اس سے مانوس تھا اس کے سامنے حیران کھڑا تھا...... میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا اس نے اپنی آنکھوں کو دوپٹے سے خشک کیا۔

''آئی ایم سوری کزن۔''

میں نے محبت سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''تمہیں زیادہ ہمت سے کام لینا ہوگا...... آنے والا وقت زیادہ نامہرباں ہوگا۔''

''میں اس کے لیے تیار ہوں۔''

''کل شام میں نے محسوس کیا جیسے تمہیں سب سے گلہ ہے...... ایک بات سمجھ لو بہن...... دنیا ہنسنے والوں کے ساتھ ہنستی ہے...... رونے والوں کے ساتھ کوئی روتا نہیں۔''

''کیا تم بھی...... کزن۔''

یہ اس نے کہا تو مجھے بازگشت میں سنائی دیا...... یو ٹو بروٹس......!

تاریخ کا جو حوالہ شیکسپیئر...... ؟ سے شہرت پا گیا جب درباری جولیس سیزر کے دشمن ہو گئے اور اسے قتل کرنے کا فیصلہ کیا تو اسے خنجر گھونپا بروٹس نے جو اس کا سب سے عزیز دوست اور معتمد تھا تو جو سیزر نے کہا وہ دکھ حیرانی بے یقینی اور مایوسی کے سارے جذبات کا اظہار بن گیا۔

میں نے کہا۔ ''نہ میں نہ باقی سب...... ایسا نہیں ہے کہ وہ تمہارے دکھ سے بے گانہ ہیں...... اگر تم دنیا کی طرح سمجھی ہو نہیں۔''

اس نے خفت سے کہا۔ ''میرا یہ مطلب نہیں تھا۔''

''تم نے کسی سے بات تو نہیں کی؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''تم نے منع جو کیا تھا۔''

''اور تم...... اپنے فیصلے پر قائم ہو؟''

''ہے تو یہ مشکل...... لیکن کزن...... میری جگہ تم ہوتے تو کیا کرتے۔''

میں لاجواب ہو گیا...... ''شاید وہی...... جو تم کر رہی ہو۔''

''تم پنڈی گئے تھے...... اس کی کوئی کزن رہتی ہے وہاں۔''

میں نے دل میں سخت ندامت محسوس کی...... ''ہاں لیکن وہ بھی چلے گئے ہیں وہاں سے۔''

ریشم بڑی مستعدی سے نمودار ہوئی...... ''سوری سر...... لاسٹ نائٹ سلیپ لیٹ...... رائز لیٹ...... کافی بنے۔''

ریشم میں کافی نہیں پیتی۔'' رابعہ نے کہا۔

''آئی نو میڈم...... ٹی فار یو...... آل سلیپ...... بال میڈم ٹیک ٹی فار بڑے صاحب بڑی بیگم صاحبہ...... شی بیسے...... اس نے ہاتھ اٹھا کے واضح کیا کہ فریال نے نماز کی پڑھی۔

رابعہ نے کہا۔ ''ہاں...... جب میں باہر آ رہی تھی تو فریال نماز کی نیت کر چکی تھی۔''

مجھے ایک خوشگوار حیرت ہوئی۔ ''وہ کب سے نمازی ہو گئی؟''

رابعہ نے مجھے گھورا...... ''جب سے ہم یہاں آئے ہیں...... صبح کی نماز تو وہ پڑھ رہی تھی...... ابا جی نے تلقین کی تھی اسے...... تمہیں کچھ نہیں کہتے وہ۔''

میں نے خفت سے کہا۔ ''اکثر کہتے رہتے ہیں...... اللہ توفیق دے مجھے بھی۔ فریال نے تو نمبر بنانے کے لیے فرمانبرداری دکھائی۔''

''تمہیں شرم آنی چاہیے کزن...... کیا ایسی ہی ہے وہ؟ اور اگر ہے تو ابھی وقت ہے سوچ لو...... تمہارے ساتھ بھی محبت کا ڈراما نہ کر رہی ہو...... نمبر بنا رہی ہو تمہیں پھانسنے کے لیے۔''

میں نے کہا۔ ''خدا کے لیے رابعہ...... اتنا ذلیل تو مت کرو مجھے...... میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔''

''میں اچھی طرح جانتی ہوں تمہارا کیا مطلب تھا۔'' وہ ناراض ہی واک آؤٹ کر گئی۔

میں ابا اور اماں کو سلام کرنے گیا تو فریال وہاں پہلے سے موجود تھی۔ وہ ان کے لیے چائے لائی تھی۔ ابا جی نے اسے روک لیا۔ جیسا کہ مجھے فریال نے بعد میں بتایا وہ فریال سے سلطان کے مسئلے پر ایک قانونی صورتِ حال ڈسکس کر رہے تھے کہ اگر فاروقی کے ذریعے فریال کورٹ کو درخواست پیش کر دے کہ اس شخص کے عزائم سے میری جان کو خطرہ ہے...... عدالت مجھے تحفظ فراہم کرے۔

ظاہر ہے بہو اور سسر کے درمیان دوستانہ انداز میں ہونے والی اس گفتگو سے اماں کو قطعی دلچسپی نہیں تھی بلکہ الثا وہ اسے سخت ناپسند کر رہی تھیں۔ جب میں داخل ہوا تو ابا جی نے بڑی ہوشیاری سے موضوع بدل دیا۔

''آؤ بھئی رفیق میاں...... ہم بات کر رہے تھے اپنے پرانے گھر کی...... اچھی قیمت پر بک گیا۔''

''بک گیا؟'' میں اچھل پڑا۔

اماں نے کچھ کہنا چاہا مگر ابا نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ان کو ڈانٹ دیا کہ وہ خاموش رہیں...... چالیس سالہ دورِ رفاقت میں اماں بھی نظر شناس ہو گئی تھیں اور خود ہی سمجھنے لگی تھیں کہ ابا کی کون سی نظر کیا کہتی ہے۔

ابا نے کہا۔ ''بھئی تمہیں نہیں معلوم؟ سودا کرنے تو تم تھک گئے تھے۔''

میرا دل دھک سے رہ گیا...... مجھے اپنے ماتھے پر پسینے کی نمی کا احساس ہوا اور میرے ذہن کو اس خوف نے گرفت میں لے لیا کہ کیا نورجہاں نے بیس لاکھ زیادہ دینے کی اصل وجہ بھی بتا دی ہے...... کیا اس نے جلے ہوئے مکان کے ساتھ مالک مکان کو بھی خرید اہے...... یہ اچھی قیمت اس لیے ملی ہے کہ خریدار کو وہ ہی اچھا لگا تھا...... کیا اس لیے مجھے بلیک میل کرنے کے عمل کا آغاز کر رہی ہے۔

پھر مجھے خیال آیا کہ یہ میرے دل کا چور ہے جو مجھے ڈرا رہا ہے ممکن ہے حاجی صاحب کے بیٹے کے ذریعے یہ خبر ان تک پہنچی ہو اس خیال کے ساتھ ہی دوسرا جھوٹ کھل جانے کے احساس نے مجھے مغلوب کر لیا۔

میں نے کہا۔ ''بے شک میری بات ہوئی تھی...... حاجی صاحب کے بیٹے سے۔''

فریال نے کہا۔ ''میرا خیال ہے فاروقی نے ان کو نہیں بتایا۔''

میں نے کہا۔ ''کیا نہیں بتایا۔''

''اس مکان کے بیعانے کا چیک موصول ہو گیا ہے۔'' اباجی نے کہا۔

''چیک نہیں...... پے آرڈر اباجی نے تصحیح کی۔'' اور اس نے جمع بھی کرا دیا ہے تمہارے اکاؤنٹ میں...... کون ہے یہ خریدار؟''

میں نے بڑی مشکل سے کہا۔ ''وہ فاروقی کو علم ہوگا۔''

وہ بولے۔ ''خیر...... جو بھی ہے...... فاروقی کہہ رہا تھا کہ فائنل پے منٹ اور ٹرانسفر کی قانونی دستاویزات سائن کرنے میں کچھ وقت لگے گا...... یہ بات البتہ ہماری سمجھ میں نہیں آئی کہ اس جگہ کی اتنی قیمت تو نہیں تھی...... زمین کی بھی اتنی مالیت تو نہیں ہوگی ہمارے خیال میں...... گھر ہوتا تب بھی نہ ہوتی...... اس جلے ہوئے گھر کے کھنڈر کے اتنے پیسے۔''

میں دم بخود رہ گیا۔ ''اباجی...... آپ کو علم تھا۔''

وہ اداسی سے مسکرائے۔ ''دیکھو میاں...... ہم جانتے ہیں تم نے یہ سب کیوں چھپایا تھا...... ہمیں مزید دکھ سے بچانے کے لیے...... ہم نے اللہ کی رضا کے سامنے صبر کیا...... ماں نہ رہی...... بھائی نہ رہا...... اس کے مقابلے میں اینٹ چونے کی دیواروں والا گھر نہ رہا تو ہم کیا روئیں اور تمہارے سامنے رو کے تمہاری پریشانی کیوں بڑھائیں...... ہر گھر ایک ٹھکانا ہوتا ہے سر چھپانے کا...... ہمیشہ کہاں رہتا ہے...... اس حویلی کو ہی دیکھو...... ڈیڑھ سو سال میں کتنے آئے اور گئے۔''

فریال نے مجھے آنکھ ماری اور موضوع بدل دیا۔

''اباجی کہہ رہے تھے کہ اس گھر کی فروخت سے جو رقم حاصل ہوگی اس سے یہاں مسجد بنوائیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''اباجی یہاں بادشاہی مسجد بنوائیں گے۔''

''نہیں بیٹا...... اس گھر کی نشانی کے طور پر جو مسجد بنے گی...... وہ رہے گی تا قیامت...... بس وہی پیسا استعمال ہوگا اس کی تعمیر میں......'' اباجی نے کہا اور اس وقت میں نے محسوس کیا کہ ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے مگر وہ پی گئے...... اماں کی طرف خود میں نے نہیں دیکھا...... مجھے معلوم تھا وہ رو رہی ہوں گی...... وہ زیادہ رقیق القلب تھیں اور ان کے اعصاب اتنے مضبوط نہیں تھے۔

وہ اتوار کا دن تھا چنانچہ فاروقی کو واپس بھاگنے کی فکر نہیں تھی...... اپنے شہری معمول کے مطابق وہ دیر سے سو کے اٹھا۔ جب وہ اپنی بیوی کے ساتھ ناشتا کر رہا تھا تو میں نے پوچھا۔ ''تو نے مکان کا بیعانہ وصول کر لیا اور مجھے نہیں بتایا۔''

وہ بے پروائی سے بولا۔ ''وہ اس رات دوسری باتیں شروع ہو گئیں تو میں بھول گیا۔ تو نے بھی تو نہیں بتایا تھا کہ سودا کر آیا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''بات ہوئی تھی ایک پراپرٹی ڈیلر کی معرفت۔''

''کون ہے یہ مسز ایم اے خان...... اس کا اٹارنی ہے ایک نوجوان وکیل...... کہنے لگا کہ قیمت پر نواب رفیق احمد شیرازی سے بات ہوئی ہے میرے موکل کی...... میں نے ایسے ہی پوچھ لیا کہ کون ہیں یہ محترمہ...... سالا پھیل گیا کہ میں اپنے موکل کے بارے میں کچھ بتانے کا پابند نہیں...... میں نے کہا کہ بھاڑ میں جائیں...... میرا مطلب کچھ اور تھا کہ وہاں جائیں۔''

لیلیٰ بھابی نے سادگی سے کہا۔ ''کہاں جائیں؟''

''تم کان بند کرو تو بتاؤں...... شرمناک جگہ ہے...... چلا گیا اپنا سا منہ لے کر۔''

میں نے اس وقت لاعلمی کا انداز برقرار رکھنا مناسب جانا۔ لیلیٰ بھابی کو پتا چل جاتا تو قطب شمالی پر رہنے والوں کو بھی معلوم ہو جاتا لیکن میں نے کچھ دیر بعد اسے بتا دیا۔

''مکان اکبر خان نے خریدا ہے۔''

''تو مذاق کر رہا ہے۔'' فاروقی بولا۔

''تجھے پتا چل جائے گا۔''

''تجھے کیسے پتا چلا...... تو ملا تھا اس مسز ایم اے خان سے۔''

میں نے کہا۔ ''نہیں...... لیکن بروکر کی باتوں سے

اندازہ ہوا۔''

اس نے مجھے غور سے دیکھا۔ ''جھوٹ تو نہیں بول رہا ہے نا تو...... تیرے کوئی خفیہ مذاکرات تو نہیں ہوئے اس سے...... بیڈروم میں۔''

مجھے پسینا آ گیا...... ''تو ایسا سمجھتا ہے مجھے؟''

''ہاں...... اسی لیے تو پوچھ رہا ہوں...... اور فیکے ہر...... آپس کی بات ہے...... جو تیرا حال ہوتا ہے اسے دیکھ کر...... اس سے بدتر حالت میری ہو جاتی ہے...... قسم اللہ کی کیا چیز بنائی ہے خدا نے...... سیکس کا ایٹم بم......''

اچانک لیلیٰ بھابی آ گئیں۔ ''یہ کس کی تعریف ہو رہی ہے۔''

''یہ کہہ رہا تھا تمہارے بارے میں۔''

میں نے گھبرا کے کہا۔ ''بکواس مت کر الو کے پٹھے...... ایسی گھٹیا بات کر سکتا ہوں میں لیلیٰ بھابی کے بارے میں...... یہ نورجہاں کے بارے میں کہہ رہا تھا۔''

لیلیٰ بھابی نے آنکھیں نکالیں۔ ''ملکہ ترنم...... مگر وہ تو مر گئی...... اچھا......'' اس نے اچھا کو لمبا کیا اور بس...... اس کے بعد جنگ عظیم کا آغاز ہوا جس میں ایک طرف ہٹلر اور سولینی کی طرح میں اور فاروقی تھے اور ہمارے خلاف اتحادی تمام خواتین...... حرامی پن میں راجا نے بھی ان کا ساتھ دیا۔

پھر موقع ملا بات کرنے کا تو میں نے کہا۔ ''فاروقی...... وہ بیس لاکھ واپس کر دے۔''

''کیوں...... اب کیسے واپس کروں؟''

''اس ڈیل کے پیچھے کوئی خفیہ مقصد ہوگا...... اکبر خان رشوت دے رہا ہے۔''

''تو نے مانگی تو نہیں۔''

''یہ بھی طریقہ ہے سائنس ریسرچ سینٹر حاصل کرنے کا۔ وہ میں ہرگز نہیں دوں گا اسے...... بلکہ اب پہلا کام یہ کروں گا کہ اسے بلڈوز کرا دوں گا۔''

''اسے پھنس جائے گا مقدمات میں۔''

''مقدمات کا سامنا کرنے کے لیے میں تیار ہوں۔'' میں نے کہا۔

''تو کیا کرے گا سامنا تو میں کروں گا لیکن پہلے ایک بات بتا مجھے...... آخر ہوتا کیا ہے سائنس ریسرچ سینٹر میں...... ہیروئن کا دھندا...... اسلحے کا...... بردہ فروشی...... جعلی نوٹ چھاپے جاتے ہیں۔''

''مجھے کیا ضرورت ہے معلوم کرنے کی۔ کوئی جعلسازی تو ہے نا جسے چھپایا جاتا ہے۔''

''میرا مشورہ ہے کہ پہلے معلوم کر لے۔ اس کے بعد کر جو کرنا ہے ایسے اللہ واسطے کا بیر مت پال...... میں بھی نہیں کہتا کہ غلط کام کی حوصلہ افزائی کر...... بس میں چاہتا ہوں کہ دشمنی میں تجھے نقصان نہ ہو۔''

میں خاموش ہو گیا۔ فاروقی جیسے مخلص دوست اور مددگار کی رائے کو ضد میں مسترد کرنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ اس دن خاصی مصروفیت رہی۔ پہلے ایک موبائل فون ڈیلر آ گیا۔ وہ موقع شناس سیلز مین تھا اور حویلی کے ہر فرد کو ایک عدد موبائل فون تھمانے میں کامیاب رہا۔ اب سیل فون کی افادیت قائم ہو گئی تھی تو سیٹ از خود ضرورت بن گیا تھا لیکن اس سے ایک اور کامیابی شہناز اور فریال سے مذاکرات میں حاصل کی۔ اس نے کہا بیگم صاحبہ گرد و نواح میں غریب لوگ رہتے ہیں کبھی فون کرنا پڑے تو ٹیلہ جوگیاں جاتے ہیں سب کے عزیز و اقارب پاکستان کے علاوہ باہر کے ملکوں میں ہیں...... وہ بات کرنا چاہتے ہیں مگر کر نہیں پاتے...... اگر آپ موبائل فون پر بات کرانے کے لیے ہر جگہ پی سی او بنا دیں تو یہ بھی ایک فلاحی منصوبہ ہوگا۔''

شہناز فوراً قائل ہو گئی۔ ''یہ تو ٹھیک کہا تم نے۔ اب بیمار کی اطلاع دینے کوئی عزیز خود آتا ہے...... پیدل یا سائیکل پر...... کال کر دے تو میں فوراً پہنچ جاؤں۔''

''اللہ آپ کا بھلا کرے ڈاکٹر صاحب...... اتنے فلاحی منصوبے بنائے ہیں نواب صاحب نے اور آپ نے...... اسے بھی صدقہ جاریہ سمجھئے...... کتنا فائدہ ہوگا لوگوں کو...... آپ تو بلا منافع یہ سروس فراہم کر سکتی ہیں۔''

شہناز نے کہا۔ ''ٹھیک ہے...... میں بتاؤں گی تمہیں کہ کتنے فون چاہئیں...... مگر چارجنگ کا کیا ہوگا...... ہر جگہ بجلی نہیں ہے۔''

''ڈاکٹر صاحب...... بجلی ہر گھر میں نہیں ہے لیکن ہر گاؤں میں ہے۔ میں ایسے سیٹ دوں گا آپ کو جن کا اسٹینڈ بائی ٹائم ایک ہفتہ ہوگا کم سے کم۔''

''صرف بات کریں گے لوگ...... باقی چیزیں غیر اہم ہیں...... سستے اور پائیدار سیٹ لاؤ...... کیمرا اور کلرڈ اسکرین وغیرہ کچھ نہیں۔'' فریال نے کہا۔

''جی بیگم صاحبہ...... ایک تجویز اور ہے۔''

میں نے کہا۔ ''لیڈیز...... آپ ایک چالاک سیلز مین کے نرغے میں ہیں۔''

''اجی نہیں نواب صاحب...... ہم کیا چالاکی کریں گے

آپ سے۔ بات سمجھ میں نہ آئے میری تو جوتے مار کے نکال دیں حویلی سے۔"

فریال کا دل پسیج گیا۔ "اچھا بولو۔"

"دیکھئے بیگم صاحبہ..... بنگلا دیش میں گرامین بینک والے نے موبائل فون فراہم کیے فقیروں کو..... دیہات کی عورتوں کو..... بہت معمولی رقم کی قسطوں پر۔ فقیروں نے بھیک مانگنا چھوڑ دی۔ عورتیں پی سی او چلانے لگیں..... یہاں آپ محمد یوسف بن سکتی ہیں۔"

راجا نے کہا۔ "ہاں دھوتی باندھ لیں اور کرتا پہن لیں۔ بنگالی بولیں۔ معاشیات میں پی ایچ ڈی تو سب خواتین ہوتی ہیں۔"

لیکن راجا کے بولنے سے پہلے ہی سیلز مین کا جادو ان دونوں خواتین کے سر چڑھ کے بولنے لگا تھا۔ انہوں نے اسکیم کی افادیت کو تسلیم کرلیا تھا اور اب حساب لگا رہی تھیں کہ کتنے سیٹ درکار ہوں گے۔ کتنی قسط ہوگی۔ تو کتنے نفل کا ثواب ہو گا..... یہ کام سیلز مین نے آسان کر دیا۔ اس نے ایک کامیاب اور مقبول مگر کم قیمت سیٹ تجویز کیا اور سو سیٹ کی مجموعی قیمت بتا دی۔ ترپ کا پتا یہ کھیلا کہ سیٹ میں چھوڑ جاؤں گا..... پیسوں کا کوئی مسئلہ نہیں۔ وہ جانتا تھا کہ پیسوں کا واقعی مسئلہ نہیں۔ اسے پہلے ہی ملیں گے۔ وہ جب واپس گیا تو بہت خوش تھا۔ اس نے ایک مارکیٹ پکڑ لی تھی۔

میرا دن غنی کے ساتھ سکیورٹی کے مسائل سے نمٹنے میں گزرا۔ اس نے حویلی کے سکیورٹی پلان کے مطابق مورچے دکھائے۔ اگلے دن وہاں گارڈ متعین ہو گئے۔ ان کی شفٹوں میں ڈیوٹی لگ گئی۔ شام کو غنی کے نیٹ ورک کا کوئی بندہ ٹرک میں آیا اور جب گیا تو غنی نے مجھے اسلحہ دکھایا۔ میں اس کی کو ئیک سروس پر دم بخود رہ گیا۔

یہ تیسری رات کی بات ہے کہ میری آواز فریال کے چلانے سے کھلی۔ وہ شہناز کو پکار رہی تھی۔ میں ہڑبڑا کے باہر نکلا تو مجھے برآمدے کے فرش پر رابعہ دکھائی دی جو اپنے کمرے کے دروازے کے سامنے بے حس وحرکت پڑی تھی۔ میرا دل جیسے اچھل کے میرے حلق میں آ گیا میں ایک جست میں آگے گیا۔ حالات کے تناظر میں میرے ذہن میں آنے والا پہلا خیال یہی تھا کہ رابعہ نے کچھ کھا کے خودکشی کرلی۔ تاہم میں نے اعصاب پر قابو رکھا۔

"کیا ہوا ہے اسے؟" میں نے فریال سے پوچھا جو رابعہ کو اٹھانے کے لیے اس پر جھکی ہوئی تھی پھر فرش پر بیٹھ گئی۔ فریال نے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ "پتا نہیں..... اس کے گرنے کی آواز اور پھر اس کی چیخ سن کر میں باہر آئی..... تو یہ یہاں پڑی تھی۔"

راجا میرے ساتھ ہی نکلا اور آخر میں شہناز اپنے کمرے سے باہر آئی..... میں نے اس کا متوحش چہرہ دیکھا۔ وہ چند سیکنڈ کے لیے غائب ہوئی اور دوبارہ اپنے میڈیکل بیگ سمیت برآمد ہوئی۔

اس وقت تک میں بھی نبض دیکھ چکا تھا۔ "یہ زندہ ہے۔"

شہناز نے سر ہلایا اور یہ تصدیق کرنے کے بعد کہ نبض اور دل کی دھڑکن ٹھیک ہے اس نے کھڑے ہو کے کہا۔ "اسے اندر لے آئیں بیڈ پر۔"

میں نے رابعہ کو دونوں ہاتھوں میں اٹھا کے اندر پہنچا دیا۔ اب شہناز نے اس کا تفصیلی معائنہ کیا اور ہم سب کی طرف دیکھا جو متوحش مگر متوقع چہروں کے ساتھ چپ کھڑے تھے۔ "فکر کی کوئی بات نہیں۔"

"پھر بھی..... ہوا کیا اسے؟"

"کچھ نہیں..... میرا خیال ہے کچھ چکر وغیرہ آ گیا۔" وہ بولی۔

اسی وقت رابعہ نے آنکھیں کھول کے دیکھا اور چند سیکنڈ میں ہم سب کی صورتوں پر غور کر کے صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کی۔ شہناز نے سب سے پہلے پوچھا۔ "کیا بات ہے رابعہ..... کیسی ہے طبیعت؟"

اس نے آہستہ سے سر ہلایا۔ "میں ٹھیک ہوں۔"

"کیا ہوا تھا تمہیں؟ کہاں جا رہی تھیں تم؟" فریال نے پوچھا۔

"میں..... پیاس لگی تھی..... پانی پینے نکلی تھی۔" اس نے کہا۔

"پانی کا گلاس تمہاری بیڈ سائیڈ پر نہیں رکھا تھا ریشم نے؟"

"وہ..... میں نے پی لیا تھا چند منٹ پہلے..... پیاس بہت سخت تھی..... پھر پتا نہیں کیا ہوا..... میرا خیال ہے دہلیز سے ٹھوکر لگی۔"

شہناز نے دروازے کی طرف دیکھا۔ "دہلیز کہاں ہے..... میرا خیال ہے کہ چکر آ گیا تمہیں۔"

یہ سوال فریال نے کیا۔ "ایسا کیا کھا لیا تھا کہ اتنی سخت پیاس لگی؟ ایسی گرمی بھی نہیں ہے۔"

وہ نظر جھکا کے بولی۔ "کھایا تو وہی تھا..... جو سب نے کھایا۔"

"اب آپ لوگ جائیں باہر تو میں تفصیلی معائنہ کروں۔" شہناز نے میڈیکل بیگ کھولا۔

یہ معائنہ چند منٹ میں ختم ہو گیا۔ رابعہ کے بارے میں میڈیکل بلیٹن جاری کر دیا گیا کہ "دائیں کولہے پر چوٹ ہے اور سب ٹھیک ہے..... کوئی فریکچر نہیں..... کوئی انجری نہیں..... میں دوا دے رہی ہوں۔"

رابعہ نے پھر پانی مانگا۔ "پتا نہیں کیوں..... میرے حلق میں کانٹے سے پڑ رہے ہیں۔"

"صبح تفصیلی چیک اپ کرائیں گے تمہارا۔" شہناز نے کہا۔ "تمہیں شوگر تو نہیں ہے نا؟ رات کو پیاس لگتی ہے؟ اکثر اٹھتی ہو؟"

"نہیں..... کبھی نہیں....." رابعہ نے پانی پی کے کہا۔

سب اپنے کمرے میں واپس لوٹ گئے۔ اماں اور ابا کو خبر ہی نہیں ہوئی تھی کیونکہ ان کا کمرا آخری حصے میں تھا اور بند تھا۔ میں نے دوبارہ سونے کی کوشش کی مگر مجھے نیند نہیں آئی۔ چکر متلی آغاز حمل کی عام علامات تھیں ابھی تک اس کی پرابلم کا علم میرے سوا کسی کو نہیں تھا اور سب کے سامنے میں اس حوالے سے بات بھی نہیں کر سکتا تھا۔

راجا کچھ دیر بعد آیا۔ "تو سو رہا ہے؟"

میں اٹھ بیٹھا۔ "نہیں..... راجا..... یہ اسی مسئلے کا شاخسانہ ہے۔"

"شاید..... وہ بڑے زور سے گری۔"

میں نے کہا۔ "شہناز کو بتا دینا چاہیے۔"

"ابھی بتایا ہے میں نے۔ وہ رابعہ کے ساتھ ہے..... میری بات سن کر متفکر ہو گئی تھی۔ کہہ رہی تھی ایسے گرنا خطرناک بھی ثابت ہوسکتا ہے۔"

"رابعہ تو ٹھیک ہے۔"

"اس کا مطلب تھا..... بچے کے لیے..... وہ پھر دیکھے گی۔"

میں نے برآمدے میں جھانکا۔ فریال ابھی باہر آئی تھی۔ اس نے میرے دل کی بات سمجھ لی اور سر ہلا کے کچن کی طرف چلی گئی۔ ہم فکر کرتے رہے کہ اگر اس حادثے کے نتیجے میں کوئی خرابی ہوئی تو کیا ہوگا۔ کچھ دیر بعد فریال کافی لے کر آئی تو ہم سے زیادہ متفکر تھی۔

"راجا کو کیسے معلوم ہوا؟" اس نے سوال کیا۔

"میں نے بتایا..... اب اس بات پر لڑنا ضروری نہیں کہ رابعہ نے شہناز کو یا تمہیں کیوں شریک راز نہیں کیا۔"

وہ خفگی سے بولی۔ "وہ بہن ہے نا تمہاری..... ہم کچھ نہیں..... مگر تم نے بھی مجھ سے چھپایا..... شہناز تو ڈاکٹر ہے۔"

شہناز اندر آئی اور بیٹھ کے سوالیہ چہروں پر نظر ڈال کے بیٹھ گئی۔ "میرا خیال ہے..... خیر رہی نہیں..... ابتدائی علامات سے ظاہر ہوتا ہے کہ شی لاسٹ ہر چائلڈ۔" اس نے اعلان کیا۔

فکرمندی کی خاموشی گہری ہو گئی۔ کوئی فیصلہ مشکل تھا کہ پہلے برا تھا تو یہ زیادہ برا ہوا؟ وہ بھی تقدیر کا فیصلہ تھا..... یہ بھی..... جو فرخ نے چاہا تھا وہ بھی نہ ہوا..... جو رابعہ نے سوچا تھا وہ بھی نہ ہوا..... ....؟ کے لیے اسی خیال کا سہارا لیا جاسکتا تھا کہ اللہ جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے.....

صبح شہناز کے خدشات کی تصدیق ہو گئی..... وہ اس کیس کو بہ آسانی ہینڈل کر سکتی تھی..... وہ آس پاس کے دیہات میں ریشم کے ساتھ میٹرنٹی کے تمام مسائل نمٹا رہی تھی اور اس کے پاس تمام ضروری ادویات وغیرہ موجود تھیں مشکل ابا جی اور اماں کو مطمئن کرنے میں پیش آئی۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ رابعہ کو کھانے کی کسی چیز سے الرجی ہو گئی ہے..... شہناز نے فوڈ پوائزننگ کا لفظ استعمال کرنے سے گریز کیا۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔

لیکن ابا کے لیے رابعہ ان کے مرحوم بھائی کی واحد نشانی تھی۔ وہ فکرمند کیسے نہ ہوتے۔ وہ رابعہ کے کمرے سے جانا نہیں چاہتے تھے۔ انہیں بڑی مشکل سے قائل کیا گیا کہ رابعہ کو آرام کی ضرورت ہے..... ان کی سمجھ میں پھر بھی نہیں آیا کہ اگر وہ رابعہ کے پاس کرسی ڈالے چپ بیٹھے رہیں گے تو اس کے آرام میں خلل کیسے پڑے گا..... مگر ہم نے مل کے انہیں قائل کرلیا۔

ہم سب نارمل نظر آنے کی بھرپور کوشش میں مصروف رہے۔ روز کی طرح ناشتا لگایا گیا۔ فاروقی ناشتا کرتے ہی بھاگ لیا۔ اسے کورٹ پہنچنا تھا۔ ہم لیلیٰ بھابی کو چھیڑتے رہے کہ اب پورا ہفتہ لیلیٰ مجنوں کے فراق میں کون سے گیت گائیں گے..... اندر سے مجھے تشویش لاحق رہی۔ ان معاملات میں عورتوں کی چھٹی حس بہت کام کرتی ہے۔ ناشتے پر شہناز موجود نہیں تھی اور ناشتا آج ریشم نے نہیں اس کی ماں فاطمہ نے بنایا تھا۔ اماں کو ذرا بھی شک ہوا تو بھانڈا پھوٹ جائے گا۔

دوپہر سے پہلے ہی شہناز نے بڑی ہوشیاری سے صورت حال پر قابو پالیا۔ اماں ابا تشویش میں مبتلا تھے۔ میں

نے انہیں قائل کرلیا کہ الرجی کسی کھانے پینے کی چیز سے ہوئی تھی اور خاصی سیریس تھی۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ فوڈ پوائزننگ جیسی کیفیت کا شکار ہوئی تھی مگر شہباز نے سب سنبھال لیا ہے۔ بارہ بجے انہوں نے خود جا کے دیکھا تو رابعہ سو رہی تھی۔ شہباز نے ڈی این سی کے بعد اسے دیگر اینٹی بایوٹک ادویات کے ساتھ خواب آور دوائیں SEDATIVES بھی دی تھیں۔

شہباز کا اندازہ تھا کہ وہ تین دن میں بالکل صحت یاب ہو جائے گی لیکن اس حادثے کا ایک نفسیاتی ردِّعمل بعد میں سامنے آئے گا۔ یہ رابعہ کی دوسری شکست بن گئی تھی۔ اس نے فرخ سے محبت کی تھی اور دھوکا کھایا تھا پھر اس نے طے کیا تھا کہ محبت کی اس نشانی کو وہ سنبھال کر اور سینے سے لگا کے رکھے گی۔ یہ بھی ممکن نہ ہوا تھا تقدیر کی ان نامہربانیوں کے نتیجے میں اس کا شدید ڈپریشن میں مبتلا ہونا بالکل فطری بات تھی لیکن میں پوری طرح پرعزم تھا کہ مجھے ہر قیمت پر رابعہ کو بچانا ہے اور ہم سب اپنی اپنی ذمے داری کو سمجھتے تھے۔

وہ اس لحاظ سے ایک اُداس دن تھا۔ اماں ابا سے حادثے کے اسباب اور عوامل کو چھپانا ایک ناخوشگوار فریضہ بن گیا تھا جو ہم سب مصنوعی طور پر نارمل رہ کے نبھا رہے تھے۔ اندر سے ہم سب اپ سیٹ تھے اور ایک احساس بے بسی پر جھنجھلاہٹ کا شکار کہ ہم فرخ کا کچھ نہیں بگاڑ سکے۔

سہ پہر کے بعد میں رابعہ کو دیکھنے گیا تو اس کی بیڈ سائیڈ پر مجھے ذرا نیچے کی طرف کسی گولی کی خالی اسٹرپ دکھائی دی۔ کسی وجہ کے بغیر میں نے اسے میز سے کھسکا کے اٹھالیا۔ گولی نکالی جا چکی تھی مگر بلسٹر پیک پر اس کا نام پڑھا جا سکتا تھا۔ مجھے وہ نام کچھ مانوس سا لگا۔ زیادہ متوجہ مجھے ایک وارننگ نے کیا۔ اس پر سرخ رنگ سے ''پوائزن'' کے الفاظ نمایاں کیے گئے تھے اور یہ لکھا تھا کہ ڈاکٹر کے مشورے پر استعمال کی جائے۔

جب میں اُٹھ کر باہر آ رہا تھا تو میری نظر دہلیز پر گئی۔ فرش اندر باہر سے ایک جیسا ہموار تھا۔ وہاں ایسی رکاوٹ ہی نہ تھی جس سے ٹھوکر کھا کے رابعہ گر سکتی...... اسے یقیناً چکر ہی آیا ہوگا پھر اچانک میں نے چوکھٹ کے نچلے حصے میں ایک چھوٹی سی کیل دیکھی جو تقریباً پوری ہی لکڑی میں ٹھوک دی گئی تھی اس میں ایک کالا دھاگا سا لٹک رہا تھا۔ میں نے اسے چھو کے دیکھا۔ وہ دھاگا نہیں تار تھا۔ میری نظر دوسری طرف کی چوکھٹ پر گئی۔ کیل وہاں بھی موجود تھی اور اس میں بھی باریک تار کا آدھے انچ کا ٹکڑا دکھائی دے رہا تھا۔

یکلخت رابعہ کے گرنے کی وجہ میری سمجھ میں آ گئی۔ فرش سے صرف دو انچ اوپر کسی نے دہلیز کی چوڑائی کے رخ ایک باریک سا نظر نہ آنے والا تار باندھا تھا۔ رابعہ کا پیر اس میں الجھا اور وہ منہ کے بل باہر گری...... تار یقیناً ٹوٹ گیا ہوگا اور اس کے دونوں ٹکڑے جھٹکے سے الگ کر کے غائب کر دیے گئے مگر ان کیلوں میں جو مشکل سے دو ملی میٹر باہر تھیں آدھے آدھے انچ کے تار باقی رہ گئے...... اگر کچھ وقت اور ملتا تو شاید پلاس سے یہ کیلیں بھی نکال لی جاتیں...... پھر رابعہ کو منہ کے بل گرانے کی سازش کا کوئی بھی سراغ باقی نہ رہتا۔

یہ جان لینے کے بعد کہ رابعہ گری نہیں تھی اسے گرایا گیا تھا میرے لیے شک کی کوئی بات ہی نہ رہی کہ ایسا رابعہ کو بدنامی اور رسوائی کے عذاب سے بچانے کے لیے کیا گیا تھا۔ جس کام کے لیے وہ تیار نہ تھی وہ کرالیا گیا تھا۔ اس طرح کہ یہ کسی کی کوشش نہیں بلکہ ایک اچانک پیش آنے والا حادثہ تھا۔

اس وقت اچانک مجھے یاد آ گیا کہ وہ کیا دوا تھی جس کا بلسٹر پیک مجھے بیڈ کے پیچھے ملا تھا۔ وہ ایک چوہے مار دوا تھی اس کی خاص بات یہ تھی کہ اسے کھانے والے چوہے گھر کے اندر نہیں مرتے تھے۔ دوا کھانے کے بعد انہیں سخت گرمی اور پیاس لگتی تھی اور وہ باہر بھاگتے تھے اور باہر جا کے مر جاتے تھے۔

رابعہ کو بھی سخت پیاس لگی تھی۔ وہ بھی باہر جا رہی تھی۔ پانی پینے کے لیے...... اندھیرے میں اسے چوکھٹ کی جگہ بندھا ہوا تار کیسے نظر آتا وہ منہ کے بل گر گئی...... جو دوا ایک چھوٹے سے چوہے کو مار دیتی تھی وہ ایک انسان کو نہیں مار سکتی تھی لیکن اس نے انسان کے وجود میں زندگی کا آغاز کرنے والی ننھی سی جان کا خاتمہ یقیناً کر دیا ہوگا۔

میری عقل چکرا گئی...... رابعہ کے خلاف ایسی خطرناک سازش کون کر سکتا تھا؟ اس سوال کا جواب راجا کی بات میں صاف نظر آتا تھا اس نے جو کچھ کہا تھا اس کا مطلب یہی تھا کہ ابارشن ایک حادثے کا نتیجہ بھی ہو سکتا ہے جو حادثہ ہی نہ لگے۔ کیا اس نے شہباز سے کہا تھا وہ اپنی طبی مہارت کو بروئے کار لائے اور وہ مسئلہ جو رابعہ کے ساتھ ہم سب کے مستقبل میں بدنامی کی روسیاہی لا سکتا تھا ہمیشہ کے لیے ختم کر دے۔

یہ سوچ کے میرا دماغ گھومنے لگا۔ اسی وقت میں نے فریال کی آواز سنی۔ وہ مجھے پکار رہی تھی۔

''تمہارا فون۔'' اس نے موبائل مجھے تھما دیا۔

میں نے جیسے ہی ''ہیلو'' کہا دوسری طرف سے ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی۔

میری زبان سے ہیلو سنتے ہی اس نے کہا۔ ''حضور نواب صاحب بندی تسلیم بجالاتی ہے۔''

فریال کے سامنے میں نے کسی پریشانی کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ ''معاف کیجیے میں نے پہچانا نہیں آپ کو۔''

''افوہ...... کیا انداز ہے بے نیازی کا...... میں نور جہاں بول رہی ہوں۔'' اس کے لہجے سے صاف ظاہر تھا کہ وہ نشے میں ہے۔

میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''اچھا...... فرمایئے کیسے یاد کیا اس وقت۔''

''یاد کی مت پوچھو...... سارا دن آتی رہی...... یہ بتاؤ قیمت مل گئی...... میرا مطلب ہے...... بیعانہ۔''

میں نے کہا۔ ''جی...... بیعانہ مل گیا۔''

''اتنی اچھی قیمت اور کون دے سکتا تھا تمہیں۔'' وہ نشے میں ڈوبے ہوئے مخمور لہجے میں بولی۔ ''میرے سوا...... اچھی قیمت اچھے خریدار ہی دیتے ہیں...... جیسے تم نے جو قیمت دی ہے......''

میں نے گھبرا کے بات کاٹی۔ ''دیکھیے...... لین دین کے قانونی معاملات کے لیے آپ میرے وکیل سے بات کریں۔''

وہ ہنسی۔ ''ویری ویل سر...... مگر جو دیگر معاملات ہیں۔ ہمارے تمہارے...... ان پر تو دل سے دل کی بات ہو سکتی ہے...... صرف تم سے۔''

''آخر آپ کیا چاہتی ہیں؟''

''یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے سویٹ ہارٹ...... تمہیں چاہتی ہوں میں...... اور یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ جو قیمت تم نے ادا کی...... وہ تو بس بیعانہ تھا...... باقی ادائیگی کب کرو گے؟...... اور کیسے؟''

شک کی کوئی بات نہیں رہی تھی۔ وہ مجھے پھر مدعو کر رہی تھی...... پھر بلا رہی تھی...... میرا دل ڈوبنے لگا۔ ایک تباہ کن جذباتی غلطی کے نتائج سامنے آنے لگے تھے۔ میں نے اس پر اعتبار کر کے خود کو دھوکا دیا تھا کہ وہ مجھے بلیک میل نہیں کرے گی، حالانکہ نور جہاں جیسی عورت ہی بلیک میل کرتی ہے...... مگر اب پچھتانے سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ میں اس کے چنگل میں گرفتار ہو گیا تھا اور بہ ظاہر نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ اپنے مستقبل اور اپنے سارے رشتوں کی آبرو کو بچانے کے لیے ضروری تھا کہ میں جوش کے بجائے ہوش سے کام لوں...... افشائے راز میں کسی قیمت پر قبول نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے فون بند کر دیا۔

اس وقت جو خیال میرے ذہن میں آیا، وہ اس مسئلے کا بہت واضح حل پیش کرتا تھا...... وہی جو ایک عام آدمی سوچ سکتا ہے۔ کسی بھی عام اور پرخطر سچویشن میں...... اگر اس کا راستہ کوئی زہریلی ناگن روک لے تو وہ اشتعال انگیزی نہیں کرے گا...... عقل سے کام لیتے ہوئے ناگن کو وار نہیں کرنے دے گا۔ وہ ذہانت سے اس پر کوٹ یا کوئی کپڑا پھینک کر اسے قابو کرے گا اور پھر مار دے گا...... خطرناک عورت بھی تو ناگن ہی ہوتی ہے۔

بس...... جیسے سپیرا بین بجا کے ناگن کو مست کرتا ہے...... ایسے ہی مجھے پیار کی بین سنا کے نور جہاں کو مست کرنا ہے...... اور پھر مار دینا ہے...... بے خبری میں...... دھوکے سے...... ورنہ وہ مجھے ڈس لے گی...... میری ساری زندگی میں زہر گھول دے گی...... میرے ساتھ فریال کی زندگی جڑی ہوئی ہے...... زہر اس کی زندگی میں بھی اتر جائے گا۔ انکار اسے مشتعل کرے گا...... مجھے نور جہاں کو اقرار سے ختم کرنا پڑے گا۔ وہ گولی دینی پڑے گی جو پُرسکون راحت بھری نیند بھی دیتی ہے...... اور ہمیشہ کی نیند بھی سلا دیتی ہے۔

فریال نے میری صورت سے میرے دل میں اٹھنے والے اس طوفان کا اندازہ کرلیا جسے میں دبانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ ''کون تھا رومیو؟''

''وہی...... جس نے ہمارا پرانا گھر خریدا تھا۔''

''کیا کہہ رہی تھی۔'' وہ ظاہری لاتعلقی سے بولی۔

''یہی کہ...... وہ ڈیل کینسل کرنا چاہتی ہے۔''

فریال نے حیرانی سے کہا۔ ''مگر کیوں؟''

''اسے احساس ہو رہا ہے کہ اس نے قیمت زیادہ لگا دی...... میں نے کہا کہ میرے وکیل سے بات کرو۔''

''اور کیا...... تم نے کوئی زبردستی تو نہیں کی تھی...... اپنی مرضی سے سودا کیا تھا اس نے...... کینسل کیسے ہو سکتا ہے۔'' اس نے سر ہلایا اور کچھ سوچ کے بولی۔ ''تمہارا یہ نمبر کیسے معلوم ہوا اسے؟''

''ہاں...... یہ ہے غور طلب بات؟''

''کل ہی تو ملے ہیں ہم سب کو موبائل فون اور نئے نمبر...... اس کے بعد تمہاری کسی سے بات نہیں ہوئی...... یا ان سے ہوئی تھی؟'' وہ شرارت سے مسکرائی۔

میرے سوچنے سے پہلے فون پھر گنگنانے لگا۔ میں نے اپنی عقل کو کوسا۔ آخر میں نے فون کا سوئچ آف کیوں نہیں کیا تھا۔ یہ تو ظاہر تھا کہ وہ پھر نمبر ملائے گی...... میں نے اسکرین کو دیکھا اور سر ہلایا۔ ''وہی ہے۔''

فریال نے ہاتھ بڑھایا۔ ''لاؤ مجھے دو...... میں پوچھتی ہوں۔''

میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکا۔ ''دیکھیے میں نے ابھی آپ کو بتا دیا ہے کہ اس ڈیل پر میں فی الحال آپ سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔''

وہ ہنسی۔ ''اوہو...... میں سمجھ گئی...... غلط وقت پر فون کیا میں نے تمہیں...... کوئی ہے تمہارے پاس جسے میرا تم سے بات کرنا بھی گوارا نہیں، وہی ہوگی...... فریال۔''

میں نے ناراضی سے کہا۔ ''دیکھیے ڈیل اب کینسل نہیں ہوسکتی۔''

اس نے ایک اور آہ بھری۔ ''یہ کون کم بخت چاہے گا کہ ڈیل کینسل ہو۔''

میں نے مزید خفگی ظاہر کی۔ ''آپ کو میرا نمبر کس نے دیا؟''

وہ ہنسی۔ ''ایک بار پہلے عرض کرچکی ہوں میں...... وہ جو چاہنے والے ہیں تیرے صنم...... تجھے ڈھونڈ ہی لیں گے کہیں نہ کہیں۔'' اس نے باقاعدہ گا کے کہا۔

میں نے فون بند کرکے سوئچ آف کردیا۔ ''پاگل عورت ہے۔''

فریال نے کہا۔ ''مجھے بات کرنے دی ہوتی۔ میں دماغ درست کردیتی۔''

میں نے دل ہی دل میں کہا۔ دماغ تو میرا درست کرنے کی ضرورت تھی۔ میرا دماغ خراب نہ ہوتا تو خطرات اور تفکرات کے سمندر سے گزرتے ہوئے جہاں ان گنت مگرمچھ اپنے خونی جبڑے کھولے مجھے نگل لینا چاہتے ہیں، میں اپنی کشتی میں سوراخ کیوں کرتا...... میری جان کے لیے اتنے روگ کم تھے کہ میں نے وقتی کمزوری سے مغلوب ہوکے ایک نیا روگ پال لیا۔

مجھے اپنی عقل پر یا اپنی بے عقلی پر جتنی ندامت اور حیرت تھی اس سے زیادہ اپنی اخلاقی گراوٹ پر غصہ تھا جس کے نتیجے میں ناقابل بیان ذلت آنے والے وقتوں میں میرا مقدر ہوسکتی تھی...... پھر مجھے خیال آتا تھا کہ کیا واقعی یہ میری بے وقوفی تھی؟ کیا کوئی مجھ سے زیادہ عقلمند آدمی نور جہاں کے دام ترغیب سے بچ کر نکل جاتا؟ میں تو ایک بار پہلے بھی نقصان اٹھا چکا تھا...... اس تجربے سے میں نے کیا سیکھا؟ دانا شخص تو سانپ کے بل میں ایک بار ڈسے جانے کے بعد پھر انگلی نہیں ڈالتا...... پھر مجھے کیا ہوگیا تھا؟

ایسے سوالات کا ایک جواب مجھے خود اپنے خلاف دفاع فراہم کرتا تھا...... کوئی اندر کی آواز مجھ پر ہنستی تھی کہ برخوردار...... تم کیا اور تمہاری اوقات کیا...... تمہاری جگہ کوئی زاہد پارسا...... کوئی افلاطون...... کوئی سکندر اعظم بھی ہوتا تو اس عورت کی شیطانی قوت کے سامنے ایسے ہی ہار جاتا...... آزمائش شرط ہے...... وہ کوئی عام عورت نہیں...... دوبارہ اس کے سامنے جاؤ گے تو پھر ہار جاؤ گے...... جیت صرف اس کے لیے ہے۔

میں اسی ادھیڑ بن میں مبتلا باہر آیا تو مجھے راجا اور شہناز فوارے سے آگے لان کے آخری سرے پر نظر آئے۔ باغ اب ایک انتہائی خوب صورت پُرسکون اور دلچسپ جگہ بن گیا تھا۔ ابا اور اماں اکثر شام کی چائے یہاں پیتے تھے اور عشا کی اذان ہونے تک آرام کرسیوں پر نیم دراز قدرت کے اس فطری حسن کا حظ اٹھاتے تھے۔ ہرن کا بچہ سب سے اتنا مانوس تھا کہ ہر ایک اسے گود میں اٹھا لیتا تھا...... بطخیں بے خوفی سے پھرتی رہتی تھیں اور ہتھیلی پر سے دانہ کھانے آجاتی تھیں۔

اجاڑ بیابان جو ویران اور آسیب زدہ حویلی کا حصہ تھا، صحن چمن بن گیا تھا جس میں بہار اپنے پورے رنگ روپ کے ساتھ لوٹ آئی تھی...... رات کے وقت اس کے رومان پرور ماحول کی کشش سب کو باہر کھینچ لاتی تھی۔ فوارے کے تالاب کی دیوار پر بارہ سنگا کے قریب بیٹھنا اور ہوا کے ساتھ آنے والی پھوار میں بھیگنا سب کو اچھا لگتا تھا اور خلوت کے لیے دور دراز کے گوشے بڑی کشش رکھتے تھے۔

میں تالاب کی منڈیر پر بیٹھا انہیں دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد وہ خود ہی ٹہلتے ہوئے میری طرف آگئے۔ ہرن کا بچہ شہناز کے آگے پیچھے دوڑتا آیا۔

راجا نے گھاس پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''ٹہنی پہ کسی شجر کی تنہا...... الو تھا کوئی اداس بیٹھا۔''

''آخر الو کیوں اکیلا ہے؟ وہ کہاں ہے؟'' شہناز بولی۔

''الو کی مونث...... پتا نہیں اسے کیا کہتے ہیں۔'' راجا نے کہا۔

میں نے کہا۔ ''راجا صاحب...... آپ نے کبھی چوہا مارا ہے؟''

''آف کورس...... بچپن میں ہم بہت بڑے شکاری تھے...... چوہے کو کمرے میں گھیر لیتے تھے۔ دروازے بند اور باہر نکلنے کے سارے راستے بند...... پھر ایک غول ہوتا تھا جو چوہے کے پیچھے ادھر سے ادھر یلغار کرتا تھا۔ جوتا...... ڈنڈا...... ہاکی یا کرکٹ کا بیٹ...... جو ہاتھ میں آجائے اس سے حملہ کرنے کے لیے مستعد...... چوہا جدھر جائے...... جس

کونے میں چھپے...... پلنگ کے نیچے...... الماری میں...... اسے نکالا جاتا تھا۔''

''میرا مطلب تھا ہوش سنبھالنے کے بعد۔''

''پھر ہم ذرا خوب صورت چیزوں کا شکار کرنے لگے تھے...... بس اسی چکر میں مارے گئے۔'' اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ''ایک خوب صورت بلا نے ہمیں شکار کرلیا...... چوہے کی طرح۔''

میں نے جیب سے گولی کا ریپر نکالا۔ ''ڈاکٹر صاحب...... کیا آپ نے غور کیا کہ چوہے دان کے علاوہ دنیا میں چوہے مارنے کے جدید طریقے کیا ہیں؟''

''فیکے پتر...... یہ کیا ہوگیا ہے آج تجھے...... چوہا فوبیا۔'' راجا بولا۔

میں نے گولی شہناز کو پیش کی۔ ''یہ گولی۔''

''یہ گولی کا ریپر ہے۔'' شہناز نے کہا۔ ''یہاں روشنی کم ہے اس لیے نام واضح نہیں۔''

میں نے اس کا نام بتایا۔ ''جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے...... یہ چوہے مار گولی ایک دوا ساز ادارے نے بڑی ریسرچ کے بعد بنائی ہے۔''

''ہاں...... بازار میں عام ملتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اگر یہ کوئی آدمی کھالے...... میری تمہاری عمر کا۔''

شہناز ہنسنے لگی۔ ''تو اس کی خودکشی کی کوشش کامیاب نہیں ہوگی...... ایک گولی سے...... چوہا بہت چھوٹا ہوتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اور اگر یہ کوئی حاملہ عورت کھالے؟''

راجا چونکا۔ شہناز بھی ایک دم سیریس ہوگئی۔ ''کیا مطلب؟''

میں نے کہا۔ ''یہ خالی اسٹرپ مجھے رابعہ کے کمرے سے ملی ہے۔ بیڈ کے نیچے سے...... سوال نمبر ایک...... یہ یہاں کیسے آئی...... کیا کسی نے حویلی میں چوہے مارنے کے لیے یہ دوا منگوائی تھی؟''

''حویلی میں چوہے نہیں ہیں...... لیکن پہلے کا میں نہیں کہہ سکتی اگر میرے یہاں آنے سے پہلے کسی نے چوہے مار دیے ہوں۔''

راجا نے کہا۔ ''کیا رابعہ نے کھائی ہے یہ گولی......''

''میں اس کی تصدیق کیسے کرسکتا ہوں...... اگر اس کا ارادہ ایسا ہوتا تو وہ شہناز سے مدد لیتی...... لیکن مجھے معلوم ہے وہ اس کے لیے بالکل تیار نہیں تھی...... نہ خودکشی کے لیے...... نہ قتل کے لیے۔''

راجا نے خفگی سے کہا۔ ''کیا مطلب ہے آخر تیرا...... اسے کسی نے دھوکے سے یہ دوا کھلا دی۔''

میں نے کہا۔ ''شہناز...... تم ذرا غور کرو علامات پر...... اسے آدھی رات کے بعد سخت پیاس لگی...... اتنی کہ سرہانے رکھا ہوا گلاس خالی کرنے کے بعد اسے مزید پانی پینے کی ضرورت محسوس ہوئی...... جبکہ عام طور پر وہ رات کو پانی پینے کے لیے کبھی نہیں اٹھی۔ ہر صبح پانی کا گلاس اسی طرح بھرا ہوا اٹھالیا جاتا تھا جیسے رات کو رکھا جاتا تھا...... ریشم ہم سب کی بیڈ سائیڈ پر رکھتی ہے...... ایک گلاس اسے کافی نہیں ہوا۔ پیاسا چوہا باہر بھاگتا ہے۔''

راجا ایک تنکا چباتا رہا۔ شہناز دم بخود کھڑی رہی۔

میں نے کہا۔ ''جب رابعہ پانی پینے اٹھی...... تو لڑکھڑا کے نہیں گری...... الجھ کر گری۔''

''کس چیز میں الجھ کے؟'' شہناز نے کہا۔

''ایک پتلا سا تار فرش سے ایک دو انچ اوپر دہلیز کے آر پار باندھ دیا گیا تھا۔''

راجا نے مزید خفگی سے کہا۔ ''تیرا دماغ خراب ہے۔''

میں نے کہا۔ ''تو خود جا کے دیکھ لے...... اس نتیجے پر پہنچنے کے لیے کسی عظیم سراغ رساں کے ذہن کی ضرورت نہیں۔''

خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد راجا نے کہا۔ ''کسی پر شک ہے تجھے؟''

''کسی پر بھی نہیں......'' میں نے جواب دیا اور پھر کچھ رک کر پوچھا۔ ''تو کس پر شک کرتا اگر میری جگہ ہوتا؟''

ہم سب جو بیک وقت مدعی تھے، ملزم بھی ہوگئے تھے اور منصف نہیں بننا چاہتے تھے۔ چپ بیٹھے رہے اپنے خیالات کے دو طرفہ سیلاب میں ادھر سے ادھر بہتے رہے۔

پھر شہناز نے کہا۔ ''ابھی کسی سے بات مت کرنا...... میں معلوم کرلوں گی۔'' اور اکیلی اندر جانے کے لیے روانہ ہوگئی۔

راجا اسے دیکھتا رہا اور پھر جیسے خود سے بولا۔ ''شہناز ایسا نہیں کرسکتی...... ایک ڈاکٹر ہے وہ۔''

میں نے سر ہلایا۔ ''ہاں...... ہم سب رابعہ کے خیر خواہ ہیں۔ اس کا بھلا چاہتے ہیں۔''

راجا نے تائید کی۔ ''اس میں کیا شک ہے۔''

''اور اس معاملے میں ایک ہی مؤقف رکھتے ہیں کہ اس کی بھلائی کس میں ہے۔ اس کی بھی اور ہم سب کی بھی۔''

جب ریشم نے صدا لگانی شروع کی۔ ''لیڈیز اینڈ

جنٹلمین...... ڈنر از ریڈی...... ہاٹ سوپ...... فش فرائی...... مٹن قورمہ...... بادام کا حلوا...... اینڈ گرین ٹی۔"

تو میں نے بھی سکون کا سانس لیا کیونکہ ہمارا ایک دوسرے کو فیس کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ "آج مینو کا اعلان بھی ہو رہا ہے لاؤڈ اسپیکر پر۔"

راجا اٹھ کھڑا ہوا۔ کھانے کی میز پر بھی ہم نے ایسی بات نہیں کی جو کسی کے ذہن میں سوال اٹھاتی۔ ہم رسمی انداز میں شریک گفتگو رہے پھر بھی فریال نے تاڑ لیا کہ میں ذہنی طور پر حاضر بھی ہوں اور غیر حاضر بھی۔ وہ جذباتی قربت کے لمبے عرصے میں میرے موڈ کی ہر کیفیت کو پہچاننے کی اسپیشلسٹ بن گئی تھی۔

شہناز سے تو لیلیٰ بھابی نے براہ راست پوچھ لیا۔ "ڈاکٹر صاحب تو کسی صحت کے کس مسئلے پر غور فرما رہی ہیں۔"

اس پر ابا جی نے سر اٹھایا۔ "بھئی رابعہ کے بارے میں فکر کی کوئی بات ہے تو مجھے بتا دو۔"

شہناز نے لیلیٰ کو گھورا۔ "آپ کی بات ہوئی رابعہ سے۔"

"ہاں...... کافی دیر بیٹھے ہم۔"

"پھر، کیا آپ کو کچھ محسوس ہوا؟"

ابا جی نے آہستہ سے سر کھجا کے پھر کھانا شروع کر دیا۔ "ویسے تو ٹھیک ہی لگی وہ۔"

شہناز نے اصرار سے کہا۔ "وہ ٹھیک ہے...... آپ اتنا مت سوچا کریں۔ میرا مطلب ہے ادھر ادھر کی پریشان کرنے والی باتیں۔"

ابا جی نے کہا۔ "کوشش تو کرتے ہیں کہ نہ سوچیں...... مگر کچھ زیادہ ہی ڈرنے لگے ہیں ان دنوں۔"

اماں نے کہا۔ "میری تم سنتے نہیں ہو...... میں نے کہا تھا نماز کے بعد پڑھنے کے لیے ایک وظیفہ ہے۔"

ابا جی نے کہا۔ "ڈر لگتا ہے اس سے بھی بیگم...... کہیں وظیفہ الٹ گیا تو لینے کے دینے نہ پڑ جائیں...... ایسا ہوتا ہے نا؟" انہوں نے تائید طلب نظر جملہ حاضرین پر ڈالی۔

حاضرین نے غیر جانبداری کے اظہار میں عافیت جانی۔ "یہ آج بیک وقت تین طرح کی مچھلی...... ہاؤ از دیٹ مس ریشم۔" راجا نے کہا۔

ریشم کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ "کیچ فش غنی......"

میں نے کہا۔ "بھئی غنی کو مچھلی نے پکڑ لیا۔ وہیل یا شارک تو نہیں تھی۔"

"نو...... نو سر...... ہی گوٹو...... دریا...... کنہار...... ہی ہے...... فش کم سیزن...... ہی کیچ سکس لارج...... [illegible] اسمال...... آئی کک غنی۔"

میں نے کہا۔ "کیا تم نے غنی کو پکا دیا؟"

ریشم پر گھبراہٹ طاری ہو گئی۔ "نو...... نو سر...... [illegible] کک غنی ووِمی ان کچن...... ہی ڈائریکٹر۔"

ریشم کی انگریزی نے ماحول بدل دیا۔ جو اس [illegible] اس کا مطلب یہ تھا کہ اس موسم میں دریائے کنہار میں مچھلیاں آتی ہیں اور یہ غنی وہیں سے پکڑ کے لایا ہے اور اس نے [illegible] ہدایات کے مطابق ہی پکائی ہیں...... سب کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا...... مگر مجال ہے جو اس گورا شاہی انگلش پر ریشم نے [illegible] بھی خفت محسوس کی ہو۔

کھانے کے بعد کبھی کبھی ابا جی کانفرنس طلب کر لیتے تھے جس کی صدارت بھی انہی کے حصے میں آتی تھی۔ وہ سب سے پوچھتے تھے کہ کون کیا کر رہا ہے۔ آج کیا ہوا...... یہ ایک جنرل گپ شپ کا سیشن ہوتا تھا۔ کھانے کے بعد گرین ٹی کا دور بھی چلتا تھا۔ اس کا سلسلہ بھی ابا جی نے شروع کیا تھا۔ سب کو عادی بنا لیا تھا۔

"کل سے ہم ایس بی ٹی بی یو شروع کر رہے ہیں۔" فریال نے اعلان کے انداز میں کہا۔

"ہائیں!...... بھئی یہ کیا ہے...... بی ٹی ایس یو بی......" ابا جی بولے۔

فریال نے تصحیح کی۔ "ایس بی...... ٹی بی یو۔"

"ست بدھائی...... تعلیم بالغاں یونی ورسٹی۔" لیلیٰ بھابی نے واضح کیا۔

"جس کی چانسلر اور وائس چانسلر آپ دونوں...... [illegible] اللہ۔" راجا نے مذاقاً کہا۔

شہناز اس دن ایک گاؤں میں پیش آنے والے کسی دلچسپ واقعے پر تبصرہ کر رہی تھی کہ میں کھسک گیا۔ جب میں نے رابعہ کے بیڈروم کا دروازہ تھوڑا سا کھول کے اندر جھانکا تو میرا خیال تھا کہ وہ سو رہی ہوگی۔ کمرے میں نائٹ لیمپ کی مدھم سی روشنی تھی مگر اس نے آہٹ پر میری طرف سر گھما کے دیکھا اور اٹھ کر بیٹھ گئی۔

میں نے کہا۔ "لیٹی رہو۔"

"تھک گئی ہوں لیٹے لیٹے بھی...... ذرا یہ لائٹ [illegible] دو۔"

"اتنی روشنی کافی ہے باتیں کرنے کے لیے۔ یہ بتاؤ اب کیسی ہو۔" میں اس کے پاس بیٹھ گیا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ ''کیا کہنا چاہیے مجھے جواب میں کزن؟ یہ کہ اللہ کا شکر ہے...... یا یہ کہ ٹھیک ہے زندہ ہوں...... آپ کی دعا ہے۔''

''دیکھو...... یہ بس ایک حادثہ تھا۔''

''ہاں...... پتا نہیں میرا کیا گناہ تھا...... خدا اچانک ناراض کیوں ہوگیا مجھ سے...... سارے حادثات کا شکار میں ہی کیوں ہوتی جارہی ہوں۔''

''اگر تم سمجھو تو یہ درد مشترک ہے۔ دکھ کا بوجھ ہم سب نے اٹھایا ہے۔ کسی نے کچھ زیادہ...... کسی نے کچھ کم...... جو رشتے ہم نے گنوا دیے...... مشترک تھے۔''

''کسی اور کی میں کیا بات کروں۔''

''دیکھو ایسا تو ہر ایک سمجھ سکتا ہے وہ تمہارے ماں باپ تھے۔ میرے نہیں تھے۔ ان کے لیے جو تمہارے جذبات ہو سکتے ہیں میرے نہیں ہیں یا جو میری دادی تھی میرے باپ کی ماں تھی جو گھر جل کے راکھ ہوا اس کا سب سے زیادہ دکھ میری ماں کو ہے۔''

''آخر تم میری بات کیوں سمجھنا نہیں چاہتے؟'' وہ غصے میں آگئی۔

میں نے کہا۔ ''لٹل گرل...... تم زندہ رہنا چاہتی ہو نا؟ تو پھر حادثات کو عام آدمی کی طرح قبول کرو...... نوشتۂ تقدیر...... اللہ کی رضا...... کچھ بھی مانو...... اور یقین رکھو کہ نہ اللہ ظالم ہے اور نہ بے انصاف...... اس کا کرم اور اس کی عنایات پہلے بھی تھیں...... آئندہ بھی ہوں گی۔''

وہ رونے لگی۔ ''کزن...... جو میں چاہتی تھی وہ نہیں ہوا۔''

میں نے اس کے آنسو پونچھے۔ ''کون جانے اس میں قدرت نے کیا مصلحت دیکھی...... فرخ آگے چل کے تمہارے ساتھ کیا کرتا...... جو تمہارے لیے ناقابل برداشت ہوتا۔ وہ تمہاری جان بھی تو لے سکتا تھا...... جو اب محفوظ ہے۔''

''میں تو اپنے بچے کو بھی نہ بچا سکی۔''

میں نے اس کے سر کو تھپکا۔ ''تم یہی سوچو...... کہ شاید بہتری اسی میں ہوگی۔ مجھے ایک بات بتاؤ...... تم کیسے گری تھیں؟''

وہ سیدھی بیٹھ گئی۔ ''کیا مطلب؟''

میں نے کہا۔ ''تمہارا پیر پھسلا تھا...... تم لڑکھڑائی تھیں...... چکر وغیرہ آگیا تھا...... یا تمہارا پاؤں الجھ گیا تھا کسی چیز میں...... جو تمہیں اندھیرے میں دکھائی نہیں دی۔''

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ ''اتنا اندھیرا بھی نہیں تھا۔ کاریڈور میں خاصی روشنی تھی...... میرا خیال ہے چکر آگیا ہوگا۔''

''یعنی راستے میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔''

''ہوں...... راستے میں کچھ نہیں تھا۔'' وہ قطعی لہجے میں بولی۔ ''اچانک پیاس لگی اتنی سخت کہ میں بتا نہیں سکتی۔ ریشم نے سرہانے جو پانی کا گلاس بھر کے رکھا تھا...... وہ پی لیا پھر بھی پیاس نہیں بجھی۔''

''تم نے شہناز کو بتایا...... اس نے کیا کہا؟''

''کچھ نہیں...... اس نے کہا کہ اب یہ تو انویسٹی گیشن کے بغیر معلوم نہیں ہو سکتا...... کھانے میں تو ایسی کوئی چیز تھی نہیں...... جو سب نے کھایا وہ تم نے کھایا...... کچھ اور کھالیا ہے تو بتا دو...... اس کا مطلب تھا...... کوئی ایسی دوا...... پریشانی سے بچنے کے لیے...... میں نے کہا کہ ایسا تو میں سوچ بھی نہیں سکتی شہناز...... یہ تم اچھی طرح جانتی ہو...... پھر کیوں پوچھ رہی ہو...... اگر میری ایسی نیت ہوتی تو پہلے تم سے کہتی...... تم سے چھپ کے میں ایسا کر سکتی ہوں کہ کسی کے کہنے میں آکے کچھ کھالوں؟ وہ میرے غصے سے ڈر گئی۔ معافی مانگنے لگی مجھ سے کہ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔''

میں نے کہا۔ ''دراصل...... ایسا ہوتا ہے کہ ایک تو سارے ہی خیر خواہ بن جاتے ہیں اور مشورہ دینا تو پھر فرض ہو جاتا ہے۔ شہناز ہے ڈاکٹر...... اپنی تسلی کے لیے پوچھا ہوگا...... خیر...... یہ بتاؤ...... تم دوا کیا کھا رہی ہو؟''

''وہی جو شہناز دے رہی ہے۔''

''کچھ اس میں گولیاں بھی ہیں...... انجکشن کے علاوہ۔''

''ہاں...... مگر مجھے معلوم نہیں کیا گولیاں ہیں...... معلوم کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے...... تم کیا تفتیش کر رہے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''نہیں تفتیش کچھ نہیں۔ دراصل تمہاری طرف سے میں کچھ متفکر تھا۔ بلاشبہ شہناز اچھی ڈاکٹر ہوگی۔ اپنے کام میں ماہر ہے لیکن خواہ مخواہ احساس تھا کہ شہر میں ایک سے ایک اچھا اسپتال ہے۔''

اس نے ممنونیت سے مجھے دیکھا اور میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''میں ٹھیک ہوں کزن...... ضرورت ہوتی تو شہناز ایک منٹ نہ لگاتی اور خود مجھے وہاں لے جاتی...... بس تھوڑی سی نقاہت ہے اس لیے آرام کر رہی ہوں...... جو دل پر گزری ہے اس کا زخم ابھی تازہ ہے۔ وقت کے ساتھ وہ بھی مندمل ہو ہی جائے گا......'' اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

میں نے اس کے ہاتھ کی پشت پر پیار کیا۔ ''اب اگر تم جلدی سے اپنے پیروں پر کھڑی ہو جاؤ تو ایک پروجیکٹ

تمہارے سپرد کیا جائے۔''

اس پر مایوسی طاری رہی۔ ''یہ بھی تو ایک پروجیکٹ ہی تھا...... زندگی گزارنے کے لیے...... دیکھو کیسی ناکامی سے دوچار ہوا۔''

''ایسا تو ہر پروجیکٹ میں ہوتا ہے۔ ہر سفر میں ہر قدم پر ہوتا ہے...... ہر کام میں ہر مرحلے پر کامیابی ہوتی ہے یا ناکامی...... اب مجھے دیکھو...... میں کیا کرتا رہا...... تباہی کے راستے پر جا رہا تھا اور اسی کو کامیابی سمجھ رہا تھا۔ یہ کوئی شوق کی بات نہیں تھی کہ مجھے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے باہر بھیجا گیا...... یہ ایک مجبوری تھی...... مجھے فرار کرایا گیا تھا...... وہاں کیا ہوا؟ میں نے زبردست کامیابی حاصل کرلی۔ ایم بی اے کی ڈگری ہاورڈ سے اور پھر لندن میں بہترین ملازمت...... لیکن یکلخت وہ سب ختم ہوگیا...... مجھے لوٹ کے آنا پڑا...... میرے کام کچھ نہ آیا یہ کمال نے نوازی۔''

''نین وازی کیا؟'' وہ سر کھجا کے بولی۔

میں نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ ''جہالت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے کزن...... نے کہتے ہیں بانسری کو۔''

''یار مجھے فارسی کہاں آتی ہے۔'' وہ ہنسنے لگی۔

''میرا مطلب تھا...... کامیابی کیا ہے اور ناکامی کیا...... یہ ہم خود کبھی طے نہیں کر سکتے۔ بعض اوقات ناکامی ہی حقیقی کامیابی ہوتی ہے جیسے آدمی کسی کو قتل کرنے میں ناکام ہو جائے یا جوئے میں سب کچھ لٹانے میں...... بس ایسے ہی سمجھو کہ ناکامی میں تمہاری کامیابی چھپی ہوئی ہے۔ میرا یہ فلسفہ تمہاری سمجھ میں آجائے گا۔ رات بھر غور فرماؤ...... صبح تم بہتر محسوس کرو گی۔''

اپنے بیڈروم میں لائٹ بجھا کے میں نے سونے کی بہت کوشش کی مگر میرے خیالوں پر نور جہاں کی یلغار رہی۔ میں ذہن کا ایک در بند کرتا تھا تو وہ اپنی شیطانی ہنسی کے ساتھ دوسرے در سے اندر گھس آتی تھی اور میری بے بسی کا مذاق اڑانے لگتی تھی۔ اب تم کچھ نہیں کر سکتے...... اگر تم مزاحمت کی طاقت رکھنے والے ہوتے تو تمہاری زندگی میں گزری ہوئی رات کی ناکامی نہ آتی...... لیکن میں نے تمہیں بے بس کر دیا تھا۔ اب تو میں جب بھی چاہوں گی تمہیں بلالوں گی اور...... کچے دھاگے سے چلے آئیں گے سرکار بندھے......

نہیں...... میں نے گھبرا کے کہا...... میں نہیں آؤں گا۔

اس کی ہنسی میرے ذہن میں گونجی...... تم آؤ گے...... تم کو آنا پڑے گا۔

نہیں میں نہیں آؤں گا...... میں چلایا۔

وہ ہنسی اور اس نے میری ناک پکڑ لی۔ ''کون بلا رہا ہے خواب میں؟''

میں گھبرا کے اٹھ بیٹھا۔ ''یہ تم ہو؟''

فریال ہنستے ہنستے دہری ہوگئی۔ ''خواب میں کون تھا؟''

میں نے خفت سے کہا۔ ''ایک بڑی خوفناک چڑیل نے پکڑ رکھا تھا۔ بعض خواب کتنی جلدی سچ ہو جاتے ہیں۔''

''بھوت کو چڑیل نہیں پکڑے گی تو کون پکڑے گا۔'' وہ میری گود میں سر رکھ کے لیٹ گئی۔

''پریشانی کیا ہے آپ کو خاتون؟ نہ خود سوتی ہو نہ سونے دیتی ہو۔''

''جو سوتا ہے...... وہ کھوتا ہے...... یعنی گدھا۔''

''روز جاگتا رہا تو میں گدھا نہیں الو ہو جاؤں گا۔''

وہ سوچ کے بولی۔ ''ہو جاؤں گا؟ ابھی کیا ہیں آپ؟''

''چھ سال سے تم الو بنا رہی ہو مجھے...... مگر میں بنا نہیں۔''

اس نے کہا۔ ''چنانچہ اب تم کوشش کر رہے ہو مجھے الو بنانے کی......'' اور پھر ایک دم چلا کے بولی۔ ''میں پوچھتی ہوں کہ آخر کیوں؟''

میں نے اس کا منہ دبا دیا۔ ''پاگل کی بچی...... کیوں آدھی رات کو نیا ڈراما کرنا چاہتی ہے...... ابھی کوئی آجائے گا۔''

وہ گانے لگی۔ ''آئے گا...... آئے گا...... آنے والا آئے گا...... آنے دو...... آنے دو۔''

میں نے دروازہ بند کیا۔ ''کل سے میں اندر سے کنڈی لگاؤں گا۔''

''اس میں زیادہ خرابی ہوگی رومیو...... میں زور زور سے دروازہ بجاؤں گی تو سب جمع ہو جائیں گے۔ میں کہوں گی کہ اندر سے رفیق مدد کے لیے پکار رہا تھا بڑی دردناک آواز میں...... اللہ خیر کرے...... پھر وہ دروازہ توڑیں گے...... اور سب سے پہلے میں ہی اندر آؤں گی...... چنانچہ مجھے روکنے کا خیال دماغ شریف سے ایسے نکال دیں جیسے نواز شریف کو نکالا گیا۔''

''اچھا بابا......''

اس نے میرے بال پکڑ لیے۔ ''بابا؟ میں بابا نظر آتی ہوں تمہیں۔ بے بی کو بابا کہتے ہوئے شرم نہیں آتی تمہیں...... بابا جی ہو تم خود...... جوانی میں بڑھاپا طاری ہوگیا ہے تم پر...... لندن میں تھے تو جوان تھے۔ کیسے دھڑلے سے عشق لڑاتے تھے...... کبھی مجھ سے کبھی اس ایشا عرف عائشہ سے۔ اور بھی

نہ جانے کس کس سے...... ساری رپورٹیں ہیں میرے پاس...... یہاں آتے ہی بڈھے ہو گئے...... شادی کے قابل بھی نہیں رہے اب تو۔''

مجھے ہنسی آ گئی۔ ''آخر تم کیا چاہتی ہو؟''

''چھوڑو...... اچھی طرح جانتے ہو تم کہ میں کیا چاہتی ہوں۔'' اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور پھر میری گود میں لیٹ گئی۔ ''لیکن وہ تم کر نہیں سکتے۔''

''حد سے زیادہ بے شرم ہو تم۔''

''اور تم جھوٹے...... پہلے مجھ سے جھوٹ نہیں بولتے تھے...... اب بولنے لگے ہو۔''

میں نے اس کی آنکھوں کو اور ہونٹوں کو چوما۔ ''کیا جھوٹ بولا ہے میں نے؟''

''پتا نہیں...... لیکن تم جھوٹ بولتے ہو تو تمہارا چہرہ عجیب سا ہو جاتا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''بہت برا۔''

صرف ایک لمحے کے لیے میرے دل میں خیال آیا کہ میں اسے سچ بتا دوں...... لیکن پھر میں ڈر گیا کہ کہیں یہ سچ وہ ایٹم بم نہ بن جائے جس نے چند لمحوں میں ہیروشیما کو نیست و نابود کر دیا تھا...... اگر میں جذبات کی رو میں بہہ کر اعتراف کر لیتا کہ حیوانی خواہشات کی ترغیب کا شکار ہو کے میں خیانت جیسے جرم کا مرتکب ہوا ہوں...... میں نے چوری چھپے اپنی زندگی کی ایک رات نور جہاں کو دے دی تھی اور اب اسی جرم کی پردہ پوشی کے لیے جھوٹ بولنے پر مجبور ہوں...... تو نہ جانے فریال کے اندر کی عورت کا ردعمل کیا ہوتا...... فریال ایک انتہائی جذباتی بلکہ جنونی لڑکی تھی...... کم سے کم میری محبت کے معاملے میں...... مجھے اس سے واقعی ڈر لگتا تھا۔

''بتاؤ نا...... آخر کیا پریشانی لاحق ہے تمہیں۔'' اس نے ایک دم میرا ہاتھ پکڑ کے میری انگلی پر کاٹ لیا۔

میں نے اپنا ہاتھ جھٹکا۔ ''کیا بالکل ہی پاگل ہو گئی ہے لڑکی۔'' اور پھر اس کے گال پر کاٹ لیا۔

اس نے ایک چیخ مار کے مجھے دھکیلا۔ ''چھوڑو مجھے۔ آدم خور۔'' اور اٹھ کر آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنے لگی۔

میں نے کہا۔ ''فکر نہیں کرو...... خون نہیں نکلا۔''

''اتنا گہرا نشان تو پڑ گیا ہے۔'' اس نے گالوں کو دبا کے کہا۔ ''کیا بتاؤں گی کسی نے پوچھا تو۔''

''بتا دینا سچ...... نہ تم ڈرتی ہو نہ شرماتی ہو۔''

وہ ایک دم پلٹی۔ ''تم پھر بات کو ٹال گئے نا۔''

میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''کیا بتاؤں فری...... میری پریشانی کی وجہ ہے رابعہ...... تم جانتی ہو۔''

''پریشانی کا جو فوری مسئلہ تھا...... وہ تو ختم ہو گیا۔ فرزا کبھی ہاتھ آیا تو دیکھا جائے گا...... رابعہ اب ٹھیک ہے۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ ایک اور پریشانی ہے...... مجھے شک ہے کہ کسی نے...... جانتے بوجھتے یہ کیا۔''

''کیا کیا؟''

''میں نے شہباز کو بھی بتایا...... آج رابعہ سے بھی بات کی...... میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔''

''اگر آپ اس ناچیز کی سمجھ پر بھروسا کریں تو مجھے بھی بتا دیں۔''

میں نے کہا۔ ''تم جانتی ہو...... رابعہ اس بچے کو پالنا چاہتی تھی۔ اس کے لیے ہر رسک لینے پر بہ ضد تھی۔ کسی کے سمجھانے کا اس پر اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ کسی صورت ابارشن نہیں چاہتی تھی۔''

''لیکن ابارشن ہو گیا...... ایک حادثے کے نتیجے میں۔''

''نہیں...... یہی تو ساری پریشانی ہے کہ وہ حادثہ نہیں تھا۔''

''تو کیا تھا؟'' وہ حیران ہوئی۔

میں نے اسے ساری صورت حال سمجھائی۔ وہ کچھ دیر سنتی رہی اور پھر ہنسنے لگی۔ ''الٹی کھوپڑی ہے تمہاری بھی۔''

''کیوں...... اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے بے وقوف لڑکی۔''

''عقلمند آدمی...... حویلی پچاس سال سے بند تھی۔ ہر قسم کے جانور اندر رہنے لگے تھے۔ سوائے انسانوں کے...... تم نے تو دیکھا ہوگا...... مجھے ریشم نے بتایا کہ چھت میں پرندوں کے گھونسلے تھے...... ہر روشن دان میں۔''

میں نے کہا۔ ''اوپر جو کمرے نہیں کھولے گئے ان میں اب بھی ہیں۔''

''ان کے علاوہ چھپکلی...... کاکروچ...... اور چوہے تھے...... جب صفائی ہوئی تو سب بھاگ گئے یا مار دیے گئے...... کچھ اپنے بلوں میں روپوش ہو گئے۔ ایک دن ریشم نے مجھے بتایا کہ رات کو چوہے پھرتے ہیں ہر کمرے میں اور کاکروچ نکل آتے ہیں۔ میں نے کہا کہ چلو کرتے ہیں ان کے خلاف آپریشن کلین اپ...... لندن میں ایک دوا ملتی تھی جس سے کاکروچ ختم ہو جاتے تھے۔ اس کو برش کے ساتھ پینٹ کی طرح کچن کی دیواروں اور کیبنٹ میں لگا دیا جاتا تھا...... اس کا اپنا کوئی رنگ نہیں ہوتا...... خشک ہونے کے بعد پتا بھی نہیں چلتا مگر اس پر سے کاکروچ گزرے تو خلاص...... تم کاکروچ کے بارے میں کیا جانتے ہو؟'' اس نے ہنستے ہوئے سوال کیا۔

''یہی کہ وہ کاکروچ ہوتا ہے...... کیا یہ کافی نہیں؟''

اس نے اپنا لیکچر جاری رکھا۔ ''کاکروچ دنیا میں پینتیس کروڑ سال سے ہیں۔''

''کیا یہ بات کاکروچ جانتے ہیں؟''

''یہ دنیا کا سب سے زیادہ سخت جان جانور ہے جو ہر جگہ رہ سکتا ہے...... پانی میں خشکی پر...... گرمی سردی...... اسے کوئی چیز نقصان نہیں پہنچاتی...... مگر اس کی ایک کمزوری ہے اگر یہ الٹا ہو جائے تو سیدھا نہیں ہو سکتا اور ٹانگیں چلاتا ہوا دنیا سے چلا جاتا ہے...... اس دوا کی ایک تاثیر تھی جب کاکروچ اس پر سے گزرتا ہے تو اس کے اعصابی نظام کو جھٹکا لگتا ہے۔ وہ مفلوج ہو کے الٹ جاتا ہے اور۔''

میں نے کہا۔ ''اب کچھ ارشاد ہو چوہے کی حیات مستعار پر۔''

''لندن میں یہی دوا ملتی تھی...... جس کا ریپر آپ نے دریافت فرمایا ہے کھانے کے بعد چوہا اندر کسی کونے کھدرے میں انتقال نہیں فرماتا۔ اسے سخت گرمی لگتی ہے اور پیاس...... وہ باہر بھاگتا ہے اور مرنے کے بعد خشک ہو کے راکھ کی طرح بکھر جاتا ہے...... آ گئی بات سمجھ میں۔'' وہ میرے ساتھ بیٹھ گئی۔

میں نے غمناک لہجے میں کہا۔ ''آدمی بھی دو مشت خاک ہے۔''

''چنانچہ تمہارا شک درست تھا مگر نتیجہ غلط...... وہ دوا ریشم نے غنی سے منگوائی اور ساری حویلی میں ڈالی۔ اوپر کی منزل پر ابھی یہ کارروائی نہیں ہوئی...... معلوم نہیں کہاں سے وہ ریپر تمہیں مل گیا...... کوئی پڑا رہ گیا ہوگا ادھر ادھر...... جناب چل پڑے سراغ رسانی کرنے۔'' وہ ہنسی۔

میں نے جھینپ کے کہا۔ ''اور وہ تار...... جو دروازے میں دہلیز کی جگہ باندھا گیا تھا۔''

اس نے دو بار ناک سے سوں سوں کی اور پھر میری قمیص کے دامن سے ناک صاف کر کے بولی۔ ''لگتا ہے کچھ الرجی ہو گئی ہے۔''

میں نے جھلا کے کہا۔ ''تمہیں الرجی ہے مجھ سے...... مت آیا کرو میرے پاس...... ناک صاف کرنے کے لیے تمہارے پاس اپنی قمیص کا دامن بھی تھا۔''

اس نے کہا۔ ''اوہ میں تو بھول ہی گئی تھی...... خیر اس تار کے بارے میں تحقیقاتی کمیشن ابھی ابھی قائم کر دیا گیا ہے جو اس ناچیز پر مشتمل ہے اور اپنی رپورٹ کل دے گا...... جیسے ہائی کورٹ کے ایک جج پر مشتمل کوئی ٹربونل ہوتا ہے...... خیر اب آپ سکون سے سو سکتے ہیں۔ جس بات نے آپ کو پریشان کر رکھا تھا۔''

''مجھے آپ نے پریشان کر رکھا ہے ایک گھنٹے سے۔''

وہ دروازے میں رک گئی۔ ''اوہ...... ایک بات پوچھنا تو میں بھول ہی گئی۔''

''کون سی بات؟''

''آخر تم نے کیوں بلایا تھا مجھے؟''

میں نے اس کے ایک گال کو چھوا۔ ''بات سنو...... ایک طرف یہ جو نقش محبت ہے یہ کچھ اچھا نہیں لگ رہا ہے اگر دوسری طرف......''

اس نے مجھے دھکا دیا اور دروازے کو دھڑام سے بند کر کے بھاگ گئی۔ میرا دل بیٹھ گیا۔ یہ ناممکن تھا کہ اب کوئی نہ جاگے...... میں نے عافیت اسی میں جانی کہ منہ لپیٹ کے پڑ جاؤں...... دھماکے سن کر آنے والوں میں لیلیٰ بھابی، شہباز اور غنی کے علاوہ اباجی بھی تھے۔ وہ مجھے گہری نیند میں پا کے ایک دوسرے سے پوچھتے رہے...... یہ کس کا دروازہ اتنی زور سے بند ہوا تھا؟ اس وقت فریال بھی چادر سر تک تانے اندر ہی اندر ہنسی کو ضبط کر رہی ہوگی۔

فریال کے بے داغ اجلے رخساروں پر میرے کاٹنے سے گہرے لال نشان پڑ گئے تھے اور وہ انہیں چھپانے سے قاصر تھی۔ جانتے بوجھتے لیلیٰ بھابی نے اس سے پوچھا۔ ''بھئی فریال یہ کیا ہوا؟''

فریال نے جھینپ کے کہا۔ ''کسی جانور نے کاٹا ہے سوتے میں۔''

لیلیٰ بھابی سر ہلانے لگیں۔ ''کوئی پالتو جانور لگتا ہے۔ وہ پیار میں بھی کاٹ لیتے ہیں۔''

شہباز نے کہا۔ ''ہاں ایک پوڈل تھا میرے پاس...... اس نے کاٹ لیا تھا لاڈ میں...... کھیلتے کھیلتے۔''

لیلیٰ بھابی نے کہا۔ ''بھئی ذرا دھیان سے سویا کرو۔''

اباجی نے سادگی میں مشورہ دیا۔ ''شہباز...... بھئی تم دیکھو ذرا۔ اسے کوئی انجکشن وغیرہ کی ضرورت تو نہیں ہے...... بڑا گہرا نشان ہے۔''

راجا نے کہا۔ ''انجکشن تو اس جانور کو لگنا چاہیے جس نے کاٹا ہے...... ورنہ وہ پھر کاٹے گا۔''

اباجی نے کہا۔ ''بھئی کتا پاگل ہو جائے تو اسے گولی مار دیتے ہیں...... انجکشن لگنے کا تو ہم نے نہیں سنا۔''

فریال سارا دن سب کے مذاق کا نشانہ بنتی رہی مگر وہ

بھی ایک ڈھیٹ چیز تھی۔ یہ اعتراف کرتے ہوئے ذرا نہیں شرمائی کہ کاٹنے والا جانور کون تھا۔ شہناز کے ساتھ ریشم کی مصروفیت بڑھتی جا رہی تھی۔ آس پاس کے درجنوں چھوٹے بڑے دیہات ہر قسم کی طبی سہولت سے محروم تھے۔ سرکاری ڈسپنسری کی خستہ حال عمارت تو موجود تھی مگر برسوں سے ویران پڑی تھی، نہ وہاں کوئی ڈاکٹر آیا تھا نہ مریض...... جو پرائیویٹ علاج کی استطاعت رکھتے تھے وہ بھی ٹیلہ جوگیاں جانے پر مجبور تھے یا پھر دینہ...... اس کے لیے بھی وہ بیل گاڑی یا تانگہ ریڑھا ہی بطور ایمبولینس استعمال کرتے تھے چنانچہ بیمار کا سفر میں جھٹکوں سے ہلاک ہو جانے کا احتمال ہمیشہ رہتا تھا۔

بیشتر امراض کا علاج ہر گھر میں خاندانی ٹوٹکوں سے کرلیا جاتا تھا۔ یہ کھالو...... وہ پھانک لو...... چنانچہ وہ لطیفہ یہاں حقیقت بن جاتا تھا کہ کسی نے علاج تجویز کیا۔ ''گامے کو تپ چڑھی تھی تو اس نے فلاں چیز کھائی تھی...... ماجھے کو فلاں چیز کھلا دی گئی اور وہ اللہ کو پیارا ہو گیا۔'' لواحقین نے شکایت کی تو جواب ملا۔ ''گاما بھی تو فوت ہو گیا تھا۔''

اب اچانک ایک حیران کر دینے والا انقلاب آیا تھا کہ شہر کی ڈاکٹر خود گھر گھر جا کر علاج بھی کر رہی تھی اور دوا بھی دے رہی تھی۔ بیشتر لوگ اس سے مستفید ہو کے دعائیں دے رہے تھے مگر کچھ لوگ اس کی مخالفت بھی کر رہے تھے۔ ہر گاؤں میں ایک سیانا تھا جو عام طور پر کوئی عمر رسیدہ بڈھا بابا ہوتا تھا۔ وہ اپنے پاس کچھ دیسی دوائیں، جڑی بوٹیاں وغیرہ رکھتا تھا...... زیادہ چالاک بابے اسپرین جیسی دوائیں بھی دیسی نسخے بنا کے اپنی حکمت کی دکان چمکاتے تھے۔ کہیں کوئی پنساری یہ کام کرتا تھا تو کہیں کوئی مولوی صاحب بیک وقت روحانی اور جسمانی علاج کے لیے ''نیک نام'' تھے۔ وہ دیسی دوا کے ساتھ دم کیا ہوا پانی...... تعویذ یا جھاڑ پھونک آزما کے ہر مرض کا علاج کرنے کی شہرت رکھتے تھے۔

ایسے تمام لوگوں نے ڈاکٹر شہناز اور ریشم کی ٹیم کے خلاف محاذ قائم کرلیا اور اچھی خاصی تعداد میں لوگ ان کے ساتھ ہو گئے جو یہ کہتے تھے کہ ولایتی دوا ہمارے مزاج کے موافق نہیں اور نقصان کرتی ہے پھر یہ بھی کہا گیا کہ اس میں حرام اجزا شامل ہوتے ہیں لیکن شہناز کے لیے یہ مخالفت غیر متوقع نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ مخالف کون لوگ ہوں گے اور کیا کہیں گے...... لیکن شہناز یہ بھی جانتی تھی کہ جب لوگ صحت یاب ہوں گے تو مخالف منہ کی کھا کے خود ہی چپ ہو جائیں گے...... اور ایسا ہی ہوا بھی تھا۔

ہمارے کہنے پر اب وہ اپنے ساتھ ڈرائیور لے جاتی تھی جو مسلح ہوتا تھا اور سیکیورٹی گارڈ کے فرائض بھی سرانجام دیتا تھا۔ وہ جس گاؤں میں جاتی تھی، مریض پہلے سے انتظار میں ہوتے تھے۔ بھاگم بھاگ وہ ہر روز آدھا گھنٹا ہر گاؤں میں گزار کے آٹھ دس دیہات کا چکر لگا لیتی تھی...... یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ کچے راستوں پر سفر دشوار ہوتا تھا۔ مریض بڑھتے جا رہے تھے۔ ایمرجنسی میں شہناز کو وقت بے وقت بھی کسی کی جان بچانے کے لیے جانا پڑتا تھا اور اب اس کی مشکلات میں مزید اضافہ یوں ہو گیا تھا کہ ہر گاؤں میں ایک موبائل فون تھا جہاں سے لوگ اسے کال کرنے لگے تھے۔ چنانچہ اب ایک اسپتال بالکل ناگزیر ہو گیا تھا جہاں بیٹھ کے وہ سارے مریضوں کو دیکھے...... مریض خود چل کے آئیں...... ہر مریض کو دروازے پر طبی سہولت کی فراہمی ناممکن ہو گئی تھی۔

اس روز بھی ڈاکٹر شہناز اور اس کی معاون خصوصی ریشم نو ساڑھے نو بجے اپنے راؤنڈ پر گئی تھیں۔ ان کے جانے کے کچھ دیر بعد راجا نے غنی کو شہر بھیج دیا۔ اس کے ذمے بہت سے اہم کام تھے۔ اسے راجا کا وہ کالم اخبار کے دفتر پہنچانا تھا جو اس نے گزشتہ روز مکمل کیا تھا۔ پھر اسے ساری ڈاک جمع کر کے لانی تھی۔ شہناز نے اسے دواؤں کی ایک لمبی فہرست تھما دی تھی جو اسے مختلف مقامات سے اٹھانی تھیں۔

اس کے جانے کے بعد راجا نے مجھے حد بندی کی ضرورت سے آگاہ کیا۔ ''تجھے کچھ پتا ہے کہ تیری یہ جاگیر کہاں تک ہے۔ اس کی حدود کیا ہیں۔''

میں نے اعتراف کیا۔ ''مجھے واقعی اندازہ نہیں...... لیکن اس کی حد بندی پٹواری کے کاغذات میں ضرور ہو گی۔''

''پہلے کبھی ایک دیوار اٹھائی گئی تھی نہ جانے کب۔''

''اس کے آثار موجود ہیں۔'' میں نے کہا۔

''لیکن اکثر مقامات پر اس کا وجود نہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ کسی نے جانتے بوجھتے ہیرا پھیری کرنے کے لیے اس دیوار کو کھود کے ہٹا دیا...... یہ کوئی سریے سیمنٹ کی فصیل نہیں تھی۔ جہاں دیوار سلامت ہے وہاں اس کی اونچائی ایک فٹ کے قریب نظر آتی ہے...... اتنی ہی موٹائی بھی ہو گی...... میرا خیال ہے کہ یہ دیوار پھر کھینچ دینی چاہیے۔''

میں نے کہا۔ ''وزیر باتدبیر...... ہم تمہاری دانش مندی کے قائل ہو گئے۔''

راجا نے کہا۔ ''حضور نواب صاحب...... آپ ماشاءاللہ اس سے کہیں زیادہ احمق ثابت ہو رہے ہیں جتنے کہ چشم بددور...... آپ کے خلد آشیانی آبا و اجداد تھے۔''

میں نے کہا۔ ''ہم غیظ و غضب سے تھر تھر کانپ رہے ہیں۔''

''آپ کو خاک بھی علم نہیں کہ آپ کے پیچھے کیا ہو رہا ہے۔''

میں نے پلٹ کے دیکھا۔ ''ہمارے پیچھے تو کچھ نہیں ہو رہا۔''

''ایک بار پہلے بھی ہم نے کچھ لوگوں کو پکڑا تھا جو ست بدھائی کی حدود سے درخت کاٹ کر لے جا رہے تھے۔ مجھے معلوم ہوا کہ یہ سلسلہ جاری ہے بلکہ بڑھ گیا ہے۔''

''تو نے دیکھا ہے یا سنا ہے۔''

''مجھے غنی نے بتایا ہے اور وہ غلط نہیں کہے گا۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ خود چل کے دیکھ لیتے ہیں۔''

کوئی اور مصروفیت نہ ہونے کی وجہ سے میں راجا کے ساتھ نکل کھڑا ہوا۔ حویلی کی بیرونی دیوار سے ملی ہوئی دونوں جانب کی دیوار کچھ بلند تھی۔ شمال کی طرف تقریباً سو گز تک یہ دیوار تین فٹ اونچی تھی اور ہنوز سلامت تھی اس دیوار کے پیچھے بائیں جانب وہ قبرستان تھا جس میں تازہ ترین اضافہ تین قبروں کا تھا چنانچہ اب یہ ہمارا خاندانی قبرستان بن چکا تھا۔ دائیں طرف دریائے کنہار تھا جو ایک طویل قوس بناتا تھا اور جاگیر کی فصیل کے ساتھ ساتھ تقریباً متوازن چلتا تھا۔ دریا کا پاٹ کہیں زیادہ اور کہیں کم نظر آتا تھا لیکن جاگیر کی حدود سے اس کا فاصلہ کم و بیش ایک جیسا تھا۔ اس بات کی طرف مجھے راجا نے متوجہ کیا۔ ''تمہاری خاندانی تاریخ کا آغاز ہوا تھا عزت علی سے۔''

میں نے تصحیح کی۔ ''عزت بیگ سے۔''

''ان کو یہ جاگیر کسی انگریز کی جان بچانے کے انعام میں ملی تھی۔''

''ہاں...... انہوں نے ایک انگریز ڈاکٹر کو رہتاس کے قلعے میں پہنچایا تھا اگر وہ نہ ملتے تو انگریز بھوک پیاس سے دم توڑ دیتا۔ وہ افغانستان سے فرار ہو کے آیا تھا۔ میرے جد امجد نے اسے اپنی بیل گاڑی میں لٹایا اور یہاں پہنچا دیا...... یہاں ایک انگریز جنرل نے روایتی انداز میں کہا کہ جاؤ...... بیل گاڑی میں جہاں تک جا سکتے ہو جاؤ لیکن چکر لگا کے شام تک واپس یہاں آجاؤ...... جتنی زمین کا تم احاطہ کرو گے وہ سب تمہاری...... اب یہ معلوم نہیں کہ انعام فوراً دیا گیا تھا یا بعد میں۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' راجا بولا۔

''فرق یوں پڑا ہو گا کہ پردادا بہت طویل سفر کے بعد یہاں پہنچے تھے۔ ان کے بیل بہت تھکے ہوئے ہوں گے اگر انگریز جنرل نے اسی وقت حکم دیا ہو گا تو بیل کیا دوڑے ہوں گے...... لیکن یہ حکم دوسرے تیسرے دن جاری کیا گیا ہو گا تو تازہ دم بیل خوب بھاگے ہوں گے...... خیر اندازہ ہے کہ اتنے لمبے سفر کے بعد رہتاس کے قلعے میں پہلے تو ان کی خوب آؤ بھگت کی گئی ہو گی بعد میں انگریز ڈاکٹر نے کہا ہو گا کہ اس گاڑی والے کو انعام ملنا چاہیے تو جنرل صاحب نے یہ تجویز قبول کرلی۔ بیل تازہ دم نہ ہوتے تو اتنی زمین کے گرد ایک دن میں چکر کیسے لگاتے۔''

راجا نے کہا۔ ''تیرا خیال درست لگتا ہے مگر زیادہ قابل غور دوسری بات ہے آج دریائے کنہار ست بدھائی کی سرحد سے ایک فرلانگ دور ہے لیکن اس وقت نہیں ہو گا۔''

''یہ فرض کرنے والی بات ہے۔''

راجا نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ حقیقت ہے...... تمام دریا اپنا رخ بدل چکے ہیں...... مغلوں نے جو عمارات دریاؤں کے کنارے بنائی تھیں دریا اب ان سے بہت دور ہیں...... رہتاس کا قلعہ دیکھا ہے تو نے؟''

میں نے کہا۔ ''نہیں۔''

''میں نے دیکھا ہے...... اس کی فصیل میں توپوں کے لیے جو موکھے یا سوراخ رکھے گئے ہیں ان کا رخ دریا کی جانب ہے۔ نیچے گہری کھائی ہے۔ زمین کی ساخت کو دیکھ کر لگتا ہے کہ پہلے دریا عین فصیل کے نیچے تھا۔ حملہ آور پر دریا کے پار گولے برسائے جاتے تھے اور دریا ایک قدرتی رکاوٹ پیدا کرتا تھا۔ دشمن دریا عبور نہ کرنے پاتے...... قلعے کے اندر موجود فوج کی ساری کوشش یہی ہوتی تھی۔ فصیل میں تیراندازوں کے بیٹھنے کی جگہ بھی ہے اور دریا پار کرنے والے اگر توپ کے گولوں سے بچ جاتے ہوں گے تو تیروں کا نشانہ بنتے ہوں گے...... خیر...... یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ دریائے کنہار بھی اب ست بدھائی سے دور چلا گیا ہے...... جب تیرے پردادا۔''

''پردادا کے دادا۔'' میں نے پھر تصحیح کی۔

''چل وہ جو بھی تھے۔ انہوں نے بیل گاڑیوں کو دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ دوڑایا ہو گا۔ دریا نہ ہوتا تو وہ سیدھے جاتے...... جیسے اب ہم پل پر سے گزر کے جاتے ہیں...... مگر وہ دریا نہ پار کر سکے...... کنارے کے ساتھ بیل گاڑی دوڑاتے گئے یہ دریا ان کی جاگیر کی ایک قدرتی حد بن گیا، دریا کے ادھر کا سارا علاقہ ان کا ہو گیا۔''

''یار راجا...... تو نے میری آنکھیں کھول دیں۔ اس کا

مطلب تو یہ ہوا کہ آج بھی دریا کے کنارے تک جتنی زمین ہے وہ میری ہے؟''

''اس میں کیا شک ہے۔''

''یعنی یہ ایک فرلانگ کا علاقہ ...... دریا کے کنارے کی ساری پٹی بھی ست بدھائی میں شامل ہے۔''

راجا نے کہا۔''ہاں ...... اگر اس کا ریکارڈ موجود ہو۔''

''ریکارڈ یقیناً ہوگا ...... مگر پٹواری کے پاس ...... ہم اس سے مل سکتے ہیں ...... اپنا مؤقف بتا سکتے ہیں۔''میں نے کہا۔

''اس ساری زمین کو ہماری ملکیت ثابت کرنے کے دو راستے ہیں ...... ایک یہ کہ ہم حد بندی کریں اور کوئی روکے تو دیوانی مقدمہ دائر کر دیں اِدھر اُدھر نہ ہو ورنہ مقدمے کی نوعیت بدل جائے گی ...... تیرے پوتے یا ان کے بیٹے شاید کیس جیت جائیں۔''

''دوسرا آسان طریقہ ہے براہِ راست پٹواری سے معاملات طے کر کے حد بندی کرانے کا ...... رائٹ۔''

راجا نے سر ہلایا ...... ''رائٹ ...... اور اس کارِ خیر کے عوض پٹواری طلب کرے گا رشوت ...... جو کم سے کم بھی پچاس لاکھ ہوگی۔''

''کیا زمین کی اتنی قیمت ہے؟''

''بات زمین کی نہیں ...... قانونی حد بندی کی ہے ...... جو اب تجھے کرا لینی چاہیے کیونکہ تو ہی اس کا قانونی وارث ہے لیکن اندیشہ یہ ہے کہ رانا اس میں رخنہ اندازی کرے گا۔''

میں نے کہا۔''یہ اس کا کام ہے ...... جیسے بچھو کا کام ہے ڈنک مارنا۔''

ہم پیدل چلتے چلتے بہت دور آ گئے تھے ...... ایک فٹ اونچی دیوار کا اب کہیں نام و نشان بھی نظر نہ آتا تھا ...... راجا کی بات سو فیصد درست تھی دریا تک پھیلی ہوئی زمین کو کسی نے سازش سے یا اپنی بے وقوفی سے بہت پیچھے کر لیا تھا ...... شاید پہلے کوئی دیوار نہیں تھی حویلی تھی اور اس کے بعد دریا ...... دیوار بعد میں بنائی گئی ...... اس طرح دریا کے ساتھ کی زمین سب کی ملکیت ہوگئی ...... جبکہ وہ ست بدھائی میں شامل تھی، اب اس زمین کے لیے مقدمے بازی کا خیال بھی میرے لیے اتنا ہی ناقابلِ قبول تھا جتنا پٹواری کو رشوت دے کر دوبارہ زمین کا قبضہ لینا ...... اور اس کے ساتھ ہی رانا کے ساتھ فساد کی نئی وجہ پیدا کرنا۔

راجا نے اچانک میری توجہ جنگل کی طرف دلائی۔''یہ دیکھ۔''

میں نے اس سمت میں دیکھا جدھر راجا نے اشارہ کیا تھا ...... وہاں کچھ لوگ درخت کاٹنے میں مصروف تھے۔ جنگل آگے زیادہ گھنا تھا۔ پھر بھی اندازہ ہو جاتا تھا کہ درخت کاٹنے والوں کی تعداد چھ سات کے لگ بھگ ہوگی۔ درختوں کے تنوں پر کلہاڑیاں مارنے کی آوازیں ایک تواتر کے ساتھ سنائی دے رہی تھیں پھر ایک درخت بھی آواز کے ساتھ گرا۔

انہیں ہماری آمد کا اندازہ ہمیں اپنے سامنے دیکھ کر ہوا۔ ہم درختوں کی آڑ لیتے ہوئے خاموشی سے اچانک چند قدم کے فاصلے پر نمودار ہوئے تو ان سب پر جیسے سکتہ سا طاری ہو گیا۔ ان کے کلہاڑی چلانے والے ہاتھ رک گئے اور وہ جہاں جس پوز میں کھڑے تھے ...... کھڑے رہ گئے۔ ان کے لب خاموش ہوگئے اور نظریں ہم پر مرتکز ہوگئیں۔

اگر وہ کوئی غلط کام نہ کر رہے ہوتے تو ان کی یہ حالت کیوں ہوتی، وہ ہم پر ایک نگاہ غلط انداز ڈال کے اپنے کام میں مصروف ہو جاتے ...... لیکن وہ انگریزی محاورے کے مطابق رنگے ہاتھوں پکڑے گئے تھے۔

وہ سات ہی تھے۔ ان کی عمریں پچیس سے پینتیس سال کے درمیان ہوں گی ...... سوائے ایک شخص کے جو ان کا نگراں معلوم ہوتا تھا۔ وہ پچاس کے لگ بھگ تھا مگر صحت کے معیار پر سب سے بہتر نظر آتا تھا۔ اس نے لنڈے کی پرانی پتلون اور ڈھیلی ڈھالی رنگین ٹی شرٹ کے ساتھ میلا خاکستری رنگ کا ہیٹ اوڑھ رکھا تھا ...... باقی سب بنیان اور دھوتی میں تھے۔ ان کے سیاہ جسم پسینے سے چمک رہے تھے۔

ایک نظر میں سب کا جائزہ لینے کے بعد میں نے کہا۔ ''کون ہو تم لوگ اور یہ کیا کر رہے ہو؟''

نگراں جو ایک درخت کے تنے پر بیٹھا ہوا تھا پتلون کو یوں جھاڑ کے اٹھا جیسے وہ بالکل بے داغ نئی پتلون کے ساتھ غلطی سے اس تنے پر بیٹھ گیا تھا۔ اس نے قریب آ کے کہا۔ ''تمہیں کیا نظر آ رہا ہے؟''

میں نے اس کے لہجے اور جارحانہ انداز کو دیکھتے ہوئے فیصلہ کیا کہ بلا رعایت جوابی کارروائی کرنا میرے حق میں بہتر ہوگا۔ میں نے پوری قوت کے ساتھ زناٹے سے اس کے منہ پر تھپڑ مارا ...... یہ اس کے لیے اتنا غیر متوقع تھا کہ وہ گھوم کے منہ کے بل گرا اور چند سیکنڈ ساکت پڑا رہا ...... اس کے ماتحت دم بہ خود کھڑے رہے۔

میں نے سکون سے کہا۔''مجھے یہ نظر آیا کہ تم چوری کر رہے ہو۔''

وہ آہستہ آہستہ اٹھا اور پھر غیظ و غضب کی دیوانگی کے ساتھ مجھ پر حملہ آور ہوا ...... اس کے ساتھ ہی گندی گالیوں کا

ایک طوفان اس کے منہ سے برآمد ہوا ...... میں اس ردِ عمل کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ وہ جیسے ہی آگے آیا میں نے گھٹنا اوپر اٹھا کے اس کی ٹانگوں کے درمیان مارا۔ وہ بلبلا کے دہرا ہوا تو میں نے اس کی گردن کو اپنی بغل میں دبوچا اور اسے پورا چکر دے کر پھینک دیا۔

وہ چیخنے لگا'' ...... اوئے ...... دیکھتے کیا ہو تمہاری ٹوٹے گردواں ...... کے ......''

چھ ماتحت جو تیز چمکتے پھلوں والی کلہاڑیوں سے مسلح تھے، ایک ساتھ حرکت میں آئے۔

میں نے راجا سے کہا۔''تو ہٹ جا پیچھے۔''

میرا پہلا شکار وہ بنا جو بہت آگے بڑھ آیا تھا۔ اس نے وار کرنے کے لیے کلہاڑی بلند کی۔ اس بے وقوف نے مجھے بھی درخت فرض کر لیا تھا جو اپنی جگہ کھڑا رہے گا۔ میں جست لگا کے تھوڑا سا دائیں طرف ہوا اور دوسرے لمحے کلہاڑی میرے ہاتھ میں تھی اور وہ میری کک سے الٹ کر پیچھے چلا گیا تھا۔ یہ اس کی بدقسمتی کہ اس کی موت خود اپنے ہی ساتھی کے ہاتھوں لکھی تھی۔ ساتھی نے کلہاڑی مجھ پر وار کرنے کے لیے چلائی تھی مگر اس کا پھل پہلے حملہ آور کی گردن پر اس صفائی سے پڑا کہ سر کو تن سے جدا کر دیا۔ سر لڑھکتا ہوا ایک طرف گیا ...... بغیر سر کا دھڑ دوسری طرف گر گیا۔

اب میں خالی ہاتھ نہیں تھا۔ میرے ہاتھ میں کلہاڑی اور میرے تیور دیکھ کے باقی حملہ آور بریک لگانے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اپنے ایک ساتھی کا سر کھلی آنکھوں سے انہیں گھور رہا تھا اور وہ اس سر کو دیکھ رہے تھے جو چند سیکنڈ پہلے ایک گردن پر تھا۔ اس منظر نے انہیں اتنا دہشت زدہ کر دیا تھا کہ وہ مفلوج ہو گئے۔

میں نے کہا۔''اگر کوئی آگے آیا تو اس کا سر بھی ایسے ہی پڑا نظر آئے گا۔''

نگراں کوشش کر کے کھڑا ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا اس نے پھر ماتحتوں کی ماں بہن کے رشتے اِدھر اُدھر جوڑنے شروع کیے۔''اوے بزدلو ...... بے غیرتو ...... اپنا بندہ مار دیا ...... اور کھڑے ہو نامرادوں کی طرح۔''

اس اشتعال انگیزی میں ایک دھمکی بھی تھی چنانچہ ذہنی طور پر شکست قبول کر لینے والی فوج پھر آگے بڑھنے پر مجبور ہو گئی۔ دو جوشیلے نوجوان بڑھک مار کے آگے آئے۔ ان کا انداز جست لگانے کا تھا۔ میں نے کلہاڑی پھینک کر ماری۔ وہ گرز کی طرح اس کے سینے پر لگی۔ اس نے ہوا میں ہاتھ بلند کر کے ایک چیخ ماری اور فرش پر گر کے لوٹنے لگا۔ دوسرے کو میں نے وار کرنے کی مہلت دی۔ اس کا وار بچا کے میں نے اسے پیچھے سے پکڑا اور اوپر اٹھا کے دور پھینک دیا۔ اس چکر میں وہ اپنی دھوتی سے محروم ہو گیا اور دس فٹ دور ایک درخت کے تنے سے ٹکرا کے گرا تو پھر نہ اٹھا۔

جس حملہ آور کے سینے پر کلہاڑی لگی تھی وہ خوش قسمت تھا کہ پھل اس کے جسم میں نہیں اترا ...... اس کی ایک دو پسلیاں ٹوٹ گئی تھیں چنانچہ بے ہوش تھا۔ تین کلہاڑی والے اب کسی صورت لڑنے کو تیار نہ تھے۔ ان کو حکم دینے والا شکست خوردہ فوج کے جنرل کی طرح غصے مایوسی اور بے بسی کی تصویر بنا کھڑا تھا۔

میں نے حکم دیا۔''چلو سارے اپنی کلہاڑیاں ادھر ڈالو۔''

ان سب نے کٹھ پتلیوں کی طرح تعمیل کی۔ اور پھر مجھے دیکھنے لگے کہ اب کیا کریں۔ میں نے نگراں کو اشارے سے اپنی طرف بلایا۔ وہ آہستہ آہستہ آگے آیا اور مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر ٹھہر گیا۔

''پتلون اتار دو۔''میں نے کہا۔

اس کا منہ کھل گیا۔ اسے شک تھا کہ کانوں نے غلط سنا۔ میں نے یہ شک دور کر دیا۔ میں نے پے در پے اس کے منہ اور پیٹ میں مکے مارے اور پھر اسے اٹھا کے زمین پر دے مارا۔ وہ اٹھنے کے قابل نہیں رہا تھا یا اٹھنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اسے کھینچ کر پیروں پر کھڑا کر دیا۔''کیا کہا تھا میں نے؟ بات سمجھ میں آ گئی یا پھر سمجھاؤں۔''

اس نے آہستہ سے سر ہلایا اور پتلون اتار دی۔ راجا اب میرے ساتھ کھڑا اس کارروائی کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

میں نے کہا۔''منہ دوسری طرف کر کے جھک جا۔''

وہ نہ جانے کیا سمجھا کہ ہاتھ جوڑ کے گڑگڑانے لگا۔ ''جناب میرا قصور معاف کر دیں ...... میں آپ کو نہیں جانتا۔''

میں نے کہا۔''آج جان لو گے ...... میں نواب رفیق احمد شیرازی ہوں ...... اس زمین کا مالک جس کے تم درخت چوری کر رہے تھے۔ چوری کی سزا شاید میں نہ دیتا مگر تم نے مجھے گالیاں دیں اور مجھ پر حملہ کیا ...... اس کی سزا ضرور ملے گی ...... چل جھک۔''

وہ منہ پھیر کے رکوع میں چلا گیا تو میں نے اس کے ماتحتوں کو حکم دیا کہ وہ باری باری آئیں ...... اس پر پیشاب کریں اور پھر اس کے ایک جوتا مار کے پیچھے ہٹ جائیں ...... انہوں نے صاف انکار کر دیا۔

میں نے کہا۔ ''تم کو اندازہ نہیں کہ میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں تم سب کو ننگا کر کے لے جاؤں گا اور پھر جو کچھ میرے ملازم تمہارے ساتھ کریں گے وہ اس سے بھی بدتر ہوگا۔''

خوف اور دہشت نے ان کو میری بات ماننے پر مجبور کر دیا۔ جب یہ تذلیل کا عمل پورا ہو گیا تو وہ سب سر جھکا کے کھڑے ہو گئے۔

''تم رجب علی رانا کے ملازم ہو نا؟'' میں نے کہا۔

انہوں نے اقرار میں ایک ساتھ سر ہلایا۔

''آج میرے ساتھ محافظ نہیں تھے اور میں بھی خالی ہاتھ تھا ورنہ تم میں سے کوئی بچ کے واپس نہ جاتا۔ سب گاڑ دیے جاتے اس جنگل میں کہیں...... اب آئندہ ادھر کا رخ مت کرنا اور بتا دینا رانا کو میرا نام۔ یاد ہے نا...... تو بتا دے۔''

نگراں نے سر ہلایا۔ ''نواب رفیق۔''

میں نے اس کے ایک لات رسید کی۔ ''نواب رفیق احمد شیرازی...... اب دفع ہو جاؤ...... مڑ کے مت دیکھنا...... لیکن اپنے بندے لے جاؤ...... ٹوٹے پھوٹے جیسے بھی ہیں۔''

وہ بڑا عبرت آموز منظر تھا جب ان میں سے ایک نے ہمت کی اور اپنے ایک ساتھی کا سر اٹھایا۔ اس کا دھڑ نگراں کو اٹھانا پڑا کیونکہ اور کوئی اس کی ہمت نہیں کر رہا تھا۔ کچھ دیر میں وہ نظر سے اوجھل ہو گئے۔

جب ہم واپس ہوئے تو دوپہر ڈھل رہی تھی۔ ''اب رانا کیا کرے گا؟'' راجا نے کچھ دیر بعد سوال کیا۔

''وہ کیا کر سکتا ہے۔''

''یہ لوگ واپس جا کے سب بتائیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''اچھا ہے اگر سب بتا دیں۔ رانا انہی کو سزا دے گا ہم سے وہ کوئی بات نہیں کرے گا۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ہم صاف انکار کر دیں گے۔ ہم تو اس وقت ست بدھائی میں بھی نہیں تھے...... چوری کرنے والوں کا آپس میں جھگڑا ہوا ہوگا۔''

راجا کی فکرمندی برقرار رہی۔ ''ہم نے کچھ زیادتی کی۔''

''ہم نے صرف اپنا دفاع کیا۔ حملہ انہوں نے کیا تھا۔ ہاں آخر میں جو ہوا اسے سزا سمجھا جا سکتا ہے۔''

حویلی میں دوپہر کے کھانے پر شہناز اور ریشم کو دیکھ کر راجا حیران ہوا۔ ''آج آدھے دن کی چھٹی۔''

شہناز نے سنجیدگی سے کہا۔ ''آج کچھ لوگوں نے ہمیں جانے ہی نہیں دیا۔''

''کون لوگ؟''

جواب ریشم نے انگلش میں دیا۔ ''آل بیڈ مین سر...... غنڈا اینڈ ویری بدمعاش...... دی لیڈر...... ڈاڑھی والا پیر...... بوگس پیر...... ہی سے...... یو گو بیک...... نو ٹریٹمنٹ...... نو انگلش میڈیسن۔''

میں نے کہا۔ ''اب یہی بات شہناز کو اردو میں کہنے دو تا کہ ہم بھی سمجھ لیں۔''

جو شہناز نے بتایا یہ تھا کہ ست بدھائی سے چار پانچ میل کے فاصلے پر کوئی گورنمنٹ ڈسپنسری تھی۔ بہت پہلے وہاں ڈاکٹر تھا کچھ عرصے لوگوں کو دوا بھی ملی۔ پھر ڈاکٹر غائب ہو گیا...... سرکاری عمارت کا کوئی والی وارث نہ رہا تو ایک فقیر نے اس پر قبضہ کر لیا۔ کسی نے اس پر اعتراض نہ کیا۔ ایک سال میں فقیر نے وہاں اپنا آستانہ بنا لیا۔ باہر سبز رنگ کرا دیا۔ کچھ رنگین جھنڈے لگا دیے۔ نہ جانے کہاں سے اس کے دو مرید آ گئے۔ وہ سبز چغے پہنتے تھے۔ سر منڈاتے تھے اور صوفیانہ کلام گاتے تھے۔ ان کی آواز اچھی تھی۔ لوگ ان کے عقیدت مند بن گئے۔ ہر جمعرات کی رات وہ ڈیرے پر گاتے ناچتے اور دھمال ڈالتے تھے۔ اردگرد کے دیہات سے اچھے خاصے لوگ آ جاتے تھے۔ آمدنی ہو رہی تھی۔ پھر ایک رات وہ فقیر مر گیا جو سب سے پہلے آیا تھا۔ اس کے چیلوں یا مریدوں نے عجیب و غریب کہانی سنائی کہ رات کو مرشد عبادت میں مصروف تھے۔ تہجد کے وقت موت کا فرشتہ آ گیا کہ مجھے حضور کی جان قبض کرنے کا حکم ہوا ہے۔ آپ نے اشارے سے فرمایا کہ توقف کرو...... وہ باادب دور ہو کے بیٹھ گیا۔ مریدوں نے کہا کہ پیر و مرشد عشا سے تہجد کو ملاتے ہیں۔ اتمام حجت کے لیے درمیان میں پانچ منٹ سوتے ہیں...... پھر فجر تک یہی سلسلہ رہتا ہے۔ چنانچہ ملک الموت نے نماز فجر کے تمام ہونے کا انتظار کیا۔ جیسے ہی پیر و مرشد نے دعا ختم کی اور کلمہ پڑھ کے منہ پر ہاتھ پھیرا، اس نے روح قبض کر لی۔

گاؤں کے سادہ لوح لوگوں نے اس پر یقین کر لیا۔ پیر صاحب کا مزار شریف بھی وجود میں آ گیا۔ بعد میں دو مریدوں میں سے ایک نہ جانے کہاں چلا گیا۔ ایک کا بزنس سیٹ ہے...... ادھر ادھر کے کچھ نام نہاد حکیموں، عطائیوں اور مولویوں نے اس کے ساتھ ساز باز کی اور کہا کہ یہ ڈاکٹر ہمارے علاقے میں گمراہی پھیلا رہی ہے اور لوگوں کو ولایتی دوائیں دے رہی ہے جن میں حرام اجزا شامل ہوتے ہیں۔

''تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا؟'' راجا نے پوچھا۔

''پہلے تو مریض سوال کرتے تھے کہ ڈاکٹر صاحب کیا یہ سچ ہے کہ آپ جو دوائیں دیتی ہو وہ ناپاک ہوتی ہیں۔ میں نے کہا کہ دوا صرف دوا ہوتی ہے۔ بیماری دور کرتی ہے۔ انہی جڑی بوٹیوں سے بنائی جاتی ہے جو خدا نے پیدا کی ہیں۔ پھر ایک دن بہت سے مریضوں کی موجودگی میں ایک گاؤں کا مولوی آ گیا۔ ایک بالشت لمبی ڈاڑھی۔ پگڑی اور ٹخنوں سے اونچی شلوار میں۔ آنکھوں میں کاجل اور عطر لگائے۔ اس کے ساتھ دو افراد اور بھی تھے جن کے بارے میں اس نے کہا کہ یہ دوسرے گاؤں کے معززین ہیں۔ میرے پاس اس روز کافی مریض تھے۔ ایک طرف مرد بیٹھے تھے۔ درمیان میں میرے لیے میز لگا دی گئی تھی اور ایک کرسی دوسری طرف عورتوں بچوں کی لائن تھی۔ اس نے آتے ہی تقریر شروع کر دی میرے خلاف کہ تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے۔ رزق، بیماری، موت سب اللہ کی طرف سے ہے۔ پھر تم اپنا ایمان کیوں خراب کرتے ہو۔ آخرت کی فکر کسی کو نہیں۔ دنیاوی زندگی سے اتنا پیار ہے کہ حرام کما رہے ہو۔ گناہ پر گناہ کر رہے ہو...... کیا تمہیں پتا نہیں کہ ولایتی دوائیں انگریز بناتے ہیں اور وہ سؤر کھاتے ہیں شراب پیتے ہیں...... ان کے ناپاک ہاتھوں سے تم پانی بھی پیو تو حرام ہے۔''

''تم نے ٹوکا نہیں اسے۔'' میں نے کہا۔

''ٹوکا تھا مگر اس کے ساتھ آنے والوں نے غرا کے کہا کہ بی بی تم چپ کرو۔ مولانا صاحب غلط نہیں کہہ رہے ہیں۔ اس مولوی نے سب سے پہلے یہ نکتہ اٹھایا تھا کہ انگریز ہمیشہ سے مسلمانوں کے دشمن ہیں اور دین و دنیا میں ان کی رسوائی چاہتے ہیں۔ اسکے ساتھ آنے والوں میں سے ایک پہلے کسی قصبے کا پوسٹ ماسٹر تھا۔ دوسرا کسی اسکول میں دینیات کا ٹیچر۔ وہ باخبر اور اعلیٰ تعلیم یافتہ شمار ہوتے تھے۔ وہ سر ہلا ہلا کر مولوی کی تائید کر رہے تھے۔ بالکل مداری کا بچہ جمورا بنے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک نے سوال کیا کہ مولانا صاحب...... کیا ان دواؤں میں حرام اشیا بھی شامل ہوتی ہیں؟ دوسرے نے کہا کہ بالکل ہوتی ہیں۔ درد کی دوا میں سور کی ہڈیوں کا سرمہ ڈالتے ہیں۔ باریک پیس کر۔ اور کھانسی کی دوا میں شراب شامل کرتے ہیں۔ بس اس کے بعد مجھ سے برداشت نہ ہوا۔ میری زبردست جھڑپ ہوئی۔ میں نے بہت سی دواؤں کے ڈبے ان کے سامنے رکھ دیے اور کہا کہ بتائیے اس میں حرام کیا ہے۔ سب پر لکھا ہے کہ اس میں کون سی دوا کی کتنی مقدار شامل ہے۔ پڑھ کے بتائیے۔ وہ چالاک آدمی تھا کہنے لگا کہ یہ سب ٹھیک ہوگا مگر اس کے علاوہ کیا ڈالا۔ یہ تب وہ ڈبے پر درج نہیں ہے...... لکھتے تو مسلمان یہ دوائیں نالی میں بہا دیتے اس زندگی پر موت کو ترجیح دیتے جس میں ایمان سلامت نہ رہے...... میں نے کہا کہ یہ دوائیں دنیا کے سارے مسلمان استعمال کر رہے ہیں...... وہ بولا کہ اسی لیے تو اُمتِ مسلمہ پر اللہ کا عذاب نازل ہو رہا ہے...... اس کے بعد وہ آ گیا فیملی پلاننگ پر...... عورتوں سے مخاطب ہو گیا کہ وہ سب جہنمی ہیں جو اولاد کو دنیا میں آنے سے روکنے والی گولیاں کھاتی ہیں...... وہ اللہ کی رضا کے خلاف کام کرتی ہیں تو خود بخود اسلام کے دائرے سے خارج ہو جاتی ہیں۔ بس اس کے بعد میں کھڑی ہو گئی۔ میں نے کہا کہ مولوی صاحب یہ جو گھڑی آپ نے ہاتھ پر باندھی ہے یہ شراب پینے اور سور کھانے والے انگریز نے بنائی ہے...... اسے پھینک دیں نالی میں...... اپنی عینک بھی توڑ دیں...... اس کا فریم اور شیشے سب ولایتی ہیں۔ نہ گاڑی میں سفر کریں نہ بس یا ٹرین میں۔ یہ ساری چیزیں انگریز نے بنائی ہیں...... میں نے بولنے نہیں دیا کسی کو...... یوسف ماسٹر کو پکڑا کہ تم نے سرکاری نوکری کی ہے۔ میڈیکل کی سہولت بھی لی ہوگی کیا تم اپنے بیوی بچوں کو شہر کے اسپتال نہیں لے جاتے تھے۔ کبھی ان کو ٹیکہ نہیں لگوایا۔ ریڈیو، ٹی وی، ٹیلی فون استعمال کرتے ہو یا نہیں۔''

''ڈاکٹر صاحبہ نے دونوں کو بھاگنے پر مجبور کر دیا۔'' ریشم بولی۔

''لیکن خرابی تو ہو گئی...... کچھ مریض چلے گئے...... یہ باتیں گاؤں میں پھیلائی گئیں...... میں اپنا کام کرتی رہی اور اکثریت نے میرا ساتھ دیا مگر کچھ لوگ مسلسل میرے خلاف پروپیگنڈا کرنے میں مصروف ہیں۔ آج تو حد ہو گئی۔''

راجا نے کہا۔ ''یار اس کی فکر تم مت کرو۔ ڈبا پیر کا ڈبا تو دو چار دن میں گول ہو جائے گا۔ سرکاری ڈسپنسری کی عمارت کو باپ کی جاگیر سمجھے بیٹھا ہے۔ اسے پولیس خالی کرائے گی۔ اور پیر صاحب کو سب کے سامنے ہتھکڑیاں ڈال کے لے جائے گی۔ میرا خیال ہے کہ تفتیش میں جب چھتر دل ہو گی تو وہ قبول کرے گا کہ پیر و مرشد کو خلد آشیانی بنانے والا وہ خود تھا۔ اس نے پیر صاحب کو قتل کیا اور مزار شریف بنا کے بزنس شروع کر دیا۔ ممکن ہے اپنے پارٹنر یعنی دوسرے مرید کے ساتھ بھی اس کا کوئی جھگڑا ہو...... کاروباری معاملات میں لالچ اور ہوس کا شکار تو سب ہوتے ہیں۔ یہ سارے مکار اور ایمان فروش لوگوں کا ٹولا تھا۔ جو سب سے زیادہ ہوشیار تھا وہ غالب آ گیا۔''

میں نے کہا۔ ''مزہ تو جب ہے کہ اس گورنمنٹ ڈسپنسری

کی عمارت میں ہی شہباز بیٹھے اور مریض آئیں۔"

"ایسا ہی ہوگا دیکھے پتر...... بالکل ہوگا...... تو دیکھتا جا۔"

"لیکن ابھی میں کیا کروں؟" شہباز نے خفگی سے کہا۔

"یار ہم سب عشق کے روگ میں مبتلا ہیں۔ درد دل کا عارضہ بڑا جان لیوا ہوتا ہے...... ہمارا علاج کرو۔"

شہباز نے چڑ کے کہا۔ "نواب صاحب...... آپ کے اسپتال کا منصوبہ ابھی تک ہوا میں ہے۔ میں مزید انتظار نہیں کرسکتی...... کل سے میں کہیں نہیں جاؤں گی...... مریض یہاں آئیں گے۔"

راجا نے اسے غور سے دیکھا۔ "ڈاکٹر صاحبہ...... یہ پریشانی ہے یا خوف؟"

میں نے راجا سے اتفاق کیا۔ "تم ڈر گئی ہو۔"

فریال نے کہا۔ "ڈرنے کی بات تو ہے...... ایسے لوگ مخالفت میں کسی بھی انتہا تک جاسکتے ہیں۔"

شہباز نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "مجھے ایسا لگتا ہے کہ...... یہ سب کسی کی شہ پر ہو رہا ہے۔"

"کس کی شہ پر؟" راجا نے پوچھا۔

"آج جن لوگوں نے میرا راستہ روکا اور مجھے واپس جانے پر مجبور کیا۔ ان میں کچھ چہرے تو دیکھے ہوئے تھے۔ ایک وہی پوسٹ ماسٹر تھا اور دوسرا وہ ٹیچر...... مولوی ایک مونچھوں والے بدمعاش ٹائپ شخص کے ساتھ کھڑا تھا اور اسے منشی صاحب کہہ رہا تھا۔ جب میری بحث دینیات کے جاہل ٹیچر سے ہو رہی تھی تو کچھ گرما گرمی ہوگئی۔ اس پر مونچھوں والے نے غرا کے کہا کہ بی بی ہوش کر...... یہ اپنے رانا صاحب کے بھی استاد ہیں...... میں نے غصے میں کہہ دیا کہ ہاں جیسے استاد ویسے شاگرد...... منشی گرم ہوگیا کہ کیا مطلب ہے اس بات کا آخر...... اس علاقے میں رہنا ہے تو خبردار جو رانا صاحب کے خلاف کوئی بات کی...... مولوی اسے سناتا رہا کہ منشی جی میں سمجھا لوں گا اس ناسمجھ لڑکی کو...... میں نے اسے بھی جھاڑا کہ مولوی صاحب...... مجھے تم کیا سمجھاؤ گے...... میں سب سمجھتی ہوں...... ڈاکٹر ہوں کوئی بے وقوف لڑکی نہیں ہوں...... یہاں جو کھیل ہو رہا ہے یہ کون کرا رہا ہے...... مجھے سب معلوم ہے۔"

"آفرین ہے تم پر شہری حسینہ اینڈ پنڈ دی کڑی۔ بڑے زوردار ڈائیلاگ مارے تم نے۔" راجا بولا۔

ریشم شرمانے اور منکنے لگی۔ "یو کال ی پنڈ دی کڑی۔"

"اوہ نو...... ایسی گستاخی کرسکتے ہیں ہم...... یہ تو میں نے شہباز کو کہا تھا۔ تم ہو شہری حسینہ......" راجا بولا تو سب ہنسنے لگے۔

"آگے بھی سنو۔ یہ ساری بات ہوئی اس ڈسپنسری کے سامنے جو اب پیر صاحب کا مزار مبارک بن گیا ہے۔ اندر سے نکلا وہ جو آج کل خود کو گدی نشین کہتا ہے...... اسی حلیے میں...... سبز چغہ...... ڈاڑھی...... سر منڈا ہوا...... گلے میں کوڑیوں کی مالا اور ہاتھ میں چمٹا۔ اس کے دو گرگے بھی پیچھے پیچھے آئے اور نزدیک آ کے اس نے اپنی بکواس شروع کی۔ ڈراما کرنے لگا کہ جا...... چلی جا...... ابھی قائم ہے...... ورنہ قائم نہیں رہے گا جانے کا...... یہ حکم ہے پیر بادشاہ کا...... میری شامت آئی تھی کہ میں نے کہہ دیا کہ پیر تو فقیر لوگ ہوتے ہیں...... یہ تمہارے پیر کس ملک کے بادشاہ ہیں۔ بس جی اس نے جلال میں چمٹا مارا گاڑی پر...... اتنا بڑا ڈینٹ پڑ گیا...... رنگ بھی اکھڑا۔ وہ دھاڑنے لگا کہ ہم عورت ذات کے منہ نہیں لگتے...... میں نے کہا کہ تمہارا اس گاڑی نے کیا بگاڑا ہے...... بس اس کے بعد ڈرائیور نے ریشم سے کہا اور مجھے ریشم نے کھینچ لیا کہ چلیں...... ورنہ معاملہ بگڑ جائے گا۔"

میں نے سوچ کے کہا۔ "تمہارا خیال ہے کہ پیر کے پیچھے بھی وہی لوگ ہیں۔ انہیں ہم شرپسند کہہ سکتے ہیں۔"

"یس...... آج کل یہ نام پاپولر ہے۔" راجا بولا۔ "کیا ان شرپسندوں کے ساتھ جو منشی تھا وہ رانا صاحب کا منشی تھا؟"

"مجھے یہی شک ہے۔"

ہم سب کھانے کے بعد رابعہ کے کمرے میں جمع تھے۔ اباجی کو کھانے کے بعد کچھ دیر سونے کی عادت تھی۔ رابعہ کی جسمانی حالت تقریباً نارمل ہوچکی تھی لیکن گفتگو کے دوران وہ خاموش ہی رہی تھی۔ اسے آرام کا موقع دینے کے لیے ہم سب باہر نکل آئے۔ راجا نے موبائل فون سے اِدھر اُدھر کچھ لوگوں سے بات کی جو اس معاملے کو قانونی طریقے سے نمٹانے کی کوشش کا پہلا مرحلہ تھا۔

"کل ایک اخبار میں محکمہ صحت کے حوالے سے رپورٹ شائع ہوگی کہ دور دراز کے علاقوں میں سرکاری ڈسپنسریوں کی کیا حالت ہے۔ اتفاق سے رپورٹر کے پاس پہلے کوئی کیس آیا تھا کہ بیسک ہیلتھ یونٹ میں عرصے سے نہ ڈاکٹر ہے نہ دوائیں اور اس جگہ پولیس کی نگرانی میں جوئے کا اڈا چل رہا ہے۔ پھر کسی نے فون کرکے بتایا کہ ایسی ہی کسی جگہ پر گاؤں کے چوہدری نے اپنی بھینسیں باندھ رکھی ہیں۔ یہ تیسرا کیس سب سے زیادہ دلچسپ رہا۔ اب وہ کل یہ خبر لگائے گا کہ محکمہ صحت کی نگرانی میں چلنے والے سرکاری اسپتالوں میں بدانتظامی اور کرپشن کے باعث لوگوں کو علاج کی کوئی سہولت

میسر نہیں۔"

"یہ خبر کل کیوں نہیں لگ سکتی؟" شہباز نے کہا۔

"جانم سمجھا کرو...... کل وہ خود مواد اکٹھا کرے گا۔ ایک کیس کی ساری تفصیل ہے...... دوسرے کیس میں اسے تصویر چاہیے۔ وہ ڈسپنسری میں باندھی جانے والی بھینسوں کی تصویر خود لائے گا۔ اس نے مجھ سے کہا ہے کہ پیر صاحب کے ڈیرے کی تصویریں میں ارسال کردوں تو فیچر مکمل۔ دو دن بعد شائع ہوگا تو ہلچل ضرور ہوگی۔ میں کوشش کروں گا کہ پولیس اسی دن کارروائی کرے۔ رانا کی دخل اندازی سے پہلے ہی پیر صاحب کو گرفتار کرلیا جائے اور ڈسپنسری کی عمارت خالی کرالی جائے۔"

میں نے کہا۔ "یہ سب اتنا آسان نہیں ہوگا۔"

"پولیس کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہوتا۔ میں اپنا سارا زور لگا دوں گا۔ اس کے بغیر شہباز کی مشکلات کم نہیں ہوں گی...... کارروائی ایسی ہو کہ اس علاقے میں ہماری بدمعاشی کی دھاک بیٹھ جائے۔ نواب صاحب کی طاقت کا اندازہ ہو جائے سب کو۔" راجا نے کہا۔

راجا نے اور میں نے ایک طے شدہ منصوبے کے مطابق اپنا حلیہ تبدیل کیا۔ سادہ شلوار قمیص میں ہم پیر کے ڈیرے تک گئے۔ ہمیں لے جانے والی گاڑی خود شہباز نے ڈرائیو کی۔ فریال اس کے ساتھ رہی۔ اس نے جو پلان پیش کیا تھا کہ ہمارے ساتھ وہ بھی برقعہ پوش ہو کے پیر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوں۔ اسے ایک ڈبا پیر کے سامنے حاجت مند کی اداکاری کرنے کا بے حد شوق تھا لیکن شہباز اس پر تیار نہ ہوئی۔

"چلو نا یار...... بڑا مزہ آئے گا...... میں دکھی بن کے روتے ہوئے کہوں گی کہ میرا شوہر دوسری عورت کے چکر میں پڑ گیا۔"

راجا بولا۔ "دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے...... حقیقت بھی یہی ہے مس فریال۔"

میں نے کہا۔ "مس فریال؟ اگر ابھی تک یہ مس ہیں تو پھر شوہر کہاں سے آگیا؟"

"نامرد شوہر کے خلاف بھی کارروائی کی جاسکتی ہے۔ عام طور پر خواتین کے معاملے میں پیر بہت رقیق القلب ہوتے ہیں۔" راجا نے کہا۔

"میں نہیں جاؤں گی۔" شہباز بولی۔ "کوئی گڑبڑ ہوگئی تو سارا کھیل بگڑ جائے گا۔"

"کیا گڑبڑ ہوگی؟" فریال بولی۔ "چلو کچھ نہیں ہوگا۔"

"پیر نے کہا کہ نقاب ہٹاؤ...... پھر...... تمہیں تو نہیں جانتا وہ مگر مجھے فوراً پہچان لے گا۔"

میں نے کہا۔ "شہباز ٹھیک کہہ رہی ہے...... تم لوگ ہمیں یہاں ڈراپ کرکے جاؤ۔"

"ابھی تو وہ جگہ دور ہے۔" شہباز نے کہا۔

"ہم پیدل چلے جائیں گے۔ آگے جانے میں رسک ہے کہ تمہاری گاڑی کسی کی نظر میں نہ آجائے...... اس گاڑی کو تو بچہ بچہ پہچانتا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"یہ تو ہے۔" شہباز نے گاڑی روک دی۔

"ہم انتظار کرتے ہیں یہاں۔" فریال نے کہا۔

"کچھ پتا نہیں ہمیں کتنا وقت لگ جائے۔ تم چلو...... ہم خود آجائیں گے۔" راجا نے کہا۔

گاڑی واپس چلی گئی تو باقی ایک کلومیٹر کا فاصلہ ہم نے آرام سے بیس منٹ میں طے کیا۔ مزار ہمیں دور سے دکھائی دے گیا تھا۔ اس کے اوپر گوٹے کناری والا تکونا سبز پرچم لہرا رہا تھا۔ سرکاری عمارت پر شاید کوئی رنگ نہیں ہوگا۔ قبضہ کرنے والوں نے اینٹوں کو سبز رنگ دیا تھا چھوٹے بڑے

جھنڈے اس کے اوپر ہی نہیں آس پاس کے درختوں پر بھی باندھ دیے گئے تھے۔

اصل عمارت دو کمروں پر مشتمل تھی۔ اس کے سامنے مختصر برآمدہ تھا۔ قبضہ گروپ نے اس میں یہ توسیع کی تھی کہ تقریباً ایک کنال زمین کے گرد قدآدم دیواریں اٹھا کے صحن بنا لیا تھا۔ صحن کے وسط میں مزار مبارک تھا۔ قبر کا چبوترہ دو فٹ اونچا تھا۔ تقریباً پندرہ فٹ لمبا اور چوڑا۔ اس کے درمیان میں عین منبر کے اوپر چار ستون اٹھا کے گنبد بنایا گیا تھا۔ اصلی قبر سبز غلاف کے پیچھے روپوش تھی۔ اس پر کچھ مرجھائے ہوئے پھول بھی پڑے تھے۔ سرہانے کی طرف کڑھائی کے برابر لوہے کا دیا روشن تھا اور سنگِ مرمر کے محرابی کتبے پر پیر صاحب خلد آشیانی کے القاب و آداب خطابات اور نام کے علاوہ بھی بہت کچھ لکھا ہوا تھا۔ جو عام طور پر ایسے ہر مزار پر لکھا جاتا ہے۔

جب ہم اندر داخل ہو رہے تھے تو ایک دیہاتی اپنی گھر والی کے ساتھ باہر جا رہا تھا۔ عورت اپنے آنسو پونچھ رہی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق ان کی عمریں زیادہ نہیں تھیں۔ عورت اگر بتیس کی تھی تو مرد آٹھ دس سال بڑا ہوگا۔ وہ یہاں اولاد کی آس میں آئے تھے۔ اس کا اندازہ مجھے مرد کی بات سن کے ہوا۔ وہ بیوی کو یقین دلا رہا تھا کہ پیر بادشاہ کی دعا سے بچہ ضرور ہوگا۔ عورت نے اس سے سوال کیا تھا کہ تم کو ..... اتنا یقین ہے تو پھر تم دوسری شادی کا کیوں سوچ رہے ہو۔ مرد نے اس کو کیا جواب دیا۔ یہ میں نے نہیں سنا مگر اس بدنصیب عورت کی پوری کہانی میری سمجھ میں آ گئی۔

ہماری آمد کی اطلاع اندر پہنچا دی گئی تھی۔ دو نوجوان جن کی عمریں مشکل سے بیس بائیس سال ہوں گی، برآمدے میں ہمارے منتظر تھے۔ انہوں نے اپنے سر پر چار خانے والے رومال باندھ رکھے تھے۔ اونچی شلواروں اور ہلکی ہلکی ڈاڑھی کے ساتھ وہ مجاور کے خادم اور مزار کے انتظامی امور میں اپرنٹس نظر آتے تھے۔

"آپ پہلے ادھر جاؤ۔" ایک نے خاصی رکھائی سے کہا۔ "نذر چڑھاؤ۔" دوسرے نے کہا۔ "چادر چاہیے تو سو روپے کی ملے گی۔"

میں نے راجا کی طرف دیکھا۔ وہ سو روپے نکال چکا تھا۔ "نذرانہ کتنا ہوگا۔"

"جتنی آپ کو توفیق ہو کم سے کم اکیاون روپے۔" پہلے نے کہا۔ دوسرے نے برآمدے میں رکھی ایک الماری میں سے گوٹا لگی سبز چادر نکال کے راجا کو تھمائی۔ "چادر چڑھا کے تین بار مزار مبارک کا طواف کرو..... پھر دعا مانگو..... جالی کو چومو۔"

میں نے کہا۔ "کیا پیر صاحب سے ملنے کے لیے یہ سب کرنا لازمی ہے۔"

"ہاں۔" پہلے نوجوان نے درشتی سے جواب دیا۔

راجا نے آہستہ سے کہا۔ "سالے نہ جانے کتنی بار اس چادر کے سو سو روپے وصول کر چکے ہوں گے۔ کتنی میلی ہو رہی ہے۔"

"اکیاون روپے فی حاجت مند کے حساب سے بھی اچھی خاصی آمدنی ہو گی۔" میں نے کہا۔ دونوں خدمت گزاروں نے یہی سمجھا ہوگا کہ ہم باتیں نہیں کر رہے ہیں دعا مانگ رہے ہیں۔ جب ہم دوبارہ برآمدے میں پہنچے تو انہوں نے ہمیں انتظار کرنے کے لیے کہا۔ پیر صاحب نے شاہِ جنات کو طلب کیا تھا۔ وہ حاضری میں تھے۔ یہ سب جاہل اور سادہ لوح یا بے وقوف لوگوں کو متاثر کرتا تھا اور پیر سائیں کی دھاک بیٹھ جاتی تھی کہ جنات ان کے مطیع ہیں اور خود شاہ جنات طلب کیے جانے پر ان کی خدمت میں حاضر ہو جاتے تو پھر کسی جن کی کیا مجال جو کسی کو تنگ کرے۔ جن اتارنا پیروں کا سب سے پسندیدہ شغل ہوتا ہے کیونکہ جن آتے ہیں صرف جوان لڑکیوں اور عورتوں پر۔ عام طور پر یہ نفسیاتی پریشانی یا جنسی ناآسودگی کا نتیجہ ہوتا ہے کہ نروس بریک ڈاؤن ایک ہسٹریا کا دورہ بن جاتا ہے۔ ظاہر ہے اس کا علاج کوئی بھی عیاش پیر خلوت میں آسانی سے کر لیتا ہے۔

راجا نے بڑی ہوشیاری سے کیمرا استعمال کیا تھا۔ اس نے دور سے مزار کو فوکس کیا تھا اور ہر زاویے سے اس کی تصویر اتاری تھی۔ میں اس دیدہ دلیری پر حیران تھا کہ سرکاری عمارت عرصہ دراز سے ناجائز تصرف میں تھی اور دیگر تمام سرکاری اہلکاروں نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ یہ کسی زمیندار یا نمبردار جیسے بااثر شخص کی سرپرستی کے بغیر ممکن نہ تھا ورنہ اور کوئی کسی کی زمین کے ایک انچ حصے پر قبضہ نہیں کر سکتا تھا۔

بالآخر ایک خادم اندر گیا اور ہمیں اذنِ باریابی ملا۔ اندر خانقاہوں کا روایتی ماحول تھا۔ اگربتی لوبان اور دھونی کے لیے جلائی جانے والی چیزوں کی تیز خوشبو تھی جو ایک دم اعصاب پر حملہ آور ہوتی تھی۔ میرا دم گھٹنے لگا مگر میں نے اسے برداشت کیا۔ پیر ایک ڈیڑھ فٹ اونچے لمبے چوڑے تخت پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ تخت پر اور فرش کے باقی حصے پر دبیز قالین تھا۔ سبز دیواروں پر تقدس کا ماحول پیدا کرنے کے لیے کمے مدینے کے مقامات مقدسہ کی فریم کی ہوئی تصاویر لگا دی گئی تھیں۔

پیر چالیس سال کا ہٹا کٹا جوان آدمی تھا۔ اس کو اچھی آمدنی ہو رہی تھی اور عیاشی کے سارے مواقع میسر تھے۔ بے فکری تھی اور خوراک میں گاؤں سے خالص گھی دودھ دہی کے علاوہ تورے پلاؤ اور حلوے آتے تھے۔ وہ صحت مند کیسے نہ ہوتا۔

وہ ہمیں دیکھتے ہی کھٹک گیا۔ ہم کسی گاؤں کے باسی نہیں لگتے تھے۔ ہمارے لباس صاف ستھرے اور چہرے فراغت ظاہر کرتے تھے۔ ہم مہذب اور تعلیم یافتہ بھی نظر آتے تھے۔ تاہم اس نے اپنا ڈراما "حق اللہ" کے نعرے سے شروع کیا اور جب ہم اس کے سامنے مؤدب بیٹھ گئے تو اس نے پھر آنکھیں کھول کے کہا۔ "تو کیا چاہتا ہے..... ہم جانتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "ہم بھی بہت کچھ جانتے ہیں بابا۔"

وہ چونکا اور ہمیں شک بھری نظر سے گھورنے لگا۔ "کون ہو تم؟"

میں نے اپنا ریوالور نکال کے سامنے رکھ لیا۔ راجا نے میری تقلید کی۔ پیر کا رنگ فق ہو گیا۔ "ہم خفیہ پولیس کے آدمی ہیں۔" راجا نے کہا۔

"خفیہ پولیس؟" اس نے غور سے ہماری صورتوں کو دیکھا۔

"ہاں..... لیکن ڈرنے کی کوئی بات نہیں..... اگر تم ہمارے ساتھ تعاون کرو گے تو کچھ نہیں ہوگا۔ تمہارا یہ دھندا چلتا رہے گا۔" میں نے کہا۔

"کس..... کس قسم کا تعاون....." وہ بڑی مشکل سے بولا۔

"معلومات ہمارے پاس پوری ہیں لیکن ہم تمہاری زبان سے سچ سننا چاہتے ہیں۔" راجا نے کہا اور ریوالور اٹھا کے پیر کا نشانہ لیا۔

وہ ہکلانے لگا۔ "یہ..... یہ کیا کر رہے ہو تم؟"

راجا نے ریوالور کو پھر سامنے رکھ لیا۔ "جھوٹ مت بولنا ورنہ تمہاری جگہ ہم اپنا بندہ بٹھا دیں گے..... تمہارا مزار شریف اسی احاطے میں بن جائے گا جگہ بہت ہے۔"

میں نے کہا۔ "باہر کس کو گاڑ رکھا ہے تم نے؟"

"وہ..... پیر سمندر شاہ۔"

"اس کا اصل نام کیا تھا..... کون تھا وہ۔" راجا نے کہا۔

میں نے کہا۔ "پہلے وہ اکیلا یہاں آیا تھا۔ کچھ عرصے بعد تمہارے ساتھ ایک اور بندہ آیا۔ تم گاؤں گاؤں چمٹا بجا کے گاتے پھرتے تھے۔"

وہ بولا۔ "پہلے آنے والا ہمارا استاد تھا۔ ولایت خان..... میرا اور رحیم بخش کا..... میرا نام فقیر محمد ہے..... ہماری منڈلی تھی۔"

"بولتے جاؤ..... لیکن اس بات کا خیال رکھنا کہ ہم نہ تمہارے مرید ہیں اور نہ عقیدت مند..... ہمیں سب معلوم ہے۔" راجا نے کہا۔

میں نے کہا۔ "ہماری رپورٹ پر تم اندر ہو جاؤ گے۔ رانا صاحب بھی تمہیں بچا نہیں سکیں گے۔"

راجا بولا۔ "پھانسی چڑھو گے۔"

"پھانسی۔" آواز اس کے حلق میں پھنس گئی۔ "مگر میں نے تو ایسا کچھ نہیں کیا۔ استاد اور ہم سرکس میں گاتے تھے۔ گاؤں گاؤں ڈرامے کرتے تھے۔"

راجا بولا۔ "تم نے اپنے استاد ولایت خان کو مار کے یہاں گاڑا اور اس کے مزار پر اپنی پیری مریدی کا دھندا چلایا۔ تمہارا پارٹنر تھا رحیم بخش..... بعد میں تم نے اسے بھی مار دیا..... اگر تفتیش ہوگی تو سب سامنے آ جائے گا۔"

اس کی حالت غیر ہو گئی۔ "یہ جھوٹ ہے۔"

میں نے کہا۔ "سچ ایک رات میں پتا چل جائے گا..... تھانے میں ایک رات الٹا لٹکایا جائے تو بندہ سیدھا ہو جاتا ہے۔"

راجا بولا۔ "ابھی کچھ نہیں بگڑا..... آمدنی میں سے آدھا ہمیں دینے کی بات کرو۔"

وہ چالاک آدمی تھا۔ معلوم نہیں کیوں اسے ہماری بات پر شک ہو گیا کہ اچانک اس کے رویے میں تبدیلی آ گئی۔ "کیا واقعی تم خفیہ پولیس والے ہو؟"

راجا نے ریوالور اٹھا لیا۔ "کیا مطلب ہے اس فضول بات کا؟ ہم جھوٹ بول رہے ہیں..... کون ہیں ہم۔"

تم ڈاکو ہو..... لوٹنا چاہتے ہو مجھے۔" وہ نروس ہو گیا۔

راجا نے میری طرف دیکھا۔ "یہ تو بہت چالاک ہے۔ اس کا کچھ کرنا پڑے گا۔"

"کیا کریں؟ مار دیں سب کو۔" میں نے کہا۔

اس کی گھگھی بندھ گئی۔ "خدا کے لیے مجھے مت مارو..... تمہارا پیغام مل گیا تھا مجھے..... تم کو شاہی بادشاہ نے

بھیجا ہے۔"

میں نے ہنسی کو ضبط کیا۔"اچھا ہے تم جلد سمجھ گئے۔"

راجا بولا۔"کیا سوچا ہے پھر تم نے۔"

وہ ہاتھ جوڑ کے بولا۔"کسی نے شامی بادشاہ کو غلط بتایا ہے...... میری اتنی آمدنی نہیں ہے کہ میں دس لاکھ کا مطالبہ پورا کر سکوں۔"

میں نے ڈانٹ کے کہا۔"جھوٹ بکنے کی ضرورت نہیں۔"

وہ قسم پر قسم کھانے لگا۔"خدا کی قسم...... اس کے رسول کی قسم...... قرآن پاک کی قسم...... یہاں سب غریب دیہاتی ہیں۔ ان کے لیے سو پچاس دینا بھی مشکل ہوتا ہے۔ کبھی کوئی ماں کے یا گھر والی کے ہاتھ سے چوڑی یا کانوں کی بالی اتروا کے نذر کر دیتا ہے ورنہ ان کے پاس کچھ نہیں۔ یہی سو روپے کی چادر خرید کے چڑھا دیں تو سمجھتے ہیں (نعوذ باللہ) خدا کو رشوت دے دی۔ اب کام ہو جائے گا ورنہ وہی جمعرات کو سوا روپیہ...... کسی گھر سے دیسی گھی کا حلوا...... کسی سے انڈے مرغی دودھ...... یہی سب چلتا ہے یہاں۔"

میں نے کہا۔"خرچا تو بہت کیا ہے تم نے مزار بنانے پر۔"

"وہ تو دکان چلانے کے لیے ضروری تھا۔"

راجا نے یہ ظاہر کیا جیسے وہ پیر کی بات سے متاثر ہونے لگا ہے۔"اچھا میں دیکھ لوں۔ اگر میرا اطمینان ہو گیا تو میں شامی بادشاہ کو بتا دوں گا کہ کسی نے غلط اطلاع دی تھی۔ اس کے پاس اتنا مال نہیں ہے۔"

"ہاں ہاں...... دیکھ لو...... اپنا اطمینان کر لو۔" وہ جلدی سے بولا۔

راجا اٹھ کر کھڑا ہوا۔"زمین میں کوئی تجوری دفن ہے تو ابھی بتا دو۔"

وہ بولا۔"کیسی باتیں کرتے ہو۔ تجوری نکل آئے تو مجھے گاڑ دینا وہاں۔"

میں نے کہا۔"ظاہر ہے اس کے بعد یہی ہوگا۔"

راجا نے اطمینان سے گھوم پھر کے اندر کی ہر زاویے سے تصویر اتاری اور لوٹ آیا۔ اندر زیادہ روشنی نہیں تھی مگر راجا کے پاس وہ کیمرا تھا جو اندھیرے میں بھی کام کرتا تھا۔ اس کا انفرا ریڈ آئی ویژن رات کی تاریکی میں بھی اسی طرح دیکھتا تھا جیسے عام کیمرے دن کے اجالے یا فلیش لائٹ میں دیکھتے ہیں۔

میرا خیال ہے اس جھوٹے پیر کی ہر قسم جھوٹی تھی۔ اگر ہم چاہتے تو دو چار لاکھ اس سے ضرور نکلوا سکتے تھے۔ معلوم نہیں اسے کس ڈاکو کا کیا پیغام ملا تھا لیکن اس سارے علاقے میں شامی بادشاہ کے نام کا سکہ چلتا تھا اور جب خود اس نے شامی بادشاہ کے پیغام کا ذکر کیا تو ہمارا مسئلہ آسان ہو گیا لیکن ہم سے ایک غلطی بہرحال ہو گئی...... ہم نے اس کی آمدنی میں سے نصف طلب کیا تھا جبکہ شامی بادشاہ نے اسے دس لاکھ کی ادائیگی کا نوٹس بھیجا تھا۔ ظاہر ہے شامی بادشاہ کی انفارمیشن غلط نہیں ہو سکتی تھی۔ پیر کی آمدنی بہت زیادہ تھی۔

باہر آ کے ہم نے دوسری غلطی کی۔ ہم نے فرض کر لیا کہ وہ پیر ابھی تک دہشت زدہ بیٹھا ہوگا اور باہر آنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ ہم نے احاطے سے باہر نکلتے ہی ہاتھ ملایا اور ہنسنا شروع کیا اور مڑ کے دیکھنے کی زحمت بھی نہیں کی۔

راجا نے کہا۔"مارا گیا سالا۔"

"تو نے اندر سے بھی تصویریں اتار لی ہیں۔ اب انکار کیسے کرے گا۔"

راجا کے بولنے سے پہلے ہی پیچھے سے ایک فائر ہوا...... پھر دوسرا۔ مجھے یوں لگا جیسے گولی میرے کان کو چھوتی ہوئی گزر گئی ہے اگر کھلی جگہ ہوتی تو میں بھی غوطہ مار کے منہ کے بل گر جاتا اور خود کو بچاتا مگر وہاں گھنے جنگل میں درختوں کے تنے ایک قدرتی پناہ فراہم کرتے تھے۔ ایک ساتھ راجا اور میں درختوں کے پیچھے گئے اور ایک ساتھ ہی ہم نے ریوالور نکال کے جوابی فائر کیے۔

احاطے کی دیوار کے اوپر سے ایک سر نکلا اور اس کے ساتھ ہی ہماری سمت میں تیسرا فائر ہوا۔ میں نے اس کا جواب دیا اور دوڑ کر چند قدم پیچھے دوسرے درخت کی آڑ میں چلا گیا۔ اس پچویشن میں پسپائی ہی سب سے بہتر حکمتِ عملی تھی۔ ہم پر فائرنگ کرنے والے قلعہ بند تھے اور ہم ان کے سامنے اوپن ٹارگٹ تھے۔

مخالف سمت سے چند فائر ہوئے لیکن کسی نے باہر آنے کی ہمت نہیں کی۔ ان کا مقصد محض ہمیں یہ احساس دلانا تھا کہ وہ مقابلے کی طاقت بھی رکھتے ہیں اور مسلح ہیں۔ جب ہم دفاعی انداز میں پیچھے ہٹتے ہوئے دور نکل آئے تو خطرے کی بات نہ رہی۔

راجا نے پہلے اپنا ریوالور جیب میں ڈالا۔"یار یہ تو بدمعاشی پر آمادہ ہیں۔"

میں نے کہا۔"وہ بدمعاش ہی ہیں۔ پیری مریدی بھی

بدمعاشی کا ہی سلسلہ ہے...... منشیات اور اسلحہ اچھے جعلی پیروں کا سائیڈ بزنس ہوتا ہے۔"

"انہیں یقیناً ہم پر شک ہو گیا۔"

"ہاں...... ہماری کچھ باتیں غلط ہونے سے پیر صاحب کھٹک گئے۔" میں نے کہا۔

راجا بولا۔"اللہ نے بچایا آج ورنہ پنگا لینے کی اچھی سزا ملتی۔"

"پڑے ہوتے کہیں...... کسی کو پتا بھی نہ چلتا کہ کیسے مارے گئے...... لیکن اب اس کا ذکر بھی کسی سے کرنے کی ضرورت نہیں۔"

راجا نے مجھ سے اتفاق کیا۔"ایک دو روز میں ان کا کھیل بھی ختم ہو جائے گا۔"

میں نے کہا۔"شہباز نے بتایا تھا کہ ان لوگوں کو رانا کی حمایت بھی حاصل ہے۔ وہ لوگ زیادہ دشمنی پر اتر آئیں گے۔"

"یار دشمنی میں کم کیا اور زیادہ کیا۔"

"اب خبیث نے یہ تو خود ہی اعتراف کر لیا تھا کہ اسے شامی بادشاہ کا پیغام ملا تھا۔ کیوں نہ ہم بھی اسی سے مدد لیں۔"

راجا سوچ میں پڑ گیا۔"میرا خیال ہے پہلے قانونی کارروائی ہو...... مزار کا ڈراما ختم ہو جائے تو باقی لوگوں کو شامی کی صرف ایک دھمکی کافی ہوگی۔ ظاہر ہے جب اخبار میں فیچر شائع ہوگا تو یہ بات چھپی نہیں رہے گی کہ یہ سب کس کا کیا دھرا ہے۔ تیرے ساتھ مجھے بھی شناخت کر لیا جائے گا کہ وہ دونوں پراسرار بندے ہم ہی تھے جنہوں نے پہلے خود کو خفیہ پولیس کا اہلکار ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی اور پھر ڈاکوؤں کا نمائندہ بننے کی۔"

"ناکام اور احمقانہ کوشش۔" میں نے کہا۔"لیکن تیری تجویز معقول ہے شامی بادشاہ کو پیغام بھجوایا جائے...... اس سے براہ راست رابطہ تو ممکن نہیں ہے...... معلوم نہیں وہ کہاں ہوگا...... کب اسے پیغام ملے گا۔"

فریال اور شہباز کو ہم نے ان کی مرضی کے خلاف واپس جانے پر مجبور کیا تھا۔ ان کے نزدیک یہ ایک بے ضرر اور بے خطر مشن تھا۔ راجا اپنے کیمرے سے چند تصویریں بنائے گا اور ہم لوٹ آئیں گے۔ انہیں پریشانی یا تشویش نہیں تھی مگر وہ ہماری واپسی کے انتظار میں ضرور تھیں...... واپسی میں پیدل آنے میں وقت زیادہ لگا تھا جو فاصلہ گاڑی میں بیس منٹ کا تھا وہ ایک گھنٹے میں طے ہوا۔

ہم نے ایک آسان جھوٹ بولا۔"وہاں کیا ہوتا...... ہم نے سو روپے کی چادر چڑھائی۔ اکیاون روپے نذرانے والی صندوقچی میں ڈالے اور خاموشی سے تصویریں بنا کے لوٹ آئے۔ اس بیان میں شک و شبہ کی گنجائش بھی نہیں تھی۔

ہم باغ میں شام کی چائے پی رہے تھے اور مسئلہ تھا شہباز کی میڈیکل سروس کا...... راجا کی اور میری رائے اس معاملے میں مختلف تھی۔ خواتین بھی اپنی اپنی رائے رکھتی تھیں چنانچہ گفتگو نے بحث کی صورت اختیار کر لی تھی۔

میں نے کہا۔"میرے خیال میں گورنمنٹ کی تعمیر کردہ ڈسپنسری کی عمارت سب سے موزوں ہے۔"

"کس لحاظ سے...... اس میں صرف دو کمرے ہیں۔"

راجا نے بولا۔

میں نے کہا۔"مریضوں کو دیکھنے کے لیے ڈاکٹر کو صرف

WWW.PAKSOCIETY.COM

ایک کمرا ہی کافی ہوتا ہے۔ دوسرے میں دواؤں کا اسٹاک رکھا جا سکتا ہے۔''

''یس سر...... آئی سٹ ان ون روم...... ڈاکٹر ان سیکنڈ روم۔'' ریشم نے انگریزی بگھارنی شروع کی۔ ''آل کم ٹومی...... آئی رائٹ نیم ایڈریس...... پیشنٹ گو باری باری۔''

''باہر ایک تختی پر لکھا ہو گا ڈاکٹر شہناز...... دوسری پرسس ریشم اکبر خان اسپیشل اسسٹنٹ نو آر ایم پی...... پی ایف۔''

فریال نے کہا۔ ''لوگ کتنے امپریس ہوں گے۔''

''باقی سب تو ٹھیک ہے مگر یہ پی ایف کیا ہے۔''

''پرائمری فیل۔'' فریال نے کہا۔

ریشم کا مسکراتا چہرہ بجھ گیا۔ ''آئی ڈو میٹرک ان ون ایر انشا اللہ...... آئی رائٹ...... ایم پی...... میٹرک پاس۔''

میں نے کہا۔ ''اصل بات یہ ہے کہ وہ جگہ مرکزی ہے اردگرد کے علاقے سے لوگوں کا پہنچنا آسان ہو گا۔''

''جی نہیں...... اصل بات یہ ہے کہ وہ سرکاری جگہ ہے کسی کے باپ کی جاگیر نہیں ہے کہ کوئی بھی قبضہ کر کے بیٹھ جائے۔ پہلے ایک پیر گھس گیا تھا اب ڈاکٹر گھس جائے۔'' راجا بولا۔

''ہم کہہ سکتے ہیں کہ شہناز کی پوسٹنگ ہوئی ہے۔''

''ہاں مگر کتنے دن چلے گا یہ جھوٹ...... اور جھوٹ کھلے گا تو کیا عزت رہ جائے گی ڈاکٹر صاحب کی۔''

''مجھے تو ویسے بھی ڈر لگتا ہے وہاں بیٹھ کے مریض دیکھنا مشکل ہو گا۔ جو آج مخالفت کر رہے ہیں وہ سب آ جائیں گے اکٹھے ہو کر۔'' شہناز بولی۔

فریال نے کہا۔ ''ایسے ڈرتی رہو گی تو کام نہیں چلے گا۔ لوگ پہلے ہر اچھے کام کی مخالفت کرتے ہیں لیکن بعد میں سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔''

راجا بولا۔ ''میرے نزدیک ایک گشتی شفاخانہ سب سے بہتر ہے۔ یہاں مریضوں کو آمدورفت کے مسائل ہیں۔ بیماروں کو ڈاکٹر کے پاس لانا سب سے مشکل کام ہے۔''

فریال نے کہا۔ ''ہم ایک ایمبولینس لے سکتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''رائٹ...... اس کا فائدہ یہ ہو گا کہ مقررہ وقت پر سب ایک جگہ آ جائیں گے۔ شہناز کا گاؤں گاؤں جانے میں کتنا وقت ضائع ہوتا ہے...... اور خواری کتنی ہے۔''

راجا بولا۔ ''لیکن مریض کے لیے کتنی سہولت ہے۔''

لیلیٰ بھابی نے کہا۔ ''سب اپنی اپنی بول چکے۔ اب ذرا شہناز سے بھی پوچھ لو...... وہ کیا چاہتی ہے۔''

شہناز نے شکر گزاری سے لیلیٰ کو دیکھا۔ ''میری [illegible] تو یہ ہے کہ لوگوں کو علاج کی سہولت بھی ملے اور آنے [illegible] کی پرابلم بھی نہ ہو۔ اس کے ساتھ ہی وہ جگہ میرے لیے محفوظ ہو۔ کوئی دخل اندازی نہ کرے۔ اس سرکاری ڈ[illegible] پر قبضہ تو کیا جا سکتا ہے لیکن کیا دشمن وہاں مجھے کام کر[illegible] گے؟ دشمنوں میں وہ بھی شامل ہو جائیں گے جن کو ہما[illegible] سے نکلنا پڑے گا۔''

میں نے کہا۔ ''ان کی تم فکر مت کرو۔''

''چلو فرض کیا میری حفاظت کے لیے سیکیور[illegible] مقرر ہو گئے۔ آخر وہ کتنے لوگ ہوں گے۔ ایک دو [illegible] سے زیادہ چار...... ہم پوری فوج تو نہیں رکھ سکتے۔ و[illegible] حفاظت کریں گے۔ خود ان کی حفاظت کون کرے گا؟''

''اللہ سب کا محافظ ہے۔'' راجا بولا۔

شہناز نے اسے گھور کے دیکھا۔ ''دوسری بات [illegible] ڈسپنسری میں کلینک کے کھلنے بند کرنے کے اوقات ہوں [illegible] صبح نو سے ایک...... شام چار سے سات...... اس وقت [illegible] آ سکتا ہے آ جائے ورنہ اگلے دن تک بیمار پڑا رہے۔''

''پھر تم پھرتی رہو دواخانہ لیے۔ جاؤ ہر جگہ بروقت [illegible] خود۔'' میں نے کہا۔

''چنانچہ تیسری صورت سب سے بہتر ہے۔'' شہ[illegible] اپنی بات جاری رکھی۔

''وہ کیا ہے؟'' لیلیٰ نے کہا۔

''میں یہاں کلینک بناؤں جہاں میں ہر وقت [illegible] ہوں۔ کوئی کسی بھی ایمرجنسی میں جب چاہے آ جائے [illegible] رہی بات آنے جانے کے مسائل کی تو ایمبولینس سروس [illegible] بہترین حل ہے۔''

''جو پبلک ٹرانسپورٹ کی طرح چوبیس گھنٹے دوڑ[illegible] گی۔'' راجا نے غیر سنجیدگی سے کہا۔ ''گاؤں گاؤں پھر[illegible] دن رات۔''

''یہ میں نے کب کہا۔ میں صرف ایمرجنسی کا [illegible] کر رہی تھی۔'' شہناز خفگی سے بولی۔

''ایک دیہاتی کے لیے یہ بھی ایمرجنسی ہے [illegible] روئے چلا جا رہا ہے اور چپ ہونے کا نام نہیں لیتا...... گھٹنے سے دیوار کو گھور رہا ہے۔''

''یہ ہم لوگوں کو سمجھا سکتے ہیں کہ ایمرجنسی کیا [illegible]

آہستہ آہستہ لوگ سمجھ جائیں گے۔ ایمبولینس کے لیے وہ فون کریں گے۔ اس وقت مریض کی حالت پوچھ کر فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''شہناز ٹھیک کہتی ہے۔ فیصلہ ہو گیا۔''

''ایک بات اور۔'' شہناز نے کہا۔ ''ہم رفتہ رفتہ اپنے کلینک کو توسیع دیں گے۔ پہلے یہاں صرف ڈسپنسری ہو گی۔ مریض آئیں گے دوا لے کر چلے جائیں گے۔ پھر ہم یہاں میٹرنٹی ہوم بنائیں گے۔''

''پھر جنرل اسپتال جہاں آپریشن بھی ہوں گے اور میو اسپتال جیسی ہر سہولت مفت فراہم ہو گی۔'' راجا طنز سے بولا۔

''نہیں...... ابھی ہمارے اتنے وسائل نہیں۔ جن کو داخل کرنا ہو گا انہیں ہم ایمبولینس میں لاہور یا جہلم بھیج دیں گے۔''

شہناز کے دلائل نے تقریباً سب کو قائل کر لیا تھا اور بات تقریباً ختم ہو گئی تھی کہ گیٹ کی طرف سے سنتری بھاگتا ہوا آیا۔

قریب آ کے اس نے سلیوٹ جھاڑا۔ ''سر پولیس۔''

میں نے کہا۔ ''آرام سے بات کرو...... پولیس کیا؟''

''پولیس کے اعلیٰ افسران جیپ میں آئے ہیں سر...... مجھ پر خفا ہیں کہ ان کو روکا...... میں نے کہا کہ آرڈر ہے نواب صاحب کا۔''

راجا اور میں ایک ساتھ اٹھے۔ جیپ میں آنے والا ایک نسبتاً نوجوان اے ایس پی تھا۔ اس نے دروازے پر رک جانے کا اتنا برا نہیں منایا تھا جتنا اس کے ساتھ آنے والے تھانیدار نے جو سمجھتا تھا کہ اس علاقے میں کوئی اس کا راستہ روکنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ وہ جس گھر میں جب چاہے چادر اور چار دیواری کے تقدس کو پامال کرتا ہوا اور سارے قواعد و ضوابط کو اپنے جوتوں تلے روندتا ہوا داخل ہو سکتا ہے۔ ان کے ساتھ حفاظتی عملے کے طور پر دو گن مین آئے تھے جو پیچھے بیٹھے تھے۔ ڈرائیونگ خود اے ایس پی کر رہا تھا۔

اس نے نیچے اتر کے مجھ سے ہاتھ ملایا اور انگریزی میں بولا۔ ''میں جہانگیر مرزا ہوں۔''

میں نے اس سے مصافحہ کیا۔ ''میں رفیق احمد شیرازی۔''

''مجھے ایک قانونی مسئلے پر آپ سے کچھ بات کرنی تھی۔ اس لیے زحمت دی۔'' اس نے بڑی شائستگی سے کہا جس کا تھانیدار نے خاصا برا مانا۔ اس کی نظر میں شکایت تھی کہ حاکم افسرانِ بالا اگر اپنی محکوم رعایا کے ساتھ ایسی عاجزی اور انکساری برتیں گے تو پولیس کا رعب اور دبدبہ تو خاک میں مل جائے گا۔

اے ایس پی ملازمت کی پہلی سیڑھی پر تھا اور پولیس سروس سے اپنے کیریئر کا آغاز کر رہا تھا۔ اس کے ذہن سے ابھی تک کالج یونیورسٹی کی تعلیم سے حاصل ہونے والے شرافت اور انسانیت کے اصول اور اخلاق و تہذیب کے درس فراموش نہیں ہوئے تھے۔ تاہم ایس پی یا آئی جی کے عہدے تک جاتے جاتے اس کے رویے اور اطوار میں فرعونیت آ جانا ایک طے شدہ بات تھی۔

میں انہیں اندر لے آیا۔ ڈرائنگ روم تک صرف تھانیدار کی رسائی ہوئی۔ نچلے درجے کے ماتحت یہ سوچ ہی نہیں سکتے تھے کہ افسرانِ بالا و اعلیٰ کے ساتھ کسی نواب کی حویلی کے ڈرائنگ روم میں تشریف فرما ہوں۔

میں نے کہا۔ ''آپ اس علاقے میں نئے ہیں۔''

''جی...... پولیس سروس میں سلیکشن کے بعد یہ میری پہلی پوسٹنگ ہے...... ایس ایچ او صاحب نے مجھے آپ کے بارے میں جو بریفنگ دی وہ مجھے خاصی دلچسپ لگی۔ ہارورڈ سے بزنس ایڈمنسٹریشن میں ڈگری اور لندن میں ایک سینئر ایگزیکٹو پوزیشن پر کام کرنے کے بعد آپ کا یہاں آنا بڑی...... عجیب سی بات ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ہاں...... اب اسے عجیب سمجھا جاتا ہے کہ کوئی امریکہ یورپ کی سکونت چھوڑ کے وطن لوٹ آئے۔ پاکستان جیسے پسماندہ ملک میں۔''

وہ مسکرایا۔ ''اس سے بھی زیادہ دلچسپ مجھے آپ کا ترقیاتی پروگرام لگا۔ اگر سب لوگ آپ کی طرح سوچنے لگیں تو ملک کی کایا کلپ ہو جائے۔''

تھانیدار نے بے چینی سے پہلو بدلا اور ایک فائل سینٹر ٹیبل پر رکھ دی جو اب تک اس کی بغل میں تھی۔ مقصد یاد دہانی کرانا تھا کہ ہم یہاں ایک قانونی مسئلے پر بات کرنے آئے ہیں۔

اے ایس پی نے فائل پر نظر ڈالی۔ ''نواب صاحب...... میرے آنے کا ایک مقصد تعارف حاصل کرنا تھا۔ لیکن ایک قانونی مسئلہ بھی تھا۔''

میں نے کہا۔ ''فرمایئے میں اس سلسلے میں کیا تعاون کروں؟''

اس نے کہا۔ ''آج دن میں ... تقریباً دوپہر کے وقت۔''

تھانیدار نے فائل اٹھا کے صفحہ پلٹا۔ ''رپورٹ کے مطابق یہ واقعہ گیارہ بج کر چوالیس منٹ پر پیش آیا۔''

اے ایس پی نے ناگواری سے تھانیدار کی طرف دیکھا۔ ''کچھ لوگ درخت کاٹ رہے تھے۔ رپورٹ میں ان کی تعداد چھ بتائی گئی ہے۔''

راجا نے کہا۔ ''رپورٹ کس نے درج کرائی ہے؟''

اے ایس پی نے کہا۔ ''آپ کی تعریف؟''

''میرا نام راجا ہے۔''

تھانیدار طنزیہ انداز میں بولا۔ ''اصل چیز تو کام ہے ان کا...... بڑے توپ قسم کے جرنلسٹ ہیں اپنے راجا صاحب۔ بڑے دھواں دھار کالم لکھ رہے ہیں آج کل...... میں نے آپ کو ایک کالم دکھایا تھا۔''

اے ایس پی نے سر ہلایا۔ ''اوہ ... مجھے یاد آگیا...... آپ نے کچھ غلامی کی روایت اور نجی جیل خانوں کا ذکر کیا تھا۔''

تھانیدار نے فوراً گفتگو کا رخ رپورٹ کی طرف موڑ دیا۔ ''رپورٹ خود متاثرین نے درج کرائی ہے۔ ان کے نام ہیں۔''

اے ایس پی نے کہا۔ ''نام چھوڑو...... رپورٹ آپ کے خلاف لکھوائی گئی ہے کہ وہ معمول کے مطابق درخت کاٹ رہے تھے کہ آپ نے اپنے چار ساتھیوں کے ہمراہ ان پر حملہ کیا اور انہیں زدوکوب کیا۔ اور شدید زخمی کیا۔''

''رپورٹ زیرِ دفعہ تین سو تیس، چوبیس ضابطہ فوجداری لکھوانے کے لیے وہ پولیس اسٹیشن گئے۔'' تھانیدار بولا۔

''پولیس اسٹیشن تک وہ کیسے گئے؟'' راجا نے کہا۔

تھانیدار نے کہا۔ ''وہ ہوائی جہاز سے...... باقی بحری جہاز سے۔''

اے ایس پی نے کہا۔ ''ڈونٹ ٹاک نان سنس۔''

''سر جی...... نواب صاحب کا سوال نان سنس تھا۔ جواب بھی نان سنس ہی ہوگا۔'' تھانیدار کا موڈ خراب ہوگیا۔ وہ پرانا گرگ باراں دیدہ تھا ایسے نوجوان افسروں سے نمٹنا جانتا تھا۔

''اچھا اب ضرورت ہوگی تو میں تم سے کہوں گا...... ورنہ مجھے بات کرنے دو۔'' اے ایس پی کا لہجہ سخت ہوگیا۔ ''آپ اس سلسلے میں کیا کہنا پسند کریں گے نواب صاحب۔''

میں نے کہا۔ ''یہ رپورٹ لغو اور بے بنیاد ہے او[...] گئی ہے...... میں ایسے کسی واقعے سے لاعلم ہوں۔''

''چھ افراد کی گواہی کو نظرانداز بھی نہیں کیا جا سکتا''

''کون چھ افراد...... چھ غلام......؟ وہ چھ کے دس بھی ہو سکتے تھے...... یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ میں نے [...] سر تن سے جدا کر دیا۔ کلہاڑی کے وار سے۔'' میں نے کہا۔

میری بات پر تھانیدار چونکا۔ ایسا ہوا تھا اور وہ [...] تھا کہ درخت کاٹنے والوں میں سے ایک اپنے ہی سا[...] ہاتھوں مارا گیا تھا۔ اور بالکل اسی طرح مارا گیا تھا مگر [...] میں اس کا ذکر ہی نہیں تھا۔ درخت کاٹنے والوں [...] سات نہیں چھ بتائی گئی تھی۔ جو مر گیا تھا اسے نفی کر دیا [...] یہ بات میرے لیے باعث اطمینان بھی تھی۔ باعث [...] بھی اور باعث حیرانی بھی۔ شاید خود تھانیدار کو ملال [...] رپورٹ میں قتل کی دفعہ کیوں شامل نہیں کی گئی۔

اے ایس پی نے کہا۔ ''انہیں واقعی مارا پیٹا گیا [...] کا کہنا ہے کہ آپ اچانک حملہ آور ہوئے۔ آپ نے کہا کہ وہ چور ہیں کیونکہ وہ آپ کی زمین پر سے درخت [...] رہے ہیں جبکہ وہ زمین رانا رجب علی کی ملکیت ہے ا[...] درخت کاٹنے کی اجازت خود رانا صاحب نے دی تھی''

میں نے پرسکون رہتے ہوئے کہا۔ ''رانا صاحب [...] بھی کہہ سکتے ہیں اور کہلوا سکتے ہیں لیکن میں صرف ا[...] کہہ سکتا ہوں...... پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھے ابھی تک [...] پرست بدھائی کی حدود سے پوری طرح آگاہی نہیں [...] سنجیدگی سے سوچ رہا ہوں کہ حد بندی کرا لوں۔ ا[...] کے گرد کوئی دیوار تعمیر کراؤں یا خاردار تاروں کی با[...] لوں۔''

''میرا خیال ہے جھگڑے سے بچنے کے لیے آ[...] کر لینا چاہیے اور اس میں دیر بھی نہیں لگانی چاہیے'' [...] ایس پی بولا۔

میں نے کہا۔ ''اصل بات کی طرف میں اب آ[...] رپورٹ میں جو وقت درج ہے بقول تھانیدار صاحب [...] بج کر چوالیس منٹ۔''

''ان کو سیکنڈ بھی لکھنے چاہئیں۔'' راجا بولا۔ ''پو[...] کہنے سے تو وقت بالکل ہی غلط ہو جاتا۔''

اے ایس پی کو راجا کی بات پسند نہیں آئی مگر وہ

[...]نیدار سے برداشت نہ ہوا۔ ''وقوعہ میں وقت کا [...] کچھ بھی ہو۔''

[...] نے کہا۔ ''کون سا وقوعہ کیسا وقوعہ...... آپ تھانے [...] کے جو چاہیں لکھ لیں...... گیارہ بج کے چوالیس منٹ [...] یہاں سے پونے دو سو کلومیٹر کے فاصلے پر تھا۔ اپنے [...] مشیر بیرسٹر فاروقی کے ساتھ۔''

[...] طنز سے بولا۔ ''ہاں جی...... آپ کے گواہ وہی ہو سکتے [...]''

[...] راجا نے کہا۔ ''آپ تو ماشاءاللہ سے خاصے سمجھدار [...] قانونی معاملہ گواہی پر چلتا ہے...... اور واقعاتی [...] پر...... میں نواب صاحب کے ساتھ تھا۔ باقی [...] کو ہم عدالت میں پیش کریں گے...... اگر ضرورت [...] ہوئی۔''

میں نے کہا۔ ''اور وہ رانا صاحب سے زیادہ معتبر گواہ [...] گے۔''

اے ایس پی نے ہاتھ اٹھایا۔ ''دیکھیے...... یہ محض ایک [...] ہے ایک فریق کا بیان...... نہ یہ فرد جرم ہے نہ [...]''

''مگر قانونی کارروائی تو ضروری ہے۔'' تھانیدار بولا۔

اے ایس پی نے کہا۔ ''مجھے صرف آپ کا بیان چاہیے۔ [...] علم تو ہے آپ کے اور رانا صاحب کے درمیان رقابت [...]ش کا...... جنگل میں دو شیر ہوں تو ان کی آپس میں نہیں [...] میری خواہش ہے کہ کسی طرح میں آپ کے درمیان [...] بقائے باہمی کا کوئی قابلِ عمل سمجھوتا کرا دوں۔''

تھانیدار بڑے معنی خیز انداز میں ہنسا۔ اس کی ہنسی میں [...] تمسخر کا انداز تھا جیسے اس نے اپنے افسر اعلیٰ کے منہ سے احمقانہ حد تک ناقابلِ عمل بات سنی ہے۔ جیسے پہلی بار طیارہ اڑانے والا کوئی پائلٹ نشے میں دعویٰ کرے کہ وہ [...] جہاز کو خلا سے گزار کے چاند کی سطح پر اتار سکتا ہے۔

اے ایس پی نے سخت لہجے میں پوچھا۔ ''واٹ از سوفنی؟''

اس نے فوراً معذرت کر لی۔ ''سوری سر...... مجھے ایک [...] یاد آگئی جو میری بیوی نے صبح مجھ سے کہی تھی۔''

میں نے کہا۔ ''اے ایس پی صاحب...... میری نیک [...]ات آپ کے ساتھ ہوں گی۔''

جب وہ میرا بیان لے کر چلے گئے تو میں نے راجا سے [...] ''تیری بات بہت جلد سچ ثابت ہوگئی۔''

''میری ہر بات سچ ثابت ہوتی ہے فیکے پتر...... تو کس بات کی بات کر رہا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''یہ حد بندی کا معاملہ اٹھ کھڑا ہوا...... رانا ہمارے علاقے کو اپنی ملکیت قرار دے رہا ہے...... رپورٹ درج کرانے والے ہماری حدود میں تھے۔ واضح طور پر چوری کے مرتکب ہو رہے تھے مگر رانا الٹا ہم پر الزام لگا رہا ہے، وہ ہماری زمین پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔''

''اور شک کی کوئی بات نہیں...... وہ پٹواری سے پہلے ہی ساز باز کر چکا ہوگا۔'' راجا نے کہا۔

''گویا پٹواری اب ہمارے خلاف جائے گا۔''

''اس کے ریکارڈ کو چیلنج نہیں کیا جا سکتا۔ ہماری ابھی تک اس سے رسمی ملاقات بھی نہیں ہوئی۔ رانا اس علاقے کا بے تاج بادشاہ ہے۔ اس کے آباؤ اجداد یہاں آباد تھے۔ وہ ان کا سیاسی وارث بھی ہے۔''

''یار اتنا فکرمند مت ہوا بھی سے...... نمٹ لیں گے رانا سے بھی اور پٹواری سے بھی۔'' راجا نے میرے کندھے پر ہاتھ مارا۔ ''جب کسی کے غرور کی شکست کا وقت آتا ہے تو وقت کا دھارا بھی الٹا بہنے لگتا ہے۔ اپنا سایہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے۔ سکندر اعظم کے مقابلے میں راجا پورس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ پورس کی فوج کو اپنے ہی ہاتھیوں نے روند ڈالا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''میں ڈرتا نہیں...... صرف پیش بندی کرنا چاہتا ہوں۔''

''تو دیکھ...... ایک بندہ مارا گیا تھا...... رانا کی طرف سے اس کا ذمہ دار ہمیں نہیں ٹھہرایا گیا۔ حالانکہ یہ بڑا آسان تھا۔ رپورٹ میں قتل بھی ہمارے کھاتے میں ڈالا جا سکتا تھا مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔''

''آخر کیوں؟''

''اس رپورٹ کا مقصد صرف ایک پیغام دینا تھا کہ نواب صاحب چاہو تو مقدے بازی کے لیے میدان میں اتر آؤ...... وہ زمین میری ہے جس کو تم اپنا سمجھتے ہو...... یہ صرف ایک چیلنج ہے۔''

''میں یہ چیلنج قبول کرتا ہوں۔''

''اگر صلح صفائی کے چکر میں ہم پیچھے ہٹتے گئے...... اپنے دعوے سے دستبردار ہو گئے تو وہ اور آگے بڑھ آئے گا۔''

''میں ایک انچ پیچھے نہیں ہٹوں گا۔'' میں نے کہا۔

رات تک مجھ پر اس بات کا اثر رہا۔ رانا کی نیت اور اس

کے عزائم بہت پہلے کھل کر سامنے آگئے تھے۔ اب یوں لگتا تھا کہ وہ جارحیت پر آمادہ ہے وہ ہر طرف سے میرا گھیراؤ کرنا چاہتا تھا۔ اس کی سازشوں کا جال پھیلتا جا رہا تھا اور آہستہ آہستہ میں یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ میرے لیے راستے بند ہو رہے ہیں۔ ان تمام ریشہ دوانیوں کا مقصد بھی مجھ پر واضح ہو گیا تھا۔

رانا چاہتا تھا کہ اس علاقے میں رہنے والوں کی طرح میں بھی اس کی بالادستی اور حاکمیت کو تسلیم کرلوں اور دوسری سپر پاور کی طرح اس کے مقابلے پر کھڑے ہونے کی خواہش اور کوشش سے دستبردار ہو جاؤں۔ اگر میں ایسا کرتا تو وہ مجھے اپنے دربار میں حاضری دینے والوں میں سب سے زیادہ عزت دیتا۔ ان معزز درباریوں میں علاقے کے سرکاری حکام...... پولیس افسران اور چھوٹے موٹے تمام تاجر رئیس اور معززین شامل تھے۔

سارا فساد اسی لیے تھا کہ اب تک وہ بلاشرکت غیرے اس علاقے میں ایک مطلق العنان شہنشاہ کی حیثیت کا مالک تھا۔ کسی نے اس کے اقتدار اور حکمرانی کے پیدائشی حق کو چیلنج نہیں کیا تھا۔ اس کی حیثیت اب تک ایسی ہی تھی جیسی اٹھارویں صدی میں ہندوستان کے مغل شہنشاہ کی...... ہندوستان میں چھوٹی بڑی سیکڑوں ریاستوں کے سارے راجے مہاراجے اور نواب اس کے حلیف اور باجگزار تھے۔ وہ اس کے دربار میں حاضر ہوتے تھے تو نذرانے پیش کرتے تھے۔ اپنی اطاعت کا یقین دلانے کے لیے سر جھکا کے کورنش بجا لاتے تھے اور اسے شہنشاہ کے لیے مخصوص تمام خطابات...... القابات و آداب سے مخاطب کرتے تھے۔ اس کے بدلے میں وہ دربار میں عزت پاتے تھے اور ان کی ریاست برقرار رہتی تھی۔ رعایا پر ان کی حاکمیت کو شہنشاہ کی تائید و حمایت حاصل ہوتی تھی۔ جو دکن یا بنگال کے صوبیدار کی طرح بغاوت یا شورش برپا کرے اس کی سرکوبی کے لیے لشکر روانہ کیا جاتا تھا اور اس کا انجام نور جہاں کے سابق شوہر اور محبوب بنگال کے صوبیدار شیر افگن جیسا ہوتا تھا۔

دیگر درباری اپنی اپنی حیثیت کے مطابق ہفت ہزاری تھے یا وزیر...... سپہ سالار اور شہنشاہ کے نورتن...... لیکن یہ اکیسویں صدی تھی اور شہنشاہیت کا زمانہ ختم ہو چکا تھا۔ نہ خلافت رہی تھی اور نہ انگریز کی حکومت...... لیکن حاکمیت کا چلن برقرار تھا۔ انداز حکمرانی کو جمہوریت کا نام دے کر ڈھول پیٹا جاتا تھا کہ اقتدار کا سرچشمہ عوام ہیں۔

عملاً ایسا نہیں تھا۔ صدر، گورنر، کمشنر، حاکم ا[...] سرکاری محکموں کے افسران تک حاکم تھے۔ تھانے دا[...] یہاں تک کہ پٹواری اور سرکاری ملازم...... انسپکٹر...... بجلی یا ٹیلی فون ٹھیک کرنے والا لائن مین ا[...] بادشاہ تھا جس کے سامنے رعایا ہاتھ باندھے نذر[...] کرنے کے لیے کھڑی رہتی تھی۔

میری تشریف آوری نے وہی غلغلہ برپا کیا تھا[...] اا کی آمریت کو چیلنج کرنے اور عوام کے لیے جمہوری[...] کے مطابق حقوق کی تحریک چلانے والا کوئی قومی سیا[...] برپا کرتا ہے۔ رانا کی مطلق العنانی اور لاقانونیت [...] حکومت کی بنیادیں ہلنے لگی تھیں۔ وہ محسوس کرنے لگا[...] ولایت کا تعلیم یافتہ یہ مڈل کلاس نوجوان جو تقدیر کی لا[...] ریاست کا انعام نکل آنے سے دولت مند بن گیا ہے[...] صدیوں پرانی خاندانی بالادستی کو ختم کردے گا۔ میں ا[...] قانون اور مساوات کی صرف بات ہی نہیں کرتا تھا...... زندگی بچا کے میں نے انسانیت پرستی کا عملی ثبوت بھی[...] تھا۔ میں نے علاقے میں اسپتال اور اسکول قائم کر[...] لوگوں کو روزگار فراہم کرنے کے سیاسی نعرے نہیں لگا[...] بلکہ ایسے عملی اقدام بھی کیے تھے کہ لوگ میری طرف[...] ہونے لگے تھے۔ شہناز گھر گھر جا کے بیماروں کو دوا د[...] تھی۔ رابعہ نے لیلیٰ کے ساتھ مل کر اسکول کے قیام[...] کر دیا تھا۔ بہت سے لوگ حویلی میں ملازم ہو گئے[...] ست بدھائی کا ترقیاتی منصوبہ عملی شکل لے رہا تھا۔ لو[...] رہے تھے، دیکھ رہے تھے اور محسوس کر رہے تھے۔ م[...] ترین کارنامہ گرد و نواح کے دیہات میں مفت مو[...] فراہم کرنا تھا۔ چنانچہ رانا کو سخت اندیشہ لاحق تھا ک[...] میں اس کی نہ عزت رہے گی اور نہ حکومت۔ زمیندار[...] بھی روبہ زوال تھی۔ اسمبلی کی سیٹ بھی نہ رہی تو سا[...] بھی ختم ہو جائے گی۔ اس علاقے میں رانا رجب [...] نواب رفیق احمد شیرازی کے نام کا ڈنکا بجے گا۔

رانا نے پہلے مجھے غنڈا گردی اور بدمعاشی سے [...] کیا تھا...... پھر میرے خلاف اکبر خان کو کھڑا کر دیا[...] ملا تو اس نے صوفی چچا کے کیس میں پولیس کے ذری[...] دباؤ ڈالا تھا اور مجھے بلیک میل کرنے کی پوری کوشش [...] اگر وہ پولیس کی حراست میں ہلاک نہ ہوتے تو مجھے

[...]امنے سر جھکانا پڑتا...... اس نے گرد و پیش کے دیہات [...]ہناز کے مخالفوں کو ورغلا کے مفت علاج کے پروگرام کو [...]ہنے کی پوری کوشش کی تھی اور اب اس نے میری [...]پر قبضہ کرنے اور مجھے مقدمے بازی میں الجھانے کے [...]یک رپورٹ درج کرادی تھی کہ میں نے ان لوگوں کو مارا [...]ں کے علاقے میں اس کی اجازت سے درخت کاٹ [...]تھے۔

[...]ے ایس پی کے رویے سے اندازہ ہوتا تھا کہ رپورٹ [...]ہو جائے گی اور یہ اشارہ بھی واضح ملتا تھا کہ رانا کے عزائم [...]یں اس نے ایک نوٹس دے دیا تھا کہ جس زمین کو میں اپنی [...]رہا ہوں، وہ میری نہیں اس کی ہے۔ اب چاہو تو عدالت [...]رو یا ویسے ہی سامنے آجاؤ۔ زمین اس کی جس کا قبضہ۔ [...]ں مقدمہ ہو گا تو دیوانہ کر دے گا اور فیصلہ ہو گا پٹواری کی فرد [...]صف صدی سے لاوارث پڑی زمین کی حد بندی میں کتنی [...]پھیری ہو چکی ہے، یہ بعد میں معلوم ہو گا۔

[...]رانا کے مطالبات کی فہرست بہت لمبی تھی۔ میں اس کی [...]ی تسلیم کرلوں (پھر وہ بھی مجھے نواب تسلیم کرسکتا ہے) [...]کے غیر قانونی اقدامات میں دخل نہ دوں۔ ست بدھائی [...]ی پروگرام ختم کردوں۔ سائنس ریسرچ سینٹر اکبر خان [...]م کردوں اور جو کچھ وہاں ہو رہا ہے، ہونے دوں...... [...]یقین دلا دوں کہ میرا ارادہ ہرگز اس کے خلاف سیاسی [...]ت حاصل کر کے اسے اسمبلی کی آبائی نشست سے محروم [...]نے کا نہیں ہے...... وغیرہ وغیرہ۔

[...]ظاہر ہے، ان میں سے ایک مطالبہ بھی جزوی طور پر [...]ے لیے قابل قبول نہیں تھا۔ چنانچہ شک و شبہے کی اب کوئی [...]ئش نہ تھی کہ ہمارے درمیان جنگ چلے گی۔ یہ جنگ اس [...]ز ایک مطلق العنان حکمرانی کے لیے تھی اور میرے [...]یک جمہوری اصولوں کی پاسداری کے لیے...... یہ دو [...] نظریات کی جنگ تھی۔ نئے اور پرانے نظام کی جنگ [...]۔ چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ حق و باطل کی جنگ تھی۔

[...]اس کا اندازہ مجھے اگلے ہی روز ہوا۔ بہت غور و خوص [...]بعد ہم نے طے کیا کہ ان سب کے خلاف رپورٹ درج [...]کی جائے جنہوں نے شہناز کو ڈرا دھمکا کے کام کرنے سے [...]اتھا۔ شہناز ان لوگوں کو صورت دیکھ کے شناخت کرسکتی [...]مگر کسی کا نام نہیں جانتی تھی۔ یہ مسئلہ شہناز کے ڈرائیور نے [...]کیا۔ وہ مقامی آدمی تھا اور سب کو جانتا تھا۔ وہ ان سب کے خلاف گواہی دینے کے لیے بھی تیار تھا۔

راجا نے گورنمنٹ ڈسپنسری پر غاصبانہ قبضہ کرنے والے جعلی پیر کے خلاف تصویروں کے ساتھ اپنی رپورٹ بھیج دی تھی اور اس کے دوست صحافی نے وعدہ کیا تھا کہ ایک دو روز میں رپورٹ نمایاں طور پر شائع کر دی جائے گی۔ اس کے بعد پولیس اور مقامی انتظامیہ کا حرکت میں آنا لازمی تھا مگر اس حرکت کو بابرکت بنانے کے لیے راجا نے اوپر تک ساری ڈوریاں ہلانے کا پکا انتظام کر لیا تھا۔ یہ بات اب یقینی تھی کہ پیر صاحب اپنے آستانے سے بڑے عبرت ناک طریقے پر بے دخل کیے جائیں گے اور سرکاری مہمان خانے میں ان کی چھترول سے ایسی خاطر تواضع ہوگی کہ ان کی خدمت اقدس میں حاضری دینے والا شاہ جناب بھی غائب ہو جائے گا۔

اگر ہم اس سے پہلے دیگر شرپسندوں کے خلاف قانونی کارروائی کا آغاز کر دیتے تو مخالفت کرنے والوں کا شیرازہ بکھر جاتا۔ رانا کا پلان فیل ہونے سے علاقے کے لوگوں کو یہ پیغام بھی مل جاتا کہ نواب رفیق احمد شیرازی کا راستہ کوئی نہیں روک سکتا۔

فریال، میں، راجا اور ڈاکٹر شہناز ایک طویل فاصلہ طے کر کے تھانے پہنچے۔ عام طور پر تھانہ انچارج تک کسی فریادی کی رسائی نہیں ہوتی یا پھر وہ موجود ہی نہیں ہوتا۔ عام آدمی کی کیا مجال جو پوچھ سکے کہ کوتوال کیوں موجود نہیں۔ خاص آدمی کو لگا بندھا جواب ملتا ہے کہ انچارج صاحب گشت پر ہیں۔ کہاں گشت پر ہیں؟ کیوں گشت پر ہیں؟ ایسے سوالات بدتمیزی کے زمرے میں آتے ہیں۔ بھلا جنگل کے شیر سے حشرات الارض سوال کر سکتے ہیں کہ وہ کہاں گھوم رہا ہے؟ اور کیوں گھوم رہا ہے؟

چنانچہ تھانیدار کا مل جانا ہمارے لیے خوشگوار حیرانی کا باعث بنا۔ وہ نہ ملتا تو اپنے پلان کے مطابق ہم اے ایس پی کے آفس جاتے لیکن ضابطے کی ہر کارروائی تھانے سے شروع ہوتی ہے۔ افسران بالا کا عمل دخل بعد میں ہوتا ہے۔

تھانیدار نے بڑی خوش دلی سے ہمارا استقبال کیا۔ ’’بڑے بڑے لوگ آئے ہیں آج خود چل کے...... اللہ خیر کرے۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’ہم محض فریادی ہیں تھانیدار صاحب۔‘‘

راجا نے کہا۔ ’’کیا ہم بیٹھ سکتے ہیں؟‘‘

تھانیدار بولا۔ ’’ہم تو خود اسی لیے کھڑے ہیں کہ پہلے

آپ تشریف رکھیں۔'' پھر اس نے کسی کو آواز لگائی۔ ''اوئے ادھر آؤ کوئی۔ اپنے نواب صاحب تشریف لائے ہیں...... ایک ڈاکٹر ایک صحافی اور ایک معزز خاتون کے ساتھ...... تھانے کی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھا جائے گا...... آج کا دن۔''

میں نے کہا۔ ''کیا آپ سپاسنامہ ختم کر کے ہماری بات سنیں گے۔''

ایک کانسٹیبل نے ڈھیلی پتلون سنبھالتے ہوئے سیلوٹ جھاڑا...... اس کی نظر فریال اور شہناز پر رہی۔ ''حکم جناب عالی۔''

''اوئے فنافٹ معزز مہمانوں کے لیے کچھ چائے پانی کا بندوبست کرو اور اپنی پتلون پہن کے آؤ۔''

میں نے کہا۔ ''اس کی ضرورت نہیں...... ہم ایک رپورٹ لکھوانے آئے ہیں۔''

''کس کے خلاف؟'' وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

میں نے کہا۔ ''یہ ڈاکٹر شہناز ہیں...... بہت مشہور ڈاکٹر ہیں۔ شہر میں اپنا کلینک تھا مگر یہاں ایک ویلفیئر کلینک اور اسپتال بنانا چاہتی ہیں۔ ابھی اردگرد کے دیہات میں خود جا کے مریضوں کو مفت علاج کی سہولت فراہم کر رہی ہیں...... دوا بھی بلا معاوضہ دے رہی ہیں۔''

''اللہ ان کو جزائے خیر دے۔'' تھانیدار بولا۔

میں نے کہا۔ ''کچھ لوگ ان کی مخالفت کر رہے ہیں۔''

''کون لوگ؟''

میں نے کہا۔ ''وہی جن کے کاروباری مفادات متاثر ہو رہے ہیں۔''

شہناز نے کہا۔ ''میں بتاتی ہوں آپ کو...... ہر گاؤں میں ایک نیم حکیم ہے۔''

''جو نیم کے نیچے بیٹھتا ہے اور نیم سے ہر مرض کا علاج کرتا ہے۔'' راجا بولا۔

شہناز نے اسے نظر انداز کر دیا۔ ''کچھ جھاڑ پھونک والے ہیں...... کچھ محض سیانے...... پیر فقیر...... تعویذ گنڈے والے۔''

تھانیدار سنتا رہا اور غالباً شہناز کی شکایت سے زیادہ اس کے اور فریال کے حسن، جسمانی خدوخال، لباس اور فیشن کا جائزہ لیتا رہا۔ اس درمیان میں چائے لائی گئی جس کو کڑوا گھونٹ سمجھ کے پینے کے سوا چارہ نہ تھا۔ انسانوں اور مویشیوں کے نہانے دھونے میں استعمال ہونے والی نہر کے تازہ پانی میں کوئی چورا جائے ڈال کے اتنا اُبالی گئی تھی کہ اس کی خاصی مقدار تو حل ہوگئی تھی پھر اس میں بافراط چینی کا اضافہ کیا گیا تھا اور غالباً براہ راست بھینس کے ملک فلٹر سے دودھ کی اتنی ہی مقدار شامل کر دی گئی تھی۔ بھینس کی بو چائے کی خوشبو پر غالب تھی۔

تھانیدار نے ساری روداد سننے کے بعد ایک ڈکار لی۔ دوسری آواز کہیں اور سے آئی...... پھر اس نے کہا۔ ''کیا جانتی ہو ان بندوں کو ڈاکٹر صاحب۔''

''نام بتا سکتی ہوں...... سامنے آئیں تو پہچان لوں گی۔''

''ماشاء اللہ...... اب آپ کیا چاہتی ہو؟''

''آپ رپورٹ لکھیں۔ انہوں نے میری گاڑی پر حملہ کیا...... دھمکیاں دیں...... مجھے کام کرنے سے روکا۔''

راجا بولا۔ ''کس پر کون سی دفعہ لگانی ہے...... یہ فیصلہ آپ ہی کرو گے۔''

''دیکھو جی...... یہ سب گاؤں کے معززین شمار ہوتے ہیں...... ان سب سے پنگا لینا......''

راجا نے کہا۔ ''معززین ہوں گے وہ آپ کے نزدیک...... ورنہ وہ سب اتائی، جعلساز اور دھوکے باز ہیں جو لوگوں کی زندگی سے کھیل رہے ہیں۔ آپ رپورٹ لکھو یا میں جاؤں اے ایس پی کے پاس۔''

''دھمکی دینے کی ضرورت نہیں۔ آپ بے شک آئی جی سے بات کر سکتے ہو مگر وہ بھی کیا کرے گا۔ ایک فون کرے گا کہے گا کہ رپورٹ لکھ لو...... جاؤ آپ پہلے اپنا شوق پورا کر لو۔'' تھانیدار نے بے نیازی سے کہا۔

''دیکھو...... مجھے معلوم ہے تمہاری پوسٹنگ کس کے کہنے پر ہوئی تھی مگر اگلے مہینے وہ ریٹائر ہوگا تو جو اس کی جگہ لے گا...... وہ تم سے زیادہ خوش نہیں ہے...... لیکن ابھی وہ بے اختیار ہے...... اختیار حاصل ہو جانے کے بعد وہ تمہیں کہاں رکھے گا یہ سوچ لو۔''

تھانیدار کا رویہ بدل گیا۔ ''او جی ہم نے تو نوکری کرنی ہے۔''

راجا نے کہا۔ ''ہاں...... مگر گزشتہ ڈیڑھ سال کی نوکری آپ نے کیسے کی ہے؟ کیا کارنامے سرانجام دیے ہیں؟ اس کی تفصیلی رپورٹ حاصل کرنے کے لیے ابھی میرے پاس ایک مہینا ہے...... میرے ساتھ صحافی کارکنوں کی بہت بڑی ٹیم ہے تھانیدار صاحب۔''

''آپ دھمکی دے رہے ہو مجھے؟''

''یس...... یہ کھلی دھمکی ہے...... اگر میں نے بھی تمہیں معطل کرا کے پولیس ہیڈ آفس میں پوسٹ نہ کرایا تو میرا بھی نام راجا نہیں۔ چلیے نواب صاحب...... کم آن ڈاکٹر شہناز۔'' وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

ہم سب ایک ساتھ کھڑے ہوگئے۔ ''ہم یہاں آپ کی چائے پینے نہیں آئے تھے۔''

تھانیدار کی ساری اکڑفوں رُخصت ہوگئی۔ اس نے نہایت بے شرمی سے اپنے چہرے پر ایک عاجزانہ مسکراہٹ طاری کر لی۔ ''آپ تو غصہ ہوگئے سر جی...... ہم آپ کے حکم کے غلام ہیں نواب صاحب...... آپ تشریف رکھیں۔''

اس کے بعد وہ سب ہوگیا جو نہیں ہو رہا تھا۔ خستہ حال وردی میں ایک عمر رسیدہ منشی بوکھلایا ہوا حاضر ہوا...... اس نے کانپتے ہاتھ کے ساتھ آہستہ آہستہ رپورٹ لکھنی شروع کی۔ وہ اتنا سست تھا کہ مجھے لگا پوری رپورٹ لکھنے سے پہلے ہی وہ ریٹائر نہ ہو جائے۔ رپورٹ میں وہی لکھا گیا جو شہناز نے بتایا مگر مختلف ملزمان کے خلاف ضابطہ فوجداری کی تمام دفعات خود تھانیدار نے لکھوائیں۔ فوری طور پر ملزمان کی حراست کے لیے ایک پولیس پارٹی ترتیب دی گئی۔ اس میں ایک حوالدار اور دو کانسٹیبل شامل تھے۔

تھانیدار نے عادتاً گالی دے کر کہا۔ ''اپنے ساتھ ہتھکڑیاں لے کر جاؤ...... سب...... کو لا کے ڈال دو اِدھر۔''

حوالدار نے منمناتے ہوئے عرض کی۔ ''سر جی...... سواری۔''

تھانیدار نے گرج کے کہا۔ ''اوئے گڈی کھڑی ہے باہر...... جلدی جاؤ۔''

میں نے کہا۔ ''پولیس پارٹی ہماری گاڑی میں جائے گی؟''

''اور کیسے جائے گی جناب...... ادھر نہ ہمارے پاس موبائل ہے نہ ہم کوئی ٹیکسی پکڑ سکتے ہیں بیگار میں...... روٹین کے مطابق کارروائی ہوگی تو ایک دن میں پولیس ایک گاؤں سے کسی کو پکڑے گی۔ دوسرے دن باقی سب مفرور ہو جائیں گے...... ورنہ ابھی دو تین گھنٹے میں سب ادھر ہوں گے۔''

''دو تین گھنٹے۔'' فریال نے کہا۔ ''اور اتنی دیر ہم یہاں بیٹھے رہیں گے۔''

''وہ تو ضروری ہے جناب...... بندوں کو شناخت بھی تو کرنا ہے۔'' تھانیدار عیاری سے بولا۔

''ڈرائیور سب کو شناخت کر سکتا ہے۔'' شہناز نے کہا۔

''لیکن مدعی تو آپ ہو ڈاکٹر صاحب۔'' تھانیدار نے کہا اور پھر اس مشکل کا ایک حل بھی پیش کر دیا۔ ''ایک طریقہ ہو سکتا ہے...... آپ تشریف لے جاؤ اپنی حویلی میں...... اس ڈرائیور کو بھیج دو گاڑی کے ساتھ۔''

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے...... ہم شام کو پھر آ جائیں گے۔''

''اس کی ضرورت نہیں جناب عالی۔ ملزمان کو وہیں لایا جائے گا آپ کے سامنے پیش ہوں گے سب...... میں خود انکوائری کے لیے حاضر ہو جاؤں گا۔''

ہمارا خیال تھا کہ قانون حرکت میں آ گیا اور شام تک وہ سب ہمارے سامنے پیش ہو جائیں گے جنہوں نے شہناز کو ہراساں کیا تھا۔ فریال، شہناز اس خیال سے کچھ پریشان تھیں کہ کچہری یہاں لگائی جائے گی اور تفتیش کا جو روایتی عمل تھانے کے ڈرائنگ روم میں ہوتا ہے وہ یہاں ہوگا۔

میں نے کہا۔ ''دیکھو ان کی تھوڑی بہت...... گوشمالی تو ہونی چاہیے جو کل بدمعاش بنے ہوئے تھے۔''

''پولیس تھوڑی بہت گوشمالی نہیں کرتی۔ تیرہ نمبر سے چھتر دل...... ڈنڈا ڈولی اور چیرا لگانا...... پتا نہیں کیا کیا کرتی ہے۔'' شہناز بولی۔

''ہم یہ سب نہیں ہونے دیں گے...... فکر مت کرو۔'' میں نے کہا۔

''جو کرنا ہے باہر کرو...... حویلی سے باہر۔'' فریال نے کہا۔ ''اندر ہوگی یہ کارروائی تو اماں ابا بھی پریشان ہوں گے۔''

فریال کی رائے معقول تھی۔ اُصولی طور پر یہ طے کر لیا گیا کہ قانونی کارروائی سرونٹ کوارٹرز کے پیچھے ہوگی۔ اس کے لیے وہاں مناسب انتظام بھی کر دیا گیا۔ تھانیدار شام پانچ بجے نمودار ہوا۔

''بندے حاضر نہیں کیے گئے ابھی تک۔'' اس نے حیرانی سے کہا۔

میں نے کہا۔ ''آپ نے دو تین گھنٹے کہا تھا۔ اب تو پانچ گھنٹے ہوگئے۔''

میری بات مکمل ہونے کے ساتھ ہی شہناز کی گاڑی اندر داخل ہوئی مگر اس میں سے پہلے پولیس پارٹی برآمد ہوئی جو ملزمان کی گرفتاری کے لیے بھیجی گئی تھی...... پھر دو خستہ جاں

ملزم برآمد ہوئے جن کے ساتھ ایسا سلوک کیا گیا تھا کہ وہ ٹھیک طرح سے چل بھی نہیں سکتے تھے۔ پولیس والوں نے انہیں دھکیل کر ہمارے سامنے پھینک دیا۔

ان میں سے ایک ساٹھ سال کا بوڑھا تھا...... ہڈیوں کا ڈھانچہ...... اس کے منہ سے اور ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ دوسرا چودہ سال کا بچہ تھا جو پسلیوں پر ہاتھ رکھ کے کراہ رہا تھا۔ کچھ دیر کے لیے راجا اور میں دم بخود بیٹھے رہے۔ یہ بات ناقابل یقین سی لگتی تھی کہ شہناز پر حملہ آوروں میں یہ دونوں بھی شامل ہوں۔

میں نے کہا۔ ''تھانیدار صاحب...... کیا واقعی یہ ملزم ہیں؟''

راجا نے پوچھا۔ ''باقی ملزم کہاں ہیں؟''

پولیس والوں نے اپنے افسر کی موجودگی میں کسی نواب یا صحافی کو جواب دینا خلاف ادب سمجھا۔ تھانیدار نے بڈھے کو ٹھوکر ماری اور سیدھا کھڑا ہونے کا حکم دیا۔ وہ بلبلانے لگا۔ ''حضور سرکار میں بے قصور ہوں...... یہ مجھے زبردستی پکڑ لائے ہیں۔''

''جناب یہ ایف آئی آر میں نامزد ایک ملزم ہے۔'' ایک کانسٹیبل بولا۔

دوسرے نے کہا۔ ''اس سے پوچھ لیں...... یہ چراغ دین ہے یا نہیں؟''

بڈھا ہاتھ جوڑ کے بولا۔ ''مائی باپ...... میں چراغ دین ولد نور دین نہیں ہوں...... میرے باپ کا نام نور دین نہیں احمد دین تھا۔ انہوں نے مجھے بہت مارا...... کہا میں جھوٹ بول رہا ہوں...... میں چراغ دین ولد نور دین ہوں اگر میں نے نہیں مانا تو میرے بیٹے کو مویشی چوری کے الزام میں بند کر دیا جائے گا...... وہ ٹی بی کا مریض ہے......''

اس سے زیادہ سننے کی تاب مجھ میں بھی نہیں تھی۔ میں نے برہمی سے کہا۔ ''اگر اس بڈھے کی بات سچ ہوئی تو تمہاری خیر نہیں۔''

کانسٹیبل نے اس دھمکی پر اپنے افسر کی طرف فریادی نظروں سے دیکھا کہ بڈھے نے اتنی مار کھانے اور دھمکی ملنے کے باوجود ہمارے سامنے سچ بول دیا تھا۔

میں نے دوسرے ملزم سے کہا۔ ''تمہیں بھی مارا ہے انہوں نے؟''

وہ رونے لگا۔ ''بہت مارا ہے جی...... میں فقیر محمد ولد کریم بخش نہیں ہوں مگر انہوں نے کہا کہ تھانیدار کے سا[منے] یہی کہنا ہے ورنہ میری بہن کو اٹھا لیا جائے گا۔''

''یہ سب کیا ہے تھانیدار صاحب...... رپورٹ [میں] چراغ دین اور فقیر محمد کا نام تھا مگر یہ ملزم نہیں ہیں اصل [ملزم] کہاں ہیں؟''

حوالدار نے کہا۔ ''اصل ملزم یہی ہیں گاؤں میں ا[س] نام کا اور کوئی بندہ نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''کچھ خدا کا خوف کرو...... یہ بوڑھا اور [یہ] بچہ تمہیں حملہ آور لگتے ہیں؟ یہ لاٹھیاں لے کر ڈاکٹر شہناز [کا] راستہ روکنے والوں میں شامل ہوں گے۔ یہ ماننے والی با[ت] ہے؟''

راجا نے کہا۔ ''میں ڈاکٹر صاحبہ کو بلاتا ہوں مگر ان [کی] شناخت سے پہلے میں ڈرائیور سے پوچھتا ہوں۔ کیو[ں] بھئی...... تم بھی پہچانتے ہو ملزموں کو۔''

ڈرائیور نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''جی...... میرا خیا[ل] ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ڈرو نہیں...... جو سچ ہے وہ بتاؤ۔''

''سر جی...... میں نے تو کہا تھا۔ یہ وہ لوگ نہیں ہیں...... وہ دوسرے بندے تھے۔ مگر انہوں نے مجھے بھی گالیاں دیں۔ ڈرایا دھمکایا کہ بکواس کی تو تجھے بھی نہیں چھوڑیں گے۔ تیرے چاچا کو اور تیرے سالے کو اندر کرا دیں گے۔''

جب شہناز نے صاف انکار کر دیا کہ یہ ملزم نہیں ہیں...... وہ سب تیس پینتیس سال کی عمر کے جوان اور ت[گڑے] کٹے لوگ تھے تو تھانیدار کا غصہ اپنے ماتحتوں پر اترا۔ وہ انہیں گالیاں دینے لگا کہ اصل مجرم کی جگہ کسی اور کو کیوں پکڑ لا[ئے] ہیں۔

میں نے کہا۔ ''رپورٹ میں سات ملزم نامزد کیے گ[ئے] تھے باقی کہاں ہیں وہ کیوں نہیں پکڑے گئے؟''

حوالدار نے کہا۔ ''جناب عالی۔ وہ مفرور ہیں۔''

''کیا انہیں الہام ہو گیا تھا؟'' راجا نے خفگی سے کہا۔

تھانیدار بولا۔ ''ایسا ہوتا ہے راجا صاحب...... ایک گاؤں میں گرفتاری ہو تو آس پاس کے ہر گاؤں میں خبر [پہنچ] جاتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''کیا انہوں نے تمام ملزمان کی فہرس[ت] جاری کر دی تھی؟''

''آپ نے تو سنا ہوگا چور کی ڈاڑھی میں تنکا...... دو پکڑے گئے تو باقی سمجھ گئے کہ اب ان کی باری ہے۔''

میں نے کہا۔ ''جھوٹ...... بکواس...... اصل چراغ دین اور فقیر محمد آزاد پھر رہے ہیں پھر باقی کو کیسے شک ہو گیا کہ اب وہ بھی پکڑے جائیں گے۔''

ڈرائیور بولا۔ ''جناب عالی...... انہوں نے جو کام کیا میں بتاتا ہوں...... چراغ دین ولد نور دین ایک دکان دار ہے...... دال، چاول، آٹے، چینی جیسی چیزوں کے علاوہ کچھ دوائیں بھی رکھتا ہے۔ دکان پر اس کا بھائی بیٹھا تھا۔ ان کی آپس میں بات ہوئی۔ میں نے صرف اتنا سنا وہ کہہ رہا تھا...... آپ فکر مت کرو...... میں گھر پہنچا دوں گا...... یہ چراغ دین موچی ہے...... جو اسے اٹھا لائے...... اصل فقیر محمد مسجد کا پیش امام ہے...... خود کو حکیم بھی کہتا ہے...... تعویذ بھی دیتا ہے...... اس پر ہاتھ ڈالنے کی ان میں ہمت نہیں تھی۔ اس نے عصر کی نماز پڑھنے والوں سے کہا کہ اس لیڈی ڈاکٹر نے ان کے خلاف تھانے میں رپورٹ لکھوائی ہے...... رپورٹ جھوٹی ہے لیکن پولیس مجھے گرفتار کرنے آئی ہے۔ سارے نمازی اصل بات جانتے تھے۔ وہ نکل گئے اور مولوی پہلے تو باہر نہیں آیا۔ پولیس کو دھمکیاں دیتا رہا کہ خانہ خدا میں قدم رکھا تو ان پر اللہ کا عذاب نازل ہوگا پھر وہ اپنے حجرے کی کھڑکی سے نکل گیا...... کھڑکی پیچھے کی طرف ہے...... یہ اس کی جگہ چودہ سال کے فقیر محمد کو پکڑ لائے۔ یہ اپنی بھینس کو نہلا رہا تھا۔''

اس بیان کے بعد کسی شک و شبے کی گنجائش ہی نہ رہی۔ پولیس نے گرفتاری کا ڈراما کیا تھا۔ جانتے بوجھتے وہ غلط لوگوں کو پکڑ لائے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ حقیقت سامنے آئے گی تو یہ بھی چھوڑ دیے جائیں گے۔ تھانیدار ہمیں دکھانے کے لیے دوسرا ڈراما کرے گا۔ انہیں گالیاں دے گا اور شاید معطل بھی کرا دے گا لیکن اصل ملزمان محفوظ رہے تھے۔ انہیں موقع دیا گیا تھا کہ وہ روپوش ہو جائیں اور اپنی ضمانت قبل از گرفتاری کرا لیں۔ گواہ پیدا کر لیں جو ان کی بے گناہی ثابت کریں۔ وہ بیان حلفی داخل کر دیں کہ ایسا کوئی واقعہ ہوا ہی نہیں۔ ڈاکٹر صاحبہ کو نہ کسی نے روکا...... نہ دھمکی دی اور نہ ان کی گاڑی پر حملہ کیا اور بفرض محال ایسا ہوا بھی تو اس وقت وہ جائے واردات سے بہت دور فلاں جگہ فلاں کے ساتھ تھے۔

ظاہر ہے اس آنکھوں میں دھول جھونکنے والی کارروائی کے بعد میں نے پولیس کو حویلی سے نکال دیا...... وہ دونوں ''ملزمان'' کو بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتے تھے مگر ہم نے انہیں روک لیا کہ انہیں ہم واپس نہیں دیں گے...... ان بے گناہوں کی حق گوئی و بے باکی انہیں بہت مہنگی پڑی...... اسے پولیس کے خلاف بغاوت کے جرم کا درجہ دیا گیا...... جیسا کہ ہمیں بعد میں ڈرائیور کے ذریعے علم ہوا...... تین دن بعد اس بڈھے کا بیمار بیٹا مر گیا...... اس کا کہنا تھا کہ رات کو اس کی طبیعت ٹھیک تھی...... جب طبیعت زیادہ خراب ہوتی تھی تو اسے کھانسی کے ساتھ خون آتا تھا...... اس کے لیے ڈاکٹر شہناز نے جو دوا دی تھی وہ کھانے سے کھانسی بھی کم ہو رہی تھی...... ڈاکٹر صاحبہ کی ہدایات کے مطابق وہ بڑی باقاعدگی سے دوا کھا رہا تھا...... مگر وہ صبح اپنے پلنگ پر مردہ پایا گیا...... دوسرے ملزم کو سچ بولنے کی یہ سزا ملی کہ دلت کو حد پر ڈھاٹا باندھ کر آنے والے چوروں نے اسے چارپائی سے باندھ دیا اور اس کے مویشی کھول کر لے گئے...... اس کی ایک بھینس...... ایک گائے...... ایک بیل اس کے خاندان کا کل اثاثہ تھے...... ڈرائیور اس لیے محفوظ رہا کہ وہ ڈاکٹر صاحبہ کا باڈی گارڈ بھی تھا اور اپنے ساتھ بھرا ہوا ریوالور رکھتا تھا۔

جب پولیس رخصت ہو گئی تو راجا نے بے حد افسوس کا اظہار کیا۔ ''مجھے پہلے ہی سمجھ لینا چاہیے تھا کہ یہاں بوگس کارروائی ہوگی۔''

''آخر یہ لوگ کب تک مفرور رہیں گے۔'' میں نے کہا۔

''مفرور یہ آج بھی نہیں ہیں...... بس پولیس نے انہیں تحفظ فراہم کر دیا ہے...... پولیس جب تک چاہے انہیں مفرور ظاہر کر سکتی ہے...... وہ بیٹھے ہوں گے کسی عزیز رشتے دار کے گھر میں...... اگر چھاپا مارا جائے تو وہ اپنے گھر سے برآمد نہیں ہوں گے...... ہر چھاپے کی اطلاع انہیں پیشگی فراہم ہوگی اور اس وقت وہ گاؤں سے نکل کر کہیں بھی چلے جائیں گے...... اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ پورے گاؤں میں ہر گھر کی خانہ تلاشی کے وارنٹ ہوں۔''

''کیا پولیس وارنٹ کو اہمیت دیتی ہے؟''

''نہیں...... نہ شہر میں نہ یہاں...... وہ جب چاہیں کسی بھی گھر میں گھس کر کسی کو بھی بھیڑیے کی طرح اٹھا لے جاتے ہیں...... لیکن کارروائی نہ کرنی ہو تو قانون کا سہارا لیتے ہیں کہ وارنٹ کے بغیر ہم اندر کیسے جائیں؟ اگر وارنٹ بھی ہوں تو لیڈی پولیس سرچ کی عدم دستیابی کا بہانہ ہوتا ہے...... ہر مجرم

WWW.PAKSOCIETY.COM

پولیس کی ایسی سرپرستی کا معاوضہ نقدی ادا کرتا ہے اور خدمات کی صورت میں بھی۔''

فریال نے تشویش سے کہا۔ ''پھر اب کیا ہوگا؟''

''کچھ نہیں ہوگا...... میں افسران بالا سے کہوں گا تو وہ بھی تھانیدار کو حکم دیں گے...... اس کے پاس ہزار حیلے بہانے ہیں۔'' راجا بولا۔

فریال نے کہا۔ ''ایسی صورت میں تو یہ لوگ شیر ہو جائیں گے۔''

''ہاں...... لیکن مایوس ہونے کی ضرورت نہیں...... جب قانون کام نہیں آتا تو لوگ مجبوراً لاقانونیت کا سہارا لیتے ہیں...... ذاتی اثر ورسوخ...... رشوت...... کسی طاقتور کی حمایت...... ان سے مسئلہ حل ہوتا ہے...... سب جانتے ہیں کہ تھانہ کچہری میں خواری ہے...... خرچہ ہے اور خطرہ ہے...... کراچی اور ممبئی جیسے شہروں میں انڈر ورلڈ کی مافیا ہے...... ڈان ہیں اور دادا ہیں...... وہ ہر کام کرا دیتے ہیں...... لوگ سیاسی تنظیموں کے پاس جاتے ہیں...... ان کی کوئی نہ کوئی طلبہ تنظیم درحقیقت مسلح قوت ہوتی ہے...... یونیفارم والے قانون سے بالاتر ہو کے کام کرتے ہیں۔''

''ہم کیا کریں؟'' شہناز نے جھلا کے کہا۔

''ہم بھی یہی کریں گے خاتون...... روم میں وہی کرو جو رومن کرتے ہیں۔'' راجا بولا۔ ''میں کوشش کر کے دیکھتا ہوں...... اگر افسران بالا مدد کرتے ہیں تو ٹھیک...... ورنہ ایس او ایس بھیجتے ہیں شاہی بادشاہ کو...... جو لوگ آج پکڑے نہیں گئے...... کل وہ زیادہ خطرناک ہو جائیں گے...... سیاں بنے کوتوال اب ڈر کا ہے کا...... پولیس بھی ان کی حمایت کرے گی تو ہم کس کا سہارا لیں گے۔''

فریال نے کہا۔ ''شاہی بادشاہ تک ایس او ایس کیسے ارسال ہوگا؟''

''اس کا نمائندہ خصوصی ہے یہاں...... اس مجذوب کو تلاش کرنا پڑے گا...... آج تک ایسا نہیں ہوا کہ جو پیغام بھیجا گیا ہو وہ نہ ملا ہو۔''

راجا نے رات کو ادھر ادھر بہت سے ٹیلی فون کیے جن سے کچھ امید پیدا ہوئی لیکن ہر بڑے افسر کی تان یہیں آ کے ٹوٹتی تھی کہ وہ خود تو ست بدھائی آ کے ملزمان کی تلاش اور گرفتاری کے آپریشن کی نگرانی نہیں کر سکتے...... یہ کام بہرحال تھانے والے ہی کریں گے...... سب نے زبانی کلامی یقین ضرور دلایا کہ ایس ایچ او کو سختی سے تاکید کی جائے گی کہ وہ ذاتی دلچسپی لے۔ راجا نے اپنے ساتھی اخبار نویسوں سے بھی کہا کہ وہ ایس ایچ او پر دباؤ بڑھانے کے لیے اس کے خلاف کچھ مواد اکٹھا کریں تاکہ اس کی جگہ کسی دوسرے تھانیدار کی پوسٹنگ ہو...... لیکن سارا مسئلہ نظام کی خرابی کا تھا...... ایک کی جگہ دوسرے ایس ایچ او کے آنے سے کیا فرق پڑ سکتا تھا۔

صبح میں نے غنی کے ساتھ سیکورٹی انتظامات کا معائنہ کیا...... اس کا اصرار تھا کہ مجھے کبھی کبھی ایسا کرنا چاہیے...... اس سے گارڈ بھی چوکس رہتے ہیں اور کہیں کوئی خامی ہو تو سامنے آ جاتی ہے...... انتظامات سب ٹھیک تھے۔ محاورے کے مطابق اندر اب چڑیا کا بچہ بھی بلا اجازت پر نہیں مار سکتا تھا...... اصل خطرہ باہر تھا اور یہ ناممکن تھا کہ حویلی سے جو نکلے اس کے آگے پیچھے صدر مملکت جیسا حفاظتی بندوبست ہو...... بکتر بند گاڑیاں اور مسلح محافظ ہوں اور پولیس اسکواڈ ہو۔

غنی نے میری خواہش پر اس سیکیورٹی گارڈ کو پیش کر دیا جو شاہی بادشاہ سے رابطہ رکھنے والے مجذوب کا عقیدت مند تھا۔ میں نے اس کی ڈیوٹی لگائی کہ جیسے بھی ہو، وہ اس مجذوب کو تلاش کرے اور اس کے ذریعے شاہی بادشاہ کو پیغام پہنچائے کہ نواب صاحب اس سے ملنا چاہتے ہیں...... گارڈ نے کہا کہ وہ پوری کوشش کرے گا لیکن کوئی وعدہ نہیں کر سکتا...... مجذوب آج نہ جانے کہاں ملے......

صبح ناشتے کی میز پر شہناز کے علاوہ ریشم کا مورال بہت ڈاؤن تھا...... ان کا جذبہ خدمت خلق شکست سے دوچار ہوا اور وہ بہت مایوس تھیں...... لیکن پھر ایک اچھی خبر ملی...... راجا کو اس کے آفس سے فون موصول ہوا کہ دیہی علاقوں میں سرکاری ڈسپنسریوں کی حالت زار پر فیچر شائع ہو گیا ہے جس میں اس ڈسپنسری کے احوال کی نمایاں جگہ دی گئی ہے جس کو لاوارث سمجھتے ہوئے ایک پیر نے کئی سال سے آستانہ بنا لیا ہے...... یہ فیچر ایک انگلش اخبار کی زینت بنا تھا جس کی سرکولیشن بہت زیادہ تھی...... اس سے زیادہ اہم یہ بات تھی کہ انگلش اخبار کو عوام نہیں خواص پڑھتے تھے...... جو اعلیٰ حکام خود باخبر رہنا پسند کرتے تھے، وہ اسی اخبار کی رپورٹنگ پر انحصار کرتے تھے اور ملک کے حکمرانوں کو دی جانے والی رپورٹیں بھی عموماً اسی اخبار کی خبروں کو بنیاد بنا کے تیار ہوتی تھیں...... چنانچہ اب کارروائی ناگزیر نظر آتی تھی۔

راجا کا خیال تھا کہ کارروائی ایک دو روز میں ہوگی لیکن محکمہ صحت کے حکام نے معمولی مستعدی کا مظاہرہ کیا...... دوپہر کے بعد ہمیں یہ اطلاع ملی کہ شہر سے آنے والی پولیس فورس نے آستانے کا محاصرہ کر لیا ہے اور اردگرد کے دیہات سے سیکڑوں جاہل عقیدت مند اس جعلی پیر کی حمایت میں مظاہرہ کرنے جمع ہو گئے ہیں......

شہناز سے زیادہ فریال اس کارروائی کو بچشم خود ملاحظہ فرمانا چاہتی تھی مگر انہیں ایسی جگہ لے جانا مناسب نہیں تھا جہاں پولیس ایکشن میں لاٹھی چارج یا شیلنگ کا امکان ہو...... اس کے لیے یہ ایک دلچسپ، سنسنی خیز اور انوکھا تماشا تھا......

''یار زندگی میں یہ تماشا پھر دیکھنے کو کہاں ملے گا...... ایک جعلی پیر کو ہتھکڑیاں لگائی جائیں اور آستانہ مبارک سے بے دخل کیا جائے۔''

میں نے کہا۔ ''بقول شاعر...... تماشا خود نہ بن جانا تماشا دیکھنے والے...... کوئی گولہ آپ کے قدموں میں آ گرا تو کیا ہوگا؟''

فریال بولی۔ ''وہی جو فلموں میں ہوتا ہے...... ہیرو اسے اُٹھا کے واپس پھینک دے گا آخر ہیروئن کو بچانا کس کا فرض ہے۔''

''معاف فرمایئے خاتون...... نہ میں ہیرو ہوں، نہ آپ ہیروئن۔''

فریال نے شہناز کو اُکسایا۔ ''یار تم بھی تو بولو۔''

''نا بھئی...... مجھے ڈر لگتا ہے۔''

اچانک راجا کو جوش آ گیا...... ''اچھا چلو یار...... ڈرنے کی کوئی بات نہیں...... ہم بیچ میں نہیں گھسیں گے...... دور سے تماشا دیکھیں گے۔''

اس کے بعد میں کیا کرتا...... ہم اسی گاڑی میں گئے جو گردونواح میں ڈاکٹر صاحب کی گاڑی کہلاتی تھی...... اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ میری گاڑی غنی لے کر شہر گیا تھا...... روزمرہ کی ضروریات کے لیے ایک چکر شہر کا لگانا اس کا معمول تھا عام طور پر وہ جیپ لے جاتا تھا لیکن کسی خرابی کی وجہ سے جیپ اسٹارٹ نہیں ہو رہی تھی۔

ابھی ہم اس ڈسپنسری یا جعلی پیر کے آستانے سے ایک کلو میٹر دور تھے کہ میں نے پہلا فائر سنا...... یہ پولیس کے آنسو گیس کے شیل کا فائر تھا...... پھر مسلسل فائر ہونے لگے لیکن ابھی ہم خطرے کی حدود سے بہت دور تھے...... راجا آگے بڑھتا گیا...... اسے ایک صحافی کی حیثیت سے اپنی ذمے داری بہرحال پوری کرنی تھی اور اس سارے واقعے کی رپورٹ حاصل کرنا اس کے کالم میں تبصرے کے لیے ضروری تھا۔

ہم دو سو میٹر دور ہوں گے جب ہم نے لوگوں کی چیخ پکار سنی۔ ظاہر ہے دیہات کے مرید پولیس کارروائی کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے...... وہ منتشر ہو رہے تھے اور جان بچا کے بھاگ رہے تھے...... جب ہوا کے ساتھ آنسو گیس کی جلن مجھے اپنی آنکھوں میں محسوس ہوئی تو میں نے راجا سے گاڑی روکنے کے لیے کہا۔

راجا نے گاڑی روک لی۔ ''مجھے تو آگے جانا ہوگا۔''

شہناز نے کہا۔ ''کوئی ضرورت نہیں...... جو ہوگا ویسے ہی معلوم ہو جائے گا۔''

اب آنسو فریال کی آنکھوں سے بھی بہہ رہے تھے...... میں نے پانی کی بوتل نکالی جو ریڈی ایٹر میں ضرورت کے وقت پانی کی کمی پوری کرنے کے لیے رکھی رہتی تھی...... اس سے خواتین نے اپنے دوپٹوں کے پلو گیلے کیے اور آنکھوں پر رکھے۔

میں نے فریال سے کہا۔ ''اب کیا خیال ہے۔''

''میں چلوں گی تمہارے ساتھ...... اتنی تکلیف برداشت کی جا سکتی ہے۔'' اس نے بہادر بن کے کہا۔

چند منٹ میں آنسو گیس کا اثر تو ختم ہو گیا مگر ایک نئی اور خطرناک بات یہ ہوئی کہ گولیاں چلنے لگیں...... اتنی دور سے یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ پہلا فائر کس نے کیا تھا اور اب مقابلہ کس کے درمیان ہو رہا ہے...... بظاہر پولیس کے لیے اس صورتِ حال کو کنٹرول کرنا بہت آسان تھا...... یہ شہر میں ہونے والا کوئی مظاہرہ نہیں تھا کہ حالات قابو سے باہر ہو جاتے...... عام دیہاتی کے پاس نہ اسلحہ تھا نہ مقابلے کی ہمت لیکن فائرنگ جاری تھی...... کوئی جوابی فائرنگ ضرور کر رہا تھا...... میرے خیال میں یہ وہی مخالف شرپسند عناصر ہو سکتے تھے جنہوں نے ڈاکٹر شہناز کے خلاف مہم چلا رکھی تھی۔

خواتین اب گھبراہٹ اور بدحواسی کا شکار تھیں...... وہ نہ خود آگے جانا چاہتی تھیں اور نہ ہمیں اجازت دے رہی تھیں کہ ہم کوئی رسک لیں۔

اچانک شور بہت قریب سے سنائی دیا...... پھر دس بارہ افراد درختوں کے پیچھے سے نمودار ہوئے...... ان سب کے

ہاتھ میں لاٹھیاں تھیں اور کلہاڑیاں...... پگڑی والا ایک باریش شخص انہیں روک رہا تھا اور چلا رہا تھا...... ''اوئے بے غیرتو...... بزدلو...... رُک جاؤ......'' پھر اس نے نعرہ تکبیر بلند کیا۔

جان بچا کر بھاگنے والے رُک گئے...... نعرہ لگانے والے نے چیخ کے کہا۔ ''اوئے آج اللہ نے تمہیں موقع دیا ہے جام شہادت نوش کرنے کا...... پیر صاحب پر اپنی جان قربان کر دو اور جنت میں جگہ بنالو...... اور تم بھاگ رہے ہو۔''

پھر اچانک اس نے ہمیں دیکھ لیا حالانکہ ہم درختوں کی پناہ میں تھے مگر گاڑی اس کے سامنے تھی اور اسے وہ پہچانتا تھا...... اس نے یکلخت اپنی اشتعال انگیزی کا رُخ بدل دیا...... ''اوئے دیکھو یہ اسی کافر لیڈی ڈاکٹر کی گاڑی ہے...... یہ اسی کا پھیلایا ہوا فساد ہے...... اسی نے گاؤں کے معزز لوگوں کے خلاف رپورٹ لکھوائی تھی...... جانے مت دو اسے......''

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی راجا نے شہناز اور فریال کو پیچھے کھینچ لیا تھا اور وہ درختوں کی آڑ میں تیزی سے واپس بھاگ رہے تھے...... دس بارہ افراد لاٹھی لے کر گاڑی کی طرف لپکے تو میں نے ریوالور نکالا اور سامنے آ گیا...... میرے پہلے فائر نے ہی حملہ آوروں کو پلٹ کر بھاگنے پر مجبور کر دیا...... لیکن بدقسمتی سے ان کی قیادت کرنے والا جوش جذبات میں بہت آگے آ چکا تھا...... میرا مقصد کسی کو نشانہ بنانا ہرگز نہ تھا اور احتیاط کے تقاضے کو ملحوظ رکھتے ہوئے میں نے رُخ نیچے رکھا تھا...... پولیس کو بھی ہدایات یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنے دفاع میں فائرنگ کریں تو حملہ آوروں کے پیروں کو نشانہ بنائیں۔

گولی اس کی پنڈلی پر لگی...... اس نے ایک چیخ یا نعرہ بلند کیا۔ ''اللہ......'' اُوپر اُچھلا اور دھپ سے زمین پر گر کے اور اپنی ٹانگ کو پکڑ کے چلانے لگا۔ ''ارے مار دیا...... قتل کر دیا......'' لیکن بھاگنے والے نہیں رُکے۔

میں نے قریب جا کے کہا۔ ''کلمہ پڑھو...... تم شہادت کے منصب پر فائز ہونے والے ہو۔'' اور اس کے سر کا نشانہ لیا۔

وہ کتے کی طرح میرے پیروں میں لوٹنے لگا...... اس کی پگڑی کھل کے گر گئی...... ''اللہ کے لیے...... رسول کے لیے...... مجھے معاف کر دو۔''

میں نے اس کے ایک ٹھوکر رسید کی تو وہ بلبلایا...... ''مجھ سے بڑی غلطی ہوئی...... میں تمہارا گنہگار ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''اٹھو اور آگے چلو۔''

''ارے ظالم میں چل نہیں سکتا۔'' اس نے اپنی ٹانگ کو دیکھا جس سے خون بہہ رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ''چاروں ہاتھوں پیروں پر چلو۔'' میں نے اس کے ایک اور لات رسید کی۔

''اچھا...... اچھا...... پٹی تو باندھ لوں۔'' اس نے اپنی پگڑی کو پھاڑ کے زخم پر لپیٹا اور لنگڑاتا ہوا چلنے لگا۔

آستانہ مبارک کے سامنے اب کوئی مظاہرہ کرنے والا نہیں رہا تھا...... پولیس نے دس پندرہ بے وقوفوں کو پکڑ رکھا تھا جو دوڑ لگانے میں آگئے تھے اور بھاگ نہیں پائے تھے...... پولیس کی نفری ایک جیپ اور ایک ٹرک میں آئی تھی...... جیپ میں وہی اے ایس پی تھا جس نے گزشتہ شب میرا بیان لیا تھا...... اس کے ساتھ تھانیدار صاحب کو آنا پڑا تھا...... ڈسپنسری پر سے جعلی پیر کا قبضہ ختم کرانے کی کارروائی ختم ہونے کے بعد مقدمہ درج کرنے اور گرفتار ہونے والوں کو اپنی تحویل میں رکھنے کی ذمے داری اسی کی تھی۔

اے ایس پی نے متانت اور خوش اخلاقی سے میرا استقبال کیا۔ ''یہ آپ کے پکڑ لائے نواب صاحب...... ہم اسی کو تلاش کر رہے تھے۔''

نواب صاحب کا لفظ سن کر وہ چونکا۔ میں نے اسے دھکیل کر آگے کر دیا۔ ''اس نے دس بارہ افراد کو مجھ پر حملے کے لیے اکسایا تھا۔''

''یہی تو ہے اصل سرغنہ شرپسندوں کا۔'' اے ایس پی نے کہا۔ ''سب سے زیادہ یہی ورغلا رہا تھا لوگوں کو۔''

میں نے کہا۔ ''سب سے پہلے بھاگنے والا بھی یہی ہوگا۔''

''صحافت کا یہ کارنامہ سرانجام دینے والے آپ کے دوست کہاں ہیں؟ نظر نہیں آئے مجھے۔''

میں نے کہا۔ ''اس کارنامے سے ان کا کوئی تعلق نہیں...... یہ بتایئے پیر صاحب کہاں ہیں۔''

''انہیں ہم نے پہلے ہی تھانے روانہ کر دیا تھا...... بہت گرج برس رہا تھا خبیث کہ یہ کر دوں گا وہ کر دوں گا...... مجھے احکامات ملے کہ ابھی اور فوری کارروائی کرنی ہے...... میں کسی کو بتائے بغیر اپنی نفری کے ساتھ اچانک پہنچ گیا تھا...... معلوم نہیں خبر کیسے پہلے پہنچ گئی...... مجھے اس عوامی ردِعمل کی توقع نہیں تھی...... یہ خیال تھا کہ خاموشی سے کارروائی کریں گے اور پیر کو اٹھا کر لے جائیں گے۔'' اے ایس پی نے کہا۔

میں نے کہا۔ ''ایسا ہی اتفاق کل بھی ہوا...... میں نے کچھ لوگوں کے خلاف رپورٹ لکھوائی تھی...... پولیس کے پہنچنے سے پہلے ہی وہ سب مفرور ہو گئے...... ایک بھی پکڑا نہیں گیا...... ہاں دو بے گناہوں کو ضرور پکڑ لائے تھے اپنے تھانیدار صاحب...... ان کا گناہ صرف یہ تھا کہ ان کے نام دو ملزموں کے نام جیسے تھے...... ولدیت الگ تھی۔''

اے ایس پی نے مڑ کر تھانیدار کو دیکھا۔ ''یہ کیا معاملہ ہے؟''

اسی وقت راجا گاڑی چلاتا ہوا نمودار ہوا...... فائرنگ ہوئی تو وہ فریال اور شہناز کو لے کر پیچھے چلا گیا تھا...... حالات معمول پر آئے تو وہ ان کے ساتھ جائے واردات پر پہنچ گیا...... اب تھانیدار کے لیے ادھر ادھر کی ہانکنے کی گنجائش نہ تھی...... خود شہناز نے پوری صورت حال سمجھا دی تو اے ایس پی کا موڈ خراب ہو گیا...... اس نے چوبیس گھنٹے کے اندر اندر تمام نامزد ملزمان کی گرفتاری کے احکامات جاری کیے۔

''یہ تو بڑا مشکل ہے سر...... یہاں ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں جانے کے لیے بھی نہ سواری ملتی ہے نہ کوئی سہولت...... ملزمان پتا نہیں کہاں روپوش ہیں...... اس کے علاوہ وہ سب علاقے کے معززین ہیں۔''

اے ایس پی گرم ہو گیا...... ''تم ایسے بدمعاشوں کو معززین میں شمار کرتے ہو...... یہ اتائی...... نیم حکیم...... عامل اور جعلساز...... لوگوں کو دھوکا دینے والے اور ان کی جان کے دشمن...... دیکھو...... تم وہی کرو جو کرتے ہو...... ہر مفرور کے گھر سے کسی بندے کو اٹھالو...... بھائی کو باپ کو۔''

تھانیدار نے حیران نظر آنے کی کوشش کی۔ ''آپ کا مطلب ہے بے گناہوں کو......''

''انچارج صاحب...... ایک سال ہو گیا مجھے نوکری کرتے...... پندرہ بیس تھانے دیکھ چکا ہوں...... مجھے معلوم ہے کہ پکڑے بے گناہ ہی جاتے ہیں اور مفرور مجرم خود حاضر ہو جاتے ہیں اگر ان کے بیوی بچے اٹھا لیے جائیں...... ایسا سب تھانوں میں ہو رہا ہے...... میں کل دوپہر تک سارے نامزد ملزمان کو حوالات میں دیکھنا چاہتا ہوں...... یہ میرا حکم ہے...... اگر تعمیل نہ ہوئی تو مجھے تمہاری جگہ کسی اور کو لانا پڑے گا جو عذر نہ پیش کرے...... کام کرے...... کیا میری بات تمہاری

سمجھ میں آ گئی ہے؟"

"یس سر......" تھانیدار نے مردہ لہجے میں کہا۔

"نواب صاحب...... میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں...... کیا آپ کے پاس میری بات سننے کے لیے وقت ہے؟" اے ایس پی بولا۔

"کیوں نہیں۔"

"تو پھر آئیے میرے ساتھ...... میرا ڈرائیور آپ کو حویلی پہنچا دے گا۔" اس نے راجا سے ہاتھ ملایا اور جیپ میں بیٹھ گیا...... جیپ کو اس کا ڈرائیور چلا رہا تھا...... گن مین جو پہلے پیچھے بیٹھا تھا اب آگے چلا گیا...... پیچھے کی سیٹ پر میں اے ایس پی کے ساتھ بیٹھ گیا۔

"نواب صاحب......" اے ایس پی نے کسی تمہید کے بغیر کہنا شروع کیا" ...... میری بات کو آپ ایک مخلصانہ مشورہ سمجھیں تو اچھا ہے۔"

میں نے کہا۔" مجھے آپ کے خلوص پر بھروسا ہے۔"

"دیکھیے ...... میری نوکری ابھی شروع ہوئی ہے...... میں آج یہاں ہوں کل کہیں اور چلا جاؤں گا...... آپ کو یہاں رہنا ہے...... انہی لوگوں کے درمیان......"

جو کچھ اس نے کہا اس کا لب لباب یہ تھا کہ میں اس علاقے میں اپنے ترقیاتی پروگرام کو اس وقت تک عملی جامہ نہیں پہنا سکتا جب تک مجھے یہاں لوگوں کی تائید و حمایت حاصل نہ ہو اور یہاں کے سادہ لوح جاہل اور غریب لوگ انہی لوگوں کے کہنے پر چلتے ہیں جن کے خلاف میں نے محاذ آرائی شروع کر دی ہے۔

"کچھ چالاک لوگ یہاں سرپنچ شمار ہوتے ہیں...... لوگ ان کے چنگل میں ہیں...... وہ لوگوں کا استحصال کرتے ہیں لیکن آپ کچھ نہیں کر سکتے...... آپ استحصال کرنے والوں سے لڑ کے یا ان کے خلاف طاقت استعمال کر کے عوامی حمایت حاصل نہیں کر سکتے...... آپ کا ترقیاتی پروگرام لاکھ اچھا ہو...... کامیابی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اسے قبولیت عامہ کی سند حاصل نہ ہو...... اور یہ کام بہت آسان ہے اگر آپ ان سب کو اپنے ساتھ ملا لیں جو رائے عامہ کی قیادت کرتے ہیں...... یہ چند لوگ ہوں گے...... ان کے ساتھ مل کر سیاسی کنٹرول حاصل کیجیے...... آپ تعلیم یافتہ ہیں...... ذہین ہیں اور دولت مند ہیں...... لوگوں کی وفاداریاں کیسے خریدی یا حاصل کی جا سکتی ہیں...... یہ سوچنا آپ کا کام ہے۔"

اے ایس پی کی بات میرے دل میں اُتر گئی...... ا[illegible] نے مجھے مختصر الفاظ میں سمجھا دیا تھا کہ سیاست سے کام [illegible] بغیر نیکی اور فلاح کے کام نہیں کیے جا سکتے...... سیاست کا نا[illegible] بدنام اس لیے ہے کہ سیاست میں سب جائز ہو گیا ہے...... جھوٹ، فریب، لالچ...... اصولوں سے انحراف...... اخلا[illegible] سے روگردانی...... مطلب پرستی...... خود غرضی...... مگر زمانے[illegible] یہی چلن ہے تو آپ کی چال بھی یہی ہونا چاہیے۔

واپس آنے کے بعد میں نے جتنا اے ایس پی کی بات [illegible] پر غور کیا اتنا اسے حقیقت کے قریب پایا...... مجھے اپنی پالیسی [illegible] نظر ثانی کی ضرورت تھی...... سوال یہ تھا کہ کیسے......؟ مجھے [illegible] کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے...... جب میں واپس [illegible] تو راجا پریشانی کے عالم میں باہر ٹہل رہا تھا۔

میں نے کہا۔" تجھے کیا ہوا ہے بھائی؟"

"یار وہ شہناز نکل گئی۔"

میں نے کہا۔" تجھے چھوڑ کے نکل گئی...... کس [illegible] ساتھ؟"

"وہ نکل گئی کیس کرنے...... کسی کا فون آیا تھا کہ میر[illegible] بیوی تڑپ رہی ہے...... اس کے بچہ ہونے والا ہے...... دا[illegible] نے بڑی کوشش کی مگر اب وہ کہتی ہے کہ ڈاکٹر کو بلا لو ورنہ یہ [illegible] جائے گی...... اس نے ڈرائیور کو ساتھ لیا اور چلی گئی...... مجھے [illegible] بھی بعد میں پتا چلا۔"

"ان حالات میں اسے جانا تو نہیں چاہیے تھا...... لیکن [illegible] وہ بہر حال ایک ڈاکٹر ہے...... کیسے نہ جاتی۔"

راجا نے خفگی سے کہا۔" یار کچھ بتا کے جاتی...... میں بھ[illegible] ساتھ چلا جاتا...... میں بیٹھا تھا اباجی کے پاس...... وہ پو[illegible] رہے تھے کہ کس چکر میں پڑے ہوئے ہو تم لوگ۔"

میں نے کہا۔" فون پر نہیں پوچھا۔"

"جلدی میں فون چھوڑ گئی ہے...... بے وقوف...... اب بتاؤ ہم کہاں تلاش کریں۔" راجا نے غصے میں کہا۔

شام تک شہناز کا کہیں پتا نہ تھا...... میں نے راجا کو بہ[illegible] تسلی دی اور فریال نے بھی سمجھایا کہ ڈلیوری کیس میں ٹائم لگ[illegible] ہے مگر اندر سے خود ہمارے دل کی کیا حالت تھی...... یہ ہم [illegible] جانتے تھے۔

رات کا اندھیرا پھیل گیا تھا جب ریشم گھبرائی ہوئی آئی۔

اس کی صورت پر عیاں وحشت کے آثار کسی بڑی پریشانی کی علامت تھے۔ وہ عام حالات میں چھوٹی موٹی خرابی سے متاثر نہ ہونے والی بے فکری اور کھلنڈری سی لڑکی تھی۔ کسی حد تک ڈھیٹ سمجھی جانے والی...... جو ہر وقت ہنستی کھیلتی اور موج مستی میں مگن دکھائی دیتی تھی۔

"صاحب جی میڈم ابھی تک نہیں آئیں؟" اس نے قریب آ کے سوالیہ انداز میں کہا۔

میں نے کہا۔" تمہیں کچھ معلوم ہے وہ کہاں گئی ہیں؟"

"نہیں جی۔"

راجا نے خفگی سے کہا۔" کیوں نہیں معلوم...... ہر جگہ تم ان کے ساتھ جاتی ہو...... آج کیا ہو گیا تھا۔"

وہ گھبرا گئی۔" سر مجھے پتا نہیں چلا۔"

"اب بتاؤ ہم اسے کہاں جا کے تلاش کریں......" راجا کی خفگی میں اضافہ ہو گیا۔" عجیب بے وقوف لڑکی ہے۔"

میں نے کہا۔" اس بے چاری کا تو کوئی قصور نہیں...... ریشم...... تمہیں کچھ اندازہ ہے...... تم ہر جگہ شہناز کے ساتھ جاتی رہی ہو...... ڈلیوری کہاں متوقع تھی آج۔"

اس نے کچھ دیر سوچا۔" مجھے...... اندازہ نہیں۔"

راجا نے دھاڑ کر کہا۔" کیوں اندازہ نہیں؟"

وہ ڈر گئی۔" بہت سی جگہ ایسا تھی سر...... ڈلیوری کا وقت قریب تھا...... مگر صحیح تاریخ کا علم تو خدا کے سوا کسی کو نہیں ہوتا۔"

میں نے کہا۔" ٹھیک کہا تم نے...... لیکن ڈاکٹر بھی مریض کو دیکھ کر اپنے اندازے سے ایک تاریخ بتاتی ہے...... عام طور پر وہ غلط نہیں ہوتی، فرق ہوتا ہے تو بس ایک دو دن کا...... تم میری بات سمجھ رہی ہو نا؟"

اس نے گھڑے جیسا سر ہلایا۔

"جب وہ معائنہ کرتی تھیں تو تم بھی قریب ہوتی تھیں۔ ان کی مدد کے لیے...... اب یاد کرو وہ کیس جہاں ڈلیوری کا دن بہت قریب تھا۔"

اس نے پہلے چھ سات بتائے...... پھر تین پر آ گئی۔ اس کے خیال میں ڈاکٹر شہناز نے سب کو تیار رہنے کے لیے کہا تھا اور کچھ سامان بھی دیا تھا کہ ضرورت پڑنے پر کام آئے۔ انکار کا سوال ہی نہ تھا۔ وہ میرے اور راجا کے ساتھ جانے کے لیے گاڑی میں آگے بیٹھ گئی۔ ڈرائیونگ غنی نے سنبھالی۔

ہم سب مسلح تھے اور ہمارے پاس ایک سرچ لائٹ بھی تھی جو کار بیٹری سے منسلک کی جا سکتی تھی۔ یہ سرچ لائٹ سامنے [illegible] ہر جگہ پر ایک کلو میٹر تک روشنی پھیلاتی تھی مگر یہاں گھنے جنگل میں درخت تھے جو روشنی کو سو میٹر تک محدود کر رہے تھے۔ ریشم کی رہنمائی میں غنی ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ راجا اور میں سرچ لائٹ سے دائیں بائیں کے علاقے کا جائزہ لیتے جا رہے تھے۔

یہاں کوئی باقاعدہ سڑک نہیں تھی لیکن گھوڑے والی سواریوں اور بیل گاڑیوں کے آنے جانے سے چھ سات فٹ چوڑا کچا راستہ بن گیا تھا جس پر عام دنوں میں کار کے گزرنے سے غبار اٹھتا تھا مگر گزشتہ روز کی بارش نے گرد کو کیچڑ بنا دیا تھا اور اس میں تانگے کے گزرنے سے نالیاں سی وجود میں آ گئی تھیں...... ہماری گاڑی انہی نالیوں پر جھٹکے لیتی آگے بڑھ رہی تھی۔

پہلا کیس دو کلو میٹر دور ایک گاؤں کا تھا مگر وہاں پہنچ کے ہمیں مایوسی ہوئی۔ خاتون ہنوز بارِ ولادت اٹھائے پھر رہی تھیں اور سارا گھر نومولود کے لیے چشم براہ تھا کیونکہ پیر صاحب اپنے روحانی ذرائع سے یہ انکشاف فرما چکے تھے کہ ان کی دعا کو اللہ نے شرفِ قبولیت عطا کرتے ہوئے اس بار اولادِ نرینہ عطا کرنے کا حکم صادر فرما دیا ہے۔ عورت اس سے پہلے چار بیٹیاں پیدا کر چکی تھی اور اسے ساس کی طرف سے الٹی میٹم مل چکا تھا کہ اگلی بار بیٹا نہ دیا تو وہ اپنے بیٹے کے لیے بیٹا پیدا کرنے والی دوسری بہو لے آئے گی...... کس کی گارنٹی پر؟ اس سوال کا جواب ساس گالیوں اور کوسنوں کی صورت میں دیتی تھی۔

یہ دیہات کا عام ڈراما تھا۔ اولادِ نرینہ کی دعا یا دوا دینے والا ففٹی ففٹی چانس کے اصول پر پیش گوئی کرتا تھا۔ لڑکا نہ ہو تو مجرم عورت...... ہو جائے تو کارنامہ پیر صاحب کا۔ اور پیر صاحب وہی تھے جو سرکاری ڈسپنسری سے بڑے بے آبرو کر کے نکالے گئے تھے اور اس وقت غالباً سرکاری مہمان خانے میں جوتے نوش فرما رہے تھے لیکن اس قانونی کارروائی سے عوام میں غم و غصہ ضرور پایا جاتا تھا۔ ان کی شہرت اور عقیدت مندی کے جذبات میں زیادہ کمی نہیں آئی تھی۔

شہناز نے ایک بار اس کا توڑ یہ تجویز کیا تھا کہ وہ جدید قسم کی پورٹیبل الٹراسونک مشین لے آئے گی اور پیر صاحب سے پہلے مریضوں کو سو فیصد یقین کے ساتھ بتا دے گی کہ انہیں لڑکے کی امید رکھنی چاہیے یا لڑکی کی۔ راجا نے اس کی سخت مخالفت کی تھی۔ اس نے انڈیا کے دیہات میں اور پسماندہ علاقوں میں دختر کشی کے بڑھتے ہوئے واقعات پر مبنی ایک فیچر دکھایا تھا۔ اس میں یہی بتایا گیا تھا کہ اتائی اور اناڑی ڈاکٹر الٹراسانک مشین لے کر گاؤں گاؤں پھرتے تھے اور

حاملہ عورتوں کو بتا دیتے تھے کہ وہ لڑکا جنیں گی یا لڑکی۔ لڑکے کی خبر ملے تو خوشی منائی جاتی تھی مگر اکثر لڑکی پیدا ہونے کی اطلاع پر عورت رونے پیٹنے لگتی تھی کہ ایک اور لڑکی اس کا مستقبل تاریک کر دے گی۔ شوہر نکال باہر کرے گا یا دوسری لے آئے گا۔ خود شوہر ایسی بری خبر سن کے غصے میں آپے سے باہر ہو جاتے تھے اور یہ خواہش کرتے تھے کہ لڑکی ہے تو اسے ختم کر دیا جائے۔ بعض اوقات یہ ممکن نہیں ہوتا تھا اور ڈاکٹر صاف بتا دیتے تھے کہ اس عرصے میں ابارشن سے عورت کی جان جا سکتی ہے مگر ان کے انکار سے فرق نہیں پڑتا تھا۔ ہر علاقے میں اناڑی دائیاں اور خود ساختہ ماہرین اپنے طریقے آزماتے تھے اور لڑکیوں کو پیدا ہونے سے پہلے ہی مار دیا جاتا تھا۔ کبھی بیٹی کے ساتھ ماں بھی مر جائے تو یہ بھگوان کی مرضی۔

اگرچہ اسلام نے اس قابلِ مذمت قبیح سوچ کا خاتمہ کر دیا تھا مگر ہندوستان میں ہندوؤں کے ساتھ رہنے سے مسلمانوں میں بھی یہ سوچ آگئی تھی کہ بیٹا باعث برکت ہوتا ہے اور بیٹی نحوست۔ اصل وجہ یہ تھی کہ بیٹا کما کے لا سکتا تھا جبکہ بیٹی محض خرچا بڑھاتی تھی چنانچہ کسی حد تک بعض علاقوں میں بیٹی کی پیدائش آج بھی عورت کا جرم سمجھی جا رہی تھی اور سائنس کی ایک مفید ایجاد کہیں کہیں غیر قانونی طور پر بیٹی کی صورت میں اسقاط کرانے میں کام آ رہی تھی۔

بعد میں ایک مرتبہ شہناز نے کہا تھا کہ اس طرح وہ ایک کام ضرور کر سکتی ہے...... پیر صاحب کی نیک نامی کو خاک میں ملا سکتی ہے یہ بتا سکتی ہے کہ پیر صاحب بکواس فرماتے ہیں...... لڑکا نہیں اس بار لڑکی ہوگی۔ پیر صاحب جتنا زور چاہیں لگا لیں...... مولوی صاحب کے دم درود اور تعویذ بھی کچھ کام نہیں آ سکتے۔

دوسرے گاؤں جاتے ہوئے مجھے یہ بات اس لیے یاد آئی کہ اپنی اپنی پریشانی میں ہم سب خاموش تھے اور اپنے اپنے خیالات کے گرداب میں غوطہ زن صرف شہناز کے بارے میں سوچ رہے تھے۔

نہ جانے کیوں ہم سب ایک انجانے خوف کا شکار تھے۔ اگرچہ یہ بات اپنی زبان سے کہتے ہوئے سب ڈرتے تھے مگر لگتا کچھ یہی تھا کہ شہناز کسی حادثے یا سازش کا شکار ہوئی ہے...... بے شک یہ اس کی بے احتیاطی یا عجلت پسندی تھی کہ اس نے کسی کو نہیں بتایا اور کسی کو ساتھ نہیں لیا...... مزید یہ کہ موبائل فون تک ساتھ نہیں لے گئی کہ رابطہ رہتا۔

دوسرے گاؤں میں صورتِ حال مختلف نہ تھی۔ مریضہ کے بجائے اس کی ساس برآمد ہوئی اور بک بک کرنے لگی کہ ابھی تک منحوس پھر رہی ہے پیٹ پھلائے۔ نہ منڈا [illegible] گڑی...... پہلے کی طرح پھر جنم دے گی اپنے جیسی [illegible] نحوست...... چار کیا کم ہیں...... جب ہم چلنے لگے تو اس [illegible] اپنے بیٹے سے چیخ پکار جاری تھی...... ماں اس ناخلف [illegible] ناراض تھی کہ وہ بیٹا جننے والی دوسری لانے پر کیوں راضی [illegible] ہوتا اور بیٹا کچھ سمجھدار تھا کہ الٹا ماں کو سمجھا رہا تھا کہ رب [illegible] مرضی ہوگی تو یہی بیٹا جن دے گی ورنہ دوسری نے بھی بیٹیوں [illegible] کی لائن لگا دی تو......

یہ سخت افسوسناک صورتِ حال تھی مگر ہم اپنی ہی پریشانی کا شکار تھے۔ اگلے دو گھنٹے میں ہم نے گردونواح کے چار پانچ گاؤں دیکھ لیے جہاں ریشم کے خیال میں یوم ولادت قریب تھا مگر ہمیں ہر جگہ مایوسی کا سامنا رہا۔ ریشم کی نشاندہی غلط نہ تھی...... بلکہ ایک جگہ تو درست ثابت ہوگئی جہاں [illegible] پیدائش کا وقت آگیا تھا اس کی بشارت پیر صاحب کو [illegible] تھی...... اب انہیں ڈاکٹر کی ضرورت تھی مگر ڈاکٹر دستیاب [illegible] تھی ڈاکٹر کی نائب کو دیکھتے ہی وہاں سنسنی پھیل گئی۔

جوشیلا شوہر دوڑتا ہوا آیا...... "یہ تو بڑا اچنگا ہوا جی کہ آپ آگئے ہو...... برے وقت پر...... خیر سے پتر جے گا آپ کے ہاتھوں۔"

ریشم گھبرا گئی۔ "میں...... میں کچھ نہیں کر سکتی۔"

"کیوں جی...... آپ رہتی ہو چوبیس گھنٹے ڈاکٹر صاحبہ کے ساتھ...... آپ پوری نہ سہی آدھی ڈاکٹر تو ہو۔"

غنی نے اسے بچانے کی کوشش کی۔ "دیکھو جی مستری کے ساتھ جو چھوٹا کام کرتا ہے وہ بن جاتا ہے مستری۔"

"یہی تو ہم کہہ رہے ہیں۔" خاندان کا سربراہ بولا۔

"مگر ڈاکٹری میں ایسا نہیں ہوتا۔" غنی نے برہمی سے کہا۔ "اس کے لیے ڈگری لینی پڑتی ہے...... چل ریشم۔"

ہم بڑی مشکل سے سب کو ناراض کر گئے۔ آگے [illegible] جگہ امید کی بند گلی آگئی...... ریشم نے کہہ دیا کہ اور تو کوئی کیس نہیں...... ویسے بھی اب رات زیادہ ہوگئی تھی اور [illegible] عمل ایک پرتشویش انجام پر ختم ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔

اس وقت اچانک ایک جگہ ہمارے اندیشوں نے [illegible] کی صورت اختیار کر لی...... سرچ لائٹس پل بھر کے لیے [illegible] کی تاریکی میں استادہ خاموش درختوں کے درمیان کسی [illegible] سطح سے منعکس ہوئی۔

"غنی۔" میں نے چلا کے کہا۔ "گاڑی روکو۔" [illegible] کے ساتھ ہی سرچ لائٹ کو پیچھے کی طرف گھما کے فوکس [illegible]

وہ شہناز کی گاڑی تھی جس کے چاروں دروازے کھلے ہوئے تھے اور وہ اداس...... آسیب زدہ اور اکیلی اس گھر کی طرح کھڑی تھی جس کے مکین کسی افتاد کے باعث گھر کے دروازے کھلے چھوڑ کے بھاگ گئے ہوں یا موت کا مہیب ہاتھ انہیں بے خبری میں سمیٹ کر لے گیا ہو۔

غنی نے گاڑی کو شہناز کی کار سے چند فٹ کے فاصلے پر ایسے روکا کہ ہیڈ لائٹس کا رخ شہناز کی گاڑی کی طرف رہے۔ میں نے سرچ لائٹ کو اپنی کار کی چھت پر رکھ دیا۔ اس طرح شہناز کی گاڑی اور اس کے اردگرد کا علاقہ پوری طرح روشن ہوگیا۔

راجا کی حالت غیر تھی۔ اس کی صورت سے میں راجا کے دلی جذبات کا بخوبی اندازہ کر سکتا تھا اور میرا خیال ہے کہ اپنی زندگی کے کسی سخت ترین آزمائش کے لمحے میں بھی اسے میں نے اتنا سیریس نہیں دیکھا تھا۔

ریشم تو رونے لگی۔ شہناز کے ساتھ اس کی ذہنی اور جذباتی وابستگی دوسروں سے زیادہ تھی۔ "کہاں چلی گئیں ڈاکٹر صاحب۔"

غنی نے اسے ڈانٹا۔ "پتا ہوتا تو بھٹکتے کیوں پھرتے...... جا کے انہیں لے نہ آتے...... بند کر یہ رونا دھونا...... وہ مل جائیں گی...... ابھی سے نحوست کیوں پھیلاتی ہے۔"

میں نے بھی کہا کہ ہاں وہ مل جائیں گی حالانکہ اندر سے مجھے بھی اپنی بات کی صداقت پر سو فیصد اعتبار نہ تھا۔ میں نے راجا کے ساتھ گاڑی کا معائنہ کسی سراغرساں کی طرح کیا۔ کار میں ہر چیز اپنی جگہ تھی۔ گلوز کمپارٹمنٹ میں سے کچھ بھی نکالا نہیں گیا تھا۔ ایش ٹرے میں چند سکے پڑے ہوئے تھے یہاں تک کہ چابی بھی اگنیشن سوئچ میں لگی ہوئی جھول رہی تھی۔

ہمیں گاڑی کے اندر مزاحمت کے کوئی آثار نہیں ملے یا تھے تو ہمیں نظر نہ آئے...... تاہم شک و شبہے والی کوئی بات نہ تھی کہ شہناز کو دھوکے سے بلا کے اغوا کر لیا گیا ہے۔ ایسا ڈاکٹر شہناز کی بے احتیاطی کی وجہ سے ہوا تھا۔ وہ اپنی فطرت سے بھی مجبور تھی ورنہ اب وہ مسیحا نہیں رہے جو خدمت خلق کے جذبے سے اتنے سرشار ہوں کہ دن رات دیکھے بغیر بیمار کو دیکھنے نکل جائیں...... اب ڈاکٹر مقررہ اوقات میں مریضوں کی مقررہ تعداد کو پہلے سے اپائنٹمنٹ کی شرط پر دیکھتے ہیں اور اس کے بعد کسی سے نہیں ملتے کسی کی جان جاتی ہے تو جائے۔ وہ اپنے موبائل فون بند کر دیتے ہیں...... گھر کے فون پر کوئی بتا دیتا ہے کہ وہ موجود نہیں اور ضرورت مند دروازے تک آ جائے تو دربان روک دیتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب گھر پر کسی کو نہیں دیکھتے۔ ڈاکٹر کے پاس اس رویے کے دفاع میں بڑی مضبوط دلیل ہوتی ہے آخر ہم بھی انسان ہیں۔ ہمیں بھی اپنے لیے اور فیملی کے لیے پرائیویٹ ٹائم چاہیے۔

یہی رویہ شہناز کا ہوتا تو کچھ نہ ہوتا۔ لیکن وہ یہاں خود کو ایک مشن پر سمجھتی تھی۔ اس کے علاوہ اسے اعتماد تھا کہ جب وہ سب کے کام آ رہی ہے اور نیکی کر رہی ہے تو کوئی اس کے ساتھ بدی کا کیسے سوچ سکتا ہے لیکن بدی کے علمبردار ایسا نہیں سوچتے...... یہ اس نے نہیں سوچا۔

میں اپنے خیال میں گم تھا۔ راجا چپ کھڑا خلا میں دیکھ رہا تھا اور صدمے سے نڈھال ریشم کے گالوں پر آنسو خاموشی سے پھسلتے جا رہے تھے۔ ہم سب کے سامنے ایک ہی سوال تھا۔ اب کیا کرنا چاہیے۔

سرچ لائٹ کا تار زیادہ لمبا نہیں تھا۔ میں نے اسے بیٹری سے الگ کیا اور غنی کے ساتھ گاڑی کے چاروں طرف گھوم پھر کے دیکھا۔ مجھے زمین پر کوئی چیز بھی پڑی ہوئی نہ ملی۔ کچے مٹی بھرے راستے پر کسی دوسری گاڑی کے ٹائرز کے نشان بھی نہ تھے۔ راجا نے بھی ایسے سراغ تلاش کرنے کی ناکام کوشش کی جن سے کچھ اندازہ ہو کہ شہناز کو اغوا کرنے والے کس طرف لے گئے ہیں اور کیسے؟ رات کے وقت یہ کام بالکل ہی ناممکن ہو چکا تھا۔

بالآخر میں نے کہا۔ "راجا...... یہاں وقت ضائع کرنے سے کچھ نہیں حاصل ہوگا۔"

"پھر کیا کریں؟" راجا نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

"ہمیں پولیس کو بتانا چاہیے۔"

"وہ کیا کریں گے؟" راجا حقارت سے بولا۔ "وہ کہیں گے کہ ابھی چار گھنٹے ہی ہوئے ہیں...... چار دن تو نہیں ہوئے...... صبح تک دیکھو بعض اوقات کیس میں دیر لگ جاتی ہے مجھ سے تو ایسی بات کہنے کی جرأت کوئی نہیں کرے گا ورنہ عام آدمی کی بیوی ہو بیٹی ہو یا بہن...... وہ منہ پھاڑ کے کہتے ہیں کہ وہ بھاگ گئی ہوگی کسی کے ساتھ...... ہم کیا کریں...... جاؤ پتا کرو کس سے یاری تھی اس کی...... تمہیں نہیں پتا مگر دوسروں کو پتا ہوگا۔"

غنی نے کہا۔ "سر! میں یہاں ٹھہرتا ہوں آپ حویلی سے اور لوگوں کو بلا لیں۔"

"اس سے کیا ہوگا؟" میں نے کہا۔

گارڈ مقامی لوگ ہیں...... وہ دوسرے لوگوں کو بلا لیں گے ان میں کچھ کھوجی ہیں...... مویشی گم جائیں یا چوری ہو

جائیں وہ پیروں کے نشان سے چوروں کے ٹھکانے تک پہنچ جاتے ہیں جو ہماری آنکھ نہیں دیکھ سکتی وہ دیکھ لیتے ہیں۔"

ریشم نے دبے دبے لہجے میں کہا۔ "کھوجی بھی اپنا کام دن کے اجالے میں کریں گے رات کے اندھیرے میں کیا دیکھیں گے۔"

میں نے کہا۔ "لیکن غنی کی بات ٹھیک ہے...... ہمیں آس پاس کے علاقے میں تلاش جاری رکھنی چاہیے...... اس کے لیے زیادہ لوگ ہونے چاہئیں۔"

جو دہشت زدہ کرنے والا خیال میرے دل میں تھا اسے میں نے زبان تک نہ آنے دیا۔ اس قسم کے حالات میں غائب ہونے والے کا زندہ ملنا ضروری نہیں ہوتا۔ اس کی لاش بھی مل سکتی ہے۔ شہناز کو کسی مسخ شدہ لاش کی صورت میں دریافت کرنے کا تصور ہی میری روح کو لرزا دیتا تھا۔

میں راجا کے بارے میں کہہ سکتا تھا کہ اس کا ذہن بھی انہی خطوط پر سوچ رہا ہو گا جن پر میں...... اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ بچپن سے اب تک ہماری ذہنی رفاقت کا سفر ریل کی دو متوازی لائنوں کی طرح رہا تھا...... ہم ایک دوسرے کے جذبات اور خیالات کو اسی طرح پڑھ سکتے تھے جیسے دو افراد ایک ہی کتاب پڑھتے ہیں۔

دوسری وجہ عملی زندگی کے تجربات تھے...... ایسے تمام واقعات میں امکانات بے حد محدود ہوتے ہیں جب دشمنی میں انتقام لینے کے لیے کسی عورت کو اغوا کیا جاتا ہے تو گاؤں کی ایک ان پڑھ لاوارث عورت کے ساتھ بھی وہی ہوتا ہے جو شہر کی کسی نامور لیڈی ڈاکٹر کے ساتھ...... راجا چونکہ صحافت کے شعبے سے وابستہ تھا اس لیے مجھ سے زیادہ جانتا تھا کہ اغوا کرنے والوں کی قید میں شہناز کے ساتھ کیا ہو سکتا ہے

اسے تسلی دینے کے لیے میں نے کہا۔ "راجا...... تو پریشان مت ہو...... شہناز مل جائے گی۔"

اس نے آہستہ سے کہا "ہاں...... مل تو جائے گی۔"

میں نے کہا۔ "یہ کسی اور کا نہیں...... انہی لوگوں کا کام ہے جو آج گرفتاری سے بچ گئے تھے۔"

"مگر وہ تو مفرور ہیں...... کیا پولیس جھوٹ بولتی ہے؟" وہ تلخی سے بولا۔

میں نے کہا۔ "یہاں کھڑے رہنے سے کچھ نہیں ہو گا۔ چل کچھ لوگوں کو مدد کے لیے لے آئیں...... ہم تلاش جاری رکھیں گے صبح تک۔"

راجا نے اختلاف نہیں کیا۔ اپنے طور پر وہ کچھ بھی سوچ رہا ہو مگر حقائق سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی تھی۔ یہ شہر نہیں گاؤں تھا۔ وہ اپنے تعلقات کے سارے گھوڑے دوڑا لے مگر کسی اغوا ہو جانے والے کا سراغ آسانی سے نہیں ملتا۔ بعض اوقات کبھی نہیں ملتا۔ شبہے میں تفتیش کا عمل مہینوں جاری رہ سکتا ہے۔ کامیابی عموماً دو ہی صورتوں میں ہوتی ہے۔ اول یہ کہ مشتبہ قرار دے کر کسی کو بھی اٹھا لیا جائے اور گناہ گاروں کی صف میں بے گناہوں کو شامل کر کے منہ کھلوانے کے ان پر سارے طریقے آزمائے جائیں جو پتھروں کو بھی سچ بولنے پر مجبور کر دیتے ہیں...... بالآخر مجرم اعتراف کر لیتا ہے اور باقی لوگ جرم بے گناہی کی سزا پانے کے باوجود جان بخشی پر خدا کا شکر بجا لاتے ہوئے گھر لوٹ جاتے ہیں یا کچھ بھی نہیں ہوتا۔

دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ اغوا کرنے والے تاوان طلب کرتے ہیں یا کچھ مطالبات سامنے رکھ دیتے ہیں پھر مذاکرات اور سودے بازی کا کھیل شروع ہوتا ہے۔ اس کے نتیجے میں کامیابی ہو تو مغوی واپس آ جاتا ہے ورنہ مار دیا جاتا ہے۔

ذہنی طور پر ہم نے تمام امکانات کو قبول کر لیا تھا اور اب اگلا مرحلہ سوچ سمجھ کے قدم اٹھانے کا تھا۔ جب ہم واپس جا رہے تھے تو دکھ کی پہلی شاک ویو گزر چکی تھی۔ انسان کا ذہن ایسے ہی کام کرتا ہے کوئی اپنا مر جائے تو وہ روتا ہے چلاتا ہے، سر پیٹتا ہے اور صدمے سے پاگل ہو جاتا ہے مگر پھر یہ لمحہ گزر جاتی ہے تو وہ آنسو پونچھ کے مرنے والے کے سفر آخرت کی تیاری میں مصروف ہو جاتا ہے۔ یہ مرحلہ بھی طے ہو جائے تو پھر صبر کے مراحل خود بخود آسان ہوتے جاتے ہیں یہاں تک کہ زندگی کا معمول لوٹ آتا ہے۔

ہم بھی اب سنبھل گئے تھے۔ جو ہونا تھا ہو چکا تھا اور جو ہو سکتا تھا وہ محض فکر و غم یا سوچ بچار میں وقت گنوانے سے ٹالا نہیں جا سکتا تھا اب ہم ایک محفوظ پلان کے ساتھ آگے بڑھنا چاہتے تھے۔

میں نے کہا۔ "راجا...... یہ ضروری تو نہیں کہ شہناز کو انہی لوگوں نے اغوا کیا ہو جو آج پولیس کی کارروائی کا ذمے دار ڈاکٹر شہناز کو سمجھتے ہوں گے۔"

"پہلا شک انہی پر جاتا ہے...... مگر تیری بات ٹھیک ہے...... یہ بھی ممکن ہے کہ اسے اکبر خان یا رانا نے اغوا کیا ہو۔"

"شہناز کے خلاف تحریک چلوانے والے بھی تو وہی ہیں۔"

"ہاں...... اور اس سے مجھے امید پیدا ہوتی ہے کہ شہناز

کی حیثیت ایک سیاسی قیدی جیسی ہو گی۔ اس کے ساتھ وہ سلوک نہیں ہو گا جو عام عورت کے ساتھ ہوتا ہے اگر اسے مرد اٹھا لے جائیں تاہم میں اس امکان کو یکسر مسترد بھی نہیں کرتا۔ وہ ایک خوب صورت جوان عورت تھی اور حیوانی خواہشات رکھنے والے مردوں کے جذبات کا شکار ہو سکتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "اس معاملے میں کیا شہر اور کیا گاؤں مگر میرا دل یہی گواہی دیتا ہے کہ اب شہناز کو ہم پر دباؤ ڈالنے کے لیے استعمال کیا جائے گا آہستہ آہستہ مطالبات سامنے آ جائیں گے مطالبہ کرنے والے سامنے نہیں آئیں گے۔"

"بس مجھے تھوڑا سا وقت مل جائے...... شہناز حیوانوں کے ہتھے نہ چڑھی ہو...... پھر میں نمٹ لوں گا سب سے۔"

"میں تو سوچتا ہوں کہ کیا فائدہ سب کو خطرے میں ڈالنے کا...... لعنت بھیج دوں اپنے سارے عزائم پر۔"

راجا نے کہا۔ "بلاوجہ احساس جرم میں مبتلا مت ہو فیکے پتر۔ ہم سب یہاں اپنی مرضی اور خوشی سے آئے ہیں...... سب عقل اور شعور بھی رکھتے ہیں جسے جانا ہو گا خود چلا جائے گا مگر ان میں سے میں اور شہناز بہر حال نہیں ہیں۔"

"معاملات خراب ہوتے جا رہے ہیں راجا۔"

"معاملات ٹھیک ہو جائیں گے۔ جب آدمی ایسے کام میں ہاتھ ڈالتا ہے تو اسے کچھ نہ کچھ نقصان بہر حال اٹھانا پڑتا ہے۔ ایسے نقصان کو ہم قربانی کا نام دیتے ہیں۔ اس قربانی کے بغیر کوئی مشن کوئی تحریک کامیاب نہیں ہوتی۔ کوئی مقصد حاصل نہیں ہوتا......" اس نے میرے کندھے پر تھپکی دی۔ "ایک تیرے میرے یا شہناز کے نہ ہونے سے فرق نہیں پڑنا چاہیے۔"

شہناز کے غائب ہو جانے اور ہمارے اس کی تلاش میں جانے کی خبر نہ جانے کس کی بے وقوفی سے پھیلی تھی۔ نتیجہ یہ کہ حویلی میں واپس پہنچتے ہی ہر طرف سراسیمگی پھیل گئی۔ ہم دو گھنٹے بعد بھی ناکام لوٹے تھے۔ شہناز ہمارے ساتھ نہیں تھی اور ناکامی ہمارے چہروں پر دکھ کی ایسی تحریر بن گئی تھی جسے کوئی بھی پڑھ سکتا تھا۔

فریال، رابعہ اور لیلیٰ بھابی باہر ہی تھیں۔ گاڑی کو دیکھتے ہی فریال سب سے پہلے دوڑتی آئی۔ رابعہ ابھی دوڑنے کے قابل نہیں تھی۔ وہ لیلیٰ کے ساتھ چند سیکنڈ کے وقفے سے قریب آئی...... اس وقت تک فریال نے رونا شروع کر دیا تھا پھر رابعہ کیوں پیچھے رہتی۔

عورت کو مشکل حالات سے مقابلے کے لیے ایک قدرتی تحفظ کی صلاحیت ملی ہے۔ وہ روتی ہے چلاتی ہے صدمے سے بے ہوش یا ہسٹریا کے پاگل پن میں مبتلا ہو جاتی ہے اور سکون چاہتی ہے۔ ایک ماہر نفسیات نے مجھے لندن میں یہ لطیفہ سنایا تھا کہ جنگل میں عورت اور مرد ساتھ ہوں اور اچانک سامنے شیر آ جائے تو عورت چیخ مارے گی اور چت سے گر کے بے ہوش ہو جائے گی...... اب مرد کے لیے دہرا عذاب...... شیر سے نمٹنے کے لیے کچھ کرے...... ڈنڈا، پتھر تلاش کرے...... خود کو بچانے کے لیے شیر کا مقابلہ کرے اور بچ جائے تو عورت کو بچائے۔ عورت سب مسائل سے بے نیاز آنکھیں بند کیے لیٹی ہے۔

میں نے فریال کو جھاڑ لگائی۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟ کس بات کا سوگ منایا جا رہا ہے...... کیا شہناز مر گئی ہے؟"

"اللہ نہ کرے۔" فریال نے پھس پھس کرتے ہوئے اپنے آنسو پونچھے۔ "بری بات منہ سے کیوں نکالتے ہو۔"

"یہ نحوست تم پھیلا رہی ہو۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "عقل ماری گئی ہے تمہاری۔"

راجا نے کہا۔ "شہناز مل جائے گی۔"

لیلیٰ نے کچھ متانت سے کام لیا۔ "انشاءاللہ...... تم جاؤ اور پہلے اباجی کو تسلی دو۔"

میں نے سر پکڑ لیا۔ "یا میرے خدا! انہیں کس نے بتایا؟"

وہ سب ایک مجرمانہ خاموشی کے ساتھ اِدھر اُدھر دیکھتی رہیں۔ ان میں مزید کوئی سوال کرنے کی ہمت نہ تھی۔ صورت حال پر تفصیلی روشنی ڈالنے کی ذمے داری اب ریشم پر آ گئی کیونکہ غنی بھی لوگوں کو جمع کرنے نکل گیا تھا۔

حسبِ توقع اباجی کو سمجھانا ایک مشکل مرحلہ بنا۔ وہ جتنے خفا تھے اس سے زیادہ دکھی تھے اور کوئی جھوٹ قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ میں نے بڑی کوشش کی اور آخر میں کہنا پڑا کہ جو پریشانی ہے وہ اپنی جگہ لیکن انہوں نے میری پریشانی میں اس طرح اضافہ کیا تو جو کچھ میں کر رہا ہوں وہ بھی نہیں کر پاؤں گا۔ وہ چپ ہو گئے۔ ممکن ہے انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہو یا انہیں میرے لہجے سے دکھ پہنچا ہو۔ اماں نے صرف ایک بار شکایتی نظر سے مجھے دیکھا اور پھر مصلے پر اپنی تسبیح کے دانے گھمانے میں مصروف ہو گئیں۔ ان سے کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ میں جانتا تھا کہ ان کے سارے وظیفے آج شہناز کی خیر و عافیت کے لیے وقف ہوں گے۔

ہم دوبارہ نکلے تو دس سکیورٹی گارڈ ہمارے ساتھ تھے۔ وہ مختلف سمتوں میں نکل گئے۔ ان سب کا تعلق گرد و نواح کے

دیہات سے تھا اور انہوں نے حق نمک ادا کرنے کے لیے یقین دلایا تھا کہ وہ مزید لوگوں کے ساتھ پوری رات ڈاکٹر صاحبہ کو تلاش کریں گے۔

وہ بڑی عجیب رات تھی جو اپنی ساری ہولناکی اور بے رحمی کے ساتھ ہم پر مسلط ہو گئی تھی۔ سنسان جنگل کی تاریکی میں منجمد ہو گئی تھی اور سنائی نہ دینے والی پر تشویش آوازوں کا روپ دھار کے ہر طرف پھیل گئی تھی۔

رات بھر پچاس ساٹھ افراد جو آس پاس کے ہر گاؤں سے آئے تھے ہر طرف پھرتے رہے، ہر جگہ پوچھتے رہے، ہر گوشۂ زمین کی خاک چھانتے رہے۔ ان میں وہ بھی تھے جو نامور کھوجی کہلاتے تھے اور مٹی کی علامات سے ہر گزرنے والے کی خبر دے سکتے تھے ان کے پاس لاٹھیاں، کلہاڑیاں اور لالٹینیں تھیں۔ ممکن ہے ان میں چند ایک منافق بھی ہوں لیکن اکثریت صدق دل سے اس نیک دل لیڈی ڈاکٹر کی خیر و عافیت کے لیے دعاگو اور سرگرداں تھی جو ان کے لیے در بدر پھرتی تھی۔ انہیں دکھ اور بیماری سے لڑنے کے لیے دوا بھی دیتی تھی اور حوصلہ بھی لیکن بدلے میں کچھ نہیں مانگتی تھی۔

جب صبح کا ماتمی اجالا پھیلا اور ایک مغموم دل زدہ اور مایوس سورج نے اگلے دن کا سفر شروع کیا تو گویا تلاش کے پہلے مرحلے کی ناکامی پر مہر تصدیق ثبت ہو گئی۔ ہم نے سارے مددگاروں کا شکریہ ادا کر کے رخصت کیا اور وہ رسم دنیا کے مطابق ہمیں دلاسا دے کر چلے گئے تو اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ ہم قانون سے مدد حاصل کریں۔

ایک بار پھر راجا نے فون پر رابطے کیے۔ اس مرتبہ معاملہ کسی حد تک پرسنل تھا۔ راجا کے وسائل سے معاملہ سیکریٹری انفارمیشن، پھر صوبائی وزارت داخلہ اور اعلیٰ حکام تک پہنچا۔ دوسری طرف پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن کے ذریعے ڈاکٹر شہناز کے اغوا پر دباؤ بڑھا تو دوپہر سے پہلے ہی اے ایس پی کا پیغام وصول ہو گیا۔ اس نے رپورٹ درج کرنے کے لیے ہم سے تھانے آنے کی درخواست کی تھی۔

یہ اندازہ ہمیں تھانے دار کے رویے سے ہی ہو گیا کہ تھانے میں تفتیش کی کارروائی کا عمل محض خانہ پری نہیں ہوگا اوپر سے اعلیٰ افسران نے ڈاکٹر شہناز کی بازیابی کے لیے چوبیس گھنٹے دیے تھے اور تھانیدار کی پریشانی یہ ظاہر کرتی تھی کہ ناکامی کی صورت میں اس کے خلاف صرف محکمہ جاتی کارروائی نہیں ہوگی اور معاملہ معطلی پر ختم نہیں ہوگا۔

سہ پہر تک ایک ایس پی بھی پہنچ گیا جسے وزیراعلیٰ کے خصوصی حکم پر ڈاکٹر شہناز کی بازیابی کا ذمے دار بنایا گیا تھا۔

پولیس کی سوچ ہم سے زیادہ پریکٹیکل تھی۔ انہوں نے ہم سے تو صرف ایک ایف آئی آر درج کرائی۔ یہ ایک قانونی ضرورت تھی۔ تھانیدار نے عادت کے مطابق پوچھ لیا کہ ہمیں کسی پر شک ہے۔

راجا بگڑ گیا۔ ''کیا تم نہیں جانتے؟ کل سے جو کچھ ہوا تمہارے سامنے ہے اور پہلے کی بات بھی تمہیں معلوم ہے۔''

تھانیدار نے فوراً پسپائی اختیار کی۔ ''پوچھنا تو پڑتا ہے جناب...... بعض اوقات ذاتی دشمنی ہوتی ہے۔''

''ہماری ذاتی دشمنی کسی سے نہیں۔'' میں نے کہا۔

اے ایس پی نے الگ کمرے میں ایس پی کو پوری رپورٹ دی۔ پیر کے ساتھ پکڑے جانے والے اس کے پانچ حمایتی ابھی تک تھانے میں بڑے آرام سے بیٹھے تھے اور خاصے پُرامید تھے کہ ان کے عقیدت مند اور حامی شام سے پہلے ہی انہیں چھڑا لے جائیں گے مگر اب صورت حال بدل چکی تھی۔ ایک گھنٹے میں وہ بھی حاضر کر دیے گئے جو ''مفرور'' تھے۔

اے ایس پی نے تھانیدار کے مشورے سے پانچ افراد کو پوچھ گچھ کے لیے منتخب کیا۔ تفتیش کا عمل خاصے زور شور سے شروع ہوا۔ زور پولیس کا تھا اور شور ملزمان کا۔ ہم نے اس میں کوئی مداخلت نہیں کی۔ پولیس کے نتائج حاصل کرنے کے اپنے طریقے تھے جو عام طور پر مؤثر ثابت ہوتے تھے۔

اے ایس پی اور ایس پی کے ساتھ شہناز کی بازیابی کا دوسرا مرحلہ حویلی میں شروع ہوا جو کسی حد تک سیاسی تھا۔ ایس پی نے مجھ سے اور راجا سے بھی بہت کچھ پوچھا تھا اور ہم نے بلاکم و کاست سب بتا دیا تھا۔ ہمارے مخالف ون تھے اور کس بنا پر مخالفت کر رہے تھے۔

ڈپلومیٹک طریقے سے مسئلہ حل کرنے کے لیے آس پاس کے دیہات سے تمام معززین کو طلب کیا گیا۔ ان کے لیے گاڑیاں بھیجی گئیں اور جب وہ آئے تو حویلی میں ان کی پُرتکلف چائے کے ساتھ خاطر تواضع بھی ہوئی۔ بظاہر وہ سب ڈاکٹر شہناز کی خدمات کے معترف تھے اور میرے ترقیاتی منصوبوں کی افادیت کا بھی اعتراف کرتے تھے انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ اپنے اپنے علاقے میں ڈاکٹر شہناز کی تلاش میں ہر ممکن مدد کریں گے۔

اس وقت تک ہم پر بھی واضح ہو گیا تھا کہ اب شہناز آسانی سے نہیں ملے گی اگر اس کے ساتھ [illegible] زیادتی کا معاملہ ہوتا تو اب تک سامنے آ جاتا۔ وہ خود مل جاتی یا اس کی لاش کسی جگہ دریافت ہو جاتی۔ تاہم اس میں بھی شک کا

تھوڑی سی گنجائش تھی۔ یہ ہوسکتا تھا کہ اسے اجتماعی زیادتی کا نشانہ بنانے والوں نے کسی گھر میں قید کر رکھا ہو۔ ایسی صورت میں یا تو وہ شہناز کو مار دیں گے یا پھر اس علاقے سے ہی فرار ہو جائیں گے کیونکہ شہناز کی تلاش کا معاملہ بہت سنگین ہو گیا تھا۔

پولیس جو کچھ سمجھ رہی تھی اور کر رہی تھی وہ ہم بھی دیکھ رہے تھے اور حویلی کے اندر کا ماحول ماتمی ہو گیا تھا تو یہ ایک قدرتی بات تھی۔ شام ہوتے ہوئے راجا کی مایوسی کا اظہار اس کی صورت کے کرب سے ہونے لگا۔ خود میں نے سمجھ لیا تھا کہ نہ پولیس کچھ کر سکے گی اور نہ ہم سب کی کوشش سے کچھ حاصل ہوگا۔ شہناز اب کبھی واپس نہیں آئے گی۔

لیکن ایس پی اور اس سے زیادہ نوجوان اے ایس پی پُرامید تھا کہ شہناز ضرور ملے گی۔ ''اگر کوئی مجرمانہ واردات ہوتی تو اب تک اس کا پتا چل جاتا۔''

میں نے کہا۔ ''یہ آپ اتنے یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتے ہیں۔''

''نواب صاحب! یہاں سے رات کے وقت نہ کوئی بس جاتی ہے اور نہ کوئی ٹرانسپورٹ ملتی ہے۔ ہم نے معلوم کر لیا ہے آس پاس کے جتنے گاؤں ہیں وہاں کوئی ڈاکٹر شہناز کو اپنے گھر میں نہیں رکھ سکتا۔ گاؤں اور شہر میں یہی فرق ہے۔ شہر میں کسی کو ساتھ والے گھر میں رہنے والے کا نام معلوم نہیں ہوتا...... یہاں لوگ یہ بھی جان لیتے ہیں کہ کس گھر میں آج کیا پکا ہے۔ کون آیا ہے اور کون کہیں گیا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''یہ آپ نے ٹھیک کہا لیکن۔''

''لیکن کیا...... آپ کہنا چاہتے تھے کہ اگر کسی نے ڈاکٹر صاحبہ کو قتل کر دیا ہو پھر...... اگر ایسا ہوتا تو اب تک ہم قاتل کو گرفتار کر چکے ہوتے اور لاش مل جاتی اگر کہیں زمین میں گاڑی جاتی تو اس کا سراغ بھی مل جاتا بے شمار لوگ ہماری مدد کر رہے تھے ان میں کچھ کھوجی بھی ہیں اور ہمارے ماہرین بھی۔''

میں نے کہا۔ ''آپ کے خیال میں ڈاکٹر شہناز کے ساتھ کیا ہوا ہے؟ اور کیا ہوسکتا ہے؟''

''ابھی میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔'' ایس پی بولا۔ ''لیکن آپ مایوس نہ ہوں۔''

اے ایس پی نے کہا۔ ''کل میں نے کچھ عرض کی تھی اگر آپ کو یاد ہو...... یہاں کے معاملات درست کرنے کے لیے آپ کو سیاست سے کام لینا ہوگا اور سیاست کا تقاضا ہے کہ آپ ہمارے ساتھ چلیں۔''

راجا نے کہا۔ ''کہاں چلیں؟''

''رانا صاحب کے پاس۔'' ایس پی نے کہا۔

اے ایس پی نے کہا۔ ''آپ ان سے مدد کی درخواست کریں۔''

''میں رانا سے درخواست کروں؟'' میرا پارا چڑھ گیا ''کیوں...... ؟ آخر کس حیثیت میں...... کیا ہے وہ؟''

ایس پی نے کہا ''وہ اس علاقے کی سب سے بااثر شخصیت ہے۔ آج سے نہیں نصف صدی سے بھی پہلے سے۔ آپ کو یہاں آئے جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے۔ اس کے آباؤ اجداد......''

میں نے کہا ''اس کے آباؤ اجداد سے مجھے کیا اگر وہ بہت بڑا وڈیرا ہے اور آبائی طور پر اسمبلی کی سیٹ ہے اس کے پاس تو میں کیا کروں؟ کیا اس علاقے میں قانون اس کا چلتا ہے؟ یا میں اس کی رعایا میں شامل ہوں؟''

''پلیز نواب صاحب! سمجھنے کی کوشش کریں۔ آپ اس فیوڈل نظام کا حصہ نہیں رہے، نہ حاکم کی حیثیت سے نہ محکوم کی حیثیت سے۔ آپ اس کے مزاج کو نہیں سمجھتے۔''

''مجھے سمجھنے کی ضرورت ہی نہیں۔ میرا ایک مسئلہ تھا' سو فیصد قانونی' قانون کے رکھوالے' آپ سمجھے جاتے ہیں۔ میں نے آپ سے مدد کی درخواست کی' میں ان کے پاس مدد مانگنے کیوں جاؤں؟ آپ مجھے کیوں مجبور کر رہے ہیں کہ اس کی حاکمیت کو تسلیم کر لوں۔ کل کوئی دوسرا مسئلہ درپیش ہو تو میں پھر اس کی خدمت میں حاضری دوں۔ ڈاکٹر شہناز کو بازیاب کرانا آپ کی ذمے داری ہے۔''

ایس پی بولا ''اپنی ذمے داری سے ہمیں انکار نہیں۔ آپ سے تعاون مانگا ہے ہم نے۔ خود آپ کے انٹرسٹ میں۔''

میں نے کہا ''دیکھیے پاکستان کے ایک آزاد شہری اور ایک انسان کی حیثیت سے یہ میری خودداری کا تقاضا ہے کہ میں اس کے سامنے ہاتھ نہ پھیلاؤں جو محض لاقانونیت کے بل بوتے پر اس علاقے میں فرعون بنا بیٹھا ہے۔ انسان اپنی حاجات کے لیے خدا کے سوا کسی اور سے مانگے تو یہ شرک کہلاتا ہے۔''

اے ایس پی نے چڑ کے کہا ''آپ مجھے لیکچر مت دیں۔ اقبال کا فلسفۂ خودی مت پڑھائیں۔ یہ کتابی باتیں زندگی میں کام نہیں آتیں۔ یہاں کا یہی چلن ہے۔ ڈاکو کسی کو اغوا کر لیتے ہیں تو مدد لینی پڑتی ہے اس علاقے کے بااثر لوگوں سے۔ ہر ایک اپنے علاقے میں اسی طرح حاکم ہے۔ ان کی

STATE ہے' STATE کے اندر۔ قانون کی عمل داری ان کے علاقے میں ان کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں۔ مجھے صاف ...ف بتائیے' آپ ڈاکٹر شہناز کی خیر و عافیت کے ساتھ ...بی کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں یا اپنی اصول پرستی کو۔''

میں نے کہا ''ان کے پاس جا کے مدد کی درخواست کرنی ہے تو آپ کریں۔''

وہ اٹھ کھڑا ہوا ''ٹھیک ہے نواب صاحب! سمجھانا ہمارا کام تھا۔ آپ کی انا اس لیڈی ڈاکٹر کی عزت آبرو اور زندگی سے زیادہ اہم ہے تو آپ کی مرضی۔''

اے ایس پی نے رکھائی سے کہا ''ہم چلتے ہیں۔ کیس کی پراگریس سے آپ کو آگاہ کرتے رہیں گے' قانون کے مطابق......''

راجا ابھی تک خاموش تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ میرے اصولی موقف سے انحراف اور انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اچانک وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں چلتا ہوں آپ کے ساتھ۔ نواب صاحب کیوں جائیں...... وہ اپنے علاقے کا حاکم ہے تو یہ اپنی ریاست کے حکمراں ہیں۔''

مجھے یوں لگا جیسے راجا نے کچھ کہے بغیر میرے منہ پر تھپڑ مار دیا ہے کہ معاملہ ہے میری زندگی کا...... اور تم اپنی خودی کو بلند رکھنا چاہتے ہو۔ شہناز کی جگہ فریال ہوتی تو میں دیکھتا' تم کیسے نہ جھکتے۔

ایس پی نے نفی میں سر ہلایا ''شاید آپ کا جانا کافی نہ ہو راجا صاحب!''

راجا نے تلخی سے کہا ''کیوں...... ؟ اس لیے کہ اس وڈیرے کی نظر میں ایک صحافی بھی کمی کمین ہی ہے...... اس کے برابر کا نہیں۔''

''کیا کریں راجا صاحب! ہم ان لوگوں کی ذہنیت نہیں بدل سکتے۔'' ایس پی اٹھ کے باہر چلا گیا۔

میں نے کہا ''ٹھیک ہے ایس پی صاحب! میں چلتا ہوں۔ آپ کہیں گے تو میں اس کے پاؤں بھی پکڑ لوں گا۔''

اے ایس پی مسکرایا ''ضرورت پڑنے پر لوگ گدھے کو بھی باپ بنا لیتے ہیں۔'' پھر وہ باہر نکل گیا تھا۔

''بدقسمتی یہ ہے ایس پی صاحب کہ ضرورت صرف میری نہیں...... ورنہ آپ دیکھتے...... میں کسی گدھے کو باپ نہ بناتا۔''

یہ جوابی تھپڑ تھا جو مجھے راجا کے منہ پر مارنا پڑا۔ اس کا چہرہ احساسِ ذلت سے مسخ ہو گیا ''اب میں تجھے نہیں جانے دوں گا۔''

میں نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا ''وہ فریال نہیں شہناز ہے راجا' اس لیے مجھے جانا ہی پڑے گا۔ میں ساری عمر بار الزام اٹھا کے نہیں پھر سکتا اگر اسے کچھ ہو گیا...... تو میں تجھے کیسے منہ دکھاؤں گا۔''

راجا اپنے سامنے خلا میں دیکھتا رہا ''میں صرف ایک بات جانتا ہوں۔ تیری جگہ میں ہوتا اور معاملہ ہوتا فریال کا تو...... تو میں سوچنے کی ضرورت بھی محسوس نہ کرتا۔ مجھے سچ بتا ایمانداری سے...... فریال کے بغیر تیرے لیے جینے کا کوئی تصور ہے؟''

میں انکار نہ کر سکا' یہ نہ کہہ سکا کہ ہاں' میں اسے اپنے اصولوں پر قربان کر سکتا ہوں۔ اس کے بغیر جی سکتا ہوں۔

''میں بھی شہناز کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا نیکے پتر۔'' راجا نے بے بسی سے کہا اور میری طرف فریادی نظروں سے دیکھا۔

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا ''مجھے معاف کر دے راجا...... کہ میں جذبات کی رو میں بہہ کے حقائق کو بھول گیا۔ آ چل میرے ساتھ...... وہ لوگ باہر ہمارا انتظار کر رہے ہیں۔''

ہم سب ایک ہی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ راجا کے اور میرے درمیان اصولی اختلاف اس انتہا تک چلا گیا تھا۔ شاید اس کی وجہ بھی تھی کہ زندگی میں ایسی مجبوری سے پہلے نہ میرا واسطہ پڑا تھا نہ راجا کا۔ غلطی میری تھی کہ میں نے ایک بنیادی حقیقت کو فراموش کر دیا۔ محبت آدمی سے سب کچھ کرا سکتی ہے۔ وہ بھی جسے آدمی ناممکن سمجھتا ہے۔

اس کا ملال مجھے بعد میں ہمیشہ رہا کہ راجا نے کمزوری کے اس لمحے میں میری ذات کو ہدف بنایا۔ یہ طعنہ دیا کہ میں خودغرض ہوں۔ شہناز کی جگہ فریال ہوتی تو میری خودی کا بلند مینار دھڑام سے گر جاتا اور میں نے غصے میں راجا کو وہ جواب دے دیا جو شاید بالکل غلط تھا کہ میں اپنی خودی پر فریال کو قربان کر دیتا تاہم بعد میں ہم نے ایک دوسرے کو اسی طرح معاف بھی کر دیا جیسے دوست کرتے ہیں۔

رانا کے در پر پولیس کے ساتھ حاضری دینا عام حالات میں کچھ اور سمجھا جاتا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی جب ہمیں متوقع مہمانوں کی طرح ریسیو کیا گیا۔ ہمیں سیدھا اندر مہمان خانے میں رانا صاحب کے پاس لے جایا گیا اور اس نے ہمارا یوں استقبال کیا جیسے وہ پہلے سے ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے کسی حیرانی کا اظہار نہیں کیا اور ایک لمحے کے لیے تو مجھے شک ہوا کہ شاید ایس پی نے اسے پہلے سے مطلع کر دیا تھا کہ میں

نواب رفیق احمد شیرازی کو لے کر آ رہا ہوں۔

یہ احساس میرے لیے مزید باعث ذلت تھا لیکن دوسری طرف رانا کے رویے سے اس احساس کو تقویت ملتی تھی کہ شاید وہ جانتا تھا کہ بالآخر ہم اس کے پاس آنے پر مجبور ہوں گے۔ کیونکہ مسئلے کا حل اس کے پاس تھا' پولیس کے پاس نہیں۔ کیا اس کا یہ مطلب بھی نکالا جا سکتا تھا کہ مجرم وہی تھا؟ شہناز کے اغوا کرانے میں اسی کا ہاتھ تھا اور اب شہناز اس کی تحویل میں تھی؟ یہ بڑا امید دینے والا خیال تھا۔

''خیر سے بڑے بڑے لوگ آئے ہیں آج!'' رانا نے خوش دلی سے کہا لیکن مجھے اس کے لہجے میں خوش دلی سے زیادہ فتح مندی کا غرور محسوس ہوا۔

ایس پی نے متانت سے کہا ''ایک کام تھا آپ سے؟''

رانا نے کہا ''او جی' کام کی بات بعد میں کریں گے۔ پہلے یہ فرماؤ کہ کیا چلے گا؟''

اے ایس پی نے کہا ''کسی تکلف کی ضرورت نہیں رانا صاحب!''

میں نے کہا ''ہاں...... آپ پہلے ایس پی صاحب کی بات سن لیں۔''

مگر رانا نے میری بات سننے سے پہلے ہی ہانک لگا دی ''او بھئی' کچھ لاؤ مہمانوں کے لیے۔''

ایک بار پھر مجھے یوں لگا جیسے تیاری مکمل تھی اور انتظار صرف ہماری آمد کا تھا۔ رانا کی آواز کے ساتھ ہی خادم ٹرالیاں دھکیلتے ہوئے اندر آ گئے۔

ایس پی نے بڑی عیاری سے کہا ''نواب صاحب! آپ کا مسئلہ ہے' آپ ہی بیان کریں۔''

بال میرے کورٹ میں آ گئی تو میرے لیے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ اپنی آمد کی غرض خود بتاؤں تاہم راجا نے مجھے اس مشکل صورتِ حال یا EMBARRASSMENT سے بچا لیا۔

اس نے کہا ''میں بتاتا ہوں' آپ ڈاکٹر شہناز کو ضرور جانتے ہوں گے۔''

رانا نے انجان بن کے ایس پی کی طرف دیکھا ''ہمارے علاقے میں نئی آئی ہوگی۔ سرکاری ڈاکٹر سے ہمارا کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔''

راجا نے کہا ''وہ ست بدھائی میں ہمارے ساتھ تھی۔''

رانا نے عدم توجہی کے ساتھ راجا کی بات سنی۔ میرا شک بڑھ گیا کہ ہو نہ ہو شہناز اسی کے قبضے میں ہے یا وہ جانتا ہے کہ شہناز کہاں ہوگی؟ شاید ایس پی نے بھی اپنے کسی مخبر کے ذریعے معلومات پہلے ہی حاصل کر لی تھیں۔ قانونی کارروائی محض مجھے مطمئن کرنے کے لیے ایک اعلیٰ سطحی ڈرامے کے سوا کچھ نہ تھی۔

رانا بیچ بیچ میں ایک مہذب اور متواضع مزاج میزبان کی طرح کبھی مجھے اور کبھی دوسرے لوگوں کو خود کچھ نہ کچھ پیش کرتا رہا۔ میں صرف چائے پر اکتفا کرنا چاہتا تھا لیکن اس نے اپنے اصرار سے مجھے بہت کچھ لینے پر مجبور کر دیا۔ راجا بھی سخت جھنجلاہٹ کا شکار تھا کہ دھیان سے بات سننے کے بجائے وہ اس سنگین مسئلے کو اتنی توجہ بھی نہیں دے رہا ہے جتنی کسی مزارع کی گائے بھینس گم ہو جانے کی رپورٹ کو دیتا ہوگا۔

ساری بات سن کے راجا نے سرسری انداز میں کہا ''بڑا افسوس ہوا جی کہ ایسی واردات ہوگئی آپ کے علاقے میں۔''

میں نے کہا ''واردات ست بدھائی میں نہیں ہوئی۔''

''خیر جی...... آپ فرماؤ ہم اس معاملے میں آپ کی کیا مدد کریں؟ اتنے بڑے پولیس افسر کچھ نہیں کر سکے۔''

میں نے کہا ''یہ ایس پی صاحب کا خیال تھا کہ آپ کر سکتے ہیں۔''

وہ ہنسنے لگا ''ایس پی صاحب! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ ہم زمیندار لوگ ہیں' تھوڑی بہت سیاست بھی کر لیتے ہیں اپنے علاقے میں۔ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں ہمارے اختیار میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔''

ایس پی نے کسی سیاست داں جیسی عیاری سے کہا ''ایسا نہ کہیں رانا صاحب! ہم جیسے سرکاری ملازم تو بس حکم کے غلام ہوتے ہیں۔ آپ بادشاہ لوگ ہو۔ اس علاقے میں پتا بھی آپ کی اجازت کے بغیر نہیں ہلتا۔''

''آپ کا مطلب ایسا تو نہیں کہ خدا نہ کرے ہم نے ہی ڈاکٹر صاحبہ کے اغوا کا حکم بھی دیا تھا؟'' وہ کچھ خوشدلانہ مذاق اور کچھ اشارہ دینے کے لیے بولا۔

''آپ بھی کمال کرتے ہیں رانا صاحب!'' ایس پی نے کہا ''میرا مطلب تھا کہ آپ کو سب خبر ہوتی ہے۔ ہم تو بہت دور اپنے آفس میں بیٹھے ہیں۔ بیٹھے کیا ہیں قید ہیں۔ سرکار جب چاہے گی اٹھا کے کہیں اور پھینک دے گی۔ پبلک ہمیں الگ گالیاں دیتی ہے خواہ ہم کیسی بھی کارکردگی دکھائیں۔ سیاست داں الگ بدنام کرتے ہیں۔''

رانا نے کہا ''اچھا جی' آپ بتاؤ' ہم کیا کریں؟''

''اپنے نواب رفیق احمد شیرازی چاہتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحبہ کی بازیابی میں اپنا اثر رسوخ استعمال میں لائیں' ان کی مدد کریں۔''

میں نے آرام سے کہا ''ایس پی صاحب! اللہ کے بعد زمین میں کسی سے مدد کی توقع رکھتا ہوں تو وہ ہیں آپ جو قانون کی عمل داری کے ذمے دار ہیں۔ یہ آپ چاہتے تھے کہ رانا صاحب سے مدد لی جائے۔''

ایس پی کا موڈ آف ہو گیا ''اگر آپ نہیں چاہتے کہ رانا صاحب سے خود یہ درخواست کریں تو آپ کی طرف سے میں کہہ دیتا ہوں۔''

راجا نے فوراً صورتِ حال کو مزید خرابی سے بچایا ''دیکھیے' ایک نیک کام میں تو کوئی بھی شریک ہو سکتا ہے۔ خواہ کوئی کہے یا نہ کہے۔ میرے پڑوسی کا بچہ اگر اپنی پالتو بلی کے گم ہونے سے پریشان ہوگا تو میں انتظار نہیں کروں گا کہ وہ خود یا اس کا باپ آ کے مجھ سے کہیں کہ میں تلاش میں ان کی مدد کروں۔''

ایس پی نے فوراً بات کو آگے بڑھایا ''رانا صاحب' اس سے پہلے کئی بار مجرموں کی گرفتاری میں مدد فرما چکے ہیں۔''

ایس پی نے متعدد واقعات کا حوالہ دیا کہ اس علاقے میں شامی بادشاہ نامی ڈاکو نے کیسی دہشت پھیلائی تھی اور لوگوں کا جینا عذاب کر رکھا تھا۔ اس کی سرکوبی اور علاقے کو اس کی مجرمانہ سرگرمیوں سے پاک کرنے میں رانا صاحب نے پولیس کی کتنی مدد کی تھی۔ شامی بادشاہ کے ساتھی مارے گئے تھے اور وہ جان بچا کے فرار ہونے پر مجبور ہو گیا تھا۔

اگرچہ اس بیان سے رانا کی اہمیت بڑھتی تھی مگر وہ بڑی ہوشیاری سے پھر دفاعی پوزیشن پر آ گیا ''بات بنتی ہے سب کے تعاون سے۔ اب سنا ہے شامی بادشاہ پھر اس علاقے میں نظر آنے لگا ہے کیونکہ اسے ہمارے کچھ بدخواہ مخالفوں کی حمایت حاصل ہو گئی ہے۔''

ایس پی نے انجان بن کے کہا ''ایسا کون ہو سکتا ہے رانا صاحب؟''

''چھوڑیے ایس پی صاحب! آپ نے تشریف لانے کی زحمت کی۔ ہم بھی سوچیں گے کہ کچھ کرنا چاہیے یا نہیں؟ دراصل زمانہ پہلے جیسا نہیں رہا۔ انصاف' جمہوریت اور مساوات کے سیاسی نعرے لگانے والوں نے اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے سیدھے سادے لوگوں کو ورغلانا شروع کر دیا ہے۔ اسے کہا جاتا ہے آزادیٔ اظہار مگر ہو کیا رہا ہے' نہ کسی کی عزت محفوظ ہے نہ جان و مال۔ اب تو بس اپنے کام سے کام رکھنے کا اور اپنی عزت بچانے کا زمانہ ہے۔ دو دو ٹکے کے لوگ ہم جیسے اشراف کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بات کرتے ہیں۔''

ایس پی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی۔ نہ میں رانا سے درخواست کروں گا کہ میری مدد کرے اور نہ اس درخواست کے باوجود رانا نیک نیتی سے میری مدد کرے گا۔ اس کے انداز اور لہجے سے جو پیغام واضح ہوتا تھا' آسانی سے سمجھ میں آ جاتا تھا کہ ڈاکٹر شہناز اس کی تحویل میں نہ سہی' اس کے رحم و کرم پر ضرور ہے اور اگر میں اس کے سامنے جھک کر اس کی حاکمیت کا اعتراف نہیں کروں گا بلکہ اپنی موجودہ روش پر کاربند رہوں گا تو اس سے زیادہ نقصان اٹھاؤں گا اگر مجھ میں دم ہے تو مقابلہ جاری رکھوں ورنہ...... آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟

ایس پی نے واپسی میں زیادہ بات نہیں کی۔ اس نے رسمی الفاظ میں اور بڑے سپاٹ لہجے میں کہا ''آپ مطمئن رہیں۔ قانون کے ہاتھ بالآخر مجرموں تک پہنچ جائیں گے۔''

اس میں بالآخر کا لفظ قابلِ غور تھا۔ مطلب یہ کہ وقت کی کوئی ضمانت نہیں۔ اس میں دن لگیں' مہینے یا سال...... ڈاکٹر شہناز محفوظ رہے گی۔ اس کی ضمانت بھی کوئی نہیں' زندہ ملے گی یا مردہ؟ کوئی ضمانت نہیں' ہاں مجرم پکڑے جائیں گے۔ یہاں نہ سہی میدان حشر میں' انشاء اللہ۔

راجا اس مرحلے میں کسی سے اختلاف کو بڑھانا نہیں چاہتا تھا اور نہ کسی کو دھمکی سے مرعوب کرنا چاہتا تھا۔ وہ صرف شہناز کی خیر و عافیت کے ساتھ واپسی چاہتا تھا اور اس کے لیے وہ کسی بھی انتہا تک جانے کے لیے تیار تھا۔ چنانچہ جب پولیس کے افسران اعلیٰ رسمی باتیں کر کے رخصت ہو گئے تو وہ مجھ پر برس پڑا۔

غصے میں اس نے مجھ پر الزام لگایا کہ میں اپنی انا پر شہناز کی زندگی کو داؤ پر لگا رہا ہوں اگر میں رانا سے درخواست کروں گا تو میری کون سی شان گھٹ جاتی۔ میں نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی۔

میں نے کہا ''راجا، تیری عقل پر جذبات غالب ہیں۔ اس لیے تو ٹھیک سے سوچ بھی نہیں سکتا۔''

''تو رہنے دے اپنی ہوش مندی۔ اب جو کرنا ہے' میں خود کر لوں گا۔ خود پاؤں پڑ لوں گا رانا کے۔''

میں نے برہمی سے کہا ''الو کے پٹھے، کیا...... نعوذ باللہ' رانا خدا ہے۔ تو اس کے پاؤں پکڑے گا اور وہ چٹکی بجا کے کہے گا لے آؤ شہناز کو اور تیرے حوالے کر دے گا کہ میں بس یہی چاہتا تھا۔''

''ہاں' یہی چاہتا ہے وہ۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

''بکواس مت کر۔ صرف ایسا کرنا کافی ہوتا تو میں تجھ سے پہلے اس کے قدموں میں سر رکھ دیتا لیکن وہ بے وقوف نہیں ہے جو اس سے مطمئن ہو جاتا۔ تو آزمانا چاہتا ہے تو چل، ہم جاتے ہیں اس کے پاس اور ہاتھ جوڑ کے اس سے سابقہ گناہوں کی معافی مانگتے ہیں آئندہ کے لیے توبہ کرتے ہیں اور حلف نامہ داخل کرتے ہیں کہ شہناز ہمارے حوالے کر دی جائے تو ہم تا ابد اس کی غلامی کریں گے۔ یہ ڈراما تو کوئی بھی چالاک آدمی کر سکتا ہے۔ رانا اس سے متاثر ہونے والا نہیں رہا۔ اس کے مقاصد کچھ اور ہیں۔ وہ صرف ہمیں نیچا دکھانا نہیں چاہتا، ہمارے منہ سے اپنی برتری کے الفاظ سن کے خوش ہونا نہیں چاہتا۔ اگر شہناز اس کے قبضے میں ہے۔''

راجا نے کہا ''شہناز اس کے پاس ہے۔ میں شرط لگا سکتا ہوں۔''

''شرط لگانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں بھی یہ بات جانتا ہوں مگر وہ ایسے واپس نہیں ملے گی۔ اس کے بدلے میں ہمیں معافی تلافی خوشامد اور زبانی اعتراف کمتری سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ سوائے مزید ذلت کے۔ رانا سودا کرے گا۔ وہ شہناز کے بدلے میں کچھ مانگے گا۔''

راجا نے خود کلامی کے انداز میں کہا ''کیا مانگے گا۔''

میں نے نرمی سے کہا ''راجا! حوصلہ رکھ' شہناز کو کچھ نہیں ہوگا۔ وہ یقیناً رانا کے اشارے پر اٹھائی گئی ہے۔ بے شک اٹھانے والے دوسرے ہیں۔ اس کے مہرے' زر خرید اور بے ضمیر غلام زادے۔ لیکن اس کی حیثیت ایک سیاسی قیدی جیسی ہے۔ اس کی باعزت رہائی کے بدلے میں رانا ہم سے کچھ مانگے گا وہ بالکل محفوظ رہے گی۔''

راجا نے ایک گہری سانس لی ''شاید تو ٹھیک کہتا ہے۔''

''تو دیکھ لینا۔ بہت جلد ہمیں اشارہ مل جائے گا۔ کوئی نہ کوئی اس کی طرف سے مذاکرات کا آغاز کرے گا۔ کوئی تیسرا بالکل غیر جانب دار اور انجان فریق سامنے آئے گا جو اس کے مطالبات ہم تک پہنچائے گا اور فی الحال میرے ذہن میں وہ مطالبات بہت واضح ہیں۔''

''ایک کاسو کی واپسی ...... اور دوسرا سائنس ریسرچ سینٹر کے حق ملکیت سے دستبرداری۔''

''مجھے خوشی ہے کہ تیری عقل بہت جلد ٹھکانے آ گئی۔''

راجا نے کہا ''یار' میں کیا کروں ...... میرا دماغ واقعی خراب ہو رہا ہے۔ میرا خیال ہے مجھے آرام کی ضرورت ہے مگر آرام کیسے کروں؟''

ذہنی اور جذباتی طور پر سب ایک سی کیفیت کا شکار تھے۔ سارا دن گزر جانے کے بعد خواتین کی سوگواری میں مایوسی کا عنصر بہت غالب تھا۔ وہ اب چپ تھیں مگر وقفے وقفے سے کوئی رونا شروع کر دیتی تھی تو دوسری بھی رونے لگتی تھیں۔ ان کو ڈانٹنے ڈپٹنے سے کچھ حاصل نہ تھا۔ میں نے ان کا اعتماد بحال کرنے اور ناامیدی ختم کرنے کے لیے انہیں سمجھانے اور منطقی انداز میں قائل کرنے کا فیصلہ کیا۔

لیکن اس سے پہلے کہ میں سب کو باری باری سمجھاتا کیونکہ اکٹھا کر کے لیکچر دینے سے مطلوبہ نتائج حاصل نہ ہوتے۔ مجھے اباجی نے طلب کر لیا۔ میں چاہتا تھا کہ صرف رابعہ کو اپنے نقطۂ نظر سے آگاہ کر دوں کہ شہناز کا اغوا ایک سیاسی ڈراما ہے' وہ جہاں بھی ہوگی بالکل خیروعافیت کے ساتھ ہوگی اور بہت جلد واپس بھی آ جائے گی۔ اس کے بعد فریال خود رابعہ کو اور لیلیٰ کو قائل کر لیتی۔ وہ اباجی اور اماں کو بھی میرے مقابلے میں بہتر طور پر یہ بات بتا سکتی تھی۔

اباجی عمر کے اس حصے میں تھے جہاں ان کا مقابلہ ساحل سمندر پر استادہ کسی قدیم عمارت سے کیا جا سکتا تھا۔ انہوں نے زندگی بھر حالات وحادثات کا مقابلہ کیا تھا لیکن اب ان کے اعصاب کمزور ہو گئے تھے۔ یہ ایک قدرتی بات تھی۔ جو عمارت پہلے تند و تیز طوفانوں کے سامنے کسی خیال کی طرح سینہ سپر رہنے کے قابل تھی وہ اب روز کے نشیب وفراز والی لہروں کی یلغار سے بھی کانپنے لگتی تھی۔

انہوں نے روز کی طرح اپنے جذباتی انداز میں مجھ پر چڑھائی کر دی اور چلانے لگے کہ اگر تمہیں ناک نیچی کرتے ہوئے شرم آتی ہے تو میں خود جا کے رانا رجب علی کے پیر پڑ لیتا ہوں۔ اماں بڑی شدت سے اپنے وظائف میں مصروف تھیں مگر آنسو ان کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے' مجھے اپنی بات سمجھانے میں بڑی دشواری ہوئی لیکن آہستہ آہستہ میں ان کو یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا کہ ان کے اندیشے درست نہیں اور شہناز کے اغوا کے پیچھے پوشیدہ کہانی کیا ہے؟

رات کے کھانے کے بعد راجا نے بھی میری مدد کی اور ہم نے باقی سب کو بھی قائل کر لیا کہ ان کے اندیشے بے بنیاد ہیں۔ بے شک ایسے حالات ہوں تو ذہن میں برے خیالات ہی آتے ہیں لیکن دن بھر کے واقعات سے جو تصویر

ابھر کے سامنے آتی ہے اس سے واضح ہو گیا ہے کہ بہت جلد رانا اور اکبر خان کے مطالبات سامنے آ جائیں گے اور اس کے بعد ہمارے لیے شہناز کو واپس لانا کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔

لیکن ان تمام عقلی دلائل کے باوجود جو میں نے دوسروں کو دیے۔ میرے اندر خوف کی بے اطمینانی برقرار رہی۔ مجھ پر ایک احساس شرمندگی وناکامی غالب رہا۔ بے شک میرے روبرو سب نے میری کسی دلیل کو مسترد نہیں کیا تھا مگر میں خود یہ محسوس کرتا تھا کہ میں کسی کو مطمئن اور قائل نہیں کر سکا۔ مروت' لحاظ یا مجبوری میں کسی نے میری تردید نہیں کی لیکن دل سے فکرمندی اور اندیشوں کا اضطراب یوں دور نہیں ہوا جیسے ایک گولی سے سر کا درد کافور ہو جاتا ہے۔

میں بے چینی اور بے خوابی میں کروٹیں بدلتا رہا اور شاید ایسا ہی سب کر رہے ہوں گے۔ میری نظروں کے سامنے شہناز کی صورت تھی اور دل میں ایک خیال کہ اس وقت وہ کہاں ہوگی؟ کس حال میں ہوگی؟ زندہ بھی ہوگی یا نہیں؟ کہیں اسے ہوس پرست درندوں نے تو نہیں گھیر رکھا ہوگا جو رات ہوتے ہی انسان سے اپنے اصل حیوانی روپ میں یلغار کرتے ہیں۔ عورت کی کمزوری اور بے بسی مرد سے زیادہ اس لیے شرمناک ہے کہ مرد صرف جسمانی تشدد جھیلتا ہے۔ عورت جنسی تشدد بھی برداشت کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔

سونے کی کوشش میں ناکامی کا نتیجہ یہ تھا کہ میں مسلسل کروٹیں بدل رہا تھا لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اٹھ کے کچن تک جاؤں۔ اپنے لیے کافی بناؤں اور باہر جا کے رات کی خاموشی میں سکون تلاش کروں۔ مجھے معلوم تھا کہ میرے ساتھ ہی راجا بھی نکل آئے گا اور شاید فریال بھی۔ باقی سب کے لیے بھی نیند فقط ایک خواہش ہوگی اور ایک ضرورت بھی لیکن اس کی تکمیل موجودہ حالات میں اپنے اختیار کی بات نہ تھی۔ آدھی رات کے وقت ہم سب کا سوگ کی محفل جمانا مجھے منظور نہ تھا۔ اس سے ہم اپنے اپنے کمرے کی تنہائی میں ہی بہتر تھے۔

اچانک میرے کانوں نے کچھ لوگوں کے بولنے کی آوازیں سنیں۔ یہ اجنبی آوازیں باہر سے آ رہی تھیں اور ایسا لگتا تھا جیسے دروازے کے باہر کچھ لوگ سنتری سے لڑ جھگڑ رہے ہیں۔ اب خاموش اور بے تعلق بیٹھے رہنا مشکل تھا۔

میں سلیپر پاؤں میں ڈال کے نکلا تو راجا کو پہلے سے برآمدے میں موجود پایا۔

''یہ کیا معاملہ ہے؟'' میں نے کہا۔

''پتا نہیں کون لوگ ہیں۔'' راجا نے نظر دروازے پر رکھی۔

''چل دیکھتے ہیں۔'' میں نیچے اترنے لگا تو راجا نے مجھے روک دیا۔

''ابھی گارڈ خود بتا دے گا۔ اس وقت ہم سے ملنے والا کون ہو سکتا ہے۔''

میں نے کہا ''راجا، زبردستی کرنے والے ہوتے تو باہر کھڑا ہوا ایک گارڈ ان کا راستہ نہیں روک سکتا تھا۔''

لیکن اتنی دیر میں اندر موجود محافظ بھی مستعد ہو گئے تھے اور حویلی کے چاروں کونوں پر موجود مسلح گارڈز اتر آئے تھے۔ ان میں سے ایک نے دروازہ کھولا اور باقی چند قدم پیچھے اپنی خودکار رائفلوں کا رخ دروازے کی طرف کیے کھڑے رہے۔ معلوم نہیں اندر کے اور باہر کے سیکیورٹی گارڈز میں کیا بات ہوئی تھی' اتنے فاصلے سے ہم ان کی گفتگو کو سن سکتے تھے' سمجھ نہیں سکتے تھے۔ تاہم اندازہ یہی ہوتا تھا کہ وہ کوئی خطرناک لوگ یا حملہ آور نہیں ہیں۔

جب وہ اندر آئے تو سب سے آگے میں نے اسی داڑھی والے کو دیکھا جس نے شہناز کی گاڑی پر حملہ کرنے والوں کی قیادت کی تھی۔ میری جوابی فائرنگ سے باقی تو بھاگ گئے تھے مگر اس کی ٹانگ میں گولی لگی تھی اور اسے پولیس اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ اس کے پیچھے پانچ افراد اور بھی تھے۔

ان سب نے ہتھیار ڈالنے کے انداز میں اپنے ہاتھ سروں سے اوپر اٹھا رکھے تھے چنانچہ آگے جا کے ان سے بات کرنے میں اب کوئی خطرہ نہ تھا۔ اس ہنگامے نے فریال' رابعہ اور لیلیٰ کو بھی بیدار کر دیا تھا۔ جاگ تو شاید وہ پہلے بھی رہی تھیں۔ ہمیں باہر پا کے انہوں نے بھی حوصلہ کیا اور ہمارے پیچھے آ کے کھڑی ہو گئیں۔

''یہ کیا ہو رہا ہے آخر؟'' فریال نے کہا۔

میں نے پلٹ کے دیکھا ''تم بھی دیکھ رہی ہو' تم مجھے بتاؤ۔''

ایک سنتری نے قریب آ کے کہا ''جناب عالی! کچھ لوگ آپ سے فریاد کرنے آئے ہیں۔''

''آدھی رات کو؟ ایسی کیا آفت آ گئی ہے ان پر؟''

راجا نے کہا ''اس داڑھی والے کو آنے دو۔''

داڑھی والا لنگڑا کے بڑی مشکل سے چلتا ہوا آ گے آیا۔ قریب سے میں نے اس کی حالت دیکھی تو مجھے اس کے چہرے پر نیل نظر آئے۔ اس کا منہ سوجا ہوا تھا اور وہ شدید اذیت میں تھا۔

اس نے سامنے آ کے ہاتھ جوڑ دیے ''جناب نواب صاحب! میری غلطی معاف ..... مجھے پناہ چاہیے۔''

میں نے کہا ''تم تو وہی ہو.......... مگر نام کیا ہے تمہارا؟''

''عبدالوحید سرکار! میں ادھر کے ایک پنڈ کی مسجد میں پیش امام ہوں۔''

''اور یہ باقی لوگ ......؟'' راجا نے پوچھا۔

''یہ بھی میرے جیسے بد بخت ہیں۔ ہم سب کو اس کنجر پیر نے اکسایا تھا آپ کے خلاف۔ اس نے ہمیں ایک ایک ہزار روپیا بھی دیا تھا کہ اس لیڈی ڈاکٹر کو علاقے میں کام مت کرنے دو۔ ہم نے لوگوں کو اکسایا۔ جناب عالی! میں کھڑا نہیں رہ سکتا۔''

میں نے کہا ''ٹھیک ہے' بیٹھ جاؤ۔''

''پولیس نے بہت مارا ہے جی ہم سب کو۔'' وہ ہانپنے لگا۔

ایک گارڈ نے وہاں دو کرسیاں لا کے رکھ دیں۔ ایک پر میں بیٹھ گیا دوسری پر راجا ''مولوی عبدالوحید' وہ پیر جعلی تھا؟''

''جی سرکار!''

''اور یہ بات تم اچھی طرح جانتے تھے؟'' میں نے کہا۔

اس نے اعتراف کے طور پر سر جھکا لیا ''وہ مر گیا ہے سرکار!''

راجا چونکا ''کیسے مر گیا؟''

''پولیس کے تشدد سے۔ رانا صاحب کی یہی مرضی تھی۔''

میں نے کہا ''رانا صاحب نے کہا اور پولیس نے اسے مار دیا' کیوں؟''

''جناب عالی! اسے رانا صاحب کی حمایت حاصل تھی۔ اس نے کہیں تھانے میں کہا کہ اسے قانونی کارروائی میں پکڑا گیا تو اس کے ساتھ رانا صاحب بھی جیل جائیں گے۔ وہ عدالت میں سب بتا دے گا۔''

راجا نے کہا ''بے وقوف آدمی!''

''بس اس کے بعد رانا صاحب نے کہا کہ اس کی زبان بند کر دو ہمیشہ کے لیے۔''

میں نے کہا ''اور پولیس کیا کہے گی' وہ کیسے مر گیا؟''

راجا نے تلخی سے کہا ''یہی کہ اس کی قضا آئی تھی' مر گیا۔ شہر میں بھی یہ ہوتا رہتا ہے تو گاؤں میں کون پوچھ سکتا ہے؟''

''وہی کہانی کہ اس نے ازار بند سے خودکشی کر لی۔''

راجا نے کہا ''تمہارے ساتھ دوسرے لوگ کون ہیں؟''

''یہ سب بھی ہنگامہ آرائی میں پکڑے گئے تھے۔ انہیں بھی پولیس نے بہت مارا ہے۔ سب کی حالت خراب ہے۔ ڈاکٹر صاحبہ کے خلاف لوگوں کو بھڑکانے پر نہیں' اس بات پر کہ تم سب نکمے ہو۔ جو کام تمہیں سونپا گیا تھا' ایک ایک ہزار معاوضہ بھی دیا گیا تھا' وہ تم نے خراب کر دیا۔ رانا صاحب بہت ناراض ہیں۔ انہوں نے کہا کہ...... سب کی اچھی طرح چھترول کرو اور سب کو سمجھا دو کہ اپنی زبان بند رکھیں۔''

میں نے اسے غور سے دیکھا ''پھر تم یہ سب ہمیں کیوں بتانے آئے ہو؟''

اس نے کہا ''حضور۔ پولیس نے ابھی چھوڑا ہے ہمیں۔ ایک گھنٹا پہلے۔ انہوں نے ہمیں پیر کی لاش دکھائی اور کہا کہ اسے ہم ٹکڑے کر کے جنگل میں پھینکنے جا رہے ہیں۔ صبح تک جنگلی جانور کھا لیں گے اگر تم نے بھی بکواس کی تو تمہارے ساتھ باقی سب کا بھی یہی انجام ہوگا۔ ہم تمہارے گھر کی عورتیں بیچ دیں گے۔ بچے باہر بھیج دیں گے' دبئی میں چھوٹے بچوں کی بڑی مانگ ہے۔ اونٹ ریس کے لیے...... اور تم سب کو مار دیں گے۔''

''اور تم ڈرے نہیں اس دھمکی سے؟'' میں نے کہا۔

راجا بولا ''پولیس وہ سب کر سکتی ہے جو کہتی ہے۔''

مولوی وحید نے روتے ہوئے کہا ''سچ فرمایا آپ نے۔ جب ہمیں تھانے سے نکالا گیا تو ایک بندہ ہمیں باہر لایا۔ وہ کچھ نیک دل تھا یا اللہ نے اس کے دل میں رحم ڈالا۔ اس نے میرے کان میں کہا کہ مولوی صاحب' راتوں رات نکل جاؤ اپنے بیوی بچے لے کر۔ باقی سب کو بھی سمجھا دو۔ رانا صاحب تو چاہتے تھے کہ تم سب کو بھی مار دیا جائے لیکن

تھانے دار نے کہا کہ جلدی نہ کریں۔ باری باری سب کو ٹھکانے لگا دیں گے۔ ایک ساتھ کسی تھانے میں چھ آدمی مر جائیں تو سب کا حساب دینا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ سب بھی یہاں ہیں اور ہم بھی۔ ایک ایک کر کے اٹھا لیں گے بعد میں۔''

''آخر ایسا کیا قصور کیا ہے تم نے؟''

''ہم نے رانا صاحب کا سارا کام خراب کر دیا۔ وہ ہمیں بھی قصوروار سمجھتے ہیں۔''

''چنانچہ تم لوگ میرے پاس آ گئے ہو۔ پناہ کے لیے؟''

''اور ہم کہاں جاتے جناب عالی!''

میں نے کہا ''تمہیں کیوں امید ہے مجھ سے کہ میں تمہیں پناہ دے سکتا ہوں۔''

''ہم نے بہت سی باتیں سنی ہیں جناب کی رحم دلی کی۔ آپ نے کاسو کو بھی بچایا تھا'' وہ بولا ''ہم پر بھی رحم کریں۔''

میں نے کہا ''کیا تمہیں معلوم ہے' وہ لیڈی ڈاکٹر اب اغوا کر لی گئی ہے؟''

وہ چونکا ''یہ بھی رانا صاحب کا ہی کام ہوگا۔''

میں نے کہا ''یہ تو میں جانتا ہوں لیکن اغوا کرنے وہ خود آیا ہوگا۔ کیا تمہیں اندازہ ہے کہ یہ کہا گیا تھا کہ بس اس ڈاکٹر کو یہاں کام مت کرنے دو۔ اسے تنگ کرو تاکہ وہ ڈر کے بھاگ جائے۔''

''تمہارے علاوہ بھی رانا کے بندے ہوں گے۔ جن سے ایسے ہی کام لیے جاتے ہیں۔''

''ہاں جی' بہت لوگ ہیں مگر میں ایسے تو کسی کا نام نہیں لے سکتا۔''

''تم معلوم تو کر سکتے ہو ناں......''

''وہ خاموش رہا۔ راجا نے پھر کہا۔ ''تمہیں یہ مشورہ کس نے دیا کہ یہاں نواز صاحب کی پناہ میں چلے جاؤ۔ وہ سب کو بچا لیں گے؟''

میں نے کہا۔ ''دیکھو مجھے تم پر اعتبار تو نہیں کرتا ہے۔ تم صرف ایک ہزار میں بک جانے والے بے ضمیر آدمی ہو۔ تمہارا چہرہ بڑا دھوکا دینے والا ہے۔ تم اس داڑھی کے ساتھ پابند شرع اور نیک آدمی لگتے ہو لیکن اندر سے تم فتنہ پرور سازشی اور لالچی ہو۔

وہ گھگھیانے لگا۔ ''مجھ گنہگار کو معاف کر دیں نواب صاحب۔''

''میں کون ہوتا ہوں تمہیں معاف کرنے والا۔ تمہارے اعمال کی پرسش روز حشر ہوگی۔ تم وہ شخص ہو جس کے پیچھے لوگ نماز پڑھتے ہیں۔ تم نے ایک عورت کو ہراساں کیا۔ بڑی مردانگی دکھائی۔ وہ یہاں بیمار لوگوں کا مفت علاج کرتی تھی۔ تم اس کی نیکی کے راستے میں حارج ہوئے۔ یہ ایسا ہی گناہ ہے جیسے کوئی کسی کو زکوٰۃ تقسیم کرنے سے روکے۔ محض بدمعاشی کی طاقت سے۔ میں تم کو معاف نہیں کر سکتا۔''

میں غصے میں گارڈ کو اشارہ کرنے ہی والا تھا کہ ان سب لوگوں کو باہر نکال دو جو محض جان کے خوف سے میرے پاس آ گئے تھے۔ یہ مظلوم لوگ نہیں تھے کہ رحم کے مستحق ہوتے۔ مگر اچانک راجا نے کہا...... تمہاری مدد کی جا سکتی ہے اگر تم ہمارے لیے کچھ کرو۔''

مولانا عبدالوحید کی مایوسی پھر امید میں بدل گئی۔ آپ حکم فرمائیں جناب عالی۔

راجا نے کہا۔ ''میں کوشش کروں گا کہ نواب صاحب تمہاری جان بچانے کے لیے کچھ کریں لیکن ایک بات اچھی طرح سمجھ لو۔ تمہیں اس حویلی کے اندر جگہ نہیں دی جا سکتی۔ ہم یہاں پناہ لینے آنے والوں کا کیمپ نہیں کھول سکتے، نہ یہ کر سکتے ہیں کہ تمہارے لیے اور تمہارے بیوی بچوں کی حفاظت کے لیے فوج رکھ لیں۔ جو ہر جگہ تمہارے ساتھ چلے...... جہاں بھی تم جاؤ۔''

میں نے راجا کی تائید کی۔ ''راجا صاحب درست فرما رہے ہیں۔''

راجا نے کہا۔ ''تمہیں عمل سے ثابت کرنا ہوگا کہ اب تک تم جو بھی رانا کے لیے کرتے رہے۔ آئندہ نہیں کرو گے۔''

وہ کان پکڑ کے بولا ''میری توبہ سرکار......''

''صرف کان پکڑ کے توبہ کرنا کافی نہیں ...... تم واپس اپنے گھر جاؤ۔ ہو سکے تو رانا صاحب کے پاس جا کے معافی مانگو۔''

''رانا صاحب کسی کو معاف نہیں کرتے حضور۔'' وہ عاجزی سے بولا۔

''پھر بھی تم جاؤ تاکہ انہیں شک نہ ہو۔ اس کے بعد لوگوں کے درمیان رہ کے دیکھو۔ کان اور آنکھیں کھلے رکھو۔

اگر معلوم کر سکتے ہو تو بتاؤ کہ ڈاکٹر شہناز کو کس نے اغوا کیا اور اسے کہاں رکھا گیا ہے؟ ایسے کام کرنے والوں کو تم جانتے ہو۔ ان سے باتوں باتوں میں پوچھو اور کوئی کام کی بات معلوم ہو تو ہمیں بتاؤ۔"

"ہماری جان خطرے میں ہے سرکار۔"

میں نے کہا "ابھی دو چار دن کچھ نہیں ہوگا...... اگر تم نے کوئی کام کی بات بتائی تو ہم تمہیں ضمانت دیتے ہیں۔ تم محفوظ رہو گے۔"

"آپ کو پتا بھی نہیں چلے گا سرکار...... وہ ایک ایک کر کے ماردیں گے سب کو۔" وہ گڑگڑانے لگا۔

راجا نے ڈانٹ کے کہا "اعتبار نہیں ہے تم پر تو دفع ہو جاؤ۔ جب ہم کہہ رہے ہیں کہ کچھ نہیں ہوگا تو مانتے کیوں نہیں...... اپنا اور باقی سب لوگوں کا نام لکھوا کے جاؤ۔ کل شام تک ہمیں بتاؤ کہ کیا معلوم ہوا۔"

مجبوراً انہوں نے اپنے نام لکھوائے مقامی لوگ جو ہمارے پاس ملازم تھے انہیں جانتے تھے۔ تصدیق کے بعد انہیں کھانا دیا گیا کیونکہ وہ سارا دن کے بھوکے تھے اور مار پیٹ سے اتنے نڈھال تھے کہ ٹھیک سے چل بھی نہیں سکتے تھے۔ اس وقت تک حویلی میں ہر شخص بیدار ہو چکا تھا۔ رحم دلی کے جذبات سے معمور ریشم نے انہیں چائے بھی پلائی اور وہ کچھ مطمئن ہو کے چلے گئے۔ راجا نے بڑے سیاسی بصیرت سے کام لیا تھا اور رانا کے خلاف ہو جانے والوں کو ایک شرط کے ساتھ حمایت کی یقین دہانی کرا دی تھی۔

جب وہ چلے گئے تو میں نے راجا سے پوچھا "ہم ان کی کیا مدد کر سکتے ہیں راجا۔ کیسے بچا سکتے ہیں انہیں۔"

راجا نے کہا...... "نواب صاحب...... ان کی طرف سے ایک درخواست لگا دی جائے گی عدالت میں کہ انہیں خطرہ ہے پولیس انہیں جھوٹے مقدمات میں ملوث کرے گی اور دوران حراست انہیں ہلاک کر دیا جائے گا۔ کچھ لوگ انہیں دھمکیاں دے رہے ہیں کہ ان کو مروا دیں گے اور ان کے بیوی، بچوں کو اٹھا لیں گے۔"

"عدالت پوچھے گی کہ وہ کون لوگ ہیں اور ان کی دشمنی کی وجہ کیا ہے؟"

"یہ بعد کی بات ہے۔ ہم پہلے عدالت سے ان کی حفاظت کے احکامات حاصل کریں گے۔ خود پولیس کو ان کی حفاظت کا ذمے دار بنا دیا جائے تو پھر ایک بات یقینی ہے کہ وہ انہیں مار نہیں سکتے۔ اب رہی اس کا نام بتانے کی بات جس سے انہیں خطرہ ہے اور جو دھمکی دیتا ہے۔ تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ علاقے کے بااثر لوگوں کے کارندے ہیں۔

میں نے کہا۔ "نہیں راجا، نام پھر بھی بتانے ضروری ہوں گے اور دشمنی کی وجہ سے بھی کسی ماتحت عدالت کا حکم انہیں نہیں بچا سکتا۔ پولیس رانا کی زرخرید ہے۔ وہی کرے گی جو رانا چاہے گا۔ ان کے خلاف جھوٹے مقدمات بھی درج ہوں گے اور ان کے خاندان کی بھی شامت آئے گی۔"

"ہاں...... لیکن یہ مارے نہیں جائیں گے۔ میں خود اے ایس پی سے بات کرلوں گا۔ ہو سکا تو ان لوگوں کے ساتھ تھانے جا کے بھی بات کروں گا۔"

"وہ کبھی تیرے ساتھ نہیں جائیں گے۔"

راجا بولا۔ "تو بھی نہیں...... میں تھانیدار کو بتا دوں گا کہ بیر کی حوالات میں خودکشی کا معاملہ سنگین ہے۔ اس کی عدالتی تحقیقات بھی ہو گی اگر یہ کیس اخبارات نے اچھالا۔ پھر میں اس سے ایک سودا کروں گا۔ بیر مر گیا...... خس کم پاک...... میں اس معاملے میں غیر جانبداری سے خاموش رہوں گا۔ لیکن بدلے میں مجھے یہ ضمانت حاصل ہونی چاہیے کہ ایسا دوسرا واقعہ نہیں ہوگا یہ اس پر میرا احسان ہوگا۔ پھر وہ میری مانے گا۔ میں اسے ان چھ افراد کے نام دے دوں گا کہ یہ پولیس کی تحویل میں تھے۔ ان کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔"

راجا کی بات میں وزن تھا۔ وہ پولیس سے ڈیل کے سارے حربے جانتا تھا۔ میں نے اس معاملے کو راجا کی صوابدید پر چھوڑ دیا۔ مجھے ان لوگوں سے ہمدردی نہیں تھی جو رانا کی غلامی کرتے تھے اور اس کی اطاعت گزاری میں چند سکوں کے عوض ہر ناجائز غیر قانونی یا غیر اخلاقی کام کرنے کے لیے تیار ہو جاتے تھے۔ اچھی بات یہ تھی کہ انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا اور یہ سب اس وجہ سے تھا کہ اس علاقے میں لوگوں کا میری ٹیم پر اعتماد بڑھ رہا تھا۔ میری گڈ ول پھیل رہی تھی۔ لوگ یہ سمجھنے اور محسوس کرنے لگے تھے کہ رانا کی شیطانی طاقت کے مقابلے میں نواب آف ست بدھانی کی رحم دلانہ طاقت ہے جس پر انحصار کیا جا سکتا ہے۔

کاسو کے معاملے نے اس علاقے میں بڑی شہرت حاصل کی تھی اور میں رانا کے ایک طاقتور حریف کے طور پر مشہور ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ وہ نیک نامی تھی جو ڈاکٹر

شہناز کی خدمات کے علاوہ میرے ترقیاتی پروگراموں کے حوالے سے حاصل ہوئی تھی۔ بہت سے لوگوں کو روزگار مل گیا تھا۔ باقی کو امید تھی کہ بہت جلد وہ سب کام ہوں گے جن کا میں نے اعلان کیا تھا۔ اس علاقے میں خوشحالی آئے گی۔ اسکول ہوگا، اسپتال ہوگا اور لوگوں کو رہنے کے لیے بھی جگہ دی جائے گی۔ علاقے میں بجلی بھی آئے گی۔

آہستہ آہستہ طاقت کا توازن بدل رہا تھا۔ اب ہمیں زیادہ تیزی سے عملی کام کرنے کی ضرورت تھی تاکہ لوگ ہمارے دعوؤں کو عملی شکل اختیار کرتا دیکھیں۔ ہمارے وعدے پورے ہوتے نظر آئیں۔ رانا ہمیں روک نہیں سکتا تھا۔ نہ کام کرنے سے نہ لوگوں کے دل جیتنے سے۔ آدھی رات کے وقت پناہ کے لیے آنے والے کچھ مصیبت کے ماروں نے مجھے مزید احساس دلا دیا تھا کہ میری کوششیں بے ثمر نہیں۔ ہم سب لوگوں کا اعتماد حاصل کرنے لگے تھے۔

رات کے دو بجے میں نے پھر سب کو سونے کے لیے اپنے اپنے کمروں میں بھیج دیا۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو صبح تک باتوں کا سلسلہ چلتا اور باتیں وہی ہوتیں۔ شہناز کی۔ وسوسے، اندیشے۔ امیدیں۔ اپنے اپنے خیال کے مطابق۔ اس سے کچھ حاصل نہ تھا۔ ہم اکثر راتوں کو جاگتے تھے اور دن کے کام پوری توانائی مانگتے تھے۔ ذہنی بھی جسمانی بھی۔ عموماً میں سکون آور یا خواب آور گولیوں پر انحصار سے گریز کر رہا تھا اور یہ نہیں چاہتا تھا کہ ہم میں سے کوئی بھی اعصابی دباؤ سے کمزور ہو تو مصنوعی سہاروں کا محتاج ہو جائے۔

پہلے کے مقابلے میں امید اور ناامیدی کا تناسب آہستہ آہستہ بدل رہا تھا...... تقریباً سب نے ہی تسلیم کر لیا تھا کہ شہناز کو کچھ مطالبات منوانے کے لیے یرغمال بنایا گیا ہے۔ اب انتظار تھا کہ مطالبات کیا ہوتے ہیں کس کی طرف سے آتے ہیں اور کب آتے ہیں؟ اس سے وہ ذہنی اذیت بہرحال کم نہیں ہوتی تھی جو شہناز کو کسی نامعلوم مقام پر بے بسی سے قید میں تصور کرنے سے ملتی تھی۔

میرا خیال ہے بڑی کوشش کے بعد میں سونے کی کوشش میں کامیاب ہو گیا تھا جب فون بجنے سے میری آنکھ پھر کھل گئی اور میرے حواس کچھ پوری طرح بیدار ہوئے تو میں بڑی مستعدی سے اٹھ بیٹھا۔

فون اٹھا کے میں نے کہا۔ "ہیلو۔"

دوسری طرف خاموشی رہی۔ میرا دل دھڑکنے لگا۔ کیا اب مجھے کوئی پیغام ملے گا۔ رانا کی طرف سے کوئی اشارہ دیا جائے گا یا شہناز کی آواز سنائی دے گی۔ میں نے عجلت کے باوجود سیل فون کے اسکرین پر نمودار ہونے والا نمبر غور سے دیکھا تھا۔ یہ ایک اجنبی نمبر تھا۔

میں نے دوسری بار کہا "ہیلو...... کون ہے۔"

دوسری طرف سے کسی نے ایک سرد آہ بھری...... "وہی جو تمہارا تصور آنکھوں میں بسائے جاگ رہا ہے۔ نور جہاں نے کہا۔"

میری مایوسی غصے میں بدل گئی۔ "میں بڑی مشکل سے سویا تھا۔"

اس نے تیز آواز سے کہا۔ "میں سوئی ہی نہیں۔ اکیلی جو تھی۔"

میں نے کہا۔ "ہر رات کے لیے ایک مرد تمہاری ضرورت ہے۔"

"ہر مرد نہیں۔ ایک تو وہ جانور ہے جو میرا شوہر کہلاتا ہے۔ اس سے کوئی رات بچ جائے تو تم جیسا روز کہاں ملتا ہے۔"

"دیکھو...... میں اس وقت بہت پریشان ہوں۔"

"اور میں کیا کم پریشان ہوں تمہارے لیے......" اس نے پھر ایک آہ بھر کے کہا۔

"تم تو خود میری سب سے بڑی پریشانی ہو۔"

وہ خوشی سے ہنسی۔ "کیا واقعی......؟ تم اعتراف کر رہے ہو محبت کا؟ یا صرف ڈائیلاگ مار رہے ہو۔ پریشان تھے تو اتنے دن گزر گئے۔ کبھی یاد ہی کر لیا ہوتا۔"

"نور جہاں آخر تم کیا چاہتی ہو۔"

"یہ بار بار سننا اچھا لگتا ہے کہ میں تمہیں چاہتی ہوں؟...... اچھا جانی...... سن لو...... آئی لو یو...... بولو کتنی بار کہوں۔ وظیفہ کروں اظہار محبت کا......"

آج وہ نشے میں نہیں تھی چنانچہ میں نے بہتر سمجھا کہ اس سے صاف بات کر لی جائے۔ "دیکھو...... تم جیسی عورتیں بہت دیکھی ہیں میں نے۔"

"اللہ......" وہ بڑی ادا سے بولی۔ "میں تو سمجھتی تھی اناڑی ہو عورت کے معاملے میں۔ تم تو خود اعتراف کر رہے ہو۔"

"میری بات کا غلط مطلب مت لو۔"

''او کے۔ پھر دوسرا مطلب کیا ہو سکتا ہے یہی کہ تم جھوٹ بول کہ مجھے یقین دلانا چاہتے ہو کہ میں بھی ایک عام عورت ہوں۔ میرے جیسی بہت دیکھی ہیں تم نے۔ مگر میں یقین نہیں کر سکتی۔''

''یہ جھوٹ کیسے ہوا۔''

''اس لیے کہ مجھے معلوم ہے۔ میری جیسی عورت تم نے پہلے نہیں دیکھی ہوگی۔ نہ یہاں نہ سات سمندر پار ولایت میں۔ وہ جو بڑی بنی پھرتی ہیں مس یونیورس اور بالی وڈ ہالی وڈ کے دلوں کی دھڑکن۔ میری جوتی کے پاسنگ بھی نہیں ہیں۔''

''بڑی غلط فہمی ہے تمہیں اپنے بارے میں۔''

غلط فہمی! ...... نواب صاحب کی حالت دیکھی تھی میں نے ...... پہلی ملاقات کے وقت بھی ہوش گم ہو گئے تھے۔ پلک نہیں جھپکائی تھی حضور نے اور اس رات پی میں نے تھی ...... تمہیں بے ہوش سے بے گانہ کرنے والی کیا چیز تھی، وہ میرے حسن و شباب کا نشہ نہیں تھا تو پھر کیا تھا؟ بولو۔

''میری اس غلطی کی سزا دینا چاہتی ہو مجھے؟ ...... فاحشہ ......''

ایسی دل دکھانے والی بات کیوں کرتے ہو ...... وہ مصنوعی ناراضی سے بولی۔ ''فاحشہ تم کہہ سکتے ہو۔ مگر سزا تو مجھے مل رہی ہے تم سے دوری کی۔ بتاؤ ابھی تک تم سے کچھ مانگا ہے میں نے؟ تم سے پہلے جس نے مجھے چاہا ...... اس نے دنیا کے خزانے میرے قدموں میں ڈھیر کر دیئے ...... اپنا سب کچھ مجھے دینے پر تیار ہو گئے۔ صرف ایک رات کے لیے ...... تمہیں تو میں نے اپنا سب دے دیا۔ اور جو ہے وہ بھی قربان کر سکتی ہوں تمہارے لیے۔ کیا کہو گے اسے تم؟ ایک فاحشہ کا عشق۔''

''اچانک مجھے ایک خیال نے مغلوب کر لیا۔ تم اور محبت۔'' میں نے غم اور طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''میں جانتا ہوں خدا نے جو حسن تمہیں دیا ہے اور جو کشش تمہارے وجود میں بھر دی ہے۔ وہ ایک سفلی عمل کی طرح ہے ...... جو اچھے بھلے ہوش مند آدمی کو دیوانہ بنا دے۔''

وہ خوش ہوئی۔ ''میں تو خبر جانتی ہوں۔ چلو تم نے بھی مانا مگر یہ جو عشق محبت کی باتیں ہیں نا۔ یہ ایسی ہی لگتی ہیں تمہارے منہ سے جیسے کوئی کال گرل کہے کہ اب تک وہ کنواری ہے۔''

وہ چلائی ''ایسا مت کہو۔ میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا تم سے۔ تم پہلے مرد نہیں ہو میری زندگی میں ...... مگر میرا پہلا پیار ضرور ہو ...... نہیں ...... تم سے پہلے بھی ایک پیار کیا تھا میں نے۔ لیکن وہ دھوکا ثابت ہوا۔ اور بات بہت پرانی ہے۔ بھول بھی چکی ہوں میں۔'' اس نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی۔

''اچھا ...... یہ بتاؤ کیا کر سکتی ہو تم میرے لیے۔''

''کچھ بھی ...... تم ایک بار کہو تو سہی۔'' وہ ہنسی اور پھر گانے لگی۔ ''دل چیز کیا ہے آپ میری جان لیجیے۔ بس ایک بار میرا کہا مان لیجیے۔''

میں نے کہا ...... ''امراؤ جان ...... آج تمہارا مالک اور رکھوالا کہاں ہے۔ بڑی چہک رہی ہو۔''

''اپنی کہو۔ تمہارے جان و دل کی مالک وہ خوش نصیب لڑکی کہاں ہے۔ بڑی دیر سے باتیں کر رہے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''نور جہاں۔ مجھے تمہاری مدد چاہیے۔''

''امریکی امداد کی طرح ...... میری امداد بھی مشروط ہوتی ہے۔''

وہ ہنسی ''پھر بھی کہو۔'' وہ ہنسی

میں نے کہا۔ ''تمہیں یقیناً معلوم ہوگا۔ میرے ساتھ یہاں میرا دوست راجا بھی ہے۔''

''میں جانتی ہوں وہاں کون کون ہے۔''

''راجا کی منگیتر ہے ڈاکٹر شہناز۔''

''صرف منگیتر ......؟ داد دیتی ہوں میں اس عورت کی قسمت کی۔ نہ جگ ہنسائی کی پروا ہے نہ خوف خدا ...... کیسے دھڑلے سے رہتی ہے راجا کے ساتھ ...... جس کا جو چاہے مجھے کہے ......''

''ڈاکٹر شہناز کا اغوا ہو گیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''تمہیں کسی پر شک ہے ......'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

''رانا رجب علی پر ...... ممکن ہے اس کا معاون و مددگار اکبر خان۔''

اگر تم ایسا سمجھتے ہو ...... تو بتاؤ میں کیا کروں ......؟

میں نے کہا'' کیا تم معلوم کر سکتی ہو ......؟ اکبر خان کہاں ہے۔

''میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتی۔ یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتی۔ اکبر خان سے براہِ راست پوچھا تو معاملہ بگڑ جائے گا۔ پھر بھی۔ تمہارے لیے میں کوشش ضرور کروں گی۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے کیسے پتا چلے گا۔''

وہ ہنسی ...... ''پیاسے کو کنویں کے پاس جانا پڑتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''پیاسا کون ہے۔''

''شاید میں۔ تم تو پیاس کہیں بھی بجھا لو گے۔ مگر میری پیاس اور کہیں نہیں بجھے گی۔ دیکھو میں خود اپنی بے بسی کا اعتراف کر رہی ہوں۔ تم کہو گے تو میں آ جاؤں گی تمہارے پاس۔ خواہ اس کے بعد کچھ بھی ہو۔ واپسی کے راستے بند ہو جائیں۔''

میں نے کہا۔ ''اس کی ضرورت نہیں۔ میں فون کر لوں گا۔''

وہ ہنسی۔ ''فون؟ وہ تو ایک بے جان آلہ ہے۔ اس سے کام نہیں چلے گا جانِ من۔''

اس کی بات ذو معنی تھی اور فحش مگر میں انجان بن گیا۔ ''تم چاہتی ہو ...... میں خود کروں ...... اگر یہی ہے تمہاری شرط۔''

''ہاں ...... یہ دل کا نہ سہی، دنیا کا سودا تو ہے۔ اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔ مجھے بھی تو کچھ ملنا چاہیے۔ غرض مند ہم دونوں ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''میں ایسا نہیں کر سکتا ......''

''کیوں؟ ڈرتے ہو فریال سے ......'' وہ طنزیہ بولی۔

''تم کو ڈر نہیں لگتا اکبر خان سے ......؟''

''لگتا ہے ...... وہ ذبح کر سکتا ہے مجھے۔ لیکن اس کے لیے میں تیار ہوں۔ تم کہو گے میں پھر ڈائیلاگ مار رہی ہوں۔ لیکن یہ سچ ہے جانِ من۔ میں تمہارے لیے جان دے سکتی ہوں۔''

''آخر جان لینے کا کیوں نہیں سوچتی ہو تم ......'' میں نے کہا۔

''اگر تم کہو تو یہ بھی کر سکتی ہوں۔''

میں نے کہا ...... ''ٹھیک ہے۔ میں کہہ رہا ہوں اکبر خان کو قتل کر دو۔''

''اور اس کے بعد؟''

میں نے کہا۔ ''اس کے بعد کیا؟''

وہ ہنسی۔ ''میں بھی پھانسی چڑھ جاؤں ...... اگر ایسا سوچتے ہو تم تو واقعی اناڑی ہو۔ مشہور تو یہی کر رکھا ہے تم جیسے سیانے مردوں نے کہ عورت کے پاس صرف صورت ہوتی ہے۔ عقل نہیں۔ خوبصورت جسم ہوتا ہے مگر ذہانت نہیں۔ بیوٹی وِد آؤٹ برین۔''

''کیا یہ غلط ہے۔''

''سنو مسٹر عقلمند۔ اکبر خان کو یا تمہیں قتل کرنا اور کرانا میرے لیے کوئی ناممکن کام نہیں۔ لیکن اپنی اس خوبصورت زندگی اور خوبصورتی کے ساتھ مٹی میں دفن ہونا مجھے کسی قیمت منظور نہیں۔ تم اپنی بات منوا سکتے ہو مجھ سے۔ مگر میری مان کر ...... اکبر خان کے بعد تم اپناؤ گے مجھے؟ بولو ...... نہیں ایسا کر سکتے نا ...... اسی لیے چپ لگ گئی ہے ...... ہمارے درمیان یہی کاروباری رشتہ ٹھیک ہے۔ تم میری ضرورت ہو۔ اس کے بدلے تم مجھ سے بھی کچھ لے سکتے ہو ...... میرے علاوہ۔''

میں نے کہا ...... ''نور جہاں۔ اگر معلوم کر سکتی ہو تو مجھے بتاؤ کہ شہناز کہاں ہے۔''

وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ ''اکبر خان لندن گیا ہوا ہے۔ صبح آئے گا۔ لیکن شام کو اسے دبئی جانا ہے۔ بکنگ تو میری بھی ہے۔ لیکن میں تمہارا انتظار کروں گی۔''

''تمہیں یقین ہے کہ تم معلوم کرا لو گی۔''

''دنیا امید پر قائم ہے سویٹ ہارٹ ...... ہر چیز مانگتے ہی تو نہیں مل جاتی۔'' اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

رات کا آخری پہر میں نے کھلی آنکھوں سے مستقبل کے اندیشوں ...... خطرات اور امکانات کو سہتے گزارا۔ میں نے بہت پہلے طے کر لیا تھا کہ اس حسین ناگن کو مارنے کے لیے مجھے اس کو اپنے بس میں کرنا ہوگا۔ اس پر اپنا جادو چلانے کے لیے مجھے اس کے قریب جانے کا خطرہ بھی مول لینا ہوگا لیکن اس کے سوا میرے پاس بچنے کی کوئی اور صورت ہی تو نہیں ...... مجھے یہ خطرناک کام بڑی ہوشیاری سے کرنا ہوگا۔ اور اکبر خان کو پتا چلے اور نہ فریال کو شک ہو ...... نور جہاں اگر میرے عشق میں ایسی ہی بے اختیار ہے تو اسے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس کے ذریعے میں دشمنی کے ہر راز تک رسائی حاصل کر سکتا ہوں۔ اگر وہ مجھے شہناز کے بارے میں بتا دے اور یہ بات جاننے کے لیے مجھے چاہنے والے کا بھیس بدل کے چوری چھپے اس کے پاس جانا پڑے ...... تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔

آہستہ آہستہ میرا ذہن ایک پلان کو مکمل کر رہا تھا۔ ایک حکمت عملی مرتب کر رہا تھا۔ پہلا مرحلہ ..... نور جہاں پر اختیار حاصل کرنا **اور** اس کے لیے نور جہاں کی ہر خواہش کی تکمیل۔ غیر **اخلاقی** ہو یا ناجائز ..... جن میں اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ مرحلہ نمبر دو ..... نور جہاں کے ذریعے اکبر خان کو ختم کرانا اور دیگر فوائد حاصل کرنا ..... مرحلہ نمبر تین ..... نور جہاں کا خاتمہ۔ مشن مکمل ..... لیکن کامیابی کے لیے راز دار شرط اول ..... اپنے سوا کسی کو کچھ نہ بتانے کی شرط ..... مجھے کسی کو کچھ نہیں بتانا۔ کسی کو بھی نہیں۔ فریال کو بھی نہیں کیونکہ یہ تو یقینی تھا کہ اس کی اجازت مجھے کوئی نہ دیتا۔ کسی غدر کسی دلیل سے کسی کو قائل نہیں کیا جا سکتا تھا کہ میں اپنا مطلب نکالنے کے لیے نور جہاں کی نفسانی خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ بن جاؤں اور ایسے شرمناک غیر اخلاقی سودے سے سب کے لیے تحفظ اور دیگر فوائد کے حصول کو یقینی بناؤں۔

اگر اشارے کنائے میں بھی ایسی بات میرے منہ سے نکل جاتی تو راجا مجھے گالیاں دیتا کہ تو ذلت کی اس انتہا تک گرنے کی سوچ بھی کیسے سکتا ہے۔ فریال کا جذباتی ابال ایک طوفان بن جاتا کہ حصول مقصد کے لیے تم اس فاحشہ نور جہاں سے جسمانی تعلق استوار کرو گے؟ کیا یہ جسم فروشی نہیں ہے!..... اگر ایسے ہی کچھ فائدے حاصل کرنے کے لیے میں اکبر خان کے پاس چلی جاؤں تو تم برداشت کر سکو گے.....

میرے ذہن میں بھی ایک جنگ جاری تھی۔ عقل اور زمانہ شناسی کے تقاضے کہتے تھے کہ محبت اور جنگ میں ہمیشہ سب جائز سمجھا گیا ہے۔ اخلاقیات کی پروا نہ پہلے کسی نے کی نہ آج کرتا ہے۔ اگر بادشاہوں نے تخت پر قبضہ کرنے کے لیے باپ کو جیل میں ڈالا، بھائیوں کو مروایا تو آج جو کچھ امریکا جیسا مہذب اور جمہوری ملک کر رہا ہے اس کے اخلاقی جواز کی وہ پروا کہاں کرتا ہے۔ ویت نام سے عراق اور ایران تک جنگ میں کیا نہیں ہوا۔ مسلمانوں میں امریکی ایجنٹ موجود ہیں۔ ڈالر سے ایمان خریدے جا رہے ہیں اور طاقتور کو فاتح بھی تسلیم کیا جا رہا ہے۔

یہاں خود میرے دشمن کون سی اخلاقی قدروں کی پاسداری کو ضروری سمجھتے ہیں۔ جو سلطان طاقت کے بل پر فریال کے ساتھ کر چکا اور کرنا چاہتا ہے وہ کون سی شرافت ہے اور شہناز پر حملہ یا اس کا اغوا کس اخلاقی اصول کی سربلندی ہے .....؟ اخلاق اور شرافت کی زنجیر ہی ہم صرف ایسے ہی پاؤں میں ڈالیں گے تو کامیابی کی امید رکھنا دیوانے کا خواب ہوگی۔

اگر دشمنی کے قلعے کی مضبوط فصیل کا کوئی کمزور حصہ معلوم ہو جائے تو کیا اس راستے سے اندر داخل ہونا غلط ہوگا کتنی ہی فتوحات ایسے حاصل کی گئیں کہ قلعہ داروں کو بھاری رشوت دے کر دروازے کھلوائے گئے۔ رشوت کے معنی بہت وسیع ہیں۔ اس میں نقد رقم، جاگیریں، اعزازات، خوبصورت عورت، عہدہ اور مراعات بہت کچھ شامل ہے۔

دھوکا جنگ کا سب سے اہم ہتھیار ہے۔ اسے کیمو فلاج کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ ففتھ کالم کی اصطلاح ان غداروں کے لیے استعمال ہوتی ہے جو دشمن کے کیمپس میں آپ کے ساتھی ہوتے ہیں۔ ایک دلچسپ تاریخی اصطلاح ٹروجن پارسا کی ہے۔

یونان کی دو ریاستوں کے درمیان جنگ ایک خوبصورت عورت ہیلن آف ٹرائے کے لیے شروع ہوئی۔ اس پر متعدد فلمیں بھی بن چکی ہیں۔ اس جنگ میں محاصرہ کرنے والے لشکر نے جنگ جیتنے کے لیے ایک چال چلی۔

انہوں نے لکڑی کا ایک بہت بڑا گھوڑا بنوایا جس کے کمرے جیسے پیٹ میں پچاس کمانڈوز چھپ کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے راتوں رات محاصرہ اٹھا لیا صبح قلعہ بند لوگوں نے دیکھا کہ دشمن تو بھاگ گیا لیکن میدان میں ایک لکڑی کا گھوڑا کھڑا ہے۔ وہ فتح کے شادیانے بجاتے آئے اور گھوڑے کو خود کھینچ کر قلعے میں لے گئے۔ رات کو گھوڑے میں چھپے ہوئے فوجی باہر نکل آئے اور انہوں نے پہریداروں کو تہ تیغ کرنے کے بعد قلعے کے دروازے کھول دیے۔ ان کا پسپا ہو جانے والا لشکر لوٹ آیا اور قلعے میں داخل ہو گیا ..... یہ جنگ ایک دھوکے سے جیتی گئی۔

صبح تک میں نے خود کو قائل کر لیا تھا کہ مجھے اخلاق اور شرافت کو ایک طرف دیکھ کے خاموشی سے نور جہاں کو استعمال کرنے کا یہ موقع گنوانا نہیں چاہیے۔ وہ دشمنی کے سلسلے میں داخل ہونے کا ذریعہ ہی تو تھی۔ یہ اس کی کمزوری تھی جسے میں اپنی شہ زوری بنا سکتا تھا اور جن معاملات میں قانون بے بس تھا وہ دشمن پر شب خون مار کے نمٹائے جا سکتے تھے۔ بے وقوفی اگر تھی تو وہ نور جہاں کی جوانی کمزوری مجھ کو

ظاہر کے یہ موقع فراہم کر رہی تھی۔

اگر جنگ کی حکمت عملی کے حوالے سے دیکھا جاتا تو نور جہاں پر اختیار حاصل کرنا ایسا ہی تھا جیسے پاکستان اپنے دشمن ملک بھارت کے فوجی سربراہ یا ہمدردی اور مدد سے فائدہ اٹھانے کے مسئلے کو اخلاقی معیار سے دیکھنا محض دیوانگی سمجھا جائے اور اس سے سیاسی یا فوجی مقاصد حاصل کرنے کو بہت بڑی کامیابی ..... انتہائی دانش مندی اور بہترین حکمت عملی۔

میں بھی یہی کر رہا ہوں۔ تو غلط نہ تھا۔ یہ کہنا قبل از وقت تھا کہ مجھے کامیابی ہوگی یا ناکامی۔ فائدہ ہوگا تو کیا اور نقصان ہوگا تو کیا۔ مجھے صرف ایک بات کا خیال رکھنا تھا کہ خود نور جہاں کے جال میں گرفتار نہ ہو جاؤں۔ مگر مجھے کوئی قدم اٹھانے سے پہلے مشاورت کرنی چاہیے تھی مگر میں جوابی ردعمل کے خوف سے ایسا نہ کر سکا۔ میں نے یہ جوا صرف اپنے بل بوتے پر کھیلنے کا فیصلہ کیا۔ رسک سارا، میرا تھا، لیکن میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوتا تو فائدہ سب کا تھا۔ فاتح کی ہر غلطی معاف کر دی جاتی ہے بلکہ غلطی سمجھی ہی نہیں جاتی۔

حویلی کے اندر سارے کام رک گئے تھے۔ صرف انتظار رہ گیا تھا۔ شہناز کی واپسی کا انتظار۔ اس کے کسی پیغام کا انتظار۔ اس کی رہائی کے لیے اغوا کرنے والوں کے رابطے کا انتظار ..... پولیس کی تفتیش کے نتائج کا انتظار۔ اور جو بات سوچ کے ہی سب کا دل لرزتا تھا۔ شہناز کی لاش دریافت ہو جانے کی خبر کا انتظار ..... سب چپ تھے۔ سب سوچ رہے تھے۔ فی الحال ایک ہی مسئلے کے بارے میں جس کا حل کسی کے دست امکاں میں نہ تھا۔ ایک ہی سوال کے بارے میں جس کا جواب کسی کے ذہن کی رسائی میں نہ تھا۔ صرف میرے والدین تھے جنہوں نے ایک ناامیدی والی دل آزردہ اور احتجاجی خاموشی اختیار کر لی تھی۔ ایسی خاموشی جو ان کی خفگی سے زیادہ تکلیف دیتی تھی۔

دس بجے کے قریب ہم پولیس چوکی گئے تو وہاں تھانہ انچارج کی جگہ حوالدار نبی بخش تشریف فرما تھا جو وہاں بیک وقت بہت سے عہدوں پر فائز تھا وہ ..... بھی تھا اور ڈیوٹی افسر کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ اس کی ماتحتی میں چار کانسٹیبل تھے اور ساری فورس حاضر نہ ہو تو وہ اس سے وڈے تھانیدار کے لیے چائے بھی بنا لاتا تھا۔

انچارج کی کرسی عموماً خالی نظر آتی تھی۔ تمام تھانیداروں کی طرف یہاں بھی تھانہ انچارج ہمیشہ گشت پر رہتا تھا۔ لیکن حوالداری نے انٹری ڈسپلن اور پروٹوکول کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اس کرسی پر تشریف رکھنے کی جرأت اور گستاخی بھی نہیں کی تھی وہ پچاس سال سے اوپر کا بھاری وجود رکھنے والا کاہل اور ناخواندہ سا افسر تھا جس نے پچیس تیس سال کی سروس میں تین فیتی لگوانے کا اعزاز حاصل کرنے کے سوا کچھ نہیں کیا تھا۔

ہمیں دیکھ کے وہ بڑی پھرتی سے اٹھا ..... ''آیئے آیئے نواب صاحب ..... بس میں سوچ ہی رہا تھا کہ سلام کرنے حاضر ہو جاؤں۔''

میں نے کہا۔ ''تھانیدار کہاں ہے۔''

وہ خوشی اور فخر سے ٹوپی ٹیڑھی کر کے بولا۔ ''اب تو آپ کا یہ غلام ہی سب کچھ ہے۔ اس تھانیدار کی تو چھٹی ہوگئی۔''

''ان کے اچانک چھٹی پر جانے کی وجہ .....'' راجا بولا۔

''آپ تشریف تو رکھیں .....؟'' اس نے لجاہٹ سے کہا۔ ''بات بڑی معمولی ہے ویسے تو ..... وہ جو ہم نے ایک جعلی پیر کو بے دخل کیا تھا سرکاری املاک سے۔ اس پر کیس تھے جعلسازی، ناجائز قبضہ۔ اقدام قتل بلوہ زنا بالجبر اور .....''

میں نے کہا۔ ''یہ فہرست تو بہت لمبی کر دی تم نے۔''

''وہ جی ..... افسران بالا سے آپ نے ہی فون کرائے تھے۔ اور اخباروں میں بہت کچھ چھپا تھا۔ اس کے نتیجے میں جب تفتیش ہوئی تو سارے یہی معاملات آئے۔''

''ہم نے صرف یہ پوچھا تھا کہ تھانیدار کی جگہ تم کیوں بیٹھے ہو اس کرسی پر۔''

اس کے چہرے پر ناگواری کا سایہ سا آ کے گزر گیا ..... ''یہ تو خیر ابھی تک نہیں پوچھا تھا آپ نے ..... لیکن بندہ یہی عرض کر رہا تھا ..... تھانیدار صاحب نے اس پر سے خود تفتیش فرمائی۔ اب اگر سختی نہ کی جائے تو کون بتاتا ہے ساری بات ..... اس کے خلاف کیس آئے سنگین بن گئے تھے کہ اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔ اس نے رات کو حوالات میں خودکشی کر لی۔''

میں نے کہا۔ ''اپنی شلوار کے ازار بند سے خود کو پھانسی

لگائی۔"

وہ چونکا۔ "تو آپ کو معلوم ہو گیا۔"

راجا بولا۔ ایسے بہت سے ڈرامے دیکھ چکے ہیں ہم ...... وہ بولا۔ "بس اس پر اے ایس پی صاحب نے ان کو معطل کیا اور اوپر رپورٹ بھیجی کہ ملزم غالباً تشدد سے ہلاک ہوا ہے۔ لاش کا پوسٹ مارٹم کرایا جائے۔ اوپر والوں نے تھانیدار صاحب کی جگہ مجھے لگا دیا اور ان کو یونٹ او ایس ڈی بنا کے ہیڈ آفس بلا لیا۔"

"گویا تھانیداری فی الحال تمہیں دی ہے۔" راجا بولا۔

"اگر جناب کا تعاون ہو۔ تو بندہ پکا تھانیدار ہی لگ جائے گا۔ ایک پھول کے لیے کیس تیسری بار ایس پی صاحب کو بھیجا گیا ہے۔"

"تم چاہتے ہو میں تمہاری سفارش کروں۔"

"جناب عالی ...... سفارش کے بغیر آج کل ماں اپنے بچے کو دودھ نہیں دیتی۔ میرٹ پر پروموشن ہوتی تو آج میں ڈی ایس پی ضرور ہوتا۔ میرے ساتھ کے سب ہو گئے۔ آپ ماشا اللہ سے بڑا اثر رسوخ رکھتے ہیں۔ ہم نے تو دیکھا ہے۔"

"ہوں ......" راجا نے گویا غور فرماتے ہوئے کہا۔ "دیکھیں گے حوالدار نبی بخش کہ تم میں کتنی صلاحیت ہے۔"

"بلکہ آزمائیں گے۔" میں نے کہا۔

"حضور نواب صاحب ...... ہم تو رعایا ہیں آں ......" اس نے نہایت عامیانہ انداز میں خوشامد کی۔

میں نے کہا ...... "کل کچھ اور لوگ بھی گرفتار ہوئے تھے۔"

"ان کو تفتیش کے بعد رہا کر دیا گیا تھا جناب ...... ان کے خلاف جرم میں ملوث ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔"

راجا نے کہا "دیکھو ...... ان سب کے نام پتے تو ہوں گے تمہارے پاس ...... روزنامچے میں اندراج کیا تھا تم نے۔"

راجا بولا ...... "محرر بھی تم تھے اور ڈیوٹی افسر بھی۔"

اس کے چہرے کا رنگ بدلا۔ "انچارج صاحب نے اندراج کا حکم تو نہیں دیا تھا۔ بس شامل تفتیش کیا تھا۔"

میں نے کہا۔ "ان میں ایک مولوی عبدالوحید کو میں نے خود پکڑ کے پولیس کی تحویل میں دیا تھا۔ ڈاکٹر شہناز کی گاڑی پر حملہ کرنے والوں کو اسی نے اکسایا تھا۔"

حوالدار نے یوں کہا جیسے ہم نے کوئی بہت پرانی بات یاد دلا دی ہے یہ غیر اہم تھی۔ "اچھا وہ ...... وہ تو انکاری تھا جناب۔"

میں نے کہا۔ "اس نے میرے سامنے حملہ کیا تھا اور میں نے اس کے دفاع میں گولی چلائی تھی جو اس کی ٹانگ پر لگی تھی۔ وہ چلا چلا کر حملہ آوروں کو حکم دے رہا تھا کہ لیڈی ڈاکٹر کا حشر نشر کر دو ...... مگر باقی لوگ بھاگ گئے تھے وہ کیسے رہا ہو گیا۔"

"ہم اسے پھر پکڑ لیں گے جناب عالی ...... اگر آپ حکم کریں گے۔"

میں نے کہا۔ "کل حوالات میں اس کے ساتھ پانچ بندے تھے اب یہاں کوئی نظر نہیں آ رہا ہے۔ اب اگر تم واقعی یہ چاہتے ہو کہ ہم تمہارے خلاف رپورٹ نہ کریں۔ بلکہ تمہاری سفارش کریں۔ تو پہلا کام یہ کرو کہ کل کی تاریخ میں اس مجرمانہ کارروائی کی رپورٹ لکھو۔"

اس کے چہرے پر مردنی چھا گئی۔ "کل کی تاریخ میں ......"

"ہاں ...... یہ واقعہ کل ہی پیش آیا تھا نا ...... ایف آئی آر نہ سہی ان سب کے نام روزنامچے میں درج کرو ...... جو تھانیدار چلا گیا۔ اس کی اتھارٹی ختم ہو گئی۔ کوئی ایسی ویسی بات ہو گی تو الزام تم پر آئے گا کہ تم بعد میں ملزمان کو رشوت لے کر چھوڑ دیا۔"

راجا بولا۔ "ہم یہ کیس ری اوپن کریں گے۔ اور تمہاری ترقی کے لیے میری سفارش کا انحصار اس کارروائی پر ہے۔ تم سب کو پکڑو ان کے ضمانت نامے لو۔ اور بے شک انہیں چھوڑ دو۔ لیکن بعد میں بھی ان کے خلاف کوئی ماورائے قانون کارروائی نہ ہو۔ اس بات کا مطلب اگر نہیں سمجھے تو میں سمجھا دیتا ہوں۔ قانون کے خلاف کوئی کام نہ ہوتا کہ ضرورت پڑنے پر انہیں پھر بلایا جا سکے۔"

اس نے بادل ناخواستہ روزنامچہ اٹھایا اور ہماری خواہش کے مطابق گزشتہ تاریخ میں اس واقعے کا اندراج کیا جس میں چھ آدمی پکڑے گئے تھے وہ سب گزشتہ رات مجھ سے پناہ مانگنے آئے تھے۔ رپورٹ کر کے وہ بولا۔ "آپ چاہتے ہو۔ میں ان سب کو پھر ڈک دوں۔"

میں نے کہا۔ "کم سے کم یہ ضرور ہونا چاہیے کہ وہ دستیاب ہوں بھاگ نہ جائیں۔"

"یا غائب نہ ہو جائیں۔ ویسے تو صرف بھوت ہی یہ کمال دکھا سکتے ہیں۔ مگر کبھی کبھی انسان بھی غائب ہو جاتے ہیں۔ درحقیقت وہ غائب کر دیے جاتے ہیں۔"

"جیسے جادوگر چیزیں غائب کرتے ہیں۔"

"تو انہیں غائب نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ یہ سمجھ لو کہ پھول تمہارے کندھے پر کبھی نہیں لگے گا۔ خواہ مرنے کے بعد تمہاری قبر پھولوں سے ڈھک دی جائے۔" راجا نے دھمکی کے انداز میں کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

نیا مگر عارضی تھانیدار۔ بری طرح پھنس گیا۔ اگر اسے رانا سے ہدایت لینے کا موقع ملتا تو شاید وہ ہمیں ٹال دیتا۔ ہم نے تو سوچنے کا موقع بھی نہیں دیا۔ بعد میں وہ یقیناً پچھتاتا ہوگا کہ اس نے تھانیداری کے عہدے کو ہمارے سامنے اتنا بے توقیر کیوں کیا۔ اس نے ہماری بات پر ایسے فدویانہ انداز میں بلا چوں، چرا عمل کیوں کیا۔

لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ نیا تھانیدار اب اس بات کا پابند ہو گیا تھا کہ رہا کیے جانے والے تمام ملزمان کی دستیابی کو یقینی بنائے۔ اب ان کے خلاف جھوٹے مقدمات درج ہو سکتے تھے اور ان کے خاندان کو ہراساں بھی کیا جا سکتا تھا مگر انہیں مارا نہیں جا سکتا تھا وہ غائب نہیں ہو سکتے تھے۔

جب ہم واپس پہنچے تو سب کے چہرے کھلے ہوئے دیکھ کر ہمیں کسی اچھی خبر کے موصول ہونے کا یقین آ گیا۔ رابعہ کے ساتھ فریال ایک فولڈنگ چیئر ڈالے برآمدے میں نیم دراز تھی۔ آسمان پر ابر تھا اور گہرے بادلوں کی سیاہی نے دوپہر کو شام کے دھندلکے میں بدل دیا تھا۔ بارش کسی بھی لمحہ برسنے کے لیے تیار تھی۔ لیلیٰ کے ساتھ ریشم وسطی فوارے کی گول دیوار پر پاؤں لٹکائے بیٹھی تھی۔ ہرنی کا بچہ بے مقصد چھلانگیں لگا رہا تھا۔ اس موسم سے سب سے زیادہ لطف اندوز بطخیں ہو رہی تھیں جو خوشی کی آوازیں نکالتی لان پر گھوم رہی تھیں۔

ہماری گاڑی کو دیکھتے ہی ریشم جو تین فٹ کی دیوار پر بیٹھی ٹانگیں چلا رہی تھی کود کے اتری اور دوڑتی ہوئی آئی۔ اس لڑکی میں تو قدرت نے جیسے بجلی بھر دی گئی۔ ہر لحظہ پارے کی طرح متحرک اور بے چین رہنے والی ریشم بری طرح ..... مضمحل تھی۔ اداسی اس کی تیز طراری پر کچھ اس طرح غالب آئی تھی کہ وہ انگریزی کا اردو اور پنجابی کے ساتھ آملیٹ بنانا تک بھول گئی تھی۔

جب اس نے قریب آ کے کہا۔ "سر ...... گڈ نیوز۔ آئی ٹیل فرسٹ ...... لیکن آپ گیس واٹ ......"

میں نے دھڑکتے دل کو سنبھال کے کہا۔ "شہناز آ گئی۔"

"راجا نے ڈانٹ کے کہا" بتاتی کیوں نہیں سیدھی طرح۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "ڈاکٹر صاحبہ پیغام کمرے ..... سال لیٹر۔ ون بوائے کم۔ میں ٹرائی رن۔ بھی گرفتار ......"

الو کی چھٹی ...... راجا نے طیش میں کہا۔ "انگریزی بولنا ضروری ہے سیدھی طرح کیوں نہیں بتاتی۔"

"سریو بلا وجہ اینگری۔ ریشم پر خاک بھی اثر نہیں ہوا ڈاکٹر اد کے۔"

اتنا تو ریشم کی گوراشاہی زبان سے میں نے ہی اخذ کر لیا تھا کہ کوئی بچہ اس کا پیغام لایا تھا کہ وہ خیریت سے ہے۔ اس نے پیغام دینے کے بعد فرار ہونے کی کوشش کی تھی لیکن اسے گرفتار کر لیا گیا ہے۔ اس مفہوم کی تصدیق فریال سے ہو گئی۔

میں نے کہا۔ "یہ ریشم کیا کہہ رہی ہے۔"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "ٹھیک کہہ رہی ہے۔ تم بیٹھو آرام سے بتاتی ہوں۔"

"تم مت بتاؤ۔ ہم کوئی پہاڑ کھود کے نہیں آ رہے ہیں۔" راجا نے کہا۔

"ہمیں شہناز کی طرف سے خیریت کی اطلاع ملی ہے۔ ایک بچے کو پکڑا ہے دروازے کے باہر والے سکیورٹی گارڈ نے۔" فریال نے کہا۔ وہ مشکوک انداز میں نمودار ہوا اور دروازے تک آیا۔ پھر معلوم نہیں گھبرا گیا یا ڈر گیا۔"

رابعہ نے کہا۔ "بچہ کیا۔ پندرہ سولہ سال کا نوجوان ہے۔" فریال نے کہا "ہاں مگر بچہ ہی لگتا ہے۔ صحت خراب ہے۔ اس نے پلٹ کر جاتے جاتے کوئی چیز پھینک دی۔ گارڈ سمجھدار ہے غنی نے سب کو بہت اچھی تربیت دی ہے۔"

ریشم مٹکنے لگی۔ "غنی، ان دی ٹیلی جنٹ۔"

غصے کے باوجود راجا کے لبوں پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔ ریشم اسے ذہین کہنا چاہتی تھی۔ مگر ان کے بعد دی کا اضافہ کرا دیا۔

تم جاری رکھو اپنا بیان۔ اور ریشم خبردار جو بیچ میں اپنی انگریزی بولی......'' میں نے کہا۔

''بس سر......می گو......نچ ریڈی......'' وہ ٹھٹک گئی۔

'' گارڈ نے اس کی پھینکی ہوئی چیز کو چھوڑا اور لڑکے کا تعاقب کیا اس نے ایک کاغذ کا پرزہ پھینکا تھا۔ لڑکا تیز تھا اور جل دے کر نکل جاتا لیکن گارڈ نے کہا کہ رک جاؤ ورنہ گولی ماردوں گا۔ اس نے گھبرا کے پیچھے دیکھا کہ کہیں گارڈ سچ مچ گولی تو نہیں چلا رہا ہے اور پھر بھاگا مگر بدقسمتی سے ایک پتھر سے ٹھوکر کھا کے گر پڑا۔ سیدھا بھاگتا تو کچھ نہ ہوتا۔ گارڈ اسے پکڑ کے لے آیا۔''

''اب کہاں ہے وہ۔''

''کمرے میں باندھ رکھا ہے۔'' رابعہ نے اشارے سے بتایا۔

''اور وہ کاغذ کا پرزہ۔''

''اس پر لکھا ہوا تھا کہ میں بالکل ٹھیک ہوں، میری فکر نہ کریں۔ اب مجھے تو وہ شہناز کی ہینڈ رائٹنگ نہیں لگتی ہے۔''

رابعہ نے کہا۔ ''وہ زنانہ ہینڈ رائٹنگ ہے ہی نہیں۔''

راجا بولا۔ ''مجھے دکھاؤ۔ میں پہچانتا ہوں اس کی تحریر۔''

فریال نے کرسی کی پشت کے پیچھے سے کاغذ برآمد کیا۔

''دراصل ہم نے اس کو انگریزی لکھتے دیکھا ہے۔ یہ اردو میں ہے۔''

راجا نے تحریر دیکھتے ہی فیصلہ صادر کر دیا۔ ''یہ شہناز نے ہی لکھا ہے۔ میں پہچانتا ہوں اس کی ہینڈ رائٹنگ......کہاں سے آیا تھا وہ لڑکا؟''

وہ کچھ نہیں بولتا۔......گارڈ نے بہت پوچھا......مارا بھی مگر چپ ہے۔'' لیلیٰ نے کہا۔

''اس کا تو باپ بھی بولے گا۔'' راجا نے دانت پیس کر کہا۔

قیدی ایک کمرے میں ایسے بندھا پڑا تھا کہ ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ فریال نے ٹھیک بتایا تھا۔ وہ پندرہ سولہ سال سے زیادہ عمر کا نہیں تھا مگر کمزور جسم کے باعث دس بارہ کا لگتا تھا۔ اس ڈر سے کہ وہ فرار نہ ہو جائے اس کے ہاتھوں پیروں کو اتنی سختی سے باندھا گیا تھا کہ نیل پڑ گئے تھے اور جب ہم نے دروازہ بند کر کے اسے آزاد کیا تو وہ کچھ دیر بے حس و حرکت پڑا رہا جب اس کا دوران خون بحال ہوا تو وہ اٹھ کے بیٹھ گیا۔ خوف سے اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ شاید اسے امید نہ تھی کہ وہ ایسے پکڑ لیا جائے گا۔ اسے بھاگنے میں اپنی تیز رفتاری پر اعتماد نے مروا دیا تھا۔

ہم نے کسی تفتیشی افسر کی طرح سوالات کئے۔ تم کون ہو۔ نام کیا ہے۔ کہاں سے آئے ہو، یہ پیغام کس نے دیا تھا، خود شہناز نے دیا تھا یا کسی اور نے لا کر دیا تھا، کس نے بھیجا تھا تمہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ آدھے گھنٹے تک ہم نے سمجھانے کے انداز میں بات کی اور اسے ڈرایا بھی کہ یہ خاموشی اسے بہت مہنگی پڑے گی۔ اگر ہم نے تشدد کا طریقہ آزمایا تو وہ اپنی مادری زبان کیا فرنچ بھی فرفر بولنے لگے گا۔ لیکن اس پر کسی بات کا اثر نہ ہوا۔

وہ انتہائی درجہ خوفزدہ نظروں سے مجھے اور راجا کو دیکھتا رہا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں رحم کی درخواست کرتا رہا۔ اس نے زبان سے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس پر مجھے خیال آیا کہ کہیں وہ گونگا تو نہیں۔ اس کی تصدیق بھی بہت جلد ہو گئی۔ راجا نے خالص پولیس والوں کے انداز میں اس کے جسم کے نازک حصے کو دبانا شروع کیا اور اس کو زمین پر لٹا کے اپنا سارا وزن اس پر ڈال دیا تو وہ تڑپنے لگا اور اس کے حلق سے بے معنی آوازوں کا ملا جلا شور برآمد ہوا۔ اس کی آنکھوں سے شدید اذیت کے باعث آنسو نکل آئے مگر زبان سے ایک لفظ نہیں نکلا۔

راجا نے اسے چھوڑ دیا۔ ''یہ تو واقعی بول نہیں سکتا۔ اس پر تشدد سے بھی کچھ حاصل نہیں ہو گا۔''

''اس کا انتخاب بڑی ہوشیاری سے کیا گیا ہے۔'' میں نے کہا یہ سنتا تو ہے۔'' راجا بولا۔ ''میری بات پر میری طرف متوجہ ہوتا تھا تیری بات پر تیری طرف دیکھتا تھا۔ مطلب بھی سمجھ رہا ہو گا۔''

ہم نے لڑکے کو پھر باندھا لیکن پہلے جیسی سختی سے نہیں کیونکہ اس کی قید سے فرار ہونے کے امکانات مثلاً نا ہونے کے برابر تھے۔ اس کے ہاتھ پیچھے بندھے ہوئے تھے جن کو وہ خود نہیں کھول سکتا تھا۔ اسی طرح اس کے دونوں پیر بھی آزاد نہ تھے۔ وہ کتنی کوشش بھی کرتا خود کو آزاد نہیں کرا سکتا تھا یہ کمرا باہر سے مقفل تھا اور حویلی کی پرانی کھڑکی کی ہر چوکھٹ میں لوہے کی سلاخیں نصب تھیں...... زنگ آلود ہونے کے باوجود ان کو ٹارزن بھی نہ توڑ سکتا تھا نہ موڑ سکتا تھا۔ پھر باہر حویلی کا احاطہ تھا اور سیکورٹی گارڈ تھے۔ اس کے باہر نکل

کے فرار ہونے کا سوال ہی نہیں ہوتا۔

کھانے کے بعد ہم نے تھوڑا سا ریلیکس کیا، اب خوف اور دہشت کی جگہ بے چینی نے لی لی تھی۔ یہ اطمینان تھا کہ شہناز زندہ ہے اور ٹھیک ہے مگر اب اس کی واپسی ایک سوالیہ نشان بن گئی تھی۔ اسے قید میں رکھنے والے کب رہا کریں گے۔ اور اس کے بدلے کیا مطالبہ کریں گے۔

''بڑا اچھا نامہ بر بھیجا انہوں نے...... جو بول ہی نہیں سکتا وہ بتائے گا کیا......'' فریال نے کہا۔

''وہ تو اپنا نام تک نہیں بتا سکتا۔'' راجا بولا۔

''بیچارا لالچ میں مارا گیا؟''

''ہمیں کیا معلوم لالچ تھا یا دباؤ۔'' رابعہ نے رائے دی۔

''اب اس کا کیا کریں۔ جانے دیں یا پولیس کے حوالے کریں۔ شاید وہ اس سے کچھ پوچھ لیں۔'' فریال بولی۔

میں نے کہا۔ ''کوئی فائدہ نہیں نہ یہ لڑکا گونگے بہروں کی عالمی زبان جانتا ہے اور نہ یہاں کی پولیس۔ وہ تو زبان کھولنے کا ایک ہی طریقہ جانتے ہیں۔''

''وہ میں نے کر کے دیکھ لیا۔ لڑکا واقعی گونگا ہے۔''

''پیدائشی......'' فریال نے ایک بے وقوفی کا سوال کیا۔

راجا چڑ گیا۔ ''اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ پیدائشی طور پر گونگا تھا یا بعد میں ہوا۔''

''فرق پڑتا ہے اگر آپ اس ناچیز کی بات پر غور کریں۔'' زبان سے برا مان کے کہا۔ ''خود کو افلاطون نہ سمجھیں۔''

''او کے مسلمان ناچیز...... دو افلاطون تمہارے ارشادات عالیہ غور سے سنیں گے، فرماؤ۔'' میں نے کہا۔

''دیکھو...... جو پیدائشی گونگے ہوتے ہیں ان سے گھر والے بات نہیں کرتے۔ بے شک وہ گونگے بہروں کی بین الاقوامی اشاروں والی زبان نہیں ہوتی۔ مگر ضرورت کے مطابق وہ بھی اشاروں میں جو کہتا ہے کہہ دیتا ہے گونگا بچہ کسی نہ کسی طرح اپنا مفہوم واضح کر دیتا ہے۔ وہ بھوکا ہو پیاسا ہو۔ اسے سردی لگ رہی ہو۔ پیٹ میں درد ہو۔ وہ بتا دیتا ہے۔''

''ہم غور سے سن رہے ہیں ابھی تک۔'' میں نے کہا

فریال نے ہم پر ایک دانش مندانہ نگاہ ڈال کے پھر سلسلہ کلام شروع کیا۔ ''لیکن اس زبان کو زیادہ تر قریب کے لوگ سمجھتے ہیں۔ میرا مطلب ہے ان مخصوص اشاروں کو جن کا مخصوص مطلب ہوتا ہے۔ ماں باپ اور بھائی بہن۔ کیا ہم ان کا سراغ نہیں لگا سکتے۔ آخر رہنے والا تو یہ اسی علاقے کا ہوگا۔''

چند لمحے خاموشی میں گزر گئے۔ فریال کی بات کی معقولیت نے سب کو قائل کر لیا تھا۔

میں نے کھنکار کے کہا...... ''مس ناچیز...... میرا مطلب ہے خاتون عزیز...... آپ کی عقل و فہم، ذہانت اور دور اندیشی میں نہ کلام پہلے تھا نہ اب ہے۔ کم سے کم مجھ ناچیز کو...... جس نے تمہیں انتخاب کیا۔''

فریال نے گلاس میں بچا ہوا تھوڑا سا پانی مجھ پر پھینک دیا۔ ''ڈراما مت کرو...... یہ چلو بھر پانی تھا جس میں تم علامتی طور پر ڈوب سکتے ہو۔''

راجا نے کہا۔ ''معاف کرنا نہیں۔ ہم اتنے غیرت مند بھی نہیں ہیں۔ مگر فراخ دل ضرور ہیں کہ کوئی ناقص العقل عورت بھی اتفاق سے یا غلطی سے عقل کی بات کرے تو مان لیتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''یہ تو معلوم کیا جا سکتا ہے کہ یہ کس گاؤں کا رہنے والا ہے۔ ہم اس کے باپ یا بھائی کو بلا سکتے ہیں۔ اب تم یہ کہو گی وہ کیسے تو جواب بہت آسان ہے۔ اس کی شناخت پریڈ ہو سکتی تھی۔ غنی یا دوسرے گارڈ اس کو گاڑی میں اپنے ساتھ لے کر پھرتے تو پتا چل جاتا کہ یہ کون ہے اور کس گھر کا ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ہم اس کی تصویر دے کر اپنے کارندے ہر طرف روانہ کر دیں۔ لیکن......''

''لیکن کیا...... آگے بولو......'' فریال نے کہا۔

''بس اب آگے میں بولوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''مسئلہ ہے راز داری...... اول تو کوئی بھی ڈر سے کچھ نہیں بتائے گا۔ دوسرے رازداری نہیں رہے گی۔ ہم کسی کو کچھ بتانا نہیں چاہتے۔''

فریال نے کہا۔ ''راز داری اب کہاں ہے۔ یہ لوٹ کے نہیں گیا تو اب تک معلوم ہو گیا ہوگا کہ پکڑا گیا۔''

''یہ تو عالمی ریکارڈ ہو گیا ایک خوبصورت لڑکی نے ایک دن میں دو عقل کی باتیں کہہ دیں۔'' میں نے کہا۔

''چلو ہم تمہیں تیسری بات کہنے کا موقع بھی فراہم

کرتے ہیں۔'' راجا بولا۔

فریال نے کہا۔ ''بڑے گھٹیا اور متعصب مرد ہو تم دونوں۔''

رابعہ نے کہا۔ ''سب ایسے ہی ہوتے ہیں فریال۔''

''سنو تیسری بات...... اس لڑکے کو چھوڑ دو۔ ایسی شکلیں مت بناؤ جیسے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہے ہیں۔ اس کو یہاں سے ایسے نکالا جائے کہ اسے کوئی شک نہ ہو۔ ایسا لگے جیسے کسی ہمدرد نے اسے فرار ہونے کا موقع فراہم کیا ہے۔ کوئی ہمدرد یا نیک دل انسان ہے جسے اس پر ترس آ گیا ہے...... اور اگر معاملہ ہو بچے کا تو کسی عورت کا دل موم ہو سکتا ہے...... کسی مرد کے مقابلے میں۔''

''اس میں کیا شک ہے...... مرد تو ہوتے ہیں پتھر دل۔'' رابعہ نے کہا۔ شاید وہ ذاتی تجربے کے حوالے سے بھی ایسا کہہ رہی تھی۔

''فرض کرو ریشم اسے پچھلی طرف سے نکال دیتی ہے۔ ریشم اسی علاقے کی لڑکی ہے۔ یہ بات اس کے حق میں جائے گی کہ شاید اس نے لڑکے کو پہچان کے یہ قدم اٹھایا جو مالکوں کے نزدیک نمک حرامی تھی۔ وہ لڑکے کے ہاتھوں پیروں کی رسی کھولے۔ پھر پچھلی طرف کی کھڑکی کھول کے اسے نکال دے کہ بھاگ جائے۔ سرونٹ کوارٹرز کی طرف سے...... مگر ادھر کا گیٹ تو اب کھلا نہیں ہوتا۔'' فریال سوچ میں پڑ گئی۔

''ریشم اسے پچھلی طرف سے اپنے ساتھ لے جائے۔ وہ سرونٹ کوارٹر جس میں کچھ عرصہ کاسو اپنی بیوی کے ساتھ رہا۔ خالی ہے اور اس کی حالت بھی ویسی ہی ہے...... ریشم اس کی باہر کھلنے والی کھڑکی میں سے راستہ بنا سکتی ہے مگر اس میں بھی سلاخیں ہیں مگر وہ نکالی جا سکتی ہیں۔ ریشم اس میں مدد کرے گی تو لڑکے کو شک نہیں رہے گا کہ خدا نے اس کے لیے ریشم کو فرشتہ غیب بنا کر بھیجا ہے۔'' تجویز رابعہ نے دی۔

فریال نے کہا۔ ''رائٹ...... اور جب لڑکا نکل جائے تو باہر کوئی موجود ہو اس کا تعاقب کرنے کے لیے۔ لڑکا قدرتی طور پر بھاگے گا۔ اسے کچھ دور بھاگنے دیا جائے جب وہ محسوس کرے گا کہ اب خطرہ نہیں رہا تو وہ پرسکون ہو جائے گا۔''

''اس کا تعاقب کون کرے گا۔''

''میرا خیال ہے اس کے لیے غنی سے زیادہ موزوں کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہ لڑکے کے گھر تک جائے۔ یہ دیکھے کہ وہ لوٹ کے کسے رپورٹ کرتا ہے غنی کچھ نہ کرے۔ واپس آ کے ہمیں بتا دے۔ اس سے یہ معلوم ہو جائے گا کہ شہناز کہاں ہے...... کس کے قبضے میں ہے۔'' راجا نے کہا

میں نے کہا ''اور اگر وہ سیدھا رانا کے پاس گیا۔''

''پھر تو شک کی کوئی بات ہی نہیں رہے گی۔''

''مگر اس سے مسئلہ تو حل نہیں ہوگا۔ ہم پہلے سے یہ جانتے ہیں کہ شہناز کو رانا ہی نے اغوا کرایا ہوگا۔''

راجا بولا۔ ''پھر شک نہیں رہے گا۔ ابھی یہ ہمارا قیاس ہے۔''

ساری اسکیم سن کے ریشم کا فرط جذبات اور جوش سے برا حال ہو گیا۔ اسے ایک ایسا کام دیا گیا تھا جس میں ایسے ذہانت کے ساتھ اپنی اداکاری کی صلاحیت کو بھی ثابت کرنا تھا۔ یہ ایک چیلنج تھا اور وہ اس پر خوش تھی کہ ہم نے اسے اعتماد پر پورا اترنے کا موقع فراہم کیا اور وہ اس قابل ہے۔ مزید یہ کہ اس کی یہ کوشش ڈاکٹر شہناز کو عافیت کے ساتھ واپسی کی جد و جہد کا ایک حصہ تھی اور ڈاکٹر شہناز سے بڑھ کر اس کا آئیڈیل کوئی نہیں تھا۔

اس نے ساری بات سن کے اور خاص روانی سے بغیر گرامر کی انگلش میں کہا۔ ''یس سر...... آئی ویری گڈ ایکٹنگ...... بوائے سی آنسو، ان مائی آنکھ، اصلی، نو گلیسرین آنسو...... بوائے تھنک آئی ویری گڈ وومن آئی سے یور سسٹر...... شاید ہی سی می...... آن گوہیر اینڈ ویر ڈاکٹر شہناز۔''

اس کے کہنے کا مطلب واضح تھا وہ بہترین اداکاری سے لڑکے کو قائل کرے گی کہ رحم دلی کے جذبات سے مغلوب ہو کے وہ اسے چوری چھپے رہا کرانے کا خطرہ مول لے رہی ہے اور اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر لڑکا بھی یقین کر لے گا مگر اس میں ایک قباحت تھی۔ وہ شہناز کے ساتھ ہر جگہ جاتی تھی۔ اور سب کو نہیں پہچان سکتی تھی مگر سب اسے پہچان سکتے تھے۔ ممکن ہے یہ لڑکا بھی پہچان لے۔

ریشم نے اس یقین کا اظہار بھی کیا کہ کمرے کی سلاخیں نکالنا اس کے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہوگا۔ کچھ اوزار دستیاب ہیں وہ لڑکا بہرحال نوجوان ہے۔ اپنی آزادی کے لیے خود بھی محنت کرے گا۔ اس کے خیال میں یہ آدھے

سمجھنے کا کام تھا۔

میں نے کہا۔ ''غنی کہاں ہے۔ ہم اسے بھی بریف کردیں۔''

وہ جاتے جاتے رکی اور گال پر انگلی رکھ کر بڑی ادا سے بولی۔ ''آئی ٹیل ہم۔ بٹ ہی ناٹ ہیر سر......''

''وہ کہاں گیا ہے۔''

اس نے ہمارے ڈانٹنے پر انگریزی چھوڑ کے اردو میں بتایا کہ غنی قریب کے گاؤں میں مولوی عبدالوحید اور اس کے ساتھیوں کی خبر لینے گیا ہے جو گزشتہ رات پناہ لینے آئے تھے۔ ان میں اس کا ایک یار بھی تھا جو کسی زمانے میں اس کے ٹریک پر کلینر بھی رہا تھا۔ وہ چاہتا ہے کہ کم سے کم اسے رکھ لیا جائے۔ وہ بھروسے کا آدمی ہے اور ہر کام کرسکتا ہے۔

غنی کچھ دیر بعد ہی آ گیا۔ اس نے وہی کہا جو ریشم ہمیں بتا چکی تھی۔ ''میں اسے سمجھانے گیا تھا کہ نواب صاحب کے خلاف کسی سازش میں آلہ کار نہ بنے۔ ہاتھیوں کی لڑائی میں مینڈک پس جاتے ہیں۔ وہ بہت پریشان تھا کہ نواب صاحب نے اسے پناہ نہیں دی۔ ادھر پولیس کی طرف سے خطرہ ہے کہ انہیں زندہ نہیں چھوڑے گی۔ ادھر آپ نے سب کے نام لکھوا دیے ہیں رپورٹ میں......''

''میں نے کہا۔ یہ کیسے معلوم ہوا اسے؟''

''وہ جو نیا نیا تھانیدار بنا ہے جناب۔ حوالدار نبی بخش اس نے ایک بندے کو کان پکڑوائے چوک میں اور چھتر لگوائے کیونکہ اس نے اسے تھانیدار کی بجائے حوالدار کہہ دیا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''دیکھو......ان سب کا نام میں نے ان کو بچانے کے لیے لکھوایا ہے۔ اس نئے تھانیدار کو ہی سمجھا دیا ہے اس طرح کہ ایک بندہ تو مار دیا ہم نے ...... باقی کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔''

غنی نے مایوسی سے کہا۔ ''اس سے کچھ نہیں ہوگا جناب عالی......مارنا ہوگا تو وہ خود نہیں ماریں گے۔ دوسروں سے مروادیں گے۔ بس نام چلتا ہے شامی بادشاہ کا......ان بیچاروں کے پاس تو کچھ نہیں مگر مشہور کردیا جائے گا کہ ڈاکو مار گئے۔''

میں نے کہا۔ ''تم خود سوچو۔ ہم کیا کرسکتے ہیں ان کے لیے یہاں نئے لوگوں کو آباد کرسکتے ہیں، کیسے حفاظت کرسکتے ہیں ہر شخص کی۔''

غنی نے کہا۔ ''آپ نے ابھی موبائل فون تقسیم کیے تھے۔''

میں نے کہا...... ''ہاں...... ہر ایک کو تو نہیں دیا۔''

''ایسا ہوتا اگر آپ انہیں اپنی حفاظت کے لیے ہتھیار دیتے۔ جناب عالی۔''

میں نے حیرانی سے کہا۔ ''یعنی میں سب میں اسلحہ تقسیم کرتا۔ غیر قانونی۔ تم پاگل تو نہیں ہو گئے۔''

''چھوٹا منہ بڑی بات نواب صاحب قانون کہاں ہے۔ آپ غیر قانونی اسلحے کی بات کرتے ہو۔ میں ٹرک بھر کے لاتا تھا اور لے جاتا تھا مشین گن، کلاشنکوف......راکٹ لانچر اسلحہ دستی بم جیسی چیز بھی سارے پاکستان میں ادھر سے لائی جاتی ہیں۔ سرحد اور بلوچستان کے راستے۔ بھارت کے راستے، سمندر کے راستے، اب تو جتنا اسلحہ کراچی میں ہے شاید اتنا پشاور میں نہیں ہوگا۔ وہ کون سا قانونی ہے۔''

راجا نے کہا۔ ''تمہاری بات ٹھیک ہے۔ مگر ہم یہ کیسے کرسکتے ہیں کہ لوگوں کو حفاظت کے لیے مسلح کردیں۔''

''جناب عالی......تنہا شخص ......کمزور اور غریب اپنی حفاظت کیسے کرسکتا ہے۔ اس کے پاس کون سی طاقت ہے۔ آپ نے تو گارڈز رکھ لیے''

ریشم نے خفگی سے کہا۔ ''غنی ......مالکوں کیسے بات کررہا ہے تو۔''

میں نے کہا۔ ''اسے بولنے دو ریشم۔''

غنی نے ایک گہری سانس لی۔ ''سب کے لیے گارڈ نہیں رکھ سکتے۔ یہ آپ نے رات کو بتا دیا تھا۔ میرے پاس ایک ریوالور تھا۔ وہ میں اپنے یار کو دے آیا ہوں۔ میں نے کہا کہ اسے چھپا کے رکھ۔ بس کسی کے سامنے ذکر بھی مت کرنا ......مگر جب موقع ہو اور کوئی تیری جان لینے کی کوشش کرے تو ڈرنا مت ......گولی مار دینا سب کو اور بھاگ جانا غیر علاقے ......جب میں واپس آ رہا تھا تو مجھے راستے میں وہ مولوی مل گیا۔ عبدالوحید......اس نے آپ کو بہت برا بھلا کہا کہ وہ بڑی امید لے کر گیا تھا۔ نواب صاحب خود ڈر گئے۔ میں نے اسے سمجھایا کہ ایسی بات ہرگز نہیں ......نواب صاحب نعوذ باللہ کوئی خدا تو نہیں ہیں کہ سب کو زندگی کی ضمانت دیں مگر سب کی حفاظت کے لیے اسلحہ تقسیم کرنے کا سوچ رہے ہیں۔ جیسے انہوں نے موبائل فون تقسیم کیے تھے۔''

راجا ایک دم بگڑ گیا۔ ''پاگل کے بچے۔ جو منہ میں آیا بک دیا۔''

غنی نے ہاتھ جوڑے......''آپ میری گزارش سن لیں میں نے جھوٹ بولا ......میں مانتا ہوں......آپ کسی کو اسلحہ نہیں دیں گے۔ لیکن ایسا مشہور ہو جائے ......اس میں تو کوئی نقصان نہیں ......یہ بات میں پھیلا دوں گا۔ آہستہ آہستہ سب کے کانوں تک پہنچ جائے گی۔ سب ایک دوسرے سے پوچھیں گے۔ اقرار کوئی نہیں کرے گا مگر پوچھنے والا سمجھے گا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اس کے پاس ضرور اسلحہ ہوگا۔ یہ کونسی ناممکن بات ہے۔ آپ ایسا کرسکتے ہیں آپ کے پاس وسائل ہیں اور آپ پر کوئی الزام بھی نہیں آئے گا...... نہ آپ کے خلاف کوئی جرم ثابت ہوگا۔''

غنی کی ہمت نے حیران کردیا

''لیکن غنی......اس کا فائدہ۔''

''فائدہ انہیں ہوگا جو کمزور ہیں......طاقتور ان پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ کہیں اس کے پاس اسلحہ ہوا تو کیا ہوگا۔''

راجا نے کہا۔ ''اور جب جھوٹ کھلے گا...... بالآخر۔''

''ایسا جھوٹ کبھی نہیں کھلتا سر......اس کے علاوہ۔''

''بولو بولو......رک کیوں گئے۔'' تم بتاؤ بات کیا ہے۔ میں نے کہا کیوں ڈر رہے ہو۔''

''سر آپ ناراض تو نہیں ہوں گے......'' وہ ہاتھ جوڑ کے بولا۔

''نہیں سر...... میں آپ کو ناراض نہیں کرنا چاہتا...... یہ کام تو میں آپ کو بتائے بغیر بھی کرسکتا ہوں ...... مگر کرنا نہیں چاہتا۔''

میں نے کہا۔ ''اچھا بولو میں کچھ نہیں کہوں گا۔''

''آپ تو جانتے ہیں سر......ٹرک ڈرائیوری میں ہر دھندا کیا ہے میں نے ......آپ کی حفاظت کے لیے اسلحہ میں لایا ہوں ...... جو سیکورٹی گارڈ استعمال کررہے ہیں۔ میرا مطلب ہے اس کے پاس اس کا تو لائسنس ہے۔ لیکن اصل میں تو دوسرا ہے۔ کلاشنکوف اور مشین گن کا لائسنس تو ملتا ہی نہیں مگر سب نے باڈی گارڈز رکھے ہیں۔ میں اس علاقے میں پلا بڑھا ہوں۔ میرے سگی بیلی ہر گاؤں میں ہیں۔ اب میں ان سب کو ریوالور دوں گا۔''

''یہ تو بہت خطرناک کام ہوگا۔''

''نہیں سر......وہ اتنے بے وقوف ہیں۔ میں انہیں جانتا ہوں۔ آپ انہیں بھی اپنا وفادار ہی سمجھ سکتے ہیں۔ ضرورت پڑنے پر وہ آپ کے کام آئیں گے ایک طرف میں مشہور کروں گا کہ آپ لوگوں میں اسلحہ تقسیم کررہے ہیں۔ ظاہر ہے۔ اس پر سب کے کان کھڑے ہوں گے۔ رانا صاحب جیسے چونکیں گے۔ پولیس ان سے پہلے چونکے گی۔ آپ تو حلف اٹھا سکتے ہیں قرآن پر ہاتھ رکھ کے کہ یہ جھوٹ ہے۔ آپ کے دشمن خوامخواہ آپ کو بدنام کررہے ہیں لیکن دوسری طرف یہ ہوگا کہ کبھی رات کے وقت ایک گاؤں میں فائرنگ ہوگی، کبھی دوسرے میں۔ کسی کو پتا نہیں چلے گا کہ فائر کس نے کیا اور کس پر۔ پولیس آئے گی اور خانہ تلاشی لے گی۔ لوگوں سے پوچھے گی کہ فائرنگ کس نے کی، کوئی بھی یہ نہیں بتا پائے گا۔ سب یہی کہیں گے کہ وہ سو رہے تھے۔ اسلحہ کہیں سے برآمد نہیں ہوگا مگر اس کی موجودگی ثابت ہو جائے گی۔ سب کی سمجھ میں آ جائے گا کہ آپ کی طرف سے اسلحے کی تقسیم والی بات صرف افواہ نہیں۔ اسلحہ سامنے نہیں مگر ہے......آپ خود سمجھ سکتے ہیں کہ اس کے بعد وہ انسان کی شکل میں پھرنے والے کتے اور بھیڑیے کتنا ڈر جائیں گے۔''

غنی کی اسکیم نے مجھے دم بخود کردیا۔ یہ ذہانت سے کی گئی منصوبہ بندی تھی جو ایک موثر حکمت عملی کے طور پر اپنائی جاسکتی تھی۔ میں نے اسے گلے لگا کے شاباش دی تو اس کا چہرہ مسرت سے چمکنے لگا مگر اس سے زیادہ ریشم کا چہرہ خوشی سے گلنار ہو گیا۔

میں نے کہا ''غنی! یہ یقیناً بہت اچھی اسکیم ہے اور تمہاری ذہانت کا ثبوت ہے۔''

ریشم نے لچکتے مٹکتے منہ بسور کے کہا ''نوبڈی آسک می!''

راجا نے کہا ''یعنی تم سے اجازت لینی ضروری ہے؟''

غنی ہنسنے لگا ''اس کا مطلب ہے جی کہ مجھے تو کوئی پوچھ ہی نہیں رہا ہے۔''

ریشم نے سر ہلایا ''ہی ڈو نوٹ تھنگ ......ہی فول، آئی ٹیل واٹ ہی ڈونٹ اسپیک دی ٹروتھ۔''

میں نے کہا ''بھئی یہ آخری جملہ ثابت کرتا ہے کہ تم نے انگریزی واقعی سیکھ لی ہے۔''

غنی نے اس کی طرف فخر سے دیکھا ''سچ یہ ہے جی کہ

مجھے یہ ساری اسکیم ریشم نے سمجھائی تھی۔ اور ...... میں نے ایسی بے وقوفی کی بات سن کر ایک جھانپڑ مارا تھا۔''

''چلو' اب اس کے لیے معافی مانگو۔'' رابعہ بولی۔

وہ ہنسنے لگا'' معافی تو ہاتھ جوڑ کے مانگ چکا ہوں جی۔ جب اس نے مجھے ساری اسکیم سمجھائی پھر میں سوچتا رہا۔''

''اچھا اب چل' باتیں مت کر۔ وقت ضائع ہو رہا ہے۔'' ریشم نے اس کا بازو پکڑ کے کہا۔

میں نے کہا ''غنی سے تم اردو میں بات کرتی ہو۔ کیا اسے نہیں آتی انگریزی؟''

راجا بولا ''ایسے جاہل شوہر کے ساتھ گزارا کیسے ہوگا تمہارا؟ تم تو انگریزوں سے بھی اچھی انگلش بولتی ہو۔''

''اسے ہمارے سامنے اردو میں سمجھا دو کہ کرنا کیا ہے ورنہ وہ تمہاری صورت ہی دیکھتا رہے گا۔'' میں نے کہا۔

ریشم اس وقت بہت جذباتی اور شوخ ہو رہی تھی۔ ایک بہت اہم ذمے داری اسے سونپی گئی تھی' اس کے محبوب کو اہمیت تو پہلے ہی حاصل تھی لیکن جس طرح میں نے بے اختیار اسے گلے لگالیا تھا' اس سے غنی کا مرتبہ بہت بڑھ گیا تھا یا کم سے کم اس نے ایسا محسوس کیا تھا۔ جس ماحول میں وہ رہے تھے وہاں کم حیثیت اور غریب کو ایک فاصلے پر رکھنے کا دستور تھا تاکہ وہ اپنی اوقات نہ بھولے۔ گلے صرف برابر کے لوگوں کو لگایا جاتا تھا۔ ریشم پہلے ہی بہت خوش تھی کہ اسے حویلی میں اتنی اہمیت حاصل تھی اور ایسی قربت میسر تھی جیسے وہ گھر کے افراد میں شامل ہے۔ اسے کام کرنے کے ساتھ اچھے پیسے مل رہے تھے۔ عزت حاصل ہو رہی تھی اور ڈاکٹر کی اسسٹنٹ کی حیثیت سے شہرت بھی۔ غنی کے ساتھ اس کا مستقبل اس کے سارے خوابوں کی حقیقی تعبیر بن چکا تھا۔

ریشم پندرہ منٹ میں جوش سے پریشر ککر کی طرح بھری ہوئی لوٹی تو فریال نے کہا ''کیا ہوا؟''

''واٹ یو سے میڈم! آئی ڈو...... غنی گو۔''

اس کی انگلش کا ترجمہ یوں تھا کہ غنی نے کام آسان کر دیا۔ اس نے اپنی ٹارزن جیسی طاقت سے سرونٹ کوارٹر کی کھڑکی میں لگی لوہے کی سلاخوں کو ہلا جلا کے ایسا کر دیا کہ ریشم کو دشواری نہ ہو اور پھر باہر جا کے کھڑا ہو گیا۔ ریشم نے لڑکے کو آزاد کیا اور ظاہر ہے اس دوران بے مثل اداکاری کا ایسا مظاہرہ کیا کہ کسی کیمرے نے فلم کے لیے یہ سین شوٹ کیا ہوتا تو اس سال بہترین اداکاری پر ایوارڈ اسی کو ملتا۔

اس نے الفاظ میں نقشہ کھینچ کر بتایا کہ وہ کیسے چوروں کی طرح دبے پاؤں گئی۔ کیسے لڑکے کو چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ کس طرح خوف زدہ نظر آتی رہی۔ پھر کیسے اسے بھگا کے لے گئی۔ کیسے روتے کانپتے اس کو پیار سے گلے لگا کے رخصت کیا اور کیسے سمجھایا کہ وہ بھاگ جائے۔ اس نے لڑکے کے جذبات کی بھی بڑی اچھی ترجمانی کی جو بے حد جذباتی ہو گیا تھا اور ریشم کے گلے لگ کے رو رہا تھا اور بار بار اس کے ہاتھ چوم کے اپنی شکر گزاری کا اظہار کر رہا تھا جیسے سچ مچ ریشم نے اپنی جان پر کھیل کے اس کی جان بچائی ہے۔

ہنس ہنس کے ہم سب کے پیٹ میں بل پڑ گئے مگر ریشم کی انگریزی نہ رکی۔ کسی کے ہنسنے سے اس کی ذرا بھی حوصلہ شکنی نہیں ہوتی تھی۔ وہ غلط سلط انگلش اردو' پنجابی سب کا قیمہ بنا کے بات جاری رکھتی تھی۔ وہ بلاشبہ ایک محنتی' وفا شعار اور مستقل مزاج لڑکی تھی۔ ہر معاملے میں ...... معاملہ کام کا ہو...... انگریزی پر عبور حاصل کرنے کی خواہش ہو یا غنی کا عشق ہو' اس کی لگن اور اس کا جذبہ بڑی توانائی رکھتے تھے۔

غنی کے آنے تک ہم اباجی کی خدمت میں حاضر رہے اور انہیں مطمئن کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ اب پتا چل گیا ہے تو شہناز جلد ہی لوٹ آئے گی۔

اباجی اتنی آسانی سے باتوں میں آنے والے نہیں تھے ''ابھی سے دعوے مت کرو۔ ابھی وہ آئی نہیں ہے' صرف اس کی خیریت معلوم ہوئی ہے۔''

فریال بولی ''یہ بھی پتا چل جائے گا تھوڑی دیر میں کہ وہ کہاں ہے؟''

انہوں نے فریال کو گھورا ''کیسے پتا چل جائے گا اور فرض کرو' معلوم ہو گیا...... کہ وہ ہے رانا کی حویلی میں...... تو پھر کیا یہ سورما توپ خانہ اور فوج لے کر جائیں گے اور اسے چھڑا لائیں گے۔''

اچانک اماں نے پھوٹ پھوٹ کے رونا شروع کر دیا ''اللہ میری بچی کو اپنی امان میں رکھ۔ وہ خیریت سے واپس آجائے۔ تو ہی عزتوں کا رکھوالا ہے میرے معبود!''

رابعہ نے اور فریال نے انہیں بہت سنبھالا مگر وہ زار و قطار روتی رہیں۔ دو دن سے وہ شدید اعصابی دباؤ میں تھیں۔ مسلسل دعا اور ہر وقت وظیفہ ان کا بڑا سہارا تھا لیکن ان کی قوت برداشت جواب دے گئی تھی۔ ابا کے

مقابلے میں جذباتی طور پر وہ پہلے بھی کمزور تھیں۔ پے در پے حادثات اور مشکلات نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ ابا کی طرح میں بھی ان کی طرف سے بہت متفکر رہتا تھا مگر ان کو تفکرات سے محفوظ رکھنے میں ناکام تھا۔

ابا نے افسردگی سے کہا ''ہم تو سمجھے تھے کہ بڑی پرسکون اور آسودہ ہوگی ہماری زندگی یہاں لیکن آدمی جو سوچتا ہے وہ پاتا نہیں۔''

میں نے کہا ''یہ وقتی مسائل ہیں اباجی!''

انہوں نے نفی میں سر ہلایا ''دراصل فرق ہماری تمہاری عمر یا عقل کا ہی نہیں۔ ہم ایک دوسرے کو سمجھنے میں ناکام نہیں۔ لیکن وہ جو چیز ہوتی ہے ناں جنریشن گیپ...... یہی ہے۔ تمہاری خواہشات اور تمہارے خواب کچھ اور ہیں۔ وہ ہماری سمجھ میں اس لیے نہیں آسکتے...... کہ ہم مستقبل میں اتنا آگے نہیں دیکھتے۔ کیسے دیکھ سکتے ہیں' تمہارے پاس خوابوں کو تعبیر دینے کے لیے چالیس پچاس سال ہیں۔ ہمیں تو اب خواب دیکھنے ہی نہیں چاہئیں۔ اتنی فرصت عمر کہاں ہے؟''

''ایسا مت کہیے۔ آپ بھی سب دیکھیں گے۔'' میں نے کہا۔

میں نے محسوس کیا کہ دو دن سے یعنی جب سے شہناز غائب ہوئی ہے لیلیٰ بھابی کا رویہ کچھ عجیب سا ہو گیا ہے۔ وہ چپ ہیں اور گفتگو میں بھی کم حصہ لیتی ہیں۔ جیسے انہیں دلچسپی نہیں۔ بعض اوقات لگتا تھا کہ وہ کچھ اور سوچ رہی ہیں۔ وہ معاملہ فہم اور حاضر دماغ عورت تھیں جو کسی بھی بحران میں آگے رہ کے سب کو سنبھالتی تھیں، مشورے دیتی تھیں اور حوصلہ بڑھاتی تھیں۔ پہلے کے مقابلے میں رابعہ بھی کم گو اور کم آمیز ہو گئی تھی لیکن اس کی وجہ سمجھ میں آتی تھی۔

جب میں نے راجا سے ذکر کیا تو اس نے بھی مجھ سے اتفاق کیا ''یہ تو میں بھی نوٹ کر رہا ہوں۔''

''کیا وہ اکتا گئی ہے یہاں کی غیر دلچسپ زندگی سے۔ جس میں ہر گھڑی ایک نئی آزمائش آجاتی ہے؟''

راجا نے کہا ''شاید۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ فاروق کو مس کرتی ہو؟''

''فاروقی بھی عجیب آدمی ہے' کب سے نہیں آیا؟''

''ایک ہفتہ ہو گیا۔ بیچ میں اتوار بھی تھا۔ پہلے تو ایک رات نہیں رہتا تھا اپنی لیلیٰ کے بغیر...... مجنوں بنا ہوا تھا۔''

''بھائی' آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ اس سے بڑی کوئی سچائی نہیں۔'' راجا نے آہ بھری۔

''یہ پھر عشق تو نہ ہوا؟''

اس نے مجھے غور سے دیکھا ''عائشہ کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اس نے کتنی بار یاد کیا تجھے؟ اس کی دیوانگی کے بعد یہ بے اعتنائی...... کہ سلام تک نہ پہنچے۔ وہ تو خود آرہی تھی تیرے پیچھے۔ اب فون بھی نہیں آتا۔ اس سے بڑا ثبوت کیا چاہیے تجھے؟''

میں نے آہ بھر کے کہا ''ٹھیک کہا تو نے یار! شاید لیلیٰ بھابی کو ایسے اکیلے رہنے کی عادت نہیں۔''

''رہنا بھی نہیں چاہیے۔ عورت کی جذباتی فطرت میں ٹھہراؤ کم ہوتا ہے۔ فوراً شک میں پڑ جاتی ہیں۔ ہول اٹھنے لگتے ہیں دل میں کہ شوہر کی دلچسپی اچانک کم کیوں ہو گئی؟ وہ کسی اور کی طرف ملتفت تو نہیں ہو گیا؟''

میں نے ہنس کے کہا ''یہ خیال تو سب سے پہلے آتا ہے۔''

''لیلیٰ کی پوزیشن یوں بھی کمزور ہے کہ رشتے کے جوڑ کو روز بہ روز مضبوط بنانے والی زنجیریں نہیں ہیں۔''

''تیرا مطلب ہے...... بچے؟''

''ظاہر ہے۔ یہ ڈر تو اسے ہر وقت رہتا ہوگا کہ بچوں کے لیے وہ دوسری نہ کر لے۔ یہ ہر مرد کی ضرورت بھی ہوتی ہے اور مجبوری بھی۔ جب پیسا بھی وافر ہو اور شرعی اور قانونی عذر بھی نہ رہے تو مرد کو بہانہ مل جاتا ہے۔''

''تو نے تو فرض کر لیا ہے کہ اور کوئی بات ہی نہیں ہے فاروقی کسی اور کے چکر میں پڑ گیا ہے؟'' میں نے ہنس کے کہا۔

''اس عورت کے بارے میں کیا خیال ہے جو فاروقی کی سیکریٹری ہے؟'' اس نے بڑے معنی خیز لہجے میں سوال کیا ''کیا نام ہے اس کا...... ہاں مریم!''

''راجا...... تو کہہ رہا ہے......؟''

''ہاں۔ مریم اتنی خوبصورت تو نہیں...... اور نوجوان لڑکی بھی نہیں لیکن وہ ہے بڑی پرکشش۔ بھرپور اور مکمل عورت۔ فاروق جیسے کسی الھڑ دوشیزہ کی ادائے معصومیت پر فریفتہ نہیں ہوتے۔ ایسی ہی عورتوں کے جال میں گرفتار ہوتے ہیں...... طلسمی مکڑی ہوتی ہیں ایسی عورتیں۔''

''بکواس مت کر۔ یہ ہو سکتا ہے' ان کے درمیان مراسم ہوں......''

''فیکے پتر! تو بڑا اُلو ہے۔ دنیا کو اپنی نظر سے دیکھتا ہے مگر تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں ...... مثلاً ہم۔ میں نے جب اسے دیکھا تو بلاشبہ مجھے بھی اس کی حیوانی کشش نے کھینچا۔''

میں نے اعتراف کیا ''جو شاید سب کو کھینچتی ہے۔''

''لیکن میں نے اس میں ایک آسودگی دیکھی۔ اب یہ تجربے کی بات ہے۔ جس عورت کا شوہر نہ ہو۔ وہ جسمانی اور جذباتی طور پر اتنی مطمئن' پرسکون اور آسودہ نہیں ہوتی۔ اس میں ایک پیاس ہوتی ہے۔ ایک اضطرابی خواہش ...... جو فطری ہے۔ جیسے بھوک آنکھوں میں نظر آتی ہے۔ اس عورت کے ساتھ ایسا نہیں ہے ...... مریم سیٹ ہے۔''

میں ہنس پڑا ''تو ماہر جنسیات کب سے ہو گیا؟''

''تو آزمالے ...... کبھی سنجیدگی سے اس کو دعوت دے۔ پھنسانے کی کوشش کر۔ وہ تھپڑ مارے گی تیرے منہ پر کسی بیاہی عورت کی طرح۔ تیری مردانہ سیکس اپیل کو ٹھکرا دے گی۔ حالانکہ تو بڑا فاتح اعظم ہے۔ میں جانتا ہوں ...... وہ خود کو SECURE سمجھتی ہے۔ کوئی رسک نہیں لے سکتی۔''

میں سیریس ہو گیا ''اور ایسا فاروق کی وجہ سے ہے۔''

''آف کورس ...... اگر انہوں نے خاموشی سے شادی نہیں کر رکھی ہے تو پھر ان کے درمیان ایک مفاہمت ہے۔ ایک سیکرٹ انڈر اسٹینڈنگ کہ کر لیں گے جب ضرورت ہو گی۔ فاروق کتنے دے رہا ہے اسے ہر مہینے۔ تنخواہ کی صورت میں؟ مریم کو تحفظ حاصل ہے۔''

''میں نے کبھی پوچھا نہیں ...... مگر یہ تشویش ناک بات ہے راجا! لیلیٰ خطرے میں ہے۔''

''ہر عورت خطرے میں رہتی ہے یا خطرے کے احساس میں ضرور گرفتار رہتی ہے۔ بچوں والی بھی ...... لیلیٰ تو ویسے ہی فاروق کے رحم و کرم پر سیاہ و سفید کی مالک بنی بیٹھی ہے۔''

میں چپ ہو گیا۔ راجا کے خیال کو یکسر مسترد کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس کی بات نے میرا زاویہ نگاہ بدل دیا تھا۔ فاروقی کوئی زاہد پارسا یا خشک مزاج آدمی نہیں تھا۔ وہ شوقین مزاج تھا۔ پینے میں بھی عار نہیں سمجھتا تھا اور آفس میں بھی پی لیتا تھا۔ یہ بات اس نے مجھ سے کبھی نہیں چھپائی

آفس بھی اس کے لیے گھر جیسی آسائش رکھتا تھا۔ اس کے عقبی حصے میں ایک بیڈ تھا۔ ریلیکس کرنے کے لیے۔ وہ کسی دن کورٹ میں زیادہ تھک جاتا تھا تو بقول اس کے کمر سیدھی کرنے لیٹ جاتا تھا اور مریم اس کے موکلوں کو مطمئن کر دیتی تھی کہ وکیل صاحب کے سر میں درد تھا۔ اسپرین کھا کے لیٹے ہیں۔ ابھی آدھے گھنٹے میں آ جائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی واش روم تھا جہاں وہ فریش اپ ہوتا تھا۔ ایک دو بار مجھے ضرورت پڑی تو میں نے اندر میک اپ کا سامان دیکھا لیکن اہمیت نہیں دی۔ عورتیں بیگ میں پوری میک اپ کٹ لیے پھرتی ہیں۔ جہاں موقع ملا یا ضرورت ہوئی لپ اسٹک پھیر لی۔ مریم بھی روز آفس آنے کے بعد ضرورت محسوس کرتی ہو گی۔ اگر اس نے کچھ رکھ لیا ہے تو کیا ہوا؟

یہ مسئلہ ایسا نہیں تھا کہ میں فوری طور پر تشویش میں مبتلا ہو کے کوئی قدم اٹھاتا ...... تفتیش کرتا یا لیلیٰ بھابی کو خبردار کرتا۔ بات لیلیٰ کی خاموشی اور بے دلی والے رویے سے شروع ہوئی تھی۔ راجا نے اسے کہاں پہنچا دیا مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے میرے دماغ میں ایک کھڑکی کا کھول دی جس سے میں امکانات کا وہ منظر بھی دیکھ سکتا تھا جو ابھی تک میں نے اپنی خوش عقیدہ سوچ کے باعث دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

ریشم نے ہمیں باہر ہی کافی لا کے دی۔ خواتین ابھی تک میرے والدین کے پاس بیٹھی، ان کی مایوسی اور اداسی دور کرنے کی کوشش میں مصروف تھیں۔ اچانک میرا فون بجا۔ میں نے کال ریسیو کرنے سے پہلے نمبر دیکھا تو مخمصے میں پڑ گیا کہ کال ریسیو کروں یا نہ کروں؟ مجھے معلوم تھا نور جہاں کس قسم کی باتیں کرے گی اور میں اکیلا نہیں تھا۔ اگر میں کال سننے د۔ چلا جاتا تو راجا شک کرتا نہ کرتا ...... حیران ضرور ہوتا کیونکہ ہمارے درمیان کبھی راز کی بات کو راز رکھنے کا تصور نہ تھا۔ میں گول مول بات کرتا تو راجا تاڑ جاتا کہ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔

ایک بار میں نے نمبر دیکھ کے فون بند کیا تو وہ پھر گنگنانے لگا۔ اب رانگ نمبر کو بھی رانگ نمبر کہنا ضروری تھا۔ میں نے کال ریسیو کی۔

میری ہیلو کے جواب میں دوسری طرف سے بڑی واضح آواز آئی ...... بوسہ ارسال کرنے کی ''کیا کر رہے

ہو ...... جانِ من!''

میں نے کہا ''کچھ نہیں۔''

وہ ہنسی ''کچھ کرنا چاہتے ہو تو آ جاؤ۔ وہ کیا کہتے ہیں فارسی میں۔ بے کار مباش کچھ کیا کر۔'' پھر عادت کے مطابق گانے لگی ''ہم بھی اکیلے تم بھی اکیلے ......''

مجھے فون بند کرنا پڑا لیکن اس سے پہلے کہ راجا کوئی سوال کرتا ...... میں نے غنی کو واپس آتے دیکھ لیا۔ وہ سیدھا ہماری طرف آیا۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔

میں نے کہا ''کیا ہوا غنی! وہ چھوکرا جل دے گیا؟''

وہ ہمارے پاس آ کے رونی شکل کے ساتھ چپ کھڑا ہو گیا ''چھوکرا کیا سر! تقدیر جل دے گئی۔'' اس نے ایک گہری سانس لی اور اس وقت میں نے دیکھا کہ آنسو غنی کی آنکھوں میں رکے ہوئے ہیں۔

میں نے اسے تسلی دی ''کچھ بولو تو سہی' اس میں رونے کی کون سی بات ہے؟''

وہ سچ مچ رو پڑا ''سر ...... انہوں نے مار دیا اسے۔''

میرے ذہن کو الیکٹرک شاک لگا ''مار دیا ...... کس نے مار دیا؟''

''انہی ظالموں نے' جنہوں نے اسے بھیجا تھا۔'' وہ آنسو پونچھ کے بولا ''میرے سامنے مار دیا اور میں کچھ نہ کر سکا ...... چھپا رہا بزدلوں کی طرح۔''

راجا نے کہا ''آرام سے بتاؤ' کیا ہوا ...... پانی پی لو پہلے۔''

اس نے پھر ایک ٹھنڈی سانس لی ''میں اس کے پیچھے تھا مگر اسے معلوم نہیں تھا۔ وہ کھڑکی سے کود کے بھاگا تو میں نے دیکھا۔ میں پچاس قدم دور ایک درخت کی آڑ سے دیکھ رہا تھا۔ میں فوراً اس کے پیچھے نہیں گیا بلکہ کچھ دیر بعد اس کے متوازی دبے پاؤں گیا۔ وہ بار بار مڑ کے پیچھے دیکھتا تھا کہ کوئی اس کے تعاقب میں تو نہیں آ رہا ہے۔ کچھ اس کے اپنے قدموں کی آواز تھی اور پھر گھبراہٹ کہ دائیں بائیں اس نے دیکھا بھی نہیں ورنہ شاید اس کی نظر مجھ پر پڑ جاتی۔''

''وہ کدھر جا رہا تھا؟'' میں نے کہا۔

''لگتا تو ایسا ہی تھا کہ رانا کی حویلی کی طرف جائے گا۔ آگے جا کے اس نے رخ بدل لیا۔ دراصل سیدھا راستہ کم تو ہے لیکن مشکل ہے۔ اس کے پیروں میں جوتے نہیں تھے۔ آپ نے دیکھا ہو گا۔ ہو سکتا ہے وہ صاف راستے سے بھی وہیں پہنچتا۔ دریا کے کنارے پر وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا۔ میرا خیال ہے تھکن دور کرنے کے لیے۔ اس کے بعد آرام سے چلنے لگا۔ دریا میں پانی تو بہت کم ہے۔ تین چار الگ دھارے بن گئے ہیں۔ میں نے سوچا وہ نکل جائے تو میں بھی دریا پار کروں ورنہ وہ دیکھ لے گا۔ وہ پار اترا ہی تھا کہ دوسری طرف سے تین بندے آ گئے۔ ان میں سے ایک کے کندھے پر کلہاڑی تھی اور دوسرے کے ہاتھ میں لاٹھی۔ معلوم نہیں انہوں نے لڑکے سے کیا پوچھا' اشاروں میں۔ لڑکے نے وضاحت کی ہو گی۔ پھر تیسرے شخص نے جو خالی ہاتھ تھا' اس کے تھپڑ مارا۔ لڑکا گر گیا اور نہ جانے ہاتھ ہلا کے کیا بتانے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ اپنی کلائیاں دکھا رہا تھا اور پیروں کے ٹخنے۔ ان میں سے ایک نے جھک کر دیکھا اور غالباً اس نے وہ نشان دیکھ لیے جو رسی کے تھے۔ لڑکے نے بتایا ہو گا کہ اسے واپس آنے میں دیر اس لیے لگی کہ اسے پکڑ کے کمرے میں بند کر دیا گیا تھا اور باندھ کے ڈال دیا گیا تھا۔ وہ اس سے اشاروں میں ہی سوال جواب کرتے رہے۔ میرا خیال ہے کہ خالی ہاتھ آنے والا اس کا باپ ہو گا۔ ساری بات وہی کر رہا تھا۔ یہ جرح پندرہ بیس منٹ جاری رہی۔ شاید لڑکے نے بتا دیا کہ اس سے پوچھ کچھ بھی ہوئی تھی اور پوچھ کرنے والے کون تھے؟ بس اس کے بعد نہ جانے کیا ہوا کہ لاٹھی والے نے کلہاڑی والے سے کچھ کہا ...... تیسرا شخص سامنے آ گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ان کے عزائم کی راہ میں حائل ہو رہا ہے۔ انہوں نے اسے دھکا دے کر گرایا اور لاٹھی والے نے لڑکے کو مارا۔ لاٹھی اس کے سر میں لگی۔ وہ چکرا کے گرا تو کلہاڑی والے نے وار کیا اور لڑکے کا سر کسی نرم پھل کی طرح دو حصوں میں تقسیم ہو گیا ...... پھر وہ چلے گئے۔ انہوں نے تیسرے شخص سے کہا کہ وہ لاش اٹھا کے چلے۔ اس نے مجبوراً لاش اپنے کندھے پر ڈالی اور پیچھے چلنے لگا۔ میرے پاس بھرا ہوا ریوالور تھا۔ مجھے کئی بار خیال آیا کہ ان کو گولی مار دوں مگر دریا کے اس کنارے سے وہ کافی دور تھے۔ دوسرے کنارے سے بھی سو گز آگے۔ میرا نشانہ اتنا پکا نہیں ہے۔ ریوالور کی گولی اتنے فاصلے سے ان کو زخمی کرتی۔ اس کا فائدہ کچھ نہ ہوتا۔ وہ لڑکے کو بہرحال مار جاتے۔ اگر میں قریب جانے کے لیے دوڑتے، دریا سے گزرتا اور ان کو للکارتا تو کیا پتا خود نشانہ بن جاتا۔ ان کے پاس بھی ریوالور بھی ہو گا۔ یہی سوچ کے میں رک گیا۔''

یہ بڑی دردناک کہانی تھی۔ ایک بے زبان' بے حیثیت اور بے معرف سمجھے جانے والے نوجوان کی داستان حیات کا انجام ایسے ہی ہونا تھا۔ اگر وہ اپنی افادیت ثابت کر دیتا تو غلامی کی زندگی کے کچھ ماہ وسال اور جی لیتا لیکن وہ ایسا کرنے میں ناکام رہا۔ اسے ایک چھوٹا سا کام دیا گیا تھا جو اس نے خرابی کے ساتھ سرانجام دیا۔ اس پر لازم تھا کہ گرفتار نہ ہوتا۔ وہ بول نہیں سکتا تھا۔ لکھ کے کچھ نہیں بتا سکتا تھا مگر اس کا امکان تو تھا کہ اس نے اشاروں کی زبان میں کچھ بتا دیا ہو۔ اسے جو سزا دی گئی وہ ہمارے جرم کی تھی۔ ہم نے اسے پکڑا اور زیر تفتیش رکھا۔ اگر ہم اسے نکل جانے دیتے تو کوئی خرابی نہ ہوتی۔ اسے جینے کا حق حاصل رہتا اور وہ فخر سے سر اٹھا کے چلتا کہ گونگا بہرا ہونے کے باوجود وہ کارآمد ہے۔ جو کام اس نے کیا کوئی اور نہیں کر سکتا تھا۔

جب مارنے والوں نے لاٹھی اٹھائی ہوگی تو اسے بچانے والا یاد آیا ہوگا اور وہ نازک' شوخ اور مہربان لڑکی یاد آئی ہوگی جس نے اسے پھر آزادی اور زندگی کی راہ پر روانہ کر دیا تھا۔ اس نیک دل لڑکی کی آنکھوں میں آنسو تھے لیکن جب قضا آتی ہے تو ایسے ہی آتی ہے۔ یہ بات وہ لڑکا نہیں جانتا تھا۔ اسی طرح جیسے وہ نہیں جانتا تھا کہ لڑکی رحم دلی کی اداکاری کر رہی تھی۔ اسیری سے رہائی محض فریب آرزو تھی۔ درحقیقت تو دست قضا اسے زندگی کی طرف نہیں موت کی طرف دھکیل رہا تھا۔

کچھ دیر ہم بھی اس بدنصیب لڑکے کے المیے پر افسوس کرتے رہے پھر میں نے کہا ''غنی! تقدیر سے کوئی نہیں لڑ سکتا۔ اپنی طرف سے ہم نے اچھا ہی سوچا تھا مگر اللہ کی رضا کچھ اور تھی۔ یہ بات کسی کو بھی بتانے کی ضرورت نہیں۔''

''خصوصاً ریشم کو...... سب سے زیادہ دکھی وہ ہوگی۔'' راجا نے کہا۔

''آپ نے ٹھیک کہا جناب عالی! میں کسی سے کچھ نہیں کہوں گا لیکن وہ پوچھے گی۔''

''کہہ دینا...... کہ وہ غائب ہو گیا۔ شاید اسے شک ہو گیا تھا کہ میں اس کا پیچھا کر رہا ہوں۔'' میں نے سمجھایا۔

میرے ذہن میں ایک اور کشمکش چل رہی تھی۔ میں نے نورجہاں کا فون نہیں سنا تھا لیکن اس کی دعوت کو مسترد نہیں کیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ میری خاطر سب کچھ کرنے کو تیار ہے۔ میرے لیے دشمنوں کے کہنے پر ترغیب کا جال پھیلا رہی تھی یا یہ اس کے دل کی آواز تھی۔ اگر فی الحقیقت میں اس کی حمایت اور مدد حاصل کر سکتا ہوں تو اس سے بہت سے فائدے حاصل ہو سکتے ہیں۔ وہ اکبر خان پر حاوی تھی اور یقیناً بہت سی مفید اور اہم معلومات کے حصول کا ذریعہ بن سکتی تھی۔ ابھی سب سے اہم مسئلہ شہناز کی بازیابی کا تھا...... دیگر معاملات کی حیثیت ثانوی ہو گئی تھی۔

میں نورجہاں کے جال میں ایک بار پہلے بھی پھنس گیا تھا۔ کچھ اپنی کمزوری کے سبب لیکن زیادہ اس کی ہوشیاری کے باعث۔ میری غلطی یہ تھی کہ میں نہ چاہتے ہوئے بھی وہاں رکا اور اس نے فائدہ اٹھاتے ہوئے مجھے کچھ پلا دیا اور دہرے نشے نے میرے حواس مغلوب اور میری عقل کو مفلوج کر دیا۔ ایک اس کے حسن و شباب کا نشہ تھا۔ اس کے ساتھ جام شراب کا نشہ شامل ہوا تو میں سب کچھ بھول گیا لیکن میری اس غلطی کا ابھی تک اس نے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا تھا۔ یہی بات مجھے حوصلہ دیتی تھی کہ مجھے بلیک میل ہونے سے نہیں ڈرنا چاہیے۔ اگر وہ خود اپنی کمزوری کو عیاں کر رہی ہے تو اس میں کوئی جھوٹ نہیں ہے۔ الٹا یہ موقع مجھے حاصل ہو رہا ہے کہ میں اسے بلیک میل کر سکوں۔

دلائل کا زیادہ وزن نورجہاں کے حق میں تھا۔ تھوڑی سی کشمکش جذباتی تقاضوں کی تھی۔ پھر مجھے راجا کو اعتماد میں لینا چاہیے۔ اس میں ڈر یہ تھا کہ کہیں وہ مخالفت نہ کرے اور مجھے روک نہ دے۔ وہ مان لے گا کہ مطلب نکالنے کے لیے کسی غیر اخلاقی فعل کو بھی نظریۂ ضرورت کی سند حاصل ہوتی ہے...... مگر وہ سوال کرے گا کہ یہ دھوکا ہوا پھر؟ نورجہاں سے مجھے رسوائی کے سوا کچھ نہ ملا پھر......؟ یہ اکبر خان کی چال ہوئی پھر......؟ کیا ہوگا فریال کے اور میرے مستقبل کا انجام؟ کیا بدگمانی اس کے دل سے جائے گی؟ وہ تسلیم کرے گی کہ میں نے جو کیا ایک مقصد رکھتا تھا اور وہ مقصد ہوس کی تسکین نہیں تھا؟ کیا کوئی عورت جذبات کی یلغار کے سامنے عقل کا ہتھیار استعمال کر سکتی ہے؟

ان سارے سوالات اور اندیشوں کے باوجود میرے اندر کوئی آواز تھی جو مجھے یہ موقع نہ گنوانے پر اکساتی تھی۔ کہنے کو کہا جا سکتا ہے کہ یہ لاشعوری طور پر نورجہاں کے لیے میری کشش تھی...... ایک خالص حیوانی جذبہ جسے اور کوئی عنوان نہیں دیا جا سکتا...... لیکن میں جانتا تھا کہ ایسا نہیں ہے۔

بالآخر میں نے یہ جوا کھیلا۔ کسی کو بتائے بغیر اپنوں کے اپنی نیک نامی اور فریال کی محبت کو داؤ پر لگا دیا۔

میرے کال کرنے پر نورجہاں کی کھنکتی آواز آئی ''میری جان! میں اس وقت بہت خوش ہوں' پوچھو کیوں؟''

''تم خود ہی بتا دو۔''

''جب تم نے فون بند کر دیا تھا تو میں نے سوچا تھا کہ تم نے کسی کے ڈر سے ایسا کیا ہوگا۔ تم پھر فون کرو گے اور تب سے میں فون پکڑے تمہاری آواز سننے کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ تم نے میرے یقین کو غلط ثابت نہیں ہونے دیا۔''

میں نے کہا ''نورجہاں! مجھے ڈر لگتا ہے۔''

وہ ہنسی ''ڈر تو مجھے بھی لگتا ہے۔''

''تم اکبر خان سے ڈرتی ہو ناں...... مجھے یہ ڈر لگتا ہے کہ کہیں یہ اکبر خان کا اسکرپٹ نہ ہو...... جو تم بول رہی ہو؟''

''چلو میں آ جاتی ہوں تمہارے پاس...... ہمیشہ کے لیے...... میں تو پہلے ہی یہ آفر دے چکی ہوں...... بولو منظور ہے؟''

''میری زندگی فریال کے لیے وقف ہے۔''

وہ ہنسنے لگی ''یار کیسے مسلمان ہو تم۔ چار کے قائل نہیں...... خیر چھوڑو...... ایک اہم خبر ہے میرے پاس تمہارے لیے...... لیکن فون پر نہیں بتاؤں گی۔''

''کیا ثبوت ہے کہ تم جھوٹ نہیں بول رہی ہو؟''

''جان من! اپنا دل چیر کے کیسے دکھاؤں تمہیں...... ایک بار ملو تو سہی۔''

میں نے کہا ''او کے۔ میں آتا ہوں۔''

اس کے بعد میں نے سوچا کہ میں راجا سے کیا کہوں اور فریال کو کیا بتاؤں کہ مجھے اچانک لاہور جانے کی کیا ضرورت پڑ گئی ہے؟ بہت سوچ سمجھ کے میں نے ایک جھوٹ بولا۔

میں نے راجا سے کہا ''یار' میں فاروقی کی طرف جا رہا ہوں۔''

راجا حیران ہوا ''اس وقت؟''

میں نے کہا ''ابھی چھ بجے ہیں...... نو بجے تک پہنچ جاؤں گا۔ دراصل اباجی کے پرانے مکان کی فروخت کے معاملے پر فاروق سے مشورہ کرنا تھا۔ میں سوچتا ہوں کسی طرح وہ ڈیل ختم ہو جائے۔ اب کچھ افسوس ہو رہا ہے کہ جلدی میں اسے بیچنے کا فیصلہ کر لیا۔''

''ڈیل اب کینسل نہیں ہو سکتی...... اور اگر ہو گی تو کیا کرے گا تو اس جگہ کا۔''

''یار! وہ میرے ماں' باپ کی نشانی ہے۔ میرا بچپن گزرا ہے وہاں۔''

''تیرا دماغ خراب کیوں ہو گیا اچانک؟''

''اچانک نہیں...... میں بہت دن سے سوچ رہا تھا۔'' میں نے کہا۔

''تو اس وقت جانے کی کون سی تک ہے۔ صبح چلے جانا۔''

میں نے کہا ''نہیں یار! میں کل واپس آ جانا چاہتا ہوں۔ فاروق دن میں تو ملتا نہیں۔ رات کو ساڑھے نو کے بعد ہی فارغ ہوتا ہے۔ میں اس کے ساتھ گھر چلا جاؤں گا۔ صبح وہ کورٹ جائے گا۔ میں واپس روانہ ہو جاؤں گا۔''

''تو نے بتا دیا ہے اسے۔''

''نہیں۔ اور تو بھی ذکر مت کرنا کسی سے...... دراصل تیری بات پر میں نے بہت غور کیا۔ اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ فاروق کوئی فرشتہ نہیں۔ میرے اچانک پہنچنے کا ایک مقصد چھاپا مارنا بھی ہو سکتا ہے۔ اگر تیری بات سچ نکلی تو عین ممکن ہے وہ رنگے ہاتھوں پکڑا جائے۔ مریم کے ساتھ...... ایک چانس ہے۔''

تھوڑی سی بحث کے بعد راجا نے مجھے اجازت دے دی۔ اسے شک ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ جو میں کہہ رہا ہوں سچ نہیں ہے۔ ''باقی سب لوگ کیسے مطمئن ہوں گے؟'' راجا نے سوچ کے کہا...... ''کہ اس وقت کیا ایمرجنسی تھی۔''

''یار! تو کچھ بتا دینا۔ میں کس کس سے بحث کروں گا۔ فریال پیچھے پڑ جائے گی اور پھر اماں بھی۔''

راجا نے کہا ''میں کہہ دوں گا کہ شاہی بادشاہ کا پیغام لایا تھا کوئی...... اس نے ابھی بلایا تھا...... فکر کی کوئی بات نہیں۔''

مجھے افسوس ہوا کہ یہ بہانہ مجھے کیوں نہیں سوجھا ''بالکل ٹھیک ہے۔ ویسے ہم نے جو پیغام بھیجا تھا اس کا جواب نہیں ملا۔''

''پتا نہیں اس کا وہ نامہ بر مجذوب گیا یا نہیں۔ پیغام ملتا تو وہ ضرور آتا۔ کم سے کم جواب ضرور ملتا۔''

میں چپکے سے نکل گیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مجھ پر

احساس جرم وگناہ کا شدید بار تھا مگر نور جہاں مجھے کھینچ رہی تھی۔ میں اسے آزمانا چاہتا تھا کہ میری مدد کے معاملے میں وہ کتنی سیریس ہے۔ وہ صرف اپنا اُلّو سیدھا کر رہی ہے یا واقعی میرے لیے کچھ کرنا چاہتی ہے۔ اس کی شرط اصل مشکل تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ پہلے میں کچھ کروں۔ جو وہ چاہتی تھی ہر لحاظ سے غیر اخلاقی' معیوب اور غلط تھا۔

میں نے آدھے راستے میں خود سے سوال کیا۔ نیکے پتر! کہیں ایسا تو نہیں کہ تم نے اس کے بے پناہ حسن' اس کے سحر آفریں اور نشہ آور اور بے بس کر دینے والے شباب کی سفلی قوت کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا ہے۔ جیسے تم چوری چھپے لذت گناہ سے فیضیاب ہونے میں مضائقہ نہیں سمجھتے۔ کسی کو کچھ پتا نہ چلے تو حرج ہی کیا ہے۔ وہ کون سی باعصمت دوشیزہ ہے کہ کسی کو فرق پڑے۔ اور یہ تو نہیں کہ ایک رات کا تجربہ تمہاری نفسانی خواہش اور حیوانی جبلت کے لیے اتنا مکمل، تسکین بخش اور پر لطف تھا کہ شیطان جو ہر انسان کے اندر چھپا رہتا ہے' تمہیں مغلوب کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے؟

بالآخر میں نے مان لیا کہ یہ بھی ایک وجہ ہے۔ خواہ یہ واحد وجہ نہ ہو۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ میں نے بھی ایک ضرورت کو ڈھال بنا لیا ہے۔ مجھے اپنے آپ سے شرم بھی آئی مگر میں نے گاڑی کا رخ واپس نہیں موڑا۔ اب اس کا تصور میرے حواس پر غالب آنے لگا تھا۔ اس کا یہ دعویٰ سچ تھا کہ جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا تو دم بخود رہ گیا تھا۔ وہ چیز ہی ایسی تھی۔ اس کے سراپا میں خوبصورتی مجسم ہو گئی تھی۔ اس کے چشم ولب ورخسار سے پیکر کے خطوط تک۔ اس کے سنگ مرمر میں ڈھلے ہوئے شفاف بدن سے زلف مشکبار کے خواب آور اندھیرے تک۔ اس کی ادائے ناز سے اس کے تکلم تک اور تبسم تک۔

جب میں نے اس کے گھر کے سامنے گاڑی روکی تو عقل پھر دامن گیر ہوئی۔ ٹھہرو' سوچو کہیں تم کسی دام بلا میں گرفتار ہونے کے لیے تو کشاں کشاں نہیں جا رہے ہو۔ رسوائی کی آتش نمرود میں تو نہیں کود رہے ہو۔ ابھی وقت ہے' سوچ لو' سمجھ لو۔

میں رک گیا۔ میں نے سوچا کہ کیا یہ کافی نہیں۔ میں یہاں تک آ گیا، اب اسے بھی آزمانا چاہیے۔ وہ میرے لیے ست بدھائی آنے پر تیار تھی۔ اکبر خان کا گھر دشمن کا حصار تھا۔ میں اس کے اندر داخل ہونے کا خطرہ کیوں مول لوں؟ وہ باہر آئے' جہاں میں بلاؤں، جہاں خطرہ نہ اس کے لیے ہو اور نہ میرے لیے۔ اگر اس کی طلب میں بدنیتی اور سازش کا پہلو نہیں ہوا تو وہ آ جائے گا۔ اکبر خان کے گھر میں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ میرا استقبال خود اکبر خان کرے۔ کوئی سوال کیے بنا مجھے گولی مار دے یا نور جہاں نے کوئی بندوبست کیا ہو جو پہلے نہیں تھا۔ ایک بار اعتبار قائم کر لیا' دوسری بار فائدہ اٹھا لیا۔ ایک رات کی ساری کہانی کسی کیمرے نے ریکارڈ کر لی تو میں پھنس گیا۔ دین و دنیا میں کہیں کا نہ رہا۔

عقل کی اس رہنمائی نے مجھے اعتماد دیا۔ میں نے ایک محفوظ راہ لے لی۔ میں نے اسے فون کیا ''نور جہاں! میں آ گیا ہوں۔''

وہ میری آواز سنتے ہی چلائی ''افوہ ...... کہاں ہو تم؟ کیوں اتنا انتظار کرا رہے ہو؟''

میں نے کہا ''میں چاہتا ہوں' آج تم آؤ۔''

''میں آؤں ...... کہاں؟ ست بدھائی؟''

میں نے کہا ''اتنی دور نہیں۔ میں تمہیں قریب ہی مل جاؤں گا۔''

''میں سمجھ گئی۔ تم ڈرتے ہو' اندر آنے سے۔''

میں نے کہا ''ہاں۔ ملاقات تو کہیں بھی ہو سکتی ہے۔''

''کوئی جگہ بتاؤ۔''

میں نے کہا ''تم اکیلی آ ؤ گی' آ سکتی ہو؟''

''ہاں۔ یہ مشکل ضرور ہو گا لیکن میں نکل آؤں گی کسی طرح۔ اگر میں گاڑی لے کر جاؤں گی تو گیٹ کیپر دیکھے گا۔ رات بھر نہ آئی تو یہ بات چھپی نہیں رہے گی۔''

میں نے کہا ''تم آؤ تو سہی۔ میں تمہیں پک کر لوں گا۔''

اس نے سوچ کے کہا ''دیکھو۔ ایسے مشکل ہے' میں کسی کی مدد لوں گی۔ اپنی ایک سہیلی کو بلاؤں گی۔ کہاں ملو گے تم؟''

میں نے مال کے ایک بینک کا نام لیا ''وہاں آ جاؤ۔ اپنی سہیلی سے کہنا تمہیں چھوڑ کے جائے۔ مجھے اس کی گاڑی کا نمبر بتاؤ۔''

''بڑے شکی ہو تم۔ عزت دار ہو ناں ...... ڈرتے زیادہ ہو اور شریف بھی ہو بدقسمتی سے۔ خیر' میں ایک بلیو سوک میں

...ں کی۔ دو تین سال پہلے کا ماڈل ہے' نمبر تو مجھے یاد ...

...کتنی دیر میں؟''

...آدھا پون گھنٹا۔ ایک گھنٹا بھی لگ سکتا ہے۔''

...ٹھیک ایک گھنٹے بعد میں نے اسے نیلے رنگ کی ہنڈا ...ک سے اترتے دیکھا۔ وہ دو ہزار ایک کا ماڈل تھا اور ...ے ایک عورت ہی چلا رہی تھی جس کی صورت میں نہیں ...یکھ سکا۔ میں ایک بک اسٹال کی سائڈ میں اخبار اپنے ...سامنے کیے کھڑا تھا۔ وہاں کچھ اندھیرا بھی تھا۔ جب ...ور جہاں کو اتار کے گاڑی آگے نکل گئی تو میں نے اسے فٹ ...تھ پر کھڑا دیکھا۔ وہ ہر طرف مجھے تلاش کر رہی تھی۔ ...کاروں کا ایک سیل رواں اس کے سامنے مال روڈ پر سے ...گزرتا جا رہا تھا۔ وہ ہر کار کو دیکھتی تھی کہ شاید وہ اس کے ...سامنے آ رکے۔ اسے ان لوگوں کی پروا نہ تھی جو قریب سے ...گزرتے تھے تو اسے دیکھ کر بے اختیار ٹھٹک جاتے تھے۔ ...س کا حسن بے مثال انہیں شاک دیتا تھا اور اس کے سراپا کی ...کشش ان کو وقتی طور پر بے خود کر دیتی تھی۔ خود میں دور سے ...یکتا رہا اور سوچتا رہا کہ کیا عورت کا اس سے زیادہ حسین ...روپ ممکن ہے؟ بے شک حسن دیکھنے والے کی نظر میں ملتا ...ہے۔ افریقا میں اس کا انداز کچھ اور ہے' چین میں کچھ اور ...لیکن ایشوریا رائے مس یونیورس ہے۔ سب کی نظر میں حسین ...ہے، اس سے کسی کو انکار نہیں۔

...دس منٹ بعد جب وہ تھک گئی تھی اور بیزار ہو گئی تھی' ...میں نے آگے جا کے کہا ''ہیلو!''

وہ چونک کے پلٹی ''بڑے ظالم ہو۔ جانتے بوجھتے مجھے ...انتظار کرا رہے تھے ناں۔''

میں نے کہا ''چلو آؤ' میرے ساتھ۔''

میرے ساتھ بیٹھ کے اس نے دروازہ بند کیا تو ایک ...ذہن اور احساس پر چھا جانے والی' ہیجان خیز اور بے خود ...کر دینے والی جادو اثر خوشبو نے مجھ پر یلغار کی۔ لندن اور ...پیرس خوشبوؤں کے شہر ہیں۔ وہاں جا کے میں نے ایسی ...خوشبوؤں کا تجربہ کیا تھا جو سیکسی کہلاتی تھیں۔ خواتین کے ...لیے وہ پرفیوم جس کا اثر مرد کے شہوانی جذبات کو متحرک ...کرے اور مردوں کے لیے ایسی جو خواتین کو جنسی خواہش ...سے مغلوب کریں۔ محنت اور ریسرچ وہاں زندگی کے ہر ...شعبے میں کارفرما ہے چونکہ خود میں نے ایسی خوشبویات کا استعمال کیا تھا۔ (پلے بوائے نہ سہی' میں کوئی خشک مزاج زاہد بھی نہ تھا) اور ان کا شکار بھی ہوا تھا اس لیے میں نے نور جہاں کے وجود سے پھوٹنے والی مہک کو محسوس کر لیا۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ اس کے جسم کی خوشبو ہے' کوئی اسپرے نہیں ہے۔

گاڑی چلی تو اس نے مدہوشی کے انداز میں اپنا سر میرے کندھے پر رکھ دیا ''کہاں لے جا رہے ہو مجھے؟'' وہ آنکھیں بند کر کے بولی۔

میں نے کہا ''ابھی میں نے طے نہیں کیا۔''

''میں بتاؤں ......؟'' اس نے کہا ''ایک گیسٹ ہاؤس ہے۔''

میں نے کہا ''وہ بدنام ہوتے ہیں۔''

''اچھا تو مجھے کسی فائیو اسٹار ہوٹل کے برائیڈل سوٹ میں لے چلو۔'' وہ ہنسی ''میں سمجھ لوں گی آج میری شب عروسی ہے اور میرا دلہا میرے ساتھ ہے اور میں دلہن ہوں۔ ہم فرض کر لیں تو کیا حرج ہے۔''

''ہاں' نہ سہی وصل تو حسرت ہی سہی۔ ایکٹنگ ہی سہی۔'' میں نے کہا ''مگر خطرہ تو ہوٹل میں بھی ہو گا۔''

''پھر ......؟ میرے گھر میں بھی تم جاتے ہوئے ڈرتے ہو۔ تمہارا اپنا کوئی گھر ہے نہیں۔ رات بھر کیا اسی گاڑی میں پھرتے رہیں گے ...... اسی طرح ......؟ بس' اب ادھر موڑ لو گاڑی۔ میں بتاتی ہوں کہاں جانا ہے۔''

اس کے حکم نے مجھے بے بس کر دیا۔ درحقیقت تو میں پہلے ہی بے بس ہو گیا تھا۔ اس کے کہنے کے مطابق میں نے گاڑی کو ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے گیٹ سے اندر موڑ لیا ...... پارکنگ میں ایک اٹینڈینٹ نے مجھ سے گاڑی لے لی اور پارک کرنے لے گیا ...... میں کسی ہپناٹائز کیے جانے والے شخص کی طرح نور جہاں کے ساتھ لاؤنج میں گیا جہاں میں نے خود کو اور اسے مسٹر اور مسز ظاہر کیا لیکن اپنا نام غلط بتایا ...... وہ پرسکون انداز میں کھڑی رہی ...... ایک لفٹ بوائے ہمیں لفٹ کے راستے اوپر لے گیا ...... وہی کچھ دیر بعد گاڑی کی چابی کے ساتھ نمودار ہوا تو نور جہاں نے اسے سو کا نوٹ بطور ٹپ دیا اور کہا ''باہر ڈونٹ ڈسٹرب'' کی تختی لگا دو۔'' اس نے سر جھکا کے یس میڈم کہا اور چلا گیا۔

ہلکی سی خنکی کے باعث نور جہاں نے کندھوں پر شال بھی ڈال رکھی تھی۔ کمرے میں اس نے یہ شال الگ کی تو

میں نے اس کے ملبوس کی حشر سامانی اور جلوہ افزائی دیکھی ...... کہنے کو وہ مکمل لباس تھا مگر یوں لگتا تھا جیسے لباس بھی اس کے شانوں سے پھسل کے گر جائے گا ...... ساری کی شفاف تہوں میں بھی اس کا پیکر یوں جھلکتا تھا جیسے سطح آب کے نیچے چاندنی۔

وہ رات طلسم ہوشربا کے فسانے جیسی تھی جس نے مجھ پر سنسنی خیزی سے معمور حیرتوں اور نا قابل تصور انبساط کے سارے در کھول دیے ...... وہ عورت نہیں تند و تیز شراب کی ایسی بوتل تھی جس کا نشہ پینے والے کو جرعہ اول میں ہی ہوش سے بے گانہ کر دیتا تھا۔ اس کا شباب ایک ایسی بلاخیز طوفانی لہر تھا جو یلغار کرتی تھی تو اپنے ساتھ کھینچ کے لے جاتی تھی ...... وہ طوفانی بارش کی طرح تھی جو پیاسی دھرتی پر گرتی ہے تو مٹی کی پیاس بھی بجھاتی ہے اور خود بھی مٹی میں جذب ہو جاتی ہے۔

اس رات کی کہانی میں شاید کوئی نیا پن نہیں ...... یہ ہر عورت کی زندگی میں آنے والی بہت [illegible] راتوں جیسی ہی تھی۔ اور اگر کسی پہلو سے اس میں کچھ نیا تھا تو اسے ضابطہ تحریر میں نہیں لایا جا سکتا۔ کچھ مصلحت کے تقاضے ہیں تو کچھ لفظوں کی کمی کا مسئلہ ...... لفظ سب کچھ تو بیان نہیں کر سکتے۔

رات کے آخری پہر میں اس نے میرے کان میں کہا۔

''رفیق ...... مجھے چھوڑ کے مت جاؤ۔''

''کیا مطلب ...... باقی زندگی ایسے ہی گزار دیں ...... اسی بیڈ پر۔''

وہ اٹھلا کے بولی۔ ''اگر یہ نہیں ہو سکتا تو پھر مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔''

میں نے کہا۔ ''یہ ناممکن ہے۔''

''کیوں ناممکن ہے؟'' وہ اٹھ بیٹھی۔

میں نے کہا۔ ''اس لیے کہ تم اکبر خان کی بیوی ہو۔''

''یہ جھوٹ ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ہو گا ...... مگر وہ کہتا ہے تو ہو ...... اس کے علاوہ مجھے شادی کرنا ہے فریال سے۔''

''تو کرو ...... مگر میں نہیں رہ سکتی تمہارے بغیر ......'' وہ مجھ سے لپٹ گئی۔

میں نے اسے دور کیا۔ ''رہ سکتی ہو ...... اور تمہیں رہنا چاہیے تمہارے یہ جذبات وقتی ہیں ...... تمہاری زندگی کا یہی انداز ہے۔''

اس نے میرے تھپڑ مارا ...... لیکن مصنوعی غصے کے ساتھ جس میں پیار کا انداز تھا۔ ''بار بار مجھے طوائف کہہ کے ذلیل مت کرو ...... ایک طوائف بھی وفادار ہو سکتی ہے اگر اسے وفا ملے۔''

میں اسے الگ کر کے اٹھ بیٹھا۔ ''دیکھو ...... ہمارا کا یہ تعلق ایک ضرورت کے تابع تھا۔''

''کس کی ضرورت؟''

''تمہاری ......''

وہ تلخی سے بولی۔ ''اور تمہاری نہیں ...... واہ شہزادے ...... ولایت پلٹ نواب صاحب ...... میں کیا گن پوائنٹ پر لائی ہوں یہاں ...... ست بدھائی ہے کہ تم خود آئے۔''

میں نے کہا۔ ''تم نے کہا تھا ...... ایک اہم اطلاع میرے لیے۔''

اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''اتنی جلدی کیا ہے ...... ابھی تو صبح ہوئی ہے اور تم دنیا داری کی باتیں لے بیٹھے۔''

''میں نے کہا تھا کہ صبح واپس آ جاؤں گا ...... مجھے جانا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اب تم کیسے جاؤ گی ...... کیا کہو گی؟''

وہ ہنسی۔ ''کچھ نہیں ...... میں اپنی اسی سہیلی کو بلا لوں گی ...... وہ مجھے گھر چھوڑ دے گی۔''

کچھ دیر بعد جب ہم ٹیرس پر بیٹھ کے ناشتا کر رہے تھے تو وہ چپ اور کچھ اداس تھی۔ غسل کے بعد اس کا رنگ دمک اٹھا تھا اور صبح کی روشنی اس کے کندن جسم کو آتش فشاں بنا رہی تھی۔ اس کے گیلے بال کمر کے پیچھے پھیلے ہوئے تھے۔ ہیئر ڈرائر لگا کے انہیں سکھانے لگی۔

''پھر کب ملو گے؟''

میں نے سوچ کے کہا۔ ''اس کا انحصار تمہارے مجھ سے تعاون پر ہے ...... تم نے کہا تھا کہ میں سب کچھ کر سکتی ہوں اب دیکھنا یہ ہے کہ کتنا کرتی ہو۔''

وہ مجھے دیکھتی رہی۔ ''تمہیں اعتبار نہیں ہے مجھ پر؟''

''اعتبار صرف الفاظ سے قائم نہیں ہوتا ...... عمل سے ہوتا ہے۔ ایک بار تم نے یہ ثابت بھی کیا ہے ...... بے شک تم نے صوفی چچا کو جس طرح دنیا کے وبال سے نجات دلائی ...... وہ ایک ظالمانہ انداز تھا ...... لیکن۔''

اس نے میری بات کاٹ دی۔ ''رفیق ...... تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''محبت کیسے ہو سکتی ہے ...... یہ زندگی ہے ...... کوئی فلم تو نہیں ...... کہ لو ایٹ فرسٹ سائٹ ہو جائے اور ہم گانا گانے لگیں۔''

''میں تمہیں اچھی لگتی ہوں؟''

''بہت ...... اس میں کوئی شک نہیں ...... تم جیسی عورت میں نے یورپ امریکا میں دیکھی نہ کہیں اور ...... اس میں کوئی مبالغہ نہیں۔''

''ایک دن میں تمہیں جیت لوں گی۔'' وہ بولی۔ ''تمہارا دل بھی جیت لوں گی۔ میں نے سنا ہے ڈاکٹر شہناز غائب ہو گئی ہے۔''

میں چونکا۔ ''کس سے سنا ہے؟''

''یار سنا ہے کسی سے ...... غلط تو نہیں سنا ناں۔'' وہ ہنسی۔

''کسی نے اغوا کر لیا ہے اسے ...... یہ نہیں سنا۔''

وہ سر ہلانے لگی۔ ''ابھی تو نہیں ...... اگر کچھ معلوم ہو گا تو ضرور بتاؤں گی تمہیں ...... ابھی ایک اور دھماکا کروں گی میں۔''

''کیسا دھماکا۔'' میں چوکنا ہو گیا۔

''تمہارا یہ جگری یار ...... بیرسٹر فاروقی ......'' اس نے اپنے لیے چائے کا دوسرا کپ بنانا شروع کیا ''بہت اعتبار ہے اس پر تمہیں۔''

''ہاں ...... اتنا ہی جتنا مجھے خود پر ہے۔''

''میں تمہیں خبردار کرنا چاہتی ہوں۔'' وہ سکون سے سر پیچھے کر کے چائے پینے لگی۔ ''وہ مار آستین ہے۔''

''شٹ اپ ...... ایسی الٹی سیدھی باتوں سے میں مطمئن نہیں ہو سکتا۔''

''میں نے اسے خود دیکھا اکبر خان سے ملاقات کے لیے آتے ہوئے ...... ابھی تین دن پہلے۔'' وہ سکون سے بولی۔ ''چاہو تو پوچھ لو اس سے۔''

میں اسے بے یقینی سے دیکھتا رہا ''وہ کسی کام سے گیا ہو گا۔''

''کام سے آیا ہو گا تو بتا دے گا تمہیں ...... مگر میرا خیال ہے وہ چھپائے گا ...... فون کرو اسے۔''

میں کچھ دیر سوچتا رہا۔ سیل فون جیب سے نکال کے فاروقی کا نمبر ملایا ...... وہ خفگی سے بولا۔ ''فٹے چتر ...... یہ کیا ترائی پن ہے۔''

میں نے کہا۔ ''سر کیا ہو گیا؟''

''اب یہ کیا چکر بازی کی ہے تو نے ...... وہاں کہہ کے آیا کہ میں فاروقی کے پاس جا رہا ہوں ...... سچ بتا کہاں ہے ...... ورنہ قسم خدا کی ابھی بتاتا ہوں فریال کو۔''

''کیا بتائے گا تو اسے ...... مجھے بھی بتا دے۔''

''آخر یہ جھوٹ کیوں بولا تو نے ...... میں تو حیران رہ گیا جب فریال نے کہا کہ میری بات کرا دو رومیو سے ...... میں نے کہا کہ بی بی ...... کیسا رومیو ...... کہاں کا رومیو ...... میرے اسٹاک میں تو نہ رومیو ہے نہ جولیٹ۔''

میں نے کہا۔ ''اب میری بھی سن لے ...... رات کو میں تیری طرف ہی آ رہا تھا۔ گجرات سے آگے گاڑی خراب ہو گئی ...... بڑی مشکل ہو گئی ...... ایک بس میں گجرات گیا ...... وہاں رات کو پہلے تو مکینک نہیں ملا ...... پھر آیا میرے ساتھ تو کہنے لگا کہ اس کا تو بال بیرنگ ٹوٹ گیا ہے ...... آگے والے ڈرائیونگ سائیڈ کے وہیل کا ...... اس وقت بال بیرنگ کہاں سے ملتا ...... میں واپس گجرات گیا ...... رات ایک درمیانے ہوٹل میں رہا۔ صبح آٹو پارٹس کی دکانیں بھی دیر سے کھلیں ...... اب پھر مکینک کو لے کر آیا ہوں ...... وہ گاڑی ٹھیک کر رہا ہے۔''

''ابے تو فون نہیں کر سکتا تھا۔''

''نہیں ...... اس کی بیٹری خلاص ہو گئی تھی ...... تجھ سے کچھ بات کرنی تھی مگر اب تو ٹائم نہیں رہا۔''

''ہاں یار ...... میں تو کورٹ جا رہا ہوں۔''

میں نے اچانک سوال داغ دیا ''تیرا کسی سے رابطہ تو نہیں ہوا شہناز کے سلسلے میں۔''

''ابے مجھ سے کون رابطہ کرے گا!''

''تو وکیل ہے ناں ہمارا ...... بلکہ اٹارنی جنرل ...... میں نے سوچا شاید اکبر خان نے کوئی بات کی ہو یا کہیں ملاقات ہوئی ہو۔''

''اکبر خان! ...... اکبر خان کی بات کہاں سے آ گئی ...... کیا شہناز کو اس نے اغوا کیا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''شک اس پر بھی جاتا ہے۔''

''میری کسی سے بات نہیں ہوئی ...... نہ ملاقات۔''

میں نے کہا۔ ''مریم کا کیا حال ہے؟''

مجھے یوں لگا جیسے وہ اچھل پڑا ...... ''ابے ...... مریم ......

مریم کیسے یاد آ گئی تجھے بیچ میں...... تو نشے میں تو نہیں ہے...... پاگل تو نہیں ہو گیا ہے۔''

''میں نے کہا۔'' کسی روز میں اسے بھگا لے جاؤں گا اور فون بند کر دیا۔

نور جہاں مسکرانے لگی۔'' کیوں سرکار...... ہم نے کیا کہا تھا۔''

''میری سمجھ میں نہیں آتا...... یہ کہ جھوٹ کیوں بولا اس نے؟''

وہ ہنسنے لگی۔'' تم نے بولا پہاڑ کے برابر جھوٹ...... مگر بلندی اس کے پہاڑ کی زیادہ ہے...... پوچھو کیوں؟''

''اگر ایسے ہی بتا دو۔''

''او کے...... میں بتاتی ہوں...... تمہارا جگری یار جس پر تم اتنا بھروسا کرتے ہو اکبر خان سے ایک سودا کرنے آیا تھا۔''

میں نے کہا۔'' کیسا سودا؟''

''تمہاری زندگی کا۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔

''کہو کہ بکواس ہے یہ بھی...... میں نہیں مانتا۔''

میں نے کہا۔'' ڈراما مت کرو...... تم نے اتنی بڑی بات کی ہے تو مجھے اس کا ثبوت بھی چاہیے۔''

''ثبوت میں کیا دوں...... یہ سلسلہ تو بہت دن سے چل رہا ہے۔ میں اسی گھر میں رہتی ہوں اور اکبر خان میری وفاداری پر شک نہیں کرتا...... پوچھو کیوں؟''

یہ اس کی عادت تھی مگر میں نے جھلا کے کہا۔

''کیوں؟''

''کیونکہ میں اسے یقین دلاتی رہتی ہوں کہ مجھ سے زیادہ اس کا خیر خواہ کوئی نہیں ہو سکتا۔ میں نے ہی اسے اکبر خان بنایا ہے...... جو وہ آج ہے...... ورنہ تم جانتے ہو کہ وہ کیا تھا...... ایک جاہل ان پڑھ آدمی۔''

''میرے سرونٹ کوارٹر میں رہنے والا...... ایک چوکیدار۔''

وہ ہنسی...... ''کس زمانے کی بات کرتے ہو...... جب اسے میرے سپرد کیا گیا تو وہ کروڑ پتی تھا۔''

میں نے کہا۔'' اسے کس نے تمہارے سپرد کیا؟''

''وہ...... جن کے لیے اکبر خان کام کرتا تھا۔'' اس نے گول مول جواب دیا۔

''ان کا کوئی نام بھی ہوگا؟''

''ایسے لوگوں کے کئی نام ہوتے ہیں اور کئی چہرے...... پہچانا ایک بھی نہیں جاتا...... ان دنوں میں نے ماڈلنگ شروع کی تھی۔ ایک نوعمر ناتجربے کار لڑکی تھی میں جس کے خواب بہت بڑے تھے۔ جو اشتہاروں سے سلور اسکرین تک کا سفر ایک جست میں کرنے کی آرزومند تھی۔ پہلے دو اشتہاروں کے چلتے ہی بہت سے لوگوں کی نظروں میں آ گئی...... ان میں سے کچھ بھیڑیے تھے...... کچھ گدھ...... کچھ محض کتے...... وہ میرے گرد منڈلانے لگے...... ایک جاگیردار مجھے داشتہ بنانا چاہتا تھا...... لیکن میری خوش قسمتی کہ کسی کے چنگل میں پھنسنے سے پہلے ہی میں کسی اور کی نگاہ انتخاب میں آ گئی...... اس نے مجھے بلایا...... میرا انٹرویو لیا اور جب اسے معلوم ہوا کہ میں اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی ہوں اور ذہین بھی...... تو اس نے مجھے اپنی سیکریٹری بنا لیا...... اس نے صاف کہا کہ یہ تمہاری لائن نہیں...... ماڈل بن کے کتنا کما لو گی تم...... فلموں کا زمانہ تو گزر گیا...... گجروں اور بدمعاشوں کے نام پر بننے والی فلموں کے دور میں نام کمانا بھی مشکل ہے...... اسٹیج پر ڈانس کرنے والی ننگی ہیروئنیں زیادہ کما رہی ہیں...... اس نے ایک جھوٹ بھی بولا مجھ سے کہ وہ مجھے بمبئی لے جا کے بالی وڈ میں انٹروڈیوس کرائے گا...... مہیش بھٹ کی بیٹی پوجا بھٹ سے اس کے مراسم ہیں...... اس نے جو تنخواہ مجھے دی اس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتی تھی...... اس کے ساتھ میں ملکوں ملکوں پھرنے لگی...... میں نے سارا یورپ دیکھا...... خریداری بھی بہت کی...... جیولری...... پرفیوم...... بیش قیمت ملبوسات۔''

''تم ایک کیریر تھیں؟''

''یس...... کئی سال رہی...... میرے نام بدلتے گئے۔''

''تم کبھی پکڑی نہیں گئیں؟'' میں نے کہا۔

''ایک بار بھی نہیں...... لیکن وہ مارا گیا...... وہ بدرد تھا...... بدمعاش تھا...... بدکردار تھا...... لیکن وضعدار تھا...... بات کا پکا۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ میں دنیا کی سب سے خوب صورت عورت ہوں...... لیکن ایک بار بھی اس نے مجھ سے شادی کے لیے نہیں کہا...... ورنہ میں یقیناً اس سے شادی کر لیتی۔ اس کی موت کے بعد میرا دل اچاٹ ہو گیا...... میں نے کہا کہ اب میں پاکستان میں رہنا چاہتی ہوں...... انہوں نے اکبر خان کو میرے سپرد کر دیا کہ اس کی تربیت کرو...... میں نے اسے پڑھنا لکھنا، کپڑے پہننا اور بات کرنا سکھایا...... اور جب اس نے کہا تو اس سے شادی بھی کر لی۔''

''ابھی تم اس کی تردید کر چکی ہو۔''

''میرا مطلب اس شادی سے تھا...... جس کا ضامن نکاح ہوتا ہے۔ ہر رات میں اس کی بیوی ہوتی ہوں...... اس سے وفادار بھی ہوں...... سب کے سامنے تسلیم کرتی ہوں کہ اس کی بیوی ہوں...... وہ مجھ سے بہت خوش ہے...... میرے اشاروں پر چلتا ہے...... میں اس کی مشیر ہوں...... راز دار ہوں...... پارٹنر ہوں...... مجھے سب معلوم ہوتا ہے۔''

''فاروقی کے بارے میں تمہیں کیسے معلوم ہوا؟''

''یہ پلان میں نے دیا تھا...... کہ فاروقی کو استعمال کرو...... اس نے غور سے میری بات سنی اور مان گیا...... میں نے مریم سے دوستی کی...... آہستہ آہستہ اسے لالچ کے جال میں پھنسایا...... وہ شدید احساس محرومی سے دوچار تھی...... اس کی خواہشات کی دنیا بہت بڑی تھی...... اسے پیسے کی ضرورت تھی...... جو کچھ فاروقی اسے دیتا تھا وہ اس کے لیے بہت ناکافی تھا...... لیکن میرے کہنے سے اس نے فاروقی کو ترغیب کے جال میں پھنسایا...... وہ اپنی بیوی سے محبت ضرور کرتا تھا مگر وہ روایتی عورت تھی...... اللہ میاں کی گائے جو مردوں کو لبھانے اور ان کا دل خوش رکھنے کے طریقے نہیں جانتی...... مریم جانتی تھی...... اس نے فاروقی کو احساس دلایا کہ دولت سے زیادہ اولاد ضروری ہے ورنہ کس کام کی یہ دولت...... اسے آدمی قبر میں تو لے جا نہیں سکتا...... اس نے فاروقی کو اپنی بیوی سے دور کیا...... یہ کہہ کر وہ بنجر زمین ہے...... اس میں وہ امیدوں کی فصل کیوں بو رہا ہے...... پہلے تعلقات استوار ہوئے اور جب وہ حاملہ ہو گئی۔''

میں اپنے لیے چائے کا دوسرا کپ بنا رہا تھا...... کپ میرے ہاتھ سے گر گیا۔'' مریم حاملہ ہو گئی۔ کیا انہوں نے شادی کر لی ہے؟''

''نہیں کی تو کر لیں گے...... مریم بے وقوف نہیں ہے...... اسی کے ذریعے اکبر خان نے ترپ کا پتا پھینکا ہے...... اس نے مجھ سے کہا اور میں نے مریم کو سمجھایا کہ وہ چاہے تو ست بدھائی کی ریاست اس کی ہو سکتی ہے...... پہلے پہل یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی...... اس نے سیریس ہونے کی کوشش نہیں کی...... وہ کہتی تھی کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے...... مگر آہستہ آہستہ ہم نے اس کے دماغ میں ایک اسکیم داخل کی...... جیسے کمپیوٹر کی پروگرامنگ ہوتی ہے...... ایک آفر ہماری طرف سے تھی...... اگر مریم جال کامیابی سے پھینکنے میں کامیاب ہو گئی تو اسے فوراً جو فائدہ ہوگا...... وہ کروڑوں میں بھی ہو سکتا ہے...... اس کا فاروقی سے کوئی تعلق نہیں...... بس وہ فاروقی کو اکبر خان کے پاس پہنچا دے...... نواب آف ست بدھائی رفیق احمد شیرازی کے ساتھ وہ اپنا پرانا دوستی اور وفا کا رشتہ بھول کے بزنس کی بات کرنے آئے...... بزنس سمجھ لے گا تو فائدہ خود بخود سمجھ میں آ جائے گا...... مریم کو کافی پاپڑ بیلنے پڑے۔''

''کتنا عرصہ۔''

''وقت زیادہ نہیں لگا...... اور ایک قدرتی فائدہ حاصل ہوا...... اس کی بیوی گھر سے ست بدھائی چلی گئی...... وہ وہیں رہنے لگی...... فاروقی خود اس سے ملنے جاتا تھا...... وہ آتی تھی تو فاروقی کے ساتھ...... لیلیٰ کی عدم موجودگی میں یہاں مریم رہی...... آج بھی ہو گی...... اگر تم چیک کرنا چاہو تو کر لو...... میں تمہیں اس کا موبائل فون نمبر دے دیتی ہوں فاروقی کے گھر کے فون پر وہ کال ریسیو نہیں کرتی...... اس وقت فاروقی کورٹ میں ہے...... وہ گھر میں آرام سے سو رہی ہو گی...... شام کو بن سنور کے اس کے ساتھ اس کی کار میں آفس چلی جائے گی...... تم اچانک گھر پہنچ جاؤ تو اس کی تصدیق کر سکتے ہو...... کیونکہ اس وقت تمہارے وہاں نازل ہونے کی نہ وجہ ہے نہ امکان۔''

''میں بات کر چکا ہوں فاروقی سے...... اس نے مریم کو خبردار کر دیا ہو گا۔'' میں نے مایوسی سے کہا۔

''بس تو وہ اپنی گاڑی میں بیٹھ کے نکل گئی ہو گی۔ واپس اپنے گھر۔''

میں نے کہا۔'' کمال ہے...... گھر میں دوسری عورت رہے تو گھر کی مالکن اس کی خوشبو محسوس کر لیتی ہے...... اس کی نظر کسی جاسوس کی طرح اجنبی بال دریافت کر لیتی ہے اور پھر بال کی کھال نکالنا کیا مشکل ہے۔''

''فاروقی چالاک ہے...... مریم اس بیڈ روم میں نہیں ہوتی جس میں لیلیٰ سوتی تھی...... وہ گیسٹ روم میں رہتے

ہیں جسے کوئی نہیں کھولتا...... صفائی مریم خود کرتی ہے...... ملازموں پر منہ بند رکھنے کی پابندی ہے...... تو خیر...... مریم خلاف توقع بہت جلد کامیاب ہوگئی...... فاروقی ایک دن آگیا...... اکبر خان نے سارا پلان اس کے سامنے رکھا...... رفیق کو تم پر اتنا اعتماد ہے کہ تم کہو چھلانگ مار دو تو وہ کنویں میں کود جائے...... پھر تمہاری بیوی اس فیملی میں شامل ہوگئی ہے...... تمہارے لیے رفیق کا پتا صاف کرنا کیا مشکل ہے۔"

غصے، صدمے اور بے یقینی کے ساتھ میں نے کہا۔ "فاروقی کیسے مان سکتا ہے؟"

"بھیکے پتر...... دنیا ویسی نہیں رہی جیسی تمہارے خیالوں میں ہے...... لوگوں کے چہرے بھی بدل گئے ہیں...... کیا تم نے دیکھا نہیں کہ بھائی کیسے بھائی کا دشمن ہوا...... وہ بھی خود کو ست بدھائی کا وارث سمجھتا تھا۔ اور اس کے نتیجے میں تمہارے خاندان میں کیسی نحوست اور تباہی آئی...... ساری زندگی پیار محبت سے ساتھ گزار دینے والوں نے کیا کیا؟"

میں نے کہا۔ "دیکھو وہ وارث تھے...... فاروقی تو کچھ نہیں...... پھر اسے ست بدھائی سے کیا مل سکتا ہے؟"

"نواب صاحب...... میری بات دھیان سے سنو...... پیسا کسی کا نہیں ہوتا مگر سب کو اپنا بنا لیتا ہے...... فاروقی نے شرافت، دوستی سب چھوڑ دی...... اس نے اکبر خان کا ساتھ دینا منظور کر لیا...... اب یہ کیسے ہوگا...... یہ بھی سمجھ لو...... تمہیں راستے سے ہٹائے گی اس کی بیوی...... دباؤ سے یا بلیک میلنگ سے۔"

میں اچھل پڑا۔ "لیلیٰ بھابی۔"

"ہاں تمہاری وہ پیاری بھابی...... وہ تمہیں زہر دے گی...... مجبوراً۔"

"تم پاگل ہوگئی ہو...... مجھے بھی پاگل کر رہی ہو۔"

وہ بولتی رہی...... تمہارے بعد ست بدھائی کی جاگیر ملے گی رابعہ کو...... تمہارے ماں باپ تو صدمے سے ہی مر جائیں گے...... تمہارے انتقال پر ملال کے بعد...... ست بدھائی کے قبرستان میں تین قبریں نئی بنی ہیں...... تین اور بن جائیں گی...... رابعہ واحد زندہ وارث کی حیثیت سے جائداد کی مالک ہوگی...... اس کا قانونی مشیر کون ہوگا؟ مسٹر فاروقی...... اس کا سب سے بڑا ہمدرد...... مخلص...... جو چاہو سمجھو...... اور فاروقی تمہیں راستے سے ہٹا سکتا ہے تو رابعہ کو بھی ہٹا سکتا ہے...... تم پہاڑ ہو تو وہ کنکری...... یا پتھر سمجھ لو...... مگر وہ ایسا نہیں کرے گا...... اب یہاں سے پلان کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے جس کی خبر مریم کو بھی نہیں...... وہ سمجھ رہی ہے کہ سارے معاملات اس کے شوہر ثانی کے ہاتھ میں ہوں گے تو سب اپنا ہوگا...... اس بے وقوف کی نظر یہ نہیں دیکھ رہی ہے کہ جس شوہر نے بیوی نمبر ایک کو چھوڑ دیا۔"

"چھوڑ دیا؟ یعنی فاروقی اسے بھی مروا دے گا؟"

"یار کیوں اچھلتے ہو بار بار۔" وہ ہنسی...... "اس دنیا میں یہ سب ہوتا ہے...... تم نہیں کرتے تو کیا ہوا...... کیوں رکھے گا وہ اس عورت کو جو بے مصرف تھی...... پھر خطرناک بھی ہو جائے گی...... اس سے ڈر رہے گا کہ بھانڈا نہ پھوڑ دے غصے میں، ڈیپریشن میں...... میرے ویو پوائنٹ سے جب وہ کبھی ضد کرے گی تو درحقیقت اپنے ہی ڈیتھ وارنٹ پر دستخط کرے گی...... فاروقی جیسا قانون شناس آدمی اسے زندہ رکھنے کا رسک مول نہیں لے سکتا...... یہی صورت حال مریم کی ہے...... اگر اس نے رعایت دی تو ٹھیک ہے...... مریم بھی رہے...... اچھی چیز ہے استعمال کے لیے...... مگر وہ کوشش کرے گا رابعہ سے شادی کرنے کی...... اور کامیاب بھی ہو جائے گا...... پوچھو کیوں؟"

میں نے ہاتھ جوڑ کے کہا "خدا کے لیے بتا دو کیوں؟"

وہ ہنس پڑی۔ "رابعہ کو تحفظ چاہیے۔ وہ ایک بار دھوکا کھا چکی ہے...... اکیلی ریاست کا انتظام نہیں چلا سکتی...... پھر فاروقی ہی اس کے لیے حالات کے مطابق آئیڈیل شوہر ثابت ہو سکتا ہے...... ذہین...... طاقتور...... بااثر...... قانون داں...... باعزت...... آئی بات سمجھ میں۔"

میرا دماغ گھوم رہا تھا۔ میں کسی بات پر یقین نہیں کرنا چاہتا تھا مگر ایسا ہی تھا جیسے اجالے سے بچنے کے لیے میں کھڑکیاں دروازے بند کر دوں اور تاریک پردے ڈال دوں۔

میرے سامنے نور جہاں تھی جو اس وقت مجھے دنیا کی سب سے حسین اور پرکشش عورت نہیں...... سب سے ذہین عورت بھی لگ رہی تھی...... مگر اس سے بڑھ کر وہ مجھے اپنی سب سے زیادہ مخلص مشیر و مددگار لگ رہی تھی...... اس نے مجھے جس خطرے سے بروقت آگاہ کیا تھا وہ میں دیکھ ہی نہیں سکتا تھا...... اگر وہ نہ دکھاتی...... کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا تھا

میں اسے دیکھ رہا تھا...... اس نے مجھے لالچ دے کر بلایا تھا...... اور میں ہوس کا مارا کچے دھاگے سے بندھا چلا آیا تھا...... لیکن اب میں محسوس کر رہا تھا کہ شاید میں نے کوئی غلطی نہیں کی تھی...... نور جہاں میرے لیے محض خوب صورتی کی نہیں...... خوش بختی اور زندگی کی علامت بھی بن گئی تھی۔

مجھے نہیں معلوم کہ میں کتنی دیر چپ بیٹھا اسے دیکھتا رہا...... پھر اچانک باہر سے کسی کی آواز آئی۔

نور جہاں ایک دم کھڑی ہوگئی "یہ...... تو اکبر خان کی آواز ہے۔"

میرا دل اچھل کے حلق میں آگیا "اکبر خان...... وہ یہاں کیسے آگیا؟"

نور جہاں کا رنگ لاش کی طرح سفید ہوگیا...... "پتا نہیں...... مگر یہ وہی ہے...... شک کی کوئی بات نہیں۔"

"دیکھنا تو پڑے گا تمہیں۔"

"پاگل ہوگئے ہو؟ میں دیکھوں؟ میرا یہاں کیا کام؟"

وہ چھپنے کے لیے الماری کی طرف بھاگی...... "تم دیکھو...... جاؤ۔"

میرے پاؤں من من بھر کے ہوگئے...... آہستہ آہستہ میں آگے بڑھا...... اس وقت تک نور جہاں الماری میں روپوش ہوگئی تھی۔ وہ اپنے ساتھ اپنی موجودگی کی ساری نشانیاں بھی سمیٹ کر لے گئی...... ان میں کچھ غیر ضروری کپڑے تھے...... اس کا بیگ تھا اور جوتے جو سامنے تھے۔

میں نے تھوڑا سا دروازہ کھولا۔

مجھے ذہنی طور پر ایک بہت بڑی آفت، ذلت، رسوائی اور ہنگامہ آرائی کا سامنا تھا، اب میرے لیے فرار کے راستے مسدود تھے۔ فرار ہونے کے لیے میرے پاس ایک ہی راستہ تھا کہ میں کھڑکی سے باہر سڑک پر کود جاؤں اور پانچویں منزل سے سڑک پر قدم رنجہ فرماؤں تو حرام موت مروں اور خودکشی کے اسباب سامنے آئیں تو لواحقین کو ایک اور صدمہ ہو کہ نواب صاحب جان سے گئے تو کس کے لیے؟ ایک بدنام زمانہ عورت کے لیے۔ شہید وفا کا لقب پاتے تو یہ ایک اعزاز ہوتا، بے وفائی اور ہوس پرستی کا الزام پا کے کیا پایا؟

نور جہاں کا بعد میں جو حشر ہوتا سو ہوتا، مجھے یقین تھا کہ دروازہ کھولتے ہی اکبر خان کسی ولن کی طرح دھاڑتا، پھنکارتا اندر گھس آئے گا اور میرے سینے پر ریوالور رکھ کر پوچھے گا کہ نور جہاں میری بیوی کہاں ہے؟ انکار سے بات نہیں بنے گی۔ اول تو وہ نور جہاں کے وجود کی خوشبو سے اس کا سراغ لگا لے گا۔ یہ خوشبو مجھے یہاں کھینچ لائی تھی تو وہ شوہر کیسے نہ پہچانے گا کہ وہ یہاں تھی اور یہاں ہے۔ ظاہر ہے یہاں تک اس کا آنا کسی مصدقہ اطلاع کی بنیاد پر ہوگا۔ وہ اسے آسانی سے تلاش بھی کر لے گا۔

انجام یہ ہوگا کہ یہاں سے دو، کم سے کم ورنہ تین لاشیں اٹھائی جائیں گی۔ میری اور نور جہاں کی...... اور اگر جوابی کارروائی میں اکبر خان بھی میرے ہاتھوں مارا گیا تو کل کے اخبارات بڑی عبرت ناک لو اسٹوری شائع کریں گے جو باتصویر ہوگی۔ فائیو اسٹار ہوٹل کے کمرے میں شوہر سے بے وفائی کرنے والی عورت اور اس کے آشنا کا قتل۔ ست بدھائی کے نواب رفیق احمد شیرازی ایک حسینہ کے دام الفت میں گرفتار ہو کے جان گنوا بیٹھے۔ قاتل شوہر پہلے ان کا ملازم تھا۔

یہ اور ایسی بہت سی رسوا کن سرخیاں میری نظر میں گھوم گئیں۔

خود کردہ را علاجے نیست۔ اب اپنی بدبختی، رسوائی کا سامنا بھی ضروری تھا۔ شب وصل اور لذت خواب سحر کا یہ انجام میرے تصور میں بھی نہ تھا مگر دنیا غلط نہیں کہتی۔ برے کام کا برا نتیجہ۔ میں نے دل مضبوط کر کے دروازہ کھولا۔

اکبر خان میرے سامنے ہی موجود تھا۔ لیکن میری طرف اس کی پشت تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ گھوم کے دیکھتا، میں نے دروازہ پھر بند کر دیا جس کے باہر ابھی تک "ڈونوٹ ڈسٹرب" کی تختی جھول رہی تھی۔ کنڈی لگا کے میں نے دروازے سے پشت لگائی اور آنکھیں بند کر کے چند گہری سانسیں لیں۔ میں نے محسوس کیا کہ ایرکنڈیشنڈ کمرے میں بھی میرے ماتھے پر پسینے کی نمی ہے اور میری ٹانگوں میں جان نہیں۔

میں جو بڑا نڈر تھا اور بہادر تھا' بے خطر آتش نمرود میں کود سکتا تھا' موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے گزر سکتا تھا۔ جوڈو کراٹے جانتا تھا اور فیکے پتر سے نواب رفیق احمد شیرازی کے مرتبے تک پہنچا تھا تو اپنی خوش بختی پر ناز کرتا تھا۔ اس لیے ڈر گیا اور بزدل بن گیا کہ میرا سامنا اکبر خان سے ہوتا تو یہ بڑی شرمناک بات ہوتی۔ اپنے ہی ادنیٰ درجے کے ملازم کی بیوی کے ساتھ دادِ عیش دیتے ہوئے مارے جانے کا خیال بڑا روح فرسا تھا۔

آہستہ آہستہ میرا اعتماد بحال ہوا اور مجھے یقین آنے لگا کہ بے عزتی کی موت میرے در تک آ کے چلی گئی ہے۔ خدا نے میری عزت رکھ لی ہے۔ شاید خدا کو صرف یہ منظور تھا کہ پہلی غلطی پر مجھے وارننگ دے کر معاف کر دے۔ یہ وارننگ بھی معمولی نہ تھی۔ میں خود کو اس مجرم کی طرح محسوس کرتا تھا جسے تختۂ دار تک پہنچا کے اتار لیا جائے کہ جاؤ وارثوں نے تمہیں معاف کر دیا۔

اکبر خان کا عین اس دروازے تک آ جانا ایک ایسا بھیانک اتفاق تھا جسے میں معمولی واقعہ سمجھ کے نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ وقت کا ایک ایک لمحہ پُر آزمائش تھا۔ اکبر خان کو اپنے بالکل پیچھے والے دروازے کے پیچھے ہونے والے ڈرامے کی خبر ہوتی تو اب تک وہ دستک دے چکا ہوتا۔

میں اس کی آواز سن سکتا تھا۔ وہ کسی عورت سے بات کر رہا تھا۔ یعنی وہ بھی کسی کی نور جہاں کے ساتھ تھا۔ عورت نے بڑی شوخی اور مستی میں کہا "آخر اتنی جلدی کیا ہے؟"

"جلدی......؟ بھئی رات پوری گزر گئی' اب مجھے جانا ہے۔"

"مجھے معلوم نہیں تھا' اتنا ڈرتے ہو تم اپنی بیوی سے؟"

وہ ہنسا "کیا تم نہیں ڈرتیں اپنے دڑھیل حاجی سے؟...... اچھا' میں چلتا ہوں۔"

"پھر کب ملو گے؟" وہ بڑے ناز سے بولی۔

"جب موقع ملا۔ اچھا خدا حافظ...... تم ابھی رکو گی؟"

"میں کچھ دیر اور سو لوں...... رات بھر تو سوئی نہیں۔" وہ ہنسی۔

پھر وہ دروازہ بند ہوا جس کے مقابل اکبر خان کھڑا تھا۔ میں نے کچھ دیر انتظار کیا اور پھر کنڈی کھول کے باہر جھانکا۔ وہ کمروں کی طویل قطار کے سامنے والے کوریڈور کے بالکل آخری حصے میں پہنچ کے لفٹ کا انتظار کر رہا تھا۔

میں نے خود کو سنبھالا اور آگے بڑھ کر کپڑوں کی الماری کو کھولا جس کے اندر نور جہاں مجھ سے زیادہ خوف زدہ اور لرزہ براندام کھڑی تھی' میرے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ کے اس کے چہرے کی رنگت بحال ہوئی۔

میں نے کہا "وہ اکبر خان ہی تھا۔"

"وہ...... یہاں کیسے آ گیا؟" نور جہاں نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔

میں نے سہارا دے کے اسے نکالا اور بیڈ تک لے گیا۔ اس کا ہاتھ سرد ہو رہا تھا اور بدن کانپ رہا تھا۔ میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ لمبی لمبی سانسیں لیتے ہوئے اس نے اپنا سر میرے کندھے پر رکھ دیا۔

"اکبر خان بھی کسی کی نور جہاں کے ساتھ تھا۔" میں نے کہا۔

"کون نور جہاں......؟"

میں نے کہا "بھئی مجھے کیا معلوم...... صرف اتنا سنا میں نے کہ وہ کسی داڑھی والے حاجی کی بیوی تھی۔"

"اف یہ کیسا جان لیوا اتفاق تھا۔ مجھے اب تک کسی ڈراؤنے خواب کی طرح لگتا ہے۔" وہ ایک گہری سانس لے کر لیٹ گئی۔

میں نے اسے پینے کے لیے پانی دیا "ڈرو نہیں' وہ چلا گیا۔"

اس نے پانی کا پورا گلاس حلق میں انڈیل لیا "تمہیں یقین ہے' وہ جا چکا ہے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا "ہاں' وہ عین ہمارے مقابل والے کمرے میں رات بھر رہے' عورت ابھی نہیں گئی۔"

اس نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا "رفیق۔ اگر وہ تمہیں دیکھ لیتا تو کیا ہوتا۔"

"صرف دیکھ لیتا تو کچھ نہ ہوتا۔ میں دروازہ بند کر دیتا۔ وہ خود سمجھ لیتا کہ میں اس سے بات بھی کرنا نہیں چاہتا۔ یا فرض کر لیتا کہ میں نے چہرہ شرمندگی سے چھپا لیا کیونکہ میں کسی کے ساتھ تھا۔ یہ سوچو کہ وہ اندر آ جاتا تو کیا ہوتا؟ ہم پکڑے جاتے تو کیا ہوتا؟"

"مت کرو ایسی باتیں۔ یہ ایک بھیانک اتفاق تھا۔ اتفاقات بار بار نہیں ہوتے۔" آہستہ آہستہ اس کا اعتماد لوٹ آیا۔ "اور بفرضِ محال...... وہ اندر آ جاتا تو اسے کچھ پتا نہ چلتا۔ میں سامنے کہاں تھی۔"

"مجھے یقین ہے کہ اسے معلوم ہو جاتا۔ تمہاری خوشبو بسی ہوئی ہے اس کمرے میں۔"

وہ ہنسی "یہ تو ٹھیک ہی کہا تم نے۔ جب چار سال قبل

پیرس گئی تھی تو شانزے لیزے کے ایک اسٹور سے میں نے ذرا سا خرید لیا تھا' اتنی اچھی لگی تھی مجھے یہ خوشبو۔"

"یہ واقعی پاگل کر دینے والی خوشبو ہے۔ کیا نام ہے اس کا؟"

وہ بولی "MON-EMI۔ اس سے پہلے میں کوئی بھی پرفیوم استعمال کر لیتی تھی' پاکستان میں تو مجھے یہ کہیں ملی نہیں۔"

"سوچو پھر اکبر خان کو اندر آتے ہی تمہاری یہاں موجودگی کا یقین کیسے نہ آتا۔" میں نے کہا "اس کے علاوہ...... یہ تم جلدی میں چھوڑ گئی تھیں' یہ مرد نہیں پہنتے۔"

وہ شرما کے شوخی سے بولی "ادھر لاؤ...... مجھے دو۔"

میں نے کہا "تمہارے جوتے تو سامنے ہی پڑے تھے۔ بات یہ ہے نور جہاں کہ قدرت کی طرف سے گنہگاروں کو بھی ایک موقع ملتا ہے۔ یہ سوچو کہ وہ ناک کرتا اور میں یہ سمجھ کے دروازہ کھول دیتا کہ ویٹر ہو گا۔ حالانکہ باہر تختی ہے ڈونٹ ڈسٹرب کی۔"

وہ آہستہ آہستہ کپڑے پہننے لگی "اس کا مطلب ہے...... تم پھر نہیں آؤ گے...... بہت ڈر گئے ہو تم۔"

میں خاموش اور پشیمان بیٹھا اپنے سامنے دیکھتا رہا۔

"تمہیں تو شاید دوسری بار آنے پر بھی پچھتاوا ہو گا۔ اگر مجبوری نہ ہوتی تو تم نہ آتے۔"

"ہاں' بہت بڑا خطرہ مول لیا میں نے۔ میرا مستقبل تباہ ہو جاتا۔"

"اجی چھوڑو نواب صاحب! کوئی مستقبل تباہ نہیں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہوتا۔ فریال چھوڑ جاتی تمہیں...... اگر وہ محبت کرتی ہے تم سے تو مجھے بتاؤ' یہ کیسی محبت ہے بلکہ تمہاری ایک غلطی پر محبت بدل جاتی نفرت میں۔ تم اس کے محبوب ہو کہ اس کی خواہشات کے غلام؟"

"چھوڑو، یہ باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔"

وہ اپنی دھن میں بولتی رہی۔ "یہ کیا محبت ہوئی کہ ایک غلطی کو معاف کرنے کا حوصلہ نہیں۔ بڑی سخت شرائط ہیں محبت کی۔ کہ تمہارے لیے اب کسی گناہ کی گنجائش ہی نہیں۔ خبردار جو میرے سوا کسی دوسری عورت کی طرف آنکھ اٹھا کے بھی دیکھا۔"

میں نے کہا "محبت میں وفاداری کی شرط تو ہوتی ہے۔"

"مجھے ایک بات بتاؤ' کس کی محبت کی طاقت کے سامنے ایک مرد سر جھکاتا ہے' محبت تو سب ہی کرتے ہیں۔ ماں' باپ' بھائی بہن اور دوست۔ لیکن ماں' باپ تو ایسا نہیں کرتے' بیٹا شرابی ہو' جواری ہو' آوارہ ہو' ذہنی یا جسمانی طور پر معذور ہو' ان کی محبت کم نہیں ہوتی۔"

میں نے کہا "میں تم سے بحث نہیں کروں گا۔"

"تمہاری اس فریال سے...... جو تم پر کسی آسیب کی طرح سوار ہے' میں اس لڑکی الزبتھ کی محبت کو ہزار درجے عظیم تر سمجھتی ہوں۔ اس نے خود ہر قربانی دی۔ تم سے کوئی فریال نہیں مانگی۔ وہ اپنی دولت' اپنا گھر' اپنا دیس اور اپنا مذہب سب چھوڑنے کے لیے تیار تھی۔ وہ تمہاری دوسری بیوی بن کے رہنے پر راضی تھی۔ اس نے کوئی شرط نہیں رکھی۔ کبھی دھمکی نہیں دی کہ قتل کر دوں گی اگر اس سے تعلق رکھا۔ جیسے کہ تمہاری یہ فریال دیتی ہے۔"

میں نے برہمی سے کہا "بند کرو اپنی بکواس۔"

"نواب صاحب! کیا میں نے کچھ غلط کہا؟ فریال تم سے گارنٹی مانگتی ہے کہ تم ہمیشہ اچھے بن کے صرف اسی کے ساتھ رہو گے۔ ورنہ کیا وہ بیویاں اپنے شوہروں سے محبت نہیں کرتی تھیں جن کے شوہر انہیں بتا کے کسی طوائف کے کوٹھے پر جاتے تھے؟ اب کوٹھا نہ سہی' کوٹھیاں ہیں۔ جن میں وہ اپنی دوسری بیوی یا داشتہ کو رکھتے ہیں۔ کبھی سیکرٹری بنا کے' کبھی پارٹنر بنا کے۔ ڈرنا چھوڑ دو پھر تم جیسے پیسے والے سب شوقین ہوتے ہیں۔ بہادر بنو اور عیش کرو' یہ زندگی پھر نہیں ملے گی۔ جوانی ہمیشہ نہیں رہے گی۔ فریال جاتی ہے تو جائے۔ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں' نور جہاں کیا چیز ہے' ایشوریا رائے پر نظر رکھو۔"

اس سے زیادہ سننے کی مجھ میں تاب نہیں تھی۔ وہ مجھے پکارتی ہی رہ گئی مگر میں نکل گیا۔ اس کی باتوں نے میرا دماغ خراب کر دیا تھا اور خطرناک یا افسوس بات یہ تھی کہ اس کے دلائل مجھے متاثر کرنے لگے تھے۔ میں سوچنے لگا تھا کہ واقعی مجھے اتنا ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟ فریال نے تو مجھے غلام بنا رکھا ہے۔ اس کی مرضی اور خوشی کے بغیر میں کچھ کرنے کی ہمت ہی نہیں رکھتا۔ وہ خود کو اس حد تک مجھ پر حاوی کیوں رکھنا چاہتی ہے؟ کیا یہ محبت ہے؟ ایسی محبت عائشہ کو تو نہیں تھی۔ میں اس سے ڈرتا نہیں تھا جیسے فریال سے ڈرتا ہوں۔ میں عائشہ کی عزت کرتا تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ عائشہ کی محبت غیر مشروط تھی۔ میں کچھ بھی کروں' کسی سے بھی تعلق رکھوں؟ اسے اعتراض نہیں تھا۔ اگر آج فریال کو معلوم ہو جائے کہ رات میں نے نور جہاں کے ساتھ ایک ہوٹل کے کمرے میں گزاری ہے تو اس کا ردِعمل کیا ہو گا؟ وہ واقعی مجھے

قتل کردے گی۔ حالانکہ نور جہاں سے تعلق وقتی ہے۔ ایک ضرورت کے تحت ہے۔ اس تعلق میں فائدہ ہے۔ یہ کاروباری تعلق ہے' آیندہ زندگی میں نہ جانے کس کس سے ہوگا۔ آخر میں مرد ہوں' باہر پھرتا ہوں۔"

ہوٹل سے باہر آتے آتے میں نے یہ سب سوچا اور میرا بہکا ہوا دماغ ایک ہی سمت میں چلتا رہا۔ پھر اچانک مجھے ہوش آ گیا اور میں نے سوچا کہ میں یہ کیا سوچ رہا ہوں؟ میرا دماغ ایسے شیطانی خیالات کی آماجگاہ کیوں بن گیا ہے۔ اگر دنیا میں ہر شخص ایسے سوچنے لگے تو محبت کا کیا ہوگا؟ وفاداری اور زندگی کی رفاقت کا کیا ہوگا؟ اگر تعلق صرف کاروباری رہ جائے تو پھر جذباتی تعلق کی کیا اہمیت رہے گی؟ ایسا مغرب میں ضرور ہو رہا ہے کہ شادی بھی ایک کاروباری معاہدہ ہوگئی ہے۔ جب تک ضرورت ہوگی ساتھ رہیں گے ورنہ خدا حافظ! کسی کو غرض نہیں' نہ معاشرے کو نہ حکومت کو۔ کہ بچہ کس کا ہے' ظاہر ہے ایک مرد اور ایک عورت نے مل کے پیدا کیا ہے؟ یہ غیر اہم ہے کہ اس مرد کا نام کیا تھا؟ لوگ مشترکہ خاندان بنا کے بھی رہتے ہیں۔ ایک عورت سب کی بیوی..... یا ایک مرد سب کا شوہر۔

لیکن مشرق مشرق ہے۔ ہمارے کچھ خاندانی' کچھ معاشرتی اور کچھ مذہبی اقدار ہیں۔ شاید یہ چھ سال امریکا' یورپ میں گزارنے کا نتیجہ تھا کہ نور جہاں مجھے ورغلانے میں کامیاب رہی اور میرا دماغ پٹری سے اتر گیا۔ میں نے ایک اخلاقی جرم کیا تھا اور ہر مجرم کی طرح میں نظریہ ضرورت کا سہارا لے رہا تھا۔ خود کو الزام سے بچانے کے لیے حیلے بہانے تراش رہا تھا۔

جب میں گاڑی لے کر ہوٹل سے نکلا تو صبح کے دس بجے تھے۔ ایک بار پھر مجھے دنیا بہت بدلی بدلی سی لگی۔ میں نے محسوس کیا کہ میں دو دنیاؤں کا باسی ہوں۔ ایک وہ دنیا ہے جو ست بدھائی کے تمام رشتوں کی دنیا ہے اور دوسری یہ جہاں میں چھپ کے اور جھوٹ بول کے اور بھیس بدل کے آیا تھا۔ وہاں میں رفیق احمد شیرازی تھا' یہاں ہوٹل کے رجسٹر میں میرا نام کچھ اور لکھا ہوا تھا۔ میں ڈبل گیم کھیل رہا تھا۔ میری دہری شخصیت کے دو پہلو تھے۔ ڈاکٹر جیکال اور مسٹر ہائڈ۔ ایک دن کی دوسری رات کی۔ ایک نیکی اور شرافت کا پیکر' دوسرا بدی اور بدکاری کا۔

اس خیال نے مجھے اتنا پریشان کیا کہ میں نے فاروقی کی غیر موجودگی میں اس کے گھر جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ مریم گھر میں موجود ہے یا نہیں؟ لیکن اپنے مجرم ضمیر کے آزار سے بچنے کے لیے میں واپس ست بدھائی کی طرف بھاگا۔ سکون میرے لیے انھی مقدس رشتوں کے درمیان تھا جو سب اعتماد اور شرافت کے رشتے تھے۔ تاہم یہ اعتراف کیے بنا چارہ نہیں کہ شیطانی خیالات میرے ہم رکاب رہے۔ شب گزشتہ کی لذت ہنوز تازہ تھی اور میری حالت ایسے مے نوش جیسی ہو رہی تھی جو نشہ ٹوٹنے کی بے کلی کا شکار ہو۔ عقل احساس گناہ دلا کے پھر جام و سبو کو ہاتھ نہ لگانے کا عہد کرنے پر اکساتی ہو لیکن دل پھر سرور و بے خودی کی پُرلطف ساعتوں کا طلبگار ہو۔ شاید شجر ممنوعہ کی خواہش آدمی کے خمیر میں یوم ازل سے ہے' ابد تک کے لیے۔

ایک خیال تھا جو مجھے بلاتا رہا۔ ایک تصور تھا جو میرے تعاقب میں رہا۔ ایک آواز تھی جو مجھے بلاتی رہی۔ یہ نور جہاں کا خیال تھا۔ اس کے ساتھ بیتے ہوئے ہر لمحے کا تصور تھا اور اس کی کھنکتی ہنسی تھی۔ پہلی بار تم نے دھوکے سے پی لی' تم کہہ سکتے تھے مگر دوسری بار تم نے خود کو دھوکا دے کر پی..... اور اب تم پیو گے' اپنی خواہش سے اور اپنی مرضی سے تم خود آؤ گے۔ ہر نشے کی لت ایسی ہی ہوتی ہے۔ اس طرح بے بس کرتی ہے' مجبور بناتی ہے اور خوار کرتی ہے۔ نشہ شراب کا ہو' ہیروئن کا یا عورت کا۔

جب میں بالآخر ست بدھائی پہنچا اور پھاٹک میرے استقبال کے لیے کھلا' میں اس پھاٹک سے گزرا اور اس کے حصار میں پہنچا تو ایک بار پھر میری شخصیت میں ایک واضح باطنی انقلاب رونما ہوا۔ میں یکلخت وہی رفیق احمد شیرازی بن گیا جو کہ میں تھا۔ سارے شیطانی وسوسے ترغیب گناہ کے خیالات اور پائے ثبات میں لغزش پیدا کرنے والے تصورات جیسے پیچھا کرنے والی بلاؤں کی طرح باہر ہی رک گئے۔ یوں جیسے حویلی کی دیوار کوئی معجزاتی پناہ گاہ تھی' جس کے اندر صرف میں ہی نہیں' ہم سب دنیا کی ساری خرابیوں اور بداعمالیوں سے محفوظ تھے۔

مجھے اندر پہنچ کے بڑا سکون ملا۔ سہ پہر کا سورج مغرب کی طرف جھک گیا تھا اور درختوں کے سائے مشرق میں آ گئے تھے۔ ایک مالی پانی کی موٹر چلا کے لان میں اسپرے کر رہا تھا اور گھاس پر پھرنے والی بطخیں اس کو بارش کی پھوار سمجھ کے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ باہر کوئی بھی نہیں تھا۔ حویلی کے در و دیوار پر ایک سوگواری خاموشی طاری تھی جو خود کہتی تھی کہ شہناز ابھی تک نہیں آئی۔ اور یہ کہ وہ کب آئے گی۔

اندر سب چپ چاپ سر جھکائے کھانا کھا رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی پل بھر کے لیے ان کے چہرے امید سے روشن

ہوئے۔ ان کی اور میری آنکھوں میں ایک ہی سوال کا عکس ابھرا۔ شہناز کی کوئی خبر؟ دوسرے لمحے نفی میں آنے والا جواب یوں ابھرا جیسے ٹی وی کی اسکرین بٹن دبانے سے روشن ہو مگر اس پر کوئی تصویر نہ آئے۔

چند منٹ بعد راجا نے سوال کیا "فاروقی کیسا ہے؟"

میں نے گول مول جواب دیا "ٹھیک ہے۔"

پھر لیلیٰ بھابی نے پوچھا "وہ آئے کیوں نہیں؟"

اچانک وہ سب میرے ذہن میں تازہ ہو گیا جو مجھے نور جہاں نے بتایا تھا مگر میں نے کہا "کام زیادہ ہے۔ آپ کی بات نہیں ہوئی؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا "گھر میں فون کی گھنٹی بجتی رہتی ہے۔ کوئی اٹھاتا نہیں' شاید فون خراب ہو گیا۔"

"اس کے آفس فون کیا ہوتا۔"

"وہاں مریم فون اٹھاتی ہے' کہتی ہے کلائنٹ بیٹھے ہیں۔ موبائل فون سے جواب مل رہا ہے کہ نمبر بند ہے۔ میرا خیال ہے میں چلی جاؤں۔"

راجا نے اس کی تائید کی "ہاں' جا کے پوچھیں کہ ایسی بھی کیا مصروفیت۔ ادھر کا راستہ ہی بھول گئے۔"

"بڑے مجنوں مشہور تھے۔ صبح شام لیلیٰ کے نام کا ورد کرتے تھے۔" فریال نے طنز سے کہا۔

راجا نے اسے ٹوکا "مجنوں فارغ نہیں ہے لیلیٰ کی طرح۔ اسے اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔ عدالتوں میں خوار ہونا کسی طرح صحرا میں خوار ہونے سے کم نہیں۔"

فریال نے کہا "ان کی باتوں میں مت آنا بھائی۔ آپ بقلم خود جا کے دیکھو۔ آنکھ اوجھل پہاڑ بوجھل۔ مجھے تو دال میں کالا نظر آ رہا ہے۔"

لیلیٰ بے اختیاری سے ہنسنے لگی "اور دال ہی کالی ہو پھر.....؟"

میں خاموشی سے کھانے میں مصروف رہا۔ نور جہاں کی اطلاع کو ہنوز ایک افواہ سے زیادہ حیثیت نہیں دی جا سکتی تھی۔ تاہم مجھے کوئی وجہ نظر نہ آتی تھی کہ نور جہاں نے جھوٹ بولا ہو۔ ایسا جھوٹ خود اس کے اعتبار کو ختم کرتا' پھر جو بات اس نے کہی وہ معمولی نہیں تھی۔ اس کا عنوان میری نظر میں ایٹمی دھماکے کی شہ سرخی بن کے پھیلا ہوا تھا۔ اس کے باوجود ایسا تھا۔ میں اس پر اعتبار کرنے سے قاصر تھا۔ نور جہاں نے فاروقی پر ایک بڑا الزام لگایا تھا۔ مجھے اس پر یقین کے لیے ثبوت درکار تھا۔ ایسا ثبوت جو روز روشن کی طرح سب پر عیاں ہو۔ سب کو نظر آئے اور جس کی تردید ممکن نہ ہو۔

میں نے نظر اٹھا کے لیلیٰ بھابی کو دیکھا جو میرے لیے خلوص کے رشتے کی بڑی مضبوط اور واضح علامت تھی۔ کیا وہ میرے قتل جیسے کسی بھیانک منصوبے میں اپنے شوہر کی آلہ کار بن سکتی ہیں۔ دباؤ کتنا ہی ہو' مجبوری کیسی بھی ہو۔ کیا وہ شوہر کے سامنے سر تسلیم خم کر سکتی ہے کہ اچھا' اگر یہی ہے میرے سہاگ کی سلامتی کی قیمت' تو مجھے منظور ہے۔ کیا کوئی عورت اتنی بے وقوف ہو سکتی ہے کہ اس سازش کا حصہ بن جائے جس کا شکار وہ خود ہو؟ اگر فاروقی نے بیوی کے سامنے شرط رکھ دی کہ جیسا میں کہہ رہا ہوں' کرو۔ سازش میں میرا ساتھ دو ورنہ ہمارا ساتھ ختم۔ تو بے چاری عورت کیا کرے گی؟ انکار کیسے کرے گی اور انکار کر کے کہاں جائے گی؟ اس کا تو آگے پیچھے کوئی ہے ہی نہیں۔

یہ صرف نور جہاں کا نہیں۔ اس خطے کی ہر عورت کا المیہ ہے کہ مرد اس کا شوہر نہیں آقا و مالک ہے۔ اس کا بھرپور جسمانی اور ذہنی استحصال کرتا ہے اور اس کے ساتھ غلاموں سے بدتر سلوک کرے تو پوچھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ غلام فرار تو ہو سکتا ہے' عورت بھاگ کے کہاں جائے؟ خود اس گھر میں پناہ نہیں ملتی جہاں شادی سے پہلے اس نے ماں' باپ کے سایہ عاطفت میں عمر گزاری تھی۔ ماں' باپ کس کے رہتے ہیں؟ بھائی بہن اپنے گھر کے ہو جاتے ہیں۔ شوہر کا گھر نہ ہو تو عورت بے آسرا ہو جاتی ہے اور یہی مرد کے ہاتھ میں سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ طلاق کے تین لفظ' جسے وہ بے دریغ استعمال کر سکتا ہے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں نور جہاں سے حاصل ہونے والی معلومات کس طرح راجا کے ساتھ شیئر کروں۔ شہناز کے اغوا نے اداس سب کو کیا تھا۔ اس سانحے نے ایک خاندان بن کر رہنے والوں کے چہروں سے مسکراہٹ تک چھین لی تھی۔ جس ماحول میں شوخی' شرارت اور ہنسی تھی وہاں اب خاموشی اور سوگواری تھی جو مکینوں کے چہروں پر ہی نہیں گھر کے در و دیوار پر بھی مسلط تھی۔ اس کے باوجود میری خاموشی کو سب نے تاڑ لیا۔

پہلے فریال نے کہا "کہاں کھوئے ہوئے ہیں نواب صاحب!"

میں نے برہمی سے کہا "نہیں' ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

"یہ بات نہیں تو پھر چونکے کیوں؟"

میں نے کہا "یار' تم تو خوامخواہ پیچھے پڑ جاتی ہو۔ شہناز کی وجہ سے سب ہی پریشان ہیں' میں بھی ہوں۔"

لیلیٰ نے کہا ''اچھا بتاؤ' کیا پوچھا تھا میں نے؟ شہناز کے بارے میں ہی پوچھا تھا۔''

مجھے اعتراف کرنا پڑا ''میں نے واقعی نہیں سنا۔ پھر پوچھ لوگی تو کیا زبان گھس جائے گی؟''

فریال نے کہا ''کھانا بھی نہیں کھا رہے ہو تم۔''

میں چمچہ پلیٹ پر پٹخ کے کھڑا ہو گیا ''ہاں' نہیں کھا رہا ہوں۔ اگر بھوک نہیں ہے تو تمہیں کیا پریشانی ہے۔ تم کیوں میری جان عذاب میں کر رہی ہو۔ آخر کیا ہو تم' میری آقا اور مالک...... تھانے دار' تنگ آ گیا ہوں میں تمہارے اس رویے سے۔''

فریال کا چہرہ اتر گیا ''میں نے ایسا کیا کہہ دیا ہے؟''

میں نے چلا کے کہا ''ہر وقت کی جرح' پوچھ پچھ' کہاں گئے تھے...... کیوں گئے تھے؟ یہ کیوں کیا' وہ کیوں کیا؟ آخر کیا ہوں میں' کوئی دودھ پیتا بچہ' فاتر العقل یا تمہارا ماتحت' ہر بات پر تمہیں جواب دوں' تمہارا غلام یا......''

جملہ نامکمل چھوڑ کے میں باہر نکل گیا۔ میری آتش فشانی نے سب کو دم بخود کر دیا تھا۔ کھانا ختم ہو گیا تھا اور سب مجھے دیکھنے لگے تھے۔ ان کی نظر میں خفگی نہیں' حیرانی تھی اور یہ سوال پہلے سے زیادہ نمایاں ہو کے سامنے آ گیا تھا کہ یقیناً کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہے۔

باہر آتے ہی مجھ پر ندامت کا دورہ پڑا۔ مجھے شدت سے احساس ہوا کہ میں نے ضرورت سے زیادہ بول کے فریال کو سب کے سامنے بے عزت کر دیا۔ اس نے کوئی ایسی بات نہیں کی تھی' سارا قصور میرے وجود میں لاوے کی طرح پکنے والے احساس جرم کا تھا یا اس جھوٹ کی خلش کا جسے نبھانے کے لیے مجھے ابھی دس جھوٹ اور بولنا تھے۔ ان سے جو میرے اپنے تھے۔

راجا میرے پیچھے آیا اور میرے سامنے بیٹھ گیا۔ میں اپنے بیڈ پر سیدھا بیٹھا خلا میں دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا ''راجا! آئی ایم سوری!''

''سوری کو چھوڑ۔ یہ بتا ایسی کیا بات ہے جو تجھے ڈسٹرب کر رہی ہے؟''

میں نے کہا ''فریال کیا سوچتی ہوگی......؟''

''کوئی کچھ نہیں سوچے گا۔ نہ وہ بے وقوف ہے نہ کوئی اور۔ سب کو تیری پریشانی نظر آ رہی ہے' تو کس چکر میں ہے؟''

میں نے کہا ''راجا، میں کیا بتاؤں کہ چکر کیا ہے؟ تو بھی مجھے ہی الزام دے گا اور کسی سے کہہ بھی نہیں سکتا' تیرے سوا۔''

''ایسی کیا پرابلم ہے فیکے پتر! جو تو کسی کے ساتھ بھی شیئر نہیں کر سکتا۔'' راجا کچھ حیران ہوا۔

میں نے کہا ''میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا راجا۔ میری عقل کام نہیں کرتی' تو مجھے سوچنے دے۔''

''یعنی تو سوچے گا کہ مجھے شریک راز کیا جائے یا نہ کیا جائے؟ جھانپڑ مار کے تیرا دماغ درست کر دوں گا الو کے پٹھے...... آخر کیا کر دیا ہے تو نے' شراب پی کے کوٹھی پر گیا تھا' تہمیں کسی کو قتل کر آیا ہے؟''

میں نے بے بسی سے راجا کو دیکھا ''راجا! تو میری مدد کرے گا ناں؟''

راجا اٹھ کھڑا ہوا ''میرا خیال ہے کہ تو آرام سے بیٹھ کے سوچ۔ مراقبہ کر یا استخارہ...... میں اتنی دیر میں اسٹامپ پیپر پر حلف نامہ بنوا کے لاتا ہوں کہ تیری مدد کروں گا۔''

میں نے اسے بٹھایا ''راجا! یہ بڑی مشکل صورت حال ہے میرے لیے۔ میری جگہ تو ہوتا تو ایسی ہی مشکل میں پڑ جاتا۔ کل جب میں شہر گیا تو راستے میں میری گاڑی خراب ہو گئی۔ اس کا بال بیرنگ ٹوٹ گیا تھا۔ گاڑی بیچ سڑک میں جام ہو گئی۔ اسے ایک طرف کرنا مشکل ہو گیا۔ خیر ہائی وے پولیس نے مدد کی اور اسے اٹھا کے سڑک کے کنارے رکھ دیا۔ پھر میں گیا مکینک کی تلاش میں اور جب مکینک ملا تو آٹو پارٹس کی دکانیں بند ہو چکی تھیں۔''

''یہ تو نے بتایا تھا۔''

''مگر اس کے بعد کیا ہوا...... یہ میں نے نہیں بتایا تھا۔ میرا مطلب ہے اصل بات نہیں بتائی تھی۔''

''اصل بات کیا تھی؟''

میں نے کہا ''مکینک نے یقین دلایا تھا کہ صبح دکانیں کھلتے ہی وہ بال بیرنگ لے کر میرے ساتھ جائے گا اور جائے واردات پر گاڑی میں نیا بال بیرنگ ڈال دے گا' ایک گھنٹے میں۔ میں سوچ رہا تھا کہ واپس آ جاؤں' میں گجرات سے کسی پرائیویٹ ٹیکسی میں آ سکتا تھا۔ صبح پھر چلا جاتا۔ مکینک کا مشورہ تھا کہ میں گجرات کے کسی ہوٹل میں رات گزار لوں۔ یہ بھی زیر غور تھا۔ گجرات میں دو چار ایسے ہوٹل ضرور ہوں گے اور جب رات کو صرف سونے کا معاملہ ہو تو بس ایک بیڈ چاہیے۔ اس وقت مجھے نور جہاں کا فون موصول ہوا۔''

راجا چونک پڑا ''نور جہاں کا؟''

''لیس...... نور جہاں کا...... اس نے کہا کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتی ہے۔ میں بڑی کوفت میں مبتلا تھا۔ میں نے [illegible] کے کہا کہ گجرات آ جاؤ۔ میں بیٹھا ہوں دریا کے کنارے [illegible] کی طرح۔ تم کو کہیں سے کیا گھڑا مل جائے گا۔ وہ ہنسنے لگی کہ مرچیں کھا لی ہیں یا کسی نے کچھ پلا دیا ہے۔ گجرات کی بات کہاں سے آ گئی؟ میں نے کہا کہ آ کے دیکھ لو' میں گجرات میں ہوں یا نہیں؟ ملاقات کی خواہش کا اظہار تم نے کیا ہے' میں نے نہیں۔''

''تو نے یہ بھی نہیں کہا کہ آخر اچانک اسے ملاقات کی ضرورت کیوں پیش آ گئی؟''

میں نے کہا ''وہ بولی کہ گجرات میں کیا کر رہے ہو؟ کسی کام سے آئے تھے۔ جان چھڑانے کے لیے میں نے اسے گجرات میں اپنی موجودگی کی وجہ بتا دی۔ اس نے کہا کہ اچھا میں آ رہی ہوں تمہاری مدد کے لیے۔ میں نے کہا کہ تم کیا کرو گی؟ بال بیرنگ لا کے لگا دو گی گاڑی میں؟ وہ ہنسنے لگی کہ تم بہت جھنجلائے ہوئے ہو' بھئی تم لاہور آ رہے تھے' میں تمہیں لاہور لے آؤں گی۔ میں نے کہا کہ کرم نوازی کا شکریہ۔ میں کار ہائر کر کے واپس بھی جا سکتا ہوں اور لاہور بھی۔ اس نے ضد جاری رکھی کہ میرے آنے سے دونوں مقصد حاصل ہو جائیں گے۔ تم لاہور پہنچ جاؤ گے اور میری تم سے ملاقات ہو جائے گی۔ میں نے کہا کہ یہ ملاقات اتنی ضروری کیوں ہے؟ وہ بولی کہ تمہارے فائدے کی ایک بات ہے۔ میں نے کہا کہ بات تو فون پر بھی بتائی جا سکتی ہے۔ وہ بولی کہ یہ ایسی بات ہے جو فون پر نہیں ہو سکتی۔ پھر وہ دوسری باتوں پر آ گئی کہ آخر تم اتنا ڈرتے کیوں ہو۔ ہم کہیں بیٹھ کے کھانا کھائیں گے اور بات بھی کر لیں گے۔''

''اور تو نے کہا ہوگا کہ ڈرتا کون الو کا پٹھا ہے۔ میں تمہاری دعوت اور پیشکش قبول کرتا ہوں۔'' راجا طنز سے بولا۔

''ابھی سے طعنے مت دے' پہلے پوری بات سن۔ اس کے بعد بے شک جوتے مار لینا۔ اس نے کہا کہ ایک بار تمہاری مدد کر چکی ہوں میں۔''

''اگر صوفی چچا کو قتل کرانا مدد سمجھا جا سکتا ہے۔''

میں نے کہا ''راجا، صوفی چچا پولیس کی تحویل میں رہتے اور وہاں سے سی آئی اے پہنچا دیے جاتے تو کیا ہوتا۔ ان کا مرنا جینا خود ان کے لیے بے معنی تھا لیکن جو کیس ان پر بنائے جاتے' ہم پر دباؤ ڈالنے کے لیے......''

راجا نے کہا ''اچھا آگے بول۔''

میں نے کہا ''نور جہاں نے کہا کہ تم ایک بہت بڑی مشکل میں پڑ سکتے ہو۔ ایک ایسے خطرے سے دوچار ہو' جس کا ابھی تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔''

''حرافہ...... ڈرامے باز! کیا اس نے تجھے پھانس لیا؟''

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی ''ہاں، میں اس کے جال میں پھنس گیا' میں اعتراف کرتا ہوں۔''

''اور اب وہ تجھے بلیک میل کرے گی۔ یہی پریشانی لاحق ہے جناب کو......؟'' وہ تلخی سے بولا۔

میں نے کہا ''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔''

''پھر کیا بات ہے؟''

میں نے کہا ''ذرا صبر و تحمل سے پوری بات سن لے۔ پھر کہنا جو کہنا ہے۔ ایک گھنٹے بیس منٹ بعد وہ آ گئی۔''

''وہ اکیلی تھی' اس نے ایک ہوٹل بتایا۔ تم نے وہاں ایک ڈبل بیڈ لے لیا' مسٹر اور مسز اکبر خان کے نام سے۔''

میں نے ایک گہری سانس لی ''اگر میں کہوں کہ ہاں' کچھ ایسا ہی ہوا تھا...... پھر......؟''

''پھر کیا...... رات گئی' بات گئی۔ صبح وہ گئی اپنے راستے۔ تو لوٹ کے گھر آ گیا۔ اب اس میں اتنی پریشان ہونے والی کون سی بات ہے؟''

میں نے حیرانی سے کہا ''کیا......؟''

راجا نے ہنس کے میرے کندھے پر ہاتھ مارا ''اے تیری جگہ میں ہوتا تو یہی کرتا۔'' اس نے مجھے آنکھ ماری ''وہ چیز ہی ایسی ہے۔ ہر مرد کی رال ٹپکتی ہے مگر ساری بات نصیب کی ہے۔ اپنے کبھی خواب میں نہیں آئی۔ تیری جھولی میں پکے ہوئے پھل کی طرح آ گری۔''

میں نے خفت سے کہا ''یار! میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا ہے۔''

راجا ہنسنے لگا ''فیکے پتر۔ یہ ضمیر کا روگ تو نے خود پال رکھا ہے۔ خوامخواہ فرشتہ بنا پھرتا ہے۔ اے تو نے کیا دیکھا نہیں کہ باہر اپنی زندگی کتنی رنگین تھی۔ یہاں جنگل میں تو بے ہیں تیری دوستی کے مارے۔ اوپر سے شہناز ہر وقت تھانے دار کی طرح موجود؟ اچانک وہ اداس ہو کے چپ ہو گیا۔

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا ''شہناز آ جائے گی۔''

''مجھے معلوم ہے وہ آ جائے گی۔ لیکن ابھی میں گلہ کر رہا تھا کہ ہر وقت چوکیداری کرتی تھی۔ اب وہ نہیں ہے تو لگتا ہے ہر طرف ویرانی ہے۔ خاموشی ہے۔ اس بڑھیا جیسا حال ہے میرا بھی جسے بچے تنگ کرتے تھے تو انہیں روز گالیاں کوسنے دیتی تھی۔ ایک دن بچوں نے تنگ کرنا چھوڑا تو خود

نکل آئی باہر کہ کہاں مر گئے سارے..... خیر' تو اپنی بات بتا۔''
میں نے کہا ''راجا! یہ بہت برا ہوا۔''
''یار' کچھ برا نہیں ہوا۔ وہ کون سی شریف زادی ہے اور تو نے کون سا فریال کو چھوڑ کے اس سے شادی کے عہد و پیمان کر لیے ہیں۔ اس پر اتنا سیریس مت ہو۔ نور جہاں ایسے ہی راتیں گزارتی ہو گی۔ ایک رات کے لیے تجھے چن لیا تو کیا ہوا؟''
میں نے کہا ''اگر فریال کو پتا چل جائے ..... یا رابعہ کو.....؟''
راجا ہنسنے لگا'' کیسے پتا چل جائے؟ کیا اس نے دھمکی دی ہے؟''
''نہیں ..... دھمکی تو نہیں دی۔''
''نواب صاحب قبلہ! آپ نے اپنی شرافت اور کردار کی عظمت کے ایسے جھنڈے گاڑ رکھے ہیں کہ اب نور جہاں جیسی دس بھی ہوں تو ان پر یقین کرنے والا کوئی نہیں ہوگا۔ بس ایک نصیحت ہے ہماری برخوردار! اپنے تجربے کی روشنی میں یہ نصیحت ہے' نمبر ون ..... اس کے عشق میں گرفتار مت ہو جانا۔ نمبر دو' اس کے لیے فریال کو مت چھوڑنا۔''
''تیرا دماغ خراب ہے۔''
''تیرا بھی ہو سکتا ہے۔ نور جہاں نام ہے اس کا نیکے پتر! وہ کوئی عام عورت نہیں ہے اس لیے سمجھا رہا ہوں۔ لیکن اصل بات ابھی تک نہیں بتائی تو نے۔ مقصد ملاقات صرف شب بسری تھا اس کا ..... یا اس نے وہ بات بھی بتائی جس کے لیے اس نے تجھے ملاقات پر مجبور کیا تھا؟''
میں نے کہا ''ہاں' میری پریشانی کا اصل سبب تو وہی بات ہے۔ نور جہاں سے ملاقات کی بات میں گول بھی کر سکتا تھا۔ تجھے بھی نہ بتاتا مگر جو نور جہاں نے مجھے بتایا ..... وہ ناقابل یقین ہے۔''
راجا نے مجھے غور سے دیکھا ''کیا کہہ دیا اس نے؟''
''اس نے کہا ..... کہ ..... فاروقی مجھے قتل کرنا چاہتا ہے۔''
راجا ہنس پڑا' ہنستے ہنستے بے حال ہو گیا ''واہ ..... کیا زبردست انکشاف کیا اس نے۔ میرے بارے میں کیا فرمایا؟''
میں سیریس رہا ''راجا' کیا میں کانوں کا اتنا کچا ہوں کہ کوئی کیسی بھی بے سروپا بات کرے' میں مان لوں گا؟''
''یعنی اس نے تجھے قائل بھی کر لیا کہ فاروقی کے یہی عزائم ہیں۔ یہ خود فاروقی نے اس سے کہا؟ جس رات وہ فاروقی کے ساتھ تھی اور فاروقی شراب کے نشے میں دھت تھا؟'' وہ پھر ہنس پڑا۔
میں نے کہا ''راجا۔ اپنی بکواس چھوڑ' پہلے میری سن لے۔''
راجا نے اپنی ہنسی روکی ''اچھا بول' میں سمجھا لطیفہ ختم ہو گیا۔''
آہستہ آہستہ میں نے اسے وہ سب بتا دیا جو مجھے نور جہاں نے بتایا تھا۔ راجا کا غیر سنجیدہ رویہ بدلتا گیا۔ اس کی صورت پر فکر و تشویش کے آثار نمایاں نظر آنے لگے۔
''یہ سب جھوٹ کیسے ہو سکتا ہے راجا! اگر واقعی فاروقی نے مریم سے شادی کر لی ہے' وہ اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے اور لیلیٰ بھابی یہاں ہے تو وہ اس کے گھر میں رہنے لگی ہے..... تو معلوم ہو جائے گا۔''
''اس کی تصدیق ہو جائے گی۔ یہ بات آخر کب تک چھپی رہ سکتی ہے مگر یار ..... لیلیٰ بھابی کا کیا ہوگا؟''
''اب لیلیٰ بھابی کو فوراً واپس جانا چاہیے۔'' میں نے کہا۔
''ہاں' مگر جو صدمہ ان کے نصیب میں لکھا جا چکا ہے' وہ انہیں بہرحال اٹھانا ہے ..... لیکن دوسری بات تو پی ڈراما ہے۔ ایک چھوٹا سچ دکھا دیا' دوسرے کا ہوا کھڑا کر دیا۔ آپ مانیں گے کہ پہلی بات غلط نہیں تو دوسری کیسے غلط ہو سکتی ہے؟''
میں نے کہا ''میں تیری بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ لیکن اتنا بڑا جھوٹ وہ کیسے بول سکتی ہے ..... وہ کہتی ہے اس نے خود سنا ہے۔ فاروقی خود آیا تھا اکبر خان سے ملنے۔''
''دل میرا بھی نہیں مانتا ..... مگر عقل مانتی ہے کہ زر ..... زن اور ذہن ..... دنیا میں فساد انہی کے سبب سے ہے ..... جہاں ایک نہیں تینوں اسباب یکجا نظر آتے ہیں۔''
میں نے کہا۔ ''راجا جی ..... دنیا میں نے بھی دیکھی ہے اور تو نے مجھ سے زیادہ ..... میں نے گھوم پھر کے دیکھی ہے اور تو نے خبروں کی دنیا میں رہ کے۔''
''اور دنیا دیکھنے کے لیے ٹی وی اور انٹرنیٹ کافی ہے۔ پہلے جو کتابوں میں پڑھتے تھے ..... پھر ریڈیو پر سننے لگے ..... اب آنکھوں سے دیکھ لیتے ہیں۔ تجربہ نام ہے مشاہدے کا تو پہلے کے سو برس اور آج کے سو دن۔''
میں نے کہا ''پہلے بڑے بوڑھے کہتے تھے کہ ہم نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے۔ پیسے کے لیے بھائی نے بھائی

کا اور بیٹے نے باپ کا گلا کاٹا ہے ..... یہ پہلے سچ تھا تو آج پہلے سے زیادہ سچ ہے ..... اگر نور جہاں نے یہ جھوٹ بولا تھا محض مجھے امپریس کرنے کے لیے۔''
''ATTRACT کرنے کے لیے .....'' راجا نے گویا تصحیح کی۔
''جو بھی وجہ تھی ..... حقیقت نہ ایجاد کی جا سکتی ہے۔ نہ چھپی رہ سکتی ہے ..... بے خبری میں آدمی اور مارا جاتا ہے لیکن باخبر ہونے کے بعد بھی جو اپنی آنکھیں اور کان بند رکھے۔ وہ بھی مارا جاتا ہے۔ بفرض محال نور جہاں کی اطلاع درست ہے تو ابھی فاروقی سوچ بھی نہیں سکتا کہ اتنا بڑا اسیکرٹ آؤٹ ہو گیا ہے ..... اور وہ بھی ایک عورت کی وجہ سے ..... ابھی ہم اپنا دفاع کر سکتے ہیں ..... خاموشی سے .....''
راجا نے سوچتے ہوئے کہا ''یار ..... عورت کی ذات کے بارے میں جو عام معنی ہے ..... کہ وہ فارغ العقل ہے اور ناقابل اعتبار ہے۔ میں سمجھ ہوں وہ جاہل ہے۔ لیکن دوسری طرف حقائق ہیں جن سے انکار ممکن نہیں ..... اب تو اپنے شاہی بادشاہ کو ہی دیکھ لے۔ ان کے ڈیرے پر کوئی عورت نہیں جا سکتی۔ بیشتر مرد عورت کو شریک راز نہیں کرتے۔''
''یہ بات مردوں نے مشہور کی ہے۔ کیا خود مرد کسی کے اعتماد کو دھوکا نہیں دیتے .....؟''
''مجھے تو ایک اور خیال سے پریشانی ہو رہی ہے۔''
''وہ کیا؟'' میں نے کہا۔
''نور جہاں کی مجھ پر بڑھتی ہوئی عنایت ..... ایسا خطرہ وہ کیوں مول لے رہی ہے آخر۔'' کیا وہ جانتی نہیں کہ اکبر خان کے اور تیرے درمیان دشمنی کا رشتہ کتنا خطرناک ہو گیا ہے۔''
''یہ بے وقوفی ہے اس کی .....''
''نیکے پتر ..... ابھی وقت ہے۔ سنبھل جا۔ ایک مرتبہ کی کوئی بات نہیں لیکن ایسا نہ ہو وہ تجھے اپنے جال میں پھانس لے۔ اگر وہ آگ سے کھیل رہی ہے تو اس کی اور کیا وجہ ہو سکتی ہے سوائے اس کے کہ وہ تجھ پر فریفتہ ہو گئی ہے ..... یا یہ کوئی سازش ہے۔''
''اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔''
''پتر تو کہتا ہے ..... میں پھر کہتا ہوں کہ وہ کوئی عام عورت نہیں ہے۔ ابھی ہر عورت دنیا میں تباہی لاتی ہے۔ گھر' خاندان یہاں تک کہ ملک برباد کر دیتی ہے۔''
میں نے کہا۔ ''تو فکر مت کر۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔''
''خدا کرے کہ ایسا نہ ہو۔ مگر صرف وعدے سے کچھ

نہیں ہوتا۔ تو اس کے سائے سے بھی بچ۔ جان چھڑا اس سے۔ جس گڑھے میں ایک بار غلطی سے گر گیا تھا اس میں دوسری بار ارادے کی شکست سے مت گرنا..... گڑھے کے کنارے پر بھی جائے گا تو گڑھا خود کھینچ لے گا تجھے۔''

''یار تو میرے پیچھے کیوں پڑ گیا ہے۔''

''اس لیے کہ میری چھٹی حس کی خطرے کو سونگھ رہی ہے جو تیری ناک ابھی سونگھ لے تو اچھا ہے۔ مگر بار بار اس عورت سے ملا تو تیری ناک صرف اس کی خوشبو سونگھنے لگے گی۔ اس لیے خبردار کر رہا ہوں تجھے۔ تو خود سوچ' آج وہ تیرے چکر میں ہے۔ کل تو اس کے چکر میں پڑ گیا پھر کیا ہوگا؟''

میں نے ہاتھ جوڑے ''خدا کے لیے راجا! تو نے ابھی سے کیوں فرض کر لیا ہے کہ میں اس چکر میں پڑ جاؤں گا۔''

''اس لیے کہ لڑکا جب پہلی بار سگریٹ پیتا ہے یا سگریٹ میں ہیروئن کا کش لگاتا ہے تو وہ بھی سمجھتا ہے کہ وہ لت کا شکار نہیں ہوگا۔ جواری ہو یا شرابی' کو لت اسی طرح جکڑتی ہے۔ جیسے نور جہاں جیسی عورت کا نشہ۔''

اچانک مجھے یوں لگا جیسے میرے کانوں نے چوڑیوں کی ہلکی سی جھنکار سنی ہے۔ ایک دم میرے کان کھڑے ہو گئے اور خطرے کے احساس نے میرے اعصاب کو اور حواس کو چوکنا کر دیا۔ میں ایک دم دروازے کی طرف لپکا اور باہر جھانکا۔ باہر کوئی نہیں تھا مگر میری چھٹی حس چلا چلا کے کہہ رہی تھی کہ وہاں کوئی تھا جو دروازے کی اوٹ میں کھڑا ہماری سب گفتگو سن رہا تھا۔

راجا نے پریشانی سے کہا ''کیا کوئی تھا؟''

میں نے سر ہلایا ''مجھے ایسا ہی لگا۔ کیا تو نے چوڑیوں کی آواز نہیں سنی؟''

راجا اٹھ کر دروازے تک آیا ''وہم ہوگا تیرا نیکے پتر!''

میں نے نفی میں سر ہلایا ''راجا جی! خوشبو اس وقت بھی موجود ہے۔''

راجا مسکرانے لگا ''مجھے تو کوئی خوشبو محسوس نہیں ہوتی۔''

میں نے کہا ''مگر میں محسوس کر سکتا ہوں' ہوا میں فریال کی خوشبو ہے۔''

''وہ یہاں تھی کچھ دیر پہلے اگر اس نے یہ باتیں سنی ہوں گی تو کیا ہوگا؟''

راجا نے میرے کندھے پر تھپکی دی ''یہ تیرے دل کا چور ہے جو تجھے ڈرا رہا ہے اور کچھ بے آرامی سے تیرے اعصاب پر برا اثر پڑا ہے۔ میرا خیال ہے تو آرام کر۔''

لیکن میرے ذہن پر تفکرات کا بار گراں تھا۔ سکون کی نیند میرے اختیار کی بات ہی نہ تھی۔ راجا دروازہ بند کر کے گیا تو جاتے جاتے اس نے پردے بھی برابر کر دیے تھے۔ میں سونے کی کوشش ناکام میں کروٹیں بدل رہا تھا کہ دروازہ کھلا اور لیلیٰ بھابی اندر آ گئی' میں اٹھ بیٹھا۔

''میں جا رہی ہوں رفیق! راجا کے ساتھ۔ پتا نہیں کیوں صبح سے میری بائیں آنکھ پھڑک رہی ہے' اللہ خیر کرے۔'' وہ بولی۔

میں نے ہنس کے کہا ''میری دائیں آنکھ پھڑک رہی ہے۔ اس کا بھی کوئی مطلب ہوتا ہے۔''

اس نے میرے مذاق کو نظر انداز کر دیا ''ان حالات میں مجھے یہاں رہنا چاہیے تھا۔ شہناز کی وجہ سے سب پریشان ہیں لیکن اماں پر اس کا اثر بہت زیادہ ہے۔''

میں نے کہا ''وہ اعصابی طور پر شروع سے بہت کمزور ہیں۔''

''ابا نے مجھے بتایا تھا کہ کل وہ ساری رات ایک منٹ کے لیے سوئی نہیں' مصلے پر بیٹھی رہیں۔ آج انہوں نے کچھ بھی نہیں کھایا صبح سے۔''

میں نے دل میں سخت شرمندگی محسوس کی۔ ''واپس آنے کے بعد میں نے انہیں نہیں دیکھا۔ مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں۔''

''فریال کا خیال ہے کہ میں انہیں اپنے ساتھ لے جاؤں۔ خدانخواستہ ان کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی..... تو شہناز بھی نہیں ہے۔''

میں نے کہا ''اگر وہ جانے پر راضی ہو جائیں تو انہیں ضرور لے جاؤ..... اور ہو سکے تو کسی اچھے اسپتال میں داخل کرا دو۔ اپنے ساتھ رابعہ کو بھی رکھو۔''

''تم ابا جی سے بات کر لو۔''

ابا جی خاموش مگر پرسکون تھے۔ انہوں نے بھی اب ہمارے معاملات میں بولنا کم کر دیا تھا اور زیادہ وقت اپنے کمرے میں ہی گزارتے تھے۔ اماں کی حالت دیکھ کر مجھے دکھ ہوا۔ پہلے کے مقابلے وہ بہت کمزور ہو گئی تھیں اور بستر پر آنکھیں بند کیے لیٹی تھیں تو لاش کی طرح دکھائی دیتی تھیں۔

اماں کو اسپتال میں رکھنے کی تجویز سے ابا نے بالکل اختلاف نہیں کیا۔ ''ان کی حالت روز بہ روز گرتی جا رہی ہے یہاں۔''

میں نے کہا ''ابا جی! بیماری تو ایسی کوئی نہیں۔''

''سو بیماریوں کی ایک بیماری بڑھاپا۔'' وہ بولے۔

''کچھ تو اعصابی اور جسمانی کمزوری ہے۔ پھر یہ ہر بات کو اتنا زیادہ دل پر لیتی ہیں۔'' میں نے کہا۔

ابا جی نے ایک آہ بھری ''رفیق میاں! کتنا حسب حال ہے وہ شعر..... تہمتیں کچھ اپنے ذمے دھر چلے' کس لیے آئے تھے اور کیا کر چلے۔ سوچا تھا یہاں سکون اور فراغت سے زندگی بسر ہوگی۔ ہر خوشی ملے گی..... اور دیکھا جائے تو کیا نہیں ہے یہاں؟ اپنی خاندانی حویلی ہے' قدرت کا سارا حسن ہے۔ خوبصورتی ہے' افراط ہے..... لیکن اب احساس ہوتا ہے کہ انسان کی خام خیالی میں خوشی کی کوئی ضمانت نہیں۔''

میں نے کہا ''یہ سب وقتی آزمائش ہے ابا جی! آپ بھی اس ماحول سے کچھ دن باہر رہیں گے تو.....''

انہوں نے میری بات کاٹ دی ''یہی تو میں کہہ رہا ہوں رفیق میاں! ہماری آدھی سے زیادہ اور تمہاری پوری زندگی ایک چھوٹے سے گھر میں گزر گئی۔ اب وہ گھر بھی نہیں جو پناہ دیتا۔ ہم بھاگے چلے آئے تھے اس حویلی کے مکین بنے۔ کتنے فخر اور غرور کے ساتھ۔''

''وہ بھی آپ ہی کا گھر ہے ابا جی!'' لیلیٰ نے کہا۔

ابا جی نے آہ بھری ''ہاں' آدمی ایسا ہی سمجھتا ہے مگر آخر میں پتا چلتا ہے کہ کوئی گھر اپنا نہیں ہوتا۔ وہ ساری عمر بھٹکتا پھرتا ہے اور بالآخر وہیں پہنچتا ہے۔''

میں نے کہا ''آپ تو کبھی ایسی مایوسی کی باتیں نہیں کرتے تھے۔''

وہ جاتے وقت بہت اداس تھے۔ میں نے لیلیٰ بھابی سے اور راں سے کہا کہ صرف اماں کو ہی نہیں ابا جی کو بھی علاج کی ضرورت ہے۔ وہ ڈپریشن کا شکار ہیں۔ اگر وہ اسپتال میں نہ رہنا چاہیں تو گھر پر ڈاکٹر کو بلا لیں۔ ابھی رابعہ ساتھ ہے۔ ایک دو دن میں شہناز کا مسئلہ حل ہوتے ہی میں بھی آ جاؤں گا۔

حویلی کا ماحول ان کے جانے کے بعد مزید سوگوار ہو گیا۔ اب وہاں میرے ساتھ صرف فریال تھی۔ فرخ سب سے پہلے رخصت ہوا تھا۔ پھر شہناز لاپتا ہوئی۔ اب ایک ساتھ پانچ افراد چلے گئے تو حویلی جیسے سنسان ہو گئی۔

فریال کے بارے میں مجھے کچھ یقین نہیں تھا کہ اس کی افسردگی کی وجہ حالات ہیں یا وہ مجھ سے خفا اور بدگمان ہے۔ میں نے دن میں سب کے سامنے اسے برا بھلا کہا تھا۔ یہ بھی اس کے موڈ کی خرابی کا ایک سبب ہو سکتا تھا لیکن اس سے زیادہ میری پریشانی کی وجہ خوف تھا۔ میرے دل میں احساسِ جرم کی ایک خلش تھی اور ایک ڈر بیٹھا ہوا تھا کہ شاید وہ میرا اعتراف جرم خود میری زبان سے اور اپنے کانوں سے سن چکی ہے۔ ایسا فریال نے دانستہ نہیں کیا ہوگا۔ اس اتفاق میں میری بدقسمتی یا شامت اعمال کا دخل تھا۔

فریال عام لڑکیوں سے بالکل مختلف تھی۔ نہ وہ سنی سنائی پر اعتبار کرتی تھی اور نہ ادھر کی بات ادھر لگاتی تھی۔ وہ صاف دل اور صاف گو تھی۔ ذہین اور حوصلہ مند تھی لیکن جذبات میں شدت پسند خصوصاً معاملات محبت میں۔ چھ سال سے جس طرح اس نے اپنی زندگی مجھے سونپ رکھی تھی' اسی طرح میری زندگی پر بھی مکمل اختیار حاصل کر لیا تھا چنانچہ حقیقت یہ تھی کہ میں اس سے ڈرتا تھا۔ فریال مجھ سے بے وفائی کرے یا کسی بات پر مجھ سے خفا اور بدگمان ہو کے مجھے چھوڑ دے۔ اس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا مگر یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ میں نے اسے چھوڑا تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گی اور پھر بے حد ڈرامائی طور پر خود اپنی جان بھی دے دے گی۔

راجا نے جاتے ہوئے وعدہ کیا تھا کہ وہ رات تک ضرور واپس آ جائے گا۔ مجھے اندازہ تھا کہ شہناز کی جدائی نے اندر سے اس کی کیا حالت کر رکھی ہے۔ گھر باہر سے وہ پرسکون اور پراعتماد نظر آتا تھا۔ عشق کسے کہتے ہیں۔ یہ میں نے راجا اور شہناز کے تعلق میں دیکھا اور جانا تھا۔ زندگی کے ہر معاملے میں مجھے بے اصولی اور بے پروا۔ دل لگانے کو دل لگی سمجھنے والا اور پیشہ ور قسم کا بدنام فلرٹ' جس نے حسن پرستی اور ہوس پرستی میں کبھی فرق نہ رکھا۔ شہناز کے معاملے میں فرہاد اور مجنوں سے بڑا دیوانہ ثابت ہوا۔ اسے زندگی میں ایک سے بڑھ کر ایک حسین لڑکی کی قربت اور چاہت میسر آئی لیکن کوئی اسے وفاداری کی زنجیر سے نہ باندھ سکی۔ یہ کام صرف شہناز نے کیا یا شاید قدرت نے کیا کیونکہ اس میں شہناز کی کوشش ارادے یا منصوبے کو قطعی دخل نہ تھا۔ وہ ایک بہت معمولی صورت والی لڑکی تھی۔ اس کے نقوش جاذب نظر تھے اور اس کے سانولے پن میں بھی ایک عجیب سی دل کو چھو لینے والی کشش تھی مگر وہ کسی طرح بھی حسن کے عالمی معیار کا نمونہ نہیں تھی اور اس سے ہزار گنا حسین لڑکیاں راجا کی زندگی میں آ کے جا چکی تھیں۔ وہ راجا سے قد میں بھی دو انچ زیادہ ہی تھی۔ اس نے راجا کو رجھانے کے لیے کبھی اپنی ناز و ادا کا جال نہیں پھیلایا تھا۔ یہ سب وہ جانتی ہی نہیں تھی۔ وہ ایک سیدھی سادی لڑکی تھی۔ نہ جانے کیوں' کب اور کیسے راجا کو اس سے محبت ہوئی اور دیکھتے دیکھتے اس عشق میں بدل گئی جو

بے بس کر دیتا ہے۔ پاگل بنا دیتا ہے اور ساری دنیا کی نظر میں تماشا۔ شہناز کو راجا پر مکمل کنٹرول حاصل تھا۔ اس حد تک کہ وہ شہناز کی ڈانٹ ڈپٹ سنتا تھا اور اس کے سامنے بھیگی بلی بن جاتا تھا۔ تاہم دوسری طرف شہناز کا حال ہی مختلف نہ تھا۔ ہم سب جانتے تھے کہ وہ راجا کے بغیر اس طرح زندہ نہیں رہ سکتی جیسے شاخ سے جدا ہو کے پھول کی خوشبو رعنائی اور تازگی۔

اب شام ہو رہی تھی۔ راجا کا آدھی رات سے پہلے لوٹ کر آنا مشکل تھا۔ فریال نے اماں کی حالت بھی دیکھی تھی اور وہ سب ہی سنا تھا جو ابا جی نے جاتے وقت مجھ سے کہا تھا۔ ان کی بات نوکِ خار کی طرح میرے دل میں چبھ گئی تھی۔ کس لیے آئے تھے اور کیا کر چلے۔ وہ اس حویلی پر میرے حق ملکیت اور قانونی اعتبار سے اتنے خوش تھے جیسے ان کے خاندان کو صدیوں کی جلاوطنی کے بعد اپنی بادشاہت پھر مل گئی ہو۔ لیکن اس کے بعد کیا ہوا؟ وہ تین بار یہاں اپنے خاندانی قبرستان میں اپنوں کو دفن کرنے آئے۔ پہلے ماں کو پھر بھائی کی بیوی کو اور بالآخر بھائی کو۔ اس کے بعد بھی انہیں ریاست اور خاندانی حویلی میں وہ خوشی نہ ملی جس کی تمنا ایک خواب کی طرح تھی۔ الٹا وہ اپنا سکون قلب بھی گنوا بیٹھے۔ انہوں نے بڑے اصرار سے مجبور کر کے اور حکم دے کے مجھے لندن سے واپس بلایا تھا لیکن اب وہ اس پوزیشن میں بھی نہ تھے کہ مجھ سے کہہ سکتے کہ رفیق میاں، ہم سے بڑی بھول ہوئی مگر اب ہم کس منہ سے کہیں کہ یہ سب چھوڑ دو اور واپس لندن چلے جاؤ ورنہ اس حویلی میں رہنے والوں کی طرح تمہاری زندگی بھی کسی آسیب کا شکار ہو جائے گی۔

ایسی باتوں پر نہ میرا اعتقاد تھا اور نہ میرے والد کا لیکن اب ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کوئی غیر مرئی، نظر نہ آنے والی اور محسوس نہ ہونے والی نحس قوت جو صدیوں سے کارفرما تھی آج بھی حویلی میں رہنے والوں کی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ میں نے تہیہ کر رکھا تھا کہ اس احساس کو ختم کر دوں گا۔ نحوست کوئی چیز نہیں، آسیب محض آدمی کے خیال میں رہتا ہے ورنہ جو کچھ ہے منجانب اللہ ہے اور اللہ کی بنیادی صفت تو وہی ہے، رحمن اور رحیم۔ جو رب العالمین ہے، وہ صرف میرے خاندان کے نوشتۂ تقدیر میں خرابی و بربادی کیسے لکھ سکتا ہے؟ وہ ناانصاف نہیں ہے اور معاف کرنے والا بھی ہے۔ یہ انسانوں کے اپنے اعمال ہی ہوتے ہیں جو بالآخر بربادی یا کامیابی لاتے ہیں۔

فریال نے میری اداسی اور مایوسی کو دیکھتے ہوئے آہستہ سے میرا ہاتھ تھام لیا ”ایسے کب تک کھڑے رہو گے، کیا سوچ رہے ہو؟“

میں چونک پڑا ”وہ...... کچھ نہیں۔ بس ذرا ابا کی بات کا دل پر اثر تھا۔“

ریشم نے میرا موڈ ٹھیک کرنے کی کوشش میں کہا ”سر یو سٹ ان گارڈن۔ آئی برنگ کافی۔ یو اینڈ میڈم کرائی ٹین منٹ۔“

میں نے کہا ”کیا مطلب...... ہم دس منٹ روتے رہیں۔“

”یس سر...... یو کرائی۔ ہارٹ لائٹ، غم آؤٹ ود آنسو۔ بٹ صرف ٹین منٹ۔ ان تین منٹ آئی برنگ کافی۔ اینڈ یو اسٹاپ کرائی۔ ڈرنک کافی، یو فیل فائن۔“

اس کی بات نے مجھے مسکرانے پر مجبور کر دیا۔ اس کی انگلش پہلے سے بہت بہتر ہو گئی تھی۔ اس نے ہمیں سمجھا دیا تھا کہ رونے سے دل ہلکا ہو جاتا ہے چنانچہ ہمارے پاس رونے کے لیے دس منٹ کی مہلت ہے پھر وہ کافی لے آئے گی۔ اس کے بعد ہم آنسو پونچھ کے کافی پئیں گے تو یقیناً بہت بہتر محسوس کریں گے۔

ہرن کا بچہ دوڑتا ہوا آیا اور فریال کے قریب رک کر اسے بڑی معصوم متوقع نگاہوں سے تکنے لگا۔ فریال نے جھک کر اسے گود میں اٹھا لیا۔ وہ ہم سب سے ایسے ہی مانوس تھا اور یہ چاہتا تھا کہ ہم اس کے ساتھ کھیلیں۔ میں کن انکھیوں سے فریال کو دیکھتا رہا اور موڈ سے اس کے جذبات کا اندازہ کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن ناکام رہا۔ عام طور پر اس کے لیے اپنے جذبات پر ریاکاری کا پردہ ڈالنا ممکن نہیں تھا۔ اس کا چہرہ ایسا آئینہ تھا جس پر جذبات کا ہر رنگ اپنی اصل حالت میں فوراً نظر آ جاتا تھا۔

اس وقت وہ کچھ اداس اور افسردہ ضرور تھی لیکن خفا یا روٹھی ہوئی ہرگز نہ تھی۔ اداسی کا سبب پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس اداسی نے گھر کے ہر فرد کے ساتھ گھر کے در و دیوار کو بھی اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ فریال کبھی اپنے جذبات کو چھپانے کی کوشش بھی نہیں کرتی تھی۔ کوئی شکایت ہو تو فوراً اس کی زبان پر آ جاتی تھی۔ غصہ ہو تو وہ لڑنے میں دیر نہیں کرتی تھی۔ پیار کا اظہار مقصود ہو تو وہ موقع محل نہیں دیکھتی تھی۔

یہ ابھی تک جو میرا شک تھا کہ اس نے راجا سے میری ساری گفتگو سن لی ہے لیکن اس کی بنیاد بہت کمزور تھی۔ سب سے مضبوط راجا کی دلیل تھی کہ یہ میرے دل کا چور تھا جو خوف کے واہمے کو حقیقت بنا کے پیش کر رہا تھا ورنہ فریال سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ اتنی دیر تک دم سادھے کھڑی رہے

اور ہماری ساری باتیں سن لے۔ یعنی تقریباً ایک گھنٹے تک دروازے کے ساتھ کان لگائے کھڑی رہے۔ مگر میرے لیے اس احساس کی نفی کرنا بھی مشکل تھا کہ میں نے چوڑیوں کی جھنکار سنی تھی اور باہر فریال کی خوشبو کو محسوس کر لیا تھا۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ فریال میری تلاش میں آئی ہو پھر کسی نے اسے آواز دے لی اور وہ دروازے تک آ کے لوٹ گئی۔

فریال نے ہرن کے بچے کو چھوڑ دیا اور وہ چوکڑیاں بھرتا ہوا بھاگ گیا۔ ریشم چائے کی ٹرے اٹھائے نمودار ہوئی اور گھٹنوں کے بل لان پر بیٹھ گئی۔ چائے بناتے ہوئے اس نے اپنی انگریزی شروع کی ”سر! حویلی ویری بگ۔ آل ہیئر ویری رونق۔ ٹوڈے یو اینڈ میڈم فریال، خاموشی ان سائڈ۔“

میں نے کہا ”کچھ دن کی بات ہے، پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

فریال اداسی سے مسکرائی۔ ”ایسا تو ہم سب ہی سوچ رہے ہیں۔ نہ جانے کب سے۔“

میں نے کہا ”کیا ایسا سوچنا غلط ہے؟“

”پہلے تو نہیں لگتا تھا۔“

میں نے کہا ”پھر اب کیوں لگتا ہے؟“

”اس کا میں کیا جواب دوں؟ تم خود دیکھ لو کہ کیا ابھی تک کچھ بھی ایسا ہوا ہے، جیسا تم نے سوچا تھا؟ کیا سوچ کے آئے تھے تم لندن سے یہاں؟“

میں نے کہا ”انگریزی میں کہتے ہیں کہ روم ایک دن میں نہیں بن گیا تھا۔“

اس نے چائے کا مگ نیچے رکھ دیا ”یہاں تو سب اس کے الٹ ہو رہا ہے۔ جو تم سوچتے ہو، تعمیر کی طرف اٹھنے والا ہر قدم تخریب کا سبب بن جاتا ہے۔ تم اچھا پلان کرتے ہو مگر نتیجہ برا نکلتا ہے۔“

”تم ایسی مایوسی کی باتیں کیوں کر رہی ہو؟“

”اگر یہ غلط اور جھوٹ ہے تو بتاؤ، منصوبے تمہارے بہت شاندار تھے، خدمت خلق کے۔ اس [illegible] تے میں خوشحالی لانے کے۔ رفاہ عامہ کے، ان کی افادیت تو میں نے ہی نہیں سب نے تسلیم کیا۔ سب تمہارا ساتھ دینے یہاں آ گئے۔ مگر یہاں آ کے کیا ہوا؟ ایک شہناز نے کام شروع کیا تھا۔ اس کا انجام دیکھ لو۔ آج راجا کے دل پر کیا گزر رہی ہے؟ اس کا اندازہ کوئی اور کیسے کر سکتا ہے؟ کیا وہ پچھتا نہیں رہا ہو گا۔“

میں نے برہمی سے کہا ”کسی اور کی بات مت کرو۔“

”کیوں نہ کروں۔ فرخ کو بھی تم لائے تھے۔ کیسا دھوکا دیا اس نے رابعہ کو۔“

میں نے غصے سے کہا ”رابعہ نے خود اپنی غلطی کا خمیازہ بھگتا۔ اس کا ذمے دار تم مجھے بنا رہی ہو؟“

”ہر ذمے داری اٹھانے کی اخلاقی جرأت ہونی چاہیے تم میں۔ کیا یہ غلط ہے کہ تم نے ہی رابعہ کے رومانس کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ انہیں ملنے کے مواقع فراہم کرنے والے تم تھے۔“ وہ تیز ہو کے بولی ”اور فرخ نے آخر کس کے جرم کی سزا دی تھی رابعہ کو؟“

میں نے سر جھکا لیا ”ایسا رابعہ نے کبھی نہیں کہا۔“

”اگر نہیں کہا تو کیا یہ غلط ہو گیا؟ یہ تو اس کی شرافت ہے یا لحاظ کی انتہا ہے۔ پھر میری بات پر چراغ پا کیوں ہو؟ سچ کو سننے کا اور برداشت کرنے کا حوصلہ پیدا کرو نواب صاحب۔ آج نہیں تو کل وہ بھی بولیں گے جو اب تک چپ تھے۔ دوستی کے رشتے نبھانے کی قیمت دکھ اٹھا کے ادا کی جا سکتی ہے۔ رفاقت کے راستے پر چلنے والے یہ بات سمجھتے ہیں مگر تم بھی یہ سمجھو کہ سارے رشتے زندگی کے رشتے ہیں۔ ان کی قیمت موت کو گلے لگا کے چکانا پڑے تو پھر باقی کیا رہ جاتا ہے؟ نہ دوستی نہ کوئی رشتہ۔“

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا جس میں فریال اور میں حالات کی عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہوئے دو ایسے لوگ بن گئے جن کو وقت کی بے رخی نے سارے رشتوں کی تقدیس اور احترام بھلا کے آمنے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ ہم بیک وقت مدعی بھی ہو گئے تھے اور منصف بھی لیکن ایک طرف اکیلا میں تھا اور دوسری طرف فریال کے ساتھ مجھے بہت سے لوگ نظر آ رہے تھے جن میں رابعہ، راجا یا شہناز ہی نہیں، میرے والدین بھی تھے جن کے پاس الزامات کی الگ فہرست تھی۔ لیکن ان سب کا سوال ایک ہی تھا۔ رفیق، ہم نے تو ایسا نہیں چاہا تھا۔ تم نے ہی کچھ اور خواب دکھائے تھے۔

جب فریال نے میرا ہاتھ پکڑا تو میں چونکا ”تم خفا ہو ناں مجھ سے رومیو!“

میں نے تلخی سے کہا ”خفگی کیسی؟ مجھے تو تمہارا شکر گزار ہونا چاہیے کہ تم نے میری آنکھیں کھول دیں۔ وہ سب کہہ دیا جو باقی سب لوگ کل کہتے۔“

اس نے میرے کندھے پر سر رکھ لیا ”میرا مرنا جینا تو تمہارے ساتھ ہے۔ یہ تم جانتے ہو، میں آخری وقت تک تمہارا ساتھ دوں گی۔“

”لیکن تم سمجھتی ہو کہ آخری وقت اب زیادہ دور نہیں ہے۔ کیونکہ میں ہر طرف سے دشمنوں میں گھر گیا ہوں۔ ان کا گھیرا تنگ ہوتا جا رہا ہے اور اس سے پہلے کہ میرے لیے فرار

کے راستے بھی بند ہوں' مجھے یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ سب کے ساتھ ...... لیکن فریال' میں ہتھیار ڈالنے والوں میں نہیں ہوں۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لو...... کیونکہ میں حق اور صداقت کے جس راستے پر چل رہا ہوں' وہ میرا تراشا ہوا نہیں ہے۔ اس پر پہلے بھی لوگ چلے آئے ہیں۔''

''خدا کے لیے۔ آئیڈیلسٹ اور فلسفی مت بنو۔ حقائق کو دیکھو اور سمجھو...... اور ذرا میری بات دھیان سے سن لو۔ پوری بات...... پلیز!''

میں نے گہری سانس لے کر کہا ''اچھا...... کہو۔''

''دیکھو' سویٹ ہارٹ! یہ کیا جگہ ہے جہاں اس وقت تم ہو یا میں ہوں اور...... اور ہمارے آس پاس کون لوگ ہیں۔ چاروں طرف دیکھو' محافظ اسلحہ اٹھائے کھڑے ہیں' مسلح گارڈز حویلی کے بند دروازے کے اندر باہر موجود ہیں۔ حویلی کی اونچی فصیل پر سرچ لائٹس لگی ہوئی ہیں۔ ہمیں دشمنوں سے محفوظ رکھنے کے سارے انتظامات ہیں۔ چاروں طرف تمہاری ریاست پھیلی ہوئی ہے' تمہاری زمین ہے اور جنگل ہیں' دریا ہے ...... قدرت کے خزانے ہیں جن کو تم اپنے استعمال میں لانا چاہتے ہو...... لیکن عملی صورت حال کیا ہے؟''

میں نے اس کا مطلب سمجھ لیا ''کیا ہے؟''

''میں تم اور ہم سب اس حویلی کے قیدی ہیں۔ اس فصیل سے باہر اکیلے نہیں جا سکتے۔ جاتے ہیں تو کسی نہ کسی دشمن کا سامنا ہوتا ہے یا اس دشمن کا خوف دامن گیر ہوتا ہے۔ تمہارے دشمن' میرے دشمن' ہم سب کے دشمن۔ سلطان' رانا' اکبر خان اور نہ جانے کتنے۔ ان کی تعداد کم نہیں ہو رہی ہے' بڑھ رہی ہے۔ تمہاری فیملی کے ساتھ جو سانحہ پیش آیا' کسی حد تک وہ بھی اسی جاگیر کا چکر تھا۔''

''یعنی تم بھی اس کی نحوست کی قائل ہو گئی ہو؟''

''نہیں رومیو! وہ سب لالچ کی وجہ سے ہوا تھا۔ بے شک قانونی طور پر تمہاری چچی اور چچا کا دعویٰ غلط تھا کہ وہ بھی نصف کے قانونی مالک ہیں اور انہیں حصہ ملنا چاہیے لیکن اس کا انجام کیا ہوگا' یہ تمہیں بھی معلوم نہیں تھا ورنہ تم فوراً ان کا دعویٰ تسلیم کر لیتے۔''

میں نے کہا ''ہاں' اس میں کوئی شک نہیں۔''

''جائیداد کے لیے تمہاری چچی نے ہر طرح سے کوشش کی کہ رابعہ کی شادی تم سے ہو جائے۔ اس کوشش میں ناکامی کے بعد ہی اس نے تمہیں زہر دے کر مارنے کی سازش کی۔ تاکہ تمہارے بعد ساری جاگیر رابعہ کو مل جائے لیکن تمہاری زندگی تھی' تم بچ گئے۔ زہر دادی نے پیا' پھر اشتعال میں تمہارے چچا نے اپنی بیوی کو مار ڈالا اور خود پھانسی نہ چڑھے' حوالات میں مار دیے گئے۔ ایکسٹرا جوڈیشل کلنگ' ماورائے عدالت قتل کہتے ہیں غالباً اسے اردو میں۔ اس کا یہاں ہر طرح پر رواج ہے۔ کوئی کسی کو بھی مار سکتا ہے یا مروا سکتا ہے۔ پولیس کی تحویل میں۔''

''ایسا میں نے نہیں چاہا تھا۔''

''تم پر یہ احسان کیا تھا کسی نے' کیا یہ غلط ہے؟''

میں نے کہا ''غلط تو نہیں ہے۔''

''احسان کیوں کیا تھا؟ کسی مطلب کے بغیر کوئی سلام کا جواب نہیں دیتا۔ نور جہاں نے اتنا تردد کیا' آخر کس لیے...... وہ تمہارے دشمن کی بیوی ہے۔''

میرا دل دھڑ کنے لگا ''آخر کیا کہنا چاہتی ہو تم؟''

''کچھ نہیں۔ میں تم سے پوچھ رہی ہوں کہ نور جہاں نے یہ خطرہ کیوں مول لیا۔ اکبر خان کو معلوم ہو جاتا کہ اس کے سارے پلان کو ناکام بنانے میں اس کی اپنی بیوی نے دشمن کا ساتھ دیا ہے...... تو وہ کیا کرتا...... بولو؟''

''وہ اسے قتل کر دیتا۔''

''مگر اس نے نہیں کیا۔ کیونکہ نور جہاں نے اس کی آنکھوں میں دھول جھونک کے یہ کام کیا۔ اتنا بڑا رسک کیوں لیا اس نے تمہارے لیے۔ یہ کوئی بہت مشکل سوال نہیں ہے رفیق۔ وہ تم سے اس کی قیمت وصول کرنا چاہتی ہوگی...... یا شاید اب تک کر چکی ہوگی۔ کیا قیمت ادا کی تم نے اس کے احسان کی؟''

میرے جسم پر پسینا آنے لگا۔ اگر یہ چکر نہ ہوتا تو شاید فریال کی نظر میرے چہرے سے میرے دل کی حالت جان لیتی۔ یہ سب کس نے کہا ہے تم سے......؟

''کوئی بات چھپی نہیں رہتی۔ اور جو باتیں اس حویلی کی چار دیواری کے اندر ہوتی ہیں وہ سنائی دیتی ہیں۔ ان کی بازگشت آتی ہے کہیں نہ کہیں سے۔ سچ بتاؤ کیا چاہتی ہے وہ عورت تم سے...... عورت تو نہیں کہنا چاہیے اسے...... وہ ایک فاحشہ ہے۔ ایک خطرناک خوبصورت ناگن ہے جس کا ڈسا ہوا پانی نہ مانگے۔''

میں نے برہمی سے کہا ''تم سمجھتی ہو......''

اس نے چلا کے میری بات کاٹ دی۔ ''کتنا پیسا وصول کیا اس نے تم سے؟ اپنے جسم کے ساتھ دین ایمان اور ضمیر...... سب کچھ پیسے کے لیے بیچ سکتی ہے وہ...... مجھے بتاؤ کیا تم نے کیا تھا یہ سودا...... تم نے حاصل کی تھیں اس کی خدمات۔''

میں نے سکون کا گہرا سانس لیا۔ میرے احساس کو [illegible] کر دینے والا یہ خوف ختم ہو گیا کہ فریال نے واقعی آج [illegible] چھپ کر راجا اور میری ساری گفتگو سنی تھی اور یہ محض [illegible] یا وہم نہیں تھا۔ اسے نور جہاں سے میری ملاقات کا [illegible] ہے۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔

بولتے کیوں نہیں...... کتنے پیسے دیئے تم نے [illegible] ایک کروڑ دو کروڑ...... یا اس سے بھی زیادہ......''

[illegible] نے کہا۔ ''کیا اب آپ اپنی بکواس بند فرمائیں [illegible] میری درخواست کافی ہوگی یا میں آپ کے جھانپڑ رسید [illegible]

[illegible] کیوں! کوئی اور جواب نہیں ہے مجھے مطمئن کرنے [illegible] میرا بیچ اتنا کڑ والا ہے۔''

[illegible] نے کہا ''بالواسطہ طور پر یہ الزام تم مجھ پر لگا رہی ہو [illegible] چچا کو خود میں نے قتل کرایا۔ نور جہاں کی خدمات [illegible] لے...... کیا اس الزام سے تم نے خود کو کم سے کم ایک [illegible] مقدار ثابت نہیں کیا ہے۔ لیکن ہم امن پسند لوگ ہیں۔ [illegible] والوں کو پھول پیش کرتے ہیں۔ ایسے......''

[illegible] دم جھپٹ کے میں نے فریال کو اپنے قریب کیا [illegible] بانہوں میں بھر کے اپنے لب اس کے لبوں پر رکھ [illegible] اس کا غصہ...... ڈسٹربنس۔ اداسی یا بدگمانی ختم [illegible] اس سے بہتر اور موثر اور زود اثر انجکشن اور کوئی نہیں [illegible] اس کو مزاحمت کا موقع بھی نہیں ملا۔ اور وہ مزاحمت [illegible] کیوں......

[illegible] دیر بعد جب میں اس کی گود میں سر رکھے بیٹھا تھا۔ [illegible] وجود کی ساری نرمی اور حرارت کے ساتھ اس کے [illegible] بالوں کا مہکتا سایہ مجھ پر مہربان تھا اور وہ میرے بالوں [illegible] رہی تھی تو آس پاس خاموشی تھی اور مکمل خلوت۔ تیں [illegible] بکھرنے والی ظلمتیں سمٹ کر کسی گوشے میں بیٹھ گئی تھیں [illegible] کا پتہ بھی کسی سمت میں روپوش تھا۔ حویلی کے اندر [illegible] اندھیرے میں کچھ دیکھا بھی ہوگا تو ہماری تنہائی [illegible] اندازی سے گریز کیا ہوگا...... سرونٹ کوارٹر کی طرف [illegible] کسی میں ہمت نہ تھی کہ ادھر آتا۔

فریال نے اچانک میری ناک پکڑ لی۔ ''رومیو میرے ساتھ۔''

میں نے کہا ''چلو...... لیکن ساتھ نہیں میں پیچھے پیچھے [illegible] گا۔ تم ایسے کب تک ناک پکڑے رہو گی۔ نکیل ڈال [illegible] لیا۔''

''مذاق مت کرو...... مجھے بتاؤ ہمارا یہاں رہنا کیوں ضروری ہے...... آخر کس لیے......''

میں نے کہا ''اس کے ایک سو ایک اسباب تم جانتی ہو۔''

وہ تڑپ کے اٹھ بیٹھی۔ ''سو اسباب دوسرے ہو سکتے ہیں مگر ایک سبب میں ہوں...... رائٹ؟''

''جو اس میں شک کرے وہ کافر......''

''تم یہاں سے گئے تھے علم حاصل کرنے اور علم حاصل کرنے کا ایک ہی واضح مقصد تھا۔ پیسا کمانا...... وہ تم لندن میں اچھا خاصا کمانے لگے تھے۔ اور اگر وہیں رہتے تو اس سے کہیں زیادہ کما لیتے۔''

''اگر دولت مند بننا میرا مقصد حیات ہوتا...... تو خاتون محترم...... میں اس کا ایک آسان راستہ اختیار کر سکتا تھا۔ ایک شارٹ کٹ تھا میرے پاس۔''

''ایشا ارنسٹ...... جو تمہارے عشق میں عائشہ خاتون ہو گئی۔''

''یس...... میں اس سے شادی کر لیتا۔ اس کے باپ کی کمپنی میں میری حیثیت تھی ایک ڈائریکٹر کی...... وہ مجھے ایگزیکٹو ڈائریکٹر بنا دیتا۔ پھر چیئر مین...... عائشہ اس کی واحد وارث تھی۔ اس کے مرنے...... یا میرے ہاتھوں قتل ہونے کے بعد کمپنی میری ہو جاتی...... لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ پوچھو کیوں......!''

''مجھے یہ پوچھنے کی ضرورت ہی کیا ہے...... اس کا جواب وہ نہیں ہے جو سب سمجھتے ہیں۔ یعنی فریال کا عشق۔''

''میں اٹھ بیٹھا۔ اور کیا ہے۔''

''ست بدھائی کی جاگیر اور حویلی...... اس دولت سے کہیں زیادہ تھی جو تمہیں عائشہ کی معرفت لارڈ انسٹ سے ملتی۔ بہت انتظار کے بعد اور تم کبھی براہ راست اس کے مالک نہ ہوتے...... تم اس کے مالک سمجھے جاتے کہ مالک تمہاری بیوی تھی۔ چنانچہ تم نے عائشہ کو چھوڑ دیا۔''

''فریال...... تم زیادتی کر رہی ہو۔''

''یہ خود تم نے بتایا تھا مجھے کہ عائشہ کو سب کچھ منظور ہے...... وہ تمہارے ساتھ یہاں آنے پر تلی بیٹھی تھی۔ پاکستان کے لیے ویزا لے چکی تھی اور سیٹ الگ بک کرا لی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو اور صرف مجھ سے شادی کرو گے مگر اس نے دوسری بیوی بن کے رہنا بھی قبول کر لیا تھا۔ میں اس لڑکی کی محبت کی عظمت کو واقعی سلام کرتی ہوں۔ ایسی قربانی میں نہیں دے سکتی۔ میں تو الٹا تمہیں قربان کر دوں......''

''اچھا یہ فضول بکواس اس وقت کیوں سوجھ رہی ہے تمہیں ہم اچھی باتیں کر رہے تھے۔''

''یہ بھی اچھی بات ہے۔ اگر تم سنو۔ دیکھو تمہیں یہ سب مل گیا...... پتا نہیں کتنے...... شاید پچاس کروڑ تم نے بینک میں ڈال رکھے ہیں...... اس حویلی اور جاگیر کی کیا مالیت ہوگی...... تمہیں بھی نہیں معلوم ہوگا مگر میرا ایسے ہی اندازہ ہے کہ بیس پچیس ملین ڈالر تو مل سکتے ہیں کھرے کھرے۔''

میں نے کہا۔ ''تم یہ حساب کتاب کیوں کر رہی ہو؟''

''اگر تمہارے مجموعی اثاثے دیکھے جائیں تو پچاس ملین ڈالر ضرور ہو جائیں گے...... ہوں گے یا نہیں؟''

''ہو سکتے ہیں مگر۔''

اس نے میری بات کاٹ دی۔ ''پچاس ملین ڈالر...... ذرا سوچو...... اگر قارون کا خزانہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔''

''آخر تم کیا ثابت کرنا چاہتی ہو؟''

''دیکھو...... بہت دن سے میں سوچ رہی تھی...... آج موقع ملا ہے تم سے بات کرنے کا تو میری پوری بات سن ضرور لو...... آگے ظاہر ہے تمہاری مرضی...... مانو نہ مانو...... یہ قسمت کی لاٹری نکلنے سے پہلے کبھی تم نے سوچا تھا...... تصور بھی کیا تھا پچاس ملین ڈالر کا...... ایک لاکھ ڈالر بھی ہوتے ہیں ساٹھ لاکھ روپے پاکستانی کرنسی میں...... سکسٹی ملین یعنی کتنے ہیں پاکستان میں...... اب ذرا ففٹی ملین یعنی پانچ کروڑ ڈالر کو ضرب دو ساٹھ سے...... یہ ہوئے تین ارب روپے۔''

میں نے حیرت سے سیٹی بجائی۔ ''واؤ...... یعنی ہم ارب پتی ہیں خیر سے میں نے کبھی حساب نہیں لگایا تھا...... تم نے تو کمال کر دیا مس کمپیوٹر۔''

وہ مجھے متاثر کرنے والی نظروں سے دیکھتی رہی۔ ''کیا میں بتاؤں کہ اس دولت کو فکس ڈیپازٹ کیا جائے کسی سوئس بینک میں تو کچھ کیے بغیر اس میں سالانہ کتنا اضافہ ہوگا...... اب تم پوچھو گے کہ مجھے سوئٹزرلینڈ کے بینک ریٹ وغیرہ کیسے معلوم ہوئے تو لندن کے ایک بینک کی برانچ میں سلطان کا اکاؤنٹ تھا...... اس بینک کا ہیڈ آفس سوئٹزرلینڈ میں تھا...... برانچ کا منیجر ایک یہودی تھا اور ایک دن سلطان نے اس سے پوچھا تھا کہ سوئس بینک میں گمنام اور خفیہ اکاؤنٹ رکھنے کی شرائط کیا ہیں...... میں تو سن کر حیران رہ گئی کہ اکاؤنٹ کھولنے کے لیے ہی کم سے کم سرمائے کی حد دس ملین ڈالر ہے...... ایک کروڑ ڈالر سے کم ہوں تو بینک والے منہ ہی نہیں لگاتے۔''

''میرے پاس کتنے ہیں...... کیا بتایا تم نے؟'' میں نے کہا۔

''پچاس ملین...... تم اوسط درجے کے کلائنٹ ہو ان کے لیے...... یہ رقم دس سال ان کے پاس رہے تو ہر سال اس میں تین کروڑ روپے کا اضافہ ہوگا...... سوچو ذرا تین کروڑ...... کچھ کیے بغیر...... اصل سرمایہ محفوظ...... یعنی تم کوئی ایک لاکھ روپے روز خرچ کرو...... بس ایک دن خرچ کی چھٹی...... تو تمہاری اصل رقم پر آنچ بھی نہیں آئے گی...... کیا اب میں تمہیں بتاؤں کہ پھر تین ارب تم کتنے دن میں اڑا سکتے ہو...... اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ تمہاری زندگی کے مزید ستر سال باقی ہیں۔''

میں نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔ ''خدا کے لیے مجھ پر رحم کرو...... میرا دماغ اعداد و شمار سے فوراً خراب ہو جاتا ہے...... یہ بتا دو کہ اتنی جمع تفریق کی زحمت کیوں کی تم نے...... کوئی اور کام نہیں تھا کرنے کے لیے؟''

''تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس رقم کے ساتھ ہم دنیا کے کسی بھی ملک کی شہریت حاصل کر سکتے ہیں...... امریکا، کینیڈا...... سرمایہ کاری کی شرط شاید صرف ایک ملین ڈالر ہے...... دس ملین سے اوپر بہرحال نہیں ہے...... تم نے خیر سے ایم بی اے کیا ہے...... کاروباری تجربہ رکھتے ہو...... اس رقم کو دگنا تگنا چوگنا کر سکتے ہو...... کر سکتے ہو یا نہیں۔''

''میرا خیال ہے کہ میرا ذہن کاروباری نہیں ہے...... ورنہ پھر وہی بات کہ میں عائشہ کو بیوی نمبر دو بنا لیتا...... مزید دو کی میرے حرم میں گنجائش رہتی......''

وہ میری گود میں سر رکھ کے لیٹ گئی رومیو...... چھوڑ دو یہ سب جھنجٹ...... چلو باہر چلیں...... سکون سے رہیں...... محفوظ زندگی گزاریں...... تم اتنے کوالی فائیڈ ہو...... سب کچھ کر سکتے ہو...... اپنی بزنس امپائر بنا سکتے ہو...... وہاں کوئی رانا تمہاری راہ میں حائل نہیں ہو سکتا...... کوئی سلطان میرے لیے خطرہ نہیں بن سکتا...... اپنے ساتھ سب کو لے چلو...... تمہارے والدین، تمہاری فیملی کا حصہ ہیں۔ کوئی پرابلم نہیں ہوگی...... رابعہ کو بھی تم دس ملین دے دو تو وہ بھی سیٹ ہو جائے گی۔''

میں خاموشی سے اس کی صورت پر خوابوں کا عکس دیکھتا رہا۔ یہ ایک مادی دنیا کی خواہشات کے خواب تھے جن میں کامیابی کا صرف ایک پہلو تھا...... دولت مندی یا دن دونا رات چوگنا اضافہ کرنا اور عیاشی کرنا...... وہ عیاشی جس میں آپ کی قوت خرید کی حد کوئی نہ ہو...... ہماری آنکھوں کو یہ خواب ان لوگوں نے دیے ہیں جن کی زندگی کی الف لیلوی کہانیاں ہم پڑھتے ہیں اور دیکھتے ہیں...... دنیا کے دس امیر

ترین لوگ...... دس امیر ترین عورتیں...... ان کے عالی شان مینشن...... ذاتی جیٹ طیارے...... پرسنل اسٹاف...... اسپورٹس کاروں کے فلیٹ...... ان کے داد و دہش کے قصے...... برسوں سے بل گیٹس دنیا کا دولت مند ترین شخص ہے...... وہ کیسے رہتا ہے...... کیسے خرچ کرتا ہے...... مائیکل جیکسن...... نکول کڈمین...... انٹرنیشنل ٹینس چیمپین...... فٹ بال پلیئر اور ایسے ہی ان گنت لوگوں کی پرتعیش زندگی کے افسانے سن سن کے ہم اسی طرح دیوانے ہو رہے ہیں جیسے بچے ہیری پوٹر کی کہانیاں پڑھ پڑھ کے ہو رہے ہیں...... یا ہمارے بچے جن پریوں کی الف لیلوی داستانوں سے ہوتے تھے۔

جب فریال نے مجھ سے پوچھا۔ ''تم میری بات سن ہی نہیں رہے تھے۔''

میں نے چونک کے کہا۔ ''دراصل...... میں خوابوں میں گم ہو گیا تھا...... جو تم نے میری آنکھوں میں بھر دیے تھے۔''

''یہ خواب تمہاری دسترس میں ہیں رومیو۔''

''ان گنت اور لامحدود خواب میری دسترس میں ہیں...... شاید ہر انسان کی دسترس میں ہیں...... میں قطب شمالی پر برف کا محل بنا کے رہ سکتا ہوں...... غبارے میں بیٹھ کے دنیا کے گرد تین سو ساٹھ چکر لگا سکتا ہوں...... ایشوریا رائے اور شاہ رخ خان کو کاسٹ کر کے فلم بنا سکتا ہوں۔''

وہ خفا ہو گئی...... ''مذاق کی بھی کوئی حد ہوتی ہے...... میں جا رہی ہوں۔''

میں نے اسے ہاتھ پکڑ کے بٹھا دیا۔ ''دیکھو جانم...... میرے خواب کچھ اور ہیں۔ یہ بات سمجھو...... پاکستان کے علاوہ میں کسی ملک کا شہری کہلانا ہی نہیں چاہتا...... میں اپنے ملک کا پیسا باہر لے جانا جرم سمجھتا ہوں...... اس پر میرے لوگوں کا پہلا حق ہے میں کسی اور ملک کی خوش حالی اور پیداوار میں کیوں اضافہ کروں...... کسی متعصب گورے یا کالے پیلے افریقی، کوریائی کو روزگار کیوں فراہم کروں جبکہ میرے ملک میں بے روزگار خودکشی کر رہے ہیں...... غربت تعلیم کی کمی...... صحت جیسے مسائل کیا میرے نہیں ہیں...... اگر حکومت کے ہیں تو حکومت کس کی ہے...... اور تنہا حکومت کیا کر سکتی ہے۔''

وہ ہاتھ چھڑا کے کھڑی ہو گئی۔ ''تم میرے بارے میں بالکل نہیں سوچتے نا...... نہ میرے خوابوں کے بارے میں۔''

''کیا تم میرے خوابوں میں ساتھ نہیں ہو؟''

''ایسے خوابوں میں ساتھ دینے کا میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔ دشمنی خون خرابے...... اغوا اور بدمعاشی کی دنیا سے نہ تمہارا تعلق تھا نہ میرا...... ذرا یاد کرو تم نے کیا وعدے کیے تھے...... کیا خواب دکھائے تھے...... وہ گھر کہاں تھا...... وہ کون سی دنیا تھی...... جس میں ہم ایک ساتھ رہنا چاہتے تھے...... ہمیشہ ایک ساتھ...... تمام تفکرات سے بے نیاز...... ساری دنیا کی خوشیاں سمیٹتے ہوئے۔''

''صاف کہو اب تم کیا چاہتی ہو؟'' میں نے گرم ہو کے کہا۔

''میں کیا کہوں...... تم مجھے بتاؤ کہ تمہارے اور میرے خوابوں میں ست بدھائی کہاں تھا...... ست بدھائی تریاقی منصوبہ کہاں تھا...... یہ تم کون سی دنیا میں لے آئے ہو مجھے...... دھوکے سے۔'' وہ رونے لگی۔

میں نے چراغ پا ہو کے کہا۔ ''دھوکے سے...... میں نے تمہیں سب بتا دیا تھا اور اگر تم خوش نہیں ہو یہاں میرے ساتھ تو جا سکتی ہو۔''

''ہاں...... چھ سال اپنی محبت کے پنجرے میں ڈال کے رکھا...... اب پنجرہ کھول کے کہتے ہو کہ جاؤ تم آزاد ہو۔'' وہ روتے ہوئے بولی۔

''مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم صرف لندن اور لاہور میں محبت کر سکتی ہو...... مشکل حالات اور آزمائش میں ساتھ دینا پڑا تو تمہاری محبت دو دن میں کریش کر جائے گی۔'' میں نے چلا کے کہا۔

وہ جاتے ہوئے بولی۔ ''تم نے مجھے اپنی خواہشات کا غلام بنا رکھا ہے...... اب بلیک میل کرتے ہو مجھے...... میری خواہشات کی کوئی اہمیت نہیں...... میں وہی کروں گی جو تم چاہو گے...... تم مرد ہو...... مجازی خدا ایسے ہی ہوتے ہیں...... عورت ان کے پاؤں کی جوتی کچھ نہیں کر سکتی۔''

جب وہ چلی گئی تو میں غصے کی آگ میں جلتا رہ گیا...... اچانک میں نے محسوس کیا کہ مجھے فریال سے نفرت ہے...... اس کی محبت ایک سراب تھی۔ جس کے پیچھے میں چھ سال تک دیوانہ وار بھاگتا رہا...... لیکن اچھا ہوا اس کی حقیقت عیاں ہو گئی...... آگے جا کے نہ جانے کتنی خرابی ہوتی۔ ابھی وقت ہے میں اسے آزاد کر سکتا ہوں...... نہیں...... خود اس کے دام محبت سے آزادی حاصل کر سکتا ہوں...... وہ جائے لندن یا گجرات...... سلطان سے شادی کرے یا غلام سے۔

میرا دماغ خراب ہونے کے قریب تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اندر فریال کے جذبات کی کیا کیفیت ہوگی۔ شاید وہ بستر پر اوندھی پڑی رو رہی ہوگی اور طے کر چکی ہوگی کہ ان حالات میں وہ میرا ساتھ نہیں دے گی اس نے حوصلہ ہار دیا ہے۔

اچانک گیٹ کھلا اور ایک شخص اندر آ گیا...... یہ غنی تھا مگر اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی تھی۔ اس کے پیچھے پولیس کے دو کانسٹیبل آئے۔ ہتھکڑی کا دوسرا سرا ان کے ہاتھوں میں تھا۔ تھانیدار سب کے بعد آیا۔ وہ نیا اور عارضی تھانیدار تھا چنانچہ ابھی تک اس میں پرانے تھانیداروں والی رعونت نہیں آئی تھی۔ وہ پکا تھانیدار بننے کے لیے میری مدد کا خواستگار بھی تھا۔

معلوم نہیں غنی کا کیا جرم تھا اور کتنا سنگین تھا کہ اسے ہتھکڑی لگا کے یہاں لانا ضروری ہو گیا تھا۔ غنی کو یہاں لانا بھی کوئی مقصد ضرور رکھتا تھا۔ وہ میرا خاص آدمی تھا شمار ہوتا تھا اور اسی علاقے کا رہنے والا تھا لیکن گردونواح کے لوگ اس کے بارے میں خراب رائے نہیں رکھتے تھے۔

میرے قریب آتے ہی سرکاری قافلہ رک گیا۔ تھانیدار نے ہاتھ اٹھا کے سلام نہیں کیا۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا مگر عزت و تکریم کے ساتھ۔

میں نے کہا۔ ''یہ کیا تھانیدار صاحب...... ہمارے بندے کو آپ نے کیوں پکڑ رکھا ہے۔ ہمارے سامنے لائے ہیں زنجیروں سے باندھ کے؟''

اس نے عیاری سے کہا۔ ''کیا کریں جناب...... ہم قانون کے ہاتھوں مجبور ہیں۔ اس کا جرم ہی ایسا ہے۔ قابل دست اندازی پولیس جس میں گرفتاری لازمی تھی...... اور ضمانت بھی سیشن کورٹ سے ہی ہو گی۔''

ہم برآمدے میں پڑی کرسیوں پر بیٹھ گئے...... دونوں کانسٹیبل بھی ملزم کے ساتھ کھڑے رہے۔ مجھے غنی کے چہرے پر کوئی ندامت نظر نہیں آئی۔ وہ بڑے اعتماد اور سکون کے ساتھ کھڑا تھا۔ میں غور سے اس کے چہرے یا جسم کے دوسرے حصوں پر تشدد کی کوئی علامت تلاش کر رہا تھا کہ اندر سے ریشم بدحواسی میں دوڑتی آئی۔

اس نے آتے ہی بولنا شروع کر دیا۔ ''ہائے ہائے...... واٹ ہی ڈو...... وائی دس ہتھکڑی...... ٹیل می۔''

تھانیدار دم بخود رہ گیا۔ ''یہ کون ہے...... انگریز کی بچی۔''

ریشم نے برہمی سے کہا۔ ''یو ڈونٹ نو می...... آئی ایم اسپیشل اسسٹنٹ ٹو ڈاکٹر شہباز...... مس ریشم جان...... اینڈ دس غنی......''

میں نے کہا۔ ''ریشم...... تم اندر جاؤ مجھے بات کرنے دو۔''

مگر وہ بولتی رہی۔ ''سر...... پلیز ٹیل می...... واٹ ہی ڈو...... مرڈر...... ڈاکا...... پولیس میک جھوٹا کیس...... ہیٹ ہم......'' اس کے ساتھ ہی ریشم نے رونا شروع کر دیا۔

اچھی بات یہ ہوئی کہ اسی وقت اندر سے اس کی ماں فاطمہ نمودار ہوئی اور اسے کھینچ کے لے گئی۔ ''دماغ خراب ہے تیرا...... چل اندر۔'' کچھ میری نظر کو دیکھتے ہوئے بھی ریشم نے چلے جانا ہی بہتر سمجھا۔

میں نے کہا۔ ''یہ لڑکی منگیتر ہے اس کی...... ذرا جذباتی ہے...... تم بتاؤ غنی پر الزام کیا ہے؟ تم نے کیا مقدمہ کھڑا کیا ہے اس کے خلاف؟''

''پرچا تو ابھی تک نہیں کاٹا ہے جناب...... بڑی مشکل ہے ہماری بھی...... اس کے خلاف شکایت درج کرانے خود کالو آیا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''کس کا خالو۔''

''خالو نہیں سر...... کالو...... وہ خاص بندہ ہے اپنے رانا صاحب کا...... وہ تو چاہتا تھا کہ اسی وقت پرچا کاٹ دیا جائے قتل کے الزام میں...... کالو کے ساتھ مدعی بھی آیا تھا کہ بیان پر انگوٹھا لگا دے۔''

میں نے کہا۔ ''ذرا آرام سے مجھے بتاؤ کہ قتل کس کا ہوا تھا جس کا الزام غنی پر ہے۔ مدعی کون تھا جو مسٹر کالو کو سفارشی بنا کے لایا تھا...... لیکن پہلے غنی کی ہتھکڑی کھولو میں ضمانت دیتا ہوں یہ فرار نہیں ہو گا۔''

تھانیدار کو معلوم تھا کہ حویلی میں کیا ہو گا۔ مگر اس نے بڑی مجبوری ظاہر کرتے ہوئے مجھ پر احسان کیا مگر ملزم اور ماتحتوں کو حکم دیا کہ وہ بڑے لوگوں سے دور جا کے بیٹھیں۔

''معاملہ کچھ نہیں ہے جناب عالی کہ رانا صاحب کا ایک ملازم ہے بخشو جو گھوڑوں کی مالش کرتا ہے اس کا منڈا چودہ پندرہ سال کا دو دن پہلے غائب ہو گیا۔ ایسے ہی بے وقوف سا لڑکا تھا۔ بول بھی نہیں سکتا تھا۔''

میں چونکا...... ''گونگا تھا۔''

''ہاں جی پیدائشی نقص تھا...... پڑھتا پڑھاتا نہیں تھا...... ویلا پھرتا تھا سارا دن...... آج اس کی لاش ملی...... کسی نے اسے مار کے جنگل میں گاڑ دیا تھا رات کو جنگلی جانوروں نے کھود کے نکال لیا...... ادھر جنگل میں گیدڑ اور چھوٹے جانوروں نے زیادہ نہیں کھایا تھا اس کے باپ کو کچھ لوگوں نے بتایا کہ وہ لڑکا اکثر غنی کے ساتھ نظر آتا تھا اس کی خواہش تھی کہ غنی کے ٹرک پر کلینر بنے...... اس کے بازو پر ایک گھڑی ملی جو غنی کی تھی۔ اب اللہ معاف کرے...... کہنے والے تو بہت کچھ کہتے ہیں کہ ایک رات پہلے وہ لڑکا اور غنی رات کے وقت جنگل میں دیکھے گئے تھے شرمناک حالت میں ان کے کچھ

ناجائز مراسم تھے۔''

میں نے اسے بولنے کا پورا موقع دیا میں سمجھ گیا تھا کہ غنی کو ایک جھوٹے اور شرمناک مقدمے میں کیوں ملوث کیا گیا ہے غنی کو اس بے بنیاد الزام سے بچانا مشکل نہیں تھا شاید خود تھانیدار بھی پولیس میں نوکری کے تجربے سے اتنا ضرور سمجھ گیا ہو گا کہ کیس میں ذاتی دشمنی کے جذبات کا دخل ہے مگر اس نے کیس درج کرنے اور کسی عدالت میں بھیجنے سے زیادہ فائدہ ملزم کو میرے پاس لانے میں دیکھا وہ مجھ سے غنی کی باعزت رہائی کی قیمت بھی وصول کر سکتا تھا اور یہ بھی ثابت کر سکتا تھا کہ وہ میرا کیسا خیر خواہ ہے حالانکہ غنی کو گرفتار کر کے وہ فریق ثانی کو بھی اپنی تابعداری کا اتنا ہی یقین دلا چکا ہو گا اور ممکن ہے اس کے حسب منشا کارگزاری دکھانے کا معاوضہ الگ وصول کر چکا ہو۔

میرے لیے اس خرابی میں خوبی کا ایک پہلو تھا۔ اس بے زبان نامہ بر کی موت کا مجھے علم تھا جو ڈاکٹر شہباز کی خیریت کی اطلاع لایا تھا مگر پکڑا گیا تھا۔ اسے کہا گیا ہو گا کہ ہوشیاری سے کام لینا...... پرچا چھوڑ کے بھاگ آنا مگر وہ ایسا نہ کر سکا اور جب ہمارے محافظوں نے اسے پکڑ لیا تو یہ کوتاہی اس کا جرم بن گئی۔ اسے بھیجنے والوں کو اندیشہ لاحق ہوا کہ ہماری تحویل میں اس نے کوئی راز افشا نہ کر دیا ہو...... اگر وہ زندہ چھوڑ دیا جاتا تو بعد میں اس کی وجہ سے ہم ان لوگوں تک پہنچ جاتے جنہوں نے اسے بھیجا تھا اور معلوم ہو جاتا کہ شہباز کس کی قید میں ہے اس کی زبان تو پہلے ہی خاموش تھی۔ اب اس کا وجود بھی لوحِ جہاں سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا گیا۔

جس طرح اس کی لاش دریافت ہوئی وہ ایک دردناک واقعہ تھا مگر اس کے بعد کچھ لوگوں نے صورت حال کو اپنے فائدے کے لیے استعمال کرنے کی سوچا پنجابی زبان کا ایک محاورہ ہے کہ سیانا کاں گو کھاندا اے...... تو ان کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا...... سیانے بننے والوں نے خود اپنا راز افشا کر دیا...... اب کوئی شک نہیں رہا کہ شہباز کے ہاتھ کا لکھا ہوا خیریت کی خبر دینے والا رقعہ کہاں سے آیا تھا۔ اس لڑکے کا باپ رانا کی حویلی میں گھوڑوں کی مالش کرتا تھا۔ اس کو اپنے ساتھ پرچا کرانے کے لیے لانے والا کالو رانا کا خاص آدمی تھا۔ ممکن ہے اس کی غنی سے کوئی ذاتی رنجش ہو مگر غنی کے خلاف مقتول کے باپ کو استعمال کر کے اس نے شہباز کے اغوا کرنے والوں کی خبر نشر کر دی تھی۔

تھانیدار کی بات سن کے میں نے کہا۔ ''تھانیدار...... تم نے مجھ سے درخواست کی تھی کہ میں تمہاری مدد کر دوں...... تمہیں ایک پھول مل جائے تو تمہاری تھانیداری پکی ہو جائے...... لیکن افسوس کہ اب یہ ممکن نہیں رہا۔''

''وہ کیوں جناب عالی...... کوئی غلطی ہو گئی ہم سے؟'' وہ گھبرا گیا۔

''غلطی نہیں...... تم پر تو فرد جرم عائد ہو گی...... کہیں کوئی لاش ملے تو تمہیں کیا کرنا چاہیے...... اسے اپنی تحویل میں لینا چاہیے یا نہیں؟ اسے پوسٹ مارٹم کے لیے ڈسٹرکٹ اسپتال روانہ کرنا چاہیے یا نہیں؟ کسی کے کہنے پر کسی کو بھی ہتھکڑی لگا دینی چاہیے یا تفتیش کر کے معلوم کرنا چاہیے کہ کہیں کوئی اپنا جرم کسی بے گناہ کے سر تو نہیں ڈال رہا ہے...... وہ مسٹر کالو اگر غنی کی جگہ میرا نام لیتا تو کیا یہی سب کچھ میرے ساتھ ہوتا؟''

تھانیدار کی حالت تو ایسی ہو گئی جیسے اس پر دل کا دورہ پڑ چکا ہے اور اس پر نزع کا عالم طاری ہے۔

میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''خیر...... اب تم مجھے بتاؤ اس لڑکے کا نام کیا تھا...... اور اس کے باپ کا...... مجھے کالو اور ان سارے گواہوں کے نام بھی دو جنہوں نے غنی کو اس لڑکے کے ساتھ دیکھا تھا۔''

''آپ کیا کریں گے؟'' اس کی مری مری آواز نکلی۔

''میں ان سب کے خلاف رپورٹ درج کرا کے انہیں تفتیش میں شامل کرتا ہوں...... بے شک تم نے اپنی حماقت سے بہت سی قانونی شہادتیں ضائع کر دی ہیں مگر پوسٹ مارٹم اب بھی ہو جائے گا...... قبر سے لاش نکلوا کے...... گواہوں کے بیانات ہوں گے کہ انہوں نے مقتول کو غنی کے ساتھ کہاں دیکھا تھا...... شرمناک حالت میں...... اس جگہ کا معائنہ ہو گا...... غنی کی وہ گھڑی کہاں ہے جو لاش کے ساتھ ملی تھی؟''

''سر...... میں نے یقین کہاں کیا تھا کسی کی بات پر...... مجھے پتا ہے، سب جھوٹ بول رہے تھے...... کوئی قانونی کارروائی اسی لیے نہیں کی میں نے۔''

''غیر قانونی کارروائی تو کی تم نے...... غنی کو ہتھکڑی ڈال کے یہاں تک لائے...... کس جرم میں۔''

وہ کانپنے لگا۔ ''سر...... ان کا منہ بند کرنے کے لیے...... کچھ تو کرنا تھا مجھے...... میں بہت معمولی اہلکار ہوں...... یہاں سب مجھ سے بڑے ہیں۔''

میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''پیسے کتنے لیے تھے کالو سے؟''

وہ اچھلا۔ ''پیسے...... آپ کا مطلب ہے رشوت......

توبہ توبہ...... حرام کبھی نہیں کھایا میں نے...... آخر خدا کو بھی منہ دکھانا ہے۔"

میں نے جیب سے پانچ ہزار نکالے اور ہاتھ میں رکھ لیے۔ "یہ تو بڑی اچھی بات ہے...... میرے پیسے بچ گئے۔"

اس نے لالچی نظروں سے نوٹوں کو دیکھا۔ "اب آپ انعام دیں اگر...... تو ہم انکار کیسے کر سکتے ہیں...... ہمارا کام ایسے ہی چلتا ہے جناب عالی...... تنخواہ تو نہ ہونے کے برابر ہوتی ہے...... اور پھر میرے ساتھ یہ دو کتے ہیں...... ان کا منہ بھی بند رکھنا ضروری ہے...... یہ حرام کھانے کے عادی ہو گئے ہیں۔"

میں نے پانچ ہزار آگے بڑھائے اور واپس کھینچ لیے...... "چلو اسے اپنا انعام سمجھ لو...... لیکن مجھے اس شخص کا نام بتاؤ...... جو کالو کے ساتھ آیا تھا...... مرنے والے کے باپ کا......"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "میں بتا دوں گا...... مگر...... آپ کیوں پوچھ رہے ہیں سر۔"

میں نے کہا۔ "دیکھو...... کسی کو کچھ معلوم نہیں ہوگا...... اس سے دگنی رقم مل سکتی ہے تم کو انعام میں...... اگر تم خاموشی سے اس کو یہاں لے آؤ...... پورے دس ہزار۔"

وہ نفی میں سر ہلانے لگا۔ "وہ نہیں آئے گا جناب۔"

میں نے کہا۔ "بیس ہزار...... تم جانتے ہو وہ کہاں رہتا ہے؟"

اس نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا۔ "مگر میں یہ خطرناک کام نہیں کر سکتا...... رانا صاحب کو پتا چلا تو۔"

"او کے...... تم صرف اس کا نام پتا بتا دو مجھے...... دس ہزار جیب میں ڈالو اور جاؤ...... کانوں کان خبر نہیں ہو گی کسی کو...... ویسے تو غنی کو بھی علم ہوگا۔"

"اسے کچھ پتا نہیں...... صرف یہ بتایا تھا میں نے کہ تمہارے خلاف قتل کا پرچا کاٹا گیا ہے...... وہ شور کرنے لگا کہ میں تو ایک ہفتے سے یہاں موجود ہی نہیں تھا...... مجھے بتاؤ کس نے لگایا ہے یہ الزام...... میں نے بڑی مشکل سے چپ کرایا اسے۔"

"تم نے مارا اسے؟ حوالات میں بند رکھا......؟ وہ بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ ایک ہفتے سے وہ لاہور میں بیرسٹر فاروقی صاحب کے ساتھ تھا۔"

اس نے ہکلا کے کہا۔ "ایک ہفتے سے...... نہیں سر جی...... میں نے دو دن پہلے دیکھا تھا اسے آپ کے ساتھ۔"

میں نے کہا۔ "تھانیدار...... یہ تم کیسے ثابت کرو گے؟ بولو...... اور جب بیرسٹر فاروقی جیسا بڑا وکیل کہے گا کہ یہ سچ ہے تو اسے کیسے جھٹلاؤ گے؟...... تمہارے جرائم بہت سنگین ہیں...... تمہاری پیٹی اترنا تو معمولی بات ہے...... اندر ہو جاؤ گے تم۔"

"سر...... بے شک مجھ سے غلطی ہوئی۔"

میں نے کہا۔ "ابھی آٹھ بجے ہیں...... دس بجے تک وہ بندہ پیش کر دو...... تمہارے خلاف ساری شکایات ختم...... چلو تمہیں یہ رعایت ہے کہ اسے تھانے بلا لو...... غنی کو بھی لے جاؤ...... تفتیش کے لیے تم کسی کو بھی بلا سکتے ہو...... غنی اس سے ایک بات پوچھے گا۔"

"کون سی بات جناب عالی؟"

"اگر تم نے غنی کے سوال کا جواب حاصل کرنے میں اس کی مدد کی اور سچ اگلوا لیا...... تو بیس ہزار تمہارے...... غنی تم کو دیں دے سکتا ہے میری طرف سے...... اس کے بعد تم دونوں کو چھوڑ دو...... تمہارا کام ختم...... اس ساری کارروائی کا کسی کو علم نہیں ہوگا...... بولو منظور ہے۔"

یہ ناممکن تھا کہ وہ اتنی بڑی دولت کو ٹھکرا دیتا۔ یہ سودا میری توقع سے کم میں ہو گیا...... اگر پرانا تھانیدار ہوتا تو شاید مجھے رقم پچاس ہزار تک بڑھانا پڑتی...... میں نے غنی کو ایک طرف بلا کے بیس ہزار دیے اور ساری بات اسے سمجھا دی...... پولیس والے جیسے آئے تھے ویسے ہی غنی کے ساتھ واپس چلے گئے۔

غنی صورت سے احمق اور انداز و اطوار سے ہر وقت سویا سویا کاہل اور کم ہمت نظر آنے والا درحقیقت اس کے برعکس شخصیت رکھتا تھا۔ پہلے پہل میں نے بھی اسے سمجھنے میں غلطی کی تھی...... اس کا ذہن معاملات کو گہرائی تک اور ہر پہلو سے دیکھتا تھا اور سمجھنے کے بعد ایک ایسا حل پیش کرتا تھا جو سب سے بہتر ہوتا تھا۔ سیکورٹی کے معاملے میں اس کے حسن انتظام نے مجھے حیران کر دیا تھا...... وہ پڑھا لکھا نہیں تھا ورنہ کسی ادارے کا بہترین منتظم ہوتا۔ وہ بھروسے کے قابل تھا اور مخلص تھا۔ اس کی انہی صفات نے غنی کی اہمیت میں اضافہ کیا تھا۔

اس کے جانے کے بعد مجھے پھر فریال کا خیال آیا۔ میرا غصہ اب پچھتاوے میں بدل گیا تھا...... میں کچھ دیر اندر باہر ٹہلتا رہا اور سوچتا رہا کہ اسے جا کے منا لوں مگر اس کی باتیں یاد کر کے میرے جذبات کا رخ بدل جاتا تھا...... یہ تبدیلی میرے لیے انتہائی حیرانی اور پریشانی کا سبب تھی...... یہ فریال کی جذباتی کیفیت میں ایک تبدیلی کا پتا بھی دیتی

...... چھ سال تک اس نے انتہائی ناموافق حالات کا [مقا]بلہ کیا تھا اور اس کی وفا کی استقامت میں فرق نہیں آیا...... وہ میرے ساتھ ہر حال میں اور ہر جگہ خوش تھی۔

لیکن آج اس نے کھل کے کہہ دیا تھا کہ وہ ست بدھائی [م]یں میرے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی اور اگر مجھے اس کی خوشی [عزیز] ہے تو میں ست بدھائی کے ترقیاتی منصوبوں کو لپیٹ کر [سرد خ]انے میں ڈالوں اور اپنی ساری دولت سمیٹ کر جدید [شہ]ری پرتعیش زندگی کی طرف لوٹ جاؤں۔

ظاہر ہے عارضی مشکلات سے گھبرا کے فریال کی طرح [سوچ]نا بھی میرے لیے ناممکن تھا۔ ہمارے خیالات کی ہم [آہ]نگی میں نمودار ہونے والی یہ پہلی دراڑ تھی۔ آگے چل کے کیا ہوگا...... کیا یہ دراڑ پھیل کر وہ خلیج بن جائے گی جسے پاٹنا [ہم]ارے اختیار میں نہیں رہے گا؟ ہمارے عہد و پیمان آزمائش کی بھٹی میں حسرتوں کی راکھ بن جائیں گے؟ اگر مجھے اپنے [وط]ن کی مٹی...... ست بدھائی کے لوگوں سے کیے ہوئے [وع]دوں اور اپنے مقاصد یا فریال میں سے ایک کا انتخاب کرنا [پ]ڑے تو میں کیا کروں گا؟ وہی جو فریال چاہتی ہے...... یا وہ جو [م]یں چاہتا ہوں؟ اور اسی طرح اگر فریال کو یقین آ جائے کہ [م]یں اس کی خاطر میں اپنی دنیا چھوڑنے اور اپنے پروگرام سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں تو اس کا فیصلہ کیا ہوگا؟

میں برآمدے میں بے چینی سے ٹہلتا رہا اور کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ ایک بار میں ہمت کر کے فریال کے بیڈروم کی طرف گیا مگر دروازے سے لوٹ آیا۔ فریال کے رویے نے مجھے واقعی مایوس کیا تھا اور بہت تکلیف پہنچائی تھی۔ اچانک تو کچھ بھی نہیں ہوتا...... بقول شاعر...... وقت کرتا ہے پرورش برسوں...... حادثہ ایک دم نہیں ہوتا...... تو فریال کی سوچ میں یہ ایک سو اسی درجے کا فرق رفتہ رفتہ آیا ہوگا...... آج بالآخر دل کی بات زبان پر آ گئی۔

ایک چور ابھی تک میرے دل میں موجود تھا جو مجھے ڈراتا تھا کہ فریال ایسی کبھی نہ تھی۔ وہ بدترین حالات میں عہد وفا نبھانے کی اہل تھی اور اس کی محبت چھ سال سے ہر جان لیوا آزمائش میں سرخرو تھی۔ وہ مرنے سے کبھی نہیں ڈری تو ست بدھائی کے خطرات سے کیوں بھاگے گی...... اصل بات یہ ہے کہ اس نے چھپ کر تمہاری اور راجا کی ساری باتیں سن لی ہیں اسے تمہاری بے وفائی اور ہوس پرستی نے بددل کر دیا ہے۔ اسے تمہارے اور نور جہاں کے مراسم کا پتا چل گیا ہے...... ممکن ہے خود نور جہاں اسے بتا چکی ہو۔

میرا ذہن نور جہاں کے ہاتھوں بلیک میل کیے جانے کے امکانات کو بھی مسترد نہیں کرتا تھا۔ وہ عورت ایسی ہی تھی جو حصول مقصد کی راہ میں حائل تمام رکاوٹیں ہٹانا بھی جائز سمجھتی تھی اور ختم کرنا بھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ اس احساس کے باوجود میرے دل میں نور جہاں کے لیے نفرت نہیں تھی۔ میرا ذہن یہ دلیل دیتا تھا کہ نور جہاں جیسی عورت کچھ بھی کرے...... فریال جیسی عورت کو وفا کی رسم ترک نہیں کرنا چاہیے...... گلی کا کتا اگر کاٹ لے تو یہ اس کی سرشت مگر گھر کا پالتو کتا تو مالک کا وفادار ہی رہتا ہے۔

یہ عجیب دلیل تھی جو میرا ذہن ایک مرد کی حیثیت سے دیتا تھا۔ مردوں کی اس دنیا میں ساتھ نباہنے کے سارے تصورات یکطرفہ ہیں...... عورت کو چاہیے کہ وہ جس سے محبت کرے اس کے ساتھ ہر حال میں خوش رہے۔ وہ چاہے جھونپڑی ہو یا قصر شاہی۔ شوہر جہاں چاہے رکھے۔ رکھی سوکھی کھلائے یا اس کے سامنے خوان نعمت سجا دے...... عورت کا فرض ہے شکر ادا کرنا...... مرد پر کوئی قدغن نہیں...... اس کے لیے کوئی شرط نہیں۔

اس ذہنی کیفیت میں میری ناراضی نور جہاں سے نہیں فریال سے تھی۔ میں اس سے توقع رکھتا تھا کہ وہ مجھ سے کسی خواہش کا اظہار نہ کرے۔ میرے سامنے کوئی مطالبہ نہ رکھے۔ اگر اسے معلوم ہو جائے کہ میرے نور جہاں سے جسمانی مراسم ہیں تو پروین شاکر جیسی شاعرہ کا رویہ اپنائے۔

وہ جہاں بھی گیا لوٹا تو مرے پاس آیا
بس یہی بات ہے اچھی مرے ہرجائی کی

چنانچہ شوہر کوٹھوں پر جاتے رہے۔ داشتائیں پالتے رہے۔ اب سیکریٹری کے نام پر جسے چاہیں ساتھ لیے پھرتے ہیں۔ بیویاں گھر میں خوش اور مطمئن صبر شکر کے ساتھ وفاداری نبھاتی رہیں اور نبھا رہی ہیں...... پھر فریال کو گلہ کیوں...... اسے عائشہ کی مثال سامنے رکھنی چاہیے جو میرے لیے سب کو چھوڑ کے یہاں آ رہی تھی۔ فریال اگر اپنا موازنہ عائشہ سے کرے تو وہی بات ہوگی کہ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ حسب نسب شکل صورت دولتمندی ہر اعتبار سے عائشہ برتر نظر آئے گی۔ میری محبت کے لیے اس کی قربانی کا بھی فریال مقابلہ نہیں کر سکتی۔ وہ تو گھر بار، مذہب اور ملک سب کچھ چھوڑ کے میرے ساتھ ست بدھائی میں رہنے کے لیے تیار تھی۔ دوسری بیوی بننے پر بھی راضی تھی۔

اور پھر نور جہاں...... یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں کبھی اس کا نہیں ہو سکتا اور میرے لیے شوہر سے بے وفائی کرنے میں اس کی جان جائے گی...... وہ میری مدد کر رہی ہے......

میں نے اس سے کوئی وعدہ نہیں کیا۔ اس کو برا سمجھ کے نفرت کا سلوک ہی کیا مگر اس کے جذبات نہیں بدلے...... اس نے صوفی چچا کے معاملے میں مجھے اور میرے خاندان کو پریشانی اور رسوائی سے بچایا اور اب فاروقی کے عزائم سے خبردار کر کے ایک اور احسان کر دیا...... بے شک ابھی اس کی بات سچ ثابت نہیں ہوئی مگر مریم سے فاروقی کی شادی کا ثبوت مل گیا تو باقی بات کی صداقت میں شک کی کون سی گنجائش رہ جائے گی۔

میرے خیالات میں یہ انقلاب بڑا عجیب تھا۔ میں فریال سے ناخوش تھا۔ نور جہاں سے نہیں...... کیونکہ میرے خیال میں فریال نے چھ سال بعد دوٹوک الفاظ میں مجھ پر واضح کر دیا تھا کہ وہ ست بدھائی کے پرمخاصمت ماحول میں میرا ساتھ نہیں دے سکتی جبکہ نور جہاں میرے دشمنوں کے درمیان رہ کے میرا ساتھ دے رہی تھی۔

میں جانتا تھا کہ فریال کتنی توقعات کے ساتھ میری منتظر ہوگی اور اگر میں اسے منانے نہ گیا تو وہ کتنی مایوس اور دل شکستہ محسوس کرے گی مگر میرے خیال میں اپنا اصولی مؤقف واضح کر دینے کے بعد میرے مزید کچھ کہنے کے لیے باقی ہی نہ تھا...... اب گیند فریال کے کورٹ میں تھی کچھ سوچنا تھا اور کوئی فیصلہ کرنا تھا تو اسے۔ میں اسے محبت کے نام پر یہاں کب تک روکے رکھ سکتا تھا۔

جب غنی ایک خمیدہ کمر بوڑھے کے ساتھ نمودار ہوا تو میرے خیالات کا رخ پھر بدل گیا۔ بڈھے کی عمر کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ یہاں سختی حالات ہر شخص کو بڑی تیزی سے زندگی کے سفر کے اختتام کی طرف دھکیلتی تھی۔ غلامی کی ذلت، فاقہ کشی میں پروان چڑھنے والے، بچے اگر زندہ رہتے تو بہت جلد بچپن کی شوخی اور معصومیت کھو دیتے تھے۔ جوان چند برس کی سخت کوشی میں بڑھاپے کی طرف بڑھ جاتے تھے۔ خصوصاً عورتیں جو آغاز شباب سے بہت پہلے ہی بیاہ دی جاتی تھیں اور ان کے حسن و شباب کی رعنائی زوال پذیر چاند کی طرح تیزی سے پُرکشش کھو کے بدصورتی میں ڈھل جاتی تھی۔

بڈھا میرے سامنے آکے اتنا جھکا کہ میرے قدموں میں گر گیا...... میں نے اسے اٹھا کے اپنے سامنے کرسی پر بٹھانا چاہا مگر وہ راضی نہ ہوا...... اس کا نحیف جسم کانپ رہا تھا اور وہ زار و قطار رو رہا تھا۔

مجھے ایک طرف لے جا کے غنی نے کہا۔ ''جناب عالی...... یہ ناجی ہے...... اس گونگے لڑکے کا باپ...... یہ کسی قیمت پر کچھ بتانے کے لیے تیار نہیں......'' تھانیدار نے بڑی سختی سے پوچھا۔

میں نے افسوس سے کہا۔ ''کیا اس بوڑھے کو مارا اس نے؟''

''زیادہ نہیں جناب...... یہ مر جاتا...... دھمکی دی تھی اسے کہ تیرے بڑے بیٹے اور بہو کو اٹھا لائیں گے...... پھر میں نے الگ لے جا کے اس کو سمجھایا تو یہ میرے ساتھ آنے پر راضی ہوا...... لیکن اس نے کہا کہ پہلے وہ اپنے بیٹے سے پوچھے گا...... میں اس کے گھر گیا...... اس کے بیٹے سے اور بہو سے بھی علیحدگی میں بات کی۔ وہ بہت ڈر رہے تھے کہ رانا صاحب کو پتا چل گیا تو سب مارے جائیں گے۔ میں نے بہت تسلی دی کہ کسی کو کچھ معلوم نہیں ہوگا۔ نواب صاحب انعام بھی دیں گے۔ انعام پر وہ کچھ نرم پڑے۔ بیٹے نے پوچھا کہ کتنا انعام ملے گا میں نے ایک ہزار کہا تو بیٹا مان گیا مگر بہو چالاک ثابت ہوئی۔ کہنے لگی پانچ ہزار کا وعدہ کرو تو میں اسے تمہارے ساتھ بھیج دیتی ہوں۔''

''پھر...... تم نے انکار تو نہیں کیا؟''

''نہیں جناب عالی...... میں نے کہا کہ پانچ تو بہت ہیں۔ دو مل جائیں گے...... لڑکے نے کہا کہ ابھی لاؤ مجھے دو...... میرے پاس دو ہی تھے۔''

''میں نے تمہیں بیس ہزار دیے تھے۔''

''وہ تھانیدار نے پہلے رکھوا لیے تھے۔ وہ میرے اپنے پیسے تھے۔ میں نے لڑکے کو دیے تو بیچ میں اس کی گھر والی نے جھپٹ لیے۔ انہوں نے بڈھے سے کہا کہ بابا تم جاؤ غنی کے ساتھ...... کچھ نہیں ہوگا۔ اب آپ پوچھ لیں اس سے جو پوچھنا ہے۔''

میں واپس آکے بڈھے کے سامنے بیٹھ گیا۔

''ناجی...... مجھے تمہارے بیٹے کی موت کا بہت افسوس ہے۔''

اس نے سر اٹھایا تو آنسو اس کی آنکھوں سے چہرے کی جھریوں میں بہہ نکلے۔ ''اللہ نے بھی انصاف چھوڑ دیا؟ جناب عالی...... ہم غریبوں کا کوئی نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''یہ کفر کا کلمہ ہے ناجی...... تمہارے ساتھ انصاف ہوگا۔''

''کب ہوگا جی...... ہمارے باپ دادا مر گئے اسی آس میں...... میرے بے زبان پتر کو مار دیا انہوں نے...... اس کی لاش جانور کھا گئے...... کیا قصور تھا اس کا آخر؟'' وہ آنسو بہاتا رہا۔

میں نے کہا۔ ''تم رانا کی حویلی کے اندر کام کرتے ہو؟''

''ساری عمر کیا ہے جناب۔''

''تمہارا وہ بیٹا بھی وہیں ملازم تھا۔''

''ملازم کیسا جناب...... کھانے کو روٹی مل جاتی تھی۔ بول نہیں سکتا تھا مگر میری مدد کرتا تھا۔''

''وہ پیدائشی گونگا تھا؟''

''نہیں جناب...... ایک صدمے سے ہو گیا تھا۔ اس کی ماں بڑی سوہنی تھی۔ مالکوں کی بات اور ہے...... ہم تو پیدا ہی ان کی خدمت کے لیے ہوئے ہیں ایک دن وہ کنویں سے پانی بھر کے لا رہی تھی۔ کھیتوں میں کوئی چھپا ہوا تھا اس نے نوراں کو روک کے زبردستی کرنے کی کوشش کی۔ نوراں نے اس پر تھوک دیا۔ اور بھاگ آئی۔ اس نے مجھے بتایا۔''

''یہ کتنی پرانی بات ہے؟''

''دس سال ہو گئے جناب میرا بڑا لڑکا چودہ سال کا تھا۔ چھوٹا چار سال کا...... میں کلہاڑی لے کر جانے لگا تو نوراں نے روک لیا کہ دفع کرو کچھ ہوا ہی نہیں تو جان کا خطرہ مول لینے کی کیا ضرورت ہے۔ نوراں کے خیال میں وہ ڈاکو تھے جو رات ہونے کے انتظار میں کھیتوں میں چھپے بیٹھے تھے۔ اس کا خیال بالکل ٹھیک تھا۔ ڈاکوؤں نے آدھی رات کے وقت حملہ کیا۔ باقی تو لوٹ مار میں مصروف رہے وہ جس کے منہ پر نوراں نے تھوکا تھا اسے تلاش کرتا رہا۔ اس نے منہ پر ڈھاٹا باندھ رکھا تھا۔ وہ گھر میں پھر کے چلا گیا۔ ہمارے پاس کیا تھا جو لے جاتا...... بعد میں وہ چار ساتھیوں کے ساتھ آیا۔ انہوں نے مجھے باندھ کے ڈال دیا۔ پھر چاروں نے باری باری نوراں کو بے آبرو کیا۔ میرا بڑا لڑکا اس رات باہر تھا۔ چھوٹا سب دیکھتا رہا۔ روتا رہا اور کہتا رہا کہ میری ماں کو مت مارو...... وہ رو رہی تھی اور منت سماجت کر رہی تھی۔ بچہ یہی سمجھا کہ ماں کو مار رہے ہیں۔ جاتے وقت اس حرامی نے نوراں سے کہا کہ تو نے میرے منہ پر تھوک کے اچھا نہیں کیا تھا...... نوراں نے کہا کہ اب موقع ملے تو میں تیری شکل پر پیشاب کر دوں...... اور پھر اس پر تھوک دیا۔ بس اس کا دماغ خراب ہو گیا اس نے کلہاڑی سے نوراں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے اور چلاتا رہا کہ تو مجھ پر تھوکے گی...... مجھ پر پیشاب کرے گی۔ وہ گالیاں بکتا رہا لیکن پھر اس کے ساتھی اسے کھینچ کر لے گئے۔ اس بچے نے یہ سب دیکھا اور اس کے دماغ پر ایسا اثر ہوا کہ وہ چپ ہو گیا۔ پھر نہیں بولا۔''

اس لرزہ خیز واردات کی تفصیل آج دس سال بعد بھی بوڑھے کو خون کے آنسو رلا رہی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ آج وہ پچاس کا ہوا تو دس سال پہلے چالیس کا ہوگا اور اس کی بیوی تیس کی...... اب معلوم نہیں وہ شوہر کو حسین لگتی تھی یا سچ مچ خوب صورت تھی۔ افسوسناک بات یہ بھی تھی کہ وہ مالکوں کے معاملے میں بالکل مختلف سوچ رکھتا تھا کہ اگر وہ استعمال کرتے ہیں تو یہ ان کا حق ہے۔ اس میں بے آبروئی کا کوئی تصور نہیں وہ غلاموں کی جان و مال عزت آبرو سب لے سکتے ہیں۔

بات مختصر کرنے کے لیے میں نے کہا۔ ''ناجی...... یہ سب جان کے مجھے بہت افسوس ہوا...... تمہارے بیٹے کی جان بلاوجہ گئی۔ وہ تو گونگا تھا۔ کچھ بتا ہی نہیں سکتا تھا۔''

''مالک سمجھتے تھے کہ وہ مکر کرتا ہے۔ بول سکتا ہے مگر بولتا نہیں...... وہ اسی لیے مارا گیا۔''

میں نے کہا۔ ''میں نے تمہیں اسی لیے بلایا ہے کہ تم سے ایک بات پوچھنی تھی۔ تم کو رانا کی حویلی کے اندر ہر جگہ آنے جانے کی آزادی تھی۔''

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''جہاں کام ہو۔''

میں نے کہا۔ ''ذرا سوچ کے بتاؤ...... حویلی میں کوئی ڈاکٹر شہناز لائی گئی تھی؟''

اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ ''نام تو معلوم نہیں جناب...... لیکن ایک عورت ہے اندر...... وہ ضرور ڈاکٹر ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ذرا اس کی شکل صورت اور حلیہ بتاؤ۔''

اس نے ذہن پر زور دے کر جو خیالی تصویر بنائی۔ وہ شہناز کے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتی تھی...... ''کل شام رانا کی دوسری بیوی کی طبیعت خراب ہوئی تھی...... اس کو پہلے الٹیاں ہوئیں...... پھر بخار چڑھا تو اس نے دیکھا تھا اور دوائی بھی لکھ کر دی تھی۔''

''تم اس وقت کہاں تھے؟''

''مجھ سے ملک صاحب نے گھوڑی منگوائی تھی...... وہ روز شام کے وقت آدھے گھنٹے کے لیے سواری کرتے ہیں...... اس وقت کچھ شور ہوا تھا۔ ملک صاحب اندر گئے تھے...... میں ادھر ہی کھڑا رہا گھوڑے کی باگ پکڑے۔ دس منٹ بعد دوسری طرف سے منشی آیا پھر ملک صاحب کی بڑی بیوی اور سب سے چھوٹی والی کے ساتھ ایک شہری لڑکی آئی۔''

میں نے کہا۔ ''ملک کی کتنی بیویاں ہیں؟''

''تین جناب...... تیسری ابھی چھ مہینے پہلے کی ہے۔ وہ بھی شہری ہے اور اس کے ساتھ رہتی ہے۔ جس کو آپ نے کہا ڈاکٹر ہے...... وہ اندر گئی پھر اندر سے ملک ایک کاغذ لے کر باہر آیا اور اس نے منشی کو آواز دے کر کہا کہ فوراً گاڑی لے کر ٹیلہ جوگیاں جائے۔ یہ دوائی لانی ہے۔''

''اور اس کے بعد...... وہ ڈاکٹر کہاں گئی؟''

''مجھے نہیں معلوم...... مجھ سے ملک صاحب نے کہا کہ گھوڑی واپس لے جا آج میں نے نہیں جانا...... میں واپس چلا گیا۔''

میں نے کہا۔ ''یہ جو ملک صاحب کی تیسری بیوی ہے کیا نام ہے اس کا؟''

''نام تو نرگس ہے جی۔''

میں نے کہا۔ ''اسی کے ساتھ رہتی ہے یہ ڈاکٹر؟''

''ہاں جی...... میں نے اس کو وہیں دیکھا ہے لیکن کمرے سے باہر بہت کم آتی ہے وہ۔''

اب میں نے مطلب کی بات کی...... ''دیکھو نا جی...... رانا نے اس ڈاکٹر کو اغوا کیا ہے۔ پہلے ہمیں شک تھا اب تمہاری بات سے تصدیق ہو گئی ہے مجھے یہ بتاؤ کہ اگر ہم اسے نکال کے لانا چاہیں...... تو تم ہماری مدد کرو گے؟''

اس کی حالت غیر ہو گئی۔ ''ہمیں تو معاف کرو جناب۔'' وہ ہاتھ جوڑ کے بولا۔ ''ہم بہت بے بس لوگ ہیں...... غریب اور مجبور ہیں...... رانا کو پتا چل گیا تو ہمیں زندہ دفن کرا دے گا۔''

میں نے کہا۔ ''مدد کا یہ مطلب نہیں کہ تم ہمارا ساتھ دو...... ایک تو تم ہمارا پیغام اس ڈاکٹر تک پہنچا دو۔''

''نہیں جناب...... میں یہ نہیں کر سکتا۔''

''دیکھو...... کسی کو کچھ معلوم نہیں ہوگا...... اگر تم ایک کاغذ چھپا کے اندر لے جاؤ گے تو کون دیکھے گا...... تمہاری تلاشی تو نہیں ہوتی آتے جاتے۔''

''تلاشی تو نہیں ہوتی جناب۔''

میں نے کہا۔ ''اس پیغام کا جواب وہ ڈاکٹر دے گی...... غنی تم سے معلوم کر لے گا۔''

''وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ ''کتنے پیسے دو گے آپ مجھے اس کام کے؟''

میں نے کہا۔ ''تم بتاؤ۔''

''میرے بیٹے نے دو ہزار لیے ہیں...... مگر وہ میری بہو کے ہاتھ میں چلے گئے...... آپ مجھے پانچ ہزار دے دو۔''

لالچ کی چمک اب بڈھے کی آنکھوں میں عیاں تھی۔

میں نے کہا۔ ''میں دس ہزار دوں گا۔''

غنی نے افسوس سے سر ہلایا۔ ''جناب عالی...... پانچ منہ سے مانگ رہا ہے بڈھا۔''

بڈھے نے اسے گھورا۔ ''تیری جیب سے تو نہیں جا رہا ہے کچھ...... تو چپ کر۔''

ان غلام زادوں کے لیے دس ہزار قارون کے خزانے سے کم نہیں ہے وہ اتنی بڑی رقم کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ سارا سال محنت مشقت کے بدلے انہیں مشکل سے اتنا ملتا تھا جو ان کا پیٹ بھرنے اور تن ڈھانپنے کو کافی ہو...... نقد رقم سے وہ سال میں دو چار سو بھی نہیں بچا پاتے تھے۔ جو بچاتے تھے وہ بیماری نہ لے جائے تو چور ڈاکو لے جاتے تھے...... مجھے یقین تھا کہ وہ دس ہزار اپنے پاس چھپا کے رکھنے میں ناکام رہے گا۔ اس کی ہوشیار بہو یہ بھی اس سے چھین لے گی۔

میں لمبا چوڑا خط ارسال نہیں کر سکتا تھا...... ابھی میں پیغام لکھنے کے لیے اٹھا ہی تھا کہ ایک گاڑی اندر آئی...... یہ راجا تھا جو سب کو فاروقی کے گھر پہنچا کے لوٹ آیا تھا...... میں نے مختصراً اسے ساری بات سمجھائی۔ امید کی خوشی سے اس کا چہرہ دمکنے لگا۔

راجا نے کاپی سائز کے ایک صفحے پر شہباز کے نام خط لکھا اس میں یہی تھا کہ ہم نے اس کا سراغ لگا لیا ہے اور وہ فکر نہ کرے...... ہم جلد از جلد اس کو نکال لائیں گے۔ یہ خط ہم نے ایک تعویذ کی صورت میں چھوٹا کر کے بڈھے کے حوالے کیا...... اس وقت نقد رقم کے لیے ہمیں آپس میں چندہ کرنا پڑا...... زیادہ حصے فریال کا رہا۔ بڈھے نے رقم اپنی ڈب میں دبائی اور غنی کے ساتھ واپس چلا گیا۔

شہباز کے بارے میں ملنے والی یہ پہلی اچھی اور یقینی اطلاع تھی۔ قدرتی طور پر اس کا ہم سب کے موڈ پر اچھا اثر ہوا۔ ریشم کے چہرے سے تو خوشی پھوٹی پڑ رہی تھی...... کھانا کچھ دیر سے لگایا گیا۔ میز پر ہم تین ہی تھے عام طور پر کھانے کے وقت آٹھ افراد ایک ساتھ ہوتے تھے اور ریشم سرو کرتی تھی مگر آج ہم نے اسے بھی ساتھ ہی بٹھا لیا مگر غنی کے آنے تک اس نے کسی روایتی بیوی کی طرح کھانا شروع نہیں کیا۔

فریال نے اپنا موڈ ٹھیک کر لیا تھا مگر وہ مجھ سے نظر چرا رہی تھی...... راجا تھکا ہوا تھا لیکن شہباز کی خیریت کی خبر نے اس کی ساری تھکان دور کر دی تھی...... اب اگلا غور طلب سوال یہ تھا کہ شہباز کو رانا کی حویلی سے نکالا کیسے جائے۔

ریشم نے اپنی عاقلانہ رائے دی۔ ''صاحب جی...... دس نو پرابلم...... یو گو ود تھانیدار...... چھاپا ہاف نائٹ سیکرٹ...... رانا سلیپ...... ڈو نو تھنگ...... ڈاکٹر صاحب برآمد۔''

اس کی بات کا مطلب یہ تھا کہ آدھی رات کو راز داری سے اچانک چھاپہ مارا جائے تو رانا کچھ بھی نہیں کر سکے گا اور

شہباز کو برآمد کر لیا جائے گا۔

میں نے کہا۔ ''کاش یہ اتنا ہی آسان ہوتا ریشم...... پولیس اتنی ہی مستعد اور فرض شناس ہوتی۔''

راجا نے میری تائید میں سر ہلایا۔ ''پولیس کی مدد کا تو خیال ہی بے کار ہے...... اگر میں اعلیٰ ترین سطح پر وزیر داخلہ یا براہ راست سیکریٹری داخلہ سے بھی احکامات لے آؤں آئی جی صاحب بنفس نفیس خود رانا کی حویلی میں تلاشی کی کارروائی مکمل راز داری سے کریں تب بھی اس کا نقصان شہباز کو ہوگا۔''

میں نے کہا۔ ''ہاں...... رانا صوبائی اسمبلی کا رکن ہے اس کے آبائی گھر کی خانہ تلاشی ایک سیاسی مسئلہ بن جائے گی...... وہ کسی عام شہری کا گھر نہیں ہے کہ چادر اور چار دیواری کے سارے اصول اور قانون پامال کرتی پولیس اندر گھس جائے اور جسے چاہے اٹھا لائے...... کارروائی کا آغاز ہونے سے پہلے ہی خبر رانا صاحب کے کانوں تک پہنچ جائے گی...... پھر وہ شہباز کو نہ جانے کہاں پہنچا دے۔''

راجا نے کہا۔ ''کیا ہم خود کمانڈو ایکشن نہیں کر سکتے؟''

میں نے کہا۔ ''کیا کمانڈوز کرائے پر ملتے ہیں؟ ہم پچاس بندے مسلح ہو کے حویلی پر حملہ کر دیں تب بھی کچھ نہیں ہوگا...... دو چار مقابلے میں مارے جائیں گے...... رانا کے محافظ بھی خالی ہاتھ نہیں کھڑے ہیں اور وہ قلعہ بند ہوں گے...... ہاں بکتر بند گاڑی یا ٹینک ہو تو یہ کام ہو سکتا ہے۔''

ہم نے دل لگی میں بہت سے فلمی ایڈونچرز کا آئیڈیا ڈسکس کیا لیکن حقیقی زندگی میں ایسا سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ ہیرو تلوار لہراتا جائے...... راہ میں حائل ہونے والے ہر پہرے دار کی گردن اڑاتا سیدھا اس زندان تک پہنچے جہاں ہیروئن آہنی سلاخوں والے مقفل دروازے کے پیچھے پابہ زنجیر کھڑی ہے...... تلوار کے وار سے ہر محافظ کو جہنم رسید کرے۔ ایک وار میں قفل اور زنجیر کو گاجر مولی کی طرح کاٹ دے...... ہیروئن کو رہائی دلائے اور وہ گانا گاتے لوٹ آئیں۔

طاقت کے بل پر شہباز کو نکالنے کی ہر کوشش کا انجام خود شہباز کے حق میں برا ہو سکتا تھا۔ رانا کو ابھی تک اطمینان تھا کہ شہباز کے حویلی کے اندر ہونے کی باہر کسی کو خبر نہیں اور اس کی تلاش میں ہم ادھر ادھر ٹامک ٹوئیاں مارتے پھر رہے تھے...... شہباز کی سلامتی کے لیے ضروری تھا کہ رانا کی یہ غلط فہمی قائم رہے۔

فریال نے کچھ دیر بعد سر کے درد کا بہانہ کیا اور اٹھ گئی۔

''میں سونا چاہتی ہوں۔''

ریشم کو ڈاکٹر صاحب کی معاون خصوصی کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیتے اتنا عرصہ ہو گیا تھا کہ اسے عام امراض کے علاج کی تھوڑی بہت شدھ بدھ ہو گئی تھی...... قاضی جی کے گھر کے چوہے بھی سیانے مشہور ہیں...... کچھ یہ حقیقت بھی ہے...... ڈاکٹروں کے تجربہ کار کمپاؤنڈر اپنی پریکٹس شروع کر دیتے ہیں اور عام امراض کی دوا خود کیمسٹ بھی دے دیتے ہیں...... نیم حکیم کی شہرت ریشم بھی حاصل کر چکی تھی۔ ایک دو بار فریال نے اسے بخار، سر اور پیٹ کے درد کی گولی دیتے پکڑا تو بہت ڈانٹا تھا لیکن ریشم اتنی آسانی سے حوصلہ ہارنے والی لڑکی نہیں تھی...... وہ جتنی لگن سے انگریزی بولنا سیکھ رہی تھی اتنی ہی کوشش دواؤں کے بارے میں بنیادی معلومات حاصل کرنے کے لیے کر رہی تھی...... مجھے لگتا تھا کہ کبھی نہ کبھی وہ کسی گاؤں دیہات میں اپنا کلینک کھول کے پریکٹس شروع کر دے گی اور باقاعدہ ڈاکٹر بن جائے گی...... ایسے اتائی تو شہروں میں بھی بہت ہیں جو کسی سند یا ڈگری کے بغیر کامیاب ڈاکٹر بنے بیٹھے ہیں...... ان کے اعجاز مسیحائی کی شہرت پر مریض جوق در جوق آتے ہیں...... بعض اوقات تو کہیں قریب ہی کوئی ایم بی بی ایس ڈاکٹر مکھیاں مارتا اور اپنا سر پیٹتا نظر آتا ہے۔

اس وقت بھی ریشم نے فوراً کہا۔ ''بی بی جی...... میں گولی دوں؟''

فریال نے غصے سے کہا۔ ''مجھے ابھی مرنا نہیں ہے...... خبردار جو مجھ پر ڈاکٹری چلائی۔''

ریشم ذرا متاثر نہیں ہوئی۔ ''یو ٹیک تشریف سر دبا دوں۔''

میں نے کہا۔ ''مس سلک...... یو ٹیک تشریف کچن۔''

اس نے باقی جملہ خود مکمل کیا...... ''لیس سر...... آئی کافی میک...... یو گارڈن گو آئی فائیو منٹ ٹیک۔''

ریشم کی بغیر گرامر والی انگلش کا مطلب سمجھتے ہوئے ہم برآمدے میں جا بیٹھے...... باغ میں ان دنوں مچھروں کے ساتھ ان سے بھی چھوٹے اڑنے والے کیڑوں مکوڑوں نے یلغار کر رکھی تھی...... مالی کا کہنا تھا کہ اس موسم میں یہ ہوتا ہے لیکن ہم نے اسے تاکید کی تھی کہ وہ روز باقاعدگی سے اسپرے کرے...... وہ اس وقت یہی کارروائی کر رہا تھا۔

راجا نے بیٹھتے ہی کہا۔ ''تیری کوئی جنگ عظیم ہوئی ہے فریال سے؟''

''ہاں...... بہت دن ہو گئے تھے۔'' میں نے تسلیم کیا۔

''تو نے ان افواہوں کی تصدیق کی؟ بلبل کے آشیانے پر کوے کے غاصبانہ قبضے کی۔''

''اس کا موقع کہاں ملا...... ہم پہنچے تو بغیر اطلاع کے تھے لیکن فاروقی اس وقت آفس میں تھا...... اسے ہماری آمد کا پتا نہ چلتا تو عین ممکن تھا کہ وہ مریم کے ساتھ ہی لوٹتا...... مگر لیلیٰ بھالی نے خود اسے اطلاع دے دی...... یہ بھی بتا دیا کہ وہ اکیلی نہیں آئی ہے۔''

''تو نے اپنی جاسوس ناک سے کچھ نہیں سونگھا...... اپنی سراغ رساں کی نظر سے کچھ نہیں دیکھا۔''

''مجھے واپس آنے کی جلدی نہ ہوتی تو شاید کوشش کرتا...... مگر یہ بات ایسی نہیں ہے کہ چھپی رہے۔''

غنی نے گاڑی لا کے اندر کھڑی کی اور سیدھا ہماری طرف آیا۔''ناجی نے کہا ہے کہ ڈاکٹر صاحب تو خود بھی ہمارے بارے میں بتانے کی کوشش کرے گا اور کل صبح سویرے ہی رقعہ پہنچا دے گا...... مالک سب دیر سے سو کے اٹھتے ہیں...... حویلی کے ملازم اپنے اپنے کام سے لگ جاتے ہیں۔''

''اور جواب کب لائے گا؟''راجا کی بے چینی بڑھ گئی۔

''کہہ رہا تھا صبح کسی بہانے سے نکلنے کی کوشش کروں گا...... خود نہیں آؤں گا...... اپنی بہو کو بھیج دوں گا۔''

میں نے کہا۔''اس کا بیٹا کیا کرتا ہے...... باپ کے ساتھ نہیں جاتا؟''

''جب چھوٹا تھا تو جاتا تھا...... پھر دیکھا کہ اندر کیا ہوتا ہے...... خود ہی شرارتی تھا...... اس کی وجہ سے باپ کو جوتے پڑے...... پھر خود بھی پٹا تو بھاگ آیا...... گھر سے ہی بھاگ گیا تھا...... آج کل موچی کا کام کرتا ہے رہتا وہیں ہے...... اس کی بیوی بہت تیز ہے...... سب جانتے ہیں کہ بڈھے کو مارتی ہے اور بیٹا اگر باپ کی حمایت کرے تو اسے بھی۔''

''اور وہ مار کھا لیتا ہے بیوی سے؟''

''ہوتے ہیں جی ایسے...... شوہر بھی آپ دیکھنا بڈھا جو پانچ ہزار لے کر گیا ہے...... وہ قبضے میں کر لے گی...... بڈھے کے بس کی بات نہیں اتنی دولت کو چھپانا...... اس کے بعد وہ خود آ جائے گی اپنی خدمات پیش کرنے...... لالچی......''

راجا نے کہا۔''یار ہمیں تو اپنے کام سے غرض ہے۔''

میں نے کہا۔''راجا...... آج تیسرا دن ہے...... ابھی تک شہناز کی رہائی کی کوئی شرط پیش نہیں کی گئی...... کسی نے کوئی مطالبہ نہیں کیا۔''

''مطالبہ واضح ہے...... اس علاقے میں مفت علاج کی سہولت فراہم کر کے لوگوں کی ہمدردیاں اور وفاداریاں حاصل کرنے کی کوشش مت کرو...... غریب، لاوارث لوگوں کو غریب لاوارث ہی رہنے دو...... اسپتال اور اسکول وغیرہ سے عوامی حمایت حاصل کرنے کا چکر مت چلاؤ۔''

''اس کے لیے ایک شہناز کو اٹھا لے جانے سے کیا ہو گا؟''

''ہم دہشت زدہ ہو جائیں گے...... ممکن ہے اس کے بعد فریال کو اٹھا لیا جائے...... ہمارا خدمت خلق کا سارا جذبہ سرد پڑ جائے گا...... اکیلا آدمی بن سکتا ہے مجاہد اعظم...... اپنی جان و مال کی پروا نہیں کرتا...... مگر اس کی کمزوری بن جاتے ہیں بیوی، بچے...... خون کے رشتے۔''

''کیا رانا ایسی کمزوری سے مبرا ہے؟''

''نہیں...... مگر ہم وہ سب نہیں کر سکتے جو رانا کر سکتا ہے۔''راجا بولا۔

''کیوں نہیں کر سکتے؟''میں نے کہا۔

''اس لیے کہ ہم پڑھے لکھے شریف اور مہذب کہلاتے ہیں۔''

میں نے کہا۔''یہ تو رانا ہمیں مجبور کر رہا ہے کہ ہم بھی بدمعاش، غیر مہذب اور وحشی بن جائیں...... کیا کریں گے ہم شرافت کی اس سند کو اگر اسے ہماری کمزوری بنا لیا گیا۔''

''کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔''راجا بے خیالی میں بولا۔

''یار جب قانون بے بس ہے اور ہماری مدد نہیں کر سکتا تو پھر ہم کیا صرف تھانوں میں رپورٹیں لکھواتے رہیں؟ بے مقصد...... افسران بالا کو فون کرتے رہیں اور اخباروں میں خبریں چھپواتے رہیں؟ وہ حویلی میں بیٹھ کے مونچھوں کو تاؤ دیتا رہے اور مسکراتا رہے ہماری شرافت پر...... ویسے تو شرافت کا شریفانہ نام بزدلی اور مجبوری بھی سمجھا جاتا ہے...... مگر ایک غیر مہذب خطاب بھی ملتا ہے ایسی شرافت دکھانے والوں کو...... جو گالی ہے۔''

میں نے کہا۔''کیا ہم وہی ہیں؟''

''ہم ہرگز وہ نہیں ہیں...... یہ ہماری عزت پر حملہ ہے...... یہاں کے بے بس کمزور اور مجبور و محکوم لوگ اس کے عادی ہیں کہ ان کی بہو بیٹیاں اٹھالی جائیں...... کوئی رانا کے گھر کی عورت اٹھا کے دیکھے...... اس کی غیرت کا طوفان خون کی ندیاں بہا دے گا۔''

''یعنی جوابی کارروائی کرتے ہوئے ہمیں اس کے گھر کی کسی عورت کو اٹھا لینا چاہیے...... یہی کہہ رہا ہے تو؟''میں

نے کہا۔

''بالکل یہی کہہ رہا ہوں میں..... ہم کل تک دیکھتے ہیں..... شہناز کی طرف سے کیا جواب ملتا ہے..... ممکن ہے رانا کی طرف سے کوئی پیغام مل جائے کہ بیٹھ کے بات کرلو..... ڈاکٹر شہناز کو سمجھانے کی کوشش کی گئی تھی کہ خدمت خلق سے لیکن نہ وہ باز آئی اور نہ تم سمجھے..... عقلمند کو اشارہ کافی ہوتا ہے..... تمہیں اسے آخری وارننگ سمجھ لو اور چاہو تو مزید خرابی سے بچنے کے لیے اپنی حدود میں رہنے کا وعدہ کرلو۔''

میں نے کہا۔ ''وہ خون خرابے کو دعوت دے رہا ہے۔''

''ہم نے یہ دعوت قبول نہ کی تو یہاں رہنا مشکل ہو جائے گا..... کم سے کم ایک بار اسے یہ احساس دلانا ضروری ہے کہ ہم بھی مرنے مارنے کے لیے تیار ہیں اور مقابلہ برابر ہے چنانچہ نقصان بھی برابر کا ہوگا۔''

میں نے کہا۔ ''یہ احساس ہم کیسے دلا سکتے ہیں؟''

راجا نے کہا۔ ''شامی بادشاہ کی مدد سے۔''

''لیکن وہ ہے کہاں؟ ہم نے اسے پیغام بھیجا تھا..... معلوم نہیں اسے ملا یا نہیں؟''

راجا نے کہا۔ ''ابھی جب میں واپس آرہا تھا تو مجھے پل سے پہلے والے موڑ پر وہ پاگل مجذوب نظر آیا جس کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ بیک وقت پولیس کا مخبر بھی ہے اور شامی کا پیغام بر بھی۔ میں نے گاڑی روک کے اسے بلایا اور اس سے پوچھا کہ اس نے شامی بادشاہ کو نواب صاحب کا پیغام پہنچا دیا تھا یا نہیں..... وہ دیوانگی کا ڈراما کرنے لگا..... کہنے لگا کون نواب..... ہم سب سے بڑے نواب ہیں..... ادھر کا پیغام ادھر..... نیچے کا پیغام اوپر..... سب ہماری ذمے داری ہے..... تو کیا سمجھتا ہے ہمیں؟ ہم غلام ہیں کسی شامی بادشاہ کے..... ہم سب سے بڑے بادشاہ ہیں..... سب سے بڑے غلام ہیں..... پھر نعرے لگاتا چلا گیا۔''

میں نے کہا۔ ''یار میں تو اس کا مطلب یہی نکال سکتا ہوں کہ پیغام پہنچ گیا۔''

''میں بھی یہی سمجھا..... لیکن شامی بادشاہ خود کیوں نہیں آیا جواب میں..... جیسے کہ ہمیشہ ہوتا ہے۔'' راجا بولا۔

میں نے کہا۔ ''اگر وہ آجائے تو اس سے مدد کی درخواست کی جاسکتی ہے۔''

''ہاں..... پھر ہم کسی طرح شہناز کو نکال لائیں..... مائنڈ وا یکشن ہی اس مسئلے کا حل ہے..... بے شک اس میں رسک بھی بہت ہے لیکن پلان کر کے حملہ کیا جائے تو نقصانات کم سے کم کیے جاسکتے ہیں۔'' راجا بولا۔

''ایسی پلاننگ تو شامی بادشاہ ہی کرسکتا ہے۔'' میں نے کہا۔

بہت سے اتفاقات ایسے ہوتے ہیں جن کی کوئی وضاحت ممکن نہیں ہوتی..... خوش بختی کے بارے میں یہ کہنا پڑتا ہے کہ اللہ کا کرم..... اس نے ہماری سنی..... برا وقت آئے تو کہا جاتا ہے کہ شامت اعمال..... اپنے کیے کی سزا..... ہمیں بھی کہنا پڑا کہ شاید ہماری ایک خواہش کو بھی خدا نے دعا کا درجہ دیا اور قبول کرلیا......

صبح ہنوز بہت دور تھی..... ابھی میں سونے کی کوشش ناکام میں کروٹیں بدل رہا تھا کہ باہر سے گیٹ کے کھولے جانے کی آواز سنائی دی..... میں باہر نکلا تو چار تاریک سائے سے اندر داخل ہوئے تھے..... کالے کپڑوں میں سر سے پیر تک کالی چادروں میں خود کو چھپائے وہ چاروں آگے بڑھتے آرہے تھے..... میرے دل نے خوشی سے نعرہ لگایا..... شامی بادشاہ۔''

شامی بادشاہ نے چادر الگ کی اور ہم پرانے بچھڑے ہوئے دوستوں کی طرح بغل گیر ہوئے۔ ''مجھے تمہارا پیغام مل گیا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''ابھی کچھ دیر پہلے ہم تمہیں یاد کر رہے تھے۔''

شامی نے مجھ سے گلے مل کے کہا۔ ''مجھے آنے میں کچھ دیر ہوگئی..... ایک اور معاملے میں الجھا ہوا تھا..... اور ہم اس علاقے سے دور تھے..... تم بتاؤ سب خیر خیریت ہے..... کیوں یاد کیا تھا ہمیں؟''

میں نے کہا۔ ''آؤ اندر آؤ..... پہلے کچھ کھا پی لو..... آرام کرلو پھر باتیں بھی کریں گے۔''

اندر آکر انہوں نے چادریں اتاریں اور صوفوں پر گر گئے..... وہ سخت تھکے ہوئے تھے اور ایسا لگتا تھا کہ لمبا سفر کر کے آئے ہیں..... میں نے ریشم کو جگایا اور اسے مہمانوں کے لیے چائے ناشتے کا انتظام کرنے کے لیے کہا۔

میں واپس مہمان خانے میں آیا تو وہ سب جوتے بھی اتار چکے تھے..... میں نے کہا۔ ''شامی..... کہاں سے آرہے ہو؟''

''مت پوچھو نواب صاحب..... تمہارا پیغام ملا تو ہم شہداد پور میں تھے۔ وہاں سے چلے تو حالات اچھے نہیں تھے۔ ہم نہ بس سے سفر کرسکتے تھے اور نہ ٹرین سے..... سڑک بھی استعمال نہیں کرسکتے تھے۔''

میں نے کہا۔ ''پھر ہوائی جہاز سے آئے..... یا بحری

جہاز سے؟''

شامی مسکرایا۔ ''کبھی ہمارے ساتھ چلو دوست..... پھر اندازہ ہوگا کہ سفر کے اور کتنے طریقے ہیں..... جب موت گھات میں ہو تو رات کا اندھیرا بھی دشمن محسوس ہوتا ہے..... اپنے سائے سے اور اپنے قدموں کی چاپ سے بھی ڈر لگتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ایسی کیا بات ہوگئی تھی؟''

''ایسی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔ اپنی تو زندگی ایسی ہی ہے..... زندگی اور موت کی آنکھ مچولی..... جب تک اللہ کو منظور ہوگا ایسے ہی گزرے گی..... تم کو فرصت میں سنائیں گے..... کہانیاں بہت ہیں نواب صاحب۔''

میں نے کہا۔ ''پھر تم نے نواب صاحب کہا...... دوست اچھا لگتا ہے تمہارے منہ سے۔''

وہ بولا۔ ''اچھا دوست..... میرے یہ تین ساتھی بھی بہت بھوکے ہیں..... یہ کھا پی کے آرام کریں گے..... کوئی ایسی جگہ ہو جہاں کسی کو ان کی یہاں موجودگی کا پتا نہ چلے...... ابھی گیٹ پر موجود ایک گارڈ کے سوا ہمیں اور کسی نے نہیں دیکھا۔''

میں نے کہا۔ ''تم فکر مت کرو..... کسی کو کچھ معلوم نہیں ہوگا۔ ویسے یہاں نمک حرام کوئی نہیں ہے۔''

وہ درشتی سے بولا۔ ''ہم کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتے دوست..... کچھ پتا نہیں ہوتا کب کس کے خون میں وفا اور آنکھ میں حیا نہ رہے۔''

شامی بادشاہ کے ساتھ آنے والے تینوں ساتھی بھی تقریباً اسی کی عمر کے تھے۔ فرق صرف ان کے قد و قامت میں تھا۔ دیکھنے میں وہ عام انسانوں جیسے ہی لگتے تھے۔ ڈاکو کے نام کے ساتھ جو سفا کی اور وحشیانہ اطوار منسوب ہیں وہ کسی میں نظر نہ آتے تھے۔

ان میں سے ایک دراز قد گورا چٹا ہیرو ٹائپ تھا جس کی ہلکی ہلکی مونچھیں بڑی نفاست سے ترشی ہوئی تھیں اور اس کے لبوں پر ایک بڑی دوستانہ قسم کی ہلکی سی مسکراہٹ پھیلی دکھائی دیتی تھی، دوسرا اس کے برعکس بھاری بدن اور درمیانے قد کا سیاہ رو شخص تھا جس کے بال چھوٹے چھوٹے اور سخت تھے۔ اس کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے عاری نظر آتا تھا اور جس کی آنکھیں ہر دم متحرک رہتی تھیں۔ جیسے وہ ہر وقت ہر سمت میں اچانک نازل ہونے والے کسی نامعلوم خطرے کی طرف سے چوکنا رہنا چاہتا ہے، تیسرا دبلا پتلا اور اپنے خیالوں میں کھویا کھویا گم سم سا شخص تھا جس کی آنکھیں کسی گہری سوچ میں گم نظر آتی تھیں۔

شامی بادشاہ نے ماحول کی اجنبیت کو دور کرنے لیے ان سب کو مخاطب کیا۔ ''چلو بھئی سجنو..... ایزی ہو جاؤ..... یہ بندہ ویسے تو خود کو نواب کہتا ہے۔''

میں نے احتجاج کیا۔ ''یہ خطاب دوسروں نے مجھے زبردستی دیا ہے۔''

شامی بادشاہ مسکرایا..... ''بہنا یار ٹھیک کہتا ہے۔ اس کے مزاج میں کوئی نوابی نہیں۔ اب تم دیکھ لو۔ کوئی لگتا ہے اس کے چہرے سے کہ یہ سات سال ولایت میں بھاڑ جھونک کے آیا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''شامی یار میری ڈگریوں کی توہین تو مت کرو۔''

وہ بولا..... ''اتنی بڑی بڑی ڈگریاں لے کر بھاڑ ہی جھونک رہے ہو نا یہاں..... جیسے ہم ایم ایس سی کی ڈگری لے کر یہ کام کر رہے ہیں۔''

میں نے کہا..... ''اپنے ان ساتھیوں کا تعارف تو کراؤ۔''

شامی نے کہا۔ ''یہ جو ہیرو نظر آتا ہے یہ مجیدا ہے۔ باپ نے تو نام رکھا تھا عبدالمجید..... یہ بی اے پاس ہے۔ فلموں میں جانے کا اسے بڑا شوق تھا۔ اپنا فلمی نام اس نے گلفام رکھا تھا۔ کیونکہ ماں اسے شہزادہ گلفام کہتی تھی۔ فلموں کے بجائے یہ پہنچ گیا ہمارے پاس۔''

مجیدا اسی طرح زیر لب مسکراتا رہا۔

''اور یہ دوسرا ہے گینڈا..... ایک ٹکر مار۔ یہ تو گینڈے کو الٹ دے۔ سر کی ٹکر سے دروازہ توڑ دیتا ہے۔ مگر اس کے سر میں پتھر نہیں ہیں۔ عقل ہی ہے۔ اور یہ ہٹلر پروفیسر کہلاتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''دوسرے ساتھی کا اصل نام بتانا تم بھول گئے۔''

''ہاں..... گینڈے کا اصل نام ارمان مسیح ہے۔ ہم سب موقع ملنے پر بھی جمعے کی نماز تک چھوڑ دیتے ہیں۔ یہ اتوار کو چرچ جانے کی کوشش ضرور کرتا ہے۔ اور یہ ہٹلر..... نام تو اس کا ارمان علی ہے ہم اسے پروفیسر کہتے ہیں۔ یہ ہر وقت سوچتا رہتا ہے۔ ایسے معاملات اور مسائل پر جن کا ہماری زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے۔ کہتا ہے یہ تمہارا کام ہے تم کرو۔ آج کل جس ایک سوال کا جواب تلاش کر رہا ہے یہ ہے کہ زمین تو مانا گول ہے۔ کیا اس کے

اوپر آسمان بھی گول ہے یا آسمان سیدھا ہے۔ اور زمین اس کے نیچے یوں ہے جیسے بے کے نیچے نقطہ اور جو اوپر کے چھ آسمان ہیں وہ ایک دوسرے سے کتنی دور ہیں۔ نیلے آسمان کے اوپر والا آسمان کس رنگ کا ہے۔ کیا سات آسمان بھی روشنی کے ساتھ رنگوں والے ہو سکتے ہیں۔''

پروفیسر نے متانت سے کہا۔ ''دماغ انسان کو سوچنے کے لیے ہی دیا گیا ہے۔''

جب ریشم چائے کے ساتھ کھانے کا سامان لے کر آئی تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ سب کتنے بھوکے ہیں۔ انہوں نے چادریں اتار دیں اور نیچے چھپا ہوا خطرناک خودکار اسلحہ ایک طرف رکھ دیا۔ ان کی آنکھوں میں بھوک چمک اٹھی اور وہ کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ ان کے ساتھ شامی بادشاہ بھی شامل تھا۔ ذرا سی دیر میں انہوں نے سب صاف کر دیا۔

شامی نے کچھ توقف سے اعتراف کیا۔ ''یار بھوک سے سب کی حالت پتلی تھی۔ پیٹ بھر کھانا ہم نے پرسوں رات کھایا تھا۔ اس کے بعد کچھ نہیں ملا۔''

میں نے حیرانی سے کہا۔ ''ملا کیوں نہیں۔''

''بس تھی کچھ ایسی مجبوری کہ کھانے سے زیادہ جان بچانے کا سوچا۔'' وہ بولا۔ ''آبادی سے دور رہے اور کہیں رکنے کا رسک نہیں لیا۔''

ریشم یہ بات سننے سے پہلے ہی سمجھ گئی تھی کہ مہمان آدمی رات کے بعد بھی معمولی خاطر مدارت سے مطمئن ہونے والے نہیں ہیں۔ اس نے وہ سب حاضر کر دیا جو موجود تھا۔ پھر وہ خود پراٹھے پکانے میں لگ گئی اور ایک وقت ایسا آیا جب نیت تو نہیں بھری مگر ان کے پیٹ بھر گئے تو انہوں نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

شامی بادشاہ نے تعریفی انداز میں کہا۔ ''بھئی یہ بجلی سے چلنے والی لڑکی تو ہمیں دے دو۔ کہاں سے مل گئی تمہیں؟''

میں نے کہا۔ ''سوری یار...... یہ ایک ہی پیس ہے اور تمہیں دے دیتا لیکن ایک پرابلم ہے اس کے ساتھ...... یہ ہر وقت انگریزی بولتی ہے۔''

''پھر کیا ہوا...... ہم کون سے ان پڑھ لوگ ہیں۔''

میں نے کہا...... ''یہ خود ان پڑھ ہے۔ جو انگریزی بولتی ہے وہ کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا۔''

ریشم شرما کے کھنکنے لگی۔ ''سر یو جوک...... مائی انگلش ویری گڈ...... سون آئی ڈو میٹرک اینڈ بی اے، ایم اے۔''

وہ سب ہنستے ہنستے بے حال ہو گئے مگر یہ ریشم کا کمال تھا کہ وہ کسی کے مذاق سے شرمندہ ہوتی تھی اور نہ انگلش بولنا چھوڑتی تھی۔

شامی بادشاہ نے کہا۔ ''اگر یہ ہمارے ساتھ ہوتی تو ہم اس کا نام مرجینا رکھتے۔''

میں حیران رہ گیا جب جاتے جاتے ریشم نے کہا۔ ''چالیس چوروں کی کہانی میں ایک علی بابا بھی تھا۔ وہ کون ہے شامی بادشاہ......''

شامی بادشاہ نے اپنی جھینپ مٹانے کے لیے کہا۔ ''دوست...... یہ تو اردو بھی بول لیتی ہے۔ تو اب مذاق کا وقت نہیں۔ میرے ان دوستوں کے لیے سونے کا بندوبست کرو۔ اس سے زیادہ ضروری یہ ہوگا کہ حویلی میں کسی کو بھی ان کی موجودگی کی خبر نہ ہو۔''

میں نے کہا۔ ''اس کی بالکل فکر مت کرو۔ یہاں تہ خانے ہیں اور خفیہ کمرے ہیں جہاں پرندہ پر نہیں مار سکتا۔''

میں نے غنی کو بلا کے تینوں مہمانوں کو اس کے حوالے کیا۔ اور اسے تفصیل سے رازداری۔ کی اہمیت سمجھا دی۔ اس نے کہا'' میں انہیں اوپر والے کسی کمرے میں لے جاتا ہوں۔ لیکن اس وقت صفائی نہیں ہو سکتی۔''

شامی نے کہا۔ ''او یار یہ ٹوٹی قبروں میں سوئے تھے کل رات۔''

میں نے کہا۔ ''ابھی تک تمہارے علاوہ ریشم کو مہمانوں کی آمد کی خبر ہے یا پھر گیٹ پر گارڈ کو...... کسی چوتھے شخص کو معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ رات کو یہاں کوئی آیا تھا۔''

''نہیں معلوم ہوگا سر......'' غنی نے مجھے یقین دلایا اور تینوں مہمانوں کو اپنے ساتھ لے گیا جو ان انتظامات سے پوری طرح مطمئن ہونے کے باوجود کچھ تذبذب کا شکار تھے۔

ان کے جانے کے بعد میں نے پوچھا۔ ''شامی اتنا پریشان میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔''

وہ بولا۔ ''بس دوست...... حالات کبھی ایک سے تو نہیں رہتے۔''

میں نے کہا۔ ''پھر بھی...... ایسی کیا بات ہو گئی۔''

''بات کچھ نہیں...... ہم نے ایک بندہ خریدا تھا۔ پورا ایک کروڑ دے کر۔''

میں نے کہا۔ ''اتنے قیمتی بندے کسی بازار میں ملتے ہیں؟''

وہ بولا۔ ''ہماری مارکیٹ بہت بڑی ہے۔ ملک کے ایک گوشے سے دوسرے کنارے تک پھیلی ہوئی ہے۔ یوں

سمجھ لو۔ جیسے کارخانے سے تجارتی مرکز پورے ملک میں ہیں مگر اسٹاک ایکسچینج تین ہی شہروں میں ہیں...... کراچی، لاہور اور پنڈی...... اصل تو کراچی ہے۔ ایسے ہی بندہ کہیں سے بھی آ جاتا ہے مگر سودا ہوتا ہے دو جگہ۔ ایک غیر علاقے ہیں...... ایک سندھ میں۔ یہ ایک صنعت کار کا بھائی تھا۔ فیصل آباد سے اٹھایا گیا۔ جمرود کے راستے خیبر ایجنسی میں گیا۔ وہاں سے شبداد پور لایا گیا۔''

میں حیرانی سے سنتا رہا۔ ''اٹھانے والے کون تھے۔''

''وہ ادھر کے آپریٹر تھے۔ انہوں نے دس لاکھ لیے۔ بندے کو غیر علاقے کے آڑھتی نے آگے پہنچایا پاس میں...... ان سے ہم نے خرید لیا ایک کروڑ میں۔ آگے بات چل رہی تھی دو کروڑ کی۔ اور اس صنعت کار کے لیے بھائی کے بدلے دو کروڑ دینا کوئی مشکل نہیں تھا مگر گڑبڑ ہو گئی۔

وہ جوان آدمی تھا۔ لیکن نازو نعم میں پلا ہوا۔ بیس دن قید میں رہا تو بگڑ گیا ہر جگہ اسے آرام سے رکھا گیا مگر قید تو قید ہوتی ہے۔ مسلح پہرا تھا اور مسلسل دھمکی کے گڑبڑ کی کوشش کی تو لاش کا پتا نہیں ملے گا۔ کئی بار اسے رات کے وقت ادھر سے ادھر شفٹ کیا تو پیدل چلنا پڑا۔ کار کہاں سے آتی۔ پھر جہاں اسے رکھا گیا وہاں ایئر کنڈیشنر تو نصب نہیں تھے۔ اور کھانے میں بھی فریج توسٹ یا کافی تو نہیں مل سکتی تھی۔ اس کے اعصاب جواب دے گئے۔ دس بیس دن میں حوصلہ ہار گیا۔ بات بن گئی تھی۔ دو ایک دن میں اپنے گھر پہنچ جاتا۔''

اس نے افسوس سے سر ہلایا۔

میں نے کہا۔ ''کیا ہوا۔ فرار کی کوششوں میں مارا گیا؟''

''نہیں دوست۔ اس نے خودکشی کر لی۔'' شامی نے کہا۔ ''بس اس کے بعد خود اپنے ہی دشمن ہو گئے۔ جس پارٹی سے بندہ لیا تھا وہ بگڑ گئے کہ یہ تم نے کیا مصیبت کر دی۔ کوئی مانتا نہ تھا کہ اسے ہم نے نہیں مارا۔ ایک دم دونوں صوبوں کی انتظامیہ حرکت میں آ گئی۔ کوئی ہمارا حمایتی نہیں رہا۔ اپنے بھی خفا تھے کہ ہم نے یہ غلطی کی۔ امانت کی حفاظت نہیں کی۔ ہر جگہ کی پولیس ہمارے پیچھے تھی۔ پناہ کی کوئی جگہ نہیں۔''

میں نے کہا'' پھر اب یہ معاملہ ختم کیسے ہوگا؟ آخر تم کیسے یقین دلاؤ گے اپنی بے گناہی کا؟''

اس نے کہا۔ ''ابھی کچھ وقت لگے گا۔ اس کے بعد ایک جرگہ بیٹھے گا۔ اس میں دونوں طرف کے لوگ ہوں گے بلکہ ہر فریق کی نمائندگی ہوگی۔ سوائے متاثرہ فریق کے۔ وہ تو بالآخر رو دھو کے صبر کرنے پر مجبور ہوں گے۔ ہر شخص انہیں صبر جمیل عطا کرنے کی دعا کرے گا۔ کہے گا کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ وہ ابھی طاقت اثر رسوخ اور دولت کے بل پر قانون کے پیچھے لگے رہیں گے اور قانون اپنی چال چلتا رہے گا۔ خیر...... تو جرگے میں شامل ہوں گے ہمارے کچھ خاص آدمی۔ جو بے حد معتبر اور طاقتور سمجھے جاتے ہیں۔ بڑے وڈیرے اور جاگیردار۔ پولیس اور قانون نافذ کرنے والوں کے چوہدری۔ کچھ ہمارے ضامن۔ تاوان کی رقم ایک کروڑ تھی۔ ہم پر اس سے دگنا جرمانہ عائد ہوگا۔''

''اور یہ مرنے والے کے ورثا کو دیا جائے گا۔ خون بہا۔'' وہ ہنسا۔ ''خون بہا نہیں ہے غریب اور ضرورت مند آدمی۔ ان کے لیے دو کروڑ کیا ہیں۔ یہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کو دیے جائیں گے تاکہ ہمیں پھر آزادی سے جینے اور کام کرنے کا حق حاصل ہو جائے۔ لیکن یہ سب ہوگا ایک دو مہینے بعد۔ درمیان کا وقت خطرناک ہے۔ اس صنعت کار کا سیاسی اثر رسوخ کام کر رہا ہے۔ اس کے حامی ارکان اسمبلی جو حکومت میں ہیں ہر طرف سے دباؤ ڈال رہے ہیں۔ ظاہر ہے یہ غیر معینہ مدت تک نہیں چل سکتا۔ ہر بات پرانی ہو جاتی ہے۔ کوئی نیا واقعہ پریس پبلک اور پولیس کے لیے زیادہ اہم ہو جاتا ہے۔ اور...... میں تو اپنی سنانے میں بھول گیا کہ یہاں میں تمہاری مدد کرنے آیا تھا۔ مگر دوست۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ابھی میں خود تمہاری مدد کا طلبگار ہوں۔''

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''فکر مت کرو شامی بادشاہ...... جب تک جی چاہے یہاں رہو۔ حویلی کے اندر تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔''

''تمہیں تو ہو سکتا ہے۔''

''میں تو خطرات کے سمندر میں ہوں۔ اور سمندر میں پانی کا ایک لوٹا زیادہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ لیکن تم میرے دوست ہو مہمان ہو۔ محسن ہو اور سب سے بڑی بات کہ میری حفاظت میں ہو۔ کیا میری یقین دہانی تمہارے لیے کافی نہیں۔''

اس کی آنکھوں میں ممنونیت آ گئی۔ ''رفیق، مجھے تمہاری دوستی پر ناز ہے۔ اب بتاؤ مجھے کیوں یاد کیا تھا۔''

میں نے کہا'' تم بہت تھکے ہوئے ہو۔ ابھی سو جاؤ۔''

''نہیں، کل رات تو ہم سفر میں رہے۔ لیکن سارا دن سو کے گزارا تھا۔ دن میں سفر کرنے میں خطرہ تھا۔ سونے کے لیے بھی ایک قبرستان کا انتخاب کیا۔ اس کے ایک حصے

میں پرانی قبریں تھیں۔ کچھ اندر دھنس گئی تھیں۔ ان میں ہی سوئے رہتے پرانے مردوں کے ساتھ۔''

میں نے اسے مختصراً سب بتا دیا۔ ''قانونی طریقے سے شہباز کو رانا کی حویلی سے نہیں نکالا جا سکتا۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''ہاں، قانونی کارروائی شروع ہونے سے پہلے ہی وہ شہباز کو کہیں غائب کر دے گا۔ وہ زیادہ برا ہوگا۔''

''مذاکرات کی امید ختم تو نہیں ہوئی۔''

میں نے کہا۔ ''ابھی تک اس کی طرف سے کوئی پیغام نہیں ملا۔ اگر اس کے کچھ مطالبات ہیں تو سامنے آنا چاہئیں۔ تین دن ہو گئے۔ اس کی طرف سے مکمل خاموشی ہے۔ آخر مقصد کیا ہے شہباز کو اغوا کرنے کا......؟ صرف ہمیں ڈرانا دہشت زدہ کرنا اور بھاگنے پر مجبور کرنا ہے۔ یہ کبھی نہیں ہوگا۔''

''ہونا بھی نہیں چاہیے۔''

''رانا کے عزائم کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اس تک ہم اپنے عزائم کیسے پہنچا سکتے ہیں اس تک ہم مہذب تعلیم یافتہ اور امن پسند ہونے کا ثبوت دیتے آئے ہیں۔ لیکن اب یہ واضح کرنا ضروری ہوتا جا رہا ہے کہ ہم اینٹ کا جواب پتھر سے دینا چاہتے ہیں۔''

''آج کی دنیا میں زندہ رہنے کا یہی چلن ہے۔ تم......تم مجھے سوچنے دو۔ میں کسی معاملے میں ایک دم فیصلہ نہیں کرتا۔ کوئی سنگین مسئلہ ہو تو اسے دماغ کے کمپیوٹر میں ڈال کے انتظار کرتا ہوں۔ دماغ میں اس فیصلے پر کام جاری رہتا ہے اور چوبیس گھنٹے گزرنے سے پہلے حل نکل آتا ہے۔''

میں نے کہا ''یہی صحیح طریقہ ہے۔ ابھی تم سو جاؤ۔ صبح ہونے میں تو زیادہ دیر نہیں۔ تم جب تک چاہو سوتے رہو۔''

میں شامی بادشاہ کو اوپر لے گیا جہاں اس کے ساتھی گرد آلود قالین پر بے سدھ آڑے ترچھے پڑے تھے۔ وہ بھی انہی کے ساتھ لیٹ گیا۔ ان کی زندگی ایسی ہی تھی۔ جو شکستہ قبروں میں سوتے رہے ان کے لیے گرد آلود قالین سے زیادہ آرام دہ چیز کیا ہو سکتی تھی۔

جب میں نکلنے لگا تو شامی نے کہا۔ ''دوست۔ اس دروازے کو باہر سے مقفل کر جاؤ۔ جیسے یہ پہلے تھا۔''

میں نے کہا۔ ''اس کی کیا ضرورت ہے۔''

''ضرورت ہے۔ تم چابی اپنے پاس رکھو گے۔ کوئی اندر سے دروازہ نہیں کھولے گا۔ ہاں وہ جو رات کو ہمیں لایا تھا۔ کیا نام ہے اس کا۔''

میں نے کہا۔ ''غنی......''

''ہاں......غنی کو بھی اجازت ہے۔ اور کوئی آئے گا تو......مارا جائے گا۔ ہم کوئی رسک لینے کی پوزیشن میں بالکل نہیں ہیں۔''

میں نے حیرانی سے کہا۔ ''میرے گھر کے اندر تمہارے لیے کیا رسک ہے۔ ایک فلمی ڈائیلاگ سے میرے جذبات کی صحیح ترجمانی ہوگئی کہ تم تک جو بھی آئے گا میری لاش پر سے گزر کے آئے گا۔''

وہ ہنسنے لگا۔ ''کیا آنے والا پہلے بتا دے گا کہ میں نواب رفیق کی لاش پر سے گزر کے آیا ہوں۔ پھر ہم اسے گولی ماریں یا سوئے پڑے رہیں۔ پیچھے کچھ ہوگا تو ہمیں کیسے معلوم ہوگا، اس لیے احتیاط بہتر ہے دوست۔''

اس کی بات میری سمجھ میں آ گئی اور مجھے یہ اندازہ بھی ہوگیا کہ اس مرتبہ شامی بادشاہ جیسا شخص بھی کتنا خائف ہے۔ وہ بزدل نہیں تھا۔ موت سے آنکھ مچولی کھیلنے والا شامی بادشاہ موت سے ڈرتا نہیں تھا لیکن اسے چوہے کی طرح بند کمرے میں مقابلہ کیے بغیر مرنا منظور نہ تھا۔ اس کے نزدیک یہ خودکشی سے بھی بدتر موت تھی۔ خودکشی آدمی اپنے ارادے سے تو کرتا ہے۔ کمزور سہاروں پر اعتماد کے دھوکے میں مارا جانا آخری لمحے میں صرف پچھتاوا دیتا ہے جس سے زندگی کے رائگاں جانے کا دکھ بڑھ جاتا ہے۔

صبح میری آنکھ کسی اجنبی عورت کی آواز سے کھلی۔ میں نے باہر نکل کے دیکھا تو برآمدے کی سیڑھیوں کے سامنے ایک دیہاتی مرد اور عورت کھڑے تھے۔ مرد تیس پینتیس برس کا ہوگا تو عورت اس سے پانچ سات سال چھوٹی ہوگی۔ عورت جسمانی طور پر بھی مرد کے مقابلے میں صحت مند تھی اور اس کے سامنے مرد ویسے بھی کاٹھ کا الو صرف حکم کا غلام ہی نظر آتا تھا۔ عورت کی گود میں سال بھر کا بچہ تھا جو اس نے مجھے دیکھتے ہی اپنے میاں کو تھما دیا اور بڑی بے باکی سے سیڑھیاں چڑھ کے اوپر آ گئی۔

اب تک وہ ریشم سے بات کر رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ریشم ایک ملازمہ سے زیادہ کچھ نہیں۔ اچھے کپڑے پہن کے انگریزی بولنے سے وہ اشراف میں شامل نہیں ہوگئی۔ اس کے برعکس ریشم ایک ڈاکٹر کی معاون خصوصی بن جانے کے بعد اور کچھ ہمارے سلوک کی وجہ سے بہت سر چڑھ گئی تھی۔ وہ خود کو اتنا ہی اہم سمجھتی تھی جتنا صاحب کا پی اے اور چپراسی ثابت ہوتا ہے۔

ریشم نے عورت کی پیش قدمی روک دی۔ ''میں کہتی ہوں ایسے منہ اٹھائے کہاں آگے جا رہی ہے۔''

عورت نے تند لہجے میں کہا۔ ''چل ہٹ، تو کون ہوتی ہے میرا راستہ روکنے والی۔ مجھے نواب صاحب سے کام ہے۔''

''رک جا ورنہ بولتی ہوں گارڈ کو۔ ابھی اٹھا کر باہر پھینک دے گا۔ پہلے مجھے بتا کام کیا ہے۔'' ریشم اس جاہل عورت کے ساتھ اپنی انگلش ضائع کرنا نہیں چاہتی تھی۔

عورت نے دہائی دی۔ ''نواب صاحب۔''

ریشم نے چلا کر کہا۔ ''گارڈ......گارڈ......روکو اس عورت کو پتا نہیں اندر کیسے آ گئی......باہر نکلوا ہے۔''

میں نے ریشم کی اتھارٹی کا بھرم رکھا۔ ''ریشم......ہواز شی......واٹ ڈز شی وانٹ سو۔''

ریشم کا چہرہ خوشی اور اعتماد کی تصویر بن گیا۔ ''سر......وِس ووُمن......شی ناٹ ٹیل انی تھنگ۔ آئی اسٹاپ۔''

اب میں نے عورت کی طرف دیکھا تو وہ شکست خوردگی اور شرمندگی کی تصویر بنی کھڑی تھی۔ ''کیا ہنگامہ برپا کر رکھا ہے تم نے۔ ریشم غلط تو نہیں پوچھ رہی ہے کہ کیا کام ہے۔''

عورت نے فوراً ہاتھ جوڑ دیے۔ ''مالک غلطی ہوگئی۔ میں نے بتا دیا تھا کہ میں اسی بندے کی بہو ہوں جو کل رات آیا تھا۔ یہ میرا گھر والا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ریشم......دس منٹ بعد ان کو میرے پاس لے آنا......پہلے میرے لیے کافی لاؤ۔''

''یس سر......'' ریشم نے بے حد مستعدی سے کہا اور پھر عورت کی طرف پلٹ گئی۔ ''خبردار جو ایک قدم آگے زینے سے اوپر رکھا۔ چل پیچھے۔''

عورت نے بادل ناخواستہ اس حکم کی ذلت کو قبول کیا اور پیچھے ہو کے کھڑی ہوگئی۔ کاٹھ کا الو آنکھیں جھپکاتا رہا۔ اس کی اولاد اتنی دیر میں اپنے والد صاحب کو بطور کموڈ استعمال کر چکی تھی۔ دیہات کی آزاد فضا میں پرورش پانے والا بچہ پیمپر تو کیا لنگوٹ یا چڈی کے تکلف سے بھی آزاد تھا۔

عورت کو دس منٹ بعد میرے سامنے پیش کیا گیا تو میں ہاتھ منہ دھو کے کافی پی رہا تھا۔ میں نے اسے اشارہ کیا تو وہ نیچے بیٹھ گئی۔ اس کا مجازی خدا کھڑا رہا۔

میں نے کہا۔ ''تمہارا سسر کہاں ہے۔ تم کیوں آئی ہو۔''

عورت نے کہا۔ ''جناب عالی اس کا تو دماغ چل گیا ہے جب سے اس کا بیٹا مرا ہے۔''

میں نے اسے ٹوکا۔ ''خدانخواستہ تمہارا یہ بیٹا ہوتا اس کی جگہ تو تمہاری کیا حالت ہوتی۔'' وہ بڈھا آدمی ہے۔ تمہیں اس کے بارے میں ایسے بات نہیں کرنا چاہیے۔ آخر وہ سسر ہے تمہارا۔''

عورت کا رنگ بدلا مگر اس نے خود کو سنبھال لیا۔ ''حضور کل رات وہ یہاں آیا تھا تو آپ نے اسے کتنے پیسے دیئے تھے؟''

میں نے کہا...... ''تم کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''جناب عالی۔ وہ صبح گاؤں کے ایک راج سے ملا اور اس سے پوچھا کہ میرے بچے کی قبر پکی بنانی ہے۔ کتنا خرچہ ہوگا۔ اس نے دو ہزار بتائے تو کہنے لگا کہ قبر کے اوپر وہ سفید پتھر لگانا۔ کیا کہتے ہیں اسے۔'' وہ شوہر کی طرف پلٹی۔

شوہر نے تابعداری سے کہا۔ ''سنگِ مرمر۔''

''ہاں وہی......اس کے علاوہ سرہانے نام لکھوانا ہو۔ اور قبر کے چاروں طرف چاروں تل۔ راج حیران ہوا کہ بڈھا کیسی باتیں کر رہا ہے۔ ایسی قبریں ملک صاحب کے خاندانی قبرستان میں ہیں۔ یا پھر رانا صاحب کے اور ادھر چوہدری صاحب کے بزرگوں کی۔ اس نے کہا کہ پورے پانچ ہزار لگ جائیں گے۔ ہیں تیرے پاس؟ بڈھے نے......میرے سسر نے کہا کہ میں پورے پانچ ہزار دوں گا۔ تو کام شروع کر......لو جی اسے شک تو ہونا تھا۔ اس نے اچھائی یہ کی کہ جناب سے پہلے ہمارے پاس آ گیا۔ ہم نے کہا کہ بڈھے کے دماغ پر بیٹے کی موت کا بہت زیادہ اثر ہے۔ اس کے پاس پانچ ہزار کیا پانچ روپے نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''ہاں......تم چھوڑتی کہاں ہو۔ غنی نے مجھے بتایا کہ کل بھی سب تم نے وصول کر لئے تھے۔''

عورت کا رنگ خفت سے پھیکا پڑ گیا مگر وہ اتنی جلدی حوصلہ ہارنے والی عورت نہیں تھی۔ ''جناب عالی! میں جو کرتی ہوں سب کے بھلے کے لیے کرتی ہوں۔ گھر کی ہزار ضرورتیں ہوتی ہیں۔ وہ پیسا اس کے علاج اور دوا دارو میں لگ جائے گا۔ میں نے راج کے جانے کے بعد پوچھا تو وہ مان گیا کہ آپ نے ایک کام کے لیے پیسے دیئے تھے۔''

میں نے کہا ''پھر مجھ سے کیوں پوچھ رہی تھیں کہ کتنے پیسے دیئے تھے! اور اب کیا چاہتی ہو؟''

''جناب عالی......جو کام آپ نے اس کو بتایا تھا۔ وہ اس کے بس کا نہیں تھا۔ وہ واقعی پاگل ہے۔ قبر بنوانے والی بات پھیل جاتی تو کام خراب ہو جاتا۔''

مجھے کچھ تشویش ہونے لگی۔ ''پھر تم نے کیا کیا؟''

''میں نے جناب عالی بڈھے کو بند کر دیا گھر میں۔ خود آپ کا کام کرنے گئی۔ یہ بڑی ہوشیاری کا کام تھا۔''

''تم خود کو بہت ہوشیار سمجھتی ہونا۔''

وہ کچھ نروس ہوئی۔ ''دیکھو نا جناب عالی۔ آپ کا یہ کام میں نے ہی کیا آخر...... اور کسی کو پتا نہیں چلا۔''

میری تشویش اب پریشانی میں ڈھل گئی۔ ''وہ تو کام کرتا تھا وہاں، تم کیسے گئیں۔''

''جناب عالی...... میں مالش بہت اچھی کرتی ہوں۔ پہلے والی بیگم اور پھر دوسری بھی مجھے بلا لیتی ہے۔ یہ تیسری ذرا نک چڑھی ہے۔ میں جاتی رہتی ہوں رانا صاحب کی حویلی میں۔ مجھ پر کوئی روک ٹوک نہیں۔ اندر بھی۔''

میں نے کہا۔ ''مختصر بات کرو...... تم نے پیغام پہنچایا۔''

''جی جناب عالی...... اور آپ دیکھ لو نا فٹ جواب بھی لے آئی ہوں...... کسی کو بھی کچھ معلوم نہیں ہوا۔''

میں نے اس کے ہاتھ سے رقعہ لے لیا جو پسینے کی نمی سے بھیگا ہوا تھا کیونکہ اس کاغذ کو اس نے تو ژ مروڑ کے اس طرح اپنی قمیص کے گلے سے سیف ڈیپازٹ والٹ میں رکھ لیا تھا جس میں خواتین بڑی آسانی سے کرنسی نوٹ کیا چھوٹے پرس بھی رکھ لیتی ہیں۔

مجھے اس لالچی اور چالاک عورت پر جتنا غصہ آ رہا تھا اتنا ہی اس سے خطرہ بھی محسوس ہو رہا تھا۔ ''دیکھو...... تم نے سب انعام کے لالچ میں کیا ہے۔ میری مرضی کے بغیر۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا۔ اگر تمہاری دخل اندازی کی وجہ سے خرابی ہوئی یا بنا ہوا کھیل بگڑا تو سزا بھی تمہیں ہی ملے گی۔''

اس کا رنگ فق ہو گیا۔ ''ہم تو خادم ہیں آپ کے جناب عالی۔''

میں نے تلخی سے کہا۔ ''یہ بات اگر رانا صاحب کو معلوم ہو جائے کہ نمک تم ان کا کھاتی ہو اور خدمت ان کے دشمنوں کی کرتی ہو...... تو کیا ہوگا؟ گھر جا کے اس پر اچھی طرح سوچنا۔ کوئی دریا میں ایک پاؤں ایک کشتی میں رکھے اور دوسرا دوسری میں تو ڈوب جاتا ہے۔''

وہ سخت بدحواسی اور خوف زدہ رخصت ہوئی۔ میں نے اس کی خدمت گزاری کو سخت ناپسند ہی نہیں کیا تھا اسے دھمکی بھی دے دی تھی کہ لالچ میں اس نے اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالا ہے۔ یہ دھمکی ضروری تھی اور مجھے یقین تھا کہ موثر ثابت ہوگی۔

اس کے جانے کے بعد میں نے راجا کے کمرے میں جا کے دیکھا تو فریال وہاں پہلے سے موجود تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگا جیسے میرے آنے سے پہلے وہ کچھ اور بات کر رہی تھی۔ بات کے ساتھ اس کے چہرے کے تاثرات بھی اتنی تیزی سے بدلے کہ میری نظر میں سب عیاں ہو گیا۔

گزشتہ شب فریال کا موڈ سخت خراب تھا۔ اب اس نے بڑی بشاشت سے کہا۔ ''نواب صاحب کے دربار میں صبح سویرے کون حاضر ہونے آ گیا تھا۔ وفد کو ملاقات کے لیے تخلیہ فراہم کیا گیا۔''

میں مسکراتے ہوئے بیٹھ گیا۔ ''ایلچی ایک اہم مراسلہ لایا تھا۔'' اور وہ کاغذ راجا کی طرف بڑھا دیا۔ ''ہمارے ایک مکتوب کا جواب......''

راجا نے خط پڑھا اور میری طرف بڑھا دیا۔ اس میں کسی کو نام لیے بغیر مخاطب کیا گیا تھا۔ ''آخر تم کیا کر رہے ہو۔ کسی پر بھروسا مت کرو۔ ایسا نہ ہو مجھے یہاں سے شفٹ کر دیا جائے۔ کچھ پتا نہیں۔''

اس نے یہ چند سطریں لپ اسٹک سے تحریر کی تھیں اور غالباً اس میں دو اسٹک صرف ہو گئی تھیں کیونکہ تحریر کے دو رنگ تھے۔ اسے یقیناً کاغذ اور قلم حاصل کرنے میں دشواری کا سامنا ہوگا اور ممکن ہے کہ لکھائی کے لیے بھی اسے واش روم میں جانا پڑا ہو۔ اسے تفصیل سے کچھ بتانے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔ اس پیغام نے ہماری پریشانی اور مایوسی میں اضافہ کر دیا۔

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد راجا نے کہا۔ ''یار اب ہمیں کچھ تو کرنا چاہیے۔ رانا کی طرف سے تو نہ پیغام ہے نہ شرط نہ مطالبہ۔ ہم کیا ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہیں۔''

میں نے کہا۔ ''پہلے تصدیق ہوئی کہ شہناز اس وقت رانا کی تحویل میں ہے۔ اب رابطہ ہو گیا۔ اللہ نے چاہا تو آج ہی ہم اسے واپس لے آئیں گے۔''

راجا نے مجھے غور سے دیکھا۔ ''تو اتنے یقین کے ساتھ یہ بات کیسے کہہ رہا ہے فیکے پتر۔''

میں نے کہا ''امید کے ساتھ عزم بھی ہے ہمارا رخت سفر سب سے بڑھ کر ایک یقین کہ اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔ جس نے راستے کا نشاں دیا ہے وہ منزل بھی دے گا۔

راجا نے جھنجلا کے کہا ''کتابی ڈائیلاگ مت بول۔''

میں نے کہا۔ ''رات شامی بادشاہ اپنے ساتھیوں سمیت آ گیا ہے۔''

اس ڈرامائی اعلان کا اثر آہستہ آہستہ ہوا۔ پہلے ان کے چہروں پر صرف بے یقینی تھی کیونکہ حویلی میں میرے ساتھ دا

ہی تھے۔ انہوں نے نہ کچھ دیکھا نہ سنا تھا۔ گزشتہ رات تک خبر تھی نہ اطلاع۔ شامی بادشا کی آمد طوفان کی طرح ہوتی تھی۔ نسیم سحر کے جھونکے کی طرح اس کے آنے کا سونے والوں کو پتا ہی نہ چلے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔''

پھر انہوں نے میری صورت سے عیاں متانت کو دیکھا جس میں شرارت کا شائبہ تک نہ تھا۔ پھر راجا نے پوچھا۔ ''شامی بادشاہ؟''

فریال نے کہا۔ ''وہ کہاں آ گیا ہے؟ کوئی اطلاع ملی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''وہ اپنے تین خاص ساتھیوں سمیت اس وقت حویلی کے اندر موجود ہے۔''

راجا نے کہا۔ ''تو ڈراما کیوں کر رہا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''دیواروں کے کان بہرے۔ ذرا اپنے کان قریب لاؤ۔''

تفصیل سن کے وہ سوچ میں ڈوب گئے۔ ڈسکس کیے بغیر ہی شہناز کی رہائی کا پورا پلان واضح ہو گیا تھا۔ مذاکرات کی راہ پیدا ہی نہیں ہوتی۔ قانون سے مدد کا راستہ اختیار کرنا ممکن نہیں مزید تیسرا راستہ یہی رہ جاتا ہے کہ ہم شامی بادشاہ کے گروہ کی مدد سے رانا کی حویلی پر حملہ کریں اور شہناز کو بزور بازو نکال لائیں۔

کچھ دیر بعد راجا بولا۔ ''اس طرح تو بہت خون خرابہ ہوگا۔''

میں نے کہا۔ ''وہ تو شطرنج کی بساط پر بھی ہوتا ہے۔ پیادے ہاتھی گھوڑے اور وزیر تک مارے جاتے ہیں۔ صرف شاہ کو مات ہوتی ہے۔''

''ہم شہناز کی زندگی بچانے جائیں گے یا داؤ پر لگانے؟ اور مقصد بھی حاصل نہ ہو تو جان گنوانا محض خودکشی۔''

میں نے کہا۔ ''ایسے کمانڈو ایکشن پلان کرنے میں ڈاکو بھی کمانڈوز سے کم نہیں ہوتے۔''

''یہ تو جب شامی بادشاہ سو کے اٹھے گا تو بتائے گا کہ اس کے دماغ کے کمپیوٹر نے کیا حل پیش کیا ہے۔''

فریال کچھ دیر سے چپ تھی۔ اس نے اچانک کہا۔ ''دیکھو...... اللہ کرے سب ویسا ہی ہو جیسا ہم چاہتے ہیں۔ لیکن ایک لمحے کے لیے فرض کر لو۔ کہیں کوئی بات ہماری توقعات کے خلاف ہو گئی۔ کوئی گڑبڑ ہو گئی۔ اس کے نتیجے میں شہناز نہ رہی۔ یا تم نہ رہے۔ تم دونوں میں سے کوئی ایک نہ رہا۔''

راجا کچھ نہیں بولا۔ میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''فریال چاہتی ہے کہ میں یہ سب چھوڑ دوں۔ جو میرے دماغ کا خناس ہے۔ اور سب کچھ بیچ کے اور نقد رقم سمیٹ کر پاکستان سے ہمیشہ کے لیے جلا وطن ہو جاؤں۔ اتنی بڑی سرمایہ کاری کے ساتھ مجھے بہت سے ممالک خوشی خوشی قبول کر لیں گے۔''

فریال کا رنگ پھیکا پڑ گیا اور اس نے چور نظروں سے راجا کی طرف دیکھا مگر خاموش رہی۔

راجا نے کہا۔ ''جب تو آیا تو فریال مجھ سے یہی بات کر رہی تھی۔''

فریال نے چونک کر راجا کو شکایتی نظر سے دیکھا۔ اسے امید نہ تھی کہ یہ بات اچانک چھڑ جائے گی اور اس کے بعد راجا بھی راز داری میں کی جانے والی بات میرے سامنے کہہ دے گا۔ ''کیا میں نے غلط کہا راجا؟'' فریال بولی۔

راجا نے پہلو بدل کے کہا۔ ''کیا غلط ہے اور کیا صحیح ہے۔ یہ اپنے اپنے خیال اور نکتہ نظر کی بات ہوتی ہے۔''

''تمہارا کیا خیال ہے۔'' فریال نے کہا۔

''میں رفیق کے ساتھ ہوں۔ یہ اعتماد کی بات ہے۔'' راجا بولا۔

''اتنا ہی اعتماد مجھے بھی تھا۔ لیکن اعتماد کا رشتہ دو طرفہ ہوتا ہے۔ اس کی بنیاد جھوٹ پر نہیں رکھی جاتی۔''

''تم سے کسی نے جھوٹ نہیں بولا۔'' میں نے برہمی سے کہا۔

''تم نے جھوٹ بولا ہے۔ جب ہم لندن میں تھے اور تم نے لوٹ کر پاکستان آنے کا فیصلہ کیا تھا۔ تو کیا خواب دکھائے تھے مجھے۔' سنو...... پہلے میری بات سن لو۔ خواب تم چھ سال سے دکھا رہے ہو اور میں کامل یقین کے ساتھ دیکھ رہی ہوں کہ یہ خواب نہیں حقیقت ہے۔ آج کی نہ سہی آنے والے کل کی۔ لیکن ست بدھائی میں مجھے وہ حقیقت نہیں ملی جسے ہم آباد کرنے آئے تھے۔ اس کا نقشہ رفیق کے ذہن میں تھا۔ وہ مجھے بھی بہت پسند آیا تھا۔''

''لیکن یہ جگہ جہنم بن گئی ہے تمہارے لیے۔'' میں نے کہا۔

''چلاؤ مت۔ میں تمہارے ساتھ جہنم میں بھی خوش رہنے کے لیے تیار تھی مگر اب مجھے یقین آنے لگا ہے کہ تم تمام عمر مجھے اسی طرح خوابوں سے بہلاتے رہو گے میں تمہیں ایسے ہی دستیاب ہوں تو تمہیں مجھ سے شادی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔''

میں نے کہا۔ ''پھر بکواس شروع کی تم نے۔ دستیابی کا کیا مطلب ہے۔ آخر ہمیشہ تم نے مجھے دقیانوسی ہونے کے

ٹلنے دیجیے۔ جوان ہوئے پر اکسایا۔''

''چنانچہ اب تم سمجھتے ہو کہ میری حیثیت تو گھر کی مرغی جیسی ہے جب چاہا حلال کرلیا۔''

''حلال حرام کی بات تمہارے منہ سے اچھی نہیں لگتی۔''

''تمہیں کیوں اچھی لگے گی۔'' وہ چڑھ کے بولی۔ ''تم مرد ہو۔ آزاد ہو ہر حد پار کرنے کے لیے۔ وفاداری صرف عورت پر لازم ہے۔''

''میں سناٹے میں آگیا۔'' آخر کیا کہنا چاہتی ہو تو۔''

وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے زہریلے لہجے میں بولی۔ ''تم میرے اعتماد کو دھوکا دے رہے ہو۔ جھوٹ بولنے لگے ہو مجھ سے۔''

میں نے کہا'' کون سا جھوٹ بولا ہے میں نے۔''

''دیکھو' میری زبان مت کھلواؤ۔ مجھے بتاؤ تمہارا مکان کس نے خریدا تھا۔ کون تھی وہ عورت؟ مجھے کیوں نہیں بتایا تھا تم نے کہ وہ نور جہاں تھی۔''

''اس ڈر سے...... کہ تمہارے دل میں بدگمانی آئے گی۔''

''بدگمانی۔'' وہ تلخی سے بولی۔ ''اس کی مہربانیوں کا سلسلہ تو جاری ہے۔ اس نے تمہارے صوفی چچا کو قتل کرادیا۔ تم اسے احسان مانتے ہو کیونکہ وہ ایسا کہتی ہے۔ جب وہ فون کرتی ہے۔ اور تم چھپاتے ہو۔ تو کیا مجھے پتا نہیں چلتا؟ وہ تمہارے احسان فراموش نمک حرام ملازم کی اور ایک دشمن کی بیوہ ہے۔ اسے کیا ہمدردی ہے تم سے...... کیوں ملتے ہو تم اس سے۔''

میرے ماتھے پر پسینا آگیا۔ ''دیکھو...... سمجھنے کی کوشش کرو۔ اسے تم مصلحت مجبوری یا ایک کاروباری ضرورت سمجھ سکتی ہو۔''

''واہ نواب صاحب...... ذرا مجھے بھی سمجھائیے کون سا ہے وہ کاروبار جس میں آج آپ کے اور اس کے مفادات مشترک ہوگئے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''حسد اور رقابت نے تمہیں پاگل کردیا ہے۔ تم جانتی ہو محبت میں صرف تم سے کرتا ہوں۔''

''میں نے عائشہ کے لیے کبھی رقابت محسوس نہیں کی۔ کسی سے حسد نہیں کیا۔ کبھی جاننے کی کوشش ہی نہیں کی کہ لندن میں تمہارے شب و روز کیسے گزرتے ہیں۔ کس کے ساتھ ہوتے ہو تم ویک اینڈ پر۔ کون کون سی تمہاری گرل فرینڈ۔ تم خود مجھے بتا دیتے تھے۔ اس وقت تم جھوٹ نہیں بولتے تھے مجھ سے۔ اسی لیے تم پر اعتماد تھا مجھے۔''

''اس اعتماد کا مظاہرہ کیا میں نے نہیں کیا تھا۔''

''تم اس لیے مطمئن تھے کہ میں کچھ کر ہی نہیں سکتی تھی۔ میں عملاً سلطان کی قید میں تھی۔ لیکن اب حالات مختلف ہیں۔ پہلے تمہاری اور میری مجبوری ایک تھی۔ ہمارے درمیان سلطان ایک دیوار بنا ہوا تھا۔ تمہارے والدین مجھے قبول کرنے پر تیار نہیں تھے۔ لیکن اب کیا ہے؟ میں مجبوریوں کی ساری دیواریں گرا کے ساری زنجیریں توڑ کے تمہارے پاس آگئی ہوں...... تمہارے ماں باپ نے بھی مجھے پسند کرلیا ہے۔ پھر تم نے مجھے کیوں لٹکا رکھا ہے۔ کیوں مسلسل ٹال مٹول سے کام لے رہے ہو۔''

''تم غصے میں یہ سب کہہ رہی ہو۔''

وہ چلائی...... ''رفیق یہ بے عزتی ہے میری۔ محبت کے نام پر تم میرا استحصال کررہے ہو۔ میں اس صورت حال کو مزید برداشت نہیں کرسکتی۔''

راجا چپ بیٹھا تھا۔ اس نے درمیان میں آنے کی کوشش بھی نہیں کی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ فریال کے الزامات کی صداقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا...... کوئی عورت اپنے محبوب پر کسی کا غاصبانہ قبضہ برداشت نہیں کرسکتی۔ محبت میں نظریہ ضرورت نہیں چلتا۔

راجا اچانک اٹھا اور باہر نکل گیا۔ جاتے جاتے اس نے کہا'' دیکھو نیکے پتر۔ ابھی وقت ہے...... معاملات تیرے ہاتھ میں ہیں۔ بعد میں پچھتانے سے کچھ نہیں ہوگا۔''

فریال کا غصہ اپنی انتہا کو پہنچ کے آنسوؤں میں ڈھل گیا۔ میں نے فیصلہ کرلیا ہے کل میں چلی جاؤں گی یہاں سے۔''

''کہاں چلی جاؤ گی؟ لندن۔''

''یہ بھی نہیں بتاؤں گی کہ کہاں جارہی ہوں۔'' وہ ایک دم اٹھی۔

میں نے اسے پکڑ لیا۔ ''میں جانے دوں گا تمہیں۔''

اس نے مجھے دھکا دیا۔ ''چھوڑ دو مجھے۔''

اس میں ہسٹریا کے زیر اثر ایسی وحشیانہ قوت آگئی تھی کہ دھکے سے میں پیچھے گرا۔ وہ تیر کی طرح دروازے کی طرف بڑھی۔ میں اس کے پیچھے لپکا ''سنو فریال۔ بس شہناز آجائے۔ پھر ہم شادی کرلیں گے۔ اللہ نے چاہا تو کل ہی۔''

لیکن وہ نہیں رکی۔ اس نے خود کو اپنے کمرے میں بند کرلیا۔ میں بند دروازے پر دستک دیتا رہا مگر اس پر اثر نہیں ہوا۔ دروازے کے پیچھے سے میں اس کے رونے کی آواز سن سکتا تھا۔ میں نے خود کو انتہائی بے بس اور خوار محسوس کیا۔ میں جتنا دکھی تھا اس سے کہیں زیادہ احساس ذلت شرمندگی سے دوچار تھا۔ فریال نے کچھ بھی غلط نہیں کیا تھا۔ اس صورت حال کو محبت کرنے والی کوئی عورت برداشت نہیں کرسکتی۔ کلہاڑی خود میں نے اپنے پیروں پر ماری تھی۔ اب میں فریال کو کیسے یقین دلا سکتا تھا کہ دنیا میں اگر میں نے کسی سے محبت کی ہے تو وہ تم اور صرف تم ہو۔ اس محبت کی قوت کو میں محسوس کرسکتا تھا مگر اب اس کا یقین دلانا کتنا مشکل ہوگیا تھا۔

مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ محبت کی مغلوب اور مجبور کرنے والی طاقت ایک ہی ہے اور اس کے مقابل فریال کے عزائم کچھ بھی نہیں۔ وہ لاکھ دعوے کرے کوشش کرے۔ زبان سے کہے۔ دل سے چاہے مگر وہ کہیں نہیں جاسکتی۔ اس وقت کوئی نہیں تھا جو میری ذلت کا تماشا کرتا۔ میں کچھ دیر بند دروازے کے سامنے تصویر بے بسی اور نقش فریادی بنا کھڑا رہا۔ پلٹنے سے پہلے میں نے دروازے سے منہ لگا کے اور چلا کے کہا۔ ''فریال...... جو میں نے کہا ہے وہ ضرور ہوگا۔ کل شہناز آجائے گی اور ہم شادی کرلیں گے۔ سنا تم نے۔ تم جو چاہو سمجھو اور کہو مگر محبت مجھے تمہارے سوا نہ کسی سے تھی۔ نہ ہے اور نہ ہوگی۔''

اچانک مجھے اپنی دیوانگی کا احساس ہوا اور یہ کہ میرے پیچھے کون کھڑا یہ سب دیکھ رہا ہے سن رہا ہے۔ میں ایک دم پلٹا تو مجھے راجا کا چہرہ نظر آیا۔ متفکر۔ مہربان اور ہمدرد۔ اس نے آہستہ سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کے دبایا۔ ''سب ٹھیک ہوجائے گا نیکے پتر۔''

میں نے کہا۔ ''راجا، میں اس سے معافی چاہتا تھا۔''

''کوئی ضرورت نہیں۔ ایسا تو محبت میں ہوتا ہے۔ تھوڑی سی بدگمانی والی نفرت ایسے ہی ہوتی ہے جیسے کھیر میں ذائقہ بڑھانے کے لیے تھوڑا سا نمک بھی پڑتا ہے۔ اور تھوڑی سی چینی ڈالتے ہیں۔ چل آ میرے ساتھ۔ ہمارے مہمان اٹھ گئے ہیں۔''

میں نے کہا'' کیا غنی اوپر گیا تھا۔''

''ہاں...... لیکن پیچھے وہ کچا تھانیدار آکے بیٹھ گیا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''کیا اسے شک ہوگیا ہے۔''

''پولیس کا تو کام ہی شک کرنا ہے۔'' راجا نے کہا۔

تھانیدار مجھے دیکھ کے کھڑا نہیں ہوا۔ آہستہ آہستہ اس کے اطوار میں تھانیداری کا رنگ نمایاں ہونے لگا تھا۔ شاید اس کی یہ وجہ بھی ہوگی کہ اسے اپنا پکا ہونے کا یقین حاصل ہوچکا تھا۔ اس دور افتادہ مقام پر شہر سے کسی تھانیدار کو سزا کے طور پر ضرور پوسٹ کیا جاسکتا تھا ورنہ اس علاقے سے کسی بھی ایرے غیرے کو کچے سے پکا کردینا آسان تھا۔

میں نے بھی کسی تمہید کے بغیر سامنے بیٹھ کر کہا۔ ''کیسے زحمت کرلی وڈے تھانیدار صاحب نے؟''

وہ کچھ سیدھا ہوا۔ ''او جی نواب صاحب۔ ہم ملازم سرکاری بھی۔ پبلک سرونٹ بھی۔ اپنی خوشی سے کہیں نہیں جاتے لیکن خوش کوئی نہیں ہوتا ہمیں دیکھ کے۔ آپ تو حاکم لوگ ہو۔''

میں نے کہا۔ ''کام کی بات کرو۔''

''ایک شکایت تو ہمیں آپ کے اس بندے سے ہے جو خود کو مشیر وزیر سے کم نہیں سمجھتا...... غنی سے۔''

''کوئی جرم کیا ہے اس نے؟''

''اب میں ہاں کہوں یا نا۔ زبان خلق تو نقارہ خدا ہوتی ہے۔ میں نے سنا تھا کہ اس نے ادھر ادھر کے گاؤں میں کچھ اسلحہ تقسیم کیا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''سنی سنائی مجھے مت سناؤ۔''

کل رات دو جگہ فائرنگ ہوئی۔ ایک جگہ کچھ لوگ ایک مزارع کے گھر میں کودے تھے۔ وہ کہتا ہے چور تھے۔ مگر وہاں چوروں کے لیے گھاس کا تنکا بھی نہیں...... ہاں ایک جوان بیٹی ہے اور ایک بہو۔ لوگ کہتے ہیں انہی میں سے کسی کو اٹھالیا جاتا لیکن شور ہوا تو ادھر ادھر سے لوگ آگئے اور انہیں بھاگنا پڑا۔ مگر یہ جھوٹ ہے۔''

''پھر سچ کیا ہے؟''

''سچ یہ ہے کہ ان پر فائر ہوا تو وہ جان بچا کے بھاگے۔ گولی کسی کو لگی نہیں۔ آواز سب نے سنی مگر بندہ انکاری ہے کہ میرے پاس اسلحہ کہاں۔ گواہی دینے والا کوئی نہیں۔ دوسری جگہ بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ مویشی چور تھے۔''

''اور تم سے شکایت کس نے کی۔ کہ اسلحہ غنی نے دیا ہے بلکہ تقسیم کیا ہے؟''

''رانا صاحب کا منشی آیا تھا۔''

''پھر کیا تم نے غنی کے خلاف ایف آئی آر لکھ لی۔''

تھانیدار نے بے بسی سے کہا۔ ''یہ تو مشکل ہے سر...... وہ آپ کا خاص بندہ ہے۔ کسی ثبوت گواہ کے بغیر ہم کچھ نہیں کرسکتے۔''

''تمہیں کرنا بھی نہیں چاہیے۔ بلکہ رانا صاحب کے منشی کو سمجھانا چاہیے کہ سوچے سمجھے بغیر کسی کا نام نہ لے۔ اسلحہ آج کل بہت عام ہے اور جب لوگ یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ

غیر محفوظ ہیں۔ ظلم کا شکار ہیں اور انصاف کہیں سے نہیں مل سکتا۔ تو پھر وہ اپنی حفاظت کے لیے خود کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بلی بھی اپنے بچوں کی حفاظت کے لیے شیر بن جاتی ہے۔"

"ایک بات اور دریافت کرنا تھی۔" وہ آہستگی سے بولا۔

"پوچھ لو جلدی سے۔" میں نے گھڑی دیکھ کے کہا۔

"آپ نے شامی بادشاہ کا نام تو سنا ہوگا۔"

میں نے کہا "شام میں صدر ہوتا ہے، بادشاہ نہیں۔ بشار الاسد ہے شامی صدر کا نام۔ حافظ الاسد کا بیٹا۔"

"سر جی...... شامی بادشاہ ایک خطرناک ڈاکو ہے۔ بلکہ ڈاکوؤں کے خطرناک گروہ کا سردار ہے۔ یہاں تو مشہور ہے کہ آپ کے ساتھ اس کے خاص مراسم ہیں۔"

میں نے کہا۔ "یہ کس الو کے پٹھے سے سنا ہے تم نے۔"

تھانیدار کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ "آپ کے برابر انگریزی تو ہم نہیں جانتے مگر انگریزی کا ایک محاورہ ہے۔ دھواں وہیں سے اٹھتا ہے جہاں آگ ہوتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "کیا تمہیں دھواں نظر آ رہا ہے۔"

"اس علاقے میں شامی بادشاہ کی بڑی دہشت ہے۔ ہمیں افسران بالا نے خبردار کیا ہے کہ وہ سندھ سے پنجاب کی طرف فرار ہوا ہے۔"

میں کھڑا ہو گیا۔ "ہم اپنی سکیورٹی سخت کر دیں گے۔ ادھر کا رخ کیا اس نے تو ہمارے گارڈز کے ہاتھوں مارا جائے گا۔ خبردار کرنے کے لیے شکریہ۔"

تھانیدار سخت جز بز ہوا۔ وہ ہرگز مجھے خبردار کرنے نہیں آیا تھا۔ وہ مجھ سے تفتیش کرنے آیا تھا کہ کہیں وہ ڈاکو میری حویلی میں تو نہیں؟ معلوم نہیں یہ شک اسے کیوں تھا۔ شاید شک اس کے دماغ میں ڈالا گیا تھا۔ جب میں نے اسے چلتا کر دیا تو اسے بہت مایوسی ہوئی۔

اس کے جانے کے بعد میں نے غنی کو ہدایت دی کہ وہ ہر طرف پہرے داروں کو مستعد کر دے۔ ہو سکے تو ان کا گشت بڑھا دے اور کسی کو بھی حویلی کے اندر تو کیا قریب نہ آنے دیا جائے۔ پھر میں راجا کے ساتھ اوپر پہنچا جہاں شامی بادشاہ اور اس کے دوست کھانا کھا رہے تھے۔ کمرے میں صفائی نہ ہونے کے علاوہ محبوس ہوا کی گھٹن تھی۔ اگر کھڑکیاں کھول دی جاتیں تو باہر سے تازہ ہوا کے ساتھ روشنی بھی آتی لیکن وہ اس کے لیے تیار نہ تھے۔ ریشم اور اس کی ماں نے مہمانوں کے لیے کھانے کا خصوصی اہتمام کیا تھا اور مہمان نوازی کے اس مظاہرے سے وہ بہت خوش تھے۔

میں نے کہا۔ "نیند کیسی آئی۔"

شامی نے کہا۔ "بہت گہری۔"

میں نے کہا۔ "تمہیں یہاں۔ میرا مطلب ہے اس علاقے میں آتے ہوئے کسی نے دیکھا تو نہیں تھا۔"

"احتیاط تو ہم نے بہت کی تھی۔ اندھیرے میں چھپ کے کہیں کوئی موجود ہو تو پتا نہیں۔ کیوں......؟"

میں نے کہا۔ "تھانیدار پوچھتا ہوا آیا تھا۔"

ان سب کے ہاتھ رک گئے۔ "پھر تم نے کیا کہا؟"

"یہی کہ میں کسی شامی ڈاکو سے واقف نہیں۔ میں نے پوچھا کہ اس کے شک کی کیا وجہ ہے تو اس نے جواب نہیں دیا۔ دراصل کل رات آس پاس کے کسی گاؤں میں فائرنگ کی آواز سنی گئی۔ دیہاتیوں کے پاس اسلحہ کہاں۔ شاید اسی سے دہشت پھیلی ہوگی۔ تم کھانا کھاؤ آرام سے۔"

وہ پھر کھانے میں مصروف ہو گئے لیکن میں نے محسوس کیا کہ میری بات نے انہیں کچھ متفکر کر دیا ہے۔ وہ اب زیادہ رغبت سے نہیں کھا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد شامی نے ہاتھ کھینچ لیا۔ "میرا خیال ہے ہمارا زیادہ ٹھہرنا ٹھیک نہیں۔"

میں نے کہا۔ "میرے مسئلے کا بھی کوئی حل سوچا تم نے۔"

"ہاں۔ آخری حل یہی ہے کہ ہم اچانک جا پڑیں رانا کے ڈیرے پر اور ڈاکٹر صاحبہ کو نکال لائیں۔ لیکن اس میں دونوں طرف کا رسک بڑا ہوتا ہے محافظوں سے تو ہم نمٹ لیں گے لیکن انہوں نے کسی خفیہ راستے سے ڈاکٹر صاحب کو باہر نکال دیا تو ساری کارروائی بے مقصد ہو جائے گی۔ ہمارے پاس اتنی نفری تو ہے نہیں کہ حویلی کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے کر ناکا بندی کر دیں۔" شامی نے پھر کہا۔ جیسے وہ سوچنے کے ساتھ خود سے باتیں کر رہا ہے۔

میں نے مایوسی سے کہا۔ "پھر تو بڑی مشکل ہو جائے گی۔"

"یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس میں کچھ لوگ مارے جائیں۔ ہمارا تو کچھ نہیں دوست...... دن رات کھیلتے ہیں موت سے۔ لیکن خدانخواستہ تم ہی نہ رہے تو کیا ہوگا۔"

میں نے کہا۔ "دائم آباد رہے گی دنیا۔ ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہوگا۔"

"چلو فرض کرو ہم اپنے ساتھ تمہیں نہیں لے جاتے۔"

"یہ ناممکن ہے۔" میں نے کہا۔

وہ بولا۔ "اگر سب خود تمہیں اپنی مرضی سے کرنا تھا تو ہمیں کیوں بلایا تھا۔ ہم چلے جاتے ہیں۔"

"یار ناراض ہونے کی بات نہیں۔"

"ہم آنکھیں بند کر کے آگ میں نہیں کود سکتے۔ وہ اللہ کے نبی تھے جن کے لیے آگ بھی گلزار بن گئی تھی۔ ہم گنہگار لوگ ہیں۔"

میں نے کہا۔ "اچھا مجھے بتاؤ تم کیا چاہتے ہو۔"

"دیکھو...... ہم جا رہے ہیں ڈاکٹر شہناز کو زندہ سلامت واپس لانے کے مشن پر...... لیکن اسے بھی نہ بچا سکے اور اپنے ساتھ تمہاری جان کی بازی بھی ہار گئے تو...... اچھا چھوڑ دو۔ تم کہو گے کہ میں کیسی کم بختی اور مایوسی کی باتیں کر رہا ہوں۔ یہ بتاؤ تمہاری حاصل کردہ انفارمیشن پر کس حد تک بھروسا کیا جا سکتا ہے۔ وہ خط رانا کی حویلی سے بھیجا گیا تھا۔ اس کی کیا گارنٹی ہے؟"

"کیا مطلب!"

"مطلب یہ کہ ڈاکٹر شہناز اندر ہے۔ جو پکی بات ہے؟"

میں نے کہا۔ "اس بڈھے کو جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔"

وہ عجیب طرح سے مسکرایا۔ "نواب صاحب...... دنیا کو کسی اور کی نظر سے مت دیکھو۔ خود اپنی عقل کی خوردبین سے چیک کرو۔ کیا لوگ جھوٹ نہیں بولتے؟ کیا لوگوں کو جھوٹ بولنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا؟ لالچ سے دھمکی سے، یہ سب دھوکے کا جال بھی تو ہو سکتا ہے۔"

میں کنفیوز ہو گیا۔ "تم کیا سمجھتے ہو؟"

"تمہارے پاس کون سا طریقہ ہے جھوٹ اور سچ کو پرکھنے سمجھنے کا؟ ہم تو ہر یقین کی بنیاد شک پر رکھتے ہیں۔ بعض اوقات آنکھوں دیکھی بھی سچ نہیں ہوتی۔ کانوں سنی کا تو ذکر ہی کیا۔"

"پھر...... یہ کیسے چیک کریں کہ شہناز اندر ہے۔"

وہ مسکرایا۔ "تو خود جا کے دیکھ لو۔"

میں نے کہا۔ "اچھا...... یعنی رانا کی حویلی میں ایک چڑیا گھر ہے۔ اس میں ایک نئی ہرنی پکڑ کے لائی گئی ہے۔ جو چاہے جا کے دیکھ لے۔ یہ اتنا ہی آسان ہے۔"

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "نواب رفیق احمد شیرازی۔ دو بڑے ڈاکو ایک دوسرے کے علاقے میں واردات نہیں کرتے۔ غلطی ہو جائے تو مال غنیمت اسے پہنچا دیتے ہیں جس کا علاقہ ہو۔ دو بڑے بدمعاش ایسی چھوٹی بدمعاشی نہیں کرتے کہ ایک دوسرے کے گھر کی عورتیں اٹھانے لگیں۔ یہ قانون تو جنگل میں بھی چلتا ہے۔ ایک شیر دوسرے کے علاوہ میں شکار نہیں کرتا۔ جاؤ یہ بات رانا کو سمجھاؤ۔ اس کا اپنا بادشاہت کا علاقہ ہے۔ تمہارا اپنا۔ مقابلہ طاقت آزمانے کا ہے تو مردوں کی طرح میدان میں ہونا چاہیے۔"

میں نے کہا۔ "تمہاری بات دل کو لگتی ہے مگر۔"

"مگر کیا۔ ابھی تک مقابلے میں مردانگی کے اصول طے نہیں ہوئے۔ جا کے پوچھو رانا سے کہ کیا ہم ایک دوسرے کے گھر کی عورتیں اٹھائیں گے۔ ہار جیت کا یہی معیار ہوگا۔ آج تم نے ڈاکٹر شہناز کو اٹھوا لیا۔ کل میں تمہاری بیٹی یا بہو لے جاؤں گا۔ ہم ایک دوسرے کی عزت لوٹ کے سرخرو ہوں گے۔ دیکھو وہ کیا کہتا ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے پہلے میں خود اس سے بات کروں۔"

"میرا بالکل یہی مطلب ہے۔ اس کے پاس چیلنج لے کر جاؤ کہ اگر تم اتنا گر کے مقابلہ جاری رکھنا چاہتے ہو تو تمہاری مرضی۔ ورنہ مقابلہ کرو سیاست کے میدان میں۔ طاقت میں، دولت مندی میں، اثر رسوخ میں۔ مجھے امید ہے کہ بات اس کی سمجھ میں آ جائے گی۔ وہ خود شہناز کو تمہارے حوالے کر دے گا۔ نہ کیا تو پھر کچھ کریں گے۔ اپنے طریقے سے۔"

راجا بولا۔ "ڈاکو صاحب۔ آج سے میں صحافت چھوڑ کے آپ کی شاگردی اختیار کرتا ہوں۔ اب تک میں جھک مارتا رہا۔"

میں نے کہا۔ "غالباً میں نے بھی ولایت میں گھاس کھودی۔"

شامی کے اصرار پر ہم دروازے کو مقفل کر کے نیچے اتر آئے۔ اب دن ڈھل چکا تھا۔ میں نے کہا۔ "راجا صاحب۔ میں جا رہا ہوں۔"

راجا نے کہا۔ "ہم جا رہے ہیں۔"

"نہیں...... یہ دن ٹو دن ٹاک ہوگی۔ جیسے دو سربراہ ملتے ہیں۔ ان معاملات پر بات کرنے کے لیے جو سرکاری وفد نہیں کرتے۔ اور مجھے احساس ہے کہ میں نے دیر کر دی۔ مزید دیر نہیں کرنی چاہیے۔ میں کسی کو بھی ساتھ نہیں لے جاؤں گا۔ گاڑی بھی خود ڈرائیو کر کے جاؤں گا۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ فکر کرنے کے لیے پیچھے تم سب ہو۔"

راجا خاموش ہو گیا۔ میں روانہ ہونے ہی والا تھا کہ ریشم نے مجھے موبائل فون تھما دیا۔ "رابعہ بی بی سپیک یو۔"

میں نے کہا "رابعہ...... معاف کرنا مصروفیت میں تم

سے بات نہیں ہو سکی۔''

''میری دوبار بات ہوئی ریشم سے۔کوئی پروگریس؟''

میں نے کہا۔''ابھی تک تو نہیں۔لیکن آج امید ہے۔''

''علی بابا اور چالیس چوروں کا کچھ پتا نہیں۔'' وہ بولی۔

میں نے کہا۔''تمہارا مطلب ہے شاہی بادشاہ۔''

''ہاں، بڑا دوست بنا ہوا تھا تمہارا کزن۔وہ ایک ہلے میں نکال کے لا سکتا تھا شہناز کو۔''

''لیں...... انڈین فلموں میں ایسا ہوتا ہے۔اس کا پیغام تو ملا ہے۔دیکھو آنے کے بعد وہ کیا کرتا ہے۔تم وہاں کی سناؤ۔''

''یہاں کی کیا سناؤں کزن...... سخت گڑبڑ لگتی ہے مجھے۔''

میں نے کہا۔''کیسی گڑبڑ...... ذرا کھل کے بات کرو۔''

''میں ذرا گہرائی میں جا کے ملاحظہ فرما رہی ہوں کزن...... ابھی کچھ عرض کرنا مناسب نہیں۔معاملات بھابی کے ہیں۔ان کے اور فاروق کے تعلقات میں ایسی کشیدگی میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔''

میرا ماتھا ٹھنکا۔تمہاری عقل شریف جیسی بھی ہے۔کیا کہتی ہے؟ اگر چھٹی حس ہے تمہارے پاس تو۔''

اس نے کہا۔''میری چھٹی حس کہتی ہے کہ۔دیکھو فی الحال تم اسے مصدقہ خبر مت سمجھو۔شام کے اخبار کی سرخی سمجھو۔غالباً فاروقی صاحب عقد ثانی کے چکر میں ہیں بے اولادی کبھی عورت کا جرم نہیں رہی ہے۔کسی ثبوت کے بغیر۔''

میں نے کہا''اس خطرے کے ساتھ تو لیلیٰ بھابی جی رہی تھی۔اب کون ہے جو فاروقی کو باپ بنانے کی گارنٹی کے ساتھ آنا چاہتی ہے۔''

''مجھے کیا معلوم۔مزید سنسنی خیز انکشافات کی توقع ہے۔ضرورت پڑی تو میں براہ راست دخل اور معقولات کروں گی۔''

میں نے کہا۔''کزن...... جلدی میں کچھ مت کرنا۔معاملہ اور بگڑ جائے گا۔میں خود آ کے فاروقی سے ملوں گا تو پتا چل جائے گا۔''

''میرا خیال ہے تمہیں چکر تو ویسے بھی لگانا چاہیے۔اماں اسپتال میں داخل ہیں۔''

''ڈاکٹر کیا کہتے ہیں۔''

''کچھ نہیں، جسمانی مسئلہ کوئی نہیں۔ذہنی اور اعصابی پریشانی کا اثر ہے۔اس کا علاج تمہارے پاس ہے۔''

اس سے پہلے کہ میں رابعہ سے یہ علاج پوچھتا لائن ڈراپ ہوگئی۔ابھی اس موضوع پر رابعہ سے لمبی بات کرنا ویسے بھی لاحاصل تھا۔مجھے معلوم تھا کہ اماں کے ذہنی سکون کی وہ کیا ادا تجویز کرے گی۔ابھی مجھے دوسرے کام کی جلدی تھی جو زیادہ اہم تھا۔

میں نے فون راجا کو دیا۔''رابعہ نے ایک بات کی تصدیق کردی ہے۔اسے تو شک ہے کہ فاروقی دوسری شادی کے چکر میں ہے۔''

راجا کو صدمہ ہوا۔''فاروقی یہ نیک کام کر چکا ہے۔''

''ہاں، نور جہاں نے غلط نہیں بتایا تھا۔آج کل میں فاروقی خود اپنی بیوی کو یہ بتادے گا۔ابھی وہ بری خبر سنانے کے لیے اسے ذہنی طور پر تیار کر رہا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''پتا نہیں یہ سب کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے۔'' راجا نے خفگی اور جھنجلاہٹ سے کہا۔''تیری زبان سے میں نور جہاں کا نام بھی سننا نہیں چاہتا۔پہلے کیا کم خرابی ہو چکی ہے۔اس عورت کا وجود ہی خرابی کی علامت ہے۔''

میں نے کہا۔''میں رانا سے مختصر بات کروں گا۔اور امید ہے ایک گھنٹے میں لوٹ آؤں گا۔''

گاڑی لے کر میں باہر نکلا تو شام کے ساتھ جنگل بھی اتنے گہرے ہوگئے تھے کہ بیچھے اندھیرا محسوس ہوتا تھا۔اوپر آسمان پر غروب ہوتے سورج کی مدھم پڑتی روشنی تھی اور پرندے آشیانوں کی طرف لوٹ رہے تھے۔میرے پاس اسلحہ بھی تھا اور موبائل فون بھی لیکن مجھے معلوم تھا کہ رانا کی حویلی میں داخلے کی اجازت ملنے سے پہلے میرے پاس کچھ نہیں رہے گا۔

وہ تقریباً ایک گھنٹے کا راستہ تھا۔آخری حصہ ایک کچی سڑک تھی۔اس کے بعد رانا کی حویلی کے گرد پھیلا ہوا جنگل تھا۔آخری حصے میں اینٹوں سے بنی ہوئی سڑک تھی جو حویلی کے دروازے تک لے جاتی تھی۔میں کچی سڑک پر اتر کے جنگل میں داخل ہی ہوا تھا کہ میرے کانوں میں ایک فائر کی آواز آئی۔گاڑی لڑکھڑائی تو میں سمجھ گیا کہ اس کا ٹائر برسٹ ہوا ہے یا برسٹ کردیا گیا ہے۔

میں نے گاڑی روکی ہی تھی کہ ہر طرف سے بے چہرہ لوگ نمودار ہوگئے۔ان کے ہاتھوں میں اسلحہ تھا جس کا رخ میری طرف تھا۔ان سب نے ماسک پہن رکھے تھے۔

بھرا ہوا ریوالور میرے ساتھ تھا لیکن میرے کسی کام نہیں آ سکتا تھا کیونکہ مجھے محصور کرنے والے تعداد میں آٹھ تھے۔یہ ہو سکتا تھا کہ خالی ہاتھوں سے دفاع کے فن میں اپنی مہارت کے باعث اکیلا ہی آٹھ حریفوں کو چت کرلوں مگر ایک ریوالور سے آٹھ بندوقوں کا مقابلہ ناممکن تھا۔خصوصاً اس لیے کہ بندوقوں کا رخ میری طرف تھا اور میں کسی محفوظ مورچے میں نہیں گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا۔چنانچہ میں آہستہ آہستہ باہر نکلا۔

میں نے ان سب کو مخاطب کیا۔''کون ہو تم لوگ اور کیا چاہتے ہو؟''

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد ان میں سے ایک نے کہا۔

''تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔''

''کہاں چلنا ہوگا؟''

''جہاں بھی ہم لے جائیں۔'' اس شخص نے جواب دیا۔

''اور اگر میں انکار کردوں؟''

''اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔پھر تمہیں زبردستی لے جائیں گے۔''

میں نے کہا''ٹھیک ہے میں تمہارے ساتھ چلنے کے لیے بھی تیار ہوں لیکن مجھے یہ تو بتادو کہ آخر تم لوگ کون ہو۔مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو؟''

''سارے سوالوں کا جواب یہاں نہیں دیا جا سکتا۔''

میں نے ایک گہری سانس لی''او کے...... کیا مجھے اجازت ہے کہ میں اپنے دوستوں کو بتادوں۔''

اس شخص نے دوسرے سے مشورہ کیا اور اس کے کان میں کچھ کہا مگر اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔''اس کی ضرورت نہیں۔''

میں نے برہمی سے کہا۔''ضرورت کیسے نہیں۔گھر سے میں کچھ اور بتا کے نکلا تھا۔مجھے ایک انتہائی ضروری معاملے میں رانا رجب علی سے بات کرنی تھی۔جو معاملہ کسی کی زندگی اور موت کا تھا۔بیچ میں تم کود پڑے ہو۔مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ تم کون ہو۔مجھے کہاں لے جارہے ہو اور کیوں۔''

اس شخص نے درشتی سے میری بات کاٹ دی۔''کہا نا سب پتا چل جائے گا۔ہم یہاں بحث میں وقت ضائع نہیں کرسکتے۔یہ رانا کا علاقہ ہے۔کسی نے دیکھ لیا تو بلاوجہ خون خرابہ ہوگا۔بہتر ہے خاموشی سے ہمارے ساتھ آجاؤ۔''

میں اب بھی تذبذب میں تھا۔یہ افتاد بالکل غیر متوقع تھی جس نے مجھے سخت پریشانی میں مبتلا کردیا تھا۔میرے سارے پروگرام کا خانہ خراب ہوگیا تھا۔میرے لیے اور باقی سب کے لیے بھی شہناز کا اغوا ہونا انتہائی اذیت کا سبب تھا اور جیسے جیسے وقت گزرتا جارہا تھا یہ اذیت بڑھ رہی تھی۔خدا خدا کرکے اس کی طرف سے خیر و عافیت کی ایک اطلاع ملی تھی جس سے سب کے دل کو کچھ سکون حاصل ہوا تھا۔اس کے ساتھ ہی شہناز کے رانا کی تحویل میں ہونے کا ثبوت بھی مل گیا تھا۔اسے بازیاب کرانے کے لیے میں نے شاہ بادشاہ سے مدد مانگی تھی اور وہ دوستی نبھانے کے لیے جان جوکھوں میں ڈال کے پہنچا تھا۔یہ اس کا مشورہ تھا کہ رانا کی حویلی پر حملہ کرکے طاقت کے بل پر شہناز کو نکال لانا ایک خطرناک جوا تھا۔اس میں شہناز کی جان بھی جا سکتی تھی اور ہم میں سے کسی اور کی بھی...... چنانچہ یہ آخری آپشن ہونا چاہیے۔شاہ بادشاہ کے مشورے پر ہی براہِ راست رانا سے بات کرنے جارہا تھا کہ بیچ میں یہ اغوا کار آگئے جو نہ جانے کون لوگ تھے اور کیا چاہتے تھے۔

اب صورتِ حال عجیب ہوگئی تھی۔اغوا ہوجانے والی شہناز کی رہائی کے لیے فیصلہ کن مرحلہ آگیا تھا۔ادھر حویلی میں شاہی بادشاہ رانا کے اور میرے مذاکرات کی کامیابی میں ناکامی کی خبر کے انتظار میں تھا۔اس کے بعد ہی ہم اگلے مرحلے کی طرف جاتے مگر ٹوٹی کہاں کمند...... میں خود اغوا ہوگیا۔میرے دوستوں کے لیے یک نہ شد دو شد اور عذاب...... پہلے شہناز کا چکر تھا۔اب یہ بھی کہ نواب صاحب کہاں غائب ہوگئے۔

یہ چند سیکنڈ کا سوچ بچار مجھے مہنگا پڑ گیا۔اغوا کار اس کا مطلب نہ جانے کیا سمجھے۔مجھے پتا ہی نہیں چلا کہ مجھ سے بات کرنے والے نے کب کوئی اشارہ کیا اور حلقہ بنا کے مستعد کھڑے ہوئے آٹھ افراد نے یکلخت گھیرا تنگ کرکے مجھے ہر طرف سے یوں دبوچا کہ میں حرکت بھی نہ کرسکا۔

میرا مزاحمت کا کوئی ارادہ نہ تھا لیکن اغوا کاروں نے رسک لینا مناسب نہیں سمجھا۔کسی نے میرے سر کو بندوق کے بٹ سے نشانہ بنایا۔وار کرنے والا کسی سرجن کے ANESTHESIA سے بیہوش کرنے والے ماہر کی طرح تھا جو مریض کو دیکھ کر طے کرتے ہیں کہ دوا کی کتنی مقدار کافی ہوگی۔

مجھے چکر آیا اور میری نظروں کے سامنے اندھیرا پھیل گیا۔آخری احساس یہ تھا کہ گرنے سے پہلے مجھے اٹھا لیا گیا ہے۔دوبارہ ہوش میں آنے کا تجربہ بھی کم ناخوشگوار نہ تھا۔ایک کمرے کا منظر آہستہ آہستہ اپنی ساری تفصیل کے ساتھ

میرے سامنے آیا۔ پہلے منظر دھندلا اور کم روشن تھا، پھر روشنی بڑھتی گئی لیکن کمرے کی دیواریں، چھت اور چھت سے آویزاں بلب اور ہر چیز جو پہلے گھوم رہی تھی کچھ دیر یوں جھولتی رہی۔ جیسے روشنی کی حرکت سے سائے لہراتے ہیں۔

جب بالآخر میری نظریں ہر چیز کو صحیح طور پر فوکس کرنے لگیں تو میں نے پختہ دیواروں والا ایک کمرا دیکھا جس کی دیواروں پر چونے کی سفیدی تھی۔ کمرے میں آرائش نام کی کوئی چیز نہ تھی اور یہ کسی گاؤں کے عام سے مکان کا حصہ تھا۔

میں جان کے پلنگ پر لیٹا ہوا تھا۔ میرے جسم کے نیچے روئی کا گدا تھا اور سر کے نیچے تکیہ۔ گدے کا استر خاتون خانہ کے پرانے اور ناکارہ ہو جانے والے پھول دار کپڑوں کے ٹکڑے جوڑ کے بنایا گیا تھا اور سفید غلاف والے تکیے کے چکنے داغوں سے سرسوں کے تیل کی بو آرہی تھی۔

میرے سامنے کرسی پر جو شخص پہلے اطمینان سے بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا اور اس کا سارا دھواں بند کمرے میں محصور ہی تھا وہ اب کھڑا ہو گیا تھا اور مجھے غور سے دیکھ رہا تھا۔ وہ چھ فٹ سے نکلتے قد کا چوڑا چکلا آدمی تھا۔ اس کا پُرگوشت چہرہ گھنی سیاہ داڑھی اور میچ کرتی مونچھوں کے ساتھ خاصا خوفناک لگتا تھا۔ اس تاثر میں اس کی بڑی بڑی لال آنکھیں اضافہ کرتی تھیں۔ وہ کریم کلر کی گھیردار دو گھوڑا بوسکی سے بنی ہوئی شلوار قمیص میں تھا اور اس کے بالوں بھری کلائی پر جانی پہچانی راڈو گھڑی جگمگا رہی تھی۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ وہ کوئی سکہ بند ڈاکو ہے۔

مجھے اپنی طرف متوجہ پا کے وہ مسکرایا۔ ''معاف کرنا سائیں۔ ہمارے بندے آپ کو ایسے اٹھا کر لائے۔''

اس کی آواز بھی اس کی شخصیت کی طرح بھاری تھی۔ اس کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا اور وہ سندھی لہجے میں اردو بول رہا تھا۔

میں نے اپنا سر دبا کے کہا۔ ''اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے انکار تو نہیں کیا تھا۔''

''بس سائیں۔ سمجھنے میں غلطی لگ جاتی ہے۔ ابھی آپ بولو کیسا حال ہے۔''

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''جیسا ہونا چاہیے۔ سر میں سخت درد ہے۔''

اس نے کرسی پر بیٹھ کر کسی کو آواز دی۔ بند دروازے کے پیچھے سے ایک مریل سا نوجوان نمودار ہوا جو کسی طرح بھی ڈاکو نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ غالباً اس گھر کا مکین تھا۔ ڈاکو نے اسے چائے اور دوائی لانے کا حکم دیا۔ وہ اپنی کاجل بھری آنکھوں سے مجھے دیکھتا ہوا سر ہلا کے چلا گیا۔ اس کے اطوار میں بڑی مضحکہ خیز نسوانیت تھی۔ ممکن ہے وہ تیسری جنس سے تعلق رکھتا ہو۔

''سائیں سب سے پہلے اپنا تعارف کرا دو۔ مجھے تو جانتے ہی ہو تم ورنہ ایسے کیوں طلب کرتے......'' میں نے کہا۔

وہ بولا...... ''یہ ٹھیک ہے سائیں......ہم ایسے لوگ نہیں ہیں کہ آپ کو بلاتے اور آپ آجاتے۔ میرا نام ہے سورج مل ایڈوانی......ادھر سندھ کے علاقے میں ہندو بہت ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے تمہارے مذہب سے کیا۔''

''وہ جو انڈیا میں ایل کے ایڈوانی ہے۔ اپنے قبیلے کا ہے لیکن وہ میرے باپ کو جانتا تھا۔ ڈاکو کسی قبیلے کا نہیں ہوتا۔ اس کا اپنا قبیلہ ہوتا ہے۔ اس قبیلے کا ایک بندہ آپ کا بھی سنگی ہے۔''

میں چونکا۔ ''کس کی بات کر رہے ہو تم؟''

''شامی بادشاہ کی سائیں اور کس کی۔'' وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ''ابھی وہ کدھر ہے؟''

میں نے سر ہلایا۔ ''مجھے نہیں معلوم۔''

زنانہ ادا میں آنے والا لڑکا چائے کی ٹرے کے ساتھ نمودار ہوا۔ ''اب اسے کہاں رکھوں؟'' اس نے کمر لچکائی۔

سورج مل نے اسے خاصا فحش جواب دیا کہ اس پر رکھ دے۔ وہ ٹرے کو میرے سامنے چارپائی پر رکھ کر مسکراتا ہوا نکل گیا۔ ٹرے میں ابلتی چائے کے دو مگ تھے جو روایتی انداز میں چینی پتی کے ساتھ دودھ کو خوب ابال کے تیار کی گئی تھی۔ بسکٹ کا بند ڈبا تھا اور اسپرین کی گولیوں کا پورا پتا۔ گولیاں نگلنے کے لیے شیشے کے میلے گلاس میں پانی تھا۔

میں نے گولیاں حلق سے اتارنے کے لیے پانی کا پورا گلاس خالی کر دیا۔ میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ گرم چائے اس وقت مجھے بڑی نعمت محسوس ہوئی۔ کچھ دیر ہم دونوں خاموشی سے چائے پیتے رہے۔ دوا کا اثر آدھے گھنٹے میں ہوتا لیکن نفسیاتی طور پر میں نے خود کو بہتر محسوس کیا۔

''ہم سب دن رات شامی بادشاہ کا پیچھا کرتے ادھر آئے ہیں نواب صاحب۔'' اس نے اچانک لہجہ بدل لیا۔ ''اور آپ کہتے ہو مجھے معلوم نہیں......''

میں نے سکون سے کہا۔ ''ہاں......سچ تو یہی ہے۔ اب کچھ اور سننا چاہتے تھے تم لوگ......آئی ایم سوری۔''

''دیکھو سائیں۔ ہم جانتے ہیں وہ ادھر آیا ہے۔ کہی

خبر ہے ہمارے پاس۔ وہ جدھر سے بھی گزرا ہے ادھر ہم نے اس کا کھوج لگا لیا۔ ہماری ناک کتے جیسی ہے۔ ہوا میں بندے کی بو پہچانتی ہے اور ہماری آنکھیں الو جیسی ہیں اندھیرے میں سایہ دیکھتی ہیں۔''

میں نے کہا ''پھر کیا مشکل ہے۔''

''مشکل یہ ہے وڈا سائیں کہ ادھر آ کے وہ گم ہو گیا ہے۔ چھپ گیا ہے کہیں اور ہم کو پتا چلا ہے کہ اس علاقے میں صرف ایک جگہ ہے ایسی...... جہاں وہ محفوظ ہے۔ وہ جگہ ہے آپ کی حویلی۔''

میں نے خالی مگ ٹرے میں رکھ دیا۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ جب وہ ادھر آتا ہے تو مجھ سے ضرور ملتا ہے۔''

''وہ آپ کی حویلی میں قیام کرتا ہے۔ آپ کا مہمان بنتا ہے۔''

میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ ''ہاں......حویلی میں جگہ کی کمی نہیں اور جب تم جانتے ہو کہ اس کے ساتھ ہمارا دوستی کا رشتا ہے تو پھر اسے کہیں اور جانے کی ضرورت بھی نہیں۔''

''وہ کہیں نہیں جا سکتا۔ اس سارے علاقے میں صرف آپ اس کے دوست ہو سائیں۔ باقی سب دشمن ہیں۔''

میں نے کہا ''سورج مل......کام کی بات کرو۔ مجھ سے تم کیا چاہتے ہو آخر؟''

''سائیں وڈا۔'' وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ ''اگر دوستی کا حق ادا کرنا ہے تو اس کو بولو کہ ہمارے ساتھ معاملہ ختم کرے۔ ایسے وہ کب تک بھاگ سکتا ہے۔''

میں نے کہا ''اگر تم چاہتے ہو کہ یہ پیغام شامی بادشاہ تک پہنچ جائے۔ تو میں کوشش کروں گا لیکن پہلے مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ معاملہ کیا ہے۔ تم کیوں اس کے پیچھے لگے ہوئے ہو۔''

اس نے اٹھ کر کمرے میں ٹہلنا شروع کیا۔ ''نواب سائیں۔ میں بتاتا ہوں۔ اپنی اس کے ساتھ کوئی دشمنی نہیں ہے ابھی تک۔ دوستی بھی کوئی نہیں۔ جیسے کراچی کا وکیل اور لاہور کا وکیل ایک ہی کام کرتے ہیں اپنے اپنے علاقے میں۔ جنگل میں شیروں کا بھی اپنا اپنا علاقہ ہوتا ہے۔ ایسے ہی ہمارا اپنا علاقہ ہے۔ شامی کا اپنا۔''

''پھر کیا بات ہے کہ تم اسے تلاش کر رہے ہو......؟''

''یہ لمبی کہانی ہے۔''

میں نے اپنی کلائی کی گھڑی پر نگاہ ڈالی۔ ''سورج مل......کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم یہ گفتگو کسی اور وقت پر اٹھا رکھیں۔ ابھی مجھے جلدی ہے۔''

''بابا جلدی کام شیطان کا۔'' وہ ہنسا۔

میں نے کہا۔ ''دیکھو...... میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس معاملے میں تمہارے ساتھ مکمل تعاون کروں گا...... تمہارا جو بھی معاملہ ہے اسے طے کرانے کے لیے جو کچھ مجھ سے ہو سکا میں ضرور کروں گا لیکن ابھی تم مجھے جانے دو۔''

وہ انکار میں سر ہلانے لگا۔ ''ہم کسی اجنبی پر بھروسا نہیں کرتے۔ تمہارا کیا پتا ادھر سے سیدھے جاؤ پولیس کے پاس۔''

میں نے کہا۔ ''سائیں، میں کیسے بتاؤں تمہیں کہ...... میری نیت بالکل صاف ہے۔ میں ایسا آدمی نہیں ہوں سورج مل......اگر تم میری قسم پر اعتبار کر سکتے ہو۔''

''نا وڈا سائیں......ہم کو معاف کرو۔ ہم نے بڑی لمبی چٹی داڑھی والوں کو دیکھا ہے عدالت میں اللہ کی کتاب ہاتھ میں لے کر جھوٹ بولتے۔ ایسے ہی ایک شخص کی گواہی پر ہم کو سیشن کورٹ نے سات سال قید سنا دی تھی۔ اس نے بولا کہ وہ جائے واردات پر موجود تھا۔ سؤر کا بچہ۔''

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''چلو تمہاری مرضی۔ میں تو چاہتا تھا کہ تم کو اپنی حویلی میں بلاؤں۔''

وہ قہقہہ مار کر ہنسا۔ ''او نواب......تو چریا ہے یار کہ ہم کو چریا سمجھتا ہے۔ ہم خود چل کے جائیں ایسی جگہ جدھر سے واپسی کا راستہ سیدھا قبرستان جائے۔''

میں نے برہمی سے کہا۔ ''سب لوگ ایک جیسے دھوکے باز نہیں ہوتے۔ نواب رفیق احمد شیرازی کے مہمان کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کے نہیں دیکھ سکتا۔ یہ سارا علاقہ جانتا ہے۔''

''جانتا ہوگا بابا۔ ہم نہیں جانتے۔''

میں نے کہا۔ ''اچھا اب کم سے کم الفاظ میں فوراً بتا دو کہ تمہارے اور شامی کے معاملے میں میرا کیا رول ہے۔''

''رول کیا۔ تم اس کو ادھر بلا لو۔''

میں نے کہا ''کہاں سے بلالوں؟ اور کیسے......اگر میں اس کو پیغام بھیجوں آج......تب بھی اس کے آنے میں وقت لگے گا۔ معلوم نہیں وہ کہاں ہے۔''

''میں نے بولا نا وہ ادھر آیا ہے۔'' وہ غصے سے دھاڑنے لگا۔

''چلاؤ مت۔ اگر وہ یہاں ہے تو مجھے نہیں معلوم......یہ ٹھیک ہے کہ وہ آتا ہے تو مجھ سے ضرور ملتا ہے لیکن ابھی تم نے خود بتایا کہ وہ خطرے میں گھرا ہوا ہے اور فرار ہوا ہے۔''

اس نے لات مار کے کرسی گرا دی۔ ''وہ تیری حویلی

میں ہے۔نواب..... تو نے چھپا رکھا ہے اسے۔''

میں نے کہا۔''دیکھو..... اس طرح تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ میں دہشت زدہ ہونے والا آدمی نہیں ہوں۔ اور زبردستی تم مجھ سے کچھ نہیں قبول کرا سکتے۔ اگر وہ میری حویلی میں ہوتا تو بھی تم نے کیسے فرض کر لیا کہ میں اپنے دوست اور اپنے مہمان کو لالچ یا ڈر سے تمہارے حوالے کر دوں۔ یہ ناممکن ہے سورج مل۔ تم مجھے الٹا لٹکا کے میری کھال کھینچ لو پھر بھی تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ مجھے اپنی جان کی بالکل پروا نہیں ہے۔''

وہ میرے پاس بیٹھ گیا اور کچھ دیر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتا رہا۔''ہم تجھے اپنے ساتھ لے جائیں گے۔''

''میں نے کہا۔''جیسی تمہاری مرضی۔''

''اور جب تک تم ہماری ملاقات شامی بادشاہ سے نہیں کرواؤ گے تم ہماری قید میں رہو گے۔''

میں نے کہا۔''مجھے منظور ہے۔ اگرچہ اس طرح میری جان سے زیادہ قیمتی کسی اور کی جان بھی جائے گی۔''

''تم کس کی بات کر رہے ہو؟''اس کا لہجہ بدل گیا۔

میں نے کہا۔''سورج مل..... میرے ساتھ حویلی میں میرا دوست راجا بھی ہے جو مجھے بھائیوں سے زیادہ عزیز ہے۔ اس کی منگیتر ہے ڈاکٹر شہناز۔ وہ بھی حویلی میں رہنے آ گئی تھی۔ ہم اس علاقے میں لوگوں کے لیے ایک اسپتال قائم کرنا چاہتے تھے جہاں ان کا مفت علاج ہو۔''

''کیسا مفت علاج۔ جیسا سرکاری اسپتالوں میں ہوتا ہے۔ سائیں۔''وہ طنزیہ انداز میں بولا۔

میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ڈاکٹر شہناز نے آس پاس کے دیہات میں گھوم پھر کے اور گھر گھر جا کے بیماروں کو دیکھنا بھی شروع کر دیا تھا۔ وہ دوائیں بھی دیتی تھی اور بیماریوں سے بچاؤ کے انجکشن بھی لگا رہی تھی۔''

ہم ایک بہت لمبے منصوبے پر کام کر رہے تھے۔ ہم یہاں اسکول بھی بنانا چاہتے تھے۔ لوگوں کو روزگار بھی فراہم کرنا چاہتے تھے۔ دریا پر ڈیم بنا کے بجلی پیدا کرنا اور اس سے لکڑی کے کارخانے چلانا بھی ہمارے پروگرام میں شامل تھا۔

وہ اب حیرانی اور دلچسپی سے میری بات سن رہا تھا۔''تم کس قسم کے نواب ہو۔''

میں نے کہا''ہاں..... میں وہ روایتی جاگیردار نہیں ہوں۔ میں نے ولایت میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور پھر سب کچھ چھوڑ کر یہاں آ گیا۔ پیسا بھی وہاں بہت کما رہا تھا۔ پیسا یہاں بھی میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں۔ میرے دل میں بڑا درد ہے۔ ان سب ہم وطنوں کے لیے جن کو حکمران پچاس سال سے لوٹ رہے ہیں۔ جن کے پاس صحت، تعلیم، روزگار کچھ نہیں۔ مگر اکیلا میں پاکستان کو امریکا تو نہیں بنا سکتا۔ مجھے ایک کیا دس زندگیاں مل جاتیں تب بھی یہ ناممکن تھا لیکن میں اپنے حصے کا یہ کام ضرور کر سکتا ہوں جو میں کر رہا ہوں۔ شاید میں ست بدھائی کے لوگوں کو آیندہ دس بیس برس میں ایک بہتر معیارِ زندگی دے سکوں لیکن تمہیں یہ سب بتانے کا فائدہ؟ تم بھی تو ایک ڈاکو ہی ہو۔ حکمرانوں کی طرح۔''

''میں سن رہا ہوں سائیں اور سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ تمہارے جیسے بندے کا شامی بادشاہ سے دوستی کا رشتا کیسے ہو گیا۔ یہ رشتا تو وہی ہے جو ہاریوں، مزارعوں کا خون چوسنے والے وڈیروں کا ہم جیسے ڈاکوؤں سے ہونا ہے۔ وہ ہماری حفاظت کرتے ہیں۔ ہم ان کی دہشت قائم رکھتے ہیں۔ کسی کو سر نہیں اٹھانے دیتے۔''

''اس رشتے کی نوعیت بالکل مختلف ہے۔ شامی بادشاہ میری مدد کر رہا ہے۔ مجھے طاقت فراہم کر رہا ہے۔ اس علاقے میں ویسا ہی ایک وڈیرا ہے رانا رجب علی۔ لوگوں کی جان و مال اور آبرو سے کھیلنے والا۔ انہیں غلام بنا کے جوتے کے نیچے رکھنے والا۔ وہ میرا بھی دشمن ہو گیا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ میں لوگوں کی فلاح و بہبود کے کام مقبولیت حاصل کرنے کے لیے کر رہا ہوں اور ایک دن اس کے مقابلے پر کھڑا ہو کے اس سے اسمبلی کی سیٹ چھین لوں گا۔ یہ سیٹ جدی پشتی طور پر اس کی ہے۔ اس نے ڈاکٹر شہناز کو ڈرایا دھمکایا کہ وہ مفت علاج کا سلسلہ بند کرے اور جب وہ نہیں مانی تو اسے اغوا کر لیا۔''

میری چال کامیاب رہی تھی۔ میں اس کی دلچسپی کو ہمدردی میں بدل چکا تھا۔ وہ اب بڑے غور سے میری بات سن رہا تھا۔

میں نے اپنی بات جاری رکھی۔''جب تمہارے بندوں نے مجھے گھیرا تو میں رانا رجب علی سے فیصلہ کن بات کرنے جا رہا تھا۔''

''کیسی فیصلہ کن بات؟''

''میں نے پہلے پولیس کے اعلیٰ افسران کے ساتھ جا کے بات کی تھی کہ وہ ڈاکٹر شہناز کی بازیابی میں میری مدد کرے مگر اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔ اب مجھے ثبوت مل گیا ہے کہ ڈاکٹر اس کی حویلی میں قید ہے۔ میں نے شامی بادشاہ کو پیغام دیا تھا اور یہ تمام صورتِ حال بتائی تھی۔ اس کا

جواب آیا کہ رانا کو نوٹس دے دو۔ اگر اس نے ڈاکٹر شہناز کو نہ چھوڑا تو پھر اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے گا۔ ہم بھی اس کے گھر کی کوئی عورت اٹھا لیں گے۔ افسوس کہ شامی خود نہیں آیا۔''

''وہ آ بھی نہیں سکتا۔''سورج مل نے کرسی سیدھی کی اور اس پر بیٹھ کے کچھ سوچنے لگا۔

میں نے کہا''وہ تو موت کو بھی جل دے کر نکل جاتا ہے۔ اتنا بزدل وہ کبھی نہیں تھا کہ خطرے سے ڈر کے یار کی مدد کرنے بھی نہ آئے۔''

''بات بزدلی کی نہیں سائیں وڈا..... کبھی بندے کو احتیاط کرنی پڑتی ہے۔ یہ بہادری نہیں ہوتی کہ لاٹھی لے کر توپ کا مقابلہ کرنے کھڑے ہو جاؤ..... یہ بے وقوفی ہوتی ہے اور شامی بے وقف نہیں ہے۔''

''یہ تو مانتا ہوں میں۔''

''آج کل اس پر برا وقت ہے۔ برے وقت میں اپنا سایہ بھی دشمن ہو جاتا ہے۔ اپنے پرائے سب ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔''

میں نے کہا''ایسی کیا بات ہوئی ہے اس کے ساتھ۔''

میں نے انجان بنتے ہوئے کہا کیونکہ بات تو مجھے پہلے ہی شامی کی زبانی معلوم ہو چکی تھی۔

وہ پھر اٹھ کر ٹہلنے لگا۔''ابھی آپ کو کیسے سمجھاؤں میں۔ یہ بات شروع ہوئی غیر علاقے سے۔ ادھر ایک وزیر کے سالے کو اغوا کیا گیا۔ وزیر سرکاری پارٹی کا خاص آدمی تھا۔ اس کی بیوی کا خاندان بھی بڑا اثر رسوخ رکھتا ہے۔ سب پیسے والے لوگ ہیں۔ اس کی رہائی کے لیے پہلے چار کروڑ کا مطالبہ کیا گیا۔ پھر پولیٹیکل ایجنٹ اور قبائلی سرداروں کی معرفت سودے کی بات ہوئی تو تاوان کی رقم نصف کر دی گئی لیکن ادائیگی کے طریقے پر کچھ مسئلہ بن گیا۔ اغوا کرنے والوں کو شک تھا کہ تاوان کی ادائیگی کرنے والوں کی نیت ٹھیک نہیں۔ انہوں نے سرکاری مخبر جاسوس اور ایجنٹ پیچھے لگا رکھے ہیں اور جب رقم وصول کر کے بندہ واپس کرنے کا وقت آئے گا تو خون خرابہ ہوگا۔ پولیس یا ایف سی کے کمانڈر اغوا کرنے والوں کو مار دیں گے۔ وزیر کا قبیلہ ضمانت دیتا تھا کہ ایسا نہیں ہوگا خود ادھر اپنی سیاسی طاقت کے غرور میں تھا۔ نتیجہ یہ کہ بات چیت رک گئی۔ اور معاملہ کچھ ایسا ہو گیا کہ بیچ میں پڑنے والے بھی پیچھے ہٹ گئے۔''

''میں نے تو سنا ہے کہ پٹھان اپنی زبان پر جان دیتے ہیں۔''

''بالکل دیتے ہیں سائیں۔ اور ہماری برادری بھی قول کی پکی ہوتی ہے۔ لیکن وہ کیا بولتے ہیں اس کو..... کالی بھیڑ۔ وہ ہر جگہ ہوتی ہے۔ بے شک آٹے میں نمک کے برابر ہوں لیکن شیطانوں میں فرشتے اور فرشتوں میں کچھ شیطان ملتے ہیں۔ ہر قوم میں، ہر قبیلے میں، ہر علاقے میں، اغوا کرنے والوں نے اسامی کو فروخت کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ سامنے آنے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتے تھے اور ان کو یہ ڈر بھی تھا کہ حکومت سے ٹکر لینا مہنگا نہ پڑے۔ ادھر انگریز کا قانون آج بھی چلتا ہے۔ مجرم ہاتھ نہ آئے تو اس کے خاندان کو پکڑ کے جیل میں ڈال دیتے ہیں۔

''تم فرنٹیئر کرائمز ریگولیشن کی بات کر رہے ہو؟''

اس نے سر ہلایا۔''ہاں.....''ڈیرہ اسماعیل خان اور ہری پور کے علاوہ بہت سی جیلوں میں عورتیں بچے بند ہیں۔ تین سال کا ایک بچہ بھی اپنے باپ کے جرم کی سزا کاٹ رہا ہے۔ اپنی جان چھڑانے کے لیے انہوں نے بندہ ہمارے حوالے کر دیا۔ ہم نے اسے خطرے سمیت خرید لیا آدھی قیمت میں۔ بندہ غیر علاقے سے سندھ پہنچا دیا گیا۔ ہم نے ایک کروڑ دے دیے۔ اب دو کروڑ ہم کیسے وصول کرتے ہیں۔ یہ ہمارا کام۔ وزیر نے سرکاری مشینری استعمال کی۔ پولیٹیکل ایجنٹ سے گورنر سرحد تک سب کا اثر رسوخ استعمال کر لیا لیکن اغوا کرنے والے ہی روپوش ہو گئے۔ انہوں نے پیغام بھیج دیا کہ بندہ اب ہمارے پاس نہیں ہے۔ وزیر کی بیوہ کا اس کے غم میں برا حال تھا۔ خود اغوا ہونے والا بہت طاقتور تھا۔ اس کی بیوی نے بھی بہت زور لگایا۔ ایسے معاملات میں قانون کی مدد کچھ نہیں کرتی۔ سپریم کورٹ کیا صدر کے احکامات بھی بے اثر رہتے ہیں۔ اس طرح دو ہفتے خاموشی میں گزر گئے تو اغوا ہونے والے کی فیملی کو یقین آنے لگا کہ بندہ ضائع ہو گیا ہے وہ رو پیٹ کے بیٹھ گئے تو ایک دن ان کی بات کرا دی گئی۔''

میں نے کہا۔''اور اتنا عرصہ وہ بندہ کہاں رہا؟''

سورج مل نے کرسی پر گرتے ہوئے کہا۔''یہی تو ساری بات ہے۔ وہ شامی بادشاہ کی ذمے داری تھا۔ اس کی قید میں تھا لیکن کسی ایک جگہ نہیں۔ پھر ایک دن ایسا ہوا کہ بندے کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا جا رہا تھا کہ وہ مر گیا۔''

''کیسے مر گیا؟''

''اگر وہ پولیس یا رینجرز کے آپریشن میں مارا جاتا تو شامی ذمے دار نہ ہوتا۔ کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔ مخبری یا غداری

سے بندے کی جان جاتی ہے۔ ہمارا مالی نقصان ہو جاتا ہے جانی نقصان کے ساتھ لیکن ایسا نہیں ہوا اگر اس کی لاش قانون نافذ کرنے والے ادارے لے جاتے تو معاملہ ختم ہو جاتا مگر نہ کوئی مقابلہ ہوا نہ لاش ملی۔ شامی کا کہنا تھا کہ اسے دوسرے گروہ نے چھیننے کی کوشش کی تھی۔ اس میں وہ مارا گیا مگر یہ جھوٹ ہے۔ ہم ڈاکو ہیں، چور نہیں۔ ایک دوسرے کے گھر میں نقب نہیں لگاتے۔ ہم نے سب سے پوچھا۔ سب نے انکار کیا۔ شامی سے بھی بولا وہ بھاگ گیا۔ یہ بھی جھوٹ تھا۔ بندے بعض اوقات غفلت کے باعث نکل جاتے ہیں۔ یا اپنی چالاکی سے۔ مگر بھاگ کے وہ واپس گھر تو جاتے ہیں۔ پھر اخبار میں پولیس کی کہانی آ جاتی ہے کہ اس نے کسی طرح کوشش کر کے مغوی کو رہائی دلائی۔ اور کوئی تاوان ادا نہیں کیا گیا۔ یہ سب جھوٹ بکواس ہوتی ہے مگر ایسا بھی نہیں ہوا۔

''اصل بات کیا ہوئی۔''

''مجھے شک ہے کہ خود شامی نے بندہ چھوڑ دیا۔ معلوم نہیں کیوں۔ وہ ملے تو اس سے پوچھا جائے۔ وہ ہماری امانت تھا۔ دو کروڑ کی اسامی تھی۔ شامی سے بھی بے وقوفی کی امید نہیں کی جا سکتی لیکن اس سے غلطی ہوئی ہے یا بے وقوفی۔ وہ ہمیں بتائے۔ مردوں کی طرح سامنے آ کے سچ بولے اور اصول یہ ہے کہ جرمانہ ادا کرے۔ ہمارا دو کروڑ کا نقصان ہوا ہے۔ یہ پورا کرے۔ اس کے علاوہ برادری جو کہے۔''

''برادری؟''

''ہاں...... ہماری ڈاکو برادری کی ایک پنچایت ہے۔ اس کو جرگہ بولو یا کچھ اور...... وہ جرمانہ لگائے گی۔ اصل نقصان کے برابر یا کم سے کم نصف۔ شامی کو تین کروڑ تو لازمی دینے ہوں گے۔ وہ بھاگ کیوں رہا ہے؟ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ اوپر آسمان پر بھی چلا جائے تو ہم فرشتوں سے کہیں گے اور وہ اسے پکڑ کے واپس دنیا میں لے آئیں گے اور ہمارے حوالے کر دیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''ہو سکتا ہے۔ شامی کے پاس تین کروڑ نہ ہوں۔''

''اس کو وقت مل سکتا ہے۔ چھ مہینے یا زیادہ سے زیادہ سال۔''

میں نے کہا ''اور اگر وہ جرمانہ ادا نہ کر سکے؟''

سورج مل نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ''پھر وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ جرگہ حکم دے گا تو اس کے اپنے ساتھی اسے مار ڈالیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''تم صرف یہ جرمانہ وصول کرنے کے لیے اس کے پیچھے لگے ہوئے ہو۔ اور کوئی وجہ نہیں؟''

''ارے بابا۔ پولیس کسی مفرور مجرم کے پیچھے کیوں لگتی ہے۔ وہ قانون توڑتا ہے اس لیے۔ جج کس لیے سزا سناتا ہے۔ انصاف قائم رکھنے کے لیے، جس نے جو بھی جرم کیا ہے اس کی سزا مقرر ہے۔ وہ بھگتے۔ ایسا تو نہیں ہوتا نواب صاحب کہ کسی کو چوری یا جیب کاٹنے پر پھانسی کی سزا سنا دی جائے اور سزا کاٹنے کے بعد جرم باقی نہیں رہتا۔ ہر مجرم جیل سے نکلتا ہے تو اس کے حقوق عام شہری کے برابر ہوتے ہیں۔ شامی بھی جرمانہ ادا کر دے تو معاملہ ختم...... وہ ہمارا ساتھی۔ جیسے پہلے تھا ویسے ہی......''

میں نے کہا۔ ''اگر یہ بات ہے سورج مل۔ تو سمجھو اس کا جرمانہ ادا ہو گیا۔''

وہ پھر تمسخرانہ انداز میں مسکرایا۔ ''یعنی میں فرض کر لوں؟ سوا ایک روپیا نہیں اور میں سمجھ لوں کہ دو کروڑ وصول ہو گئے؟ رسید بھی لکھ کر دے دوں؟''

میں نے کہا۔ ''میں مذاق نہیں کر رہا تھا۔ اس کا جرمانہ ادا کروں گا۔''

وہ کچھ دیر بے یقینی سے میری صورت دیکھتا رہا۔ ''دو کروڑ تم دو گے؟''

''ہاں...... لیکن اس کے بعد شامی کے خلاف کوئی فرد جرم باقی نہیں رہے گا۔'' میں نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

''سائیں تم ایسا کیوں کرو گے؟''

''فرض کر لو کہ میرا دماغ خراب ہو گیا ہے۔'' میں نے برہم ہو کے کہا۔ ''شامی نے دھمکی دی ہے مجھے کہ دو کروڑ ادا کر دو ورنہ تمہارے بیوی بچوں کو اٹھا لیا جائے گا اور میں ڈر گیا ہوں۔ حالانکہ ابھی شادی نہیں ہوئی میری۔''

''وڈا سائیں۔ ناراضگی کی بات نہیں۔ دو کروڑ کی رقم دو سو روپے نہیں کہ آدمی کسی کی مدد کے لیے جیب سے نکال لے۔ اگر اتنا فالتو ہے تمہارے پاس...... تو ٹھیک ہے۔''

''بات فالتو... ہونے کی نہیں تم مجھے بتاؤ خدانخواستہ تمہارے بھائی کو کینسر ہو جائے۔ تمہاری بہن کو اٹھا لے کوئی۔ تو تم پیسے کو دیکھو گے یا رشتے کو...... عام آدمی اپنا گھر بار بیچ دیتا ہے۔ اور اپنے بچے کو نہ بچا سکے تو پچھتاتا بہت کہ اس نے بے وقوفی کی تھی سن کہ جذباتی ہو گیا۔ وہ سمجھتا رہتا ہے کہ اس نے جو کیا ٹھیک تھا اور اسے یہی کرنا چاہیے تھا۔''

وہ حیرانی سے میری صورت دیکھتا رہا۔ ''اگر ایسا پکا رشتا ہے تمہاری شامی سے دوستی کا۔ تو مجھے یقین ہے کہ تم نے ضرور اسے اپنی حویلی میں پناہ دی ہے۔ جان دینے کا دعویٰ بھی غلط نہیں لیکن ابھی تم دو کروڑ دے کر اس کو بچا رہے ہو۔ آفرین۔ صد آفرین۔''

میں نے کہا۔ ''اب بتاؤ تم کون وصول کرے گا۔ اور کب۔''

''رقم میں وصول کروں گا۔ تمہیں اعتبار ہے مجھ پر۔''

میں نے کہا ''رقم خود شامی تمہارے ہاتھ پر رکھے گا۔''

''لیکن وہ ہے کہاں۔''

''اس کی تم فکر مت کرو۔ بتاؤ دو کروڑ کہاں لو گے۔ اپنے کسی ڈیرے پر...... یا میری حویلی آ کے۔''

وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ ساتھی تم واقعی مرد کا بچہ ہے۔ ایسے ڈاکو ضرور دیکھے ہیں ہم نے۔ نواب نہیں دیکھے۔ اور ولایت سے پڑھ کر آنے والے تو......''

اس کی ناقابل اشاعت تعریف کو میں نے نظر انداز کر دیا۔ ''ٹھیک ہے، کل کا ٹائم دو مجھے۔ پرسوں رقم لے کر میں شامی کے ساتھ تمہارا حویلی میں انتظار کروں گا۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ہم نے پہلے بولا۔ اعتبار کا دھوکا ہم نہیں کھاتے۔ کسی کی شکل پر لکھا نہیں ہوتا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے یا سچ۔ اور دل کا حال صرف خدا جانتا ہے۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ اب یہ بتاؤ ہم کہاں آئیں۔''

''بتا دیں گے سائیں...... لیکن ابھی نہیں...... اڑتالیس گھنٹے لیے ہیں تم نے۔ ہمیں کوئی جلدی نہیں۔ جہاں اتنے دن گزرے ہیں دو چار دن اور گزر جانے سے فرق نہیں پڑتا۔ تم رقم تیار رکھو۔ ہمارا پیغام تم تک پہنچ جائے گا۔

''ٹھیک ہے سورج مل، رقم حویلی میں ہو گی۔ تم جب چاہو آ جاؤ۔ وہ تمہاری امانت ہے۔'' میں نے کہا ''لیکن اس کے ساتھ ایک بات اور اچھی طرح سمجھ لو۔ اگر تم نے اسے مال غنیمت جانا اور لوٹ کر لے جانے کی کوشش کی تو میرا تمہیں چیلنج ہے۔''

وہ ہنسنے لگا۔ ''ارے وڈا سائیں۔ تم کو کچھ معلوم نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''سب معلوم ہے مجھے۔ وہ بھی جو کچھ لوگ کہتے ہیں مگر ان کے دل میں کچھ اور ہوتا ہے۔ دنیا دیکھی ہے میں نے بھی۔''

وہ بدستور افسوس سے نفی میں سر ہلاتا رہا۔ ''تبھی نواب صاحب۔ بے شک آپ نے یورپ امریکا دیکھا ہے۔ لاہور کراچی دیکھا ہے مگر آپ کو ہماری دنیا کا کچھ پتا نہیں۔ ابھی دیکھو شامی ڈاکو تمہارا یار ہے نا۔ وہ کیسا آدمی ہے۔''

''اچھا آدمی ہے۔ یاروں کا یار۔ زبان کا پکا۔ قول نبھانے والا۔ ان شریفوں اور شریف زادوں کے مقابلے میں لاکھ درجہ بہتر جو اسے ڈاکو سمجھتے ہیں اور برا سمجھتے ہیں۔''

''ہاں...... یہی میں بھی بولتا ہوں۔ جو ذہن اور قول سے پھرے وہ ڈاکو ہی نہیں ہوتا۔ وہ چور یا اٹھائی گیرے ہوتے ہیں جو ایسا کرتے ہیں۔

''ہم نے دیکھ لیا کہ تمہارا دل کتنا بڑا ہے اپنے یار کے لیے۔ پھر بھی تمہیں دکھا دیں گے کہ اعتبار کے معاملے میں سورج مل تمہارے دوست شامی بادشاہ سے کم نہیں۔

ہم پرسوں آئیں گے۔ دن کے اجالے میں اور دروازے پر دستک دے کر مہمانوں کی طرح۔ تم دیکھ لو گے۔''

میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ ''نواب رفیق احمد شیرازی پورے عزت واحترام کے ساتھ تمہارا استقبال کرے گا۔ تم بھی دیکھ لو گے۔ آج کی اس ملاقات اور ہمارے درمیان طے پانے والے معاہدے کے بارے میں کسی کو علم نہیں ہو گا۔ سوائے شامی بادشاہ کے۔ تم بے خوف ہو کے آؤ۔ اور اطمینان رکھو۔ اس میں میری کوئی چال نہیں ہے۔''

اس نے مجھ سے ہاتھ ملا کے کہا۔ ''سائیں۔ ہم چالبازی کرنے والے کی نظر بھی پہچانتے ہیں۔ صورت بھی اور نیت بھی۔ لیکن پہچاننے میں غلطی ہو جائے تو پھر جو اللہ کو منظور۔ موت سے ہم نہیں ڈرتے۔ موت اپنی سنگی ساتھی ہے لیکن چالباز کو اندازہ نہیں ہوتا کہ اس نے اپنی زندگی کتنی مختصر کر لی ہے۔''

میں نے کہا۔ '' میرا خیال ہے کہ اب مجھے جانا چاہیے۔''

اس نے معذرت آمیز انداز میں کہا۔ '' تمہاری گاڑی حاضر ہے لیکن یہاں سے تم کو چھوڑنے بھی وہی لوگ جائیں گے جو تمہیں یہاں لائے تھے۔''

میں نے مذاق میں کہا۔ ''اسی طرح...... بے ہوش کر کے۔''

وہ ہنسنے لگا۔ ''جیسے آپ بولو سائیں۔ آنکھوں پر پٹی

باندھ کے بھی گزارا ہوجائے گا۔“

میں نے یہ شرط منظور کر لی۔ ظاہر ہے ڈاکو مجھے اپنے ٹھکانے کا سراغ دے کر آزاد نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ اعتبار میں اس حد تک آگے نہیں جا سکتے تھے کہ اپنی حفاظت کے خیال سے غافل ہوجائیں۔ انہوں نے میری آنکھوں پر سیاہ الاسٹک بینڈ چڑھا دیا جو تین چار انچ چوڑا تھا اور مجھے گاڑی میں پیچھے بیٹھا دیا۔ میرے اندازے کے مطابق گاڑی میں میرے ساتھ چار افراد ہونگے۔ دو میرے دائیں بائیں بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ شاید... اس کے ساتھ والی سیٹ پر ہی ہوگا۔

فاصلے کا اندازہ وقت سے کرنا ممکن نہیں تھا۔ گاڑی اگر سیدھی سڑک پر اس رفتار سے رواں رہتی تو آدھے گھنٹے میں بیس پچیس میل ضرور جاتی لیکن یہ ہوسکتا تھا کہ اسے دو چار میل کے دائرے میں دائیں بائیں گھمایا پھرایا گیا ہو۔ آدھے گھنٹے بعد گاڑی رک گئی۔ میرے دائیں بائیں، بیٹھے ہوئے نگراں فرشتے دروازہ کھول کے اتر گئے۔ آگے والے چند منٹ بعد اترے۔ مجھ سے کسی نے کوئی بات نہیں کی۔

میرے کانوں نے ان کے دور جاتے قدموں کی چاپ سنی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔ میں کچھ دیر اپنی جگہ بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ پھر میں نے کہا۔ ”ہیلو...... کیا اب میں پٹی اتار دوں۔“

کسی نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ جہاں گاڑی رکی ہوئی تھی وہاں ہر طرف جنگل کا سکوت تھا۔ ہوا ساکت تھی چنانچہ شاخوں اور پتوں کی حرکت کی آواز نہیں تھی۔ درختوں میں خوابیدہ پرندے چپ تھے۔ اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے بولنے والے جھینگر اور مینڈک تک خاموش تھے۔

میں نے سمجھ لیا کہ مجھے یہاں تک لانے والے جا چکے ہیں۔ آہستہ سے میں نے پٹی کو کھینچ کے اتارا تو مجھے چار سو ہی

جنگل نظر آیا جو ست بدھائی میں میلوں تک پھیلا ہوا تھا۔ گاڑی کا انجن چل رہا تھا۔ اور لائٹس آن تھیں۔ میں نے گھڑی دیکھی تو اس کے روشن حروف نصف منٹ کے بعد تاریخ بدل جانے کا اعلان کر رہے تھے۔

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ کے میں نے غور سے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ آسمان پر نظر آنے والے قطبی ستارے نے مجھے سمت کا تعین کرنے میں مدد دی۔ میں نے گاڑی کو آگے بڑھایا۔ آہستہ آہستہ میں اپنے علاقے کی شناخت کرنے لگا تھا۔ سارے درخت جو پہلے مجھے ایک سے لگتے تھے اب مخصوص علامات کے حوالے سے پہچانے جاتے تھے اور کچھ لینڈ مارک کے راستوں کا سراغ دینے لگے تھے۔

گاڑی کو کچے راستے پر جس رخ کھڑا کیا گیا تھا میں نے اسی سمت میں آگے بڑھا دیا۔ دن کے اجالے میں سمت کا اندازہ یقیناً آسان ہوتا لیکن قطبی ستارے سے شمال کا تعین کرنے کے بعد میں یہ سمجھنے میں حق بجانب تھا کہ میں صحیح راستے پر اور صحیح سمت میں جا رہا ہوں۔ دریا اس وقت میرے بائیں ہاتھ پر ہے اور حویلی دائیں ہاتھ پر ہوگی۔

کچے راستے کی چوڑائی اتنی ہی تھی کہ گاڑی گزر سکتی۔ بعض جگہ درختوں کی شاخیں اس سے ٹکرائی تھیں یا جھاڑیاں راہ میں حائل ہوئی تھیں۔ اب تک اور کوئی خرابی تو نہیں ہوئی تھی لیکن سب گاڑیوں کے رنگ روغن کا بیڑا غرق ہو چکا تھا۔ ان کی بیرونی سطح پر خراشوں کا جال بچھ گیا تھا۔ یہ نازک اور خوبصورت گاڑیاں شہر کی ہموار سڑکوں پر نزاکت اور سبک رفتاری سے چلنے کے لیے بنائی گئی تھیں جن کو ہم جنگل کے ناہموار پرخار اور دشوار راستوں پر دوڑاتے پھر رہے تھے۔ یہ ایسا ہی تھا جیسے ریشمی لباس اور اونچی ایڑھی کی نازک جوتی پہن کے کوئی لڑکی جس نے کبھی کار سے نیچے قدم نہ رکھا ہو اس جنگل میں میلوں چلنے پر مجبور ہو۔ جیسے ہم یہاں جنیز اور جوگرز استعمال کرتے تھے ایسے ہی یہاں دوڑانے کے لیے جیپ یا ایسی ہی سخت جان فور وہیل ڈرائیو گاڑیوں کی ضرورت تھی۔ میں نے یہ پوائنٹ نوٹ کر لیا۔ پہلی فرصت میں ہمیں ان گاڑیوں کی جاں بخشی کروانی چاہیے۔

پندرہ منٹ بعد ایک جانا پہچانا دوشاخہ آگیا۔ میں نے کچھ دیر عقل کے گھوڑے دوڑائے اور پھر گاڑی کو ایک راستے پر ڈال دیا لیکن دس منٹ بعد ہی مجھ پر واضح ہوگیا کہ میرا فیصلہ غلط تھا اور میں مخالف سمت میں اپنے گھر سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ یہ احساس ہوتے ہی میں نے گاڑی کو موڑا اور واپس چلنے لگے تو بیچ راستے میں مجھے ایک بھیڑیا نظر آیا۔ روشنی پڑنے سے اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

اس سے پہلے میں نے بارہا لومڑی اور گیدڑ جیسے جانور دیکھے تھے جو انسان کو دیکھتے ہی فرار ہوجاتے تھے۔ بھیڑیے سے یہ پہلی ملاقات تھی۔ جو اپنی نوع کے دیگر حیوانوں سے زیادہ خونخوار مکار اور خطرناک سمجھا جاتا ہے۔ انسان سے تو شیر بھی ڈرتا ہے اور اسے مشتعل نہ کیا جائے یا وہ بھوک سے مجبور نہ ہو اس وقت تک وہ آدمی پر حملہ نہیں کرتا۔ یہ بھیڑیا تو جانے کیوں اپنی جگہ جما کھڑا تھا۔ گاڑی کی روشنی پڑنے پر تو

اسے ضرور بھاگ جانا چاہیے تھا۔

میں بند شیشوں والی گاڑی میں بالکل محفوظ تھا۔ میرے پاس ریوالور بھی تھا لیکن میں اسے ہلاک کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے سنا تھا کہ بھیڑیے غول کی صورت میں پھرتے ہیں۔

یہاں مجھ سے کبھی کسی نے خطرناک خوں آشام جانوروں کی موجودگی کا ذکر نہیں کیا تھا۔ شیر تو اب پاکستان کے چڑیا گھروں کیلئے امپورٹ کئے جاتے ہیں لیکن بعض علاقوں میں چیتے کی نسل کے جانور ریچھ اور بھیڑیے بہر حال پائے جاتے ہیں۔ یہ بھیڑیا بھی شاید کہیں سے آگیا تھا۔

میں نے اسے راہ سے ہٹانے کے لیے ہارن کو زور سے بجایا اور انجن کو ریس دے کر غراہٹ سے اسے ڈرانا چاہا مگر وہ ٹھہرا رہا۔ بالآخر میں نے گاڑی کو روک دیا اور شیشے کو تھوڑا سا کھول کے آسان اردو میں اسے ڈانٹا کہ دفع ہوجائے اور راستہ چھوڑ دے۔ وہ دانت نکوستا اور غراتا رہا اور غالباً سوچتا رہا کہ کیا کرے۔ یہ فولادی باڈی اور تیز روشنی والا مشینی جانور تو کھانے کے لائق ہے نہیں اور جسے کھایا جا سکتا ہے وہ اندر سے نہ جانے کیا کہہ رہا ہے۔

بالآخر وہ ہٹ گیا۔ میں نے بعد میں راجا سے ذکر کیا تو اس نے یہ خیال ظاہر کیا کہ وہ کہیں سے بھولا بھٹکا آگیا ہوگا اور اس نے کار جیسا جانور زندگی میں پہلی بار دیکھا ہوگا۔ شاید وہ اتنا بھوکا ہوگا کہ مجھے دیکھ کر اس کے منہ میں پانی بھر آیا ہوگا۔ یا پھر وہ پاگل ہوگیا ہوگا۔ قطع نظر ان تمام باتوں کے جو ہم نے غیر سنجیدگی سے کی تھیں۔ یہ ایک وارننگ تھی کہ جنگل میں کم سے کم ایک بھیڑیا ضرور ہے۔ اگر اس کی مادہ بھی ساتھ ہے یا پورا قبیلہ یہیں رہتا ہے تو ہم سب کو جنگل میں سفر کرتے ہوئے اپنی حفاظت کے خیال سے بے خبر نہیں رہنا چاہیے۔

آدھے گھنٹے میں حویلی سامنے آگئی۔ اس کے گیٹ پر نصب سرچ لائٹ کا رخ پل کی طرف سے آنے والے راستے پر بھی تھا چنانچہ باہر کھڑے ہوئے گارڈ نے دور سے ہی میری گاڑی پہچان لی اور گیٹ کھول کے اندر والے گارڈ کو ٹارزن کی واپسی سے مطلع کیا۔ نتیجہ یہ کہ جب اندر پہنچ کے میں گاڑی سے اترا تو میرے دوست جو میرے عزیز و اقارب بھی تھے یوں مجھ سے ملنے دوڑے جیسے میں دوسری دنیا سے لوٹا ہوں۔

مجھے گلے لگانے والوں میں فریال کے ساتھ رابعہ تھی۔ استقبال کے مردانہ اور زنانہ انداز میں بڑا فرق تھا۔ راجا نے مجھے دو مکے مارے اور چار گالیاں دیں۔ خواتین نے آٹھ آٹھ یعنی مجموعی طور پر سولہ آنسو بہا کے پوچھا کہ میں کہاں چلا گیا تھا۔ راجا نے پوچھا کہ کہاں مر گیا تھا۔

رات کے سوا دو بجے میں نے جوتے اتار کے اپنے ایڈونچر کا تذکرہ شروع کیا تو بے حد سسپنس اور اشتیاق کے ساتھ ایک سنسنی خیز سفر کی روداد سننے والوں میں مس ریشم جان اسپیشل اسسٹنٹ ٹو ڈاکٹر شہناز بھی شامل تھی مگر اسے ڈانٹ ڈپٹ کر کے کچن کی طرف روانہ کر دیا گیا کہ کافی لاؤ۔ اس نے اپنی بغیر گرامر کی انگلش میں احتجاج کیا اور کہا کہ اسے بھی میری اسٹوری سننے کا حق حاصل ہے مگر اس کی کسی نے نہیں سنی۔ فریال نے کہا کہ اسے بعد میں بتا دیا جائے گا لیکن جو نمبر فرسٹ شو میں بریکنگ نیوز کا ہوتا ہے وہ سنی سنائی میں کہاں۔ وہ منہ بسورتی اور شاید دل میں گالیاں دیتی گئی۔

رابعہ کا موڈ مجھے بہت اکھڑا اکھڑا سا لگ رہا تھا۔ بعض اوقات اسے محسوس ہوتا تھا جیسے وہ میری طرف متوجہ نظر آنے کے باوجود ذہنی طور پر کہیں اور ہے۔ میں اس کی ذہنی کیفیت کو سمجھ سکتا تھا۔ وہ اندر سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھی اور جیسے جیسے شہناز کی واپسی موخر ہوتی جا رہی تھی اس کا اعتماد بھی رخصت ہو رہا تھا۔ اس کے لیے خود کو بکھرنے نہ دینا مشکل سے مشکل تر ہونے لگا تھا۔ اس کی پُراعتماد پُرعزم اور پُرامید نظر آنے کی کوشش ناکام ہو رہی تھی۔

وہ شخص جو کسی معاملے کو سنجیدگی سے نہیں لیتا تھا۔ سوائے اپنے مشن کے، صحافت اس کا پیشہ نہیں ایک جنون یا OBSESSION تھی۔ خبر کی سچائی جاننے کے لیے اور اس کا اظہار کرنے کے لیے وہ کسی بھی خطرے کی آگ میں کود پڑتا تھا۔ انتظامیہ کی دھونس۔ انڈر ورلڈ کے کسی ڈان کی دھمکی۔

کسی قسم کی رشوت یا لالچ اسے اپنے مقصد سے روگردانی پر مجبور نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے مار کھائی تھی، ہڈیاں تڑوائی تھیں اور جیل میں بند رہا تھا لیکن خوف زدہ ہونا اس کی فطرت کے خلاف تھا۔ ایسا ہی رویہ وہ دیگر معاملات زندگی میں رکھتا تھا۔ وہ ایک شوقین مزاج ہلے بوائے تھا۔ لڑکیوں کو ورغلا کے محبت کا یقین دلانا۔ شادی کے وعدے پر ان کے ساتھ عیش کا وقت گزارنا اور پھر انہیں بھلا دینا۔ یہ اس کے نزدیک بالکل معیوب تر تھا کیونکہ اس کا ٹارگٹ ہی فلرٹ ٹائپ لڑکیاں ہوتی تھیں یا بعض اوقات وہ راجا کو ٹارگٹ بنالیتی تھیں۔ راجا کو پینے پلانے کا شوق بھی تھا لیکن اس کی لت نہیں تھی۔ وہ بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست کے فلسفے پر پوری طرح کار بند تھا۔

صرف شہناز کا معاملہ مختلف تھا۔ کیونکہ یہ محبت تھی۔ اصلی سچی اور مکمل، مغلوب اور مجبور کردینے والی۔ جس نے اسے سنبھال رکھا تھا سہارا دے رکھا تھا۔ جوڑ رکھا تھا۔ اب شہناز کے نہ ہونے سے وہ خود کو بے یقینی کے خلا میں غبار کی طرح معلق محسوس کرتا تھا۔ تو یہ فطری بات تھی حاصل انتظار نے اس کے ذہن اور اعصاب کو متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔

میری بات ختم ہوتے ہی وہ اٹھا۔ ''یار۔ صبح کریں گے باقی بات۔ مجھے نیند آرہی ہے۔ شب بخیر۔''

کسی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ نکل گیا۔ ہم سب کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔ پھر رابعہ نے کہا۔ ''اگر یہی حالت رہی تو راجا پاگل ہو جائے گا۔''

ریشم نے کافی کے برتن سمیٹتے ہوئے کہا۔ ''یس سر، ہی نو سلیپ۔ آئی سی ہم نائٹ۔ ہی ڈرنک۔ وائن۔''

فریال نے کہا۔ ''تم اپنے کام سے کام رکھو۔''

ریشم نکل گئی تو رابعہ نے کہا۔ ''ریشم نے غلط نہیں کہا تھا۔ راجا پینے لگا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''وہ پہلے بھی پی لیتا تھا۔''

فریال بولی۔ ''اب بہت زیادہ پی رہا ہے۔ بے شک وہ پی کر بہکتا نہیں لیکن ابھی کچھ دیر پہلے میں نے دیکھا۔ وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا اور رو رہا تھا۔''

میں نے خاتمے کے لیے کہا۔ ''اس کی جگہ میں ہوتا تو میری زیادہ بری حالت ہوتی۔''

فریال نے طنز سے کہا۔ ''ہاں، دعوے کرنے میں کیا جاتا ہے۔''

میں نے سخت جواب دینے سے گریز کیا کہ کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ اس طرح بات بڑھ جاتی۔ میں نے کہا۔ ''بے شک اس میں دیر ہو رہی ہے مگر مجھے یقین ہے شہناز کو کچھ نہیں ہوگا۔ وہ بہت جلد لوٹ آئے گی۔''

''ہاں...... لیکن کب، اب تک تو ایک خوش گمانی کا آسرا ہے کہ وہ رانا کی تحویل میں ہے اور خیریت سے ہے۔ ثبوت کوئی نہیں۔ یہ ہی نہیں معلوم کہ اس کی رہائی کیسے ہوگی۔ ابھی تک نہ کسی کا مطالبہ سامنے آیا ہے نہ کسی نے کوشش کی ہے۔''

میرے لیے غصے پر قابو رکھنا مشکل ہوگیا۔ ''فریال...... یہ مت کہو کسی نے کوشش نہیں کی۔''

''کیا کوشش کی ہے؟ وہ تمہارا یار شاہی بادشاہ آیا ہے تو بند کمرے میں چھپا بیٹھا ہے۔ باہر نکلنے کی ہمت نہیں ہے اس میں۔ اور تم گئے تھے تو تم نے کیا تیر مارا۔''

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ''تم سے بات کرنا فضول ہے اس وقت۔ ہم صبح بات کریں گے۔''

فریال کا رویہ روز بروز جارحانہ ہو رہا تھا۔ اس کے رویے میں یہ تبدیلی بڑی تیزی سے اور اچانک آئی تھی۔ اسے مجھ سے شکایت تھی کہ میں اس کا استحصال کر رہا ہوں۔ محبت کے نام پر آٹھ سال سے اس کے ساتھ کھیل رہا ہوں۔ شادی کے معاملے میں سیریس نہیں ہوں اور صرف ہمت وعقل سے کام چلا رہا ہوں۔ ایک کے بعد دوسرا بہانہ تراش کے اسے بے وقوف بنا رہا ہوں۔

یہ غلط تھا اور جھوٹ تھا۔ مجھ سے زیادہ خود فریال یہ بات جانتی تھی لیکن اب اچانک اس کی شکایت میں الزام تراشی کا عنصر بڑھ گیا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ فوری طور پر سلطان کی طرف سے عناد رقابت کا خطرہ ٹل گیا تھا۔ میرے والدین نے بھی فریال کو پسندیدگی کی سند عطا کردی تھی اور ہم شادی کے لیے آزاد تھے مگر میرے خاندانی حادثات کے ساتھ جاگیر کے تنازعات کا سلسلہ دراز ہوتا چلا جا رہا تھا۔ ان حالات میں سب کچھ چھوڑ کے میں شادی رچانے کی کیسے سوچ سکتا تھا۔

کیا فریال کو نظر نہیں آتا۔ وہ سمجھتی نہیں۔ میں نے اپنے کمرے میں آکے غصے میں رہتے ہوئے سوچا۔ شادی شادی شادی! اور کوئی مسئلہ تو جیسے ہے ہی نہیں۔ سارے کام چھوڑ کے میں فوراً بیاہ رچالوں آخر کیا ہوگیا ہے فریال کو۔ کیا اس کے لیے اپنے جسم کی طلب کو دبانا مشکل ہوگیا ہے؟ آٹھ سال اس نے بڑی استقامت سے گزار دیئے۔ پھر آٹھ دن میں آٹھ ہفتے مزید کیوں نہیں گزارے جاسکتے؟ اب تو کچھ بھی غیر یقینی نہیں رہا۔ صرف حالات کے موافق ہونے کا انتظار ہے۔ ایسے ناموافق ماحول میں شادی کے شادیانے بجانے کا سوچ بھی کیسے سکتی ہے۔ الو کی پٹھی۔

میں نے کوشش کی کہ کروٹ لے کر فریال کے خیال کو ذہن سے جھٹک دوں۔ یہ مسئلہ اہم ضرور تھا لیکن اتنا بھی نہیں کہ اسے دیگر تمام مسائل پر ترجیح دی جائے۔ زیادہ اہم اور تھوڑی توجہ کے طالب مسئلے تھے جو غنیم لشکر کی طرح میرے گرد اپنا حصار تنگ کرتے جا رہے تھے۔ سرفہرست شہناز کی خیر وعافیت کے ساتھ بازیابی کا مسئلہ تھا۔ پھر میرے والدین کی صحت اور سلامتی تھی۔ وہ اپنی عمر کے آخری ایام بڑے بے سکونی میں بسر کر رہے تھے۔ وہ بڑی امیدوں خواہشوں اور خوابوں کے ساتھ اپنا گھر چھوڑ کے ست بدھائی آئے تھے۔ ست بدھائی ان کی آبائی جاگیر تھی۔ ان کے خاندانی غرور کا سرمایہ تھی۔ ان کے لیے کسی گم گشتہ جنت سے کم نہ تھی۔

تقدیر نے ان کے ساتھ بڑا بے رحم مذاق کیا۔ ان کا اپنی حق حلال کی کمائی سے بنایا ہوا گھر جل کے راکھ ہوگیا اور وہ اپنے خوابوں کی جنت ست بدھائی سے بھی نکلنے پر مجبور ہوئے۔ نہ نفس نہ آشیانہ۔ اب وہ بے گھر تھے اور میرے ایک دوست کے گھر میں علاج کے لیے مہمان تھے۔ پے در پے حادثات اموات اور خطرات نے ان کو خوف کے آسیب میں مبتلا کر دیا تھا۔ انہیں اندازہ ضرور تھا مگر یقین نہیں تھا کہ ان مصائب کا ذمے دار کون ہے۔ وہ لوگ جنہوں نے مجھے اس جاگیر کے انتظام وانصرام کے لیے سات سمندر پار سے بلایا جہاں میں خوش اور محفوظ تھا۔ یہ جاگیر جس کی نحوست کے قصے تاریخ کا حصہ تھے، یا میں جو اپنے کام سے کام رکھنے کے بجائے ست بدھائی کے ترقیاتی منصوبوں کی دلدل میں اترا تھا۔

جاگیر کی ملکیت کوئی مسئلہ نہ تھا۔ مسائل میرے عزائم نے پیدا کئے تھے۔ اپنے عزائم سے میں نے رانا کو دشمن بنالیا تھا مسئلہ میری اصول پرستی نے پیدا کیا تھا کہ میں نے اکبر خان جیسے نمک حرام کا ایک ناجائز مطالبہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا ورنہ چار ایکڑ پر بنا ہوا سائنس ریسرچ سینٹر اس کے نام کرنے سے میں غریب نہیں ہو جاتا تھا۔

فریال کا میرے نزدیک کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ میرے پاس اور میرے ساتھ تھی۔ اس کی حیثیت میرے وجود کا ایک حصہ تھی۔ اس طرح جیسے میں سانس لیتا تھا یا زندگی گزارتا تھا۔ میں فریال سے عشق بھی کرتا تھا۔ گزرے ہوئے آٹھ برسوں کا کوئی ایک لمحہ بھی اس محبت کے احساس سے خالی نہ تھا چنانچہ اس سے شادی میرے لیے جسمانی ضرورت کی تکمیل کا ایک معاشرتی مذہبی اور قانونی جواز تھی۔ اس کے بغیر ہمارا تعلق جائز تسلیم نہیں کیا جاسکتا تھا۔ پہلے اس راہ طلب میں جو دشواریاں حائل تھیں اب دور ہو چکی تھیں چنانچہ بے صبری کیسی۔ یہ غصہ کیسا۔ بیزاری اور جھنجلاہٹ کیسی۔ الزام تراشی کیسی اور بے اعتباری کیسی۔

میں نے اچانک محسوس کیا کہ گھوم پھر کے میرا ذہن پھر فریال کے ناروا رویے پر آگیا ہے اور میں اندر کے اضطراب سے سخت بے سکون ہوں۔ بس۔ میں نے سوچا۔ اچانک یہ بے اعتباری کیوں؟ وہ کیوں سمجھنے لگی ہے اور کہنے لگی ہے کہ میں اس کا استحصال اور استعمال کر رہا ہوں اور اسے اپنانے کے بارے میں سنجیدہ نہیں رہا کیونکہ میں نے اسے آسان حاصل سمجھ لیا ہے۔ گھر کی مرغی دال برابر۔ اسے یہ خوف لاحق ہوگیا ہے کہ میں اس سے شادی نہیں کروں گا۔ میرے لیے اب شادی میں کون سا تجسس اشتیاق یا بے قراری کا سنسنی خیز پہلو باقی رہ گیا ہے۔ وہ سب کچھ تو مجھے مل گیا جو طویل انتظار اور کوشش کے بعد شب وصل کے انعام کی صورت میں ملتا ہے۔ اور کیوں سمجھنے لگی ہے کہ میں اسے ٹال رہا ہوں اور ٹالتے ٹالتے کسی دن اتنا بے مروت ہو جاؤں گا کہ صاف کہہ دوں گا۔ میں باز آیا محبت سے اٹھالو پاندان اپنا۔ میں سلطان کی رقابت کے خوف کو بہانہ بنالوں گا یا کسی بھی بات کو۔ انکار کرنے والے کو بہانوں کی کیا کمی۔ اقرار کرنے والے کا تو صرف اقرار ہوتا ہے۔

ان سارے سوالات کا جواب جن کا تعلق فریال کے جارحانہ اور شک آمیز پرخوف رویے سے تھا اچانک میری سمجھ میں آگیا۔ عورت بلاوجہ خود کو غیر محفوظ نہیں سمجھتی۔ اس کے اندر کی چھٹی حس اسے خبردار کرتی ہے کہ تیری محبت خطرے میں ہے۔ اور ایک عورت کے لیے خطرہ دوسری عورت پیدا کرتی ہے۔ فریال کبھی عدم تحفظ کے احساس کا شکار نہیں ہوئی تھی۔ کم سے کم وہ ظاہر یہی کرتی تھی کہ نہ اسے ایلشیا سے خطرہ ہے جو میری خاطر عائشہ بن کے سب کچھ چھوڑنے پر کمر بستہ تھی۔ نہ رابعہ سے جسے میرے ساتھ زبردستی نتھی کیا جا رہا تھا۔ وہ کہتی تھی کہ دنیا کی کوئی عورت مجھے اس سے نہیں چھین سکتی۔ اگر کسی نے ایسا کیا تو وہ اسے قتل کردے گی یا مجھے۔ یہ بالکل فطری ردعمل تھا اور فریال کی فطرت اور مزاج کے عین مطابق۔

عائشہ اب یاد ماضی ہوگئی تھی اور میری زندگی سے نکل گئی تھی۔ رابعہ سے میرے تعلق کی نوعیت ہی کچھ اور ہوگئی تھی۔ وہ میرے لیے حقیقی بہن بن چکی تھی۔ پھر فریال اتنی اپ سیٹ کیوں ہے؟ میں نے ہمیشہ اس کے اور اپنے تعلقات میں ایک حد قائم رکھی تھی۔ اسے وہ میری دقیانوسی سوچ کہتی تھی۔

لندن جیسے شہر میں رہ کے بھی صرف فریال کے معاملے میں ایک حد پر قائم رہنا اسی لیے ضروری سمجھتا تھا کہ فریال نہ میری گرل فرینڈ تھی نہ محض ایک عورت۔ وہ میری ہونے والی شریک حیات تھی۔ فریال کی طرف سے مکمل آزادی حاصل تھی بلکہ وہ لندن کے ماحول سے اتنی متاثر ہو چکی تھی کہ بڑی بے باکی سے میری حوصلہ افزائی کرتی تھی لیکن میں نے تمام مواقع حاصل ہونے کے باوجود اپنے پائے استقامت میں لغزش نہیں آنے دی۔ وہ کبھی نہ ہوا جو فریال چاہتی تھی۔

ست بدھائی کی حویلی میں بھی میں نے ثابت قدم رہنے کی پوری کوشش کی لیکن یہاں حالات نے میرے خلاف سازش کرلی۔ مجھے خلوت میسر آئی اور مکمل خود اختیاری۔ شیطان نے جنت میں بھی حوا کو شجر ممنوعہ کے لیے ورغلایا تھا۔ یہاں بھی کچھ مختلف نہ ہوا۔ فریال جو ہمیشہ اپنے جذبات کے اظہار میں بے باک تھی اور ہر حد سے گزر جانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتی تھی۔ (جب ہم شادی کرنے والے ہیں تو پھر آج کیا اور کل کیا۔ یہ اس کی سوچ تھی)۔ اگر اس کے جذبات کے طوفان میں میری عقل کے دلائل غرق ہو گئے اور میری مزاحمت کی قوت کو شکست ہوگئی تو اس کی ذمے داری کسی حد تک ماحول پر عائد کی جاسکتی تھی یا پھر فریال پر۔ استحصال اس نے میرے جذبات کا کیا تھا پھر وہ مجھے کیسے مورد الزام ٹھہرا سکتی تھی۔

اس کے احساس عدم تحفظ، بے اعتباری یا خوف کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اسے مجھ پر بھروسا نہیں رہا تھا۔ استحصال اور استعمال کا الزام بے بنیاد تھا۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ میں اس سے کتنی محبت کرتا ہوں اور اس کے سوا مجھے کسی سے شادی کرنی ہوتی تو میں آٹھ سال نہ گزارتا۔ یہ کام میں بہت پہلے کر لیتا۔ مجھے اس کے بہترین مواقع حاصل رہے تھے لیکن میں نے ہمیشہ یہی کہا تھا کہ فریال...... فریال اور صرف فریال۔ آج جو کچھ وہ کہہ رہی تھی، اس کی وجہ کچھ اور تھی۔

اس کی الزام جوئی میں جلن اور رقابت کے جذبات کار فرما تھے۔ عائشہ نے میرا پیچھا چھوڑ دیا تھا۔ رابعہ سے خطرہ نہیں تھا تو پھر وہ کیوں بھڑک رہی تھی؟ اس سوال کا جواب واضح طور پر ایک ہی تھا۔ اسے شک ہو گیا تھا یا خبر مل گئی کہ نور جہاں مجھ پر غاصبانہ قبضہ کر رہی ہے۔ عشق اور مشک...... چھینک اور ایٹمی دھماکا چھپائے نہیں چھپتے۔ فریال کے مزاج کی برہمی اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ بہت کچھ جان گئی ہے جو میرا خیال تھا کہ وہ نہیں جان سکتی۔ آج کل خبر کا سفر روشنی کی رفتار سے ہوتا ہے...... چھپا کچھ نہیں رہتا۔ جاگنے والے کسی نہ کسی ذریعے سے جان لیتے ہیں اور بتانے والے نور جہاں جیسے ہوں تو حضور فلمی شاعر کی زبان میں کہہ دیتے ہیں کہ...... محبت جرم ہے تو جرم کا اقرار کرتے ہیں۔

کیا پتا نور جہاں نے خود فریال کے دل میں شک کا بیج بویا ہو۔ ایک عورت دوسری عورت کے خلاف ہر چال چل سکتی ہے جس سے اس کو بساط عشق پر مات ہو جائے۔ نور جہاں ایک فتنہ ساماں عورت ہے مگر کیا وہ اپنے ناجائز تعلق کا چرچا عام کرنے کا رسک لے سکتی ہے؟ نہیں، وہ اتنی بے وقوف نہیں ہے کہ خود اپنے قتل کا سامان کرے۔ ضرور فریال کو میری کسی بات سے شک ہوا ہے۔

صبح کا اجالا پھیلنے تک میں یہی سوچتا رہا کہ فریال کا شک کیسے دور کروں۔ اس کا اعتماد کیسے بحال کروں۔ کیسے یقین دلاؤں کہ ایک نہیں ہزار نور جہاں بھی ہوں تو وہ مجھے فریال سے دور نہیں کرسکتیں۔ میرے سامنے ایک راستہ انکار کا تھا۔ میں جھٹلا دوں کہ فریال کا شک بے بنیاد ہے۔ میرا نور جہاں سے نہ تعلق تھا نہ ہے نہ ہوگا۔ دوسرا خطرناک طریقہ اقرار کا تھا۔ میں اعتراف جرم کرلوں کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں ایک ضرورت ہے۔ نظریہ ضرورت سیاست سے عشق تک ہر جگہ چل سکتا ہے۔ میں نور جہاں کو الو بنا کے اپنا الو سیدھا کر رہا ہوں لیکن کیا فریال مجھے اس کی اجازت دے گی کہ اچھا ٹھیک ہے یہ جنگی حکمت عملی ہے تو چلنے دو...... نہیں...... ایسا کوئی عورت نہیں کہہ سکتی۔

ذہنی اور جسمانی تھکن کی ایک انتہا کو پہنچ کے میں ہار گیا اور پناہ کے لیے نیند کی آغوش میں پہنچ گیا پھر میں جاگا تو دوپہر ہونے کو تھی۔ مجھے حیرانی ہوئی کہ کسی نے میرے کمرے میں آ کے جھانکا تو مجھے جگایا کیوں نہیں۔ فریال کے نہ آنے کا ایک سبب تھا۔ اس کا مزاج برہم نہ ہوتا تو وہ رات کو موقع پاتے ہی آجاتی لیکن راجا نے یا رابعہ نے بھی مجھے جگانا ضروری نہیں سمجھا۔ کیا وہ خود بھی ابھی تک سوئے پڑے ہیں؟

یہ دیکھنے کے لیے میں باہر آیا تو میرے کانوں میں ریشم کی آواز آئی۔ وہ برآمدے کی سیڑھیوں میں اکیلی بیٹھی ہرن کے بچے سے انگریزی میں بات کر رہی تھی۔ ہرن کا بچہ سب سے زیادہ ریشم سے مانوس تھا اور اس کی ٹانگوں کے درمیان پھنسا ہوا حیرانی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ میں نے غور کیا تو ریشم محض اپنی پریشانی کا اظہار کر رہی تھی۔ اسے باتیں کرنے والا کوئی اور نہیں ملا تھا تو وہ ہرنی کے بچے سے کہہ رہی تھی کہ تم بھی خدا سے دعا کرو۔ وہ ہم سب پر اپنا کرم کرے۔ سب کی پریشانی دور کرے۔ سب پھر یہاں اکٹھے ہو جائیں۔ سب پھر خوشی خوشی رہیں۔ سب کی شادی ہو۔ سب کے گھر بس

جائیں۔ سب کے بچے یہاں تیرے ساتھ کھیلیں۔

اچانک اس نے مجھے دیکھا تو گھبرا کے اور جھینپ کے ہرن کو چھوڑ دیا۔ وہ قلانچیں بھرتا فوارے کی سمت نکل گیا اور ریشم اٹھ کھڑی ہوئی۔ "گڈ مارننگ سر۔ ٹی آر بریک فاسٹ۔"

میں نے کہا۔ "دعا خود کیوں نہیں مانگتی پاگل لڑکی۔"

"ہرن کا بچہ معصوم ہے سر اور اس کی دعا میں کوئی غرض اپنی نہیں ہوگی۔" وہ سادگی سے بولی۔

میں نے کہا "باقی لوگ کہاں ہیں۔"

"باقی کون سرکار۔" وہ اداسی سے بولی "سب اپنے اپنے کمروں میں اکیلے بند ہیں جیسے آپ تھے۔ ہم سب اکیلے ہو گئے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "بہت بولنے لگی ہے تو۔" اور پلٹ کے راجا کے کمرے کی طرف گیا وہ مہاتما بدھ کی طرح آسن میں چارپائی پر آلتی پالتی مارے چپ بیٹھا تھا اور اپنے سامنے کی دیوار کو ایسے دیکھ رہا تھا جیسے وہ سینما کا اسکرین ہے اور اس پر کوئی مزاحیہ فلم چل رہی ہے۔

میں نے کہا۔ "راجا...... کس بات پر ہنسی آرہی ہے۔"

وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔ "یار...... میں سوچ رہا تھا۔ اس سال میں اور شہباز یکم اپریل کو شادی کرلیں۔ اپریل فول بنائیں ایک دوسرے کو۔ باقی سب بھی تو شادی کر کے بے وقوف ہی بنتے ہیں۔ شادی کے لیے ہم جوکروں والا لباس بنوائیں۔ میری لال ٹوپی...... لمبی مخروطی۔ لمبی لہراتی داڑھی۔ دو رنگ کی شیروانی۔ دایاں پٹ گلابی...... بایاں ہرا۔"

میں اس کے پاس بیٹھ کے سب سنتا رہا۔ راجا کی آواز میں لکنت بہت واضح تھی۔ اس لکنت کے اسباب کمرے میں دیکھے اور محسوس کیے جاسکتے تھے۔ شراب کی خالی بوتل بیڈ پر پڑی تھی۔ اس کی بو بند کمرے میں محسوس کی جاسکتی تھی۔ اس کے اثرات راجا کے لہجے سے عیاں تھے اور اس کے انداز و اطوار میں نمایاں تھے۔

"ایسے کیوں دیکھ رہا ہے مجھے تیکھے پتر۔ مشورہ دے یار۔ دلہن کا لباس...... اور باراتی......" وہ ایک دم ہنس پڑا۔ "کیسا ہو اگر سب چڈی میں ہوں۔ کنگلوں کی بارات......"

میں نے کہا۔ "راجا...... تو ایسا کیوں کر رہا ہے۔"

"کیا، تجھے آئیڈیا اچھا نہیں لگا۔"

میں نے کہا۔ "تو نے اتنی شراب کیوں پی ہے۔"

"اتنی کتنی......" اس نے ہچکی لی۔" میں نے اسے برطرف...... کر دیا...... ڈسمس...... غنی...... سور...... کا بچہ...... نافرمان...... حکم عدولی کرتا ہے مالکوں کی۔ کل...... ہاں کل...... وہ بوتلیں لایا تھا۔ آج انکار کر دیا۔"

راجا کی حالت پر مجھے دکھ ہوا۔ وہ روایتی طریقے سے اپنے غم کو شراب کے نشے میں ڈبو رہا تھا۔ وہ ہمت ہار گیا تھا۔ اس نے امید چھوڑ دی تھی اور خود فراموشی کا راستہ اختیار کرلیا تھا۔ ایسی حالت میں اس سے کچھ کہنا لاحاصل تھا۔ میں اٹھ کر باہر آگیا۔ اس مسئلے کا آسان حل یہی تھا کہ راجا کو شراب کی سپلائی پر پابندی عائد کر دی جائے۔ سب کو سختی سے تاکید کر دی جائے کہ راجا کتنا بھی دباؤ ڈالے۔ اسے کوئی شراب لا کر نہ دے۔

رابعہ اپنے کمرے میں موجود ہی نہ تھی۔ دریافت کرنے پر فاطمہ نے بتایا کہ وہ پچھلے حصے میں ہوگی۔ پچھلا حصہ قبرستان کا تھا۔

"آج ان کے والد کا چہلم ہے۔" فاطمہ نے کہا۔

میں نے کہا۔ "اچھا؟ چالیس دن ہو گئے صوفی چچا کے انتقال کو۔"

فاطمہ نے ایک آہ بھری۔ "ایسے ہی ہوتا ہے جی۔ وقت گزرنے کا پتا نہیں چلتا۔ بی بی قرآن پڑھ رہی ہوں گی ادھر۔"

میں نے سر ہلایا۔ "چلو اچھا ہے۔ اس کے دل کو کسی طرح سکون تو ہے۔ تم میرا ناشتا فریال کے کمرے میں بھیج دو۔"

فریال اپنے کمرے میں ٹی وی آن کیے کسی انڈین چینل سے آنے والی فلم دیکھ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کے اس نے ٹی وی کو آف کر دیا۔

"نیند پوری ہوگئی نواب صاحب کی۔" وہ مسکرائی۔

میں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ "کمال ہے آج تم نے بھی نہیں جگایا۔ اتنے کام تھے۔"

"تمہارے دوست بھی پوچھ رہے تھے۔"

"کون دوست...... وہی...... تم شامی بادشاہ کی بات کر رہی ہو۔"

"ہاں...... پیشے کے اعتبار سے ڈاکو ہیں۔ نام کے بادشاہ۔ دوست ہیں نواب رفیق احمد شیرازی کے اور مہمان بھی لیکن چوہے کی طرح بل میں گھسے بیٹھے ہیں۔"

میں نے ناگواری سے کہا۔ "آخر اس لہجے میں بات کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ تمہیں اندازہ نہیں کہ وہ کیسے حالات سے دوچار ہیں۔"

''مجھے تو کچھ اندازہ نہیں۔ کسی بات کا علم نہیں۔ نہ میرے پاس دیکھنے والی آنکھیں ہیں۔ نہ سننے والے کان اور نہ سمجھنے والی عقل۔ ایک بے حس اور بے جان چیز ہوں میں اور بس۔''

میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''مجھے معلوم ہے تم بہت ناراض ہو۔''

''ناراض ہونے کا اختیار پہلے تھا میرے پاس۔ جب تم پروا کرتے تھے میری ناراضی کی۔ اب تمہارے پاس فرصت کہاں میری طرف دیکھنے کی بھی۔''

''ایسا نہیں ہے۔...... یو نو ہاؤ مچ آئی لو یو۔''

''اوہ یس...... آئی نو۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا اور میرا موبائل فون میری طرف بڑھا دیا۔ ''یہ کل سے میرے پاس ہے۔ تم اپنے ساتھ لے جانا بھول گئے تھے۔''

میں نے موبائل فون لے لیا۔ ''بڑی بے وقوفی ہوئی تھی مجھ سے۔''

''بڑی یا چھوٹی بے وقوفی کا تو مجھے علم نہیں لیکن تمہاری دو کالز مس ہوئیں۔ ایک میں نے غلطی سے وصول کرلی تھی لیکن کسی نے مجھ سے بات کرنا پسند نہیں کیا۔ میری آواز پسند نہیں آئی شاید۔ بعد میں پھر دوبارہ کال آئی تو وہی نمبر تھا۔ تم فوراً کال بیک کرلو۔'' وہ اٹھ کر باہر جانے لگی۔

کال رجسٹر میں نمبر دیکھتے ہوئے میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا ''تم کہاں بھاگی جا رہی ہو۔ کیا نور جہاں نے کچھ کہا ہے تم سے۔''

''نہیں...... وہ صرف تم سے بات کرتی ہے۔ میں اسی لیے جا رہی ہوں کہ تم اکیلے میں کھل کے باتیں کرسکو ورنہ تمہیں جھوٹ بولنا پڑے گا۔''

''کیسا جھوٹ...... آرام سے بیٹھو...... مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔''

وہ بیٹھ گئی۔ ''ابھی تم فون کرو گے تو وہ پوچھے گی کہ آس پاس کوئی اور تو نہیں ہے۔ فریال تو سامنے نہیں ہے پھر مجھے اور اس کو مطمئن کرنے کے لیے تمہیں ایک نہیں دس جھوٹ بولنے پڑیں گے۔ تم نہیں چاہو گے کہ مجھے اصل گفتگو کا پتا چلے جو تمہارے اور اس کے درمیان ہو رہی ہے اور اسے بھی اشاروں میں سمجھانا ہوگا کہ اس وقت کھل کے بات کرنے میں خطرہ ہے۔''

میں نے برہمی سے کہا ''ایسی کیا بات کرتا ہوں میں اس سے۔''

''یہ میں کیا جانو...... اور کیسے جانوں جب کہ تم بتایا بھی نہیں۔''

میں نے کہا ''میں بتا چکا ہوں کہ اس سے ایک کاروباری بات ہوتی ہے۔''

وہ تلخی سے بولی۔ ''کاروباری بات! کیا کاروبار چل رہا ہے تم دونوں کے بیچ۔ اس کو تمہارے سوا اور کوئی نہیں ملا اس کاروبار کے لیے اور تمہیں بھی وہی نظر آئی کاروباری معاملات کے لیے۔ یقیناً کوئی بہت بڑا اور غیر معمولی فائدہ ہوگا جس نے دو دشمنوں کو یکجا کردیا۔ اس حد تک کہ وہ اپنے شوہر کی طرف سے بے خوف ہوگئی اور تم مجھے بھول کے اس کاروبار میں لگ گئے۔''

''شٹ اپ فریال۔''

وہ پھر کھڑی ہوگئی ''میں نے تو منہ بند رکھا تھا۔ خاموشی سے جا رہی تھی۔ تم میری فکر مت کرو۔ اگر تم اس سے کاروباری میٹنگ کے لیے جاؤ یا اسے بلالو یہاں۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں مگر تم دوسروں سے کیا کہو گے؟ وہ اپنے شوہر اور تمہارے دشمن اکبر خان کو کیا بتائے گی کہ تم دونوں مل کے کون سا کاروبار چلا رہے ہو؟'' وہ ایسے زہر اگل رہی تھی جیسے آتش فشاں لاوا اگلتا ہے۔

بدقسمتی سے اسی وقت ریشم میرے لیے ناشتا لے کر آگئی اور اس نے فریال کو لال بھبوکا چہرے کے ساتھ واک آؤٹ کرتے دیکھا۔ بلی اب تھیلے سے باہر آگئی تھی۔ لگی لپٹی رکھے بغیر فریال نے میرے منہ پر کہہ دیا تھا کہ میں نور جہاں کے ساتھ ناجائز مراسم بڑھا رہا ہوں لیکن ہم دونوں سارے زمانے کی آنکھوں میں دھول جھونک کے یہ خطرناک کھیل جاری نہیں رکھ سکتے۔

شرمندگی، خفت اور احساسِ ذلت کا سارا غصہ ریشم پر اترا۔

میں نے ہاتھ مار کے ناشتے کی ٹرے گرادی۔ ''نہیں کرنا مجھے ناشتا......'' میں نے دھاڑ کے کہا۔ ''کوئی نہیں سمجھتا کہ میں کس عذاب سے گزر رہا ہوں۔ سب کو اپنی پڑی ہے۔ سب کچھ چھوڑ دوں میں اور بس شادی کرلوں۔ دنیا جائے بھاڑ میں۔ میں سہرا سجا کے بند ہو جاؤں حجلۂ عروسی میں۔''

ظاہر ہے میرا غصہ بالکل بے جا تھا۔ ریشم مجھے کیا جواب دیتی۔ میرا خیال ہے کہ اس حد تک وہ بھی سمجھتی کہ میں فریال کی کس بات پر آگ بگولا ہو رہا ہوں۔ اس نے سب کچھ خود دیکھا اور سنا تھا لیکن وہ اپنی حیثیت سے بڑھ کے مجھے سمجھاتی یا فریال سے کچھ کہتی تو اس کے حصے میں مزید ذلت آتی۔ وہ بہت معاملہ فہم اور ذہین لڑکی تھی۔ اس نے خاموشی سے

برتنوں کے ٹکڑے سمیٹے اور نکل گئی۔

جب میں اکیلا رہ گیا تو خود اپنے غصے کے ردعمل کا شکار ہوگیا۔ مجھے احساس ہونے لگا کہ میں نے اس سچویشن کو مس ہینڈل کرکے مزید خراب کرلیا تھا۔ فریال کے جذباتی ابال کو کنٹرول کرنے کے لیے مجھے ٹھنڈے دماغ سے کام لینا چاہیے تھا۔ آگ کو آگ سے نہیں پانی سے بجھایا جاسکتا ہے۔ میرے رویے نے تو اس پر تیل چھڑک دیا تھا۔

میں کچھ دیر اپنی بے وقوفی پر خود کو کوستا رہا۔ آخر میں نے ایسا کیوں کیا؟ کیا مجھ پر ایک مجرمانہ جھنجلاہٹ سوار تھی۔ میں جانتا تھا کہ اپنے دفاع میں کچھ نہیں کہہ سکتا تو الٹا فریال پر برس پڑا تھا۔ اگر میں راجا کو اس طرح شراب نوشی پر برا بھلا کہنے لگتا تو جھنجلا کے وہ بھی مجھے ایسا ہی جواب دیتا کہ ہاں شراب پی رہا ہوں اور مزید پیوں گا۔ تو مرنے دے مجھے۔ میری فکر مت کر۔ جا اپنا کام کر۔ میں نے اچھا کیا جو چپ رہا۔ فریال کو بھی میں مصلحت کے پیشِ نظر خاموشی سے ٹال دیتا تو بات نہ بڑھتی لیکن اسے بھی تو اپنی حد پار نہیں کرنا چاہیے۔ ہر وقت کا جارحانہ رویہ بھی خرابی پیدا کرتا ہے۔ وہ موقع اور موڈ دیکھ کر پیار سے بات کرتی...... سمجھاتی۔

غنی کی آمد نے میرے منتشر خیالات کا سلسلہ روک دیا۔ غالباً ابھی تک اسے ریشم سے میرے موڈ کی خرابی کا علم نہیں ہوا تھا۔ وہ مسکراتا ہوا آیا اور سلام کرکے کھڑا ہوگیا۔ ''سر...... آپ کے دوست یاد کر رہے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''کون...... شامی بادشاہ۔ اچھا آگئے وہ لوگ۔''

''جی سر...... ناشتا کر رہے ہیں اب۔ کل رات آپ کو واپسی میں دیر ہوئی تو وہ بہت پریشان ہوئے تھے۔ آپ کے آنے کے بعد سوئے تھے۔''

میں نے کہا۔ ''غنی...... ایک بہت ذمے داری کا کام ہے۔''

اس نے سکون سے کہا ''آپ حکم کریں سر۔''

میں نے کہا۔ ''دیکھو...... بینک جاؤ۔ منیجر صاحب سے ملو اور انہیں ایک پیغام دو میرا۔ آج ہمیں حویلی میں تین کروڑ کیش چاہیے۔''

غنی پریشان نظر آنے لگا۔ ''تین کروڑ کیش۔''

''ہاں...... لیکن اس طرح کہ کسی کو معلوم نہ ہو۔ وہ کیش ریڈی رکھیں ہم خود لائیں گے اور ابھی چلے جاؤ۔ ممکن ہے انہیں انتظام کرنے میں وقت لگے۔ اگر آج پرابلم ہو تو کل صبح تک کرلیں۔''

''آپ ان سے فون پر بات کیوں نہیں کر لیتے۔''

''غنی...... موبائل فون کی کال بھی ٹریس ہو جاتی ہے۔ تم میرے بھروسے کے آدمی ہو۔ راز داری سے یہ پیغام پہنچا دو۔ منیجر صاحب سے کہنا کہ وہ بھی کسی سے بات نہ کریں۔ کیش کیسے آئے گا یہاں۔ یہ ان کی ذمے داری نہیں..... میں خود لینے آؤں گا' رائٹ۔''

غنی نے سر ہلایا اور سوچتا ہوا باہر نکل گیا تو میں نے اوپر کا رخ کیا۔ شامی اور اس کے ساتھی فرمائشی قسم کے ناشتے میں لگے تھے۔ انہوں نے پائے پکوائے تھے اور اس کے ساتھ تندوری پراٹھے اڑا رہے تھے۔ ظاہر ہے... یہ ناشتے کا نہیں' دوپہر کے کھانے کا وقت تھا چنانچہ انہوں نے مجھے مدعو کیا تو میں بھی شریک ہو گیا۔

شامی نے کہا۔ ''بھئی نواب صاحب...... اپنا کھانا تو ایسے ہی ہوتا ہے جو... ملا کھالیا۔ جب ملا کھالیا۔ یہاں تمہارے مہمان بن کے... عیش کر رہے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''جب تک چاہو عیش کرو۔''

وہ ہنسا۔ ''بات چاہنے کی نہیں ہوتی۔ نصیب کی ہوتی ہے۔ میں نے تو اس پٹاخا چھوکری کو کہا تو اللہ نے بڑا ذائقہ دیا ہے تیرے ہاتھ میں...... تو شرماتی رہی...... بولی نہیں یہ کھانا میری ماں نے پکایا ہے۔

میں نے کہا۔ ''وہ بس انگریزی بول سکتی ہے...... غلط سلط۔''

''نہیں دوست۔ وہ بڑی سمجھدار اور بہت کام کی لڑکی ہے۔ ایسا ہی اس کا ہونے والا شوہر ہے۔ خیر تم چھوڑو اِدھر اُدھر کی باتیں۔ یہ بتاؤ کہ کل رات اتنی دیر کیوں لگی ؟ رانا نے کھانے پر روک لیا تھا اور اس کے بعد تمہارے اعزاز میں کوئی مجرے کی محفل سجائی تھی؟''

میں نے کہا۔ ''میں رانا سے نہیں ملا۔''

وہ تقریباً اچھل پڑا۔ ''کیوں؟ تم تو اس سے بات کرنے گئے تھے۔''

''مجھے راستے میں ہی اغوا کر لیا گیا۔''

شامی کا ہاتھ رک گیا۔ ''یار کیا ایک کے بعد دوسرا دھما کا کرتے جا رہے ہو۔ کس نے اغوا کیا تھا تمہیں۔''

میں نے کہا' ''کھانا کھا لو پھر اطمینان سے بتاؤں گا۔''

''بس کھا لیا جتنا کھانا تھا۔'' اس نے دسترخوان سے ہاتھ صاف کرنے کی کوشش کی مگر اسے واش روم جا کے ہاتھ دھونے پڑے۔

میں نے کہا۔ ''مجھے سورج مل نے اغوا کیا تھا۔

کیوں؟ ہے نا تیسرا ایٹمی دھما کا...؟''

اب شامی کے ساتھیوں نے بھی دسترخوان سے ہاتھ کھینچ لیا۔ وہ شامی کے سامنے چپ رہتے تھے۔ خصوصاً اس وقت جب وہ مجھ سے بات کر رہا ہو۔ یہ کچھ تو ڈسپلن کی بات تھی کہ سردار معاملات طے کر رہا ہو تو دوسرے دخل نہ دیں۔ کچھ کمپلیکس کا چکر بھی تھا۔ وہ حویلی کی سیٹ اپ میں شدید احساسِ کمتری کا شکار تھے۔ ایک تو وہ ڈاکو تھے۔ پرانے سزا یافتہ اور مطلوب، مفرور...... پھر وہ جاہل تھے۔ ان میں کوئی بیک گراؤنڈ ہی نہیں تھا۔ ان کے مقابلے میں شامی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ذہین بھی تھا چنانچہ جائز طور پر ان کا لیڈر تھا۔ اس لیڈر کی دوستی ایک اعلیٰ خاندانی قسم کے تعلیم یافتہ نواب سے ہو گئی تھی۔ اس نواب کی حویلی کے ملازم اور سیکورٹی گارڈ بھی مہذب تھے اور عزت یافتہ شمار ہوتے تھے پھر ڈاکو کیسے کمپلیکس کا شکار نہ ہوتے۔ وہ طاقتور اور سفاک ضرور تھے۔ دوست بھی رکھتے تھے مگر ان کے لیے عزت کا کوئی مفہوم نہ تھا۔ وہ صرف بے عزت تھے۔

انہوں نے میری روداد حیرت، خوف اور بے یقینی کے ساتھ سنی۔ اِدھر میری بات ختم ہوئی اُدھر ریشم چائے کے مگ ایک ٹرے میں سجا کے لے آئی۔ جتنی دیر میں اس نے سب مگ دیے اور درمیان میں چینی رکھی ہم سب خاموش رہے۔ ریشم نے یہی سمجھا ہوگا کہ خاموشی کا یہ وقفہ اس کی آمد کا نتیجہ ہے۔ وہ فٹافٹ نکل گئی۔

شامی نے سر ہلا کے ایک گہری سانس لی۔ ''اب میری طرف سے تین کروڑ بھی ادا کرو گے۔''

''ہاں...... میں نے وعدہ کر لیا ہے۔''

''لیکن دوست...... اتنے بڑے احسان کا قرض میں کیسے ادا کروں گا۔''

میں نے کہا' ''تم تین کروڑ کو قرض سمجھ رہے ہو؟''

''نہیں...... قرض تمہارے احسان کا ہے۔ یہ میری زندگی کی اور میری آزادی کی قیمت ہے۔ جو فی الحال میں ادا کرنے کے قابل نہیں تھا۔''

''اسی لیے میں نے یہ ذمے داری قبول کی۔''

''آج تیسرا دن ہے۔ ہم اس کمرے میں قید ہیں اور تمہاری میزبانی کے مزے لوٹ رہے ہیں لیکن ہم سے پوچھو ہماری کیا حالت ہے۔ اندر سے ہم کتنے پریشان اور خوفزدہ تھے۔ ہمارے پاس تین کروڑ نہیں تھے چنانچہ ہمارے لیے پناہ کہیں نہیں تھی۔ ہم کب تک بھاگتے رہتے۔ ہم پر زندگی کے راستے بند ہو چکے تھے۔''

میں نے کہا' ''تمہیں ایک سال کی مہلت تو ملتی۔''

''ہاں...... لیکن تین کروڑ...... کہاں سے لاتے ہم اتنی۔ یہ ٹھیک ہے کہ کبھی کبھار ہزاروں سے بڑھ کر لاکھوں کا بھی لگ جاتا ہے مگر جتنا ہم کماتے ہیں سب ہمارا تو نہیں تا۔ دوسرے حصے دار آدھا لے جاتے ہیں۔ ہم کتنا بھی تے مگر تین کروڑ کا قرض نہیں چکا پاتے۔ اپنی جان بچانے کے لیے۔ ایک سال میں یہ ناممکن تھا۔ ہم کتنے ڈاکے ڈال سکتے تھے آخر۔ ایک واردات کے لیے کئی دن پلاننگ کرنی پڑتی ہے۔ بعض اوقات کئی ہفتے موقع تلاش کرنے میں نکل جاتے ہیں۔ مہینے کے تیس دن اور سال کے تین سو پینسٹھ دن بھلا کون ڈاکے ڈال سکتا ہے۔ چور بھی چوری نہیں کر سکتا۔ شاید جیب کترا روز جیب کاٹ لیتا ہو مگر ڈاکو کسی علاقے میں مسلسل وارداتیں کرنے لگیں تو شور مچ جاتا ہے۔ پولیس خود ہمیں خبردار کر دیتی ہے کہ دبک جاؤ۔''

میں نے کہا' ''چلو چھوڑو یہ بات...... تمہارا مسئلہ حل ہو گیا۔ اب تم آزاد ہو۔''

''نہیں دوست۔ اب ہم غلام ہیں۔ تم نے ہم سب کو خرید لیا ہے...... ہمیشہ کے لیے۔''

میں نے کہا۔ ''شامی...... تم جذباتی ہو رہے ہو۔ دوست ہی دوستوں کے کام آتے ہیں۔ رہی احسان کی قرض کی بات تو یہ سلسلہ ایسے ہی چلتا ہے۔ کبھی تم میرے لیے کچھ کر دو گے۔ کبھی میں حساب برابر کر دوں گا۔ جب تک زندگی ہے ہم ایک دوسرے کے کام آئیں گے۔''

میری باتوں سے ان کی تشفی نہیں ہوئی۔ وہ سب میرے خلوص سے زیادہ تین کروڑ کے دباؤ میں آ گئے تھے۔ یہ تین ہزار یا تین لاکھ نہیں تھے۔ بڑے بڑے دولت مند تین کروڑ کا ذکر سن کے ہاتھ روک لیتے ہیں۔ سوچنے لگتے ہیں۔ نفع نقصان کی بیلنس شیٹ سامنے رکھ لیتے ہیں۔ دولت ایسے لٹائی جا سکتی ہے کمائی نہیں جا سکتی۔

کہا جا سکتا ہے کہ میں نے اپنی دولت محنت سے نہیں کمائی تھی۔ قطرہ قطرہ کر کے یہ دولت کا دریا نہیں بنا تھا۔ یہ سب مجھے اچانک مل گیا تھا۔ یہ قسمت کی لاٹری تھی۔ مجھے اس کی قدر نہیں تھی لیکن میرے نزدیک اس دولت کا اس سے بہتر مصرف نہیں تھا کہ وہ مجھے' میرے عزیز و اقارب اور دوستوں کے ساتھ میرے آس پاس بسنے والے سب انسانوں کی زندگی میں کچھ خوشی لائے۔ کچھ بہتری لائے۔ یہ میرے لیے رحمت کا سبب تھے۔ زحمت نہ تھے۔ دوست تو پھر دوست ہوتے ہیں۔ ان کے لیے مال کیا جان بھی قربان کی جا سکتی ہے مگر جو کچھ نہ کرنا چاہیے...... کیا وہ اپنا سب کچھ سمیٹ کر قبر میں ساتھ لے جا سکتا ہے؟

ایک سوال ہنوز میرے دل میں کھٹک رہا تھا۔ میں یہ طے کرنے سے قاصر تھا کہ وہ سوال سب کے سامنے کرنا مناسب ہوگا یا نہیں۔ میرے کسی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے شامی پھر اسی سوال پر آ گیا جو گفتگو کا نقطۂ آغاز تھا۔

''یہ تو بڑی عجیب بات ہو گئی نواب صاحب۔ ہم آئے تھے تمہاری مدد کرنے اور تمہارا مسئلہ حل کرنے۔ الٹا تم نے ہمارا کام کر دیا اور تمہارا کام ابھی تک نہیں ہوا۔''

میں نے کہا' ''وہ بھی ہو جائے گا۔ اللہ جب چاہے گا۔''

''اب میں اس حد تک ضرور آزاد ہوں کہ اپنے سنگی ساتھیوں کو سندیسہ بھیج سکتا ہوں۔ بس پولیس کو خبر نہیں ہونی چاہیے۔ تمہاری دوستی کی وجہ سے پولیس میری دشمن ہو رہی ہے۔''

میں نے کہا' ''میری اجازت اور مرضی کے بغیر پولیس کا باپ بھی اندر قدم نہیں رکھ سکتا۔''

وہ ہنسنے لگا۔ ''باپ کہاں ہوتا ہے ان کا۔ آج پتا کر لیتے ہیں کیا ڈاکٹر صاحبہ ابھی تک رانا کی حویلی میں ہیں؟''

''کل تک شہناز وہیں تھی۔''

''اگر آج بھی وہیں ہو گی تو انشاء اللہ کل نہیں ہو گی۔''

''کیا مطلب۔''

وہ مسکرایا۔ ''کل وہ یہاں ہو گی...... تمہارے ساتھ۔''

''لیکن کیسے؟''

''بس اب یہ معاملات ہم پر چھوڑ دو۔ آج پتا کرتے ہیں کہ وہ اندر ہے تو کہاں ہے۔ پھر کوئی نقشہ بناتے ہیں۔''

''تم کیسے معلوم کرو گے۔''

''تلاش کرتے ہیں کوئی بندہ جس کا اندر کنکشن ہو۔ شام تک تصدیق ہو جائے گی۔ رات تک اپنی فورس آ جائے گی تو کارروائی کریں گے۔''

''باہر نکلنے میں کوئی خطرہ تو نہیں ہے تمہارے لیے اور...؟''

وہ بولا۔ ''اب کوئی خطرہ نہیں۔ خطرہ اپنے ہی ساتھیوں سے تھا اور کسی سے نہیں۔ دو دن سے ہم اسی کمرے میں بند یہی سوچ رہے تھے کہ ایسے کب تک چلے گا۔ اب میں انہیں بھیجتا ہوں باہر۔''

شامی کے ساتھیوں نے اقرار میں سر ہلایا۔ ان کے مایوس اور بجھے ہوئے چہروں پر مسکراہٹ آ گئی تھی۔ وہ پھر پُر عزم اور پُر امید نظر آنے لگے تھے اور میں ان کی آنکھوں میں

اپنے لیے شکر گزاری کے جذبات واضح طور پر دیکھ سکتا تھا۔ میں نے انہیں آزادی ہی نہیں ایک نئی زندگی کی ضمانت فراہم کردی تھی۔ اب مجھے ان کی غیر مشروط حمایت حاصل تھی۔ میں نے ان کی وفاداریاں خرید کے انہیں بندہ بے دام بنالیا تھا اور میرے خیال میں یہ کوئی مہنگا سودا نہیں تھا۔

میں اٹھنے لگا تھا کہ شامی نے پوچھ لیا۔ ''راجا صاحب کہاں ہیں۔ ان کی تو صورت دکھائی نہیں دیتی۔''

میں نے کہا ''میرے ساتھ آؤ۔ میں بتاتا ہوں راجا کہاں ہے۔''

وہ اطمینان سے میرے ساتھ سیڑھیاں اتر کے نیچے آیا۔ میں اسے راجا کے کمرے میں لے گیا۔ راجا اب آنکھیں بند کیے ایک ایزی چیئر پر نیم دراز تھا۔ قدموں کی آواز پر اس نے آنکھیں کھول کے ہمیں یوں دیکھا جیسے پہچاننے کی کوشش کررہا ہو۔

میں نے کہا ''راجا..... شامی آیا ہے تم سے ملنے۔''

اس نے اٹھنے کوشش کی مگر لڑکھڑا کے پھر بیٹھ گیا۔ ''آؤ آؤ بادشاہ سلامت۔ ست بدھائی کی کیا بات ہے۔ یہاں ایک نواب ہے، ایک راجا اور ایک بادشاہ..... حکومت کسی کی نہیں۔ پتا ہے چرچل سے پوچھا تھا کسی نے۔ دنیا میں کتنے بادشاہ رہیں گے۔ اس نے کہا۔ پانچ، تاش کے چار اور ایک انگلستان کا۔ وہ ہمارے شامی بادشاہ کو بھول گیا۔ ورنہ چھ کہتا۔ شامی بادشاہ! تمہیں معلوم ہے۔ جنگ آزادی کے بعد۔ آخری مغل شہنشاہ کی حکومت بھی قلعے تک محدود تھی۔ جیسے ہماری حکومت اس حویلی تک محدود ہے۔ باہر انگریز کی حکومت کا ڈھنڈورچی کیا اعلان کرتا تھا..... ملک خدا کا..... سکہ بادشاہ کا..... حکم کمپنی بہادر کا۔''

راجا نے باقاعدہ آواز لگا کے یہ اعلان اس طرح کیا جیسے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈھنڈورچی دلی کے کوچہ بازار میں کرتے ہوں گے۔ شامی اور میں خاموشی سے سنتے رہے۔ مجھے کچھ کہنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ شامی کو اندازہ ہو چکا تھا کہ راجا نشے میں دھت ہے۔

راجا نے پھر بات کا آغاز کیا۔ اس کی زبان میں واضح لکنت تھی۔ ''پتا ہے۔ باہر کیا اعلان ہوتا ہے۔ اس حویلی کے باہر۔ ملک صدر کا..... سکہ اسٹیٹ بینک کا اور حکم رانا کا۔'' وہ اپنے اس لطیفے پر خود ہی قہقہہ مار کے ہنسا۔ ''میرا حکم چلتا تو میرے غلام شراب لا کے دینے سے انکار کرتے تو میں ان کی گردنیں اڑادینے کا حکم دیتا۔'' اس نے ہاتھ کو تلوار کے انداز میں لہرایا۔

ہم باہر آ گئے۔ شامی کا چہرہ دکھی تھا۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر افسوس سے سرہلایا۔ ''یہ سب میری وجہ سے ہوا۔''

میں نے کہا ''نہیں شامی۔ یہ سب محبت کی وجہ سے ہوا۔ شہناز کی جگہ فریال ہوتی تو یہی حال میرا ہوتا۔''

''میرا مطلب تھا۔ اس دیر کی وجہ سے جو میں نے کی۔ راجا کی یہ حالت رہی تو وہ پاگل ہوجائے گا یا خودکشی کرلے گا۔ ابھی اور تاخیر کی گنجائش ہی نہیں۔ راجا کو شراب نہ ملی تو اس کا رویہ زیادہ جارحانہ ہوگا۔ اسے سمجھانے کی کوشش کرنا کہ آج شہناز کی واپسی ہے۔''

میں نے کہا ''شامی..... ایک بات پوچھوں؟''

وہ مڑا۔ ''تمہیں اجازت مانگ کے مجھے شرمندہ نہیں کرنا چاہیے۔''

میں نے کہا۔ ''سورج مل کی باتوں سے یہ تاثر ملتا تھا کہ تم کسی غفلت کے مرتکب نہیں ہوئے۔ دو کروڑ کی جس اسامی کو تمہاری حفاظتی تحویل میں رکھا گیا تھا۔ تم نے جانتے بوجھتے اسے فرار کردیا۔ وہ نہ ہلاک ہوا اور نہ فرار کی کوشش میں پایا گیا۔''

''یہ غلط ہے۔'' شامی خلا میں دیکھتا رہا۔

میں نے کہا ''مجھے یہ سچ لگتا ہے شامی اور تمہارے دوستوں کو بھی۔ وہ بندہ مارا جاتا یا مرجاتا کسی وجہ سے تو اس کی لاش ملتی۔''

''کیا لوگ شہر سے فرار نہیں ہوتے۔''

میں نے کہا ''شامی..... کیا تم مجھے بھی سچ نہیں بتاؤ گے کہ تم نے اسے کیوں نکل جانے دیا۔ اتنا بڑا خطرہ کیوں مول لیا۔ اپنے لیے اور اپنے ساتھیوں کے لیے، تم امانت میں خیانت کے مرتکب ہوئے۔ اپنے ساتھیوں کے اعتماد کو دھوکا دے کر تم نے انہیں اپنی جان کا دشمن بنالیا۔ آخر کیوں۔''

اس کی آنکھیں دھندلا گئیں۔ ''میں مجبور ہوگیا تھا دوست ...اور آج تم نہ بچاتے تو شاید میرے یہی یار مار کے مجھے ماردیتے۔ یا کچھ پکڑ کے جرگے کے حوالے کردیتے۔ مجھ پر مقدمہ چلتا اور مجھے سزائے موت ہوتی۔ باقی سب بچ جاتے۔''

میں نے کہا ''یہی تو میں جاننا چاہتا ہوں۔ ایسی رسک کیوں لیا تھا تم نے۔ وہ کیا مجبوری تھی جس نے تم سے یہ جرم کرایا۔ کیا تمہیں معلوم نہیں تھا کہ اس کی کیا سزا ہوگی؟''

''سب معلوم تھا نواب صاحب لیکن میری مجبوری بہت بڑی تھی۔ غلطی مجھ سے بس یہ ہوئی کہ میں نے فرار کا راستہ اختیار کیا۔ مجھے اعترافِ جرم کرلینا چاہیے تھا۔''

میں نے کہا ''پھر بھی..... ایسا کیوں کیا تم نے۔''

وہ میرے ساتھ باغ کی طرف بڑھا۔ لان پر دھوپ پھیلی تھی۔ ہم آہستہ آہستہ چلتے ہوئے آخری حصے کی طرف گئے۔ مالی نے اس گوشے کو اپنی کاریگری اور مہارت سے ایک سایہ دار کنجِ عافیت میں بدل دیا تھا۔ لوہے کے پرانے پائپوں والا چوکور کمرے جیسا فریم پہلے سے موجود تھا مگر اس کے ایک حصے کو زنگ نے کھالیا تھا۔ پائپ ٹوٹ کے الگ ہوا تو ڈھانچہ بھی ڈھیلا پڑ کے لٹک گیا تھا۔ مالی نے پائپ پھر سے جوڑے اور ان پر رنگ کرنے کے بعد بیلوں کو چڑھانے کے لیے تار باندھ دیے۔ خصوصی توجہ نے بیلوں کو بڑھنے میں مدد دی اور دیکھتے دیکھتے چاروں طرف سے بیلوں نے سرسبز دیوار کھڑی کردی۔ چھت کو ڈھک لیا اور دس فٹ لمبا چوڑا اور آٹھ فٹ اونچا ہوادار ہرا بھرا کمرا سب کی پسندیدہ جگہ بن گیا۔ دن میں یہاں دھوپ چھن کر آتی تو رات کو چاندنی۔ یہ جگہ خلوت خانہ کہلاتی تھی۔ معلوم نہیں یہ نام کس کے ذہن کی اختراع تھی۔

خلوت خانے میں لکڑی کی کرسیاں بہت قدیم تھیں۔ ان کے اوپر سفید رنگ..... غنی نے کروادیا تھا۔ کبھی میں سوچتا کہ ہم سب کی مشترکہ کوشش اور دلچسپی نے اس ویران اور آسیب زدہ نظر آنے والی حویلی کو کیا سے کیا بنادیا تھا تو میرے تصور میں اس کا پرانا منظر ابھرتا تھا۔

شامی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ اسے میں نے خود چھوڑا تھا۔''

''کون تھا وہ۔''

''نام تو اس کا سلمان خان تھا لیکن وہ مکینکل انجینئر تھا۔ اس کی اپنی فیکٹری جس میں زرعی آلات اور مشینری کے پرزے بنتے۔ اس نے امریکہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی اور فیکٹری کی ساری جدید مشینری بھی امریکہ سے اپنے ساتھ لایا تھا۔ اس کا پروگرام تھا کہ آہستہ آہستہ موٹروں کے پرزے بنانے کا کام شروع ہوگا اور..... بالآخر کاروں یا کمرشل گاڑیوں کی تیاری ہوگی لیکن کہتے ہیں نا۔ تدبیر کند بندہ تقدیر زند خندہ۔ آدمی ارادے کرتا ہے۔ تقدیر اس کے ارادوں پر ہنستی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے فارسی آتی ہے۔''

وہ مسکرایا۔ ''سلمان خان کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اس کی شادی اپنی مرضی سے قبیلے کے باہر سندھ کے ایک معزز گھرانے میں ہوئی تھی۔ اس کی بیوی بھی بہت خوبصورت اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی۔ شادی کے دو سال بعد ان کو خدا نے ایک بیٹی دی جو ماں کا نقش ثانی تھی۔ اس کی ولادت کے وقت کچھ ایسی پیچیدگی ہوگئی کہ پہلی اولاد ہی آخری بن گئی۔ ڈاکٹروں نے انہیں بتادیا کہ وہ آیندہ کے لیے امید نہ رکھیں۔ قدرت کا ایک نظام ہے۔ ساری کائنات ایک نظام کے مطابق چل رہی ہے۔ کوئی لاکھ دعائیں مانگے، چلے کاٹے یا منتر پڑھے۔ تھر کے صحرا میں جون میں برف باری نہیں ہوگی۔ سلمان کی بیوی کے جسم میں نصب تخلیقی و تولیدی مشینری.... نکال دی گئی تھی کیونکہ اس کا ایک حصہ کینسر سے متاثر تھا اور یہ سرجری نہ کی جاتی تو سرطان کے خلیے اس عورت کے پورے جسم کو کھا جاتے۔ میاں بیوی نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اللہ نے دونوں کی زندگی کو محفوظ رکھا لیکن یہ اطمینان عارضی ثابت ہوا۔

سرطان کے بچے کھچے خلیے شکست خوردہ فوج کے منتشر ہوجانے والے سپاہیوں کی طرح اکٹھے ہوئے اور انہوں نے اندر ہی اندر نئے سرے سے یلغار کی۔ ایک سال بعد وہ عورت مرگئی۔ بچی کی پرورش دادا اور دادی کرتے رہے۔ باپ نے اس کی خاطر دوسری شادی کرنے سے صاف انکار کیا اور اپنے انکار پر قائم رہا۔ بچی نے پشاور سے اولیول کا امتحان پاس کیا اور پھر پڑھنے کے لیے لندن چلی گئی۔ وہاں اس کو بھی کینسر نے نشانہ بنایا۔ یہ جراثیم.....''

میں نے کہا۔ ''کینسر کے جراثیم نہیں ہوتے۔''

اس نے سرہلایا۔ ''میرا مطلب تھا اثر جو موروثی تھا یا پیدائشی۔ آغازِ شباب تک نمودار نہیں ہوا تھا۔ باپ تو پاگل ہوگیا۔ اس نے یورپ و امریکا کے سارے اچھے ڈاکٹروں اور ہسپتالوں سے رجوع کیا اور بالآخر امید پیدا ہوگئی کہ لڑکی کو بون میرو ٹرانس پلانٹ سے بچایا جاسکتا ہے..... یعنی اس کی ہڈیوں کا گودا بدل دیا جائے۔ یہ گودا براہِ راست خون کا رشتہ رکھنے والے ہی دے سکتے ہیں۔ لڑکی کا نہ بھائی نہ بہن۔ ماں بھی مرچکی تھی۔ باپ نے اپنا گودا دینے کا فیصلہ کیا اور اتفاق دیکھو کہ اس کا گودا میچ بھی کرگیا۔ اب اس آپریشن کے لیے مناسب وقت کا انتظار تھا۔ اسی وقت باپ اغوا ہوگیا۔ وہ بہت رویا لیکن اغوا کاروں نے اس کی بات ہی نہیں سمجھی۔ اُدھر بے وقوف رشتے دار طاقت اور اثر و رسوخ کے زعم میں وقت کی نزاکت کو بھول گئے۔ انہوں نے سیاسی تعلقات پر بھروسا کیا۔ حکومت کی مشینری کو پیچھے لگادیا۔ پولیس اور پیرا ملٹری فورس۔ پولیٹیکل ایجنٹ اور قبائلی عمائدین سے رابطے کیے۔ ساتھ وہ اغوا کاروں کو رقم بھی پیش کرتے رہے مگر اس

دو غلے پن کے باعث سلمان خان کی رہائی عمل میں نہ آئی۔ اسے یہاں سے وہاں لے جایا گیا۔ علاقہ غیر میں کوئی اس کی نہ سنتا تھا نہ سمجھتا تھا۔ سلمان خان پشتو نہیں جانتا تھا۔"

"کیا وہ پٹھان نہیں تھا۔"

"پٹھان تھا...... اس کا آفریدی قبیلہ آج بھی مضبوط ہے لیکن بہت پہلے سلمان خان کا باپ وکالت پڑھنے برطانیہ گیا تو اُدھر اس کی ملاقات سندھ کے ایک جاگیردار خاندان کے لڑکے سے ہوئی۔ وہ بھی وکالت پڑھ رہا تھا۔ وہ چھٹیوں میں سندھی لڑکے کے ساتھ گیا تو انہوں نے روایتی مہمانداری کا مظاہرہ کیا۔ سلمان خان کا باپ بھی عام آدمی نہیں تھا۔ ایک دولت مند اور تعلیم یافتہ گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ سندھی جاگیردار کی حویلی میں اس نے ایک لڑکی دیکھی اور اس پر فریفتہ ہوگیا۔ چھٹیاں ہوئیں تو وہ لڑکی اپنی فیملی کے ساتھ لندن پہنچی۔ انہیں وہاں کے کسی لارڈ نے کرسمس پر انوائٹ کیا تھا۔ لڑکا اور لڑکی پھر ملے۔ قصہ مختصر۔ انہوں نے شادی کا فیصلہ کیا لیکن عقلمندی یہ کی کہ سارا معاملہ اپنے بڑوں کے سامنے رکھ دیا۔ لڑکی کا کزن سلمان خان کے باپ کا دوست تھا۔ اس کا ووٹ سلمان کے باپ کے حق میں گیا۔ برٹش لارڈ نے دونوں طرف کے بڑوں سے بات کی۔ یوں معاملہ خوش اسلوبی سے طے ہوگیا ورنہ قبائلی روایات کی دیوار گرانے کا انجام بہت خون خرابے پر ہوتا۔ شادی کے بعد سلمان کا باپ حیدرآباد میں سیٹل ہوا۔ لڑکی پٹھانوں کے درمیان جا کے رہنے پر راضی نہ تھی۔ وہ بھی ماں باپ کی اکلوتی تھی۔ ان کی رہائش حیدرآباد کے پوش علاقے میں رہی لیکن وہ اندرونِ سندھ اپنی زمینوں پر آتے جاتے رہے۔ لڑکی کا باپ ایک بہت بڑے سیاسی حلقۂ اثر رکھنے والے پیر کا خاص آدمی تھا اور سیاست میں بھی بہت ایکٹو تھا۔ سلمان خان ابھی دو سال کا تھا کہ کسی نے اس کے باپ کو قتل کردیا۔ یہ پتا نہ چل سکا کہ قتل کے اسباب سیاسی تھے یا خاندانی۔ سنا ہے سندھ کے اس پیر کا کوئی بیٹا بھی لڑکی میں دلچسپی رکھتا تھا۔ بزرگوں اور قبیلے کے بڑوں کا فیصلہ اس نے قبول تو کرلیا تھا مگر اس کے دل میں رقابت کی آگ روشن تھی۔ یہ بھی سنا گیا کہ لڑکے کا رشتا اس کے اپنے قبیلے میں طے تھا۔ وہاں ساری بات زبان کی ہوتی ہے مگر دونوں طرف کے جن بزرگوں نے زبان دی تھی وہ زندہ نہیں تھے۔ ان کے درمیان کیا بات ہوئی تھی اس کا عینی گواہ کوئی نہیں تھا۔ خود لڑکی اور لڑکے کی ماں کا یہی کہنا تھا کہ ایسی کوئی بات ان کے علم میں نہیں۔ سامنے آنے اور حلف اٹھا کے بیان دینے والا کوئی نہ تھا۔ تاہم شک یہ بھی کیا جاتا ہے کہ اس لڑکے نے اپنا انتقام لیا۔ باپ کی موت کے بعد سلمان کی پرورش ننھیال میں ہوئی۔ نانا نے بیٹی اور نواسے کو اندرونِ سندھ اپنی جاگیر پر کڑے پہرے میں رکھا۔ اس کی ابتدائی تعلیم وہیں ہوئی۔ اس کی مادری زبان سندھی تھی۔ وہ پشتو کا ایک لفظ نہیں جانتا تھا۔ اب یہ قسمت کا چکر کہ جب سلمان کا وقت آیا تو اسے اپنے قبیلے کی ایک لڑکی پسند آگئی اور اس نے ایک طرح سے پچھلی نسل کی غلطی کا تاوان یوں ادا کیا کہ اپنے قبیلے میں لوٹ آیا اور وہیں شادی کی۔ اب اسے قسمت کا کھیل کہیں یا کچھ اور۔

سلمان کے اغوا کار سندھی نہیں جانتے تھے اور سلمان پشتو نہیں سمجھتا تھا۔ ان کے درمیان ٹوٹی پھوٹی اردو سے رابطہ تھا لیکن سلمان انہیں اپنی بیٹی کے کیس کی سنگینی سمجھانے میں ناکام رہا۔ وہ بیماری کا سن کے کہتے تھے "اللہ اپنا فضل کرے گا۔ دعا کرو۔" ادھر لندن میں اس کی بیٹی کی حالت بگڑ رہی تھی۔ اس کے آپریشن کا وقت آگیا تھا مگر ہڈیوں کا گودا دینے والا باپ غائب تھا۔ جب وہ میرے پاس آیا تو صدمے سے نیم پاگل تھا۔ اس نے رو رو کے مجھے ساری بات سمجھائی۔ اس کی حالت دیکھ کے میرا دل خون ہوگیا۔ میں نے سوچا کہ آخر ہم کون ہیں؟ ڈاکو ہیں تو کیا انسان نہیں ہیں۔ اگر اس شخص کی بیٹی مرگئی تو اس کا خون کس کی گردن پر ہوگا۔ سلمان خان نے کہا کہ پیسے کی کوئی بات نہیں۔ تم جتنا کہو گے میں دے دوں گا لیکن ابھی مجھے لندن جانے دو۔ میرے ٹکٹ کے پیسوں کا انتظام کراؤ اور مجھے کراچی پہنچا دو۔ آگے سب میں سنبھال لوں گا۔ میں نے کہا کہ جاؤ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔ میں نے اسے نکال دیا۔ بحفاظت کراچی پہنچا دیا۔ وہاں معلوم نہیں اس نے کیا چکر چلایا۔ اپنا اثر رسوخ استعمال کیا اور خاموشی سے ایک دن میں پاسپورٹ بنوا کے لندن بھاگ گیا۔"

"اور اس کی بیٹی۔ وہ بچ گئی یا نہیں۔"

"مجھے نہیں معلوم۔ میرا بعد میں اس سے کوئی رابطہ نہیں ہوا لیکن میرا خیال ہے کہ وہ آپریشن سے پہلے پہنچ گیا ہوگا۔"

"کب تھا یہ آپریشن۔"

"ابھی ایک ہفتہ پہلے۔" کہکشاں نے کہا۔

"تمہیں اسپتال کا یا لڑکی کا نام معلوم ہے۔"

شامی نے کہا" لڑکی کا نام اس نے مجھے نہیں بتایا۔ اسپتال تھا غالباً کرامویل ہوسپٹل۔"

میں نے کہا" میں معلوم کرلوں گا۔ لڑکی کے باپ کا نام

تو معلوم ہے نا۔ اس سے پتا چل جائے گا۔"

"اس نے کہا تھا کہ میں تمہیں تین کروڑ روپے پہنچا دوں گا۔ میں نے کہا کہ وہ بعد کی بات ہے۔ ابھی تم جاؤ اپنی بیٹی کو دیکھو۔ اللہ اسے زندگی اور صحت دے۔ وہ جاتے وقت رو رو کے میرے ہاتھ چوم رہا تھا اور وعدہ کررہا تھا کہ مجھ سے ملنے آئے گا۔ بیٹی کو بھی ساتھ لائے گا اور مجھے یقین ہے کہ وہ اپنا وعدہ پورا کرے گا۔ بس اللہ کرے اس کی بیٹی بچ جائے۔ دن رات دعا کی ہے میں نے اس کے لیے۔"

میں نے کہا" شامی...... تم رو رہے ہو۔"

وہ خفت سے مسکرایا۔ "نہیں دوست...... یہ تو بس۔"

میں نے کہا" شامی...... تمہاری دعا ضرور قبول ہوگی۔ مگر مجھے ایک بات بتاؤ۔ سلمان خان کے نانا کا خاندان اتنا سیاسی اثر رسوخ رکھتا ہے سندھ میں تو تم نے ان کو بیچ میں کیوں نہیں ڈالا۔"

"میں نے سلمان سے کہا تھا کہ ابھی نہ کچھ کہنے کی ضرورت ہے نہ سننے کی خاموشی سے نکل جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی جھگڑا کھڑا ہو جائے اور تمہارا جانا رک جائے۔"

"میں اپنی حفاظت کرسکتا ہوں۔"

اس کی بات کے بیچ میں میرے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے سی ایل آئی پر نمبر دیکھا۔ یہ نور جہاں کا نمبر تھا۔ شامی کی بات کے بیچ میں کسی قسم کے ردِعمل کا اظہار نا مناسب تھا۔ میں نے فون بند کردیا ورنہ شاید وہ دوبارہ کال کرتی۔

شامی کی بات نے مجھے حیران کردیا تھا۔ اس نے اپنی جان خطرے میں ڈال کے ایک قیدی کی مدد کی تھی۔ میرے سوا اس نے کسی پر یہ راز ظاہر نہیں کیا تھا۔ وہ اپنی نیکی کو ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا۔ شاید کسی کو کچھ بتانے کا فائدہ ہی نہ ہوتا۔ اس کے ہم پیشہ انسانی جان کی قیمت کچھ نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے لیے تین کروڑ اہم تھے۔ اب مجھے اپنے تین کروڑ بھی حقیر اور بے قدر و قیمت لگ رہے تھے۔ جو نیکی شامی نے کمائی تھی وہ اس رقم کے مقابلے میں بہت بڑی تھی۔

وہیں بیٹھے بیٹھے میں نے لندن میں لارڈ ارنسٹ کو فون ملایا۔ وہ بے حد مصروف کاروباری آدمی تھا لیکن اس وقت وہ مجھے بلیئر ڈ کھیلتا ہوا مل گیا۔ وہ لندن کے ریجنٹ ہوٹل میں اپنی بیوی کے ساتھ آیا ہوا تھا۔

گھنٹی کئی بار بجنے کے بعد جب اس نے کال ریسیو کی تو مجھے بیک گراؤنڈ میں بہت شور سنائی دیا۔ شور میں لوگوں کے ہنسنے بولنے کی آوازوں کے ساتھ فاسٹ بیٹ والی میوزک بھی شامل تھی۔

اس دلچسپ ترین کہانی کے بقیہ واقعات چوتھے حصے میں ملاحظہ فرمائیں

قسمت کے پھیر میں اُلجھے ایک نوجوان کی داستان

اناڑی

احمد اقبال

4

اناڑی

قسمت کے پھیر میں اُلجھے ایک نوجوان کی کتھا، حالات اور واقعات کا بہاؤ اُسے دیارِ غیر لے گیا جہاں وہ اناڑی تھا مگر خود کو کسی کھلاڑی سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ ایسا کھلاڑی جسے کسی بساط پر شکست نہیں دی جا سکتی تھی۔ اس کا اناڑی پن اُسے کھلاڑیوں کے مقابل کامیابیاں دلاتا رہا۔ اُسے پردیس راس آ گیا تھا جہاں کی ہنگامہ خیزیاں اس کا دل لبھاتی تھیں مگر دوسری طرف دیس میں اُس کی لاٹری کھل گئی، ایسی لاٹری کہ جس کے بعد اُسے لوٹنا تھا۔ اناڑی سے کھلاڑی بننے کے بعد...... وہ لوٹا...... تو ہنگامے اور شرارتیں اُس کے ساتھ تھیں۔ قدم قدم پر آنسو اور لمحہ لمحہ قہقہوں سے لبریز اُس اناڑی کی کہانی جس کا دل دو حصوں میں منقسم تھا۔

خوب صورت و گل رنگ جذبوں سے گندھی ایک تیز رفتار کہانی

لارڈ نے کسی کی بات پر قہقہہ لگانے کے بعد کہا۔ ''ہیلو۔''

میں نے کہا۔ ''لارڈ نسٹ...... میں رفیق بول رہا ہوں۔''

''کون؟ مجھے سمجھ میں نہیں آیا۔''

میں نے کہا۔ ''پاکستان سے رفیق احمد...... یا تم کو یاد بھی دلانا پڑے گا کہ رفیق احمد کون تھا۔''

اس نے ایک نعرہ لگایا۔ ''او یونائی بوائے۔ مجھے تو یقین نہیں آ رہا۔ کون سی دنیا سے بول رہے ہو تم۔ اچھا ایک منٹ ٹھہرو۔ میں باہر جا کے بات کرتا ہوں۔''

''اس وقت کہاں ہو تم۔''

''میں بلیئرڈ کھیل رہا تھا۔ میں اور میری بیوی ریجنٹ ہوٹل میں ہیں۔''

میں نے کہا ''ہاؤ از یور وائف۔ اینڈ ایشا۔''

وہ ہنسا۔ ''کال ہر عائشہ۔ ابھی تک وہ تمہارے سحر سے آزاد نہیں ہو پائی ہے۔ لیکن شی از مچ بیٹر۔ اس کی ماں بھی۔''

میں نے محسوس کیا کہ پس منظر کے شور میں واضح کمی آ گئی ہے اور لارڈ ارنسٹ کی آواز صاف سنائی دینے لگی ہے۔

''مجھے افسوس ہے کہ اتنا عرصہ میں نے کسی سے رابطہ نہیں کیا۔''

''افسوس کیا۔ یہی ہوتا ہے دنیا کے جھمیلوں میں۔ آدمی کو وہی یاد رہتا ہے جو سامنے ہو۔ آج کا دن۔ گزرنے والا لمحہ۔''

میں نے کہا ''مجھے امید ہے۔ عائشہ نے اپنے مسائل پر قابو پا لیا ہوگا۔''

''ہاں...... ہاں۔ اس کے لیے ہمیں بہت آزمائش سے گزرنا پڑا۔ ہم نے اس کی مدد کی۔ دوستوں کی طرح۔ اسے ہمدردی اور غمگساری کی ضرورت تھی۔ وقت درکار تھا...... ہم سختی کرتے تو صورتِ حال زیادہ خراب ہو جاتی۔ میرا ایک دوست بہت اچھا سائیکاٹرسٹ ہے۔ اس نے ڈرگز کا علاج کرنے والے روایتی اسپتالوں سے دور رہنے کا مشورہ دیا۔ ان کا طریقہ علاج بعض اوقات منفی نتائج کا حامل ہوتا ہے۔ خیر...... بالآخر ہم کامیاب ہوئے۔ وہ اب بالکل صحت مند اور نارمل ہے۔ اس نے ڈرگز لینا بالکل چھوڑ دیا ہے۔ تاہم ابھی تک اس نے آفس میں اپنی ذمے داریوں کو پوری طرح نہیں سنبھالا ہے۔''

میں نے کہا ''یہ ہو جائے گا بہت جلد۔''

''ہاں...... تم جانتے ہو میری پریشانی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میرا کوئی وارث نہیں ہے۔ اسے ہی سب سنبھالنا پڑے

گا بالآخر۔ خیر مستقبل قریب میں میرا کوئی ارادہ تو نہیں ہے مرنے کا۔'' وہ خوش دلی سے ہنسا۔

''تب تک وہ اس قابل ہو جائے گی۔''

''کیسے پتا۔ تم یقیناً اس قابل تھے کہ اس کے بہترین مددگار مشیر اور محافظ بنتے۔ جیسا کہ مثالی لائف پارٹنر کو ہونا چاہیے۔''

''اس تعریف میں خاصا مبالغہ ہے۔''

''ہرگز نہیں۔ میں ایمانداری سے اپنی رائے دے رہا ہوں۔ اب آگے سب قسمت کی بات ہے کہ وہ کسے چنتی ہے۔ قسمت ایسی ہوگی تو تم جیسا دوسرا بھی مل جائے گا ورنہ...... خیر...... یہ بتاؤ میری یاد کیسے آ گئی۔''

میں نے کہا ''کام تھا اس لیے۔''

وہ ہنسنے لگا۔ ''کام بتاؤ۔''

میں نے اسے تفصیل بتائی۔ ''سلمان خان کی بیٹی کے نام میں سلمان خان بھی آتا ہوگا۔ معلوم کر کے مجھے بتاؤ وہ کیسی ہے۔''

''اس میں آدھا گھنٹا تو لگے گا۔''

''نو پرابلم...... میں تمہاری کال کا انتظار کروں گا اور لارڈ۔ ایک درخواست اور بھی ہے۔''

''بولو، میں سن رہا ہوں۔''

میں نے کہا ''یہ شخص سلمان خان۔ مخلص ہے اسے مدد کی ضرورت ہو۔ مالی مدد نہیں۔ سکیورٹی درکار ہو۔ وہ پولیس کے پاس نہیں جا سکتا فی الحال۔ گمنام رہنے پر مجبور ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں دیکھ لیتا ہوں۔ تمہاری بیوی کیسی ہے۔''

''پتا نہیں۔''

وہ ہنسا...... ''کیا مطلب بدمعاش......''

میں نے کہا۔ ''واقعی...... مجھے یہ نہیں معلوم کہ بیوی کون ہوگی تو کیسے بتاؤں وہ کیسی ہے۔ فی الحال میری کوئی بیوی نہیں۔''

''لیکن تم تو شادی کے لیے بہت سیریس تھے۔ کیا نام تھا اس لڑکی کا...... پریا۔''

میں نے کہا ''فریال...... کچھ ایسے حالات رہے کہ شادی نہیں ہو سکی۔ فیملی میں کچھ افسوسناک حادثات ہوئے۔ کچھ دیگر مسائل۔ لیکن اب بہت جلد ہم شادی کر لیں گے۔ میں تمہیں انوائٹ کروں گا۔''

''کیا ابھی سے بتا دوں۔ میرے لیے آنا عملاً ناممکن ہے۔''

میں نے کہا ''عائشہ نے مجھ سے وعدہ لیا تھا۔''

''دیکھو رفیق۔ بعض اوقات وعدہ خلافی بہتر رہتی ہے۔ وہ ایک مخصوص جذباتی کیفیت تھی۔ جس میں عائشہ نے ایسا کہا ہوگا۔ اس بات کو بھول جاؤ۔ بلکہ عائشہ کو بھول جاؤ پلیز۔''

میں نے کہا۔ ''آپ فکر نہ کریں۔ ایسا ہی ہوگا لارڈ۔''

''میں...... یا میری سیکریٹری تمہیں کچھ دیر میں کال بیک کرے گی۔ بائی۔''

شامی نے کچھ حیرانی اور دلچسپی سے یہ گفتگو سنی تھی۔ لارڈ ارنسٹ کی سیکریٹری کا فون بیس منٹ بعد آیا۔ وہ اس کے ساتھ طویل رفاقت کا تجربہ رکھتی تھی چنانچہ میرے نام کی اہمیت سے واقف تھی۔ میں خود اس کمپنی میں بہت اچھے عہدے پر فائز رہا تھا اور براہِ راست نہ سہی لیکن میرا شمار بھی کمپنی کے باس میں ہوتا تھا۔

بیس منٹ کے اس وقفے میں شامی نے لارڈ ارنسٹ اور اس کی بیٹی عائشہ سے میرے مراسم کی روداد انتہائی حیرت سے سنی۔ پھر فون گنگنانے لگا میں نے اسکرین کو دیکھا۔ اس پر نور جہاں کا نمبر آیا ہوا تھا۔ اب میں فون کو آف نہیں کر سکتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ چار چھ یا آٹھ دس بار بج کے فون خود ہی چپ ہو جائے گا مگر نور جہاں نے ایک کال ڈس کنکٹ ہونے اور ''نو ریسپانس'' کا جواب ملنے کے باوجود کال ملانے کا سلسلہ جاری رکھا۔

شامی نے کہا ''کون ہے۔''

میں نے ٹالنے کے لیے کہا۔ ''ہے ایک مصیبت۔''

''بات نہیں کرنا چاہتے تو کچھ دیر کے لیے سوئچ آف کر دو۔''

میں نے کہا ''لندن سے کال کسی وقت بھی آ سکتی ہے۔''

اور ایسا ہی ہوا۔ نور جہاں کی چار مس کالز کے بعد ایک وقفے میں جو نمبر اسکرین پر آیا وہ لندن کا تھا۔

میں نے کال ریسیو کی۔ ''ہیلو پٹریشیا۔''

''مسٹر رفیق۔ تم کو میرا نمبر یاد تھا۔ کیا حال ہے تمہارا۔''

''بہت اچھا۔ تم کیسی ہو۔''

''مسٹر رفیق۔ آپ نے جس مریض کے بارے میں پوچھا وہ ایک لڑکی ہے۔ سونیا خان۔''

میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔ کیا حال ہے اس کا۔''

''اس کا بون میرو ٹرانس پلانٹ کامیاب ہو گیا ہے لیکن ابھی تک وہ آئی سی یو میں ہے۔ ڈاکٹر بہت پُرامید ہیں کہ وہ

نارمل زندگی گزارے گی۔ علاج کافی عرصہ چلے گا۔''

''اور اس کا باپ۔''

''وہ ٹھیک ہے۔ کیا وہ تمہیں جانتا نہیں۔'' پوچھ رہا تھا کہ رفیق احمد کون ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ اب تو وہ کسی ریاست کا نواب ہے تو حیران ہو رہا تھا۔ خیر...... اس نے کہا کہ اسے کسی قسم کی مدد درکار نہیں ہے۔

''بس وہ محسوس کرتا ہے کہ اسے لوٹ کے پاکستان نہیں جانا چاہیے۔ اس کو وہاں اپنی زندگی خطرے میں محسوس ہوتی ہے۔ اس کی بیٹی کے علاج کا سلسلہ ہے۔ اور شاید مستقبل کا بھی۔''

میں نے کہا ''لارڈ سے کہنا اس کے لیے جو کر سکتا ہو کرے۔''

''میں کہہ دوں گی لیکن لارڈ کی بیٹی بات کرے گی تو باپ کے لیے انکار ناممکن ہوگا۔ اور بیٹی تمہیں انکار نہیں کر سکتی۔''

میں نے کہا ''مشورے کا شکریہ۔''

میں نے فون بند کر کے شامی کو یہ خبر سنائی تو اس نے ایک عجیب حرکت کی۔ وہ اٹھا اور قبلہ رو ہو کے سجدے میں گر گیا۔ وہ بہت دیر سجدے میں پڑا رہا۔ پھر اٹھا تو اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ ''تیرا شکر بھی کیسے ادا کروں میرے معبود۔ تو نے مجھ گنہگار پر اتنا کرم کیا۔ میں تو اس کے بدلے اپنی زندگی کے لیے بھی تیار تھا۔''

پھر وہ اٹھا اور بولا۔ ''میں اپنے ساتھیوں سے کہتا ہوں کہ جائیں اور دوسرے ساتھیوں سے رابطے کریں۔ اب ہم بیکار نہیں بیٹھ سکتے۔''

میں نے کہا ''لیکن تم فی الحال تو اس علاقے میں نہیں گھوم پھر سکتے۔ تمہارے دوسرے دشمن بھی ہیں۔''

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''دشمن تو ہمارے ہر جگہ ہیں مگر جو خطرہ دوستوں سے تھا وہ اب نہیں رہا۔ اللہ نے چاہا تو ہم آج رات ہی ڈاکٹر شہناز کو تمہارے حوالے کر دیں گے۔''

میں نے کہا ''سورج مل کو نقد ادائیگی کے لیے میں نے انتظام کر لیا ہے۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ اس کے بعد تمہارے لیے واپسی محفوظ ہو جائے گی۔''

''سورج مل سب سے سینئر اور قابل احترام سمجھا جاتا ہے۔ اس کی بات سب مانتے ہیں۔ اور آپس کے اختلافات طے کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ کوئی سپریم کورٹ کی طرف غیر جانبداری سے انصاف پر مبنی فیصلہ دے تو اس پر عمل بھی کیا جائے۔ ورنہ ہم سب نفاق کا شکار ہو جائیں گے۔''

''برطانیہ کی طرح تمہارا بھی کوئی غیر تحریری آئین ہے جس کی سب پاسداری کرتے ہیں۔'' میں نے مذاق میں کہا۔

''نواب صاحب اس ملک میں عدالتوں سے زیادہ جرگہ سسٹم کامیاب ہے۔ جہاں فوری اور بلا معاوضہ انصاف ملتا ہے کیونکہ وہ قبیلے کی روایات کی ملک کے قانون سے زیادہ پاسداری کرتے ہیں۔ وہاں کوئی جھوٹ نہیں بول سکتا اور جھوٹی گواہی نہیں دے سکتا۔ سب ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور پہچانتے ہیں۔ کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا۔ وہاں رشوت دے کر بچنے کا بھی کوئی تصور نہیں۔ سزائیں سخت ہیں اور ان پر عمل درآمد بھی ہوتا ہے۔''

''پھر یہ ونی، سوارا اور کاروکاری جیسے معاملات کیا ہیں؟''

''آپ کہہ سکتے ہو کہ یہ روایات غلط ہیں۔ انہیں ختم ہو جانا چاہیے۔ مگر جب تک روایات ہیں قبیلے انہی کے مطابق ہوں گے۔ چوری ڈکیتی قتل اغوا اور زنا کے معاملات جب عدالتوں میں جاتے ہیں تو کیا ہوتا ہے۔''

میں نے اس سے بحث نہیں کی۔ عدالتی نظام کی طرح جرگہ سسٹم یا پنچایتی نظام میں بھی ساری خرابیاں جڑ پکڑ چکی تھیں جو عدم مساوات کے اصولوں پر استوار معاشرے میں فروغ پا رہی تھیں، جہاں انصاف کی راہ میں رشوت حاکم و محکوم کے لیے جداگانہ معیار اور قانون کے مقابلے بھی طاقت کا استعمال عام ہو چکا تھا۔ جب پورا معاشرہ خرابی کا شکار ہو تو اس کا کوئی حصہ یا طبقہ ایسا نہیں رہتا جو خراب نہ ہو۔ چنانچہ اب ڈاکٹر وکیل استاد اور صحافی بھی سو فیصد دیانت داری سے اپنے پیشہ ورانہ فرائض سرانجام نہیں دے رہے تھے۔

جب شامی بادشاہ باغ کراس کر گیا تو میں نے جیب سے فون نکالا۔ اس وقت تک فون میں نور جہاں کی مس کالز کا اسکور سات ہو چکا تھا۔ فون وہ پہلے بھی کرتی تھی مگر ایسے متواتر نہیں۔ وہ رات کے وقت کال کرتی تھی۔ دن میں اس کا بار بار فون کرنا اس کی بے چینی سے زیادہ یہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ کوئی خاص بات فوراً مجھ تک پہنچانا چاہتی ہے۔ شاید ایسا ہی گزشتہ روز ہوا تھا اور وہ ساری کالز فریال نے نوٹ کی تھیں چنانچہ اس کا شک یا اس کی تشویش دونوں غلط نہ تھے۔

ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ آٹھویں کال آ گئی۔ میں نے براہِ راست نور جہاں سے مخاطب ہو کے کچھ کہنے سے گریز کیا۔ اس امکان کو بالکل مسترد بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ فون اس کے شوہر کی تحویل میں ہو۔

میری ہیلو کے جواب میں اس نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ''ارے میرے چاند...... تم کہاں چھپ گئے ہو۔ کب سے میری نگاہیں تمہیں تلاش کر رہی ہیں۔''

میں نے کہا'' یہ کیا طریقہ ہے۔''

وہ گانے لگی'' تو کون سی بدلی میں مرے چاند ہے۔ آجا۔'' اور پھر ہنس پڑی۔

میں نے خفگی سے کہا۔ ''نور جہاں'' تم کیوں میری تباہی کے پیچھے پڑی ہو۔''

اس نے پھر ڈائیلاگ مارا۔ ''میری تباہی تو ہو چکی ہے۔ اور اب بقول شاعر۔ ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے۔''

''آخر کیا چاہتی ہو تم۔''

''افوہ کتنی بار پوچھو گے یہ سوال۔ کیا میرا یہ کہنا اچھا لگتا ہے تمہیں کہ میں صرف تمہیں چاہتی ہوں۔''

''پلیز شٹ اپ۔ کل سے تم نے مصیبت ڈال رکھی ہے۔ لائن لگا دی ہے فون کالز کی۔''

''وہ جی قبلہ نواب صاحب، لائن میں تو ہم خود بھی لگے ہوئے ہیں کیوں کیا کریں۔ ہم سے آگے آپ کے چاہنے والے بہت ہیں۔ ہماری باری بس نہیں آتی۔''

''صرف یہی فضول باتیں کہنے کے لیے تم فون پر فون کر رہی تھیں۔''

''نہیں، اصل میں تو ایک بہت اہم اطلاع تھی تمہارے لیے۔''

میں نے کہا'' کیا اطلاع ہے۔''

''اکبر خان لندن گیا ہے دو دن کے لیے۔'' وہ سرگوشی میں شرارت سے بولی'' ارے سنو سنو۔ فون بند مت کر دینا۔ اہم اطلاع اس کے علاوہ ہے۔''

میں نے کہا'' بتاؤ ورنہ میں فون بند کرتا ہوں۔''

''اطلاع ہے تمہاری ڈاکٹر شہناز کے بارے میں۔ اور بے حد کار آمد۔ تم سنو گے تو میرا منہ چوم لو گے کہ واہ نور جہاں۔ تم نے تو میرا دل جیت لیا ہے۔ کیا ایسا ہوگا کبھی؟''

''کیا؟'' میں نے انجان بن کے پوچھا۔

''کبھی تمہارا دل جیت سکوں گی میں۔''

میں نے کہا'' دل سے تمہارا کیا واسطہ۔ جو تمہیں چاہیے وہ مل جاتا ہے۔ مجھ سے بس۔''

یہ انتہائی ذو معنی بات تھی۔ وہ ہنس پڑی۔ ''چلو...... دنیا امید پر قائم ہے۔ یار زندہ صحبت باقی......''

''وہ بات کیا ہے۔''

''افوہ...... اتنی بے صبری بھی ٹھیک نہیں۔ تم چاہتے ہو ابھی بتا دوں؟ فون پر؟ ہرگز نہیں......'' وہ شوخی سے بولی'' اور تم نہیں جانتے کہ راز کی بات فون پر کی جائے تو راز نہیں رہتی۔ میں تمہیں راز داری سے بتاؤں گی۔ جہاں سننے والا اور کوئی نہیں ہوگا۔ تمہارے سوا۔''

''تم صرف ڈراما کر رہی ہو۔ ایسی کوئی بات نہیں۔''

''اپنے ایمان سے کہو۔ پہلے جھوٹ بولا ہے تم سے؟ اور دیکھو کیسے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کے ملتی ہوں میں تم سے۔ اگر یہ ڈراما ہے تو اس میں ماری جائے گی صرف انارکلی۔ تم کو کچھ نہیں ہوگا۔ شہزادے۔ عورت دیوار میں چن دی جاتی ہے۔ مرد تخت نشین ہو جاتا ہے۔''

''فضول ڈائیلاگ مت مارو۔''

''دیکھو...... کیا تمہارے یار غار کے بارے میں تم کو بالکل صحیح خبر نہیں دی تھی میں نے۔''

''ابھی تک اس کی صداقت کا کوئی ثبوت نہیں ملا۔''

''یہ کیسے کہہ سکتے ہو تم۔ تمہاری پیاری بہن رابعہ تو ایک چشم دید گواہ ہے۔ سب دیکھ چکی ہے۔ کیا اس نے کچھ نہیں بتایا تمہیں؟ وہ بھی مل گئی ہے۔ تمہارے تانگوں کے ساتھ۔''

''بکواس مت کرو۔ مجھے موقع نہیں ملا اس سے بات کرنے کا۔''

''جان من...... نور جہاں کو تمہاری زندگی عزیز ہے۔ نہیں نہیں۔ جس روز تم نہ رہے میں خود مر جاؤں گی۔ جیسے چراغ نہ رہے تو روشنی مر جاتی ہے۔''

''یا میرے خدا۔ تم سیدھی طرح بات نہیں کر سکتیں۔''

''میں نے خبردار کر دیا ہے تمہیں نواب رفیق احمد شیرازی۔ تمہاری زندگی کے دشمن اور کوئی نہیں۔ وہی ہیں جن کو تم اپنا سمجھتے ہو۔ اب تو ڈھکی چھپی بات کوئی نہیں رہی۔ فاروقی نے مریم سے تعلق کو تسلیم کر لیا ہے۔ اس کا اگلا مرحلہ آئے گا جب وہ تمہاری منہ بولی بہن پر ڈورے ڈالے گا اور تمہاری پیاری لیلیٰ بھابی بھی اس کار خیر میں اپنے شوہر کے ساتھ تعاون کرے گی۔ اپنا سہاگ بچانے کے لیے بلیک میل ہونے والی عورت کتنی مجبور ہوتی ہے۔''

''مجھے یہ سب ناقابلِ یقین لگتا ہے۔''

''ابھی لگتا ہے نا۔ جس دن پہلا ثبوت تمہارے سامنے آیا۔ تم کہو گے کہ نور جہاں سے بڑھ کر تمہارا خیر خواہ کوئی نہیں۔ دیکھنا ایک دن اچانک مریم کی طبیعت خراب ہو گی۔ اس کو اسپتال لے جایا جائے گا۔ وہاں اس کو بتایا جائے گا کہ اس کا بچہ ضائع ہو گیا ہے۔ پھر وہ خود بھی ضائع ہو جائے گی۔

اس کا کوئی والی وارث نہیں جو پوسٹ مارٹم کرائے۔ اس کا شوہر اتنا بڑا قانون داں ہے۔ جب اسے شک نہیں اور وہ اپنی دوسری بیوی کی بات کو صحیح تسلیم کرتا ہے تو شک کیسا۔''

''تمہاری باتوں سے مجھے خوف آتا ہے۔''

وہ بولتی رہی۔ ''اس کے بعد تمہاری باری آئے گی لیکن تمہارے کیس میں پوری قانونی کارروائی کا منصوبہ ہے تاکہ قتل ثابت ہو اور پس منظر میں رہنے والے اصل مجرم کا راستہ صاف ہو جائے۔ بیوی نمبر ایک پھانسی چڑھے یا جیل جائے ساری عمر کے لیے۔ آخری مرحلہ ہوگا تمہارے عزیز دوست اور تمہاری منہ بولی بہن کے درمیان عمر بھر کے لیے عہد رفاقت کا۔ وہ مالک ہوگی ست بدھائی کی اور اس کا قانون داں شوہر اصل کرتا دھرتا۔''

میں نے کہا'' نور جہاں۔ مجھے اب یقین ہے کہ یہ سب صحیح نہیں ہو سکتا...... لیکن وہ اطلاع کیا تھی جس کا تعلق شہناز سے تھا۔''

وہ ہنسی'' آج رات میں بتا دوں گی تمہیں۔''

میں نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔ '' اچھا۔ بتاؤ میں کہاں آؤں؟''

''نہیں...... تم بتاؤ میں کہاں آؤں۔'' وہ مدہوش آواز بنا کے بولی'' دل کے ہاتھوں مجبور میں ہوں۔''

میں نے کہا'' اچھا...... میں بتا دوں گا۔ فون کر دوں گا۔''

''بائی سویٹ ہارٹ۔'' اس نے منہ سے چومنے کی آواز نکالی۔ ''میں بے چینی سے تمہارے فون کا انتظار کروں گی۔''

فون بند کرنے کے بعد میں بہت دیر تک وہیں بیٹھا رہا اور یہ سوچتا رہا کہ آخر اس خطرناک کیس کا انجام کیسا ہوگا۔ میں اس شخص کی طرح بے بس کھڑا تباہی کو دونوں طرف سے یلغار کرتا دیکھ رہا تھا وہ ایک طرف سے سمندر کی طوفانی موجیں نگلنا چاہتی ہوں اور دوسری طرف آگ اگلتا آتش فشاں ہو۔

کیا یہ ممکن ہے کہ نور جہاں نے سچ بولا ہو۔ کیا واقعی میرا دوست فاروقی مجھے اپنی بیوی کے ہاتھوں ٹھکانے لگا سکتا ہے؟ کیا لیلیٰ بھابی مجھے زہر دے سکتی ہے۔ صرف ست بدھائی کی قانونی وارث کہلانے کے لیے رابعہ اس سازش میں شریک ہو سکتی ہے؟ زبان سے تو رابعہ یہی کہتی ہے کہ اسے نہ جاگیر سے دلچسپی ہے نہ حق وراثت سے۔ لیکن اس کے دل کا حال کون جان سکتا ہے۔ اس کی ماں کو اسی جاگیر سے اپنا جائز حق نہ ملنے کا غم تھا۔ یہ صدمہ تھا کہ مجھ سے شادی کر کے رابعہ کو جاگیر اور حویلی کا مالک بنانے کا خواب بھی ادھورا رہ گیا۔ اس چکر میں وہ ماری گئی۔ پھر رابعہ کا باپ مارا گیا۔ کیا رابعہ کے دل میں ملال نہ ہوگا کہ ایسا صرف میری وجہ سے ہوا۔ اگر میں آدھا حصہ رابعہ کے حوالے کر دیتا تو اس کے والدین آج زندہ ہوتے۔ خوش و خرم زندگی جی رہے ہوتے۔ اور یہ ممکن نہیں تھا تو رابعہ سے شادی بہر حال کر سکتا تھا۔ وہ اتنی بری بھی نہیں۔ نہ صورت میں نہ سیرت میں۔

بے شک رابعہ پہلے ایسا نہیں سوچتی ہوگی۔ لیکن ایسا سوچ تو سکتی ہے۔ یا کوئی اس کی سوچ کے دھارے کو بدل تو سکتا ہے۔ اسے یہ لائن دے سکتا ہے۔ ایسا نہیں سمجھا جا سکتا کہ جس سازش کا امکان نور جہاں نے ظاہر کیا ہے وہ بالکل ہی ناممکن ہے۔ جتنا میں نے مخالف ذہن سے سوچا اتنا ہی قائل ہوتا گیا کہ مجھے نور جہاں کی بات کو مسترد نہیں کرنا چاہیے۔ مجھے اس کی بات کو اہمیت دینی ہوگی۔

اور اس کا دوسرا مطلب یہ تھا کہ مجھے نور جہاں کو اہمیت دینی ہوگی۔ بلاشبہ جان ہتھیلی پر اس نے رکھی تھی۔ انارکلی اور سلیم کے ڈرامے کا انجام کچھ اور ہو جائے۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ اکبر خان اپنی بے وفا بیوی کو قتل کر سکتا تھا۔ مجھے نہیں۔ آخر کیا ہو گیا ہے اس عورت کو......'' میں نے افسوس سے سر ہلایا۔

میرے ذہن میں فلم ''برسات کی رات'' کی ایک قوالی گونجنے لگی۔ یہ عشق عشق ہے عشق عشق۔ ساحر لدھیانوی نے اس میں عشق کا سارا فلسفہ سمو دیا تھا اور بیک وقت رفیع تھا آشا مبارک بیگم سدھا ملہوترہ اور دوسری بہت سی آوازوں میں گائی جانے والی یہ قوالی آدمی پر ایک وجد طاری کر دیتی تھی۔

مجھے اس وقت ہوش آیا جب میں نے راجا کو باہر آتا دیکھا۔ وہ اب بالکل نشے میں نہیں تھا۔ اس کے صاف ستھرے کپڑے اس بات کی علامت تھے کہ وہ نہا دھو کے نکلا ہے۔ اس کی نگاہیں مجھے تلاش کر رہی تھیں۔ جب وہ خلوت خانہ کی طرف بڑھا تو میں باہر نکل آیا۔

اب شام ہو گئی تھی۔ سورج کا رخ مغرب کی طرف ہونے سے لان پر سایہ آ گیا تھا۔ ہم کرسیوں پر آ کے سائے میں بیٹھ گئے۔ راجا کچھ شرمندہ سا نظر آتا تھا۔ اس نے کہا'' کیا تو مجھے گالیاں نہیں دے گا؟''

میں نے کہا'' نہیں، میں تجھے جوتے ماروں گا۔ یہ کیا حرکت کی تو نے۔ میرے یقین کو غلط کر دیا۔ میں تو سمجھتا تھا کہ تیرے اعصاب بہت مضبوط ہیں۔''

اس نے نظر چرا کے کہا'' یار میں بھی ایسا ہی سمجھتا تھا۔''

''شراب کیا اعصاب کی مضبوطی کے لیے ٹانک ہے الو کے پٹھے۔ یہ غم کو شراب میں ڈبونے کا فارمولا خالص فلمی ہے۔ اتنا دکھی ہے تو خود ڈوب جا چلو بھر پانی میں۔ ابے خدانخواستہ شہناز مری نہیں ہے کہ تو اس کا سوگ منانے لگا ہے۔ ہم کوشش کر رہے ہیں اس کو واپس لانے کی۔''

راجا نے کہا'' ہاں یار...... لیکن پتا نہیں مجھے کیا ہوگیا ہے۔ میری عقل کام نہیں کرتی۔''

''برادر۔ بیماری دل کا اثر دماغ پر ہی ہوتا ہے۔''

وہ بولتا رہا۔'' جب وہ یہاں تھی۔ مجھے احساس نہیں تھا کہ وہ میرے وجود کی تکمیل کرتی ہے۔ ہوا نظر نہیں آتی مگر آدمی کے گرد موجود اور محیط رہتی ہے اور اس سے وہ زندہ رہتا ہے مگر ایسا کبھی نہیں سوچتا کہ ہوا نہیں ہوگی تو کیا ہوگا۔ شہناز نہیں ہے تو لگتا ہے میں خلا میں ہوں۔''

''اچھا...... زیادہ قنوطی مت ہو۔ سب بندوبست ہوگیا ہے۔ وہ واپس آجائے گی۔''

''کل رات میں نے اسے خواب میں دیکھا۔ عجیب سا خواب تھا۔ وہ زرق برق کپڑے پہنے کسی ملکہ کی طرح تخت پر بیٹھی تھی۔ سونے کے زیورات میں لدی ہوئی۔ دو کنیزیں اس پر مور کے پروں سے بنا ہوا پنکھا جھل رہی تھیں۔ تیسری اس کے سامنے طشت لیے کھڑی تھی۔ اس میں بہت سے گلاس تھے...... جام کی شکل کے۔ ان میں مختلف رنگ کے مشروب بھرے ہوئے تھے۔ ایک وہ پی رہی تھی۔ میں اس کے سامنے باادب باملاحظہ ہوشیار کھڑا تھا۔ وہ ایک کاغذ پر لکھی ہوئی تحریر پڑھ رہی تھی پھر اس نے وہ کاغذ میری طرف بڑھا دیا اور بولی۔'' فریادی ہم نے تمہاری عرض داشت ملاحظہ کی۔ اس سے اندازہ ہوا کہ تم ہمارے عشق میں مبتلا ہو اور ثبوت کے طور پر صحرا کی خاک چھاننے یا پہاڑ کھود کے دودھ کی نہر نکالنے کے امتحان دینے کے لیے بھی تیار ہو۔ یہ ٹیسٹ کوالیفائی کرنے کے بعد تم مجھ سے عقد کی خواہش بھی رکھتے ہو لیکن فریادی۔ ہم تمہیں بتادیں کہ عشق اور شادی دو متضاد جذبے ہیں۔ تم ایک وقت میں ایک کر سکتے ہو...... یا عشق یا شادی...... چونکہ تم عشق کرتے ہو اس نے شادی ہم رانا صاحب سے کریں گے جن سے ہمیں بھی عشق نہیں ہے۔ تم عشق کرتے رہو لیکن خیال رہے کہ ہمارے سرتاج من سلامت کو خبر نہ ہو ورنہ وہ تمہیں دیوار میں زندہ چنوا دیں گے۔ اگر انارکلی کے ساتھ یہ ہوسکتا ہے تو گوبھی کے پھول کے ساتھ بھی ہوسکتا ہے۔''

وہ خود ہی یہ سب بتاتے ہوئے ہنس رہا تھا۔ میں نے ہنستے ہنستے کہا۔'' خواب ویسے تو سب بھی بے سروپا ہوتے ہیں۔ تو نے خواب دیکھا نشے کی کیفیت میں۔ وہ ایسا ہی ہوسکتا تھا۔''

''جب میں جاگا تو ہنسی مجھے بھی آئی مگر پھر میں سوچنے بیٹھ گیا کہ اس خواب میں کیا اشارے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ رانا نے تین تو پہلے ہی کر لی ہیں۔ چوتھی شادی وہ شہناز سے کر لے۔''

میں نے کہا'' ہاں' باقی بیویوں اور ان کے بچوں کے علاج کے لیے ڈاکٹر گھر میں موجود...... ابے پاگل خانے...... خوابوں کی تعبیر نہیں ہوتی ہے۔''

''میں مزید ڈیپریس ہوا۔ میں نے سوچا کہ رانا سے کچھ بعید نہیں۔ وہ انتقاماً بھی ایسا کرسکتا ہے۔''

میں نے کہا'' تو چھوڑ فضول باتیں۔ میں نے کہا تھا کہ آج وہ آجائے گی۔ ہم نے سارا بندوبست کرلیا ہے۔''

''مجھے بھی تو پتا ہے کہ یہ بندوبست کیا ہے۔''

میں نے اسے گزشتہ رات کے واقعات کی تفصیل بتائی پھر یہ بتایا کہ آج رات شامی بادشاہ، اپنی پوری فورس کے ساتھ کمانڈو ایکشن کرے گا اور شہناز کو واپس لے آئے گا۔

وہ تشویش سے سنتا رہا۔'' مگر یہ...... اس میں تو بہت سے لوگوں کے بھی مارے جانے کا امکان ہے۔''

''یہ خطرہ مول لیے بنا چارہ نہیں مگر مجھے بھروسا ہے شامی بادشاہ کی پلاننگ پر۔ اس نے مجھے یقین دلایا ہے کہ ہم اچانک ان پر جا پڑیں گے۔ دم لینے کی مہلت نہیں ملے گی انہیں اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ سوچنے یا کرنے کے قابل ہوں۔ ہم نکل آئیں گے لیکن صرف شہناز کے ساتھ نہیں۔ رانا کی حویلی میں سے بھی کسی کو یرغمال بنا کے لائیں گے۔ اس کی تین بیویاں ہیں۔ دو بیٹے ہیں۔ بیٹیاں پتا نہیں کتنی ہیں۔ انہیں ہم اپنی حفاظت کے لیے ایک ڈھال کے طور پر استعمال کریں گے۔''

راجا بدستور فکر مند رہا۔'' یہ خطرناک منصوبہ ہے۔''

''پرابلم یہ ہے راجا کہ اب چوائس کوئی نہیں۔ وقت بدل گیا۔''

میری بات مکمل ہونے سے پہلے فون کی گھنٹی بجی۔ یہ پھر نور جہاں کی کال تھی۔ پہلے میں نے سوچا کہ فون آف کردوں مگر پھر خیال آیا کہ ضرور... کوئی ایسی بات ہوگی کہ اس نے فون کرنا ضروری سمجھا۔

میں نے کال ریسیو کی اور کہا۔'' ہیلو...... اب کیا ہے۔''

وہ کسی تمہید کے بغیر بولی۔'' بس تمہیں بتانا تھا کہ تم کتنے مجبور ہو۔ اب تو تمہیں آنا ہی پڑے گا۔''

''ایسی کیا بات ہوگئی۔''

''میرے پاس جو اطلاع تھی۔ اس کی تصدیق ہوگئی ہے۔ اب ایک ایسا ترپ کا پتا دوں گی میں تمہارے ہاتھ میں کہ رانا کو دن میں تارے نظر آجائیں گے۔ وہ خود لے کر آئے گا شہناز کو تمہارے پاس اور ہاتھ جوڑ کے تم سے معافی بھی مانگے گا۔''

''کیا مجھے اس پر یقین کرلینا چاہیے؟''

''مجھے پتا تھا۔ تم کہو گے میں دانہ ڈال رہی ہوں تمہیں لیکن جان من۔ اب تو تمہیں اعتبار ہونا چاہیے مجھ پر اور میری محبت پر اگر کچھ بھی جھوٹ ثابت ہو تو پھر قتل کردینا۔ ایک دھمکی سے مر جاؤں گی میں...... تم پر الزام بھی نہیں ہوگا۔ صرف اتنا کہہ دینا کہ نور جہاں...... اب میدان حشر میں ہی ملاقات ہوگی۔ دنیا میں نہیں۔''

''جھوٹ سچ کا پتا چل ہی جائے گا۔''

''لیکن پتا چلانے کے لیے بھی تم کو آنا تو پڑے گا۔ بعد میں قتل ہونے سے کسے انکار ہے۔ جان تو ویسے ہی تمہارے حوالے کر دی ہے ظالم۔'' اس نے پھر منہ سے آواز نکالی۔ آئی لو یو۔''

میں نے فون بند کر دیا۔ اس عورت نے واقعی مجھے چکر میں ڈال دیا تھا۔ میں اسے سمجھنے سے قاصر تھا۔ بقول شاعر۔ لوگ ایسی ہی اداؤں پر فدا ہوتے ہیں۔ اس کا حسن و شباب بھی فتنہ انگیز و ہوش ربا تھا۔ وہ باتیں بھی بڑی دلچسپ کرتی تھی۔ ان میں ذہانت کے ساتھ شوخی ہوتی تھی۔ متانت کے ساتھ شرارت۔ شاید یہی اس کی فتح مندی کے عوامل تھے۔ اس نے میرے جیسے وحشی کے لیے ایسا جال بُنا تھا کہ کسی ترغیب میں نہ آنے والا خود کھنچ کر اسیری قبول کر چکا تھا۔

راجا نے غور سے مجھے دیکھا۔'' یہ کس کا فون تھا فیکے پتر۔''

میں چونک پڑا۔'' اسی کا...... نور جہاں کا۔''

''پھر بلایا ہے اس نے؟'' وہ تلخی سے طنزیہ لہجے میں بولا۔

''ہاں...... اور میں جا رہا ہوں۔''

''تو نے فریال کا موڈ دیکھا۔'' وہ ناراضی سے بولا۔

''مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ کتنی بدگمان ہے اور کیوں لیکن یہ سب وقتی بات ہے۔''

راجا نے نفی میں سر ہلایا۔'' مجھے ایسا نہیں لگتا نواب صاحب...... آپ جتنا آگے بڑھ گئے ہیں۔''

میں نے بگڑ کے کہا۔'' دیکھ راجا۔ میں تجھ سے یہ توقع نہیں رکھتا کہ تو بھی آنکھیں بند کرکے پتھر مارنے والوں میں شامل ہوجائے گا۔ فریال کی بات اور ہے۔ وہ جذبات کی آندھی سے اندھی ہوگئی ہے۔''

''اندھا تو ہوگیا ہے سور کے بچے جسے تو کھیل سمجھ رہا ہے وہ تماشائے عبرت نہ بن جائے۔''

''یہ میرے لیے کوئی کھیل نہیں۔ ایک ذمے داری ہے اگر وہ مجھے کچھ بتانا چاہتی ہے جس سے شہناز کی واپسی یقینی ہوجائے۔''

''وہ بکواس کرتی ہے۔ دانہ ڈالتی ہے تجھے۔''

میں نے ایک گہری سانس لے کر اپنا غصہ خارج کیا پھر میں نے اسے وہ سب بتایا جو مجھے نور جہاں سے معلوم ہوا تھا۔ راجا بے یقینی سے سنتا رہا۔

''کیا تو بالکل ہی پاگل ہوگیا ہے۔'' بالآخر راجا سے مزید برداشت نہ ہوسکا۔'' ایسی بے سروپا کہانی سن کے بھی چپ رہا۔ اور اب مجھے بتا رہا ہے۔ فاروقی کرسکتا ہے یہ سب۔''

میں نے کہا'' نہیں...... ابھی تک میں اس پر اتنا ہی اعتماد رکھتا ہوں جتنا تجھ پر۔''

''لیکن کل وہ ف[illegible] میرے بارے میں بھی ایسے ہی سازش کے پلان کا راز فاش کردے گی تو۔''

''راجا میں تھپڑ ماروں گا تیرے۔ اس کے کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ کیا عقل نہیں ہے میرے پاس۔''

''نہیں' تیری عقل کو نور جہاں نے یرغمال بنالیا ہے۔''

''اچھا فیصلہ کر۔''

مجھے یہ اندیشہ لاحق ہونے لگا تھا کہ راجا سے میری گفتگو میں بحث کی تلخی آجائے گی۔ اس کی وجہ نور جہاں کے لیے اس کے اور میرے نکتہ نظر کا فرق بھی تھا مگر اس سے زیادہ فرق ہمارے جذباتی ردِعمل کا تھا۔ راجا یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار ہی نہ تھا کہ نور جہاں ہمارے ساتھ مخلص ہوسکتی ہے یا ہم سے ہمدردی رکھتی ہے۔ وہ ہمارے بدترین دشمن کی بیوی تھی جس نے مجھے ساحرانہ حسن و شباب کے جال میں پھانس لیا تھا اور مجھے ہوس نے اتنا اندھا کر دیا تھا کہ میں اس کے اصل عزائم سے بے خبر اس کی ہر بات پر یقین کرنے لگا تھا۔ جو کچھ اس نے مجھ سے کہا تھا ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت مجھے فاروقی کے ساتھ رابعہ سے بدظن کرنے کے لیے تھا۔ یہ کہانی یقیناً اکبر خان نے ایجاد کی تھی اور نور جہاں مجھے اسکرپٹ کے مطابق سنا رہی تھی۔ اصل مقصد ہمارے درمیان بداعتمادی کی فضا پیدا کرنا اور پھر اس سے فائدہ اٹھانا تھا۔ اکبر خان جیسے بے ضمیر شخص سے کچھ بعید نہ تھی اور پھر نور جہاں کون سی اس کی وفا

شعار بیوی تھی۔ وہ سب کی بیوی تھی اور اکبر خاں اسے اپنے مذموم عزائم کی تکمیل کے لیے پوری طرح استعمال کرتا تھا۔ اگر وہ سچ مچ میرے ساتھ مخلص ہوتی اور اس کی جذباتی وابستگی میں حقیقت ہوتی تو وہ اکبر خاں کو چھوڑ کے میرے ساتھ نہ آجاتی۔

اس آخری بات کا جواب میں نہیں دے سکتا تھا۔ یہ میں راجا کے سامنے تسلیم کر چکا تھا کہ ایک بار نادانستہ اور دوسری بار غلطی سے میں اس کے بلاوے پر چلا گیا تھا اور ایک شب کی مہمانی قبول کر چکا تھا۔ مجھے اپنی کمزوری کا بھی اعتراف تھا کہ اس کے بے پناہ حسن اور شباب کی بے مثل رعنائی کے سامنے میری شرافت سارے دعوے اور مزاحمت کی ساری قوت صفر ہو جاتی تھی لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ مجھ پر حاوی آچکی ہے اور مجھے اپنے پوشیدہ مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال کر سکتی ہے۔

میرے لیے راجا کو یہ یقین دلانا دشوار تھا کہ معاملہ برعکس ہے۔ کمزوری کا شکار میں نہیں نور جہاں ہوئی ہے۔ وہ میری مجبوری نہیں میں اس کی ضرورت بن گیا ہوں۔ اس میں مخلص ہونے کا کوئی سوال نہیں۔ وہ صرف میرے لیے اپنی زندگی کو داؤ پر لگا رہی ہے۔ مجھے حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ میرے لیے کچھ کرے۔ جس سے میری نظر میں اس کی قدر و قیمت بڑھے۔ وہ اچھی طرح سمجھتی ہے کہ اکبر خان کو چھوڑنا بھی اتنا ہی ناممکن ہے جتنا مجھے حاصل کرنا۔ وہ مجھے فریال سے نہیں چھین سکتی اور میرے دل میں اپنی محبت پیدا نہیں کر سکتی۔ چنانچہ وہ اس وقتی تعلق پر ہی اکتفا کر رہی ہے۔ اس امید پر کہ شاید جو ناممکن نظر آتا ہے وہ ممکن ہو جائے...... کسی دن میں اسے اپنا لوں۔

نور جہاں کی باتوں کو جھوٹ پر مبنی اور ناممکن واقعات سے بھری ہوئی ایسی فرضی کہانی قرار دینا جو اکبر خاں کے سازشی ذہن نے ایجاد کی تھی مجھے راجا کا پُرعناد تعصب لگتا تھا۔ صوفی چچا کے معاملے میں نور جہاں کی مدد شامل نہ ہوتی تو ہم سب شدید قانونی مشکلات کے ساتھ ناقابلِ بیان رسوائی کا سامنا کرتے۔ اکبر خان نے رانا کے اکسانے پر صوفی چچا کے خلاف بہت سے جھوٹے مقدمات قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ قتل کے کیس میں تو ہم ان کو دیوانگی کے عذر پر بچا لیتے لیکن پولیس نے یہ بندوبست کر لیا تھا کہ ان کی دیوانگی کو میڈیکل بورڈ کی رائے سے جعلی اور سزا سے بچنے کی کوشش قرار دیا جائے۔ پھر ان پر پیری فقیری کی آڑ میں بدمعاشی کے کیس کھڑے کیے جائیں۔ وہ آستانے پر منشیات فروشی کرتے تھے اور عقیدت مند عورتوں کی آبرو لوٹتے تھے۔ اگر یہ کیس بن جائے تو ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتے۔ صوفی چچا کو سی آئی اے کے حوالے کرنے کا منصوبہ ہمیں بلیک میل کرنے کی کوشش تھی۔ یہ کوشش نور جہاں کی کوشش سے ہی ناکام ہوئی تھی۔ بے شک جو طریقہ اس نے اختیار کیا ظالمانہ تھا۔ اس نے حوالات میں صوفی چچا کو مروا دیا تھا۔ اگر حقیقت دیکھی جائے تو ان کی زندگی خود ان کے لیے بھی عذاب ہوتی اور ہمارے لیے بھی۔ ان کی موت ہماری حق میں بھی باعث نجات ہوئی اور صوفی چچا کے مشکل آسان کرنے کا سبب بھی بنی۔

نور جہاں نے ہمارے خلاف کی جانے والی ایک سازش کو بڑی ہوشیاری سے ناکام کر دیا تھا۔ فاروقی کے بارے میں جو کچھ اس نے مجھے بتایا تھا، وہ بھی اندر کی بات تھی۔ جو کچھ اس نے خود دیکھا تھا اور سنا تھی وہی میرے سامنے رکھ دیا تھا۔ اب کیا جھوٹ ہے کیا سچ۔ اس کا فیصلہ تو آنے والا وقت ہی کر سکتا تھا۔ مریم سے فاروقی کے تعلقات پر میں نے کبھی شک نہیں کیا تھا لیکن نور جہاں کی اطلاع تھی کہ ان کے درمیان مراسم کی نوعیت اب ناجائز نہیں رہی۔ مریم نے فاروقی سے شادی کر لی ہے کیونکہ وہ اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔

اگر نور جہاں کی یہ بات سچ ثابت ہو جاتی تو پھر کہا جا سکتا تھا کہ اس نے جو بتایا، وہ سب جھوٹ نہیں تھی۔ پھر بھی یہ ضروری ہوگا کہ میں محتاط رہوں...... دنیا میں ناممکن کچھ نہیں ہوتا۔ اگر حالات نور جہاں کی اطلاع کے مطابق نظر آتے ہیں تو بڑی خرابی کو رونما ہونے سے پہلے روکا جا سکتا ہے لیکن اصل بات وہی تھی کہ اس کا فیصلہ آنے والا وقت کرے گا۔ راجا ابھی کچھ سننے اور سمجھنے کو تیار نہیں تھا۔ اس کا ذہن ایک طرف شہناز میں الجھا ہوا تھا تو دوسری طرف اس بات کی طرف سے اپنی آنکھیں کان اور عقل کے دروازے بند کر لیے تھے کہ نور جہاں کی طرف سے مجھے کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ وہ ماننے کے لیے تیار نہ تھا کہ وہ شکاری نہیں شکار ہے۔ وہ میرا استحصال نہیں کر رہی ہے۔ وہ صرف استعمال ہو رہی ہے اور یہ میری نہیں نور جہاں کی مجبوری ہے۔ خطرہ اگر ہے تو اس کے لیے اور کسی بھی مرحلے پر اس سے اپنا دامن چھڑانا میرے اختیار میں ہے۔

اس مسئلے پر میری اور راجا کی بحث کو فریال کے ساتھ رابعہ نے نمودار ہو کے ختم کیا۔ ان کے پیچھے ریشم تھی جو ہم سب کے لیے چائے لائی تھی۔

فریال کے چہرے پر ابھی تک ذہنی و اعصابی کشیدگی کے آثار تھے وہ کوشش ضرور کر رہی تھی کہ اپنے رویے سے اس کا اظہار نہ ہونے دے مگر وہ مجھے دھوکا نہیں دے سکتی تھی۔ اس کے انداز کی شوخی اور اطوار کی طراری یکسر مفقود تھی۔ وہ لڑکی جو ہمہ وقت پارے کی طرح مضطرب و بے چین رہتی تھی۔ سنجیدگی جس کے مزاج میں نہیں تھی۔ جس کے لبوں کی ہنسی دوسروں کی افسردگی دور کرتی تھی اور کچھ نہیں تو چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد۔ وہ مجھ سے الجھتی رہتی تھی۔ کبھی پیار کے جھگڑے میں تو کبھی جھگڑے کے پیار میں۔ وہ لڑکی اتنی تھکی ہوئی خاموش اور گم سم ہو گئی تھی۔

فریال کے اس بجھے بجھے رویے کو باقی سب لوگ ایک فطری ردِعمل سمجھتے تھے۔ ہم سب ایک جیسے صبر آزما دور سے گزر رہے تھے، مشکل حالات سے نبرد آزما تھے لیکن ایسا لگتا تھا کہ ست بدھائی حویلی کے اندر اس کی تاریخ سے وابستہ نحوست کے پراسرار سائے بڑھتے جا رہے تھے۔ گھر کی رونق مکینوں سے ہوتی ہے۔ کوئی مخالف قوت ان کی یک جہتی کو انتشار میں بدل رہی تھی۔ کچھ حادثاتی طور پر جدا ہوئے اور ایک صدی کے بعد قبرستان کو آباد کرتے یہاں آئے...... پھر فرخ نے میرا انتقام رابعہ سے لیا اور اس کی زندگی میں زہر گھول کے نکل گیا...... پھر شہناز کا اغوا ہوا۔ میرے والدین جو بڑی امیدوں کے ساتھ یہاں بسنے آئے تھے، حویلی سے رخصت ہو گئے۔ اب حویلی کی فضا میں سوگواری بس گئی تھی۔ راجا ڈپریشن میں شراب پی کے دوسروں کو ڈیپریس کر رہا تھا۔ گھر میں مغرور ڈاکو نے ڈیرا ڈال رکھا تھا اور معاملات مجموعی طور پر بے یقینی کا شکار تھے۔

ان حالات کا تھوڑا بہت اثر تو سب پر تھا لیکن فریال کی اداسی اور بیزاری کے اسباب کچھ اور ہی تھے۔ جن سے میں اچھی طرح واقف تھا۔ کسی نہ کسی طرح وہ دوسروں سے اپنی فرسٹریشن کو چھپا رہی تھی۔ وہ کیسے کہہ سکتی تھی کہ مجھے شک ہے وہ شخص جواب تک مجھ سے اور صرف مجھ سے محبت کرتا تھا...... جو آٹھ سال سے اپنے عہد پر قائم تھا کہ شادی کرے گا تو صرف مجھ سے۔ وہ بے وفائی پر آمادہ ہے۔ وہ ایک حسین فاحشہ کے خوبصورت جسم اور ناز و ادا کا شکار ہو گیا ہے اور مجھے پچھتانا پڑ رہا ہے کہ میں اس کے پیچھے یہاں تک آئی اور خود کو ایسے لٹا دیا کہ اب میری نہ قدر ہے نہ محبت...... نہ اہمیت ہے نہ ضرورت۔

درحقیقت ایسا نہیں تھا لیکن عورت کے دل میں شک اور حسد کا بیج ایک بار پھوٹ جائے تو اسے تناور درخت بنتے دیر

نہیں لگتی۔ پھر اس درخت میں پھولوں کی جگہ کانٹے نکلتے ہیں اور اس کے زہر جیسا پھل محبت کی ساری خوشیوں کو نفرت کے دکھ میں ڈھال دیتا ہے۔

رابعہ نے باتوں میں پہل کی۔ ''آخر کیا کر رہے ہو تم لوگ...... کچھ بتاتے ہی نہیں۔''

راجا نے کہا۔ ''بتانے کو کیا ہے ابھی۔''

فریال نے کہا ''ہاں...... میٹنگ تو بڑی لمبی لمبی کر رہے ہو۔'' میں نے کہا ''ہاں۔ وہ ڈاکو صاحب بھی جس کے نام کی ساری علاقے میں بڑی دہشت ہے۔ دبکے ہوئے ہیں بند کمرے میں چوہے کی طرح۔ مفت کی اڑا رہے ہیں...... دعوتیں۔''

مجھے سخت طیش آیا مگر میں نے ضبط سے کام لیا۔ ''بہت جلد تم دیکھ لوگی کہ جو کام ہم سے نہیں ہو سکتا تھا۔ یہی لوگ کریں گے۔''

''بہت جلد کسے کہتے ہیں۔'' فریال طنز سے بولی۔

''آج رات شہناز آجائے گی۔'' میں نے کہا۔

''بڑے یقین سے کہہ رہے ہو تم......''

میں نے کہا ''ہاں...... تم یقین نہ کرنا چاہو تو تمہاری مرضی۔''

رابعہ نے بروقت مداخلت کی۔ ''کزن...... تمہیں فرصت ملے تو جا کے دیکھو...... شہر میں کیا ہو رہا ہے۔''

میں نے کہا ''تم آئی ہو شہر سے۔ تم بتاؤ کیا ہو رہا ہے۔''

''وہ سب ہو رہا ہے جو نہیں ہونا چاہیے۔''

''پہیلیوں میں بات مت کرو۔'' میں نے کہا۔

''تمہارے والدین۔ میرے تایا اور تائی سخت غم زدہ اور ملول ہیں...... ان کے سارے ارمان خاک میں مل گئے۔''

میں نے کہا ''یہ تھوڑے دن کی بات ہے پھر بس ویسا ہی ہوگا جیسا انہوں نے سوچا تھا۔''

''ان کے پاس بھی تھوڑے دن ہیں کزن اور دن گزرتے جاتے ہیں۔ جب سے وہ شہر گئے ہیں، تم ان کو دیکھنے ہی نہیں گئے۔''

''ان کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔''

''ہاں...... اماں نے اسپتال میں داخل ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ ڈاکٹر روز انہیں دیکھنے آتا ہے۔ ان کی حالت بہت بہتر ہے لیکن وہ تنہا ہیں۔ تمہارے ابا بھی ان کے ساتھ گھر کے ایک کمرے میں بند ہو گئے ہیں۔ اور بدقسمتی سے وہ گھر بھی ان کا نہیں ہے۔''

''میں ان کو واپس لے آؤں گا۔ میرا خیال تھا کہ فاروقی کے گھر میں وہ خود کو اجنبی محسوس نہیں کریں گے۔ لیلیٰ بھابی ان کا خیال رکھیں گی۔ اس کے علاوہ تم بھی ان کے ساتھ تھیں۔ تم کیوں واپس آگئیں؟''

''مجھے آنا پڑا کزن۔'' وہ کچھ سوچ کے بولی۔

راجا بولا ''کیا تمہاری بے دخلی کے احکامات صادر کرائے تھے...... لیلیٰ بھابی نے۔''

''ارے وہ بچاری کیا کسی کو بے دخل کرے گی جو خود بے دخلی کے خطرے سے دوچار ہے۔'' رابعہ بولی۔

اس بات پر بیک وقت راجا کا اور میرا چونکنا فطری بات تھی۔ میں نے کہا۔ ''کزن...... اس سنسنی خیز سرخی کے پیچھے کیا اسٹوری ہے۔''

''اسٹوری بڑی دردناک، شرمناک اور افسوسناک ہے کزن لیکن میری رپورٹ اسی ریسرچ پر مبنی ہے جو میں نے بقلم خود کی۔'' رابعہ نے کہا۔ ''میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔''

ہاں...... سوچنے کے لیے دماغ کی ضرورت بہرحال پڑتی ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ بولی۔ ''آپ کچھ نہ بولیں۔ ایسی دوستی کے دعوے اور ایسی بے خبری۔ تم نے کچھ نہیں دیکھا۔''

میں نے کہا ''یار کیا نہیں دیکھا۔ میں نے تو بہت کچھ نہیں دیکھا۔ تم نے آخر کیا دیکھ لیا۔''

''گڑبڑ تو یقیناً بہت پہلے سے چل رہی تھی لیکن اب شک کی کوئی بات نہیں رہی...... فاروقی نے دوسری شادی کر لی ہے۔''

اس انکشاف پر شدید ردِعمل صرف فریال کا سامنے آیا۔

''یہ کیا بک رہی ہو تم۔'' اس نے چلا کے کہا۔

میں نے راجا کی طرف دیکھا اور نظروں ہی نظروں میں سوال کیا کہ اب کہو راجا جی۔ نور جہاں تو یہ بریکنگ نیوز پہلے ہی دے چکی تھی۔

راجا نے مجھ سے نظر چرا کے رابعہ سے سوال کیا۔ ''تمہیں کس نے بتائی یہ بات......؟''

میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ''کس سے کی ہے اس نے دوسری شادی...... سونی سیکریٹری مریم سے۔''

دونوں خواتین نے چونک کے مجھے دیکھا۔

''گویا آپ کو پہلے سے علم تھا۔'' رابعہ نے کہا۔

''بھئی دوست ہیں۔ راز دار ہیں۔'' فریال طنز سے بولی۔

''یہ کہو کہ سازش میں شریک ہیں۔''

میں نے اپنا دفاع کیا۔ ''یار یہ صرف گیس ورک تھا۔ کیا کہتے ہیں اسے اردو میں۔ قیاس آرائی ہے، خیال کے گھوڑے دوڑا رہا تھا میں۔''

''گھوڑے دہیں کیوں پہنچے آخر۔ مریم تک۔''

میں نے کہا ''دیکھو۔ کیا مجھے سچ بولنے کی اجازت ہے۔ میں کسی وجہ کے بغیر شک کرتا تھا۔ اگر فاروقی کی جگہ میں ہوتا تو ہر شخص شک کرتا۔ یہ ایک قدرتی بات ہے۔''

''خاک قدرتی بات ہے۔ وہ ہوگی ایسی ہی...... شاید تم پر بھی ڈورے ڈالے ہوں گے۔'' رابعہ نے کہا۔

''اور انہوں نے ماشاء اللہ حوصلہ شکنی نہیں کی ہوگی اس کی۔ تمہارے چچا زاد اس معاملے میں بڑے فراخ دل ہیں۔ کسی کا دل توڑنے کو گناہ سمجھتے ہیں۔'' فریال نے اپنا طنزیہ انداز برقرار رکھا۔

راجا نے کہا ''یار تم لوگ یہ کیوں نہیں سوچتی ہو کہ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بجتی۔ اور کون نہیں جانتا کہ عورت کا گھر خود عورت اجاڑتی ہے۔ عورت کی سب سے بڑی دشمن خود عورت ہوتی ہے۔''

میں نے کہا ''اس کے علاوہ...... قدرتی بات سے میری مراد تھی کہ حالات ایسے ہوں تو یہی ہوگا۔ مریم بیوہ ہے لیکن جوان ہے۔ اس کی تعریف کر کے میں مجرم بننا نہیں چاہتا لیکن جو لوگ فاروقی کے آفس میں آتے ہیں اور ویٹنگ روم میں کچھ دیر بیٹھتے ہیں۔ ان کا وقت اچھا گزرتا ہے۔ ممکن ہے کچھ ایسا بھی محسوس کرتے ہوں کہ انتظار کا ایک گھنٹا پانچ منٹ میں گزر گیا۔ فاروقی کے پاس دولت ہے ناموری ہے لیکن ایک چیز نہیں ہے...... اولاد۔''

''کیا اس میں لیلیٰ بھابی کا قصور ہے؟'' رابعہ نے کہا۔

''قصور ہے یا نہیں ہے۔ اس کا علم تو انہی کو ہوگا مگر ہمارے سیٹ اپ میں مرد کو بہانہ تو مل جاتا ہے۔ پھر چاہے دوسری، تیسری اور چوتھی سے بھی کچھ نہ ملے۔''

فریال نے کہا ''دولت تو مل جائے گی مریم کو۔ ایسی عورت اور کچھ نہیں چاہتی۔''

میں نے کہا ''رابعہ بی بی...... تم اپنی انویسٹی گیشن کی رپورٹ پیش کر دو۔''

''لیلیٰ بھابی اچانک واپس گئی تھیں ہمارے ساتھ۔ فاروقی نے ظاہر تو کیا کہ اسے خوشی ہوئی ہے لیکن اس کے چہرے سے پریشانی عیاں تھی۔ اس نے پوچھا کہ تم کیوں واپس آگئیں۔ وہ پہلے اتر کے اندر گئی تھیں۔ فاروقی کے الفاظ میں نے باہر سنے پھر میں دروازہ کھول کے اندر گئی تو وہ مزید حیران ہوا۔ اس نے کہا کہ اچھا اچھا خیر ہے آپ بھی ساتھ ہیں۔ بھئی یہ کیا چکر ہے۔ کیوں پوچھا مارا گیا ہے آخر۔ اس وقت وہ مجھے خاصا اپ سیٹ لگا۔ خیر یہ بات آئی گئی ہوگی۔ اگلے روز میں نے محسوس کیا کہ لیلیٰ بھابی بہت ٹینس ہیں۔ ان کا چہرہ اترا ہوا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ وہ رات کو روتی رہی ہیں اور سوئی نہیں ہیں۔ ان کی آنکھیں سرخ اور سوجی ہوئی تھیں۔ میں نے پوچھا تو انہوں نے ٹال دیا۔ فاروقی اور لیلیٰ بھابی ایک دوسرے سے نظر بھی چرا رہے تھے اور بات بھی نہیں کر رہے تھے۔ یہ میں نے ناشتے کی میز پر دیکھا۔ دن میں نارمل مصروفیت رہی۔ فاروقی نے ایک ڈاکٹر اور لیڈی ڈاکٹر کی ٹیم بھیج دی تھی۔ وہ میاں بیوی بڑے اچھے لوگ تھے۔ میاں ساٹھ کے لگ بھگ تھے۔ سفید بال تھے مگر دراز قامت اور خوبصورت۔ خوش پوش اور وجیہہ...... ان کی بیگم کی عمر کم تھی لیکن ان کی جوڑی دیکھ کے خدا کی قدرت میرا اعتبار آتا تھا کہ واقعی جوڑے وہ آسمانوں پر بناتا ہے۔''

میں نے کہا ''پھر اگر اس نے فاروقی کا جوڑا مریم کے ساتھ بھی بنا دیا ہے تو......''

''شٹ اپ کزن...... ایسے تو آدمی اپنی ہر برائی کو اللہ کے کھاتے میں ڈال دے گا کہ اس کی مرضی......'' رابعہ بگڑ کے بولی۔

راجا نے کہا ''تم ایسے بیان جاری رکھو۔''

''وہ بڑے تجربہ کار ڈاکٹر تھے۔ بڑے خوش اخلاق اور مہذب۔ انہوں نے انتہائی دوستانہ انداز میں تایا اور تائی کا معائنہ کیا۔ ادھر ادھر کی بہت سی باتیں پوچھیں۔ چند ٹیسٹ لکھے اور کہا کہ ویسے تو سب ٹھیک ہے۔ اسپتال جانے کی قطعی ضرورت نہیں اور دوائیں لکھ دیں۔ میں چائے لے کر گئی تو وہ بتا رہے تھے کہ شادی کو تیس سال ہو گئے۔ اماں نے سوال کر دیا کہ بچے کیا کر رہے ہیں؟ کیا وہ بھی ڈاکٹر ہیں؟ تو ہنسنے لگے کہ بچے تو نہیں ہیں۔ اب خدا ہر چیز تو نہیں دیتا۔ اتنی کامیابی...... شہرت، زندگی کا آرام اور آسائش کے اسباب، سب کچھ تو مل گیا۔ ایک خوشی نصیب میں نہیں تھی تو نہ سہی۔ ہم گلہ نہیں کر سکتے۔''

فریال نے کہا ''وفا شعاری کی ایسی مثالیں بھی ہیں۔''

رابعہ نے کہا ''تم اس عورت کو دیکھ لیتیں تو مزید حیران ہوتیں۔ اللہ معاف کرے، صورت اس کی دبی ہوئی تھی مگر وہ عورت واقعی بدصورت تھی۔ کالی، پست قامت، موٹی، وہ جو اکثر لوگ کہتے ہیں نا۔ پہلوئے حور میں لنگور خدا کی قدرت۔

اس کا بالکل الٹ کیس تھا مگر کیا سکون تھا ان کی زندگی میں۔ کیا اطمینان تھا۔ ورنہ ڈاکٹروں کو مواقع کی کیا کمی۔ آج سے بیس سال پہلے یہ ڈاکٹر کتنا ڈشنگ ہوگا۔ غلطی سے یا کسی مجبوری کے باعث اس عورت سے شادی کر بیٹھا تھا تو کیا اسے چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ دوسری چھانٹ کے کسی ملکہ حسن سے کرتا۔"

میں نے کہا "تمہاری رپورٹ کا یہ جذباتی پیرا حذف کیا جاتا ہے۔ اب پھر آجاؤ اصل بات کی طرف۔"

"ہاں...... رات کو عجب اتفاق ہوا۔ میں جلدی سوگئی تھی لیکن پھر نیند ڈسٹرب ہوگئی ایک خواب سے۔ دوبارہ نیند نہیں آئی۔ میں نے خاموشی سے فرج کھولا اور اپنے لیے ایک کولڈ ڈرنک لے کر باہر نکل گئی۔ باغ میں ٹہل رہی تھی کہ بے خیالی میں کھڑکی کے قریب چلی گئی۔ وہ فاروقی اور لیلیٰ بھابی کے بیڈروم کی کھڑکی تھی جو کسی وجہ سے کھلی رہ گئی تھی۔ میرے کانوں میں لیلیٰ کی آواز آئی۔ انہوں نے کہا کہ...... جھوٹ بولتے ہو تم...... مجھے معلوم ہے جب میں یہاں نہیں تھی تو وہ عورت تھی میرے گھر میں۔ اس بات نے میرے کان کھڑے کردیے۔ میں ذرا قریب جا کے سننے لگی۔ حالانکہ یہ معیوب بات ہے مگر میں خود کو روک نہ سکی۔"

میں نے کہا" بے شک تمہارا جرم قابل معافی ہے کزن۔"

"جب میں نے ان کی باتیں سنیں تو سارا کیس میری سمجھ میں آگیا۔ بھابی کو پہلے بھی مریم کے سیکریٹری ہونے پر اعتراض تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اس عورت کی چھن درست نہیں مگر فاروقی کہتا تھا کہ بیوہ عورت ہے اور جواں ہے، اس لیے سب ہی شک کرتے ہیں اس پر...... سب کی رال ٹپکتی ہے۔ میں حفاظت کرتا ہوں اس کی۔ اور وہ سیکریٹری بہت اچھی ہے لیکن اب ثابت ہوا کہ لیلیٰ بھابی کا شک درست تھا۔"

"کوئی عورت بلاوجہ شک نہیں کرتی۔" فریال بولی۔

راجا نے سر ہلایا" دریں چہ شک لیکن وہی عورت بیوی بننے کے بعد شوہر پر شک نہ کرے۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔"

رابعہ نے کہا" میں پتا نہیں کتنی دیر وہاں کھڑی رہی۔ ان کی خوب لڑائی ہوئی۔ لیلیٰ بھابی نے بتادیا کہ مریم کی کتنی چیزیں بیڈروم سے ملی ہیں اور برطرف کرنے کی دھمکی پر ملازموں نے بتا دیا ہے کہ مریم بی بی یہاں آکے رہی تھیں۔ جب بھی وہ ست بدھائی جاتی ہیں مریم یہاں آجاتی ہے لیکن صاحب نے سب کو منع کر رکھا ہے زبان کھولنے سے۔ فاروقی اس پر بہت چراغ پا ہوا کہ ان سالے نمک حراموں کو میں نے صبح ہوتے ہی جوتے مار کے نہ نکالا تو میرا بھی نام فاروقی نہیں۔ بھابی نے انہیں دھمکی دی تھی کہ وہ بھی چپ نہیں رہیں گی۔ انجام یہ ہوا بحث کا کہ فاروقی نے اعتراف کرلیا کہ اولاد کے مسئلے کو مزید ٹالنا اس کے لیے ممکن نہیں چنانچہ وہ مریم سے نکاح پڑھوانے کی سوچ رہا ہے۔ باقی وہی بکواس کہ بیوہ سے نکاح سنت ہے اور اخلاقی یا قانونی طور پر اس میں کوئی قباحت نہیں۔ بس اس کے بعد رونے دھونے کے سوال لیلیٰ بھابی کیا کرسکتی تھیں۔ صبح فاروقی کورٹ چلا گیا مگر لیلیٰ بھابی اپنے کمرے سے باہر نہیں آئیں۔ میں نے پوچھا تو نوکروں نے بتایا کہ بیگم صاحبہ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ میں پریشان ہوگئی کہ کہیں اس نے کچھ کھا پی تو نہیں لیا ہے۔ مایوسی کی ایسی کیفیت میں عورت کچھ بھی کرسکتی ہے۔ خیر میں نے اندر جا کے حال پوچھا۔ تو انہوں نے پھر ٹالنے کی کوشش کی۔ اس پر میں نے کہہ دیا کہ گزشتہ رات دن ان کی ساری باتیں میں نے سن لی تھیں۔ میرا یہ کہنا غضب ہوگیا۔ انہوں نے جو رونا شروع کیا تو مجھے سنبھالنا مشکل ہوگیا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ تایا تائی کو کچھ معلوم ہو۔ وہ یہاں سکون اور عافیت کے لیے آئے تھے۔ ان کی پریشانی مزید بڑھ جائے گی۔ خیر خدا خدا کرکے لیلیٰ بھابی کی حالت سنبھلی۔ میں نے انہیں پانی، گلوکوز اور پھر چائے سب کچھ دیا۔ اس کے بعد وہ ایک گھنٹا بولتی رہیں۔ خود کو کوستی رہیں کہ انہوں نے اپنی آنکھیں بند کیوں رکھیں اور فاروقی پر اعتبار کیوں کیا۔ مریم ایسی ہی عورت تھی۔ میں نے انہیں سمجھایا کہ اولاد نہ ہونے کا تو صرف بہانہ ہوتا ہے۔ کیا اولاد والے دوسری شادی نہیں کرتے۔"

میں نے کہا" کزن...... کیا تم نے وہ بنیادی سوال سامنے رکھا۔ تکنیکی خرابی کے بارے میں۔"

رابعہ سمجھ گئی۔ "نہیں...... یہ سوال خود لیلیٰ بھابی نے نہیں اٹھایا کہ دوسری شادی سے اولاد کی کون سی ضمانت حاصل ہے۔ اگر وہ خود اس کی اہل ہوتیں تو دعوے سے بولتی کہ ایک نہیں وہ چار کرلے۔ اولاد نہیں ہوگی۔ اس سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ خرابی ان کے سسٹم کی ہے۔"

میں نے راجا کی طرف دیکھا۔"ایک خاتون کا منطقی نتیجہ اخذ کرلینا یقیناً غیر معمولی واقعہ ہے۔"

راجا نے تائید کی۔" دنیا اتفاقات سے خالی نہیں ہے دوست۔"

رابعہ نے احتجاج کیا۔" سارے مرد ایک سے متعصب ہوتے ہیں۔"

"اور ایک سی خوش فہمی کا شکار کہ وہ عقل کل ہیں۔" فریال نے کہا۔

ہم دونوں نے اتفاق رائے میں سر کو اوپر نیچے ہلانے میں حرج نہ سمجھا۔ میں نے کہا" مردوں کے اس معاشرے میں ایسا ہی ہوگا۔"

"اداس ہی جینا آپ لوگوں کا نصیب۔ یہ ہم نے نہیں بنایا۔ اگر نصیب کے سلسلے میں فریاد کرنی ہو تو میدان حشر میں کرنا۔"

"چھوڑو رابعہ۔ ان پر اثر ہونے والا نہیں ہے۔ آگے کہو۔"

رابعہ نے کہا" جب لیلیٰ بھابی کا صدمہ کم ہوا تو ان کا غصہ جاگا۔ چلو پہلے تصدیق کرتے ہیں کہ فاروقی کا صرف ارادہ ہے یا اس نے سچ مچ نکاح پڑھوالیا ہے اس فاحشہ سے۔ میں نے کہا یہ آپ کیسے معلوم کریں گی۔ انہوں نے کہا کہ میں جانتی ہو وہ ڈائن کہاں رہتی ہے۔ اس سے پوچھوں گی۔ میں نے کوشش ضرور کی بھابی کو روکنے کی۔ سمجھایا کہ اس کا فائدہ کوئی ہیں۔ ایسا نہ ہو آپ بے عزتی کرا کے واپس آئیں۔ لیکن وہ بہت غصے میں تھیں۔ انہوں نے کہا کہ تم کو نہیں جانا میرے ساتھ تو میں اکیلی جاتی ہوں۔ مجبوراً میں نے ان کا ساتھ دیا۔ ہم مریم کے گھر گئے۔ وہ اپنے بھائی بھاوج کے ساتھ رہتی ہے لیکن مکان مریم کے سابق شوہر کا ہے اور مریم کے نام ہے۔"

"کون سے سابق شوہر کا۔" یہ سوال راجا نے کیا تھا اور بڑی معصومیت سے۔

رابعہ نے اسے گھور کے دیکھا۔" یہ تم معلوم کرلینا۔ مریم پہلے تو حیران ہوئی پھر بھابی کے تیور دیکھ کے ڈر گئی۔ اتفاق سے وہ گھر میں اکیلی تھی۔ اچھا خاصا بڑا گھر ہے۔ مریم کے زیر استعمال تو ایک بیڈروم ہی ہے۔ باقی بھابھی بھاوج کے پاس ہے۔ کرایہ نہیں دینا پڑتا اس لیے مریم کو برداشت کرنے پر مجبور ہیں۔ اپنا خرچہ بھی وہ خود اٹھاتی ہے۔ مریم نے بلاشبہ بہت برداشت سے کام لیا۔ بھابی نے تو اسے ایسی سنائیں کہ میں کیا بتاؤں۔ اس نے نہ تردید کی اور نہ تائید۔ ہر سوال کے جواب میں کہتی رہی کہ فاروقی سے پوچھیں۔ ظاہر ہے اس کے بعد پوچھنے کو کیا رہا تھا۔ اس نے چائے کو پوچھا مگر ہم نکل آئے بلکہ میں باہر کھینچ لائی بھابی کو۔ انہوں نے واپس آنے کے بعد کہا کہ آج فیصلہ ہوجائے گا۔ اس گھر میں یا وہ رہے گی یا میں رہوں گی۔ وہ آئے گی تو میں چلی جاؤں گی ست بدھائی۔"

میں چونک پڑا۔" ست بدھائی۔"

"ہاں... بھابی کا میکا تو ہے نہیں... کچھ دور کے رشتے دار ہیں ان کے پاس وہ جانا نہیں چاہتیں اور پھر فاروقی نے کہہ دیا تھا کہ جاؤ بلالو اپنے ست بدھائی کے طرف داروں کو... یہ بات ان کے دل کو لگ گئی۔"

میں نے کہا" یہ تو بڑی پرابلم ہوجائے گی۔"

"لیکن ہم انکار نہیں کرسکتے۔" فریال نے قطعی لہجے میں کہا" وہ یہاں رہے گی۔ اس کے بعد فاروقی نہیں آتا تو نہ آئے۔"

راجا کسی سوچ میں گم تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ نور جہاں کی فراہم کردہ اطلاعات کی تھوڑی بہت۔ صداقت کے ثبوت سامنے آنے سے وہ پریشان ہوگیا تھا۔ اسے اتفاق بھی سمجھا جاسکتا تھا مگر حالات کا رخ وہی تھا جن کی نشاندہی نور جہاں کرچکی تھی۔

میں خود سوچنے پر مجبور تھا کہ کیا واقعی ایسا ہوگا؟ مریم کا ابارشن ہوجائے گا پھر وہ مرجائے گی۔ لیلیٰ بھابی اپنا گھر بچانے کے لیے شوہر کے ہاتھوں بلیک میل ہوگی؟ وہ مجھے زہر دے گی پھر خود جیل جائے گی یا پھانسی کے تختے پر...... فاروقی کا راستہ صاف ہوگا۔ وہ رابعہ کو پرپوز کرے گا۔ اسے اپنے جال میں پھنسائے گا اور ست بدھائی کی وارث و مالک رابعہ کی ساری ہوشیاری دھری رہ جائے گی۔ عورت اکیلی خود کو بہت کمزور محسوس کرتی ہے...... اسے قدم قدم پر مرد کے سہارے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور جب مرد ہو فاروقی جیسا ہوشیار...... زمانہ ساز...... قابل اور نامور...... جس پر شبہ نہ کیا جاسکے کہ وہ دولت کی خاطر سب کچھ کررہا ہے۔ تو رابعہ جیسی عورت پر محبت بھرے الفاظ کا جادو چلنے میں دیر نہیں لگتی۔ رابعہ کی دنیا میں کون ہوگا میرے بعد...... نہ ماں باپ نہ بھائی بہن۔ ایک شخص نے عمر بھر ساتھ نبھانے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ دھوکا دے کر بھاگ گیا۔ فاروقی اس سے کہیں زیادہ ذمے دار تو ہے۔

ریشم چائے کے برتن اٹھانے آئی تو اس نے مجھے شامی بادشاہ کا پیغام دیا۔"انہوں نے کہا کہ فارغ ہوں تو بات کرلیں۔"

شامی بادشاہ کو میں چھت پر حویلی کی گیلری میں ٹہلتا ہوا دیکھ سکتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اسے کسی کا انتظار ہے۔ میرا اندازہ درست تھا۔ میں اٹھ کے چند قدم چلا تھا کہ گیٹ کھلا اور میں نے مجذوب کو اندر آتے دیکھا جو میرے اور شامی بادشاہ کے درمیان پیغام رسانی کا ذریعہ بنا ہوا تھا۔ اس حسب عادت مجھے دیکھتے ہی نعرہ لگایا۔ مست قلندر۔ مست قلندر۔ اور وہ ہاتھ اوپر اٹھا کے اور پاؤں زمین پر مار کے رقص کے

انداز میں گول گول گھومنے لگا۔ میں نے کوئی توجہ دینا ضروری نہیں سمجھا کیونکہ اوپر سے شامی بادشاہ نے اسے دیکھ لیا تھا اور اس سے ملنے کے نیچے آ رہا تھا۔ میرے لان کو عبور کرنے سے پہلے شامی زینہ اتر کے گیٹ کی طرف بڑھ چکا تھا۔

گیٹ ایک بار پھر کھلا اور غنی اندر آیا۔ اس نے گاڑی مجھ سے کچھ فاصلے پر روکی اور نیچے اتر کے مجھے سلام کیا۔

میں نے سلام کا جواب دے کر پوچھا۔ ''تم بینک منیجر کے پاس گئے تھے۔''

''جی سر۔'' اس نے ڈکی کھول کے کچھ سامان نکالنا شروع کیا۔

''کیا کہا انہوں نے۔''

غنی نے ڈکی بند کر کے چابی مجھے تھما دی۔ ''انہوں نے کہا ہے کہ ٹائم بہت کم دیا آپ نے لیکن وہ کچھ نہ کچھ بندوبست کر کے رکھے گا۔ رقم پہنچانے کی ذمے داری لینے پر وہ راضی نہیں۔ کہتا ہے آپ خود اپنی ذمے داری پر لے جا میں ورنہ ایک دن اور دیں۔ برنکس جیسی ہی دوسری کمپنی کیش لانے لے جانے کا کام کرتی ہے۔ ان کی بکتر بند گاڑی کی انشورنس ہوتی ہے۔''

میں نے کہا'' ٹھیک ہے۔ کل بتا دیں گے جیسی ضرورت ہوگی۔''

گیٹ کے قریب قلندر کے اور شامی بادشاہ کے درمیان خفیہ مذاکرات جاری تھے۔ قلندر کے بارے میں شامی مجھے بتا چکا تھا کہ وہ پولیس کا مخبر بھی ہے اور پولیس اور ڈاکوؤں کے درمیان رابطے کی خدمات بھی سرانجام دیتا ہے۔ اس کی... پُراسرار نقل و حرکت میرے لیے دلچسپی کا باعث تھی۔ کمائی کے لیے بھی آدمی کیا نہیں کرتا۔ کیسے کیسے پاپڑ بیلتا ہے اور کیا کیا سوانگ بھرتا ہے۔ بقول شامی وہ اچھا بھلا ہوش مند بلکہ دوسروں سے زیادہ سیانا بندہ تھا جو دیوانہ بنا پھر رہا تھا۔ ادھر سے ادھر ٹہلتا تھا اور بظاہر اس کا ٹھکانہ کہیں نہیں تھا لیکن شامی بادشاہ نے بتایا تھا کہ اس کا گھر بار بیوی بچے سب ہیں۔ پولیس اور ڈاکوؤں کی خدمت سے اس کو یقیناً معقول آمدنی ہوگی لیکن اس کی کمائی کا زیادہ بڑا ذریعہ وہ عقل کے اندھے عقیدت مند تھے جو اسے اللہ والا اور بڑا پہنچا ہوا سمجھتے تھے۔ اس کی دیوانگی میں معرفت کے اشارے تلاش کرتے تھے اور اس سے اپنی حاجات پوری کرانے کے لیے نذرانے دیتے تھے۔

شامی کچھ دیر بعد نمودار ہوا۔ ''نواب دوست۔ قلندر اچھی خبر لایا تھا۔ اب تمہارا کام سمجھو ہو گیا۔''

میں نے کہا'' کس کام کی بات کر رہے ہو شامی۔''

''اسے سورج مل نے بلایا تھا۔ اس کا پیغام ملا ہے کہ کل رات حویلی میں جرگہ ہوگا۔ اس کو تم پر بھروسا ہے۔''

''یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔''

''اس سے بھی اچھی بات یہ ہے کہ وہ تم سے مل کے بہت متاثر ہوا تھا اور جس طرح تم نے دوستی نبھانے اور میری جان بچانے کے لیے تین کروڑ ایسے نکال کر دیے جیسے وہ تین روپے تھے جن کی کوئی حیثیت ہی نہیں۔ اس سے تم نے سورج مل کا دل بھی جیت لیا ہے۔''

میں نے کہا'' ڈاکو برادری میں میری مقبولیت ایسے ہی بڑھتی رہی تو ایسا نہ ہو وہ مجھے صدر منتخب کر لیں۔''

شامی ہنسا۔ ''سورج مل نے کہا ہے کہ ایسے دوست کی مدد کرنا تمہارا فرض ہے۔ اس نے تمہارا مسئلہ حل کیا۔ اب تم اس کا مسئلہ حل کرو۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ اس بات کا مطلب سمجھتے ہو؟''

میں نے کہا'' تم سمجھا دو تو بہتر ہے۔''

''آج ہم کچھ نہیں کریں گے۔ کل شہناز کا مسئلہ جرگے میں پیش ہوگا۔ اتفاق رائے سے حل تلاش کیا جائے گا۔ طریقہ کچھ بھی ہو۔ رانا کی اب خیر نہیں۔ وہ ہر طرف سے محصور ہو جائے گا۔ کل اسے نوٹس ملے گا کہ شہناز کو واپس پہنچائے۔ ورنہ ہم آئیں گے تو اور بہت کچھ لے جائیں گے۔ صبح تک اس نے ڈاکٹر شہناز کی واپسی کا وعدہ نہ کیا تو اسے بہت نقصان اٹھانا پڑے گا۔ یہ بات وہ جانتا ہے۔''

''اور اس نے پولیس سے مدد مانگ لی پھر۔''

''پولیس کسی کو کب تک بچا سکتی ہے۔ رانا تو خیر اسمبلی کا ممبر ہے۔ اس کے ساتھ پولیس کی گارڈ جا سکتی ہے ہر جگہ مگر باقی لوگ۔ آتے جاتے ہر ایک کے ساتھ مسلح محافظ ہوں تب بھی حفاظت کی کوئی ضمانت نہیں۔ اس کے علاوہ ڈاکوؤں کا چیلنج کوئی نہیں لیتا۔ وہ کسی وقت بھی نازل ہوں۔ نقصان بہت زیادہ ہوتا ہے۔''

میں نے کہا'' اگر ایسا ہو جائے تو اچھا ہے مگر کیا اس میں شہناز کے لیے رسک نہیں ہے۔''

''سارا رسک رانا لے گا۔ اگر اس نے بے وقوفی کی۔ میں اسے اتنا بے وقوف نہیں سمجھتا۔ اپنا نفع نقصان تو وہ دیوانہ بھی دیکھتا ہے جو ابھی پیغام لے کر آیا تھا۔''

میں نے کہا'' مجھے بھی ایک اور سورس سے بڑی اچھی ٹپ ملی ہے۔''

''کس سورس سے۔''

''ابھی میں اس کا نام نہیں بتا سکتا۔ اس نے کہا ہے کہ

رانا خود اسے ڈاکٹر شہناز کو واپس پہنچائے۔ میں ابھی جا رہا ہوں۔ معلوم ہو جائے گا کہ ایسا منتر کون جانتا ہے جو رانا کو عرش سے فرش پر لے آئے۔'' میں نے کہا۔

''اگر خون خرابے کے بغیر ہی بات بن جائے تو کیا بات ہے۔''

میں تیار ہو کے نکلا تو فریال سامنے آ گئی۔ ''کہاں جا رہے ہو؟'' میں نے پرسکون رہتے ہوئے کہا۔ ''کام ہے...... شہر۔''

''کیا کام ہے ایسا۔''

میں نے کہا۔ ''میں ہر بات کی وضاحت کا پابند نہیں ہو پھر بھی بتا دیتا ہوں۔ اپنے والدین کو دیکھنا ہے۔ فاروقی سے ملنا ہے۔''

''پھر میں بھی ساتھ چلوں گی۔''

''کیوں...... تمہارا کیا کام ہے......'' میں نے جھنجلا کے کہا۔

اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ''کیوں...... تمہارے والدین کو دیکھنے کے لیے مجھے نہیں جانا چاہیے۔''

میں نے کہا'' ضرور جانا چاہیے لیکن یہاں رابعہ اکیلی ہوگی۔''

''وہی......!'' وہ طنز سے بولی۔ ''اتنے لوگوں میں وہ اکیلی ہوگی اور اس سے پہلے جب میں اکیلی تھی۔''

میں نے کہا'' اچھا بابا چلو...... مگر مجھے کہیں اور بھی جانا ہے۔ میں تمہیں فاروقی کے گھر چھوڑ دوں گا۔''

''مجھے معلوم ہے اور کہاں جانا ہے تمہیں۔''

میں بھڑک اٹھا۔ ''دیکھو فریال۔ تمہارا یہ رویہ بالکل ٹھیک نہیں ہے۔ تم نے ابھی سے جاہل بیویوں کی طرح مجھے تنگ کرنا شروع کر دیا ہے۔ یہ ہر وقت کی جھک جھک اور روک ٹوک...... میں برداشت نہیں کر سکتا۔''

وہ چیخ کے بولی۔ ''اپنے رویے پر غور کرو۔ ابھی تم بھی نہیں ہو روایتی مطلق العنان شوہر۔ بیوی کو پاؤں کی جوتی سمجھنے والے۔ اسے گھر کے اندر تک محدود کر کے خود باہر عیش کرنے والے۔''

میں نے کہا'' تم شک کرتی ہو مجھ پر۔''

''تم جھوٹ کیوں بولتے ہو۔ ذرا سوچو تم کتنے بدل گئے ہو یہاں آ کے۔ میں تو اپنی کشتیاں جلا کے آئی تھی۔'' اس نے رونے کی تیاری کی۔

میں نے ہاتھ جوڑ کے کہا'' خدا کے لیے فریال۔ اگر تمہیں بھروسا نہیں رہا مجھ پر تو ابھی وقت ہے پھر سوچ لو۔''

''تم بھی سوچ لو۔ میں اپنی اور تمہاری جان ایک کر دوں گی۔ اتنی آسانی سے ہار نہیں مانوں گی۔'' وہ ایک دم پلٹی اور روتی ہوئی اندر بھاگ گئی۔

رابعہ برآمدے میں آ گئی تھی۔ اس نے ہماری سب باتیں سنی تھیں اور وہ بہت اپ سیٹ تھی۔ ''یہ کیا ہو رہا تھا۔''

میں نے کہا'' کچھ نہیں کزن...... فریال ٹینشن میں ہے۔''

''ٹینشن کا شکار تو ہم سب ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم آپس میں ہی لڑنا شروع کر دیں۔ تم کہاں روانہ ہو گئے؟''

میں نے کہا'' تم نے اتنا شرمندہ کیا کہ جا رہا ہوں ماں باپ کو اپنی صورت دکھانے۔ تم اسے سنبھال لو گی۔''

وہ مسکرائی۔ ''سنبھال لوں گی۔''

''میں آ جاؤں گا صبح...... گیارہ بجے تک۔'' میں نے گاڑی میں بیٹھ کے کہا۔

گاڑی حویلی سے نکلی تو میں نے ایک گہری سانس کے ساتھ کشیدگی کے دباؤ کو خارج کرنے کوشش کی۔ فریال نے مجھے مخمصے میں ڈال دیا تھا۔ میرے احساس جرم و گناہ کی شدت میں اضافہ کر دیا تھا اور اب میرا نور جہاں سے ملنے کا بالکل موڈ نہیں رہا تھا۔

میں نے بددلی سے سوچا کہ پروگرام منسوخ کر دوں۔ واپس کے جا کے فریال کو مناؤں۔ اس کے دل سے خدشات اور شبہات کو دور کر دوں اور اسے یقین دلا دوں کے اس کے لیے میرے جذبات نہیں بدلے ہیں اور نہ بدل سکتے ہیں، ہمارا مستقبل وہی ہے جس کے خواب ہم نے مل کے دیکھے تھے اور ان کی تعبیر بھی وہی ہے۔ بس کسی طرح بھی اس کا اعتماد بحال ہو جائے۔

گاڑی اسی وقت تک دینہ کے موڑ تک پہنچ گئی تھی جب میں نے نور جہاں کو فون کیا۔ پہلی گھنٹی پر ہی اس نے کہا'' ہیلو۔''

میں نے کہا'' نور جہاں۔ مجھے کچھ کہنا تھا تم سے۔''

''تو کہہ دینا میرے سامنے آ کے۔ آخر ایسی کیا بات ہے جو فون پر کہنی ہے۔'' وہ ہنسی۔ ''نو عمر لڑکے جب پہلی بار اظہار عشق کرتے ہیں تو سامنے جا کے کہنے کی ہمت نہیں رکھتے۔''

میں نے کہا'' پلیز شٹ اپ۔ دیکھو میں راستے میں ہوں۔''

''اچھا میں سمجھ گئی۔ تم چاہتے ہو میں آدھے راستے میں آ کے ملوں۔'' اس نے کہا اور پھر گانے لگی۔ ''ادھر سے تم چلے اور ہم ادھر سے۔''

''نور جہاں۔ آج میرا آنا مشکل ہے۔''

وہ سیریس ہو گئی۔ ''سوچ لو۔ جو ٹپ میں شہناز کی رہائی کے سلسلے میں دینے والی تھی......''

''وہ تم فون پر بھی دے سکتی ہو۔''

وہ پھر ہنسی ''میرے چندا۔ نور جہاں سب کچھ ہے مگر بے وقوف نہیں ہے۔ بیوٹی وتھ برین۔''

''مطلب یہ کہ فون پر نہیں بتاؤں گی۔''

''تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے۔ تم سے ملنے کے بہانے میں خود پیدا کر رہی ہوں۔ بہانے نہ رہے تو تم قابو کیسے آؤ گے۔''

میں نے کہا ''اچھا...... اگر ہم کل پر رکھ لیں۔''

''اونہوں...... جو بات میں تمہیں بتانے والی ہوں۔ اس کی اہمیت کل صفر ہو جائے گی۔ فائدہ اٹھانا چاہتے ہو تو صبح اٹھا سکتے ہو۔''

''دیکھو...... چکر مت دو مجھے۔'' میں نے کہا۔

وہ بولی۔ ''چکر ہو تو ایک تھپڑ مارنا میرے منہ پر اور کہہ دینا کہ آیندہ تم پر اعتبار نہیں کروں گا۔ بعد میں تم احسان مانو گے میرا۔ حالانکہ میں احسان نہیں کر رہی ہوں۔ قیمت چکا رہی ہوں تمہارے التفات کی۔ ہے نا الٹی بات۔ لوگ میری ایک نگاہ التفات کی کیا قیمت چکاتے ہیں۔ تمہیں کیا معلوم...... تمہارے ساتھ دل کا معاملہ ہے میرے چندا۔ اور کچھ نہیں۔''

میں نے کہا ''اچھا...... میں آتا ہوں لیکن میرا موڈ بہت خراب ہے۔''

''مجھے موڈ کو ٹھیک کرنے کے ایک سو ایک طریقے آتے ہیں اور جب میں تمہیں وہ بات بتاؤں گی جس سے کل تمہیں ڈاکٹر شہناز واپس ملے گی۔ تو کتنی خوش ہو گی تمہیں۔ اس سے زیادہ خوشی تمہیں اس کے غرور کی شکست سے حاصل ہو گی۔ وہ خود آئے گا تمہارے پاس شہناز کے ساتھ۔ جہاں بھی تم بلاؤ گے۔ بارگیننگ کرنے کی پوزیشن میں تم آ جاؤ گے۔ اب بولو۔''

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ تم جیتیں اور میں ہارا۔''

میرے ذہن میں کوئی ابہام نہیں تھا کہ وہ دانہ ڈال رہی ہے اور میں اپنی مرضی اور خوشی سے شکار ہونے جا رہا ہوں۔ علامہ اقبالؒ نے مجھے یاد دلانے کی کوشش کی۔ اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی۔ مگر اب ان کے اور قائد اعظم کے راہ نما فرمودات کی کسے پروا ہے۔ پچاس برس سے زیادہ بیت گئے۔ پبلک جانتی ہے کہ جس سمت میں اس کا سفر جاری ہے وہ منزل کا راستہ نہیں ہے مگر ایک ہجوم (جسے قوم نہیں کہا جا سکتا) جو آنکھیں بند کیے چل رہا ہے۔

ایسے ہی میں ہوں کہ خرابی کے راستے پر بڑھتے قدموں کو روکنے سے قاصر ہوں۔ برائی میں ایک کشش ہے جو آدمی کے ارادوں کو کمزور کرتی ہے۔ کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے۔ نہیں اس سے پہلے والا مصرعہ زیادہ حسب حال ہے۔ ایماں مجھے کھینچے ہے بلائے ہے مجھے کفر۔ اور میں کسی شرابی کی طرح کمزور اور بے بس ہوتا یا سگریٹ پینے والے کی طرح جو اچھی طرح جانتا ہے کہ اس لت کے نقصانات کیا ہیں۔ دیکھتا ہے سنتا ہے اور پڑھتا ہے کہ نشے کی لت کیسے تباہ کرتی ہے مگر اس سے خود کو روک نہیں سکتا۔

نور جہاں تو شراب یا سگریٹ سے کہیں زیادہ نشہ آور لت ہے۔ دنیا کا ہر مرد عورت کے سامنے اپنی قوت ارادی کھو بیٹھتا ہے۔

کسی معمول سے زیادہ بے اختیار ہو جاتا۔ شاید سارے شوق ایسے ہی ہوتے ہیں۔ شوقین مونٹی کارلوس کے جوئے خانوں میں لاکھوں ڈالر ایک رات میں ہارنے جاتے ہیں۔ آخر کیا فرق ہے مجھ میں اور پرانے وقتوں کے کسی روایتی نواب میں جو کسی نور جہاں کے کوٹھے پر اپنا سب کچھ لٹا دیتے تھے۔

میرا ذہن متضاد خیالوں کی یلغار میں تھا۔ میرے سامنے فریال کا چہرہ آتا تھا تو مجھے ندامت ہوتی تھی۔ کتنی سخت اور صبر آزما تھی وفا کی راہ جس پر اس نے میرا ساتھ دیا۔ آٹھ برس وہ راہ طلب میں کانٹوں پر چلتی رہی اور میں نے اس راہ پر خار پر اس کا ساتھ دیا۔ اس یقین کے ساتھ ایک دن ہمارا سفر دائمی خوشیوں کی گلرنگ وداری میں ضرور ختم ہوگا۔ شاید وہ ست بدھائی میں اپنے سارے خوابوں اور ارمانوں کی تعبیر دیکھتی تھی۔

دوسری طرف نور جہاں۔ شعلہ ساماں...... حشر بداماں۔ مجھے بے بس کیے دیتی تھی۔ دیکھو میں نے تم سے تمام عمر کا عہد وفا تو نہیں مانگا۔ میں فریال سے اس کے خوابوں کی تعبیر تو نہیں چھین رہی۔ اس کی وہ خوشیاں تو نہیں مانگ رہی جن پر اس کا حق ہے۔ میں تمہارے یا فریال کے ساتھ کوئی برائی تو نہیں کر رہی۔ میں تو خوشیوں کے حصول میں تمہارے کام آ رہی ہو جیسے میں تمہیں فریال سے محبت کرنے سے روک نہیں سکتی۔ ایسے ہی کوئی اور مجھے تم سے محبت کرنے سے نہیں روک سکتا اور پھر اس محبت میں کیا ہے میرے لیے خطرہ جاں کے سوا مگر ایسی محبت کو تم کیسے سمجھ سکتے ہو۔ بڑی آسانی سے اس پر ہوس کا لیبل لگایا جا سکتا ہے۔ بڑی آسان بات ہے نور جہاں کو فاحشہ کہنا۔

وہ سارا راستہ میں نے کیسے طے کیا۔ میری رفتار کہیں بھی اسی نوے کلومیٹر سے کم نہیں رہی۔ ہائی وے پولیس نے بھی مجھے حد رفتار سے بڑھنے پر نہیں روکا۔ میرے دماغ کا ایک حصہ پوری طرح الرٹ رہا۔ اس حصے کا میری ڈرائیونگ پر مکمل کنٹرول تھا چنانچہ میں ہائی وے کے تمام ٹریفک رولز کی پابندی کرتا صرف ڈھائی گھنٹے میں لاہور پہنچ گیا۔ میرے دماغ کا دوسرا حصہ پنڈولم کی طرح سے ادھر ہوتا رہا۔ کبھی فریال کی طرف تو کبھی نور جہاں کی طرف۔

یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ تمام پرانے اور ماہر ڈرائیور ایسا کر سکتے ہیں۔ وہ ڈرائیونگ پر پوری توجہ رکھتے ہیں لیکن ان کا ذہن دفتری یا کاروباری مسائل بھی حل کرتا رہتا ہے۔ ڈرائیونگ ایک INSTINCT بن جاتی ہے۔ ایک غیر شعوری اور فطری عادت جیسے سانس لینا یا اخبار پڑھتے ہوئے چائے پینا۔

میں ٹانگیں سیدھی کرنے کے لیے اترا تو مجھے سخت تھکن محسوس ہوئی۔ نہر خاموشی سے بہہ رہی تھی اور اس میں سینکڑوں ہزاروں ننھے منے بلب ستاروں کی طرح روشن تھے۔ یہ حسن انتظام ایل ڈی اے کا تھا۔ جس نے شہر کے درمیان سے گزرنے والی نہر میں چراغاں کر دیا تھا۔

نہر کے دونوں کناروں پر استادہ پرانے سایہ دار درخت صف بستہ تھے۔ دونوں جانب کی سڑکوں پر کاریں خاموشی سے روشنی کی لکیریں بناتی گزر رہی تھیں۔ نہر کا پانی اپنی یکساں پرسکون رفتار سے بہتا چلا جا رہا تھا۔ اس پرسکون منظر کی سحر آفرینی نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا۔ میں نے بدن کا جمود توڑنے کے اپنے ہاتھوں کو اور پیروں کو پھیلا کے انگڑائی لی۔

اور اسی وقت میں نے نور جہاں کو اچانک روبرو دیکھا۔ وہ مجھ سے چند فٹ کے فاصلے پر یوں نمودار ہوئی تھی جیسے اس کے وجود نے ہوا میں ہی ایک پیکر رعنائی اختیار کر لیا ہے۔ ایک لمحہ پہلے وہ کہیں نہ تھی۔ دوسرے لمحے وہ اپنے حسن کی ساری آب و تاب کے ساتھ میرے سامنے کھڑی مسکرا رہی تھی۔

میں نے حیرانی سے کہا۔ ''تم...... کہاں تھیں تم۔''

وہ مسکرائی۔ ''کہاں تھی؟ یہاں تمہارے سامنے اور کہاں۔''

میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ ''پھر میں نے تمہیں کیوں نہیں دیکھا تھا۔''

''یہ اپنی نظر سے پوچھو۔'' وہ ہنسی اور اس نے چادر ہٹا کے اپنے ریشمی بالوں کو ایک ادا سے ناز سے سر جھٹک کر شانوں پر پھیلا دیا۔

''تمہاری گاڑی کہاں ہے؟''

وہ نہر کے کنارے سبزے پر بیٹھ گئی۔ ''میں گاڑی نہیں لائی...... اپنی ایک سہیلی کے گھر سے ٹیکسی میں آئی ہوں۔''

میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ ''یہ میری سمجھ نہیں آئی۔''

''آئے گی بھی نہیں۔ تم تو آزاد ہو۔ نہ کوئی روک ٹوک ہے نہ کوئی خطرہ۔ مجھے سو جتن کرنے پڑتے ہیں گھر سے ایسے نکلنے کے لیے کہ کسی کو شک ہو نہ خبر۔'' اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ''اس سے پہلے ہی ایک سہیلی کے ساتھ نکل آئی تھی۔ دوبارہ نکلتی تو گیٹ کے سیکورٹی گارڈ کو شک ہوتا۔ وہ سب اکبر خاں کے جاسوس ہیں۔ اس کا دیا کھاتے ہیں تو اس کے لیے جان دے بھی سکتے ہیں اور لے بھی سکتے ہیں۔''

اس کی قربت میں محسوس ہونے والی مخصوص خوشبو میرے حواس میں چھانے لگی تھی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ یہ جذبات کو برانگیختہ کرنے والی خوشبو اس نے فرانس کی ایک سیکس شاپ سے لی تھی جہاں مردوں اور عورتوں کے لیے ایسی تمام مصنوعات دستیاب ہوتی ہیں جو جنس مخالف کے لیے باعث کشش ہوں۔

''میں نے اپنی اس سہیلی کو بلایا۔ اب وہ بیڈ روم میں میری جگہ سو رہی ہے۔ میں خاموشی سے اس کی کار کی ڈکی میں بند ہو گئی۔ پھر میری سہیلی نے میرے ڈرائیور کو بلا کے کہا کہ وہ گاڑی اس کے گھر لے جائے۔ وہاں اس کی ضرورت ہے۔ وہ آج میرے ساتھ رہے گی۔ ڈرائیور خالی گاڑی لے گیا۔ گارڈ کو بھی یقین ہے کہ آج صاحب نہیں ہے تو ایک سہیلی میرے ساتھ ہے۔ اس کی گاڑی واپس گئی تو خالی تھی۔ سہیلی کے گھر پہنچ کے ڈرائیور نے گاڑی پورچ میں کھڑی کی اور چابی اگنیشن میں چھوڑ کے لوٹ گیا۔ میں نے پینسل ٹارچ روشن کی۔ ایک چھوٹے سے پیچ کس کی مدد سے ڈگی کر اندر سے کھولا اور باہر نکل آئی۔''

''تمہاری واپسی کا طریقہ بھی ایسا ہی ہوگا۔''

''ہاں میری سہیلی کا شوہر گاڑی لائے گا۔ جب وہ اندر چلا جائے گا تو میں بھی نکل کے پیچھے سے اندر چلی جاؤں گی۔ بیوی اسے پہلے ملے گی۔ مجھے دیکھ کے وہ سمجھے گا کہ میں اندر کچن میں تھی۔ یہ سب اس لیے کرنا پڑا مجھے کہ تم ڈرتے ہو۔ مجھ پر اعتبار نہیں ہے تمہیں۔'' اس نے جوتے اتارنے اور اپنے پیر پانی میں لٹکا دیے۔

آج وہ سیاہ ساری میں تھی جس میں حرکت سے ستارے سے روشن نظر آتے تھے۔ اس کا بلاؤز کسی ماہر فیشن ڈیزائنر کے کمال فن کا شاہ کار تھا۔ سامنے سے اس حد تک کشادہ کے

نظر ایک حد تک پہنچ کے بے قرار ہو جائے مگر اس کے آگے صرف تصور سے تصویر ...مکمل ہو۔ پیچھے سے۔ ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے۔ کسی عملی تفسیر۔ اسٹار پلس کے ڈراموں میں نظر آنے والا نازک ریشمی ڈوریوں کا جال جس سے کمر کا سارا اجلا پن اور گداز آتش عشق بھڑکانے ...... شانوں سے بہت اوپر تک بازوؤں کی سنہری گلابی جلد کا گورا پن عیاں ...... لیکن سر عام اس جلوہ حسن کی نمائش سے اجتناب کرنے کے لیے وہ ایک چادر پہن کر آئی تھی۔

''ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟'' وہ آہستہ سے ہنسی۔

میں نے کہا'' جب تم ہو سامنے۔ تو کوئی تمہارے سوا نہیں کیا دیکھ سکتا ہے؟''

''اچھا...... یہاں کیوں بلایا تھا مجھے؟''

''بلایا تم نے تھا......'' میں نے بات کاٹی۔

''تم ابھی تک اس خوف سے نجات نہیں پا سکے نا کہ کسی دن میں تمہیں مروادوں گی کیونکہ میں تمہارے دشمن اکبر خاں کی بیوی ہوں۔''

میں نے کہا'' میرا خیال ہے اب ہمیں کہیں چلنا چاہیے۔ میں بہت تھکا ہوا ہوں۔''

''تمہاری تھکن تو میں یوں دور کردوں گی۔'' اس نے چٹکی بجائی'' لیکن دیکھو...... کیا ہم ہوٹل کے سوا کہیں اور نہیں جاسکتے۔ پچھلی بار بال بال بچ گئے تھے ہم...... سامنے والے کمرے میں اکبر خاں تھا۔''

میں نے کہا'' ہر روز ایسا اتفاق نہیں ہوگا اور ہوٹل کے سوا کوئی اور جگہ بھی تو نہیں ہے۔''

''ہے ایک جگہ...... میرا گھر...... چونکو نہیں۔ میں اکبر خان کے گھر کی نہیں اپنے گھر کی بات کر رہی ہوں۔ جہاں میں رہتی تھی۔''

میں نے کہا'' کب رہتی تھیں۔''

''جب میں نے ہوش سنبھالا پھر وہیں ایک گورنمنٹ اسکول میں پڑھنے جاتی رہی۔ وہیں سے کنیرڈ کالج گئی۔''

''تم نے کنیرڈ کالج میں پڑھا ہے۔''

وہ آہستہ سے مسکرائی۔'' انگلش لٹریچر میں ایم اے کیا تھا میں نے اس وقت تک مجھے اندازہ ضرور ہوگیا تھا کہ میری اصل طاقت کیا ہے؟ لیکن اسے استعمال کرنا میں نے اس گھر سے نکل کے سیکھا۔''

''کہاں ہے یہ گھر۔'' میں نے دلچسپی سے کہا۔

''ایک چھوٹی سی آبادی ہے۔ نسبتاً نئی۔ شالا مار لنک روڈ پر انگوری باغ اسکیم کہلاتی ہے۔ وہاں پہلے انگوری باغ تھا میرے والد نے چار مرلے جگہ لے کر وہ گھر بنایا تھا۔ جواب بند پڑا ہے۔ چلو آج تمہیں اس گھر میں لے جا کے کچھ تصویریں ... دکھاتی ہوں...... اپنے بچپن سے جوانی تک دور کی۔ میرا سارا معصوم ماضی اس گھر میں رہ گیا تھا۔ بولو چلو گے؟''

''اگر زندہ رہا تو۔ میرا تو بھوک سے دم نکلنے والا ہے۔''

وہ ہنسی۔''نہیں مرو گے اتنی دیر میں، چلو۔''

میرے اٹھنے سے پہلے عین ہماری پیچھے کوئی گاڑی رکی میں نے پلٹ کے دیکھا تو وہ بالکل نئے ماڈل کی چمکتی دمکتی پراڈو تھی۔

دولت مندی کا نیا اشتہار۔ اس کی ہیڈ لائٹس آف کردی گئی تھیں لیکن انجن چل رہا تھا۔ بیک وقت اس کے چاروں دروازے کھلے اور اس میں سے چار افراد برآمد ہوئے۔ وہ چاروں ہٹے کٹے جوان لوگ تھے۔ ان کے جارحانہ عزائم کو سمجھنے میں مجھے دیر نہ لگی۔ میرے اٹھنے سے پہلے ہی انہوں نے نور جہاں کو پکڑ لیا اور کھینچ کر گاڑی کی طرف لے جانے لگے۔

نور جہاں نے ایک چیخ ماری۔''چھوڑو مجھے۔''

میں نے کہا'' کون ہو تم؟ یہ کیا بدمعاشی ہے۔''

ان میں سے ایک ہنسا۔'' اوئے بدمعاشی کی بات کرتا ہے تو...... یہاں اور کیا ہو رہا تھا۔ تم دونوں کیا کر رہے تھے؟''

نور جہاں چلا رہی تھی اور مچل رہی تھی مگر دو صحت مند مردوں کی گرفت سے نکلنے میں ناکام تھی۔ وہ اسے پراڈو کے کھلے دروازے سے اندر ٹھونس رہے تھے۔ میں نے ان میں سے ایک پر حملہ کیا۔ اس نے میرے سر پر مکا مارا۔ میں لڑکھڑایا۔ پھر دوسرے نے مجھے دھکا دیا۔ میرا پیر نہر کے کنارے پر تھا۔ میں خود کو سنبھال نہ سکا اور پانی میں جا گرا۔ میں نے نور جہاں کی آخری آواز سنی۔ وہ مجھے پکار رہی تھی پھر گاڑی کے دروازے ایک ساتھ بند ہوئے اور پراڈو کسی بد مست ہاتھی کی طرح روانہ ہوگئی۔

یہ سارا کھیل مشکل سے دو منٹ کا تھا۔ یقیناً وہاں سے گزرنے والے کسی کار نشیں نے بھی یہ اغوا کا منظر دیکھا ہوگا لیکن ان میں سے کسی کو عملی زندگی میں ہیرو بننے کا شوق نہیں تھا۔ جو فیملی والے ہوں گے انہیں خواتین نے کہا ہوگا کہ بس نکل چلو۔ یہاں تو پتا نہیں کیا ڈراما چل رہا ہے۔ کیا ضرورت ہے پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑا کے مشکل میں پڑنے کی۔

جب میں پانی سے نکلا تو پراڈو کی لائٹس کافی دور ہوگئی تھیں لیکن میری نظر میں تھی۔ پانی میں شرابور کپڑوں جوتوں کے ساتھ میں دوڑ کے اپنی گاڑی میں بیٹھا اور اگنیشن میں چابی لگائی۔ انجن خاموش رہا۔

میں نے ایک بار پھر کوشش کی اور اس بار میری وفادار کرولا کا انجن بڑی مستعدی سے غرایا۔

دور جاتی پراڈو کی ٹیل لائٹس اب دوسری کاروں کی لائٹس میں گم ہوگئی تھیں مگر مجھے امید تھی کہ سیدھی سڑک پر میں اسے جالوں گا۔ دائیں جانب دھرم پورے کے پل تک کوئی موڑ نہیں تھا۔ بائیں جانب اس سے ذرا پہلے الٹے ہاتھ پر پتلی سی سڑک میو گارڈن کے عقب سے گزرتی تھی۔ اس سڑک پر بائیں جانب چیف کالج کے عملے کی رہائش گاہوں کی لمبی دیوار تھی...... کوئی نام نہ ہونے کے باعث لوگ اسے ٹھنڈی سڑک یا بانسوں والی سڑک کہتے تھے کیونکہ اس پر بانسوں کے بہت درخت تھے۔

میرے کپڑے پانی سے شرابور تھے اور پانی میرے جوتوں میں بھی بھرا ہوا تھا لیکن میں نے پروا نہیں کی۔ میرا پیر ایکسی لریٹر کو دباتا گیا اور کار کسی چیتے کی تیز رفتاری سے دوڑی جو اپنے شکار کے تعاقب میں ہو۔ میں نے کار کو کہیں دائیں سے تو کہیں بائیں سے یوں نکالا کہ دوسرے کار والوں نے یقیناً مجھے گالیاں دی ہوں گی۔ ایسی خطرناک زگ زیگ ڈرائیونگ بگڑے ہوئے رئیسوں کی ناخلف اولادیں کرتی ہیں جن کے ہاتھ میں حرام کی کمائی سے خریدی ہوئی منہ زور گاڑیاں آجاتی ہیں۔ وہ خود بھی اتنے ہی منہ زور ہوتے ہیں اور ان کی جوانی ان سے زیادہ منہ زور......

میں ایک منٹ سے کم وقت میں نہر سے نکل کے گاڑی کو لے کر ان بدمعاشوں کے تعاقب میں روانہ ہوا تھا جو میری نظروں کے سامنے نور جہاں کو چھین کر لے گئے تھے۔ اس وقت مجھے انجام کی فکر نہیں تھی اور نہ یہ سوچنے کی فرصت کہ وہ کون تھے۔ میرے کانوں میں نور جہاں کی پکار گونج رہی تھی اور نظروں میں اس کا خوف زدہ چہرہ اور وحشت سے پھیل جانے والی آنکھیں گھوم رہی تھیں۔

میرا خیال ہے کہ دو ڈھائی کلومیٹر کے اس فاصلے کو طے کرنے میں ڈیڑھ دو منٹ بھی نہیں لگے۔ پراڈو والے غالباً مطمئن تھے کہ شکار ان کے قبضے میں ہے۔ کس میں ہمت ہے کہ شیر کے منہ سے اس کا نوالا چھینے۔ انہیں اپنی گاڑی پر بھروسا تھا۔ اس سے زیادہ انہیں جوانی کی شہ زوری پر ناز تھا۔ اس طاقت پر اعتماد تھا جو ان کے سوشل اسٹیٹس کی عطا کردہ تھی اور یہ اطمینان بھی تھا کہ وہ چار ہیں۔

جب پراڈو پر میری نظر پڑی تو وہ بانسوں والی سڑک پر تھی۔ میں نے انڈی کیٹر دیے بغیر یوں اپنی گاڑی کو موڑا کے میرے پیچھے آنے والی گاڑی کے بریک لگانے کی آواز میرے کانوں تک پہنچی۔ اس نے اپنی گاڑی کو بچا لیا تھا۔ پتا نہیں اس کے پیچھے کوئی تھا یا نہیں۔ میری نظر تو صرف آگے دیکھ رہی تھی۔

پراڈو نے اچانک اسپیڈ تیز کی۔ میں نے پراڈو کے اندر نور جہاں کا تصور کیا۔ معلوم نہیں بھوکے بھیڑیے اس کو کس طرح دہشت زدہ کر رہے ہوں گے۔ ایسی عورت کو ...... جسے دیکھ کے پاپا شاباسو اپنی حیوانی کشش پر شرمندہ ہو اور ایشوریا رائے اپنے حسن بے مثال پر احساس کمتری میں مبتلا ہو جائے ...... روز کہاں ملتی ہے۔ وہ تو اسے تقدیر کی لاٹری کا ایسا انعام سمجھ رہے ہوں گے جو زندگی میں ایک بار ہی ملتا ہے۔ وہ کتنے خوش ہوں گے لیکن نور جہاں کتنی دہشت زدہ ہوگی اور کتنی بے بس بھی ...... چار بھیڑیوں کے چنگل میں پھنسی ہوئی کمزور بھیڑ۔

ایک تنگ جگہ پر میں نے دائیں جانب سے پراڈو کو اوورٹیک کیا۔ میری گاڑی نے پراڈو کو رگڑا دیا۔ پراڈو تھوڑا سا آف بیلنس ہوئی۔ میں نے اسے پھر ٹکر ماری۔ پراڈو دوسری جانب کی چھ فٹ اونچی دیوار سے ٹکرائی ...... دیوار گر گئی۔

اب پراڈو کے ڈرائیور نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ اس نے گاڑی کو نکالنے کی کوشش کی مگر میں نکل جانے کی جگہ دیتا تو پھر شاید اسے نہ پکڑ پاتا۔ دیوہیکل پراڈو کا کرولا سے کوئی مقابلہ نہ تھا لیکن مقابلہ سواری سے زیادہ سوار کا تھا۔

مجھے معلوم تھا کہ میری گاڑی کا ایک سائیڈ سے خانہ خراب ہوگیا ہوگا لیکن مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ میں نے تیسری ٹکر ماری تو بھی پراڈو...... چند فٹ آگے تھی۔ رات کی خاموشی میں ہیڈ لائٹس کے شیشے بکھرنے کی آواز کے ساتھ گاڑیوں کے فولادی جسموں کے ٹکرانے کا شور بہت زیادہ ہوگا مگر اس سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا اور دونوں جانب رہائشی علاقے سڑک سے کافی فاصلے پر تھے۔

تیسری ٹکر نے پراڈو کو پھر دیوار سے لگا دیا لیکن اس کا ڈرائیور ہار ماننے کو تیار نہ تھا۔ ہار جیت سے زیادہ یہ ان کے لیے قانونی مسئلہ بن گیا تھا۔ انہوں نے سوچا بھی نہ ہوگا کہ ایک خوبصورت عورت کے ساتھ رات گزارنے کا خواب پلک جھپکتے میں حوالات کی سلاخوں کے پیچھے مجرموں کے ساتھ بسر ہونے والی رات میں بدل جائے گا۔

وہ اب فرار ہونا چاہتے تھے۔ شاید وہ اثر رسوخ رکھنے والے باپوں کی اولاد ہونگے اور انہیں پورا یقین ہوگا کہ قانون کے ہاتھ میں اتنا دم ہی نہیں کہ انہیں گرفتار رکھ سکے

لیکن رسوائی سے انہیں کون بچائے گا۔ اخبار والے اتنے برق رفتار ہوگئے ہیں کہ سفارش آنے سے پہلے کیمرے لے کر آجاتے ہیں اور کسی وزیر سفیر کا فون آنے سے پہلے پورے معاملے کو الم نشرح کر دیتے ہیں۔ صبح سارا شہر دیکھ اور جان لے گا کہ گاڑی کس کی تھی، اولاد کس کی تھی اور اس نے کیا کارنامہ سرانجام دیا تھا کہ اب ان کے چہرے سلاخوں کے پیچھے نظر آرہے ہیں۔ عورت تو مظلوم ہو جائے گی...... اور پھر یہ بھی طے ہے کہ وہ کسی عام آدمی کی بیوی نہیں۔ اس کا لباس، چہرہ اور انداز کسی غریب گھر کی چھاپ نہیں رکھتا۔ معلوم نہیں اس کے گھر والے کیا مصیبت ڈالیں گے۔

شاید انہیں اپنی بے وقوفی یا غلطی کا اور اپنے جرم کی سنگینی کا بخوبی اندازہ ہو چکا تھا۔ وہ بھی سمجھے ہوں گے کہ میں اس عورت کا شوہر ہوں اور اس کے لیے جان کی بازی لگا دوں گا۔ انہوں نے فرار کی آخری کوشش کی۔ چند لمحوں کے لیے مجھے یوں لگا جیسے کرولا ہمت ہار رہی ہے۔ اس کے ٹمپریچر میٹر کی سوئی تیزی سے اوپر کی جانب بڑھ رہی تھی اور یہ اس بات کی علامت تھی کہ اس کا ریڈی ایٹر ٹوٹ گیا ہے۔

کچھ دیر میں میری گاڑی کا گرم ہو کے بند ہو جانا یقینی تھا۔ میں نے آخری کوشش کی۔ پراڈو کو بھی نقصان ہوا تھا کیونکہ اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ آگئی تھی۔ آگے والا وہیل اندر گھس گیا اور شاید ایکسل نکل گیا تھا مگر گاڑی اب بھی بھاگ رہی تھی۔

پھر قسمت نے میری مدد کی۔ سامنے سے کوئی گاڑی نمودار ہوئی۔ پراڈو کے ڈرائیور کو راستہ دینا پڑا۔ وہ بائیں طرف ہوا تو قدرت نے بھی کچھ رکاوٹ ایک کھلے گٹر کی صورت میں پیدا کر دی تھی۔ پراڈو کا بائیں جانب والا وہیل ایک دم گٹر میں گیا۔ پراڈو کے ٹائر بڑے ہوتے ہیں۔ وہ جھٹکا کھا کے گزر جاتی لیکن گٹر کافی عرصے سے کھلا ہوا تھا۔ اس کے کنارے ٹوٹ گئے تھے اور دہانہ پھیل کر تین فٹ کا ہو گیا تھا۔

پراڈو ایک دھاکے سے آگے لپکی۔ اس کا ونڈ اسکرین جھٹکے سے نکل کے سڑک پر بکھر گیا۔ میں نے ٹائر کا نشانہ لے لیا تھا۔ اس وقت میں پراڈو سے شاید دس فٹ پیچھے تھا اور اس کے پچھلے ٹائر کو برسٹ کرنا چاہتا تھا۔

پراڈو ایک دم رکی تو میں نے خود کو تصادم سے بچایا۔ آگے کم فاصلے میں بوسٹر بریک بھی کیا کام کرتے...... ادھر میرے ریوالور سے گولی نکلی ادھر کرولا لہرا کے پراڈو میں گھس گئی۔ سیٹ بیلٹ باندھنے کی عادت مجھے یورپ اور امریکا میں پڑی تھی۔ وہاں اس کے بغیر گاڑی چلانا جرم تھا۔ یہاں عموماً اس عادت پر مجھے لوگ یوں دیکھتے تھے جیسے میں نے کوئی بڑی ہی مضحکہ خیز حرکت کر دی۔ یہاں ٹریفک رولز کی خلاف ورزی نہ کرنے والے کو بزدل یا بے وقوف سمجھنے کا فیشن بھی تھا مگر آج اسی عادت نے مجھے محفوظ رکھا۔

گاڑی کے رکتے ہی میں نے خود کو حفاظتی بیلٹ کی گرفت سے آزاد کیا اور دروازہ کھول کے باہر نکلا۔ دوسری سائیڈ سے گاڑی کے پرخچے اڑ گئے تھے۔ اس کا پسنجر سیٹ کے ساتھ والا دروازہ ٹوٹ کے گر چکا تھا۔ پیچھے والا دروازہ جھول رہا تھا۔ آگے پیچھے کے ونڈ اسکرین غائب ہو گئے تھے۔ ان کی جگہ کناروں سے شیشے کے نکیلے ٹکڑے نکلے رہ گئے تھے۔

اتنی دیر میں تین سورما راہ فرار اختیار کر چکے تھے۔ انہیں گاڑی نے نہیں قسمت نے دھوکا دیا تھا۔ انہیں یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ بھوت کی طرح پیچھے لگ جانے والا مسلح ہے اور جان لیے بغیر پیچھا نہیں چھوڑے گا۔

انہیں فرار کے لیے حالات سازگار ملے۔ رات کے وقت سڑک ویران تھی اور بائیں ہاتھ والی دیوار کے اوپر سے کود کر چیف کالج کی رہائشی کالونی میں گم ہو جانا یقیناً آسان تھا۔ ان کا تعاقب لاحاصل تھا چوتھا اس لیے پکڑا گیا کہ وہ ڈرائیور تھا۔ یہاں کی عادت کے مطابق سیفٹی بیلٹ باندھنا اس کے لیے کسر شان تھا چنانچہ اس کا سر پھٹ گیا تھا اور ممکن ہے پسلیاں بھی اسٹیئرنگ وہیل سے ٹوٹ چکی ہوں۔

وہ بیہوش تھا۔ پیچھے والے دروازے سے خوف اور دہشت سے بدحال نور جہاں زار و قطار روتی ہوتی اتری اور مجھ سے لپٹ گئی۔ وہ اب صرف ساری کے بلاؤز اور پیٹی کوٹ میں تھی۔ یہ پوچھنے کی ضرورت ہی نہ تھی کہ ساری کہاں گئی...... وہ تین بدمست جوانوں کے بے صبر ہاتھوں نے کھول کے الگ کر دی تھی۔

میں نے اسے سینے سے لگا کے تسلی دی۔ ''اٹ از او کے۔ بھاگ گئے ہیں وہ بدمعاش۔'' لیکن اس کی ہچکیاں بند نہ ہوئیں۔ خوف سے اس کا جسم لرز رہا تھا۔

ایک گاڑی حادثہ دیکھ کر پیچھے اور ایک سامنے رک گئی تھی اس میں کوئی فیملی تھی۔ اس کا ڈرائیور اتر کے میرے پاس آیا پھر دوسری گاڑی والے نے بھی کہا۔ ''میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں۔''

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ پچاس پچپن کی عمر کا معزز آدمی بے حد تشویش اور ہمدردی کے ساتھ مجھے اور نور

جہاں کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے نوجوان کا شکریہ ادا کیا اور دوسرے کی پیشکش قبول کر لی۔

نوجوان نے واپس جانے سے پہلے دونوں گاڑیوں کی پوزیشن پر غور کیا۔ ''یہ حادثہ ہوا کیسے۔''

میں نے کہا۔ ''بدقسمتی سے...... حادثات ایسے ہی اچانک ہوتے ہیں۔ نہ ان کا پہلے سے پتا ہوتا ہے اور نہ کوئی جان بوجھ کر حادثہ کرتا ہے۔''

میرا مقصد پورا ہوا۔ اس تیز سے جواب کے بعد نوجوان نے واپس لوٹ جانا ہی مناسب سمجھا۔ شاید بعد میں اسے احساس ہوا ہوگا کہ کسی حادثے کے شکار شخص سے ہمدردی کرنا چاہیے، تفتیش نہیں۔ تاہم جاتے جاتے اس نے دونوں گاڑیوں پر یوں نظر ڈالی جیسے ان کے نمبر ذہن نشین کر رہا ہو۔ اس نے یہ پہلے ہی دیکھ لیا تھا کہ اسٹیئرنگ وہیل پر ایک شخص اوندھا پڑا ہوا ہے اور وہ زخمی ہونے کی وجہ سے بے ہوش ہے یا پھر مر چکا ہے۔

عمر رسیدہ شخص نے پیچھے والا دروازہ اس وقت تک پکڑے رکھا جب تک میں نے نور جہاں کو کار میں بیٹھا نہیں دیا۔

اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''کیا آپ پولیس کو رپورٹ کریں گے پہلے۔''

میں نے کہا'' رپورٹ تو کرنی پڑے گی لیکن ابھی نہیں۔''

اس نے کہا۔ ''کیا میں آپ کو اسپتال لے چلوں لیکن وہاں بھی یہ سوال اٹھے گا......''

میں نے کہا۔ ''دیکھیے میں ٹھیک ہوں اگر آپ واقعی ہماری کچھ مدد کرنا چاہتے ہیں تو پولیس کے آنے سے پہلے ہمیں اس جگہ سے لے جائیں۔''

وہ تذبذب میں پڑ گیا۔ ''کیا یہ کار آپ کی نہیں ہے؟''

میں نے کہا'' یقیناً میری ہے، میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''او کے...... لیکن ایسا نہ ہو میں کسی مشکل میں پڑ جاؤں۔''

میں نے کہا'' یقین کیجیے آپ پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔ مسئلہ میرا نہیں...... ان خاتون کا ہے۔''

''میں پولیس کے پاس نہیں جا سکتی...... پلیز۔'' نور جہاں نے کہا۔

اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے...... لیکن آپ کہاں جائیں گی آخر، کیا آپ ان صاحب کے ساتھ نہیں ہیں؟''

میں نے پھر کہا۔ ''پلیز یہاں سے چلیے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں۔''

وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ''اس دوسری گاڑی میں جو شخص پڑا ہے۔ کیا وہ زندہ ہے؟''

''وہ بالکل زندہ ہے۔''

''ایسی صورت میں...... کیا اسے چھوڑ جانا غلط نہیں ہے۔''

میں نے بھنا کے کہا۔ ''یہ آپ کس بحث میں پڑے ہوئے ہیں۔ گاڑی چلائیے۔ جلدی کیجیے۔''

وہ ذرا متاثر نہیں ہوا۔ ''اگر وہ بعد میں مر گیا۔''

میں نے چلّا کے کہا۔ ''وہ نہیں مرے گا، تم گاڑی چلاؤ ورنہ......''

''ورنہ کیا؟'' وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

''میں تمہیں اتار دوں گا اور گاڑی لے جاؤں گا۔''

میں نے اپنا ریوالور نکال لیا۔ ''اور اگر ضرورت پڑی تو......''

وہ بالکل متاثر نہیں ہوا۔ ''تم مجھے گولی مارو گے؟ اس نیکی کے صلے میں جو میں نے تمہارے لیے رک کر اور تمہیں مدد کی آفر دے کر کی۔''

میں نے بے بسی سے کہا'' آل رائٹ...... ہم اتر جاتے ہیں۔ ہم پیدل چلے جائیں گے۔ آگے کوئی گاڑی ضرور مل جائے گی۔''

پیچھے سے نور جہاں نے کہا'' سر، آپ اعتبار کریں۔ ہم شریف لوگ ہیں۔ پولیس کیس کی بدنامی سے بچنا چاہتے ہیں۔ بس ہم یہاں سے کسی بھی طرح نکل جائیں۔''

وہ چند سیکنڈ سوچتا رہا پھر اس نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ ''چلو میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں۔ جہاں بھی تم کہو لیکن پھر میں واپس آؤں گا اور پولیس کو بھی اطلاع دوں گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ میں ایک زخمی شخص کو مرتے ہوئے چھوڑ دوں اور گھر جا کے سکون سے سو جاؤں۔''

گاڑی آگے بڑھی تو میں نے ریوالور رکھ لیا۔ ''آئی ایم سوری۔ میں نے بڑی غلط حرکت کی لیکن میری جگہ آپ ہوتے تو اس پریشانی سے بچنے کے لیے کچھ بھی کرتے۔''

''پریشانی اور بدنامی...... دو الگ الگ مسائل ہیں۔ خاتون کا مسئلہ ہے بدنامی۔ چلو فرض کر دو وہ اس سے بچ جاتی ہیں لیکن گاڑی تمہاری تھی۔ تم پریشانی سے نہیں بچ سکتے۔ جب یہ معاملہ قانونی رخ اختیار کرے گا۔ تو ایک چشم دید گواہ میں ہوں۔ دوسرا ابھی چلا گیا ہے لیکن مجھے یقین ہے اس نے نمبر نوٹ کیے تھے۔ وہ اب تک پولیس کو مطلع کر چکا ہوگا۔ اس

کے بعد بدنامی تو ہوگی ہی۔"

میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ جھکی اور خبطی شخص ہے۔ وہ گاڑی چلاتے ہوئے خود ہی بولتا جا رہا تھا۔

میں نے کہا" آپ نے کچھ بھی غلط نہیں کہا۔ بعد کے مسائل سے میں نمٹ لوں گا...... جیسے بھی ہوا...... اب میں آپ کو بتاتا ہوں میں کون ہوں۔ میں رفیق احمد شیرازی ہوں۔ جہلم سے آگے میری اسٹیٹ ہے...... ست بدھائی۔"

"میں نے پہلے کبھی ایسا مضحکہ خیز نام نہیں سنا۔"

میں نے کہا۔" نام تو اس سے بھی زیادہ مضحکہ خیز مل جاتے ہیں لیکن یہ ٹھیک ہے...... ست بدھائی ایک غیر معروف جگہ ہے۔ بہت چھوٹی سی جاگیر ہے۔ اسے اسٹیٹ کہنا شاید غلط ہوگا۔ یہ مجھے حال ہی میں ملی ہے۔ ایک دور کے عزیز نے مجھے اس کا وارث بنادیا۔ اس وقت میں لندن میں تھا اور ایک کمپنی میں ڈائریکٹر کے عہدے پر فائز تھا۔ اس سے پہلے میں چار سال امریکہ میں رہا۔ وہاں سے میں نے ایم بی اے کیا...... ہارورڈ سے۔ میرے والد ایک لیکچرر تھے اب ریٹائرڈ لائف گزار رہے ہیں...... یہ تو تھا میرا تعارف۔"

اس نے سرہلایا۔" اب خاتون کے بارے میں بھی بتادو۔"

میں نے کہا۔" دیکھیے، میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ یہ میری بیوی نہیں ہیں، ہم دوست ہیں۔"

"بیوی یہ کس کی ہیں۔"

میں نے کہا" وہ بڑا ہی خطرناک آدمی ہے۔ اس کے سارے دھندے ناجائز ہیں۔ منشیات، اسلحہ، بردہ فروشی...... ظاہر ہے ایسے کام کرنے والا انڈر ورلڈ کا آدمی ہوتا ہے اور اس کے تعلقات بھی پیشہ ور قاتلوں بدمعاشوں اور مجرموں سے ہوتے ہیں۔"

"اور تم ایسے شخص کی بیوی کو ساتھ لیے پھر رہے ہو...... کمال ہے۔"

میں نے آہ بھر کر کہا۔" محبت اندھی ہوتی ہے جناب۔"

اس نے کہا" میں نے یہ ڈائیلاگ کس فلم میں سنا تھا؟...... خیر چھوڑو۔"

میں نے کہا۔" اب میں چاہتا ہوں کہ خاتون اس معاملے سے باہر رہیں، ان کا نام بھی نہ آئے اس کیس میں۔"

"اور تمہارا نام بھی ان کے نام کے ساتھ نہ آئے، رائٹ۔"

میں نے کہا" رائٹ...... وہ مجھے قتل کرادے گا اور خاتون کو بھی۔"

اس نے کہا۔" اتنی خوبصورت چیز کو ضایع نہیں ہونا چاہیے۔ حسن ساری انسانیت کا اثاثہ ہوتا ہے۔ خواہ کسی جھیل کا ہو یا مصوری کے کسی شہکار کا۔ جھیل کی جگہ دھواں اگلنے والا کارخانہ نہیں بننا چاہیے۔ مصوری کے شہکار کو بھی محفوظ رہنا چاہیے۔"

میں نے نور جہاں کی طرف دیکھا۔ وہ اس حالت میں بھی مسکرانے پر مجبور ہوگئی تھی۔ یہ شخص کوئی فلسفی یا دانشور تھا اور دنیا کو اپنی نظر سے دیکھتا تھا۔

نور جہاں نے اچانک کہا۔" دیکھیے...... یہ ٹیکسی کھڑی ہے۔ آپ ہمیں یہاں اتار دیں۔ یہاں سے میں چلی جاؤں گی۔"

میں نے کہا" اکیلی کیسے جاؤ گی۔ میں بھی چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔"

اس نے گاڑی روک لی۔" ابھی تک تم نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ وہاں کیا ہوا تھا۔"

میں نے کہا۔" یہ خاتون مجھ سے ملنے آئی تھیں۔ پتا نہیں کہاں سے وہ چار بدمعاش آ گئے اور انہوں نے خاتون کو زبردستی اغوا کرنے کی کوشش کی۔"

وہ بولا۔" اغوا زبردستی ہی ہوتا ہے۔ رضا کارانہ طور پر کون اغوا ہوتا ہے۔"

میں نے کہا" مجھے شک ہے کہ یہ اس کے شوہر کے بھیجے ہوئے غنڈے تھے اور بہت خطرناک لوگ تھے۔"

میری باتوں سے وہ ڈر گیا۔ میرا مقصد بھی یہی تھا۔

اس نے گاڑی روک لی۔" یہ سب جان لینے کے بعد...... اور دوبارہ سوچنے پر میں بھی یہی مناسب سمجھتا ہوں کہ مجھے اس سارے معاملے سے خود کو الگ رکھنا چاہیے۔"

میں نے کہا۔" آپ دور اندیش آدمی ہیں۔"

"میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ تمہاری کہانی جھوٹی ہے۔ وہ کیا نام بتایا تھا تم نے اپنی ریاست کا...... سات بھائی۔"

"ست بدھائی۔"

"ایسی کوئی ریاست وغیرہ نہیں ہوگی۔ تم بھی ایک خطرناک آدمی ہو۔ ورنہ انڈر ورلڈ کے کسی ڈان کی بیوی کے ساتھ انوالو کیوں ہوتے۔"

میں نے مسکینی سے کہا۔" جناب! کیا میں صورت سے ایسا لگتا ہوں؟"

اس نے مجھے غور سے دیکھا۔" ہاں...... میری نظر دھوکا

نہیں کھا سکتی۔ کسی خوبصورت عورت کے لیے تاریخ میں کئی بار جنگ ہوئی ہے۔ بہت خون خرابا ہوا ہے...... مگر میں اس کا حصہ کیوں بنوں۔"

میں نے کہا" بالکل درست فیصلہ کیا آپ نے اور بروقت بھی۔"

"میرا خیال ہے کہ تم جاؤ ٹیکسی میں اور میں بھی جاتا ہوں اپنے گھر...... تم فرض کر لینا کہ یہاں تک پیدل آئے تھے یا پھر ٹیکسی وہاں سے گزر رہی تھی۔"

"میں سمجھ گیا۔ آپ تو ادھر سے گزرے ہی نہیں۔"

میں نے سرہلایا۔

"اصل میں...... دو بار پہلے بھی ایسا ہو چکا ہے...... ایک بار میں قتل کے کیس میں گواہ بن گیا۔ پیشیاں بھگتنے میں کئی سال گزر گئے۔ دوسری بار ایکسی ڈنٹ میں زخمی ہونے والے کو اسپتال لے گیا تھا۔ وہ راستے میں مر گیا۔ میں نے پولیس کو گاڑی کا نمبر لکھوا دیا اور مشکل میں پڑ گیا۔"

میں نے کہا۔" زمانہ ایسا ہی ہے، اپنی جان بچانی چاہیے۔"

"یہ رویہ...... بڑا غیر انسانی ہے مگر میں کیا کروں میرے بچے۔ خیر وہ اتنے بچے بھی نہیں۔ خود بچوں والے ہیں۔ وہ بہت بگڑتے ہیں مجھ پر۔" وہ اتنا شرمندہ تھا کہ بات مکمل کیے بغیر گاڑی لے کر سیدھا نکل گیا۔

میں نے افسوس سے سرہلایا۔" بچارا، پڑھا لکھا، با ضمیر، اصول پرست پرانا آدمی...... کتنی مشکل میں ہے۔"

ٹیکسی ڈرائیور اپنا سر پیچھے کیے سو رہا تھا۔ میں نے اس کا شانہ ہلایا تو وہ جاگا۔ اس نے آنکھیں کھول کے ہمیں دیکھا تو پل بھر کے لیے پلک جھپکنا بھول گیا۔ نور جہاں کے حسن بے مثال اور رعنائی شباب کا پہلا شاک ایسے ہی ہوش گم کردینے والا ہوتا تھا پھر وہ صرف بلاؤز اور پیٹی کوٹ میں تھی۔ ڈرائیور کو تو ایسا لگا ہوگا جیسے کوئی فلمی پری اپنے رقص شرر بار سے جذبات میں آگ لگاتے لگاتے پردۂ سیمیں سے اتر کے سامنے آ کھڑی ہوئی ہے۔

جب میں نے چٹکی بجائی تو وہ چونکا۔ میں نے کہا۔ "خالی ہے ٹیکسی؟"

اس نے میرے بھیگے ہوئے کپڑوں کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

میں نے کہا" دراصل ہماری گاڑی نہر میں گر گئی تھی۔"

"نہر میں گر گئی تھی۔" اس نے بے یقینی سے کہا" وہ کیسے؟"

غالباً سوال کے آخری حصے کا مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ کیا تم نشے میں گاڑی چلا رہے تھے۔ میں نے کہا" اس کا ایکسل نکل گیا تھا؟"

"تمہاری گاڑی ابھی تک وہیں پڑی ہے...... نہر میں۔"

میں نے کہا" گاڑی تو نکلوالی ہم نے...... لیکن وہ چلنے کے قابل نہیں تھی۔ ایک شریف آدمی ہمیں یہاں تک لے آیا۔ گاڑی کو کل دیکھیں گے۔"

اس پر میری دردبھری کہانی سے زیادہ نور جہاں کے جلوۂ بے حجاب کا اثر ہو رہا تھا۔

"کہاں جانا ہے۔"

اس سوال کے جواب کے لیے میں نے نور جہاں کی طرف دیکھا۔ اس نے مسکرا کے کہا۔" شاہی باغ۔"

ڈرائیور شک میں پڑ گیا۔" وہ تو اس وقت بند ہوتا ہے۔"

میں نے کہا" ہم کھلوالیں گے، تم بتاؤ پیسے کتنے لوگے۔"

اس نے مجھے آزمانے کے لیے کہا۔" تین سو۔" جو اصل کرائے سے تین گنا رقم تھی۔" مجھے سیٹ صاف کرانا پڑے گی۔ گندی ہو جائے گی۔"

اس کی پوری بات سنے بغیر ہی میں دروازہ کھول کے نور جہاں کے ساتھ بیٹھ چکا تھا۔ نور جہاں نے اپنا سرد ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ ابھی تک بہت نروس تھی لیکن میری دلجوئی کے لیے اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔" تم ٹھیک ہونا۔"

میں نے کہا" اٹ از اوکے ناؤ لیکن...... ہم......"

وہ میرا مطلب سمجھ گئی۔ اس نے مجھے آنکھوں آنکھوں میں اشارے سے فی الحال چپ رہنے کو کہا۔ پندرہ منٹ بعد ٹیکسی ڈرائیور نے پلٹ کے دیکھا۔" اب کدھر...... گیٹ تو آ گیا سامنے۔"

اشارے سے نور جہاں نے ایک گلی کی نشاندہی کی۔" یہاں روک لو۔"

میں نے جیب سے بٹوا نکالا۔ وہ پانی میں بھیگا ہوا تھا۔ اس کے اندر سارے نوٹ آپس میں چپک گئے تھے۔ میں نے کہا" یار معاف کرنا، تمہیں ان پر استری کرنی پڑے گی۔"

"رہنے دو۔" نور جہاں نے اپنا پرس کھولا۔" میں دے دیتی ہوں۔"

یہ ایک تکنیکی غلطی تھی۔ اگر وہ بھی گاڑی میں تھی اور نہر

میں بھی میرے ساتھ تھی تو اس کے بیگ میں پانی کیوں نہیں گیا تھا۔ بلاؤز اور پیٹی کوٹ سے تو اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ بھیگی ہوئی ہے یا نہیں لیکن ساری کے بارے میں ڈرائیور کے ذہن میں سوال ضرور اٹھا ہوگا کہ کیا وہ بھی کھل کے نہر میں بہ گئی۔

تاہم وہ تین سو لے کر اور نور جہاں کے بھرپور شباب پر الوداعی حسرت بھری نظر ڈال کے رخصت ہوگیا تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ رات کے وقت گلی میں اندھیرا تھا۔ ایک بچہ ہمارے پاس سے گزرا پھر ایک برقع پوش عورت نمودار ہوئی۔ نور جہاں کے لباسِ بے حیائی کو دیکھ کر یقیناً اس کے دل کو سخت صدمہ پہنچا ہوگا۔

نور جہاں نے کہا۔ ''یہی ہے میرا گھر۔'' اور مجھے بیگ میں سے ایک چابی نکال کے دکھائی۔ ''آ جاؤ......''

میں نے کہا ''آئی سی...... تمہارا پروگرام پہلے سے طے تھا لیکن میں اب جاؤں گا۔''

''اندر آ جاؤ۔'' اس نے ہاتھ پکڑ کے مجھے اندر کھینچ لیا۔

''ایسے کیا دروازے سے لوٹ جاؤ گے...... سب جانتے ہیں مجھے یہاں مگر کسی نے ایسے لباس میں کبھی نہیں دیکھا۔ تم کو ساتھ دیکھ کے نہ جانے کیا کہیں گے۔''

''کیا تم کو پروا ہے کہ کوئی کیا کہتا ہے تمہارے بارے میں؟''

اس نے دروازہ بند کر دیا۔ ''یہاں خیال رکھنا پڑتا ہے۔ یہاں وہ لوگ ہیں جنہوں نے مجھے چھوٹے سے بڑا ہوتے دیکھا ہے۔''

''اب وہ کیا سمجھتے ہیں تمہیں۔''

''ان کا خیال ہے کہ میں نے کسی بہت بڑے آدمی سے شادی کر لی ہے۔ زیادہ تر ملک سے باہر رہتی ہوں۔'' اس نے سوئچ آن کیا تو ایک ٹیوب لائٹ روشن ہوگئی۔ ''تمہیں کوئی دیکھتا تو حیران ہوتا کہ یہ کیسا بڑا آدمی ہے۔''

''کیا اکبر خان کبھی تمہارے ساتھ نہیں آیا۔''

''نہیں...... اسے میں نے کچھ نہیں بتایا۔ ایک ملازمہ ہے میری۔ وہ ہفتے میں ایک بار یہاں آ کے صفائی کر جاتی ہے۔ میں سال چھ مہینے کی تنخواہ اسے کسی نہ کسی کے ذریعے پہنچا دیتی ہوں...... کبھی کبھارا کیلی یہاں آتی ہوں۔''

میرے سامنے نچلے متوسط طبقے کا معمولی سا گھر تھا۔ عام سے انداز میں تھوڑے سے فرنیچر سے آراستہ، صاف ستھرا، دو کمرے...... تیسرا ڈرائنگ روم...... بیڈ روم کے سائز کے...... ایک کمرے میں ڈبل بیڈ تھا جو نیا تھا...... دوسرے میں دو پرانے سنگل بیڈ لگے ہوئے تھے...... ان پر صاف چادریں تھیں۔ ڈرائنگ روم میں قدیم انداز کے صوفہ سیٹ کے علاوہ دو کرسیاں تھیں۔ دیواروں پر مکے مدینے کی تصاویر اور کچھ طغرے تھے۔

''کھڑے کیوں ہو...... بیٹھو...... میں کپڑے بدل کے آتی ہوں۔'' نور جہاں بولی۔

میں نے کہا۔ ''نور جہاں...... آج میں نہیں رک سکتا...... میں چاہتا تھا کہ تم بس کسی طرح واپس اپنے گھر پہنچ جاتیں۔''

وہ میرے برابر بیٹھ گئی۔ ''اتنے نروس کیوں ہو۔ اللہ کا شکر ہے کہ تمہیں یا مجھے کچھ نہیں ہوا ورنہ بہت کچھ ہو سکتا تھا۔ وہ مجھے لے جاتے یا ہم دونوں پڑے ہوتے کسی مردہ خانے میں یا اسپتال میں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے...... لیکن میں ذہنی طور پر بہت ڈسٹرب ہو گیا ہوں۔''

''تم ابھی کچھ دیر میں پُرسکون ہو جاؤ گے۔ ریلیکس کرو...... یہ کپڑے اتار دو۔ صبح تک سوکھ جائیں گے۔ آئی ایم سوری...... تمہارے لیے دوسرے کپڑے نہیں ہے میرے پاس بٹ اٹ از او کے۔'' وہ مسکرائی۔

میں نے خفت سے کہا ''کیا او کے؟''

وہ ہنس پڑی۔ ''یار مجھ سے کیسی شرم...... اچھا چلو یہ تولیہ کافی بڑا ہے...... میں دیکھتی ہوں کھانے کے لیے کیا ہے۔ تم ایزی ہو جاؤ۔''

میں نے کہا ''میری تو بھوک مر گئی ہے بالکل۔''

''دیکھو...... میں عورت ہو کے پریشان نہیں ہو...... حالانکہ جو میرے ساتھ کیا ان حرامزادوں نے اتنی دیر میں......''

میں نے کہا۔ ''حادثے میں میری گاڑی انوالو ہے۔ پولیس آ گئی ہوگی وہاں پر۔''

''آنے دو...... جو کارروائی ہوگی صبح ہوگی۔ ابھی کچھ نہیں ہوگا۔''

میں نے کہا ''وہ پوچھیں گے کہ آپ کہاں فرار ہو گئے تھے۔''

''فرار...... نواب صاحب...... کیا آپ مجرم ہیں؟...... جب آپ اپنا تعارف کرائیں گے تو پولیس باادب باملاحظہ ہوشیار ہو جائے گی۔ جو آپ کہیں گے وہی صحیح مانا جائے گا۔ مثلاً یہ کہ آپ ایک دوست کے ساتھ چلے گئے تھے۔ میڈیکل چیک اپ کے لیے۔ دوست کا نام اگر فاروقی

ہو......''

میں نے کہا ''نور جہاں...... یہ کیا بحث کر رہی ہو تم مجھ سے۔''

''بحث تم کر رہے ہو...... چپ چاپ کپڑے بدلو اور بیٹھو آرام سے۔''

میں نے کہا۔ ''اور اگر کسی نے...... راجا نے یا فریال نے فون کر دیا فاروقی کے گھر...... میں تو کہہ کے آیا تھا......''

''بعد میں جب انہیں معلوم ہوگا اس حادثے کے بارے میں...... تو وہ تمہاری ہر بات مانیں گے۔ ناؤ شٹ اپ۔''

میری قوتِ مزاحمت پہلے ہی کمزور پڑ گئی تھی۔ اس کے ساتھ رات اور گھر کی خلوت بھی میرے خلاف سازش میں شریک ہوگئی۔ نور جہاں بڑی بھرپور اور مکمل عورت تھی۔ وہ مردوں کے دل جیتنے کے ایک سو ایک گر جانتی تھی۔ اس معاملے میں صرف اس کا حسن و شباب ہی کارگر ہتھیار نہیں تھا۔ اس میں ہر قسم کی صورتِ حال سے نمٹنے کی غیر معمولی صلاحیت تھی۔ اسے ایک منفی ذہانت بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ مکڑی کی طرح جال بنتی تھی اور اس میں گرفتار ہو جانے والا مرد رہائی کی خواہش تو کوشش کر سکتا تھا...... رہا نہیں ہو سکتا تھا۔

وہ ایک حسین ساحرہ تھی۔ اس نے اپنے جادو سے مجھے بے بس کر دیا۔ میری قوتِ ارادی کو اپنے تابع کر لیا۔ اس نے مجھے پکڑ کے بیڈ پر لٹا دیا اور میرے پاس بیٹھ گئی۔ اس کا ہاتھ میرے سر کو سہلانے لگا...... میری پیشانی کو پیار سے ملنے لگا۔ مجھ پر نشہ سا طاری ہونے لگا۔ میں سب کچھ بھول گیا کہ میں کون ہوں...... کہاں ہوں...... اس کے وجود سے پھوٹنے والی خوشبو میرے حواس پر چھا گئی۔

میں نے غنودگی کے عالم میں کہا ''نور جہاں...... مجھے یہاں کیوں لے آئیں۔''

اس کے بالوں کا ریشمی لمس میرے چہرے کو چھونے لگا۔ ''چپ چاپ لیٹے رہو...... ابھی تمہاری ساری تھکن دور ہو جائے گی...... ساری فکروں کو اپنے دماغ سے جھٹک دو...... بھول جاؤ ساری دنیا کے غم...... میں تمہارے ساتھ ہوں نا...... یہاں صرف میں ہوں اور تم ہو...... یہاں کوئی نہیں آ سکتا...... کوئی نہیں۔''

وہ کسی ہپناٹسٹ کی طرح بول رہی تھی۔ اس کی آواز میرے کانوں سے دل میں اترتی جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ میرے رگ و پے میں سکون اور سرور یوں اتر رہا تھا جیسے تپتی دھوپ سے جھلسنے والے جسم میں کسی ایرکنڈیشنڈ کمرے کی ٹھنڈک بھرتی ہے۔ اس کی آواز دور ہونے لگی اور وہ میرے قریب آتی گئی۔ یہاں تک کہ میرا وجود ایک غیر مرئی احساس بن کے اس میں گم ہو گیا۔ یوں جیسے دھواں بھاپ میں تحلیل ہو جاتا ہے...... بھاپ ہوا میں غائب ہو جاتی ہے۔

معلوم نہیں کب میں نے کہا ''نور جہاں...... مجھے بھوک لگی ہے۔''

وہ بولی۔ ''بولو کیا کھاؤ گے۔''

''اس وقت تم کیا کھلا سکتی ہو......'' میں نے سوچ کے پوچھا۔

''سب کچھ...... تم کہو تو سہی۔'' وہ ہنسی۔

میں نے کہا ''چکن کارن سوپ...... نوڈلز...... کلب سینڈوچ اور پائن ایپل آئس کریم۔''

اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھے ہوئے فون کا ریسیور اٹھا لیا۔ ڈائری میں کوئی نمبر تلاش کیا اور آرڈر لکھوانے لگی۔ اپنا پتا لکھوانے کے بعد اس نے کہا ''مجھے کتنی دیر انتظار کرنا ہوگا۔ ...... او کے' مجھے امید ہے آدھا گھنٹا بڑھ کے اکتیس منٹ نہیں ہوگا۔''

جب میں اور وہ کھانا کھا رہے تھے تو میں ایک بالکل مختلف اور بدلا ہوا انسان تھا۔ میں اپنی دنیا میں نہیں تھا۔ یہ ایک نئی دنیا تھی...... میں نواب رفیق احمد شیرازی آف ست بدھائی نہیں تھا۔ میں نے دُہری شخصیت اختیار کر لی تھی۔ میں دو دنیاؤں کا باسی ہو گیا تھا۔ جب بھی ایک دنیا میں ہوتا تو دوسری سے میرا تعلق ختم ہو جاتا تھا۔ اس وقت میں فریال کے بارے میں نہیں سوچ رہا تھا۔ مجھے احساس ہی نہیں تھا کہ میں اس سے بے وفائی کا مرتکب ہو رہا ہوں۔ میں کسی قسم کے احساسِ جرم کی پشیمانی میں مبتلا نہیں تھا۔ میں مطمئن تھا اور پُرسکون پُراعتماد اور خوش...... مجھے دوغلے پن کے اس کھیل میں اپنے کردار پر کوئی شرمندگی بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ میرے سامنے نور جہاں تھی صرف نور جہاں...... اس کے علاوہ جو بھی تھا وہ اپنی ضرورت اور اہمیت کھو چکا تھا۔

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میرا وجود خطرناک انداز میں دو حصوں میں منقسم ہو گیا ہے۔ میں جو دن کے اجالے میں ساری دنیا کے لیے ہوں۔ رات کے اندھیرے میں اس کے برعکس ہوں۔ ڈاکٹر جیکال اور مسٹر ہائیڈ...... نیکی بدی کے دو روپ...... میرے ایک وجود پر ایک خوب صورت اور خوب سیرت پری فریال کا قبضہ تھا۔ دوسرے وجود پر ایک چڑیل کا

لیکن وہ مجھے اس پری سے زیادہ خوبصورت نظر آتی تھی۔

صبح کی پہلی کرن کے ساتھ ہی یہ طلسم ٹوٹ گیا۔ میں نے اپنی پرانی اور میلی شخصیت میں آنکھ کھولی۔ کچھ دیر میں سوچتا رہا کہ میں کون ہوں اور کہاں ہوں...... پھر صورتِ حال کی سنگینی ہر طرف سے مجھ پر حملہ آور ہوئی۔ میں گھبرا کے اٹھ بیٹھا۔ میرا ذہن پریشانی، سراسیمگی اور بدحواسی کا شکار تھا۔ میں ہڑبڑا کے اٹھا۔ نور جہاں نے پھر مجھے اسیر کرنا چاہا تو میں نے سختی سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

اس نے پیچھے سے میری کمر میں ہاتھ ڈال دیے ”کیوں خفا ہو مجھ سے چندا۔“

میں نے اسے جھٹک دیا۔ ”ایک جادوگرنی ہو تم۔“

وہ بڑے دلار سے بولی ”جادو تو تم نے کیا ہے ظالم۔“

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ”مت کرو ایسی باتیں...... بے وقوفی میری ہے کہ تم نے بلایا اور میں آ گیا۔ تم یہاں لے آئیں مجھے...... بے وقوف بنا کے...... جھوٹ بول کے۔“

”جھوٹ کون سا بولا ہے میں نے۔“ وہ روہانسی ہوئی۔

”کیا بتایا ہے تم نے ابھی تک مجھے...... کون سی ٹپ دی ہے ایسی...... تم نے کہا تھا......“

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”مجھے یاد ہے میں نے کیا کہا تھا۔ اتنا غصہ کرنے کی کون سی بات ہے۔ میں بتاتی ہوں تمہیں۔“

میں پھر بیٹھ گیا۔ ”مجھے معلوم نہیں۔ یہ سب کیا ہو رہا ہے اور کیوں...... ہم آگ سے کھیل رہے ہیں نور جہاں...... اور اس میں صرف تباہی ہے...... میں اسی لیے کہتا ہوں کہ تم جادوگرنی ہو...... میری عقل پر پتھر پڑ جاتے ہیں...... میری قوتِ ارادی ختم ہو جاتی ہے تمہاری سامنے۔“

”اتنا اپ سیٹ ہونے کی کیا ضرورت ہے چندا۔ ابھی تو صبح ہونی ہے۔ میں تمہیں روک تو نہیں رہی ہوں...... چلے جانا آرام سے......“ وہ میرا سر اپنے سینے سے لگائے تھپکتی رہی۔ ”کچھ دیر بعد میں بھی چلی جاؤں گی...... پھر پتا نہیں تم کب ملو گے...... ملو گے یا نہیں...... میری اپنی زندگی ہو گی...... تمہاری اپنی۔“

میں نے کہا۔ ”نور جہاں...... وہ کون لوگ تھے۔“

اس نے کہا ”میں نہیں جانتی۔“

”کیا انہیں اکبر خاں نے بھیجا تھا......؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اس کے آدمی ہوتے تو...... کچا کام نہ کرتے...... اگر وہ مجھے لے جاتے تو تمہیں بھی ٹھکانے لگا جاتے...... وہ تو مسلح بھی نہیں تھے۔ ایسے ہی عیاش اور اوباش نوجوان تھے۔ ان میں سے دو شراب کے نشے میں دھت تھے۔ تم نے دماغ درست کر دیا ان کا۔“

”مجھے اب اپنی فکر ہے۔“

وہ مسکرائی ”فکر کریں تمہارے دشمن...... تمہارا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے۔“

”ابھی تو کسی کو معلوم ہی نہیں کہ میں کہاں ہوں؟“

وہ اٹھ کھڑی ہوئی ”تم تو رہ سکتے ہو یہاں...... جب تک تمہارا دل چاہے...... پوچھو کیسے۔“

”تمہارا دماغ خراب ہے۔“

”تم کہہ سکتے ہو کہ حادثے کے بعد تم بے ہوش ہو گئے تھے۔ تمہارے سر میں چھوٹ آئی تھی۔ کوئی تمہیں اسپتال لے گیا۔ پتا نہیں کون اور وہاں چھوڑ کے بھاگ گیا۔ تمہیں کچھ یاد نہیں تھا کہ تم کون ہو“

”مجھے سب یاد ہے کہ میں کون ہوں...... تم بتاؤ مجھے کیوں بلایا تھا؟ ورنہ میں جاتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

وہ ہنسی...... ”افوہ...... چلے...... جانا...... تم...... نہا دھو لو...... میں تمہارے لیے چائے بناتی ہوں...... تمہارے کپڑے بھی استری کر دوں۔“

”نہیں...... پہلے وہ بات بتاؤ۔“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔

”دیکھو...... رانا کی ایک بیٹی ہے...... گل رعنا۔“

نور جہاں نے بال سمیٹ کر جوڑے کی شکل میں باندھے۔

”اچھا ادھر آ جاؤ کچن میں۔“

میں اس کے پیچھے کچن میں چلا گیا۔ ”آگے بولو۔“

”رانا نے لندن میں ایک شادی کر رکھی تھی۔ اس کا علم یہاں کسی کو نہیں۔ وہ ایک انڈین ڈانسر تھی۔ کسی ٹروپ کے ساتھ پرفارم کرنے لندن گئی تھی۔ رانا کو پسند آ گئی۔ کافی پرانی بات ہے۔ رانا برابر اس کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ لندن جاتا رہتا تھا کاروبار کے بہانے...... گل رعنا اسی کی بیٹی ہے۔ اب اصل بات کا مجھے علم نہیں۔ کچھ عرصے بعد وہ ڈانسر مر گئی یا مار دی گئی۔ اسے عادت نہیں تھی کسی جاگیردار کی بیوی بن کر قید میں رہنے کی۔ لندن جیسا شہر ہو تو چیونٹی کے بھی پر نکل آتے ہیں۔ ممکن ہے اس نے اڑنے کی کوشش کی ہو۔ رانا نے بیٹی کو وہیں رکھا۔ پیدائشی طور پر وہ برطانوی شہری ہے۔ اس نے وہیں تعلیم حاصل کی۔ سارا خرچہ رانا نے برداشت کیا۔ اسکول کے ریکارڈ میں بھی باپ کا نام رجب علی رانا ہی درج ہے۔ اب وہ پاکستان آ رہی ہے۔“

میں چونکا۔ ”پاکستان آ رہی ہے؟“

”ہاں...... اس نے اولیول کر لیا ہے۔ اس کے بعد وہ یہاں پڑھے گی۔ لاہور کے کنیرڈ کالج میں اس کا داخلہ ہو گیا ہے۔ وہ ہوسٹل میں رہے گی۔ حالانکہ رانا کی ایک کوٹھی لاہور میں بھی ہے۔ وہ لڑکی آج دوپہر کی فلائٹ سے کراچی پہنچے گی وہاں سے لاہور کی فلائٹ لے گی۔ جو شام چھ بجے یہاں اترے گی۔“ اس نے پلٹ کے پوچھا۔ ”چائے پیو گے یا کافی؟“

میں نے کہا ”کافی...... اگر ہے تو۔“

نور جہاں نے کہا۔ ”تم اس لڑکی کو لے جاؤ۔“

میں اچھل پڑا۔ ”میں لے جاؤں...... کہاں...... اور کیسے۔“

وہ ہنسی۔ ”سوچو...... پلان کرو...... ابھی وقت ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے میں اسے اغوا کر لوں۔“

”بالکل یہی مطلب ہے میرا...... جیسے کو تیسا۔ اس نے بھی تو شہناز کو اغوا ہی کیا تھا۔“

میں سوچ میں پڑ گیا۔ ”تمہاری بات دل کو لگتی ہے...... لیکن یہ آسان تو نہیں ہے۔“

”میرے چندا...... آسان تو عشق کرنا بھی نہیں ہوتا۔“

اس نے کافی کا مگ مجھے تھما دیا۔

”آل رائٹ مجھے کچھ اور بتاؤ۔“ میرا دماغ کافی کا گھونٹ لیتے ہی ایکٹو ہو گیا۔

”اس کی کوٹھی کا نمبر تو مجھے یاد نہیں۔“ وہ میرے ساتھ کمرے میں لوٹ آئی ”لیکن کوٹھی کے گیٹ پر دو پھول بنے ہوئے ہیں۔ کالے گیٹ پر سفید پھول...... کوٹھی کا رنگ سرمئی ہے۔

”وہ میں معلوم کر لوں گا۔“

”وہاں جو گاڑی رہتی ہے وہ بلیک مرسیڈیز...... اس کا نمبر ہے ایل او سی...... ڈبل ون ڈبل زیرو سیون...... یہی گاڑی ایئرپورٹ جائے گی اور فلائٹ اگر چھ بجے اترے گی تو گاڑی چار بجے کے بعد روانہ ہو گی۔ ڈرائیور پرانا ہے لیکن لڑکی نے اسے نہیں دیکھا۔ اس نے اس لڑکی کو نہیں دیکھا۔ وہ بیٹھا رہے گا پارکنگ ایریا میں۔ اس کے ساتھ ایک گن مین جائے گا۔ وہ بھی پرانا بندہ ہے۔ وہ ایک پلے کارڈ لے کر لاؤنج میں کھڑا ہو جائے گا۔ جہاں آنے والے مسافروں کا استقبال کرنے والے کھڑے ہوتے ہیں۔ تم نے دیکھا ہو گا اکثر غیر ملکی مہمانوں کو ریسو کرنے والے نام کے پلے کارڈ لیے نظر آتے ہیں۔“

میں نے جوش سے کہا۔ ”میں سمجھ گیا۔ اس گارڈ کی جگہ کوئی بھی کھڑا ہو۔ وہ لڑکی...... کیا نام ہے اس کا......“

”گل رعنا...... رانا نے اپنے نام کی مناسبت سے اچھا نام رکھا ہے۔“

”ہاں...... اسے کوئی بھی لے جا سکتا ہے...... لیکن ڈرائیور......“

”ڈرائیور تم بھی ہو سکتے ہو۔ اچھی ڈرائیونگ کر لیتے ہو۔ کل رات اس کا مظاہرہ بھی کر چکے ہو۔“ وہ ہنسی۔

میں نے کہا۔ ”مجھے یقین نہیں آ رہا کہ جو تم نے بتایا...... وہ سچ ہے۔ یہ تو بہت آسان حل ہے ہمارے مسئلے کا۔“

”میں نے کیا کہا تھا؟ رانا خود آئے گا تمہارے پاس شہناز کے ساتھ...... معافی بھی مانگے گا تم سے۔“

”اگر ایسا ہو گیا نور جہاں...... تو یہ بہت بڑا احسان ہو گا تمہارا پھر مجھے سوچنا پڑے گا۔“

”کیا؟...... کہ احسان کا بدلا کیسے چکایا جائے؟ وہ بھی بتاؤں گی تمہیں۔“

میں نے کہا ”اب میں چلتا ہوں۔“

”پھر کب آؤ گے۔“ وہ مجھ سے لپٹ گئی۔

”جب تمہارا حکم ہو گا۔ یہ میرے اختیار میں کہاں ہے کہ انکار کر سکوں۔“ میں نے اسے چوم کے کہا۔

جب میں اس گھر سے نکلا تو دنیا مجھے ایک بار پھر بہت بدلی ہوئی نظر آئی۔

یہاں آتے ہوئے میں جس احساسِ جرم و گناہ کے بار تلے دبا ہوا تھا، وہ اب محسوس نہیں ہوتا تھا۔ میں پُرامید اور پر اعتماد تھا۔ نور جہاں کے لیے میرے جذبات کی نوعیت میں فرق آ چکا تھا۔ جس طرح جان ہتھیلی پر رکھ کے وہ مجھ سے ملتی تھی اور زندگی کو داؤ پر لگا کے میری مدد کر رہی تھی، وہ معمولی بات نہیں تھی۔ یہ ہوس نہیں محبت کی دیوانگی تھی جو اسے بے خطر آتشِ نمرود میں کود پڑنے کا حوصلہ دیتی تھی۔

لیکن میں نور جہاں کے بارے میں سوچتا تھا تو فکرمند ہو جاتا تھا۔ یہ تو فرض کیا ہی نہیں جا سکتا تھا کہ اس کی میری ملاقات کا راز کبھی افشا نہ ہو گا اور ہم اپنی اپنی طرف سے محبت کا یہ متوازی ڈراما ایسے ہی چلاتے رہیں گے۔ یہ محبت کسی کی ضرورت ہو یا کاروبار۔ ایک ناجائز تعلق ہی قرار پائے گی۔ فریال کو شک ہو چکا تھا۔ اکبر خاں کو معلوم ہو گا تو کھیل ختم...... نور جہاں یوں غائب ہو گی جیسے کبھی اس کا وجود بھی نہ تھا۔ بس ایک تصویرِ حسن کا تصور رہ جائے گا۔ اکبر خاں جیسے لوگ یہی کرتے ہیں...... مجھے اس کے بارے میں سوچنا

چاہیے۔ زیادہ سنجیدگی سے ...... یہ تو بڑی سفا کی ہوگی کہ میں کچھ بھی نہ کروں کہ وہ ہے تو کیا اور نہیں ہے تو کیا۔

اصولاً تو مجھے اس سے کہنا چاہیے کہ چھوڑ دو اکبر خاں کو...... یہ میری اخلاقی ذمے داری بنتی ہے کہ وہ آنکھوں پر جذبات کی پٹی باندھ کے خودکشی کی جانب بڑھ رہی ہے تو اسے روکوں۔ اس کا ہاتھ تھام لوں اور اسے سلامتی کی طرف لے آؤں لیکن اس کے بعد کیا ہوگا؟ وہ میری زندگی میں جگہ بنانا چاہتی ہے اور میرے لیے یہ ناممکن ہے کہ فریال کی جگہ کسی اور کو دوں۔ ایک نیام میں دو تلواریں رہ سکتی ہیں...... ایک ملک میں دو بادشاہ ہو سکتے ہیں مگر فریال اور نور جہاں کا بیک وقت میرے دل میں اور میرے گھر میں رہنا ناممکن ......

میں خیالوں کے اسی گرداب میں غوطہ زن رہا اور ٹیکسی نے مجھے فارقی کے در پر پہنچا دیا۔ وہاں ایک نئے دربان کو دیکھ کر مجھے تعجب ہوا کیونکہ دربان حال ہی میں تبدیل ہوا تھا۔ ایک بار پھر مجھے شناخت کے اور داخلے کی اجازت کے طریقِ کار سے گزرنا پڑا۔

فاروقی چند منٹ پہلے ہی کورٹ گیا تھا۔ مجھے بھابی نے بتایا۔

میں نے کہا ''اچھا ہی ہوا...... صبح صبح اس کی صورت نہیں دیکھی۔''

وہ اداسی سے مسکرائیں۔ ''اتنی بری تو نہیں ہے ان کی صورت۔''

میں نے آہ بھری۔ ''آپ تو مجبور ہیں ایسا سمجھنے پر...... اور کہنے پر۔''

اندر سے اباجی میری آواز سن کے نکلے۔ ''رفیق بیٹا۔''

میں نے سلام کیا۔ ''کیسے ہیں آپ اور امی۔''

حسبِ عادت انہوں نے دعا دے کر کہا۔ ''اللہ کا شکر ہے...... ٹھیک ہیں۔''

میں نے اندر جا کے اماں کو دیکھا۔ وہ مجھے پہلے سے زیادہ کمزور نظر آئیں۔ انہوں نے گلے لگا کر مجھے دعا دی۔ ''خیال آ گیا تمہیں ہمارا...... مصروفیت میں وقت نکل آیا ماں باپ کے لیے۔''

ابا اتنے صابر شاکر تھے کہ کچھ بھی ہو جائے حرفِ شکایت زباں پر نہیں آتا تھا۔ اماں اتنی ہی شکوہ بلب اور دکھی۔

لیلیٰ بھابی نے پوچھا ''ناشتا تو کرو گے نا۔''

میں نے کہا کہ صرف چائے پیوں گا۔ وہ مجھے بہت افسردہ اور بجھی بجھی نظر آئیں لیکن میں نے وجہ پوچھنے سے گریز کیا۔ مجھ میں اس معاملے کو چھیڑنے کی نہ ہمت تھی اور نہ فرصت۔

فون لاؤنج میں بھی تھا لیکن میں نے ڈرائنگ روم سے بات کرنے کو ترجیح دی۔ اب تک مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ رات کو میری روانگی سے بعد سے اب تک کسی نے بھی ست بدھائی سے یہاں فون پر بات نہیں کی ہے ورنہ سب کا پہلا سوال یہی ہوتا کہ رات بھر کہاں رہے۔ میرے نہ پہنچنے کی خبر دونوں جگہ یکساں تشویش کے اسباب پیدا کرتی۔ فریال کو صرف شک تھا۔ راجا کو معلوم تھا کہ میں کسی ارادے سے نکلا ہوں۔ اس کے نزدیک بھی کام کو میں نے بہانہ بنا لیا تھا ورنہ حقیقت یہی تھی کہ نور جہاں نے دانہ ڈالا تھا اور میں شوقِ گرفتاری میں عقل کو پیچھے چھوڑ کے چل پڑا تھا۔

راجا نے پوچھا۔ ''کہاں ہے تو۔''

میں نے کہا۔ ''یہاں فاروقی کے گھر میں اور کہاں، تو نے کل رات فون نہیں کیا۔''

''میں نے ضرورت محسوس نہیں کی۔ تو نے ابھی تک واپسی نہیں پکڑی؟''

میں نے کہا...... ''راجا...... ابھی میں نہیں آ رہا ہوں۔ یہاں ایک کام پڑ گیا ہے۔''

''بھاڑ میں جائیں دونوں...... تو اور تیرا کام۔''

میں نے کہا ''پہلے میری بات سن لے...... تو کتنی دیر میں پہنچ سکتا ہے یہاں؟''

''دن میں تین گھنٹے تو لگتے ہیں لیکن اب کیا کر دیا ہے تو نے؟''

میں نے کہا ''ابھی تک صرف ایک ایکسی ڈنٹ کہ ہے۔ اس میں گاڑی تباہ ہوئی ہے۔ بالکل اسکریپ...... لیکن میں بالکل خیر و عافیت کے ساتھ نکل آیا......''

''ابے کیا کوئی بندہ مار دیا؟ گاڑی سمیت گھس گیا کہیں۔''

میں نے کہا ''میں نے جو کچھ کیا۔ بقائمی ہوش و حواس کیا۔''

وہ سنتا رہا۔ میں نے اس سے کچھ نہیں چھپایا۔ نور جہاں سے ملاقات کے بعد پیش آنے والے واقعات من و عن بتا دیے۔ صرف وہ سین سنسر کر دیے جو نور جہاں کے گھر دروازہ بند ہو جانے اور صبح دروازہ کھلنے تک پیش آئے تھے۔ راجا کو ان سے کوئی دلچسپی بھی نہیں تھی۔

ساری بات سن کے اس نے کہا۔ ''تو نور جہاں کے ساتھ جائے حادثہ سے فرار ہو کے کہاں گیا تھا، اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اس وقت وہ کہاں ہے۔''

''اپنے گھر میں...... شاید چلی گئی ہو بابل کے گھر سے پیا کے گھر۔''

''تجھے یقین ہے کہ کسی نے بھی تجھے اس کے ساتھ نہیں دیکھا ہوگا مگر کم سے کم تین افراد چشم دید گواہ ہیں۔ ٹیکسی ڈرائیور سمیت۔''

''وہ نہ مجھے جانتے تھے اور نہ نور جہاں کو۔''

''نور جہاں ایسی چیز نہیں کہ کوئی دیکھے اور بھلا دے۔ اس کے علاوہ اکبر خان کے ساتھ وہ کاروباری تعلقات کے بہت بڑے سرکل میں گھومتی ہے...... وہ دوسری گاڑی کسی کی تھی۔''

''مجھے کیا معلوم...... میں نے تو نمبر بھی نہیں دیکھا لیکن معلوم ہو جائے گا۔ وہ چاروں لوفر تھے۔ بگڑے ہوئے شوقین مزاج رئیس زادے...... تین تو بھاگ گئے تھے۔ چوتھے کا کچھ پتا نہیں زندہ ہے کہ مر گیا۔''

''اچھا دیکھ اب میری بات سن دھیان سے...... میں معلوم کر لیتا ہوں کہ گاڑی میں کون لوگ تھے۔ تو ادھر جانے کی غلطی مت کرنا۔''

''میں کیا کروں۔''

''تو گھر میں بیٹھ آرام سے...... میں اِدھر اُدھر سے معلوم کرتا ہوں کہ نواب رفیق احمد شیرازی کل رات ست بدھائی سے لاہور جانے کے لیے نکلے تھے۔ ابھی تک لاہور نہیں پہنچے۔ کسی نہ کسی تھانے سے پتا چل جائے گا کہ تیری گاڑی کہاں ہے۔ آدھے گھنٹے میں یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ ان لڑکے کون تھے۔ اس کے بعد میں نکلتا ہوں شاہی بادشاہ کے ساتھ۔ ہم بارہ ساڑھے بارہ بجے لاہور میں ہوں گے۔''

''اس وقت تک میں بیٹھا رہوں ہاتھ پر ہاتھ دھرے۔''

''ایک گھنٹے بعد تجھے کس تھانے میں جانا ہے۔ یہ میں تجھے ابھی معلوم کر کے بتاتا ہوں۔'' راجا نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''تیری کہانی بہت سمپل ہو گئی۔ جی ٹی روڈ پر گوجرانوالہ سے نکلتے ہی تیری گاڑی چھینی گئی تھی۔ گاڑی چھیننے والے کون تھے تو نے نہیں دیکھا کیونکہ ایک نسبتاً سنسان جگہ پر اچانک گاڑی کے ٹائر پنکچر ہو گئے۔ تو نے اتر کے دیکھا تو دو ٹائر فلیٹ تھے۔ ایک آگے والا...... ایک پیچھے کا۔ ایک ہوتا تو اسپیئر وہیل لگا کے کام چل جاتا۔ ابھی تو سوچ ہی رہا تھا کہ ایک جیپ پیچھے آ کے رکی۔ تو نے سمجھا کے وہ مدد کے لیے آئے ہیں لیکن ان میں سے جو لوگ اترے، انہوں نے منہ پر ڈھاٹے باندھے ہوئے تھے۔ دو نے تجھے دبوچ لیا۔ وہ جوان اور صحت مند لوگ تھے۔ ان سب سے ایک نے کلوروفارم میں بھیگا ہوا رومال تیری ناک پر رکھ دیا۔ اس کے بعد تجھے نہیں معلوم کیا ہوا۔ جب تجھے ہوش آیا تو تو سڑک سے کچھ دور پڑا ہوا تھا۔''

''کتنی دور اور کہاں......؟''

''ابے سو گز ہوں یا دو سو۔ کیا فرق پڑتا ہے اور وہ کھیت نہیں تھے۔ کوئی نالہ تھا...... یا گڑھا تھا...... تو بڑی مشکل سے چل کے سڑک تک گیا۔ وہاں نہ تیری گاڑی تھی اور نہ ہی جیپ...... تو نے ایک گاڑی والے سے لفٹ لی۔ اس کے بعد کی تجھے کچھ خبر نہیں کہ گاڑی لے جانے والوں نے کیا کیا۔ گاڑی کے ساتھ کیا ہوا۔ وہ غالباً ڈاکو ہوں گے۔ ممکن ہے انہوں نے کوئی واردات کی ہو۔ ضرورت پڑی تو ہم گواہ بھی لے آئیں گے۔ میڈیکل رپورٹ بھی لے لیں گے کلوروفارم کے اثرات کی...... آئی بات سمجھ میں؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں کسی حد تک۔''

فاروقی کے خانگی معاملات کی رپورٹ مجھے رابعہ سے مل چکی تھی اور بھابی کے رویے سے بھی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ شوہر کے رویے سے پیدا ہونے والی خرابی اور اپنی مظلومیت کے مسئلے پر مجھ سے بات کرنے اور میری ہمدردی حاصل کرنے کی خواہاں ہیں۔ یہ خواہش فطری تھی۔ ہر عورت چاہتی ہے کہ جب خاوند اس پر سوکن لا کر بٹھانے کا فیصلہ کرے تو سارا زمانہ شوہر کی مذمت اور بیوی نمبر ون کی حمایت کرے۔ میں فاروقی کا وہ دوست تھا جو اس سے کھل کے بات کر سکتا تھا۔ کم سے کم لیلیٰ بھابی کو یہ خوش فہمی ضرور تھی کہ میں فاروقی کا عقد ثانی کا فیصلہ تبدیل کرا سکتا ہوں۔ فاروقی کی طرح کوئی مرد عقد ثانی کی ضرورت کا اخلاقی، شرعی اور قانونی جواز رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو لیکن اگر ایک بار وہ فیصلہ کر لے تو اسے کون روک سکتا ہے۔

جانتے بوجھتے میں نے لیلیٰ بھابی کا سامنا کرنے سے گریز کیا حالانکہ مجھے دیکھ کر انہوں نے اپنی شکل زیادہ دکھی اور دردناک بنالی تھی اور...... تو ذرا چھیڑ تو اسے تشنۂ مضراب ہے ساز...... کی عملی تفسیر بنی پھر رہی تھیں۔ میں اماں اور ابا سے باتیں کرتا رہا۔ وہ عجیب مخمصے میں گرفتار تھے۔

''میاں ہم تو نہ گھر کے رہے نہ گھاٹ کے۔ بہت خوش تھے کہ اب خاندانی جاگیر پر جا کے ٹھاٹھ سے رہیں گے۔''

میں نے کہا ''آپ مایوس کیوں ہوتے ہیں۔ یہ تھوڑے دن کی بات ہے۔''

''تھوڑے دن ہی ہیں ہمارے پاس زندگی کے۔'' وہ

ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔ ''اگر اپنا گھر ہوتا تو لوٹ کے وہیں چلے جاتے۔ بڑے سکون سے زندگی گزر رہی تھی۔ قناعت کے ساتھ رہتے تو کچھ نہ ہوتا۔''

میں نے کہا۔ ''آپ آئندہ بھی سکون سے رہیں گے۔''

''نہیں رفیق، دل میں ایک چیز رہتی ہے ہوس یا قناعت۔ ہم نے ست بدھائی کے جاگیر کی خاطر تمہیں بلالیا۔ پہلے اپنا گھر چھوڑا پھر سارے رشتے ٹوٹے۔ نہ ماں رہی نہ بھائی رہا۔ تم نے تو خیر چھپالیا تھا ہم سے لیکن ہمیں کیا مل گیا۔ وہ گھر جل کے راکھ ہوا اور اس کی مٹی بک گئی۔ وہ شاخ ہی نہ رہی جس پر آشیانہ تھا۔ اب کہاں جائیں۔''

ان کے ڈیپریشن کا ذمے دار حالات کو ٹھہرایا جاسکتا تھا مگر وہ حالات میری وجہ سے پیدا ہوئے تھے اور یہ ممکن نہیں تھا کہ میں کسی جادوئی عمل سے سب کچھ ٹھیک کرلوں۔ اس کے لیے میری کوشش بھی وقت مانگتی تھی اور اماں ابا کے ڈیپریشن کی وجہ بھی یہ تھی کہ وہ سمجھتے تھے کہ اب ان کے پاس وقت نہیں ہے۔

میں نے ان کے سامنے خود کو لاجواب اور بے بس محسوس کیا۔ نہ میں ان سے کوئی وعدہ کرسکتا تھا۔ نہ انہیں گارنٹی دے سکتا تھا کہ تمام حالات ایک ہفتے میں ایک مہینے میں بالکل ٹھیک ہوجائیں گے تو میں انہیں واپس ست بدھائی لے جاؤں گا جہاں ان کے ہر خواب کو تعبیر دینا میرے اختیار میں ہوگا۔ ان کی طرح فریال بھی ایک ٹائم فریم مانگتی تھی۔ حالات کب ٹھیک ہوں گے! خواب کب حقیقت کا روپ دھاریں گے! میری فریال سے شادی کب ہوگی۔ ہمارے بچے کب ہوں گے۔ میرے ماں باپ کو پوتا پوتی کب ملیں گے! ست بدھائی کی حویلی کب سکون اور مسرت کا گہوارہ بنے گی! ایسے تمام سوالات کا جواب میں کیسے دے سکتا تھا۔

میری گلوخلاصی اس وقت ہوئی جب لیلیٰ بھابی نے فون کی گھنٹی کے بعد چلّا کے کہا۔ ''راجا سے بات کرلو رفیق۔''

میں نے لاؤنج کے ریسیور کو الگ پڑا دیکھا تو اٹھا کے واپس کریڈل پر رکھ دیا۔ ''میں اندر سے بات کرتا ہوں۔''

لیلیٰ بھابی نے کچن سے مڑ کے میری طرف دیکھا۔ ''اچھا...... بات کرلو پھر مجھے کچھ کہنا ہے تم سے۔''

راجا نے کہا ''تیری گاڑی کو گڑھی شاہو تھانے والے اٹھا کر لے گئے ہیں۔ وہیں پڑی ہوگی۔''

''اور وہ دوسری گاڑی......''

''وہ بھی اٹھالی گئی ہے لیکن کسی تھانے میں نہیں ہے۔ ابھی یہ معلوم نہیں ہوا کہ اس کا مالک کون ہے...... پتا چل جائے گا۔''

''اور جو اسے چلا رہے تھے......''

''یہ بھی پتا چل جائے گا۔ پولیس کو ابھی مدعی کا انتظار ہے۔ وہ اس حادثے کو دوسرا رنگ دیں گے۔ اگر تو اصل واقعات کے مطابق رپورٹ درج کراتا تو کچھ فائدہ ہوسکتا تھا۔ دوسری گاڑی کا مالک تجھ سے سودا کرلیتا۔ تجھے نئی گاڑی مل جاتی اور بات ختم...... وہ نہیں چاہتا کہ اس حادثے کی رپورٹ بھی درج ہو...... بلاوجہ اس کا نام آئے اور بدنام ہو۔''

''مگر وہ ہے کون؟''

راجا نے جھنجلا کے کہا۔ ''ابے ہوگا کوئی بہت بڑا رشوت خور افسر...... اسے کوئی غرض مند دوسری گاڑی پیش کردے گا۔ نقصان پورا ہوجائے تو قانونی کاروائی کا کیا فائدہ۔ خوامخواہ کوئی اخبار والا یہ چھاپ دے کہ فلاں کے ہونہار سپوت نے یہ کارنامہ سرانجام دیا اور اس کے ساتھ فلاں فلاں کے فرزندانِ ارجمند بھی تھے۔''

میں نے کہا ''ایک فرزند گاڑی میں پڑا تھا۔''

''وہ معمولی زخمی تھا۔ بے ہوش ہوگا۔ مرجاتا تو کوئی کہانی بنتی لیکن ایسی کوئی بات ابھی تک پتا نہیں چلی۔ وہ کسی پرائیویٹ اسپتال کی وی آئی پی روم میں آرام سے لیٹا ہوا ہوگا لیکن تجھے ان سارے معاملات سے کیا۔ تیری کہانی کچھ اور ہے۔ ایکسی ڈنٹ ان سے ہوا جو تجھ سے گاڑی چھین کر لے گئے تھے۔ وہ کون تھے ''نامعلوم ملزمان''...... پولیس تیری رپورٹ لکھے گی اور ان کی تلاش جاری رکھے گی۔ وہ قیامت تک نہیں ملیں گے تو رپورٹ لکھوا جا کے گڑھی شاہو تھانے۔ اسکریپ ہوجانے والی گاڑی پر فاتحہ پڑھ کے کسی کباڑی کے حوالے کر یا یہ ذمے داری بھی تھانے والوں پر ڈال کے آجا۔ وہ تیرے بہت شکرگزار ہوں گے۔ اسکریپ سے بہت کچھ کارآمد نکل آئے گا۔ لوہا بعد میں بکے گا۔ انہیں بیس پچیس ہزار مل ہی جائیں گے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ تھرڈ پارٹی ڈیل کرادوں۔''

''کیسی ڈیل!''

''تھوڑا سا دباؤ ڈالنے سے نئی گاڑی مل سکتی ہے۔ کسی کرائم رپورٹر کو اس کام پر مامور کردیتا ہوں۔ وہ پولیس کے ذریعے پیغام پہنچائے کہ گاڑی نواب رفیق احمد شیرازی کی تھی۔ وہ رپورٹ لکھوانے پر بضد ہیں اور وہ کوئی عام آدمی نہیں ہیں اگر ان کا نقصان پورا کردیا جائے تو......''

''یار اتنا تو ہونا ہی چاہیے۔ بدمعاشی کی بھی کوئی حد ہے۔ جوانی، دولت اور شراب کے نشے میں جس کی عزت پر چاہیں ہاتھ ڈال دیں جو عورت اچھی لگے اٹھالیں۔''

''غصہ تھوک دے فیکے پتر۔ کیا حقائق چھپانا خود تیری اپنی مجبوری نہیں ہے؟ اگر معاملہ نور جہاں کا نہ ہوتا فریال کا ہوتا تو ہم ان سب کے غرور کی ہوا نکال دیتے۔ سب سالے حوالات میں نظر آتے۔ ان کے باپ بھی انہیں نہ بچاسکتے لیکن اب ویک پوائنٹ ہمارا بھی ہے۔ ہم بھی اسٹوری بدلنا چاہتے ہیں جس میں نہ تیرا نام آئے نہ نور جہاں کا۔ اس لیے تو وہی کر جو میں بتا رہا ہوں۔ ابھی جا شاہدرہ تھانے۔ وہاں گاڑی چھن جانے کی رپورٹ درج کرا۔ واقعات وہی جو میں نے پہلے بتائے تھے۔ کوئی سوال جواب نہیں کرے گا تجھ سے۔''

''تیری بات ہوگئی ہے۔''

''ہوگئی ہے...... رپورٹ لکھوا کے جا گڑھی شاہو تھانے۔ گاڑی کو ملاحظہ فرما اور بس...... تھانے والوں سے کہہ کہ چاند سی نواب تیرے حوالے۔''

میں نے کہا ''فارسی میں کہتے ہیں۔ سپردم بہ تو مایہ خویش را۔''

''تھانے والے فارسی نہیں سمجھتے، اس کے بعد تیرا کام ختم آرام سے گھر بیٹھ۔''

''تو کتنی دیر میں پہنچے گا۔''

''وہی ساڑھے بارہ تک......'' راجا نے کہا ''شامی بادشاہ اور ہمو اسیر سے ساتھ ہوں گے۔''

''فریال یا رابعہ کو تو کچھ نہیں بتایا نا۔''

''وہ تو خود آ کر بتادیتا۔ اصل کہانی سن کے دنوں بہت خوش ہونگی۔ فریال تو منہ مانگا انعام بھی دے گی۔'' راجا نے کہا اور فون بند کردیا۔

میں دبے پاؤں باہر نکلنا چاہتا تھا مگر لیلیٰ بھابی کی نظر نے مجھے گرفتار کرلیا۔ ''کہاں بھاگے جارہے ہو۔''

میں نے کہا ''میں ابھی آتا ہوں آدھے گھنٹے میں۔'' اور ان کی طرف دیکھے بغیر باہر نکل گیا۔

شاہدرہ پولیس اسٹیشن بالکل ویسا ہی تھا جیسا ہر قدیم تھانہ ہوتا ہے۔ اس کا مخصوص پُرآسیب اور دہشت زدہ ماحول بھی وہی تھا۔ تھانے کے معمولات بھی وہی تھے۔ فرق مجھے یہ نظر آیا کہ ایس ایچ او صاحب جو اس وقت گشت پر ہوتے ہیں میرا بے چینی سے انتظار فرمارہے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ میں کون ہوں...... کس کام سے آؤں گا اور کیا رپورٹ لکھواؤں گا۔

میرا استقبال اہم شخصیت کی طرح کیا گیا۔ چائے بڑے قرینے سے لائی گئی پھر محرر نے حاضر ہو کے سیلوٹ کیا۔ میں نے بتایا کہ مجھے کیا رپورٹ لکھوانی ہے۔ اس نے بہت بہتر رپورٹ لکھی۔ جائے واردات میں نے دیکھی نہیں تھی۔ اس لیے مجھے تفصیل سے بتایا کہ میری گاڑی کہاں چھینی گئی تھی۔ اس نے واقعات کو ایک اچھے ایڈیٹر کی طرح مرتب کیا۔ مثلاً ملزمان کے حلیے اور ان کی عمر وغیرہ کے بارے میں مجھے بریف کیا پھر پوری رپورٹ مجھے پڑھ کر سنائی گئی اور جب میں نے اس پر دستخط کردیے تو تھانیدار اور محرر نے میرا شکریہ ادا کیا۔ شکایت کنندہ اور پولیس کے درمیان مخلصانہ تعاون کا ایسا مثالی مظاہرہ دیکھنے میں کب آتا ہے۔

گڑھی شاہو کے پولیس اسٹیشن کے احاطے میں بہت سی نامکمل اور گردآلود گاڑیوں کے ڈھانچے کھڑے تھے۔ ایسے نمونے کم و بیش ہر تھانے میں نظر آتے ہیں۔ کچھ جرائم میں ملوث گاڑیاں ہوتی ہیں تو کچھ ضبط شدہ یا مالِ مسروقہ۔ ان کے اصل ٹائر غائب تھے۔ پھٹے پرانے ٹائروں پر گاڑیاں فرشِ خاک پر بیٹھی نظر آرہی تھیں۔ اندر سے ان کی ہر کارآمد چیز یہاں تک کہ بعض اوقات انجن بھی نکال لیا جاتا ہے جو بچ جاتا ہے اسے مالک بھول جاتے ہیں اور صبر کرلیتے ہیں کیونکہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

میری گاڑی بھی انہی کے ساتھ پڑی تھی۔ گاڑی سے زیادہ وہ گاڑی کی ٹوٹی ہوئی لاش تھی۔ اندر میری ملاقات ڈیوٹی افسر صاحب سے ہوئی۔

''اچھا تو آپ ہو اس گاڑی کے مالک۔'' اس نے طنزیہ کہا۔

''ہاں...... اسے آپ بانسوں والی سڑک سے کیسے لائے۔'' میں نے کہا۔

اس نے زور سے اپنی ناک صاف کی۔ ''بانسوں والی سڑک! یہ کہاں ہے؟''

''جہاں سے آپ اسے اٹھا کے لائے ہیں۔'' میں نے کہا۔

وہ بولا۔ ''آپ نے تو مجھے حیران پریشان کردیا ہے، ہمارے علاقے کی حدود میں یہ کون سی نئی سڑک بن گئی۔ حادثہ تو پیش آیا تھا ادھر۔''

میں نے اس کے ہاتھ کی ڈائریکشن دیکھی۔ ''ادھر کدھر۔''

''چوک میں۔ ادھر سے آرہی تھی گاڑی۔ ریلوے

اسٹیشن کی طرف سے اور ادھر سے آ رہا تھا کوئی ٹرک۔ مغلپورے کی جانب سے۔''

میں نے کہا'' وہ ٹرک تھا۔''

اس نے خفگی سے کہا۔'' پھر کیا تھا۔ آپ ہی بتا دو۔ ایکسی ڈنٹ میرا ہوا تھا یا آپ کا۔''

میں نے کہا۔'' میرا تو کوئی ایکسی ڈنٹ نہیں ہوا۔''

اس نے پھر ناک صاف کی۔'' ایک تو یہ نامراد نزلہ۔ اوپر سے آپ مجھے حیران پریشان کر رہے ہو۔ یہ گاڑی آپ کی ہے یا نہیں جس کا ملبہ ہم اٹھا کے لائے ہیں۔ آپ تو سڑک پر چھوڑ کے لیے چلے گئے تھے۔ میرا ہزار روپیہ خرچ ہوا ہے۔''

میں نے کہا'' گاڑی یقیناً میری ہے لیکن ایکسی ڈنٹ کے وقت میں گاڑی میں ہوتا تو آپ کے سامنے ایسے صحیح سالم بیٹھا ہوتا۔''

'' یہی تو میں حیران پریشان ہوں۔''

میں نے کہا'' مسٹر حیران پریشان..... یہ گاڑی مجھ سے چھین لی گئی تھی۔ اس کی رپورٹ ابھی تھانہ شاہدرہ میں لکھوا کے آیا ہوں۔ کیا گاڑی میں سے اس کے کاغذات برآمد نہیں ہوئے۔''

''نہیں۔ وہ ملزمان ساتھ لے گئے ہوں۔'' وہ بولا۔

میں نے کہا'' ملزمان چار تھے۔ ان میں سے کوئی آپ کی تحویل میں ہے۔ زندہ یا مردہ؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔'' وہ مفرور ہیں۔ اگر کوئی زخمی ہوا تھا یا مرا تھا۔ تو وہ اس کی لاش بھی لے گئے۔''

''صبح سے بہت پہلے۔ تین چار بجے کے درمیان کسی نے فون کر کے بتایا تھا۔''

میں نے کہا'' کیا ملزمان نے گاڑی مجھ سے چھیننے کے بعد کوئی واردات کی۔''

'' دیکھو جی..... ابھی تک تو میرے علم میں نہیں، کی ہو گی تو پتا چل جائے گا۔'' وہ بولا۔

میں نے کہا۔'' پھر میرے لیے کیا حکم ہے؟''

'' گاڑی آپ کو مل جائے گی۔ ملزمان پکڑے جائیں گے تو انہیں عدالت میں پیش کیا جائے گا۔ مالِ مسروقہ سمیت، کیس کا فیصلہ ہونے کے بعد عدالت گاڑی آپ کو ریلیز کر دے گی۔

میں نے کہا'' گویا میری زندگی میں اس کا امکان بہت کم ہے۔''

''نہیں جی، آپ اس سے پہلے بھی عدالت سے گاڑی اپنی ذمے داری پر لے سکتے ہو کہ ملزمان جب پیش ہوں گے آپ گاڑی لاؤ گے۔''

میں نے کہا'' میں یہ ملبہ کیسے عدالت میں پیش کروں گا؟''

'' یہ آپ کا کام ہے جی..... آخر ہم بھی تو اٹھا کے لائے ہیں۔ ہزار روپیہ خرچ کر کے..... گاڑی آپ کی خرچ ہمارا۔''

میں نے کہا۔'' میری طرف سے یہ گاڑی تحفے میں قبول کریں۔ یقیناً اس سے آپ خرچہ نکل آئے گا۔ میرا اس پر کوئی دعویٰ نہیں۔''

اس وقت کوئی فون آیا۔ وہ سنتا رہا اور مجھے دیکھتے ہوئے سر ہلا کہ'' بس سر..... جی سر کہتا رہا۔ وہ اتنا باادب ہو گیا کہ اس نے نامراد نزلے کے باعث بہنے والی ناک بھی آواز نکالے بغیر صاف کی۔ فون کا ریسیور رکھنے کے بعد اس نے کہا'' آپ نواب رفیق احمد شیرازی ہو۔''

میں نے کہا'' مجھے پورا یقین ہے۔''

'' سر جی، آپ نے مجھے بڑا حیران پریشان کیا۔ آپ پہلے ہی فرما دیتے تو ہم کچھ خاطر تواضع کرتے آپ کی۔ ابھی ایس پی صاحب نے بتایا۔''

میں نے کہا'' مجھے تھانے میں خاطر تواضع کرانے کا کوئی شوق نہیں میں چلتا ہوں۔''

'' سر جی، ایک منٹ۔'' تھانیدار سے وہ ایک تابعدار بن گیا تھا۔'' اپنے چودھری چراغ دین صاحب تشریف لا رہے ہیں۔''

میں نے کہا'' اب میں حیران پریشان ہوں۔ چودھری چراغ دین کون ہیں۔ میں تو نہیں جانتا۔''

'' آپ نہیں جانتے؟ سارا لاہور جانتا ہے۔'' اس نے جو تعارف کرایا، اس سے مجھ پر واضح ہوا کہ مختلف منافع بخش محکموں کے منافع بخش عہدوں پر فائز رہنے کے بعد ترقی کرتے کرتے فی زمانہ ہائی وے ڈیپارٹمنٹ میں ڈپٹی چیف انجینئر لگے ہوئے ہیں اور چیف انجینئر جا رہا ہے غیر ملکی دورے پر۔ واپسی تک اس کا پتا صاف ہو جائے گا۔ اسے بھیج دیا جائے گا جنگلات کے محکمے میں اور اپنے چودھری چراغ دین ہوں گے چیف انجینئر، انشاء اللہ۔

میں نے کہا'' تمہارا ان سے خاصا قریبی تعلق ہے۔''

وہ عاجزی سے بولا۔'' بس جی، پرانے مہربان ہیں اپنے بھی۔''

میں نے کہا۔ ''لیکن یہ تم نے ابھی تک نہیں بتایا کہ مجھ سے وہ کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں۔''

''جناب عالی، یہ بڑے لوگوں کی باتیں ہیں۔ ہم بہت چھوٹے لوگ ہیں، ہم کیا جانیں۔'' اس نے زور سے ناک صاف کر کے کسی کو گالی دے کر بلایا۔ ''اوئے سور دے پتر۔ چائے کیوں نہیں آئی ابھی تک نواب صاحب کے لیے؟''

چودھری چراغ دین کی سواری آدھے گھنٹے بعد آئی۔ اس نے تھانے میں آنے کی زحمت نہیں کی۔ ایک کانسٹیبل ہانپتا کانپتا آیا اور اس نے مجھے مطلع کیا کہ وہ باہر گاڑی میں میرا انتظار فرما رہے ہیں۔

میں باہر گیا تو دروازے کے سامنے ایک بالکل نئی چمکتی دمکتی کرولا کھڑی تھی۔ اس کا انجن چل رہا تھا کیونکہ اے سی آن تھا۔ کالے شیشوں کے پیچھے کون تھا۔ یہ باہر سے اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ میرے قریب پہنچتے ہی دروازہ کھلا اور چودھری چراغ دین نے کہا ''تشریف رکھیں۔''

چودھری چراغ دین پچاس پچپن سال کا بھاری بدن والا اور شکل وصورت سے خرانٹ نظر آنے والا بیورو کریٹ تھا۔ اس کی آنکھوں میں عیاری سے زیادہ تکبر تھا۔ عام آدمی سے اس کا رویہ یقیناً مختلف ہوتا ہوگا میرے بیٹھتے ہی گاڑی چل پڑی۔ گاڑی میں اور کوئی نہیں تھا اس لیے پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ ''آپ ہی نواب رفیق احمد شیرازی ہیں؟''

میں نے کہا ''جی...... لیکن یہ آپ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں۔''

اس نے اپنی نظر سامنے رکھی۔ ''وہ میری گاڑی تھی جس سے کل آپ کا ایکسی ڈنٹ ہوا تھا۔''

میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''دیٹ واز نو ایکسی ڈنٹ۔''

اس نے میری برہمی کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ ''آپ نے تو میرے بچے کو تقریباً مار ہی ڈالا تھا۔''

''ان میں کون آپ کا بیٹا تھا، وہ جو گاڑی چلا رہا تھا۔'' میں نے غصے میں کہا۔

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''مائی اونلی سن۔ اسی لیے مجھے خود آپ سے ملنے آنا پڑا۔''

میں نے کہا'' اس نے اور اس کے دوستوں نے کیا حرکت کی تھی؟ یہ معلوم ہے آپ کو۔''

''چھوڑیے نواب صاحب۔ نادانی اور جوانی میں بچے غلطی کر جاتے ہیں۔ کل کو آپ کے بچے ایسی کوئی شرارت کریں......''

میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''شرارت؟ اتنے سنگین جرم کو آپ بچوں کی شرارت سمجھتے ہیں۔ میرا بیٹا ایسے کرے تو میں......''

''پلیز ڈونٹ شارٹ...... میں بات ختم کرنے آیا ہوں۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ آپ بھی قانونی معاملات میں پڑنا نہیں چاہتے۔ میں آپ کے نقصان کی پوری تلافی کر رہا ہوں۔ آپ کی پرانی کرولا تھی۔ یہ بالکل نئی کرولا آپ کی نذر ہے۔'' اس نے ڈیش بورڈ سے ایک فولڈر اٹھایا اور مجھے دے دیا۔

''یہ کیا ہے۔''

''گاڑی کے سارے کاغذات۔ ٹرانسفر لیٹر کے ساتھ۔ میں نے دستخط کر دیے ہیں۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ گاڑی میرے نام ہے۔ باقی تفصیلات آپ خود لکھ لیں۔ بروکر پانچ ہزار لے گا۔ گاڑی آج ہی آپ کے نام ہو جائے گی۔ کیا اب میں اس معاملے کو ختم سمجھوں؟''

میں نے کہا'' مجھے ترس آتا ہے اس باپ پر جو اتنا مجبور ہو جائے۔ اتنا با اختیار ہونے کے باوجود۔''

اس نے کہا'' میں گلبرگ میں رہتا ہوں۔ میں اپنے گھر کے دروازے پر اتر جاؤں گا آپ گاڑی لے جائیں۔ کوئی پرابلم ہو تو پہلے مجھے فون کر لیں۔'' اس نے مجھے ایک کارڈ تھما دیا۔

میں نے کارڈ جیب میں رکھ لیا۔ ''خدا وہ وقت نہ لائے کہ ہم پھر ملنے پر مجبور ہوں۔''

اس نے ایک موڑ پر گاڑی روک لی۔ ''یہی ہے میرا گھر نواب صاحب۔ بائی داوے۔ کیا نام ہے اس ریاست کا جس کے آپ نواب ہیں۔''

میں نے کہا'' ست بدھائی۔''

''ست بدھائی...... سنا ہوا لگتا ہے کچھ۔'' اس نے سوچتے ہوئے کہا اور اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ ''خدا حافظ......''

میں نے ڈرائیونگ سیٹ پر جا کے سیفٹی بیلٹ باندھی تو وہ اس عالی شان کوٹھی کے اندر جا چکا تھا۔ مجھے ہرگز اپنی گاڑی کے بدلے کسی دوسری گاڑی کا سودا کرنا منظور نہیں تھا لیکن رابعہ نے اپنا کام دکھا دیا تھا۔ یہ اس کی کوشش کا نتیجہ تھا کہ سب کی عزتوں کا بھرم رہ گیا۔ قانون اندھا کہلاتا ہے۔ اس نے کچھ نہیں دیکھا۔

فاروقی کے گیٹ کے چوکیدار نے ایک بار پھر مجھے

روک دیا لیکن شیشہ اتار کے میں نے رونمائی کی تو وہ گھبرایا۔ ''سوری سر، گاڑی نہیں پہچانی میں نے۔'' وہ بولا اور گیٹ کھولنے دوڑا۔

ابھی ساڑھے گیارہ ہوئے تھے۔ راجا کے آنے میں کم سے کم مزید ایک گھنٹا باقی تھا۔ میں نے گاڑی پورچ میں روکی تو باہر نکلتے ہی لیلیٰ بھابی کو دیکھا۔ وہ ایک ہاتھ کمر پر رکھے حیرانی سے نئی کار کو دیکھ رہی تھیں۔

''یہ کب لی دیور جی۔'' انہوں نے پوچھا۔

میں نے عاجزی سے جواب دیا۔ ''یہی لینے تو گیا تھا۔ کیسی ہے۔''

''تمہارے لائق ہے۔'' وہ برآمدے میں پڑی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

مجھے ان کے پاس بیٹھنا پڑا۔ اب میرے پاس ان کی داستان سننے کے لیے ایک گھنٹے کی مہلت تھی۔ جتنی دیر وہ بولتی رہیں میرا ذہن نور جہاں کے خیال میں رہا۔ اس نے تو یہ سب پہلے ہی مجھے بتا دیا تھا۔ فاروقی کیا کر چکا ہے۔ کیا کر رہا ہے اور کیا کرنے والا ہے۔ اور اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ بھابی کو بتا دینا چاہیے وہ سب جو پردۂ غیب سے ظہور میں آنے والا ہے۔ فاروقی کا پورا سازشی منصوبہ بھابی کے سامنے رکھ دینا چاہیے! فاروقی نے مریم سے شادی کر لی ہے۔ مریم حاملہ ہے۔ اس کا ابارشن ہوگا اور مر جائے گی۔ پھر فاروقی تمہیں بلیک میل کرے گا۔ کہے گا کہ مریم کو تم نے مارا ہے لیکن میں تمہاری جان بچا سکتا ہوں۔ ایک شرط پر۔ تم کو وہی کرنا ہوگا جو میں کہوں۔ تم رفیق کو ٹھکانے لگانے میں میری مدد کرو گی۔ میں ست بدھائی کی ریاست کا مالک بن جاؤں گا۔ اس کے بعد آخری کام ہوگا رابعہ سے نجات پانے کا۔ وہ ہم مل کے کریں گے۔ اگر تم نے میرا ساتھ نہ دیا تو تمہیں جیل جانے سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ میرے تعلقات ہیں۔ میں اپنی مرضی کی رپورٹ حاصل کر سکتا ہوں۔ سیشن کورٹ سے تمہیں سزائے موت دلوا سکتا ہوں۔ پھر میرا کام تو زیادہ آسان ہو جائے گا۔ تم کچھ بھی کہتی رہو۔ تمہاری کون سنے گا۔

لیکن یہ سب سن کے لیلیٰ بھابی کیا کرے گی؟ وہ میرے منہ پر تھپڑ مار کے کہے گی۔ تم پاگل ہو گئے ہو یا شراب کے نشے میں ہو۔

میرا ہاتھ بے اختیار اپنے گال پر گیا۔ ''نہیں۔'' میں نے کہا۔

لیلیٰ بھابی نے ناراضی سے کہا۔ ''کیا نہیں؟ میں کہہ رہی ہوں کچھ کرو۔ تم کہہ رہے ہو نہیں وہ حرافہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی تو میں کہاں جاؤں گی۔''

میں نے کہا'' یہ گھر آپ کا ہے۔ آپ کو کہیں جانے کی کیا ضرورت ہے لیلیٰ بھابی۔''

''لیکن اس کے ساتھ میں اس گھر میں رہوں۔ یہ بھی ناممکن ہے۔ اگر وہ مریم کو یہاں لائے تو میں ست بدھائی چلی جاؤں گی۔''

اور وہاں مجھے زہر دیں گی۔ میں نے دل میں کہا لیکن زبان سے نہیں کہا۔ ''فاروقی ایسا نہیں کر سکتا۔ میں اسے قتل کر دوں گا۔''

بھابی نے گھبرا کے کہا۔ ''کیسی باتیں کرتے ہو دیور جی۔''

میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''پھر کیا میں اسے پہل کرنے کا موقع دوں۔''

''کیا مطلب؟'' بھابی نے الجھن سے میری طرف دیکھا۔

میں نے بات کا رخ بدلا۔ ''دراصل...... یہ سب جو آپ نے کیا۔ رابعہ مجھے بتا چکی تھی۔ اب آپ نے بھی تصدیق کر دی۔ اب میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے تو نہیں بیٹھ رہ سکتا۔ مجھے کچھ رپورٹس تو ملی تھیں اس کی مشکوک نقل و حرکت کے بارے میں لیکن مجھے یقین نہیں آیا کہ فاروقی میرا دوست ایسا کر سکتا ہے۔ وہ ایسا سوچ بھی کیسے سکتا ہے۔ لیکن زر، زمین، زن۔ دنیا میں فساد کے اسباب۔

لیلیٰ بھابی یہی سمجھتی رہی کہ میں اس کی زندگی کے مسائل پر بات کر رہا ہوں۔ میں اسے کیسے بتاتا کہ میری نظر کس حقیقت کو دیکھ رہی ہے۔ اب یہ گھر مجھے اس دوست کا نہیں لگتا جس پر میں سب سے زیادہ اعتماد کرتا تھا۔ اب یہ میرے جانی دشمن نمبر ون کا گھر ہے۔ وہ دوست آستین کا سانپ بن گیا ہے۔ اسے مارنا ہی پڑتا ہے۔ پالا نہیں جا سکتا۔ اور وہ .... لیلیٰ بھابی۔ اس کے مہرباں چہرے میں مجھے ایک قاتل کا چہرہ نظر آتا ہے جو مجھے زہر کا پیالہ دے گی لیکن میں سقراط نہیں ہوں کہ پی جاؤں۔ کوئی مجھے اتنا اناڑی سمجھتا ہے تو وہ پاگل ہے۔

جب راجا نمودار ہوا تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اس نے دلچسپی سے نئی گاڑی کو دیکھا اور مسکراتے ہوئے مجھے آنکھ ماری۔

''دیکھ لے فیکے پتر۔ اسے کہتے ہیں پابندیٔ وقت۔'' اس نے گھڑی کا رخ میری طرف کیا۔ ''ساڑھے بارہ اب ہوئے ہیں۔''

میں نے کہا ''تو اکیلا کیوں آیا ہے۔''

وہ کرسی پر گر گیا۔ ''ابے تو کیا شامی بادشاہ اینڈ کمپنی کو یہاں لے آتا۔ ڈاکوؤں کو گھر دکھا دیتا دوست کا۔''

میں نے کہا ''راجا...... یہ میرے قاتل کا گھر ہے۔ اب مجھے کوئی شک نہیں رہا۔''

''کیا وہ تجھ پر قاتلانہ حملہ کر چکا ہے۔ ناکام قاتلانہ حملہ۔''

''راجا...... مذاق مت کر...... تجھے اب نور جہاں پر شک نہیں ہونا چاہیے کہ وہ کس طرح ہماری مدد کر رہی ہے۔ جان ہتھیلی پر رکھ کے۔''

''اس کی جان کی مجھے پروا نہیں لیکن یہی سلسلہ رہا تو پہلے تیری جان جائے گی۔ فاروقی کو کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوگی۔ تیرا کام رقیب روسیاہ تمام کر دے گا۔ تجھے شرم نہیں آتی۔''

میں نے کہا ''پہلے آتی تھی۔ اب کسی بات پر نہیں آتی۔''

''وہ کسی اور کی بیوی ہے۔ اس کا شوہر تیرا ملازم تھا۔ سوچ اگر شادی کے بعد اس طرح فریال کسی کو پھانس لے۔''

میں نے کہا ''راجا...... اپنی بکواس بند کر...... مجھے بتا باقی لوگ کیوں نہیں آئے۔''

وہ بے رخی سے بولا۔ ''وہ چلے گئے ادھر۔ رانا کی کوٹھی کی طرف۔''

میں نے کہا ''ویری گڈ...... گویا اب ہمیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔''

''نہیں...... شامی نے کہا ہے کہ وہ ایئرپورٹ سے اس لڑکی کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔''

''گویا ہمارا اب یہاں کوئی کام نہیں ہے۔''

''گویا کے بچے شامی نے کہا کہ ہم وعدے کے مطابق رقم لے کر حویلی میں موجود ہیں۔ سورج مل اندھیرا ہونے کے بعد آئے گا۔ اس کو ریسور کرنے کے لیے شامی بھی ہوگا لیکن اسے کسی وجہ سے دیر ہو جائے تو نواب صاحب اپنے مہمان کو روک لیں۔ وہ پہنچ جائے گا۔''

''میری بڑی خواہش تھی کہ ایئرپورٹ کا ڈراما دیکھوں۔ کیا سین ہوگا جب شامی بادشاہ جیسا نامی گرامی ڈاکو اور اس کے حواری ''بین الاقوامی آمد'' والے گیٹ کے سامنے انتظار کرنے والوں میں رانا رجب علی کے فرماں بردار ملازموں کا روپ دھارے اور ہاتھ میں گل رعنا کے نام کا پلے کارڈ اٹھائے کھڑے ہوں گے۔ اور گل رعنا مکمل اعتماد کے ساتھ خود کو ان کی تحویل میں دے کر پورے اعتماد کے ساتھ اپنے باپ کی مرسیڈیز میں بیٹھے گی۔''

راجا نے کہا ''ہم رک نہیں سکتے۔ ہمیں واپسی پر تین کروڑ کی رقم بھی اٹھانی ہے جو آج رات سورج مل کو او... جائے گی۔''

''اس رقم کو بحفاظت ست بدھائی پہنچانا خاصا رسک ہے۔'' میں نے کہا۔

''شیر کے منہ سے نوالہ چھیننا آسان تو نہیں۔ ڈاکو... کا مال کون لوٹنے کی ہمت کرے گا لیکن ابھی کسی کو کیا معلو... کہ مال کس کا ہے۔ یہ تو بعد میں پتا چلے گا جب اسے ہضم... مشکل ہوگا۔''

''پھر کیا ہے اس مسئلے کا حل۔''

''کل رات میری شامی سے بات ہو رہی تھی۔ ا... نے کہا کہ راجوں مہاراجوں نوابوں اور خاندانی رئیسوں... طرح ڈاکوؤں کا دور بھی ختم ہو چکا ہے۔ پہلے گنے چنے ... ہوتے تھے۔ ان کی بڑی دھاک تھی۔ بڑے بڑیان کے... سے تھر تھر کانپتے تھے لیکن ان کی شرافت اور وضعداری کے ... بھی مشہور تھے۔ وہ غریبوں کو نہیں امیروں کو لوٹتے تھے... غریبوں کے مددگار تھے۔ حالات نے چوروں کو بھی ... بنا دیا ہے۔ جس کے ہاتھ میں بندوق آ جائے وہ کچھ نہیں بن... ڈاکو بن جاتا ہے اور کہتا پھرتا ہے کہ معاشرے نے اسے ڈ... بنا دیا۔ ڈاکو شہروں میں اور گلی محلوں میں وارداتیں کرتے ... اور پولیس کو عوام ان کا ورکنگ پارٹنر کہتی ہے تو وڈیرو... سلیپنگ پارٹنر...... خیر آخر میں شامی بادشاہ نے ایک تجو... دی۔''

میں نے دلچسپی سے کہا۔ ''وہ کیا؟''

''اس نے کہا کہ ایسی خبریں آتی رہتی ہیں کہ بنک عملہ خود شہری ڈاکوؤں سے تعاون کرتا ہے۔ براہِ راس... نہیں۔ عموماً پولیس کے ذرائع سے معلومات آگے پہنچا... جاتی ہے کہ آج کون پارٹی بڑی رقم لائے گی، لے جائے... اور یہ شہری اٹھائی گیرے جو خود کو ڈاکو کہتے ہیں، رقم چھین... فرار ہو جاتے ہیں۔ ایسا ہمارے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ چنا... اس نے دلچسپ ترکیب بتائی۔ ہوگا یہ کہ بنک سے ا... سوزوکی میں دو تین باکس رکھے جائیں گے جیسے کہ کیش لا... لے جانے میں استعمال ہوتے ہیں۔ ہم اس کے پیچھے ... روانہ ہوں گے۔ ان بکسوں میں کچھ نہیں ہوگا۔ پتھر بھر... ہوں گے۔ دینہ کے موڑ تک ہم اس کے پیچھے رہیں گے پھ... سوزوکی سیدھی نکل جائے گی۔ ہم روہتاس والی سڑک پ... جائیں۔ ہماری بنک سے روانگی کے فوراً بعد دوسری سوزوکی میں دو بوریاں رکھی جائیں گی۔ ان میں نیچے اوپر آلو پیاز ہوں گے۔ درمیان میں نوٹ...... سوزوکی کوئی ڈرائیور کرے گا لیکن اپنا حلیہ بدل کے۔ اس کے ساتھ کوئی اور نہیں ہوگا۔ نہ سیکیورٹی گارڈ نہ کوئی مددگار۔ اگر مخبری کی وجہ سے کوئی تین کروڑ کے پیچھے گیا تو وہ پہلی سوزوکی کا تعاقب کرے گا۔ پہلی سوزوکی جب سیدھی لاہور کی جانب جائے گی تو پیچھا کرنے والوں کو پریشان ہوگی۔ وہ کچھ دور جانے کے بعد اسے روکیں گے۔ ایک امکان یہ ہے کہ وہ جلدی میں صندوق گاڑی میں ڈال کے فرار ہو جائیں لیکن اندیشہ یہ بھی ہے کہ انہیں اپنے بے وقوف بنائے جانے کا فوراً پتا چل جائے۔''

میں نے کہا ''وہ تو ناکامی کی جھنجلاہٹ میں ڈرائیور کو گولی مار دیں گے۔''

''ہاں یہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ڈرائیور جیسے ہی محسوس کرے گا کہ کوئی گاڑی اس کا تعاقب کر رہی ہے، وہ گاڑی کو ایک کنارے پر روک کے سرپٹ دوڑ لگا دے گا۔ سو گز کے فاصلے پر اسسٹنٹ کمشنر کی رہائش گاہ ہے۔ اس کے دروازے پر پولیس گارڈ ہوتی ہے۔ وہاں وہ محفوظ ہو جائے گا۔ ڈاکوؤں کو جب تک یہ اندازہ ہوگا کہ انہیں بے وقوف بنایا گیا ہے سادہ کپڑوں میں ایک پولیس پارٹی آ پہنچے گی۔ کچھ نہ ہوا تو سوزوکی پانچ کلومیٹر جا کے واپس آ جائے گی۔ اس وقت تک آلو پیاز والی سوزکی موڑ سے بہت آگے جا چکی ہوگی۔ روہتاس کی طرف مڑ کے ہم اپنی گاڑی میں سوزوکی کے پیچھے رہیں گے اور بیچ میں کوئی آیا تو اس کی خبر نہیں۔ ریوالور ہیں ہمارے پاس...... مجھے یہ اسکیم ٹھیک لگی۔''

''لگتی تو مجھے بھی فول پروف ہے لیکن راجا۔ یہ سب کیا فضول بات ہے کہ نقد رقم دی جائے۔ الیکٹرانک بنکنگ کا دور ہے۔ پلاسٹک منی چل رہی ہے۔ ڈاکو کسی بھی نام سے بنک اکاؤنٹ رکھ سکتے ہیں تاکہ بنک ڈرافٹ اور پے آرڈر لے سکیں۔''

راجا نے کہا ''بس ان کی مرضی ہے ورنہ ملک لوٹنے والے بڑے ڈاکوں تو باہر کے بنکوں میں خفیہ اکاؤنٹ رکھتے ہیں۔ سوئس بنکوں میں رقم ٹرانسفر کرا لیتے ہیں اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔''

ہماری واپسی کی خبر نے اماں ابا کے علاوہ لیلیٰ بھابی کو بھی بہت مایوس کیا۔ ان کی خواہش تھی کہ ہم کم سے کم ایک رات رک جائیں لیکن ایسا کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں تھا۔ راجا پریس کلب جا کے اپنے کچھ دوستوں سے ملنا چاہتا تھا۔ لاہور میں نہ رہنے کا نقصان یہ ہوا تھا کہ وہ فیلڈ سے آؤٹ ہو گیا تھا۔ اس نے کالم لکھنے شروع کر دیے تھے۔ یہ کالم عوام اور فورس میں یکساں دلچسپی سے پڑھے جاتے تھے۔ اس میں کچھ کمال موضوع کے انتخاب کا ہوتا تھا لیکن زیادہ شہرت راجا کے تند و تیز اور کاٹ دار اندازِ بیاں سے ہوئی۔ اس کے پرانے ساتھی بدستور اس کے ساتھ تھے لیکن ان کالموں کی وجہ سے راجا کا حلقۂ اثر حکمراں مقتدر طبقے تک پھیل گیا تھا۔

لیلیٰ بھابی نے اصرار کر کے ہمیں کھانے پر روک لیا تو راجا کا پروگرام ڈسٹرب ہو گیا۔ کھانے کی میز پر اماں ابا کو تو موقع مل گیا کہ وہ دل کی بھڑاس نکال سکیں لیکن بھابی کی اپنا دکھڑا رونے کی حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ ہم ان کے وکیل بن کے فاروقی سے فیصلہ کن بات کریں۔

چلتے وقت ایسا اتفاق ہوا کہ راجا کو واش روم جانے کی ضرورت پیش آ گئی۔ اس وقت لیلیٰ بھابی ہمیں سی آف کرنے کے لیے پورچ میں تھیں۔ انہیں تسلی دینے کے لیے میں نے کہا۔ ''بھابی سب ٹھیک ہو جائے گا۔ حوصلہ رکھیں۔''

''ایسے کچھ ٹھیک نہیں ہوگا۔ تم آج رات رک جاتے تو ان سے بات کرتے، ذرا سخت لہجے میں۔''

میں نے کہا ''کیا بات کر لوں۔''

''دیکھو رفیق، دنیا میں میرا کوئی نہیں۔ اگر کچھ کر سکتے ہو تم تو میرا گھر بچا لو جیسے بھی ہو۔'' ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

میں نے کہا ''بھابی...... خود تم میں کتنی ہمت ہے۔ فاروقی کے لیے تم کیا کر سکتی ہو۔''

''اس کے لیے میں سب کچھ کر سکتی ہوں۔'' بھابی نے بڑے عزم سے کہا۔

''فرض کرو...... صرف فرض کرو۔ تمہاری خاطر میں اپنے دوست کے سامنے کھڑا ہو جاؤں، بالکل فلمی انداز میں اور اپنے سینے پر ہاتھ مار کے کہوں کہ فاروقی...... تو اس گھر میں دوسری عورت کو میری لاش پر سے گزر کے ہی لا سکتا ہے۔ تمہاری خاطر میں اس کی مخالفت مول لے لوں۔ یہ دوستی بدل جائے دشمنی میں...... اور وہ تم سے کہے کہ فیصلہ کرو۔ تمہیں میری زندگی عزیز ہے یا رفیق کی......''

''یہ کیا فضول بات ہے۔''

''نہیں فرض کرو، وہ کہے کہ...... میرا ساتھ چاہیے تو میرے اس دشمن کو ٹھکانے لگانے میں میری مدد کرو۔''

وہ گھبرا گئی۔ ''پاگل ہوئے ہو جو ایسی بات سوچتے

ہو۔"

میں نے کہا" بھابی...... ڈیئر بھابی...... میں تو صرف فرض کرنے کو کہہ رہا ہوں۔ اگر وہ تمہارے ہاتھ میں ریوالور دے اور کہے ایک کو گولی مار دو...... مجھے یا میرے دشمن کو...... تو پھر کیا کرو گی۔"

"میں خود کو گولی مارلوں گی۔" یہ بھابی نے جھنجلا کے کہا۔

میں نے ہنس کے کہا" بس پتا چل گیا...... تمہاری محبت میں کتنا دم ہے۔ تمہاری جگہ میں ہوتا تو ایک سیکنڈ لگائے بغیر فیصلہ کرلیتا۔ شوہر کو حاصل کرنے کے لیے ایک کیا دس خون کردیتا...... اور ایک بات بتاؤں۔ وقت آیا تو تم بھی کرو گی...... فناک سے گولی ماردو گی مجھے۔"

"تم سیریس نہیں ہو۔" وہ مایوسی سے بولیں۔

واپسی میں سارے راستے میری راجا سے جھک جھک چلتی رہی۔ وہ کسی صورت یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ نور جہاں جو کچھ کررہی ہے میری محبت میں کررہی ہے۔

"آخر تو سمجھتا کیوں نہیں۔ اس جیسی عورت کیا جانے محبت کس چڑیا کا نام ہے۔"

میں نے کہا" بار بار اسے بدکردار، فاحشہ کہنے سے کیا فائدہ۔ کیا طوائف محبت نہیں کرتی۔ ثبوت کے لیے ملاحظہ ہو فلم امراؤ جان ادا، انڈین یا پاکستانی...... اور یہ جو فاروقی کررہا ہے......"

"کیا کررہا ہے فاروقی۔ دوسری شادی کررہا ہے نا...... مرد کرتے ہیں دوسری، تیسری یا چوتھی شادی اور فاروقی کی ضرورت ہے اولاد۔ مریم اس کی غلط چوائس نہیں ہے۔ یہ بالکل نیچرل ہے لیکن باقی سب بکواس ہے کہ فاروقی کے کہنے پر لیلیٰ بھابی تجھے زہر دے گی پھر وہ رابعہ پر ڈورے ڈالے گا اور اس سے شادی رچا کے ست بدھائی کا مالک بن جائے گا۔"

"اس کے گھر میں ہوئی تھیں یہ ساری باتیں...... نور جہاں نے خود سنی تھیں۔"

"جھوٹ بکتی ہے وہ...... اس نے ایک بے سروپا فلمی کہانی سنادی ہے تجھے۔"

میں نے کہا" مہاراجا دنیا میں سب کچھ ہوتا ہے۔"

"ہاں مگر یہ نہیں ہوسکتا جو اس نے تیری کھوپڑی میں ڈالا ہے۔ تیری مت ماردی ہے اس نے۔"

میں نے کہا" اور اگر آج اس کی صداقت کا ثبوت مل گیا پھر...... اگر سچ مچ رانا کی بیٹی ہمارے قبضے میں آگئی تو......"

راجا لاجواب ہوگیا۔" پھر تو اس سے کہنا کہ اکبر خان کو چھوڑ کر ہمارے پاس آجائے۔ ہم اس کی حفاظت کریں گے۔ وہ وہاں رہی تو ماری جائے گی۔"

"لیکن وہ ہمارے ساتھ بھی کیسے رہے گی۔"

"یہ تیرے سوچنے کی بات ہے۔ یہ بارود اور چنگاری کا کھیل ہے نیکے پتر۔ کبھی نہ کبھی دھماکا تو ہوگا۔ بات دل لگی کی حد تک رہتی تو ٹھیک تھا مگر یہ دل کی لگی بن گئی ہے۔"

"میرے لیے نہیں...... اس کے لیے۔"

"کسی کے لیے بھی ہو، ہمیں تو فکر ہے تیری۔" وہ چپ ہوگیا۔

سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ موسم بہت خوشگوار تھا اور بالکل نئی گاڑی چلانے میں مجھے بہت لطف آرہا تھا۔ یہ سولہ سوسی سی انجن کی طاقت والی کرولا تھی جو کسی اعلیٰ نسل کے گھوڑے کی طرح سوار کے اشاروں کو سمجھتی تھی۔ پونے دو گھنٹے میں ہم گجرات کے قریب تھے جب راجا نے کہیں چائے کے لیے رکنے کی خواہش ظاہر کی۔

جی ٹی روڈ پر سفر کرنے والوں کے لیے اچھے ریسٹورنٹ بہت کم تھے۔ زیادہ تر وہ ہوٹل تھے جو عرفِ عام میں چھپر ہوٹل کہلاتے ہیں اور جہاں زیادہ تر ٹرک رکتے ہیں یا عام بسوں کے مسافر۔ چوبیس گھنٹے کھلے رہنے والے ان ہوٹلوں کے باہر چار پائیوں پر اور پرانی میزوں پر لوگ ہر وقت بیٹھے نظر آتے ہیں۔ ان ہوٹلوں میں ایک جیسی چائے ملتی ہے۔ خوب ابال کے بنائی ہوئی دودھ اور چینی کے ساتھ۔ یہاں کھانے کا مینو ہی کم و بیش یکساں ہوتا ہے۔ کچھ بس سروس والوں نے اب اپنے مسافروں کے لیے معیاری ریسٹورنٹ بنائے ہیں جہاں صرف ان کی بسیں ٹھہرتی ہیں۔ یہ نسبتاً صاف ستھرے ہیں اور یہاں سروس کا معیار بھی بہتر نظر آتا ہے۔

اتفاق سے مجھے سڑک سے ذرا ہٹ کے ایک بس کمپنی کا ریسٹورنٹ نظر آگیا۔ وہاں چار بسوں کے علاوہ درجن بھر گاڑیاں بھی تھیں۔ گاڑی کو پارک کر کے ہم ہال میں گئے۔ راجا نے ایک خالی میز منتخب کی جو بڑے شیشوں والی کھڑکی کے ساتھ تھی، جہاں سے باہر کا پورا منظر دکھائی دیتا تھا۔

ہال ایئر کنڈیشنڈ تھا اور کرسیاں بھی بہت آرام دہ تھیں۔ میں نے راجا سے کہا کہ وہ چائے اور مل جائے تو کافی منگوالے، میں واش روم ہو کے آتا ہوں۔

میں پانچ منٹ بعد آیا تو راجا نے آگے جھک کر سرگوشی کے انداز میں کہا" نیکے پتر...... وہ بھی آگئے۔"

میں نے کہا" کون......" اور اپنی گردن گھمائی۔

راجا نے کہا" غنیمت ہے کہ ہم اس آخری میز پر ہیں۔ درمیان میں بیٹھے ہوتے تو آمنا سامنا ہوجاتا۔"

میں نے کہا" کس کی بات کررہا ہے تو۔"

"یار اس حرام الدہر خبیث الزماں رانا کی، اس کی گاڑی کو بالکل ہماری گاڑی کے ساتھ جگہ ملی، پرانی گاڑی ہوتی تو پہچانی جاتی۔"

میں نے کہا" وہ یہاں کیا کررہا ہے۔"

"ہم یہاں کیا کررہے ہیں...... اس کے ساتھ دو گن مین ہیں، ڈرائیور دہیں گاڑی میں بیٹھا ہے۔"

میں نے شیشے میں سے رانا کی گاڑی کو دیکھ لیا۔ گاڑی کا ڈرائیور سفر میں بیٹھ جانے والی گرد صاف کرنے میں مصروف تھا۔

میں نے کہا" یہ ہمارے تعاقب میں آئے ہیں......"

راجا نے سر ہلایا۔" نہیں، یہ لاہور جارہے ہیں اور میرا خیال ہے کہ رانا نے اپنی بیٹی کو خود ریسور کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔"

"یہ تو بڑی گڑبڑ ہوجائے گی۔"

"گڑبڑ کیا۔ سارا پروگرام چوپٹ...... باپ خود موجود ہوگا تو کسی ملازم کو پلے کارڈ کے ساتھ کھڑا رہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ شامی بادشاہ اور ہمنوا مشکل میں نہ پڑ جائیں۔"

میں نے کہا" اگر ان کی نظر نے رانا کو پہلے دیکھ لیا پھر تو وہ چپکے سے کھسک لیں گے لیکن رانا خاموشی سے جا کے انتظار کرنے والوں کے ہجوم میں شامل ہوگیا تو وہ مارے جائیں گے۔ زیادہ امکان یہی ہے۔ مسافروں کو ریسور کرنے والے دو چار افراد ہی پلے کارڈ کے ساتھ ہوتے ہیں۔ وہ خود نظر آئیں نہ آئیں...... رانا کی نظر پلے کارڈ پر بیٹی کا نام ضرور دیکھ لے گی اور جب وہ دیکھے گا کہ جن کے ہاتھ میں پلے کارڈ ہیں، وہ اس کے ملازم نہیں بلکہ اجنبی ہیں تو......"

"اجنبی کیا...... وہ فوراً پہچان جائے گا شامی بادشاہ کو۔"

راجا نے کہا" پھر اب کیا کریں۔ تیرے پاس موبائل فون نمبر ہے شامی کا۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔" نہ اس نے کبھی دیا نہ میں نے مانگا۔"

"اسے خبردار کرنا ضروری ہے۔ میں کچھ کرتا ہوں۔ جب تک رانا نہ نکلے ہم بھی باہر نہیں جاسکتے...... وہ دیکھ لے گا۔"

راجا نے فریال سے اور پھر غنی سے موبائل فون پر بات کی مگر وہ کیا بتاتے...... پھر راجا نے اپنے موبائل کی میموری سے کوئی نمبر ڈھونڈ کے نکالا۔ جواب دینے والے سے کسی کے بارے میں پوچھا پھر اس کا نمبر لکھا اور اس سے کسی شخص کے بارے میں معلوم کیا جس کی ڈیوٹی ایئرپورٹ پر بین الاقوامی آمد والے گیٹ پر ہو...... وہ شخص مل گیا تو راجا کے چہرے پر اطمینان آگیا۔ اس نے کسی حوالے سے اپنا تعارف کرانے کے بعد کہا۔" ایک کام کرنا ہے آپ کو...... انتہائی ارجنٹ...... جو لوگ لندن سے آنے والی پرواز کے ٹائم پر موجود ہوں گے۔ ان میں ایک شخص ہاتھ میں پلے کارڈ لیے کھڑا ہوگا۔ اس پر لکھا ہوگا گل رعنا...... رعنائی سے رعنا، ہاں جی...... آپ ان کو ایک پیغام دے سکتے ہیں...... پلیز...... تکلیف کے لیے معذرت۔ پیغام یہ ہے کہ رانا...... نہیں یہ دوسرا رانا ہے۔ رانا رجب علی خود ایئرپورٹ پہنچ رہے ہیں۔ اپنی بیٹی کو ریسیو کرنے کے لیے۔ جی بس یہی کہنا ہوگا۔ کہہ دیں گے آپ؟ پلیز بھولیے گا نہیں۔ جیسے بھی ہو...... اور پھر مجھے کنفرم کردیں۔ اسی نمبر پر بتادیں، تھینک یو۔"

میں نے کہا۔" کچھ بات بنی۔"

راجا کے اضطراب میں کمی نہیں آئی تھی۔" دیکھو کیا ہوتا ہے۔ وقت پر صحیح پیغام ملتا ہے یا نہیں۔"

"کون تھا یہ بندہ۔"

"میرے ایک دوست کا بہنوئی...... میں نے اسے کبھی دیکھا تک نہیں۔ پتا نہیں وہ کتنا ذمے دار ہے۔ کسی کام میں الجھ کے بھول گیا تو بیڑا غرق ہوجائے گا ہمارا...... شامی پکڑا جائے گا ایئرپورٹ پر...... اور یہ سب ہوگا تیری اس نور جہاں کی وجہ سے۔"

میں نے حیرانی سے کہا۔" راجا...... نور جہاں کا اس میں کیا قصور۔"

"اس نے یہ اطلاع دی تھی۔ یہ کہا تھا کہ رانا کی بیٹی کو ایئرپورٹ سے اغوا کرلو۔ ورنہ ہمارا پروگرام تو کچھ اور تھا۔ شامی نے کہا تھا کہ رات کو جائیں گے اور شہناز کو نکال لائیں گے۔ اب وہ بھی نہیں ہوسکتا۔"

میں نے کہا" ٹیک اٹ ایزی راجا۔"

"کیا ایزی لوں یار...... سارا دارومدار تھا شامی بادشاہ کی مدبر۔ اس پر عمل درآمد روک دیا کہ ہم رانا کی بیٹی کو اٹھا لائیں گے تو رانا خود آئے گا شہناز کو ہمارے حوالے کرنے، ہاتھ جوڑتا ہوا۔ اب کچھ نہیں ہوگا۔ راجا اپنی بیٹی کو لے جائے

گا لیکن اسے معلوم ہو جائے گا کہ شامی ایرپورٹ پر اس کی بیٹی کے نام کا پلے کارڈ لے کر کیوں کھڑا تھا۔ اس کی بیٹی تو بچ گئی مگر اب شہناز نہیں ملے گی ہمیں۔ رانا کو پہلے ہی شک تھا کہ شامی بادشاہ ہمارا حمایتی ہے۔ آج اس کی تصدیق ہو جائے گی۔'' راجا نروس لہجے میں بول رہا۔

میں نے کہا اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ ''اتنا مایوس نہ ہو راجا ہو سکتا ہے پیغام بر وقت مل جائے۔''

لیکن راجا مطمئن نہیں ہوا۔ اس نے پھر کوئی نمبر ملایا۔ وہ ایک کے بعد دوسرا نمبر ملاتا رہا پھر اسے ایرپورٹ پر کوئی اور مل گیا۔ اس نے مختلف حوالوں سے خود کو متعارف کرانے کے بعد پھر وہی پیغام دیا جو وہ پہلے دے چکا تھا۔

اس وقت میں نے رانا کو اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھتے دیکھا۔ اچانک میرے ذہن میں دوسرا خیال آیا۔ میں نے کہا ''راجا...... تو جا۔''

''کہاں جاؤں۔''

''ایرپورٹ۔ اگر رانا پہنچ سکتا ہے ایرپورٹ...... تو کیا تو نہیں پہنچ سکتا...... یہ بالکل نئی گاڑی ہے۔ تجھے رانا سے پہلے ہی پہنچا سکتی ہے۔''

راجا کا چہرہ امید سے روشن ہوا۔ ''اور تو۔''

''میری فکر مت کر۔ میں پکڑتا ہوں یہاں سے کوئی گاڑی۔ دینہ کا فاصلہ ہی کتنا رہ گیا ہے...... تو نکل جا۔'' میں نے گاڑی کی چابی اسے تھما دی۔ ''رانا کا باپ بھی تجھے دیکھ نہیں سکتا۔ یہ گاڑی نئی ہے۔ اس نے پہلے نہیں دیکھی اور اس کے شیشے بھی کالے ہیں۔''

راجا چابی اٹھا کے بھاگا۔ اس وقت تک رانا کی گاڑی نکل چکی تھی۔ میں نے راجا کو شیشے کی دیوار کے اُدھر گاڑی تیزی سے ریورس کرتے اور پھر گولی کی رفتار سے اسی راستے پر دوڑاتے دیکھا جس پر چل کے ہم دس منٹ پہلے یہاں پہنچے تھے۔ راجا اپنی چائے بھی چھوڑ گیا تھا۔ میرے لبوں پر خود بخود مسکراہٹ آ گئی۔ جہاں چاہ ہے وہاں راہ...... اس بات کی صداقت سامنے آ رہی تھی۔ اسباب خود بخود پیدا ہو رہے تھے۔ صبح میرے پاس ایک پرانی گاڑی تھی اور راجا کو اتنے کم وقت میں لاہور نہیں پہنچا سکتی تھی لیکن دستِ غیب سے کچھ ایسا بندوبست ہوا کہ مجھے نئی زیادہ طاقتور گاڑی مل گئی۔ اب مجھے یقین آنے لگا تھا کہ جو ہو رہا ہے اچھا ہو رہا ہے۔ اب راجا نسبتاً رانا سے پہلے ہی ایرپورٹ پہنچے گا۔ کار کے انجن کی طاقت سے زیادہ قوت اس جذبے کی تھی جو راجا کے دل میں جاگزین تھا۔

میں باہر نکلا اور سڑک پر آ گیا۔ ایک بس میرے سامنے روانہ ہوئی۔ اس میں جگہ نہیں تھی۔ جگہ ہوتی تب بھی یہ غیر یقینی تھا کہ وہ مجھے وقت پر دینہ پہنچا سکے۔ دو کاریں ریسٹورنٹ کے پارکنگ ایریا سے نکلیں۔ میں نے لفٹ مانگنے کا سوچا لیکن ان میں فیملی سفر کر رہی تھیں۔ پھر لاہور کی طرف سے ایک سرخ رنگ کی اسپورٹ کار دھواں اڑاتی نمودار ہوئی۔ میں نے لفٹ کے لیے انگوٹھے سے اشارہ کیا۔ مجھے بہت کم امید تھی کہ اس میں سوار لاابالی قسم کے نوجوان کسی کی مدد کے لیے گاڑی روکنے کی زحمت کریں گے۔ گاڑی راکٹ کی طرح میرے سامنے سے گزری تو میں نے ایک برگر کلاس کی لڑکی کو پچھلی سیٹ پر دیکھا۔ وہ سر گھما کے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

غالباً اس لڑکی نے مجھ پر ترس کھایا یا اسے میں پسند آ گیا کہ اس نے آگے والوں سے کچھ کہا۔ اسپورٹس کار زبردست بریک لگا کے رکی۔ اس کے ٹائروں کے سڑک پر رگڑ کھانے سے دھواں سا اٹھا جس میں گرد زیادہ تھی پھر گاڑی غرا کے پیچھے لپکی اور دو سو گز کا فاصلہ چند سیکنڈ میں طے کر کے میرے سامنے آ رکی۔

لڑکی نے ہاتھ ہلا کے کہا۔ ''جمپ ان۔''

میں بغیر چھت والی گاڑی میں لڑکی کے ساتھ بیٹھ گیا۔ میرے بیٹھنے سے پہلے ہی گاڑی ایک جست لگا کے پھر آگے بڑھی۔ سرخ ٹی شرٹ اور جینز میں ملبوس لڑکی کے دونوں ساتھی بھی ایسے ہی اوٹ پٹانگ لباس میں تھے۔ ایک کی بلیک ٹی شرٹ کے سامنے والے حصے پر عورت ننگی ناچ رہی تھی اور نیچے تحریر تھا ''ویمن فریڈم موومنٹ'' یعنی تحریک آزادیٔ نسواں۔ دوسرے کی ٹی شرٹ پر ابراہم لنکن کی تصویر تھی جس نے امریکن جھنڈے کی واسکٹ اور پتلون پہن رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں گٹار تھی اور پیچھے لکھا ہوا تھا۔ ''میں اسامہ بن لادن ہوں۔''

لڑکی نے چیونگم چباتے چباتے مجھے کہنی ماری۔ ''کدھر جاؤ گے۔''

میں نے کہا ''دینہ۔''

لڑکی نے آگے والے کے کان میں چلا کے پوچھا۔ ''یہ ڈینا کہاں ہے۔''

''جہنم کے آخری اسٹاپ پر۔'' اس نے چرس والی سگریٹ کا دم لگاتے ہوئے جواب دیا۔ ''کس کو جانا ہے۔''

''دِس فیلو۔''

دوسرے نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ ''یہ ہمارے راستے

میں نہیں پڑتا۔''

میں نے مسکرا کے کہا۔ ''پڑتا ہے...... یہاں سے کوئی ساٹھ ستر کلومیٹر...... اسی سڑک پر...... میں بتا دوں گا۔''

لڑکی نے میرے کندھے پر سر رکھ دیا۔ ''تم ہمارے ساتھ کیوں نہیں چلتے، ہماری شادی میں شریک ہونے۔''

''ہم بھاگ کے شادی کر رہے ہیں۔'' چرس کا سگریٹ پینے والے نے مجھے مطلع کیا۔

ڈرائیور نے اس سے سگریٹ لے لیا۔ ''اور میں ان کی مدد کر رہا ہوں ہے نا نیکی کا کام؟''

''اگر تم ایسا سمجھتے ہو تو ٹھیک ہے، لیکن افسوس کے میں اس بارات میں شامل نہیں ہو سکتا۔''

لڑکی نے قہقہہ مارا۔ ''کیوں کیا آج ہی تمہیں بھی کسی کے ساتھ بھاگ کر شادی کرنی ہے۔''

''میں ہر روز کسی نہ کسی کے ساتھ بھاگ کے شادی کرتا ہوں۔ جولیا رابرٹ...... ایشوریا رائے...... ریما...... جو بھی خواب میں آ جائے۔'' میں نے کہا۔

وہ ہنس ہنس کے دُہرے ہو گئے۔ گاڑی کی رفتار اتنی زیادہ تھی کہ مجھے ڈر تھا کبھی بھی وہ سڑک سے اتر کے کسی کھڈ میں جا گرے گی یا سامنے سے آنے والی گاڑی میں گھس جائے گی۔ ایک بار میں نے دیکھا تو گاڑی کے اسپیڈ میٹر کی سوئی ایک سو پچاس پر تھی۔ احتیاطاً میں نے کلمہ پڑھ لیا کہ ہو سکتا ہے بعد میں اس کی مہلت بھی نہ ملے۔

جو فاصلہ مجھے اپنی گاڑی میں طے کرنے میں چالیس منٹ لگتے، وہ بیس منٹ میں طے ہو گیا۔ جب دینہ موڑ قریب آیا تو میں نے ڈرائیور کے کان میں چیخ کے کہا ''ڈراپ می ہیر۔''

اس نے بھی چیخ کے جواب دیا۔ ''سوری بڈی۔ گاڑی کے بریک فیل ہو گئے ہیں...... تم چھلانگ لگا دو جہاں لینڈ کرنا ہو۔''

اس مذاق پر باقی دو یعنی ہونے والے دولہا دلہن بھی ہنسے پھر ایک دم بریک لگانے سے گاڑی کے ٹائر چرچرائے اور گاڑی رک گئی۔ ہمارے پیچھے آنے والے ایک ٹرک ڈرائیور نے بڑی کوشش سے ٹرک کو موڑا ورنہ وہ گاڑی میں گھس جاتا۔ پاس سے گزرتے ہوئے اس نے ہم سب کو مخاطب کر کے ایک زبردست گالی دی۔

میں چھلانگ مار کے اتر گیا۔ گاڑی غرا کے آگے بڑھ گئی۔ انہوں نے میرے تھینکس کا بھی انتظار نہیں کیا۔ کچھ آگے جا کے لڑکی نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور مجھے ایک ہوائی بوسہ ارسال کیا۔ میں نے اس کا جواب دیا جو دینہ میں نیویارک کے کلچر کا روڈ شو تھا۔ اپنے پاکستانی کلچر کے مظاہرے میں یہاں دیکھتا رہتا تھا۔ پکڑنے والا کوئی نہ ہو تو میرے ہم وطن کسی بھی اسپتال یا گرلز اسکول کی دیوار کی طرف منہ کیے چمن کی آبیاری کرتے دکھائی دیتے تھے۔ دنیا میں فاصلے بے معنی ہو گئے تھے۔

دینہ موڑ سے بنک کا فاصلہ چند منٹ کا تھا۔ بنک بند ہو چکا تھا۔ گرل والا گیٹ کھینچ کر مقفل کر دیا گیا تھا۔ گارڈ باہر بندوق تھامے اور سینے پر گولیوں کے میگزین کا ہار پہنے بہت مستعد کھڑا تھا۔ اس سے پہلے وہ ہمیشہ مجھے کرسی پر بیٹھا نظر آتا تھا اور بندوق اسی کرسی کے سہارے کھڑی رہتی تھی۔ غالباً اندر تین کروڑ کی رقم کی موجودگی کے باعث ایسا تھا۔

منیجر سخت نروس حالت میں میرے انتظار میں تھا۔ ''بڑی دیر کی مہربان آتے آتے...... میں آپ ہی کے لیے چشم براہ تھا۔''

میں نے کہا ''میں معذرت چاہتا ہوں...... ایک ضروری کام میں الجھ گیا تھا، اس لیے دیر ہو گئی۔''

''چلیے اب میری فکر دور ہو گئی۔'' اس نے اپنے موبائل فون پر کوئی نمبر ملا کے کہا۔ ''اپنے نواب صاحب آ گئے ہیں۔'' اور فون بند کر دیا۔

ان کی تیاری مکمل تھی۔ اسکرپٹ کے مطابق سارے ایکٹر اپنا اپنا رول ادا کرنے کے لیے تیار تھے۔ اندر والے کمرے سے دو افراد نمودار ہوئے جو چپراسی کی وردی میں تھے۔ انہوں نے ٹین کا مقفل سیاہ صندوق آگے پیچھے کے کنڈوں سے اٹھا رکھا تھا۔ اسے وہ بنک کے دروازے سے باہر لے گئے۔ کچھ دیر بعد وہ اندر آئے تو ویسا ہی دوسرا بکس اٹھا کے باہر چلے گئے۔

منیجر کی گھبراہٹ نے مجھے بھی تھوڑا سا اپ سیٹ کر دیا تھا۔ بنک کا دروازہ بند ہو گیا۔ چند منٹ بعد گارڈ نے اندر سر ڈال کے کہا۔ ''سر، وہ گاڑی گئی...... دوسری آ گئی ہے۔''

منیجر نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے...... جلدی کرو۔''

آلو پیاز کی بوری بھی اندر سے لائی گئی۔ اسے اٹھانے والوں کو زیادہ محنت کرنی پڑ رہی تھی۔ وہ اسے گیٹ تک گھسیٹ کر لے گئے۔ گیٹ سے چوکیدار نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ اس وقت تک میں بھی باہر آ گیا تھا۔ بوری اب سبزی لے جانے والی سوزکی میں رکھ دی گئی تھی۔ اس کے ڈرائیور نے مجھ دیکھ کے سر ہلایا تو میں نے غور سے دیکھنے پر ایک اجنبی چہرے میں غنی کی شباہت تلاش کر لی۔ وہ غنی ہی تھا لیکن اس

نے بڑے ڈرامائی انداز میں چہرہ بدلا تھا۔ اس نے کہیں سے داڑھی مونچھیں حاصل کر لی تھیں۔ بالوں کا رنگ سفید ہونے کے باعث وہ خاصا عمر رسیدہ لگتا تھا۔ اس نے سر پر میلی پگڑی لپیٹ رکھی تھی اور گول شیشیوں والی عینک لگالی تھی۔

جب دوسری بوری بھی رکھ دی گئی تو میں غنی کے ساتھ جا بیٹھا "چلو بابا جی ...... فٹافٹ ......؟" میں نے کہا۔

وہ مسکرایا۔ "جناب عالی ...... آپ کی گاڑی ......"

میں نے کہا "جس میں ہم تشریف فرما ہیں، وہی ہے ہماری گاڑی ...... یہ بتاؤ ریوالور ہے نا تمہارے پاس۔"

"ایک نہیں دو دو ...... کوئی قریب آ گے دیکھے۔" اس نے گاڑی کو گیئر میں ڈال کے ایک دم دوڑایا۔

میں نے کہا۔ "آہستہ غنی۔ سبزی لے جانے والی گاڑیاں ایسے نہیں جاتیں۔ اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہوگا۔ ...... آرام سے چلو۔"

"راجا صاحب آپ کے ساتھ نہیں آئے۔"

میں نے کہا۔ "انہیں کام تھا لاہور میں۔"

جب راجا نے مجھے یہ پلان بتایا تھا جس سے ڈاکوؤں کو بے وقوف بنا کے ڈاج دیا جا سکتا تھا تو میں نے اسے کوئی خاص اہمیت نہیں دی تھی بلکہ کسی حد تک غیر ضروری اور مضحکہ خیز سمجھا تھا لیکن بعض اوقات معمولی سی احتیاط اور پیش بندی انسان کو بہت بڑے حادثات سے بچا لیتی ہے۔ ہم ست بدھائی کے راستے میں ہی تھے جب غنی کے موبائل فون نے "دے سب توں سونیا" کی دھن بجانی شروع کی۔

اس نے ایک ہاتھ سے کال ریسو کی۔ اچانک اس کا چہرہ تاریک ہوگیا۔ "کیا ...... تین ...... اسی جگہ ...... اچھا پھر ...... ہاں ...... پکڑے گئے وہ کہ نہیں۔ اچھا۔ ہاں۔ ایک مارا گیا اور باقی ...... اور وہ تو نکل گیا تھا نا ...... مستانہ ماہی ...... کیا ...... او یار یہ تو بڑا برا ہوا۔ اچھا دیکھ میں آتا ہوں۔ ابھی آدھا گھنٹا تو لگے گا۔"

سمجھ تو میں گیا تھا کہ جس بات کی توقع نہیں تھی وہ ہوگئی ہے۔ لیکن میں نے گفتگو کے دوران مداخلت نہیں کی۔

غنی نے فون بند کیا تو میں نے پوچھا "غنی کیا ہوا۔"

اس کے چہرے پر دکھ کے گہرے سائے تھے۔ "جناب عالی ...... جس بات کا ڈر تھا ...... وہ ہوگئی۔ بنک سے بندے لگ گئے تھے پیچھے۔"

"پھر؟ پولیس نے پکڑا انہیں یا نہیں۔"

"پولیس آگئی تھی لیکن اس کو بھاگنے کا موقع نہیں ملا تھا، گاڑی کے ڈرائیور کو۔ انہوں نے آگے پیچھے سے راستہ روکا تھا پولیس مقابلہ ہوا اُدھر۔ چار بندے آئے تھے سوزدکی لوٹنے۔ ایک مارا گیا۔ تین زخمی ہوئے اور پکڑے گئے لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ جی اپنا یار بھی زخمی ہوگیا۔ مستانہ ماہی۔ اللہ اسے زندگی دے، بڑا چنگا بندہ ہے ...... یاروں کا یار ...... ہر وقت یاروں کے لیے جان دینے پر تیار۔"

میں نے کہا "کہاں لگی ہے اسے گولی؟"

"پیٹ میں جناب عالی ......"

"اسے اسپتال پہنچایا کسی نے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں جی ...... ادھر ہی دینہ کے کسی اسپتال میں لے گئے ہیں۔"

"دیکھو ...... فون کر کے کہو کہ وہ نواب صاب کا خاص بندہ ہے ...... اس کو پوری توجہ دی جائے ...... ضروری ہو تو اسے جہلم، پنڈی یا اسلام آباد شفٹ کریں ...... وہاں کے سب سے اچھے اسپتال میں، پیسے کی فکر نہ کریں اور تم بھی فوراً جاؤ۔"

"میں آپ کو پہنچا کے جاتا ہوں۔"

میں نے کہا "نہیں ...... یہ گاڑی میں لے جاؤں گا۔ تم اتر جاؤ یہاں۔ دیکھو سامنے سے گاڑی آرہی ہے، اسے روکو۔"

غنی نے سوزدکی سائیڈ میں کھڑی کی اور سامنے سے آنے والی گاڑی کو رکنے کا اشارہ کیا۔ وہ ٹیلہ جوگیاں کا وہ دکاندار تھا جس سے ہم نے موبائل فون خرید کے تقسیم کیے تھے۔ اس نے مجھے پہچان لیا اور کچھ حیران ہوا کہ میں ایک سبزی لے جانے والی گاڑی میں سفر کر رہا ہوں۔ اس سے زیادہ حیرت اسے تب ہوئی جب غنی نے اپنی داڑھی، مونچھیں عینک اور پگڑی اتار کے گاڑی میں ڈال دی۔

میں نے غنی کی جگہ سنبھالی اور سوزدکی کو آگے بڑھا دیا۔ مجھے یقین تھا کہ غنی نے اپنے بھیس بدل کر گاڑی چلانے کی کوئی معقول وجہ بتا دی ہوگی۔ اصل وجہ اس نے نہیں بتائی ہوگی۔

حویلی کے گیٹ پر سیکیورٹی گارڈ کو اس وقت زبردست شاک لگا جب اس نے گیٹ کھولنے سے پہلے ڈرائیور کو دیکھا۔ وہاں خود نواب صاحب کو موجود پا کے وہ بوکھلا گیا۔

"آپ سرکار ...... میں ...... ابھی گیٹ کھولتا ہوں۔" وہ بدحواسی میں گیٹ کی طرف دوڑا۔

میں نے سوزدکی اندر پارک کی اور سبزی کے ساتھ آلو پیاز کی بوریاں بھی وہیں چھوڑ دیں۔ تین کروڑ حویلی کے اندر پہنچ جانے کے بعد محفوظ تھے۔

رابعہ اور فریال بڑی اضطرابی کیفیت میں ہماری واپسی کا انتظار کر رہی تھیں۔ میرے ساتھ راجا کو نہ پا کے ان کی بے چینی میں اضافہ ہوا۔ جب میں گاڑی سے اترا تو وہ لان کے وسط میں فوارے کے گرد بنی ہوئی دیوار پر پانی میں پاؤں لٹکائے بیٹھی تھیں۔ فوارہ بند نہیں تھا چنانچہ وہ پانی کی پھوار سے ایسے شرابور تھیں جیسے بارش میں بھیگی ہوں۔

"اس شاندار گاڑی کو تم ڈرائیو کر کے لائے ہو کزن اور یہ سبزی پورے سال کے لیے خرید لائے۔ یہ ہم سب کھائیں گے۔"

میں نے کہا "یہ صرف تمہارے لیے ہے کیونکہ تم موٹی ہو رہی ہو۔ کل سے صرف سبزی کھاؤ گی۔"

فریال نے کہا "راجا کو کہاں چھوڑ آئے۔"

میں نے کہا "اسے کوئی کام تھا۔ آجائے گا تھوڑی دیر میں۔"

فریال نے ناگواری سے کہا۔ "یہ تم لوگوں نے کیا رازداری کا چکر چلا رکھا ہے۔ پتا نہیں کیا کرتے پھر رہے ہو اور ہم سے چھپاتے ہو۔"

میں نے کہا۔ "جب وقت آئے گا تمہیں بھی پتا چل جائے گا۔"

"یعنی وقت سے پہلے ہم پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔"

میں نے کہا "فریال ...... میں اتنا تھکا ہوا آیا ہوں۔ مجھے مہلت دو، یہ کیا جرح شروع کر دی میرے آتے ہی۔"

وہ پلٹ گئی۔ "نہیں بتانا چاہتے تو نہ بتاؤ ...... تم تھکے ہوئے ہو تو میں بھی پچھلے چوبیس گھنٹے سے تشویش میں مبتلا ہوں۔ رات بھر تم غائب تھے۔ مجھے کچھ نہیں معلوم کس کے ساتھ تھے ...... کہاں تھے ......"

میں نے بہتر سمجھا کہ آتے ہی فریال کی تلخ و ترش باتوں کا فی الحال نوٹس نہ لوں۔ میں سیدھا اندر چلا گیا۔ غسل لے بعد لباس بدل کے میں نے بہت بہتر محسوس کیا لیکن فریال کے ناروا لہجے کا اثر باقی تھا۔ اس کا رویہ مسلسل جارحانہ تھا۔ شک اور حسد کا اظہار اس کی ہر بات سے ہوتا تھا۔ وہ خوشگوار لہجے میں نرمی اور پیار سے بات کرنا بھی بھول گئی تھی، ہنسی مذاق تو دور کی بات ہے۔ اس کے اطوار میں بیزاری اور جھنجلاہٹ نظر آتی تھی اور اس کا مزاج ہر وقت برہم رہتا تھا۔

میں جانتا تھا کہ یہ سب بے سبب نہیں ہے۔ اس کا شک اب یقین کا درجہ رکھتا تھا کہ میں اس سے بے وفائی کا مرتکب ہو رہا ہوں اور نور جہاں کے چکر میں پڑ گیا ہوں۔ اگر میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتا کہ میں ایسا کیوں کر رہا ہوں تو میری بات کا اثر الٹا ہوتا۔ وہ میری ضرورت کے اصل جواز کو میرا بہانہ قرار دیتی اور صورتِ حال پہلے سے زیادہ خراب ہو جاتی۔ چنانچہ میں سب سن رہا تھا اور برداشت کر رہا تھا۔ اس امید میں کہ جب شہناز رہا ہو کے واپس آجائے گی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میری تائید کے لیے راجا ہوگا جو کہے گا کہ اس معاملے میں نور جہاں نے کس طرح ہماری مدد کی۔

تاہم یہ سوال اس کے بعد بھی اپنی جگہ موجود رہے گا کہ آخر نور جہاں نے ایسا کرم ہمارے حال پر کیوں کیا؟ اس نے جان کی بازی لگانے کا یہ رسک کس وجہ سے لیا؟ اگر میری ذات میں اس کی اپنی دلچسپی نہ ہوتی تو کیا یہی اطلاع وہ کسی اور کو نہیں دے سکتی تھی مثلاً رابعہ یا فریال کو ...... یا فون پر نہیں کہہ سکتی تھی اور گھوم پھر کے بات وہیں پہنچتی تھی کہ کیوں؟ اس کیوں کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔

مجھے راجا کے فون کا انتظار تھا۔ میں نے مسلسل کئی بار اس سے رابطے کی کوشش کی مگر رابطہ نہیں ہوا۔ شاید اس کی یہ وجہ تھی کہ وہ ایئر پورٹ ایریا میں تھا جہاں شور میں رنگ سنائی نہیں دیتی اور سگنل بھی ڈسٹرب ہو جاتے ہیں۔

اب ساڑھے چھ بج چکے تھے۔ باہر اندھیرا پھیل گیا تھا۔ رانا کی بیٹی کو لندن سے لانے والا جہاز اگر وقت پر پہنچا تو اب تک لینڈ کر چکا ہوگا۔ کیا راجا بروقت ایئر پورٹ پہنچ کے شامی بادشاہ کو خبردار کرنے میں کامیاب رہا کہ رانا خود بیٹی کو ریسو کرنے آیا ہے اور اگر وہ رانا سے پہلے پہنچ گیا تو اس نئی صورت حال میں شامی نے اپنی حکمتِ عملی کیسے بدلی؟

ظاہر ہے رانا کی موجودگی میں اس کی بیٹی کو دھوکے سے ساتھ لے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ شامی اب کیا کرے گا؟ وہ ناکام لوٹ آئے گا یا اس کے ساتھی رانا سے راستے میں اس کی بیٹی کو چھین لیں گے۔

ریشم کافی لے کر آئی تو ڈرتے ڈرتے بولی۔ "سر غنی ناٹ کم ...... ہی نو ریپلائی۔"

میں نے اسے تسلی دی۔ "وہ آجائے گا تھوڑی دیر میں، فکر مت کرو میں نے اسے بھیجا ہے کسی کام سے۔"

جب وہ مطمئن ہو کے چلی گئی تو میں نے غنی سے رابطہ کیا۔ اس نے پہلی گھنٹی پر ہی کہا۔ "لیس سر۔"

میں نے کہا "کیا خبر ہے غنی ...... تمہارا دوست کیسا ہے۔"

"وہ مر گیا سر ...... میں یہاں اسپتال میں ہوں۔"

مجھے شدید صدمہ ہوا۔ میں نے غنی سے کہا۔ "تم اس کی میت کے ساتھ گھر جاؤ گے نا۔ میری طرف سے تعزیت کرنا۔

میں آج تو نہیں ......کل ضرور آؤں گا، کون ہے اس کے گھر میں۔"

"ماں باپ ہیں جی ......بیوہ ہے اور دو بچے......کیا ہوگا ان کا۔"

میں نے کہا" وہ ہمارے ذمے داری ہیں غنی۔"

اس خبر نے مجھے بہت اداس کیا تھا۔ میں اس وقت پھنسا ہوا نہ ہوتا تو ضرور اسی وقت جا کے اس شخص کی آخری رسوم میں شریک ہوتا جس نے ایک دوست کے کہنے پر اپنی جان کو خطرے میں ڈالا۔ کسی صلے کی تمنا کے بغیر......وہ کسی نواب رفیق احمد شیرازی کو نہیں جانتا تھا جس کے وہ کام آیا۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ مرتے وقت آدمی کو پتا نہ ہوا کہ اس نے کس کے لیے جان دی اور کیوں۔ اس جان کی کیا قیمت ہوگی آخر؟ جو میں ایک بیوہ کو دے سکتا ہوں کہ تمہارے سہاگ کی قیمت ہے۔ اس کے بچوں کو دے سکتا ہوں کہ یہ تمہاری یتیمی کا معاوضہ ہے۔ اور اس کے ماں باپ کو دے سکتا ہوں کہ یہ تمہارے پیار کی اور اس خون کی قیمت ہے جو تم نے ایک بیٹے کو پیدا کر کے جوان کرنے کی محنت میں دن رات جلایا ہے۔

میرے خیالات کا سلسلہ ریشم کے اندر آنے سے ٹوٹ گیا۔ اس نے دروازے میں سے کہا" سر......شی کم......سے شی وانٹ سی یو......آئی ٹیل......"

میں نے برہمی سے کہا۔" انگریز کی بچی......اردو میں بتا۔"

ریشم کا رنگ فق ہوگیا۔" جناب وہ عورت......آپ سے ملنا چاہتی ہے۔ جو آپ کا......میرا مطلب ہے راجا صاحب کا خط لے کر گئی تھی......ڈاکٹر صاحبہ کے پاس......رانا کی حویلی میں۔"

میں نے گہری سانس لے کر کہا" اچھا......بھیجو اسے اندر۔"

وہ عورت اندر آ کے ہاتھ جوڑ کے کھڑی ہوگئی۔" ایک بات بتانے آئی تھی سرکار۔"

میں نے کہا" بولو......ڈاکٹر شہناز کی کوئی خبر لائی ہو۔"

"جی سرکار......وہ اب رانا صاحب کی حویلی میں نہیں ہیں۔"

میں نے چونک کے کہا۔" پھر کہاں ہیں۔"

"نہیں معلوم سرکار......رانا صاحب نے کل رات ان کو کہیں اور بھیج دیا ہے۔ صبح ہم نے باتوں باتوں میں چھوٹی بیگم صاحبہ سے پوچھا۔ انہوں نے کہا کہ وہ تو چلی گئیں۔ ہم نے کہا کیا اپنے گھر چلی گئیں۔ چھوٹی بیگم نے کہا کہ عجیب عجیب باتیں سنی ہیں ہم نے......کوئی کہتا ہے کہ رانا صاحب نے ان کو شہر میں رکھا ہے۔ وہ ایک شادی اور کر سکتے ہیں نا......شرع کے مطابق......لیکن ڈاکٹر صاحبہ کہتی تھیں کہ میں یہاں نہیں رہوں گی۔ رانا صاحب نے وعدہ کیا ہے کہ شہر میں ان کو اسپتال بنوا کے دیں گے۔"

میں نے بلاارادہ کہہ دیا۔" یہ کیسے ہوسکتا ہے۔"

"ہو تو سکتا ہے سرکار......چھوٹی بیگم بھی بہت اداس تھیں۔ ابھی ان سے شادی کو دن ہی کتنے ہوئے تھے۔ رانا صاحب کی نظر بدل گئی۔ اب وہ رہیں گی ساری عمر حویلی میں......جیسے پہلے والی رہتی ہیں۔ رانا صاحب آ گئے تو آ گئے ورنہ کچھ نہیں......روٹی کپڑا ملتا رہے گا۔"

میرے دل کو جیسے اندر سے کوئی ہاتھ نچوڑنے لگا۔" ڈاکٹر شہناز مر جائے گی مگر رانا سے شادی نہیں کرے گی۔"

"ہم نے کچھ اور بھی سنا ہے سرکار۔"

"وہ کیا......" میں نے کہا۔

وہ بولی" رانا صاحب کو خبر ملی ہے کہ شامی بادشاہ اس علاقے میں موجود ہے۔ اور......اسے آپ نے بلایا ہے۔"

"میں نے......" میرا اس سے کیا تعلق۔

"بس سرکار......رانا صاحب کو کسی نے بتا دیا کہ شامی بادشاہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ حویلی پر حملہ کرے گا اور ڈاکٹر صاحبہ کو چھڑا کر لے جائے گا، اسی لیے انہوں نے ڈاکٹر صاحبہ کو دوسری جگہ پہنچا دیا۔"

میں نے سکون کا سانس لیا۔" یہ ہوسکتا ہے۔"

"بس میں یہی بتانے آئی تھی سرکار۔" وہ کھڑی رہی۔

"تم نے بہت اچھا کیا، شکریہ۔"

وہ پھر بھی کھڑی رہی۔" بڑا جان جوکھوں کا کام ہے سرکار آپ کو خبر پہنچانا۔"

میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔ میں نے اسے پانچ سو روپے انعام میں دیے مگر اس لالچی عورت کی تسلی نہ ہوئی۔ میں نے پانچ سو مزید دیے تو خوش ہوئی۔ وہ میرے لیے کوئی خوش خبری نہیں لائی تھی لیکن ایک مخبر جو رانا کی حویلی کے اندر کی خبر لائے، وہ آئندہ بھی کارآمد تھا۔

اب میری بے چینی نے پریشانی کی صورت اختیار کر لی۔ اگر آج کا مشن فیل ہوگیا تو شہناز کی واپسی کے امکانات معدوم ہو جائیں گے۔ اب تو شامی بادشاہ کے

ساتھیوں کا کمانڈو ایکشن بھی لاحاصل رہے گا۔ شہناز حویلی میں ہے ہی نہیں۔ اس عورت کی پہلی بات محض قیاس آرائی ہو سکتی تھی۔ رانا کی تازہ ترین بیگم کے ذہنی خوف کی اختراع۔ ابھی وہ منظورِ نظر ہے......کسی چوتھی کی خالی جگہ اس کے لیے آسیب کی طرح ہے لیکن دوسری بات غلط نہیں تھی۔

سوال یہ تھا کہ شامی بادشاہ کا پلان لیک آؤٹ کیسے ہوا۔ اس کی مجھ سے دوستی کسی اوپن سیکرٹ کی طرح تھی۔ ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے۔ جو بات سب جانتے تھے میں نہیں جانتا تھا لیکن اس کے یہاں موجود ہونے کی خبر کیسے عام ہوئی۔ وہ تو اپنے ساتھیوں کے ساتھ کمرے سے ہی نہیں نکلا۔ اور یہ بات کہ وہ حملہ کر کے شہناز کو نکال لائے گا۔ یہ صرف ہم جانتے تھے۔ میں راجا......فریال اور رابعہ......کیا پتا ریشم نے بھی سنی ہو یا اس کی ماں نے۔ ہم ان کی موجودگی کا نوٹس نہیں لیتے اور ان سے کچھ چھپانا ضروری بھی نہیں سمجھتے۔

اب ساڑھے سات بج چکے تھے۔ ایک بار پھر میں نے راجا کے موبائل فون پر کال کی۔ اس بار کسی اجنبی آواز نے کہا۔" ہیلو۔"

میں نے کہا" راجا......تو کہاں ہے۔"

کسی نے بدتمیزی سے قہقہہ لگا کے کہا۔" اے ہم راجا نہیں مہاراجا ہیں اور اس وقت ہاتھی پر سوار ہیں۔"

میں نے لائن کاٹ کے نمبر پھر ملایا۔ مجھے یقین تھا کہ میں نے غلط نمبر ملا دیا ہے مگر دوسری بار بھی وہی شخص آواز بنا کے بولا۔" ہیلو راجا اسپیکنگ......کیا تم میری رانی کو میرے پاس لا سکتے ہو غلام؟" پھر اس نے قہقہہ لگا کے فون بند کر دیا۔

میری سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ راجا کا موبائل فون کسی اور کے پاس کیسے پہنچا۔ کیا فون کے ساتھ راجا بھی اب رانا کے قبضے میں ہے۔ اس کا پُرتمسخر انداز تو یہی کہتا ہے، یا میرے خدا......آخر میں کس سے معلوم کروں کہ ایئرپورٹ پر کیا ڈراما ہوا......کہاں جاؤں۔

اس وقت میں کہیں جا ہی نہیں سکتا تھا۔ باہر آلو پیاز کی دو بوریوں میں تین کروڑ روپے کاغذ کے ٹکڑوں کی طرح بھرے ہوئے تھے اور شامی بادشاہ سے جرمانہ وصول کرنے والے کسی وقت بھی آ سکتے تھے۔ شامی نے کہا تھا کہ انہیں روکے رکھنا۔ میں کچھ نہیں کر سکتا تھا سوائے انتظار کرنے کے مجھے کمرے میں گھٹن محسوس ہو رہی تھی، میں باہر آ گیا۔

اچانک مجھے ایک اور خیال آیا۔ گھنٹی کئی بار بجی۔ میں مایوس ہو کے لائن ڈس کنکٹ کرنے والا تھا کہ اس نے سرگوشی میں کہا۔" ہیلو۔"

میں نے کہا" نور جہاں......کیا بات ہے۔ کیا تمہارا شوہر آ گیا ہے؟"

اس نے آہستہ سے کہا۔" ہاں......وہ واش روم میں ہے۔ جلدی بولو کیوں فون کیا ہے۔"

میں نے کہا" کیا وہ بھی اس فلائٹ سے آیا ہے اکبر خان......"

"یس......میں اسے لینے گئی تھی۔ ہم ابھی واپس گھر آئے ہیں۔" نور جہاں نے سرگوشی میں بات جاری رکھی۔

" کچھ بتاؤ تو سہی، تم نے کچھ دیکھا۔"

نور جہاں کا لہجہ یکلخت بدل گیا۔ اس نے قہقہہ لگا کے کہا۔" ارے نہیں سویٹی۔ میرا دبئی کا کوئی پروگرام نہیں۔ تم جاؤ، میرا یہاں میاں آج آ رہا ہے' لندن سے۔ ہاں ابھی تھوڑی دیر پہلے تم اپنے میاں کو ساتھ لے جانا۔ اچھا وہ پہلے سے دبئی میں ہے۔ یار پھر کیا ہے، مجھے کیوں گھسیٹ رہی ہو اپنے ساتھ۔"

اس کے بعد نور جہاں نے...... اکبر خاں سے کہا۔ "سویٹی ہے۔"

اکبر خاں کی آواز پیچھے سے آئی۔" تمہاری یہ سہیلی ہر وقت پھرتی رہتی ہے۔" اس کے بعد فون بند ہوگیا۔

مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ نور جہاں یقیناً مجھے بتا سکتی تھی کہ ایئرپورٹ پر کیا ہوا۔ گل رعنا اپنے باپ کے ساتھ گئی یا ان کے ساتھ جو چلے کارڈ لیے کھڑے تھے۔ یہ ناممکن ہے کہ رانا ایئرپورٹ پہنچا ہو اور نور جہاں نے اسے نہ دیکھا ہو۔ اس کی ملاقات اکبر خان سے بھی ہوئی ہوگی۔

میں پلٹا تو مجھے فریال اپنے پیچھے نظر آئی۔ اس کی آنکھوں میں ایک سفاک چمک تھی۔ جیسی مجرم سے اعتراف کرانے والے تھانیدار کے لبوں پر نظر آتی ہے۔ اس کے لبوں پر ایک تلخ مسکراہٹ تھی۔ شک اور حسد کے زہر سے بھری ہوئی۔ ایک سوال تھا کہ بولو اب کیا ہے کہتے ہو......میں نے تمہیں رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہے۔

اس نے بڑے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔" تت تت تت......بات نہیں ہو سکی، شوہر آ گیا اس کا کم بخت۔"

میں نے دفاعی انداز میں کہا۔" فریال......تم غلط سمجھ رہی ہو۔"

"ہاں ہاں......تم صحیح کہہ رہے ہو۔ تم کسی نور جہاں سے بات نہیں کر رہے تھے۔ نور دین سے مخاطب تھے۔"

"دیکھو......اس لہجے میں بات مت کرو مجھ سے۔ میں بعد میں تمہیں سب سمجھا دوں گا۔" میں نے کہا۔

''بعد میں کب...... پانی سر سے گزر جانے کے بعد...... آخر کیا سمجھ رکھا ہے تم نے مجھے۔ دودھ پیتی بچی یا جاہل بے وقوف عورت......'' وہ چلّانے لگی۔ ''دن رات میری آنکھوں میں دھول جھونک رہے ہو تم۔''

میں نے دھاڑ کے کہا۔ ''بند کرو اپنی فضول بکواس...... ورنہ......''

وہ ایک قدم آگے بڑھی۔ ''ورنہ کیا۔ زبان کھینچ لو گے میری...... مار دو گے مجھے...... اس فاحشہ کے لیے...... جس کا دلال شوہر اسے ہر رات کسی نئے ہیرو کے پاس بھیج دیتا ہے۔ تم نے کیا دیا اسے...... اس جگہ کا حق ملکیت۔''

پیچھے سے رابعہ چلّائی۔ ''یہ کیا تماشا ہو رہا ہے سب کے سامنے۔''

لیکن اس سے پہلے میرا ہاتھ گھوم چکا تھا۔ میرا تھپڑ فریال کے چہرے پر ایسے پڑا کہ وہ لڑکھڑا گئی۔ بے اختیار اس کا ہاتھ اپنے گال پر گیا۔ اس نے ایک چیخ ماری۔ ''کمینے...... ذلیل انسان۔'' پھر وہ ایک دم پلٹی اور روتی ہوئی اندر بھاگی۔

رابعہ نے سخت غصے سے مجھے دیکھا ''آخر ہو نا تم بھی وہی روایتی مرد۔ عورت کو پاؤں کی جوتی سمجھنے والے۔'' پھر وہ فریال کے پیچھے اندر گئی۔ میں پشیمانی کی اذیت میں مبتلا اپنے ہونٹ کاٹتا رہ گیا۔ فوراً مجھے اپنے جرم کی سنگینی کا احساس ہو گیا تھا۔ یہ دوطرفہ ذہنی دباؤ تھا جس نے میرے اعصاب کو شکستہ کر دیا تھا۔

میں نے سوچا کہ ابھی اندر جا کے فریال سے ہاتھ جوڑ کے معافی مانگ لوں گا جیسے بھی ہو اسے منالوں لیکن اسی وقت گیٹ کھلا اور باہر والے گارڈ نے اندر والے گارڈ سے کچھ کہا۔

اندر والا گارڈ تیز تیز قدموں سے میری طرف آیا۔ ''سر...... آپ کے مہمان آئے ہیں۔ کہتے ہیں آپ نے انہیں بلایا تھا۔ چار آدمی ہیں۔ ایک نے اپنا نام سورج مل بتایا ہے۔''

میں نے گہری سانس لے کر اپنا غصہ ضبط کیا۔ ''انہیں اندر لے آؤ۔''

سورج مل اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ اندر آیا۔ ان سب نے روایتی انداز میں سندھی اجرک کندھوں پر ڈال رکھی تھی۔ یہ اندازہ کرنا مشکل نہ تھا کہ اس کے پیچھے انہوں نے اپنا اسلحہ چھپایا ہے۔ اندر آنے کے بعد انہوں نے چادر کے پیچھے سے کلاشنکوف برآمد کرنے میں دیر نہیں لگائی۔

میں نے آگے بڑھ کے ان کا استقبال کیا۔ ''سورج مل، خوش آمدید۔...... یہ نواب رفیق احمد خان شیرازی کی حویلی ہے۔ تم حویلی کے مہمان ہو۔''

اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ''وڈا سائیں، ناراض مت ہونا...... ہم اپنے گھر بھی خالی ہاتھ نہیں جاتے۔''

''یہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔''

''خطرے کا کسی کو پتا نہیں ہوتا پھر تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ خطرہ بھی نہیں......'' وہ میرے ساتھ چلنے لگا۔ ''تمہاری حویلی تو بہت شاندار ہے۔''

میں نے کہا ''ڈیڑھ سو سال پرانی حویلی ہے سائیں۔''

اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ''ڈیڑھ سو سال...... تم کیا جدی پشتی نواب ہو۔''

''یہی سمجھ لو۔'' میں نے کہا۔

ہم ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے۔ جب میں نے پہلی بار اس لق و دق کمرے کو دیکھا تھا تو یہ بوسیدہ قدیم فرنیچر، بدرنگ قالینوں اور پرانے پردوں سے بھرا ہوا کباڑ خانہ تھا۔ اس میں آرائش کے تمام اسباب پر نصف صدی کی دھول جمع تھی جس میں اس کا رنگ روپ غائب ہو چکا تھا پھر اس کو قابل استعمال بنانے میں دلچسپ مشورے اور شراکت تو سب کی تھی لیکن اس میں کسی کو کلام نہ تھا کہ اصل محنت فریال کی تھی۔ آج پرانا فرنیچر پالش ہو کے انٹیک ڈیزائن کا خوبصورت نمونہ بن گیا تھا۔ پالش نے آرائشی ظروف، دیواروں پر آویزاں روغنی تصاویر، شکار کیے جانے والے بارہ سنگھوں، شیروں اور چیتوں کے حنوط شدہ سر...... قدیم تلوار...... سب کا اصل حسن بحال کر دیا تھا۔ نایاب کاشانی اور اصفہانی قالین مکمل صفائی کے بعد پرانی آب و تاب حاصل کر چکے تھے۔ پردے البتہ ہٹانے پڑے تھے کیونکہ ان کا کپڑا بوسیدگی سے گل گیا تھا تاہم فریال نے یہ اہتمام پیش نظر رکھا تھا کہ نئے پردے دیکھنے میں پرانے جیسے ہی لگیں۔

ظاہر ہے سورج مل نے مغلیہ انداز کی یہ شان و شوکت سندھی وڈیروں کی اوطاق میں نہیں دیکھی تھی۔ وہ اور اس کے ساتھی اس سے بہت مرعوب نظر آتے تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ شامی بادشاہ کو میرے ایک کام سے جانا پڑا لیکن وہ کچھ دیر میں آ جائے گا۔

سورج مل نے خوش اخلاقی سے کہا ''کوئی بات نہیں سائیں۔''

میں نے کہا ''رقم تو آ گئی ہے...... اس بات کا بندوبست کر لیا تھا میں نے کہ آپ لوگوں کو خالی ہاتھ نہ لوٹنا پڑے اور یہ خیال نہ آئے کہ ہم نے وعدہ خلافی کی۔ آپ چاہو تو رقم آپ کے حوالے کی جا سکتی ہے۔''

وہ مسکرانے لگا۔ ''نہیں وڈا سائیں، ہمارا ایسا دستور نہیں ہے جرمانہ خود شامی ادا کرے گا، ساری کارروائی اس کی موجودگی میں ہو گی۔''

میں نے کہا ''یہ آپ کے ساتھی ہیں؟''

''یہ سب سردار ہیں۔ جرگے میں شامل ہیں۔ ابھی کچھ بندے آنے والے ہیں...... ان کو دیر ہو گئی، دور سے آنا تھا۔'' اس نے باری باری سب کا تعارف کرایا۔

میں نے کہا ''ابھی آپ نے دوستوں کی بات کی تو مجھے بہت عجیب لگا۔ پاکستان کے دستور کو بھی اتنی ہی اہمیت دی جاتی تو آج ملک کا یہ حال نہ ہوتا۔''

''ہم سیاسی لوگ نہیں ہیں بابا۔ مگر ایک بات جانتے ہیں۔ قاعدہ قانون کے بغیر آدمی اور جانور میں کیا فرق رہ جاتا ہے۔ گھر...... کلاس روم، دفتر، کارخانہ...... قاعدہ قانون کی پابندی کے بغیر چل سکتا ہے کیا؟''

میں نے کہا ''سات افراد کا یہ جرگہ بھی سپریم کورٹ کی بنچ جیسا ہے۔''

''ہاں سائیں، میں سینیارٹی پر اس کا چیف جسٹس ہوں لیکن فیصلہ ہم مل کر کرتے ہیں جو اکثریت کہے وہی ہوتا ہے۔''

ابھی ہم چائے پی ہی رہے تھے کہ جرگے کے مزید تین ارکان پہنچ گئے۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ اس وقت میرے سامنے جو سات افراد متانت اور شرافت کی تصویر بنے بیٹھے ہیں، وہ سب ڈاکوؤں کے گروہ کے سردار ہیں۔ جن کی زندگی لوٹ مار، قتل و غارت گری اور لاقانونیت میں گزری ہے۔ ہر ایک کی اپنی کہانی تھی کہ کون کس طرح عام زندگی کا راستہ چھوڑ کے اس راہ پُرخطر پر چل نکلا۔ یہ سب مجرم اور قانون کو مطلوب لوگ تھے۔ اگر قانون کے بازو مضبوط ہوتے تو انہیں اتنی مہلت ہی کہاں ملتی کہ یہ گروہ بنائیں یا جرگے ترتیب دیں۔ آج بھی قانون ان ڈاکوؤں سے درپردہ تعاون کرتا تھا۔ قانون بنانے والے انہیں تحفظ فراہم کرتے تھے اور ان کی طاقت کو اپنی طاقت بنا کے استعمال کرتے تھے۔

ایسا ہی میں بھی کر رہا تھا۔ مجھے یہ بہت عجیب لگا مگر میں یہ اعتراف کرنے پر بھی مجبور ہوا کہ میرے خیالات میں ایک تبدیلی رونما ہو گئی ہے۔ میں بہت نازاں تھا اور بہت غرور محسوس کر رہا تھا کہ طاقت اور دہشت سے اپنے علاقے کو مفتوح اور اطاعت گزار رکھنے والے سات لشکروں کے سپہ سالار اس وقت میری حویلی میں میرے سامنے باادب بیٹھے ہیں، ان کی طاقت کی تائید و حمایت حاصل ہے اور جو تحفظ مجھے میرے ملک کا قانون اور نظام انصاف فراہم نہیں کر سکتا وہ اِن لاقانونیت کے علمبرداروں سے مل سکتا ہے۔

میرے نظریات کا یہ انقلاب جتنا حیران کن تھا اس سے کہیں زیادہ افسوسناک تھا۔ میں یورپ امریکہ سے کیا پڑھ کے کیا سیکھ اور کیا دیکھ کے آیا تھا۔ عدل و انصاف...... انسانی حقوق، تہذیب امن اور مساوات کے سارے اصول اور پیمانے کیا ہوئے؟ لیکن اس میں قصور میرا نہیں تھا۔ فارسی مقولے کے مطابق...... ہر کہ در کانِ نمک رفت نمک شد...... انگریز کہتے ہیں کہ روم میں وہی کرو جو رومن کرتے ہیں۔ اگر حمام ہی سب ننگے ہیں تو تم بھی کپڑے اتار دو۔

میرے ملک میں جنگل کا قانون نافذ تھا۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس نصف صدی میں تباہ ہو جانے والے نظام کو ست بدھائی کی جاگیر کا مالک کیسے بدل سکتا تھا۔ مجبوراً میں نے خود کو اس نظام کا حصہ بنا لیا۔ میں ایسا نہ کرتا تو اس قبرستان کا حصہ بنتا جس میں تین قبروں کا اضافہ میرے سامنے ہوا تھا۔

میں نے اپنے لیے ڈاکوؤں کی رفاقت اور حمایت قبول کر لی تھی کیونکہ شرافت اور نجات کے لیبل لگا کر نامور ہونے والے بھی تو ڈاکو ہی تھے لیکن میں نے اپنا رول طے کر لیا تھا۔ اگر مجھے ڈاکوؤں کا ساتھی یا حامی سمجھا جاتا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ ڈاکوؤں کا سرغنہ کیا ڈاکو نہیں ہوتا؟ سید نام کے نواب بھی وہی ہیں۔ یورپ امریکہ کی تعلیم تو سندھ کے سارے وڈیروں نے حاصل کی مگر فرق کیا پڑا۔

فرق میرے مستقبل کے منصوبوں کا تھا۔ جو فیوڈل لارڈ اور وڈیرے تھے، وہ اپنی طاقت کو رعایا کے خلاف انہیں دبا کے رکھنے اور ان کے خون پسینے کی محنت کو اپنی دولت مندی بڑھانے میں استعمال کرتے تھے۔ میرا پروگرام اس کے برعکس تھا۔ میں اپنے آس پاس رہنے والوں کی فلاح، خوشحالی اور ترقی کے لیے کوشاں تھا مگر اس میں مجھے ہر طرف سے مخالفت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ صرف رجب علی رانا جیسے ہی نہیں یہ پورا سسٹم میرے ارادوں کی راہ میں حائل تھا۔ اس سسٹم سے لڑنے کے لیے مجھے طاقت کی ضرورت تھی جو قانون سے حاصل نہیں ہوتی تھی۔ یہ طاقت مجھے لاقانونیت سے مل رہی تھی تو یہ حصولِ مقصد کے لیے ایک طرح سے تائید غیبی تھی۔

اگر ڈاکو سے کسی کارِ خیر میں مدد لی جائے تو کیا حرج ہے...... اگر وہ بھی اپنے گناہ بخشوانے کے لیے اس میں حصہ لینا چاہتا ہے تو کیا اسے موقع نہیں دینا چاہیے؟ ایک راہزن بڈ

تھا۔ ایک سلطانہ ڈاکو تھے۔ وہ غریبوں کی مدد کرتے تھے۔ کیا انہیں زندگی کی کسی نیکی سے روکنا جائز ہوتا۔ اگر کسی طرح یہ ڈاکو صرف اتنا کرتے ہیں کہ میری راہ میں روڑے اٹکانے والوں کو روک دیتے ہیں۔ فلاح کا ایک منصوبہ ان کی حمایت سے تکمیل کے مراحل طے کرتا ہے تو وہ بھی خوش ہوتے کہ چلو زندگی میں کوئی نیکی تو کی اور میں بھی خوش کہ کوئی کام نہ آیا تو کیا چور نے میرا کام آسان کر دیا۔

میری یہ حکمتِ عملی غلط مگر پریکٹیکل تھی۔ کسی بھی کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے صرف عزم اور وسائل کافی نہیں ہوتے۔ اس کے لیے قوت بھی درکار ہوتی ہے۔ اگر میں ان ڈاکوؤں کے ساتھ ایک ورکنگ ریلیشن شپ بنا سکوں تو اس سے فائدہ مجھے ہی ہوگا اور یہ کام مشکل اس لیے نہیں تھا کہ ایسے لوگ جو معاشرے میں عزت سے نہ دیکھے جاتے ہوں عزت مانگتے ہیں۔ میں انہیں عزت دوں تو وہ میرے لیے جان دینے پر تیار ہوں گے۔

ساڑھے آٹھ بجے باہر کوئی گاڑی آ کے رکی۔ اس کا انجن ہلکے سے غرا کے خاموش ہوا پھر اس کا ایک دروازہ بند کرنے کی آواز آئی تو میں سمجھ گیا کہ یہ راجا ہوگا۔ میرا اندازہ باہر آنے پر درست ثابت ہوا۔

میں نے اسے برآمدے میں جالیا۔ ''یار کب سے کوشش کر رہا تھا میں۔ تیرا فون کہاں ہے بے۔''

وہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''وہ ایرپورٹ پر کہیں گر گیا یا کسی نے نکال لیا۔''

''اوہ...... میں تو پریشان ہو گیا تھا۔ جب کال ملتی تھی تو نہ جانے کون الو کا پٹھا الٹے سیدھے جواب دیتا تھا...... خیر۔''

راجا نے کہا ''میں تو ایرپورٹ پہنچ گیا وقت سے پہلے ہی۔ لیکن بعد میں کیا ہوا...... یہ مجھے نہیں معلوم۔''

''کیا مطلب۔''

''میں نے شامی کو بتا دیا تھا کہ رانا خود آ رہا ہے۔ بس اس کے بعد وہ غائب ہو گیا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ تم بھی نکل جاؤ۔ وہیں ملیں گے...... ست بدھائی میں۔''

''تو نے رانا کو دیکھا۔''

''ہاں...... پندرہ بیس منٹ بعد وہ پہنچا لیکن اس نے مجھے نہیں دیکھا۔ فلائٹ شیڈول کے مطابق آ رہی تھی۔ میں نے پسنجر لسٹ پہلے ہی چیک کر لی تھی۔ اس میں گل رعنا کا نام تھا۔ ایک نام اور بھی تھا۔''

''اکبر خان کا۔'' میں نے کہا۔

''تجھے کیسے پتا چلا۔''

میں نے کہا ''چھوڑ...... یہ بتا شامی کہاں گیا۔''

''مجھے نہیں معلوم یار...... میں نے پارکنگ ایریا میں جا کے دیکھا تو رانا کی بلیک مرسیڈیز بھی نہیں تھی۔''

میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ ''سارا پلان چوپٹ ہو گیا شامی بادشاہ کا۔''

راجا نے کہا ''وہ آئے گا تو پتا چلے گا، دیکھو کب آتا ہے۔''

وہ جیسے اسی انتظار میں تھا۔ گیٹ کھلا اور ڈاکٹر شہباز کی گاڑی اندر آ گئی۔ اس کے چاروں دروازے کھول کے شامی اور اس کے ساتھی باہر آئے۔ شامی مسکراتا ہوا آیا اور ہمارے پاس آ کے بیٹھ گیا۔

میں نے کہا ''شامی بادشاہ...... کیا ہوا؟''

''کیا ہوا؟...... ایسی رونی شکل بنا کے کیوں پوچھ رہے ہو دوست۔''

اس نے کہا۔ ''رانا کے آنے سے سارا کام خراب ہوا۔ بس تھوڑا سا پروگرام بدلنا پڑا۔ راجا نے بروقت خبردار نہ کیا ہوتا تو گڑبڑ ہو جاتی۔''

''کیا مطلب...... تم نے کر لیا اپنا کام۔''

وہ مسکرایا۔ ''ہاں نواب صاحب کام کیسے نہ ہوتا۔ بس ایرپورٹ سے ہمیں واپس جانا پڑا رانا کی کوٹھی پر۔ جتنی دیر میں وہ ایرپورٹ پہنچا ہوگا، ہم بھی کوٹھی پہنچ گئے۔ اس کے نمک خوار وہاں بندھے پڑے ہیں باتھ روم میں۔ ہمارے پہنچتے ہی رانا کا فون آ گیا۔ میں نے ریسور اٹھایا ہی تھا کہ وہ گالیاں دینے لگا۔ حرام خور' فلائٹ کا ٹائم ہو گیا۔ ابھی تک ایرپورٹ نہیں پہنچا کوئی...... میں نے کہا گاڑی تو جا چکی ہے بہت دیر پہلے۔ وہ غصے میں اتنا اپ سیٹ تھا کہ اس نے آواز کے فرق پر زیادہ غور نہیں کیا یا شاید اسے فرق نہیں لگا۔ اس نے کہا کہ آج خیر نہیں تم سب کی۔ غیر ذمے داری کی حد ہوتی ہے۔ میں نہ آتا تو کیا ہوتا۔ اسے تو لاہور کے راستوں کا پتا نہیں۔ گھر کیسے آتی وہ...... ٹیکسی میں۔ پھر اس نے فون بند کر دیا۔ میرا خیال ہے کہ فلائٹ آ گئی تھی۔ اس نے بیٹی کو ریسیو کیا اور ایک گھنٹے بعد پہنچا گھر تو اس کے استقبال کے لیے ہم موجود تھے۔ گاڑی اسے پورچ میں ہی نظر آ گئی ہوگی۔ اس نے سمجھا ہوگا کہ دیر سے پہنچنے والے جھک مار کے لوٹ آئے ہیں۔ بس یہ ہے ساری کہانی۔''

میں نے کہا ''وہ کہاں ہے اس وقت۔''

''کون رانا...... ہوش میں آنے کے بعد چیخ پکار مچا رہا ہوگا۔ بھاگا پھر رہا ہوگا تھانوں میں۔''

''اور اس کی بیٹی۔''

''اسے ہم نے پہنچا دیا محفوظ جگہ۔ وہ آرام سے ہے۔''

میں نے کہا۔ ''تم نے تو کمال کر دیا یار۔''

''یہ بتاؤ وہ لوگ آئے۔'' شامی نے بے نیازی سے پوچھا۔

''سب آئے بیٹھے ہیں ڈیڑھ گھنٹے سے۔ چائے پی رہے تھے۔ چلو پہلے تم ان سے مل لو۔ کھانے کے بعد کرنا باقی کارروائی۔'' میں نے کہا۔

راجا کے اور میرے ساتھ شامی ڈرائنگ روم میں پہنچا تو سب لوگوں نے کھڑے ہو کے یوں اس کا استقبال کیا جیسے وہ آج کی تقریب کا مہمان خصوصی ہے حالانکہ دیکھا جاتا تو اس کی حیثیت کورٹ میں پیش ہونے والے مفرور مجرم جیسی تھی۔ وہ سب بڑے تپاک سے آپس میں گلے ملے...... یوں جیسے کوئی بات ہی نہیں تھی۔ شامی اور سورج مل ساتھ ساتھ بیٹھے۔

سورج مل نے کہا۔ ''کیا خیال ہے کارروائی شروع کریں۔''

شامی نے سر ہلا دیا تھا لیکن میں نے کہا ''کھانا تیار ہے۔ پہلے کھانا کھا لیں۔''

ان سب کے لیے یہ ایک خوشگوار حیرت کی بات تھی۔ وہ ہرگز یہ امید نہیں رکھتے تھے کہ یہاں ان کے ساتھ معزز مہمانوں جیسا سلوک ہوگا۔ ایک خاندانی نواب انہیں اپنے ساتھ بیٹھا کے کھانا کھلائے گا۔ راجا نے جانے سے پہلے تفصیلی ہدایت دے دی تھیں۔ نگرانی کے لیے فریال کے ساتھ رابعہ موجود تھی اور کام کرنے والی ریشم تھی اور اس کی ماں...... ان کی مدد کے لیے سرونٹ کوارٹرز والے ہمیشہ موجود رہتے تھے۔

کھانا لگایا گیا۔ ریشم خود وہاں نہیں آئی، اس کے معاون تربیت یافتہ ویٹرز کی طرح کھانا چننے لگے۔ میں نے شامی کے چہرے پر بھی حیرانی دیکھی۔ وہ ایسی شاہانہ انداز کی دعوت کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ تاہم اس کا مجھے بہت فائدہ ہوا۔ اس عزت افزائی نے مجھے وہ حیثیت دے دی جو کسی شہنشاہ کو سات طاقتور راجاؤں کے حلیف بننے سے حاصل ہوتی تھی۔

انسان اور اقوام نے طاقت تین طرح سے حاصل کی۔ سب سے پہلے جسمانی طاقت تھی جس نے وقت کے ساتھ اسلحے کی طاقت اور ایٹمی طاقت کا انداز اختیار کیا۔ دوسری دولت کی طاقت جس کے بل پر سب کچھ حاصل کیا جا سکتا تھا۔ تیسری علم کی طاقت جس کے بل پر کبھی ایک تہذیب نے عروج حاصل کیا اور کبھی دوسری نے...... آج مغربی تہذیب کا بول بالا ہے اور مسلمانوں پر زوال آ گیا ہے۔

اہل علم یہاں اب بے توقیر ہو گئے تھے۔ جو طاقت دولت مند کو حاصل تھی، اسے سب سلام کرتے تھے۔ میرا علم میرے کام اس وقت آ سکتا تھا جب مجھے طاقت ملے اور صرف ہارورڈ کی ڈگری کی مدد سے میں دنیا تو کیا اپنے اردگرد کوئی تبدیلی نہیں لا سکتا تھا کیونکہ رانا جیسے جاہل اپنی طاقت سے میری راہ میں کوہ گراں بنے ہوئے تھے۔ دولت کی طاقت کے ساتھ اگر میں بدمعاشی کی طاقت سے اشتراک کر لیتا تو میرے سارے کام آسان ہو جاتے تھے۔ میں ڈاکوؤں کو عزت دیتا تو یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ مجھے ان کا تعاون حاصل نہ ہوتا۔ اچھے سلوک سے تو انسان شیر جیسے درندے کو رام کر لیتا ہے۔ یہ تو پھر بھی انسان تھے۔

جب کھانا ختم ہوا تو کارروائی ایک بار پھر شروع ہوئی۔ میں ایک غیر جانبدار مبصر کی حیثیت سے موجود رہا۔ ہر عدالت کا اپنا طریقۂ کار ہوتا ہے۔ سب سے پہلے سورج مل نے شامی بادشاہ کے خلاف الزامات یا فرد جرم پڑھ کے سنائی۔ اس نے لمبی بات نہیں کی۔ وہ گمبھیر لہجے میں سکون اور اعتماد سے بات کرتا رہا۔

پھر اس نے دوسرے لوگوں کے طرف دیکھا جو اس وقت ڈاکو نہیں بنچ کے معزز ارکان تھے۔ ''میں نے کوئی غلط بات کہی؟''

انہوں نے ایک ساتھ نفی میں سر ہلایا پھر سورج مل نے یہی سوال شامی بادشاہ سے کیا۔

اس نے کہا ''بے شک ایسا ہی ہوا تھا۔''

سورج مل نے کہا ''تو پھر میں تم پر تین کروڑ کا جرمانہ عائد کرتا ہوں۔ کیوں بھئی...... یہ ٹھیک ہے۔''

باقی کچھ افراد نے اتفاق رائے سے اس کی تائید کی۔

شامی نے کہا'' میں جرمانہ ادا کرنے کے لیے تیار ہوں۔''

اس کے بعد ایک عجیب رسم ادا کی گئی۔ سورج مل نے چمڑے کی جلد والا ایک رجسٹر کھولا جو اب تک اس کے سامنے رکھا ہوا تھا۔ اس کے ایک تہائی صفحات پلٹے اور شامی سے کہا۔

''اس پر ضمانت کر دو۔''

معلوم نہیں اس لال رجسٹر کی کیا روایتی اہمیت تھی اور اس کے ابتدائی صفحات میں کیا درج تھا۔ شامی نے سامنے کھلے ہوئے صفحے پر یوں ضمانت کی کہ سورج مل نے اسے ایک چھوٹا سا چمکیلا خنجر دیا۔ اس نے میرے سامنے بڑی صفائی

سے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے پر کٹ لگایا۔ اس سے خون کی پتلی سی دھار نکلی۔ اس خون کو شامی نے انگوٹھے پر یوں پھیلالیا جیسے سیاہی پھراس نے انگوٹھا اس کاغذ پر ثبت کردیا۔

چاقو اب پھر سورج مل کے ہاتھ میں آیا۔ اس نے بھی یہی عمل دہرایا۔ باری باری جرگے کے ساتوں افراد نے کارروائی پر مہرِ تصدیق ثبت کردی۔ اسے وہ ضمانت کرنا کہتے تھے۔ غالباً ضمانت اپنے خون سے کی جاتی تھی، وہ سب چاقو کو استعمال کرنا جانتے تھے۔ کسی کا انگوٹھا اتنا نہیں کٹا کہ اس سے خون کا دھارا نکلتا۔ اس پر ہلکی سی خراش آئی جو اتنی کم گہری تھی کہ بعد میں انہوں نے اسے دبا کے رکھا تو خون بہنا بند ہوگیا۔

اب شامی اٹھ کے باہر گیا اور جرمانے کی رقم میں سے کچھ رقم ایک سفید رومال میں لپیٹ کر یہ رومال سورج مل کے سامنے دونوں ہاتھوں پر رکھ کے پیش کیا۔ سورج مل نے اس پر اپنا ہاتھ رکھا۔ شامی نے دونوں ہاتھوں کو باری باری سب کے سامنے کیا اور انہوں نے رومال پر ہاتھ لگا کے گویا رقم کی وصولی کا علامتی اقرار کیا۔

شامی نے کہا ''باقی رقم باہر موجود ہے۔''

سورج ملنے سر ہلایا۔ ''اب بتادو کہ کیا ہوا تھا۔''

شامی نے کہا ''سب کا شک غلط نہیں تھا۔ بندہ میرے ہاتھوں مارا نہیں گیا تھا۔ میں نے اسے فرار کرادیا تھا۔''

پھر اس نے جرگے کے ارکان کو پوری کہانی سنادی جو وہ مجھے پہلے ہی بتا چکا تھا۔ میں نے محسوس کیا باقی ڈاکو بڑی دلچسپی سے سنتے رہے۔ ان کے چہروں پر ہمدردی کے جذبات تھے۔ جب شامی نے بتایا کہ لندن میں اس لڑکی کے بارے میں نواب صاحب نے کسی سے بات کی تھی اور امید ہے اب وہ بچ جائے گی تو بیک آواز ان سب نے کہا ''انشاء اللہ۔''

پھر سورج مل بولا ''شامی..... تو کم سے کم مجھے بتا دیتا تو مجھے اتنی پریشانی نہ اٹھانی پڑتی۔''

شامی نے کہا ''مجھے موقع نہیں ملا۔''

''چلو، بھگوان تمہاری اس نیکی کو قبول کرے۔'' سورج مل نے کہا ''ہم اب چلتے ہیں۔''

میں نے کہا ''اس وقت کچھ نہیں ہے ورنہ معاملات طے ہونے کی خوشی میں آپ سب کا منہ میٹھا کراتا لیکن ایک پیالی چائے پی جاسکتی ہے۔''

شامی نے کہا ''دوست..... تم نے پہلے ہی بہت کچھ کردیا ہے جو کسی اور سے امید نہیں کی جاسکتی تھی۔ تم دیکھنا ایک دن اس لڑکی کا باپ خود تم سے ملنے آئے گا۔ وہ تمہارے تین کروڑ واپس کرے گا۔''

''مجھے اس کی ضرورت نہیں۔''

''لیکن وہ دے گا اور میرے ساتھ تمہارا بھی شکریہ ادا کرے گا۔ اس کی بیٹی کی جان بچ گئی۔ وہ اسے بہت بڑا احسان سمجھتا ہے۔'' شامی نے کہا۔

چائے دس منٹ میں آگئی۔ ابھی اس کا پہلا گھونٹ ہی لیا گیا تھا کہ باہر سے پہلا فائر ہوا پھر ایک ساتھ ہر طرف سے فائرنگ کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ڈاکوؤں کے جرگے میں شامل سات ارکان اور شامی کے ساتھیوں کا ردِعمل بڑا شدید اور فوری تھا۔ وہ سب اچھل کے کھڑے ہوگئے۔ ان کا اسلحہ ایک دم ان کے ہاتھوں میں آگیا۔ اچانک میں نے گیارہ کلاشنکوف کی آتش فشاں نالوں کا رخ اپنی طرف دیکھا۔

میں نے کہا۔ ''یہ کیا ہے؟''

سورج مل نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو بتا..... دغا باز..... فریبی نواب.....''

میں اپنی جگہ منجمد ہوگیا۔ ''تم سمجھ رہے ہو۔ یہ میں نے دھوکا کیا ہے تمہارے ساتھ..... خدا کی قسم مجھے نہیں معلوم باہر کیا ہورہا ہے۔''

باہر فائرنگ جاری تھی۔ جواب میں حویلی کے سیکیورٹی گارڈ بھی فائرنگ کررہے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ باہر نکل کے صورتِ حال کا جائزہ لوں لیکن میں مجبور تھا۔

میں نے شامی کی طرف دیکھا۔ ''شامی..... تم تو میرے دوست ہو کیا تم بھی سمجھتے ہو میں نے دھوکا کیا۔''

شامی نے سپاٹ لہجے میں کہا ''تم نے نہیں کیا تو تمہارے کسی نمک حرام نے کیا۔ تمہارے اخبار والے دوست نے کیا۔''

سورج مل بولا۔ ''ہم ایسے ہی محصور نہیں ہوتے۔ ضرور کسی نے مخبری کی ہے لیکن نواب..... ہم ایسے جال میں پھنسنے والے شکار کی طرح کسی کے ہاتھ نہیں آئیں گے۔ کوئی ہمیں اناڑی سمجھتا ہے تو مارا جائے گا۔''

اس کے دوسرے ساتھی نے غرا کے کہا۔ ''ہم ایک ایک کو ماردیں گے۔ لاشیں بچھادیں گے تیری حویلی میں۔''

میں نے کہا ''خدا کے لیے مجھے موقع تو دو۔''

''یہ موقع دینے کی بے وقوفی کا نتیجہ ہے۔'' سورج مل کا تیسرا ساتھی بولا ''پھر بھروسے میں مارے گئے۔ اس اخبار والے نے حرامی پن کیا۔''

چوتھا بولا ''سورج مل کہتا تھا یہ خاندانی آدمی ہے۔''

سورج مل نے کہا ''بہت بڑی بھول ہوئی مجھ سے۔ مجھے سمجھنا چاہیے تھا کہ یہ چالاک عیار نوجوان ہے..... آج کل کے زمانے کا۔''

میں نے بے بسی سے شامی کی طرف دیکھا۔ ''شامی..... آخر تم لوگ سمجھتے کیوں نہیں۔''

سورج مل نے کہا۔ ''سب سمجھ میں آگیا ہے ہماری..... تین کروڑ کے جال میں پھنسایا تو نے ہمیں اور پولیس بلالی، خبر بھی بن گئی۔''

''یہ ناممکن ہے۔ پولیس میری مرضی کے بغیر حویلی کے اندر داخل نہیں ہوسکتی۔'' میں نے کہا ''راجا خبر بتانے کے لیے ایسا نہیں کرسکتا۔''

''تو نے ہمیں روکے رکھا، چائے پلانے کے بہانے نکلنے نہیں دیا۔'' سورج مل کے ایک ساتھی نے کہا۔

میں نے کہا ''اچھا تم مجھے باہر لے چلو۔ میں پوچھتا ہوں گارڈ سے کہ فائرنگ کون کررہا ہے۔''

شامی نے سورج مل کی طرف دیکھا۔ ''نواب رفیق سب کچھ کرسکتا ہے۔ دھوکا نہیں کرسکتا دوستوں کے ساتھ۔''

فائرنگ میں ایک مختصر وقفہ آیا۔ سورج مل کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر بولا ''اچھا..... چلو آگے..... لیکن خیال رکھنا کہ موت ایک قدم پیچھے ہے۔''

راجا کے ساتھ میں اس طرح باہر آیا کہ ایک کلاشنکوف کی نال ہماری پیٹھ سے لگی ہوئی تھی۔ حویلی کے اندر سخت افراتفری تھی۔ رابعہ اور فریال اپنے کمرے میں بند مجھے اور راجا کو آوازیں دے رہی تھیں۔ ریشم نہ جانے کہاں تھی۔ میں نے چیخ کر گیٹ پر موجود گارڈ سے پوچھا۔ یہ کیا ہورہا ہے۔ مجھے کوئی جواب نہیں ملا۔ اندر کی ساری لائٹس آف تھیں۔ چھت پر لگی ہوئی سرچ لائٹس کا رخ باہر کی طرف تھا۔ ان کی تھوڑی بہت روشنی منعکس ہوکے اندر آرہی تھی۔ غور سے دیکھنے پر مجھے گیٹ کے اندر کوئی گارڈ نظر نہ آیا۔

میں نے پھر چیخ کے کہا۔ ''گارڈ..... گارڈ.....کون فائرنگ کررہا ہے۔''

فائرنگ کے ایک مختصر وقفے میں اوپر سے ایک گارڈ نے چلا کے کہا۔ ''آپ اندر جائیں سر..... ہم کسی کو قریب نہیں آنے دیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''مگر یہ ہے کون۔''

میرے پیچھے سے سورج مل نے کہا ''پوچھو کیا یہ پولیس ہے۔'' تو میں نے چلا کے پوچھا۔ ''گارڈ..... کیا پولیس نے محاصرہ کیا ہے؟

گارڈ نے اوپر سے جواب دیا ''نہیں سر..... پولیس نہیں ہے..... رانا صاحب کے بندے ہیں۔''

میری جان میں جان آئی۔ میں نے پلٹ کے سورج مل کو دیکھا۔ ''اب یقین آیا تمہیں..... یہ تمہارے نہیں میرے دشمن ہیں۔''

راجا نے کہا ''نہ میں خبر بتانے کے لیے دوستوں کا خون بیچتا ہوں اور نہ اپنا ضمیر۔''

میں نے چیخ کے آواز دی۔ ''..... گارڈ..... جو قریب آئے اسے گولی ماردو..... وہ کوئی بھی ہو۔''

''آپ فکر نہ کریں سر.....'' گارڈ نے جواز دیا۔

فائرنگ جیسے شروع ہوئی تھی ایسے ہی اچانک ختم بھی ہوگئی۔ اس اعصاب شکن شور کے بعد خاموشی بھی کم ڈراؤنی نہیں تھی۔ ہم سب سانس روکے منجمد کھڑے رہے۔ اس انتظار میں کے فائرنگ پھر کب دوبارہ شروع ہوتی ہے لیکن آہستہ آہستہ وقت گزرتا گیا۔ بظاہر ایسا ہی محسوس ہوتا تھا کہ حملہ آور پسپا ہوگئے۔

میں نے کہا ''شامی..... تم مجھ سے بہتر جانتے ہو کہ رانا نے حویلی پر حملہ کیوں کیا۔ وہ تمہاری نہیں میری جان لینا چاہتا ہوگا۔''

شامی نے اپنی کلاشنکوف واپس کندھے پر لٹکالی۔ اس کے ساتھ ہی سورج مل نے اس کی تقلید کی۔ آہستہ آہستہ باقی ڈاکوؤں نے بھی اپنا اسلحہ شانوں پر ڈال لیا۔

میں نے کہا ''اگر وہ کامیاب ہوجاتے تو حویلی کے اندر آکے کیا لے جائے؟ ہماری جان لے کر انہیں کیا ملتا۔''

شامی نے کہا ''جس کی رانا کو تلاش ہے، وہ یہاں نہیں ہے۔''

''لیکن وہ شاید ایسا ہی سمجھتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''سورج مل..... کیا اب تمہارا شک دور ہوگیا۔ میرے مہمان بالکل محفوظ تھے۔''

سورج مل نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''ہمیں معاف کردینا نواب صاحب..... لیکن ہماری جگہ کوئی بھی ہوتا۔ غلط فہمی میں مبتلا ہوجاتا۔''

''مجھے بہت افسوس ہے کہ میں اپنا اعتبار نہیں قائم کرسکا۔ قصور تمہارا نہیں۔ اعتبار کا زمانہ جو نہیں۔'' میں نے کہا۔

راجا نے سر ہلایا ''اگر ہمارے حفاظتی انتظامات ایسے نہ ہوتے تو حملہ آور اندر آجاتے۔ وہ بڑی تیاری سے آئے تھے۔''

میں نے کہا ''اب تم بیٹھو۔ میں ذرا دیکھ آؤں کے کوئی نقصان تو نہیں ہوا۔''

شامی نے کہا ''ہم ایسے نامردوں کی طرح منہ چھپا کے بیٹھ جائیں؟''

سورج مل نے کہا ''گھر والوں کو خطرہ اور مہمان کچھ نہ کریں۔''

''نہیں ہوسکتا......ہم تمہارے ساتھ ہیں نواب صاحب۔'' دوسرے نے کہا۔

''تم ذرا یہ لائٹس آف کرادو۔ تھوڑی دیر کے لیے۔'' شامی نے کہا۔

میں نے کہا۔ ''ہوسکتا ہے ابھی وہ پیچھے ہٹ گئے ہوں۔ اندھیرا ہوگا تو وہ جنگل سے نکل کے پھر حملہ کریں گے۔''

''ہم بھی یہی چاہتے ہیں۔ صرف پانچ منٹ کے لیے اندھیرا کردو۔ وہ ذرا سامنے آئیں پھر ہم بتاتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''تم ...... تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔''

سورج مل نے کہا ''نہیں دوست......اب تم بیٹھو۔ تمہیں جو کرنا تھا تم کر چکے۔ اب دیکھو ہم کیا کرتے ہیں۔''

ان کے اصرار سے ہی مجبور ہوگیا۔ پہلے میں نے اندر جا کے رابعہ اور فریال کو تسلی دی کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ خطرہ ٹل گیا۔

''لیکن یہ تھے کون؟ کیا چاہتے تھے؟'' رابعہ نے خوف سے لرزتی آواز میں پوچھا۔

لرزہ فریال کے جسم پر بھی طاری تھی۔ ''کیا یہ ان ڈاکوؤں کے پیچھے آئے تھے۔ تمہارے ان دوستوں کی وجہ سے پھر عذاب میں پڑ گئے۔''

میں نے کہا ''فریال جو تم کہہ رہی ہو۔ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ یہ رانا کے کارندے تھے۔ بیٹی کے غائب ہوجانے سے اس کی آتشِ غضب بھڑک اٹھی ہے۔ اسے شک ہے کہ وہ ہماری تحویل میں ہے اور یہاں ہے۔''

''جو غلط ہے۔'' راجا نے کہا۔

میں نے کہا ''اینٹ کا جواب پتھر سے ملا ہے تو وہ بلبلا رہا ہے لیکن ابھی اندازہ نہیں کہ اب یہ حویلی نہیں۔ ایک قلع ہے۔ اس کے بدمعاشوں کی فوج قریب نہیں بھٹک سکتی۔ ہمارا دفاع بہت مضبوط ہے اور آج تو ہمارے دوست بھی ہیں۔''

''مجھے تو یقین نہیں آتا کہ یہاں میں اکیسویں صدی میں اور ایک ایسے شخص کے ساتھ ہوں جو یورپ امریکہ سے اعلیٰ تعلیم پا کے آیا ہے۔ یہاں تو قبائلی دور کی جنگ چل رہی ہے۔ عورتیں اغوا کی جارہی ہیں۔ خون ریزی ہورہی ہے۔ قانون ہے تو جنگل کا......'' فریال چلانے لگی۔ ''راجا مہاراجوں کی فوجیں لڑ رہی ہیں۔ توبہ توبہ۔ ایک نے غلام اور بدمعاش پال رکھے ہیں تو دوسرے نے ڈاکوؤں کو دوست بنا رکھا ہے۔ میں یہاں نہیں رہ سکتی۔''

میں نے بھنا کے کہا۔ ''کہاں جانا چاہتی ہو؟ جاؤ...... میں گارڈ سے کہہ دیتا ہوں گیٹ کھول دے تمہارے لیے جو گاڑی چاہو لے جاؤ۔''

رابعہ نے کہا ''یار تم جاؤ۔ فریال غصے میں ہے اور نروس ہے میں سمجھالوں گی۔''

راجا مجھے کھینچ کے لے گیا۔ ''ابھی وہ دہشت زدہ ہے فیکے پتر۔ خوف نے اس کا ذہن اور اعصاب مفلوج کردیے ہے۔''

میں نے کہا۔ ''آخر رابعہ بھی تو ہے۔''

باہر ابھی تک خاموشی تھی۔ میں نے راجا کے ساتھ حویلی کا چکر لگایا۔ شامی کے کہنے کے مطابق سرچ لائٹس بجھا دی گئی تھیں۔ اس کے اور سورج مل کے ساتھی حویلی کی چھت پر مورچے سنبھال رہے تھے۔ سارا خطرہ اس طرف سے تھا جدھر جنگل اور دریا تھا......وہ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر مورچہ بند ہوگئے تھے۔ گارڈ نے مجھے بتایا کہ انہوں نے پہلے سرچ لائٹس کو نشانہ بنایا تھا۔ اگر وہ کامیاب ہوجاتے تو اندھیرے کی اوٹ میں جنگل سے نکل آنے اور حویلی میں داخل ہونے کی کوشش کرتے لیکن جوابی فائرنگ نے انہیں پیچھے ہٹ کر جنگل میں پناہ لینے پر مجبور کردیا تھا۔

رانا زخم خوردہ سانپ کی طرف خطرناک ہورہا تھا۔ اس کے پاس ثبوت کوئی نہیں تھا لیکن وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کی لندن سے آنے والی بیٹی کو ایسی پلاننگ کے ساتھ اغوا کرنے والا میرے سوا اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ اسے یہ یقین بھی تھا کہ گل رعنا کو حویلی میں ہی رکھا گیا ہوگا۔ اس کا مقصد بھی بہت واضح تھا۔ یہ سب اس کے سر پُرغرور کو جھکانے کے لیے ہوا تھا۔ اب اسے شہناز کی واپسی کے لیے خود مجھ سے بات کرنی پڑے گی۔ وہ میری شرائط ماننے پر مجبور ہوگا کیونکہ معاملہ اس کی بیوی کا نہیں بلکہ بیٹی کا تھا۔

دوسرا حملہ آدھے گھنٹے بعد ہوا۔ شامی بادشاہ کے کہنے پر گیٹ کے سیکیورٹی گارڈ ہٹا لیے گئے تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ انہیں ڈھال بنا کے آگے رکھا گیا تو وہی سب سے پہلے مارے جائیں گے۔ حملہ آور فصیل نہیں توڑ سکتے تھے اور کمند لگا کے

اوپر چڑھنے میں بھی کامیاب نہیں ہوسکتے۔ وہ ہر صورت میں گیٹ سے اندر آنے کی کوشش کریں گے۔

شامی کا خیال درست تھا۔ دوسری طرف سے فائرنگ کا سارا زور گیٹ پر رہا۔ گیٹ بہت مضبوط تھا پھر بھی اس میں گولیوں نے سوراخ کردیے۔ اگر پرانے وقتوں کی منجنیق ہوتی تو وہ بڑے بڑے پتھر پھینک کے دیوار توڑ دیتے۔ اب کے زمانے کے حساب سے دروازے یا فصیل کو گرانے کے لیے توپ سے گولا باری کی جاتی تو کامیابی ہوتی مگر توپ وہ کہاں سے لاتے۔

جیسے ہی دوسرا حملہ ہوا شامی کی ہدایات کے مطابق سرچ لائٹس پھر روشن کردی گئیں اور اوپر متعین گارڈز نے ان کا رخ گیٹ کی طرف کردیا۔ سورج مل اور شامی کے ساتھیوں نے ایک ساتھ کلاشنکوف کا برسٹ مارا...... یہ حملہ آوروں کے لیے چند منٹ کا فیصلہ کن راؤنڈ ثابت ہوا، اوپر سے سرچ لائٹس انہیں اندھا کررہی تھیں۔ وہ نیچے سے اوپر فائرنگ کرکے نظر نہ آنے والے دشمن کو کیا نقصان پہنچا سکتے تھے......ہاں وہ خود پوری طرح اس کی زد میں تھے۔ روشنی میں کلاشنکوف کی گولیوں کی بارش ہوئی تو وہ جان بچا کے بھاگے اور جنگل میں ایسے روپوش ہوئے کہ پلٹ کر نہیں آئے۔

مزید آدھے گھنٹے بعد ہم نے اوپر سے سرچ لائٹس کو گھما کے ہر طرف دیکھا لیکن جہاں تک روشنی گئی، ہمیں حرکت کے آثار دکھائی نہ دیے۔ ایک اندازہ تھا کہ حملہ آور دس سے بارہ کے درمیان تھے اور پوری طرح مسلح تھے۔ فرار ہوتے وقت دو افراد کو انہوں نے کندھوں پر ڈال رکھا تھا، پتا نہیں چل سکا کہ وہ زخمی ہیں یا مر چکے ہیں۔

سرچ لائٹس پھر فکس کردی گئیں۔ گارڈز نے اپنی اپنی پوزیشن سنبھال لی۔ ہم سب نیچے اتر آئے۔ شامی اور سورج مل کے ساتھی بھی صحن میں جمع ہوگئے۔

''میرا خیال ہے، اب ہم چلتے ہیں۔'' سورج مل نے کہا۔

''میں سمجھتا ہوں کہ تمہیں صبح تک ٹھہرنا چاہیے۔'' راجا بولا۔

سورج مل مسکرایا۔ ''جو ہم سمجھتے ہیں، تم نہیں سمجھتے۔ ہمارے لیے یہی مہلت سب سے بہتر ہے۔''

شامی نے بھی کہا۔ ''ہاں ...... تم لوگ نکل جاؤ۔''

''اور تم......'' سورج مل نے کہا۔

''ہم سب کو ایک ساتھ نہیں جانا چاہیے۔'' شامی بولا۔

''یہ بھی ٹھیک ہے، اچھا نواب صاحب...... ہم کو معاف کرنا۔ تم نے ہمارے ساتھ بڑا اچھا سلوک کیا، بڑی عزت دی ہمیں......اور ہم نے۔''

میں نے کہا۔ ''جو ہوا اس کو بھول جاؤ لیکن ہمارے درمیان اعتماد کا رشتہ ہمیشہ قائم رہنا چاہیے۔''

''وہ رہے گا بھگوان نے چاہا تو......'' سورج مل نے پُرجوش انداز میں ہم سے مصافحہ کیا۔ ''ابھی ہمارے جانے کے بعد تم پولیس کو فون کرنا، ان کو بتانا کہ ڈاکوؤں نے حویلی پر حملہ کیا تھا گارڈز نے ان کا مقابلہ کیا مگر وہ بہت کچھ لے گئے۔''

میں نے حیرانی سے کہا۔ ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔''

''ہماری بات مانو وڈا سائیں۔ اس میں ہماری بھی بچت ہے اور تمہاری بھی۔ سیاست کو سمجھو ابھی...... ہم سے دوستی کو چھپاؤ۔ ظاہر یہی کرو کہ ڈاکو تمہارے دشمن ہیں۔ پولیس سے مدد مانگو......شور مچاؤ کے پولیس کچھ نہیں کرسکی اور ڈاکو ---- تم کو لوٹ کر لے گئے۔''

شامی نے کہا ''میں سمجھا دوں گا اپنے دوست کو۔''

وہ سب باری باری ہم سے گلے ملے۔ شاید انہوں نے پہلے ہی اپنے کسی ساتھی کو طلب کرلیا تھا۔ عین وقت پر دو ملٹری ماڈل جیپیں باہر آکے رکیں۔ گارڈ نے اجازت لے کر گیٹ کھول دیا۔ ایک میں رقم رکھی گئی اور تین افراد سوار ہوگئے، دوسری میں باقی چار بیٹھے اور ان کی جیپ پیچھے رہی پھر وہ ہاتھ ہلا کے باہر نکل گئے۔ ان کی گاڑیاں اندھیرے میں غائب ہوگئیں۔ وہ بغیر ہیڈ لائٹس جلائے پل کراس کرگئے۔

ہم واپس اندر آئے تو رات کے بارہ بجے تھے۔ شامی بہت تھکا ہوا لگ رہا تھا مگر مسکرا رہا تھا۔ ''چلو دوست...... سارے کام ٹھیک ہوگئے۔''

میں نے کہا ''اب مجھے کیا کرنا ہوگا۔''

''کچھ نہیں، تم بیٹھو آرام سے۔ رپورٹ یہی کرنا کہ ڈاکو آگئے تھے۔ فائرنگ کی آواز آس پاس سب جگہ سنی گئی ہوگی۔ اپنے شک کا اظہار کردینا کہ وہ شامی بادشاہ کا گروہ تھا۔''

میں نے حیرانی سے کہا ''کیا مطلب......تمہارا نام لوں۔''

''ہاں...... یہ کبھی ظاہر مت ہونے دو کہ ہمارے درمیان دوستی کا کوئی رشتہ ہے۔''

میں نے ہنس کے کہا۔ ''یہ کیا دشمنی ہے۔''

''ہاں......ڈاکو کسی کا دوست نہیں ہوتا۔ شامی بادشاہ

نے تمہیں بھی لوٹ لیا ہے۔''

میں نے کہا'' لیکن اس کا فائدہ۔''

'' تم ہمیشہ اس الزام سے بچے رہو گے کہ تم ڈاکو پالتے ہو...... اور ان کی مدد سے دہشت پھیلاتے ہو جیسا کہ بہت سے وڈیرے کرتے ہیں۔''

میں نے کہا'' رانا سمجھ جائے گا۔''

وہ بولا۔'' نہیں، وہ چکر میں پڑ جائے گا کہ جھوٹ کیا ہے اور سچ کیا۔ اس کے علاوہ جنگ اور محبت کے اصول ایک ہی ہیں۔ اس میں سب جائز ہے اور جو پہل کر گیا اس نے بازی جیت لی۔''

میں نے کہا'' محبت کا اصول آزما چکے ہو یا محض سنی سنائی بات دہرا رہے ہو۔''

اس نے اپنی بات جاری رکھی۔'' اگر رانا پہل کر گیا رپورٹ لکھوانے میں تو پھر بازی اس کے ہاتھ رہے گی۔ تم کچھ بھی کہو یہ سمجھا جائے گا کہ یہ دفاعی اور انتقامی کارروائی ہے۔''

'' حملہ اس نے کیا تھا اور وہ ہی رپورٹ لکھوائے گا میرے خلاف۔'' میں نے کہا۔

وہ بولا۔'' نواب صاحب۔ تم واقعی اناڑی ہو۔ وہ تم پر الزام لگائے گا کہ تمہاری حویلی میں وہ ڈاکو ہیں جو مفرور اور قانون کو مطلوب ہیں۔ انہوں نے میرے بندوں پر کلاشنکوف سے فائرنگ کی۔''

'' میرے کسی گارڈ کے پاس کلاشنکوف نہیں جو اسلحہ ہے وہ قانونی ہے۔''

'' یہی تو پوائنٹ ہوگا تمہارے خلاف کہ پھر کلاشنکوف کے برسٹ کس نے مارے۔ اس حد تک پولیس شاید نہ جائے کہ حویلی کی تلاشی کے وارنٹ لے آئے لیکن رانا سے کچھ بعید نہیں۔ اگر ایف آئی آر میں یہ لکھ دیا گیا کہ حویلی میں کلاشنکوف سے فائرنگ ہوئی تو مشکل ہوگی تمہارے لیے۔ کلاشنکوف ممنوعہ خطرناک اسلحہ شمار ہوتا ہے۔ پولیس کو باہر سے شیل مل جائیں گے۔ سوال یہ ہوگا کہ جب کلاشنکوف استعمال ہی نہیں ہوئی تو خالی خول کہاں سے آئے۔''

میں نے سوچ کے کہا'' یہ مسئلہ پیدا ہو سکتا۔''

'' اس چکر میں اگر تمہارے سیکیورٹی گارڈ شامل تفتیش کر لیے گئے تو وہ مصیبت میں پڑ جائیں گے۔ اس لیے ابھی ہمارے نکلتے ہی پولیس سے رابطہ کرو۔ یہاں کوئی نہ سنے تو اوپر والوں کو بتاؤ کہ ڈاکوؤں نے حملہ کیا۔ وہ کلاشنکوف جیسے خطرناک ہتھیاروں سے مسلح تھے۔ میرے گارڈ ان کا کیا مقابلہ کرتے۔ چنانچہ ڈاکو واردات کر کے فرار ہو گئے۔ اندر کلاشنکوف کے جتنے خالی شیل پڑے ہیں۔ باہر ڈلوا دو۔''

'' لیکن ڈاکو کیا لے گئے؟'' میں نے کہا۔

وہ ہنسا۔'' نواب صاحب، وہ آپ کے تین کروڑ لے گئے ہیں۔''

میں تقریباً اچھل پڑا۔'' یعنی جو رقم سورج مل کو دی ہے...... وہ ڈاکو لوٹ کر لے گئے۔''

'' ہاں...... یہی تو بنیاد ہوگی تمہارے کیس کی۔ تمہارے پاس ثبوت ہے کہ تم نے بنک سے تین کروڑ کی رقم نکلوائی تھی۔ خود لے کر آئے تھے۔ اس معاملے میں بنک منیجر اور وہاں کا عملہ گواہ ہوگا۔''

میں نے کہا'' اس کا تو پورا ریکارڈ ہے۔''

شامی نے کہا'' رقم نکلوانے کے بعد کیا ہوا۔ اس کا بڑا ٹھوس ثبوت ہے۔ ڈاکو بنک سے تمہارے پیچھے لگ گئے تھے۔ وہ تو تمہاری احتیاط پسندی کام آئی۔ تم رقم کیسے لائے۔ من و عن بتا دو۔ ایک سوزکی میں پتھر سے بھرے ہوئے صندوق گئے۔ تم آلو پیاز کی بوری میں نوٹ بھر کے لائے۔ ثبوت گواہ سب موجود ہیں کہ اس کے بعد کیا ہوا...... تمہاری اسٹوری پکی ہے۔''

میں نے قائل ہو کے کہا۔'' اس سے ثابت ہوگا کہ رات کو حملہ کرنے والے بھی وہی ڈاکو تھے؟''

'' ہاں...... وہ بے وقوف بنائے جانے پر مشتعل تھے۔ ان کو پتا چل گیا تھا کہ رقم ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کے حویلی میں لائی گئی ہے۔ ان کا ایک ساتھی بھی مارا گیا تھا اور تین پولیس نے پکڑ لیے تھے۔ یہ انتقامی کارروائی تھی۔''

'' اور اس کارروائی کا ذمے دار شامی بادشاہ کے گروہ کو ٹھہرا دوں، یہی چاہتے ہو تم۔''

'' یہ افواہ پہلے سے گردش کر رہی ہے کہ شامی بادشاہ کا گروہ اس علاقے میں موجود ہے۔ وہ سندھ سے فرار ہو کے آئے ہیں لیکن ابھی تک ان کی موجودگی کا نہ ثبوت ہے نہ گواہ۔ رانا تصدیق ضرور کرے گا کہ تمہاری رپورٹ میں کتنا جھوٹ ہے اور کتنا سچ۔ دینہ کی پولیس اسے بتائے گی کہ ان کے علاقے میں ناکام ڈکیتی کی واردات ہوئی تھی اس میں سوزکی کا ڈرائیور مارا گیا۔ ایک ڈاکو بھی ہلاک ہوا اور تین پکڑے گئے۔''

'' جو پکڑے گئے وہ صاف انکار کر دیں گے کہ ہمارا شامی بادشاہ سے کوئی تعلق نہیں۔''

وہ ہنسا۔'' یہ تو پولیس بھی اب تک معلوم کر چکی ہوگی کہ

وہ کون ہیں اور ان کا کس گروہ سے تعلق ہے۔ بنک کے عملے سے مل کر انہوں نے تین کروڑ لے جانے کی کوشش کی تھی یا کوئی اور معاملہ ہے۔ اتنی رازداری کے باوجود مخبری تو ہو گئی تھی نا۔''

'' پھر تمہارا نام لینے سے کیا ہوگا۔''

'' کچھ نہیں...... ہم پر ہزار الزام پہلے ہیں، ایک اور سہی۔ تم تو صرف شک کا اظہار کرو گے۔ پریشانی رانا کے لیے ہوگی۔''

'' تم پر الزام سے اسے کیا پریشانی ہو سکتی ہے۔''

'' پریشانی اسے یہ ہوگی کہ اب وہ کیسے الزام لگائے گا کہ ڈاکو شامی بادشاہ کو نواب رفیق احمد شیرازی نے پناہ دے رکھی ہے اور وہ تو اس کے خلاف ڈکیتی کی رپورٹ درج کرا رہا ہے۔''

بات فوراً میری سمجھ میں آ گئی۔'' وہ تو چکر میں پڑ جائے گا۔''

'' وہ کسی سے کیسے کہے گا کہ شامی بادشاہ تو حویلی میں تھا...... اور کون مانے گا یہ بات۔''

'' آخر اس نے حملہ کیوں کرایا حویلی پر۔''

'' اسے یقین ہوگا کہ ایئرپورٹ سے اس کی بیٹی کو تم نے اغوا کرایا اور اس کارِ خیر میں تمہاری مدد کی شامی بادشاہ نے۔ قدرتی طور پر اس کے ذہن میں یہ بات آئی کہ تم گل رعنا کو ایئرپورٹ سے اپنی حویلی میں لائے ہو۔ اسے چھپا کے رکھنے کے لیے اس سے بہتر جگہ کوئی نہیں ہو سکتی۔''

'' اگر آج تمہاری اور تمہارے دوستوں کی مدد شامل نہ ہوتی تو وہ گارڈز کو مار کے اندر آ جاتے اور پھر پتا نہیں کیا کرتے۔''

'' بس اللہ جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے...... یہ اتفاق ہے کہ آج صرف ہم چار ہی نہیں تھے۔ سورج مل کے ساتھی بھی تھے۔ گیارہ افراد کی پوری فوج مقابلے پر تھی۔ رانا پر سخت دہشت بیٹھ چکی ہوگی کہ تمہارے پاس جتنی فورس نظر آتی ہے، اس سے کہیں زیادہ ہے۔ گارڈ ہاتھ میں عام قسم کا اسلحہ لیے نظر آتے ہیں مگر تمہارے خفیہ اسلحہ خانے میں اس سے کہیں زیادہ اسلحہ موجود ہے۔ میں سمجھتا ہوں اس کے بندے واپس جا کے صحیح رپورٹ دیں گے کہ وہاں آٹھ دس کلاشنکوف سے جوابی فائرنگ ہوئی۔ ان کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔''

'' معلوم نہیں اس کے کتنے بندے مرے۔''

'' اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جانثار ہوتے ہیں جان نثار کرنے کے لیے۔ وہ سب کو اٹھا کر لے گئے ہوں گے۔

زخمیوں کو بھی اور مرنے والے کو بھی۔ رانا ابھی سوچ رہا ہوگا کہ کیا کرے۔ رپورٹ لکھوائے یا نہ لکھوائے۔ تم اس وقت سے فائدہ اٹھالو، ہم اب چلتے ہیں۔"

شامی اور اس کے سارے ساتھی ہم سے خوب گلے مل کر اور شکر گزاری کے جذبات کا بھرپور اظہار کر کے رخصت ہوئے۔ آدھے گھنٹے بعد راجا نے ٹیلی فون کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ مقامی تھانے سے اس وقت کارروائی کی امید رکھنا لا حاصل تھا۔ راجا نے ڈی ایس پی اور ایس پی سے بات شروع کی اور لاہور میں ڈی آئی جی اور آئی جی تک اپنی بات پہنچانے میں کامیاب رہا۔ ابھی صبح کے اخبارات کی آخری کاپی پریس میں نہیں گئی تھی۔ راجا کسی نہ کسی طرح چند اخبارات میں ڈکیتی کی اس واردات کی خبر لگوانے میں بھی کامیاب ہوگیا۔

فریال اور رابعہ سخت پریشان اور دہشت زدہ تھیں۔ حویلی میں سب ہی جاگ رہے تھے۔ اتنی فائرنگ ہوئی تھی کہ لگتا تھا انڈیا پاکستان کے درمیان ست بدھائی پر قبضے کی جنگ چل رہی ہے۔

موقع پاتے ہی رابعہ نے کہا۔ "کزن...... آخر یہ کیا ہورہا ہے، یہ سلسلہ بڑھتا جارہا ہے۔"

میں نے کہا "ذرا حوصلے سے کام لو۔"

فریال نے استہزائیہ زدہ لہجے میں کہا۔ "نہیں ہے مزید حوصلہ مجھ میں......"

میں نے کہا "کام ڈاؤن فریال۔ ہم بقا کی جنگ لڑرہے ہیں۔"

"میں کسی سے کوئی جنگ لڑنا نہیں چاہتی۔ تھک گئی ہوں میں۔ ذہنی اور اعصابی طور پر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگئی ہوں۔ پاگل ہوجاؤں گی میں۔"

رابعہ نے بھی کہا۔ "بہت مشکل بلکہ ناممکن ہوگیا ہے ہمارا یہاں رہنا۔"

میں نے کہا۔ "ہوسکتا ہے آج کا معرکہ آخری ہو۔ یہ ہم نے جیت لیا ہے۔ کل سے حالات بہت بہتر ہوجائیں گے۔"

"جھوٹ...... ہے...... یہ۔ بہلاوا ہے......" فریال چلائی۔ "ہم یہاں رہیں گے تو مارے جائیں گے اور اسی قبرستان میں دفن ہوجائیں گے۔"

میں نے کہا "اب تو شہناز بھی آجائے گی۔"

فریال نے چلانا جاری رکھا۔ "نہیں آئے گی وہ...... پتا نہیں وہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔ ہم سب تمہاری دشمنی کی بھینٹ چڑھ جائیں گے اگر یہاں رہے۔"

میں نے دھاڑ کے کہا۔ "بند کرو اپنی بکواس، میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کررہا ہوں۔"

راجا نے کہا "تھوڑا سا صبر سے کام لو۔ دیکھو آخر میں بھی تو امید پر سب کچھ کررہا ہوں۔ رابعہ...... اس سے کہو ہمارے لیے مشکلات پیدا نہ کرے۔ لے جاؤ اسے یہاں سے۔"

میرے موڈ کو دیکھتے ہوئے رابعہ اسے کھینچ کر لے گئی مگر فریال پر دہشت سوار تھی۔ وہ نروس بریک ڈاؤن کے قریب تھی۔ "کیا زندگی ہے یہ بھی، واہ...... خواب کیا دکھائے تھے۔ ہو رہا ہے کیا۔ خون خرابہ...... اغوا پر اغوا...... ڈاکوؤں کی مہربانی......" وہ چلاتی گئی۔

میں نے بڑی مشکل سے اپنے غصے پر قابو پایا اور اپنے کمرے میں جا کے پُرسکون ہونے کے لیے لیٹ گیا۔ اس وقت میں نے کسی سکون آور دوا کی اشد ضرورت محسوس کی۔ شہناز ہوتی تو میں کہتا کہ مجھے کوئی انجکشن لگادے تاکہ میں سو جاؤں اور ہوسکے تو فریال کو بھی...... اعصابی دباؤ کا شکار سب ہی تھے۔ کیا اس کا علاج گولی یا انجکشن ہی ہے؟ شراب بھی ہے جیسے راجا نے سوچا تھا۔

نہیں...... حالات بدلیں گے تو سب کچھ خود ہی ٹھیک ہوجائے گا۔ ابھی تک ہم صحیح طور پر اپنے ترقیاتی پروگرام کو شروع ہی نہیں کرپائے تھے۔ صرف شہناز نے ایک کام شروع کیا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کی مخالفت شروع ہوگئی...... اسے روکا گیا، بدنام کیا گیا، دہشت زدہ کیا گیا اور جب اس کے باوجود وہ اپنے کام میں لگی رہی تو اسے اغوا کرلیا گیا لیکن اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں' بدکار...... ہمیشہ نیکوکاروں کی راہ میں کانٹے بچھاتے ہیں۔ بعد میں سب ٹھیک ہوجاتا ہے۔ رفتہ رفتہ اچھائی اثر دکھاتی ہے، لوگوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور قائل کرلیتی ہے۔

صرف رانا جیسے لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ وہ اسی وقت راہِ راست پر آتے ہیں جب اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے۔ اب تک میں نے مفاہمت اور مصالحت کے سارے طریقے آزمائے تھے اور کامیاب نہیں رہا تھا۔ اب اسے سمجھ آجانی چاہیے کہ نواب رفیق احمد شیرازی کے پاس صرف ولایتی ڈگری ہی نہیں بدمعاشوں سے مقابلہ کرنے کی طاقت بھی ہے۔

میں انہی خیالات میں غلطاں کروٹیں بدلتا رہا۔ حویلی میں اب خاموشی تھی۔ باقی لوگ بھی شاید میری طرح کروٹیں بدل رہے تھے۔ سوچ رہے تھے کہ اب کیا ہوگا۔ ست بدھائی کے ترقیاتی منصوبوں کے خواب کو تعبیر ملی گی یا ان کا وجود خیالی تصویر کی طرح ہوا میں تحلیل ہوجائے گا اور میرے ساتھ سب ناکامی کو نوشتۂ تقدیر سمجھ کے قبول کرلیں گے۔ اب بوریا بستر سمیٹ کے اپنی اپنی دنیا میں لوٹ جائیں گے۔ خواب تھا جو ہم نے دیکھا جو بھی سنا افسانہ تھا۔

باہر کا گیٹ کھلنے کی آواز پر میرے کان کھڑے ہوئے۔ اس وقت کون آسکتا ہے۔ میں نے سوچا اور باہر نکل آیا۔ آنے والا غنی تھا۔ مجھے برآمدے میں دیکھ کر وہ سیدھا میری طرف آگیا۔ "سر...... خیریت ہے نا۔"

"خیریت کہاں غنی۔" میں نے کہا اسے مختصراً سب بتایا۔ وہ اپنے دوست کو دفن کرکے آیا تھا۔ اس کا سارا دن بہت مصروف گزرا تھا چنانچہ وہ بہت تھکا ہوا بھی تھا لیکن میری بات سن کے وہ پھر مستعد ہوگیا۔

"آپ اطمینان رکھیں سر۔ میں سب ٹھیک کرلوں گا۔"

میں پھر سونے کی کوششِ ناکام میں مصروف ہوگیا۔ کچھ دیر کروٹیں بدلنے کے بعد میرے جسم کی توانائی کا گراف اتنا نیچے آگیا کہ نیند خود بخود غالب آگئی۔ یہ نیند سے زیادہ بے ہوشی تھی جو مزاحمت کی آخری پناہ گاہ ہوتی ہے۔

شاید میں دیر تک سوتا لیکن صبح آٹھ بجے ریشم نے دروازہ بجانا شروع کیا "سر...... پلیز گیٹ اپ۔"

میں نے غنودگی میں کہا۔ "کیا شور مچا رکھا ہے ریشم، اندر آکے بات کرو۔"

وہ اندر آگئی۔ "سر' ہی کم ٹو سی یو...... فرام پولیس اسٹیشن...... یونیفارم تھری اسٹار۔"

میں نے کہا "اچھا میں دیکھتا ہوں۔"

میں نے واش روم میں جا کے منہ ٹھنڈے پانی سے دھویا تو میری آنکھوں کا بوجھل پن کچھ کم ہوا۔ تھری اسٹار کا مطلب تھا کہ کوئی انسپکٹر بھیجا گیا ہے۔ یہ گزشتہ رات کی کارروائی کا نتیجہ تھا۔ میں کپڑے بدل کے باہر نکلا تو مجھے حویلی کے گیٹ کے اندر ایک موٹر سائیکل نظر آئی۔ یہ یقیناً اس انسپکٹر کی تھی جسے میری رپورٹ درج کرنے کے لیے آنا پڑا تھا۔

اس نے بڑے رکھ رکھاؤ والی متانت سے اپنا تعارف کرایا۔ "خاص تفتیش کی ذمے داری دی گئی ہے۔ میں ڈکیتی کی اس واردات کی رپورٹ لکھوں گا جو گزشتہ شب یہاں ہوئی۔ اور گواہوں کے بیانات میں لوں گا۔"

میں نے کہا "ایک اے ایس آئی یہاں کے تھانے میں ہے کیا رپورٹ اسے نہیں لکھنی چاہیے۔"

"اسے میری معاونت پر مامور کیا گیا ہے۔ ابھی میں اس سے مل کر ہی آرہا ہوں۔ بدقسمتی سے وہ ڈائریا میں مبتلا ہے اور سوائے باتھ روم کے آج کہیں نہیں جاسکتا۔ یہ ایف آئی آر اسی تھانے میں لکھی جائے گی۔ آپ کے بیان کے مطابق۔" انسپکٹر نے کہا۔

اسی وقت کافی آگئی لیکن انسپکٹر نے معذرت کی "میں کافی نہیں پیتا۔"

میں نے اس کے لیے چائے منگوائی اور اپنا بیان لکھوایا۔ اگر اس پر حکام بالا کا دباؤ نہ ہوتا تو وہ میرے بیان میں ضرور مین میکھ نکالتا اور ہرگز میری مرضی اور منشا کے مطابق ایف آئی آر درج نہ کرتا۔ یہ ناممکن تھا کہ حویلی کے اندر آکے وہ اس کی شان وشوکت سے مرعوب نہ ہوتا۔ جب میں بیان لکھوا رہا تھا تو راجا بھی آنکھیں ملتا ہوا آگیا۔ میں نے اس کا تعارف کرایا تو انسپکٹر جو اپنے علاقے میں یقیناً فرعون ہوگا یور موسٹ اوبی ڈینٹ سرونٹ کی عملی تصویر بن گیا۔

جو سوالات اس نے گواہان سے کیے وہ بھی رسمی خانہ پری کے لیے تھے۔ سب سے پہلے غنی آیا۔

میں نے اس کا تعارف کرایا۔ "یہ حویلی کے پروٹوکول اور سیکیورٹی کے ذمے دار ہیں...... مسٹر عبدالغنی۔"

انسپکٹر نے اس سے ہاتھ ملایا۔ "غنی صاحب، آپ اسی علاقے کے رہنے والے لگتے ہیں۔"

غنی نے متانت سے جواب دیا۔ "جی...... میں یہیں پلا بڑھا ہوں۔ میرے آباؤاجداد بھی حویلی کے نمک خوار تھے۔"

"کیا تم بھی سمجھتے ہو کہ حملہ کرنے والے وہی ڈاکو تھے...... شامی بادشاہ کے گروہ سے تعلق رکھنے والے؟"

"یس سر...... میں نے گزشتہ ہفتے میں بہت سے لوگوں سے سنا ہے کہ آج کل وہ پھر اس علاقے میں نظر آرہا ہے۔"

"کیا تم اسے پہچانتے ہو۔"

"شاید پہچانتا بھی ہوں۔ بہت پہلے دیکھا تھا اسے...... لیکن اصل بات یہ ہے کہ کل دن میں جو ڈکیتی کی نیت سے آئے تھے۔ وہ شامی بادشاہ کی بات کررہے تھے۔"

"اس سے یہ تو ثابت نہیں ہوتا کہ وہ شامی بادشاہ کے گروہ کے ارکان تھے۔ باتیں تو عام لوگ بھی کرتے ہیں۔" تھانیدار بولا۔

غنی نے کہا "کل جو حملہ آور حویلی میں آئے اور تین کروڑ کی رقم لے گئے۔ ان میں سے ایک نے کہا تھا کہ شامی بادشاہ کو پتا چلا تو تیری خیر نہیں۔ دوسرے نے کہا کہ اسے کیسے

پتا چل سکتا ہے اگر تو خود نہ بتائے۔"

انسپکٹر نے اسے غور سے دیکھا" ایسی کیا بات تھی تمہارے خیال میں؟"

"غالباً وہ کچھ رقم نکال کے آپس میں تقسیم کرنے کی بات کرر ہے تھے۔ اس وقت میں گاڑی کے نیچے چھپ کر لیٹا ہوا تھا۔ اس گاڑی میں رقم تھی۔"

"اچھا ...... اندر آنے کے بعد انہوں نے کسی کو مارا پیٹا تو نہیں کسی سے بدسلوکی نہیں کی۔"

"نہیں سر پہلے ہمارے گارڈ نے مقابلہ کیا۔ اپنے ہتھیاروں سے جواب میں کلاشنکوف سے فائرنگ ہوئی تو انہوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ ڈاکوؤں نے اندر آ کے کہا کہ اب کسی نے ایک گولی بھی چلائی تو ہم سب کو بھون ڈالیں گے۔ وہ رقم لے کر چلے گئے۔ وہ جانتے تھے رقم کہاں ہے۔"

"محل میں کتنے گارڈ ہیں؟" اس نے حویلی کے بجائے محل کا لفظ استعمال کیا تو اس میں تمسخر کا پہلو تھا یا مرعوبیت کا ...... یہ اندازہ مجھے نہیں ہوا۔

"آٹھ سر۔"

آہستہ آہستہ انسپکٹر کے سوالات سے مجھے اندازہ ہونے لگا کہ وہ اتنا فرمانبردار یا تعاون کرنے والا نہیں تھا جتنا نظر آ رہا تھا۔ اس نے سوالات کا سلسلہ ایک جال کی طرح پھیلایا۔ اس جال کے تانے بانے واضح طور پر یہ ظاہر کرتے تھے کہ ایف آئی آر ہماری مرضی کے مطابق لکھنے کے باوجود وہ تفتیش اپنے انداز سے کرے گا۔

اس نے سارے گارڈز کے نام لکھے۔ ان کی ڈیوٹی کے طریق کار کے بارے میں پوچھا پھر وہ گھریلو ملازمین پر آ گیا۔ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی تفتیش مکمل کرنے کے بعد صاف کہہ دے کہ قبلہ نواب صاحب، آپ ایک نمبر کے دروغ گو اور افسانہ طراز ہیں۔ آپ کی ساری کہانی خالص جھوٹ کی بنیادوں پر استوار ہے۔ اصل حقائق میں عرض کرتا ہوں۔

اس کے پاس تجربہ اور ذہانت تھی۔ ظاہر ہے افسران بالا نے کسی احمق کو خصوصی تفتیش کا سربراہ مقرر نہیں کیا تھا۔ ہماری ساری خوش فہمی یا غلط فہمی دور ہوگئی کہ ہم قانون کو اپنی مرضی کے مطابق جیسے چاہیں گے، استعمال کرلیں گے۔ نہ اس نے سخت زبان استعمال کی اور نہ کوئی دھمکی دی۔ اس نے بڑی شرافت سے اپنے عزائم کی جھلک دکھادی۔ سمجھدار کو اشارہ کافی ہوتا ہے کہ حالات کو خرابی سے پہلے سدھار لے۔

جب اس نے اس عزم کا اظہار کیا کہ وہ تمام گواہان کو باری باری تھانے بلا کے تفتیش کرے گا جن میں گھریلو ملازمین بھی شامل ہونگے میں اور دیگر افراد خانہ بھی۔ تو مجھے خطرے کی گھنٹی سنائی دی۔ دیگر افراد بڑی معنی خیز اصطلاح تھی مثلاً رابعہ یا فریال۔ اس نے یہ بھی کہا کہ مختلف ماہرین کی مدد سے جائے واردات اور وقوعہ کے بارے میں تفصیلی رپورٹ لے گا۔ تو میں نے راجا کو باہر بلایا۔

راجہ نے مجھ سے اتفاق کیا۔ "یہ تو مہاحرامی ہے۔ بڑی شرافت اور عاجزی سے کہہ رہا ہے کہ میں تو آپ کی ...... دوں گا۔"

"گویا اثر، رسوخ یا دھمکی وغیرہ سے بات نہیں بنے گی۔"

"آج کل نقد سودا ہوتا ہے۔ اس نے بغیر کہے یہ کہہ دیا ہے کہ اپنی مرضی کا کام کرانا ہے تو میری مرضی کا معاوضہ دو ورنہ قانون تو اندھا ہوتا ہے۔ کتابوں میں یہی لکھا ہے۔ سودا ہوگیا تو ہم اندھے بن جائیں گے۔ کیا خیال ہے بات کروں؟"

میں نے کہا" بالکل کرلے۔ بعد میں کچھ نہیں ہوسکے گا۔"

راجا اخباری زندگی کے تجربات سے بہت کچھ سیکھ چکا تھا اور حالات کے آئینے میں آج کی تصویر ہم جیسے عام لوگوں کے مقابلے میں زیادہ صاف دیکھتا تھا۔ اس نے بڑے قرینے سے بات کی۔ شرفا ضمیر کا سودا بھی شرافت سے کرتے ہیں۔ انسپکٹر نے ہماری مالی حیثیت کا صحیح اندازہ لگالیا تھا۔ جاگیر...... حویلی، ملازمین کا لشکر...... تین کروڑ ڈاکو لے گئے تو جو رقم بنکوں میں محفوظ ہوگی وہ کتنی ہوگی۔ یہ سارا حساب کتاب کرکے اس نے ایک کروڑ طلب کیے اور کسی قسم کی سودے بازی سے صاف انکار کردیا۔ یہ تو باٹا کے ریٹ ہیں۔ ننانوے لاکھ ننانوے ہزار نوسو ننانوے روپے پچانوے پیسے۔ اس میں ایک پیسہ کم نہیں ہوگا۔

راجہ نے بھی اتنی ہی باہرانہ شرافت سے واضح کہا کہ ایک کروڑ دینے والے کسی قسم کی وعدہ خلافی برداشت نہیں کرتے اور کسی کو یہ غلط فہمی ہرگز نہیں ہونی چاہیے کہ ایک کروڑ واپس نہیں لیے جاسکتے۔ ہوسکتا ہے بدعہدی کرنے والے کا نقصان ایک کروڑ سے کہیں زیادہ کا ہوجائے۔ آدمی کی اپنی جان کی کیا قیمت ہوتی ہے یا پھر بیوی بچے ہیں، ماں باپ ہیں، ان کی سلامتی کے بارے میں ضرور سوچنا چاہیے ورنہ ڈاکوؤں کا کیا ہے۔ آج کسی نواب کی حویلی پر حملہ آور ہوئے۔ کل تھانیدار کی کوٹھی تاڑلیں۔

وہ سمجھ گیا۔ اس نے یقین دلایا کہ اب ہم نے اسے

خرید لیا ہے تو وہ اصول کا پکا ہے۔ ہمارے دشمنوں کے ہاتھ نہیں بکے گا خواہ وہ دس گنا زیادہ قیمت لگائیں۔ اس نے بتایا کہ ابھی تک کسی نے کوئی ایف آئی آر درج نہیں کرائی ہے اور عملی تعاون کا پہلا دوستانہ مظاہرہ یوں کیا کہ ہماری رپورٹ پر صبح آٹھ بجے کا نہیں گزشتہ رات گیارہ بج کر پچپن منٹ کا وقت ڈالا۔ تاریخ ایک دن پہلے کی ہوگئی۔ اب جو رپورٹ درج کرانے آئے گا ایک دن بعد کی جائے گی۔ قانون کی اعلیٰ ترین عدالت میں یہ فرق فیصلہ کن ثابت ہوسکتا ہے۔

اس نے جاتے وقت یہ بھی بتادیا کہ ادائیگی کی صورت کیا ہوگی۔ اسے ہم پر اعتبار تھا مگر وہ خود کو بھی رشوت کے الزام سے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ سروس ریکارڈ میں اس کو ایک ایماندار اور فرض شناس افسر کی حیثیت حاصل تھی۔ ریٹائر ہونے تک۔ امید تھی کہ اس ریکارڈ کی بنا پر وہ ایس پی تو لازمی ہوگا۔ ڈی آئی جی کے عہدۂ اعلیٰ تک جانے کی امید بھی رکھ سکتا ہے۔

اس کے جانے کے بعد راجا نے اسے ایک سو ایک اعلیٰ ترین گالیوں سے نوازا مگر یہ اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کی بات تھی۔ وہ ان گالیوں کی حدِ سماعت سے دور جاچکا تھا۔ سامنے بھی ہوتا تو مسکراتا رہتا اور تھینک یو سر کہتا رہتا۔ پیسا کمانا واقعی مشکل کام ہے۔

اس قانونی کارروائی میں ایک گھنٹا صرف ہوچکا تھا۔ رات کے دہشت زدہ واقعے کا اثر ابھی تک حویلی کے ماحول پر نظر آتا تھا۔ غنی نے انسپکٹر کے جانے کے بعد صفائی کا یعنی شہادتوں کو ضائع کرنے کا کام شروع کیا۔

معمول کے مطابق ریشم اپنی ڈیوٹی سرانجام دے رہی تھی مگر وہ بہت تھکی ہوئی اور بجھی ہوئی تھی ... ڈاکٹر شہناز کے ساتھ اس کی معاون خصوصی کی حیثیت سے گاؤں گاؤں پھرنا اور شان بھگارنے کا سلسلہ خواب بن گیا تھا۔ وہ سب سے زیادہ مس کرتی تھی تو شہناز کو۔

جب میں نے اسے ناشتا لگانے کے لیے کہا تو اس نے پوچھا۔ "ناشتا آپ کے کمرے میں لاؤں۔"

میں نے کہا" کیوں ...... باقی لوگ بھی تو ہیں۔"

"باقی کون سرکار ...... رابعہ بی بی سو رہی ہیں اور فریال بی بی کو ابھی میں نے دیکھا ہے ...... وہ کمرے میں نہیں ہیں۔"

"کمرے میں نہیں ہیں پھر کہاں ہیں۔" میں نے کہا۔

"مجھے نہیں معلوم سرکار۔" آج اپنی انگریزی بھی اس نے چھوڑ رکھی تھی۔

میں نے کچھ پُرخطر تشویش محسوس کی۔ آخر اتنی صبح فریال کہاں جاسکتی تھی اگر وہ باہر قبرستان تک ہی جاتی تو تنی دیر میں واپس آجاتی لیکن گزشتہ رات کی واردات کے بعد ناممکن تھا کہ وہ اکیلی باہر نکلنے کی ہمت کرے۔ ابھی تک میں نے یا راجا نے باہر جا کے گرد و پیش کا جائزہ نہیں لیا تھا۔

میں نے فریال کے کمرے کا دروازہ کھول کے اندر جھانکا۔ وہ واقعی کمرے میں نہیں تھی۔ اندر اندھیرا تھا اور اس کا بستر خالی تھا۔ میں لوٹ کے دروازے تک گیا اور گارڈ سے پوچھا۔

گارڈ نے کہا" فریال بی بی ...... وہ تو صبح ہی شہر چلی گئی ہیں۔"

مجھے حیرت اور صدمے کا ایک جھٹکا لگا۔ "شہر گئی ہیں؟ کیسے... گئی ہیں۔ ساری گاڑیاں تو اندر موجود ہیں۔"

"انہیں لینے کوئی گاڑی آئی تھی، سر۔"

میں نے کہا۔ "گاڑی ...... کون تھا اس گاڑی میں۔"

گارڈ نے پھر لاعلمی کا اظہار کیا۔ "کوئی ڈرائیور تھا۔ کالے رنگ کی نئی گاڑی تھی۔"

"انہوں نے جاتے وقت کچھ کہا؟"

"صرف یہ کہا کہ کوئی پوچھے تو بتا دینا، میں لاہور جارہی ہوں۔"

میں نے برہمی سے کہا۔ "پھر تم نے بتایا کیوں نہیں۔"

"آپ نے پوچھا کہاں سر۔" وہ ڈرتے ڈرتے بولا۔

میں سخت الجھن اور پریشانی میں واپس آیا تو مجھے ریشم نظر آئی۔ وہ فریال کے کمرے کی طرف سے آرہی تھی۔

"سرکار، یہ خط میں نے ابھی دیکھا ...... آپ کے لیے ہے، فریال بی بی کے تکیے پر رکھا تھا۔" ریشم نے ایک بند لفافہ میری طرف بڑھایا۔

میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ لفافہ کھولا۔

مجھے کچھ اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ خط میں کیا ہو گا چنانچہ اسے کھولتے ہوئے میری حالت سزائے موت پانے والے اس مجرم جیسی تھی جو اپنی رحم کی اپیل مسترد ہونے کا پروانہ وصول کرے۔

فریال نے لکھا تھا۔

رومیو

میں جا رہی ہوں۔ حالات کے جبر نے مجھے یہ فیصلہ لینے پر مجبور کر دیا ہے۔ مجھے اعتراف کر لینا چاہیے کہ میرے لیے برداشت کی حد آ گئی ہے۔ میں نے خواہش کی اور پھر کوشش کہ یہ حد نہ آئے مگر جیسے دعا کے قبول ہونے نہ ہونے پر انسان کا اختیار نہیں، ایسے ہی خواہش یا کوشش کی کامیابی یا ناکامی پر میرا اختیار نہ تھا...... یہ اختیار تمہارے پاس تھا۔

میں کہاں جا رہی ہوں۔ یہ ابھی تک میں نے طے نہیں کیا۔ ابھی تو میں ست بدھائی سے اور اس حویلی کے شاہی زنداں سے نکل رہی ہوں جہاں میری وقعت اور اہمیت ہر گزرتے دن کے ساتھ کم ہوتی جا رہی تھی۔ ترجیح کے اعتبار سے اور بہت کچھ تھا جو میری خواہشات اور میرے جذبات سے زیادہ اہم ہونے لگا تھا۔

ایک وقت تھا کہ مجھے حاصل کرنا تم اپنے لیے ایک چیلنج سمجھتے تھے۔ یہ تمہاری زندگی کا ایک مقصد تھا...... شاید سب سے اہم مقصد تھا۔ دیگر تمام مقاصد اور اہداف اس کے بعد آتے تھے مگر یہاں آ کے ان کی ترتیب بدل گئی۔

مجھے وہ وقت ایک بھولا بسرا خواب لگتا تھا جب مجھ سے ایک بار ملنے کے لیے تم سو جتن کرتے تھے۔ میری ناراضی اور خوشی تمہارے شب و روز میں اندھیرے اجالے کی طرح تھی۔ میری خاطر تم سلطان کی جان لینے یا اپنی جان دینے کا ارادہ اور عزم رکھتے تھے...... لیکن خواب کو تعبیر مل گئی۔ کسی مقابلے کو جیت لینے کے بعد ...... وہ کرکٹ کا ورلڈ کپ ہو یا مس ورلڈ کا ٹائٹل اس کی ساری سنسنی خیزی ختم ہو جاتی ہے۔ چیلنج اور مقابلے کی سنسنی خیزی لگن اور دیوانگی سب ایک ٹرافی کی صورت میں کسی کارنس پر سجا دی جاتی ہیں۔ ایک اور چیلنج کوئی اور مقصد یا اگلی فتح ساری خواہش، جنوں اور جدوجہد کا مرکز بن جاتی ہے۔

میرے ساتھ یہی ہوا۔ فائنل میں سلطان ہار گیا اور تم جیت گئے۔ دیکھا جائے تو فتح خود میں نے تمہارے نام کر دی۔ تمہیں ایک طرح سے واک اوور مل گیا۔ تم نے مجھے جیت کی ٹرافی بنا کے ست بدھائی کی حویلی میں سجا دیا۔ ان شکار کیے گئے شیروں کی کھالوں اور بارہ سنگھوں کے سروں کی طرح جو تمہارے آبا و اجداد کے سامنے آئے تو مارے گئے۔

آج تمہارے سامنے ایک نہیں کئی نئے چیلنج ہیں اور میں یہ محسوس کرتی ہوں کہ میرا جذباتی ردعمل تمہاری کامیابی کی راہ میں رکاوٹ بن رہا ہے۔ پہلے میں ایسا نہیں سمجھتی تھی کہ شبِ عروسی کے ساتھ ہی عشق کی زندگی تمام ہو جاتی ہے لیکن زندگی کی عملی حقیقت یہی ہے۔

میں کوئی جذباتی بے وقوفی نہیں کر رہی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ محبوبہ جب بیوی بنتی ہے تو اس کا STATUS بدل جاتا ہے لیکن مقام بدلنے سے اہمیت کم نہیں ہونی چاہیے۔ بیوی تمام عمر محبوبہ بن کے نہیں رہ سکتی لیکن نصف بہتر بن کے رہنا تو اس کا حق ہے۔ یہاں میں ایسا محسوس کرتی ہوں کہ نصف تو کیا بلحاظ اہمیت میں کوارٹر بہتر بھی نہیں...... دس فیصد بہتر بھی نہیں۔

مجھے یہ بے وقعتی منظور نہیں چنانچہ میں جا رہی ہوں لیکن میں تمہارا انتظار کروں گی...... تمام عمر...... جس دن تم محسوس کرو کہ میری ضرورت اور اہمیت ست بدھائی اور اس کے ترقیاتی منصوبوں سے زیادہ ہے۔ ہر کام، ہر چیز اور ہر مقصد سے زیادہ ہے...... اس دن آ جانا۔ جس دن تمہیں احساس ہو کہ تمہاری ہر خوشی میرے بغیر ادھوری ہے۔ اس دن مجھے تلاش کر لینا...... تب تک میں اپنی ادھوری خوشی کے ساتھ گزارا کر لوں گی۔

تمہاری جیولیٹ

پس نوشت: جب تم آؤ گے...... جب آؤ گے...... تو میں اپنی کامیابی کی ٹرافی بڑے فخر سے تمہارے سامنے پیش کروں گی۔ میں اپنے بچے کو جنم دوں گی اور پالوں گی۔ اسے تمہارے بارے میں بتاتی رہوں گی...... مجھے نہیں معلوم کہ جب تم آؤ گے تو وہ عمر کی کون سی منزل پر ہو گا۔ چلنا اور باتیں کرنا سیکھ چکا ہو گا۔ کسی اسکول میں پڑھ رہا ہو گا یا یونیورسٹی میں...... لیکن وہ تمہیں جانتا ہو گا۔ تم ہی اس کے لیے آئیڈیل ہو گے۔ اسے بھی تمہارا اتنا ہی انتظار ہو گا جتنا مجھے...... اور کیا عجب کہ بڑا ہو کے وہ اتنا بڑا ہو جائے کہ میری بھی نہ مانے۔ خود تمہیں تلاش کرنے نکل جائے...... اور تلاش کر لائے...... یا تم سامنے آؤ تو تمہیں قتل کر دے۔

فریال

ایک آخری بات...... پتا نہیں کہ ایسا میں کیوں سوچتی رہی۔ اس سے تمہیں دکھ بھی ہو سکتا ہے، غصہ بھی آ سکتا ہے لیکن یہ میرا خوف تھا۔ میری طرح رابعہ نے بھی سوچا تھا مگر حویلی میں رہنے والوں نے اس کے برعکس سوچا جو کچھ اس کے ساتھ ہوا یا کیا گیا۔ وہ میرے ساتھ بھی ہو سکتا تھا پھر اسے بدقسمتی کا نام بھی دیا جا سکتا تھا...... حادثہ بھی بنایا جا سکتا تھا۔ عدم تحفظ کے اس احساس نے بھی مجھے یہ دفاعی قدم اٹھانے پر مجبور کیا کہ میں وہاں سے نکل جاؤں۔

فریال

یہ خط میرے ذہن اور اعصاب کے لیے اتنا ہی تباہ کن ثابت ہوا جتنا ہیروشیما پر گرایا جانے والا ایٹم بم تھا۔ میری سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیت مفلوج ہو گئی اور مجھ پر صدمے اور غصے کی شدت سے ایک جنونی کیفیت طاری ہو گئی۔ میں نے خط کو پھاڑ کر پرزہ، پرزہ کر دیا اور فریال کو ایک سو ایک گالیاں دیں۔

راجا مجھے پکڑ کے کمرے میں لے گیا۔ ”کیوں تماشا بنا رہا ہے خود کو سب کے سامنے۔“

”تماشا تو اس نے کیا ہے...... جوتا مارا ہے میرے منہ پر...... اتنا ذلیل کر کے گئی ہے۔“ میں نے دھاڑتے ہوئے کہا۔

”کہاں گئی ہے۔“

”کچھ نہیں بتایا اس نے...... لیکن وہ جا کہاں سکتی ہے۔“

راجا نے مجھے زبردستی بٹھا دیا۔ ”ہاں...... وہ کہیں نہیں جا سکتی۔ تو فکر مت کر...... ہم اسے ڈھونڈ لائیں گے۔“

”تو نہیں جانتا اسے راجا...... وہ کوئی عام لڑکی نہیں ہے۔ وہ کہیں بھی جا سکتی ہے۔ کچھ بھی کر سکتی ہے۔“

رابعہ خاموشی سے آئی اور میرے پاس بیٹھ گئی۔ ”دیکھو کزن...... وہ غصے میں گئی ہے۔ غصہ اتر جائے گا تو خود ہی لوٹ آئے گی۔“

”نہیں رابعہ۔ وہ مر جائے گی لیکن واپس نہیں آئے گی۔ تم اسے تلاش کر لو پھر بھی وہ آئے گی نہیں...... جب تک میں خود اسے نہ لاؤں۔“

”تو آپ جائیں۔ یہاں بیٹھ کے چیخنے چلّانے سے کیا ہو گا۔“ رابعہ نے برہمی سے کہا۔ ”آخر ایک عورت ہے وہ...... کوئی پن نہیں ہے کہ گم ہو جائے تو نظر نہ آئے۔ ابھی وہ نزدیک ہی ہو گی۔ یہاں سے نکلتے ہی کسی جہاز پر بیٹھ کے تو جانے سے رہی اور جائے گی تو لندن کے سوا کہاں جائے گی۔ تم لندن چلے جانا۔“

”لندن جانے کے لیے بھی اسے ویزا چاہیے...... پھر کسی فلائٹ پر بکنگ۔ اس میں وقت لگتا ہے۔ میں اس کا بھی بندوبست کر لوں گا کہ وہ ویزا کے لیے درخواست دے تو ہمیں معلوم ہو جائے۔“

میں نے مایوسی سے سر ہلایا۔ ”جانے دے راجا۔ اگر اس نے تہیہ کر لیا ہے تو وہ تیری اور میری ہر کوشش کو ناکام بنا دے گی۔ وہ نام بدل لے گی۔ نیا شناختی کارڈ بنوائے گی۔ لندن کے بجائے دبئی یا سنگاپور چلی جائے گی۔“

راجا نے کہا۔ ”ابھی سے اتنا مایوس ہونے کی کیا ضرورت ہے آخر، ہم معلوم کرتے ہیں کیا پتا وہ فاروقی کے گھر جائے؟“

رابعہ نے کہا۔ ”اس خط میں کیا لکھا تھا اس نے کزن جس پر تمہیں اتنا غصہ آیا...... کیا وہ سچ تھا؟“

میں نے چلّا کے کہا۔ ”وہ جھوٹ تھا۔“

راجا نے کہا۔ ”کچھ تو صحیح ہو گا اس میں فیکے پتر۔“

میں نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔ ”ہاں

......اس کے نقطہ نظر سے وہ سب سچ تھا...... جو اس نے محسوس کیا۔''

''یا دیکھا......'' راجا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''ہاں...... ایسا سب کے ساتھ ہوتا ہے...... جو وہ دیکھتے رہیں، سنتے ہیں یا سمجھتے ہیں اسے سچ مان لیتے ہیں۔ زمین سورج کے گرد گھومتی تھی مگر دیکھنے والوں کو الٹا نظر آتا تھا اور وہ اس کو سچ مانتے تھے۔''

''کیا سچ دو ہوتے ہیں کزن۔''

''میرے سچ کو نہ اس نے دیکھا نہ سنا۔ تو مانتی کیسے...... اس نے اپنی عقل کے سچ کو تسلیم کرلیا...... اور چلی گئی۔'' میں نے افسوس سے سر ہلایا۔

''اس نے مجھ سے بھی کچھ نہیں کہا۔'' رابعہ بولی۔

میں نے کہا۔ ''اس نے الزام لگایا ہے کہ میں نے اسے اہمیت دینا چھوڑ دیا۔ اسے نظر انداز کیا۔''

''یہ بات وہ کہتی رہتی تھی لیکن تو نے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی...... تو اس سے لڑنے لگتا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''راجا...... لڑائی وہ شروع کرتی تھی۔ فضول بے بنیاد باتوں پر خفا ہو جاتی تھی۔ بدگمانی کی کوئی حد ہوتی ہے۔''

''بدگمان بے سبب نہیں تھی فیکے پتر۔ وہ کہاں تک برداشت کرتی۔ اس کی جگہ کوئی بھی عورت ہوتی۔ وہ سب خاموشی سے کیسے دیکھتی رہتی جو اس کی نظروں کے سامنے ہو رہا تھا۔'' راجا بگڑ گیا۔ ''تو میرا منہ مت کھلوا......''

رابعہ نے کہا ''محبت کرنے والی عورت اور محبت میں دھوکا کھانے والی عورت...... تو میں ہوں۔''

''بے شک تمہارے ساتھ فرخ نے دھوکا کیا۔ لیکن میں نے تو فریال کو دھوکا نہیں دیا۔'' میں نے احتجاج کیا۔

راجا نے طنز سے کہا۔ ''بجا ارشاد...... فریال کو بلاوجہ غلط فہمی ہوگئی کہ آپ کی نیت میں فتور ہے لیکن رابعہ بی بی...... آپ کے جذباتی ڈائیلاگ ایک طرف...... آخر تمہیں کیوں یقین ہے کہ فریال وہیں ملے گی۔ یہ الہام ہوا ہے تمہیں؟''

''بات الہام کی نہیں۔ میرے دل کی بات کو میری عقل بھی تسلیم کر رہی ہے۔'' رابعہ نے کہا۔

میں نے کہا۔ ''اس کی جگہ تم ہوتیں تو تمہارا ارادہ بھی بدل جاتا۔ ہمت جواب دے جاتی۔''

''یہ ہمت کی بات بھی نہیں نواب صاحب۔''

میں نے کہا۔ ''اور کیا بات ہے۔''

''اس نے تمہیں ایک موقع دیا۔'' رابعہ بولی۔

راجا نے کہا۔ ''کس بات کا موقع۔''

''یہ موقع کہ ابھی وقت ہے۔ تم جاؤ اور اسے روک لو۔ منالو۔ منا کے واپس لے آؤ۔ تم اسے ارادے کی کمزوری کیسے کہہ سکتے ہو۔ یہ تو جذبات کی مجبوری ہے۔ شاید تمہارے لیے رشتوں کی زنجیریں توڑ کے جانا ہمت کی بات ہو کیونکہ تم مرد ہو۔''

''یہ تم جانب داری برت رہی ہو کزن۔''

''جانب داری کی کون سی بات ہے۔ اس میں...... مجھے بتاؤ کیا فریال نے تمہارے لیے کم ہمت دکھائی...... جیسے اس نے چھ سال گزارے۔ حالات کا مقابلہ کیا...... نہ سلطان سے خوف زدہ ہوئی نہ اس کی بدمعاشی کی طاقت سے۔ کیا کوئی کم ہمت عورت ایسا کرسکتی تھی؟''

میں نے شرمندگی سے کہا۔ ''یہ تو ٹھیک کہا تم نے۔''

رابعہ بولتی رہی۔ ''آج جسے تم چالاکی کہتے ہو۔ یہ اس کی ہمت تھی کزن کہ وہ لندن سے اکیلی نکل آئی اور آدھی دنیا کا چکر کاٹ کے تمہارے پاس ست بدھائی پہنچ گئی۔ سلطان کو چکمہ دینا کوئی آسان تھا۔ وہ چھ سال تک اس کا مقابلہ کرتی رہی۔ اکیلی کمزور عورت جس کے سامنے بڑے بڑے بدمعاش تھے۔ آج تم کہتے ہو اس کی ہمت جواب دے گئی تو اس نے اپنا ارادہ بدل لیا...... شرم آنی چاہیے تمہیں۔''

میں نے سر جھکا کے کہا۔ ''اب کیا بتاؤں کتنی شرم آرہی ہے اس وقت مجھے...... گیس کا پریشر دیکھنے کا آلہ ہے مگر شرم میٹر کوئی نہیں۔''

''اب تم جاؤ...... معافی مانگو اس سے۔''

''یار تم قصور تو بتاؤ میرا...... معافی مانگنے کا ڈراما کرنا کیا مشکل ہے۔ میں ہاتھ جوڑوں گا...... پیر پکڑلوں گا۔''

راجا نے کہا۔ ''حرامزادے...... الو کے پٹھے۔ میرا منہ مت کھلوا۔''

رابعہ نے کہا ''ایک بات بتائیے قبلہ نواب صاحب۔ اس کے خط میں ایسی کیا بات تھی جس نے آپ کو اتنا چراغ پا کیا کہ آپ نے خط کو پھاڑ کے پرزہ پرزہ کردیا۔ اپنا غصہ کاغذ کی تحریر پر اتارا۔ کیا وہ تحریر کا سچ تھا؟''

میں نے برا مان کے کہا۔ ''تم جانتی ہو کزن وہ جھوٹ تھا۔ میں نے کچھ نہیں چھپایا جو لکھا تھا اس نے، سب بتادیا۔''

''اس میں کیا جھوٹ ہے؟...... کیا یہ جھوٹ ہے کہ ست بدھائی آنے کے بعد تمہارے لیے اس کی اہمیت ختم ہوگئی۔''

راجا نے لقمہ دیا۔ ''اہمیت اور ضرورت...... کیا میں نے غلط کہا فیکے پتر۔''

''بکواس فرماتے ہیں آپ۔'' میں نے بگڑ کے کہا۔

''کیا فریال نے یہ بھی بکواس کی ہے کہ وہ تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہے؟'' رابعہ نے سپاٹ لہجے میں سوال کیا۔ ''کس لیے چھ سال انتظار کیا تھا تم نے...... تم لندن میں تھے۔ وہاں کون تھا تمہیں روکنے والا...... کس کا ڈر تھا کہ سوسائٹی کچھ کہتی۔ نہ قانون پوچھتا لیکن تم دونوں شادی کرنا چاہتے تھے پہلے پھر یہاں آکے کیا ہوا؟ وہی جو فریال کا شکوہ ہے۔ تمہارے لیے حالات زیادہ اہم ہوگئے۔ شادی غیر اہم ہوگئی۔''

میں نے احتجاج کرنا چاہا۔ ''رابعہ...... اگر تم......''

رابعہ نے مجھے روک دیا۔ ''سنو میری بات...... میں اگر خاموش تماشائی بنی رہی اور بولی نہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں میں اندھی بہری تھی۔ میں لاتعلق تھی کہ یہ میرا معاملہ نہیں۔ پہلے تمہیں سلطان کی مخالفت کا سامنا تھا۔ اب تو یہ کانٹا بھی نکل گیا مگر اب تم دوسرے معاملات میں الجھ گئے ہو۔ ایسے تو حالات کبھی سازگار نہیں ہوں گے رفیق...... اور جب تمہارے والدین بھی مان گئے ہیں تو پھر حالات کا کون سا عذر باقی رہ گیا ہے۔ شادی میں کتنی دیر لگتی ہے۔ پانچ منٹ...... صرف پانچ منٹ جو قاضی کے سامنے ایجاب و قبول میں صرف ہوتے ہیں۔ کیا تمہارے پاس پانچ منٹ بھی نہیں تھے۔''

میں نے کہا۔ ''آئی ایم سوری...... میں اعتراف کرتا ہوں۔''

رابعہ نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''ہم سب کے دکھ سکھ ساجھے ہیں کزن۔ پہلے تم میرے لیے پریشان تھے...... پھر شہناز کے لیے ہم سب پریشان تھے تو آج یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم تمہارے لیے پریشان نہ ہوں۔''

''میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔''

''جذبات اس کے مجروح ہوئے ہیں جو روٹھ کے چلی گئی ہے لیکن جاتے جاتے بھی تم کو اس نے موقع دیا ہے کہ زندگی بھر پچھتانے سے بہتر ہے ابھی تلافی کرلو۔ اس معاملے میں واقعی وہ کمزور پڑ گئی...... اس نے اپنی انا کو قربان کردیا۔ وہ فاروقی کے گھر رک گئی جیسے کوئی جانے والا پلٹ کر دیکھتا ہے کہ کوئی اس کے پیچھے آرہا ہے یا نہیں؟ کسی کو احساسِ زیاں ہے کہ نہیں۔ کوئی پچھتانے پر آمادہ ہے یا نہیں۔ کوئی اس کو اہم سمجھتا ہے یا نہیں۔ اگر تم نے فوراً قدم آگے نہ بڑھایا تو پھر وہ رکے گی نہیں۔ دوبارہ پلٹ کے بھی نہیں دیکھے گی...... اور یقین کرو میری بات کا۔ وہ تمہیں پھر ملے گی بھی نہیں...... کبھی نہیں...... کہیں نہیں...... تم ساری عمر پچھتاتے اور اسے تلاش کرتے گزار دو گے۔''

میں نے کبھی رابعہ کو اس طرح اور اتنا بولتے نہیں سنا تھا۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ اس نے جو کہا تھا دل سے محسوس کر کے جذبات کی پوری شدت کے ساتھ کہا تھا۔

میں نے اس کا ہاتھ تھام کے کہا۔ ''رابعہ...... میرا وعدہ...... میں آج ہی اسے لے آؤں گا...... اور ممکن ہوا تو اس سے شادی میں پانچ منٹ کی تاخیر بھی نہیں کروں

گا۔ میرے ساتھ تم بھی چلو۔ ہم وہیں بلالیں گے قاضی کو۔''

رابعہ مسکرائی۔'' ہم سب چلیں گے۔ تمہارے باراتی بن گئے۔''

راجانے سر جھکا کے کہا۔'' مس رابعہ...... کیا اس سچوئیشن میں تم بھی وہی کرتیں...... جو فریال نے کیا؟''

رابعہ اداس ہوگئی۔'' ہاں...... میں بھی دھمکی دیتی اور پھر رک کر انتظار کرتی لیکن فرخ نے مجھے موقع ہی نہیں دیا۔ وہ تو رکا ہی نہیں......''

راجانے فوراً بات پلٹ دی۔'' اب تم یوں کرو...... بات کرو فریال سے۔''

'' وہ کسی سے بات نہیں کرے گی۔'' رابعہ نے نفی میں سر ہلایا۔'' سوائے رفیق کے...... مگر وہ بھی فون پر نہیں۔''

'' چلو لیلیٰ بھابی سے بات کرو اور بتا دو انہیں کہ ہم آ رہے ہیں بارات لے کر۔ دولہا کو جوتے مارتے ہوئے لائیں گے۔ دلہن سے کہو وہ بھی ایسے ہی استقبال کے لیے تیار رہے۔'' راجا بولا۔

میں نے کہا۔'' کہیں یہ لیلیٰ بھابی کا پلان تو نہیں تھا۔''

رابعہ مسکرائی۔'' پلان تو فریال کا ہی ہوگا۔ ممکن ہے اسٹاپ اوور کا آئیڈیا لیلیٰ بھابی کا ہو...... کہ یہاں رک کے دیکھو۔''

'' اور یہ آئیڈیا فیل ہو جاتا...... پھر۔''

رابعہ نے کہا۔'' پھر شاید لیلیٰ بھابی اسے نہ روکتی...... کہ جاؤ زندگی تمہاری ہے۔ اسے رفیق جیسے کسی شخص کے لیے ضائع مت کرو۔''

راجانے کہا۔'' مجھے اب شک ہوتا ہے کہ ٹیکسی بھی لیلیٰ بھابی نے نہ بھیجی ہو۔ سوچنے کی بات ہے کہ ست بدھائی جیسی جگہ سے کوئی فون پر ٹیکسی کیسے منگوا سکتا ہے۔ کوئی آئے گا بھی نہیں۔''

رابعہ نے خفگی سے کہا۔'' بس اب اسی طرح سوچتے رہو۔ کہیں اس خط کا مضمون بھی انہوں نے مل کے نہ بنایا ہو؟ یہ ساری سازش فاروقی کے ذہن کی نہ ہو۔ تم تو مجھے بھی سازش کا ڈراما کرنے والوں میں شامل کرلو گے...... تم سے بات کرنا بے کار ہے...... جو چاہو کرو۔''

رابعہ خفا ہو کے چلی گئی تو راجا بولا۔'' کیا واقعی ڈراما ہو سکتا ہے فیکے پتر؟''

'' کیسا ڈراما۔''

'' فریال سے جذباتی ہمدردی رکھنے والی خواتین کا ڈراما...... بلیک میلنگ کا ڈراما...... ایک دھمکی میں دوسری دھمکی۔ میں جا رہی ہوں تمہارے بچے کو لے کر...... ٹو ان ون...... میں ماں بننے والی ہوں...... اور بچے کو تم سے چھین رہی ہوں۔ قانونی کارروائی کا ذکر کوئی نہیں کر رہی۔ حق محفوظ ہے۔ آگے تم خود سمجھدار ہو۔ ٹکٹ لے لیا ہے مگر ابھی ٹرین پر سوار نہیں ہوئی ہوں۔ پلیٹ فارم پر ہوں۔ دوڑو فلمی ہیرو کی طرح اور خود بھی چڑھ جاؤ روانہ ہو جانے والی ٹرین پر۔''

میں نے کہا۔'' راجا صاحب...... اب انجام فلمی ہو یا غیر فلمی۔ یہ ڈراما ہو یا حقیقت...... رومیو جا رہا ہے جیولیٹ سے شادی کرنے...... آج...... ابھی۔''

راجانے کہا۔'' یہ تیری کزن کس سے بات کر رہی ہے؟ چل دیکھتے ہیں۔''

لیکن اس سے پہلے کہ ہم چوری چھپے رابعہ کی گفتگو سن سکتے دروازے سے گارڈ نمودار ہوا۔'' سر...... ڈی ایس پی صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں۔'' اس نے سلیوٹ مار کے کہا۔

'' کون ڈی ایس پی۔'' میں نے کہا۔

'' وہی جو پہلے بھی آئے تھے۔'' گارڈ نے کہا۔

'' ان کے ساتھ دو سادہ کپڑوں والے ہیں۔ وہ بھی افسر لگتے ہیں۔''

میں نے کہا۔'' ٹھیک ہے۔ انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ۔''

ڈی ایس پی کا آنا غیر متوقع نہیں تھا۔ رانا کی برطانیہ سے آنے والی بیٹی اغوا ہوگئی تھی۔ اغوا کرنے والے اسے باپ کی موجودگی میں اس کی لاہور والی کوٹھی سے اٹھا کے لے گئے تھے اور وہ کچھ بھی نہیں کرسکا تھا۔

اس کا شک میری طرف گیا تھا کہ میں نے شامی بادشاہ کے گروہ کی مدد سے یہ کارروائی کی ہوگی اور اس کی بیٹی کو بھی اپنی حویلی میں ہی لا کے بند کر لیا ہوگا۔

یہ ایک فطری بات تھی۔ اس کے یقین کے مطابق (جو غلط بہرحال نہ تھا) شامی بادشاہ سے میرے دوستانہ مراسم تھے اور وہ اپنے گروہ کے ساتھ میری کوٹھی میں ہی مقیم تھا۔ رانا کی قید سے شہناز کو رہا کرانے کی ہر کوشش میں ناکامی کے بعد میں نے جوابی کارروائی کے طور پر اس کی بیٹی کا اغوا کرایا اور اس کار خیر میں شامی بادشاہ کے گروہ کے سوا میری مدد کوئی اور نہیں کرسکتا تھا۔

اس ردعمل کی توقع ہم پہلے سے کر رہے تھے چنانچہ اغوا کی کارروائی مکمل ہوتے ہی شامی بادشاہ اپنے ساتھیوں سمیت نکل گیا اور ہم نے رانا کی بیٹی کے اغوا میں ملوث ہونے کے تمام ثبوت اور شواہد ختم کر دیے۔ رات کو رانا نے غصے اور جھنجلاہٹ کی دیوانگی میں اپنے...... ہتھیاروں کو حویلی پر حملہ کرنے بھیجا۔ وہ مسلح تھے اور اگر حویلی میں داخل ہو جاتے تو شاید کسی کو زندہ نہ چھوڑتے۔ گل رعنا ان کو پھر بھی نہ ملتی۔ وہ شامی بادشاہ کی تحویل میں نہ جانے کہاں تھی۔

میرے محافظوں نے پھر حملہ پسپا کر دیا تھا اور ہم نے اس کی رپورٹ یوں لکھوائی تھی کہ شامی بادشاہ کے گروہ نے ڈاکا ڈالنے کے لیے حویلی پر حملہ کیا تھا لیکن ہم نے انہیں مار بھگایا۔ صبح سویرے جو پولیس انسپکٹر تفتیش کے لیے آیا، اس نے معاوضہ وصول کیا اور ہماری رپورٹ کو صداقت کا سرٹیفکیٹ دے دیا کہ کلاشنکوف کا استعمال اندر سے نہیں باہر سے کیا گیا تھا۔ اندر سے عام اسلحہ اپنے دفاع کے لیے استعمال ہوا جو لائسنس یافتہ تھا۔

اب رانا کے پاس یہ کہنے کی گنجائش نہ رہی تھی کہ شامی بادشاہ میرا حمایتی تھا اور حویلی کے اندر موجود تھا۔ اس نے تو حویلی پر ڈاکا ڈالنے کی کوشش کی تھی کیونکہ حویلی میں اس رات تین کروڑ موجود تھے۔ اس کی مجھ سے دوستی والی بات سفید جھوٹ کے سوا کچھ نہیں اور اس کا حویلی میں ہونا صرف بکواس...... ظاہر ہے اس کے بعد میرا شامی بادشاہ کی مدد سے رانا کی بیٹی گل رعنا کو اغوا کرنے والی اسٹوری بھی جھوٹی...... سچ وہ جو ثابت ہو...... ثبوت کے ساتھ جھوٹ بھی سچ۔

ظاہر ہے قانونی طور پر میری پوزیشن بہت مضبوط اور محفوظ تھی۔ دیکھنا یہ تھا کہ اب رانا کیا پالیسی اپناتا ہے۔ نور جہاں نے تو کہا تھا کہ وہ خود آئے گا تمہارے پاس صلح کرنے...... تمہاری شرائط پر بات کرنے...... وہ خود شہناز کو واپس لائے گا اور ہاتھ جوڑ کے اپنی بیٹی مانگے گا۔ میں بھی اب یقین سے کہہ سکتا تھا کہ ایسا ہی ہوگا...... لیکن فوراً نہیں ہوگا۔ رانا کی عزت کا غرور کاغذ کی ناؤ نہیں کہ فوراً ڈوب جائے۔ ایک بہت عظیم الشان بحری جہاز ہے جو آہستہ آہستہ ڈوبنے میں بھی بہت وقت لگا دیتا ہے۔

جب میں ڈرائنگ روم میں پہنچا تو ڈی ایس پی اٹھ کھڑا ہوا لیکن ایس پی بیٹھا رہا۔ ڈی ایس پی سے میری ملاقات پہلے بھی دوبار ہو چکی تھی۔ ایس پی نیا تھا اور غالباً گزشتہ روز کے واقعات کی تفتیش اس کے سپرد کی گئی تھی۔ اسے اندازہ تو ہو چکا تھا کہ یہ معاملہ سیاسی اسباب رکھتا ہے اور دو طاقتور حریفوں کی بالادستی حاصل کرنے کی جنگ ہے۔ تاہم وہ اپنے عہدے اور اپنی ذمے داری کا بھرم رکھنے کے لیے غیر جانبداری کا ڈراما کرنے پر مجبور تھا اور قانون کا علمبردار بن کے آیا تھا۔

میں نے رسمی انداز میں کہا۔'' کہیے ڈی ایس پی صاحب...... میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔''

ڈی ایس پی نے کہا۔'' پہلے میں آپ کا ایس پی صاحب سے تعارف کرا دوں۔ یہ شمشیر علی خاں ہیں۔ انہیں آئی جی پنجاب نے خاص طور پر بھیجا ہے کہ گزشتہ روز کے واقعات کی رپورٹ دیں۔''

میں نے اخلاقاً ایس پی کی طرف دیکھ کے سر ہلایا۔'' میں ہر طرح کے تعاون کے لیے حاضر ہوں...... لیکن پہلے فرمائیے چائے چلے گی یا کافی۔''

'' ابھی کچھ نہیں...... ہم ڈیوٹی پر ہیں۔'' ایس پی نے کہا۔

میں نے کہا۔'' معاف کیجیے...... آپ کی ڈیوٹی پر

ہم اپنی روایات کو قربان نہیں کر سکتے۔ آپ حویلی میں آئے ہیں تو آپ کا سرکاری عہدہ کچھ بھی ہو۔ آپ کی خاطرداری ہمارا فرض ہے...... ورنہ آپ کو صرف تفتیش کرنی ہے تو ہم پولیس اسٹیشن آجائیں گے۔“

ڈی ایس پی نے کہا۔ ”چلیے پھر جیسی آپ کی خوشی۔“

میں نے آواز لگا کے کہا۔ ”بھئی کوئی ہے...... کافی لاؤ۔“

ایس پی اکڑ میں تھا چنانچہ میں نے ابھی نوابی کا انداز اختیار کر لیا تھا۔ اپنے لیے میں نے ہم کا صیغہ استعمال کیا تھا اور عاجزی وانکساری کا رویہ ترک کر دیا تھا۔ یہ ڈراما وقت کی ضرورت تھا۔ راجا نے اس میں بہت اچھا رول ادا کیا۔

راجا بروقت اندر آیا اور اس نے بڑے اعتماد کے ساتھ دونوں افسران سے مصافحہ کیا...... پھر وہ میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ ”کیا مسئلہ ہے نواب صاحب۔“

میں نے کہا۔ ”یہ راجا صاحب ہیں۔ ان کو آپ میرا پریس سیکریٹری، انفارمیشن آفیسر یا چیف ایڈوائزر سمجھ لیں۔“

ڈی ایس پی مسکرایا۔ ”بطور صحافی ان کا بڑا نام ہے۔“

ایس پی بولا۔ ”غالباً اب بھی آپ کالم لکھتے ہیں...... اور خوب لکھتے ہیں۔“

ڈی ایس پی نے کہا۔ ”چلیں اب کچھ کام کی بات کریں۔ کل ایک واردات یہاں ہوئی۔“

”ڈکیتی کی واردات۔“ ایس پی معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا۔

”یس...... تین کروڑ ڈاکو لے گئے۔“ ڈی ایس پی بولا۔ ”اس کی رپورٹ آپ نے لکھوا دی تھی۔ میں نے دیکھ لی ہے۔ یہ رقم آپ نے کل ہی بنک سے لی تھی۔ یہ بھی ثابت ہے۔“

”لیکن یہ آپ کیسے ثابت کریں گے کہ ڈکیتی کی یہ واردات شامی بادشاہ گروپ نے کی تھی۔“ ڈی ایس پی نے اپنی دانست میں بڑی ذہانت کا سوال کیا۔

میں نے سادگی سے کہا۔ ”میں نے صرف شک [کا] اظہار کیا تھا۔ کچھ بھی ثابت کرنا آپ کا کام ہے۔ ڈاکو پکڑے جائیں گے تو پتا چلے گا کہ میرا شک درست [ہے یا] بے بنیاد۔“

ایس پی نے بدمزہ ہو کے پوچھا۔ ”شک کی بھی [کوئی] وجہ تو ہوتی ہے۔ کیا آپ نے شامی کو یا اس کے گرو[ہ کے] کسی رکن کو پہچان لیا تھا۔“

میں نے کہا۔ ”کیا آپ کے پاس شامی کی تصویر ہے۔“

وہ گڑبڑا گیا۔ ”یہاں...... اس وقت تو نہیں ہے۔“

میں نے افسوس سے کہا۔ ”ہوتی تو بتاتا...... میں نے چہرے ضرور دیکھے تھے ان کے...... میں پہچانتا نہیں کسی کو۔“

ایس پی نے پھر میری بات پکڑ لی۔ ”پھر نام کیسے [لیا] آپ نے شامی کا؟“

میں نے کہا۔ ”اس علاقے میں وہی مشہور ہے۔ بہت دہشت ہے اس کے نام کی...... اور سنا ہے وہ آج کل اس علاقے میں ہے۔“

”کس سے سنا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”راہ چلتے سنا تھا...... دوبار۔“

اب ڈی ایس پی کے لیے افسر اعلیٰ کی تفتیش [میں] دخل نہ دینا مشکل ہو گیا تھا۔ اس نے کہا۔ ”چھوڑیں...... دوسری واردات اغوا کی ہے۔“

”یس“ میں نے راجا کی طرف دیکھا۔ ”ہم [نے] ڈاکٹر شہناز کے اغوا کی رپورٹ لکھوائی تھی۔ ایک [ہفتہ] ہو گیا مگر آپ کے محکمے نے کچھ نہیں کیا۔“

راجا نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ابھی تک پروگریس صفر۔“

ایس پی نے کہا۔ ”رانا رجب علی کی بیٹی اغوا ہوئی ہے۔“

میں نے بے خیالی میں کہا۔ ”کون سی بیٹی...... مطلب ہے ان کی تو بہت سی بیویاں ہیں۔ بیٹیاں بھی ہوں گی۔“

”آپ تفتیش کو سیریس نہیں لے رہے ہیں۔“

ایس پی بگڑ گیا۔ ”اس سے زیادہ سیریس ہونا میرے لیے ممکن نہیں ایس پی صاحب اور سیریس ہو کے آپ فرمائیے کہ مجھے یہ خبر سنانے کا مقصد کیا ہے آخر؟ یا آپ سمجھتے ہیں اسے میں اٹھا لایا ہوں؟“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔

ڈی ایس پی نے پھر صورتِ حال کو سنبھالا۔ ”نواب صاحب...... پلیز...... میں بتاتا ہوں آپ کو...... رانا صاحب کی ایک بیٹی کل لندن سے آئی تھی۔ وہ ایئرپورٹ سے لاہور میں رانا صاحب کی کوٹھی پہنچی تو وہاں کچھ لوگ موجود تھے۔ انہوں نے نوکروں کو باندھ کے ڈال دیا تھا۔ رانا کا کہنا ہے کہ وہ تعداد میں چار تھے اور مسلح تھے۔ انہوں نے رانا کو باتھ روم میں بند کیا اور گل رعنا کو لے گئے۔“

”یہ گل رعنا کون ہے؟“ میں نے غور کرتے ہوئے پوچھا۔

راجا نے کہا۔ ”نواب صاحب...... تقسیم سے قبل دہلی میں نوابزادہ لیاقت علی خاں کی دہلی میں کوٹھی تھی...... گل رعنا۔“

ایس پی خفا ہو گیا۔ ”کمال کرتے ہیں آپ...... یہ مذاق کی بات تو نہیں ہے۔ گل رعنا کوٹھی نہیں رانا کی بیٹی کا نام ہے۔“

ڈی ایس پی نے میرے ردعمل سے پہلے کہا۔ ”آپ سے ذکر اس لیے کر رہے ہیں ایس پی صاحب کہ رانا نے بھی شامی گروپ کو اس کا ذمے دار ٹھہرایا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”ڈاکو تو ڈاکو ہوتے ہیں۔ کسی کا لحاظ نہیں کرتے۔ اب وہ تاوان طلب کریں گے رانا سے۔“

ڈی ایس پی نے ایک گہرا سانس لیا۔ ”پرابلم یہ ہے...... کہ اس نے آپ کو بھی شریکِ جرم بنانے کی کوشش کی تھی۔ اس نے کہا کہ آپ کے شامی سے مراسم ہیں۔ اور وہ آپ کی حویلی میں قیام پذیر ہے۔“

یہ ہنس پڑا۔ ”کیا رپورٹ لکھواتے وقت وہ نشے میں تھا......؟“

راجا بولا۔ ”اور تھا تو آپ نے اس کی بات کو سیریس کیوں لیا۔“

ایس پی نے ناگواری سے کہا۔ ”نواب صاحب...... وہ ایک ایم پی اے اور اس علاقے کا بااثر شخص ہے۔ اس کا ایک فیملی بیک گراؤنڈ ہے سیاست میں۔ ہم اس معاملے کو غیر اہم قرار دے کر نظرانداز نہیں کر سکتے۔“

”اوکے...... پھر جو آپ کو کرنا ہے وہ کریں۔ مجھے امپریس مت کریں ان حوالوں سے۔“ میں نے کہا۔

ڈی ایس پی نے پھر کچھ کہنا چاہا مگر ایس پی نے اسے بولنے نہیں دیا۔ ”دیکھیے میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ یہ لڑائی بند کر دیں...... جو آپ دونوں کے درمیان جاری ہے۔“

”ورنہ؟“ میں نے کہا۔ ”آپ ہم دونوں کو بند کر دیں گے؟“

”پلیز سر...... ایس پی صاحب یہاں آفیشلی تفتیش کے لیے آئے ہیں لیکن درحقیقت ان کو بھیجا گیا ہے ایک امن مشن پر...... آپ میری پوری بات سن لیں۔ آپ بڑے لوگ ہو۔ ہماری حیثیت ہے پبلک سرونٹس کی۔ ہم پر دباؤ آتا ہے دونوں طرف سے۔ چکی کے دو پاٹوں میں ہم پس جاتے ہیں۔ کیا کریں کیا نہ کریں۔ کس کا ہاتھ پکڑیں کس کی زبان۔ ہم اپنا سارا وقت آپ جیسے حاکم طبقے کے مسائل حل کرتے رہتے ہیں۔ جو درحقیقت اقتدار کی بالادستی یا حاکمیت کی جنگ سے پیدا ہوتے ہیں...... ہم اپنا کام کیسے کریں۔“

میں نے راجا کی طرف دیکھا۔ ”بہت کام کرتے ہیں یہ لوگ......“

راجا نے میری تائید کی۔ ”اور سب اچھے کام کرتے ہیں۔“

ڈی ایس پی نے اس حملے کو نظرانداز کر دیا اور ایس پی کو بھی روکا۔ ”یہاں آنے سے پہلے میں رانا صاحب سے ملا تھا۔ اور یہی تجویز ان کے سامنے رکھی تھی بلکہ ان سے گزارش کی تھی...... اور اب آپ سے بھی کرتا ہوں کہ اس دشمنی کے پودے کو جڑ پکڑنے سے پہلے اکھاڑ دیں...... ورنہ یہ نفرت کی فصل آپ دونوں کاٹیں گے اور

جیسا کہ محاورہ ہے...... ہاتھی لڑیں گے اور مینڈک مارے جائیں گے۔"

میں نے کہا۔"رانا صاحب نے کیا جواب دیا آپ کی امن تجاویز کا؟"

ڈی ایس پی نے کہا۔"وہ تعاون کریں گے۔"

"ان کا رسپانس بہت پازیٹو تھا۔" ایس پی نے اضافہ کیا۔

میرا جی چاہا کہ قہقہہ مار کے ہنسوں اور پھر ایس پی کے ہاتھ پر ہاتھ مار کے کہوں۔اب آیا نا اونٹ پہاڑ کے نیچے لیکن میں نے اپنی پُروقار متانت کے ساتھ فرمایا۔"ہم بھی پُرامن بقائے باہمی کی افادیت کے قائل ہیں...... اور ہم نے ابتدا میں کوشش کی تھی کہ رانا صاحب بھی یہ بات سمجھ لیں...... مگر اس وقت ہماری شرافت کو انہوں نے ہماری کمزوری جانا۔"

راجا نے کہا۔"یہ تو اب ہونا ہے۔پہلے گردن میں سریا نظر آتا ہے...... پھر معلوم ہوتا ہے کہ ریڑھ کی ہڈی بھی نہیں...... کمزور سمجھ کے اکڑ گئے اور شہزور تو بچ گئے۔"

ایس پی نے کہا۔"فارگٹ دی پاسٹ...... وہ آپ سے ملنے کے لیے تیار ہیں۔"

میں نے عیاری سے کہا۔"میں ویلکم کرتا ہوں...... جب چاہیں تشریف لے آئیں۔"

"جو آئے آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں۔" راجا بولا۔

ایس پی نے نفی میں سرہلایا۔"انہوں نے آپ کو مدعو کیا ہے۔"

میں نے کیا"ایس پی صاحب۔ان سے کہیے کہ باری ان کی ہے۔دوبار میں نیک نیتی سے ان کی خدمت میں حاضری دے چکا ہوں۔ڈی ایس پی صاحب گواہ ہیں۔میں نے رانا صاحب سے درخواست کی تھی کہ وہ ڈاکٹر شہناز کی بازیابی میں میری مدد کریں۔"

ڈی ایس پی نے تائید میں سرہلایا۔"مجھے معلوم ہے۔"

"پھر تو آپ کو یہ بھی یاد ہوگا کہ خیر سگالی کے اس جذبے کا رانا صاحب نے رعونت سے جواب دیا تھا۔اب میرا جواب ہے نو...... میں تیسری بار اس کے در پر جا[ـنے] کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔"

راجا نے کہا"اگر وہ ضرورت محسوس کرتا ہے تو آ[ـئے] ورنہ......"

"جہنم میں جائے۔" میں نے راجا کا جملہ مکم[ـل] کردیا۔

کچھ دیر کے لیے ایس پی کے چہرے پر برہمی [کے] آثار نظر آئے۔صاف نظر آتا تھا کہ وہ رانا سے نمک خوار[ی] کا حق ادا کررہا ہے۔رانا سے وہ اچھی طرح متعارف [تھا] اور شاید خود رانا نے اسے تفتیش کے لیے نامزد کرا[یا] ہوگا۔امن کا سفیر بن کے وہ رانا کی پگڑی کا شملہ اونچا رکھ[ـوا] سکتا تھا۔اس کے لیے میں ایک نووارد تھا۔ایک نو دولت[یا] جسے نوابی لاٹری ٹکٹ کے انعام کی طرح مل گئی تھی۔م[یں] ولایت پلٹ بھی تھا۔اسے یقین ہوگا کہ میرے دماغ م[یں] خاندانی وڈیروں کی خوبیاں نہیں ہوں گی۔مجھے انا کا پر[چم] بلند کرنے کی عادت نہیں ہوگی اور میں اس کے رعب م[یں] آسانی سے آجاؤں گا۔

جب اس کی یہ غلط فہمی دور ہوگئی تو اس نے اپنا رو[یہ] تبدیل کرلیا۔اس نے خاصے مہذب انداز میں کہا"دیکھیے نواب صاحب...... ایسے تو بات نہیں بنے گی۔جب تک آمنے سامنے بیٹھ کے رنجش اور غلط فہمی ختم نہ ہو۔"

"اب نہ مجھے خوش فہمی ہے نہ غلط فہمی۔یہاں ر[ہ] کے میں نے سب کے مزاج اور فطرت کو سمجھ لیا ہے۔م[یں] جانتا ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے...... جیسے آپ جانتے ہی[ں] کہ آپ کو کیا کرنا چاہیے۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

ڈی ایس پی نے پھر بات کو بگڑنے نہیں دیا۔"نواب صاحب آپ تو ماشاءاللہ انتہائی تعلیم یافتہ ہیں۔"

میں نے کہا۔"اس کا یہ مطلب نہ نکالا جائے کہ م[یں] عزت نفس نہیں رکھتا یا انا پسند نہیں ہوں۔"

ایس پی نے کہا۔"چلیے چھوڑیے۔نہ آپ اس سے ملنے جائیں نہ وہ یہاں آئے۔ہم آپ کی ملاقات کرادیتے ہیں کسی تیسری جگہ......"

میں نے بے رخی سے کہا۔"مجھے کوئی شوق نہیں ہ[ے] اس سے ملنے کا......"

راجا نے کہا۔"میں اور کلیئر کردوں۔رانا کو ملنا ہے تو اسے یہاں آنا ہی ہوگا۔"

"یہ شرط نہیں چلے گی۔" ایس پی مایوسی ہو کے اٹھ کھڑا ہوا۔

"آپ اسے بتادیں۔معاملات برابری کی بنیاد پر طے ہوتے ہیں...... اور ہاں میں جاچکا ہوں اس سے ملنے...... دوبارا سے آنا ہوگا...... اور نہیں تو نہ سہی۔آپ نے اپنا فرض پورا کیا۔اب آپ بیچ میں مت پڑیں۔" میں نے کہا۔

ڈی ایس پی کو بھی اٹھنا پڑا۔"مجھے بہت توقع تھی آپ سے۔"

"غلط توقع تھی ڈی ایس پی صاحب...... میں اپنے خاکروب کے اور شرافت سے ملنے والے کے گھر دس بار جاسکتا ہوں...... لیکن خود کو فرعون سمجھنے والے کی صورت دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا۔اس سے ملنا تو دور کی بات ہے۔" میں نے کہا۔

وہ دونوں منہ لٹکائے رخصت ہوگئے تو ہم نے ایک دوسرے کو اس پرفارمنس پر مبارکباد دی۔

"تو نے تو کمال کردیا نیکے پتر۔"

میں نے راجا سے ہاتھ ملایا۔"بہت کائیاں سمجھتا تھا خود کو یہ ایس پی...... سالا رانا کا چمچہ۔"

"رانا کا تو باپ بھی آئے گا۔" راجا نے کہا۔

میں نے کہا"کتے کی دم کیسے سیدھی ہوئی راجا۔اب مان لے کہ یہ نہ تیرا کمال نہ میرا...... یہ سب نور جہاں کی مدد سے ہوا۔"

راجا نے سرہلایا۔"ماننا پڑتا ہے دوست حالانکہ دل نہیں مانتا کہ وہ عورت اتنی مخلص بھی ہوسکتی ہے...... ان حالات میں۔"

"اگر اس نے یہ ٹپ نہ دی ہوتی تو ہمیں یہ طاقت کیسے حاصل ہوتی۔اگر آج رانا کی رگ دبی ہے تو اسی وجہ سے...... اس کی بیٹی ہمارے قبضے میں ہے۔صرف نور جہاں کی وجہ سے۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک کہتا ہے تو...... لیکن یہ سب پھر بھی ٹھیک نہیں ہے۔پاگل ہے وہ عورت جو یہ سب کررہی ہے۔جانتی ہے کہ اس تعلق کا انجام کیا ہوگا اور پھر بھی۔" راجا نے افسوس سے سرہلایا۔

"اس پاگل پن کا کوئی علاج بھی نہیں۔"

"علاج تو آپ کررہے ہیں حکیم صاحب...... لیکن میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ اچھا کررہے ہیں۔آخر کہاں ختم ہوگا یہ سلسلہ...... فریال تجھے چھوڑ کر چلی گئی۔نور جہاں جان سے جائے گی۔"

"پھر بتا میں کیا کروں۔"

"یہی تو مشکل ہے۔" راجا نے ایک گہری سانس لی۔"میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ اس کھیل کو جاری رکھ...... جتنا فائدہ اٹھا سکتا ہے اٹھالے۔نور جہاں کی پروا مت کر۔اس کا انجام تو صاف نظر آرہا ہے، یہ بڑی سنگدلی اور کمینگی ہوگی۔یہ مشورہ بھی نہیں دے سکتا کہ نور جہاں کو اس انجام سے پہلے بھی نکال کر یہاں لے آ۔اس کو اکبر خاں کے ہاتھوں مرنے سے بچالے...... اس سے مزید خرابی پیدا ہوگی۔"

میں نے کہا"خود میری سمجھ میں نہیں آتا۔"

"تیری سمجھ میں کیا آئے گا پتر...... تو مزے لوٹ رہا ہے اور فائدہ بھی اٹھا رہا ہے۔ہم خرما و ہم ثواب۔تیری تو مت ماردی ہے اس جادوگرنی نے...... کوئی توڑ نہیں اس کے حسن وشباب کے جادو کا...... لیکن میں کہتا ہوں...... بس بہت ہوگیا۔نہیں چاہیے ہمیں اس قیمت پر یہ مدد...... جتنا اس نے کردیا وہ کافی ہے۔اب تو پیچھے ہٹ جا۔چھوڑ دے اسے...... ابھی کچھ نہیں بگڑا...... نکل آ اس کے جال سے...... تو یہ کرسکتا ہے نیکے پتر۔" راجا نے محبت سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

میں نے سرہلا دیا۔"مجھے ایسا کرنا ہوگا۔"

رابعہ نے اندر جھانک کے دیکھا۔"تم ابھی تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہو کزن۔"

"ہرگز نہیں...... میں ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھا ہوں۔" میں نے کہا۔

وہ اندر آگئی۔"وہ سرکاری فرشتے تو چلے گئے کب کے۔تمہاری خفیہ میٹنگ چل رہی ہے۔"

راجا بولا۔"اب یہ خفیہ نہیں رہی محترمہ۔"

''میں کہتی ہوں اب دیر کس بات کی۔ تم جاؤ...... فریال کو لے کر آؤ فوراً...... اٹھو۔''

میں نے کہا۔''بقول شاعر...... اس سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے۔''

رابعہ مزید خفا ہوگئی۔''بس تمہیں تسلی ہوگئی ہے نا کہ ایسے میں خالی خولی دھمکی تھی اس کا خط...... یہاں سے نکل کے فاروقی کے گھر میں جا بیٹھی...... ہمت نہیں تھی دھمکی پر عمل کرنے کی اور جائے گی تو کہاں جائے گی۔''

''تم میرے جذبات کی غلط ترجمانی کر رہی ہو۔'' میں نے کہا۔

''نہیں...... تم خالص مردانہ فطرت کا مظاہرہ کر رہے ہو۔''

میں نے کہا''اگر زنانہ فطرت کا مظاہرہ کیا تو وہ نظر آؤں گا...... جو تالی بجا کے بات کرتے ہیں۔''

''دیکھو کزن...... ایسا نہ ہو کہ تمہیں پچھتانا پڑے...... دیر ہو جائے اور تمہیں ساری عمر رونا پڑے۔ اس جذباتی کیفیت میں وہ کوئی اور غلط قدم اٹھالے۔ یہ سمجھ لے کہ تم پر کوئی اثر نہیں ہوا...... اور مایوسی میں خودکشی کرلے...... کم سے کم بات کرلو فون پر۔''

میں نے کہا۔'' اوکے...... میں کوشش کرتا ہوں...... مگر مجھے معلوم ہے لیلیٰ بھابی کا جواب کیا ہوگا۔''

''جواب کی فکر مت کرو۔ فریال کو تمہاری تشویش اور پریشانی کا یقین تو آجائے گا۔ کہہ دو کہ میں آرہا ہوں اسے منانے۔''

رابعہ کی بات میرے دل کو لگی۔ میں نے فاروقی کے گھر کا نمبر ملایا مگر وہ مصروف تھا۔ میں نے لیلیٰ بھابی کے موبائل فون پر کوشش کی۔ کال مل گئی لیکن اس نے شاید میرا نمبر دیکھا تو فون بند کر دیا۔ فاروقی کے بارے میں مجھے معلوم تھا کہ وہ کورٹ میں ہو تو اپنا موبائل فون بند رکھتا ہے۔

میں نے کہا''ڈیئر کزن...... مجھ سے کوئی بات کرنے کو تیار نہیں۔ کیا تم میری خاطر ایک چھوٹا سا جھوٹ بول سکتی ہو؟''

''پہلے بتاؤ کیا جھوٹ بول سکتی ہو۔''

میں نے کہا''تم کہہ دو...... کہ مجنوں تو کب کا نکل گیا اپنی لیلیٰ سے ملنے کے لیے۔''

رابعہ نے نفی میں سر ہلا دیا۔''ہرگز نہیں...... پہلے تم نکل جاؤ...... پھر میں ایسا کہوں گی تو جھوٹ نہیں ہوگا۔''

میں نے کہا۔''اوکے...... میں جا رہا ہوں۔ اسے منا کے لانا تھا کوئی مشکل نہیں۔ بہت تجربہ ہے مجھے لیکن تم کو اللہ اس کا اجر دے گا۔ یہ تو کہہ دو کہیں میرے پہنچنے سے پہلے فریال خودکشی بھی نہ کرلے۔''

وہ مسکرائی۔'' کچھ میری قدر کرو کزن۔ تمہارا کتنا خیال رکھتی ہوں میں۔ ایک جھوٹ نہیں۔ دس جھوٹ بول چکی ہوں تمہارے خاطر...... کہہ چکی ہوں کہ نواب صاحب کا دل خراب ہے۔ دن میں تارے نظر آگئے ہیں خط پڑھ کے۔ جلاب لگ گئے ہیں۔ آنکھوں سے آنسو بہ رہے ہیں۔ لوٹا لیے بھاگے چلے آرہے ہیں۔ لیلیٰ بھابی نے یقین تو نہیں کیا مگر مجھے پتا ہے وہ فریال کو بتا دیں گی کہ تمہارے آنے کے بعد رفیق کی کیا حالت ہوئی۔ فکر نہیں کرو...... وہ آئے گا سر کے بل۔''

''یو آر گریٹ کزن۔'' میں اٹھ کھڑا ہوا۔''حالات اب بہتری کی جانب جا رہے ہیں۔ بہت جلد سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''پھر یہ پولیس افسران کیوں آئے تھے۔''

''یہ تمہیں بتائے گا راجا۔''

راجا نے کہا''شامی سے رابطے کی کوئی صورت ہونی چاہیے۔ اگر مجبوری رانا کو ہمارے در پر لے آئی تو مذاکرات کیسے آگے بڑھیں گے؟ قیدیوں کے تبادلے کی بات کیسے ہوگی۔''

میں نے کہا۔'' راجا...... اب ترپ کے پتے ہمارے ہاتھ میں ہیں۔ ہم جلد بازی سے کام نہیں لیں گے۔ ہر چال سوچ سمجھ کے چلنی ہوگی۔''

''وہ تو ہے...... لیکن مزید تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔ ایک مہینہ ہو گیا شہناز کو اس حرامزادے کی قید میں۔ اس کے لیے ایک ایک دن بھاری ہے؟۔''

میں نے کہا۔''میں جانتا ہوں۔ بس تھوڑا سا صبر۔''

''اب امید پیدا ہوئی ہے تو میرے لیے صبر مشکل

ہے۔ میں چاہتا ہوں وہ آئے تو ہم سیدھی صاف بات کریں۔ شہناز کو لاؤ اور اپنی بیٹی کو لے جاؤ...... گل رعنا کو یہاں ہونا چاہیے۔''

میں نے کہا۔''راجا...... ہمیں پتا ہونا چاہیے کہ وہ کہاں ہے...... لیکن اسے یہاں نہیں ہونا چاہیے۔ کیا ضرورت ہے یہ رسک لینے کی۔ کل کو وہ ہمارے خلاف کوئی بات نہ کرے کہ مجھے اس حویلی میں رکھا گیا تھا اور یہ لوگ تھے مجھے قید میں رکھنے والے...... لیکن میں شامی سے رابطہ کرتا ہوں...... اول تو امید ہے وہ خود ہی کوئی پیغام بھیجے گا...... وہ بے تعلق ہو کے نہیں بیٹھا رہے گا۔''

دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا تھا لیکن مجھے بھوک بالکل نہیں تھی...... میں گاڑی میں روانہ ہونے لگا تو غنی نے کہا کہ وہ میرے ساتھ جائے گا مگر میں نے اس کو سمجھا دیا کہ اسے یہاں رہنا چاہیے۔ گیٹ اندر سے کھولنے والا گارڈ وہی تھا جو شامی کے نام پر ڈرامے باز مجذوب کا بڑا عقیدت مند تھا اور اسے بہت پہنچا ہوا اللہ لوک کو سمجھتا تھا حالانکہ وہ مصدقہ اطلاعات کے مطابق پولیس کا مخبر بھی تھا اور ڈاکوؤں کا بھی۔

میں نے گاڑی روک کے کہا۔'' گارڈ، تم نے اس پاگل کو نہیں دیکھا ہے جو شاہی کا پوسٹ مین ہے۔''

گارڈ کا چہرہ دکھی ہو گیا۔''سر...... وہ پاگل نہیں ہے۔ شاہی بادشاہ خود اس کا مرید ہے۔ اس کے ہاتھ پر بیعت کر چکا ہے۔''

میں نے کہا۔''وہ نظر آئے تو کہنا کہ نواب صاحب ملنا چاہتے ہیں شامی سے۔''

''آج صبح وہ ایک پیڑ پر چڑھا ہوا تھا...... شاید وہیں ہو۔''

میں نے کہا۔''پیڑ پر کیا کر رہا تھا۔''

گارڈ نے کہا۔''اس نے بتایا کہ کسی جن کو پکڑنے چڑھا تھا...... جن اس پیپل پر رہتا ہے...... لوگوں کو تنگ کرتا۔''

''پھر کیا جن نے اسے پکڑ لیا تھا۔''

گارڈ پھر دکھی ہو گیا۔''جن موجود نہیں تھا سر...... آج کل وہ کسی لڑکی پر آیا ہوا ہے۔ لڑکی کے گھر والے اسے گجرات لے گئے ہیں۔ شاہ دولہ کے مزار پر۔ جن اس لڑکی کو چھوڑے گا تو وہیں آئے گا جہاں رہتا ہے۔ سائیں اللہ لوک اس کو پکڑ لیں گے۔''

''کیسے پکڑ لیں گے؟ کسی جال سے...... اور پکڑ کے کچھ کریں گے؟''

''سر...... وہ جن کو بوتل میں بند کر دیتے ہیں اور بوتل کو مضبوطی سے بند کر کے دریا میں غرق کر دیتے ہیں...... مجھے تو پتا نہیں تھا۔ اِدھر سے گزرا تو اوپر سے پانی گرا میرے اوپر...... میں حیران ہوا کہ بادل نہیں...... بارش کیسے ہو رہی ہے...... لیکن وہ سائیں اللہ لوک تھے۔''

مجھے ہنسی آئی۔''انہوں نے تمہیں بھی پاک کر دیا۔ چلو کسی کو بتاؤ وہ کہاں ٹنگے ہوئے ہیں۔ میرا پیغام پہنچا دو۔''

اس جہالت کا علاج کچھ نہیں تھا۔ یہ خوش عقیدہ لوگ انہی فقیروں اور جعلی پیروں پر آسرا کرتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ ان کو وسیلہ بنائے بغیر اللہ تک ان کی دعا نہیں پہنچتی۔ کوئی مراد پوری نہیں ہوتی۔ میں گارڈ کی بے وقوفی یا سادہ لوحی پر مسکراتا آگے بڑھ رہا تھا جب اچانک وہ میرے سامنے آگیا۔

گاڑی اس وقت پل پر تھی۔ میں حیران تھا کہ وہ کہاں سے نمودار ہو گیا۔ پل کی چوڑائی اتنی ہی تھی کہ اس پر سے ایک وقت میں ایک گاڑی گزر سکتی تھی۔ وہ عین وسط میں آ کے ناچنے لگا تو میں نے بریک لگائے اور نیچے اترا۔

میں نے کہا''کیا تم خودکشی کرنا چاہتے ہو۔ اگر میں گاڑی نہ روکتا تو تم نیچے آجاتے۔''

اس نے نعرہ لگایا۔''کون نیچے...... کون اوپر...... یہ تو نہیں جانتا...... دیکھ اوپر کیا ہے...... آسمان...... نیچے کیا ہے...... زمین۔''

میں نے کہا۔''کیا تم میری بات سنو گے۔''

اس نے ایک ہاتھ اوپر اٹھایا پھر نیچے کیا۔''بندہ کہاں جاتا ہے۔ نیچے...... زمین کے نیچے...... اور کہاں پہنچاتا ہے؟ اوپر...... آسمان پر۔'' اس نے ہاتھ کو اوپر اٹھا کے آسمان کی طرف دیکھا۔

میں نے کہا۔''بند کرو یہ ڈراما ورنہ میں تمہیں پل

سے نیچے پھینک دوں گا۔ پہنچ جاؤ گے آسمان پر۔"
وہ گول گول گھوم کے ناچنے لگا۔ "زمین سے آسمان تک کون سا پل ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں۔" پھر وہ پلٹ کے اس طرح نعرے لگاتا رقص کرتا آگے چلنے لگا۔ میری دھمکی سے وہ ذرا بھی متاثر نہیں ہوا تھا۔ میں اسے دیکھتا رہا کہ وہ پل میں اترے تو میں گاڑی کو آگے بڑھاؤں۔ جہل میں مبتلا لوگوں کے لیے وہ صاحب کرامات تھا۔ میرے لیے دیوانہ مگر درحقیقت کچھ بھی نہیں تھا۔ فارسی میں کہتے ہیں دیوانہ بکار خویش ہوشیار۔ وہ ایسا ہی تھا۔ پولیس اور ڈاکوؤں کے لیے مخبری اور ان کے درمیان رابطے کا خطرناک کام کرنے والا اللہ لوک یا پاگل کیسے ہوسکتا تھا۔ وہ عام آدمی سے زیادہ سیانا اور دنیا دار تھا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ آخر اسے یہ سوانگ رچانے کی کیا ضرورت تھی۔ شاید اس طرح وہ ہر جگہ پہنچ جاتا تھا۔ ہر ایک کا اعتماد حاصل کر لیتا تھا اور بے ضرر سمجھا جاتا تھا۔

راستہ صاف ہو جانے کے بعد میں نے پھر گاڑی اسٹارٹ کی تو میری نظر پل پر پڑی ہوئی کسی چیز پر گئی جو دھوپ سے چمک رہی تھی۔ میں پھر اتر کے گیا اور اس چیز کو اٹھا لیا۔ یہ ایک بالکل نیا اور چھوٹا سا موبائل فون تھا۔ شک کی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ یہ فون پہلے وہاں ہوتا تو اس پر میری نظر ضرور پڑتی۔ یہ وہی سائیں اللہ لوک ڈراپ کر کے گیا تھا۔ میری نظر اس کی طرف تھی اور اس کے ڈرامائی پرفارمنس کی طرف...... اس نے بڑی صفائی سے فون گرا دیا اور اس طرح رقص کرتا آگے بڑھ گیا۔

فون کے اسکرین پر ایک نمبر آیا ہوا تھا۔ میں نے ذہن پر زور دے کر یاد کرنے کی کوشش کی لیکن یاد نہ آیا کہ نمبر کس کا ہے۔ یہ نمبر ڈائل کرنے کے لیے ملایا گیا تھا لیکن کال ملانے والا بٹن دبایا نہیں گیا تھا چنانچہ اسکرین پر موجود تھا۔ نمبر اب میرے ذہن میں محفوظ ہو چکا تھا۔ میں نے فون کی میموری چیک کی لیکن اس میں اور کچھ بھی نہیں تھا۔ یہ نئے کنکشن کی سم تھی جو کسی نے استعمال نہیں کی تھی۔

گاڑی میں بیٹھ کے میں نے وہ نمبر ملایا...... نہ جانے کہاں گھنٹی بجی پھر کسی نے کہا۔ "یہ کال ملانے کے بعد آپ جہلم کے ریلوے اسٹیشن پر آجائیں۔" بولنے والی کوئی عورت تھی اور پیغام ریکارڈ شدہ تھا۔ چند سیکنڈ کے وقفے کے بعد یہی جملہ پھر دہرایا گیا۔ دوسری طرف کوئی ٹیپ ریکارڈ چل رہا تھا یا آنسرنگ مشین تھی۔ میں نے فون بند کر دیا اور گاڑی آگے بڑھائی۔

آخر یہ کس کا نمبر ہوسکتا ہے اور مجھے جہلم کے ریلوے اسٹیشن پر بلانا چہ معنی دارد...... وہ دیوانہ غائب ہو گیا تھا۔ میری نظر نے اسے ہر طرف تلاش کیا لیکن ویران جنگل میں گم ہونا بہت آسان تھا۔ پہلا خیال بھی تھا کہ مجھے شاہی بادشاہ نے بلایا ہوگا مگر وہ دیوانہ صرف اس کا ہی نامہ بر نہیں تھا۔ وہ پولیس کے رابطے کا کام بھی کرتا تھا۔ صبح دو بہت ہوشیار پولیس افسر مجھ سے ملنے آئے تھے۔ کہیں ان کے ذریعے مجھے پھانسا تو نہیں جا رہا۔ جہلم کے اسٹیشن سے مجھے کہیں اور لے جایا جائے۔ ایس پی کا دفتر جہلم میں ہی تھا۔ میری رانا سے ملاقات کا بندوبست ہو۔ گاڑی چلاتے ہوئے میں نے کسی امید کے بغیر دوبارہ اس نمبر پر کال کی اور مجھے پھر وہی آواز سننے کو ملی اور وہی ایک جملہ۔

اب میرے ذہن میں الجھن پیدا کرنے والا سوال یہ بھی تھا کہ کیا مجھے جہلم کے ریلوے اسٹیشن جانا چاہیے یا یہ کوئی فریب کا جال تو نہیں ہے۔ میں تو فریال کو منا کر لانے کے ارادے سے نکلا تھا۔ تو مجھے لاہور کی طرف ہی جانا چاہیے یا پھر جہلم میں رک کر دیکھنا چاہیے کہ پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے......؟ جہلم کے ریلوے اسٹیشن پر کون ملتا ہے۔ نہ جانے کیوں اس وقت میرے بے سمت بھٹکنے والے دماغ میں ایک خیال یہ بھی آیا کہ کہیں یہ نور جہاں کی چال تو نہیں۔ وہ ملنے کے لیے نت نئے پر اسرار طریقے آزماتی تھی۔ اس خیال کو میں نے فوراً مسترد کر دیا۔

دینہ کی سڑک سے جی ٹی روڈ پر مڑنے سے پہلے مجھے سوچنا پڑا کہ میں دائیں طرف جاؤں یا بائیں طرف...... پھر میں نے جہلم جانے کا فیصلہ کیا۔ فریال کی طرف سے مجھے اطمینان تھا کہ وہ فاروقی کے گھر سے کہیں نہیں جا رہی اور اب میرے آنے کا یقین ہے تو تمام ناراضی کے باوجود وہ بے چینی سے انتظار کرے گی۔

عورت کی ذات بھی کیا عجوبہ قدرت ہے۔ غصے کا ابال آیا تو نوٹس دے دیا کہ میں جا رہی ہوں۔ آدھے راستے میں غصہ اتر گیا تو بہانہ کہ چلو مجھے منالو۔ ایک چانس ہے تمہارے لیے۔ اب چاہنے والے کا فرض ہے کہ دست بستہ سر کے بل جا کے کہے کہ بیوی آنکھیں کھولو میں تمہارا غلام۔

میں نے راجا کو فون کر کے ساری بات بتائی۔

"بہت غور و غوض کے بعد میں نے جہلم جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"اگر یہ کہانی سچی ہے۔"

میں نے کہا"اگر کا کیا مطلب۔"

"ایک کہانی تو نے مجھے بھی سنائی تھی کہ گاڑی خراب ہوگئی۔ بال بیرنگ ٹوٹ گیا اور تجھے رکنا پڑا گجرات میں۔ اس رات تو نور جہاں کے ساتھ تھا۔"

میں نے کہا۔" بکواس بند کر۔ تجھے اس لیے بتا رہا ہوں کہ یہ پیغام اپنے شامی بادشاہ کا ہوا تو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ ہم خود بھی رابطہ کرنا چاہتے تھے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے...... لیکن تجھے محتاط رہنا چاہیے۔"

میں نے کہا۔" شامی بادشاہ کی قسمت کے ستارے آج کل گردش میں ہیں۔ ہماری دوستی اسے مہنگی پڑ رہی ہے۔"

"اور ہم نے اچھی دوستی نبھائی کہ اس کے خلاف ڈکیتی کی رپورٹ لکھوا دی۔ رانا پہلے ہی اس کے خلاف اپنا اثر و رسوخ استعمال کر رہا ہے۔"

میں نے کہا۔" شاید اس لیے وہ زیادہ محتاط ہے...... مجھے بھی ڈیرے تک براہ راست نہیں لے جایا گیا تھا۔ اب بات آگے بڑھی ہے تو مجھے جانا ہی چاہیے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ اس میں کچھ وقت لگ جائے۔"

"وہاں فریال کا کیا ہوگا وہ تو اور خفا ہوگی نکے پتر۔"

"زیادہ خفا ہوگی تو زیادہ منالیں گے یار۔ شہناز کی بازیابی کا مسئلہ زیادہ اہم ہے یا فریال کی ناراضی کا......؟"

"اہم تو یہی ہے کہ رانا اگر شہناز کو لائے تو ہم بھی اس پوزیشن میں ہوں کہ اس کی بیٹی واپس کر دیں...... لیکن تو اسے اپنے ساتھ لانے کی غلطی مت کرنا۔" راجا نے کہا۔

"یار اتنا اناڑی نہیں ہوں میں...... لیکن تجھے پہلے سے بتا دوں۔ مجھے لاہور پہنچنے میں دیر لگی تو میں کوئی جھوٹ بولوں گا۔ بولنا پڑے گا۔"

"جھوٹ کو اللہ معاف کرنے والا ہے...... مگر بیٹے اس جھوٹ کا رشتہ فریال پھر اس سے نہ جوڑے۔ شک، حسد اور رقابت میں عورت کا دماغ کچھ زیادہ ہی ماؤف ہو جاتا ہے۔"

"اسی لیے تو تجھے بتا رہا ہوں...... بعد میں حقیقت سامنے آ ہی جائے گی۔" میں نے کہا۔

"چل جو بھی صورتِ حال ہو...... مجھے بتا دینا۔"

میری گاڑی اس وقت تک جہلم کی حدود میں داخل ہو چکی تھی۔ ریلوے اسٹیشن کا راستہ مجھے لوگوں سے پوچھنا پڑا۔ وہاں کا منظر وہی تھا جو ہر ریلوے اسٹیشن کا ہوتا ہے۔ آنے والے مسافروں کا اژدھام اور افراتفری۔ تانگے، رکشا اور سوزوکیوں کا بے ترتیب ہجوم...... میں آہستہ آہستہ ہر طرف دیکھتا گاڑی بچاتا آگے بڑھتا گیا۔

بہت سی کاریں اس حصے میں کھڑی تھیں جو پارکنگ کے لیے مخصوص تھا۔ ان میں پرائیویٹ ٹیکسی والے بھی تھے جو سواری کے انتظار میں اپنی سجی سجائی گاڑیاں چمکانے میں مصروف تھے۔ اسٹیشن پر اندر جانے کے لیے ضروری تھا کہ میں بھی گاڑی کو پارک کروں۔ اس کے بعد پلیٹ فارم پر کھڑا منتظر رہوں کہ کوئی میرے پاس آئے یا مجھے مزید ہدایات دینے کے لیے فون کرے۔

ابھی میں نے گاڑی روکی ہی تھی کہ ہلکی ہلکی داڑھی والا ایک نوجوان نمودار ہوگیا۔ وہ پارکنگ فیس وصول کرنے کے چکر میں تھا لیکن پھر اس نے گاڑی پر اور نمبر پلیٹ پر غور کیا تو اس کا ہاتھ ٹکٹ پھاڑتے پھاڑتے رک گیا۔

اس نے مجھے غور سے دیکھا۔" آپ کا نام رفیق احمد ہے۔"

میں نے کہا۔"تم تو کمال کے آدمی ہو۔ صورت دیکھ کے نام بتا دیتے ہو۔"

اس نے اپنی بتیسی دکھائی۔" آپ کو انتظار کرنا پڑے

گا۔"

"کس کا؟...... ویسے تو زندگی مسلسل انتظار ہے۔"

میں نے کہا۔" کون آنے والا ہے مجھ سے ملنے؟"

اس نے جاتے جاتے کہا۔" یہ تو مجھے پتا نہیں۔"

اب ایک صورت یہ تھی کہ میں دوڑ کر اسے پکڑوں اور اس سے پوچھوں کہ اسے میرے بارے میں کس نے بتایا اور پیغام پہنچانے کے لیے اسے ہی کیوں منتخب کیا گیا یا پھر میں خاموشی سے انتظار کروں۔ میں نے دوسری صورت کو ترجیح دی گاڑی بند کر کے میں باہر دیکھتا رہا۔ انہیں جو آ جا رہے تھے یا گاڑیوں میں گزر رہے تھے کہ میری طرف کوئی متوجہ ہے۔ پارکنگ فیس وصول کرنے والا بے تعلقی سے اپنے کام میں مصروف ہوگیا تھا اور نہ جانے کدھر چلا گیا تھا۔

جب فون کی گھنٹی بجی تو میں چونک پڑا۔ یہ میرا نیا فون تھا جس کا نمبر بھی مجھے معلوم نہیں تھا۔ اسکرین پر بھی ایک نمبر نظر آ رہا تھا۔ یہ کسی موبائل فون کا نہیں بلکہ لوکل کال کو ظاہر کرتا تھا۔

میں نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔" ہیلو۔"

دوسری طرف سے شامی بادشاہ کی آواز سنائی دی۔

"ویلکم نواب دوست...... خلافِ توقع تم بہت جلدی آگئے۔ اس لیے انتظار کرنا پڑا۔"

میں نے کہا" تمہارا نامہ بر بڑے وقت پر نمودار ہوا۔ نکلا تو میں کہیں اور جانے کے لیے تھا۔ فوراً ادھر چل پڑا۔"

"اچھا اب گاڑی وہیں چھوڑ دو۔ پیچھے آؤ...... نہیں نہیں لانے کے لیے گاڑی موجود ہے۔ دس سال پرانی سوزوکی مہران ہے۔ سفید رنگ کی۔"

میں نے کہا۔" نمبر بتا دو۔"

"مجھے نہیں معلوم ڈرائیور نے کیا نمبر لگا رکھا ہے۔ وہ تمہیں پہچانتا ہے...... ڈرنے کی کوئی بات نہیں...... ممکن ہے تم بھی اسے پہچان لو۔"

میں نے کہا...... "اوکے...... کتنا وقت لگے گا تم تک پہنچنے میں۔"

"زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹا......" شامی نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں گاڑی کو لاک کر کے اترا اور پارکنگ لاٹ میں کھڑی ہوئی گاڑیوں کی قطار سے گزرتا ہوا پیچھے گیا۔ ایک سفید مہران تیسری قطار کے آخر میں تھی۔ ایک اور مجھے بالکل آخری حصے میں دکھائی دی۔ اس کا ڈرائیور ہاتھ باندھے گاڑی کا سہارا لیے کھڑا تھا اور بظاہر اطمینان سے سگریٹ پی رہا تھا۔ غور کرنے پر مجھے اس کی صورت میں آشنائی کی جھلک محسوس ہوئی۔ شاید میں نے اسے شامی کے ڈیرے پر دیکھا ہوگا۔ وہ ان ساتھیوں میں شامل نہیں تھا جو گزشتہ ہفتے حویلی میں میرے مہمان رہے تھے۔

میرے قریب جاتے ہی ڈرائیور نے مسکرا کے گاڑی کے پیچھے والا دروازہ کھول دیا۔ میں اللہ کا نام لے کر بیٹھ گیا۔ ڈرائیور نے گیٹ بند کیا اور آگے بیٹھ کے گاڑی اسٹارٹ کی۔

میں نے اس سے پوچھا......" تم مجھے جانتے ہو؟"

اس نے مختصراً کہا۔" یس سر۔"

گاڑی اسی راستے پر واپس چل پڑی جس پر میں سفر کر کے یہاں پہنچا تھا پھر ایک سائیڈ روڈ پر مڑ گئی۔ میں ان راستوں سے آشنا تھا۔ اگلے بیس منٹ تک میں باہر دیکھتا رہا۔ بازار ختم ہوئے تو کوئی رہائشی آبادی شروع ہوگئی جو سیٹلائٹ ٹاؤن جیسی نئی اسکیم لگتی تھی اور ہنوز پوری طرح آباد نہیں تھی۔ آگے جا کے غیر آباد علاقے کا تناسب زیادہ ہوگیا جو مکان بنے ہوئے تھے، وہ ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر تھے۔ درمیان کے پلاٹ ہنوز مالکوں کے انتظار میں تھے۔ اچانک ڈرائیور نے گاڑی روک دی اور انگلی کے اشارے سے ایک گھر کی نشاندہی کی۔

"آپ یہاں چلے جائیں۔"

میں کچھ حیران ہو کے اترا۔" یہ کس کا گھر ہے؟"

اس نے میری بات کا کوئی جواب دینا مناسب نہیں سمجھا اور مجھے اتار کے پتلی سی سڑک پر سیدھا آگے نکل گیا۔ وہ گھر سڑک سے تقریباً سو گز دور ہوگا۔ درمیانی فاصلہ غیر آباد پلاٹس پر مشتمل تھا۔ ایک پلاٹ پر کسی کی فصل بھی لہلہا رہی تھی۔ پیچھے کسی نے چھپر ڈال کے بھینسوں کا باڑا بنا لیا تھا۔ اس گھر سے نزدیک ترین گھر بھی پچاس

ساٹھ گز دور ہوگا بلکہ اس سارے علاقے میں گھر اسی طرح دور دور بکھرے ہوئے تھے۔ صاف نظر آتا تھا کہ بنانے والوں نے گھر تو بنائے مگر آباد ..... بہت کم ہوئے حالانکہ علاقے میں بجلی اور ٹیلی فون کے پول جدید زندگی کی ضروریات کی دستیابی ظاہر کرتے تھے۔

گلیاں ہنوز کچی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ اس گھر کا جغرافیائی محلِ وقوع کہیں دریا کے نزدیک ہوسکتا تھا۔ مکان مکمل اور واجبی حد تک خوبصورت بھی تھا۔ اس کے باہر کسی نام کی تختی نہیں تھی لیکن اوپر کسی نے ''کرائے کے لیے خالی ہے۔'' لکھ کر ایک کاغذ چپکا دیا تھا۔

میں نے کال بیل بجائی تو اندر سے ڈنگ ڈانگ کی آواز صاف سنائی دی۔ آس پاس غیر معمولی خاموشی تھی۔ میں نے کسی کے گیٹ تک آتے قدموں کی چاپ بھی واضح سنی ...... پھر دروازے کی اوٹ سے شامی کا مسکراتا چہرہ دکھائی دیا۔ اس مسکراہٹ نے میری آدھی تشویش دور کردی۔

کچھ وقت رسمی باتوں میں گزر گیا۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا پیو گے ...... چائے کافی۔''

میں نے کہا۔ ''سچ پوچھو تو میں کچھ کھانا چاہتا ہوں۔ کیا ملے گا۔''

''کھانا ملے گا ...... تھوڑی دیر لگے گی۔'' وہ اٹھ کے اندر چلا گیا۔

میں نے سادگی سے آراستہ کمرے کو دیکھا۔ گزارے کے لیے اس میں ایک پرانا صوفہ رکھ دیا گیا تھا۔ چار کرسیاں نئی تھیں۔ درمیان والی میز بھی پرانی تھی۔ ظاہر ہے وقتی ضرورت کے لیے کرائے پر حاصل کیے جانے والا یہ مکان شامی کا عارضی ٹھکانہ تھا۔

جب وہ واپس آیا تو میں نے کہا۔ ''شامی ...... وہ کہاں ہے!اسی مکان میں۔''

شامی نے کہا۔ ''اور کہاں ہوگی۔''

''کیا تم نے اسے تہ خانے میں باندھ کے رکھا ہے؟ منہ میں کپڑا ٹھونس کے۔''

وہ کہنے لگا۔ ''نہیں نواب دوست۔ وہ ولایت میں پلی لڑکی تو مر جاتی اگر اس کے ساتھ یہ سلوک ہوتا۔ وہ آرام سے اپنے کمرے میں ہے۔ میں اس کا جیلر نہیں محافظ ہوں۔''

''تمہیں کوئی ڈر نہیں کہ وہ بھاگ جائے گی۔''

''اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں ...... کھڑکی دروازے سب کھلے ہیں۔ فون بھی ہے مگر اس کی دسترس میں نہیں۔''

میری حیرت میں اضافہ ہوا۔ ''ایسا کیا جادو کیا ہے تم نے اس پر؟ اوہ ...... میں سمجھ گیا ...... تم نے اسے سلا رکھا ہے۔ خواب آور دوا دے کر۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ...... ابھی تم خود اس سے مل لوگے ...... وہ بھی تمہارا انتظار کر رہی تھی۔''

میں نے کہا ''یار میری تو عقل چکرا گئی ہے۔ اغوا ہونے والوں اور کرنے والوں کے درمیان ایسا تعاون کا جذبہ کیسے پیدا ہوا؟''

شامی نے کہا۔ ''ظاہر ہے اغوا ہونے کے بعد وہ سخت مشتعل اور خوفزدہ تھی۔ بہت چیخ پکار کر رہی تھی میں نے سب سنا اور تحمل سے کام لیا۔ اس کے ساتھ محبت اور نرمی کا سلوک کیا۔ پہلے وہ کچھ سننے پر راضی نہ تھی ...... آہستہ آہستہ میرے شریفانہ رویے کا اثر ہونے لگا۔ اسے احساس ہوا کہ اغوا کرنے والا کوئی خطرناک ارادہ نہیں رکھتا۔ پڑھی لکھی اور شریف لڑکی ہے۔ میں اس انگریزی میں بات کر رہا تھا۔''

''کیا اسے اردو بالکل نہیں آتی؟''

''آتی ہے ...... لیکن عادت انگریزی بولنے کی ہے ...... قدرتی طور پر اس نے سب سے پہلے یہ پوچھا کہ اسے کیوں اغوا کیا گیا ہے۔ اغوا ہونے والا مرد ہو تو سمجھتا ہے کہ اس کے بدلے تاوان وصول کیا جائے گا۔ عورت ایک اضافی ڈر رکھتی ہے کہ اس کا ریپ کیا جائے گا۔ اجتماعی آبروریزی کی دہشت بھی ہوتی ہے۔ میں نے اسے تسلی دی کہ اغوا کا مقصد وہ نہیں جو اس کے ذہن میں ہے۔ اس نے آفر کی تھی کہ میں رقم بتاؤں ...... وہ اپنے باپ سے منگوا دے گی ...... اس کی گارنٹی بھی دے رہی تھی کہ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ نہ ابھی نہ بعد میں ...... ایک پورا دن اسے یہ سمجھانے میں لگ گیا کہ اس کے اغوا کا مقصد کیا ہے؟''

''اور وہ سمجھ گئی؟''

''نہ سمجھتی تو کیا کرتی۔ پہلے تو ریکارڈ کی طرح بجتی رہی کہ جھوٹ بولتے ہو تم ...... بکواس کرتے ہو ...... دھمکیاں بھی دیتی رہی۔ اسے بہت غرور ہے اپنے باپ کی دولت اور طاقت پر ...... میں نے اپنی کوشش جاری رکھی ...... ہم جب اس کو ایئرپورٹ سے لائے تھے۔ میرا مطلب ہے گھر سے ......''

میں نے کہا۔ ''ایئرپورٹ پر اس کا باپ موجود تھا۔''

''اسے ہم نے بروقت دیکھ لیا تھا۔ ہم وہاں سے نکل گئے اور واپس اس کی کوٹھی چلے گئے۔ کچھ دیر بعد رانا آیا تو ہم نے استقبال کیا۔ کوٹھی میں باقی نوکر بندھے پڑے تھے۔ ہم نے اسے بھی انہی کے ساتھ باتھ روم میں بند کردیا۔''

''لڑکی کو کیسے قابو کیا۔''

''وہاں اسے انجکشن دینا پڑا۔ ایئرپورٹ سے واپسی ایک کیمسٹ سے لے لیا تھا۔ ورنہ اسے ناک آؤٹ کرنا پڑتا' منہ پر ٹیپ لگا کے اور ہاتھ پیر باندھ کے لانا پڑتا۔ انجکشن آسان طریقہ ہے۔''

ایک عورت ٹرے اٹھائے اندر آئی۔ وہ درمیانی عمر کی غریب نظر آنے والی بھولی صورت عورت تھی جس نے صاف ستھرے کپڑے پہن رکھے تھے لیکن صاف نظر آتا تھا کہ وہ خدمت پر مامور ملازمہ سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس نے خاموشی سے کھانا میرے سامنے رکھا اور واپس نکل گئی۔

میں نے کھانا شروع کیا۔ ''رانا بعد میں کیسے نکلا۔''

''یہ رانا سے پوچھنا۔ ہم تو اس کی بیٹی کے ساتھ نکل آئے تھے۔ اس کا سارا اسباب بھی ساتھ لے آئے تھے کہ نہ جانے کتنا عرصہ ہمارے ساتھ رہے گی۔ ضرورت کی ہر چیز ہم کیسے فراہم کریں گے ...... یہاں اسے ایک کمرا دے دیا تھا۔ کسی فائیو اسٹار ہوٹل کے کمرے جیسی لگژری تو فراہم نہیں کی جاسکتی تھی لیکن اس میں آرام کی ہر چیز تھی۔ علیحدہ باتھ روم تھا۔ پہلے دن اس نے کچھ قبول نہیں کیا۔ نہ چائے نہ کافی۔ یہ خادمہ اس سے پوچھتی رہی۔ ولایتی لڑکی قورمہ، بریانی کیا کھاتی۔ ہم نے اسے سینڈوچ اور برگر قسم کی چیزیں پیش کردیں۔ دوسرے دن اس نے کھا لیا ...... چائے کافی مانگی ...... پھر حالات سے سمجھوتا کرلیا۔ اپنے سامان کو دیکھ کر وہ سمجھ گئی کہ شاید اسے کچھ عرصہ ہمارے ساتھ ہی رہنا ہوگا۔ اس نے کپڑے نکالے اور غسل بھی کیا ...... پھر اس خادمہ کے سوا کوئی بھی اس کے کمرے میں نہیں گیا۔''

''کیا اس نے نکلنے کی بالکل کوشش نہیں کی؟''

''کوشش کرنا تو ایک فطری بات تھی۔ اسے اندازہ ہوگیا کہ یہ ممکن نہیں۔ اس کمرے کی ہر کھڑکی میں گرل تھی۔ دروازہ باہر سے مقفل رہتا تھا۔ اندر سے کھولا ہی نہیں جاسکتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ذہین اور حوصلہ مند لڑکی ہے۔ جب اسے مجھ سے خطرہ نہ رہا تو وہ ایزی ہوگئی۔ اس نے صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کی۔ میں نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا کہ میں کون ہوں اور کیا کرتا ہوں۔ میں نے کہا کہ یہ غیر اہم ہے ...... لیکن میں نے اسے کافی حد تک اصل حالات پر بریف کردیا۔ اس کا ذہن ہر بات کو فوراً قبول نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے بہت سوال کیے اور پھر بھی مطمئن نہیں ہوئی۔ تاہم وہ سمجھ گئی ہے کہ اس کو کیوں اغوا کیا گیا ہے۔''

''میرے بارے میں وہ کیا جانتی ہے؟''

''میں نے اسے یہ تاثر دیا ہے کہ میں کچھ بھی نہیں ...... جس کے لیے میں کام کرتا ہوں، وہ جتنا مہذب، اعلیٰ تعلیم یافتہ، طاقتور اور دولت مند ہے ...... اتنا ہی خطرناک بھی ہے اور رانا رجب علی نے اس کے ساتھ پنگا لے کر اچھا نہیں کیا اگر ایک آدمی اپنے علاقے میں فلاحی کام کرنا چاہتا ہے تو رانا صاحب کو مخالفت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ بات وہ سمجھ نہیں پائی ...... یہ ایک لیڈی ڈاکٹر کا جرم کیسے بن گیا کہ وہ اپنے علاقے کے لوگوں کا مفت علاج کر رہی تھی، انہیں دوائیں بھی فراہم کر رہی تھی اور بیماریوں سے بچاؤ کے ٹیکے بھی لگا رہی تھی۔ پاکستان کے اس سماجی اور سیاسی کلچر سے وہ بالکل ناواقف تھی ...... اب کسی حد تک سمجھ گئی ہے ...... یہ جانتی ہے کہ جیسے ہی اس کا باپ ڈاکٹر شہناز کو رہا کرے گا، اسے باعزت طور پر باپ کے گھر پہنچا دیا جائے گا ...... یہ سمجھ لینے کہ بعد وہ پوری

طرح تعاون کر رہی ہے اور کسی حد تک مایوس بھی ہے کہ اس کے باپ کا اصل چہرہ ایسا ہے۔ ظاہر ہے لندن میں اس کا روپ بالکل مختلف نظر آتا ہوگا۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ یہ سب سچ ہے تو باقی معاملات مجھ پر چھوڑ دو۔ ڈاکٹر شہناز کو بھی رہا کراؤں گی اور جب تک وہ نہیں آئے گی، میں خود یہاں سے نہیں جاؤں گی۔ یہ بات میرے باپ کو بتا دو۔"

"یہ سمجھداری ہے یا مجبوری؟"

"دونوں...... میں نے اسے یقین کرنے پر مجبور کر دیا کہ فرار ہونا، اس کے لیے ناممکن ہوگا...... باہر نکلتے ہی اسے پھر پکڑ لیا جائے گا۔ آس پاس کے علاقے میں دور دور تک نواب صاحب کے لوگ موجود ہیں۔"

"تم نے مجھے کسی مافیا کا ڈان بنا دیا ہے۔"

"اس کے بغیر کام نہ چلتا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ یہ اس کے لیے اجنبی ملک ہے اور اس بات کا امکان بہت زیادہ ہے کہ وہ غلط لوگوں کے ہاتھ میں پڑ کے نقصان نہ اٹھائے۔ بدکارا سے خراب کر کے لاش کہیں پھینک دیں یا خرکار لے جائیں۔ میں نے بتایا کہ خرکار کون ہوتے ہیں...... اگر وہ بردہ فروشوں کے ہتھے چڑھ گئی تو مزید خرابی...... اس کا باپ ساری عمر تلاش کرتا رہے پھر بھی اس تک پہنچ نہیں پائے گا۔ یہاں رہنے میں اس کا آئندہ چند دن میں عزت آبرو کے ساتھ اپنے گھر پہنچ جانا یقینی ہے...... وہ اتنی دہشت زدہ ہوئی کہ خود کو یہاں محفوظ سمجھنے لگی ہے۔"

"کیا اسے میرے یہاں آنے کی خبر ہے۔"

"یس...... میں نے تمہارا پیغام ملنے کے بعد اسے بتا دیا تھا کہ نواب صاحب کی آمد آج کسی وقت متوقع ہیں۔"

"پھر اب انتظار کس بات کا ہے، اسے بلا لو۔"

"میرا خیال ہے کہ تم خود جا کے اس سے ملو۔ آؤ میرے ساتھ۔"

شامی مجھے اپنے ساتھ عقبی حصے کی طرف لے گیا جہاں سے ایک زینہ اوپر جا رہا تھا۔ وہ وہیں سے لوٹ گیا تو میں اوپر گیا۔ اوپر صرف دو بیڈ روم بنے ہوئے تھے۔ سامنے کھلا ٹیرس تھا۔ ایک دروازے پر باہر کی طرف قفل لگا ہوا تھا۔ میں نے دوسرے پر دستک دی۔

اندر سے آواز آئی۔ "یس پلیز۔"

میں ہینڈل گھما کے اندر داخل ہو گیا۔ اس پر نظر پڑتے ہی مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ میں کچھ دیر اس کے سامنے دم بخود کھڑا رہا۔

"تم...... گل رانا ہو......؟"

وہ مسکرائی "اور...... تم...... نواب...... رفیق...... احمد شیرازی...... رائٹ لیکن کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ تم اس قدر حیران پریشان کیوں ہو مجھے دیکھ کر۔"

میں نے خود کو سنبھالا اور اس سے ہاتھ ملایا۔

"اس کی ایک وجہ ہے۔" میں نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ابھی تک ہمارے درمیان تمام گفتگو انگلش میں ہی ہوئی تھی۔ وہ اس کی عادی تھی اور آٹھ سال امریکہ، یورپ میں رہنے سے میرا لہجہ بھی انگریزوں جیسا ہی ہو گیا تھا۔

وہ میرے سامنے بیٹھ گئی "مجھے بتایا گیا تھا کہ آپ نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے پھر کافی عرصہ لندن میں بھی رہے۔"

"یہ ٹھیک ہے مس رعنا...... مجھے میرے دوست نے بتایا کہ میرے متعلق تمام معلومات آپ کو پہلے ہی حاصل ہو گئی ہیں۔"

"یس...... ہمیں رسمی تعارف کی ضرورت نہیں۔"

میں نے کہا۔ "آپ کو دیکھ کر میری حیرانی کے اسباب واضح ہیں۔ ایک تو یہ کہ رانا کی بیٹی ہونے کے باوجود آپ میں اس کی مشابہت بالکل نہیں۔"

"میں اپنی ماں سے مشابہہ ہوں۔"

"آپ کسی طرح بھی پاکستانی نظر نہیں آتیں جسے وہاں انڈین فیچرز کہا جاتا ہے۔" میں نے کہا۔

وہ بولی۔ "اس کی وجہ بھی میری ماں ہے، وہ آئرش ہے۔"

"معلوم نہیں کیوں میں نے فرض کر لیا تھا کہ وہ لندن میں سیٹل ہونے والی کسی ایشیائی فیملی کی خاتون ہوں گی۔"

"آپ نے دو وجوہات کا حوالہ دیا تھا۔"

"یس...... دوسری وجہ بتانے سے پہلے میں آپ سے پوچھوں گا کہ کیا حسن اتفاق سے آپ کا کوئی تعلق یا رشتہ لارڈ ارنسٹ سے یا اس کی بیوی سے ہے۔"

اس نے سوچ کے کہا۔ "لارڈ ارنسٹ کون ہے؟"

میں نے کہا۔ "لندن میں وہ اتنا غیر معروف نہیں ہے۔ وہ ہاؤس آف لارڈز میں ہے اور ایک خاصی بڑی بزنس ایمپائر کا مالک ہے۔ اس کی ایک بیٹی ایلشیا تھی۔"

"تھی کیا مطلب؟"

"بعد میں اسلام قبول کرنے کے بعد اس نے اپنا نام بدل کے عائشہ رکھ لیا تھا۔ آپ کی صورت میں اس کے نقوش سے اتنی زیادہ مماثلت ہے کہ ایک لمحے کے لیے میری آنکھوں کو یہ دھوکا ہو گیا...... میں سمجھا کہ میرے سامنے عائشہ ہے۔"

وہ مسکرائی۔ "ایسا تو نہیں کہ وہ آپ کے خیالوں میں ہو اور آپ کو میری صورت میں وہ نظر آئی ہو۔"

"ایسا ہرگز نہیں ہے۔ آپ کا چہرہ...... رنگ و روپ، قد و قامت...... بالوں کا رنگ اور آنکھوں کا رنگ...... سب وہی ہے...... کسی روز میں آپ کو عائشہ کی تصویر دکھاؤں گا تو آپ اسے اپنی تصویر سمجھنے پر مجبور ہوں گی۔ یہ حقیقت ہے کہ ایسی مکمل مشابہت صرف جڑواں بہنوں میں ہی ممکن ہوتی ہے۔ خیر...... کام کی بات کرنے سے پہلے مجھے آپ سے افسوس کا اظہار کرنا چاہیے...... جو سلوک آپ کے ساتھ پاکستان پہنچنے پر ہوا۔"

"کیا یہ آپ کے ملازم تھے۔ میرا مطلب ہے ہارڈ لوگ جو میرے اغوا پر مامور تھے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں...... زیادہ سے زیادہ آپ انہیں معاون کہہ سکتی ہیں۔ انہوں نے میرا کام بلا معاوضہ کیا۔ یہ مہذب لوگ ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ آپ کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔"

"تکلیف...... تو میں نے خاصی اٹھائی...... لیکن جسمانی اذیت سے زیادہ میرے لیے ذہنی اذیت تھی۔ ایسا میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی...... یہ کسی ہارر فلم کی طرح تھا میرے لیے...... لیکن اس سے زیادہ تکلیف مجھے اپنے باپ کے بارے میں بتائی جانے والی باتوں سے ہوئی...... ابھی تک میرا ذہن تسلیم نہیں کرتا کہ وہ سب سچ ہوگا۔"

"بدقسمتی سے وہ سب سچ ہے۔"

"میں نے اپنے باپ کو ایک بالکل مختلف روپ میں دیکھا تھا۔"

میں نے کہا۔ "وہ کبھی آپ کو پاکستان نہیں لایا؟"

اس نے کہا۔ "ہم تین بار پاکستان آئے۔ گرمیوں کا ایک پورا سیزن ہم نے مری اور شمالی علاقوں میں گزرا...... کاغان ویلی اور سوات میں رہے۔ میں نے جو فلمیں بنائیں وہ لندن میں میرے دوستوں نے دیکھ کر کہا کہ تم جھوٹ بولتی ہو۔ یہ سوئٹزر لینڈ ہے یا ایسی ہی کوئی جگہ...... یہ پاکستان نہیں ہو سکتا۔ وہ علاقہ جنت کی تصویر ہے۔ دوسری بار ہم ایک مہینہ اسلام آباد میں رہے پھر ایک مہینہ لاہور، پشاور اور کراچی میں گزارا...... لیکن یہ درست ہے کہ ہم کبھی اپنی کی آبائی جاگیر پر نہیں گئے۔"

"وہ لے کر نہیں گیا؟ یا خود تم نے جانا نہیں چاہا۔"

اس نے پہلو بدل کے کہا۔ "دراصل...... میرے باپ نے ہمارے سامنے اس علاقے کا جو نقشہ رکھا وہ کچھ اچھا نہیں تھا...... اس کے نزدیک وہ غیر مہذب اور غیر محفوظ علاقہ تھا۔ جہاں ہمارے لیے تفریح کوئی نہیں تھی، صرف تکلیف تھی۔ ایک تو اس وجہ سے میری ماں ڈر گئی۔"

"انگریز ہمارے ترقی یافتہ ملک کے بارے میں کم علمی کے تحت ایک جاہلانہ تعصب ضرور رکھتے ہیں...... لیکن قصوروار ہمارے رانا جیسے ہم وطن بھی ہیں۔ کیا تم نے دیکھا نہیں تھا کہ لاہور، کراچی جیسے شہر بیسویں صدی کی ہر سہولت رکھتے ہیں اور کتنے ترقی یافتہ ہیں؟"

"میں اس وقت اتنا نہیں سمجھتی تھی۔ میری ماں کو اس حویلی میں جا کے رہنے کا شوق بھی نہیں تھا، جہاں اس کی کم سے کم ایک سوکن پہلے سے قید تھی۔ ان سوکنوں کے علاوہ گھر کے دیگر افراد بھی اسے دیکھ کر خوش نہ ہوتے...... شاید اس کے ساتھ غیر شائستہ رویہ اپناتے۔ خود رانا چاہتا تھا کہ مشرق اور مغرب الگ رہیں...... لیکن جب میں بڑی ہو گئی اور ہم تیسری بار پاکستان آئے تو میں نے اصرار کیا کہ میں اپنی جاگیر دیکھنا چاہوں گی۔ میری

ماں خفا ہوئی کہ اس کو میں نے اپنی جاگیر کیسے سمجھا۔ میں نے کہا یہ بات غلط بہر حال نہیں ہے کیونکہ قانونی طور میں بھی ایک وارث ہوں۔ یہ بحث رانا کے سامنے نہیں ہوئی تھی...... بعد میں میری اپنے باپ سے بات ہوئی اور میں نے ضد پکڑ لی کہ خواہ کچھ بھی میں وہاں جاؤں گی۔ میں بتادوں کہ میرا باپ مجھ سے بہت محبت کرتا ہے۔ میں اس سے ہر بات منوا سکتی ہوں۔ بچپن سے ایسا ہی ہے۔ میری یہ بات بھی اس نے مان لی اور ہمیں اپنے گاؤں لے گیا۔ وہ اتنی بڑی جگہ نہیں تھی جیسا ہم سمجھتے تھے۔ لوگ ہم سے فاصلے پر رہے اور بے تکلف نہیں ہوئے لیکن کسی نے ہمارے ساتھ نا مناسب سلوک نہیں کیا...... ہم نے دس دن اچھے گزارے...... زیادہ وقت سیر و تفریح اور شکار میں صرف ہوا...... میں نے بندوق چلائی اور ایک جانور بھی مارا...... وہ غالباً کوئی لومڑی تھی...... اس بار میں اکیلی آگئی...... اپنی ماں کی مخالفت کے باوجود...... لیکن سوچو اگر وہ سب میری ماں کو معلوم ہو جائے جو میرے ساتھ ہوا...... تو کیا کہے گی...... یہی کہ اس کے یا میرے باپ کے خدشات بے بنیاد نہیں تھے۔"

"کیا اب تم فوراً واپس جانا چاہو گی۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔" میں نہیں جاسکتی...... یونیورسٹی میں میرا ایک مضمون انڈین ہسٹری تھا اور اس کے لیے میں نے اپنے باپ کے کہنے پر اس علاقے کی تاریخ کو اپنے پیپر کا موضوع بنالیا تھا۔ یہاں ایک پرانا قلعہ ہے۔ تین چار سو سال پرانا جس کے آثار مٹ رہے ہیں۔"

"رہتاس کا قلعہ۔"

"یس...... اور اب مجھے پرانی حویلیوں کا پتا چلا ہے۔ تمہاری اپنی حویلی ڈیڑھ سو سال کی دلچسپ تاریخ رکھتی ہے۔ یہ مجھے تمہارے دوست نے بتایا...... میں وہ سب دیکھوں گی...... پتا نہیں یہ سب کیسے ہوگا کیونکہ یہاں میرے باپ کے اور تمہارے درمیان جو سیاسی عداوت چل رہی ہے۔ اس میں پرانے قبائل کی جنگ کا ماحول ہے۔ ایک دوسرے پر حملے...... خونی مقابلے...... ڈاکوفورس کا استعمال...... عورتوں کا اغوا...... برا نہ مانو تو ایک بات پوچھوں۔"

"میں برا نہیں مانوں گا۔"

"اگر میرا باپ مقامی روایات پر چلتا ہے...... تو اس کے خاندانی ماحول کی مجبوری ہے...... وہ غلط ہے...... لیکن تم نہ فیوڈل کلچر کی پیداوار ہو نہ جاہل ہو...... تمہارا باپ ایک کالج پروفیسر تھا...... خود تم باہر رہے اور اعلیٰ تعلیم کے بعد جاب کرتے رہے...... وہ کیا جاب تھا؟"

میں نے کہا" میں لارڈ ارنسٹ کی ایک فرم میں فنانس کا شعبہ سنبھالتا تھا۔ اس کی بیٹی نے جو اکلوتی تھی، تعلقات عامہ کے شعبہ کی تعلیم پائی تھی۔ ہمارا عہدہ برابر تھا۔"

اس کی آنکھوں میں ایک تجسس ابھرا......" کیا وہ خوبصورت تھی؟"

"اگر تم ہو...... تو وہ بھی تھی......" میں نے کہا۔

وہ بولی۔" اگر اس نے تمہاری وجہ سے اسلام قبول کیا تھا...... تو اس کی یقیناً جذباتی وجہ ہو گی...... خیر یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے...... مجھے بتاؤ کہ میرے باپ کے ساتھ تم نے محاذ آرائی میں برابری کیوں کی۔"

جواب میں مجھے ایک طویل مدلل تقریر سے ثابت کرنا پڑا کہ جو کچھ میں نے کیا ہرگز پسندیدہ نہیں تھا لیکن اپنے دفاع میں اور بقا کی جنگ کے لیے ناگزیر تھا۔ وہ بڑی توجہ سے سنتی رہی...... مجھے اندازہ تھا کہ وقت گزرتا جارہا ہے۔ جب ایک خادمہ رات کا کھانا لے کر آئی تو مجھے پریشانی لاحق ہوگئی...... باتوں میں اتنی دیر نہ میں چاہتا تھا نہ مجھے اس کی توقع تھی...... لیکن اس لڑکی کا معاملہ آسان نہیں تھا...... اسے یہ سمجھانا کہ ہم نے اسے اغوا کر کے کوئی اخلاقی یا قانونی جرم نہیں کیا ہے بلکہ ایک اچھے مقصد کے لیے اغوا کیا ہے...... کوئی آسان کام نہیں تھا...... اب وہ قائل ہوگئی تھی کہ معاملات کو سلجھانے میں اس کا کردار اہم ہوسکتا ہے تو اسے مطمئن کرنا بے حد ضروری تھا۔

کھانے کے دوران بھی کسی نے مداخلت نہیں کی۔ میں شامی کو شریکِ گفتگو کرنا چاہتا تھا لیکن گل رعنا نے مجھ سے اتفاق نہیں کیا۔

"مجھے اب اپنی اہمیت کا اندازہ ہوگیا ہے۔" اس نے کہا۔" میری حیثیت اقوام متحدہ کے امن قائم کرنے والے نمائندے جیسی ہوگئی ہے۔ میرا خیال ہے میں یہ کام کرسکتی ہوں۔"

میں نے کہا" کیسے کرو گی تم یہ کام غیر جانبداری تمہارے لیے ممکن نہیں کیونکہ تم بہر حال رانا کی بیٹی ہو۔"

"مجھے سب سے زیادہ نیک دل اور بے گناہ لیڈی ڈاکٹر کا خیال ہے جو ایک مہینے سے یرغمال بنی ہوئی ہے...... مجھے صرف تین دن ہوئے ہیں اور مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میں برسوں سے قید ہوں۔ آخر ہر جنگ کا ایندھن بے گناہ کیوں ہوتے ہیں۔ لڑائی میرے باپ کی اور تمہاری ہے...... لیکن تم دونوں محفوظ ہو اور آزاد بھی ہو"

میں نے کہا۔" کیا تم نے اپنے باپ سے بات کی ہے۔"

"کیسے کرتی...... میرا موبائل فون یہاں کام نہیں کرتا۔ اگر میں اس سے بات کرسکتی تو اب تک ڈاکٹر شہناز واپس آجاتی۔"

میں نے کہا۔" یہ سب اتنا آسان نہیں ہے مس رانا۔"

"تم مجھے گل کہہ سکتے ہو۔"

"او کے...... گل...... شہناز کی رہائی کو وہ خود تمہاری رہائی سے مشروط کرے گا...... کہے گا پہلے تم آجاؤ...... پھر میں اسے چھوڑ دوں گا۔"

"اور تم کہو گے کہ پہلے شہناز کو چھوڑ دو۔"

میں نے کہا" دراصل یہ معاملہ اب اعلیٰ ترین سطح پر رپورٹ ہوگیا ہے۔ پولیس کے اعلیٰ افسران اپنی نگرانی میں تفتیش کر رہے ہیں لیکن ان کی مجبوریاں ہیں، وہ حویلیوں کے اندر کسی بھی وقت ایسے دندناتے ہوئے نہیں گھس سکتے جیسے عام مجرم کے ٹھکانے پر چھاپہ مارتے ہیں...... وہ چاہتے ہیں کہ ہم آپس میں بیٹھ کر اس معاملے کو نمٹا لیں۔ دشمنی کو آگے نہ بڑھائیں ورنہ نقصان دونوں کا ہوگا۔"

"یہ بڑا صائب مشورہ تھا۔"

"ڈاکٹر شہناز کی رہائی کے لیے ایک بار میں اپنی مرضی سے اور دوسری بعد پولیس کے کہنے پر رانا کے پاس گیا تھا...... الزام عائد کرنے نہیں کہ اس نے شہناز کو اغوا کیا ہے...... نہ دھمکی دینے کہ اس نے شہناز کو واپس نہ کیا تو پھر میں جوابی کارروائی کروں گا...... میں نے ڈپلومیسی سے کام لیا کہ وہ شہناز کی بازیابی میں میری مدد کرے...... لیکن اس کا الٹا اثر ہوا...... اس کی فطرت ہی بن چکی ہے...... وہ سب کو اپنے سامنے جھکا ہوا دیکھنا چاہتا ہے اور ان کی تذلیل کو اپنا حق سمجھتا ہے...... وہ اور اکڑ گیا......"

"اچھا اب تم کیا کرو گے......؟ یہ مسئلہ کیسے حل ہوگا؟"

"میں نے کہا کہ رانا مجھ سے بات کرنے میرے پاس آئے...... میں تیسری بار اس کے در پر جانے والا نہیں ہوں۔"

"وہ مانتا ہے کہ شہناز کو اس نے اغوا کرایا اور اب اس کی تحویل میں ہے...... اور تم بھی تسلیم کرتے ہو کہ جوابی کارروائی کے طور پر تم نے مجھے بند رکھا ہے۔"

میں نے ہنس کے کہا۔" اس اعتراف جرم کے بعد تو ہم دونوں ہی جیل میں ہوتے...... ہم دونوں سب کے سامنے یہی مؤقف رکھتے ہیں کہ ہمارے ہاتھ صاف ہیں...... بلکہ دل بھی صاف ہیں...... لیکن سب جانتے ہیں کہ پس پردہ حقیقت کیا ہے...... یہ ایک اوپن سیکرٹ ہے۔"

"او کے...... میں اس سے بات کرتی ہوں...... یہ کہتی ہوں کہ فوراً تم سے رابطہ کرے اور معاملات طے کرے۔"

"اس سے کچھ نہیں ہوگا گل...... الٹا یہ ہوتا کہ تمہیں یہاں سے کہیں اور لے جانا پڑے گا۔"

"وہ کیوں......"

"پولیس فوراً کال ٹریس کرے گی اور اس مکان تک پہنچ جائے گی۔"

وہ کچھ سوچتی رہی۔" اچھا فرض کرو...... میں تمہارے ساتھ چلوں۔"

"کہاں چلوں؟"

"تمہاری حویلی میں...... کیا نام ہے اس جگہ کا...... ست بدھائی...... اپنے باپ سے کہوں کہ ڈاکٹر شہناز کے ساتھ آئے اور اسے تمہارے حوالے کرے۔

مجھے لے جائے......ایک فوری اور آسان حل۔"

میں نے ہنس کے کہا۔"یہ اتنا آسان نہیں ہے گل......میں جانتا ہوں اس کے بعد کیا ہوگا......وہ پولیس کے ساتھ آئے گا اور تمہیں حویلی سے برآمد کرا کے لے جائے گا......مجھ پر فرد جرم عائد ہو جائے گا اور میں کم سے کم بھی سات سال کے لیے جیل چلا جاؤں گا......ڈاکٹر شہناز کا معاملہ ویسے ہی رہے گا......شاید پہلے سے بھی زیادہ خراب ہو جائے گا۔"

وہ مضبوط لہجے میں بولی۔"نواب صاحب......اگر میرے...... باپ نے میرے ساتھ ایسا کیا......تو وہ مجھے ہمیشہ کے لیے کھو دے گا......یوسی......میں قانونی طور پر بالغ ہوں......اس کے علاوہ میں پاکستانی نہیں......برطانوی شہری ہوں......اگر وہ شہناز کو ساتھ نہ لایا اور پولیس کے ساتھ آیا تو میں اس کے ساتھ جانے سے صاف انکار کر دوں گی......پولیس کو بتا دوں گی کہ یہاں میں اپنی مرضی سے آئی ہوں اور حویلی میں اپنی مرضی سے رکی ہوں......میں باپ کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔"

میں دم بخود رہ گیا......"تم اپنے باپ کے خلاف جاؤ گی۔"

"اپنی بیٹی کے ساتھ دھوکا کرنے والا سب کچھ کر سکتا ہے......عزت......احترام......اعتبار......اس کے بغیر رشتے کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے......وہ میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتا......کرے گا تو میں ہمیشہ کے لیے اس سے تعلق توڑ لوں گی۔ میں تمہارے ساتھ رہوں گی......کیا وہ اتنی بے عزتی، رسوائی اور جگ ہنسائی برداشت کرے گا۔"

میں نے کہا" یہ اس کے لیے ناقابلِ تصور ہوگا......لیکن گل......میں کیسے مان لوں کہ یہ سب تم اس لیے کہہ رہی ہو......کہ تمہیں رہائی مل جائے۔"

"تمہیں مجھ پر اعتبار کرنا چاہیے۔"

میں نے کہا"فرض کرو تم نے عین وقت پر اس کے برعکس کہہ دیا......جو اس وقت کہہ رہی ہو......اغوا اور قید میں رکھنے کا الزام مجھ پر عائد کر دیا......پولیس کو اصل کہانی سنا دی......تو میرا انجام کیا ہوگا......پھر میرے پاس کہنے کے لیے کیا رہ جائے گا۔"

"میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ اس میں کوئی رسک نہیں......لیکن رسک ہے تب بھی تمہیں لینا چاہیے......اور کوئی صورت ہے تو مجھے بتاؤ......کیا میں لکھ کر دے دوں......اپنی تحریر میں اپنے دستخط کے ساتھ......تمہیں پھر بھی اطمینان نہیں ہوگا۔ یہ امکان رہے گا کہ آزاد ہوتے ہی میں اس تحریر کو دباؤ کا نتیجہ قرار نہ دے دوں......ایک قیدی سے کچھ بھی لکھوایا جا سکتا ہے......لیکن رفیق......میرا مطلب ہے نواب صاحب......میری پرورش لندن میں میری ماں نے کی ہے......وہاں جھوٹ اور منافقت کو سنگین اخلاقی جرم سمجھا جاتا ہے......میرے کردار میں ایسی کمزوری کا خیال بھی شرمناک ہے۔"

میں نے فوراً فیصلہ کر لیا۔"اوکے گل......میں تم پر اعتبار کرتے ہوئے یہ رسک لوں گا......تم فون پر رانا سے یہ سب کہہ دو......اس کے بعد فوراً ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔"

"تم مجھے دوسری جگہ شفٹ کرو گے۔"

"میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا......رات بارہ ایک بجے تک ہم ست بدھائی میں ہوں گے......کیا تمہیں منظور ہے؟"

"اگر تم نے مجھ پر اعتبار کیا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ میں تم پر اعتبار نہ کروں۔ فون کہاں ہے؟"

میں نے شامی سے بات کی......وہ سوچ میں پڑ گیا۔"نواب دوست......تم بہت بڑا خطرہ مول لے رہے ہو اپنے لیے۔"

میں نے کہا۔"شامی......میں نے ہمیشہ اپنے اندر کی آواز پر بھروسا کیا ہے......اور میرا دل کہتا ہے کہ گل ہمیں دھوکے سے مروانا نہیں چاہتی۔"

"دیکھ لو......وہ رانا کی بیٹی ہے۔"

"کیا آذر کے گھر میں ابراہیم کے پیدا ہونے کی روایت نہیں ہے......؟ اس کے علاوہ......فرض کرو یہ دھوکا ہے......وہ ہمیں بے وقوف بناتی ہے تو کیا ہم بے وقوف ہیں؟......"نہیں......کوئی مجھے اتنی آسانی سے ٹریپ نہیں کر سکتا......میں اتنا بھی اناڑی نہیں ہوں۔"

"آخر کیا کرو گے تم۔"

"مجھے یہ بتاؤ کہ فون کال ٹریس کر کے پولیس یہاں کتنی دیر میں پہنچ سکتی ہے۔"

"پاکستانی پولیس بڑی مستعدی دکھائے......پھر بھی آدھا گھنٹا کم سے کم۔"

"رائٹ......ہم گل کو پندرہ بیس منٹ دیں گے......اپنے باپ سے بات کرے اور اس سے وہ سب کہہ دے جو مجھ سے کہا ہے......پھر ہم ایک منٹ ضائع کیے بغیر یہاں سے نکل جائیں گے۔"

"نکل کے کہاں جائیں گے۔"

"تم جاؤ اپنے ٹھکانے......میں جاتا ہوں اپنے ٹھکانے......پولیس جب یہاں آئے تو اسے کچھ نہیں ملنا چاہیے۔ تم تیاری کرو کوچ کی۔"

"تیاری مکمل ہے۔"

"میں نے کہا"گھر کس کا ہے......تم نے کرائے پر لیا ہے؟"

وہ مسکرایا۔"گھر لاوارث پڑا تھا......مالک مکان ملک سے باہر رہتا ہے۔"

"اور یہ جو اوپر لکھا ہوا تھا......کرائے کے لیے خالی ہے۔"

"یہ ہم نے ہی لکھا تھا۔"

فون دوسرے کمرے میں تھا۔ جدید طرز پر بنے اس مکان کی وائرنگ ایسی تھی کہ فون اور کیبل کے کنکشن ہر کمرے میں فراہم کیے گئے تھے چنانچہ فون یا ٹی وی کہیں بھی کنکٹ کیے جا سکتے تھے......میں نے ٹیلی فون سیٹ کو گل کے کمرے میں لگا کے اس کا اسپیکر آن کر دیا۔ اب گل کی اور اس کے باپ کی آواز براہِ راست سن سکتا تھا۔

گل نے نمبر ملایا اور......دوسری طرف گھنٹی بجنے لگی پھر کسی نے ریسور اٹھایا گیا......"رانا ہاؤس......"کسی عورت نے کہا۔

گل بولی"مجھے رانا رجب علی سے بات کرنی ہے۔"

"آپ کا نام جی۔ کیا کام ہے؟"

گل نے کہا"مجھے رانا سے بات کرنی ہے تم سے نہیں......جاؤ انہیں بلاؤ۔"

دوسری طرف کی خاموشی سے ظاہر ہوا کہ وہ خادمہ یا رانا کی کوئی بیوی رعب میں آ کے برا مان کے چلی گئی......کچھ دیر بعد رانا کی بارعب بھاری بھر کم آواز نے کہا۔

"ہیلو......"

گل نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔" پاپا......میں گل ہوں۔"

وہ چلایا۔"گل......گل پتر......کہاں ہے تو......کہاں سے بات کر رہی ہے......یہ کس کا نمبر ہے۔"

"پاپا......نمبر کو چھوڑیں......میری بات سنیں۔"

وہ پھر وفورِ جذبات......سے چلایا"مجھے بتا تو کہاں ہے......میں آتا ہوں۔"

"پاپا نہ مجھے معلوم ہے میں کہاں ہوں......نہ آپ آ سکتے ہیں یہاں۔"

"کیوں......کیوں نہیں آ سکتا......تو مجھے بتا۔"

"میں نہیں بتا سکتی پاپا......آپ میری بات سنیں......"

رانا نے کہا" اچھا بول بول......لیکن تو ٹھیک ہے نا......ان ظالموں نے تجھے نقصان تو نہیں پہنچایا۔ کوئی تکلیف تو نہیں دی۔"

"نہیں پاپا......وہ تو بہت شریف لوگ ہیں۔"

وہ دھاڑا......"شریف......میرے ہاتھ لگ جائیں تو میں بتاؤں کیا ہوتی ہے شرافت۔"

"دیکھیے میرے پاس وقت کم ہے۔"

"کیا انہوں نے قید میں رکھا ہے تجھے؟......ہاتھ پیر باندھے ہیں......کوئی سر پر پستول لیے کھڑا ہے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں......میں بالکل آزاد ہوں اور بہت...... مزے ... میں ... ہوں ......بہت COMFORTABLE۔ انہوں نے بہت عزت دی ہے مجھے اور میرا بہت خیال رکھا ہے۔"

"کون ہیں یہ لوگ آخر......اور کیا چاہتے ہیں......ان سے پوچھ کتنا پیسا چاہیے......میں دے سکتا ہوں۔"

"پاپا......دنیا میں پیسا ہی سب کچھ نہیں ہوتا......میں تو آپ کے اعمال کی سزا بھگت رہی ہوں۔ انہوں نے مجھے اس لیے اغوا کیا کہ آپ نے ان کے گھر کی

کوئی عورت اٹھائی تھی۔"

"ان سے پوچھ..... بلکہ فون دے انہیں..... میں خود بات کرتا ہوں..... یہ کس عورت کی بات کرر ہے ہیں؟"

"یعنی ایک عورت نہیں ہے..... آپ تو کئی اٹھا چکے ہیں۔"

"نا پتر..... یہ جھوٹ بول رہے ہیں..... تجھے گمراہ کرر ہے ہیں..... تو ابھی آئی ہے ولایت سے۔"

"وہ کوئی ڈاکٹر ہے پاپا۔"

"ڈاکٹر....." رانا نے یوں کہا جیسے اسے کرنٹ لگا ہو اور میں نے تصور میں اس کو اچھلتا دیکھا۔" ان کی تو.....؟" وہ گالی دیتے دیتے رک گیا۔

"اس کا نام ڈاکٹر شہناز ہے۔"

"لیں لیں..... میں سمجھ گیا۔ مجھے پہلے ہی شک تھا کہ یہ وہی نواب کا بچہ ہوگا..... میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں..... فون اسے دے۔"

"یہاں کوئی نواب نہیں ہے پاپا..... بس ایک محافظ ہے۔"

"محافظ نہیں وہ کوئی ڈاکو ہوگا..... اس نواب کے یار..... شاہی بادشاہ کے گروہ کا بندہ..... بالکل ٹھیک شک تھا میرا۔"

"مجھے نہیں معلوم آپ کس کی بات کرر ہے ہیں۔ یہ بتائیں وہ قیدی ڈاکٹر آپ کے پاس ہے یا نہیں..... میں آپ کو بتا رہی ہوں پاپا۔ جب تک آپ اسے رہا نہیں کریں گے۔ یہ مجھے نہیں چھوڑیں گے۔"

"گل تو میری بات کرا ان سے۔"

"آپ مجھ سے بات کریں پاپا۔ کون ہے وہ قیدی ڈاکٹر..... کیوں اغوا کیا تھا آپ نے اسے..... کیوں قید کر رکھا ہے۔"

"دیکھ گل..... تو نہیں سمجھتی ان معاملات کو پتر۔"

"میں سمجھ رہی ہوں پاپا۔ آپ اپنی ضد اور دشمنی پر بیٹی کو قربان کرنے کے لیے تیار ہیں۔"

"نہیں نہیں پتر..... ایسی بات کیوں سوچتی ہے۔ ابھی فرض کر میں اس قیدی ڈاکٹر کو چھوڑ دوں..... تو کیا گارنٹی ہے کہ یہ تجھے چھوڑ دیں گے۔ ان لوگوں کی زبان کا کوئی اعتبار نہیں۔"

"اعتبار تو آپ کو کرنا ہی پڑے گا پاپا۔ آپ اس ڈاکٹر کو خود اپنے ساتھ لے کر آجائیں۔"

"کہاں آجاؤں گل۔"

"نواب رفیق احمد شیرازی کی حویلی میں۔ جہاں سے اسے اغوا کیا گیا تھا آپ نے۔"

وہ چلانے لگا۔" یہ کس نے کہا ہے تجھ سے..... میں نے کسی کو اغوا نہیں کیا۔"

"آپ کے کسی کارندے نے کیا ہوگا۔ بات ایک ہی ہے۔"

"میں کہتا ہوں فون پر میری بات کرا..... انہوں نے تجھے اپنا وکیل کیوں بنا دیا ہے۔"

"میں نے کہا نا۔ وہ بات نہیں کریں گے..... ان کی شرط یہ ہے کہ آپ ڈاکٹر کو لے آئیں اور مجھے لے جائیں۔"

وہ پھر دھاڑا..... "یعنی تو اسی حویلی میں ہے۔ مجھے پتا تھا..... اس حرامزادے نے تجھے حویلی کے قید خانے میں ڈال رکھا ہوگا..... اس نے پولیس کو بھی چکر دے دیا۔ اس کی تو....."

"پلیز پاپا..... آپ اپنی بیٹی سے بات کرر ہے ہیں..... کسی مزارع سے نہیں..... اور آخر آپ معزز آدمی ہیں..... اسمبلی میں بیٹھتے ہیں۔ ایسی گندی زبان آپ کو زیب نہیں دیتی۔"

"تو مجھے مت پڑھا گل..... یہ بتا تو حویلی میں کیسے آئی۔"

"پاپا میں حویلی میں نہیں ہوں..... لیکن جب آپ ڈاکٹر شہناز کو لے کر آئیں گے تو میں وہیں ملوں گی۔"

"میں خود نہیں آؤں گا..... پولیس آئے گی۔"

"پولیس کی دھمکی سے نقصان ہوگا..... میرا بھی اور آپ کا بھی..... یہ آپ کی بیٹی کا معاملہ ہے..... آپ خود آئیں گے۔"

"تو مجھے بے عزت کرانا چاہتی ہے..... میرے دشمن کی نظر میں۔"

"میں چاہتی ہوں کہ آپ کی عزت کا بھرم رہ

جائے..... اگر آپ نے اپنی طاقت یا پولیس پر بھروسا کیا تو آپ کی بہت سبکی ہوگی پاپا..... پھر میں آپ کے ساتھ جانے سے انکار کردوں گی۔"

"تو ایسا نہیں کرسکتی گل۔"

"میں سب کچھ کرسکتی ہوں پاپا..... مجھے سب بتا دیا گیا ہے کہ آپ کیا کرتے ہیں اپنی رعایا کے ساتھ..... نوکروں غلاموں اور ان کے ساتھ جو غریب یا کمزور ہیں۔"

"تیرا دماغ خراب کردیا ہے انہوں نے..... اور تو ان کے جھوٹ کو سچ سمجھ رہی ہے گل۔"

"جھوٹ سچ کا پتا چل جائے گی..... یہ بتائیے آپ ڈاکٹر شہناز کے ساتھ کب آرہے ہیں۔"

"اس نواب سے کہنا کہ میری دشمنی اسے مہنگی پڑے گی۔"

"ابھی تو یہ مجھے مہنگی پڑ رہی ہے پاپا..... ایک بات میں واضح کردوں اگر آپ اپنی طاقت کے زعم میں پولیس کے ساتھ آئے..... تو میں پولیس کے سامنے بیان دے دوں گی..... کہ اغوا کی رپورٹ جھوٹی ہے..... میں یہاں اپنی مرضی سے آئی ہوں۔"

وہ چلایا..... "تو ایسا نہیں کرسکتی۔"

"میں اس سے زیادہ کرسکتی ہوں پاپا..... میں کوئی بچی نہیں..... بالغ ہوں اور اپنی مرضی کی مالک..... میں کوئی پاکستانی عورت نہیں جسے آپ کی پولیس طاقت کے بل پر زبردستی اٹھا کے لے جائے..... میں برطانوی شہری ہوں..... مجھے سفارتی تحفظ حاصل ہیں۔ میں جہاں چاہوں رہ سکتی ہوں..... میں کہہ دوں گی کہ نواب رفیق کی حویلی میں میرا قیام اپنی مرضی سے ہے کیونکہ میں تاریخ پر ریسرچ کرر ہی ہوں..... رہتاس کا قلعہ میرا سبجیکٹ ہے لیکن میں اس علاقے کی تاریخی عمارات بھی دیکھوں گی..... اور اس میں ایک ست بدھائی کی حویلی ہے جو مجھے بہت دلچسپ لگتی ہے..... پھر آپ کیا کریں گے؟..... ان فیکٹ اب میں پہلے برٹش ہائی کمیشن کو مطلع کردوں گی کہ میں اپنی مرضی سے ست بدھائی جا رہی ہوں..... میرے خلاف جو اغوا کی رپورٹ میرے باپ نے درج کرائی ہے وہ بے بنیاد ہے۔"

"خدا کے لیے ایسا مت کرنا۔"

"ابھی میں کہوں گی کہ ایسا میرے باپ نے غلط فہمی کی بنا پر کیا۔ بعد میں یہ بھی کہہ سکتی ہوں کہ بدنیتی کی بنا پر کیا۔ سوچ لیں میں آپ کی اس علاقے میں کتنی بے عزتی اور جگ ہنسائی ہوگی۔"

"مجھے پتا چلا ہے کہ یہ نمبر تو جہلم کے علاقے کا ہے جہاں سے تو بات کررہی ہے۔"

"اب آپ پولیس کے ساتھ چھاپہ مارنے روانہ ہوجائیں لیکن آپ کو یہاں کچھ نہیں ملے گا پاپا..... کیا آپ اتنی سی بات نہیں سمجھتے۔ اغوا کرنے والے مجھے کہیں بھی شفٹ کردیں گے۔ آپ ہر فون کال پر سارے پاکستان میں دوڑتے پھریں گے۔ حاصل کچھ بھی نہیں ہوگا۔"

"مجھے اتنا مجبور مت کر گل۔"

"آپ رہیں اپنی انا کے حصار میں۔ چند روز بعد میں ست بدھائی چلی جاؤں گی..... جب تک دل چاہے رہوں، وہاں رہ کے اپنی ریسرچ مکمل کروں گی اور پھر آپ سے ملے بغیر واپس لندن چلی جاؤں گی..... آپ سوچ لیں کہ دنیا سے کیا کہیں گے کہ بیٹی ولایت سے آکے رانا ہاؤس میں کیوں نہیں ٹھہری۔ آس پاس کتنی باتیں مشہور ہوں گی۔ کس کس کی زبان پکڑیں گے آپ..... ابھی وقت ہے..... ٹھنڈے دماغ سے سوچیں..... خاموشی سے ڈاکٹر شہناز کو لائیں اور مجھے لے جائیں..... بائی۔"

میں گل کے سامنے خاموش بیٹھا اس کی صورت سے اس کے دل کی بات جاننے کی کوشش میں مصروف تھا۔ یہ دیکھ رہا تھا کہ جو اس کی زبان کہہ رہی ہے کیا وہی وہ محسوس بھی کرتی ہے یا الفاظ کی شعبدہ بازی اور اداکاری سے وہ مجھے غچہ دینے کی کوشش میں مصروف ہے۔ آخر میں مجھے تسلیم کرنا پڑا کہ ایسی کوئی بات نہیں..... میں اتنا اناڑی بھی نہیں کہ مجھ سے کم عمر کی ایک ناتجربہ کار لڑکی باتوں سے مجھے الو بنا سکے اور میں بھی اس کی اداکاری سے دھوکا کھا جاؤں۔

اس نے تعریف طلب نظروں سے مجھے دیکھا..... "کیا تم مطمئن ہو؟"

”تم ایک سمجھدار لڑکی ہو...... کیا اب ہم چلیں۔“

وہ اٹھ کھڑی ہوئی...... ”میں تمہارے ساتھ ہوں۔“

گل کا سارا سامان پھر ایک گاڑی میں رکھا گیا۔ یہ ایک سامان لے جانی والی ہائی ایس تھی۔ ڈبل کیبن پک اپ...... پچھلا کیبن بہ آسانی چار افراد کی نشست کے لیے کافی تھا۔ اس پر ایک آدمی آرام سے سو بھی سکتا تھا...... ایرکنڈیشنڈ ہونے کے باوجود کسی لگژری کار جیسا آرام دہ سفر نہیں تھا۔

روانگی سے قبل نہ جانے کہاں سے تین افراد نمودار ہو گئے تھے...... غالباً وہ اس ڈبل کیبن پک اپ میں آئے تھے۔ ان میں سے ایک نے ڈرائیور کے فرائض سنبھال لیے۔ باقی دو گھر کے ساز و سامان کے ساتھ پیچھے بیٹھ گئے۔ شامی میرے آنے پر آگے بیٹھ گیا۔

میں نے کہا ”میری گاڑی کا کیا ہوگا؟“

”وہ اب تک ست بدھائی کی جانب آدھا راستہ طے کر چکی ہوگی۔ ممکن ہے اب اسے روکا جائے...... لیکن اس میں صرف ڈرائیور ہے۔“

”کون روکے گا اسے؟“

”پولیس...... یا خود رانا کے کارندے...... اب تک وہ شکاری کتوں کے ساتھ نکل کھڑے ہوئے ہوں گے۔ وہ تمہاری گاڑی کو پہچانتے ہونگے۔“

میں نے کہا۔ ”تمہاری لیڈر شپ کی وجہ تمہاری اعلیٰ انتظامی صلاحیت بھی ہے۔“

گاڑی ایک گھنٹے بعد نہ جانے کہاں تھی جب شامی نے اچانک میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ ”نواب دوست...... فی الحال خدا حافظ۔“

میں نے حیرانی سے گرد و پیش کی ویرانی اور تاریکی کو دیکھا۔ ”یہاں اتر کے تم کہاں جاؤ گے...... اور کیسے؟“

”فکر مت کرو...... ہم اپنا بندوبست کر سکتے ہیں۔“

”اور تمہارا اسباب۔“

”وہ تمہارے ساتھ نہیں جائے گا۔“ وہ نیچے اتر گیا۔

گل اسے تجسس اور دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ اس نے شامی کی طرف اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ ”تم جو بھی ہو، اچھے آدمی ہو۔“

شامی مسکرایا۔ ”تم بھی بہت اچھی لڑکی ہو۔“

پک اپ آگے بڑھی۔ شامی پیچھے رہ گیا...... اس کے ساتھی بھی اتر گئے تھے۔ سامان غالباً وہ پہلے ہی کہیں پھینک چکے تھے۔ یہ دوستی کا ایک اور سنگ میل تھا۔ میں نے اس کو مشکل سے نکالا تھا...... اس نے میری مدد کر کے احساس کا بدلہ چکا دیا تھا...... میں نے تین کروڑ دے کر اس کی آزادی واپس دلائی تھی...... اس نے شہناز کی واپسی کو یقینی بنا دیا تھا۔

لیکن اس تمام واقعات کے پیچھے جو رانا کے غرور کی شکست کا سبب بنے، وہ عورت تھی جو بہت بدنام تھی...... کیونکہ وہ اکبر خان جیسے دشمن کی بیوی تھی اور اپنے حسن و شباب کو ایسے استعمال کرتی تھی جیسے ڈاکو بغیر لائسنس والی کلاشنکوف استعمال کرتے ہیں۔ لوٹ مار کے لیے...... کسی کا مال، کسی کا حق چھیننے...... کسی کا گھر اور کسی کی دنیا اجاڑنے کے لیے...... بس وہ کوٹھے پر نہیں بیٹھی کی کوٹھی میں رہتی تھی۔

اگر نور جہاں نہ بتاتی تو آج گل رعنا ڈاکوؤں کے ہاتھوں اغوا ہونے کے باوجود اپنی خوشی سے میرے ساتھ ست بدھائی نہ جا رہی ہوتی۔ ہمارے ہاتھ میں یہ طاقت کہاں سے آتی جس نے رانا کی خدائی کے بت کو ہمارے قدموں میں سجدہ ریز کر دیا تھا۔ نور جہاں نے کہا تھا کہ وہ خود شہناز کو لے کر تمہارے پاس آئے گا...... اور وہ جو ناقابل تصور تھا حقیقت کا روپ دھار چکا تھا۔

لیکن اس کے باوجود نور جہاں کا احسان ماننے، اسے عزت دینے پر کوئی راضی نہ تھا۔ میں تھا تو یہ میری مجبوری...... اس کی نیک نیتی شبے اور بدگمانی سے پاک نہ تھی کیونکہ اس میں سفلی جذبات شامل تھے۔ یہ سب کچھ وہ صرف جسم کی ہوس میں میرے لیے کر رہی تھی۔

ڈبل کیبن پک اپ نے دینہ کا موڑ کاٹا تو رات کے بارہ بج رہے تھے۔ بیٹھے بیٹھے گل کو نیند آنے لگی تھی۔ وہ مجھ پر گری اور فوراً اٹھ بیٹھی۔ ”سوری...... میں بہت تھکی ہوئی ہوں۔“

میں نے کہا ”کچھ دیر بعد ہم رہتاس کے قلعے میں ہوں گے۔“

”کیا مطلب...... اس وقت ہم تاریخ پر ریسرچ کرنے جا رہے ہیں؟“

میں نے کہا ”جب تم رانا کی جاگیر پر گئی تھیں تو کیا تم نے دیکھا نہیں تھا...... راستہ قلعے کے اندر سے گزرتا ہے۔“

”اس وقت مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔“

”قلعے کا رقبہ اتنا ہے کہ اب اس میں آبادی ہے۔ رات کو شاید تمہیں کچھ دکھائی نہ دے۔ کھنڈر بہت دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔“

اس کے باوجود وہ ناک کھڑکی کے بند شیشے سے چپکائے باہر دیکھتی رہی۔ میں اس کی دلچسپی کے پیش نظر کسی گائیڈ کی طرح اسے انفارمیشن دیتا رہا لیکن میرا مشاہدہ سطحی تھا۔ میں نے وہی بتایا جو آتے جاتے دیکھا تھا...... پھر ویرانہ شروع ہو گیا اور سڑک بائیں جانب گھوم گئی۔

”یہ سیدھا راستہ کہاں جاتا ہے۔“ گل نے پوچھا۔

”ٹیلہ جوگیاں...... یہاں سے تیس کلو میٹر دور ہے...... اس کے ساتھ ہی پنڈ رانا ہے، رانا فیملی کی جاگیر...... میں نے سنا ہے رانا اب اس کا نام بدل کے رانا نگر کرنا چاہتا ہے۔ پنڈ سے بہت چھوٹے گاؤں کا امپریشن پڑتا ہے۔“

اچانک سامنے سے کوئی گاڑی نمودار ہوئی۔ اس کی ہیڈ لائٹس فل بیم پر تھیں۔ پک اپ کے ڈرائیور نے اسے لائٹس کو ڈپ کرنے کا سگنل دیا۔ سڑک تنگ تھی، ایسا لگتا تھا کہ سامنے سے آنے والی کار ہمیں راستہ دینے پر تیار نہیں۔ ان راستوں پر ڈرائیوروں کی جاہلانہ ضد کی وجہ سے خطرناک حادثات بھی ہو جاتے ہیں۔ سڑک چھوڑ کے کچے راستے پر اترنے کے لیے کوئی راضی نہیں ہوتا اور سامنے والے سے توقع رکھتا ہے کہ وہ سڑک چھوڑ دے۔

اس وقت بھی یہی ہوا۔ پک اپ کا ڈرائیور بھی ضدی تھا اور کیوں نہ ہوتا۔ اس کے پاس زیادہ طاقتور اور بڑی گاڑی تھی۔ اس کی ہیڈ لائٹس کی روشنی بھی اندھا کرنے والی تھی۔ آخری وقت میں سامنے والی گاڑی کے ڈرائیور کو ہار ماننا پڑی...... لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔ فرق سیکنڈ کے دسویں یا نویں حصے کا ہی تھا جب اس نے ایک دم اسٹیرنگ گھمایا تو اس کی گاڑی قابو سے باہر ہو کے جھاڑیوں میں گھس گئی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کار نے ہماری پک اپ کے بمپر کو چھو لیا تھا۔ یہ خفیف سی رگڑ بھی کار کو آف بیلنس کرنے کے لیے کافی تھی۔ یقیناً اس کی ڈرائیونگ سائیڈ کے پچھلے حصے کو نقصان ہوا ہوگا۔

میں نے پلٹ کر دیکھنا چاہا مگر پیچھے تاریکی تھی اور کار کے نیچے اترنے سے گرد کا طوفان بھی اٹھا ہوگا۔ مجھے کچھ دکھائی نہ دیا۔ گل کچھ خوفزدہ ہو گئی تھی...... میں نے اسے تسلی دی کہ فکر کی کوئی بات نہیں...... یہ سب ہوتا رہتا ہے۔

”کیا مطلب...... ایک تو ہم رکے نہیں...... اب پولیس کو اطلاع تو کرو۔“ اس نے پیچھے سر گھما کے کہا۔

میں نے کہا۔ ”تمہیں کچھ نظر نہیں آئے گا...... اور انہیں کچھ بھی نہیں ہوا ہے۔ گاڑی کا معمولی سا نقصان ہوا ہوگا۔“

”کون تھا یہ احمق...... کیا وہ نشے میں تھا؟“

میں نے کہا۔ ”اسے طاقت کا نشہ ہوگا۔ ممکن ہے کہ یہ گاڑی تمہارے پاپا نے بھیجی ہو۔ تمہاری تلاش میں۔“

نصف شب کے بعد ست بدھائی میں میری آمد قطعی غیر متوقع تھی۔ گل نے یہ منظر بڑی دلچسپی سے دیکھا کہ گارڈ نے کسی اجنبی گاڑی کا رخ گیٹ کی طرف دیکھتے ہی پوزیشن سنبھال لی۔ دیکھتے دیکھتے اوپر لگی ہوئی سرچ لائٹس کا رخ ہماری طرف ہو گیا۔ سرچ لائٹس کی چندھیا دینے والی روشنی میں کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا مگر مجھے معلوم تھا کہ گیٹ پر پہرا دینے والے گارڈز نے بھی اپنی رائفلوں کا رخ ہماری طرف کر لیا ہوگا۔

میں نیچے اترا تو سب ایک دم بدل گیا۔ گارڈ نے رائفل نیچے کرتے ہوئے مجھے سیلوٹ جھاڑا اور گیٹ کھولنے لپکا۔ ہم پر سے سرچ لائٹس ہٹ گئیں اور گاڑی حویلی میں داخل ہو گئی...... گل نیچے اتری تو دم بخود رہ گئی...... اس کی نظریں حویلی کا طواف کرنے لگیں۔

میں نے ڈرائیور سے بھی کہا۔ ”آ جاؤ...... ہم پہنچ گئے۔“

اس نے کہا۔ ”سر...... مجھے اجازت دیں۔“

میں نے کہا۔ ”ابھی جانا ضروری ہے۔ تم تھکے ہوئے

ہو، صبح تک آرام کرلو۔"

"نہیں سر...... مجھے یہی آرڈر تھا...... میں رک نہیں سکتا۔"

میں نے کہا" اس وقت تمہارے اکیلے جانے میں خطرہ ہے۔"

"خطرہ کوئی بات نہیں ہمارے لیے سر......" اس نے دروازہ بند کرتے ہوئے گاڑی کو موڑا اور واپسی کے لیے روانہ ہو گیا۔

میرے آنے کی خبر سب سے پہلے راجا کو ہوئی۔ یقیناً گاڑی کی آواز اس کی نیند میں مخل ہوئی ہوگی۔

میں نے تعارف کی رسم ادا کیا۔ "یہ گل رعنا ہے...... اور گل ...... یہ راجا ہے...... میرا سب کچھ...... دوست، مشیر، بھائی...... یہ پاکستان کا بڑا نامور صحافی ہے۔"

گل نے راجا سے ہاتھ ملایا۔" اس جنگل بیابان میں میرے لیے حیرانی کا کتنا سامان ہے...... یہ حویلی...... تم اور خود نواب صاحب...... ان کے پلان ناقابل یقین......"

باتوں کی آواز پر پہلے رابعہ نکلی...... پھر ریشم نمودار ہوئی...... پھر ایک دم ایکٹیوٹی شروع ہوگئی...... گل کا بس چلتا تو وہ ابھی ساری حویلی کا دورہ شروع کردیتی...... گل کی آمد نے حویلی میں سنسنی پھیلا دی تھی...... سب سے زیادہ حیران ریشم تھی...... اس نے موقع پاتے ہی کہا۔" میڈم...... یو انگلش...... یا امریکن...... آئی نو انگلش...... ویری گڈ اسپیک۔"

گل مسکرائی......" تم مجھ سے اردو میں بھی بات کرسکتی ہو۔"

"یس...... یس...... آئی کچن گو...... فائیو منٹ کافی میک......" وہ پلٹ کے پھر رکی......" گل مطلب فلاور...... یو فلاور جیسی بیوٹی فل۔"

میں انہیں مصروف چھوڑ کے باہر نکل گیا۔ غنی نہ جانے کہاں تھا...... میں نے خود گارڈ کو ہدایات دیں کہ میری اجازت کے بغیر کسی کے لیے گیٹ نہ کھولا جائے اور کوئی زبردستی کرے تو اسے روکا جائے...... جیسے بھی ہو...... کسی کو نہ میرے آنے کی خبر ہونی چاہیے' نہ میرے ساتھ آنے والے مہمان کی۔

گل کچھ پریشان تھی رابعہ اسے اپنے ساتھ لے گئی۔ میں اتنا تھکا ہوا تھا کہ کافی کے آنے سے پہلے ہی سو گیا۔ صبح...... میری آنکھ آٹھ بجے کھلی...... میں نے باہر نکل کے دیکھا تو رابعہ اور گل باغ میں ٹہل رہی تھیں۔ ضرور وہ حویلی کی تاریخ پر بات کررہی تھیں۔ گل کے انہماک سے یہی ظاہر ہوتا تھا۔ حیرت مجھے حالات کے اس ڈرامائی تغیر پر تھی۔ رانا کے فرشتوں کو بھی یہ خیال نہیں آسکتا تھا کہ اس کی لندن سے وارد ہونے والی بیٹی اس وقت ست بدھائی کی حویلی میں محو خرام ہے' اپنی خوشی اور مرضی سے...... خالص انسانی ہمدردی اور اخلاقی جواز پر وہ باپ کے دشمنوں سے مل گئی ہے۔

راجا اس بات پر ناراض تھا کہ میں نے فریال کی مکمل ناراضی کو پھر غیر اہم سمجھتے ہوئے اپنا پروگرام بدل دیا۔

میں نے جھلا کے کہا۔"یار سب معلوم ہے تجھے...... اس کے باوجود تو مجھے الزام دے رہا ہے۔"

"یہ الزام دینے کا مسئلہ نہیں ہے۔ تیری زندگی کا سوال ہے پھیکے پتر...... فریال کو یہی شکایت ہے تجھ سے کہ تو سارے زمانے کو اہمیت دیتا ہے...... اس کی اہمیت کوئی نہیں رہی......"

میں نے کہا" راجا میں کیا کرتا...... مجھے جانا تو پڑا...... نہ جاتا تو مجھ سے بڑا بے وقوف نہ ہوتا...... شہناز کی واپسی زیادہ اہم تھی یا فریال کی...... فریال کو روکنے والا تو کوئی نہیں...... مگر شہناز کو ہم کیسے واپس لاتے اگر گل ہمارے ساتھ نہ ہوتی۔"

"چل ٹھیک ہے...... تو اب دیر مت کر......"

میں نے کہا" کل تیری یا رابعہ کی بات ہوگئی تھی اس سے......"

"میری تو کسی نے سنی نہیں...... رابعہ کی اور لیلیٰ بھابی کی آپس میں کافی دیر گفتگو ہوئی تھی۔ وہ بہت ناراض تھیں ویسے تو سارے مردوں سے...... وہ حرامی فرخ بھاگ گیا رابعہ کو دغا دے کر...... نواب صاحب پڑ گئے ہیں دوسرے چکر میں...... سب سے بڑا چکر اس فاحشہ نور جہاں کا

ہے...... راجا کو خاک پروا نہیں کہ شہناز پر قید میں کیا بیت رہی ہے' ڈٹ کے کھاتا ہے اور لمبی تان کے سوتا ہے...... ہم ہوتا تو ایک مہینے میں نیند بھوک اُڑ چکی ہوتی...... پھر وہ میرا رونا لے کر بیٹھ گئی...... نتیجہ وہی کہ مرد کی ذات بری۔"

"یہ سب رابعہ نے بتایا۔"

"ہاں...... اس کی گفتگو سے میں نے اخذ کیا...... فریال نے اس سے کوئی بات نہیں کی...... نند سے خیر کیا امید رکھے...... مگر رات تک وہ وہیں تھی۔"

میں نے کہا" وہ وہیں رہے گی...... مجھے معلوم ہے...... اماں ابا اسے پسند کرنے لگے تھے۔ ان کے سامنے اپنا دکھڑا رو کے مظلوم بن جائے گی اور پوری حمایت حاصل کرے گی۔"

"لیلیٰ بھابی کا کہنا بھی ہے کہ میں نے اسے بڑی مشکل سے روکا ہے رفیق کے آنے تک۔"

"سب ان کی ملی بھگت ہے...... خواتین کلب کا ڈراما ہے راجا...... تو شرط لگالے...... میں جانتا ہوں فریال کو......"

اچانک گیٹ کی طرف سے گارڈ دوڑتا ہوا آیا۔" سر۔ وہ آئے ہیں...... وہ......" اس کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

میں نے کہا۔" آرام سے بتاؤ۔"

"سر گاڑی رانا صاحب کی ہے۔ رانا کا بیٹا آیا ہے...... آپ سے ملنے......"

میں نے کہا۔" صرف بیٹا آیا ہے؟ اکیلا؟...... اس کے ساتھ اور کوئی نہیں۔"

گارڈ نے سر ہلایا۔"نہیں جناب عالی۔"

راجا کی بے قراری پر مایوسی غالب آگئی۔" تم نے اچھی طرح دیکھا تھا۔"

"سر جی...... آپ کا حکم تھا اس لیے میں نے گیٹ نہیں کھولا...... وہ مجھ پر غصہ ہونے لگا...... میں نے نزدیک جا کے کہا کہ میں معمولی حیثیت کا ملازم ہوں مالکوں کی اجازت کے بغیر کسی کو اندر جانے کی اجازت نہیں دے سکتا...... اس وقت میں نے پیچھے بھی دیکھا تھا...... گاڑی میں اور کوئی نہیں ہے۔"

میں نے کہا" اچھا...... جاؤ اس کو بتادو کہ گاڑی باہر چھوڑ دے...... تم اسے اندر لا کے مہمان خانے میں بٹھادو......"

گارڈ واپس چلا گیا تو راجا نے کہا۔" رانا خود کیوں نہیں آیا۔"

میں نے کہا۔" وہ سیاست داں ہے...... پہلے بیٹے کو حالات کا جائزہ لینے اور ماحول دیکھنے کے لیے بھیجا ہے۔"

"جیسے سربراہ کانفرنس سے پہلے سیکریٹری کی سطح پر ایجنڈا طے ہوتا ہے۔"

خواتین کو پہلے ہی اندر بھیج دیا گیا تھا۔ سیکیورٹی گارڈ خود رانا کو بیٹے کے ساتھ لے کر آیا اور اسے مہمان خانے میں چھوڑ کے واپس چلا گیا۔ مجھے صحیح طور پر علم نہیں تھا کہ رانا کے بیٹے کتنے ہیں...... اس نے تیسری شادی تو حال ہی میں کی ہے۔ دو پرانی بیویوں میں سے یقیناً پہلی خاندانی اور سب سے سینئر ہوگی۔ جوان اولاد بھی اس کی ہوگی...... رانا کے اس بیٹے کو میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔

باہمی مشورے سے یہ طے کیا گیا کہ رانا خود آتا تو میرا اس سے ملنا ٹھیک تھا لیکن شہزادہ اس کا سفیر بن کے آیا تھا تو اس سے میرے مشیر یعنی راجا کو ملاقات کرنی چاہیے...... راجا گیا اور کچھ دیر بعد منہ لٹکائے واپس آگیا۔

"وہ مجھ سے بات کرنے پر تیار نہیں...... کہتا ہے مجھے نواب صاحب سے بات کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔"

میں نے کہا۔" او کے...... ہم اسے ایشو نہیں بنائیں گے مگر فوراً ہی حاضر بھی نہیں ہوں گے۔"

راجا نے نواب صاحب کی مصروفیت کے عذر پر اسے آدھا گھنٹا انتظار کرایا۔" میں نے انہیں مطلع کردیا ہے...... وہ ذرا مصروف تھے۔"

رانا کے فرزند نے یہ بے عزتی بھی برداشت کی...... راجا نے اسے چائے کافی پیش کی تو اس نے بڑی بداخلاقی سے انکار کردیا۔" میں یہاں چائے پینے نہیں آیا ہوں۔"

"یہ ہماری روایت ہے۔" راجا نے ہکا۔

"اور ہماری روایت یہ ہے کہ ہم دشمنوں کے گھر کا

پانی بھی نہیں پیتے۔" اس نے تلخ لہجے میں جواب دیا۔

ان کی یہ گفتگو میں نے ایک دروازے کے پیچھے سے سنی..... مناسب وقت پر میں دوسرے دروازے سے اندر چلا گیا۔ میں نے شاہانہ وقار کے ساتھ اس سے ہاتھ ملایا بلکہ اسے اجازت دی کہ ہمارا ہاتھ تھام لے۔ "بھئی ہم کچھ مصروف تھے..... آپ صاحب زادے ہیں رجب علی رانا کے۔"

وہ غور سے مجھے دیکھتا رہا۔ "جی۔"

رانا کے ایک بیٹے سے میں پہلے متعارف تھا۔ اسے رانا نے اپنا ولی عہد قرار دیا تھا..... یہ نسبتاً کم عمر تھا۔ اس کی صورت کے نقوش میں بھی رانا کی مشابہت نہیں تھی۔ یہ نسبتاً سیاہ رو، کوتاہ قامت اور اکھڑ نظر آتا تھا۔ روایتی لباس کے بجائے وہ سوٹ میں تھا اور اس کے باوجود کہ مہمان خانے میں فانوس روشن تھے، اس نے دھوپ کا چشمہ اتارنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔

"رانا صاحب کے ایک فرزند سے ہم پہلے مل چکے ہیں۔ آپ کو پہلی بار دیکھا ہے..... اپنا نام تو بتائیے۔" میں نے بیٹھنے کے بعد کہا۔

"میرا نام زوہیب ہے۔" اس نے مختصراً کہا۔

میں نے بزرگی اور برتری کے لہجے میں کہا۔ "اچھا بھئی زوہیب..... کیسے زحمت کی آپ نے۔"

خلافِ توقع اس نے مذاکرات میں بڑی معاملہ فہمی دکھائی "نواب صاحب..... مجھے اس لیے آنا پڑا کہ رانا صاحب کو کچھ مصروفیت تھی۔ آپ جانتے ہیں ان کی سیاسی اور سماجی مصروفیات بہت زیادہ ہیں۔"

میں نے معنی خیز لہجے میں کہا۔ "یہ ہم سے بہتر کون جانتا ہے۔"

"معاملات طے کرنے کے لیے انہوں نے مجھے بھیجا ہے۔"

میں نے کہا۔ "کون سے معاملات۔"

اس نے بڑی ہوشیاری سے جواب دیا۔ "جو تصفیہ طلب ہیں۔"

میں نے کہا۔ "اس کے لیے انہیں خود ہی آنا چاہیے۔ معاہدے سربراہان کے درمیان ہوتے ہیں..... نچلی سطح پر نہیں۔"

اس کے چہرے پر ناگواری کا سایہ سا آ کے گزر گیا۔ "وہ بھی آ جائیں گے..... لیکن مجھے کچھ یقین دہانی چاہیے۔"

"کس معاملے میں۔" راجا نے پوچھا۔

"یہی کہ..... جب وہ تشریف لائیں تو ان کے ساتھ توہین آمیز سلوک روا نہ رکھا جائے۔"

میں نے خفگی سے کہا۔ "برخوردار..... ہم اتنے کم ظرف نہیں ہیں..... اس حویلی میں اگر فقیر بھی آئے تو ہمارا مہمان ہوتا ہے۔ ہمارے وضعداری یہ اجازت نہیں دیتی کہ اس کی عزتِ نفس کسی طرح بھی مجروح ہو۔"

راجا نے کہا "انہیں وہ پروٹوکول ملے گا جس کے وہ مستحق ہیں۔"

زوہیب نے پہلو بدلا..... "دیکھیے۔ میں بھی اپنے باپ کا بیٹا ہوں۔ یہ چاہتا ہوں کہ ان کے آنے سے پہلے ہر بات کلیئر ہو جائے۔ میرے کچھ اندیشے ہیں۔"

"آپ کھل کر بات کریں۔" راجا نے کہا۔

"پہلی بات تو یہ..... کہ کسی معاملے میں بدعہدی نہیں ہوگی..... رانا صاحب نے تو خیر سگالی کے جذبات کو مدنظر رکھتے ہوئے اکیلے آنے کا فیصلہ کیا تھا۔"

"انہیں یہاں کسی قسم کا خطرہ محسوس نہیں کرنا چاہیے۔"

"لیکن احتیاط اس ضروری ہے..... گارڈ ان کے ساتھ آئیں گے۔"

"وہ اپنے ساتھ فوج لے آئیں..... لیکن حویلی کے اندر نہیں..... یہاں ان کی حفاظت ہماری ذمے داری ہے۔"

میں نے اور راجا نے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔

"یہاں آپ گل رعنا کو رانا صاحب کے حوالے کر دیں گے۔"

میں نے مسکرا کے کہا۔ "حوالگی تو قیدیوں کی ہوتی ہے..... گل رعنا اپنی مرضی سے یہاں مقیم ہے..... اسے اپنے والد کے ساتھ جانے میں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔"

"اگر اسے روکا گیا....."

راجا نے اسے ٹوک دیا۔ "وہ اس وقت بھی آزاد ہے۔"

اس نے تیز لہجے میں کہا۔ "کیا آپ مجھے اس سے ملنے دیں گے۔"

میں نے سکون سے کہا۔ "کیوں نہیں..... راجا صاحب..... گل رعنا کو بلائیے۔"

زوہیب کے لیے یہ قطعی غیر متوقع بات تھی..... شاید اسے باور کرایا گیا تھا کہ ہم نے گل کو اغوا کرانے کے بعد کسی تہ خانے میں ڈال رکھا ہوگا..... یہ نہیں تو وہ سخت پہرے میں ضرور ہوگی..... گل اس کی سوتیلی بہن تھی اور یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ ایک دوسرے کے لیے ان کے دل میں کیا جذبات ہوں گے۔

میں نے کہا۔ "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ رانا صاحب نے ڈاکٹر شہناز کو اپنی حویلی میں مہمان کی طرح رکھا ہے..... یا قیدی کی طرح۔"

"ہم اتنے غیر مہذب نہیں ہیں نواب صاحب..... وہ ہماری مہمان ہیں۔"

میں نے کہا۔ "میں نے اس لیے پوچھا..... کہ جب ہم رانا صاحب سے ملنے گئے تھے تو ہماری ڈاکٹر شہناز سے ملاقات نہیں کرائی گئی تھی۔"

ظاہر ہے اس کے پاس جواب میں کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ اس موضوع پر بات کرنا بھی اس کے لیے پریشانی اور پشیمانی کا باعث بن رہا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کے باپ نے شہناز کو کیسے اغوا کرایا تھا اور کیسے رکھا تھا..... آج اس کا نتیجہ تھا کہ انہیں سر جھکا کے اور ناک نیچی کر کے آنا پڑ رہا تھا۔

گل اندر آئی تو زوہیب اپنی شرمندگی بھول گیا۔ اسے حیرانی نے مغلوب کر لیا۔ گل کی صورت ہی نہیں اس کا لباس اور پُراعتماد انداز بھی اس حویلی کے اندر اتنا ہی آؤٹ آف پلیس لگتا تھا جتنا پیرس کے کسی فیشن ایبل شاپنگ سینٹر میں سمٹ بدحالی کی کوئی غریب دیہاتی عورت نظر آتی۔

گل نے اس سے ہاتھ ملایا۔ "ہیلو زوہیب..... کیسے ہو تم۔"

زوہیب نے سر ہلایا۔ "تمہیں یہاں دیکھ کے حیرت ہوئی۔ تم کیسی ہو۔"

"فائن..... میں تمہارے والد کو Expect کر رہی تھی۔"

زوہیب نے کہا۔ "وہ تمہارے بھی والد ہیں..... پھر تم یہاں کیوں ہو؟ کیا تمہیں ان کے گھر میں نہیں ہونا چاہیے؟"

گل نے اس کے تلخ لہجے کو نظر انداز کر دیا۔ "اس بحث میں مت پڑو کہ کیا ہونا چاہیے اور کیا نہیں..... ہم اس پر بھی بات نہیں کریں گے.... کہ پہلے کیا ہوا۔"

وہ برہمی سے بولا۔ "اس کا مطلب ہے تم سب جانتی ہو..... تمہیں پہلے ہی بریف کر دیا گیا ہے۔"

گل نے کہا۔ "مجھے حقائق کا علم ہے۔"

"یعنی تم سچ مچ اپنی مرضی سے یہاں ہو؟"

گل نے کہا۔ "تمہیں اس میں شک کیوں ہے۔ میں ایک عاقل بالغ عورت ہوں۔"

"تمہیں شرم آنی چاہیے لیکن تمہاری جگہ مجھے شرم آ رہی ہے کہ میری بہن خود ہماری عزت سے کھیل رہی ہے۔" وہ تیز لہجے میں بولا۔

"بکواس بند کرو زوہیب..... اس صورتِ حال کی ذمے دار میں نہیں ہوں..... یہاں جو بھی ہوا میرے آنے سے پہلے ہوا..... اور مجھے اس پر واقعی شرم آتی ہے....." گل نے بگڑ کے کہا۔

"مجھے ایک بات بتاؤ..... عاقل و بالغ عورت..... کیا تم جانا چاہو تو میرے ساتھ جا سکتی ہو۔ اتنی خود مختار ہو تم؟"

"کیوں نہیں..... مگر میں نہیں جاؤں گی..... جب تک ڈاکٹر شہناز باعزت طور پر واپس نہیں آ جاتی..... یہ بات کلیئر ہونی چاہیے۔"

"مجھے تو اب تم سے اندیشہ لاحق ہے کہ ڈاکٹر شہناز کی واپسی کے بعد تمہارا فیصلہ کیا ہوگا۔"

گل نے کہا۔ "میں پاپا کے ساتھ جاؤں گی۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "ایک بات اچھی طرح سمجھ لو..... اگر شہناز کی واپسی کے بعد تم نے یہی رویہ

رکھا......اپنی خودمختاری کا......"
"تو کیا ہوگا...... مجھے دھمکی مت دو زوہیب۔"
"میں سمجھا رہا ہوں تمہیں......اس سے بہت خرابی ہوگی۔"
اب راجا نے کہا۔"مسٹر زوہیب......حالات جتنے خراب ہیں اس سے زیادہ نہیں ہو سکتے......اور ہوں گے تو ہم سامنا کریں گے...... یہ بات رانا صاحب کو بھی سمجھا دینا۔"
زوہیب کسی سلام دعا کے بغیر ایک دم اٹھ کر کمرے سے نکل گیا۔ گل کے رویے نے اسے سخت شاک پہنچایا تھا۔ وہ تصور ہی نہیں کر سکتا تھا کہ اس کی بہن یوں انکار کر دے گی...... مجھے یہ بھی اندازہ ہوا کہ زوہیب کے دل میں پہلے بھی بہن کے لیے چاہت یا پسندیدگی کے جذباتی نہیں تھے۔
"مجھے ڈر ہے یہ معاملہ خراب نہ کر دے......" کچھ دیر بعد راجا بولا۔
گل نے افسوس سے سر ہلایا۔"یہ فطرت میں میرے پاپا جیسا ہے۔ غصے کا تیز اور بہت کم قوتِ برداشت رکھنے والا......"
میں نے کہا"اس کے لیے تم کیا محسوس کرتی ہو۔ آخر وہ بھائی ہے تمہارا۔"
"ابھی میں کچھ محسوس نہیں کرتی......میرا اس کے ساتھ رسمی سا تعلق ہے......ہاں اگر وہ محبت سے پیش آئے تو مجھے اچھا لگے گا کیونکہ میرا بھائی کوئی نہیں...... لیکن اس کو کسی بہن کی ضرورت نہیں...... تین پہلے ہی ہیں۔"
"شاید تمہیں اس کا آنا اچھا نہیں لگا۔"
"پاپا آتے تو مجھے بہت زیادہ خوشی ہوتی۔" وہ بولی۔
راجا نے کہا۔"اور نہ آئے تو تمہیں مایوسی ہوگی یا دکھ ہوگا۔"
"یہ ناممکن ہے......میں جانتی ہوں جتنی مجھے ان کی ضرورت ہے......اس سے زیادہ وہ مجھے چاہتے ہیں......وہ بہت بے قرار ہوں گے......رات بھر سوئے نہیں ہوں گے......میں نے دیکھا ہے کہ بچے اپنے والدین کے لیے وہ جذبات نہیں رکھتے......میرا مطلب ہے جذبات کی شدت نہیں رکھتے......جو والدین رکھتے ہیں......اور یہ سب بالکل قدرتی ہے......فطری ہے......بچے ہوں تو کوئی فرق نہیں پڑتا......وہ ہر ایک کو اتنی محبت دے سکتے ہیں......لیکن وہ دس بچے مل کر بھی انہیں اتنی محبت نہیں دے پاتے......حالانکہ انہیں تو دس گنا ملنا چاہیے۔"
میں نے اسے غور سے دیکھا۔"تمہارا مشاہدہ اس عمر میں بھی سطحی نہیں ہے۔"
وہ اپنی دھن میں بولتی رہی۔"وہ سورج کی طرح ہوتے ہیں۔ سورج سے دنیا کو جتنی روشنی اور حرارت ملتی ہے......کیا دنیا کے سارے انسان توانائی کے سارے وسائل استعمال کر کے سورج کو اتنی روشنی دے سکتے ہیں، اتنی حرارت لوٹا سکتے ہیں۔ بچے ساری توجہ وصول کر لیتے ہیں مگر جب توجہ دینے کا وقت آتا ہے تو انہیں اولڈ ہوم میں چھوڑ آتے ہیں......والدین کی ساری جذباتی سرمایہ کاری یک طرفہ ہوتی ہے۔"
"یہاں میں تم سے اتفاق کرتا ہوں گل...... مجھے اکثر احساسِ جرم ہوتا ہے کہ میں اپنے والدین کے لیے وہ نہیں کرتا جو مجھے کرنا چاہیے......اور میں کر سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔
"ایک بار میں بیمار پڑ گئی...... مجھے خسرہ نکلا تھی......میں رات بھر بے چین رہی...... پاپا ساری رات میرے پاس بیٹھے رہے......اس رات میں نے انہیں بہت تنگ کیا......میں نے کہا کہ مجھے فریش اسٹرابیری آئس کریم چاہیے۔ وہ گئے اور نہ جانے کہاں سے لے آئے حالانکہ باہر برف پڑ رہی تھی......ایک چمچہ کھا کر میں نے آئس کریم پھینک دی اور کہا کہ یہ اچھی نہیں ہے...... مجھے پائن ایپل والی چاہیے جس میں چیری کم ہو......وہ پھر گئے......" گل نے کہا اور ایک ٹھنڈا سانس لیا۔"میرا خیال ہے میں اتنی تکلیف نہیں اٹھاؤں گی......میں انہیں ٹال دوں گی۔"
اندازہ یہ تھا کہ دوپہر تک رانا آ جائے گا......ہم نے اپنی طرف سے پوری یقین دہانی کرا دی تھی کہ اس کے ساتھ معزز مہمانوں جیسا شایانِ شان سلوک ہوگا......شہباز کو واپس حویلی میں دیکھنے کا خیال ایسا تھا کہ ہم سب انتظار میں بے قرار نظر آئے تھے......ریشم صبح سے تیاری میں مصروف تھی۔ اس نے مجھے بتا دیا تھا کہ وہ دوپہر کے کھانے میں میڈم کی پسند کی ہر چیز بنائے گی......وہ اضطرابی کیفیت میں کبھی خود سے باتیں کرتی نظر آتی تھی......کبھی گنگنانے لگتی تھی......میں نے ایک بار اسے کچن میں دو بڑے چمچے لہرا کے ڈانس کرتے دیکھا......وہ ماں سے بھی اپنی گورا شاہی انگلش میں کچھ کہہ رہی تھی......اور ہنس رہی تھی۔
راجا کی حالت سب سے زیادہ خراب تھی لیکن وہ اپنی بے چینی کو ظاہر نہیں کر رہا تھا......کئی بار میں نے باتوں میں محسوس کیا کہ وہ ذہنی طور پر غیر حاضر ہے......وہ شہباز کے خوابوں میں کھویا ہوا تھا......وہ راجا سے بہت دور ہو گئی تھی اور پورا ایک مہینا راجا نے اس کے خواب دیکھتے اور اس سے تصور میں باتیں کرتے گزارا تھا......اب پھر اسے اپنے قریب محسوس کر کے راجا کے عشق کی ساری رانائی لوٹ آئی تھی۔
دوپہر ڈھل گئی اور ہم سب کے لیے انتظار کا عذاب سخت سے سخت تر ہوتا گیا......ہم سب کے کان کسی گاڑی کی آواز پر لگے ہوئے تھے......سب کو گارڈ کے اعلان کا انتظار تھا کہ رانا صاحب آ گئے......مایوس اور بددل ریشم نے کئی بار کھانے کا پوچھا مگر ہم نے کہا کہ تھوڑی دیر ٹھہرو......پھر سہ پہر بھی ڈھل گئی۔
رابعہ نے کہا۔"ہو سکتا ہے رانا دن کے اجالے میں نہ آئے......اندھیرا ہو جانے کے بعد آئے۔"
میں نے کہا" میں تم سے اتفاق کر سکتا ہوں کزن......رانا کو منظور نہیں ہوگا کہ وہاں سے یہاں تک اپنے پرائے سب اس کی سواری کو گزرتا دیکھیں اور ہر شخص جان لے کہ رانا صاحب بقلم خود نواب صاحب سے ملنے گئے۔"
"رائٹ......رات کے اندھیرے میں نکلے گا......" راجا بولا۔
گل نے ہم سب کی سن کے کہا۔"نو پرابلم......میں پوچھ لیتی ہوں، اسے بتا دیتی ہوں کہ میں اس کا انتظار کر رہی ہوں۔"

پھر سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا......گل کی بات کا دوسرا مطلب یہ ہوتا کہ ہم سب بے چینی سے شہباز کی واپسی کے منتظر ہیں......اس میں شک کی بات کوئی نہیں تھی۔
میں نے کہا"ہاں......اگر معلوم ہو جائے کہ وہ ابھی نہیں آ رہا ہے تو میں لاہور چلا جاتا ہوں......فریال کو بھی لے آؤں۔"
"یہ ٹھیک ہے......یہاں شہباز کا استقبال کرنے والوں میں فریال بھی ہو......" رابعہ بولی۔
میں نے کہا۔"ابھی سوا دو بجے ہیں۔ آٹھ بجے تک میں لوٹ آؤں گا۔ ایسے ہی چھ گھنٹے ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہنے سے کیا فائدہ۔"
گل کو سب کی تائید مل گئی تو اس نے میرے فون سے رانا کا نمبر ملایا اور اس کا اسپیکر آن کر دیا۔ دوسری طرف سے گھنٹی بجنے کی آواز آئی۔
رانا نے کچھ دیر بعد رعونت سے کہا۔"ہیلو۔"
گل نے شکایتی لہجے میں کہا"ہاں......میں آپ کا انتظار کر رہی ہوں۔"
رانا نے کہا۔"کیوں؟"
"آپ آئیں اور مجھے لے جائیں......" گل نے بڑے مان سے کہا۔
"کیا تمہیں کوئی معذوری درپیش ہے......میرا مطلب جسمانی معذوری نہیں ہے......" رانا سپاٹ لہجے میں بولا۔
"پھر کیا مطلب ہے۔"
"مطلب صاف ہے......اگر تم قید میں نہیں ہو اور تمہیں اپنی مرضی کرنے کا قانونی اختیار بھی حاصل ہے......تو پھر تم خود آ سکتی ہو......آخر ست بدھائی کی حویلی میں بھی تم خود ہی گئی ہو......اپنی مرضی سے......" وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔
گل کا چہرہ تاریک ہو گیا......"آپ وعدہ خلافی کر رہے ہیں۔"
"ہاں......ان حالات میں جو تم نے پیدا کر دیے

ہیں۔ یہ کوئی سنگین اخلاقی جرم نہیں رہا۔"

"میں نے کیا کیا ہے پاپا؟"

"یہ تم خود جانتی ہو...... تم نے دشمنوں پر اعتبار کیا...... ان کے جھوٹ کو بھی سچ مان لیا...... یہ نہیں سوچا کہ تمہارے باپ کی بھی عزت ہے...... تم بے شک عاقل و بالغ اور خود مختار ہو...... لیکن گل یہ ہرگز نہیں ہوسکتا کہ تم چار دن کے لیے ولایت سے آؤ اور میری ناک کٹوا دو...... تم تو چلی جاؤ گی...... یہاں کتنی باتیں ہوں گی...... اس کا اندازہ ہے تمہیں؟"

"باتیں کیا آج نہیں ہورہی ہیں پاپا۔ کون سی نیک نامی کا پہاڑ کھڑا کررکھا ہے آپ نے جو زمیں بوس ہوجائے گا۔"

"اپنے معاملات کو میں اچھی طرح سمجھتا ہوں لڑکی...... تم کیا جانو یہاں دوستی دشمنی کے پیمانے کیا ہیں...... یہ ولایت نہیں پاکستان ہے۔"

گل نے برہمی سے کہا۔ "اس کا مطلب ہے آپ ڈاکٹر شہناز کو نہیں لارہے ہیں۔"

"کون ڈاکٹر شہناز۔" رانا نے دھاڑ کے کہا۔

"ضرور آپ کو زوہیب نے بدگمان کیا ہے۔"

"زوہیب نے مجھے بچالیا...... مٹی پلید ہونے سے بے عزت ہونے سے...... تم جیسی لڑکی ماں باپ کی رسوائی ہی کراتی ہے۔ میں آجاتا تو مجھے ذلیل کیا جاتا...... میرے دشمنوں کو موقع ملتا مجھے جوتے مارنے کا منہ کالا کر کے گدھے پر بٹھا کے واپس روانہ کرتے کا۔"

گل نے چیخ کے کہا۔ "اگر زوہیب نے ایسا کہا ہے تو بکواس کی ہے۔"

"خود زوہیب کے ساتھ کیا ہوا...... اس نے بتا دیا ہے...... اس کے بعد بھی تم مجھ سے توقع رکھتی ہو کہ میں وہاں کیوں......"

"زوہیب کو پوری عزت دی گئی۔"

"پہلے اسے گالیاں دی گئیں...... پھر دھکے دے کر حویلی سے نکالا گیا اور وہ حرامزادہ نواب...... اسے بھی قید میں ڈالنا چاہتا تھا۔"

"یہ جھوٹ ہے......" گل چلائی۔

"دیکھو گل...... میں نے تمہارے ساتھ آج تک فرق نہیں رکھا لیکن تم نے ثابت کردیا کہ تم صرف ایک انگریز کی اولاد ہو...... جسے باپ کے نام سے بھی سروکار نہیں ہوتا۔"

"آپ مجھے حرامی کہہ رہے ہیں پاپا۔" گل رونے کے قریب ہی تھی۔

"مجھے کچھ کہنے کی ضرورت ہی کیا ہے...... تم خود کو کیا ثابت کررہی ہو؟ میں تم سے دستبرداری کا اعلان کرتا ہوں...... تمہاری ماں کو بھی طلاق دے دوں گا...... تم رہو اس نواب کے ساتھ...... اس سے تو میں نمٹ لوں گا......" رانا نے سخت غصے میں فون رکھ کردیا۔

گل رونے لگی...... ہم سب بالکل سکتے کی کیفیت میں بیٹھے رہے۔ ہمارے لیے اس اینٹی کلائمکس کا شاک ناقابلِ برداشت ثابت ہورہا تھا...... یکلخت ساری امیدوں نے دم توڑ دیا تھا۔ شہناز کا تصور بھی مایوسی کے اندھیرے میں کھو گیا تھا...... ہماری چال ناکام ہوچکی تھی۔ ہم جو خود کو بہت ہوشیار کھلاڑی سمجھتے تھے رانا کے مقابلے میں اناڑی ثابت ہوئے تھے۔

خاموشی کے ایک لمبے بوجھل وقفے کے بعد یہ سوال راجا نے ہی کیا جو ہم سب کے دل میں تھا۔ "اب کیا ہوگا...... کیا کریں گے ہم۔"

میں نے کہا "ثابت ہوگیا کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔"

"اگر ہم وہی کرتے...... جو زوہیب نے باپ سے کہا۔ ہم سچ مچ اسے بھی روک لیتے۔" راجا بولا۔ "اسے بھی قید کرلیتے تو رانا کا باپ بھی آتا۔"

"ہم نے فرض کرلیا تھا کہ رانا سے شرافت کی زبان میں بات کی جاسکتی ہے اور معاملات پُرامن طریقے سے سلجھائے جاسکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

راجا بولا۔ "معلوم نہیں اب شہناز کے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔"

"اب مجھے کچھ کرنا چاہیے۔" گل نے جیسے خود سے کہا۔

"تم کیا کرسکتی ہو......" رابعہ نے آہ بھری۔

"میں اس کی بیٹی ہوں...... اس کا کچا چٹھا سب کو بتا سکتی ہوں...... جب اس نے مجھ سے لاتعلقی کا فیصلہ سنا دیا اور میری ماں کو چھوڑنے کا اعلان ہی کردیا...... تو پھر مجھے کس بات کا لحاظ...... میں یہیں رہوں گی۔"

میں نے کہا "نہیں گل...... تم کو جانا ہوگا...... ہم تمہیں اپنی جنگ کی آگ میں نہیں جھونک سکتے...... اور نہ تمہاری ماں کے مستقبل کو داؤ پر لگائیں گے۔"

"آپ نہیں جانتے رفیق صاحب...... میں اسے تباہ کرسکتی ہوں۔"

میں نے کہا...... "اس کی تباہی سے تمہیں کیا حاصل ہوگا! ہمیں کیا ملے گا۔ اب تم وہی کرو گی جو میں بتا رہا ہوں...... اگر تم واقعی ہماری مدد کرنا چاہتی ہو تو اپنے باپ کے پاس جاؤ اور اس سے معافی مانگ لو...... اسے یقین دلا دو کہ تم اپنی غلطی پر پشیمان ہو۔"

"وہ ٹھیک تھا اور تم غلط تھیں...... سنو...... پوری بات سنو میری...... رانا کے گھر میں رہ کے تم بہت کچھ کرسکتی ہو ہمارے لیے...... تم شہناز کو بچا سکتی ہو...... کسی بھی خرابی سے...... فرار ہونے میں اس کی مدد کرسکتی ہو...... اسے نکال کرلانے کی کارروائی میں ہماری مددگار ثابت ہوسکتی ہو...... کیسے؟...... یہ سب حالات کے مطابق ہوگا...... پہلے تم وہاں جاؤ۔"

آہستہ آہستہ بات گل کی سمجھ میں آنے لگی۔

"شاید...... یہ ٹھیک ہوگا...... مگر مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"اس کے برعکس...... میرا خیال ہے وہاں اس بات کا زیادہ خیال رکھا جائے گا کہ تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہ ہو...... تم ان عورتوں میں نہیں ہو جو حویلی کے ماحول میں مجبوری کی زندگی گزارتی ہوں...... رانا کی بیویاں، بیٹیاں اس کی ماں یا داری...... سب پر روایات کے پہرے ہیں...... وہاں مرد حاکم ہے اور سب کی تقدیر کے فیصلے کرتا ہے...... عورت ان فیصلوں سے انحراف کرنے کا سوچتی ہی نہیں...... تم نے تو پہلے ہی خود مختاری کا اعلان کردیا ہے اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ تم پاکستانی نہیں...... برطانوی شہری ہو۔"

"کیا اس رویے کے ساتھ مجھے برداشت کیا جائے گا!"

"تم اپنے رویے میں لچک رکھو...... مفاہمت پیدا کرو...... باقی سب کو چھوڑ کے صرف اپنے باپ کی سنو...... اسے ناراض نہ ہونے دو...... تم نے خود بتایا کہ اسے تمہاری کتنی پروا ہے...... بس اسے منالو...... تمہارے یہاں آنے سے اس کی انا کو سخت ٹھیس پہنچی ہے لیکن ابھی یہ بات کسی کو بھی معلوم نہیں...... اس سے پہلے ہی تم اپنے گھر چلی جاؤ گی تو رانا کا سارا گلہ دور ہو جائے گا...... وہ خدا کا شکر ادا کرے گا کہ اس کی جگ ہنسائی نہیں ہوئی...... وہ تمہیں معاف کر دے گا۔"

میری بات سے راجا اور رابعہ نے بھی اتفاق کیا...... حالات کو بگڑنے سے بچانے میں یہ حکمتِ عملی کارگر تھی...... کامیابی کا تمام تر انحصار گل کی اچھی اداکاری پر تھا...... اسے رانا کو یقین دلانا تھا کہ وہ اپنے رویے پر پشیمان ہے اور اسے اپنی غلطی کا احساس ہو چکا ہے۔

رانا کا فون موصول ہونے کے ایک گھنٹے بعد ہم نے گل کو رخصت کر دیا...... اسے بحفاظت رانا کی حویلی تک پہنچانے کی ذمے داری غنی کو سونپی گئی...... وہ اپنے ساتھ دو گارڈ بھی لے گیا...... ڈیڑھ گھنٹے بعد اس نے واپس آ کے اپنی رپورٹ دی کہ گل کو اس نے رانا کی حویلی کے دروازے پر اتار دیا تھا...... اس کا سامان رانا کے ملازمین اندر لے گئے تھے...... کسی نے غنی سے تعرض نہیں کیا تھا اور نہ اس کی واپسی کی راہ میں مزاحم ہوا تھا۔

شہناز کے واپس نہ آنے سے سب مایوس اور دل گرفتہ تھے۔ قدرتی طور پر راجا کا دکھ سب سے زیادہ تھا۔ ایک ناکامی نے سب کا حوصلہ پست کر دیا تھا...... شہناز اب کیسے واپس آئے گی...... اس کی بازیابی کے لیے ہمارا لائحہ عمل کیا ہوگا۔ یہ سب غیر یقینی تھا...... ہو سکتا ہے گل اپنے باپ کو قائل کر لے...... یا وہ اسے کسی طرح فرار کرا دے...... ہم پھر شامی سے مدد کی درخواست کریں اور بہتر منصوبہ بندی کے ساتھ بزور بازو شہناز کو نکال لائیں...... ان سارے امکانات کو نہ یکسر مسترد کیا جا سکتا تھا اور نہ ان سے کامیابی کا یقین حاصل ہوتا تھا۔

میں نے بہتر سمجھا کہ لاہور جا کے فریال کو واپس لے آؤں اور اس کے ساتھ ہی اپنے والدین کو بھی...... ان سب لوگوں کی واپسی حویلی کے ماحول کی افسردگی اور مایوسی کو دور کرنے میں معاون ثابت ہو سکتی تھی۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ مسائل کو سمیٹا جائے۔ ان میں مزید اضافہ نہ کیا جائے۔

لاہور تک ڈرائیو کرتے ہوئے میں نے حالات کا تجزیہ کیا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ شہناز کو واپس لانا کسی کے اختیار کی بات نہیں مگر خرابی کا ایک سبب میں خود ہوں...... اگر فریال مجھ سے بدگمان اور خفا ہے تو جائز ہے...... اگر میرے والدین آزردہ ہیں تو اس کا ذمے دار میں ہوں۔ اگر میں فوری طور پر نور جہاں سے مکمل قطع تعلق کر لوں تو فریال کی ناراضی دور ہو جائے گی۔ میں اس سے شادی میں مزید تاخیر نہ کروں تو وہ بھی خوش ہو جائے گی اور میرے والدین کو بھی وہ خوشی مل جائے گی جس کی آس وہ برسوں سے لگائے بیٹھے ہیں۔

اس فیصلے نے مجھے بہت سکون دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ...... نور جہاں کے لیے میرے دل میں صرف منفی جذبات ہیں۔ اس کے خیرہ کر دینے والا حسن اور مدہوش کر دینے والا شباب کی کشش میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتی...... اس نے اپنی ہوس کی تسکین کے لیے مجھے حاصل کیا تھا اور اس کی قیمت احسان سے ادا کی تھی...... میں اس کا مزید متحمل نہیں ہو سکتا تھا...... اس سے پہلے کہ یہ تعلق میری مکمل تباہی کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہو، مجھے اس سے کنارہ کش ہو جانا چاہیے۔

رات نے لاہور پر اپنا دامن پھیلا دیا تھا...... سڑکوں پر زندگی اپنی ساری خوبصورت اور توانائی کے ساتھ رواں دواں تھی۔ میں نے فاروقی کی کوٹھی کے اندر گاڑی روکی تو مجھے اندر غیر معمولی خاموشی اور تاریکی کا احساس ہوا...... پورچ کی اور گارڈن کی ساری لائٹس گل تھیں جو لیلیٰ بھابی اپنی عادت کے مطابق مغرب کی اذان سنتے ہی جلا دیتی تھیں۔

میں اندر گیا تو سناٹے نے میرا استقبال کیا...... اندر سے نہ کسی کے ہنسنے بولنے کی آواز سنائی دے رہی تھی اور نہ ٹی وی چلنے کی...... تمام کمروں کی روشنیاں بھی بند تھیں...... صرف لیلیٰ بھابی کے کمرے میں بند دروازے

کے پیچھے مجھے روشنی کی لکیر دکھائی دی۔ میں دروازہ کھول کے اندر داخل ہوا تو میں نے لیلیٰ بھابی کو دیکھا...... وہ اپنے بیڈ پر گم صم اور اکیلی بیٹھی تھیں۔

میں نے کہا...... "بھابی...... یہ سب کیا ہے...... گھر میں اندھیرا کر کے کیوں بیٹھی ہیں آپ...... سب لوگ کہاں ہیں۔"

"اسپتال میں۔" بھابی نے نظر اٹھا کے مجھے دیکھا تو مجھے ان کی آنکھوں میں آنسو نظر آئے۔

میں ان کے پاس جا بیٹھا...... وہ جیسے کسی کندھے کا انتظار کر رہی تھیں۔ انہوں نے ایک دم پھوٹ پھوٹ کے رونا شروع کر دیا۔

میں نے گھبرا کے کہا۔ "بھابی...... خدا کے لیے کچھ بتایئے...... سب ٹھیک رہا۔"

میری بات کا الٹا اثر ہوا...... انہوں نے ہچکیوں سے اور دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیا...... گھر میں ملازم انہوں نے کبھی نہیں رکھا تھا...... میں خود ہی پانی لے کر آیا اور بڑی مشکل سے انہیں دو گھونٹ پلائے۔

"بھابی مجھے بتائیں کیا ہوا ہے...... فاروقی نے کچھ کہا ہے؟"

انہوں نے نفی میں سر ہلایا اور دوپٹے سے آنسو صاف کیے۔ "وہ...... وہ مر گئی۔" میرے دل کی دھڑکن بند ہو گئی...... "کون...... کس کی بات کر رہی ہیں آپ۔"

انہوں نے سسکی لی۔ "وہ...... مریم...... ابھی ابھی اسپتال سے فون آیا تھا۔"

"مریم مر گئی۔ کیسے۔"

انہوں نے پھر رونا شروع کر دیا۔ "وہ...... اس کو یہاں لے آئے تھے...... اسی گھر میں...... مجھے تو کچھ معلوم ہی نہیں تھا...... یہ سب کیسے ہوا...... دفتر میں کیا ہوتا تھا...... مجھے کسی نے نہیں بتایا...... میں نے کبھی شک بھی نہیں کیا...... میں سمجھتی تھی...... میرا شوہر کسی عورت پر بری نظر ڈال ہی نہیں سکتا...... مریم بیوہ ہے...... وہ اس کی مدد کرتا ہے...... مگر معاملہ کچھ اور تھا...... جب میں نے شک کا اظہار کیا تو انہوں نے مان لیا کہ وہ دوسری شادی کر چکے ہیں...... اس پر میں نے ہنگامہ کیا...... چیخی چلائی تو وہ اسے یہاں لے آئے...... رابعہ کے جانے کے بعد ہی...... رابعہ نے تو سب دیکھا اور سنا تھا۔"

میں نے کہا "لیکن وہ مر کیسے گئی۔"

"وہ گر گئی تھی...... پورچ کی سیڑھیوں سے لان پر جاتے ہوئے اس کا پاؤں پھسل گیا تھا۔ ماربل فلور پر پالش ہوئی تھی اور اس پر پانی تھا' وہ جاتے ہوئے گری تھی...... لیکن میں نے اسے دھکا نہیں دیا تھا...... خدا کی قسم۔"

"یہ کون کہتا ہے۔"

"میرا شوہر......" بھابی نے پھر بری طرح رونا شروع کیا۔

"وہ گرنے سے مر گئی۔"

"وہ...... ماں بننے والی تھی...... فاروقی اسے اسپتال لے گئے تھے آج صبح...... وہ کورٹ بھی نہیں گئے۔ سارا دن اسپتال میں ہی رہے...... میں نے فون کیا تو مجھے بہت برا بھلا کہا۔ مجھ پر الزام لگایا کہ میں نے اسے مار دیا۔ اس کا ابارشن ہو گیا تھا...... ڈاکٹر شام تک اسے بچانے کی کوشش کرتے رہے...... وہ آئی سی یو میں تھی۔"

میں نے کہا...... "مگر ابارشن سے موت...... یہ بات سمجھ میں نہیں آتی۔"

"اسپتال بھی اچھا تھا...... ڈاکٹر تجربہ کار تھے۔"

"پھر یہ کیسے ہوا۔"

"فاروقی کہتے ہیں...... میں نے اسے زہر بھی دیا تھا۔" وہ زار و قطار رونے لگی۔

"فاروقی پاگل ہو گیا ہے کیا۔" یہ میں نے برہمی سے کہا۔

"جب اس کا پیر پھسلا...... تو میں اسے چائے دینے گئی تھی...... وہ باہر بیٹھی تھی...... میرے ہاتھ سے چائے کا کپ لے کر وہ اٹھی...... گارڈن میں جانے کے لیے...... میرا خیال ہے اس سے کچھ چائے چھلکی...... اس پر پاؤں پڑنے سے وہ پھسلی...... فاروقی کہنے لگا چائے میں زہر تھا۔"

"کیا چائے اس نے پی لی تھی۔"

"کہاں...... وہ چائے لے کر اٹھی اور بس...... اس کے گرتے ہی چائے بھی گر گئی...... میں نے ہی اسے

اٹھایا۔"

"چائے کی پیالی تو ٹوٹ گئی ہوگی۔"

"پیالی لان پر جا کے گری...... پیالی کہاں مگ تھا...... مگ ٹوٹنے سے بچ گیا...... چائے لان میں جذب ہوگئی...... بس اس بات کو پکڑ لیا ہے تمہارے فاروقی صاحب نے...... کہتے ہیں اس نے چائے پی لی تھی...... پھر تم نے اسے دھکا دیا...... کہ زہر سے نہ مرے تو گر کے مر جائے...... سوچو ذرا کتنی فضول ہے یہ بات...... میں تو خود اس کے لیے چائے لے کر گئی تھی۔"

"آپ کیوں گئی تھیں چائے لے کر۔" میں نے کہا۔

بھابی نے کہا۔" اگر لے گئی تھی...... تو کیا یہ میرا جرم بن گیا۔"

میں نے کہا۔" جرم بن سکتا ہے...... اگر فاروقی آپ کو راستے سے ہٹانا چاہے۔"

وہ چلائی۔" یہ تم کیسی باتیں کرر ہے ہو...... مجھ سے انہوں نے فون پر کہا ہے کہ قتل کا الزام سوائے تمہارے کسی پر نہیں آسکتا...... لیکن فکر مت کرو...... میں تمہیں بچالوں گا...... اگر......"

میں نے بھابی کو غور سے دیکھا۔" کوئی شرط رکھی تھی فاروقی نے تمہارے سامنے...... بولو...... چپ کیوں ہوگئیں۔"

بھابی کا رنگ اُڑ گیا...... مجھے نور جہاں کی بات یاد آئی پہلے اس نے جو کہا تھا سچ ثابت ہوا تھا...... کیا اب اس کی اگلی وارننگ کے درست ثابت ہونے کا وقت بھی آگیا تھا...... مریم کے بعد میرا نمبر تھا۔

آہستہ آہستہ لیلیٰ بھابی نے خود پر قابو پالیا" وہ...... وہ کہتے ہیں کہ ابھی تک معاملات میرے ہاتھ میں ہیں۔"

"قانونی معاملات...... ڈیتھ سرٹیفکیٹ میں موت کا سبب یہ لکھا جاسکتا ہے کہ...... حادثاتی تھی...... مریم پاؤں پھسلنے سے گری تھی۔"

"ایسا تو ہوا تھا......" میں نے کہا" یہ زہر والا معاملہ بیچ میں کہاں سے آگیا؟"

"میں تو خود بھی یہ بات سمجھنے سے قاصر ہوں۔ مریم کو اسپتال پہنچانے میں بھی دیر نہیں ہوئی تھی۔ فاروقی خود اسے لے کر بھاگے تھے۔ ایسے حادثے میں ابارشن ہو تو بچہ مر سکتا ہے مگر عورت کو کچھ نہیں ہوتا۔ ابھی صرف تین مہینے ہی ہوئے تھے۔ اسپتال والے ڈی این سی کے بعد ایک دو دن رکھ کے پھر چھٹی کردیتے۔ مریم کے مرجانے سے اسپتال والوں کو پریشانی لاحق ہوئی۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کوئی سینئر ڈاکٹر موجود نہ تھی۔ جونیئر ڈاکٹر نے کیس دیکھا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ جب سینئر ڈاکٹر آئی تو اس نے پوسٹ مارٹم کے لیے کہا۔ اسے ڈر تھا کہ مرنے والی کا شوہر اتنا بڑا وکیل ہے وہ اسپتال پر کیس نہ کردے...... اسپتال کو لینے کے دینے پڑ جاتے۔"

میں نے کہا" کہیں ایسا تو نہیں کہ اپنی جان بچانے کے لیے اسپتال والوں نے زہر دینے کی کہانی گھڑی ہو۔ اگر ایسا ہے تو ابھی وقت ہے ہم پوسٹ مارٹم رپورٹ کو چیلنج کر سکتے ہیں۔"

"مجھے خود سمجھ نہیں آئی کہ فاروق نے اسپتال والوں کی بات شک وشبے کے بغیر فوراً کیوں مان لی اور پھر براہِ راست مجھ پر الزام کیوں عائد کردیا۔ کیا وہ مجھے جانتے نہیں؟ ایسی حرکت میں کرسکتی ہوں......" وہ پھر رونے لگی۔

میں نے کہا۔" بھابی...... فاروق نے شرط کیا رکھی تھی۔"

لیلیٰ بھابی کے چہرے کے تاثرات میں ایک بار پھر نمایاں تبدیلی نظر آئی۔" شرط...... وہ دراصل...... شرط کوئی نہیں مجھ سے یہ وعدہ چاہتے تھے کہ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔"

"کیا مطلب؟ آپ آئندہ مریم کو زہر نہیں دیں گی؟ انہوں نے پھر کسی سے شادی کی تو اسے...... یہ کیا فضول بات ہے بھابی۔"

"ان کا مطلب تھا...... آئندہ یہ بات نہیں ہوگی۔ ہم اس مسئلے پر آپس میں بھی بات نہیں کریں گے۔"

صاف لگا کہ لیلیٰ بھابی جھوٹ بول رہی تھی۔ شرط والی بات اس کی زبان سے بے اختیار نکل گئی تھی اور اب وہ مجھے بے سروپا وضاحت سے قائل کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ میں اسے کیسے بتاتا کہ فاروقی کی شرط کے بارے میں مجھے پہلے سے معلوم ہے۔

فاروقی نے کہا ہوگا کہ دیکھو...... اس وقت تمہاری زندگی اور موت کا فیصلہ میرے ہاتھ میں ہے۔ اگر ڈیتھ سرٹیفکیٹ میں یہ لکھ دیا گیا کہ مریم کی موت کا سبب حادثاتی نہیں۔ یہ قتل ہے اور اسے زہر دیا گیا ہے تو فاروقی کے ایک اشارے پر پولیس تمہیں گرفتار کرے گی اور یہ ثابت کرنا بہت آسان ہوگا۔ مریم کو زہر دینے والی اس کی سوکن اور فاروقی کی پہلی بیوی لیلیٰ کے سوا کوئی نہیں کیونکہ اس کے پاس قتل کی ٹھوس وجہ تھی۔ سوکن سے حسد کے فطری سبب سے بڑھ کر یہ بات تھی کہ مریم ماں بننے کا اعزاز حاصل کرنے والی تھی جس کے لیے لیلیٰ تمام عمر ترستی رہی۔

اگر فاروق کے اشارے پر مریم کی موت کا ذمے دار لیلیٰ کو بنادیا جاتا تو پھر ذلت درسوائی کے ساتھ اس کی زندگی کے بقیہ ایام کسی زنانہ جیل میں جرم بے گناہی کی سزا پوری کرتے گزر جاتے۔ یہ اس کے لیے دہرا عذاب ہوتا۔ جیل کی سختی الگ اور چوبیس گھنٹے کچوکے دینے والا یہ احساس الگ کہ قانون کے ساتھ ساتھ اس کے شوہر نے بھی اسے مجرم تسلیم کرلیا جس کی محبت پر اس کا اعتماد اپنے ایمان کی طرح کامل تھا۔

شرط کا علم مجھے بہت پہلے ہو چکا تھا۔ فاروق نے کہا ہوگا کہ لیلیٰ...... اس وقت میں چاہوں تو تمہیں پھانسی کے تختے پر بھی پہنچا سکتا ہوں یا عمر قید کی سزا دلوا سکتا ہوں لیکن ایک شرط پر تم عزت وآبرو کے ساتھ حسب سابق میرے گھر میں میری بیوی بن کے رہ سکتی ہو۔ اور فرط غم سے عقل وہوش کھو دینے والی لیلیٰ بھابی نے بغیر سوچے سمجھے کہا ہوگا کہ مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔ قتل کے الزام کی دہشت نے اس کی عقل کو ماؤف اور اعصاب کو شکستہ کردیا ہوگا۔

فاروقی ایک نامور وکیل تھا اور اسے یہ ناموری اس کی عیاری نے ہی عطا کی تھی۔ لیلیٰ بھابی جیسی سیدھی سادی گھریلو عورت کیا جانے کہ آج کل شوہر کا ذہن کس شیطانی سازش کی منصوبہ بندی کررہا ہے...... ممکن ہے ابھی فاروقی نے کچھ نہ بتایا ہو لیکن بڑی ہوشیاری سے اس نے بیوی کو اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے قابو کرلیا ہوگا۔ اگر لیلیٰ نے پوچھا بھی ہوگا تو فاروقی نے کہا ہوگا کہ شرط کے بارے میں تمہیں ابھی کچھ نہیں بتایا جاسکتا...... جب وقت آئے گا تو تمہیں خود ہی پتا چل جائے گا لیکن اس خوش فہمی کا شکار کبھی مت ہونا کہ مریم کے ساتھ ہی یہ معاملہ ہمیشہ کے لیے دفن ہوجائے گا...... اگر تم نے وعدہ خلافی کا سوچا بھی تو میں پولیس کو ایک درخواست دوں گا کہ میری بیوی مریم کی موت کسی حادثے کا نتیجہ نہیں تھی۔ میری پہلی بیوی نے اب اعتراف کیا ہے کہ اسے زہر دے کر مارنے والی وہ خود تھی...... اور پولیس دس سال بعد بھی لاش قبر سے نکلوا کے پوسٹ مارٹم کرائے تو زہر کا پتا بالوں اور ہڈیوں سے چلایا جاسکتا ہے۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں اپنے خیالات کے جنگل میں اکیلا بھٹک رہا ہوں لیکن میری نظر لیلیٰ بھابی پر جم کے رہ گئی ہے...... میرے یوں پلک جھپکائے بغیر دیکھنے سے وہ سخت نروس ہورہی تھی...... بالآخر اس نے پوچھ لیا" رفیق بھائی...... ایسے کیوں دیکھ رہے ہو۔؟"

میں چونکا۔" معاف کرنا...... میں کچھ اور سوچ رہا تھا...... عام طور پر بیوی کی موت پُراسرار ہو تو سب سے پہلے شک کیا جاتا ہے خود شوہر پر...... اس کے بعد آتے ہیں سسرالی عزیز اور آخری میں رقابت اور حسد کرنے والے۔"

"شاید آپ ٹھیک سوچ رہے ہوں مگر۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی......" سوال یہ ہے لیلیٰ بھابی...... کہ اسپتال والوں نے فاروقی کو موردِ الزام کیوں نہیں سمجھا؟ آپ پر شک کا اظہار کس نے کیا؟...... اسپتال والوں کو آپ کے بارے میں کیا معلوم ہے کہ مریم آپ کی سوکن تھی؟"

"آخر کیا مطلب ہے آپ کا......"

میں نے کہا" مطلب صاف ہے بھابی...... یہ سوال فاروقی سے کیا جاسکتا تھا کہ آپ کے خیال میں انہیں کس نے زہر دیا؟ مطلب یہ کہ ایسا خود آپ نے نہیں کیا تو پھر آپ ہی بتائیں کس نے کیا۔ ساس یا نند نے...... کسی رشتے دار نے حسد اور دشمنی میں یا پھر کسی اور نے...... جب تک خود فاروقی نہ کہے کہ مجھے اپنی پہلی بیوی پر شک ہے...... اسپتال والے کسی کا نام کیسے لے سکتے ہیں۔"

بات اتنی سادہ اور منطقی تھی کہ لیلیٰ بھابی کو سمجھنے میں دشواری نہیں ہوئی...... میرا مقصد بھی یہی تھا کہ انہیں اپنے شوہر سے بدظن کردوں۔ یہ سمجھادوں کہ انہیں ایک سازش کے تحت کسی اور کے جرم میں ملوث کیا جارہا ہے۔

"لیکن...... وہ میرا نام کیوں لیں گے۔ وہ ایسا نہیں کرسکتے...... مجھے معلوم ہے وہ ایسا نہیں کرسکتے...... لیلیٰ بھابی کا رنگ لاش کی طرح سفید ہو چکا تھا اور وہ ہسٹریا میں مبتلا ہونے لگی تھیں۔

میں نے کہا" بھابی...... میری طرف دیکھیے...... میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بتائیں...... آپ نے اسے زہر نہیں دیا......؟"

وہ چلائیں......" تم بھی شک کررہے ہو مجھ پر پھر؟...... تم جس کی کہو قسم کھاسکتی ہوں میں...... قرآن پر ہاتھ رکھ کے کہہ سکتی ہوں......"

"بس بس......" میں نے لیلیٰ بھابی کے سر پر تسلی دینے کے لیے اپنا ہاتھ رکھا۔" مجھے یقین آگیا۔"

وہ میرے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے

لگیں۔ ''معلوم نہیں یہ سب کیوں ہوا...... کس کی نظر لگ گئی میری زندگی کو...... میں تو بہت خوش تھی اور بہت مطمئن بھی...... میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ فاروق اسی گھر میں دوسری عورت لے آئیں گے۔ میں نے خود ان سے بار ہا کہا کہ انہیں اولاد کی خواہش ہے تو میری طرف سے اجازت ہے...... وہ دوسری شادی کر لیں...... مگر وہ خفا ہو جاتے تھے۔''

میں نے بھابی کو الگ کیا۔ ''اب آپ رونا چھوڑیں...... میں اسپتال جا کے دیکھتا ہوں معاملہ کیا ہے؟''

''چھوڑیں رفیق بھائی...... اب کیا فائدہ اسپتال جانے سے؟''

میں نے کہا ''بات فائدے اور نقصان کی نہیں...... میں حقیقت جاننا چاہتا ہوں...... مجھے اس الزام کے پیچھے کچھ اور نظر آرہا ہے۔''

لیلیٰ بھابی نے خوفزدہ سی نظر اٹھائی۔ ''کیا نظر آرہا ہے؟''

''جھوٹ...... زہر آپ نے نہیں دیا فاروقی نے نہیں دیا تو پھر کسی نے دیا اور کیوں!...... ہو سکتا ہے یہ ساری کہانی ہی جھوٹ ہو...... اس کی موت کا اصل سبب کچھ اور ہو...... اسے کسی نے بھی زہر نہ دیا ہو...... خیر...... میں چلتا ہوں...... باقی سب لوگ ابھی اسپتال ہی میں ہوں گے۔''

لیکن میں باہر نکلا تو گیٹ سے ایمبولینس اندر داخل ہو رہی تھی۔ یہ اسپتال سے مریم کی ڈیڈ باڈی آگئی تھی۔ ڈرائیور اسے ریورس گیئر میں اندر لایا۔ گیٹ کے باہر فاروقی کی کار سے وہ سب لوگ اتر کر اندر آئے جو اسپتال بھی ساتھ ہی گئے تھے۔

فاروقی نے اترتے ہی مجھے دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے حیرانی سے زیادہ وہ پریشانی کا شکار ہوا ہے...... یا شاید یہ میرے احساس کا کرشمہ تھا۔ میں اسے پریشان دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔ اماں اور ابا نے بھی مجھے اجنبی نظروں سے دیکھا اور میرے پاس سے گزر کے اندر چلے گئے...... فریال ان کے پیچھے تھی۔ اس نے میری طرف نظر ہی نہیں اٹھائی...... ان سب کے چہروں پر سایہ فگن اذیت ناک خاموشی میں بھی ایک سوال تھا کہ آخر ہم سب اس المیے کا حصہ کیوں ہیں جب کہ ہم کسی بھی حوالے سے مریم کو نہیں جانتے...... ہمارے لیے وہ اتنی ہی اجنبی تھی جتنے ہم اس کے لیے......''

اس سوال کا جواب ایک الزام تھا جو میری ذات سے منسوب ہوتا تھا...... وہ میری وجہ سے یہاں تھے ورنہ وہ اپنے گھر میں ہوتے۔ اس گھر میں جو کھنڈر ہو گیا تھا، جل کے راکھ ہو گیا تھا۔ میری وجہ سے ست بدھائی میں ان کے خوابوں کی جنت آباد نہ ہو سکی اور وہ فاروقی کے گھر میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے...... اس خیال نے میرے احساس جرم کو دو چند کر دیا۔

فاروقی کی گاڑی کے ڈرائیور اور چوکیدار نے مل کر ایمبولینس سے ڈیڈ باڈی کو اتارا اور اندر لے گئے۔ فاروقی بھی میری طرح ایک افسوسناک لاتعلقی کے ساتھ چپ چاپ کھڑا رہا۔

جب میں نے اندر جا کے مریم کو دیکھا تو میرے دل میں درد کی ایک کسک جاگی جس نے مجھے غم و غصے کا شکار کر دیا۔ مریم سے میرا کوئی رشتہ نہ تھا۔ ایک شناسائی تھی جو میری شرارت اور اس کی شرافت کی ہم آہنگی سے بے تکلفی میں ڈھل گئی تھی۔ وہ بہت خوبصورت نہیں لیکن اس میں نسائیت کا حسن بڑے بھرپور انداز میں جلوہ گری دکھاتا تھا۔ اس کی پہلی شادی بہت کامیاب تھی مگر شوہر کی حادثاتی موت نے اسے ناکارہ بنا دیا تھا۔ زندہ رہنے کے لیے وہ ملازمت کا سہارا لینے پر مجبور ہوئی تھی۔ فاروقی نے ازراہِ ہمدردی اسے اپنے آفس میں سیکریٹری رکھ لیا تھا جہاں وہ انتظار گاہ کے ایک گوشے میں اپنی میز کے پیچھے کسی حسین مجسمے کی طرح موجود رہتی تھی...... انتظار کرنے والے اس مجسمے کے گداز متناسب بدن کے سارے قوس و خم اور نشیب و فراز دیکھتے تو انہیں کبھی کوفت نہ ہوتی۔ انہیں محسوس ہوتا تھا...... کہ وقت پر لگا کے اڑ گیا۔

وہ بڑی خوبصورتی سے ساری باندھتی تھی اور جانتی تھی کہ ساری کا سارا حسن بلاؤز سے شروع ہو کے بلاؤز پر ختم ہوتا ہے۔ اچانک اس کا آنچل پھسل جاتا...... وہ بے نیاز رہتی یا اچانک سنبھلتی...... کبھی آگے جھکتی تو تراشیدہ بالوں کی ایک لٹ ماتھے پر جھولنے لگتی یا سارے بال پھسل کر چہرے کو گھیرا دے دیتے۔ خود میں فاروقی سے دوستی کا فائدہ اٹھاتا، دل لگی میں بہت کچھ کہہ جاتا۔ وہ کبھی برا نہ مانتی۔

فاروقی اس پر بہت مہربان تھا۔ ان کے درمیان تعلق کے لیے حالات قدرتی طور پر سازگار تھے۔ یہ باہمی ضرورت کا رشتہ تھا جس پر انگلیاں اٹھائی جاتی تھیں مگر انہیں پروانہ تھی...... پھر اچانک فاروقی نے اس ناجائز تعلق کو دنیا کی نظر میں جائز کرنے کا فیصلہ کیا...... انہوں نے شادی کر لی۔

اس کی یہ وجہ نہیں تھی کہ فاروقی کو مریم کی محبت نے مجبور کر دیا تھا...... نہ مریم کے لیے یہ ممکن تھا کہ اسے بلیک میل کرتی...... اچانک فاروقی کے سامنے ایک پلان آگیا جس کی

تکمیل کے لیے مریم وسیلہ بن سکتی تھی...... وہ بدبخت عورت کیسے جان سکتی تھی کہ...... وہ تو محض استعمال ہو رہی ہے...... اس کے خواب یا اس کی زندگی غیر اہم ہے۔

اتفاق سے یہ پلان نور جہاں نے جان لیا تھا اور پھر مجھے بھی بتا دیا تھا۔ نور جہاں کی اپنی غرض تھی...... میری اپنی...... خود غرضی کے اس کھیل میں ہم سب برابر کے شریک تھے۔ اپنے اپنے مفادات ہم سب کے لیے دوسرے کی زندگی سے زیادہ اہم تھے۔ میں نور جہاں کے جسم کی طلب کا سامان تھا۔ نور جہاں میرے لیے دشمن کے راز جاننے کا ذریعہ تھی۔ ہر بار اس نے مجھے بتایا کہ اب دشمن کی چال کیا ہوگی۔

اور نور جہاں کی فراہم کردہ ہر اطلاع درست ثابت ہوئی تھی...... اس نے کہا تھا کہ تمہارا دوست، قانونی مشیر اور مددگار بک گیا ہے۔ اسے اکبر خان نے خرید لیا ہے۔ وہ مریم سے شادی کرے گا...... اولاد کی خاطر...... اور ایسا ہی ہوا...... پھر نور جہاں نے بتایا کہ ایک حادثے کے نتیجے میں مریم کا ابارشن ہوگا اور وہ مر جائے گی...... یعنی...... ماردی جائے گی...... الزام عائد ہوگا، فاروقی کی پہلی بیوی پر مگر فاروقی اسے بچا لے گا...... اس شرط پر کہ وہ نواب رفیق احمد کو زہر دے...... وہ ایسا کرنے پر مجبور ہوگی...... پھر ست بدھائی کی مالک ہو گی اس کی چچازاد بہن رابعہ...... فاروقی اس طرح رابعہ کا قانونی مشیر، محافظ اور مددگار بن جائے گا جیسے رفیق کا تھا۔ بالآخر وہ رابعہ کا دل جیتنے میں کامیاب ہوگا، رابعہ اس کے خلوص سے متاثر ہوگی...... وہ ایک بار محبت میں دھوکا کھا چکی ہے...... اب وہ مستقبل کا تحفظ چاہے گی...... وہ فاروقی کو قبول کر لے گی...... فاروقی ست بدھائی کا مالک بن جائے گا...... فہو المطلوب۔

اس رات میں سو نہ سکا...... انہی خیالات نے میرے وجود میں تلاطم برپا رکھا...... بہت کچھ ہو چکا تھا...... بہت کچھ تھا جو ہوتا نظر آتا تھا...... نور جہاں نے مجھے بچا لیا تھا...... اب مجھے نور جہاں کو بچانا تھا...... جیسے بھی ہو...... مگر یہ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جو میں سوچتا ہوں وہ کیسے ہوگا...... پہلے فریال وہ الجھن تھی جو سلجھائے نہ سلجھتی تھی۔ جب بالآخر مسئلے کے حل میں حائل رکاوٹ دور ہو گئی۔ عائشہ سات سمندر پار رہ گئی...... سلطان نے فریال پر اپنے دعوے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ میرے والدین نے فریال کو قبول کر لیا...... تو نور جہاں نمودار ہو گئی...... سب سے بڑا چیلنج بن کے سامنے آگئی۔

پاکستان کی طرح میں اندرونی بیرونی خطرات کے مسائل میں بری طرح الجھا ہوا تھا۔ بیک وقت دو محاذوں پر لڑ رہا تھا۔ باہر اکبر خان، رانا رجب علی اور فاروقی جیسے خطرناک دشمن تھے تو اندر خود میں نے اپنے لیے جذباتی مسائل کے بحران کھڑے کر لیے تھے۔ ایک ختم نہیں ہوتا کہ دوسرا پیدا ہو جاتا تھا۔

مریم کو صبح تھوڑے سے لوگوں کی موجودگی میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ ان میں ست بدھائی سے آنے والے راجا اور غنی کے علاوہ چند پڑوسی، کچھ دوست اور ملازم شامل تھے۔ مریم دنیا میں اکیلی تھی...... فاروقی نے مجھے پہلے بتایا تھا کہ اس نے گھر والوں کی مرضی کے خلاف شادی کی تھی۔ شادی کے سال بھر بعد باپ مر گیا...... مزید ایک سال گزرا تو ماں بھی رخصت ہوئی۔ بہن کوئی نہ تھی...... دو بھائی تلاش معاش میں ملک سے نکلے تو پھر لاپتا ہو گئے پھر مریم کو کون روتا۔

میں نے سب دیکھا تھا اور دیکھ رہا تھا...... میرے لیے یقین کرنا مشکل رہا تھا کہ فاروقی ایسا کر سکتا ہے...... مریم جیسی جیتی جاگتی عورت کو ٹشو پیپر کی طرح استعمال کرے اور ضائع کر دے۔ وہ شطرنج کی بساط پر پیادے کی طرح سب سے پہلے ماری گئی تھی۔ فاروقی کا غم زدہ چہرہ دیکھ کر میرے دل میں نفرت کی آگ بھڑکنے لگی تھی۔ اندر سے یہ شخص کتنا مطمئن اور خوش ہوگا کہ اس نے پہلی بازی جیت لی...... اس کے پلان کا پہلا مرحلہ اس طرح مکمل ہوا جیسے اس نے سوچا تھا۔

اب اس کی نظر مجھے اگلے شکار کے طور پر دیکھتی ہوگی۔ ایک دن آئے گا جب مجھے زہر دیا جائے گا...... اس طرح میں مر جاؤں گا۔ اسی طرح دفن کر دیا جاؤں گا...... ست بدھائی کا نواب رفیق احمد مر گیا...... رابعہ کو تاج پوشی مبارک ہو...... اس دن میرے قتل کے الزام میں لیلیٰ بھابی کسی حوالات کے سلاخوں کے پیچھے سر پٹخ رہی ہوگی۔ فاروقی کو اپنی منزل آسان نظر آنے لگی...... اب رابعہ بچ کر کہاں جا سکتی ہے...... مریم...... رفیق اور لیلیٰ سب مہرے تھے جو کام آئے...... رابعہ کو شہ مات...... وہ خود بخود فاروقی کی ملکیت ہوگی...... اپنا تاج اتار کے فاروقی کے سر پر سجا دے گی...... میرے سرتاج تو آپ ہیں...... جب میں آپ کی تو ست بدھائی کے مالک بھی آپ...... ایک بہت بڑا وکیل...... بہت بڑا شاطر...... بہت بڑا دوست...... بہت بڑا دشمن...... بہت بڑا شیطان...... میرا خون رگوں میں کھولتا رہا۔

گھر کے ماحول میں اتنی کشیدگی تھی کہ کوئی بھی کسی سے بات کرنے کا روادار نہ تھا، فریال مجھ سے خفا تھی...... اس سے زیادہ میرے والدین خفا تھے، میں فاروقی سے خفا تھا...... فاروقی اپنی بیوی سے خفا تھا...... گھر میں ایک ہولناک

خاموشی نے ڈیرا ڈال لیا تھا۔ ایک نحوست زدہ ویرانی بس گئی تھی جس میں مریم کی پرچھائیں ہر سمت سرگرداں اور نوحہ خواں نظر آتی تھی۔

فریال نے مجھ سے بات کرنے یا میرے سامنے آنے سے گریز کیا۔ وہ میرے والدین کے ساتھ انہی کے کمرے میں تھی۔ میرے والدین یقیناً یہ چاہتے ہوں گے کہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہو کے اپنے طرزِ عمل کی وضاحت کروں لیکن میں فریال کی موجودگی میں کوئی بھی بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔

فاروقی بھی بیوی کے ساتھ کمرے میں بند ہو گیا تھا اور ان دونوں کے درمیان نہ جانے کیا صلاح مشورہ جاری تھا۔ شاید فاروقی جاننا چاہتا ہوگا کہ بیوی نے مریم کی موت کے بارے میں مجھے کیا بتایا ہے...... خود فاروقی نے اس موضوع پر مجھ سے کوئی بات نہیں کی تھی۔

صبح سے کسی نے کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔ جس گھر میں کسی کی موت ہو جائے، وہاں سوگواروں کو کھانے پکانے کا ہوش ہی کہاں ہوتا ہے۔ یہ ذمے داری عزیز و اقارب یا محلے دار اٹھاتے ہیں کہ لواحقین کو کچھ کھلا پلا دیں۔ ایسا لگتا تھا کہ یہاں رہنے والوں نے تدفین میں شرکت کو کافی سمجھتے ہوئے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے۔ سب نے فرض کر لیا ہے کہ یہ کام دوسروں کا بھی تو ہے...... یا شاید یہ خاموش سماجی احتجاج تھا۔ وکیل صاحب نے چپکے سے دوسری شادی کر لی...... محلے میں کسی کو خبر ہی نہیں۔

خود گھر والوں کے بارے میں ہم سے بہتر کون جانتا تھا کہ مریم کے مرنے کا کسی کو بھی اتنا صدمہ نہیں ہے کہ وہ کھانا پینا چھوڑ دے...... فاروقی غم زدہ نظر آنے کی کوشش ضرور کر رہا تھا مگر اس کے غم کی حقیقت کو مجھ سے بہتر کون جان سکتا تھا...... رنج سے زیادہ وہ احساسِ جرم کی ندامت کا شکار تھا اور ہم سب کے سامنے آنے سے کترا رہا تھا۔

بالآخر راجا نے کہا ”چل یار...... یہاں بیٹھے رہنے سے کوئی فائدہ نہیں...... اس ماحول میں میرا دم گھٹ رہا ہے۔“

میں نے کہا ”مجھے بھی ایسا لگتا ہے جیسے فاروقی ہمیں محض برداشت کر رہا ہے کیونکہ وہ مروت میں کھل کے نہیں کہہ سکتا کہ بس اب اپنے گھر جاؤ۔“

”چنانچہ ہم سب کو چلے جانا چاہیے۔“

”چلے تو ہم جائیں گے...... لیکن اتنی جلدی کس بات کی ہے...... پہلے میں اسپتال جانا چاہتا ہوں۔“

راجا نے میرا مطلب سمجھ لیا۔ ”یہ تو میں بھی سوچ رہا تھا۔“

”تو جا کے میرے اماں ابا سے کہہ دے کہ تیار رہیں۔ شام سے پہلے ہم نکل جائیں گے۔“

راجا نے مجھے غور سے دیکھا۔ ”یہ میں کہوں؟ آپ کا کیا خراب ہے۔“

میں نے کہا ”یار سمجھا کر...... پتا نہیں فریال نے ان سے کیا کہا ہوگا...... ان کے سامنے میں فریال سے کیا بات کروں اور وہ خود باہر آ نہیں رہی ہے۔“

”میں بلاتا ہوں۔“

”ابھی مت چھیڑ اسے...... یہاں بات کرنا مجھے ٹھیک نہیں لگ رہا ہے...... واپس ست بدھائی جا کے میں سب ٹھیک کر لوں گا...... فریال مل گئی...... بس میرے لیے یہی کافی ہے۔“ میں نے کہا۔

”رابعہ نے بڑے پتے کی بات کہی تھی کہ فریال ایک آخری موقع ضرور دے گی۔“

میں نے کہا ”راجا صاحب...... آپ لکھ لیجیے میری بات...... یہ ڈراما تھا، سب پہلے سے طے شدہ تھا۔“

”پر نیکے پتر...... تجھے تو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ ڈراما تھا...... اگر حقیقت ہوتی تو کیا ہوتا؟“ راجا نے اٹھتے ہوئے کہا۔

وہ گیا اور لوٹ آیا۔ اس وقت تک میں اپنی گاڑی اسٹارٹ کر چکا تھا۔ میں نے کہا...... ”کیا ری ایکشن ہوا؟“

”کچھ نہیں...... تیرے اماں ابا تو پہلے ہی طے کر چکے تھے کہ واپس جانا ہے آج ہی...... کوئی چاہے نہ چاہے۔“

”اور فریال؟“

”وہ اندر نہیں تھی...... ہوتی تو کیا انکار کرتی...... میرا مشورہ یہ ہے کہ جانے سے پہلے تو ایک بار اس سے معافی مانگ لے۔ نہیں...... کہہ دے کہ تو صرف اسے واپس لے جانے کے لیے آیا ہے۔“

”کیا یہ کہنا ضروری ہے۔“

”ضروری ہے یا نہیں...... تو کہہ دے گا تو تیری زبان نہیں گھس جائے گی۔ اس کی تسلی ہو جائے گی۔“

اسپتال پرائیویٹ تھا اور شادمان کے علاقے کا غالباً سب سے اچھا اسپتال سمجھا جا سکتا تھا...... یہاں عام لوگ نہیں آتے تھے۔ دیگر وی آئی پی اسپتالوں کی طرح اس اسپتال میں علاج کے اخراجات برداشت کرنا عام آدمی کے بس کی بات ہی نہیں تھی۔

معلومات حاصل کرنے کے دو طریقے تھے۔ ہم براہ

راست اسپتال کے ایڈمنسٹریٹر سے ملاقات کرتے اور مریم کی موت کے اسباب معلوم کرتے۔ اس کے لیے ہمیں جھوٹ کا سہارا لینا پڑتا۔ مثلاً مجھے کہنا پڑتا کہ میں مریم کا بھائی ہوں اور لندن سے اس کی موت کی اطلاع ملنے کے بعد آج صبح ہی پہنچا تو ہوں۔ ایڈمنسٹریٹر سے مجھے وہی معلوم ہوتا جو اسپتال کا قانونی موقف تھا۔ سوچا سمجھا اور طے شدہ...... کہ مریم کی موت حادثاتی تھی۔

دوسرا طریقہ بیک ڈور سے انفارمیشن لینے کا تھا۔ نچلے درجے کے ملازمین اندر کی ہر بات جانتے ہیں اور تھوڑے سے لالچ میں سب بتانے پر راضی بھی ہو جاتے ہیں بشرطیکہ ایسا کرنے سے خود ان کی ذات ہر الزام سے محفوظ رہے۔ ہم نے دونوں طریقے آزمانے کا فیصلہ کیا۔

اسپتال کا ایڈمنسٹریٹر ایک ریٹائرڈ کرنل انتہائی خوش مزاج لیکن حد درجہ عیار شخص تھا۔ اپنے انداز و اطوار میں وہ کسی سینئر بیوروکریٹ کی شان رکھتا تھا۔ اس نے خندہ پیشانی سے میرا تعارف سنا۔

”تو آپ لندن سے تشریف لائے ہیں...... مسز مریم فاروقی کے بھائی ہیں۔“ اس نے سکون سے کہا۔ ”فرمائیں میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”میں جاننا چاہتا ہوں کہ اچانک ایسی کیا بات ہو گئی...... میرا مطلب ہے ابھی پرسوں ہی مریم نے مجھے فون کیا تھا تب وہ بہت خوش تھی......“

کرنل نے کہا ”آپ اپنے برادر ان لا سے ملے؟“

”آف کورس...... تدفین کے وقت میں پہنچ گیا تھا...... لیکن آپ سمجھتے ہیں میں انہیں تسلی دینے کے سوا کیا کر سکتا تھا...... وہ رات بھر کے جاگے ہوئے اور غم سے بے حال تھے۔ انہوں نے صرف اتنا کہا تھا کہ بس اللہ کی مرضی...... اور سونے چلے گئے تو میں نے بہتر سمجھا کہ آپ سے رجوع کروں۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”دیکھیے مسٹر رفیق...... یہ ایک افسوسناک حادثہ تھا...... وہ گریں اور ظاہری چوٹ ایسی نہیں تھی...... لیکن اندر کافی نقصان ہوا...... شی واز پریگنٹ...... گرنے سے ابارشن ہوا۔“

”کیا ابارشن سے ڈیتھ ممکن ہے۔“

”کیوں نہیں...... اگرچہ ایسا بہت کم ہوتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”کیا اسے اسپتال لانے میں دیر ہوئی؟“

”میرا خیال ہے...... نہیں۔“

میں نے کہا۔ ”کیا وہ کافی بلندی سے گری تھی......“

کرنل نے سوچ کے کہا۔ ”نو......“

”کیا اس کی موت کا سبب کوئی چوٹ نہیں ہو سکتی...... مثلاً سر کی چوٹ۔“ میں نے کہا۔

وہ بولا۔ ”موت کا سبب وہی ہے جو میں نے بتایا۔“

”کیا آپ ڈاکٹر ہیں؟“

”نہیں...... لیکن میں نے رپورٹ دیکھی تھی...... ڈاکٹر سے بھی بات کی تھی۔“

میں نے کہا۔ ”وہ یقیناً کوئی گائناکالوجسٹ ہوگی۔“

”آف کورس...... اس نے مسز فاروقی کی جان بچانے کی پوری کوشش کی تھی...... ڈاکٹر بلقیس اس شہر کی نامور ڈاکٹر ہیں۔“

”کیا میں ان سے مل سکتا ہوں؟“

”یقیناً...... لیکن وہ آپ کو یہی سب بتائیں گی...... کیا آپ کسی قسم کے شک میں مبتلا ہیں کہ اس کیس میں اسپتال سے کوتاہی ہوئی یا ڈاکٹر کی غفلت سے کچھ ہوا......“

میں نے کہا ”ایسی کوئی بات نہیں......“

”دیکھیے...... ہمارے اسپتال کی ایک گڈ ول ہے...... اگر ہمیں ذرا بھی شک ہو تو ہم پوری انکوائری کرتے ہیں...... آپ بھائی ہیں...... میں آپ کے جذبات کو سمجھ سکتا ہوں...... آپ کے لیے یہ انتہائی غیر متوقع اور بہت بڑا شاک ہے...... آپ کا ذہن طبعی یا حادثاتی موت کے اسباب کو قبول کرنے پر راضی نہیں۔“

میں نے کہا ”کرنل...... آپ بہت معاملہ فہم انسان ہیں۔“

”میں ڈاکٹر بلقیس کو بھی بلا لیتا ہوں...... آپ جس طرح چاہیں اپنی تسلی کر لیں...... معلوم ہے، آپ کی جگہ میں ہوتا تو کیا کرتا؟“

میں نے کہا۔ ”کیا کرتے؟“

”میں کسی ڈاکٹر کے پاس نہ جاتا...... میں پولیس اسٹیشن جا کے رپورٹ لکھواتا کہ میری بہن کو قتل کیا گیا ہے۔“

میں نے حیرانی سے کہا۔ ”وہ کیوں؟“

”یہاں ایسا ہوتا ہے...... حالات مشکوک ہوں تو سب سے پہلے شوہر ہی شک کی زد میں آتے...... کہ دوسری عورت کا چکر ہے...... مرنے والا شوہر ہو تو بیوی پر یہی شک ہوتا ہے کہ آشنائی ہوگی کسی سے...... ورنہ جائیداد کے مسئلے...... ہمارا ان معاملات سے کیا تعلق...... ہم صرف موت کا سبب دیکھتے ہیں......“

میں نے سوچتے ہوئے کہا...... ”بظاہر میرے بہنوئی

ایسے آدمی نظر نہیں آتے ...... مگر مجھے کیا معلوم ...... میں لندن میں تھا ......"

کرنل نے کہا ...... "یو آر اے ینگ مین ...... میری زندگی کا تجربہ مجھے بتاتا ہے کہ مرد کی نیت بدلے تو سب سے پہلے بیوی کی نظر تاڑتی ہے ...... یہ ایک قدرتی بات ہے ...... میاں بیوی سے زیادہ ایک دوسرے کو بھلا کون سمجھ سکتا ہے۔ اگر آپ کے بہنوئی کے رویے میں فرق پڑتا تو بہن سب سے پہلے آپ سے کہتی کہ وہ کسی چکر میں ہیں ...... وہ آپ سے بڑی تھی ......"

میں نے اقرار میں سر ہلایا ...... لیکن ہم دوستوں کی طرح تھے ...... چھوٹا ہونے کے باوجود میری ان سے کافی اچھی انڈر اسٹینڈنگ تھی۔"

"جہاں تک مجھے معلوم ہے ...... ان کی شادی کو پندرہ سال ہوگئے ...... ان کے بچے نہیں تھے ...... وہ پہلی بار ماں بن رہی تھی ...... ظاہر ہے مسٹر فاروقی سے زیادہ خوش کون ہوگا ......"

میں نے اور راجا نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا ...... کرنل کو یہ علم ہی نہیں تھا کہ مریم اس کی دوسری بیوی ہے ...... وہ مریم کو پہلی بیوی ہی سمجھ رہا تھا ...... یہ امپریشن خود فاروقی نے دیا تھا یا اصل حالات جانے بغیر کرنل نے ایک رائے قائم کرلی تھی ...... لیکن اس کی بات نے یہ ثابت کردیا تھا کہ پہلی بیوی پر زہر دینے کا الزام کسی نے عائد نہیں کیا تھا۔ اسپتال والے کو فاروقی کی پہلی بیوی کی موجودگی کا کوئی علم نہیں تھا۔

اس کے باوجود میں نے کرید جاری رکھی ...... "آپ کی بات نے میرے سارے شکوک دور کردیے ہیں۔ اچھا ہوا میں نے پہلے آپ سے پوچھ لیا۔ صدمے نے واقعی میری سوچنے سمجھنے صلاحیت ختم کردی تھی۔"

راجا نے پہلی بار مداخلت کی "تو خوامخواہ شک کررہا تھا کہ مریم کو زہر دیا گیا ہوگا ......"

کرنل چونکا ...... "زہر؟ ...... نہیں مسٹر رفیق ...... یہ اتنا آسان نہیں ہوتا ...... زہر کا فوراً پتا چل جاتا ہے ...... عام اناڑی سے اناڑی ڈاکٹر بتا دیتا ہے۔ میرا خیال ہے آپ ڈاکٹر بلقیس سے بات کرلیں" اس نے انٹرکام کا بٹن دبایا۔

ڈاکٹر بلقیس اسی وقت کوئی کیس کرکے فارغ ہوئی تھی ...... دس منٹ بعد وہ نمودار ہوئی تو بہت تھکی ہوئی تھی ...... کرنل نے اسے میرے بارے میں بتایا اور پھر یہ بھی کہ مجھے کیا شک تھا۔

وہ خفا ہوگئی۔ "یہی تو مشکل ہے ...... ہر جگہ لوگوں نے گھروں میں میٹرنٹی ہوم کھول لیے ہیں جیسے انگلش میڈیم اسکول کھول رکھے ہیں۔ ایک نرس یا مڈوائف ہوتی ہے جو سارے کیس کرتی ہے۔ ڈاکٹر ہاتھ بھی نہیں لگاتی ...... اور اس کی وجہ ہے ...... دو چار فیصد کیس ہی ایسے ہوتے ہیں جس میں کوئی پیچیدگی آجائے۔ ایسے کیس وہ لیتی ہی نہیں ہیں۔ ریفر کردیتی ہیں ...... یوں مسٹر رفیق ...... گاؤں، دیہات اور چھوٹے شہروں کی بات چھوڑیں۔ یہاں شہروں میں ہر کیس اسپیشلسٹ کے پاس جاتا ہے۔ کس بات کے اسپیشلسٹ ہیں ہم اگر ہم میں اور کسی مڈوائف میں کوئی فرق نہ ہو۔"

میں نے کہا۔ "میرا ہرگز یہ مقصد نہیں تھا۔"

اس کا غصہ کچھ کم ہوا۔ "کیسے سمجھ لیا آپ نے کہ آپ کی بہن کی موت زہر دینے سے ہوئی اور ہمیں معلوم نہ ہوتا۔"

میں نے کہا "برا مت مانیے گا ...... یہاں پاکستان میں سب کچھ ہونا ممکن ہے۔ موت کے اصل اسباب پر کوئی پردہ ڈالنا چاہے تو ......"

اس نے میری بات کاٹ دی۔ "تو وہ اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتا ہے یا پیسہ خرچ کرتا ہے لیکن مسٹر رفیق ...... ہماری گڈول کی کوئی قیمت نہیں ...... میرے نام کی گڈول الگ ہے، اس اسپتال کی الگ ...... کل کو اگر کوئی آپ جیسا شخص کورٹ میں چلا جائے کہ مجھے بہن کی لاش نکلوا کے پوسٹ مارٹم کرانا ہے ...... تو ہم کیا کریں گے ...... زہر کا پتا تو دس سال بعد بھی چل جاتا ہے۔ بالوں سے اور ہڈیوں سے ...... ہم شریک جرم ہوجائیں گے کہ ہم نے قتل کو چھپایا۔ یہ رسک کوئی نہیں لے سکتا ...... آپ بے شک چلے جائیں کورٹ میں ...... میڈیکل بورڈ سے رپورٹ لے لیں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

اب شک کی کوئی بات نہیں رہی تھی ...... نہ مریم کی موت زہر دینے سے ہوئی تھی اور نہ کسی نے ایسا کیا تھا ...... اسپتال والے تو یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ فاروقی کی کوئی پہلی بیوی بھی ہے ...... اور بلیک میلنگ کا کھیل فاروقی کے شیطانی ذہن نے کھیلا تھا۔ جھوٹا الزام اس نے اپنی سیدھی سادی گھریلو بیوی پر عائد کیا تھا اور اب وہ پوری طرح فاروقی کے قبضے میں تھی۔

اسپتال کے ایڈمنسٹریٹر اور پھر ڈاکٹر بلقیس کے بیان میں کوئی فرق نہیں تھا۔ ثابت بھی ہوا تھا کہ مریم کی موت ایک معمولی سے حادثے کی وجہ سے ہوئی تھی۔ ہمارا ایمان بھی یہی ہے کہ مارنے اور بچانے والا ایک ہی قادر مطلق ہے۔ وہ

ایسے معجزے بھی دکھاتا ہے کہ جہاز کریش ہونے پر جہاں کسی کے بچنے کی امید نہ ہو، کوئی بچہ خراش سے بھی محفوظ رہتا ہے ...... اور وقت آجائے تو مریم کی طرح چھوٹی سی بات موت کا سبب بن جاتی ہے۔

باہر آنے کے بعد میں نے کہا "راجا ...... کیا ساری بات تیری سمجھ میں آگئی۔"

"ہاں ...... فاروقی خوامخواہ اپنی بیوی کو دہشت زدہ کررہا ہے۔"

"خوامخواہ نہیں ...... ایک مقصد کے تحت ......" میں نے کہا۔

راجا بولا ...... "چلو مان لیتے ہیں کہ مریم کو کسی نے زہر نہیں دیا ...... مگر صرف پیر پھسلنے سے کوئی مرجائے ...... یہ بات ذرا کھٹکتی ہے۔"

"مجھے تو اب کوئی شک نہیں رہا۔"

راجا بولا۔ "ایک بات سمجھ لیجیے پتر ...... کرنل اس اسپتال کی گڈول کا محافظ ہے۔ پبلک ڈیلنگ کا ماہر ہے۔ ڈاکٹر بلقیس اپنی ناموری کو ڈھال بناتی ہے کہ مجھ سے کوتاہی ممکن ہی نہیں ...... لیکن اصل بات یہ ہے کہ کیس کرنے والی ڈاکٹر بلقیس نہیں تھی ...... کیس ایک جونیئر ڈاکٹر نے کیا تھا۔ بلقیس بعد میں آئی جب کیس اس کے قابو میں نہیں رہا۔ ممکن ہے اس کے پہنچنے سے پہلے ہی مریم کا کام تمام ہوگیا ہو۔ نااہلی یا غفلت کی مرتکب ہوئی جونیئر ڈاکٹر ...... بلقیس نے اسے الگ کرکے ذمے داری خود قبول کرلی ...... اور اس کی بات کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا ...... مستند ہے میرا فرمایا ہوا ......"

"ہم کون سا اسے چیلنج کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔"

"لیکن کیا حرج ہے اگر ہم اس جونیئر ڈاکٹر سے بات کریں۔ وہ کوئی آر ایم او ہوگی۔ آج کل بڑے اسپتالوں میں بھی ایسا ہی ہے۔ نام لکھا جاتا ہے کسی توپ قسم کے اسپیشلسٹ کا ...... جسے کوئی چیلنج نہیں کرسکتا ...... اس کو ہینڈل کرتے ہیں آٹھ دس ہزار ماہانہ تنخواہ دار ...... جونیئر ڈاکٹر جو آر ایم او کہلاتے ہیں۔ دن رات کی شفٹ میں وہی موجود رہتے ہیں۔"

"لیکن یہ معلوم کیسے ہوگا ......"

"معلوم ہوجائے گا ...... ڈیوٹی روسٹر سے۔" راجا نے کہا۔

اور ایسا ہی ہو۔ راجا نے ایک نرس سے پوچھ لیا ...... وہ میٹرنٹی وارڈ کے ڈیوٹی روم سے نکلی تھی ...... راجا کا سوال سن کے وہ رکی۔ "کل نائٹ شفٹ میں؟ ...... ڈاکٹر عندلیب ...... مگر آپ کیوں پوچھ رہے ہیں ......"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "کوئی خاص بات نہیں ...... ایک ذاتی سا مسئلہ تھا۔ وہ کس وقت ملیں گی۔"

نرس جاتے جاتے رکی۔ "نائٹ شفٹ رات بارہ بجے شروع ہوتی ہے۔"

میں نے کہا "ایک منٹ ...... میں غلطی سے نائٹ شفٹ کہا۔ رات بارہ بجے تک ڈیوٹی پر کون تھا۔"

"ایوننگ شفٹ میں ڈاکٹر صبیحہ تھیں لیکن آج ان کا ڈے آف ہے ...... رات انہیں بخار ہوگیا تھا ...... آپ کام بتائیں۔"

میں نے کہا "ہم پھر آجائیں گے۔"

"کوئی پیغام ہے تو مجھے بتادیں یا اپنا نام ......"

میں نے کہا ...... "ان سے کہیے گا کناڈا سے ڈاکٹر قربان علی ملنے آئے تھے۔" میں نے جان چھڑانے کے لیے کہا۔

ڈاکٹر صبیحہ کے گھر کا فون نمبر ہمیں اس جھوٹ کی مدد سے بہ آسانی مل گیا پھر فون نمبر سے راجا نے اس کا پتا معلوم کرلیا۔ آدھے گھنٹے بعد ہم اس کے دروازے پر تھے۔ یہ متوسط طبقے کی آبادی تھی جو رحمان پورہ کہلاتی تھی۔ اندر کی گلیاں ٹیڑھی میڑھی اور تنگ تھیں اور نمبر سے مکان کی تلاش اور مشکل ہوتی لیکن اتفاق سے ہم قریب تھے اور ڈاکٹر ہونے کی وجہ سے صبیحہ کو آس پاس رہنے والے جانتے تھے۔

کال بیل پر دروازہ تھوڑا سا کھول کے سامنے آنے والی لڑکی میرے خیال میں اٹھارہ انیس سال کی ہوگی۔ کسی کالج میں انٹر یا بی اے کی طالبہ ...... دبلی پتلی اور شرمیلی سی ...... اسے میں نے ڈاکٹر صبیحہ کی چھوٹی بہن فرض کیا "مجھے ڈاکٹر صبیحہ سے ملنا تھا۔"

اس نے کہا۔ "میں ہی ڈاکٹر صبیحہ ہوں ...... فرمایئے۔"

میں نے کہا۔ "میں اسپتال گیا تھا ...... پتا چلا آج نہیں آئیں گی۔"

"یس ...... میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔ "میں ہرگز آپ کو ڈسٹرب کرنے گھر نہ آتا ...... لیکن مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی تھی۔"

اس نے کچھ تذبذب کا مظاہرہ کیا اور پھر بولی۔ "اچھا ...... میں ڈرائنگ روم کھولتی ہوں۔" اور غائب ہوگئی ...... ڈرائنگ روم دس بارہ سال کے ایک بچے نے کھولا۔

ڈرائنگ روم سادہ سا کمرا تھا۔ چار کرسیاں..... ایک معمولی سا صوفہ اور سینٹر ٹیبل..... فرش پر قالین..... دیواروں پر تصادیر کی جگہ طغرے..... چاروں قل..... خانہ کعبہ اور مسجد نبوی کی رنگین تصادیر..... اسباب سے اندازہ ہوتا تھا کہ مکینوں کی مالی حالت کچھ اچھی نہیں ہے..... تاہم سلیقے اور صفائی کا فقدان نہیں تھا۔

بچہ اندر غائب ہوگیا تو ایک عمر رسیدہ خاتون نمودار ہوئیں۔ ان کے بال بالکل سفید تھے لیکن وہ سیدھا چلتی تھیں اور وہ عینک کے شیشوں کے پیچھے سے یوں دیکھتی تھیں کہ گویا اندر تک اتر کے نیت کو پرکھ رہی ہیں۔ وہ ایک باتونی خاتون تھیں..... انہوں نے ہمارا تفصیلی انٹرویو لیا۔ کون ہو..... کیا کرتے ہو؟ کہاں سے آئے ہو؟ صبیحہ کو کیسے جانتے ہو؟ ایسا کیا کام تھا کہ گھر پہنچ گئے؟۔

تمام سوالات کا جواب میں نے جھوٹ سے دیا۔ جب وہ مطمئن ہوئیں تو اپنے بارے میں بتانے لگیں کہ شوہر نہیں ہے۔ لڑکی کو بڑی مشکل سے ڈاکٹری پڑھائی تھی۔ اب یہ حال ہے کہ اسپتال والے آٹھ ہزار دیتے ہیں..... دن رات کی ڈیوٹی لیتے ہیں۔ گھر اس سے چلتا ہے۔ ایک چھوٹے بھائی کو بھی پڑھا رہی ہے۔ گھر میں کوئی مرد نہیں اس لیے آنے جانے والوں پر مجھے بھی نظر رکھنی پڑتی ہے..... کیا کروں جوان لڑکی کا ساتھ ہے..... وغیرہ وغیرہ۔

میں پریشان تھا کہ بڑی بی کی موجودگی میں کیسے بات ہوگی، معاملہ نازک اور قانونی تھا۔ چنانچہ اچانک وہ اٹھ کھڑی ہوئیں کہ میں صبیحہ کو بھیجتی ہوں تو میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ غالباً وہ میرے حد درجہ سعادت مندی والے رویے سے قائل ہوگئی تھیں کہ ہم بدمعاش نہیں ہیں۔

راجا نے کہا ”بیٹی ڈاکٹر بن گئی مگر اماں کو بھروسا نہیں..... آخر پانچ سال لگائے ہوں گے اس نے میڈیکل کالج میں..... ہاؤس جاب کیا ہوگا اور اب اسپتال میں ڈیوٹی دیتی ہے تو ڈر کیسا۔“

میں نے کہا ”ہوتا ہے یار..... جب شوہر نہ رہے تو عورت بہت کمزور پڑ جاتی ہے..... بس اپنے دل میں بیٹھے ہوئے خوف کو اس طرح دور کرتی ہے..... گھر پر سوائے مفت میں مشورے لینے والوں کے کون آتا ہوگا۔“

صبیحہ نمودار ہوئی تو بالکل مختلف حلیے میں تھی۔ اب نہ صرف یہ کہ اس نے لباس بدل کے بال بنائے تھے بلکہ تھوڑا سا میک اپ بھی کرلیا تھا چنانچہ وہ زیادہ پر اعتماد اور واجبی حد تک خوبصورت بھی لگ رہی تھی..... ماں کے مقابلے میں وہ کم گو نظر آتی تھی۔

اس نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو میں نے کہا۔ ”مس صبیحہ..... میں مریم کا بھائی ہوں..... جس کی کل ڈیتھ ہوئی تھی۔“

اس کا رنگ اڑ گیا۔ ”آپ اس کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہیں تو اسپتال والوں سے بات کریں۔“

میں نے کہا ”ان سے ملنے کے بعد ہی میں نے ضروری سمجھا کہ آپ سے بات کی جائے۔“

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”میں آپ کو کچھ نہیں بتا سکتی۔“

میں نے کہا ”آپ بتا سکتی ہیں..... یوں..... نام ضرور ڈاکٹر بلقیس کا جا رہا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ کیس صرف آپ نے کیا تھا۔ بلقیس کو تو اس وقت بلوایا گیا جب مریم کی حالت بگڑ گئی۔ ڈریں نہیں..... نہ میں آپ پر کوئی الزام لگا رہا ہوں غفلت برتنے کا اور نہ میرا ارادہ قانونی چارہ جوئی کا ہے..... پلیز بیٹھیے۔“

وہ بیٹھ گئی۔ ”پھر کیا چاہتے ہیں۔“

میں نے کہا ”مجھے معلوم ہے قانونی طور پر آپ کی پوزیشن بالکل محفوظ ہے۔ ساری ذمے داری ڈاکٹر بلقیس کی ہے..... ایسا ہر جگہ ہوتا ہے..... سارے کیس آر ایم اوز لیتے ہیں اور وہ جونیئر ڈاکٹر ہوتے ہیں۔ ان کا اسی طرح استحصال کیا جا رہا ہے۔ نام اور پیسہ کما رہے ہیں..... بڑے نام والے ڈاکٹر اور اسپتال کے مالک۔“

اس نے پھر کہا۔ ”میڈیکل رپورٹ میں سب لکھا ہوا ہے۔ میں نے کہا ”رائٹ..... لیکن اس سے میں مطمئن نہیں ہوں۔ نہیں..... میں کوئی کیس کرنے کا بالکل ارادہ نہیں رکھتا۔ میرے پاس اتنا وقت ہی نہیں ہے۔ کل میں واپس لندن چلا جاؤں گا..... دراصل مریم سے میری بات ہوتی رہتی تھی..... اس نے کبھی نہیں بتایا کہ اسے صحت کا کوئی مسئلہ درپیش ہے..... اچانک مجھے پتا چلا کہ وہ پھسل گئی اور گرنے سے کچھ ایسی پیچیدگی پیدا ہوگئی کہ وہ مرگئی۔“

”ایسا ہی ہوا بھی تھا۔“ وہ بولی۔

میں نے کہا۔ ”یہ اسپتال والوں نے کہا تو میں نے مان لیا۔ ڈاکٹر بلقیس کی رائے کو بھلا کون جھٹلا سکتا ہے..... لیکن کیس آپ نے کیا تھا..... جو آپ نے دیکھا، وہ بلقیس نے نہیں دیکھا۔“

”آپ صاف کہیے آپ کو کیا شک ہے۔“

”میں صرف ایک بات جاننا چاہتا ہوں..... مریم کو زہر تو نہیں دیا گیا تھا؟“

وہ چونک پڑی۔ ”اوہ نو..... ناممکن..... ایسی کوئی بات نہیں دیکھی میں نے..... کوئی جان لینے والا زہر ہو تو فوراً ہی پتا چلتا ہے..... بعد میں بھی.....“

”لیکن کوئی پھسل کر گرے..... اور مر جائے..... یہ بات ہضم نہیں ہوتی، آف کورس ابارشن ہوسکتا ہے..... اور فوراً ٹریٹمنٹ نہ ملے تو عورت کے لیے خطرہ ہوتا ہے..... مگر اسے تو فوراً ہی اسپتال پہنچا دیا گیا تھا۔“

”کیا آپ سمجھتے ہیں..... کہ اس میں کوئی فاؤل پلے تھا؟ وہ مری نہیں..... اسے مارا گیا۔ آپ کو اپنے بہنوئی پر شک ہے یا اسپتال پر.....“

”بہنوئی پر.....“ میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہہ دیا اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”آپ کچھ ثابت نہیں کرسکتے۔“

”میں صرف حقیقت جاننا چاہتا ہوں..... مجھے معلوم ہے کہ اسپتال کے مالکان کتنے اثر و رسوخ کے مالک ہیں..... ڈاکٹر بلقیس کا نام بہت بڑا ہے..... اور خود میرا بہنوئی ایک نامور وکیل ہے۔ میں کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا.....“

”آپ میرے الفاظ کو میرے خلاف تو استعمال نہیں کریں گے؟“

میں نے کہا۔ ”ہرگز نہیں..... میں کر بھی کیسے سکتا ہوں..... آپ کا تو اس کیس سے تعلق ہی ثابت نہیں ہوتا۔“

وہ کچھ دیر بعد بولی۔ ”دیکھیے..... اس میں کوئی شک نہیں کہ بچہ ضائع ہوگیا تھا۔ میں نے فوراً ہی ڈی این سی کردی تھی بالکل نارمل طریقے سے..... اور آپ کی بہن بھی ٹھیک تھی..... اسے کمرے میں شفٹ کردیا گیا تھا..... وہ اینستھیزیا کے زیر اثر تھی..... ہوش میں نہیں تھی لیکن اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ ایک دو گھنٹے میں اسے ہوش آجانا چاہیے..... میں نے ڈاکٹر بلقیس کے مشورے سے سب کچھ کیا تھا۔

”لیکن وہ تو موجود نہیں تھیں۔“

”آخری وقت میں وہ آگئی تھیں۔ دوائیں انہوں نے ہی تجویز کی تھیں۔ مریضہ کا خون کافی ضائع ہوا تھا..... میں نے یہ بات انہیں بتائی تو انہوں نے کوئی خاص اہمیت نہیں دی..... کہا کہ صحت ٹھیک ہے..... کچھ نہیں ہوگا..... جب ہم نے مریضہ کو کمرے میں شفٹ کیا تو مسٹر فاروقی نے بہت زیادہ پریشانی کا اظہار کیا..... ان کا خیال تھا کہ مریم کی حالت سیریس ہے۔ اس کا رنگ لاش کی طرح سفید ہو رہا ہے..... اسے سانس ٹھیک نہیں آرہی ہے..... اس کی تو نبض بھی محسوس نہیں ہوتی..... میں نے انہیں تسلی دی کہ آخر ہم بھی ڈاکٹر ہیں..... آپ ہم پر بھروسا رکھیں..... مگر وہ چلے گئے ڈاکٹر بلقیس کے پاس اور پھر ایڈمنسٹریٹر کے پاس..... ہنگامہ کیا کہ آپ لوگ بہت ایزی لے رہے ہیں۔ میری بیوی مر رہی ہے۔ ایڈمنسٹریٹر نے ان کی تسلی کے لیے کہا کہ ہم مانیٹر لگا دیتے ہیں۔ آپ خود دیکھتے رہیں۔ ان کی حالت میں جو تبدیلی ہوگی نظر آئے گی..... لیکن اس سے پہلے کہ مانیٹر لگایا جاتا مریم مرگئی..... فاروقی نے آسمان سر پر اٹھا لیا کہ دیکھو یہ مرگئی۔ تم کیسے ڈاکٹر ہو..... تم نے میری بات بھی نہیں مانی..... اس وقت تو ڈاکٹر بلقیس بھی پریشان ہوگئی تھی اور ایڈمنسٹریٹر کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہے..... وہ فاروقی کو اپنے کمرے میں لے گئے..... اور معلوم نہیں وہاں کیا بات ہوئی..... لیکن اس کے بعد فاروقی صاحب خاموشی سے ڈیڈ باڈی لے گئے۔“

”آپ کے خیال میں..... مریم کی موت طبعی نہیں تھی؟“

”یہ میں کیسے کہہ سکتی ہوں..... لیکن غیر متوقع ضرور تھی..... کسی کو ایک فیصد شبہ نہیں تھا کہ ایسا ہوسکتا ہے..... شبہ ہوتا تو کیا ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے..... اگر کیس بگڑ جائے تو سب پھنس جاتے ہیں..... مجھ سے زیادہ نرسنگ اسٹاف کا حال خراب تھا..... ایک لمبا چکر چل جاتا کہ کیا ہوا؟ کسی نے غفلت کی؟..... کسی نے غلط دوا تو نہیں دے دی..... جب وکیل صاحب خاموش ہوگئے۔“

صبیحہ ذہین لڑکی تھی۔ ”دیکھیے..... میں اس لیے بات کر رہی ہوں کہ آپ بھائی ہیں اور اتنی دور سے آئے ہیں..... میں بہت اَپ سیٹ تھی..... اسپتال میں مریضوں کا مرجانا کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں ہوتا..... لیکن عموماً موت متوقع ہوتی ہے..... معلوم ہوجاتا ہے کہ مرنے یا بچنے کا چانس کتنا ہے..... اس کیس میں مرنے کا کوئی چانس نہیں تھا.....“

”پھر ایسی کیا بات ہوگئی تھی؟“ میں نے پوچھا۔

وہ بولی۔ ”یہی میں سوچتی رہی..... گھر آکے بھی..... اور آہستہ آہستہ میرے ذہن میں ایک پکچر کلیئر ہوتی گئی..... اس وقت سے جب مسٹر فاروقی نے ایڈمنسٹریٹر آفس میں ہنگامہ کیا..... اس وقت تک جب نرس ڈاکٹر بلقیس کی نگرانی میں مانیٹر لگانے کمرے میں گئی..... درمیان میں پانچ سات منٹ کا وقفہ رہا جس میں اپنی بیوی کے ساتھ صرف مسٹر فاروقی تھے.....“

میں نے کہا ”کہیں تم یہ کہنے کی کوشش تو نہیں کر رہی ہو کہ..... خود مسٹر فاروقی نے.....“

''میں کچھ نہیں کہہ رہی ہوں...... آپ جو نتیجہ چاہیں اخذ کریں...... لیکن یہ بات مجھے ناممکن لگتی ہے کہ ایک شخص جس کی بیوی شادی کے پندرہ سال بعد ماں بننے جارہی ہے...... ایسا کیوں کرے گا...... وہ تو انتہائی خوش ہوگا...... بیوی کو پھول کی طرح سنبھال کررکھے گا...... جو باپ بننے کی پندرہ سال پرانی خواہش پوری کررہی ہے...... لیکن لیکن......'' وہ بولتے بولتے خاموش ہوگئی۔

''آپ رک کیوں گئیں؟''

''آپ ناراض ہوں گے......'' اس نے کہا ''جانے دیں۔''

میں نے کہا...... ''میں ناراض نہ ہونے کا وعدہ کرتا ہوں۔''

وہ پھر بھی سوچتی رہی۔ ''جب تک کہ...... مسٹر فاروقی کو یہ شک نہ ہو کہ...... بچہ ان کا نہیں تھا...... بیوی...... پندرہ سال تک کوئی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا نہیں رہتا...... صرف دعاؤں پر بھروسا کرنا کافی نہیں سمجھتا...... وہ دوا بھی کرتا ہے...... علاج بھی کراتا ہے...... اور اگر اسے معلوم ہوجائے کہ خامی بیوی کی نہیں...... وہ خود بانجھ ہے...... INFERTILE ہے...... اور بیوی خوشخبری سنادے کہ اللہ نے ہماری سن لی...... تو اس کا ردِعمل کیا ہوگا؟''

میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''تھینک یو مس صبیحہ...... میں نے آپ کا کافی وقت لیا...... لیکن اب ہر چیز میرے ذہن میں کلیئر ہوگئی ہے...... مگر میں کچھ بھی نہیں کرسکتا...... پاکستان میں ہوتا تب بھی کچھ نہ کرتا...... جو ہونا تھا ہوگیا...... اب تھانہ کچہری سے کیا حاصل۔ فاروقی اتنا بڑا وکیل ہے...... اور یہاں تو کوئی بھی قانون کو اندھا گونگا بہرا بنا سکتا ہے...... پیسے یا اثر ورسوخ سے سچ کو جھوٹ ثابت کرسکتا ہے...... بس ایک آخری بات......''

''وہ کیا......''

''آخر فاروقی صاحب کو اسپتال والوں نے کیسے خاموش کیا...... دھمکی دے کر یا کہ آپ نے ہم پر الزام لگایا تو ہم آپ پر شک ظاہر کردیں گے...... ہماری گواہی کو نظر انداز کرنا کسی عدالت کے لیے ممکن نہیں ہوگا...... آپ کتنے بڑے وکیل ہی کیوں نہ ہوں...... ہماری گردن پکڑنے سے پہلے اپنی گردن کی فکر کریں...... کیا یہی دھمکی کارگر ہوئی......''

وہ مسکرائی۔ ''آپ خود سمجھدار ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''آپ کا بہت شکریہ...... میری طرف سے مطمئن رہیے۔ سمجھ لیں کہ ہماری ملاقات ہی نہیں ہوئی۔''

مجھے نہیں معلوم کہ اس لڑکی نے ہم اسے اتنا تعاون بھی کیوں کیا...... وہ بات کرنے سے صاف انکار بھی کرسکتی تھی۔ غالباً اس کے دل میں فاروقی کے خلاف غصہ تھا...... اسے یقین تھا کہ بیوی کو خود فاروقی نے مارا...... بیہوشی کی حالت میں اس کے منہ پر تکیہ رکھ کے دم گھوٹ دیا...... اور شور مچا دیا...... پانچ منٹ میں سب ہوگیا...... تاہم اس نے ہر قدم سوچ کے اٹھایا تھا...... یہ ایک CALCULATED گیم تھا...... وہ جانتا تھا کہ اسپتال والے بے وقوف نہیں ہیں...... جب وہ ان پر الزام لگائے گا تو وہ جواب میں اس پر شک ظاہر کریں گے۔ وہ جانتے ہیں فاروقی کتنا بڑا وکیل ہے...... دونوں کے درمیان خاموش رہنے کا معاہدہ ہوجائے گا...... اسپتال والے قانونی چارہ جوئی کو اپنی گڈول کے لیے پسند نہیں کرتے خصوصاً فاروقی جیسے نامور وکیل کے ساتھ...... خاموشی اور چشم پوشی میں دونوں کا بھلا ہے...... کوئی کسی پر انگلی نہ اٹھائے......

فاروقی نے بڑی ذہانت سے یہ گیم کھیلا تھا...... اس نے اسپتال والوں کو پتا نہیں چلنے دیا کہ مریم اس کی پہلی نہیں دوسری بیوی ہے...... پہلی تو آج بھی بے اولاد اپنے گھر میں بیٹھی ہے...... دوسری طرف مریم کی موت کو اس نے لیلیٰ بھابی کے کھاتے میں ڈال دیا...... اسے یقین دلا دیا کہ اسپتال والوں نے موت کا سبب زہر کو قرار دیا ہے اور زہر دینے والی ذات پہلی بیوی کی ہے۔ اس نے مریم کو چائے میں زہر دیا...... لیلیٰ بھابی جیسی عورت کو دہشت زدہ کرنا کیا مشکل تھا...... فاروقی نے انہیں اپنے جال میں جکڑ لیا۔

لیلیٰ بھابی پھنس گئیں...... ایک شوہر کی محبت کی وجہ سے...... دوسرے خوف کے باعث...... اپنی زندگی، اپنی عزت اپنا گھر اور اپنا مستقبل بچانے کے لیے انہوں نے فاروقی سے وعدہ کرلیا کہ جیسا وہ کہے گا وہ ایسا ہی کریں گی...... فاروقی نے یہ بھی واضح کردیا کہ وعدہ خلافی کا انجام کیا ہوسکتا ہے......

باہر کھانا کھاتے ہوئے میں نے اور راجا نے اس تمام صورت حال پر تفصیل سے سوچا اور فیصلہ کیا کہ حالات کو نظر میں رکھتے ہوئے خاموشی اختیار کرنا ہی بہتر ہوگا...... یہ بھڑوں کا چھتا تھا...... اس میں ہاتھ ڈالنا سب کے لیے مشکلات میں اضافے کا سبب بنتا...... خصوصاً لیلیٰ بھابی کے لیے اور اس سے زیادہ نور جہاں کے لیے...... سازش کا راز فاش ہونے کا سارا شک اس پر جائے گا...... ہمیں محتاط اور چوکس رہتے ہوئے دیکھنا چاہیے کہ فارقی کی اگلی چال کیا ہوگی۔

سہ پہر ڈھلنے لگی تو میں نے کہا ''راجا...... سب لوگ ہمارا انتظار کررہے ہوں گے...... ہم کسی کو کچھ بتائے بغیر آگئے تھے۔''

''ہاں...... اب چلیں گے تو ست بدھائی پہنچتے پہنچتے شام ہوجائے گی۔'' راجا نے کہا ''وہاں رابعہ اکیلی ہے۔''

''یہاں سے سب بھاگنا چاہتے ہیں...... کیسی مجبوری ہے ان کی۔ یہ لوگ ست بدھائی سے بھاگ کر یہاں آئے تھے۔ اب واپس وہیں جائیں گے۔ مجھے سب اپنا قصور نظر آتا ہے......'' میں نے کہا ''فریال حویلی کو شاہی قید خانہ کہتی ہے...... وہ میری وجہ سے مجبور ہے...... میرے والدین کی مجبوری بھی یہی ہے مجھے چھوڑ کے کہاں جائیں...... میری وجہ سے تو اور تیری وجہ سے شہناز مجبور ہوئی...... فرخ ساتھ نبھاتا تو رابعہ اس کے ساتھ چلی جاتی...... اب وہ بھی قید ہے...... پتا نہیں حالات کی مجبوری کا یہ سلسلہ کب اور کہاں ختم ہوگا؟''

راجہ نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا...... ''اللہ پر بھروسا رکھو نیکے پتر...... سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

راجا کی رفاقت خدا کے بعد میرا سب سے بڑا سہارا تھی۔ مجھے خوب اندازہ تھا کہ اندر سے اس کے دکھ کا گھاؤ کتنا گہرا ہے، صرف ایک بار ایسا ہوا تھا کہ اس کا اپنے اعصاب پر قابو نہیں رہا تھا اور اس نے اپنے غم کو شراب میں ڈبونے کی کوشش بھی کی تھی لیکن وہ پھر سنبھل گیا تھا اور ہمیشہ ناصح اور غمگسار بن کے وہ میرا حوصلہ بڑھاتا رہا تھا۔

فاروقی لان میں اکیلا ٹہل رہا تھا، پریشانی اس کی صورت پر لکھی ہوئی تھی...... ہمیشہ ہنستا کھیلتا نظر آنے والا بے فکر فاروقی آج اداس اور فکرمند تھا...... اس کے بال بے ترتیب تھے اور شیو بڑھی ہوئی تھی...... اس کی آنکھوں میں الجھن اور وحشت تھی۔

مجھے دیکھ کے اس نے ہاتھ ہلایا۔ ''آؤ یار...... کہاں چلے گئے تھے تم لوگ......'' اور پھر ان کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا جو لان میں رکھی رہتی تھیں۔

راجا کے ساتھ لان عبور کرکے میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا...... ''راجا کو پریس کلب میں کسی سے ملنا تھا۔'' میں نے کہا۔

فاروقی کچھ دیر اپنی انگلیاں چٹخاتا رہا۔ ''یار...... پتا نہیں یہ سب کیوں ہوگیا...... جو نہیں ہونا چاہیے تھا......''

میں نے کہا ''اسے اچھا تو نہیں کہا جاسکتا۔''

''وہ بس...... حالات ایسے ہوگئے...... میں نہیں چاہتا تھا لیکن...... شادی کرنی پڑی...... اور شادی کرکے بھی کیا ملا۔''

وہ بولتا رہا۔ اس کے خیالات میں انتشار تھا اور باتوں میں ربط بھی نہیں تھا...... اس پر احساسِ جرم کا دباؤ تھا...... وہ ایک لاشعوری خوف میں مبتلا تھا کہ کبھی اس کے سازشی ذہن کا راز فاش نہ ہوجائے...... ہم اس کے منافق چہرے کو پہچان نہ لیں...... اس کی کسی بات سے یہ اندازہ نہ لیں کہ ہوس نے اسے کتنا بے ضمیر کردیا ہے...... کہ اب وہ دوستی کے خلوص کی آڑ میں میرے لیے بدترین دشمنی کے جذبات رکھتا ہے۔

اس نے مریم کی بات کی ...... بے سہارا عورت تھی...... میں نے اسے پناہ دینے کے لیے نکاح کرلیا...... اس میں کون سی معیوب بات تھی...... خود لیلیٰ نے کئی بار کہا تھا کہ دوسری شادی کرلو اولاد کے لیے...... قسمت کو یہ منظور نہیں تھا...... اپنی گفتگو میں ایک بار بھی اس نے مریم کی موت کے اسباب کا ذکر نہیں کیا...... نہ یہ کہا کہ زہر دیا گیا تھا اور یہ کام لیلیٰ نے کیا تھا۔

ہماری خاموشی سے وہ مزید نروس ہورہا تھا...... اسے یہ اندازہ کرنا مشکل ہوگیا تھا کہ ہم اس کی باتوں سے اتفاق کرتے ہیں یا نہیں...... اگر اختلاف رکھتے ہیں تو اس کا اظہار کیوں نہیں کررہے...... ہماری ایک چپ اس کے دل میں سو وسوسے پیدا کررہی تھی۔

بالآخر میں نے مزید وقت ضائع نہ کرنے کا فیصلہ کیا...... ''فاروقی ہم اب چلتے ہیں ...... باقی لوگ کہاں ہیں۔''

''باقی لوگ......؟ یہاں تو میں اکیلا ہوں...... سب چلے گئے......''

''کہاں چلے گئے...... اور کب......!''

''تھوڑی دیر پہلے...... سب ست بدھائی گئے ہیں...... سب مجھ سے خفا ہیں...... میری بیوی بھی...... حالانکہ میں نے کوئی غیر اخلاقی غیر قانونی یا غیر شرعی کام نہیں کیا تھا اور لیلیٰ خود کہتی تھی......''

میں نے کہا...... ''فاروقی ...... ایک ہی بات بار بار دہرانے کی کیا ضرورت ہے...... سب چلے گئے ہیں تو پھر ہمارا یہاں ٹھہرنا فضول ہے۔''

''ہاں...... ابھی میرا دماغ حاضر نہیں ہے...... قانونی معاملات کے لیے......'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میں نے دل ہی دل میں اس شخص کے لیے سخت نفرت محسوس کی...... یہ وہی شخص تھا جسے میں نے اپنے سارے قانونی معاملات کا نگراں بنالیا تھا...... یہ سمجھا تھا کہ وہ مجھے دشمنوں کے خلاف قانونی تحفظ فراہم کرے گا......اس پر اعتماد کیا تھا کہ قانونی جنگ میں وہ دشمنوں کے خلاف میرا ساتھ دے گا...... لیکن وہ کتنی آسانی سے بک گیا تھا...... تھوڑی سی زمین کی خاطر جو ست بدھائی کی جاگیر کہلاتی تھی، وہ میری جان لینے کے درپے ہوگیا تھا......اس کی آدھی سے زیادہ زندگی گذر گئی تھی بالآخر اسے بھی دوگز زمین میں ہی سمانا تھا......وہ یہ بات وہ بھول گیا تھا۔

ست بدھائی کی طرف لوٹتے ہوئے راجا اور میں آدمی کی فطرت کی اسی کمزوری پر افسوس کرتے رہے...... فاروقی بڑا صاحب کردار شمار ہوتا تھا مگر ایک ایسی عورت نے اس کی اصلیت کو بے نقاب کردیا تھا جس کے کردار پر انگلیاں اٹھانے والے بہت تھے۔

یقیناً میں نور جہاں کے لیے شکرگزاری کے جذبات سے مغلوب تھا......اب میں جانتا تھا کہ میرا دوست کون ہے اور دشمن کون...... مجھے معلوم تھا کہ کون کس سمت سے وار کرے گا...... بلاشبہ یہ بھی بچانے والے ہاتھ کے زبردست ہونے کا ثبوت تھا کہ اس نے نور جہاں کو وسیلہ بنایا اور مارنے والے ہاتھ کی پہچان کرادی۔

ست بدھائی پہنچنے تک ہم اپنا دفاعی لائحہ عمل مرتب کرچکے تھے۔ لیلیٰ بھابی کا سب کے ساتھ آجانا بظاہر فاروقی کے خلاف ناراضی کا اظہار لگتا تھا لیکن یہ ہوسکتا تھا کہ اسے فاروقی نے مجبور کیا ہو...... یہ سمجھایا ہو کہ تم اس وقت سے فائدہ اٹھا سکتی ہو...... خفا ہو کے جاؤ......سب کی ہمدردیاں تمہارے ساتھ ہیں......اپنا احتجاج جاری رکھو...... میں تمہیں لینے آؤں تب بھی نہ آنا......ست بدھائی کو تم نے پہلے بھی اپنا میکا کہا تھا...... میکے میں بیٹھی رہو...... بہت جلد میں تمہیں بتادوں گا کہ تمہیں کیا کرنا ہے......تم وعدہ کرچکی ہو اور اچھی طرح جانتی ہو کہ وعدہ خلافی کی سزا کیا ہوگی۔

ست بدھائی پہنچتے ہی ایک صدمے نے ہمارا استقبال کیا۔ رابعہ تیزی سے ہماری طرف لپکی۔ ''فریال نہیں آئی؟......'' وہ قریب آکے رک گئی۔

میں نے کہا ''کیا وہ لوگ ابھی تک نہیں پہنچے۔''

''کون لوگ...... چچا چچی کے ساتھ لیلیٰ بھابی آئی ہیں۔'' رابعہ نے کہا۔

میں نے کہا ''فریال ان کے ساتھ نہیں آئی۔''

رابعہ نے خفگی سے کہا۔ ''کیا ڈراما کررہے ہو......وہ تمہارے ساتھ تھی۔''

راجا نے اور میں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ''ہمارے ساتھ یہ تو واقعی ڈراما ہے۔ ہم سے فاروقی نے کہا کہ سب لوگ گئے......وہ اکیلا تھا گھر میں...... مگر ہاں......نام اس نے کسی کا نہیں لیا تھا......''

راجا بولا ''ایک منٹ......تم سے کس نے کہا کہ فریال ہمارے ساتھ تھی؟''

''لیلیٰ بھابی نے اور کس نے......تم دونوں کہاں گئے تھے۔''

میں نے کہا ''راجا کو ایک کام تھا پریس کلب میں......''

''حد کرتے ہو تم بھی کزن......سب یہی سمجھ رہے تھے کہ تم فریال کے ساتھ لوٹ کے ست بدھائی چلے گئے......چچا چچی بے حد خفا ہیں کہ تم نے ان سے بات تک نہیں کی......وہ تمہارے ساتھ ہی آنے کا طے کرچکے تھے۔''

''پھر وہ کیسے آئے......'' راجا نے پوچھا۔

''فاروقی نے اپنی گاڑی بھیجی......اس کا ڈرائیور چھوڑ کے واپس چلا گیا......لیلیٰ بھابی نے اچانک ساتھ آنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔''

میرا دل کہتا تھا کہ فریال کا معاملہ پھر خراب ہوگیا ہے......وہ ہمارے ساتھ تو نہیں تھی شاید ہمارے نکلتے ہی وہ بھی نکل گئی تھی اور باقی لوگوں نے فرض کرلیا کہ وہ ہمارے ساتھ گئی ہے......سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ آخر وہ کہاں گئی اور کیوں؟

اماں ابا کے پاس میں نے راجا کو بھیج دیا کہ صورت حال کی وضاحت کردے اور اپنی صفائی پیش کرنے میں جتنی سخت سست سننی پڑیں سن لے......ایک تو میرے مقابلے میں راجا کو یہ رعایت حاصل تھی کہ وہ بیٹوں کی طرح ضرور تھا مگر بیٹا نہیں تھا......اماں ابا کا آدھا غصہ راجا پر نکل جاتا تو باقی آدھا میں آسانی سے بھگت لیتا۔

لیلیٰ بھابی فریال کے کمرے میں چپ بیٹھی دیوار کو گھور رہی تھیں۔ انہیں میرے آنے کی خبر بھی نہ ہوئی...... میں سامنے گیا تو انہوں نے چونک کر دیکھا اور جذبات سے عاری لہجے میں کہا...... ''آگئے تم!''

میں نے کہا...... ''لیلیٰ بھابی......فریال کہاں ہے؟''

انہوں نے تلخی سے کہا۔ ''جانے دو......بھول جاؤ فریال کو......وہ چلی گئی......''

میں نے خفگی سے کہا۔ ''کہاں چلی گئی۔''

انہوں نے قریب رکھے ہینڈ بیگ کو کھولا اور ایک تہ کیا ہوا کاغذ میری طرف بڑھا دیا......یہ فریال کی تحریر تھی......اس نے لکھا تھا۔

''رفیق صاحب۔

معلوم نہیں کیوں لیلیٰ بھابی کے مجبور کرنے پر میں یہ بات اٹھانے رک گئی تھی......اگر میں ان کی بات رد کردیتی تو کم سے کم میری عزتِ نفس تو مجروح نہ ہوتی......انہوں نے بڑے وثوق سے کہا تھا کہ تم آؤ گے ہاتھ جوڑ کے اور ناک سے زمین پر لکیریں نکال کے معافی مانگو گے......یہ الفاظ ان کے ہیں......میرے نہیں...... بے شک تم آئے......لیکن شرمندہ ہو کے نہیں......تم شرمندہ کرنے آئے......جب آپ راجا سے فرما رہے تھے کہ آپ لکھ لیجیے میری بات......یہ ڈراما تھا......سب پہلے سے طے شدہ تھا......میں چھپ کر باتیں سننے کا شوق نہیں رکھتی......بس اتفاق سے میرا ادھر سے گزر ہوا اور میں نے آپ کے لبوں سے اپنا نام سنا تو رک گئی......کاش میں نہ رکی ہوتی۔

میں بہت دیر اس تحریر پر نظریں جمائے بیٹھا رہا......ایک بار پھر بدبختی نے مجھے شکار کرلیا تھا......میں نے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار لی تھی......وہ ایک غیر سنجیدہ خیال تھا جو الفاظ میں ڈھل کے میرے لبوں پر آگیا تھا لیکن میرے اور فریال کے درمیان غلط فہمیوں کی خلیج پیدا کرنے والے نحوست کے سلسلے نے میرے غلط خیال کو غلط وقت پر فریال کے کانوں تک پہنچانے کا بندوبست کردیا تھا......وہ ایک منحوس اتفاق تھا جس نے فریال کی ساری خوش گمانی کو شرمندگی میں بدل دیا اور میری امیدوں کو خاک میں ملا دیا۔

معلوم نہیں اپنے ہی آزار کے عذاب میں مبتلا میں کتنی دیر تک آنکھوں سے نہ چھلکنے والے خون کے آنسو روتا رہا......ایک لاحاصل خواہش کی بے اثر فریاد سنتا رہا......کاش ایک بار......صرف ایک بار وہ پھر مل جائے۔

لیلیٰ بھابی نے کہا۔ ''واہ......کیا ڈراما کررہے ہو تم بھی دیور جی......لگتا ہے سخت صدمے سے ہارٹ فیل ہوجائے گا تمہارا......البتہ اداکاری اچھی کرلیتے ہو تم......''

میں نے خفگی سے کہا۔ ''میں ڈراما کررہا ہوں؟''

وہ طنز سے بولی۔ ''نہیں جی......ڈراما تو صرف فریال کررہی تھی......شاید میرے لیے بھی تم ایسا ہی سمجھتے ہوگے......میں بھی ڈرامے میں شریک تھی۔''

میں نے کہا ''اب اور ذلیل نہ کریں بھابی۔''

''تمہیں کون ذلیل کرسکتا ہے......تم ٹھہرے نواب......ذلت صرف اس کا مقدر تھی...... چھ سال خوار ہوئی تمہارے لیے اور تم نے اس کی وفا کا ایسا شاندار انعام دیا......شادی کیے بغیر اس کو انعام میں ایک بچہ عطا فرما دیا......اس کی اپنی تو کوئی عزت تھی نہیں...... ہمیشہ سب اس کے کردار پر انگلیاں ہی اٹھاتے رہے......اور ایک وہ عزت زندگی کی آرزو میں تمہارے پیچھے پیچھے پھرتی رہی......ست بدھائی پہنچ گئی...... لیکن جو نصیب میں نہ ہو وہ چاہنے سے کیسے مل سکتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''آپ نے اسے کیوں جانے دیا......روکا کیوں نہیں۔''

وہ چیخ کے بولی۔ ''کیوں روکتی میں اسے......ایک بار روک کے کیا ملا اسے......وہ تمہاری بیوی بننے کے لیے ساری ذلت اٹھاتی رہی...... بڑی مہربانی کی تم نے اس کے حال پر کہ اسے ماں کے مرتبے پر فائز کردیا...... بہت افسوس ہے مجھے رفیق صاحب کہ میں نے آپ کو سمجھنے میں غلطی کی۔''

''وہ موقع تو دیتی مجھے بات کرنے کا......''

''ہاں......باتوں سے آپ پھر اسے بہکا لیتے......پھر بے وقوف عورت تم جیسے مردوں کی باتوں میں آکے اپنا سب کچھ گنوا بیٹھتی ہے......اس نے میرے سامنے بیٹھ کے یہ چند سطریں لکھیں اور چلی گئی......اس نے کہا کہ ابھی کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں......رفیق نے مجھ سے بات کرنا تو دور میری طرف نظر اٹھا کے نہیں دیکھا اور واپس چلا گیا......جیسے میں یہاں موجود ہی نہیں......وہ نہ مجھے منانے آیا تھا، نہ مجھے واپس لے جانے......وہ مریم کی علالت پر فاروقی سے اظہار ہمدردی کرنے آیا تھا اور مریم مرگئی تو اس کے جنازے میں شرکت کے بعد چلا گیا......جیسے راجا آیا تھا۔''

میں نے احتجاج کیا ''لیلیٰ بھابی......آپ جانتے ہیں یہ غلط ہے۔''

''میں کیسے جان سکتی ہوں رفیق صاحب......کیا غلط ہے کیا صحیح......''

میں نے کہا۔ ''مجھے بالکل علم نہیں تھا مریم کی بیماری کا......''

''کیوں کیا فاروقی نے تمہیں فون کر کے نہیں بتایا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''تمہارے سر کی قسم......فاروقی سے میری کوئی بات نہیں ہوئی تھی...... بے شک تم اس سے پوچھ لو......میں صرف اسے منانے آیا تھا......آپ جانتی ہیں میں نے طے کرلیا تھا کہ اب شادی میں ایک دن کی تاخیر بھی نہیں ہوگی...... مجھے اپنے والدین کو بھی ساتھ لے جانا تھا......''

''اب یہ سب مجھ سے کہنے کا کچھ فائدہ نہیں ......''

''بھابی ...... اس نے آپ کو ضرور بتایا ہوگا ...... کہ وہ کہاں جائے گی۔''

بھابی نے نفی میں سرہلایا۔ ''سچی بات یہ ہے کہ میں نے پوچھا ہی نہیں ...... وہ کون سا بتاتی ...... وہ رو رہی تھی ...... اس نے صرف یہ کہا کہ بھابی بس بہت ہوگیا ...... میں اکیلی ہی زندہ رہ لوں گی۔ میری قسمت خدا نے ایسی ہی بنائی ہے۔''

میں نے مایوسی سے کہا۔ ''پتا نہیں وہ کہاں جائے گی ...... کیا کرے گی ...... یہ سوچ سوچ کے میرا دماغ خراب ہو رہا ہے ...... اوپر سے تم بھی یہاں آگئی ہو ......''

اس نے دکھی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''تمہیں میرا یہاں آنا اچھا نہیں لگا۔''

میں نے کہا۔ ''میرا مطلب ہے ...... شاید وہ تم سے رابطہ کرتی ...... کیا تمہیں فاروقی نے مجبور کیا تھا۔''

وہ چونکی۔ ''یہاں آنے کے لیے! وہ کیوں مجبور کرتا ...... اسے تو اب میری زیادہ ضرورت محسوس ہوگی۔''

''ان حالات میں تم اس کی غلطی معاف کرتیں تو اس کا اچھا اثر ہوتا۔'' میں نے کہا۔

''بات یہ ہے دیور جی ...... پہلے خود میں نے اس سے کہا کہ اولاد کی خواہش ہے تو دوسری شادی کرلو ...... لیکن ایسا میں چاہتی نہیں تھی ...... مجبوری میں کہتی تھی ...... اور وہ خفا ہو جاتا تھا کہ آئندہ ایسی بات مت کرنا ...... پھر اس نے چپکے سے شادی کرلی ...... مجھے بتانا بھی ضروری نہیں سمجھا ...... میں کون سا اسے روکتی ...... روک بھی نہیں سکتی تھی ......''

''وہ اکیلا بہرحال نہیں رہ سکتا۔''

''نہ رہے ...... کرلے ایک اور شادی ...... ایک چھوڑ دو کرے ...... میرا دل اس سے کھٹا ہوگیا ہے۔ میں اسے بہت شریف اور باکردار سمجھتی تھی ...... وہ کہتا کہ مجھے اولاد کی خواہش ہے اور کسی شریف لڑکی کو لے آتا تو مجھے دکھ ہوتا مگر اتنا نہیں۔ مجھے پتا چلا کہ اس کے مریم سے مراسم تھے۔ ایک داشتہ پال رکھی تھی اس نے ...... میرے سامنے بات کرتا تھا انسانی ہمدردی کی کہ غریب بے سہارا بیوہ کی مدد کر رہا ہوں۔ جب اس کے پیٹ میں بچہ پڑ گیا تو اسے گھر لے آیا بیوی بنا کے ...... کتنی بے غیرتی کی بات ہے۔''

میرا دماغ بار بار غیر حاضر ہو جاتا تھا ...... میں لیلیٰ بھابی کی بات کم سن رہا تھا ...... فریال کے بارے میں زیادہ سوچ رہا تھا ...... ابھی فریال کی جدائی برداشت کرنے سے زیادہ دوسرے مسائل کا سامنا بھی تھا ...... میں اماں ابا کو کیا بتادوں گا۔ رابعہ سے کیا کہوں گا۔

لیلیٰ بھابی نے بھی مجھے ڈراما کرنے کا طعنہ دیا تھا حالانکہ سب سے بڑا ڈراما وہ خود کر رہی تھیں ...... مجھے معلوم تھا کہ یہاں وہ مجھے ٹھکانے لگانے آئی ہیں لیکن میں یہ بات کہتا تو کہتیں کہ تم پاگل ہوگئے ہو ...... اور کوئی سنتا تو یہی کہتا کہ میرا دماغ چل گیا ہے ...... چنانچہ میں خاموش رہا۔''

جب ریشم نے دروازے میں نمودار ہو کے کہا۔ ''سر! بگ صاب کالنگ'' تو میں تھکے ہارے قدموں سے چلتا اماں ابا کی خدمت میں حاضر ہوگیا ...... حسب توقع وہ بہت گرم ہو رہے ...... گلے شکوے پرانے تھے ...... ہمیں گھر سے بے گھر کردیا ...... زمانے بھر کی فکر ہے اپنی نہیں ...... ہر ایک سے دشمنی مول لے رکھی ہے۔ اس بچاری ڈاکٹر کی زندگی تمہاری وجہ سے خراب ہوئی اور اس کے ساتھ راجا کی بھی مگر تم اپنے آگے کسی کی نہیں سنتے ...... اماں روتی رہیں ...... ابا بولتے رہے۔ میں اپنے خیالوں کے دشت میں بھٹکتا رہا۔

اچانک ابا نے چلا کے کہا۔ ''آخر کیا ہوگیا ہے تمہیں ...... تم کچھ سن ہی نہیں رہے ہو ...... ہم کتے ہیں کہ بھونک رہے ہیں۔''

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ''معاف کیجیے ابا جی ...... میرا دماغ حاضر نہیں اور میں آپ کو بتا بھی نہیں سکتا کہ ...... میرے ساتھ کیا ہوا ہے۔''

وہ ٹھٹک گئے۔ ''اب کیا ہوگیا رفیق میاں۔''

میں نے کہا۔ ''فریال چلی گئی۔''

وہ ذرا سی دیر کے لیے خاموش ہوئے۔ ''فریال چلی گئی ...... کہاں؟''

میں نے کہا ...... ''مجھے نہیں معلوم ...... شاید واپس لندن۔''

''لیکن کیوں؟ ......'' ابا نے کہا۔

''وہ یہاں رہنا نہیں چاہتی تھی۔'' میں نے ٹالنے کے لیے کہا۔ ''کہتی تھی یہ جنگل ہے ...... وہ لندن جیسے شہر میں رہنے کی عادی تھی۔''

''لیکن ...... پھر وہ آئی کیوں تھی ...... اور ہمارے سامنے تو اس نے کبھی ایسی بات نہیں کی۔'' ابا نے تائید کے لیے اماں کی طرف دیکھا۔

اماں نے سرہلایا۔ ''وہ تو بہت خوش تھی یہاں۔''

میں نے کہا۔ ''سب ڈراما تھا ...... آپ کو امپریس کرنے کے لیے ...... آپ کی تائید اور حمایت حاصل کرنے کے لیے۔''

''میں نہیں مان سکتا رفیق میاں ...... کوئی لڑکی مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتی ...... تم اس سے میری بات کراؤ ......'' ابا نے کہا۔

''بات کیسے کراؤں ...... وہ کون سا فون نمبر چھوڑ کے گئی ہے یہ بھی محض میرا خیال ہے کہ وہ لندن گئی ہوگی ...... فی الحال میں اس کے بارے میں کوئی بات کرنا نہیں چاہتا۔'' میں نے باہر جاتے جاتے کہا۔

رات بھر میں سوچتا رہا اور کمرے کی چار دیواروں کی قید میں سرگرداں رہا۔ اپنی غلطی کا اعتراف میں سو بار کرتا تھا لیکن مجھے دکھ، افسوس اور غصہ فریال پر اس لیے تھا کہ اس نے انتہائی قدم اٹھایا تھا ...... اپنا سراغ نہ چھوڑ کے وہ مجھے پچھتاوے کے جہنم میں اکیلا جلنے مرنے کے لیے چھوڑ گئی تھی۔

اب میرا تصور مجھے ڈرا رہا تھا۔ میرے سامنے امکانات کی عذاب ناک تصویریں پیش کر رہا تھا۔ میں سوچنے کی کوشش کرتا تھا کہ اس وقت جب میں اس کی دی ہوئی سزا جھیل رہا ہوں اور وہ خود کہاں ہوگی ...... یہ تو ناممکن ہے کہ وہ میرے بارے میں نہ سوچ رہی ہو اور اس زندگی کے بارے میں جسے وہ اپنی انا کی قربان گاہ کی بھینٹ چڑھا کے کسی ناقابل تصور مستقبل میں جینے کے لیے اکیلی نکل کھڑی ہوئی ہے۔

سوال ایک ہی تھا جو ہر طرف کسی راستہ نہ دینے والی دیوار کی طرح کھڑا تھا۔ آخر وہ کہاں جائے گی ...... میری معلومات کے مطابق پاکستان میں ایسا کوئی گھر نہ تھا جہاں وہ پناہ لے سکے ...... ماں باپ تو بہت پہلے ہی دنیا چھوڑ گئے تھے۔ جب فریال نے اپنی خود مختاری کا اعلان کرتے ہوئے پہلے ماڈلنگ شروع کی اور پھر فلمی دنیا کا رخ کیا تو بہن بھائیوں نے اس سے مکمل لاتعلقی اختیار کرلی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ عاق کردی جانے والی فریال کبھی لوٹ کر ان کے پاس نہیں جاسکتی ...... اگر چلی جاتی تو ہر در سے دھتکاری جاتی کہ تم جیسی لڑکی کا یہاں آنا ہی ہمارے لیے بڑی رسوائی کی بات ہے۔

کچھ دور کے عزیز یقیناً ہوں گے ...... ممکن ہے ان میں کچھ فراخدل اور خداترس بھی ہوں گے مگر فریال نے کبھی ان کا ذکر نہیں کیا تھا ...... یہ فریال کی ماں تھی جس کی ضد پر فریال کو کالج تک پڑھنے دیا گیا تھا ...... بعد میں فریال کی وجہ سے خاندان کی عزت پر جو دھبا لگا، اس کے بعد ماں بھی پچھتاتی ہوگی ...... کالج کے زمانے میں اور شوبزنس کے تجرباتی دور میں اس کا کوئی خاص دوست ہوتا جس پر وہ اعتماد کرسکے۔ اس کا مجھے علم نہیں تھا ...... غالباً ایسا کوئی بھی نہیں تھا ...... ہوتا تو وہ بھی ذکر کرسکتی ...... اس کی ساری زندگی میرے سامنے ایک کھلی کتاب تھی ...... اس کا ہر صفحہ زندگی کا ایک دن تھا تو ہر لفظ اس دن کا کوئی لمحہ جس سے میں واقف تھا۔

فریال کے پاس اگر کچھ پیسا تھا تو کتنا ...... اس کا پاسپورٹ کارآمد تھا یا نہیں ...... وہ واپس لندن یا کہیں اور جانے کے لیے ویزا ابھی افورڈ کرسکتی تھی اور جہاز کا کرایہ بھی ...... مجھے کچھ اندازہ نہ تھا ...... لوگ غیر شادی شدہ ضرورت مندوں کو کرائے پر گھر نہیں دیتے ...... مجھے ایک واقعہ یاد تھا جب کئی سال پہلے ہم چند دوستوں نے ایک ڈرامیٹک سوسائٹی بنائی ...... وہاں کچھ میوزک کا سلسلہ بھی شروع ہوا تو چند محلے کے اخلاق و کردار کے ٹھیکے دار مذمت کی قرارداد لے کر آگئے کہ یہ کیا ہو رہا ہے شرفا کے محلے میں آخر ہماری بہو بیٹیاں رہتی ہیں یہاں ...... میں نے کہہ دیا کہ کیا آپ کو ان پر اعتماد نہیں ...... یہ ڈر ہے کہ وہ ہم میں سے کسی کے ساتھ نکل جائیں گی ...... ایسا ہے تو قصور آپ کی تربیت کا ہے۔ اس بات پر میں پٹتے پٹتے بچا تھا۔

خوبصورت اور جوان عورت کا اکیلے رہنا تو اور...۔ ناممکن ہے ...... اس کے بارے میں معاشرتی اقدار کے محافظوں کا طے شدہ اور متفقہ ردعمل ایک ہی ہوتا ہے کہ وہ کال گرل یا فاحشہ ہوسکتی ہے چنانچہ سب سے پہلے ان کے بھولے بھالے نوجوانوں پر ڈورے ڈال کے ان کا اخلاق تباہ کرے گی اور پھر گھر کی معصوم بہو بیٹیوں کو اپنی راہ پر لگا لے گی۔ اس مفروضے کی بنیاد پر تمام جوان بڑی دل جمعی سے اس کو پھنسانے کی کوشش شروع کرتے ہیں۔ ہمت مرداں ...... مدد خدا ...... لیکن خود ساختہ معاشرتی اخلاق کے ٹھیکے داروں کی رال بھی ٹپکنے لگتی ہے اور چوری چھپے وہ بھی اسی صف میں شامل ہو جاتے ہیں۔

اب رہی ہوٹل کی بات تو فائیو اسٹار ہوٹلوں میں مستقل قیام کون افورڈ کرسکتا ہے ...... نچلے درجے کے ہوٹلوں میں عموماً ایک شب کی مہمان عورتوں کا ٹھکانہ ہوتا ہے۔ وہاں اکیلی عورت کیسے محفوظ رہ سکتی ہے۔ ایسا صرف ان ملکوں میں ممکن ہے جو اسلامی جمہوریہ نہیں ہیں۔ کافروں کے مادر پدر آزاد معاشرے کہلاتے ہیں لیکن عورت وہاں کتنی محفوظ ہے ...... صرف عورت ہی کیا ...... قانون اور معاشرے سب کو یکساں تحفظ فراہم کرتا ہے۔

ایک آرزوئے خام بار بار میرے دل میں انگڑائی لیتی تھی۔ کاش ایسا ہو کہ وہ لوٹ آئے۔ صبح ریشم دوڑتی آئے اور کہے۔ ''سر ...... میڈم فریال بیک کم ......'' یا ابھی فون کی گھنٹی

بجے اور وہ کہے...... ''رومیو...... میں نے بہت غلط فیصلہ کیا تھا...... مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اب میں تمہارے بغیر کہیں نہیں رہ سکتی...... ایک دن بھی نہیں'' ...... مگر یہ...... اے بسا آرزو کہ خاک شد...... والی بات تھی۔

میرا خیال تھا کہ راجا نے اتنی دیر سے کروٹ نہیں لی تو وہ سو چکا ہے...... جاگ رہا ہوتا تو کچھ بات کرتا...... وہ منہ دوسری طرف کیے ساکت پڑا تھا لیکن جاگ رہا تھا۔

اچانک اس نے کہا۔ ''یار اب ہم کیا کریں گے۔''

میں رک گیا۔ ''ہم کیا کر سکتے ہیں راجا۔''

''ایسے رات رات بھر جاگنے اور سوچتے رہنے سے کچھ نہیں ہوسکتا۔ ہم نے ہر کوشش کر کے بھی دیکھ لیا۔''

میں بیٹھ گیا۔ ''اب تو مجھے بھی سوچنا پڑے گا کہ امید بھی کس امید پر رکھی جائے۔''

راجا اٹھ بیٹھا۔ ''ایک ایک کرکے سب چلے گئے...... فرخ نے سب سے پہلے رابعہ کو چھوڑا...... پھر شہناز گئی مجھے اکیلا چھوڑ کے...... اور اب فریال......''

میں نے کہا ''شہناز اپنی مرضی سے نہیں گئی۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے فیکے پتر...... کیا نہیں کیا ہم نے اسے واپس لانے کے لیے...... آج ایک مہینے سے زیادہ ہوگیا...... سوچتا ہوں تو دماغ ماؤف ہونے لگتا ہے۔''

میں نے کہا ''میرا خیال ہے اب مجھے یہ کھیل ہی ختم کر دینا چاہیے...... افسوس اس بات کا ہے کہ یہ خیال مجھے اتنی خرابی کے بعد آرہا ہے...... کس چکر میں پڑ گیا...... بھاڑ میں جائے ست بدھائی اور اس کے سارے ترقیاتی منصوبے...... اگر میں آنے کے بعد اسے بیچ کے کروڑوں کی رقم وصول کرتا...... کچھ مستحق حصے داروں کو دیتا اور اپنے والدین کے ساتھ لندن لوٹ جاتا...... اسی فرم میں اسی جاب پر جہاں میرا مستقبل اور کیریئر دونوں بہت شاندار تھے...... تو آج حالات کتنے مختلف ہوتے...... وادی اور چچا، چچی سب زندہ ہوتے...... رابعہ اتنی دکھی نہ ہوتی...... فریال میرے ساتھ ہوتی...... تو بھی آباد ہوتا شہناز کے ساتھ...... ایک خواب نے ہم سب کو برباد کردیا۔''

''جو ہونا تھا ہو چکا...... اب آگے کی سوچنا چاہیے۔''

میں نے کہا۔ ''ہاں...... جو کل نہ کیا...... وہ کل کرلیا جائے...... آدھی جاگیر میں رابعہ کے نام کردوں اور اسے خود مشورہ دوں کہ وہ فاروقی سے شادی کرلے۔ یہ دونوں کے انٹرسٹ میں ہے...... اسے تحفظ حاصل ہوجائے گا...... فاروقی کو جاگیر مل جائے گی اور اولاد بھی...... یہ تو ثابت ہوچکا ہے کہ رابعہ میں ماں بننے کی صلاحیت ہے...... شاید بطور سوکن لیلیٰ بھابی کا رویہ بھی اس کے ساتھ معاندانہ نہیں ہوگا...... اسے وہ قبول کرلیں گی بڑی بہن کی طرح......''

''اور فریال کا کیا ہوگا......''

''اسے کبھی نہ کبھی معلوم ہوجائے گا کہ میں لندن میں اس کا انتظار کررہا ہوں...... یہ ناممکن ہے کہ وہ بالکل لاتعلق ہوجائے مجھ سے......''

''میں بھی سوچتا ہوں کہ رانا کے سامنے جا کے اس کے پاؤں پکڑ لوں۔ ہاتھ جوڑ کے اس سے معافی مانگ لوں...... اس کی ہر شرط قبول کرلوں...... اور کہوں کہ بس مجھے شہناز عطا ہوجائے تو ساری عمر کی غلامی منظور...... پھر یار میں اس کے بغیر زندہ رہ کے بھی کیا کروں گا...... یار تجھے پتا ہے ایک رات میں نے تقریباً خودکشی کرلی تھی...... پھر شہناز نے ہی روک لیا...... اس کے خیال نے کہا کہ سوچ میں واپس آکے تمہیں نہیں پاؤں گی تو کہاں جاؤں گی...... ابھی تو میں زندہ ہوں......''

اس سے پہلے کہ میں راجا سے خودکشی کے طریقے کے بارے میں کوئی سوال کرتا فون کی گھنٹی بجنے لگی...... ہم نے ایک دوسری کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا...... پھر میں نے فون اٹھالیا...... اس کے اسکرین پر جو نمبر روشن تھا، وہ میرا جانا پہچانا تھا۔

میں نے کہا۔ ''نور جہاں......'' اور گھنٹی کو بجنے دیا۔

راجا نے کہا۔ ''بات کرلے اس سے...... اس نے بہر حال ہماری مدد کی ہے...... غرض کچھ بھی ہو...... میں کافی بنا کے لاتا ہوں......''

میں نے کال ریسیو کی۔ ''ہیلو۔''

وہ بولی۔ ''مجھے معلوم تھا تم جاگ رہے ہوگے۔''

''تمہیں ہر بات معلوم ہوجاتی ہے...... اس وقت رات کے دو بجے ہیں...... تم کیوں جاگ رہی ہو؟''

''مجھے موقع ہی اب ملا ہے...... کیا کرتی...... اکبر خان کی فلائٹ صبح پانچ کی تھی...... وہ لندن گیا ہے۔ ابھی نکلا ہے گھر سے......''

میں نے کہا۔ ''اسے بہت اعتماد ہے تم پر...... وہ تمہاری کالز چیک نہیں کرتا......''

''کرتا ہوگا...... میں نے یہ فون صرف تم سے بات کرنے کے لیے رکھا ہے...... اس کا اکبر خان کے فرشتوں کو بھی علم نہیں ہوسکتا۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔''

''الفاظ سے؟'' وہ معنی خیز انداز میں شوخی سے بولی۔ ''صرف زبان سے۔''

''پہلے پوچھو کس بات پر...... تم نے صحیح انفارمیشن دی۔''

''کس بارے میں۔''

''فاروقی کے عزائم کے بارے میں...... کیا تمہیں معلوم ہے مریم مرگئی...... بالکل اسی طرح جیسے تم نے بتایا تھا۔''

''یہ تو پرانی خبر ہے جان۔''

میں نے کہا۔ ''ابھی...... اس سے بھی نئی ہے تمہارے پاس......''

''ہاں...... گیس کر کے بتاؤ کیا خبر ہوسکتی ہے...... اس وقت تمہارے لیے اس سے زیادہ اہم کوئی خبر نہیں ہوسکتی۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟''

وہ ہنسی۔ ''مجھے فریال نے فون کیا تھا......''

میرے ذہن کو ایک شدید جھٹکا لگا۔ ''فریال نے فون کیا تھا؟ کیوں......؟...... کہاں سے؟''

''کہاں سے کا جواب میں دے سکتی ہوں...... فون نمبر میرے پاس ہے میں نے محفوظ کرلیا تھا......''

میں نے بے چینی سے کہا۔ ''پلیز...... مجھے بتادو...... وہ اپنا پتا ٹھکانا بتائے بغیر مجھ سے ناراض ہو کے چلی گئی ہے۔''

''فون نمبر سے تمہیں کچھ معلوم نہیں ہوگا...... میں نے چیک کیا تھا، وہ کسی پبلک کال آفس کا فون تھا...... مالک نے کہا کہ ہاں ایک برقع پوش عورت آئی تھی ٹیکسی میں......''

''او مائی گاڈ...... یہ فریال کیا کررہی ہے...... خیر تم سے کیا کہا اس نے؟''

''کیا تم اندازہ نہیں کرسکتے......؟ کیا کہہ سکتی ہے وہ مجھے۔''

''میں گیس کرنے کا کھیل کھیلنے کے موڈ میں نہیں ہوں...... نور جہاں......''

وہ بولی...... ''اس نے مجھے گالیاں دیں...... وہی کہا جو اسے کہنا چاہیے تھا، اس کی جگہ میں ہوتی تو میرا بھی ایسا ہی ری ایکشن ہوتا۔''

''تم نے سب سن لیا......'' میں نے کہا۔

وہ بولی۔ ''ہاں...... میں نے اسے دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع دیا۔ ویسے بھی وہ میری وضاحت کہاں قبول کرتی...... اتنا ضرور کہا میں نے کہ فریال...... جو تمہارا ہے، تمہارا ہی رہے گا...... کسی اندیشے میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں...... اس نے کہا کہ تم جیسی عورتیں خود کسی کی نہیں ہوتی۔

جو محبت کرتے ہیں ان سے حسد کرتی ہیں۔ انہیں خوش نہیں دیکھ سکتیں...... بس ایسی ہی باتیں...... اس نے کہا کہ وہ جارہی ہے تمہیں چھوڑ کے...... اب تم عیش کرو...... چھوڑ دو اکبر خان کو تم بھی اور رفیق کے ساتھ جا کے رہو...... جب تک دل چاہے...... دل بھر جائے گا تو تمہارا کیا ہے...... کسی اور کو تلاش کرلو گی......''

''وہ پاگل ہوگئی ہے......''

''ہاں...... اس نے مجھ سے کہا کہ جانتی ہو میں نے اکبر خان کو فون کیوں نہیں کیا...... میرے پاس ثبوت نہیں تھا...... لیکن یہ ہوسکتا تھا کہ وہ تمہیں قتل کردے...... رفیق کا جانی دشمن تو وہ پہلے ہی ہے...... لیکن اس کا رفیق کو بہت دکھ ہوتا اور میں اسے دکھی دیکھنا نہیں چاہتی...... مجھے چھوڑ کے وہ تمہارے عشق میں مبتلا ہوگیا ہے تو یہ میری بدقسمتی......''

''کس وقت فون کیا تھا اس نے......''

''رات دس بجے...... میرے گھر کا نمبر اس نے معلوم کرلیا ہوگا...... اتفاق سے اکبر خاں کے پاس کوئی آیا ہوا تھا...... بلکہ آئی ہوئی تھی...... اس کی کوئی بزنس پارٹنر تھی...... اس کے ساتھ لندن گئی ہے...... میرا خیال ہے اکبر خان نے یہ گفتگو نہیں سنی......''

''ہوسکتا ہے وہ پھر فون کرے......''

''اب کیوں فون کرے گی...... اسے جو کہنا تھا کہہ دیا...... دل کی بھڑاس نکل گئی۔''

میں نے کہا۔ ''وہ فون نمبر مجھے بتادو...... جہاں سے اس نے کال کی تھی۔''

''میں تمہیں ایس ایم ایس کردوں گی...... لیکن تم یہ سوگ مت مناؤ...... ایزی ہو جاؤ...... وہ واپس آجائے گی......''

''یہ تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو......''

''ارے یار ایسے ڈرامے چلتے ہیں...... روٹھنے منانے

کے..... سو اگر تم نہیں رہ سکتے اس کے بغیر..... تو وہ کیسے رہے گی..... مجھے ہر بات معلوم ہوتی ہے نا..... ابھی تم کہہ رہے تھے..... تو سمجھ لو یہ بات بھی کچی ہے..... مجھے معلوم ہے..... اب کوشش کرو اور سو جاؤ اچھے بچوں کی طرح..... اور نیند نہیں آ رہی تو یہاں آ جاؤ میرے پاس..... میں سلا سکتی ہوں تمہیں.....؟"

میں نے کہا۔"نور جہاں..... میرا دماغ بہت بے سکون ہے۔"

"تمہیں سکون بھی دے سکتی ہوں میں..... کبھی دوا سمجھ کے ہی مجھے آزما لو....."

میں نے فون بند کر دیا راجا نے کافی لا کے میرے سامنے رکھ دی..... نور جہاں کی بات سن کے اس نے تائید میں سرہلایا۔"نور جہاں کا خیال غلط نہیں ہے..... فریال آجائے گی....."

میں نے آہ بھری۔"کاش ایسا ہو جائے..... لیکن راجا..... نور جہاں جانتی نہیں فریال کو....."

صبح دیر تک سونے کے باوجود میں اٹھا تو کسلمندی سے میرا جسم ٹوٹ رہا تھا..... زندگی کو حرکت اور توانائی دینے والا جذبہ کہیں گم ہو گیا تھا..... احساس میں ایک خلا سا باقی رہ گیا تھا..... مجھے لگتا تھا کہ یہی کیفیت رہی تو میں اور میرے ساتھ باقی لوگ بھی ڈیپریشن کے مریض بن جائیں گے..... غسل کے بعد میں نے کچھ بہتری محسوس کیا..... ایک کمرے میں اعلیٰ سطحی اجلاس جاری تھی جس میں اماں ابا کے ساتھ رابعہ اور لیلیٰ بھابی بھی شریک تھیں۔

میں نے باہر برآمدے میں بیٹھ کے ناشتا کیا..... پھر راجا اٹھا اور میرے پاس آ کے بیٹھ گیا..... اسی وقت گیٹ کے اندر ڈیوٹی دینے والے سنتری نے قریب آ کے سلیوٹ جھاڑا..... "سر..... کوئی مرد اور عورت آپ سے ملنا چاہتے ہیں....."

میں نے کہا۔"تم جانتے ہو انہیں؟"

"جی سر..... قریبی گاؤں کے رہنے والے ہیں..... ایک بار پہلے بھی آئے تھے..... عورت کہتی ہے کہ آپ کے سوا کسی سے بات نہیں کرے گی۔"

میں نے کہا"اچھا آنے دو....."

جب وہ قریب آئے تو میں نے انہیں پہچان لیا۔ یہی عورت ایک بار ہمارا پیغام شہناز تک پہنچا چکی تھی اور پھر اس کا جواب بھی لائی تھی..... وہ ایک لالچی عورت تھی..... اس کا دعویٰ تھا کہ وہ رانا کی حویلی کے اندر تک رسائی رکھتی ہے۔

عورت نے قریب آ کے کہا۔"مجھے رانی بی بی نے بھیجا ہے سرکار۔"

"کون رانی بی بی۔"میں نے کہا۔

وہ بولی۔"اپنے رانا صاحب کی چھوٹی بیٹی جو ولایت سے آئی ہے۔"

"اچھا..... گل رعنا نے..... کہو کیا بات ہے....."میں نے پوچھا۔

اس نے قمیص کے گریبان میں ہاتھ ڈال کے ایک کاغذ کا پرزہ برآمد کیا جو پسینے کی نمی سے گیلا ہو رہا تھا۔

راجا نے پوچھا۔"تمہیں ڈاکٹر شہناز کی کچھ خبر ہے؟"

اس نے نفی میں سرہلایا۔"وہ تو اب اندر رہتی ہیں سرکار..... بڑی بیگم کے ساتھ....."

میں نے کاغذ کو کھولا تو اس پر انگریزی میں لکھا ہوا تھا۔"آج بعد دوپہر رہتاس کے قلعے میں..... جی آر"..... وہ پرچا میں نے راجا کی طرف بڑھا دیا۔ فرط اشتیاق سے اس کا چہرہ روشن ہو گیا..... وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے اشارے سے منع کر دیا اور پھر انگریزی میں کہا۔"انہیں جانے دو۔"

عورت عجیب نظروں سے راجا کی اور میری طرف دیکھ رہی تھی..... میں سمجھ گیا کہ وہ انعام کے لالچ میں وہاں کھڑی ہے..... وہ رانا کی حویلی کے اندر پیغام رسانی کا وسیلہ تھی..... اس میں اگر کوئی رسک تھا تو اس کے لیے..... میں نے اندر سے اس کو پانچ سو روپے لا کے دیے..... اس کا شوہر پہلے کی طرح بچے کو اٹھائے جپ کھڑا رہا تھا..... نوٹ پل بھر کے لیے اس کے ہاتھوں میں گیا..... پھر اس کی بیوی نے اچک لیا..... اس کا شوہر چلنے لگا مگر وہ کھڑی رہی۔

میں نے کہا۔"اب کیوں کھڑی ہو..... جاؤ....."

اس نے راجا کی طرف دیکھا۔"سرکار آپ کچھ نہیں دیں گے۔"

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی راجا نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور اسے مزید پانچ سو بخش دیے..... "اگر تم مجھے ڈاکٹر شہناز کی خبر لاؤ کے اور یا اس کا پیغام لاؤ تو اور انعام ملے گا....."

"میں کوشش کروں گی سرکار لیکن وعدہ نہیں کر سکتی..... مجھے اندر جانے کی اجازت نہیں ہے....." وہ بولی۔"راجا صاحب کو شک ہو گیا تو مجھے مار ڈالیں گے۔"

جب وہ چلی گئی تو میں نے کہا۔"گل رعنا نے رہتاس کے قلعے میں کیوں بلایا ہے آخر....."

"کیونکہ وہ یہاں نہیں آ سکتی تھی..... ضرور کوئی خاص بات ہو گی....."راجا کا چہرہ پُرامید ہو گیا۔

رہتاس کا قلعہ بہت وسیع رقبے میں پھیلے ہوئے کھنڈرات کا مجموعہ تھا لیکن زیادہ تر سیاح اس فصیل تک محدود رہتے تھے جس کے سامنے ایک اجاڑ باغیچہ تھا اور دو تین چائے اور کولڈ ڈرنکس کے کیبن..... ان کے پیچھے جو بلند عمارت باقی تھی وہ سیاحوں کے لیے بند تھی..... وہاں کچھ مرمت اور بحالی کا کام چل رہا تھا۔ فصیل پر چڑھنے اترنے کے شکستہ زینے تھے اور ان میں بنے ہوئے موکھلوں یا سوراخوں سے باہر کا سارا منظر دکھائی دیتا تھا..... یہ موکھلے مختلف سائز کے تھے اور انہی سے دشمنوں پر گولہ باری کی جاتی یا تیر برسائے جاتے تھے..... فصیل کے عین پیچھے گہری کھائی تھی جو محصور کرنے والے غنیم کی پیش قدمی روکنے میں مددگار ثابت ہوتی تھی..... اس کھائی یا خندق سے گزر کر آگے بڑھنے والے پر اوپر سے پتھر برسائے جاتے تھے..... وہ ایسی ہی جنگوں کا دور تھا۔

اس فصیل کے نچلے حصے میں محکمہ سیاحت اور آثار قدیمہ والے اپنی دکان ڈالے بیٹھے تھے۔ ایک عورت جس کا تعلق مقامی آبادی سے تھا چھوٹے موٹے کتابچے لیے بیٹھی رہتی اور پوچھنے پر سیاحوں کو تھوڑی بہت تاریخی معلومات بھی فراہم کر دیتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ گل اسی جگہ ملے گی۔

ہم ساڑھے بارہ بجے ہی رہتاس کے قلعے میں داخل ہو کے اپنی کار کو دوسری گاڑیوں کے ساتھ پارک کر چکے تھے..... اتوار کی وجہ سے وہاں کافی رونق نظر آ رہی تھی..... ایک بس کسی اسکول کی تھی جس میں بچے بھر کے لائے گئے تھے دوسری کسی ویمن کالج کی تھی..... اس میں آنے والی لڑکیوں نے کھنڈرات کی ویرانی میں ہر طرف رنگ بکھیر دیے تھے۔

مجھے معلوم تھا کہ گل نے اس علاقے کے تاریخی مقامات کو اپنے پیپر کا موضوع بنایا ہے۔ اس کے یہاں آنے پر کوئی پابندی نہ تھی اور نہ کسی کو شک ہو سکتا تھا کہ یہاں وہ ہم سے رابطہ کرے گی..... وہ بے حد ذہین اور سمجھدار لڑکی تھی..... رانا کی حویلی میں پہنچے اسے دو دن بھی نہیں ہوئے تھے کہ وہ پھر ملنے آ رہی تھی..... یقیناً اس کے پاس کوئی ایسی بات تھی جس کا تعلق شہناز سے تھا اور جو صرف ہمیں بتائی جا سکتی تھی۔

راجہ کا اشتیاق، اضطراب فطری تھا۔ وہ کئی بار اس خیال کا اظہار کر چکا تھا کہ ضرور کوئی خاص بات ہو گی ورنہ گل ایسی رازداری سے نہ ملتی۔ وہ گل کے بارے میں بہت اچھے خیالات رکھتا تھا۔

"یہ تو رانا کی بیٹی مگر کتنی مختلف ہے۔ یہ ضرور کچھ کرے گی..... مجھے تو بہت امید ہو گئی ہے۔"

میں راجا کی حوصلہ شکنی نہیں چاہتا تھا چنانچہ صرف سنتا رہا اور تائید کرتا رہا۔ مجھے لگتا تھا کہ راجا نے گل سے بہت زیادہ توقعات وابستہ کر لی ہیں..... کہیں ایسا نہ ہو کہ مایوسی کا ردعمل ناامیدی کا وہ سیلاب لائے جو اس کے صبر و ضبط کو بہا لے جائے۔

ہم عام لوگوں کی طرح بظاہر تاریخی کھنڈر دیکھ رہے تھے لیکن ہماری نظر گل کی تلاش میں سرگرداں تھی..... اس نے اچانک ایک شکستہ دیوار کی اوٹ سے آواز دے کر ہمیں روک لیا..... وہ نہ جانے کب سے اس ویران گوشے میں کھڑی تھی جہاں کوئی سیاح جانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔

اسے دیکھ کر میں خاصا حیران ہوا۔ رانا کی بیٹی نے اس علاقے کی روایات اور خاندانی طور طریقوں کو نظر انداز کرتے ہوئے ولایتی لباس پہن رکھا تھا..... جینز اور جوگرز..... سیاہ چشمہ اور ڈھیلی ڈھالی کھدر کی لمبی سی شرٹ..... اس میں کوئی شک نہیں کہ یہاں غیر ملکی سیاح بھی آتے تھے جو عموماً ایسے ہی حلیے میں ہوتے تھے۔

گل نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔"میں سوچ رہی تھی کہ پتا نہیں تمہیں پیغام ملے گا یا نہیں..... میں نے اس عورت کو ایک ہزار روپے دیے تھے۔"

میں نے کہا۔"ایک ہزار وہ ہم سے بھی لے گئی..... مجھے بتاؤ تمہارا استقبال وہاں کیسا ہوا۔"

"پہلے بتاؤ شہناز کیسی ہے۔"راجا بولا۔

"بتاتی ہوں..... سب بتاتی ہوں..... کیا حرج ہے اگر ہم یہاں بیٹھ جائیں..... دراصل یہاں میں اکیلی نہیں آ سکتی تھی..... تاریخ پر ریسرچ کے لیے بھی..... پاپا نے کہا کہ غیر ملکیوں کا خصوصاً نوجوان لڑکیوں کا اکیلے پھرنا غیر محفوظ ہے..... انہوں نے گاڑی کے ساتھ ڈرائیور کر دیا..... مقصد مجھ پر نظر رکھنا تھا..... وہ پاپا کا نمک کھاتا ہے لیکن میں نے اسے اپنے ساتھ ملا لیا۔"

میں نے کہا..... "یہ تمہاری غلط فہمی ہو سکتی ہے۔ رانا کے نمک خوار آسانی سے اپنی وفاداری نہیں بدلتے۔"

"مجھے معلوم ہے..... میں نے اسے کچھ لالچ دیا..... پانچ ہزار لیتے ہوئے وہ تذبذب کا شکار تھا..... اس کی آنکھوں میں لالچ کی چمک تھی مگر وہ خوف زدہ بھی تھا..... میں نے دھمکی کا حربہ بھی استعمال کیا..... کہا کہ اگر اس نے میری بات

نہ مانی تو واپسی پر میں پاپا سے اس کی شکایت کروں گی کہ اس نے مجھ سے دست درازی کی کوشش کی تھی......اس کا تو حال برا ہوگیا......ہاتھ جوڑ کے گھگیانے لگا کہ بی بی جی......خدا کے لیے ایسا مت کرنا......آپ کے جھوٹ پر بھی رانا صاحب مجھے مروا دیں گے......میری کون مانے گا......بس اس کے بعد وہ قابو آگیا......اس نے پانچ ہزار ہی رکھ لیے......وہ گاڑی میں ہے اور دوسری طرف دیکھ رہا ہے......میں نے کہا تھا کہ خبردار جو ادھر نظر اٹھائی......" وہ ہنسی۔

راجا نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ "شہناز ٹھیک ہے نا؟"

گل نے بیگ میں سے کولڈ ڈرنک کے ٹن نکال کے ہمیں تھمائے "ہاں ویسے تو ٹھیک ہے......جب میں پہنچی تو رانا صاحب کی جان میں جان آئی......اس کی تو عزت پر بن گئی تھی......دھمکی ضرور دی تھی اس نے لیکن میں بھی اڑ جاتی تو اسے آنا پڑتا......اس نے خدا کا شکر ادا کیا اور مجھے گلے لگالیا۔"

راجا کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا۔ "آخر تم شہناز کی بات کیوں نہیں کرتیں......اب کیا صورت حال ہے۔"

گل نے ایک گھونٹ لیا۔ "آئی ایم سوری راجا......تمہارے لیے میرے پاس کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔"

"کیا ہوا شہناز کو......" راجا چلایا۔

"اسے کچھ نہیں ہوا ہے راجا......وہ بالکل صحت مند اور خوش و خرم ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ اطلاع تمہیں کیسے دوں......میں نے شہناز کی محبت میں تمہاری دیوانگی اور بے قراری دیکھی ہے......" وہ پھر گھونٹ لینے رکی۔

"تم بتاتی کیوں نہیں آخر......راجا نے برہمی سے کہا۔

"آئی ایم سوری راجا......لیکن تمہیں اس خیال کو دل سے نکال دینا چاہیے کہ شہناز بھی تم سے اتنی ہی محبت کرتی ہے......حقیقت یہ ہے کہ اسے تمہارا ذرا بھی خیال نہیں......وہ وہاں بہت خوش ہے۔"

راجا نے میری طرف دیکھ کے کہا۔ "یہ لڑکی پاگل ہے۔"

گل نے اپنی بات جاری رکھی۔ "مجھے تم کچھ بھی کہو......میں برا نہیں مانوں گی......تم کو صدمہ ہوا ہے میری بات سے......تم کو یقین نہیں آیا......لیکن میں تصدیق کرچکی ہوں کہ شہناز اب لوٹ کے تمہارے پاس آنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی۔"

راجا کا پارا چڑھ گیا۔ "کیا مطلب ہے آخر اس فضول بات کا......کیا وہ رانا صاحب کی تیسری بیوی بننے کا اعزاز حاصل کرنا چاہتی ہے......اور اس پر خوش بھی ہے......ہم یہ فضول بکواس سننے کے لیے نہیں آئے تھے۔"

گل کا لہجہ اور رویہ سرد رہا۔ "مسٹر راجا......تین بیویاں تو پہلے ہی ہیں......دو یہاں......ایک انگلینڈ میں......وہ چوتھی بن سکتی ہے......اور شاید بن جائے گی......"

میں نے کہا۔ "مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی گل......کیا مقصد ہے آخر تمہارا......تم رانا صاحب کی طرف سے یہ پیغام لائی ہو......ہمیں بے عزت کرنے کے لیے؟ ہمارا حوصلہ پست کرنے کے لیے......؟ ہمارا مورال ڈاؤن کرنے کے لیے......"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "حقیقت کو تسلیم نہ کرنے سے حقیقت نہیں بدلتی......میں اپنے پاپا کی بیٹی بن کے ان کے دشمنوں سے بات کرنے نہیں آئی تھی......مجھے تم سے واقعی ہمدردی ہوگئی تھی مگر میں نے وہاں جا کے دیکھا تو ایک مہینے میں حالات بہت بدل چکے تھے۔"

"اس سے گھٹیا جھوٹ میں نے آج تک نہیں سنا۔" راجا بولا۔

اس نے کہا۔ "سچ بالآخر تمہارے سامنے آئے گا لیکن تم اپنے طور پر تصدیق کرنا چاہو تو کرسکتے ہو۔"

"وہ کیسے؟ کیا میں شہناز سے پوچھوں؟" راجا نے تلخی سے کہا۔

گل نے چند سیکنڈ سوچا۔ "میرا خیال ہے......میں پاپا کو قائل کرسکتی ہوں کہ وہ تمہاری میٹنگ کروادیں......شہناز کے ساتھ......کم سے کم ایک معاملہ تو طے ہوجائے گا۔"

میں نے کہا "یہ ضرور کوئی سازش ہے۔"

راجا نے کہا۔ "تمہارا باپ میرے ہاتھوں مارا جائے گا......وہ کیا سمجھتا ہے کہ اس کی بدمعاشی اس طرح چلتی رہے گی......اس نے سب کے سامنے شہناز کو اغوا کیا تھا۔"

"خود رانا صاحب نے؟" گل نے سکون سے کہا "تم نے دیکھا یا گواہ ہیں جو کہتے ہیں کہ خود رانا صاحب اغوا کرنے والوں کے ساتھ تھے۔"

میں نے کہا۔ "مس گل......جو حقیقت ہے وہ سب جانتے ہیں......شہناز کو کس نے اغوا کروایا تھا اور وہ کس کے آدمی تھے۔"

"لیکن تم ثابت نہیں کرسکے......پولیس بھی لے کر گئے تھے۔"

میں نے کہا۔ "کیا اب بھی کسی ثبوت کی ضرورت ہے......ہمیں پہلے سے معلوم تھا کہ شہناز حویلی میں ہے۔"

"ہاں وہ حویلی میں ہے......لیکن اپنی مرضی سے۔"

"یہ اتنا ہی ناممکن ہے جتنا سورج کا مغرب سے نکلنا......" میں نے کہا۔

"نواب صاحب......آپ کا علم اور تجربہ یقیناً مجھ سے زیادہ ہے......اس کے باوجود مجھے کہنا پڑے گا کہ آپ آج کی دنیا کے حقائق سے نظر چراتے ہیں۔ ایک خیال پرست انسان میں......ناممکن کچھ نہیں ہوتا......انسان کو خریدا اور بیچا جاسکتا ہے......اس کی وفاداری......ایمان......ضمیر......سب کی ایک قیمت ہوتی ہے۔"

"تم جس دنیا سے آئی ہو......وہاں ایسا ہوگا......" راجا بولا۔

وہ ہنسی......"تمہاری دنیا میں اب سقراط یا حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نہیں ہوتے راجا صاحب......شہناز یہاں تمہارے ساتھ کیوں آئی تھی......؟ وہ یہاں ایک اسپتال بنانا چاہتی ہیں جہاں غریبوں کا مفت علاج ہو......رانا صاحب نے کہا کہ اسپتال میں بنوا کے دیتا ہوں......جتنا بڑا تم کہو......میں اس علاقے کے عوام کا نمائندہ ہوں اور خود بھی جدی پشتی رئیس ہوں......میرے پاس وسائل ہیں......لیکن یہاں کیا فائدہ......اپنا وقت اور انرجی ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے......لعنت بھیجو خدمت خلق پر......ثواب نہیں پیسا کماؤ......پھر پیسے سے ثواب کے سارے کام کرو......"

راجا نے تلخ لہجے میں کہا "اور شہناز مان گئی......"

"ہاں......وہ مان گئی......رانا صاحب اسے شہر میں اسپتال بنوا کے دیں گے۔ ان کی وہ کوٹھی جہاں سے تم نے مجھے اغوا کیا تھا......شہناز کے نام کردی جائے گی......وہ وہیں رہے گی......وہیں یہ اسپتال بھی ہوگا......تم نے دیکھا ہوگا، وہ چار کنال کی کوٹھی ہے......اس کی دوسری منزل موجود ہے......تیسری بنوائی جائے گی......وہ سو بیڈ کا اسپتال ہوگا......اس کی مالک شہناز ہوگی......اور یہ سب اسے بہت آسانی سے مل جائے گا۔

رانا صاحب نے تو کہا ہے کہ اگلی مرتبہ وہ اسے خواتین کی مخصوص سیٹ پر سینٹ میں بھی پہنچا سکتے ہیں......عزت، شہرت، دولت......اسے سب مل جائے گا......پھر رانا صاحب کی چوتھی بیوی بننا اس کے لیے کون سا گھاٹے کا سودا ہے......اچھا......اب میں چلتی ہوں......مجھے افسوس ہے کہ تمہیں اذیت ہوئی......لیکن آدمی ہر صدمہ برداشت کرسکتا ہے......بالآخر۔"

وہ ہماری نظروں کے سامنے نپے تلے قدم اٹھاتی اپنی گاڑی کی طرف چلی گئی......ہم نے گاڑی کو پارکنگ ایریا میں کھڑی گاڑیوں کی قطار سے نکل کے باہر جانے والی سڑک پر غائب ہوتے دیکھا اور چپ بیٹھے رہے۔

بالآخر راجا نے قہقہہ لگا کے کہا۔ "چل یار......خوامخواہ وقت برباد کیا یہاں آکے......سالی رانا کی ناجائز اولاد......ہمیں چکر دینے آئی تھی......"

راجا کا قہقہہ کھوکھلا تھا......اس میں اپنی شکست کی صدائے بازگشت تھی......یہ خود فریبی کی آرزو تھی جو ہنسی بن گئی تھی مگر اس ہنسی میں درد کی پکار تھی......فریاد کی لے تھی......جسے میرا ذہن انتہائی کوشش کے باوجود یہ تسلیم کرنے پر تیار نہ تھا کہ گل نے جو کہا سب جھوٹ تھا......جھوٹ ایک کنکر ہوسکتا ہے......پتھر یا چٹان جیسا ہوسکتا ہے لیکن جھوٹ کا سہارا کون ہوسکتا ہے۔

نہ گل پاگل تھی اور نہ نشے میں......اس نے تو خود ہی پیشکش کردی تھی کہ ہم چاہیں تو شہناز سے مل کے تصدیق کرلیں......میرا عقیدہ متزلزل ہو رہا تھا کہ شہناز کی وفا کی شکست ناممکن تھی......شاید بعض اوقات ناممکن کو ممکن سمجھنا ہماری اپنی مجبوری یا کمزوری ہوتی ہے ورنہ ناممکن کچھ نہیں ہوتا۔

راجا خود فریبی کے حصار سے باہر آنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ اس کا ذہن کسی دلیل کا سہارا لینے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا تھا......چنانچہ اس نے گل کو پاگل اور اس کی بات کو جھوٹ اور بکواس قرار دے کر سکون حاصل کرلیا تھا مگر میں اندر سے خوف زدہ ہوگیا تھا کہ اگر یہ سچ ہوا پھر......

واپسی کا سفر آدھے گھنٹے سے زیادہ کا نہیں تھا......راجا تمام راستہ گل کو گالیاں دیتا رہا اور اس کی باتوں کی دیوانگی قرار دے کر ہنستا رہا۔ مجھ میں ہمت نہ تھی کہ میں اس کی تردید کرتا یا اسے سمجھانے کی کوشش کرتا۔

اس نے مجھ سے کہا۔ "یار کسی کو بتانے کی ضرورت نہیں......ہم کہاں گئے تھے اور کیوں......"

میں نے کہا۔ "یہ چھپانے سے کیا ہوگا۔"

"ایسے ہی سب کے ہاتھ ایک موضوع آجائے گا......سب اپنی اپنی عقل کے گھوڑے دوڑانے لگیں گے......دشت ظلمات میں۔" وہ ہنسا۔

میں خاموش ہوگیا......راجہ کا معاملہ براہ راست تھا......وہ اس حادثے کی سنگینی پر غور کرنے کے لیے بھی راضی نہ تھا......اس عورت کی طرح جو اپنے اکلوتے بیٹے کی موت پر رونے کے لیے تیار نہ تھی اور اس بات پر قائم تھی کہ وہ مرا نہیں

سو رہا ہے..... کوئی دلیل اس کے یقین میں رخنہ نہیں ڈال سکتی تھی۔

مجھے ڈر لگ رہا تھا..... شاید کھیل ختم ہوگیا تھا..... دوسری جنگ عظیم میں جاپان پر یکے بعد دیگرے دو ایٹم بم گرائے گئے تھے اور جاپان ہار گیا تھا..... ہمارے ساتھ دو دن میں ایسے دو حادثات پیش آئے تھے..... پہلے فریال مجھے چھوڑ گئی تھی..... آج شہناز کے ساتھ چھوڑنے کی خبر ملی تھی..... اور ہم ہار چکے تھے اب اس جنگ کو جاری نہیں رکھا جاسکتا تھا جو ہم نے بڑے جوش اور جذبے سے شروع کی تھی..... خدمت خلق..... انسانی فلاح و بہبود..... کار ثواب..... جو ست بدھائی کے ترقیاتی منصوبوں کی بنیاد تھے..... دیوانے کا خواب ثابت ہوئے تھے۔

مجھے اب یہ فکر لاحق تھی کہ جذباتی خلفشار میں مبتلا راجا کوئی الٹی سیدھی حرکت نہ کر بیٹھے..... اندرونی چوٹ کا اثر دیر میں ہو مگر ہوتا ہے..... وہ خودکشی کرنے والوں میں سے نہیں تھا لیکن یہ ہوسکتا تھا کہ وہ پھر شراب میں خود کو غرق کردے..... احساس کی اذیت ہوش میں رہتی ہے..... خود فراموشی اور بے ہوشی میں نہیں..... یہ ہوسکتا تھا کہ وہ اچانک شہناز سے ملنے نکل جائے اور دیوانہ وار اس حویلی میں گھسنے کی کوشش کرے جس میں شہناز بند تھی۔

لیکن وہ نارمل رہا..... اس نے کھانا کھایا اور پھر سوگیا..... میں باہر ٹہلتا رہا..... حویلی کے در و دیوار پر ایک آسیب خاموشی طاری تھی..... وہ رونق اور گہما گہمی جو آغاز سفر میں تھی..... وہ قربت اور یگانگت جس نے ہم سب کو اکٹھا کیا تھا اور ایک مقصد سے جوڑے رکھا تھا..... کچھ کر دکھانے کی لگن..... وہ جذبہ اور وہ جنون جو سب کو متحرک اور فعال رکھتا تھا..... اسے کسی کی نظر لگ گئی تھی..... دیکھتے دیکھتے سب ختم ہوگیا تھا..... نہ وہ لوگ رہے تھے نہ ان کی خواہشات کے خزانے..... امیدوں کے سرمائے اور یقین کے ختم نہ ہونے والے خزینے..... سب ختم ہوگئے تھے۔

اچانک میں نے لیلیٰ بھابی کو اپنی طرف آتے دیکھا..... میں نے سوچا کہ کیا انہیں سب بتادوں..... وہ سب جو مجھے بہت پہلے سے معلوم تھا..... حالات پہلے جیسے نہیں رہے تھے..... ست بدھائی سے میرا دل اچاٹ ہوگیا تھا..... میں خود اسے چھوڑ دینا چاہتا تھا..... کیا ضرورت ہے لیلیٰ بھابی کو اپنے شوہر کے ہاتھوں بلیک میل ہونے کی..... اس کی سازش بھی شریک ہونے کی..... میں ویسے ہی نصف کا مالک رابعہ کو بنانے کا سوچ رہا ہوں..... باقی نصف بیچ کے میں واپس چلا جاؤں گا..... آگے رابعہ جو چاہے کرے..... مجھے نہ اکبر خاں سے واسطہ رکھنا تھا نہ رانا سے..... بھاڑ میں جائیں سب۔

لیکن لیلیٰ بھابی کو یہ سب بتانے کا بھی کوئی فائدہ نہیں..... جو ہوگا سامنے آجائے گا..... جب مقابلے پر کوئی نہیں ہوگا تو جنگ خود ہی ختم ہوجائے گی..... مزاحمت میری طرف سے تھی..... میرے جانے کے بعد تمام فریق راضی خوشی رہ سکتے ہیں..... ان کے درمیان باہمی مفادات کا پرانا معاہدہ چل سکتا ہے۔

لیلیٰ بھابی نے کہا۔ ''رفیق بھائی..... کیا سوچ رہے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''سوچنے کے لیے اب کیا رہ گیا ہے۔''

''فریال کی کوئی خیر خبر نہیں۔''

''خیر خبر کہاں سے ملے گی..... آپ نے بھی اسے جانے دیا۔''

لیلیٰ بھابی نے سر جھکالیا۔ ''مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ تمہیں اس کے کسی ٹھکانے کا علم نہیں..... اس کے کسی عزیز رشتے دار یا جاننے والا کا پتا نہیں..... میرا خیال تھا کہ تم پریشان ہوکے دوڑ بھاگ کرو گے تو اسے ڈھونڈ لاؤ گے۔''

میں نے کہا۔ ''وہ صرف آپ کو اپنا ہمدرد سمجھتی تھی۔''

''لیکن میں..... میں نے تو یہاں رہنے کا فیصلہ کرلیا ہے..... میں لوٹ کر اپنے گھر میں جانا نہیں چاہتی۔''

میں نے کہا۔ ''اس فیصلے کی میں تائید نہیں کرسکتا..... کیونکہ شاید میں خود یہاں سے چلا جاؤں..... اپنے والدین کے ساتھ لندن..... پھر کون ہوگا یہاں.....''

ان کے چہرے پر مایوسی آگئی ''تمہارے تو بڑے پروگرام تھے۔''

''کوئی فائدہ نہیں بھابی..... اتنا عرصہ کوشش کی..... صرف دشمنوں کی تعداد میں اضافہ ہوا..... مشکلات بڑھ گئیں..... آپ بھی اپنا گھر نہ چھوڑیں..... جو کچھ فاروقی نے کیا اس کی غلطی تھی..... اب بات ختم ہوگئی۔''

''وہ بھی مجھ سے بدظن ہیں۔''

میں نے کہا'' کچھ عرصے میں سب ٹھیک ہوجائے گا..... ایک بات اور بتادوں..... مریم کو کسی نے زہر نہیں دیا تھا۔''

''فاروقی کہتے ہیں۔''

''میں نے اسپتال والوں سے پوچھا تھا..... اس ڈاکٹر

[ے] بات کی تھی..... ان کا کہنا تھا کہ کسی نے زہر کی بات نہیں [کی]..... زہر کا شک ہوتا تو وہ ضرور بتاتے۔''

''وہ تو فاروقی نے معاملہ ختم کردیا۔''

''غلط ہے..... ڈاکٹر اور اسپتال والے کہتے ہیں کہ [ا]تنا کوئی مول نہیں لے سکتا..... کل کو لڑکی کے گھر والے [یا] خطرہ کیس بنادیں..... شوہر کے خلاف..... اور دوبارہ [قت]ل کا [پوس]ٹ مارٹم کے لیے عدالت میں چلے جائیں تو شوہر کے [س]اتھ باقی لوگ بھی پھنس جائیں گے..... ڈاکٹر کو بھی شریک [جر]م قرار دیا جاسکتا ہے..... اسپتال والوں پر الزام آسکتا ہے؟''

''پھر وہ..... مری کیسے؟'' لیلیٰ بھابی نے نروس ہو کے کہا۔

''وہ حادثاتی موت تھی..... اور کچھ نہیں..... آپ کسی [دب]اؤ میں نہ آئیں۔ فاروقی محض آپ کو دہشت زدہ کرنے کے لیے ایسا کہتا ہے..... آپ ڈٹ جائیں کہ میں نے کسی کو زہر نہیں دیا جس کو شوق ہے وہ پھر پوسٹ مارٹم کرالے..... دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوجائے گا..... آپ [د]یکھیے گا پھر کیا ہوتا ہے۔''

''میں ایسا نہیں کرسکتی۔''

''کیوں؟..... کس بات کا ڈر ہے آپ کو!..... میری [ما]نیں تو ایک بار اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بات [ک]ریں..... بلکہ اسے بتادیں کہ میں نے خود اسپتال والوں [س]ے معلوم کیا ہے۔''

''میرا جھوٹ پکڑا جائے گا۔''

میں نے کہا۔ ''آپ کا نہیں فاروقی کا جھوٹ پکڑا جائے [گ]ا..... آپ نے ہمت نہ کی تو وہ ہمیشہ آپ کو دبائے گا..... [آپ] سے ہر ناجائز بات منوالے گا۔''

وہ چونکی۔ ''کیا تم سمجھتے ہو تمہارا دوست ایسا کرسکتا ہے؟ [او]ر مجھے بلیک میل بھی کرسکتا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''میں کسی کے دل کا حال کیا جانوں..... میں صرف ایک امکان کی بات کررہا تھا۔''

لیلیٰ بھابی کی آنکھوں میں سخت الجھن نظر آرہی تھی..... وہ فیصلے کرنے سے قاصر تھیں کہ آخر میری اس بات کے پیچھے کیا ہے..... وہ کچھ دیر بیٹھی اماں ابا کی بات کرتی رہی کہ اس صورت حال سے وہ کتنے دکھی اور مایوس ہیں لیکن انہوں نے اب خود کو تقدیر کے لکھے پر قانع کرلیا ہے کہ ان کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوگا..... شاید قدرت کو ہی منظور نہیں کہ اپنی زندگی میں وہ پوتے پوتیوں کی خوشی دیکھ سکیں..... پھر راجا کو آتے دیکھا تو وہ اٹھ گئیں۔

اس سے پہلے کہ میں راجا سے غیر یقینی مستقبل کے معاملے پر بات کرتا..... باہر والے گارڈ نے اندر والے سے کچھ کہا..... وہ ہماری طرف بڑھا اور سیلوٹ کر کے بولا۔ ''سر..... رانا صاحب کا منشی آیا ہے۔''

''رانا کا منشی؟'' میں نے چونک کے کہا۔ ''کیا چاہتا ہے۔''

''آپ کے چٹھی لایا ہے..... کہتا ہے آپ کو دے گا۔''

میں نے کہا..... ''اس کی اچھی طرح تلاشی لینے کے بعد آنے دو.....''

منشی سے میں واقف تھا..... آس پاس کے علاقے میں اس کی بڑی دہشت تھا..... لوگ اس سے ڈرتے تھے کہ وہ رانا کا خاص آدمی تھا..... وہ تاڑ کی طرح سیدھا اور لمبا تھا..... اس کے چہرے پر بدمعاشی کی چھاپ تھی اور ایک بے رحم کرختگی..... وہ نوکیلی مونچھوں کو ہر وقت تاؤ دیتا رہتا تھا لیکن صرف انہی کے سامنے جن کو وہ مرعوب کرنا ہو کے۔

میرے سامنے آکے اس نے یہی حرکت کی تو میں نے گرج کے کہا۔ ''میرے سامنے مونچھ اونچی کرتے ہو..... ابھی جوتے مار کے حویلی سے نکال دوں گا..... منہ کالا کر کے بھیجوں گا واپس رانا صاحب کے پاس.....''

وہ ڈر گیا، اس نے کہا ''غلطی ہوگئی جناب.....''

''سلام نہیں کیا تم نے..... یہ دوسری غلطی ہے۔''

اس نے مجبوراً ہاتھ اٹھا کے سلام کیا اور پھر ایک لفافہ آگے بڑھا دیا۔ ''یہ ہم کو رانی بی بی نے دیا ہے۔''

راجا نے لفافہ میرے ہاتھ سے لے لیا۔ ''یہ گل نے بھیجا ہے۔'' اور اندر سے کاغذ نکال لیا۔

''کیا لکھا ہے۔'' میں نے کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد کہا۔

راجا نے کاغذ میری طرف بڑھا دیا..... اس پر صرف ایک جملہ لکھا ہوا تھا کہ آج شام کو چائے میرے ساتھ پی لیں..... گل رعنا۔

میں نے منشی کو کہا ''ٹھیک ہے تم جاؤ۔''

''رانی بی بی نے کہا تھا جواب لانا ہے۔'' وہ کھڑا رہا۔

میں نے راجا کی طرف دیکھا اور فیصلہ کرلیا۔ ''گل سے کہنا ہم آئیں گے۔''

منشی کے لبوں پر ایک معنی خیز مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ پلٹ کر جانے سے پہلے اس نے سلام کیا لیکن گیٹ کے قریب جا کے اس نے اپنی بے عزتی کا تھوڑا سا بدلہ یوں لیا

کہ پلٹ کے میری طرف دیکھتے ہوئے مونچھوں کو تاؤ دیا اور دوڑ کے گیٹ سے نکل گیا...... اگر میں چاہتا تو گارڈ سے کہتا کہ اسے پکڑ کے لاؤ اور مرغا بنا کے اسے دو جوتے لگاؤ...... مگر گل کی دعوت قبول کرنے کے بعد میں حالات کو مزید کشیدہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔

ہم کسی کو کچھ بتائے بغیر نکلے...... راجا اب بالکل خاموش تھا...... اس کی حالت اس مجرم جیسی ہو رہی تھی جو بے گناہی کے پورے یقین کے باوجود عدالت سے فیصلہ سننے جا رہا ہو...... ایک ایسا فیصلہ جس میں عدالت اسے بری کرے گی یا سزائے موت سنائے گی۔

میں نے راستے میں کہا۔ ''راجا...... میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔''

اس نے کہا۔ ''آج اجازت لینے کی ضرورت کیوں محسوس ہو رہی ہے مجھے۔''

''دیکھو راجا...... یقین مجھے بھی ہے...... کہ گل نے جو کہا جھوٹ تھا...... لیکن بالفرض محال...... بالفرض محال...... وہ سچ ہو گیا...... پھر......''

وہ خلا میں دیکھتا رہا۔ پھر کہا۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ گل کے منہ سے ایسی بات سن کے میرا دماغ خراب ہو گیا تھا...... لیکن میں بعد میں سوچتا رہا...... واقعی دنیا میں ناممکن کچھ بھی نہیں ہوتا......''

''حقیقت خود اپنا وجود تسلیم کراتی ہے لیکے پتر...... یقین تو مجھے بھی نہیں آتا کہ شہناز بدل سکتی ہے...... لیکن کیا معلوم حویلی میں اس کے ساتھ کیا ہوا...... شاید وہ جو پولیس کی تحویل میں ہوتا ہے بے گناہ وہی کہنے لگتے ہیں جو پولیس کہتی ہے...... شہناز کی مجبوری بھی تو ہو سکتی ہے......''

میں نے کہا۔ ''ہاں...... گل کو ابھی دو دن بھی نہیں ہوئے...... اسے کیا معلوم کہ شہناز کے ساتھ قید میں کیا سلوک ہوا...... یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس نے قربانی دی ہو......''

''خود اپنی قربانی؟''

''قربانی ایسے ہی دی جاتی ہے...... دوسروں کے لیے...... دوسروں کے مفادات کو تحفظ دلانے کے لیے...... اس نے کوئی سمجھوتا کر لیا ہو...... تجھے بچانے کے لیے یا ہم سب کی خاطر......''

راجا چلایا۔ ''بھاڑ میں گیا سمجھوتا...... میں نہیں مانتا ایسے کسی سمجھوتے کو...... کسی قربانی کی ضرورت نہیں ہے مجھے۔''

میں نے ہمت کر کے کہا۔ ''فیصلہ اس کا ہو گا راجا...... تو تیرے لیے قبول کر لینے کے سوا کون سا آپشن ہو گا...... فریال نے میرے ساتھ زیادتی کی...... سوچ اور سمجھ کے مطابق یک طرفہ فیصلہ کر لیا...... کیا کر سکا میں......''

''میں شہناز کو ایسے یک طرفہ فیصلہ کرنے سے روک سکتا ہوں......''

''کیسے؟ اور یہ قربانی یا سمجھوتے والی بات تو ایسے ہی میرے ذہن میں آ گئی...... کوئی ضروری نہیں کہ ایسا ہو......''

وہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ ''ہاں یار...... زبردستی تو نہیں کی جا سکتی محبت میں...... اگر ایک کے جذبات بدل جائیں تو دوسرے کے پاس صبر کے سوا چارہ بھی کیا رہ جاتا ہے۔ تھانے جا کے رپورٹ تو لکھوائی نہیں جا سکتی کہ یہ عورت مجھ سے پیار کرتی تھی...... اب کسی اور سے محبت کرنے لگی ہے...... اسے روکا جائے۔''

''جرم بے وفائی کی سزا اسے ملتی ہے جو یہ جرم نہیں کرتا...... لیکن ہو سکتا ہے راجا یہ ہمارے وسوسے ہوں...... حقیقت کچھ اور ہو......''

راجا خاموش بیٹھا ونڈ اسکرین کے پار دیکھتا رہا اور جانے کن خیالوں میں گم رہا...... یہ تقدیر کا عجیب ستم تھا کہ ایک جیسے حالات میں ایک ساتھ محبت سے محرومی کے عذاب سے گزر رہے تھے اور قصور وار نہ تھے مگر درد فرقت کی سزا کاٹ رہے تھے...... حالات پر ہمارا کوئی کنٹرول نہ تھا۔

ہماری گاڑی ابھی دور تھی کہ ہر طرف سے رانا کے نمک خواروں نے اسے گھیرے میں لے لیا...... موٹر سائیکلوں پر سوار اور مسلح گارڈ ہمارے دائیں بائیں چلنے لگے۔ پھر انہی جیسے دو سوار گھوڑوں پر نمودار ہوئے...... حویلی سے تقریباً ایک فرلانگ کی دوری پر جنگل شروع ہو جاتا تھا اور صرف ہماری آمد پر وہاں اپنی مستعدی کا مظاہرہ کرنے آ جاتے تھے یا پھر اس علاقے میں گشت کرنا ان کا معمول تھا۔

جنگل کو ایک خاص حد تک بالکل صاف کر دیا گیا تھا اور حویلی کے گیٹ کے سامنے کا سارا علاقہ صاف چٹیل میدان تھا...... دیکھنے میں یہ کوئی مختصر سا کچا رن وے یا ہیلی پیڈ لگتا تھا...... میں نے وہاں صرف ایک تبدیلی دیکھی...... حویلی کا صدر دروازہ کسی محل کے انداز میں نیا بنوایا گیا تھا...... اور محرابی پھاٹک پر ''رانا پیلس'' کے الفاظ بہت نمایاں انداز میں چمک رہے تھے...... یہ شیشے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو جوڑ کر بنائے گئے تھے۔

اس حویلی کو جو قدیم و جدید کا بھونڈا امتزاج تھی رانی کہا جاتا تھا...... عام لوگ اسے رانا صاحب کی حویلی کہتے تھے۔ اب شاید ست بڑھائی کے نواب کی تاریخی حویلی کے تکبر اور شہرت نے رانا کو کمپلیکس میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس نے حویلی کو ترقی دے کر محل کر دیا...... صدر دروازہ مکمل ہو گیا لیکن چاروں طرف کی دیوار کو مزید اونچا کر کے اس پر کنگورے بنائے جا رہے تھے اور اسے ٹائلوں سے مزین کیا جا رہا تھا کہ یہ دیکھنے میں بھی محل لگے...... میں رانا کے اس لطیفے پر مسکرائے بنا نہ رہ سکا۔

خلاف معمول آج ماحول سازگار بلکہ کسی حد تک دوستانہ تھا...... بالکل ویسا ہی جیسا ہتھیار ڈالنے کے لیے آنے والے شکست خوردہ جنرل کے لیے فاتح جنرل کا ہوتا ہے...... گیٹ پر متعین گارڈ نے ہمیں سلیوٹ بھی کیا اور ہمیں گاڑی اندر لے جانے کی اجازت بھی دی۔

اس حسن سلوک کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی تھی کہ آج ہم رانا کے نہیں اس کی رانی بیٹی کے مہمان تھے جسے ہم گل کہتے تھے۔ وہ برآمدے سے اتر کے آئی اور ہمیں بڑے تپاک سے مہمان خانے میں لے گئی...... وہاں رانا پہلے سے موجود تھا، اس نے اپنی بیٹی کے سامنے حسن اخلاق اور اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہم سے اٹھ کر مصافحہ کیا اور پھر مجھے اپنے ساتھ بٹھایا۔

اس کے چہرے پر بڑی بشاشت تھی...... ایک فاتحانہ مسکراہٹ جو عاجزی کے پردے میں غرور اور عزت افزائی میں تمسخر کا انداز رکھتی تھی۔

رانا نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ ''آپ کی بڑی مہربانی نواب صاحب کہ آپ نے ہماری رانی بیٹی کی دعوت قبول کی......''

''میں چاہتی تھی کہ جس حد تک ممکن ہو...... آپ لوگوں کے درمیان بڑی بدگمانیاں دور ہو جائیں۔''

میں نے کہا۔ ''گل صرف تمہارے چاہنے سے کیا ہو گا۔''

''او جی جی...... ہم بھی چاہتے ہیں ایسا ہی......'' رانا نے کہا۔

''یہ بھی الفاظ سے زیادہ اعمال پر منحصر ہے......'' راجا بولا۔

''دیکھو جی...... پہلے بہت کچھ ہوا...... جو نہ ہوتا تو اچھا تھا اور اس کی ابتدا بھی آپ نے کی...... کا سو ہمارا ملزم تھا آپ نے بغاوت پر اکسایا اور اغوا کر لیا...... حویلی سے نکال کر لے گئے......''

میں نے کہا۔ ''ہم آج بھی آپ کے قانون کی حاکمیت کو تسلیم نہیں کرتے اور نہ کریں گے...... ہم مظلوم کی مدد ضرور کریں گے......''

راجا نے کہا...... ''ذرا اپنے کرتوت دیکھو رانا...... تم نے کس طرح شہناز پر حملہ کرایا...... کیسے تمہارے غنڈے اسے اغوا کر کے لائے۔''

رانا نے شاید غصہ نہ ہونے کا وعدہ کیا تھا...... اس نے بیٹی کی طرف دیکھا اور بولا...... ''نہیں راجا صاحب...... آپ تو پولیس کے ساتھ آ گئے تھے اور ہمارے خلاف پرچا بھی کٹانے کی کوشش کی تھی...... ہم نے ڈاکٹر شہناز کو اغوا نہیں کرایا تھا۔''

راجا نے برہمی سے کہا...... ''پھر وہ یہاں کیسے موجود ہے...... آپ کی حویلی میں۔''

''کچھ آپ خود ان سے پوچھ لیں...... وہ اپنی مرضی سے ہیں یہاں یا ہم نے انہیں زبردستی روک کے رکھا ہے......'' رانا بولا...... ''اب آپ نے پرانی شکایتوں کا ذکر کھولا ہے تو ہم بھی کہہ سکتے ہیں کہ جو کچھ آپ نے رانی بی بی کے ساتھ کیا......''

میں نے اس کی بات کاٹ دی...... ''پوچھو گل سے...... ہم نے اسے اغوا نہیں کیا تھا...... اور نہ کسی نے اس کے ساتھ کوئی زیادتی کی۔''

گل نے محسوس کر لیا کہ بات آہستہ آہستہ تلخی کی طرف بڑھ رہی ہے...... اس نے فوراً مداخلت کی۔ ''مجھے کسی سے گلہ نہیں...... فارگیٹ دی پاسٹ...... آگے بڑھنے سے پہلے کیوں نہ ہم چائے پی لیں۔''

''میرا کوئی موڈ نہیں...... میں شہناز سے ملنا چاہتا ہوں۔''

گل نے کہا ''آف کورس وہ بھی ہمارے ساتھ چائے پینے آئیں گی۔''

وہ میرے لیے ناقابل یقین اور افسوسناک منظر بنا جب چائے کی ٹرالی لانے والوں کے ساتھ شہناز بڑے پرسکون انداز میں اندر آئی۔ اس نے نئے کپڑے پہن رکھے تھے...... کیونکہ یہ پہلے اس کے پاس نہیں تھے۔ احساس جرم کی ندامت سے اس میں ہمت نہ تھی کہ وہ ہم سے نظر ملا سکتی...... وہ کسی سے کچھ کہے بغیر رانا کے بالکل سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

کمرے میں ایک بہت بوجھل خاموشی کا تسلط ہو گیا...... وہ جانتی تھی کہ ہم دونوں پلک جھپکائے بغیر اسے دیکھ رہے ہیں۔ وہ خفیف تھی مگر اس سے زیادہ خوفزدہ کہ نہ

جانے ہمارا کیا ردِعمل ہو...... لیکن وہ رانا کے اور گل کے بھروسے پر بیٹھ گئی اور فرش کو دیکھتی رہی۔

بالآخر میں نے اس سکوت کو توڑا...... ''کیسی ہو شہناز......''

اس نے نظر اٹھائی...... ''ٹھیک ہوں۔''

گل نے چائے بنا کے میری طرف بڑھائی...... میں نے نہ چاہنے کے باوجود کپ لے لیا...... اس وقت رانا کے ہونٹوں پر جو مسکراہٹ میں نے دیکھی ...... وہ اس کے لبوں سے نکلنے والی گالی سے زیادہ پرآواز تھی لیکن ہم مجبور تھے کہ سب کچھ برداشت کریں...... شہناز کے رویے نے ہمیں مزید بے حوصلہ اور رسوا کردیا تھا...... کچھ کہے بغیر اس نے محض اپنے سرد، بے حس اور کسی حد تک سفاک رویے سے وہ سب کہہ دیا تھا جو ہمیں گل نے بتایا تھا...... اسے کچھ اور کہنے کی ضرورت ہی نہیں تھی ...... یہ انداز، راجا کو بھی ہوگیا تھا...... احساس شکست کی ذلت کو برداشت کرنے کی کوشش میں اس کا چہرہ بگڑ گیا تھا اور مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ بے قابو نہ ہوجائے۔

راجا کے لیے بات کرنا مشکل ہورہا تھا...... وہ زہرآلود اور نفرت بھری نگاہوں سے شہناز کو گھورے جا رہا تھا...... ماحول میں سنگینی بڑھتی جارہی ہے...... اسے کم کرنے کے لیے میں نے بھی پھر پوچھا...... ''کیا یہ سچ ہے شہناز......''

راجا اچانک پھٹ پڑا...... ''یار لحاظ کس بات کا...... اس سے پوچھ کہ کیا اس نے بیچ دیا ہے خود کو......''

میں نے کہا ''راجا...... مجھے بات کرنے دے۔''

رانا نے مسکرا کے کہا۔ ''اگر آپ کہو تو ہم ہٹ جائیں میاں سے۔''

میں نے کہا ...... ''کیا یہ ہوسکتا ہے رانا صاحب کہ ہم کیلے میں شہناز سے بات کرلیں......؟''

''کیوں نہیں ...... لیکن تمہارا یہ دوست اپنے غصے پر قابو رکھے ...... یہ نہ بھولے کہ ہماری شرافت کی حد ہے...... اور مجبوری کی بھی ......'' وہ اٹھا اور باہر نکل گیا۔

میں نے کہا...... ''ویسے تو گل نے ہمیں بتادیا تھا۔''

شہناز نے کہا...... ''لیکن تم اس پر یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔''

''کیا یقین کرنا اتنا آسان تھا......'' میں نے کہا۔

راجا چلایا...... ''ایسا کیوں کیا تم نے میرے ساتھ شہناز ...... بولو۔''

شہناز کا چہرہ سپاٹ رہا...... ''حالات ہمیشہ ایک جیسے نہیں رہتے راجا۔''

میں نے کہا ''میں بھی نہیں مان سکتا...... قید میں ان اپنی خود مختاری ...... اپنی عزت نفس ...... اپنی سوچ سے محروم ہوجاتا ہے۔''

''تم اگر یہ سمجھ رہے ہو کہ مجھ پر جبر ہوا...... وحشت زدہ کیا گیا...... مجھے بدتر انجام سے ڈرایا گیا غلطی پر ہو......''

''یعنی بات وہی ہے جو راجا نے پوچھی تھی...... سودا کرلیا۔''

''اپنی مرضی کا سودا سب کرتے ہیں۔'' وہ ڈھٹائی بولی۔

میں نے کہا...... ''مجھے یقین ہے رانا کہیں سے دیکھ رہا ہوگا ...... اور سب سن بھی رہا ہوگا ...... کیا ایسا ہوسکتا کہ تم باہر چل کے ہم سے بات کرو......''

''میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔''

''دیکھو تم ایک خود مختار عورت ہو اور آزادی سے کرسکتی ہو تو پھر ڈر کیسا......'' میں نے کہا...... ''ہم تم زبردستی تو اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتے۔''

وہ اٹھ کھڑی ہوئی...... ''مجھے جو کہنا تھا میں نے دیا۔''

راجا سخت مشتعل تھا...... شہناز کی باتوں نے اسے اپنی نظر سے گرادیا تھا...... مجھے اس کی مجبوری پر افسوس ہورہا تھا...... اور کوئی جگہ ہوتی تو شہناز کو گالیاں دیتا...... برا بھلا کہہ کے دل کی بھڑاس نکالتا...... شدید جذباتی میں انسان سب کچھ کر گزرتا ہے...... ایسی سچویشن میں کرسکتا ہے...... لیکن راجا نے عملیت پسندی کا ثبوت ہوئے خود کو کسی حد تک پہلے سے تیار کرلیا تھا کہ نا نہیں...... وہ بھی ہوسکتا ہے جو کسی کے خواب و خیال نہیں۔

میں نے شہناز کو روکا...... ''شہناز...... اتنی جلدی آخر کچھ بتاؤ تو سہی کہ اتنا بڑا فیصلہ تم نے اتنی آسانی کرلیا۔''

وہ بیٹھ گئی...... ''رفیق...... مشکل فیصلے آتے ہیں میں...... تمہاری زندگی میں بھی آئے ہوں گے۔''

''لیکن جس فیصلے سے کسی اور کی زندگی تباہ ہو......''

اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے

''کیوں...... وہ جو لڑکی تھی لندن میں عائشہ...... اسے تم کیسے ٹھکرا آئے تھے! حالانکہ اس نے فنا کرلیا تھا تمہارے عشق میں......''

میں نے خفگی سے کہا...... ''اس کی وجہ یہ تھی کہ میں فریال سے محبت کرتا تھا۔''

''جواب تمہیں چھوڑ کے چلی گئی ہے۔''

''میں بھونچکارہ گیا...... یہ تمہیں کس نے بتایا۔''

''چھوڑو یہ بات ...... ایسا ہے یا نہیں ...... سب اپنی اپنی زندگی کے فیصلے کرتے ہیں...... اپنے انٹرسٹ میں ...... دوسروں کی پروا کیے بغیر...... اگر میں نے ایسا کیا تو کون سی قیامت آگئی......''

''قیامت نہیں آئے آئی ...... ہم پر تو قیامت گزر گئی...... مجھے معلوم نہیں تھا کہ تمہارے ظاہر باطن میں اتنا تضاد ہے...... تم کیا مقصد لے کر یہاں آئی تھیں ...... اگر ایسی ہی خواہش تھی اپنا اسپتال بنانے کی تو مجھ سے کہا ہوتا ...... میں شہر میں اس سے بڑا اسپتال بنوادیتا...... کم سے کم تمہیں کسی وڈیرے کی چوتھی بیوی تو نہ بننا پڑتا اس کے لیے......'' میں نے غصے میں کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

گل ہمارے ساتھ باہر تک آئی ...... اس صورت حال سے وہ بھی پریشان تھی اور کچھ خفیف بھی جیسے باپ کے جرم میں وہ بھی شامل ہو حالانکہ اس کا قصور تھا تو صرف اتنا کہ اس نے غیر جذباتی ہوتے ہوئے حقیقت ہمارے سامنے رکھ دی تھی ...... اس امید میں کہ ہم بھی صورت حال کو قبول کرلیں گے تاہم مسئلے کی سنگینی جذباتی عوامل کو اس نے پیش نظر رکھا ہوتا تو خود کو الگ رکھتی کہ ایک نہ ایک دن سچائی خود ہم پر عیاں ہوجائے گی۔

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ راجا نے اس کی طرف دیکھا تک نہیں ...... واپسی کے سفر میں اس نے مجھ سے بھی کوئی بات نہیں کی ...... ابھی راجا کو کچھ سمجھانے کے لیے بھی وقت ناموزوں تھا ورنہ اتنا تو میں کہہ سکتا تھا کہ راجا...... میں نے تو پہلے ہی تجھے خبردار کردیا تھا کہ کیا پتا جسے ہم ناممکن مان چکے ہیں وہی ممکن ہوجائے اور تو خود بھی اس کے لیے تیار تھا۔

غالب نے کہا تھا......

کیا ہے عشق کی غارت گری نے شرمندہ
سوائے حسرت تعمیر گھر میں خاک نہیں

ایک وقت تھا کہ اسی حسرت تعمیر کے ساتھ ہم سب نے ست بدھائی کا رخ کیا تھا...... بلند مقاصد اور ناقابل شکست نظر آنے والے عزائم کے ساتھ ...... اس وقت تقدیر مہرباں تھی کہ وسائل پیدا ہوتے گئے اور منزل کا حصول صرف وقت سے مشروط رہ گیا...... بس کام شروع کرنے کی دیر ہے...... پھر سب کچھ خود بخود ہوتا جائے گا...... لکڑی کے کارخانے کھڑے ہوجائیں گے...... اسپتال اور اسکول بن جائیں گے...... ڈیم تعمیر ہوجائے گا...... کالونی وجود میں آجائے گی اور دیکھتے دیکھتے اس علاقے میں آنے والی خوش حالی سے لوگوں کی تقدیر جاگ اٹھے گی۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ...... آج ہمارے پاس تہی دامنی کے سوا کچھ بھی نہیں تھا...... خواب تھا جو بھی ہم نے دیکھا جو بھی سنا افسانہ تھا...... کھیل ختم ہوگیا تھا...... بساط لپیٹنے کا وقت آگیا تھا...... ہم سب کے لیے صرف واپسی کا راستہ کھلا ہوا تھا ...... ناامیدی کا وہ حال تھا کہ امید پر ندامت ہوتی تھی...... خصوصاً جس کے ساتھ رشتہ خلوص رکھنے والے ازخود بندھے چلے آئے تھے۔

ابھی تک میں نے سب کچھ ختم کرکے واپس جانے کا باضابطہ اعلان نہیں کیا تھا...... سوائے ریشم اور اس کی ماں کے ہمارے مایوسی اور ناکامی کا اندازہ کسی کو بھی نہیں تھا...... کیا ہوگا جب یہ خبر عام ہوگی کہ نواب رفیق احمد شیرازی اپنے ست بدھائی ترقیاتی منصوبے سے دستبردار ہو کے اور زمین بیچ کے واپس ولایت جارہے ہیں، لوگوں نے تو میرے پروگرام سے بڑی توقعات وابستہ کرلی تھیں۔ ان کو خوشحال مستقبل کے سارے خواب میں نے ہی دیے تھے...... یہ خواب ان سے چھین لینا ان کے ساتھ ایک سنگین مذاق ہوگا......

رات تک میں نے راجا سے بات کرلی تھی اور اس نے مجھ سے اتفاق کیا تھا کہ ہمارے لیے اپنی اپنی حقائق کی دنیا میں لوٹ جانا ہی بہتر ہے...... یہ دل شکستگی کا فطری ردِعمل تھا...... اسے شہناز نے جینے کی امنگ سے محروم کردیا تھا...... مجھے فریال کی جوانی نے بددل کیا تھا...... آعندلیب مل کے کریں آہ وزاریاں...... تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل...... لیکن یہ بھی تو بے سود تھا۔

رات کو ابا جی نے مجھے بہت لتاڑا...... ''بس اتنا ہی دم خم تھا...... چلے تھے ست بدھائی میں انقلاب لائے...... میاں دنیا کیا فریال تھی؟ زندگی فریال کے ساتھ ہی ختم ہوگئی...... اب تم کیا کروگے؟ تارک الدّنیا ہو کے کسی غار میں جا بیٹھو گے اور فریال کے نام کی مالا جپتے عمر بتادو گے......؟ آخر ہمارا قصور کیا تھا...... میں نے اپنی ماں کو اور اپنے بھائی بھاوج کو یہاں لا کے لٹادیا ہے تم سات سمندر پار سے لے جا کے گوروں کی مٹی میں گاڑو گے...... نا میاں ...... تم جاؤ جہاں دل چاہے۔''

میں نے بے بسی سے کہا...... ''ابا جی...... میں اکیلا کیا

کروں۔"

"بابر بھی اکیلا تھا جس نے مغلیہ سلطنت کی بنیاد رکھی...... حکومت چھن گئی...... جلا وطن رہا...... لیکن پھر آیا اور تاج وتخت سب پھر حاصل کرلیا...... تم یہاں کون سی سکندر اعظم کی فوج کے ساتھ آئے تھے......"

میں نے کہا" راجا تو تھا......"

"ان کی شکل دکھائی نہیں دی مجھے ورنہ میں ان کا مزاج بھی پوچھتا...... بہت بڑے صحافی تھے...... کیا کام آئے ان کے تعلقات؟ نہ پولیس نے کچھ کیا نہ تمہارے ان نامی گرامی ڈاکوؤں نے جن کے نام کی دہشت سے لوگوں کا پیشاب خطا ہوتا ہے...... زمانے بھر میں چلاتے پھرے شہناز...... شہناز...... اسے واپس نہ لا سکے۔ اب روتے پھر رہے ہیں ایک ایسی عورت کے لیے...... اب میں کیا کہوں اسے...... لیکن میں رفیق...... اگر انہی دو عورتوں کے بل بوتے پرست بدھائی ترقیاتی پروگرام شروع کیا تھا تو تف ہے تمہاری سوچ پر...... لعنت تمہاری اعلیٰ تعلیم اور تمہاری جوانی پر...... ارے ہمیں دیکھو...... اتنے صدمے اٹھا کے بھی ہمت نہیں ہارے......"

میں نے کہا...... "آپ کیا چاہتے ہیں...... میں یہاں رہوں......"

"رفیق میاں...... ست بدھائی قدرت کا انعام ہے...... یہ تمہارا حق تھا جو ایک صدی گزر جانے کے بعد ملا...... تم اسے ٹھکراؤ گے! کفران نعمت کرو گے؟ میں تو بہت خوش تھا کہ ولایت میں رہ کے تم نے ولایتی طور طریقے اختیار نہیں کیے...... تم اپنے ساتھ کوئی میم نہیں لائے...... تمہارے دل میں وطن کے لیے اور اس علاقے کے لوگوں کے لیے کچھ کرنے کا جذبہ ہے...... دولت نے تمہیں عیاشی پر راغب نہیں کیا...... اب تو میں محبت کے معاملے میں بھی تمہاری ثابت قدمی سے متاثر ہوگیا تھا...... ہم نے فریال کو قبول کرلیا تھا...... اب یہ تمہارا مسئلہ ہے...... تم جانتے ہو کہ وہ کیوں چلی گئی...... اول تو مجھے امید ہے وہ واپس آئے گی...... تم اسے لا سکتے ہو...... دنیا کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ سمٹ کر چھوٹی ہوگئی ہے...... گلوبل ویلج بن گئی ہے...... تم اس گاؤں میں فریال کو تلاش نہیں کرسکتے......؟ شہناز کو بتانے دو شہر میں اسپتال...... کیا اور کوئی ڈاکٹر نہیں ملے گی تمہارا ساتھ دینے والی...... راجا کو چاہیے کہ شہناز پر ثابت کرے کہ اس بے وفائی سے دنیا ختم نہیں ہوئی...... جس کام سے وہ بھاگ گئی...... وہ ہوگا...... ضرور ہوگا۔"

ابا جی پروفیسر تھے...... بہت زیادہ قوت برداشت رکھتے تھے لیکن بات حد سے گزر جائے تو پھر ان کے جلال کی حد بھی کوئی نہیں تھی...... جب وہ طیش میں آجاتے تھے تو اماں دخل اندازی سے گریز کرتی تھیں...... ان کا تجربہ تھا کہ پروفیسر صاحب بولتے بولتے خود ہی چپ ہوجاتے ہیں...... بحث معاملات کو خراب کرتی تھی...... اس وقت میں نے بھی یہی پالیسی رکھی...... انہوں نے غصے میں نامرد، بزدل اور بہت کچھ کہا لیکن بہت شائستہ الفاظ میں...... میں کافی پیتے ہوئے سنتا رہا۔

جب بالآخر میری گلو خلاصی ہوئی تو میں اپنے بستر پر جا کے گر گیا...... میرے ذہن میں سخت کنفیوژن تھا...... میری سمجھ بوجھ کی صلاحیت کو قبض کی شکایت ہورہی تھی اور ابا جی نے جلاب دے کر میری طبیعت صاف کردی تھی...... وہ غیر جذباتی انداز میں بات کررہے تھے اور ان کے ساتھ زندگی کا تجربہ بول رہا تھا...... میں یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ ان کی کوئی بات غلط یا غیر منطقی تھی...... حقیقت تو یہ ہے کہ میں شرمندگی محسوس کررہا تھا......

مجھے معلوم تھا کہ راجا سو نہیں رہا ہے...... ایک محشر اس کے خیالوں میں بھی برپا تھا...... ہم پر ایک جیسی واردات گزری تھی اور ہمارے دل ایک جیسے فگار تھے...... فرق صرف یہ تھا کہ فریال مجھے ٹھکرا کے گئی تھی تو اس کا سبب کچھ اور تھا...... اسے مجھ سے بے جا ہی سہی مگر شکایت تھی کہ میں بے وفائی کا مرتکب ہورہا ہوں...... مجھے غصہ تھا تو اس کا غلط فہمی اور ناسمجھی پر...... راجا کے ساتھ معاملہ مختلف تھا...... شہناز نے اسے چھوڑ کے رانا جیسے شخص کے ساتھ زندگی گزارنے کا جو فیصلہ کیا تھا اس کی وجہ ایسی تھی کہ راجا نے سخت تذلیل محسوس کی تھی...... وہ اپنی نظر سے گر گیا تھا اور اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا تو یہ ایک فطری ردِعمل تھا...... خود میرا ذہن ابھی تک اس حقیقت سے سمجھوتا نہیں کرپایا تھا کہ راجا کو چھوڑنے کی جو وجہ گل نے بتائی وہ درست تھی......

معلوم نہیں اس خاموشی میں اپنے ان خیالات کے دشت پر وحشت میں بھٹکتے کتنا وقت گزر گیا...... باہر بالکل سناٹا تھا جس میں ہوا کے درختوں سے گزرنے کی سرسراہٹ بھی سنی جاسکتی تھی...... آج ہوا تیز تھی...... کبھی کبھی جنگل کی طرف سے کسی گیدڑ کے چلانے کی آواز سنائی دے جاتی تھی یا کوئی اُلو بولنے لگتا تھا۔

پھر نہ جانے کیا ہوا...... رات کے سکوت کو ایک اجنبی شور اٹھا...... ایک عورت چیخنے لگی...... پھر دوسری نے چلا کے

کچھ کہا اور گیٹ کھلا تو چیخ پکار کا سارا شور جیسے کمرے میں آگیا...... میں اسپرنگ کی طرح اچھل کے اٹھا...... راجہ مجھ سے پہلے ہی کود کے باہر نکل گیا تھا......

صرف ایک لمحہ تھا جب میں نے اس آواز کو پہچانا تھا اور محسوس کیا جیسے وہ میرے خواب کا لمحہ تھا...... پھر یقین نے پوری قوت اور شدت کے ساتھ مجھے اپنی گرفت میں لے لیا...... شک کوئی نہ رہا...... وہ آواز شہناز کی تھی...... شہناز کے سوا کسی اور کی نہیں ہوسکتی تھی......

پھر میری آنکھوں نے ایک عجیب منظر دیکھا...... جو میرے تصور میں بھی نہیں آسکتا تھا...... گیٹ کی طرف دوڑ کر آنے والی شہناز کو راجہ نے بڑی صفائی سے اپنے ہاتھوں میں اٹھا لیا تھا...... اب وہ واپس اندر کی طرف بھاگ رہا تھا...... اس کے پیچھے دوسری عورت تھی جو بھاگتے بھاگتے ٹھوکر کھا کے گری...... پھر میں اس کو اٹھانے پہنچ گیا...... یہ گل تھی...... میں نے گرتے ہی اسے اٹھالیا۔

گل کی حالت غیر ہورہی تھی...... اس کا سانس قابو میں نہیں تھا...... اس کے پیروں میں جوتے نہیں تھے اور کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے...... پیروں سے خون رس رہا تھا اور خراشیں اس کے ہاتھوں اور چہروں پر نظر آرہی تھیں...... میں نے اسے بستر پر لٹا دیا...... خوف سے اس کی آنکھوں میں وحشت اتری ہوئی تھی...... وہ کچھ کہنے کی کوشش کررہی تھی...... بالآخر اس نے کہا" رفیق...... وہ...... ہمارے پیچھے آرہے ہوں گے......"

میں نے کہا...... "ایزی...... ایزی گل...... یہاں کوئی نہیں آسکتا......"

وہ چلائی...... "نہیں...... شٹ دی ڈور......"

میں نے کہا...... "گیٹ بند ہیں...... ڈرو نہیں...... اب تم محفوظ ہو...... ایک منٹ ٹھہرو...... میں سیکیورٹی گارڈ کو الرٹ کردوں......"

شہناز کی ڈرامائی واپسی نے حویلی میں سنسنی پھیلا دی تھی...... شور سے اندر کچن کے ساتھ والے کمرے میں سونے والی ریشم بھی جاگ اٹھی تھی اور باہر ہکا بکا کھڑی تھی۔

"سر...... آئی ہیر ڈاکٹر میڈم وائس...... ڈریم سی......"

اتنی بدحواسی کے باوجود وہ انگریزی نہیں بھولی۔

میں نے کہا...... "شہناز کو راجا لے گیا ہے...... اندر جا کے دیکھو۔"

"دس نو ڈریم......" وہ چیخ مار کے اندر بھاگی...... "ڈاکٹر میڈم کم......"

میں نے سیکیورٹی گارڈز کو حکم دیا...... "لائٹس کا رخ بدل دو...... سب کو ڈیوٹی پر بلالو...... حملے کا خطرہ ہے...... جو قریب آنے کی کوشش کرے گولی ماردو......"

گارڈ نے کہا...... "یس سر......" اور دوڑتا ہوا سرونٹ کوارٹر کی طرف چلا گیا۔ میں واپس پلٹ کے راجا کے کمرے کی طرف گیا...... وہاں شہناز اس سے چمٹی زار و قطار رو رہی تھی اور خود بھی رونے والا راجا اس کے جذبات کو کنٹرول کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

ریشم خود بھی رونے میں مصروف ہوگئی لیکن اس کے رونے میں خوشی شامل تھی...... میں نے اسے ڈانٹا...... "ایسے رونے کے بجائے جا کے میڈیکل ایڈ کا سامان لاؤ...... ان کی حالت نہیں دیکھ رہی ہو......"

اس نے سر ہلایا اور باہر بھاگ گئی...... چند سیکنڈ بعد وہ ڈاکٹر شہناز کے بیگ کے ساتھ نمودار ہوئی...... کسی سے کچھ پوچھے جو کہے بغیر اس نے ڈاکٹر کی مددگار کے بجائے ڈاکٹر کا رول سنبھال لیا۔ اس کی ڈاکٹر میڈم کی حیثیت اس وقت مریض کی تھی...... چنانچہ سب تجربہ جو ریشم نے ڈاکٹر شہناز کی رفاقت میں حاصل کیا تھا اس ایمرجنسی میں کام آیا...... اس نے اپنی بغیر گرامر کی انگلش بولتے ہوئے ڈاکٹر شہناز کو ڈانٹا کہ آپ خاموش بیٹھی دیکھتی رہیں...... اگر میں کچھ غلط کروں تو بولنا...... پھر اس نے مجھے اور راجا کو بڑے رعب سے کہا کہ ہمیں پیچھے بیٹھ کر اسے کام کرنے کا موقع دینا چاہیے اور خود کو سنبھالنا چاہیے۔

حویلی کے اندر جیسے زندگی جاگ اٹھی تھی...... راجا کا بیمار چہرہ خوشی سے کھل اٹھا تھا...... وہ آنسو پونچھ کے مسکرا رہا تھا...... گل اور شہناز کے چہروں پر خوف باقی تھا مگر ان کے ہسٹریا میں کمی آگئی تھی...... پھر اچانک ابا جی نمودار ہوئے...... انہوں نے بے یقینی سے یہ منظر دیکھا...... "شہناز آگئی......" وہ دروازے میں رک گئے۔

اس سے پہلے کہ میں ان کو جواب دیتا' میرے کانوں نے دور سے آنے والی کچھ آوازیں سن لیں جو میرے لیے نئی نہیں تھیں...... یہ موٹر سائیکلوں کی آواز تھی...... پھر اس کے ساتھ کتوں کے بھونکنے کی آوازیں شامل ہوگئیں۔

شہناز دہشت سے اٹھ بیٹھی...... "وہ...... وہ آگئے......"

میں نے اسے پھر لٹا دیا...... "شہناز...... اندر کوئی نہیں آسکتا...... تم آرام سے بیٹھو...... میں نے محسوس کیا کہ اس کا سارا جسم کانپ رہا ہے۔

ابا جی قریب کے بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گئے...... "تو

میری ڈاکٹر بٹی بھی آ گئی...... شاباش......"

گل نے میرا ہاتھ پکڑ لیا...... "رفیق...... میں واپس نہیں جا سکتی۔"

میرے بجائے ابا جی نے کہا...... "اے بٹی کس کی مجال ہے جو تمہیں لے جائے...... یہ بھی تمہارا ہی گھر ہے۔"

راجا نے مجھے اشارہ کیا اور ہم باہر نکل آئے...... آوازوں کا شور اب کچھ نزدیک محسوس ہوتا تھا...... میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیا تو مجھے اوپر خاصی نقل و حرکت نظر آئی...... اب غنی ایکٹو ہو گیا۔ اس نے تمام دستیاب فورس کو اسلحے کے ساتھ مختلف مقامات پر کھڑا کر دیا تھا...... وہ ایک ماہر منصوبہ ساز تھا اور حفاظتی انتظامات میں اس کی کارکردگی پر بھروسا کیا جا سکتا تھا۔

راجا نے اب خود کو سنبھال لیا تھا...... بہت دیر سے وہ ایک ہی بات دہرائے جا رہا تھا...... جو غلط بہرحال نہیں تھی...... "دیکھا شہناز نے میرے اعتماد کو دھوکا نہیں دیا...... میرا دل کہتا تھا کہ ایسا ہو نہیں سکتا...... خوب ڈراما کیا اس نے......"

میں نے کہا "واقعی...... میں تو چکرا گیا تھا کہ یہ شہناز کو کیا ہو گیا...... وہ زبردست ایکٹرس ہے راجا...... تجھ سے بھی بڑی"

"اور یہ لڑکی گل......"

"میرا خیال ہے وہ ایکٹنگ نہیں کر رہی تھی...... اسے شہناز کے اصل ارادوں کا علم نہیں ہوگا...... لیکن شہناز کو بھاگنے کا موقع ملا تو گل نے بھی فرار کا فیصلہ کر لیا۔"

"کیا پتا یہ موقع اسے گل کی وجہ سے ملا ہو۔"

میں نے کہا...... "ہو سکتا ہے...... حقیقت بعد میں سامنے آئے گی...... لیکن ان دونوں نے واقعی کمال کیا...... اتنی رات کو جنگل سے گزر کے آئیں...... دوڑتی ہوئی......"

اس وقت باہر پہلا فائر ہوا...... آواز کچھ دور سے آئی تھی مگر اوپر سے کسی گارڈ نے جواب میں کلاشنکوف کا پورا برسٹ چلا دیا...... یہ غنی تھا...... اس نے اوپر سے چلا کے کہا...... "سر آپ اندر جائیں......"

رانا کے غلاموں نے کتوں کے ساتھ یلغار کی تھی...... کتے خطرناک انداز میں بھونکتے ہوئے قریب آ رہے تھے...... ایسا لگتا تھا جیسے رانا کا سارا غصہ ان کی دیوانگی بن گیا ہے...... وہ اپنے مالک کی بے غیرتی کا بدلہ لینے کے لیے جان دینے اور لینے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔

میں نے غنی سے کہا...... "دیکھو...... کلاشنکوف مت استعمال کرو۔"

"سر......" اس نے جواب دیا...... "آج بچ کے کوئی نہیں جائے گا۔"

میں نے کہا "ہوش سے کام لو غنی...... ہمیں کشت و خون نہیں چاہیے......"

"میں کتوں کی بات کر رہا تھا سر......"

مجھے اس کی بات سمجھ آئی "یہ ٹھیک ہے...... آج سب کو ختم کر دو۔"

کتے رانا پیلس سے فرار ہونے والی دونوں عورتوں کی بو کا تعاقب کرتے آئے تھے...... ڈاکٹر شہناز اور گل کے کپڑوں سے پھوٹتی جسم کی بو اور ان کے خون کی بو نے کتوں کو حویلی کے دروازے تک پہنچا دیا تھا...... یہ خون ان کے پیروں کے زخموں سے رس کر جنگل کی مٹی میں جذب ہوا تھا...... یہ فرض کرنا مشکل تھا کہ وہ ننگے پیر نکلی ہوں گی...... غالباً دوڑتے ہوئے جوتے ان کے پیروں سے نکل گئے تھے...... یا انہوں نے خود اتار پھینکے ہوں گے کیونکہ اونچی ایڑھی والے جوتوں کے ساتھ بھاگنا مشکل ہوگا۔

موٹر سائیکلوں والے کچھ فاصلے پر رک کر ایکسی لریٹر سے گھوں گھوں کر رہے تھے...... پھر انہوں نے فائرنگ کی اور چلا کر کتوں سے کچھ کہا...... کتوں کے لیے گیٹ توڑنا یا فصیل پر چڑھنا ممکن نہیں تھا...... انہوں نے فرار ہونے والوں کا صحیح سمت میں تعاقب کیا تھا لیکن وہ تھوڑے سے فرق سے پیچھے رہ گئے تھے...... چند منٹ کے اسی فرق نے شہناز اور گل کو بچا لیا تھا...... وہ حویلی میں داخل ہو گئی تھیں اور ان خوں آشام جانوروں اور انسانوں کو دسترس سے محفوظ تھیں۔

جنگل کی طرف سے فائرنگ کا سلسلہ وقفے وقفے سے جاری تھا...... غنی کی ہدایت پر اس کا جواب بھی دیا جا رہا تھا...... حملہ آور اب پیچھے ہٹ گئے تھے مگر انہوں نے حویلی کے گرد ایک حصار قائم کر رکھا تھا...... رانا کے غلام بے بسی سے دور کھڑے تھے...... ان میں ہمت نہ تھی کہ واپس جا کے رانا کو بتائیں کہ فرار ہونے والی ڈاکٹر اور رانی بی بی چند منٹ پہلے ست بدھائی کی حویلی میں داخل نہ ہوتیں تو ہم انہیں زندہ یا مردہ لے کر آتے...... جیسا کہ آپ نے حکم دیا تھا...... مگر ان غلاموں کی نا اہلی ان کا جرم بن جاتی اور بے بسی میں رانا کا سارا غیظ و غضب ان پر نازل ہوتا۔

کچھ دیر بعد میں نے غنی کو نیچے بلایا "دیکھو...... اب باہر...... نکل کے انہیں مار بھگانا ضروری ہو گیا ہے۔"

غنی نے سر ہلایا۔ "آپ فکر نہ کریں...... میں نے کہا ہے کہ نا کہ آج ایک کتا بھی زندہ بچ کے نہیں جائے گا۔"

میں نے کہا "ساری فورس کو ایک دائرے میں پھیلا دو...... پھر ہر طرف سے آگے بڑھو تا کہ انہیں بھاگنے کا موقع نہ ملے...... خود کو بچاؤ اور براہ راست کسی بندے پر فائر مت کرو...... ہم تمہارے ساتھ چل رہے ہیں۔"

غنی کے احتجاج کے باوجود میں راجا کے ساتھ باہر نکلا...... ہم دونوں کے پاس بھرے ہوئے ریوالور تھے...... ٹارچ سب کے ہاتھوں میں تھی...... میری ہدایات کے مطابق وہ جنگل میں ہر طرف پھیل گئے...... یہ ایک وسیع دائرہ تھا...... سامنے کے مقابلے میں پیچھے زیادہ افراد تھے۔

جب ہم نے پیش قدمی شروع کی تو حملہ آور پیچھے ہٹنے لگے۔ اب وہ واپس جانا چاہتے تھے...... راجا پہلے میرے ساتھ تھا...... پھر وہ دائیں جانب کہیں اندھیرے میں گم ہو گیا...... سامنے سے کیے جانے والے فائروں کا جواب حملہ آور بڑی بے ترتیبی سے دے رہے تھے...... ایسا لگتا تھا کہ انہیں خطرے کا احساس ہو گیا ہے کہ وہ محصور ہو چکے ہیں اب وہ حصار توڑ کر نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔

ایک کتے کی چیخ میں نے فائر کی آواز کے ساتھ بھی سنی...... یہ میرے بائیں جانب سے آئی...... گولی نشانے پر لگی تھی...... کتا چند منٹ تک کرب میں بڑی بھیانک آواز کے ساتھ چیختا رہا...... پھر رفتہ رفتہ اس کی موت غالب آ گئی اب کم ہوتے ہوتے اس کی آواز غائب ہو گئی...... اس وقت دوسرا کتا نشانہ بنا...... کوئی قہقہہ لگا کے ہنسا یہ غنی تھا...... نہ جانے کسی نے اسے گالی دی...... وہ کتے کا محافظ یا ملازم تھا...... کتنے کی موت نے اسے سخت صدمہ پہنچایا تھا...... وہ چلا رہا تھا...... ہائے اوئے...... چیتا بھی مار دیا اب میں رانا صاحب کو کیا منہ دکھاؤں گا۔"

غنی نے چیخ کے کہا...... "خبردار جو ایک قدم آگے بڑھایا...... تو بھی مارا جائے گا کتے کی موت......"

شاید کتے کی دیکھ بھال کرنے والا اس خیال سے پاگل ہو رہا تھا کہ ایک قیمتی شکاری کتے کی موت کا ذمے دار سمجھتے ہوئے رانا صاحب اسے بھی مار ڈالیں گے...... وہ غنی پر حملہ کرنے دوڑا ہوگا...... غنی اسے وارننگ دے چکا تھا...... وہ گولی چلا کے اپنا دفاع کرنے پر مجبور ہوا...... جنگل میں ایک انسانی چیخ گونجی...... پھر غنی کی آواز آئی...... "میں نے منع کیا تھا تجھے......"

رانا کے کتوں کی دیکھ بھال پر مامور یہ انسان کتوں کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہ رکھتے تھے...... وہ بندۂ بے دام تھے...... کتے بہت قیمتی تھے...... ایسا ہی غلام کاسو...... رانا کے سب سے قیمتی کتنے کی موت اس کا جرم بن گئی تھی اور غیظ و غضب کی دیوانگی میں رانا کے حکم دیا تھا کہ کاسو کو کتے کے ساتھ دفن کیا جائے...... یہ خبر ہم تک پہنچی تو ہم نے کاسو کو اس کی فیملی کے ساتھ رہا کرا لیا اور اپنی حویلی میں لے آئے تھے...... رانا نے اسے انا کا مسئلہ بنا لیا تھا اور ایک عرصے تک کوشش کرتا رہا کہ ہم کاسو کو واپس کر دیں اس نے مرنے والے کتے کی کھال میں بھس بھروا کے رکھ لیا تھا کہ کاسو جب بھی واپس ملا اسے ڈمی کتے کے ساتھ ضرور زندہ دفن کرے گا...... یہ بات پرانی ہو گئی تھی...... کاسو کو شاہی بادشاہ لے گیا تھا...... لیکن رانا اس بات کو بھولا نہیں تھا۔

کتوں کی دیکھ بھال پر مامور غلام صرف نیکر پہنتے تھے اور وہ عموماً سزا یافتہ مزارع یا گھر کے ملازم ہوتے تھے جن کو کتوں کے ساتھ ہی رہنا پڑتا تھا۔ جب میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا آگے بڑھ رہا تھا تو مجھے ان مجبور اور بے حیثیت انسانوں پر افسوس ہو رہا تھا جو اپنی زندگی ان کتوں پر قربان کر دیتے تھے اور کتوں سے کمتر تھے...... میں آگے بڑھتے ہوئے ٹارچ جلا کے دیکھتا تھا اور پھر بجھا کے تیزی سے آگے بڑھتا تھا۔

فائرنگ کرنے والے اور جوابی فائرنگ کرنے والے پیچھے ہٹ رہے تھے...... کتوں کے ساتھ حملہ کرنے والے واپس رانا پیلس کی طرف راستہ بنانے کی کوشش کر رہے تھے اور میرے ساتھ آنے والے ان کو گھیرنے کے چکر میں تھے...... ان کے ساتھ آنے والے دو موٹر سائیکل سوار جو اس حملہ آور دستے کی کمان کرتے تھے بہت پہلے غائب ہو چکے تھے۔

اچانک میں نے ایک نیکر پوش گنجے کو دیکھا...... وہ کتے کا منہ دبائے میرے سامنے سے اندھیرے میں کسی سائے کی طرح گزرتا جا رہا تھا...... میں نے نشانہ لے کر گولی چلائی...... کتا ایک چیخ مار کے اچھلا اور زمین پر گر کے لوٹنے لگا...... اس کا منہ دبا کر بھاگنے والا کتے کے ساتھ ہی زمین پر گر کے واویلا کرنے لگا...... اس نے کتے کا منہ اس لیے دبا رکھا تھا وہ آواز نہ نکال سکے لیکن اس کی کوشش کتے کو قضا سے نہ بچا سکی تھی۔

میں ایک دم پیچھے ہٹا اور مخالف سمت میں نکل گیا...... اب تک تین کتے مارے جا چکے تھے...... رانا کے لیے یہ نقصان بہت بڑا تھا...... کتے صرف مہنگے ہی نہیں تربیت یافتہ بھی تھے اور ایک کتے کی تربیت کئی سالوں میں ہوتی

ہے..... میرے محافظوں نے بڑی بھرپور جوابی کارروائی کی تھی..... حملہ آور جان بچا کے نکلنا چاہتے تھے..... اگر میں نے غنی کو منع نہ کیا ہوتا تو وہ کتوں کے ساتھ آنے والوں کو بھی نہ چھوڑتا.....

اب جنگل میں سیٹیاں گونج رہی تھیں..... یہ غنی تھا جو واپسی کا سگنل دے رہا تھا کیونکہ حملہ آور جا چکے تھے..... ان کے تعاقب میں آگے بڑھنا خود کو خطرے میں ڈالنے کے مترادف ہوتا کیونکہ یہاں سے رانا کی حویلی زیادہ دور نہیں تھی..... میں بھی سمت کو ذہن میں رکھتے ہوئے واپس چلنے لگا..... پل کے پاس میں نے پہلے راجا کو دیکھا..... پھر غنی اور اس کے ساتھ جانے والے گارڈ بھی ایک ایک کر کے لوٹ آئے۔

غنی بہت خوش تھا..... ''تین شکار کیے سر..... اعلیٰ نسل کے کتے تھے.....''

میں نے کہا..... ''آئے کتنے تھے؟''

''میرا خیال ہے چار..... میں تو ان بدمعاشوں کے پیچھے تھا..... وہ جو موٹر سائیکلوں پر آگے آگے آئے ہیں..... بھاگنے میں بھی وہ سب سے آگے تھے..... نظر آجاتے تو ان کی موٹر سائیکل کے پٹرول ٹینک میں سوراخ کرتا..... موٹر سائیکل جل کے راکھ ہو جاتی..... وہ دکھائی ہی نہیں دیے.....'' غنی بولا۔

واپس حویلی میں پہنچ کے ہم نے گارڈز کو اپنی اپنی جگہ بھیج دیا اور انہیں چوکس رہنے کو کہا..... رانا کو سخت جھٹکا لگا تھا..... پہلے شہناز اس کی آنکھوں میں دھول جھونک کے نکل گئی اور اس کی بیٹی جو ولایت سے اس کی عزت کا جنازہ نکالنے آئی تھی' اپنے مقصد میں کامیاب رہی..... وہ پھر اسی حویلی میں پہنچ گئی جہاں سے اس کا آنا بے سبب نہیں تھا..... وہ شہناز کو لے جانے کے لیے آئی تھی..... ان دونوں نے رانا کو سخت بے وقوف بنایا..... اس کا اعتماد حاصل کیا اور ایسا ڈراما کیا کہ وہ ان کی نیت پر شک ہی نہ کر سکا..... اور اعتبار اس کو بہت مہنگا پڑا۔

اس نے سخت طیش میں اپنے شکاری کتے پیچھے دوڑائے تھے کہ ان دونوں کو پکڑ لائیں گے مگر یہاں بھی قسمت نے اسے دھوکا دیا۔ وہ حویلی کی پناہ میں پہنچ گئیں۔ اس کے تین بیش قیمت کتے مفت میں مارے گئے..... رانا تو پاگل ہو جائے گا..... شہناز چلی گئی..... بیٹی نے دشمن کے گھر میں پناہ لے لی..... وہ کچھ بھی نہ کر سکا..... لیکن وہ صبر کر کے بیٹھ نہیں سکتا تھا۔

سوال یہ تھا کہ اب وہ کیا کرے گا.....

ڈاکٹر شہناز نے اپنے میڈیکل بیگ سے کوئی انجکشن نکال کے گل کو لگا دیا تھا..... پھر یہی انجکشن اس کی اسسٹنٹ ریشم نے شہناز کو لگایا تھا اس کے خواب آور اثر سے وہ پرسکون ہو کے سو گئی تھیں۔ ریشم ان کے پاس موجود تھی اور ابا جی سے باتیں کر رہی تھی..... ڈاکٹر میڈم کے واپس آجانے سے وہ اتنی خوش تھی جیسے اسے سارے جہاں کے خزانے مل گئے ہیں۔ اس کی نیند غائب ہو گئی تھی..... نیند ابا جی کی بھی اڑ گئی تھی اور وہ شہناز کے سرہانے کی طرف بیٹھے آہستہ آہستہ اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیر رہے تھے..... ریشم کی بے سروپا انگلش سن کے مسکرا رہے تھے جو وہ بے تکان بول سکتی تھی..... بہت دن بعد مجھے ان کی صورت پر بھی وہ طمانیت دکھائی دی جس سے وہ محروم تھے۔

میں نے ان سے کہا..... ''اب فکر کی بات کوئی نہیں ابا جی..... آپ جا کے سو جائیں۔''

انہوں نے کہا..... ''اب کیا سونا رفیق میاں..... تھوڑی دیر میں صبح ہو جائے گی..... لیکن یہ جو تم کہہ رہے ہو کہ فکر کی کوئی بات نہیں کاش ایسا ہوتا۔''

''سب سے بڑی پریشانی تو ڈاکٹر شہناز کے لیے ہے۔''

''جی ہاں..... لیکن اب یہ لڑکی جو اس طرح گھر سے بھاگ کے ہمارے پاس آگئی ہے..... یہ سب سے بڑی پریشانی بن سکتی ہے..... رانا جیسے عزت کے مسئلے پر جان دینے اور لینے کے عادی ہوتے ہیں۔ ان کی بہو بیٹی ایسے نکل جائے..... اور پہنچ جائے دشمن کے گھر..... اس بے عزتی کا بدلہ لیے بغیر وہ چین سے نہیں بیٹھیں گے۔''

میں نے کہا..... ''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ابا جی..... اس معاشرے میں یہ قبائلی سوچ رائج ہے..... لیکن رانا اور اس کے بیٹے بھی پڑھ لکھ گئے ہیں۔ ان کا آبائی خون سرد پڑ گیا ہے..... وہ سیاسی اور دنیاوی مصلحت کے تقاضوں کو سمجھنے لگے ہیں کیونکہ وہ گاؤں سے زیادہ شہر میں رہتے ہیں..... یہاں تو صرف زمین ہے یا ان کے ووٹ ہیں۔''

''شاید تمہارا خیال درست ہو..... مگر وہ خاموش بیٹھنے والا نہیں ہے۔''

میں نے کہا..... ''طاقت کے استعمال سے تو اسے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا..... اس کے پاس کون سے ٹینک یا بکتر بند گاڑیاں توپ خانہ ہے کہ ہم پر چڑھ دوڑے..... اسے کئی بار اندازہ ہو چکا ہے کہ مقابلے پر کھڑا ہونے والا صرف ڈگریاں نہیں رکھتا۔

اسلحہ بھی رکھتا ہے..... اور عقل بھی جو اس کی ساری چالبازی اور فریب کاری کا جواب دینے کے لیے کافی ہے..... قانون جب اس کے اشاروں پر چلتا تھا..... وہ وقت گزر گیا..... اب آپ کا بیٹا نواب رفیق احمد شیرازی بھی برابر کی طاقت کے ساتھ سامنے کھڑا ہے اور قانون رانا کی اس طرح مدد نہیں کر سکتا جیسے کسی مزارع کے معاملے میں کرتا رہا.....''

''وہ سب تو ٹھیک ہے..... لیکن ہم حویلی میں قلعہ بند ہو کے نہیں بیٹھے رہیں گے..... وہ کینہ پرور آدمی ہے اور خطرناک بھی..... اس نے جرائم پیشہ افراد پال رکھے ہیں.....''

میں نے ہنس کے کہا..... ''جب میں نے شامی بادشاہ سے تعلقات بڑھائے مجھے تو آپ کو سخت اعتراض تھا.....''

''بھئی میں پڑھنے پڑھانے والا آدمی..... ساری عمر سرکاری ملازمت کی اور کلاس روم میں کتابی علم دیتا رہا..... یہ معاملات میں نے دیکھے نہ تھے۔''

''آپ دیکھ لیں کہ آج کی دنیا میں جینے کے طور طریقے کتنے بدل چکے ہیں..... رانا جیسے تو کسی کو اپنی مرضی سے جینے کا حق بھی خیرات کی طرح دیتے ہیں..... ورنہ یہ حق چھیننا پڑتا ہے..... ہم کون سا غلط کام کر رہے تھے لیکن رانا نے اپنی حاکمیت اور مطلق العنانی خطرے میں محسوس کی تو ہمیں نکال باہر کرنے کی پوری کوشش کی..... حالانکہ یہ ہماری زمین تھی اور ہمارا گھر تھا..... آج طاقت کا توازن ہے تو وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا..... اس کے پاس جرائم پیشہ لوگ ہیں تو میرے پاس بھی شامی بادشاہ کے گروہ کی طاقت ہے.....''

''لیکن اس طرح کب تک چل سکتا ہے۔''

راجا نے کہا'' جب وہ تسلیم کرے گا کہ ہم بھی برابر کی طاقت ہیں اور ہمیں نہ دبایا جا سکتا ہے اور نہ ختم کیا جا سکتا ہے..... ایسی ہر کوشش خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف ہو گی..... تو امن ہو جائے گا..... جیسے ہندوستان پاکستان اسی طاقت کے توازن کے باعث پرامن ہمسایوں کی طرح رہنے پر مجبور ہیں..... ایٹم بم ادھر ہے تو ادھر بھی ہے۔''

''ابھی تم کیا کرو گے..... معاملہ اس کی بیٹی ہے۔''

راجا نے کہا..... ''ایسی بیٹیوں کو یہ لوگ خود قتل کر دیتے ہیں..... ورنہ کرا دیتے ہیں مگر یہاں بھی مشکل یہی ہے کہ بیٹی وہ بے زبان مخلوق نہیں جسے رانا کے کلچر میں عورت بھی نہیں سمجھا جاتا..... جو بھیڑ بکری کی طرح ان کی پراپرٹی ہوتی ہے..... بیٹی ہے برٹش نیشنل..... رانا اچھی طرح سمجھتا ہے کہ اس کی طرف ٹیڑھی آنکھ سے دیکھنا بھی مہنگا پڑے گا..... اب دیکھیے وہ کیا کرتا ہے..... اپنی عزت کیسے بچاتا ہے..... کل تک بازی اس کے ہاتھوں تھی..... اب ہمارے ہاتھ میں ہے۔''

صبح کا اجالا ہنوز دور تھا..... میں نے ریشم سے کہا کہ وہ ہمیں کافی بنا کے لا دے..... راجا کے ساتھ میں برآمدے میں آ کے بیٹھ گیا..... باہر سکوت تھا لیکن اس کے پردے میں وہی ہولناک کشیدگی جو میدان جنگ میں عارضی سیز فائر کے بعد باقی رہتی ہے..... اس کے باوجود ہم پرسکون تھے۔

''کیا کمال ہے..... جو کام ہماری ڈپلومیسی سے نہ ہوا..... شامی بادشاہ کی طاقت نہ کر سکی..... قانون کی مدد سے ممکن نہ تھا..... وہ اکیلی شہناز نے کر لیا..... خود کر لیا۔'' راجا بولا۔

میں نے کہا'' میں اس کی ذہانت سے زیادہ اس کی ہمت کی داد دیتا ہوں..... اس نے اندازہ کر لیا ہو گا کہ باہر سے کوئی کچھ نہیں کر پائے گا..... اندر کے حالات کو اس کی نظر دیکھتی تھی..... اس نے اپنا پلان بنا لیا اور واقعی کمال کر دیا۔''

راجا ہنسا..... ''رانا جیسے بڈھوں کی عقل پر جادو کی ٹکڑی پھیرنا کسی بھی عورت کے لیے اتنا مشکل نہیں ہوتا..... ان کی ہوس ختم نہیں ہوتی..... جہاں موقع ملا ایک شادی کر لی..... حالانکہ شادی کی ان کے نزدیک کیا اہمیت ہے..... عیاش لوگ ہیں۔''

میں نے کہا..... ''دراصل پہلی شادی تو ہو جاتی ہے خاندان میں..... اپنی پسند سے یہ دوسری کرنے میں بھی دیر نہیں لگاتے..... پھر تیسری بیوی کے بارے میں سنا ہے کہ پڑھی لکھی اور خوبصورت تھی..... پھر بھی شہناز کی طرح ڈاکٹر تو نہیں تھی..... رانا کی نیت کا فتور تو شہناز پر پہلے ہی ظاہر ہو گیا ہو گا..... لیکن حویلی میں دوسری بیویاں تھیں اور بیٹے بیٹیاں تھے..... ان کی موجودگی میں زبردستی نہیں ہو سکتی تھی..... شہناز نے اس کی نیت دیکھتے ہوئے جال بچھایا ہو گا..... ظاہر یہ کیا ہو گا کہ وہ پھنس گئی..... پھانس لیا رانا کو.....''

''یہ بہت خطرناک گیم تھا..... رانا بہرحال کچھ عقل اور تجربہ رکھتا ہے۔ اس کے جوان بیٹے ہماری عمر کے ہیں..... اسے اناڑی سمجھنا بڑی بے وقوفی ہو گی..... وہ کھلاڑی ہے پرانا۔''

میں نے کہا'' ہاں..... اگر اسے ذرا سا بھی شک ہو جاتا شہناز کی نیت پر کہ وہ اسے بے وقوف بنا رہی ہے تو شہناز کو لینے کے دینے پڑ جاتے۔ نہیں اس نے بڑی ذہانت دکھائی اور ایسی چال چلی کہ اس کو لگا اس نے میدان

مارلیا۔ وہ سمجھا کہ اس کی دولت نے میدان مارلیا ہے۔ غریب گھر کی لڑکی ڈاکٹر تو بن گئی مگر اس کے خواب ادھورے رہے۔ ایک صحافی اسے کہاں سے اسپتال بنوا کے دیتا۔ یہاں خیراتی اسپتال چلاتے ہیں صرف بے روزگار جو شہرت اور دولت شہر میں حاصل ہو سکتی تھی یہاں کہاں؟ رانا کو اپنا فائدہ نظر آیا۔ ایک نوجوان' خوبصورت اور اعلیٰ تعلیم یافتہ بیوی حاصل کرنے کے لیے یہ زیادہ قیمت نہیں تھی۔ علاقے میں فی الحال کوئی فری اسپتال بننے کا منصوبہ ختم ہو جاتا۔ ہماری ناک کٹ جاتی...... ہم کسی کو بھی منہ دکھانے کے قابل نہ رہتے۔ اس کے دماغ میں آئی ہوگی کہ یہ عورت ہائی سوسائٹی میں اسے آگے بڑھا سکتی ہے۔ اس نے شہناز کو دانہ ڈالا کہ میں تمہیں سینیٹ میں پہنچاؤں گا اور شہناز نے ظاہر بھی یہ کیا ہوگا کہ اس نے دانہ چگ لیا۔ جو دانا شہناز نے ڈالا وہ رانا نے قبول کرلیا تو شہناز کا پلان کامیاب ہو گیا۔

''اب یہ خود ہی بتائے گی کہ اس نے یہ مشکل کام کیسے کیا۔''

''آخر میں اس کی مدد کے لیے گل آگئی...... بیٹی کے معاملے میں راجا کمزوری کا شکار ہو گیا۔''

راجا نے کہا ''اب وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے تو بیٹھا نہیں رہ سکتا۔

''اس وقت ہی وہ پریشان ہوگا کہ اپنی عزت کیسے بچائے' ہم سے کیسے بات کرے' شہناز کا صدمہ تو برداشت کرنا ہی پڑے گا' ہم جیسے دشمن نہتے بھی ہونتے رہیں۔ گھر میں دو بیویاں ہیں۔ بیٹے اور بیٹیاں ہیں۔ وہ بھی پیٹھ پیچھے مذاق ضرور کریں گے کہ ڈاکٹرنی کیسے راجا کو چکمہ دے کر نکل گئی۔''

''اصل مسئلہ ہوگا بیٹی کا۔ وہ دشمن کے ساتھ رہے۔ اس سے زیادہ جگ ہنسائی اور بے عزتی کی بات نہیں ہو سکتی۔ وہ ہر قیمت پر چاہے کہ بیٹی واپس ہو جائے۔ یہ خبر دنیا کو معلوم ہونے سے پہلے دبا دی جائے۔''

اس نے کہا ''کس منہ سے بات کرے گا...... اور کب۔''

راجا نے نفی میں سر ہلایا ''اب بات نہیں ہو سکتی فیکے پتر' بہت ذلت اٹھائی شہناز نے اور اس کے ساتھ میں نے' ہم سب نے' بہت اذیت دی اس نے ہمیں۔ اب اس کا حساب چکانے کا وقت آگیا ہے۔ ذرا سوچ ہم نے کیا نہیں کیا' ہم فوراً اس کی منت سماجت کرنے گئے تھے...... حرامزادہ کس تیور سے بات کرتا تھا۔ کل ہی دیکھا تو ہے کیسے آسمان پر دماغ تھا اس کا۔ شہناز کے ہاتھوں ہماری بے عزتی کو کتنا انجوائے کر رہا تھا' اس کا بس چلتا تو یہ رسوائی کا تماشا ٹی وی پر دکھاتا۔''

''ہمیں کیا کرنا چاہیے راجا۔ اس کے سامنے شرائط رکھیں۔ آئندہ کے لیے پرامن بقائے باہمی کا معاہدہ کرنا چاہیے۔''

''یہ سب بے کار ہے۔ وہ کسی وعدے کی ضمانت پر کاربند رہنے والا نہیں ہے۔ اس کے علاوہ...... گل پر اس کا زور نہیں چل سکتا تو ہم کیا کر سکتے ہیں...... کیا ہمارے سمجھانے سے وہ واپس چلی جائے گی......'' راجا نے کہا۔

''میں ایسی کوشش ہی نہیں کروں گا...... اب گل کو واپس بھیجنا اسے موت کے منہ میں دھکیلنے کے مترادف ہے...... یہ لوگ اسے ماردیں گے...... اس یقین پر کہ ہم اپنے سیاسی اثر و رسوخ سے معاملہ دبا دیں گے۔'' میں نے کہا۔

''راجا بولا ''فیصلہ وہ خود کرے گی لیکن میں کسی مصلحت سے کام نہیں لوں گا اور نہ گل کے بارے میں سوچوں گا۔ میں شہناز کے ساتھ پولیس اسٹیشن جا کے اغوا کی ایف آئی آر درج کراؤں گا...... گواہی میں پہلا نام گل کا ہی دوں گا۔''

''وہ باپ کے خلاف گواہی دے گی۔''

''میرا خیال ہے کہ دے گی...... اس کی تربیت رانا کی حویلی میں نہیں برطانیہ میں ہوئی ہے جہاں سچ بولنا سکھایا جاتا ہے۔ اس نے یہاں آ کے جو دیکھا وہ بھی اسے باپ کے خلاف کرنے کے لیے کافی ہے۔ اگر اس نے شہناز کے حق میں بیان دے دیا کہ اسے رانا نے حویلی میں بند کر رکھا تھا تو سمجھو رانا کے خلاف ناقابل ضمانت وارنٹ جاری ہو جائیں گے۔ اس کی گرفتاری یقینی ہے۔ گواہ بہت ہیں۔ وہ سب جنہوں نے رانا کی حویلی کے اندر ایک مہینے تک شہناز کو دیکھا۔''

میں نے کہا ''کیس تو بہت مضبوط ہے۔''

''یہ رانا کا پتا صاف کرنے کا بہترین موقع ہے۔ ہم اسے بھی رعایت نہیں دے سکتے...... آپ سمجھ لیں نواب صاحب کہ وہ آپ کا سیاسی حریف ہے...... آئندہ انتخابات میں یہ سبقت آپ لیں گے۔''

میں نے راجا سے کہا ''اچھا بھئی ہم تو جا رہے تھے بوریا بستر سمیٹ کر۔''

راجا مسکرایا ''کل جو لیکچر پروفیسر صاحب نے آپ کو دیا۔ میں نے بھی سنا تھا۔ میں باہر کھڑا تھا...... اندر آنے کی ہمت نہیں پڑی...... لیکن اس سے میرے نہایت ہلچل پیدا ہوئی۔ انہوں نے جو بھی کیا میری سمجھ میں آیا اور اب جانے کا کیا سوال جب شہناز آگئی ہے......''

میں نے کہا ''ایک دن فریال بھی آجائے گی۔''

''مایوسی واقعی گناہ ہے فیکے پتر...... نیت صاف ہو تو پھر خدا کی مدد شامل حال ضرور ہوگی......''

''ست بدھائی کا ترقیاتی پروگرام ضرور کامیاب ہوگا۔'' میں نے کہا۔

میرے فون کی گھنٹی بجی تو میں نے وقت دیکھا' صبح کے ساڑھے چھ بج چکے تھے...... آخر اس وقت فون کرنے والا کون ہو سکتا ہے۔ میں نے سوچا...... یہ نمبر میرے لیے اجنبی تھا۔

میں نے بٹن دبا کر کہا ''ہیلو......!''

''مجھے نواب رفیق احمد شیرازی سے بات کرنی ہے۔'' کسی نے کہا۔

میں نے کہا ''میں بول رہا ہوں......''

اس نے کہا ''نواب صاحب...... میں سیف علی بول رہا ہوں میں آپ کے والد صاحب کا دوست ہوں اور فاروقی صاحب کا بھی...... میں خود بھی سپریم کورٹ کا وکیل ہوں۔''

میں نے کہا ''جی فرمائیے۔''

''مجھے آپ سے کچھ بات کرنی تھی......'' اس نے شہد سے زیادہ میٹھے اور ملائم لہجے میں کہا۔

''مجھے کچھ شبہ ہوا...... ''کس سلسلے میں۔''

''دیکھیے نواب صاحب...... تفصیل تو ملاقات پر بتاؤں گا...... جس کا مقصد [illegible] مصالحت ہوگا...... کچھ مخاصمت...... غلط فہمیوں کو دور کر [illegible] بہتر بنانا......''

میں نے کہا ''کس کے در[illegible] جا کو آنکھ ماری۔

''آپ کے اور ہمارے دوست درمیان......''

میں نے اس کی بات کاٹ دی ''سیف [illegible] اپنا اور میرا وقت ضائع مت کریں۔ آپ اگر ان [illegible] بھی کرتے ہیں تو بہتر ہوگا کہ ان کے دفاع کی تیار[illegible] اور ان کی ضمانت پر رہائی کے لیے۔''

''وہ کس سلسلے میں...... کیا کیس ہے ان پر۔''

میں نے کہا ''اس کی تفصیلات آپ کو پریس سے بھی مل جائیں گی۔ کل تک۔''

اس نے کہا ''دیکھیے نواب صاحب' میں ان کی طرف سے درخواست کرتا ہوں۔''

میں نے کہا ''آپ مت کریں...... ان سے کہیں کہ خود

حاضر ہوں درخواست لے کر۔ ڈاکٹر شہناز اگر انہیں معاف کردے تو یہ خوش قسمتی ہوگی ان کی لیکن اس کا کوئی امکان مجھے نظر نہیں آتا۔"

"دیکھیے وہ عزت دار آدمی ہیں۔"

"لیکن کسی اور کو نہیں سمجھتے۔ اب ہر بات انہیں سمجھایئے کہ وقت آگیا ہے۔"

وہ بولا "اس کا نقصان آپ کو ہی ہوگا۔"

"کیا نقصان ہوگا' سیف صاحب...... ہماری پگڑی نیچی ہوجائے گی' تمہیں نہیں معلوم ہماری کیا چیز چھن جائے گی؟ خاندانی سیٹ۔ ہمارے نام کی دہشت۔ جھوٹی عزت کا غرور۔ ہمارے پاس ہے کیا......"

"آپ بہت غصے میں ہیں نواب صاحب اور ہونا بھی چاہیے...... لیکن آپ ذرا خود کو ان کی جگہ رکھ کر سوچیں...... وہ جیسے بھی ہیں ایک باپ ہیں۔"

میں نے ایک مصنوعی قہقہہ لگایا "ابھی تو میری شادی بھی نہیں ہوئی' وکیل صاحب!"

"ان کی بیٹی گل رعنا آپ کے پاس ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ...... یہ آپ سے کس نے کہہ دیا...... یہ تو بہت سنگین الزام ہے۔"

"نواب صاحب ...... پھر بیٹی کو باپ کے گھر ہونا چاہیے۔"

"ہونا تو بہت کچھ چاہیے مثلاً کسی لیڈی ڈاکٹر کو اغوا نہیں ہونا ہے...... اسے کسی رانا کی حویلی میں بند نہیں ہونا چاہیے...... جو ہوتا رہا وہ نہیں ہونا چاہیے مگر اب بہت دیر ہوگئی ہے...... پچھتاوے یا معافی تلافی کے لیے...... ظاہر ہے ہر بات وقت پر ہوسکتی ہے...... وقت گزرنے کے بعد نہیں ہوسکتی......"

"میں صرف گل رعنا کی بات کرنا چاہتا تھا۔"

"لیکن میں کوئی بات نہیں کرنا چاہتا...... نہ رانا سے نہ آپ سے...... رہی گل رعنا کی بات...... تو وہ بالغ عاقل اور خود مختار ہے...... وہ باپ کے گھر میں رہے یا کہیں اور' اس کی مرضی...... کون مجبور کرسکتا ہے اسے...... ایک اور خطرہ ہے سیف صاحب کہ کبھی وہ باپ کے خلاف گواہی دینے نہ کھڑی ہو جائے...... آپ تو جانتے ہوں گے کہ وہ برٹش نیشنل ہے...... حویلی میں اس کی پرورش نہیں ہوئی...... باپ کا یہ رویہ اس نے اب دیکھا ہے اور سمجھتی ہے کہ بہت قابل شرم ہے۔"

اس نے مردار آواز میں کہا "اگر وہ خود بات کرنا چاہیں۔"

"کوشش کرکے دیکھ لیں...... یہاں آکے ہاتھ جوڑیں' پاؤں پڑیں...... زندگی میں جو دوسروں سے کراتے رہے...... خود بھی کریں تو شاید عزت بچ جائے ورنہ تو اب جیل جانے کی تیاری کریں۔" میں نے کہا اور فون بند کردیا۔

راجا نے مجھ سے ہاتھ ملایا...... "آ گیا ناں اونٹ پہاڑ کے نیچے! یہ کون اُلّو کا پٹھا تھا جو اس کا حمایتی بن کر بات کررہا تھا۔"

"مسٹر سیف علی...... ایڈووکیٹ سپریم کورٹ۔"

اسی وقت فون پھر بولا...... میں نے نمبر دیکھا "لے بھئی راجا...... اس مرتبہ لندن سے فون آیا ہے...... ٹونی بلیئر کی سفارش......"

"دیکھ لے کوئین الزبتھ کا نہ ہو۔"

میں نے کہا "ہیلو!"

دوسری طرف سے آواز آئی "میں ڈاکٹر شائستہ بول رہی ہوں۔

میرے ذہن کو زبردست جھٹکا لگا "آپ کیسی ہیں؟"

اس نے ہمیشہ کی طرح سپاٹ لہجے میں کہا "فریال کہاں ہے...... میری اس سے بات کراؤ۔"

میں نے کہا "فریال...... وہ تو نہیں ہے اس وقت۔"

"کہاں گئی ہے...... مجھے نمبر دو......" اس نے مجھے حکم دیا۔

"میں نمبر بھی نہیں دے سکتا۔"

"کیوں؟ وہ خیریت سے تو ہے ناں...... اس نے فون کیا تھا مجھے۔"

میں نے کہا "کہاں سے۔"

"مجھے نہیں معلوم۔ وہ چاہتی تھی کہ میں اسے لندن بلالوں۔ ٹکٹ بھیج دوں اسے۔ کیا وہ تمہارے ساتھ نہیں ہے۔"

میں نے کہا "وہ مجھ سے ناراض ہوکر چلی گئی ہے۔"

"کہاں چلی گئی ہے؟...... ایسی کیا بات ہوگئی آخر کہ...... اس نے مجھ سے روتے ہوئے کہا کہ وہ سلطان سے شادی کرلے گی۔ اگر اسے ویزا نہ ملا یا اس کے پاس ٹکٹ نہ ہوا...... ایک منٹ ٹھہرو میں دیکھ لوں اس نے کہاں سے فون کیا تھا۔ ہاں یہ ہے نمبر۔"

میرا سر گھومنے لگا کسی کوڈ نمبر کے حساب سے یہ گجرات کا نمبر تھا اور سلطان بھی گجرات میں تھا۔

ڈاکٹر شائستہ کی آواز نے مجھے حقائق کی دنیا میں کھینچ لیا۔ "رفیق...... آر یو ویر آن لائن...... تم نے نمبر نوٹ کیا......؟"

"ہاں...... فون نمبر گجرات کا ہے اور سلطان کا آبائی گھر اور گاؤں بھی گجرات میں ہے...... لیکن یہ ناممکن ہے۔"

"کیا ناممکن ہے۔"

"یہی کہ اس نے سلطان سے شادی کا فیصلہ کرلیا ہے...... اگر وہ کہتی کہ وہ خودکشی کرلے گی تو...... یہ ہوسکتا تھا۔"

"نہیں...... اس کا مطلب ہے تم فریال کو نہیں جانتے...... وہ ایسی لڑکی نہیں ہے جو خودکشی کا سوچے۔"

میں نے کہا...... "ڈاکٹر صاحبہ...... غصے کی دیوانگی میں فریال جیسی لڑکی بھی ایسا کہہ سکتی ہے...... بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ کرسکتی ہے...... لیکن وہ لوٹ جائے سلطان کی طرف...... اور اس سے شادی کی بات کرے...... یہ میں نہیں مان سکتا۔"

"برا نہ مانو تو ایک بات کہوں......"

"کیا فرق پڑتا ہے تمہیں میرے برا ماننے یا نہ ماننے سے۔"

"فریال کی جگہ میں ہوتی تو......"

میں نے برہمی سے کہا "لیکن تم نہیں ہو...... اس لیے چھوڑ دو یہ فرض کرنے والی بات...... مجھے بتاؤ اس نے اور کیا کہا۔"

وہ رکھائی سے بولی۔ "جو اس نے کہا' وہ میں نے تمہیں بتادیا۔"

"میرا خیال ہے وہ نارمل نہیں ہوگی۔ شاید ہسٹریا کے زیر اثر ہوگی؟"

"رفیق صاحب...... اس کی کوئی وجہ تو ہوگی۔"

میں نے کہا "کیا اس نے تمہیں کچھ نہیں بتایا؟"

"بتایا ہوتا تو تم سے کیوں پوچھتی میں۔"

میں نے کہا "بڑی عجیب بات ہے...... اگر وہ رو رہی تھی تو تم نے پوچھا نہیں کہ رو کیوں رہی ہو......؟ جب اس نے کہا کہ وہ سلطان سے شادی کرلے گی تو کیا تم نے سوال نہیں کیا کہ ایسی کیا بات ہوگئی...... تم تو رفیق سے شادی کرنے پاکستان گئی تھیں؟"

"اس نے کہا کہ وہ لندن آکے بتائے گی۔"

"پھر بھی...... اس نے کوئی ایڈریس...... کوئی فون نمبر دیا ہوگا تمہیں...... آخر کہاں بھیجو گی تم اسے ٹکٹ! کیسے بتاؤ گی کہ تم نے ٹکٹ بھیج دیا ہے جب اس کا کوئی پتا ٹھکانا نہیں......!"

"میں سچ بتا رہی ہوں تمہیں...... اس نے بڑی عجلت میں بات کی...... کہا کہ وہ پھر بات کرے گی...... اور فون بند کردیا...... یا شاید لائن کٹ گئی۔"

"ایسا تو نہیں کہ لائن کاٹ دی گئی ہو!"

"میں کیا بتاسکتی ہوں شاید اس نے کسی پی سی او سے بات کی تھی۔ وہ پھر لائن ملا سکتی تھی...... مگر لائن میں کوئی گڑبڑ تھی۔ اس کے بعد میں نے فوراً اسی نمبر پر بات کرنے کی بہت کوشش کی مگر لائن نہیں ملی پھر دس منٹ بعد ملی تو کسی مرد نے کہا کہ یہاں کوئی فریال نہیں اور فون بند کردیا۔ کوئی بہت بدتمیز شخص تھا۔ میں نے دوبارہ پوچھا تو کہنے لگا کہ بی بی آپ کیا انکوائری کررہی ہو...... میرے پاس فالتو وقت نہیں ہے۔"

میں نے کہا "بعض پی سی او والے جاہل ہوتے ہیں۔"

"ابھی تک تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا ہے۔"

"کون سے سوال کا!"...... میں نے کہا۔

وہ بولی۔ "میں نے فریال کے ناراض ہوکر جانے کی وجہ پوچھی تھی۔"

میں نے ایک گہری سانس لی...... "مجھے پتا ہے تم یقین نہیں کروگی۔"

"یہ تم نے پہلے سے فرض کرلیا ہے۔" وہ طنز سے بولی۔

"ایک تو تم عورت ہو...... پھر اس کی سہیلی بھی۔ بہر حال ...... تم یقین کرو یا نہ کرو...... لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی...... جس پر فریال نے یہ انتہائی قدم اٹھایا اور کسی کو کچھ بتائے بغیر چلی گئی...... یہ محض ایک غلط فہمی تھی۔"

شائستہ نے تلخ لہجے میں کہا "کتنا آسان ہوتا ہے یہ کہنا...... تم نے تو فیصلہ ہی کردیا کہ بات صرف غلط فہمی کی تھی...... یعنی فریال نے غلطی کی...... تم نے کچھ نہیں کیا...... ان چھ برسوں میں اسے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی جب تم یہاں تھے حالات کا مقابلہ کیا...... جب وہ تمہارے ساتھ تھی تمہارے گھر میں تھی تو غلط فہمی کا شکار ہوگئی...... اور وہ بھی ایسی کہ تمہیں چھوڑ کے چلی گئی۔"

میں نے ضبط سے کام لیا۔ "دیکھو ڈاکٹر شائستہ...... اسے غلط فہمی نہ کہو...... شکایت سمجھ لو...... ساتھ رہنے سے ایسا ہوا...... مثلاً ایک شکایت یہ تھی کہ میں اب اس سے شادی کے معاملے میں ٹال مٹول سے کام لے رہا ہوں...... حالانکہ ایسا ہرگز نہیں تھا۔"

"تم یہ شکایت آسانی سے رفع کرسکتے تھے۔"

"اب میں تمہیں کیا بتاؤں ...... حالات کی مجبوری نہ

ہوتی تو میں ایک منٹ کی تاخیر بھی نہیں کرتا۔''

''معاف کرنا میری سمجھ میں تمہاری بات نہیں آئی..... اس نے چھ سال انتظار کیا..... ابھی اسے لندن سے گئے چھ مہینے ہوئے ہیں..... وہ ایسی بے صبری نہیں تھی..... اسے تم پر پورا بھروسا تھا..... وہ خود بھی حالات دیکھ رہی ہوگی اور تم نے سمجھایا بھی ہوگا اسے کہ دیر ہو رہی ہے تو کیوں ہو رہی ہے۔''

میں نے کہا ''اگر میں نے ساری صفائی فون پر پیش کی تو صبح سے شام ہو جائے گی..... اس کی ناراضی کی اصل وجہ غلط فہمی تھی۔ میں یہ لفظ استعمال کرنے پر مجبور ہوں۔''

''کیسی غلط فہمی۔''

''وہ بلا وجہ اس وہم میں مبتلا ہوگئی تھی..... کہ شادی کو میں اس لیے ٹال رہا ہوں..... کہ میں اب شادی کرنا ہی نہیں چاہتا۔''

''اس کے ایسا سمجھنے..... یا اس وہم میں مبتلا ہونے کی بھی کوئی وجہ تو ہوگی رفیق۔''

میں نے کہا ''شائستہ..... اگر کوئی بات دنیا میں ناممکن ہے..... تو فریال سے بے وفائی کرنا..... یا اس کے بارے میں ایسا سوچنا..... کہ اب مجھے اس کی ضرورت نہیں رہی..... اگر اس نے سخت حالات میں میرا ساتھ نہیں چھوڑا تو یہ بھی سوچو کہ میں اس کی محبت میں کتنا ثابت قدم رہا..... عائشہ کا سارا کیس تمہاری نالج میں ہے..... اس کی دیوانگی کی کوئی انتہا تھی..... وہ میرے ساتھ پاکستان آنے کے لیے تیار بیٹھی تھی..... اپنا گھر اپنا مذہب اپنا ملک اور شان و شوکت کی زندگی..... سب چھوڑ کے میرے ساتھ ست بدھائی میں رہنا اسے منظور تھا.....''

''وہ سب مجھے معلوم ہے..... لیکن وہ بات تو ختم ہوگئی تھی..... اب یہ شک کیوں ہوا فریال کو کہ تم اس سے بیوفائی کے مرتکب ہو رہے ہو.....؟''

میں نے کہا ''میں تم سے کچھ چھپاؤں گا نہیں..... کیونکہ اس سے کہیں زیادہ خود فریال تمہیں بتا دے گی..... کچھ وہ جو سچ ہے..... کچھ وہ جسے فریال سچ سمجھتی ہے..... ایک تو ہماری لغزش..... بے احتیاطی..... اسے تم جو نام چاہو دے سکتی ہو۔ لندن میں یہ سب میں نے نہیں ہونے دیا..... حالانکہ فریال کو قطعی اعتراض نہ تھا بلکہ الٹا اسے مجھ سے گلا تھا کہ میں پارسائی کے دقیانوسی فلسفے کو اتنی اہمیت کیوں دیتا ہوں..... شادی تو کرنی ہے بالآخر..... خیر..... جب وہ یہاں میرے گھر میں..... جسے سب حویلی کہتے ہیں..... میرے ساتھ رہنے آئی..... تو حالات پر میرا اختیار نہ تھا اور ہم..... یوں سمجھو کہ میاں بیوی کی زندگی گزارنے لگے..... نکاح سے پہلے.....''

''اور اس کے نتیجے میں وہ پریگننٹ ہوگئی؟''

''بس..... دیٹ واز نیچرل.....''

''اور اس کے بعد تم نے دنیا کے ڈر سے اس کو ابارشن پر مجبور کیا؟''

میں نے کہا ''نو..... نیور..... اس کا دماغ خراب ہوا ایک اور عورت کی وجہ سے..... وہ سمجھنے لگی کہ میرے اس سے مراسم ہیں..... مراسم یقیناً تھے لیکن صرف... کاروباری۔

''کون تھی وہ عورت؟''

''اب فون پر کیا کیا بتاؤں..... ابھی تم میری ایک بات دھیان سے سنو..... تم اسے فوراً اپنے پاس لندن بلالو..... اس کے بعد میں بھی آجاؤں گا..... جو بھی گلا شکوہ ہوگا تمہارے سامنے ہوگا..... پھر تم جو فیصلہ کروگی..... جو سزا دوگی مجھے منظور۔''

اس نے کہا ''یہ سب بعد کی بات ہے..... میں اسے بلاؤں کیسے؟''

میں نے کہا..... ''تم اسے ٹکٹ بھیجو..... ٹکٹ تو میں بھی یہاں سے ارینج کر دوں مگر میرے پاس اس کا پتا نہیں ہے..... اور نہ مجھے اس کا کوئی ٹھکانا معلوم ہے..... میری معلومات کے مطابق ایسی کوئی جگہ نہیں..... جہاں وہ جا سکے اور محفوظ بھی رہے..... مجھے کچھ پتا نہیں اس وقت وہ گجرات میں ہے تو کیوں.....''

''اس کا فون آنے کے بعد ہی میں ٹکٹ بھیجوں گی۔''

میں نے کہا..... ''مجھے ایک بات کا خیال آیا ہے ابھی ابھی..... یہ ہوسکتا ہے کہ وہ ویزا لینے اسلام آباد جا رہی ہو..... بائی ٹرین..... اور گجرات ریلوے اسٹیشن پر ٹرین رکی ہو تو اس نے پلیٹ فارم پر بنے کسی پی سی او سے تمہیں کال کر دی ہو..... پوری بات اس لیے نہ کر سکی کہ لائن کٹ گئی..... یا ٹرین نے وسل دے دی..... ہر فاسٹ ٹرین چند منٹ کے لیے رکتی ہے گجرات میں۔''

''یس..... یہ ہوسکتا ہے۔''

''تمہارے پاس عائشہ کا فون نمبر ہے؟..... یا اس کے باپ کا؟ اچھا چھوڑو..... میں خود بات کر لیتا ہوں.....''

''مجھے بتاؤ کیا کہنا ہے ان سے.....''

''عائشہ سے کہنا..... وہ اپنے باپ سے کہے..... کہ فریال اگر لندن کے ویزا کے لیے اپلائی کرتی ہے تو اسے

بلا تا خیر مل جائے...... لارڈ ارنسٹ تو نصلیٹ میں کسی کو فون کر دے...... عائشہ کی ماں کا کوئی پرانا دوست بھی ہے یہاں کسی اچھے عہدے پر...... ویزا میں دیر لگ جاتی ہے عموماً...... جیسے ہی وہ لندن پہنچے گی...... میں بھی آ جاؤں گا۔"

"او کے...... میں جو کر سکتی ہوں کروں گی۔"

"جب وہ تمہیں بتا دے گی...... تو تم مجھے بھی بتا دینا۔"

شائستہ نے کہا...... "میرا خیال ہے نہیں...... شاید وہ ابھی ایسا نہیں چاہے گی...... ہاں اس کے آنے کی خبر میں تمہیں ضرور دوں گی......"

"تھینکس شائستہ...... مجھے خیال آیا تھا کہ ہمارے درمیان تم ایک ایسا پل ہو جس پر بھروسا کیا جا سکتا ہے...... شاید واحد پل ہو...... خدا حافظ۔"

شائستہ نے خدا حافظ بھی نہیں کہا اور فون رکھ دیا...... میں جانتا تھا کہ وہ کتنے روکھے طریقے سے بات کرتی ہے...... بعض اوقات نام کے برعکس اس کا رویہ مجھے غیر شائستہ محسوس ہوتا تھا لیکن آج مجھے احساس ہوا کہ فریال کے لیے اس کے جذبات کیا ہیں...... وہ اس کے لیے اتنی دکھی تھی کہ مجھے فون کرنے پر مجبور ہوگئی...... وہ مایوسی کے گھپ اندھیرے میں روشنی کی کرن بن گئی تھی۔

راجا نے یہ ساری گفتگو سنی تھی...... اس نے میرے خیال سے اتفاق کیا کہ فریال کی لندن میں اپنی سہیلی سے گفتگو گجرات کے ریلوے اسٹیشن سے ہوئی ہوگی ورنہ اس کے گجرات جانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جہاں سلطان کو اس کی موجودگی کی خبر مل جاتی تو فریال ایسی غائب ہوتی کہ پھر کسی کو اس کی خبر نہ ملتی...... فریال نے سلطان سے شادی کے بارے میں جو بیان دیا تھا، اس کی حیثیت راجا کے نزدیک بھی کچھ نہ تھی...... غصے اور جنون میں آدمی کچھ بھی کہہ سکتا ہے۔

فریال کے لیے میرے دل میں جذباتی انتشار کے بہت سے پہلو تھے۔ میں اس سے برہم تھا کہ مجھے صفائی پیش کرنے کا پورا موقع دیے بغیر اس نے ایک انتہائی قدم اٹھا لیا...... مجھے خود سے ندامت تھی کہ عواقب پر غور کیے بغیر میں نے ایسے کام کیے جو فریال کی بدگمانی اور برگشتگی کا سبب بنے...... مجھے افسوس تھا کہ حسد میں مبتلا ہو کہ وہ کسی جاہل اور بے وقوف عورت کی عامیانہ سطح پر آ گئی اور اس نے فون پر نور جہاں کو گالیاں دیں...... مجھے پریشانی تھی کہ مجھ سے بے تعلق ہو جانے کا فیصلہ کہیں خود اس کے لیے سزا نہ بن جائے...... جب کہ سزا وہ مجھے دینا چاہتی تھی......

تاہم شائستہ کے فون نے میرے دل میں امید کی ایک کرن پیدا کر دی اور میرے لیے سکون کا کچھ سامان فراہم ہوگیا...... اسی روز راجا نے اپنے ذرائع استعمال کرتے ہوئے یہ بھی معلوم کر لیا کہ گجرات کے جس نمبر سے فریال نے لندن میں اپنی سہیلی کو فون کیا تھا، وہ ریلوے پلیٹ فارم پر ایک پی سی او تھا...... شاید جانتے بوجھتے اس نے ایسا کیا تھا...... اسے یقین ہوگا کہ میں اس کا سراغ لگانے کی کوشش میں ہر جگہ فون کروں گا...... شائستہ سے مجھے معلوم ہوگا کہ فریال کا فون گجرات سے آیا تھا...... پھر وہ اس کی تصدیق کرے گی...... محض مجھے پریشان کرنے کے لیے اس نے یہ بیان بھی داغ دیا کہ وہ سلطان سے شادی کر لے گی...... اور اس لیے وہ گجرات پہنچی ہے...... غصے میں آدمی کی عقل ماؤف ہو جاتی ہے...... اسے اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور کیا کر رہا ہے...... کوئی اس کی بات مانے گا بھی یا نہیں......

لندن کا وقت پاکستان کے معیاری وقت سے پانچ گھنٹے پیچھے تھا۔ جب شائستہ نے اپنی بات ختم کی تو وہاں آدھی رات ہو چکی تھی جب کہ یہاں صبح صادق کے آثار عیاں ہونے لگے تھے۔ راجا کی طرح میں بھی ذہنی اور جسمانی تھکن سے بے حال تھا...... شہناز کی واپسی نے راجا کو جتنا سکون دیا تھا اتنا ہی مجھے لندن سے موصول ہونے والی ڈاکٹر شائستہ کی کال سے ملا تھا۔ فریال کا سراغ مل گیا تھا اور یہ یقین بھی حاصل ہو گیا تھا کہ وہ لندن ہی جا رہی ہے...... جیسا کہ میں نے سوچا تھا...... لندن سے ہی اسے منا کے واپس لا سکتا ہوں۔

ہم دوپہر تک سوتے رہے...... پھر میں نے اٹھ کے دیکھا تو حویلی کے اندر کا موسم اور ماحول گزشتہ روز بلکہ گزرے ہوئے پورے مہینے کے مقابلے میں خوشگوار تھا...... ریشم نے حویلی کے کسی کمرے سے فولڈ ہو جانے والی ایزی چیئرز نکال کے برآمدے میں لگا دی تھیں اور ان پر اماں اور ابا بڑی فراغت کے ساتھ نیم دراز گل کی باتیں سن رہے تھے...... وہ تیسری کرسی پر سکون سے بیٹھی تھی...... مجھے اندازہ تھا کہ گل کے پاس بتانے کے لیے بہت کچھ ہے...... اپنی اس زندگی کے بارے میں جو اس لندن میں گزاری تھی اور اس مختصر مدت کے بارے میں جو اس نے یہاں رانا صاحب کی حویلی میں گزارا تھا...... رانا صاحب کی رانی بیٹی کے مشاہدات اور تجربات میں بھلا کسے دلچسپی نہ ہوتی۔

چوتھی کرسی خالی دیکھ کر میں بھی سامعین میں شامل ہو گیا لیکن یہ سلسلہ وقتی طور پر رک گیا...... ابا جی نے فریال کے

بارے میں سوال کر کے موضوع بدل دیا...... میں نے تفصیل سے گریز کرتے ہوئے صرف اتنا بتانا کافی سمجھا کہ فریال نے لندن میں اپنی سہیلی ڈاکٹر شائستہ سے بات کی تھی اور وہ شاید لندن جا رہی ہے۔

ابا جی نے کہا...... "شکر ہے...... ابھی وہ کہاں ہے؟"

میں نے کہا "کچھ پتا نہیں...... اس نے کسی پبلک کال آفس سے فون کیا تھا۔"

اماں نے آہستہ سے کہا "بس اب وہ لندن پہنچ جائے تو تم جاؤ اور اسے لے آؤ......"

ابا نے تائید کی...... "اور تم سمجھتے ہو کہ وہ تمہارے کہنے سے واپس نہیں آئے گی تو ہم جا کے اسے لائیں گے...... میں بہت فکرمند ہوں اس کے لیے۔"

اماں نے سر ہلایا۔ "ہماری بیٹی نے بہت دکھ جھیلے ہیں۔ تمہاری بے وقوفی کی وجہ سے۔"

"بے شک قصوروار ہم بھی ہیں...... کہ تمہارے ذاتی معاملات میں دخل دینے سے گریز کیا...... تمہیں بہت ڈھیل دی...... ورنہ یہ قصہ کب کا نمٹ جاتا...... حالات کو عذر بنا کے آدمی کسی بھی کام کو جب تک چاہے ٹال سکتا ہے۔"

اس سے پہلے کہ میری نالائقی اور کوتاہی پر ناخوشی کے اظہار کا سلسلہ سرزنش تک جاتا، میں نے ایک وقفے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے گل سے سوال کر لیا...... "تم بہت بہتر لگ رہی ہو اب......"

اس نے بے چینی سے پہلو بدلا...... "لیکن یہ سچویشن پہلے سے زیادہ خطرناک لگتی ہے مجھے۔"

میں نے کہا "درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا......"

وہ بولی...... "میری اردو بہت خراب ہے...... بس بات کر لیتی ہوں...... شاعری وغیرہ میری سمجھ میں نہیں آتی۔"

میں نے کہا۔ "سچویشن رانا صاحب کی اتنی خراب ہو گئی کہ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی...... اب وہ مصالحت کے بہانے تلاش کر رہے ہیں۔"

اس نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا۔ "پہلے میں اپنے باپ کو اتنا نہیں جانتی تھی...... اب یہ کہہ سکتی ہوں کہ وہ جھکنے والے آدمی نہیں ہیں...... خواہ نہ جھکنے سے وہ خود کو تباہ کر لیں......"

میں نے کہا...... "ہم نے اسے جھکنے پر مجبور کر دیا ہے گل...... ہم سب کی ہمت نے...... خصوصاً جو کام شہناز نے اور تم نے کیا...... اس کے بعد رانا صاحب کے غرور کی دیوار کو گرنے سے بچانا بالکل ناممکن ہو گیا ہے...... اس کی عزت داؤ پر لگی ہوئی ہے...... اس کے سامنے کوئی راستہ نہیں رہا۔"

"ایسا سمجھنا تمہاری خوش فہمی ہے......"

میں نے کہا "نہیں گل...... یہ حقیقت ہے...... اس کی طرف سے پیغام مل چکا ہے...... ہم سے کسی سیف علی خاں نے بات کی تھی۔"

گل چونکی۔ "یہ کون ہے؟"

"وہ خود کو رانا صاحب کا وکیل بتا رہا تھا...... سپریم کورٹ میں وکالت کرتا ہے...... اس نے بڑے گول مول لہجے میں بات کی...... کہنے لگا کہ آپ کے اور رانا صاحب کے درمیان جو غلط فہمیاں ہیں وہ دور ہونی چاہئیں۔"

"یہ تو ٹھیک کہا اس نے......" ابا جی بولے۔

میں نے کہا۔ "ابا جی...... یہ خیال انہیں پہلے کیوں نہیں آیا۔"

"رفیق میاں...... دیر آید درست آید...... چلو خیال اب آیا تو موقع سے فائدہ اٹھاؤ۔"

میں نے کہا...... "آپ اس کی چالوں کو نہیں سمجھ سکتے...... آپ بلاشبہ بہترین استاد تھے...... مثالی انسان ہیں...... لیکن گستاخی معاف...... سیاسی جوڑ توڑ اور رانا جیسے ضمیر فروشوں کی پہچان آپ کے بس کی بات نہیں۔"

وہ کچھ خفیف ہوئے۔ "ہاں...... یہ شاید ٹھیک کہا تم نے۔"

"اب وہ چاہتا ہے کہ ہم رانا سے ملیں...... پھر اس کے در دولت پر حاضر ہوں تا کہ اس کی انا کا قلعہ سلامت رہے...... وہ کہہ سکے کہ ہم ہی صلح صفائی کی درخواست لے کر حاضر ہوئے اور اس نے ازراہ لطف و کرم ہمیں معاف کر دیا...... نہیں ابا جی...... ہم اتنے اناڑی نہیں ہیں...... میں نے صاف انکار کیا تو اس کے وکیل نے کسی تیسری جگہ ملاقات کی تجویز پیش کی۔"

"اور تم نے وہ بھی مسترد کر دی......؟" وہ بولے۔

"میں نے بالکل ایسا ہی کیا...... وہ شخص کسی رعایت کا مستحق نہیں...... جو سلوک اس نے ہمارے ساتھ روا رکھا...... جو کچھ شہناز کے ساتھ کیا...... وہ بھلایا نہیں جا سکتا...... آج گردن آئی ہے شکنجے میں تو صلح کی بات کرتا ہے۔" میں نے غصے میں کہا۔

گل نے کہا۔ "تم نے اسے کیا جواب دیا۔"

"میں نے کہا کہ وکیل صاحب...... مصالحت کے چکر میں مت پڑو...... اپنے مؤکل کو ضمانت پر رہا کرانے کی فکر کرو...... ہم اس پر ڈاکٹر شہناز کے اغوا اور اسے حبس بے جا

میں رکھنے اور تشدد کا نشانہ بنانے کا کیس کر رہے ہیں......اور ہم دیکھیں گے کہ کون سی عدالت ایسے سنگین جرائم میں اس کی ضمانت قبول کرتی ہے۔''

ابا جی نے آہستہ سے کہا''رفیق...... یہ سب تم کیسے ثابت کرو گے؟ عدالت صرف الزام پر کسی کو نہیں پکڑتی......''

میں نے کہا......''بیان ہوگا ڈاکٹر شہناز کا......اس پر ایف آئی آر بھی درج ہوگی......شہناز کے کیس میں گواہی کے لیے ان سب کو طلب کیا جا سکتا ہے جو حویلی کے اندر خود کو قانون کی گرفت سے محفوظ سمجھتے ہیں......رانا کی دونوں بیویاں......اس کے بچے......بیٹے بیٹیاں......اس کے ملازم......ان سب نے شہناز کو رانا کی حویلی میں دیکھا......وہ سب دیکھا جو شہناز کے ساتھ ہوا......''

''لیکن ان کی گواہی پر انحصار کرنا تمہارے اناڑی ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے......'' ابا جی نے ناراضی سے کہا......''تم کیا سمجھتے ہو وہ رانا کے خلاف بیان دینے آئیں گے۔''

''کورٹ آرڈر پر انہیں آنا پڑے گا......رہی بات رانا کے خلاف بیان دینے کی......تو ایک ہوشیار وکیل باتوں باتوں میں سارے حقائق اگلوا لے گا۔ رانا کے لیے تو یہی بے عزتی کم نہیں ہوگی کہ اس کے اہل خانہ کو عدالت میں حاضر ہونا پڑے اور اس کے نمک خوار غلاموں کو اس کے خلاف گواہی دینے کے لیے کٹہرے میں بلایا جائے......ان سے وہ باتیں پوچھی جائیں گی جن کا تعلق حویلی کے اندر سات پردوں میں رہنے والوں کی زندگی سے ہوگا......''

''ایسا وہ کبھی نہیں ہونے دے گا......'' ابا جی نے کہا۔

''ابھی تو میں نے پہلی چال بھی نہیں چلی......آگے آپ دیکھتے جائیں کیا ہوتا ہے......اس کے خلاف ترپ کا پتا آپ کے سامنے ہے......'' میں نے گل کی طرف اشارہ کیا۔

گل چونکی......''میں......مجھ سے کیا چاہتے ہو تم......''

میں نے کہا......''سچ......صرف سچ اور سچ کے سوا کچھ نہیں......اگر تم سے کہا جائے کہ حویلی میں تم نے کیا دیکھا......شہناز کے ساتھ تمہیں کیوں فرار ہونا پڑا......تو تم کیا بتاؤ گی پولیس کو......''

''میں جھوٹ بہرحال نہیں بول سکتی......میں وہی بتاؤں گی جو میں نے دیکھا سنا یا محسوس کیا......'' وہ پُراعتماد لہجے میں بولی۔

میں نے مسکرا کر ابا جی کی طرف دیکھا اور اٹھ کھڑا ہوا ''میں دیکھتا ہوں راجا کہاں ہے؟''

گل نے کہا۔'' وہ یہاں شہناز کے ساتھ باتیں کر رہا تھا......پھر وہ ادھر چلے گئے......باغ میں ٹہلتے ہوئے......''

گل نے گوشۂ عافیت کی طرف اشارہ کیا......یہ باغ کے آخری حصے میں بیلوں سے ڈھکی ہوئی جگہ تھی......جب میں نے ست بدھائی کی حویلی کا چارج لیا تھا تو یہ ایک ویران کھنڈر جیسی جگہ تھی......اس کا چمن اجڑا ہوا ویرانہ تھا اور یہ جگہ رہنے کے قابل بھی نہ تھی لیکن صرف چھ ماہ میں اس کی کایا کلپ ہوگئی تھی۔ حویلی کی تزئین نو اور آرائش میں سب سے زیادہ دلچسپی فریال نے لی تھی۔ دن رات کی محنت نے باغ کا نقشہ ہی بدل دیا تھا۔ اس میں اب سرسبز لان تھے۔ مرکزی فوارہ چلتا تھا۔ ہر طرف رنگین پھولوں کے تختے تھے اور آخری حصے میں کھڑے ہوئے شکستہ لوہے کے ڈھانچے کی جگہ سرسبز شاداب بیلوں سے ڈھکا ہوا ایک کمرا سا بن گیا تھا جس کے سائے میں فرحت و ٹھنڈک اور سکون و خلوت کا انوکھا احساس ہوتا تھا۔

میں نے فوری طور پر شہناز اور راجا کی خلوت میں دخل انداز ہونا مناسب نہیں سمجھا......ان کے لیے جدائی کا ایک مہینا صدیوں کی دوری کا عذاب رکھتا تھا۔ شہناز نے اسیری میں کیا دکھ جھیلا۔ کیا محسوس کیا اور اب واپسی کے بعد اس کے خیالات کیا ہیں۔ شاید وہ راجا کے ساتھ یہی بات کر رہی تھی۔

شہناز کے لیے یہ زندگی کی نئی صبح تھی۔ راجا کے ساتھ وہ اپنے مستقبل کی راہ خود متعین کر سکتی تھی۔ میری باتوں نے گل کو بھی فکرمند کر دیا تھا۔ یہاں وہ عداوتوں کے کسی سلسلے کا حصہ بننے نہیں آئی تھی۔ وہ تاریخ پر ریسرچ کرنے اور اپنے باپ کی حویلی میں رہ کے اس کی شان و شوکت اور حاکمیت کے انداز دیکھنے آئی تھی۔ وہ اپنا کام مکمل کرتی، گھومتی پھرتی اور خوش و خرم لوٹ جاتی......لیکن قسمت نے اسے پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی احساس دلا دیا کہ اس کے عزائم کچھ بھی ہوں......تقدیر نے اسے دوسرے کھیل میں شامل کر دیا ہے۔

گل ایک ایسی لڑکی تھی جس کا عملاً پاکستان سے کوئی جذباتی رشتہ نہ تھا۔ وہ پاکستان کے بارے میں عام برطانوی شہری سے یا کسی سیاح کے مقابلے میں زیادہ معلومات رکھتی تھی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ رانا کی بیٹی تھی۔ یہ حسن اتفاق تھا یا مجبوری حالات تھی کہ گل کی ماں کو رانا کی ایک بیوی بن کے لندن میں رہنا پڑا......گل کی ساری پرورش اور تعلیم و تربیت برطانوی سوسائٹی کے ماحول میں ہوئی تھی......دو بار وہ پہلے پاکستان آئی تو رانا نے اسے کسی گائیڈ کی طرح پاکستان کے قابلِ دید حصے دکھائے، وہ ایک اجنبی ملک کی سیر

تھی......پاکستان گل کا نہیں اس کے باپ کا وطن تھا۔

گل یہ ضرور جانتی تھی کہ اس کا باپ کوئی عام پاکستانی نہیں۔ جیسے کہ لندن میں لاکھوں نظر آتے ہیں......وہ لینڈ لارڈ تھا اور اس کے ساتھ سیاست دان بھی تھا......گل کی پاکستان کے سیاسی یا معاشرتی حالات سے شناسائی نہ ہونے کے برابر تھی۔ وہ اتنا ہی جانتی تھی جتنا اسے بتایا گیا تھا اور یہ سمجھتی تھی کہ حاکم طبقے کی لابی میں شامل ہونے کے باعث اس کا باپ ایک حاکمانہ ذہن اور احساسِ برتری یا غرور والا مزاج رکھتا تھا۔

گل کو کیسے اندازہ ہو سکتا تھا کہ رانا صاحب کی سیاسی عداوتوں یا عداوتوں کی سیاست کی اصل حقیقت کیا ہے۔ اس نے باپ کے کہنے سے انڈین ہسٹری کا مضمون لے لیا اور اسے رہتاس کے قلعے پر اپنا تھیسس مکمل کرنے کے لیے پھر پاکستان آنا پڑا۔ عام حالات میں وہ رانا صاحب کی عملداری میں رانی بیٹی بن کر گھومتی اور کسی سے تعلق رکھے بغیر اپنا کام مکمل کر کے ولایت واپس چلی جاتی......اس کی باقی زندگی وہیں گزرتی اور اسے کبھی اندازہ نہ ہوتا کہ اس کے باپ کی شخصیت اور کردار کا ان دیکھا روپ کتنا گھناؤنا اور قابلِ نفرت ہے۔

یہ روپ اس نے حادثاتی طور پر دیکھا جب اسے باپ کی بداعمالی کا خمیازہ بھگتنا پڑا......ہم نے اسے شہناز کے بدلے میں اغوا کیا تھا۔ اسیری کے بعد ان ایام میں جو اس نے بحالتِ مجبوری ہمارے ساتھ گزارے، اسے اپنے اغوا کیے جانے کے اصل اسباب کا علم ہوا......اس کے ساتھ ہی ہمارے حسنِ سلوک نے اس کے دل پر ایسا اثر کیا کہ وہ اپنے باپ کے دشمنوں کی طرف دار ہوگئی......رہی سہی کسر ان چند دنوں میں پوری ہوگئی جو اس نے ہماری قید سے رہائی پانے کے بعد رانا کی حویلی میں گزارے تھے......اب وہ رانا کے نام سے نفرت کرتی تھی۔

مجھے اندازہ تھا کہ رانا کی حویلی میں اس وقت کیا ماحول ہوگا......حویلی کی آن اور عزت کے ٹھیکے دار خاندان کی عزت کے رکھوالے اور وارث سر جوڑ کے بیٹھے سوچ رہے ہوں گے، دشمن نے گھر کے بندوں کے ساتھ مل کر بڑا کاری وار کیا ہے......رانا کسی زخم خوردہ ناگ کی طرح پھنکار رہا ہوگا کہ جس گل کو وہ اپنی بیٹی سمجھتا تھا، وہ کسی اور کا گندا خون نہ ہوتی تو یوں پیٹھ میں خنجر گھونپ کے نہ جاتی......شہناز تو مالِ غنیمت کی طرح تھی......بھاگ گئی تو افسوس صرف اس بات کا ہے کہ اس کے ساتھ عزت اور شرافت کا برتاؤ کیوں کیا......پہلے دن ہی اس کی عزت اتار کے اسے بتا دیا جاتا کہ ڈاکٹر ہونے سے وہ کوئی خاص چیز نہیں ہوگئی......عام استعمال کی چیز ہے......لیکن بنیادی سوال اپنی جگہ کہ اب خاندانی عزت کا جنازہ سرعام اٹھنے سے کیسے روکا جائے؟

میرا خیال تھا کہ رانا کا وکیل سیف علی خاں ایک کوشش کی ناکامی سے دل برداشتہ نہیں ہوگا......وہ پھر رابطہ کرے گا اور شاید ثالث کے طور پر اپنی خدمات کی افادیت ثابت کرنے کے لیے خود ست بدھائی پہنچ جائے مگر ابھی تک دشمن کی توپیں خاموش تھیں......یہ خاموشی کسی طوفان کا پیش خیمہ بھی سمجھی جا سکتی تھی اور محاصرے کی ناکامی کا اعتراف بھی......

دوپہر کے کھانے پر ہم سب اکٹھے ہوئے تو مجھے اطمینان اور سکون کی آوازوں میں چھپی تشویش اور فکرمندی کی خاموش صدا صاف سنائی دے رہی تھی......گل واضح طور پر اپ سیٹ تھی اور شاید یہ سوچ رہی تھی کہ اس دلدل سے کیسے نکلے جس میں اسے تقدیر کی ستم ظریفی نے دھکیل دیا تھا۔

شہناز پُرسکون اور خوش نظر آنے کی کوشش میں ناکام تھی......اس کے اعصاب ہنوز شکستگی سے دوچار تھے۔ وہ نروس تھی اور خوف اس کی آنکھوں کی ویرانی سے جھلکتا تھا......راجا کے سامنے رو دھو کے اس نے اپنے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ضرور کر لیا تھا لیکن اسے پوری طرح پہلے جیسی پُراعتماد شہناز بننے میں کچھ وقت درکار تھا۔

گزشتہ شب ہم سب نے ہی جاگتے ہوئے گزاری تھی......میرے والد بھی آرام کرنے چلے گئے تو میں نے سوچا کہ راجا سے اکیلے میں بات کروں لیکن مجھے موقع نہ ملا......شہناز اور گل نے ہمیں ایک منٹ کے لیے تنہا نہیں چھوڑا۔ فوری طور پر میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ شہناز سے تفصیل کے ساتھ رانا کی قید میں بیتے ہوئے وقت کے ہر لمحے کی روداد سنوں لیکن لیلیٰ بھابی کو صبر نہ تھا......ان سے زیادہ برا حال ریشم کا تھا جو اپنی ڈاکٹر میڈم کی واپسی پر خوشی سے باؤلی ہو رہی تھی......وہ شہناز کے آگے پیچھے پھرتے ہوئے مسلسل انگریزی کی مٹی پلید کر رہی تھی......بار بار دوپٹے کے کونے سے آنکھوں میں آنے والے آنسو پونچھتی اور پھر خود ہی بے وجہ ہنستی تھی۔

گل نے میرے والدین کو مختصراً شہناز کے بارے میں بتا دیا تھا کہ قید میں اس کے ساتھ کیا سلوک ہوا اور بالآخر وہ دونوں کس طرح حویلی سے فرار ہونے میں کامیاب ہوئیں لیکن گل کی رپورٹ میں وہ تفصیل بہرحال نہیں تھی جس کا تعلق اس کی آمد سے پہلے کے حالات سے تھا۔

لیلیٰ بھابی نے کہا ''ہاں بھئی شہناز ...... اب بتاؤ رانا صاحب کی حویلی میں تم پر کیا بیتی ......؟''

میں نے ٹالنے کے لیے کہا ...... ''بھابی ...... ایسی بھی جلدی کیا ہے ...... شہناز کو آرام کی ضرورت ہے ......''

شہناز نے سر ہلایا ...... ''نہیں رفیق ...... میں ٹھیک ہوں۔''

ظاہر ہے اس کے بعد میرے یا راجا کے لیے خاموشی اختیار کرنے کے سوا چارہ نہ تھا ...... شہناز کی آپ بیتی فرسٹ پرسن میں کچھ یوں تھی ...... اس نے بتایا۔

☆☆☆

مجھے تو اب یاد بھی نہیں کہ دن کیا تھا اور تاریخ کیا تھی ...... مگر لگتا ہے برسوں پہلے کی بات ہے ...... درمیان میں جو وقت گزرا اس کا ہر سیکنڈ ایک دن تھا تو ہر دن ایک پُر اذیت مہینا ...... عمر قید کاٹ کے میں پھر اپنی دنیا میں واپس آگئی ہوں تو یہ محسوس ہوتا ہے جیسے درمیان میں صدیاں حائل ہیں ...... خیر ...... اس روز مجھے قریب کے ایک گاؤں سے کال موصول ہوئی تھی ...... ہم نے اس سارے علاقے میں موبائل فون اسی لیے تقسیم کیے تھے کہ ایمرجنسی کی صورت میں میرے مریض مجھے پریشانی سے آگاہ کر دیں ...... ان بیچاروں کے پاس آمد و رفت کی کوئی سہولت نہیں ...... اپنی گاڑی میں میرے لیے ان تک پہنچنا آسان تھا۔

میرے علم میں دو ایسے کیس تھے جو قدرے پیچیدہ تھے۔ عام طور پر زچگی کسی دشواری کے بغیر ہو جاتی تھی اور گھر کی بڑی بوڑھیاں زچہ کی مدد کرتی تھیں ...... میں نے ہائی جین کے کچھ اصول سمجھا دیے تھے جس سے انفیکشن وغیرہ کا چانس کم سے کم ہو جائے کچھ ضرورت کی دوائیں اور ڈلیوری میں کام آنے والا سامان بھی ہر ضرورت مند کو فراہم کر دیا تھا۔

یہ دو کیس نارمل نہیں تھے ...... ایک میں بچے کی پوزیشن مسئلہ پیدا کر سکتی تھی۔ دوسرے میں ماں کا وزن اور ہائی بلڈ پریشر خطرناک ثابت ہو سکتا تھا ...... ان دونوں کی ڈلیوری کسی بھی وقت متوقع تھی اور جب کال موصول ہوئی کہ مریضہ کی حالت خراب ہے اور وہ اذیت سے تڑپ رہی ہے تو میں کچھ کنفیوز ہوگئی کہ فون کس نے کیا ہے اور مجھے پہلے کہاں جانا چاہیے ...... میں پہلے گھر پہنچی تو وہاں کسی پریشانی کے بغیر ڈلیوری ہو چکی تھی اور گھر والے بہت خوش تھے کیونکہ نومولود ...... تین لڑکیوں کے بعد پہلا لڑکا تھا ...... ان کا خیال تھا کہ ایسا میرے بابرکت ہاتھ لگنے سے ہوا ...... بیچارے سادہ لوح دیہاتی عقیدت کے رشتے بہت آسانی سے قائم کر لیتے ہیں ...... یہی وجہ ہے کہ بہ آسانی پیروں فقیروں کے جھانسے میں آ جاتے ہیں ...... کسی جعلی پیر نے انہیں بتایا کہ انہوں نے بہت دیر کر دی ...... خصوصی وظیفہ کیا جا سکتا ہے لیکن اس پر ایک ہزار کا خرچا ہوگا ...... ردِ بلا کے لیے ...... کالا بکرا چار دانت والا ...... پہاڑی قبرستان کا اُلّو ...... کسی عورت کا جو وضع حمل کے دوران جمعرات اور جمعہ کی درمیانی شب میں مرگئی ہو ...... ہنسنے کی بات نہیں ...... یہ جعلی پیر عام طور سے ایسی ہی ناممکن چیزوں کی فرمائش کرتے ہیں اور مشکل کا آسان حل یہ تجویز کرتے ہیں کہ وہ اپنے ذرائع سے ان چیزوں کا حصول ممکن بنا سکتے ہیں لیکن اس میں پیسا خرچ ہوگا ...... خیر ...... اس عورت کے گھر والوں سے خصوصی وظیفے اور اولاد نرینہ کے جلالی عمل کے لیے ایک ہزار مانگے گئے تھے ...... ان کی پوزیشن نہیں تھی کہ ایک ہزار کا بندوبست کر سکتے ...... ماں کے پیٹ میں بچے کی جنس بدلنے والے عامل نے انہیں بھگا دیا کہ جاؤ اب اگلی بار آنا ...... اس مرتبہ تو پھر بچی ہوگی ...... عورت سخت افسردہ اور مایوس تھی کہ چوتھی بیٹی ہوگئی تو پھر شوہر بیٹے کے لیے دوسری شادی کر لے گا ...... میں نے عورت کو بھی سمجھایا مگر اس سے زیادہ مرد کو ڈانٹا ڈپٹا کہ یہ قدرت کے کھیل ہیں اور کوئی انسان یہ دعویٰ کرے کہ وہ مشیتِ ایزدی میں دخل دے سکتا ہے تو وہ مشرک اور کافر ہے ...... جب بیٹا ہوا تو عورت نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ وہ سوکن کا عذاب جھیلنے سے بچ گئی ...... مرد کی خوشی کا بھی ٹھکانا نہ تھا ...... انہوں نے مجھے مٹھائی کھلائی اور کہا کہ انہوں نے مجھے کوئی فون نہیں کیا تھا ...... انہیں ضرورت ہی نہیں پڑی۔

ظاہر ہے اس کے بعد میں دوسرے گھر کی طرف روانہ ہوگئی ...... وہاں خاتون مزے سے فرش پر پھسکڑا مارے ساگ کے ساتھ مکئی کی روٹی کھا رہی تھی ...... ایک پاؤ مکھن کے ساتھ ...... مکھن والی لسی کا ڈیڑھ فٹ لمبا لسی کا گلاس اس کے پاس رکھا ہوا تھا ...... اس نے کہا کہ میں نے تو فون نہیں کیا ڈاکٹر صاحبہ ...... میں پریشان ہوگئی کہ پھر فون کس نے کیا تھا ...... میں نے اسے ڈانٹا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ ...... مرنا چاہتی ہو تو آسانی سے مرو ...... پہلے ہی تمہارا وزن اور بلڈ پریشر خطرناک حد تک پہنچ گیا ہے ...... تم اتنا کھاؤ گی تو زندہ نہیں بچو گی ...... اس کی سمجھ میں میری بات پہلے ہی نہیں آئی تھی ...... اس کی ساس کہتی تھی کہ ڈاکٹر صاحبہ ماشاء اللہ اتنی اچھی صحت ہے پھر آپ کیوں نظر لگاتی ہو اسے ...... وہ عورت بعد میں وضع حمل کے دوران مرگئی ...... مجھے یقین ہے اس کے گھر والوں نے موردِ الزام مجھے ٹھہرایا ہوگا کہ میں نے نظر

لگادی ...... اس دن ریشم میرے ساتھ نہیں تھی ورنہ یہ کنفیوژن نہ ہوتی ...... وہ ہر کیس کو کسی حوالے سے یاد رکھتی تھی ...... لیکن اس کا میرے ساتھ نہ جانا بھی اس کے حق میں اچھا ہی ہوا ورنہ وہ بھی اٹھا لی جاتی ...... میں تو کچھ اپنی حیثیت اور عزت کی وجہ سے محفوظ رہی ...... اس کی عزت لٹیروں سے کون بچاتا؟ ...... وہ ایک عام غریب لڑکی تھی جو کمین سمجھے جاتے ہیں ...... جن کی کوئی عزت ہوتی ہی نہیں ...... جب میں گاؤں سے نکل کے واپس ست بدھائی کی طرف لوٹ رہی تھی تو اندھیرا پھیل گیا تھا ...... ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں جاتے ہوئے ریشم میری گائیڈ ہوتی تھی ...... یہاں سڑکیں تو ہیں نہیں ...... ریشم کچے راستوں کے شارٹ کٹ بھی پہچانتی تھی ...... میں نے جاتے ہوئے ایسا ہی ایک شارٹ کٹ استعمال کیا تھا ...... لیکن واپسی پر بھٹک جانے کے ڈر سے میں نے سیدھا راستہ پکڑا۔

میری یہی غلطی میری بدقسمتی بن گئی ...... اگر میں جاتے وقت سیدھا راستہ اختیار کرتی تو جو واپسی میں ہوا پہلے ہو جاتا ...... یا میں واپسی پر بھی شارٹ کٹ لیتی تو شاید بچ کے نکل آتی ...... لیکن اب اس کی کوئی اہمیت نہیں کہ یوں نہ ہوتا تو کیا ہوتا ...... یہ نہ ہوتا تو وہ نہ ہوتا ...... وہ طے کر چکے تھے کہ ڈاکٹر شہناز کو اس کی خدمتِ خلق اور مفادِ عامہ کے خلاف کام کرنے کی سزا دینا ضروری ہے۔ وہ عاملوں اور پیروں کے خلاف بکواس کرتی ہے ...... تعویذ گنڈوں کے خلاف بولتی ہے یہاں تک کہ حکمت کے آزمودہ ٹوٹکوں کو غلط بتاتی ہے اور ولایتی دوائیں تقسیم کرتی پھرتی ہے۔ انہوں نے پہلے آپس میں مشورہ کیا تھا اور پھر رانا سے ایک وفد بنا کے ملے تھے ...... رانا نے انہیں ساری اسکیم سمجھائی تھی۔

تمہیں یاد ہوگا کہ اس واردات سے قبل بھی ان لوگوں نے میرے خلاف ایک انتہائی شر انگیز پروپیگنڈا مہم چلائی تھی ...... چند روز قبل ہی میں ایک گاؤں کے باہر مریضوں کو دیکھ رہی تھی ...... ان میں زیادہ تعداد عورتوں اور بچوں کی تھی لیکن کچھ مرد بھی ان کے ساتھ آئے تھے ...... میری یہ او پی ڈی ہر جگہ کسی درخت کے نیچے یا کسی گھر کے صحن میں ہوتی تھی ...... عام طور پر میرے لیے کوئی تخت یا چارپائی بچھا دی جاتی تھی اور میرے سامنے مریض فرش پر براجمان رہتے تھے ...... پھر کسی نے ایک میز اور کرسی فراہم کر دی جو میرے آنے سے پہلے ہی اس گاؤں میں پہنچا دی جاتی تھی جہاں مجھے جانا ہوتا ...... ہر گاؤں کی باری مقرر تھی۔

اس روز میں میز کے پیچھے بیٹھی تھی اور مریض میرے سامنے بڑے نظم و ضبط سے باری کا انتظار کر رہے تھے ...... پہلے رش میں ہڑبونگ ہوتی تھی اور پہلے دکھانے کے لیے دھکے بازی ہوتی تھی ...... پھر ریشم نے سب کو کنٹرول کیا اور ڈسپلن قائم کر دیا ...... اچانک ایک غول بیابانی کی طرح میرے مخالف نمودار ہوا ...... ان کی قیادت وہ جعلی پیر کر رہا تھا جس نے یہاں سرکاری ڈسپنسری بند کرا کے اس جگہ پر غاصبانہ قبضہ کر لیا تھا اور اپنا آستانہ قائم کر رکھا تھا ...... وہ دم درود اور تعویذ گنڈوں کی فریب کاری سے مال بنا رہا تھا ...... دوسرا شخص پہلے پنساری تھا اور اپنی دکان پر کچھ یونانی ادویات رکھتا تھا مگر بعد میں اس نے کریانہ ختم کر کے دکان پر حکیم حاذق فلاں فلاں کا بورڈ لگا لیا اور دیسی دواؤں کے ساتھ ہومیو پیتھی کی گولیاں بھی دینے لگا۔

ان دونوں کے ساتھ مجھے خوفزدہ کرنے کے لیے کچھ بدمعاش صورت معززین بھی تھے۔ انہوں نے آتے ہی ہنگامہ برپا کر دیا اور لوگوں کو بھگانے کی کوشش کی ...... وہ تو خدا کا شکر ہے میرے مریض مستقل مزاج ثابت ہوئے اور ان میں جو مرد تھے، وہ مقابلے پر آگئے ...... انہوں نے کہا کہ زبان سے بات کرو ...... ایک لیڈی ڈاکٹر کے ساتھ بدمعاشی کیوں کرتے ہو ...... خیر اس پر وہ رک گئے اور میرے ساتھ ان کی خوب جھڑپ ہوئی ...... وہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ جو دوائیں میں دیتی ہوں ان میں الکحل ہوتی ہے جو شراب ہے چنانچہ حرام ہے ...... اور بھی بہت بکواس فرمائی انہوں نے کہ ولایتی دواؤں میں نجس جانوروں کا خون، چربی اور ایسی ہی ناپاک اشیا ہوتی ہیں ...... گورے یہ سب مسلمانوں کا ایمان خراب کرنے کے لیے دواؤں میں ڈالتے ہیں۔

میں نے پہلے تو انہیں دلائل سے زچ کیا ...... سب کے سامنے ان کا اچھا خاصا تماشا بنا ...... پھر میں نے دوائیں ان کے سامنے رکھ دیں اور پوچھا کہ ان کے ڈبوں پر جو فارمولا لکھا ہے اس کے بارے میں وہ کیا جانتے ہیں ...... وہ اجزا کے نام تک نہ پڑھ سکے اور مریض تو نہیں بھاگے ...... انہیں بھاگنا پڑا ...... ان کی بہت بے عزتی ہوئی اور ظاہر ہے مستقبل کی خوشحالی خطرے میں پڑ گئی۔

اس کا بدلا لینے کے لیے انہوں نے پھر رانا سے رجوع کیا تو رانا نے ایک تیر سے دو شکار کیے ...... اس نے کہا کہ اٹھا لاؤ اس ڈاکٹر کو ...... اس کا علاج میں کروں گا ...... خدمتِ خلق کا سارا جذبہ بھول جائے گی ...... رانا کا مقصد کچھ اور تھا ...... وہ ہمارے فری اسپتال کے پروجیکٹ سے خائف تھا اور

اپنی دہشت پھیلا کے ہمارے تمام ترقیاتی منصوبوں کو ختم کرنا چاہتا تھا...... اس نے خود کچھ نہیں کہا...... ان بے وقوفوں کو استعمال کیا جو میری بڑھتی ہوئی مقبولیت سے پریشان تھے۔

واپس آتے ہوئے مجھے رات ہوگئی تھی چنانچہ میں نے لمبا مگر سیدھا راستہ اختیار کیا...... وہاں ایک جگہ اچانک کچھ لوگ گاڑی کے سامنے آگئے...... ان کے ہاتھوں میں لاٹھیاں تھیں جو انہوں نے گاڑی پر ماریں...... میں نے راستہ کاٹ کے بھاگنے کی کوشش کی تو جنگل میں بھٹک گئی اور ایک جگہ گاڑی کا راستہ بند ہوگیا...... اتنی دیر میں تعاقب کرنے والے آگئے۔

میں نے ہیڈ لائٹس روشن رکھیں اور باہر نکل آئی...... میں نے چلا کے کہا ''دیکھو...... تم سب کو پہچان لیا ہے میں نے......''

ایک نے آگے بڑھ کے گاڑی پر لاٹھی ماری ''پہچان لیا ہے تو کیا کرے گی تو...... بول......'' اس نے مجھے گالی بھی دی۔

میں نے کہا...... ''تم سب پکڑے جاؤ گے......''

حکیم نے مجھے پکڑ لیا...... ''ابھی تو ہم تجھے پکڑ کے لے جا رہے ہیں۔''

میں نے چلا کے کہا...... ''چھوڑو مجھے......''

پیر نے قہقہہ لگایا...... ''ایسے ہی چھوڑ دیں تیری جیسی رنگین تتلی کو...... تجھ سے کہا تھا گاؤں چھوڑ دے...... چلی جا عزت کے ساتھ واپس......''

ان ہٹے کٹے مشٹنڈوں سے میں کیسے لڑ سکتی تھی...... انہوں نے میری ایک نہیں سنی...... انہوں نے مجھے باندھ کے ایک بوری میں ڈال دیا...... میرے ہاتھ پیر باندھنے کے بعد انہوں نے میرے منہ میں بھی کپڑا بھی ٹھونس دیا تھا...... میرے لیے سانس لینا بھی مشکل تھا...... تاہم میں نے اپنے حواس بحال رکھے اور خدا سے دعا کرتی رہی کہ مجھے ان وحشیوں کے چنگل سے بچا...... میری عزت کا محافظ تو ہی ہے۔

بوری کو انہوں نے ایک بیل گاڑی میں پھینک دیا...... مجھے اچھی خاصی چوٹیں آئیں...... پھر جب بیل گاڑی جنگل کے اونچے نیچے راستوں پر چلی تو میرے جسم کا جوڑ جوڑ ہل گیا...... ایک مرحلے پر یہ اذیت ناقابلِ برداشت ہوگئی اور مجھ پر بے ہوشی غالب آگئی۔

پھر مجھے ہوش آیا تو میں رانا کی حویلی میں ایک بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی...... آنکھیں کھولنے کے بعد میں نے گردو پیش پر نگاہ ڈالی تو ساری بات سمجھ میں آگئی...... مجھے اغوا کر کے رانا کی حویلی میں پہنچا دیا گیا تھا...... رانا اس کمرے میں ایک کرسی پر شیطانی مسکراہٹ لبوں پر طاری کیے بڑی تمکنت سے بیٹھا تھا۔

میں نے کروٹ بدل کے اٹھنا چاہا تو میری کراہ نکل گئی...... میرا سارا جسم کسی پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ رانا ایک دم اٹھا اور میرے قریب آ کے مجھ پر جھک گیا۔

''لیٹی رہیں...... اٹھنے کی کیا ضرورت ہے ابھی......'' اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔

میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا...... ''ہاتھ مت لگاؤ مجھے۔''

اس نے کرسی کو میرے بیڈ کے قریب کرلیا۔ ''آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے ڈاکٹر شہناز......''

میں نے کہا...... ''میری طبیعت کو چھوڑو...... یہ بتاؤ میں یہاں کیسے آئی؟''

اس نے نظر جما کے مجھے دیکھا...... ''کیا آپ کو کچھ یاد نہیں؟''

میں نے غصے سے کہا...... ''مجھے سب یاد ہے رانا صاحب...... کون لوگ تھے جو مجھے اغوا کر کے یہاں لائے...... میں سب کو پہچانتی ہوں۔''

''پھر تو کوئی مسئلہ نہیں...... ہم سب کو حاضر کردیں گے آپ کی خدمت میں...... جو مجرم پائے گئے ان کو سزا بھی ہوگی۔''

میں نے کہا...... ''میرے سامنے ڈراما مت کرو...... وہ تمہارے ہی آدمی تھے اور انہوں نے تمہارے اشارے پر مجھے اغوا کیا۔''

وہ نفی میں سر ہلانے لگا...... ''اغوا کے بارے میں تو مجھے کسی نے بھی نہیں بتایا...... جو لوگ آپ کو اٹھا کے لائے تھے آپ خود ان سے بات کرلیں...... لیکن پہلے اپنے لیے جو دوا مناسب سمجھتی ہوں خود تجویز کرلیں...... میرا ملازم لا دے گا......''

میں نے اپنی حالت پر غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچی کہ رانا کی حویلی کے اندر میری حیثیت ایک قیدی جیسی ہے لیکن وہ مجھے مہمان جیسی عزت دے رہا ہے تو مجھے فائدہ اٹھانا چاہیے...... میری جسمانی حالت بھی ایسی نہیں تھی کہ میں کچھ کرسکتی اور حویلی سے میرا باہر جانا بہرصورت رانا کی مرضی اور خوشنودی پر منحصر تھا۔

میں نے رانا کو ایک پین کلر کا نام بتایا...... وہ باہر گیا اور کچھ دیر بعد ایک ملازم کے ساتھ لوٹا تو دوا چائے کی ٹرالی میں رکھی ہوئی تھی...... اس ٹرالی میں بہت کچھ تھا لیکن میں نے صرف کافی لی...... میرا جی متلا رہا تھا اور میرے لیے کچھ کھانا ممکن ہی نہیں تھا...... دوا اور کافی کا اثر ہونے تک میں آنکھیں بند کیے لیٹی رہی...... رانا نے لائٹ آف کردی...... صرف زیرو واٹ کا ایک بلب جلتا رہنے دیا اور دبے پاؤں کمرے سے نکل گیا۔

ابھی تک رانا کا میرے ساتھ رویّہ شریفانہ ہی تھا...... مستقبل میں وہ کیا عزائم رکھتا تھا...... اس کا اندازہ میں قبل از وقت لگانے سے قاصر تھی...... رانا تقریباً ایک گھنٹے بعد لوٹا تو میری حالت میں نمایاں فرق آگیا تھا...... میں تکیے کے سہارے بیٹھ گئی...... رانا پھر کرسی میں ...ٹ ہوگیا۔

میں نے کہا...... ''رانا صاحب...... کیا واقعی وہ لوگ یہاں موجود ہیں جو مجھے اغوا کر کے لائے تھے۔''

''آپ نے پھر اغوا کی بات کی بی بی...... وہ آپ کو اٹھا کر ضرور لائے تھے لیکن زبردستی نہیں......''

میں نے برہمی سے کہا...... ''کیسی باتیں کرتے ہیں آپ رانا صاحب...... انہوں نے مجھے زبردستی گاڑی سے اتارا...... گاڑی پر لاٹھیاں ماریں اور مجھے گالیاں دیتے رہے...... انہوں نے میرے ہاتھ پاؤں باندھ کے مجھے بوری میں ڈالا اور بوری کو ایک بیل گاڑی میں پٹخ دیا میرے منہ میں کپڑا ٹھونسا...... یہ زبردستی نہیں تھی تو اور کیا تھا...... کیا میں خود اپنی مرضی اور خوشی سے یہاں آئی تھی......''

وہ مجھے ایسے دیکھتا رہا جیسے میں یونانی زبان میں کچھ کہہ رہی ہوں جو اس کی سمجھ میں نہیں آیا...... ''مجھے یہ سب معلوم نہیں ڈاکٹر صاحبہ......''

''ابھی آپ نے خود کہا تھا کہ مجھے آپ کے آدمی یہاں لائے تھے کہاں ہیں وہ بدمعاش...... وہ حکیم اور وہ جعلی پیر......''

''وہ میرے ملازم ہیں بی بی...... میں بلاتا ہوں انہیں...... ان میں نہ کوئی نہ پیر ہے اور نہ حکیم......'' وہ اٹھا اور دروازے سے جھانک کے کسی کو آواز دی......

تین مظلوم صورت غلام دست بستہ حاضر ہوئے اور سر جھکا کے کھڑے ہوگئے...... ''یہی آپ کو اٹھا کر لائے تھے یہاں۔''

میں نے کہا...... ''جھوٹ...... یہ مجھے اٹھا کے نہیں لائے...... ان تین مشٹنڈوں کو میں جانتی ہوں...... آپ بھی جانتے ہیں...... ہر شخص جانتا ہے۔''

رانا نے نفی میں سر ہلایا...... ''نہیں بی بی...... آپ پوچھ لیں ان سے...... یہی آپ کو جنگل سے اٹھا کے لائے تھے...... آپ کو کچھ پتا نہیں۔''

''خدا کے لیے رانا صاحب...... جھوٹ کی بھی حد ہوتی ہے۔''

''یہ سچ ہے بی بی...... آپ بے ہوش پڑی تھیں...... یہ تینوں فارم سے کام کر کے لوٹ رہے تھے کہ انہوں نے آپ کو دیکھ لیا ورنہ آپ تو رات بھر وہیں پڑی رہتیں...... یہ آپ کو جانتے نہیں...... انہوں نے آپ کو اٹھایا اور حویلی میں لے آئے...... میں نے کہا کہ بھئی یہ تو اپنی ڈاکٹر شہناز ہیں...... ست بدھائی والی۔''

میں ان مجبور اور محکوم انسانوں سے کیا پوچھتی...... وہ بے بسی کی تصویر بنے کھڑے تھے...... سچ وہی تھا جو ان کے مالک و آقا کے لبوں سے الفاظ کی صورت میں برآمد ہو رہا تھا...... اس کے سوا کچھ بھی سچ نہیں ہوسکتا تھا...... رانا اگر کہتا کہ اس وقت دن ہے اور کمرے میں سورج کی روشنی ہے تو وہ بھی ایسا ہی کہتے اور اپنی صداقت کا ثبوت دینے کے لیے انہیں حلف بھی اٹھانا پڑتا تو دریغ نہ کرتے...... مالک کی اطاعت ان کے لیے ایمان سے بڑھ کر تھی...... ایمان سے منحرف ہونے کی سزا تو میدانِ حشر کے لیے تھی...... مالک کے حکم سے انحراف کی سزا فوری اور یقینی تھی...... انتہائی عذاب ناک اور عبرت ناک

میں نے پسپائی اختیار کی...... ''ان کو جانے دیں رانا صاحب۔''

رانا نے سر ہلایا اور تینوں غلام روبوٹس کی طرح بیک آؤٹ کر گئے...... رانا پھر میری طرف متوجہ ہوا...... ''اب ذرا آپ بتائیں...... اگر آپ کی طبیعت ٹھیک ہو...... بڑی عجیب اسٹوری بتا رہی ہیں آپ......''

یہ جانتے ہوئے بھی کہ رانا مکاری کر رہا ہے اور جانتے بوجھتے انجان بن رہا ہے۔ میں نے اسے اصل واقعہ بتا دیا...... وہ بڑی توجہ اور حیرانی سے سنتا رہا اور افسوس سے سر بھی ہلاتا رہا۔

پھر وہ کمرے میں ٹہلنے لگا...... ''اب میں یہ تو کہہ نہیں سکتا...... کہ آپ جھوٹ بول رہی ہو...... یا......

میں نے تیز ہو کے کہا......''ہاں ہاں......یا کیا......کہہ دیں کہ دماغ خراب ہے میرا......سر کی چوٹ کا اثر ہے......میں ایسے واقعات فرض کر کے سنا رہی ہوں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں......سب میرے تصور کا فتور ہے......کسی ڈراؤنے خواب کا حصہ ہے......''

''میں ایسا تو خیر نہیں کہوں گا......'' وہ سوچتے ہوئے بولا۔

''اچھا چھوڑیں ساری بحث......جو کچھ آپ نے فرمایا وہی درست ہوگا......آپ کے ملازموں نے بڑی نیکی کی جو میری جان بچائی اور آپ کی بڑی ذرہ نوازی کہ آپ نے مجھے اتنی توجہ دی......اب میں جانا چاہتی ہوں......''

وہ چونکا......''جانا چاہتی ہیں......اس وقت......''

''وقت کی کوئی بات نہیں......مجھے اپنے گھر ہی جانا ہے......آپ خود نہ سہی آپ کے جاں نثار مجھے بحفاظت پہنچا سکتے ہیں۔''

وہ سر کو دائیں بائیں ہلانے لگا۔'' نہیں بی بی......اس وقت آپ کے جانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا......''

''دیکھیے......میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

''لیکن اتنی جلدی کیا ہے......'' وہ دروازے کی طرف بڑھا......''صبح دیکھیں گے۔'' وہ ڈرامائی انداز میں رکا اور پلٹ کے بولا......''ویسے بھی آنا اپنی مرضی سے ہوتا ہے اور جانا میزبان کی مرضی سے......'' اور پھر ایک دم باہر نکل گیا۔

اشارہ مجھے مل گیا تھا کہ میں اپنی مرضی سے جانے کے لیے آزاد نہیں ہوں......اسی خوف نے مجھے رات بھر بیدار رکھا کہ رانا جیسے فرعون مزاج اور بے ضمیر شخص کی قید میں میرے ساتھ بدترین انسانیت سوز سلوک خارج از امکان نہیں......حویلی کے غلام ہر طرح کے جسمانی تشدد کو برداشت کرنے کے عادی تھے......وہ سمجھتے تھے کہ یہ نوشتہ تقدیر ہے......اللہ سے کیا گلا کہ اس نے رانا صاحب کے نصیب میں حاکمیت اور ان کی قسمت میں محکومی لکھی......وہ جسے چاہے عزت دے جسے چاہے ذلت......اس سوچ کی وجہ سے رانا کے کمی کمینوں کے لیے احساس ذلت کا کوئی عذاب نہ تھا......لیکن جسمانی تشدد سے کہیں زیادہ عذاب ذہنی ہوتا ہے جس کا تصور کر کے میری روح لرز جاتی تھی......شاید اس لیے بھی کہ میں ایک عورت تھی۔

اگلا پورا دن میں نے اسی کمرے کی تنہائی میں گزارا......رانا کے بارے میں مجھے ایک ملازمہ نے بتایا کہ وہ لاہور چلے گئے ہیں......وہ میرے لیے صبح کی چائے اور ناشتا لائی تھی۔

میں نے کہا......''تم جھوٹ بولتی ہو......رات کو انہوں نے کہیں جانے کی بات نہیں کی تھی......''

اس جوان اور قبول صورت ملازمہ کی حیثیت یقیناً دوسروں سے بہتر ہوگی......اس کا لباس اور بات کرنے کا انداز اس بات کی گواہی دیتا تھا......اس نے مسکرا کے کہا......''اچھا جی؟ کیا رات کو ملک صاحب آپ کے ساتھ تھے؟''

میں نے برہمی سے کہا......''میری بات ہوئی تھی ان سے......پھر وہ چلے گئے تھے۔''

''یہ تو آپ خود ہی پوچھنا ان سے......کہ جانا تھا تو بتا کے کیوں نہیں گئے......'' پھر وہ ایک ادا سے بولی......''ویسے بڑی بیگم کی بھی مجال نہیں جو ان سے سوال کر سکیں......پھر ہماری کیا اوقات ہے جی۔''

میں نے کہا......''مجھے لگتا ہے کہ تمہاری اوقات دوسروں سے یقیناً بہتر ہے......تم جانتی ہو کہ ملک صاحب کہاں ہیں۔''

''بتایا تھا جی......لاہور گئے ہیں......جاتے ہی رہتے ہیں......کبھی اچانک ضروری کام پڑ جاتا ہے......ہم تو نہیں پوچھ سکتے کہ کیا کام تھا......اسمبلی کا اجلاس نہ شروع ہو گیا ہو......ایسا ہوا تو پھر سمجھو پندرہ بیس دن بعد ہی لوٹیں گے......''

میرا دماغ چکرانے لگا......اس خادمہ پر غصہ کرنا یا شور مچانا لاحاصل تھا......خادمہ وہی کہہ رہی تھی جو وہ کہہ سکتی تھی......اسے حکم تھا کہ کہے......یہ ناممکن تھا کہ وہ میری باتوں میں آجائے اور کوئی راز کی بات بتا دے......پھر بھی اس کے ساتھ دوستانہ رویہ فائدہ مند ثابت ہو سکتا تھا۔

میں نے گزشتہ رات کچھ بھی نہیں کھایا تھا......حالات کو سمجھنے اور ان کا مقابلہ کرنے کے لیے ضروری تھا کہ میں جذبات سے نہیں عقل سے کام لوں......عقل رہتی ہے دماغ میں اور دماغ جسم کا حصہ ہے......جسم کو توانائی نہ ملے تو دماغ متاثر ہوتا ہے اور عقل کام نہیں کرتی......یہی سوچ کے میں نے پورا ناشتا کیا اور

پھر دوپہر کے بعد تک سوتی رہی۔

وہ کمرا اور بیڈ......سامان آرائش اور دیگر تمام اشیا ایک اچھے مہمان خانے کی ضرورت پوری کرتی تھیں لیکن وہاں رہتے ہوئے ایک دن گزارنا مشکل ہو گیا تھا......میرے لیے یہ خیال سوہان روح تھا کہ نہ جانے مجھے کب تک وہاں رہنا پڑے......ابھی تک میں نے باہر جانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی......مجھے یقین تھا کہ دروازہ مقفل ہوگا یا پھر وہاں کوئی پہریدار موجود ہوگا......آگے حویلی سے باہر جانے کا راستہ نہ جانے کتنا دور ہوگا اور اس کی راہ میں کتنی رکاوٹیں ہوں گی۔

دوپہر کے بعد وہی خادمہ پھر آئی......وہ میرے لیے کھانا لائی تھی......کھانا وافر تھا اور بہت اچھا تھا......میں نے اس سے پوچھا......''تمہارا نام کیا ہے؟''

اس نے اٹھلا کے کہا......''نام تو جنت بی بی تھا مگر چھوٹی بیگم صاحبہ مجھے گلابو کہتی ہیں۔''

میں نے کہا......''ٹھیک کہتی ہیں......گلابی رنگ تم پر اچھا لگتا ہے......رانا صاحب کی دو ہی بیویاں ہیں۔''

اس نے اقرار میں سر ہلایا''پہلے تین تھیں......ایک فوت ہو گئی......''

میں نے کہا''ایک کیا وہ دو اور کر سکتے ہیں۔''

اس نے بڑے معنی خیز لہجے میں کہا''ایک تو بہت جلد کریں گے شاید......یہ چھوٹی بیگم بھی خیر سے چودہ پڑھی ہیں......کیا پتا اس کے بعد والی زیادہ ہو......ڈاکٹر ہو آپ جیسی......''

میں غصے کو پی گئی......''گلابو......کیا میں باہر جا سکتی ہوں۔''

''باہر کہاں جی!''

میں نے کہا'' اس کمرے سے باہر......حویلی میں......جہاں میرا جی چاہے......''

''یہ مہمان خانہ ہے جی......آپ کو یہاں کوئی تکلیف ہے تو بتائیں۔'' وہ میرے سوال کا جواب گول کر گئی۔

میں نے پھر پوچھا......''گلابو......کیا میں یہاں قیدی ہوں۔''

''اللہ نہ کرے جی......اپنے ملک صاحب کا حکم ہے کہ آپ کا خیال رکھا جائے۔'' اس نے کھانے کے برتن سمیٹے اور پھر آہستہ سے سرگوشی میں بولی۔'' ڈاکٹر صاحبہ......باہر جانے کی کوشش مت کرنا......''

گلابو کی بات میری سمجھ میں آ گئی تھی لیکن اس کے باوجود میں نے گلابو کے جاتے ہی باہر جھانکا۔ سامنے ایک مختصر سا برآمدہ تھا......پھر چھوٹا سا صحن جس کی دیواریں آٹھ فٹ اونچی تھیں......یہ کسی طرح سے بھی رانا کی حویلی کا مہمان خانہ نہیں ہو سکتا تھا......وہ اسمبلی کا رکن تھا اور بہت بڑا جاگیردار......یقیناً اس کے مہمان بھی ایسے ہی صاحب حیثیت لوگ ہوتے ہوں گے......ان کے لیے حویلی کے شاہانہ معیار کا مہمان خانہ ہوگا......یہ غالباً حویلی کا ایک کمرے والا سرونٹ کوارٹر تھا جسے کسی خاص مقصد کے لیے فرنش کر دیا گیا تھا۔

صحن کے فولادی دروازے کے باہر سے میں دو افراد کے باتیں کرنے کی آوازیں سن سکتی تھی......اس کے باوجود میں دبے پاؤں صحن عبور کر کے گئی اور دیوار کا کونا اپنے دونوں ہاتھوں سے تھام کے خود کو اوپر کھینچا......سر کو تھوڑا سا اوپر نکال کر جھانکنے سے مجھے دو قوی ہیکل اور مسلح محافظ نظر آئے جو دروازے کے سامنے کھڑے تھے۔ آگے حویلی کا پورا منظر تھا......ایک طرف گھوڑوں کے اصطبل تھے اور بھینسوں کا باڑا......حویلی بالکل سامنے تھی......درمیان میں وسیع احاطہ تھا جس میں ٹیوب ویل تھا......ایک بیل گاڑی کھڑی تھی......سبزی کاشت کی گئی تھی اور زمانے کا کاٹھ کباڑ پڑا تھا۔

مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہاں سے فرار کی کوشش میں کامیابی کا چانس ایک فیصد بھی نہیں......کمرے میں پچھلی طرف کوئی کھڑکی بھی نہیں تھی......میں مایوس ہو کے بیٹھ گئی اور سوچتی رہی کہ کیا کبھی مجھے اس زندان سے رہائی نصیب ہوگی......کیا جسم و جاں اور عزت آبرو کی قربانی دیے بغیر میں پھر اپنی پرانی زندگی کی طرف لوٹ سکوں گی۔

مجھے اندازہ تھا کہ ست بدھائی کی حویلی میں میرے یوں لاپتا ہونے سے سب پر کیا گزری ہوگی......تلاش کرنے پر میری گاڑی ضرور مل گئی ہوگی اور ممکن ہے تم لوگوں نے دوڑ دھوپ کر کے اور اپنے تعلقات کی مدد سے میرے اغوا کی واردات کا سراغ بھی لگا لیا ہو......لیکن مجھے بازیاب کرانے کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہوگی......پولیس پر بہت دباؤ ہو تو وہ قانونی کارروائی پوری کرنے کے لیے سرچ وارنٹ کے ساتھ حویلی میں داخل ہونے کا ڈراما کر سکتی ہے لیکن اس کے لیے بھی رانا کا تعاون درکار ہوگا......پولیس زنان خانے میں داخل نہیں ہو سکتی......حویلی کے عقب میں ہر سرونٹ کوارٹر تک پولیس کیسے جائے گی اور بالفرض محال رانا یہ اجازت بھی

دے کہ حویلی کا کونا کونا کھنگال ڈالو...... پھر بھی ڈاکٹر شہناز نہیں ملے گی۔ مجھے وہ حویلی میں ہی آگے پیچھے کرسکتا ہے...... خواتین کے درمیان بٹھا سکتا ہے...... اس طرح کہ میں نظر ہی نہ آؤں...... تم لوگ مجھے حویلی سے نکال کر لے جاؤ...... یہ ناممکن ہوگا۔

اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ میں گلابو کے مشورے پر عمل کروں...... اس کی نیت کے خلوص پر بھروسا کرنے ہی بھی رسک تھا...... وہ رانا کی نمک خوار تھی...... اسے مجھ سے کیا ہمدردی ہوسکتی تھی...... وہ شام کو پھر آئی تو میں نے اس سے کہا کہ اکیلے میں میرا وقت نہیں کٹتا...... یہاں نہ ٹی وی ہے نہ اخبار...... نہ کوئی بات کرنے والا...... اگلے دن مجھے ایک چھوٹا ٹی وی فراہم ہوگیا...... اخبار نہ حویلی میں آتا تھا اور نہ ٹیلا جوگیاں کے بازار سے لایا جاسکتا تھا...... کتابوں سے حویلی والوں کا کبھی دور کا بھی رشتہ نہیں رہا تھا۔

ٹی وی میں ڈش اور کیبل کے بغیر صرف دو مقامی چینل دیکھے جاسکتے تھے...... پاکستان ٹیلی وژن اور دوسرا ایس ٹی این...... تین دن بعد کمرے کی دیواریں بھی مجھے کاٹنے لگیں...... میں اندر چکر لگاتی رہتی...... ٹی وی آن کرتی اور بند کردیتی...... سونے کی کوشش میں جاگتی رہتی...... سوچتی رہتی...... کیا ہوگا؟...... رانا کیا کرے گا؟...... سب کچھ اس کے اختیار میں ہے...... ہر نماز کے بعد میں خدا سے دعا کرتی...... بچانے والا تو ہی ہے...... مارنے والے سے تیرا ہاتھ زبردست ہے۔

اگر ایک ہفتہ گزر جاتا تو میں پاگل ہوجاتی...... میری قسمت کہ رانا لوٹ آیا...... یہ خبر بھی مجھے گلابو سے ملی...... اس ایک ہفتے میں گلابو نے مجھے ذاتی ضرورت کی ہر چیز فراہم کی تھی...... اس میں استعمال کے کپڑے بھی شامل تھے۔ معلوم نہیں وہ کیسے میرے جسم پر فٹ آئے......

گلابو کو باتیں کرنے کی اجازت نہیں تھی...... وہ ذرا دیر کرتی تو باہر سے کوئی اسے پکارنے لگتا تھا اور وہ کھانے کے برتن چھوڑ کر بھاگ جاتی تھی...... اس کے باوجود چپکے چپکے اس نے مجھے بہت کچھ سمجھا دیا...... اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ گلابو کی ہمدردی کے پیچھے درحقیقت چھوٹی بیگم کا ہاتھ ہے...... گلابو اس کی کنیز خاص تھی...... اس نے چھوٹی بیگم صاحبہ کو میرے بارے میں تمام معلومات فراہم کی تھیں...... مثلاً یہ کہ ڈاکٹرنی بڑی سونی ہے۔

چھوٹی بیگم سے رانا کی شادی کو تین سال ہوگئے تھے۔ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا...... چھوٹی بیگم کا نام شبانہ کوثر تھا اور وہ راولپنڈی کے کسی کالج میں پڑھتی تھی...... وہ معمولی شکل وصورت کی لڑکی تھی جسے فیشن کا بہت شوق تھا...... وہ ماڈل اور پھر فلم اسٹار بننا چاہتی تھی اور وہ ایک فلمی اتفاق ہی تھا جس نے اسے رانا کی بیوی نمبر تین بنا دیا...... بیوی نمبر دو نے اس سے شادی رکوانے کی کوشش میں ناکام ہوکے خودکشی کرلی تھی۔

رانا صاحب اپنی گاڑی میں کالج کے سامنے سے گزر رہے تھے کہ اندر سے شبانہ دوڑتی ہوئی نکلی...... سامنے سے اس کی بس نکلی جارہی تھی...... رانا صاحب نے اسے صرف ایک نظر دیکھا...... اس کے ہیر اسٹائل کو...... اس کے جدید وضع کے شوخ وشریر لباس کو اور اس کی ہرنی جیسی چال کو...... دوسرے لمحے وہ گاڑی سے ٹکرائی...... اس کی کتابیں ہوا میں بکھر گئیں اور وہ چیخ مار کے نیچے گرگئی۔

ڈرائیور کا اس میں کوئی قصور نہیں تھا...... اس نے گاڑی روک کے رانا صاحب کو بتایا کہ لڑکی بے ہوش ہے...... اس وقت تک وہاں اور لوگ بھی آگئے تھے...... رانا صاحب نے خود شبانہ کو گاڑی میں منتقل کیا اور اسپتال لے گئے...... چوٹیں معمولی تھیں اور اسپتال بہت شاندار تھا...... اس کے وی آئی پی روم میں رانا صاحب نے شام حاضری دیتے رہے...... ڈاکٹروں نے رانا صاحب کے کہنے پر شبانہ کو ڈسچارج نہیں کیا اور علالت وعیادت کا یہ سلسلہ اظہار واقرار محبت میں بدل گیا...... رانا صاحب پرانے شکاری تھے...... ایک ناتجربہ کار جوان جذبات کی فراوانی سے کوکا کولا کی بوتل کی طرح ابلی جھاگ دیتی لڑکی کو ترغیب کے جال میں لانا ان کے لیے ذرا بھی مشکل ثابت نہ ہوا...... پہلے انہوں نے شبانہ پر اپنی وضعداری اور شرافت ثابت کی تھی...... اس کے بعد اپنی دولت مندی کا رعب ڈالا...... پھر اپنی خاندانی اہمیت بتائی اپنی سیاسی طاقت کا ذکر کیا اور پھر ترپ کا پتا پھینک دیا کہ وہ فلمسازی کی طرف رجوع کرنے کا ارادہ کرچکے ہیں اور اس سلسلے میں ہوم ورک مکمل کرچکے ہیں۔

انجام وہی ہوا جو ہوسکتا تھا...... شبانہ ان کے جال میں پھنسی تو ان کی تیسری بیوی کے عہدے پر فائز ہوئی اور ہمیشہ کے لیے کی حویلی میں قید ہوگئی...... ماڈلنگ کا اجازت نامہ منسوخ کردیا گیا...... فلمسازی کا پروگرام ختم ہوگیا...... شبانہ کی شہر میں آزادی سے سوشل لائف

گزارنے کی خواہش محض ایک حسرت بن کے رہ گئی...... اس کا احتجاج کچھ نہ کرسکا۔

پھر انہی دنوں میں جب وہ شادی کے ایک ماہ بعد ہنی مون سے لوٹی تو رانا صاحب اسے اپنی جاگیر اور حویلی دکھانے لے گئے...... یورپ کے مختلف شہروں کے فائیو اسٹار ہوٹلوں میں قیام شاپنگ اور سیر وتفریح کے حسین خواب کا یہ انجام ہوگا...... ایسا شبانہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی...... اچانک اس پر انکشاف ہوا کہ رانا صاحب کی دو بیویاں پہلے سے موجود ہیں...... پہلی خاندانی بیوی عزت دار اور با اختیار سمجھی جاتی ہے...... دوسری کو رانا صاحب اسی طرح حویلی میں لائے تھے جیسے شبانہ کو...... ایسی بیویاں لانے پر تعداد کی کوئی پابندی نہ تھی...... اگر کسی وقت ان کی تعداد شرعی حد سے بڑھنے کا اندیشہ ہوتو ایک دو کو ایسے صدارتی آرڈیننس جیسے حکم سے فارغ کیا جاسکتا تھا جس کے خلاف نہ داد ہوتا فریاد......

دوسری بیوی نے اپنی بے قدری کے خلاف احتجاج کیا لیکن حویلی کے اندر رہتے ہوئے...... کسی عائلی قوانین کی دفعہ یا آئین کے بنیادی حقوق کی شق کے تحت وہ کسی عدالت کا دروازہ نہیں کھٹکھٹا سکتی تھی...... حویلی کے اندر ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ سب رانا صاحب تھے...... اس نے مرجانے کی دھمکی دی تو رانا صاحب نے بڑی فراخدلی سے اجازت دی...... وہ رات کو چھت کی پنکھے سے لٹک گئی...... اس کو بڑے عزت واحترام کے ساتھ دفن کردیا گیا...... اس کی آخری رسوم روایتی شان وشوکت کے ساتھ ادا کی گئیں...... سیکڑوں سوگواروں نے اس کی اچانک بیماری اور وفات پر تعزیت کی...... حویلی کی تاریخ میں یہ لکھا گیا کہ اسے گردن توڑ بخار ہوگیا تھا۔

اس واقعے نے شبانہ کے ہوش گم کردیے...... اس کے والدین پہلے ہی اس شادی سے ناخوش تھے اور ان سے تعلق بھی رسمی سا رہ گیا تھا...... وہ حویلی میں صرف ایک بار آئے اور مہمان خانے میں رانا صاحب کے سامنے اپنی بیٹی سے مل کر چلے گئے...... جانتے بوجھتے انہیں کھانے کے لیے بھی نہیں روکا گیا اور صرف ایک پیالی چائے پر ٹرخا دیا گیا۔

شبانہ اپنی حویلی میں اسیری پر آنسو بہانے کے سوا کچھ نہ کرسکی...... اس میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اپنی جان دے سکتی...... طلاق لینے یا قانون کی مدد حاصل کرنے کا کوئی سوال نہ تھا...... اگلے دو سالوں میں مزید خرابی یہ ہوئی کہ وہ نفسیاتی مریض بن گئی...... وہ ہر وقت کھانے لگی اور اس کا وزن بڑھتا گیا یہاں تک کہ رانا صاحب کی چاہت بھی اس کے لیے نہ رہی...... ایک بے ڈول معمولی شکل وصورت کی عورت کے لیے وہ کوئی کشش محسوس نہ کرتے تھے۔

ان حالات میں جب مجھے حویلی میں قیدی بنا کے لایا گیا تو شبانہ کے دل بھی اشتعالی جذبات جاگ اٹھے...... اسے مجھ سے دلی ہمدردی میں تھی اور وہ رانا کو ایک شکست کی ذلت کا مزہ چکھانا چاہتی تھی...... گلابو کے ذریعے اس نے میری مدد کا منصوبہ بڑی ہوشیاری سے بنایا اور میں سمجھتی ہوں یہ سب قدرت کے دست غیب کا کرشمہ تھا کہ اس منصوبے کی کامیابی کے لیے آخر میں رانا کی بیٹی گل لندن سے آئی۔

رانا جب لوٹ کے آیا تو اس کی اطلاع مجھے گلابو سے مل گئی تھی...... مجھے خوف تھا کہ معلوم نہیں شرافت کا ظاہری لبادہ اتار پھینکنے کے بعد وہ میرے ساتھ کیسا سلوک کرے گا...... وہ بھیڑ کی کھال میں بھیڑیا تھا اور میں ایک کمزور بھیڑ...... میں یہ طے کرچکی تھی کہ اس نے مجھے تماشائے عبرت بنایا اور میرے ساتھ وہی سلوک کیا جو شبانہ کوثر کے ساتھ ہوا تھا تو میں اسے قتل کردوں گی۔ اس کے لیے مجھے نہ خنجر کی ضرورت تھی نہ تلوار کی...... نہ پستول کی اور نہ بم کی۔ میں ایک ڈاکٹر تھی...... میرا علم میرا ہتھیار بن سکتا تھا...... اس کا دل جیتنا اور اعتماد حاصل کرنا میرے لیے مشکل نہ تھا...... اس کے بعد رانا صاحب کو بیمار کرنا اور کسی انجکشن یا دوا کی گولی سے سفر آخرت پر روانہ کردینا میرے لیے بہت آسان تھا...... نہ مجھ پر قتل کا الزام آتا اور نہ دنیا کی کوئی عدالت مجھے سزا دے پاتی۔

رانا اگلے دن میرے پاس آیا تو اس کے تیور بدلے ہوئے تھے...... وہ بڑی تمکنت سے میرے سامنے آکے بیٹھ گیا اور سگریٹ پینے لگا...... جب اس نے دیکھا کہ میں غیظ وغضب میں آتش فشاں نہیں بنی بلکہ پرسکون اور خاموش ہوں تو اس کی ہمت بڑھی۔

اس نے کہا...... ”آپ کی طبیعت تو بہت اچھی لگ رہی ہے مجھے ڈاکٹر صاحبہ۔“

میں نے کہا...... ”میں آپ کو اچھی لگ رہی ہوں یا نہیں۔“

وہ مسکرایا...... ”آپ تو ہیں ہی اچھی۔“

”اور اچھی چیزیں جمع کرنا آپ کا شوق ہے...... کیا

اسی لیے آپ نے مجھے اغوا کرایا تھا...... یا مجھے قید رکھنے کا مقصد کچھ اور ہے؟"

اس نے سگریٹ کو فرش پر ڈال کر مسل دیا...... "کوئی اور مقصد آپ کے خیال میں کیا ہو سکتا ہے۔"

میں نے کہا...... "کیا آپ مجھ سے ڈرتے ہیں رانا صاحب......؟"

اس نے سر اٹھایا...... یہ خیال کیسے آیا آپ کو۔"

"آپ میرے سامنے جھوٹ بولتے رہے...... حالانکہ آپ صاف کہہ سکتے تھے کہ وہ آپ کے حکم کے غلام تھے جنہوں نے مجھے اغوا کیا اور یہاں لائے۔"

"یہ بات نہیں ہے ڈاکٹر شہناز۔"

"تو پھر کیا بات ہے...... کسی عورت کا حصول آپ کے لیے کوئی چیلنج نہیں بن سکتا...... آپ کے پاس دولت ہے...... طاقت ہے......"

"تم بہت اچھی طرح جانتی ہو......" اس نے برہمی سے میری بات کاٹ دی۔ "میں اس نواب کے نطفے کا دماغ درست کرنا چاہتا تھا...... جو کل تک ایک معمولی دو کوڑی کے ٹیچر کی اولاد تھا...... آج ست بدھائی کا بادشاہ سمجھتا ہے خود کو...... اس سارے علاقے پر حکومت کرنا چاہتا ہے...... شہنشاہ رفیق احمد شیرازی...... ڈھائی بوٹے تے فتو باغبان......"

میں نے کہا...... "آپ کو یقیناً غلط فہمی ہے......"

وہ دھاڑ کے بولا...... "غلط فہمی اس کو ہو گئی ہے کہ وہ میرے مقابلے پر آسکتا ہے...... مجھے شکست دے سکتا ہے۔"

"میرا خیال ہے ان کا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔"

"غلط ہے تمہارا خیال...... تم جھوٹ بول رہی ہو...... اس نے طے کر لیا ہے کہ وہ ہم خاندانی لوگوں کی عزت کی لاش پر اپنی سیاست چمکائے گا...... وہ سیاست کر رہا ہے اور تم باقی لوگوں کی طرح اس کے کھیل میں شامل ہو......"

میں نے کہا...... "رانا صاحب...... میں نے کون سی سیاست کی ہے؟"

وہ چلانے لگا...... "تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتیں...... یہ فری اسپتال کا ڈراما اور کیا ہے...... تم اس علاقے کے غریب لوگوں کو خواب دکھا رہے ہو...... اسپتال ہوگا...... اسکول ہوگا...... روزگار ہوگا...... بجلی ہوگی...... تاکہ وہ تمہارے فریب میں آجائیں اور میرے مقابلے میں تم کو ووٹ دیں...... میں بتا رہا ہوں تمہیں ڈاکٹر کہ ایسا کبھی نہیں ہوگا...... ان غریبوں کے نصیب میں تو یہی زندگی ہے جو صدیوں سے نہیں بدلی اور نہ بدلے گی...... اور تم لوگوں کی یہ خواہش بھی میری زندگی میں پوری نہیں ہوگی کہ تم اس دھوکے فریب کے کھیل میں مجھ سے جیت جاؤ...... نام میرا بھی رانا رجب علی ہے......" اس نے جاتے جاتے دروازہ دھڑ سے مارا...... اس وقت وہ غصے سے پاگل ہو رہا تھا...... اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا...... سانس تیز تیز چل رہا تھا اور منہ سے کف جاری تھا۔

میرے اندازے کے مطابق رانا کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ ہوگی۔ اس کا طرز زندگی بھی کھاؤ پیو عیش کرو والا رہا ہوگا...... عیاشی میں اس مزاج کے حامل جاہل وڈیرے اپنی دولت مندی کے بل پر ایک دوسرے سے چار قدم آگے ہی نظر آنے کی کوشش کرتے ہیں...... رانا کا ڈیل ڈول بھی ایسا ہے کہ اسے تمام عارضے جو عمر سے اور بے احتیاطی سے آتے ہیں لاحق ہوں گے...... مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں اس کی طبیعت نہ بگڑ جائے۔

میرا خیال کچھ ہی دیر بعد درست ثابت ہو گیا...... تقریباً آدھے گھنٹے بعد گلابو دوڑتی ہوئی آئی...... "ڈاکٹر صاحبہ...... ڈاکٹر صاحبہ...... جلدی چلو...... رانا صاحب کی طبیعت خراب ہو گئی ہے...... بہت خراب...... چھوٹی بی بی نے بولا ہے فوراً آپ کو بلاؤں۔"

میں نے سکون سے پوچھا...... "کیا دل کا دورہ پڑ گیا۔"

اس نے سینے پر ہاتھ رکھا...... "ایسا ہی لگتا ہے جی...... آپ چلو......"

اب سارے پہرے دار باادب کھڑے ہو گئے اور مجھے فوراً رانا کی حویلی میں اس کے بیڈ روم تک لے جایا گیا...... اس وقت مجھے اپنی ڈاکٹری کی ڈگری پر جتنی خوشی ہوئی پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی...... اس ڈگری نے یکلخت بازی پلٹ دی تھی...... فاتح کی طرح گرجنے والا بستر پر آنکھیں بند کیے پڑا تھا اور قیدی سے اس کی زندگی کی بھیک مانگی جا رہی تھی۔

میرے لیے فوراً کرسی رکھی گئی۔ میں نے اس کا معائنہ کیا۔ آثار بہت واضح تھے...... اسے دل کا دورہ پڑا تھا...... میں نے فوراً اسے اسپتال شفٹ کرنے پر زور

دیا...... روتی ہوئی بڑی اور چھوٹی بیگمات نے التماس کیا کہ پہلے میں کچھ کروں...... میں نے بلڈ پریشر دیکھنے کا آلہ مانگا جو مجھے مل گیا...... اس کا بلڈ پریشر خطرناک حد تک زیادہ تھا...... پھر میں نے پوچھا کہ یہ دوائیاں کیا کھاتے ہیں...... میرے سامنے ایک تھیلا دوائیوں سے بھرا ہوا رکھ دیا گیا...... میں نے اسے بستر پر الٹ کے دیکھا...... یہ مختلف ماہرین امراض قلب کی لکھی ہوئی ضروری اور غیر ضروری دوائیں تھیں یہ خریدی ضرور گئی تھیں مگر کھانے میں باقاعدگی کون کرتا...... یا کرا سکتا تھا۔

یہ رانا کی خوش قسمتی تھی کہ اس بے کار ذخیرے میں ہی مجھے اس کی زندگی کو بچانے والی دوائیں مل گئیں اور مجھے اپنے اعجاز مسیحائی سے حالات کو پلٹ دینے کا موقع ملا...... غالباً احتیاط یا پیشگی انتظام کے طور پر اس تھیلے میں کچھ ہنگامی ضرورت میں کام آنے والی دوائیں بھی رکھی گئی تھیں جو گرد و نواح میں دستیاب نہ ہوتی تھیں...... میں نے فوراً انجکشن لگائے اور کچھ مخصوص دوائیں بھی دیں۔

ایک عقلمندی میں نے یہ کی...... نہ جانے کیسے عین وقت پر مجھے اس کا خیال آ گیا۔ عام طور پر ڈاکٹر جلدی میں کسی سے کچھ نہیں پوچھتے...... وہ اپنی عقل کا دستیاب وقت کا استعمال کرتے ہیں...... میں انجکشن لگانے ہی والی تھی کہ اس خیال نے میرا ہاتھ روک لیا۔

میں نے بڑی بیگم سے کہا...... "آپ کی اجازت چاہیے مجھے......"

اس نے کہا...... "لو جی ڈاکٹر صاحبہ...... اجازت کیسی...... ہم نے خود بلایا ہے آپ کو۔"

میں نے کہا "دیکھیے زندگی اور موت پر اختیار صرف اللہ کا ہے...... کیا آپ کو اس پر شک ہے؟......"

"بالکل نہیں...... مگر آپ یہ باتیں کرنے میں وقت ضائع کر رہی ہو۔"

میں نے کہا...... "یہ بتانا ضروری ہے کہ خدا نخواستہ...... خدا نخواستہ...... میرے منہ میں خاک...... رانا صاحب کو فائدہ نہ ہوا...... یا نقصان ہو گیا...... تو مجھے قصوروار نہیں سمجھا جائے گا...... میری نیک نیتی پر شک نہیں کرے گا کوئی...... میں اپنی طرف سے اچھا کر رہی ہوں...... لیکن نتائج کی ذمے داری لوں گی اور نہ کوئی گارنٹی دوں گی...... جو سزا مجھے دینی ہے آپ دے سکتے ہو۔"

بڑی بیگم نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا...... "تم اللہ کا نام لے کر اپنا کام کرو۔"

میں نے محسوس کیا کہ رانا کی حیثیت ہمارے ملک کے صدر جیسی ہے تو بڑی بیگم اس کی وزیر اعظم ہے۔ رانا کی دوسری بیگم کی تو اوقات ہی وزیر بے محکمے والی تھی مگر اس کے جوان بیٹے اور بیٹیاں سب ماں کے سامنے چپ کھڑے تھے...... پھر بڑی بیگم سے ضمانت حاصل ہونے کے بعد میں نے وہی کیا جو ایک ڈاکٹر اپنے مریض کی جان بچانے کے لیے کرتا ہے اور چونکہ اللہ کو میری عزت رکھنی تھی...... یہ نہ ہوتا تو مجھے ایسا موقع کب فراہم ہوتا...... دس منٹ میں رانا کی طبیعت سنبھل گئی...... اب یہ فرض کرنا لاحاصل ہے کہ صورت حال اس کے برعکس ہوتی اور وہ مر جاتا تو بڑی بیگم کی ضمانت میرے کس کام آتی......

رات بھر میں وہیں رہی...... میں نے وقفے وقفے سے رانا کی حالت کو مانیٹر کیا اور دوائیں دیتی رہی...... وہ سوتا رہا...... صبح میں نے اعلان کر دیا کہ رانا کی طبیعت ٹھیک ہے لیکن اسے اب اپنے معالج کے پاس یا اسپتال جانا چاہیے اور اس کے بعد جو دوائیں ڈاکٹر دے وہی کھانی چاہئیں...... وغیرہ وغیرہ...... میری دھاک بیٹھ گئی تھی اور وہ سب شرمسار سے نظر آتے تھے لیکن صدیوں کی فطرت منٹوں میں کیسے بدل سکتی ہے......

کسی نے مجھ سے ناشتے کے لیے نہیں پوچھا...... کسی نے چائے کی ایک پیالی پیش نہیں کی...... میرا خیال ہے بد اخلاقی سے زیادہ یہ رانا کی اجازت کا مسئلہ تھا...... میں لوٹ کر اپنے قید خانے میں آئی تو کچھ دیر بعد گلابو نمودار ہوئی...... خوشی سے دمکتے اور امید سے چمکتے چہرے کے ساتھ......

"لو جی ڈاکٹر صاحبہ...... آپ کا تو کام ہو گیا......"

میں نے کہا...... کیا کام ہو گیا گلابو......"

"آپ نے میدان مار لیا...... آپ اسی وقت چلو چھوٹی بیگم کے پاس۔"

میں نے کہا...... "اب کیا انہیں دل کا دورہ پڑ گیا ہے۔"

وہ ہنس پڑی...... "اب آپ کو انہی کے ساتھ رہنا ہے۔ یہ بڑی بیگم سے چھوٹی بیگم نے کہا...... انہوں نے رانا صاحب سے پوچھا اور رانا صاحب نے اجازت دے دی ہے۔"

میں نے کہا...... "اب بھی یہ ممکن نہیں کہ میں حویلی

میں رہ سکوں......؟ یا بڑی بیگم مجھے اپنے پاس بلالیں......اس سے ان کی شان گھٹتی ہے۔"

چھوٹی بیگم کے کمرے میں پہنچ کے مجھے اندازہ ہوا کہ رانا کے دل کا ایک دورہ کتنا انقلاب آفریں تھا......اب حویلی میں کسی میرے جیسی ڈاکٹر کی مستقل ضرورت کے امکانات پر بات ہورہی ہے اور میرے جیسی ہوتو پھر میں ہی کیوں نہیں......بڑی بیگم کے ذہن میں کچھ ہے کہ رانا صاحب کو مجھ سے شادی کرلینی چاہیے......اس کے بڑے فائدے ہیں......باقی دوتو رانا صاحب نے نقصان کے سودے کیے تھے۔

دیکھتے دیکھتے دل کی بات زبان پر آگئی......اچانک حویلی کے اندر میری وقعت بڑھ گئی......رانا صاحب نے مجھے طلب کیا تو بڑی عزت کے ساتھ بٹھایا......

میں نے کہا......"اب کیسی ہے آپ کی طبیعت......؟"

"بس جی آپ نے بچالیا ہمیں۔"

میں نے کہا......"بچانے والا بھی اللہ ہے اور مارنے والا بھی......اگر میں چاہتی تو آپ کو مارنے کی کوشش ضرور کرسکتی تھی......الزام مجھ پر نہ آتا......میں نے اس کی گارنٹی حاصل کرلی تھی۔

"آپ ابھی چھوٹی بیگم کے ساتھ رہو گی......کسی قسم کی تکلیف ہوتو مجھے بتانا۔"

اس نے میری بات کو ہوا میں اڑا دیا تھا۔

میں نے کہا......"گویا میری رہائی کا کوئی چانس نہیں......اس قید خانے میں مجھے آرام سے رکھا جائے گا......"

"ابھی مجھے آپ کی ضرورت ہے۔"

میں نے کہا......"آپ کو باقاعدہ علاج کی ضرورت ہے......کسی اسپیشلسٹ کی نگرانی میں......"

"او جی دفع کرو اسپیشلسٹوں کو......اور اطمینان رکھو......ابھی میرا مرنے کا کوئی ارادہ نہیں......یہ دوائیں بھی فضول ہیں بڑے بڑے ناموں والی......معمولی سی خرابی ہوجاتی ہے ہاضمے کی یا جگر میں گرمی بڑھ جائے تو اسے دل کا دورہ سمجھنا غلطی ہے......دل میرا بہت مضبوط ہے خیر سے......گھوڑے پر سواری کرتا ہوں......شکار کھیلتا ہوں......دنیا کے سارے کام کرتا ہوں......اب بھی جوانوں سے زیادہ فٹ ہوں۔"

میں سمجھ گئی کہ وہ جاہل ہی نہیں خود پرست بھی ہے......وہ کسی حقیقی بیماری کے وجود کو بھی اس لیے تسلیم نہیں کرسکتا کہ یہ اس کا جسمانی نقص شمار ہوگی......اس کا علاج نہ کیا جاسکتا تھا اور نہ کرایا جاسکتا تھا......اللہ پر چھوڑا جاسکتا تھا کہ جب تک مہلت ہے جی لے۔

میں نے قید کے مسئلے کو زیادہ ایکسپلائیٹ نہیں کیا......مجھے چھوٹی بیگم یعنی شبانہ نے ڈپلومیسی سے کام لینے کی تاکید کی تھی اور بار بار کہا تھا کہ یہاں سے میں لڑ جھگڑ کے یا طاقت استعمال کرکے مرتے دم تک نہیں نکل سکتی لیکن عقل سے کام لوں تو شاید سارے پہرے اور ساری دیواریں دھری رہ جائیں اور میں چھلاوا بن کے غائب ہوجاؤں......

چھوٹی بیگم نے مجھے اندر باہر کے بہت سے راز بتائے......وہ کہانیاں سنائیں جو کسی کو معلوم نہیں......اس کی رہائش حویلی کے الگ حصے میں تھی جہاں دو بیڈ روم اس کے تصرف میں تھے......ایک مجھے دے دیا گیا تھا......گلابو اس کے ساتھ میری خدمت بھی کرنے لگی تھی......تاہم اس رعایت سے فائدہ اٹھا کے فرار ہونا میرے لیے اتنا ہی ناممکن تھا جتنا پرندے کی طرح اڑ کے نکل جانا......باہر قدم قدم پر ملازم اور محافظ تھے اور حویلی کے مین گیٹ تک دشمن کی چھاؤنی تھی۔

ایک بار کے بعد یہ معمول بن گیا......رانا صاحب کو دن میں ایک سے زیادہ مرتبہ دیکھنا ضروری تھا......ضرورت بھی وہ خود محسوس کرتے تھے تو کبھی بڑی بیگم کا حکم ہوتا تھا......اس کے ساتھ ہی خود بڑی بیگم کو بھی عارضے شروع ہوگئے......میں انہیں بھی دیکھتی رہی اور دوائیں لکھ کر دیتی رہی......ایسا لگتا تھا جیسے حویلی کے اندر چوبیس گھنٹے کسی ڈاکٹر کی موجودگی کی ضرورت کو اس طرح تسلیم کرلیا گیا ہے جیسے دیگر ملازمین تھے......رانا کی بیٹیاں میرے سامنے احساس کمتری کا شکار ہوتی تھیں اور مجھے واقعی کسی ملازم کی طرح بلاتی تھیں......رانا کے بیٹے بھی مجھے اور میری اہمیت کو ناپسند کرتے تھے......

شبانہ مسلسل مجھے گائیڈ کررہی تھی......وہ مجھ سے زیادہ رانا کے مزاج کو سمجھتی تھی......وہ ذہین لڑکی تھی مگر پنجابی میں کہتے ہیں ناکہ سیانا کوا ہی گو کھاتا ہے......اس نے بھی رانا کے چنگل میں پھنس کے زندگی برباد کرلی تھی......پھر ایک دن مجھے موقع ملا۔

رانا نے سرسری انداز میں پوچھا......"صرف یہ اسپتال بنانے کے چکر میں تم یہاں آگئیں......یہاں کیا ہے......دراصل تم کو بھی بے وقوف بنایا ہے اس نواب نے......خدمت خلق کے چکر میں ڈال دیا......صرف اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے۔"

"مجھے ایسا کہنا تو نہیں چاہیے......"میں نے آہ بھری......"لیکن رانا صاحب......دنیا میں سب ہی استحصال کرتے ہیں......کیا اپنے کیا پرائے......یہ درست ہے کہ اسپتال بنانے اور چلانے کا جو مزہ شہر میں ہے وہ یہاں کہاں......لیکن میرے اپنے وسائل نہیں تھے......ہر ڈاکٹر کا خواب اس کا اپنا اسپتال ہوتا ہے جو اس کے نام پر چلتا ہو اور جہاں اس کے پاس اتنے مریض ہوں کہ اپائنمنٹ لینے والوں کو ڈس اپائنمنٹ کا سامنا ہو......منہ مانگی فیس دینے کے باوجود بھی......"

وہ محظوظ ہوا......"اپائنمنٹ کے بجائے ڈس اپائنمنٹ......"

میں نے اپنی بات جاری رکھی......"پیسہ تو پھر خود آتا ہے......اور اسپتال بڑھتا جاتا ہے......شہر کے سب اسپتالوں کا یہی حال ہے......تمام بڑے اسپیشلسٹ وہاں باری سے بیٹھتے ہیں......ایک دو گھنٹے کی او پی ڈی ہوتی ہے......لیکن کمرے بھرے رہتے ہیں......بس اسی خواب کے پیچھے میں یہاں آگئی کہ چلو لاہور میں نہ سہی کہیں تو کوئی اسپتال اپنا ہوگا......اور میں کیا آئی......میں راجا کے چکر میں آگئی......اس نے دھوکا دیا مجھے......"

"راجا نے تمہیں دھوکا دیا......"وہ اپنی حیرت بلکہ خوشی پر قابو پا کے بولا۔

"ہاں......وہ اپنے چکروں میں تھا......آپ نہیں جانتے وہ کتنا چکر باز آدمی ہے......آپ شہر جائیں تو پتا چلے کہ اس کے چکر کتنی لڑکیوں کے ساتھ ہیں......جن کو وہ شادی کا جھانسا دیتا رہا......"

"تم سمجھتی ہو تمہیں بھی جھانسا دیا اس نے؟"

میں نے آہ بھری......"رانا صاحب......ایک تو خدا نے مجھے معمولی شکل وصورت دی......"

"ایسا کیوں سمجھتی ہیں آپ......لاکھوں میں ایک نظر آتی ہیں اگر ہماری نظر سے دیکھیں......"رانا بولا"میں نے جب پہلی بار دیکھا تو سمجھا آپ کوئی ماڈل ہیں۔"

میں نے شرما کے کہا......"رہنے دیں رانا صاحب......میں کوئی ایشوریا رائے نہیں ہوں......پھر میری عمر آپ دیکھ رہے ہیں۔"

"کیا ہوا ہے آپ کی عمر کو......؟"

"ہمارے ملک میں پچیس سال کی ہوجانے والی لڑکی کے لیے رشتوں کے دروازے بند ہونے لگتے ہیں......میں تو اٹھائیس......بلکہ اب آپ سے کیا پردہ......میں تیس کی ہوچکی ہوں۔"

رانا کا دل شاد ہوگیا......"آپ مجھ سے قسم لے لیں جو بائیس سے اوپر کی سمجھے آپ کو......اس کی نظر میں فتور......"

"راجا نے مجھے جھانسا دیا کہ تم یہاں اسپتال کی مالک بن جاؤ گی۔ہم شادی کرلیں گے......رفیق مجھ پر اندھا اعتماد کرتا ہے......تم دیکھنا میں کیا چکر چلاتا ہوں......اسپتال ہوگا تمہارے نام......اور اسے بنوانے میں دس بیس لاکھ تو میں نکال ہی لوں گا......پھر کیسی دوستی کہاں کی دوستی......ہم اسپتال بیچ کے آجائیں گے لاہور اور یہاں اپنا اسپتال بنالیں گے جسے چلائیں گے ہمارے بچے......ہم سب کو ڈاکٹر بنائیں گے......بس جی اس کی باتوں کے جال میں پھنس گئی......رفیق اس کی توقعات سے کہیں زیادہ کائیاں ثابت ہورہا ہے......اور کیوں نہ ہوگا......آخر وہ باہر سے ایم بی اے کرکے آیا ہے......ابھی تک تو اسپتال کی اینٹ بھی نہیں رکھی گئی......خواری کے سوا کچھ ملا نہیں ہے......میں تو پچھتا رہی ہوں......"

میری باتوں نے رانا کے دل میں نئی امید جگادی......"مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ اندر کے حالات ایسے ہیں......میرا خیال تھا......تمہیں بہت محبت ہے راجا سے......"

"محبت تھی......اب مجبوری ہے......نہ اسپتال بن رہا ہے نہ وہ شادی کی بات کرتا ہے......شاید کرے گا بھی نہیں......اس کی غرض ویسے ہی پوری ہوگئی ہے......اب بھی شہر جاتا رہتا ہے مختلف بہانوں سے......لیکن مجھے پتا ہے اس کے چکر ختم نہیں ہوئے......پچھلے دنوں اس نے کسی سے پیسے لے کر حج کا پورا سفرنامہ لکھ دیا تھا......توبہ توبہ......جو آدمی ایسے کام کرسکتا ہو پیسے کے لیے......وہ سب کچھ کرسکتا ہے......پینے پلانے کا شوق تو وہ یہاں بھی جاری رکھتا ہے......"

آئی ایم سوری کہ میں نے آپ لوگوں کی اتنی برائی کی......لیکن یہ شبانہ کا آئیڈیا تھا......اس نے مجھے سچویشن کو اپنی ضرورت کے مطابق ایکسپلائیٹ کرنا سکھایا......موقع مجھے قدرت نے فراہم کردیا تھا......یہ بھی

مجھے شبانہ نے بتایا کہ اس روز ڈاکٹر کی حیثیت سے میری ضرورت نہ پڑتی تو میرے ساتھ حویلی میں وہی ہوتا...... جو دشمنی میں اغوا ہو کے آنے والی کسی بھی عورت کا مقدر ہوتا ہے...... مجھے مرنے کے لیے زندہ رکھا جاتا...... میں مرنے کی آرزو کرتی اور مر نہ پاتی...... مجھے ایک تصویرِ عبرت بنا دیا جاتا اور شاید یہ تصویریں لوگ دیکھتے بھی...... لیکن واقعی بچانے والا وہ ہاتھ زبردست تھا۔

رانا نے اس کے بعد اپنی خواہش بیان کرنے میں دیر نہیں لگائی...... اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ لاہور شہر میں میری مرضی اور خواہش کے مطابق اسپتال بنوا کے میرے نام کر دیا جائے گا...... اگر میں اس سے شادی کر لوں تو...... اس نے یہ خدشہ ظاہر کیا کہ ممکن ہے شبانہ نے میرے بارے میں تم سے غلط بیانی کی ہو...... وہ ماڈل اور ایکٹریس بننا چاہتی تھی لیکن ڈاکٹر صاحبہ آپ خود ہی سوچیں...... کیا بیک وقت آدمی کو زمین اور آسمان مل سکتے ہیں...... کوئی یہ بھی چاہے کہ اسے عزت مل جائے اور وہ ایکٹریس بھی بن جائے...... گھر بھی بسا لے اور محفلوں میں جادو بھی جگاتی پھرے...... ہماری وضعداری کے معیار ایسے نہیں ہیں...... اسے شادی کے بعد حویلی میں رکھنا مجبوری تھی...... لیکن تمہاری مجبوری ہوگئی لاہور میں رہنا...... ورنہ اسپتال کون چلائے گا...... یہ میرا وعدہ کہ اسپتال کی رجسٹری شادی کے بعد تمہارے نام کر دی جائے گی...... انشاء اللہ تم کو اگلے انتخابات میں خواتین کی مخصوص نشستوں پر اسمبلی میں پہنچانا میری ذمے داری ہے۔

میں بڑی ہوشیاری سے قائل ہوتی گئی...... میں نے جلدی نہیں دکھائی...... اعتراضات کیے...... شکوک کا اظہار کیا...... ضمانتیں مانگیں...... یقین دہانی کے عملی ثبوت طلب کیے اور وہ بے وقوف سمجھنے لگا کہ میں طمع کے جال میں پھنس گئی ہوں...... میں نے تو یہ بھی مان لیا کہ وہ جوانوں سے زیادہ جوان ہے کیونکہ مرد کبھی بوڑھا نہیں ہوتا اور وہ مجھے ہمیشہ خوش رکھے گا...... میں نے اس کے ساتھ اپنی وابستگی یوں بڑھائی کہ اس کی صحت کا زیادہ خیال رکھنے لگی...... اس کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے لگی اور اس کو یوں روکنے ٹوکنے بھی لگی جیسے میں اس کی بیوی ہوں...... یہ کھائیں وہ نہ کھائیں...... یہ کریں وہ نہ کریں...... اور وہ مانتا گیا...... بڑھاپے کے عشق میں آدمی کا یہی حال ہوتا ہے...... سب حیران بھی ہوتے تھے لیکن اس کے ذاتی معاملات میں داخل اندازی کی ہمت کسی میں نہ تھی...... بڑی بیگم خود اس خیال کی علم بردار تھیں کہ گھر میں ایک ڈاکٹرنی ہونی چاہیے مگر میرا اثر و رسوخ ان کے لیے بھی پریشانی پیدا کر رہا تھا۔

اس درمیان میں آپ لوگ اپنی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ آپ کی طرف سے مجھے دو بار پیغامات بھی اسمگل ہوئے...... پھر شبانہ کے کہنے پر میں نے خود ہی یہ سلسلہ منقطع کر دیا...... وہ کہتی تھی کہ بنا بنایا کھیل نہ بگڑ جائے...... انہی دنوں لندن سے گل آئی اور تم لوگ اسے اغوا کر کے لے گئے...... تمہاری طرف سے مطالبہ بھی آ گیا کہ شہناز دے دو اور گل لے لو۔

یہاں بڑا کہرام مچا...... عالم اشتعال میں ڈائریکٹ ایکشن لیا گیا مگر وہ فیل ہو گیا...... پھر رائے عامہ یہ تھی کہ گل کو چھوڑ دیا جائے...... عاق کر دیا جائے...... اس کی ماں کو طلاق بھجوا دی جائے...... اس کا فون رانا کے منہ پر ایک تھپڑ بن گیا تھا...... بالآخر یہی طے کیا گیا کہ گل کے معاملے سے ہاتھ کھینچ لیا جائے...... میرے کہنے سے اس قرارداد میں رعایت کی ایک ترمیم لی گئی کہ رانا صاحب اسے لینے نہیں جائیں گے...... وہ خود آنا چاہے تو اس کی مرضی...... اور کمال دیکھو کہ یہ ترکیب کام آ گئی...... گل خود ہی آ گئی۔

گل کی واپسی کو رانا اور اس کی پوری فیملی نے بیک وقت اپنی فتح سے تعبیر کیا اور ظاہر ہے اس پر جشن بھی منایا اور خدا کا شکر بھی ادا کیا کہ ان کی عزت کا تماشا سر بازار نہیں ہوا...... ورنہ وہ کیا کرتے...... بدقسمتی سے گل اس ملک کی شہری نہیں تھی جس کے ساتھ قانون اور انسانیت کی پروا نہ کرتے ہوئے ہر قسم کا سلوک کیا جا سکتا ہے...... مظلوم اگر غریب ہے اور انصاف کے حصول کے لیے تھانے جاتا ہے تو وہاں بھی طاقتور کے اشارے پر اسے سلاخوں کے پیچھے بند کر کے تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور اگر وہ پھر بھی اپنے حق کی بات کرنے سے باز نہ آئے تو اس پر چوری ڈکیتی سے دہشت گردی تک ہر قسم کے مقدمات بنا دیے جاتے ہیں اور بعض اوقات تشدد سے ہلاک کر دیا جاتا ہے...... عورت پر ہونے والے مظالم کی حالت اور بھی بری ہے جسے عزت دار اپنی غیرت کے نام پر جب چاہیں قتل کر سکتے ہیں...... اور جہیز نہ لانے پر ہلاک کیا جا سکتا ہے۔

ہم سب اپنے ملک میں قانون اور انصاف کی صورت حال جانتے ہیں لیکن گل کے لیے پاکستان کا یہ دورہ...... نئے خوف زدہ کرنے والے ناقابل یقین اور لرزہ خیز انکشافات کا سبب بن گیا تھا...... حویلی کے اندر اس نے اپنے لیے پہلی بار ایک پُر عداوت رویہ دیکھا...... اس کے ساتھ وہ سلوک ہوا جو گھر سے بھاگ کر اور عزت گنوا کے واپس آنے والی لڑکی کے ساتھ ہوتا ہے۔

رانا کی لعن طعن تو اس نے برداشت کر لی کیونکہ وہ باپ تھا مگر جوش جذبات میں اس کے سوتیلے بھائی حد سے بڑھ گئے اور مطالبہ کرنے لگے کہ دشمنوں کے گھر میں رہنے اور ہماری عزت کی دشمن ہو جانے والی اس بے غیرت لڑکی کو زندہ گاڑ دینا چاہیے۔ گھر کی عورتیں اسے یوں دیکھنے لگیں جیسے وہ گندگی کا ڈھیر ہو...... اور اسے لعن طعن کرنے لگیں تو گل سے برداشت نہ ہوا...... اس کے دو ٹوک الفاظ نے بتا دیا کہ کوئی غلط فہمی میں نہ رہے...... وہ برطانوی شہری ہے اور سفارت خانے والوں کو معلوم ہے کہ وہ کہاں ہے۔

صورت حال کو بڑی بیگم نے سب سے پہلے سنبھالا اور گل کی حمایت میں دوسروں کو محتاط رہنے کی تاکید کی...... پھر کچھ رانا صاحب نے بھی رویّہ بدلا اور یہ کہا کہ چلو جو ہوا اس پر مٹی ڈالو...... اس کے بعد دو دن تک وہ گل کو ہم سب کی اصلیت بتاتے رہے کہ ہم کتنے مردود اور شیطان ہیں اور وہ خود کیسے نیک اور فرشتہ سیرت ہیں...... ہم کتنے گھٹیا ہیں اور وہ کتنے اعلیٰ...... سب سے بڑی بات یہ کہ جو دشمنی ہے وہ سب کے لیے دشمنی ہے اور دوست سب کا دوست ہے کیونکہ ہم بہرحال ایک فیملی ہیں۔

لیکن انہی دو دنوں میں گل نے مجھ سے اور شبانہ سے جو کچھ سنا وہ گل کو ایسی فیملی ایسی اقدار اور ایسے خاندانی نظام سے تنفر کرنے کے لیے کافی تھا...... حقائق اس کے باپ کو شیطان کا بدترین روپ ثابت کرتے تھے...... وہ قاتل تھا جو سیاست کی دیوار کے پیچھے خود کو محفوظ سمجھتا تھا...... عزتوں کا لٹیرا تھا جو باعزت شمار ہوتا تھا...... گھر کے ملازموں اور کمی کمین کہلانے والوں کا ساتھ اپنے خاندان والوں کا سلوک گل نے خود بھی دیکھا اور ہم سے بھی سنا...... خاص طور پر کاسو کا واقعہ خود میں نے اسے بتایا کہ کس طرح شکار کے دوران رفیق نے ایک خرگوش کو کتے سے بچا لیا تھا کتے نے رفیق پر حملہ کیا تو مارا گیا...... کتے کے مرنے کا رانا کو اتنا افسوس صدمہ اور غصہ تھا کہ اس نے کتے کی نگہداشت پر مامور کاسو کو کتے کے ساتھ دفن کرنے کا حکم دیا اور رفیق نے مداخلت نہ کی ہوتی تو ایسا ہی ہوتا...... رفیق ایک رات کاسو اور اس کی فیملی کو نکال لے گیا...... اسے رانا نے اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا اور دشمنی وہیں سے شروع ہوئی...... رفیق نے کاسو کی فیملی کو یہاں سے دور بھیج دیا ورنہ کبھی نہ کبھی رانا کے زرخرید غلام اسے اغوا کر کے لے جاتے...... سب کے سامنے اسے زندہ زمین میں گاڑ دیا جاتا اور کوئی دم نہ مارتا۔ رانا نے کتے کی کھال میں بھس بھروا کے ایک ڈمی عرصہ دراز تک محفوظ رکھی تھی کہ اسے کاسو کے ساتھ گاڑا جائے گا۔

اس قصے کے علاوہ رانا کی نکاحی اور غیر نکاحی شادیوں کے بہت سے دہشت ناک واقعات شبانہ کے علم میں تھے...... گل نے جب یہ قصے سنے تو اس کے لیے حویلی ایک ہیبت ناک جیل خانے سے بدتر ہو گئی...... وہ فوراً وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی مگر ہم نے اسے روکا...... شبانہ نے اسے اپنا پلان سمجھایا اور میں نے مدد کی درخواست کی تو وہ ہماری سازش میں شریک ہو گئی...... اس کے نزدیک یہ کارِ ثواب تھا...... اس کا فرض تھا اور ضروری تھا۔

دریں اثنا اپنی قابل قبول شرائط کے ساتھ میں نے دبے دبے الفاظ میں رانا سے شادی پر رضامندی کا اظہار کر دیا تھا۔ رانا یہ سمجھتا تھا کہ شرائط کی بعد میں کیا قانونی حیثیت جب ڈاکٹر شہناز اس کے چنگل میں ہوگی...... میں بہت محتاط انداز میں آگے بڑھ رہی تھی تاکہ اسے شک نہ ہو...... مجبوری کو اپنی مرضی تک لانے میں مجھے خاصی اداکاری کا مظاہرہ کرنا پڑا اور نہ وہ تاڑ لیتا کہ یہ ڈراما ہے۔

خوش قسمتی سے مجھے بڑی بیگم کی سرپرستی بھی حاصل تھی۔ مجھے رانا کے حرم میں شامل کرنے کی ضرورت اور افادیت کو سب سے پہلے اسی نے...... محسوس کیا تھا...... میں ان کی فرمانبردار تھی انہی سے رہنمائی حاصل کرتی رہی جیسے ان کا مجھ پر احسان ہے...... وہ صرف ایک بات سے پریشان تھی کہ رانا نے میرے لیے شہر میں اسپتال بنوایا مجھے شہر میں رکھا اور پھر اسمبلی میں پہنچا دیا تو گھر میں ایک ڈاکٹر کی ہمہ وقت موجودگی کا پلان تو اپنی موت آپ مر جائے گا...... تاہم وہ رانا کی مرضی کے آگے بے بس تھی۔

گل کے آنے سے قبل ہی مجھے گھر میں دیگر عزت دار

خواتین کی طرح آزادانہ نقل وحرکت کے علاوہ تمام دیگر اختیارات بھی حاصل ہو گئے تھے......مثلاً نوکروں سے خدمت لینا اور کچھ بھی طلب کر لینا......بیوی سے قبل ہی مجھے حویلی کی بیگم کا پورا پروٹوکول مل رہا تھا......قدغن صرف ایک تھی جو سب کے لیے تھی......میں باہر نہیں جا سکتی تھی......باہر جانے کے لیے رانا کی اجازت کے علاوہ یہ ضروری تھا کہ میں حویلی کی گاڑی میں ڈرائیور اور گارڈز کے ساتھ جاؤں۔

یہ بھی تقریباً طے ہو گیا تھا کہ رانا سے شادی کے بعد مجھے کیا ملے گا......رانا نے صرف دعوے کیے تھے۔ یہ ضروری تھا کہ میں اس کی زبان پر اعتبار کروں اور اس کے ہر بیان کی صداقت کو عدالتی بیان حلفی کا درجہ دوں......اگر میں قانونی دستاویز کی بات کرتی تو وہ مجھ سے اکھڑ جاتا......کسی قسم کی تحریر......حلف نامہ یا عدالتی ضمانت سارا کھیل خراب کر سکتی تھی......وہ اسے انا کا مسئلہ بنا لیتا کہ کیا میری زبان پر اعتبار نہیں۔

یہ تو بس اللہ کا احسان ہے کہ اس نے اسباب پیدا کر دیے اور میں عزت آبرو کی سلامتی کے ساتھ اس زنداں سے نکل آئی ورنہ تم لوگ مجھے اس دنیا میں پھر نہ دیکھتے......شبانہ کے اندازے کے مطابق رانا مجھے اپنے حرم میں رکھتا......کسی نکاح کے بغیر......پھر میری سزا اور انتقام کو درسِ عبرت بنانے کے لیے مجھے کچھ خاص مہمانوں کے سامنے پیش کیا جاتا......اس کے بعد میں پبلک پراپرٹی بن جاتی......مجھے حسب رتبہ سب کا مہمان ہونا پڑتا اور اس ذلت کے سفر میں اگر میں خود کسی مرحلے پر اپنی زندگی ختم نہ کرتی تو یہ سلسلہ نہ جانے کہاں تک جاتا......

میں یہ ظاہر کرتی رہی......جیسے مجھے رانا کی ہر بات پر اعتبار ہے اور وہ خوش ہوتا رہا کہ شہر کی ڈاکٹر بالآخر ناقص العقل عورت ذات ہی ثابت ہوئی......خوش فہمی کی یہ پٹی خود میں نے اس کی آنکھوں پر باندھی تھی......وہ سمجھ رہا تھا کہ میں کچھ نہیں دیکھ سکتی......حقیقت اس کے برعکس تھی......انجام اسے نظر نہیں آ رہا تھا۔

مجھے نہیں معلوم کہ رانا کے دونوں بیٹوں کا باپ کی نئی شادی کے بارے میں کیا ردِعمل تھا......وہ رانا کے نقشِ قدم پر چل رہے تھے اور پڑھے لکھے ہونے کے باوجود اپنی سوچ بدلنا نہیں چاہتے تھے۔ اس کی دونوں بیٹیاں خفا تھیں مگر صرف مجھ سے......ان کا خیال تھا کہ شبانہ کی طرح میں نے بھی ان کے باپ کو پھانس لیا......شہری لڑکیاں ایسا ہی کرتی ہیں......رانا کو کسی کی پروا نہیں تھی۔ اس نے بطور صدر اپنی مملکت کی وزیراعظم بڑی بیگم کو بتا دیا تھا کہ محرم گزر جانے کے بعد مجھ سے شادی ہو گی......بڑی بیگم نے ربیع الاول تجویز کیا اور یہ معاملہ تقریباً طے پا گیا۔

انہی دنوں گل کا نزول ہوا اور حویلی کے اندر خاصی گرما گرمی رہی......پھر جب گل حویلی پہنچ گئی تو زلزلے کا دوسرا جھٹکا آیا جو پہلے جیسا تباہ کن نہیں تھا......بالآخر گرد بیٹھ گئی اور گل کو ہم نے حالات سے فائدہ اٹھانے کے لیے اپنی سازش میں شریک کر لیا......وہ فوراً مان گئی کیونکہ یہ اصولی طور پر جائز تھا اور وہ اپنے باپ کو سزا دینے کے حق میں تھی۔

اس ڈرامے کے آخری ایکٹ میں گل نے تمہیں شامل کیا......مجھے حیرانی ہوتی ہے کہ شبانہ کی ڈراما کرنے کی صلاحیت کتنی زبردست ہے۔ اسے اسٹیج پر آنے کا شوق تھا......یہ کوئی خاص بات نہیں......فلم اور ٹی وی نے اس شوق کو ہوا دی ہے لیکن وہ فطری اور پیدائشی ایکٹرس ہے اور ڈراما اس کے دماغ میں ہے اس کے خون میں ہے......اگر ایسی خداداد صلاحیت کو تربیت اور نشوونما کا موقع ملے تو پتا نہیں شبانہ جیسی کتنی لڑکیاں اسکرپٹ رائٹر یا ڈائریکٹر بھی بن جائیں......خیر......شبانہ نے گل کو ایک اسکیم سمجھائی اور اس نے بڑی پراسرار راز داری کے ساتھ تمہیں بات کرنے کے رہتاس کے قلعے میں بلا لیا۔

وہاں اس کی اور تمہاری تمام گفتگو اسکرپٹ کے مطابق تھی......مجھے افسوس ہے کہ اس سے راجا کو شدید ذہنی اذیت سے گزرنا پڑا......لیکن......مجھے اس سے ہرگز یہ اندیشہ نہ تھا کہ شدید مایوسی میں یہ خودکشی کر لے گا......خودکشی کرنے والوں کی ٹائپ دوسری ہوتی ہے......گل کی باتوں کا اثر یہ ہوا کہ اسی شام تم دونوں رانا کی حویلی میں پہنچ گئے اور اس سے بات کرنے کے بعد مجھ سے براہ راست تصدیق چاہی۔

رانا اتنا پراعتماد بلکہ OVER CONFIDENCE تھا کہ اس نے بے خطر مجھے بلایا اور میں نے اس عقل کے اندھے کی آنکھ میں آخری پٹی باندھ دی۔ میں نے اس کے سامنے راجا کو صاف جواب دے دیا کہ میں رانا سے شادی کر رہی ہوں اور اس کی وجہ بھی بتا دی......اس وقت مجھے کتنا دکھ ہو رہا تھا......مت پوچھو......رانا کی اور تمہاری وہ شکل مجھے نہیں بھولتی......تم سخت مایوس اور خفا

تھے......لیکن وہ میرے ڈرامے کا آخری سین تھا۔

اس دن رانا کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا......وہ اپنے دشمن کو گھر بلا کے ذلیل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا......اور یہ کوئی معمولی کامیابی نہ تھی......راجا کو اس کے رقیب روسیاہ نے برباد کر دیا تھا......اس کے بعد رانا کو یقین ہو گا کہ یہ صحافی تو گیا......اول تو کچھ کھا کے مر جائے گا ورنہ یہاں تو ہرگز نہیں رہے گا......اس کا میرے فیصلے پر اعتماد کامل ہو گیا۔

پرسوں رات ہم نے آزمائشی پرواز کی......میں اور گل کھانے کے بعد ٹہلتے رہے اور گیٹ کی طرف چلے گئے......گل نے گیٹ کھلوایا اور ہم باہر گیٹ کے محافظوں کی نظر کے سامنے چہل قدمی کرتے رہے......کسی کی مجال نہ تھی کہ حکم عدولی کرتا مگر ڈر کے مارے محافظوں نے فوراً یہ خبر رانا تک پہنچا دی کہ رانی بی بی اور ڈاکٹر صاحبہ باہر نکلی ہیں......غالباً رانا نے کہا ہو گا کہ دونوں پر نظر رکھنا......لیکن ہم خود ہی کچھ دیر بعد باتیں کرتے ہوئے لوٹ آئے۔

دوسرے دن پھر ایسا ہی ہوا......پہلے دن ہم نے اپنی نیک نیتی ثابت کر دی تھی......رانا مطمئن تھا کہ تشویش کی کوئی بات نہیں......ایک ولایت سے آئی ہے دوسری شہر کی ڈاکٹر ہے......حویلی کی چار دیواری میں خود کو قید محسوس کرتی ہو گی......باہر نکل کے ٹہل رہی ہیں تو جائز ہے......

کل ہم نے فائدہ اٹھانے کا طے کر لیا تھا......ہم نے چہل قدمی کا فاصلہ بڑھا دیا......پہلے دن ہم گیٹ سے سو گز ادھر اور سو گز ادھر پھرتے رہے تھے......دوسرے دن آہستہ آہستہ یہ فاصلہ بڑھ کے ڈیڑھ سو گز کیا پھر دو سو گز......واپسی میں آخری راؤنڈ لگایا اور دوسری طرف دو سو گز چلے گئے......محافظ مطمئن تھے کہ سب خیر ہے......ہم نے پلان کے مطابق غائب ہو کے دوڑ لگائی......مجھے ڈائریکشن کا کچھ اندازہ تھا مگر راستے کا نہیں تھا......ہم بے تحاشا بھاگے......بھاگتے بھاگتے ہمارا سانس پھول گیا......ہم راستہ بھٹک گئے مگر ایک دوسرے کے ساتھ رہے۔

نازک ولایتی جوتے اس ریس میں ہمارا کیا ساتھ دیتے وہ الٹا رکاوٹ بن رہے تھے......اونچی ایڑی کے ساتھ دوڑنا مشکل تھا......ہم نے جوتے اتار پھینکے اور ننگے پاؤں دوڑنا شروع کیا......قسمت نے مزید یہ ساتھ دیا کہ راستہ ہموار آ گیا......پھر چاند نکل آیا جس کی روشنی میں راستہ دیکھنا مشکل نہ رہا......ہماری سمت غلط نہیں تھی......کئی جگہ ہم سانس پر قابو پانے کے لیے رکے اور چند منٹ دم لے کر دوبارہ بھاگے......ہم پر ایک دہشت طاری تھی کہ تعاقب کرنے والوں نے پکڑ لیا تو ہمارا انجام کیا ہو گا۔

یہ بات یقینی تھی کہ گیٹ کے محافظوں نے ہمارے آخری راؤنڈ سے واپس نہ آنے کو فوراً نوٹ کر لیا ہو گا......پہلے وہ خود دیکھنے آئے ہوں گے اور یہ جان لینے کے بعد کہ دونوں لڑکیاں ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کے فرار ہو گئی ہیں، وہ رانا کو یہ خبر سنانے دوڑے ہوں گے......کوتاہی کی جو سزا انہیں ملی ہو گی وہ اپنی جگہ......اس خبر نے رانا پر بجلی گرا دی ہو گی......یک نہ شد دو شد......ہونے والی بیوی گئی سو گئی اس کے ساتھ بیٹی بھی گئی......اسے یقین نہیں آیا ہو گا کہ اسے بے وقوف بنایا گیا......اور جب آیا ہو گا تو غصے نے اسے پاگل کر دیا ہو گا......میری بڑی خواہش تھی کہ یہ صدمہ اس کے ہارٹ اٹیک بلکہ ہارٹ فیل کا سبب بن جائے لیکن میری یہ بددعا قبول نہیں ہوئی......وہ ابھی تک زندہ ہے......صحیح غیرت مند ہوتا تو ڈوب کے مر جاتا......

☆☆☆

شہناز کی ہمت اور ذہانت کا یہ کارنامہ ہم سب کے لیے باعثِ فخر ہو گیا تھا......سب سے زیادہ خوش ہونے کا حق راجا کا تھا......وہ اتنا جذباتی ہو رہا تھا کہ ایک بار اس نے سب کی موجودگی میں شہناز کا ہاتھ پکڑ کے چوم لیا اور بولا......''یو آر گریٹ......'' شہناز کچھ شرمائی مگر اس نے برا نہیں مانا اور ہم نے بھی کوئی خاص اہمیت نہیں دی......اسی روز شام کے وقت جب ہم سب باغ میں چائے پی رہے تھے اور اماں ابا بھی موجود تھے......میں نے وہ سوال کر دیا جو شاید سب کے دل میں تھا......

میں نے پوچھا......''شہناز......اب کیا سوچا ہے تم نے؟''

''کس بارے میں رفیق بھائی......'' اس نے سادگی سے سوال کیا۔

میں نے کہا......''ست بدھائی ترقیاتی منصوبے کے بارے میں......''

وہ مسکرائی......''اس کے بارے میں آپ سوچیں۔''

''میرا مطلب تھا......اس منصوبے کا سب سے اہم

اور پہلا مرحلہ تھا وہ اسپتال...... جو تمہارے ذمے داری تھا......''

شہناز نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا...... ''میں اپنی ذمے داری پوری کروں گی...... اسپتال ضرور بنے گا......''

ریشم خوشی سے بے قابو ہو کے چلائی...... ''بیک یو ناٹ گو میڈم...... دین آئی گو اینڈ یو گو...... سی پیشنٹ......''

شہناز مسکرائی...... ''ہم اسی طرح گاؤں گاؤں مریضوں کو دیکھنے جائیں گے۔''

اس بات پر راجا نے پھر پہلے جیسی جذباتی حرکت کی...... شہناز سے برہمی سے کہا...... ''دماغ خراب ہو گیا ہے تمہارا......'' اور اٹھ کے دور جا بیٹھی۔

میں نے فوراً صورت حال کو سنبھالا...... ''یہ کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے شہناز......''

ابا جی نے فیصلہ کن انداز میں کہا...... ''ہاں...... میں اس کی اجازت نہیں دوں گا کہ تم جانتے بوجھتے دوبارہ خطرات کے منہ میں جاؤ...... یہ بہادری نہیں بے وقوفی ہو گی...... اللہ نے ایک مصیبت سے بچایا...... اس کا شکر ادا کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ اپنی حفاظت کی جائے اور وہ غلطی دہرائی نہ جائے۔''

''مگر ایسے اندر بیٹھ کے یہ کام نہیں ہو سکتا ابا جی......'' شہناز بولی۔

میں نے کہا...... ''ہو سکتا ہے...... تم حویلی میں کلینک بناؤ گی...... جب تک اسپتال کی لیز مکمل نہیں ہوتی مریضوں کو یہاں آنا ہو گا......''

''اور جو نہیں آ سکتے...... جہاں میرا جانا ضروری ہوا......''

''وہاں غنی تمہیں سیکیورٹی کے ساتھ لے جائے گا......''

میں نے کہا...... ''یا ہم ایمبولینس سروس دیں گے۔''

گل نے کہا...... ''میں کیا کروں...... میری ریسرچ تو رہ گئی جس کے لیے میں پاکستان آئی تھی...... میرا ایک سال ضائع ہو جائے گا۔'' فکر مت کرو...... تمہاری ریسرچ پوری ہو گی۔

''ایجنسی والے تمہاری حفاظت کو یقینی بنائیں گے۔ تمہیں پولیس اسکورٹ مل جائے گی۔''

''مجھے تو اب کسی پر بھروسا نہیں رہا......'' وہ مایوسی سے بولی ''ابھی تک کچھ بھی نہیں ہوا...... معاملات کو نمٹانے کے لیے۔''

''رانا کے وکیل سیف علی خان کا فون آنے کے بعد ہم نے انہیں تھوڑی سی مہلت دی تھی کہ شاید وہ پھر رابطہ کریں۔ کوئی پیشکش ہو پر امن بقائے باہمی کے لیے سمجھوتے کی...... مگر ایسا لگتا ہے وہ کچھ نہیں کریں گے۔'' اس نے کہا۔

راجا بولا...... ''اور خواہش کرتے ہوں گے کہ ہم بھی کچھ نہ کریں۔ معاملہ دب جائے...... شہناز کے اغوا اور حبس بے جا کا کیس نہ ہو...... رہا گل کا معاملہ تو وہ بالآخر ولایت لوٹ ہی جائے گی...... جو کام پہلے نہ ہوا اب کر لیا جائے گا...... گل عاق اور اس کی ماما کو طلاق......''

''حالانکہ دونوں سے ہمارا بھلا ہی ہوتا ہے۔'' گل نے غصے سے کہا...... ''ایسے باپ سے میری نسبت بھی میری توہین ہے...... اور میری ماں پہلے کون سی خوش تھی...... یہ حالات معلوم ہو جانے کے بعد وہ خود ایک منٹ ایسے شخص کی بیوی کہلانا قبول نہیں کر سکتیں۔''

میں نے کہا...... ''راجا...... ہم ایف آئی آر لکھوائیں گے رانا کے خلاف...... ہم نے کچھ دیر نہیں کر دی۔''

راجا نے خفگی سے کہا...... ''دیر سے کیا فرق پڑتا ہے...... اور شہناز وہاں سے کون سی ڈائری میں تاریخ لکھ کے یا حاضری رجسٹر میں دستخط کر کے فرار ہوئی تھی...... ہم کل صبح بھی کہہ سکتے ہیں کہ وہ ابھی چند گھنٹے پہلے پہنچی ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے۔''

''تیرے دماغ میں یہ تذبذب کیسا ہے فیکے پتر......''

میں نے کہا...... ''بس ایسے ہی...... سوچ رہا تھا کہ کیا افہام و تفہیم کی یہ پیشکش فائدہ مند ہو سکتی ہے......؟''

راجا طنز سے بولا...... ''پکڑے جانے والے کو برا سانپ سے معاہدہ کہ وہ پھر ملا تو ڈسے گا نہیں......''

''راجا...... میں اناڑی ہوں مگر بے وقوف نہیں...... یہ بس ایک خیال تھا کہ کیا اس سے وقتی طور پر معاملات سدھر سکتے ہیں...... عارضی طور پر ٹھہراؤ آ سکتا ہے جس سے ہمیں حالات پر قابو پانے میں مدد ملے...... جو بعد میں ہو گا اس سے بعد میں نمٹ لیں گے...... دوسری بات میرے خیال میں تھا کہ زخم خوردہ سانپ پر رحم کھانا بے وقوفی ہے...... فریب کاری میں اچھائی دیکھنا خود اپنے ساتھ دشمنی ہے۔''

''یہی درست رویہ ہے...... رانا آج قابو میں آیا ہے تو اس کے ساتھ رعایت کا کیا سوال...... ہم اسے ایسا سبق

سکھائیں گے جو اس کی آنے والی سات نسلوں کو یاد رہے...... اس کے علاوہ...... ابھی تک اس نے سیف علی خاں سے فون کرانے کے سوا کیا قدم اٹھایا ہے...... وہ اپنی ناک نیچی کر کے ہم سے بات بھی کرنے کا روادار نہیں......'' راجا بولا۔

میں نے کہا...... ''میرا خیال تھا وہ کسی اور کو بھیجے گا۔''

ادھر میرے لبوں سے یہ بات نکلی اور ادھر گیٹ کھلا اور فاروقی اندر آ گیا...... کسی تکلف کے بغیر وہ سیدھا آیا اور ایک خالی کرسی پر بیٹھ گیا...... اس کرسی پر سے ابا جی اٹھ کر گئے تھے...... اس کے رویے نے ہم سب کو حیران کر دیا...... شہناز کو دیکھ کر اسے حیرت کا بہت شدید جھٹکا نہیں لگا تھا۔

اس نے واجبی سی خوشی کے ساتھ کہا...... ''بھئی ڈاکٹر صاحبہ آپ کے لوٹ آنے کی ہمیں بھی بڑی خوشی ہے۔''

میں نے کہا...... ''فاروقی...... کیا تجھے معلوم تھا کہ شہناز لوٹ آئی ہے۔''

اس کا رنگ لمحہ بھر کے لیے متغیر ہوا لیکن اس نے خود کو سنبھال لیا...... ''کیا تو نے بتایا تھا مجھے؟...... یا اس مہاراجا نے......؟ پھر مجھے کیسے معلوم ہوتا۔''

میں نے کہا...... ''میرا مطلب تھا...... تو نے پوچھا نہیں کہ کب آئیں...... کیسے آئیں...... تو حیران نہیں ہوا......''

''بھئی سب پوچھیں گے...... آہستہ آہستہ...... پہلے چائے تو پلاؤ......'' اس نے میرے سوال کے آخری حصے کا جواب گول کر دیا اور پھر شہناز کی طرف متوجہ ہو گیا...... ''ہاں بھئی...... تم نے تو واقعی دم بخود بھونچکا ہکا بکا کر دیا......'' اس نے حسب عادت ایک قہقہہ بلند کیا...... ''طلسماتی ٹوپی پہن کے نکلی یا شاہ جنات اٹھا لائے......''

شہناز نے متانت سے کہا...... ''بس کچھ بھی سمجھ لیں آپ......''

''خیر سے یہ ذات شریف کون ہیں...... پہلے کبھی دیکھا نہیں......'' وہ گل کی طرف متوجہ ہو گیا۔

میں نے کہا...... ''یہ گل ہے...... لندن سے آئی ہے......''

''یعنی ولایتی پھول......'' اس نے پھر قہقہہ لگایا۔

شہناز نے کہا...... ''مجھے بہت افسوس ہوا...... آپ کی دوسری بیوی کی حادثاتی موت کا سن کر......''

فاروقی اپنے پرانے کردار کے مطابق بے تکلفی کا مظاہرہ کرنے میں مصروف تھا...... یا اس کی اداکاری کر رہا تھا...... شہناز کی بات نے اس کو خفیف بلکہ ذلیل کیا...... جس شخص کی بیوی کو مرے چند روز ہی گزرے ہوں...... اور وہ اس کے پہلے بچے کو جنم دینے والی بیوی تھی...... وہ ایسے کھل کر قہقہے لگائے تو اپنا بھید خود کھول دیتا ہے کہ نہ اس کا غم حقیقی تھا نہ یہ خوشی حقیقی ہے۔

اس نے ایک دم متانت اختیار کر لی...... ''وہ بس...... اللہ کو یہی منظور تھا...... یہ شاید میری غلطی کی سزا تھی......''

مجھے پتا نہیں چلا کب راجا نے شہناز کو اٹھ جانے کا اشارہ کیا...... وہ ایک دم کھڑی ہو گئی...... ''گل...... میرے ساتھ آؤ ذرا۔''

گل نے کوئی سوال نہیں کیا اور کھڑی ہو گئی...... اس نے بالکل نہیں پوچھا کہ یہ ذات شریف کون ہیں جن سے آپ نے مجھے ملوایا...... یا تو وہ غائبانہ تعارف رکھتی تھی اور اندازے سے پہچان گئی تھی کہ وہ لیلیٰ بھابی کے میاں اور ہمارے وکیل فاروقی کے سوا دوسرا فاروقی نہیں ہو سکتا۔

رابعہ کے علاوہ اب وہاں صرف لیلیٰ بھابی تھیں جو اپنے شوہر کے رویے سے کچھ خوش نظر نہیں آئی تھیں...... فاروقی نے اسے چائے لانے کے لیے روانہ کر دیا...... جب ہم تینوں وہاں رہ گئے تو اس نے سنجیدگی سے کہا...... ''یار مجھے احساس ہے کہ تم لوگ مجھ سے خوش نہیں ہو......''

میں نے کہا...... ''فاروقی...... وہ تیرا ذاتی معاملہ تھا...... تو نے ہم سے چھپایا...... تیری مرضی...... ہم خفا ہونے کا کوئی حق نہیں رکھتے......''

''تم لوگ اپنی بھابی سے زیادہ جذباتی قربت رکھتے ہو...... اس کے دل میں رنجش ہے اور تمہاری ہمدردیاں اس کے ساتھ ہیں...... میں چاہتا تھا کہ اب ہم لوگ پرانی باتوں کو بھلا کے پہلے کی طرح ہو جائیں......''

راجا نے کہا...... ''سب ٹھیک ہو جائے گا فاروقی...... لیکن اس میں وقت تو لگے گا...... ہم بھی دوسرے معاملات میں الجھے ہوئے ہیں...... یہ بتا تو کسی سیف علی خاں کو جانتا ہے...... ایڈووکیٹ سپریم کورٹ......''

''ہاں نام سنا ہے...... تم کیوں پوچھ رہے ہو......''

راجا نے کہا...... ''میں سوچ رہا تھا اسے اپنا قانونی مشیر بنا لیا جائے۔'' فاروقی نے حیرانی ظاہر کی۔ ''یعنی

میری نوکری ختم؟"

راجا نے بات ٹالی...... "بابو تم سول سائیڈ سے ڈیل کرتے ہو بلکہ کارپوریٹ کیس لیتے ہو...... ہمیں کرمنل سائیڈ کا بندہ چاہیے جو پھانسی نہ ہونے دے میرا ارادہ ہے کچھ قتل کرنے کا......"

اسی وقت میرے فون کی گھنٹی گنگنانے لگی...... میں نے نمبر دیکھا اور وہاں سے اٹھ کے کچھ دور چلا گیا...... "ہیلو......" میں نے کہا۔

دوسری طرف سے نور جہاں نے اپنی ریشمی آواز میں کہا...... "مبارک ہو...... آپ کی ڈاکٹر شہناز واپس آ گئی......"

میں نے کہا...... "تمہیں معلوم ہوگیا...... کیسے؟"

"اجی ہمیں سب پتا ہوتا ہے سرکار...... اندر باہر کا حال...... تم جانتے ہو ہم انتریا ی ہیں......" وہ ہنسی۔

"یہ بات ہے تو اندر کی اور خبر بتاؤ...... اب کیا ہو رہا ہے وہاں......"

"اب کیا ہوگا میرے چندا...... تمہارے قتل کا سامان ہو رہا ہے اور کیا...... ایک خونی کو سزا تو ملنی چاہیے......"

میں نے کہا...... "میں نے کس کا خون کیا ہے......؟"

"آپ نے؟ میں بتا دوں کتنے خون کیے ہیں...... میرے دل کا خون کیا...... میرے ارمانوں کا خون کیا...... میری حسرتوں کا خون کیا...... میرا خون کیا......"

"گویا خبر کوئی نہیں......"

اس نے آہ بھری...... "بڑے بے مروت اور احسان فراموش ہو جی؟ غرض کے بغیر کیا ملنا گناہ ہے......؟"

"گناہ کی بات مت کرو......"

"چلو ثواب سمجھ کے آ جاؤ...... کوئی پیاس سے تڑپ رہا ہو تو اس کی پیاس بجھانا ثواب ہے کہ نہیں...... درد جدائی سے مرنے والے کو بچانا ثواب ہے کہ نہیں۔" اس نے کہا۔

"آج تو مشکل ہے۔" میں نے اسے ٹالنا چاہا۔

"تو مشکل کو آسان کرلو...... اپنے علاوہ بھی بہت کچھ ہے میرے پاس تمہیں دینے کے لیے......" اس کی آواز جیسے نشے میں ڈوب گئی۔

پھر معلوم نہیں اچانک مجھے کیا ہوا...... میں نے محسوس کیا کہ مجھے نور جہاں کی ضرورت ہے...... یہ ولسی ہی بے بس کر دینے والی طلب تھی جیسی نشے کا عادی نشہ ٹوٹنے پر محسوس کرتا ہے...... یہ جانتے ہوئے بھی کہ شراب حرام ہے اور تباہ کر دیتی ہے وہ بوتل کو منہ سے لگا لیتا ہے...... اس کی ساری عقل سلیم اور حرام حلال کی تمیز دھری رہ جاتی ہے...... اس کی بے چینی اور طلب کے آگے قوت ارادی شکست کھا جاتی ہے...... جب نشہ ٹوٹتا ہے تو دنیا کے زر و جواہر بھی اس کے لیے بے مصرف ہو جاتے ہیں...... صرف ایک ہی چیز پر زندگی کا انحصار محسوس ہوتا ہے۔

نور جہاں کا نشہ تھا جس کا میں عادی ہو چکا تھا...... یہ نشہ دنیا کے ہر نشے سے زیادہ بے اختیار اور مدہوش کر دینے والا تھا...... دنیا کی اعلیٰ ترین شراب اس کے سامنے ہیچ تھی...... یا کم سے کم میں ایسا محسوس کرتا تھا اور یہی اصل خرابی تھی...... نہ راجا ایسا محسوس کرتا تھا نہ فاروقی...... کیونکہ انہوں نے ایسا کوئی نشہ کبھی کیا ہی نہیں تھا...... ہائے کم بخت تو نے پی ہی نہیں...... والی بات تھی......

نہ جانے کہاں سے نور جہاں کی ریشمی ڈور جیسی آواز آئی اور اس نے مجھے کچے دھاگے کی طرح باندھ کے بے بس کر دیا...... ایسے کھینچ لیا جیسے میں پتنگ سے بندھی ڈور ہوں...... میں نے راجا سے کہا کہ میں جا رہا ہوں تو میری صورت دیکھ کر اس نے میرے دل کی بات جان لی۔

"نور جہاں کے پاس......" اس نے ٹھنڈی سانس لی۔

میں نے اقرار میں سر ہلایا...... "میں صبح آ جاؤں گا۔"

"جا نیکے پتر...... تجھے میں کیا کہوں...... میں بھی شراب سے علاج غم کرتا تھا...... نشہ آدمی کو سب بھلا دیتا ہے...... لیکن......" راجا کچھ پریشان ہوگیا۔

میں نے کہا...... "لیکن کیا...... تو میری سیکیورٹی سے پریشان ہے......"

"پریشانی کی بات تو ہے...... ان حالات میں...... تیرا اکیلا جانا۔"

میں نے اسے تسلی دی...... "ابھی وہ ڈائریکٹ ایکشن کا رسک نہیں لیں گے۔"

"تو فاروقی کی گاڑی لے جا......" راجا بولا...... "وہ تو رات کور کے گا......"

اس کی ترکیب مجھے پسند آئی...... دس منٹ بعد میں

فاروقی کی تقریباً نئی ہنڈا سوک میں اڑتا ہوا جا رہا تھا...... رہتاس کے قلعے سے دینہ کا پندرہ کلومیٹر کا فاصلہ کوئی مسافت نہ تھی لیکن اس سے پہلے ست بدھائی کے دس کلومیٹر اس سے دگنی مسافت کے برابر تھے کیونکہ سڑک بہت خراب تھی بلکہ نہ ہونے کے برابر تھی...... جی ٹی روڈ تک پہنچتے ہوئے مجھے پون گھنٹا لگ گیا۔

میری ذہنی کیفیت اس مخص جیسی تھی جو اپنی رقم شراب خانے میں اڑانے جا رہا ہو...... اس کی عقل ملامت کرتی ہو لیکن وہ نشہ ٹوٹنے کی بے کلی سے مجبور ہو اور اس سرور کے تصور میں گم ہو جو اسے شراب کی بوتل دے گی اور جو اس کی دسترس میں ہے...... نور جہاں کا تصور بھی اس سے کم جان فزا نہ تھا...... اس کے حسن کی آب و تاب...... اس کے بدن کی دودھیا چاندنی...... اس کی زلف پریشاں کی پرسکون مہک...... اس کے قرب کی آنچ...... اس کے ریشمی لمس کا جادو بھرا احساس اور اس کی خود سپردگی کا انداز...... جس میں وارفتگی تھی...... دیوانگی تھی اور دل بستگی تھی۔

پھر اچانک کہیں سے فریال کا خیال لطف و انبساط کے خواب کو درہم برہم کرنے آ جاتا تھا...... بولو کیا یہ بے وفائی نہیں ہے؟ اپنی فطرت میں تم بھی روایتی مرد ہی ثابت ہوئے...... حقیقت میں کیا تم ان بدکردار نوجوانوں سے کم ہو جو گھر میں حرم آباد رکھتے ہیں...... داشتہ الگ پالتے تھے اور کوٹھے پر جانا اپنی شان سمجھتے تھے مگر پھر بھی شرفا میں شمار ہوتے تھے اور پھر بیوی سے وفاداری کی سند بھی حاصل کر لیتے تھے...... یہی سب تم کرو گے...... بلکہ کر رہے ہو...... یعنی محبت تو تمہیں صرف فریال سے ہے...... نور جہاں کا اس سے کیا مقابلہ...... ایک شمع انجمن اور دوسری چراغ خانہ...... کہاں داشتہ کہاں بیوی...... شریک حیات کا بڑا ارفع مقام ہے...... نور جہاں تو محض سامان تفریح ہے...... جیسے آدمی فلم دیکھنے چلا جاتا ہے...... دوستوں کی محفل میں شراب پی لیتا ہے...... بس تھوڑی سی تفریح اور کچھ تبدیلی کے لیے...... منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے......

تو جناب رفیق احمد شیرازی...... اگر میں بھی یہی دلائل دوں اور منہ کا مزہ بدلنے کے لیے کسی کے ساتھ چلی جاؤں...... تو کیسا لگے گا آپ کو؟...... جیسے تم نے نور جہاں کی آغوش میں سکون تلاش کیا میں کسی جہانگیر کے پہلو کی پناہ تلاش کرلوں...... پھر"

لیکن اس کے بعد بڑی قوت کے ساتھ نور جہاں کا تصور فریال کے خیال کو پیچھے دھکیل دیتا تھا اور میں ساری شرمندگی بھول کے پھر شب وصل کی لذت کے تصور میں گم ہو جاتا تھا...... فریال بہت دور تھی...... کسی کو معلوم نہیں تھا کہ میرے کردار کا ایک کمزور پہلو نور جہاں بن چکی ہے...... جیسے اپنی اولاد کو بہت معصوم سمجھنے والے والدین کو پتا ہی نہیں چلتا کہ ان کا سپوت خیر سے باہر رہ کے سب کچھ سیکھ چکا ہے...... وہ سگریٹ ہی نہیں ہیروئن بھی پینے لگا ہے۔

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی...... کسی شاعر نے کہا تھا...... سچ کہا تھا...... شراب یا ہیروئن...... جوئے اور سٹے کی لت یا کوئی عورت جو لت بن کر چمٹ جائے...... کہاں جا کے ختم ہوگا یہ سلسلہ......؟ کسی منزل رسوائی پر یا تباہی کے غار میں...... کیسے؟...... کب؟...... ان سوالوں سے بچنے کے لیے میں بھاگ رہا تھا۔

بالآخر میں نے گاڑی کو نہر کے کنارے روک دیا...... اس نے کہا تھا...... میں وہیں ملوں گی...... نہر کے کنارے...... اسی لباس میں جسے تم نے اڑتے ہوئے بادلوں کا پیرہن کہا تھا...... چاندنی کا غبار کہا تھا...... اچھے بھلے شاعر ہو تم تو...... اب ہر بار تو ایسا نہیں ہوگا مگر وہ بھی کیا ایڈونچر تھا جب کچھ لوگ مجھے اغوا کر کے بھاگے تھے اور شاعر صاحب نہر میں گر گئے تھے...... پھر کیا زبردست فلمی ہیرو والی ریس لگائی تھی اور کیا فائٹ دی تھی......

وہ سب یاد کر کے میں مسکرانے لگا تھا کہ اچانک میری نظر ٹھہر گئی...... آج بھی چاندنی درختوں کے سائے میں الجھی تھی اور نہر کے گدلے پانی میں اتر رہی تھی...... سڑک پر سے اکا دکا گاڑیاں گزرتی جا رہی تھیں...... میں نے اپنی گاڑی کو ایک ویران کوٹھی کی دیوار کے ساتھ روک لیا تھا جس کے سامنے درختوں کی پوری قطار صف بستہ تھی۔

میرے اندازے کے مطابق یہی وہ جگہ تھی جہاں گزشتہ بار وہ اچانک تاریکی میں سے طلوع ہوئی تھی...... بے داغ لہراتے سفید ملبوس میں...... کسی اپسرا کی طرح...... اڑتے ریشمی بالوں کے ساتھ ہلکے پھلکے قدموں سے یوں چلتی جیسے اس کے پیر زمین کو نہیں چھو رہے...... وہ ہوا میں تیرتی آئی ہے......

وہاں مجھ سے کچھ فاصلے پر ایک گاڑی آ کے رک گئی

تھی...... لیکن اس میں سے نور جہاں نہیں نکلی...... بیک وقت چار افراد برآمد ہوئے...... ان سب نے سیاہ چست بنیاں اور پتلون پہن رکھے تھے...... باہر آتے ہی انہوں نے چہرے پر بھی سیاہ نقاب کھینچ لی...... اب وہ اس رات کی تاریکی کا حصہ بن گئے تھے...... بڑی پھرتی کے ساتھ انہوں نے خود کو آس پاس کے درختوں کے پیچھے چھپا لیا...... ان میں سے ایک بمشکل تمام مجھ سے پچاس قدم کے فاصلے پر تھا...... اس میں بھی شک وشبے کی کوئی بات نہ تھی کہ وہ مسلح تھے۔

دہشت سے رگوں میں میرا خون منجمد ہونے لگا...... میرے دل کی دھڑکن خود میرے کانوں میں دھمک بن کے گونجنے لگی...... یہ لوگ میرے قتل پر مامور تھے...... موت کے فرشتے تھے جو میرا انتظار کر رہے تھے...... گاڑی میں کوئی شخص موجود نہیں تھا...... وہ آہستہ آہستہ گاڑی چلا کے آگے لے گیا...... جب وہ ایک روشن اسٹریٹ لائٹ کے نیچے آیا تو میں نے اس کی ایک جھلک دیکھی...... وہ اکبر خان ہی تھا......

میں سڑک سے ذرا ہٹ کے کھڑا تھا اور یہ میری نہیں فاروقی کی گاڑی تھی...... گاڑی جس کوٹھی کے گیٹ پر کھڑی تھی اس کی لائٹس آن تھیں اور درختوں کی قطار نے اسٹریٹ لائٹ کو روک لیا تھا...... سڑک پر سے گزرنے والی گاڑیوں کی روشنی بھی مجھ تک نہیں پہنچ رہی تھی...... سب سے بڑی بات یہ کہ قاتلوں کو جس گاڑی کی جستجو تھی وہ انہیں ابھی تک نظر نہیں آئی تھی جس گاڑی کے اندر میں تھا وہ فاروقی کی تھی اور ونڈ اسکرین کے پیچھے میرے موجودگی محسوس بھی نہیں کی جاسکتی تھی......

یہ سارے عوامل تھے جو میری زندگی کے ضامن ہوگئے...... میں ساکت وصامت بیٹھا رہا...... میرے ذہن میں اب کوئی شک نہیں تھا کہ نور جہاں کے اور میرے چوری چوری ملنے کا راز فاش ہوگیا تھا...... مشک کی طرح عشق کی خوشبو بالآخر اکبر خان نے محسوس کر لی تھی اور یہ ناممکن تھا کہ ایسا نہ ہوتا...... اکبر خاں پہریداری اور خبرداری کا پورا انتظام رکھتا تھا...... خبر ملنے کے بعد اس نے تصدیق کی ہوگی...... پھر چور کو چوری کرتے ہوئے رنگے ہاتھ پکڑنے کے لیے جال پھیلایا ہوگا۔

نشہ حسن وشباب سے مخمور جذبات کی سیلابی لہر میں آنکھیں بند کیے بہنے والی نور جہاں نے کچھ نہیں سوچا اور کچھ نہیں دیکھا...... اکبر خان نے میرے نام ہوا کے دوش پر ارسال کیے جانے والے پیغام کو ایسے پکڑ لیا جیسے شاہی جاسوس کسی قاصد کبوتر کو پکڑ لیتے تھے۔

جرم کا یہ ثبوت نور جہاں کے سامنے رکھ کے اکبر خاں نے کیا کیا ہوگا...... اور پھر کیا کیا ہوگا؟

میرے تصور میں بہت سے درد واذیت سے بھرے ہوئے مناظر آرہے تھے...... ان میں نور جہاں کے گلابی مرمریں جسم پر لہو کے داغ نظر آتے تھے...... لمبی لمبی سرخ لکیروں سے رستا خون دکھائی دیتا تھا...... میں اس کے ستم دیدہ جسم کو کسی لہو آلود قالین پر بے حس پڑا دیکھتا تھا...... کسی کھودی جانے والی قبر کی مٹی کے پاس...... کسی اندھے کنوئیں کی گہرائی میں...... الگ الگ اعضا کی صورت میں کسی بوری میں بند......

اور ایک صدائے غیب پکارتی تھی...... نواب صاحب...... شوق کے ایسے کھیل کا انجام اس کے سوا کیا ہوسکتا تھا...... آدمی صراط مستقیم پر محفوظ ہے...... جرم وگناہ کے پر پیچ راستے کا اختتام ایسے ہی رسوائی وبربادی یا مرگ ناگہاں پر لازمی تھا...... لیکن طاقت کی فکر کسے ہوتی ہے...... دنیا میں غلط کاری کا وجود ہی خوف سے بے نیازی کے باعث ہے۔

میرے لیے اتنا ہی بڑا اینٹی کلائمکس تھا جیسے کوئی سرسبز وشاداب اور گلپوش پہاڑ پر قدرت کے حسن سے لطف اندوز ہوتا چوٹی پر پہنچے تو لڑھک کر دوسری طرف لگی ہوئی جنگل کی آگ میں جاگرے...... نور جہاں مرچکی تھی یا شاید موت سے بدتر عذاب سے گزر رہی تھی اور میں موت کے خوف میں مبتلا سوچ رہا تھا کہ بہت سے اتفاقات نے مجھے کیوں بچالیا...... اگر میں اپنی گاڑی لاتا تو اب تک یہ قاتل جورات کی تاریکی میں چھپے بیٹھے ہیں ہر طرف سے گولیاں برسا کے جاچکے ہوتے...... میری چھلنی لاش گاڑی کے اندر درس عبرت بنی پڑی ہوتی......

اکبر خان کچھ دیر بعد لوٹ کے آیا...... وہ شاید آگے تک گیا تھا کہ مجھے جی ٹی روڈ سے آتا دیکھے تو میرا تعاقب کرے اور مجھے قتل گاہ تک لے آئے...... میرے لہو سے اپنے انتقام کی آگ کو سرد کرے...... یہ خوش خبری میرے تمام دشمنوں تک پہنچا کے داد وصول کرے اور سکون سے سو جائے۔

مجھے کچھ اندازہ نہ تھا کہ دم سادھے موت کے نامہ بر دشمنوں سے خود کو روپوش رکھنے میں نے کتنا وقت گزار دیا...... کسی نے ایک کوٹھی کے دروازے پر کھڑی گاڑی کی طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا...... ان کے نزدیک یہ کوٹھی میں رہنے والوں کی یا ان کے کسی مہمان کی گاڑی تھی...... بالآخر میں نے پھر اکبر خان کو مخالف سمت سے واپس آتا دیکھا...... اس نے ہاتھ ہلایا اور تاریکی میں سے چار سیاہ سائے نمودار ہوئے...... گاڑی نے ان کو سمیٹ لیا اور سیدھی نکل گئی......

میں نے سکون کا گہرا سانس لیا...... آج کی رات دو ایک جیسے گنہگاروں میں سے ایک کے لیے پیغام اجل بنی تھی...... کہا جاسکتا ہے کہ ایک کو خوش قسمتی نے محفوظ رکھا...... دوسرے کو بدقسمتی نے مروادیا...... نور جہاں کو اس کے شوہر مالک آقا اکبر خان نے یقیناً مار دیا ہوگا...... پھر بھی اس کے غصے کی آگ نہیں بجھی تو وہ کرائے کے قاتلوں کو لے کر مجھے مارنے نکل کھڑا ہوا...... یہ انتقال کے جنون کی انتہا تھی۔

کانپتے ہاتھوں سے میں نے اپنا موبائل فون نکال کر اور نور جہاں کا نمبر ڈائل کیا...... فون کی گھنٹی بجنے لگی تو میرے دل کی دھڑکن بھی خاموش ہوگئی...... ایک بار...... دو بار...... ساتویں گھنٹی کے بعد مشینی آواز نے بولنا شروع کیا...... آپ کا ملایا ہوا نمبر......

میں نے دوبارہ کوشش کی اور پھر ناکامی کے بعد اپنا سر اسٹیئرنگ پر رکھ دیا...... میرا دل صدمے اور اشتعال سے دیوانہ ہورہا تھا...... وہ حسن بے مثال خاک میں مل گیا تھا...... اس کا خیرہ کن حسن وشباب ایک بے جان لاش میں ڈھل گیا تھا...... جیتی جاگتی دمکتی مسکراتی نازو ادا کا پیکر نور جہاں ڈی کمپوز ہونے لگی تھی...... جو موت کے بعد کی بدصورتی اور فنا کا عمل ہے۔

میرا وہاں کھڑے رہنا بے مقصد اور لا حاصل تھا...... میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور آہستہ آہستہ نہر کے کنارے چلنے لگا...... میرے ذہن میں ایک خلا تھا...... میں کچھ بھی طے کرنے سے قاصر تھا...... مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ نور جہاں نہیں رہی...... جس کے تصور نے مجھے ست بدھائی سے لاہور تک مسحور رکھا تھا...... میرے خیالوں کو اپنے عکس جمال سے روشن رکھا اور ہمیشہ اپنی جان سے میری جان کو عزیز تر جانا...... وہ نور جہاں خواب اور سراب ہوگئی ہے...... اس نے محبت میں کوئی نیک نامی نہیں کمائی...... مجھ سے کوئی عہد وفا نہیں مانگا...... میرے لیے کوئی شرط نہیں رکھی...... اپنی محبت کا کوئی صلہ طلب نہیں کیا...... یہ محبت سو فیصد یک طرفہ تھی اور اسے معلوم تھا کہ وہ تلوار کی دھار پر چل رہی ہے...... اس کے باوجود وہ میری مدد کرتی رہی...... مجھے بچاتی رہی...... خبردار کرتی رہی۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ نور جہاں کے بارے میں سوچتے ہوئے میں اسی راستے پر رواں ہوں جو اس کے گھر کو جاتا تھا...... میں نے خود کو سنبھالا اور لوٹ کر ست بدھائی کے راستے پر آگیا...... میرا دل دکھ سے بوجھل تھا...... احساس گناہ کی جگہ احساس جرم نے لے لی تھی کہ نور جہاں کی موت کا ذمے دار میں ہوں...... کیا مجھے ایسی خاموشی اور بے حسی کے ساتھ اس کی موت کو قبول کر لینا چاہیے؟ یہ سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اکبر خان کی بیوی تھی اور اس نے بیوی کو جرم بے وفائی کی سزا دی تو کیا غلط نہیں کیا...... اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں......

رفتہ رفتہ میرا غصہ بڑھنے لگا...... میرے دشمن نے مجھے بھی مارنا چاہا تھا...... اس نے پہلے بھی مجھے نقصان پہنچایا تھا اور وہ آئندہ بھی کوشش کرے گا...... مجھے اس کے عزائم کا پتا چل گیا ہے تو پھر تذبذب کیسا...... اس کا پہلا وار خالی گیا...... مجھے اس کو دوسرے وار کے لیے زندگی کی مہلت ہی نہیں دینی چاہیے...... وہ نور جہاں کا قاتل ہے...... جو کچھ نور جہاں نے اپنی زندگی میں میرے لیے کیا...... اس کے بعد کیا میرا یہ فرض نہیں بنتا کہ میں اس کے قاتل کو کیفر کردار تک پہنچاؤں...... اس نے نور جہاں جیسے پیکر رعنائی کے وجود کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا...... وہ قدرت کے حسن کا شاہکار تھی جسے اس نے خاک وخوں میں ملا دیا......

میرا دماغ چل گیا تھا...... یہ صدمہ اتنا غیر متوقع تھا کہ میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی سلب ہوگئی تھی...... کچھ دیر پہلے میں اس راستے سے گزرا تھا تو میرے خیالات میں خوبصورتی کے سارے رنگ تھے...... میری آنکھوں میں سنہرے خواب تھے اور میرے راستے پر ستارے بچھے ہوئے تھے...... راستہ وہی تھا لیکن واپسی پر میں کسی سنسان اور آسیب زدہ پرانی قبروں والے قبرستان سے گزر رہا تھا...... میرے خیالوں میں دیوانگی تھی اور میرے خواب میرا عذاب بن گئے تھے۔

میں نے خود کو سنبھالا...... نور جہاں کا یہ انجام غیر متوقع نہیں تھا...... اور اس کا اتنا خیال تھا تو مجھے خود کو بہت پہلے اس کھیل سے الگ کر لینا چاہیے تھا...... جیسے اس نے

مجھے بچایا...... مجھے بھی اس کو بچانا چاہیے تھا......اب اس کے لیے دکھی ہونے سے کیا فائدہ......اس کی زندگی میں یہ بہت آسان تھا...... میں اس سے صرف ایک بار کہتا تو وہ اکبر خاں کو چھوڑ کے میرے پاس ست بدھائی آ جاتی لیکن یہ ممکن نہ تھا......اس گھر کے لوگوں کے دل میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں بنتی تھی۔

مجھے اب اس کو بھول جانا چاہیے......شاید اسی میں بہتری ہوگی...... میرے لیے......فریال کے لیے اور ہم سب کے لیے نور جہاں کا نہ ہونا ہی فلاح کی ضمانت ہے......میرے اور فریال کے رشتے میں خرابی اسی کے باعث تھی......شاید اب حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔

نصف شب کے قریب میری گاڑی حویلی میں داخل ہوئی تو صرف راجا جاگ رہا تھا...... گاڑی کی آواز پر وہ باہر آگیا ''واپس آگیا تو......'' اس نے مجھے غور سے دیکھا......''کیا ہوا...... تیری شکل پر بھی بارہ کیوں بج رہے ہیں۔''

میں گاڑی سے اتر کے لان کی طرف بڑھا اور ایک کرسی پر گر گیا......''راجا......وہ کھیل ختم ہوگیا......'' میں نے ایک ٹھنڈی سانس۔

''وہ نہیں ملی......یا ملنے سے انکار کر دیا ابے چل چھوڑ......اس میں رونے کی کون سی بات ہے......تو خود ہی تو کہتا تھا کہ لڑکی اور بس کا کیا ہے......ایک نکل گئی تو دوسری آتی ہوگی......اور یہ تو بس دل لگی تھی......''

میں نے کہا......''راجا......وہ مر گئی......اکبر خان نے اسے قتل کر دیا......''

راجا چونکا......''قتل کر دیا......کب...... تجھے کیسے معلوم ہوا؟''

میں نے اسے نہر کے کنارے پیش آنے والے سارے واقعات سنائے......''اگر میں بھی فاروقی کی گاڑی نہ لے جاتا تو اس وقت میری لاش پڑی ہوتی وہاں۔''

راجا کچھ دیر سوچتا رہا......''نور جہاں نے کچھ بتایا تھا تجھے......کہ اس کا شوہر کہاں گیا ہوا ہے......''

''وہ ہمیشہ بتا دیتی تھی......آج اس نے نہیں بتایا تو میں نے بھی نہیں پوچھا......فرض کر لیا کہ وہ یقیناً ملک سے باہر ہوگا......وہ رسک کبھی نہیں لیتی تھی۔''

راجا نے کہا......''اس کے باوجود ایک بار تو بال بال بچ گیا تھا......وہ بیوی سے دبئی یا لندن کا کہہ کے گیا تھا مگر تھا یہیں کسی ہوٹل میں......کسی کے ساتھ......اور تم کو شامت اعمال بالکل سامنے والے کمرے میں لے گئی تھی......شاید اس مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا......''

''یعنی اکبر خان نے کہا کہ وہ باہر جا رہا ہے......مگر گیا نہیں...... جانتے بوجھتے......وہ خود دیکھنا چاہتا تھا کہ بیوی کے بارے میں ملنے والی رپورٹس کس حد تک حقیقت پر مبنی ہیں......اور جب ثبوت مل گیا تو ایک بے غیرت آدمی کی غیرت بھی جاگ اٹھی......اس نے پہلے فاحشہ بیوی کو ٹھکانے لگایا اور پھر اس کے آشنا کو قتل کرنے نکل کھڑا ہوا......''

''کہیں تو مفروضات پر مبنی نتائج کو حقیقت سمجھنے کی غلطی تو نہیں کر رہا ہے فیکے پتر......'' راجا بولا۔

میں نے جز بز ہو کے کہا......''کیا فرض کیا ہے میں نے؟''

''سب سے پہلے یہی کہ......اکبر خان نے نور جہاں کو قتل کر دیا......''

میں نے کہا......''یہ فطری ردِعمل ہوتا ہے راجا...... پہلا نشانہ عورت بنتی ہے......بیوی کی بے وفائی کوئی برداشت نہیں کرتا......''

''بیوی!'' راجا طنز سے بولا......''ابے وہ بیوی ہوتی ہے......کیا نور جہاں اس کی بیوی تھی؟ تو نے دیکھا ہے ان کا نکاح نامہ......یاد ہے سب سے پہلے تو نے ہی شک کا اظہار کیا تھا کہ یہ عورت اکبر خاں کی بیوی کیسے ہو سکتی ہے۔''

میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا......''یہ تو ٹھیک ہے راجا۔''

''وہ اکبر خان کی داشتہ تھی......پی آر او...... سیکریٹری......پروموٹر......کیریئر......اعلیٰ ترین سطح پر جو عورت برائے فروخت ہو......ڈیل میں رشوت کے طور پر استعمال کی جائے......اس کے ایسے ہی نام ہوتے ہیں......نچلی سطح پر اسے پرانا نام دیا جاتا ہے......طوائف کا......ورنہ طوائف بھی اب کال گرل ہے اور سیکس ورکر کہلاتی ہے......تو کیا سمجھتا ہے اکبر خاں واقعی اس کے لیے اتنا جذباتی ہو سکتا ہے......تیرا دماغ خراب ہے......''

''شاید تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔''

''شاید کے گھوڑے......میں یقیناً صحیح فرما رہا ہوں......اپنی اس نیک پروین عفت مآب فرشتہ سیرت بیوی کو خود شوہر نامدار نے نہ جانے کس کس کی خدمت میں

خود ارسال کیا ہوگا......خود ایسے لوگوں کی خواب گاہ میں چھوڑ کے آیا ہوگا جن سے اس کے مفادات کا سلسلہ ہوگا......اسے وہ قتل کر سکتا ہے؟......سونے کا انڈا دینے والی مرغی کو......''

میں نے ایک گہرا سانس لیا......''اس پہلو سے نہیں سوچا تھا میں نے۔''

''سوچنے کے لیے عقل کا صحیح حالت میں ہونا ضروری ہے اور تیری عقل چلی گئی تھی رخصت پر......جذبات کی پٹی باندھنے کے بعد نظر کچھ نہیں آ رہا تھا تجھے......سوائے نور جہاں کے......''

میں نے کہا......''خیر......معلوم ہو جائے گا......''

''معلوم تو آج ہی ہو جاتا تجھے کہ ٹریس پاس کتنا سنگین جرم ہے......دوسرے کی زمین ہو یا عورت......یہ ٹھیک ہے کہ آج تو صحیح سلامت لوٹ آیا......لیکن تیرے اس بیان پر بھی مجھے شک ہے کہ اکبر خاں قاتلوں کی پوری ٹیم کے ساتھ مجھے قتل کرنے آیا تھا......''

میں نے کہا......''پھر کیا وہ کسی فلم کے سین کی شوٹنگ کے لیے ڈریس اپ ہو کے آئے تھے۔''

راجا بولا......''کیا وہ مسلح تھے۔''

میں نے گڑبڑا کے کہا......''یقیناً ہوں گے۔''

''تو نے دیکھا......؟ اسلحہ تھا ان کے پاس......؟ کیا اسلحہ تھا......''

میں نے کہا۔''راجا......وہ توپ خانہ لے کر بہرحال نہیں آئے تھے۔''

راجا بولا......''یار تیرے جیسے مجنوں کو قتل کرنے کے قاتلوں کی کسی ٹیم کی کیا ضرورت تھی......؟ کیا ایک گولی تجھے کافی نہ ہوتی......؟ یہ گولی خود اکبر خاں تیرے سر میں پیچھے سے آ کے اتار سکتا تھا......تجھے تو پتا ہی نہ چلتا......تو بیٹھا تھا نور جہاں کے تصور میں چشم براہ......''

میں نے خفت سے کہا......''پھر کیا مقصد تھا ان سب کے آنے کا......''

''میرے اندازے......بلکہ یقین کے مطابق وہ آپ کی گوشمالی کرنا چاہتے تھے......جائے واردات پر......یا ممکن ہے وہ آپ کو اٹھا کر اپنے گھر لے جاتے اور آپ کی محبوبہ دلنواز کے سامنے کچھ کرتے جس سے دونوں کو عبرت ہوتی......معاملہ ابھی قتل و خونریزی تک نہیں پہنچا ہے......قتل کسی کو بھی کیا جا سکتا ہے......البتہ تیرے پاس مقتول ہونے کا اعزاز حاصل کرنے کے چانس زیادہ ہیں......''

''ہم سب ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔''

''ہاں......لیکن کشتی تیری ہے......دنیا میں قتل کے جتنے اسباب زمانہ قبل اور تاریخ سے چلے آ رہے ہیں وہ تین ہیں......زر......زمین اور زن......خیر سے تیرے معاملے میں تینوں اسباب اہمیت اختیار کر گئے ہیں......زمین تجھے وراثت میں ملی......زر و جواہر حویلی سے ملے......زن کا فساد تو نے خود پیدا کر لیا......نور جہاں کی وجہ سے اس کا نام نہاد شوہر تجھے قتل کرے نہ کرے......فریال ضرور کر دے گی......انشاءاللہ۔''

''نور جہاں کی طرف سے مجھے سخت تشویش ہے۔''

راجا نے ناراضی سے کہا......''نور جہاں کا بھوت اب تیرے سر سے اتر جانا چاہیے فیکے پتر......اس دل لگی کو دل کی لگی بنانے سے بچ......اپنے مسائل مت بڑھا......''

''یار......اس عورت نے بڑی مدد کی ہے ہماری......''

''کی ہے مگر اپنی غرض کے لیے......تجھے حاصل کرنے کے لیے......ہوس تھی کوئی محبت نہیں تھی جس کا موازنہ فریال کے عشق سے کیا جائے......یا جس کی خاطر فریال کے لیے جذباتی مسائل کھڑے کیے جائیں۔'' راجا غصے میں پیر پٹختا چلا گیا۔

میں کچھ دیر شرمندگی میں بیٹھا رہا......پھر اندر جا کے لیٹ گیا......میرے خیالات کی رو ادھر سے ادھر بھٹکتی رہی......اس ذہنی کیفیت میں کچھ بھی کرنے کی کوشش کرنا ہی بے سود تھا......میں ادھر سے ادھر کروٹیں بدل بدل کے تھک گیا تو میں نے بہتر سمجھا کہ شہناز کو جگا کے اس سے کہوں کہ مجھے خواب آور انجکشن لگا دے یا کم سے کم گولیاں ہی دے دے......گزشتہ رات بھی بے سکونی اور بے خوابی کی نذر ہو گئی تھی......میرے شکستہ اعصاب مزید آزمائش برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

میں ایک کمرے کے سامنے والے کوریڈور سے گزرا تو میرے کانوں میں باتیں کرنے کی آواز آئی......کمرے میں تاریکی تھی لیکن کھلی کھڑکی کے سامنے پردہ تھا......اپنا نام سن کے میرے قدم رکے......فاروقی اور اس کی بیوی کسی بات پر بحث کر رہے تھے......ان کے درمیان یہ بحث خاصی تلخ ہو چکی تھی......وہ اپنی آواز نیچی رکھنے پر مجبور تھے ورنہ ان کے لڑنے کا شور سب کو جگا

دیتا...... انہیں علم نہیں تھا کہ پردے کے پیچھے والی کھڑکی کھلی ہوئی ہے...... یہ تو وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اس وقت کوئی باہر گزرتے ہوئے یہ گفتگو سن لے گا۔

لیلیٰ بھابی نے کہا تھا...... ''خود رفیق نے بتایا ہے مجھے۔''

فاروقی نے غصے سے کہا...... ''کیا مطلب ہے آخر تمہارا...... وہ سچ بولتا ہے اور میں جھوٹ بول رہا ہوں......''

''ہاں...... مجھے بلیک میل کرنے کے لیے۔''

''دیکھو...... غصہ مت دلاؤ...... تمہیں میرا شکر گزار ہونا چاہیے کہ میں نے تمہیں بچا لیا......''

''میں نے اسے زہر نہیں دیا تھا...... یہ میں جانتی ہوں۔''

''اس کی موت زہر دینے سے ہوئی تھی۔''

لیلیٰ بھابی نے کہا...... ''یہ غلط ہے۔''

''اگر میں نے دوبارہ پوسٹ مارٹم کرایا تو سچ تمہارے سامنے آجائے گا...... لیکن اس کے بعد کیا ہوگا......''

''جو ہوگا مجھے منظور ہے......'' لیلیٰ بھابی نے رکھائی سے جواب دیا۔

''تمہیں پھانسی ہو جائے گی۔''

''ہو جائے...... پکڑے وہ بھی جائیں گے جنہوں نے پہلے جھوٹی رپورٹ دی تھی...... اخفائے جرم کی سزا انہیں بھی ہوگی......''

''افوہ...... بڑی قانونی زبان بول رہی ہو......''

''کیوں نہ بولوں...... اتنے بڑے وکیل کی بیوی ہوں۔''

فاروقی نے کہا...... ''اگر میری بات نہیں مانو گی تو یہ غرور بھی نہیں رہے گا۔''

''میں کسی دھمکی سے ڈرنے والی نہیں ہوں...... شوہر ہونے کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ تم مجھ سے کچھ بھی منوا لوگے...... تم کہو گے رفیق کو زہر دے دو تو میں دے دوں گی......''

''آہستہ بولو......'' فاروقی نے دانت بھینچ کے کہا...... ''اس میں تمہارا ابھی فائدہ تھا......''

''مجھے کسی فائدے کا جھانسا مت دو...... اللہ کا دیا سب کچھ ہے میرے پاس...... تم تو لالچ میں پاگل ہو گئے ہو...... میں اس کا حصہ نہیں بن سکتی...... تم مرد ہو...... ایک چھوڑ دو شادیاں کرو اولاد کے لیے...... مجھے پروا نہیں...... طلاق دینا بھی تمہارا شرعی حق ہے...... آج نہیں تو کل استعمال کرو گے...... پھر میں کیوں ڈروں...... تم نے مریم سے شادی کی...... کیا اس نے تمہیں اولاد دی......''

''بکواس بند کرو...... وہ ماں بن رہی تھی...... اس لیے تم نے مار ڈالا اسے......'' فاروقی نے آخر میں ایک گالی دی۔

''آج تم اپنے دوست کی جان کے دشمن ہو رہے ہو...... صرف جائیداد کے لیے...... وہ تم پر اتنا اعتماد کرتا ہے جتنا کوئی اپنے سگے بھائی پر نہیں کرتا؟ تم سگے بھائی کی طرح اس سے سب کچھ ہتھیانا چاہتے ہو...... تم تو لالچ میں رابعہ کو بھی قتل کر دو گے......''

''بھونکنا بند کر کتیا......'' فاروقی نے اس کے تھپڑ مارا...... لیلیٰ بھابی کی دبی دبی چیخ سنائی دی...... اس سے زیادہ میں برداشت نہیں کر سکتا تھا...... میں نے دروازے پر دستک دے کر کہا۔ ''شہناز......''

اندر ایک دم خاموشی چھا گئی...... پھر فاروقی آنکھیں ملتا نمودار ہوا...... یہ ظاہر کرنے کے لیے وہ سو رہا تھا...... ''نواب صاحب...... حویلی کے اندر بھی راستے بھولنے لگے ہیں آپ......'' فاروقی نے خوشدلی سے کہا۔

''اوہ!......'' میں نے سر کھجا کے کہا...... ''یہ تو لیلیٰ مجنوں کا حجلۂ عروسی ہے۔''

''شاہی سواری کب آئی......'' فاروقی نے پوچھا۔

''میں کچھ دیر پہلے واپس آیا تھا...... نیند نہیں آرہی تھی...... سوچا شہناز سے کوئی گولی مانگ لوں...... سوری...... تمہیں ڈسٹرب کیا......''

فاروقی سر ہلا کے دروازہ بند کرنے ہی والا تھا کہ اس کی نظر نے کھلی ہوئی کھڑکی کو دیکھ لیا...... میرے آگے بڑھتے ہی کھڑکی بھی بند ہو گئی...... میں سیدھا نکل گیا اور شہناز کو جگا کے اس سے نیند کی دوا مانگنے کا ارادہ ملتوی کر دیا...... کھڑکی کھلی رہ جانا محض اتفاق تھا...... میں سیدھا باہر نکل گیا اور تازہ ہوا میں ٹہلنے لگا...... فاروقی کے اچانک ست بدھائی آنے کا سبب مجھ پر واضح ہو گیا تھا...... وہ اپنے پلان پر عمل درآمد میں تاخیر نہیں چاہتا تھا۔ بیوی اس کے رویے سے ناخوش تھی اور ہمارے ساتھ رہنے آگئی تھی...... فاروقی اس کے پیچھے پیچھے آگیا...... اس نے پہلے بیوی کو منایا ہوگا...... یقین دلایا

ہوگا کہ وہ اب بھی اس سے اتنی ہی محبت کرتا ہے...... خرابی اس وقت ہوئی جب فاروقی نے بیوی کو یہ یاد دلایا کہ یہاں رہ کے اسے کیا کرنا ہوگا...... اسے اندازہ نہ تھا کہ ہماری بریفنگ نے اس کے عزائم خاک میں ملا دیے ہیں...... بیوی اب وہ پہلے والی بیوی نہیں رہی تھی جسے وہ جھوٹ بول کے اور دھمکی دے کر بلیک میل کر سکتا تھا...... ہم نے بھی لیلیٰ بھابی کو اکسایا تھا کہ وہ بالکل نہ ڈرے...... نہ مریم زہر دینے سے مری ہے نہ اسپتال والے ایسی کوئی بات کہتے ہیں...... یہ فاروقی کے ذہن کی اختراع ہے اور اسے خوفزدہ کرنے کا مقصد اس کو ناجائز دباؤ میں رکھنا ہے...... ہم نے اسے بتا دیا تھا کہ ہماری اس اسپتال کی انتظامیہ سے اور وہاں کے ڈاکٹروں سے تفصیلی بات ہو چکی ہے جہاں مریم کی موت ہوئی تھی...... اسے وہ ایک حادثاتی موت سمجھتے ہیں...... اس سے زیادہ کچھ نہیں...... وہ دوبارہ پوسٹ مارٹم کے چیلنج کو بھی قبول کرتے ہیں چنانچہ وہ فاروقی کے سامنے ڈٹ جائے اور اس کے جھوٹ سے بالکل نہ ڈرے۔

لیلیٰ بھابی نے وہی کیا تھا جو ہم نے کہا تھا...... یعنی اس سے فاروقی کو بہت مایوسی ہوئی ہوگی...... تاہم اس کے دماغ میں اکبر خاں نے ست بدھائی پر قبضے کا جو خواب بھر دیا تھا وہ اتنی آسانی سے اسے چھوڑنے والا نہیں تھا...... اگر بیوی اس کی مدد نہیں کرے گی تو وہ دوسرا ذریعہ تلاش کرے گا...... وہ میرے دونوں دشمنوں رانا رجب علی اور اکبر خاں سے مل گیا تھا...... جنگ کے کوئی اخلاقی اصول نہیں ہوتے...... دشمن کے کسی دست راست اور معتمد خاص کی وفاداری خرید کر لینا جنگ میں کامیابی حاصل کرنے کا پرانا اور آزمودہ نسخہ ہے...... جعفر اور صادق کا تو نام بدنام ہے...... ایسے ضمیر فروش ہر جگہ ملتے ہیں۔

ایک لحاظ سے ہم نے اپنی حکمت عملی غیر جذباتی انداز میں نہیں بنائی تھی...... اگر ہم فاروقی کی بے ضمیری پر خفا نہ ہوتے بلکہ ٹھنڈے دماغ سے جوابی اقدام کرتے تو لیلیٰ بھابی کو شوہر کے مقابلے پر کھڑا ہونے کے لیے نہ اکساتے...... ہم ان سے کہتے کہ وہ شوہر کی ہاں میں ہاں ملاتی رہیں اور جو وہ کہے ہمیں بتاتی رہیں اسے شک ہی نہ ہو کہ ہم کچھ جانتے ہیں اور ہم باخبر ہیں۔

لیلیٰ بھابی کے باغی رویے نے فاروقی کو مشتعل کیا تھا لیکن وہ مایوس ہو کے بیٹھنے والا نہیں تھا...... یہ بات یقینی تھی کہ بیوی سے مایوس ہو کے وہ کسی اور کو آلۂ کار بنائے گا...... حویلی کے اندر کسی اور کو تلاش کرے گا جو لالچ میں یہ کام کر سکے...... لالچ انسان کی کمزوری ہے اور غریب آدمی اس جال میں بہ آسانی پھنس جاتا ہے...... اس کے لیے تو چھوٹا لالچ بھی بہت بڑا ثابت ہو سکتا ہے...... میرے آس پاس بہت سے لوگ ہیں جن پر مجھے پورا اعتماد ہے مثلاً ریشم اور غنی...... ان کے کچھ خواب ہیں جو ابھی بغیر کے سفر میں ہیں...... اگر فاروقی ان کے سامنے نئے خوشبودار کرارے نوٹوں کا ڈھیر ڈالے...... تو مجھے پتا بھی نہیں چلے گا......

میں نے سر کو جھٹکا...... یہ میں کیا فضول باتیں سوچ رہا ہوں...... دنیا میں ہر شخص مجبور یا بکاؤ نہیں ہوتا...... اور جب تک موذی کی حقیقت معلوم نہ ہو آدمی خطرے سے خبردار نہیں ہوتا...... حقیقت پتا چل جانے کے بعد وہ محتاط ہو جاتا ہے اپنی حفاظت کرتا ہے اور خطرے سے دور رہتا ہے...... یا اسے ختم کر دیتا ہے...... فاروقی کی حقیقت پتا چل جانے کے بعد مجھے کسی لحاظ مروت کے بغیر اسے دوستی اور اعتماد کے سارے رشتوں سے محروم کر کے اپنا دفاع مضبوط بنا لینا چاہیے...... نہ رہے بانس نہ بجے بانسری...... وہ میرے قریب تو کیا ست بدھائی میں ہی نہ پھٹک سکے...... اس کا مجھے قتل کرنے اور رابعہ سے شادی کر کے جاگیر اور حویلی کا مالک کہلانے کا خواب ادھورا رہ جائے......

میں نے طے کیا کہ صبح راجا کو ساری بات بتا کے فاروقی کے خطرے کا پکا بندوبست کر لوں گا...... رات کے ایک بجے میں نے شہناز کے کمرے کا دروازہ آہستہ سے بجایا...... میرا خیال تھا کہ وہ گہری نیند میں ہوگی...... دروازہ گل نے کھولا تو میں حیران ہوا...... کمرے میں زیرو واٹ کا بلب روشن تھا...... میں نے ہاتھ بڑھا کے لائٹ جلا دی......

''تم لوگ کیوں جاگ رہی ہو بھئی......'' میں نے کہا۔

شہناز بولی...... ''ہم باتیں کر رہے تھے...... تم کب آئے؟''

میں نے کہا...... ''بہت دیر ہوئی...... نیند نہیں آرہی تھی...... سوچا تم سے دوا لے لوں......''

''رفیق بھائی...... یہ کوئی طریقہ نہیں ہے...... آپ عادی ہو جائیں گے اس طرح تو......''

میں نے کہا......''اس وقت پرسکون نیند کے طریقے اور اچھی عادت پر لیکچر سننے کا بالکل موڈ نہیں......کرسکتی ہو تو میرے حالات کو کنٹرول کرلو......نیند پر میں کنٹرول کرلوں گا......'' میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا......''تم ایسی کیا باتیں کررہی تھیں اس وقت......جو صبح تک التوا میں رکھنا تمہارے ہاضمے کی خرابی کا سبب بن جاتا؟''

شہناز نے کہا''......گل بہت اپ سیٹ ہے......اس نے کسی کو بتایا نہیں لیکن اسے فون پر مسلسل دھمکیاں مل رہی ہیں۔''

''کون دھمکیاں دے رہا ہے۔''

''وہی جو ابھی تک کچھ کر نہیں پائے......گل کو دہشت زدہ کررہے ہیں کہ خاموشی سے واپس لوٹ جاؤ......زبان کھولی تو بہت مہنگی پڑے گی......ہرگز......اس خوش فہمی میں مت رہنا کہ تم برطانوی شہری ہو تو برطانیہ کی حکومت تمہیں بچالے گی......ہمارے ہاتھ بہت لمبے ہیں......لندن میں بھی تم کو اور تمہاری ماں کو گم کردیں گے......وغیرہ وغیرہ......''

میں نے گل کی طرف دیکھا......''گل......کیا سوچا ہے تم نے؟''

''میں نے سوچ لیا ہے۔'' وہ خلا میں دیکھتے ہوئے بولی۔''یہ تو بہت آسان ہے کہ میں صبح ٹکٹ لے کر پہلی دستیاب فلائٹ سے لندن چلی جاؤں۔''

''میرا خیال ہے تمہیں ایسا ہی کرنا چاہیے......'' میں نے کہا۔

وہ بولی......''مجھے حیرانی ہے کہ تم ایسی بات کرتے ہو......میں نہیں جاسکتی......''

شہناز نے کہا......''تمہیں اپنے ریسرچ پیپر کو بھی تو پورا کرنا ہے۔''

گل نے افسوس سے شہناز کو دیکھا......''میں اس کے بارے میں بالکل نہیں سوچ رہی ہوں......یہ کام تو بعد میں بھی پورا کیا جاسکتا ہے......مجھے یہاں آنے کی ضرورت ہی نہیں......کوئی مجھے بنیادی مواد اور تاریخی معلومات لندن میں فراہم کردے تو وہاں بیٹھ کے ہی میں یہ پیپر لکھ سکتی ہوں......اصل مسئلہ یہ ہے کہ سچ سے نظر چرا کے جانا میرے لیے ناممکن ہے......اگر میں نے ایسا کیا تو میں تمام عمر خود کو معاف نہیں کرپاؤں گی۔''

''تم اپنے باپ کے خلاف مقدمے کا حصہ بنو گی۔''

''مس شہناز کو اغوا کر کے حبس بے جا میں رکھنے اور تشدد کا نشانہ بنانے والوں کو سزا دلوانے کے لیے سچ ضرور بولوں گی......وہ سب ضرور بتاؤں گی جو میں نے دیکھا اور سنا......اگر میں نے اسے چھپایا تو ضمیر کی سزا میرے لیے سخت ہوگی......مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ مجرموں سے میرا کیا رشتہ ہے......ہے بھی یا نہیں......''

میں نے کہا''تمہارے اس فیصلے نے میرے دل میں تمہاری عزت بہت بڑھادی ہے......تمہاری جگہ میں ہوتا تو ایسا ہی کرتا......''

''لیکن تمہارا یہ وکیل دوست میری سمجھ میں نہیں آیا......'' گل نے کہا۔

''اس نے کوشش کی ہوگی کہ تمہیں ایسا نہ کرنے دے......'' میں نے تلخی سے کہا۔

''صرف یہی نہیں......اس نے مجھے باقاعدہ دہشت زدہ کیا......پہلے سمجھاتا رہا کہ یہاں کا قانونی اور عدالتی نظام ایک جوہڑ ہے......شریف آدمی اس میں اترنا تو کیا اس کے قریب پھٹکنا بھی پسند نہیں کرتا......پولیس کیا کرے گی......عدالت میں کیا ہوگا جھوٹے گواہ میرے خلاف کیا بکواس کریں گے......مجھے بدنام کیا جائے گا......''

شہناز نے بھی خفگی سے کہا......''فاروقی نے تو واقعی حد کردی......''

گل بولتی رہی......''جب ان باتوں کا مجھ پر اثر نہیں ہوا تو وہ دوسری طرف آیا اس نے مجھے ڈرایا کہ میرا باپ کتنا با اثر اور طاقتور ہے......وہ مجھے اغوا کرسکتا ہے......مروا سکتا ہے......اس کے پاس کرائے کے قاتل ہیں اور اس کے خلاف بیان دینے سے پہلے ہی میں ماری جاؤں گی......برطانوی ہائی کمیشن کچھ نہیں کرسکتا......''

میں نے کہا......''تم فکر مت کرو......تمہاری حفاظت اب میری ذمہ داری ہے......صبح ہم ایف آئی آر درج کرادیں گے......تھانے جاکے......''

''یہی نہیں......میں نے اپنے طور پر معلومات حاصل کی ہیں......راجا کے ذریعے......میں نے برٹش ایمبیسی سے بھی رابطہ کیا تھا......صبح مجھے حفاظتی گارڈ فراہم کردی جائے گی......میں مجسٹریٹ کے سامنے اپنا تفصیلی بیان ریکارڈ کروادوں گی......اس کی ایک نقل ایمبیسی کے پاس جائے گی......مجھے یقین دلایا گیا ہے کہ اس بیان کے بعد میری ذمے داری ختم ہوجائے گی اور میری یہاں موجودگی ضروری نہیں ہوگی......تاہم میں یہ انڈرٹیکنگ دوں گی کہ عدالت نے ضروری سمجھا اور طلب کیا تو میں حاضر ہوجاؤں گی......''

''کیا تم نے یہ سب فاروقی کو بھی بتادیا ہے؟'' میں نے کہا۔

''نہیں......مجھے راجا نے منع کردیا تھا......''

میں شہناز سے خواب آور گولی لے کر لوٹ آیا اور کچھ دیر بعد چند گھنٹوں کے لیے سونے لیٹ گیا......میری آنکھ دیر سے کھلی......جہلم سے ایک ڈی ایس پی کی قیادت میں پولیس گارڈ آچکی تھی......ایک جیپ میں عمر رسیدہ اور بیزار صورت ڈی ایس پی کے ساتھ ڈرائیور تھا اور دو کانسٹیبل تھے۔ دوسری جیپ میں ایک نوجوان سب انسپکٹر کے ہمراہ تین پولیس گارڈ تھے......یہ سب کچھ برطانوی سفارت خانے کے دباؤ کا نتیجہ تھا......

فاروقی کو اچانک معلوم ہوا کہ گل پولیس کی حفاظت میں جہلم کے مجسٹریٹ کی عدالت میں رضاکارانہ بیان دینے جارہی ہے تو اسے کچھ مایوسی اور برہمی کے جذبات نے مغلوب کرلیا......''تم نے مجھے نہیں بتایا......آخر یہ ایک قانونی معاملہ تھا......''

''تمہیں نہیں بتاتی......تم اتنی مخالفت کررہے تھے......حوصلہ شکنی کررہے تھے اور دہشت زدہ کررہے تھے......'' گل نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''خیر......میں ساتھ چلتا ہوں......تمہیں وکیل تو چاہیے۔''

گل نے کہا......''میرے لیے وکیل کا بندوبست بھی سفارت خانے والوں نے کردیا ہے۔''

''کون ہے تمہارا وکیل......'' فاروقی نے کہا۔

''مجھے نہیں معلوم......ابھی عدالت میں جا کے وکالت نامہ سائن کروں گی لیکن یقیناً کرمنل سائیڈ کا کوئی اچھا وکیل ہی ہوگا......''

یہ قافلہ جہلم ڈسٹرکٹ کورٹ کے لیے روانہ ہوا تو اس میں پانچ گاڑیاں تھیں۔ سب سے آگے ڈی ایس پی کی گاڑی تھی جس پر نیلے رنگ کی لائٹ گھوم رہی تھی اور وہ ہر موڑ پر یا ٹریفک کی رکاوٹ میں سائرن بجاتی جارہی تھی......اس کے پیچھے ڈاکٹر شہناز کی گاڑی میں غنی تھا اور اس کے ساتھ تین مسلح گارڈ تھے جو حویلی کے عملے میں شامل تھے......پھر میری گاڑی میں شہناز کے ساتھ راجا تھا......اس کے پیچھے فاروقی کی گاڑی تھی اور آخر میں پھر پولیس کار......

اس کارواں نے دینہ تک کا فاصلہ بڑی برق رفتاری سے طے کیا......پیچھے سے کسی کے اوورٹیک کرنے کا سوال ہی نہ تھا......سامنے سے آنے والے بھی گھبرا کے راستہ چھوڑ دیتے تھے......جی ٹی روڈ پر جہلم تک پولیس کا سائرن مسلسل بجتا رہا اور ٹریفک راستہ دیتی گئی......

اپنی اہمیت کے اعتبار سے یہ کیس بہت غیر معمولی تھا۔ اس میں مدعا علیہ اور ملزم صوبائی اسمبلی کا ایک رکن اور سیاست کے میدان کا پرانا شہسوار تھا......مدعی ڈاکٹر شہناز تھی جسے اپنے طور پر ہم پیشہ ڈاکٹروں کی حمایت حاصل ہوسکتی تھی......اس کے ساتھ راجا تھا اور راجا کے ساتھ میڈیا کی طاقت تھی......ایک مدعی میں بھی تھا جو بہر حال عام آدمی نہیں تھا......لیکن سب سے اہم مقدمے کی گواہ گل تھی جس کا ملزم کے ساتھ خونی رشتہ تھا......اور وہ نامزد ملزم رانا رجب علی کی بیٹی تھی۔

مجسٹریٹ کی عدالت کا ماحول آج بالکل بدلا ہوا تھا......ہر طرف نظم وضبط تھا......عدالتی اہلکار مستعد بیٹھے تھے اور وہ افراتفری کہیں دیکھنے میں نہ آئی تھی جو ہماری عدالتوں سے منسوب ہے......پیشی کے لیے لائے گئے ملزمان کو بھی دور رکھا گیا تھا اور پولیس ان کے لواحقین سے ملاقات کو کیش کرا رہی تھی......یہ سب حسن انتظام اس لیے تھا کہ مجسٹریٹ کو پہلے سے مطلع کردیا گیا تھا......برٹش سفارت خانے کی کال نے وزارت خارجہ کے حکام کو مجبور کیا ہوگا کہ وہ فوری طور پر وزارت داخلہ کو ہوشیار کردیں کہ صبح ایک خصوصی معاملہ پیش ہوگا چنانچہ مجسٹریٹ کی عدالت میں خصوصی انتظامات کو یقینی بنایا جائے......

یہ میری وجہ سے نہیں تھا......صرف اس لیے تھا کہ گل عظیم مملکت برطانیہ کی شہری تھی چنانچہ وی آئی پی تھی......ایک عام پاکستانی شہری کے مقابلے میں اس کی اہمیت بہت زیادہ تھی......اس غیر معمولی انتظام نے مجھے کچھ تشویش میں مبتلا کردیا......اگرچہ گل کا پروگرام اچانک عدالت میں جا کے بیان ریکارڈ کرانے کا تھا مگر سفارت خانے کی دخل اندازی کے باعث یہ طے شدہ پروگرام بن گیا تھا......اگر پولیس اور مجسٹریٹ کو علم تھا کہ آج کیا کارروائی ہوگی تو یہ خطرہ بھی موجود تھا کہ فریق ثانی تک خبر پہنچ گئی ہوگی......

میں نے اور راجا نے بڑے غور سے ہر طرف دیکھا لیکن کہیں کوئی مشکوک چہرہ نظر نہ آیا جس کا رانا رجب علی

سے تعلق محسوس ہوتا...... جب ایک نوجوان بیرسٹر شہزاد نے گل سے خود کو متعارف کرایا تو فاروقی نے اپنی سخت بے عزتی محسوس کی کہ مسٹر شہزاد نے اس کی طرف دیکھا نہ گل نے اس کا تعارف کرانے کی ضرورت محسوس کی......

سفارتی عملے کا ایک غیر ملکی افسر گل کو ایک طرف لے گیا اور اس سے کچھ دیر باتیں کرتا رہا...... راجا سب سے الگ نہ جانے کس کس سے موبائل فون پر بات کرنے میں معروف تھا...... میرا خیال تھا کہ وہ گل کے بیان ریکارڈ کراتے وقت اخبار والوں کی موجودگی کو یقینی بنا رہا تھا...... دوسری طرف گل کے وکیل شہزاد اور ڈی ایس پی کے درمیان گفتگو جاری تھی۔

اس کا نتیجہ تھوڑی دیر میں ظاہر ہوا...... ڈی ایس پی میری طرف آیا...... ''سر...... آپ نے ڈاکٹر صاحبہ کی طرف سے کوئی ایف آئی آر ابھی تک درج نہیں کرائی ہے......''

میں نے کہا...... ''ہم ڈاکٹر شہناز کے بیان کو ایف آئی آر کا حصہ بنانا چاہتے ہیں......''

''بہتر ہے آپ پہلے ایف آئی آر لکھوائیں...... اس سے کوئی قانونی پے چیدگی پیدا نہیں ہوگی......'' ڈی ایس پی بولا۔

میں نے کہا...... ''یہ تو مزید تاخیر ہوگی...... اب ہم پہلے تھانے جائیں......''

''تھانہ خود حاضر ہو رہا ہے آپ کی خدمت میں......''

اس نے یوں کہا کہ اس میں عاجزی سے زیادہ طنز کا گماں ہوتا تھا......

مجسٹریٹ کچھ روٹین کے کیس نمٹا رہا تھا...... شہزاد نے اپنی مؤکلہ کا وکالت نامہ داخل کرانے کے بعد گیارہ بجے کا وقت لے لیا تھا...... آدھے گھنٹے میں ست بدھائی سے لگنے والے تھانے کا ایس ایچ او بھی ہانپتا کانپتا نمودار ہوا...... منشی اس کے ساتھ تھا...... اس کی تھانیداری بچ گئی تھی لیکن اس میں میری کوشش سے زیادہ رانا کی سفارش کا ہاتھ تھا۔

تھانہ انچارج کو افسران بالا کے حکم پر آنا پڑا تھا مگر اسے علم نہ تھا کہ معاملہ کیا ہے...... یہ جانتے ہی کہ ڈاکٹر شہناز کی طرف سے رانا رجب علی کے خلاف ایف آئی آر لکھنی ہے اس کی حالت ایسی ہو گئی جیسے اس کے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہے ہوں...... وہ ٹائلٹ کے بہانے سے گیا اور میرے یقین کے مطابق اپنے مربی اور محسن کو تمام صورت حال سے آگاہ کرنے کا فرض پورا کیا اور حق نمک ادا کیا......

گزشتہ روز تھانے میں کوئی رپورٹ نہیں لکھوائی گئی تھی چنانچہ ڈی ایس پی کے حکم پر تھانے دار کے دوسرا گھونٹ نگلنا پڑا۔ انتہائی مجبوری اور بے بسی میں اس نے گزشتہ روز کی تاریخ ڈالی اور میری مرضی کے مطابق ہر کے وقت کا اندراج کیا۔

گل کے بیان سے کچھ دیر پہلے شہزاد میرے پاس آیا۔ ''نواب صاحب...... آپ بھی استغاثہ کے گواہ ہیں...... آپ کا بیان بھی ہوگا۔''

میں نے کہا...... ''کیا یہ ضروری ہے؟''

''ایف آئی آر کے مطابق شہناز کی ایک گواہ گل ہے...... دوسرے آپ ہیں آپ دونوں کا بیان گل کے بیان کی تائید بھی ہوگا...... آپ وہی بتائیں گے جو آپ جانتے ہیں اور یہ گل کے بیان کا حصہ بنے گا۔''

میں نے کہا...... ''میں تیار ہوں۔''

فاروقی وہاں موجود تھا لیکن میں نے اور شہناز نے شہزاد کو ہی اپنا وکیل مقرر کر دیا...... فاروقی نے سخت برا مانا مگر سب نے اسے سمجھا دیا کہ یہ معاملہ فوجداری کا ہے اور ایک کیس ہے تو وکیل بھی سب کا ایک ہی ہونا چاہیے...... مجھے یوں لگا جیسے ہمارے رویے سے وہ کچھ شک میں پڑ گیا ہے...... دوسری طرف میرا شک تھا کہ وہ تمام معاملات کی رپورٹ لمحہ بہ لمحہ رانا کو دے رہا تھا۔

گل کا بیان سب سے پہلے ہوا...... اس نے ڈاکٹر شہناز کی ایف آئی آر کو اپنے بیان کی بنیاد بنایا اور ابتدا اس وقت سے کی جب اس نے پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھا تھا تو نامعلوم افراد نے اسے اغوا کر لیا تھا...... بعد میں اسے پتا چلا کہ وہ مشہور ڈاکو شامی بادشاہ تھا...... تاہم ان ڈاکوؤں نے اس کے ساتھ بڑی شرافت کا سلوک کیا اور اسے ست بدھائی کی حویلی میں نواب رفیق احمد شیرازی کے پاس پہنچا دیا۔ ان ڈاکوؤں نے بتا دیا تھا کہ اسے کیوں اغوا کیا گیا تھا۔ اس کے باپ نے کسی ڈاکٹر شہناز کو اغوا کیا تھا...... کسی نے شہناز کی بازیابی کے لیے شامی بادشاہ سے رابطہ کیا جو اسی علاقے میں موجود تھا اور شامی نے اس کام کی ہامی بھری...... بعد میں شہناز کے بدلے اس کی رہائی کا مسئلہ اٹھا تو رانا رجب علی نے اپنی بیٹی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اسے خود رانا کی حویلی جانا پڑا جہاں اس کی ملاقات ڈاکٹر شہناز سے ہوئی اور اسے

ام حالات کا علم ہوا...... اس نے حویلی میں جو کچھ دیکھا ب بیان کیا اور یہ کہا کہ تمام حالات جان کے اسے نے باپ سے نفرت ہو گئی تھی۔ اس نے ڈاکٹر شہناز کی ری اور وہ فرار ہو کے ست بدھائی کی حویلی پہنچ گئی۔

گل کا بیان ڈیڑھ گھنٹا جاری رہا۔ اس نے بڑی فصیل سے رانا کی حویلی کے اندر کے سارے واقعات روشنی ڈالی...... اس کی دوسری بیوی کی موت کے اصل سباب کا ذکر کیا...... پھر یہ بتایا کہ لندن میں اس کی ماں کے ساتھ رانا کی شادی کب ہوئی تھی اور وہ پاکستان میں کیوں نہیں رہتی...... اس نے تمام دھمکیوں کا ذکر کیا جو سے ہر طرح سے مل رہی تھیں۔

اس بیان کے دوران گل کئی بار جذباتی ہو کے روئی...... عدالت کے علاوہ اس بیان کو تین اخباری نمائندے لکھ رہے تھے اور ایک شخص ریکارڈ کر رہا تھا جس کے بارے میں بعد میں معلوم ہوا کہ سفارت خانے کا اسٹینو گرافر تھا...... ڈیڑھ گھنٹا عدالت میں مکمل خاموش رہی...... راجا اور میں ہر طرف دیکھتے رہے کہ عدالت کے کمرے میں موجود لوگوں میں کوئی مشتبہ شخص تو شامل نہیں ہوا۔

گل اپنا بیان ختم کر کے آگے ہی بیٹھ گئی جہاں شہناز اپنے وکیل کے ساتھ موجود تھی...... میں درمیان میں بیٹھا ہوا تھا اور راجا بالکل آخر میں دروازے سے لگا کھڑا تھا...... ہم مسلسل سیکیورٹی والوں کو یاد دلا رہے تھے کہ وہ غافل نہ ہوں...... سفارت خانے کا نمائندہ گل کے ساتھ تھا...... جب شہناز کا بیان شروع ہوا تو وہ گل کو اپنے ساتھ مشاورت کے لیے ایک بغلی کمرے میں لے گیا۔

شہناز کا بیان ایک گھنٹا جاری رہا...... اس نے بھی ابتدا سے انتہا تک کے سارے واقعات کا احاطہ کیا اور اپنے اغوا کے اسباب تفصیل سے بیان کیے پھر اخبار والوں کے لیے تو یہ دھما کا کیس تھا جس میں ایک جاگیردار سیاسی خاندان پر ایسے سنگین اخلاقی جرائم کے الزامات عائد کیے گئے تھے جو اس کا سیاسی مستقبل ہمیشہ کے لیے تاریک کر سکتے تھے۔

شہناز کے بیان کے دوران ہی تھانیدار نے ایف آئی آر پیش کرنے کا ناخوشگوار فریضہ بھی سر انجام دیا...... پھر میرا بیان ہوا جس میں مجھے اپنی پوزیشن بھی کلیئر کرنی پڑی کہ شامی ڈاکو نے اغوا کے بعد گل کو میری حویلی میں کیوں پہنچایا...... نہ ہی شامی ڈاکو سے ذاتی طور پر

واقف ہوں نہ کبھی ملا ہوں...... اس سے گل کو اغوا کرنے کی درخواست کسی نے کی تھی...... یہ بھی نہیں جانتا...... وہ گل کو میرے پاس کیوں لایا...... یہ بھی اسی سے پوچھا جائے...... میں نے سنا ہے کہ وہ بہت پڑھا لکھا اور فلمی قسم کا ڈاکو ہے جو مظلوموں کی مدد کرتا ہے اور ظالموں کو سزا دیتا ہے...... ممکن ہے اس نے عدالت عالیہ کی طرح اس کیس کا ''سوموٹو'' نوٹس لے کر کارروائی کی ہو اور مجھے اس قابل سمجھا ہو کہ باقی معاملات طے کروں۔

ظاہر ہے میرا بیان اپنی قانونی پوزیشن محفوظ کرنے کے لیے تھا۔ چار گھنٹے کی یہ عدالتی کارروائی ختم ہوئی تو تین بج رہے تھے...... مجسٹریٹ کے جاتے ہی اخبار والوں نے گل کو اور شہناز کو گھیرنا چاہا لیکن سیکیورٹی والوں نے ان کی کوشش ناکام بنا دی...... صحافیوں نے راجا سے گلہ کیا اور پھر میری طرف آ گئے...... میں نے کہا کہ اس سے زیادہ میرے پاس بھی کہنے کے لیے کچھ نہیں ہے جو میں نے عدالت میں کہا......

''ماحول میں سخت کشیدگی تھی...... پولیس والے چاہتے تھے کہ انہیں ان کے فرض سے سبکدوش کیا جائے...... ان کے لیے یہ فلیگ تھی...... کچھ ملنا تو درکنار کسی نے انہیں چائے کی ایک پیالی کو بھی نہیں پوچھا تھا...... میں نے کہا کہ واپس جانے سے پہلے ہم جہلم کے سب سے اچھے ریسٹورنٹ میں کھانا کھائیں گے تو ان کے چہروں کی رونق کچھ بحال ہوئی۔

اس وقت گل میری طرف آئی...... ''رفیق...... آئی ایم سوری...... میں تمہارے ساتھ واپس نہیں جا سکتی۔''

''کیوں؟'' میں نے حیرانی سے کہا۔

''سفارت خانے سے آنے والے سیکیورٹی کے ذمے دار کی رائے اس کے خلاف ہے...... اس کا کہنا ہے کہ ایسا بیان دینے کے بعد مجھے پاکستان میں نہیں رہنا چاہیے...... میری جان کو خطرہ ہے۔'' گل بولی۔

میں نے کہا...... ''اب تک تمہاری حفاظت کے ذمے دار ہم تھے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے......مگر میں اس کے مشورے کو مسترد کرنے کا رسک نہیں لے سکتی......میری اخلاقی اور قانونی ذمے داری پوری ہوگئی۔''

''گویا تم اس کے ساتھ چلی جاؤ گی۔''

''ہاں......آج رات سفارت خانے میں یا جہاں وہ کہیں گے وہاں رکوں گی......کل لندن روانہ ہو جاؤں گی......اس نے سارے انتظامات کر لیے ہیں۔''

میں نے کہا...... ''ٹھیک ہے......لیکن ہم کھانا تو ایک ساتھ کھا سکتے ہیں......میں اس سے بات کر لیتا ہوں۔''

سفارت خانے کا نمائندہ ایک پاکستانی سراج الدولہ تھا......وہ پہلے ایف آئی اے میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر وغیرہ تھا......پھر اس نے نارکوٹکس سے اپنا ٹرانسفر کرا لیا اور اب ڈیپوٹیشن پر سفارت خانوں کی سیکیورٹی فورس میں شامل تھا۔ اس نے با دلِ ناخواستہ میری دعوت قبول کی۔

واپسی کے لیے ہماری ترتیب کچھ بدل گئی......پولیس والے اپنی اپنی گاڑی میں رہے......گل میرا ساتھ چھوڑ کے سفارت خانے کی گاڑی کی طرف چلی گئی......راجا اور شہناز میری گاڑی میں بیٹھ چکے تھے کہ میرے کانوں نے ایک فائر کی آواز سنی......پھر شہناز چیخ مار کے بھاگی......راجا نے اسے پکڑ لیا مگر اس نے خود کو چھڑا لیا......پھر ایک دم پولیس والے گاڑی سے کودنے لگے۔

اور تب میری نظر سفارت خانے کی گاڑی کی طرف گئی......اس کے آگے والا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اس میں بیٹھنے والی گل پیچھے گری ہوئی تھی......اس کے دروازہ بند کرنے سے پہلے ہی نامعلوم سمت آنے والی کسی گولی نے گل کو نشانہ بنا لیا تھا۔

جب راجا کے ساتھ میں اس جگہ پہنچا تو سفارت خانے کا نمائندہ گھٹنوں کے بل بیٹھا گل کو اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا......گولی گل کی گردن میں لگی تھی اور اس کا خون جس تیزی سے بہہ رہا تھا اس سے اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ زخم کتنا مہلک ہے......سفارت خانے کا نمائندہ مجھ پر چلایا...... ''یہ تمہاری احمقانہ خواہش کی وجہ سے ہوا......''

میں نے اسے ایک طرف دھکا دیا...... ''شٹ اپ......'' اور پیچھے بیٹھ گیا۔

گل کا جسم کرب میں تھا......اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور موت تیزی سے اس کی طرف بڑھ رہی تھی......یہ بات خود گل بھی جانتی تھی۔

میں نے گل کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ''گل......پلیز میری طرف دیکھو......''

گل نے میری طرف دیکھا اور اس کے لبوں پر ایک مسکراہٹ نمودار ہوئی......اس نے منہ سے خون اگلا اور کچھ بولنے کی کوشش کی......راجا میرے ساتھ بیٹھا تھا......شہناز دھاڑیں مار مار کے رو رہی تھی اور گل کو پکار رہی تھی......ہر طرف ایک افراتفری تھی......پولیس والے ہر طرف دوڑ رہے تھے اور بے وجہ فائرنگ کر رہے تھے۔

گل کے لب ہلے...... ''میں......میں نے......اپنا فرض......ادا کر دیا......'' اس نے بمشکل تمام کہا......پھر اس کی گردن ڈھلک گئی۔

''انا للہ وانا الیہ راجعون۔''......میں نے کہا اور کھڑا ہو گیا......شہناز چلاتی ہوئی گل پر گر پڑی اور اس کی خون آلود لاش سے لپٹ کے رونے لگی......راجا نے اسے بڑی مشکل سے الگ کیا......ہم سے کچھ فاصلے پر فاروقی اور گل کا وکیل شہزاد دم بخود اور افسردہ کھڑے تھے۔

میں نے جیپ میں بیٹھے ہوئے ڈی ایس پی کو باہر کھینچ لیا...... ''تم بیٹھے ہو آرام سے......''

''سر جی......میں کیا کروں......'' اس نے خود کو سنبھالا۔

''یہ کس کی نااہلی ہے......کس کی ذمے داری تھی گل کو بچانا......آخر کیوں آئے تھے تم لوگ......'' میں نے دھاڑ کے کہا۔

''جنابِ عالی......موت سے کون کسی کو بچا سکا ہے......امریکی صدر کینیڈی کو ایک قاتل کی گولی سے بچانے والے کتنے لوگ تھے۔''

''بکواس بند کرو......معلوم کرو کس نے گولی چلائی......پوچھو اپنے ماتحتوں سے جو ادھر ادھر دوڑ رہے ہیں۔''

ایک ماتحت خود ہی دوڑتا ہوا آ گیا...... ''سر......گولی ایک گاڑی سے چلائی گئی......اس پان والے نے بتایا ہے۔''

ڈی ایس پی نے گالی دے کر کہا...... ''اس کو لاؤ ادھر......''

پان والا حاضر کیا گیا......اس پر سخت گھبراہٹ سوار تھی۔ ''سر میں نے صرف گاڑی دیکھی......اور کچھ نہیں

دیکھا......فائر ہوا تو میری نظر ادھر گئی......فائر کے بعد وہ گاڑی تیزی سے چلی گئی۔''

''کیسی گاڑی تھی......نمبر دیکھا تم نے......'' میں نے پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''سفید رنگ کی ٹویوٹا تھی......نمبر نہیں تھا۔''

''نہیں تھا کیا مطلب۔''

''نمبر پلیٹ نہیں تھی جناب......ورنہ میں نوٹ کر لیتا۔''

ڈی ایس پی نے کہا...... ''اسے تھانے لے چلو۔''

پان والا بہت چیخا چلایا مگر اس کی ایک نہیں چلی......ظاہر ہے اسے اب چشم دید گواہ ہونے کا خمیازہ بھگتنا تھا۔

جو ہونا تھا ہو چکا تھا......اب اگلا مرحلہ درپیش تھا......گل کے جسدِ خاکی کو سپردِ خاک کرنے کا......میں نے راجا سے بات کی اور ہم نے اتفاقِ رائے سے فیصلہ کر لیا......گل کو لندن جانا تھا......وہ لندن ہی جائے گی......ابھی ہم نے انتظامات کا آغاز بھی نہیں کیا تھا کہ ایک اور خبر آ گئی۔

ڈی ایس پی نے مجھے بتایا...... ''سر......جس گاڑی سے فائر کیا گیا تھا، وہ مل گئی ہے۔''

''اور جس نے فائر کیا تھا......وہ بھی پکڑا گیا۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا...... ''گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا......یہاں سے کچھ دور موڑ کاٹتے ہوئے......اس میں ایک ہی بندہ تھا......وہ مارا گیا......اس کے سر میں بھی گولی لگی ہے۔''

بات میری سمجھ میں آ رہی تھی......قاتل کو بھی قتل کر دیا گیا تھا......اگر یہ سارا انتظام رانا نے اپنی انا کو شکست سے بچانے کے لیے کیا تھا تو بہت بھرپور تھا......گل نے اپنے بیان میں اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ اسے قتل کر دیا جائے گا مگر اس نے باپ کا نام نہیں لیا تھا۔

میں شہناز کو راجا کی گاڑی میں بٹھانے جا رہا تھا کہ ڈی ایس پی نے میری طرف آ کے کہا...... ''نواب صاحب......آپ کا فون......رانا صاحب آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔''

میں رک گیا......اس فون کی ٹائمنگ حیران کن تھی۔

ڈی ایس پی نے پھر کہا۔ ''نواب صاحب......آپ کے لیے کال ہے......رانا صاحب بات کرنا چاہتے ہیں۔''

میں نے کہا...... ''ابھی میں اس سے بات نہیں کرنا چاہتا......تم خود اسے بتا دو جو بتانا ہے......''

مجھے نہیں معلوم کہ ڈی ایس پی نے گل کے قتل کیے جانے کی خبر رانا کو کیسے دی......میری نظر میں وہ باپ نہیں قاتل تھا' یہ خبر میری زبان سے سننا چاہتا تھا......اس سے رانا کی انا پرستی کے جذبے کو تسکین حاصل ہوتی جو اس کے سفاک خون سے نمو پا کے خون آشامی کے ناقابلِ یقین یقین واقعات کا سبب بنتا تھا۔

جیسے عام انسان کا وجود محبت کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ اس محبت کے مظاہر ان گنت ہو سکتے ہیں۔ محبت وہ خدا سے یا خدا کے بندوں سے کر سکتا ہے......خون کے اور زمین کے رشتوں سے کر سکتا ہے۔ اپنے عقیدے سے، کائنات کے حسن سے، سچائی سے یا نیکی سے کر سکتا ہے......یہی محبت اسے انسانیت کے منصب پر فائز کرتی ہے۔

اس کے برعکس رانا جیسے ہر فرعون کے وجود سے حاکمیت اور خود پرستی کا زہر پھوٹتا ہے پھر نہ وہ کسی سے محبت کر سکتا ہے اور نہ کسی کو عزت دے سکتا ہے۔ وہ فرعون، یزید یا ڈکٹیٹر بن جاتا ہے جو ہر گردن کو اپنے مقابل جھکا ہوا دیکھنے کی آرزو میں صرفِ خون کرتا ہے، رشتوں کی آبرو کا......عقیدے کی تقدیس کا......اچھائی اور سچائی کا۔

چنانچہ رانا جیسے لوگ اپنی خود ساختہ عزت اور غیرت کے بلند میناروں کو سربلند رکھنے کے لیے ان کی بنیادوں میں اپنی ہی اولاد کا خون ڈالتے رہتے ہیں۔ وہ بیٹیوں کی ڈولی اٹھانے کے بجائے ان کے جنازے اٹھواتے ہیں۔ بیٹوں کو قبروں میں اتار دیتے ہیں......بھائیوں کو مروا دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح انہوں نے خاندان یا قبیلے کی عزت و ناموس کو بچا لیا ہے۔

رانا نے اپنی پگ نیچی ہونے سے بچانے کے لیے اپنی جوان بیٹی کو بے رحم قاتلوں کے سپرد کر دیا تھا کہ ہمیں دنیا میں رسوائی دینے والی اس لڑکی کو دوسری دنیا میں بھیج

دو...... جیسے خود پر آنے والی مصیبت کو ٹالنے کے لیے کچھ لوگ کالا بکرا قربان کرتے ہیں۔

گل جب سے لندن سے آئی تھی، رانا کے لیے ایک خطرہ بنی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے باپ کی اصلیت سے واقف ہونے کے بعد علی الاعلان ہمارا ساتھ دینا شروع کردیا تھا۔ رانا کے لیے اس سے بڑی بے عزتی کی کوئی بات نہیں ہوسکتی تھی کہ اس کی جوان بیٹی کو پہلے دشمن اغوا کرلیں اور پھر وہ انہی کے ساتھ رہنے لگے...... رانا نے گل کو ساتھ لے جانے کے لیے خود ست بدھائی آنے کی شرط قبول کرنے سے انکار کردیا تھا۔

اس سے صاف کہہ دیا تھا کہ آنا ہے تو خود آجاؤ ورنہ میں تمہیں عاق کرتا ہوں اور تمہاری ماں کو طلاق دیتا ہوں۔ اپنا سا منہ لے کر گل کو باپ کے گھر جانا پڑا تھا۔ وہاں رہ کے اس نے رانا کی عزت پر دوسرا کاری وار کیا۔ وہ خود بھی فرار ہوئی اور سازش کرکے ڈاکٹر شہناز کو بھی نکال لے گئی جسے رانا نے اپنے دشمنوں پر فتح کی ٹرافی کے طور پر حویلی میں سجانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

رانا کے لیے یہ ذلت ناقابلِ برداشت تھی۔ اسے بے وقوف بنایا گیا تھا۔ خود اس کی بیٹی نے جگ ہنسائی کا یہ شرمناک ڈراما کیا تھا۔ وہ ڈاکٹر شہناز سے شادی کا خواب دیکھ رہا تھا...... اچانک اسے احساس ہوا کہ بیٹی اس کے منہ پر تھپڑ مار کے پھر دشمنوں سے جا ملی ہے۔ اب زمانہ اس پر ہنسے گا اور تھوتھو کرے گا پھر اسے پتا چلا کہ وہ بیٹی ایک قدم اور آگے بڑھ کے اسے ہتھکڑیاں ڈلوانے اور جیل بھجوانے کے ارادوں میں بھی دشمن کا ساتھ دے رہی ہے۔

اس نے حکم دیا...... ختم کردو اس کو...... اس سے پہلے کہ یہ میری عزت کا جنازہ اٹھائے۔ اس کا جنازہ اٹھادو...... اور حکم کے غلام شیطان کے بے ضمیر چیلوں نے فوراً تعمیل کی۔

لیکن وہ جو رانا نے چاہا تھا، نہ ہوا...... بیٹی پھر باپ کے مقابلے میں زیادہ ہوشیار شاطر ثابت ہوئی...... رانا اسے عدالت میں بیان دینے سے روکنا چاہتا تھا جو اسے...... رانا رجب علی ایم پی اے...... زمیندار جاگیردار...... جدی پشتی عزت دار شخص کو کسی عادی مجرم کی طرح عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کرسکتا تھا۔ اس کے خلاف قتل اور اغوا جیسے سنگین جرائم کے ناقابلِ تردید شواہد فراہم کرسکتا تھا...... ایسا نہ ہوسکا۔

ایک پُرعبرت سزائے موت تو گل کا مقدر بن چکی تھی۔ اس کا یہ انجام زمانے نے دیکھا۔ اس کا خون انصاف کے دروازے پر ہوا...... لیکن اس وقت جب وہ ضمیر کی گواہی دے چکی تھی...... حلفیہ بیان کے ذریعے دنیا کو بتا چکی تھی کہ رانا جو بدقسمتی سے اس کا باپ بھی ہے...... اس کی حقیقت کیا ہے!...... کچھ ہم نے پیش بندی کی تھی۔ کچھ خود اس نے حفاظتی انتظام کے لیے سفارت خانے والوں سے رابطہ کیا تھا۔ اسے بیان دینے سے نہ روکا جاسکا۔ عدالت جاتے ہوئے راستے میں اس کے قتل پر مامور حکم کے غلاموں کو قریب جانے یا راستہ روک کے اپنی کارروائی کرنے کا موقع نہ ملا...... گل کو بیان دینے سے پہلے ختم نہ کیا جاسکا۔

رانا کے لیے یہ ایک اور شکست...... ایک اور ذلت...... ایک اور ناکامی تھی...... اس کے منہ پر سیاہی تھوپنے سے پہلے اس کی بیٹی کی زبان نہ روکی گئی...... اس کوتاہی...... اس مجرمانہ نااہلی کے ذمے دار کو بھی سزائے موت...... بلا تاخیر...... بلا عذر...... چنانچہ مقتول کے ساتھ ہی قاتل بھی گیا...... ایک سے خون کا رشتہ...... دوسرے سے نمک خواری کا...... لیکن دونوں کا جرم ایک...... حکم عدولی...... دونوں کا انجام ایک......

اب میں ہوں اور ماتم یک شہر آرزو...... گل کی لاش فرشِ خاک پر پڑی اس آسمان کو تک رہی تھی جس کی بیکراں نیلاہٹ میں پرواز کرکے اس نے سلامتی کے افق تک جانے کا سوچا تھا۔ اس کی روح آسمانوں سے لامتناہی فاصلے رکھنے والی بلندیوں تک پرواز کرکے عالمِ ارواح میں پہنچ گئی تھی۔

ضابطے کی کارروائی جاری تھی۔ جہلم پولیس کے نام نہاد ماہرین جائے واردات پر پہنچ چکے تھے۔ ایک صدی پرانے طریقہ کار کے مطابق وہ کاہلی اور بے دلی سے کوائف

جمع کررہے تھے...... قتل کے اسباب اور واقعات خود قاتل کی نشاندہی کرتے تھے...... لیکن قتل کے جرم کی کہانی بڑی عبرت آموز تھی۔

کچھ لوگ اب کہتے ہیں کہ یہ کہانی ملک کے پہلے وزیراعظم کے قتل سے بھی پہلے شروع ہوچکی تھی...... دروغ برگردن راوی۔ پہلے وزیراعظم کے قتل کی نگرانی اس وقت کے وزیر داخلہ نے ذاتی طور پر موجودہ کے کی جبکہ سرکاری طور پر وہ کراچی میں تھے۔ ان کے ماتحت پولیس کے ایک افسر نے خود گولی مار کے قاتل کو ہلاک کرڈالا کہ اس سے تفتیش کا امکان نہ رہے۔ اس کارکردگی کا صلہ اسے ترقی کی صورت میں ملا۔

تب سے اب تک جتنے قتل ہوئے یا کرائے گئے...... سیاست کی خونی بساط پر تو یہ کھیل تاریخ کے ہر دور میں جاری رہا لیکن اسلامی جمہوریہ پاکستان میں حکیم سعید جیسے دانشور ہوں یا گل جی جیسے مصور کسی کے قتل کا سراغ کب ملا فہرست میں کتنے نام ہیں...... سب برعیاں ہیں۔

اور پھر دوسری قسم کے عامیانہ قتل بھی تو ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی مجرم نہ ہو تو بنا لیا جاتا ہے...... احمد کی پگڑی محمود کے سر...... پھندا جس کے گلے میں فٹ آرہا ہے...... اسے لٹکادو...... اب رانا صاحب جیسے معزز آدمی کو بھلا کیسے ملوث کیا جاسکتا ہے...... کسی اور کو دیکھو...... کوئی اور بندہ پکڑو...... کوئی وجہ بنالو......

ایک ایمبولینس گل کی لاش کے ساتھ سرکاری اسپتال کی جانب روانہ ہوگئی۔ اب پوسٹ مارٹم ہوگا...... آتشیں اسلحے کا ماہر ایک رپورٹ دے گا...... ڈاکٹر دوسری رپورٹ دیں گے...... موت کے اسباب کا یقین قانونی طور پر کیا جائے گا...... وہیں گل کے قاتل کی لاش بھی لائی جائے گی...... تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے۔

وہاں میں نے رانا کو دیکھا...... وہ اپنے محافظوں اور مصاحبوں کے جلوس میں پہنچا تھا۔ وہ سب خوں آشام نظروں سے ہمیں گھور رہے تھے...... جیسے ایک اشارے کے منتظر ہیں...... رانا سر ہلا دے تو درجنوں گولیاں ہمارے ناپاک جسموں سے گزار دیں...... وہ غمگین نہیں تھے مشتعل تھے کیونکہ رانا بھی غمگین نہیں تھا بلکہ مشتعل تھا۔

میں نے اس کے سامنے جانے سے گریز کیا۔ راجا نے جو اخبار نویس بلائے تھے، ان میں سے ایک کو شامت نے گھیر لیا...... اس نے قریب جا کے گل کی تدفین کے بارے میں کوئی سوال کیا تھا۔ رانا کے جانثار اس پر پل پڑے...... انہوں نے اخباری رپورٹر کو بری طرح مارا اور اس کا کیمرا چکنا چور کردیا۔ رپورٹرز کے لیے یہ نئی بات نہ تھی...... سچ اپنی جگہ محفوظ تھا...... اس میں ایک نیا سنسنی خیز اضافہ ہوگیا تھا۔

شہناز کی حالت غیر ہورہی تھی۔ اس کے آنسو تھمتے نہ تھے۔ وہ بار بار کہتی تھی۔ ''مجھے گل کے پاس لے چلو۔''

راجا اسے تسلی دیتا تھا۔ ''تم جانتی تو ہو پوسٹ مارٹم روم میں کوئی نہیں جاسکتا۔''

اس کمرے کے باہر جہاں پوسٹ مارٹم جاری تھا کافی لوگ جمع تھے۔ راجا نے ایک اخبار نویس کو اشارے سے اپنی طرف بلایا۔

''کیا مسئلہ ہے......؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''کچھ نہیں...... رانا کہتا ہے میت میں لے جاؤں گا۔ اپنے خاندانی قبرستان میں تدفین کے لیے۔''

راجا نے اسے گالی دی۔ ''...... خود دفن ہوجائے۔''

گل کے وکیل نے اعتراض کیا ہے کہ گل کا بیان ان کے خلاف تھا۔ وہ وکیل پر گرم ہوگیا...... اسے گالیاں دینے لگا کہ میں باپ ہوں اس کا...... نوجوان وکیل نے کہا کہ زبان سنبھال کے بات کرو مجھ سے...... تم باپ نہیں قاتل ہو۔

''فیصلہ کیا ہوا؟''

''فیصلہ سفارت خانے کے افسر نے کیا کہ وہ برٹش نیشنل تھی۔ اس کی لاش واپس جائے گی۔ رانا نے کہا کہ وہ اس فیصلے کے خلاف عدالتی حکم حاصل کرے گا۔ پولیس چاہتی ہے کہ تفتیش سے جان چھڑائے...... گل کے وکیل نے کہا ہے کہ وہ بھی عدالت میں درخواست دے گا...... برطانوی سفارت خانے کے ذریعے تفتیش کے لیے برطانیہ سے ماہرین بلائے جائیں گے۔''

''یہ بالکل ٹھیک مطالبہ ہے......'' راجا نے کہا۔

"لیکن پھر تدفین رک جائے گی.....لاش محفوظ کردی جائے گی..... کسی سرد خانے میں۔"

شہناز نے پھر رونا شروع کردیا.....راجا گاڑی میں جا کے اسے چپ کرانے لگا.....رپورٹر آگے چلا گیا۔ مجھے جتنا غصہ تھا اس سے کہیں زیادہ صدمہ تھا۔ ایک احساسِ جرم میرے دل کو جکڑ رہا تھا کہ یہ سب میری وجہ سے ہوا.....رانا کی اور میری دشمنی نے گل کی جان لے لی.....وہ بلاوجہ بیچ میں آئی اور ماری گئی..... یہ ایک فطری ردِعمل تھا ورنہ حالات پر کس کا بس چلتا ہے..... جیسے میں نے ست بدھائی آنے سے پہلے یہ تصور بھی نہیں کیا تھا کہ یہاں مجھے کیا کیا مسائل درپیش ہوں گے ایسے ہی گل بھی نہیں جانتی تھی کہ اس بار وہ لندن سے آتو رہی ہے مگر واپسی کا سفر کسی تابوت میں کرے گی۔

اچانک یوں لگا جیسے بحث وتکرار بڑھ کے ہنگامے میں بدل گئی ہے.....پھر ایک فائر ہوا.....راجا نے چلاّ کے کہا۔"رفیق.....بیٹھ گاڑی میں۔"

میں گاڑی میں بیٹھ گیا.....راجا نے گاڑی کو ایک دم موڑا اور ایک عمارت کے پیچھے لے گیا۔

شہناز نے گھبرا کے کہا۔"کیا ہوگیا؟"

"میں دیکھتا ہوں۔"راجا اتر کے واپس جانے لگا۔

شہناز بڑی پھرتی سے اتری اور اس نے راجا پکڑ لیا۔"کوئی ضرورت نہیں اُدھر جانے کی.....مرنا ہے کیا۔"

وقفے وقفے سے فائرنگ ہورہی تھی اور لوگ ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ صورتِ حال ہمارے حق میں خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔ ہماری گاڑی فائرنگ کی زد میں آسکتی تھی بعد میں کیا پتا چلتا کہ فائرنگ کس نے کی تھی اور ہمیں کس کی گولی لگی۔ ہم نے اسٹامپ فروشوں کی ایک دکان کے پیچھے بنے ہوئے غلیظ باتھ روم کے پیچھے پناہ لی جہاں سے سامنے کا پورا منظر دکھائی دے رہا تھا۔

اسپتال کے برآمدے میں پولیس کے اہلکار ستونوں کی اوٹ سے فائر کررہے تھے اور ان کی بندوقوں کا رخ سامنے ہجوم کی طرف تھا جو اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ رہا تھا.....ان میں کچھ تماشائی بھی تھے جو عدالت کے احاطے میں پہلے سے موجود تھے۔ کچھ رانا کے ساتھ آنے والے وفادار تھے اور چند اخباری نمائندے۔

شہناز رونا بھول گئی....."یہ کیا ہورہا ہے راجا۔"

راجا نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور اسے اپنے قریب کرلیا۔"کچھ نہیں.....پولیس اپنے دفاع میں گولی چلا رہی ہے۔"

"کس پر....."

"مجھے ایسا لگتا ہے.....کہ رانا نے زبردستی لاش لے جانے کی کوشش کی ہے۔" راجا دیوار کی اوٹ سے جھانک رہا تھا۔

اس کا اندازہ درست تھا.....ایک شخص دوڑتا ہوا ادھر ہی آیا جہاں ہم پناہ گزین تھے۔ راجا نے اسے غور سے دیکھا۔"تم رپورٹر ہو!"

"او نہیں جی.....میں تو ایویں رک گیا تھا ادھر....." اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔"مجھے کیا پتا تھا فائرنگ ہوجائے گی.....لڑکی کا باپ چاہتا تھا کہ بیٹی کو وہ ادھر پاکستان میں دفن کرے.....وہ ولایت سے آئی تھی.....ماں ادھر ہے.....پولیس انکار کررہی تھی کہ ڈیڈ باڈی واپس جائے گی.....بس جھگڑا بڑھ گیا۔ رانا نے ریوالور نکال لیا ڈی ایس پی پر.....بولا تم جانتے نہیں میں کون ہوں!.....اس نے رانا کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ جناب عالی میری مجبوری ہے۔ ادھر سفارت خانے والے کھڑے ہیں.....اتنی دیر میں رانا کے ساتھیوں نے پولیس پر حملہ کردیا۔ اسپتال کے مردہ خانے میں گھسنے کی کوشش کی.....پولیس نے بھی فائرنگ کردی۔"

"کوئی مرا یا زخمی ہوا....."میں نے پوچھا۔

"پتا نہیں جی......... دونوں طرف سے گولی چل رہی تھی۔"

ہنگامہ اب ختم ہوگیا تھا.....پولیس نے رانا کی زبردستی لاش حاصل کرنے کی کوشش ناکام بنادی تھی۔ کراس فائر میں پولیس کا ایک کانسٹیبل زخمی ہوا تھا۔ اسے اسپتال میں امداد فراہم کی جارہی تھی.....ایک نامعلوم شخص گولی لگنے سے ہلاک ہوگیا تھا۔ اخباری نمائندوں نے پورا واقعہ دیکھا تھا اور کچھ تصویریں بھی بنائی تھیں۔ صورت

[...]ی نزاکت کو سمجھتے ہی رانا کی عقل ٹھکانے آگئی.....وہ [...] ساتھیوں سمیت فرار ہوگیا.....اگر پولیس چاہتی تو [...] کو گرفتار کرسکتی تھی لیکن ایک تو ڈی ایس پی بزدل [...] اسے اپنی نوکری پیاری تھی.....پھر اس کے پاس [...] بھی کم تھی۔

ایسے ہر موقع پر پولیس بڑی دوراندیش ہوجاتی ہے۔ [...] اس علاقے کا ایم پی اے تھا اور اپنے اثر رسوخ سے [...] ایس پی کو فائدہ بھی پہنچا سکتا تھا اور نقصان بھی.....وہ [...] جو مرگئی برٹش نیشنل تھی۔

وہ یا برطانوی سفارت خانہ قانونی پوزیشن اختیار [...] نے پر اسے نہ ترقی دلوا سکتے تھے نہ سند.....اس نے رانا [...] اپنے ہمراہیوں سمیت نکل جانے کا پورا موقع فراہم کیا [...] انہیں تمام الزامات سے تحفظ فراہم کیا جاسکے۔ ایک [...] نام راہ گیر کے مارے جانے سے فائدہ یہ ہوا تھا کہ اس [...] اور دیگر نامعلوم ملزمان پر تمام مقدمات تھوپے جاسکتے [...] آتشیں اسلحے کا استعمال.....بلوہ.....قتل اور اقدامِ قتل [...] مرنے والے کے پاس سے اسلحے کی برآمدگی دکھانا اور [...] ابت کرنا کہ اسی کی گولی سے کانسٹیبل پائنے خاں زخمی [...] بہت آسان تھا۔

گل کے سارے حمایتی ادھر ادھر چھپ گئے تھے۔ [...] ے علاوہ وہاں سفارت خانے کا نمائندہ تھا اور گل کا [...] ل شہزاد جس نے کچھ دیر پہلے ہی اس سے وکالت نامے [...] دستخط کروائے تھے۔ غنی اور ہمارے ساتھ آئے وہ [...] ہاڑی گارڈ.....اخباری نمائندے اور اسپتال کا عملہ [...] ب آہستہ آہستہ لوٹ آئے.....فاروقی البتہ ایسا غائب [...] اکہ پھر دکھائی نہ دیا۔

[...] وہاں اب ایک نئی صورتِ حال پیدا ہوگئی تھی.....گل [...] نوجوان اور جوشیلا وکیل رانا کے خلاف رپورٹ لکھوانے [...] مصر تھا اور اس کی بحث ڈی ایس پی سے ہورہی تھی...... [...] پ کمال کرتے ہیں.....میری مؤکلہ نے جو خدشہ ظاہر [...] کیا تھا.....وہ درست ثابت ہوا.....اس نے اپنے باپ [...] کے خلاف بیان دیا تھا۔"

ڈی ایس پی نے کہا"اس نے اپنے بیان میں یہ نہیں [...] کہا تھا کہ مجھے باپ کی طرف سے جان کا خطرہ ہے۔"

"کمال ہے.....اور کیا کہا تھا؟"وہ برہمی سے بولا۔

"اس کا عدالتی بیان عدالت کی ذمے داری ہے۔" ڈی ایس پی نے جان چھڑانے کی کوشش کی۔

"پھر تمہاری کیا ذمے داری ہے۔"

"آپ کی مؤکلہ کو حفاظت سے عدالت لانا اور لے جانا....."

وکیل اس کی جان آسانی سے چھوڑنے والا نہیں تھا۔"وہ تم نے پوری نہیں کی.....گل تمہاری تحویل میں تھی جب اس کا قتل ہوا۔"

"وکیل صاحب.....قتل تو ان کا بھی ہوجاتا ہے جو بڑی سخت سیکیورٹی میں سفر کرتے ہیں.....امریکی صدر کینیڈی اکیلا سائیکل پر تو نہیں جارہا تھا پھر بھی اس کو گولی لگی۔" ڈی ایس پی کا موڈ خراب ہونے لگا۔"ہم تفتیش کررہے ہیں.....قاتل گرفتار ہوجائے گا.....انشاءاللہ۔"

وکیل نے تلخی سے کہا"انشاءاللہ.....یعنی اللہ نے چاہا مگر.....تم ایسا نہیں چاہتے.....تم نے اسے نکل جانے دیا تھا قاتل جائے واردات سے بھاگ گئے۔ اب تم کہتے ہو انشاءاللہ گرفتار ہوجائے گا۔"

"خوامخواہ میرے متھے مت لگو وکیل صاحب۔" ڈی ایس پی کا پارا چڑھ گیا۔"کیا ثبوت ہے آپ کے پاس کہ رانا قاتل تھا.....بتاؤ مجھے.....آپ نے دیکھا اسے گولی چلاتے۔"

"قتل اس نے کرایا.....گولیاں اس کے ساتھ آنے والوں نے چلائیں.....سب نے دیکھا۔"

"کس نے دیکھا.....لاؤ اسے میرے سامنے.....آکے گواہی دے بیان لکھوائے.....گولی چلانے والوں کے نام بتائے.....ثابت کرے کہ وہ رانا کے ساتھی تھے.....میں پرچہ درج کرلوں گا۔" ڈی ایس پی نے چلاّ کے کہا۔

وکیل نے بھی چلاّ کے جواب دیا۔"کیا تم نے دیکھا نہیں تھا؟ کون زبردستی لاش لے جانا چاہتا تھا.....اس کے ساتھی نہیں تھے تو کیا وہ راہگیر تھے.....انہوں نے فائرنگ کی.....تمہارا ایک بندہ زخمی ہوا۔ سب اخبار والوں نے دیکھا.....تم نے اور تمہاری پولیس فورس نے صرف ہوائی

فائر کیے اور ان کو فرار کا موقع فراہم کیا۔"

"چلانے کی ضرورت نہیں۔"

"ضرورت ہے..... صرف اس لیے کہ وہ اسمبلی کا ممبر ہے۔ اثر و رسوخ رکھتا ہے۔ کارروائی کرتے تو تمہارا ٹرانسفر کرادیتا۔ اب شاید تمہاری ترقی کی سفارش کرے گا۔ میں سب سمجھتا ہوں ڈی ایس پی صاحب....."

ڈی ایس پی ڈھٹائی سے مسکرایا۔

"کہاں یار..... سمجھتے ہو تو پھر اتنا شور کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یار ہمیں نوکری کرنے دو۔"

ابھی تک راجا نے یا میں نے کہیں بھی براہِ راست دخل اندازی نہیں کی تھی۔ نوجوان وکیل شہزاد کچھ جوشیلا تھا اور اس پر گل کی موت کے صدمے کا اثر بھی تھا، وہ ضرورت سے زیادہ جذبات کا مظاہرہ کررہا تھا۔ یہ ایک فطری بات تھی..... گل نوجوان تھی..... خوبصورت تھی..... اپنی تعلیم مکمل کرنے کا جذبہ لے کر پاکستان آئی تھی، اسے یہ بھروسا بھی تھا کہ پاکستان اس کے لیے دیارِ غیر نہیں۔ وہ خود برطانوی شہریت رکھتی تھی لیکن یہ اس کے باپ کا ملک تھا۔ اس کا باپ کوئی عام آدمی نہیں..... بہت دولت منداور بارسوخ تھا۔ اس کے لیے خوف اور پریشانی کی کوئی بات نہ تھی۔

یہ اس کے خواب و خیال میں بھی نہ ہوگا کہ اس بار موت اسے بلا رہی ہے اس پر جو قابلِ نفرت انکشافات اپنے باپ کے اصل کردار کے بارے میں ہوئے، وہ گل کی شخصیت کے لیے اتنے ہی تباہ کن تھے جتنی سونامی کی لہر..... اس صدمے نے اسے لخت لخت کردیا۔ اور بات جا کے باپ کے ہاتھوں بیٹی کے خون پر ختم ہوئی۔

وہ تاریک دور تھا جب بیٹیاں زندہ دفن کی جاتی تھیں۔ کفر نے پھر دلوں میں وہی سفاکی بھردی ہے۔ بیٹیاں جلادی جاتی ہیں۔ کاری قرار دے کر ماردی جاتی ہیں۔ ونی یا سوارا جیسی رسموں کی بھینٹ چڑھادی جاتی ہیں اور ہوس کی قربان گاہ پر مردار کھانے والوں کے ہاتھ فروخت کردی جاتی ہیں۔

پھر وہ نوجوان وکیل بے گناہ گل کی مرگِ ناگہاں پر کیسے دکھی نہ ہوتا اور وہ اس معاشرے کے رسم رواج جانتا تھا۔ اپنی خواہش کے لاحاصل ہونے اور قانون کے بے حس ہونے کی مجبوری کو بھی سمجھتا ہوگا۔ اس کے باوجود اپنے خون کی بغاوت کو مصلحت کے تقاضوں سے دبانے میں ناکام تھا۔ کبھی کبھی ہم سب اتنے ہی بے بس ہوجاتے ہیں۔ فریاد کرتے کرتے چلاتے چلاتے جاتے ہیں انصاف..... انصاف..... انتقام..... انتقام..... پھر سب ٹھیک ہوجاتا ہے اور ہم بھی چپ ہوجاتے ہیں۔

میں اس وکیل کے ساتھ جا کھڑا ہوا..... "ڈی ایس پی صاحب قائل ہونے والے نہیں ہیں۔ یہ قانون و انصاف سے زیادہ رانا کی زبان سمجھتے ہیں۔"

ڈی ایس پی کچھ گھبرایا۔ "نواب صاحب یہ زیادتی ہے۔"

"ہاں..... اور یہاں جو ہوا اس میں کوئی زیادتی نہیں..... کم سے کم رانا کی طرف سے زیادتی نہیں ہوئی۔" شہزاد طنز سے بولا۔

"شہزاد" میں نے کہا۔ "انہیں اپنا کام اپنے طریقے سے کرنے دو..... ہم اپنا کام اپنے طریقے سے کریں گے۔ رپورٹ یہاں نہیں لکھی جائے گی تو کورٹ آرڈر سے لکھی جائے گی۔"

ڈی ایس پی نے سر ہلایا۔ "ضرور جناب..... آپ کو عدالت میں جانے سے نہیں روک سکتے..... عدالت ہمیں حکم دے سکتی ہے لیکن کام تو پھر ہم اپنی مرضی سے کریں گے۔"

اس کی بات بہت واضح تھی۔ جج ہائی کورٹ کا ہو سپریم کورٹ کا..... تفتیشی افسر یا رپورٹ کے لیے پولیس کا محتاج ہوتا ہے اور وہ پولیس کے نظام یا طریقہ کار کو بدل نہیں سکتا۔ آخری اختیار نہ آئی جی صاحب کے پاس ہوتا ہے نہ کسی وزیر داخلہ کے پاس جو جتنا عرصہ وزیر رہے ماننے پر مجبور ہوتا ہے کہ پولیس کا محکمہ اس کا ماتحت ہے (ہوتا برعکس ہے)..... تمام اختیارات مرتکز رہتے ہیں ایس ایچ او یا تھانہ انچارج میں..... وہ جسے چاہے ملزم بنائے اس پر جو الزام چاہے عائد کرے..... ثبوت اور گواہ سب اس کی مرضی کے حکم کے تابع رہتے ہیں۔

شام ہونے تک پوسٹ مارٹم کی رسمی کارروائی بھی

ہوئی۔ ہم نے خصوصی اجازت سے آخری بار گل کا دیدار کیا۔ راجا ساتھ نہ ہوتا تو خصوصی اجازت ہمیں کچھ لیے بغیر نہ ملتی۔ ہم نہ مرنے والی کے وارث نہ..... برطانوی سفارت خانے کا نمائندہ ادھر ادھر سے معلومات لیتا رہا اور آگے پہنچاتا رہا۔

آخری وقت میں گل کی ماں نے لندن سے پیغام دیا کہ بیٹی کی لاش لینے وہ خود آرہی ہے۔ اب ہمارے وہاں رکنے کا نہ جواز تھا نہ فائدہ..... فاروقی ہم سے ملے بغیر نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ہمارے رویے سے کچھ کھٹک گیا ہے۔

بے تکلف اور پُراعتماد دوستی کے رشتے میں دراڑ پڑ گئی تھی اور بڑھتی جارہی تھی۔ اس کی ابتدا فاروقی کی دغا سے ہوئی تھی۔ ابھی تک وہ مطمئن تھا کہ ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ وہ لالچ میں میری جان کے دشمنوں سے میری زندگی کا سودا کرچکا تھا، وہ ست بدھائی کا مالک بننے کا خواب دیکھ رہا تھا اور بہت جلد اس کی تعبیر بھی چاہتا تھا۔ اس کے کردار کی بنیادیں اتنی کمزور ہیں..... یہ میں نے سوچا بھی نہ تھا۔ خدا کو ہنوز مجھے زندہ رکھنا منظور تھا۔ مجھے اس کے قاتلانہ عزائم کی خبر دوصفِ دشمناں میں میری خیر خواہ نور جہاں نے دی تھی۔ ظاہر ہے اس صدمے سے نکلنے کے بعد ہم سب محتاط ہوگئے تھے۔ فطری طور پر ہمارے درمیان ایک فاصلہ پیدا ہوگیا تھا۔

چور کی داڑھی میں تنکے والی بات سو فیصد درست ہے۔ ہمارے بدلے ہوئے رویے نے فاروقی کے دل میں خوف کا شک پیدا کیا۔ کہیں ہمیں معلوم تو نہیں ہوگیا کہ وہ اکبر خان سے مل گیا ہے.....؟ چور کو پکڑے جانے کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ سازش کرنے والا ہر لحظہ اس اندیشے میں مبتلا رہتا کہ اس کا پلان کہیں سے لیک آؤٹ نہ ہوجائے۔ کوئی غلطی یا بے احتیاطی افشائے راز کا سبب نہ بن جائے کسی کی بدنیتی یا بے وقوفی سے بنا بنایا کھیل نہ بگڑ جائے۔

اپنی طرف سے ہم پوری کوشش کررہے تھے کہ ہمارے رویے سے کچھ بھی ظاہر نہ ہو۔ وہ سمجھتا رہے کہ ہم حسبِ سابق اس پر بھروسا کرتے ہیں۔ وہ تمام معاملات میں ہمارا مشیر ہے۔ جس کے مشورے پر ہم آنکھ بند کرکے عمل کرتے ہیں اور اس کو آج بھی گھر کے ایک فرد کی عزت حاصل ہے..... لیکن ہماری کوشش سے کیا ہوسکتا تھا۔ فرق دلوں میں آگیا تھا تو سلوک میں کیسے نہ جھلکتا۔

درمیان میں ایک سے زیادہ واقعات ایسے ہوئے تھے کہ فاروقی کے شکوک کو تقویت ملی ہوگی۔ میرے اور نور جہاں کے تعلق کا راز افشا ہوگیا تھا..... میرا خیال تھا کہ اس کے نام نہاد شوہر اکبر خاں نے غیرت و اشتعال میں آکر اسے قتل کرڈالا لیکن راجا کی منطق جدا تھی..... اس کو یقین تھا کہ اتنی فائدہ پہنچانے والی عورت کو اکبر خان کیسے قتل کرسکتا ہے جب کہ وہ اس کا حقیقی شوہر بھی نہیں۔ بقول راجا کے وہ سونے کا انڈا دینے والی مرغی ہے..... اسے اکبر خاں مار کیسے سکتا ہے!

اگر یہ دلیل تسلیم کرلی جائے تب بھی اس امکان کو ختم نہیں کیا جاسکتا کہ اکبر خان نے نور جہاں سے سب پوچھ لیا ہو..... پوچھنے کے طریقے ہزار ہیں..... نور جہاں جیسی عورت میں اتنی قوتِ برداشت کہاں کہ سچ نہ بتائے۔ غصے میں اکبر خان کے ساتھ آنے والے میرا دماغ درست کرنے آئے تھے یا زیادہ سے زیادہ مجھے اٹھا کرلے جانے کے لیے تاکہ سچ مجھ سے بھی اگلوالیں۔

اگر بیوی کی غداری اور بے وفائی کا راز اکبر خان پر فاش ہوگیا تو فاروقی کو بھی پتا چل ہی گیا ہوگا کہ ایک عورت کی وجہ سے بھانڈا پھوٹ گیا۔ اکثر مرد اسی لیے کسی بڑے پلان میں جہاں رازداری شرطِ اول ہو کسی عورت کی شمولیت کو قبول ہی نہیں کرتے۔ فاروقی کو سخت مایوسی ہوئی ہوگی۔ ہمارا بدلا ہوا رویہ خود بخود اس کی سمجھ میں آجائے گا..... پھر بھی وہ کوشش کرے گا کہ بے قصور اور مخلص بنا رہے۔ اگر ہم بات کریں تو اسی زور شور سے اپنی صفائی پیش کرے جیسے کورٹ میں کسی قاتل کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے دلائل دیتا ہے۔

اپنی بیوی کی جرأتِ انکار نے بھی اسے پریشان کیا ہوگا۔ جو عورت کل تک اس کے کہنے پر سب کچھ کرنے کے لیے تیار تھی۔ وہ اچانک باغی کیسے ہوگئی..... اتنی بہادر کیسے ہو گئی..... فاروقی کے دل میں یہ خیال بھی ہوگا کہ کہیں اس

کے اور بیوی کے درمیان ہونے والی گفتگو میرے کانوں تک تو نہیں پہنچ گئی...... گزشتہ رات یہ گفتگو میں نے اتفاق سے سن لی تھی...... فاروقی بیوی کو مجبور کر رہا تھا کہ وہ فوراً مجھے زہر دے اور اس نے صاف انکار کر دیا تھا...... وہ شوہر کی اس دھمکی سے بھی ڈری نہیں کہ اسے مریم کو زہر دے کر مارنے کے جرم میں پھانسی ہو سکتی ہے۔

اب بہر حال وقت آ گیا تھا کہ میں فاروقی کے ساتھ دوستی کے رشتے کا بھرم بھی ختم کر دوں۔ اسے بتا دوں کہ اب وہ لکیر کے اس طرف ہے...... جہاں میرے دشمن کھڑے ہیں۔ نہ یہ جھوٹ ہے نہ الزام...... صفائی پیش کرنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں...... تاریکی میں وہ خود ہے...... اس کے جرائم کو ہم کب سے روشنی میں دیکھ رہے ہیں۔

واپسی کا سفر خاموش اذیت میں گزرا...... ہمارے ساتھ نہ گل واپس آئی تھی نہ فاروقی تھا...... پولیس اسکورٹ بھی جا چکا تھا...... ہماری دو گاڑیاں آگے پیچھے چلتی ہوئی ست بدھائی تک آئیں...... غنی کے ساتھ سیکیورٹی گارڈ ایک گاڑی میں آگے رہے۔ پیچھے والی گاڑی میں راجا کے اور میرے ساتھ شہناز درمیان میں بیٹھی تھی...... گاڑی کو ایک ڈرائیور چلا رہا اور اس کے ساتھ بھی ایک مسلح محافظ تمام وقت چوکس بیٹھا رہا۔

شہناز کی آنکھیں بار بار آنسو بہانے لگتی تھیں۔ ایک بار اس نے کہا۔ ”گل کے ساتھ کوئی نہیں......“ اور پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

راجا نے کہا...... ”ایک ڈاکٹر ہو کے تم......“

وہ چلانے لگی...... ”کیا ڈاکٹر انسان نہیں ہوتے؟ چیرنے پھاڑنے والے قصاب ہوتے ہیں؟...... ان کے رشتے نہیں ہوتے...... جذبات نہیں ہوتے؟ ان کا اپنا کوئی مر جائے تو وہ روتے نہیں؟“

میں نے اسے بڑی مشکل سے خاموش کیا۔ ”مجھے معلوم ہے شہناز تمہاری اس لڑکی سے اتنے کم وقت میں کتنی وابستگی ہو گئی تھی۔“

”رفیق بھائی...... اس نے مجھے رانا کی قید سے رہائی دلوائی...... اپنی جان پر کھیل کے...... ورنہ کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا...... نہ تم نہ راجا...... نہ کوئی اور......“

میں نے کہا...... ”بالکل ٹھیک کہتی ہو تم......“

”لیکن میں اس کے لیے کچھ نہیں کر سکی۔“ وہ رو رہی۔

ست بدھائی کے قریب پہنچ کے میں نے کہا ”شہناز...... مجھے معلوم ہے تم کو کتنا صدمہ ہے۔“

”کیا تمہیں نہیں ہے؟“ وہ بولی۔

”تم جانتی ہو شہناز...... ہم سب...... خصوصاً میں خود کو اس کی موت کا ذمے دار سمجھتا ہوں...... لیکن ...... کے سوا چارہ ہی کیا ہے...... ایسا کون چاہتا تھا ہوا...... ہمارے دکھ کا درد ایک سی شدت رکھتا ہے...... فرق صرف یہ ہے کہ تم رو سکتی ہو...... میں رو بھی نہیں سکتا......“ میں نے کہا...... ”لیکن میری ایک مشکل اور بھی ہے۔“

راجا نے سپاٹ لہجے میں میرے دل کی بات کہہ دی...... ”شہناز...... جتنا رونا ہے ابھی رو لو...... یا بعد میں رونا...... ابھی کسی کے سامنے کوئی بات نہیں ہو گی۔ اگر کوئی پوچھے دکھی نظر آنے کا سبب...... تو تمہیں کہنا ہے کہ گل چلی گئی اس لیے۔“

میں نے کہا...... ”شہناز...... تمہارا ہزار احسان ہوگا مجھ پر...... میرے والدین اب مزید صدمات برداشت کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے۔“

”میں سمجھتی ہوں رفیق......“ اس نے آہستہ سے کہا۔

میں نے کہا...... ”اگر دوسروں کو بتانا ہو تو ایسے بتانا کہ...... انہیں پتا نہ چلے...... میں کہہ دوں گا رابعہ سے...... لیلیٰ بھابی سے اور ریشم سے بھی...... کہ خیال رکھیں۔“

جب ہماری گاڑیاں ست بدھائی کی حویلی میں داخل ہوئیں تو رات ہو چکی تھی...... شہناز سیدھی اپنے کمرے میں چلی گئی...... میں نے اور راجا نے اباجی کی خدمت میں حاضری دی...... وہ کچھ گم صم تھے...... اماں جائے نماز پر عشا کی نماز ادا کر رہی تھیں۔

اباجی نے ہماری اتری ہوئی صورتوں کو دیکھا کی...... ”خیر کی خبر لائے ہو نا برخوردار...... گل کہاں ہے؟“

سوال کے دوسرے حصے نے میری مشکل آسان کر دی...... پہلے کے جواب میں اقرار یا انکار۔ دونوں مشکل ہوتے...... ”وہ تو چلی گئی۔“

”چلی گئی...... کہاں......“

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”وہیں...... جہاں سے آئی تھی۔“

انہوں نے کہا...... ”لندن...... اتنی جلدی......؟ میرا مطلب ہے یہاں سے کہہ کے تو نہیں گئی تھی۔“

میں نے کہا...... ”ابھی گئی نہیں ہے...... سفارت خانے والوں کی تحویل میں ہے...... کل اس کی ماں آ رہی ہے...... اسے ساتھ لے جانے کے لیے۔“

اباجی نے سمجھنے کے انداز میں سر ہلایا۔ ”یہ ٹھیک ہے...... اس کا یہاں رہنا کسی صورت بھی مناسب نہیں تھا۔“

راجا نے کہا...... ”ان حالات میں...... وہ یہاں زندہ نہیں رہ سکتی تھی۔“

”بھئی زندگی اور موت کے معاملات کا ہم کیا فیصلہ کر سکتے ہیں...... لیکن باپ کا گھر ہوتے وہ یہاں رہے یہ ٹھیک نہیں تھا...... ہم سے کون سا رشتہ تھا اس کا......“

”رشتے جذبات سے ہوتے ہیں اباجی...... اور باپ کے لیے اس کے دل میں کیا جذبات تھے...... آپ جانتے ہیں......“ میں نے کہا۔

”وہ ٹھیک ہے بیٹا رفیق...... لیکن دنیا والوں کی زبان نہیں پکڑی جا سکتی دنیا کو کیا...... اس دنیا میں رانا جیسے لاکھوں کروڑوں ہیں...... ان کے گھر کی عورتیں...... اور ان کی بیٹیاں انہی کے ساتھ رہتی ہیں۔“

”آپ کا مطلب ہے گل نے جو کیا غلط کیا۔“

”پاگل ہو تم...... غلط صحیح کا فیصلہ ہم تم کریں تو کون مانتا ہے...... زبانِ خلق کی آواز سنی جاتی ہے......“

”اس نے آج اپنے باپ کے خلاف عدالت میں جو بیان دیا...... وہ بھی خلق نے سنا...... باپ کا سارا کچا چھٹا کھول دیا......“ میں نے برہمی سے کہا۔

”اس نے جو کیا بڑی بات ہے۔ اپنی ضمیر کی آواز کے مطابق کیا...... اور یہ جہاد ہر کوئی نہیں کر سکتا...... لیکن

میں بات کر رہا تھا دنیا کی...... کچھ لوگ یقیناً گل کے اس فعل کو قابلِ صد ملامت قرار دیں گے...... شاید یہ کہیں گے کہ تم نے اسے ورغلایا...... اور وہ تمہاری زبان بولنے لگی تھی۔

راجا نے کہا۔ ''سچ بولنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ابا جی......''

''اس میں کیا شک ہے...... حق گوئی پیغمبرانہ صفت ہے...... راہِ حق پر چلنے والوں کو دنیا میں بڑی سخت سزا بھی ملتی ہے...... خیر...... اللہ اسے اپنی حفظ وامان میں رکھے...... وہ جہاں رہے خوش رہے۔'' ابا جی اسے یاد کر کے اداس ہو گئے۔

میں نے کہا...... ''وہ اس دنیا میں کیسے رہتی ابا جی...... وہ دوسری دنیا سے آئی تھی۔''

''چلی گئی واپس اسی دنیا میں......'' راجا بولا۔

''اب غور کرو تو ہے وہ بھی ہماری دنیا...... لندن کیا ہے...... صرف آٹھ دس گھنٹے کی مسافت...... لیکن دیکھو معاشرتی رویے کتنے مختلف ہیں...... وہاں جھوٹ بولنا برا سمجھا جاتا ہے...... وہ جھوٹ نہیں بولتے...... ہم اسے گناہ کا درجہ دیتے ہیں لیکن ہر جگہ ہر وقت جھوٹ بولتے ہیں...... بلاوجہ اور بلا ضرورت جھوٹ بولتے ہیں...... جھوٹ ایک قوی عادت بن گئی ہے۔''

وہ کچھ دیر گل کی باتیں کرتے رہے...... میں اپنے خیالوں میں کھویا ہوا اندیشہ ہائے دور دراز میں مبتلا رہا۔ نہ جانے کب اور کیسے میرے خیالات میں نور جہاں در آئی...... گل کی طرح اس کے بھی دو روپ تھے...... ایک صبح بہار کی طرح روشن...... شگفتہ اور حسین...... دوسرا مسخ شدہ...... لہو آلود اور فریادی...... بہت دکھی ہو نا تم گل کے لیے...... تمہارے خیالوں میں میرا گزر کیوں نہیں...... اس نے سچ بولا اپنے لیے...... میں نے سچ بولا تمہارے لیے...... اس کی جان تم نے نہیں لی لیکن میری جان تم نے لی...... اس کے قتل کا کیس کرنے کی بہت فکر ہے تمہیں...... میرے قتل کا کیس کون کرے گا...... گل کی موت پر خوش ہونے والا کوئی نہیں...... میرے مرنے سے تمہاری فریال تو بہت خوش ہو گی......

راجا نے پیچھے سے میرے پیر کو ٹھوکر ماری...... ''ابا جی کہہ رہے ہیں کہ اس سال حج پر چلے جائیں۔''

میں نے چونک کے کہا۔ ''ہاں...... کیوں نہیں...... بہت اچھا اور نیک خیال ہے۔''

ابا جی نے کہا...... ''اس کے لیے ابھی سے کوشش ضروری ہو گی۔''

میں نے کہا...... ''آپ فکر نہ کریں...... سب بندوبست ہو جائے گا۔''

اماں نے نماز ختم کر لی تھی۔ تسبیح گھماتے ہوئے انہوں نے میری طرف دیکھا۔ ''سوچا تھا تمہیں اکیلا چھوڑ کے نہ جائیں۔''

میں نے کہا...... ''اماں...... اتنے لوگ ہیں یہاں۔''

''ہاں...... لوگ تو بہت ہیں...... لیکن کوئی ہوتا تمہارا خیال رکھنے والا۔''

میں نے پھر کہا...... ''سب خیال رکھتے ہیں میرا......''

راجا نے کہا...... ''اے گھامڑ...... اماں کی خواہش تھی کہ حج پر جانے سے پہلے تیرا گھر آباد ہو جائے۔''

میں نے سر کھجایا۔ ''گھر آباد ہوتا ہے گھر والوں سے...... ماشاءاللہ بڑی رونق ہے یہاں......''

ابا نے متانت سے کہا...... ''تمہیں ہماری خوشی منظور نہیں تو نہ سہی۔ جب دل چاہے کر لینا شادی...... تمہارے لیے ہم یہ دینی فریضہ کب تک پورا نہ کریں...... خدا کو کیا جواب دیں گے کہ جب فراغت بھی تھی اور استطاعت بھی تو پھر ادائے فرض میں کوتاہی کیوں ہوئی۔''

میں نے کہا...... ''میری شادی کوئی مسئلہ نہیں...... آپ حج کر آئیں...... اس کے بعد ہو جائے گی۔''

ابا جی نے ہنس کے کہا۔ ''وہ کیا کہا ہے شاعر نے...... ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا...... تمہیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ فریال کہاں ہے...... اور تمہیں اس کی کوئی خاص فکر بھی نہیں ہے۔''

میں نے کہا...... ''ایسا نہیں ہے ابا جی...... جیسے ہی وہ لندن پہنچے گی...... معلوم ہو جائے گا......''

''پھر کیا ہوگا......'' ابا نے کہا۔

''میں جا کے اسے لے آؤں گا......'' میں نے چڑ کے کہا۔

''وہ ایسے آنے والی ہوتی رفیق میاں تو جاتی ہی کیوں...... تم نے بہت زیادتی کی اس کے ساتھ...... کتنا ساتھ دیا اس نے تمہارا...... کتنی سختی جھیلی لیکن تم نے قدر نہیں کی اس کی......''

میں نے خفگی سے کہا...... ''آج اتنی حمایت کر رہی ہیں آپ اس کی...... آپ ہی اس کی مخالفت کرتے تھے۔''

''میاں...... جب تک اسے جانا نہیں تھا...... ہمارا خیال کچھ اور تھا...... جب وہ یہاں آکے رہی تو ہم نے اس کے گن دیکھے...... کیا سلیقہ شعار اور خدمت گزار لڑکی تھی...... سب کچھ اسی نے سنبھال رکھا تھا...... ایک کھنڈر تھی یہ حویلی...... اپنی محنت اور ذہانت سے اس نے کیا نقشہ بدلا...... آج یہ محل لگتی ہے۔''

اماں نے ایک ٹھنڈی سانس لی...... ''بڑا سلیقہ تھا اس میں۔''

میں اٹھ کھڑا ہوا...... ''اس کے بارے میں یوں بات نہ کریں...... جیسے وہ اس دنیا ہی سے چلی گئی ہے...... اب لوٹ کے بھی نہیں آئے گی...... میں کہہ رہا ہوں کہ اسے لے آؤں گا...... آپ کو اعتبار کیوں نہیں ہے مجھ پر......''

''خدا کرے ایسا ہی ہو......'' ابا جی چپ ہو گئے۔

میں نے کہا...... ''ابھی میں بہت تھکا ہوا ہوں...... سونا چاہتا ہوں۔''

گل کی اندوہناک موت پر آنسو بہا کے خواتین اب ایک ماتمی حلقہ بنائے بیٹھی تھیں اور اسی کی باتیں کر رہی تھیں۔ چشم دید گواہ صرف ڈاکٹر شہناز تھی...... رابعہ...... لیلیٰ بھابی اور ریشم اس سے کرید کرید کے ہر بات پوچھ رہی تھیں۔ عدالت میں کیا ہوا...... رانا کیوں نہیں آیا تھا...... اس کے بعد عدالت سے نکلنے...... گل کے گولی کا نشانہ بننے سے پوسٹ مارٹم تک ہر واقع کی تفصیل پر ان کے آنسو بہنے لگتے تھے۔ گل کے ساتھ ان کے تعلق کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا لیکن ایک تو اس لڑکی نے اپنے کردار سے...... سب کو متاثر کیا تھا...... پھر اس کی ٹریجڈی بہت غیر متوقع تھی...... خود مجھ پر اس کا بہت زیادہ اثر تھا...... خواتین تو ہوتی ہی رقیق القلب ہیں۔

کھانے کی محض رسم پوری کی گئی...... ان حالات میں بھوک کسے لگتی...... میں بھی سونے کی اجازت لے کر اٹھ گیا...... راجا مجھ سے پہلے ہی چلا گیا تھا لیکن جاگ رہا تھا۔

میں نے کہا...... ''کیا سوچ رہا ہے؟''

اس نے میری طرف کروٹ لی...... ''کہ رانا اب کیا کرے گا؟''

''کچھ نہیں...... اگر تو سمجھ رہا ہے کہ گرفتاری کے ڈر سے وہ روپوشی اختیار کرے گا تو غلط ہے......''

راجا نے کہا...... ''وہ اسمبلی کا ممبر ہے...... آسانی سے ضمانت پر رہائی حاصل کر سکتا ہے۔''

''اس کی پوری کوشش ہوگی کہ کیس دب جائے۔''

''ویسے تو ہر کیس دبا دیا جاتا ہے...... اس میں اگر برطانوی حکومت ملوث نہ ہوتی تو یہ بھی دب جائے گا...... پولیس ابھی سے رانا کو شک کا پورا فائدہ پہنچانے کی کوشش کر رہی ہے...... تفتیش اگر ہوگی تو کیس کو کمزور کرنے کے لیے......''

میں نے کہا...... ''گل کا وکیل شہزاد بڑا جوشیلا ہے۔''

''سب وقتی بات ہے...... جب ہر طرف سے دباؤ پڑے گا...... پولیس دلچسپی نہیں لے گی...... عدالت میں حاضر کوئی نہیں ہوگا...... نہ چالان پیش ہوگا...... یا ہوا بھی تو نامکمل ہوگا...... اور پھر شہادتیں بھی ختم کر دی جائیں گی...... گواہ سامنے نہیں آئیں گے یا منحرف ہو جائیں گے۔''

''اور منحرف نہ ہوئے تو مار دیے جائیں گے۔''

میں نے کہا...... ''گواہوں کے پیش ہونے کی نوبت ہی نہیں آئے گی...... گواہ ملے گا کہاں...... آخری بات یہ کہ رانا کی طرف سے دو پیچ دیے جائیں گے اسے...... بولا کیا منظور ہے؟...... تمہاری ہڈیاں توڑ کے تمہیں دریائے جہلم میں پھینک دیا جائے...... یا ایک سوٹ کیس چاہیے نوٹوں سے بھرا ہوا...... اگر ایسی پیشکش کی جائے؟...... تو...... زبان کیسے بند نہ ہوگی مسٹر شہزاد کی۔''

راجا نے مجھ سے اتفاق کیا...... ''اس کا جوش اور جذبہ وقتی ہے...... عقلمند ہوگا تو رانا صاحب سے منافع بخش ڈیل کرے گا...... گل کیا دے گئی...... دفن ہونے کے لیے سات سمندر پار چلی گئی۔''

''اور ہم...... ہم بھی محض خاموش تماشائی بنے دیکھتے رہیں گے؟''

میں نے کہا...... ''اس کیس میں سب سے اہم کردار ہے برطانوی وزارت خارجہ کا...... وہ اپنے ایک شہری کی موت کو کس طرح لیتے ہیں۔''

''اسمبلی کے ایک رکن کے لیے حکومت کچھ نہیں کرے گی۔''

''کوشش یقیناً ہوگی...... لیکن میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ رانا کی اتنی آسانی سے گلوخلاصی نہ ہو...... میں براہ راست سامنے آکے کچھ نہیں کرد۔ میں کان کو پیچھے سے پکڑوں گا...... میری دلی خواہش ہے کہ رانا کو ایک بار بیٹی کے قاتل کی حیثیت ہتھکڑی ضرور لگے۔''

''اس ملک میں ایسا نہیں ہوتا۔''

''کب تک نہیں ہوگا یار...... کیس بہت مضبوط ہے...... بیان ریکارڈ کرانے میں گل ماری گئی...... وہ خدشہ درست ثابت ہوا جس کا اس نے اظہار کیا تھا۔ اس کے بیان کو اب کون چیلنج کرسکتا ہے۔ شہناز کے اغوا کا معاملہ الگ ہے...... ہم یہاں دباؤ بڑھائیں گے دوسری طرف میں عائشہ کے باپ سے مدد لوں گا۔ گل کے قتل کا معاملہ پارلیمنٹ میں اٹھانے کے لیے...... خارجہ تعلقات کی کمیٹی میں لے جانے یا دولت مشترکہ کے معاملات کی کونسل میں لے جانے کے لیے ......''

''وہ تیری مدد کرے گا......''

''اس میں میری مدد کا پہلو ہرگز ذاتی نہیں ہے...... یہ سو فیصد قانونی مسئلہ ہے...... اس کو سردخانے میں نہ جانے دیا جائے...... یہ برٹش پریس، پبلک پارلیمنٹ کے سامنے آجائے پھر دیکھنا...... میں لارڈ ارنسٹ سے خود بات کروں گا پھر یہ اس کی اخلاقی قانونی اور معاشرتی ذمے داری ہوجائے گی...... دباؤ بڑھانے کے لیے میں اپنے کچھ دوستوں کا سہارا لوں گا۔''

راجا کی دلچسپی بڑھ گئی...... ''وہ کیا کریں گے؟''

''میں نے لارڈ ارنسٹ کی فرم میں دو سال بڑی اچھی پوزیشن میں کام کیا تھا...... میرے تعلقات سول سوسائٹی کے با اثر لوگوں سے تھے...... عائشہ اسی فرم میں پبلک ریلیشن کا شعبہ سنبھالتی تھی...... وہ چاہے تو گل کی موت کو ایک پبلک ایشو بنا سکتی ہے...... اس میں ہیومن ٹریجڈی کا پہلو تو اپنی جگہ ہے...... یہاں کے اس ماحول کا مسئلہ الگ ہے جس میں عورت پر ایک غیر انسانی ظلم ہوتا ہے۔ یہ معاملہ شہناز جیسی ڈاکٹر کے اغوا سے شروع ہوکے گل کے مرڈر پر ختم ہوتا ہے...... یہ پوری فلمی کہانی ہے......''

''یو آر رائٹ...... اسے ایکسپلائٹ کیا جاسکتا ہے۔''

''پہلے اخباروں میں چند آرٹیکل شائع ہوں...... پورا ایک گراؤنڈ ہے کہ گل کا قتل کیوں اور کیسے ہوا...... آگے یہ کہ فیوڈل باپ کس طرح پولیس اور عدالت کے نظام انصاف پر اثر انداز ہونے کی کوشش کررہا ہے...... وہاں کچھ پاکستانی این جی اوز بھی ہیں...... ان سے گل کے حق میں مظاہرہ کرایا جاسکتا ہے...... پاکستان سفارت خانے سامنے...... یا پارلیمنٹ کے سامنے۔''

''اتنا ہی ہوجائے تو سارے برطانیہ میں طوفان کھڑا ہوجائے گا مگر صبح اس کی ماں آرہی ہے۔''

''پھر کیا ہوا...... وہ صرف لاش لینے آرہی ہے۔''

''تو بھول رہا ہے فیکے چتر...... وہ رانا کی بیوی ہے...... اگر رانا نے اس پر دباؤ ڈال کے اپنی بات منوالی تو......''

''تو کیا...... وہ میرا کیا بگاڑ سکتی ہے۔''

راجا نے کہا...... ''یہ ہوسکتا ہے کہ وہ رانا کے کہنے پر گل کی میت کو لندن نہ لے جائے...... اس کی تدفین یہاں کردی جائے۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا...... کیس اور خراب ہوجائے گا کہ پاکستان جانے والی لڑکی کو باپ نے مار کے گاڑ دیا...... لندن سے لاش لینے کے لیے جانے والی ماں بھی کچھ نہیں کرسکی...... باپ سیاستدان اور فیوڈل لارڈ ہے...... گل کوئی بچی نہیں تھی کہ ماں باپ اس کے وارث سمجھے جائیں۔ وہ عاقل وبالغ تھی...... پھر اس پورے کیس میں بنیادی کردار میرا ہے۔ قانون کے عمل میں میری گواہی سب سے اہم ہوگی...... یا پھر شہناز کی...... قانون اپنا راستہ خود بنائے گا...... میں پیچھے رہ کے اس بات کو یقینی بناؤں گا کہ اس عمل میں رکاوٹ نہ آئے اور یہ تیزی سے مکمل ہو......''

''شاید گل کا برٹش نیشنل ہونا ہی رانا کے گلے پڑ جائے۔ یہاں تو مجھے کوئی امید نظر نہیں آتی کہ رانا کو سزا ملے۔''

میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے گھڑی دیکھی تو رات کے بارہ بجے تھے۔ کال لندن سے آئی تھی جہاں شام کے سات بج رہے تھے، میں نے نمبر دیکھ لیا تھا۔

''ہیلو......''

حسب توقع یہ ڈاکٹر شائستہ تھی...... ''میں فریال کے فون کا انتظار کررہی ہوں......'' اس نے خفگی سے کہا۔

''مجھ سے تو وہ ناراض ہے۔''

''تم سے کون ناراض نہیں ہے...... برا مت ماننا مسٹر رفیق...... تم ایک خودغرض انسان ہو جسے ہمیشہ اپنی خوشی سے سروکار رہتا ہے۔''

''یہ تمہاری رائے ہے......'' میں نے رکھائی سے جواب دیا۔

''یہ عائشہ کی رائے ہے......'' وہ چیخ کے بولی۔

''تم نے فون کیا تھا اسے......'' میں نے کہا۔

''ہاں...... اس نے مجھ سے پوچھا کہ آخر معاملہ کیا ہے۔''

میں نے کہا۔'' جواب میں تم نے اسے سب بتادیا...... نمک مرچ لگا کے۔''

''مجھے کوئی ضرورت نہیں تھی نمک مرچ لگانے کی...... وہ تم پہلے ہی بہت لگا چکے تھے...... میں نے اسے وہی بتادیا جو سچ تھا۔''

میں نے جل کے کہا...... ''بڑی سچائی کی پیروکار ہو تم......''

''اس کے بغیر میں کیا بات کرتی...... عائشہ خود کیا کرسکتی تھی...... پاکستان ایمبیسی میں جو شخص کام آسکتا تھا...... وہ اس کی ماں کا شناسا تھا اور اس کی ماں تمہاری جانی دشمن ہے۔''

''کیا اس نے انکار کردیا؟''

''اس کی نوبت ہی نہیں آئی...... عائشہ نے کہا کہ اس کی ماں کو رفیق کے لیے ایک انگلی ہلانی پڑے اگر...... اس کی جان بچانے کے لیے ضروری ہو...... تو وہ انگلی کو پکڑے گی کہ غلطی سے نہ ہل جائے۔''

''مطلب یہ کہ بات نہیں بنی...... عائشہ نے ماں سے کچھ نہیں کہا۔''

''تم مجھے بات کرنے دو...... عائشہ نے کہا کہ میں خود اس شخص کو فون کردوں گی...... مجھے یقین ہے کہ وہ انکار نہیں کرے گا...... فریال کو اپلائی کرتے ہی ویزا مل جائے گا...... لیکن عائشہ بہت افسوس کررہی تھی کہ تم نے فریال کے ساتھ ایسا کیوں کیا۔''

''میں نے کچھ نہیں کیا...... عائشہ......''

''ہونہہ...... مجھے اور عائشہ کو چھوڑو...... وہاں ہے کوئی ایسا جو تمہاری بات سن کے قائل ہوجائے......؟ تم دیکھو جو عورت دنیا میں خوار ہو کے گئی تھی تمہارے ساتھ زندگی گزارنے...... وہ کیسی دل شکستہ اور مایوس لوٹ کے آنے پر مجبور ہوگئی...... یہ سب بلاوجہ ہوا......''

''شائستہ...... مجھے تمہاری مدد چاہیے۔''

وہ بگڑ کے بولی...... ''میں فریال کی مدد کررہی ہوں...... تمہاری نہیں...... تم ہرگز اس قابل نہیں ہو کہ تمہاری مدد کی جائے...... تم ناشکرے اور بے وفا ہو......''

''یہ بھی عائشہ کہتی ہے، میں نے تلخی سے کہا۔

''ہاں...... چاہو تو پوچھ لو...... تصدیق کرلو...... یہی تھے اس کے الفاظ یا نہیں...... رہی میری بات تو میں فریال سے کہوں گی کہ تم پر لعنت بھیج دے۔ ایسے مر مر کے جینے سے بہتر ہے ایک بار ہی مر جائے...... لیکن تمہیں مار کے۔''

مجھے ہنسی آگئی...... ''مائی ڈیئر ڈاکٹر شائستہ...... تم بہت غصے میں ہو اس لیے میں تمہاری کسی بات کا برا نہیں مانوں گا...... اور نہ جواب دوں گا...... ہاں مگر ایک شعر ضرور سناؤں گا کہ مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے......''

شعر مکمل ہونے سے قبل ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ اس نے لائن کاٹ دی ہے۔ شائستہ کے ساتھ میری کبھی نہیں بنی تھی۔ اس کے باوجود کہ وہ فریال کی واحد راز دار تھی اور اس کی مددشامل حال نہ ہوتی تو فریال کے لیے سلطان جیسے پہریدار کی آنکھوں میں دھول جھونک کے مجھ سے ملاقات کے لیے نکلنا ہی محال ہوتا۔ وہ میرے ساتھ بڑی بے رخی بلکہ کسی حد تک بد اخلاقی سے پیش آتی تھی۔ فریال کے ساتھ اس کی گہری دوستی میرے لیے بالکل ناقابل فہم تھی...... دونوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ فریال کے سامنے ہی اسے ڈاکٹر غیر شائستہ کہا کرتا تھا اور پھر ایک دن اس کے سامنے بھی کہہ دیا تھا اس کے بعد ہمارے تعلقات مزید خراب ہوگئے تھے۔

شائستہ کے فون نے میری تشویش میں اضافہ ہی کیا تھا۔ مجھے تو یقین تھا کہ وہ اسلام آباد گئی ہے اور وہاں برطانوی سفارت خانے میں ویزا کے لیے اپلائی کرے گی۔ اس نے راستے میں گجرات کے ریلوے اسٹیشن سے لندن بھی اپنی سہیلی کو فون کیا اور زاروقطار روتے ہوئے کہا کہ رفیق نے مجھے دھوکا دیا، وہ ایک شادی شدہ عورت نورجہاں کے چکر میں پڑ گیا ہے اور مجھ سے شادی نہیں کررہا ہے۔ غالباً اس نے غصے میں کہا ہوگا کہ اس سے بہتر تھا میں سلطان سے شادی کرلیتی...... ڈاکٹر شائستہ نے یہی بات مجھ تک ایسے پہنچائی کہ وہ سلطان سے شادی کرنے گجرات گئی ہے...... اس نے مجھے فون نمبر بھی دے دیا جو ظاہر ہے گجرات کا ہی تھا...... مجھ پر اس اطلاع سے کوئی بجلی نہیں گری...... میں نے خودکشی کا سوچا نہ رقیب روسیاہ کو قتل کرنے کا...... میں نے حقیقت معلوم کرلی۔

میری حاصل کردہ معلومات کے مطابق فریال کو اسلام

آباد میں ہونا چاہیے تھا۔ وہاں فریال کا کوئی صورت آشنا تک نہ تھا۔ جس کے پاس وہ چند دن قیام کر سکتی...... ہوٹل بہت تھے اکیلی عورت کے لیے کسی ہوٹل میں ٹھہرنے پر پابندی تو نہیں مگر ہر عورت میں اتنی ہمت نہیں ہوتی۔

راجا مجھے فکر مند دیکھ کے بولا۔ ''فریال کا مسئلہ ہے۔''

میں نے کہا...... ''ہاں راجا...... معلوم نہیں وہ کہاں ہوگی؟''

''پریشان مت ہو...... فریال کوئی پنڈ دی کڑی نہیں ہے۔ چار سال رہی ہے لندن میں۔''

''اس نے ابھی تک ریزے کے لیے بھی اپلائی نہیں کیا۔''

''اس میں وقت لگتا ہے۔ میں کل معلوم کرلوں گا۔''

میں نے کہا...... ''وہ اسلام آباد میں کسی کو نہیں جانتی...... ہوٹل بہت ہیں لیکن ایسے ہوٹل بہت مہنگے ہیں۔ معلوم نہیں اس کے پاس کتنے پیسے ہیں۔''

''گیسٹ ہاؤس اتنے مہنگے نہیں ہوتے جو لوگ ویزے کے چکر میں اسلام آباد آتے ہیں انہیں۔ سفارت خانوں کے چکر لگانے پڑتے ہیں۔ ان کی سہولت اور اپنے فائدے کے پیش نظر بہت سے لوگوں نے ذاتی کوٹھیوں اور گھروں کو گیسٹ ہاؤس میں تبدیل کر دیا ہے۔

''معلوم کرو کسی گیسٹ ہاؤس میں ہے یا نہیں۔''

راجا ہنسا...... ''گیسٹ ہاؤس ہر علاقے میں ہیں...... میں کہاں سے معلوم کروں۔ خوانخواہ پریشان نہ ہو بیکے پتر...... وہ کوئی بے وقوف لڑکی نہیں ہے۔ آدھی دنیا کا چکر لگا کے اس نے سلطان کو چکر میں ڈال دیا تھا۔ لندن سے کراچی براستہ جوہانسبرگ اور ٹوکیو آئی تھی...... بالکل اکیلی...... ڈائریکٹ لندن جانا اس کے لیے کیا مشکل ہے...... چل سو جا۔''

اگلا پورا دن خاموشی میں گزرا...... ہم سب اماں ابا کے سامنے نارمل نظر آنے کی ناکام کوشش میں مصروف رہے۔ ایک اعصابی کشیدگی نے سب کو اپنی گرفت میں لیے رکھا...... گل کا تصور تھا کہ ایک دل خراش یاد بن کے ٹھہر گیا تھا اور بات کہیں سے بھی شروع ہو گھوم پھر کر وہیں آجاتی تھی۔

ناشتے کے بعد میں نے خواتین کو دیکھا۔ رابعہ، شہناز اور لیلیٰ بھابی ایک کمرے میں بیٹھی گل کی باتیں کر رہی تھیں۔ ریشم آتے جاتے رک کر اس تعزیتی اجلاس میں شریک ہوتی تھی اور اپنے حصے کے دو آنسو بہا کے پھر کسی کام سے اٹھ جاتی تھی۔ موضوع سخن گل کی مظلومیت تھی۔

''ہائے بیچاری گل...... قضا لائی تھی اسے کھینچ کے۔'' رابعہ نے آہ بھری۔

''اور وہ کیا کہا ہے کسی نے...... مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے۔'' لیلیٰ بھابی نے کہا۔

رابعہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ''اکڑی پڑی ہوگی کولڈ اسٹوریج میں۔''

ریشم نے رک کر دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھے۔ ''باجی...... سب کو ساتھ لٹا دیتے ہوں گے مردہ خانے میں...... مرد عورت......''

شہناز نے کہا...... ''ارے بھئی مرنے کے بعد سب برابر ہوجاتے ہیں۔''

''لو جی برابر کیسے ہو جاتے ہیں......'' ریشم نے شرعی نکتہ اٹھایا۔ ''اپنا شوہر ہی نامحرم ہو جاتا ہے۔''

شہناز نے کہا۔ ''اسے تو ڈال دیا گیا ہوگا تابوت میں۔''

ریشم نے پھر رونا شروع کیا۔ ''کفن بھی نصیب نہیں ہوگا؟''

میں نے اسے ڈانٹا...... ''یہ کیا فضول باتوں میں پڑی ہوئی ہو تم سب...... کچھ کرنا ہے تو اس کے ایصال ثواب کے لیے تلاوت کرو۔''

لیلیٰ بھابی نے کہا۔ ''وہ ہم کر چکے...... تم تو ابھی سو کے اٹھے ہو...... ہم فجر کی نماز کے بعد بیٹھے تھے۔ قرآن پڑھ کے بخش دیا۔''

میں اپنا سامنہ لے کر باہر آگیا۔ راجا فون پر کسی سے بات کر رہا تھا اور بہت خفا تھا...... ''یار آخر تم کس مرض کی دوا ہو۔ ہاں مجھے سب معلوم ہے۔ اس نے تم سے کہا تھا...... تم نے اہمیت نہیں دی ورنہ سر پر کھڑے ہو کے کام کراتے...... یار آدمی کی آنکھ میں مروت ہونی چاہیے۔ ہم فیلڈ میں نہیں ہیں تو کیا...... صحافت سے رشتہ تو نہیں توڑا......''

جب اس نے غصے میں فون بند کیا تو میں نے پوچھا۔ ''کس کا فون تھا۔''

وہ گالیاں دینے لگا...... ''سالے سب حرامی ہیں...... آنکھوں میں سور کا بال ہے...... میں نے ذاتی طور پر درخواست کی تھی کہ خبر پوری لگے اور سٹی پیج پر ہو...... صرف ایک اخبار میں چھوٹی سی خبر لگی ہے۔ وہ بھی ڈسٹرکٹ پیج پر...... دوسرے نے بقیہ والے صفحے کے آخری کالم میں ڈال دیا۔''

میں نے کہا...... ''تفصیل ہے یا وہ بھی گول ہوگئی......''

اس نے مایوسی سے سر ہلایا...... ''صرف حوالہ ہے کہ لندن سے آنے والی طالبہ کا عدالت کے احاطے میں قتل...... ایک نے ڈرتے ڈرتے لکھا ہے کہ اس واردات میں مبینہ طور پر جہلم کے

ایک رکن صوبائی اسمبلی کا نام لیا جا رہا ہے دوسرے نے کہا ہے کہ قتل کی اس پراسرار واردات کے پیچھے سیاسی دشمنی کو ایک وجہ قرار دیا جا رہا ہے۔''

''مطلب یہ کہ تیری نہیں چلی...... رانا کا دباؤ کام کر گیا۔''

''ساری بات یہ ہے کہ میں بیٹھا ہوں ست بدھائی میں...... رپورٹنگ نہیں کر رہا ہوں...... کالم لکھ رہا ہوں...... صحافت بھی اب تجارت ہو چکی ہے نواب صاحب...... سب کاروباری مفادات کو دیکھتے ہیں...... اثر رسوخ چلتا ہے یا پیسہ......

میں نے کہا...... ''تو مجھے کہتا...... ہم بھی خرید لیتے اپنی مرضی کی خبر کے لیے جگہ۔''

راجا نے مایوسی سے کہا...... ''مجھے اپنے ساتھیوں سے امید نہیں تھی کہ سالے چار پیسوں کے لیے برسوں کا یارانہ بھول جائیں گے۔''

میں نے کہا...... ''جانے دے راجا...... یہ تو زمانے کا چلن بن گیا ہے...... گل کی ماں کے بارے میں کیا خبر ہے؟''

''وہ آج صبح کراچی پہنچ گئی...... شام تک لاہور آجائے گی۔''

میں نے کہا...... ''شہزاد نے کچھ بتایا......''

''کوئی خاص بات نہیں...... گل کے قتل سے صورت حال بدل گئی ہے...... عدالت میں اس کے بیان اور پھر قتل کی رپورٹ اعلیٰ حکام کو یقیناً ارسال کر دی گئی ہوگی لیکن پولیس کچھ بتا نہیں رہی ہے...... رانا فارغ نہیں بیٹھا ہوگا...... اس نے سیاسی رابطے کیے ہوں گے...... سرکاری مشینری اس کو بچانے کے لیے حرکت میں آچکی ہوگی...... تو ٹھیک کہتا ہے...... یہاں کچھ نہیں ہوگا......''

''مجھے اندازہ تھا۔''

''ایک اخبار کے مالک کا مجھے معلوم تھا۔ اسے اطلاعات ونشریات کے محکمے کا سیکشن افسر بھی فون کر دے تو اس کے ہاتھ روم کے چکر شروع ہو جاتے ہیں...... رات بھر نیند نہیں آتی کہ سرکاری اشتہارات بند ہوگئے تو خدانخواستہ گھر میں فاقوں کی نوبت آجائے گی۔ دوسرے سے میرا جھگڑا ہوا...... کہنے لگا کہ تم خود صحافی ہو...... مجھے بتاؤ کہ جہلم کی خبر میں لاہور کے سٹی پیج پر کیسے لگا دوں۔ میں نے کہا کہ صوبائی اسمبلی کہاں ہے۔ لاہور میں اور خبر میں واضح ہے صوبائی اسمبلی کے رکن کا......''

میں نے کہا...... ''سوال یہ ہے کہ رانا اب کیا کرے گا۔''

راجا نے اسے گالی دی...... ''جو چاہے کرے...... ابھی کچھ معلوم نہیں ہو سکتا...... پولیس عام لوگوں سے تمام معاملات سیف راز میں رکھتی ہے...... اس کا وہ نمک خوار ایس پی خود بتانے گیا ہوگا کہ معاملات کس رخ پر جا رہے ہیں اور کس طرف موڑے جا سکتے ہیں......''

میں نے کہا...... ''رانا نے قانونی مشیروں کو بھی بلایا ہوگا۔ ایک تو وہی تھا...... بیرسٹر سیف علی خان۔''

''وہ نطفۂ ناتحقیق...... ہمارا قانونی مشیر کہاں غائب ہے......''

میں نے کہا...... ''وہ جائے واردات سے محاورے کے مطابق غائب ہو گیا تھا...... جیسے گدھے کے سر سے سینگ......''

''حالانکہ اسے ہمارے ساتھ رہنا چاہیے تھا...... اور مشورے کے لیے یہاں موجود ہونا چاہیے تھا۔''

''اس سے کچھ بعید نہیں...... رانا کا مشیر بنا ہوا ہو...... براہ راست نہ سہی...... بالواسطہ اس کی مدد کر رہا ہو...... ہماری ہر بات بتا کے...... ہمیں بہت محتاط رہنا چاہیے اس کی طرف سے...... وہ ناقابل اعتماد...... بلکہ خطرناک ہو گیا ہے...... بہتر ہے اس سے صاف بات کر لی جائے۔''

راجا نے مجھ سے اتفاق کیا۔ ''وہ تو ابھی سے ساتھ چھوڑ گیا ہے حالانکہ ہم نے اسے کچھ نہیں کہا......''

''وہ کھٹک گیا ہے...... ہمارے رویے سے......''

''اگر اس سے کھل کے بات کی تو پتا نہیں وہ کیا کرے......'' راجا بولا۔

''کیا کرے گا...... شور مچانے کے سوا کہ یہ جھوٹ ہے...... ثبوت ہمارے پاس بھی کوئی نہیں...... بے شک جونور جہاں نے بتایا سب سچ ثابت ہوا ہے مریم مرگئی اور میں نے خود سنا...... فاروقی بیوی پر دباؤ ڈال رہا تھا کہ جلد از جلد میرا کام تمام کرے...... لیکن مسئلہ وہی ہے...... ثبوت کا...... اگر شوہر سامنے ہوگا تو بیوی میں اتنی ہمت کہاں ہوگی کہ اقرار کرلے...... مان لے کہ فاروقی اس سے کیا چاہتا تھا......''

''اس لیے تو کہتا ہوں...... ایسا رویہ اختیار کر لیا جائے کہ کچھ کہنے کی نوبت بھی نہ آئے...... اور وہ سامنے آنا بھی چھوڑ دے...... یہاں آنے میں اپنی بے عزتی محسوس کرے...... ڈھیٹ بھی کہاں تک بنے گا......'' راجا نے کہا۔

میں نے کہا۔ ''پہلے اپنے تمام ڈاکومنٹ اور فائلیں اس سے واپس لے لیں...... اس کے بعد جھگڑا کرنا کیا مشکل ہے......''

راجا نے کہا...... ''اس کی جگہ کون لے گا...... یہ سوچا ہے تو نے۔''

میں نے کہا...... ''وکیل بہت ہیں۔''

راجا نے کہا۔۔۔۔۔۔ ''دیکھ نیکیے پتر۔۔۔۔۔۔ ہمارے قانونی معاملات کے لیے اب ایک وکیل کافی نہیں۔۔۔۔۔۔ فوجداری اور دیوانی معاملات کے لیے الگ وکیل ہونے چاہئیں۔۔۔۔۔۔ نامور وکیل اپنی گڈول کے حساب سے فیس چارج کرتے ہیں۔۔۔۔۔۔ اور مقدمے کی نوعیت دیکھ کر بھی۔۔۔۔۔۔ سب سے بہتر ہے کہ ہم کسی اچھی لیگل فرم کو اپنے تمام قانونی معاملات کی ذمے داری سونپ دیں۔۔۔۔۔۔ کنٹریکٹ کی بنیاد پر۔''

میں نے کہا۔۔۔۔۔۔ ''یہ جو بیرسٹر شہزاد ہے۔''

''اس سے بھی بات کی جاسکتی ہے۔۔۔۔۔۔ ابھی تو اس کے بارے میں کچھ بھی پتا نہیں۔۔۔۔۔۔ نوجوان جذباتی اور جوشیلا ہے۔۔۔۔۔۔ مخلص بھی لگتا ہے۔''

اسی وقت میرے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔۔۔۔۔۔ میں کہا۔ ''بڑی عمر ہے اس کی بھی۔۔۔۔۔۔'' اور پھر شہزاد سے کہا۔۔۔۔۔۔ ''ہیلو۔''

اس نے کہا۔۔۔۔۔۔ ''نواب صاحب۔۔۔۔۔۔ گل کی ماں آگئی ہے۔''

''مجھے معلوم ہے۔۔۔۔۔۔ شام تک لاہور پہنچے گی۔۔۔۔۔۔ آپ اس سے ملیں گے؟''

میں نے کہا۔۔۔۔۔۔ ''اس کا شوہر ملنے دے گا مجھے؟ مجھے نہیں معلوم کہ گل کی ماں سے کیا بات ہوئی تھی۔۔۔۔۔۔ ہمارے متعلق اس نے ماں کو کیا بتایا تھا۔۔۔۔۔۔ لیکن رانا بھی اس سے روز بات کرتا ہوگا۔۔۔۔۔۔ اسے اپنے نقطۂ نظر سے بتاتا ہوگا کہ ہم کتنے خبیث اور شیطان ہیں۔۔۔۔۔۔ لندن میں بیٹھی ہوئی عورت کیا جانے جھوٹ سچ کو۔۔۔۔۔۔ بیٹی کی مانے یا شوہر کی سنے۔۔۔۔۔۔''

''میرا خیال ہے آپ آجائیں۔''

''کہاں۔۔۔۔۔۔ اسپتال۔۔۔۔۔۔ کوئی ہنگامہ نہ ہوجائے۔۔۔۔۔۔''

''نہیں ہوگا۔۔۔۔۔۔ رانا کے قانونی مشیر۔۔۔۔۔۔ سیف علی خان۔۔۔۔۔۔ نے مجھے فون کیا تھا۔۔۔۔۔۔ وہ چاہتا تھا کہ میں اس کیس میں زیادہ دلچسپی نہ لوں بلکہ اس سے خود کو الگ کرلوں۔''

''پھر تم نے کیا جواب دیا۔''

اس نے کہا کہ اس مس گل رانا کا وکیل ہوں۔۔۔۔۔۔ صرف وکالت نامے کی حد تک۔۔۔۔۔۔ آگے کا مجھے بھی پتا نہیں۔۔۔۔۔۔ اب کیس ہے ڈاکٹر شہناز کے اغوا کا۔۔۔۔۔۔ اس کی گواہی مس گل رانا کا جرم بنی۔۔۔۔۔۔ چشم دید گواہ ایسے ہی مارے جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔ اب قتل کے کیس میں مدعی کون ہوگا۔۔۔۔۔۔ مجھے نہیں معلوم۔۔۔۔۔۔ آپ کے قانونی معاملات غالباً فاروقی صاحب دیکھتے ہیں۔''

میں نے کہا۔۔۔۔۔۔ ''دیکھتے تھے۔۔۔۔۔۔ اب ہمارا خیال ہے کہ کسی اور کو اپائنٹ کریں۔''

''کیا آپ ان سے مطمئن نہیں ہیں؟''

''دراصل وہ کارپوریٹ لائیر ہیں۔۔۔۔۔۔ اب فوجداری مقدمات کے کسی ماہر کی ضرورت ہوگی۔۔۔۔۔۔ گل کے قتل کے کیس میں شہناز کے سوا مدعی کون ہوگا۔۔۔۔۔۔ اس کا باپ تو ہوگا نہیں۔''

شہزاد نے کہا۔۔۔۔۔۔ ''وہ تو معاملہ ختم کرنا چاہتا ہے۔۔۔۔۔۔''

''ہمارے کچھ دیوانی کیسس بھی ہیں۔۔۔۔۔۔ تم کسی اچھی لیگل فرم کا نام بتا سکتے ہو۔۔۔۔۔۔''

وہ بولا۔۔۔۔۔۔ ''نواب صاحب۔۔۔۔۔۔ یہاں بڑے بڑے نام ہیں۔۔۔۔۔۔ آئینی معاملات پر حکومت کی پیروی کرنے والے بھی ہیں۔۔۔۔۔۔ لاکھوں کروڑوں میں فیس لیتے ہیں۔۔۔۔۔۔ ایک فرم میری بھی ہے۔۔۔۔۔۔ یہ تو نہیں کہہ سکتا ہے کہ ٹاپ پر ہے۔۔۔۔۔۔ اتنی مشہور بھی نہیں لیکن پانچ سال میں ہم نے جو کیس لیے ہیں۔۔۔۔۔۔ ان میں ہماری کارکردگی کا جائزہ آپ لیں۔۔۔۔۔۔ اور پھر خود فیصلہ کریں۔۔۔۔۔۔ بات آپ کے لیے فیس کی نہیں۔۔۔۔۔۔ میرے لیے نام کی نہیں۔۔۔۔۔۔ میں صرف اتنا یقین دلا سکتا ہوں کہ ہم اپنے ہر کلائنٹ کے ساتھ مخلص رہتے ہیں۔۔۔۔۔۔ دوسرے میرا اصول بے اصولی نہیں۔''

میں نے کہا۔۔۔۔۔۔ ''یہ بڑی دلچسپ بات کہی آپ نے۔''

''میں وہ کیس نہیں لیتا جس میں خود مجھے اطمینان نہ ہو کہ صرف پیسے کے لیے میں سیاہ کو سفید ثابت نہیں کر رہا ہوں۔''

میں نے کہا۔۔۔۔۔۔ ''ایسی صورت میں یہ ہوسکتا ہے کہ ہمارے درمیان بھی رفاقت کا ایگریمنٹ ہوجائے۔۔۔۔۔۔ جو دونوں کے لیے فائدمند ہے۔۔۔۔۔۔ اگر میں ایک ذمے داری دوں تمہیں۔''

''کیا میں اسے آزمائش کہوں۔''

میں نے کہا۔۔۔۔۔۔ ''ہرگز نہیں۔۔۔۔۔۔ اسے دوستانہ تعاون سمجھو۔۔۔۔۔۔ معلوم کرو کہ گل کی میت برطانیہ بھیجنے کے کیا انتظامات کیے گئے ہیں۔۔۔۔۔۔ میرا مطلب ہے کب اور کس فلائٹ سے۔۔۔۔۔۔''

''وہ میں معلوم کر چکا ہوں۔۔۔۔۔۔ برطانوی سفارت خانے کی کوشش سے کل تابوت کو پہلے کراچی بھیجا جائے گا۔۔۔۔۔۔ وہاں سے براستہ امارات لندن۔۔۔۔۔۔ اس کی ماں ساتھ ہوگی۔۔۔۔۔۔ شاید باپ بھی ہوگا۔۔۔۔۔۔ ابھی اس کی سیٹ کنفرم نہیں ہے۔''

میں نے کہا۔۔۔۔۔۔ ''رانا کیسے جاسکتا ہے۔۔۔۔۔۔ عدالت کی اجازت کے بغیر۔۔۔۔۔۔ اغوا اور حبس بے جا کے کیس میں نامزد ملزم ہے۔''

''سیف علی خان کا مقصد یہی تھا۔۔۔۔۔۔ کہ میں قانونی اعتراض نہ اٹھاؤں۔۔۔۔۔۔ اصولاً تو اب تک اسے گرفتار ہوجانا چاہیے تھا۔۔۔۔۔۔ اس کے پرانا نمک خوار ایس پی نے مجھ سے

جھوٹ بولا کہ رانا صاحب نے ضمانت قبل از گرفتاری لے لی ہے۔۔۔۔۔۔ میں نے پوچھا کہ ضمانت کس نے دی اور کب تو وہ جواب دیے بغیر چلا گیا۔۔۔۔۔۔''

میں نے کہا۔۔۔۔۔۔ ''ضمانت قبل از گرفتاری آدھی رات کو بھی منظور کرلی جاتی ہے۔۔۔۔۔۔ یہ معاملہ ہے ایک رکن صوبائی اسمبلی کا۔ وہ ذاتی مچلکہ دے سکتا ہے۔۔۔۔۔۔ دوسرے رکن اسمبلی کو ضامن بنا سکتا ہے اور عدالت دس لاکھ کہے تو سامنے پھینک سکتا ہے۔۔۔۔۔۔''

''اسے روکنے کی ایک صورت ہے۔۔۔۔۔۔ آپ اس کے خلاف گل کے قتل کا پرچا کٹوا دیں۔۔۔۔۔۔ یہ اتنا آسان بہرحال نہیں ہوگا۔۔۔۔۔۔ ایک کام میں کرسکتا ہوں۔۔۔۔۔۔''

''وہ کیا۔۔۔۔۔۔'' میں نے کہا۔

''اگر آپ مجھے وکیل کرلیں۔۔۔۔۔۔ تو میں آپ کی طرف سے برطانوی سفارت خانے میں درخواست لگا سکتا ہوں کہ گل کے ساتھ جانے والا رانا رجب علی سنگین فوجداری معاملات میں ملوث ملزم ہے۔ اس کا ویزا منسوخ کیا جائے ورنہ کہا جائے گا کہ سفارت خانہ ایک ملزم کو فرار کرانے میں معاون ہے۔۔۔۔۔۔''

میں نے کہا۔۔۔۔۔۔ ''تم درخواست لگاؤ۔۔۔۔۔۔ میں آج ہی وکالت نامے پر سائن کرتا ہوں۔۔۔۔۔۔ شام کو۔۔۔۔۔۔''

''جب تک دستخط نہیں ہوں گے۔۔۔۔۔۔ میرے پاس اختیار نہیں ہوگا۔۔۔۔۔۔'' وہ بولا۔

میں نے سوچ کے کہا۔۔۔۔۔۔ ''میرے دستخط زیادہ مشکل نہیں ہیں۔''

''میں نے دیکھے ہیں۔۔۔۔۔۔ مس گل رانا کے بیان پر آپ نے بطور گواہ سائن کیے تھے۔۔۔۔۔۔'' وہ بولا۔

''اگر تم بنالو۔۔۔۔۔۔ تو مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔''

وہ بولا۔۔۔۔۔۔ ''یہ جعل سازی ہوگی۔۔۔۔۔۔ لیکن میں آپ کی اجازت سے کروں گا۔۔۔۔۔۔''

تیسرے پہر غنی ہمیں لاہور لے گیا۔ اس نے اپنے ساتھ ایک مسلح سیکیورٹی گارڈ کو رکھا۔۔۔۔۔۔ وہ خود بھی مسلح تھا اور بھرے ہوئے ریوالور ہمارے پاس بھی تھے۔۔۔۔۔۔ رہتاس کے قلعے کو کراس کر کے جیسے ہی کار جی ٹی روڈ دینہ کے موڑ پر پہنچی۔۔۔۔۔۔ میں نے لارڈ ارنسٹ کا نمبر ملایا۔

لندن میں صبح کے ساڑھے دس بجے تھے۔۔۔۔۔۔ لارڈ ارنسٹ آفس میں تھا۔۔۔۔۔۔ کال اس کی سیکریٹری نے وصول کی۔۔۔۔۔۔ نام سے وہ مجھے فوراً نہیں پہچان سکی۔۔۔۔۔۔ پھر پہچان گئی۔۔۔۔۔۔ آئی ایم سوری رفیق۔۔۔۔۔۔ رش آف ورک۔۔۔۔۔۔''

میں نے کہا ''اٹ از او کے۔۔۔۔۔۔ لارڈ مصروف تو نہیں ہے۔''

''تمہاری خوش قسمتی ہے کہ وہ ایک ہفتے باہر رہ کے آج ہی لوٹا ہے۔۔۔۔۔۔ ابھی کچھ دیر میں اس کی میٹنگ ہے وزارت خارجہ کے کسی عہدے دار سے۔''

''میں نے کہا۔۔۔۔۔۔ ''پھر تو میری فوراً اس نے بات کرادو۔''

لارڈ ارنسٹ نے عادت کے مطابق بڑی گرمجوشی کا مظاہرہ کیا۔ ''ہیلو رفیق۔۔۔۔۔۔ تمہیں میری یاد کیسے آگئی۔۔۔۔۔۔ ہاؤ آر یو۔۔۔۔۔۔''

''فائن۔'' میں نے کہا۔۔۔۔۔۔ ''ہر بار مجھے ہی کام پڑتا ہے تم سے۔۔۔۔۔۔''

وہ ہنسا۔ ''بلاتمہید شروع ہوجاؤ۔''

میں نے کہا۔۔۔۔۔۔ ''لارڈ۔۔۔۔۔۔ یہ ایک انتہائی افسوسناک معاملہ ہے۔۔۔۔۔۔ اور تمہارا براہ راست تو اس سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔۔۔۔۔۔ لیکن ہر انسانی مسئلہ بہرحال اتنا ہی تمہارا ہونا چاہیے جتنا میرا۔۔۔۔۔۔ میں مختصر بتاؤں گا۔۔۔۔۔۔ تم نوٹ کرتے جاؤ۔۔۔۔۔۔''

''بولو۔۔۔۔۔۔ میرے پاس پندرہ منٹ ہیں۔۔۔۔۔۔''

''میں کوشش کروں گا کہ چودہ منٹ میں بات ختم کردوں۔۔۔۔۔۔'' میں نے کہا اور اختصار کے ساتھ ہر ضروری تفصیل شامل کر کے گل کا پورا کیس اسے بتادیا۔

''مجھے یقیناً بہت دکھ ہوا۔۔۔۔۔۔'' وہ بولا۔۔۔۔۔۔ ''اب جلدی۔۔۔۔۔۔ بتادو مجھے کیا کرنا ہوگا۔۔۔۔۔۔ میں نے سب لکھ لیا ہے۔''

میں نے کہا۔۔۔۔۔۔ ''نمبر ون۔۔۔۔۔۔ اس لڑکی کے باپ کو برطانیہ آنے کی اجازت نہیں ملنی چاہیے۔۔۔۔۔۔ وہ ایک مجرم ہے۔۔۔۔۔۔ نمبر دو۔۔۔۔۔۔ گل کی ڈیڈ باڑی کو یہاں نہ روکا جائے۔۔۔۔۔۔ اس کی تدفین لندن میں ہو۔۔۔۔۔۔ نمبر تین۔۔۔۔۔۔ اس کے قتل کی تفتیش اسکاٹ لینڈ یارڈ کرے۔۔۔۔۔۔''

''کیوں۔۔۔۔۔۔ یہ پاکستان کی پولیس بھی کرسکتی ہے۔''

میں نے کہا۔۔۔۔۔۔ ''آف کورس۔۔۔۔۔۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ یہاں پولیس رپورٹ میں جانبداری برتی جائے گی۔۔۔۔۔۔ کیس کسی کو مورد الزام قرار دیے بغیر کلوز ہوجائے گا۔۔۔۔۔۔ غیر جانبداری سے تفتیش ہو تو قاتل یقیناً اس کا باپ ثابت ہوگا۔۔۔۔۔۔''

''لیکن قتل پاکستان میں ہوا ہے۔''

میں نے کہا۔۔۔۔۔۔ ''گل برٹش نیشنل تھی۔۔۔۔۔۔ اگر سفارت خانہ تفتیش پر عدم اطمینان ظاہر کرے تو مقامی پولیس کی مدد کے لیے اسکاٹ لینڈ یارڈ سے شعبۂ قتل کے ماہرین بلائے جاسکتے ہیں۔۔۔۔۔۔ وہ یہاں اپنی تفتیش مکمل کر کے رپورٹ دے سکتے ہیں۔''

اس نے کہا..... ''میں دیکھتا ہوں اس سلسلے میں کیا ہوسکتا ہے..... جس شخص پر اتنے سنگین الزامات ہوں اس کو ویزا جاری ہونے کا تو سوال ہی نہیں..... اگر ایسا ہو گیا ہے تو میں اسے لندن ایر پورٹ سے ہی واپس بھجوادوں گا..... دوسری پرابلم میں مجھے کچھ نہیں کرنا..... سفارت خانہ خود اس کی اجازت نہیں دے گا.....''

''یعنی اس کی ماں بھی راضی ہو جائے..... پھر بھی نہیں؟''

''وہ کوئی بچی نہیں تھی..... اس کے والدین کا کسی قانونی معاملے میں کوئی اختیار نہیں.....''

میں نے کہا..... ''تیسرا معاملہ اصل ہے.....''

''مجھے بات کرنی ہوگی وزارت داخلہ سے..... ہمارے سفارت خانے کی رپورٹ پر سب منحصر ہے..... اگر انہوں نے بھی کہا کہ..... کیا نام تھا اس کا..... گل..... گل کے قتل کی تفتیش پر اس کا باپ اثر انداز ہوگا..... کیا قتل کے شبے میں اس کا نام بھی مشکوک افراد میں شامل ہے.....؟''

''ان فیکٹ..... اس کے سوا کسی اور پر شک کی گنجائش ہی نہیں..... یہ بات گل نے اپنے آخری بیان میں مجسٹریٹ کو بتادی تھی.....''

''پھر اس کی حفاظت کا مناسب بندوبست کیوں نہیں کیا گیا۔''

''یہاں کی پولیس کے انتظامات ناقص تھے..... تسلی بخش نہیں تھے..... ورنہ قتل کیسے ممکن ہوتا..... گل کا باپ سیاست دان ہے اور کرپٹ پولیس پر ہر طرح سے اثر انداز ہوگا..... سیاسی طور پر بھی اور رشوت سے بھی..... وہ ثبوت اور گواہ غائب کردیں گے اور معاملہ کولڈ اسٹوریج میں چلا جائے گا بالآخر..... یہ نہیں ہونا چاہیے..... انکوائری مکمل اور غیر جانبدارانہ ہونی چاہیے.....''

''ایسا ہی ہوگا..... وہ بہرحال برٹش نیشنل تھی..... اس معاملے میں ہم بعد میں تفصیل سے ڈسکس کرسکتے ہیں.....''

میں نے کہا..... ''شیور..... عائشہ کیسی ہے..... اور اس کی ماں.....؟''

''ایوری باڈی از جسٹ فائن.....'' اس نے کہا..... ''بائی.....''

''اسے سمجھ بھی آگئی.....'' راجا بولا۔

''بات نہ اتنی پیچیدہ تھی نہ غلط..... سیدھا سادا مسئلہ تھا..... میں نے کوئی آؤٹ آف دی وے رعایت نہیں مانگی..... اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے لیے کچھ نہیں کہا..... گل سے میرا کوئی تعلق ہے نہ رانا سے.....'' میں نے کہا۔

میو اسپتال میں پہنچتے ہی شہزاد نظر آگیا..... وہ برآمدے میں بڑی بے چینی سے ٹہل رہا تھا..... ''اچھا ہوا آپ آگئے..... وہ بھی آگئی ہے.....''

''گل کی ماں؟.....'' میں نے ادھر ادھر دیکھا۔

''وہ آفس میں بیٹھی ہے..... اپنے شوہر کے ساتھ..... برطانوی سفارت خانے کا نمائندہ بھی وہیں موجود ہے.....'' شہزاد نے کہا..... ''وہ لوگ تمہارا انتظار کررہے ہیں۔''

میں نے باہر کھڑے ہوئے ان لوگوں کی طرف دیکھا جو رانا کے محافظ بن کر آئے تھے اور مجھے خون آشام نظروں سے گھور رہے تھے..... ''کیا گل کی ماں نے مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی ہے؟''

شہزاد نے آہستہ سے سر ہلایا ''..... ہاں..... اس نے کہا تھا کہ میں نواب رفیق احمد شیرازی سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔''

''تمہارا کیا مشورہ ہوگا..... مجھے ملنا چاہیے.....''

''کوئی حرج نہیں ہے.....'' شہزاد نے کہا..... ''آپ اظہار افسوس تو کر ہی سکتے ہیں۔''

میں نے راجا کی طرف دیکھا تو اس نے کہا..... ''ہم موجود ہیں باہر.....'' اور غنی نے اس کی تائید میں سر ہلایا۔

وہ میو اسپتال کے اے ایم ایس کا آفس تھا۔ اندر داخل ہوتے ہی میری نظر نے اس انگریز نظر آنے والی پاکستانی عورت کو دیکھا جس کی صورت کے نقوش میں گل کی جھلک بہت نمایاں تھی۔ اس کے بالوں کا رنگ ڈارک براؤن اصلی نہیں تھا..... شاید عمر کے ساتھ غالب آنے والی سفیدی کو اس نے ہیر کلر میں چھپادیا تھا..... اگرچہ وہ دس بارہ گھنٹے کا سفر کرکے لندن سے لاہور پہنچی تھی اور اپنی اکلوتی بیٹی کی موت کے صدمے سے بھی نڈھال تھی لیکن اس کے میک اپ کی شوخی برقرار تھی..... وہ جینز پر ہاف سلیوز کی زردونی شرٹ میں ملبوس تھی..... اس کی اپنی عمر چالیس پینتالیس سے کم نہ ہوگی تاہم رانا کے مقابلے میں وہ جوان ہی نظر آرہی تھی۔

اسسٹنٹ میڈیکل سپرنٹنڈنٹ ایک ہٹا کٹا درمیانی عمر کا ڈاکٹر تھا جو اپنی پھیلی ہوئی گھنی سیاہ داڑھی..... گھٹے ہوئے سر اور کھدر کی شلوار قمیص میں کسی مسجد کا پیش امام لگتا تھا..... میں اس کی وسیع میز کے دائیں طرف بیٹھ گیا۔ اب گل کی ماں میرے دائیں ہاتھ پر تھی..... رانا اس کے دائیں ہاتھ پر..... اس کی نظر مجھ پر جم کے رہ گئی تھی..... رانا کسی مصلحت کے تحت خاموش بیٹھا رہا۔

''تو تم ہو وہ نواب؟'' اس نے پرنفرت تلخ لہجے میں کہا۔

میں نے کہا۔ ''اور آپ گل کی والدہ ہیں..... آپ مجھ سے ملنا چاہتی تھیں۔''

اس نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں۔ ''میرے ذہن میں تمہاری تصویر بالکل مختلف تھی..... تم تو ابھی۔ جوان ہو.....''

میں نے کہا..... ''آپ کا خیال ہوگا کہ کوئی بوڑھا مغل بادشاہوں کے لباس میں بڑے کروفر سے آئے گا..... خیر..... یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں..... مجھے بہت افسوس ہے.....''

اس نے میری بات کاٹ دی..... ''ہاں..... اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہو تم..... جو مجھ سے ملتا ہے ایک رسم کے طور پر یہ جملہ بول دیتا ہے۔''

میں نے کہا..... ''مجھے واقعی سخت صدمہ ہے۔''

''نہیں نواب صاحب..... ابھی تو آپ نے شادی بھی نہیں کی ہوگی شاید..... کیا میرا اندازہ درست ہے.....''

''جی..... میری شادی واقعی نہیں ہوئی ہے۔''

''پھر تم کیا جانو اس صدمے کو..... جسے میں جھیل رہی ہوں..... جس کی جوان بیٹی کی لاش ساتھ والے کمرے میں پڑی ہے.....'' وہ ایک دم غصے میں ہسٹریائی ہوگئی..... ''تمہیں کیا معلوم دل پر کیا گزرتی ہے..... جب آپ ایک بچے کو پیدائش کے روز سے سنبھالتے ہیں..... بڑا کرتے ہیں..... یہ بڑا لمبا عرصہ ہوتا ہے نواب صاحب..... بہت صبر آزما..... بہت مشکل..... اور بائیس سال بعد وہ بچہ اچانک آپ کو لاش کی صورت میں دے دیا جائے..... ایک تابوت میں ڈال کر..... کہ جاؤ اسے زمین میں دبادو۔''

بات ختم ہوتے ہی وہ دھاڑیں مار کے رونے لگی تھی..... میرے لیے سر جھکا کر سننے کے سوا چارہ نہ تھا..... وہ ایک ماں تھی..... اس کے جذبات فطری تھے۔ میں واقعی غم کی اس شدت کو محسوس ہی نہیں کرسکتا تھا..... رانا نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر تھپکی دی۔ اے ایم ایس نے پانی کا گلاس آگے بڑھادیا۔

کچھ دیر بعد اس نے اپنے آنسو پونچھ لیے۔ ''لندن سے یہاں تک بھی آنسو بہاتی رہی..... حالانکہ اس کا فائدہ کوئی نہیں..... گل تو مرگئی..... میرے آنسو اسے زندہ نہیں کرسکتے..... اس کی موت کے ذمے دار تم ہو.....''

میں نے اچانک ہونے والے اس حملے سے خود کو سنبھالا۔ ''آپ کچھ بھی کہہ سکتی ہیں..... میں برا نہیں مانوں گا۔''

''کیوں؟..... کیا یہ غلط ہے۔''

میں نے کہا۔ ''گل کا قاتل کون ہے..... ایک تو وہ تھا جس نے گولی چلائی..... اور پھر خود بھی مارا گیا..... مگر.....''

''دوسرے تم ہو.....'' وہ چلائی..... ''تم نے اسے ورغلایا..... اس کے دل میں بدگمانی پیدا کی..... اسے باپ سے بدظن کیا..... وہ یہاں صرف اپنی تعلیم مکمل کرنے آئی تھی..... تم سے کیا تعلق تھا اس کا؟..... کس رشتے سے تم نے اسے اپنے ساتھ رکھا..... وہ تو کچھ بھی نہیں جانتی تھی.....''

''آپ میری بات پوری سن لیں۔''

''کیا سنوں میں تمہاری بات..... تمہاری فطرت میں شرانگیزی ہے..... تم نے اسے اغوا کیا.....''

''یہ غلط ہے.....'' میں نے احتجاج کیا۔

''تم نے اسے اغوا کرایا..... اپنے گھر میں رکھا..... اس کے دماغ میں زہر بھرا..... مجھے سب معلوم ہے تم یہاں اپنی سیاست کی دکان کیسے چمکا رہے ہو..... میرے شوہر کی نیک نامی کو کیسے خاک میں ملا رہے ہو..... حد یہ ہے کہ تم نے گل کے قتل کا مجرم بھی اس کے باپ کو بنادیا ہے..... کیا کوئی باپ اپنی بیٹی کا خون کرسکتا ہے..... ہاں مگر تم کرسکتے ہو؟''

میں اٹھ کھڑا ہوا..... ''آپ کو کچھ معلوم نہیں.....''

''سب معلوم ہے مجھے..... تمہارے کہنے پر ہی اس فاحشہ ڈاکٹر شہناز نے میرے شوہر پر اغوا کا مقدمہ بنایا..... گل کا قتل تم نے کرایا..... وہ تمہارا آدمی تھا جسے تم نے مروادیا..... گل تمہارے چنگل میں تھی..... تم اس کے بیان کو استعمال کررہے ہو..... مجرم میرے شوہر کو بنانا چاہتے ہو.....'' وہ چلاتی رہی۔

اے ایس ایم نے مجھے اشارہ کیا..... ''پلیز ایک منٹ بیٹھ جائیں۔'' پھر وہ گل کی ماں سے مخاطب ہوا..... ''آپ بھی سنبھالیں اپنے آپ کو۔''

میں بیٹھ گیا۔ ''خاتون اپنے دل کی بھڑاس نکال سکتی ہیں..... ان کو میں کیا کہوں..... یہ وہی جانتی ہیں جو ان کو رانا صاحب نے بتایا ہے۔''

''کیوں؟ کیا یہ بھی غلط ہے کہ تم نے گل کو یہاں تدفین کے معاملے میں رانا صاحب کی مخالفت کی.....؟''

میں نے کہا۔ ''یہ برطانوی سفارت خانے والوں کا معاملہ ہے..... قانونی پوزیشن کو وہ سمجھتے ہیں۔''

''قانونی پوزیشن.....'' اس نے تلخی سے کہا۔ ''تم اعتراض نہ کرتے تو وہ مان جاتے..... کیا تمہارے وکیل نے اعتراض داخل نہیں کیا ہے کہ گل کے والد کو لندن نہ جانے دیا جائے.....؟''

میں نے کہا..... ''آف کورس..... میں نے اسے ہدایت کی تھی.....''

''تمہارا کیا نقصان تھا اگر باپ اپنی بیٹی کی تدفین میں

شریک ہونا اور واپس آجاتا......"

میں نے کہا...... "ایک مجرم صرف عدالت کی اجازت سے ملک چھوڑ کے جاسکتا ہے۔"

اے ایم ایس نے کہا۔ "نواب صاحب...... کچھ درگزر سے کام لیں...... یہ موقع ایسا نہیں ہے...... اپنے وکیل سے کہیں اعتراض واپس لے لے......"

"ان کی نظر میں یہ باپ نہیں...... بیٹی کا قاتل ہے......" وہ چلائی۔

"ابھی تک میں نے ایسا نہیں کہا ڈاکٹر صاحب...... آپ کس کی سفارش کررہے ہیں...... اور کیوں...... یہ گل کے قتل کا معاملہ نہیں...... ڈاکٹر شہناز کے اغوا اور حبس بے جا میں رکھنے کا کیس ہے...... اس میں رانا صاحب کے خلاف ایف آئی آر پہلے درج ہوئی تھی...... گل کی مجسٹریٹ کے سامنے گواہی بعد میں ریکارڈ ہوئی...... انہیں تو اس وقت بھی جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہونا چاہیے...... مگر یہ آپ کے کمرے میں بیٹھے ہیں" میں اٹھا اور کمرے سے واک آؤٹ کرگیا۔

ایک جذباتی خواہش کا اظہار شہناز کے علاوہ رابعہ...... لیلیٰ بھابی اور ریشم نے بھی کیا تھا کہ وہ گل کا آخری دیدار کرنے کے لیے میرے ساتھ چلیں گی لیکن میں نے انہیں سمجھا دیا کہ شاید یہ ممکن نہ ہو...... اس کی اجازت...... صرف وارثوں کو مل سکتی ہے...... اب یہی خواہش میرے دل میں پیدا ہوئی کہ جانے سے پہلے ایک بار میں گل کی صورت دیکھ لوں مگر ماحول سخت کشیدہ تھا اور اس کا امکان ایک فیصد بھی نہ تھا کہ میں ایسا کرسکوں۔

باہر بیرسٹر شہزاد کے سامنے ایک طویل قامت اور سیاہ رو شخص فائل اٹھائے کھڑا تھا...... اس کے سر کے چاروں طرف بالکل سفید بالوں کی جھالر سی باقی رہ گئی تھی لیکن سفید مونچھیں بہت گھنی تھیں۔ ان کے درمیان بحث چل رہی تھی اور تیسرا شخص ظاہری لاتعلقی اور رواجی سی دلچسپی کے ساتھ سن رہا تھا...... اسے میں جانتا تھا...... وہ اسلام آباد سے آیا ہوا برطانوی سفارت خانے کا نمائندہ تھا۔

اس نے قریب پہنچنے پر مجھ سے ہاتھ ملایا...... طویل قامت اور سیاہ فام شخص مجھے دیکھتے ہی پلٹ کے اندر چلا گیا۔

میں نے پوچھا...... "یہ کون تھا؟"

"آپ نہیں جانتے؟ یہ سیف علی خان تھا......" شہزاد نے کہا۔

"آئی سی...... اب تک اس کی صرف آواز سنی تھی...... وہ بھی فون پر...... یہ کیا چاہتا ہے؟......" میں نے پوچھا۔

راجا نے کہا...... "شہزاد کے اعتراض داخل کرنے پر خفا تھا...... کہہ رہا تھا کہ آدمی میں کچھ مروت ہونی چاہیے۔"

میں نے کہا...... "یہ عجیب بات ہے...... آپ مجرم کے لیے رعایت مانگتے ہیں...... مروت، انسانیت اور شرافت کی بات کرتے ہیں...... اندر اے ایم ایس نے بھی مجھ سے یہی کہا...... میں نے پوچھا کہ آپ کیوں سفارش کررہے ہیں؟"

"رانا نے ہم سے پہلے آ کے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی تھی...... مجھ سے بھی کہہ رہا تھا کہ نواب صاحب کو سمجھاؤ...... رانا صاحب معزز آدمی ہیں...... اسمبلی کے ممبر ہیں...... فرار ہو کے نہیں جاسکتے...... بیٹی کی تدفین کے بعد لندن سے واپس آجائیں گے...... اعتراض واپس لے لیں۔"

"پھر تو نے کیا جواب دیا؟"

"میں نے کہا کہ آپ وکیل ہیں...... قانون کو سمجھتے ہیں...... رانا صاحب کی جگہ کوئی اور شخص ہوتا تو آپ اسے جانے دیتے...... یہ تو کھلی دھاندلی ہے اور لاقانونیت ہے کہ جس شخص کے خلاف ایک لیڈی ڈاکٹر کو اغوا کرنے اور قید میں رکھنے کا مقدمہ درج ہے اسے پولیس نے ابھی تک گرفتار نہیں کیا۔ مجھے لگا کہ ان کی ضمانت قبل از گرفتاری ہوجائے گی...... میں نے کہا کہ سیف صاحب...... مانا میں صحافی ہوں وکیل نہیں لیکن اتنا قانون ضرور جانتا ہوں کہ ایسے سنگین الزامات ہوں تو قبل از گرفتاری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

اب شہزاد بولا...... "میں نے کہا کہ رانا صاحب گرفتاری دے دیں...... ضمانت کرالیں اور پھر جائیں...... چند روز گل کی ماں انتظار کرسکتی ہے...... ڈیڈ باڈی کولڈ اسٹوریج میں رکھی جاسکتی ہے۔"

میں نے کہا...... "بالکل ٹھیک کہا آپ نے...... وہ کیا بولا؟"

"میرا خیال ہے یہی پروپوزل لے کر گیا ہے رانا کے پاس......"

میں نے کہا...... "راجا...... رانا کو گرفتار ہونا چاہیے۔"

راجا نے پھر کوئی نمبر ملایا...... "اسی بات پر اچھی خاصی جھڑپ ہوچکی ہے ایس پی سے...... میں نے کہا کہ آپ کا ڈی ایس پی ایک مجرم کے ساتھ رعایت کررہا ہے...... ابھی تک اسے گرفتار نہیں کیا گیا...... ایس پی کہنے لگا کہ نواب صاحب وہ کوئی عام آدمی نہیں...... عوامی نمائندہ ہے...... ہم اس پر ایسے ہاتھ ڈال دیں تو نوکری کیسے کریں...... اسمبلی کے اسپیکر کو بتانا پڑے گا پہلے...... وزارت داخلہ سے اجازت لینی پڑے گی...... میں نے کہا کہ بکواس کرتے ہیں آپ...... اسمبلی کا ممبر

قتل کرے تو کیا جائے واردات سے گرفتار کرنے کے لیے پولیس باادب کھڑی رہے گی کہ عوامی نمائندہ ہے...... اسپیکر اور وزارت داخلہ سے اجازت لینے میں کئی دن بھی لگ سکتے ہیں...... آپ کی ساری گفتگو میں نے ریکارڈ کرلی ہے اور ابھی لے کر جاتا ہوں ہوم سیکریٹری کے پاس...... کہنے لگا کہ جاؤ...... مجھے پھانسی لگوا دو۔"

"سارا مسئلہ ہی یہ ہے کہ کسی کے دل میں کوئی خوف نہیں...... انسپکٹر کے عہدے تک تو معطلی یا ٹرانسفر کا ڈراما بھی کیا جاسکتا ہے...... ایس پی کا کوئی کیا بگاڑ سکتا ہے......" میں نے کہا۔

راجا بولا...... "لیکن میں نے پھر بھی ڈی آئی جی لاہور سے بات کی۔"

"ریکارڈنگ والی بات تلف تھی......" میں نے کہا۔

"ہاں...... مگر ڈی آئی جی نے نئی کہانی بنالی...... کہنے لگا کہ رانا صاحب کی گرفتاری کے لیے ایک ٹیم گئی تھی...... وہ ناکام واپس آگئے...... رانا صاحب مفرور ہیں...... میں نے کہا کہ آپ کا مفرور مجرم یہاں میو اسپتال میں بیٹھا ہے...... اے ایم ایس کے کمرے میں...... اس نے بڑی عیاری سے کہا کہ اچھا...... میں تھانے والوں سے کہتا ہوں......"

"کیا یہ سیف علی خان کو معلوم ہے۔"

"سب معلوم ہے...... وہی رانا کو گائیڈ کررہا ہے......"

اسی وقت رانا کمرے سے برآمد ہوا...... اس نے مجھ پر ایک قہر آلود نظر ڈالی...... "نواب کی اولاد...... سمجھ لوں گا میں تجھ سے......" وہ دانت پیس کے بولا۔

سیف علی خان نے اسے کھینچ لیا...... "رانا صاحب...... چلیں......"

میں نے رانا کی ہرزہ سرائی کے جواب میں صرف مسکرانے پر اکتفا کیا تھا...... مگر راجا نے کہا...... "اپنے رانا صاحب...... کیا پھر مفرور ہورہے ہیں خیر سے!"

سیف علی خان نے پلٹ کے کہا۔ "ہاں...... تم پکڑوا سکتے ہو تو کوشش کر کے دیکھ لو......"

راجا نے افسوس سے سر ہلایا۔ "تت تت تت...... کیا برا وقت آگیا ہے شرفا کے لیے...... اپنے گھر میں نہیں رہ سکتے...... بڑے گھر کے ڈر سے...... بے چارے کہاں رہیں گے۔"

شہزاد نے کہا...... "سیف علی خاں اپنے مؤکل کو اپنے گھر میں رکھیں گے۔"

میں نے کہا...... "اور مفرور بھی کہتے رہیں گے...... کیا بات ہے......"

رانا کی گاڑی سامنے لگ گئی تھی...... وہ بکتا جھکتا اپنے محافظوں اور سیف علی خاں کے ساتھ بیٹھ کے نکل گیا...... اس کی لندن والی بیوی ابھی تک اندر اے ایم ایس کے کمرے میں تھی...... مجھے اس عورت سے دہری ہمدردی تھی...... ایک اس لیے کہ وہ گل کی بدنصیب ماں تھی...... دوسری اس لیے کہ وہ رانا کی بدنصیب بیوی تھی جسے حقائق کا علم نہ تھا۔

گل کی ماں کچھ دیر بعد باہر آئی اور ایک گاڑی میں بیٹھ کے چلی گئی جو غالباً کرائے کی تھی...... ہاں برطانوی سفارت خانے کا نمائندہ ہمیں کہیں دکھائی نہیں دیا...... اب وہاں ٹھہرنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہا تھا مگر راجا کچھ دیر رک کے دیکھنا چاہتا تھا کہ ڈی آئی جی صاحب نے رانا کی گرفتاری کے لیے تھانے سے پولیس بھیجنے کا جو وعدہ کیا تھا اسے وہ پورا کرنا یاد بھی رہتا ہے یا نہیں۔

میرا خیال تھا کہ ڈی آئی جی نے ایک صحافی سے جان چھڑانے کے لیے جھوٹ کا سہارا لیا ہوگا...... دس پندرہ منٹ میں وہاں علاقے کے تھانے کی ایک موبائل پہنچ گئی اور اس میں سے ایک سب انسپکٹر کی سربراہی میں چار ماتحتوں پر مشتمل ٹیم اتر کے اے ایم ایس کے کمرے میں داخل ہوئی تو قدرتی طور پر مجھے حیرانی ہوئی۔

باریش اے ایم ایس بڑی خفگی دکھاتا ہوا باہر آیا۔ "غلط تھی آپ کی اطلاع...... آپ نے دیکھ لیا...... یہاں کوئی مفرور مجرم نہیں ہے۔"

"ڈی آئی جی کو کسی صحافی نے مطلع کیا تھا......" سب انسپکٹر نے ادھر ادھر دیکھا۔

"یہاں کوئی صحافی نہیں آیا......" اے ایم ایس نے کہا پھر اس کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ کچھ اپ سیٹ ہوا۔

میں نے کہا...... "ڈاکٹر صاحب...... اطلاع غلط نہیں تھی...... بس یہ لوگ حسب عادت اس وقت آئے جب مفرور مجرم دوبارہ مفرور ہوگیا۔"

سب انسپکٹر میری طرف آیا۔ "ڈی آئی جی صاحب کو آپ نے فون کیا تھا۔"

اے ایم ایس کچھ خفیف ہوا...... "انسپکٹر صاحب یہ نواب رفیق احمد شیرازی ہیں...... یہ سٹ بدھائی سے تشریف لائے ہیں۔"

راجا بولا...... "فون میں نے کیا تھا...... آدھا گھنٹا پہلے۔"

"اب اتنا ٹائم تو لگتا ہے نا جناب...... موبائل تھانے میں ہر وقت کھڑی نہیں رہتی......" انسپکٹر نے ناگواری سے کہا اور

موبائل میں بیٹھ کے روانہ ہوگیا۔

اس نے اپنا فرض پورا کردیا تھا...... مجرم اگر پہلے ہی فرار ہوگیا تھا تو اس کا کیا قصور...... میرے اطمینان کے لیے یہ بات بہت تھی کہ رانا کو گرفتاری کے ڈر سے بھاگنا پڑا...... اسے یہ خطرہ ضرور محسوس ہوتا ہوگا کہ شہناز کے اغوا اور حبس بے جا میں وہ نامزد ملزم ہے اور اس ڈر سے وہ اپنے گھر میں نہیں رہ سکتا۔

رانا کے لیے محفوظ ٹھکانے بہت تھے...... لاہور اسلام آباد کے علاوہ بھی نہ جانے اس نے کہاں کہاں کوٹھیاں بنا رکھی تھیں۔ اس کے وکیل نے ماتحت عدالت میں درخواست برائے ضمانت داخل کرنے میں دیر نہیں لگائی ہوگی لیکن اس بار معاملہ کسی مزارع یا ملازم کا نہیں تھا...... مدعی ایک ڈاکٹر تھی جس کی پشت پناہی پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن کررہی تھی...... اس کا ساتھ دینے والا راجا جیسا نامور صحافی تھا اور ایک طاقتور سیاسی حریف بن کے سامنے آنے والا ست بدھائی کا نواب اس صورت حال کو پوری طرح ایکسپلائٹ کررہا تھا...... رہی سہی کسر اس کی اپنی بیٹی نے پوری کردی تھی جو آئی تو اپنی تعلیم مکمل کرنے تھی لیکن یہاں حق و باطل کی جنگ میں فریق بن کے اس کے مقابل کھڑی ہوگئی اور پھر اسی چکر میں ماری گئی۔

ہم اپنی گاڑی کی طرف جارہے تھے کہ میں نے سفارت خانے کے نمائندے کو دیکھا...... وہ کچھ کہنے کے لیے بے تاب تھا اور تیز تیز قدموں سے ہماری طرف آرہا تھا...... پھر رک گیا۔

''نواب صاحب...... اچھا ہوا کہ آپ مل گئے...... نکل جاتے تو مجھے فون کرکے بلانا پڑتا......'' وہ بولا۔

میں نے کہا...... ''ایسی کیا بات ہوگئی ہے؟''

اس نے کہا۔ ''وہ دراصل...... گل کی ماں آپ سے ملنا چاہتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ان سے ایک ملاقات کافی......''

اس نے کہا۔ ''انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ یہ پیغام آپ تک پہنچادوں کہ وہ ایرپورٹ پر آپ کا انتظار کریں گی۔''

''ایرپورٹ پر......؟ کیا وہ واپس جارہی ہیں۔''

''میرا خیال تھا کہ آپ کے علم میں ہوگی یہ بات...... رات کی فلائٹ پر ان کی بکنگ ہے۔''...... وہ بولا ''آف کورس...... ڈیڈ باڈی کے ساتھ......''

''اور ان کے شوہر......''

''ان کی سیٹ کنفرم ہوگئی تھی...... لیکن کسی وجہ سے ان کا پروگرام بدل گیا......'' وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا...... ''فلائٹ رات دو بجے ٹیک آف کرے گی۔''

راجا نے کہا۔ ''ایرپورٹ پر تو ہونگے وہ بھی...... اپنے رانا صاحب۔''

اس نے نفی میں سرہلایا۔ ''خاتون نے کہا ہے کہ وہ موجود نہیں ہونگے...... اچھا...... میں چلتا ہوں...... مجھے کچھ انتظامات کرنے ہیں۔''

اس کے جانے کے بعد میں نے کہا...... ''بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی...... خاتون کو اور کون سی بات یاد آگئی...... جو کہنے سے رہ گئی تھی۔''

''ایسی کیا بات ہوسکتی ہے جو رانا کے سامنے کہی نہ جاسکی...... وجہ کچھ بھی ہوسکتی ہے۔'' راجا نے سوچتے ہوئے کہا۔

''یہ معلوم کرنے کے لیے ہمیں جانا پڑے گا ایرپورٹ۔''

راجا نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اس میں کسی سازش کی بو آتی محسوس ہورہی ہے نیکیے پتر۔''

''اس میں تیری ناک کا کوئی قصور نہیں...... تیری ناک کچھ اور سونگھنے کے قابل نہیں رہی......'' میں نے کہا...... ''لیکن راجا...... ابھی صرف سات بجے ہیں...... دو بجے کی فلائٹ کے لیے مسافر بارہ بجے رپورٹ کرتے ہیں...... ابھی پانچ گھنٹے ہیں...... ایسی کوئی بات تھی تو اس مہلت سے فائدہ اٹھایا جاسکتا تھا...... آخر وہ کہاں ٹھہری ہوگی۔''

''اسی کوٹھی میں...... جہاں سے گل کو اٹھایا گیا تھا......'' راجا بولا۔

''رائٹ...... اور شوہر نامدار جو ویسے تو مفرور ہیں...... اس کے ساتھ ہونگے...... لیکن ایرپورٹ پر وہ ساتھ نہیں ہونگے...... رانا کی موجودگی میں وہ ہم سے فون پر بھی بات نہیں کرسکتی۔''

راجا نے کہا...... ''اب تو جانا لازی ہوگیا۔''

درمیان میں حائل پانچ گھنٹے گزارنے کے لیے راجا نے اپنے کچھ پرانے دوستوں سے ملاقات کی اور ان سے بہت گلا شکوہ کیا اتنی جلدی وہ اپنے ساتھی رپورٹر کو نظر انداز کرنے لگے ہیں...... ان میں سے کچھ شرمندہ بھی نہیں ہوئے...... انہوں نے الزام مالکوں پر یا ایڈیٹر صاحب پر رکھ دیا کہ ہم نے تو اسٹوری فائل کردی تھی...... آگے دبادی گئی تو ہمارا قصور نہیں۔''

ایک نوجوان نے پریس کلب میں راجا سے ملاقات کی...... ہم اس وقت کھانا کھارہے تھے...... راجا اسے صورت سے جانتا تھا...... اس نے کہا کہ وہ راجا کے کالم بڑے شوق سے پڑھتا ہے اور خود بھی کالم نگار بننا چاہتا ہے۔

راجا نے بزرگوں کی طرح کہا...... ''برخوردار...... دنیا میں کامیابی کا صرف ایک معیار رہ گیا ہے...... پیسا...... پہلے صحافت ایک مشن تھی...... اب پیشہ ہے دا آؤٹ پیسا...... اینڈ لو عزت......''

وہ کچھ مایوس ہوا...... ''بعض اوقات میں بھی مایوس ہوجاتا ہوں۔''

راجا نے کہا...... ''اسی لیے کہہ رہا ہوں...... دنیا میں اور بھی بہت پیشے ہیں۔ تم ابھی جوان ہو...... نکل جاؤ کسی منافع بخش پیشے میں...... یہاں بیٹھے رہے اصول اور ضمیر صاحب کے چکر میں تو کچھ نہیں ملے گا خواری کے سوا......''

''سر میں کچھ بتانے آیا تھا......'' اس نے راز داری سے کہا...... ''آپ کی جو اسٹوری تھی رانا صاحب کے بارے میں...... کیا یہ درست ہے کہ اپنی لندن سے آنے والی بیٹی کو انہوں نے خود ہی قتل کروادیا۔''

''تم کیوں پوچھ رہے ہو......'' راجا بولا۔

''میں نے وہ اسٹوری فالو کی تھی...... مجھے پتا چلا کہ اس لڑکی...... کیا نام تھا اس کا......''

''گل رانا......'' میں نے کہا۔

''یس...... اس کا قاتل ایک وائٹ کرولا سے فائر کرکے فرار ہوا تھا...... لیکن اسے کسی نے گولی کا نشانہ بنایا...... گاڑی اس وقت موڑ کاٹ رہی تھی یا بے قابو ہو کے دائیں طرف مڑ گئی تھی اور پھر الٹ گئی...... اس کی لاش مردہ خانے سے غائب ہوگئی......''

راجا چونکا...... ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔''

''یس سر...... ایسا ہی ہوا...... اس کے پاس شناخت کی کوئی چیز نہیں تھی...... لکھا گیا کہ نامعلوم شخص......''

میں نے کہا۔ ''ایک پان والے نے اسے دیکھا تھا۔''

وہ مسکرایا...... ''غلطی کی تھی اس نے...... اس کی سزا ملے گی...... آئندہ کبھی ایسا نہیں کرے گا......''

''غائب کیسے ہوگئی وہ لاش......''

''اس کا پوسٹ مارٹم ہوا...... رپورٹ لکھی گئی...... لاش کا وارث کوئی نہیں آیا تو اسے ایک خیراتی ادارے کے مردہ خانے بھیج دیا گیا...... وہاں سے لاوارثوں کے قبرستان پہنچا دیا گیا...... یہ سب چوبیس گھنٹے میں ہوا...... یا تو وارث آئے اور انہیں لاش دکھائی ہی نہیں گئی...... لوگ تو آتے ہیں...... جن کا کوئی عزیز لاپتا ہوجائے وہ اسپتالوں میں ہی دیکھتے ہیں...... اور مردہ خانوں میں بھی...... اور کوئی نہ آئے تو تین دن انتظار ضرور کیا جاتا ہے......''

راجا نے کہا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو...... اتنی جلدی کرنے کی جو وجہ ہوگی......''

وہ آگے جھک کے بولا۔ ''اس کی گاڑی تھانے میں پڑی ہے...... لیکن اسے اندر سے دھو دیا گیا ہے...... میں خود دیکھ کے آیا ہوں...... وہ چوری کی گاڑی تھی...... ایک ہفتہ پہلے چوری ہوئی تھی...... اصل مالک سیالکوٹ کا ایک تاجر ہے۔ اس نے رپورٹ لکھوادی تھی کہ وہ ایم ایم عالم روڈ کے ایک ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے گیا تھا...... رات کے وقت...... واپس آیا تو گاڑی غائب تھی۔''

''تم نے یہ پوری اسٹوری فائل کی...... اور فالو کی...... تمہارا یہ جذبہ یقیناً مجاہدانہ ہے...... اور قابل قدر بھی......''

''لیکن اس کی سخت ناقدری ہوئی......'' وہ مایوسی سے بولا۔

''ہاں...... جب تم آگے بڑھو گے تو ہر قدم پر تمہیں احساس ہوگا کہ یہ راستہ کتنا کٹھن ہے...... تمہیں دوسرے راستے پر چلنے کی ترغیب ملے گی جو فائدہ مند اور آسان ہوگا...... تم مزاحمت کروگے تو نقصان اٹھاؤ گے...... ہر شخص میں مزاحمت کی قوت ایک جیسی نہیں ہوتی......''

''مجھ میں ہے سر......'' وہ جوش سے بولا۔

''ہاں ابھی ہوگی...... تم پر ذمے داریاں جو نہیں ہیں...... جب تم ایک گھر چلاؤ گے...... بیوی بچے ہوں گے...... ان کی ضروریات اور خواہشات کا دباؤ ہوگا...... مثلاً اچھے گھر، گاڑی اور اچھی تعلیم کا...... اور خدانخواستہ تم پر بوڑھے یا بیمار ماں باپ کی دیکھ بھال کا بوجھ بھی آگیا...... تو پھر ہر منافع بخش پیشکش پر تمہاری قوت مزاحمت کم ہوتی جائے گی...... تم سوچنے لگو گے کہ کیا فائدہ آخر اس جہاد کا۔''

''آپ میری حوصلہ شکنی کررہے ہیں......'' وہ مایوسی سے بولا۔

''میں تمہیں پہلے سے آنے والے وقت کے حقائق کی تصویر دکھا رہا ہوں...... ابھی سے تیاری کرلو...... آج کتنا حوصلہ ہے تم میں...... یہ جاننے کے لیے تمہارا ایک ٹیسٹ لوں گا؟'' راجا نے کہا۔

وہ چونکا...... ''ٹیسٹ؟''

''ہاں ٹیسٹ......'' راجا نے کہا...... ''بولو تم تیار ہو......''

''آپ بتائیں......''

''جو کچھ تم نے ابھی بتایا...... فرض کرو یہی تمہیں عدالت میں آکے بتانا پڑے...... میں تمہیں رانا کے خلاف ایک گواہ کے طور پر طلب کرلوں...... کیا تب بھی تمہارا یہی بیان ہوگا......؟''

اس کا چہرہ پھیکا پڑ گیا۔ ''سر...... میں کچھ عرصہ کرائم رپورٹر کے ساتھ رہا...... تھانے کچہری سے مجھے بہت ڈر لگتا

ہے...... میں نے دیکھا ہے کہ وہ کس طرح مقدمات بناتے ہیں اور تھانوں میں اقبال جرم کیسے کرائے جاتے ہیں...... میں خود تو نہیں ڈرتا...... لیکن میرے بھائی کو ملوث کرلیا تو...... میری ایک بہن یونیورسٹی میں پڑھتی ہے...... پولیس کے ہتھکنڈے ایسے ہوتے ہیں...... کہ......"

راجا مسکرانے لگا۔ "ٹھیک ہے برخوردار...... اچھا ہوا میری بات فوراً تمہاری سمجھ میں آگئی...... میں تمہیں کس طرح بھی مورد الزام نہیں سمجھتا...... آدمی بزدل بنتا ہے انہی رشتوں کی وجہ سے...... ضروریات کے بھی آدمی کی مجبوری بنتی جارہی ہیں...... جاؤ صحافت کرو...... کام اور پیسا کماؤ......"

وہ جس طرح خفیف اور شرمسار ہو کے اٹھا اس پر مجھے افسوس ہوا...... شاید اسے ایسی آزمائش کی امید بھی نہیں ہوگی...... راجا نے اچھا ہی کیا جو اسے فوراً عملیت پسندی کا سبق پڑھا دیا...... آدمی اگر غازی یا شہید کے مرتبے پر فائز ہونے کے لیے آگے بڑھنے کا حوصلہ رکھتا ہو...... خواہشات میں کسی قلندر کی طرح قناعت اختیار کرلے...... تب بھی رشتوں کی زنجیر کتنا بے بس اور مجبور کردیتی ہے...... وہ نوجوان صحافی جلد سمجھ گیا تھا۔

ایرپورٹ پر نصف شب کے وقت بھی دن کا سماں تھا...... وہی گہما گہمی...... ہجوم اور افراتفری...... کار پارکنگ سے ڈیپارچر لاؤنج تک جاتے ہوئے ہم انتہائی چوکس رہے...... اس میں کوئی شک نہیں کہ آدمی کا وقت آجائے تو کسی نامعلوم سمت سے آنے والی گولی نظر ہی نہیں آتی لیکن پھر بھی احتیاط کے تقاضوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا...... غنی اور اس کے ساتھی محافظ ہمارے ساتھ رہے اور ہر طرف نظر دوڑاتے رہے۔

گل کی ماں کو راجا نے پہلے دیکھا...... وہ ڈیپارچر لاؤنج کے باہر ایک کرسی پر اکیلی بیٹھی چائے یا کافی پی رہی تھی...... اس کا لباس وہی تھا...... یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ پلاسٹک کی رنگین کرسیوں پر اس کے آس پاس جو لوگ بیٹھے ہیں ان میں اسے سی آف کرنے والے کون سے ہیں!۔

مجھے اس عورت پر بہت ترس آیا...... وہ جوانی میں یقیناً بہت خوبصورت رہی ہوگی اور اب بھی اچھے کپڑوں...... میک اپ اور ہیر اسٹائل کے ساتھ پرکشش نظر آرہی تھی...... اس نے خود کو سلم اور فٹ رکھا تھا یا پھر یہ اس کی قدرتی جسمانی ساخت تھی...... بیٹی کی موت کے صدمے کو اس نے بڑی ہمت سے جھیلا تھا...... لندن سے اکیلے سفر کیا تھا اور آرام کے کسی وقفے کے بغیر تابوت لے کر اکیلی واپس جارہی تھی...... صدمے کی شدت اور سفر کی تکان نے اس کا برا حال کر رکھا تھا۔

مجھے اچانک سامنے پا کے وہ اٹھی۔ "مجھے بہت کم امید تھی کہ تم آؤ گے......" اس کا لہجہ بالکل بدلا ہوا تھا۔

میں نے کہا۔ "پلیز آپ بیٹھ جائیں۔"

"ہم ایک طرف چل کے بات کریں گے...... یہاں بیٹھنے کی جگہ نہیں ہے...... اور باتیں سننے والے بہت ہیں......" وہ پیپر گلاس اٹھائے چل پڑی" اور تم کچھ پیو گے...... چائے یا کافی......"

راجا نے کہا...... "میں لاتا ہوں۔"

وہ میرے ساتھ چلتی گئی پھر ایک دیوار سے ٹیک لگا کے کھڑی ہوگئی...... اس کی نظریں ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں جیسے کسی کو تلاش کررہی ہو...... میں نے کہا...... "مسز رانا...... آپ کو چھوڑنے کوئی نہیں آیا؟"

"اچھا ہی ہوا کہ نہیں آیا......"

"آپ کو یقیناً غصہ ہوگا کہ میں نے آپ کے شوہر کو ساتھ جانے نہیں دیا......" میں نے کہا۔

وہ بولی۔ "نہیں...... تم نے میرے حق میں اچھا کیا...... تم بہت حیران ہو رہے ہو کہ میرے رویے میں یہ تبدیلی کیسی...... آئی ایم سوری...... رانا کے سامنے مجھے اپنی مرضی کے خلاف بہت کچھ کہنا پڑا...... اور کرنا پڑا...... وہ میری مجبوری تھی......"

"مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں...... یقین کریں میں خود احساس جرم کے عذاب میں مبتلا ہوں...... لیکن میں نے جو کیا نیک نیتی سے کیا تھا اور گل نے بھی...... وہ اپنی فطرت کے اعتبار سے نیک تھی...... با اصول تھی...... یہ اس کی تربیت کا نتیجہ ہی تھا چنانچہ اس نے مجبوراً وہی کیا جو اس کے نزدیک درست تھا......"

"میں سب سمجھتی ہوں...... اب یہ دہرانے کا کیا فائدہ......"

"میں آپ کو کچھ بتانا چاہتا تھا......"

وہ بولی۔ "مجھے سب معلوم ہے...... اسپتال میں مجھے وہ سب کہنا پڑا جو ضروری تھا...... کیونکہ میرا شوہر وہاں تھا...... اگر میں سچ بولتی تو میرے لیے بھی بہت سے مسائل کھڑے ہوجاتے...... جیسے میری بیٹی کے لیے سچ بولنا ایک جرم بن گیا تھا...... اور اس نے بڑی سختی جھیلی...... دہرا عذاب تھا اس کے لیے...... اگر تم عدالت میں کھڑے ہو کے قاتل کو قاتل کہہ دیتے ہو تمہیں سکون ملتا ہے کہ تم نے سچ بولا...... بوجھ اتار دیا...... اپنی ذمے داری پوری کی...... لیکن اس کو سچ بولنا پڑا اپنے ہی باپ

کے خلاف...... اب تک اس کے تصور میں باپ کا چہرہ کچھ اور تھا...... اچانک ایک حادثے نے اس کو بدل دیا...... جو روشنی تھی وہ تاریکی بن گئی...... اور اسے دنیا کو بتانا پڑا...... تم اندازہ کرسکتے ہو اس کے عذاب کا...... یہ بات کرتے کرتے وہ رونے لگی تھی اور ہمارے قریب سے گزرنے والے ذرا سی دیر کے لیے ٹھٹک کر رک تے تھے...... پھر دور چلے جاتے تھے۔

میں نے کہا...... "پلیز...... آپ حوصلے سے کام لیں۔"

"یہ میرا حوصلہ ہی تو ہے جس نے مجھے زندہ رکھا...... ورنہ کیا رہ گیا ہے اب زندگی کی آرزو کرنے کے لیے؟......" وہ بولی...... "میں تمہارا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی......"

مجھے سخت حیرانی ہوئی...... "شکریہ کس بات کا......"

"تم نے میری بیٹی کو بچانے کی کوشش تو کی...... یہاں سے وہ مجھے ہر روز کال کرتی تھی...... اس نے مجھے ہر بات بتائی تھی...... میں نے اس سے کہا تھا کہ تم کسی چکر میں مت پڑو...... اپنے کام سے کام رکھو...... لیکن وہ ایک جذباتی صدمے سے گزر رہی تھی...... اس نے کہا کہ میں اس لڑکی ڈاکٹر شہناز کی مدد نہ کروں...... یہ کیسے ہوسکتا ہے...... اس کے لیے یہ بہت بڑا نقصان تھا کہ اس باپ کو وہ کیا سمجھتی تھی...... وہ کیا تھا...... آخر میں وہ بہت پریشان تھی...... کہتی تھی کہ باپ میرا دشمن ہوگیا ہے...... کیونکہ میں نے اس کے دشمن کے گھر میں پناہ لے لی ہے...... بتائیں کیا کروں...... مجھے وہ دشمن کسی طرح بھی دشمن نہیں لگتا...... اگر اپنے باپ سے موازنہ کروں تو وہ دوست ہے...... میرا باپ دشمن ہے...... وہ مجھے دھمکی دے رہا ہے کہ تمہاری ماں کو طلاق دے دوں گا...... تمہیں جان سے ماردوں گا...... میں نے کہا کہ گل...... تم نے اپنا فرض ادا کردیا...... اب خدا کے لیے نکل آؤ وہاں سے...... وہ کہنے لگی کہ بس آخری کام باقی ہے...... مجھے عدالت میں بیان دینا ہے...... آئی ایم سوری کہ میں نے اس کے ارادے کی راہ میں حائل ہونے کی بہت کوشش کی...... اپنے ضمیر کے خلاف...... وہ غلط نہ تھی لیکن میں رانا سے ڈرتی تھی...... کیونکہ میں رانا کو جانتی تھی...... جیسے ایک بیوی کسی شخص کو جانتی ہے...... کوئی اور نہیں جان سکتا...... اور انجام دیکھ لو کیا ہوا......"

"آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں؟"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا...... "تم نے بدنیتی کے ساتھ کچھ نہیں کیا تھا...... اگر گل کو نقصان ہوا تو اپنے باپ کی سوچ سے...... اس کے کردار سے...... ایک معاملے میں مجھے تمہارا شکریہ بھی ادا کرنا چاہیے......"

"اس موقع پر شکریہ...... مجھے اور شرمندہ نہ کریں......"

"نہیں...... اگر تم دخل اندازی نہ کرتے تو میری مشکلات میں بہت اضافہ ہوتا...... رانا چاہتا تھا کہ مجھے یہاں روکے...... تاکہ میں بھی اس کا ساتھ دوں اور گل کو یہاں ان کے خاندانی قبرستان میں دفن کیا جائے...... اس کی یہ خواہش پوری نہ ہوئی...... تمہارے قانونی اعتراض اٹھانے کی وجہ سے...... اگر اپنی مرضی کے خلاف مجھے گل کو یہاں دفن کرنا پڑتا تو مجھے بہت دکھ ہوتا...... اور گل کی روح کو بھی...... ایک قاتل دنیا کو دکھانے کے لیے محبت کا ڈراما کرے اور مقتول کو یہ اعزاز دے...... میں تو کسی کو کچھ بتا ہی نہیں سکتی تھی......"

"اگر میں آپ کے کسی کام آسکوں...... آئندہ بھی......"

اس نے گھڑی دیکھی...... تمہارے وکیل کے قانونی اعتراض کی وجہ سے سفارت خانے نے اس کو ویزا جاری نہیں کیا...... وہ جلد از جلد یہاں سے نکلنے کے چکر میں تھا...... اگر اسے اندازہ ہوتا کہ عین وقت پر تم ٹانگ اڑا دو گے تو وہ مجھے روکتا...... خواہ گل کی میت کولڈ اسٹوریج میں پڑی رہتی...... وہ برطانیہ میں ویزا کی اجازت کے لیے کوشش کرتا...... اس کا سیاسی اثر و رسوخ ہے...... وہ ضمانت کرالیتا اور کورٹ سے اجازت بھی لے لیتا...... ایک بار وہ ملک سے نکل جاتا تو پھر لندن میں قیام کو طول دیتا...... تم نے مجھے اس عذاب سے بچالیا......"

میں نے کہا...... "وہ جیسا بھی ہے...... آپ کا شوہر ہے......"

اس نے ایک گہری سانس لی...... "ہاں...... بائیس سال میں نے گزار دیے...... ایک مجبوری گل کی تھی...... دوسری میری اپنی...... میں اس کے پیسے پر ریجھ گئی تھی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ میں نے بہت عیاشی کی زندگی بسر کی...... وہ سال میں دو چار مرتبہ آتا تھا...... کبھی ایک مہینے سے زیادہ نہیں ٹھہرا...... وہ دو چار مہینے کا شوہر بن کے مطمئن تھا...... میں اسے برداشت کرلیتی تھی...... باقی عرصہ میں آزادی سے اپنی زندگی جیتی تھی......"

مجھے اس کے اعتراف پر سخت حیرانی ہوئی...... اس رسمی ملاقات میں اس کو یہ سب بتانے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی لیکن اس کے اندر بھری نفرت اور غصے کی آگ اسے جلا رہی تھی...... ایسا صرف مغرب کی عورت کرسکتی تھی...... مشرقی عورت کتنی بھی مجبور اور مظلوم ہو، شوہر سے بے وفائی کرکے بدلا نہیں لیتی...... وہ پھنس جائے تو اور بات ہے...... ایسی عورت کو معاشرے میں داشتہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے جو پارٹ ٹائم بیوی ہو...... اور جو بیوی خود کو ردیے سے داشتہ بنالے وہ ہر ایک

کے سامنے اعتراف بھی نہیں کرتی۔

میں نے کہا..... ''آپ کو اب جانا چاہیے.....''

''ہاں..... وہ آہستہ آہستہ ڈیپارچر لاؤنج کی طرف چلنے لگی..... ''ایک اور بات بھی کہنی تھی تجھے..... اب میں نے فیصلہ کرلیا ہے کہ رانا سے طلاق لے لوں گی..... مجھے رانا سے تعلق کی مزید ضرورت محسوس نہیں ہوتی.....''

''کیا وہ تمہیں آسانی سے چھوڑ دے گا.....؟''

''وہ مجھے آسانی سے چھوڑ سکتا ہے..... لیکن میں اسے مشکل میں ڈالنا چاہتی ہوں..... دراصل کئی سال سے میں چاہتی تھی کہ اسے چھوڑ کے اپنی مرضی سے شادی کرلوں..... اب اسے مزید ٹالنا ممکن نہیں رہا.....''

میں نے کہا..... ''کسے ٹالنا ممکن نہیں رہا.....؟''

''میرے بوائے فرینڈ کو..... میں گل کی وجہ سے مجبور تھی..... اب میں اس کی خواہش پوری کرسکتی ہوں..... ہم ساتھ رہ سکتے ہیں..... میرا مطلب ہے شادی کر کے ساتھ تو ہم پہلے ہی رہتے تھے..... رانا سے میں نصف جائیداد اینٹھ لوں گی..... لندن میں اس کے دو اپارٹمنٹ ہیں..... ایک لازمی مجھے ملے گا.....''

''یہ سب آپ مجھے کیوں بتارہی ہیں؟''

''اس لیے کہ..... میں اب تمہارے ساتھ ہوں..... تمہارے ساتھ مل کر مجھے گل کی موت کا بدلہ لینا ہے..... اس کے قاتل کو سزا دلوانی ہے..... گل تو اپنا بیان دے کر مر گئی..... میں زندہ ہوں..... جو کچھ اس نے مجھے بتایا تھا وہ میں کورٹ کو بتا سکتی ہوں.....''

میں نے کہا..... ''آپ ایسا کریں گی.....؟''

''میں ایسا ضرور کروں گی.....''

میں نے کہا..... ''لیکن اس کے لیے آپ کو یہاں آنا پڑے گا.....''

''یہ بالکل ضروری نہیں..... میں وہاں اوتھ کمشنر کے سامنے یا کورٹ میں اپنا بیان ریکارڈ کرا کے بھیج سکتی ہوں..... اس میں جھوٹ کچھ نہیں ہوگا..... گل نے جھوٹ نہیں بولا..... جو سچ تھا وہ کہہ دیا..... میں بھی تم سے یہ سب چھپا سکتی تھی..... مثلاً اپنی پرائیویٹ لائف کے بارے میں..... لیکن میں تمہاری مدد کرنا چاہتی ہوں..... کیونکہ گل یہی کر رہی تھی..... وہ مر گئی یا ماردی گئی تو اس سے حقائق نہیں بدلے..... جو ہے سو ہے.....'' اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

میں نے اس سے مصافحہ کیا..... ''ایک ماں اپنی بیٹی کے حق میں اس سے بہتر نہیں کرسکتی..... کہ اس کے قاتلوں کو کیفر کردار تک پہنچادے۔

''خواہ وہ اس کا باپ ہی کیوں نہ ہو..... یس..... یہی ہونا چاہیے..... اچھا نواب رفیق..... بائی.....'' اس نے راجا سے ہاتھ ملایا..... ''ہاں..... میرا فون نمبر لے لو.....''

اس نے ایک پرزے پر فون نمبر لکھا اور پھر کچھ سوچ کے ایڈریس بھی لکھ کر مجھے تھما دیا..... راجا نے اس ساری گفتگو میں کوئی مداخلت نہیں کی تھی اور خاموشی سے سب سنتا رہا تھا..... وہ راجا سے واقف ضرور ہوگی لیکن اس نے بھی براہِ راست راجا کو مخاطب کر کے کچھ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی.....

ہم ایئر پورٹ سے باہر آئے تو آدھی رات گزر چکی تھی..... یہ احساس بڑا عجیب تھا کہ جس لڑکی کو ہم نے کچھ عرصہ قبل مسکراتے ہوئے باتیں کرتے ہوئے زندگی کی حرارت سے معمور دیکھا تھا وہ اس وقت سرد اکڑی ہوئی لاش کی صورت میں ایک تابوت کے اندر بند ہے اور تابوت جہاز کے کارگو سیکشن میں ہے..... اب مسافر نہیں کارگو ہے.....

غنی اور اس کے ساتھ آنے والا سیکیورٹی گارڈ پارکنگ ایریا میں پوری طرح مستعد کھڑے تھے..... ان پر دن بھر کی ڈیوٹی سے تھکن کے آثار مفقود تھے..... ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کے بعد غنی نے کہا..... ''اب کہاں سر.....

میں نے کہا..... ''اب ہم واپس جائیں گے.....''

''اس وقت؟'' اس نے کچھ تذبذب اور فکرمندی سے کہا.....

میں نے کہا..... ''یہی سب سے محفوظ وقت ہے غنی.....''

غنی نے سر ہلایا اور گاڑی کو واپسی کے راستے پر ڈال دیا..... آج کا دن بے حد مصروف غیر متوقع واقعات اور انکشافات سے پر تھا..... یکلخت جیسے بھاگ دوڑ ختم ہوگئی تھی..... گل آئی اور چلی گئی..... اس کے آنے اور جانے کے درمیان جو وقت گزرا کل کی بات لگتا تھا..... کچھ دیر ہم اپنی یادوں میں گم رہے.....

پھر راجا نے کہا..... ''یہ کیا عجیب عورت تھی..... گل کی ماں.....''

''تو ذرا غور کر مشرق اور مغرب کے فرق پر..... ایک خاندان یہ تھا جس میں رانا اس کی بیوی اور بیٹی شامل رہے..... بائیس سال تک..... لیکن اس تعلق کو جذباتی رشتوں کی مضبوط بنیاد فراہم نہ ہوئی.....''

راجا نے کہا..... ''واقعی..... رانا نے تو بڑے لوگوں کی تقلید کی ہوگی..... ولایتی بیوی بھی ایک شان کی بات ہوتی ہے.....''

''جیسے پراپرٹی پاکستان کے ہر شہر میں ہے وہ اپنی جگہ مگر ولایت میں بھی ہے.....'' میں نے کہا..... ''ایسے میں ایک بیوی بھی ہے.....''

راجا بولا..... ''جہاں دیسی بیوی ایک مجبوری ہوتی ہے..... ورنہ وہ ہر چیز ولایتی استعمال کرتے ہیں۔''

میں نے کہا..... اس ولایتی بیوی کے ولایتی انداز تو دیکھو کیسی بے شرمی اور ڈھٹائی سے اعتراف کر رہی تھی کہ رانا تو سال میں دو چار مہینے کے لیے شوہر ہوتا ہے..... باقی سال پیسہ رانا کا اور شوہر اپنی مرضی کا۔''

''کیا رانا کو واقعی یہ سب معلوم نہیں ہوگا؟''

میں نے کہا..... ''یہ کیسے ہوسکتا ہے..... لیکن وہ کیا کرسکتا تھا..... ولایت میں قانون بھی ولایت کا ہے، نہ بیوی کو زبردستی یہاں لانا ممکن تھا نہ اس پر پہرے بٹھانا یا اس کی نقل و حرکت محدود کرنا.....''

''ضرورت مندی کا رشتہ..... کمپرومائز..... مجھے تو حیرانی ہے کہ بائیس سال کیسے گزر گئے..... جو یہاں اتنے غیرت مند بنتے ہیں..... اس بے غیرتی سے سمجھوتا کیسے کرتے ہیں.....'' راجا بولا۔

میں نے کہا'' وہ جو محاورہ ہے نا..... روم میں وہی کرو جو رومن کرتے ہیں..... ہم کہتے ہیں جیسا دیس ویسا بھیس.....''

جنگ میں جارحیت کو سب سے موثر دفاع سمجھا جاتا ہے اور پہل کرنے والے کو اپنے حریف پر کچھ STRATEGIC برتری بھی حاصل ہوجاتی ہے..... کچھ اسی قسم کا فائدہ رانا کے مقابلے میں ہم نے اٹھالیا..... اس میں ہماری پلاننگ کا کوئی دخل نہ تھا..... یہ فائدہ ہمیں گل نے پہنچایا تھا.....''

شہناز کی بازیابی کے لیے کی جانے والی ہماری ہر کوشش ناکام رہی تھی یہاں تک کہ لندن سے آنے والی رانا کی بیٹی گل کو اغوا کرنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا..... ہمارا یہ خیال بھی غلط ثابت ہوا تھا کہ دباؤ میں آ کے رانا خود شہناز کو واپس لائے گا اور ہم سے اپنی غلطی کی معافی مانگ کے بیٹی کو چھڑا لے جائے گا..... باپ اور بیٹی کے جذباتی رشتے کی مجبوری اسے ہمارے دروازے تک لے آئے گی۔

بیٹی کی محبت سے بڑا مسئلہ گھر کی عزت کا ہوگا..... رانا کیسے برداشت کرے گا کہ اس کی بیٹی کے دشمن کے گھر میں ہونے کی خبر عام ہو تو اس کے ملازم مزارع اور گرد و نواح میں رہنے والے بے حیثیت لوگ اور جان پہچان والے اس پر تھو تھو کریں..... لیکن رانا نے اپنی ضد انا پرستی اور عداوت کے جذبات میں ہمارا مطالبہ ٹھکرا دیا تھا..... اپنی بیٹی کو چھوڑ دیا تھا لیکن شہناز کو نہیں چھوڑا تھا۔

یہ گل کی بے مثل جرأت اور ذہانت کا نتیجہ تھا کہ رانا ایک جیتی ہوئی بازی ہار گیا..... گل اپنے ساتھ شہناز کو بھی نکال لائی..... خود اس نے زندگی کی بازی ہار دی لیکن وہ ایک بہت بڑی فتح ہمارے نام کر گئی..... اب رانا کے خلاف ایک بہت مضبوط پولیس کیس درج ہو چکا تھا اور وہ گرفتاری کی ذلت سے بچنے کے لیے روپوشی پر مجبور تھا..... اس کی نمک خوار اور مددگار پولیس بھی مجبور تھی کہ رانا صاحب کو ایک مفرور ملزم ظاہر کرے۔

فی الحال رانا اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ ہمارے خلاف کوئی جارحیت کرسکے..... وہ محصور ہوگیا تھا اور یکے بعد دیگرے اس کی ہر کوشش ناکامی سے دوچار ہورہی تھی..... ہم نے اس کو باہر جانے سے روک دیا تھا اور اس کے لیے قانون کو خریدنا یا اپنے اثر و رسوخ سے بے عمل بنانا مشکل کردیا تھا۔ اس کے پاس اب ایک ہی راستہ تھا کہ خود کو قانون کی عدالت میں پیش کرے اور ضمانت پر رہائی حاصل کرلے.....

اگلا پورا دن ایک خاموش بے عملی میں گزر گیا۔ میں نے لندن فون کیا تو ڈاکٹر شائستہ کے پاس کوئی خبر نہیں تھی..... ہمیشہ کی طرح وہ مجھے جلی کٹی سنانے لگی..... ''فریال کا مجھ سے کیا پوچھتے ہو.....''

میں نے ضبط سے کام لیا..... ''ٹکٹ ابھی تک تمہارے پاس ہیں.....''

''ظاہر ہے..... اس کا پتا ہی کچھ نہیں تو کسے بھیجوں اور کہاں.....''

میں نے کہا..... ''اس نے ویزا کے لیے اپلائی بھی نہیں کیا۔''

''کمال ہے..... ہر بات مجھ سے پوچھ رہے ہو جیسے میں لندن میں نہیں..... اسلام آباد میں ہوں..... تمہاری اس عائشہ نے کچھ نہیں بتایا؟''

میں نے کہا..... ''میری اس سے بات نہیں ہوئی.....''

''ہاں..... تمہیں ضرورت بھی کیا ہے زیادہ پریشان ہونے کی..... کبھی کبھی فرصت ملی تو مجھے فون کرلیا..... کتنا ایزی لے رہے ہو تم فریال کے معاملے کو..... وہی بے وقوف تھی کہ زندگی خراب کی اپنی..... تم جیسے شخص کے لیے.....''

میں نے کہا..... ''ڈاکٹر شائستہ..... تم حد سے بڑھ رہی ہو..... آخر کیا کروں میں..... اس کے فراق میں خودکشی کرلوں..... ہر وقت دھاڑیں مار کے روتا رہوں یا کپڑے پھاڑ کے پاگلوں کی طرح نکل جاؤں گھر سے.....''

وہ چیخ کے بولی...... "کیوں؟...... اسے تلاش کرنے کے لیے نہیں جاسکتے؟ اسلام آباد کیا لندن سے بھی دور ہے؟...... اور گجرات تو راستے میں پڑتا ہے...... لیکن تمہیں ست بدھائی کے چکروں سے فرصت ملے تب نا...... فریال کے بغیر کون سے کام اپ سیٹ ہیں...... آنا ہوگا تو خود آجائے گی جھک مار کے...... تم اپنے ترقیاتی منصوبے کیسے چھوڑ سکتے ہو......" اس نے فون بند کر دیا۔

ڈاکٹر شائستہ کی بات پر مجھے غصہ نہیں آیا...... سوچنے پر مجبور کر دیا...... مجھے شدت سے احساس ہوا کہ فریال کے لیے میری بے قراری میں پہلے جیسی شدت اور تڑپ نہیں رہی...... اس کا جانا میرے لیے ایک حادثہ تھا...... دیگر حادثات کی طرح...... شاید حادثات کے ہجوم میں اس کی سنگینی گم ہوگئی تھی یا پیچھے چلی گئی تھی...... میں نے محسوس کیا کہ اپنے جذباتی طرز عمل سے میں نے دوسروں کو یہ سوچنے کا موقع دیا کہ دیگر مسائل کے مقابلے میں میرے لیے فریال کے مسئلے کی اہمیت زیادہ نہیں ہے۔

یہی شکایت فریال کو مجھ سے پیدا ہوگئی تھی...... اس نے مجھے مجبوری کی بہت رعایت دی لیکن ایک حد پر جا کے وہ خود مجبور ہوگئی کہ احتجاج کرے اور اپنی اہمیت کا احساس دلائے...... لگی لپٹی رکھنا اس کی عادت اور فطرت کے خلاف تھا...... اس نے صاف کہا کہ میری ترجیح میں ست بدھائی کے ترقیاتی منصوبے اور دیگر مسائل اوپر آگئے ہیں اور وہ اس لیے سب سے اہم نہیں رہی کہ اس نے خود کو میرے لیے آسان حاصل بنا لیا ہے۔

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا...... یہ حقیقت اپنی جگہ ناقابل تردید تھی...... کون عورت یہ سننا پسند کرے گی کہ روٹی کپڑا اور مکان اس کے عشق سے زیادہ اہم ہیں...... جب تک فریال کے اور میرے درمیان دوری تھی اور سلطان کی رقابت کی خلیج حائل تھی میری تڑپ اور طلب کچھ اور تھی...... اس کی جگہ آج ایک اعتماد اور اطمینان نے لے لی تھی کہ فریال کے اور میرے درمیان کوئی دوری یا مجبوری حائل نہیں...... زندگی اپنی ہے اور محبت......

فریال کے چلے جانے سے پہلے صدمہ بھی ہوا پریشانی بھی ہوئی اور شرمندگی بھی لیکن جیسے ہی یہ اندازہ ہوا کہ مجھے چھوڑ کے وہ واپس لندن جارہی ہے تو مجھے ایک اطمینان حاصل ہوگیا کہ وہ محفوظ ہے اور اسے واپس لانا مشکل ہوگا ناممکن نہیں...... تاہم فریال کے لیے میرا یہ اطمینان بھی توہین محبت کے زمرے میں آتا تھا...... اس کی تو خواہش ہوگی کہ میں دیوانہ وار اس کے پیچھے جاؤں...... ساری دنیا کو بھلا کے دوڑوں...... سر کے بل جاؤں...... اسے یقین دلاؤں کہ تو جو نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے...... نہ میری زندگی کا کوئی مقصد نہ جینے کی خواہش...... ایسا ہی پہلے کہتا رہا تھا...... اب نہیں کہتا تھا...... روٹھ کر بھی فریال نے مجھے موقع ضرور دیا کہ میں اسے منالوں...... مگر میں نے اس میں بھی دیر کر دی تھی......

دوسری طرف نور جہاں کی خبر مفقود تھی...... کچھ پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ وہ کون سی دنیا میں ہے...... میرے خوف سے مغلوب ذہن نے یہ فرض کر لیا تھا کہ جرم بے وفائی کی سزا میں وہ تصویر حسن وشباب اپنے شوہر وآقا کے ہاتھوں ایک بے عزت...... بد صورت اور المناک موت سے دو چار ہوئی...... اس کا سفر حیات حسن وشباب کی منزل پر تمام ہوا...... لیکن راجا کے دلائل نے میرے یقین کو متزلزل کر دیا...... اکبر خان ایسا غیرت مند اور حقیقی شوہر ہوتا تو نور جہاں کی یوں نمائش نہ کرتا...... اسے سامان تشہیر بنا کے ساتھ نہ لیے پھرتا، رشوت کے طور پر سکہ رائج الوقت کی جگہ استعمال نہ کرتا اور کامیابی کی سیڑھی نہ بناتا۔

اس میں نہ کوئی شک کی بات تھی اور نہ مجھے اپنی کمزوری کا اعتراف کرنے سے انکار تھا کہ نور جہاں نے کسی خوئے بد کی طرح میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو سلب کر رکھا تھا...... اس نے مجھے اپنی طلب سے اتنا مجبور اور بے بس بنا دیا تھا کہ مجھے اپنے بس میں کر لیا تھا...... لیکن یہ بھی غلط نہ تھا کہ ہم سب اس سے فائدہ حاصل کر رہے تھے۔

نور جہاں کی مجبوری میں تھا...... مجھے حاصل کرنے کے لیے وہ اب مختلف انداز اپنا رہی تھی...... ہر بار جب وہ مجھے طلب کرتی تھی تو اس کے پاس دشمن کے قلعے کے اندر کی کوئی اطلاع...... کوئی خبر یا ہمارے لیے کوئی وارننگ ہوتی تھی...... وہ صاف کہتی تھی کہ فون پر کچھ نہیں...... تم آؤ گے تو ایک خاص اور اہم بات بتاؤں گی...... وہ جھوٹ نہیں کہتی تھی...... خود مجھے اس کے ساتھ شب بسری کے لیے اسی بہانے کی آس ہوتی تھی...... میں جاتا تھا اور کسی انتہائی اہم انکشاف کے ساتھ واپس آتا تھا۔

اب وہ گم تھی تو انکشافات کا یہ سلسلہ بھی نہیں رہا تھا...... باقی سب لوگ جو اسے اچھا نہیں سمجھتے تھے اور میرے اس سے رابطے کو خطرناک بھی قرار دیتے تھے کسی حد تک اس کے احسان مند تھے...... تسلیم کرتے تھے کہ یک طرفہ طور پر اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کے اس نے متعدد مواقع پر ہماری مدد نہ کی ہوتی تو ہم بے خبری میں مارے جاتے۔

وہ اچھی طرح یہ بات سمجھتی تھی کہ اس سے محبت کرنا تو خیر ناممکنات میں تھا...... وہ میرے قریب رہنے کی خواہش کرے تو

حالات اسے ناممکن کر دیں گے...... اسے ست بدھائی میں کوئی نہیں رہنے دے گا کیونکہ اسے عزت دار نہیں سمجھا جاتا...... اس کے باوجود وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کے چوری چھپے مجھ سے ملتی رہی اور اس خطرناک کھیل کا انجام وہی ہوا جو متوقع تھا۔

آج یہ جاننے کے لیے کسی کو فرصت نہ تھی کہ نور جہاں آخر کہاں ہے اور کس حال میں ہے...... زندہ ہے کہ مرگئی...... یہ جنگ کی اخلاقیات کا سبق ہے...... دشمن کے علاقے میں ایسے جاسوس گرفتار ہو جائیں تو انہیں سزائے موت ہو جاتی ہے لیکن ان کی موت پر آنسو بہانا تو درکنار ان کو اپنا کہنے والا کوئی نہیں ہوتا...... انہیں اپنے بھی پہچاننے سے انکار کر دیتے ہیں۔

غنی سارا دن الگ معروف رہا تھا۔ اس نے سیکیورٹی چیف بلکہ ست بدھائی کی ریاست کے وزیر داخلہ کا قلمدان سنبھال رکھا تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ صرف مخلص ہی نہیں ذہین اور محنتی بھی تھا...... اس نے حویلی کے اندر اور باہر حفاظتی انتظامات کو مزید بہتر بنا کے مجھے رپورٹ دی...... میرے سر میں درد تھا...... یہ تھکن سے زیادہ جذباتی دباؤ کا نتیجہ تھا...... اس کا اثر سب پر تھا چنانچہ شہناز کی ذمے داری بڑھ گئی تھی...... اپنے علاوہ وہ سب کو دیکھ رہی تھی...... مجھے اس نے مشورہ دیا تھا "آرام کرو...... سوچو مت......"

میں نے کہا...... "نہ سوچنے کیلئے مجھے کیا کرنا چاہیے؟ اپنا دماغ نکال کے آپ کے حوالے کر دوں کہ فی الحال فرج میں رکھیں...... جب مجھے ضرورت ہوگی نکال کے استعمال کرلوں گا......"

"چلو تم نے یہ تو مانا کہ دل ہے...... عام خیال یہ ہے کہ تیرے سینے میں دل نہیں تیر ہے......"

"اگر فریال ایسا کہتی ہے تو ٹھیک ہی ہوگا...... پولیس رپورٹ کے مطابق تمہارا دل اسی نے چرایا تھا...... آخری بار......"

میں نے کہا...... "شہناز...... ایسی کوئی دوا نہیں ہے......"

"دوا کا نام مت لینا...... سب کو بتا دیا ہے میں نے کہ نیند نہیں آتی تو جاگتے رہو...... رات بھر روتے رہو اور دن بھر کچھ نہ کھاؤ...... میں نہ کوئی دوا دوں گی نہ کسی کو کھانے دوں گی...... سب کو عادی بنانے کا الزام مجھ پر آئے گا۔"

"میرے سر میں سخت درد ہے ڈاکٹر......"

"فطری بات ہے...... چوٹ لگنے سے درد تو ہوتا ہے...... ٹھیک ہو جائے گا...... کافی پیو...... آرام سے لیٹ کے کوئی کتاب پڑھو...... ٹی وی دیکھو...... اور خیالات سے مت ڈرو...... دماغ کو پریشان ہونے دو...... سوچنے دو جو سوچنا چاہے...... کب تک سوچے گا آکر...... تھک کے بیزار ہو جائے گا......"

"آپ کے مشورے کا شکریہ...... آپ جاسکتی ہیں...... راجا صاحب کو دیں یہ قیمتی مشورہ...... وہ حکم سمجھ کے قبول کرسکتا ہے......"

"مشورہ میں سب کو دے چکی ہوں...... سب مجھ سے خفا ہیں...... لیکن مجھے بالکل پروا نہیں۔"

اس کے جانے کے بعد پہلے ریشم کافی لے کر آئی...... اس نے کچھ ڈرتے ڈرتے کہا...... "سر میں کم...... آؤٹ اسٹینڈنگ......"

میں نے کہا...... "کون کھڑا ہے باہر......"

"مسٹر عبدالغنی سر...... ہی سے...... ٹاک ویری اہم...... ورنہ ہم نو ڈسٹرب...... یور اجازت لیک...... ہی ٹیل می......"

میں نے کہا...... "بس مس ریشم...... اتنی انگریزی کافی ہے...... آپ جائیں اور غنی کو اندر بھیج دیں۔"

غنی نے اندر آکے سلام کیا...... "سر...... میں نے کچھ انتظامات کیے ہیں...... آپ کی منظوری چاہیے۔"

میں نے کہا...... "کس قسم کے انتظامات؟"

وہ بولا...... "حفاظتی انتظامات سر...... اضافی......"

میں نے کہا...... "یار کچھ خدا پر بھی بھروسا کرو۔"

"وہ اپنی جگہ سر......" غنی نے ایک کاغذ میرے سامنے رکھ دیا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا...... "یہ ہے حویلی کا نقشہ...... اور یہ ہے ست بدھائی کی طرف آنے والے ہر راستے کی پوزیشن۔"

میں نے کہا "یہ لال دائرے کیا ہیں...... اور یہ نیلے دائرے......"

"یہ سیکیورٹی گارڈ ہیں سر......" اس نے بتایا...... "جو پہلے سے موجود تھے ان کو آپ نیلے دائرے سے دیکھ رہے ہیں۔ یہ لال دائرے نئی پوزیشن کی نشاندہی کرتے ہیں...... حویلی کی طرف آنے والے راستے پر......"

مجھے اس کی بات کرنے کے پر اعتماد انداز نے حیران کر دیا۔ "غنی...... میں نے تمہیں منظوری کا پابند کبھی نہیں کیا۔"

اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ "یہ چار بندے کچھ فاصلے سے ہر راستے پر نظر رکھیں گے...... ان کے پاس موبائل فون ہیں ابھی لیکن میں چاہتا ہوں ان سب کو ایک وائرلیس سسٹم سے کنکٹ کر دوں...... یہ سب آپس میں اور مجھ سے یا آپ سے براہ راست بات کرسکیں۔

میں نے کہا...... ''اگر چاہتے ہو تو ضرور کرو۔''

اس نے کہا...... ''یہ چار آدمی ان کے علاوہ ہیں...... یہ حویلی کے چاروں طرف آدھا کلومیٹر کے فاصلے پر گشت کریں گے...... وہ ایک دوسرے سے آدھا کلومیٹر کا فاصلہ رکھیں گے اور چاروں طرف آدھا کلومیٹر کے دائرے میں ہر قسم کی نقل و حرکت پر نظر رکھیں گے...... اس طرح ہر گارڈ ایک کلومیٹر کے دائرے میں......''

میں نے کاغذ ایک طرف کر دیا...... ''چھوڑو یہ سب...... تمہاری کارکردگی کی آزمائش کے لیے ایک اور مسئلہ ہے چیف......''

وہ سوالیہ نشان بنا گیا...... ''وہ کیا سر......''

''اپنے شعبہ جاسوسی و سراغرسانی کی مدد سے پتا چلاؤ کہ بھارت میں کیا ہو رہا ہے؟''

''بھارت میں؟''

''میرا مطلب تھا...... رانا صاحب کے رانا پور کے رانا محل میں ہمارے خلاف اب کیا سازش ہو رہی ہے...... اپنا کوئی جاسوس اندر بھیجو یا اندر سے کسی کو پکڑو...... خرید لو کسی لالچی نمک حرام کو......''

اس نے باہر کی طرف دیکھا اور پھر اٹھ کر دروازے تک گیا...... اپنا اطمینان کر لینے کے بعد وہ پھر سامنے کھڑا ہو گیا......

''ایک ذریعہ ہے سر...... لیکن ریشم کو پتا چلا تو وہ مار دے گی مجھے......''

میں نے ہنس کے کہا...... ''وہ مارتی ہے تمہیں۔''

اس نے اقرار میں سر ہلایا...... ''جو بھی زیر دست ہو مارتا ہے سر...... ایک لڑکی ہے جو وہاں کام کرتی ہے...... رانا کے منشی کی بہو ہے۔''

''تمہارا کیا تعلق ہے اس سے؟''

''پہلے تھا سر...... شادی کی بات بھی چلی تھی...... اس کے باپ نے کہا کہ آوارہ گرد ٹرک ڈرائیور جس کا نہ گھر بار ہے نہ ٹھکانا...... پتا نہیں چرس اسمگل کرتا ہے...... یا ہیروئن...... کسی دن پکڑا جائے گا یا مارا جائے گا...... اس نے صاف انکار کر دیا......''

''تم اس سے شادی کرنا چاہتے تھے۔''

''جو آپ کا مطلب ہے سر...... ایسی بات نہیں تھی...... مجھے بعد میں پتا چلا کہ چکر اس نے چلایا تھا...... آپ میرے باپ کو جانتے تھے...... وہ اکبر خان کا چھوٹا بھائی تھا۔''

میں نے کہا...... ''ہاں...... میں نے دیکھا تھا اسے...... میرے سامنے ہی مارا گیا تھا......''

''وہ اپنے زمانے میں بڑا گبرو جوان تھا...... اکھاڑے میں زور کرتا تھا...... آس پاس کے علاقے میں کبڈی کا چیمپئن تھا...... عورتیں اس پر مرتی تھیں...... وہ رانا کا ملازم ایک عورت کو لے کر بھاگ گیا تھا...... بعد میں پکڑا گیا تھا۔''

میں نے کہا...... ''یہ سب مجھے معلوم ہے...... پھر وہ مجذوب ہو گیا تھا...... تشدد کے نتیجے میں اس کے سر پر چوٹ لگی تھی۔''

''اس سے پہلے وہ دنگل میں جاتا تھا یا کبڈی کھیلتا تھا تو میں بھی اس کے ساتھ رہتا تھا...... وہ مجھے اپنا جانشین بنانا چاہتا تھا...... جوان ہونے تک میں نے کشتی کے داؤ پیچ سیکھے اور ایسے ہی چلتا رہتا تو اس کی جگہ میں ضرور لیتا...... لیکن اسے ایک عورت بھگا کر لے گئی...... اس کے بعد ہم مشکل میں پڑ گئے...... اس زمانے میں خاتون نے مجھے دیکھا تھا......''

''کس خاتون نے......''

''وہ...... اس کا یہی نام تھا...... میں ذرا شوقین مزاج تھا...... کچھ دن اس کے ساتھ کبھی دل لگی کی...... وہ پیچھے پڑ گئی...... اس کا باپ میرے باپ کا دشمن تھا...... رانا کا خاص بندہ جو ہوا...... اس نے مجھے انکار ہی کرنا تھا...... بس چلتا تو وہ مجھے قتل کرا دیتا لیکن میں بعد میں یہاں سے نکل گیا تھا...... پھر مجھے ریشم مل گئی تو اس نے ساری بری عادتیں چھڑا دیں۔''

میں نے کہا...... ''تو اب تم نے انہی خاتون محترم سے پھر رابطہ کیا اور اس نے تمہیں مایوس نہیں کیا...... یہی بات ہے نا......''

وہ جھینپ کر مسکرانے لگا...... ''ضرورت پڑنے پر گدھے کو باپ بنانا پڑتا ہے...... سر......''

''یعنی تم اسے بے وقوف بنا رہے ہو پھر سے؟''

''نہ بنے وہ...... شوہر کی وفادار ہوتی تو جواب میں گالیاں سناتی جوتے مارتی مجھے۔''

میرا ذہن خود بخود نور جہاں کی طرف چلا گیا...... محمود و ایاز اس معاملے میں ایک ہی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں...... جو فائدہ میں نے نور جہاں سے اٹھایا وہی خاتون سے غنی اٹھا رہا تھا...... جیسے میں فریال کی بدگمانی سے ڈرتا تھا ایسے ہی ریشم کی ناراضی کا خوف غنی کو تھا...... میں نے سوچا کہ اسے خبردار کر دوں...... کہ دیکھو فریال یہ برداشت نہیں کر سکی...... مجھے چھوڑ کے چلی گئی...... کہیں ایسا نہ ہو کہ ریشم کو پتا چل جائے...... اور یہ ممکن نہیں کہ پتا نہ چلے...... عشق اور مشک کی بات مشہور ہے کہ انہیں چھپایا نہیں جا سکتا مگر محبت کرنے والی عورت کی فطرت میں ایک چھٹی حس پیدا ہو جاتی ہے جو راڈار کی

طرح کام کرتی ہے...... اسے فوراً خبردار کر دیتی ہے کہ آس پاس خطرہ موجود ہے...... رہی ضرورت کی بات تو کوئی عورت کسی مرد کے اس خیال سے کبھی اتفاق نہیں کر سکتی کہ وہ اپنا مطلب نکالنے کے لیے پیار کا جھوٹا ناٹک کر رہا ہے...... اسے جھوٹا تعلق ہی برداشت نہیں ہوتا...... ایسا نہ ہو ریشم تمہیں مارنے کے بجائے جان سے مار دے۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں اپنے خیالوں میں بھٹک کے کہیں اور نکل گیا ہوں...... غنی نہ جانے کیا کہہ رہا تھا۔

میں نے اس کے خاموش ہوتے ہی کہا...... ''تو کیا معلوم ہوا تمہیں اس خاتون سے......''

وہ حیرانی سے مجھے دیکھنے لگا...... ''میں نے سب بتایا سر......''

میں نے کہا...... ''معاف کرنا میرا دھیان کہیں اور تھا۔''

وہ بولا...... ''رانا صاحب اپنے محل میں نہیں ہیں...... شہر گئے ہیں اور وکیل کل عدالت کھلنے پر ان کی طرف سے ضمانت کی درخواست دے گا...... پھر وہ گھر آ جائیں گے۔''

میں نے کہا...... ''اگر ضمانت ہو گئی......''

''یہاں ان کا بڑا بیٹا زوہیب ہے...... اس نے ابھی سارے معاملات کو روک دیا ہے...... وہ پڑھا لکھا اور سمجھدار ہے......''

میں نے کہا...... ''سوچتا وہ بھی باپ کی طرح ہے۔''

''باپ کے پاس نہ عقل ہے نہ تعلیم...... بس غرور ہے...... زوہیب نے اب معاملات کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے...... کہتا ہے کہ جیل جانے کی نوبت تو آ گئی...... عزت خاک میں مل گئی...... اپنی ہی بیٹی نے دشمنوں کے حق میں بیان دے دیا...... شہباز کا کیس بہت خراب ہو گیا ہے...... جب تک یہ مسئلے حل نہ ہو جائیں اور کوئی ایسا قدم نہیں اٹھانا ہے کہ صورت حال قابو سے باہر ہو جائے......''

میں نے کہا...... ''یہ تو اچھی خبر ہے...... کہ فی الحال کوئی خطرہ نہیں......''

''دشمن کی طرف سے غافل نہیں ہونا چاہیے سر...... اور باپ کے مقابلے میں بیٹا زیادہ خطرناک دشمن ہے......''

اس کی بات جاری تھی کہ باہر سے فاروقی کی آواز سنائی دی...... پھر وہ اندر آ گیا...... غنی نے اسے سلام کیا اور کمرے سے نکل گیا...... فاروقی اپنے ساتھ فائلوں کا ڈھیر اٹھا لایا تھا...... اس نے غنی کو حکم دیا کہ وہ گاڑی سے ساری فائلیں نکال لائے......

''پھر وہ میرے سامنے بیٹھ گیا......'' میں عدالت سے فارغ ہوا ہی تھا کہ تمہارا حکم موصول ہوا...... میں نے کہا کہ خدا خیر کرے۔

میں نے کہا...... ''تو کس حکم کی بات کر رہا ہے؟''

''کیوں منگوائی ہیں ساری فائلیں...... میں آفس گیا...... کوئی سیکریٹری تو ہے نہیں...... ایک نوجوان وکیل کو اسسٹنٹ رکھ لیا ہے...... اس نے ساری فائلیں گاڑی میں رکھیں...... میں نے کہا کہ آج چھٹی کرو...... تالا لگا کے بھاگ جاؤ تم بھی یا جو آئے اسے بھگا دو...... کہہ دو فاروقی صاحب کا تو دماغ چل گیا ہے...... پاگل خانے میں ہیں...... آئی سی یو میں پڑے ہیں......'' وہ قہقہہ مار کے ہنسا۔

میں سمجھ گیا کہ فائلیں راجا نے منگوائی ہوں گی...... ''ایسی کوئی جلدی بھی نہیں تھی......''

''جلدی مجھے تھی یار...... میری بیوی کو یرغمال بنا رکھا ہے تم نے...... وہ سچ مچ اسے میکہ سمجھنے لگی ہے۔''

میں نے کہا...... ''میکے کا زور چلتا تو دوسری شادی کیسے ہوتی تیری......''

اس کی ساری شوخی ختم ہو گئی...... ''تم لوگ اسے بھڑکا رہے ہو۔''

میں نے کہا...... ''اس معاملے میں ہم تیری طرف داری نہیں کر سکتے تھے۔''

یہ آخری بات راجا نے بھی سنی جو اندر آ کے ہمارے سامنے بیٹھ گیا تھا۔ ''اپنے فاروقی صاحب...... ایک افواہ سنی ہے میں نے...... مریم کے بارے میں۔''

فاروقی چونکا...... ''کیسی افواہ......؟''

''کیا اس کی موت زہر دینے کا نتیجہ تھی......؟''

فاروقی ایسے اچھلا جیسے کسی نے اسے بھڑ نے ڈنک مار دیا ہو...... ''یہ کس نے کہا ہے۔''

''صحافی اپنی معلومات کا ذریعہ بتانے کے پابند نہیں...... نہ قانونی طور پر...... نہ اخلاقی طور پر...... یہ صحیح ہے یا غلط......''

''کیا تم نے اسپتال والوں سے پوچھا تھا۔'' فاروقی گرم ہو گیا۔

''میں نے کسی سے نہیں پوچھا......'' راجا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''پھر کیا فرشتے آ کے یہ بات بتا گئے۔''

راجا نے کہا...... ''کون سی بات؟ فاروقی صاحب...... اگر فرشتے بتائیں گے تو وہ بات غلط نہیں ہوگی...... وہ افواہیں نہیں پھیلاتے...... میں نے کہا کہ یہ افواہ سنی ہے میں نے......''

"کوئی اسپتال کا ریکارڈ دیکھنے گیا تھا...... مجھے پتا چلا ہے۔"

"کون گیا تھا...... یہ نہیں پتا چلا......" راجا واضح طور پر جارحانہ موڈ میں نظر آتا تھا...... "اور کیوں گیا تھا...... جب ایسی بات ہی کچھ نہیں۔"

"جو ایسی بات کرتا ہے بکواس کرتا ہے۔"

راجا نے دروازے کی طرف دیکھا...... "یعنی مریم کی موت حادثاتی تھی...... اس کے گرنے سے پرابلم پیدا ہوئی تھی...... کوئی پیچیدگی......"

اس وقت لیلیٰ بھابی اندر آ گئی...... اس نے راجا کا پورا سوال سنا اور ہاتھ باندھ کے کھڑی ہوگئی...... فاروقی کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے بدلا......

"کیا بات ہے......" اس نے بیوی سے پوچھا...... "تم کیوں آئی ہو۔"

"کیوں ؟...... میرا داخلہ ممنوع تھا اس کمرے میں...... باہر تو نہ کوئی گارڈ تھا نہ روکنے والا نوٹس تھا۔"

"بکواس بند کرو اور جاؤ...... ہم ضروری بات کر رہے ہیں۔"

راجا نے کہا...... "فاروقی صاحب...... میرا سوال آپ نے سنا یا دہراؤں؟"

لیلیٰ بھابی نے شوہر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا...... "ضرور سنا ہوگا...... میں نے بھی سنا...... اور اب میں جواب لیے بغیر نہیں جاؤں گی......"

فاروقی غصے میں کھڑا ہوگیا...... "اوہ...... تو مجھے ٹریپ کیا گیا ہے...... یہ ایک سازش تھی......"

میں نے کہا...... "کیسی سازش فاروقی......"

"میں سب سمجھتا ہوں...... راجا تیری دوستی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے۔"

راجا نے کہا...... "میں نے تم سے ایک سیدھا سوال کیا ہے...... جو میں نے سنا ہے وہ افواہ ہے یا حقیقت...... جھوٹ ہے یا سچ۔"

وہ مزید چراغ پا ہوا...... "میں اس فضول سوال کا جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا...... تمہارا کیا ہے...... کل یہ سوال لے کر سامنے کھڑے ہو جاؤ گے کہ تمہاری وکالت کی ڈگری اصلی ہے یا جعلی...... ہم نے افواہ سنی ہے کہ تمہارے باپ نے تمہاری ماں سے بعد میں شادی کی تھی...... تم پہلے پیدا ہوگئے تھے۔"

"لاحول ولا قوۃ...... فاروقی...... آخر تیری پرابلم کیا ہے...... کس بات پر اتنا طوفان کھڑا کر رہا ہے......" میں نے بھی بگڑ کے کہا۔

"میں دیکھ رہا ہوں نواب رفیق احمد شیرازی صاحب...... طوفان کھڑا کیا جا رہا ہے...... اور پرابلم میری نہیں...... تمہاری ہے...... تمہارا میرے ساتھ رویہ بدل گیا ہے...... میری وہ حیثیت نہیں رہی جو پہلے تھی...... سب نے بے رخی کا انداز اپنا لیا ہے...... میں آتا ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے میں بن بلایا مہمان ہوں......"

راجا نے کہا...... "چور کی داڑھی میں تنکا......"

وہ چیخ کے بولا...... "کیا چوری کی ہے میں نے راجا صاحب...... اور یہ وہم ہے میرا تو وہاں کیا ہوا تھا...... جب کورٹ میں گل کے سامنے میں بھی موجود تھا لیکن اس نے ایک نئے اور اجنبی شہزاد مرزا کو اپنا وکیل کیا۔"

راجا نے کہا...... "گل کے معاملات اس کے ساتھ ختم ہوئے...... ویسے بھی وہ خود مختار تھی۔"

"وہ تمہاری رائے پر چلتی تھی...... وہی کرتی تھی جو تم کہتے تھے...... اس کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا...... تمہاری وجہ سے ہوا......"

اب معاملہ میری برداشت سے باہر ہوگیا...... "فاروقی ...... بات کو اتنا بڑھانے کی کیا ضرورت ہے...... میں سمجھتا ہوں کہ ست بدھائی کے اور میرے یا ہم سب کے قانونی معاملات بہت پیچیدہ ہوتے جا رہے ہیں...... تم دوست ہو...... ایک وقت تھا جب تمہاری مدد اس جاگیر اور حویلی کا قبضہ حاصل کرنے میں بہت معاون ثابت ہوئی...... لیکن تم بہرحال کارپوریٹ معاملات کے ماہر ہو...... ہمیں دیوانی سے زیادہ فوجداری مقدمات کے ماہر کی خدمات درکار ہیں...... ہمیں ایک ایسی لیگل فرم کی ضرورت ہے جو ہمارے تمام معاملات سنبھال سکے۔ کنٹریکٹ پر...... اور اس کے لیے مجھے شہزاد مرزا موزوں نظر آتا ہے۔"

فاروقی کا رنگ آہستہ آہستہ اڑ گیا...... میری بات ختم ہونے کے بعد بھی اسے سنبھلنے میں چند سیکنڈ لگے...... "شہزاد مرزا...... وہ کیا ہے...... جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے اسے......"

راجا نے کہا...... "کبھی تم بھی نئے تھے۔"

فاروقی کی ساری پھوں پھاں ختم ہوگئی تھی...... اسے اندازہ ہوگیا کہ تیر کمان سے نکل چکا ہے......

"کیا تم سمجھتے ہو...... کسی کیس میں میری وجہ سے نقصان ہوا...... میں نے صحیح وکالت نہیں کی۔"

میرے جواب دینے سے پہلے راجا بولا...... "بس...... اکبر خان کے کیس میں تم نے کچھ نہیں کیا۔"

"اس میں خود تم پیچھے ہٹ گئے۔"

"ہم اس لیے پیچھے ہٹے کہ ہماری پوزیشن کو تم نے بہت کمزور بتایا...... تم نے کہا کہ یہ دیوانی مقدمہ ہے...... ہم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے...... فاروقی صاحب...... کیس موکل نہیں...... وکیل لڑتے ہیں...... سیاہ کو سفید اور جھوٹ کو سچ وہ بناتے ہیں اور ثابت کرتے ہیں۔"

میں نے کہا...... "دیکھو...... تعلقات اپنی جگہ...... یہ کاروباری معاملات ہیں...... ہو سکتا ہے شہزاد مرزا بھی ہماری توقعات پر پورا نہ اترے...... فائدہ نہ ہو تو ڈاکٹر یا وکیل بدلنا کوئی غلط بات نہیں۔"

"لیکن یہ جو تم نے میرے ساتھ کیا۔" وہ سخت بے عزتی کے احساس سے مجروح لہجے میں بولا...... "مجھے کچھ نہیں بتایا اور فائلیں منگوا لیں...... تمہارا کیا خیال ہے میں انکار کرتا......" "میں اب یہاں ایک منٹ نہیں ٹھہر سکتا...... "چلو لیلیٰ......"

لیلیٰ بھابی نے اپنی جگہ سے جنبش نہیں کی...... "پہلے اس سوال کا جواب تو دے دو...... جو راجا نے پوچھا تھا۔"

وہ گرم ہو کے بولا "مجھے کوئی ضرورت نہیں کسی کے سوال کا جواب دینے کی۔"

"لیکن مجھے جواب چاہیے......" لیلیٰ بھابی نے کہا۔

وہ دھاڑا...... "لیلیٰ...... کیا تم بھی...... ان سے مل گئی ہو...... میری ذلت پر تم کو پہلے واک آؤٹ کرنا چاہیے تھا...... ہر تعلق ختم کر کے......"

"میرے تمہارے تعلق کا دارومدار اس سوال کے جواب پر ہوگا...... میں بھی جاننا چاہتی ہوں کہ سچ کیا ہے۔"

"میں تمہیں بتا چکا ہوں سچ کیا ہے۔" وہ ایک دم ہنسا...... "اس کے باوجود تم یہاں رکنا چاہتی ہو تو تمہاری مرضی...... بعد میں چلے گی میری مرضی۔"

"مجھے دھمکی مت دو......" لیلیٰ بھابی چلائی......

وہ ذرا سی دیر کے لیے رکا...... "میں تمہیں سوچنے کے لیے وقت دے رہا ہوں...... انتخاب تمہارا ہے...... یہ گھر یا میرا گھر......"

یہ ہر مرد کی آخری چال ہوتی ہے...... جب اس کے پاس نہ کوئی دلیل ہوتی ہے نہ اپنی بالادستی قائم رکھنے کا کوئی اور طریقہ تو وہ یہی ترپ کارڈ استعمال کرتا ہے اور نوے فیصد حالات میں بازی جیت لیتا ہے۔

لیلیٰ بھابی نے اپنے شوہر نامدار کو کڑی کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح جاتے دیکھا اور شکست خوردہ...... مایوسی اور بے یقینی کا شکار کھڑی رہی...... فیصلے کی گھڑی اچانک آ گئی تھی...... اس کی بے بسی دیکھ کے مجھے ترس آ گیا...... اکیلی عورت خود کو کتنا کمزور محسوس کرتی ہے...... مرد اس کا جیون ساتھی کم محافظ زیادہ ہوتا ہے جو اسے ایک گھر کی چھت کا سایہ...... خوراک اور لباس سب فراہم کرتا ہے اور اعتماد دیتا ہے۔

میں نے راجا سے احتجاج کیا...... "یہ تو نے اچانک کیا بات چھیڑ دی......"

راجا کے سکون میں کوئی فرق نہیں پڑا...... "میں نے ایک سادہ اور آسان سا سوال کیا تھا...... ہاں یا نہیں کہتا کون سا مسئلہ تھا کیسے پتر......"

"لیکن اتنی جلدی کیا تھی یہ مسئلہ اٹھانے کی۔"

"مجھ سے لیلیٰ بھابی نے کہا تھا...... یہ سامنے کھڑی ہیں...... پوچھ لو۔"

لیلیٰ بھابی نے آہستہ سے سر ہلایا...... "غلطی میری تھی...... لیکن میں کیا کرتی...... جب شہناز سے بات ہوئی تو اس نے بھی کہا کہ بلیک میل ہونے کی ضرورت نہیں......"

"آپ نے اور کس کو بتایا ہے؟"

"اور...... رابعہ کو...... ایک بات تم جانتے ہو...... راجا کو معلوم ہے تو پھر شہناز یا گل سے چھپانے کی کیا ضرورت ہے...... انہوں نے کہا کہ سب کے سامنے بات کروا اپنے میاں سے...... ڈرو نہیں...... پھر شہناز نے راجا سے کہا اور راجا نے کہا...... فکر مت کرو...... ہم اس سے تمہارے سامنے پوچھیں گے۔"

میں نے کہا...... "اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔"

"کیا جواب نہ دینا لاجواب ہونے کا ثبوت نہیں ہے......" راجا بولا۔

میں نے کہا...... "ہے...... لیکن وہ نوٹس دے چکا...... اب تم کیا کرو گی لیلیٰ بھابی...... بال اس نے تمہارے کورٹ میں پھینک دی ہے......"

"کچھ نہیں...... میں کیا کر سکتی ہوں......" میرے لیے اس دباؤ کے ساتھ رہنا بھی مشکل تھا...... کیا میں یہاں نہیں رہ سکتی......؟

"بالکل رہ سکتی ہو......" میں نے کہا...... "اپنا گھر سمجھ کے ...... لیکن کیا تم اس شوہر کے بغیر بھی رہ سکتی ہو...... جس کے ساتھ رہنے کی تمہیں عادت ہوگی......"

وہ سوچ کے بولی.....''سچ کہوں دیور جی.....جب سے یہ بات ہوئی ہے.....وہ مریم سے شادی کرنا چاہتے تھے.....مجھے بتائے بغیر.....میں تو پہلے بھی کہتی رہی کہ اولاد تمہاری ضرورت ہے.....دوسری شادی کرلو.....پھر چوری چھپے یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی.....جس طرح اس کی موت ہوئی اور فاروقی نے بلاوجہ موردالزام ٹھہرایا.....مجھے بلیک میل کیا.....اس کے بعد میرا دل کھٹا ہوگیا ہے.....میرے جذبات بالکل وہ نہیں رہے جو پہلے تھے.....میں اس کی ہر جائز اور ناجائز مان سکتی تھی.....محبت میں.....لیکن.....''

لیلیٰ بھابی کے پاس اس سے زیادہ کہنے کی ہمت نہیں تھی.....وہ فاروقی پر یہ الزام عائد نہیں کرسکتی تھی کہ وہ اپنی بیوی سے ایک قتل کروانا چاہتا ہے.....اسے مجبور کررہا ہے کہ رفیق کو جسے وہ بڑے مان اور پیار سے دیور جی کہتی ہے.....زہر دے دو.....تاکہ ست بدھائی پر قبضے کی راہ ہموار ہوسکے.....رفیق نہیں ہوگا تو جاگیر اور حویلی کی مالک بنے گی رابعہ اور جب وہ تمام انتظامی مالی اور قانونی مسائل اس کو سونپ دے گی تو یہ سب اپنا ہوگا.....

میں نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا.....''بھابی.....آپ جائیں اور اسے سمجھائیں.....کچھ ٹھنڈا کریں.....بعد میں ہم بھی کوشش کریں گے۔''

لیلیٰ بھابی نے سر ہلایا اور باہر چلی گئی.....''تم کہتے ہو تو میں بھی بات کرکے دیکھ لوں گی.....لیکن مجھے امید کم ہے۔''

میں نے اس کے جانے کے بعد راجا کو پکڑا.....''یہ تو نے مجھ سے پوچھے بغیر اتنا بڑا اقدم اٹھالیا.....''

''پوچھنا کیا مطلب.....''

''میرا مطلب تھا مجھ سے مشورہ بھی نہیں کیا۔''

''ہم یہ فیصلہ اتفاق رائے سے کرچکے تھے۔'' راجا بولا۔

میں نے کہا.....''سوال یہ ہے کہ اب فاروقی کیا کرے گا.....''

''جواب یہ ہے کہ وہ اتنی آسانی سے ہار نہیں مانے گا.....اس نے ست بدھائی پر قبضے کا پلان مکمل کرلیا تھا.....''

میں نے کہا.....''یہ ایک نئی سچویشن ہے.....وہ اپنی بیوی سے مکمل اور غیر مشروط تابعداری کی توقع رکھتا تھا.....اس کی کامیابی کا انحصار لیلیٰ بھابی کے تعاون پر تھا.....''

راجا بولا۔''اب وہ کسی اور کا انتخاب کرے گا.....''

''اور کون ہے جو اس کا آلہ کار بن سکے.....'' میں نے کہا۔

''اس کی فکر ہم ابھی سے کیوں کریں.....کہ اس کی اگلی چال کیا ہوگی انگریزی میں کہتے ہیں کہ جب دریا آئے گا تو سوچیں گے کہ کیسے عبور کیا جائے۔''

میں نے کہا.....''اگلی بار کون سی نور جہاں ہوگی جو ہمیں پہلے سے ہوشیار کردے.....''

راجا نے مجھے غور سے دیکھا''تو اس کے لیے بھی دکھی ہے؟.....تیری دردناک حالت مجھ سے دیکھی نہیں جاتی.....آہ یہ تیری اکیلی جان اور اتنے دکھ.....گل کا صدمہ تو سب کو ہی ہے مگر تیرا دکھ نمبر دن فریال.....دکھ نمبر ٹو نور جہاں.....آخر تیرا کیا بنے گا لیکھے پتر.....''

میں نے کہا.....''راجا.....فریال ابھی تک لاپتا ہے.....اس نے لندن جانے کے لیے ویزا کی درخواست بھی نہیں دی۔''

''تجھے کیسے معلوم.....یہاں بیٹھے بیٹھے۔''

میں نے کہا.....''اس الو کی پٹھی کا فون آیا تھا.....ڈاکٹر غیر شائستہ کا.....اس نے مجھے سخت بے عزت کیا۔''

''ویسے تو عزت آنی جانی چیز ہے.....اور خاتون مذکور کی زبان سے تو ماشاءاللہ ویسے ہی کانٹے جھڑتے ہیں.....مگر تجھے ایسا کیوں لگا.....''

میں نے کہا.....''اس نے الزام لگایا مجھ پر کہ میں نے فریال کو برباد کرکے چھوڑ دیا اور اب مزے سے بیٹھا ہوں اپنی ریاست میں.....فکر ہوتی تو سب چھوڑ چھاڑ کے نکل کھڑا ہوتا اسے تلاش کرنے.....''

''یہ تو اس نے سچ کہا.....میں ایک سو ایک فیصد اتفاق کرنے پر مجبور ہوں ڈاکٹر غیر شائستہ سے.....''

''یعنی مجھے خود جانا چاہیے فریال کی تلاش میں۔''

''ابے الو کے پٹھے.....سور کے بچے.....نواب کے ٹٹو.....تو نہیں جائے گا تو اور کون جائے گا.....تیرا باپ.....''

''مگر یار.....اسلام آباد جیسی جگہ.....جہاں میں پہلے کبھی گیا نہیں.....اس کو صورت نام سے تلاش کرنا کوئی آسان ہے.....''

راجا اٹھا.....''آسان طریقہ بتاؤں تجھے.....فریال کی تصویر شائع کردے اخبارات میں کہ میری بلبل.....جب سے تم گئی ہو دن کا چین اور رات کی نیند چلی گئی ہے.....نگاہیں ہر طرف تمہاری صورت دیکھتی ہیں کہ شاید کوئی تم جیسی دوسری مل جائے.....تم لوٹ آؤ.....تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا.....''

میں نے کہا.....''بکواس نہیں مجھے مشورہ چاہیے۔''

''وہ بولا.....''وہی تو دے رہا ہوں.....''ایک اور زیادہ آسان طریقہ.....تو سلطان کو فون کر.....اسے بتا کہ فریال گم

گئی ہے.....وہ فریال کی تلاش میں دنیا کی خاک چھانتا رہا ہے.....زمین آسمان ایک کردے گا اور اسے تلاش کرکے تجھے مطلع کردے گا کہ تمہاری دائمی منگیتر اور متوقع زوجہ مل گئی ہے.....آپ خود لینے آئیں گے یا ٹی سی ایس سے بھیج دوں.....تجھے تکلیف کرنے کی کیا ضرورت ہے لیکھے پتر.....''

راجا کے پیچھے میں بھی باہر نکلا.....فارقی کی گاڑی ابھی تک گیٹ کے قریب کھڑی تھی.....فاروقی اندر بیٹھا تھا.....لیلیٰ بھابی باہر کھڑی اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کررہی تھی یا اس کی بات سمجھنے کی.....آواز صرف فارقی کو سنائی دیتی تھی.....لیلیٰ بھابی یہ نہیں چاہتی ہوگی کہ ان کا جھگڑا ایک پبلک ایشو بن جائے جس پر حویلی کے ملازمین بھی باتیں بنائیں۔

راجا سیدھا لان تک گیا جہاں رابعہ اور شہناز پہلے سے چپ بیٹھی تھیں.....چوتھی کرسی پر میں بیٹھ گیا تو شہناز نے پوچھا.....''یہ کیا ڈراما چل رہا ہے.....''

راجا بولا.....''زندگی ایک اسٹیج ہے اور ہم سب ایکٹر.....اور ہم سب تماشائی۔''

''فاروقی ایکٹر نہیں.....ری ایکٹر رہا ہے.....ایٹمی ری ایکٹر.....'' رابعہ نے کہا.....''لیلیٰ مجنوں لڑ رہے ہیں کزن.....''

میں آہ بھر کے کہا.....''کیا زمانہ آگیا ہے۔''

شہناز خفا ہونے لگی.....''سیدھی طرح بتاتے کیوں نہیں اندر کیا بات ہورہی تھی۔''

میں نے کہا.....''اندر ہم ایک سو فیصد قانونی مسئلے کو ڈسکس کررہے تھے.....'' میں نے کہا۔

''راجا بولا.....''وہ بعد میں جذباتی مسئلہ بن گیا تو ہمارا اس میں کوئی قصور نہیں۔''

''پہیلیاں مت بجھواؤ۔فارقی بڑے غصے میں نکلا تھا.....'' شہناز نے کہا.....

میں نے کہا.....''ہم نے اسے قانونی مشیر کی ذمے داری سے سبکدوش کردیا تھا.....وہ ناراض ہوگیا.....''

''میاں بیوی کے جھگڑے کی یہ وجہ نہیں ہوسکتی.....'' رابعہ بولی۔

میں نے کہا.....''وہ غصے میں جانے لگا تو اس نے بیوی کو نوٹس دے دیا کہ تم ابھی چلو میرے ساتھ.....آئندہ اسے اپنا ٹھیکہ کہا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا.....اس نے ہماری شان میں اور بھی بہت سے نازیبا الفاظ استعمال کیے جو میں دہرانا نہیں چاہتا.....''

راجا بولا.....''لیکن آپ اصرار کریں گی تو میں کان میں بتا سکتا ہوں.....''

میں نے کہا.....''اور کوئی عورت اپنے میکے والوں کی شان میں اس قسم کے الفاظ برداشت نہیں کرسکتی.....''

''مطلب یہ کہ تم صحیح بات نہیں بتاؤ گے کہ جھگڑا کس بات پر ہوا ہے.....'' شہناز نے خفگی سے کہا۔

راجا بولا.....''ہاتھ کنگن کو آرسی کیا.....ابھی آپ براہ راست سن لیں گی.....انگریزی میں.....ڈائریکٹ گھوڑے کے منہ سے.....''

میں نے کہا.....''مجھے یقین ہے کہ کچھ دیر میں مسٹر فاروقی ایک پریس کانفرنس سے خطاب فرمائیں گے.....اس کے بعد آپ لوگ سوالات کریں۔''

راجا بولا.....''ویسے تو میاں بیوی کے جھگڑے میں اقوام متحدہ کو بھی مداخلت کا حق نہیں.....''

خواتین باقاعدہ ناراض ہو کے اٹھ گئیں.....اس وقت فاروقی کے چلانے کی آواز آئی''جہنم میں جاؤ تم.....'' پھر گاڑی کا انجن غرایا اور وہ تیزی سے گیٹ کی طرف بڑھی.....لیلیٰ بھابی خفیف اور احساس ذلت سے دوبارہ کچھ دیر وہیں کھڑی رہی.....گاڑی نکل جانے کے بعد گیٹ پھر بند ہوگیا تو وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی شہناز اور رابعہ کی طرف گئی.....وہ اسے اپنے ساتھ لے کر اندر غائب ہوگئیں۔

مغرب کے بعد مجھے ابا نے طلب کیا.....میرا خیال تھا کہ وہ گزشتہ رات سے اب تک میرے غیر حاضر ہونے کا سبب پوچھیں گے لیکن وجہ کچھ اور نکلی.....

ابا نے کہا.....''فاروقی سے تمہارا اچانک جھگڑا کیوں ہوگیا۔''

میں سمجھ گیا کہ خواتین نے مسئلہ سپریم کورٹ کے سامنے رکھ دیا ہے.....اصل بات کا علم لیلیٰ بھابی کے علاوہ مجھے یا راجا کو تھا مگر خود لیلیٰ بھابی سمجھتی تھیں کہ ہم کچھ نہیں جانتے.....

میں نے کہا.....''جھگڑا تو کوئی نہیں ہوا.....''

''اسے تم نے قانونی مشیر کی حیثیت سے برطرف کردیا ہے.....''

میں نے کہا.....''اس کے سوا چارہ نہیں تھا.....وہ کارپوریٹ مقدمات کا وکیل ہے دیوانی یا فوجداری مقدمات میں وہ اتنا اچھا ثابت نہیں ہوا.....''

''وہ کون سی تم سے فیس لے رہا تھا۔''

میں نے کہا.....''یہی تو خرابی کی وجہ تھی.....ہم اسے کچھ کہہ نہیں سکتے تھے اور وہ اپنا سارا وقت ہمیں نہیں دے سکتا تھا.....ہم نے کنٹریکٹ کی بنیاد پر ایک لیگل فرم کی خدمات

حاصل کر لی ہیں...... جو کاروباری معاملات ہیں...... ان کا اثر ذاتی تعلقات پر نہیں پڑنا چاہیے۔"

ابا جی نے کچھ سوچ کے کہا...... "وہ کچھ اور کہتا ہے۔"

"میں چونکا...... "آپ کی اس سے بات ہوئی ہے؟"

"مجھے تمہارے قانونی مسائل اور کاروباری معاملات سے کیا...... وہ تو رابعہ نے مجھے بتایا...... کہ لیلیٰ نے شوہر کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا...... میں پہلے لیلیٰ سے بات کرتا لیکن وہ آئی ہی نہیں میرے سامنے......"

"فاروقی نے آپ سے کیا کہا......"

"اس نے تو بڑی عجیب بات کی...... کہنے لگا کہ تم نے اس کی بیوی کو ورغلایا ہے......"

"لاحول ولاقوۃ...... ایسی فضول اور واہیات بات پر آپ یقین کر سکتے ہیں......" میں نے کہا۔

"برخوردار...... تم نے بھی سنا ہوگا کہ دھواں وہیں سے اٹھتا ہے جہاں آگ ہوتی ہے...... آگ کے بغیر دھواں کیسا...... فاروقی پاگل ہے نہ وہ نشے میں تھا...... آخر کس بنا پر اس نے یہ بات کہی۔"

"آپ اس سے پوچھتے......"

"وہ کہتا ہے تم سے پوچھوں......" ابا جی نے خفگی سے کہا۔

"آپ مت پڑیں اس چکر میں......"

"کیسی باتیں کرتے ہو رفیق میاں...... ایک عورت کی زندگی داؤ پر لگی ہوئی ہے...... میں خاموش تماشائی بنا دیکھتا رہوں......" وہ مزید خفا ہوئے۔

میں نے کہا...... "پھر آپ ان دونوں سے بات کریں...... مجھے تو جھگڑے کی کوئی وجہ معلوم نہیں...... فاروقی کی الزام تراشی ایک بے بنیاد بات ہے۔"

"مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ مجھ سے کچھ چھپایا جا رہا ہے۔"

میں نے کہا...... "اگر کوئی بات ہوتی تو رابعہ اور شہناز کو پہلے معلوم ہوگی وہ بھی اس گھر میں رہتی ہیں اور لیلیٰ بھابی کی شریک راز ہیں۔"

اچانک اماں نے تسبیح روک کے کہا...... "رفیق...... میرے سر پر ہاتھ رکھ کے قسم کھا کہ تو جھوٹ نہیں بول رہا ہے۔"

میں کھڑا ہوا اور پھر بیٹھ گیا...... "اماں...... بہت سے سچ اتنے کڑوے ہوتے ہیں کہ ان پر جھوٹ کا پردہ ڈالے رکھنا ہی بہتر ہوتا ہے۔"

"یہ تم ٹھیک کہتے ہو......" ابا جی نے کہا...... "لیکن جھوٹ سے بھی صورت حال بہتر کہاں ہو رہی ہے...... شاید سچ پتا چلے تو ہم کچھ کریں۔"

"مجبوراً میں نے انہیں بتا دیا......" فاروقی کو شک ہے کہ اس کی دوسری بیوی مریم کی موت کی ذمے دار لیلیٰ بھابی ہے۔"

"وہ کیسے......"

"فاروقی کہتا ہے کہ لیلیٰ نے اسے زہر دیا۔"

ایک لمحے کے لیے ان پر سکتہ سا طاری ہو گیا...... یہ اس انکشاف کا فطری ردعمل تھا...... "وہ پاگل ہو گیا ہے......" ابا نے برہمی سے کہا۔

میں نے جاتے جاتے کہا...... "اب آپ خود انکوائری کریں...... اصل بات میں نے آپ کو بتا دی...... اماں کے قسم دینے سے......"

ماحول ایک بار پھر کشیدہ ہو گیا...... لیلیٰ بھابی اپنے کمرے میں بند ہو گئی...... وہ کھانے کے لیے بھی باہر نہیں آئی...... رابعہ نے بتایا کہ وہ رو نہیں رہی ہے...... بس چپ ہے...... فارقی سے اسے یہ امید نہیں تھی۔

"صدمے کا اثر تو ہوگا......" شہناز نے کہا...... "لیکن وہ اپنے فیصلے پر قائم ہے...... اس کا لوٹ کر جانے کا قطعی کوئی ارادہ نہیں۔"

راجا نے کہا...... "تم لوگ سمجھاؤ اسے......"

رابعہ نے کہا...... "سمجھانے کی کوشش کا ان پر اثر ہوتا ہے...... وہ رونے لگی تھی کہ کیا تم بھی مجھے یہاں سے نکالنا چاہتی ہو؟...... میں نے کہا کہ ایسی بات مت کرو...... وہ بولی کہ میں اسے اپنا گھر سمجھتی ہوں تو کیا غلط ہے...... میں نے کہا کہ تمہیں سمجھانے کا یہ مطلب نہیں کہ ہم تم سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہیں...... وہ بولی کہ میں تو شوہر کے گھر کو بھی اپنا ہی سمجھتی تھی...... اب اندازہ ہوا کہ عورت کا کوئی گھر نہیں ہوتا...... شادی کے بعد شوہر چھوڑ دے تو میکے والے بھی دھتکارتے ہیں کہ جاؤ واپس...... وہی بات کہ ڈولی آتی ہے اور جنازہ جاتا ہے......"

میں نے کہا...... "یہ ڈیپریشن کا اثر ہے...... تم لوگ اس کے ساتھ رہو۔"

رات گئے میں نے راجا کو اپنے فیصلے سے مطلع کیا کہ میں نے فریال کی تلاش میں اسلام آباد جانے کا فیصلہ کر لیا ہے...... "کل صبح میں نکل جاؤں گا......"

"جب تک وہ نہ ملے...... اپنی صورت مت دکھانا......"

"یہ وہی کیس ہوگا...... لیلیٰ لیلیٰ پکاروں میں بن میں...... اسلام آباد کے ہر گلی کوچے میں فریال فریال چلاتا پھروں گا...... ہر راہ گیر کو اس کی تصویر دکھا کے پوچھوں گا کہ اس خاتون کو دیکھا ہے کبھی۔"

"اور وہ ہوئی لندن میں...... پھر؟"

"ابھی تک تو ایسی کوئی خبر نہیں......" میں نے کہا۔

راجا ہنسا...... "خبر کون دے گا...... وہی ڈاکٹر غیر شائستہ...... کیا تیرے خیال میں وہ اتنی ہی قابل اعتبار ہے؟"

میں اٹھ بیٹھا...... "کیا مطلب؟"

"میں نے فارسی تو نہیں بولی...... سلیس اردو بھی یہ کہ ہو سکتا ہے وہ جھوٹ بول رہی ہو...... اس وقت جب وہ تجھے بے عزت کر رہی تھی...... فریال اس کے ساتھ بیٹھی ہو...... اور انجوائے کر رہی ہو......"

"ایسا بالکل ہو سکتا ہے استاد محترم...... یہ لڑکیاں کچھ بھی کر سکتی ہیں...... مجھے پہلے لندن میں دیکھ لینا چاہیے......" میں نے کہا۔

"معاف کرنا...... میں سوچ چکا ہوں...... ورنہ جواب دیتا......" راجا بولا۔

میں نے سوچا کہ لندن میں فریال کے ہونے کی تصدیق کس سے کرائی جا سکتی ہے...... لندن میں میرے کاروباری دوست بہت تھے لیکن ان سے مراسم کی نوعیت رسمی تھی...... وہاں لوگ حد درجہ مصروف ہونے کے علاوہ بہت ریزرو رہنے کے عادی تھے...... عائشہ یا اس کے باپ لارڈ ارنسٹ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا...... اس آفس میں سوشی سے میرے بڑے اچھے مراسم تھے...... وہ بڑی وضع دار جاپانی لڑکی تھی جس کی پرورش اور تعلیم امریکا میں ہوئی تھی...... اس کا باپ امریکن اور ماں جاپانی تھی...... اس کا شوہر بھی میرا بڑا اچھا دوست تھا...... اور وہ بھی نصف امریکی تھا لیکن اس کی ماں امریکن تھی اور باپ جاپانی...... پاکستان آنے کے بعد بھی میں نے سوشی سے فون پر رابطہ رکھا تھا اور اس نے دو بار میری مدد کی تھی...... لیکن اب میرے پاس اس کا فون نمبر نہیں تھا۔

اچانک مجھے گل کی ماں کا خیال آیا...... وہ جاتے جاتے مجھے اپنا فون نمبر دے گئی تھی...... وہ میری مدد کے لیے احسان مند تھی اور اگر میں اسے یہ ذمے داری دیتا تو وہ میرا کام ضرور کرتی لیکن ابھی وہ سوگ میں تھی...... یہ کہنا بھی مشکل تھا کہ وہ گل کی تدفین کر چکی ہوگی...... لندن میں تدفین کے لیے بھی سب کی سہولت کو مدنظر رکھنا پڑتا ہے اور انتظامات بھی فوراً نہیں ہو جاتے......

راجا نے فقط ایک امکان ظاہر کیا تھا...... یہ بھی ہو سکتا تھا کہ ڈاکٹر شائستہ نے کہا وہ سچ ہو...... فریال اسلام آباد میں ہی ہو...... سوال یہ تھا کہ وہاں وہ کیا کر رہی ہے...... کس بات کا انتظار کر رہی ہے...... اس نے اپنی سہیلی ڈاکٹر شائستہ سے ٹکٹ منگوایا تھا لیکن اسے کوئی ایڈریس نہیں دیا تھا...... آخر کیوں؟ کیا اس کو ڈر تھا کہ میں یہ پتا حاصل کر کے اسے واپس لے جانے کے لیے اسلام آباد پہنچ جاؤں گا...... کیا ویزا اس نے پہلے ہی حاصل کر لیا تھا؟ یہ معلومات تو برٹش ایمبیسی سے بھی حاصل کی جا سکتی ہیں کہ حال ہی میں فریال نام کی کسی خاتون کو برطانیہ کا ویزا جاری کیا گیا ہے یا نہیں۔

سوتے سوتے مجھے ایک پریشان کن خیال آیا...... کہیں اس کے ساتھ کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو گئی ہو...... وہ کسی مشکل میں نہ پڑ گئی ہو...... اکیلی عورت کے ساتھ ایک اجنبی شہر میں کچھ بھی ہو سکتا ہے...... مجھے خود جا کے دیکھنا چاہیے...... فریال اگر اسلام آباد میں ہوگی تو ویزا لینے آئے گی...... ویزا لے چکی ہوگی تو معلوم ہو جائے گا...... لندن جانے کے لیے مجھے بھی تو وہیں سے ویزا لینا ہوگا...... اس فیصلے سے مجھے کچھ سکون حاصل ہوا......

اس رات میں نے دادی کو خواب میں دیکھا...... سارے خواب اوٹ پٹانگ ہوتے ہیں...... ادھر ادھر کی یادوں کے ٹکڑے جوڑ کے لاشعور کوئی منظر دکھا دیتا ہے...... میں نے دیکھا میں کسی اندھیرے کمرے میں اکیلا لیٹا ہوا ہوں...... اچانک دروازہ کھلتا ہے اور دادی اندر آ کے کہتی ہیں...... کیا بات ہے

نواسے...... "تو سورہا ہے کہ رورہا ہے؟"

میں کہتا ہوں...... "آپ کی بلا سے دادی......"

دادی اجلا سفید لباس پہنے کھڑی تھیں...... اس لباس سے جو روشنی خارج ہورہی تھی اس نے کمرے میں اجالا پھیلا دیا تھا...... "ایسا کیوں کہتا ہے نواسے...... پہلے پریشان ہوتا تھا تو میرے پاس آجاتا تھا۔"

میں نے کہا...... "اب آپ مجھے چھوڑ گئی ہیں۔"

انہوں نے ہنس کے کہا...... "ہے ناپاگل...... ارے میں تیرے اتنے قریب تو ہوں......" انہوں نے میری طرف ہاتھ بڑھایا...... "آجا......"

میں نے ان کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی...... میرے ہاتھ میں کچھ بھی نہ آیا...... میں ایسے گر گیا جیسے میں نے ہوا کا سہارا لینے کی کوشش کی تھی...... مجھے سخت چوٹ آئی...... درد سے میری آنکھ کھلی تو میں بیڈ کے قریب فرش پر گرا ہوا تھا۔

میں نے اٹھ کے گھڑی دیکھی...... کھڑکیوں پر صبح کا دھندلکا نمودار ہورہا تھا...... میں نے غسل خانے میں جاکے وضو کیا جائے نماز اور قرآن مجید اٹھا کے باہر نکلا اور حویلی کے بیرونی حصے میں دادی کی قبر کے سرہانے جا بیٹھا...... وہاں دس قبریں تھیں...... سات پرانی اور تین نئی...... گیارہویں قبر آگے تھی اور اس میں روایت کے مطابق وہ مرد قلندر مدفون تھا جس کی بد دعا نے میرے آباؤ اجداد کو عذاب میں مبتلا کردیا تھا...... واللہ اعلم بالصواب...... اس وقت سے حویلی پر آسیب کے منحوس سائے تھے۔

میں نے نماز ادا کی اور پھر سورۃ یٰسین کی تلاوت کرنے بیٹھ گیا...... اس عبادت نے مجھے بڑا سکون قلبی عطا کیا...... صبح کی خاموشی میں پرندوں کے چہچہانے کی آوازیں گونجنے لگیں اور مشرق کا افق روشن ہوا تو میں واپس حویلی میں گیا۔

میں اپنے کمرے کی طرف جارہا تھا کہ مجھے کوریڈور میں ایک سایہ سا دکھائی دیا...... یہ رابعہ تھی...... اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا...... اس کا انداز اتنا پراسرار تھا کہ میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا...... میں قرآن پاک اور جائے نماز اپنی جگہ پر رکھ کے واپس گیا...... رابعہ کاریڈور کے آخر میں کھڑی تھی......

"تم کہاں گئے تھے صبح صبح......" وہ سرگوشی میں بولی۔

میں نے کہا...... "دادی کی قبر پر......"

"ادھر آؤ......" وہ دبے پاؤں کچن کی طرف بڑھی۔

کچن کا دروازہ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا اور اندر سے کسی کے باتیں کرنے کی آواز آرہی تھی...... میں نے سر جھکا کے دیکھا۔

میں نے حیرانی سے پوچھا۔ "لیلیٰ بھابی۔"

رابعہ نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

"یہ کچن میں کس سے باتیں کررہی ہیں؟"

"اندر تو ان کے سوا کوئی اور نہیں ہے...... اور پھر اپنے آپ سے بات کرنے کے لیے کچن میں چھپنا بالکل ضروری نہیں ہوتا۔" رابعہ نے اپنے لہجے میں شک کو نمایاں کیا۔

"ہوسکتا ہے کہ وہ موبائل فون پر کسی سے بات کررہی ہوں۔"

"سوال پھر وہی پیدا ہوتا ہے کزن کہ...... کچن میں کیوں......؟"

میں نے کہا۔ "اظہار و گفتار کی آزادی میں یہ شامل ہے کہ کوئی جہاں چاہے بیٹھ کے بات کرے...... ہمالیہ کی چوٹی پر یا بحر الکاہل کی تہ میں...... کچن میں یا باتھ روم میں......" میں نے اسے کھینچ لیا۔ "آخر تمہارے پیٹ میں کیوں مروڑ اٹھ رہے ہیں کزن۔"

اس نے احتجاج کیا۔ "وہ اپنے میاں سے بات کررہی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "اور کس کے میاں سے کرے۔ تمہارے میاں سے؟۔"

"افوہ...... تم سیریس کیوں نہیں ہوتے۔ اس نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا...... میں نے چھپ کر باتیں سنی ہیں...... کچھ باتیں۔"

میں نے رک کر کہا۔ "بڑے شرم کی بات ہے مس رابعہ۔"

"ہوا کرے۔" وہ ڈھٹائی سے مسکرائی۔ "لیکن دال میں کچھ کالا ہے کزن...... شرط لگالو...... آخر پہلے بھی تو ان کی بات ہوتی تھی...... لیلیٰ بھابی نے کبھی رازداری نہیں برتی...... سب کے سامنے بات ہوتی تھی۔ انہوں نے کبھی اٹھ کر دور جانے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔"

"انہیں تمہاری نیند ڈسٹرب ہونے کا خیال ہوگا۔"

"پہلی بات تو یہ کہ میں جاگ رہی تھی۔ انہیں اندازہ نہیں تھا۔ رنگ میں نے سنی نہیں...... اس کا مطلب ہوا۔ فون وائبریٹر پر تھا۔ جب وہ اٹھیں تو مجھے بالکل پتا نہیں چلا۔ دروازے کی ہلکی سی آہٹ پر میں نے آنکھیں کھولیں تو وہ چور بنی میری طرف دیکھ رہی تھیں کہ میں جاگی تو نہیں...... پھر انہیں اطمینان ہوگیا کہ میں گہری نیند میں ہوں تو وہ دبے پاؤں آہستہ سے دروازہ کھول کے باہر نکل گئیں۔"

"اور اس کے بعد تمہارے دماغ میں یہ خارش ہوئی۔"

میں رابعہ کے ساتھ باہر آگیا۔

"یار مجھ سے پوچھو تو سہی کہ میں نے کیا سنا۔"

"مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔"

"وہ بڑے اصرار سے اور بہت غصے میں کہہ رہی تھیں کہ تم جو چاہو کرلو...... میں تمہاری باتوں میں آنے والی نہیں۔"

میں نے کہا۔ "یہ بیویاں ایسے ہی کہتی ہیں۔"

رابعہ نے اپنی بات جاری رکھی۔ "اس کے بعد کچھ کہا ہوگا میاں نے۔ اچانک لیلیٰ بھابی کی آواز اونچی ہوگئی...... انہوں نے کہا کہ بہت ڈرا دھمکا چکے تم...... اب میری بات بھی سن لو...... میں تمہارا بھانڈا پھوڑ دوں گی...... سب کو بتادوں گی...... بس اتنا ہی سن پائی تھی میں...... شاید دوسری طرف میاں صاحب اس دھمکی پر شیر کی طرح دھاڑنا بھول کے بلی کی طرح میاؤں میاؤں کرنے لگے ہوں گے۔"

فکرمند تو میں بھی ہوگیا تھا۔ بے عزت ہوکے حویلی سے رخصت ہونے کے باوجود فاروقی مایوس نہیں تھا۔ اس کے شاطر ذہن کو ہم نے بڑی آسانی سے مات دے دی تھی۔ اس نے بڑی عیاری سے بیوی کو استعمال کرنے کی کوشش کی تھی...... مریم کے قتل میں اپنی سیدھی سادی وفادار بیوی کو ملوث کرنے کا ڈراما کیا تھا اور اسے قانونی انجام سے خوفزدہ کرنے میں بھی کامیاب رہا تھا۔ عمر قید یا پھانسی کا تصور بڑے بڑوں کا پتہ پانی کردیتا ہے۔ لیلیٰ بھابی تو ایک عام عورت تھی...... وہ ڈر گئی اور اس نے فاروقی سے وعدہ کرلیا کہ وہ مجھے زہر دے دے گی۔

فاروقی کے پلان لمبے تھے۔ مجھے راستے سے ہٹا دیا جاتا تو ست بدھائی کا حق وراثت خود بخود رابعہ کو حاصل ہوجاتا تھا۔ اپنے منصوبے کے مطابق وہ رابعہ کو یہ حق دلاتا اور اس پر اپنے خلوص کا ایسا سکہ جماتا کہ عملاً تمام معاملات اس کے ہاتھ میں آجاتے اور وہ رابعہ کا دوست ہمدرد مخلص محافظ سب کچھ بن جانے کے بعد یہ بآسانی اسے شیشے میں اتار لیتا اور اس سے شادی کرکے ست بدھائی کا نواب بنتا...... لیلیٰ بھابی کا انجام ہوتا...... نواب رفیق کے قتل میں عمر قید یا سزائے موت...... اے بسا آرزو کہ خاک شدہ...... ہم نے فاروقی کا سارا کیس بگاڑ دیا...... لیلیٰ بھابی کو مقابلے پر کھڑا کردیا کہ ڈٹ جاؤ...... نہ تم پر مریم کے قتل کا الزام ہے اور نہ آسکتا ہے...... اس کی موت کے اسباب طبعی ہیں۔

یہ بات سمجھ میں آتے ہی پندرہ سال شوہر کے ساتھ مثالی بیوی بن کے رہنے والی لیلیٰ بھابی کی نظروں کے سامنے سے وہ پردہ ہٹ گیا جو مجازی خدا کے عشق مجازی نے ڈال رکھا تھا۔ اسے اندازہ ہوا کہ ہوس میں آدمی کس حد تک گر جاتا ہے اور کتنا خود غرض، سفاک اور بد باطن ہوسکتا ہے...... فاروقی ایک اعتماد کرنے والے مخلص دوست کو اپنی بیوی کے ہاتھوں قتل کرانا چاہتا تھا۔ صرف ریاست ہتھیانے کے لیے...... وفادار بیوی کو تختہ دار تک پہنچانا چاہتا تھا۔ ریاست کی وارث رابعہ سے شادی رچانے کے لیے۔

ہم سے حوصلہ پاکے لیلیٰ بھابی کے اندر کی بزدل عورت ایک دم باغی ہوگئی...... اس نے وہ فیصلہ کرلیا جو کسی بھی عورت کے لیے زندگی اور موت میں سے ایک کا انتخاب کرنے سے زیادہ مشکل ہوتا ہے...... جو عورت مرنے کا فیصلہ کرلے اسے ایک اطمینان ضرور ہوتا ہے کہ اس کے سارے مصائب و آرام زندگی کے ساتھ ہی ختم ہوجائیں گے۔ شوہر کو چھوڑنے کے بعد لیلیٰ بھابی جیسی عورت کی زندگی آسان ہونے کی کوئی ضمانت نہ تھی...... سفر تنہا طے کرنے کے لیے بھی سہارے درکار ہوتے ہیں...... ایسے رشتے کہ جن پر بھروسا کیا جاسکے کہ کبھی ان کے خلوص میں کمی نہ آئے گی...... کوئی گھر ہو جس کی چھت اپنی ہو اور جسم و جاں کا رشتہ آبرومندی کے ساتھ برقرار رکھنے کے لیے مادی وسائل ہوں۔"

لیلیٰ بھابی کے پاس یہ سب نہیں تھا...... اگر کچھ تھا تو وہ اعتماد جو انہوں نے ہم سے لیا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ بوجھ سمجھے بغیر ہم انہیں اپنے ساتھ رکھ سکتے ہیں...... کچھ یقین انہیں خود پر بھی ہوگا کہ بے سہارا رہ کے بھی زندگی گزاری جاسکتی ہے اور وہ زندگی فاروقی کا ساتھ نبھانے کی مجبوری سے بہر حال بہتر ہوگی۔ فاروقی کے خلاف اس کے جذبات کی شدت اب نفرت کی اس انتہا پر پہنچ تھی جہاں یہ فیصلہ ناگزیر تھا۔

فاروقی کی ساری اکڑفوں ختم ہوگئی تھی۔ اس کی سمجھ میں آگیا تھا کہ اس کا مکروہ شیطانی منصوبہ ہوا میں دھوئیں کی طرح تحلیل ہوگیا ہے...... وفا شعار اور مثالی بیوی الگ ہاتھ سے گئی جس کی فرمانبرداری اور اطاعت گزاری پر منصوبے کی کامیابی کا سارا دارومدار تھا۔ اس کی سازشی فطرت الگ بے نقاب ہوئی اور قدر کرنے والوں نے اسے خارش زدہ کتے کی طرح دھتکار دیا۔

مزید پریشانی اسے یہ ہوگی کہ باغی حسینہ عرف لیلیٰ آگے نہ جانے کیا گل کھلائے گی۔ اصل میکا تو تھا نہیں جن کو اس نے

میکے والا بنالیا ہے وہ اس کی طرف داری میں اٹھ کھڑے ہوئے تو ان سے کون نمٹے گا...... بات تو بگڑ ہی گئی ہے۔ بیوی نے غصّے اور انتقام کے جذبات سے مغلوب ہو کے میکے والوں پر سازش کا راز افشا کردیا تو دوستی بدل جائے گی دشمنی میں...... رانا کونا کوں چنے چبوانے والے بھی چنے اس کے سامنے بھی ڈال دیں گے کہ چباؤ فاروقی صاحب تم بھی...... نواب رفیق کی وفات حسرت آیات کے بعد رابعہ سے رشتۂ مناکحت قائم کرکے ست بدھائی کی ریاست پر حکمرانی کے خواب دیکھ رہے تھے نا...... اب تعبیر بھی دیکھو۔

ان تمام عوامل پر غور کرنے کے بعد وہ واضح نتائج سامنے آتے تھے...... افشائے راز کے خوف سے فاروقی اپنی بیوی کی زبان کھلنے سے پہلے ہی ہمیشہ کے لیے بند کردے گا...... یا وہ اسے ہاتھ جوڑ کے پاؤں پڑ کے منائے گا اور اپنے ساتھ لے جائے گا...... خواہ اس کے لیے اسے بیوی کی ناجائز سے ناجائز شرط قبول کرنی پڑے اور نیک چلنی کی ضمانت کے طور پر حلف نامہ داخل کرنا پڑے...... دوسرا کام آسان تھا...... اظہارِ ندامت...... جدائی کی حالتِ زار کا دردناک بیان...... رقت آمیز لہجے میں وعدے...... معافی تلافی...... فلمی ڈائیلاگ...... یہ سب کسی بھی عورت کے پتھر دل کو موم کرسکتے ہیں...... بیوی بچاری تو پھر بیوی ہے...... ایک پالتو مخلوق۔

چنانچہ اب میں اس نتیجے پر پہنچا کہ فاروقی اپنی بیوی سے مصالحت میں دیر نہیں لگائے گا...... وہ جلد از جلد اسے یہاں سے لے جائے گا اور لیلیٰ بھابی راضی خوشی جائے گی کہ چلو صبح کا بھولا شام کو گھر آگیا...... اپنا شوہر واپس مل گیا اور ڈرائی کلیننگ کے بعد بالکل ویسا ہی جیسے پہلے تھا...... وہ کیا جانے کہ شوہر صاحب کی ٹیوننگ نہیں ہوئی...... وہ اپنی جان بچا رہا ہے...... ست بدھائی پر قبضے کا پروگرام فی الحال کینسل پہلے بیوی کے خطرے سے نمٹنا ضروری ہے۔

فاروقی کو کیا معلوم کہ ہم تو پہلے ہی سب کچھ جانتے ہیں اور ہمیں اس کے عزائم کی اطلاع برہم، باغی و برگشتہ بیوی نے نہیں دی تھی۔ یہ خبر دینے والی وہ عورت تھی جس کے بارے میں کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ زندہ ہے یا نہیں...... نور جہاں کا حسن بے مثال میرے تصور میں زندہ تھا اس کے ساتھ بیتے ہوئے ہر لمحہ جانفزا کی لذت میں آج بھی محسوس کرسکتا تھا مگر وہ خود کہاں تھی...... اس کی کچھ خبر نہ تھی۔

لیلیٰ بھابی نے تو ابھی تک ہمیں کچھ نہیں بتایا تھا اور اس کے سامنے ہم سب ایسے بنے ہوئے تھے جیسے کچھ جانتے ہی نہیں۔ رابعہ نے کچھ دیر مجھے اپنے خیالات سے مستفید فرمایا...... پھر اسے احساس ہوا کہ اس کی آواز میرے کانوں میں تو داخل ہورہی ہے مگر دماغ تک نہیں پہنچ رہی ہے...... اس نے لیلیٰ بھابی کی چوری پکڑ کے سراغ رسانی کا عظیم کارنامہ سرانجام دیا تھا مگر میں اسے اہمیت دینے پر تیار نہ تھا...... اس نے برا مان کے اٹھ جانا بہتر سمجھا۔

اس کے جاتے ہی لیلیٰ بھابی کچن سے برآمد ہوئیں...... اس کے دونوں ہاتھوں میں کافی کے مگ تھے۔ میرا دل بیٹھ گیا...... لے بھئی فیکے چتر...... کلمہ پڑھ...... ست بدھائی کی حویلی اور اس عالمِ فانی پر حسرت کی آخری نظر ڈال اور چل...... اچانک بہت سے دردناک گانے میرے دماغ میں گونجنے لگے...... جائے گا جب یہاں سے کچھ بھی نہ پاس ہوگا...... یہ جگ رین بسیرا بندے...... انشا جی اٹھو اب کوچ کرو...... کیا پتا رابعہ نے کیا سنا اور کیا سمجھا تھا...... زہر ہلاہل کی شیشی تو لیلیٰ بھابی کے پاس بحفاظت موجود تھی...... فاروقی کے ساتھ مل کے اس نے یہ ناراضی کا ڈراما ہی نہ کیا ہوا...... اب اس کی طرف سے گنگل مل گیا...... سزائے موت صبح صبح ہی دی جاتی ہے...... بھابی نے عمل درآمد کے لیے کیا موقع بنایا ہے...... میں صبح اٹھ کے باہر آبیٹھتا ہوں...... پھر ریشم کافی لا کردیتی ہے...... بھابی نے کہا کہ لو دیور جی آخری بار ہماری ہاتھ سے کافی پی لو۔

یا میرے مولا...... اب میں کیا کروں...... بھابی زہر کا پیالہ لیے بڑھتی آرہی ہے اور میں کوئی سقراط نہیں کہ آگے بڑھ کے فوراً اٹھالوں...... خیر...... ایسے تو میں مرنے والا نہیں...... میرے پاس بھی جان بچانے کے بہت سے طریقے ہیں۔

چالاکی سے کافی کا مگ ایسے گرادوں کے حادثہ لگے یا بھابی سے کہوں کے چینی کم ہے...... وہ جائے کچن سے چینی لائے...... مگر وہ مگ ساتھ لے گئی پھر؟ اور چینی کم بتانے کے لیے پہلے زہر آلود کافی کا ایک گھونٹ تو لینا ہی پڑے گا...... ایک طریقہ مگ بدل دینے کا بھی ہے...... اوٹ پٹانگ خیالات کی یلغار جاری رہی۔

بھابی نے قریب آکے کہا۔ ''کیا ہوگیا ہے دیور جی...... بت بنے بیٹھے کیا دیکھ رہے ہو۔''

میں نے سر کو جھٹکا اور اپنے دماغ میں آنے والے سر دیا خیالات پر لاحول پڑھی...... ''آپ کافی بنا کے لائی ہیں...... اس پر حیران ہورہا تھا...... ریشم کہاں گئی۔''

وہ میرے پاس بیٹھ گئیں...... ''ہوگی کہیں...... میری

آنکھ جلدی کھل گئی تھی...... سوچا اپنے لیے کافی بنالوں...... پھر نہیں دیکھا۔''

میں نے کہا...... ''میں آپ کی پریشانی کو سمجھتا ہوں...... یہ سب ہماری وجہ سے ہوا......''

''کیسی باتیں کرتے ہو...... تمہارا کیا قصور ہے اس میں۔'' بھابی نے کافی کا مگ میرے سامنے رکھ دیا...... ''تم نے تو بڑا سہارا دیا ہے...... حوصلہ دیا کہ میں اس گھر کو اپنا سمجھوں......'' ان کی آواز بھرا گئی۔

کافی کا ایک گھونٹ لے کر میں نے کہا۔ ''فاروقی پچھتائے گا۔''

بھابی نے آنکھوں میں آنے والے آنسو دوپٹے سے صاف کرلے...... ''نہیں رفیق...... پتا نہیں ان کے دماغ کو کیا ہوگیا ہے...... وہ بہت بدل گئے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''ان کا کوئی فون آیا۔''

بھابی نے سادگی سے کہا...... ''ہاں...... اس نے تو صبح صبح جگا دیا۔ میں نے سوچا سب سو رہے ہیں...... کچن میں جا کے بات کرلوں۔''

مجھے رابعہ کا شک سے بھرا لہجہ یاد آیا۔ ''پھر...... کیا کہا اس نے۔''

''وہی...... ڈرانا دھمکانا...... کہاں جاؤ گی...... کیا کرو گی...... چار دن میں یہ سب منہ بولے رشتے دار نکال باہر کریں گے...... شوہر کے گھر سے واپس جانے والی عورت کو سگے ماں باپ اور بھائی بہن بھی نہیں رکھتے...... یہ نقلی میکا ساتھ نہیں دے گا...... میں نے کہا کہ تم میری فکر مت کرو...... میں اب تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی...... یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔''

میں نے کہا۔ ''بھابی...... آپ کے لیے اپنے ارادے پر قائم رہنا مشکل ہوگا۔''

بھابی کا رنگ اڑ گیا...... ''کیوں......''

میں نے کہا۔ ''فاروقی آپ کو یہاں نہیں رہنے دے گا...... اگر وہ منت ساجت خوشامد سے آپ کو منانے میں کامیاب نہ ہوا تو آپ لکھ لیں...... وہ ہاتھ جوڑے گا...... آپ کے پاؤں پکڑے گا اور ناک سے لکیریں لگانے میں بھی شرم محسوس نہیں کرے گا......'' پھر میں نے کافی کا دوسرا گھونٹ لیا۔

''یہ تم کیسی باتیں کررہے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''اور آپ پھر بھی نہ گئیں...... تو...... ہوسکتا وہ زبردستی کرے...... آپ کو گن پوائنٹ پر لے جائے...... اغوا کرائے...... یا قتل کروادے......''

''رفیق...... تم پاگل تو نہیں ہوگئے ہو......'' وہ چلائیں۔

میں نے کافی کا مگ خالی کردیا۔ ''نہیں بھابی...... میں پاگل ہوتا تو یہ کافی نہ پیتا...... اس ڈر سے کہ کہیں آپ نے اس میں زہر نہ ملادیا ہو۔''

کافی کا مگ بھابی کے ہاتھ سے گر گیا...... ان کی آنکھیں ساکت ہو کے مجھ پر ٹھہر گئیں اور رنگ لاش کی طرح سفید ہوگیا...... ایک لمحے کے لیے تو مجھے یوں لگا جیسے وہ کرسی سے گر کے بے ہوش ہوجائیں گی...... میں بے حسی کے ساتھ ان کی حالت کے تغیر کو دیکھتا رہا۔

بالآخر ان کے ہونٹ کانپے...... ''تم...... تمہیں معلوم ہے؟''

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''ہاں...... مجھے سب معلوم ہے...... وہ بھی جو تمہیں معلوم نہیں...... بس ایک بھروسا تھا تم پر کہ میں نے کافی پی لی۔''

اس کی نظریں خلا میں منجمد ہوگئیں...... ''کیا جانتے ہو تم......''

میں نے کہا۔ ''مثلاً یہی...... کہ تمہارے پاس ایک انتہائی خطرناک زہر سے بھری ہوئی شیشی ہے...... گہرے، نیلے رنگ کی...... فاروقی نے تمہیں یہ زہر مجھے دینے پر مامور کیا تھا۔''

وہ کھوکھلے لہجے میں بولی...... ''اور؟''

''اور اس کے لیے فاروقی نے تمہیں دہشت زدہ اور بلیک میل کیا تھا...... اس نے کہا تھا کہ تم پر اپنی سوکن مریم کو زہر دے کر ہلاک کرنے کا الزام ثابت ہوچکا ہے...... اور یہ ایک طرح سے دہرا قتل شمار ہوگا کیونکہ وہ حاملہ تھی۔''

''یہ جھوٹ تھا......؟؟'' وہ چلائیں۔

''لیکن اس نے سچ بتادیا تھا...... تمہارے سامنے...... تم سے یہ کہا تھا کہ اسپتال کے ڈاکٹرز کی رائے یہی ہے...... پھر اس نے تم پر احسان کیا اور تمہیں بچانے کے لیے اسپتال میں اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا۔ پیسا لٹایا کہا کہ خود اسپتال والے بدنامی نہیں چاہتے تھے...... انہوں نے مریم کے قتل کو حادثاتی موت قرار دے دیا...... لیکن......'' میں نے ایک ڈرامائی وقفہ دیا۔

''لیکن کیا!''

''تم سے فاروقی نے کہا کہ مریم کا دوبارہ پوسٹ مارٹم کسی بھی وقت کرایا جاسکتا ہے...... اس سے اصلیت سامنے آجائے گی کہ اسپتال والوں نے جھوٹ کہا تھا...... وہ زہر

دینے سے ہی ہلاک ہوئی تھی...... اور زہر تم سے دیا تھا اس لیے تم جاؤ گی پھانسی کے تختے پر..... ورنہ کم سے کم عمر قید۔''

لیلیٰ بھابی نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا۔ آنکھوں سے بہتے آنسو رخساروں پر لکیریں بناتے ان کی جھولی میں گر رہے تھے۔

''پھر فاروقی نے تمہارے سامنے ایک چوائس رکھی..... اگر تم نے ایک کام کرو جو بہت آسان ہے اور تم ہی کر سکتی ہو..... تو مجھے کیا ضرورت ہے پوسٹ مارٹم دوبارہ کرانے کی۔ تم نواب رفیق احمد شیرازی کو میرے راستے سے ہٹا دو۔ اس نے تمہیں ایک خواب بھی دکھایا۔ ست بدھائی کی ریاست پر قبضے کا خواب..... تمہیں اس خواب سے کوئی دلچسپی نہ تھی..... لیکن تم قتل کے الزام میں ساری عمر جیل میں گزارنے سے ڈرتی تھیں..... اس نے بڑھا چڑھا کے بتایا ہوگا کہ جیل میں عورت کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔''

''خدا کے لیے..... مجھے معاف کردو.....'' وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کے رونے لگیں..... ''میں بہت خوف زدہ تھی۔''

''معافی مانگنے کی کوئی ضرورت نہیں..... ایک طرف شوہر کا ساتھ تھا۔ اس کا گھر تھا اور باعزت زندگی تھی..... دوسری طرف رسوائی اور عمر قید کی اذیت..... تم مجبور تھیں..... پھر ہم نے تمہاری مدد کی..... ہم نے اسپتال سے معلوم کیا..... فاروقی کا جھوٹ کھل گیا..... مریم کی موت کا سبب ایک حادثہ تھا..... یہ طبی موت تھی..... زہر دینے کی بات کسی مرحلے میں نہیں ہوئی..... یہ بات ہم نے تمہیں بتائی..... تمہارا ضمیر پہلے ہی دامن گیر تھا..... ہماری حوصلہ افزائی نے ہمت دی..... تم نے شوہر کی بات ماننے سے انکار کردیا..... تم اس کی ہر دھمکی کے سامنے چٹان کی طرح ڈٹ گئیں اور اس کی کسی دھمکی کی پروا نہیں کی..... اس لیے مجھے تم پر پورا اعتماد تھا۔''

''تم نے کبھی مجھ سے نہیں کہا..... کبھی ظاہر نہیں ہونے دیا کہ تم سب جانتے ہو.....؟'' اب وہ ہچکیوں سے رو رہی تھیں۔

''ہم سب کی تم پر نظر تھی..... اعتماد ہونے کے باوجود.....''

''ہم سب کون؟.....'' وہ چونکیں۔

''ہم سب..... جو یہاں ہیں..... اماں ابا کو چھوڑ کے..... ہم دیکھ رہے تھے اور ہمیں معلوم تھا کہ تمہارے اور فاروقی کے درمیان کیا چل رہا ہے..... وہ تمہارے انکار سے کتنا مشتعل ہے..... تمہیں کس طرح دھمکا رہا ہے..... دہشت زدہ کر رہا ہے..... لیکن تم کسی قیمت پر اس کی آلۂ کار بننے کے لیے تیار نہیں۔''

''کیا راجا اور شہناز..... فریال..... رابعہ سب کو معلوم تھا؟''

''ہاں..... ہم سب تمہاری جاسوسی کرتے تھے..... فاروقی کی اور تمہاری گفتگو چھپ چھپ کر سنتے تھے..... آج ہی صبح موبائل فون پر تم نے جو بات کی وہ رابعہ اور میں نے سنی.....''

''اتنا بڑا خطرہ مول لیا تم نے.....''

''ہمیں بھروسا تھا تم پر کہ کچھ بھی ہو جائے..... تم یہ کام نہیں کرو گی..... تمہیں بہت محبت تھی فاروقی سے..... مریم سے اس کے مراسم تم سے پوشیدہ نہ تھے..... پھر اس نے مریم سے شادی کرلی..... تم نے برداشت کیا..... اگر وہ تم سے جان مانگتا تو تم دے سکتی تھیں لیکن وہ لالچ میں کسی کی جان لینے کو کہے تو تم انکار کرو گی..... اور تم نے یہی کیا..... تم نے اس کی ہر دھمکی کو نظر انداز کر دیا۔''

وہ روتے روتے بولیں..... ''وہ مجھے طلاق دے رہا ہے..... میں نے کہا ہے کہ دے دو..... تم نہیں دو گے تو میں مانگ لوں گی..... اب میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی..... کسی قیمت پر بھی.....''

''لیلیٰ بھابی..... معاملہ صرف طلاق کا نہیں۔''

''مجھے معلوم ہے..... ساری زندگی اکیلے گزارنے کا ہے.....'' وہ بولیں۔

''یہ بھی نہیں..... اب خطرہ تمہاری زندگی کو لاحق ہے..... فاروقی کے پاس ترپ کے دو پتے تھے..... اس کی پہلی چال کو ہم نے ناکام کر دیا..... تمہیں اس خوف سے محفوظ کر دیا کہ تم پر کبھی مریم کو زہر دینے کا الزام نہیں آ سکتا ہے..... دوسرے ٹرمپ کارڈ کو تم نے ضائع کر دیا..... ہر مرد کے ہاتھ میں عورت کو طلاق دینے اور گھر سے بے گھر کرنے کی دھمکی بڑا مؤثر ہتھیار ہوتی ہے..... عورت کہاں جائے گی..... کیا کرے گی..... کیسے جیے گی..... اس نے تمہیں بھی طلاق کے انجام سے ڈرایا..... اور اس کے ساتھ اپنے اثر و رسوخ سے کہ وہ تمہارا جینا حرام کر دے گا..... لیکن تم نے مقابلہ کیا۔''

''تمہارے بھروسے پر دیور جی۔''

''ایسا مت کہو..... یہ تمہارے کردار کی مضبوطی ہے کہ تم نے غلط کام کی حامی نہیں بھری ورنہ مجھے زہر دینا کیا مشکل تھا..... یہ ریاست اور حویلی تمہیں مل جاتی..... فاروقی نے تم سے یہی کہا ہوگا کہ میں مالک تو تم مالکن..... لیکن میرے بعد رابعہ ہے..... اگر میں نہ رہوں تو میری وارث رابعہ ہوگی.....''

''اس نے کہا تھا..... بعد میں رابعہ کو راستے سے ہٹانا کیا مشکل ہوگا۔ سارے معاملات میرے ہاتھ میں ہوں گے..... رفیق بھی مجھ پر بھروسا کرتا ہے..... رابعہ کیسے نہیں کرے گی..... میں جہاں کہوں گا آنکھ بند کر کے دستخط کر دے گی..... جاگیر اور حویلی میرے نام لکھ دے گی..... بے وقوف جاہل عورت ہے۔''

میں نے ہنس کے کہا۔ ''ڈیر بھابی..... میں تمہیں کیا بتاؤں تمہارا یہ شوہر نامدار کتنا بڑا شیطان ہے..... معلوم نہیں یہ لالچ اس کے دماغ میں کیسے داخل ہوا..... کیسے وہ ہوسِ زر سے اتنا مغلوب ہوا کہ سب بھول گیا..... اپنی دوستی..... اپنا فرض..... اپنا پیشہ..... اپنا ضمیر..... اس نے تمہیں..... اپنی شوہر پرست مثالی بیوی کو آلۂ کار بنایا..... اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کے لیے..... اس نے مریم کو مار دیا..... اگر تم اس خبیث کے چنگل سے نہ نکل پاتیں اور خدانخواستہ اس کی خواہشات کی تکمیل کا ذریعہ بن جاتیں تو معلوم ہے وہ کیا کرتا؟..... اس کے پلان میں رابعہ سے شادی کرنا شامل تھا۔''

''کیا؟'' لیلیٰ بھابی اچھل پڑیں..... ''رابعہ سے شادی.....''

''ہاں..... جیسے وہ میرا دوست اور قانونی مشیر ہے..... ایسے ہی رابعہ کا بھی ہوتا..... وہ رابعہ کے دوست، ہمدرد اور محافظ کا کردار بھی ادا کرتا اور اس کے تمام قانونی اور مالی معاملات پر کنٹرول حاصل کر لیتا..... میری بات اور ہے..... میں مرد ہونے کے ساتھ انتظامی امور کا تجربہ رکھتا ہوں..... ایم بی اے الگ ہوں..... رابعہ سیدھی سادی بی اے پاس گھریلو لڑکی..... اس کا کلی انحصار فاروقی پر ہوتا..... پھر فاروقی کے لیے اسے شیشے میں اتارنا کیا مشکل ہوتا..... رابعہ ایک بار محبت میں دھوکا کھا چکی ہے..... وہ فاروقی کے سہارے کو غنیمت جانتی..... اور قبول کر لیتی..... اب رہ گئیں تم..... پندرہ سال کی رفاقت اور خدمت کا اس نے تمہیں کیا صلہ دینا تھا؟''

''میری اب کوئی ویلیو نہیں..... وہ مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہے۔''

''ایک بار تمہیں اقرار نے بچا لیا..... تم نے خوف کے دباؤ میں فاروقی سے وعدہ کر لیا کہ جیسا تم کہو گے ویسا ہی
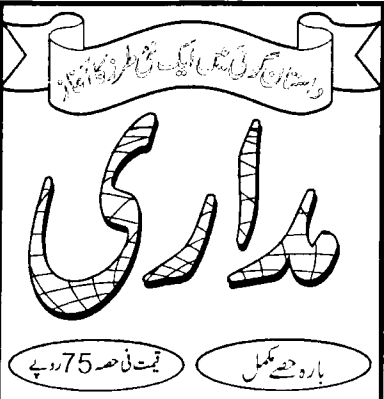
کروں گی...... ورنہ وہ واقعی تمہیں مریم کے قتل میں پھنسا دیتا...... بے گناہی ثابت ہونے میں برسوں لگ جاتے ہیں...... رسوائی اور تھانے کچہری کی اذیت ایک عورت کے لیے جہنم کی عقوبت سے کم نہیں ہوتی...... وہ بڑا سازشی ہے...... اس سے کچھ بعید نہیں کہ وہ اپنے اثرورسوخ سے تمہیں مجرم بنا کے بیچ ہی لٹکوا دیتا...... دوسری بات تمہیں انکار نے بچالیا۔'' میں نے کہا۔

''وہ بولیں۔'' میں کچھ سمجھی نہیں۔''

''اگر تم اس کی ماں کے بیچ بیچ مجھے زہر دے دیتیں...... تو تمہارا کیا خیال ہے الزام راجا پر آتا یا رابعہ پر...... نہیں بھابی...... اپنے پیارے دوست نواب رفیق احمد شیرازی کو زہر دے کر مارنے کے الزام میں فاروقی ہی تمہیں تختۂ دار تک پہنچاتا...... دوستی...... فرض شناسی اور روشن ضمیری کی کیسی قابلِ تقلید مثال ہوتی کہ اپنی پیاری پندرہ سال کی شریکِ حیات سے بھی رعایت نہ کی...... تمہارے بعد سب فاروقی کے اختیار میں ہوتا......''

''کیا یہ بات رابعہ کو بھی معلوم ہے۔''

''اسے آدھی بات معلوم ہے...... فاروقی کے مستقبل کے عزائم کی اسے کچھ خبر نہیں کہ ست بدھائی پر قبضے کے لیے وہ اس سے شادی رچانے کے خواب بھی دیکھ رہا تھا...... ورنہ وہ اسے جوتے مار کے نکال دیتی اور ست بدھائی میں گھسنے بھی نہ دیتی......''

''لیکن یہ سب تمہیں بتایا کس نے۔''

''یہ مت پوچھو...... جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے...... تم نور جہاں کو جانتی ہو......''

''اس فاحشہ کو کون نہیں جانتا......'' وہ تلخ لہجے میں بولیں۔

''اسی فاحشہ نے سب سے پہلے مجھے اطلاع دی تھی کہ تمہارا دوست اور قانونی مشیر فاروقی تمہارے دشمن اکبر خان سے ملنے آتا ہے...... اب یہ مت پوچھنا کہ نور جہاں نے ایسا کیوں کہا۔''

''چلو نہیں پوچھوں گی......'' لیلیٰ بھابی نے طنز سے کہا۔

''اسی نے باقی باتیں بھی بتائیں...... اللہ اس کی مغفرت کرے......''

''کیوں؟...... وہ مرگئی ہے کیا؟......''

''مجھے شک ہے کہ اس کے شوہر اکبر خان نے اسے قتل کر دیا ہے...... اس کے بعد سے ہم محتاط تھے...... اب تو خیر ہم نے تمام معاملات اس کے ہاتھ سے لے لیے ہیں...... فاروقی صاحب پر ست بدھائی کی حویلی کے دروازے بند ہو چکے ہیں...... ہمارے رویے سے وہ پہلے ہی چوکنا ہو گیا تھا...... اب اسے یقین آ گیا ہوگا کہ اس کا کھیل تمام ہو چکا ہے...... یقیناً اس کا ذمے دار وہ تمہیں قرار دے گا...... نور جہاں پر اس کا شک پہلے بھی نہ جاتا چنانچہ مجھے اب تمہاری زندگی خطرے میں نظر آتی ہے...... وہ زخم خوردہ ناگ سے زیادہ خطرناک ہو رہا ہے...... میں آج گارڈز کو کہہ دوں گا کہ اسے اندر نہ آنے دیا جائے...... اور تم بھی یہ بات سمجھ لو...... مرنے کا شوق ہے تو جاؤ...... آج ہی چلی جاؤ...... مگر وہ اب وکیل نہیں ایک خطرناک مجرم ہے۔''

''جرم کا راستہ انہوں نے کیوں اختیار کیا آخر......''

''لیلیٰ بھابی...... میں فاروقی کو زیادہ عرصے سے نہیں جانتا...... پاکستان آنے کے بعد اس سے ملاقات ہوئی...... میں کسی کے حوالے سے گیا تھا...... اس کی باتوں میں خلوص محسوس ہوا...... جو دراصل ریاکاری تھی...... ہماری دوستی ہو گئی...... اب مجھے نہیں معلوم کہ پہلے بھی اس کے تعلقات جرائم پیشہ لوگوں سے تھے یا نہیں...... ایک قانون پرست آدمی اچانک تو قانون شکن نہیں بن جاتا...... ممکن ہے وہ پہلے سے اکبر خان کا دوست ہو......''

''تم خود سوچو...... کیا ان حالات میں میرے جیسی تنہا اور لاوارث عورت واپس جانے کا سوچ سکتی ہے......؟ مجھے تو اب اس آدمی سے خوف آنے لگا ہے جو میرا شوہر ہے...... لیکن دیور جی...... جب میں سوچتی ہوں کہ دوسروں کی نظر میں میری کیا عزت ہوگی......''

میں نے اس کی بات کاٹ دی...... ''تمہاری عزت کسی طرح بھی رابعہ، شہباز یا فریال سے کم نہیں ہے لیلیٰ بھابی...... اب تم اس خاندان کا حصہ ہو...... اور ذرا دیکھو یہ خاندان کیسے بنا ہے...... سوائے رابعہ کے کسی سے بھی میرا کوئی رشتہ نہیں...... سوائے خلوص اور اعتماد کے رشتے کے......''

اب دھوپ اوپر آ چکی تھی...... حویلی میں روزمرہ کے معمولات کا آغاز بہت پہلے ہو چکا تھا...... اگر کسی نے ہمیں ایک گوشے میں باتیں کرتا دیکھا ہوگا تو اندازہ کر لیا ہوگا کہ موضوعِ گفتگو کیا ہوگا...... شاید کسی نے بھابی کی آنکھوں میں آنسوؤں کی چمک بھی دیکھ لی ہو...... اس لیے کوئی ہمارے قریب نہیں آیا تھا......

حویلی کا ماحول کچھ بہتر ہوا تھا...... شہباز واپس آ گئی تھی...... کل کی صرف یاد رہ گئی تھی...... فریال کے لیے سب کو امید تھی کہ اس کا سراغ مل جائے گا اور وہ لوٹ آئے گی ورنہ

ب مل کے اسے لے آئیں گے...... حویلی کے مکین پوری کوشش کر رہے تھے کہ زندگی اپنے معمول پر لوٹ آئے امیدوں اور خوابوں کا سفر پھر جذبوں کی بھرپور توانائی کے ساتھ شروع ہو اور خوشیوں کی گہما گہمی لوٹ آئے...... ریشم کی آواز بہت دن بعد اپنی طبعی شوخی کے ساتھ سنائی دی تو مجھے بہت اچھا لگا...... ''لیڈیز اینڈ جنٹلمین......'' اس نے زور زور سے گھنٹی بجاتے ہوئے اعلان کیا...... ''بریک فاسٹ ریڈی...... سٹ آن ٹیبل...... کم سون ورنہ...... ٹی کولڈ......''

میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔'' سمجھو یہ بات آج یہاں ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی...... شاید یہ مشکل ہو...... مگر خوش نظر آنے کی کوشش کرو......''

''اگر کسی نے مجھ سے بات کی...... پھر......''

میں نے کہا...... ''تسلی رکھو...... تم سے کوئی بھی کچھ نہیں پوچھے گا...... میں سب کو سمجھا دوں گا...... بس تم خود کو مضبوط رکھو......''

ناشتے کے دوران مجموعی فضا خوشگوار رہی...... یہ راجا کی پالیسی تھی جس پر شہباز نے بھی عمل کیا...... سب کا موڈ دیکھتے ہوئے رابعہ نے بھی اچھی باتیں ہی کیں......

سب سے پہلے شہباز نے اعلان کیا...... ''بھئی ہم تو اپنا اسپتال شروع کر رہے ہیں...... میں اور ڈاکٹر ریشم......''

ریشم نے گرم چائے لانے کے لیے تھرماس اٹھایا اور باہر جاتے ہوئے بولی۔ ''یس میڈم اینڈ ی...... پیشنٹ ہیئر ی...... پہلے ان ڈاکٹر...... ناؤ گو ڈاکٹر......''

میں نے کہا...... ''بھئی مبارک ہو...... تم نے تو کمال کر دیا ریشم...... راتوں رات ڈاکٹر بن گئیں......'' وہ خوشی سے آنکھیں چمکاتی باہر نکل گئی۔

راجا بولا...... ''یہ ست بدھائی میڈیکل یونیورسٹی کی وائس چانسلر ڈاکٹر شہباز کی اتھارٹی ہے...... وہ چاہیں تو گدھے کو بھی ڈگری دے دیں......''

''تو اب تک تجھے کیوں نہیں دی......'' میں نے کہا۔

شہباز نے کہا...... ''بات یہ ہے...... کہ یہاں جس کا دل چاہے اپنے نام کے ساتھ ڈاکٹر لکھ کر شرطیہ علاج شروع کر دیتا ہے...... کیا تم یقین کرو گے کہ ایک شخص ہے جو پی ایچ ڈی کر کے جھک مارتا رہا......''

''بہت سے لوگ مار رہے ہیں۔'' میں نے کہا...... ''باہر ایسی بہت سی یونیورسٹیاں ہیں جو فیس وصول کر کے آپ کو پی ایچ ڈی کی ڈگری عطا کر دیتی ہیں...... ان کا نام بھی کوئی نہیں جانتا مگر یہاں چیلنج کون کر سکتا ہے......''

راجا بولا۔'' ایسی ہی ایک یونیورسٹی آپ کے سامنے بیٹھی آملیٹ کھا رہی ہے۔''

شہباز نے کہا...... ''ہومیو پیتھی تو مستند ہے...... مگر یہاں عجیب و غریب طریقۂ علاج کے دعوے دار ہیں...... وہ سب خود کو ڈاکٹر کہتے ہیں...... تو میں نے سوچا کہ کیا برا ہے اگر ریشم بھی خود کو ڈاکٹر کہے...... یہ ہزاروں عطائیوں سے بہتر ہے...... اس گاؤں کا ایک پنساری خود کو ڈاکٹر کہتا ہے...... ریشم نے میرے ساتھ کام کیا ہے...... اور میری نگرانی میں...... آئندہ بھی کرے گی......''

میں نے کہا...... ''انگریزی بھی ماشاء اللہ ایسی بولتی ہیں کہ فارن کوالیفائیڈ ڈاکٹر لگیں گی......''

''اور حالات یہی رہے تو ایک دن تم ڈاکٹر ریشم کی ماتحت بن کے کام کرتی نظر آؤ گی......'' راجا بولا۔

''یہ مذاق کی بات نہیں...... ریشم بہت ذہین ہے...... میرے ساتھ جاتی تھی تو ہر مریض کی بیماری اور علامات بڑے غور سے سنتی تھی...... پھر دیکھتی تھی کہ میں نے کیا دوا دی...... ایک دن اس نے میرے کہنے سے پہلے ہی دوا نکال کے سامنے رکھ دی...... میں نے بعد میں پوچھا تو کہنے لگی کہ پہلے ایک عورت کو آپ نے یہی دوا دی تھی...... ایسی ہی بیماری تھی اس کی...... وہ دواؤں کے نام پڑھ سکتی ہے...... اگر علامات سمجھ لے اور میں اسے بتاتی رہوں کہ کس مرض میں کون سی دوا دینی ہے اور اس کی خوراک کیا ہوگی...... تو میرا خیال ہے وہ غلطی نہیں کرے گی۔''

''تم پاگل ہو گئی ہو...... یہ خطرناک کام ہے......'' راجا بولا۔

شہباز نے کہا...... ''یہاں نوے فیصد امراض کیا ہیں...... پیٹ کی خرابی...... نزلہ زکام یا کھانسی...... ملیریا...... ان کی دوائیں عام اور بے ضرر ہیں۔''

''مگر ضرورت کیا ہے ریشم کو علاج کرنے کی...... جب تم ہو......''

''میں نے اسے اجازت نہیں دی ہے...... سب کچھ میں ہی کروں گی...... یہ ایمرجنسی کے لیے ہے...... فرض کرو کبھی مجھے فرصت نہ ہو...... یا میں بیمار پڑ جاؤں...... ڈاکٹروں کے کمپاؤنڈر اور کیمسٹ بھی پورے معالج بن جاتے ہیں...... ریشم بن جائے تو کیا حرج ہے......''

راجا نے کہا...... ''یہ خطرناک بات ہے......''

''میں اسے کنٹرول کروں گی...... مرض سمجھ میں نہ آئے تو دوا مت دو...... ویسے بھی یہاں ہیپاٹائٹس...... ایڈز یا کینسر کا

ملاں تو ہوگا نہیں...... نہ سرجری ہوگی اور نہ وہ سب جو شہروں کے بڑے اسپتالوں میں ہوتا ہے...... رہ گئے میٹرنٹی کیس...... وہ جاہل دائیاں کررہی ہیں...... ریشم ان سے لاکھ درجے بہتر ثابت ہوگی...... اور ذرا سوچو...... اس لڑکی کے لیے یہ اعزاز کسی نوبل پرائز سے کم ہے؟''

راجا نے اپنا احتجاج جاری رکھا...... مگر میں اس ہیلتھ پالیسی سے اصولی اختلاف کرتا رہوں گا......''

''ضرور کرو...... لیکن ہمیں کچھ سامان چاہیے...... حویلی میں کلینک بنانے کے لیے...... یہ اس کی فہرست ہے......''

شہناز نے ایک کاغذ مجھے تھما دیا۔

میں نے اس پر ایک نظر ڈالی اور پڑھے بغیر اسے ریشم کی طرف بڑھا دیا جو ابھی ابھی اندر آئی تھی...... ''ڈاکٹر ریشم...... اس کو دے دینا جو ایک معمولی ڈرائیور اور چوکیدار ہے تمہارے مقابلے میں......''

اس نے کاغذ لے لیا...... ''ڈاکٹر ریشم کہنے پر اس کا چہرہ دمک اٹھا...... ''ہو ڈرائیور یو ٹاک سر......''

میں نے کہا...... ''ارے وہی...... غنی اور کون پتا نہیں کیا سمجھتا ہے خود کو...... تمہارے مقابلے میں اب اس کی کیا حیثیت ہے......''

راجا نے سر ہلایا...... ''بالکل بالکل...... تم ڈاکٹر بن چکی ہو...... اس کا تمہارا کوئی جوڑ نہیں بنتا...... آج اسے صاف بتا دو......''

وہ کھنکنے لگی...... ''نو سر...... غنی ڈرائیور...... ریشم گاڑی...... ہی ماسٹر......''

اس کی بات پر ہنسی آنی لازمی تھی...... اسی وقت لیلیٰ بھابی کے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی...... میں اندازہ کرسکتا تھا کہ فون کس کا ہوگا...... بھابی نے میری طرف دیکھا تو میں نے آنکھ کے اشارے سے منع کردیا...... اس نے فون ریسیو کیا اور بند کردیا......

رابعہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی...... ''کس کا فون تھا بھابی؟''

بھابی نے بے نیازی سے کہا...... ''پتا نہیں...... میرا خیال ہے رانگ نمبر تھا......''

شہناز نے کہا...... ''اس تمام سامان کے علاوہ...... ہمیں کم سے کم ایک ایمبولینس چاہیے......'' اور ٹرانسپورٹ کے لیے ایک پک اپ......''

''آپ تکلف سے کام نہ لیں......'' میں نے کہا۔

''بہتر تو ہوتی ہے ٹویوٹا ہائی ایس...... اگر وہ امپورٹ کی جائے تو ڈیوٹی فری ہوسکتی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ ہم دو لوکل بولان لے لیں تو زیادہ فائدہ ہوگا...... وہ ہائی روف کہلاتی ہیں...... ان میں مطلوبہ ساز و سامان نصب کرانے میں ایک دن بھی نہیں لگے گا...... بس ایک اسٹریچر...... آکسیجن سلنڈر ماسک اور خون یا گلوکوز کے بیگ کے لیے سپورٹ......''

میں نے کہا...... ''تم اپنی ڈیمانڈ براہ راست غنی کو دو...... تمہارا ارادہ کب سے کام شروع کرنے کا ہے......''

''گاڑیاں آتے ہی......'' شہناز بولی۔

میرے فون کی گھنٹی بجی تو میں نے اسکرین پر نمبر دیکھا اور باہر چلا گیا...... یہ فاروقی کا نمبر تھا...... اچانک باہر بڑے زور و شور سے ڈھول بجنے لگا...... میں نے دیکھا کہ ایک عجیب و غریب مجمع گیٹ کے نزدیک کھڑا ہے...... ایک بانس جیسا لمبا اور پتلا شخص اپنے سر کے اوپر سات ہانڈیاں رکھے پیروں میں گھنگھرو باندھے ناچ رہا تھا...... میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا...... دوسری طرف سے فاروقی ہیلو ہیلو کررہا تھا......

میں نے کہا...... ''ہاں ہیلو......''

''یہ کیا ڈھول پیٹے جارہے ہیں حویلی میں......'' وہ خوش دلی سے بولا...... میں سمجھ گیا کہ وہ گزشتہ روز کی تلخی اور گرما گرمی کے بعد نظریہ ضرورت کے تحت مصالحانہ رویہ اختیار کرنا چاہتا ہے......

''تیری بیوی نے جشن کا اہتمام کیا ہے......''

''میری بیوی نے...... کس خوشی میں......'' وہ ہنسا۔

''تجھ سے جان چھٹنے کی خوشی میں......'' میں نے کہا۔

ظاہر ہے اس جواب کے بعد اس کی ساری خوش دلی دور ہوگئی...... ''میں نے تصور میں اس کی صورت کو دیکھا اور محظوظ ہوا......''

''یہ کیا بکواس ہے......'' وہ غرایا۔

''تم آکے دیکھ سکتے ہو...... اس نے کہا کہ جس دن اسے طلاق ملے گی وہ چراغاں بھی کرائے گی...... مگر تم آؤ گے کیسے...... آنے کی سوچنا بھی مت......''

''مجھے آنے سے کون روک سکتا ہے......''

میں نے بے نیازی سے کہا...... ''ظاہر ہے میں تو ایسے کام نہیں کرتا...... میرے ملازم کافی ہیں......''

''دیکھو رفیق...... ابھی کچھ نہیں بگڑا...... تم نے کسی اور کو قانونی مشیر بنالیا...... یہ ایک غیر دوستانہ قدم تھا مگر تمہاری مرضی...... لیکن میرے اور میری بیوی کے درمیان آنے کی کوشش مت کرو......''

''مجھے کیا ضرورت ہے وکیل صاحب......''

''تم اسے ورغلا رہے ہو...... میرے خلاف......''

میں نے کہا...... ''بہتر ہوگا اگر تم اس سے بات کرو......''

''وہ فون ریسیو نہیں کررہی ہے۔''

میں نے کہا...... ''پھر میں کیا کرسکتا ہوں...... بس آئندہ مجھے فون مت کرنا...... میرے اور تمہارے درمیان اب کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہے...... از دیٹ کلیئر؟''

''مگر میں اپنی بیوی کو لینے آرہا ہوں......''

''آؤ اور مزید بے عزت ہوکے جاؤ...... صرف دھکے اور گالیاں کافی ہیں یا جوتے بھی نوش فرماؤ گے......''

وہ چیخا...... ''رفیق...... میں کیس کردوں گا تم پر...... تم نے میری بیوی کو حبس بے جا میں رکھا ہے...... زبردستی بند کر رکھا ہے......''

''یہ کیس ضرور کرو...... تاکہ تمہاری بے عزتی اس عدالت میں ہو جہاں تمہاری کچھ عزت ہے...... وہ سب کے سامنے تھوک دے گی تمہارے منہ پر اور کہہ دے گی کہ میں لعنت بھیجتی ہوں......''

ظاہر ہے اس سے زیادہ سننے کی فاروقی میں تاب نہ تھی...... میں نے فون بند کیا اور راجا کی سوالیہ نظروں کے جواب میں سر ہلا دیا...... اندازہ تو لیلیٰ بھابی کو بھی ہوگیا تھا کہ میں فون پر کس سے بات کررہا تھا...... وہ سب ڈھول کی آواز سن کر باہر نکل آئے تھے...... جوش میں ریشم سب سے آگے بڑھ گئی تھی......

میں نے کہا...... ''یہ کیا ہورہا ہے ڈاکٹر ریشم......''

وہ خوشی سے ہنسی...... ''پبلک سٹی سر...... کم یان واک دس اے......''

میں نے کہا...... ''راجا صاحب...... آپ کچھ سمجھے؟''

راجا نے نفی میں سر ہلایا...... ''میری انگریزی بھی اتنی اچھی نہیں ہے یار......''

شہناز نے کہا...... ''میں سمجھاتی ہوں...... یہ پبلسٹی کمپین ہے جو اس طرح چلے گی......''

میں نے اپنے سر پر ہاتھ مارا...... ''خاتون...... یہ آپ کی ڈاکٹر ریشم ایک بالکل نئی قسم کی انگریزی ایجاد کررہی ہے...... اسے روکو ورنہ انگریز ہمیں ماریں گے......''

''وہ ہمیں پہلے ہی مار رہے ہیں کزن......'' رابعہ بولی...... ''دراصل یہ آئیڈیا کل ہماری میٹنگ میں ڈسکس ہوا تھا اور منظور کرلیا گیا......''

''کون سا آئیڈیا......''

''ہمیں گرد و نواح میں اعلان کرانا تھا اور اطلاع بھی دینی تھی...... کہ خیر سے ڈاکٹر شہناز ولایت سے واپس آگئی ہیں...... اور اب حویلی میں علاج کریں گی......''

میں دم بخود رہ گیا...... ''کیا یہ ولایت گئی ہوئی تھیں؟''

رابعہ نے کہا...... ''بھئی سمجھا کرو...... اس تاثر کو بھی دور کرنا تھا جو افواہوں سے پھیلا تھا ڈاکٹر شہناز کو رانا صاحب نے اغوا کرلیا تھا......''

''یہ تاثر نہیں...... حقیقت ہے......''

''یار عام آدمی کو کیا پتا قانونی معاملات کا...... نہ وہ تصدیق کرے گا نہ تفتیش...... خوش ہوجائے گا......''

''یہ کس دانشور میڈیا ایکسپرٹ کے تخلیقی ذہن کا آئیڈیا تھا......''

رابعہ نے بتایا...... ''کہا جاسکتا ہے کہ یہ ایک اجتماعی کوشش تھی مگر کریڈٹ بہرحال ڈاکٹر ریشم کو دینا ہوگا...... ہمارا خیال تھا کہ ہر گاؤں میں ڈھول بجا کے منادی کرادی جائے...... ریشم نے تجویز دی کہ لوگوں کو متوجہ کرنے کے لیے کچھ اٹریکشن پیدا کی جائے...... یہ طریقہ سب کو پسند آیا......''

شہناز نے فخر سے اپنی اسسٹنٹ کو دیکھا...... ''اس نے بتایا کہ ہواز ہو...... گرد و نواح میں کون کیا کرسکتا ہے...... اب وہ تمہارے سامنے ہے دس میل کے دائرے کا انتخاب کرلیا گیا ہے...... انہیں غنی جمع کرکے لایا ہے......''

کسی آرکسٹرا کے بینڈ ماسٹر کی طرح غنی ان فنکاروں کو ترتیب سے بٹھا رہا تھا...... سر پر گھڑے رکھ کر ناچنے والا بھی بیٹھ چکا تھا...... باقی مجمع میں مجھے انسانوں کے ساتھ جانور بھی دکھائی دیے...... دو بھالو...... دو بندر...... چار کتے...... جوکر اور مداری نظر آنے والے...... اور کچھ موسیقار...... ڈھول بانسری اور باجا بجانے والے...... بعد میں مزید فنکار تشریف لائے......

برآمدے میں لائن سے کرسیاں ڈال دی گئیں...... اماں اور ابا بھی شور سن کے باہر آگئے تھے اور یہ تماشا خاصی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے...... سب کو ہدایات دینے کے بعد غنی ہماری طرف آیا۔

میں نے کہا...... ''غنی...... یہ کون لوگ ہیں......''

''یہ فنکار ہیں سر...... آس پاس کے دیہات سے بلوائے ہیں...... ابھی آپ کو اپنے اپنے کمال دکھائیں گے...... سب بے روزگار ہیں...... پہلے سرکس کرتے تھے تو کام مل جاتا تھا...... اب شہر جاکے بھی کچھ نہیں ملتا...... میں نے پانچ پانچ سو دینے کا وعدہ کیا ہے...... ڈاکٹر صاحبہ نے کہنے

ہے......"

"وہ تو ٹھیک ہے...... مگر یہ کریں گے کیا؟"

"یہ تین دن تک آس پاس کے دیہات میں رونق لگائیں گے اور لوگوں کو بتائیں گے کہ حویلی میں فری اسپتال اور اسکول شروع ہونے والا ہے...... اگر کوئی ڈھول پیٹ کے اعلان کرتا تو مجمع نہ لگتا...... اور لوگ شام تک بھول جاتے......"

میں نے کہا...... "ٹھیک ہے...... تم شروع کرو......"

وہ سب باری باری آئے...... یہ بڑا عجیب منظر تھا...... مجھے بہت سی فلمیں یاد آئیں جن میں روسی شہنشاہ اپنے درباریوں ملکاؤں اور کنیزوں کے ساتھ بیٹھ کر غلاموں کی شمشیرزنی کے یا شیروں کے دست بدست لڑائی کے مقابلے دیکھتے تھے...... یہ مقامی فنکار ہمارے سامنے آ کے ہاتھ جوڑ کے سلام کرتے تھے اور پھر ایک رٹی ہوئی تقریر دہراتے تھے...... تقریر میں سارے دعائیہ کلمات ہوتے تھے...... اللہ عزت دے دولت دے...... طاقت دے...... اقبال بلند رہے...... اولاد سکھی رہے...... خزانے بھرے رہیں...... بھاگ لگے رہیں...... نسل شادمان رہے...... فصلیں آباد رہیں...... اور ایسا ہی بہت کچھ...... دو چار فنکاروں سے یہ سب سن کے میں نے غنی سے کہا کہ ایسے تو شام ہو جائے گی...... یہ بس اپنے کرتب کا ایک نمونہ دکھائیں اور جائیں......

سب سے پہلے چودہ پندرہ سال کا ایک لڑکا آیا جو پندرہ فٹ اونچے بانسوں پر چلتا تھا کسی بھی سہارے کے بغیر...... اس کا رنگ توے جیسا سیاہ تھا اور دلچسپ بات یہ تھی کہ اس نے کچھ نہیں پہن رکھا تھا سوائے لنگوٹی کے مگر وہ بھی سیاہ تھی...... خواتین بھی پہلے کچھ گھبرائیں شرمائیں...... وہ بیس فٹ کی بلندی سے ہاتھ کو سر تک لے جا کے ہمیں سلام کرتا اور نعرے لگاتا گزرا...... یہ بعد میں معلوم ہوا کہ اس نے بدن پر کالک مل رکھی ہے۔

اس کے بعد ایک ادھیڑ عمر کا باریش پہلوان آیا...... اس نے پہلے ایک بھالو کو چت کیا...... پھر دو بھالو مقابلے پر آ گئے اور ایک زبردست قسم کی نورا کشتی ہوئی جو دیکھنے والوں کو بالکل اصلی لگی...... ایک بار جب بھالو نے اسے اٹھا کر پٹخا تو شہناز نے اور دوسری بار مس رابعہ نے چیخ ماری اور ہمارے ہنسنے کا انہوں نے برا بھی مانا...... اس میں کوئی شک نہیں کہ بھالو خاصے جسیم اور طاقتور تھے...... ان پر حیوانی جبلت غالب آ جاتی تو وہ اپنے مالک کو ادھیڑ سکتے تھے لیکن ٹریننگ کے مطابق آخر میں وہ ایسے گرے کہ پھر نہ اٹھے۔ دوسرے جانوروں کا تماشا دکھانے والے بھی پرفارم کر کے چلے گئے تو دو ہیجڑے آ گئے...... وہ بھی ہیجڑے بنے ہوئے تھے...... معلوم نہیں ان کی فنکاری پر ان کی بیویوں کو کیا کچھ سہنا پڑتا ہوگا...... انہوں نے جو گانے ہمارے سامنے گائے وہ بیشتر فلمی تھے لیکن انہوں نے حسب ضرورت ان میں ترمیم کر لی تھی اور یہ ترمیم ذو معنی ہونے کے باعث فحاشی بن گئی تھی...... پھر اس کے ساتھ ان کی حرکات...... راج محل کی عالی نسب خواتین منہ میں دوپٹے ٹھوس کے اور ایک دوسرے کی بغل میں سر گھسا کر ہنسی کرتی رہیں......

اس کے بعد بھانڈ آئے...... یہ دیہات کی تقریبات کی رونق ہوتے ہیں اور اسٹیج فنکاروں کی طرح ڈائیلاگ بولتے ہیں...... معلوم نہیں ان کے لیے اسکرپٹ کون تیار کرتا ہے...... کہا جاتا ہے کہ وہ موقع کی مناسبت سے خود اپنے ڈائیلاگ بناتے ہیں اور بغیر تیاری کے فی البدیہہ بھی بول سکتے ہیں...... ان کے ہاتھوں میں ڈیڑھ فٹ لمبے چھتر تھے...... چمڑے کے بڑے بڑے ٹکڑے جن کی شکل جوتے کے تلے جیسی ہوتی ہے...... وہ ایک دوسرے سے عالم معمول کی طرح سوال جواب کرتے ہیں اور کوئی کسی بھی وقت اچانک دوسرے کو جوتا رسید کر دیتا ہے...... اس کا ایکشن بڑا زبردست ہوتا ہے اور آواز بھی ایسے آتی ہے جیسے چھتر بڑے زور سے لگا...... دوسرا اس ضرب پر بہترین ردعمل دیتا ہے اور دیکھنے والوں کو حقیقت کا گماں ہوتا ہے کہ بڑی چوٹ آئی ہوگی لیکن یہ سب ڈراما ہوتا ہے...... جو اصل کمال ہے وہ کچھ اور ہے...... یہ بھانڈ یا جگت باز تماشا دیکھنے والوں اور میزبانوں سے پیسے وصول کرنے کے بڑے دلچسپ طریقے اختیار کرتے ہیں...... چونکہ برا کوئی نہیں مانتا اس لیے وہ کسی کسی کو رگید بھی ڈالتے ہیں...... کوئی کنجوس ہو...... زن مرید ہو...... بیوی سے دبتا ہو کچھ خامیوں کو وہ ایسے مزاحیہ انداز اور مزاحیہ جملوں میں...... جو اکثر پھکڑ پن ہوتے ہیں۔ پبلک کے سامنے لاتے ہیں کہ سننے والے ہنس ہنس کے باؤلے ہو جاتے ہیں۔ ایسے میں جسے نشانہ بنایا جائے وہ غصہ کرے تو مزید تماشا بنے۔ وہ بھی کھسیانی بلی کی طرح انہیں چپ کرانے کے لیے کچھ دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

میرے سامنے دو بھانڈ لائے گئے۔ ایک پتلا جس کا نام کھیرا تھا...... دوسرا چھوٹا اور موٹا...... اس کا نام زیرہ تھا مگر جیرا کہلاتا تھا...... اگر وہ پہلے سے تیاری کر کے آئے تھے تو حیرت کی بات تھی کیونکہ انہیں بہت شارٹ نوٹس پر آنا پڑا

تھا...... اور اگر جو کچھ انہوں نے بولا فی البدیہہ تھا تو واقعی کمال تھا۔ وہ پنجابی بول رہے تھے جو سب سمجھ سکتے تھے اب ان کے ڈائیلاگ سے ملاحظہ ہوں...... یہ اردو میں پیش کیے جا رہے ہیں۔

کھیرا...... اوئے تو نے کچھ سنا جیرے......

جیرا...... آہو...... تیری بلا چیخنے والی پاگل کتیا جیسی آواز سنی۔

کھیرا: (چٹاخ سے جوتی مار کے) ایک جنگل میں دو شیر رہ سکتے ہیں؟

جیرا: ہائے میں مر گیا...... تو اپنے رانا...... اور نواب کی بات تو نہیں کر رہا؟

کھیرا: نام لے گا تو تیرا ٹکھ (ٹکا) بھی نہیں رہے گا... اسو کی طرح۔

جیرا:...... جوتا مار کے...... تو بھی انہیں جانور کہہ رہا ہے پیچھے ہاتھ رکھ کے روئے گا۔

کھیرا: ہائے...... سنا ہے نیا شیر ولایتی ہے...... دو والتی گگڑی بڑی چنگی لگدی رے۔

جیرا...... گگڑی یا گڑی جو کپڑوں سے پرہیز کرے۔

کھیرا: (جوتا مار کے) اوئے کیا سب کے سامنے بتا دوں...... ہاں نام تو سب کے پتا ہیں۔

جیرا: ہائے میں مر گیا...... اپنا دیسی شیر پھر بیاہ رچانے لگا تھا۔

کھیرا: آہو...... پر وہ تھی کوئی ڈاکٹرنی...... اس نے پیچھے ڈیڑھ فٹ کا انجکشن لگا کے ممی کر دیا۔

جیرا: (جوتا مار کے)...... ممی وہ پہلے ہی تھا...... شیرنی بنا دیا......

کھیرا:...... پھر تو دو شیر رہ سکتے ہیں ساتھ...... ولایتی شیر دیسی شیرنی۔

جیرا:...... اوئے اسی ڈر سے تو وہ نٹ گیا ہے...... ولایتی شیر تو......"

اس مرحلے پر میں نے انہیں روک دیا۔ خود میرا ہنسی سے برا حال تھا اور خواتین کی تو حالت خراب تھی...... میں نے ریشم سے کہا کہ ان سب کو کچھ کھانے کے لیے دو......

وہ پریشان ہو گئی...... "سر...... ٹوٹلی مین ایٹ راٹ......"

غنی نے کہا...... "بک بک نہ کر...... جا کچھ بنا لے...... یہ انتظار کر لیں گے۔"

میں نے کہا "غنی...... یہ سب انہیں تم نے سکھایا۔"

"سر...... قسم لے لیں مجھ سے...... یہ سب خود کرتے ہیں۔"

میں نے کہا...... "کیا یہ مناسب ہے۔"

"آپ فکر نہ کریں سر...... یہ وہی کہتے ہیں جو سنتے ہیں...... اور لوگ بھی جانتے ہیں...... یہ تو کچھ بھی نہیں صرف ایک نمونہ تھا......"

شہناز نے کہا...... "یعنی یہ اس سے زیادہ بولیں گے......؟"

"یہ تو ایسی مستی کر دیں گے رانا کی...... لیکن بیچ میں تھوڑا بہت آپ کو بھی لائیں گے۔"

میں نے کہا۔ "اس کا مطلب ہے ہدایات کا رتم ہی ہو......"

وہ سر کھجانے لگا...... ڈائیلاگ ان کے اپنے ہوتے ہیں مسٹر راجا نے کہا۔ "جانے دے یار...... یہ بھی اچھا تماشا رہے گا۔"

میں خاموش ہو گیا...... مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ پبلسٹی کا یہ آئیڈیا پیش کرنے والی خواتین کا ووٹ بھی راجا کے ساتھ ہے۔

میں نے کہا...... "میں حیران ہو...... ریشم کو ڈاکٹری کی ڈگری شہناز نے دے دی...... میں سوچ رہا ہوں اسے ماس کمیونی کیشن میں ڈاکٹریٹ کی سند دے دوں۔"

شہناز بولی...... "یہ لوگ گروپ بنا کے گاؤں گاؤں پھریں گے۔ ایک دن میں پانچ چھ جگہ پر فارم کریں گے...... ہر جگہ گاؤں کے لوگ میلے میں جمع ہوں گے...... مرد، عورتیں، بچے بوڑھے سب......"

رابعہ نے کہا...... "اگر بازار میں ڈھول پیٹ کے اعلان کرتے تو اس کا اتنا اثر نہ ہوتا......"

ریشم کا چہرہ حیرت سے دمکنے لگا...... "اب آپ دیکھا سر اس علاقے میں صرف آپ کا ڈنکا بجے گا......"

"ایک اور اعلان میری طرف سے......" میں نے کہا...... "جس دن اسکول اور اسپتال شروع ہوں گے اس دن رات کو یہاں دعوت عام ہوگی اور سب کو فلم ہیر رانجھا مفت دکھائی جائے گی۔"

"فلم کی بات اچھی ہے جناب عالی...... لیکن دعوت...... بڑی خلقت آ جائے گی...... دور دور سے......" غنی سوچ میں پڑ گیا۔

راجا نے کہا...... "یار کتنے لوگ آئیں گے ہزار...... دو ہزار......"

غنی نے سر کھجاتے ہوئے کہا...... ''زیادہ...... پانچ ہزار تک......''

''چلو پانچ ہزار سہی... وہ کون سا چکن بروسٹ یا قورمہ بریانی مانگتے ہیں... میٹھے چاول کھا کے خوش ہو جاتے ہیں۔''

راجا نے کہا۔''بڑی ہڑ بونگ ہوگئی...... انتظام مشکل ہو جائے گا۔''

یہ ذمے داری غنی نے قبول کرلی...... ''اس کی فکر نہ کریں سر...... میں کرلوں گا......''

اماں ابا پہلے ہی اٹھ کر چلے گئے تھے۔ اب وہاں جوش اور جذبے سے بھری ہوئی خواتین پر مشتمل انتظامی کمیٹی رہ گئی تھی۔ میری تائید اور دلچسپی نے ان کے حوصلے بڑھا دیے تھے۔ اچانک ان کی بے کیف اور کسی حد تک مایوس...... پریشان حال اور پرآرام زندگی میں خوشی اور امنگ...... دلچسپی اور چیلنج کی سنسنی خیزی آ گئی تھی۔

رابعہ نے بڑے جوش سے کہا...... ''تم دیکھنا ہم کیا کرتے ہیں کزن......''

شہناز نے اپنی بات جاری رکھی...... ''پہلے ہمارا پروگرام تھا ایک میلہ لگایا جائے...... ارد گرد کے سارے دیہات کو جمع کرنے کے لیے...... لیکن اس کی تیاری میں وقت لگتا ہے...... پھر غنی نے یہ پروگرام بنا دیا۔''

رابعہ نے کہا...... ''اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ میلے کا آئیڈیا ڈراپ کر دیا گیا ہے...... میلا بھی ہوگا...... اور اس میں وہ سب ہوگا جو کسی عرس یا عید کے موقع پر لگنے والے میلوں میں ہوتا ہے...... جھولے...... کھیل تماشے...... کھانا، پینا...... مقابلے...... سرکس اور موت کا کنواں......''

''یہ سب کون کرے گا...... میرا مطلب ان سب کو جمع کرنا......''

راجا نے کہا...... ''جو لوگ فن فیئر اور نمائش...... مینا بازار، میلے لگاتے ہیں...... وہ سب کو بلا لیتے ہیں...... ان کے پاس سب کے نام اور پتے ہوتے ہیں...... سارا کھیل ہوتا ہے گارنٹی منی کا...... سرکس والا آئے گا اسے امید ہونی چاہیے کہ کم سے کم اتنی رقم ضرور ملے گی...... یہ گارنٹی ہم فراہم کر دیں گے...... پھر وہ کیوں نہیں آئیں گے...... کمائی کا موقع کون چھوڑتا ہے...... اور مجھے یقین ہے کمائی بہت ہوگی کیونکہ منتظم ہمارے ہوں گے...... لوگوں کو کھینچ کر لانے کے گر ہوتے ہیں...... یہ ایونٹ منیجر اسی کے ماہر ہوتے ہیں۔

''او کے...... گرانڈ میلے کا آئیڈیا منظور......''

رابعہ اور شہناز نے خوشی سے چیخ مار کے آپس میں ہاتھ ملایا...... ''قسم خدا کی مزہ آ جائے گا......'' رابعہ بولی...... ''راجا جی...... سمجھ لو گرین سگنل مل گیا...... کل سے تیاری شروع کر دو...... جس سے رابطہ کرنا ہے کرلو......''

شہناز نے کہا...... ''لیکن رابعہ ابھی تو کچھ طے نہیں ہوا...... میلا کب ہوگا...... کہاں ہوگا......''

میں نے کہا...... ''دیکھو...... اگر ہمارا یہ پروگرام کامیاب ہو جاتا ہے۔''

رابعہ بولی...... ''اگر مگر کا کیا سوال...... ہمارا پروگرام کامیاب ہوگا...... دیکھ لینا۔''

راجا نے کہا...... ''کل سے میں بھی غنی کے ساتھ رہوں گا...... سوچ رہا ہوں آس پاس کے سارے علاقے میں پوسٹر اور بینرز لگوا دوں مگر یہ ذرا مشکل کام ہے...... اور اس کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں لوگ شہناز کا نام پہلے سے جانتے ہیں...... لیکن ایک دو آسان طریقے ہیں...... ہمارے یہ فنکار جہاں جائیں بچوں میں ٹوپیاں تقسیم کر دیں...... ''کاغذ کی ٹوپیاں جن پر اسپتال کا نام لکھا ہو......''

''وہ تو ہم نے ابھی سوچا ہی نہیں......'' رابعہ بولی۔

میں نے کہا...... ''اس میں سوچنے والی کون سی بات ہے...... شہناز ویلفیئر اسپتال...... یا شہناز فلاحی اسپتال۔''

شہناز کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا...... ''ست بدھائی ویلفیئر اسپتال''

میں نے کہا...... ''لو...... نام طے ہو گیا......''

راجا نے کہا...... ''او کے...... ٹوپی پہن کے بچے سارا دن پھرتے رہیں...... جہاں بھی جائیں ٹوپی سر پر ہو...... انہیں پانچ روپے دیے جائیں گے...... گاؤں کے بچوں کے لیے یہ بڑی دولت ہے۔''

رابعہ نے کہا...... ''بات میلے کی ہو رہی تھی کہ کب ہوگا......''

''اسپتال کا افتتاح کب ہوگا......'' راجا نے سوال پر سوال کر دیا......

''میرا خیال ہے...... دس دن بعد...... اگر دس دن میں سارے کام ہو گئے......'' شہناز نے کہا۔

''ٹھیک ہے...... دس دن کی تاریخ دے دو، آج سے دس دن...... اسی دن اسکول بھی شروع ہوگا......''

رابعہ گھبرائی...... ''اسی دن؟...... کیوں لیلیٰ بھابی!''

لیلیٰ بھابی نے سر ہلا دیا...... ''مجھے کوئی اعتراض نہیں......''

''فلم شو کا انتظام میں کرا دوں گا...... جگہ غنی طے کرے گا...... کوئی مرکزی جگہ جہاں پانچ ہزار افراد بیٹھ سکیں۔ زمین پر۔''

''اور پانچ ہزار افراد کا کھانا...... پک تو خیر جائے گا...... کھلائے گا کون...... برتن بھانڈے کہاں سے آئیں گے۔''

''وہ سب اپنے اپنے لائیں گے...... ہم انہیں نظم و ضبط بھی سکھائیں گے...... کوئی ہنگامہ نہیں ہڑ بونگ نہیں...... لائن میں کھانا لیتے جاؤ اور بیٹھتے جاؤ...... اپنی اپنی جگہ...... ہمارے رضا کار سب کو کنٹرول کریں گے...... رضا کار غنی فراہم کرے گا......''

رابعہ بولی...... ''اُفوہ...... میلے کی بات سے کیوں ہٹ جاتے ہو تم لوگ۔''

میں نے کہا...... ''حوصلہ رکھو کزن...... میلا بھی ہوگا...... ایک مہینے بعد کا کوئی دن رکھ لیتے ہیں...... آج اٹھارہ تاریخ ہے...... اگلے مہینے کی آخری تاریخوں میں دیکھ لو......''

''میں فیصلہ کرتا ہوں...... اٹھائیس تاریخ...... منظور؟''

''منظور......'' ہم سب نے ایک ساتھ کہا اور ہاتھ ملایا۔

''ایک اور تجویز تھی میری...... ترغیب کے لیے اسکول میں داخلہ لینے والے بچوں عورتوں اور مردوں کو کچھ انعام دیا جائے...... مثلاً یہ کہہ دیا جائے کہ جس کی حاضریاں پوری ہوں گی اسے عید کا جوڑا ملے گا...... سو فیصد حاضری تو شہر میں نہیں ہوتی...... ہم پچاس فیصد بھی رکھ سکتے ہیں؟ راجا نے کہا۔

''اگر تو لڑکی ہوتا تو ایسے شاندار آئیڈیے پر میں تیرا منہ چوم لیتا۔'' میں نے کہا۔

راجا بولا...... ''اگر تو اجازت دے تو تیری طرف سے یہ کام میں کرنے کے لیے تیار ہوں دوست......''

شہناز نے چپل اتار لی...... ''واقعی دوستی ہو تو ایسی......''

رابعہ نے کہا...... ''لیلیٰ بھابی...... تم بھی کچھ بولو... کسی سوچ میں گم ہو......''

رابعہ ہی نہیں ہم سب بھی اس کی اداسی اور خاموشی کا سبب جانتے تھے...... اس سوال کا مقصد اسے شریک گفتگو کرنا تھا تاکہ اس کے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو مگر اس کے جواب نے سب کو چپ کر دیا۔ ''میں دیکھ رہی ہوں کہ تم لوگ اپنی خوشی میں کتنے خود غرض ہو...... کسی کو فریال کی کمی محسوس نہیں ہو رہی ہے... کسی نے نہیں کہا کہ آج وہ بھی ہمارے ساتھ ہوتی تو کتنی خوشی ہوتی...... شاید سب سے زیادہ......''

ایک لمحے کے لیے سناٹا چھا گیا...... شرمندگی کی خاموشی میں ہم سب کے سر جھک گئے...... کسی میں ہمت نہ تھی کہ لیلیٰ بھابی سے نظر ملاتا اور ان کی بات کا جواب دے سکتا۔

''کیا کسی نے دیکھا۔'' لیلیٰ بھابی نے آنکھوں میں آ جانے والے آنسو پونچھے...... ''اماں اور ابا کے جذبات کیا تھے؟...... ان پر کیا بیت رہی تھی جب یہاں تماشا ہو رہا تھا اور سب خوش تھے...... ہنس رہے تھے...... ابا کا چہرہ اچانک دکھی ہو گیا تھا...... آخر کیوں؟......''

میں نے ندامت سے کہا...... ''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔''

بھابی نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں...... اماں نے ان سے کچھ کہا تھا...... پھر انہوں نے تمہاری طرف دیکھا اور افسوس سے سر ہلا کے کھڑے ہو گئے...... مجھ سے تو انہوں نے یہی کہا کہ بیٹا یہ کھیل تماشا تم لوگوں کے دیکھنے کی چیز ہے...... مگر میں سمجھ گئی تھی...... انہیں فریال یاد آ رہی تھی...... وہ ہر کام میں بڑھ چڑھ کر حصے لیتی تھی...... اماں ابا کہتے ہیں...... اس کھنڈر کو فریال نے حویلی بنایا...... کیا شک ہے اس میں...... یہ باغ اس کی دلچسپی سے بنا...... اور وہ تہ خانہ جہاں سب کی تصویریں ہیں...... حویلی کے پرانے مکینوں کی...... وہ جگہ ایک کباڑ خانہ تھی...... اس نے تصویر خانہ بنا دیا...... کہتی تھی فرصت ملتے ہی اماں ابا کی تصاویر بھی لگانی ہیں...... آج وہ کسی کو یاد نہیں آئی...... واقعی...... دنیا کے کام چلتے رہتے ہیں...... کسی کے ہونے نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے......''

بات کرتے کرتے وہ پھر رونے لگیں۔

شہناز نے انہیں گلے لگا لیا...... ''مت روئیں بھابی...... بھلا ہم بھول سکتے ہیں فریال کو......''

رابعہ نے کہا...... ''ہم پوری کوشش کر رہے ہیں...... اسے تلاش کر کے واپس لانے کی۔''

''جھوٹ...... مجھے تو کوئی کوشش ہوتی دکھائی نہیں دیتی...... صبح سے شام تک سب اپنے اپنے کاموں میں لگے رہتے ہیں۔''

میں نے کہا...... ''لیلیٰ بھابی...... ہم معلومات حاصل کر رہے ہیں...... میں طے کر چکا تھا کہ فرصت ملتے ہی اسلام آباد چلا جاؤں گا۔''

''ہاں...... اب اور کوئی کام نہیں رہے گا تو فریال کے بارے میں بھی سوچیں گے...... اتنی ہی ہے اس کی اہمیت تمہاری نظر میں؟...... دنیا کے سب معاملات کے لیے وقت ہے...... فریال کے لیے فرصت چاہیے...... فرصت کا بہانہ

کیوں کرتے ہو نواب صاحب...... وہ وقت یاد کرو جب تم اسے لے کر میرے گھر آئے تھے...... تم نے کہا تھا کہ برات لے کر آؤ گے...... وہ دلہن بن کے میرے گھر سے رخصت ہو گی...... اور تب تک وہ وہیں رہے گی...... کہا تھا یا نہیں؟''
لیلیٰ بھابی کا سارا غصہ جو شاید فاروقی پر نہیں نکلا تھا مجھ پر نکل رہا تھا۔

میں مجرموں کی طرح سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا...... بھابی نے میرے منہ پر سب کے سامنے پتھر مارا تھا اور اس کی اذیت میں اپنی روح میں محسوس کر رہا تھا...... مزید اتفاق یہ ہوا کہ اسی وقت میرے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی اور مجھے اسکرین پر فریال کی سہیلی شائستہ کا نمبر دکھائی دیا۔

مجھ میں ہمت نہ تھی کہ یہاں سب کے سامنے فریال کی بات کروں اور شائستہ سے مزید تلخ ترش سنوں...... پتا نہیں میرا ذہن اس حد تک مایوسی کی گرفت میں کیوں تھا...... میں نے یہ نہیں سوچا کہ لندن سے اچھی خبر بھی آ سکتی ہے۔ شائستہ یہ بھی تو بتا سکتی ہے کہ فریال کا سراغ مل گیا...... میں نے اسے ٹکٹ بھیج دیئے ہیں اور وہ آ رہی ہے۔

میں نے اندر جا کے شائستہ سے بات کی...... یہاں پاکستان میں دوپہر کا ایک بجا تھا...... لندن میں صبح کے آٹھ بجے کا وقت تھا......

میں نے مصنوعی خوشدلی سے کہا...... ''ہیلو ڈاکٹر شائستہ''
اس نے اپنے روکھے طریقے سے براہ راست سوال کیا۔ ''تم کہاں ہو۔''
میں نے کہا...... ''یہاں...... ست بدھائی میں۔''

''مجھے یہی امید تھی...... زمین جنبد نہ جنبد گل محمد...... تم نہیں نکلو گے اپنی حویلی سے...... اب تو فون کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے نواب صاحب......''
میں نے غصے کو پی کے کہا۔ ''کیا اس کی کوئی خبر ملی۔''

''ہاں...... ملی ہے...... وہ ست بدھائی سے نکلی...... گجرات پہنچی اور لاپتا ہو گئی...... نہ اسلام آباد پہنچی نہ لندن...... اب کون جائے اسے تلاش کرے...... نہ کسی کو فرصت نہ ضرورت......''

''میں آج اسلام آباد جا رہا ہوں۔''
''واقعی...... اتنی جلدی بھی کیا ہے...... کچھ دن اور دیکھ لیتے...... وہ جائے گی کہاں...... دھکے کھا کے لوٹ آئے گی...... ساری خوش فہمی دور ہو جائے گی محترمہ کی...... از راہ بندہ پروری ترس کھا کے رکھ لینا۔''

میرا دل چاہتا تھا کہ میں اسے ایسی بے نقط سناؤں کہ اس کا دماغ درست ہو جائے لیکن ایک وہی تھی جو میرے اور فریال کے درمیان رابطے کا واحد وسیلہ تھی۔ بعد میں بھی فریال کی خبر مجھے اور کہیں سے نہیں مل سکتی تھی...... دوسرے مجھے ایک شک تھا...... جو روز بروز تقویت حاصل کرتا جا رہا تھا...... کہ کہیں فریال کے ساتھ ہونے والی زیادتی پر شائستہ مجھے سزا نہ دے رہی ہو...... فریال کب کی لندن پہنچ کے اس کے گھر میں بیٹھی ہو...... سہیلی مجھے ذہنی اذیت میں مبتلا کر کے بدلا لے رہی ہو...... وہ گجرات میں ہے...... سلطان سے شادی کر رہی ہے...... پاگل کی بچی...... بغیر سوچے بول گئی...... اب کہہ رہی ہے جاؤ اسلام آباد کی خاک چھانو...... خیر...... جھوٹ سچ کا آخر پتا چل ہی جائے گا...... وہ چاہتی ہے کہ میں بہت خواری اٹھا کے لندن تک جاؤں تو یہی سہی...... دوسری طرف یہ خیال زیادہ جان لیوا تھا کہ شائستہ ڈراما نہیں کر رہی ہو...... فریال سچ لاپتا ہو۔

دوپہر کے کھانے سے پہلے ہی میں نے راجا سے مشورہ کیا اور اعلان کر دیا کہ میں فریال کو واپس لانے کے لیے اسلام آباد جا رہا ہوں...... ظاہر ہے میرے ارادے کو سب کی تائید حاصل رہی...... ابا جی نے کہا...... ''اللہ کرے وہ مل جائے۔''

میں نے کہا...... ''مل جائے گی ابا جی...... میں تلاش کر لوں گا۔''

''بہت دیر کی مہرباں جاتے جاتے...... پھر بھی...... امید پر دنیا قائم ہے دیر آید درست آید......''
اماں نے کہا...... ''سنو جی...... اس کے کہنے سے وہ نہیں آئے گی تم جاؤ اس کے ساتھ......''
میں نے گھبرا کے کہا...... ''کیسی باتیں کرتی ہو اماں...... یہ میرے ساتھ کہاں خوار ہوں گے......''
''اچھا تو اپنے ساتھ راجا کو لے جاؤ......''
میں نے کہا...... ''یہاں کے معاملات کون سنبھالے گا...... اسے بہت کام ہیں یہاں شہناز کا اسپتال شروع ہونے والا ہے۔''
اماں اپنی بات پر اڑی رہیں...... ''رابعہ تو جا سکتی ہے۔'' یہ بحث نہ جانے کب تک چلتی...... قسمت اچھی تھی کہ پھر سے لوگوں کے اونچی آواز میں باتیں کرنے کا شور سنائی دیا...... میں باہر لپکا تو راجا کے ساتھ غنی گیٹ پر موجود تھا...... شہناز اور رابعہ کے ساتھ لیلیٰ بھابی برآمدے میں کھڑی تھیں...... ہوائیاں سب کے چہرے پر اڑ رہی تھیں مگر بھابی

کی تو حالت غیر تھی۔

میں نے پوچھا...... ''رابعہ...... کیا پرابلم ہے۔''

اس نے گیٹ کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا...... ''تمہارا دوست آیا ہے پولیس کے ساتھ...... اپنی بیوی کو ساتھ لے جانے کے لیے۔''

میں نے کہا...... ''پھر تم لوگ یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو...... چلو اندر...... گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔''

لیلیٰ بھابی نے کانپتے ہوئے کہا...... ''میں نہیں جاؤں گی رفیق بھائی......''

میں نے انہیں تسلی دی۔ ''زبردستی کون لے جا سکتا ہے آپ کو......''

''وہ...... وارنٹ لے کر آئے ہیں۔''

میں نے کہا...... ''وارنٹ کس بات کے؟ نہ ہم نے تمہیں چھپا کے رکھا ہے نہ زبردستی بند کر رکھا ہے...... آپ اطمینان رکھیں...... اور حوصلہ رکھیں......''

پھر میں گیٹ کی طرف گیا...... باہر سے فاروقی چلا رہا تھا...... ''سالے صحافی کی اولاد...... میں تجھے جیل میں سڑا دوں گا۔''

راجا نے ترکی بہ ترکی جواب دیا...... ''چل بھٹ یہاں سے وکیل کے گھوڑے...... تیرے جیسے بہت دیکھے ہیں ہم نے۔''

میں نے قریب جا کے کہا...... ''راجا...... اسٹاپ دس...... نان سنس۔ فاروقی اگر پولیس کے ساتھ آیا ہے تو اسے آنے دو......''

''یار ایسے ہی ڈرا رہا ہے وارنٹ سے سالا...... دھونس میں اپنے ساتھ کسی ڈی ایس پی کو لے آیا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''بات کر لیتے ہیں ڈی ایس پی سے بھی...... گارڈ...... گیٹ کھول دو...... گاڑی کوئی اندر نہیں آئے گی۔''

گیٹ کھولا گیا...... باہر ایک جیپ تھی جس میں ڈی ایس پی کے ساتھ مقامی تھانے کا انچارج اور اس کے ماتحت تھے...... وہ بیچارے نچلے درجے کے ملازم ہر افسر کو سلیوٹ کرنے اور اس کا حکم ماننے کے پابند تھے۔ اس کے پیچھے فاروقی کی گاڑی تھی...... سیکورٹی گارڈز راستہ روک کے کھڑے ہو گئے۔ میں راجا کے ساتھ کافی پیچھے رہا...... پھر ہم اندر چلے گئے۔

ڈی ایس پی نے یقیناً بہت بے غیرتی محسوس کی ہو گی جب ماتحتوں کے سامنے اس کی اتھارٹی نہیں چلی اور اسے جیپ سے اتر کے پیدل اندر جانا پڑا...... جب تھانے دار اور سپاہیوں نے اندر آنا چاہا تو سیکورٹی گارڈز نے انہیں باہر ہی روک کے گیٹ بند کر دیا۔

غنی نے پورے سرکاری پروٹوکول کے ساتھ فاروقی اور ڈی ایس کو مہمان خانے تک پہنچایا...... اب تک فاروقی ایک دوست کی حیثیت سے آیا تھا تو کسی بھی وقت آ سکتا تھا اور کہیں بھی جا سکتا تھا...... اب اس کی حیثیت بدل گئی تھی...... وہ دل ہی دل میں بہت پیچ و تاب کھا رہا ہو گا کہ رفیق جانتے بوجھتے حویلی کے اندر نوابی رکھ رکھاؤ کا ڈراما کر رہے ہیں لیکن یہ ضروری تھا۔

جیسے ہم نے ایک بار رانا کے بیٹے کو ریسیو کیا تھا اور ایسے انتظار کرایا تھا جیسے کسی امیر سے غریب کو کسی وی آئی پی یا وی وی آئی پی سے شرف ملاقات کے لیے خوار ہونا پڑتا ہے۔ ایسے ہی میں نے ان دونوں کو پندرہ بیس منٹ انتظار کیا تاکہ ان میں جو تھوڑی بہت اکڑفوں ہے وہ بھی نکل جائے۔

جب میں اندر گیا تو ان سے ہاتھ ملائے بغیر کافی فیصلے پر بیٹھ گیا ایک سیکورٹی گارڈ راجا کے کہنے پر میرے پیچھے اٹین شن ہو گیا...... پھر میں نے سپاٹ لہجے میں کہا...... ''کیا آپ اس علاقے کے نئے ڈی ایس پی ہیں۔''

''جی نہیں...... میں تو فاروقی صاحب کے کہنے پر آ گیا تھا...... میرا نام ہے...... اعجاز الحسن......''

''کہاں پوسٹنگ ہے آپ کی۔'' میں نے پوچھا۔

''اس کو چھوڑیں۔ یہ آپ کے دوست ہیں مسٹر فاروقی! ان کو شکایت ہے کہ آپ نے ان کی بیوی کو اس کی مرضی کے خلاف یہاں روک رکھا ہے حبس بے جا......''

میں نے اس کی بات کاٹ دی ''ایک منٹ ڈی ایس پی صاحب' آپ ایک ساتھ بہت سی غلط باتیں کر گئے۔ پہلی یہ کہ مسٹر فاروقی میرے دوست ہیں' دوست ہیں تو ان کی بیوی حبس بے جا میں کیسے ہوئی؟ بیویاں تو دوستوں کے گھر میں آتی جاتی رہتی ہیں۔ قید میں رکھتے ہیں دشمن!''

ڈی ایس پی خفا ہو گیا ''آپ زبان پکڑ رہے ہیں۔''

''آپ وردی میں ہیں' ذمے داری سے بات کریں۔ دوسری بات آپ نے کہی ہے کہ انہوں نے شکایت کی ہے۔ کہاں ہے ان کی رپورٹ؟ کس تھانے میں شکایت درج ہوئی ہے' اور کب......؟''

''دیکھیے' ابھی اس کی نوبت نہیں آئی...... مگر......''

میں نے کہا ''مگر کیا...... یہ آپ کا علاقہ نہیں۔ آپ کیسے وردی میں پولیس فورس لے کر آ گئے؟ حبس بے جا کی

ایف آئی آر ہو گی تو اس علاقے کا پولیس افسر ساتھ آئے گا۔'' میں نے برہمی سے کہا ''اور اس سے میں نمٹ لوں گا۔''

''آپ بات کو بڑھانا چاہتے ہیں۔''

میں نے کہا ''ڈی ایس پی صاحب! جو میرے گھر آئے وہ میرا مہمان ہوتا ہے اور اسے ہم بے عزت نہیں کرتے لیکن اسے بے عزتی کا حق بھی نہیں دیتے۔ میں آپ کو دروازے سے لوٹا سکتا تھا لیکن آپ فاروقی صاحب کے ساتھ تھے اس لیے میں نے گارڈز سے کہا کہ آپ کو آنے دیا جائے۔''

''میں ان کا دوست ہوں۔''

میں نے کہا ''بس پھر دوست بن کر بات کیجیے۔ سرکاری حیثیت کو بھول جائیے۔ قانونی بات فاروقی صاحب خود بھی کر سکتے ہیں۔''

فاروقی اب تک ضبط سے کام لے رہا تھا۔ شاید اسے ڈی ایس پی نے کہا ہو گا کہ تم مجھے بات کرنے دینا۔ اس کی افسری اور رعب و اختیار کے غبارے کی ہوا نکل گئی تو فاروقی کو اپنی بے وقوفی کا اندازہ ہوا۔ میرے موڈ کو دیکھتے ہوئے بھی وہ محتاط تھا۔ وہ جانتا تھا کہ میری مرضی کے خلاف کوئی بات ہوئی تو میں ان دونوں کو بے عزت کر کے بھی حویلی سے نکال دوں گا اور وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ پائیں گے۔''

ڈی ایس پی کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے کہا ''فاروقی' پھر تم کرو بات۔ یہاں لا کے تم نے میری بے عزتی ہی کرائی۔''

فاروقی نے میری طرف دیکھا ''رفیق! بات کو ختم کرو' میری بیوی میرے حوالے کر دو۔''

''حوالے کر دوں......؟ کیا وہ میری تحویل میں ہے؟ وہ تمہارے ساتھ آئی تھی لیکن اس نے تمہارے ساتھ جانے سے انکار کر دیا تو میں کیا کر سکتا ہوں' میں اسے نکال تو نہیں سکتا؟''

فاروقی مشتعل ہو کے بولا ''تمہارے ورغلانے سے اس کی اتنی جرأت ہوئی۔''

میں نے کہا ''کیا میں تمہارے ڈی ایس پی دوست کے سامنے وہ اسباب بیان کروں جو اس کے انکار کا سبب بنے تھے؟ رہی بات ورغلانے کی...... تو وہ اپنی خوشی اور مرضی سے یہاں رہنا چاہتی ہے۔''

ڈی ایس پی پھر بولا ''میں نہیں مانتا۔''

میں نے غرا کے کہا ''آئی ڈیم کیئر۔ فاروقی کہے تو اس کی بیوی یہاں آ کے اس کے منہ پر وہ سب کہہ سکتی ہے۔ جو میں نے بتایا۔''

فاروقی نے بے چینی سے کہا ''ہاں' بلاؤ اسے۔''

میں نے پیچھے کھڑے گارڈ سے کہا ''جاؤ مسز فاروقی سے پوچھو کہ کیا وہ یہاں آنا چاہیں گی؟ فاروقی صاحب سے بات کرنے کے لیے۔''

''اس فضول بات کا کیا مطلب ہے؟'' فاروقی بگڑ گیا۔

میں نے سپاٹ لہجے میں کہا ''اسے گرفتار کر کے یا زبردستی اٹھا کے تو نہیں لایا جا سکتا۔''

گارڈ سلیوٹ جھاڑ کے چلا گیا۔ اسی وقت ریشم چائے کی ٹرالی دھکیلتی ہوئی لائی۔

''میرا کوئی موڈ نہیں ہے چائے پینے کا۔'' فاروقی نے بدمزگی سے کہا۔

''میرا بھی۔'' ڈی ایس پی نے بھی اس کا ساتھ دیا۔

''مہمانوں کی خاطر مدارات ہماری روایت ہے۔ خواہ مہمان کتنے ہی بداخلاق کیوں نہ ہوں۔ ہم بداخلاقی جائز نہیں سمجھتے۔ ریشم...... چائے کی ایک پیالی مجھے بنا کے دو۔ باقی واپس لے جاؤ۔'' میں نے کہا۔

''یس سر! وڈ یو لائک اینی تھنگ ایلس؟'' ریشم بولی۔

میں دم بخود رہ گیا۔ اتنی عمدہ انگلش اتنی روانی سے ریشم بول ہی نہیں سکتی تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ جملہ اسے رٹایا گیا تھا۔ اس کا زبردست اثر ہوا۔ ڈی ایس پی سخت متاثر ہوا کہ نواب صاحب کی خادمائیں اور کنیزیں بھی انگلش میں بات کرتی ہیں۔ ہم لوگ ایسی باتوں سے مرعوب ہونے کے عادی ہو گئے ہیں۔

لیلیٰ بھابی بڑی تمکنت سے آئی اور مجھ سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گئی۔ اس نے بڑے سکون سے پوچھا ''آپ کوئی بات کرنا چاہتے ہیں' مجھ سے۔''

فاروقی نے کہا ''ہاں' میں اکیلے میں بات کرنا چاہتا تھا۔''

''جو بات ہو گی نواب صاحب کے سامنے ہو گی۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

''زیادہ ڈراما مت کرو۔ سیدھی طرح میرے ساتھ چلو۔''

لیلیٰ بھابی نے کہا ''یہ میں نے کل ہی بتا دیا تھا کہ میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ پھر تمہارے ساتھ جانے کا کیا سوال!''

فاروقی نے سخت بے عزتی محسوس کی ''تمہیں معلوم ہے تم کیا کہہ رہی ہو؟''

''بہت سوچ سمجھ کے میں نے یہ فیصلہ کیا ہے۔ نہ مجھے کسی نے ورغلایا ہے اور نہ مجھ پر کسی کا دباؤ ہے۔ یہ بات تمہیں سمجھ لینی چاہیے۔ ضرورت پڑنے پر یہ بات میں عدالت میں بھی کہہ دوں گی۔''

صدمے اور احساس ذلت سے فاروقی پر جیسے بجلی گر گئی ''تم...... طلاق لینا چاہتی ہو...... تمہارا دماغ خراب ہے......''

''اس کے برعکس۔ میرا دماغ پہلے کچھ سمجھنے سے قاصر تھا۔ اب میں جو کہہ رہی ہوں' سوچ سمجھ کے کہہ رہی ہوں۔ اگر تم بات کو نہ بڑھاؤ تو اس میں تمہارا ہی بھلا ہے ورنہ طلاق تو میں عدالت کے ذریعے بھی لے لوں گی۔'' وہ اٹھی اور اطمینان سے چلتی باہر نکل گئی۔

فاروقی کے لیے یہ سب ناقابل یقین و تصور تھا۔ جذبات کا غلبہ ہو تو عقل کام نہیں کرتی۔ فاروقی اکیلا آ کے بات کر لیتا تو نہ ہمیں نوابی اکڑفوں کا یہ کھیل رچانا پڑتا اور نہ اس کے' ڈی ایس پی کی عزت کا تماشا بنتا۔ فاروقی اچھی طرح جانتا تھا کہ لنکا میں جو ہے سو باون گز کا۔ یہاں سارے ایک جیسے مزاج کے ہیں۔ شرافت میں غلام کے سامنے جھک جائیں اور بدمعاشی میں شاہ کے سامنے نہ جھکیں۔

ان دونوں نے میرے موڈ سے اندازہ کر لیا تھا کہ شور ہنگامہ کرنے سے مزید خرابی ہوگی۔ شاید ڈرامے کے آخری سین میں نواب رفیق احمد شیرازی تالی بجا کے پہرے داروں کو طلب فرمائیں اور حکم دیں کہ ان گستاخوں کو حویلی کی فصیل تک جوتے مارتے لے جاؤ اور باہر گرا دو۔ یا منہ کالا کر کے گدھے پر الٹا بٹھاؤ اور ریاست بدر کر دو۔ اس اکیسویں صدی میں بھی وڈیرا شاہی کے یہ نمونے دیکھے جاسکتے ہیں۔ پاکستان کے اندر ایسی بہت سی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہیں جہاں ملکی قانون کا پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ غلامی کا دستور ہے اور حاکم کی نجی جیلوں میں نافرمان برسوں زنجیریں پہنے پڑے رہتے ہیں۔

فاروقی اندر سے آتش فشاں بنا اٹھ کھڑا ہوا۔ ڈی ایس پی اس سے زیادہ آگ بگولا تھا۔ شاید اتنی بے عزتی اس کے خواب و خیال میں نہ تھی ورنہ وہ کبھی فاروقی کے ساتھ نہ آتا۔ جب وہ چلے گئے تو سب نے لیلیٰ بی بی کے حوصلے کو سراہا۔ اگر وہ کمزور پڑ جاتیں تو شرمندگی ہمارے حصے میں آتی لیکن اصل معاملہ نہ کسی کی شان کا تھا نہ آن کا۔ کسی بھی عورت کو پندرہ سالہ ازدواجی زندگی تعلق ختم کرنے پر اکسانا بدترین اخلاقی حرکت ہوگی۔ کوشش یہی ہونی چاہیے کہ جیسے تیسے زندگی کی گاڑی چلتی رہے لیکن یہاں ہم اس بارے میں عقل کی ہر دلیل کے ساتھ یہ تسلیم کرنے پر مجبور تھے کہ فاروقی اب وہ پہلے والا فاروقی نہیں رہا جو خود کو لیلیٰ بھابی کا مجنوں سمجھتا اور کہتا تھا اور ایسا نظر بھی آتا تھا۔ شاید یہ اس کے دوغلے کردار کا کھیل تھا جسے کوئی سمجھ نہ سکا۔ یہاں تک کہ اس کی اپنی چوبیس گھنٹے ساتھ رہنے والی شریک حیات بھی بے خبر رہی کہ شوہر کے ظاہر و باطن میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

فاروقی ایک خطرناک مجرمانہ شخصیت کا حامل شخص تھا جس نے دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے کالا کوٹ پہن کے قانون دانی کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔ اس کے جرائم پیشہ لوگوں سے تعلقات پہلے رہے ہوں گے۔ اب میرے ساتھ راجا کو بھی شک گزرتا تھا کہ اس کا ماضی صاف نہیں تھا۔ وہ پہلے بھی ایسا ہی ہوگا۔ اس کے جرائم پیشہ افراد سے کاروباری رشتے ہوں گے جن پر پردہ پڑا ہوا تھا۔ اب پردہ اٹھ چکا تھا۔

لیلیٰ بھابی اس کے ساتھ جانے پر راضی ہو جاتی یا جذبات کی رو میں بہہ کر اسے ایک چانس اور دینے کا سوچتی تو خود اپنی زندگی کا چانس گنوا دیتی۔ اگر ہم اسے مجبور کرتے تو یہ کسی ناسمجھ کو موت کی طرف دھکیلنے کے مترادف ہوتا۔ ہم نے لیلیٰ بھابی کی زندگی بچانے کے لیے اسے فاروقی کا ساتھ چھوڑنے پر قائل کیا۔ ہمیں اس کا ایک فی صد امکان بھی نظر نہ آتا تھا کہ ان حالات میں فاروقی اسے زندہ رہنے دے گا۔

اصولی طور پر میں نے بھی طے کر لیا تھا کہ اگلی صبح ست بدھائی سے اسلام آباد کے لیے نکل جاؤں گا۔ یہ مشکل سے ڈھائی گھنٹے کی ڈرائیو تھی۔ جانے سے پہلے میں لیلیٰ بھابی اور فاروقی کے معاملات پر اماں ابا کو اعتماد میں لینا چاہتا تھا مگر میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان کو کیا بتاؤں اور کیا نہ بتاؤں؟ راجا نے کہا کہ یہ ذمے داری میں اس پر چھوڑ دوں۔

لیلیٰ بھابی پر شام تک اپنے فیصلے سے ہونے والے صدمے کا اثر رہا۔ یہ بالکل فطری بات تھی۔ کسی بھی عورت کے لیے ایسا فیصلہ شدید ذہنی اور اعصابی خلجان کا سبب بنتا ہے۔ لیکن یہ کوئی فوری اشتعال کے نتیجے میں کیا جانے والا فیصلہ نہیں تھا۔ اس کے اسباب بہت پہلے سے پیدا ہو رہے تھے۔ لیلیٰ بھابی ایک لمبے عرصے تک سب برداشت کرتی رہی مگر فاروقی کے رویے کی تبدیلی زیادہ سے زیادہ عذاب ناک ہوتی چلی گئی۔ محبت کا آب حیات نفرت کے زہر سے آلودہ ہوتا چلا گیا۔ نوبت بہ ایں جا رسید کہ اس کا ایک قطرہ بھی زندگی کے لیے خطرہ بن گیا۔

لیلیٰ بھابی بار بار ایک بات ضرور کہتی رہی۔ فاروقی' آخر کیسے بدل گیا۔ اگر یہ جادو ٹونے کا اثر نہیں ہے تو پھر کیا ہے۔ دماغ کی خرابی' نفسیاتی بیماری' نروس بریک ڈاؤن۔ آدمی فرشتے سے شیطان کا روپ دھار لے تو اس کی کوئی وجہ ضرور ہوتی ہے۔ ہم سب اسے قائل کرتے رہے کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ ایسا ہی تھا مگر وہ گھر میں رہنے والی سیدھی سادی عورت، شوہر کا ایک ہی روپ دیکھتی رہی۔ دوسرا روپ اس کے سامنے کیسے آسکتا تھا۔ دہری شخصیت کے ایسے کیس کم ہوتے ہیں مگر ہوتے ہیں۔

شام کو راجا نے اباجی کو اپنے ساتھ لیا اور حویلی کے باغ میں ٹہلتا ہوا آخری حصے میں لے گیا۔ وہاں گوشہ عافیت میں اس نے اباجی کو وہ سب بتایا ہوگا جو مجھ میں بتانے کی ہمت نہیں تھی۔ خواتین کی ہنگامی میٹنگ میں اسکول اور اسپتال کے معاملات اور پبلسٹی کے امور ڈسکس ہو رہے تھے۔ اس میٹنگ میں ریشم کے ساتھ غنی بھی شریک تھا۔ میں موجود ہونے کے باوجود وہاں موجود نہیں تھا۔ میرے خیالات کے سب دھارے فریال کی جانب بہہ رہے تھے۔

میری عدم دلچسپی سے کسی کو گلہ بھی نہ تھا۔ سب کو معلوم تھا کہ میں فریال کی تلاش کے مشن پر روانہ ہو رہا ہوں اور یہ تلاش مجھے اسلام آباد سے لندن بھی لے جاسکتی ہے۔ میری واپسی کا کوئی ٹائم ٹیبل نہیں چنانچہ اگلے دس دن کی مصروفیات کے سارے امور سے انہی کو نمٹنا ہے۔

اچانک شہناز کے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے باتوں کے درمیان وقفہ دے کر اسکرین پر نظر ڈالی اور بڑبڑائی۔ ''یہ کون ہے؟'' اور پھر بولی ''ہیلو!'' معلوم نہیں دوسری طرف سے کیا کہا گیا۔ شہناز نے کہا ''راجا...... ہاں یہ انہی کا نمبر ہے۔ نہیں' بھئی میں جو بھی ہوں' تم اپنا کام بتاؤ...... ہاں وہ نہیں ہیں اس وقت۔ مجھے نہیں معلوم کہاں گئے ہیں۔ کون...... ہاں' رفیق صاحب ہیں...... میں بلاتی ہوں۔''

اس نے فون میری طرف بڑھا دیا ''یہ شاہد صدیقی کون ہے؟''

میں نے کہا ''میرے ایک رشتے کے ماموں تھے۔ جوانی میں فوت ہو گئے تھے۔''

''مذاق مت کرو۔ راجا کا کوئی دوست ہے۔ بات کرو' تمہیں بھی جانتا ہے۔''

میں نے بہت سوچا مگر مجھے شاہد صدیقی نام کا کوئی شناسا یاد نہ آیا۔ وہاں خواتین بیک وقت بول رہی تھیں۔ سننے کی فرصت کسی کو نہ تھی۔ اس شور میں موبائل فون پر بات کرنا دشوار ہوتا۔ میں باہر نکل آیا۔ راجا بہت دور تھا اور اسے ڈسٹرب کرنا بھی نامناسب ہوتا۔

میں نے کہا ''شاہد صدیقی صاحب! میں رفیق بول رہا ہوں مگر میں نے آپ کو پہچانا نہیں؟''

''سر آپ سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ راجا صاحب کے ساتھ۔ پریس کلب میں' آپ کھانا کھانے آئے تھے۔''

''مجھے اب بھی یاد نہیں آیا' یہ کب کی بات ہے؟''

''ابھی دو دن پہلے کی۔ میں نے اس کار کے بارے میں بتایا تھا جسے مس گل کا قاتل چلاتے ہوئے مارا گیا تھا۔''

''اوہ۔ آئی ایم سوری شاہد! دراصل میرا دھیان کہیں اور تھا' خیریت ہے' تم نے کیسے یاد کیا؟''

''سر میں راجا صاحب سے بات کرنا چاہتا تھا۔ جنہوں نے کال ریسیو کی وہ ان کی وائف تھیں؟ یہ پوچھنے پر وہ خفا ہو گئی تھیں۔''

میں نے کہا ''ابھی ان کی شادی نہیں ہوئی۔''

''تو کیا وہ سیکریٹری تھیں؟''

میں نے کہا ''بھئی' وہ ان کی منگیتر تھیں' ڈاکٹر شہناز!''

''اوہ۔ مجھ سے بڑی بے وقوفی ہوئی۔ مجھے معافی مانگنی چاہیے ان سے۔''

میں نے کہا ''چھوڑیں' میں انہیں سمجھا دوں گا۔ راجا صاحب تو ابھی ہیں نہیں۔ کوئی پیغام ہے تو مجھے بتا دیں۔''

''آپ کے لیے ایک اچھی خبر ہے۔ میرے والد کے ایک دوست ہیں' وزارت اطلاعات و نشریات میں ڈپٹی سیکریٹری۔''

''یہ میرے لیے اچھی خبر کیسے ہوئی؟''

''میں نے مس گل کے مرڈر کی پوری اسٹوری پھر فائل کی ہے۔''

میں نے کہا ''وہ پھر دبا دی جائے گی۔''

''نہیں سر۔ یہی تو اچھی خبر ہے۔ رانا کی پارٹی کے دو مخالف اخبار ہیں۔ ان کے مالک سینیٹ کے رکن ہیں۔ میرے والد کے دوست نے ان سے بات کی تھی۔ وہ کل پوری اسٹوری شائع کریں گے۔ بیک پیج پر تین کالم کی سرخی' باکس میں۔''

''کیا واقعی ...... مجھے یقین نہیں آتا۔ تم نے تو کمال کر دیا۔''

''یہ کام ایسے ہی ہوتے ہیں سر! میں سب سیکھ رہا ہوں۔''

میں نے کہا ''کیا تمہارے چچا بھی اپوزیشن میں ہیں؟''

''بالکل ٹھیک سمجھے آپ سر! انہیں سرکاری پارٹی کے دباؤ پر بہت پریشان کیا جارہا ہے۔ پہلے رانا نے ایک بار انہیں او ایس ڈی بنوادیا تھا۔ وہ کورٹ آرڈر سے بحال ہوئے۔ تین ماہ معطل رہے تھے' وہ ڈپٹی سیکریٹری ہیں۔''

''آج کل وہ کہاں ہوتے ہیں؟''

''وہیں اسلام آباد میں۔ موقع ملے تو آپ ان سے ضرور ملیں۔ بہت اچھے اور پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ رپورٹ شائع ہونے کے بعد رانا کو گرفتار ہونے سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔''

''اب تم خود کو بچاؤ۔ کام یقیناً تم نے بڑا کیا ہے لیکن خطرناک بھی ہے۔'' میں نے کہا ''راجا نے کیا کہا تھا تم سے؟''

''دراصل اس دن راجا صاحب کی بات پر مجھے بڑی شرم آئی۔ میں اتنا بزدل بھی نہیں ہوں سر! یہ راجا صاحب کو بتادیں' خدا حافظ سر!''

''میں ضرور بتاؤں گا' خدا حافظ!''

راجا کو یہ بات بتانے کا موقع مجھے رات کو ملا۔ وہ خلاف توقع خوش ہونے کے بجائے افسوس سے سرہلانے لگا۔ ''میں نے اس لڑکے کو طعنہ نہیں دیا تھا۔ نیک مشورہ دیا تھا۔ اب دیکھو جذباتی ہو کے اس نے کیا حرکت کی ہے۔''

میں نے کہا ''راجا۔ تجھے اس کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔''

''وہ تو میں کروں گا۔ مگر اس نے تو دشمنی مول لے لی ناں رانا سے۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے؟ اس کے باپ کا یہ دوست یا اخبار کے مالکان جو سینئر ہیں' کروڑپتی لوگ ہیں۔ آج اپوزیشن میں ہیں تو کل حکومت میں۔ ان کے لیے یہ کھیل ہے' ایک دوسرے پر گند اچھالنا۔ یہ اس لڑکے کو بچانے نہیں آئیں گے۔''

''کیا تو نہیں چاہتا تھا کہ یہ خبر شائع ہو؟''

''اگر سب اخبارات شائع کرتے تو کچھ اور بات ہوتی۔ یہ خبر ہوتی اگر کسی سفارش یا دباؤ کے بغیر آتی۔ اب اسے الزام کہا جائے گا۔ کردار کشی کا نام دیا جائے گا۔

خیر...... جو ہوا اچھا ہوا' دشمنی میں سہی' کسی نے سچ تو چھاپا۔''

میں نے کہا ''سیاسی بیان بازی سے رانا حقیقت پر کیسے پردہ ڈال سکتا ہے؟''

راجا نے کہا ''زیادہ جذباتی نہ ہو فیکے پتر! یہاں پردہ ڈالنے کے سوا ہوتا کیا ہے۔ ہر ادارہ پردے ڈال کے اصل سچ کو عوام کی نظروں سے چھپاتا ہے اور اپنے سچ کو مشتہر کرتا ہے۔ سیاسی قتل' بدعنوانی' کرپشن' ہر حکومت ان پر جھوٹ کے پردے ڈالتی رہی اور پچاس برس بیت گئے۔ نصف صدی میں یہ عادت نیچے تک آگئی۔ گراس روٹ لیول تک۔ آج ہر شخص دہرے معیار رکھتا ہے۔ جھوٹ اور منافقت اس کی فطرت میں رچ بس گئی ہے۔''

''ایسی مایوسی کی باتیں مت کر۔ مجرموں کو آج بھی سزائیں ہو رہی ہیں۔ عدالتیں کام کر رہی ہیں۔''

''جو کام وہ کر رہی ہیں' عدالتوں میں جاکے دیکھو' اور جن کو سزا مل رہی ہے' ان میں مجھے کسی بڑے آدمی کا نام دکھادے۔ سیاسی دشمنی میں اپنے حریفوں پر سب مقدمات بناتے ہیں اور انہیں اندر رکھتے ہیں۔ کون سی عدالت انہیں رہائی دلاسکتی ہے۔ اسیر ہونے والے بھی اس سے خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اپنا قد کاٹھ بلند کرتے ہیں کہ دیکھو' ہم عوام کی خاطر اور حق گوئی کی پاداش میں کیسے عذاب جھیل رہے ہیں۔ حالانکہ جیل وہ خاک ہوتی ہے۔ اے کلاس میں اسے کون سی عیاشی میسر نہیں آتی؟ نوکر چاکر' اے سی' ٹی وی' شراب و شباب سب حاصل رہتا ہے۔''

''مطلب یہ کہ رانا کا اس خبر سے بھی کچھ نہیں بگڑے گا؟''

''یار' خبروں سے پہلے کچھ ہوا ہے؟ مجھے بتا' آج تک کتنے لوگ پولیس تشدد سے تھانوں میں ہلاک ہوئے؟ کتنے جعلی مقابلوں میں مار دیے گئے۔ آج کل ایک بھی تھانے دار کو عمر قید یا پھانسی ہوئی؟ اس وقت ہے کوئی جیل میں؟''

میں نے کہا ''مجھے تو معمولی کانسٹیبل بھی یاد نہیں جسے پھانسی ہوئی ہو' پھر کیا کرنا چاہیے؟''

''بدمعاشی ...... قانون کی کتابوں کو ایک طرف پھینک دو۔ ڈاکو' غنڈے' بدمعاش پالو' جائز ناجائز ذرائع سے مال کماؤ۔ کھاؤ اور کھلاؤ ...... اور عیش کرو۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس کے اصول پر دنیا چل رہی ہے۔''

''دنیا کی بات مت کر۔ جو یہاں ہو رہا ہے امریکا' برطانیہ یا یورپ کے کسی ملک میں ہو سکتا ہے؟''

''تو بھی ان ممالک کی بات نہ کر فیکے پتر! یہاں ہم

رفت کے ساتھ بہتری کی طرف نہیں جارہے ہیں۔ اکیسویں صدی میں حالات بیسویں صدی سے بدتر ہیں۔''

''تو کیا کریں برائی کو برائی اور غلط کو غلط کہنا چھوڑ دیں انقلاب ایسے ہی آتے ہیں۔ پچاس سال بعد یہ تو ہوا کہ لوگوں کو سمجھ آگئی ...... کہ حکمران ان کو کیسے بے وقوف بناتے رہے ہیں۔ کیسے ان کا استحصال ہوا ہے۔ میڈیا نے ان کے شعور کی بہت تربیت کی ہے۔''

''مجھے تو لگتا ہے کہ یا تو اس دن کے آنے سے پہلے ہی میری طبعی عمر پوری ہو جائے گی یا پاکستان ہی نہیں رہے گا۔''

''پاکستان رہے گا ...... اور جو ہم نہ دیکھ سکے' وہ ہماری کوشش اور جدوجہد سے ہماری اگلی نسل دیکھے گی۔''

''کون سی اگلی نسل!'' راجا ہنس پڑا ''مجھے عقد کی تاریخ سے پہلے تاریخ وفات آنے کے امکانات زیادہ نظر آتے ہیں۔''

صبح میری روانگی سے قبل ہی راجا کو فون موصول ہو گیا۔ رانا کے کھیل کی پوری رپورٹ شائع ہو گئی ہے۔ راجا کا اور موڈ ایک دم بدل گیا۔

اس نے کہا ''اب تو دیکھ فیکے پتر! اس رانا کی تو میں ......''

میں نے کہا ''رات کو تیرے خیالات مجھے بھی ڈپریس کر رہے تھے۔''

''دراصل ...... مجھے یقین تھا کہ رپورٹ شائع نہیں ہوگی۔ کوئی نہ کوئی ڈیل ہو جائے گی۔ اپوزیشن اور حکومت کا کھیل تو مل کر ہی چلتا ہے۔ اخبار کے مالکان قوم کا نہیں اپنا مفاد دیکھتے ہیں۔''

''مگر ایسا نہیں ہوا۔''

''اب تو اسلام آباد جارہا ہے' تو اس بندے سے ضرور ملنا۔ کیا نام تھا اس کا ...... وہی جو ڈپٹی سیکریٹری ہے' وہ تجھے مفید معلومات فراہم کر سکتا ہے۔ اس نوجوان شاہد صدیقی نے کہا تھا کہ وہ پڑھا لکھا بندہ ہے۔ اگر تو نے اسے متاثر کر لیا ......''

میں نے کہا ''کیا مطلب؟ بے وقوف بنالیا ......؟''

''نہیں۔ تو اسے بتانا کہ تیرے اور رانا کے درمیان نہ سیاسی عداوت ہے نہ خاندانی۔ رانا ست بدھائی کے ترقیاتی منصوبوں سے خوف زدہ ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ ایک سچا پاکستانی اور تعلیم یافتہ شخص جو سوچ سکتا ہے۔ تیری طرف داری نہ کرے۔''

''اس کی طرف داری سے مجھے کیا فائدہ؟''

''میری بات سن۔ وہ سرکاری مشینری کا پرانا پرزہ ہے۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکا ہے یعنی نہ جانے کتنے محکموں میں رہا ہوگا۔ ایسے لوگ اندر کے بہت سے راز جانتے ہیں۔ سیاسی رگڑے میں آنے والے موقع کی تاک میں رہتے ہیں اور یہ سرکاری افسران بالا ایسا کام دکھاتے ہیں کہ کسی کو پتا ہی نہیں چلتا اور دشمن کا پتا صاف۔ وہ تجھے بتا سکتا ہے کہ کس کس کو رانا سے براہ راست نقصان ہوا اور کس کو اس کی پارٹی سے۔ ایسے عناد پالنے والے تیرے ہاتھ میں بڑے کام کے پتے تھما سکتے ہیں۔ آئی بات سمجھ میں۔''

''آگئی۔ لیکن میرے اسلام آباد جانے کا یہ مقصد نہیں ہے۔''

''اس کو ذیلی مقاصد میں رکھو ...... اور ہاں' اب تو اکیلا نہیں جائے گا۔ ٹنی اور دو سکیورٹی گارڈز تیرے ساتھ ہوں گے۔''

''یہ کیا مصیبت ہے؟''

''یہ ایوان صدر سے جاری ہونے والا آرڈی ننس ہے۔ اس پر میں نے انہیں قائل کیا تھا کہ رسک نہیں لیا جاسکتا۔ اس امکان کو مسترد نہیں کیا جاسکتا کہ رانا وہیں روپوش ہو' اسلام آباد میں۔ وہ سب سے محفوظ سیاسی پناہ گاہ ہے اور سب سے خطرناک سیاسی جنگل بھی۔ وہاں بڑے شکاری بیٹھے ہیں۔ بڑا شکار کرنے والے۔''

میں نے معصومیت سے کہا ''مگر میں تو ایک خرگوش ہوں۔''

''تو خرگوش نہیں خر ہے۔ خرگوش بھی بھاگ جاتا ہے جان بچانے کے لیے۔ تو ڈھینچوں ڈھینچوں کرتا مارا جائے گا' احتیاط اچھی چیز ہے۔''

اماں' ابا کے پاس گیا تو ایک نیا حکم نامہ ملا ''لیلیٰ بھی تمہارے ساتھ جائے گی۔'' ابا نے کہا ''تمہارا خیال رکھے گی۔''

میں نے کہا ''افوہ اباجی! میں کوئی بچہ ہوں یا سات سمندر پار جارہا ہوں کہ اتنا اہتمام ......''

''ابھی تم سمجھ نہیں رہے ہو۔ فریال کی تلاش میں تم ہر جگہ منہ اٹھا کے نہیں جاسکتے۔ اکثر جگہ تمہیں کسی عورت کی ضرورت پڑے گی۔ خصوصاً وہاں ہوسٹل جیسی جگہ پر۔ وہاں تمہیں کوئی انفارمیشن نہیں دے گا۔ اس کے علاوہ ابھی لیلیٰ کا یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔''

''یہاں کچھ نہیں ہو سکتا ...... اور جو کام چل رہا ہے۔''

اباجی نے میری بات کاٹ دی ''کام ہوتا رہے گا۔

چند دن سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ وہاں میرے ایک دوست ہیں' راولپنڈی میں۔ تم ان کے گھر میں قیام کرو گے۔ کسی ہوٹل میں نہیں۔ اور تم اپنی گاڑی نہیں لے جاؤ گے۔ راجا نے رینٹ اے کار سے گاڑی منگوائی ہے۔ اسے راولپنڈی میں چھوڑ دینا۔ وہاں بھی کرائے کی گاڑیاں استعمال کرنا۔''

اچانک اماں نے کہا''اور فریال کو ساتھ لے کر آنا۔ ورنہ مجھے اپنا منہ نہ دکھانا۔''

مجھے اندازہ ہوا کہ میری سلامتی چاہنے والے میرے بارے میں مجھ سے زیادہ سوچتے تھے۔ صرف سوچتے ہی نہیں تھے۔ اس کے لیے عملاً بھی جت کچھ کرتے تھے۔ مجھے کسی نے کچھ بتانا ضروری نہیں سمجھا لیکن حفاظتی انتظامات پورے کیے۔ مجھے تسلیم کرنا پڑا کہ ان کی خواہش میں صرف جذباتی خلوص ہی کو دخل نہیں۔ عقل اور تجربے کی رہنمائی ہی ہے۔ ان کی کوئی بات غلط نہ تھی۔

میرے کہنے سے صرف اتنا ہوا کہ غنی کے ساتھ صرف ایک گارڈ کر دیا گیا۔ ڈرائیور گاڑی کے ساتھ آیا تھا۔ غنی اس کے ساتھ بیٹھا تھا۔ پیچھے میں رابعہ کے ساتھ رہا۔ ایک بھرا ہوا ریوالور میرے پاس تھا دوسرا غنی کے پاس لیکن آخری وقت میں غنی ایک کلاشنکوف لے کر نکلا۔

میں چونکا۔ ''نہیں اس کی اجازت نہیں۔''

غنی نے کہا''ہم اس کا لائسنس دکھا دیں گے' چلو۔''

مجھے معلوم تھا کہ کلاشنکوف کا لائسنس کوئی نہیں ہوتا مگر میں نے غنی سے کچھ نہیں کہا۔ اس نے کلاشنکوف اپنے پیروں میں رکھ لی اور اس کے اوپر ربر میٹ ڈال دی۔

انگریزی کے وہ اخبار جن میں رانا کیس کی رپورٹ شائع ہوئی تھی' مجھے راولپنڈی پہنچ کے بھی تلاش کرنے پر ملے۔ وہ کوئی بہت مقبول اخبار نہیں تھے لیکن انگریزی صحافت کے معیار پر معتبر تسلیم کیے جاتے تھے۔ ابا کے دوست لالہ زار کالونی میں رہتے تھے۔ کسی زمانے میں وہ ابا کے ساتھ پڑھاتے تھے۔ وہ پرنسپل ہو کے ریٹائر ہوئے۔ ان کے ساتھ اب صرف ایک بیٹا اور بہو اپنے دو بچوں کے ساتھ رہتے تھے۔ باقی لڑکے روزگار کے چکر میں باہر نکل گئے تھے۔ لڑکیاں رخصت ہو کے سسرال میں آباد تھیں۔ یہ ہماری سوسائٹی کے ایک عام گھر کی زندگی کا نمونہ تھا۔

اس روز کہیں جانے اور کچھ کرنے کا موقع نہ تھا۔ پروفیسر صاحب مجھ سے باتیں کرتے رہے۔ ابا کے بارے میں پوچھتے رہے۔ انہیں ست بدھائی کی ریاست اور حویلی سے بہت دلچسپی تھی۔ ان کے لیے یہ ایک الف لیلوی داستان تھی۔ میں نے انہیں بڑی تفصیل سے بتایا کہ ست بدھائی کی وراثت کا حق مجھے کیسے حاصل ہوا۔ کچھ اس سے پہلے کی تاریخ سنائی۔ ان کی بیوی بھی کسی گرلز اسکول کی ہیڈ مسٹریس رہی تھیں۔ دونوں کے لیے یہ داستان یکساں حیرت عبرت کا باعث بنی۔

جب میں نے انہیں ست بدھائی کے ترقیاتی منصوبوں کے بارے میں بتایا تو وہ مزید متاثر ہوئے کہ میں نے باہر کی تعلیم اور خوشحال مستقبل کے لیے حاصل مواقع کو ٹھکرا کے پاکستان آنے کا فیصلہ کیا اور اب میں اس علاقے کے لوگوں کو بہتر زندگی گزارنے کے مواقع فراہم کرنے کے لیے کوشاں ہوں۔

''تمہارے والد بڑے خوش نصیب ہیں۔''انہوں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا''تم اکلوتے تھے۔ باہر رہ کے بگڑ جاتے۔ یہاں آتے بھی تو سب کچھ بیچ کے ساری دولت ڈالروں کی صورت میں باہر منتقل کرتے اور عیش کرتے۔ اب ہمارے بیٹوں کو دیکھو۔ یہاں اچھا کما رہے تھے۔ ہزاروں' لاکھوں سے بہتر تھے۔ مگر دھن سوار تھی امریکا میں سیٹل ہونے کی۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ نکل گئے' پہلے ایک گیا پھر دوسرا' پھر تیسرا۔ دو بیٹوں کے رشتے بھی وہیں کرا دیے اور بہت خوش ہیں اس کامیابی پر۔''

میں نے کہا''چلیے' ایک تو ہے ناں آپ کے پاس۔''

''وہ بھی اپنی خوشی سے کہاں ہے۔ بس ہمارے جانے کا انتظار کر رہا ہے۔ سب سمجھتے ہیں ماں باپ ضدی ہیں۔ ورنہ وہاں آ جائیں۔ وہ تو کہتے ہیں کہ یہ ملک کوئی رہنے کی جگہ ہے۔ میں نے صاف کہہ دیا کہ میرے نزدیک امریکا جانا' اسرائیل جانے کے طرح گناہ کبیرہ ہے۔''

میں خاموشی سے سنتا رہا۔ ان سے بحث کرنا یا اختلاف کرنا لاحاصل تھا۔ جو بیٹوں سے قائل نہ ہوا' مجھ سے کیسے ہوتا۔ کسی حد تک ان کا شکوہ بھی غلط نہ تھا۔ نئی نسل کو اس ملک سے' نظریۂ پاکستان یا اپنے دین سے زیادہ اپنے مستقبل کی خوش حالی سے دلچسپی تھی اور مال و دولت کمانے کے لیے جائز اور ناجائز طریقے سے باہر جا رہے تھے۔ دنیا کے ہر ملک کا رخ کر رہے تھے اور ان کے لیے ماں' باپ' بہن بھائی اور وطن کی محبت نے ثانوی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ پہلا مقصد تھا حصول دولت۔ ملک میں مواقع کی عدم دستیابی کا جواز بعض اوقات ٹھیک لگتا تھا مگر بہت سے لوگ سب کچھ میسر ہونے کے باوجود ترک وطن کر رہے تھے۔

ابا نے انہیں صرف اتنا بتایا تھا کہ میرے بیٹے کو اسلام آباد میں کسی سے کام ہے۔ وہ اپنی بھابی کے ساتھ آ رہا ہے۔ پروفیسر صاحب نے اچانک مجھ سے سوال کر دیا ''کام تمہارا ہے یا تمہاری بھابی کا؟''

میں نے سنبھل کے کہا''بھابی کا' میرا ہوتا تو میں اکیلا آ جاتا۔''

''ویزا کا کوئی مسئلہ ہے؟''ان کی بیگم نے پوچھا۔

میں نے کہا''جی...... جی...... بھابی کا ویزا لگوانا ہے۔ یہ بھی جا رہی ہیں اپنے میاں کے پاس' امریکا!''

اب پروفیسر صاحب نے لیلیٰ بھابی کو لیکچر دینا شروع کیا''تمہیں چاہیے کہ اپنے میاں کو بھی واپس پاکستان لے آؤ۔ دونوں بھائی مل کے کام کریں۔''

لیلیٰ بھابی نے بڑی مشکل سے جان چھڑائی''جی' اسی لیے جا رہی ہوں۔''

رات کو ان کے بیٹے سے ملاقات ہوئی۔ اس کا کوئی دوست ٹریول ایجنسی چلا رہا تھا۔ اس نے کہا کہ کوئی مسئلہ نہیں۔ صبح اسے بلا لیتے ہیں۔ وہ سب کرا دے گا۔ وہ خود امپورٹ ایکسپورٹ کے بزنس میں پڑا ہوا تھا اور بہت تیز آدمی تھا۔ باہمت اور خوش اخلاق تھا اور مجھ سے بہت جلد بے تکلف ہو گیا۔ اس کا نام ارسلان تھا۔

لیلیٰ بھابی جلد سو گئی تو میں نے ارسلان سے کہا کہ چلو' باہر کا چکر لگا کے آتے ہیں۔ وہ مجھے اسلام آباد کے پرفضا مقام دامن کوہ پر لے گیا۔ وہاں چائے پیتے ہوئے میں نے اسے اصل بات بتائی کہ میں مجنوں بن کے اپنی لیلیٰ کی تلاش میں نکلا ہوں۔

اس نے بڑی دلچسپی سے ساری بات سنی''کیسے تلاش کرو گے تم اسے۔ جب خود تمہیں ابھی تک اس کے اسلام آباد میں ہونے کا بھی یقین نہیں۔''

میں نے کہا''وہ اور کہیں نہیں جا سکتی۔ تمہارا کیا خیال ہے' مجھے کہاں سے شروع کرنا چاہیے' ہوٹلوں سے؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا''اسلام آباد میں سرینا اور ہالیڈے ان ٹائپ کے ہوٹلوں میں ہی تنہا لڑکی رہ سکتی ہے۔ وہاں فرضی نام یا شناختی دستاویزات کے بغیر کوئی نہیں رہ سکتی۔''

''اس کے علاوہ پرائیویٹ گیسٹ ہاؤسز......؟''

''بالکل ہیں۔ لیکن چند ایک کی وجہ سے سب بدنام ہیں۔ اکیلی عورت وہاں جانے کی ہمت نہیں کر سکتی۔ رجسٹرڈ گیسٹ ہاؤس کم ہیں۔ گمنام زیادہ۔ پھر سب عیاشی کے اڈے ہیں۔ پنڈی میں فائیو اسٹار ہوٹل تو ایک پی سی ہے۔ باقی نور اسٹار یا تھری اسٹار ہوٹلوں کی بھرمار ہے۔ وہاں بھی مشکل ہے۔''

''پھر کہاں جاؤں؟''

''یہ تم نے اچھا کیا کہ بھابی کو ساتھ لے آئے۔ یہاں ورکنگ ویمن ہوسٹل ہیں۔ گرلز ہوسٹل بہت ہیں۔ وہاں خاصی سختی ہے۔ فون پر تو کیا وہ تمہیں خود جا کے معلوم کرنے پر بھی کچھ نہیں بتائیں گے لیکن بھابی ساتھ ہوگی تو بہت سے مسائل حل ہو جائیں گے۔''ارسلان نے کہا۔

''کوئی اسٹوری تو سنانی پڑے گی۔''میں نے کہا۔

وہ ہنسا''ہاں' اسٹوری بہت سمپل بھی چلے گی۔ بھابی کی چھوٹی بہن ہے' اس کی شادی مرضی کے خلاف طے کر دی گئی تھی۔ وہ کہیں اور چاہتی تھی۔ غصے میں گھر چھوڑ آئی۔ پتا چلا ہے کسی ہوسٹل میں ٹھہری ہوئی ہے۔ کوئی شک نہیں کرے گا مگر ایک جھوٹ البتہ بولنا پڑے گا۔''

''کیسا جھوٹ؟''

''بھابی کو بھابی مت بتانا۔ لوگ فرض کر لیں گے کہ تم اپنی سالی کو تلاش کرنے نکلے ہو۔ کوئی پوچھے تو کہہ دینا کہ ہاں' یہ میری وائف ہیں۔''

''یہ تو مشکل ہوگا۔''

''چھوڑو یار! لوگ ضرورت پڑنے پر گدھے کو باپ بنا لیتے ہیں۔ تمہاری بیوی کا اپنی بہن کے لیے پریشان ہونا فطری سمجھا جائے گا۔ یہ کہا کہ ہمارا آپس میں کوئی رشتہ نہیں تو تمہارا کیس بھی مشکوک ہو جائے گا کہ پتا نہیں کس کو ساتھ لیے پھر رہے ہو اور کسے تلاش کر رہے ہو اور کیوں؟ کسی کو بھی تم سے ہمدردی نہیں ہوگی' سب اپنی جان چھڑائیں گے کہ پتا نہیں کیا معاملہ ہے۔''

''میرے لیے لیلیٰ بھابی سے بات کرنا مشکل ہوگا۔ اچھا ہوتا میں اسے بھی ساتھ لے آتا۔''میں نے کہا۔

''تم فکر مت کرو۔ میں کر لوں گا' صبح ان سے بات۔''

میں نے کہا''مجھے رینٹ اے کار سے گاڑی چاہیے۔''

''وہ کس لیے...... تم میری گاڑی رکھو اپنے پاس۔ ابا کی گاڑی تو ایسے ہی کھڑے کھڑے خراب ہو رہی ہے۔ میں وہ استعمال کر لوں گا۔''

''تھینک یو ویری مچ!''میں نے کہا۔

''ایک بات پوچھوں اگر برا نہ مانو۔''ارسلان بولا۔

میں نے کہا''ایک نہیں دو پوچھو۔''

''یہ جو بندہ تمہارے ساتھ ہے' یہ کیا ہے؟ ڈرائیور یا

سکیورٹی گارڈ؟''

میں نے کہا'' دونوں۔ ہم جیسے لوگوں کو اپنی جان کی بہت فکر ہوتی ہے اور ہم اپنے ذاتی کام کے لیے ہر قدم پر کسی ملازم کے محتاج بھی ہوتے ہیں۔ میرے ساتھ تو آگے پیچھے گاڑیاں چلتی ہیں۔''

''کیا تمہارے دشمن بہت ہیں؟'' وہ حیرانی سے بولا۔

میں نے کہا'' دشمن ایک بھی بہت ہوتا ہے۔''

''رانا رجب علی تمہارا دشمن ہے؟'' وہ اچانک بولا۔

میں چونک پڑا'' تم کیسے جانتے ہو؟''

اس نے کہا'' میرے آفس میں سب اخبار آتے ہیں۔ میں نے اتفاق سے دیکھ لیا۔ اسمبلی کے رکن پر بیٹی کو قتل کرانے کا الزام۔ برطانیہ سے آنے والی بیٹی نے عدالت میں باپ کے خلاف بیان دیا تھا۔ پہلی سرخی تھی۔ دوسری ذیلی سرخی۔ مجھے دلچسپی محسوس ہوئی۔ پوری خبر پڑھ کے میں حیران ہوا۔''

''اس خبر میں میرا ہی نام تھا۔''

''ہاں' نواب رفیق احمد شیرازی۔ اس رپورٹ میں رانا سے تمہاری دشمنی کا سبب بھی بتایا گیا تھا۔ ڈاکٹر شہناز کا ذکر تھا جسے رانا نے اغوا کیا تھا۔ کیا یہ ڈاکٹر شہناز ہیں...... جو تمہارے ساتھ آئی ہیں؟''

میں نے کہا'' اوہ نو...... یہ واقعی میرے ایک دوست کی بیوی ہیں۔ اور انہیں میں اپنی بڑی بہن جیسا سمجھتا ہوں۔ ان کے شوہر فاروقی ایڈووکیٹ ہیں۔ لاہور میں رہتے ہیں اور پریکٹس کرتے ہیں۔ سوری میں نے تمہارے والد صاحب کو یہ سب نہیں بتایا تھا۔''

''اچھا کیا۔ تمہیں بہت لیکچر سننے پڑتے۔ وہ خبطی ہوگئے ہیں۔''

میں نے کہا'' ایسا مت کہو۔ اس عمر کو پہنچ کے نہ جانے ہم اپنے بچوں کی نظر میں کتنے خبطی ہوں گے۔''

''بات عمر کی نہیں' نظریات کی ہے۔''

''میں سمجھتا ہوں لیکن ستر سال کی عمر میں تم کیسے توقع رکھتے ہو کہ ان کا ذہن تمہارے نظریات سے ہم آہنگ ہو۔ وہ تمہاری طرح سوچنے لگیں' کیا تم ان کی سوچ اپنا سکتے ہو' ایڈجسٹ تمہیں کرنا پڑے گا' مارجن تم دو گے۔''

''سب یہی کہتے ہیں۔ مگر میں کیا کروں' اچھا مستقبل امریکا میں میرا انتظار کر رہا ہے۔ میری عمر کا اچھا وقت گزرتا جا رہا ہے اور میں یہاں پھنسا ہوا ہوں۔ اماں' ابا سب کے ہیں۔ سب نے اپنی ذمے داری مجھ پر ڈال دی حالانکہ میں سب سے چھوٹا ہوں۔ بس ڈالر بھیج دیتے ہیں۔ ان کا میں کیا کروں' میرا کیریر' میرا فیوچر...... سب داؤ پر لگا ہوا ہے۔''

میں افسوس کے ساتھ سنتا رہا۔ اس سے یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ چھوڑو ذمے داری کو۔ تم جاؤ' ماں' باپ کو جب مرنا ہوگا مر جائیں گے۔ جن کو اتفاق ہوگا دفنا دیں گے۔ لیکن اس کے لیے تیار رہو کہ یہی وقت تم پر آ سکتا ہے پھر گلہ مت کرنا اولاد سے۔''

ارسلان نے مجھے کچھ پتے فراہم کیے تھے۔ ارسلان کی بیوی کا رویہ بڑا سرد مہری کا تھا۔ اس کی وجہ بعد میں معلوم ہوگئی۔ اس کی ساس سے بالکل نہیں بنتی تھی۔ اس کی باقی بہنیں بیاہ کے باہر نکل گئی تھیں اور اسے موقع میسر تھا تو شوہر نے ماں باپ کی ذمے داری کو بہانہ بنا رکھا تھا۔ شوہر کے لیے ہی یہ صورت حال پسندیدہ نہیں تھی مگر وہ بیوی کے کہنے پر ماں باپ کو چھوڑ کے روانہ نہیں ہوسکتا تھا نتیجہ یہ کہ اسے ساس سسر کی نوکرانی بن کے رہنا پڑ رہا تھا۔ اب یہ اس کی سوچ کا قصور تھا کہ بزرگوں کی خدمت اسے بیگار نظر آتی تھی۔

ارسلان نے لیلیٰ بھابی سے علیحدگی میں بات کی اور معذرت کی میری بیوی بہت شکی مزاج ہے۔ لیلیٰ بھابی نے اس کے نقطۂ نظر کو پریکٹیکل سمجھتے ہوئے بڑی آسانی سے قبول کرلیا۔ ہم سے زیادہ مخفی راستوں سے واقف تھا۔ وہ کئی سال ٹرک چلاتا رہا تھا اور پنڈی' لاہور' پشاور آنا جانا اس کا روز کا معمول تھا۔

پہلا ایک ورکنگ ویمن ہاسٹل تھا۔ وہاں ہمارا واسطہ خود مالکوں سے پڑا۔ اس کا انتظام کاروباری بنیاد پر دو میاں بیوی نے سنبھال رکھا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ ہمارے تو پرانے کلائنٹ ہیں۔ بیس کمرے ہیں۔ دس میں اکیلی خواتین رہتی ہیں۔ دس میں دو دو رہتی ہیں۔ اس طرح کل تیس خواتین ہیں اور ہم عارضی بنیاد پر کسی کو نہیں ٹھہراتے کیونکہ ویسے ہی گڈ ول کے باعث ہمارے پاس ایک جگہ خالی ہو تو دس خواتین آنے کے لیے تیار بیٹھی ہوتی ہیں۔ انہوں نے بڑی ہمدردی دکھائی اور یہ تعاون کیا کہ ہمیں بہت سے پتے دے دیے کہ آپ یہاں بھی دیکھ لیں۔

ہم نے ہر جگہ وہی کہانی دہرائی۔ ایک دو جگہ کلرک اور خدمت گار خواتین کے ہاتھوں میں نوٹ تھما کے بھی انفارمیشن لی۔ دو جگہ کچھ امید پیدا ہوئی۔ وہاں نئی لڑکیاں آئی تھیں لیکن ان کے نام مختلف تھے۔ ایک جگہ لیلیٰ بھابی نے کہا'' ہوسکتا ہے فریال نے نام غلط لکھوایا ہو۔''

کلرک نے کہا'' ہم شناختی کارڈ کی کاپی لیتے ہیں۔ آپ دیکھ لیں۔''

دوسری جگہ ایک خادمہ نے رازداری سے کہا'' آپ کہنا کہ مجھے کمرا دیکھنا ہے۔ میں آپ کو اس لڑکی کے کمرے میں لے چلتی ہوں' جو ابھی کچھ دن پہلے آئی ہے۔''

لیلیٰ بھابی گئی اور مایوس لوٹ آئی۔ دوپہر کے بعد ہم نے ایک جگہ رک کے چائے پی اور سینڈوچ کھائے اور پھر شام تک پنڈی کی سڑکوں پر ادھر سے ادھر پتے تلاش کرتے رہے۔

شام تک ہم تھکن سے چور ہوگئے تھے۔ ہمارے پاس فہرست میں دس ایڈریس باقی تھے۔ ہم جہاں جاتے تھے' کسی نئی جگہ کا پتا حاصل ہوجاتا تھا۔ دن بھر میں ہم نے پانچ جگہ انکوائری کی تھی اور نتیجہ ہنوز صفر تھا۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے یہ بے مقصد تلاش رائگاں جائے گی۔ فریال یہاں نہیں ہے۔ ہم ایک مفروضے پر بھٹک رہے ہیں۔

لیکن صرف ایک دن کی ناکامی سے بددل ہو کے تلاش ترک کر دینا بھی بے وقوفی ہوتی۔ دن میں کئی فون آئے۔ کبھی راجا کا تو کبھی شہناز کا۔ ایک بار ابا جی نے پوچھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ پروفیسر صاحب کو ٹالنے کے لیے میں نے کیا کہا تھا۔ رابعہ نے مجھے پبلسٹی کے پہلے دن کی پرجوش رپورٹ دی۔ فنکاروں کے اعلان نے سنسنی پھیلا دی تھی بلکہ تہلکہ مچا دیا تھا۔ لوگ فلم ہیر رانجھا کے لیے بھی اتنے ہی مشتاق تھے جتنے نواب صاحب کی دعوت کے لیے اور میلے کی خبر تو دور دور پھیل گئی تھی۔ شاید اب دس دن کی پبلسٹی کی ضرورت بھی نہ پڑے۔ دو تین دن میں آس پاس کے دس میل تک سب کو ویسے ہی معلوم ہوجائے گا۔

رات کو میں دیر تک جاگتا رہا اور سوچتا رہا کہ کاش میرے پاس کوئی ایسی پراسرار قوت ہوتی جس سے میں فریال کا تصور کرتا اور جان لیتا کہ وہ کہاں ہے؟ یا اسے اپنے عشق کی مقناطیسی قوت سے کھینچ سکتا۔ اس شعر کے مصداق کہ

جذبہ عشق سلامت ہے تو ہم دیکھیں گے
کچے دھاگے سے چلے آئیں گے سرکار بندھے

پھر میرا اپنا خیال مجھے شرمسار کرتا تھا کہ پھیکے پتر' تم کس عشق کی تاثیر کی بات کرتے ہو؟ ایسا تمہارا باندھ کے رکھنے والا عشق ہوتا تو فریال جاتی کیسے؟ اب پکارتے پھرو گلی گلی' نگر نگر۔ فریال نہیں ملے گی۔

اگلا دن پھر شہر نوردی کی نذر رہا۔ شام ہونے کو تھی کہ اچانک فریال مل گئی۔ عین اسی وقت جب مایوسی پوری طرح ہم پر غالب آچکی تھی اور میری طرح فریال کو بھی یقین آچکا تھا کہ فریال یہاں نہیں ہے۔ بس اطلاع لیے میرے اعصاب کو اسی طرح جھنجوڑ دیا جیسے غیر متوقع دھماکا سن کے آدمی اچھل پڑتا ہے۔

میں نے بے قابو ہوجانے والے دل کو سنبھالا'' فریال یہاں ہے۔''

میرے سامنے بیٹھی ہوئی سانولی سی نحیف لڑکی نے سر ہلایا'' روم نمبر بارہ۔''

لیلیٰ بھابی نے بے چین ہو کے پوچھا'' کدھر ہے روم نمبر بارہ؟''

لڑکی نے نفی میں سر ہلایا'' اندر جانے کی اجازت کسی کو نہیں۔ میں اسے بلا لیتی' اگر وہ ملنا چاہتی اور یہاں ہوتی۔''

کیا مطلب وہ یہاں نہیں ہے۔

''کہاں گئی ہے وہ؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔

لڑکی نے کہا'' صبح سے نہیں ہے اور کہاں گئی ہے یہ مجھے کیا پتا' گئی ہوگی کسی کام سے۔''

''اور کب تک آجائے گی؟''

لڑکی کا منہ بن گیا'' یہ آپ بتا دیں مجھے' میں تو غیب کا علم نہیں رکھتی۔''

لیلیٰ بھابی نے خوشامد سے کہا'' ارے لڑکی! اتنی بڑی خوشخبری دی ہے تم نے۔ یہ لو مٹھائی کھا لینا۔'' اس نے پانچ سو کا نوٹ مٹھی میں دبا کے لڑکی کو دے دیا۔

لڑکی کے رویے میں نمایاں تبدیلی آئی'' آپ بیٹھ جائیں۔''

ہم دیوار کے ساتھ لگے پرانے صوفوں پر بیٹھ گئے۔ یہ کاروباری علاقے سے ذرا ہٹ کے بنا ہوا گرلز ہوسٹل تھا اور بظاہر اس کی حالت بہت اچھی نہیں تھی۔ شاید یہاں رہائش کے اخراجات کم ہوں گے ورنہ ہم نے فائیو اسٹار ہوٹلوں جیسے چمکتے دمکتے ایرکنڈیشنڈ ہوسٹل بھی دیکھے تھے۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ روپوشی کے لیے فریال ایسی ہی جگہ کا انتخاب کرسکتی تھی۔ اس کے باوجود میں نے لیلیٰ بھابی سے کہا کہ وہ مزید معلومات حاصل کرلیں۔ کلرک کو اب کسی سوال کا جواب دینے سے انکار نہیں تھا۔ اس کے فریال کی آمد کی تاریخ بتائی۔ کچھ اس کا حلیہ بتایا۔ سب ٹھیک تھا۔ صرف ایک بات غلط لگتی تھی۔ فریال جاب تلاش کر رہی تھی۔ فریال کو ایسا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ لندن جانے کے لیے اسلام آباد آئی تھی۔ ملازمت تلاش کرنے نہیں۔ اگر وہ چاہتی تو

انٹریئر ڈیکوریشن بن سکتی تھی۔ اس نے چار سال لگا کے لندن سے ڈپلوما لیا تھا۔ مگر اسے ضرورت نہیں تھی۔

انتظار کا ہر لمحہ پر اضطراب تھا۔ اس کے اچانک سامنے آنے کا تصور میرے دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کر دیتا تھا۔ خود بھابی سخت نروس تھی اور بے چینی سے بار بار پہلو بدل رہی تھی۔ ایک گھنٹے میں کئی لڑکیاں اور زیادہ عمر کی خواتین ہمارے سامنے سے گزر کے باہر گئیں اور باہر سے اندر آئیں۔

ڈیسک کلرک نے باہر دیکھ کے اچانک کہا ''لیجیے فریال آ گئی۔''

اس اعلان کا اثر الیکٹرک شاک جیسا ہوا۔ میرا دل بڑے زور سے دھڑکا اور میں ایک دم کھڑا ہو گیا۔ کچھ ایسی ہی کیفیت بھابی کی تھی۔ انتظار کے ان چند لمحات میں بہت سے سوالات نے یلغار کی۔ ہمیں دیکھ کے وہ کیا کرے گی؟ کیا کہے گی؟ خوش ہوگی یا خفا ہوگی؟ ہمارے منانے سے مان جائے گی یا ہنگامہ کرے گی۔ یہ شدید جذباتی بحران کا مرحلہ ہوگا۔

میرے کانوں میں ڈیسک کلرک کی آواز آئی ''کیا ہوا؟ آپ نے فریال سے بات نہیں کی؟''

میں چونکا ''کہاں ہے فریال؟''

''ابھی تو گزر کے گئی ہے آپ کے سامنے سے۔'' وہ بولی۔

بھابی صوفے پر بیٹھ گئی...... ''یہ ...... یہ تو فریال نہیں......''

ڈیسک کلرک نے کہا...... ''یہی فریال ہے۔''

یہ اینٹی کلائمکس انتہائی حوصلہ شکن تھا...... ''یہ فریال وہ نہیں ہے جس کی ہمیں تلاش ہے۔''

''آئی ایم سوری......'' وہ بولی...... ''آپ کا وقت ضائع ہوا......''

''کوئی بات نہیں......'' میں نے کہا...... ''تمہارا اس میں کیا قصور ہے۔''

اس نے جھجکتے ہوئے بھابی سے کہا...... ''میڈم...... پلیز...... یہ لے لیں۔''

بھابی نے اس پانچ سو کے نوٹ کو دیکھا جو لڑکی واپس کر رہی تھی ''نہیں...... تم بھی تو میری چھوٹی بہن جیسی ہو...... رکھ لو......''

وہ بہت کم تنخواہ پر کام کرنے والی غریب لڑکی ہوگی...... اس کے لیے پانچ سو کی رقم بہت بڑی تھی...... یہ واپس کرتے ہوئے یقیناً اسے افسوس ہوگا کہ اب کوئی خوشی یا چھوٹی چھوٹی بہت سی خوشیاں وہ نہیں خرید سکتی تو پانچ سو روپے غیر متوقع طور پر مل جانے سے اس کی دسترس میں آ گئی تھیں۔ بھابی کے انکار پر مجھے یوں لگا جیسے وہ رو پڑے گی۔

فریال کے ملنے کی امید نے دم توڑ دیا تھا...... مجھے تلاش کو جاری رکھنا بے سود نظر آتا تھا...... لیلیٰ بھابی نے بھی مجھ سے اتفاق کیا کہ اب اور کہاں جائیں...... ہر جگہ دیکھ لی۔''

میں نے کہا...... ''ہاں...... وقت ضائع کر کے بھی وہ ملے گی نہیں۔''

بھابی نے کہا...... ''آخر وہ گئی کہاں؟''

''وہ ضرور کسی جاننے والے کے گھر میں ہوگی...... جسے میں نہیں جانتا۔ میں نے کہا اور اسے لندن جانا ہے تو ویزا کے لیے اسلام آباد کے سوا کہاں جائے گی۔''

''پھر تو اس کی تصویر کے ساتھ اخبارات میں اشتہار شائع کرا لینا چاہیے......'' میں نے کہا۔

''کیسی باتیں کرتی ہو بھابی...... وہ کوئی گم شدہ یا گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی ہے...... لیکن اخبار کے نام پر یاد آیا...... واپس جانے سے پہلے مجھے کسی سے ملنا ہے۔''

بھابی کو گھر چھوڑ کے میں نے راجا کے ذریعے ڈپٹی سیکریٹری کا پتا معلوم کیا اور ان کے گھر جا پہنچا...... وہ سیٹلائٹ ٹاؤن کے ایک پرانے مکان کی نچلی منزل پر رہتے تھے اور اتفاق سے گھر پر تھے...... نیچے والی کال بیل بجانے پر وہ خود ہی دروازہ کھولنے آئے۔ وہ پچاس پچپن سال کا بھاری بھرکم شخص تھا۔ سر کے بال تقریباً اڑ چکے تھے...... آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی چہرے پر ایک درشتی نظر آتی تھی لیکن وہ نرم خو شخص تھا۔

میں نے کہا۔ ''مجھے برہان الدین صاحب سے ملنا تھا۔''

''میں ہی برہان الدین ہوں......'' وہ بولا۔

''میں رفیق احمد شیرازی ہوں...... نواب رفیق احمد شیرازی آف ست بدھائی۔'' اس کے چہرے کا تاثر ایک دم بدل گیا...... اچھا اچھا...... آیئے اندر آیئے......

''میں نے اچانک آ کے آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا......''

وہ مسکرایا...... آپ نے بہت اچھا کیا...... مجھے بڑی خوشگوار حیرت ہوئی آپ کو اپنے دروازے پر دیکھ کر...... یہاں آنے والے آپ پہلے نواب ہیں۔''

میں نے کہا...... ''اس خطاب سے مجھے شرمندگی زیادہ ہوتی ہے...... میرے والد ایک ریٹائر کالج پروفیسر ہیں...... اس پر مجھے زیادہ فخر ہے...... یا اس پر کہ میں نے ہارورڈ سے ایم بی اے کیا۔''

''اچھا پہلے بتائیں کیا پسند ہے آپ کو...... چائے یا کافی......''

میں نے کہا...... ''میزبان آپ ہیں۔''

وہ اندر گیا اور چند منٹ میں لوٹ آیا۔ باتیں خبر کے حوالے سے شروع ہوئیں...... ''وہ لڑکا شاہد آیا میرے پاس کہ چچا یہ خبر لگوا دو جیسے بھی ہو...... وہ میرے مرحوم دوست کا بیٹا ہے...... میں نے پوچھا کہ تمہیں کیا پریشانی ہے آخر......؟ پھر اس نے کافی باتیں بتائیں...... جو اسے راجا نے بتائی تھیں......''

میں نے کہا...... ''راجا میرا دوست ہے...... میرے ساتھ ہے...... آج کل فیلڈ میں نہیں ہے تو اس کی چلتی نہیں...... اس نے خبر شائع کرانے کی کوشش کی تھی......''

''نواب صاحب...... بات فیلڈ میں ہونے کی نہیں...... اپنے اپنے مفادات کی ہے...... اب میں آپ سے سب کچھ سننا چاہتا ہوں۔''

میں نے کہا...... ''میں اس لیے آیا ہوں کہ آپ کو اور بہت کچھ بتا دوں جو خبر میں نہیں...... اور شاہد صدیقی بھی نہیں جانتا...... لیکن میری ایک گزارش ہے...... آپ مجھے نواب صاحب نہ کہیں...... صرف رفیق کہیں...... میرے والد بھی تقریباً آپ کی عمر کے ہیں...... آپ کے بچوں جیسا ہوں میں......''

وہ میری بات سے خوش ہوا...... ''ایسی وضع داری کی روایات اب دیکھنے میں نہیں آتیں...... کبھی دیکھو ان بیورو کریٹ وڈیروں کی اولادوں کو تو میر صاحب کو شعر یاد آتا ہے کہ زمانہ نازک ہے...... دونوں ہاتھوں سے تھامیے دستار......''

میں نے برہان الدین کو اپنے اور ست بدھائی کے ترقیاتی منصوبوں کے بارے میں تفصیل سے بتایا اور یہ بھی بتایا کہ کن وجوہات کی بنا پر رانا میرا دشمن ہوا...... میں نے کافی اختصار برتا اور سارے واقعات اس کے گوش گزار کر دیئے...... اس کی دلچسپی کا اظہار اس کے سوالوں سے ہوتا رہا...... مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ میری باتوں نے اسے کتنا متاثر کیا ہے۔

آخر میں اس نے کہا...... ''مجھے بتاؤ میں تمہارے لیے اور کیا کر سکتا ہوں۔''

میں نے کہا...... ''آپ کو بھی رانا سے نقصان پہنچا تھا۔''

''ہاں...... بچھو تو سب کو ڈنک مارتا ہے......'' اس نے کہا...... ''میں ایک سرکاری ملازم ہوں...... نہ سیاست میں حصہ لے سکتا ہوں نہ اپنے سیاسی خیالات کا اظہار کر سکتا ہوں...... یہ سب قواعد و ضوابط نچلے درجے کے ملازمین کے لیے ہیں ورنہ اوپر کی سطح پر جو اپائنٹمنٹ ہوتی ہے پولیٹکل ہوتی ہے...... لیکن نوکری پیشہ آدمی کو حکم کا غلام بننا پڑتا ہے...... اصول وغیرہ کچھ نہیں...... میں علانیہ نہیں کہتا پھرتا لیکن سب کو معلوم ہے کہ میرا اخبار کس طرف ہے...... جیسے میں جانتا ہوں کہ کون جماعت سے ہمدردی رکھتا ہے اور کون سرکاری لیگ سے...... جوانی کے دور میں بھٹو صاحب ملک کے سب نوجوانوں کی طرح میرے آئیڈیل تھے...... وہ بدقسمتی سے بیرونی اور اندرونی سازشوں کا شکار ہو گئے...... اس کے برعکس سوچنے والے بھی بہت ہیں...... ایوب خان اور ضیاء الحق کے پرستار بھی کم نہیں...... انیس سو تراسی میں ایک وزیر نے ایک جاہل تنگ نظر شخص کو ترقی دے کر میرا باس بنوا دیا تھا...... میں اس وقت بہت جونیئر تھا...... اس شخص کے ساتھ میرا نباہ مشکل ہو گیا...... رفیق صاحب...... ایک سرکاری ملازم کے لیے نوکری سزا بن جاتی ہے اگر اس کا باس نالائق ہو اور نا اہل ہو...... اس باس نے بھی مجھے بہت پریشان کیا۔

یہ رانا رجب علی بھی اسی دور کی پیداوار ہے...... میں سب کو نہیں کہتا لیکن رانا جیسے بہت تھے جو بڑی دھوم دھام سے محافل نعت خوانی کرتے تھے...... ان کے گھروں کی خواتین میلادیں کرتی تھیں۔ یہی لوگ بمبئی تقریبات میں ناچ گانے کے لیے بمبئی سے سنگر ڈانسرز بلواتے تھے شراب و شباب کے سارے مزے لوٹتے تھے۔

رانا کے ایک سیاسی حریف نے بیٹے کی شادی پر خوب رونق لگائی...... ناچ گانے کی محفل سجائی اور وہ سب کیا جو لہو و لعب میں آتا ہے لیکن آج باعث شان سمجھا جاتا ہے...... اس شادی کی رپورٹ رنگین تصاویر کے ساتھ ''سماجی تقریبات'' کے عنوان نے ایک دو شام کے اخبارات میں شائع ہوئیں...... رانا نے سازش کی اور تصاویر بدل دیں...... فیملی گروپ کے ساتھ چند تصاویر رقص کی شامل کر دیں...... یہ اس دور کے سنسر قوانین کے مطابق سخت قابل اعتراض تھیں۔

چند ہفتے پہلے رانا کے بیٹے کی شادی ہوئی تھی......اس کی رپورٹ اسی اخبار نے بڑے سخت تبصرے کے ساتھ شائع کی تھی اور نمونے کے طور پر ایک تصویر بھی شائع کی تھی جس میں رانا صاحب ہاتھ میں جام لیے ایک رقاصہ کی کمر میں ہاتھ ڈالے جھول رہے تھے......رقاصہ ''دشمن ملک'' کی تھی......نیچے لکھا تھا کہ ہم بے شرمی کا یہ نمونہ معذرت کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔ اس سے کہیں زیادہ شرمناک مناظر ہمارے کیمرے نے دیکھے مگر سنسر کی مجبوری ہے۔

رانا مشکل میں پڑ گیا تھا......اس نے کہا کہ یہ دشمنوں کی سازش ہے......تصویر بنائی گئی ہے یعنی کیمرا ٹرک ہے......میری کردار کشی کی گئی ہے......وغیرہ وغیرہ......اس نے اخبار کو نوٹس بھی بھیجا مگر ظاہر ہے یہ سب ڈراما تھا......کچھ عرصے بعد معاملہ دب گیا......میرے باس نے کہا کہ اس اخبار کے خلاف کارروائی ہونی چاہیے۔ میں نے سمری بنا کے بھیج دی......اخبار کے مالک کو نوٹس پہنچا کہ کیوں نہ تمہارا ڈکلیریشن منسوخ کر دیا جائے......یا سرکاری اشتہار بند کر دیے جائیں......وہ میرے پاس آیا......میں نے اوپر بھیج دیا......باس سے ملا اور خوش خوش چلا گیا......کچھ عرصے بعد باس بالکل نئی چمکتی دمکتی کار میں آفس تشریف لائے......میں نے پوچھا تو فرمایا کہ میری بیوی کو شادی کی سلور جوبلی پر اس کے بھائی نے گفٹ کی ہے۔

رانا اپنی باری کا منتظر رہا......جب اس کے ہاتھ حریف کے گھر کی تقریب کی سنسنی خیز تصاویر لگیں تو اس نے بڑا گیم کھیلا......اس نے کاپی جوڑنے والے اور میگزین ایڈیٹر کو اپنے ساتھ ملایا......انہیں ایک ایک لاکھ نقد دیے اور دوسرے اخبار میں دگنی تنخواہ پر ملازمت دلوائی جو دبئی سے شائع ہوتا وہ تو بھاگ گئے......ایڈیٹر کے ساتھ پرنٹر پبلشر سب پھنس گئے......اپنا بدلہ چکانے کے لیے رانا نے مزید یہ کیا کہ دو ڈھائی سو کرائے کے مظاہرین جمع کیے......انہوں نے اخبار کے دفتر کے خلاف فحش تصاویر کی اشاعت پر مظاہرہ کیا اور اندر جا کے خوب توڑ پھوڑ مچائی......اوپر سے ہدایات ملنے پر باس نے پھر مجھ سے کہا کہ نوٹ بنا کے پیش کرو......میں نے لکھا کہ اخبار کے خلاف سخت کارروائی ہونی چاہیے اور اس کا ڈکلیریشن منسوخ ہونا چاہیے......باس بہت خفا ہوا کہ یہ کیا ہے......لکھو کہ یہ سیاسی مخالفت پر ذاتی لڑائی ہے......ایڈیٹر اور پرنٹر پبلشر نے عدالت میں کہا ہے کہ وہ قصوروار نہیں......اصل مجرم فرار ہو گئے ہیں......ان کی ضمانت بھی منظور ہو گئی ہے......اخبار کو وارننگ دینا کافی ہے......میں نے کہا کہ آپ اپنے قلم سے جو باتیں لکھ سکتے ہیں......میں سمری واپس نہیں لوں گا......باس نے پھر تگڑی رشوت لی ہو گی......اس نے میرے خلاف شکایت کی......مجھے پہلے او ایس ڈی بنا دیا گیا......میں نے اپیل کی اور اس میں بہت کچھ لکھ دیا......اس پر مجھے معطل کر دیا گیا......میں نے معطلی کے احکام کو چیلنج کر دیا اور بالواسطہ طور پر باس تک یہ بات پہنچا دی کہ مجھ سے پنگا لیا تو میں سب کو ننگا کر دوں گا......میں ہوں رزق اور زندگی کے معاملات میں راضی برضائے رب......ڈرنا انہیں چاہیے جن کو عاقبت سے زیادہ دنیا عزیز ہے......میرے پاس بہت گولا بارود ہے......وہ سب اس جنگ میں جھونک دوں گا......رند خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو......

میں نے ہنس کے کہا......''یہ گولہ بارود کیا تھا؟''

''جب بھی حکومت بدلتی ہے......تو آنے والی حکومت پوری سرکاری مشینری تبدیل کرتی ہے......آج تک یہ انتقال اقتدار خوشگوار ماحول میں پرامن طریقے پر نہیں ہوا......جیسے امریکہ یا بھارت میں ہو جاتا ہے......جیسے ہی حکومت بدل پڑتی کے حامی ادھر ادھر ہو گئے اوپر والے بھی خوش نہ تھے مگر مجبوری میں ساتھ تھے......ویسے بھی حکومتی پارٹی کے طرف دار صحافی کم ہوتے ہیں مخالف زیادہ......انہیں محکموں کے اندر کی خبریں ملتی رہتی ہیں......غیر قانونی سرکاری احکامات کی نقول......دستاویزات کی کاپیاں......فوٹوز......پچھلی اور موجودہ حکومت کے حامی واضح طور پر اور گروپس میں بٹے ہوئے برسرپیکار تھے۔ چنانچہ اپنے محکمے کے اندر کے راز مجھے اسمگل ہوتے رہے......یہی میرا گولہ بارود تھا......صرف دھمکی نے میرے باس کو خوفزدہ کر دیا......میری معطلی کے احکامات واپس لے لئے گئے......میری او ایس ڈی کی حیثیت برقرار رہی......ایسا ہمیشہ ہوتا ہے......میرا باس بھی رگڑے میں آیا اور برطرف کر دیا گیا لیکن تب تک وہ اتنا مال اکٹھا کر چکا تھا کہ نوکری کے بغیر عیش سے زندہ رہ سکتا تھا......اب تم بتاؤ تمہارے آنے کا مقصد کیا تھا؟''

میں نے کہا......''راجا نے کہا تھا کہ آپ سے مجھے گولہ بارود مل سکتا ہے۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا......''جب مجھے اگلے عہدے پر ترقی ملی تھی تو یہی رانا تھا جو مجھے مبارکباد دینے آیا تھا......مٹھائی کا ٹوکرا لے کر......اور میں نے اس سے ملنے سے انکار کر دیا تھا......میں جانتا تھا کہ مقصد ملاقات کیا

ہے......ایک تو وہ مجھ سے اپنے خلاف مواد واپس لینا چاہتا تھا......بلکہ خریدنا چاہتا تھا......دوسرے اس نے ایک اخبار کے ڈکلیریشن کے لیے درخواست فائل کر رکھی تھی......اس زمانے میں ڈکلیریشن حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا......فذات تک بے بس تھی......حکومت بدلنے سے رانا کو کچھ امید ہو گئی تھی کہ اب سودا ہو سکے گا......اس میں کوئی شک نہیں کہ پالیسی نرم ہو گئی تھی لیکن اس کے باوجود این او سی میں مہینوں لگ جاتے تھے......اور لاکھوں......رانا ڈھیٹ آدمی تھا......اس نے میری بیٹی کی شادی میں تحفہ بھیجا......یہ ایک مہران کار تھی......میں نے واپس کر دی......وہ باز نہ آیا......پھر مجھے پتا ہی نہیں چلا اور اس کی بیوی میرے گھر آئی اور میری بیوی کی دوست بن گئی۔ اس نے بہت بھاری اور مہنگے سونے کے کڑے تحفے میں دیے۔......تصدیق پر معلوم ہو گیا کہ اصل سونے کے کڑے ایک لاکھ سے اوپر کے ہیں۔ میں نے بیوی سے واپس کرنے کا کہا تو وہ تائل کرنے لگی......دراصل میری ایمانداری سے وہ پہلے ہی ناخوش تھی ہم بیٹی کو جہیز میں کار دیتے تو ہماری ناک کتنی اونچی ہوتی......زندگی میں اپنی آمدنی سے کبھی اسے انگوٹھی تک بنوا کے نہ دی......ایک لاکھ کے کڑے اس نے سخت ناگواری سے واپس کیے......میں نے رانا کو بتا دیا کہ میرے ہوتے ڈکلیریشن اسے نہیں ملے گا......اس نے دوسری چال چلی......ایک روز میں آفس سے نکلا تو دروازے پر ہی مجھے پولیس نے گھیر لیا......میری کار میں سے ایک بریف کیس برآمد ہوا......اس میں ایک لاکھ کے نوٹ تھے جن پر اینٹی کرپشن والوں نے دستخط کر رکھے......مجسٹریٹ کی موجودگی میں رشوت کی رقم برآمد ہو گئی......مجھے گرفتار کر لیا گیا......رانا کی تحریری شکایت پہلے سے موجود تھی......مجھے برطرف کر دیا گیا اور میں نے تین سال سختی میں گزارے......پھر ہائی کورٹ کے حکم پر مجھے بحال کیا گیا......اس دوران میری بیوی مر گئی......میرے پاس ایک پرانی گاڑی تھی......اسے آگ لگا دی گئی......میں پیدل ہو گیا......سوری......یہ سب تمہیں بتانے کا مقصد کچھ اور تھا......تمہارے لیے میری مدد زیادہ فائدہ مند ہو سکتی......لیکن میرے جیسے اور بھی ہیں جو رانا کی وجہ سے بڑی مشکل میں پڑے......ان میں ایک ہے ڈی آئی جی عبداللہ جان......''

میں نے کہا......''یہ نام میں نے سنا ہے۔''

''اسے حال ہی جہلم پوسٹ کیا گیا تھا......وہ رانا کو گرفتار کر کے بہت خوش ہو گا......''

''مگر میں اس سے براہ راست کیا کہوں......''

''تمہیں کچھ بھی کہنے یا کرنے کی ضرورت نہیں......تم صرف یہ پتا لگاؤ کہ رانا کہاں ہے اور اسے یا مجھے بتا دو......''

مجھے کچھ مایوسی ہوئی......رانا کا سراغ لگانا آسان نہیں ہو گا......

''دیکھو......وہ کوئی عام مجرم نہیں ہے......جو گرفتاری کے ڈر سے چھپتا پھرتا ہے۔ پولیس اس کے گھر پر نظر رکھتی ہے......بعض اوقات گھر والوں کو اٹھا لیتی ہے......رانا کو اپنے اثر و رسوخ پر بہت اعتماد ہے کہ پولیس اسے راہ چلتے یا گھر پر چھاپہ مار کے نہیں پکڑ سکتی......وہ اپنے وکیلوں اور حکومتی پارٹی کے دوستوں سے مشورہ کر رہا ہو گا......کہ کیس کو کیسے دبایا جائے......یہ روپوشی محض ایک ڈراما ہے......اس کا سراغ لگایا جا سکتا ہے......اگر تم اپنے مخبر پیچھے لگا دو......''

میں جب اٹھا تو زیادہ پرامید نہیں تھا......اخبار میں شائع ہونے والی رپورٹوں نے کافی ہلچل پیدا کی تھی اور حسبِ توقع رانا نے اپنے وکیلوں کے ذریعے تمام الزامات کو لغو اور بے بنیاد قرار دیا تھا......اس کے بیٹے نے کہا تھا کہ میرے والد صاحب کے وہ کون دشمن ہیں جو یہ سب کچھ کرا رہے ہیں......میں جانتا ہوں اور ان کے خلاف قانونی کارروائی کا ارادہ رکھتا ہوں۔

رات کو میں دیر سے واپس پہنچا۔ تو مجھے بھابی اکیلی باہر ٹہلتی نظر آئیں۔ میں ان کے پاس بیٹھ گیا ''آپ جاگ رہی ہیں ابھی تک؟''

''کیا کروں دیور بھیا' نیند جو نہیں آتی۔ دماغ پریشان رہتا ہے۔''

میں نے کہا ''کل ہم واپس چلے جائیں گے۔ یہاں آنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ وہاں کافی مصروفیت ہے۔ آپ کا دل بہل جائے گا۔''

میرا دل کہتا ہے فریال لندن میں ہے۔ تمہیں ایسے ہی پریشان کر کے سزا دے رہی ہے۔''

''وہ لندن جاتی تو ویزا یہیں سے لیتی۔ ہمیں معلوم ہو جاتا۔ ابھی تک ڈاکٹر شائستہ ایڈریس نہ ہونے کی وجہ سے ٹکٹ نہیں بھیج سکی۔ یہی سب سے بڑی پریشانی کی بات ہے۔ اگر وہ اسلام آباد میں ہوتی تو اب تک بیکار نہ بیٹھی رہتی۔ ویزے کے لیے اپلائی کرتی۔''

''پھر وہ کہاں گئی۔''

میں نے کہا ''اس کے ساتھ کوئی حادثہ پیش

آ گیا ہے۔ وہ اسلام آباد پہنچی نہیں ہے۔"

"پھر کیا ہمیں اس کی گم شدگی کی رپورٹ نہیں لکھوانی چاہیے۔"

میں نے کہا "میرا خیال ہے اب یہ ضروری ہو گیا ہے میں ایک بار ڈاکٹر شائستہ سے اور بات کر لوں۔ راجا سے بھی مشورہ کر لوں۔"

بھابی گم سم بیٹھی اندھیرے کی چادر میں نہ جانے کیا دیکھ رہی تھیں "یہ فریال کے لاپتا ہو جانے کی پریشانی نہیں تھی۔ ان کی الجھنوں کا سبب کچھ اور تھا' اپنی پریشانی کو مجھ سے چھپانے کی کوشش کر رہا تھا مگر ناکام تھیں۔

میں نے کہا "بھابی! کیا بات ہے؟"

وہ چونکیں "بات کیا......" پھر انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا "کچھ دیر پہلے شہناز نے فون کیا تھا۔ پہلے تو بتاتی رہی کہ گاؤں گاؤں پھرنے والے فن کاروں کی ٹولی کا پروگرام بہت کامیاب رہا۔"

"اور پھر......" میں نے کچھ دیر انتظار کے بعد پوچھا۔

بھابی نے کہا "انہوں نے شہناز کو فون کیا تھا۔"

"فاروقی نے۔"

"ہاں اور کہا کہ نواب صاحب یا راجا صاحب تو مجھ سے بات ہی نہیں کریں گے۔ اس لیے تم سے درخواست کر رہا ہوں۔ لیلٰی سے بات کرا دو۔ شہناز نے کہا کہ وہ تو یہاں نہیں ہے۔ انہوں نے پوچھا کہ پھر کہاں ہے۔ شہناز نے کہا کہ یہ میں نہیں بتا سکتی۔ وہ کہنے لگے اس طرح میاں بیوی کے درمیان دیوار کھڑی کرنا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ اگر کسی سے غلطی ہو جائے تو دوسروں کو مصالحت کرانی چاہیے۔ شہناز نے کہا کہ غلطی اور جرم میں کیا فرق ہوتا ہے' یہ ایک وکیل سے بہتر کون جانتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ جب تک جرم ثابت نہ ہو' الزام رہتا ہے۔ جو الزام مجھ پر لگایا گیا ہے' بے بنیاد ہے۔ اس کے بعد وہ کہنے لگے کہ میں اپنی بیوی سے معافی مانگ لوں گا۔ اسے ہر ضمانت فراہم کر دوں گا کہ آئندہ اسے مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہو گی۔"

خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد میں نے کہا "پھر......؟ کیا آپ اسے معاف کر کے واپس جانے کا سوچ رہی ہیں۔"

"خیال تو آتا ہے لیکن میں سوچتی ہوں کہ فاروقی نے کس طرح مریم کو استعمال کیا۔ اسے صرف اس لیے مار دیا کہ قتل کا الزام لگا کے مجھے بلیک میل کر سکے اور اس کے بعد کس طرح مجھے استعمال کرنے کی کوشش کی۔ میرا دماغ خراب ہو جاتا ہے پھر جو تم نے بتایا کہ تمہارے قتل کے الزام میں مجھے مجرم ثابت کرنے کے بعد وہ رابعہ پر ڈورے ڈالتا تو میرے دل میں نفرت کا آتش فشاں بھڑک اٹھتا ہے۔ ایسا شخص بدل نہیں سکتا۔ وہ واقعی مجھے نہیں چھوڑے گا۔"

میں نے کہا "بس حوصلہ رکھیں۔"

"شہناز کہتی تھی کہ جب تک یہ رشتہ رہے گا اور پھر اس طرح حق جتا کے دباؤ ڈالتا رہے گا۔"

"یہ تو اس نے ٹھیک ہی کہا۔"

"یہ کیا میں طلاق کا کیس کر دوں؟"

میں نے کہا "ابھی سے اس کے لیے کیوں پریشان ہیں۔ اللہ نے آپ کو محفوظ رکھا۔ شکر کریں۔ چلیں سو جائیں' بہت رات ہو گئی ہے۔

ان کے سو جانے کے بعد جانے سے پہلے لندن میں ڈاکٹر شائستہ سے بات کی۔ خلاف توقع اس کا لہجہ کم جارحانہ تھا۔ اس نے میری تلاش کی ناکامی کا ماجرا بڑی تشویش سے سنا۔ "رفیق اس پر کوئی آفت آئی ہے۔"

"مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔"

"اسے ضرور کسی نے اغوا کر لیا ہے۔" وہ گجرات پہنچی لیکن اسلام آباد نہیں پہنچی۔ تم معلوم کرو راستے میں کوئی حادثہ تو نہیں ہوا۔ خدانخواستہ ایسی کوئی خبر یا اطلاع ہے کہ کوئی عورت......" وہ کہنا چاہتی ہو گی کہ گر کے ٹرین سے تو نہیں کٹی مگر اس کا حوصلہ جواب دے گیا وہ رونے لگی۔

"کم آن ڈاکٹر شائستہ۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔"

وہ روتی رہی۔ "حادثات ہوتے ہیں۔"

میں نے کہا "اغوا والی بات زیادہ قرین قیاس لگتی ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ گجرات ریلوے اسٹیشن پر اسے کسی نے دیکھ لیا ہو۔"

"تمہارا مطلب ہے' سلطان نے۔"

"ہاں...... اور کون ایسا کر سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"مشکل یہ ہے نواب صاحب کہ آپ کا خود پرست ذہن اس امکان کو قبول نہیں کرتا کہ وہ خود سلطان کے پاس جا سکتی ہے۔" شائستہ کا لہجہ ایک دم تلخ ہو گیا "کیا شدید نفرت یا مایوسی کے ردعمل میں فریال کی سوچ بدل نہیں سکتی۔ تم کہتے ہو وہ خودکشی کر سکتی ہے۔ سلطان سے شادی نہیں کر سکتی۔ مگر کیا یہ بھی خودکشی کی ایک صورت نہیں ہے۔ اس کی ساری اذیت تمہارے لیے ہی ہو گی۔

"آئی ایم سوری' میں تم سے اتفاق نہیں کر سکتا۔"

"نہ کرو...... لیکن میری ایک بات پر غور کرو...... کیا سلطان کو فریال سے محبت نہیں تھی؟...... وہ صرف انا کی خاطر فریال کو حاصل کرنے پر تلا ہوا تھا؟ یہ وجہ بھی ہو گی...... مگر میں سمجھتی ہوں فریال کے لیے اس کی دیوانگی میں بڑی قوت تھی...... اس کی شدت میں کبھی کمی نہیں آئی...... کیا کچھ نہیں کیا اس نے فریال کو حاصل کرنے کے لیے؟ کیا فریال صرف ایک عورت تھی؟ اس جیسے شخص کے لیے عورت کی کوئی حیثیت ہے؟ لیکن اس نے کتنی اہمیت دی فریال کو...... جو فریال نے کہا اس نے مانا...... اس کی ہر خواہش پوری کی...... چار سال اسے لندن میں آرام سے رکھا...... تم نے کیا کیا؟"

"تم میرا موازنہ سلطان سے کر رہی ہو؟" میں نے خفگی سے کہا۔

"نہیں...... فریال نے کیا ہو گا...... اور ہو سکتا ہے ایسا سوچا ہو کہ اب وہی بہتر ہے...... قدر تو کرے گا ساری عمر......"

"تمہارا دماغ خراب ہے۔"

"دماغ تمہارا خراب تھا...... فریال تمہارا دماغ درست کرنے کے لیے تمہیں یہ سزا دے سکتی ہے...... وہ خود سلطان کے پاس جا سکتی ہے۔"

میں نے فون بند کر دیا۔

شائستہ کی بات پر بہت دیر تک میں اندر ہی اندر کھولتا رہا...... مجھے یقین کرنا مشکل تھا کہ کوئی عورت اس کی طرح بھی سوچ سکتی ہے...... فریال میرے رویے سے بددل تھی...... دل شکستہ اور مایوس تھی لیکن وہ مجھ سے نفرت نہیں کر سکتی تھی...... سلطان سے وہ دل کی گہرائی سے نفرت کرتی تھی...... اتنی کہ اس کا بس چلتا تو اسے قتل کر دیتی...... اگر یہ اس کے سامنے آخری آپشن ہوتا کہ موت اور سلطان میں سے ایک کو قبول کر لو تو وہ ایک لمحہ تذبذب میں ضائع کیے بغیر موت کو قبول کر لیتی۔

ڈاکٹر شائستہ کے اس خیال کی طرف میرا ابھی دھیان جاتا تھا کہ گجرات ریلوے اسٹیشن کے ایک پبلک کال آفس سے لندن کال کرنے کے بعد اس کے ساتھ کوئی سانحہ پیش آیا...... دو امکانات بہت واضح محسوس ہوتے تھے۔

ایک یہ کہ اس نے فون کیا اور اس کا دھیان ٹرین کی طرف نہیں رہا...... گجرات پر ایکسپریس ٹرین کا اسٹاپ چند منٹ سے زیادہ نہیں ہوتا...... گاڑی نکل گئی اور گاڑی میں اس کا سامان بھی چلا گیا...... سامان کیا ایک سوٹ کیس ہو گا جس میں اس کے کپڑے ہوں گے اور ذاتی ضرورت کی کچھ چیزیں...... زیور کا اسے کوئی شوق نہیں تھا لیکن لندن میں اسے کئی بار میں نے زیور پہنے بھی دیکھا تھا...... وہ خاصا قیمتی زیور تھا...... گاڑی چھوٹ جانے سے یقیناً اسے بہت پریشانی ہوئی ہو گی...... فوراً کوئی گاڑی نہیں تھی...... ممکن ہے اس کی پریشانی دیکھ کر کسی نے مشورہ دیا ہو کہ آپ ریلوے اسٹیشن کے باہر سے پرائیویٹ ٹیکسی پکڑ لو...... وہ آپ کو جہلم کے ریلوے اسٹیشن پر ٹرین سے پہلے پہنچا سکتی ہے بشرطیکہ ڈرائیور اچھا ہو...... ورنہ پنڈی تو آپ یقیناً ٹرین سے پہلے پہنچ جاؤ گی...... آپ کا سوٹ کیس مل جائے گا...... اس کے علاوہ کوئی صورت نہیں...... نہ ریلوے پولیس کچھ کر سکتی ہے اور نہ ٹرین پہنچنے کے بعد اس کا کوئی امکان ہے کہ کوئی ایماندار قلی اس لاوارث سوٹ کیس کے ساتھ مالک کا انتظار کرے......

اگر اس نے ایسا کیا ہو گا تو کچھ بھی ہو سکتا ہے...... گجرات سے آگے کہیں بھی ڈرائیور کی نیت خراب ہو تو وہ فریال کو کہیں بھی لے جا سکتا ہے...... یہاں اکیلی عورت شہر میں ایسا خطرہ مول نہیں لیتی...... شہر سے باہر تو اس کا اللہ ہی حافظ ہے...... دوسرا امکان یہ تھا کہ وہ ریلوے اسٹیشن سے نکلی ہو گی کہ کوئی ٹیکسی پکڑ لے...... گاڑیاں باہر موجود ہوتی ہیں مگر وہ ضرورت مند کو دیکھ کر منہ پھاڑ کے پیسے مانگتے ہیں...... ممکن ہے...... اس نے سوچا ہو کہ گاڑی تو ابھی ہے نہیں...... باہر اڈے پر جا کے پنڈی کی بس میں بیٹھ جائے...... اسے معلوم نہیں ہوا اور کسی جگہ بدقسمتی سے سلطان کی اس پر نظر پڑ گئی......

تیسری صورت وہی تھی کہ فریال حادثے کا شکار ہو گئی...... وہ چلتی ٹرین سے گر گئی اور کسی کو پتا نہ چلا ہو...... یا کسی نے اسے دھکا دے دیا اور اس کے سوٹ کیس پر قبضہ کر لیا...... جب برے خیالات کی یلغار ہو تو ان کی کوئی سمت اور حد نہیں ہوتی...... مجھے کروٹیں بدلتے ہوئے یہ خیال بھی آیا کہ کہیں اسلام آباد پہنچنے کے بعد اس کو کسی نے اغوا نہ کر لیا ہو...... کسی ہوٹل یا کسی گیسٹ ہاؤس میں بھی تو اکیلی لڑکی غیر محفوظ ہوتی ہے...... بدنیت اور بدکار لوگ ہر جگہ ہیں......

معلوم نہیں کتنی دیر تک میں اپنے خیالوں کی اعصاب شکن یلغار کی زد میں رہا...... پھر اچانک تکیے کے نیچے میرے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی...... میں نے روشن اسکرین پر نمبر دیکھا تو غیر شناسا تھا...... وقت دیکھا تو تین بجے تھے اس وقت فون کرنے والا کون ہو سکتا ہے...... میں

نے کال ریسیو کرتے ہوئے سوچا۔

میں نے جب ''ہیلو'' کہاتو دوسری طرف خاموشی رہی...... میں فون بند کر کے پھر لیٹ گیا...... گھنٹی پھر بجی تو میں نے کہا...... ''کون ہے...... کس سے بات کرنی ہے؟''

دوسری طرف سے کسی نے گہری ٹھنڈی سانس لی......

''اگر میں کہوں کہ بات تو آپ ہی سے کرنی تھی...... پھر؟''

یکلخت میرے رگ و پے میں بجلی سی دوڑ گئی...... میرے حواس پوری طرح بیدار ہو گئے...... میں نے تقریباً چلا کے کہا۔ ''نور جہاں......''

''میرا نام یاد ہے تمہیں۔'' وہ اداسی سے بولی۔

''بے وقوفی کی بات مت کرو...... کہاں ہو تم؟''

''ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو...... کچھ ہماری خبر نہیں آتی......''

میں نے کہا۔ ''نور جہاں...... یہ تمہارا نمبر ہے؟''

''اس نمبر پر مجھ سے بات کرنے کی غلطی مت کرنا...... میں خود تم سے بات کرلوں گی...... تم اسلام آباد میں ہونا۔''

''ہاں...... تمہیں کیسے معلوم...... تم کہاں ہو؟'' بے چینی سے میرا حال خراب تھا۔

''میں بھی اسلام آباد میں ہوں......'' وہ سرگوشی میں بولی۔

میں نے کہا۔ ''کہاں؟...... مجھے بتاؤ...... میں ابھی آجاتا ہوں۔''

''نہیں جان...... یہ اتنا آسان نہیں ہے......'' وہ اچانک سسکیاں لینے لگی۔

میں نے کہا۔ ''نور جہاں...... نور جہاں...... پلیز مجھے بتاؤ۔''

''کوئی فائدہ نہیں ابھی نہ تم یہاں آسکتے ہو...... نہ میں باہر نکل سکتی ہوں۔'' اس نے سرگوشی میں بات جاری رکھی۔

''تمہیں معلوم ہے...... یہ کون سی جگہ ہے۔''

''یہ ایک تہ خانہ ہے...... اسلام آباد میں گراؤنڈ فلور کے نیچے بھی بہت سے لوگ BASEMENT بناتے ہیں...... اور مجھے کچھ پتا نہیں۔''

''کہیں تم قید میں ہو؟''

''یہی سمجھو...... کیا تمہیں فریال کا کچھ پتا چلا......؟''

میں بھونچکا رہ گیا...... ''یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا...... کہ میں اسے تلاش کرنے یہاں آیا تھا۔''

وہ آہ بھر کے بولی۔ ''مجھے تلاش کرنے تو تم آنے سے رہے...... میری ایسی قسمت کہاں!......''

میں نے کہا۔ ''ایسا مت کہو...... تمہارے احسانات......''

''احسانات!'' وہ بولی پھر اچانک فون بند ہو گیا......

مجھے یوں لگا جیسے وہ احسانات کے حوالے پر برا مان گئی...... وہ مجھ سے کچھ اور توقع رکھتی تھی...... میں اس سے کہوں کہ میں تو دن رات تمہیں یاد کرتا رہا...... تمہاری تلاش میں دیوانہ وار سرگرداں رہا...... اسے یقین دلاؤں کہ اس سے بچھڑ کے میرے دل پر کیا قیامت گزری...... میں کتنا پریشان رہا...... دن رات اسے تلاش کرتا رہا...... تم سے جدا ہو کے مجھے اندازہ ہوا کہ مجھے تم سے کتنی محبت تھی......

اگر میں ایسا کہتا تو یہ جھوٹ ہوتا لیکن محبت کرنے والی عورت تو جھوٹ ہی سننا چاہتی ہے...... اگر وہ پاگل تھی تو اس کے پاگل پن کا کوئی علاج نہیں تھا...... اگر اس کی آواز نے میرے ذہن اور اعصاب کو جھنجوڑ کے رکھ دیا تھا تو یہ اس لیے تھی کہ میں اپنی دانست میں اسے بھلا چکا تھا...... جیسے لوگ ہمیشہ کے لیے بچھڑ جانے والوں کو بھلا دیتے ہیں...... لیکن وہ زندہ تھی...... یہیں اسلام آباد میں مجھ سے چند کلو میٹر کے فاصلے پر موجود تھی لیکن وہ قید میں تھی...... میرے دماغ میں سوالات کا بھونچال سا آیا ہوا تھا...... جذبات کی ایک آندھی تھی جس نے میرا سکون چھین لیا تھا...... یہ عشق نہیں تھا...... یہ نور جہاں کی جسمانی کشش سے الگ اپنائیت کا ایک جذبہ تھا...... اس نے جو کچھ ہمارے لیے جان ہتھیلی پر رکھ کے کیا تھا اس کا احساس تھا۔

میں بہت دیر مضطرب بیٹھا رہا...... گوش برآواز رہا وہ پھر کال کرے...... نور جہاں نے کہا تھا کہ یہ نمبر اس کا نہیں ہے...... کیا یہ اکبر خان کا نمبر تھا؟ کیا نور جہاں نے اکبر خان کے فون سے مجھے کال کرنے کی بے وقوفی کی تھی؟ اسے تو فوراً معلوم ہو جائے گا کہ نور جہاں نے پھر اس کے دشمن سے رابطہ کرلیا ہے...... کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ بات پوری ہونے سے پہلے ہی آ گیا ہو...... ایسے ہی اندیشوں کی وجہ سے میں نے اسے کال نہیں کی......

لیکن بالآخر میری قوت برداشت جواب دے گئی...... میں نے وہ نمبر ملایا جو میرے موبائل فون میں محفوظ ہو گیا تھا اور دھڑکتے دل کے ساتھ نور جہاں کی آواز سننے کا انتظار کرتا رہا لیکن چھ سات بار گھنٹی بجی...... پھر آپریٹر کی آواز میں ریکارڈ چلنے لگا...... ہم معذرت خواہ ہیں آپ کے مطلوبہ نمبر سے جواب موصول نہیں ہو رہا ہے۔

میں نے اٹھ کے پانی پیا اور کمرے میں ٹہلتا رہا......

سوچتا رہا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے...... اگر نور جہاں نے مجھے بلایا تو کیا ہوگا؟ اگر اس نے کہا کہ مجھے قید سے نکالو...... اس نے مجھے اپنا پتا بتا دیا...... تو میں کیا کروں گا؟ وہ جانتی ہے کہ میں یہاں فریال کی تلاش میں آیا ہوں...... یہ انفارمیشن اسے کس نے دی؟ کیا کچھ لوگ یہاں بھی مجھ پر نظر رکھے ہوئے ہیں......

میرے خیالات کی رو دوبارہ گھنٹی بجنے سے ٹوٹی......

میں نے لپک کے بیڈ پر پڑا ہوا موبائل فون اٹھا لیا......

''ہاں...... نور جہاں...... کیا ہوا تھا......؟''

''میں صبح فون کروں گی...... ٹھیک نو بجے......''

''مجھے اپنا پتا ٹھکانا کچھ تو بتاؤ...... میں تمہاری کیا مدد کروں؟''

وہ بہ دستور سرگوشی میں بول رہی تھی...... ''تم واقعی کچھ کرنا چاہتے ہو میرے لیے؟''

میں نے کہا۔ ''آزمالو...... میں اتنا......'' میں احسان فراموش کہتے کہتے رک گیا...... ''بے وفا بھی نہیں ہوں۔''

''تم مجھے یہاں سے لے جاؤ گے اپنے ساتھ ست بدھائی؟''

''ہاں...... مگر تم ہو کہاں......؟'' میں نے سوچے سمجھے بغیر کہا۔

''یہ مجھے بھی معلوم نہیں...... لیکن میں نکل آؤں گی...... دیکھو...... تمہارے وعدے پر میں اپنی ساری کشتیاں جلا کے آؤں گی...... پھر میرے لیے واپسی کی کوئی صورت نہیں رہے گی...... بولو تم مجھے پناہ دو گے...... ست بدھائی میں جگہ ہوگی میرے لیے؟''

''نور جہاں...... ایسی کیا بات ہے آخر؟''

''رفیق...... ہاں یا نہ...... تم میں ہمت ہے میرے جیسی عورت کو اپنے گھر میں جگہ دینے کی......؟ سب کی مخالفت کے باوجود......؟''

''ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا...... دوسروں کے بارے میں۔''

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی...... ''مجھے پتا تھا...... تم بزدل ہو...... مالک ہو ست بدھائی کے لیکن تم میں ہمت نہیں ہے کہ ایک عورت کو پناہ دے سکو...... کیونکہ میں بہت بری عورت ہوں...... کوئی بھی اچھائی نہیں مجھ میں۔''

''خدا کے لیے ایسی باتیں مت کرو...... تم کچھ بتاؤ تو سہی۔''

''رفیق...... فرض کرو میں اکبر خان کو قتل کردوں...... اور نکل آؤں باہر...... کیا تم مجھے پک کرلو گے...... کسی سڑک سے......''

میں نے گھبرا کے کہا...... ''یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟''

''وہی جو میں طے کر چکی ہوں...... دیکھو نا یہ بھی تو تمہارے فائدے کا سودا ہے۔ تمہارا ایک دشمن کم ہو رہا ہے...... کچھ بھی کیے بغیر۔''

''لیکن میں نے تم سے کہا تو نہیں......''

''اوہو...... میں کب کہہ رہی ہوں کہ یہ میں تمہارے لیے کر رہی ہوں...... یہ تو میں اپنی زندگی کے لیے کر رہی ہوں...... دیکھو نا...... اگر آگ لگی ہوئی ہو اور آپ کے سامنے چھٹی ساتویں منزل پر صرف ایک کھڑکی ہو...... تو کیا کرنا چاہیے...... آرام سے بیٹھ کے جل جانا چاہیے یا کھڑکی سے کود جانا چاہیے...... یہ قتل بھی کھڑکی سے کودنے جیسا چانس ہے جو میں اپنے لیے لے رہی ہوں...... قتل کر کے میں بچ جاؤں گی...... یا پھانسی چڑھ جاؤں گی...... ففٹی ففٹی چانس ہیں...... اور یہ میں تمہارے آسرے پر کرنا نہیں چاہتی تھی...... اسے تو بس اتفاق سمجھو...... کہ آج میرے ہاتھ ایک موبائل فون لگ گیا...... ایک بندہ آیا تھا...... وہ بھول گیا...... دو دن میں نے چھپائے رکھا...... اگر اسے یاد آجاتا تو وہ واپس لے جاتا...... وہ نہیں آیا اس کا مطلب ہے اسے یاد نہیں کہ موبائل کہاں رہ گیا...... اس میں بیلنس بھی تھا......''

''تم پیتی رہی ہو؟''

وہ ہنسی...... ''ہاں...... اس کی اجازت ہے مجھے۔''

''یہاں کوئی تمہاری باتیں سننے والا نہیں ہے؟''

''ابھی نہیں ہے...... میں واش روم میں ہوں اور کھلے دروازے سے دیکھ رہی ہوں...... ابھی تک اس نے کروٹ بھی نہیں لی...... مجھے بتاؤ تم نے کیا سوچا...... مجھے لے جاؤ گے یا نہیں؟''

''نور جہاں...... اتنی جلدی مت کرو۔''

''دیکھو...... ڈرو نہیں...... صاف کہہ دو کہ میں تمہیں نہیں لے جاسکتا...... میں چلی جاؤں گی کہیں...... پھر زندگی رہی اور موقع ملا تو تم سے رابطہ کروں گی...... یہ تو میں نے طے کرلیا ہے...... صبح ہونے سے پہلے اکبر خان کا گلا کاٹ دوں گی...... چھری میرے تکیے کے نیچے ہے...... پھر اس کا ریوالور لوں گی...... گاڑی نکالوں گی تو چوکیدار کو بھی شوٹ کرنا پڑے گا۔''

اچانک میں نے فیصلہ کرلیا۔ ''او کے...... کیا تم اسلام آباد کے راستوں سے واقف ہو؟''

''نہیں...... لیکن تم بتاؤ...... میں کہاں آؤں؟''

''شکر پڑیاں ہل...... اس سے جو راستہ نیچے اترتا ہے...... میں اس پر تمہارا انتظار کروں گا۔''

اس نے ہونٹوں سے چومنے کی آواز نکالی۔ ''ٹھیک ہے...... صبح نو بجے...... اور اب ایک اچھی خبر...... فریال کے حوالے سے......''

میرا دل بڑے زور سے دھڑکا۔ ''تمہیں کچھ معلوم ہوا ہے...... وہ کہاں ہے؟''

''دوبارہ سوچنے پر میں اس نتیجے پر پہنچی ہوں کہ ابھی تمہیں کچھ نہیں بتانا چاہیے...... جب تم آؤ گے تو بتاؤں گی......'' وہ ہنسی۔

''بکواس مت کرو...... یہ خیال ابھی ابھی تمہارے دماغ میں آیا ہے۔''

''نہیں جان...... تم سے پہلے کبھی جھوٹ نہیں بولا میں نے...... ہاں تمہیں...... بلانے کے لیے دانہ ضرور ڈالا ہے...... تم بڑے خودغرض ہو...... صرف میرے لیے کبھی نہیں آتے...... اپنا فائدہ دیکھ کے کھیلتے ہو...... حالانکہ میں جانتی ہوں...... دنیا کے ننانوے فیصد مرد فائدہ چھوڑ کے میری طرف لپکیں گے۔''

''میں ان میں شامل نہیں ہوں۔''

''یہی تو تمہاری وہ ادا ہے جو مجھے پاگل کرتی ہے...... اگر ثابت ہو جائے کہ میں نے جھوٹ بولا تھا...... تو مجھے چھوڑنا تمہارے اختیار میں ہوگا...... تم مجھے کہیں بھی چھوڑ کے جا سکتے ہو......''

''او کے...... میں آ رہا ہوں۔''

''بروقت فیصلہ کر لیا تم نے...... دل خوش کر دیا میرا...... میں تو سمجھ رہی تھی......''

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ غالباً اس کے موبائل میں بیلنس ختم ہو گیا تھا...... فون بند کر کے میں کچھ دیر اندھیرے میں بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ میرے دماغ میں خیالات کی افراتفری تھی...... میں نے نورجہاں سے وعدہ تو کر لیا تھا مگر مجھے خود پر اعتبار نہ تھا کہ اسے لینے جاؤں گا یا نہیں۔

صبح ہونے یا نو بجنے میں ہنوز ساڑھے چار گھنٹے تھے...... اس وقفے میں کچھ بھی ہو سکتا تھا...... اکبر خان بیدار ہو سکتا تھا...... خود نورجہاں کا ارادہ بدل سکتا تھا...... اس کی ہمت جواب دے سکتی تھی...... بے شک وہ مایوسی اور نفرت کے انتقامی جذبات کی اس انتہا پر پہنچ چکی تھی جہاں اکبر خان کو قتل کرنا اس کے لیے ناگزیر ہو گیا تھا...... لیکن کیا وہ ایسا کر پائے گی......

اور فرض کرو...... اس نے اکبر خان کے گلے پر چھری پھیر دی...... اور نکل نہ پائی...... وہیں پکڑی گئی پھر...... مگر یہ ہی کیوں سوچوں...... مجھے تو یہ سوچنا چاہیے کہ کیا صبح نو بجے اسے لینے جاؤں؟...... اسے ساتھ لے کے میں کہاں جاؤں گا؟ میرے ساتھ لیلیٰ بھابی ہے...... غنی ہے...... کیا وہ مجھے ایسا کرنے دیں گے؟ اور اگر میں نے ان کی مخالفت کو نظرانداز کر دیا...... تب بھی اکبر خان کی قاتل بیوی کو میں کہاں لے جاؤں گا؟......

عام حالات میں بھی نورجہاں کے لیے ست بدھائی میں کوئی جگہ نہ تھی...... ہر شخص اس سے نفرت کرتا تھا...... اسے طوائف سے بدتر جانتا تھا...... اس کا مجھ سے تعلق پہلے ہی بہت خرابیاں پیدا کر چکا تھا...... اسے کون برداشت کرے گا...... نہ راجا...... نہ فریال...... نہ شہناز...... نہ رابعہ...... اور آخر میں اماں ابا...... اس سے کسی کو ہمدردی نہیں تھی...... کوئی نہیں سوچے گا کہ اس نے کس طرح ہماری مدد کی تھی...... سب کہیں گے کہ وہ سب اس نے اپنی ہوس کے جذبات سے مجبور ہو کے کیا تھا......

اب اس کے ہاتھ خون سے رنگے ہوں گے تو اسے پناہ دینے کی کون سوچے گا...... الزام براہ راست نورجہاں پر آئے...... کسی اور پر شک کا سوال ہی نہیں...... اس کی قانونی مدد سے بھی کچھ نہیں ہوگا...... وہ کہاں تک چھپے گی...... کب تک چھپے گی...... ہمارے مسائل پہلے ہی کم نہیں...... ہم یہ مصیبت کیوں مول لیں سب کا ایک ہی مؤقف ہوگا اور بالکل جائز ہوگا...... بے شک اس نے ہمارے ایک دشمن کا قتل کیا ہے مگر قتل تو قتل ہے...... اس نے اپنے لیے اس زندگی کا انتخاب خود کیا تھا...... اس کا یہی انجام ہو سکتا تھا......

میں سخت پریشانی میں بار بار گھڑی دیکھتا رہا...... میرے لیے کسی نتیجے پر پہنچنا مشکل ہو رہا تھا...... بالآخر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ نورجہاں کو ست بدھائی میں پناہ دینے کا کوئی سوال نہیں...... لیکن اسے کہیں اور چھپا کے رکھا جا سکتا ہے...... اس میں بھی ایک بہت بڑی الجھن تھی کہ میں اسے کہاں رکھ سکتا ہوں اور کب تک...... سب سے بڑھ کر یہ کہ کیوں...... لیکن دوسری طرف ایک خیال تھا کہ کیا میں اسے دغا دوں...... سہارے کے لیے ہاتھ بڑھا کے کھینچ لوں...... وہ بربادی کے غار میں گر جائے...... وہ مدد کی طالب تھی...... وہ میری دشمن بھی نہیں تھی...... اس نے ہمیشہ میری مدد کی تھی...... میری زندگی بچائی تھی...... اب اس کی زندگی

بچانے کا وقت آیا تو میں کچھ بھی نہ کروں...... وہ میری راہ دیکھتی رہ جائے اور پولیس اسے لے جائے......

نہیں...... مجھے کچھ کرنا ہی ہوگا...... اگر میں نے لیلیٰ بھابی سے ذکر کیا تو بات ایک دم راجا تک پہنچ جائے گی...... ابھی مجھے کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں...... اسے فریال کے بارے میں بھی کچھ معلوم ہے...... اس نے کہا تھا کہ اچھی خبر ہے...... میں کہہ سکتا ہوں کہ میں خبر کے چکر میں گیا تھا...... راجا کہے گا کہ بکواس مت کر...... تو نورجہاں کے چکر میں گیا تھا...... اس نے پھر مجھے پھانس لیا تھا...... وہ ایک کتیا ہے...... تو کتے کی طرح اس کے پیچھے دم ہلاتا جاتا ہے...... جس کا جو دل چاہے کہے......

پھر سوال وہی کہ اسے کہاں لے جاؤں جہاں وہ محفوظ ہو...... ابھی تو میرے پاس کوئی بھی جگہ نہیں...... اگر ست بدھائی لے جاؤں اور اکبر خان کے قتل سے لاعلمی ظاہر کروں...... مگر نہیں...... راجا کو معلوم ہو جائے گا...... ایک دن بعد سہی...... اس کے بعد طوفان اٹھ کھڑا ہوگا۔

صبح آٹھ بجے تک میں کمرے میں ہی تھا...... لیلیٰ بھابی نے دروازے پر دستک دی اور کافی کا مگ لیے اندر آ گئیں...... ''مجھے پتا تھا تم جاگ رہے ہو گے۔''

میں نے پہلا جھوٹ بولا۔ ''ابھی آنکھ کھلی......''

وہ میرے پاس بیٹھ گئیں...... ''آج واپس جانا ہے نا؟''

میں نے کہا۔ ''ان شاء اللہ...... ابھی تھوڑی دیر کے لیے میں جاؤں گا کسی سے ملنے۔''

بھابی نے کہا۔ ''صبح میں نے استخارہ کیا...... نماز کے بعد۔''

میں نے کہا۔ ''اچھا کیا...... اس سے صحیح فیصلے میں مدد ملتی ہے۔''

''استخارہ میرے حق میں رہا...... میں اب فاروقی کے ساتھ نہیں رہوں گی...... جانتے بوجھتے آگ میں کودنا کوئی عقلمندی نہیں۔''

میں نے گھڑی کی طرف دیکھا۔ ''بھابی...... مجھے جانا ہے۔''

''ناشتا تو کر لو......'' بھابی نے کہا۔

میں نے دوسرا جھوٹ بولا۔ ''آ کے کروں گا...... تھوڑی دیر کے لیے جانا ہے میں تیار ہو جاؤں۔''

وہ کھڑی ہو گئیں...... ''میں غنی سے کہہ دوں۔''

میں نے تیسرا جھوٹ بولا۔ ''اس کی ضرورت نہیں...... میں پیدل ہی جاؤں گا۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس وقت میرا دماغ ایک ہی ٹریک پر سوچ رہا تھا...... میرے دماغ نے وہ دروازہ بند کر دیا تھا جو مخالف دلائل کی طرف کھلتا تھا۔ میں نے بڑی عجلت میں لباس بدلا اور نکل گیا...... غنی نے بڑی تشویش کے ساتھ اپنی خدمات پیش کیں۔ ''قریب ہے تو کیا سر...... میں لے چلتا ہوں۔''

میں نے اسے سختی سے ڈانٹ دیا۔ ''تم کیا مجھے بالکل ہی مفلوج بنا دینا چاہتے ہو...... مجھے کچھ تو استعمال کرنے دو اپنی ٹانگوں کا۔''

ساڑھے آٹھ بج رہے تھے جب میں نے ایک ٹیکسی کو روک لیا...... پنڈی میں ٹیکسی ہر وقت ہر جگہ دستیاب رہتی ہے میں نے اسے شکر پڑیاں چلنے کو کہا...... وہ ایسی جگہ ہے جہاں لوگ عموماً صبح نہیں جاتے...... اس جگہ سے گزرنے والی سڑک دن میں بھی غیر آباد رہتی ہے اور وہاں ٹریفک بھی کم ہوتا ہے...... یہ راستہ ایک طرف اسلام آباد ہائی وے سے ملتا ہے تو دوسری طرف روز اینڈ جاسمین گارڈن کی طرف سے آب پارہ مارکیٹ کی طرف نکل جاتا ہے۔

میرے اندازے کے مطابق وہ جگہ چھ سات کلومیٹر دور تھی جہاں میں نے نورجہاں کو بلایا تھا لیکن صبح کے اوقات میں ٹریفک کا رش تھا...... قدم قدم پر سگنل تھے...... گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ ساتھ میری بے قراری بڑھ رہی تھی۔

ابھی پانچ منٹ باقی تھے کہ ٹیکسی والے نے گاڑی کو دائیں جانب موڑنے کا اشارہ دیا۔ میں نے اسے کہا کہ گاڑی یہیں روک لے...... وہ کچھ حیران ہوا مگر بولا نہیں...... اوپر شکر پڑیاں ہل کی طرف جانے والی سڑک مجھ سے پچاس قدم کے فاصلے پر تھی......

میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا...... ''تم یہاں انتظار کرو...... مجھے واپس بھی جانا ہے......'' اس نے سر ہلا دیا اور گاڑی بند کر کے آرام سے بیٹھ گیا۔ میں دائیں بائیں سے آنے والی کاروں کو دیکھتا رہا جو بڑی تیز رفتاری سے گزر رہی تھیں...... میں تھوڑا سا اندر کی طرف اور گھنے درختوں کی اوٹ میں تھا......

اچانک ایک بالکل نئی ہنڈا سوک میرے قریب آ کے رک گئی...... میرا دل تیزی سے دھڑکا میری نظر نے کار میں نورجہاں کا چہرہ دیکھا...... اس پر مردنی چھائی ہوئی تھی...... پھر میری نظر کار کے ڈرائیور پر گئی جو مسکراتا ہوا اترا تھا اور اب میری طرف بڑھ رہا تھا۔

''نواب صاحب! آپ نے ہم کو پہچانا نہیں۔'' فیضان ڈرائیور نے میرے قریب آ کے خوشدلی سے کہا۔ اس کی گرم جوشی سے تو ایسا لگتا تھا کہ وہ مجھ سے بغلگیر ہونے کے موڈ میں ہے۔

میں محتاط ہو کے ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ''تم وہی ہو، جو مجھے یہاں لائے تھے۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''جی ...... وہ آپ کا ملک ہے۔ کیا نام ہے اس کا ...... سات بڑھئی ......''

میں نے اس کی تصحیح ضروری نہیں سمجھی ...... اور نہ یہ وضاحت مانگی کہ وہ آج اپنے ساتھ نور جہاں کو کیسے لے آیا۔ دوسری طرف کچھ فاصلے پر وہ ٹیکسی ڈرائیور شش و پنج میں مبتلا تھا کہ جدید ترین ماڈل کی ریڈیو ٹیکسی آ جانے کے بعد اس کی ضرورت ہو گی یا نہیں۔ میں نے اسے منہ مانگے کرائے سے پچاس روپے زائد دے کر رخصت کیا اور پھر پٹھان سے کہا کہ وہ کچھ دیر انتظار کرے۔ وہ سمجھ تو گیا ہو گا کہ ٹیکسی میں آنے والی خاتون سے نواب صاحب کو اس ویران مقام پر کوئی خاص اور پرائیویٹ بات کرنی ہو گی لیکن اس کی پروا کرنے کی کیا ضرورت تھی کہ وہ کیا سوچتا ہے۔

نئی کرولا کی پیچھے والی سیٹ پر نور جہاں کے ساتھ بیٹھ کے میں نے کہا۔ ''نور جہاں ...... یہ کیا حال بنا لیا ہے تم نے اپنا۔''

میرا سوال پورا ہونے سے پہلے ہی اس نے میرے کندھے پر سر رکھا اور پھر مجھ پر گر گئی۔ ''میں نے؟'' اس نے بڑی مشکل سے کہا اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ''یہ تم مجھ سے پوچھ رہے ہو؟''

''نور جہاں ...... خدا کے لیے سنبھالو خود کو......'' میں نے گھبرا کے اسے اٹھایا اور سیدھا بٹھانے کی کوشش کی۔ ''دیکھو، سڑک پر گاڑیاں گزر رہی ہیں۔ لوگ دیکھ رہے ہیں ...... ڈرائیور دیکھ رہا ہے۔''

وہ ہچکیاں لے کر روتی رہی۔ ''دیکھنے دو ...... کسی کی پروا نہیں مجھے ...... اور تمہیں پروا ہے سب کی ...... تو جاؤ ...... تم بھی چھوڑ دو مجھے ...... جاؤ......'' وہ مجھے دونوں ہاتھوں سے دھکیلنے لگی اور چلانے لگی۔

گاڑی کے شیشے بند تھے کیونکہ اے سی چل رہا تھا اس لیے۔ نور جہاں کی آواز باہر نہیں جا رہی تھی۔ وہ شدید ہسٹریا میں مبتلا تھی۔ میں نے ڈرائیور کو اشارے سے بلایا۔ وہ خاصا پریشان نظر آ رہا تھا۔

''خیر تو ہے نواب صاحب ......''

میں نے کہا۔ ''دیکھو، بیگم صاحب کی طبیعت بگڑ گئی ہے۔ تم گاڑی آگے بڑھاؤ۔ بیگم صاحب کو میں سنبھال لوں گا۔''

وہ بڑی ہمدردی سے نور جہاں کو دیکھ رہا تھا اور غالباً اپنی عقل و فہم کے مطابق یہ سمجھنے پر مجبور تھا کہ بیگم صاحبہ پر پاگل پن کے دورے پڑتے ہیں یا شاید جن آتا ہے۔ اس کی اتفاقیہ شناسائی میرے کام آئی۔ اس نے مجھے ایک معزز اور شریف آدمی سمجھتے ہوئے میری بھرپور مدد کی۔

نور جہاں پر وحشت سوار تھی ...... وہ چیخ رہی تھی۔ ''مرنے دو مجھے۔ کیا ہو گا میرے مرنے سے۔ میرے ناپاک وجود کا بوجھ کم ہو جائے گا۔''

مجھے اور کوئی صورت نظر نہ آئی کیونکہ وہ اپنے حواسوں میں نہ تھی اور میری سن ہی نہیں رہی تھی۔ میں نے اپنے ہاتھ کا بھرپور طمانچہ اس کے رخسار پر مارا۔ وہ جھٹکے سے پیچھے گئی اور پھر سیٹ پر میری گود میں گر گئی۔

پٹھان ڈرائیور نے پلٹ کے کہا۔ ''نواب صاحب، یہ مارنے سے ٹھیک نہیں ہو گا۔ ہم اس پر دم کرے گا۔''

اجازت ملنے سے پہلے ہی اس نے گاڑی روکی اور کچھ پڑھ کے اس نے نور جہاں پر تین بار پھونکا۔ اس کی نیک نیتی اور جو کچھ اس نے پڑھا اس کی تاثیر سے مجھے انکار نہیں۔ نور جہاں کی وحشت پہلے ہی کم ہو گئی تھی۔ اب وہ میری گود میں منہ چھپائے رو رہی تھی۔

میں نے ڈرائیور کا شکریہ ادا کیا۔ ''پانی ہے تمہارے پاس......'' اس نے اپنی سیٹ کے نیچے سے ایک بوتل نکال کے مجھے تھمائی۔ ''اللہ خیر کرے گا۔ اپنا فضل کرے گا۔ ابھی کدھر جائے گا سر؟''

میں نے سوچ کے کہا۔ ''ابھی تم چلو ...... ہوٹل ...... یہاں کوئی اسپتال ہے قریب میں۔ جہاں ڈاکٹر انہیں دیکھ لے۔''

''مجھے نہیں جانا کسی اسپتال ......'' نور جہاں مچلی۔

میں نے اسے زبردستی پانی پلایا۔ ''چپ ...... بالکل چپ۔ میں جو کر رہا ہوں کرنے دو۔ جسٹ شٹ اپ۔ میں سب ٹھیک کر لوں گا۔'' اس نے پھر کچھ بولنے کی کوشش کی تو میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

وہ تھوڑا سا بے چین ہوئی پھر ایک گہری سانس لے کر اس نے خود کو میرے سپرد کر دیا اور میری گود میں سر رکھ کے لیٹ گئی۔ اس کی رنگت جو پہلے ہی ہلدی کی طرح ہو رہی تھی اب لاش کی طرح سفید پڑ گئی تھی اور کانپ رہی تھی۔ بار بار اسے جھٹکے سے آتے تھے۔ میں نے آہستہ آہستہ سے اسے تھپکا۔ ''ایزی ...... ایزی ...... فکر کی اب کوئی بات نہیں ...... یو آر سیف۔''

گاڑی ایک اسپتال کے سامنے رک گئی۔ ''یہ رہا اسپتال سر۔''

میں نے اسپتال کی جدید وضع کی عمارت کو دیکھا اور نیچے اتر گیا۔ ''تم ذرا بیگم صاحب کا خیال رکھنا۔ میں آتا ہوں ڈاکٹر سے بات کر کے۔''

وہ اسپتال بھی انہی خالص کاروباری اصولوں پر صرف منافع کے لیے چلائے جانے والے اسپتالوں میں سے ایک تھا جہاں دولت مند اپنے مخصوص لائف اسٹائل کے امراض لے کر آتے تھے۔ بعض اوقات ان کا عارضہ ایک وہم سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا تھا ...... وہ ایگزیکیٹو کلینک میں اپنا مکمل چیک اپ کرانے کے لیے یا محض آرام کرنے کے لیے بھی داخل ہوتے تھے۔

ایسی جگہ صرف آدمی کی حیثیت یعنی دولت مندی کے سوا کچھ بھی نہیں دیکھا جاتا۔ یہ افسروں اور کلرکوں کا شہر تھا، جیسے فیصل آباد صنعتکاروں اور مزدوروں کا شہر ہے۔ اتفاق سے میں دیکھنے میں افسر ہی دکھائی دیتا تھا۔ صورت اور حلیہ کے بعد اسپتال والے میرے رویے سے مرعوب ہو گئے۔

میں نے کہا۔ ''میں ڈائریکٹر جنرل بی آر ایس ہوں۔ میری وائف شدید ڈیپریشن میں ہے، ان اے ویری بیڈ شیپ ......''

کاؤنٹر پر موجود لڑکی نے فوراً فارم بھرنا شروع کر دیا۔ ''یس سر ......''

میں نے کہا۔ ''اسے فوراً وی آئی پی روم میں شفٹ کرو۔ اس کے فوری چیک اپ کے لیے کسی نیورولوجسٹ کو بلاؤ یا سائیکاٹرسٹ کو۔ اسے کچھ دن یہاں رہنا ہو شاید ......''

''یس سر ...... آپ کا نام ......'' لڑکی نے مجھ سے کہا

میں نے فارم اپنی طرف کھینچ لیا۔ ''آر اے شیرازی لکھ دیا۔ اور ایڈریس یہاں کا لکھوں یا لندن کا ...... یہ وہیں رہتی ہیں۔''

میں نے لندن والا پرانا پتا لکھ کے فارم واپس کیا...... ''کتنا ایڈوانس ......''

''ففٹی تھاؤزنڈ سر ......''

میں نے اپنا ماسٹر کارڈ آگے بڑھا دیا۔ بے منٹ ہوتے ہی ساری کارروائی مکمل ہو گئی۔ میں نے نور جہاں کو سمجھا دیا کہ وہ خاموش رہے۔ اسپتال کے عملے نے اسے وی آئی پی روم میں شفٹ کر دیا۔

''یہاں کیوں لے آئے ہو مجھے۔'' نور جہاں نے عملے کے جاتے ہی کہا۔

میں نے کہا۔ ''آرام سے بیٹھی رہو۔ ایک تو تمہاری حالت ایسی ہو رہی ہے کہ تمہیں ضرورت ہے علاج اور دیکھ بھال کے علاوہ آرام کی ......''

''لیکن میں یہاں کب تک رہ سکتی ہوں ......''

میں نے کہا۔ ''اس کی فکر مجھ پر چھوڑ دو۔ یہ محفوظ ترین جگہ ہے تمہارے لیے۔''

اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''تم نے ابھی تک مجھ سے پوچھا ہی نہیں۔''

میں نے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی۔ ''ابھی مجھے کچھ نہیں پوچھنا اور تمہیں بھی کوئی جلدی نہیں ہونی چاہیے بتانے کی۔ سب سے پہلے اور سب سے اہم ہے تمہاری صحت ......''

وہ پھر لیٹ گئی لیکن اس کے اوپر وہی ایک اضطراب کا سمندر موجزن تھا جس کی طوفانی لہروں میں وہ ایک تنکے کی طرح اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ ''رفیق ...... میں سوچتی ہوں مجھے مر ہی جانا چاہیے ......''

''شٹ اپ ...... تمہاری یہی سوچ تمہیں مریض ثابت کرتی ہے۔ جسمانی حالت سے زیادہ تمہاری ذہنی کیفیت میرے لیے پریشانی کا باعث ہے ......''

وہ پھر اٹھ بیٹھی ...... ''تم پریشان ہو میرے لیے؟ ...... میری پروا ہے تمہیں؟''

میں نے کہا۔ ''اف ...... یہ کیا پاگل پن ہے ...... آرام سے خاموش نہیں لیٹا جاتا ......''

وہ عجیب طرح سے ہنسی ...... ''جیسے مردہ قبر میں پڑا رہتا ہے ...... رفیق، سچ سچ تم پریشان ہو میرے لیے۔ بتاؤ نا ......''

میں نے تیزی سے اس کا ہاتھ تھام لیا ...... ''پریشان نہ ہوتا تو تمہیں یہاں لاتا ...... مجھے تو تمہیں دیکھ کر اتنا شاک لگا تھا کہ کیا حال کر دیا ہے غموں نے تمہارا لیکن سچ پوچھو تو اس خوشی کا میں بتا نہیں سکتا جو مجھے تمہاری آواز سن کے ہوئی تھی۔ میں تمہاری طرف سے بالکل مایوس ہو چکا تھا اور اتنا دکھی تھا کہ تمہیں کیا بتاؤں ......''

وہ بڑے اشتیاق و انہماک سے میری بات سن رہی تھی اور اس کے چہرے کی زردی میں ہلکی سی سرخی کی رمق شامل ہو گئی تھی ...... اس کی آنکھیں مسکرانے لگی تھیں، وہ پھر سے ایسی

ہی باتیں سننا چاہتی تھی۔ شاید اس سے بھی زیادہ اظہارِ محبت کی آرزو مند تھی۔ ایک زمانے کی سفاک ہوس کے ہاتھوں لٹی ہوئی جسم سے لپٹ جانے والے ناگ جیسے خریداروں کی ڈسی ہوئی...... محبت سے ترسی ہوئی زخمی روح والی وہ عورت جو زندگی میں حسن کی علامت تھی لیکن موت کے بدصورت دوزخ میں جل رہی تھی...... یقیناً ہمدردی، پیار اور توجہ کے تسکین دینے والے جذبوں اور مہربان الفاظ کی مستحق تھی۔

دروازے پر دستک ہوئی اور ایک سینئر ڈاکٹر اپنے ماتحت جونیئر ڈاکٹر اور دو نرسوں کے ساتھ اندر آ گیا...... اس نے اندر آ کے مجھ سے ہاتھ ملایا اور اپنا تعارف کرایا' وہ ایک نیورو سائیکاٹرسٹ تھا...... اس نے پہلے نور جہاں کا جسمانی معائنہ کیا اور اپنی صورت سے خاصی تشویش ظاہر کرتا رہا...... دونوں نرسوں نے بلڈ پریشر، نبض کی رفتار...... دل کی دھڑکن اور درجہ حرارت کا مسلسل پتا دینے والے الیکٹرانک مانیٹرز نور جہاں کے جسم سے منسلک کر دیے...... بڑے ڈاکٹر نے چھوٹے ڈاکٹر کو درجن بھر ٹیسٹ لکھوائے...... مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں تھا کہ کیا ضروری تھا اور کیا غیر ضروری...... میں بس اس کا مکمل چیک اپ اور علاج چاہتا تھا۔

اس نے بڑی خوش طبعی کے ساتھ نور جہاں سے باتیں بھی جاری رکھیں...... ''کتنا عرصہ ہوا ہے شادی کو؟''

نور جہاں نے میری طرف دیکھا اور بولی...... ''ایک سال......''

''یعنی ہنی مون چل رہا ہے ابھی...... اچھا ہے آپ نے بچوں کے معاملے میں جلدی نہیں کی...... وہ تو ہو ہی جاتے ہیں خود بخود...... مجھے یقین ہے کہ یہ لو میرج ہو گی...... اب پوچھو مجھے کیسے الہام ہوا...... تو جواب سب کے سامنے ہے...... تمہاری بیوی اور تمہارے میاں کی حالت غیر...... لگتا ہے ابھی میرے پیر پکڑ کے دلیپ کمار کی طرح بولنا شروع کر دیں گے...... ڈاکٹر...... میری بیوی کو بچا لو...... حالانکہ تم ٹھیک ٹھاک ہو...... زیادہ بیمار تمہارے میاں نظر آ رہے ہیں...... کیا خیال ہے ساتھ ہی ان کا بھی علاج شروع کر دیں......''

وہ اپنی باتوں سے آدھا مرض دور کرنے پر قادر تھا...... وہ نرمی سے اور شفقت سے مسکراتے ہوئے بات کرتا تھا۔ اس کے ماتحت جونیئر ڈاکٹر کو شاید یہ انداز مسیحائی پسند نہیں تھا...... وہ ان نرسوں سے بھی خفا لگتا تھا جو اس کی باتوں پر مسکرا رہی تھیں...... خود نور جہاں پر اسپتال کے ماحول' جسم سے منسلک نیلے پیلے لال تاروں اور سرہانے روشن حروف اور لکیروں سے اندر کا احوال ظاہر کرتے مانیٹرز کی دہشت کا بہت کم اثر رہ گیا تھا...... وہ مسکرانے لگی تھی۔

''تم کچھ کھاتی پیتی نہیں ہو لڑکی......'' ڈاکٹر نے اپنا معائنہ جاری رکھا...... ''کیا تمہاری صحت شادی سے پہلے بھی اتنی ہی خراب تھی...... یا یہ حال کیا ہے شوہر کی محبت نے؟...... دراصل پہلے سال میں تم جیسے جوڑے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ بس عشق کافی ہے...... مگر لڑکی' جسم کا گزارا تو اچھی خوراک کے بغیر نہیں ہوتا......''

میں نے کہا...... ''ڈاکٹر صاحب...... یہ ٹھیک تو ہو جائے گی نا......''

وہ میری طرف پلٹ کے سنجیدگی سے بولا...... ''یہ تمہیں بہت اچھی لگتی ہے''

میں نے کہا...... ''ظاہر ہے۔''

''تو پھر اس جیسی دوسری تلاش کر لو...... اسٹینڈ بائی...... مجھے تو اپنی بیوی جیسی ملی نہیں یہ بات میں اسے کہتا رہتا ہوں...... ورنہ میں کب کی دوسری کر چکا ہوتا...... زبان نکالو...... ہاں بس...... میری بیوی کو اور غالباً دنیا کی ہر بیوی کو کچھ عرصے بعد شکایت ہو جاتی ہے کہ آپ اب پہلے جیسی محبت نہیں کرتے مجھ سے...... ایک بار ہم کہیں جا رہے تھے...... راستے میں ایک سارس اور اس کی زوجہ آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دنیا و مافیہا سے بے خبر کھڑے تھے...... میری بیوی نے کہا کہ دیکھو کتنی محبت ہے ان میں...... سال بھر بعد ہم نے پھر یہی سین دیکھا...... میری بیوی نے مجھے شرم دلانے کے لیے کہا کہ دیکھو سارس کو یہ آج بھی اپنی مادہ کو کتنی محبت سے دیکھ رہا ہے جیسے اس کی پوجا کر رہا ہو...... میں نے کہا کہ بیوی...... غور سے دیکھو چشمہ لگا کے...... مادہ دوسری ہے...... او کے...... اب تم آرام کرو...... رپورٹس آنے کے بعد تمہارا علاج ہو گا......'' پھر وہ میری طرف پلٹا...... ''یو کم ودی......''

مجھے اچھی طرح اندازہ تھا کہ ڈاکٹر یہ بات ضرور کرے گا...... مجھ سے ضرور پوچھے گا کہ شادی کے سال بھر بعد بیوی کی یہ حالت کیسے ہو گئی کیا مسئلہ ہے...... بیماری کوئی نظر نہیں آتی لیکن اتنی خراب صحت اور اس کے ساتھ یہ نروس بریک ڈاؤن...... تم اس پر ذہنی اور جسمانی تشدد کرتے ہو؟ اسے کھانے کو نہیں دیتے...... یا ساس بہو اور نند بھاوج کی جنگ عظیم جاری ہے گھر میں۔ وہ اتنی نروس، اپ سیٹ اور ڈری ہوئی کیوں ہے؟

میں نے اس کی تسلی کے لیے ایک کہانی بنالی تھی...... اس کے کمرے میں جا کے میں نے یہ کہانی سنا دی...... جب

شادی ہوئی تو اس کی ماں بیمار تھی...... اسے کینسر ہو گیا تھا...... اس نے کہا کہ میں بیٹی کو رخصت کر کے جانا چاہتی ہوں...... شادی کے دو ماہ بعد وہ مر گئی گھر میں ایک باپ تھا اور ایک بیٹا۔ گھر میں ڈاکو آ گئے...... بیٹا جوان خون تھا...... ان سے بھڑ گیا اور مارا گیا...... بہو نے عدت کا زمانہ بھی پورا نہیں کیا...... میکے چلی گئی...... اس کا بوڑھا باپ اکیلا رہ گیا...... ہم نے بہت بلایا مگر وہ پرانے وقتوں کا آدمی...... بیٹی کے گھر کا پانی نہ پینے والا...... گھر میں میری اپنی ماں مفلوج ہے...... وہیل چیئر پر رہتی ہے...... میری بیوی ہی سب کچھ کرتی ہے...... مزید یہ کہ وہ امید سے ہوئی اور تین ماہ بعد یہ امید ختم ہو گئی...... کیا اتنے گہرے غم اور مصائب و آلام کم ہیں؟ پھر میں اسے بہت کم وقت دے پاتا ہوں...... میری ذمے داریوں کی نوعیت ایسی ہے کہ دن رات کا فرق نہیں......''

وہ سب سنتا رہا اور سمجھنے کے انداز میں سر ہلاتا رہا......

''پھر آپ کیا کریں گے!...... میرا مطلب ہے حالات کو بدلنا ضروری ہو گا...... ورنہ دوا کیا خاک اثر کرے گی......''

میں نے کہا...... ''میں چاہتا ہوں کہ وہ کچھ عرصہ یہاں رہے...... تمام مسائل سے دور......''

''یہ اسپتال کے لیے تو بہت فائدہ مند ہو گا...... پانچ ہزار روز کا کمرا آپ کی مسز کے نام بک کر دیا جائے...... دیکھ بھال اور علاج مشورہ چلتا رہے...... منی از نو پرابلم فار یو...... لیکن سوال پھر وہی ہے کہ کتنے دن؟...... دس دن...... پندرہ دن...... ایک مہینے...... کیا اتنا عرصہ وہ رہ سکے گی یہاں؟...... آپ کسی اسپتال کو ہوٹل کب تک بنا سکتے ہیں؟''

میں نے کہا...... ''آپ نے بالکل ٹھیک کہا...... لیکن ہوٹل میں یہ علاج اور دیکھ بھال نہیں ہوتی جو یہاں ہو گی...... آپ اس کی مکمل صحت یابی تک اسے یہاں رکھیں...... اس کے بعد میں کچھ کرتا ہوں...... میری قسمت اچھی تھی کہ اسے یہاں لے آیا...... آپ نے واقعی اس کا آدھا مرض اپنی دلچسپ باتوں سے دور کر دیا......''

''لیکن اسے صحت مند رکھنے کی اصل ذمے داری آپ کی ہے۔''

میں نے کہا...... ''میں تسلیم کرتا ہوں کہ کچھ میری کوتاہی ضرور تھی...... اب میری ایک درخواست ہے...... ایک تو یہ کہ گھر کے حالات پر اس سے کوئی بات نہ کی جائے...... اسے سخت ذہنی اذیت ہوتی ہے......''

''آج تو وہ سوتی رہے گی......''

میں نے کہا...... ''یہ بہت اچھا ہے...... میں ابھی دو

بجے کی فلائٹ سے کراچی جاؤں گا...... وہاں ایک انٹرنیشنل سیمینار میں مجھے اپنے ملک کی نمائندگی کرنی ہے...... رات تک میں واپس آجاؤں گا...... یہ میرا وعدہ ہے...... اور اس کے بعد کہیں نہیں جاؤں گا...... آفس سے بھی چھٹی لے لوں گا...... آئی ایم شیور کہ ایک دن کے لیے میرے جانے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا...... شی ول بی سیف......"

"سیف......؟ آف کورس...... وہ ہماری ذمّے داری ہے...... اچھا اسے معلوم ہے کہ تمہیں کراچی جانا تھا......"

"نہیں...... وہ ایک دم ٹینشن میں مبتلا ہوجاتی ہے...... رات کو میں اس کے ساتھ رہوں گا...... اسے میرے آنے جانے کا پتا بھی نہیں چلے گا۔"

اس نے سر ہلایا......"کل تک رپورٹس بھی مل جائیں گی...... پھر آپ سے مزید بات ہوگی......"

میں نے اطمینان کا سانس لیا...... میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس ماہر نفسیات کو میں اپنی کہانی سے کس حد تک قائل کرنے میں کامیاب ہوا مگر یہ عام زندگی کی اور گھر گھر کی کہانی تھی...... عام طور پر ایسے معالج صرف شوہر یا صرف بیوی کی بات سن کے مطمئن نہیں ہوتے...... وہ سمجھتے ہیں کہ یہ یک طرفہ تصویر ہے...... دوسرے فریق کے نقطۂ نظر سے آگاہی کے لیے وہ اس سے علیحدگی میں بات کرتے ہیں...... یہ رسک میں نہیں لینا چاہتا تھا...... ابھی تو نور جہاں کو بھی معلوم نہیں تھا کہ میں نے ڈاکٹر کو کیا کہانی سنائی ہے...... اور میں اسے بریف کر ہی دوں کہ اسے کیا کہنا ہے تب بھی کچھ پتا نہیں یہ ذہین اور تجربہ کار ڈاکٹر اس سے باتوں باتوں میں کیا اگلوا لے۔

فی الحال میں بہت آگے کی نہیں سوچ رہا تھا کہ نور جہاں کا مستقبل کیا ہوگا...... میں یہ محسوس کرتا تھا کہ میں اس کا قرض دار ہوں...... اپنی زندگی کے لیے اس کے احسان کو تسلیم نہ کرنا ماضی کے حقائق کے پیشِ نظر ممکن ہی نہیں تھا اور آج جب اس کی زندگی بچانے کا سوال میرے سامنے آیا تھا تو اپنا دامن بچانے کی کوشش خود غرضی، احسان فراموشی اور کمینگی ہوتی۔

مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ میری اس کوشش کو جو میں نور جہاں کی زندگی بچانے کے لیے کر رہا ہوں مختلف لوگ کس نظر سے دیکھیں گے اور کیا معانی پہنائیں گے...... ہر ایک کا ردِ عمل ناپسندیدگی کا ہوگا...... کسی کا کم کسی کا زیادہ...... سب سے شدید فریال کا ہوگا تو سب سے خفیف راجا کا...... فریال کچھ سمجھنے کی ضرورت سے ہی انکار کر دے گی...... کچھ سننے کو بھی تیار نہیں ہوگی...... جب بھی وہ ملی یا جب بھی اسے معلوم ہوا...... راجا کا رویّہ ہمدردی کا ہوگا اور وہ میری مجبوری کو سمجھے گا...... درمیان میں دوسرے بہت سے لوگ ہیں جن کا مخالفانہ رویّہ اتنی اہمیت نہیں رکھتا...... لیلیٰ بھابی...... رابعہ...... شہناز ریشم اور میرے اپنے والدین......

آخر میں وہ لوگ ہوں گے جو میری نیکی کے جذبے میں غرض مندی اور دشمنی کے نئے اسباب تلاش کریں گے مجھے سب سے نمٹنا پڑے گا لیکن بعد میں...... ابھی کی صورتِ حال فوری توجہ مانگتی تھی چنانچہ میں نور جہاں کے ساتھ روپوش ہوگیا تھا...... جھوٹ میری ضرورت اور میرا دفاع تھا اور میری واحد پناہ گاہ بھی...... مجھے یقین تھا کہ اس اسپتال کے وی آئی پی روم میں نور جہاں محفوظ ہے۔

میں چاہتا تھا کہ نور جہاں کو بھی جھوٹ کی وہی ڈھال فراہم کردوں جو میں نے ایجاد کی تھی اور کامیابی سے استعمال کر رہا تھا...... جھوٹ کی ابتدا خود نور جہاں نے کی تھی جب ڈاکٹر کے سوال پر اس نے بڑی پُراعتماد روانی سے تسلیم کیا تھا اور ہماری شادی کو ایک سال ہوا ہے مگر مجھے یقین ہے...... وہ بھی سمجھتی تھی کہ اس کے ساتھ میں کس قسم کے خطرات میں گھرا ہوا ہوں اور اس نے خود کو میری سپردگی میں دے دیا تھا...... اب میں اسے بریف کرنا چاہتا تھا کہ وہ کیا کہے گی اور کیا نہیں کہے گی...... اس کے بیان کو میرے مؤقف کی تائید میں ہونا چاہیے...... ہم دونوں اتفاقِ رائے اور اشتراکِ عمل سے جھوٹ بول کے ہی محفوظ رہ سکتے تھے۔

میں اوپر اس کے کمرے میں گیا تو مجھے مایوسی ہوئی وہ سکون سے آنکھیں بند کیے گہری نیند میں تھی...... ضرور ڈاکٹر نے سکون آور انجیکشن دیا ہوگا۔

میں باہر نکل آیا...... اسپتال کا ایک ایڈمنسٹریٹر ٹائپ شخص بڑے کروفر کے ساتھ ماتحت عملے کو ڈانٹ رہا تھا...... زیادہ تر ہدایات کا تعلق معائنے میں نظر آنے والی صفائی کی خامیوں سے تھا...... میں نے اسے براہِ راست مخاطب کیا......"میں شیرازی ہوں...... ڈائریکٹر جنرل بی ایس آر......"

اس نے مہذب انداز میں مصافحہ کیا......"ڈاکٹر کرنل جمشید...... یہ بی ایس آر سے کیا بنتا ہے؟"

میں نے کہا......"بیورو آف سوشل ریفارمز...... یہ براہِ راست پرائم منسٹر کو جواب دہ ہے، یو ریٹائرڈ ناؤ......؟"

"او یس......" وہ بولا......"بتائیے میں آپ کے لیے کیا کرسکتا ہوں۔"

"میں نے کہا......"میری وائف یہاں وی آئی پی روم ون میں ہے...... اسے مکمل سکون اور تنہائی چاہیے یہ اس کے معالج ڈاکٹر عزیز چیمہ نے کہا ہے...... میرے سوا کسی ملاقاتی کو اس سے ملنے کی اجازت نہیں...... فی الحال......"

"آپ مطمئن رہیں...... انہیں کوئی ڈسٹرب نہیں کرے گا......"

"دراصل میرا بھی پورا خاندان ہے...... اور غیر متعلقہ لوگ جو زبردستی خود کو میرا دوست یا مہربان ثابت کرنا چاہتے ہیں وہ ایسے موقعے سے فائدہ اٹھائیں گے...... میں چاہتا ہوں کہ کسی کو بھی اس کے بارے میں انفارمیشن نہ دی جائے خواہ میرے اور اس کے والدین...... بھائی بہن...... وہ سب محبت کی جہالت میں یلغار کردیں گے......"

وہ مسکرایا......"آپ ہیں نا یہاں انہیں بچانے کے لیے......"

میں نے کہا......"یہی تو پرابلم ہے...... میں نے ڈاکٹر چیمہ سے بھی کہا ہے...... آج دو بجے میری فلائٹ ہے کراچی کے لیے...... اور آج ہی رات تک میں لوٹ آؤں گا...... اس کے بعد سب میری ذمّے داری......"

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا......"اطمینان سے جائیں سر...... آپ کی امانت محفوظ ہاتھوں میں ہے......"

پارکنگ ایریا میں ڈرائیور اور اسپتال کا چوکیدار کسی سیاسی مسئلے پر پشتو میں بحث کر رہے تھے ان کے لہجے اور تیور دیکھ کے لگتا تھا وہ کسی بھی وقت اسلحہ نکال کے ایک دوسرے کو شوٹ کردیں گے۔

مجھے دیکھتے ہی وہ ہاتھ ہلا کے اور "پا مخا دے خا......" کہتا ہوا میری طرف لپکا......"نواب صاب...... ابھی کیسا حال ہے میم صاب کا......"

میں نے کہا......"انہیں میں نے داخل کرا دیا ہے...... اب تم مجھے وہیں لے چلو جہاں تین دن پہلے لائے تھے...... یاد ہے وہ جگہ...... سٹلائٹ ٹاؤن"۔

"بالکل یاد ہے سر...... آپ بیٹھو......" اس نے بڑی مستعدی سے کہا۔

گاڑی اسپتال کی حدود سے نکلی تو میں نے کہا "نام کیا ہے تمہارا......"

"شیر دل خان......" وہ بولا

میں نے کہا......"یہ ٹیکسی ریڈیو کیب کمپنی کی ہے؟"

"گاڑی تو امارا ہے سر...... ادھر کمپنی کا پاس رجسٹر کرا دیا ہے...... پچیس فیصد کمپنی لیتا ہے......"

میں نے کہا......"شیر دل خان...... اب تم ہی واپس لے کر جاؤ گے...... وہ سات بڑھئی نہیں...... ست بدھائی ہے۔"

"سات بادائی؟...... اس کا کیا مطلب ہوا سر......"

میں نے کہا......"سات بار مبارکباد...... ابھی میری بات سنو...... پٹھان قابلِ بھروسا اور وعدہ نبھانے والے ہوتے ہیں......"

"وہ مرد ہی نہیں جو قول پر جان نہ دے......" وہ بولا

"اچھا تو پھر مجھ سے ایک وعدہ کرو...... آج جو کچھ تم نے دیکھا اس کے بارے میں کسی سے کوئی بات نہیں کرو گے......"

وہ کچھ پریشان ہوا......"ایسا کیا بات ہے سر؟"

میں نے کہا......"حقیقت میں تمہیں پھر بتاؤں گا...... یہ ہوسکتا ہے کہ مجھے آئندہ چند دنوں میں تمہاری مدد کی ضرورت پڑے......"

"ام آپ کا کیا مدد کرسکتا ہے سر...... لیکن آپ بھروسا کرے گا تو شیر دل خان پورا اترے گا......"

"تمہارے پاس اسلحہ ہے......" میں نے کہا۔

"اسلحہ مرد کا زیور ہوتا ہے نواب صاب......"

میں نے کہا......"اوکے...... آج سے تمہاری یہ گاڑی میں کمپنی سے پورے مہینے کے لیے بک کرا لوں گا مجھے جہاں جانا ہوگا تم لے جاؤ گے...... ڈرائیور کے علاوہ تم میرے باڈی گارڈ بھی ہوگے...... اس کی تنخواہ دس ہزار ماہانہ تمہیں الگ ملے گی...... بولو منظور ہے......"

اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی......"منظور ہے سر...... ایک دم منظور ہے......"

میرے غائب ہوجانے سے لیلیٰ بھابی بہت پریشان تھیں اور غنی پر خفا بھی ہو رہی تھیں کہ اس نے مجھے پیدل اور اکیلا کیوں جانے دیا۔

میں نے ان کا غصہ ٹھنڈا کیا......"خود میں نے ہی اسے روک دیا تھا...... یہ تو بضد تھا ساتھ جانے پر......"

"اور تم اتنے لمبے کہاں نکل گئے تھے کہہ کر گئے تھے کہ ابھی آتا ہوں...... قریب ہی جانا ہے مگر اب آئے ہو مشکل میں......"

"ارادہ تو یہی تھا...... یہاں ایک جاننے والے نکل آئے تھے...... سوچا پھر ادھر آنا ہو نہ ہو...... ان سے ہیلو ہائے کرلوں...... باہر یہ ٹیکسی نظر آئی...... نظر کیا آئی اس نے مجھے دیکھا اور پہچان کے گاڑی روک لی...... یہ وہی ہے جو ہمیں

یہاں لایا تھا......"

"چلو یہ اچھا ہوا...... ہمیں واپس بھی تو جانا تھا...... کیا خیال ہے چلیں؟"

میں نے کہا...... "مجھے کون سی تیاری کرنی ہے...... چلو......"

واپسی کے سفر میں لیلیٰ بھابی زیادہ مایوس تھیں کہ تین دن میں اتنا تلاش کرنے کے باوجود فریال نہیں ملی...... وہ کسی جاننے والے کے گھر میں نہ چھپی بیٹھی ہو......"

میں نے کہا...... "بھابی...... اول تو اس کا کوئی ایسا جاننے والا نہیں اور بالفرض محال...... ہے جس کا مجھے پتا نہیں...... تو اس کے چھپ کر بیٹھنے کا مقصد...... وہ تو لندن جانے کے لیے آئی تھی...... اس نے ٹکٹ بھی نہیں منگوایا......"

"مجھے تو لگتا ہے اس نے تمہیں چکما دیا...... اس نے اور لندن والی ڈاکٹر شائستہ نے...... وہ نکل گئی کسی اور ہی راستے جیسے آئی تھی......"

میں نے کہا...... "پھر ہوسکتا ہے...... سنگاپور یا بنکاک جاسکتی ہے...... اور وہاں سے لندن...... ہر ملک کا ویزا آسانی سے اور جلدی نہیں ملتا......"

"میں تو کہتی ہوں...... تم لندن جاؤ......"

میں نے کہا...... "جیسا آپ کا حکم...... ابھی چلا جاؤں؟ جہاز نہ ملے تو بس...... کشتی سائیکل موٹر سائیکل......"

بھابی نے مجھے خفگی سے گھورا...... "فریال کا گلا بالکل جائز تھا...... تم ابھی تک بالکل نان سیریس ہو...... ہم سب کے دباؤ پر اسلام آباد آگئے ورنہ اپنے کاموں سے فرصت نہیں تھی...... وہ ٹھیک کہتی تھی کہ اہمیت اور ترجیح میں اس کا نمبر آخری ہوگیا ہے......"

میں نے ٹھنڈی سانس لی...... "سب اس کے طرف دار ہیں۔ مجھ سے کسی کو ہمدردی نہیں......"

"یہ تمہاری ہمدردی میں نہیں تو پھر کیا ہے......" بھابی اور ناراض ہوگئیں "...... ہم سب لاتعلق اور خاموش تماشائی بنے رہتے تو ٹھیک تھا۔ تم سے کہتے کہ لعنت بھیجو فریال پر...... تمہیں کیا کمی ہے لڑکیوں کی...... فریال جیسی ہزار ملیں گی۔ آخر کس چیز کی کمی ہے تم میں...... جوان...... خوبصورت...... اعلیٰ تعلیم یافتہ...... اکلوتے اور پھر اتنی بڑی جاگیر کے مالک...... لیکن رفیق...... سب جانتے ہیں کہ فریال کے بغیر تمہاری زندگی کیا ہوگی...... میں نہ سہی...... باقی سب تو چھ سات سال سے تمہاری اور اس کی دیوانگی دیکھ رہے ہیں......"

میں نے کہا۔ "پیاری بھابی...... اسی لیے تو سب کی توقعات کے خلاف میں پریشان حال مجنوں کے رول میں روتا پیٹتا...... آہیں بھرتا...... گریباں چاک اور خاک بسر دکھائی نہیں دیتا...... میری نیند بھوک اور دماغی سکون ختم نہیں ہوا...... آخر میری......"

"وہی عدم توجہی اور بے اعتنائی کا انداز...... غرور......"

"ہرگز نہیں...... یہ میرا اعتقاد ہے کہ وہ خفا ہوسکتی ہے...... روٹھ کے جاسکتی ہے لیکن ہمیشہ کے لیے نہیں میں اسے ٹائم دے رہا ہوں...... جب اس کا غصہ تھم جائے گا...... وہ کچھ پُرسکون ہوجائے گی تو جیسے گئی ہے ایسے ہی کسی دن واپس آجائے گی......"

"مطلب یہ کہ تم نہیں جاؤ گے اسے منانے اور لانے...... نواب صاحب ہونا......" بھابی اور خفا ہوئیں......

"وہ تو میں جا رہا ہوں......"

"دیکھو...... روٹھنا عورت کا حق ہے...... منانا مرد کا فرض...... وہ اور تم ہی ایک دوسرے کے لیے ہو...... کہاں جدا رہ سکتے ہو مگر حالات سے مجبور ہو کے جدا ہونا اور بات ہے مجبور ہو کے مل جانے میں محبت کہاں...... صرف مجبوری نظر آتی ہے اور محسوس ہوتی ہے......"

میں نے کہا...... "کیا اسی لیے آپ نے فاروقی کو چھوڑ دیا؟"

بھابی کے چہرے پر دکھ کا سایہ سا آکے گزر گیا......" اس کے سوا مجھے کیا شکایت ہوسکتی تھی...... سب کچھ تو حاصل تھا جس کی خواہش کی تھی میں نے...... بس محبت نہیں رہی تھی...... اب انہیں میری ضرورت ہی نہیں رہی تھی...... میں بغیر لائسنس والے ریوالور جیسی ہوگئی تھی...... جو آدمی ناجائز ذرائع سے حاصل کرتا ہے اور قتل کے بعد دریا میں پھینک دیتا ہے یا دبا دیتا ہے کہیں......"

میں نے ان کا ہاتھ دبا کے انہیں روکا...... "آئی ایم سوری...... میری زبان سے یہ سوال نکلا......"

"میں نے برا نہیں مانا...... آگے نہ جانے مجھے کس کس کو جواب دینا ہوگا...... میں اس کے لیے تیار ہوں......"

ست بدھائی میں ہمارے مشن کی ناکامی کی خبر ہم سے پہلے پہنچ چکی تھی...... افسوس سب کو تھا لیکن آدمی کی فطرت ایسی ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ جذبات سرد پڑتے جاتے ہیں...... انسان زندگی کی مصروفیات میں ان کو بھی بھول جاتا ہے جن کے لیے وہ یقین رکھتا ہے کہ ان سے جدا ہو کے زندہ

رہنا ناممکن ہوگا یہ دنیا ایسے ہی چلتی ہے......

ست بدھائی والے بھی فریال کی عدم موجودگی سے پیدا ہونے والے خلا کو دوسری مصروفیات سے پُر کرنے میں لگ گئے تھے چنانچہ فریال کا غم ہر گزرتے دن کے ساتھ کم اور اپنے مقاصد میں کامیابی کے لیے جوش و جذبہ ہر آنے والے دن کے ساتھ بڑھتا جا رہا تھا۔

جب ہم ست بدھائی پہنچے تو شام ہوگئی تھی...... باغ میں فوارہ چل رہا تھا اور سب لوگ چائے پی رہے تھے کچھ فاصلے پر ایک ہجوم باادب باملاحظہ ہوشیار کھڑا تھا...... یہ سب وہ فنکار تھے جو حویلی میں قائم ہونے والے اسپتال اور اسکول کی پبلسٹی کے لیے گاؤں گاؤں گھوم کے تہلکہ مچا چکے تھے۔

میں بیشتر وقت خاموش رہا۔ لیلیٰ بھابی نے فریال کی تلاش کے ہر لمحے اور مرحلے کی تفصیلی رپورٹ بڑے جذباتی انداز میں پیش کی...... لیکن اس کے کچھ دیر بعد ہی شہناز نے اور اس سے زیادہ جوشیلی ریشم نے اپنی دھواں دھار انگلش میں بتانا شروع کیا کہ تین دن میں وہ مقاصد حاصل ہوگئے جو دس دن کے پلان میں شامل تھے چنانچہ فنکار بھی خوش ہیں کہ جو انعام دس دن بعد ملتا وہ تین دن کی محنت سے مل رہا ہے۔

یہ خالص زنانہ ایشو بنا ہوا تھا۔ شہناز اور ریشم کے لیے وہ اسپتال سب کچھ تھا تو رابعہ اور لیلیٰ بھابی نے خود کو اسکول کے لیے وقف کردینے کی ٹھان لی تھی...... وہ پلان کی تفصیلات ڈسکس کرنے میں مصروف تھیں۔ میں نے راجا کو آنکھ سے اشارا کیا۔ ہم اٹھ کر کھڑے ہوئے دور نکل گئے اور سرسبز گھاس کے قالین پر بیٹھ گئے...... فوارے کی نمی ہوا میں محسوس ہوتی تھی......

"راجا نے پہلا سوال ٹیکسی کے بارے میں کیا۔ "تو ایک گاڑی میں پھرتا رہا......"

میں نے کہا...... "پہلی بار یہ واپسی کے لیے اتفاق سے مل گیا لیکن اب میں نے اسے مستقل رکھ لیا ہے......"

"وہ کیوں؟......"

"اس کی ضرورت تھی...... صرف ایک غنی کب تک سارے معاملات سنبھالے گا...... یہاں کی سیکیورٹی...... سب کو لانے لے جانے کی ذمے داری اور ہر ایک کا کام......"

"یہ پٹھان کیا کرسکتا ہے...... کیا نام ہے اس کا۔"

"شیر دل خان...... یہ بھی وہ سب کرسکتا ہے جو غنی کر رہا ہے...... ایک سے دو بھلے...... اب اسپتال اور اسکول کی ضروریات کے لیے گاڑی بھی چاہیے اور ڈرائیور بھی...... اس کی ٹیکسی ماہانہ بنیاد پر ہائر کرلی ہے......"

"اگر تو مطمئن ہے تو ٹھیک ہے...... یہاں میں نے ایک خبر سنی ہے"

میرا دل دھڑکا...... "کس کے بارے میں......"

"رانا صاحب نے وکیلوں کا ایک پینل بنالیا ہے اور انہوں نے مشورہ دیا ہے کہ جوابی کارروائی سے بچنے کا کوئی راستہ نہیں...... بہتر ہے کہ آپ ضمانت قبل از گرفتاری کی درخواست کے ساتھ عدالت میں پیش ہوجائیں......"

میں نے کہا...... "کون سی عدالت اس کیس میں ضمانت قبل از گرفتاری منظور کرسکتی ہے؟"

"بظاہر تو یہ ناممکن ہے...... مگر فیکے پتر...... پاکستان میں وہ سب ممکن ہے جو دنیا میں کہیں ممکن نہیں......"

"ایسا تو ہم پاکستانی عوام کھلی آنکھوں سے دیکھتے رہتے ہیں۔"

"جج انصاف کرتا ہے لیکن آزاد ہوتا ہے...... اگر وہ کسی بھی وجہ سے ضمانت منظور کرلے ہمارے وکیلوں کی مخالفت کے باوجود وکیل سرکار کے لیے کوئی اعتراض نہیں...... تو رانا مسکراتا ہوا جائے گا اور مسکراتا ہوا عدالت سے نکل آئے گا......"

"اور ضمانت منظور نہ ہوئی تو...... تو......"

"تو اس کے وظیفہ خوار اسے عدالت سے یوں نکال لے جائیں گے جیسے مکھن سے بال نکالتے ہیں پولیس کی بھاری نفری منہ دیکھتی رہ جائے گی...... خبر آئے گی کہ ضمانت منظور نہ ہونے پر ملزم کا عدالت سے فرار...... ایسی خبریں پہلے بھی بہت آئی ہیں......"

"یہ ڈراما کب ہوگا......"

"ابھی کچھ پتا نہیں...... مجھے شہزاد نے فون کر کے بتایا تھا۔ شاید دو چار دن میں......"

"ہمیں رانا کا راستہ روکنے کے لیے کچھ کرنا چاہیے...... خاموشی سے" راجا بولا...... "میں بھی یہی سوچ رہا ہوں...... میرے ذہن میں دو تین مختلف پلان ہیں...... فی الحال کسی سے بھی بات کرنے کی ضرورت نہیں...... سب سے پہلے معلوم ہو کہ رانا کب اور کہاں پیش ہوگا...... جب عدالت میں درخواست ضمانت دائر ہوگی تو پتا چل جائے گا...... اس وقت تک ایکشن پلان کا پہلا مرحلہ مکمل ہوجائے...... ایک تو یہ کہ جو پولیس کی نفری عدالت میں حاضری کے لیے مامور ہو اس کا پتا چلایا جائے...... یہ کام مشکل ہے مگر ناممکن نہیں......"

میں نے حیرانی سے کہا...... "یہ پتا چل جانے کے بعد

کیا ہوگا۔

''پھر دوسرا مرحلہ شروع ہوگا..... میرا اندازہ ہے کہ دس بیس لوگ ہوں گے جو متعلقہ تھانے سے جائیں گے..... ہم دس ہزار فی کس ایک دن پہلے ادا کردیں.....''

''کس بات کے؟.....''

''اس بات کے..... کہ وہ بیمار ہوجائیں..... ڈیوٹی پر حاضر نہ ہوں..... کسی ڈاکٹر سے دوا اور سرٹیفکیٹ لے لیں کہ انہیں جلاب لگے ہوئے تھے یا تیز بخار تھا.....''

میں نے کہا..... ''یہ اسکیم کامیاب ہوسکتی ہے۔ دس ہزار ایک کانسٹیبل کے لیے بہت ہوتے ہیں..... ہر ایک سے کہا جائے گا کہ بس تم غیر حاضر ہوجاؤ..... وہ سمجھے گا کہ ایک میرے نہ جانے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ باقی تو جائیں گے۔ کبھی بندہ بیمار بھی ہوجاتا ہے سچ مچ..... بیماری کے جرم میں کوئی نوکری سے تو نکالے گا نہیں..... بعد میں پتا چلے گا کہ ساری نفری بیمار ہوگئی تو اس کے پیچھے کیا سازش تھی..... عدالت میں حاضر ہوں گے سب انسپکٹر قسم کے افسر.....''

میں نے کہا..... ''وہ رانا کو راستہ دینے پر مجبور ہوں گے۔ ان کا کام تو مزید آسان ہوجائے گا.....''

''مرحلہ نمبر تین..... عدالت میں حاضر ہوگی پولیس کی دوسری نفری..... پولیس کی وردی میں ناآشنا چہرے..... وہ کہیں گے ہمیں آرڈر تھے..... وہ عین وقت پر آئیں گے..... کسی انسپکٹر کے لیے تفتیش کا وقت ہی نہیں ہوگا..... یہ نفری رانا صاحب کو نہیں جانے دے گی..... گرفتار کرکے ہتھکڑی لگائے گی اور تھانے کی حوالات تک لے جاکے غائب ہوجائے گی.....''

مجھے ہنسی آئی..... ''کہاں سے بندوبست ہوگا پولیس کی وردی کا اور وہ کون لوگ ہوں گے.....''

''بندے ہمارے ہوں گے..... وردی پولیس اسٹور سے ملتی ہے..... ان کی گرفتاری اور ہتھکڑی لگانے سے حوالات میں لے جانے تک کی تصاویر اور ویڈیو فلم بنانے والے اخباری نمائندے موجود ہوں گے.....''

''تیرے اخباری دوست سے مدد نہیں لوں گا۔ کچھ شام کے اخبار کے پروفیشنل بلیک میلرز ہیں..... ان کی خدمات حاصل کروں گا۔ نقد قیمت دے کر..... گرفتار ہونے کے بعد رانا تھانے والوں کی ذمے داری..... وہ اسے فرار کرائیں اور نوکری سے جائیں.....''

''یہ اسکیم تو شاندار ہے..... مگر راجا..... ہمارے جعلی پولیس والوں میں سے کوئی پکڑ لیا گیا..... پھر.....''

''انہیں گن پوائنٹ پر نکال لے جائیں گے۔ تو فکر نہ کر..... ان میں سے کوئی ہاتھ لگنے والا نہیں ہوگا..... میں غنی کے ساتھ پانچ سات بندوں کی ٹریننگ کروں گا..... پوری ریہرسل کراؤں گا..... لیکن.....''

''لیکن کیا.....'' میں نے کہا۔

''یہ ہوسکتا ہے کہ ہمارا پلان لیک آؤٹ ہوجائے..... کوئی کانسٹیبل ڈر کی وجہ سے کسی افسر کو بتادے..... یا اپنے کسی ساتھی سے مشورہ کرے تو بھانڈا پھوٹ جائے..... میرا پلان نمبر دو یہ ہے کہ عدالت میں رانا کا کیس لگنے سے پہلے پولیس کی نفری تو رکھی جائے..... رانا صاحب کی طرف سے سب کو چائے یا کولڈ ڈرنک پلائی جائے..... آدھے گھنٹے میں وہ سب ہوجائیں انٹا غفیل..... انتظام ہوگا ایک الگ..... کمرے میں..... سب اکٹھے نہیں جاسکتے۔ باری باری جائیں گے اور لیٹتے جائیں گے..... جب ضرورت پڑے گی تو ان کی وردی میں ہمارے بندے ایک ساتھ نمودار ہوں گے..... وہ ایسا وقت ہوگا کہ جج صاحب فیصلہ سنانے والے ہوں گے..... یا سنا چکے ہوں گے..... سخت افراتفری ہوگی۔ رانا ایک دم بھاگے گا..... اس امید میں کہ راستہ روکنے والا کوئی نہیں..... ہماری نفری اسے جانے نہیں دے گی..... ہم شور مچادیں گے کہ لگاؤ ہتھکڑی اور تھانے لے جاؤ..... کوئی سب انسپکٹر یا انسپکٹر اس وقت کیسے انکار کرے گا۔ کیسے ثابت کرے گا کہ یہ جعلی پولیس ہے..... ہتھکڑی تو اسے لگانی پڑے گی..... اور تھانے بھی لے جانا پڑے گا.....''

میں نے غور فرماکے کہا..... ''ہوں..... راجا صاحب دوسری اسکیم زیادہ خطرناک ہے.....''

''یہ متبادل ہے اگر پہلی اسکیم فیل ہوجائے تو..... ورنہ ہم ایک رات قبل جو دس ہزار داؤ پر لگائیں گے..... وہ کام کر جائیں گے..... ہم سب سے عہد لیں گے کہ دس ہزار لو اور گم ہوجاؤ..... بیماری کا بہانہ کرو یہ کہو کہ کسی نے اغوا کرلیا تھا..... الزام بہرصورت ہم پر آئے گا.....''

''الزام سے ہم نہیں ڈرتے..... الزام ثابت کون کرے گا..... تو ایک جینیس ہے راجا..... جو ست بدحالی میں ایسے ہی پڑا ہے۔ جیسے دنیا کا سب سے بڑا ہیرا ابھی تک افریقہ کی کسی کان میں دفن پڑا ہے..... اچھا اب میری بات سن.....''

''پہلے تو میری سن..... میں نے تجھے ہمیشہ کیا نصیحت کی ہے فیکے پتر۔ یہی کہ کسی لڑکی کے لیے جان ہلکان نہیں کرنی..... لڑکی اور بس..... ایک نکل گئی تو دوسری آئی

ہوگی.....''

میں نے کہا..... ''آپ بکواس فرمانے سے گریز کریں۔''

''نورجہاں وہاں گئی جہاں سے کوئی لوٹ کے نہیں آتا..... اور فریال نے تجھے اپنی زندگی سے یوں نکال پھینکا ہے جیسے دودھ سے مکھی.....''

میں نے کہا..... ''یہ مکھی پھر اسی دودھ میں گرے گی..... تیرے گی یا ڈوب مرے گی.....''

''ڈائلاگ مت مار میرے سامنے..... میرا عاقلانہ مشورہ یہ ہے کہ اب میدان صاف ہے..... پھر لارڈ ارنسٹ کی اکلوتی بہن ایلشا عرف عائشہ پر فریفتہ ہوجا..... بڑے فائدے ہوں گے ست بدحالی کے ترقیاتی منصوبے کو اگر یہ مشرق اور مغرب کا ملاپ ہوگیا.....''

میں اٹھ کھڑا ہوا..... ''میں جارہا ہوں.....''

راجا حیران ہوا ''کہاں..... عائشہ کو پرپوز کرنے یار صبح کردینا..... ایسی بھی کیا جلدی.....''

میں نے کہا ''راجا میرے دوست میں لوٹ کے اسلام آباد جارہا ہوں..... ابھی اور اسی وقت.....''

''اسلام آباد..... کوئی سراغ ملا ہے فریال کا.....؟''

میں نے کہا..... ''اللہ مجھے معاف کرے..... میں یہ ارادہ لے کر آیا تھا کہ تجھ سے..... اپنے اکلوتے مخلص دوست سے..... جھوٹ بولوں گا لیکن اچانک میرا ضمیر مجھے لعنت ملامت کرنے لگا ہے کہ فیکے پتر راجا سے بھی جھوٹ بولے گا تو پھر سچ کس سے بولے گا.....''

راجا نے سوچ کے کہا..... ''تو اسلام آباد نہیں جارہا ہے''

''میں اسلام آباد ہی جارہا ہوں..... مگر فریال کو تلاش کرنے نہیں۔''

راجا بولا ''پھر.....؟''

میں نے اعترافِ جرم کے انداز میں کہا..... ''میں نورجہاں کے پاس جارہا ہوں۔''

راجہ بھونچکا رہ گیا..... ''وہ..... زندہ ہے..... اسلام آباد میں ہے''۔

میں نے اسے مختصراً ساری بات بتادی..... وہ پلک جھپکائے بغیر ایسے سنتا رہا جیسے میری بات کا یقین نہیں اور جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں وہ سچ نہیں جھوٹ ہی ہے۔

وہ پہلے لیٹا ہوا تھا پھر اٹھ کے بیٹھ گیا..... پھر ٹہلنے لگا..... ''مجھے پہلے ہی سمجھ لینا چاہیے تھا کہ جھوٹ تو صرف اسی کے لیے بولتا ہے..... خیر یہ بتا کیا اس نے اکبر خان کو قتل کردیا ہے؟''

میں نے کہا..... ''میرا خیال ہے..... کردیا ہوگا اس کی حالت ایسی ہی ہورہی تھی.....''

''ابے حالت کے گھوڑے..... تو نے پوچھا نہیں۔''

میں نے کہا..... ''یار..... اس کی حالت ہی ایسی ہورہی تھی..... میرا مطلب ہے۔ اس سے بولنے کی میری ہمت نہیں ہوئی لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں۔ معلوم ہوجائے گا۔''

''کب.....؟ پولیس کے پہنچ جانے کے بعد..... تو نے اخبار نہیں دیکھا.....'' راجا سخت خفا تھا۔

میں نے کہا..... ''اخبار میں کب آئے گا..... کل.....''

''تو نے اسے اسپتال میں چھپا رکھا ہے.....'' اس نے افسوس سے سر ہلا کے کہا..... ''اپنی بیوی بنا کے۔''

''اور میں کیا کرتا راجا..... کہاں لے جاتا اسے..... ایسی کوئی جگہ نہیں تھی..... اور پھر اسے فوری علاج کی ضرورت تھی.....''

''یہ کس قدر بے وقوفی کی بات ہے..... اگر اس نے کچھ کہہ دیا..... یا کسی کو شک ہوگیا.....''

میں نے کہا..... ''راجا..... وہاں کچھ نہیں ہوگا..... وہ بالکل محفوظ ہے اور مجھے بھی کوئی جانتا نہیں.....''

''سوال یہ ہے..... کہ اسپتال میں وہ کب تک روپوش رہ سکتی ہے..... وہاں سے تو اسے کہاں لے جائے گا.....''

میں نے مضبوط لہجے میں کہا..... ''اگر ضرورت پڑی راجا..... تو میں اسے یہاں لے آؤں گا.....''

وہ ایک دم پلٹا..... ''یہاں..... پاگل ہوگیا ہے تو.....''

میں نے کہا ''نہیں راجا..... میں اسے بے یار و مددگار..... لاوارث اور مصیبت میں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا.....''

''خواہ فریال تجھے چھوڑ جائے..... ہم سب چھوڑ جائیں.....''

''ہاں لیکن مجھے معلوم ہے تم سب میں سے کوئی بھی مجھے چھوڑ کے نہیں جاسکتا۔ مجھے تیری مدد کی ضرورت ہے راجا..... میں اس عورت کے احسانات کے بار تلے دبا ہوا ہوں' اس میں کوئی شک نہیں کہ آج میں تیرے سامنے زندہ سلامت کھڑا ہوں تو اس کی وجہ سے..... غیر ہوکے اس نے میری جان بچالی..... ورنہ مجھے مارنے کا پورا انتظام انہوں

نے کرلیا تھا۔“

راجا نے کہا..... ”تیری بات ٹھیک ہے..... مگر.....“

”مگر کیا راجا شرافت اور انسانیت بھی کوئی چیز ہے..... آج اس کی زندگی بچانے کا سوال ہے تو میں پیچھے ہٹ جاؤں..... اگر تو بھی عام لوگوں کی طرح یہ سمجھتا ہے کہ میں اپنی جذباتی کمزوری کا شکار ہوں..... وہ میرا استعمال کرتی رہی ہے اور آئندہ بھی کرے گی کیونکہ اس کے حسن وشباب کے جال سے نکلنا میرے بس کی بات نہیں.....“

راجا نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا..... ”کیا ایسا نہیں ہے نواب رفیق احمد شیرازی.....“

”ہوگا..... ہر آدمی کسی نہ کسی کمزوری کا شکار ہوتا ہے۔ کیا تو نہیں ہے،..... لیکن کیا نور جہاں کو محض اس لیے جلاّدوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دینا چاہیے..... کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے.....؟ یہ جانتی ہے کہ میں محبت صرف فریال سے کرتا ہوں..... اس کے باوجود اپنی غرض کے لیے میرا ساتھ دیتی ہے..... جان ہتھیلی پر رکھ کے میری مدد کرتی ہے..... اس کے ہر احسان کے پیچھے اس کی اپنی غرض تھی..... مگر احسان تو احسان ہی ہے..... خواہ کوئی طوائف کرے..... تو نے دیکھی نہیں اس کی حالت..... ورنہ تیرا پتھر دل بھی پانی ہو جاتا پہلے وہ حسن کا تاج محل تھی تو اب ایک کھنڈر ہے قابلِ رحم ہے اس کی حالت۔“

راجا نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا..... ”ٹھیک ہے ٹھیک ہے..... میں ذرا جذباتی ہو گیا تھا..... میں صرف تیرے لیے سوچتا ہوں..... فریال کے حوالے سے اور تیرے رشتوں کے حوالے سے..... تو جا.....“

میں نے کہا..... ”باقی معاملات کو تو سنبھال لے گا نا.....“

”کل کی کل دیکھیں گے نیکے پتر..... اللہ مالک ہے..... ہم اسے بچانے کی پوری کوشش کریں گے اور تجھے بھی.....“

”مگر مجھے کیا بہانہ کرنا چاہیے یار..... جھوٹ تو بولنا پڑے گا.....“

راجا نے گھڑی دیکھی۔ ”اگر تو کل صبح صبح نکل جائے کسی کے اٹھنے سے پہلے رات کا سفر مناسب نہیں..... رات بھر میں پھر کچھ سوچ لیں گے..... ابھی تو لیلیٰ بھابھی تیرے ساتھ آئی ہے..... وہ کہے گی کہ ایسی کیا آفت آگئی.....“

میں نے کہا ”میں نے وعدہ کیا تھا..... خیر میں دیکھتا ہوں کہ پوزیشن کیا ہے۔“

میں نے اسپتال کا نمبر ملایا..... میری بات ڈاکٹر سے ہوگئی اس نے کہا ”سر آپ کی وائف بالکل سیٹ ہیں..... فکر کی کوئی بات نہیں۔“

میں نے کہا..... ”میں یہاں پھنس گیا ہوں..... ایسا لگتا ہے کہ واپسی کی فلائٹ نہیں پکڑ سکوں گا..... لیکن صبح پہلی فلائٹ سے پہنچ جاؤں گا.....“

اس نے کہا..... ”آپ ان سے بات کرلیں..... ابھی وہ جاگ رہی ہیں.....“ اور کال ٹرانسفر کردی۔

دوسری طرف سے گھنٹی کئی بار بجنے کے بعد نور جہاں نے ڈرتے ڈرتے کہا..... ”ہیلو.....“

میں نے کہا..... ”نور جہاں..... کیسی ہو.....“

”میں..... ٹھیک ہوں مگر تم کہاں ہو.....؟“

”میں صبح آؤں گا.....“ میں نے کہا..... ”تم آرام کرو.....“

”رفیق..... مجھے ڈر لگ رہا ہے.....“

میں نے کہا..... ”اب ڈرنے کی کیا بات ہے..... تم یہاں بالکل محفوظ ہو..... میں نے اسپتال والوں کو بتادیا ہے..... کسی کو بھی معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ تم یہاں ہوں خواہ وہ کتنی ہی قریبی رشتے دار ہونے کا دعویٰ کرے.....“

”مگر تم کیوں چلے گئے ہو مجھے چھوڑ کے.....“

میں نے کہا..... ”جان..... مجھے کچھ انتظامات کرنے تھے.....“

”کیسے انتظامات.....؟“

”دیکھو..... تم اسپتال میں کتنے دن رہ سکتی ہو.....“ میں نے نرمی سے کہا

وہ نروس ہوگئی ”میں تمہارے ساتھ رہوں گی رفیق..... اکیلی کبھی نہیں رہوں گی..... تم نے اکیلا چھوڑا مجھے تو میں مر جاؤں گی..... خودکشی کرلوں گی۔“

میں نے کہا ”میں نے کب کہا ہے کہ تمہیں اکیلا چھوڑوں گا بس اب پریشان ہونا چھوڑدو..... تم آج سے میری ذمّے داری ہو..... رائٹ..... میں صبح تمہارے آنکھ کھولنے سے پہلے آجاؤں گا... ناؤ بی اے گڈ گرل کھانا کھاؤ اور سو جاؤ اسپتال کو سمجھو میں نے خرید لیا ہے تمہارے لیے..... وہ سب تمہارے محافظ بھی ہیں اور غلام بھی.....“

”وہ اندر آگئے تو مجھے مار ڈالیں گے.....“

میں نے کہا..... ”اندر کوئی نہیں آسکتا نور جہاں.....“

”وہ ڈاکٹرز سے ساز باز کرسکتے ہیں۔ ان کے پاس

پیسا ہے اور طاقت بھی..... وہ مجھے زہر کا انجیکشن لگوادیں گے کسی نرس سے.....“

میں نے کہا..... ”وہ اسلام آباد کا ایسا اسپتال ہے جہاں بڑے بڑے بیوروکریٹس جاتے ہیں وزیر سفیر جنرل وہاں یہ سب نہیں ہوسکتا۔ خوف کو دل سے نکال دو..... صرف ایک رات ہی کی بات تو ہے..... صبح میں آجاؤں گا۔“

”آخر تم ابھی کیوں نہیں آسکتے..... ایسا کیا کام ہے..... رات کو کون سے انتظامات کرنے ہیں..... کیا مصروفیت ہے.....“ وہ ہسٹیریا کا شکار ہونے لگی۔

میں نے کہا۔ ”اوکے..... اوکے میں آتا ہوں..... ابھی آتا ہوں.....“

”کتنی دیر میں.....؟“

میں نے کہا..... ”ایک ڈیڑھ گھنٹا تو لگے گا.....“

”..... ڈیڑھ گھنٹا..... اس سے زیادہ نہیں..... ابھی ساڑھے سات بجے ہیں..... تم اگر نو بجے تک نہ آئے..... تو..... میں بتا رہی ہوں..... میں اپنی کلائی کاٹ لوں گی..... باتھ روم کا شیشہ توڑ کے.....“

”خدا کے لیے نور جہاں..... میں وعدہ کررہا ہوں کہ نو بجے سے پہلے ہی آجاؤں گا..... وعدہ کرو تم کوئی بے وقوفی کی حرکت نہیں کروگی.....“

”نہیں کروں گی..... نو بجے تک.....“ اس نے کمزور آواز میں کہا

میں نے ریسیور رکھ کے پھر ڈاکٹر سے بات کی اور اسے بتایا کہ نور جہاں نے مجھ سے کیا کہا ہے..... ”آپ فوراً کچھ کریں..... اور کمرے میں ایک نرس کی ڈیوٹی لگادیں۔“

ڈاکٹر نے کہا..... ”آپ ایزی ہوجائیں سر ہم اس سے زیادہ سیریس کیس آسانی سے سنبھال لیتے ہیں..... انہیں کچھ نہیں ہوگا..... آپ کے آنے تک وہ سوتی رہیں گی۔“

”پھر بھی ایک نرس کو وہاں بٹھادیں..... میرے اطمینان کے لیے۔“

”اگر آپ کہتے ہیں تو یہ بھی ہوجائے گا سر..... آپ بالکل بھی پریشان نہ ہوں..... شی از ان سیف پروفیشنل ہینڈز.....“

میں نے فون رکھا تو راجا میرا مذاق اڑانے لگا..... ”ابے جب پنگا لیا ہے تو پھر رونے کی کیا بات ہے.....“

میں نے کہا۔ ”یار اس کی ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے.....“

”تیری اس سے زیادہ خراب ہورہی ہے..... اسے تو ڈاکٹر دیکھ رہے ہیں یہاں رات بھر کے لیے تجھے روکنے کی سزا مجھے ملے گی..... تو جاگتا رہے گا، آہیں بھرتا رہے گا اور بکواس کرتا رہے گا..... سوئے گا تو ڈراؤنے خواب دیکھے گا اور چیخ مار کے اٹھے گا..... نہ نیکے پتر..... میں نے تجھے روکا تھا کہ تجھے کچھ آرام ملے گا..... خود بے آرام ہونے کے لیے نہیں..... تو جا ابھی چلا جا۔“

میں نے بے خیالی میں کہا..... ”ابھی چلا جاؤں.....“

”ہاں ہاں..... جا..... میں کہہ دوں گا کہ منظر کا فون تھا..... اسے لاہور جانا پڑا..... لیکن دیکھ اسپتال سے باہر مت نکلنا..... کچھ بھی ہوجائے۔“

میں نے کہا..... مجھے کچھ نہیں ہوگا.....“

”کل میں آؤں گا..... اگر موقع ملا..... مجھے بتادینا کہ کیا صورتِ حال ہے..... اس کے بعد سوچیں گے کہ نور جہاں کے لیے کیا بندوبست کیا جاسکتا ہے..... مسئلہ صرف اس کی صحت کا ہی نہیں..... مستقبل کا بھی ہے.....“ راجا نے کہا

راجا کا اشارا بہت واضح تھا..... اگر نور جہاں نے اپنے شوہر اکبر خان کو قتل کیا ہے تو پھر اسے پناہ نہیں دے سکتے یہ علاقہ غیر نہیں ہے..... اس کے لیے اچھے سے اچھا وکیل کیا جاسکتا ہے اس کی ضمانت پر رہائی کے لیے کوشش کی جاسکتی ہے مگر اسے ست بدھائی میں نہیں رکھا جاسکتا۔

شیر دل خان نے مجھے دو گھنٹے میں اسلام آباد پہنچایا۔ رات ہوتے ہی ٹرک، ٹرالر اور کنٹینرز کی ٹریفک کم تھی اور دن کے مقابلے میں راستہ بھی رات کے وقت زیادہ غیر محفوظ ہوگیا تھا..... ناہموار اونچے نیچے پہاڑی راستے پر تیز رفتاری خطرناک ثابت ہوسکتی تھی۔ میرا زیادہ وقت اپنے اندیشوں سے لڑتے گزرا..... ڈاکٹرز کی یقین دہانی کے باوجود میں بار بار گھڑی دیکھتا رہا..... نور جہاں کے دیے ہوئے وقت کے مطابق میرا نو بجے پہنچنا ضروری تھا لیکن شیر دل خان محتاط ڈرائیور تھا..... اس نے میرے بار بار اسپیڈ بڑھانے کی ہدایات کو اہمیت نہیں دی۔

جب میں نور جہاں کے کمرے میں داخل ہوا تو ساڑھے نو سے بھی اوپر کا ٹائم تھا..... بلاوجہ مجھے تشویش تھی کہ اندر ایک دہشت ناک فلمی منظر میرے روبرو ہوگا..... نور جہاں سفید بستر پر آنکھیں کھولے چت لیٹی چھت کو گھور رہی ہوگی اس کا ایک ہاتھ بیڈ پر ہوگا..... دوسرا نیچے لٹک رہا ہوگا..... اسپتال کے بیڈ کی بے داغ سفید چادر اس کے لہو سے لال ہوگی..... فرش کے چمکتے ماربل ٹائلز پر اس کا لہو بہہ

کے جم چکا ہوگا اور اس کی سرخ چمک ماند پڑ رہی ہوگی۔

ایسا کچھ نہیں تھا...... نور جہاں پُر سکون گہری نیند میں تھی اور اس کے قریب کرسی پر ایک نرس بیٹھی کوئی ناول پڑھ رہی تھی...... وہ مجھے دیکھتے ہی باہر نکل گئی...... میں کرسی پر بیٹھ کے نور جہاں کو دیکھتا رہا...... سکون کی حالت میں اس کے چہرے سے وحشت اور پژمردگی رخصت ہوگئی تھی اور دلکشی لوٹ آئی تھی۔ اس کی جلد کی گلابی رنگت پر زردی غالب تھی جو سنہرے پن کا تاثر دیتی تھی...... اس کا سڈول جسم اب ہڈیوں کا ڈھانچا بن گیا تھا لیکن اس میں بھی آج کل کے فیشن کی وہ نزاکت نظر آتی تھی جو ماڈلز کی پیشہ ورانہ ضرورت تھی...... مجھے یقین تھا کہ مناسب دیکھ بھال، علاج اور خوراک سے وہ بہت جلد پھر پہلے جیسی نور جہاں ہو جائے گی جس کا حسن وشباب راہ چلتے لوگوں کو چونکاتا تھا...... انہیں ٹھٹکنے اور مسحور ہونے پر مجبور کر دیتا تھا۔

میں نے شیر دل خان سے اس کا موبائل فون نمبر لے لیا تھا...... میں نے اسے کمرے میں بلا لیا...... مگر اسے سیکیورٹی اسٹاف نے لاؤنج سے آگے جانے کی اجازت ہی نہ دی...... مجبوراً مجھے خود ہی لاؤنج میں جانا پڑا۔

"شیر دل خان تم اسلام آباد اور پنڈی کی مارکیٹ سے واقف ہو؟......" میں نے کہا

"بہت اچھی طرح سر......"

میں نے کہا...... "یہ پیسے اپنے پاس رکھو...... پورے دس ہزار ہیں۔"

اس نے نوٹ پکڑ لیے...... "اس میں کیا لانا ہے سر......"

میں نے کہا...... "مجھے ایک موبائل فون چاہیے...... سم اور کارڈ کے ساتھ۔ بالکل سادا کیمرے وغیرہ کی ضرورت نہیں...... تین چار ہزار میں مل جائے گا۔ مجھے کے ایف سی یا میکڈونلڈ سے برگر اور کولڈ ڈرنک لا دو...... خود جو چاہو لے لو......"

اس نے پانچ ہزار مجھے واپس تھما دیے...... "پانچ کافی ہیں سر......"

میں نے کہا...... "یہ بھی رکھو...... میں بار بار تم سے کچھ لانے کو کہوں گا۔ آج رات قریب ہی کسی ہوٹل میں کمرا لے لو...... مگر الرٹ رہنا......"

"ہم ادھر گاڑی میں رہے گا سر...... پارکنگ میں...... ہم کو گاڑی میں سونے کا عادت ہے......"

وی آئی پی روم میں پیشنٹ کے اٹینڈینٹ کے لیے بھی بہت اچھا آرام دہ بیڈ تھا۔ میں جوتے اتار کے اس پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر میرے خیالات کی رو مختلف سمتوں میں بھٹکتی رہی۔ میں اکبر خان کے بارے میں سوچتا رہا کہ کیا واقعی نور جہاں نے اسے قتل کر دیا ہوگا...... اگر ایسا ہوا تو میرے لیے خطرات کم ہوں گے یا بڑھ جائیں گے...... میں نور جہاں کو کیسے چھپاؤں گا آخر کب تک اور قانون کی گرفت سے کیسے بچاپاؤں گا پھر فریال کا چہرہ میرے سامنے آ گیا...... نور جہاں نے کہا تھا کہ وہ جانتی ہے فریال کہاں ہے...... کیا وہ اکبر خان کے ہتھے چڑھ گئی تھی؟...... اکبر خان کا پورا گروہ تھا جو رانا کی سرپرستی میں غیر قانونی دھندے کرتا تھا...... ان دھندوں کی نوعیت ابھی کسی پر واضح نہیں تھی...... فریال نے غصے میں ست بدھائی چھوڑ کے بہت بڑی غلطی کی تھی، ایک طرف اس کے دشمن تھے جن کی کمان سلطان نے سنبھال رکھی تھی...... دوسری طرف میرے، وہ کسی کی نظر میں بھی آ سکتی تھی۔

شیر دل خان کے آنے سے پہلے ہی ذہنی اور جسمانی تکان کے باعث بھرپور نیند غالب آنے لگی تھی...... شیر دل نے مجھے جگایا میں نے صبح سے کچھ بھی نہیں کھایا تھا...... برگر دیکھ کے میری بھوک ایک دم چمک اٹھی...... کھانے کے بعد میری نیند غائب ہوگئی...... میں نے موبائل فون میں سم ڈال کے کارڈ لوڈ کیا۔ یہ میں نے نور جہاں سے رابطے میں رہنے کے لیے منگوایا تھا...... ابھی مجھے اس کے لیے بہت کچھ کرنا تھا...... اسے جوتوں کپڑوں کے علاوہ ذاتی ضرورت کے لیے رقم کی ضرورت بھی ہوگی...... میں نے اس کے سرہانے رکھا ہوا بیگ کھول کے دیکھا...... وہ اپنی چیک بکس شناختی کارڈ اور پاسپورٹ وغیرہ لانا نہیں بھولی تھی...... اس کے تین مختلف بنکوں میں اکاؤنٹ تھے، دو شناختی کارڈ تھے اور دو ہی پاسپورٹ بھی...... ایک میں اس کا نام نور جہاں بیگم تھا اور شوہر کے بجائے والد کا نام لکھا ہوا تھا...... دوسرے میں وہ نور جہاں اکبر تھی اور شوہر کا نام اکبر خان درج تھا۔

میں نے اسپتال کے کیفے ٹیریا سے کافی منگوائی اور خود کو خاصا بہتر محسوس کیا...... ایک بار پھر سکون و راحت کا احساس مجھ پر نیند کا غلبہ بن کے اترا اور نصف شب کے بعد میں سویا تو صبح آٹھ بجے تک نرسوں کی آمد و رفت سے بھی ڈسٹرب نہیں ہوا۔

جب میں جاگا تو وہ بستر پر سیدھی بیٹھی شفاف شیشوں والی بہت بڑی کھڑکی سے نظر آنے والے مارگلا ہلز کا منظر دیکھ رہی تھی جو مجھے سنیما اسکوپ سائز اسکرین پر کسی کیمرے کی بہت خوبصورت رنگین تصویر کی طرح نظر آ رہا تھا...... نیلے

آسمان کے پس منظر میں سرسبز پہاڑیاں۔ پیچھے کے پہاڑوں کی سلیٹی آؤٹ لائن......اوپر بادلوں کے ٹکڑے جو تیزی سے آپس میں مل کر گھٹا بننے کی جدوجہد میں معروف تھے......ایک طرف شاہ فیصل مسجد کے سربلند مینار......دوسری طرف دامنِ کوہ اور اس سے بہت اوپر کی طرف پیر سوہاوہ...... یہ ایک سکون بخش اور مسرت انگیز منظر تھا۔

میں اٹھا تو آہٹ پر نور جہاں نے میری طرف دیکھا اور مسکرانے کی کوشش کی...... میں نے اس کے پاس بیٹھ کے اس کا سرد ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا......"تم بہت بہتر لگ رہی ہو۔"

"دیکھنے میں یا شاید صرف تمہیں......"

"چند دنوں میں خود کو پھر دیکھنا......آئینہ گواہی دے گا کہ تم وہی نور جہاں ہو......جس کے حسن نے ایک عالم کو دیوانہ بنا رکھا تھا...... خیر...... یہ بتاؤ تم نے کچھ کھایا پیا...... رات کو نیند کیسی آئی......"

"یہ نیند کہاں تھی...... بے ہوشی تھی' انہوں نے انجکشن دے کر سلا دیا تھا......تم کب آئے تھے۔"

میں نے کہا......"اپنے وعدے کے مطابق ٹھیک نو بجے......"

"جھوٹ......نرس سے پوچھا تھا میں نے......تم ساڑھے نو بجے آئے تھے۔"

"اس پر اعتبار ہے......مجھ پر نہیں ہے......"میں نے آہ بھر کے کہا......"اچھا میں کم سے کم منہ دھولوں......اس کے بعد باقی باتیں۔"

نور جہاں کی حالت یقیناً بہت بہتر تھی......وہ پُرسکون ہو گئی تھی اور متفکر ضرور نظر آئی مگر پریشان نہیں...... یہ دواؤں کا اور آرام کا نتیجہ تھا......اس نے میرے ساتھ ناشتا کیا اور میں نے اسے زبردستی بہت کچھ کھلا دیا......وہ میری ہر بات مانتی جا رہی تھی...... یہ خود سپردگی کا انداز میری ذمے داری کے بوجھ کو بڑھاتا تھا لیکن اس سے مفر بھی نہ تھا......کئی بار مجھے محسوس ہوا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے......یقیناً اس کے پاس بہت کچھ تھا جو ابھی تک راز کی صورت میں اس کے دل کا بوجھ بنا ہوا تھا۔ اسے زبان تک لاتے ہوئے وہ ڈرتی بھی تھی لیکن مجھے بتائے بغیر چارا بھی نہ تھا۔ جب بھی اس نے لب کھولنے کا ارادہ کیا میں نے کوئی اور بات شروع کر دی۔

ناشتے کے بعد اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔"تم ایسا کیوں کر رہے ہو میرے ساتھ؟...... مجھے بولنے کیوں نہیں دیتے؟ مجھ سے کچھ پوچھتے کیوں نہیں؟......کب تک خاموش رہوں میں......"

میں نے ہنس کے کہا"ہر کام اپنے وقت پر اچھا لگتا ہے۔ میرے لیے تمہاری باتوں سے زیادہ تمہاری حالت کو سنبھالنا ضروری تھا۔"

وہ ساکت بیٹھی پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھتی رہی......

"......اکبر خان کی قید سے آزادی حاصل کر لی ہے......"

"کیسے؟......فرار ہو کے......"

"میں نے اسے قتل کر دیا ہے......"وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔"چھری سے اس کو سوتے میں ذبح کر دیا......"

میرا سانس ذرا سی دیر کے لیے رکا......"بہت اچھا کیا......مگر کیا یہ ضروری تھا۔ میرا مطلب ہے......اگر تم جان بچا کر نکل آتیں......"

وہ ایک دم بگڑ گئی......"کیسے نکل آتی......زنجیریں کاٹ کے دروازے توڑ کے......تمہیں معلوم ہے ایک مہینے میں اس حرامزادے نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا......مجھے کیسے کیسے عذاب دیے......"

میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا......"ایزی...... ایزی......خیال رکھو کہ یہ اسپتال ہے بات آرام سے کر سکتی ہو تو کرو......ورنہ رہنے دو۔"

اس نے ایک گہری لمبی سانس لی۔"میرے پاس اور کوئی صورت نہیں رہی تھی......سوائے اس کے کہ یا میں اسے مار دوں یا خود مر جاؤں......میں مرنا نہیں چاہتی تھی......زیادہ ضروری یہ تھا کہ اس شخص کے مکروہ وجود کو مٹا دوں جو میری زندگی میں اتنے دکھ مصائب اور آلام بھرنے کا ذمے دار تھا کہ میں مرنے کا سوچنے لگی تھی......میں نے کسی کی زندگی عذاب نہیں کی تھی......خود تم بتاؤ......سوائے خوشی کے اور محبت کے میں نے تمہیں کبھی کوئی آزار دیا' میرا سارا اثاثہ حسن تھا جو قدرت نے مجھے بے حد و حساب دے دیا تھا مگر اس سے میں نے کون سی خرابی پیدا کی......کسی کی جان لی......کسی حکومت کا تختہ الٹا......کسی سازش کو کامیاب کیا......کوئی گھر اجاڑا...... ہاں مجھ سے لوگوں نے لذت اور تسکین پائی......وہ مسرور ہوئے اور شاداں و فرحاں گئے......"

میں نے کہا"تمہارا فیصلہ بالکل درست تھا کہ سزائے موت کا مستحق وہ تھا......اور تمہاری زندگی پر میرا بھی حق تھا......"

اس نے کہا"میں کچھ بہک گئی تھی......خیر جب میں نے طے کر لیا کہ مجھے مرنا ہی ہو گا تو پہلے اسے ماروں گی......پھر دیکھوں گی قسمت مجھے زندہ رہنے کا موقع دیتی ہے یا

نہیں۔ میرا کوئی پرستار مجھے بچانے کے لیے سامنے آتا ہے یا نہیں......دعوے دار تو بہت تھے......لیکن سب غرض مند تھے......بزدل اور بے غیرت تھے......"

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو......کیا تم نے کسی کو آزمایا؟"

اس نے پھر ٹھنڈی سانس لی"نہیں......جب میں نے غور کیا اور سوچا تو ایک ایک کر کے اس فہرست سے سارے نام خارج ہو گئے......صرف ایک نام رہ گیا تھا تمہارا......"

"تم نے اتنا بھروسا کیا مجھ پر......اس کا شکریہ......"

"میں نے تمہیں آزمائش میں ڈالا......"

میں نے کہا"اکبر خان تمہیں کیسے استعمال کرتا تھا یہ مجھے معلوم ہے پھر تم سے کسی روایتی وفاشعار بیوی جیسا رویّہ کیوں مانگتا تھا......"

"اسے کوئی اعتراض نہیں ہوتا تھا جب میں اس کے مفاد میں کسی بزنس مین یا بیوروکریٹ کے پاس جاتی تھی...... لیکن تم اس کے دشمن تھے......جب اسے معلوم ہوا کہ میں تم سے ملتی ہوں تو وہ غصے سے پاگل ہو گیا......"

"یہ اسے کس نے بتایا؟......"

"کسی نے نہیں......اس نے مجھے فون پر تم سے باتیں کرتے سن لیا تھا۔ اور میرے پیچھے لگ گیا میری تمہاری ملاقات کہاں ہو گی......کب ہو گی......یہ جان لینے کے بعد اس نے موبائل فون مجھ سے چھین لیا' مجھے اس نے ایک بید کی چھڑی سے اتنا مارا کہ میں بیہوش ہو کے گر گئی......اس نے مجھے ایک تہ خانے میں بند رکھا اور میں کیا بتاؤں میرے ساتھ کیا کیا' اس نے کہا کہ میں تجھے مرنے نہیں دوں گا......تیرے عاشق نواب کی لاش تیرے سامنے لا کے ڈالوں گا......اور وہ تیرے سامنے سڑتی رہے گی......اس کا گوشت گل سڑ جائے گا......اس میں کیڑے پڑ جائیں گے چیونٹے اسے کھائیں گے......جب تک وہ صرف ہڈیوں کا ڈھانچا نہیں رہ جائے گا تو دیکھتی رہے گی......یہی ہے تیری سزا......اس تہ خانے میں اندھیرا تھا اور مٹی تھی......دن میں بھی چوہے گھومتے پھرتے تھے' مجھے اس نے ایک دیوار کے ساتھ زنجیر سے باندھ دیا تھا......میں اسی زنجیر کے ساتھ بیٹھ سکتی تھی اور لیٹ سکتی تھی......مجھے دن میں گرمی لگتی تھی......رات کو سردی میں دبی پڑی رہتی تھی......اور آنے والے عذاب سے کانپتی رہتی تھی لیکن ایک دن گزرا......پھر دوسرا دن......مجھے ایسا لگا کہ خدا نے میری سن لی تیسرے دن اکبر خان پھر آیا اور اس نے مجھے چمڑے کے ایک ٹکڑے سے بہت مارا وہ پھر کہتا رہا کہ تیرا وہ عاشق آیا کیوں نہیں......میں اس پر تھوک کر ہنستی رہی......میں پاگل ہو چکی تھی......"

"میں آیا تھا......قسمت اچھی تھی کہ بچ گیا' اکبر خان مجھے قتل کرنے مسلح افراد کے ساتھ وہاں چھپا تھا......"

"میں نے کہا نا، خدا نے میری دعا قبول کر لی تھی......تم چاہو تو اسے اپنی خوش قسمتی سمجھو......"

"پھر تمہاری رہائی کیسے ہوئی......"

"رہائی؟ میں نے اسے قتل کر کے رہائی حاصل کی ہے......تم جانتے ہو۔"

میں نے کہا"میرا مطلب تھا......اس نے تمہیں قتل کیوں نہیں کیا؟"

وہ بولی"پہلے یہ میری سمجھ میں بھی نہیں آیا تھا......ایک دن اچانک اس نے مجھے تہ خانے سے اپنے بیڈ روم میں شفٹ کر دیا......مجھ پر تمام سختی ختم ہو گئی......پھر علاج شروع ہو گیا......"

"تہ خانے میں تم نے کتنے دن گزارے......"

"مجھے کوئی اندازہ نہیں شاید دس بارہ دن' مجھے تو وہ ایک پوری صدی کا عذاب لگا تھا......جب میری حالت کچھ بہتر ہوئی تو اس نے ایک دن بڑی محبت سے پوچھا کہ تمہیں رفیق اچھا لگتا ہے......کیا تم اس سے محبت کرتی ہو؟"......

میں نے کہا......"ہاں بہت اچھا لگتا ہے' میں اس سے اتنی محبت کرتی ہوں جتنی دنیا میں آج تک کسی عورت نے کسی مرد سے نہیں کی ہو گی......یہ میرا یقین ہے۔"

وہ کچھ حیران ہوا......"تجھے ڈر نہیں لگتا......کہ یہ سن کے میں تجھے جان سے نہ مار دوں......؟"

میں نے کہا......"میرے جھوٹ پر تم کب یقین کرتے......مجھے اپنی موت سامنے نظر آ رہی ہے......پھر ساری عمر کے گناہوں میں جھوٹ بول کے ایک اور گناہ کا اضافہ کیوں کروں......"

اس نے کہا......"وہ بھی محبت کرتا ہے تم سے؟"

میں نے کہا......"یہ اس سے پوچھو......"

اس نے میرے منہ پر الٹے ہاتھ کا تھپڑ رسید کیا......

"میں تجھ سے پوچھ رہا ہوں......"

میں نے کہا......"وہ مجھ سے محبت نہیں کرتا......"

وہ مجھے گالیاں دینے لگا"حرامزادی......میرے سامنے جھوٹ بولتی ہے......تیری کھال ادھیڑ دوں گا تیزاب سے تیرا چہرہ کیا سارا بدن جلا دوں گا۔"

میں نے کہا......"پھر اس نیک کام میں دیر کس لیے۔"

وہ بولا"تو بلاتی ہے تو وہ آتا ہے یا نہیں؟......"

میں نے کہا ”ہاں...... لیکن اپنی مرضی سے آتا ہے......“

اس نے کہا...... ”تو جانتی ہے کہ وہ میرا دشمن ہے...... کہیں تو اس کے ساتھ مل کے میرے خلاف سازش تو نہیں کر رہی ہے۔“

میں نے کہا...... ”ایسا ہوتا تو میں کب کی بھاگ گئی ہوتی تمہیں چھوڑ کے...... یا تمہیں قتل کر چکی ہوتی...... کسی عورت کے لیے یہ مشکل نہیں ہوتا۔“

”تجھے ڈر ہوگا پھانسی کا؟“ وہ بولا۔

میں نے کہا...... ”اگر میں رفیق کے ساتھ مل کے سازش کرتی تو قتل کا الزام ہی مجھ پر نہ آتا...... وہ بچا لیتا مجھے......“

اس نے کہا...... ”اچھا چھوڑ...... یہ بتا اگر میں تجھے آزاد کر دوں...... رفیق کے پاس جانے کے لیے......“

میں نے کہا ”سورج مشرق کے بجائے مغرب سے نکل سکتا ہے لیکن تم مجھے چھوڑ نہیں سکتے......“

”کیوں نہیں چھوڑ سکتا...... آخر تو بیوی ہے میری......“

میں نے تلخی سے کہا ”بیوی؟...... ذرا حساب لگاؤ میرے مجازی خدا کہ تم نے اپنے حکم سے مجھے کس کس کی بیوی بننے پر مجبور کیا۔ کسی ڈائری میں تم بھی لکھے ہیں ان کے نام...... جو فائدہ تم نے اٹھایا اس کا حساب تو ضرور دینا ہوگا تمہیں...... تمہاری نظر میں کیا اوقات تھی میری...... کیا کہتے رہے تم ہمیشہ کہ عورت روز ایک مرد کے ساتھ سوئے یا ہر رات مرد بدل جائے...... اس کی صحت پر کیا اثر پڑتا ہے...... پھر ایک کے ساتھ میں اپنی مرضی سے سوتی رہی تو تم چراغ پا کیوں ہوئے۔“

ظاہر ہے اس جواب پر اس نے مجھے بہت مارا...... مارنے کے سوا وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ میرا جسم سارے عذاب جھیلتا رہا...... اگر اس کو خوشی دی تو صرف تم نے...... اور خوشی روح کا ایک احساس ہے...... خیر...... اس کے بعد کئی دن گزر گئے...... ایک دن پھر وہ میرے پاس آیا۔

کہنے لگا...... نور جہاں...... میں سچ بول رہا ہوں، میں تمہیں رفیق کے پاس جانے کی اجازت دے سکتا ہوں......“

میں نے کہا...... ”کس شرط پر؟“

اس نے کہا ”تم بہت ذہین عورت ہو......“

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے...... تم نے صرف میری خوبصورتی سے فائدہ اٹھایا ہے...... اور تم جیسے سارے مردوں نے...... ایک رات کی محبت بھی تمہیں ہی ملی ہے...... کبھی کوئی معاہدہ...... کبھی ایک دستخط...... کبھی کوئی سودا......“

وہ بولا...... ”میں رفیق سے ایک سودا کرنا چاہتا ہوں...... اور یہ کام تم کرا سکتی ہو، تم نے ان سے اپنی بات منوالی جو تمہارے لیے اجنبی تھے...... پھر رفیق سے کوئی بات منوانا کیا مشکل ہے جو تمہارا عاشق ہے...... سچا عاشق۔“

میں نے کہا...... ”کیا تم جانتے نہیں کہ وہ فریال سے محبت کرتا ہے...... یہ ٹھیک ہے کہ وہ آجاتا ہے مجھ سے ملنے......“

وہ پھر بحث کرنے لگا...... ”آخر کیوں آجاتا ہے؟...... تم جانتی نہیں ان دولت مندوں کی فطرت کو یہ ایک کے ہو کے نہیں رہتے...... فریال کے ساتھ یہ نور جہاں سے بھی محبت کر سکتے ہیں...... ایلیشا سے بھی کر سکتے ہیں جو اس نواب کے تحم کے لیے مسلمان ہو کے عائشہ بن گئی...... نواب ایسے ہی ہوتے ہیں...... چار تو شرع کے مطابق کر لیتے ہیں باقی غیر شرعی سہی وہ سب کو اپنے حرم میں جگہ دے سکتا ہے...... جتنی بڑی حویلی ہے اس کی اتنا ہی بڑا دل بھی......“

میں نے کہا ”تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“

اس نے کہا...... ”تم جانتی ہو اس کے اور میرے درمیان دشمنی کس طرح شروع ہوئی؟......“

میں نے کہا ”شاید کوئی ملکیت کا جھگڑا تھا......“

”ہاں...... اس کے دادا نے مجھے بہت بد حالی میں ایک جگہ دی تھی...... اس نے قانونی دستاویز میں لکھا تھا کہ اس جگہ سائنس ریسرچ سینٹر بنانے کی اجازت ہے...... وہ بھی چالاک بڈھا تھا...... اس نے صاف نہیں لکھا کہ زمین فروخت کی گئی ہے یا تحفے میں دے دی گئی ہے یا کرایے پر ہے۔ رفیق نے مجھ سے یہ جگہ واپس لینے کی کوشش کی اسے شک ہو گیا تھا کہ یہاں کوئی غیر قانونی کاروبار ہوتا ہے......“

میں نے کہا...... ”کیا اس کا شک غلط تھا؟...... تم اس جگہ اغوا کیے جانے والے بچوں کو بند رکھتے ہو...... پھر انہیں اونٹ ریس میں استعمال کرنے کے لیے دبئی بھیجا جاتا ہے...... وہاں دیہات سے خریدی ہوئی یا اغوا کی جانے والی لڑکیاں رکھی جاتی ہیں...... یہ ہے تمہارا سائنس ریسرچ سینٹر...... ذرا سوچو تم نے تو کروڑوں کما لیے...... ان گھروں پر کیا بیتی، جن کے بچے غائب ہوئے......“

وہ بولنے لگا...... ”اپنی بکواس بند کرو...... جو میں کہہ رہا ہوں وہ سنو...... یہ تمہارا نواب رفیق مجھ سے وہ جگہ واپس لینے پر تلا ہوا ہے...... ہمارے لیے وہ جگہ بہت اہم ہے...... شہر میں خطرہ ہوتا ہے...... کوئی لڑکی نکل جائے محافظوں کو چکما

دے کر یا میڈیا والے بو سونگھتے ہوئے پہنچ جائیں تو الگ مصیبت...... ساری عمر جیل میں چکی پیستے گزر جائے گی......“

میں نے کہا...... ”تم چاہتے ہو وہ جگہ تمہیں مل جائے......“

وہ ہنسنے لگا...... ”عورت خوبصورت ہوتی ہے تو ذہین نہیں ہوتی اور ذہین ہو تو خوبصورت نہیں ہوتی...... ہم نے تو یہی دیکھا ہے ہمیشہ...... جس میں دونوں خوبیاں ہوں وہ دو دھاری تلوار سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے...... ایسی عورتیں حکومتوں کے تختے الٹتی آئی ہیں......“

میں نے کہا...... ”میں نے تو کسی حکومت کا تختہ نہیں الٹا......“

”اگر تم اس جگہ کے حقِ ملکیت کی قانونی دستاویز پر رفیق کے دستخط کرا دو...... اسے مجبور کر دو کہ وہ تمہاری خاطر یہ کام کرے......“

میں نے کہا...... ”بھول جاؤ یہ بات...... یہ ناممکن ہے...... اگر فریال بھی اسی طرح دشمن کی قید میں ہو تو وہ اس کی رہائی کے لیے ایسا سودا نہیں کرے گا جو اس کے ضمیر کے خلاف ہو......“

خلافِ توقع اس نے غصے کا اظہار نہیں کیا...... ”میں تم کو سوچنے کے لیے وقت دیتا ہوں...... رفیق ایک مرد ہے...... اور تم وہ عورت ہو جو اپنے حسن کی کشش کو جادو کی طرح استعمال کر سکتی ہے...... بڑے بڑے اصول پرست پرہیز گار اور مضبوط قوت ارادی رکھنے والے مرد اس جادو سے بچ نہیں پائے...... رفیق کیا چیز ہے۔“

اس کے جانے کے بعد مجھے خیال آیا کہ بے وقوف میں تمہیں کیوں بناؤں...... اکبر خان کو کیوں نہ بناؤں...... جھوٹ مکر و فریب یا ضمیر فروشی سب اپنی جان بچانے کے لیے جائز ہے...... بے شک حرام کے حلال ہونے کا نظریہ بہت غلط استعمال ہونے لگا ہے مگر میرے کیس میں یہ غلط نہیں تھا...... میں نے سوچا کہ اپنی بات پر اڑی رہوں اور اذیت و ذلت اٹھاتے اٹھاتے کسی روز مر جاؤں...... کیا اس سے یہ بہتر نہیں ہے کہ میں پہلے جان بچانے کے سارے طریقے آزماؤں...... جائز ناجائز کے چکر میں نہ پڑوں...... اکبر خان سے کہوں کہ ہاں میں رفیق سے یہ کام کرانے کے لیے راضی ہوں...... پھر وہ کہے گا کہ اس سے رابطہ کرو...... اکبر خان پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا...... وہ کام ہو جانے کے بعد مجھے مار ڈالے...... لیکن رفیق پر یہ بھروسا ضرور کیا جا سکتا ہے کہ رابطہ ہونے کی صورت میں وہ مجھے بچا لے...... اور مرنا مقدر ہی ہے تو پھر نہ نواب رفیق نہ میری چالاکی...... مجھے کون بچا سکتا ہے...... لیکن مجھے ایسے خود کو بچانے کی کوشش کیے بغیر موت بھی قبول نہیں کرنی چاہیے۔

بس اس کے بعد میں نے ڈراما شروع کیا...... میں نے سخت بدحالی میں تمہیں فون کیا...... ایسے چونکنے کی ضرورت نہیں...... فون رابعہ نے ریسیو کیا اور اس نے مجھے خوب سنائیں کہ تم کیوں رفیق کے پیچھے پڑ گئی ہو...... تمہاری وجہ سے فریال ایسی گئی کہ لوٹ کے نہیں آئی...... میرا بھائی پاگل ہوا پھر رہا ہے...... رفیق کے ماں باپ اور ہم سب کتنے دکھی ہیں...... اس کا تمہیں اندازہ نہیں...... اس نے مجھے گالیاں بھی بہت دیں۔ ذلیل بھی بہت کیا اور کہا کہ آئندہ اسے فون مت کرنا۔

ظاہر ہے یہ ساری گفتگو اکبر خان سن رہا تھا...... وہ بے وقوف نہیں ہے کہ تمہارا جواب سنے بغیر مجھ پر یقین کر لیتا...... میں کہتی کہ رفیق مان گیا ہے اور وہ مان لیتا...... رابعہ کی باتیں سن کے وہ چلا گیا اور اس نے اپنے جاسوس چھوڑ دیے کہ فریال کا پتا چلائیں...... اسے پتا چلا کہ فریال واقعی ناراض ہو کے چلی گئی ہے...... تمہاری حویلی کے اندر کی انفارمیشن باہر کیسے گئی...... یہ معلوم کرنا تمہارا کام ہے...... جاسوس باہر تو ہیں مگر اندر بھی کسی سے ان کا رابطہ ضرور ہے...... اس نے یہ بھی معلوم کر لیا کہ فریال گئی تو اسلام آباد تھی لیکن اسلام آباد نہیں پہنچی...... اس نے آخری فون گجرات کے ریلوے اسٹیشن سے کیا تھا...... ابھی چار دن پہلے اکبر خان آیا اور بولا کہ ہمیں اسلام آباد جانا ہے...... رفیق وہیں ہے...... وہ فریال کو تلاش کرنے گیا ہے...... پاگل کا بچہ...... فریال تو گجرات میں ہے...... اس کے فرشتے وہاں نہیں پہنچ سکتے......“

میں نے کہا ”تمہیں کس نے بتایا؟“

وہ بولا ”بی بی ہمارے ہزار ہاتھ ہیں اور ہزار آنکھیں ہیں۔ ہم سے نہ کوئی چھپ سکتا ہے اور نہ بچ سکتا ہے......“

میں نے کہا...... ”کیا فریال بھی قید میں ہے......“

وہ بولا...... ”یہ کس نے کہا تم سے......“

میں نے کہا...... ”تم کہہ رہے ہو نا کہ رفیق کے فرشتے بھی اس تک نہیں پہنچ سکتے......“

وہ ہنسنے لگا...... ”کیا ضروری ہے کہ وہ قید میں ہو...... وہ اپنی مرضی سے گئی ہے...... جس گھر میں ہے ہنسی خوشی رہتی ہے۔“ اب مجھے نہیں معلوم کہ وہ کتنا جھوٹ بول رہا تھا اور کتنا سچ لیکن وہ مجھے اسلام آباد لے آیا۔ اس کے جاسوس تمہارے پیچھے لگے رہے مگر تمہارا کچھ پتا نہیں چلا...... میرا خیال ہے کہ

رابعہ نے دوسروں کو بھی میرے فون کے بارے میں بتادیا تھا...... ایک بار میں نے ڈاکٹر شہناز سے بات کرنے کی کوشش کی پھر وہی ہوا جو پہلے ہوا تھا پھر ایک دن اکبر خان شراب کے نشے میں وحشت تھا...... اس نے مجھے مارا اور گالیاں دینے لگا کہ مجھے سب معلوم ہے رفیق کہاں ہے لیکن میں بتاتی نہیں...... جس گھر میں ہم ٹھہرے تھے وہاں مجھے سخت پہرے میں رکھا گیا تھا...... اسلام آباد اور پنڈی میں گراؤنڈ فلور کے نیچے ایک منزل بنانا عام ہے...... یہ تہ خانہ یا BASEMENT ذرا کم کرایے پر مل جاتا ہے...... ہم جس گھر میں تھے اس میں اوپر مالک مکان رہتا تھا مگر اپنی فیملی کے ساتھ گرمیاں لندن میں گزارنے گیا ہوا تھا...... مجھے نیچے سے اوپر آنے کی اجازت نہیں تھی...... اکبر خان باہر نکلنے کا ہر راستہ مقفل رکھتا تھا یہاں تک کہ میرا بیڈروم بھی...... گیٹ پر اس کا اپنا چوکیدار تھا...... اس کے باوجود وہ ڈرتا تھا کہ میں اس کی آنکھوں میں دھول جھونک کے یا اسے کوئی نشہ آور چیز کھلا کے نہ بھاگ جاؤں...... اور میرے ہاتھ سے لے کر کچھ نہیں کھاتا تھا...... اس کا ایک پرانا ڈرائیور بھی تھا اور خانساماں بھی...... پرسوں قدرت نے میری مدد کی...... اکبر خان کے کسی ملاقاتی کا ڈرائنگ روم میں موبائل فون جیب سے نکل کے صوفے پر گر گیا...... وہ اٹھ کر گیا تو اکبر خان اسے گیٹ تک چھوڑنے گیا...... میں ڈرائنگ روم میں گئی تو مجھے موبائل فون نظر آیا...... میں نے جھپٹ کر اسے اٹھالیا اور چھپادیا...... لیکن آف کرنے کے بعد...... تم اندازہ نہیں کرسکتے کہ خوشی اور جوش سے میری کیا حالت تھی...... میرے ہاتھ پیر کانپ رہے تھے...... اس خیال سے کہ اب میں تم سے رابطہ کرسکوں گی...... رابطہ میں بہت پہلے اکبر خان کے کہنے پر کرسکتی تھی لیکن میں نہیں چاہتی تھی کہ اسے تمہارا فون نمبر معلوم ہو...... اس نے مجھ پر بہت سختی کی مگر میں یہی کہتی رہی کہ تم نے نمبر بدل لیا ہے اور نیا نمبر مجھے بھی نہیں معلوم...... ایسا کرنے کی ایک وجہ تھی...... میں چاہتی تھی کہ پہلے تم کو اپنی ساری اسکیم بتادوں...... کہ میں اکبر خان کے سامنے کیا کہوں گی اور تمہیں جواب میں کیا کہنا ہوگا...... اس کے بعد اکبر خان کے سامنے ہمت کروں...... مجھے یقین تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح تمہارا فون نمبر معلوم کرہی لے گا۔

جو موبائل فون میں نے چھپایا تھا اسے اکبر خان دیکھ لیتا تو بھی کچھ نہ ہوتا میں کہہ دیتی کہ تمہارا مہمان گرا گیا تھا...... زیادہ امید یہی تھی کہ اصل مالک اسے واپس لینے آئے گا تو مجھے واپس دینا پڑے گا مگر وہ نہیں آیا...... اس روز اکبر خان تمہارا موبائل فون نمبر معلوم کرنے میں کامیاب ہوگیا...... اس نے جھوٹ بولنے پر مجھے بہت مارا...... اس نے کہا۔ ''تیرے عاشق کا نمبر تو یہی ہے...... تو نے جھوٹ بولا تھا مجھ سے۔''

میں نے کہا...... ''ہاں...... میں اس سے بات کرنا نہیں چاہتی......''

''اس کا مطلب ہے اب تک تو بے وقوف بنارہی تھی مجھے؟''

میں نے کہا...... ''کیا مجھے اس کا بھی حق نہیں...... جو تم نے میرے ساتھ کیا ہے......''

اس نے میری بات کاٹ دی...... ''جو اب تک کیا وہ کچھ بھی نہیں...... صرف ٹریلر تھا اصل فلم تو اب دیکھے گی جب میں تیرے عاشق کی لاش تیرے سامنے لاکر ڈالوں گا اور تو آخری سانس تک اسے گلتا سڑتا دیکھتی رہے گی...... اور اسے کفن نصیب ہوگا...... نہ تجھے...... تم دونوں کی لاشیں اس تہ خانے میں پڑی رہیں گی......''

اس رات مجھے تم سے بات کرنے کا موقع مل گیا...... وہ گہری نیند میں تھا...... میں احتیاط سے اٹھی...... موبائل فون لے کر واش روم میں گھس گئی مگر دروازہ تھوڑا سا کھلا رکھا...... اس وقت تک میں نے طے کرلیا تھا کہ اکبر خان کو قتل کیے بنا چارہ نہیں...... میری نجات کی اور کوئی صورت نہیں...... اگر اس رات تم میری مدد کا وعدہ نہ کرتے یا آنے سے انکار کردیتے تو اکبر خان کو مارنے کے بعد میں خود بھی مرجاتی...... میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا...... ریوالور کا تو سوال ہی نہیں...... بس مجھے کچن کی وہ چھری نظر آئی جو سبزی کاٹنے میں استعمال ہوتی ہے...... وہ ایک ہی چھری تھی جس سے ناشتے میں ڈبل روٹی پر مکھن بھی لگایا جاتا تھا مگر وہ نئی خریدی گئی تھی اور بہت تیز تھی......

رات کو اس نے خوب شراب پی اور مجھے مجبور کرتا رہا کہ تمہیں فون کرکے بلاؤں...... اب مجھے یقین ہی نہیں تھا کہ اکبر خان وعدے کے مطابق مجھے تم سے ملنے دے گا اور بالفرض محال...... میں تم سے سائنس ریسرچ سینٹر کی ملکیت کے کاغذات پر دستخط کرالوں...... تو وہ مجھے تمہارے ساتھ جانے دے گا...... مجھے یقین تھا کہ میرے بعد وہ تمہیں بھی قتل کرادے گا۔

صبح تک میں جاگتی رہی...... میں نے کئی بار اکبر خان کو چیک کیا کہ وہ واقعی نیند میں ہے یا میری طرح ایکٹنگ کررہا ہے وہ میرے مقابلے میں بہت طاقتور مرد تھا...... میرا ہاتھ

کانپ جاتا...... بہک جاتا یا کمزور پڑجاتا تو وہ پل بھر میں مجھے نیچے گرا کے ذبح کردیتا میں نے اپنے ارادے اور اپنے ہاتھوں کو اور اعصاب کو مضبوط کیا اور کچن تک گئی...... وہاں خانساماں فرش پر بستر ڈالے سو رہا تھا...... میں اس کے اوپر سے گزری اور اندھیرے کے باوجود برتنوں کی الماری سے چھری ایسے اٹھائی کہ آہٹ تک نہ ہوئی...... واپسی میں خانساماں کو عبور کیا اور کمرے تک آئی...... ایک عجیب بات بتاؤں...... تم ہنسو گے۔ میں نے دل ہی دل میں خدا سے دعا مانگی کہ مجھے ہمت اور میرے ارادوں کو کامیابی دے کیونکہ یہ سب میں دنیا سے ایک ظالم' بدچلن عیاش بے کردار اور بے ضمیر شخص کی قید سے رہائی حاصل کرنے کے لیے کررہی ہوں اور یہ میرا حق ہے ورنہ میں نے تو آج تک مرغی ذبح نہیں کی۔ سوچو ذرا خدا سے بھی لوگ کیسی کیسی دعا کرتے ہیں...... جواری' سٹے باز قسمت پھیر دینے کے لیے صرف ایک بار نمبر لگ جانے کی دعا مانگتے ہیں...... ایک بار تم نے بتایا تھا یا کسی اور نے...... قبرستان کا گورکن دعا مانگ رہا تھا کہ مولا تو نے رزق دینے کا وعدہ کیا ہے...... بھیج کوئی میت۔

عجیب بات یہ ہے کہ اس دعا سے مجھے سکون بھی ملا اور ہمت بھی ملی۔ ایک یقین تھا میرے دل میں کہ جو میں کررہی ہوں جائز ہے جیسے سانپ بچھو یا پاگل کتے کو ماردینا جائز ہے ایسے ہی اکبر خان کا وجود ضرررساں ہے...... میں نے کمرے میں جاکے دیکھا تو وہ عادت کے مطابق چت سو رہا تھا...... مجھے خیال آیا کہ گلا کٹے گا تو اس کا ناپاک خون فوارے کی طرح نکلے گا...... میں نے ایک چادر اپنے سر پر ڈال لی...... چھری سے اس میں دو سوراخ کیے جو آنکھوں کے سامنے آگئے...... پھر میں نے جھک کے کہا...... چل جہنم رسید ہو مردود...... اور ایک دم اس کے گلے پر پوری قوت سے چھری چلادی۔

وہ ایک دم تڑپ کے اچھلا لیکن میرا وار کاری تھا...... پھرتی سے اس کا گلا اور نرخرہ سب کاٹ دیے تھے میں نے...... اس کے خون کی تیز دھاریں چادر نہ ہوتی تو میرے چہرے پر گرتیں...... میری آنکھوں، بالوں اور کپڑوں پر خون ہی خون ہوتا...... ذرا سی ہوش مندی نے مجھے بچالیا...... یہ محسوس کرتے ہی کہ میں اپنے ارادے میں کامیاب ہوگئی ہوں میں نے چادر کو اتار کے پھینکا اور دور کھڑی ہوکے اس شخص کو مرتا دیکھنے کی خوشی حاصل کرتی رہی جس سے میں دنیا میں سب سے زیادہ نفرت کرتی تھی...... وہ میری طرح تڑپ رہا تھا...... اس کے ہاتھ پاؤں اسی طرح کھنچ رہے تھے جیسے اس پر مرگی کا دورہ پڑا ہو اور اس کے حلق سے خرخراہٹ نکل رہی تھی...... اس کی کھلی آنکھیں چھت پر مرتکز تھیں اور خون کے ساتھ ساتھ اس کے جسم سے زندگی رخصت ہورہی تھی...... میں نے اپنے بچپن میں بالکل اس طرح بقرعید پر قربان کیے جانے والے بکرے کو مرتے دیکھا تھا۔

تین چار منٹ میں وہ ساکت ہوگیا۔ پھر بھی اس کا جسم کبھی کبھی پھڑکتا رہا...... میں نے وہی چادر اس کے اوپر ڈال دی...... پھر میں نے اپنا بیگ نکالا اس میں اپنی تمام ضروری چیزیں میں پہلے ہی رکھ چکی تھی...... اب میں نے اکبر خان کے تکیے کے نیچے سے بھرا ہوا ریوالور نکالا...... پھر اس کی الماری کی چابی نکالی...... الماری میں سے سارا کیش اکٹھا کیا اور باہر نکل آئی...... میں نے کمرے کو باہر سے لاک کرکے چابی اپنے ساتھ لے لی۔

اس وقت تک صبح کا اجالا پھیل گیا تھا...... میں نے باہر نکل کے دیکھا تو چوکیدار گیٹ کے سامنے اندر کی طرف ٹہل رہا تھا۔ پہلے تو میں نے یہی سوچا تھا کہ اسے بھی اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے گولی ماردوں گی لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ فائر کی آواز لوگوں کو متوجہ کرے گی...... اس غریب آدمی کی جان لینا مجھے گوارا نہ ہوا میں نے سوچا کہ گھر سے نکلنے کا متبادل راستہ کیا ہوسکتا ہے۔

میں پیچھے کی طرف گئی...... تقریباً دس فٹ چوڑی گیلری کی دیوار آٹھ فٹ اونچی تھی...... دیوار کے دوسری طرف بھی کوئی کوٹھی ہوگی۔ اس کی بھی اتنی ہی چوڑی گیلری ہوگی لیکن آگے اس کوٹھی کے گیٹ پر میرا راستہ روکنے والا کوئی چوکیدار ہوا تو کیا ہوگا...... یہی سوچ کے میں سائیڈ کی گیلری میں آگئی...... اس طرف کی دیوار نسبتاً کم اونچی تھی...... وہاں ایک اسٹول بھی پڑا تھا۔ میں نے اوپر چڑھ کے جھانکا...... ساتھ والی کوٹھی میں خاموشی تھی...... اس کے گیٹ پر کوئی چوکیدار نہیں تھا اور وہاں سے میں نے کبھی کتے کے بھونکنے کی آواز نہیں سنی تھی...... میں ادھر اتر گئی۔

تقریباً بھاگتی ہوئی میں گیٹ تک گئی بڑا گیٹ جو گاڑی اندر لانے میں استعمال ہوتا تھا مقفل تھا...... کار اندر موجود تھی...... بڑے گیٹ کے ساتھ ہی مجھے چھوٹا دروازہ نظر آیا...... وہ مقفل نہیں تھا...... میں نے اسے احتیاط سے کھولا اور گلی میں آگئی...... گلی دور تک ویران تھی...... فوری طور پر مجھے اپنے جرم کا راز فاش ہونے کا کوئی خطرہ نہیں تھا...... اکبر خان دیر سے اٹھنے کا عادی تھا...... دس بجے سے پہلے خانساماں یا چوکیدار کو شک بھی نہیں ہوگا...... شاید بارہ ایک

بجے کے بعد وہ دروازہ بجائیں..... اگر معاملہ پولیس تک بھی گیا تو ایک دو بجے سے پہلے کوئی بھی خواب گاہ کا دروازہ توڑ کے اندر نہیں جائے گا۔

میں نے مخالف سمت میں چلنا شروع کیا..... اس وقت تک سورج نکل آیا تھا..... گلی میں دودھ والے اخبار والے آ جا رہے تھے..... میں چلتی گئی پھر ایک پارک آ گیا وہاں بہت لوگ جاگنگ اور واکنگ کر رہے تھے..... زیادہ عمر کے لوگ بینچوں پر بیٹھے دیکھ رہے تھے..... میں بھی ایک بینچ پر بیٹھ گئی اور ایک گھنٹا بیٹھی رہی..... حیرت کی بات یہ ہے کہ اندر سے میں خوفزدہ تھی..... نروس تھی اور میری نظروں کے سامنے اکبر خان کی موت کا منظر ٹھہر گیا تھا لیکن مجھے خود پر کنٹرول کرنا تھا۔

پہلے میں نے سوچا کہ تمہیں فون کر کے فوراً بلا لوں..... پھر یہ ارادہ بدل دیا..... میں پارک سے نکلی تو مجھے پیاس اور کمزوری محسوس ہو رہی تھی..... میں نے ایک اسٹور سے کوک کا ٹن لیا مگر پی نہیں سکی..... مجھے الٹی آ گئی..... دکاندار پریشان ہو گیا..... میں کچھ دیر وہاں بیٹھی..... مجھے پسینا آنے لگا تھا اور مجھ پر گھبراہٹ طاری تھی..... دکاندار نے پوچھا کہ آپ کہاں رہتی ہیں..... میں نے کہا کہ کیا تم میرے لیے ٹیکسی منگوا سکتے ہو..... اس نے فوراً فون اٹھایا اور ریڈیو کیب منگوالی..... اسے آنے میں تقریباً آدھا گھنٹا لگا..... میں نے دکاندار کا شکریہ ادا کیا اور ٹیکسی میں بیٹھ گئی..... یہ اتفاق دیکھو کہ ٹیکسی والا تمہیں جانتا تھا..... تمہیں دیکھتے ہی میرا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا..... میں خود پر قابو نہ رکھ سکی۔

☆☆☆

میں سب کچھ سن رہا تھا اور اس کی حالت میں بتدریج رونما ہونے والی تبدیلی پر بھی غور کر رہا تھا۔ وہ جذبات کے مدوجزر میں تنکے کی طرح بہتی جا رہی تھی..... میں نے کئی بار اسے روکنے کی کوشش کی کہ چلو باقی بات پھر کریں گے۔ تم تھک گئی ہو..... تھوڑی دیر آرام کر لو مگر وہ بولتی گئی..... میں نے سوچا کہ زبردستی کا بھی کوئی فائدہ نہیں..... اب وہ دل کی بھڑاس نکالنا چاہتی ہے تو اچھا ہے..... ورنہ یہ غبار اس کے دل میں بھرا رہے گا..... وہ مجھے یہ سب بتانے کے لیے مضطرب رہے گی اور مجھے بھی یہ معلوم تو ہونا چاہئے کہ اس نے اکبر خان کے ساتھ کیا کیا۔

اپنی بات ختم ہونے تک وہ پھر ہسٹیریا کا شکار ہو گئی تھی اور روتے ہوئے بار بار مجھ سے پوچھ رہی تھی..... ''تم مجھے مرنے تو نہیں دو گے نا..... تم مجھے پھانسی تو نہیں ہونے دو گے نا..... میں مرنا نہیں چاہتی..... مجھے زندگی سے پیار ہے کیونکہ اب میں آزاد ہوں..... اپنی مرضی سے جینے کے لیے.....''

اچھا یہ ہوا کہ ڈاکٹر معمول کے مطابق راؤنڈ پر آ گیا..... اس کے ساتھ وہی ٹیم تھی جو گزشتہ روز تھی..... اس نے اندر کا منظر دیکھ کے سمجھ لیا ہوگا کہ مریضہ پھر ٹینشن کا شکار ہے لیکن اس نے خوش دلی سے پوچھا..... ''ہیلو سویٹ ہارٹ..... ہاؤ آر یو..... دیکھو میں آ گیا..... چلو مسٹر شوہر تم ہٹ جاؤ.....'' اس نے بیڈ کے پاس آ کے نور جہاں کی آنکھیں دیکھیں..... ''بیوٹی فل..... میں آنکھوں کو نہیں کہہ رہا ہوں آنسوؤں کو کہہ رہا ہوں..... اچھا مجھے زبان چڑا سکتی ہو..... اگر مسکرا کے دکھانا مشکل ہے.....''

نتیجہ خاطر خواہ نکلا..... نور جہاں نے خود کو سنبھال لیا..... ڈاکٹر کے کسی خفیہ اشارے پر یا پہلے کی ہدایت کے مطابق ایک نرس نے بلڈ پریشر دیکھا تو دوسری نے ڈرپ لگا دیا اور اس میں دو تین انجیکشن ڈال دیے..... یقیناً ان میں سے ایک سکون آور ہوگا..... ڈاکٹر جتنی دیر موجود رہا اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں بولتا رہا..... نتیجہ یہ کہ جب دس منٹ بعد وہ فارغ ہوا تو نور جہاں واقعی مسکرا رہی تھی۔

اس نے کہا ''آپ آدھے گھنٹے بعد مجھ سے ملیں..... میں ذرا اپنا راؤنڈ مکمل کر لوں.....''

ڈاکٹر کے جانے کے بعد میں نے نور جہاں سے کہا..... ''بس اب تم سو جاؤ گی..... تمہیں آرام کی ضرورت ہے.....''

''آرام اسپتال میں..... سکون آور انجیکشنوں کی مدد سے.....'' اس نے تلخی سے کہا۔

میں نے کہا..... ''ایک موبائل فون تمہارے تکیے کے نیچے موجود ہے۔''

اس نے تکیے کے نیچے دیکھا..... ''یہ تم لائے ہو.....''

میں نے کہا..... ''مجھے بتاؤ تمہیں اور کیا چاہیے..... تمہارے جوتے کا کیا سائز ہے..... کپڑے وغیرہ خرید لاؤں گا..... اس کے علاوہ.....''

''مجھے کچھ نہیں چاہیے.....'' وہ خوابیدہ لہجے میں بولی۔

اسپتال کے گیٹ سے باہر آتے ہی مجھے اخبار مل گیا۔ اس میں اکبر خان کے قتل کی خبر اندر کے صفحے پر تھی اور اس میں سب وہی تھا جو متوقع تھا..... نوکروں نے ایک بجے پولیس کو رپورٹ کی تھی..... دو بجے پولیس نے دروازہ توڑ کے لاش دریافت کی..... ایک تصویر میں اکبر خان کی لاش اور مسخ شدہ چہرہ تھا..... ملازمین نے مقتول کی بیوی پر شک کا اظہار کیا

تھا جو گھر سے فرار ہو چکی تھی۔ پولیس سرجن کے مطابق مقتول کی موت چھ سے آٹھ گھنٹے قبل ہوئی تھی۔

باقی وہی تھا کہ پولیس تفتیش کر رہی ہے..... مزید سنسنی خیز انکشافات کی توقع ہے..... اخبار میں نور جہاں کی کوئی تصویر نہیں تھی لیکن مجھے یقین تھا کہ بہت جلد پولیس کو تصویر کے ساتھ قتل کے اسباب بھی معلوم ہو جائیں گے..... یہ ہو سکتا تھا کہ شک کا اظہار براہِ راست مجھ پر کیا جائے اور میری تصویر بھی لگوا دی جائے تاہم اس کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا..... کسی ثبوت کے بغیر میری تصویر کی اشاعت اخبار کے لیے قانونی مسائل پیدا کر سکتی تھی.....

یہاں اکبر خان کے گھر سے پولیس شاید نور جہاں کی کوئی تصویر حاصل نہ کر سکی لیکن لاہور والے گھر سے انہیں اپنے مطلب کی تصویر ضرور مل جائے گی جو ملزمہ کی گرفتاری میں مددگار ثابت ہو..... نور جہاں کی تازہ ترین تصویر کتنی پرانی تھی یہ مجھے بھی معلوم نہیں تھا لیکن سال دو سال پرانی تصویر سے بھی کام چل سکتا تھا۔ اس عرصے میں نور جہاں کے چہرے کے نقوش میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

تصویر شائع ہونے تک خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ عام طور پر قتل کی کسی عام واردات کا فالو اپ اگلے دن نہیں ملتا۔ اگلے روز جرائم کی دوسری خبریں اس کی جگہ لے لیتی ہیں..... یہ واردات لاہور میں ہوتی تو پولیس کو تلاش کے دوران نور جہاں کی تصاویر مل جاتیں اور وہ خبر کے ساتھ ہی شائع ہوتیں۔ یہاں اکبر خان ایک گمنام کرایے دار تھا..... وہ بہت کم اسباب کے ساتھ آیا تھا اور اس کے بارے میں مقامی کرائم رپورٹرز کی معلومات بھی محدود تھیں۔ یہ میرے اور نور جہاں کے حق میں اچھا تھا..... ضابطے کی کارروائی پوری کرنے کے لیے لاہور کی پولیس اکبر خان کے گھر جائے گی..... پوسٹ مارٹم کے بعد لاش بھی لاہور لے جائی جائے گی اور تدفین کے بعد مزید کارروائی ہوگی..... اس میں دو چار دن گزر جائیں گے..... پھر اخبار والے ایک پرانے قتل کے سلسلے میں مطلوب مقتول کی بیوی کی تصویر خود تو نہیں لگائیں گے..... ہاں اس واردات کا پس منظر جاننے والے میرے دشمن یہ کام ضرور کریں گے۔

دو بجے راجا کا فون ملا وہ پریس کلب میں میرا انتظار کر رہا تھا۔ ہم کھانے کے لیے اسلام آباد چلے گئے..... راجا نے اخبار دیکھ لیے تھے..... اکبر خان کے قتل کی خبر سب نے دی تھی لیکن اس قتل کے پیچھے پوشیدہ اغراض و مقاصد کے بارے میں صرف قیاس آرائی تھی..... تمام معلومات کی بنیاد دو ملازموں کا بیان تھا..... ان میں ایک خانساماں تھا اور دوسرا چوکیدار..... پولیس ان دونوں کو ساتھ لے گئی تھی..... خبر میں یہ ہی نہیں تھا کہ مقتول کا بزنس کیا تھا اور وہ لاہور میں اپنا گھر ہوتے ہوئے اسلام آباد میں کرایے کا گھر لے کر کیوں مقیم تھا۔ صرف ایک اخبار کے رپورٹر نے تحقیق سے یہ پتا چلا لیا تھا کہ اکبر خان اپنے اصل نام کے بجائے عبدالرحیم کے نام سے کرایے دار بنا تھا..... یہ بات ملازم بھی نہیں جانتے تھے..... رپورٹر نے مالک مکان کا پتا چلا کے لندن فون کیا تھا..... اس سے قتل کی یہ واردات مزید پُراسرار ہو گئی تھی۔

کھانے کے دوران راجا نے کہا ''تو نے اخبارات ملاحظہ کیے فیکے پتر؟''

میں نے بڑے انکسار سے جواب دیا..... ''جی راجا صاحب.....''

''چشم بد دور..... کتنی رونق بخشی ہے آپ کی نور جہاں نے آج کی خبروں کو، ہر جگہ اسی کا تذکرہ ہے.....''

''سنسنی خیزی والی زرد صحافت کے دور میں ایسا بھی ہو رہا ہے.....'' میں نے ایک ٹھنڈی سانس کے ساتھ افسوس سے سر ہلایا۔

راجا نے خفگی سے کہا..... ''میں یہ سالن کا ڈونگا تیرے سر پر پلٹ دوں گا..... تو ایسا کیوں ظاہر کر رہا ہے جیسے یہ کوئی خاص بات نہیں..... صرف اخبار والے بڑھا چڑھا کے لکھ رہے ہیں.....''

میں نے متانت سے سر ہلایا ''بے شک نور جہاں نے اچھا نہیں کیا.....''

''ابے نور جہاں گئی بھاڑ میں..... تو کیا کر رہا ہے؟''

میں نے کہا..... ''ابھی تو کھانا کھا رہا ہوں..... جیسا کہ آپ دیکھ سکتے ہیں۔''

اس نے اِدھر اُدھر دیکھا..... ''اگر یہاں کہیں کوئی توپ ہوتی میری دسترس میں تو تجھے ابھی گولے پہ بٹھا کے چلا دیتا..... ذرا سوچ تیرے سنگین جرائم کی فہرست کتنی طویل ہے.....''

میں نے افسوس سے کہا..... ''میں کھانا کھا سکتا ہوں یا پھر سوچ سکتا ہوں.....''

اس نے اپنی بات جاری رکھی..... ''میں نہیں سمجھتا کہ نور جہاں کو اسپتال میں چھپا کے رکھنا کوئی عقلمندی ہے..... یہ حماقت ہے.....''

میں نے سر ہلایا..... ''نہ یہ عقلمندی ہے اور نہ حماقت..... یہ ایک ضرورت ہے راجا صاحب.....''

''اب علاج تو کرا رہا ہے...... اس کا شوہر بن کے حالانکہ شوہر کو وہ قتل کر چکی ہے...... اگر کسی نے اسے پہچان لیا تصویر دیکھ کے...... تو کیا ہوگا۔''

میں نے اسی غیر سنجیدگی سے کہا...... ''یہ ثابت ہو جائے گا کہ مقتول شوہر میں نہیں تھا......''

راجا نے غصے سے کہا...... ''الو کے پٹھے...... تیرے خلاف ایک کیس ہوگا جعلسازی کا...... دھوکا دہی کا...... اس کے بعد پولیس تجھ پر حدود آرڈیننس کی تمام دفعات لگا دے گی...... پھر اخبارات کی سرخیاں کیا ہوں گی......''

میں نے کہا...... ''یہی کہ بیوی نے آشنا کے ساتھ مل کے شوہر کو قتل کر دیا...... آشنا کے ساتھ اسپتال میں رنگ رلیاں مناتے ہوئے گرفتار......''

''اگر تو سیریس نہیں ہوگا تو میں چلا جاؤں گا......''

میں نے کہا...... ''راجا...... تو کیوں خوامخواہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ میرے سر میں عقل نام کی کوئی چیز نہیں...... مجھے بتا میں اسے کہاں لے جاتا اس کی جو حالت تھی وہ تو نے نہیں دیکھی...... اس کا علاج کیا میں خود کرتا......''

راجا کی ناراضی کم نہیں ہوئی...... ''یار وہ دو چار دن میں خود ہی ٹھیک ہو جاتی...... صرف نروس بریک ڈاؤن تھا نا...... کوئی بیماری تو نہیں تھی...... یہ ایک قدرتی ردِعمل تھا...... ہم خود اسے سکون آور گولیاں دیتے تو ٹھیک ہو جاتی......''

میں نے کہا...... ''اوکے...... اب آگے کی بات کر...... مجھے کیا کرنا چاہیے۔''

راجا نے کہا...... ''سب سے پہلے تو اسے نکال اسپتال سے...... اور خود بھی نکل ابھی وقت ہے......''

''رائٹ...... اسپتال سے اسے کہاں لے جاؤں میں تیری سسرال......''

وہ بولا...... ''ابھی کچھ سوچتے ہیں...... یار وہ جو تیرے ابا کے پروفیسر دوست ہیں......''

میں نے کہا...... ''ہاں...... لالہ زار کالونی میں رہتے ہیں''

''تو نے بتایا تھا کہ ان کے گھر کے اوپر والے حصے میں کرایے دار ہیں۔''

میں نے کہا...... ''ابھی وہ خالی نہیں ہے''۔

راجا نے کہا...... اگر وہ چاہیں تو خالی کرا سکتے ہیں...... کیا چند دن نور جہاں ان کے گھر میں نہیں گزار سکتی......''

میں نے کہا...... ''تیرا دماغ خراب ہے؟ وہ ابا کے دوست ہیں۔ ابا کو فوراً بتا دیں گے کہ آپ کے برخوردار کسی خاتون کو بطور امانت رکھوا گئے ہیں...... بڑی حسین و جمیل ہیں...... نام ہے نور جہاں...... مگر ان کی زوجہ نہیں ہیں......''

راجا بولا...... یار کوئی جھوٹی کہانی وہاں بھی سنائی جا سکتی ہے۔''

میں نے کہا...... ''یقیناً سنائی جا سکتی ہے لیکن پروفیسر صاحب سے یہ کہا جائے کہ میرے ابا کو کچھ پتا نہ چلے...... تو وہ فوراً بتائیں گے...... لیکن......''

''لیکن کیا......'' راجا نے کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد پوچھا

میں نے کہا ''ایک بندہ ہے...... برہان الدین......''

''یہ نام کچھ سنا ہوا لگتا ہے......''

میں نے راجا کو برہان الدین کے بارے میں بتایا...... ''وہ ہماری مدد کرنے پر راضی ہو سکتا ہے...... وہ اکیلا رہتا ہے...... صرف ایک ملازم کے ساتھ...... پرانا بیوروکریٹ ہے...... زمانے کا سرد و گرم چشیدہ...... گڈ اولڈ مین......''

''لیکن اس نے اخبار میں نور جہاں کی تصویر دیکھی اور پولیس کی اسٹوری پڑھی تو وہ فوراً پولیس کو فون کرے گا کہ آپ کی مطلوبہ خاتون یہاں موجود ہے...... آئیے اور لے جائیے......''

''اس کے ساتھ جھوٹ نہیں چلے گا...... صرف سچ بتانے کی صورت میں یہ ممکن ہے کہ وہ ہماری مدد کرے...... یہ چانس لیا جا سکتا ہے راجا......''

ہم چانس لیں گے فیکے پتر...... چل اٹھ......''

برہان الدین سے میری صرف ایک دفعہ کی ملاقات اس کے کردار کو سمجھنے کے لیے یقیناً کافی نہیں تھی لیکن اس نے مجھ پر اچھا تاثر چھوڑا تھا وہ سچا اور کھرا آدمی ہے جس نے ملازمت میں کسی قسم کا دباؤ قبول نہیں کیا۔ اپنے اصولی موقف پر ڈٹے رہنے کی پاداش میں نقصان بھی اٹھایا لیکن کبھی ہمت نہیں ہارا...... اس نے خود کو تیس مار خان ثابت کرنے کے لیے زمین آسمان کے قلابے نہیں ملائے اور نہ اپنی چالاکی و چالبازی سے دنیا کو بدل دینے کے دعوے کیے۔

وہ دوپہر کے کھانے کے بعد سو جاتا تھا...... جب ہم پہنچے تو وہ اٹھ گیا تھا اور عصر کی نماز پڑھ رہا تھا...... اس کے دبلے پتلے بنگالی ملازم نے ہمیں ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا...... گھر میں مکمل خاموشی تھی...... وہ تقریباً پندرہ منٹ بعد نمودار ہوا اور مجھے دیکھ کے حیران ہوا۔

میں نے راجا کا تعارف کرایا...... ''یہ بڑے نامور

صحافی تھے......''

''تھے کیا مطلب؟...... صحافی بھی شاعر، موسیقار یا کرکٹر کی طرح پیدائشی ہوتا ہے اور مرتے دم تک رہتا ہے......''

میں نے کہا...... ''بالکل صحیح کہا آپ نے...... پہلے یہ میڈیا میں تھے...... ان کی رپورٹنگ نے تہلکہ مچا رکھا تھا......''

''میں جانتا ہوں'' وہ بولا ''وہی کام اب یہ کالم لکھ کر کر رہے ہیں...... لوگ کہتے ہیں راجا بجا دے باجا......''

راجا نے کہا...... ''سب کہنے کی بات ہے سر...... آپ جانتے ہیں یہ دنیا نہ کسی انکشاف کے ایٹمی دھماکے سے بدلی ہے نہ کسی کالم کے میزائل کی مار سے...... پبلک واہ واہ کرتی ہے مگر کون سنتا ہے فغاں درویش...... عوام کی آہ یا واہ کے شور سے حاکموں کے کانوں پر جوں بھی نہیں رینگتی......''

وہ مسکرایا...... ''مایوس نہ ہوں راجا صاحب...... یہ جوئیں حاکموں کے کان کھا جائیں گی...... صرف کان پر کیا ان کے سارے بدن پر رینگنے لگیں تو انہیں پاگل کر دیں گی...... خیر...... یہ فرمایئے کیسے زحمت کی دوبارہ......؟''

میں نے کہا...... ''ایک غرض پھر آپ کے دروازے پر لے آئی ہے...... لیکن اس سے پہلے کہ میں اپنی غرض بیان کروں......''

اس نے میری بات کاٹ دی...... ''اس سے پہلے ضروری ہے کہ میں آپ سے پوچھوں کہ آپ کیا پسند کریں گے...... چائے یا کافی...... دراصل یہاں میری شریکِ حیات...... بیٹی، بہو...... دوست اور مددگار سب کا رول ایک عبدل نبھا رہا ہے وہ تیس سال سے میرے ساتھ ہے، دوران ملازمت بھی میرے ساتھ چپراسی رہا اور جب ریٹائر ہوا میرے ساتھ تو یہاں آ گیا......''

میں نے کہا...... ''ہم فرمائش کرنے والے مہمان نہیں ہیں......''

وہ اندر گیا اور لوٹ آیا...... ''ایک سوال ضرور ہوگا آپ لوگوں کے ذہن میں...... میری فیملی کے بارے میں...... کہ میرے بیوی بچے کہاں ہیں...... تو جواب یہ ہے کہ اللہ نے مجھے اس نعمت سے محروم رکھا...... یہ پتا نہیں میرے کس گناہ کی سزا تھی جو مجھے اس دنیا میں دے دی گئی...... میں نے شادی نہیں کی......''

میں نے کہا...... ''یہ آپ کا فیصلہ ہوگا...... قدرت کو اس کا الزام دینا کس حد تک جائز ہے؟''

وہ مسکرایا...... ''دراصل...... شادی تو میں کرنا چاہتا تھا...... لیکن جس لڑکی سے کرنا چاہتا تھا اس کا جوڑا قدرت نے کہیں اور بنایا تھا......''

راجا نے اس کی بات کاٹ دی...... ''اس کیس میں فریق ثانی کی مرضی کیا تھی...... کیا میں پوچھ سکتا ہوں......؟''

وہ خوشدلی سے ہنسا...... ''آپ پوچھ چکے ہیں راجا صاحب...... فریق ثانی کی مرضی کچھ اور ہوتی تو میں قدرت کو الزام کیوں دیتا۔''

میں نے کہا...... ''آپ نے اس کی جگہ اور کسی کو نہیں دی؟ یہ فیصلہ تو خود آپ کا تھا...... کیا اپنی وفا کو سزا کا نام دینا جائز ہے......؟''

اس کے چہرے پر دکھ کا سایہ سا آ کے گزر گیا۔ یہ اس کی زندگی کا مندمل ہو جانے والا زخم تھا جس کو کریدنے سے اسے تکلیف ہوتی تھی...... اس نے کسی لڑکی سے محبت کی...... لڑکی بھی اسے چاہتی تھی لیکن اس کی شادی نہ چاہنے کے باوجود کسی اور سے کر دی گئی...... اس نے پھر کسی کو قبول نہیں کیا...... وہ مرد تھا...... انکار کر سکتا تھا...... محبت اتنی منہ زور تھی کہ اس نے دل کے سارے دروازے ہر عورت کے لیے بند رکھے۔

راجا نے غلطی محسوس کرتے ہوئے فوراً موضوع بدل دیا ''کیا اب ہم اپنے آنے کی وجہ بتائیں......''

میں نے کہا...... ''مجھے آپ کی راہنمائی اور مدد درکار ہے۔''

اس نے کہا...... ''جب تک مجھے حقائق کا علم نہ ہو میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتا کہ مدد ضرور کروں گا......''

اس دلچسپ ترین کہانی کے بقیہ واقعات پانچویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

قسمت کے پھیر میں اُلجھے ایک نوجوان کی داستان

اناڑی

احمد اقبال

5

اناڑی الناز

قسمت کے پھیر میں اُلجھے ایک نوجوان کی کتھا، حالات اور واقعات کا بہاؤ اُسے دیارِ غیر لے گیا جہاں وہ اناڑی تھا مگر خود کو کسی کھلاڑی سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ ایسا کھلاڑی جسے کسی بساط پر شکست نہیں دی جا سکتی تھی۔ اس کا اناڑی پن اُسے کھلاڑیوں کے مقابل کامیابیاں دلاتا رہا۔ اُسے پردیس راس آ گیا تھا جہاں کی ہنگامہ خیزیاں اس کا دل لبھاتی تھیں مگر دوسری طرف دیس میں اُس کی لاٹری کھل گئی، ایسی لاٹری کہ جس کے بعد اُسے لوٹنا تھا۔ اناڑی سے کھلاڑی بننے کے بعد...... وہ لوٹا...... تو ہنگامے اور شرارتیں اُس کے ساتھ تھیں۔ قدم قدم پر آنسو اور لمحہ لمحہ قہقہوں سے لبریز اُس اناڑی کی کہانی جس کا دل دو حصوں میں منقسم تھا۔

خوب صورت و گل رنگ جذبوں سے گندھی ایک تیز رفتار کہانی

میں نے کہا...... ''ایک لڑکی ہے...... دنیا میں اس کا کوئی نہیں...... اس کی شادی ایک بدقماش بدکردار اور بے ضمیر شخص سے ہوگئی...... لڑکی بہت حسین تھی' غیر معمولی طور پر خوبصورت تھی...... اپنی دولت کے بل پر اس شخص نے لڑکی کو خرید لیا اور بیوی بنا لیا...... لیکن بعد میں وہ لڑکی کو کاروباری مقاصد کے لیے استعمال کرنے لگا...... اس کا تعلق جرائم پیشہ افراد سے تھا...... لڑکی کیا کرتی...... شوہر کے مفادات پر قربان ہوتی رہی...... وہ بھاگ کے کہیں نہیں جا سکتی تھی...... اس کے شوہر کا تعلق انڈرورلڈ کی جس مافیا سے تھا وہ طاقتور تھی اور پاکستان ہی نہیں...... باہر بھی ان کا نیٹ ورک بہت مضبوط تھا...... وہ کہاں جاتی اور چھپ کے کیسے رہتی...... وہ اپنی زندگی کے اس انداز سے سخت متنفر تھی۔ وہ ایک عزت دار عورت کی طرح رہنا چاہتی تھی......''

''اگر وہ اتنی ہی خوبصورت تھی تو یقیناً ایسے بہت ہوں گے جو اسے پناہ دے سکتے تھے......''

''ہاں...... اس کے حسن و شباب پر سب فریفتہ تھے...... لیکن اسے اس دلدل سے نکال کے اپنی زندگی کا حصہ بنانے والا کوئی نہیں تھا...... زیادہ تر لوگ ڈرتے تھے اس کے شوہر سے...... اپنے خاندان والوں سے...... بدنامی سے...... ذمے داری سے...... نتیجہ یہ کہ ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کے احساسِ جرم و گناہ کی شدت میں اضافہ ہوتا گیا...... ایک وقت ایسا آیا جب ڈپریشن میں اس نے اپنی زندگی کا خاتمہ کرنے کی کوشش بھی کی...... پھر کرنا خدا کا ایسا ہوا کہ اسے ایک شخص سے محبت ہوگئی۔''

''جو پہلے کسی سے نہیں ہوئی تھی؟......'' برہان الدین نے کہا۔

''غالباً...... اور جس سے اس لڑکی کو محبت ہوئی وہ اس کے شوہر کے بدترین دشمنوں میں شمار ہوتا تھا' اپنے محبوب کی توجہ حاصل کرنے کے لیے وہ شوہر کے خلاف اس کی مدد کرنے لگی...... وہ جان ہتھیلی پر رکھ کے اس سے ملتی رہی اور اس کو اندر کی باتیں بتاتی رہی یعنی وہ راز جو اس کے نام نہاد شوہر کا بیڑا غرق کر سکتے تھے...... اس نے ایک سے زائد بار اپنے محبوب کی جان بھی بچائی...... اسے اپنے شوہر کے قاتلانہ عزائم سے آگاہ کر دیا......''

''پھر شوہر کو سب معلوم ہوگیا'' برہان الدین بولا۔

میں نے کہا ''یس...... اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں...... شوہر نے پہلے اپنے رقیب کو قتل کرانے کی کوشش کی...... لیکن وہ شخص بچ گیا...... بعد میں شوہر نے عورت کے ذریعے اس کے محبوب کے ساتھ ایک کاروباری ڈیل کرنے کی کوشش کی...... یہ کروڑوں کی ڈیل تھی اور اس سے مستقبل کے مفادات وابستہ تھے...... اس نے اپنی بیوی کو مجبور کیا کہ وہ اپنے محبوب کو اس ڈیل پر رضامند کرے...... اس سے کچھ قانونی کاغذات پر دستخط حاصل کر لے...... عام حالات میں یہ ناممکن تھا...... شوہر نے کہا کہ یہ کام صرف تم کر سکتی ہو...... وہ تمہاری بات مانے گا...... اس نے قانونی دستاویز پر دستخط کرنا منظور کر لیا تو میری طرف سے تم آزاد ہو جاؤ گی...... باقی زندگی اس کے ساتھ گزار سکو گی...... عورت جانتی تھی کہ یہ سب مکر و فریب کے ہتھکنڈے ہیں...... اس کا شوہر بعد میں اسے بھی قتل کرا دے گا اور اس کے محبوب کو بھی۔ اس کی زبان کا اعتبار کیا جا سکتا تھا نہ قسموں وعدوں کا

......عورت نے انکار کر دیا......شوہر نے اس پر انسانیت سوز ظلم کیا...... ویسا ہی جیسا پولیس لاوارث قیدیوں پر حوالات میں کرتی ہے...... عورت کے لیے مرنے سے جینا مشکل ہوگیا...... ان حالات میں کوئی بھی عورت کیا کرسکتی ہے.. اس نے بھی شوہر کو قتل کر دیا......''

برہان الدین نے سر ہلایا......''اس نے بالکل ٹھیک کیا مگر اس کے بعد؟ کیا اس نے خودکشی کرلی......''

''نہیں...... اس نے اپنے محبوب کو بلایا...... اور وہ اسے نکال لے گیا...... اب محبوب کے لیے مسئلہ یہ ہے کہ اسے کہاں لے جائے...... پولیس سے کیسے بچائے...... بعد میں وہ سب کچھ کرسکتا ہے...... اسے نئی شناخت دے کر ملک سے باہر بھی نکال سکتا ہے...... وقت کے ساتھ تمام معاملات دب جاتے ہیں یا دبا دیے جاتے ہیں......''

برہان الدین نے کہا......''اسے وہ اپنے گھر کیوں نہیں لے جاتا؟''

''یہی تو اصل مسئلہ ہے...... گھر میں اس کے والد ہیں اور بھائی بہن...... رشتے دار دوست احباب...... اس عورت کو کوئی اچھا نہیں سمجھتا...... حالانکہ وہ مظلوم ہے مگر اس کی مدد کوئی نہیں کرے گا...... خطرہ یہ ہے کہ وہ خود اسے پولیس کے حوالے کر دیں گے...... وہ چاہتا ہے کہ کچھ عرصہ اس لڑکی کو کہیں چھپا کے رکھے...... بات زیادہ سے زیادہ مہینے دو مہینے کی ہے...... پھر وہ لڑکی باہر چلی جائے گی...... نئے نام کے ساتھ نئی جگہ اپنی زندگی کا نیا آغاز کرے گی...... مسئلہ آج کا ہے...... اسے نہ ہوٹل میں رکھا جاسکتا ہے نہ کسی گھر میں...... خطرہ یہ ہے کہ جب اس کی تصویر اخبارات میں شائع ہوگی تو کہیں نہ کہیں کوئی اسے شناخت کرلے گا اور پولیس کو اطلاع کر دے گا......''

''اس کا خطرہ تو ہوگا'' برہان الدین نے کہا۔''کیا تم نور جہاں کی بات کر رہے تھے......''

میں تقریباً اچھل پڑا......''آپ جانتے ہیں؟......''

اس نے کہا......''ہاں...... اخبار میں دیکھا تھا...... مقتول کا نام اکبر خان تھا۔''

میں نے کہا......''جی......''

برہان الدین مسکرایا......''اور اس کے محبوب کا نام؟''

میں نے کہا......''نواب رفیق احمد شیرازی......''

چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد اس نے کہا......''میرا اندازہ درست تھا......''

میں نے کہا......''میں آپ کے سامنے اعترافِ جرم کر رہا ہوں......''

''محبت کرنا تو کوئی جرم نہیں......'' وہ سوچتے ہوئے بولا''لیکن اس کا شوہر کو قتل کرنا اور تمہارا اسے قانون کی گرفت سے دور رکھنا......بہر حال جرم ہے......''

میں نے کہا......''انصاف کرنے والا حالات کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔''

برہان الدین نے سر ہلایا......''لیکن جج تم نہیں ہو...... میں بھی نہیں ہوں...... ممکن ہے...... بلکہ مجھے یقین ہے کہ عدالت اسے باعزت طور پر رہا کر دے گی......''

میں نے کہا......''سارا مسئلہ تو عدالت کا فیصلہ ہونے تک تفتیش اور ریمانڈ پر پولیس کی تحویل...... پھر جوڈیشنل ریمانڈ پر جیل اور ضمانت پر رہائی کے مراحل سے گزرنے کا ہے......''

''پیسا ہر مشکل مرحلے کو آسان کرتا ہے......''

میں نے کہا......''بجا ارشاد...... پیسا ہو تو گرفتاری سے رہائی تک مجرم کو وی آئی پی ٹریٹمنٹ ملتا ہے پھر بڑے اور نامور وکیل کسی بھی قتل کو طبعی موت ثابت کرسکتے ہیں' پیسا جتنا خرچ ہو مجھے منظور ہے لیکن یہ معاملہ مختلف ہے۔ نور جہاں کو پولیس کی تحویل میں مار دیا جائے گا...... عدالت تک کیس جائے گا ہی نہیں......''

''ہاں...... یہ مسئلہ تو ہے...... ایسا ہی ہوگا'' وہ بولا...... پھر اٹھ کے ٹہلنے لگا...... وہ گہری سوچ میں غرق تھا اور کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا...... راجا اور میں سسپنس میں مبتلا بیٹھے رہے۔

چند منٹ بعد وہ پھر ہمارے سامنے بیٹھ گیا......

''او کے...... مجھ سے تم کیا چاہتے ہو......''

میں نے کہا......''کیا یہ ہوسکتا ہے کہ وہ کچھ عرصہ آپ کے گھر میں روپوش رہے...... ظاہر ہے اس کی یہاں موجودگی کی طرف پولیس کا خیال جا ہی نہیں سکتا...... اس کا کسی سے رابطہ نہیں ہوگا...... ہم سے بھی نہیں...... نہ وہ کسی کے سامنے آئے گی...... چند دن میں خبر بھی پرانی ہو جائے گی اور پولیس بھی کب تک دوڑ دھوپ کرے گی...... ان کے سامنے ہر روز نیا کیس آجاتا ہے...... وہ ایک حد تک تلاش کرتے ہیں پھر فائل کولڈ اسٹوریج میں بھیج دی جاتی ہے......''

''یہ ہوسکتا ہے کہ خاتون کی تصویر تمام اخبارات میں روز شائع ہوگی...... وہ چاہیں تو ہر شہر میں پوسٹر لگا سکتے ہیں...... میں نے تلاشِ گم شدہ کے اشتہارات ہر ٹرین میں ریلوے اسٹیشن اور ایئر پورٹ پر دیکھے ہیں...... آج کل ٹی وی پے......تصویر ہر چینل پر دکھائی جاسکتی ہے...... گھر گھر پہنچ سکتی

ہے...... ہر گاؤں اور شہر میں......''

میں نے کہا''یہ ناممکن نہیں ہے...... لیکن گستاخی معاف...... کیا ایسا کبھی ہوا ہے؟ آپ نے کبھی سنا یا دیکھا ہے......''

اس نے کہا''ہاں...... مجھے یاد تو نہیں پڑتا ایسا کیس۔''

میں نے کہا......''تاہم...... بالفرض محال ایسا ہوتا ہے تو یہ سلسلہ بھی آخر کب تک جاری رہے گا...... مہینے دو مہینے...... تب تک نور جہاں یہاں ایسے رہے جیسے ہے ہی نہیں......آپ کے سوا اس کی صورت کوئی نہ دیکھے......''

''عبدل دیکھے گا'' وہ بولا''لیکن وہ بھروسے کے قابل ہے۔''

میں نے کہا......''پھر کیا ڈر ہے...... ہم اسے برقعے میں یہاں لائیں گے...... وہ بھی رات کے وقت...... وہ خود کو ایک کمرے تک محدود کرلے گی...... کسی کو شک بھی نہیں ہوگا کہ اس گھر میں کوئی عورت ہے...... آپ چاہیں تو اس کو کمرے میں لاک کر دیں...... اس کی آواز تک باہر نہ جائے......''

''بے وقوفی کی باتیں مت کرو......'' وہ خفگی سے بولا۔ ''میرا گھر کوئی نجی جیل خانہ نہیں ہے...... جاؤ اسے لے آؤ......''

میں نے محسوس کیا کہ میرے سینے پر رکھی ہوئی چٹان ہٹ گئی ہے''میں آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں......''

''اس کی ضرورت نہیں...... لیکن مجھے یہ بتاؤ...... دو مہینے بعد کیا ہوگا؟......دو مہینے کی ذمے داری میری...... یہاں وہ محفوظ رہے گی......''

میں نے کہا......''اس سے پہلے ہی میں اسے بحفاظت باہر نکال دوں گا...... ایسی جگہ پہنچا دوں گا جہاں کسی کے خیال کی رسائی ہی نہ ہو......''

اس نے نفی میں سر ہلایا......''معلوم نہیں تم اتنے پُر یقین کیسے ہو...... لیکن مجھے کیا...... دو مہینے بعد کی ذمے داری تمہاری ہے...... اس کے بعد زندگی تمہیں کتنی مہلت دیتی ہے...... چالیس پچاس سال میں کیا ہوتا ہے...... خوش قسمتی کب تک تمہارا ساتھ دیتی ہے...... تمہارے حصے میں حادثات اور ناموافق اتفاقات آتے ہیں یا نہیں...... یہ نہ میرے سوچنے کی بات ہے نہ تمہارے......''

میں نے کہا......''آپ کا احسان ہمیشہ رہے گا......''

''میری ایک شرط ہے نواب صاحب...... آپ کتنے ہی بڑے مجنوں کیوں نہ ہوں...... اپنی لیلیٰ سے آپ میری اجازت کے بغیر نہیں ملیں گے......''

میں نے کہا......''بالکل ایسا ہی ہوگا۔''

''آپ موبائل فون پر بھی اس سے رابطہ نہیں کریں گے...... کال ٹریس ہو جاتی ہے...... پولیس کی نظر میں مشکوک افراد کی فہرست میں سب سے اوپر تمہارا ہی نام ہوگا...... بہتر ہے اپنی ضمانت قبل از گرفتاری کے لیے کوشش شروع کردو...... اور اپنی سیکیورٹی بھی بڑھا دو...... تم ایک ڈائریکٹ ٹارگٹ بھی ہوسکتے ہو...... میں بہت پریکٹیکل آدمی ہوں...... آج تم جس نظام سے نالاں ہو میں اس کا حصہ رہا ہوں...... جتنا عرصہ میں نے نوکری کی ہے اتنی تمہاری عمر نہیں......''

میں نے کہا......''میں ایک سوال کرسکتا ہوں؟''......

وہ مسکرایا......''مجھے اندازہ ہے تم کیا پوچھو گے...... آخر میں نے یہ رسک کیوں لیا جبکہ میری تمہاری شناسائی صرف ایک ملاقات تک محدود ہے۔''

میں نے کہا......''بالکل ٹھیک کہا آپ نے...... کس بات نے آپ کو میری مدد پر مجبور کیا......''

''میں مجبور نہیں ہوا...... قائل ہوا...... وہ سب جو تم ست بدحالی میں کر رہے ہو...... مجھے اچھا لگا...... تم چاہتے تو ساری دولت سمیٹ کے لندن، امریکا چلے جاتے...... جیسے کہ اس ملک کے زیادہ تر نوجوان جا رہے ہیں...... ڈالر کمانے...... آزاد اور محفوظ اور باعزت مستقبل کے لیے...... لیکن تم نے ایک مشکل اور خطرناک ذمے داری کا بوجھ اٹھا لیا ہے...... میں قدرتی طور پر تمہارا طرف دار ہوں...... میں تمہارے دشمنوں کا ساتھ کیسے دے سکتا ہوں...... میں تمہاری بس اتنی ہی مدد کرسکتا ہوں...... اب جاؤ...... دیر مت کرو......''

ہم اس گھر سے نکلے تو ہمارا اعتماد بحال ہو چکا تھا۔ قدرت نے برہان الدین کو وسیلہ بنا دیا تھا اور ایک مشکل آسان کردی تھی۔ میں نے راجا کے ساتھ کچھ خریداری کی...... یہ سب شہناز کی ضرورت کا سامان تھا' راجا شام تک میرے ساتھ رہا...... میری دو بار نور جہاں سے بات ہوئی......اس کی حالت یقیناً بہتر ہوئی تھی' وہ زیادہ سکون اور اعتماد کے ساتھ بات کرتی رہی۔

شام ہوئی تو راجا نے واپسی کا ارادہ ظاہر کیا......اس وقت ہم اسپتال کے کیفے ٹیریا میں چائے پی رہے تھے...... میں نے کہا......''تو نور جہاں سے نہیں ملے گا۔''

''نہیں...... ایسا نہ ہو کوئی مجھے پہچان لے......تو کب

آئے گا؟''

میں نے کہا..... ''ہوسکتا ہے آج ہی رات تک..... شیر دل ہے میرے ساتھ مگر راجا..... تیری سپورٹ سے مجھے بڑا حوصلہ ملا..... تو ناراض تو نہیں ہے نا؟''

''میں خوش بھی نہیں ہوں..... لیکن دوستی میں آدمی کو سب کرنا پڑتا ہے..... اچھائی کے ساتھ برائی میں بھی ساتھ نبھانا پڑتا ہے..... کوشش کرنا کہ کسی کو پتانہ چلے اور نور جہاں بحفاظت نکل جائے..... آگے اس کی قسمت اس کے ساتھ۔ تجھے تمام عمر اس کا ساتھ نبھانے کی سوچنا بھی نہیں چاہیے.....''

''اور اگر وہ ایسا سوچے..... پھر؟''

''نہیں فیکے پتر..... یہ نہیں ہوسکتا..... وہ ہم میں شامل نہیں ہوسکتی۔ اس میں خرابی ہی خرابی ہے..... تیرے لیے بھی اور ہم سب کے لیے بھی..... اسے کوئی قبول نہیں کرے گا..... ایسا نہ ہو ایک نور جہاں کی وجہ سے ہم سب کا ساتھ چھوٹ جائے..... اس نے تیری مدد کی..... تیری زندگی بچائی..... تو اس کا احسان مانتا ہے..... اس کے بدلے ہی تو اس کی زندگی بچانا چاہتا ہے..... اس حد تک ٹھیک ہے۔ میں بھی تیرے ساتھ ہوں۔ تو اسے بحفاظت باہر پہنچادے اور اسے بھول جا..... یہی ہم سب کے حق میں بہتر ہوگا.....''

میں نے کہا..... ''میں کوشش کروں گا کہ ایسا ہی ہو.....''

''اس نے فریال کے بارے میں کیا بتایا؟''

میں نے کہا..... ''وہ یہی کہتی ہے کہ فریال گجرات میں ہے..... یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔''

''گجرات میں وہ کیا کررہی ہے۔''

''میں کیا بتاؤں..... تو خود پوچھ لے اس سے فون کرکے'' میں نے کہا۔

راجا بولا..... ''ضروری تو نہیں کہ نور جہاں کی ہر بات پر آنکھ بند کرکے اعتبار کرلیا جائے..... اس کی انفارمیشن غلط ہوسکتی ہے.....''

''ہاں..... مگر وہ اسلام آباد نہیں پہنچی تو کہاں گئی..... گجرات سے اس نے فون کیا تھا... اس کے بعد کیا ہوا.....''

راجانے اپنا سر کھجایا..... ''میں کسی عظیم سراغ رساں کی طرح غور فرماؤں تو اس امکان کو مسترد نہیں کرتا کہ فریال کے ساتھ کوئی افسوسناک حادثہ پیش آیا..... مثلاً اغوا..... اگر اغوا کو فلمی پچ دیا جائے تو ولن اسے اٹھالے گیا.....''

''جیسے میں نے اسلام آباد کے گلی کوچوں کی خاک چھانی..... ایسے گجرات میں فریال کو تلاش نہیں کرسکتا.....''

راجانے میرے کندھے پر ہاتھ مارا..... ''فیکے پتر..... یہ کام میں کروں گا آخر یار کی یاری کب کام آئے گی.....''

میں نے کہا..... ''اگر وہ ہوئی سلطان کے کسی محل کے زندان میں قید..... یا اس کے نکاح میں.....''

راجانے سلطان راہی کی طرح بھڑک ماری..... ''اوئے ایہہ نہیں ہوسکدا..... میں ٹوٹے کردیاں گا.....''

اِدھر اُدھر سے کچھ لوگوں نے دلچسپی سے راجا کو دیکھا۔ راجا لوگوں کی طرف دیکھ کے مسکرایا ''میرا خیال ہے مجھے اب جانا چاہیے۔''

''ہاں..... ایسا نہ ہو کوئی ولن کے رول کے لیے فلم کا کنٹریکٹ سائن کرانے آجائے..... یا پاگل خانے والے پکڑ کے لے جائیں۔''

''تو نہیں ملے گا نور جہاں سے.....'' میں نے کہا۔

''نہیں یار..... تو جانتا ہے خوبصورت لڑکی میری کمزوری ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تیرے میرے درمیان تلواریں چل جائیں.....''

راجا کو رخصت کرکے میں اسپتال کے اندر گیا تو مجھے ڈاکٹر نظر آگیا..... وہ تیر کی طرح میری طرف آیا..... ''ہیلو سر کہاں ہیں آپ.....''

میں نے کہا..... ''آپ کے سامنے اور کہاں.....''

وہ ہنسا..... ''میرا مطلب تھا دن بھر کہاں رہے..... میں آپ کا انتظار کرتا رہا اپنے کمرے میں.....''

میں نے کہا..... ''آئی ایم سوری..... مجھے ایک ارجنٹ کال آگئی.....''

وہ میرے سامنے کھڑا رہا..... ''آپ کے لیے سب سے ارجنٹ ہونا چاہیے آپ کی وائف کا مسئلہ.....''

میں نے کہا ''وہ بہت بہتر ہیں۔''

''آف کورس بہتر ہیں۔ بہترین حالت میں لانے کے لیے ان کی کیس ہسٹری اہم ہے.....''

میں نے کہا..... ''کیا آپ کی ان سے بات ہوئی ہے۔''

اس نے مایوسی سے سر ہلایا..... ''میں نے بات کرنے کی کوشش ضرور کی تھی لیکن معلوم نہیں کیا بات ہے..... انہوں نے بات کرنے سے انکار کردیا..... مریض کا ڈاکٹر پر اعتماد نہ ہو.....''

میں نے کہا..... ''سوری میں آپ کی بات کاٹ رہا ہوں..... میں یقیناً اس کی پروگریس سے بہت مطمئن تھا..... لیکن وہ بضد ہے کہ مجھے یہاں سے لے چلو..... میں بالکل ٹھیک ہوں.....''

ڈاکٹر مایوس نظر آنے لگا..... ''مگر وہ ٹھیک نہیں ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''میں یہ بات اچھی طرح سمجھتا ہوں لیکن مریض میں نہیں ہوں اس کا اطمینان ضروری ہے..... میں نے سوچا ہے کہ اسے لندن لے جاؤں..... دو ہفتے کی رخصت لی ہے میں نے بڑی مشکل سے..... مجھے کہنا پڑا کہ بھاڑ میں جائے نوکری..... میں نوکری چھوڑ سکتا ہوں اپنی بیوی کو نہیں چھوڑ سکتا..... میرا خیال ہے شوہروں کی حد سے زیادہ مصروفیت بھی بیویوں کو نفسیاتی مریض بنادیتی ہے..... میں اسے پورا وقت نہیں دے سکا.....''

''آپ نے بہت اچھا فیصلہ کیا.....''

میں نے کہا..... ''ایک بریک مجھے بھی ملے گا..... اور دو ہفتے کا یہ سیکنڈ ہنی مون ایک فائدہ مند چینج ثابت ہوگا..... شاید اسے دوا کی ضرورت ہی نہ پڑے..... ویسے میں اس کو لے جاؤں گا..... لندن میں اچھے ڈاکٹر ہیں.....''

اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا..... ''گڈ لک سر..... برا علاج تو ہم بھی نہیں کرتے یہاں..... باہر جانا اسٹیٹس کی بات ہوتی ہے..... میں کسی کو بتادوں کہ میں لندن کے سب سے اچھے اسپتال میں دس سال رہا..... تو لوگ زیادہ متاثر نہیں ہوتے.....''

صاف نظر آتا تھا کہ ڈاکٹر نے برا مانا ہے لیکن مجھے یہی بہانہ سب سے بہتر لگا تھا..... میں نور جہاں کے کمرے میں پہنچا تو وہ کمرے میں ٹہل رہی تھی..... مجھے دیکھتے ہی وہ میری طرف لپکی..... ''کہاں چلے گئے تھے تم.....''

میں نے اسے صوفے پر بٹھادیا..... ''میں تمہیں بتا کے گیا تھا..... طبیعت کیسی ہے تمہاری؟''

''مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے..... مجھے یہاں سے لے چلو رفیق.....''

میں نے کہا..... ''ڈاکٹر نے تم سے کیا پوچھا تھا.....''

''میں نے اس سے کوئی بات نہیں کی..... اس کے کسی سوال کا جواب نہیں دیا.....''

میں نے کہا..... ''اچھا کیا..... اب جو میں کہہ رہا ہوں غور سے سنو..... ایسے ڈرنے سے کام نہیں چلے گا..... تمہیں ہمت سے کام لینا ہوگا..... ورنہ.....''

وہ میرے لہجے سے ڈر گئی..... ''ورنہ کیا..... تم مجھے چھوڑ جاؤ گے۔''

''جب تک تم ساتھ نہیں دو گی..... میری کوشش سے کیا ہوگا..... کاش یہ ممکن ہوتا کہ میں تمہیں اپنے ساتھ ست بدھائی لے جاؤں..... لیکن تم جانتی ہو یہ ناممکن ہے..... وہ جگہ سب سے زیادہ غیر محفوظ ہے..... میں نے تمہارے لیے اپنے ایک دوست کے گھر میں رہائش کا انتظام کیا ہے..... ایک دو مہینے کے لیے جب تک یہ معاملہ سرد نہیں پڑ جاتا.....''

''وہ کون دوست ہیں؟..... کیا وہاں میں اکیلی رہوں گی.....''

میں نے آہستہ آہستہ اسے سب سمجھادیا۔ ''یہ بالکل ایک قیدی جیسی زندگی ہوگی..... اس گھر سے کیا تم اس گھر سے باہر نہیں آؤ گی۔ کسی سے بھی بات نہیں کرو گی.....''

''تم تو آؤ گے نا.....''

میں نے نفی میں سر ہلایا..... ''تمہیں سمجھنا چاہیے کہ سب سے پہلے شک مجھ پر کیا جائے گا..... بے شک پولیس صرف شک کی بنیاد پر مجھے پکڑ نہیں سکتی۔ یہ ثابت نہیں کرسکتی کہ اکبر خان کے قتل میں میرا ہاتھ تھا..... لیکن مجھ سے تفتیش ضرور ہوگی..... میں ضمانت قبل از گرفتاری بھی لے لوں گا مگر جب تک یہ ثابت نہیں ہوتا کہ میرا تم سے دور کا تعلق بھی نہیں..... میری پوزیشن کلیئر نہیں ہوگی..... نہ میں تم سے ملنے آؤں گا اور نہ فون پر تم سے بات کروں گا..... کال ٹریس ہوگئی تو ساری محنت اکارت جائے گی..... اگر میں نے بات کی تو لاہور جاکے کسی پی سی او سے کروں گا..... فرضی نام سے اسلام آباد کی کوئی سم لے لوں گا..... اور ملنے آیا بھی تو اس بات کا یقین ہوجانے کے بعد آؤں گا کہ اس میں کوئی خطرہ نہیں..... میں ایک فیصد رسک نہیں لے سکتا۔''

وہ دھیان سے سنتی رہی..... خوف کا تاثر اس کی صورت اور اس کی آنکھوں سے عیاں تھا..... وہ میرا ہاتھ ایسے پکڑے بیٹھی تھی جیسے ڈرتی ہو کہ کہیں میں بھاگ نہ جاؤں..... ابھی تک سب کچھ ٹھیک تھا۔ اسپتال میں کسی کو بھی نہ مجھ پر شک ہوا تھا کہ میری شناخت جعلی ہے۔ نہ نور جہاں پر کہ وہ اپنے شوہر کی قاتلہ ہے..... کسی خرابی کا امکان پیدا ہونے سے پہلے میں نکل جانا چاہتا تھا..... میں نے نور جہاں کو ہر بات بہت تاکید سے سمجھائی۔ اسے خرابی کے تمام امکانات سے آگاہ کیا اور اس پر واضح کیا کہ مکمل روپوشی کے بغیر اس کے لیے پکڑے جانے کا خطرہ ہر وقت ہے..... ہر جگہ ہے..... اسے یوں غائب ہوجانا چاہیے جیسے وہ اس دنیا میں ہی نہیں ہے۔

''ایک دو مہینے کے بعد کیا ہوگا.....'' میرے خاموش ہونے کے بعد اس کا پہلا سوال تھا۔

میں نے کہا..... ''یہ مدت حتمی نہیں ہے..... دو مہینے

بڑھ کر تین بھی ہو سکتے ہیں۔ اس سے پہلے بھی میں تمہیں وہاں لے جا سکتا ہوں جہاں تمہارے لیے کوئی خطرہ نہ ہو...... تمہاری زندگی اور تمہارا مستقبل محفوظ ہو۔"

"ایسی کون سی جگہ ہے؟"...... وہ مایوسی سے بولی۔

میں نے کہا......"ابھی میں نے کچھ بھی طے نہیں کیا...... لیکن وہ جگہ لندن ہو سکتی ہے...... وہاں میرے دوست بہت ہیں......"

اس نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی اور اپنا سر میرے کندھے پر رکھ دیا......"اب تم جو چاہو کرو جانی...... میں نے تو خود کو تمہارے حوالے کر دیا ہے...... مارو یا زندہ رکھو...... تمہاری مرضی......"

میں نے اس کے گالوں پر تھپکی دی......"کم آن...... بی بریو...... تمہیں زندہ رہنا ہے......"

اس نے سر اٹھا کے مجھے دیکھا......"کس کے لیے؟"

"اپنے لیے اور کس کے لیے......"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔"میں سمجھی تھی تم کہو گے...... میرے لیے......"

میں نے کہا......"کیا یہ کہنا ضروری ہے؟ میرے سوا کون ایسا چاہتا ہے...... لیکن زندگی کی خواہش تمہارے دل میں پہلے ہونی چاہیے ورنہ میرے چاہنے سے کیا ہوگا...... یہ ایک جنگ ہے...... جدوجہد ہے بقا کے لیے...... اس کے لیے تمہیں ساری طاقت میں فراہم کروں گا...... مگر لڑنا تو تمہیں ہے......"

"معلوم ہے میں کیوں زندہ رہنا چاہتی ہوں؟...... صرف تمہارے لیے...... تم نہ ہوتے میری زندگی میں...... تو میں ہنسی خوشی پھانسی چڑھ جاتی...... دنیا کو چھوڑنا بہت آسان تھا مگر تمہیں کیسے چھوڑوں......"

وہ لڑکی واقعی پاگل تھی...... اس کا یہی پاگل پن میرے پاؤں کی زنجیر بنا ہوا تھا...... اب یہ ممکن ہی نہ تھا کہ میں پیچھے ہٹ جاؤں اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دوں...... باتوں باتوں میں دو گھنٹے گزر گئے تھے...... میں محسوس کرتا تھا کہ گزرتے وقت کا ہر لمحہ غیر محفوظ ہے۔ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے لیکن نور جہاں کو ذہنی طور پر مضبوط کیے بغیر...... اگلا قدم اٹھانا بھی غلط ہوتا۔

میں نے اسپتال کے رجسٹریشن کاؤنٹر پر دو دن کا حساب برابر کیا...... انہوں نے بہ کمال مہربانی مجھے دس ہزار واپس کر دیے...... بیس ہزار یومیہ پر وہ مزید دس بیس دن نور جہاں کی تیمارداری کر کے زیادہ خوش ہوتے اور اگر میرا تعاون جاری رہتا تو مہینہ دو مہینہ ہمیں مہمان رکھتے، مرض کا علاج مریض کی پاکٹ کے مطابق طویل یا مہنگا کرنے کا فن جانتے تھے۔

شیر دل بڑی مستعدی سے گاڑی کے قریب موجود تھا۔ وہ مجھے نور جہاں کے ساتھ دیکھ کے دوڑا......"سر آپ مجھے بولتے...... میں گاڑی اندر گیٹ پر لاتا......"

آخری وقت میں آنے والے ایک خیال کے تحت میں نے اچانک اپنا فیصلہ بدل دیا۔ میں نے اسے ایئرپورٹ چلنے کے لیے کہا......"بیگم صاحبہ کو کراچی جانا ہے۔"

شیر دل خان حکم کا غلام تھا...... ایئرپورٹ پہنچ کے میں نے اسے انتظار کرنے کے لیے کہا...... وہ پارکنگ ایریا میں جا کھڑا ہوا...... میں نور جہاں کے ساتھ دوسری ریڈیو کیب میں ایئرپورٹ سے نکلا اور برہان الدین کے گھر جا پہنچا...... وہاں بھی میں نے احتیاط برتی نور جہاں نے راستے میں برقعہ اوڑھ لیا...... میں نے ڈرائیور کو مطمئن کرنے کے لیے کہا......"میرے دادا بہت پرانے خیال کے آدمی ہیں......"

گاڑی میں نے آگے رکوائی اور ٹیکسی کے جانے کے بعد نور جہاں کا سامان خود اٹھا کے برہان الدین کے گھر تک گیا...... عبدل نے دروازہ کھولا اور نور جہاں کو اندر لے گیا۔

برہان الدین یقیناً باہمت آدمی تھا۔ باہمت ہونے کے ساتھ ہی وہ معاملہ فہم، فراخ دل اور دوسروں کے لیے ہمدردی کا جذبہ رکھنے والا وضعدار شخص تھا...... ایسا نہ ہوتا تو وہ مجھے صاف انکار کر دیتا کہ نواب صاحب میرے اور آپ کے درمیان تعلق کو جمعہ جمعہ آٹھ دن نہیں ہوئے اور تم مجھ سے امید رکھتے ہو کہ تمہارے ناجائز مراسم کے نتیجے میں ہونے والے قتل کی پردہ پوشی کروں اس عورت کو اپنے گھر میں پناہ دوں جس کا کوئی کریکٹر نہیں۔ رفقائے جرم بھی ارتکاب جرم سے کم سنگین جرم نہیں سمجھا جاتا...... میں یہ رسک کیوں لوں؟

لیکن وہ معاملہ فہم تھا...... اس نے میری بات کو سنا سمجھا اور اس پر غور کیا تو اسے میرے ساتھ ایک ہمدردی ہو گئی۔ میری زندگی کے اغراض و مقاصد نے اسے متاثر کیا اور اس کی جہاں دیدہ نظر نے میرے خلاف حالات کی سازش کے تمام عناصر کو سمجھ لیا...... پھر اس نے میری مدد کا فیصلہ کیا تو یہ کوئی جذباتی ردِعمل نہیں تھا۔

اس نے میری احتیاط پسندی کو سراہا......"بس اب تم اس طرف سے بالکل بے فکر ہو جاؤ...... اور جاؤ...... تمہارا ڈرائیور ایئرپورٹ پر انتظار کر رہا ہوگا۔"

میں نے کہا "میں نے نور جہاں کو سب سمجھا دیا ہے......"

"اور میں نے تمہیں سمجھا دیا ہے کہ تمہیں کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے...... یہ لڑکی اب میری ذمے داری ہے...... اور میں اس کا ذمے دار ہوں......"

نور جہاں نے دبے دبے لہجے میں کہا......"آپ کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔"

"کیوں نہیں...... شکایت کیوں نہیں ہوگی...... شکایت انسانوں کو انسانوں سے ہوتی ہے...... گھر کی دیواروں کی چھت سے یا صوفے کو سینٹر ٹیبل سے نہیں ہوتی...... تو بیٹا...... میں بولتا بہت ہوں...... ڈانٹ، ڈپٹ بھی کروں گا...... ایک کریزی اولڈ مین کی کسی بات کا برا مت ماننا۔ آج سے یہ گھر تمہارا ہے......"

مجھے جس بات کا ڈر تھا وہ ہو کر رہی...... نور جہاں پہلے ڈری سہی ہوئی تھی...... احساسِ جرم و ندامت سے مغلوب تھی۔ رفتہ رفتہ اس کا اعتماد بحال ہونے لگا...... اس نے محسوس کیا کہ اس گھر میں عافیت ہے پھر برہان الدین کی باتوں نے اسے جذباتی کر دیا...... وہ رونے لگی۔

میں نے بہتر سمجھا کہ فوراً رخصت ہو جاؤں...... بعد میں وہ دونوں ایک دوسرے کو سنبھال لیں گے اور سمجھ لیں گے تو ایڈجسٹمنٹ بھی کر لیں گے...... میں خود اب تک کی پروگریس سے بہت پر اعتماد تھا۔ کسی کے فرشتوں کو خبر نہیں ہو سکتی تھی کہ نور جہاں کس گھر کی محفوظ پناہ میں پہنچ چکی ہے۔ اب مجھے اپنی فکر کرنے کی ضرورت تھی۔

شیر دل خان نے ڈھائی گھنٹے بعد میری صورت دیکھی لیکن اس نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا کہ کیا کراچی جانے والی فلائٹ تاخیر سے روانہ ہوئی ہے کسی کو سی آف کرنے میں ڈھائی گھنٹے تو نہیں لگتے...... وہ بہت صابر و شاکر اور اپنی حدود میں رہنے والا آدمی تھا...... تجسس پسند ہوتا تو میرے پیچھے آتا اور فلائٹ کا ٹائم بھی دیکھ لیتا...... مجھے تو یہ بھی علم نہیں تھا کہ اس وقت کوئی پرواز کراچی کے لیے روانہ ہوتی ہے۔

رات دو بجے میں ست بدھائی پہنچا تو کسی کو بھی میری آمد کی خبر نہ ہوئی...... تھکن سے میرا حال برا تھا۔ ذہنی انتشار کے باوجود میں بیڈ پر گرا اور سو گیا...... صبح نو بجے تک میں نیند پوری کر کے اٹھا تو باہر خاصی گہما گہمی نظر آئی...... اوپر زیادہ شور تھا۔ راجا اور غنی کی آواز بھی اوپر سے سنائی دے رہی تھی۔ خواتین نیچے بدحواس پھر رہی تھیں۔ کمروں سے سامان نکال کے باہر رکھا جا رہا تھا...... برآمدے میں اماں ابا کے سوا کوئی نہ تھا...... میں ان کے پاس جا بیٹھا۔

"ابا جی...... یہ کیا ہو رہا ہے......" میں نے کہا۔

"بھئی نقل مکانی ہو رہی ہے......" ابا نے کہا۔

"ہماری رہائش اوپر والے حصے میں ہوگی......"

"وہ کیوں؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"نیچے صرف اسپتال اور اسکول کے لیے جگہ ہوگی......"

میں نے کہا......"پوری حویلی میں...... اس کے لیے دو کمرے وقف کیے گئے تھے...... ایک شہناز کے کلینک کے لیے...... دوسرا اسکول کے لیے......"

"وہ سارا پلان بدل گیا ہے...... ان لوگوں نے فیصلہ کیا ہے کہ مستقبل کی ضروریات کے پیشِ نظر توسیع کی گنجائش رکھی جائے...... اسپتال اور اسکول کو آج نہیں تو کل بڑھانا پڑے گا...... نیچے ہر وقت لوگوں کا آنا جانا ہوگا تو شور بھی ہوگا...... پرائیویسی نہیں رہے گی...... چنانچہ ہمیں اوپر رہنا چاہیے تاکہ ہمارا سکون ڈسٹرب نہ ہو......"

میں نے کہا......"بات تو سمجھ میں آتی ہے...... لیکن اوپر والا حصہ رہائش کے قابل کہاں تھا......"

"تم دیکھ سکتے ہو کہ کام کیسی ہنگامی بنیادوں پر ہو رہا ہے...... یہ بتاؤ تم جس کام سے گئے تھے اس کا کیا ہوا؟"

میں نے کہا......"کیلی بھابی نے آپ کو سب بتا دیا ہوگا۔"

"اسے یہاں چھوڑ کے تم پھر چلے گئے تھے......"

میں نے کہا "جی...... ایک اطلاع ملی تھی...... مگر وہ غلط تھی۔"

اماں نے مراقبے سے سر اٹھایا......"کیسی اطلاع...... یہی کہ فریال گجرات میں ہے......"

میں نے کہا......"اس کی تصدیق نہیں ہوئی......"

"گجرات میں کون ہے اس کا...... سلطان کے سوا...... میں نے سنا ہے وہ تمہیں چھوڑ کر اس سے بیاہ رچانا چاہتی ہے؟ اس لڑکی کا دماغ چل گیا ہے کیا؟ غصہ ٹھیک ہے لیکن ایسا بھی کیا......" اماں نے خفگی سے کہا۔

میں نے کہا......"اماں...... اماں...... ایسی کوئی بات نہیں......"

اماں بولتی رہیں......"بات کیسے نہیں...... پہلے تو اس کا یوں جانا ہی غلط تھا۔ ایسی بھی کیا خودسری...... نہ کسی کا لحاظ نہ خوف۔ ہم تو جیسے ہیں ہی نہیں۔ منہ اٹھایا اور نکل گئیں...... جن کا آگے پیچھے کوئی ہوتا ہے پوچھنے والا وہ ایسی بے مہار نہیں ہوتیں...... میں تو اس کے شروع سے خلاف تھی...... لیکن

یہاں آکے اس نے خوب ڈراما کیا ہمارے سامنے...... جیسے اس سے زیادہ فرمانبردار نیک چلن تو کوئی ہے ہی نہیں...... مگر ذراسی بات ہوئی اور نکل گئی گھر سے...... چلی گئی لوٹ کے اس کے پاس...... میں کہتی ہوں اس کا اتنا خیال تھا تو اسے چھوڑا ہی کیوں تھا......"

میں سمجھ گیا تھا کہ اماں کے پرانے جذبات لوٹ آئے ہیں۔ فریال کے گجرات میں ہونے اور سلطان سے شادی کی افواہ نے اماں کے دل میں پرانی آگ بھڑکا دی تھی۔ ابا شاید یہ سب پہلے ہی سنتے رہے تھے۔ انہوں نے مجھے خاموش رہنے کا اشارا کر دیا تھا لیکن اماں رکنے میں نہ آئیں تو ان کا حوصلہ بھی جواب دے گیا۔

ابا نے برہمی سے کہا...... "کیا اناپ شناپ بولے جا رہی ہو...... ہر بات کی ایک حد ہوتی ہے...... ایک افواہ پر یقین کر کے اسے موردِالزام ٹھہرانا بڑی زیادتی ہے...... پتا نہیں اس بیچاری کے ساتھ کیا حادثہ ہوا......"

میں .... ان کو بحث میں مصروف چھوڑ کے اندر گیا، ریشم کو میں نے بڑی افراتفری کے عالم میں پکڑا تو اس نے خاصی مشکل انگریزی میں میرے آسان سوالوں کے جوابات دیے...... مجھے بالآخر یہ معلوم ہوگیا کہ حویلی سے سب ناکارہ سامان نکالا جا رہا ہے یعنی وہ جسے اب ANTIQUE میں بھی شمار نہیں کیا جا سکتا اور جس کی کوئی افادیت نہیں۔ اس کے بعد جو سامان بچے گا اور ضروری سمجھا جائے گا وہ اوپر شفٹ ہوگا پھر شہناز نے مجھے اسپتال اور اسکول کی تزئین و آرائش کے پروگرام پر لیکچر دیا اور یہ بتایا کہ اوپر کی منزل پر رہائش کے پروگرام پر مرحلہ وار کیسے عمل ہوگا...... رنگ روغن اور مرمت کا جو کام ہنگامی بنیادوں پر چل رہا ہے وہ کب تک پورا ہو جائے گا...... دیگر تفصیلات کے لیے مجھے رابعہ سے رجوع کرنا چاہیے۔

میں نے خفگی سے کہا...... "تم نے اتنی دیر میں فریال کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا......"

"سوال سے کیا فائدہ...... جواب ہمیں معلوم ہے......" اس نے جاتے جاتے کہا...... "لیلیٰ بھابی سب بتا چکی ہیں کہ وہ اسلام آباد میں نہیں گجرات میں ہے۔ اور سلطان سے شادی کر رہی ہے......"

"لاحول ولاقوۃ لیلیٰ بھابی تو شام کا اخبار ہوگئی ہیں کہ تصدیق کیے بغیر کچھ بھی چھاپ دو...... ہر انکشاف کے ساتھ سوالیہ نشان لگا دو...... ہر سنسنی خیز خبر کے ساتھ لکھ دو...... غیر مصدقہ اطلاع کے مطابق......"

لیکن شہناز میری بات سنے بغیر نکل گئی تھی۔ میں احتجاج کرنے کے لیے بھابی کی تلاش میں تھا کہ میرا سامنا رابعہ سے ہوگیا...... میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا...... "مجھے تم سے کچھ کہنا ہے......"

اس نے کہا...... "جو کہنا ہے فریال سے کہو......"

میں نے کہا...... "یہ کیا باتیں ہو رہی ہیں حویلی میں...... فریال کے متعلق...... کس الو کے پٹھے نے کہا ہے کہ وہ گجرات میں ہے......"

"یہاں تم سے منسوب کیا جا رہا ہے کزن......" وہ ہنسی۔

میں نے کہا...... "مجھے حیرانی ہے کہ سب کی عقل کو کیا ہوگیا ہے......"

"ایسے ہی سب کو حیرانی ہے کہ تمہاری عقل کو کیا ہوگیا ہے۔ اگر تمہارے منہ پر کوئی کچھ نہیں کہتا تو تمہارا لحاظ کرتا ہے...... ورنہ سب کو معلوم ہے کہ تم اسلام آباد کیوں گئے تھے......"

میں نے ضبط سے کام لیا...... "چلو تم لحاظ مت کرو...... تم بتا دو۔"

وہ دیوار کا سہارا لے کر کھڑی ہوگئی...... "تم فریال کو تلاش کرنے کے بہانے نور جہاں سے ملنے اسلام آباد گئے تھے......"

"یہ کیا بکواس ہے......"

وہ بولتی رہی "تم اکیلے جا رہے تھے...... اماں ابا نے زبردستی لیلیٰ بھابی کو تمہارے ساتھ کر دیا...... کئی بار تم ان کو چکما دے کر نکل گئے۔"

"یہ غلط ہے رابعہ......"

"میرا منہ مت کھلواؤ کزن...... تم سے پہلے وہ اسلام آباد پہنچی تھی...... اس نے تمہیں فون کیا تھا...... کیا کر رہی تھی وہ اسلام آباد میں؟"

"فون تم نے ریسیو کیا تھا......"

"ہاں...... اور میں نے اسے ایسی بے نقط سنائیں کہ اس کی طبیعت صاف ہوگئی...... اب راجا سے معلوم ہوا ہے کہ اس نے وہاں اپنے شوہر کو قتل کر دیا اور غائب ہوگئی...... پولیس اسے تلاش کر رہی ہے...... کہاں چھپایا ہے تم نے اسے کزن؟...... لیلیٰ بھابی کو یہاں چھوڑ کے تم واپس کیوں بھاگے تھے......"

میں نے کہا...... "رابعہ...... بہت افسوس کی بات ہے......"

"وہ تو ہے اگر تم سمجھو......"

میں نے کہا...... "تم غلط سمجھ رہی ہو......"

"کیا سارے اخباروں میں غلط چھپا ہے......؟ میں نے خود ایک اخبار دیکھا ہے جو راجا نے چھپا کے رکھا تھا...... شہناز نے اس کے بیگ سے نکال لیا...... بعد میں راجا نے بھی مان لیا......"

"کیا مان لیا؟...... یہ کہ میں نور جہاں ملنے گیا تھا...... فریال کو تلاش کرنے کے بہانے...... مجھے غصہ مت دلاؤ کزن......"

"میں تمہارے غصے سے نہیں ڈرتی...... راجا ہے تمہارا چمچا...... جیسی روح ویسے فرشتے...... وہ بھی تمہارے کرتوتوں پر جھوٹ کا پردہ ڈال رہا ہے...... ان کا فرمان بھی یہی ہے کہ تم اسلام آباد میں نور جہاں کی موجودگی سے بے خبر تھے...... وہ شوہر کے ساتھ کسی کام سے گئی ہوگی...... اگر ایسا تھا تو پھر اس نے شوہر کو ذبح کیوں کیا؟...... کیا اس کے ساتھ تمہارا اسلام آباد میں پایا جانا محض ایک اتفاق تھا...... اتفاق تھا تو اس نے تمہیں اسلام آباد سے فون کیوں کیا تھا؟"

میں نے کہا...... "کیا اس نے مجھے بلایا تھا؟"

"اب کیا مقصد ہوگا اس کا...... اتفاق یہ ہے کہ تمہارا موبائل یہاں رہ گیا تھا اور کال میں نے ریسیو کرلی...... تم غلطی سے میرا موبائل فون لے گئے تھے۔ یہ خبر صرف ایک اخبار میں تو شائع نہیں ہوئی ہوگی...... فریال نے بھی دیکھی ہوگی اور اس کے بعد ہی سلطان سے شادی کا فیصلہ کیا ہوگا......"

میں نے کہا...... "اس کے فیصلے کا علم تمہیں کیسے ہوا...... کیا سب کو الہام ہوا ہے کہ فریال گجرات میں ہے......؟"

وہ مجھے دیکھتی رہی "کزن...... اس نے گھبراہٹ سے فون کیا تھا...... اپنی لندن والی سہیلی کو...... اسے فون کرو گے تو سب معلوم ہو جائے گا...... اب راستہ چھوڑو میرا...... مجھے بہت کام ہے......"

غصے اور صدمے سے میرا برا حال تھا...... اماں کا جارحانہ رویہ اب میری سمجھ میں آ رہا تھا ابا شاید میری ذمے داری کے خیال سے خاموش تھے۔ یہاں سب نے اتفاقات اور واقعات کی کڑیاں ملا کے ایک "حقیقت" تسلیم کرلی تھی...... اب میری یا راجا کی تردید محض سچ کو چھپانے کی کوشش قرار دی جا رہی تھی۔

میں نے اوپر جا کے راجا کو پکڑا اور اسے ایک طرف لے گیا۔ "راجا یہ کیا باتیں ہو رہی ہیں یہاں......"

اس نے بے بسی سے ہاتھ پھیلائے...... "اس میں میرا کوئی قصور نہیں...... ساری خرابی تیری ایک بھول سے ہوئی......"

"کون سی بھول؟"

"تو اپنا موبائل فون یہاں بھول گیا تھا۔ نور جہاں کی کال بھی رابعہ نے ریسیو کی اور ڈاکٹر شائستہ کی کال بھی...... "

"کیا واقعی فریال نے ڈاکٹر شائستہ سے کہا ہوگا کہ اب وہ سلطان سے شادی کرنے کا فیصلہ کر چکی ہے...... نور جہاں کے ہاتھوں اس کے شوہر کے قتل کی خبر پڑھنے کے بعد......"

"جھوٹ سچ کا مجھے پتا نہیں...... ہوسکتا ہے ڈاکٹر شائستہ نے بکواس کی ہو...... اس نے تمہیں پوچھا تھا...... رابعہ نے کہا کہ وہ تو اسلام آباد میں ہیں...... فریال کو تلاش کرنے گئے ہیں...... اس وقت تک نور جہاں کے کارنامے کی خبر بھی نشر ہو چکی تھی...... خبر کو دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچنے میں وقت کہاں لگتا ہے...... اب یا تو شائستہ نے جھوٹ بولا...... مجھے سزا دینے کے لیے...... یا تیری کزن بول رہی ہے......"

"فریال ایسی بات نہیں کہہ سکتی......"

"پہلے میں بھی سو فیصد یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتا تھا......"

میں نے کہا...... "اور اب؟"

"میں کنفیوزڈ ہوں جھوٹ اور سچ کے درمیان...... لیکن فکر مت کر...... سوچنے دے سب کو جو ان کا دل چاہے...... ایک دن ہم حقیقت کی تہ تک پہنچ جائیں گے...... معلوم کرلیں گے کہ فریال کہاں ہے...... ابھی تو اپنی فکر کر...... میں نے بڑی مشکل سے سب کو راضی کیا ہے......" راجا بولا۔

میں نے کہا...... "کس بات پر......"

"مجھے یقین ہے کہ پولیس کو تیری تلاش ہوگی...... وہ یہاں آئیں گے تفتیش کے لیے...... ان کا پہلا سوال یہی ہوگا کہ گزشتہ ایک ہفتے سے آپ کہاں تھے؟...... کل...... پرسوں...... اس سے ایک دن پہلے کیا کر رہے تھے...... یہاں سب کا ایک ہی بیان ہوگا...... تو حویلی سے ایک منٹ کے لیے باہر نہیں گیا...... اماں ابا اس معاملے میں نہیں پڑیں گے...... باقی سب کی گواہی کافی ہے...... اس کے باوجود...... میں سمجھتا ہوں کل تجھے ضمانت قبل از گرفتاری کی درخواست دائر کر دینی چاہیے...... میں نے شہزاد سے بات کرلی ہے......"

"رانا کہاں میری ضمانت ہونے دے گا......" میں نے پریشانی سے کہا...... "اسے اچھا موقع ملا ہے مجھے ہتھکڑیاں لگوانے کا......"

"ایف آئی آر اسی کی معیت میں درج کرائی گئی

ہے...... اور اس میں تجھے شریکِ ملزم کی حیثیت سے نامزد کیا گیا ہے......"

"کیا ستم ظریفی ہے...... میں رانا کو اپنی بیٹی کے قتل کے الزام میں گرفتار کرانے کی کوشش کر رہا تھا...... اب اکبر خان کے قتل کے جرم میں وہ مجھے گرفتار کرائے گا۔ ہم دونوں ایک ساتھ جیل جائیں گے......"

"گرفتاری سے بچنے کا ایک طریقہ ہے......" راجا بولا۔

میں نے کہا...... "وہی جو رانا نے اختیار کیا۔"

"بس...... روپوشی...... تو بھی درخواست ضمانت کی سماعت کے وقت خود کو عدالت میں پیش کر دینا......"

"لیکن اس وقت تک میں کہاں رہوں گا؟"

"تجھے کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ نواب صاحب کہیں گئے ہوئے ہیں...... پتا نہیں کب آئیں گے...... لیکن پھر وہ بیان مشکوک ہو جائے گا کہ نواب صاحب تو ایک ہفتے ہوا حویلی سے نکلے ہی نہیں......"

میں نے کہا...... "پھر؟...... کیا میں گرفتاری دے دوں......"

راجا نے کہا۔ "میرا خیال ہے یہی بہتر ہوگا...... یہ تیری بے گناہی کے حق میں ایک دلیل ہوگی...... تو نے کچھ نہیں کیا تو پھر ڈر کیسا...... ڈر ہوتا تو تیرے لیے رانا کی طرح فرار ہونا کیا مشکل تھا...... تیرا اعتماد تفتیش کرنے والوں کو متاثر کرے گا۔ ہو سکتا ہے وہ رانا کے بیان کو پرانی دشمنی پر مبنی قرار دیتے ہوئے تجھے چھوڑ دیں۔"

میں نے کہا...... "اگر مجھے شریکِ جرم نامزد کیا گیا ہے تو یہ ناممکن ہوگا"

راجا نے میرے کندھے پر ہاتھ مارا...... "پاکستان میں ناممکن کچھ نہیں نیکے پتر...... اپے قائد اعظم سب ممکن بنا دیتے ہیں......"

میں نے کہا...... "راجا...... اکبر خان کی موت کا مجھے یہاں کوئی ردِعمل نظر نہیں آ رہا ہے...... وہ ریشم کا باپ تھا...... اور فاطمہ کا شوہر......"

"فاطمہ کچھ روئی دھوئی تھی، ریشم نے پہلے اسے چپ کرلیا پھر بگڑ گئی کہ اس کو کیوں روتی ہے جس نے ساری عمر تجھے رلایا...... کون سے رشتے کو نبھایا اس نے...... میں کیوں مانوں اسے اپنا باپ...... شہناز نے بتایا کہ بعد میں وہ بھی روئی تھی اس کے پاس آ کے...... پرانی باتیں یاد کرتی رہی کہ جب میں چھوٹی تھی تو وہ کتنا خیال رکھتا تھا ہم سب کا......"

میں نے کہا...... "نورجہاں نے مجھے بتایا ہے کہ سائنس ریسرچ سینٹر کی اس عمارت میں کیا ہوتا تھا...... ملک بھر سے بچے لڑکیاں اور عورتیں خرید کے یا اغوا کر کے لائے جاتے تھے لڑکے امارات میں اونٹ ریس کے لیے بھیج دیے جاتے تھے...... لڑکیاں بھی مڈل ایسٹ کی مارکیٹ میں اور کچھ ہانگ کانگ سنگاپور یا بنکاک میں فروخت ہوتی تھیں......"

"ریشم کو اور اس کی ماں کو یہ بات معلوم تھی......"

میں نے حیرانی سے کہا...... "وہ جانتی تھیں؟"

"ہاں...... ریشم نے شہناز کے سامنے اعتراف کیا...... اکبر خان کے اس کاروبار نے بیوی اور بیٹی کو اس سے متنفر کیا...... پہلے وہ خود جاتا تھا اور ادھر اُدھر کے دیہات سے بچے اٹھا لاتا تھا...... بکریاں چرانے والے...... کھیتوں اور جنگل میں پھرنے والے...... ندی نالے میں یا جوہڑ میں نہانے والے...... اِکّا دُکّا بچے ہر جگہ نظر آتے ہیں اور ان کے ماں باپ بھی کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتے...... نو دس سال کی عمر تک لڑکے لڑکیاں برابر ہی سمجھے جاتے ہیں اور کسی پر روک ٹوک نہیں ہوتی...... جب دو چار واقعات ہوئے اور یہاں شور مچا تو اکبر خان نے اپنا دائرہ وسیع کر دیا...... وہ دور دراز کے علاقوں سے بچے اور بچیاں اٹھا لاتا تھا...... ریشم کو نہیں معلوم کہ پہلے سائنس ریسرچ سینٹر میں کیا ہوتا تھا...... اکبر خان اغوا کیے جانے والے بچوں کو گھر نہیں لاتا تھا...... سینٹر میں رکھتا تھا...... پھر وہ خود وہاں چوکیدار بن گیا تھا...... پہلے یہ بات ریشم کو معلوم ہوئی وہ کھیلتی ہوئی اندر چلی گئی...... گیٹ پر اس وقت کوئی نہیں تھا...... اس نے جو اندر دیکھا وہ ماں کو بتا دیا کہ بہت سے لڑکے...... اور لڑکیاں ہیں...... میری عمر کے...... لیکن سب ننگے تھے...... کسی نے بھی کپڑے نہیں پہن رکھے تھے...... شاید اس خیال سے انہیں برہنہ رکھا گیا ہوگا کہ وہ بھاگ نہ سکیں...... ممکن ہے یہ جنسی تربیت کا ایک حصہ ہو کہ آگے انہیں کیسی زندگی ملے گی اور ان کے ساتھ کیا ہوگا...... ریشم کی ماں نے اکبر خان سے پوچھا اور ان کی بہت لڑائی ہوئی...... اکبر خان نے بیوی کو دھمکی دی کہ اس نے اپنی زبان کھولی تو وہ ریشم کو بھی لے جائے گا...... بس اس کے بعد سے انہوں نے چپ سادھ لی اور اکبر خان نے انہیں چھوڑ دیا...... بردہ فروشی سے اس نے اپنے مجرمانہ کیریئر کا آغاز کیا تھا...... اس کے بعد دوسرے راستے کھلتے چلے گئے......"

میں نے کہا...... "اس کی تدفین کہاں ہوئی......"

"ابھی نہیں ہوئی...... اس کی لاش مردہ خانے میں رکھی ہے...... رانا صاحب کے منشی نے پیغام بھجوایا تھا کہ اس کی فیملی لاش وصول کر لے......"

"پھر کیا انہوں نے انکار کر دیا؟"

"نہیں...... وہ غنی کا چچا تھا...... غنی میرے پاس آیا...... آس پاس کے لوگ اور کچھ نہیں جانتے...... یہ جانتے ہیں کہ اکبر خان نے بیوی کو چھوڑا نہیں تھا...... طلاق نہیں ہوئی تھی وہ بیوہ ہوئی ہے تو اسے عدت میں بیٹھنا چاہیے...... اکبر خان کو لاوارث قرار نہیں دیا جا سکتا اور بیٹا نہیں تو بھتیجا جائے اور میت لے کر آئے...... میں نے بھی یہی کہا کہ اب ایک لاش کے ساتھ انتقامی بدسلوکی سے کیا فائدہ...... مگر جو کچھ وہ کرتا رہا ہے اس کی وجہ سے غنی بھی آمادہ نہیں...... ریشم کہتی ہے کہ اس سے بڑا جہنمی کون ہوگا جو معصوم بچوں اور بچیوں کو ماں باپ سے چھین کر مال کمائے...... انہیں دنیا کے بازار میں ہوس پرستوں کے ہاتھ بیچ دے...... معلوم نہیں آج بھی کتنی لڑکیاں اسے بددعائیں دے رہی ہوں گی...... غنی کا خیال ہے کہ اس کا جنازہ بھی جائز نہیں......"

"پھر کیا ہوگا اکبر خان کا......"

"آخر میں کیوں سوچوں اس کے بارے میں" راجا نے بیزاری سے کہا۔

مجھے اپنے سوال کا جواب آدھے گھنٹے بعد ملا جب ایک بدحواس گارڈ نے مجھے سلیوٹ مار کے ہکلاتے ہوئے کہا۔

"سر وہ...... پولیس...... جنازہ...... ایک ایمبولینس...... اکبر خان......"

میں نے ساری بات سمجھ لی...... "انہیں اندر آنے دو......"

حویلی میں ایک کہرام برپا ہو گیا...... میں نے غنی کو بھیجا کہ جاؤ اپنے چچا کی لاش وصول کرو...... اس کے لیے انکار کی گنجائش نہ رہی...... پولیس پارٹی کے ساتھ آنے والوں میں ایک ڈی ایس پی الگ جیپ میں تھا...... اس کے ساتھ مقامی پولیس چوکی کا انچارج اور سب انسپکٹر کے عہدے کے دو افسران تھے۔ غنی لاش کو سرونٹ کوارٹرز کی طرف لے گیا...... راجا پولیس پارٹی کو مہمان خانے میں لے آیا۔

"آپ نواب رفیق احمد شیرازی ہیں؟" ڈی ایس پی نے رعونت آمیز متانت سے کہا...... "میں اکبر خان کے قتل کی تفتیش کرنے والی خصوصی ٹیم کا سربراہ ہوں...... گلزار کیانی...... اور یہ دونوں میرے ماتحت......"

میں نے کہا...... "فرمایئے میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں......"

"آپ کو ہمارے ساتھ چلنا ہوگا...... قتل کی ایف آئی آر میں آپ کو شریکِ مجرم نامزد کیا گیا ہے......"

میں نے کہا...... ”کس بنیاد پر؟“

”پرانی دشمنی کی بنیاد پر......“

میں نے کہا” یہ کیا فضول بات ہے...... اکبر خان آج کچھ بھی ہو...... کل تک اس کی حیثیت کیا تھی...... وہ میرا ادنیٰ ملازم تھا...... سرونٹ کوارٹر میں رہنے والا۔“

”ہم کل کی نہیں آج کی صورتِ حال کو دیکھ رہے ہیں نواب صاحب......“ وہ ترشی سے بولا۔

میں نے کہا...... ”قتل کی یہ واردات اسلام آباد میں ہوئی تھی......“

”ہم بھی اسلام آباد سے آئے ہیں...... ایس ایس پی صاحب نے یہ خصوصی ٹیم تشکیل دی ہے......“ وہ بولا۔

”کیا میں اپنے وکیل سے بات کر سکتا ہوں......؟“ میں نے کہا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا...... ”میں زیادہ سے زیادہ آپ کو یہ رعایت دے سکتا ہوں کہ آپ کو ہتھکڑی نہ لگاؤں......“

”اگر میں اپنی گاڑی میں جانا چاہوں......؟“

اس نے کچھ دیر سوچا اور پھر سر ہلا دیا...... ”ٹھیک ہے...... لیکن ہم آپ کے ساتھ رہیں گے......“

میں نے کہا...... ”آپ مجھے صرف دس منٹ دیں تیاری کے لیے۔ اتنی دیر میں آپ چائے پئیں...... اتنی دور سے آئے ہیں...... کچھ ریفریش ہو جائیں۔“

ڈی ایس پی نے پہلے رسمی طور پر انکار کیا...... پھر راجا نے اسے راضی کر لیا۔ راجا نے اپنا تعارف کرانے کے بعد قانونی معاملات کو خوش اسلوبی سے طے کرنے کے لیے کھل کے بات کی...... پیسے کی طاقت سے کون مکر سکتا ہے...... اس کمرے میں صرف تین افراد قانون کی نمائندگی کر رہے تھے...... راجا نے کسی ماہر نیلام کرنے والے کی طرح آہستہ آہستہ اپنی بولی بڑھائی اور ان کی مزاحمت کم ہوتی چلی گئی۔

دس منٹ کے بجائے میں ایک گھنٹے بعد اپنی گاڑی میں نکلا تو میں اپنی گاڑی خود ڈرائیو کر رہا تھا...... ڈی ایس پی میرے ساتھ بیٹھا تھا اور اس کا موڈ بدلا ہوا تھا...... شام پانچ بجے ہم راولپنڈی کے سیٹلائٹ ٹاؤن تھانے پہنچے...... یہ تقریباً طے ہو گیا تھا کہ رسمی طور پر مجھے ضابطے کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد حوالات میں بند رکھا جائے گا لیکن اس کے بعد مہمان کی حیثیت سے میں ڈی ایس پی کے گھر پر رہوں گا اور تفتیش اگلے روز شروع ہوگی۔

تھانے میں صورت حال اس کے برعکس ہو گئی...... ڈی ایس پی میرے ساتھ ایس ایچ او کے کمرے میں داخل ہوا تو ایک انسپکٹر نے مسکراتے ہوئے میرا استقبال کیا...... مجھے حیرانی سے زیادہ صدمہ ہوا۔

ڈی ایس پی نے کہا...... ”بس ان کا اندراج وغیرہ کر لو...... یہ نواب رفیق احمد شیرازی ہیں......“

انسپکٹر کی مسکراہٹ گہری ہو گئی...... ”میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں سر، اور یہ بھی مجھے پہچان گئے ہوں گے......“

ڈی ایس پی نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”یہ ہمارے بھی پرانے دوست نکلے...... ہم چاہتے ہیں ان کا خاص خیال رکھا جائے......“

”بالکل رکھیں گے سر......“

”اگر یہ رات کو ہمارے گھر قیام کریں......“

انسپکٹر نے کہا...... ”میری نوکری کا معاملہ ہے سر...... آپ بالکل فکر نہ کریں یہاں ان کو وی آئی پی ٹریٹمنٹ ملے گا......“

ڈی ایس پی نے شاید انسپکٹر کے موڈ کو سمجھ لیا...... ”چلو ٹھیک ہے...... ہم کل سے تفتیش کا آغاز کریں گے......“

جب ڈی ایس پی مجھ سے نظر ملائے بغیر چلا گیا تو انسپکٹر نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیر کے کہا...... ”جی نواب صاحب...... کچھ یاد آیا آپ کو...... آپ نے میری شکایت کی تھی کہ میں رانا کا نمک خوار ہوں...... غلام اور کتا ہوں......“

میں نے کہا...... ”کیا آج بھی ہو؟......“

”آپ کو آج رات بھر میں اندازہ ہو جائے گا......“ وہ دھاڑ کے بولا اور پھر گھنٹی بجانے لگا۔

ایک ساتھ دو سپاہی اندر آئے۔

”اوئے لے جاؤ اسے...... اور پھینک دو حوالات میں اس نواب کے...... کو......“ اس نے گرج کر حکم دیا۔

چند منٹ بعد میں سلاخوں کے پیچھے پڑا تھا...... حوالات میں پانچ قیدی اور بھی تھے...... ان میں سے ایک جو فرش پر پڑا تھا قریب المرگ لگتا تھا...... اس کا پیشاب پاخانہ حوالات کے فرش پر پھیلا ہوا تھا مگر اسے ہوش نہ تھا...... اندر سخت بدبو تھی...... میرے سامنے فرش پر لیٹا ہوا قیدی تڑپا...... اس نے خون اگلا اور ساکت ہو گیا...... اس کی آنکھیں بجھ کے ٹھہر گئیں...... وہ قیدِ حیات سے آزاد ہو چکا تھا...... باقی حوالاتی اس منظر کو وحشت زدہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

اچانک میری نظر گیٹ کی طرف گئی...... مفرور مجرم رانا رجب علی ایم پی اے ایک کار سے اتر رہا تھا...... وہ سیدھا میری طرف آیا۔

رانا غرور آمیز تمکنت سے قدم اٹھاتا میری طرف آیا...... اس کے لبوں پر معنی خیز تمسخر اڑاتی اور چیلنج دیتی ہوئی مسکراہٹ تھی جس کا مطلب میں اچھی طرح سمجھتا تھا۔

سلاخوں کے اُدھر وہ تھا...... بے داغ سفید کلف لگے چیئرمین لٹھے کے شلوار قمیص میں...... سیاہ واسکٹ اور سنہری گھڑی ایک ہاتھ میں، اونچے اکڑی ہوئی گردن کے سربلند شملے کے ساتھ...... اپنی دولت مندی خاندانی اثر رسوخ اور سیاسی قوت کا بھرپور مظاہرہ کرتا ہوا اور میرا مذاق اُڑاتا ہوا کہ دیکھو نواب آف ست بدھائی...... بڑا ناز تھا تمہیں اپنی عقل کی ہوشیاری پر اپنی ذہانت کی عقدہ کشائی پر...... اپنی ولایت کی اعلیٰ تعلیم پر اور قانون کی بالادستی پر۔

بالکل میرے سامنے آ کے اس نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا اور میری طرف ہاتھ بڑھا کے بولا۔ ”یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں اپنے نواب صاحب۔“

میں نے اس کے ہاتھ کو نظر انداز کر دیا۔ ”ابھی تم اور بہت کچھ دیکھو گے رانا رجب علی......“

اس نے افسوس سے سر ہلایا۔ ”خدا نہ کرے کہ میں تمہیں اس طرح پڑا ہوا دیکھوں۔“ اس نے حوالات کے فرش پر ساکت لاش کو دیکھا۔

”مگر میں ضرور دیکھوں گا...... پھانسی گھاٹ سے مردہ خانے لائی جانے والی تمہاری لاش اس فلم کا آخری سین ہوگی جس میں تم بے گناہوں کے خون سے ہولی کھیلتے رہے......“

اس نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں۔ ”کیسے ظالم ہوتے ہیں یہ پولیس والے بھی...... کوئی ہڈی سلامت نہیں چھوڑتے...... ہڈی سے بوٹی بوٹی الگ کر دیتے ہیں مگر جان نہیں نکلنے دیتے...... تم کہو تو میں بات کروں تھانے دار سے...... اپنا بندہ ہے۔“

میں نے کہا۔ ”تم اپنی فکر کرو رانا۔“

وہ ڈھٹائی سے ہنسنے لگا۔ ”ہمارا خیال رکھنے والے بہت ہیں نواب صاحب...... ہم نام کے نواب نہیں ہیں...... لاٹری کھلنے سے کمی کمین اشراف میں شامل نہیں ہو جاتے۔ ایس پی بھی دس قدم دور سے سلام کرتا ہے ہمیں...... کیونکہ ہم حاکم لوگ ہیں اور وہ پبلک سرونٹ...... قانون ہم بناتے ہیں اور ہم ہی توڑ بھی سکتے ہیں...... تم جیسے ولایتی ڈگری والے کنگلے کیا کر سکتے ہیں۔“

حقیقت یہ ہے کہ رانا کی باتوں سے مجھے سخت اذیت ہو رہی تھی...... میں کوشش ضرور کر رہا تھا کہ اس کی ہر بات کا منہ توڑ جواب دوں لیکن اس سے کچھ حاصل نہ ہوتا...... اس کی اور میری پوزیشن کا فرق جھٹلایا نہیں جا سکتا تھا۔ اس حوالات کے دوسرے اسیر بھی میری ذلت کا یہ تماشا بڑی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے...... ان میں سے ایک غالباً ہیروئن والی سگریٹ کے کش لگا رہا تھا اور خاصی بے فکری سے پیر پھیلائے دیوار کا سہارا لیے بیٹھا تھا...... اس نے ہنس کے دوسروں کو مخاطب کیا...... ”اوئے ماں کے یارو...... دیکھو یہ ہوتا ہے نواب...... پہلے دیکھا ہے کبھی کسی چڑیا گھر میں؟“ ایک مخبوط الحواس حوالاتی اس کی بات پر قہقہہ مار کے ہنسا۔

مجھے اور کچھ نہیں سوجھا۔ میں نے لہجہ بدل کر عاجزی سے کہا۔ ”رانا صاحب...... آپ سے ایک بات کہنی تھی...... کیا آپ واقعی کچھ کر سکتے ہیں؟“

رانا کا چہرہ اپنے دشمن کے اعترافِ شکست پر خوشی سے دمکنے لگا...... ”اوئے ہم سب کچھ کر سکتے ہیں۔“ اس نے میری گزارش سننے کے لیے اپنا چہرہ کچھ آگے کر لیا۔

میں نے ایک دم اس کی گردن دبوچ لی۔ ”تو پھر ایسا کریں۔ یہ مونچھیں ہٹا دیں اپنی منحوس شکل کے فریم سے...... بلکہ میں ہٹا دیتا ہوں...... دو منٹ میں۔“

وہ چلّانے لگا، اس کی گردن میرے ایک بازو کی گرفت میں تھی اور اس کا چہرہ لوہے کی سلاخوں میں پھنس گیا تھا...... میرا دوسرا ہاتھ اس کی مونچھوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش میں مصروف تھا حالانکہ نہ یہ ممکن تھا اور نہ ہی میرا یہ ارادہ تھا۔

”اوئے بچاؤ مجھے اس پاگل سے...... تھانے دار......“

میں نے کہا۔ ”ایلفی سے لگائی ہیں یہ مونچھیں...... اور یہ بال بھی مجھے کتے کی دم کے لگتے ہیں۔“

رانا کی چیخ پکار سے تھانے میں کھلبلی مچ گئی تھی۔ ایک دم تھانے کا عملہ اس کی مدد کے لیے لپکا...... آخر میں تھانے دار شیر کی طرح دھاڑتا ہوا اپنے کمرے سے برآمد ہوا...... ”اوئے یہ کیا ہو رہا ہے؟“ اس نے میری طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

اس وقت تک میں نے رانا کے منہ پر تھوک کے اسے چھوڑ چکا تھا اور اسی وقت ایک سنتری حوالات کے گیٹ کا تالا بھی کھول چکا تھا۔ رانا کی بہت ذلت ہوئی تھی۔ وہ چیخ چیخ کے تھانے دار سے کہہ رہا تھا ”اس پاگل کتے کو ابھی گولی مار دی جائے۔ یہ تو کسی کی بھی جان لے سکتا ہے۔“ وہ ہانپنے لگا۔

تھانے دار کے بس میں ہوتا تو وہ حوالات میں گھسے کے ایسا ہی کرتا۔ اس نے مجھے ایک سو ایک گالیوں اور دھمکیوں سے نوازنے کے بعد حکم دیا کہ ملزم کو ڈرائنگ روم میں منتقل کر دیا جائے جہاں آج رات اس کے دماغ کا خصوصی علاج کیا جائے گا......

دو مسلح کانسٹیبل مزید گالیاں دیتے ہوئے مجھے دھکیل کر

باہر لے گئے..... انہوں نے میری ایک نہیں سنی..... میں خود ہوش میں آچکا تھا اور یہ سمجھ رہا تھا کہ دیوانگی کا یہ مظاہرہ یقیناً مجھے مہنگا پڑے گا..... تھانے میں کچھ بھی ہوسکتا ہے اور قانون کی بالا دستی کا راگ الاپنے والے وکیل صحافی، ہیومن رائٹس کے مجاہد اور حکمراں..... سب مل کر ایک تھانے دار کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے..... صبح تک میری لاش ورثا کے حوالے کر دی جائے گی کہ جاؤ کرلو جو کرنا ہے..... پریس کانفرنس کرو جلوس نکالو..... عدالتی تحقیقات کراؤ..... اقوام متحدہ کو بلالو..... تمہارے بندے نے خودکشی کی ہے..... تھانے دار کی بات کو غلط ثابت نہیں کیا جاسکتا۔

جب سپاہی مجھے تھانے دار کے حکم پر دھکے اور گالیاں دیتے ہوئے عقوبت خانے کی طرف ایسے لے جارہے تھے جیسے قصاب کسی بیل کو ذبح کرنے کے لیے مذبح خانے لے جاتے ہیں تو مجھے احساس ہوا کہ غصّے کی دیوانگی میں خود پر قابو نہ رکھ کے میں نے اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے..... اس وقت بھی میں یہ کرسکتا تھا کہ دونوں سپاہیوں کو دس سیکنڈ میں ناک آؤٹ کردوں..... ان کے پیچھے آنے والے تھانے دار کو اسی کے ریوالور سے یرغمال بنالوں اور اس کے ساتھ کسی فاتح کی طرح تھانے سے مارچ کر جاؤں..... جتنا مارشل آرٹ میں نے سیکھا تھا، وہ تھانے کی ساری نفری کو نمٹانے کے لیے کافی تھا مگر اب میری عقل و ہوش ٹھکانے آچکے تھے اور میں زندگی کے باقی ماندہ امکانات سے ہاتھ دھونا نہیں چاہتا تھا۔

عقوبت خانہ ہر تھانے کا لازمی حصّہ ہوتا ہے..... اس میں تفتیش کے نام پر جو کچھ کسی بے بس انسان کے ساتھ کیا جاتا ہے، وہ بھی پورے ہندوستان پاکستان میں ایک جیسا ہے۔ تفتیش کے آلات بھی سب جگہ کم و بیش یکساں ہوتے ہیں..... تیرہ نمبر کا چھتر جو چمڑے کا ڈیڑھ فٹ لمبا ٹکڑا ہوتا ہے..... کوڑے اور جسم پر ضرب لگانے والے ڈنڈے..... جکڑنے اور لٹکانے والی رسیاں اور زنجیریں..... چیرا لگانے اور ناخنوں کو کھینچنے کے آلات..... جسم کے نازک حصّوں کو دبانے یا برقی جھٹکے دینے..... مرچیں بھرنے اور برف میں دبانے یا غوطے دینے کا نظام..... پہلے زمانے میں اسپتال اور قبرستان جائے عبرت سمجھی جاتی تھیں..... اب کسی تفتیشی ادارے کا عقوبت خانہ سب سے بڑی عبرت کی جگہ ہے..... جو کچھ وہاں تفتیش کے نام پر ہوتا ہے، وہ ٹی وی پر دکھا دیا جائے تو شاید جرائم بالکل ختم ہوجائیں۔

میں نے بھی اس جگہ کے بارے میں بہت کچھ سنا اور پڑھا تھا..... آج مجھے اس کا عملی تجربہ ہونے والا تھا اور مجھے واقعی ایسا لگتا تھا کہ میں اس رات کی صبح نہ دیکھ سکوں گا..... قسمت کی خوبی دیکھیے ٹوٹی کہاں کمند..... یورپ امریکا گھوم کے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والا ست بدھائی کا نواب بنا اور مرا تو کیسے..... ساری لگن، ساری جدوجہد، خلوص... اور کہاں کا ترقیاتی پروگرام اور کیسی انقلاب لانے کی خواہش..... کون فریال یا نور جہاں اور کیسا ان کا عشق۔

رانا خصوصی مبصر یا مہمان کے طور پر میری سزا کا تماشا دیکھنے اندر آگیا اور اسے تھانے دار کے حکم سے ایک کرسی بھی فراہم کر دی گئی..... وہ اب بھی بول رہا تھا اور انتقام کی خواہش سے مغلوب تھا۔ ایسی ذلت کا وہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے لیے تسکین کا واحد وسیلہ میری سو گنا یا ہزار گنا یا ایک لاکھ گنا زیادہ ذلت کا نظارہ ہی ہوسکتا تھا..... وہ مجھے گالیاں دے رہا تھا اور بار بار کہہ رہا تھا..... ”ابھی دیکھ تیرا کیا حشر ہوتا ہے.....“

تھانے دار کے آنے تک سپاہی رک گئے تھے..... میں نے انہیں ایک فضول سی دھمکی دی تھی کہ کسی نے مجھے ہاتھ بھی لگایا تو اچھا نہیں ہوگا..... ایسی باتیں انہیں متاثر نہیں کرسکتی تھیں مگر شاید میری شخصیت نے انہیں مرعوب کرلیا تھا، عام مجرم کا وہ اب تک حشر نشر کرچکے ہوتے۔

تھانے دار نے آتے ہی گرج کے حکم دیا۔ ”لٹکا دو اسے الٹا اور دماغ درست کرو پہلے۔“

ماتحت ان ہدایات کا مطلب اچھی طرح سمجھتے تھے..... الٹا لٹکانے سے پہلے ننگا کرنا ایک لازمی شرط تھی..... ابھی وہ میری طرف بڑھے ہی تھے کہ تھانے دار کے ہاتھ میں موبائل بجنے لگا..... باہر سے ایک کانسٹیبل بوکھلایا گھبرایا ہوا اندر آیا..... ”ڈی آئی جی صاحب بات کرنا چاہتے ہیں سر۔“

تھانے دار نے کچھ حیرانی سے موبائل فون کے اسکرین کو دیکھا۔ ابھی اس کا ارادہ کال ریسیو کرنے کا بالکل نہیں تھا مگر اب یہ ناگزیر تھا..... اس نے فون کو کان سے لگا کے کہا..... ”جی سر..... یس سر.....“ اس کی نگاہ میری طرف اٹھی..... پھر اس کے چہرے کے تاثرات بڑی تیزی سے بدلے۔

”جو آپ کا حکم سر..... لیکن سر..... قتل کا کیس ہے..... یس سر.....“ اس کی آواز میں تحکم کے بجائے فرماں برداری آگئی۔ باقی وقت اس کے ہونٹوں سے یس سر کے سوا کچھ نہ نکلا..... اس کی شکل ناگواری سے مسخ ہورہی تھی لیکن وہ افسر اعلیٰ سے گفتگو میں مکمل تابعداری ظاہر کرنے پر مجبور تھا..... اس کی نظر جیسے مجھ پر ٹھہر گئی تھی۔

فون بند کر کے اس نے ایک گہری سانس لی..... چند سیکنڈ کے لیے سارا ایکشن رک گیا..... تھانے دار سخت مایوس اور غصّے میں تھا اور اس سے میرے دل میں نئی امید جاگ اٹھی تھی..... یقیناً کوئی غیر متوقع بات ہوئی تھی جس نے تھانے دار کی تھانے داری کے غبارے کی ساری ہوا نکال دی تھی۔

اچانک مجھے ڈی آئی جی کا نام یاد آگیا..... عبداللہ جان..... یہ نام مجھے اسلام آباد میں برہان الدین نے بتایا تھا کہ برسر اقتدار سیاسی جماعت سے اختلاف کے باعث وہ بہت عرصہ معطل رہا تھا..... پھر او ایس ڈی بنا دیا گیا تھا لیکن حکومت بدلی تو اسے نوکری پر بحال کر کے جہلم پوسٹ کیا گیا ہے..... سوال یہ تھا کہ اسے میری گرفتاری کے بارے میں کس نے بتایا تھا۔

تھانے دار کے ماتھے پر خفت کے پسینے کی نمی آگئی تھی..... یہ تبدیلی اتنی عیاں تھی کہ خود رانا رجب علی بھی دیکھ رہا تھا۔ تھانے دار کے تیور بدلنے لگے تھے..... رانا نے مربیانہ انداز میں پوچھا۔ ”خیر تو ہے تھانے دار.....؟“

تھانے دار نے سر جھکا۔ ”خیر کدھر رانا صاحب..... اپنی تو بس نوکری ہے..... افسروں کے حکم کے غلام ہیں۔“

”کیا کہہ رہا تھا یہ ڈی آئی جی؟“

”آپ کے دشمنوں نے اس کے کان بھر دیے ہیں..... وہ پہلے بھی آپ کے خلاف تھا..... میری مانو تو آپ یہاں سے فٹافٹ نکل جاؤ..... کل پرسوں میں یہ بندہ جہلم میں چارج سنبھالے گا..... آپ ہوشیار ہو جاؤ۔“

”مگر ادھر کیا لینے آرہا ہے وہ.....؟“

”رانا صاحب کوئی عقل کی بات کرو..... اتنے بڑے افسر سے میں پوچھ سکتا ہوں.....؟ حکم آگیا ہے ان کا کہ نواب رفیق احمد شیرازی میرے خاص دوست ہیں، ان کا خیال رکھو۔“

”کیا خیال رکھو.....؟“ رانا برہمی سے بولا۔ ”دو دن بعد وہ چلا جائے گا تو تم کو حکم کیوں دے رہا ہے؟“

تھانے دار کے ماتھے پر بل پڑ گئے..... ”رانا..... وہ ادھر آگیا نا تو سمجھو میری نوکری گئی مگر اس سے پہلے تم گئے حوالات میں..... نواب صاحب کی جگہ۔“

میں نے طنزاً کہا۔ ”انہیں کون ڈال سکتا ہے حوالات میں..... یہ حاکم ہیں اور وہ پبلک سرونٹ..... یہ ڈر کے بھاگنے والے نہیں ہیں۔“

رانا بھڑک اٹھا۔ ”میں سمجھ لوں گا تجھ سے نواب کے نطفے.....“

تھانے دار نے سخت لہجے میں کہا۔ ”اوئے رانا..... یہ کیا بکواس لگا رکھی ہے؟ یہ تھانہ ہے..... اور عبداللہ صاحب بہت جلد آئی جی بھی بن جائیں گے۔“

رانا کا رنگ فق ہوگیا..... ”سمجھ گیا میں..... نمک حرام.....“

تھانے دار نے میز پر زور سے ہاتھ مارا۔ ”دفع ہوجاؤ یہاں سے ورنہ ابھی ڈال دوں گا حوالات میں.....“

میں نے مسکرا کے کہا۔ ”تھانے دار..... تم ایک مفرور مجرم کو دفع ہوجانے کا کہہ رہے ہو..... اگر تم نے اسے نکل جانے دیا تو یہ تمہارا جرم شمار ہوگا۔“

تھانے دار ایک نمبر کا بے غیرت اور بے شرم تھا..... کچھ دیر پہلے رانا کی نمک خواری کا دم بھرنے والا..... پل بھر میں اسی پر بھونکنے والا اور میرے قدموں میں لوٹنے والا کتا بن گیا..... رانا اس انقلاب کو دیکھ رہا تھا اور اس ذلت کو برداشت کرنے پر مجبور تھا..... تھانے دار کی وارننگ کے باوجود وہ اطمینان سے بیٹھا رہا۔ شاید اسے یقین تھا کہ تھانے دار نے مجھے مطمئن کرنے کے لیے رویہ بدلا ہے..... اور شاید یہ درست بھی تھا.....

تھانے دار نے بڑے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ ”سر..... آپ بڑے لوگ ہیں..... ہم بہت معمولی حیثیت کے ملازم سرکار..... ہاتھیوں کی لڑائی میں مینڈک خوامخواہ پس جاتے ہیں۔“

”ڈی آئی جی صاحب کے ایک فون نے تمہیں اتنا سمجھ دار بنا دیا۔“

وہ بولا..... ”آپ پہلے ہی فرما دیتے جناب عالی کہ وہ آپ کے دوست ہیں..... اتنے سینئر آفیسر ہیں..... سال دو سال میں آئی جی ہونے کا چانس ہے۔“

میں نے کہا۔ ”بات یہ ہے تھانے دار جی..... کہ میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔“

رانا چونکا۔ ”کیا مطلب.....؟ یہ عبداللہ جان تمہارا دوست نہیں ہے؟“

میں نے ہنس کے کہا۔ ”میں نے آج تک اس کی صورت نہیں دیکھی..... اور وہ بھی مجھے پہچانتا نہیں۔“

رانا کا چہرہ تھانے دار کی طرف گھوم گیا۔ ”تو نے سنا تھانے دار..... یہ کیا ڈراما ہو رہا ہے آخر..... وہ کس کا فون تھا؟“

تھانے دار نے اسے پھر سمجھانے کی کوشش کی..... ”رانا..... ابھی وقت ہے..... نکل جاؤ یہاں سے..... بعد میں مت کہنا ہم نے زیادتی کی۔“

رانا اٹھ کھڑا ہوا..... ”تو دھمکی دیتا ہے مجھے..... ساری

عمر میرے سامنے ہاتھ پھیلاتا رہا..... آج زک دینے کی بات کرتا ہے..... چل زک دے مجھے..... لیکن اس کے بعد کیا ہو گا..... میں کوئی ایرا غیرا نہیں..... اسمبلی کا ممبر ہوں۔"

تھانے دار کو اپنی غلطی کا احساس ہوا..... اس نے رانا کے سامنے ہاتھ جوڑ کے کہا۔ "رانا صاحب..... خدا کے لیے آپ جاؤ..... مجھے آزمائش میں مت ڈالو..... ہم بعد میں بات کریں گے....." پھر اس نے نظر بچا کے رانا کو آنکھ ماری۔

رانا باہر نکل گیا..... تھانے دار نے اپنے ماتھے سے پسینا پونچھا۔ "سر جی آپ بھی دو جوتے مار لو..... ہم ہیں ہی کتے..... سب کی خیرات پر پلنے والے..... کس کی مانیں کس کی نہ مانیں..... بڑا مشکل ہوتا جا رہا ہے نوکری کرنا۔"

"اب تک تم نے کنویں کے مینڈک کی طرح صرف رانا جیسے لوگوں کی غلامی کی ہے..... مگر وقت بدل گیا ہے تھانے دار صاحب....."

اس نے احمقوں کی طرح سر ہلایا۔ "سچ فرمایا جناب نے..... آپ تشریف لاؤ میرے ساتھ۔"

شاید عبداللہ جان کو بھی اندازہ تھا کہ فون پر دیے جانے والے کسی حکم پر فوراً عمل نہیں ہوتا اور عموماً خودسر تھانے دار حکم کو نظر انداز کر دیتا ہے چنانچہ اس نے خود آنے کا فیصلہ کیا تھا..... چند روز میں اسے جہلم جا کے چارج سنبھالنا تھا لیکن وہ بہت سینئر افسر تھا اور کل کو آئی جی بن کے واپس اسلام آباد بھی آ سکتا تھا..... بازی ایک دم پلٹ جانے کی یہی وجہ تھی..... ابھی مجھے عقوبت خانے سے نکل کر تھانہ انچارج کے کمرائے خاص میں تشریف فرما ہوئے چند منٹ ہی گزرے تھے کہ باہر بھگدڑ مچ گئی..... ڈیوٹی افسر ہانپتا کانپتا اندر آیا.....

"سر جی..... ڈی آئی جی صاحب آ رہے ہیں۔"

تھانے دار نے سر ہلایا۔ "تم چلو ڈیوٹی پر..... روزنامچہ کدھر ہے..... حوالات میں سے بندے غائب کرو..... اور وہ رانا نکل گیا کہ نہیں۔"

"وہ چلے گئے سر..... اپنا انسپکٹر شبیر آگے آگے نکل آیا..... اچھا ہوا، اس نے بتا دیا کہ وہ پیچھے آ رہے ہیں۔"

کسی گہری سوچ میں مستغرق تھانے دار نے افہامی انداز میں سر ہلایا۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ ڈی آئی جی صاحب کی اس وقت تشریف آوری کا اصل مقصد کیا ہو سکتا ہے..... وہ تھانے کا معائنہ تو کرنے سے رہے..... جو افسر چند دن میں جانے والا ہو، اسے کیا پڑی ہے کہ اپنی نیند حرام کرے کارکردگی دکھانی یا دیکھنی ہو گی تو چھاپہ وہاں مارے گا جہاں جا رہا ہے..... یقیناً وہ فون پر دیے جانے والے احکامات کی تعمیل چاہتا ہے۔

تھانے دار پرانا..... جہاں دیدہ اور سیانا آدمی تھا..... اپنی سروس میں ہر قسم کے افسر سے نمٹ چکا تھا..... وہ معاملہ فہم اور موقع شناس نہ ہوتا تو تھانہ انچارج کے عہدے تک کبھی نہ پہنچ پاتا..... جھوٹ و فریب اور عیاری و مکاری..... خوشامد اور چاپلوسی..... (علامہ اقبال کے فرمودات کے برعکس)..... جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں..... اسے کل کے دشمن آج کے دوست اور کل کے دوست آج کے دشمن بنا کے جینے کی سیاست آتی تھی۔

میں نے کہا۔ "تم کچھ پریشان لگ رہے ہو تھانے دار؟"

وہ مسکرانے لگا۔ "پریشانیاں آتی جاتی ہیں نواب صاحب۔"

میں نے کہا۔ "اب تم کیا کہو گے ڈی آئی جی صاحب سے کہ تم نے رانا کو کیوں نکل جانے دیا؟"

وہ ہنسا..... "کہاں سے نکل جانے دیا اور کب؟"

"ویری گڈ..... تم کہو گے کہ وہ یہاں آئے ہی نہیں۔"

اس نے ڈھٹائی سے کہا۔ "رانا صاحب یہاں آئے ہوتے تو انہیں کوئی تو دیکھتا۔"

میں نے طنز سے کہا۔ "اور وہ آتے تو تم انہیں ضرور گرفتار کرتے۔"

"بالکل یہی تو سر..... آخر ہم یہاں بیٹھے کس لیے ہیں..... قانون کے مطابق مجرم کو پکڑنے اور بے گناہ کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے۔"

"تم اس سے بھی صاف انکار کر دو گے..... کہ تم نے میرے ساتھ کوئی نامناسب سلوک کیا.....؟" میں نے تلخی سے کہا۔

"وہ خود دیکھ لیں گے کہ ہم نے آپ کے ساتھ معزز مہمانوں جیسا سلوک کیا..... آپ کو عزت کے ساتھ اپنے کمرے میں بٹھایا..... لو وہ چائے بھی آ گئی جناب عالی۔"

میں نے کہا۔ "اتنا یقین ہے تمہیں کہ میرے سچ کے مقابلے میں وہ تمہارے جھوٹ کو مان لیں گے؟"

"میرے سچ کے گواہ سارے تھانے والے ہیں..... اب دشمنی میں آپ کچھ بھی کہہ دیں اگر وہ مان لیں تو ان کی مرضی۔"

میں نے کہا۔ "میری تمہاری کیسی دشمنی؟"

"بڑے لوگ تھانے بلانے پر بھی ناراض ہو جاتے ہیں۔" وہ چائے بنانے لگا۔ "لیکن سر..... زیادہ سے زیادہ بھی کیا ہو سکتا ہے؟ وہ کچھ دن کے لیے معطل کر دیں..... ٹرانسفر کرا دیں..... نوکری میں یہ سب ہم بہت دیکھ چکے ہیں..... کوئی توپ کے منہ پر باندھ کے گولا نہیں چلا سکتا..... آپ چائے پیو اور بھول جاؤ اگلی پچھلی ساری باتوں کو۔"

ایک سب انسپکٹر اس وقت اندر آ گیا اور کرسی کھینچ کے میرے ساتھ بیٹھ گیا..... انہوں نے جس طرح ہاتھ ملایا، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ پرانے ساتھی ہیں..... آنے والے سب انسپکٹر نے گالی شامل کر کے سوال کیا..... "یار کدھر ہے وہ نواب کا نمونہ..... ہمیں بھی دکھا۔"

تھانے دار نے کھنکار کے اسے آنکھ ماری۔ "اوئے پاگل دے پتر..... یہی ہیں اپنے نواب رفیق احمد شیرازی جو تیرے ساتھ بیٹھے ہیں..... ست بدھائی کی ریاست کے حکمران۔"

انسپکٹر کا حال ایسا ہو گیا جیسے اس کا پیشاب خطا ہونے والا ہے یا ہو چکا ہے..... "سر جی مجھے معاف کر دیں۔"

میں نے کہا۔ "کچھ لیے دیے بغیر تم تھانے لائے جانے والوں کو معاف کرتے ہو؟"

تھانے دار اس کی حمایت میں بولا۔ "غلطی تو کسی سے بھی ہو جاتی ہے سر۔"

"ہو جانے والی اور دانستہ کی جانے والی غلطی میں فرق ہوتا ہے۔"

"ہم تو جناب آپ کے بھی حکم کے غلام ہیں۔"

میں نے کہا۔ "ہاں..... مجھے معلوم ہے تم طوائف کی طرح بکاؤ مال ہو..... اور وفاداری اور فرض شناسی بیچتے رہتے ہو۔"

اس کے مزید کچھ کہنے سے پہلے ہی تھانے میں پھر چیخ پکار ہوئی اور دونوں تھانے دار ٹوپی سر پر جمائے اور بیلٹ سنبھالتے باہر لپکے..... چند منٹ کے بعد گرے شرٹ اور بلیک پینٹ میں ایک اسپورٹس مین ٹائپ شخص اندر آ گیا..... اس کا جسم ورزشی تھا اور صحت بہت اچھی تھی..... گھنے سیاہ بالوں کا کچھ حصہ کنپٹی پر سفید ہوا تھا..... میرے اندازے کے مطابق اس کی عمر چالیس پینتالیس کے درمیان تھی..... اس نے سنہرے فریم کی نازک سی عینک لگا رکھی تھی۔

میں نے کھڑے ہو کے اس کا استقبال کیا..... "آپ یقیناً عبداللہ جان ہیں..... ڈی آئی جی..... میں رفیق احمد ہوں۔"

اس نے مجھ سے بھرپور مصافحہ کیا۔ "نواب آف ست بدھائی میں نے آپ کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا ہے۔"

"مجھے بھی برہان الدین صاحب نے آپ کے بارے میں بہت کچھ بتایا ہے..... آپ سے مل کے خوشی ہوئی۔"

"دی بلیو راز آل مائن..... ابھی کچھ دیر پہلے ان کا فون آیا تھا۔ وہ میرے والد کے دوست ہیں۔"

"میں آپ کے والد کا ایک نالائق شاگرد تھا..... شاید انہیں یاد بھی نہ ہو بہت پرانی بات ہے..... وہ کیسے ہیں؟"

"ہی از فائن..... ریٹائرڈ لائف کو انجوائے کر رہے ہیں۔"

وہ بولا۔ "میرے پاس وقت کم ہے نواب صاحب....."

میں نے کہا۔ "پلیز..... مجھے صرف رفیق احمد کہیے۔"

"مختصراً آپ مجھے بتائیے..... یہ اکبر خان کون تھا..... اور اس کے قتل کے الزام میں آپ کو کیسے ملوث کر لیا گیا..... کیا یہ کوئی سازش ہے؟"

اس کے رویے اور لہجے سے زیادہ ان الفاظ نے میرے لیے آسانی پیدا کر دی..... میں نے مختصراً اکبر خان کی ہسٹری بتائی۔

وہ بڑے دھیان سے سنتا رہا۔ اس دوران باہر مکمل خاموشی رہی۔ کسی نے بھی براہِ راست اندر آنے یا باہر ہنگامہ آرائی سے ہمارے اعلیٰ سطحی اجلاس میں دخل اندازی کی جرأت نہیں کی۔ یقیناً اس کے لیے واضح ہدایات پہلے ہی جاری کر دی گئی ہوں گی۔

خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا تو عبداللہ جان نے سوال کیا۔ "میں نے سنا ہے کہ اکبر خان کی بیوی بہت خوب صورت ہے۔"

میں نے محتاط انداز میں کہا۔ "اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔"

"میں نے یہ بھی سنا ہے....." اس نے سرسری انداز میں کہا۔ "کہ آپ کے بھی اس سے مراسم تھے....."

"کہنے والوں کی زبان کون پکڑ سکتا ہے۔ رانا کی لابی میرے خلاف پوری طرح سرگرم عمل ہے۔" میں نے کہا۔

"پولیس کا خیال ہے کہ اکبر خان کو اس کی بیوی نے اپنے آشنا کی مدد سے قتل کیا..... اور وہ آشنا آپ تھے۔"

"اس سے زیادہ فضول اور بے بنیاد بات نہیں ہو سکتی۔" میں نے کہا۔

"یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ آپ نے اسے اپنی حویلی میں چھپا رکھا ہے۔"

میں نے کہا۔ "آپ قانون کو چھوڑیے..... آپ ابھی چلیں اور اپنی تسلی کر لیں۔ میں کسی وارنٹ کے بغیر آپ کو اجازت دیتا ہوں کہ حویلی کا چپہ چپہ چھان کر دیکھ لیں۔ جتنی نفری چاہیں ساتھ لے لیں۔"

اس نے سر ہلایا۔ "میں آپ پر اعتماد کرتا ہوں۔ اس

عورت کے مراسم نہ جانے کتنے مردوں سے رہے ہوں گے لیکن ابھی تک پولیس کو کوئی بھی CLUE نہیں ملا ہے..... وہ عورت غائب ہوگئی ہے۔ اکبر خان کا مرڈر ایک طے شدہ منصوبے کے مطابق ہوا ہے۔"

میں نے مسکرا کے کہا۔ "اس طرح تو ہوتا ہے۔ اس طرح کے کاموں میں۔ اس کے دشمن بھی بہت ہوں گے اور رقیب بھی۔"

"یہ بات نا قابلِ فہم ہے کہ وہ غلط نام سے کرایے پر مکان حاصل کر کے کیوں رہا..... وہ کسی ہوٹل یا گیسٹ ہاؤس میں بھی رہ سکتا تھا۔"

میں نے کہا۔ "وہ گیسٹ ہاؤس یا ہوٹل خرید سکتا تھا..... مگر وہ خود کسی سے چھپ کے رہنا چاہتا ہوگا..... شاید اسی قاتل سے۔"

"یعنی اسے خطرے کا اندازہ ہو چکا تھا..... خیر..... میں وہاں آؤں گا تو اس کے فیملی ممبرز سے بھی ملوں گا جو حویلی میں رہتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "ضرور آیئے..... لیکن برسوں سے اس کا کسی سے کوئی رشتہ نہیں تھا۔

"مجھے اس سائنس ریسرچ سینٹر کو بھی دیکھنا ہے۔ جہاں وہ ایسا انسانیت سوز کاروبار چلاتا رہا۔"

"اور کمال یہ ہے کہ پولیس بے خبر رہی....." میں نے طنز سے کہا۔

اس نے اچانک کہا۔ "جب یہ واردات ہوئی تو..... آپ کہاں تھے۔"

"میں وہیں تھا..... ست بدھائی کی حویلی میں۔ اس کے گواہ بہت ہیں....." میں نے اطمینان سے کہا۔

"یقیناً ہوں گے..... گواہ بہت مل جاتے ہیں۔ خیر چھوڑیے اس معاملے کو..... مجھے آپ کے ترقیاتی پروگرام نے بہت متاثر کیا۔"

میں نے کہا۔ "ابھی تو وہ محض ایک کاغذی منصوبہ ہے۔ رانا کی طرف سے مخالفت کے باعث کام آگے نہیں بڑھا۔ دوسرے مسئلے کھڑے ہوگئے۔ بعض اوقات تو میں اتنا پریشان ہو جاتا ہوں کہ سوچتا ہوں سب بیچ کر واپس لندن چلا جاؤں۔ یہاں نہ کوئی نظام ہے نہ قانون۔ رانا جیسے خود کو حکمراں سمجھتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ عوام کی حالت بدلے۔ ان میں شعور آئے....."

"ایسا یقیناً ہے.....اور ہر جگہ ہے....."

میں نے کہا۔ "نصف صدی گزر گئی جمہوریت اور عوام کے حقوق کی باتیں کرتے..... عملی طور پر ہم پیچھے چلے گئے عوام آج پہلے سے زیادہ غلام ہیں..... گورے آقا کے مقابلے میں کالے صاحب سے زیادہ نالاں ہیں جو بات اسلامی عدل کی کرتا ہے مگر انصاف فرنگی کافر کے برابر بھی نہیں دیتا..... خیر..... چھوڑیے..... یہ تو بڑی لمبی بات ہے میرے لیے کیا حکم ہے....."

"آپ اپنا بیان ریکارڈ کرا کے جا سکتے ہیں..... ایف آئی آر سے نام خارج کرانا عدالتی کارروائی کے ذریعے ہی ممکن ہے....."

میں نے کہا۔ "یہ کام میرے وکیل کر سکتے ہیں۔"

"کل آپ ضمانت قبل از گرفتاری لے سکتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "لیکن گرفتار تو مجھے کر لیا گیا ہے۔"

وہ مسکرایا۔ "نہیں..... ابھی آپ کی گرفتاری ظاہر نہیں کی گئی۔"

میں نے کہا۔ "جو پولیس پارٹی ایک ڈی ایس پی کی سربراہی میں ست بدھائی بھیجی گئی تھی۔"

"وہ ناکام واپس آگئی..... آپ جہلم کی سیشن کورٹ میں پیش ہو جائیں..... آپ کی ضمانت منظور ہو جائے گی۔"

یہ بات وہ اتنے یقین کے ساتھ کہہ رہا تھا کہ میں نے کچھ اور پوچھنے سے گریز کیا..... یقیناً نئے پوسٹ ہونے والے ڈی آئی جی نے ان سب کو اشارہ کر دیا ہوگا جو "متعلقہ حکام" تھے۔ وہ بہت سینئر آدمی تھا اور اس کے مستقبل قریب میں آئی جی بننے کے امکانات بہت روشن تھے۔ اقتدار و اختیار کی بساط پر چھوٹے بڑے تمام مہرے ہر چال اس طرح چلتے تھے کہ بازی بہرصورت ان کے ہاتھ میں رہے..... عرفِ عام میں یہ بیوروکریسی تھی جو ملک کے سارے نظام کو اپنی مرضی کے مطابق چلاتی تھی.....

مجھے عبداللہ جان کی حمایت ایسے وقت ہی حاصل ہوئی تھی جب مجھے اس کی اشد ضرورت تھی۔ اس کی بروقت آمد کو تائید غیبی کے سوا کیا کہا جا سکتا تھا..... اگر اس کی فون کال میں بھی چند منٹ کی تاخیر ہو جاتی تو رانا کے سامنے میری عزت و غیرت کا جنازہ اٹھ جاتا۔ مجھے ننگا کر کے الٹا لٹکا دیا جاتا اور میرے جسم پر پیشہ ورانہ مہارت اور سفاکی کے ساتھ ایسی مشقِ ستم ہوتی کہ میں ساری نوابی بھول جاتا۔ میری تذلیل کا تماشا دیکھ کے رانا کا سیروں خون بڑھ جاتا اور اس منظر کو یاد کر کے وہ ہمیشہ غرور اور خوشی محسوس کرتا۔ کچھ عجب نہیں کہ میری جان نکلنے تک وہ ہر لمحے کو وڈیو میں محفوظ کرنے کا بندوبست بھی کر چکا ہو۔

لیکن سو باتوں کی ایک بات کہ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے..... صورتِ حالات ڈرامائی طور پر یکلخت ایسی پلٹی تھی کہ فرعونیت کے نشے میں بدمست رانا کو عزت بچا کے فرار ہونا پڑا تھا ورنہ جس حوالات سے مجھے نکالا گیا تھا، وہاں وہ نظر آتا اور اس کی نمک خواری کا دم بھرنے والے تھانیدار کو ڈی آئی جی صاحب حکم دیتے تو وہ انہیں کمرائے تفتیش میں لانے اور مروجہ طریقِ کار کے مطابق اس سے پوچھ گچھ پر مجبور ہوتا۔

عبداللہ جان کی آواز پر میں چونکا..... "میں اب چلتا ہوں..... آپ سے پھر ست بدھائی میں ملاقات ہوگی۔"

میں نے کہا۔ "مجھے آپ کی آمد کا انتظار رہے گا۔"

"یہاں کوئی پرابلم ہو تو یہ کارڈ رکھ لیں..... اس پر میرے گھر کا فون نمبر بھی ہے اور موبائل فون کا نمبر بھی....."

میں نے شکریہ ادا کر کے کارڈ رکھ لیا اور عبداللہ جان کے ساتھ ہی کمرے سے باہر آیا۔ تھانے کی عسکری نفری گارڈ آف آنر پیش کرنے کے انداز میں الرٹ کھڑی تھی۔ تھانیدار نے خود دوڑ کے ڈی آئی جی صاحب کی گاڑی کا دروازہ کھولا اور گاڑی کے چلنے تک اٹینشن کھڑا رہا..... اس کے لیے یہی اطمینان کافی تھا کہ ڈی آئی جی صاحب نے روزنامچہ چیک نہیں کیا۔ حاضری نہیں دیکھی اور حوالات میں بند بے گناہ افراد کا ریکارڈ طلب نہیں کیا..... وہاں تشدد سے ہلاک ہونے والے ایک شخص کی لاش بھی پڑی تھی..... لاش کو غائب کر دیا گیا تھا۔ بعد میں وارثوں کو یہی بتایا گیا ہوگا کہ اس نے خودکشی کر لی یا وہ دل کا دورہ پڑنے سے مر گیا..... آگے جس کا جو دل چاہے کرے..... چیخ پکار کرے..... مظاہرہ کرے یا بھوک ہڑتال..... پوسٹ مارٹم کرائے یا جوڈیشل انکوائری..... عارضی معطل یا ٹرانسفر کے سوا کسی تھانیدار کا آج تک کوئی کیا بگاڑ سکا ہے جو اب اسے قتل کے جرم میں عدالت لے جا سکے۔

تھانیدار فرصت پاتے ہی میری طرف آیا..... "جنابِ عالی، آپ کا ایک بیان قانونی مجبوری ہے....."

میں نے دانستہ بڑی رعونت کا مظاہرہ کیا..... "لکھ لو جو لکھنا ہے، میں دستخط کر دوں گا....."

ڈیوٹی افسر نے بڑی عاجزی سے میرا بیان میرے سامنے بیٹھ کے لکھا..... وہی جو میں نے کہا..... پھر اس نے پورا بیان مجھے پڑھ کے سنایا اور میرے دستخط حاصل کرنے کے لیے یوں کھڑا رہا جیسے کسی شاہ رخ خان جیسے سپر اسٹار کے آٹوگراف لے رہا ہو..... اس نے میرا شکریہ بھی ادا کیا..... یہ ساری کارروائی آدھے گھنٹے سے کم وقت میں مکمل ہوگئی تو مجھے بتایا گیا کہ میری گاڑی تیار ہے..... تھانیدار نے مجھے بھی اسی طرح رخصت کیا جیسے کچھ دیر پہلے اپنے افسرِ اعلیٰ کو رخصت کیا تھا۔

جانتے بوجھتے میں نے تھانے میں رانا کی موجودگی کا ذکر نہیں کیا تھا اور اپنے ساتھ ہونے والے سلوک کی شکایت بھی نہیں کی تھی۔ تھانیدار نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ وہ صاف انکار کر دے گا اور ثبوت نہ ہونے کے باعث خفت مجھے ہی اٹھانی پڑے گی۔

تھانے سے کچھ دور آ کے میں نے سوچا کہ اس وقت مجھے کہاں جانا چاہیے..... رات کے آخری پہر میں سڑکیں سنسان تھیں۔ سٹیلائٹ ٹاؤن کے رہائشی علاقے میں دن کے وقت بھی گہما گہمی نہیں ہوتی۔ مجھے اس علاقے کے راستوں کا بھی علم نہ تھا۔ میری خواہش تھی کہ واپس جانے سے پہلے برہان الدین کا شکریہ ادا کر دوں..... اس کی بروقت امداد نے میری عزت بچائی تھی پھر وہاں نور جہاں تھی..... اسے تمام صورتِ حال سے آگاہ کرنا ضروری تھا۔

میری نظر مسلسل عقب تما شیشے پر تھی۔ جب بھی کوئی گاڑی پیچھے نمودار ہوتی تھی، میں رفتار کم کر لیتا تھا اور گاڑی گزر جاتی تھی تو سکون کا سانس لیتا تھا کہ کوئی میرے تعاقب میں نہیں تھا..... کسی اطلاع کے بغیر فجر سے بھی پہلے برہان الدین کے گھر جاتے ہوئے مجھے جھجک محسوس ہوتی تھی۔ پھر میں نے اس ڈی ایس پی کے گھر جانے کا سوچا جو مجھے یہاں لایا تھا۔ مجھے مہمان کرنے کا سارا خرچا وصول کرنے کے باوجود اس نے مجھے تھانے والوں کے حوالے کرنے میں تامل نہیں کیا تھا..... وہ خصوصی پولیس پارٹی کا سربراہ تھا جو میری گرفتاری کے لیے اسلام آباد سے بھیجی گئی تھی۔ عام حالات میں یہ ان کی بڑی کامیابی سمجھی جاتی اور انہیں تعریف کی سند سے نوازا جاتا لیکن صبح ہونے سے پہلے بازی پلٹ گئی۔ ان کی کامیابی پر ناکامی کی مہر لگ گئی۔

میں نے سوچا کہ ڈی ایس پی کو یہ بات معلوم نہیں تو اسے گھر جا کے بتانے میں کوئی حرج نہیں۔ اس وقت مجھے اپنے موبائل فون کا خیال آیا جو مجھ سے دوسری چیزوں کے ساتھ تھانے میں لے لیا گیا تھا۔ یہ تھانے کا دستور ہے۔ ہر ملزم سے تلاشی کے دوران جو برآمد ہو، بحق سرکار ضبط سمجھا جاتا ہے۔ موبائل کے ساتھ میری گھڑی تھی اور پرس تھا جو میں بھی عجلت میں واپس لینا بھول گیا تھا۔

میں نے گاڑی کو واپس تھانے کی طرف موڑا اور باہر ہی روک لیا..... گاڑی سے اتر کے میں سیدھا تھانے دار کے

کمرے کی طرف گیا اور چق اٹھا کے اندر داخل ہو گیا۔ اندر روشنی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ تھانیدار صاحب ابھی تک رخصت نہیں ہوا۔ اندر سے اس کے جوتے کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔

کمرے میں قدم رکھتے ہی میرے ذہن کو ایک جھٹکا لگا۔ اس منظر کو دیکھنے کے لیے میں بالکل تیار نہ تھا جو ایک دم میرے سامنے آ گیا۔ تھانیدار میرے سامنے تھا۔ مجھے اپنے مقابل پا کے وہ بھی میری طرح چونکا۔ اس کے سامنے میری طرف پیٹھ کیے رانا بیٹھا تھا۔ پُرتکلف چائے ان کے درمیان رکھی تھی۔ تھانیدار کا ردِعمل دیکھ کے رانا بھی پلٹا...... چند سیکنڈ کے لیے وہ منجمد ہو گیا۔

میں نے کہا۔ ''ویری گڈ تھانیدار صاحب۔ یاد ہے کچھ دیر پہلے تم نے کیا کہا تھا...... ہم یہاں بیٹھے کس لیے ہیں...... مجرموں کو پکڑنے کے لیے...... یا میں غلط کہہ رہا ہوں......''

وہ ایک دم اٹھا۔ ''جناب عالی...... آپ تشریف رکھیں۔''

میں نے رکھائی سے کہا۔ ''میں صرف اپنا موبائل فون اور دوسرا سامان واپس لینے آیا تھا۔ تشریف رکھنے نہیں......''

اس نے بڑی مستدی سے دراز کھولی۔ ''ویری سوری سر...... جلدی میں آپ کو بھی یاد نہیں رہا۔ چیک کر لیں......''

میں نے گھڑی کلائی پر باندھ کے موبائل فون اور پرس اٹھایا۔ ''جب میں پاکستان آیا تھا تو مجھے واقعی اندازہ نہیں تھا کہ یہاں ہر قدم پر میرا واسطہ سانپ بچھوؤں سے...... کتوں سے اور بھیڑیوں سے پڑے گا لیکن وقت نے مجھے سب سے نمٹنا سکھا دیا ہے۔''

''نواب صاحب۔ میری ایک گزارش ضرور سن لیں۔ اس وقت رانا صاحب بھی موجود ہیں...... ہم اگر بیٹھ کے بات کر لیں......''

''اب بات کرنا چاہتے ہو......'' میں نے غرا کے کہا۔ ''کچھ دیر پہلے تم کیا کرنا چاہتے تھے۔ اسی شخص کے کہنے پر......''

''چلو سر جی...... پرانی بات چھوڑو...... غلطی ہو جاتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''نہیں تھانیدار...... ہو جانے والی اور کی جانے والی غلطی میں بڑا فرق ہے۔ کی جانے والی غلطی کی سزا میں ضرور دیتا ہوں۔ تم سمجھ لو کہ میں نے بھی کینہ پروری کا چلن اختیار کر لیا ہے۔ شرافت چھوڑ دی ہے۔''

تھانیدار مایوس ہو گیا۔ ''ہم تو چاہتے تھے صلح صفائی ہو جائے۔''

''تم اپنی چارج رپورٹ بناؤ...... تمہارا نام میں نے اپنے دشمنوں کی فہرست میں لکھ لیا ہے۔ رانا کی دوستی میں تم جو کچھ میرے ساتھ کرنے جا رہے تھے۔ وہ میں بھلا نہیں سکتا اور تم کیا خود کو بہت چالاک سمجھتے ہو۔ میں نے تمہیں رانا کو آنکھ مارتے دیکھ لیا تھا۔ یہ فرار نہیں ہوا تھا۔ اسی تھانے میں کہیں چھپا بیٹھا تھا۔ تم نے چھپا رکھا تھا اسے۔ میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں تھانیدار۔''

تھانیدار کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ اس کے ضبط کا حوصلہ جواب دے گیا تھا۔ اس نے ایک دم ریوالور نکال لیا۔ ''دفع ہو جاؤ یہاں سے ورنہ گولی مار دوں گا۔ دو منٹ میں ساری نوابی...... کے راستے نکل جائے گی۔ میری تھانیداری کچی ہے نواب کی اولاد، تیرے جیسے بہت دیکھے ہیں میں نے۔''

رانا گھبرا کے اٹھا۔ ''اوئے ہوش کر......''

میں نے حقارت سے کہا۔ ''گولی چلا کے تو ایک زنخا بھی بڑی مردانگی دکھاتا ہے...... باہر آؤ اور بلالو تھانے کے سارے عملے کو میرا راستہ روکنے کے لیے۔ کوئی پانچ منٹ بعد اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل نہیں ہو گا۔''

خوف سے رانا کی حالت ابتر تھی۔ ''چل بیٹھ جا تھانیدار......''

وہ صرف ایک لمحے کی بات تھی جب غصے میں تھانیدار کے دماغ کا فیوز اڑ جاتا اور... وہ مجھے شوٹ کر دیتا۔ وہ لمحہ گزر گیا تھا۔ اس سے اگلا لمحہ ایسی بے وقوفی پر پچھتاوے کا تھا۔ تھانہ نہ ہوتا تو اب تک میں اسے مزہ چکھا دیتا۔ اس سے ریوالور چھین کے اسے یرغمال بنا کے اپنے ساتھ لے جانا بہت آسان تھا مگر میں نے اپنے جرائم کی تعداد میں اضافہ کرنے سے گریز کیا۔

رانا نے اور میں نے اب تک براہِ راست ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ ایک مخلص دوست یا مہربان بزرگ کی طرح تھانیدار کو ڈانٹ رہا تھا اور تھانیدار کرسی پر ساکت و جامت دیوار پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔ اسے بھی احساس ہو گیا تھا کہ تھانیداری کے زعم میں وہ کتنی بڑی بے وقوفی کر چکا ہے۔ اب پچھتانے یا معافی مانگنے سے بھی کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

میں باہر آ گیا اور گاڑی لے کر نکلا تو افق پر صبحِ کاذب کے آثار ہویدا تھے۔ کہیں دور سے ایک مؤذن کی صدا سنائی دی۔ پھر قریب کی اور آس پاس کی ہر مسجد سے نمازِ فجر کی صدا آئی۔ میں نے ایک مسجد کے سامنے گاڑی روک کے نماز ادا

کی اور دو نفل شکرانے کے ادا کیے۔ آج خدا نے میری عزت اور زندگی دونوں کو اپنے کرم سے محفوظ رکھا تھا۔

اجالا پھیلنے لگا تو میں نے گاڑی کو برہان الدین کے گھر کی طرف موڑ لیا۔ گاڑی کو سڑک پر روک کے میں نے گلی میں اس کے گھر تک کا فاصلہ پیدل طے کیا۔ اس وقت تک سورج تھوڑا سا اوپر اٹھ چکا تھا۔ برہان الدین سحر خیز آدمی تھا اور نمازِ فجر مسجد میں باجماعت ادا کر کے لوٹا تھا اور اپنے گھر کے مختصر سے لان میں اکیلا بیٹھا چائے پی رہا تھا۔

''آہا...... رفیق صاحب...... صبح صبح کیسے بھئی......''

اس نے بے حد خوشی کا اظہار کیا۔ ''بیٹھو...... چائے پیو گے۔''

میں نے کہا۔ ''ضرور...... اس کے بعد ناشتا بھی کروں گا۔''

''ہاں ہاں۔ بھئی اس لڑکی نے تو ہمیں نکما کر دیا ہے۔ ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے...... اب کچھ کرنے کو رہا ہی نہیں۔ اس نے نقشہ بدل کے رکھ دیا ہے گھر کا۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا وہ اٹھ گئی ہے؟''

''ہاں بھئی...... نماز کی بڑی پابند ہے...... اسے دیکھ کے خیال آتا ہے اگر میری بیٹی ہوتی تو ایسی ہوتی۔''

میں نے اپنی حیرانی کو ظاہر نہیں ہونے دیا کہ نور جہاں جیسی عورت میں یہ کایا کلپ کیسے ہو گئی۔ بقول شاعر پہلے شمعِ انجمن تھی اب چراغِ خانہ ہے۔ یہ تبدیلی عارضی اور ضرورت کے تحت ہے یا اس کی فطرت میں کوئی انقلاب...... اپنے حالات سے سبق سیکھنے کے بعد آیا۔

''میں آپ کا شکریہ ادا کرنے آیا تھا۔''

وہ مسکرائے۔ ''عبداللہ جان خود آیا ہو گا۔''

''یہی حیرانی تھی مجھے۔ وہ نہ آتا تو بات نہ بنتی۔ تھانیدار ایک کان سے سنتا اور دوسرے سے اڑا دیتا۔'' میں نے کہا۔

''چلو ہم اندر چل کے بیٹھتے ہیں...... وہ دراصل نور جہاں پر باہر نہ آنے کی پابندی ہے۔'' انہوں نے چائے کا کپ اٹھا لیا۔

نور جہاں نے میری آواز سن لی تھی۔ اس نے کچن میں سے مڑ کے مجھے دیکھا اور مسکرائی۔ مجھے اس میں کوئی بھلی بری تبدیلی نظر نہیں آئی لیکن پہلے کے مقابلے میں وہ مجھے بہت پُرسکون لگی۔ نہ اس کے چہرے پر کوئی پریشانی تھی اور نہ وہ گھبراہٹ کا شکار تھی۔ یہ ایک اچھی ابتدا تھی۔ چائے کا کپ میرے سامنے رکھ کے وہ دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں نے مختصراً گزشتہ شب کی روداد سنا دی۔

''مجھے تمہارے دوست راجا نے فون کیا تھا...... اس نے بتایا کہ راولپنڈی سے ڈی ایس پی کی سربراہی میں پولیس پارٹی ست بدھائی پہنچی تھی اور وہ تمہیں تفتیش کے لیے سٹیلائٹ ٹاؤن کے تھانے لائے ہیں...... اس نے تو کہا تھا کہ پولیس سے سب معاملات نقد طے پا گئے ہیں اور فکر کی بات کوئی نہیں...... لیکن رفیق میاں...... یہ کوئی عام فوج داری کیس نہیں ہے...... ایف آئی آر میں تمہارا نام سیاسی دشمنی کی بنیاد پر ڈالا گیا ہے...... ایسے معاملات میں پولیس بھی بے بس ہوتی ہے...... رشوت نہیں چلتی...... اوپر والوں پر دباؤ ہوتا ہے...... نیچے والے رعایت دے نہیں سکتے......'' برہان الدین نے بات روک کے چائے ختم کی جو شاید بالکل ٹھنڈی ہو چکی تھی۔

میں نے کہا۔ ''رانا آج کل یہیں ہے...... وہ اسی لیے آیا ہو گا کہ وزارتِ داخلہ میں اپنا اثر رسوخ استعمال کرے...... میری گرفتاری اور اپنی رہائی کے لیے۔''

''ویسے تو سیاسی حالات اب رانا کے حق میں نہیں رہے...... اس کی پارٹی انتخابات میں بری طرح شکست کھا گئی ہے اور حکومت کے ایوانوں میں بیٹھے ہیں اس کے پرانے حریف...... کل تک جو معتوب تھے وہ آج وفاداری کا صلہ پا رہے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''یہاں حکومت بدلنے سے کیا فرق پڑتا ہے...... وہی لوگ پارٹی بدل لیتے ہیں یا ایک نئی سرکاری پارٹی وجود میں آ جاتی ہے۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو...... پاکستان کے جدی پشتی سیاسی وڈیرے اندر سے سب ایک ہیں...... ذاتی مفادات کے سوا کسی کا کوئی ایجنڈا نہیں ہوتا...... جو حزبِ اختلاف کا رول کرتے ہیں، وہ بھی سیاسی ڈرامے کے اسکرپٹ کے مطابق ہی چلتے ہیں۔''

''تم کہہ سکتے ہو کہ عوام لوگوں کی اکثریت کو رانا جیسے بھی بے وقوف بنانے میں کامیاب رہتے ہیں۔''

میں نے کہا...... ''یعنی یہ عبداللہ جان کچھ نہیں کر سکتا؟''

وہ ہنسنے لگے۔ ''بھئی اس نے کر کے دکھا دیا کہ وہ کیا کر سکتا ہے...... پولیس تمہیں گرفتار کر کے لائی اور گرفتاری بے اثر ہو گئی...... تمہاری ضمانت قبل از گرفتاری بھی ہو جائے گی اور تمہارا نام بھی ایف آئی آر سے خارج کر دیا جائے گا۔''

''کیا آئندہ بھی مجھے اس کی حمایت حاصل ہو گی...... آپ سے تعلق کی بنا پر......''

انہوں نے جواب دینے سے پہلے نور جہاں کی طرف

دیکھا۔ ''بھئی کیا سوچا ہے تم نے آخر...... ہمیں ناشتا نہیں دو گی آج...... باتوں سے تو پیٹ نہیں بھرتا......''

نور جہاں سمجھ گئی کہ اسے بڑی مہارت سے وہاں سے بھیجا جا رہا ہے۔ ''بس ابھی لائی دو منٹ میں۔'' اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔

برہان الدین نے مسکرا کے میری طرف دیکھا۔ ''سمجھ دار لڑکی ہے...... بات یہ ہے رنیق میاں کہ یہ عبداللہ جان پاگل ہے...... رشوت لینا تو دور کی بات ہے...... اپنے باپ کی سفارش قبول نہ کرے اگر اسے یقین ہو کہ ناجائز ہے۔''

''پھر اس نے آپ کی بات کیسے مان لی...... میرا مطلب ہے مجھے کیسے بے گناہ تسلیم کر لیا؟''

''کیا تم نے جرم کیا ہے؟ اس نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کیسے کہتے ہیں اکبر خان کو رنیق نے قتل نہیں کیا...... میں نے کہا کہ جب قتل ہوا تو وہ میرے ساتھ تھا...... میرے گھر میں تھا...... اس نے مجھ سے کوئی بھی بات چھپائی نہیں...... اسے تو یہ علم ہی نہیں تھا کہ اکبر خان بھی اسلام آباد میں ہے۔''

''اس نے پوچھا نہیں کہ رنیق اسلام آباد میں کیا کر رہا تھا؟''

''پوچھا تھا...... میں نے حقیقت بتا دی...... وہ فریال کی تلاش میں آیا تھا...... ہر ہوٹل گیسٹ ہاؤس اور ہاسٹل کی خاک چھان رہا تھا...... فاروقی ایڈووکیٹ کی بیوی اس کے ساتھ تھی...... ایک شوفر تھا جو اس کا باڈی گارڈ بھی ہے...... ان سے بھی معلوم کیا جا سکتا ہے اور وہاں سے بھی جہاں جہاں وہ گیا۔''

''آپ کی ہر بات وہ مان لیتا ہے؟''

''یہ اعتماد ایک دن میں تو حاصل نہیں ہوا...... وہ میرے کریکٹر سے اسی طرح واقف ہے جیسے میں اس کو جانتا ہوں۔''

''اس نے فریال کے بارے میں سوال نہیں کیا؟''

''کیا تھا...... اور میں نے وہی بتایا جو سچ تھا...... اس نے کہا کہ اگر وہ فریال کا ایسا ہی دیوانہ ہے تو پھر نور جہاں کے ساتھ اس کے ناجائز مراسم کی بات کیوں ہوتی ہے؟ میں نے کہا کہ سنی سنائی پر مجھے یقین نہیں...... اس کی عمر میں ہم بھی ایسے ہی دل پھینک تھے...... وقتی تعلق کا مجھے علم نہیں...... محبت وہ صرف فریال سے کرتا ہے اور شادی بھی اسی سے کرے گا...... وہ مطمئن ہو گیا۔''

''اگر وہ نور جہاں کے بارے میں سوال کر بیٹھتا؟''

''تو یقیناً مجھے جھوٹ بولنا پڑتا...... ذاتی فائدے یا کسی دوسرے کو نقصان پہنچانے کے لیے جھوٹ میرے مذہب میں حرام ہے...... مگر کسی کی جان بچانے کے لیے جھوٹ جائز ہے...... چاہے تولی کچھ بھی کہے...... جو کچھ تم نے بتایا......''

ان کی بات ادھوری رہ گئی...... اچانک باہر سے کچھ لوگوں نے دروازہ پیٹنا اور شور مچانا شروع کیا۔

''یہ کون بے ہودہ بدتمیز لوگ آ گئے۔'' وہ اٹھے۔

میں نے کہا۔ ''یہ تو گالیاں بک رہے ہیں۔''

باہر سے سنائی دینے والی گالیوں میں اب دروازہ پر ڈنڈے یا پتھر مارنے کا شور بھی شامل ہو گیا تھا...... صاف لگتا تھا کہ حملہ آوروں کے عزائم اچھے نہیں اور وہ دروازہ توڑ کے اندر آنے کی کوشش کر رہے ہیں...... ایک لمحے میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ کون لوگ ہو سکتے ہیں۔

میں نے برہان الدین کو ٹیلی فون کی طرف لپکتے دیکھا...... وہ شاید ایمرجنسی پولیس کو طلب کر رہے تھے...... میں کچن کی طرف بھاگا تو اُدھر سے بدحواسی میں آنے والی نور جہاں سے ٹکرا گیا۔

نور جہاں کا رنگ فق ہو رہا تھا۔ ''رنیق...... یہ کیا ہو رہا ہے...... کون لوگ ہیں یہ؟''

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور اوپر کی طرف بھاگا...... ''یہ میرے اور تمہارے پیچھے آئے ہیں۔''

اس وقت تک دروازہ ٹوٹ چکا تھا...... میں زینے کے راستے اوپر تک نور جہاں کو گھسیٹ کے لے گیا...... خوف اور دہشت نے اسے بھی نئی طاقت اور ہمت دے دی تھی...... وہ میرے ساتھ بھاگ رہی تھی...... میں نے اوپر جانے والے زینے کا پہلا دروازہ بند کیا...... اس وقت میں نے برہان الدین کے چیخنے کی آواز سنی......

وہ چلّا رہے تھے...... ''کون ہو تم لوگ...... کیا چاہتے ہو......'' جواب میں کسی نے کیا کہا...... یہ نہ میں نے سنا نہ اس وقت مجھے سمجھ آتا...... میں چھت کے زینے کی طرف نور جہاں کا ہاتھ پکڑے بھاگ رہا تھا اور مجھے یہ سوچنے کی فرصت ہی نہ تھی کہ میرا تعاقب کرنے والے یہاں کیسے آ گئے۔

''نور جہاں...... جلدی...... ہمیں نکلنا ہے اس جگہ سے۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''مگر چھت پر کون سا راستہ ہے؟''

میں نے کہا۔ ''کود جائیں گے چھت پر سے...... پاس پڑوس کے کسی گھر میں......''

''مرے نہ تو ٹانگیں تو ٹوٹ ہی جائیں گی۔''

''دوسری طرف کون سی سلامتی ہے...... چلو......'' میں نے چیخ کے کہا۔

اس وقت میں نے ایک فائر سنا...... پھر برہان الدین کی چیخ سنائی دی...... میرے اور نور جہاں کے پیچھے آنے والے حملہ آوروں نے ہمارے عمر رسیدہ شریف اور وضع دار میزبان کو ہلاک کر دیا تھا...... میرا دل اس غم کی شدت سے خون کے آنسو رونے لگا۔

نور جہاں نے ہسٹریا زدہ لہجے میں کہا۔ ''انہوں نے مار دیا انہیں رنیق۔''

''چلو ورنہ وہ ہمیں بھی مار دیں گے......'' میں نے اسے اوپر کھینچ کے دوسرا دروازہ بھی بند کر دیا...... اس وقت وہ پہلی منزل کے زینے کا دروازہ توڑ رہے تھے...... اردگرد بہت سے لوگوں نے یہ شور سنا ہو گا...... وہ سب بھی برہان الدین کے ہمسائے تھے مگر کسی نے مداخلت کی جرأت یا حماقت نہیں کی...... ممکن ہے ان میں کسی نے ہنگامی پولیس امداد کے لیے فون کیا ہو۔

چھت سپاٹ تھی...... میں نے نور جہاں کو اپنے ساتھ کھینچتے ہوئے ایک حصے کو دیکھا...... ادھر گلی تھی...... اس گلی سے حملہ آور آئے تھے...... ان کی ایک جیپ عین دروازے پر رکی ہوئی تھی اور اس میں ایک شخص ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا...... جیپ کا انجن چل رہا تھا...... حملہ آوروں نے کمانڈو ایکشن کیا تھا...... وہ طے کر کے آئے تھے کہ چند منٹ میں ہمیں مار کے یا اٹھا کے لے جائیں گے...... ابھی تک مجھے ان کی تعداد کا کوئی اندازہ نہ تھا...... اس بات کا یقین ہوتا کہ وہ خالی ہاتھ آئے ہیں تو میں ان سب کو ٹھکانے لگا دیتا۔ خواہ وہ چار نہیں دس ہوتے مگر ایک فائر سے انہوں نے برہان الدین کو اپنے راستے سے ہٹا دیا تھا۔ طے شدہ طور پر وہ سب خطرناک لوگ تھے اور مہلک ہتھیاروں سے لیس ہو کے آئے تھے۔

چھت کے دائیں جانب ایک مکان کی گلی تھی...... پیچھے دوسرے مکان کا عقبی حصہ بھی کھلا ہوا تھا...... بائیس فٹ کی بلندی سے کودنے کا حوصلہ نہ مجھ میں تھا نہ نور جہاں میں...... ہم نیچے گرتے تو پھر نہ اٹھتے...... اوپر سے حملہ آور ہم پر اپنے میگزین خالی کرنے اور ہماری چھلنی ہو جانے والی لاشوں کو چھوڑ کر فرار ہو جائے۔ تیسری طرف کے مکان میں گیلری کم تھی اور اوپر چھت کا کٹہرا کافی آگے تک بڑھا ہوا تھا۔ درمیانی فاصلہ مشکل سے دو فٹ کا تھا۔ کسی تکلف کے بغیر کٹہرے کی دیوار کے اوپر رک کر میں نے نور جہاں کو کھینچا اور اس کے انکار سے پہلے اسے ساتھ والی چھت پر دھکیل دیا۔

نور جہاں کے ساتھ میں نے چھت کے آخری حصے کی طرف دوڑ لگائی جہاں کبوتروں کی ایک چھتری پر چار کبوتر بڑے سکون سے بیٹھے تھے اور شاید ہم انسانوں کی بے سکونی کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ وہیں سے زینہ نیچے جا رہا تھا۔ یہ عقبی حصے کا زینہ تھا جو ایک اسٹور جیسی کھلی جگہ میں بہت سے کاٹھ کباڑ کے درمیان اترا...... وہیں دروازہ نظر آ رہا تھا جو پیچھے کی گلی میں کھلتا تھا......

گھر کے مکین اگلے حصے میں تھے یا شاید پڑوس کے گھر سے چیخ پکار اور فائرنگ کی آوازیں سن کے کونوں کھدروں

میں چھپ گئے تھے۔ میں نے باہر کا دروازہ کھولا اور نور جہاں کو پھر اپنے ساتھ گھسیٹ لیا۔ نور جہاں نے چپل پہن رکھے تھے۔ ان میں سے ایک داغ مفارقت دے گیا...... نازک چپل کسی رکاوٹوں والی لمبی دوڑ کے لیے بہرحال نہیں بنے تھے۔

مجھے یقین تھا کہ ہمارے قاتل بھی اسی راستے پر تعاقب میں آئیں گے۔ انہیں نقش قدم دیکھنے کی بھی ضرورت نہیں...... تھوڑی سی عقل وفہم رکھنے والا بھی اندازہ کرسکتا تھا کہ ہمارا کسی اور سمت فرار ہونا ممکن نہیں...... گلی ناہموار تھی اور سیدھا دوڑتے رہنا بھی خطرناک ثابت ہوسکتا تھا......

اس وقت میں نے ایک جوا کھیلا۔ لمبی ریس میں ہم ہار جاتے...... ہمارے تعاقب میں آنے والے قاتل سخت جان اور پکے تھے...... انہیں غچہ دینے میں ہی ہمارے لیے چانس تھا مگر وہاں غچہ دینے کے حالات واسباب مفقود تھے...... ایسے میں مجھے ایک گھر کا عقبی دروازہ کھلا دکھائی دیا تو میں نے فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگائی......

نور جہاں کو اپنے ساتھ اندر کھینچتے ہی میں نے دروازے کو بند کردیا۔ آگے برآمدہ تھا...... وہاں ایک بزرگوار کرسی پر بیٹھے اپنے کسی پوتے یا نواسے کو پڑھا رہے تھے...... ان کی عمر ستر سال سے یقیناً زائد تھی کیونکہ ان کی داڑھی کے اور سر کے سارے بال بالکل سفید تھے...... انہوں نے سفید کرتا پاجامہ بھی پہن رکھا تھا مگر جسمانی طور پر وہ بہت دھان پان سے تھے...... ان کے سامنے بیٹھا ہوا کمزور سا بچہ دس سال کا ہوگا۔

مجھے اور نور جہاں کو یوں وارد ہوتے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے تو دادا پوتا دونوں ساکت ہوگئے اور ان کی حیرت زدہ آنکھیں سوالیہ انداز میں ہم پر جم کے رہ گئیں...... دادا نے ایسا سین تو کسی فلم میں بھی نہ دیکھا ہوگا جو حقیقی زندگی میں ان کے سامنے آگیا تھا......

اس سے پہلے کہ اچھل کر کھڑے ہوجانے والے دادا ریلوے انجن جیسی سیٹی مارتے، میں نے پوتے کو دبوچ کر ریوالور نکال لیا...... ''خبردار جو حلق سے آواز نکلی......'' میں نے ایک فلمی ولن کے لہجے میں کہا۔

دادا جان کی آواز ہی نہیں سانس بھی بند ہوگئی...... ایک لمحے کے لیے مجھے لگا کے صدمے سے وہ فرش پر ایسے گریں گے جیسے چھت سے چھپکلی گرتی ہے مگر پھر انہوں نے ہمت اور کوشش کرکے سر ہلایا...... تب تک پوتا تتلانے لگا تھا۔

''دادا...... دادا...... مجھ بچاؤ......''

میں نے کہا...... ''اندر چلو......'' اور خود بھی پوتے کو تھیلے کی طرح اٹھائے اندر پہنچ گیا...... دادا نے اس کے بعد حرکت کی...... نور جہاں آخر میں آئی...... میں نے پھر ایک چیخ سنی جو بالکل واضح نہیں تھی۔ یہ دادی تھیں جن کا گلا بڑھاپے یا نزلے سے بالکل بیٹھا ہوا تھا اور یہ منظر دیکھ کے تو لیٹ گیا تھا...... انہوں نے اپنے پوتے للو یا کلو کا نام لینے کے ساتھ ہی سینے پر دوہتھڑ بھی مارا تھا اور پھر ہائے کرکے اسی تخت پر لڑھک گئی تھیں جس پر وہ پاندان سامنے رکھے گلوری ترتیب دے رہی تھیں...... غالباً اپنے قدیم مجازی خدا کو بھجوانے کے لیے......

اب دادا نے خود کو سنبھال لیا اور سچویشن کو کنٹرول کرنے کی ذمے داری قبول کرلی تھی...... انہوں نے کہا......

''اس بچے کو چھوڑ دو...... تم جیسا کہو گے ویسا ہی ہوگا......''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''بچے کی جگہ آپ آجائیں......''

انہوں نے بڑی بہادری سے خود کو پیش کیا۔ ''ریوالور اصلی ہے؟''

میں نے کہا...... ''گولی چلے گی تو پتا چل جائے گا۔ کیا بڑھیا مرگئی ہے؟''

انہوں نے نفی میں سر ہلایا...... ''مکر کر رہی ہے...... ابھی اٹھ جائے گی۔''

میں نے کہا...... ''اور کون ہے گھر میں......''

''اس بچے کی ماں ہے...... سو رہی ہے...... دوپہر کے بعد اٹھے گی......''

''اور باپ'' میں نے پوچھا......

''وہ چلا گیا، ڈیوٹی پر...... تم کون ہو......؟ کیا چاہتے ہو......؟''

میں نے کہا...... ''پہلے اس بچے کو چپ کراؤ...... غالباً یہ سمجھ رہا ہے کہ دادی اللہ کو پیاری ہوگئی......''

بڑھیا ایک دم اٹھ بیٹھی...... اس نے بچے کو دبوچ کے سینے سے لگالیا اور چپ کرانے لگی...... ''ارے ڈر مت...... تیرے دادا بہت بہادر ہیں...... کتنے بڑے شکاری تھے...... شیر کیسے مارتے تھے...... ایسے اٹھا کے پٹخ دیتے تھے۔ شیر شرم سے مرجاتا تھا ابھی انہیں بھی چت کردیں گے۔'' پھر انہوں نے پاندان میں سے ٹافی نکالی...... پوتا ایسی رشوت قبول کرنے کا عادی تھا...... اس کی ریں ریں یوں ٹھیک ہوگئی جیسے کسی نے سوئچ آف کردیا ہو......

میں نے کہا...... ''بزرگوار...... ہم بڑی مصیبت میں

ہیں۔''

انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''نہیں ہم بڑی مصیبت میں ہیں......''

میں نے کہا۔ ''جان کے دشمن ہمارے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔''

''لگے ہوئے تھے......'' انہوں نے زور دے کے کہا۔ ''اس وقت تو تم ہماری جان کے دشمن ہورہے ہو...... اور جس کی بیوی بھگا کے لاؤ گے، وہ جان کا دشمن نہیں ہوگا تو پھر کیا ہوگا...... اور پھر ایسی بیوی...... میری جیسی ہوتی تو......''

میں نے کہا...... یہ کیا فضول بولے جارہے ہیں آپ...... میں کسی کی بیوی بھگا کے نہیں لایا......''

دادی نے ہاتھ نچا کے کہا...... ''ارے بھیا...... ساری عمر ایسے ہی فضول بولتے رہے ہیں...... تم مجھ سے بات کرو...... کیا چاہیے...... زبان سے بات کرو......''

دادا نے کہا۔ ''ہاں...... یہ توپ کا دہانہ ہٹالو ہماری طرف سے...... ہم ڈرتے تو نہیں ہیں......''

دادی نے جملہ مکمل کیا...... ''مگر پاجامہ گیلا ہوجاتا ہے...... ہر بار......''

یہ صورت حال عجیب مضحکہ خیز تھی جس کا میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا...... کیا شادی کے چالیس بیالیس سال بعد ازدواجی زندگی کے رومانس کا یہ انداز ہوجاتا ہے...... میں نے سوچا...... اس وقت تک مجھے یقین آچکا تھا کہ میں اپنے دشمنوں کو غچہ دینے میں کامیاب ہوچکا ہوں۔ وہ جو بھی تھے گلی میں اِدھر سے اُدھر دوڑ رہے ہوں گے کہ آخر ہم گئے کہاں...... نور جہاں کی حالت ابھی تک غیر تھی......

میں نے ایک گہری سانس لے کر ریوالور واپس جیب میں رکھ لیا...... ''میں سخت شرمندہ اور معافی کا خواستگار ہوں......''

بزرگوار نے فرمایا ''اچھا یہاں بیٹھو آرام سے اور بتاؤ......''

کمرے میں پرانا فرنیچر تھا...... بڑی بی کے تخت شاہی کے سامنے بید کی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ دیواروں کے پرانے زرد مٹیالے رنگ پر مکڑیوں کے جالے بھی دکھائی دیتے تھے۔ آیات قرآنی کے طغرے اور مکے مدینہ کی فریم کی ہوئی تصاویر پر گرد تھی...... ہر چیز عدم توجہ کا گلا کرتی محسوس ہوتی تھی...... وجہ خوب سمجھ میں آتی تھی...... بوڑھا جوڑا اب جھاڑ پونچھ اور پورے گھر کی دیکھ بھال کرنے کے قابل نہیں رہا تھا...... جسمانی طور پر بھی اور شاید مالی طور پر بھی...... گھر میں نئی آنے والی کا حال بھی سامنے تھا...... اس کا شوہر آفس جاچکا تھا مگر وہ ہنوز سو رہی تھی......

میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور نور جہاں کو اشارہ کیا کہ وہ میرے ساتھ دوسری کرسی پر بیٹھ جائے...... میرے خیال میں ایک عکس ٹھہر گیا تھا...... یہاں سے کچھ فاصلے پر وہ گھر تھا جس نے ہمیں اس وقت پناہ دی تھی جب ساری دنیا غیر محفوظ ہوگئی تھی...... اس گھر کی نچلی منزل کے فرش پر برہان الدین الٹا پڑا تھا...... اس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں اور سینے یا سر کے زخم سے بہنے والے خون کو دیکھ رہی تھیں جو فرش پر پھیلتا جارہا تھا...... جمتا جارہا تھا...... یہ سزائے موت اسے ہماری مہمان داری کے جرم میں دی گئی تھی......

ایک سوال میرے ذہن میں جیسے جم کے رہ گیا تھا...... میں نے تو احتیاط میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی...... پھر وہ کرائے کے قاتل ہماری پناہ گاہ تک کیسے پہنچ گئے...... آدمی کا یقین بھی بعض اوقات کتنا مفروضہ ہوتا ہے...... دوسرا سوال قدرے غیر اہم تھا۔ وہ کس کے ارسال کردہ موت کے فرشتے تھے......؟ اس سے زیادہ فرق تو نہیں پڑتا تھا لیکن میرے دل میں ایک خلش سی تھی کہ اس قاتلانہ کارکردگی کا مظاہرہ میرے دشمن رانا رجب علی نے کیا تھا یا اکبر خان کے کسی جانثار نے...... وہ مجھے مارنے آئے تھے یا نور جہاں کو۔

''اب کچھ منہ سے بولو گے بھی یا مجھے ہی گھورتے رہو گے......'' بڑی بی نے جھنجلا کے کہا...... پھر انہوں نے پان کی گلوری اپنے میاں کی طرف بڑھائی۔

میں نے چونک کے کہا...... ''ہم جان بچانے کے لیے گھس آئے تھے آپ کے گھر میں...... اس کے لیے ہم معافی چاہتے ہیں......''

بڑے میاں بولے...... ''چلو یہ قصور تو معاف کیا...... ہمیں ہراساں کرنا کیا ضروری تھا؟''

میں نے معذرت کی...... ''اس کے بغیر آپ خاموش کہاں رہتے......''

نور جہاں بولی ''ہمیں پتا ہی نہیں تھا کہ اندر صرف آپ لوگ ہوں گے...... آپ بھی شور کردیتے تو تعاقب کرنے والے متوجہ ہوجاتے...... وہ بڑے خونخوار اور سفاک لوگ ہیں......''

''وہ تو ہوں گے...... مگر تم نے کیا بگاڑا ہے ان کا......'' بڑی بی نے کہا۔

بزرگ جو غالباً یاد ماضی میں گم تھے، پان چباتے ہوئے گویا ہوئے۔ ''بھئی کچھ یاد ہے...... اپنے ساتھ بھی یہی

ہوا تھا......''

''کیا ہوا تھا جی...... تم بھی زمین کی بات آسمان سے جوڑتے ہو......'' ان کی زوجہ جھلا کے بولیں......

بڑے میاں نے پان کو بند منہ کے مکسر میں گھونٹتے ہوئے فرمایا۔ ''جب میں نے تمہارے ابا اور اپنے تایا سے کہا تھا...... ڈرتے ڈرتے اور بڑے ادب کے ساتھ...... کہ میں آپ کی دختر کو بھگا کے بھی لے جاسکتا ہوں...... اگر آپ شرافت سے عقد پر رضامند نہ ہوئے...... تو وہ ایسے جوتا اتار کے میرے پیچھے دوڑے تھے...... ہاتھ میں عصا بھی تھا...... مغلظات الگ بک رہے تھے...... یہ بھی وہی کیس لگتا ہے مجھے...... ہم بھی بھاگے تھے......''

بڑی بی نے شرما کے کہا...... ''اجی ہٹو...... یہ کیا ذکر لے بیٹھے ڈاکوؤں کے سامنے...... موقع محل تو دیکھ لیا کرو۔''

میں نے کہا...... ''ہم ہرگز ڈاکو نہیں ہیں...... لیکن معاملہ وہی ہے تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے ہم نے اپنی مرضی سے شادی کرلی ہے...... اس کے اور میرے گھر والوں کی مشترکہ فوج ہمارے تعاقب میں ہے...... انہیں رقیبوں کی حمایت بھی حاصل ہے......''

بزرگ نے ہمدردی سے کہا...... ''تمہارے تو رقیب بھی بہت ہوں گے مگر اب تم جاؤ گے کہاں......''

میں نے دردناک آواز میں کہا...... ''ہنولولو...... یا ٹمبکٹو...... بقول فلمی شاعر کے...... دنیا دے اس نکرے جتھے بندہ نہ بندے دی ذات ہووے...... اب ہمیں اجازت ہے......''

بڑی بی متفکر ہوگئیں ''اتنی جلدی بھی کیا ہے...... ابھی تو وہ پھر رہے ہوں گے آس پاس ہی...... یہ پستول بندوق تو ان کے پاس بھی ہوں گے۔''

میں نے کہا...... ''پورا توپ خانہ لے کر آئے تھے وہ تو...... لیکن ہم زیادہ دیر نہیں رک سکتے...... ہم دوسری طرف سے نکل جاتے ہیں......''

بزرگ نے پان کی پیک ایک برتن میں خالی کی جسے اگالدان کہا جاتا ہے...... ''بھئی کیوں نہ ہم تمہیں نکال دیں...... ایسے کہ تمہارے دشمنوں کو پتا بھی نہ چلے...... گاڑی بھی ہے ہمارے پاس......''

بڑی بی چہک کے بولیں...... ''اجی بس رہنے بھی دو...... وہ دھکے سے اسٹارٹ ہوتی ہے۔ آدھے راستے میں بگڑ گئی تو کیا ہوگا......''

''تم اپنی بات کررہی ہو؟...... فاکس ویگن کو کچھ مت کہنا...... جرمن گاڑی ہے...... انگریزوں کے ٹینک اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے......'' وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

گاڑی گیراج میں کھڑی تھی اور جیسا کہ بزرگوار نے بعد میں بتایا...... ان کی بیوی کی ہم عمر تھی...... سن پینسٹھ کی جنگ میں دونوں نئی تھیں۔ وہ دونوں پر فریفتہ تھے اور آج بھی ہیں...... گاڑی لال تھی اور دلہن کا جوڑا بھی...... دونوں ایک سی وفادار تھیں...... ساتھ نبھا رہی تھیں......

اور ان کی بات غلط نہ تھی...... ذرا سے دھکے سے گاڑی اسٹارٹ ہوگئی...... یہ آفر میں نے اس لیے قبول کرلی تھی کہ گاڑی کے پیچھے والے شیشے کالے تھے...... ہم دو دروازوں والی کار میں پیچھے بیٹھے تو بڑی بی نے ہم دونوں کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیر کے دعا دی ''اللہ ہمیشہ ہر آفت سے بچائے اور ہر خوشی دے...... ہماری طرح۔''

گاڑی غراتی ہوئی باہر نکلی...... اگر کوئی دشمن باہر موجود ہوتا تو اسے کچھ نظر نہ آتا...... چالیس سال پرانی گاڑی کو ایک ستر سالہ بوڑھا چلا رہا تھا۔ اندر اس کے ساتھ کوئی بیٹھا تھا نہ پیچھے ہوسکتا تھا...... نورجہاں کے ساتھ میں بھی قاتلوں کی نظر سے محفوظ تھا جو شاید اب بھی گلیوں میں کھڑے ہوں گے...... بے وقوف وہ بھی نہیں ہیں...... وہ سمجھ گئے ہوں گے کہ ہم ایک گھر سے نکل کے دوسرے گھر میں گھس گئے...... یہ تو فرض نہیں کیا جاسکتا تھا کہ ہم پرندوں کی طرح پرواز کر گئے یا کسی جادو منتر سے غائب ہوگئے...... اب وہ گھروں کا جائزہ لے رہے ہوں گے...... ہم کس گھر سے برآمد ہوتے ہیں اور کیسے...... یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ ہمیں کسی گھر میں پناہ ملی تو کیسے......

بزرگوار پرانے وقت کے ضرور تھے مگر بدحواس نہیں تھے...... وہ حاضر دماغ، پرسکون اور زندگی کے تجربے کو مشکل وقت میں راہنما سمجھنے والے عملی انسان تھے...... یہ ایک حادثاتی ملاقات تھی جس کا انہوں نے ہمت سے مقابلہ کیا تھا اور صورتِ حال سے بہ آسانی نمٹنے میں کامیاب رہے تھے...... ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو خوف اور گھبراہٹ میں اس کے اعصاب اور اس کا دماغ سب جواب دے جاتے...... بڑی بی ان کی مزاج والی تھیں مگر ہوش وحواس پر انہوں نے بھی قابو رکھا تھا......

میری طرح نورجہاں کی نظر بھی ہر سمت میں دیکھ رہی تھی۔ کالے شیشیوں کے اندر ہم سب کی نظر سے محفوظ ہوتے ہوئے بھی سب کو دیکھ رہے تھے...... اس کے ساتھ ہی میں یہ سوچ رہا تھا کہ اب کیا ہوگا؟ برہان الدین کی مرگِ ناگہانی کا

غم مجھ پر احساسِ جرم بن کر مسلط تھا...... اس کی موت کا ذمے دار میں اور صرف میں تھا...... گو میری نیت ہرگز اپنے محسن کو نقصان پہنچانے کی نہ تھی لیکن نقصان تو ہوگیا تھا...... اب میں خود کو یہ کہہ کے بری الذمہ کیسے قرار دے سکتا تھا کہ قسمت کا لکھا ہو کے رہتا ہے اور قضا کو جب اور جہاں آنا ہو آ کے رہتی ہے۔

بزرگوار نے ایک دم گاڑی روک دی...... ''میرا خیال ہے کہ اب تم خطرے کی حدود سے نکل آئے ہو......''

میں نے کہا...... ''آج آپ نے ہماری زندگی بچالی......''

ان کا موڈ اب بالکل مختلف تھا...... ''فضول باتیں مت کرو...... یہ خدائی معاملات ہیں...... بندے کے اختیار سے باہر......''

میں نے کہا...... ''پھر بھی آپ کا شکریہ ادا کرنا میرا فرض ہے۔''

''شکریہ کس بات کا!...... میں نے مجبوری میں تمہاری مدد کی...... شکرگزار مجھے ہونا چاہتے تمہارا...... کہ تم نے ہمیں کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچایا...... گن نہ ہوتی تمہارے ہاتھ میں تب بھی ہم بوڑھے لوگ اتنے ہی بے بس ہوتے......''

''آپ مجھے شرمندہ کررہے ہیں۔''

''میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتا...... نہ ہم پہلے ملے تھے...... نہ پھر ملیں گے...... مجھے نہیں معلوم کہ تم کون ہو؟...... تم نہیں جانتے کہ میرا نام کیا ہے؟...... ہم ملتے وقت بھی اجنبی تھے...... جدا ہوتے وقت بھی اجنبی ہیں...... نہ مجھے تمہارے سچ سے غرض ہے نہ جھوٹ سے......''

میں نورجہاں کے ساتھ اتر گیا...... ''اس کے باوجود میں ہمیشہ آپ کو یاد رکھوں گا...... خدا حافظ...... اور ایک بار پھر معذرت......''

''خدا حافظ......'' انہوں نے مسکرا کے کہا...... ''اللہ تمہارا حامی وناصر ہو۔''

میں اور نورجہاں وہیں کھڑے رہے...... انہوں نے گاڑی آگے بڑھائی اور روک دی...... ''پیسے ہیں تمہارے پاس......''

میں نے سر ہلایا...... گاڑی آگے بڑھ گئی اور چند منٹ میں موڑ کاٹ کے غائب ہوگئی...... وہ فیض آباد کا علاقہ تھا جہاں سے ہر جگہ کے لیے ہر قسم کی سواری دستیاب تھی...... دوسرے شہر جانے والی بڑی بڑی ائر کنڈیشنڈ بسوں سے لے کر فولادی ڈبا ٹائپ ویگنوں تک اور کھڑکھڑاتی ٹیکسیوں سے لے کر پرائیویٹ کاروں تک...... ہر طرف ایک ازدحام تھا...... بسوں کے ہارن تھے اور افراتفری تھی...... مجھے یہ جگہ قدرے غیر محفوظ لگی...... شہر سے فرار ہونے کے لیے عام ٹھکانے دو چار ہی تھے...... ریلوے اسٹیشن...... ائرپورٹ یا بسوں کے اڈے...... ایک اڈا فیض آباد میں تھا دوسرا پیرودھائی پر اور تیسرا سواں ندی کا...... صبح کے گیارہ بجے تھے اور دنیا روز مرہ کے کاموں میں مصروف تھی...... ہماری صورت سے کون اندازہ کرسکتا تھا کہ ہم کون ہیں پھر بھی میں نے نوٹ کیا کہ ہر نظر نورجہاں پر پڑتی تھی تو جم کے رہ جاتی تھی...... یہی بات خطرناک تھی...... اس کا چہرہ بھولنے والا نہیں تھا۔

اچانک نورجہاں نے کہا...... ''یہاں کھڑے کیا سوچ رہے ہو...... میری ہمت جواب دے رہی ہے...... میں بے ہوش ہو کے گر جاؤں گی۔''

میں نے کہا۔ ''بس چند منٹ...... میرا خیال ہے میں کوئی ٹیکسی لے لوں۔''

''جو چاہو کرو...... مگر جلدی......'' وہ تکان زدہ لہجے میں بولی۔

میں نے اس کی حالت دیکھتے ہوئے پہلی ٹیکسی کو روک لیا جو میرے سامنے سے گزر رہی تھی...... ڈرائیور نے متوقع نظروں سے مجھے دیکھی ''مری جانا ہے سر؟''

میں نے سوچے سمجھے بغیر سر ہلا دیا...... دروازہ کھلتے ہی نورجہاں اندر گر گئی...... میں نے کہا...... ''ہمیں پورے دن کے لیے گاڑی چاہیے...... کیا لوگے؟''

''دو ہزار سر...... یہی ریٹ ہے۔'' وہ بولا۔

اس وقت تک میں نے اپنا پلان کسی حد تک مکمل کرلیا تھا...... نورجہاں فرار ہوتے وقت کچھ نہیں لے سکی تھی...... اس نے صرف ایک بیگ اٹھایا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس میں کیا ہے؟...... میرے پاس سات آٹھ ہزار روپے تھے جو ایک دن گزارنے کے لیے یقیناً کافی تھے...... مری میں ابھی سیزن کا آغاز نہیں ہوا تھا...... ہم ایک دن بہ آسانی کسی ہوٹل میں گزار سکتے تھے...... وہاں بینک تھے جہاں سے میں مزید رقم حاصل کرسکتا تھا...... وہاں راجا کو طلب کیا جاسکتا تھا اور اس کے مشورے سے آگے کے معاملات طے کیے جاسکتے تھے۔

راولپنڈی سے پندرہ بیس منٹ کی مسافت پر مجھے ٹورزم والوں کا چھوٹا سا ہوٹل دکھائی دیا...... مین روڈ سے ایک سڑک بائیں جانب چھوٹی سی ندی کراس کر کے ایک

پارک تک جا رہی تھی جس میں کچھ جھولے وغیرہ نظر آ رہے تھے..... اسی پارک کے ایک کونے پر وہ موٹل تھا..... میرے کہنے پر ڈرائیور نے گاڑی وہاں روک لی اور پارکنگ ایریا میں جا کے کھڑا ہو گیا۔

اب نور جہاں پھر نروس بریک ڈاؤن کی طرف بڑھ رہی تھی..... ہال میں ہمارے سوا کوئی نہ تھا..... ایک گوشے میں بیٹھ کے میں نے ناشتے کا آرڈر دیا..... صبح سے اب تک ہم نے کچھ نہیں کھایا تھا..... میرے پیٹ میں مروڑ اٹھنے کا ایک سبب یہ بھی تھا۔

نور جہاں نے بیٹھتے ہی کہا..... ''رفیق..... اب میرا کیا ہوگا؟.....''

میں نے اسے ٹوک دیا..... ''ناشتے کے بعد بات کریں گے.....''

''مگر مجھے بھوک نہیں ہے..... میرا کسی بات کے لیے دل نہیں چاہ رہا..... میں چاہتی ہوں..... بس مر جاؤں..... ابھی..... اسی وقت.....''

''شٹ اپ نور جہاں..... یہ ہسٹریا میں مبتلا ہونے کی جگہ نہیں ہے..... خود پر قابو رکھو.....''

''کیسے قابو رکھوں..... وہ نیک آدمی میری وجہ سے مارا گیا..... اس نے باپ جیتنی توجہ اور شفقت دی تھی مجھے.....''

وہ رونے لگی۔

میں نے پریشان ہو کے ویٹر کو طلب کیا۔ ''کوئی روم ہے یہاں؟''

''یس سر..... دو روم ہیں..... لیکن رات کو ٹھہرنے کے لیے مناسب نہیں۔ کچھ بجلی کا مسئلہ ہے..... جنریٹر آ گیا ہے مگر چالو نہیں ہوا.....''

میں نے باقی بات سنے بغیر ایک کمرا لے لیا اور نور جہاں کو ساتھ لے گیا..... اس کی حالت بگڑتی جا رہی تھی..... عین اس وقت جب وہ خود کو محفوظ تصور کرنے لگی تھی، نحوست نے پھر چھاپا مارا اور وہ بڑی مشکل سے جان بچا کے فرار ہونے میں کامیاب رہی مگر اس حادثے نے اس کے اعصاب کو پہلے سے زیادہ توڑ پھوڑ دیا.....

میں نے اس کا بیگ دیکھا..... اس میں کچھ سکون آور دوائیں تھیں جو وہ کھا رہی تھی..... میں نے دواؤں کے نام دیکھے اور اسے دو گولیاں نگلنے پر مجبور کر دیا..... وہ مسلسل رو رہی تھی اور مستقبل کا خوف اس کا عذاب بن گیا تھا..... میں نے اسے زبردستی ناشتا کرایا اور پھر خاموش کر کے لٹانے کی ناکام کوشش کی..... میں نے مری جانے کا پروگرام کینسل کر دیا تھا مگر ٹیکسی والے کو واپس نہیں کیا تھا..... اسے دو ہزار سے غرض تھی..... اسے صرف چھتر پارک تک آ کے مری کا کرایہ مل رہا تھا' یہ اس کے لیے اچھا تھا.....

اس کے بعد میں نے راجا کو فون کیا۔ ''راجا..... فوراً آ جا۔''

''کہاں آ جاؤں..... آخر تو ہے کہاں.....؟''

میں نے کہا۔ ''مری کے راستے میں ایک جگہ ہے چھتر پارک..... وہاں پی ٹی ڈی سی کا ایک ہوٹل ہے.....''

وہ بھونچکا رہ گیا..... ''حوالات میں چھتر کھاتے کھاتے تو چھتر پارک کیسے پہنچ گیا.....''

میں نے کہا۔ ''میرے ساتھ نور جہاں بھی ہے۔''

شاید غصّے اور صدمے سے وہ کچھ دیر خاموش رہا..... ''پھر میرے آنے کی ضرورت ہے نیکے پتر عرف رنگیلے نواب..... عیش کر.....'' اس نے کہا اور فون بند کر دیا.....

میں نے پھر فون ملایا..... کچھ دیر بعد اس نے کال ریسیو کی..... ''راجا میں بڑی مشکل میں ہوں.....''

''وہ تو رہتا ہے ہمیشہ..... مشکل نہیں مشکلات کہہ..... تو خود گھستا ہے مشکلات کے جنگل میں..... اور تیری سو مشکلات کی ایک مشکل ہے وہ..... اب میں کیا کہوں اسے.....''

''تو اسے فاحشہ کہہ یا میری داشتہ..... یا کچھ اور..... مجھے فرق نہیں پڑتا کیونکہ میرے لیے وہ ایک ذمے داری ہے..... میں اسے یوں چھوڑ نہیں سکتا.....''

''میں بھی تو یہی کہہ رہا ہوں..... سب کو چھوڑ..... لعنت بھیج فریال پر اور نور جہاں سے شادی کر لے..... تو چڑھ جا پھانسی اس کے لیے..... وہ پھانسی چڑھے تیرے لیے..... جرم تو دونوں کا ایک ہے.....'' وہ مجھے گالیاں دینے لگا۔

میں نے کہا۔ ''راجا..... کسی نے برہان الدین کو قتل کر دیا ہے.....''

وہ ایک دم خاموش ہو گیا..... ''برہان الدین کو..... کب؟''

''آج صبح..... ہم بڑی مشکل سے جان بچا کے فرار ہوئے..... اور اب یہاں چھپے ہوئے ہیں..... ظاہر ہے وہ مجھے یا نور جہاں کو قتل کرنے آئے تھے۔''

''وہ کون.....؟''

''یار میں نے کسی کی شکل نہیں دیکھی..... کیسے دیکھتا.....''

اس نے کہا..... ''اچھا..... میں آتا ہوں.....''

''کتنی دیر میں......؟''

''تین چار گھنٹے تو لگیں گے تو فکر مت کر...... آرام سے بیٹھا رہ وہیں......'' راجا نے کہا اور فون پھر بند کر دیا۔

میں نے سکون کا سانس لیا اور نور جہاں کے سامنے صوفے پر نیم دراز ہو کے جوتے اتار دیے...... ''اب انشاءاللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

اس نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا...... ''کچھ بھی ٹھیک نہیں ہوگا...... میرے مرنے تک......''

''نور جہاں...... آدمی ہمت نہ ہارے تو کچھ نہیں ہوتا......'' میں نے کہا۔

وہ بولی...... ''میں اب زندہ رہنا ہی نہیں چاہتی۔''

میں اس کے پاس جا بیٹھا...... وہ سیدھی لیٹی ہوئی تھی...... میں اس پر جھک گیا...... ''میری خاطر بھی نہیں...... بولو نور...... یہ کیسی محبت ہے تمہاری......''

وہ مجھے پلک جھپکائے بغیر دیکھتی رہی...... ''تمہیں کیا فرق پڑے گا میرے ہونے نہ ہونے سے......''

''فرق نہ پڑتا...... تو میں تمہارے ساتھ کیوں ہوں...... کس چیز کی کمی ہے میری زندگی میں آخر...... لیکن جو تمہاری جگہ ہے، اسے اور کوئی پر نہیں کر سکتا ہے......''

اس کی آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہوئی...... ''سچ جان...... میری اہمیت ہے تمہاری زندگی میں......'' وہ تھوڑا سا اوپر اٹھی اور مجھ سے لپٹ گئی اور بار بار ایک ہی بات دہراتی رہی...... ''میری محبت کی ضرورت ہے تمہیں......؟''

میں نے اسے آہستہ سے چوما۔ اس کی آنکھوں کو لبوں کو اور رخساروں کو...... وہ لمبے لمبے سانس لیتی رہی اور میرے ہاتھوں میں اتنی بے بسی اتنی خود سپردگی کے ساتھ پگھلتی گئی جیسے وہ برف کی مورت ہو اور میں بھڑکتا شعلہ...... اس کی سرگوشی میرے کانوں میں اترتی رہی...... ''میں جیوں گی جان...... تمہارے لیے اب صرف تمہارے لیے...... کسی اور کے لیے نہیں......'' میرے کشیدہ اعصاب میں سکون ایسے اترتا گیا جیسے رات کی تاریکی میں پیاسے پھولوں پر شبنم کی نمی اترتی ہے...... برف کی ٹھنڈک نے شعلے کی ساری حرارت کو جذب کر لیا۔

جب میں نے آنکھیں کھول کے سکون کی نیند میں گم نور جہاں کو دیکھا تو یکلخت ہر سمت سے مجھ پر سنگِ الزام برسنے لگے...... رفیق احمد...... نواب آف ست بدھائی...... یہ تم کیا کر رہے ہو...... اور کیوں کر رہے ہو...... کس راستے پر جا رہے ہو...... کیا ہوئے تمہارے نظریۂ ضرورت کے جواز؟...... اب تم نور جہاں کی ضرورت نہیں رہے...... تمہاری ضرورت بن چکی ہے...... تم اسے مجبور کہتے تھے...... دیکھو اب خود سے مجبور ہو...... تمہیں کس کی پروا ہے کہ کوئی کیا کہے گا...... فریال...... تمہارے ساتھ خلوص کا رشتہ رکھنے والے...... ماں باپ...... لوگ...... کتنی بدنامی ہوگی تمہاری، ہر انگلی تمہیں گنہگار ہی نہیں مجرم قرار دینے کے لیے اٹھے گی...... زبانِ خلق کی آواز نقارہ کی طرح بولے گی...... ہاں تم نے ہی اکبر خان کو مارا...... نور جہاں پر بلاشرکتِ غیرے اختیار حاصل کرنے کے لیے...... اخبار کی سرخی چلائے گی...... بیوی نے آشنا سے مل کے شوہر کو قتل کرا دیا......

میں آہستہ سے اٹھا...... میرا حلق خشک ہو رہا تھا...... میں پانی پی کے کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا...... سوچتا رہا...... کمرے میں چکر لگاتا رہا...... جواب نہ رکھنے والے بہت سے سوالات میں سے ایک سوال نکل آیا تھا جو ہر قدم پر میرا راستہ روک رہا تھا...... کیا اب فریال غیر اہم ہو گئی ہے۔ بس یہی تھا وہ عشق جس پر ناز تھا...... وہ جنون جس کا دعویٰ تھا...... وہ دیوانگی جس کا چرچا تھا...... دست تہ سنگ آمدہ پیمان وفا تھا؟ ...... فریال خوابِ فردا ہو گئی...... پل بھر کے لیے نظر سے دور ہوئی تو دل سے دور ہو گئی...... اتنی آسانی سے دوسری عورت نے تمہارے دل کی سلطنت پر قبضہ کر لیا جس پر چھ سال سے فریال کی حکمرانی تھی...... اور کتنی کم ہمتی...... بے شرمی اور خود غرضی سے تم نے ہتھیار ڈال دیے۔

دروازے پر دستک ہوئی تو میں چونکا...... بے اختیار میری نظر گھڑی کی طرف گئی اور مجھے اندازہ ہوا کہ اندر باہر کے طوفان سے لڑتے میں نے چار گھنٹے گزار دیے ہیں...... اور شاید میں ہار گیا تھا۔

میں نے دروازہ کھولا، راجا اندر آ گیا...... اس نے ایک لمحے کے لیے رک کر گہری نیند میں خاموش لیٹی ہوئی نور جہاں کو دیکھا...... اس کے گھنے ریشمی بالوں کا ڈھیر تکیے پر پھیلا ہوا تھا اور وہ ایک تکیے پر اسی سمت میں کروٹ لیے سو رہی تھی جدھر دوسرا تکیہ اور بیڈ کا خالی حصہ تھا...... راجا نے صرف ایک بار میری طرف دیکھا اور اگرچہ اس پر سب عیاں تھا...... سوال بھی اور الزام بھی اور ملامت بھی...... مگر اس نے مجھے شرمندگی سے بچانے کے لیے کہا...... ''چل باہر بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔''

باہر شام ہو رہی تھی مری کی پہاڑیوں کا اور ان پر کھڑے بلند قامت درختوں کا اندھیرا غالب آ جاتا ہے...... پارک میں اب جھولوں پر زیادہ بچے تھے اور سبزہ و رگلی میں آنچل اور

پیراہن کے رنگ بھی شامل ہو گئے تھے۔ خوش پوش اور خوش باش خاندان مری جاتے ہوئے یا مری سے واپس آتے ہوئے یہاں تھوڑی دیر کے لیے رک گئے تھے...... پارکنگ ایریا میں گاڑیوں کی تعداد بھی بہت بڑھ گئی تھی...... مجھے آخر میں شیر دل خان نظر آیا...... وہ اپنی گاڑی کے بونٹ پر بیٹھا سگرٹ پی رہا تھا۔

ہم ہوٹل کے مختصر سے لان پر لگی ہوئی ایک ٹیبل پر بیٹھ گئے...... وہاں کافی بھی دستیاب تھی راجا سب سنتا رہا...... ایک سوال اس نے مجھ سے جانتے بوجھتے نہیں کیا کہ فیکے پتر...... آخر تو اُدھر گیا ہی کیوں تھا، حوالات سے نکل کے سیدھا گھر جاتا تو یہ سب کیوں ہوتا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہوگا۔

میری بات ختم ہوئی تو خاموشی کا ایک مختصر سا وقفہ آیا...... پھر راجا نے کہا...... ''تیری گاڑی کہاں ہے......''

میں نے کہا...... ''ہوگی وہیں...... جہاں میں نے اسے چھوڑا تھا۔''

''وہاں اس کا جلا ہوا ڈھانچہ پڑا ہے......''

''تو نے دیکھا؟''

''میں پہلے اُدھر ہی گیا تھا...... وہاں کوئی نہیں تھا...... دروازے پر پولیس کھڑی تھی...... انہوں نے بتایا کہ ڈیڈ باڈی اسپتال میں ہے...... ابھی کولڈ اسٹوریج میں رکھوا دی گئی ہے......''

اور میرے پاس اپنی صفائی میں کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں...... حالات و واقعات کی شہادت صرف مجھے مجرم ثابت کرتی ہے...... میں نے مایوسی سے کہا۔ ''کھیل ختم ہوا راجا...... میرا خیال ہے کہ اب ہمیں خود کو پولیس کے حوالے کر دینا چاہیے...... نور جہاں کو بھی اور مجھے بھی......''

راجا کا چہرہ تاریک ہو گیا...... ''ان حالات میں...... کوئی بھی کیا کر سکتا ہے...... بڑے سے بڑا وکیل تیری بے گناہی کیسے ثابت کرے گا...... ایک رات کی تفتیش میں نور جہاں پوری کہانی سنا دے گی...... کیا ہوا...... کب ہوا کیسے ہوا قتل سے پہلے اور قتل کے بعد......''

''سب قسمت کے کھیل ہیں راجا...... کل رات میں گرفتار ہوا...... صبح تک گرفتاری غیر موثر ہو گئی...... ضمانت قبل از گرفتاری پکی ہوگی...... مگر کتنی دیر رہی یہ خوش گمانی......''

''اب میں کیا کہوں تجھے...... اس عورت کے چکر میں یہ ہونا ہی تھا......''

میں نے خفگی سے کہا...... ''تو کیا غیب کا حال جانتا ہے......''

''مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ عبداللہ جان اس کیس میں خاص دلچسپی لے رہا ہے...... اس کے برہان الدین سے قریبی مراسم تھے۔ کل رات برہان الدین نے تیری سفارش کی اور صبح اس کا قتل ہو گیا...... وہ تجھ سے ضرور پوچھے گا کہ تھانے سے رہائی کے بعد آپ کہاں گئے......''

''اور میرا کیا جواب ہونا چاہیے......''

راجا چلّانے لگا...... ''اٹھ کے بیٹھ...... پاگل کے بچے...... یہ مجھ سے پوچھتا ہے...... تیری مت ماری گئی ہے...... تجھے نور جہاں کے پاس نہیں اپنے گھر جانا چاہیے تھا...... ست بدھائی میں ہونا چاہیے تجھے...... اس کے سوا تیرے بچنے کی کوئی صورت نہیں...... وہاں ہم ایک نہیں دس گواہ ہوں گے کہ تو صبح سویرے ست بدھائی پہنچ گیا تھا......''

''اور میری گاڑی......''

''لعنت بھیج گاڑی پر...... ابھی کسی کو معلوم نہیں کہ وہ گاڑی تیری تھی...... اور اسے کسی نے آگ لگائی...... اسے متعلقہ تھانے والے اٹھا کے لے جائیں گے...... وہاں میں معاملات کو سنبھال لوں گا...... تو جا...... شیر دل کے ساتھ ابھی نکل جا...... جا......'' اس نے اتنی زور دار آواز میں چیخ کر کہا کہ آس پاس کے لوگ متوجہ ہو گئے۔

''اور نور جہاں؟......'' میں نے بے بسی سے کہا۔

مجھے یوں لگا جیسے راجا کا بھرپور تھپڑ میرے چہرے پر پڑتے پڑتے رہ گیا۔ نہ جانے کیسے اس نے اپنی خواہش کے اس فطری ردِعمل پر قابو پا لیا...... وہ غصے سے لال چہرہ لیے مجھے گھورتا رہا...... پھر اس نے ایک گہری سانس لے کر جیسے اپنے اندر کا سارا غصہ نکال دیا...... اس نے میز پر رکھے ہوئے جگ سے گلاس میں پانی ڈالا اور پھر ویٹر کو بلا کے مزید کافی لانے کے لیے کہا۔

''نور جہاں کا کیا کرنا ہے......'' جب وہ دوبارہ بولا تو اس کا لہجہ بالکل سپاٹ اور نارمل تھا۔

''میں اسے چھوڑ نہیں سکتا......'' میں نے ہمت سے کام لے کر کہا۔

راجا کچھ دیر اپنے ہونٹ چباتا رہا...... ''اچھا...... کہاں لے جائے گا اسے اپنے ساتھ؟...... ست بدھائی!''

میں نے کہا...... ''ہاں......''

راجا پھر خاموش ہو گیا...... شاید وہ کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس ذہنی کیفیت میں اسے بات جاری رکھنی چاہیے یا مجھے میرے حال پر چھوڑ کے چلے جانا چاہیے

...... وہ حقیقی معنوں میں دوست نہ ہوتا تو ایسا ہی کرتا۔

''اگر تو نے فیصلہ کرلیا ہے...... اور نتائج کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہے تو جا لے جا۔ ہم بھی ساتھ......''

میں نے کہا...... ''دیکھ راجا......''

اس نے مجھے ہاتھ اٹھا کے روک دیا...... ''مجھے کوئی دلیل نہیں سننی...... یہ تیرا فیصلہ ہے...... اس کے اچھے برے نتائج پر تو نے غور کرلیا ہوگا...... تو کوئی پاگل تو نہیں ہے...... ہم سب جو تیرے ساتھ ہیں، تیرے کسی غلط فیصلے کی بنا پر تجھے چھوڑ تو نہیں سکتے۔ کل اگر تو فریال کو بالکل چھوڑ کے نور جہاں سے شادی کرنا چاہے تو کرسکتا ہے تو اپنی زندگی کے فیصلے کرنے میں خود مختار ہے......''

''تو غصے میں کچھ نہیں سن رہا ہے......''

''بات غصے کی نہیں نواب صاحب...... وقت نکلا جارہا ہے......'' اس نے اپنی گھڑی دکھائی۔

میں نے بھی بہتر سمجھا کہ اس وقت بحث نہ کی جائے...... شام کے سائے مزید گہرے ہو چکے تھے اور کچھ دیر میں رات اترنے والی تھی...... میں نے کمرے میں جا کے دیکھا تو نور جہاں اسی طرح نیند میں تھی...... میں نے آہستہ سے اس کا شانہ ہلایا تو وہ اٹھ بیٹھی۔

''اوہ...... رات ہوگئی؟......'' اس نے نشیلی آواز میں کہا۔

''رات ہونے والی ہے...... چلو اٹھو...... ہمیں ابھی جانا ہے......''

''اب کہاں لے جاؤ گے مجھے......؟'' وہ انگڑائی لے کر بولی۔

''اپنے ساتھ...... ست بدھائی......''

اس کی انگڑائی ٹوٹ گئی...... ''ست بدھائی؟ سچ کہہ رہے ہو؟''

میں نے کہا...... ''راجا آیا ہے گاڑی لے کر...... باقی باتیں ہم راستے میں کرسکتے ہیں...... تمہیں کچھ کھانا پینا ہے......؟''

خوشی اس کے چہرے پر کھیل رہی تھی...... ''میری تو بھوک اُڑ گئی ہے یہ جان کے کہ تم مجھے اپنے گھر لے جارہے ہو...... چلو...... میں تیار ہوں......''

جو ٹیکسی میں نے مری جانے کے لیے لی تھی، وہ میں نے راجا کے حوالے کردی اور خود شیر دل کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا...... راجا نے چلتے چلتے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا......

''فیکے پتر...... حوصلہ رکھ...... اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا......''

میں نے کہا...... ''تیرے جیسے یاروں کے ہوتے مجھے فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے''

راجا آہستہ سے نور جہاں کی طرف پلٹا...... ''یہ میرا ایک ہی دوست ہے، مجھے نہیں معلوم اس نے اچھا کیا یا برا...... مگر اس نے تمہاری ذمے داری قبول کی ہے تو تمہارا بھی فرض بنتا ہے کہ اسے اپنی ذمے داری سمجھو......''

نور جہاں رو پڑی...... ''تمہارا تو دوست ہے...... میرے لیے تو یہی سب کچھ ہے سب کچھ اور فکر مت کرو...... اسے اپنے فیصلے پر پچھتانا نہیں پڑے گا...... لیکن بشرط زندگی...... ابھی تو کچھ پتا نہیں......''

راجا نے آہستہ سے اس کے شانے پر تھپکی دی......

''دیر مت کرو......''

گاڑی واپس راولپنڈی والے راستے پر دوڑنے لگی، نور جہاں نے آہستہ سے میرے کندھے پر اپنا سر رکھ دیا...... اس کی آنکھوں سے اب بھی آنسو بہہ رہے تھے...... شیر دل سامنے دیکھتا رہا اور خاموشی سے گاڑی چلاتا رہا...... اس عورت کو وہ اچھی طرح پہچانتا تھا وہی اس کو اکبر خان کے قتل کے بعد نروس بریک ڈاؤن کی حالت میں میرے پاس لے کر آیا تھا...... وہ اس کے بعد کے ہر دن کے ہر گھنٹے کی کہانی کا عینی شاہد تھا مگر راز داری اور وفاداری اس پٹھان کے کردار کا حصہ تھی۔

راستے میں ہم نے صرف ایک جگہ چائے پی...... میں نے خود کو اور نور جہاں کو اس طوفان کے لیے تیار کیا جو ست بدھائی کی حویلی میں ہمارے قدم رنجہ فرماتے ہی اٹھنے والا تھا۔ وہ اس کے لیے بالکل تیار تھی، اس کے لیے یہ ایک خوشی کسی اژدھے کی طرح تھی کہ میں خود اسے اپنے ساتھ رہنے کے لیے ست بدھائی لے جارہا ہوں...... جس نے چھوٹے موٹے تمام اندیشوں کے سانپ نگل لیے تھے۔

اصل کام میرا تھا...... مجھے نہ صرف یہ کہ ہر شخص کو سمجھانا بلکہ کسی نہ کسی طرح مجبور اور پابند بھی کردینا تھا کہ وہ نور جہاں کو بچانے کے معاملے میں اتنے ہی سیریس ہوں جتنے مجھے بچانے کے لیے ہیں...... دلیل سے یہ بات ہرگز نہیں منوائی جاسکتی تھی...... نور جہاں کے لیے ان سب کے دل میں نفرت کے ایک سے جذبات تھے جو میرے کہنے سے محبت میں نہیں بدل سکتے تھے...... ان سے اپنی بات منوانے کا صرف ایک ہی طریقہ بلیک میلنگ کا تھا۔

جب گاڑی حویلی کے پھاٹک سے داخل ہوئی تو رات کے دس بج چکے تھے...... اس وقت تک میں طے کرچکا تھا کہ صورتِ حالات نمٹنے کے لیے میرا کیا لائحہ عمل ہونا چاہیے...... برآمدے میں روشنی تھی لیکن باہر کوئی بھی نہیں تھا...... سب لوگ کھانے کے کمرے میں میز کے گرد جمع تھے اور ان کے ہنسنے بولنے کی آواز باہر تک سنائی دے رہی تھیں۔

میں نے نور جہاں کا ہاتھ پکڑا تو وہ سرد ہورہی تھی...... وہ کانپ رہی تھی اور خوف سے اس کا رنگ سفید پڑ گیا تھا میں نے کہا...... ''ہمت سے کام لو...... تم کو کچھ نہیں بولنا ہے...... بس خود پر قابو رکھنا......''

اس نے سر ہلایا...... ''مجھے تم پر بھروسا ہے......''

نور جہاں کے ساتھ میں سیدھا اماں ابا کے کمرے میں گیا، وہ کبھی سب کے ساتھ بیٹھ جاتے تھے لیکن ایسا دن کے وقت ہوتا تھا...... رات کا کھانا عموماً انہیں کمرے میں پہنچانا ریشم کے فرائض منصبی میں داخل تھا مگر یہ ذمے داری رابعہ نے سنبھال رکھی تھی۔

وہ کھانا کھا چکے تھے...... ابا دانتوں میں خلال کررہے تھے اور اماں عادت کے مطابق تسبیح کے ساتھ جائے نماز پر بیٹھی تھیں۔ مجھے اور نور جہاں کو ایک ساتھ اندر آتا دیکھ کے ان کی عجیب کیفیت ہوئی...... ابا کا خلال کرنے والا ہاتھ رک گیا اور ان کی نظر نور جہاں پر ٹھہر گئی اماں کے ہاتھ سے تسبیح چھوٹ گئی۔

میں نے نور جہاں کو ابا کے بیڈ پر پیروں کی طرف بٹھا دیا...... اور مربوط لہجے میں کہا...... ''ابا...... یہ نور جہاں ہے...... یہ فی الحال یہیں رہے گی......''

ابا نے میری طرف دیکھا...... ''کیا مطلب...... ہم کہیں اور چلے جائیں۔''

میں نے کہا...... ''میری مراد گھر سے تھی......''

اماں نے سپاٹ لہجے میں کہا...... ''پھر ہمیں کیوں بتارہے ہو...... اگر فیصلہ کرہی لیا ہے......''

ابا نے کہا...... ''فیصلہ اور کون کرے گا...... اس کی حویلی ہے...... اس کا حکم چلتا ہے...... چاہے تو ہمیں بھی نکال دے......''

میں نے کہا...... ''میں سب کی سننے کے لیے تیار ہوں...... لیکن پہلے سب کو میری بات سننی ہوگی...... اس کے بعد اگر سب کا یہی فیصلہ ہوگا کہ نور جہاں ان کے ساتھ نہیں رہ سکتی...... تو پھر سب رہیں گے...... میں چلا جاؤں گا نور جہاں کو لے کر......''

اس بات کا خاطر خواہ اثر ہوا...... اماں ابا نے خاموشی اختیار کرلی...... میں نے نور جہاں کو وہیں چھوڑا اور کھانے کے کمرے کی طرف گیا...... مجھے دیکھتے ہی وہاں ایک شور مچا...... سب اپنی اپنی بولنے لگے۔

رابعہ نے کہا...... ''آؤ آؤ کزن...... راجا نے بتلا دیا تھا مگر تم بقلم خود سناؤ حوالات کی ایک رات کا افسانہ......''

لیلیٰ بھابھی نے کہا...... ''پھر یہ بتاؤ کہ سارا دن کہاں رہے۔''

شہناز نے کہا۔ ''اور آئے ہو تو اکیلے کیوں آئے ہو...... راجا کہاں ہے؟''

میں نے کھڑے کھڑے سب پر ایک نظر ڈالی...... ''میں اکیلا نہیں آیا ہوں...... میرے ساتھ نور جہاں آئی ہے......''

یکلخت ہر چہرے کی مسکراہٹ کافور ہوگئی...... ان سب نے فوراً...... مجھے دیکھا...... یہ جاننے کے لیے کہ جو کچھ میں نے کہا ہے؟ اس پر کسی بے ہودہ مذاق کا گمان کیا جاسکتا ہے یا نہیں لیکن میرے چہرے کی سنجیدگی کو دیکھتے ہوئے انہیں یقین کرنا پڑا کہ میں نے جو کہا ہے سچ کہا ہے۔

رابعہ ہی سب سے پہلے بولی...... ''اگر یہ مذاق ہے کزن......''

میں نے اس کی بات کاٹ دی...... ''وہ اماں ابا کے کمرے میں بیٹھی ہے......''

ایک بار پھر خاموشی کا وقفہ آیا...... پھر شہناز نے خفگی سے کہا...... ''ایسا کرنے کی وجہ رفیق بھائی......''

رابعہ تلخی سے بولی...... ''وجہ کیا بھابھی...... یہ اب ایک منٹ اس سے دور نہیں رہ سکتے...... اس سے شادی کرلی ہے تو بتادو کزن......''

میں نے کہا ''شٹ اپ رابعہ...... آپ سب اماں ابا کے کمرے میں آجائیں...... میں سب بتادیتا ہوں......'' میں پلٹا اور ڈرامائی تاثر کے لیے رکا...... ''اور ہاں...... میں بالکل کسی قسم کا شور شرابا نہیں چاہتا...... میں سب کی سنوں گا لیکن پہلے آپ سب میری سن لیں، رائٹ''

میں واپس اماں ابا کے کمرے میں پہنچا تو وہاں نور جہاں اپنی جگہ چپ بیٹھی تھی...... اماں نے جائے نماز پر عشا کے بعد کے نوافل اور وظائف کا آغاز کردیا تھا اور ابا کی نظریں خلا میں نہ جانے کیا دیکھ رہی تھیں...... یہاں آکر محفل جمنی تھی چنانچہ بیڈ کے سامنے دیوار کے ساتھ ساتھ ایک جیسی صوفہ نما کرسیاں لگادی گئی تھیں۔

میں انتظار کرتا رہا لیکن آدھے گھنٹے بعد بھی نہ وہاں رابعہ آئی۔۔۔ نہ شہناز اور نہ لیلیٰ بھابھی تو میں سمجھ گیا کہ انہوں نے میری پریس کانفرنس کا بائیکاٹ کر دیا ہے۔۔۔۔ وہ میری کوئی وضاحت سننا ہی نہیں چاہتی تھیں۔ انہوں نے نور جہاں کے خلاف ابھی سے ایک سنجیدہ محاذ بنالیا تھا کہ وہ یہاں نہیں رہ سکتی۔۔۔ میں نے ابا جی سے بات کرنے کی کوشش کی تو انہوں نے بھی مجھے ہوں ہاں کر کے ٹال دیا۔۔۔ ایسے میں کب تک بے وقوف بنا بیٹھا رہتا۔۔۔۔ بالآخر میرے صبر کا پیانہ لبریز ہوگیا۔

میں نے کہا۔۔۔ ''نور جہاں۔۔۔ چلو میں تمہیں تمہارا کمرا دکھا دوں۔۔۔۔''

وہ اٹھی اور خاموشی سے میرے ساتھ ہولی۔۔۔۔ باہر مجھے ریشم نظر آئی جو کھانے کے برتن سمیٹ کر کچن کی طرف لے جارہی تھی۔۔۔۔ اس نے مجھے اور پھر نور جہاں کو غور سے دیکھا۔۔۔ رشتے کے اعتبار سے نور جہاں اس کی سوتیلی ماں بنتی تھی' یہی عورت تھی جو اس کی ماں سے شوہر کو چھین کر لے گئی تھی۔ اسے اپنے باپ سے نفرت تھی۔۔۔۔ اتنی کہ وہ موت کے بعد بھی اس کی شکل دیکھنے کی بھی روادار نہیں تھی مگر وہ اس عورت کو بھی برابر کا قصوروار سمجھنے پر مجبور تھی جس نے تباہی و بربادی کے راستے پر اکبر خان کا ساتھ دیا۔۔۔۔ اس کی مدد کی اور اس کی آلۂ کار بنی رہی۔۔۔۔ اگر وہ بیوی ہوتی تو شوہر کو اس راستے پر جانے ہی کیوں دیتی مگر وہ عورت نہیں ناگن تھی جس نے بالآخر اسے ڈس لیا۔

ریشم کی صورت پر نفرت کے یہ جذبات فطری تھے۔۔۔۔۔ دو دن پہلے ہی پولیس اکبر خان کی لاش لائی تھی۔ اس کے دفن ہوتے ہی نور جہاں یہاں آ پہنچی تھی جو کہنے کو اس کی بیوی تھی مگر اس پر اکبر خان کے قتل کا الزام تھا اور وہ میرے ساتھ ایسے کھڑی تھی جیسے مالک سے تعلق استوار کر کے وہ معتبر اور عزت دار ہوگئی ہے۔۔۔۔ ان کی ہم پلہ بن گئی ہے جو حویلی میں رہتے ہیں۔

میں نے اسے روکا۔۔۔۔ ''ریشم۔۔۔۔ کہاں ہیں سب لوگ۔۔۔۔؟''

خلاف معمول اس نے انگریزی نہیں بولی۔۔۔۔ ''اپنے اپنے کمروں میں مالک۔''

''اچھا دیکھو۔۔۔۔ ہم نے کھانا نہیں کھایا ہے۔۔۔۔ کھانا میرے کمرے میں لے جاؤ۔۔۔۔'' میں نے ایک سخت گیر مالک کا رعونت آمیز اور تحکمانہ لہجہ اختیار کرلیا۔

ریشم نے یہ تبدیلی محسوس کی اور ''جی مالک'' کہہ کے آگے بڑھ گئی۔۔۔۔ میں نے نور جہاں کو اپنے کمرے میں پہنچا کے کہا۔۔۔۔ ''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔۔۔ کھانا کھاؤ اور سو جاؤ۔۔۔۔''

''مجھے بھوک نہیں ہے۔۔۔۔'' وہ آہستہ سے بولی اور بیڈ کے سہارے پر ٹک گئی۔۔۔۔ ''تم کھالو۔۔۔۔''

میں نے کہا۔۔۔۔ ''دیکھو میں نے تمہیں بتا دیا تھا کہ یہاں کیسا ماحول ملے گا۔۔۔ مگر میں سب ٹھیک کرلوں گا۔۔۔ اس وقت مجھے راجا کی کمی شدت سے محسوس ہورہی ہے۔۔۔۔ وہ سب کا دماغ درست کرسکتا تھا۔۔۔۔''

''یہاں کوئی مجھے قبول نہیں کرے گا رفیق۔۔۔۔ کبھی نہیں۔۔۔۔''

''تم دیکھتی جاؤ۔۔۔۔ یہ میرا کمرا ہے۔۔۔۔ آج رات گزارا کرو۔۔۔ صبح تمہیں حالات بدلے ہوئے ملیں گے۔۔۔۔''

نور جہاں کا ساتھ دینے کے لیے میں نے کھانا کھایا اور پھر شہناز کے کمرے میں چلا گیا جہاں ایک طرح سے مزاحمتی تحریک کا لائحہ عمل طے کیا جارہا تھا۔۔۔۔ ان تینوں کے درمیان بحث چل رہی تھی جو میرے آتے ہی ختم ہوگئی۔

میں نے کہا۔۔۔۔ ''تمہیں میری بات سننی پڑے گی۔۔۔۔''

رابعہ کا موڈ سب سے زیادہ جارحانہ تھا۔۔۔۔ ''اب سننے اور کہنے کو کیا رہ گیا ہے کزن۔۔۔۔ فیصلہ ہم نے کرلیا ہے لیکن ایک بات اچھی طرح سمجھ لو۔۔۔۔ ہم تمہارے کسی غلط فیصلے کو قبول کرنے کے پابند نہیں ہیں۔۔۔۔ اگر وہ عورت تمہاری مرضی سے یہاں رہے گی تو ہم اپنی مرضی سے چلے جائیں گے۔۔۔۔''

''جانتی ہو اس کے بعد کیا ہوگا۔۔۔۔؟'' میں نے کہا۔

''کیا ہوگا تم بالآخر اس سے شادی کرلو گے۔۔۔۔ ممکن ہے کر ہی چکے ہو۔۔۔۔ فریال کے جانے کا سبب اور کیا تھا۔۔۔۔ تم جھوٹ بول کے ہم سب کو بے وقوف بناتے رہے۔۔۔۔ تم نے فریال کو بھلا دیا۔۔۔۔ اسے تلاش ہی نہیں کیا۔ اس کی جگہ آگئی ہے یہ ڈائن جو ایک شوہر کو کھا گئی ہے۔۔۔۔ اب تم سے چمٹ گئی ہے۔۔۔۔ وہ کیا سمجھتی ہے۔۔۔۔ ہم اتنے بے بس ہیں کہ سب دیکھتے رہیں گے۔ بے شک تم مالک ہو حویلی کے لیکن ہمارا بھی حق ہے تم پر۔۔۔۔'' رابعہ فرطِ جذبات سے رونے کے قریب ہوگئی۔

میں نے کہا۔۔۔۔ ''بس یا کچھ اور۔۔۔۔ سوچا تو یہی تھا میں نے کہ پہلے میں کہوں گا۔۔۔۔ مگر چلو پہلے تم بولو۔۔۔۔''

شہناز نے کہا۔۔۔۔ ''یہ تم نے کیا بے وقوفی کی رفیق بھائی۔۔۔۔ ذرا سوچو وہ یہاں کیسے رہ سکتی ہے۔۔۔۔''

میں نے کہا۔۔۔۔ ''یہاں آنے سے پہلے میری راجا سے ساری بات ہوچکی تھی یہ اسی کا مشورہ تھا۔۔۔۔''

''میں نہیں مان سکتی۔۔۔۔'' شہناز نے خفگی سے کہا۔

''کہاں ہے وہ خود۔۔۔۔؟''

میں نے کہا۔۔۔۔ ''کل تو وہ کراچی جارہا ہے۔۔۔۔ پرسوں آئے گا۔۔۔۔ خود پوچھ لینا۔۔۔۔ یہ گاڑی مجھے راجا نے ہی دی تھی کہا تھا نور جہاں کو لے کر نکل جاؤ۔۔۔۔''

اب لیلیٰ بھابھی نے لب کھولے۔ ''جانے دو دیور جی کیوں راجا کا نام لے کر ہمیں بے وقوف بناتے ہو۔۔۔۔ لیکن اس نے تمہارے دباؤ میں ایسی بات کہی تو اس کی بھی وجہ ہوگی۔۔۔۔''

میں نے کہا۔ ''وجہ ہے۔۔۔۔ لیکن تم لوگ سن کہاں رہی ہو۔۔۔۔ تمہارا غصہ اپنی جگہ۔۔۔۔ میری بھی تو سنو کہ میں نے اتنا بڑا قدم کیسے اٹھالیا۔۔۔۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس کا ردِعمل کتنا شدید ہوگا۔۔۔۔ مگر میں ردِعمل کو دیکھتا یا اس پھانسی کے پھندے کو جو میری گردن میں پڑ چکا ہے۔۔۔۔ ہاں ایسے چونکنے کی بات نہیں میں کوئی جذباتی ڈائیلاگ بول کے تمہاری ہمدردی حاصل کرنا نہیں چاہتا۔۔۔۔ یہ حقیقت ہے۔۔۔۔ اگر تم سب نے ساتھ نہ دیا تو نور جہاں کے ساتھ پھانسی مجھے بھی ہوگی۔۔۔۔ یہ بات یقینی ہے۔۔۔۔ تم جانتی ہو اس پر کیا الزام ہے۔۔۔۔؟ ہر اخبار میں ایک ہی خبر ہے۔۔۔۔ تم سب نے ضرور دیکھی ہوگی۔۔۔۔ بیوی نے آشنا کے ساتھ مل کے شوہر کو قتل کردیا۔۔۔۔ یہ آشنا میں نہیں تھا۔۔۔۔''

رابعہ نے میری بات میں دخل دیا۔۔۔۔ ''تم نہیں تھے تو پھر تمہیں کیا۔۔۔۔ جس نے قتل کیا ہے وہی چڑھے گا پھانسی پر۔۔۔۔''

لیلیٰ بھابھی نے اس کی حمایت کی۔۔۔۔ ''پولیس خود معلوم کرلے گی اس سے۔۔۔۔ نور جہاں سے۔۔۔۔ میں جانتی ہوں پولیس کے سارے طریقے کیونکہ میرا شوہر وکیل تھا۔۔۔۔ بڑے بڑے سورما چیں بول جاتے ہیں۔۔۔۔ مشہور ہے کہ وہ تو پتھروں سے بھی اقبالِ جرم کرا لیتے ہیں۔۔۔۔''

''بالکل صحیح فرمایا آپ نے۔۔۔۔ لیکن ایک چیز ہوتی ہے حالات اور واقعات کی گواہی۔۔۔۔ یہ بھی فاروقی کے ساتھ رہ کے سنا ہوگا تم نے۔۔۔۔ کسی بھی عدالت میں بیٹھا ہوا جج کچھ نہیں جانتا کیونکہ وہ جائے واردات پر نہیں تھا۔۔۔۔ اس کے سامنے جو ثبوت پیش ہوتے ہیں جو گواہ لائے جاتے ہیں ان کی بنیاد پر وہ فیصلہ صادر کرتا ہے۔''

''یہ تو ٹھیک ہے۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔''

میں نے کہا۔ ''بدقسمتی سے اس کیس میں سب کچھ میرے خلاف ہے۔۔۔۔ صرف اور صرف میرے خلاف۔۔۔۔''

رابعہ تنک کے بولی۔ ''کیوں؟۔۔۔۔ کیا تم تھے وہاں۔۔۔۔ جائے واردات پر۔۔۔۔ نور جہاں کے ساتھ۔۔۔۔؟''

''نہیں لیکن جو شخص ایک گواہ تھا۔۔۔۔ [illegible]ں کے کہنے پر پولیس نے مان لیا تھا کہ اس رات میں اسلام آباد میں اس کے گھر پر تھا۔۔۔۔ اس کا بھی قتل ہوگیا ہے۔۔۔۔ اور میں جو اس وقت تمہارے سامنے زندہ سلامت ہوں' وہ بھی اس لیے کہ خدا نے بچایا ورنہ مارنے والوں نے تو کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی' میری گاڑی کو انہوں نے آگ لگا دی۔۔۔۔ وہ دروازے توڑ کے فائرنگ کر کے گھر میں گھسے مجھے اور نور جہاں کو چھت سے دوسری چھت پر اور پھر گلی میں کود کے فرار ہونا پڑا۔۔۔۔ وہ ہمارے تعاقب میں آئے۔۔۔۔ برہان الدین کو قتل کرنے کے بعد۔۔۔۔ وہ شریف آدمی صرف مجھے بچانے کے چکر میں مارا گیا۔۔۔۔ وہ انسان دوست تھا۔۔۔۔ انہوں نے اسے گولی ماردی۔۔۔۔''

میں نے محسوس کیا کہ میں ان سب کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب رہا ہوں۔۔۔۔ اگلا پورا ایک گھنٹا میں بولتا رہا۔۔۔۔ یوں جیسے میں کسی عدالت میں جج کو اپنی بے گناہی پر قائل کرنے کے لیے دلائل دے رہا ہوں۔ یہ ناممکن تھا کہ میں سو فیصد سچ بولوں مثلاً میں نور جہاں کے لیے اپنے جذبات کی بے راہ روی کا اعتراف نہیں کرسکتا تھا۔۔۔۔ یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ محبت تو مجھے فریال سے مگر نور جہاں میری کمزوری بن چکی ہے۔۔۔۔ یہ بات کسی کی سمجھ میں کیسے آسکتی تھی۔۔۔۔

میں نے یہ بھی ثابت کیا کہ نور جہاں اپنے شوہر کی قاتل نہیں ہے۔۔۔۔ وہ اپنے کاروباری دشمنوں کے خوف سے اسلام آباد میں روپوش تھا' اس نے غلط نام سے کرائے پر مکان لے رکھا تھا۔ جس قسم کے دھندوں میں وہ ملوث تھا' اس میں یہ انجام غیر متوقع نہیں سمجھا جاسکتا۔ معمولی سی غلطی بے ایمانی یا بے وفائی کسی مافیا۔۔۔ کے باس یا کسی ڈان کو برگشتہ کردیتی ہے اور وہ چٹکی بجاتے ہی آدمی کو چیونٹی کی طرح مسل دیتے ہیں۔۔۔۔ ان کی نظر سے چھپ کے کوئی ہمالیہ پر چڑھ جائے یا سمندر کی تہ میں جا بیٹھے تب بھی بچ نہیں سکتا۔

درمیان میں پھر رابعہ نے لقمہ دیا۔۔۔۔ ''تم یہ کہہ رہے ہو کہ قتل نور جہاں نے نہیں کسی اور نے کیا۔۔۔۔''

''ہاں۔۔۔۔ سچ یہی ہے مگر الزام اس پر آیا کیونکہ گھر میں اکبر خان کے ساتھ وہی تھی۔۔۔۔''

''اس نے دیکھا ہوگا قاتلوں کو؟'' لیلیٰ بھابھی نے سوال کیا۔

’’نہیں وہ جب سوکے اٹھی تو اسے معلوم ہوا...... اکبر خان مرا پڑا تھا...... کسی نے چھری سے اس کا گلا کاٹ دیا تھا......‘‘

شہناز نے کہا...... ’’قاتلوں نے اسے کیسے چھوڑ دیا؟‘‘

’’ایسے لوگ بے وجہ قتل نہیں کرتے۔ ہاں وہ جاگ رہی ہوتی اور قتل ہوتا دیکھ لیتی تو وہ اسے بھی نہ چھوڑتے۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’چشم دید گواہ کو زندہ نہیں چھوڑا جاتا...... وہ اتنی دہشت زدہ ہوئی کہ جائے واردات سے فرار ہونے کے سوا اسے کچھ نہ سوجھا......‘‘

’’اور فرار ہوکے وہ پہنچ گئی تمہارے پاس؟‘‘ رابعہ نے طنز سے کہا۔ ’’اور کوئی نہیں ملا اسے...... ؟ اس کے تو بہت یار ہوں گے......‘‘

میں نے کہا...... ’’اس کے میرے پاس آنے کی یہی معقول وجہ تھی۔‘‘

’’اور کوئی اتنا بے وقوف نہیں تھا نا...... ‘‘ لیلیٰ بھابھی نے کہا۔

’’یہ بات نہیں تم تو جانتی ہو رابعہ...... اس نے کیسے میری جان بچائی...... جو بات اس نے بتائی کسی کو بھی معلوم نہیں تھی......‘‘

رابعہ نے شہناز کی طرف دیکھا...... وہ سمجھ گئی تھی کہ میں کس سازش کا حوالہ دے رہا ہوں...... شہناز کی نظر بے اختیار لیلیٰ بھابھی کی طرف گئی۔ لیلیٰ بھابھی کی حالت غیر ہوگئی...... وہ جان چکی تھیں کہ فاروقی کی سازش میرے علم میں تھی...... ’’یہ...... یہ بات اس نے بتائی تھی تمہیں؟......‘‘

میں نے کہا۔ ’’ہاں بھابھی...... اسی نے فاروقی کو اکبر خان کے گھر میں دیکھا تھا...... اور ان کی ساری گفتگو سنی تھی......‘‘

’’اس نے جو کیا اپنی غرض پوری کرنے کے لیے کیا۔‘‘ رابعہ بولی۔

’’مگر میں اپنی زندگی کے لیے اس کا مقروض ہوں...... وجہ کچھ بھی ہو...... اس نے مجھے خبردار کیا...... یہی نہیں...... اس سے پہلے بھی وہ مجھے دشمنوں کی ہر سازش سے خبردار کرتی رہی ہے...... ایک نہیں اس کے کئی احسانات ہیں مجھ پر...... میں انکار نہیں کرسکتا...... خود راجا جانتا ہے...... اور مانتا ہے...... اس کے بعد اگر ایک بار وہ مجھ سے مدد مانگتی ہے تو کیا میں انکار کردوں...... ؟ کہہ دوں کہ میں تمہاری بے گناہی پر یقین نہیں کرتا...... جاؤ چڑھ جاؤ پھانسی میری بلا سے...... نہیں میں اتنا کمینہ اور خودغرض نہیں ہوسکتا...... اس کے کردار پر تمہیں لاکھ اعتراض ہو...... تم اس سے نفرت کرسکتی ہو...... اسے قتل تم بھی نہیں کردگی...... اور یہ بات اچھی طرح سمجھ لو وہ مجرم ثابت ہوگئی تو الزام مجھ پر بھی آئے گا...... زرد مایوسی کی کیفیت میں یا کسی وکیل کے کہنے پر اس نے عدالت میں بیان دے دیا کہ اکبر خان کی گردن پر چھری چلانے والا تو رفیق تھا...... میں یہ کام کیسے کرسکتی تھی...... میرا شوہر تھا اور مجھے ورغلانے والا یہ شخص تھا...... ایک عورت کسی تندرست و توانا مرد کے گلے پر چھری کیسے چلاسکتی ہے...... یہ کام اس نے کیا تھا...... اس کی تو اکبر خان سے پرانی دشمنی چل رہی تھی...... بتاؤ اس بیان کے بعد میرا کیا بنے گا......‘‘

میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی مخالف کے جذبات پر برف پڑنے لگی تھی اور میں بڑے غور سے ہر چہرے کا بدلتا رنگ دیکھ رہا تھا...... اس سے میری دلیل تراشی کی صلاحیت اور میری ہمت بڑھی لیکن میں سمجھتا ہوں وہ عورت ہی کیا جو دلیل اور صرف دلیل سے قائل ہوسکے اپنا مؤقف تبدیل کرلے۔ اصل میں تو یہ جذباتی استحصال کا راستہ تھا جس نے میرے لیے منزل آسان کی۔

میں نے ہر پہلو سے نور جہاں کو محسن اور مددگار ثابت کیا...... اس کی مظلومیت بیان کی...... یہ بتایا کہ وہ شریف گھر کی پڑھی لکھی لڑکی غلط ہاتھوں میں پڑکے اکبر خان جیسے لوگوں کا آلۂ کار بننے پر مجبور ہوئی تھی۔ کیا یہ ہمارا انسانی اور اخلاقی فرض بنتا ہے کہ اسے راہِ راست کی طرف لوٹنے میں مددگار ہوں نہ کے مخالف...... اکبر خان کے ساتھ نور جہاں کی عذاب ناک زندگی کے دردناک مناظر کی تصویر کھینچی جس سے خواتین کی آنکھیں نمناک ہوئیں...... آخر میں بیان حلفی کے ساتھ کہا کہ قتل اس نے نہیں کیا...... بے شک جھوٹ سچ عدالت میں سامنے آجاتا ہے لیکن معاملہ عدالت تک جانے کی نوبت ہی کہاں آئے گی...... اس سے پہلے ہی دشمن اسے (اور مجھے) ٹھکانے لگادیں گے۔ انہوں نے برہان الدین کو قتل کردیا ہے اور اب وہ ہمارے پیچھے ہیں۔

تان اس بات پر ٹوٹی تھی کہ کیسوں کے ساتھ گھن کا پس جانا لازمی ہے...... نور جہاں گرفتار ہوئی تو سزائے موت یقینی ہے مگر وہ اسے تختہ دار تک نہیں جائے گی...... اکبر خان کے قاتل مجھے بھی وہیں پہنچائیں گے...... نور جہاں بچے گی تو میں بچوں گا...... وہ مرے گی تو میں لازمی مروں گا۔

اس بحث میں رات گزر گئی...... پہلا سیشن ختم ہوا تو دوسرا فیصلہ کن اجلاس اماں ابا کی سپریم کورٹ میں ہوا۔ وہاں سے بھی مخالف فیصلہ کیسے آتا۔ میں ان کی واحد زندہ

اولاد تھا...... وہ میری کیسے نہ مانتے...... نور جہاں کے حق میں فیصلہ دیتے وقت وہ سب خود کو مجرم محسوس کرتے تھے اور اپنے آپ سے شرمندہ تھے کیونکہ یہ فریال کی اخلاقی حمایت سے پیچھے ہٹنے کا معاملہ بن گیا تھا۔

وقت کی گردش بھی کیسے کیسے کھیل دکھاتی ہے...... اکبر خان سے پہلے اس کی کئی نسلیں حویلی کے مکینوں کی خدمت گزار اور نمک خوار تھیں...... لیکن کئی بار حویلی کے مالک آسیب کا شکار ہوئے، جاہ و جلال سے رہے اور تماشائے غیرت بن کے رخصت ہوئے...... خدمت گار نسل در نسل حویلی کے سرونٹ کوارٹر میں...... زندگی بسر کرتے رہے...... اکبر خان ایک معمولی چوکیدار اس وقت سامنے آیا جب حویلی کی وراثت نصف صدی بعد لاٹری بن کے میرے نام ہوئی۔

اس چوکیدار نے اپنی راہ پہلے ہی بدل لی تھی...... اور وہ رحمان سے شیطان کا بندہ بن گیا تھا...... اس نے معصوم بچوں کو ماؤں کی گود سے چھینا اور دنیا کے بازار میں بیچ کے رقم جیب میں ڈال لی تھی۔ اس نے حویلی کا مال چرانے کی ناکام کوشش کی اور اپنے بوڑھے باپ کو مار ڈالا جو اس کے ارادوں کی راہ میں حائل ہوا تھا...... اس کے بعد وہ بردہ فروشوں سے مل گیا...... پھر مزید ترقی کی اور منشیات فروشی کا راستہ اختیار کیا...... اس نے نور جہاں جیسی پری مثال عورت کو اپنے کاروبار کے فروغ کا ذریعہ بنانے کے لیے اس پر بیوی کا لیبل لگادیا۔

آج وہ حویلی کے باہر ایک کچی قبر کی گہرائی میں سو رہا تھا...... اسی دو گز لٹھے کے کفن میں جو سب کو مل جاتا ہے...... اکبر کو بھی غریب کو بھی...... شاہ کو بھی اور گدا کو بھی...... پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔

اسی سے کچھ فاصلے پر وہ عورت موجود تھی جس نے بدکار زندگی کی زنجیریں کاٹنے کے لیے اکبر خان کے گلے پر چھری پھیر دی تھی۔ جو اس کا سہاگ تھا اور شوہر تسلیم کیا جاتا تھا۔ خواہ وہ دلال ہی تھا...... اکبر خان کے سارے گناہوں کے بدلے نور جہاں کو حویلی میں پناہ مل گئی تھی۔

رابعہ...... لیلیٰ بھابھی یا شہناز میں سے کسی نے خوش ہوکے نور جہاں کو قبول نہیں کیا تھا...... اماں کا رویہ اس سے بھی زیادہ ناراضی کا تھا...... میری مشکل ابا نے آسان کی...... جب تمام معاملات طے پاگئے تو انہوں نے حکم صادر کیا......

’’نور جہاں کو بلاؤ......‘‘ انہوں نے اکبری جلال کے ساتھ کہا۔

سب ایک دم خاموش ہوگئے مگر اس حکم کے خلاف بات کی ہمت کسی میں نہ تھی...... میں فوراً گیا اور اپنے کمرے سے نور جہاں کو ساتھ لے کر واپس آیا...... وہ رات بھر جاگتی رہی تھی اور اکیلی اپنے اندیشوں سے نبرد آزما رہی تھی...... میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں زیادہ کہہ سکتا...... کم سے کم الفاظ استعمال کرکے میں نے نور جہاں کو بتادیا کہ اب وہ حویلی کی مکین ہے اور یہ فیصلہ سب کا ہے جس کی تصدیق اباجی نے کی ہے۔

اس کے چہرے پر رونق آگئی...... ’’یہ سب تم نے کیا...... میرے لیے میں اس کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی......‘‘ وہ رونے لگی۔

’’اب چلو میرے ساتھ واپس آکے تسلی سے رونا......‘‘ میں نے اسے ڈانٹا...... ’’یہ کیا ہے...... دوپٹہ گلے میں مت ڈالو...... سر پر رکھو......‘‘

وہ مجرمانہ انداز میں سر جھکائے اباجی کے سامنے پہنچی تو میں نے باقی ججوں کے چہرے دیکھے...... رابعہ سب سے زیادہ برہم تھی...... لیلیٰ بھابھی کچھ اداس تھیں...... شہناز کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا...... اماں کا میں جانتا تھا کہ اندر سے وہ آتش فشاں...... بنی ہوئی ہوں گی۔

اباجی نے کہا۔ ’’آگے آؤ نور جہاں۔‘‘

نور جہاں ان کے پاس چلی گئی اور اپنا سر جھکا دیا۔ اس وقت وہ کانپ رہی تھی۔

اباجی نے غیر متوقع طور پر اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔ ’’آج سے تم یہاں رہوگی...... ہمارے ساتھ...... جیسے سب رہتے ہیں۔‘‘

نور جہاں رونے لگی...... یہ سخت جذباتی منظر تھا جس نے مجھے بھی آبدیدہ کردیا تھا مگر باقی سب لوگ اس سے خوش نہیں تھے...... ان کے چہرے بدستور کھنچے ہوئے تھے۔

’’تمہاری اس گھر میں اتنی ہی عزت ہوگی...... جتنی سب کی ہے۔‘‘ اباجی نے کہا۔

رابعہ کھڑی ہوگئی۔ ’’یہ تو بڑی زیادتی ہے تایاجی۔‘‘

اباجی نے اسے بڑے زور سے ڈانٹا...... ’’بدتمیزی مت کرو...... بیٹھ جاؤ......‘‘ رابعہ کی سٹی گم ہوگئی۔ اباجی نے پہلے کبھی سب کے سامنے تو کیا اکیلے میں بھی اسے نہیں ڈانٹا تھا۔

نور جہاں نے دوپٹے سے آنسو صاف کیے اور سب کی طرف دیکھا...... ’’میں کسی کو شکایت کا موقع نہیں دوں گی...... بس وہ گناہ معاف کردیے جائیں جن کا تعلق میرے ماضی سے ہے۔‘‘

ابا نے زیرِ لب کہا۔ ’’یہاں کون ہے جو گنہگار نہیں

ہے...... اللہ سب کو معاف کرنے والا ہے...... جاؤ بیٹی آرام کرو۔"

رابعہ اور لیلیٰ بھابی نے باہر نکل کے بھی عدم تعاون کا مظاہرہ جاری رکھا۔ صرف شہناز نے مجھ سے پوچھا۔ "یہ کہاں رہے گی...... کس کے ساتھ؟"

میں نے کہا۔ "اس کے لیے بھی جگہ نکل ہی آئے گی...... بس کچھ دن کی بات ہے شہناز۔"

"اس کے بعد کیا ہوگا؟"

"کوئی بندوبست ہو جائے گا...... ساری عمر تو ہم اسے چھپا کے نہیں رکھ سکتے...... یہ معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے تو اسے باہر بھیج دیں گے۔"

"باہر کہاں...... کس کے پاس؟"

میں نے چڑ کے کہا۔ "ابھی سے کیا بتاؤں...... یہی سوچا ہے میں نے اور راجا نے۔"

حویلی کی نچلی منزل خالی کی جارہی تھی...... ایک حصے کو شہناز نے اپنے کلینک یا اسپتال کے لیے وقف کر دیا تھا اس کی ابتدا ایک ہی کمرے سے ہوئی تھی لیکن مستقبل میں توسیع کی گنجائش بہت تھی...... دوسرے حصے میں رابعہ اور لیلیٰ بھابی نے اسکول پلان کر لیا تھا چنانچہ صبح ہوتے ہی حویلی میں ہلچل شروع ہوگئی اور اسباب کی منتقلی کا ہنگامہ سنائی دینے لگا۔ میں نے خود اوپر جا کے دیکھا اور ایک کمرا نور جہاں کے لیے منتخب کر لیا جو نئے انتظام کے بعد میرے اور ابا اماں کے کمروں کے درمیان تھا۔

دوپہر سے پہلے راجا کا فون آیا...... "میں اب کراچی جارہا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "ایک بار پھر سوچ لے۔"

"تو سنا...... معاملات طے ہو گئے...... اچھا شگون ہے۔"

میں نے کہا۔ "تجھے کیسے پتا چلا؟"

"شہناز نے بتایا...... اور نیکے پتر...... سچ پوچھ تو مجھے تیرے ابا جی سے یہی توقع تھی کہ وہ ضرور تیری حمایت کریں گے۔"

"مجبور ہیں دل کے ہاتھوں۔"

"یہ بات نہیں...... ان کی فطرت میں ہے یہ شفقت اور فراخ دلی...... ہمدردی اور نیکی کا جذبہ...... شہناز نے بتایا کہ تو نے وکالت بھی ایسی کی...... اچھا میری فلائٹ کا ٹائم ہو رہا ہے...... میں کوشش کروں گا کہ رات تک لوٹ آؤں...... فلائٹ نہ ملی تو پھر کل...... تیری گاڑی کا معاملہ میں نے دبا دیا ہے۔"

"رشوت کتنی دی؟"

"اس کے بغیر کوئی کام ہوتا ہے؟" وہ بولا۔ "پچاس مانگ رہا تھا' تھانے دار...... تیس میں مان گیا...... گاڑی جلی ہوئی حالت میں اٹھوالی اور تھانے کے پیچھے والے حصے میں ڈال دی...... وہاں بہت سے ڈھانچے پڑے ہیں...... نہ کسی کے خلاف آتش زنی کا کیس ہے' نہ گاڑی کا اندراج ہے...... نام نمبر کچھ نہیں...... کچھ دن پڑی رہے گی...... پھر تھانے والے خود ہی بیچ دیں گے کسی کباڑی کو...... وہاں سب ٹھیک ہے نا۔"

"ابھی تک تو ٹھیک ہے...... تفتیش کے لیے کوئی نہیں آیا۔"

راجا نے کہا۔ "تیرا مؤقف دو ٹوک اور واضح ہے...... کل صبح تجھے حوالات سے چھوڑا گیا...... تو سیدھا ست بدحالی آیا...... یہ کوئی نہیں پوچھے گا کہ کس کی گاڑی میں...... تھانے سے تو اپنی گاڑی میں نکلا تھا۔"

"یہاں باقی لوگ اس کے گواہ ہوں گے۔"

"رہی نور جہاں کی بات...... تو تجھے کیا معلوم وہ کہاں ہے۔"

میں نے کہا۔ "اس میں تو کوئی شک نہیں۔"

"تفتیش صرف قتل کی ہوگی کہ کس نے کیا اور کیوں...... برہان الدین نے جو تیری سفارش کی تھی...... اس کا قتل سے کوئی تعلق نہیں بنتا...... جب تک یہ معلوم نہ ہو جائے کہ حملہ آور کون تھے؟ برہان الدین جیسے شریف آدمی سے کسی کو بھی ذاتی دشمنی نہیں ہو سکتی...... ممکن ہے پولیس جان چھڑانے کے لیے اسے چوری ڈکیتی کا کیس بنا دے...... یہ آسان ہوتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "یہ تو کبھی معلوم نہیں ہوگا کہ حملہ آور کون تھے۔"

"کسی کی صورت نہیں دیکھی تو نے؟"

"بے وقوف آدمی...... صورت دیکھنے کے لیے رکتا تو پلٹ کر دیکھنا پڑتا پھر آگے کیسے دیکھتا...... میں اپنے ساتھ نور جہاں کو لے کر بھاگ رہا تھا...... اور مجھے اگلے لمحے کا بھروسا نہیں تھا...... کہ کب گولی آئے گی اور خاتمہ کر دے گی۔" میں نے کہا۔

راجا بولا۔ "تجھے اندازہ بھی نہیں۔"

"اندازہ کیا...... مجھے یقین ہے کہ وہ پولیس اسٹیشن سے میرا پیچھا کرتے آئے تھے...... رات تھی اس لیے مجھے پتا نہیں چلا...... پھر میں نے ایک مسجد میں فجر کی نماز پڑھی...... وہاں انہوں نے میری گاڑی دیکھ لی ہوگی۔"

"شرلاک ہومز سمجھ گیا نیکے پتر...... سب سمجھ گیا...... پوری پکچر کلیئر ہوگئی...... مسجد کے باہر سے کوئی ڈکی کھول کے تیری گاڑی میں بیٹھ گیا...... ایک بندہ تو آسانی سے فٹ ہوتا ہے...... دو بھی سما جاتے ہیں...... پھر جب تو نے گاڑی روکی تو کچھ دیر بعد وہ بھی نکلے...... ان کے پاس موبائل فون ہوں گے...... انہوں نے باقی لوگوں کو بھی بلا لیا...... شاید ایک نے دور رہ کے تیرا پیچھا کیا ہوگا اور دیکھ لیا ہوگا کہ تو کس گھر میں گیا۔"

میں نے کہا۔ "میں تیرے ہاتھ پر غائبانہ بیعت کرتا ہوں...... فی زمانہ تجھے دنیا کا سب سے بڑا جاسوس قرار دیتا ہوں...... یہی ہوا میرے ساتھ۔"

"مگر سوال اپنی جگہ ہے...... بندے کس کے تھے؟"

"اسی حرام الدہر خبیث الزماں نطفہ مشکوک رانا کے اور کس کے...... وہ تھانے میں بیٹھا تھا...... بلکہ مقیم تھا...... اس کا نمک خوار تھانے دار ناہنجار بدکار...... وہ پہلے سے میرا دشمن ہے...... میں نے اسے ٹرانسفر جو کرایا تھا...... یہ پیشہ ور قاتل اسی نے رانا کو فراہم کیے ہوں گے۔"

"پتا چل جائے گا...... لیکن تو اپنی سیکیورٹی ریڈ الرٹ کر دے...... جوابی کارروائی ضروری ہے مگر میرے واپس آنے کے بعد پلان کریں گے اب مجھے جانا چاہیے ورنہ بورڈنگ کارڈ نہیں ملے گا...... خدا حافظ۔"

فوری طور پر مخالف جذبات کی برف پگھل کر قربت کی بہار خوش گوار موسم آ جانے کی امید نہیں کی جا سکتی تھی...... اعلیٰ ترین اتھارٹی کے حکم کو دل سے تسلیم نہیں کیا گیا تھا...... زنانہ پارٹی نے جن میں رابعہ، شہناز اور لیلیٰ بھابی کے ساتھ ریشم نے بھی اتحاد کر رکھا تھا۔ نور جہاں کے وجود کو عملاً ایسے نظر انداز کیے رکھا جیسے وہ انہیں دکھائی ہی نہیں دیتی۔

وہ رات بھر کی تھکی ہوئی تھی...... ابا جی کے فیصلے نے اسے سکون کے ساتھ اعتماد بھی دیا تھا...... میرے کہنے پر وہ کمرے میں جا کے سو گئی...... خود میرا نیند کی کمی سے برا حال تھا مگر مجھے بہت سے معاملات نمٹانے تھے...... ایک طرف مجھے کسی بھی وقت پولیس کے آجانے کا ڈر تھا تو دوسری طرف ضمانت قبل از گرفتاری کرانے کی فکر تھی...... دس بجے شہزاد نے خود ہی مجھ سے رابطہ کر لیا۔

"آپ کہاں ہیں سر......؟" اس نے شکایت آمیز لہجے میں کہا۔

میں نے جواب میں غالب کا شعر پڑھ دیا۔ "ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو...... کچھ ہماری خبر نہیں آتی۔"

"میرا فوراً آپ سے ملنا از حد ضروری ہے۔"

"یہ بات تو میں تم سے کہنے والا تھا...... میری ضمانت قبل از گرفتاری کی درخواست تیار کرو۔"

"درخواست تیار ہے...... میں آپ کے دستخط کرانے آرہا ہوں۔ اگر ہو سکا تو سیشن کورٹ میں آج ہی دائر ہو جائے گی...... کل صبح آپ میرے ساتھ پیش ہو جائیں تو پہلا کیس آپ کا ہوگا۔"

میں نے کہا۔ "درخواست مسترد ہوگئی پھر؟"

وہ ہنسنے لگا۔ "سوال ہی پیدا نہیں ہوتا سر...... مجھے راجا صاحب نے سب بتا دیا ہے۔"

"ہمارے دوست کا کچھ پتا ہے کہاں روپوش ہیں؟"

"رانا صاحب...... وہ اسلام آباد میں دیکھے گئے تھے...... بھاگ دوڑ کر رہے ہیں گرفتاری سے بچنے کے لیے...... لیکن معاملہ ایسا ہے کہ کوئی بھی ان کی کیا مدد کر سکتا ہے...... سیشن جج ضمانت منظور کر سکتا تھا...... رانا کے وکیل سیف علی خان کے علاوہ فاروقی صاحب نے بڑی کوشش کی کہ معاملات طے ہو جائیں۔"

میں نے کہا۔ "کون فاروقی صاحب؟"

"آپ کے پرانے کرم فرما...... ان کی خدمات رانا صاحب نے حاصل کر لی ہیں۔"

"مجھے تو اللہ نے اس کے شر سے بچا لیا...... اب دیکھو رانا کا کیا انجام ہوتا ہے۔"

"یہ سیشن جج بہت راشی مشہور ہے...... لیکن اس معاملے میں ڈرتا ہے کہ ہائی کورٹ وضاحت نہ مانگ لے کہ کس بنیاد پر ضمانت منظور کی...... اسے معلوم ہے کہ ہماری طرف سے ضمانت کی منسوخی کے لیے اپیل ضرور دائر کی جائے گی...... دوسری طرف آپ کے معاملے میں اسے اوپر سے اشارہ مل

گیا ہے کہ سیاسی رقابت کے اس جھگڑے میں وہ خود کو غیر جانبدار رکھے...... وہ اعتراض نہیں کرسکتا۔''

میں نے کہا۔ ''پھر بھی...... اس کو کچھ دے دلا کے مطمئن کردو بلکہ بولی لگاؤ اور خرید لو...... یہ رانا کیا چیز ہے...... ہمارے ساتھ وفادار رہے گا تو زیادہ عیش کرے گا۔''

''سچ مانیں تو زمانہ قوتِ خرید کا ہے...... خالی خولی اثر رسوخ کام نہیں آتا...... اس کے ریڈر نے اشاروں کنایوں میں مجھ سے کہا تھا کہ نواب صاحب کے بارے میں سنا ہے خاندانی ہیں...... غریب غربا کا بڑا خیال رکھتے ہیں کسی کو خالی ہاتھ نہیں جانے دیتے...... میں نے ٹال دیا کہ خدمت گزاروں کو ملتا ہے مال اور نمک حراموں کی اتار لی جاتی ہے کھال۔''

''تم کتنی دیر میں آرہے ہو؟''

''بس یہی گھنٹا ڈیڑھ میں......'' اس نے کہا۔

شفٹنگ آخری مراحل میں تھی...... ہنگامی بنیادوں پر شروع کیا جانے والا کام تین دن میں مکمل ہوا تھا...... نچلی منزل کا نصف سے کچھ کم حصہ اسکول اور اسپتال کے لیے وقف کر دیا گیا تھا۔ باقی حصے میں مہمان خانہ تھا اور ایک انیکسی جہاں مہمانوں کو قیام کی ہر سہولت حاصل ہوتی......

دوسرے حصے میں عجائب خانہ تھا اور نگار خانہ...... وہ تمام چیزیں جو اب قابل استعمال نہیں رہی تھیں اور نوادرات میں شمار ہوتی تھیں۔ عجائب خانے کی زینت بنی تھیں...... نگار خانہ وہی ہال تھا جس میں میرے آباؤاجداد کی قد آدم روغنی تصاویر آویزاں تھیں...... اسے یہ نام فریال نے دیا تھا...... میری کب سے خواہش تھی کہ اس میں ابا کی تصویر بھی ہو جس میں اماں ان کے ساتھ کھڑی نظر آئیں لیکن اماں پر رفتہ رفتہ مذہبی رنگ غالب آتا جا رہا تھا...... وہ تصویر کشی کو حرام سمجھنے لگی تھیں...... تصویر کے مسئلے پر خود علما میں اختلاف رائے برقرار ہے...... میں اماں سے کیا بحث کرتا اور بحث سے کوئی قائل ہوتا ہے...... خود ابا اس سے گریز کرتے تھے کیونکہ وہ انتہا پسندی اور تنگ نظری کے ہمیشہ مخالف رہے۔

موقع پاتے ہی میں نے غنی کو طلب کرلیا...... میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ بھی مجھ سے دور دور ہے اور اس نے مصروفیت کو بہانہ بنالیا ہے۔

میں نے کہا۔ ''کیا بات ہے چیف صاحب...... تم تو لفٹ ہی نہیں کرا رہے۔''

اس نے بجھی بجھی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''ہم ملازم پیشہ لوگ ہیں سرکار...... حکم کے غلام...... ہماری کیا مجال۔''

میں نے کہا۔ ''تمہیں جو کہنا ہے کھل کے کہو...... کیا تم بھی عورتوں کی طرح نور جہاں کے آنے سے خفا ہو؟''

''نہیں سرکار...... یہ بات نہیں۔''

میں نے اصرار کیا۔ ''پھر کیا بات ہے؟''

''سرکار ناراض نہ ہوں تو کہوں...... آپ نے سیکیورٹی کی جو ذمے داری مجھے دی تھی...... وہ واپس لے لیں۔''

میں نے حیرانی سے اسے دیکھا ''کیوں...... تم کہیں جا رہے ہو؟'' میں نے کہا۔

وہ بولا۔ ''نہیں سر...... میں وہ ذمے داری پوری نہیں کر سکتا۔''

''یہ تم سے کس نے کہا؟'' میں نے کہا۔

وہ بولا۔ ''کسی نے نہیں...... میں خود ایسا محسوس کرتا ہوں۔''

''پھر وہی بات...... آخر ہوا کیا؟''

وہ بولا۔ ''ابھی تک تو کچھ نہیں ہوا...... لیکن کسی دن ہوگیا تو الزام مجھ پر آئے گا...... آپ اپنی مرضی کرتے ہیں...... میں نام کا سیکیورٹی انچارج ہوں...... لیکن آپ مالک ہیں...... میں آپ سے کچھ کہہ نہیں سکتا...... بہتر یہی ہے کہ خود کو ان معاملات سے الگ کرلوں۔''

میں نے ہنس کے کہا۔ ''تو یہ بات ہے...... بھئی میں اپنی غلطی مانتا ہوں...... بہت سے معاملات میں تم کو نظر انداز کیا گیا...... میں نے تمہیں ساتھ نہیں رکھا اور تمہاری ہدایات پر عمل نہیں کیا۔''

''سر...... میرے جیسے کی زندگی کی کیا اہمیت ہے آپ کے مقابلے میں...... آپ اس کنبے کے سربراہ ہیں...... صرف ریاست کا مالک ہونے کی بات نہیں...... جو صلاحیت آپ کے پاس ہے جو کام آپ کر رہے ہیں جو ذمے داری آپ نے اٹھائی ہے...... وہ کسی اور کے بس کی بات نہیں...... آپ کے دشمن بھی طاقتور ہیں...... یا تو آپ سارے معاملات سے ہاتھ کھینچ لیں اور سب چھوڑ کے واپس ولایت چلے جائیں۔''

''اوہو...... تم بہت خفا ہو...... خیر...... اس مسئلے پر بات کریں گے راجا صاحب کے آجانے کے بعد...... میں وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ اپنی حفاظت کے لیے تمہارا ہر مشورہ مانوں گا...... رائٹ۔''

''میں بہت ڈرتا ہوں سر...... اتنی بڑی ذمے داری کا میں اہل نہیں تھا...... آپ نے بڑی عزت دی ہے۔'' وہ خوش نظر آنے لگا۔

''اچھا اب میری بات سنو...... یہ ہوسکتا ہے کہ پولیس یہاں تفتیش کے لیے آئے...... تمام سیکیورٹی گارڈز کو الرٹ کر دو...... پہلی بات یہ کہ وہ خود کسی کو بھی کچھ نہ بتائیں...... کوئی

انفارمیشن نہ دیں...... صاف انکار کریں کہ حویلی کے اندر کی بات کا ہمیں پتا نہیں...... نہ ہمیں اس کی اجازت ہے...... ہمارا کام گیٹ کھولنا اور بند کرنا ہے...... جسے مالک اجازت دیں اسے جانے دیں...... جسے اجازت نہ ملے اس کو روک دیں۔''

''ایسا تو ہے...... پہلے سے۔''

میں نے کہا۔ ''بات تم کرو گے...... تم سے پوچھا جائے کہ نواب صاحب کہاں گئے تھے...... تم کہہ سکتے ہو کہ وہ مجھے بتا کے نہیں جاتے...... وہ جاننا چاہیں گے کہ نواب صاحب واپس کب آئے...... اس کے جواب میں تمہیں کہنا ہے کہ کل صبح پانچ بجے...... سب کو یہی کہنا ہے...... جس سے بھی پوچھا جائے۔''

''یس سر......''

''دوسری بات...... نور جہاں نام کی خاتون جو اکبر خان کی بیوی تھی...... یہاں کبھی نہیں آئی...... نہ اکبر خان کے ساتھ نہ کسی اور کے ساتھ...... نہ اکبر خان کی زندگی میں...... نہ اس کی موت کے بعد...... حویلی کے اندر سب کو یہی ایک بات کہنی ہے...... اگر پولیس یا کوئی اور شخص نور جہاں کی تصویر دکھا کے پوچھتا ہے کہ اسے تم نے دیکھا ہے تو تمہارا کیا جواب ہوگا؟''

''کبھی نہیں۔''

''رائٹ...... ابھی کچھ دیر میں وکیل صاحب آنے والے ہیں...... فاروقی صاحب نہیں...... شہزاد صاحب...... میں کچھ دیر آرام کروں گا......'' میں نے کہا۔

مجھے لیٹے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ غنی نے مجھے جگا دیا۔ ''جناب عالی...... کوئی عبداللہ جان آپ سے ملنے آئے ہیں۔''

میں ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ ''عبداللہ جان...... اکیلے آئے ہیں؟''

''ڈرائیور ہے ساتھ۔''

''انہیں بٹھاؤ مہمان خانے میں۔'' میں نے کہا۔ ''میں آتا ہوں۔''

میری معلومات کے مطابق عبداللہ جان کو دو چار دن بعد جہلم کے ڈی آئی جی کا چارج لینا تھا...... اس کا کسی اطلاع اور پروگرام کے بغیر یہاں پہنچ جانا جتنا حیرت انگیز تھا اس سے زیادہ معنی خیز تھا...... اس نے بڑی خاموشی سے اور بڑے دوستانہ انداز میں چھاپہ مارا تھا۔

جب میں نے مہمان خانے میں قدم رکھا تو وہ بڑے غور سے مہمان خانے کی آرائش کا جائزہ لے رہا تھا...... مجھ سے مصافحہ کر کے اس نے کہا۔ ''مجھے تو لگتا ہے کسی الف لیلوی دور کے محل میں پہنچ گیا ہوں...... یہ تصاویر...... اسباب آرائش...... کاریگری کے یہ نمونے...... یہ نوادرات...... آپ کی حویلی تو ایک عجائب خانہ ہے۔''

میں نے کہا۔ ''یہ تقریباً دو صدیوں میں جمع ہونے والے نوادرات ہیں...... میرے آباؤاجداد کی نشانیاں۔''

وہ سخت حیرت میں تھا۔ ''کمال ہے...... میں پہلے بھی جہلم میں رہا۔ نام ضرور سنا تھا ست بدھائی کا...... کسی نے بتایا تھا کہ ایک پرانی حویلی بھی ہے مگر مجھے اس کی تاریخی اہمیت کا بالکل اندازہ نہ تھا۔''

میں نے کہا۔ ''یہ تو کچھ بھی نہیں...... عجائب خانہ دیکھیے جس میں تاریخی نوادرات کو جمع کیا گیا ہے...... یا نگار خانہ...... بہت کچھ لوٹ لیا گیا یا چوری ہوگیا...... مثلاً سونے چاندی کے ظروف...... قدیم زیورات وغیرہ...... یہاں پرانی گاڑیاں تھیں...... وہ خود ہم نے قدیم گاڑیوں کے ڈیلر کو فروخت کردیں...... ہم انہیں رکھ کے کیا کرتے۔''

اس نے تعریفی انداز میں سر ہلایا...... ''یہ جاگیر...... حویلی کب سے آپ کے خاندان میں ہے؟''

میں نے کہا۔ ''میں ساتویں نسل کا وارث ہوں۔ ڈیڑھ سو سال پہلے اس کی بنیاد میرے پردادا نے رکھی تھی...... میرے قبضہ لینے سے پہلے یہ تقریباً پچاس سال تک لاوارث رہی...... اس میں بہت نقصان ہوا...... اب بات نکلی ہے تو اکبر خان کا حوالہ ضرور آئے گا...... اس کا باپ بڑا وفادار تھا...... اکبر خان نے حویلی کو سب سے زیادہ لوٹا...... مجھے کچھ اندازہ نہیں کہ وہ یہاں سے کیا کچھ نکال کے لیے گیا...... آخری کوشش میں وہ سونے چاندی کے ظروف یا زیورات لے جانا چاہتا تھا کہ باپ اس کے راستے میں کھڑا ہوگیا...... اس نے باپ کو بھی مار دیا...... اور اب دیکھیے خود اسی مٹی میں دفن ہوا...... حویلی کے باہر اس کی قبر ایک عبرت کا نشان ہے...... کیا لے گیا وہ اپنے ساتھ۔''

عبداللہ جان نے کہا۔ ''سکندر جب گیا دنیا سے دونوں ہاتھ خالی تھے۔''

میں نے کہا۔ ''آئی ایم سوری...... آپ اتنی دور سے تشریف لائے...... میں نے آپ سے کچھ نہیں پوچھا...... کیسے زحمت فرمائی؟''

اس نے کچھ سوچ کے کہا۔ ''بات یہ ہے رفیق صاحب...... معاملات بڑے الجھ گئے ہیں۔''

''آپ رانا کے اور میرے قانونی معاملات کی بات کر رہے ہیں یا اکبر خان کے قتل کی؟''

''میں برہان الدین کے قتل کی بات کررہا ہوں۔''

میں نے چونک کے سخت حیرانی اور صدمے کا اظہار کیا۔ ''برہان الدین کا قتل..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔''

اس نے مجھے غور سے دیکھا۔ ''آپ کو نہیں معلوم؟''

''ابھی آپ نے بتایا... ورنہ مجھے علم نہیں تھا۔''

وہ بولا۔ ''خبر تمام اخبارات میں شائع ہوچکی ہے۔''

میں نے معذرت کی۔ ''دراصل اخبارات یہاں نہیں پہنچتے.....کوئی ٹیلہ جوگیاں جائے تو شام کو خرید لاتا ہے۔''

''تھانے سے نکل کے آپ ان سے نہیں ملے؟... ان کا شکریہ ادا کرنے بھی نہیں گئے؟''

میں نے کہا۔ ''آپ دیکھ رہے ہیں میری مصروفیت۔''

''یہ کیا ایکٹوٹی چل رہی ہے؟''

میں نے کہا۔ ''رہائش کے لیے اوپر کی منزل کا انتخاب کیا گیا ہے..... نیچے فوری طور پر فری ڈسپنسری قائم کی جارہی ہے..... ڈاکٹر شہناز کی نگرانی میں... اسے کچھ عرصے بعد اسپتال بنادیا جائے گا..... اس کے علاوہ دو اسکول قائم کیے جارہے ہیں..... مفت تعلیم کے لیے..... ایک لڑکوں کا دوسرا لڑکیوں کا..... الگ الگ شفٹ میں... مجھے فوراً واپس آنا پڑا۔'' اسی وقت ریشم چائے کافی کی ٹرالی دھکیلتی ہوئی لائی اور درمیان میں چھوڑ کے رخصت ہوگئی۔

''برہان الدین جیسے شریف النفس آدمی کا قاتل کون ہوسکتا ہے..... میرے لیے تو یہ انتہائی رنج کی بات ہے۔'' میں نے چائے بناتے ہوئے کہا۔

''کچھ سمجھ نہیں آتا..... محلے والوں کا کہنا ہے کہ حملہ آور ایک جیپ میں آئے تھے..... اور تعداد میں چار تھے..... ایک باہر بیٹھا رہا..... تین اندر گئے... دروازہ توڑ کے..... یہ بھی ناقابلِ فہم ہے..... ظاہر ہے پہلے انہوں نے کال بیل بجائی ہوگی..... دستک دی ہوگی..... اور برہان الدین نے دروازہ نہیں کھولا ہوگا تو وہ توڑنے پر مجبور ہوئے ہوں گے... سوال یہ ہے کہ برہان الدین نے دروازہ کیوں نہیں کھولا تھا..... کیا اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ دروازے پر آنے والے کون ہیں اور ان کے کیا عزائم ہیں..... ان کے گھر جانے والے بہت لوگ تھے..... انہوں نے کبھی کسی سے کچھ نہیں پوچھا کہ کون ہو..... وہ ہر ایک کے لیے دروازہ کھول دیتے تھے..... ظاہر ہے انہیں کسی کا بھی ڈر نہیں تھا۔''

میں نے تائید کی۔ ''آج کل تو لوگ انٹرکام اور کلوز سرکٹ کیمرے لگاتے ہیں..... گیٹ پر سیکیورٹی گارڈ رکھتے ہیں۔''

''برہان الدین کے گھر کے آس پاس بھی ایسا ہے..... مگر خود ان کے گھر میں کیا تھا کہ انہیں خطرہ محسوس ہوتا..... اندر گھسنے والوں نے انہیں گولی ماردی جو ان کے سر میں لگی..... فائر بہت قریب سے کیا گیا..... ایک دو فٹ کے فاصلے سے۔''

میں نے کہا۔ ''گھر میں تو اور کوئی بھی نہیں ہوگا.....''

اس نے چائے کا ایک گھونٹ لیا۔ ''حملہ آور چور ڈاکو ہوتے تو اور بات تھی مگر ان کے گھر میں کیا تھا..... کچھ بھی نہیں..... حملہ آور کسی اور کے پیچھے آئے تھے۔''

میں نے پھر چونک کے کہا۔ ''کسی اور کے پیچھے؟''

''ہاں..... وہاں ایک مرد تھا اور ایک عورت تھی..... وہ حملہ آوروں کے ڈر سے بھاگے..... ان کے پیچھے حملہ آور تھے..... فرار کا واحد راستہ اوپر کی طرف تھا..... وہ زینے سے بھاگے..... اوپر جاکے انہوں نے زینے کا دروازہ بند کیا جو بعد میں حملہ آوروں نے توڑ کے کھولا..... پھر وہ چھت پر گئے..... چھت پر جانے والا دروازہ بھی ٹوٹا پڑا تھا..... نشانات بہت واضح تھے ایک مرد کے اور اس کا ساتھ دینے والی عورت کے فٹ پرنٹ گرد آلود چھت پر بہت نمایاں تھے... وہ ساتھ والے گھر کی چھت پر کودے اور وہاں سے گلی میں نکل گئے..... ہمیں عورت کی ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے ملے ہیں..... حملہ آور ان کے پیچھے پیچھے رہے..... لیکن گلی میں وہ کہیں غائب ہوگئے۔''

''کون؟..... حملہ آور.....!''

''نہیں..... وہ مرد اور عورت..... دراصل گلی صاف نہیں ہے..... وہاں کوڑا کچرا پڑا رہتا ہے..... سیوریج لائن کا پانی بہتا ہے..... لوگ ملبہ پھینک دیتے ہیں..... ان میں فٹ پرنٹ غائب ہوگئے..... حملہ آور مسلح تھے... لوگوں نے انہیں گلی میں دوڑتے گالیاں بکتے اور دھمکیاں دیتے سنا لیکن وہ بھی زیادہ دیر نہیں رک سکتے تھے..... پڑوس کے کسی شخص نے پولیس کو مطلع کردیا تھا... وہ جیپ میں بیٹھ کے فرار ہوگئے..... پولیس چند منٹ بعد پہنچی..... ایک پڑوسی نے جیپ کا نمبر دے دیا اور حملہ آوروں کا حلیہ بھی بتایا..... ہم اس کی مدد سے خاکے بنوارہے ہیں... لیکن اس عورت اور مرد کے بارے میں کوئی بھی کچھ نہیں بتاسکا''

خاموشی کا ایک وقفہ آیا جس میں ہم چائے پیتے رہے اور اپنے اپنے نقطۂ نظر سے صورتِ حال پر غور کرتے رہے..... میں سوچ رہا تھا کہ آخر یہ تجربہ کار ذہین اور فرض شناس پولیس افسر اس عورت اور مرد کے بارے میں مزید کتنا جان چکا ہے جو اس نے ابھی تک مجھے بتایا نہیں ہے..... وہ سب جان چکا ہے! اس کے یہاں آنے کا مقصد اور کیا ہوسکتا ہے.....

میں نے کہا۔ ''عبداللہ صاحب..... میں آپ کی کیا مدد کرسکتا ہوں اس معاملے میں..... دکھ تو مجھے بھی اتنا ہی ہے جتنا آپ کو.....''

''ابھی میں نے چارج نہیں لیا ہے.....اور نہ ہی یہاں آپ کی حویلی دیکھنے آیا تھا..... میں آپ سے پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا آپ اس عورت اور مرد کے بارے میں کچھ بتاسکتے ہیں... وہ کون ہوسکتے ہیں؟ ایک دن پہلے آپ کی برہان الدین سے ملاقات ہوئی تھی۔''

میں نے کہا۔ ''اس روز وہ اکیلے تھے۔''

''آپ کو یقین ہے کہ اندر کوئی اور نہیں تھا؟''

میں نے کہا۔ ''یہ میں کیسے بتاسکتا ہوں..... میں ان کے ساتھ باہر بیٹھا رہا تھا..... لیکن اندر کوئی ہوتا تو وہ بتاتے..... کوئی آواز سنائی دیتی..... یا وہ چھپاتے تو پریشان نظر آتے..... وہ بالکل پُرسکون اور نارمل تھے۔''

''آپ ان کے خاندان سے کس حد تک واقف ہیں؟''

میں نے کہا..... ''بہت کم..... یہ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں۔''

''خاندانی دشمنی کے پہلو کو قتل کے کیس میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا..... مجھے شک ہے کہ یہ ان کے جاننے والوں میں سے کوئی تھا..... کسی نے ایک لڑکی کو اغوا کیا یا لڑکی نے پسند کی شادی کی... اس کے قبیلے یا خاندان والے دشمن ہوگئے..... انہیں پتا چل گیا کہ اس وقت وہ برہان الدین کے گھر میں چھپے ہوئے ہیں..... اس شریف آدمی نے ان کو رکھ لیا ہو۔''

میں نے کہا۔ ''ایسا ہوسکتا ہے۔''

''لیکن گھر میں ایسی کوئی چیز نہیں ملی..... کسی عورت کے یا نئی دلہن کے استعمال کی کوئی چیز..... وہ سوٹ کیس اٹھا کے تو نہیں بھاگے ہوں گے... عورت کو موقع ہی کہاں ملا ہوگا کہ اپنا میک اپ کا سامان..... زیور یا کپڑے سمیٹ سکے..... اس کے علاوہ جو چوڑیوں کے ٹکڑے ملے ہیں..... وہ عام طور پر نئی دلہن نہیں پہنتی..... وہ بہت معمولی قیمت کی اور پرانی چوڑیوں کے ٹکڑے ہیں۔''

معلوم نہیں وہ یہ سب مجھے کیوں بتارہا تھا.....

''آپ کیا سوچ رہے ہیں نواب صاحب؟'' عبداللہ نے کہا۔

میں چونکا۔ ''یہی..... کہ برہان الدین نے کسی مرد عورت کو گھر میں رکھ لیا تھا جس کی وجہ سے اس کی جان گئی..... یقیناً وہ جان پہچان کے ہوں گے۔''

عبداللہ مسکرایا۔ ''پہلے میرا بھی یہی خیال تھا..... لیکن اب ایک فلمی سچویشن آرہی ہے میرے ذہن میں۔''

میں نے کہا۔ ''وہ کیا؟''

''فرض کیجیے..... برہان الدین صاحب اکیلے بیٹھے ہیں..... کال بیل بجتی ہے اور وہ دروازہ کھولتے ہیں..... ایک مرد اور عورت اندر آجاتے ہیں..... جن کو وہ بالکل نہیں جانتے..... خوف زدہ گھبرائے ہوئے اور بدحال..... وہ منت کرتے ہیں اور ہاتھ جوڑتے ہیں کہ ہماری جان کے دشمن پیچھے لگے ہوئے ہیں..... ہمیں کچھ دیر چھپنے کا موقع دیں..... وہ نیک دل اور مہربان آدمی ان کا دکھ دیکھ کے پگھل گیا..... اس نے کہا کہ اچھا اندر چلو..... لیکن ان کے پیچھے پیچھے دشمن آگئے..... برہان الدین نے دروازہ کھولنے میں دیر کی..... ان سے کہا کہ وہ بھاگ جائیں..... بھاگنے کا ایک راستہ پیچھے کی طرف سے بھی تھا لیکن ممکن ہے دشمن اُدھر بھی کھڑے ہوں..... وہ اوپر کی طرف بھاگے..... دشمن اتنی دیر میں دروازہ توڑ کے گھر میں گھسے..... برہان الدین نے ان کا راستہ روکا اور مارا گیا..... وہ عورت اور مرد نکل گئے۔''

جب عبداللہ یہ ''فلمی سچویشن'' بیان کررہا تھا تو میں ان بڈھا بڑھیا کے بارے میں سوچ رہا تھا جنھوں نے میری اور نور جہاں کی مدد کی تھی..... ہم ان کے گھر میں ایسے ہی داخل ہوئے تھے..... ہم نے بھی یہی کیا تھا۔

''ہم نے چھت پر جاکے دیکھا ہے..... گلی کے آخری کونے تک یہ چھت ملی ہوئی ہے..... یا درمیان میں فاصلہ بہت کم ہے..... لیکن فرار ہونے والوں کے پاس اتنی لمبی دوڑ کے لیے مہلت کہاں تھی..... وہ گلی میں بھی سیدھا بھاگتے تو قاتلوں کی گولی کا نشانہ بن جاتے..... فائر صرف ایک سنا گیا..... اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ زندہ سلامت فرار ہونے میں کامیاب رہے..... یہ صرف ایک صورت میں ممکن ہے..... جب وہ دوسری تیسری یا چوتھی چھت سے زینے کے راستے کسی گھر میں اترے ہوں اور پھر گھر والوں نے انہیں باہر نکالا ہو..... اپنی گاڑی میں۔''

میرے دل کی دھڑکن رکنے لگی..... ''آپ نے پڑوس میں رہنے والوں سے معلومات حاصل کی ہوں گی؟''

''ہاں.....'' وہ کچھ دیر بعد مجھ پر نظر جما کے بولا۔ ''کسی سے کچھ بھی معلوم نہیں ہوا..... کوئی تسلیم نہیں کرتا کہ اس نے کسی مرد عورت کو فرار میں مدد دی تھی۔''

''آپ کے پاس جیپ کا نمبر ہے؟''

''جیپ چوری کی تھی..... ایک مہینا پہلے گوالمنڈی سے چوری ہوئی تھی..... اس پر نمبر پلیٹ جعلی تھی..... اب ہماری توجہ برہان الدین کے قاتلوں کی طرف ہے..... ان کے خاکے تیار ہیں۔ کل اخبارات کو جاری کردیے جائیں

گے..... کیا آپ خاکوں کی مدد سے کسی کو پہچان سکتے ہیں؟'' اس نے اچانک دو کاغذ نکال کے میری طرف بڑھائے۔ ''یہ فوٹو کاپی ہیں۔''

میں نے ہر اسکیچ کو غور سے دیکھا۔ ایک تو جس نے بھی قاتلوں کو دیکھا تھا صرف ایک نظر دیکھا تھا..... پھر حلیہ بیان کرتے ہوئے کوئی بھی الفاظ کی مدد سے تصویر نہیں کھینچ سکتا..... پولیس کے خاکے بنانے والوں کا طریقہ مجھے معلوم ہے' ان کے پاس ایک شناختی کٹ (IDENTITY KIT) ہوتی ہے..... وہ چہرے کے فریم کی آؤٹ لائن بناتے ہیں..... چہرہ کتابی تھا..... گول..... لمبا..... بیضوی یا چوکور..... پھر اس پر آنکھیں لگاتے جاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

اس کے باوجود بعض اوقات گواہ جان چھڑاتا ہے..... پہلے وہ جذباتی ہو کے بول پڑتا ہے کہ میں نے دیکھا تھا..... بعد میں عزیز و اقارب سمجھاتے ہیں کہ پاگل ہوا ہے..... شناخت کے چکر میں پڑے گا تو مارا جائے گا..... پولیس تھانہ کچہری میں خوار کرے گی..... یا اس سے پہلے ہی اصل مجرم ہمیشہ کے لیے خاموش کر جائیں گے..... نتیجہ یہ کہ وہ ہوش کے ناخن لے کر سو فیصد غلط بولتا ہے..... شاہ رخ خان کو دیکھا ہو تو خاکہ امیتابھ کا بنوا دیتا ہے کہ اصل مجرم دیکھے تو خفا نہ ہو..... اور خاکے کی مدد سے کبھی پکڑا نہ جائے۔

اس کے باوجود میں نے ایک خاکے ... میں رانا کے منشی کی مشابہت دیکھ لی جو اتنی واضح تھی کہ میں نام لیتا تو منشی ضرور پکڑا جاتا اور جس نے اسے دیکھا تھا' وہ شناختی پریڈ میں بھی اسے شناخت کر لیتا..... یقیناً اس چشم دید گواہ کا مشاہدہ بہت تیز تھا..... اس کی نظر بہت تیز تھی اور اس نے مارے جانے کے خوف سے پولیس کو گمراہ نہیں کیا تھا۔

میں نے خاکے عبداللہ کو واپس کر دیے۔ ''میں کسی کو نہیں پہچانتا۔''

''میرا یہ وزٹ بالکل ان آفیشلی ہے..... مجھے اکبر خان کے بارے میں کچھ معلومات بھی حاصل کرنا تھیں..... کیا میں اس کی بیوی..... میرا مطلب ہے بیوہ سے اور بیٹی سے بات کر سکتا ہوں؟''

''کیوں نہیں..... میں انہیں بلوا لیتا ہوں۔''

''یہاں آپ کے ساتھ کتنے لوگ ہیں؟ جو مستقل رہتے ہیں؟''

میں نے اسے بتایا۔ ''میرے والدین..... میری چچا زاد بہن..... میرا دوست مشہور صحافی راجا..... اس کی منگیتر ڈاکٹر شہناز..... اور مسز فاروقی۔''

''اور ملازم.....''

میں نے اسے غنی، ریشم اور فاطمہ کے علاوہ سیکیورٹی گارڈز کے بارے میں بتا دیا..... عبداللہ نے بریف کیس پھر کھولا اور ایک تصویر میرے سامنے کر دی..... یہ نور جہاں کی رنگین تصویر تھی جو زیادہ پرانی نہیں تھی..... میں نے کوشش کی کہ اپنے چہرے سے کسی قسم کے جذبات کا اظہار نہ ہونے دوں۔

''اسے تو یہاں سب پہچانتے ہوں گے؟''

میں نے سر ہلایا۔ ''سب کی نہیں کہہ سکتا..... اکبر خان کی پہلی بیوی اور بیٹی سے پوچھ لیں۔''

''اگر آپ برا نہ مانیں..... تو پہلے اپنے والدین سے ملوا دیں۔''

میں نے اپنے اعصاب پر قابو رکھا..... یہ انتہائی ہوشیار پولیس افسر جسے ''ان آفیشل'' وزٹ کہہ رہا تھا وہ حقیقت کی تہ تک پہنچنے کی بڑی پُرفریب کوشش تھی..... وہ دیکھنے آیا تھا کہ نور جہاں حویلی میں تو روپوش نہیں..... وہ اکبر خان کے قتل کو برہان الدین کے قتل سے جوڑنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس کے پس منظر میں میرے نور جہاں سے تعلق کو نہیں بھولا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ رانا کی اور میری دشمنی کے عوامل پر بھی غور کر رہا تھا کیونکہ اکبر خان کی رانا کے ساتھ پارٹنر شپ ثابت ہوتی تھی۔

''میں انہیں زحمت تو نہیں دینا چاہتا..... وہ میرے استاد تھے..... لیکن میں فرض سے مجبور ہوں۔''

میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''دراصل..... والد صاحب تو آ جائیں گے..... اماں ایک تو بیمار ہیں..... دوسرے..... وہ کسی نامحرم کے سامنے نہیں آتیں..... بات بھی مجبوری میں کریں گی۔''

''چلیں انہیں رہنے دیں۔''

ابا جی بڑے سکون اور اعتماد کے ساتھ آئے..... عبداللہ نے کھڑے ہو کے ان کا استقبال کیا..... چند منٹ پرانے وقتوں کی بات کرنے کے بعد اس نے وہی سوالات شروع کیے جو مجھ سے پوچھے تھے..... ابا جی سکون سے جواب دیتے رہے..... انہوں نے سب وہی کہا جو میں نے کہا تھا..... عبداللہ نے نور جہاں کے اور میرے مراسم کے بارے میں ان سے کوئی بات نہیں کی..... پھر اس نے اچانک نور جہاں کی تصویر ان کے سامنے کر دی۔

''اسے جانتے ہیں آپ؟''

''ہاں یہ اکبر خان کی دوسری بیوی ہے..... صرف ایک بار آئی تھی یہاں اس کے ساتھ..... بہت پرانی بات ہے۔''

''کیا آپ کو علم نہیں کہ یہ اکبر خان کی قاتل ہے..... اور

مفرور ہے۔''

''ہو گی..... میں نے بھی سنا ہے۔'' ابا جی نے سرسری لہجے میں کہا۔ ''ایسے کاموں کے ایسے ہی نتیجے نکلتے ہیں۔''

''آپ کو یقین ہے کہ یہ پھر یہاں نہیں آئی..... شوہر کے قتل کے بعد۔''

''کیسی باتیں کرتے ہو عبداللہ..... یہاں کون رہتا ہے..... میں بتا چکا ہوں۔''

''وہ..... دراصل..... اتنی بڑی حویلی ہے۔''

''ہے تو پھر..... مجھے پتا نہیں چلتا اندر کون آیا کون گیا..... حویلی بھی گھر ہوتی ہے..... کوئی جنگل نہیں..... یا خدانخواستہ تم یہ کہنا تو نہیں چاہتے کہ وہ حویلی میں موجود ہے..... وہ کیوں آئے گی یہاں..... کون ہے اس کا ہمدرد۔''

عبداللہ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''آپ کا بیٹا..... نواب رفیق احمد شیرازی..... شاید آپ کو علم نہ ہو..... مگر نور جہاں سے اس کے مراسم کے بارے میں بہت سی باتیں مشہور ہیں۔''

ابا جی کے چہرے پر ناراضی کے آثار عیاں ہو گئے۔ ''پھر اس سے پوچھو..... یا تلاشی لینا چاہو تو لے لو..... تم شاگرد پہلے تھے..... ڈی آئی جی بعد میں بنے مگر اب استاد کی بات کا یقین کرنا تم پر فرض نہیں رہا..... تمہارا فرض اولیت رکھتا ہے۔''

''میں معافی چاہتا ہوں۔'' وہ پھر کھڑا ہوا جس کا مطلب واضح تھا کہ اب ابا جی کو جانے کی اجازت ہے۔

مجھے بڑی شرمندگی تھی کہ میری وجہ سے ابا جی جھوٹ بولنے پر مجبور ہوئے..... ساری زندگی وہ میری خاطر دکھ جھیلتے رہے تھے..... سب کچھ برداشت کرتے آئے تھے..... ماں باپ بڑے مجبور لوگ ہوتے ہیں..... وہ یہ تو کر سکتے ہیں کہ پھانسی کا پھندا اپنے گلے میں ڈال لیں لیکن اکلوتے جوان بیٹے کے لیے ایسی سزا کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

عبداللہ جان میں مروت اور وضعداری تھی لیکن احساس ذمے داری سے بڑھ کر نہیں..... وہ چاہتا تو یہ کام اپنے کسی ماتحت سے بھی لے سکتا تھا مگر اسے معلوم تھا کہ پولیس کیا روایتی طریقے اختیار کرتی ہے' ماتحت دونوں طرف سے اس کے تعلق کو نقصان پہنچائیں گے اور وہ خاطر خواہ نتائج پھر بھی حاصل نہ ہوں گے..... اس کی پوسٹنگ ہو چکی تھی اور اگلے دو چار برس اسے اسی علاقے میں رہنا تھا..... وہ برہان الدین کی طرح ابا جی پر اور مجھ پر اعتماد کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے اندر کا پولیس مین تفتیش کے بغیر مطمئن نہ ہوتا تھا..... صرف اپنے اطمینان کے لیے اس نے ست بدھائی کا چکر لگایا جہاں اکبر خان لوٹ کے گیا تھا..... یہ شبہ بھی تھا کہ اس کی قاتل بیوی نور جہاں کی روپوشی بعید از امکان نہیں کیونکہ اس کا چاہنے والا اور اکبر خان کا دشمن نواب رفیق احمد شیرازی بھی وہیں تھا۔

فاطمہ ڈرتی ہوئی حاضر ہوئی..... میں نے اسے تسلی دی۔ ''دیکھو فاطمہ یہ بہت بڑے افسر ہیں مگر بہت اچھے آدمی ہیں..... یہ تم سے اکبر خان کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتے ہیں..... ڈرے بغیر انہیں سب سچ سچ بتا دو۔''

''فاطمہ تمہارا اور اکبر خان کا ساتھ کتنا عرصہ رہا؟'' عبداللہ نے پوچھا۔

اس نے سوچ کے جواب دیا۔ ''میری بیٹی ہے انیس سال کی..... شادی کے چوتھے سال پیدا ہوئی تھی۔''

''گویا تقریباً پچیس سال وہ تمہارا شوہر رہا لیکن لگتا ہے تمہیں اس کے مرنے کا زیادہ دکھ نہیں؟''

''دکھ کی اب کیا بات کروں جناب عالی..... ساری عمر دکھ ہی تو جھیلے ہیں..... دکھوں کے سوا اس نے دیا کیا تھا..... شروع کے تھوڑے سے دن مجھے کچھ پتا ہی نہیں چلا..... پھر مجھے معلوم ہوا کہ وہ کیا کرتا ہے۔''

''کیا کرتا تھا وہ؟''

''چوریاں کرتا تھا سرکار..... آس پاس کے گاؤں سے مویشی چرا کے بیچ آتا تھا..... پھر حویلی کے مال پر ہاتھ صاف کرنے لگا..... باپ اس معاملے میں بہت سخت تھا..... چابیاں اپنے پاس رکھتا تھا..... اس نے کئی بار باپ کو کچھ کھلا دیا..... جس سے وہ سو گیا یا بے ہوش ہو گیا..... اسے کبھی کھانسی بخار ہو تو اس کے لیے دوا لاتا تھا..... مگر گولیاں بدل دیتا تھا..... ایک بار میں نے تکیے کے نیچے سے چابیاں چراتے دیکھ لیا..... وہ حویلی کے ایک کمرے میں گیا تو میں نے دیکھ لیا..... میں نے روکا تو اس نے مجھے مارا اور کہا گلا گھونٹ دوں گا..... تیرا بھی اور ریشم کا بھی..... میں ڈر گئی..... لیکن میں نے باپ کو بتا دیا کہ چابیوں کو دھیان سے سنبھال کر رکھیں..... انہوں نے چابیاں میرے پاس رکھوا دیں اور میں نے ایک جگہ بنا کے زمین میں دبا دیں..... اس نے مجھ سے پوچھا تو میں نے کہا کہ مجھے کیا معلوم..... چابیوں کے بغیر دروازہ کھولنا ناممکن تھا..... بابا بھی پہلے سے زیادہ محتاط ہو گیا تھا..... آخر میں بابا اسی کے ہاتھوں قتل ہوا..... لیکن یہ بہت بعد میں ہوا جب مالک بھی آ گئے تھے۔''

''وہ میں بتا چکا ہوں۔''

فاطمہ نے کہا۔ ''پھر جناب عالی وہ شہر جا کے چوروں کے ساتھ مل گیا..... ایک بار پکڑا گیا تو مجھے پتا چلا..... میں

اس سے ملنے جیل گئی تھی...... میں نے کسی کو نہیں بتایا..... سال بعد وہ چھوٹ کے آیا تو پہلے سے زیادہ نڈر ہو گیا تھا..... جب مجھے پیسا لا کے دیتا تھا تو میں کہتی تھی مجھے نہیں چاہیے یہ حرام کا پیسا وہ شراب پینے لگا تھا اور نشے میں مجھے مارتا تھا..... آخری خرابی یہ ہوئی کہ وہ بچے چرانے لگا۔ آس پاس کے گاؤں دیہات سے کبھی کسی لڑکی کو اٹھا لاتا تھا کبھی لڑکے کو...... پہلے مجھ سے جھوٹ بولتا رہا کہ جنگل میں راستہ بھول گیا تھا میں معلوم کر لوں گا کہاں سے آیا تھا۔ پتا کتنی بار چلتا..... بعد میں کبھی کسی کا نام لیتا کبھی کسی کا..... مگر میں سمجھ گئی تھی... اس پر میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب میں نہیں یا یہ میرا شوہر نہیں..... اس نے مجھے مارا اور ریشم کو کہیں لے گیا...... کہنے لگا کہ اس کا سودا ہو گیا ہے..... پچاس ہزار ملیں گے..... میں روئی پیٹی تو ریشم کو واپس لے آیا اور بولا کہ آئندہ اپنا منہ بند رکھنا ورنہ یہ پھر واپس نہیں آئے گی..... ریشم اس وقت تھی بارہ تیرہ سال کی۔''

عبداللہ نے کہا۔ ''ان بچوں کو یہاں رکھا جاتا تھا؟''

فاطمہ نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ''اُدھر ایک عمارت ہے جناب..... کہتا تھا وہاں چوکیدار رکھ لیا گیا ہے مجھے..... اصل بات کچھ اور تھی..... یہ ریشم ایک دن گھومتی پھرتی اُدھر چلی گئی..... اس نے مجھے بتایا کہ اندر سات لڑکے تھے اور بارہ لڑکیاں..... انہیں کپڑوں کے بغیر رکھا گیا تھا..... میرا تو کلیجہ ہل گیا..... میں نے پوچھا تو اس نے پھر مجھے مارا اور ریشم کو لے جانے لگا کہ یہ بھی انہی کے ساتھ رہے گی..... اب تو ایک لاکھ کی ہو گئی ہے..... میں نے ہاتھ پاؤں جوڑے اور چپ رہنے کا وعدہ کیا تو اس نے ریشم کو چھوڑ دیا..... لیکن سرکار...... اس کے بعد میں نے سوچ لیا تھا کہ اس کے ساتھ نہیں رہوں گی..... میں ریشم کو لے کر کہیں چلی جاؤں گی..... لیکن وہ خود ہی چلا گیا..... ایک سال بعد آیا تو بولا کہ چل میرے ساتھ تجھے عیش کراؤں گا..... میں نے انکار کر دیا...... وہ پھر غائب ہو گیا..... اس کے بعد جب آتا..... کبھی سال بعد کبھی چھ مہینے میں..... اس کے ساتھ کوئی عورت ہوتی...... وہ کہتا کہ اس نے دوسری شادی کر لی ہے..... میں کہتی کہ پھر یہاں کیا لینے آتے ہو؟''

''ہاں کیوں آتا تھا آخر وہ؟'' عبداللہ نے کہا۔

''اس کی نظر حویلی پر تھی..... کسی طرح اندر کا مال سمیٹ کر لے جائے..... بابا اس کی نیت جان گیا تھا...... اس نے ایک بار اکبر خان پر پستول نکال لیا تھا کہ تجھے اپنے ہاتھ سے گولی مار دوں گا...... وہ نقلی پستول تھا مگر اکبر خان ڈر گیا..... حویلی پر اس کی نظر پھر بھی رہی..... میں نے بابا سے سنا تھا کہ اندر سونے چاندی کے برتن ہیں..... پرانے مالک استعمال کرتے تھے..... آخری بار وہ سال بھر پہلے آیا تو وہ عورت اس کے ساتھ تھی..... نور جہاں...... وہ گاڑی میں آئے تھے۔ اکبر خان نے کہا کہ اس کی بیوی ہے مگر وہ تو ہر سال نئی بیوی لاتا تھا..... میں نے یقین نہیں کیا۔''

عبداللہ چونکا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے..... نور جہاں بھی اس کی بیوی نہیں تھی؟''

''نہیں جناب عالی..... کہاں نور جہاں کہاں اکبر خان..... اچھی عورت بھلا اس سے کیوں شادی کرے گی!''

''اس عورت پر اکبر خان کے قتل کا الزام ہے۔''

''وہ بری عورت نہیں تھی سرکار..... برائی کے راستے پر چل پڑی تھی..... صرف پیسے کے لیے۔''

''یہ تم اتنے یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتی ہو؟'' عبداللہ بولا۔ ''کیا کبھی تمہاری اس سے بات ہوئی تھی؟''

''نہیں جناب..... بات تو نہیں ہوئی..... بس میرا اندازہ ہے۔'' فاطمہ گھبرا گئی۔

''اس کے بعد وہ یہاں کبھی نظر نہیں آئی؟''

''نہیں جناب..... اکبر خان کی پھر لاش آئی۔'' فاطمہ نے کہا۔

''غنی اس کا بھتیجا ہے..... اس نے لاش وصول کرنے اس کا جنازہ پڑھنے اور اسے یہاں دفن کرنے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا..... کیا اسے بھی یہ ساری باتیں معلوم تھیں؟''

''بعد میں سب کو پتا چل گیا تھا جناب۔''

''تم نے بھی کہا تھا کہ نہ وہ میرا شوہر تھا اور نہ ریشم کا باپ..... یہ بات تم نے غصے میں کی تھی؟''

فاطمہ نے کچھ دیر سوچ کے میری طرف دیکھا۔ ''ریشم کا باپ تو وہ تھا...... لیکن اسے بھی علم نہیں کہ وہ میرا شوہر نہیں رہا تھا..... ایک سال پہلے میں نے اس سے طلاق مانگ لی تھی..... اور اس نے کھڑے کھڑے دے دی تھی..... اس وقت وہ نشے میں مدہوش تھا..... لیکن طلاق تو نشے میں بھی ہو جاتی ہے..... میں نے مولوی صاحب سے معلوم کر لیا تھا۔''

عبداللہ جان کا انفارمل وزٹ ایک لمبی تفتیش کا سلسلہ بن گیا تھا..... وہ بڑے اطمینان سے سوالات کر رہا تھا......

میں سوچ رہا تھا کہ کیا گھومنے پھرنے اور حویلی کو دیکھنے کے بہانے وہ تلاشی بھی لے گا..... اس قسم کی تلاشی لاحاصل ہوتی..... جب تک کہ پولیس کی پوری بٹالین ساتھ نہ ہو اور

گھر والوں کو ایک کمرے میں بند نہ کر دیا جائے، حویلی میں نور جہاں تو کیا ہاتھی کو برآمد نہیں کیا جا سکتا تھا...... حویلی کے درجنوں کمرے اور ہال تھے اور تہ خانے کی بھول بھلیاں تھیں...... عبداللہ عقل مند تھا...... اس نے یہ حماقت نہیں کی۔

آخری میں اس نے غنی کو طلب کیا اور اس سے اکبر خان کے بارے میں پوچھتا رہا مگر وہ کوئی نئی بات نہ بتا سکا...... اچانک وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''اگر آپ مناسب جانیں تو میں باہر سے حویلی کا ایک راؤنڈ لگاؤں گا...... اور سائنس ریسرچ سینٹر کی عمارت دیکھوں گا...... اندر سے بعد میں سہی...... ابھی اتنا وقت نہیں ہے میرے پاس۔''

میں اسے اپنے ساتھ لے گیا...... اس نے باہر کی طرف سے ہمارا خاندانی قبرستان دیکھا...... پھر گھوم کے سائنس ریسرچ سینٹر کی طرف گیا...... میں نے اسے بتایا کہ ہماری اندر جانے کی کوشش کتنی بار ناکام ہوئی...... اس جگہ مسلح محافظ ہوتے تھے اور سیکیورٹی کے انتظامات انتہائی سخت تھے......

لیکن ایک بار ہم پولیس کی مدد سے اس مقصد میں کامیاب ہوئے تو ہمیں اندر ایسی کوئی بھی چیز نہیں ملی تھی...... اندر کچھ سائنس دان نظر آنے والے لوگ واقعی تحقیق میں مصروف تھے۔

خلاف توقع عبداللہ نے عمارت کو باہر ہی سے دیکھا۔

''ابھی اتنا کافی ہے...... میں نے لوکیشن سمجھ لی ہے...... قانونی صورتِ حال کو سمجھنے کے بعد ہم اس کا بھی کچھ کریں گے...... یہ کیس کورٹ میں ہے؟''

میں نے کہا۔ ''بس...... مجھے یقین ہے اس کا قبضہ مجھے مل جائے گا۔''

عبداللہ نے واپسی میں اکبر خان کی قبر بھی دیکھی۔ وہ گاؤں کا قبرستان تھا جہاں سو سوا سو کچی پکی اور شکستہ قبروں پر شام کے سائے پھیل رہے تھے...... اس نے سست بدحالی ترقیاتی پروگرام کے حوالے سے سارے علاقے کو دیکھا اور مجھ سے بہت سے سوالات بھی کیے...... میرے لیے یہ طے کرنا مشکل تھا کہ میں اس کے رویے سے کیا سمجھوں...... وہ تفتیش کرنے آیا تھا تو نتائج سے مطمئن تھا یا نہیں۔

حویلی کا اور جاگیر کا یہ دورہ مشکل سے چالیس منٹ کا تھا...... اس نے خود کو حویلی کے آس پاس تک محدود رکھا...... اس نے ہر جگہ موجود سیکیورٹی گارڈز کو بھی دلچسپی سے دیکھا جو چھت پر بھی مورچہ بند تھے...... کہیں وہ اچانک نور جہاں کی تصویر یا ملزموں کے خاکے نکال کے کسی سیکیورٹی گارڈ سے پوچھتا تھا...... ان میں سے کسی کو حویلی میں دیکھا ہے؟ اس نے دیگر لوگوں سے بھی یہی سوالات کیے مگر اسے کسی سے بھی مختلف جواب نہیں ملا...... غنی نے اپنا کام بہت عمدگی سے کیا تھا اور سب کو سبق یاد کرا دیا تھا......

میرا وکیل شہزاد کس وقت آیا اور کب گیا...... مجھے بالکل معلوم نہیں ہوا...... اسے غنی نے بتا دیا تھا کہ نواب صاحب کے پاس تو ڈی آئی جی صاحب بیٹھے ہیں...... اس نے دخل اندازی مناسب نہیں سمجھی...... کچھ دیر انتظار کیا لیکن وہ سارا دن صرف میرے دستخط کرانے کے چکر میں ضائع نہیں کر سکتا تھا...... اس نے وہی کیا جو وکیل یا ان کے منشی عموماً کرتے ہیں...... اپنے مؤکلوں کے دستخط حاصل کرنے میں مشکلات کا سامنا ہو تو وہ آسان راستہ اختیار کرتے اور دستخط خود بنا لیتے ہیں...... چونکہ شناخت کرنے والے بھی وکیل خود ہی ہوتے ہیں اس لیے ذمے داری بھی انہی کی رہتی ہے...... اب تو تقریباً تمام سرکاری دفاتر میں جہاں ایجنٹ سے معاملات ایسے ہی چلتے ہیں...... ایجنٹ فیس لینے کے بعد آپ کو دستخط فرمانے کی زحمت بھی نہیں دیتا۔

عبداللہ کے رخصت ہو جانے کے بعد میں بے یقینی میں مبتلا رہا۔ اس کے رویے سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ ایک دوستانہ ملاقات میں اس نے اپنا پورا اطمینان کر لیا ہے اور اب میرے لیے تشویش کی کوئی بات نہیں رہی...... تاہم کسی کے دل کا حال کون جان سکتا ہے۔

اصل خطرہ ابھی باقی تھا...... جیسے جیسے شام ڈھل رہی تھی اور تاریکی دن کے اجالے پر غالب آ رہی تھی، میرے اندیشے بھی بڑھتے جا رہے تھے اور مایوسی مجھ پر یلغار کر رہی تھی...... مغرب کی اذان ہوئی تو میں نے خود راجا کو فون کرنے کا فیصلہ کیا...... لیکن پھر میری ہمت جواب دے گئی...... راجا کا ایک جملہ میرے لیے عدالت عظمٰی کے فیصلے سے کم نہ تھا...... نور جہاں چپ تھی اور اس کی حالت ابھی سے ایسی ہو رہی تھی جیسے فیصلہ اس کے خلاف آ چکا ہے۔

اُدھر اذان ختم ہوئی اِدھر فون کی گھنٹی بجی...... میں نے سینے میں زخم خوردہ پرندے کی طرح پھڑپھڑاتے دل کو سنبھالا اور کال ریسیو کی۔

چند سیکنڈ گزار کے میں نے کہا۔ ''راجا؟''

دوسری طرف خاموشی رہی...... پھر راجا نے کہا۔ ''دیکھیے پتر......''

میں نے بڑی کمزوری محسوس کی اور اپنے قریب رکھی کرسی پر ٹک گیا۔

راجا کی آواز میں مجھے ایک امید شکن، حوصلہ شکن اور اعصاب شکن مایوسی محسوس ہوئی۔ لیکن یہ اس کی اداکاری اور صداکاری کا کمال تھا۔

جب میں نے اپنی ہمت کو مجتمع کر کے سوال کیا۔ ''راجا... میں سب سننے کے لیے تیار ہوں... اگر کوئی بری خبر ہے!''

یکلخت اس کے لہجے کی بشاشت لوٹ آئی۔ ''بری خبر نہیں فیکے پتر... خوش خبری ہے تیرے لیے۔''

میں نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔ ''کیا... کیا خبر ہے تمہارے پاس؟''

''انشاء اللہ اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا مگر مکمل بات پوری صورتِ حال واضح ہونے کے بعد ہی بتائی جا سکتی ہے۔''

میں نے محسوس کیا کہ میں کسی چٹان کے نیچے سے نکل آیا ہوں اور سکون و اطمینان کا سانس لے سکتا ہوں۔

''تو واپس کب آ رہا ہے؟''

''میں... میں اسلام آباد جا رہا ہوں۔ مجھے چانس پر ایک سیٹ مل گئی ہے... مجھے برہان الدین کی نمازِ جنازہ اور تدفین میں شرکت کرنی ہے... اور تجھے بھی۔''

''ہاں... میں صبح نو دس بجے تک نکلوں گا تو پہنچ جاؤں گا۔ ظاہر ہے تدفین نمازِ ظہر کے بعد ہی ہو گی۔''

راجا نے اس کی تصدیق کی اور فون بند کر دیا۔ فون بند کرنے کے بعد میں نور جہاں کے پاس گیا۔ وہ کمرے میں اکیلی بیٹھی کسی سوچ میں گم تھی۔ اباجی کی طرف سے نور جہاں کو حویلی میں رہائش کی اجازت مل گئی تھی اور انہوں نے فراخدلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے بیٹی کہا تھا۔ لیکن گھر کی خواتین نے اس فیصلے کو دل سے قبول نہیں کیا تھا۔

اس کی دو اہم وجوہات تھیں۔ ایک یہ کہ نور جہاں نے فریقینِ مخالف کے خیال میں... فریال کو بے دخل کر کے اس کی جگہ پر ناجائز قبضہ کیا تھا اور دوسری یہ کہ وہ اکبر خان کی بیوی کہلاتی تھی مگر مجھ سمیت دجانے کتنے مردوں کی بیوی تھی جو ہوس پرست... بے وفا اور احمق تھے۔

بدقسمتی سے نور جہاں پر... اور اس کے ساتھ مجھ پر بھی عائد کیے جانے والے تمام الزامات سابقہ حالات اور واقعات کے پیش نظر کچھ اتنے زیادہ غلط بھی نہ تھے۔ مجھے یقین تھا کہ رفتہ رفتہ میں حالات کو ٹھیک کر لوں گا لیکن ابھی تک خود مجھے اندازہ نہ تھا کہ یہ انقلاب کیسے آئے گا۔

میں نے لائٹ جلائی تو نور جہاں چونکی۔ وہ بیڈ پر گھٹنے سمیٹے... ٹھوڑی گھٹنوں پر ٹکائے کسی سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

میں نے کہا۔ ''یہ کیا ہے نور جہاں! ایسے اکیلی اندھیرا کیے کیوں بیٹھی ہو؟''

''جب کوئی مجھے قبول کرنے اور مجھ سے بات کرنے پر ہی تیار نہیں تو کیسے میں اکیلی نہ بیٹھوں!''

میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ ''خود کو قبول کرانے کے لیے تمہیں بھی کچھ کرنا چاہیے۔ دیکھو ہمارے ملک میں کیا ہوتا ہے... جب کسی جمہوری حکومت کو غیر آئینی طور پر برطرف کر کے کوئی فوجی حکمراں خود کو عوام پر مسلط کرتا ہے تو رائے عامہ اس کے کتنی خلاف کیوں نہ ہو، کچھ عرصے میں کیسے وہ خود کو مستحکم کر لیتا ہے۔''

''میرے پاس کون سا اختیار ہے... جو مارشل لا لگانے والے کے پاس ہوتا ہے؟''

''ایک اختیار ہے... زبردستی گلے پڑنے کا۔'' میں نے مذاق میں کہا۔

''کوئی مجھے گلے لگانے کو تیار نہیں۔''

''نہ ہو... تم پھر بھی ملو... تم اتنی ذہین اور باہمت ہو... خیر چھوڑو... وقت کے ساتھ بہت کچھ بدل جاتا ہے؛ ابھی تو تم مجھے مسکرا کے دکھاؤ۔''

اس نے میری طرف فریادی نظروں سے دیکھا۔ ''میرا دل خون کے آنسو رو رہا ہے اور تم فرمائش کر رہے ہو میرے لبوں پر مسکراہٹ دیکھنے کی... تم اتنے بے رحم کیسے ہو سکتے ہو؟''

''جو آدمی بدترین حالات میں مسکرا سکتا ہے، وہی حالات کو سنوار سکتا ہے... بھلا رونے سے کبھی کچھ ہوا ہے؟''

اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''ٹھیک ہے میں کوشش کروں گی۔''

میں نے کہا۔ ''پولیس ابھی آئی تھی... بلکہ یہ سمجھو کہ ڈسٹرکٹ پولیس کا سربراہ خود تفتیش کرنے کے لیے آیا تھا۔''

''مجھے پتا چلا تھا۔''

''اس نے سب سے بات کی۔ اباجی سے... فاطمہ، ریشم، غنی سے اور سیکیورٹی گارڈز سے بھی... سب سے تمہارے بارے میں پوچھتا رہا... تمہاری تصویر دکھاتا رہا لیکن اسے مایوسی ہوئی... سب ایک ہی بیان پر قائم تھے... بہت پہلے تم اکبر خان کے ساتھ آئی تھیں۔ اس کے بعد کسی نے تمہیں یہاں نہیں دیکھا۔''

''وہ سمجھ گیا ہو گا کہ تمہیں بچانے کے لیے سب ایک ہو گئے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''اول تو وہ بے وقوف نہیں... بہت ذہین و تجربہ کار افسر ہے۔ آسانی سے ہر بات نہیں مانتا، اس نے دو

گھنٹے بڑے دوستانہ لہجے میں تفتیش کی لیکن بڑی گہرائی کے ساتھ۔ گھوم پھر کے اس نے حویلی کو ہر طرف سے دیکھا... میرا اندازہ ہے کہ اس نے حویلی میں تمہاری عدم موجودگی کو تسلیم کر لیا ہے... خواہ مجبوری میں سہی۔''

''مجبوری کیسی؟''

''دیکھو! پولیس کے لیے اور عدالت کے لیے سچ وہ ہے جو ثابت ہو... ثبوت سے اور شہادت سے۔ ڈی آئی جی صاحب نے حویلی کی وسعت کو دیکھا اور اس کے ساتھ ہی باقی لوگوں کی مجبوری کو سمجھا۔ ماں باپ اپنے جذبات سے مجبور ہوتے ہیں۔ باقی سب میرے فرمانبردار ملازم ہیں اور اطاعت کے لیے مجبور ہیں۔ اتنی بڑی حویلی میں اگر میں چڑیا گھر سے ہاتھی چرا کے لے آؤں تو اسے چھپانا مشکل نہیں... اور سب لوگ ایک آواز ہو کر کہیں گے کہ ہاتھی! جناب یہاں تو چڑیا کا بچہ بھی نہیں۔ وہ اپنے ساتھ پولیس کی پلٹن تلاشی کے لیے لے آئے تب بھی حویلی میں ایسے خفیہ گوشے ہوں گے جہاں تک ان کی رسائی نہیں ہو سکے گی پھر ضرورت کیا ہے اپنی ناکام کوشش کی خفت اٹھانے کی۔ مصلحت اسی میں ہے کہ جو نظر آ رہا ہے اور ثابت کیا جا رہا ہے... اسی کو سچ مان کے اپنی جان چھڑائی جائے اور عزت بچائی جائے۔ اسی کے ساتھ مجھ پر عنایت اور مہربانی کا احسان بونس میں کہ نواب صاحب! ہم آپ کو قابلِ اعتبار گردانتے ہیں۔''

نور جہاں یہ سن کر ہنسنے لگی۔ ''بہت چالاک ہو تم۔''

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''اچھا اب اٹھو اور نکلو اپنے اس گوشۂ تنہائی سے۔ آؤ میں تمہیں حویلی دکھاؤں۔''

''حویلی میری دیکھی ہوئی ہے۔''

''اچھا تو میرے ساتھ چل کے لوگوں سے ملو۔'' میں نے اسے کھینچ لیا۔

''ارے رکو... میں اپنا حلیہ تو ٹھیک کر لوں۔ تم چلو میں آتی ہوں۔''

حویلی کے مکینوں کے موڈ میں کسی فوری انقلاب کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ ظاہری اخلاق کا سرد رویہ ان کی اندرونی مزاحمت کو ظاہر کرتا تھا۔ اگر درجہ بندی کی جاتی تو میں کہہ سکتا تھا کہ صرف اباجی کے ظاہر و باطن میں کوئی کشمکش نہ تھی۔ انہوں نے نور جہاں کو دل سے قبول کر لیا تھا۔ باقی خواتین میں شاید شہناز کے مخالفانہ جذبات سب سے کم درجے کے تھے۔ وہ کسی حد تک نیوٹرل تھی۔ لیلیٰ بھابی کا پلڑا مخالفت کی طرف جھکا ہوا تھا۔ ان سے بڑھ کر رابعہ تھی اور آخر میں اماں تھیں جو کسی طرح بھی نور جہاں کو عزت اور چاہت دینے پر راضی نہیں ہو سکتی تھیں۔ انہوں نے تو فریال کو بھی برسوں بعد بڑی مشکل سے قبول کیا تھا اور جب اسے پسند کرنے کا وقت آیا تھا تو اس کی جگہ نور جہاں آ گئی... جیسے کوئی سانپ کے ساتھ جینا سیکھ لے تو سانپ کی جگہ اژدھا آ جائے۔

نور جہاں کے پاس پہننے کے لیے اور کپڑے تک نہیں تھے۔ ابھی تک اس نے وہی کپڑے پہن رکھے تھے جن میں وہ میرے ساتھ برہان الدین کے گھر سے فرار ہوئی تھی۔ مجھے بڑی خوش گوار حیرت ہوئی جب رابعہ نے سب سے پہلے کہا۔ ''تم جب سے آئی ہو... انہی کپڑوں میں ہو۔''

نور جہاں نے کہا۔ ''اور کپڑے نہیں ہیں میرے پاس۔''

رابعہ نے خفگی سے کہا۔ ''کپڑے گھر میں تو کم نہیں ہیں... شہناز کے میرے... کسی کے بھی کپڑے تمہیں آ جائیں گے۔''

نور جہاں نے کہا۔ ''جی... وہ تو ٹھیک ہے مگر...''

رابعہ کھڑی ہو گئی۔ ''مگر کیا! ہم مل کے درخواست کریں تم سے کہ کپڑے بدل لو... چلو آؤ میرے ساتھ۔''

میں نے حیرانی سے نور جہاں کو رابعہ کے ساتھ اندر جاتے دیکھا۔ ہمارے آنے سے پہلے وہ شہناز اور لیلیٰ بھابی کے ساتھ لان میں بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ وہ سب چائے پی چکی تھیں اور میرا خیال تھا کہ اب سر جوڑ کے کوئی ایسی متحدہ حکمتِ عملی اختیار کرنے پر غور جاری تھا جس سے نور جہاں کو قدم جمانے کا موقع نہ ملے۔ بلکہ الٹا پریشان ہو کے بھاگنا پڑے۔

میں نے کہا۔ ''ڈاکٹر شہناز! رابعہ کا موڈ کیسے بدل گیا... کیا تم نے کوئی ایسا انجکشن لگا دیا ہے۔''

شہناز نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''بہتر ہے آپ کسی خوش فہمی کا شکار نہ ہوں نواب صاحب!''

''کیا مطلب؟ رابعہ اسے اندر لے گئی ہے چھرا گھونپنے کے لیے۔''

''ایسے کارہائے نمایاں صرف وہی سرانجام دے سکتی ہے۔'' لیلیٰ بھابی نے کہا۔

''آپ شوق سے سمجھتی رہیں کہ اپنے شوہر کو قتل کرنے والی خود نور جہاں ہے... اس سے مجھے فرق نہیں پڑتا۔'' میں نے تلخی سے کہا۔

''رفیق بھائی... آپس کی رنجش کو بڑھانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ہم نے بہت سوچ سمجھ کے ایک فیصلہ کیا ہے۔''

''واقعی؟... میرا خیال تو اب یقین میں بدل رہا تھا کہ آپ لوگ اس صلاحیت سے عاری ہیں۔'' میں نے کہا۔

''اس میں قصور تمہارا نہیں... تمہاری کھوپڑی میں ایک مرد کا دماغ ہے، اس لیے تم ایسا ہی سوچو گے۔'' شہناز نے تیز

لہجے میں کہا۔

''او کے... آئی ایم سوری۔''

''تم نے دو... بلکہ تین نکات اٹھائے تھے نور جہاں کی حمایت مانگنے کے لیے۔'' شہناز نے کہا۔''ایک یہ کہ اس کا قیام عارضی ہوگا!''

لیلیٰ بھابی نے کہا۔''تم اسے بہت جلد باہر بھجوا دو گے۔''

میں نے کہا۔''رائٹ... لیکن بہت جلد کا مطلب ہے جیسے ہی ممکن ہوا... اس کے لیے میں کوئی وقت مقرر نہیں کر سکتا۔''

شہناز نے اپنی بات جاری رکھی۔''نمبر دو... نور جہاں اپنی غلطی اور دوسروں کی سازش کی وجہ سے گناہ کی دلدل میں تھی، وہ اس سے نکلنا چاہتی ہے۔''

''بالکل صحیح سمجھا آپ نے؟''

''نمبر تین... جو سب سے اہم نکتہ تھا اور جس کے سامنے ہم بے بس ہو گئے تھے۔ یہ تھا کہ نور جہاں گرفتار ہو گی تو تم بھی نہیں بچو گے۔''

''میں نے یہ کہا تھا... اسے پھانسی ہو گی تو مجھے بھی ہو گی۔''

شہناز نے کہا۔''جب ابا جی نے فیصلہ سنا دیا تو ہمارے پاس قبول کرنے کے سوا چارہ نہ رہا۔ ہم نہیں چاہتے کہ نور جہاں کی وجہ سے حویلی کے اندر تناؤ کی کیفیت رہے۔ یہ کشیدگی ہمارے آپس کے رشتوں میں آئے اور ماحول اتنا خراب ہو کہ... زندہ رہنا مشکل ہو جائے۔''

لیلیٰ بھابی نے کہا۔''چنانچہ ہم نور جہاں کے ساتھ اچھا رویہ رکھیں گے... اس شرط پر کہ تم اپنے وعدے پر قائم رہو۔ جتنی جلدی ممکن ہو اسے حویلی سے یا ملک سے رخصت کرو اور فریال کو واپس لاؤ۔ فریال کی جگہ اس کو دینے کی کوشش کی تو سمجھو سب ختم۔''

میں نے کہا۔''بھابی! ایسا ہو سکتا ہے؟''

''یہ تم جانو تمہارے دل میں کیا ہے۔'' بھابی نے بے رخی سے کہا۔''ہم نے اپنی مرضی بتا دی۔''

''آپ کی تسلی کیسے ہو گی۔ حلف نامہ داخل کروں یا آپ کے سر پر ہاتھ رکھ کے قسم کھاؤں۔ فریال کی جگہ نور جہاں تو کیا... مس یونیورس بھی نہیں لے سکتی۔ آپ دیکھنا وہ بہت جلد آئے گی۔''

شہناز نے طنز سے کہا۔''ہاں! خود آئے گی اپنے پیروں پر چل کے... سر کے بل آئے گی، کوئی لوحِ تسخیرِ محبوب لے لی ہے کسی عامل سے... جو دیواروں پر لکھتے پھرتے ہیں بقلم خود ...محبوب آپ کے قدموں میں۔''

لیلیٰ بھابی نے اس میں اضافہ کیا۔''ویسے بھی ان جیسا یوسف ثانی اسے کہاں ملے گا سارے زمانے میں۔''

میں نے ہاتھ جوڑے۔''محترم خواتین... اپنے طنز کے تیر مجھ عاجز و ناتواں پر مت چلائیں... میرا جگر ویسے ہی چھلنی ہے۔''

لیلیٰ بھابی نے ڈانٹ کر کہا۔''ڈراما مت کرو، سیدھی طرح بتاؤ فریال کا پتا چلانے کی کیا کوشش کر رہے ہو تم؟''

شہناز نے اداس لہجے میں کہا۔''انہیں کہاں فرصت بھابی، ابھی زیادہ اہم معاملات پر ہے ان کی توجہ۔''

رات کے کھانے پر صورتِ حال میں مزید بہتری آئی۔ میری اس یقین دہانی نے کہ نور جہاں ضرور جائے گی اور فریال ضرور واپس آئے گی، وقتی طور پر سب کو مطمئن کر دیا تھا۔ اب نور جہاں کے ساتھ ان کا رویہ ایسا ہی تھا جیسا کسی مہمان کے لیے ہوتا ہے... خواہ وہ بن بلایا ہو یا اور ناپسندیدہ بھی مگر اس کے سامنے ظاہری اخلاق کا مظاہرہ بھی نہ کرنا بدتہذیبی سمجھا جاتا ہے۔

رات کو میں سونے لیٹا تو خاصا مطمئن اور پُرسکون تھا۔ میرے ذہن میں اب صرف ٹائم فریم کا مسئلہ تھا۔ نور جہاں کب جائے گی اور فریال کب آئے گی... کب کے ساتھ کیسے کا سوال جڑا ہوا تھا مگر میں نے سوچا کہ ساری بات نیت کی ہے اور وقت کی ہے۔ صرف چاہنے سے ہتھیلی پر سرسوں نہیں جمتی۔ ناممکن کچھ بھی نہیں، بس قدرت کا اشارہ چاہیے۔

ایک پُرسکون نیند کے بعد میں اٹھا تو میرے ذہن پر برہان الدین کی آخری رسوم میں شرکت کا خیال غالب تھا۔ میں نے جلدی جلدی ناشتا ختم کیا اور باہر نکلا تو دیکھا ابا جی ہاتھ میں چھڑی لیے تیار کھڑے ہیں۔

میں نے پوچھا۔''آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

''جہاں تم جا رہے ہو۔'' انہوں نے رنج اور خفگی کے ساتھ کہا۔

میری اپنی گاڑی جل کے تباہ ہو چکی تھی اور کسی تھانے کے کباڑ خانے میں لاوارث پڑی تھی۔ شیر دل کی ٹیکسی اب آمد و رفت کا واحد ذریعہ رہ گئی تھی۔ دوسری گاڑی ڈاکٹر شہناز کی پرانی خیبر تھی لیکن طویل سفر کے لیے اس میں آرام کے اسباب نہ تھے۔ میں نے طے کیا کہ اب ہمیں ایک کار اور ایک ویگن ضرور خریدنی چاہئیں۔

برہان الدین کے گھر کے باہر شامیانہ لگا ہوا تھا اور کرسیوں پر اس وقت بھی سو کے قریب تعزیت کرنے والے جمع تھے۔ جنازہ اٹھائے جانے تک ان کی تعداد کئی گنا ہو جاتی۔ وہاں عبداللہ جان بھی تھا، وہ اٹھ کے ابا جی سے ملا۔

راجا میرے ساتھ شامیانے کے پیچھے کرسیوں کی آخری قطار میں تھا۔ اس نے رسمی طور پر پوچھا۔''وہاں سب ٹھیک ہے؟''

میں نے مختصر جواب دیا۔''ہاں... اب ٹھیک ہو گیا ہے۔''

تدفین کے بعد مجھے راجا سے بات کرنے کا موقع ملا۔ میں نے اسے گزشتہ شام ڈی آئی جی عبداللہ جان کی اچانک سے بدحالی آمد اور تفتیش کی غیر رسمی مگر مکمل کارروائی کے بارے میں بتایا تو وہ کچھ متفکر نظر آنے لگا۔

''یہ وضعداری دکھا رہا ہے یا چالاکی؟'' راجا نے کہا۔ ''ہمیں اب اور محتاط رہنا ہو گا۔ وہ ہمیں اعتماد میں لے کر کچھ جاننے کی کوشش کرے گا لیکن اس پر اعتماد کرنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔''

''نور جہاں کو کیسے ریسیو کیا گیا حویلی میں؟''

میں نے کہا۔''سخت احتجاج کے ساتھ پھر اللہ نے ابا جی کے دل میں رحم ڈالا۔ انہوں نے نور جہاں کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ باقی سب نے کھل کے دو مطالبات پیش کر دیے ہیں۔ جلد از جلد نور جہاں کو رخصت کیا جائے اور جلد از جلد فریال کو واپس لایا جائے۔''

''میری شہناز سے بات ہوئی تھی۔ وہ سخت مشتعل تھی پھر میں نے اسے جھاڑ لگائی کہ جب تک وہ حویلی میں ہے، مہمان ہے۔ اس کے ساتھ بدسلوکی نہیں ہونی چاہیے۔''

''اسلام آباد کی پولیس سخت کنفیوزڈ ہے کہ آخر ہوا کیا ہے... ایسے بے ضرر اور شریف آدمی کو کس نے مارا ہے؟''

''میرا خیال ہے... جو رائے عبداللہ جان کی تھی وہی اسٹوری بنے گی کہ کوئی مفرور نوجوان جوڑا جان بچانے کے لیے ان کے گھر میں گھسا انہوں نے فطری رحم دلی کے باعث پناہ دے دی... وقتی طور پر کہ بیٹھ جاؤ تسلی سے... یہاں کوئی نہیں آ سکتا... شاید پانی پلایا ہو... لیکن جو پیچھے لگے ہوئے تھے وہ دندناتے اندر آ گئے اور برہان الدین نے روکا تو انہوں نے بے دریغ گولی چلا دی۔''

راجا بولا۔''یہاں بھی کچھ ایسی ہی بات ہو رہی تھی۔''

قبرستان سے واپسی کے بعد ہم بھی وہاں سے روانہ ہو گئے۔

ہم کافی رات گئے گھر پہنچے تو شہزاد کو اپنا منتظر پایا۔ اس نوجوان اور جوشیلے وکیل کے خلوص اور جذبے سے مجھے اس کی ذہانت اور صلاحیت سے زیادہ متاثر کیا تھا۔ وہ نوجوان تھا اور یہ اس کے کیریئر کا آغاز تھا۔ اس کے نام کی شہرت ملک گیر ہونی تو بہت دور کی بات تھی۔ ہنوز مقامی سطح پر وہ فاروقی جیسے وکیلوں کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتا تھا لیکن آثار بتاتے تھے کہ وہ وکالت کے پیشے میں بہت نام کمائے گا اور نام کمائے گا تو دام بھی بہت کمائے گا۔ ابھی مجھے بڑے نام سے زیادہ مخلص شخص کی ضرورت تھی۔

شہزاد احمد کے لیے میری وکالت کی ذمے داری ایک بہت بڑا چیلنج بن گئی تھی۔ قسمت نے اسے ایک موقع فراہم کیا تھا کہ وہ اپنی قابلیت ثابت کرے۔ یہ کام وہ بڑی دلچسپی اور دل جمعی سے کر رہا تھا۔ میرے لیے اسی بات کی اہمیت تھی ورنہ فیس تو میں بڑے سے بڑے وکیل کی ادا کر دیتا۔ فاروقی نے دوستی کی آڑ میں خنجر میری پیٹھ میں گھونپنے کی کوشش کی تھی۔ اگر وہ کامیاب ہو جاتا تو میرے ساتھ میرے سارے خواب مٹی میں دفن ہو جاتے۔ بس مارنے والے سے بچانے والے کا ہاتھ زبردست ہوتا ہے۔ اسے اکبر خان نے گمراہ کیا تھا اور خود اکبر خان اپنے سارے شیطانی اعمال اور منصوبہ بندی کے ساتھ مٹی میں دفن ہو گیا تھا۔ فاروقی نہ گھر کا رہا تھا نہ گھاٹ کا۔ بیوی نے بھی اسے چھوڑ دیا تھا اور اب وہ زخم خوردہ سانپ کی طرح رانا کے ساتھ مل کر مجھے برباد کرنے کی خواہش رکھتا تھا۔

شہزاد نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔''سر بڑی دیر کر دی آپ نے... میں تو مسلسل فون کر رہا تھا۔''

میں نے کہا۔''سوری! میں ایک جنازے میں تھا... موبائل فون بند کر رکھا تھا میں نے۔ بعد میں مجھے کھولنا یاد نہیں رہا۔''

''آپ کے لیے ایک خبر ہے۔ آپ کی درخواست برائے ضمانت قبل از گرفتاری میں نے آج لگا دی تھی۔''

''پھر کب کی تاریخ پڑی؟''

''وہ منظور ہو گئی سر۔''

میں نے حیرانی سے کہا۔''میری پیشی کے بغیر؟''

شہزاد ہنسنے لگا۔''آپ بھول گئے سر... آپ کو نوٹس بھی جاری ہوا تھا اور آپ پیش بھی ہوئے تھے۔''

میں نے کہا۔''معموں میں بات کیوں کر رہے ہو شہزاد؟''

''آپ کو خود ہی سمجھ لینا چاہیے سر کہ یہ پاکستان ہے... سارے معاملات یہاں ایسے ہی طے ہوتے ہیں... سفارش سے یا پیسے سے۔''

''تم نے رشوت دی؟''

''نہیں سر! کورٹ کو کہیں سے اشارہ مل گیا تھا کہ ضمانت منظور کی جائے۔ اس بے چارے کی کیا مجال کہ انکار کرتا۔ اس نے مجھے چیمبر میں بلایا۔ پوچھا نواب صاحب کہاں ہیں

میں نے کہا کہ حویلی میں ہوں گے آپ کہیں تو حاضر کردوں۔ اس نے کہا کہ چھوڑو انہیں کیا تکلیف دینی... ابھی پولیس کی طرف سے پراسیکیوٹر آیا تھا اس نے کہا کہ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ وہیں میں نے سمن وصول کیا۔ آپ کی طرف سے شخصی ضمانت کا مچلکہ داخل کیا۔"

"میرے دستخط بھی کیے؟"

"وہ تو کرنے پڑتے ہیں سر! یہ کام ایسے ہی چلتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "نہیں شہزاد! آئندہ ہم قاعدے قانون کے مطابق ہر کام کریں گے۔ اب تم دیکھو کہ اِدھر عدالت میں میری پیشی دکھائی گئی ہے۔ اُدھر میں اسلام آباد میں تھا اور جنازے میں خود ڈی آئی جی صاحب بھی موجود تھے... انہوں نے مجھے دیکھا..."

"لیکن آپ پہنچے ہوں گے دوپہر کے بعد۔"

"ہاں... تدفین بعد نمازِ ظہر تھی۔"

شہزاد مسکرایا۔ "کورٹ میں آپ صبح نو بجے پیش ہوئے تھے۔ اس کے بعد اسلام آباد گئے۔ راستہ تو صرف دو گھنٹے کا ہے۔"

"یعنی اب میں آزادانہ ہر جگہ جاسکتا ہوں۔"

"ابھی آپ اسلام آباد سے آرہے ہیں۔ آزاد نہ ہوتے تو آپ کو گرفتار نہ کرلیا جاتا۔ یہاں قانونی معاملات ایسے ہی چلتے ہیں آپ کا نام بڑا ہے... عبداللہ جان تو آپ کا دوست سمجھا جاتا ہے اور وہ جہلم کا ڈی آئی جی تعینات کیا گیا ہے... آپ کو پکڑنے کی جرأت کون کرسکتا ہے۔"

"پکڑا تو گیا تھا میں... تھانے میں بند بھی ہوا تھا۔"

"وہ پرانی بات ہوگئی... پولیس کو آپ کی طاقت اور حیثیت کا اندازہ نہیں تھا۔ اب دیکھ لیں رانا بھی کیسے آزاد پھر رہا ہے... حالانکہ اس کے خلاف قتل کی پکی ایف آئی آر درج ہے۔"

"وہ تو تھانے میں بیٹھا تھا... کسی وی آئی پی کی طرح۔"

"وہ وی آئی پی ہے نواب صاحب... اس کی گرفتاری آسان نہیں ہے۔" شہزاد بولا۔ "لیکن ناممکن بھی نہیں ہے۔"

"کیا وجہ ہے کہ ابھی تک اس نے ضمانت نہیں کرائی؟"

شہزاد مسکرانے لگا۔ "ابھی وہ گرفتار کہاں ہوا ہے... لیکن میری معلومات کے مطابق اس نے گرفتاری دینے کی رسمی کارروائی پوری کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "یہ گرفتاری کی رسمی کارروائی کیا ہوتی ہے؟"

"اس میں بھی بہت کچھ آن پیپر ہو جاتا ہے سر۔ اگر آپ کی طرف سے خطرہ نہ ہوتا تو مقامی تھانے دار کب کا اس کی گرفتاری کا اندراج کر چکا ہوتا اور وہ ضمانت پر آزاد گھوم رہا ہوتا۔"

"اور اب کیا ہوگا؟"

"اب گرفتاری کے ساتھ ہی درخواستِ ضمانت داخل کردی جائے گی اور منظور بھی ہو جائے گی۔ جیسے آپ کی ضمانت قبل از گرفتاری منظور ہوگئی اور آپ کو بھی پتا نہیں چلا۔ ایسے ہی رانا کا معاملہ ہوگا۔ اس کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ آپ پر صرف شک ظاہر کیا تھا پولیس نے... کسی ثبوت کے بغیر۔ رانا کو براہِ راست قاتل نامزد کیا اس کی اپنی بیٹی نے۔ اس کے لیے گرفتاری دینا لازمی ہے۔ اس کے بعد ضمانت کی کارروائی ہوسکے گی۔ اسے دو ضامن بھی لانے ہوں گے اور ممکن ہے دس لاکھ کا مچلکہ بھی بھرنا پڑے... مگر یہ اس کے لیے مشکل نہیں ہوگا۔"

"تم پتا چلاؤ وہ کب اور کہاں گرفتاری دے گا!"

"میں کوشش ضرور کروں گا... لیکن رانا کی پوری کوشش ہوگی کہ اس کی گرفتاری کا پتا چلے نہ ضمانت پر رہائی کے لیے پیشی کا۔"

میں نے کہا۔ "شہزاد! کیا قتل کے کیس میں اسے ضمانت پر رہا کیا جاسکتا ہے؟"

"یہ اتنا آسان تو نہیں ہوتا لیکن سر یہاں وی آئی پی کلچر ہے۔ رانا ایم پی اے ہے۔ اس کو گرفتار کرنے کے بعد اسمبلی کے اسپیکر کو مطلع کرنا ضروری ہوگا۔ ہوسکتا ہے اس کے دونوں ضامن بھی رکن اسمبلی ہوں۔ ایک سیشن جج کی کیا مجال کہ انکار کرے۔"

"ہم اعتراض کرسکتے ہیں۔"

"یس سر! اور اپیل بھی... ہم دونوں کام کریں۔ اعتراض اس بنیاد پر کہ ملزم کے خلاف دو سنگین کیس ہیں۔ ایک ڈاکٹر شہناز کو اغوا کرکے حبس بے جا میں رکھنے کا... دوسرا اپنی بیٹی کے قتل کی سازش کا جس میں استغاثہ کی سب سے اہم گواہ بھی ڈاکٹر شہناز ہیں۔ ملزم کی ضمانت پر رہائی سے اندیشہ ہے کہ وہ اپنے اثر ورسوخ سے گواہوں پر اثر انداز ہوگا اور ڈاکٹر شہناز کو بھی راستے سے ہٹانے کی کوشش کرے گا... ہائی کورٹ میں رانا کے لیے بہت مشکل ہوگی۔"

"جب تک ہم اس کے لیے جینا مشکل نہیں کریں گے۔ ہمارے لیے کوئی کام آسان نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔

"بقا کی جنگ کا اب یہی اصول ہے سر... میں آپ کو یہی بتانے آیا تھا۔"

میں نے کہا۔ "ایک چھوٹا سا معاملہ اور تھا شہزاد... ایف آئی آر سے میرا نام نکلوانے کا۔"

"وہ ہو جائے گا سر۔"

میں نے کہا۔ "دیکھو! میرے معاملات ایسے ہیں کہ تمہیں شاید دوسرے معاملات دیکھنے کی فرصت نہ ملے۔ مجھے نہیں معلوم کہ تم بیک وقت کتنے کیس لے سکتے ہو... کتنا عملہ ہے تمہارے پاس اور اس میں تم مزید کتنا اضافہ کرسکتے ہو... میں چاہتا ہوں کہ میرا ہر کیس تم خود تیار کرو... کسی ماتحت کے سپرد نہ کرو۔"

"میں ایسا ہی کر رہا ہوں سر۔"

"تمہیں ہر کیس براہِ راست مجھ سے یا راجا صاحب سے ڈسکس کرنا ہوگا اور ہماری ہدایات کے مطابق چلنا ہوگا... ہماری ترجیحات بدل سکتی ہیں... ضرورت اور حالات کے مطابق... آج میں تمہیں ایک آفر کرتا ہوں... تم اس پر سوچ لو... غور کرلو۔ پہلے یہ ذمے داری فاروقی صاحب کی تھی... اب تم لے سکتے ہو تو بتاؤ۔"

"مجھے بڑی خوشی ہوگی آپ کی خدمت کرکے۔"

"میں چاہتا ہوں کہ ہمارے درمیان تعاون یا کاروباری تعلق مستقل ہو... ذاتی سطح پر اور اعتماد کی بنیاد پر۔ لیکن بزنس از بزنس... تم جیسے چاہو طے کرلو۔ ہر کیس کی فیس کیس کی نوعیت کے اعتبار سے بھی ادا کی جاسکتی ہے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تم ست بدھائی کے لیگل ایڈوائزر بن جاؤ، تمام کیس وہ دیوانی ہوں یا فوجداری۔ ان کی پیروی اول تا آخر تمہاری ذمے داری ہو... اس کے لیے تمہیں سالانہ کنٹریکٹ کی بنیاد پر ایک معقول رقم دی جائے... اس کی ادائیگی ماہانہ یا سہ ماہی ہوسکتی ہے۔"

اس کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ "یہ میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہوگی اور آپ مجھ پر پوری طرح بھروسا کرسکتے ہیں سر۔"

"اوکے، اب تم بتاؤ... قانونی مشیر کی حیثیت سے تم کیا لوگے...؟ تم چاہو تو سوچ کے بھی بتا سکتے ہو۔"

"آپ نے بھی تو کچھ سوچا ہوگا سر؟"

میں نے کہا۔ "فاروقی سے ساٹھ لاکھ سالانہ کا معاہدہ ہوا تھا... اسے پانچ لاکھ ماہانہ ادا کیا جاتا تھا۔"

"میرے لیے آپ کی کیا آفر ہوگی؟"

میں نے کہا۔ "وہی... معاملات وہی ہیں تو فیس بھی وہی ہوگی۔"

اس کے لیے شاید یہ بڑی غیر متوقع پیشکش تھی کیونکہ وہ خود کو فاروقی کا ہمسر نہیں سمجھتا تھا۔ اس نے بے اختیار اٹھ کے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ "آپ کی حوصلہ افزائی ہے سر کہ آپ مجھے ان کے برابر سمجھتے ہیں۔"

"بات شہرت کی نہیں... صلاحیت کی ہے اور میری رائے میں تم کسی طرح بھی فاروقی سے کم نہیں ہو۔" میں نے کہا۔

"میں آپ کو مایوس نہیں کروں گا سر۔" وہ بولا۔

میں نے شہزاد کو ان قانونی مسائل پر بریف کیا جو مستقبل میں سامنے آسکتے تھے... ایک معاملہ سائنس ریسرچ سینٹر کا تھا۔ اب اکبر خان نہیں رہا تھا تو میں اس پر اپنا قبضہ حاصل کرنے کی عدالتی کارروائی کو آگے بڑھانا چاہتا تھا کیونکہ وہ جگہ بہرحال ست بدھائی کی حدود میں تھی۔ ایک معاملہ لیلیٰ بھابی کی فاروقی سے خلع کا تھا جو ابھی نہ سہی کبھی نہ کبھی عدالت جائے گا۔ فاروقی کی موجودہ روش کے پیش نظر مصالحت کی کوشش بھی ممکن نہ تھی۔ وہ رانا کا وکیل اور ساتھی بن گیا تھا۔

اس کے بعد مستقبل کے کچھ منصوبے زیرِ غور آئے۔ اسکول اور اسپتال کا منصوبہ شروع ہوگیا تھا... اپنے وقت پر باقی کام بھی ہوں گے... مقامی لوگوں کو روزگار فراہم کرنے کے لیے جنگلات کا تحفظ... عمارتی لکڑی اور ہائی کلاس فرنیچر کے کارخانے لگانا اور دیگر چھوٹی صنعتوں کا قیام... کارکنوں کی رہائش کے لیے ایک ماڈل بستی کا قیام جہاں رہائش کے ساتھ صحت، تعلیم اور دیگر ضروریات زندگی کے اسباب ہوں۔ اب آخر میں اگر ممکن ہو تو دریائے کنہار پر ایک اسمال ڈیم کے ترک کیے جانے والے منصوبے کو پھر قابلِ عمل بنانا۔

وہ بڑی دلچسپی سے سنتا رہا اور مجھے بھی وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہوا۔ جب اندر معمول کے مطابق ریشم نے رات کے کھانے کا اعلان گھنٹی بجا کے اور اپنی انگریزی سے کیا تو شہزاد نے گھڑی دیکھ کے اجازت مانگی۔ میں نے اسے روک لیا "کھانے کا وقت ہو چکا ہے۔"

"بہت دیر ہو جائے گی سر!"

میں نے کہا۔ "تو کیا ہوا۔ راستے میں خطرے کی کوئی بات نہیں۔ ہم آتے جاتے رہتے ہیں۔"

جب یہ فیصلہ ہوا تھا کہ حویلی کے نیچے والے حصے کو اسپتال، اسکول اور دیگر ضروریات کے لیے رکھا جائے اور اوپر کی منزل کو رہائش کے لیے آراستہ کیا جائے تو ایک بار پھر مرمت رنگ وروغن اور سامان کی ادھر سے ادھر منتقلی کا عمل شروع ہوا تھا۔ غنی نے اس کے لیے بڑی تعداد میں مزدور اور کاریگر حاصل کرکے یہ کام کم سے کم وقت میں پورا کردیا تھا۔

نیچے اور اوپر کی منزل میں تعمیر کا کوئی فرق نہ تھا۔ سوائے اس کے کہ گراؤنڈ فلور پر جو محرابی دروازوں اور ستونوں والا برآمدہ تھا وہ اوپر کھلا ٹیرس بن گیا تھا۔ اب نہ وہ پہلے سے تکلفات رہے تھے نہ وہ ساز وسامان تھا... کچھ نوادرات پیچھے ایک ہال میں منتقل کر دیے گئے تھے۔ کاٹھ کباڑ قرار دیا جانے والا تمام اسباب نیلام یا تقسیم کر دیا گیا تھا اور پرانی حویلی کو رہائش کے لیے نئی صورت مل گئی تھی۔

اوپر بھی تو ایسے کمرے تھے جو بیڈ روم بن سکتے تھے۔ کوئی کمرا بھی چوبیس فٹ سے کم لمبائی چوڑائی نہیں رکھتا تھا اور ان کی تقسیم ہر ایک کی خواہش کے مطابق کر دی گئی تھی۔ اوپر دو ہال تھے۔ ایک کو اب کھانے کا کمرا بنا دیا گیا تھا اور غنی نے رابعہ کے کہنے پر دو کھانے کی میزوں کو لمبائی کے رخ جوڑ کر ایک کرا دیا تھا۔ اس میں ایک مقامی کارپینٹر نے اپنی ہنر مندی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس نے دونوں میزوں کی اوپر والی سطح کو ایسے جوڑا تھا کہ جوڑ کہیں نظر بھی نہ آتا تھا۔ اب یہ ایک طویل میز بن گئی جس میں آمنے سامنے دس دس کرسیوں کی قطار تھی اور دونوں آخری کناروں کی کرسی کو ملا کے اس پر بائیس افراد کھانا کھا سکتے تھے۔

ابھی ڈائننگ ہال کی ڈیکوریشن باقی تھی۔ رابعہ کے پروگرام میں میز پر لمبائی کے رخ ایک بڑا اور دو چھوٹے فانوس لگانا شامل تھا پھر دیواروں کی آرائش تھی۔ اس کا خیال تھا کہ پھر یہ ڈائننگ روم نہیں بنکویٹ ہال لگے گا... دوسرا ہال ابھی بند تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ ابھی جن بیڈ رومز میں رہائش اختیار کر لی گئی تھی، وہ بھی پوری طرح آراستہ نہیں ہوئے تھے... لائٹس، فرنیچر اور باتھ رومز کا بہت سا کام باقی تھا۔

شہزاد ابھی تک میرے ساتھ مہمان خانے میں ہی تھا جو نچلی منزل پر رکھا گیا تھا اور اس ہال کی آرائش نے عبداللہ جان کو بھی متاثر کیا تھا۔ حالانکہ وہ اپنے عہدے کے مطابق کسی عالی شان کوٹھی میں رہتا ہوگا... پھر شہزاد کیسے مرعوب نہ ہوتا۔

جب وہ میرے اصرار پر کھانے کے لیے رکا تو خاصا نروس ہوا۔ گھر کے تمام افراد کی اپنی اپنی جگہ تھی لیکن ہم سب طویل میز کے ایک کنارے پر تھے... شہزاد کے نام سے سب واقف تھے۔ میں نے اس کا باقاعدہ تعارف کرایا کہ یہ اب ہمارے قانونی مشیر ہیں تو سب نے بڑے اخلاق کے ساتھ اسے مبارک باد دی۔ مجھے بالکل معلوم نہ تھا کہ اس کا فیملی بیک گراؤنڈ کس قسم کا ہے۔ ہم سب کسی رئیسانہ یا ارسٹو کریٹ ماحول کے پروردہ نہیں تھے... ایک خوش نصیبی کے اتفاق نے ہم سب کو اکٹھا کر دیا تھا۔

شہزاد نے ہمارے مابین بے تکلفی کے رشتے کو یقیناً پسند کیا ہوگا مگر وہ ایک اجنبی تھا اور سب کی اپنائیت والی حوصلہ افزائی کے باوجود وہ خاموش ہی رہا۔

رابعہ نے مجھے مخاطب کیا۔ ''معاف کرنا کزن... یہ کیسے تمہاری وکالت کریں گے... انہیں تو بولنا بھی نہیں آتا۔''

''یہ تمہاری طرح موقع محل دیکھے بغیر نہیں بولتے۔'' میں نے کہا۔

رابعہ نے کہا۔ ''انہیں جھوٹ بولنا تو ضرور آتا ہوگا... ورنہ یہ وکیل کیسے بنتے۔''

شہزاد نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ''کیا آپ صرف سچ بولتی ہیں سچ کے سوا کچھ نہیں بولتیں... عمر کے معاملے میں بھی نہیں۔''

رابعہ جھینپ گئی۔ باقی لوگ ہنسنے لگے۔ اسی وقت باہر سے بادل کے گرجنے کی آواز سنائی دی۔

میں نے ریشم سے پوچھا ''کیا بارش ہو رہی ہے؟''

ریشم جو کھانے کے وقت خدمت کے لیے حاضر رہتی تھی۔ انگریزی کو شرمندہ کرنے والی انگلش میں فرمایا۔ ''یس سر... فاسٹ رین ہیپن (HAPPEN)... مِنی ہنڈرڈ گیلن واٹر ون منٹ... کلاوڈ ویری ڈیپ ... رین واک آل نائٹ۔''

سب کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ بارش بہت تیز ہو رہی ہے، بادل بہت گہرے ہیں اور شاید بارش رات بھر چلے گی اور اپنی... شاہی انگلش بولنے سے باز نہیں آتی تھی... شوق اور جذبے کی وجہ سے اس نے حیرت انگیز مہارت حاصل کر لی تھی۔

شہزاد نے ہنسی روک کے کہا ''حویلی کا ماحول تو بڑا مشرقی ہے لیکن یہ ہاؤس میڈ لیس انگریز ہے۔''

جواب رابعہ نے دیا۔ ''وکیل صاحب... یہ ڈاکٹر ہے۔''

شہزاد نے محسوس کیا کہ اسے بے وقوف بنایا جا رہا ہے یا یہ لڑکی خود کو بہت تیز طرار سمجھتی ہے۔ اس نے کہا۔ ''فزیشن ہے یا سرجن، آپ تو اسی سے علاج کراتی ہوں گی۔''

''کمال ہے! آپ اسے مذاق سمجھ رہے ہیں... پوچھ لیں ڈاکٹر شہناز سے۔''

شہناز نے اتنی ہی سنجیدگی سے کہا۔ ''رابعہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ بہت سی ڈاکٹرز کو آپ نے دیکھا ہوگا کہ پریکٹس نہیں کرتیں۔ وہی گھرداری اور ہانڈی چولہا کرتے عمر گزار دیتی ہیں جو ایک جاہل عورت کرتی ہے۔''

شہزاد اب کچھ کنفیوز ہوا۔ ''آپ کا مطلب ہے... یہ ایم بی بی ایس کر چکی ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''شہزاد صاحب... یہاں کوئی کم نہیں ہے... یہ جو آپ کو گارڈ، چوکیدار اور ڈرائیور نظر آتے ہیں۔ ایم اے سے کم کوئی نہیں... چاہیں تو یونیورسٹی میں پڑھانے لگیں۔''

شہزاد ہنسنے لگا۔ ''پھر تو تمہاری یہ کزن پی ایچ ڈی ہوں گی۔''

میں نے کہا۔ ''سات سال کی عمر میں کر لیا تھا اس نے پہلا پی ایچ ڈی... اس کے بعد ہر سال کرتی ہے... کیوں کزن۔''

بات ہنسی میں ختم ہو گئی لیکن ایک بات جو میں نے محسوس کی اور شاید دوسروں نے بھی کی ہوگی۔ رابعہ اور شہزاد کی نظروں کا تبادلہ تھا اور ایک دوسرے کی ذات میں غیر معمولی دلچسپی کا اظہار تھا۔ اس میں کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی۔ سانولے رنگ کے باوجود رابعہ کے حسن میں بڑی کشش تھی جس میں چہرے کے نقوش کی جمال آفرینی اور بے حد متناسب جسم کی دلکشی کے ساتھ ایک اور چیز تھی جو انگریزی میں سیکس اپیل کہلاتی ہے۔ یہ بعض اوقات حسنِ کامل میں محسوس نہیں ہوتی جس کو دستِ قدرت نے کسی فرصت کے لمحے میں تراشا ہو... مقابلے میں شہزاد بھی اچھی شکل و صورت والا اعلیٰ تعلیم یافتہ مہذب اور خوش پوش نوجوان تھا۔

اس رات شہزاد کو مہمان خانے میں ہی رکنا پڑا کیونکہ باہر بارش واقعی بہت تیز ہو رہی تھی اور ست بدھائی سے مین جی ٹی روڈ تک تقریباً بیس کلومیٹر کا راستہ ایسے موسم میں سفر کے لیے محفوظ نہ تھا۔ کھانے کے بعد میں راجا اور شہزاد برآمدے میں کرسیاں ڈال کے بیٹھ گئے۔ آسمان پر بجلی لہراتی تھی تو حویلی کے باغ کا سارا منظر روشن ہو جاتا تھا۔ پھر گرج سنائی دیتی تھی تو جنگل سے اس کی گونج آتی تھی۔ بارش کی آواز جنگل کے درختوں میں ایسا شور پیدا کر رہی تھی جیسے کوئی پہاڑی دریا پورے زور و شور سے بہہ رہا ہو۔

ریشم ہمارے لیے کافی رکھ گئی۔ ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے پھر راجا نے پوچھا۔ ''شہزاد، اپنے بارے میں کچھ بتاؤ۔''

وہ چونکا ''اپنے بارے میں... کیا بتاؤں؟''

میں نے کہا... ''یار تم کو فاروقی سے جو فائلیں ملی ہیں ان میں میری ساری خاندانی ہسٹری تھی... میرے آباواجداد کے وقت سے اب تک کے حالات تم نے دیکھ لیے ہوں گے۔''

''اور اپنی زندگی تو ایک کھلی کتاب ہے ہمیشہ سے۔ ایک بات کا علم شاید تمہیں نہ ہو... یہ جو ڈاکٹر شہناز ہے۔ اس پر میرے نام کی تختی لگی ہوئی... اس پر بری نظر مت ڈالنا۔'' راجا نے کہا۔

شہزاد جھینپا ''آپ کیسی بات کرتے ہیں... وہ منگیتر ہیں آپ کی تو میری بھابی ہیں لیکن وہ کون تھیں۔ آپ کی کزن رابعہ کے ساتھ۔''

میں نے کہا۔ ''لیلیٰ بھابی... فاروقی کی سابق وائف۔ ان کا خلع کا کیس عدالت میں ہے۔''

''نہیں... دوسری طرف... جو چپ بیٹھی رہیں کچھ اداس سی...''

میں نے راجا کی طرف دیکھا۔ ''وہ نور جہاں ہے۔''

''بلاشبہ اسم بامسمّیٰ... ملکہ نور جہاں۔'' شہزاد کے لبوں سے بے اختیار نکل گیا پھر وہ جھینپا۔ ''پلیز ڈونٹ مائنڈ مائی ورڈز۔''

میں نے کہا ''اس کی صورت جتنی اچھی ہے۔ قسمت اتنی ہی خراب ہے۔''

میں نے راجا کی نظر کا اشارہ پا کے نور جہاں کے بارے میں شہزاد کو اول تا آخر سب بتا دیا۔ یہ اتنی حیران کرنے والی کہانی تھی کہ شہزاد کافی پینا بھول گیا تھا۔ راجا کو اسے بار بار یاد دلانا پڑتا تھا... میں نے خاصے اختصار سے کام لیا لیکن اخلاقی یا معاشرتی مسئلے سے زیادہ نور جہاں ایک قانونی مسئلے کی حیثیت اختیار کر چکی تھی۔

ساری بات سن کے شہزاد نے کہا۔ ''میں آپ کے نجی معاملات میں دخل تو نہیں دے سکتا لیکن نواب صاحب... اسے کب تک چھپا کے رکھیں گے؟''

''جب تک اکبر خان کے قتل کا معاملہ ٹھنڈا نہیں پڑتا۔'' میں نے کہا۔

''برا نہ مانیے گا میری بات کا... آپ جیسے دور اندیش شخص سے میں ایسی احمقانہ حرکت کی توقع نہیں کر سکتا۔''

مجھے تھوڑا سا شاک لگا۔ ''تم غلط نہیں کہتے... ایک جگہ کو میں نے محفوظ سمجھا تھا... میرا خیال تھا کہ وہاں تک کسی کے خیال کی رسائی ہی ممکن نہ ہوگی۔''

''لیکن پھر آپ خود شامتِ اعمال کو اپنے پیچھے لگا کے وہاں تک لے گئے۔''

میں نے کہا۔ ''آف کورس وہ میری بڑی فاش غلطی تھی۔''

''فاش نہیں... مہلک لیکن سر... ایسا ہوتا ہے۔ اور جو ہوتا ہے وہ دوبارہ بھی ہو سکتا ہے۔''

راجا نے سر ہلایا۔ ''بالکل ٹھیک کہا تم نے۔''

''مگر میں نہیں سمجھا۔'' میں نے کہا۔

''دیکھیے... جب کوئی غلطی کا ارتکاب کر رہا ہوتا ہے تو وہ سمجھتا ہے... یا اسے شعور اور احساس نہیں ہوتا کہ وہ غلطی کر رہا ہے... اپنی دانست میں وہ بہت محتاط ہوتا ہے۔''

میں نے خفت سے کہا۔ ''مجھے بھی یہی یقین تھا۔''

''دوسری بار بھی ایسا ہی ہوگا... آپ پہلے والی غلطی کو نہیں دہرائیں گے لیکن غلطی کوئی اپنی مرضی سے نہیں کرتا۔ جیسے کوئی حادثہ... اگر اس سے بچنا ممکن ہو تو پھر وہ حادثہ کیوں کہلائے۔ یہ حالات ہوتے ہیں یا اتفاقات... جو ہماری عقل کو دھوکا دیتے ہیں... سب غلط کر دیتے ہیں... جو نہیں ہونا چاہیے وہ ہو جاتا ہے... آپ سمجھ رہے ہیں نا میری بات کو۔''

میں نے سر ہلایا۔ ''تم تو فلاسفر ہو۔''

''یہ منطقی بات ہے سر... خدا نہ کرے یہاں پھر کوئی ایسی صورتِ حال پیدا ہو جائے... جو آپ کے وہم و گمان میں نہ ہو... بعد میں آپ افسوس سے سوچیں کہ ایسا مجھے سوچنا چاہیے تھا مگر میں نے نہیں سوچا... تو کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ آپ خطرہ نہ پالیں... اور فکروں سے آزاد رہیں۔ کوئی خطرناک چیز لوگ گھر میں نہیں رکھتے مثلاً پیٹرول... تیزاب... آتش گیر مادہ۔''

راجا نے کہا۔ ''نور جہاں ایک خطرناک چیز ہے؟''

''کیا نہیں ہے؟'' شہزاد نے پلٹ کے پوچھا۔

میں نے تسلیم کیا۔ ''ہے تو سہی۔''

''پھر اسے گھر سے دور رکھیں... یہ آپ کا گھر ہے۔ یہاں آپ کے ماں باپ رہتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''گھر سے دور رکھنے والی بات سے میں اصولی طور پر اتفاق کرتا ہوں لیکن ایسی کوئی جگہ میری نظر میں تو نہیں ہے۔ ایک نظر آئی تھی۔ وہاں کیا ہوا۔''

''اگر آپ مجھ پر بھروسا کریں۔''

میں نے چونک کے اسے دیکھا۔ ''کیا مطلب؟ تم سمجھتے ہو تمہارے پاس کوئی جگہ ہے؟''

''نواب صاحب! اسے چھوٹا منہ بڑی بات نہ سمجھیں... جہاں آج آپ نے نور جہاں کو چھپا رکھا ہے... یہ صرف حویلی نہیں... ایک پبلک پلیس ہے۔ جہاں سب آتے جاتے رہتے ہیں۔ درجنوں تو آپ کے ملازم اور خدمت گار ہیں۔ اب اسکول شروع ہوا ہے اور اسپتال بھی... ابھی نہ جانے کتنے طالب علم، استاد مریض اور لواحقین آئیں گے۔''

''یہ تو ہے مگر...''

اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''آپ سو فیصد یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ کبھی کسی کی نظر ان پر نہیں جائے گی۔ اتفاقیہ یا غیر ارادی طور پر... حادثاتی طور پر... جب تک کہ آپ ان کو کسی کمرے میں مقفل نہ کر دیں جس کی چابی صرف آپ کے پاس ہو۔''

راجا نے کہا۔ ''کیا حرج ہے... کل سے ایسا کرتے ہیں۔''

شہزاد مسکرایا۔ ''دوسری بات... یہ حویلی دشمنوں کی نظر کے فوکس میں ہے۔ شک کی ہر دوربین خواہ وہ پولیس کی ہو یا رانا کی۔ حویلی کو دیکھ رہی ہے۔ میں شرط لگا سکتا ہوں کہ پولیس بہت جلد مخبر چھوڑے گی یا مخبر بنائے گی جو حویلی کے اندر کی رپورٹیں دیں گے پولیس کی سراغرسی کا نظام ایسے ہی چلتا ہے۔''

راجا نے کہا۔ ''یہ تم نے سولہ آنے پکی اور درست بات کی ہے... ایسا ہوگا۔''

''اس کے ساتھ ہی رانا کے جاسوس پیچھے لگ جائیں گے اور آپ کو سو فیصد بھروسا کیوں ہے، اپنے سو فیصد نمک خواروں پر... کیا ان میں ایک فیصد بھی نمک حرامی نہیں کر سکتے؟ تو سر! ایسا سوچنا بھی بالکل غیر دانش مندانہ اور ان پریکٹیکل ہے... کسی کو بھی لالچ سے خریدا جا سکتا ہے... ہر آدمی ایک قوتِ خرید رکھتا ہے۔ کوئی کم کوئی زیادہ... حویلی میں نور جہاں کی موجودگی کی خبر زیادہ دیر چھپی نہیں رہ سکتی۔''

اس کے خاموش ہونے کے کچھ دیر بعد میں نے کہا۔ ''یو آر ویری رائٹ مسٹر شہزاد! لیکن ایسی کوئی جگہ کہاں ہے؟''

''ایک موٹی سی بات ہے سر! کسی چیز کو چھپانا ہو تو اسے چوراہے پر نہیں رکھتے۔ کسی سنسان گلی میں کوئی گمنام سا گھر ہو تو وہاں کس کی نظر پڑ سکتی ہے۔''

''ایسا گھر کس کا ہے؟'' راجا بولا۔ ''تمہارا؟''

''بس سر! میرا گھر۔''

میں دم بخود رہ گیا۔ ''تم... اپنے گھر میں رکھو گے نور جہاں کو۔''

''اگر آپ چاہیں گے تو!''

''یہ جانتے ہوئے بھی... کہ یہ کتنی مشکل اور خطرناک ذمے داری ہے۔'' میں نے کہا۔

''مشکل کوئی نہیں... خطرناک آپ کے لیے ہے... میرے لیے کیوں ہوگی... مجھے کون جانتا ہے... میرے گھر کی طرف کس کا دھیان جا سکتا ہے سر... نہ میرا آپ سے ایسا تعلق ثابت ہوتا ہے... ابھی تو سب یہ سمجھتے ہیں کہ فاروقی کی جگہ

میں نے وقتی طور پر لی ہے... بعد میں آپ فاروقی جیسی شہرت رکھنے والے بیرسٹر کا انتخاب کریں گے۔"

شہزاد کی منطقی سوچ اور اس کی پیشکش کے خلوص نے مجھے بے حد متاثر کیا تھا... ابھی یقیناً اس کی میری شناسائی کی مدت بہت تھوڑی تھی اور عام تاثر یہی تھا کہ وہ محض میرا وکیل ہے۔ فاروقی کے جیسے ذاتی اور گھریلو مراسم ہر وکیل کے ساتھ نہیں ہوتے۔

بالآخر راجا نے کہا۔ "شہزاد... کہاں ہے تمہارا گھر۔"

"راولپنڈی کی لالہ زار کالونی میں... چھوٹا سا دس مرلے کا گھر ہے جو میرے والد نے چھوڑا تھا۔"

"اور اب تمہارے علاوہ اس میں کون رہتا ہے؟"

"ایک میری والدہ ہیں... ان کی عمر تو زیادہ نہیں لیکن ان کی شوگر کنٹرول میں نہیں رہتی... ان کی اپنی بے اعتدالی اور علاج میں بے قاعدگی کی وجہ سے... اور یہ وجہ بھی ہے ان کی نظر چلی جانے کی۔ ان کے ساتھ میری ایک بیوہ خالہ رہتی ہیں... پچھلے دس سال سے۔ انہیں شوہر کی موت کے بعد سسرال والوں نے مار کے گھر سے نکال دیا تھا، ان کے بچے بھی رکھ لیے تھے... جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے... وہ کہاں جاتیں... بڑی بہن کے گھر آ گئیں۔ میں نے ان کا کیس لڑا... بچوں کی کسٹڈی انہیں نہیں ملی... سسرال والوں نے ان کے معصوم ذہنوں میں ماں کے خلاف زہر بھر دیا تھا۔ اس میں یہ بھی شامل تھا کہ ہمارے باپ کی موت بھی ماں کی وجہ سے ہوئی... یہ انہیں بہت پریشان کرتی تھیں اور ان سے بہت لڑتی تھیں۔ ان کی وجہ سے وہ بیمار ہو گئے پھر بھی انہوں نے تنگ کرنا نہیں چھوڑا۔ ان کا علاج نہیں کرایا وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب پڑھایا ہوا سبق تھا... انہوں نے ماں کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ میں نے ریلوے سے ان کے واجبات کی وصولی کا کیس لیا، وہ انہیں مل گئے تھے۔ اب وہی اماں کی دیکھ بھال کرتی ہیں، ان کی مدد کے لیے ایک بڑی بی آتی تھیں... وہ پچھلے ماہ فوت ہو گئیں۔ قصہ مختصر... اس گھر میں صرف دو بوڑھی عورتیں ہیں... میں صبح کا گیا رات کو آتا ہوں... سارا دن نہ کوئی آنے والا نہ جانے والا۔"

میں نے اس کی بات کاٹی۔ "کیوں؟ تمہارے عزیز و اقارب نہیں ہیں۔"

"یہ لمبی کہانی ہے سر! میں اپنے والدین کا ایک ہی بیٹا تھا۔ میرے والد کی شادی ان کی مرضی کے خلاف کر دی گئی تھی۔ اس کی سزا انہوں نے میری ماں کو دی... وہ ان سے دور رہے... ان کے والد کا ایک چھوٹا موٹا بزنس تھا... اس میں انہوں نے کوئی دلچسپی نہ لی اور اس پر رفتہ رفتہ بھائی قابض ہو گئے۔ وہ ان کے کارندے کے طور پر کام کرتے رہتے۔ وہ خود بھی ایسا ہی چاہتے تھے۔ بھائی انہیں کاروباری دوروں پر کبھی ایک ملک بھیج دیتے تھے کبھی دوسرے... وہ مہینوں غائب رہتے تھے۔ میری ماں کو ان کے حصے کا منافع یا ان کے شوہر کی تنخواہ ملتی رہی... ان کی غیر حاضری کے وقفے طویل سے طویل تر ہوتے گئے۔ بالآخر ایک دفعہ وہ ایسے گئے کہ پلٹ کر نہیں آئے... اب معلوم نہیں وہ زندہ ہیں کہ نہیں۔ میری ماں کی پرانی سوچ ہے کہ چلو انہوں نے چھوڑا تو نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ اس سے بہتر تھا وہ طلاق لے کر الگ ہو جاتیں... شروع ہی میں جب انہیں سب معلوم ہو گیا تھا تو شوہر کو پکڑ لیتیں کہ میری زندگی کیوں برباد کی۔ ہمت تھی تو انکار کرتے اور اس سے شادی کرتے جو تمہیں پسند تھی... آپ اپنی مرضی سے دوسری شادی کر لیتیں۔ مگر یہ سب ہماری سوچ ہے... اب تو عمر بیت گئی۔ میری ماں کو سسرال والوں نے نکالا نہیں... ان کا حصہ دے کر الگ کر دیا۔ کئی سال بعد... یہ حصہ بہت کم تھا مگر میری ماں کیا کرتی۔ میں چھوٹا تھا... وہ کسی عدالت میں تو اپنا حق مانگنے نہیں جا سکتی تھی۔ ہمیں یہ مکان ملا اور ایک دکان جس کے کرایے سے گزر اوقات ہوتی رہتی۔ ظاہر ہے چچا تایا اور پھوپھی سب تھے مگر آنا جانا کسی کا نہیں۔ جب میں بڑا ہوا اور میری وکالت چل نکلی تو کچھ لوگ پلٹ کے آئے تھے... اپنی لڑکیوں کی وجہ سے جن کے رشتے نہیں ہوتے تھے۔ میں نے کھری کھری سنائیں تو اپنا سا منہ لے کر چلے گئے بلکہ الٹا دشمن ہو گئے۔ خیر ان کی دوستی سے کیا فائدہ تھا کہ دشمنی سے نقصان ہوتا۔ کہنے کا مطلب یہ کہ میرے گھر میں آنے جانے والا کوئی نہیں... میری ماں اور خالہ کے ساتھ نور جہاں رہ سکتی ہیں۔"

میں نے ساری کہانی سن کے کہا۔ "سب کچھ ٹھیک ہے لیکن مجھے بتاؤ... امی جان اور خالہ سے تم کیا کہو گے؟"

وہ مسکرانے لگا۔ "سر... وکیل کہانیاں گھڑنے کے ماہر ہوتے ہیں اور وہ ہیں پرانے وقتوں کی سیدھی سادی عورتیں جو مجھ پر اعتماد کرتی ہیں۔"

"پھر بھی... مثال کے طور پر قائل کرنے والی کوئی کہانی؟" میں نے کہا۔

وہ سوچ کے بولا۔ "میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ میرے ایک دوست کی بیوہ ہیں... عدت کا زمانہ یہاں گزاریں گی کیونکہ شوہر کا قتل ہو گیا ہے اور سسرال والوں نے انہیں گھر سے نکال دیا ہے۔ کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ یہ یہاں ہیں... ان کی

جائیداد پر ملکیت کا کیس چل رہا ہے۔ کچھ لوگ چاہتے ہیں کہ ان کو بھی ٹھکانے لگا کے ان کی ہر چیز پر قابض ہو جائیں۔"

راجا ہنسا۔ "کہانی قائل کرنے والی ہے۔"

"میری ماں اور خالہ کو اس لیے قائل کرے گی کہ ان کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔" وہ بولا۔ "اب بتائیے آپ نے کیا سوچا؟"

میں نے کہا۔ "اتنی جلدی کیا ہے۔"

"کمال کرتے ہیں آپ... جلدی ہونی چاہیے... ورنہ وقت نکل جائے گا۔ بعض اوقات صحیح وقت پر ایک فیصلہ زندگی بدل دیتا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے... لیکن ابھی اس وقت... اس طوفانی بارش والی رات میں تو کچھ نہیں ہوگا۔" میں نے ہنس کے کہا۔

وہ کچھ سوچتا رہا پھر بولا۔ "سر! آپ ڈی ڈے کے بارے میں جانتے ہوں گے۔ اس کو چرچل نے اپنی زندگی کا طویل ترین دن کہا تھا۔"

"لیں... THE LONGEST DAY بڑی مشہور فلم تھی... ڈی ڈے کہتے ہیں چھ جون 1945ء کو۔"

"رائٹ سر... اس رات اتحادی فوجوں نے فرانس کے ساحل نارمنڈی پر یلغار کی... پیراشوٹ سے فوج اتاری اور فرانس کو نازی جرمنوں کے قبضے سے چھڑا لیا۔ وہاں سے نازی فوجوں کی شکست شروع ہوئی لیکن آپ نے فلم دیکھی ہے تو جانتے ہوں گے کہ اس رات سخت طوفانی موسم تھا... پیرا ٹروپس کو اچانک حملے کا حکم ملا تھا... یہ ایک جوا تھا جو کامیاب رہا۔ نازی فوجی اتنے خراب موسم میں حملے کی توقع نہیں رکھتے تھے۔"

میں نے کہا۔ "اس بات کا نور جہاں سے کیا تعلق؟"

"آج بھی ایسا ہی موسم ہے... ایسے موسم میں اگر آپ انہیں ساتھ لے کر نکلیں گے تو نہ کوئی خطرہ ہوگا نہ اندیشہ۔ صبح مطلع صاف... میدان صاف... میں انہیں لے جاتا ہوں۔"

"تم اکیلے؟ ناممکن۔" میں نے کہا۔

راجا نے کہا۔ "ہم غنی کو ساتھ بھیج دیتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "نور جہاں مانے تب... وہ نہیں جائے گی... جب تک میں ساتھ نہ جاؤں... میں راستے میں اسے سمجھا سکتا ہوں اور صبح واپس بھی آ سکتا ہوں۔"

یہ فیصلہ بڑی عجلت میں کیا جانے والا تھا جسے میری عقل اس لیے تسلیم کرتی تھی کہ شہزاد کی یہ دلیل بہت مضبوط منطقی بنیادوں پر استوار تھی لیکن دل کو تھوڑا سا تامل تھا تاہم میں نے اس بار دل کی نہیں سنی اور دماغ کے فیصلے کو قبول کر لیا۔ کچھ اس وجہ سے بھی کہ فیصلے کو راجا کی بھرپور تائید حاصل تھی۔

اگلا مرحلہ نور جہاں کو قائل کرنے کا تھا کہ وہ ایک اجنبی کے ساتھ رہنے چلی جائے۔ یہ مشکل نہیں تھا... مجھے یقین تھا کہ میں اس سے ہر بات منوانے کا اختیار رکھتا ہوں۔

میری بات نے اسے حیران سے زیادہ پریشان کیا۔ "اس وقت؟ ایسی کیا بات ہو گئی؟"

میں نے متفکر چہرہ بنا کے کہا۔ "ہے کوئی بات کہ میں تمہارے پاس آنے پر مجبور ہو گیا۔"

"مجھے بھی تو پتا چلے۔"

"کیا تمہیں بھروسا نہیں مجھ پر؟" میں نے اسے جذباتی کرنے کے لیے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔

"بالکل ہے... تمہارے ساتھ میں آنکھ بند کر کے اندھے کنوئیں میں کود جاؤں۔" وہ مسکرائی۔ "لیکن..."

"پھر وہی لیکن... کچھ ایسی اطلاعات پہنچی ہیں مجھ تک کہ مجھے تمہارے یہاں رہنے میں خطرہ محسوس ہوتا ہے۔"

"خطرہ کس کے لیے؟ اپنے لیے یا میرے لیے؟"

"کیا تمہارا اور میرا معاملہ الگ ہے؟ تم مزید وقت ضائع نہ کرو... میں تمہارے ساتھ چل رہا ہوں اور اس موسم میں نکل رہا ہوں تو اندازہ کر لو کہ معمولی بات نہیں۔"

"تم نے اور لوگوں کو بتایا؟"

میں نے برہمی سے کہا۔ "اتنا وقت نہیں ہے... باقی سب کو بعد میں راجا بتا سکتا ہے۔"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اچھا چلو... میرا کیا ہے یہاں... کون سا اسباب سمیٹنا ہے... خالی ہاتھ آئی تھی خالی ہاتھ جاؤں گی... سب سے مل تو لوں۔"

"سب سو رہے ہیں۔" میں نے جھنجلا کے کہا۔ "انہیں جگا کے بتاؤ گی تو مزید ایک گھنٹا وضاحتوں میں صرف ہو جائے گا۔"

وہ چپ ہو گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ آنسوؤں کو روکنے کی ناکام کوشش کر رہی ہے۔

میں نے اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ "جان... روتی کیوں ہو... یہ سب تمہاری بہتری کے لیے ہی تو ہو رہا ہے۔"

وہ سسکیاں لینے لگی۔ "میری بہتری؟ آج تک مجھے پتا نہیں چلا کہ میری بہتری کس میں ہے... میں نے جو کیا اس میں خرابی کے سوا کچھ نہ ملا... میں ایک گھر کے لیے در بدر ہوں جسے میں اپنا کہہ سکوں۔ تم مجھے یہاں لائے تھے پھر ابا جی نے میرے سر پر ہاتھ رکھا تھا تو میں سوچنے لگی کہ شاید مجھے میرا گھر

مل گیا۔"

ایک لمحے کے لیے میرا ارادہ ڈانواں ڈول ہوا۔ میں نے سوچا کہ مفروضہ اندیشوں کو جھٹلا دوں اور نور جہاں کی آنکھوں سے بہہ کر میری قمیص کو گیلا کرنے والے آنسوؤں کو پھر مسکراہٹ میں بدل دوں۔ اس سے کہوں کہ اچھا...تم کو کہیں جانے کی ضرورت نہیں...جو ہوگا دیکھا جائے گا لیکن پھر جذبات کا یہ ریلا عقل کی دیوار سے ٹکرا کے بکھر گیا۔

میں نے کہا۔ "تم کون سا ہمیشہ کے لیے جا رہی ہو...تم واپس آؤ گی...اسی گھر میں اب تمہاری جگہ مقرر ہو چکی۔"

"کل کی کسے خبر ہے میرے سرکار...ہم کہاں اور تم کہاں۔" اس نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لے کر آنسو پونچھے اور مسکرائی۔ "چلو۔"

ایک گاڑی شہزاد کی تھی جو اٹھاسی ماڈل کی نسان سنی تھی۔ دوسری شیر دل کی کرولا تھی۔ غنی اس اچانک فیصلے سے اپ سیٹ ضرور ہوا لیکن پھر راجا نے اسے ایک طرف لے جا کے سمجھا دیا تو وہ مطمئن نظر آنے لگا تھا۔

تین گھنٹے بعد بھی بادِ باراں کا سلسلہ جاری تھا اگرچہ اس کی شدت میں کمی آ گئی تھی۔ بجلی اب بھی چمک رہی تھی لیکن بادل کم گرج رہے تھے۔ جب دونوں گاڑیاں آگے پیچھے باہر نکلیں تو شہزاد کی گاڑی آگے تھی۔ غنی اس کے ساتھ مسلح بیٹھا تھا۔ پیچھے شیر دل کی گاڑی میں نور جہاں میرے ساتھ تھی۔ میں اور شیر دل بھی مسلح تھے۔

جنگل کے سارے راستوں نے طوفانی بارش کے بعد چھوٹے موٹے نالوں کی شکل اختیار کر لی تھی۔ نالے پھیل کر نہر بن گئے تھے اور سارا پانی نشیب کی جانب بہہ کر کنہار میں شامل ہو رہا تھا...وہ ایک دریا بن گیا تھا۔

گاڑیوں کے وائپر تیزی سے حرکت کر رہے تھے۔ اس کے باوجود پانی کے دھارے ونڈ اسکرین پر بہہ رہے تھے اور بخارات اندر سے بھی شیشے کو دھندلا دیتے تھے۔ شیر دل بار بار کپڑے سے انہیں صاف کرتا تھا تو ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی میں سامنے کا منظر صاف ہو جاتا تھا۔ لائٹ کی متوازی لکیروں میں بارش کے دھارے چمکنے لگتے تھے۔

رات کے ساڑھے بارہ بجے اس چھوٹی سی برانچ روڈ پر عام حالات میں بھی کوئی ٹریفک نہیں ہوتی تھی۔ رہتاس کے قلعے یا ٹیلہ جوگیاں میں بھی گرد و نواح کے دیہات میں رہنے والوں کے لیے مغرب کے بعد رات ہو جاتی تھی۔ عشا کی نماز کے بعد لوگ سو جاتے تھے پھر اس موسم میں انتہائی اشد ضرورت میں کوئی نکلے تو ٹرانسپورٹ کا مسئلہ ہوتا تھا۔ پبلک ٹرانسپورٹ صرف دن میں دستیاب ہوتی تھی۔ کسی بیمار کو لانا لے جانا پڑے تو اس کے لیے بڑی مشکل سے کوئی سوزوکی پک اپ دستیاب ہوتی تھی مگر اس کا کرایہ صرف صاحبِ استطاعت لوگ ہی ادا کر سکتے تھے۔ غریب آدمی تانگے ریڑھے ہی کو وسیلہ بناتا تھا۔

یہی وجہ تھی کہ جب رہتاس کے قلعے کی آبادی سے نکل کے ہم پھر ویرانے میں پہنچے تو مجھے سامنے سے آنے والی دو گاڑیوں کی لائٹس نے چوکنا کیا۔ اس وقت ہماری گاڑی آگے تھی اور شہزاد ہمارے پیچھے آ رہا تھا۔ میں نے غور کیا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ کسی بس، ویگن یا سوزوکی پک اپ کی ہیڈ لائٹس نہیں تھیں ان کی ہیڈ لائٹس گول ہوتی ہیں جبکہ آگے والی گاڑی کی لائٹس گول نہیں تھیں۔ مزید یہ کہ ان کے پیچھے بمپر میں بھی دو لائٹس نظر آ رہی تھیں۔

مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ سامنے سے تیزی سے قریب آتی ہوئی گاڑی لینڈ کروزر یا پجارو قسم کی بڑی گاڑی ہے اور اس کے پیچھے کوئی کار ہے، اس وقت مجھ سے ملنے کون آ سکتا تھا۔ یہ یقیناً رانا رجب علی خود تھا۔ اس موسم کا فائدہ اٹھا کے وہ اپنے گھر لوٹ رہا تھا۔ اس کا دن کی روشنی میں سفر غیر محفوظ ہوتا کیونکہ یہاں اس کی حیثیت ایک مفرور مجرم کی تھی۔ علاقے کا تھانے دار ہی نہیں ڈی آئی جی بھی بدل گیا تھا۔ نئے آنے والے اس کے سیاسی مخالفوں کے ہمدرد تھے۔

یہ بات سمجھ میں آتے ہی میں نے شیر دل سے کہا۔ "شیر دل ہوشیار...سامنے سے دشمن آ رہے ہیں۔"

پھر میں نے سر نکال کے پیچھے یہی بات غنی کو سمجھانی چاہی مگر وہ مجھ سے زیادہ ہوشیار ثابت ہوا...اس نے چلا کے کہا۔ "سر گاڑی روک کے نکل جائیں آپ۔"

لیکن مجھے اتنی مہلت ہی نہ ملی۔ دیوہیکل پراڈو کسی مست ہاتھی کی طرح چنگھاڑتی آئی...اس کی ہیڈ لائٹس کی نظروں کو خیرہ کر دینے والی روشنی نے شیر دل کو اندھا کر دیا۔ اس نے بریک لگائے۔ گاڑی کے رکنے سے پہلے ہی رانا کی پراڈو نے کرولا کو ہٹ کیا۔ پراڈو سائز میں بہت بڑی اور اونچی تھی۔ رانا نے بلندی سے کار کے اندر دیکھ لیا ہوگا...جانتے بوجھتے اس نے اپنے ڈرائیور کو حکم دیا ہوگا کہ نواب صاحب کی گاڑی کا راستہ روک لو...پروا نہیں ٹکر ہو جائے...پراڈو کا کیا بگڑے گا...نازک سی کرولا کا خانہ خراب ہوگا۔

ٹکر لگتے ہی شیشوں کے ٹوٹنے کا چھناکا اور گاڑیوں کے تصادم کا زبردست دھماکا سنائی دیا۔ تصادم کے وقت کرولا کی رفتار بھی کم ہو کے پانچ دس کلومیٹر ہو چکی تھی اور پراڈو بھی بہت

کم رفتار پر تھی۔ پراڈو کے ڈرائیور نے سائیڈ سے گزرنے کے بجائے سامنے آ کے راستہ روکا تھا چنانچہ دونوں ڈرائیورز کے لیے یہ ٹکر متوقع تھی اور وہ اس کے لیے تیار تھے۔

ہیڈ لائٹس کا چورا ہوتے ہی اندھیرا چھا گیا۔ ٹکر نے کرولا کو تھوڑا سا پیچھے دھکیلا تو پیچھے شہزاد اپنی گاڑی کو نہ بچا سکا۔ وہ کرولا میں گھس گیا اور یہ دوسرا حادثہ ایک سیکنڈ سے بھی کم کے وقفے سے ہوا۔ کرولا آگے پیچھے دونوں طرف سے ہٹ ہوئی۔

تصادم ہوا تو نور جہاں نے چیخ ماری۔ میں نے اسے پکڑ لیا اور پھر خود کو سنبھالا۔ ہم آگے والی سیٹ سے ٹکرائے اور پھر پیچھے آئے۔ پلک جھپکنے کی دیر تھی کہ میں نے پیچھے والا دروازہ کھولا اور نور جہاں کو ساتھ کھینچتے ہوئے باہر چھلانگ لگا دی۔

پہلا فائر میں نے اس وقت سنا جب میں نور جہاں کے ساتھ سڑک سے چند فٹ دور ایک کھیت میں گھس چکا تھا۔ کھڑی فصل میں راستہ بنانا بڑا سخت مرحلہ تھا۔ میرے پیروں کے نیچے بارش سے کیچڑ بن جانے والی کھیت کی زمین تھی۔ میرے ہاتھوں پر فصل کے پودوں کی تیز دھار سے خراشیں پڑ رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی میں نور جہاں کو بھی کھینچ رہا تھا۔ وہ دو بار گری اور میں نے جھٹکے سے اس کو اٹھا لیا۔ ایک کے بعد اس کا دوسرا اسینڈل کیچڑ میں پھنس کے پاؤں سے نکل گیا۔

یہ بہ مشکل تمام ایک منٹ کی جدوجہد تھی۔ میں نے نور جہاں کو چھوڑا اور پلٹا۔ وہ میرے پیروں سے چمٹ گئی۔ "تم کہاں جا رہے ہو؟"

میں نے اپنا پیر جھٹکا اور اس کے سر کو بالوں سے پکڑ کے ایک جھٹکا دیا۔ "بے وقوف عورت...جانے دو مجھے۔"

وہ میرے قدموں سے لپٹ گئی۔ "میں نہیں جانے دوں گی۔"

اس وقت تک تین فائر ہو چکے تھے۔ کسی شخص نے چیخ بھی ماری تھی مگر وہ نہ شہزاد تھا نہ غنی...شیر دل میری سائیڈ پر تھا۔ غنی اور شہزاد اپنی گاڑی کی اوٹ میں تھے لیکن مخالف سمت میں تھے۔

میں نے رانا کی آواز سنی۔ "اوئے گاڑی نکال۔"

نہ جانے کس نے کراہ کے کہا۔ "رانا صاحب...گاڑی آپ چلاؤ۔"

"اوئے تجھے کیا ہوا ہے؟"

"گولی لگی ہے مجھے۔" ڈرائیور چلایا۔

اس وقت مخالف سمت سے دو فائر ہوئے۔ ایک کار جو رانا کی پراڈو کے پیچھے تھی تیزی سے آگے نکل گئی۔ اس کی لائٹس بند تھیں۔ اندھیری رات میں اسے سڑک کیا نظر آتی۔ کچھ دیر بعد ایک دھماکا سنائی دیا۔ وہ گاڑی غالباً کسی درخت سے ٹکرا گئی تھی۔

میرا خیال تھا کہ فرار ہونے والی کار میں رانا نکل گیا مگر وہ عین میرے سامنے دھاڑا۔ "اوئے نمک حرامو! کدھر جا رہے ہو سب رک جاؤ۔"

شیر خان نے ایک فائر کیا اور چلایا۔ "وہ مارا۔"

دوسری طرف سے غنی نے دھاڑ کے کہا۔ "رانا! سیدھا کھڑا رہ...ورنہ تیری لاش پڑی ہوگی یہاں۔"

رانا نے کہا۔ "نا...نا...گولی مت چلانا۔"

غنی کی آواز آئی۔ "ہاتھ اوپر اٹھا۔"

اب دوسری طرف سے شیر خان نے للکارا۔ "کسی نے حرکت کی تو مارا جائے گا۔"

اب میں نے نور جہاں سے کہا۔ "خدا کے لیے اب تو چھوڑ دو۔ کوئی خطرہ نہیں رہا اب۔"

اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ میں اسے دیکھ نہیں سکتا تھا مگر اس کے کپڑے اور ہاتھ پیر سب کیچڑ میں لت پت تھے۔

جب میں کھیت سے باہر آیا تو چند منٹ میں میدانِ جنگ کا نقشہ پلٹ گیا تھا۔ رانا سڑک پر ہاتھ اٹھائے کھڑا تھا۔ اس کا واحد وفادار ڈرائیور اس کے قریب زخمی پڑا تھا۔ پیچھے والی کار میں جو محافظ تھے انہوں نے جان بچا کے بھاگنے کی کوشش کی تھی لیکن تھوڑے ہی فاصلے پر ان کی کار حادثے کا شکار ہو کے تباہ ہو گئی تھی۔

میں آگے بڑھا ہی تھا کہ دور سے ایک اور گاڑی کی لائٹس نمودار ہوئیں۔ نور جہاں پھر میرے بازو سے چمٹ گئی۔ "تم آگے مت جاؤ۔"

"کیوں؟" میں نے ہاتھ جھٹکا۔

"کیونکہ تمہارے ساتھ میں بھی ہوں۔" وہ بولی۔

اچانک شہزاد نے میرے قریب سے سرگوشی کی۔ "نواب صاحب...آپ نکل جائیں۔"

میں نے کہا۔ "اور تم...؟"

"میری فکر مت کریں۔" وہ پھر غائب ہو گیا۔

میں نے نور جہاں کا ہاتھ پکڑا اور کھیتوں میں اندر کی طرف چلنے لگا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ شہزاد نے مجھے جائے واردات سے غائب ہو جانے کا مشورہ کیوں دیا تھا۔ وہاں پہنچنے والی تیسری گاڑی ایک پولیس جیپ تھی۔ شہزاد نور جہاں کی اور میری قانونی پوزیشن کی طرف سے فکر مند تھا۔

کھڑی فصلوں میں راستہ بنانا بہت مشکل کام تھا۔

میرے پیر جوتوں سمیت کیچڑ میں دھنس جاتے تھے تو انہیں زور لگا کے نکالنا پڑتا تھا۔ نور جہاں کی حالت ابتر تھی۔ اس کے ننگے پاؤں کیچڑ میں زخمی ہو رہے تھے کیونکہ کیچڑ میں کنکر اور کانٹے بھی تھے۔ میں اسے اپنے ساتھ کھینچنے پر مجبور تھا۔ مسلسل اس کی ہمت بڑھا رہا تھا مگر وہ تکلیف سے کراہ رہی تھی۔

بارش ابھی تک بند نہیں ہوئی تھی۔ سڑک کی طرف سے میں ملی جلی آوازیں سن رہا تھا لیکن فصلوں میں گرتی بارش کے شور میں ان آوازوں کا مطلب سمجھنا مشکل تھا۔ اچانک کھیت ختم ہو گیا اور میں نے خود کو ایک چھوٹے سے نالے کی منڈیر پر پایا۔ اس میں بارش کا پانی تیزی سے بہہ کر جا رہا تھا۔ میں نے اپنے پیر اس میں ڈال دیے۔ پانی میرے جوتوں میں بھر گیا لیکن سارے کیچڑ کو بہا لے گیا۔

میں نے نور جہاں کو نیچے بٹھایا اور اس نے پانی میں اپنے پیر دھو کے صاف کیے۔ ”یہ کون سی جگہ ہے؟“

میں نے کہا۔ ”ہم غالباً لندن میں ہیں؟“

”تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے۔“ وہ بگڑ کے بولی۔

”پھر احمقانہ سوالات کیوں کر رہی ہو۔ چلو اب اٹھو۔“

”میں نہیں چل سکتی۔“ وہ کراہ کے بولی۔

”ہم یہاں نہیں رک سکتے۔ تھوڑی دور چلو۔ آگے سڑک ہے۔“ میں نے اسے کھینچا۔

وہ نہیں اٹھی۔ ”تم کو جانا ہے تو جاؤ... مجھے مر جانے دو یہیں۔“

”پاگل مت بنو... کم آن... تھوڑی سی ہمت کرو۔“ میں نے کہا لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

مجبوراً میں نے جھک کر اسے اٹھایا۔ اس کا جسم ہلکا پھلکا ہونے کے باوجود اسے اٹھا کے چلنا میرے لیے مشکل ہو رہا تھا۔ اس کا جسم بارش میں بھیگ کے سرد ہو رہا تھا۔ وہ کانپ رہی تھی اور میرے گلے میں بازو حمائل کر کے مجھ سے چمٹی ہوئی تھی۔ مجھ پر اوپر سے بارش پڑ رہی تھی اور نیچے میرے جوتے کیچڑ میں دھنس رہے تھے۔

اچانک مجھے ایک کچی کوٹھری دکھائی دی۔ یہ ایک ٹیوب ویل تھا۔ جس نالی میں ہم نے پیر دھوئے تھے۔ وہ اس کے پانی کو کھیتوں میں لے جاتی تھی۔ میں نے نور جہاں کو ٹیوب ویل کے چبوترے پر بٹھا دیا اور کوٹھری میں جھانک کر دیکھا۔ اس میں ٹیوب ویل سے پانی نکالنے والی موٹر نصب تھی۔ کوٹھری صرف اسے بارش سے محفوظ رکھنے کے لیے بنائی گئی تھی، میں نے جھک کر اس کے اندر کی جگہ کا جائزہ لیا۔ اندھیرے میں کچھ بھی دکھائی نہ دیتا تھا۔ بجلی چمکی تو مجھے اس میں ایک چارپائی لگی ہوئی نظر آئی۔ اس کے نیچے کافی کاٹھ کباڑ جمع تھا۔

میں نے نور جہاں کو اندر بلا لیا۔ وہ سر جھکا کے اندر داخل ہوئی اور چارپائی پر بیٹھ گئی۔ میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔

”کیا رات ہم یہاں بسر کریں گے؟“

میں نے کہا۔ ”ارادہ تو نہیں ہے لیکن کیا پتا... یہاں دور دور تک آبادی کا نشان نہیں۔“

”بارش تو اور تیز ہو گئی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”لگتا ہے صبح تک چلے گی۔ میرا خیال ہے کہ نہا لوں اور کپڑے بھی دھو لوں۔“

”کیا ٹیوب ویل چلاؤ گے؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”اوپر سے صاف پانی کا شاور گر رہا ہے... پھر ٹیوب ویل چلتا ہے بجلی سے... اس موسم میں تار وغیرہ سب ٹوٹ چکے ہوں گے۔“

وہ میرا مطلب سمجھ گئی۔ باہر نکل کے میں نے جوتے موزے اتارے۔ پھر کپڑے اتار کے کیچڑ مٹی کو دھو کے صاف کیا اور کپڑے اچھی طرح نچوڑ کے پہننے سے پہلے پھر اس کوٹھری میں گھس گیا۔ اندھیرا اتنا تھا کہ وہ مجھے دیکھ نہیں سکتی تھی۔ جب میں کپڑے پہن چکا تو بجلی چمکی اور اسے میری موجودگی کا اندازہ ہوا۔

میں نے کہا۔ ”جاؤ تم بھی یہی کرو۔ کوئی نہیں ہے دیکھنے والا۔“

وہ کچھ تذبذب کے بعد مان گئی۔ نچوڑے ہوئے کپڑے میرے جسم پر اتنے بھاری محسوس نہیں ہو رہے تھے۔ میں چارپائی پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد نور جہاں کا سراپا دروازے میں نمودار ہوا۔ اس نے دھو کر نچوڑے ہوئے کپڑے ہاتھ میں اٹھا رکھے تھے۔ اسی وقت بجلی پھر چمکی اور میں نے اس کے پیکر کے نقوش ایک روشن پس منظر میں دیکھے... وہ کچھ سمٹ گئی اور پھر اندر آ کے کپڑے پہننے لگی۔

چارپائی بہت چھوٹی تھی مگر وہ مجھ سے چمٹ کر میرے ساتھ لیٹ گئی۔ ”اب مجھے بہت بہتر محسوس ہو رہا ہے۔ میرے سارے بدن پر مٹی کیچڑ تھا۔“

”کچھ دیر میں کپڑے خشک ہو جائیں گے۔“ میں نے کہا۔

”ہاں... کچھ دیر کا مطلب ہے صبح تک۔“

میں نے کہا۔ ”صبح تک ہم ایسی بارش میں جا بھی کہاں سکتے ہیں۔ مجھے تو سمت کا بھی کوئی اندازہ نہیں ہے۔“

”حویلی سے ہم کیوں نکلے تھے؟ یہاں آ کے اس چارپائی پر سونے کے لیے۔“ اس کا موڈ اب بہتر ہو رہا تھا۔

”معلوم نہیں وہاں کیا ہوا۔ ہم تو بھاگ آئے۔“

وہ بولی۔ ”بھاگتے نہ تو پکڑے جاتے۔ تم کہہ رہے ہو پولیس آ گئی تھی۔“

”ہاں مجھے خود سمجھ میں نہیں آتا کہ اس وقت پولیس وہاں کیسے پہنچ گئی۔ ایسے موسم میں۔“

”کیا پتا کسی نے بلایا ہو۔“

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”اول تو بلانے پر پولیس شہر میں اتنی جلدی نہیں آتی... پھر یہ کہ بلایا کس نے؟“

”اس کا بھی پتا چل جائے گا۔ لیکن پولیس نہ آتی تو آج ہم رانا کو گولی مار کے اس مصیبت سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا پا سکتے تھے... ورنہ گرفتار تو ضرور کر لیتے۔“

وہ آہستہ سے کسمسائی۔ ”پھر کیا کرتے؟“

”اسے پولیس کے حوالے بھی کر سکتے تھے۔“ میں نے کہا۔

وہ بولی۔ ”آخر وہ کہاں سے آ رہا تھا اس وقت؟“

”کہیں سے بھی آ رہا ہو... لیکن دیکھو... خوامخواہ اس نے پنگا لیا... آ بیل مجھے مار... اپنی گاڑی بھی تباہ کی۔“

”اسے کوئی فکر نہیں ہو گی۔ وہ دوسری لے گا۔“

میں نے کہا۔ ”ہم بھی لے لیں گے۔ پہلے میری گاڑی تھی جسے آگ لگا دی گئی تھی۔ آج شیر دل کی گاڑی برباد ہوئی۔“

”پیچھے شہزاد کی گاڑی کا بھی خاصا نقصان ہوا۔“

”مجھے حیرانی اس بات پر ہے کہ رانا کے پیچھے آنے والی گاڑی میں جو لوگ تھے، وہ اسے چھوڑ کے فرار کیوں ہوئے۔ اس کے ساتھ جو ڈرائیور تھا اسے گولی لگی تھی۔ پولیس نہ آتی تو غنی اور شیر دل مل کے رانا کو پکڑ لیتے۔“

وہ خاموش رہی تو میں نے پوچھا۔ ”تم سو رہی ہو...؟“

”نہیں... میں بہت تھک گئی تھی... مجھے سردی بھی لگ رہی تھی۔ تمہارے ساتھ بہت اچھا لگ رہا تھا...“

میں نے کہا... ”چاہو تو سو جاؤ... ابھی تو کوئی صورت نہیں کسی سے رابطے کی... میرا موبائل فون بھیگ گیا ہے... پرس میں نوٹ بھی گیلے ہو گئے ہیں...“

”شاید میرا موبائل فون ٹھیک ہو“ اس نے سر کے نیچے رکھے ہوئے چمڑے کے بیگ کو نکالا۔

”یہ تمہارے ساتھ رہتا ہے ہر جگہ... کیا ہے اس میں؟“

وہ بولی۔ ”میری جان۔“

میں نے ہنس کے کہا ”اپنی جان بیگ میں رکھتی ہو۔“

وہ بولی۔ ''اس میں میری چیک بکس ہیں۔ کچھ زیور ہے اور نقد رقم جو میں نے فرار ہوتے وقت اٹھالی تھی... یہ لو موبائل فون۔''

''پتا نہیں اب وہاں کوئی ہے یا نہیں۔''

وہ بولی۔ ''پہلے یہ دیکھو ان کے موبائل فون کام کررہے ہیں۔ کیا پتا کسی سے رابطہ ہوجائے۔''

''اور وہ ہوئے پولیس کی تحویل میں... پھر۔''

نور جہاں نے کہا۔ ''اس کا بھی پتا چل جائے گا۔''

میں نے اندھیرے میں اندازے سے شہزاد کا نمبر ملایا لیکن کچھ دیر بعد ٹیپ چلنے لگا کہ آپ کے مطلوبہ نمبر سے جواب موصول نہیں ہورہا ہے۔ نمبر شیر دل کا بھی میرے موبائل فون میں محفوظ تھا اور غنی کا بھی لیکن مجھے یاد نہیں تھا۔

نور جہاں نے کہا۔ ''راجا سے بات کرلونا۔''

میں نے کہا۔ ''کمال ہے... یہ موٹی سی بات میری عقل میں کیوں نہیں آئی۔''

میں نے راجا کا نمبر ملایا تو چار پانچ بار گھنٹی بجی پھر جواب آیا کہ جواب موصول نہیں ہورہا ہے۔ میں مایوس ہوگیا۔ بارش میں رابطے کا نظام کسی خرابی کا شکار تھا یا پھر راجا سو رہا تھا اور موبائل فون نہ جانے کہاں رکھا تھا۔

میں سوچ ہی رہا تھا کہ اب کس کو کال کروں کہ میرے ہاتھ میں فون کی ٹیون بجنے لگی اور اسکرین پر راجا کا نمبر آگیا۔

میں نے کہا۔ ''ہیلو... کہاں تھا تو؟''

اس نے کہا۔ ''یار سو رہا تھا... خیریت ہے نا۔''

''خیریت کہاں راجا... ذرا فون کر غنی کو یا شیر خان کو... دیکھ ان سے بات ہوتی ہے یا نہیں۔''

''کیا وہ تیرے ساتھ نہیں ہیں۔'' راجا کا تشویش میں مبتلا ہوجانا جائز تھا ''تو خود کہاں ہے؟''

''راجا... جیسا میں کہہ رہا ہوں ویسا کر... اور پھر مجھے بتا... ساری بات بعد میں ہوگی۔''

راجا نے اچھا کہہ کے فون بند کردیا۔ ہم اندھیرے میں لیٹے وقت کے لمحوں کو گزرتا ہوا شمار کرتے رہے... نور جہاں مجھ سے اس طرح چپکی ہوئی تھی کہ میں اس کی سانسوں کو اپنی گردن پر محسوس کرسکتا تھا... اس کے دل کی دھڑکن سن سکتا تھا۔ آہستہ آہستہ ہمارے جسموں کی گرمی ایک راحت افزا احساس میں ڈھل رہی تھی۔ اس رات کا ایک انوکھا تجربہ تھا جو اس کی اور میری غیر متوقع قربت کا سبب بن گیا تھا۔ ورنہ یہ ہم نے کب سوچا تھا کہ ایسی برسات کی رات میں ہم اس ویرانے میں... اس کوٹھری میں اور اس چارپائی پر ایسے یک جان دو قالب ہوں گے۔

راجا کے فون کا انتظار طویل ہوتا گیا... میں اس کا سبب سمجھنے سے قاصر تھا۔ اگر اس کی بات غنی یا شیر خان یا شہزاد میں سے کسی سے ہوجاتی تو کوئی مجھ سے رابطہ کرتا... ورنہ راجا کا فون تو آنا چاہیے کہ ان سے رابطہ نہیں ہوا۔

میں بالکل سیدھا لیٹا ہوا تھا اور نور جہاں کا سر میرے ایک بازو پر تھا۔ بان کی چارپائی پر یہ بازو شل ہوچکا تھا مگر نور جہاں میری طرف کروٹ کیے گہری گہری سانسیں لے رہی تھی... قربت اور جسموں کا یہ اتصال اب جذبات پر اثر انداز ہونے لگا تھا۔ میں نے آہستہ سے اپنا بازو آزاد کیا اور اس کی طرف کروٹ لی۔

نور جہاں نے سرگوشی میں کہا۔ ''کیا تم کو... یہ ایسا نہیں لگ رہا ہے...''

میرے کچھ جواب میں کہنے سے پہلے راجا کا فون آگیا۔ میں نے نیچے گرجانے والا موبائل فون اٹھالیا... ''کیا راجا... اتنی دیر۔''

''یار مجھے کسی سے کوئی جواب نہیں مل رہا ہے... خراب موسم کی وجہ سے مواصلاتی نظام متاثر ہوا ہے۔''

میں نے کہا... ''نہیں راجا... بات کچھ اور ہے۔''

پھر میں نے اسے کم سے کم الفاظ میں ساری بات بتادی۔ اس کا پریشان ہونا لازمی تھا ''اب تم لوگ کہاں ہو؟''

میں نے کہا۔ ''مجھے نہیں معلوم... ہم اندھیرے میں بھاگے اور کھیتوں میں چلے گئے... اب ایک ٹیوب ویل کی کوٹھری میں چھپے ہوئے ہیں۔''

''اور باقی سب؟''

''مجھے نہیں معلوم... اب تو ہمت کرکے نکل... اپنے ساتھ گارڈ لے کر جا اور دیکھ... انہیں پولیس لے گئی رانا سمیت یا رانا پولیس کی مدد سے انہیں لے گیا۔''

''ٹھیک ہے... تم لوگ وہیں ٹھہرو۔''

''ہم اس وقت کہاں جاسکتے ہیں راجا... نہ جگہ کا آئیڈیا ہے اور نہ سمت کا کوئی اندازہ ہے... باہر بارش اور کیچڑ ہے۔''

''تم صبح کا انتظار کروگے۔''

''ظاہر ہے... اس وقت اگر تو ہماری مدد کے لیے آنا چاہے تو ہم کیا بتاسکتے ہیں کہ کہاں ہیں... تین چار گھنٹے گزاریں گے یہاں۔''

''ٹھیک ہے... میں صورتِ حال پتا کرتا ہوں... اس وقت صرف شہناز کی گاڑی ہے... وہی لے کر نکلتا ہوں۔''

میں نے فون بند کرکے پھر نیچے رکھ دیا... کچھ دیر ہم خاموش لیٹے اندھیرے کو دیکھتے رہے پھر نور جہاں نے کہا۔ ''کیا کبھی تم اس رات کو بھلا پاؤ گے؟... جو زبردستی ہماری زندگی میں گھس آئی۔''

میں نے کہا۔ ''بعض واقعات ہمارے خواب و خیال اور تصور میں نہیں ہوتے... لیکن ہوجاتے ہیں۔ انہیں ہم حادثات میں شمار کرتے ہیں۔''

''لیکن ہر حادثہ اتنا خوشگوار نہیں ہوتا... مجھے تو لگتا ہے کہ یہ سب ہماری زندگی میں ایک خوبصورت رات کا اضافہ کرنے کے لیے تھا۔ جیسے ایک دیہاتی نے کہا تھا کہ میلہ تو میرا رومال چرانے کے لیے لگایا گیا تھا... یہ حادثہ... بارش... ہمارا فرار ہوکے یہاں آجانا... یہ خلوت۔''

میرے کانوں میں رفیع اور لتا کے ایک گانے کی صدا گونجنے لگی... زندگی بھر نہیں بھولے گی وہ برسات کی رات... کچھ دیر بعد میں سب بھول گیا کہ میں کون ہوں اور کہاں ہوں... تاریک رات... بارش... بجلی کی چمک اور گرج... سب کا احساس مٹ گیا... راجا کے فون کا انتظار ہی نہ رہا... صبح کے اجالے کا انتظار ہی نہ رہا... ضبط بھی نہ رہا... قرار ہی نہ رہا... جو رہی تو بے خبری رہی۔

مدہوشی اور خواب جیسی کیفیت کے کسی لمحے میں مجھے یوں لگا جیسے کہیں سے موسیقی کی بازگشت مجھے بیدار کررہی ہے۔ یہ موبائل فون کی رنگ ٹون تھی۔ میں ہڑبڑا کے اٹھا اور نیچے لپک کے فون اٹھالیا۔ اسکرین پر راجا کا نمبر روشن تھا۔

میں نے کہا۔ ''ہیلو راجا... کیا خبر ہے؟''

وہ بولا۔ ''سب ٹھیک ہے... تو کیا سو رہا تھا؟ تیری آواز سے لگتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''نیند کیسی... میں انتظار کررہا تھا تیرے فون کا۔''

نور جہاں نے مجھے ٹھوکا دیا اور میرے کان میں سرگوشی کی ''جھوٹے۔''

راجا نے کہا۔ ''مجھے غنی نے اور شہزاد نے سب بتادیا۔''

''وہ کہاں ہیں اس وقت؟''

''میرے ساتھ... رانا نے پولیس سے مک مکا کرلیا کہ اندھیرا اور بارش کی وجہ سے اور ڈرائیور کی بے احتیاطی سے ایکسی ڈنٹ ہوگیا۔''

''پولیس کیسے پہنچ گئی وہاں... اور جو فائرنگ ہوئی۔''

''فون پر کیا بتاؤں... بس سمجھ لے کہ سب خیریت ہے۔ رانا کی جان بھی بچ گئی... ہماری بھی... وہ اپنی گاڑی لے کر چلا گیا۔ ہم اپنی گاڑیاں لے کر یہاں آگئے... ورنہ۔''

''گاڑیاں چلنے کے قابل تھیں؟''

''ہاں... لائٹس چورا ہوگئیں... وہ میرے پیچھے پیچھے آئے... صبح ورکشاپ کھلے گی تو کام ہوگا۔''

''صبح ہونے میں اب کتنی دیر ہے؟''

''ساڑھے چار بجے ہیں... ایک گھنٹے تک اجالا ہوجائے گا۔ تجھے اندازہ تو ہوگا کہ سڑک سے بھاگ کے تم کتنی دور گئے تھے۔''

میں نے کہا... ''میرا خیال ہے ایک کلومیٹر۔''

''تو اندازے سے سڑک کی طرف آجا... بارش رک گئی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ہاں... لیکن پانی بھرا ہوا ہے... کیچڑ ہے۔''

راجا نے کہا۔ ''اب ہیلی کاپٹر تو تمہیں پک کرنے سے رہا... سڑک پر ہم تمہیں تلاش کرلیں گے۔'' پھر فون بند ہوگیا۔

نور جہاں آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔ میں نے کہا۔ ''چلو اٹھو... صبح ہونے والی ہے...''

اس نے مجھے پھر کھینچ لیا۔ ''ابھی ہوئی تو نہیں ہے نا... اور کتنا اچھا ہوتا اگر اس رات کی صبح نہ ہوتی۔''

میں نے کہا۔ ''پھر کیا ہوتا...''

''کچھ نہیں... بس موت آجاتی... زندگی تمام ہوجاتی۔''

''تم تو پاگل ہو۔''

''ہاں... تم نے کردیا ہے۔ ایک اچھی خبر سنو گے... جو ایک یادگار شب کی تاریخ سے منسوب رہے گی... ہمیشہ... ساری زندگی۔''

میں نے کہا۔ ''ایسی کون سی خبر ہے؟''

اس نے میرے کان میں کہا۔ ''میں ماں بننے والی ہوں... تمہارے بچے کی ماں۔''

مجھے جیسے بھڑ نے کاٹ لیا۔ میں ایک دم اٹھ بیٹھا۔ ''بکواس کرتی ہو تم... یہ کیسے ہوسکتا ہے۔''

وہ اسی طرح سکون سے لیٹی رہی۔ ''اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ شعر ٹھیک پڑھا نا میں نے۔''

میرے کانوں میں سائیں سائیں ہورہی تھی جیسے نور جہاں نے بے خبری میں میرے کانوں پر ریوالور رکھ کے فائر کردیا ہو ''غلط کہتی ہو تم!''

''پہلے کبھی تم سے غلط کہا ہے۔''

میں نے چلّا کے کہا۔ ''نہیں... یہ میرا بچہ نہیں ہوسکتا... تم جھوٹ بول رہی ہو... یہ اکبر خان کا بچہ ہے۔''

”یہ اکبر خان کا بچہ نہیں ہے۔“

”یہ تم اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہو۔“

وہ سکون سے بولی۔ ”ہر عورت پورے یقین سے بتا سکتی ہے کہ بچے کا باپ کون ہے... اکبر خان میرا شوہر نہیں تھا کہ میں اس کے بچے کی ماں بنتی... اگر وہ چاہتا تب بھی میں منظور نہ کرتی لیکن اس نے کبھی کہا بھی نہیں... اب میں نے خود ہی ماں بننا چاہا تو مجھے روکنے والا کون تھا۔“

معلوم نہیں یہ غصہ تھا یا پچھتاوا... صدمہ تھا یا عقل کے ماؤف ہو جانے کا اثر... کہ میں نے نور جہاں کو بالوں سے پکڑ کے جھٹکے دیے اور چلانے لگا ”یہ غلط ہے... تم جھوٹ بکتی ہو... بے وقوف بنا رہی ہو مجھے... بلیک میل کرنا چاہتی ہو۔“

وہ چلائی۔ ”وحشی... خود غرض آدمی... اس سے تو بہتر ہے کہ مار ڈالو مجھے... گلا گھونٹ دو میرا۔ کون ہے یہاں دیکھنے والا اور کون ہے میرا وارث اس دنیا میں۔“

یکلخت مجھے ہوش آ گیا... میں نے اس کے بال چھوڑ دیے۔ وہ نیچے گر کے رونے لگی ”ساری دنیا نے میرا استعمال کیا۔ مجھے ایک خوبصورت کھلونا سمجھ کے... اپنا دل بہلایا... تم نے بھی... مجھے استعمال کی چیز سمجھا۔“

میں نے جلدی سے کہا۔ ”ایسی بات نہیں نور جہاں۔“

”ایسی ہی بات ہے نواب صاحب... ایسی کون سی انہونی بات ہو گئی اگر میرے پیٹ میں تمہاری نشانی آ گئی... ہر عورت کی طرح ہوں میں بھی... قدرت نے میرے اندر جو نظام رکھا ہے... وہ ایسا ہی ہے... کیا تم بچے ہو کہ یہ بات نہیں جانتے... تمہاری ماں نے بھی تو تمہیں ایسے ہی جنا ہوگا۔“

”خدا کے لیے چپ ہو جاؤ نور جہاں... مجھے سوچنے دو۔“

”اب کیا ہے سوچنے کے لیے... جو ہونا تھا ہو گیا... اگر تم سوچ رہے ہو کہ کونپل پھوٹنے سے پہلے ہی زمین سے بیج کو نکال پھینکو گے تو یہ بھول ہے تمہاری... جو میری چیز ہے اس پر تم کوئی اختیار نہیں رکھتے۔“

میں نے تلخی سے کہا۔ ”ہاں... ہتھیار تو اب آیا ہے تمہارے ہاتھ میں... میرے خلاف استعمال کے لیے۔“

وہ ایک دم اٹھ کے میرے سامنے کھڑی ہو گئی۔ ”معاف کرنا نواب صاحب... آپ نے غلط سمجھا مجھے۔ نہ میں نے آپ سے محبت کی بھیک مانگی تھی اور نہ اب رحم کی بھیک مانگوں گی۔ محبت میں نے کی تھی... غیر مشروط اور یک طرفہ۔ آپ آزاد ہیں... نہ آپ کی عزت پر حرف آئے گا نہ آپ پر کوئی ذمے داری ہوگی۔ نہ میری نہ اس بچے کی۔ اب تک آپ نے جو کیا اس کے لیے بہت شکریہ... آئندہ کے لیے میری فکر چھوڑ دیں... جو کرنا ہوگا اپنے لیے میں خود کر سکتی ہوں... جہاں جانا ہوگا خود چلی جاؤں گی۔ کیا اب ہم چلیں۔“ وہ باہر نکلی اور سڑک کی طرف روانہ ہو گئی۔

میں تیز قدم اٹھا کے اس کے ساتھ چلنے لگا۔ باہر اجالا پھیل رہا تھا۔ بارش تھم چکی تھی اور بادل چھٹ رہے تھے۔ کائنات سکوت اور سکون کی کیفیت میں تھی لیکن میرے دماغ میں آتش فشاں کا لاوا میرے مستقبل کو جھلسا رہا تھا۔ ابھی فریال کا زخم تازہ تھا کہ نور جہاں نے مجھے ایک اور سنگین الزام سے لہولہان کر دیا۔

میں نے محسوس کیا کہ میرے چاروں طرف ان گنت ہاتھوں میں پتھر ہیں... یہ ہاتھ ان دوستوں کے ہیں جو اب دشمن ہو گئے ہیں۔ نہیں ہے یہ شخص... یہ نواب رفیق احمد شیرازی اس قابل کہ ہم پر اس سے شناسائی کی تہمت آئے... یہ کوتاہ اندیش... ہوس پرست... بے ضمیر و بے کردار شخص... جو بیک وقت دو عورتوں کو محبت کا فریب دیتا رہا... آج دو بچوں کا باپ ہونے سے کیسے انکار کر سکتا ہے۔ یہ ساری دنیا کی نظر میں پاکباز بننا چاہتا ہے... ان دونوں عورتوں کو الزام دے کر خود کو بچانا چاہتا ہے۔“

نور جہاں کو چلتے چلتے ٹھوکر لگی... میں نے ایک دم اسے سنبھال لیا ورنہ اس کے سامنے کیچڑ اور پانی کا ایک تالاب تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ ”کیوں بچاتے ہو مجھے گرنے سے... میں تو پہلے ہی بہت گری ہوئی عورت ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”دیکھو نور جہاں... مجھے غلط مت سمجھو۔“

”غلط تم نے سمجھا مجھے... اس کا دکھ ہے مجھے... مجھے بتاؤ کیا میں نے کبھی تم سے کچھ مانگا... کبھی کوئی توقع کوئی آس رکھی؟... میں نے تو خود اپنی ہستی کو مٹا دیا... اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا.. سب کچھ اور کبھی اپنی زندگی کو تمہاری خوشی سے زیادہ اہم نہیں سمجھا۔ آج تم کہتے ہو کہ میں جھوٹ بولتی ہوں... بلیک میل کرنا چاہتی ہوں تمہیں... کیا ملے گا مجھے تم سے؟... کیا تم اپنے ولی عہد کو آدھی ریاست بخش دو گے؟“

نور جہاں نے مجھ سے کبھی اس لہجے میں بات نہیں کی تھی۔ میں نے کہا۔ ”پلیز نور جہاں... مجھے اتنا ذلیل مت کرو... میں پہلے ہی اپنی نظر سے گر چکا ہوں۔“

اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے اپنے ہونٹوں سے چوما اور اپنی آنکھوں سے لگایا ”میں کسی کو نہیں بتاؤں گی چندا... کسی پر بھی ظاہر نہیں ہونے دوں گی کہ یہ کس کی نشانی ہے... لیکن اسے میں سینے سے لگا کے رکھوں گی... پالوں گی اور بڑا کروں گی۔

خدا کرے وہ بالکل تم جیسا ہو... تاکہ جب تم میرے خیالوں کے آسمان سے بھی دور کہیں اپنی دنیا کی خوشیوں میں مجھے فراموش کیے بیٹھے ہو... تو میں تم کو اپنے سامنے دیکھ سکوں۔“

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا ”ایسا مت کہو... اب میرے لیے یہ ممکن نہیں رہا کہ تمہیں چھوڑ سکوں۔“

”ابھی تم جذباتی ہو رہے ہو... یہ نہ ممکن ہے... تم مجھے اپنے ساتھ کیسے رکھ سکتے ہو... مجھے جانا ہے... تم نے مجھے عارضی پناہ دی ہے۔ اس کے بعد تم مجھے نکال دو گے۔ اپنے دل سے... اپنی حویلی سے اور اس ملک سے۔ کسی گمنام زندگی کا تحفہ دے کر مجھے کسی اجنبی ساحل پر چھوڑ دو گے کہ جاؤ اب جیسے چاہو جیو... اپنا نام بدلو یا شناخت... پھر تم چلے جاؤ گے اور پلٹ کر بھی نہ دیکھو گے۔“

”شاید کل کے بارے میں ابھی خود مجھے معلوم نہیں کہ کل کیا ہوگا... اس کی بات مت کرو۔“ میں نے کہا۔

اب ہم سڑک پر پہنچ گئے تھے۔ ہم اب فصلوں کے درمیان سے گزر کے نہیں آئے تھے۔ ہم کھیتوں کے درمیان حد بندی کرنے والی چھوٹی چھوٹی منڈیروں پر چلتے رہے تھے جو پانی اور کیچڑ سے محفوظ تھیں۔ وہ سب کیچڑ جو گزشتہ شب ہمارے کپڑوں اور جوتوں میں بھر گیا تھا دھل چکا تھا۔ ہمارے کپڑے صاف تھے اور چہرے معصوم تھے۔ گزشتہ رات کی کوئی ملامت کا داغ رکھنے والی نشانی ہمارے ظاہر و باطن سے عیاں نہ تھی۔

جب دور سے مجھے راجا کی کار نظر آئی تو میں وقتی طور پر سب بھول گیا۔ گاڑی قریب آ کے رکی اور اس میں سے راجا کے ساتھ شہزاد برآمد ہوا۔

”ہم تو بہت دیر سے پھر رہے ہیں اس سڑک پر۔“ راجا بولا۔

میں نے کہا۔ ”ہم ابھی پہنچے ہیں۔“

”کہاں چھپے رہے تم رات بھر؟“

میں نے کہا۔ ”ایک ٹیوب ویل لگا ہوا تھا اس کوٹھری میں۔“

شہزاد نے کہا۔ ”تشویش کے مارے راجا صاحب کا حال خراب تھا۔“

”اور ان دونوں کی صورت دیکھو۔“ راجا بولا۔

میں نے کہا۔ ”ہمیں کیا ہوا ہے۔“

”لگتا ہے رات بھر روتے رہے اماں کو یاد کر کے۔ جیسے بچھڑے ہوئے بچے روتے ہیں...“ راجا بولا۔ ”چلو بیٹھو گاڑی میں۔“

شہزاد آگے بیٹھ گیا تھا چنانچہ مجھے نور جہاں کے ساتھ پیچھے بیٹھنا پڑا۔ وہ گم سم تھی اور باہر دیکھ رہی تھی۔

میں نے بیٹھتے ہی کہا۔ ”پہلے مجھے بتاؤ رانا نے تمہیں کیسے چھوڑ دیا“

شہزاد ایک دم پلٹا۔ ”رانا نے کیسے چھوڑ دیا۔؟ آپ بھی کمال بات کرتے ہیں... یہ پوچھیے ہم نے اسے کیسے چھوڑا۔ پولیس بالکل اتفاق سے آ گئی تھی... انہیں ٹیلہ جوگیاں سے کسی نے فون کیا تھا کہ یہاں ڈاکو ایک گھر میں گھسے ہوئے ہیں۔ گھر کسی ریٹائرڈ فوجی افسر کا تھا۔ ان کو جانا پڑا۔ راستے میں رانا اور ہم سب مل گئے۔ اسی وقت میں پولیس کو بتایا کہ میں وکیل ہوں... اور مطالبہ کرتا کہ رانا کو گرفتار کیا جائے کیونکہ یہ ایک مفرور مجرم ہے۔“

”وکیل صاحب! رہنے دیں یہ بات... اس جنگل میں آپ کی وکالت چلنے والی نہیں تھی۔ رانا کی اس علاقے میں چلتی ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں اس نے کتنے رعب سے بتایا تھا کہ میں رانا رجب علی ہوں... رکن اسمبلی... تو پولیس والوں کی کیا حالت ہوئی تھی۔“

”میں پولیس کو بھی نہ چھوڑتا مگر تم ڈر گئے۔“

راجا نے کہا۔ ”میں ڈرا نہیں... میں نے مصلحت اسی میں دیکھی۔ رانا نے خود کہا کہ اندازے کی غلطی سے حادثہ ہو گیا۔ سڑک چھوٹی ہے اور بارش بہت تیز تھی۔ اس نے کہا کہ ہم دونوں گاڑیوں کی مرمت کا خرچا بھی دیں گے کیونکہ غلطی میرے ڈرائیور کی تھی۔“

”اور ڈرائیور کہاں تھا... پولیس نے دیکھا نہیں کہ اسے گولی کا زخم آیا ہے۔“ میں نے کہا۔

”نہیں... رانا نے اسے گاڑی میں ڈال دیا تھا۔ جب اس نے فائرنگ کا کوئی حوالہ نہیں دیا تو میں بھی خاموش رہا۔ غنی اور شیر خان نے ہی زیادہ گولیاں چلائی تھیں۔ وہ بھی الگ کھڑے رہے۔ پولیس والے کرتے بھی کیا... انہیں ٹیلہ جوگیاں پہنچنا تھا۔ وہ چلے گئے لیکن رانا انہی کے ساتھ نکل گیا تھا۔ ڈرائیونگ وہ خود کر رہا تھا۔“

میں نے کہا۔ ”اور وہ گاڑی جو اس کے ساتھ تھی۔ جو آگے نکل گئی تھی اور کسی درخت سے ٹکرا کے تباہ ہوئی تھی؟“

”اس میں دو مرد تھے... غالباً اس کے محافظ اور ایک عورت تھی... وہ سب ہلاک ہو گئے۔“

”پولیس نے ان کے بارے میں نہیں پوچھا۔“

”رانا نے ان کی بات ہی نہیں کی۔ آگے جا کے پولیس نے دیکھا ہوگا تو یہی سمجھا ہوگا کہ طوفانی بارش میں ہونے والا

یہ دوسرا حادثہ ہے۔ اس کا رانا سے تعلق کیسے ثابت ہوسکتا تھا۔"

میں نے کہا۔ "لیکن وہ رانا کو چھوڑ کے فرار کیوں ہوئے تھے۔ رانا نے چلا کے کہا بھی تھا کہ کہاں بھاگ رہے ہو نمک حراموں!"

"یہ معلوم نہیں... رات کو جب میں اکیلا آرہا تھا تو میں نے بھی اس کار کو دیکھا تھا اور کار روک کے اندر بھی جھانکا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ گاڑی رانا کے ساتھ تھی۔ میں نے یہی سمجھا کہ کسی کار کا ایکسی ڈنٹ ہوا ہے۔ اندر جھانکنے کا مقصد یہ تھا کہ کوئی زندہ ہو تو مدد کروں۔ ایک عورت کو دیکھ کر میں سمجھا کہ کوئی فیملی ہے۔ یہ تو بعد میں پتا چلا کہ وہ رانا کے ساتھی تھے۔"

شہزاد نے کہا۔ "ہم نے ابھی کچھ دیر پہلے جا کے دیکھا تو وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ کار نہ مرنے والے۔"

"کیا پولیس لے گئی انہیں۔"

"پولیس اتنی مستعد نہیں ہوسکتی کہ راتوں رات جائے واردات پر پہنچ جائے۔ یہ کارروائی رانا کے حکم پر ہوئی۔ اس نے گھر پہنچتے ہی اپنے بندے بھیج دیے۔ میرا خیال ہے اب نہ گاڑی کا سراغ ملے گا اور نہ مرنے والوں کا۔ خیر ہمیں کیا۔ رانا نے بھی جان چھڑائی۔"

"ہاں... یہ بتاؤ اپنے سب لوگ ٹھیک ہیں نا۔ کسی کو چوٹ تو نہیں آئی۔" میں نے پوچھا۔

"اللہ کے فضل سے کسی کو کچھ نہیں ہوا۔ خراش تک نہیں آئی۔ غنی اور شیر خان گاڑیاں ٹھیک کرا کے آئیں گے۔" راجا نے کہا۔

"رانا کی یہ چال بھی الٹ گئی۔ اس نے ہماری دو گاڑیوں کو آتے دیکھا ہوگا تو سمجھ گیا ہوگا کہ ان میں کون ہوگا... اپنے گھر والوں کی گاڑیاں وہ پہچانتا ہوگا۔" میں نے کہا۔

راجا بولا۔ "پھر بھی اس پاگل پن کی وجہ... سامنے سے گاڑی ٹکرادی۔"

میں نے کہا۔ "یہ غرور فرعونیت کا پاگل پن تھا۔ گاڑی کا نقصان ہوتا ہے تو ہونے دو... ہم نئی لے سکتے ہیں۔"

نور جہاں نے کہا۔ "وہ خود بھی زخمی ہوسکتا تھا۔"

"نہیں... اتنی کم رفتار پر اس کا چانس نہیں تھا۔ ممکن ہے اس نے سیٹ بیلٹ بھی باندھ لی ہو۔ اس کے علاوہ مجھے اس کے لب و لہجے سے شک ہوا تھا کہ وہ نشے میں ہوگا... اس کا اثر ابھی باقی تھا۔ اس کی زبان میں کچھ لکنت تھی اور اسے اعصاب پر بھی پوری طرح قابو نہیں تھا۔" راجا بولا۔

میں نے کہا "جب ہماری طرف سے فائرنگ ہوئی تو سارا نشہ ہرن ہوگیا... لینے کے دینے پڑ گئے۔ مزید یہ کہ پولیس آگئی۔ اس نے اپنا تعارف کرایا۔ سارا الزام اپنے سر لیا۔ ذمے داری قبول کی اور بھاگ گیا۔"

"ابھی یہ معمہ حل ہونا باقی ہے کہ دوسری گاڑی میں کون لوگ تھے اور وہ فرار کیوں ہوئے۔ انہوں نے رانا کی مدد کیوں نہیں کی۔"

میں نے کہا۔ "اس کے بہت سے اسباب ہوسکتے ہیں۔ وہ لوگ مسلح نہیں تھے۔ وہ رانا کے ساتھ پکڑے جانا نہیں چاہتے تھے۔ کیا پتا وہ عورت کون تھی۔ ہوسکتا ہے وہ رانا کے گھر کی کوئی عورت ہو۔ اسے بحفاظت نکال کر لے جانا ضروری ہو۔"

"اگر ہم پکڑے جاتے تو کیا ہوتا۔" نور جہاں نے کہا۔

میں نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ "وہی ہوتا جو تمہارا حکم ہوتا۔ تمہاری نظر کا اشارا ہوتا۔ رانا کا نانا... سب تمہارے غلام..."

"باتیں تم سے جتنی چاہو کرالو۔" وہ بولی لیکن اس نے اپنا ہاتھ نہیں چھڑایا۔

جب ہم راولپنڈی پہنچے تو سورج کافی اوپر آگیا تھا۔ لالہ زار کالونی میں شہزاد کے گھر تک پہنچتے ہوئے ساڑھے نو بج گئے۔ وہ متوسط اور اپر کلاس کے لوگوں کی ملی جلی آبادی تھی جو خاصی مہنگی سمجھی جاتی تھی۔ اس نے خود ہی اتر کے گیٹ کھولا اور پھر گاڑی کو اندر لے گیا۔

ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے جو زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن خوبصورتی سے آراستہ تھا۔ دیوار پر کچھ مشہور پینٹنگز کی ری پروڈکشن فریم کر کے لگائی گئی تھیں۔ لمبائی کے رخ نصف حصے میں آٹھ کرسیوں والی گلاس ٹاپ ٹیبل لگی ہوئی تھی اور اس کے پیچھے برتنوں کی الماری نظر آرہی تھی۔

نور جہاں کو شہزاد اپنے ساتھ اندر لے گیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ پانی لے کر آیا تو اس کے ساتھ ایک ضعیف خاتون تھیں جن کے سر کے بیشتر بال سفید تھے لیکن وہ سیدھی چلتی تھیں اور انہوں نے چشمہ بھی نہیں لگا رکھا تھا۔ ان کا لباس بھی عمر کی مناسبت سے بہت سادہ تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ اس کی خالہ ہوں گی۔ ماں تو معذوری کے باعث دیکھنے سے قاصر تھیں۔ وہ پیچھے پیچھے آئیں، ان کا ہاتھ نور جہاں نے تھام رکھا تھا۔

شہزاد نے ہمارا تعارف اپنے دوستوں کی حیثیت سے کرایا۔ اس کی خالہ نے ہمارے سلام کے جواب میں دعا دی

اور پھر ناشتا بنانے چلی گئیں۔ اس کی ماں ہمارے سامنے بیٹھ گئیں۔

"تم کب سے جانتے ہو شہزاد کو... کیا نام بتایا تم نے۔" انہوں نے سوال کیا۔

میں نے کہا۔ "رفیق احمد شیرازی... ہماری ملاقات ابھی ہوئی ہے۔"

"ابھی کب؟... شہزاد کے پریکٹس شروع کرنے کے بعد یا پہلے سے جان پہچان تھی۔" انہوں نے جرح کے انداز میں پوچھا۔

میں نے کہا۔ "پریکٹس شروع کرنے کے بعد"

"اچھا۔ کیا تم بھی وکیل ہو؟ شادی ہوگئی تمہاری۔"

میں نے کہا۔ "جی نہیں... یہ دونوں سوالوں کا جواب ہے۔"

"کیا کرتے ہو؟" انہوں نے کہا۔

میں نے کہا۔ "جی میں نے ایم بی اے کیا ہے۔ کچھ زمین ہے میری۔"

"والد کیا کرتے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "جی وہ کالج میں پڑھاتے تھے۔ ریٹائر ہوگئے ہیں۔"

"اچھا اچھا!" اس جواب نے جیسے انہیں مطمئن کردیا۔ "مگر یہ شیرازی کیا ہے۔ تم لوگ ایران سے آئے تھے۔"

میں نے کہا۔ "میرے آباواجداد آئے ہوں گے۔ مجھے علم نہیں۔"

"اور تم..." وہ راجا کی طرف متوجہ ہوگئیں۔

راجا نے ایک سانس میں کہا۔ "جی میں صحافی ہوں۔ رفیق صاحب کا دوست ہوں... شادی نہیں ہوئی۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہیں۔ "شاید تمہیں میرا سوال کرنا اچھا نہ لگا لیکن بیٹا۔ شہزاد کی طرف سے فکرمند رہنا میری عادت سے بڑھ کر فطرت بن چکی ہے۔ جانتی ہوں اب وہ بچہ نہیں رہا لیکن کیا کروں۔ ایک بیٹا ہے۔ اسے میں نے بڑی مشکلوں سے پالا ہے اور زمانہ بڑا خراب ہے۔ وہ کن لوگوں سے ملتا ہے..."

راجا نے شرمندگی سے کہا۔ "اپنی تسلی کرنا آپ کا حق ہے۔"

"مجھے کچھ نظر تو آتا نہیں۔ نہ ہر جگہ اس کے ساتھ باہر جاسکتی ہوں۔ جو وہ بتائے یا کوئی اور۔ مجھے ماننا پڑتا ہے۔ وہ مجھ سے جھوٹ بھی بول سکتا ہے لیکن بولتا نہیں۔" انہوں نے کہا اور پھر نور جہاں کی طرف متوجہ ہوگئیں۔

نور جہاں ان کے سوالات کے جوابات شہزاد کی بریفنگ کے مطابق دیتی رہی اور انہیں مطمئن کرنے میں بھی کامیاب رہی۔ پھر ناشتا آگیا اور ناشتے کے بعد ہم نے ان سے اجازت لی۔

شہزاد ہمارے ساتھ باہر تک آیا۔ "امی کی باتوں کا برا نہ منایئے گا... حالات نے انہیں بہت شکی مزاج بنا دیا ہے۔ وہ میری طرف سے خوامخواہ فکرمند رہتی ہیں۔"

میں نے کہا۔ "ہر ماں رہتی ہے... اس میں برا ماننے والی کون سی بات ہے۔"

"ابھی وہ نور جہاں سے بھی بہت کچھ پوچھیں گی۔"

میں نے کہا۔ "وہ بھی جھوٹ بولنے میں ماہر ہے۔ ہماری طرح۔"

"امی جھوٹ کو پکڑ لیتی ہیں لیکن میں نور جہاں کو اچھی طرح سمجھا دوں گا۔"

میں نے کہا۔ "نور جہاں کے پاس ابھی کچھ نہیں ہے۔ اسے ضرورت کی ہر چیز لا کے دینے کی ذمے داری بھی تمہاری ہے۔"

"میں اپنی ذمے داری کو سمجھتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "اس کے لیے پیسے میں دوں گا۔ تم نور جہاں سے کچھ مت لینا۔ ہوسکتا ہے وہ چیک کاٹ دے لیکن اس میں رسک ہے۔"

"آپ کمال کرتے ہیں۔ آخر میں وکیل ہوں۔ کیا امی کی طرح آپ بھی مجھے نادان بچہ سمجھتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "سوری۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔"

دوپہر کے کھانے کے وقت ہم پھر اپنی حویلی میں تھے۔ ہمارے نور جہاں کے ساتھ راتوں رات نکل جانے کے انکشاف سے صبح بڑی سنسنی پھیلائی تھی اور ناراضی بھی۔ خواتین کا مجموعی ردِعمل ناخوشی سے زیادہ اطمینان کا تھا کہ بلا ٹلی۔ خس کم جہاں پاک... میرے دلائل راجا کے اصرار یا ابا جی کے فیصلے کے آگے کسی میں انکار کی ہمت نہ تھی اور سب نے اس صورت حال کو بادلِ ناخواستہ قبول کرلیا تھا۔

ابا جی بہت خفا تھے۔ "آخر یہ کیا کھیل ہو رہا ہے... تم نے تماشا بنا لیا ہے ہمیں بھی۔ پہلے ایک بات ہم سب سے منواتے ہو... پھر خود پیچھے ہٹ جاتے ہو۔"

میں نے کہا "ابا جی ہر فیصلہ حالات کے مطابق کرنا پڑتا ہے۔"

"رات کے کھانے تک کچھ نہیں تھا پھر حالات بدل گئے۔ تم ایسی شدید طوفانی بارش میں نکل کھڑے ہوئے اور چلو

ایسی کوئی بات ہوئی تھی تو کم سے کم ہمیں بتا جاتے لیکن ہم کو اس قابل ہی نہیں سمجھا جاتا۔ بس ہم تمہاری ہاں میں ہاں ملاتے رہیں۔ تم کہو دن ہے تو دن مان لیں۔"

میں نے کہا۔ "آپ کیسی باتیں کرتے ہیں ابا جی۔ آپ کی اجازت نہ ہوتی تو وہ یہاں رہ سکتی تھی۔"

"رہنے دو میاں۔ اجازت ہم نے تمہاری مرضی دیکھ کر دی۔ اپنی عزت کی خاطر۔ ہم انکار کر دیتے تو کون سا تم اسے یہاں سے لے جاتے۔ لے جاتے وقت کون سی ہماری مرضی پوچھی۔ خیر ہمیں کیا۔ ہم تو جا رہے ہیں۔"

میں نے چونک کے کہا۔ "کہاں جا رہے ہیں۔"

"بس بلاوا آ گیا ہے..." انہوں نے تکیے کے نیچے سے ایک خط نکالا۔ "ہمارا نام آ گیا ہے قرعہ اندازی میں۔"

میں نے وزارت حج و اوقاف کا لیٹر دیکھا۔ "آپ حج پر جا رہے ہیں بڑی خوشی کی بات ہے۔ آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔"

"ابھی بہت سے کام ہیں۔ پیسے جمع کرانے ہیں۔ پاسپورٹ بنوانے ہیں۔ اس کے بعد جو مراحل ہوتے ہیں اپنا گروپ اور معلم وغیرہ منتخب کرنے کے۔"

میں نے کہا۔ "آپ فکر ہی نہ کریں... سب ہو جائے گا۔"

"یہاں بیٹھے بیٹھے تو نہیں ہوگا... ہم نے سوچا ہے اسلام آباد چلے جائیں۔"

میں نے کہا۔ "وہاں رہائش کا مسئلہ ہوگا۔"

"کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔"

شام تک میرا سارا وقت خواتین کو اس خطرے کی نوعیت سمجھاتے گزرا جو گزشتہ شب طوفانی بارش میں اچانک پیدا ہو گئی تھی۔ راجا اپنی ہر بات شہناز سے منوا لیتا تھا۔ لیلیٰ بھابی مروت میں سب مان لیتی تھیں... مصیبت تھی رابعہ جس نے اعلان کر دیا تھا کہ میں ایک مستند جھوٹا ہوں اور فی البدیہہ جھوٹ بولنے کا ایسا ماہر ہوں کہ مجھے جھوٹ میں پی ایچ ڈی کی سند اعزازی طور پر دی جا سکتی ہے۔

"تم میری کردار کشی کر رہی ہو کزن۔" میں نے فریاد کی۔

وہ بولی۔ "راجا صاحب تو پہلے ہی نواب صاحب کے جوڑی دار تھے۔ ماشاءاللہ سے بچپن میں ہی اس مضمون میں ڈاکٹریٹ لے چکے تھے پھر اس جھوٹ کی تکون کا تیسرا ضلع بنے فاروقی صاحب اور اب ان کی جگہ لی ہے شہزاد صاحب نے۔"

میں نے کہا۔ "اس نے ابھی تک شادی نہیں کی ہے۔"

رابعہ نے چیخ کے کہا۔ "یہ کس نے پوچھا ہے۔"

میں نے معصومیت سے کہا۔ "تم نے۔"

"میری پوچھتی ہے جوتی۔" رابعہ بولی۔

میں نے کہا۔ "چلو فرض کرو تمہاری دلچسپی کو دیکھتے ہوئے خود میں نے تمہیں اپ ڈیٹ کر دیا۔"

وہ بری طرح جھینپ کر چلائی۔ "میری دلچسپی۔"

راجا بولا۔ "ہاں... مجھے معلوم ہوا تھا کہ تم اس سے شادی کرنا چاہتی ہو۔"

رابعہ پر سب ہنسنے لگے تو اسے غصہ آ گیا۔ "راجا دروغ گو... کس سے معلوم ہوا ہے تمہیں... سچ بتاؤ ورنہ..."

"ورنہ کیا... ایک طرف کہتی ہو دروغ گو... دوسری طرف سچ بولنے کی بات کرتی ہو... ہم صحافی اپنی معلومات کا ذریعہ بتانے کے پابند نہیں ہوتے۔" راجا نے ڈھٹائی سے کہا۔

رابعہ نے شہناز سے فریاد کی۔ "تم دیکھ رہی ہو اسے؟"

راجا بولا۔ "یہ مجھے کئی سال سے دیکھ رہی ہے... اور اب تو اسے یقین ہے کہ میرے جیسا دوسرا اسے نہیں مل سکتا۔"

غنی کی آمد نے اس محفل کو تھوڑی دیر کے لیے ڈسٹرب کر دیا۔ میں نے کہا۔ "تم کیسے آئے... کیا گاڑی ٹھیک ہو گئی۔"

"کچھ ہو گئی ہے سر... باقی بعد میں کرا لیں گے۔"

میں نے کہا۔ "شیر خان کو تسلی دینا کہ ہم اسے نئی گاڑی لے کر دیں گے... شہزاد کی گاڑی کا کیا ہوا۔"

"اس کی ہیڈ لائٹس بدل دی تھی... شیر خان لے کر گیا ہے... مجھے آنا پڑا اس لیے کہ آج رات فنکشن تھا۔"

"کیسا فنکشن۔" میں نے پوچھا۔

"یہ لو... انہیں نور جہاں کے سوا دنیا کی خبر ہی نہیں" رابعہ نے اپنا بدلہ لیا۔ "اس کے آگے کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا۔"

شہناز نے کہا۔ "ہاں... فریال تک نظر نہیں آتی۔"

لیلیٰ بھابی نے ٹھنڈی سانس لی۔ "وہ تو ایسی گم ہوئی ہے کہ کسی کو بھی نظر نہیں آتی۔"

میں نے بہتر سمجھا کہ اس وار کو پی جاؤں۔ "تم اس فلم شو اور دعوت عام کی بات تو نہیں کر رہے ہو؟"

"اسی کی بات کر رہا ہوں سر... فلم والے پہنچ گئے ہیں اور اپنا انتظام کر رہے ہیں۔ اسکرین اور پروجیکٹر لگا رہے ہیں۔"

"فلم ہیر رانجھا؟" راجا نے پوچھا۔

"جی سر... میں ابھی ادھر سے چکر لگا کے آیا ہوں۔ لائٹ والوں نے اپنا کام مکمل کر لیا ہے۔ اب دریاں بچھا رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "کیا اندازہ ہے تمہارا... کتنے لوگ آئیں گے؟"

"پہلے پانچ ہزار کا خیال تھا۔ اب کچھ کم ہو جائیں گے... تین ہزار تک۔"

میں نے پوچھا۔ "وہ کیوں؟"

"دراصل کچھ دیہات میں مولوی لوگوں نے کہا ہے کہ جو سنیما دیکھنے جائے گا، اس کا نکاح ٹوٹ جائے گا... سنیما حرام ہے۔"

مجھے ہنسی آئی۔ "اچھا... اور لوگوں نے فتویٰ تسلیم کر لیا؟"

"کچھ پرانے لوگوں نے مان لیا... وہ اپنے بیوی بچوں کو نہیں آنے دیں گے... لیکن یہ آج کل کے بچے ماں باپ کے قابو میں کہاں ہیں۔"

میں نے کہا۔ "غنی... تم نے فتوے کو غلط ثابت کرنے کے لیے کچھ کیا۔"

"پہلے میں نے سوچا تھا سر... کے اعلان کرا دوں جو فلم دیکھنے نہیں آئے گا اسے نہ اسکول میں داخلہ ملے گا نہ اس کا علاج مفت کیا جائے گا۔"

"یہ تو بڑی غلط بات ہو جاتی۔"

"میں غصے میں تھا سر... ریشم نے مجھے کنٹرول کیا۔"

راجا بولا۔ "کیسے کنٹرول کیا بیٹے... جوتی اتار لی؟ یا ہنٹر سے کام لیا... تم نے تو ناک کٹوا دی مردوں کی شادی سے پہلے ہی۔"

وہ ہنسنے لگا۔ "اس نے مجھے سمجھایا کہ نیکی برباد مت کر۔ نہ ہم کسی کو تعلیم دینے سے انکار کریں گے نہ دوا دینے سے۔ خواہ وہ مسلمان ہو یا ہندو... بچہ ہو یا بوڑھا... دوست ہو یا دشمن۔"

راجا نے ٹھنڈی سانس لی۔ "کاش میری بیوی بھی اتنی ہی سمجھدار ہو... جو بھی ہو... جہاں بھی ہو۔"

رابعہ نے کہا۔ "تمہیں دور دور کہیں نظر آتی ہے کوئی ایسی بدبخت خاتون تو مجھے بتاؤ... میں اسے سمجھا دوں۔"

"پہلے تم خود تو سمجھدار ہو جاؤ بی بی... چلی ہیں دنیا کو سمجھانے... سمجھ نام کی کوئی چیز خود کے پاس بھی نہیں۔" راجا نے اسے ڈانٹا۔

میں نے غنی سے پوچھا۔ "غنی... یہ سب آج کس وقت ہے۔"

"فلم آٹھ بجے شروع ہوگی سر... کھانا اس سے پہلے مغرب کے فوراً بعد... ابھی ساڑھے پانچ بجے ہیں... میرا اندازہ ہے کہ چھ بجے سے لوگ آنے لگیں گے۔"

شہناز نے کہا۔ "کھانا تیار ہے۔"

"تیار ہو جائے گا ڈاکٹر صاحب... پلاؤ زردے کی دیگیں دم پر ہیں... میں دیکھ کے آیا ہوں۔"

"اور برتن... لوگ اپنے اپنے لائیں گے۔"

"پہلے یہی سوچا تھا... پھر میں نے پلیٹیں منگوالی ہیں شہر سے... چار افراد یا ایک فیملی کے لیے ایک بڑی پلیٹ... آپ کس وقت تشریف لائیں گے۔"

میں نے کہا۔ "تم بتاؤ۔"

شہناز نے کہا۔ "ہم سب لوگ اپنے مہمانوں کے ساتھ ہی کھانا کھائیں گے اور فلم بھی دیکھیں گے۔"

راجا نے فریاد کی۔ "ہم سب... مجھے تو میڈیکل سرٹیفکیٹ دے دو غیر حاضری کے لیے۔"

"جھوٹے سرٹیفکیٹ میں نہیں دیتی۔" شہناز نے ڈانٹا۔ "کسی کا کوئی بہانہ نہیں چلے گا... جب اماں ابا جا رہے ہیں تو باقی سب کو کیا ہے۔"

رابعہ نے مزید ڈانٹا۔ "ہم کون سی بیگار کے لیے جانے کا کہہ رہے ہیں... تفریح ہے۔"

میں نے کہا۔ "تفریح! خدا کا خوف کرو کزن... پلاؤ زردہ تو آدمی کھا لیتا ہے سلور کی تھالی میں ہاتھ سے... مگر ہیر رانجھا..."

اس وقت ریشم نے سینے پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ "او گاڈ... فردوس ویری بیوٹی فل لائک می... اینڈ اعجاز... واٹ سونگ اینڈ ڈانس... ہیرو نجلی سویٹ میوزک... آئی قربان۔"

سب کا ہنس ہنس کے حال برا ہو گیا۔ ریشم نے جس گانے کا ترجمہ کیا تھا وہ کچھ یوں تھا کہ... سن ونجلی دی مٹھری تان وے۔ میں تاں ہو ہو گئی قربان وے۔

غنی جانے لگا تو میں نے کہا۔ "غنی۔"

وہ رک گیا۔ "جی سر!"

"تم نے سیکیورٹی کے انتظامات کو تو نظر انداز نہیں کیا ہے۔ ہمارے مخالفین شرارت کر سکتے ہیں۔"

"بس سر... مخالفین اور مولوی... میں نے تیس یا بیس بندے رکھے ہیں۔ وہ ڈانگ لے کر کھڑے رہیں گے... کوئی بجلی کا تار کاٹ دے... سانپ یا بیل چھوڑ دے۔"

میں نے کہا۔ "اوہ! یہ بھی ہوتا ہے۔"

''ہاں جی... ایک شادی ہو رہی تھی اِدھر... لڑکی راضی نہیں تھی۔ اس کے ایک چاہنے والے نے نکاح کے وقت مولوی کے قریب کالا ناگ چھوڑ دیا... لو جی مولوی تو چیخ مار کے ایسا دوڑا کہ پلٹ کر نہیں دیکھا... لیکن دولہا اس سے پہلے سہرا پھینک کے دوڑا... دوسری طرف سے ایک بیل باراتیوں میں گھس آیا اسے شراب پلا دی گئی تھی... اس نے اِدھر اُدھر بہت سے بندے لٹائے مگر پھر سامنے آ گیا دولہا۔ اس نے سینگوں پر اٹھا کے پھینکا تو اس کا ایک بازو ٹوٹ گیا اور پسلیاں بھی۔''

سب اتنا ہنسے کہ خواتین نے پیٹ پکڑ لیا... میرے بھی آنسو نکل آئے... یہ کسی زبردست کامیڈی فلم کا سین تھا۔ میں نے ہنستے ہنستے پوچھا۔ ''پھر انجام کیا ہوا... لڑکی کو کون لے گیا۔''

''وہی جی... جس نے ساری کارروائی کی تھی... خود بھی بیٹھا تھا باراتیوں میں... اصل دولہے کو تو گھر والے اٹھا کے لے گئے اسپتال... اور انہوں نے کہہ دیا کہ ایسی منحوس لڑکی کو ہم نہیں لے جا سکتے۔ پتا نہیں بعد میں گھر پر کیا مصیبت لائے گی... وہ لڑکا سامنے آ گیا اور لڑکی کے باپ کو منانے میں کامیاب ہو گیا... اسے بھی پتا تھا کہ اب لڑکی بیٹھی رہے گی... لوگ پتا نہیں کیسی کیسی باتیں کریں گے۔''

ہم یعنی ست بدھائی کی حویلی میں رہنے والے ایک ساتھ پنڈال میں پہنچے تو شام کے سات بجے تھے۔ غنی نے یہ اجتماع سائنس سینٹر والی عمارت کے سامنے رکھا تھا۔ وہاں بلاشبہ دو ڈھائی ہزار کا مجمع تھا۔ دیہاتی مرد، عورتیں، بچے ہر سمت سے یلغار کر رہے تھے۔ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کچھ لوگ دس کلومیٹر سے پیدل چل کے آئے تھے۔ فلم کے خلاف فتوے نے بھی آسانی پیدا کی ورنہ یہ مجمع دوگنا ہوتا تو قابو سے باہر ہو جاتا۔

ہجوم میں چیخ پکار کے باعث کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی... غنی کی لٹھ بردار فورس بڑی مستعد تھی... انہوں نے کہیں نرمی سے تو کہیں ماں بہن ایک کر کے لوگوں کو بٹھایا۔

ایک فیملی ایک جگہ بیٹھ جائے اور اپنی جگہ سے نہ ہلے... فیملی کا ایک فرد پہلے نمکین چاول لینے جائے۔ افرادِ خانہ کے حساب سے ایک بوٹی فی کس ملے گی اور دوبارہ نہیں دی جائے گی... جب نمکین چاول سے پیٹ بھر جائے تو اسی پلیٹ میں میٹھے چاول لے لے... وغیرہ وغیرہ۔

ان ہدایات پر کسی حد تک عمل ہوا... لیکن افرادِ خانہ کی تعداد زیادہ بتا کے لوگوں نے زیادہ بوٹیاں لیں۔ کچھ چاول فیملی کے پاس کسی ممبر پر الٹ گئے اور خالی پلیٹ کے ساتھ پھر دیگ والی دوسری لائن میں کھڑے ہوئے... یہ سب بہت مضحکہ خیز اور دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ افسوسناک بھی تھا۔ ان غربت زدہ لوگوں کے لیے یہ کھانا ایسی نعمت تھا جس کی امید وہ کسی بڑے آدمی کی شادی یا موت پر ہی رکھتے تھے۔ خود اپنے گھر کی شادیوں میں بہت کم لوگ اس عیاشی کے متحمل ہو پاتے تھے۔

فلم اضافی عیاشی تھی... جیسا کہ مجھے بعد میں ریشم نے انگلش میں دھواں دھار تقریر کر کے بتایا... نصف سے زائد لوگ ایسے تھے جنہوں نے کبھی فلم دیکھی ہی نہیں تھی... ہماری موجودگی نے اس اجتماع کو مزید رونق بخشی۔ کھانے پینے کے بعد بہت سے عقیدت مند ڈکاریں مارتے ہم سے مصافحے کا اعزاز حاصل کرنے آئے... ان میں اکثریت شہناز کے پاس آئی۔ دوسرا نمبر میرا تھا... تیسرے نمبر پر ریشم رہی جو ڈاکٹر شہناز کے ساتھ گاؤں گاؤں جاتی تھی... باقی لوگوں کو زیادہ لفٹ نہیں ملی۔ ان میں میرے اماں ابا بھی شامل تھے۔ اس پر خفگی کا اظہار صرف راجا نے کیا۔ ''کیسی بے توقیری ہوئی ہے میری بھی، ملک کے اتنے عظیم صحافی کو کسی نے پوچھا تک نہیں۔''

مجموعی طور پر انتظامات اطمینان بخش رہے... وقفے وقفے سے تھوڑی بہت ہڑبونگ مچتی تھی... ایک برخوردار نے جو بدہضمی کا شکار تھا۔ اجابت سے چند لوگوں کو پاک کیا۔ ایک صاحب نے اپنی بک بک کرتی زوجہ کو بہ آواز بلند گالیاں دینے کے بعد بھی تھپڑ رسید کیا۔ دو تین حضرات زیادہ کھا جانے کے باعث کھیتوں کی طرف دوڑے... لیکن غنی کی اس پبلسٹی مہم کے زبردست نتائج برآمد ہوئے۔ اردگرد کے دیہات میں اس مہمان نوازی کی اور تقریب کی دھوم مچ گئی۔ ان سب کے نکاح برقرار رہے جو ملاجی کی نافرمانی کرتے ہوئے فلم دیکھنے آئے تھے۔ جو نہیں آئے تھے انہیں ملال رہا کہ بلاوجہ ان کی بات مانی۔ بعد میں اس سے اسکول اور اسپتال کے پروجیکٹ چلانے میں بہت مدد ملی... لیکن سب سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آس پاس کے سارے علاقے میں جو رانا کے ووٹر تھے... نواب رفیق احمد شیرازی کا نام آ گیا۔

ہم رات کے بارہ بجے کے بعد لوٹے۔ اماں سخت خفا تھیں کیونکہ ان کی نمازِ عشا اور نوافل کے بعد کا وظیفہ سب اس ہلڑبازی کی نذر ہو گیا تھا جس میں لذتِ گناہ کے سوا ان کے نزدیک کچھ نہ تھا۔ ان کی مجبوری یہ تھی کہ کھانے کے بعد کوئی اٹھ کر حویلی جانے کے لیے راضی نہ ہوا یہاں تک کہ ابا جی نے

بھی انہیں روک دیا کہ ایک دن کی غیر حاضری اللہ میاں معاف کر دیں گے۔ خدمتِ خلق کا درجہ بھی عبادت سے کم نہیں... انہوں نے ایک شعر بھی پڑھا کہ علامہ اقبال ایسے ہی تو نہیں فرما گئے تھے۔

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

ظاہر ہے اس دلیل نے ان کو متاثر نہیں کیا۔ باقی سب لوگ بڑے جوش میں تھے۔ خصوصاً شہناز اور رابعہ جن کے مقاصد کو اس اجتماع سے بڑی تقویت حاصل ہوئی تھی۔ ان کے ساتھ لیلیٰ بھابی جذبۂ ایمانی کے ساتھ شریک تھیں اور وہ اس تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے اگلے پروگرام میں دیر نہ کرنے کی حمایت کر رہی تھیں۔ اگلا پروگرام ایک عوامی تفریحی میلہ تھا۔

غنی ہنوز دعوت اور فلم شو کے بعد کے معاملات میں مصروف تھا اور ریشم دل و جان سے اس کے ساتھ شریک تھی۔ اس تقریب کی کامیابی کا سارا سہرا وہ غنی کے سر باندھنا چاہتی تھی۔ راجا نے کہا کہ کامیابی کو چھوڑو... شادی کا سہرا اس کے سر باندھو تو بات ہے... ماشاء اللہ سے اب تم بھی سیانی ہو گئی ہو اور لڑکا بھی برسرِ روزگار ہے۔

میں نے اپنے کمرے میں پہنچ کے سخت تھکن محسوس کی اور بستر پر گر گیا۔ اگلا کمرا نور جہاں کو دیا گیا تھا جو اب ویران اور مقفل تھا، میں نے سوچا اسے فون کر کے پوچھوں کہ وہ خوش ہے یا نہیں لیکن پھر اس ارادے کو ملتوی کر دیا۔ وہ سو رہی ہو گی اور اس سے یہ پوچھنا ایک فضول سی بات ہو گی۔ اگر اس نے حالات پر قناعت کر لی ہے تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ خوش ہے۔ شاید خوشی کی منزل سے ہم سب دور ہیں۔ خواہش کی راہ پر استقامت سے چلنے کے باوجود۔

پھر میری نظر نے چار مس ہونے والی کالوں کو دیکھا۔ تقریب اتنی پُرشور اور ہنگامہ خیز تھی کہ میرے موبائل فون کی گھنٹی نقار خانے میں طوطی کی صدا بن گئی تھی۔ میرے کانوں نے اس کی پکار سنی ہی نہیں تھی... جب میں نے تفصیل دیکھی تو چاروں کالز لندن سے کی گئی تھیں اور ایک ہی نام سے... یہ نام ڈاکٹر شائستہ کا تھا۔ پہلی کال گیارہ بجے موصول ہوئی تھی پھر دس دس منٹ کے وقفوں سے اس نے مجھ سے بات کرنے کی کوشش کی تھی... آخری کال ساڑھے گیارہ بجے کی گئی تھی۔ لندن کے وقت کے مطابق شام کے ساڑھے چھ بجے۔

میں نے بیلنس چیک کیا اور شائستہ کا نمبر ملایا۔ تین گھنٹیوں کے بعد اس نے جواب دیا۔ ''ہیلو۔''

میں نے کہا۔ ’’ہیلوڈاکٹر شائستہ... کیسی ہو تم؟‘‘

’’میں تو ٹھیک ہوں... تم کہاں ہو... فون کیوں بند تھا تمہارا؟‘‘

میں نے کہا۔ ’’فون بند نہیں تھا... یہاں ایک فلم شو تھا... شور میں رنگ ٹون سنائی نہیں دی... خیریت تو ہے نا؟‘‘

’’پتا نہیں خیریت تمہارے نزدیک کیا ہوتی ہے۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’فریال کی کوئی اطلاع؟‘‘

’’اطلاع نہ ہوتی تو کیا میں تم کو گپ شپ کے لیے فون کرتی اب کوئی فائدہ ہے یا نہیں تمہیں بتانے کا کہ فریال گجرات ہی میں ہے۔‘‘

’’تمہیں کیسے معلوم ہوا؟‘‘

’’بڑا اچھا سوال ہے نواب صاحب... تم نے کچھ کیا نہیں... کسی جاسوس نے ہی سراغ لگایا ہوگا یا اسکاٹ لینڈ یارڈ والوں نے ازخود دلچسپی لی ہوگی... معاملے کی بین الاقوامی اہمیت تھی۔‘‘

’’ایسی جلی کٹی باتوں کے بغیر بھی تم بتا سکتی ہو... اگر کوئی بات ہے۔‘‘ میں نے ہنس کے کہا۔

’’جلی کٹی باتوں کا بھی تم پر کیا اثر ہوگا... تم اپنی زندگی میں مگن رہو... وہ گجرات میں ہے تو کیا فرق پڑتا ہے... آجائے گی کسی دن جھک مار کے واپس... لیکن اب شاید ایسا نہ ہو نواب صاحب... اس نے آج خود فون کر کے مجھے یہ بات بتادی ہے... تمہارے گھر سے وہ پہلے ہی چلی گئی تھی... اب تمہاری زندگی سے بھی نکل گئی ہے۔‘‘

’’ایسی کیا بات ہے شائستہ... کیا کہا ہے اس نے تم سے۔‘‘

’’دیکھو... اس امید پر میں تمہیں یہ بات بتا رہی ہوں کے شاید آج بھی تمہارے دل میں اس کی محبت کی کوئی چنگاری موجود ہو... جسے نور جہاں بجھانے میں ناکام رہی ہو۔‘‘

’’نور جہاں کا یہاں کیا ذکر۔‘‘

’’ذکر تو فریال نے بھی کیا تھا... اس نے مجھے بتایا کہ اب وہ حویلی میں تمہارے ساتھ رہتی ہے... اس نے خود یا تمہاری مدد سے اپنے شوہر کو بھی ٹھکانے لگا دیا ہے۔‘‘

میرے دل میں جیسے انگارہ اتر گیا۔ ’’شائستہ!‘‘

’’مجھے اس سے غرض نہیں کہ کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ۔ تم اگر کچھ کرنا چاہتے ہو تو یہی وقت ہے... جاؤ اور فریال کو لے آؤ... اگر وہ آنا چاہے... میں تمہیں اس کا فون نمبر بھی دے رہی ہوں... اور پتا بھی۔‘‘

’’آخر وہ کیوں نہیں آئے گی۔‘‘

’’اس لیے کہ اب فریال نے بھی اپنی زندگی کی ترجیحات ازسرِنو طے کرلی ہیں... میں تمہیں کیا بتاؤں... تم یقین ہی نہ کرو شاید... خود جا کے ملو گے تو وہ تمہیں بھی بتا دے گی۔‘‘

’’تم مجھے فون نمبر اور پتا لکھواؤ۔‘‘ میں نے بے چینی سے کہا۔

شائستہ نے بولنا شروع کیا، میں لکھتا گیا۔ اس نے سب کچھ ایک بار دہرا کے پوچھا۔ ’’لکھ لیا؟‘‘

میں نے کہا۔ ’’ہاں لیکن ایک بات بتاؤ... تمہیں کس نے بتایا کہ نور جہاں میرے ساتھ رہتی ہے؟‘‘

’’دیکھو اس تفتیش سے کیا فائدہ... یہ جھوٹ ہے یا سچ تم خود جانتے ہو... مجھے اس سے کیا فرق پڑ سکتا ہے... دکھی میں صرف فریال کے لیے ہوں۔ جس نے تمہارے لیے اپنی زندگی داؤ پر لگادی تھی۔ تمہارا کیا ہے... مرد ہو اور پھر خیر سے نواب... اپنا حرم آباد کرلو تو فریال کیا کرسکتی ہے۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’بی بی شائستہ... اتنا بڑھ بڑھ کے نہ بولو... تمہاری سہیلی کے لیے میں نے بھی زندگی وقف کر رکھی تھی اور وفاداری کے راستے پر میں بھی اپنی جان ہتھیلی پر لے کر چلتا رہا... کتنا عرصہ رہی وہ لندن میں؟ چار سال... چار سال کی اس سے پوچھو... کبھی کسی کی طرف آنکھ اٹھا کے بھی دیکھا میں نے... ایک لارڈ کی بیٹی میرے لیے اپنا گھر اپنا مذہب اور اپنا ملک سب چھوڑنے کے لیے تیار تھی... فریال خود چھوڑ گئی مجھے۔‘‘ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں اکیلا ہی ریسیور میں بولتا جا رہا ہوں۔ دوسری طرف سننے والا کوئی نہیں۔ شائستہ فون رکھ چکی تھی۔ اس کا ذہن فریال کے معاملے میں جانبداری سے سوچتا تھا تو جائز تھا کیونکہ ایک تو وہ فریال کی سہیلی تھی... دوسرے عورت تھی جو مرد کو مظلوم مان ہی نہیں سکتی۔ لیکن تیسری بات جو میرا ناقابلِ معافی قصور بن گئی تھی وہ نور جہاں کا وجود تھا۔ حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ نور جہاں کے ست بدھائی پہنچنے کی خبر فریال تک اور پھر لندن تک پہنچ گئی۔ آخر کون ہے یہ گھر کا بھیدی؟ فریال سے کس کا رابطہ تھا جس کی خبر مجھے بھی نہ ہوسکی۔

میں صبح تک انتظار نہیں کرسکتا تھا... میرے دل میں پریشان رہنے والے سوالوں نے کھلبلی مچا رکھی تھی۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے فریال کو فون کرنے کا فیصلہ کیا... رات کا ایک بجنے والا تھا تو کیا... اگر وہ سننا چاہے گی تو جاگ بھی جائے گی۔

گھنٹی بجتی رہی... ریسیور کسی نے نہیں اٹھایا۔ میں نے پھر کوشش کی۔ پھر ناکام ہوا۔ نیند اب میری آنکھوں سے بہت دور جا چکی تھی۔ میں سوچتا رہا کہ آخر فریال نے گجرات کا رخ کیوں کیا جہاں سلطان تھا، وہ ناراض تھی۔ پاگل تو نہیں ہوگئی تھی۔ اور اب اس نے گجرات میں اپنی رہائش کا پتا اور فون نمبر دیا تھا تو اس سے کیا ظاہر ہوتا تھا... وہ گجرات میں کیوں ہے اور کس کے ساتھ ہے؟ بہت پہلے مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ سلطان سے شادی کرنے کا سوچ رہی ہے... اس وقت میں نے اسے غصے کا ردِعمل سمجھا تھا۔

دوسری بات یہ تھی کہ اس کا شائستہ سے یا کسی اور سے رابطہ تھا... اسے ہر خبر مل رہی تھی یا پہنچائی جا رہی تھی... کیا یہ سب فریال کو مجھ سے برگشتہ کرنے کی سازش تھی۔ کون چاہتا تھا کہ اس کی بدگمانی کم نہ ہو... وہ مجھ سے اتنی مایوس ہو کے نفرت کرنے لگے... رابعہ؟ شہناز؟... نہیں... یہ خواہش صرف نور جہاں کی ہوسکتی تھی... وہ پہلے بھی خفیہ خبر رسانی کرتی رہی تھی۔

اسی ادھیڑ بن میں سوتے جاگتے صبح ہوگئی۔ رات کے آخری پہر میں کچھ دیر کے لیے تھکن کے باعث میری آنکھ لگی اور پھر کھلی تو باہر اچھی خاصی ایکٹوٹی چل رہی تھی... میں اب گجرات جانے کے لیے پُرعزم تھا اور کسی عذر پر بھی تاخیر نہیں کرسکتا تھا۔

میں نے نیچے جھانک کر دیکھا... کچھ لوگ برآمدے کو رنگین جھنڈیوں سے سجا رہے تھے۔ آج اسکول اور اسپتال کے آغاز کا مبارک دن تھا۔ ایک اور ٹیم سائن بورڈ لگانے پر مامور تھی۔ دو سائن بورڈ ایک دیوار کے ساتھ رکھے نظر آ رہے تھے... ایک پر شہناز ویلفیئر کلینک لکھوایا گیا تھا... اس کے لیے ہم سب نے بڑی مشکل سے شہناز کو منایا تھا... دوسرے پر اسکول کا نام لکھنے کا معاملہ آیا تو شہناز نے شرط رکھ دی کہ اس کا نام رابعہ اسکول نہ رکھا گیا تو وہ بھی کلینک کا نام اپنے نام پر نہیں رکھے گی۔

راجا بھی انتظامی امور کی نگرانی میں مصروف تھا۔ میں نے اسے اشارے سے اوپر بلایا اور رات فون پر ہونے والی ساری گفتگو سنادی۔

وہ زیادہ متفکر نہیں ہوا۔ ’’تو نے اسے کال کیا...‘‘

’’رات کو کیا تھا... اس نے ریسیور نہیں اٹھایا۔‘‘

’’چل اب پھر کر... اس وقت وہ سو رہی ہوگی۔‘‘

میں نے نمبر ملایا تو دوبارہ گھنٹی بجی۔ پھر کسی مرد نے اکھڑ لہجے میں کہا۔ ’’ہیلو...‘‘

میں نے کہا۔ ’’کیا فریال یہاں رہتی ہے۔‘‘

چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد اس نے کہا۔ ’’آپ میڈم کی بات کر رہے ہو... کیا کام ہے آپ کو ان سے۔‘‘

’’مجھے ان سے بات کرنی ہے۔‘‘

’’آپ کون ہو... اپنا نام بتاؤ...‘‘ وہ غالباً کوئی چوکیدار تھا۔

میں نے کہا۔ ’’انہیں بتاؤ کہ رفیق کا فون ہے۔‘‘

’’اچھا جی... لیکن ابھی وہ سو رہی ہوں گی۔ میں دیکھتا ہوں شاید اٹھ گئی ہوں...‘‘

’’نہیں اٹھی ہوں تو اٹھا دینا... وہ خفا نہیں ہوں گی۔‘‘

’’نہیں جی... اس کا آرڈر نہیں ہے۔‘‘ وہ بولا اور ریسیور رکھ کے چلا گیا۔

تقریباً پانچ منٹ بعد وہ پھر بولا۔ ’’رفیق صاحب... وہ اٹھ گئی ہیں لیکن باتھ روم میں ہیں۔‘‘

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ کچھ دیر راجا اور میں اس صورتِ حال پر مختلف پہلوؤں سے غور کرتے رہے۔ ’’وہ میڈم کیسے ہوگئی... اور گجرات میں ایسے ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ کیسے رہتی ہے۔ کوئی اس سے براہِ راست بات نہیں کرسکتا۔‘‘

راجا نے کہا۔ ’’میرا مشورہ ہے کہ آپ بقلم خود تشریف لے جائیں۔ گجرات ہے کتنی دور... ساٹھ ستر کلومیٹر۔‘‘

’’اس کے پاس تو لندن جانے کے لیے ہوائی جہاز کا ٹکٹ خریدنے کے پیسے بھی نہیں تھے... ٹکٹ اس نے ڈاکٹر شائستہ سے منگوایا تھا۔‘‘ میں نے کہا اور پھر ریسیور اٹھا لیا۔ اب نمبر بیزی جا رہا تھا۔

پیچھے سے راجا کو آوازیں پڑنے لگیں تو وہ بولا۔ ’’وقت ضائع مت کر... تو نکل جا... مجھے تو آج کوئی چین سے نہیں بیٹھنے دے گا۔‘‘

میں نے سر ہلایا اور فریال کو فون کرتا رہا۔ نمبر مسلسل انگیج جانے کے دو مطلب ہوسکتے تھے۔ فریال کسی سے بات کر رہی ہے یا ریسیور اٹھا کے نیچے رکھ دیا گیا ہے۔ افتتاحی تقریب کی تیاری میں مصروف ہونے کے باوجود ریشم میرے لیے ناشتا لے کر حاضر ہوئی۔ اس نے اپنی فصیح و بلیغ انگلش میں اس تقریبِ سعید کے بارے میں اپنے جذبات کا اظہار کرنے کی کوشش کی تو میں نے اسے ڈانٹ دیا۔ ’’یہ کیا مصیبت ہے ریشم... دیکھ نہیں رہی ہو میں فون کر رہا ہوں... تمہاری بکواس کیسے سنوں۔‘‘

اس کا چہرہ اتر گیا۔ وہ سوری سر کہہ کے بھاگ گئی۔ میں نے بڑی فکرمندی کے ساتھ ناشتا ختم کیا اور پھر یہ سوچ کے نمبر ملایا کہ اب بھی انگیج ملا تو پھر دیر نہیں کروں گا۔ شیر خان کی

گاڑی ٹھیک ہو کے آ گئی تھی... میں نکل جاؤں گا... لیکن پھر نمبر مل گیا۔

اسی چوکیدار نے پھر ریسیو کیا تو میں نے کہا۔ ''میڈم سے کہو...''

اس نے میری بات کاٹ دی۔ ''میڈم تو چلی گئی۔''

''چلی گئی...؟ کہاں؟'' میں نے مایوسی سے کہا۔

''پتا نہیں جی...''

میں نے خفگی سے کہا۔ ''لیکن ابھی تو وہ فون پر بہت دیر کسی سے باتیں کرتی رہی۔ ایک دم نکل گئی... تم جھوٹ بول رہے ہو۔''

لیکن دوسری طرف وہ میری بات شروع ہونے سے پہلے ہی فون بند کر چکا تھا... دوبارہ کوشش کرنا لاحاصل تھا۔ میں طیش میں اٹھا اور چند منٹ میں تیار ہو کے نیچے اتر گیا۔ یہ خواتین کیلیے غیر متوقع تھا۔

رابعہ نے شور مچایا۔ ''کیا ہے کزن... تھوڑی دیر میں افتتاحی تقریب ہے... تم کہاں چل دیے۔''

میں نے کہا۔ ''ایک ضروری کام ہے...''

شہناز نے برا مان کے کہا۔ ''افتتاح سے بھی زیادہ ضروری؟''

لیلیٰ بھابی نے طنز کا تیر چلایا۔ ''ایسا تو ایک ہی کام... ہوتا ہے۔''

رابعہ نے مجھے دھمکی دی۔ ''میں ابا جی سے شکایت کروں؟ ابھی تمہاری ساری نوابی نکال دیں گے۔''

میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''یار سمجھا کرو۔''

وہ اور سر چڑھ گئی۔ ''سمجھوں کیا خاک... افتتاح تمہیں ہی کرنا تھا اور تم کو پتا نہیں کس نے طلب کر لیا ہے۔''

میں نے بگڑ کے کہا۔ ''جو تم سمجھ رہی ہو... تم سب...''

شہناز نے بیچ میں کہا۔ ''وہ غلط نہیں ہے...''

میں نے کہا۔ ''میں فریال سے ملنے جا رہا ہوں۔''

ایک دم یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے دہکتے شعلوں پر بالٹی بھر پانی پھینک دیا ہو... ان سب کی نظریں مجھ پر ٹھہر گئیں۔

راجا نے میری وکالت کی۔ ''میرا دوست ٹھیک کہہ رہا ہے۔ فریال کا پتا چل گیا ہے۔ یہ گجرات جا رہا ہے۔''

ان سب نے کورس میں کہا۔ ''گجرات!''

میں نے کہا۔ ''کیا اب مجھے اجازت ہے؟''

ان سب نے مجھے گھیر لیا۔ ''یہ کب معلوم ہوا... کس نے بتایا کہ فریال گجرات میں ہے۔''

میں نے انہیں شائستہ سے ہونے والی گفتگو بتائی۔ صورتِ حال بیک وقت سنسنی خیز اور مایوس کن ہو گئی... انہوں نے آپس میں مشورہ شروع کیا۔

راجا نے کہا۔ ''جا فیکے پتر... خیر نال جا خیر نال آ...''

رابعہ نے کہا۔ ''اللہ کرے تم اس کے ساتھ لوٹو... مگر جہاں اتنے دن ٹالتے رہے... گھنٹا بھر ہمارے کہنے سے رک جاؤ۔''

شہناز بولی۔ ''ہاں... فریال کا ملنا مبارک... تم افتتاح کر کے جا سکتے ہو۔''

ظاہر ہے ایک معقول مطالبے کو مسترد کر کے سب کی خوشی کو پامال کرنا مجھے بھی منظور نہیں تھا... مگر ایک گھنٹے کا التوا تیاریوں کے مراحل طے ہونے میں دو گھنٹے سے زائد ہو گیا... جب بورڈ آویزاں ہو گئے تو منتظمین کو اپنا خیال آیا۔ تقریب کیسی بھی ہو... خواتین کے لباس اور میک اپ میں کمی ہو تو ادھوری رہ جاتی ہے۔

سج دھج اور جلوہ نمائی میں کوئی بھی کسی سے کم نہ تھا لیکن ریشم کے اہتمام نے مجھے دم بخود کر دیا۔ اس لڑکی نے اپنے شوق اور جذبے سے ہمارے دلوں میں جگہ بنانے کے ساتھ اپنی حیثیت کو مستحکم کرنے کے لیے بڑی جانفشانی سے دن رات ایک کیا تھا۔ اس کے دل میں ترقی کی لگن تھی۔ وہ کچھ بننا چاہتی تھی اور یہ ثابت کرنا چاہتی تھی کہ ست بدھائی جیسی پسماندہ جگہ اور ایک سرونٹ کوارٹر میں زندگی گزارنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ عمر کے اٹھارہ سال ہی گزرے ہیں۔ عمر تو نہیں گزر گئی۔

جب میں نے کہا۔ ''تم تو آج نمبر لے گئیں ڈاکٹر ریشم'' تو خوشی سے اور حیا سے اس کا چہرہ لال ہو گیا۔

راجا نے بھی کہا۔ ''واقعی... کوئی تمہارا مقابلہ نہیں کر سکتا آج تم ڈاکٹر لگ رہی ہو اور شہناز تمہاری اسسٹنٹ۔''

اس کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ ''مجھے گناہگار مت کریں راجا صاحب۔'' اس نے صاف اردو میں کہا۔ ''میں آج جو بھی ہوں انہی کی دم سے ہوں... عزت مجھے آپ سب نے دی... ورنہ میری کیا حیثیت تھی۔''

میں نے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحبہ... آپ اردو بول رہی ہیں غلطی سے۔''

اچانک غنی نمودار ہوا اور کچھ کہتے کہتے ریشم ایک دم پلٹ کے اندر بھاگ گئی۔

راجا نے حیرانی سے سر ہلایا۔ ''اسے کیا ہو گیا؟''

غنی آگے آیا اور خاموش کھڑا ہو گیا... یوں جیسے وہ کچھ

کہنا چاہتا ہے لیکن ہمت نہیں کر پا رہا... بالآخر اس نے کہا۔ ''جناب عالی!''

میں نے کہا۔ ''کوئی خاص بات ہے غنی... بولو۔''

اس نے کہا۔ ''اب ماں باپ بھی آپ ہی ہیں... اور کس سے کہوں... بات یہ ہے کہ... آپ ہماری شادی کرا دیں۔''

راجا نے ہنس کے کہا۔ ''تو یہ بات تھی... برخوردار... کل اتنی بڑی تقریب کا اتنا اچھا انتظام تم نے کسی کی مدد کے بغیر کر لیا... اپنی شادی کے لیے ہم سے مدد چاہتے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''شادی بھی کوئی مسئلہ ہے... جب میاں بیوی راضی۔''

''بس... اٹھ کے جاؤ اور قاضی صاحب کو اٹھا لاؤ... ابھی افتتاحی تقریب سے پہلے یہ نیک کام کیا جا سکتا ہے۔''

غنی خاموش کھڑا مسکراتا رہا... میں نے کہا۔ ''اچھا کیا تم نے ہمیں احساس دلا دیا۔ ہم اپنے کاموں میں یہ کام بھولے ہوئے تھے۔ میں ابا جی سے بات کرتا ہوں۔ وہ حج پر جانے سے پہلے یہ فرض بھی پورا کر جائیں گے۔''

غنی سلام کر کے خوش خوش چلا گیا۔ مجھے اندازہ نہ تھا کہ گیٹ پر دربانوں نے کتنے لوگوں کو روک رکھا ہے... جب بالآخر انہیں اندر آنے کی اجازت ملی تو لوگوں کا ایک ہجوم اندر آ گیا۔ نہ وہ سب اسکول میں داخلہ لینے والے تھے اور نہ مریض... گزشتہ شب کی تقریب کے بعد آس پاس دور دور تک ست بدھائی کے نواب صاحب کی شہرت پھیل گئی تھی اور یہ سب عقیدت مند ایک کارِ خیر میں اپنی سپورٹ ظاہر کرنے آئے تھے۔

لوگوں نے مجھ سے جھک جھک کر ہاتھ ملانا شروع کیا تو مجھے شرمندگی ہونے لگی۔ ان میں سے کچھ مصافحہ کرتے وقت میرے ہاتھ یوں چوم لیتے جیسے میں کوئی پیر ہوں۔ وہ دعائیں دیتے تھے، نیک خواہشات کا اظہار کرتے تھے اور آگے بڑھ جاتے تھے۔ اسی طرح عورتوں کی قطار تھی جو ڈاکٹر شہناز اور ریشم سے عقیدت مندی ظاہر کرنے آئی ہوئی تھیں۔

پھر ایک عجیب بات ہوئی۔ نہ جانے کس نے ایک چار خانے والا سوتی رومال وہاں بچھا دیا۔ اس میں کچھ نوٹ تھے کچھ سکے اور کچھ گہنے۔ اب لوگوں نے اس پر نوٹ اور عورتوں نے زیور ڈالنے شروع کیے۔

میں نے کہا۔ ''غنی... یہ کیا ہو رہا ہے... کس نے چندہ جمع کرنے کو کہا ہے۔''

''کسی نے بھی نہیں سر۔''

''پھر روکو انہیں... سب کو واپس کرو جو جمع ہوا ہے۔''

غنی نے کہا۔ ''جناب عالی... لوگ اپنی خوشی سے دے رہے ہیں۔ وہ ثواب کمانا چاہتے ہیں تو ان کو نہ روکیں۔ وہ ایک نیکی کے کام میں شریک ہونا چاہتے ہیں۔ کوئی ایسا نہیں سمجھتا کہ آپ کو خدانخواستہ مدد کی ضرورت ہے۔ یہ لوگ مسجد بناتے ہیں تو ہر شخص کی خواہش ہوتی ہے کہ ایک اینٹ لگا دے۔''

میں حیران رہ گیا۔ ظاہر ہے اس کے بعد نیکی کے اس جذبے پر قدغن لگانا ممکن نہ تھا۔ مرد لان کے ایک حصے میں بیٹھ گئے۔ عورتیں دوسری طرف ہو گئیں تو گاؤں کی مسجد کے پیش امام نے قرأت شروع کی۔ غنی نے میرے کان میں بتایا۔ ''یہ وہی مولوی ہے سر جو ڈاکٹر شہناز کی مخالفت میں پیش پیش تھا۔''

میں نے کہا۔ ''چلو اچھا ہے۔ خود ہی سمجھ گیا۔''

''اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اپنے سابقہ اعمال پر شرمندہ ہوں اللہ معاف کرنے والا ہے لیکن میں نواب صاحب سے بھی معافی مانگنا چاہتا ہوں کل افتتاح سے پہلے مجھے تلاوت کا موقع دیا جائے... میں نے خود ہی کہہ دیا کہ تم آ جاؤ... نواب صاحب کی ذمے داری میں لیتا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''یہ بہت اچھا کیا تم نے۔''

''اس کی حمایت سے بہت فائدہ ہو گا سر'' غنی بولا۔

مجھ سے فیتہ کاٹ کے افتتاح کرایا گیا پھر مولوی صاحب نے بڑی لمبی دعا مانگی۔ حاضرین سنے اور سمجھے بغیر بہ آوازِ بلند آمین کہتے رہے۔ اس پوری کارروائی نے ہم سب کو سخت جذباتی کیا۔ بعد میں مولوی جس کا نام شجاعت بغدادی تھا مجھ سے گلے ملا۔ جب اسکول میں پڑھنے والوں نے نام لکھوانا شروع کیا اور دوسری طرف شہناز نے مریضوں کو بلایا تو میں نے بہتر سمجھا کہ گجرات کے لیے روانہ ہو جاؤں۔

اس وقت ایک دم گیٹ پر شور مچا اور افراتفری پھیل گئی۔ سیکیورٹی گارڈز چلا رہے تھے اور کسی کو مارتے ہوئے گالیاں دے رہے تھے۔ غنی معلومات حاصل کرنے کے لیے لپکا تو میں رک گیا۔ چند منٹ میں گرفتار ہونے والے کو میرے سامنے لا کر پھینکا گیا تو اس کی حالت خراب تھی۔ گارڈز نے اسے بڑی بے رحمی سے مارا تھا۔

غنی نے میرے سامنے ایک ڈبا رکھ دیا۔ ''یہ اس سور کے بچے کے پاس سے برآمد ہوا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''یہ کیا ہے؟''

''دستی بم سر۔'' غنی نے کہا۔

وہ شخص کراہتا ہوا چلّایا۔ ''میں نے خود دیا ہے۔''

میں ابتدائی صدمے سے سنبھل چکا تھا۔ میں نے کہا۔ ''کون ہو تم؟ یہ دستی بم پھینکنے آئے تھے یہاں؟ غنی اسے سیدھا کھڑا کرو۔''

غنی نے اسے اٹھنے میں مدد دی۔ وہ بولا۔ ''جناب عالی! مجھے معاف کر دیں۔ میرا نام قاسم ہے۔ کل رات بھی میں آیا تھا۔''

''اس دستی بم کے ساتھ۔'' اس انکشاف نے مجھے سن کر دیا تھا۔

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''میں نے چاول بھی کھائے۔ نمکین اور میٹھے اور فلم بھی دیکھی... لیکن یہ کام نہیں کر سکا جس کے لیے آیا تھا۔''

''تم مجمع پر یہ دستی بم پھینکنے آئے تھے... شیطان۔'' راجا سخت غصّے میں اس پر پل پڑا اور مار مار کے اسے پھر لٹا دیا۔ اس میں راجا کا ساتھ غنی نے بھی دیا۔

خواتین جو سخت دہشت زدہ بھی تھیں، راجا کی حوصلہ افزائی کرتی رہیں... ''اور مارو اسے... ہڈیاں توڑ دو حرامی کی۔''

میں نے راجا کو روکا۔ ''ایسے تو یہ مر جائے گا۔''

راجا نے کہا۔ ''خدانا خواستہ یہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا تو ہم کیا کرتے۔ آج لاشیں اٹھا رہے ہوتے۔''

میں نے غنی سے کہا۔ ''اسے قید میں رکھو۔ جب تک یہ سچ نہ بولے۔''

وہ چلّانے لگا۔ ''میں مانتا ہوں نواب صاحب... مجھے شیطان نے بہکا دیا تھا لیکن آپ کا نمک کھانے کے بعد میری ہمت نہ ہوئی۔ میں نے خود ہی یہ چیز غنی کو دی تھی۔ پوچھ لو اس سے۔''

''تمہیں رانا نے بھیجا تھا؟''

اس نے اقرار کیا۔ ''ہاں جی... میں نے یہ کام کبھی نہیں کیا مگر اس نے لالچ دیا مجھے... ایک مربع زمین ملے گی اگر میں زندہ لوٹ آیا۔ یہ کہا تھا کہ بم دور سے پھینکنا... ایسے کہ پتا نہ چلے کس نے پھینکا ہے پھر افراتفری میں تم نکل آنا۔''

میں نے کہا۔ ''بم کس نے دیا تھا؟''

''رانا کے منشی نے... اس کے لیے شہر سے ایک عورت کو لایا گیا تھا... وہ عورتوں میں گھس کر بیٹھ جاتی... وہ اس کام کی ماہر تھی لیکن اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا... اس کے دو ساتھی بھی مارے گئے۔'' وہ ہاتھ جوڑ کے اٹھ بیٹھا۔

میں نے کہا۔ ''یہ کب کی بات ہے... پرسوں رات کی؟''

''جی سرکار!''

میں نے راجا کی طرف اور راجا نے میری طرف دیکھا۔ رانا کے ساتھ آنے والی کار میں ایک عورت کے ساتھ دو مرد تھے۔ پہلے انہوں نے فرار کی کوشش کی تھی... جب وہ حادثے میں مارے گئے تو ان کی لاشیں اور گاڑی سب راتوں رات اٹھائے گئے تھے۔

قاسم نے ایک دم میرے پاؤں پکڑ لیے۔ ''مجھے مار ڈالیں نواب صاحب... لیکن واپس نہیں جاؤں گا میں... رانا میری بوٹی بوٹی کر دے گا۔''

میں نے غنی سے کہا۔ ''اس کو غائب کر دو... کسی کو معلوم نہ ہو کہ دستی بم کے ساتھ کوئی بندہ پکڑا گیا ہے... گارڈ کو سمجھا دو۔''

''یس سر!'' غنی نے کہا اور اسے لات ماری۔ ''چل اٹھ۔''

میں نے دہشت زدہ خواتین کو تسلی دی۔ ''چلو اللہ نے اس کے دل میں نیکی ڈالی اور ہمیں بچا لیا۔''

رابعہ پریشان رہی۔ ''لیکن کزن... جو آج نہ ہو سکا... وہ کل ہو سکتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''کل کی فکر کل کریں گے۔''

جب میں حویلی سے نکلا تو دوپہر ڈھل چکی تھی مگر فکرمند ہونے کی کوئی بات نہیں تھی۔ گجرات کا راستہ ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ کا نہیں تھا... شیر دل خان کی گاڑی کا حسن سامنے سے متاثر ہوا تھا مگر اس کی کارکردگی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

ڈھائی بجے گجرات پہنچ کے میں نے ایک پراپرٹی ڈیلر کا بورڈ دیکھا اور اس سے پتا پوچھا۔ عام لوگوں کے مقابلے میں وہ شہر کے جغرافیے سے زیادہ واقف ہوتے ہیں۔ اس نے مجھے دیوار پر لگے ایک نقشے کی مدد سے بتایا کہ اس وقت آپ یہاں ہو... آپ اس سڑک پر جاؤ... پھر اس پر بائیں جانب مڑو... اس نے مجھے ہر نشانی بتائی اور میرے لیے اس گھر تک پہنچنا آسان بنا دیا۔

اچانک اس نے پوچھا۔ ''کس سے ملنا ہے جی آپ کو؟''

میں نے بہانہ کیا۔ ''کسی نے باہر سے کچھ بھجوایا ہے ایک ڈاکٹر صاحب ہیں۔''

وہ مطمئن ہو گیا... میری بات سے پتا نہیں چلتا تھا کہ تحفہ بھجوانے والے ڈاکٹر صاحب ہیں یا اس گھر میں رہنے والے... دس منٹ بعد میں اس گھر کے سامنے تھا اور میرا دل

تیزی سے دھڑکنے لگا تھا... یہ نئی آبادی تھی اور یہاں سارے گھر بڑے تھے... کوئی کوٹھی ایک کنال سے کم کی نہ تھی... باہر سے ان کی زیب و زینت پر دل کھول کے خرچ کیا گیا تھا۔

میں نے گاڑی گیٹ کے سامنے روک کر کال بیل تلاش کی۔ دروازے پر کسی کی نیم پلیٹ نہیں تھی۔ چند منٹ کے بعد ایک باوردی محافظ نے دروازہ کھول کے جھانکا اور جب میں خاموش رہا تو اس نے سوال کیا۔ ''جی؟ کس سے ملنا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''میڈیم سے... فریال سے۔''

اس نے کہا۔ ''آپ کا نام؟''

میں نے کہا۔ ''نواب رفیق احمد شیرازی۔''

وہ کچھ دیر سوچ کے بولا۔ ''صبح آپ نے ہی فون کیا تھا؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں... کیا میڈم گھر پر ہیں؟''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ''گاڑی سائیڈ میں لگا دیں اور اندر آ جائیں۔''

میں نے گاڑی کو گیٹ کے سامنے سے ہٹا کے بیرونی دیوار کے متوازی کھڑا کر دیا اور گارڈ کے پیچھے اندر داخل ہوا۔ میری عقل حیران تھی کیونکہ جدید انداز میں تعمیر شدہ ایسی کوٹھی میں فریال کا خود اپنے وسائل کے ساتھ رہنا ناممکن تھا۔ رہ رہ کے میرے دل میں ایک یہ سوال اٹھتا تھا کہ آخر اس کی کفالت کون کر رہا ہے۔ گجرات شہر میں سلطان کے سوا کون تھا جسے فریال سے دلچسپی ہو۔

سامنے والے حصّے میں مختصر سا لان تھا جس کے سبز قالین جیسے لان پر چار کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ پورچ میں کوئی گاڑی نہیں تھی اور اندر سے کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ میں برآمدے تک پہنچا۔ میری رہنمائی کرنے والے نے ایک دروازہ کھولا۔

اس نے کہا۔ ''میڈم ابھی گھر میں نہیں ہیں... آپ بیٹھو۔''

''میڈم کب تک آئیں گی؟''

اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔ ''کچھ پتا نہیں۔''

اندر خاصی نفاست اور مہارت سے آراستہ ڈرائنگ روم تھا جس میں دولت مندی کی نمائش کا خاص اہتمام نظر آتا تھا۔ صوفے، قالین، پردے سب بیش قیمت اور امپورٹیڈ تھے۔ میری فکرمندی بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک ناممکن خیال اب اندیشہ بن کے سر اٹھا رہا تھا فریال نے کہا تھا کہ وہ سلطان کے پاس جا رہی ہے اور اس سے شادی کر لے گی۔ اس وقت میں نے کہا تھا کہ وہ خودکشی تو کر سکتی ہے لیکن یہ نہیں کر سکتی... میں فریال کو جانتا ہوں۔

اب میں شک و شبے میں پڑ گیا تھا۔ کیا واقعی میں فریال کو جانتا تھا؟ نارمل ذہنی کیفیت میں انسان کے طرزِ عمل کا پہلے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے لیکن وہ پاگل ہو جائے تو کچھ بھی کر سکتا ہے۔ کیا فریال پاگل ہو گئی تھی... بظاہر ایسا نہیں تھا۔

فریال کے قید میں ہونے کا بھی کوئی ثبوت نہیں ملتا تھا۔ ایک نکمے سے ملازم کے سوا جو مجھے یہاں بٹھا کے نہ جانے کہاں گم ہو گیا تھا۔ مجھے دروازے پر کسی سیکیورٹی گارڈ کے آثار نظر نہیں آئے تھے... وہ کہیں گئی تھی تو اپنی مرضی سے گئی تھی... لیکن کس کے ساتھ گئی تھی؟ یہ سوال تو پوچھا جا سکتا تھا۔

میں صوفے پر بیٹھا کروٹیں بدلتا رہا اور اپنی کلائی کی گھڑی میں وقت دیکھتا رہا... پھر میں ایک صوفے سے اٹھ کر دوسرے صوفے پر جا بیٹھا۔ میں نے پردے ہٹا کے کھڑکی سے باہر کا منظر دیکھا۔ باہر وہی چھوٹا سا لان تھا اور گیٹ تھا جس سے گزر کر میں اندر آیا تھا۔

میں کچھ دیر کمرے کے درمیان کی محدود سی جگہ پر ٹہلتا رہا اور سوچتا رہا کہ مجھے رکنا چاہیے یا چلا جانا چاہیے؟ فریال شام تک لوٹ کے نہ آئی تو کیا میں شام تک بیٹھا رہوں گا؟ لیکن ایسا نہیں ہو سکتا۔ اسے یہ معلوم ہے کہ میں نے فون کیا تھا... مگر یہ تو معلوم نہیں کہ میں آنے والا ہوں۔

وہ بڈھا نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔ مجھے اب بھوک بھی لگ رہی تھی۔ میں اس سے چائے لانے کا تو کہہ سکتا ہوں۔ یہ سوچ کے میں نے دروازہ کھولنا چاہا، دروازہ بند تھا۔ کمرے کے دوسرے سرے پر ایک اور دروازہ تھا جو یقیناً اندر کے حصّے میں کھلتا تھا۔ میں نے اسے کھولنا چاہا... وہ بھی بند تھا... میں نے اس پر زور زور سے ہاتھ مارے۔

اندر خاموشی رہی... میں نے پھر دروازہ بجایا اور زور زور سے کہا۔ ''کوئی ہے؟'' میری پکار کا کسی نے جواب نہیں دیا۔ میں نے پھر دروازے پر ہاتھ مارے۔ اتنی قوت سے کہ اندر کوئی سو رہا ہوتا تو بھی اٹھ کے آ جاتا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

آہستہ آہستہ مجھ پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ دروازے مقفل ہیں اور اندر شاید کوئی نہیں ہے۔ وہ بڈھا مجھے یہاں قید کر کے چلا گیا ہے۔

میں نے غصّے میں کھڑکی کا رخ کیا اور باہر کی طرف رخ کر کے چلّایا۔ ''کوئی ہے...؟'' مگر باہر صرف خاموشی تھی۔ اب میرا شک پختہ ہونے لگا تھا۔ مجھے دھوکے سے یہاں بلوایا گیا تھا۔

اس خیال میں بڑی اذیت تھی کہ فریال نے مجھے سزا دینے کے لیے اس گھر میں قید کر دیا ہے۔ میرا جرم یہ تھا کہ میں نے اپنی دیگر مصروفیات کو سرفہرست رکھا تھا اور فریال کو منا کر واپس لانے کو ترجیح نہیں دی تھی... اس کو اپنے جذبۂ دل کی تاثیر پر پورا بھروسا تھا کہ کچے دھاگے سے چلے آئیں گے سرکار بندھے۔ اس کے ناراض ہو کر نکل جانے کے بعد میں دیوانہ وار اس کے پیچھے سر کے بل آؤں گا... لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔

اور ایسا نہ ہونے کے بھی اسباب تھے جن سے فریال ناواقف تھی۔ میں جاتا تو کہاں جاتا... اس کا نشانِ منزل تھا اور نہ کہیں نقشِ کفِ پا۔ یہ بھی غلط تھا کہ میں نے اسے تلاش کرنے کی کوشش ہی نہیں کی یا اس میں جانتے بوجھتے تاخیر کی جیسے ہی مجھے اس کا سراغ ملا میں نکل کھڑا ہوا تھا۔ میں نے لیلیٰ بھابی کے ساتھ پنڈی اسلام آباد کے ہر ٹھکانے کی خاک چھانی تھی۔

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس صورتِ حال میں مجھے کیا کرنا چاہیے... مجھے فوراً راجا کو مطلع کرنا چاہیے اور مدد کے لیے طلب کرنا چاہیے۔ پولیس کو اطلاع دینی چاہیے یا کچھ دیر صبر کے ساتھ انتظار کرنا چاہیے۔ ابھی میں پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ فریال اسی گھر میں ہے، کسی نے اسے یہاں دیکھا نہیں تھا۔ اس کے یہاں موجود ہونے کی اطلاع لندن میں اس کی سہیلی ڈاکٹر شائستہ کو ملی تھی اور اس نے یہ خبر مجھ تک پہنچادی تھی۔ سارا معاملہ ٹیلی فون نمبر سے ملنے والی معلومات تک محدود تھا۔

میرے لیے دوسرا مشکوک معاملہ فریال کی حیثیت کا تھا۔ اس کا یہاں کیا کام تھا۔ وہ یہاں کیوں آئی تھی... یہ گھر کس کا تھا اور وہ یہاں میڈم بنی کیا کر رہی تھی۔ اگر اسے معلوم ہو گیا تھا کہ میں آرہا ہوں تو اس نے میرا انتظار کیوں نہیں کیا۔ وہ عین وقت پر کہاں چلی گئی... اور کس کے ساتھ۔ آخر کون تھا جو اسے گجرات میں ایسے شاہانہ انداز کی رہائش اور زندگی کی آسائش کے سارے لوازمات فراہم کر رہا تھا۔ اس سوال کے جواب میں ایک ہی نام میرے سامنے آتا تھا... چوہدری سلطان کا۔

یہ خیال زیادہ اذیت ناک تھا کہ فریال نے مجھ سے مایوس ہو کے غصے کی دیوانگی میں اسی چوہدری سلطان سے پھر تعلق استوار کر لیا ہوگا جس سے وہ شیطان سے زیادہ نفرت کرتی تھی۔ میرا دل کہتا تھا کہ فریال مجھ سے کتنی ہی خفا اور بدظن کیوں نہ ہو ایسا نہیں کر سکتی۔ میری عقل کہتی تھی کہ غصے اور انتقام کے جذبات میں آدمی اندھا اور پاگل ہو جاتا ہے۔ وہ مر بھی سکتی ہے... مار بھی سکتی ہے۔ میں نے فریال کو اذیت پہنچائی تھی... مجھے اذیت دینے کے لیے اس نے سلطان سے تعلق استوار کر لیا تھا... اب وہ ساری عمر اذیت برداشت کرتی رہے گی... محض مجھے سزا دینے کے لیے۔

میں بند کمرے کی محدود جگہ میں کب تک پھر سکتا تھا۔ ایک بار پھر میں نے دروازے پر مکے مارے۔ لاتیں رسید کر کے زور زور سے چلایا۔ ''کوئی ہے...؟''

ایک دم دروازے کا ہینڈل گھوما اور وہی شخص اندر آگیا جس نے مجھے اس کمرے میں بند کیا تھا۔ ''جی سر!'' اس کے ہاتھ میں ایک ٹرے تھی۔

میں نے دھاڑ کے کہا۔ ''جی سر کے بچے... کہاں مر گئے تھے تم مجھے اس کمرے میں لاک کر کے؟''

اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''لاک کر کے...؟ نہیں جناب!''

میں نے چلّا کے کہا۔ ''کیا نہیں جناب... تم نے دروازے کو باہر سے لاک کیوں کیا تھا؟''

''دروازے کا لاک خراب ہے جناب... کبھی کبھی پھنس جاتا ہے۔'' وہ اسی لہجے میں بولا۔

''جھوٹ بولتے ہو تم۔'' میں دھاڑا۔

''آپ چیک کر سکتے ہیں جناب۔''

''اتنی آوازیں دیں میں نے... دروازہ بجایا... تم نے سنا نہیں۔ کہاں تھے تم...؟''

وہ بولا۔ ''میں اُدھر کچن میں تھا سر۔'' اس نے ٹرے کو میز پر رکھ دیا۔ ''آپ کے لیے چائے بنا رہا تھا۔''

میں نے صوفے پر بیٹھ کے ماتھے پر آیا ہوا پسینا صاف کیا۔ ''آخر کہاں چلی گئی ہیں تمہاری یہ میڈم فریال... چائے میں دودھ میں ڈالنا۔''

اس نے چائے بناتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ مجھے بتا کے نہیں جاتیں سر... میں ان کا سیکریٹری نہیں ہوں۔''

میں چونکا۔ ''کیا ان کا کوئی سیکریٹری بھی ہے؟''

''نہیں جناب۔'' اس نے چائے میرے سامنے رکھی۔

میں نے کہا۔ ''یہ کوٹھی کس کی ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم سر...'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں ایک معمولی ملازم ہوں۔ میرا کام چوکیداری کرنا ہے... میں مالی بھی ہوں۔''

''اور باقی کام کون کرتا ہے؟''

وہ جاتے جاتے پلٹا۔ ''ایک ان کا ڈرائیور رمیس گن مین ہے... بابو۔ ایک ان کی ذاتی مددگار ہے... روزی... وہ کھانا بھی پکاتی ہے۔'' اس نے کہا اور میرے اگلے سوال سے پہلے باہر نکل گیا۔

میرے لیے یہ تمام صورتِ حال سخت الجھن پیدا کرنے والی تھی۔ فریال جو گھر سے غصے کی کیفیت میں خالی ہاتھ نکلی تھی، اس ٹھاٹ باٹ کے ساتھ کیسے رہنے لگی کہ کم سے کم تین افراد اس کی خدمت پر مامور تھے، اس کے رہنے کے لیے ایک عالی شان کوٹھی تھی اور یقیناً اسے شاندار گاڑی بھی فراہم کی گئی ہوگی۔

اب یہ خیال میرے ذہن میں کینسر کی طرح اپنے پنجے گاڑ رہا تھا کہ فریال کو یہ سب چوہدری سلطان کے سوا کوئی اور فراہم نہیں کر سکتا۔ جس لڑکی کے پاس لندن پہنچنے کے لیے جہاز کا کرایہ نہ ہو، وہ اس طرزِ زندگی کو کیسے افورڈ کر سکتی ہے!

میرا سر گھومنے لگا۔ کیا سچ فریال نے خودکشی سے بدتر موت قبول کر لی ہے۔ تمام زندگی سولی پر لٹکے رہنا اور سسک سسک کر مرنا قبول کر لیا ہے۔ مجھے جلانے کے لیے خود کو آگ میں جھونک دیا ہے... مجھ سے عملی انتقام لیا ہے کہ تم ایک بدکردار عورت نور جہاں کے لیے مجھے چھوڑ سکتے ہو تو ایک بدکردار مرد سلطان کے لیے میں بھی تمہیں چھوڑ سکتی ہوں۔

میں نے اپنا سر تھام لیا۔ بے وقوف پاگل لڑکی! اب میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ دل کی لگی اور دل لگی میں فرق ہوتا ہے۔

کیا فرق ہوتا ہے؟... میرے اندر کی آواز نے کہا۔ کیا دل لگی بڑھ کے دل کی لگی نہیں بن جاتی اور دل کی لگی کم ہو کے دل لگی نہیں بن سکتی، یہ سب تو جذبات کا کھیل ہے۔

میرے مثبت اور منفی خیالوں کا یہ ریلا نہ جانے کب تک مجھے لہروں کے نشیب و فراز میں سرگرداں تنکے کی طرح پریشان رکھتا کہ اچانک باہر سے کسی کار کا ہارن سنائی دیا۔ میں اٹھ کر کھڑکی تک گیا۔ چوکیدار دروازہ کھولنے لپکا پھر ایک گولڈن نیا لک کلر کی ہنڈا اسوک اندر آئی، اسے سفید وردی اور ٹوپی والا شوفر چلا رہا تھا۔ اس کی پچھلی سیٹ پر میں نے فریال کی ایک جھلک دیکھی پھر کار گھوم کے پورچ کی جانب چلی گئی۔

میرے دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔ صورتِ حال کے اس انقلاب کو دیکھتے ہوئے میرے جذبات کی آتش فشانی پر مایوسی کی برف پڑ چکی تھی مگر ایک امید تھی جو مجھے حوصلہ دیتی تھی کہ خواہ سب بدل جائے مگر فریال وہی ہے تو اس کے جذبات بھی وہی ہوں گے۔

گزرتے وقت کا ایک ایک لمحہ مجھ پر بھاری ہو گیا۔ میرے کان ہر آہٹ پر تھے اور میری نظریں دروازے پر۔ ایک عجیب سی بے چینی تھی جو مجھے کمزور کر رہی تھی۔ ایک بے یقینی کی کیفیت تھی جو مجھے ڈراتی تھی کہ یہ سارا انقلاب حقیقی ہے... کوئی خواب پریشان نہیں۔ اپنی امیدوں کی پرواز کو پرانے وقت کے آسمان تک نہ رکھو کیونکہ وقت کا آسمان بدل گیا ہے۔ آخر دنیا میں وہ بھی تو ہوتا ہے جو ممکن نہیں لگتا۔

فریال ایک دم اندر آگئی، اچانک اس کا سراپا میری نظر میں روشن ہو گیا۔ وہ اندر آئی اور رک گئی۔ میری نظر اس پر یوں مرتکز ہوئی کہ اس کے سوا نگاہ میں کچھ نہ رہا۔ اس کے حسن کی آب و تاب اور سج دھج نے ایسی چکاچوند پیدا کی کہ گرد و پیش کے سارے منظر تاریکی میں روپوش ہو گئے۔

اس کے حسن و جمال کا کیا بیان... میری نظر اسے ساری کائنات میں سب سے حسین مانتی ہے۔ ایک مدت سے اس کے حسن کے ماہِ کامل پر خود فراموشی میں عدم توجہی کے بادلوں کا سایہ تھا۔ اس نے مصروفیت یا بے زاری کے باعث اپنے لباس پر توجہ دینا چھوڑ رکھا تھا اور آرائشِ جمال کی طرف سے بے لاپروا ہو گئی تھی۔ حویلی کے اندر کا ماحول بھی ایسا نہ تھا جہاں لباس اور میک اپ کا موازنہ اور مقابلہ ہوتا۔

آج وہ میرے سامنے یوں کھڑی تھی جیسے کسی مقابلہ حسن میں شریک ہے۔ اس نے ہلکے زرد رنگ کی ساری پہن رکھی تھی جس پر ستارے سے جھلملاتے تھے۔ جارجٹ کی ساری میں اس کے جسمانی خطوط کی سحر آفرینی اور بڑھ گئی تھی۔ اس کے چہرے کے خدوخال کو کسی ماہرِ حسن میک اپ آرٹسٹ نے بڑے کمال سے اجاگر کیا تھا۔ رہی سہی کسر گردن کے سنہرے پن میں سورج کی رو پہلی کرنوں سے بنے نازک سے نیکلس میں جگ مگ کرتے ہیرے نے اور کانوں میں دمکتے آویزوں نے پوری کر دی تھی۔

مجھے اندازہ نہیں کہ کتنا وقت تھا جو سکوت اور جمود کے اس وقفے میں گزر گیا جب خاموشی ہی میری زبان بن گئی تھی اور میرے لیے فریال کے سوا کسی کے وجود کا احساس باقی نہیں رہا تھا۔ خود اپنے وجود کا بھی نہیں... پھر یکلخت حقیقت نے مجھے عرش سے فرش پر کھینچ لیا۔

میں اس کے نظارۂ حسن میں گم تھا کہ اس کے لبوں سے نکلنے والے الفاظ میری سماعت سے گولی کی آواز بن کر ٹکرائے۔ ''تشریف رکھیے نواب صاحب! کھڑے کیوں ہیں۔'' پھر وہ میرے سامنے بیٹھ گئی۔

اور تب مجھے اندازہ ہوا کہ وقت نے ہمارے درمیان

اجنبیت کی دیوار پہلے سے چن رکھی تھی۔ یہ دیوار نہ ہوتی تو اس کے نظر آتے ہی میں سب کچھ بھول کے بے تابانہ لپکتا اور اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ کر اپنے وجود کا ایک حصہ بنالیتا... وہ خود مجھ میں سما جاتی۔

لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ بیگانگی اور اجنبیت کی نظر نہ آنے والی دیوار کو محسوس کرتے ہوئے ہم اپنی اپنی جگہ رک گئے اور اب یہ اندازِ مخاطب ... یہ زہر کی تلخی رکھنے والے بے رحم الفاظ... تشریف رکھیے نواب صاحب!

میں بیٹھ گیا اور خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ''کہیے کیسے زحمت کی۔''

میں ایک دم اٹھا اور اسے یوں دبوچ لیا جیسے وہ اٹھ کے بھاگ جانا چاہتی ہے۔ اسے حرکت کرنے کی مہلت بھی نہ ملی۔ میں نے اس کے گالوں... اس کی آنکھوں اور اس کے لبوں کو دیوانہ وار چوما ''میرے ساتھ ایسا مت کرو فری... میں یہ برداشت نہیں کرسکتا۔ یہ بیگانگی کا رویہ...''

اس نے مجھے دونوں ہاتھوں سے دھکیلا۔ اپنی انگلیوں سے میرا چہرہ نوچ لیا اور خود کو چھڑانے میں کامیاب ہوگئی۔ ''چھوڑو... چھوڑو مجھے... ورنہ میں بلاتی ہوں گارڈ کو۔''

میں لڑکھڑا کے پیچھے ہٹا... یکلخت میرے اندر غصّے اور اشتعال کا آتش فشاں پھٹ گیا۔ ''گارڈ کو بلاؤ گی؟ بلاؤ! میں اسے بھی جان سے ماردوں گا اور تمہیں بھی۔''

وہ صوفے پر گرگئی۔ ''ضرور ماردو مجھے... اگر اس سے تمہیں کوئی فائدہ ہوتا ہے۔''

''تمہیں کیوں فکر ہے میرے فائدے یا نقصان کی۔''

وہ پھولی ہوئی سانس کے ساتھ بولی۔ ''کیوں اپنی مشکلات بڑھاتے ہو رفیق! جاؤ... واپس چلے جاؤ۔''

میں اٹھ کے اس کی طرف بڑھا۔ ''ایسے کیسے واپس چلا جاؤں... جاؤں گا تو تمہیں ساتھ لے کر۔''

وہ ایک دم دروازے کی طرف لپکی۔ ''میں تمہارے ساتھ نہیں جاسکتی، یہ بات ابھی سمجھ لو تو اچھا ہے۔'' اس نے دروازہ کھول دیا۔

میں رک گیا۔ ''فریال! پلیز... میری بات سنو۔ اتنی بے رحم نہ بنو۔ اتنی مشکل سے میں نے تمہیں تلاش کیا ہے۔''

''تم اپنے ہوش میں نہیں ہو، تمہاری بات کیا سنوں۔''

میں نے عاجزی سے کہا۔ ''او کے... میں وعدہ کرتا ہوں۔ اب ایسی کوئی حرکت نہیں کروں گا۔ میں دور سے بات کروں گا۔''

اس نے دروازہ کھلا چھوڑ دیا اور قریب والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ ''اب اور کہنے کو کیا رہ گیا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے بتاؤ! تم نے ایسا کیوں کیا میرے ساتھ؟''

''کس نے کس کے ساتھ کیا کیا، یہ دہرانے سے کیا حاصل۔'' وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔

''اچھا! مجھے بتاؤ، تم میرے ساتھ کیوں نہیں جاسکتی ہو۔''

''میری کچھ مجبوریاں ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''کیسی مجبوریاں، فریال مجھ سے نظر ملا کے بات کرو۔ کیا تم کو مجھ سے محبت نہیں رہی۔''

''تمہاری محبت کے سوا رہا کیا ہے میرے پاس۔ جس دن یہ محبت بھی نہ رہے گی... فریال زندہ نہیں رہے گی۔'' وہ باہر دیکھنے لگی۔

''پھر تمہیں میرے ساتھ جانے سے انکار کیوں ہے۔ دیکھو! میں اپنی ہر غلطی اپنا ہر قصور مانتا ہوں۔ مجھے اس کی اتنی بڑی سزا نہ دو۔ میرے ساتھ چلو! ہم شادی کرلیں گے۔''

اس نے زخمی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''شادی کی بات مت کرو یہ اپنے اختیار کی بات ہوتی تو کب کی ہو جاتی۔ آئی ایم سوری، فی الحال میں اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی... میں مجبور ہوں۔''

''ایسی کیا بات ہوگئی آخر... کیا مجبوری ہے تمہاری؟'' میں نے برہمی سے کہا۔ ''کس کا ڈر ہے تمہیں۔''

''ڈر کسی کا نہیں... کل جو مجبوری تمہاری تھی، آج وہی میری ہے۔''

''میری کوئی مجبوری نہیں تھی۔'' میں نے احتجاج کیا۔

اس نے زور دے کر کہا۔ ''تھی رفیق! تمہاری مصروفیت تمہاری مجبوری تھی۔''

''دیکھو، طعنے مت دو... میں اپنی غلطی مانتا ہوں۔''

''میں طعنے نہیں دے رہی ہوں۔ غلطی میری تھی کہ میں نے تمہاری مجبوری کو نہیں سمجھا، تمہارے لیے کچھ کام شادی سے زیادہ ضروری تھے۔ شادی بالآخر سب کی ہو جاتی ہے لیکن دنیا کے بہت سے کام پہلے نمٹانا ضروری ہوتے ہیں۔ اگر تم ایک عام آدمی ہوتے تو یہ تمہارے لیے بہت آسان ہوتا... میرا مطلب ہے شادی کرنا۔ مگر تم عام آدمی نہیں ہو... تمہاری ذمے داریاں بہت بڑی ہیں۔''

''مجھے معلوم ہے تم یہ بات شکایت کے طور پر کہہ رہی ہو... تم نے بہت رعایت دی تھی مجھے۔ کوتاہی میری تھی لیکن مجھے اس کی بہت سزا مل چکی ہے۔ اب غصہ چھوڑو... ساتھ چلو۔''

اس نے پھر ایک گہری سانس لی۔ ''پھر وہی بات! میں نے کہہ دیا نا کہ میں تمہارے ساتھ نہیں جاسکتی... وہ کہانی ختم ہوگئی۔''

میں نے چلا کے کہا۔ ''تم میرے بچے کی ماں بننے والی تھیں... کیا وہ بھی کہانی تھی؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''سچ پوچھو تو وہ بھی کہانی تھی... تم پر دباؤ ڈالنے کے لیے۔''

''میں نہیں مانتا... تم قید میں ہو، اس لیے یہ کہہ رہی ہو۔''

''قید؟... کیسی قید؟'' وہ بولی۔

''تم سلطان کی قید میں ہو۔'' میں نے چلا کے کہا۔

وہ بولی۔ ''یہ تم سے کس نے کہا؟''

''کیا یہ غلط ہے؟ بولو! یہ گھر... یہ گاڑی... یہ رہن سہن یہ سب کیا ہے فریال؟'' میں نے کہا۔

اس نے چند سیکنڈ بعد جواب دیا۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ سب اسی نے دیا ہے مجھے۔''

میں پھر چلایا۔ ''اور اس کے باوجود تم کہتی ہو کہ اس کی قید میں نہیں ہو۔''

''ہاں یہ سچ ہے۔ اس کی طرف سے مجھ پر کوئی پابندی نہیں۔ اگر میں جانا چاہوں تو ابھی تمہارے ساتھ جاسکتی ہوں لیکن بات صرف میرے چاہنے کی نہیں ہے۔''

''پھر کیا بات ہے؟''

''میں مجبور ہوں، ان ذمے داریوں کی وجہ سے جو اب میں نے قبول کرلی ہیں۔'' وہ مجھ سے نظر چرا کے بولی۔

میں نے کہا۔ ''کھل کے بات کرو فریال۔''

وہ رک رک کے بولی۔ ''میں نے فلم لائن پھر جوائن کر لی ہے۔''

میرے دماغ کو جیسے چار سو چالیس والٹ کا جھٹکا لگا۔

''فلم لائن؟ تم پھر اس حرامزادے کے پھیلائے ہوئے جال میں گرفتار ہوگئی ہو؟''

''اسے بلاوجہ گالی مت دو۔''

میں نے تلخی سے کہا۔ ''اچھا؟ بہت برا لگا تمہیں۔''

وہ بولی۔ ''میں نے کسی اور کی فلم سائن کی ہے۔''

''یعنی ایگریمنٹ بھی سائن کرلیا ہے۔'' میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ''آخر کیوں فریال... کیا ضرورت تھی تمہیں؟''

''ضرورت کی بات مت کرو... تمہیں کیا ضرورت تھی ست بدھائی کے لیے ایک ترقیاتی منصوبے کی؟'' وہ تیز لہجے میں بولی۔ ''کیا اس کے بغیر تمہارا گزارا نہیں تھا... نہیں، بات گزارے کی نہیں۔ ہر شخص کے کچھ خواب ہوتے ہیں... کچھ ارادے... کچھ منصوبے... دولت تو اتنی تھی تمہارے پاس کہ تم پورے نوابی ٹھاٹ باٹ کے ساتھ رہ سکتے تھے اور میں تم سے شادی کرلیتی تو مجھے وہ سب مل جاتا جو تمہارا تھا۔''

''وہ اب بھی تمہارا ہے۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اب اس معاملے میں بہت دیر ہوچکی ہے۔ وہاں رہ کے میں نے بہت کچھ دیکھا اور سیکھا... تم دولت کے علاوہ طاقت چاہتے تھے، قوت اور شہرت چاہتے تھے۔ کیا یہ غلط ہے؟''

میں نے کسی مجرم کی طرح سر جھکا لیا۔ ''یہ ٹھیک ہے... مگر...''

''مگر کیا... تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ تم مرد ہو اس لیے یہ خواب دیکھ سکتے ہو اور ان کو تعبیر دے سکتے ہو... منصوبے بنا سکتے ہو اور انہیں پورا کرسکتے ہو اور میں صرف تمہارا ساتھ دے سکتی ہوں... تمہاری مدد کرسکتی ہوں... تمہاری کامیابی پر فخر کرسکتی ہوں اور خوش ہوسکتی ہوں۔ کیونکہ میں صرف ایک عورت ہوں... مجھے عزت اور شہرت تمہارے ذریعے سے... تمہارے ساتھ رہ کر ہی مل سکتی ہے اور دولت بھی... وہ بھی اگر تم چاہو تو... ورنہ تم کسی اور کو چاہنے لگو تو تمہاری مرضی۔ میں سوائے جلنے کڑھنے اور گھٹ گھٹ کر مرنے کے اور کیا کرسکتی ہوں۔''

''ایسی کوئی بات نہیں تھی فریال۔''

''ایسی ہی بات تھی نواب صاحب جس نے مجھے اس حویلی سے قدم نکالنے پر مجبور کیا۔ تم نے میری محبت کو میری کمزوری سمجھ لیا تھا... میری مجبوری بنادیا تھا۔'' فریال نے غصے میں کہا۔

''نہیں فریال۔ تم نے بالکل غلط سمجھا۔''

''اس کے سوا کہہ بھی کیا سکتے ہو تم... میں نے وہ سب کیا جو میں کرسکتی تھی۔ جو میرا فرض تھا... تمہیں خوش رکھنے کے لیے میں نے ان سب کو خوش رکھا جو حویلی کے اندر تم سے کوئی رشتہ رکھتے تھے... میں نے تمہارے والدین کا دل جیت لیا لیکن اس کے بدلے میں مجھے کیا ملا؟ تم نے یہ سمجھ لیا کہ تمہیں میری فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے میں تو ایک مفتوحہ مملکت ہوں... میرے دل پر تمہارا مکمل اختیار ہے... میرے جسم کی طرح پھر میری خوشی کے لیے تردد کیسا۔ میں تو خوش ہوں اور

مجھے خوش ہونا بھی چاہیے، آخر کوئی عورت اس سے زیادہ اپنی تقدیر سے کیا مانگ سکتی ہے۔"

"ایسا میں نے کبھی نہیں سوچا۔"

"مگر میں نے سوچا... کیا تمہارے نزدیک اس کی اہمیت ہے کہ میں کیا سوچتی ہوں یا صرف وہ اہم ہے جو تم سوچتے ہو؟"

میں نے تلخی سے کہا۔ "ابھی تک تم نے نور جہاں کا حوالہ نہیں دیا۔"

"اس سے مجھے کوئی پرخاش نہیں... اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ اس نے میری حیثیت جو پہلے ہی کم ہو رہی تھی، مزید کم کر دی۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں نواب صاحب! آپ جیسے رئیس ہمیشہ سے ایسی عورتوں کے پیچھے لپکتے رہے ہیں۔ گھر کے لیے وفا شعار عفت مآب بیوی لاتے ہیں... چندے آفتاب چندے ماہتاب... مگر استعمال کے بعد وہ دو کوڑی کی ہو جاتی ہے۔ تم نے بھی یہی کیا... مجھے سب معلوم ہوتا تھا... بعد میں بھی معلوم ہوتا رہا۔ اپنے نام نہاد شوہر کو قتل کر کے وہ تمہاری پناہ میں آ گئی، تمہارے محل میں پہنچ گئی۔ میں کب تک سمجھوتے کر کے جیتی۔ صرف اس خیال میں میرے لیے کون سی خوشی تھی کہ ایک دن تم مجھ سے نکاح کر لو گے۔"

"گویا تمہارا ست بدھائی سے نکلنا کوئی فوری ردِعمل نہیں تھا... پہلے سے طے شدہ تھا؟" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"یہ ضروری تھا... مجھے اپنی اہمیت کسی منکوحہ کی طرح صفر کر کے تمہاری قیدِ شریعت میں رہنا منظور نہیں تھا۔ میری توقعات اس سے زیادہ تھیں جتنی تم سمجھتے تھے۔ میں چاہتی تھی کہ میری محبت ہی تمہارے لیے سب کچھ ہو اور محبت صرف بیڈ روم کی رفاقت تک محدود نہ ہو... یہ عزت احترام توجہ اور تمہاری زندگی کے سارے رشتوں تمام معاملات سے بڑھ کر ہو۔ ظاہر ہے ایسی خواہش کرنا میری بے وقوفی بن گیا تھا، میں اپنی ہستی کو مٹا کے صرف تمہارے لیے جینے کی مجبوری سے کیسے نباہ کرتی۔ پھر میں نے سوچا کہ اگر تم عزت اور شہرت اور طاقت کو محبت سے زیادہ اہم سمجھنے لگے ہو تو پھر میں بھی ایسا کیوں نہ چاہوں۔"

"چنانچہ تم نے پھر فلمی دنیا کا رخ کیا۔"

"ہاں۔ مجھے خیال آیا کہ تم جتنی قوتِ تسخیر رکھتے ہو، اس سے کہیں زیادہ تسخیر کی طاقت میرے پاس ہے۔ تم ایک رانا کو مطیع بنا کے ست بدھائی کے گرد و نواح میں اپنے نام کی دھاک بٹھانا چاہتے ہو تو میں تو ایک زمانے کو اپنا دیوانہ بنا سکتی ہوں۔ تم جیسے شرفا کسی ماڈل یا ایکٹریس کو ناک بھوں چڑھا کے طوائف کہتے ہیں... مگر بھاگتے تو اسی کے پیچھے ہیں۔ میری جوتی کو بھی پروا نہیں کہ کون کیا کہتا ہے۔" وہ سخت مشتعل تھی۔

میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "دیکھو فریال! اگر تم کو یہ سب کرنا تھا تو تم نے مجھ سے کیوں نہیں کہا؟"

وہ چیخ کے بولی۔ "کیوں کہتی میں تم سے؟ جب خود تم نے نہیں سوچا۔ یہ درخواست لے کر بھی میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوتی کہ جناب نواب صاحب قبلہ... آپ کی یہ کنیز ماڈل بننے کی آرزو مند ہے، فلم میں کام کرنا چاہتی ہے اور آپ از راہِ بندہ پروری اپنی روشن خیالی کا ثبوت دیتے ہوئے اس پروجیکٹ کے لیے بھی پچاس لاکھ کی رقم مختص فرما دیتے... ست بدھائی ترقیاتی فنڈ کے کسی پروجیکٹ کی طرح۔"

میں نے دھاڑ کے کہا۔ "اور اس کے لیے تم نے سلطان جیسے شخص سے رابطہ کرنا منظور کر لیا... اس کی داشتہ بن گئیں۔"

وہ چلّا کے بولی۔ "اپنی بکواس بند کرو... میں نے ہرگز ایسا نہیں سوچا تھا نہ میں اس کی داشتہ ہوں۔"

"پھر یہ سب کیا ہے... کس نے دیا ہے تمہیں یہ سب کچھ... یہ کوٹھی کار... نوکر چاکر... یہ ٹھاٹ باٹ۔" میں نے چیخ کے کہا۔

اس نے دروازہ بند کر دیا۔ "اگر تم میں تحمل سے بات سننے کا حوصلہ نہیں ہے... تو تم جاؤ۔"

میں نے جگ سے ایک گلاس پانی کا بھرا اور پی لیا۔ "دیکھو فریال! میں یہاں بات بنانے آیا تھا... بگاڑنے نہیں۔"

اس نے ایک گہری سانس لی۔ "میں بھی جب ست بدھائی سے نکلی تھی تو گجرات آنے کے لیے ٹرین پر سوار نہیں ہوئی تھی۔ میں واپس لندن جانا چاہتی تھی، میں نے اپنی سہیلی ڈاکٹر شائستہ سے یہی کہا تھا کہ مجھے ٹکٹ بھیج دے۔ میرا ارادہ اسلام آباد جا کے ویزا حاصل کرنے کا تھا۔"

"پھر کیا تمہارے دل کی بات فرشتوں نے سلطان تک پہنچا دی اور وہ تمہارے استقبال کے لیے اسٹیشن پر آ گیا؟"

"پہلے پوری بات سن لو... بہتری اسی میں ہے اور نہیں سن سکتے تو مجھے بھی کوئی ضرورت نہیں ہے وضاحت کرنے کی۔" وہ بگڑ گئی۔

"او کے... آئی ایم سوری۔" میں نے کہا۔

"میرا پروگرام یہ تھا کہ لندن پہنچ کے شائستہ سے بات کروں گی۔ وہاں جا کے دیکھوں گی کہ مجھے کون سا پروفیشن

اختیار کرنا چاہیے۔ میں نے لندن سے چار سال کا ڈپلوما کورس کیا ہے... انٹیریئر ڈیزائننگ کا... میرا رجحان ماڈلنگ کی طرف بھی تھا۔ میں لندن میں اس کی ٹریننگ بھی لے سکتی تھی... اگر شائستہ کہتی تو میں فلم لائن لینے کا فیصلہ بھی کر لیتی۔ پاکستان کے علاوہ دنیا کے فلم ساز بھی لندن آتے رہتے ہیں اور ایڈورٹائزنگ والے بھی۔ میرے لیے عزت شہرت اور دولت کا حصول مشکل نہیں تھا۔ یہ میں جانتی تھی... ٹرین کے سفر میں میرا یہ خیال پختہ ہو گیا کہ مجھے فلم لائن ہی اختیار کر لینی چاہیے۔ جب میں کامیابی کی منزل پا لوں گی تو سلطان جیسے اور تم جیسے خود میرے پیچھے آئیں گے۔"

"تم مجھے ذلیل کر رہی ہو۔" میں نے گلاس کو دیوار پر کھینچ مارا۔

وہ متاثر نہیں ہوئی۔ "جتنی ذلت میں نے برداشت کی اس کا کچھ اندازہ ہے تمہیں؟ جس طرح تم نے وفا کے نام کو بے آبرو کیا... اس عورت نور جہاں کے لیے۔ صرف اس لیے کہ وہ مجھ سے زیادہ حسین اور پُرکشش تھی... تم مردوں کے لیے صرف یہی اہم ہے شاید۔"

میں نے کہا۔ "مجھے صرف اتنا بتا دو کہ تم یہاں کیسے آ گئیں؟" اور جواب میں اس نے مجھے سب بتا دیا۔

☆☆☆

"میں گجرات کے ریلوے اسٹیشن پر اتری تھی۔ ایک فون کرنے کے لیے... اس میں کچھ دیر ہو گئی جب میں نے پلٹ کے دیکھا تو ٹرین حرکت میں آ چکی تھی۔ میں فون کا ریسیور پھینک کے دوڑی لیکن میری بدقسمتی کہ ایک قلی سے ٹکرا کے گر گئی جو سر پر سامان اٹھائے بھاگ رہا تھا کسی کو سوار کرانے کے لیے۔ وہ قلی تو ٹرین پکڑنے میں کامیاب ہو گیا ہو گا لیکن اس کے سر پر رکھے سوٹ کیس کا کونا میرے سر پر لگا تو میں گر کے بے ہوش ہو گئی۔ جب صبح مجھے ہوش آیا تو میں کسی اسپتال کے بیڈ پر تھی، مجھے کمزوری محسوس ہو رہی تھی اور کمرا میری نظروں میں گھوم رہا تھا۔ کچھ دیر بعد میری حالت میں بہتری آئی تو میں نے غور سے دیکھا... وہ کوئی بہت اچھا پرائیویٹ اسپتال تھا۔ سوچنے پر مجھے اپنے ساتھ پیش آنے والے حادثے کے بارے میں بھی یاد آ گیا۔ میں نے ایک نرس سے پوچھا کہ مجھے یہاں کون لایا تھا۔ اس نے لاعلمی کا اظہار کیا کیونکہ رات کو اس کی ڈیوٹی نہیں تھی۔

اس نے مجھے معلوم کر کے بتایا کہ تین دن پہلے مجھے خود چوہدری صاحب یہاں لائے تھے۔

میں نے پوچھا۔ "کون چوہدری صاحب؟"

نرس نے کہا۔ "جن کا یہ اسپتال ہے... چوہدری سلطان۔"

مجھے تو جیسے کرنٹ لگ گیا۔ "مجھے یہاں چوہدری سلطان لایا تھا۔ یہ اس کا اسپتال ہے۔"

نرس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "ان کے والد چوہدری ذیشان نے یہ اسپتال بنایا تھا... پچھلے سال۔"

میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو چکر آ گیا۔ میں گر پڑی۔ نرس نے فوراً ایک لیڈی ڈاکٹر کو بلا لیا... اس نے آتے ہی میرا معائنہ شروع کر دیا۔ "یہ آپ کیا کر رہی ہیں میڈم! آپ کو ابھی اٹھنے کی بالکل اجازت نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔ "کیا ہوا ہے مجھے؟"

"آپ کو نہیں معلوم... آپ کے سر میں چوٹ آئی ہے چھ ٹانکے لگے ہیں جب آپ کو یہاں لایا گیا تو آپ بے ہوش تھیں۔"

میں نے کہا۔ "لیکن اب میں ٹھیک ہوں۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہم نے رات بھر آپ کو انڈر آبزرویشن رکھا۔"

میں نے کہا۔ "ڈاکٹر میں جانا چاہتی ہوں۔"

"چوہدری صاحب کی اجازت کے بغیر۔"

میں ایک دم بگڑ گئی۔ "کون چوہدری صاحب... تم چوہدری سلطان کی بات کر رہی ہو... ڈاکٹر وہ ہے یا تم۔ اور اگر تم اتنا ڈرتی ہو اس سے تو اس لیے کہ ملازم ہو۔ میں نہیں ڈرتی... میں جا رہی ہوں۔"

وہ گھبرا گئی۔ "پلیز میڈم! آپ کی حالت واقعی ایسی نہیں ہے اور چوہدری صاحب کو معلوم ہو گا تو ہماری شامت آ جائے گی۔"

میں نے کہا۔ "کیا میں چوہدری صاحب کی قید میں ہوں... جواب دو۔ انہوں نے کہا ہے کہ مجھے نہ جانے دیا جائے۔"

ڈاکٹر اور نرس دونوں میں مجھ سے نظر ملانے کی ہمت نہیں تھی پھر ڈاکٹر نے صورتِ حال کو سنبھالا۔ "آپ غلط سمجھ رہی ہیں... آپ کی حالت کو دیکھتے ہوئے انہوں نے ایسا کہا تھا۔ اگر آپ سمجھتی ہیں کہ بالکل ٹھیک ہیں تو میں ڈائریکٹر صاحب کو بتا دیتی ہوں۔"

میں نے کہا۔ "کون ڈائریکٹر... میں چوہدری سلطان سے بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"وہ... اس وقت تو بڑے چوہدری صاحب ہیں۔"

میں نے پوچھا۔ ''ان کے والد... ٹھیک ہے۔ میں ان سے بات کروں گی۔''

''وہ راؤنڈ پر ہیں، ابھی یہاں آئیں گے۔'' ڈاکٹر نے کہا اور پھر نرس پر خفا ہونے لگی۔ ''ابھی تک دوا نہیں کھلائی، انجکشن کدھر ہے؟''

میں نے کہا۔ ''میں دوا کھاؤں گی نہ انجکشن لوں گی۔''

ڈاکٹر کی پریشانی اندر آنے والے کو دیکھ کر دور ہوگئی۔ وہ ساٹھ ستر سال کا شفیق صورت شخص تھا۔ اس کی ڈاڑھی کے سارے بال سفید تھے اور سر کے بال بھی اتنے ہی سفید مگر گھنے تھے۔ اس نے موٹے شیشوں والی عینک لگا رکھی تھی اور سادہ شلوار قمیض کے ساتھ اس نے کاندھے.... پر ایک شال ڈال رکھی تھی۔ اس کے پیچھے گرے بھاری سوٹ والا قدرے موٹا اور بھاری سانولے چہرے والا شخص اسپتال کا ڈائریکٹر ہی ہو سکتا تھا۔

عادت یا روایت کے مطابق اس نے مسکراتے ہوئے مجھ سے میرا حال پوچھا۔ ''کیسی ہے طبیعت پتر؟'' اس نے میرے سر پر تھپکی دی اور پھر سوالیہ نظروں سے ڈاکٹر کو دیکھا۔

''ان کو کل رات چھوٹے چوہدری صاحب لے کر آئے تھے۔'' ڈائریکٹر نے بتایا۔ ''ان کے سر میں چوٹ لگی تھی۔''

''اچھا اچھا!'' اس نے سر ہلایا۔ ''بتایا تھا مجھے سلطان نے... چلو اللہ کا شکر ہے زیادہ چوٹ نہیں آئی۔''

وہ جانے لگا تو میں نے کہا۔ ''چوہدری صاحب! میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔''

وہ رک کے پلٹا۔ ''کوئی خاص بات ہے؟''

میں نے کہا۔ ''جی خاص ہی ہے۔''

''اچھا تو پھر میں راؤنڈ سے فارغ ہو کے آتا ہوں، کسی بات کی تکلیف تو نہیں ہے نا؟'' اس نے پوچھا۔

''جی سب ٹھیک ہے۔''

اسی وقت ڈاکٹر نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ ''جناب یہ دوا نہیں کھاتی اور انجکشن لگوانے سے بھی انکار کر رہی ہے۔''

وہ دروازے سے واپس آیا۔ ''کیوں پتر! کیا ڈاکٹر ٹھیک کہہ رہی ہے؟ ہمارے علاج پر بھروسا نہیں؟ کسی اور اسپتال میں جانا ہے یا کسی اور ڈاکٹر کو دکھانا ہے؟''

میں نے خفت سے کہا۔ ''نہیں جی ایسی کوئی بات نہیں۔'' وہ ڈائریکٹر کی طرف پلٹا۔ ''اس کے بارے میں کچھ پتا چلا؟''

اس نے بھی نفی میں سر ہلا دیا۔ ''اس نے کچھ نہیں بتایا... نہ کوئی آیا۔''

وہ میری طرف مخاطب ہوا۔ ''چل ضد کر کے مجھے گنہگار نہ کر، کھا لے دوا... شاباش۔''

اس کا رویہ اتنا پُرشفقت تھا کہ میں دوا سے انکار کر کے بھی شرمسار ہوتی۔ چوہدری سلطان اور اس کے باپ کے ظاہری رویے میں بھی زمین آسمان کا فرق تھا اور صاف نظر آتا تھا کہ یہ فرق ان کی فطرت اور مزاج میں بھی نمایاں ہوگا۔

میں نے ڈاکٹر سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ یہ ٹرسٹ اسپتال چوہدری ذیشان نے اپنی مرحومہ بیوی کی یاد میں قائم کیا تھا۔ یہاں علاج کی بہترین سہولیات دستیاب تھیں لیکن معاوضہ لینے کا اصول بہت آسان اور سادہ تھا جو جتنا دے سکتا ہے لے لو... جو کچھ دینے کے قابل نہ ہو اسے جانے دو۔ ہر سال تقریباً نصف اخراجات خود بڑے چوہدری صاحب برداشت کرتے تھے اور یہ نصف بھی پچاس لاکھ ہوتا تھا۔ تاہم ان کے دوست مددگار بھی بہت تھے۔

میں سوچتی رہی کہ ایسے خدمتِ خلق کرنے والوں کے لیے کوئی حادثہ ایک بہانہ بن جاتا ہے۔ قدرت پہلے انہیں کسی آزمائش میں ڈالتی ہے... عمران خان کی والدہ کا کینسر میں مبتلا ہو کے انتقال ہوا۔ اس صدمے نے عمران خان کے دل میں ایک امنگ جگائی... کچھ کرنے کی جو ہمارے ساتھ ہوا دوسروں کے ساتھ نہ ہو اور اس نے دنیا کا سب سے عظیم الشان اسپتال کھڑا کر دیا۔ کیا ایسا ہی بڑے چوہدری صاحب کے ساتھ بھی ہوا جو قدرت غم دیتی ہے وہی حوصلہ دیتی ہے... وہی وسائل دیتی ہے... وہی کامیابی دیتی ہے۔

جب بڑے چوہدری صاحب آئے تو مجھ پر کچھ غنودگی طاری تھی۔ انہیں دیکھ کر میں سیدھی بیٹھ گئی۔ اب وہ اکیلے تھے۔

''ہاں بھئی... کیا نام ہے تیرا کڑی... فریال۔'' انہوں نے چارٹ اٹھا کے دیکھا۔ ''بھئی میں ڈاکٹر نہیں ہوں مجھے مرض کا تو پتا نہیں چلتا لیکن مریض کا پتا چل جاتا ہے۔ ماشاءاللہ اچھے گھر کی پڑھی لکھی لڑکی ہو۔''

میں نے کہا۔ ''میں نے لندن سے انٹیریئر ڈیزائننگ میں چار سال کا کورس کیا ہے۔''

انہوں نے سر ہلایا۔ ''یعنی میرا اندازہ درست تھا پھر کیا بات ہے۔ ابھی تک کوئی تجھے دیکھنے نہیں آیا، تو نے کسی کو فون کر کے نہیں بتایا۔''

''ایسا کوئی ہوتا تو میں ضرور بتاتی۔''

''اچھا؟ ایک بات پوچھوں پتر... برا نہ مانے تو... مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ میں نے تجھے پہلے بھی دیکھا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''آپ نے اپنے بیٹے کے ساتھ دیکھا ہوگا یا اس کے پاس میری تصویر دیکھی ہوگی۔''

''کس کے پاس؟ سلطان کے پاس؟''

میں نے کہا۔ ''جی، وہی مجھے یہاں لایا ہے اور اس نے مجھے یہاں قید کر دیا ہے۔''

وہ چونکا۔ ''قید کر دیا ہے؟ اسپتال میں۔ نہ پتر! ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟''

''تو کیا میں جا سکتی ہوں؟'' میں نے کہا۔

''ضرور... جب تیرا جی چاہے اور حوصلہ ہو لیکن تیری بات نے مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے... ایسا کیوں کہا تو نے؟''

''ایسا میں نے بے وجہ نہیں کہا جناب۔''

''چل پھر وجہ بتا دے مجھے... اس کے بعد جہاں تیرا جی چاہے چلی جا ورنہ مجھے سلطان سے پوچھنا پڑے گا۔ ہو سکتا ہے وہ مجھے صحیح نہ بتائے۔''

میں نے کہا۔ ''ساری بات بتاؤں گی تو بہت لمبی ہو جائے گی۔ ایک زمانے میں سلطان مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا، وہ ایک فلم بنا رہا تھا۔''

''مجھے یاد آ گیا... بڑا پیسا ضائع کیا اس شوق میں سلطان نے... فلم پوری نہیں ہوئی۔''

میں نے کہا۔ ''اور ہر بار جب وہ کوئی فلم اناؤنس کرتا تھا تو کسی لڑکی کو ہیروئن بنانے کا چانس دیتا تھا... میں بھی اس کے چکر میں آ گئی تھی۔ بعد میں اس نے شادی کا کہا تو میں نے ہاں کر دی... لیکن رفتہ رفتہ مجھے بھی اندازہ ہو گیا کہ فلم کو اس نے جال کے طور پر استعمال کیا تھا۔ آپ کہہ سکتے ہیں میری بے وقوفی کہ میں اس جال میں پھنسی لیکن حقیقت سامنے آتے ہی میں نے خود کو الگ کر لیا لیکن سلطان میرے پیچھے پڑ گیا کہ مجھ سے منگنی کی ہے تو شادی بھی کرنی پڑے گی۔ آپ برا نہ مانئے گا سلطان کے کردار کا اصل روپ سامنے آنے کے بعد میرے لیے یہ ناممکن تھا۔''

''میں کیا برا مانوں گا، بیٹے دو ہوتے تو ایک کو عاق بھی کر دیتا لیکن سلطان اکلوتا ہے... ایک انڈا وہ بھی گندا۔ میں اور میری بیوی اکثر گلہ کرتے ہیں کہ اس سے تو اللہ بے اولاد رکھتا۔'' انہوں نے آہ بھری۔

''یقین نہیں آتا کہ آپ جیسے نیک اور با کردار شخص کا ایسا بیٹا ہو سکتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''اللہ اسے ہدایت دے۔ ایک لڑکی پہلے بھی آئی تھی میرے پاس، بڑی دکھی تھی وہ۔ میں جو کر سکتا تھا میں نے کیا لیکن میں زبردستی سلطان کی اس سے شادی نہیں کرا سکتا تھا۔ روپیا پیسا سب اس کے لیے بے کار تھا۔ بدنامی کے ڈر سے اس نے بعد میں خودکشی کر لی۔ مجھے ضمیر پر آج تک اس کا بوجھ محسوس ہوتا ہے۔'' انہوں نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے اپنی آنکھوں کو شال کے کنارے سے صاف کیا۔

میں نے کہا۔ ''میرے انکار نے سلطان کو میرا دشمن بنا دیا۔ اس نے میرا جینا مشکل کر دیا اور اس شخص کا بھی جس کے ساتھ میں شادی کرنا چاہتی تھی۔ چار سال میں نے سخت عذاب میں گزارے جب میں لندن گئی تو اس کے آدمی دن رات میری نگرانی کرتے تھے۔ میں وہاں سے فرار ہو گئی۔ اس نے مجھے بہت تلاش کیا اور مایوس ہو گیا۔ اب مجھے یقین آنے لگا تھا کہ میری جان اس سے چھوٹ گئی ہے، میری بدقسمتی کہ گجرات کے ریلوے اسٹیشن پر اس نے پھر مجھے دیکھ لیا اور یہاں لے آیا۔ کیا آپ یہاں سے نکلنے میں میری مدد کریں گے۔ وہ مجھے جانے نہیں دے گا۔''

''کیسی باتیں کرتی ہے... جھلی نہ ہو تو۔ یہ اسپتال ہے کوئی جیل خانہ نہیں۔ تجھے جہاں جانا ہو مجھے بتا، میں خود پہنچاؤں گا۔''

میں نے کہا۔ ''میں ابھی جانا چاہتی ہوں۔''

''ابھی؟ نا پتر... اتنی جلدی کیا ہے، ابھی تیری حالت کچھ ٹھیک نہیں لگتی مجھے۔''

میں نے کہا۔ ''میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

''اچھا پھر کسی کو بلا لے۔ کوئی تجھے یہاں سے لے جائے، تیرا اکیلے جانا ٹھیک نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''میں کسی کو بلانا بھی نہیں چاہتی۔''

''اچھا جیسی تیری مرضی۔'' وہ سر جھکا کے اٹھے اور باہر چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد میں نے سوچا کہ میرے پاس تو اب کچھ بھی نہیں ہے۔ میرا سامان جو ٹرین میں تھا نہ جانے کہاں پہنچ چکا ہوگا۔ غنیمت یہ ہوا کہ میرا ہینڈ بیگ میرے ساتھ تھا اور اس میں میرا زیور محفوظ تھا لیکن میرے استعمال کے سارے کپڑے جوتے یہاں تک کہ میرے کچھ اہم کاغذات بھی چلے گئے تھے... سوائے پاسپورٹ کے جسے میں کیش کی طرح اپنے بیگ میں رکھتی ہوں۔ کیش بھی میرے پاس چند ہزار روپے سے زیادہ نہ تھا۔ اس سے میں اسلام آباد ضرور پہنچ سکتی تھی... لندن نہیں۔ اس کے باوجود میں نے وہاں سے نکلنے کا فیصلہ کیا۔

ڈاکٹر کچھ دیر بعد آئی تو میں نے اس سے کہا کہ مجھے

فوری طور پر ڈسچارج کر دیا جائے۔

وہ سوچ میں پڑ گئی کہنے لگی کہ میں ڈائریکٹر صاحب سے بات کر لوں۔

مجھے سخت طیش آیا۔ ''میں بڑے چوہدری سے بات کر چکی ہوں، انہوں نے مجھے اجازت دے دی ہے۔''

وہ دروازے کی طرف بڑھی۔ ''پھر تو ڈائریکٹر صاحب کو بھی اعتراض نہیں ہوگا۔ ویسے ابھی آپ کی حالت ایسی نہیں ہے...''

میں اس کی طرف لپکی۔ ''دیکھو کیا میں بیمار لگتی ہوں۔ کیا میں بالکل ٹھیک نظر نہیں آتی؟'' مگر اس کے ساتھ ہی مجھے زبردست چکر آیا اور میں دروازے کے پاس گر گئی۔ ڈاکٹر نے نرس کی مدد سے مجھے پھر بیڈ پر شفٹ کیا۔

''آپ ٹھیک نظر ضرور آتی ہیں لیکن ہیں نہیں، یہ ہم جانتے ہیں۔'' وہ میرا معائنہ کرتے ہوئے بولی۔ ''آپ کو کم سے کم دو دن یہاں رہنا چاہیے... اس کے بعد دیکھیں گے۔''

ایک طرف میرے دل میں سلطان کا ڈر بیٹھا ہوا تھا۔ دوسری طرف بڑے چوہدری صاحب کی یقین دہانی بھی میرے سامنے تھی۔ میں نے وہاں دو دن رک کے علاج جاری رکھنے کا فیصلہ کیا۔ مجھے یہ ڈر بھی ہوا کہ پوری طرح صحت یاب ہوئے بغیر میں اسپتال سے چلی گئی اور راستے میں کہیں کچھ ہو گیا تو زیادہ خرابی ہوگی۔ سر کی چوٹ کا کچھ بھروسا نہیں ہوتا۔

دو دن بعد میں بالکل فٹ تھی۔ میں نے باغ میں چہل قدمی کی اور تھوڑی بہت ایکسر سائز بھی۔ بڑے چوہدری صاحب صبح آئے تو خلافِ معمول چپ تھے اور انہوں نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ شام کو ڈاکٹر کے ساتھ اچانک سلطان اندر آ گیا۔ ڈاکٹر نے ڈسچارج سرٹیفکیٹ مجھے تھمایا اور فوراً نکل گئی۔ سلطان کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

خلافِ توقع اس کا لہجہ اور رویہ بہت بدلا ہوا تھا۔ اس نے شائستگی سے پوچھا۔ ''کیسی ہو فریال؟''

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہوں۔''

وہ بولا۔ ''یہ اتفاق ہے کہ میں نے تمہیں دیکھ لیا۔''

''اسے میں اپنی بدقسمتی سمجھتی ہوں۔'' میں نے کہا۔

''میں اپنے ایک کزن کو چھوڑنے گیا تھا۔ وہ کچھ لیٹ ہو گیا تھا۔ آگے بھاگ رہا تھا۔ میں پیچھے تھا۔ اچانک تم بدحواسی میں دوڑتی آئیں اور قلی سے ٹکرا گئیں۔''

''اس کا سوٹ کیس بڑی زور سے میرے سر پر لگا تھا۔''

''میں نے تمہیں گرتے دیکھ لیا تھا۔ تم گجرات کے ریلوے اسٹیشن پر کیا کر رہی تھیں۔''

''میں اسی ٹرین میں تھی جو مس ہو گئی۔ میرا سب سامان اس میں چلا گیا۔''

''اوہ! آئی ایم سوری... اگر مجھے معلوم ہو جاتا مگر معلوم کیسے ہو جاتا۔ تم تو بے ہوش تھیں... کیا بہت قیمتی سامان تھا؟''

میں نے کہا۔ ''نہیں صرف ایک سوٹ کیس تھا۔ پہننے کے جوتے اور کپڑے تھے، میرا خیال ہے اب مجھے چلنا چاہیے۔''

''اگر تم برا نہ مانو تو میں تمہیں چھوڑ آؤں۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''تھینکس، میں خود بھی جا سکتی ہوں۔''

''دیکھو ڈرنے کی کوئی بات نہیں... اگر میری نیت میں فتور ہوتا تو کیا میں تم کو کہیں اور نہیں لے جا سکتا تھا۔ اللہ کے فضل سے یہاں اپنی بہت کوٹھیاں ہیں اور یہ اسپتال تو ہے ہی اپنا۔''

''میری بڑے چوہدری صاحب سے بات ہو چکی ہے۔''

''اس وقت تو کوئی ٹرین اسلام آباد نہیں جاتی۔'' اس نے گھڑی دیکھی۔ ''جلدی ہے تو میں تمہیں بس کے اڈے تک پہنچا دیتا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''میں ٹیکسی سے چلی جاؤں گی۔''

وہ مسکرانے لگا۔ ''یہاں ٹیکسیاں نہیں ہیں اور اجنبی شہر میں تمہارا اکیلے جانا مناسب نہیں۔ اس قسم کے لباس میں خواتین یہاں صرف کاروں میں نظر آتی ہیں۔''

یہ بات غلط نہیں تھی۔ میں نے اس کے ساتھ جانے پر آمادگی ظاہر کی۔ اس کی گاڑی اسپتال کے پورچ میں کھڑی تھی۔ یہی گاڑی اب میرے استعمال میں ہے۔ ڈرائیور نے دروازہ کھولا تو میں پیچھے بیٹھ گئی۔ اس نے میرے ساتھ بیٹھنے کی بالکل کوشش نہیں کی۔ شہر میرے لیے واقعی اجنبی تھا۔ مجھے بالکل بھی اندازہ نہ تھا کہ بس کا اڈہ کہاں ہے جب کار اچانک اس کوٹھی میں داخل ہو گئی تو مجھے اندازہ ہوا کہ میں ٹریپ ہو چکی ہوں۔

میرا چیخنا چلانا سب بے کار تھا۔ میری آواز آس پاس کی کسی کوٹھی میں جا بھی نہیں سکتی تھی اور جاتی تو وہاں سے میری مدد کے لیے کون سی فوج آ جاتی۔ نوکر چاکر سب سلطان کے حکم کے غلام تھے۔ انہیں پہلے سے سب معلوم تھا۔ وہ دروازے بند کر کے چلے گئے تو کمرے میں سلطان کے ساتھ صرف میں رہ گئی۔ وہ بڑا پُرتعیش بیڈ روم تھا جو اب میرے

استعمال میں ہے۔ میں نے کہا۔ ''ویری گڈ سلطان! بالآخر تم نے مجھے پکڑ لیا، اب میں تمہاری قید میں ہوں۔''

اس نے کہا۔ ''دیکھو جو کچھ تم سوچ رہی ہو... غلط ہے۔''

میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''کیا میں تمہیں جانتی نہیں سلطان... اسے میں اپنی بے وقوفی کہوں یا قسمت کی خرابی... ست بدھائی میں مجھے تم سے کوئی خطرہ نہیں تھا... میں وہاں سے نکلی اور تمہارے جال میں پھنس گئی۔''

وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ ''یہ میرا شک نہیں... یقین تھا کہ تم وہیں ہو... ست بدھائی کی حویلی میں... میری آنکھوں میں دھول جھونک کے تم کب تک چھپی رہ سکتی تھیں... کب تک وہ نواب زادہ تمہیں چھپا کے رکھ سکتا تھا۔''

''تم نے مجھ پر زبردستی قبضہ اور اختیار حاصل کرنے کے لیے سب کچھ تو کیا تھا۔'' میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''یہ تم نے ٹھیک کہا۔ بعد میں مجھے ثبوت بھی مل گئے تھے کہ تم وہیں ہو۔ آتے جاتے کسی بھی جگہ سے تمہیں اٹھوانا مشکل ضرور تھا... ناممکن نہیں تھا... تم کون سا بکتر بند گاڑی میں پھرتی تھیں یا تمہارے آگے پیچھے کون سے کمانڈوز چلتے تھے۔''

میں نے چیخ کے کہا۔ ''پھر تم نے ایسا کیوں نہیں کیا؟''

وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ ''تم نہ مانو... تمہاری مرضی... لیکن حقیقت یہی ہے کہ میں نے تمہارا خیال چھوڑ دیا... اپنی ضد چھوڑ دی... ایسا ہر شخص کے ساتھ ہوتا ہے... زندگی کا کوئی واقعہ... کوئی حادثہ اس کی سوچ کا رخ بدل دیتا ہے... کسی کی نصیحت کا مجھ پر کیا اثر ہوتا... میں کسی کی سنتا کب تھا... وہی کرتا تھا جو میرے دل میں آتی تھی... کیا اچھا ہے کیا برا... کیا غلط ہے کیا صحیح... اس کا فیصلہ بھی میں خود کرتا تھا... آج بھی کرتا ہوں... میری فطرت اور مزاج میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے... لیکن تمہارے معاملے میں میرے خیالات بدل گئے... تو اس کی ایک وجہ ہے۔''

میں اب حیرانی سے اس کو دیکھ رہی تھی۔ سلطان وہی تھا لیکن اس کا میرے ساتھ رویہ بدلا ہوا تھا۔ اس کا لہجہ جیسے اپنی شرمساری کا... اپنی شکست کا اور اپنی ہر غلطی کا اعتراف کرتا محسوس ہوتا تھا... کوئی مجھ سے کہتا کہ کتے کی دم سیدھی ہو گئی ہے تو میں مان لیتی... یہ نہیں مان سکتی تھی کہ سلطان راہِ راست پر آ گیا ہے۔

اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''تم جانتی ہو اس لیے میں تم سے کچھ بھی نہیں چھپاؤں گا۔ میں نے اپنی بیوی کو قتل کر دیا تھا۔ شاید تم پوچھو گی، کس جرم میں... تو حقیقت یہی ہے کہ اس نے صرف ایک جرم کیا تھا کہ مجھ سے شادی کے وقت انکار نہیں کیا تھا... یہ اس کے لیے ممکن بھی نہیں تھا۔ وہ خاندان کی لڑکی تھی۔ مجھ سے شروع سے منسوب تھی اور دوسروں کے نزدیک بھی یہ بڑی خوش قسمتی کی بات تھی کیونکہ میرے پاس سب کچھ تھا جس کی کوئی عورت تمنا کر سکتی ہے... میں صورت شکل کا بھی اچھا تھا... رہے اطوار تو یہاں سب مرد میرے جیسے ہی ہوتے ہیں... شاید مجھ سے بھی برے... اکلوتا اور دولت مند ہونے کے سبب میں زیادہ خودسر، عیاش اور بانٹے خان تھا تو یہ فطری بات تھی... میری بیوی خوب صورت تھی۔ واجبی حد تک پڑھی لکھی بھی تھی۔ میٹرک فیل یہاں تعلیم یافتہ ہی سمجھی جاتی ہے اور بہت مطمئن بھی... اسے نہ میری عیاشی پر اعتراض تھا نہ میری بدکرداری پر... وہ اپنے کام سے کام رکھتی تھی... شوہر کی توجہ جتنی مل جائے کافی ہے... بچے جتنے ہو جائیں، ٹھیک ہیں... ساس نند جو سلوک کریں، جائز ہے... میرا خیال تھا کہ وہ اپنے نصیب پر قانع ہے۔ وہ گھر میں رہتی تھی... میں گھر سے باہر رہتا تھا... شکایت نہ اسے مجھ سے تھی نہ مجھے اس سے... عورتیں میری زندگی میں آتی جاتی رہتی تھیں... اچھی بری... نیک یا پیشہ ور... تم نے خود دیکھا ہے... بس اسی وجہ سے میری بیوی نظر انداز ہوئی... میں بھول گیا کہ اس کے لیے بھی جسمانی ضرورت کی تکمیل ایک فطری تقاضا ہے... بھوک صرف مرد کو نہیں لگتی... عورت کو بھی اتنی ہی لگتی ہے... میں تو باہر سب پر منہ مارتا رہا... اپنے پرائے دسترخوان سے اپنی بھوک مٹاتا رہا... وہ بھوکی رہی... پہلے اگر میں مہینے دو مہینے میں اس کے پاس چلا جاتا تھا تو بعد میں یہ وقفہ بڑھ کے چھ مہینے سال کا ہو گیا... میری راتیں باہر گزرتی تھیں... اور اسے میں اپنی بے خوفی، مردانگی یا بہادری سمجھتا تھا کہ باہر جو کرتا تھا سب اسے بتا دیتا تھا... کہ بیوی سے ڈرنے والا نامرد میں نہیں ہوں... اس کی کیا مجال کہ مجھے روکے ٹوکے... اگر کبھی میں رات کے وقت اپنے بیڈروم میں اس کے ساتھ ہوتا تھا تو میری طبیعت اس کی طرف راغب بھی نہیں ہوتی تھی... بعض اوقات وہ شرم و حیا کو بالائے طاق رکھتے ہوئے مجھے... رجھاتی تھی... یہی لفظ استعمال کیا جا سکتا ہے اس کی خواہش کے لیے... قصہ مختصر... اس نے بھی اپنا بندوبست کر لیا... انتقاماً یا ضرورتاً... بھوکا تو کوئی نہیں رہ سکتا... گھر میں نہ ملے تو باہر سے کچھ کھا لے گا... جائز طریقے سے نہ ملے تو ناجائز طریقے سے حاصل کر لے گا۔

مجھے بہت دیر سے پتا چلا... پتا کیا چلا کسی نے مجھے بتا دیا... پھر دکھا دیا... جو گھر میں رہتے تھے ان سے کیا چھپا رہ سکتا

تھا... وہ میرے ایک غلام... ادنیٰ ملازم... میرے سائیس کا بیٹا تھا... اس کا باپ اصطبل میں گھوڑوں کی دیکھ بھال اور مالش پر مامور تھا... بیٹا چھوٹے سے بڑا ہوا تو یہی کام کرنے لگا... اس کام میں وہ بہترین شہسوار بھی بن گیا۔ اس کا جسم ورزشی اور توانا ہو گیا... اس نے قد نکالا تو مردانہ حسن کے سانچے میں ڈھل گیا... گھر کی ملازم کی کمینوں کی کیا عزت... غضب یہ ہوا کہ میری بیوی اس پر مرمٹی اور وہ بھی اپنی اوقات بھول گیا... انجام کار یہ کہ میں نے اس نمک حرام کو اپنی بیوی کے سامنے، ٹکڑے کر کے کتوں کے سامنے ڈال دیا... اور بھوکے کتے اسے کھا گئے... اس کی ہڈیاں تک چبا گئے... انہیں کئی روز بھوکا جو رکھا گیا تھا... میری بیوی پاگل ہو گئی... میں نے اسے ایک کمرے میں بند کر دیا... بڑے چوہدری صاحب اپنی زمینداری میں لگے رہتے تھے... انہیں کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ گھر میں بہو اچانک کیسے پاگل ہو گئی... لیکن میری ماں نے پتا چلا لیا... جو بات عامل، سیانے اور ڈاکٹر معلوم نہ کر سکے... میری ماں نے پوچھ لی... اور اس پاگل نے جسے نہ اپنا ہوش تھا نہ دنیا کا... دوسری عورت کو سب بتا دیا۔ وہ سب جو بہت مکروہ سچ تھا... میری ماں کسی سے کیا کہتی... اس نے مجھ سے پوچھا کہ بہو اچانک کیسے پاگل ہو گئی... میں نے کہا کہ ''یہ آپ اسی سے پوچھو...'' ماں نے کہا۔ ''پوچھ لیا ہے میں نے۔''

''پھر؟... کیا بتایا اس نے؟''

ماں نے خفگی سے کہا۔ ''سلطان... کیا تو جانتا نہیں؟ یا تو اپنی ماں سے سننا چاہتا ہے۔''

اس کے بعد ماں نے جو کچھ مجھے بتایا وہ مبنی برحقیقت تھا۔ ایک پاگل ہو جانے والی عورت نے دوسری عورت کو جتنی بے شرمی کے ساتھ اپنی اور شوہر کی زندگی کی ہر سچائی سے آگاہ کیا تھا اتنی ہی بے شرمی کے ساتھ ایک ماں نے بیٹے سے بات کی... اس سے میں شرمندہ نہیں ہوا... غصے میں پاگل ہو گیا... میں نے اپنی ماں کو بھی چپ کرا دیا اور اپنی بیوی کے لیے سزائے موت کے فیصلے کی توثیق کر دی... مشکل یہ تھی کہ اسے کسی مزارع یا کمین کی بیٹی کی طرح نہیں مارا جا سکتا تھا۔ وہ میرے تایا کی بیٹی تھی اور ان کی حیثیت خاندان کے سربراہ جیسی تھی۔ انہوں نے میرے والد کی تعلیم و تربیت میں بھی والد جیسا کردار ادا کیا تھا کیونکہ والد کے انتقال کے وقت ان کے چھوٹے بھائی کی عمر صرف دس سال تھی۔

تایا خود بیٹی کا دماغی توازن بگڑ جانے سے پریشان تھے۔ وہ بے وقوف نہیں تھے۔ اتنا ضرور سمجھتے تھے کہ ایسا ایک دن میں نہیں ہوا... وہ کسی حد تک میرے سلوک کو بھی اس کا ذمے دار سمجھتے تھے لیکن میں ان کا داماد تھا... کسی ثبوت کے بغیر وہ مجھ پر الزام بھی نہیں لگا سکتے تھے۔ انہوں نے میرے والد سے کہا اور انہوں نے مجھے مجبور کیا کہ میں بہو کو شہر لے جا کر کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھاؤں... میں نے کہا کہ پاگل پن اور جنون کا علاج ڈاکٹر صرف پاگل خانے میں کر سکتے ہیں لیکن اس خیال کی شدید مخالفت ہوئی۔ میں یہ بتا دوں کہ آج بھی ہمارا آبائی گھر گجرات شہر میں نہیں ہے... آبائی گھر یہاں سے چالیس کلومیٹر دور ہے جہاں ہماری زمینداری ہے۔ وہ آج بھی چند ہزار نفوس پر مشتمل گاؤں ہے۔ وہاں آج بھی صرف سرکاری اسپتال ہے جہاں نہ ڈاکٹر ہوتا ہے اور نہ دوائیں... یہ ٹھیک ہے کہ اب ہم زیادہ وقت شہر والی کوٹھی میں گزارتے ہیں... شان ہاؤس میں... شان میرے دادا کا نام تھا... لیکن جب فصل کٹنے کا زمانہ ہو تو ہم گاؤں چلے جاتے ہیں... سال میں دو بار یعنی چار ماہ ہم آبائی گھر میں رہتے ہیں۔ شہر آنا جانا لگا رہتا ہے۔''

ان دنوں ہم وہیں تھے، آبائی گھر میں... اس کا نام بعد میں شان ہاؤس ہو گیا تھا... پہلے وہ شان والی حویلی کہلاتی تھی۔ میں نے زینب کو شہر لے جانے کی مخالفت کی۔ زینب میری بیوی کا نام تھا۔ میں نے کہا کہ فصلوں کی کٹائی کا زمانہ ہے... یہ ہو سکتا ہے کہ ہم شہر سے کسی قابل ڈاکٹر کو یہاں بلا لیں... زینب کی ماں ایک جاہل عورت تھی۔ اس نے شروع سے جن بھوت اور آسیب کا چکر چلا رکھا تھا۔ عامل اور روحانی علاج کرنے والے نہ جانے کہاں کہاں سے آتے تھے اور جھک مار کے چلے جاتے تھے۔

میں نے شہر سے ایک ڈاکٹر کو بلوایا... وہ میری بیوی کی باتیں سن کے خود پاگل ہو گیا۔ اس نے صاف کہا کہ زینب کا علاج کسی دماغی اسپتال ہی میں ممکن ہے... اسے الیکٹرک شاک دینے کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ ظاہر ہے اس خیال کی سخت مخالفت ہوئی۔ اب تمہارے سامنے اعتراف کرتا ہوں تو میں کچھ چھپاؤں گا نہیں... اس کے بغیر تم کو یقین کرنا مشکل ہو گا کہ میری فطرت میں انقلاب کیسے رونما ہوا۔ میری بیوی عام طور پر خاموش اور گم صم بیٹھی رہتی تھی لیکن کوئی اس سے بات کرنے کی کوشش کرے تو یہ ایسا ہی ہوتا تھا جیسے کوئی ساکن پانی میں پتھر پھینک دے... اس سے لہریں اٹھتی تھیں... وہ عجیب و غریب سوالات کرنے لگتی تھی۔ یہ سوال سن کے بڑی بوڑھیاں بھی شرما جاتی تھیں اور توبہ توبہ کرنے لگتی تھیں... ایسی باتوں کی وجہ سے ملازماؤں کا زینب کے کمرے میں جانا

ممنوع تھا تاہم انہوں نے بھی بہت کچھ سن رکھا تھا اور شاید دیکھا بھی تھا۔ زینب کے کمرے میں صرف اس کی ماں جا سکتی تھی یا میری ماں۔ ان دونوں عورتوں کی دانش مندانہ سوچ تھی کہ میرے سوا کسی مرد کو بھی زینب کے پاس جانے نہیں دیا گیا۔

میں شوہر تھا... یہ میرا حق تھا اب اگر زینب فحش جنسی سوالات، باتیں یا حرکتیں کرے تو میرے لیے منع نہ تھا۔ میں ان حرکتوں کی تفصیل نہیں بتا سکتا۔ شوہر کی حیثیت سے میں نے اس کو ذہنی اور جسمانی اذیت دینے میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی۔ میں اسے اسی طرح مارنا چاہتا تھا... خود اپنی موت... جس کا الزام مجھ پر نہ آئے۔ میں اس سے صفدر کے بارے میں پوچھتا تھا۔ صفدر اس سائیس کے بیٹے کا نام تھا جس سے اس نے مراسم استوار کر لیے تھے۔ میں اسے صفدر کی تصویر دیکھاتا تھا۔ میرے پاس ایک آڈیو کیسٹ تھی۔ اس میں صفدر کی دہشت ناک چیخیں بھری ہوئی تھی۔ رحم کی فریادیں تھیں اور آخری آواز میں بعض کتے اسے چیر پھاڑ رہے تھے۔ ظاہر ہے یہ آواز بھی سن کر زینب پر جنون کا دورہ پڑتا تھا۔ لیکن یہ آوازیں وہ میری موجودگی میں سنتی تو الزام براہِ راست مجھ پر آتا کہ مجھے دیکھ کر اس پر دورہ پڑتا ہے۔ اس کے لیے میں نے ایسا بندوبست کیا تھا کہ یہ آوازیں وہ رات کو سنتی تھی۔ جب گھر کے دوسرے سب لوگ سو جاتے تھے۔ وہ دیوانگی میں چیختی تھی۔ اپنے کپڑے اتار پھینکتی تھی۔ دیواروں سے سر ٹکراتی تھی پھر لوگ اسے سنبھال لیتے تھے۔

میری سفاکی آج خود میرے لیے سوہانِ روح ہے لیکن اس وقت مجھے زینب کو عبرتناک سزا دیتے ہوئے کسی رحم دلی کے مظاہرے کا خیال بھی نہیں آیا۔ میرے خیال میں وہ اس سے زیادہ کی مستحق تھی۔ اس نے میری غیرت کے منہ پر ایسا طمانچہ مارا تھا جو ناقابلِ برداشت تھا اور یہ حقیقت ہے کہ اگر میں اپنے یا اس کے باپ کو سچ بتا دیتا کہ ان کی بیٹی، بہو ایک غلام زادے کے ساتھ سوتی رہی ہے... تو وہ میرے ہاتھوں اس کے قتل کو جائز قرار دیتے مگر خود مجھ میں ایسی بے عزتی برداشت کرنے کی ہمت نہ تھی۔

آخری کام میں نے یہ کیا کہ ایک دن زینب کو وہ وڈیو فلم بھی دکھا دی جس میں صفدر کو کتوں کے سامنے ڈالا گیا تھا اور انہوں نے اس کو چیر پھاڑ کے کھالیا تھا۔ ایسا منظر کسی عام ہوش مند آدمی کو بھی پاگل کر سکتا تھا لیکن میری ذہنی کیفیت مختلف تھی۔ میں انتقام کی آگ میں جل رہا تھا اور صفدر کی سزا سے مجھے سکون ملا تھا۔ زینب نے دوبارہ وہ منظر دیکھا تو اس کی یہ حالت ہوئی کہ اسے باندھنا پڑا۔ یہ کام عورتوں کے بس کا نہیں تھا۔ میں نے اور میرے ساتھ زینب کے ایک بھائی نے اسے قابو کیا۔

کسی کو معلوم نہ تھا کہ زینب نے ٹی وی کیوں توڑا۔ اس کی پکچر ٹیوب کے پھٹنے کا دھماکا کسی بم کے دھماکے جیسا تھا۔ میں نے اس سے پہلے ہی وی سی آر سے فلم نکال کے چھپا لی تھی۔ جب گھر والے جاگے اور بھاگے ہوئے آئے تو میں نے ظاہر کیا جیسے میں بھی انہی کے ساتھ پہنچا ہوں۔ کمرے میں دور دور تک شیشے کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے اور زینب نے ایک شیشے سے خود کو زخمی کر لیا تھا۔

صبح یہ طے کر لیا گیا تھا کہ اب زینب کو پاگل خانے منتقل کرنے کے سوا چارہ نہیں۔ تاہم خاندان کو بدنامی سے بچانے کے لیے کوئی محفوظ راستہ نکالنا ضروری تھا۔ میں نے کہا کہ گجرات میں ایسا کوئی اسپتال نہیں جہاں مکمل رازداری ممکن ہو... اسے لاہور کے پاگل خانے میں داخل کر دینا چاہیے... خطرہ وہاں بھی ہے کہ اندر کی بات باہر کے لوگوں کو معلوم ہو جائے تو ہماری عزت خاک میں مل جائے۔

اس تمام معاملے میں سب سے زیادہ دکھی میری ماں تھی جو حقیقتِ حال سے پوری طرح آگاہ تھی اور یہ بھی سمجھتی تھی کہ زینب کی اس حالت کا ذمے دار میرے سوا کوئی نہیں۔ اسے یہ شک بھی تھا کہ زینب میرے انتقام کا نشانہ بن رہی ہے۔ وہ بار بار کہتی تھی... تو ایسا کیوں کر رہا ہے سلطان۔ خدا سے ڈر... اور میں کہتا تھا کہ میں نے تو کچھ نہیں کیا جو کیا تمہاری بہو نے کیا ہے... اور یہ سزا تو خدا کی طرف سے ہی ہے... پھر میں کیوں ڈروں۔

زینب کا ایک بھائی امریکا میں تھا۔ جب اسے خبر ملی تو وہ گجرات پہنچ گیا۔ اس نے بہن کو لاہور کے پاگل خانے میں داخل کرانے کی تجویز مسترد کر دی اور لاہور کے ایک بہت بڑے ڈاکٹر کو لے آیا جو دماغی علاج میں ماہر سمجھا جاتا تھا۔ وہ ڈاکٹر کوئی معجزہ نہیں دکھا سکتا تھا۔ اس نے کچھ پُرسکون کرنے والی دوائیں دیں اور چلا گیا۔ یہ دوائیں خود میں لے کر آیا تھا... اس میں ایک انجکشن بھی تھا۔ رات کو جب زینب نیند میں یا بے ہوش تھی، میں نے اسے دوسرا انجکشن لگا دیا۔ وہ سوتے میں مر گئی۔ اسے باعزت طریقے پر خاندانی قبرستان میں دفنا دیا گیا لیکن اس کے بعد میرے امریکن سالے نے خود تفتیش کا آغاز کر دیا۔ اسے شک ہو گیا تھا کہ اپنی بیوی کی موت کا ذمے دار میں ہوں۔ یہ شک اسے کچھ اندر کے لوگوں کی باتیں سن کر ہوا تھا۔ کچھ ملازموں نے خوف یا لالچ میں اسے سارے واقعات بتا دیے تھے اور اس نے ان واقعات کی کڑیاں جوڑ کے اندازہ کر لیا تھا کہ اس کی بہن کو قتل کیا گیا لیکن ظاہر ہے اسے قتل ثابت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہاں پولیس کے معاملات مختلف انداز میں چلتے ہیں اور ان پر ہمارا کنٹرول تھا۔ میرے سالے نے اپنے طور پر بہت محنت سے تفتیش کی لیکن اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔ یہاں کا پورا سیٹ اپ اس سے تعاون نہیں کر رہا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ خود میری یا اس کی ماں نے اس کی سخت حوصلہ شکنی کی حالانکہ وہ حقائق سے باخبر تھیں۔ عورت اس معاشرے میں مرد کے ظلم کا شکار ہے لیکن صرف اپنی بدبختی کو روتی ہے، کرتی کچھ نہیں... زیادہ تر ظلم کو بھی نوشتہ تقدیر کے طور پر قبول کر لیتی ہیں... زینب کے معاملے میں مجرم میں تھا لیکن خود عورتیں یہ بھی کہتی تھیں کہ عورت کو صبر شکر سے کام لینا چاہیے اور جو زینب نے کیا وہ تو گناہِ عظیم تھا... اسے اپنے کیے کی سزا ملی۔ وفاداری، شرم و حیا، پاک دامنی اور باعصمت ہونے کے سارے تصورات یک طرفہ اور صرف عورت کے لیے ہیں اور عورتوں نے ایسے مان لیے ہیں جیسے نعوذ باللہ خدا رسول نے مرد کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے کہ وہ جو چاہے کرتا پھرے۔

دوسری زیادہ اہم وجہ یہ تھی کہ زینب کا اور میرا جرم اپنی جگہ... جو مر گیا اسے پھر زندہ نہیں کیا جا سکتا۔ قاتل کو مارنے سے مقتول کی زندگی واپس نہیں ملتی۔ مجھے تو سات خون معاف تھے کیونکہ میں اکلوتا بیٹا تھا، میری ہر خطا درگزر کی جا سکتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ سب کچھ جاننے والے بھی انجان بن گئے۔ خود زینب کے باپ نے اپنے بیٹے کو میرے خلاف ثبوت جمع کرنے اور مجھے پھانسی چڑھانے کی فضول کوشش سے روک دیا اور وہ جھک مار کے پیر پٹختا واپس امریکا چلا گیا۔

خرابی اس کے بعد صرف ایک ہوئی کہ میری ماں بیمار پڑ گئی۔ اس نے میرے ضمیر کا بوجھ بھی اٹھا لیا تھا۔ تم جانتی ہو... یہ مائیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ اس نے ہمیشہ میری طرف داری اور پردہ پوشی کی تھی۔ زیادہ تر باتوں کا میرے باپ کو علم ہی نہیں ہوتا تھا۔ کوئی بات ان تک پہنچ جاتی تھی تو میری ماں بات ایسے بدل دیتی تھی کہ میرا گناہ بھی معمولی خطا نظر آنے لگے۔ جرم ہے تو میری شرارت بن جاتے لیکن اس معاملے کو میری ماں نے دل پر لے لیا۔ اس نے مجھ سے بات کرنا چھوڑ دیا۔ میں نے جب اسے دیکھا روتے دیکھا۔ زینب کی موت نے اسے بھی نفسیاتی مریض بنا دیا تھا۔

اچانک پتا چلا کہ اس کا ایک بریسٹ کینسر سے متاثر ہے اور بہت عرصے سے ہے۔ عورتیں کچھ تو لاعلمی کے باعث اور کچھ فطری شرم و حیا کے باعث اس کا ذکر مردوں سے نہیں کرتیں۔ وہ کمزور ہوتی چلی گئی، اسے بخار رہنے لگا اور اس کا کھانا پینا چھوٹ گیا۔ گاؤں کا ڈاکٹر کیا سمجھتا... جب اسے شہر کے اسپتال لے گئے تو پتا چلا لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو گئی تھی۔ لاہور جانے کے مشورے کو اس نے خود مسترد کر دیا جہاں سرجری سے سرطان زدہ حصے کو کاٹ کے الگ کیا جا سکتا تھا۔ ہر عورت ایسے آپریشن کو انتہائی رسوا کن اور شرمناک سمجھتی ہے۔ میرے باپ نے زبردستی کی اور اسے اپنے ساتھ لے گیا لیکن اس وقت تک کینسر بہت پھیل چکا تھا۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ کینسر کو دوا سے زیادہ قوتِ ارادی سے شکست دی جا سکتی ہے۔ جینے کی خواہش ہی موت کے خلاف سب سے بڑا ہتھیار بن جاتی ہے۔ میری ماں مرنا چاہتی تھی، وہ ڈیڑھ مہینے میں مر گئی۔ اس نے مرنے کے لیے خود بہت کوشش کی لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی موت کو میرے لیے بہت سخت سزا بنا دیا۔ ماں کی موت کسی بھی بیٹے کے لیے زندگی کا سب سے بڑا سانحہ تو ہوتی ہے۔ میری ماں نے یہ کیا کہ جب اس کا آخری وقت قریب آیا تو اس نے مجھے معاف کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے سب کے سامنے کہا کہ میں سلطان کو قیامت تک اپنا دودھ نہیں بخشوں گی اور نہ میدانِ حشر میں اسے پہچانوں گی جہاں سب ماں کے نام سے بلائے جائیں گے۔ اس نے نہ میرے رونے دھونے کی پروا کی نہ دوسروں کی مانی۔

مرنے سے پہلے اس نے ایک اور وصیت کر دی۔ سلطان مجھے اپنے ناپاک ہاتھوں سے مٹی نہ دے۔ میرا باپ اس کے سرہانے بیٹھ کے سورۃ یٰسین کی تلاوت کر رہا تھا اور رو رہا تھا۔ اس نے کہا کہ میری ایک بات مانو گے... میرا باپ انکار کیسے کرتا۔ اس نے کہا کہ قرآن میرے سامنے لاؤ۔ جب قرآن سامنے لایا گیا تو اس نے میرے باپ سے کہا کہ اس پر ہاتھ رکھ کے وعدہ کرو... میرے باپ کو بالکل اندازہ نہ تھا کہ وہ کیا کہہ سکتی ہے۔ عام طور پر ایسے وقت میں عورتیں یہ وعدہ لیتی ہیں کہ شوہر ان کے بعد دوسری نہیں کریں گے۔ شوہر وعدہ کر لیتے ہیں اور پھر دوسری کر لیتے ہیں۔ میرے باپ نے قرآن پر ہاتھ رکھا تو اس نے کہا۔ سلطان کو میری نمازِ جنازہ میں بھی شامل مت کرنا اور نہ میری قبر پر مٹی ڈالنے دینا۔ میرا باپ صدمے سے سن ہو گیا مگر اسے میری وکالت کرنے کا اور مجھے ایسی سخت سزا سے معافی دلوانے کا موقع ہی نہیں ملا۔ چند منٹ بعد ہی وہ مر گئی۔

یہ میرے لیے عمر قید سے یا پھانسی سے بھی سخت سزا ہوگی۔ میں بہت رویا پیٹا لیکن میری سزا برقرار رہی۔ ایک بات رہ گئی جب میری ماں نے مجھے یہ سزا سنائی تو وہاں

میرے باپ کے سوا تیسرا شخص موجود نہ تھا۔ جب جنازہ اٹھا تو میں اپنے کمرے میں سر پٹخ رہا تھا اور خون کے آنسو رو رہا تھا۔ کہا یہ گیا کہ صدمے سے سلطان پر بیہوشی طاری ہے۔ میں اپنی نظر میں گر گیا تھا اور تقریباً پاگل ہو گیا تھا۔ خواب آور دوا کے بغیر مجھے نیند نہیں آتی تھی۔ شام ہوتے ہی میں قبرستان چلا جاتا تھا اور ماں کی قبر پر سر رکھ کے روتا رہتا تھا۔ دنیا کے کسی بیٹے کو کسی ماں نے ایسی بے رحمی کے ساتھ اتنی سخت سزا نہ دی ہوگی۔ میں رو رو کر ایک ہی بات کہتا رہتا تھا... ماں اب تو مجھے معاف کر دو۔

اور ماں نے مجھے معاف کر دیا۔ ایک رات میں نے محسوس کیا کہ میرے کمرے کا دروازہ کھلا ہے اور کوئی میرے بیڈ کے پاس کھڑا ہے۔ میں نے آنکھیں کھول کے دیکھا تو وہ میری ماں تھی لیکن وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ ایک عورت اور تھی، یہ عورت زینب تھی۔ اس حال میں نہیں جو مرتے وقت تھا بلکہ پورے لباسِ عروسی میں دلہن کے پورے میک اپ کے ساتھ اور زیورات میں لدی پھندی... بالکل ویسی ہی جیسی وہ شان والی حویلی میں اتری تھی۔ اسے میری ماں بالکل اسی طرح ہاتھ پکڑ کے حجلۂ عروسی تک لائی تھی۔ یہ کوئی بہت پرانی بات نہیں تھی۔ مجھے اس رات کا وہ منظر یاد تھا جو آج پھر میری نظر کے سامنے البم میں کسی تصویر کی طرح آ گیا تھا۔

زندگی کے بہت سے معاملات ناقابلِ فہم ہوتے ہیں۔ ان کی منطقی وضاحت نہیں کی جا سکتی... جن بھوت اور آسیب کو کچھ لوگ تصور کا کرشمہ یا فریبِ عقل و نظر HELUNCINATION قرار دیتے ہیں تو کچھ ان کے حقیقی ہونے پر یقین کامل رکھتے ہیں۔ ایسی ہی کیفیت خواب کی ہے۔ کچھ لوگوں کو خواب میں بشارت ہوتی ہے۔ کچھ کو آنے والے واقعات کی خبر مل جاتی ہے۔ کچھ اسے خوابیدہ شخص کی عقل کی شعبدہ گری کے سوا کچھ نہیں سمجھتے... شاید تم بھی کہو گی کہ جو میں نے دیکھا میری خواہشات کا فلمی عکس تھا۔ میں نے وہی دیکھا جو دیکھنا چاہتا تھا۔ مجھے کمرے میں عطرِ حنا کی خوشبو محسوس ہوئی جو شبِ عروسی زینب کے وجود سے پھوٹ رہی تھی۔ میں ایسا مسحور یا دہشت زدہ ہوا کہ اپنی جگہ بیٹھا رہ گیا۔

ماں نے کہا۔ ”سلطان میں اپنی بہو کو لائی ہوں۔“

شاید یہی جملہ اس نے میری شادی کی رات میں کہا ہوگا... میں نے کہا۔ ”ماں... میری سزا کب ختم ہوگی؟“

ماں نے کہا۔ ”مجھے زینب اپنے ساتھ لائی ہے... یہ تم سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”زینب میں تمہارا مجرم ہوں... لیکن [illegible] سے کہو مجھے اب معاف کر دے۔“

میں نے اس کی آواز سنی۔ ”ماں نے کہا ہے کر دو [illegible] معاف کر دے گی... لیکن اس کی ایک شرط ہے۔“

میں نے کہا۔ ”میں سب کچھ کرنے کے لیے [illegible] ہوں۔“

”اگر زینب نے کہا تو میں تجھے معاف کر دوں گی“ ماں بولی۔

”میں نے کہا۔ ”زینب... اپنی شرط بتاؤ۔“

اس نے کہا۔ ”کیا تم خود کو بدل سکتے ہو۔“

میں نے کہا۔ ”میں نے خود کو بدل لیا ہے زینب، اب میں وہ پہلے والا سلطان نہیں رہا۔“

اس نے کہا۔ ”اس کا ثبوت چاہیے۔“

میں نے کہا۔ ”کیا ثبوت چاہیے۔“

”فریال کو بخش دو... اسے آزاد کر دو، اپنی زندگی [illegible] دو، اس کے ساتھ زبردستی ختم کر دو۔“

میں نے کہا۔ ”اگر تم کہتی ہو... تو ایسا ہی ہوگا۔“

ماں نے کہا۔ ”اگر تم نے ایسا کیا تو میں تمہیں معاف کر دوں گی۔“

اس کے بعد وہ دونوں غائب ہو گئیں۔ ایک لمحے [illegible] کمرے میں چاندنی جیسا اجالا تھا جو یکلخت کمرا تاریک ہو گیا۔ میں نے چلا کے کہا۔ ”ماں...!“ لیکن کوئی جواب [نہیں] ملا۔ میں نے اٹھ کے لائٹ جلائی... جہاں وہ ساس بہو کھڑی تھیں وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ تم کچھ بھی سمجھ سکتی ہو۔ وہ [illegible] واہمہ تھا... خواہش... لیکن میری آواز سن کر نوکر آ گئے۔ پھر [illegible] کے دوسرے لوگ... میرے والد... تایا اور تائی۔ میری [illegible] کیفیت ایسی تھی کہ سب میرا بہت خیال رکھتے تھے۔ اور معل[وم] ہے ان سب نے کیا کہا... انہوں نے پوچھا یہ عطرِ حنا [کی] خوشبو کیسی ہے۔

”تم کہہ سکتی ہو کہ یہ سب میرا واہمہ تھا... یا میں صرف تمہیں متاثر کرنے کے لیے افسانہ طرازی کر رہا ہوں۔“

وہ کچھ دیر کے لیے خاموش ہوا جیسے اب مجھ سے میر[ی] رائے جاننا چاہتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس [نے] بہت سے معاملات میں جس کا مجھے علم نہیں تھا کھل کے بات [کی] تھی اور اپنے تمام مجرمانہ ماضی کا اعتراف بھی کر لیا تھا [لیکن] میرے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ ایک تو میں [پہلے] ہی اس کی رگ رگ سے واقف تھی۔ دوسرے میرے نزدیک

[illegible]ی نہیں ڈھتائی تھی۔ اسے مجھ سے کوئی ڈر نہیں تھا... [illegible] شرمندگی اس طرح وہ میری نظر میں اپنی ساکھ بہتر بنانا چاہتا تھا اور شاید اس [illegible] ایک پرانے کھیل کو نئے طریقے سے شروع کرنے کا خواہش مند تھا۔

میری خاموشی پر وہ کچھ دیر بعد بولا۔ ”تم نے مجھ پر [اعت]بار نہیں کیا۔“

میں نے کہا۔ ”اعتبار کیسے کروں... آج بھی تم نے ثابت [ک]ر دیا ہے کہ تم وہی پرانے سلطان ہو۔“

”آئی ایم سوری! مجھے تم کو دھوکے سے یہاں لانا پڑا۔ [اگر] میں شرافت سے کہتا کہ فریال... میرے ساتھ چلو، مجھے تم سے کچھ کہنا ہے... تو کیا تم آ جاتیں؟“

”اس کی ضرورت بھی کیا تھی۔“ میں نے تند لہجے میں [ک]ہا۔ ”اگر تم راہِ راست پر آ گئے ہو تو مجھے کیا... نہ آتے تب [بھ]ی مجھے فرق نہ پڑتا... اور یہ سب مجھے بتانا کیوں ضروری [تھ]ا۔“

اس نے کہا۔ ”ایک تو اس لیے کہ میں نے تمہیں بہت [پر]یشان کیا تھا۔“

”اسے تم صرف پریشان کرنا کہتے ہو...؟ تم نے میرا [ج]ینا محال کر دیا تھا۔ تم میری عزت آبرو کے اور میری زندگی کے دشمن تھے۔“

”چلو اب جو بھی تھا... اگر آج میں تمہارے سامنے اپنی [ہ]ر غلطی، اپنے ہر گناہ یا جرم کا اعتراف کر رہا ہوں تو کیا تم اتنا [بھ]ی نہیں کر سکتیں کہ مجھے معاف کر دو...“ اس کے لہجے میں [رق]ت کی بر ہمی آ گئی۔

میں نے کہا۔ ”او کے... میں نے تمہیں معاف کیا۔ کیا [ا]ب میں جا سکتی ہوں؟“

اس نے کہا۔ ”ضرور... لیکن کیا تم مجھے بتا سکتی ہو کہ تم [ا]سلام آباد کیوں جا رہی ہو۔“

میں نے کہا۔ ”یہ تم کیوں جاننا چاہتے ہو۔ ہاں یہ شرط ہے میری رہائی کی تو میں کچھ بھی بتا سکتی ہوں، ضروری نہیں کہ [و]ہ سچ ہو۔“

”لیکن سچ مجھے معلوم ہے... تم اپنے اس چاہنے والے [ک]ے سارے محبت کے رشتے ختم کر کے جا رہی ہو جس کے لیے تم نے مجھے ٹھکرایا تھا۔ حالانکہ اس کی اور میری محبت ایک [ت]ھی۔ محبت کبھی بھی اے کلاس یا بی کلاس نہیں ہوتی... اگر محبت ہے تو جھوٹی یا سچی نہیں ہو سکتی۔“

میں نے کہا۔ ”جانے دو سلطان... تم کیا جانو محبت کیا ہوتی ہے۔“

”لیکن اب تم جان گئی ہو فریال، کیا تھی اس کی محبت جسے تم نے محبت کے خدا کا درجہ دے رکھا تھا۔ کتنی جلدی وہ بدل گیا... دولت ملتے ہی اس کی نظر میں محبت غیر اہم ہو گئی۔ وہ ایک رئیس نواب بن گیا جس کی نظر میں تم بھی محض ایک عورت ہو گئیں...“

میں کانوں پر ہاتھ رکھ کے چلّائی۔ ”بند کرو اپنی بکواس۔“ وہ بولتا رہا۔

”کیوں... سچ سننے کی ہمت نہیں... کیا یہ غلط ہے کہ اب وہ تم سے شادی کے معاملے میں سیریس نہیں رہا... وہ ٹال مٹول کر رہا ہے... یہ نور جہاں کون ہے؟“

اس کا سوال اچانک کیے جانے والے فائر کی طرح تھا۔

”تم... تمہیں یہ سب کس نے بتایا۔“

”نور جہاں اس کی داشتہ ہے... ہے نا؟ اور اس نے رفیق کو تم سے چھین لیا ہے۔ اسے تمہارے جذبات کی کوئی پروا نہیں۔ اب تو اس کے والدین بھی راضی تھے مگر وہ تم سے شادی نہیں کر رہا... آخر کیوں؟ اس نے تمہارے رونے پیٹنے کو تمہاری ہر دھمکی کو نظر انداز کر دیا آخر تم کو وہاں سے نکلنا پڑا۔ تم واپس لندن جا رہی تھیں۔ بتاؤ کون سی بات غلط ہے؟“ وہ کمرے میں چکر لگاتے ہوئے چلانے لگا۔

میں بے حس و حرکت بیٹھی خلا میں دیکھتی رہی اور آنسو خود بخود میری آنکھوں سے میرے رخساروں پر بہتے اور میری گود میں گرتے رہے، پھر وہ میرے ساتھ آ بیٹھا۔ ”فریال... تم نے کبھی سمجھا نہیں، عورت میرے لیے کچھ نہیں تھی۔ دنیا کی کوئی عورت میرے قوتِ خرید سے باہر نہیں تھی... کم سے کم میں ایسا ہی سمجھتا تھا۔ تم جانتی ہو زندگی کی ہر رات میں میرے ساتھ کوئی عورت ہوتی تھی۔ وہ کون ہے، میرے کسی غریب مزارع کی بیوی یا کوئی سپر اسٹار ماڈل... اس سے مجھے فرق نہیں پڑتا تھا۔ لیکن تم سب سے الگ سب سے جدا، سب سے اہم تھیں۔ تم نے مجھے پاگل کر دیا تھا۔ میں تم سے محبت کرتا تھا، اس سے بھی زیادہ جو کل تک فقیر تھا اور آج نواب ہو گیا ہے... اور آج بھی کرتا ہوں۔“

میں نے چیخ کے کہا۔ ”شٹ اپ... نہیں سننا چاہتی میں تمہاری یہ بکواس... مجھے جانے دو۔“

”میں تمہیں زبردستی نہیں روکوں گا... یہ تو ایک حادثہ تھا جس نے تمہیں یہاں پہنچا دیا۔ بعض حادثات بھی قدرت کی طرف سے ایک اشارہ ہوتے ہیں... جن سے انسان کی زندگی کا رخ بدل جاتا ہے۔ جیسے میری زندگی ایک حادثے نے بدل دی۔ مجھے افسوس نہیں غصہ ہے کہ اس نواب کی اولاد نے

تمہاری یہ توہین کی... ایک فاحشہ کو تم پر ترجیح دی۔''

میں نے کہا۔ ''سلطان... یہ سب تم کیسے جانتے ہو؟ کیا تم نے میرے پیچھے اپنے جاسوس لگا رکھے تھے۔''

وہ مسکرایا۔ ''اگر میں کہوں کہ تمہارے اپنے کسی رازدار نے مجھے ہر بات بتائی۔ ورنہ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ تم کہاں ہو۔''

میں نے حیرانی سے کہا۔ ''کس کی بات کر رہے ہو تم۔''

''تمہاری لندن والی سہیلی... ڈاکٹر شائستہ کی۔''

میں دم بخود رہ گئی۔ ''یہ سب... شائستہ نے بتایا ہے۔''

اس نے کہا۔ ''تم اس سے کنفرم کرلو۔ جب اس کا فون آیا تو وہ اپنا تعارف کرانے لگی۔ میں نے کہا۔ خاتون میں اچھی طرح جانتا ہوں آپ کو... فرمایئے آج مجھے کیسے یاد کرلیا۔''

شائستہ نے کہا۔ ''مجبوری ہر در پر لے جاتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اور میرا فون نمبر کیسے ملا آپ کو۔''

''چھوڑیے... ضرورت مند سب معلوم کرلیتا ہے۔ میرا خیال ہے آپ میری ایک پریشانی دور کرسکتے ہیں... دراصل اسلام آباد جاتے ہوئے فریال کہیں لاپتا ہوگئی ہے۔''

فریال کے نام پر میں چونکا۔ ''یہ پولیس اسٹیشن نہیں ہے ڈاکٹر صاحبہ!''

''مجھے معلوم ہے... لیکن... آپ کو معلوم ہوگا۔''

''یہ آپ نے کیسے فرض کرلیا کہ فریال کے لاپتا ہونے میں میرا ہاتھ ہوگا۔'' میں نے برہمی سے کہا۔

''میں نے ایسا نہیں کہا۔''

''اس کے علاوہ... فریال کیا کوئی ننھی نادان بچی ہے، ذہنی طور پر معذور ہے یا کوئی چیز ہے کہ لاپتا ہوگئی۔ وہ تو مجھے چکر دے کر لندن سے ایسی لاپتا ہوئی تھی کہ میں سارے جہاں میں اس کا پتا ڈھونڈتا رہا... اور وہ پہنچ گئی ست بدھائی کی حویلی میں۔''

شائستہ نے میری بات سنی اور بولی۔ ''دراصل اس کی آخری کال مجھے گجرات سے موصول ہوئی تھی... جو ادھوری رہ گئی تھی۔ معلوم نہیں کیوں... بعد میں جب میں نے نمبر دیکھا اور معلوم کیا تو پتا چلا کہ وہ گجرات کے ریلوے اسٹیشن پر کسی پبلک کال آفس کا نمبر تھا۔ وہ اسلام آباد میں نہیں پہنچی۔''

''پھر میں کیا کروں... ریلوے اسٹیشن جاکے اس پی سی او کے مالک سے تفتیش کروں۔''

''دیکھیے... میرا مطلب تھا۔''

میں نے کہا۔ ''آپ کا مطلب میں نے سمجھ لیا ڈاکٹر صاحبہ... وہ گجرات کے ریلوے اسٹیشن پر غائب ہوئی، اغوا ہوئی... اغوا ہوئی تو میرے سوا گجرات میں یہ کارنامہ سرانجام دے سکتا ہے۔''

ڈاکٹر شائستہ نے کہا۔ ''اگر میرا خیال غلط ہے تو آپ سے معذرت چاہتی ہوں۔''

اس سے پہلے کہ وہ فون بند کرتی، میں نے کہا۔ ''ایک منٹ... آپ کا خیال سو فیصد درست ہے۔''

''کیا مطلب...'' وہ آپ کے پاس ہے؟''

''میرے پاس تو نہیں لیکن وہ گجرات میں ہے اور معلوم ہے کہ کہاں ہے لیکن اس کے بارے میں مزید بتانے سے پہلے میں آپ سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔''

اس نے کہا۔ ''فریال... ٹھیک تو ہے نا۔''

میں نے کہا۔ ''ابھی میں آپ کی اس سے بات کرا دیتا ہوں... وہ اسپتال میں ہے۔''

''اسپتال میں... کیوں؟'' وہ گھبرا گئی۔

میں نے کہا۔ ''اس کے ساتھ ایک معمولی سا حادثہ پیش آگیا تھا۔ اب وہ بالکل ٹھیک ہے اور شاید آج کل میں اسپتال سے ریلیز ہوجائے گی۔ اب مجھے یہ بتائیں کہ وہ اسلام آباد کیوں جارہی تھی... وہ بھی ٹرین سے۔''

اس نے کہا۔ ''تھی کوئی مجبوری۔''

میں نے کہا۔ ''آپ نہیں بتائیں گی تو بات ختم ہوجائے گی۔''

اس نے سوچ کے کہا۔ ''وہ لندن آنے کے لیے جارہی تھی۔''

''اکیلی...؟ نواب رفیق احمد شیرازی اس کے ساتھ کیوں نہیں تھے۔''

''وہ بات ختم ہوگئی...'' شائستہ کے منہ سے نکل گیا۔

میں بھونچکا رہ گیا۔ ''کون سی بات... اس نے رفیق کو چھوڑ دیا؟''

''یہی سمجھ لیں آپ۔''

''لیکن کیوں... لیلیٰ مجنوں کی کہانی میں ایسی جدائی نہیں آتی۔''

''سلطان صاحب، یہ لیلیٰ مجنوں کی محبت کا زمانہ نہیں ہے یہاں روز لیلیٰ بدلتی ہے... روز مجنوں بدلتا ہے۔ لوگوں کی نظر... وفاداری... ایمان سب بدل جاتا ہے۔ رفیق بھی ایک مرد ہی تم جیسا۔''

''کیا رفیق نے بے وفائی کی فریال سے... مجھے یقین نہیں آتا، کس کے لیے۔''

''ہے ایک بے حیا... محبت پیشہ... نور جہاں۔ بیوی کسی اور کی ہے، اس نے پھانس لیا رفیق کو۔''

میری حیرت بڑھ گئی۔ ''ایسی کیا بات تھی اس میں۔''

''مرد کو عورت میں خوبصورتی کے سوا کیا نظر آتا ہے۔ اس کا حسن ایسا ہی تباہ کن ہے، اس نے فریال کی دنیا تباہ کردی، رفیق سب بھول گیا۔ اس نے فریال سے شادی نہیں کی حالانکہ فریال کے رویے نے رفیق کے والدین کو قائل کرلیا تھا خیر اب آپ میری بات کرادیں فریال سے... میں نے آپ کو سب کچھ بتادیا۔''

میں نے ڈاکٹر شائستہ کو اسپتال کا نمبر دے دیا اور اس نے فون بھی کیا لیکن اس کی بات صرف ڈاکٹر سے ہوئی۔ اس نے ساری تفصیل معلوم کی، اس وقت تم سو رہی تھیں۔ ڈاکٹر نے تمہیں جگانے سے انکار کردیا تھا۔ اب تم مجھے بتاؤ، یہ سب جو شائستہ نے بتایا جھوٹ ہے یا سچ۔

میں نے کہا۔ ''میں اس پر کوئی تبصرہ کرنا ہی نہیں چاہتی۔''

وہ ہنسا'' اس سیاسی بیان کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں نکالا جاسکتا کہ ایسا ہی ہے... انفارمیشن درست ہے۔''

''یہ ڈاکٹر شائستہ کی بے وقوفی تھی۔''

سلطان نے کہا۔ ''میرا خیال ہے اس طرح وہ میرا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب رہی، میں نے اسے ٹالا نہیں۔ خیر اب تم بتاؤ تمہیں اسلام آباد جانا ہے یا لندن... میں انتظام کردیتا ہوں۔''

''مجھے جہاں جانا ہوگا خود چلی جاؤں گی۔''

''کیسے...؟ تم نے تو ٹکٹ بھی شائستہ سے منگوایا تھا۔ دیکھو میری کسی بات کا غلط مطلب نہ لو۔ مجھے بتاؤ لندن جاکے تم کیا کروگی؟''

''میں کچھ بھی کرسکتی ہوں۔'' بالآخر اس نے اپنے ہمدردانہ رویے سے مجھے متاثر کرلیا... ''یہاں اب میرے لیے کچھ نہیں۔''

اس نے کہا۔ ''ایسا مت کہو، اگر تم چاہو تو یہاں بھی کامیابی کے دروازے تم پر کھل جائیں گے... جو تم نے خود بند کیے تھے۔ تم اس نواب کو بتا سکتی ہو کہ تمہیں اس کی دولت سے غرض نہیں تھی۔''

میں اتنے غصے میں تھی کہ مجھے سلطان کی بات بری نہیں لگی۔ ''تم کس کامیابی کی بات کر رہے ہو۔''

وہ بولا۔ ''تم آج بھی وہی فریال ہو، اگر تم چاہو تو پھر شوبزنس میں جاسکتی ہو۔''

یکلخت مجھے یوں لگا جیسے سلطان نے میرے دل کی بات جان لی ہے... ایسا ہی میں سوچ رہی تھی لیکن میں دوسری بار اس کے جال میں گرفتار ہونا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے کہا۔ ''سوچا تو میں نے بھی تھا... لیکن سلطان، اگر تم نے پھر وہی چکر چلایا... اپنی فلم میں چانس دینے کا۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں نے وہ سارے دھندے چھوڑ دیے لیکن میں تمہاری مدد کرسکتا ہوں۔ شوبزنس میں ابھی تک میرے تعلقات ہیں جو تمہیں چانس دلوانے میں کام آسکتے ہیں... اور یہ مت سمجھنا کہ میں پھر جال پھیلا رہا ہوں اور تمہارے حالات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ یہ سمجھو کہ میں تمہارے ساتھ ہونے والی زیادتی کی تلافی کرنا چاہتا ہوں۔ اپنی نیک نیتی ثابت کرنا چاہتا ہوں۔''

میں اس سے کہتی رہی... ''آخر کیوں...؟''

اس نے کہا۔ ''اس امید میں... کہ شاید کسی دن تمہارا دل میری طرف سے صاف ہوجائے، تم مجھے بھی اچھا آدمی مان لو۔''

میں سمجھ گئی کہ اس سے اگلا جملہ کیا ہوسکتا تھا جو اس نے نہیں بولا... اور مجھے قبول کرلو۔ یہ جملہ کہتا تو مجھ پر اس کے عزائم، اس کی نیت اور خواہش سب عیاں ہوجاتے۔ وہ پہلے ہی کہہ چکا تھا کہ مجھ سے اس کی محبت آج بھی پہلے کی طرح دائم و قائم ہے۔ اس مرحلے پر میں یہ تو نہیں کہہ سکتی تھی کہ چاہت، طلب یا ہوس اور محبت میں فرق کو وہ کیا جانے لیکن یکلخت ذہن میں آنے والے ایک خیال نے مجھے مغلوب کرلیا۔ پہلے سلطان نے میری کمزوری سے فائدہ اٹھایا تھا، کیوں نہ اب میں اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھاؤں۔ میری کمزوری تھی دولت کے ساتھ شہرت کا حصول اور میں اس کے لیے شوبزنس میں اپنے حسن و شباب کی مدد سے کامیابی کی خواہش مند تھی۔ خود کو سنیما کی اسکرین پر سپر اسٹار دیکھنا اور ان کی زندگی جینا میری کمزوری تھی جس سے سلطان نے فائدہ اٹھایا تھا۔

آج اگر یہ ثابت ہوگیا ہے اور وہ خود ہی اس کا اعتراف کر رہا ہے کہ میں اس کی کمزوری ہوں تو مجھے اس کمزوری کو اپنی شہزوری بنالینا چاہیے۔ مجھے سلطان کو بے وقوف بنا کے آگے بڑھنا چاہیے۔ ایک امید کا آسرا دے کر اسے اپنی خواہش کا غلام بنالینا چاہیے، جیسے کوئی ایک ہڈی ڈال کے کتے کو پیچھے پیچھے دم ہلانے پر مجبور کردے۔ جب ضرورت نہ رہے تو کتے کو لات مار کے بھگایا جاسکتا ہے۔

میں ست بدھائی سے جو سوچ کے نکلی تھی کچھ اور تھا۔ میں

لندن جانا چاہتی تھی۔ راستے میں ایک خیال نے میری سوچ بدل دی... لندن جیسے شہر میں انٹرٹیرڈ پرانز بننا زیادہ مشکل ہوگا۔ کیوں نہ میں پہلے یہاں شوبزنس میں اپنی قسمت آزمالوں۔ مجھے اپنی پہلی کوشش میں بڑا حوصلہ افزا رسپونس ملا تھا۔ مجھے ہرطرف سے آفرز آرہی تھیں۔ فلم میگزین میری تصویر اپنے کورپیج پر شائع کرنے لگے تھے اور مجھے ایک چونکادینے والا چہرہ قرار دیا جارہا تھا لیکن ایسے وقت میں سلطان نے کاروباری سمجھ بوجھ سے کام لیتے ہوئے مجھ پر ''جملہ حقوق محفوظ ہیں'' کا بورڈ لگادیا اور مجھے پابند کردیا کہ میں کسی اور سے معاہدہ ہی نہ کروں۔ اس حقِ ملکیت پر اپنا ٹھپا لگانے کے لیے اس نے مجھ سے منگنی بھی کرلی۔ ظاہر ہے اس کے بعد وہ سب ٹھنڈے پڑگئے جو آگے بڑھ کے اپنی اپنی آفر دینا چاہتے تھے لیکن اب میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔

کافی دیر سوچنے کے بعد میں نے کہا۔ ''سلطان... کیا آج بھی شوبزنس میں میری کامیابی کے امکانات تمہیں روشن نظر آتے ہیں۔''

''کیوں نہیں، ابھی اتنا عرصہ تو نہیں گزرا کے لوگ تمہیں بھول گئے ہوں... اور میری نظر سے دیکھو تو تمہارا رنگ روپ اور نکھر آیا ہے۔ دوسری اہم بات یہ ہے فریال کہ تمہیں ہیڈ اسٹارٹ بہت آگے سے ملے گا۔ میرا مطلب سمجھ رہی ہونا۔ جب ایک عام لڑکی جس کا والی وارث یعنی سپورٹر کوئی نہ ہو فلمی دنیا میں قدم رکھتی ہے تو اس کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ یہ تم نے سنا بھی ہوگا اور دیکھا بھی ہوگا۔ وہ نچلی سطح پر Punters کے ہاتھ چڑھ جاتی ہے۔ اسے جھوٹی امیدیں دلانے والے خوابوں کے میدان کی فٹ بال بنا کے اِدھر سے اُدھر پھینکتے رہتے ہیں اور اس میں دم نہ ہو تو ایک دن وہ گراؤنڈ سے باہر کک آؤٹ کردی جاتی ہے، بازار میں بیٹھ جاتی ہے یا کسی کے گھر میں لیکن تمہارے ساتھ ایسا کون کرسکتا ہے۔ تمہیں پروموٹ کرنے والا میں ہوں... اسپانسر اور فنانسر یعنی پروڈیوسر خود تمہیں سائن کریں گے۔ ڈائریکٹ چانس دیں گے۔''

''اور یہ سب مجھ پر تمہارا قرض ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''بالکل نہیں... کوئی احسان نہیں، کوئی قرض نہیں... بار اگر ہے تو مجھ پر، مجھے اپنا قرض چکانا ہے ہر زیادتی کا ہر ظلم کا جو میں نے تم پر کیے، اس سے مجھے سکون ملے گا اور عاقبت تو دور ہے دنیا میں میرے لیے اس راستے پر چلنا آسان ہوتا جائے گا جس پر میں نہیں چلا تھا... اس سے میری ماں کی روح کو سکون ملے گا۔'' وہ جذباتی ہوکے چپ ہوگیا۔

اس وقت مجھے واقعی سلطان سے اتنی نفرت محسوس نہیں ہوئی جتنی میں اپنے دل میں لے کر آئی تھی۔ مجھے اس کی باتیں جھوٹ اور اس کی نیت خراب نہیں لگی۔ شاید جو کچھ وہ کہہ رہا تھا صدقِ دل سے کہہ رہا تھا۔ مجھے اس پر اعتبار کرکے دیکھنا چاہیے۔ صبح کا بھولا شام کو گھر آجائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔ اگر خدا نے یہ نیکی میرے لیے لکھی ہے کہ میں ایک صراطِ مستقیم سے بھٹکے ہوئے آدمی کو راہِ راست پر لانے کا ذریعہ اور وسیلہ بنوں تو مجھے یہ نیکی کمانے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیے۔ خدا کی مرضی نہ ہوتی تو یہ سب کیوں ہوتا۔ یہ حادثہ جو میرے ساتھ گجرات کے ریلوے اسٹیشن پر پیش آیا ایک بہانہ بن گیا۔ میں فون کرنے کے لیے نہ اترتی... ٹرین نکلتی دیکھ کر میں بدحواسی میں نہ بھاگتی، وہ قلی میرے سر پر سوٹ کیس نہ مارتا تو اس وقت میں یہاں نہ بیٹھی ہوتی۔ اسلام آباد سے لندن کا ویزا لے کر کب کی پاکستان سے نکل گئی ہوتی۔

ساری بات یہ ہے کہ میں ایک نیت لے کر نکلی تھی کہ اب مجھے دولت، شہرت اور عزت کی منزل خود حاصل کرنی ہے تو اسباب خود پیدا ہوگئے اور تائید میں دلائل خود میرے دماغ نے فراہم کردیے۔ میں نے سلطان کی بات مان لی۔ وہ اتنا خوش ہوا جیسے اسے ہفت اقلیم کی بادشاہت مل گئی ہو۔ کہاں میری وہ کیفیت کہ میں ایک منٹ رکنے کے لیے تیار نہ تھی میں اس جنگلی شیرنی کی طرح پیش آرہی تھی جسے ابھی ابھی جنگل سے پکڑ کے لایا گیا ہو۔ کہاں میرا یہ ذہنی اور جذباتی یوٹرن کہ میں نے سلطان کو قبول کرلیا۔ سلطان کو قبول کرنے کا مطلب ہے اس کی ہر وضاحت پر یقین دہانی... ہر دعوے اور ہر پیشکش کو قبول کرلیا۔

تم کہہ سکتے ہو کہ میں نے جو کچھ کیا اس میں ایک انتقامی جذبہ شامل تھا۔ میں انکار نہیں کروں گی... جب میں ست بدھائی سے نکلی تو خود اپنی نظر میں بہت گرچکی تھی۔ یہ احساس تذلیل مجھے دھکیل رہا تھا۔ یہ احساس میرے لیے سخت آزار کا باعث تھا کہ میں کچھ نہیں... میری شخصیت اور حیثیت صرف ایک عورت کا حسن و شباب ہے جس کے پیچھے سلطان ہی نہیں تھا اور جس کی رفیق بھی ملکیت چاہتا تھا۔ سلطان کی دیوانگی کا سبب اس کی محرومی تھی۔ رفیق کی بیگانگی کا سبب اس کے برعکس یہ بنا کہ میں نے خود کو غیر مشروط طور پر اس کے حوالے کیا اگر سلطان مجھے حاصل کرلیتا تو اس کی محبت کا بھی یہی انجام ہوتا۔

اس احساس نے مجھے وہ مقام حاصل کرنے پر اکسایا

جہاں میں کسی کے لیے آسان حاصل نہ رہوں۔ میری آرزو کرنے والے لاکھوں ہوں اور انتخاب میرے ہاتھ میں ہو۔ میں اپنی شرائط پر محبت کروں... عزت میری ہو، اپنی کمائی ہوئی۔ مجھے شوہر کی عزت نہ ملے۔ اس جنون نے مجھے سلطان کو پھر آزمانے پر راغب کیا۔ اگر سچ مچ وہ خود کو ویسا ہی ثابت کردیتا ہے جیسا ظاہر کررہا ہے تو پھر مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔ محبت کسی سلطان کی ہو یا نواب کی... صرف لیبل ہی بدلے گا باقی سب وہی ہوگا جو میں چاہوں گی۔

سلطان نے خود کو سچا ثابت کرنے کے لیے دن رات ایک کردیا۔ اس نے یہ کوٹھی میرے نام کردی۔ چونکنے کی ضرورت نہیں۔ ''یہ میری پہلی کامیابی تھی... کہاں یہ کہ چند روز قبل میرے پاس لندن تک ہوائی جہاز کے کرائے کے پیسے نہیں تھے۔ اور کہاں یہ کہ میں ایک کروڑ کی اس جائیداد کی مالک ہوں۔ وہ کار بھی میرے نام کردی گئی ہے جو میں استعمال کررہی ہوں۔ اب میں بے آسرا اور ضرورت مند نہیں رہی۔ مجھے اپنی حیثیت میں یہ طاقت حاصل ہوگئی ہے۔ سلطان کہتا ہے کہ وہ کوئی احسان نہیں کررہا ہے، اپنی سابقہ زیادتیوں کا کفارہ ادا کررہا ہے۔ میں سب سمجھتی ہوں اور مسکرا کے اسے موقع دیتی ہوں۔ اگر اس کے دماغ میں کہیں یہ خیال ہے کہ اس طرح وہ مجھے خرید رہا ہے تو اسے سخت مایوسی ہوگی۔ میں طاقت حاصل کررہی ہوں... طاقتور مردوں کی دنیا میں اپنی مرضی سے جینے کے لیے۔

سلطان نے اس عرصے میں مجھے بہت سے لوگوں سے ملوایا ہے۔ ایک ایڈ ایجنسی نے پہلا ایگریمنٹ کیا۔ ایک رنگ گورا کرنے والی کریم کا شوٹ ہے۔ تیس سیکنڈ کا... دوسرا فریج اور فریزر بنانے والی کمپنی کا ہے۔ مرچ مسالے اور کوکنگ آئل بنانے والی ایک کمپنی مجھے اپنے شو میں بطور میزبان لانا چاہتی ہے، اس کی بات چل رہی ہے۔ تین فلم ساز آئے تھے۔ ایک کو میں نے صاف انکار کردیا۔ فلم کا نام تھا... رن باز گجر... دوسرے سے میں نے اسکرپٹ مانگا لیکن تیسرے بڑے نامور اور معتبر فلمساز تھے۔ انہوں نے مجھے لیڈ رول نہیں دیا لیکن سیکنڈ لیڈی کا کردار بہت اہم اور جاندار تھا۔ وہ میں نے سائن کرلیا۔ اس کے ایڈوانس کے چیک سے میں نے اپنا اکاؤنٹ بھی کھولا ہے لاہور میں۔ شوبزنس میں رہنا ہے تو رہنا بھی لاہور میں ہوگا۔ میں نے گلبرگ میں ایک کوٹھی کرائے پر لی ہے۔ یہ کوٹھی ابھی میرے نام نہیں ہوئی۔ اس کے لیے قانونی کارروائی جاری ہے۔ سال بھر بعد دیکھوں گی صورتِ حال کیا ہے اگر میں کامیاب ہوگئی تو یہ کوٹھی

بیچ دوں گی۔ سلطان کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکوں گی، ابھی تو وہ میرے ساتھ ساتھ ہے۔ میرے سیکریٹری، مددگار، محافظ، دوست اور مشیر کی ساری ذمے داری اسی نے سنبھال رکھی ہیں۔ بڑی امیدوں کے ساتھ... پچھلی مرتبہ میں خود اپنی کمزوری کا شکار ہوگئی تھی۔ اس بار میں طاقتور بنوں گی۔ دولت سے ساری طاقت آتی ہے۔ جس دن میں نہیں چاہوں گی اس دن سلطان جیسے میری حویلی کی دیوار سے سر ٹکرا کے مرجائیں۔ اس کی اجازت تو ہوگی لیکن ان دیواروں کے دوسری طرف وہی پہنچے گا جس کو میں باریابی کا شرف عطا کروں گی۔ دیواروں کے علاوہ میرے محافظ چوبیس گھنٹے میرے ساتھ ہوں گے۔

اب تم نے سمجھ لیا ہوگا کہ جس سفر کا میں نے آغاز کیا ہے وہ آگے جانے کے لیے ہے۔ میں تمہارے ساتھ واپس اور پیچھے نہیں جاسکتی... آئی ایم سوری۔''

☆☆☆

ظاہر ہے اس کے بعد میرے کہنے سننے کے لیے کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ میں اسے دلائل سے قائل نہیں کرسکتا تھا۔ میرا چیخنا چلّانا لاحاصل تھا۔ وہ جذباتی استحصال کی منزل سے آگے جاچکی تھی۔ اب وہ میرے مقابل کھڑی تھی... پوری قوت اور عزم کے ساتھ۔ اس کا ارادہ مصمم تھا اور اتنا عرصہ اس کے ساتھ رہ کے میں نے جان لیا تھا کہ وہ کتنی ضدی ہے۔ شاید ضد کا مثبت پہلو قوتِ ارادی کی مضبوطی ہے۔ میری محبت کو اس نے اپنی زندگی سے خارج کردیا تھا۔ اس کے اور میرے راستے جدا ہوگئے تھے۔

اس نے جذبات سے عاری لہجے میں کہا۔ ''کھانا لگ گیا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے بھوک نہیں ہے۔''

''میں گیسٹ بیڈ کھلوادیتی ہوں... صبح چلے جانا۔''

میں نے رکھائی سے کہا۔ ''ست بدھائی اتنی دور بھی نہیں ہے۔ دو گھنٹے کا راستہ ہے... خدا حافظ۔''

اس نے دروازے تک آکے کہا۔ ''ملنے آتے رہنا۔''

میرا دل چاہتا تھا کہ اس بات کے جواب میں پلٹ کر اس کے منہ پر ایک تھپڑ تو مار ہی دوں لیکن اس وقت میں جب فریال اپنی نئی منزل کے لیے آغازِ سفر کی روداد کہہ رہی تھی، اور اسے خدا کی مرضی قرار دے رہی تھی، میں نے سب کچھ خاموشی سے سنا تھا اور ایک عہد کیا تھا... اپنے آپ سے کہ میرا جوابی ردِعمل اتنا ہی غیر جذباتی ہوگا جتنا فریال کا رویہ ہے۔ میں نارمل رہوں گا، اپنے جذبات پر قابو رکھوں گا اور تمام صورتِ حالات کو میٹر آف فیکٹ طریقے پر قبول کر دوں گا۔ اپنے رونے پر خجالت ندامت کا اظہار اب کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ مستقبل کے لیے وعدے یا ماضی کے تعلق کا حوالہ کام نہیں آ سکتا تھا۔ یہ سوچنا بھی بے کار تھا کہ غلطی کس کی تھی۔ غلط فہمی کیسے ہوئی۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ فریال نے مجھے چھوڑ دیا تھا اور ایک نئی زندگی اپنالی تھی۔ اسے واپس نہیں لایا جا سکتا تھا۔ اینڈ دیٹ از دی اینڈ آف دی لو اسٹوری۔ ہر داستانِ محبت کا انجام المناک نہ ہوتا تو محبت کا نام کیسے ہوتا۔ لیلیٰ مجنوں کے بچوں کے نام کون یاد رکھتا۔

اس کے باوجود جب میں گجرات سے آندھی طوفان کی رفتار سے نکلا تو اس سے شدید تر آندھی طوفان میرے جذبات کی دنیا میں بپا تھا۔ میری ذہنی کیفیت بڑی عجیب تھی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں چلا چلا کے روؤں... دیواروں سے سر ٹکراؤں... ہر چیز کو تہس نہس کر دوں... سب کو مار ڈالوں... فریال کو... سلطان کو اور اپنے آپ کو۔ خدا کا شکر ہے کہ اس بحرانی کیفیت میں بھی میں نے گاڑی کسی سامنے سے آنے والی گاڑی سے نہیں ٹکرائی۔

آدھی رات سے کچھ پہلے میں ست بدھائی پہنچا تو ردِعمل کے طوفان کی پہلی تباہ کن لہر گزر چکی تھی۔ اس ضرورت کا احساس غالب آ گیا تھا کہ یہاں خود کو تماشا بنانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ مجھ پر ایک ذمے داری خود کے ساتھ دوسروں کو سنبھالنے کی بھی ہے۔ مجھے اپنے ایک دوست کے ساتھ پیش آنے والی بہت پرانی ٹریجیڈی یاد آئی۔ اس کے والد بجلی کمپنی میں معمولی حیثیت کے میٹر ریڈر تھے۔ کسی کی شکایت پر انہیں ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔ اس کا ان کے دماغ پر ایسا اثر ہوا کہ وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے۔ ایک دن گھر سے نکلے اور ٹرین میں بیٹھ گئے۔ دروازے میں کھڑے تھے یا بیٹھے تھے کہ جھٹکے سے باہر گرے اور مخالف سمت سے آنے والی ٹرین کے نیچے کٹ گئے۔ میرے دوست نے بڑی مشکل سے ان کا سراغ لگایا۔ اسے باپ کے جسم کے ٹکڑے دے دیے گئے۔ اس نے حوصلے سے کام لیا۔ ان ٹکڑوں کو گھر لے جاتا تو ماں پاگل ہو جاتی۔ اس نے باہر ہی باہر سب انتظام کیا اور لاش کے ٹکڑوں کو اکٹھا کر کے کفن دفن کی رسم سارے شرعی تقاضوں کے مطابق ادا کر دی۔ پھر گھر آ کے کہہ دیا کہ ابا جی تو نہیں ملے۔ آہستہ آہستہ سب کو صبر آ گیا۔ پاگل تو وہ ہو گئے تھے۔ کہیں نکل گئے۔ اصل حقیقت ان کو کئی سال بعد معلوم ہوئی۔

ایسی ہی ذمے داری مجھ پر آ گئی تھی گو اتنی سنگین نہ تھی۔ مجھے سب کو فوری صدمے سے بچانا تھا۔ میری آمد کی خبر کے ساتھ ہی حویلی میں سنسنی پھیل گئی۔ سب نے ایک ساتھ میرے کمرے میں یلغار کی۔

رابعہ نے پہلا سوال داغا۔ ”تم آ گئے؟ فریال کہاں ہے۔“

پھر شہناز بولی۔ ”تم اکیلے واپس آئے ہو۔“

لیلیٰ بھابی نے مایوسی سے کہا۔ ”وہ ساتھ نہیں آئی... یا ملی نہیں؟“

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”بتاتا ہوں... سب بتاتا ہوں۔ ذرا کپڑے بدل لوں۔ میں نے کھانا بھی نہیں کھایا ہے۔ ریشم سے کہو یہاں لے آئے۔ تم سب کی صورتوں پر بارہ کیوں بجے ہوئے ہیں؟ اس لیے کہ گھڑی میں رات کے بارہ بجے ہیں۔“

”یہ کیا ڈراما کر رہے ہو کزن...“ رابعہ نے خفگی سے کہا۔ ”تم فریال کو واپس لانے گئے تھے یا تفریح کرنے۔ خوش ایسے ہو جیسے وہ ساتھ آ گئی ہے۔“

”واقعی رابعہ... دیکھو اسے چھپا تو نہیں رکھا ہے... ہمیں سرپرائز دینے کے لیے۔“ لیلیٰ بھابی نے کہا۔

میں نے کہا۔ ”لیڈیز... میں ایک اعلان کر دوں۔ اس سے آپ سب کو یقیناً مایوسی ہوگی... فریال نہیں آئی... اور آئے گی بھی نہیں۔ دوپہر کے بعد سے اب تک میں اسی کے ساتھ تھا۔ اب آپ لوگ تشریف رکھیں تو میں اس ملاقات کی تفصیلات بتاؤں۔“

میں نے کھانا کھاتے ہوئے جس کی مجھے قطعی خواہش نہ تھی بڑے سکون سے فریال کے بارے میں ہر بات بتا دی۔ جو فریال نے مجھے بتائی تھی مجھے کچھ چھپانے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہر بات بالآخر خود ہی سامنے آ جاتی۔

میں نے کہا۔ ”بہت جلد آپ اسے اپنے ٹی وی پر جلوہ نما دیکھ سکیں گی۔ اور اس کے بعد پردہ اسکرین پر... اگر کسی کے ذہن میں یہ خیال ہے کہ میں نے سنجیدگی سے کوشش نہیں کی یا میرے غلط رویے سے بات مزید بگڑ گئی۔ کسی کو اپنی عقل

اور ذہانت پر ناز ہے یا شک ہے کہ میں صحیح صورتِ حال پیش نہیں کر رہا ہوں تو میں فون نمبر کے علاوہ پتا سمجھا سکتا ہوں... جس کا جی چاہے خود جائے اور کوشش کر کے دیکھ لے۔ اس سے زیادہ کہنے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں۔ آپ لوگ جاگتے ہیں مجھے نیند آ رہی ہے۔“

اس کے باوجود ان میں سے کوئی اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ ان کے مایوس دکھ بھرے چہرے ان کے دلی جذبات کی عکاسی کرتے تھے۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ فریال یہ سب کر سکتی ہے جو میں نے کہا۔ لیکن ان کے لیے یقین آئے بنا چارہ بھی نہ تھا۔ آہستہ آہستہ ان کی مایوسی غصے میں بدل رہی تھی۔

حسبِ توقع رابعہ سب سے پہلے بولی۔ ”یہ تو ہونا تھا کزن... اور اس کے ذمے دار جتنے تم ہو اس سے زیادہ وہ ہے، تمہاری نور جہاں۔“

لیلیٰ بھابی نے اس میں اضافہ کیا۔ ”ایسی عورتیں ہی کامیاب ہوتی ہیں رابعہ جیسے دنیا میں اپنا میاں مشہور کر رکھا تھا۔ اسے ٹھکانے لگا کے پہنچ گئی یہاں... دوسرا شکار مل گیا ہے۔“

رابعہ نے دانت پیس کے کہا۔ ”لیکن خدا کی قسم اس گھر میں دوبارہ قدم رکھ کر تو دیکھے وہ... یا وہ نہیں یا میں نہیں۔“

میں نے کہا۔ ”نہیں... تم تو ویسے بھی پرایا مال ہو۔ آج نہیں تو کل جانا ہی ہے اس گھر سے۔“

شہناز نے مجھے گھور کے دیکھا۔ ”آخر تم اتنے نان پرلیس کیوں ہو۔“

میں نے کہا۔ ”دنیا کے کام تو ایسے ہی چلتے ہیں ڈاکٹر صاحبہ... میرے رونے پیٹنے، ماتم کرنے یا چیخنے چلانے سے فریال کا فیصلہ تو نہیں بدل سکتا۔ مرنے والوں کے ساتھ کوئی نہیں مرتا حالانکہ لواحقین کے صدمے کی شدت دیکھ کر لگتا یہی ہے کہ سب مردہ بن گئے۔“

”پھر تو مرنے والوں کو رونا بھی نہیں چاہیے۔“ لیلیٰ بھابی نے کہا۔

میں نے کہا۔ ”دیکھا تو نہیں میں نے لیکن سعودی عرب سے آنے والے میرے ایک دوست نے بتایا تھا کہ وہاں لوگ موت کو بھی اتنے ہی میٹر آف فیکٹ طریقے پر لیتے ہیں کہ زندگی خدا کی امانت تھی۔ اس نے مقررہ وقت پر لے لی۔ نہ ایک منٹ پہلے اور نہ ایک منٹ بعد۔ پھر رونا کیسا... آئیں آپ لوگ بھی سکون سے سو جائیں۔“

”کل سے فریال کی بات بھی کوئی نہ کرے... مر گئی فریال۔“ رابعہ نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”بے حسی اور ڈھٹائی ملاحظہ ہو... جس کی وجہ سے یہ سب ہوا اس پر اثر بھی نہیں... دعوے کتنے تھے محبت کے۔“

”دعوے کیا صرف میرے تھے...“ بالآخر میرا حوصلہ جواب دے گیا۔ ”اور ایسا کون سا ناقابلِ معافی جرم سرزد ہوا تھا مجھ سے۔ کیا میری محبت اس کے لیے وقف نہیں تھی۔ تھوڑا سا شادی میں دیر ہوئی تھی تو اس کے اسباب تھے۔ میں نے کون سا نور جہاں سے نکاح پڑھوا لیا تھا اور فریال کو انکار کر دیا تھا۔ اس سے زیادہ میں کیا اپنی محبت کا یقین دلاتا۔ صرف اور صرف اس کی خاطر میں نے کس طرح عائشہ کا دل توڑا۔ یہ عائشہ سے پوچھو۔“

شہناز نے کہا۔ ”دکھ تو ہے نا سب کو۔“

میں نے دہاڑ کے کہا۔ ”سب اس کے لیے دکھی ہیں۔ میرے لیے کوئی دکھی نہیں۔ مجھ سے کسی کو ہمدردی نہیں۔ سب مجھے قصوروار ٹھہرا رہے ہیں... سب اس کے طرف دار ہیں... جاؤ ذرا اس سے بات کر کے دیکھو۔ پھر اندازہ ہوگا کہ جذبات میرے بدلے ہیں یا اس کے۔ وہ بہت اونچی ہواؤں میں اڑ رہی ہے۔ سپر اسٹار بننے کے خواب دیکھ رہی ہے۔“

”اس کو پھر اس سلطان کے جال میں ہی پھنسنا تھا۔“ رابعہ نے افسوس سے سر ہلایا۔

میں نے کہا۔ ”کزن... اب وہ اسے اپنا دوست... ہمدرد... مددگار سیکریٹری اور خیر خواہ سمجھتی ہے۔ کہتی ہے یہ مشیتِ ایزدی نہ ہوتی تو وہ گجرات پر کیوں اترتی... عجیب تاویلیں ہیں اس کے پاس۔“

”میں جاؤں گی اس کے پاس۔“ رابعہ نے کہا۔

”ضرور جاؤ... وہ بڑی محبت سے ملے گی۔ بڑی اپنائیت سے اس کوٹھی میں ٹھہرائے گی جو سلطان نے اس کے نام کر دی ہے۔ اس کار میں لیے پھرے گی جو سلطان نے دی ہے۔ ان کامیابیوں کا ذکر کرے گی جو سلطان کے عوض اسے نصیب ہوئی ہیں۔ تمہاری ایک نہیں سنے گی وہ۔“

”مجھے یقین نہیں آتا۔“ شہناز نے زیرِ لب کہا۔

”میں ایک بات بتاؤں... اتنا بڑا فیصلہ اس نے ایک دن میں نہیں کیا ہوگا۔ میں اسے کوئی جذباتی ردِعمل نہیں مانتا۔ اس کے دماغ میں یہ خیال پہلے سے تھا۔ ست بدھائی کی حویلی کے اندر کی زندگی میں اس لڑکی کے لیے کون سی کشش ہو سکتی ہے جو لندن کی آزاد فضا میں چار سال گزار آئی ہو۔ اور ویسے بھی... تم خود کو دیکھو شہناز، تم راجا کے ساتھ اور ایک مشن لے کر آئی ہو۔ رابعہ تو ہمارے ساتھ ہے اور ہماری ذمے

داری ہے لیکن اس کے پاس بھی ایک مشن ہے۔ فریال میرے ساتھ زندگی گزار سکتی تھی... اگر میں کراچی یا لاہور کے کسی پوش علاقے میں رہتا۔ ہماری ایک سوشل لائف ہوتی۔ ہم گھومتے پھرتے۔ دبئی، لندن آتے جاتے تو وہ بہت خوش رہتی۔ اس جنگل بیابان میں اسے مستقبل کی زندگی میں بوریت اور بیزاری کے سوا کچھ نظر نہیں آتا ہوگا۔ یہاں اسے یہ خیال آیا ہوگا کہ وہ دوبارہ شوبزنس جوائن کرے تو لازمی اسے لاہور جانا پڑے گا اور وہاں وہی لائف ہوگی جو اسے پسند ہے۔ وہ جائے گی تو اکیلی نہیں رہے گی۔ میں اس کے ساتھ جاؤں گا اور میرا آنا جانا رہے گا تو دونوں کا کام چل جائے گا۔"

رابعہ بولی۔ "تمہارا مطلب ہے اس کو بہانہ مل گیا؟"

میں نے کہا۔ "حالات ایسے بن گئے کہ اسے بہانہ بنالینا مشکل نہیں رہا۔ گجرات کے ریلوے اسٹیشن پر سلطان سے ملاقات حادثہ سہی۔ اس نے تو کہا تھا کہ تم قید میں نہیں ہو... جاؤ... اس کے ساتھ ہی دانہ بھی ڈال دیا تھا۔ جال میں گرفتار ہونے کے لیے وہ خود تیار تھی۔ یہ اس نے تسلیم کیا میرے سامنے... اس کے علاوہ... مجھ سے ناراض سہی... اس نے تو سب کو چھوڑ دیا... سب کچھ بھلا دیا۔"

میرا خیال تھا کہ میں خاص حد تک سب کے جذبات کا رخ بدلنے میں کامیاب ہوں لیکن رابعہ بڑی سخت جان چیز تھی۔ وہ پھر وہیں آگئی۔ "دیکھو کزن میں نہیں سمجھتی کہ فریال کا پھر شوبزنس میں جانے کی خواہش رکھنا کوئی غلطی تھی۔ ہر لڑکی جس نے اتنی آزادانہ زندگی گزاری ہو... اپنے سارے فیصلے خود کیے ہوں۔ یہاں آسانی سے ایڈجسٹ نہیں ہوسکتی۔ لیکن اصل خرابی پیدا کی نور جہاں کے لیے تمہارے جذبات نے۔ جن کو وہ سمجھ ہی نہیں سکی۔"

"جب اباجی نے اسے قبول کرلیا تو گویا اس کے دل کو ایک اور دھچکا لگا... تو اب یہ اسی گھر میں رہے گی، یہ بہت بعد کی بات ہے لیکن اسے معلوم تھی۔" میں نے کہا۔

"اسے کس نے بتایا؟"

"اس کی لندن والی سہیلی نے... نور جہاں آئی اور چلی گئی۔ میں صرف اس کی باہر نکلنے میں مدد کررہا ہوں... اگر اسے بچا رہا ہوں تو اس لیے کہ ساتھ میں بھی پھنستا ہوں... یہ تھوڑے دن کی بات ہے۔ جب وہ چلی جائے گی تو اس کا کسی سے بھی کیا تعلق رہے گا... لیکن فریال نے یہ سب نہیں سوچا... کیونکہ وہ اسے مستقبل کا لائحہ عمل طے کرچکی تھی۔"

شہنا نے آہستہ سے کہا۔ "میرا دل نہیں مانتا کہ کوئی عورت کسی وجہ کے بغیر اپنی محبت کو اپنے مستقبل... مرز... مستقبل پر قربان کرسکتی ہے۔"

رابعہ نے کہا۔ "اور تم دیکھو ان مردوں کی سوچ... صاحب بھی تو انہی کے ہم خیال اور طرف دار... دو... جمعہ جمعہ آٹھ دن نہیں ہوئے جان پہچان کو... نور جہاں کو۔"

میں نے ہنس کے کہا۔ "یہ تمہارے لیے لمحۂ فکر... چاہیے... اس جیسی عورت کے لیے تو وہ حلوا ہے حلوا... آدم خور چیز ہے وہ... سالم نگل جائے اس معصوم بچے کو۔"

راجا کو تمام صورتِ حال کا علم صبح ہوا۔ اسے رپورٹ خواتین سے ملی تھی۔ میں بہت دیر سے سو کے اٹھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ میرے اور اس کے درمیان یہ زیر بحث آتا ایک بہت بڑی آفت نازل ہوگئی... بلکہ چاہیے کہ نازل ہوتے ہوتے رہ گئی۔ ایک معمولی سی بندی نے ہم سب کو بہت بڑی پریشانی سے بچالیا۔

گیارہ بجے پولیس نے اچانک ہر طرف سے حویلی کا محاصرہ کرلیا۔ وہ ایک ایس پی کی قیادت میں آئے تھے۔ ایس پی کے ساتھ جیپ میں مقامی تھانے کا انچارج اور اس کے ماتحت بھرپور فرض شناسی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بڑی مستعدی سے شریک تھے۔ ان کے پیچھے آنے والے ٹرک میں پولیس کی نفری بھری ہوئی تھی اور وہ اپنے ساتھ زنانہ پولیس لانا بھی نہیں بھولے تھے۔

مجھے اس کی اطلاع ریشم نے دی۔ میرے جاگنے کے بعد وہ معلوم کرنے آئی تھی کہ اب کافی لائے یا ناشتا۔ باہر ایک سیکیورٹی گارڈ ہانپتا کانپتا یہ اطلاع لایا کہ پولیس کی نفری نے ہر طرف سے حویلی کو گھیر لیا ہے۔ اس نے ریشم کو دیکھ کر کہا کہ نواب صاحب کو بتادے۔ ریشم دوڑی اور اس نے بدحواسی میں اپنی بغیر گرامر کی انگلش کا مزید خون کیا۔ نتیجہ یہ کہ میں اندازے سے بھی کچھ نہ سمجھ سکا۔

میں نے اسے ڈانٹا۔ "اردو میں بات نہیں کرسکتی انگریز کی بچی۔"

پھر اس نے مفہوم سلیس اردو میں واضح کیا۔ مجھے حیرت ضرور ہوئی لیکن پریشانی کی اب کوئی بات نہیں تھی چنانچہ میرے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔ میں نے کہا۔ "ریشم! پولیس پہلے کبھی نہیں آئی۔ اتنا خوف زدہ ہونے کی اس میں کیا بات ہے... غنی بات کرلے گا۔"

اسی وقت غنی نمودار ہوا۔ "سر... پولیس خانہ تلاشی کے لیے آئی ہے۔ ایس پی غلام قادر آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "ان کو مہمان خانے میں بٹھاؤ۔"

"بٹھا دیا ہے۔ راجا صاحب ان سے بات کررہے ہیں۔ میرا خیال ہے..."

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے تمہارا خیال... ان کو اپنا کام کرنے دو۔"

غلام قادر اس خصوصی ٹیم کا سربراہ تھا جو اکبر خان کے قتل کی تحقیقات کے لیے بنائی گئی تھی۔ اس نے پنڈی اسلام آباد میں مختلف مقامات پر چھاپے مارے تھے لیکن اسے کوئی کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ وہ معاملے کی سیاسی پیچیدگی کو سمجھتا تھا۔ قتل کا شک صرف نور جہاں پر جاتا تھا لیکن وہ ایسی غائب ہوئی تھی کہ پھر کسی کو نظر نہیں آئی تھی۔ نور جہاں کے میرے ساتھ مراسم کے افسانے رانا کی لابی نے یہ ثابت کرنے کے لیے پھیلائے تھے کہ اس قتل میں میرے سوا کسی کا ہاتھ نہیں ہوسکتا لیکن ایک تو سیشن کورٹ نے میری ضمانت قبل از گرفتاری کی توثیق کردی تھی۔ دوسرے ایس پی جانتا تھا کہ رانا کی مخالف پارٹی کی حمایت سے اسے بحال کیا گیا ہے اور وہ جہلم کا ڈی آئی جی ہے۔ مزید یہ کہ مستقبلِ قریب میں اس کے پنجاب کا آئی جی بن جانے کے امکانات ہیں۔ ایسی صورت میں ایس پی کھل کے مجھ سے دشمنی یا میرے خلاف قانونی کارروائی نہیں کرسکتا تھا۔

ایس پی پر دوسری طرف سے دباؤ تھا۔ رانا کی پارٹی اب برسرِ اقتدار نہ سہی ایک مضبوط سیاسی طاقت رکھتی تھی اور ان کی طرف سے یہ بات اٹھائی جارہی تھی کہ پولیس اس کیس میں نواب آف ست بدھائی کی حویلی میں گھس کر نور جہاں کو گرفتار کرنے سے عمداً گریز کررہی ہے حالانکہ اس کی حویلی میں موجودگی کے واضح ثبوت ہیں۔ شہزاد کے اندیشے بہت جلد درست ثابت ہوگئے تھے۔ حویلی کے اندر سے کسی نہ کسی نمک حرام نے لالچ میں یہ مصدقہ خبر باہر پہنچادی تھی۔ رانا اس علاقے میں اپنے اثر رسوخ سے محروم نہیں ہوا تھا۔ اس کے مخبروں نے بھی اندر کی پوری رپورٹ حاصل کرلی ہوگی۔ پولیس کا یہ چھاپا اسی کا نتیجہ تھا۔

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میں نے بروقت شہزاد کی بات مان لی۔ ہم نے ایک طوفانی بارش کی رات میں نور جہاں کو حویلی سے نکال دیا۔ اگر یہی کام موسم کے بہتر ہو جانے تک ملتوی کردیا جاتا تو شاید نور جہاں کے حویلی سے جانے کی خبر بھی رانا تک پہنچ جاتی اور یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ وہ کس کے ساتھ گئی ہے۔ اب میں یقین کرنے پر مجبور تھا کہ حویلی کے اندر اور باہر موجود پولیس کے اور میرے دشمنوں کے مخبر ہماری نقل و حرکت پر پل پل نظر رکھے ہوئے تھے۔ بس اس طوفانی رات میں ان کی نظر چوک گئی۔

غلام قادر پوری قانونی تیاری کے ساتھ آیا تھا اور بے حد محتاط تھا۔ اس نے تمام دستاویزات دکھانے کی کوشش کی لیکن میں نے ٹال دیا۔ "مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا... آپ اپنی تسلی کریں... بس ایک تو یہ خیال رکھیں کہ وہ کہاں ہیں... اور کیا کررہے ہیں... یہ ذمے داری ان کی ہے۔"

ایس پی نے مجھے یقین دلایا۔ "اگر کسی کو بھی ان کے رویّے سے شکایت ہوئی تو میں اسے کھڑے کھڑے برطرف کردوں گا۔ ہم صرف ایک ایسی عورت کو تلاش کررہے ہیں جس پر اپنے شوہر کے قتل کا الزام ہے۔"

میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ "میں نے سنا ہے وہ اکبر خان کی بیوی نہیں تھی۔"

ایس پی چونکا۔ "یہ آپ نے کس سے سنا ہے سر!"

"کیا آپ کے پاس یہ ثابت کرنے کے لیے کچھ ہے؟ کوئی ثبوت جو عدالت میں پیش کیا جاسکے۔" میں نے کہا۔ "مثلاً نکاح رجسٹریشن سرٹیفکیٹ جسے ہم نکاح نامہ بھی کہتے ہیں۔"

"ابھی تک ایسی کوئی دستاویز مجھے نہیں ملی۔"

میں نے کہا۔ "میں نے یہ سنا ہے کہ..."

اس نے نظر اٹھا کے میری طرف دیکھا۔ "آپ رک کیوں گئے؟"

میں نے کہا۔ "پہلے آپ پوچھ لیں کس سے سنا ہے؟"

وہ کچھ جھینپ کر مسکرایا۔ "پہلے معلوم تو ہو کیا سنا ہے۔"

میں نے کہا۔ "نور جہاں کسی اور کی بیوی تھی۔"

"کس کی...؟" وہ حیران ہوا۔

"مجھے نہیں معلوم... دو آدمی باتیں کررہے تھے۔ ایک نے کہا کہ اکبر خان کو اسی نے قتل کیا ہے۔"

"اس آدمی نے؟" وہ چونکا۔

"اونہوں... اس نے جو نور جہاں کا اصل شوہر تھا۔ دوسرے نے کہا کہ کوئی میری بیوی کو بھگا کے لے جائے تو میں بھی اسے نہ چھوڑوں۔ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا... اور میں بھی... اس پر وہ چونکے اور وہاں سے چلے گئے۔"

ایس پی نے مجھے غور سے دیکھا۔ "کون تھے وہ آدمی؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "پتا نہیں... وہاں بہت سے لوگ تھے۔"

"آپ کہاں کی بات کررہے ہیں؟"

''برہان الدین کے جنازے میں۔ آپ کے ڈی آئی جی صاحب بھی تھے۔''

''آپ نے ان سے ذکر کیا؟''

میں نے کہا۔'' کیسے کرتا... ان کے کندھے پر جنازہ تھا اور قبرستان میں سیکڑوں لوگ تھے۔ میری جگہ آپ ہوتے تو انہیں پکڑ لیتے۔ پتا نہیں کون تھے مجھے پھر دکھائی نہیں دیے لیکن آپ کو یہ بات بتانے کا ایک مقصد ہے کہ آپ تفتیش میں اس امکان کو نظر انداز نہ کریں۔''

''اگر یہ بات درست ہے۔''

میں نے کہا۔'' کمال ہے ایس پی صاحب... اگر کا کیا سوال... میں بتا رہا ہوں آپ کو، کیا میں کوئی لطیفہ سنا رہا ہوں، آپ کو یقین کرنا چاہیے۔''

''جی... بالکل... میرا مطلب ہے... ایسا ہو سکتا ہے بلکہ ہوگا، میں ضرور دیکھوں گا۔'' وہ میرے لہجے سے پریشان ہو گیا۔

میں نے کہا۔'' یہ اطلاع آپ کو کس نے دی کہ نور جہاں میری حویلی میں موجود ہے۔''

''اطلاع تو بڑے معتبر ذرائع سے ملی تھی۔''

میں نے کہا۔'' آئندہ کے لیے آپ اسے غیر معتبر ذرائع میں شامل کر لیں۔ ویسے مجھے ڈر لگ رہا ہے... کہیں اندر سے نور جہاں برآمد ہی نہ ہو جائے۔ آپ لوگ اس میں بڑی شہرت رکھتے ہیں۔ کسی سے کچھ بھی برآمد کر لیں۔ آپ کو ایک لطیفہ سناتا ہوں۔ روسی وزیرِ اعظم خروشچیف کے دور میں ایک امریکی صدر نے ماسکو کا دورہ کیا۔ ایک صبح امریکی خاتون اول نے اپنی معاون روسی مترجم سے کہا، میری ڈھائی لاکھ ڈالر کے ہیروں سے جڑی کلائی کی گھڑی نہیں مل رہی ہے۔ مجھے یقین ہے وہ رات کو چوری ہو گئی۔ معاون مترجم نے یہ بات آگے پہنچا دی۔ خاتون اول سارا دن سرکاری مصروفیات میں گزار کے رات کو فارغ ہوئیں اور اپنی سرکاری رہائش گاہ کے باتھ روم میں پہنچیں تو دیکھا کہ گھڑی باتھ ٹب کے کنارے پر رکھی ہے۔ غسل کے بعد ناشتے کی میز پر انہوں نے اپنی معاون سے کہا کہ بھئی میری گھڑی مل گئی ہے۔ میں نے رات کو اتار کے سرہانے نہیں رکھی تھی باتھ ٹب پر بھول گئی تھی۔ معاون نے یہ بات بھی حکام بالا تک پہنچا دی۔ تھوڑی دیر بعد پولیس چیف بدحواس سا حاضر ہوا اور بولا 'میڈم آپ کی گھڑی تو مل گئی۔ لیکن میں ان چھ بندوں کا کیا کروں جن کے خلاف چوری کا کیس تھا... سب اعتراف جرم کر چکے ہیں اور سب کے پاس سے گھڑی بھی برآمد کی جا چکی ہے۔''

ایس پی ہنسا۔'' ہم ایسا نہیں کرتے۔''

میں نے سخت حیرانی سے کہا۔'' اچھا... اکثر خبریں آتی ہیں کہ پولیس نے مشتبہ افراد کو گرفتار کیا، پھر ان کے پاس سے کچھ نہ کچھ برآمد بھی ہو جاتا ہے۔ ہیروئن یا اسلحہ وغیرہ، کیا پولیس کی آنکھوں میں دورانِ تربیت کوئی مخصوص لینس لگایا جاتا ہے کہ راہ چلتے لوگوں کی بھیڑ میں سے وہ مشتبہ افراد کو تاڑ لیتے ہیں؟ ویسے اس معاملے میں آپ کیا کرتے؟''

وہ سمجھ گیا تھا کہ میں نان سیریس موڈ میں کیوں ہوں۔ لاحاصل کارروائی کے پیشِ نظر وہ خفت کا شکار تھا۔ میرے سوال پر وہ پھر چونکا۔'' کس معاملے میں نواب صاحب؟''

''میرا مطلب تھا... خدانخواستہ... خدانخواستہ... ایسے میں کوئی آپ کی وائف کو بھگا لے جاتا تو کیا آپ اسے زندہ چھوڑتے۔ میرا خیال ہے نہیں، غیرت مند آدمی ایسا ہی کرے گا اگر کسی طرح آپ یہ معلوم کر لیں کہ نور جہاں کا سابق شوہر کون تھا... یا کون کون تھے۔''

اس کا موڈ باقاعدہ خراب ہو گیا تھا لیکن مجھے جواب دینے سے پہلے اس کے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے سارا غصہ فون کرنے والے پر اتار دیا۔ بات پتا نہیں کیا تھی لیکن میرا خیال ہے فون رانا کی طرف سے یا اس کے کسی خاص بندے کا تھا۔ ایس پی نے اس پر چڑھائی کر دی۔'' میں کیا کر رہا ہوں؟ اپنا وقت ضائع کر رہا ہوں... جھک مار رہا ہوں... ذلیل ہو رہا ہوں صرف تمہاری وجہ سے... شٹ اپ...! تم کو کس الو کے پٹھے نے کہا تھا؟ وہ ہوش میں تھا اس وقت... کیا ملا؟'' اپنے سوال کے جواب میں اس نے جو لفظ خود ہی بولا وہ لکھا نہیں جا سکتا۔ پھر اس نے فون بند کر دیا اور اس لفظ پر میری طرف دیکھ کے خفت سے مسکرایا۔'' سوری سر!''

تلاشی کا سارا عمل ایک مربوط پلان کا نتیجہ تھا۔ بے حد ترتیب کے ساتھ آگے بڑھنے والا۔ نقشے کے مطابق اور SYSTEMATIC جس میں اس بات کا ایک فیصد امکان نہیں چھوڑا گیا تھا کہ کوئی ادھر سے ادھر کیا جا سکے یا روپوش رہ جائے... پہلے نیچے... پھر اوپر... کسی کو نقل و حرکت کی اجازت نہیں تھی۔ ایک چوہا بھی اپنے بل سے نکلتا تو جہاں جاتا پکڑا جاتا۔ یہ بڑی کامیاب اور مکمل اسٹریٹجی تھی جس میں کمانڈوز کی طرح تربیت یافتہ پولیس فورس نے بڑی بھرپور کارروائی کی۔ اگر نور جہاں حویلی میں ہوتی تو پہلے مرحلے میں ہی برآمد ہو جاتی۔

انہوں نے کوئی دو چھتی، کوئی الماری، کوئی تہ خانہ اور

...نہیں چھوڑا اور انہیں ایک کامیابی بہرحال ہوئی۔ ...گوشہ ...ر دتے پیٹے شخص کو انہوں نے ایس پی کے سامنے لا کھڑا ...کیا۔'' ...پیچھے قید تھا۔''

ایس پی نے اسے غور سے دیکھا۔'' یہ کون ہے؟''

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔'' مجھے تو نہیں معلوم۔''

ایس پی نے مجھے حیرانی سے دیکھا۔ اس کا خیال ہوگا کہ ...قیدی کو اپنا ملازم بتاؤں گا جس کو حویلی کی روایات کے ...مطابق کسی جرم کی پاداش میں قید کیا گیا تھا۔ حویلیوں اور محلوں ...نجی جیل خانے اور عقوبت خانے سب ہوتے ہیں۔ سزا ...کا اپنا ہی نظام ہوتا ہے۔

''کیا مطلب... یہ آپ کی قید میں تھا۔''

''مطلب آپ بتائیں مجھے اس فضول بات کا۔ آپ کہہ ...رہے ہیں کہ میری حویلی میں کوئی قید خانہ ہے... نجی جیل ہے ...میری؟'' میں نے برہمی سے کہا۔'' یہ بہت سنگین الزام ہے ...ایس پی صاحب۔''

ایس پی خون کے گھونٹ پی کے رہ گیا۔ اس نے بندے ...سے پوچھا۔'' اوئے کون ہو تم... نام کیا ہے تمہارا؟''

مزید لطیفہ یہ ہوا کہ قیدی نے کہا۔'' غلام قادر۔''

میں نے کہا۔'' بے وقوف... ایس پی صاحب نے تمہارا ...کہا ہے... ہمارا نہیں۔ ان کو بتاؤ تم کون ہو؟''

وہ ہاتھ جوڑنے لگا۔'' سرکار... ہم نے کچھ نہیں کیا۔''

ایس پی نے اس کے ایک بید رسید کی جو بہت دیر سے ...اس کے ہاتھوں میں بے قرار تھی۔'' حویلی میں کس نے قید کر ...رکھا تھا تمہیں اور کیوں؟''

''ہم بتاتے ہیں سرکار... ہمیں رانا صاحب نے بھیجا تھا۔''

اس کی بات کے ساتھ ہی غنی نے ایس پی کے قدموں ...میں ایک چیز رکھ دی۔'' یہ تحفہ دے کر...''

ایس پی نے پیر پیچھے کر لیے۔'' یہ... یہ... تو دستی بم ہے۔''

میں نے کہا۔'' میں نے پہلے کبھی دیکھا نہیں... لیکن آپ کہتے ہیں تو ٹھیک ہی ہوگا۔''

ایس پی نے خوں آشام نظروں سے ملزم کو دیکھا۔'' یہ سچ ہے؟''

''ایک دم سچ ہے سرکار... یہ ہم اپنے ساتھ لائے تھے۔'' اس نے کانپتے ہوئے پوری بات بتا دی۔

''یہ کس دعوت اور فلمی شو کی بات کر رہا ہے؟''

میں نے کہا۔'' یہ ہماری طرف سے انتظام تھا۔ آس پاس کے دیہات میں رہنے والوں کے لیے۔ یوں کل ہی فری کلینک اور ایجوکیشن سینٹر کا افتتاح تھا۔''

''آپ نے اس کے خلاف رپورٹ درج نہیں کرائی۔''

میں نے بے نیازی سے کہا۔'' دراصل میں کچھ مصروف تھا۔ میرا چیف سیکیورٹی آفیسر میرے حکم کے بغیر کچھ نہیں کرتا۔ اعترافِ جرم تو آپ نے سن ہی لیا... آپ جو قانونی کارروائی کرنا چاہیں کریں۔ اسے بھی لے جائیں اپنے ساتھ۔''

غلام قادر نے واویلا کیا۔'' سرکار... رحم کریں مجھ پر... مجھے بچا لیں... اپنے پاس پناہ دے دیں مجھے... یہ لوگ مار ڈالیں گے مجھے۔''

میں نے کہا۔'' نہیں بھئی... تم نے کون سا جرم کیا ہے۔ ارتکاب سے پہلے اعتراف کر لیا، خود کو ہمارے حوالے کر دیا۔ ایس پی صاحب... ملازم کے جرم کا ذمے دار مالک کو سمجھا جاتا ہے مگر ملازم حکم کی تعمیل ہی نہ کرے اور آلۂ قتل سمیت حاضر ہو کے سب بتا دے تو کیا وہ بے قصور نہیں؟''

اس نے سر ہلایا۔'' دیکھیے... فیصلہ عدالت ہی کر سکتی ہے۔'' پھر اس نے اشارہ کیا۔'' اوئے لے جاؤ اسے۔''

غلام قادر کو چیخنے چلانے فریاد کرنے اور دھاڑیں مار مار کر رونے کے باوجود گھسیٹ کر پولیس کی لاری میں ڈال دیا گیا۔

میں نے کہا۔'' میری طرف سے میرا سیکیورٹی افسر تھانے میں رپورٹ درج کرائے گا۔ ضابطے کی کارروائی تو ہوگی ویسے میرا خیال تھا کہ اس کو جانے دیا جائے... اس کیس میں کچھ بھی نہیں...''

''ہم تفتیش تو کریں گے سر...'' وہ بولا۔

''اور میں اسے کل ہی چھوڑ دیتا۔ چلو خیر... آپ کا کام آپ جانیں مگر ایسا نہ ہو تفتیش میں بندہ ضائع ہو جائے۔''

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔'' آئی ایم رئیلی سوری... جو زحمت آپ کو اور فیملی کو ہوئی۔''

میں نے کہا۔'' دوبارہ کب ہوگی؟... زحمت...؟''

وہ تھوڑا سا نروس ہوا۔'' ہمیں احکامات کی تعمیل کرنا پڑتی ہے۔''

''یہی تو میں پوچھ رہا ہوں... کل کسی اور مصدقہ ذرائع سے یہ اطلاع ملی کہ جس کی تلاش ہے... وہ اب آ گیا ہے یہاں، آپ کے جاتے ہی... تو کیا صبح پھر یہی سین ہوگا؟''

اس نے خفت سے ہنس کے ہاتھ ملایا۔'' میں نے آپ کے بارے میں جیسا سنا تھا... ویسا ہی پایا؟''

''یعنی کیسا؟ کیا تصور تھا آپ کے ذہن میں نواب رفیق احمد شیرازی کا... یہاں آنے سے پہلے۔''

اس نے کہا۔ ''اسے چھوڑیئے... کیا میں آپ سے تخلیے میں چند منٹ گفتگو کر سکتا ہوں۔ اِن کیمرا... آف دی ریکارڈ۔''

میں نے کہا۔ ''کیوں نہیں۔''

میرے ایک اشارے پر مہمان خانہ خالی ہوگیا۔ خلوت میسر آتے ہی اس نے کہا۔ ''نواب صاحب... مجھے معلوم ہے یہاں کی سیاست کے بارے میں... لیکن میں ابھی اس کھیل میں شریک نہیں۔ کبھی اگر یہاں پوسٹنگ ہوئی تو پھر دیکھی جائے گی کہ خود کو اور نوکری کو کیسے بچایا جائے۔ ابھی میں صرف ایک مرڈر کیس کی تفتیش پر مامور ہوں۔ یہ خصوصی ٹیم بھی رانا صاحب کے دباؤ پر بنی تھی اور آپ کا نام محض اس لیے آیا کہ مقتول آپ کا ملازم رہا تھا... اور اس لیے کہ اسے قتل کرنے والی عورت نور جہاں کے ساتھ آپ کے مراسم تھے۔ مراسم مشہور تھے، مبینہ طور پر۔''

میں نے کہا۔ ''لیں... مبینہ طور پر۔''

''ابھی تک ہمیں کوئی ثبوت نہیں ملا۔ گواہی صرف رانا صاحب کی ہے جو ظاہر ہے قابلِ اعتبار نہیں۔''

''اس لیے کہ وہ خود ایک مفرور مجرم ہیں۔ خود ان کی بیٹی نے ان پر قتل کا الزام لگایا تھا، قتل ہونے سے کچھ دیر پہلے۔ میرا خیال ہے کہ پولیس کی کارکردگی خراب سے خراب تر ہوتی جارہی ہے۔ ابھی تک نہ نور جہاں گرفتار ہوئی ہے نہ رانا صاحب۔''

وہ معنی خیز انداز میں مسکراتا ہوا کھڑا ہوگیا۔ ''ہمیں امید رکھنی چاہیے کہ ہماری دوسری ملاقات بہتر ماحول میں ہو۔''

میں نے کہا۔ ''ایس پی صاحب... یہ تحفہ تو آپ بھولے جارہے ہیں۔''

اس نے دستی بم اٹھالیا۔ ''آپ مطمئن رہیں۔ میں اپنے اس ہم نام کو چھوڑ دوں گا۔ اس کے بعد کی ذمے داری میری نہیں، اگر مشن میں ناکام رہنے پر اسے سزائے موت دے دی جائے۔''

اخلاقاً میں اسے چھوڑنے باہر تک گیا۔ ''پھر کبھی آیئے... حویلی دیکھنے کے لیے بڑی دلچسپ جگہ ہے۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''ایک صاحب آپ کے ساتھ خاموش بیٹھے رہے تھے۔ مجھے لگتا ہے انہیں میں نے کہیں دیکھا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''وہ راجا تھا۔ مشہور صحافی... میرا دستِ راست، مشیر و معاون سب کچھ ہے۔''

اس نے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ ''او مائی گاڈ... راجا کو نہیں جانتا۔ بڑے آتش فشاں کالم آرہے ہیں ان کے۔ آپ نے خیر تعارف بھی نہیں کرایا۔ میری طرف سے معذرت، میں انہیں تحریروں سے جانتا ہوں، پہچانتا ہوں۔''

مجھے معلوم تھا کہ گزشتہ رات میرے ناکام و نامراد لوٹنے کی خبر صبح ہوتے ہی اماں ابا کو مل چکی ہوگی۔ یہ ایسی خبر نہیں تھی جو چھپائی جاسکتی۔ انہوں نے میرے بارے میں پوچھا ہوگا تو انہیں بتادیا گیا ہوگا کہ میں رات دیر سے لوٹا تھا اور اب سو رہا ہوں۔ اس کے بعد میرے خود ان کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے ہی پولیس نے خانہ تلاشی کی کارروائی شروع کردی تھی اور اس میں ڈھائی گھنٹے صرف ہوئے تھے۔

اب میں نے حاضری دی تو قدرتی طور پر جتنے خفا تھے اس سے زیادہ دل گرفتہ اور مایوس تھے۔ میں سلام کرکے بیٹھ گیا۔ اماں کمبل کو گردن تک پھیلائے سیدھی لیٹی ہوئی تھیں۔

میں نے کہا۔ ''آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگتی۔''

ابا نے کہا۔ ''ٹھیک کیسے رہ سکتی ہے۔ موسم بدل رہا ہے اور یہ اپنا خیال نہیں رکھتیں... کوئی اور بھی نہیں رکھتا۔''

اماں نے آہ بھر کے کہا۔ ''چھوڑو... شکایت مت کرو۔ ہم تو اب جارہے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''اماں کو کیا ہوا ہے؟''

''بس بخار چل رہا ہے۔ شہناز نے کہا ہے کہ کچھ ٹیسٹ کرالیں مگر وقت کہاں ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ایسے انہیں کون جانے دے گا۔ میڈیکل سرٹیفکیٹ تو لینا پڑتا ہے۔''

''اللہ مالک ہے۔ جس کا بلاوا ہے وہ خود سب ٹھیک کر دے گا اور اس کی رضا اپنے پاس بلانے کی ہوگی تو اپنے پاس بلالے گا۔''

میں نے کہا۔ ''آپ ایسی مایوسی کی باتیں کیوں کرتی ہیں؟''

ابا کسی سوٹ کیس میں کچھ تلاش کرر ہے تھے۔ ''بات یہ ہے رفیق میاں... اب یہاں کے معاملات تم جانو، ہم جو کر سکتے تھے ہم نے کیا۔ فریال کے لیے بھی اور نور جہاں کے لیے بھی... لیکن جو نصیب میں نہ ہو وہ انسان اپنی کوشش سے حاصل نہیں کرسکتا۔''

میں نے کہا۔ ''شاید اسی کو تقدیر کہتے ہیں۔''

''ہاں، یہ ریاست تمہیں بن مانگے مل گئی، تم کروڑوں کے مالک بن گئے۔ ہم ایک چھوٹی سی خوشی مانگتے رہے مگر نہیں ملی۔ حالانکہ وہ سب کو بن مانگے مل جاتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''آپ پھر میری شادی کی بات کرر ہے ہیں۔''

اباجی نے برہمی سے کہا۔ ''پھر کا کیا مطلب... پہلے بھی ہوئی ہے تمہاری شادی۔ بے شک زندگی تمہاری ہے جیسے چاہو گزارو، فریال سے شادی کردیا نور جہاں سے... یا نہ کرو۔ ہم اس خوش فہمی کا شکار تھے کہ ہم بھی تمہاری زندگی پر حق رکھتے ہیں۔ یہ خواہش کوئی جرم تو نہیں تھی کہ ہم تمہارے سر پر سہرا دیکھیں... تمہارے بچوں کو کھلائیں... دادا کہلائیں... پوتے پوتیاں شاید ہمارا آخری خواب تھے۔ ہم تمہیں بہرحال الزام نہیں دیتے... تم حالات کے گرداب میں پھنسے ہوئے ہو۔''

''آپ میرے حق میں دعا کریں گے وہاں... تو میرے سب مسائل حل ہوجائیں گے۔'' میں نے کہا۔

''ہماری سمجھ میں تو یہ بھی نہیں آتا کہ دعا کیا کریں۔ خدا سے کہیں وہ فریال کو نیکی کی ہدایت دے... اور وہ دوبارہ جس راستے پر چل رہی ہے... اس سے لوٹ کے پھر تمہاری طرف آجائے۔ تمہاری طرف سے اس کا دل صاف ہوجائے۔ تم کو خدا ایک راستے پر چلنے کی توفیق عطا کرے... یہی نہیں یہ ایک دعا ہے کہ بہت سی دعاؤں کا مجموعہ... اور جب آدمی کو خود اپنی دعاؤں پر اعتبار نہ ہو تو پھر قبولیت کی توقع رکھنے کا کیا فائدہ...؟ دعا تب کی جاتی ہے جب انسان اپنی کوششوں کی کامیابی سے مایوس ہوجائے۔''

جب تک وہ بولتے رہے... میں سنتا رہا۔ پھر اماں نے کہا۔ ''اب جانے بھی دو... ایسی کون سی چیز مانگ لی ہے اس نے... تم تو شروع ہوجاتے ہو۔''

ابا مسکرانے لگے۔ ''بھئی کیا کروں... عادت جو ہے لیکچر دینے کی... رہی دعا کی بات تو کیا ماں باپ سے کہنا چاہیے کہ ہمارے لیے دعا کرنا... ان کی تو ساری دعائیں اولاد کے لیے وقف ہوتی ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''آپ کا پروگرام فائنل ہوگیا۔''

''تمہیں نہیں معلوم...؟ ہاں لیٹر کل ہی تو آیا تھا۔ میں سمجھا راجا نے بتادیا ہوگا... ہم پرسوں لاہور چلے جائیں گے۔'' انہوں نے وزارتِ حج کا لیٹر مجھے تھمادیا۔

اسے پڑھ کے میرا دل بوجھل ہوگیا۔ مجھے شدت سے احساس ہوا کہ جب وہ چلے جائیں گے تو یہ گھر کتنا خالی ہوجائے گا لیکن میں نے چہرے سے اپنا غم ظاہر نہیں ہونے دیا۔ میں نے کہا۔ ''اللہ نے بہت بڑی سعادت بخشی ہے آپ کو۔''

اماں نے یاد دلانے کے انداز میں کہا۔ ''وہ اپنا غنی بھی تو کچھ کہہ رہا تھا۔''

ابا نے کہا۔ ''ہاں بھئی... وہ چاہتا ہے کہ ہم جانے سے پہلے اس کا ریشم سے نکاح کرجائیں اپنی موجودگی میں نکاح کیا رخصتی بھی ساتھ ہی ہوجائے گی... گھر کی گھر میں۔''

میں نے کہا۔ ''لیکن... اتنی جلدی انتظام کیسے ہوگا؟''

''اس نے کہا ہے ہوجائے گا۔ تو میں نے کہا کہ پھر نیک کام میں دیر کیسی... کرو...'' اباجی بولے۔ ''اور دیکھنا وہ کرلے گا۔''

غنی نے بہت سے کام کیے تھے۔ تازہ ترین انتظامی کارنامہ قلم شور اور دعوت عام تھی۔ یہ تو اس کا ذاتی معاملہ تھا۔ اس کے کون سے دور کے عزیز و اقارب تھے جن کو دور دور دعوت نامے ارسال کیے جاتے۔ سب وہی تھے جو حویلی میں تھے یا آس پاس کے دیہات میں تھے۔ میں نے دلہا میاں کو اپنی شادی کے انتظامات میں چکری بنے دیکھا۔ بے شک خواتین کی دلچسپی کہیں زیادہ تھی لیکن وہ بدحواس ہونے میں ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی کوشش کرتی دکھائی دیتی تھیں۔ وہ صبح جہلم کی مارکیٹ پہنچ گئیں جب مارکیٹ پوری طرح کھلی بھی نہ تھی۔ دوپہر کے بعد تک انہوں نے اندھادھند شاپنگ کی۔ دلہا دلہن کے لیے کم اپنے لیے زیادہ۔ انہوں نے راجا کو الگ دوڑایا مجھے الگ۔ گاڑیاں صرف دو تھیں۔ ایک شہناز کی خیبر، ایک شیر خان کی کرولا۔ رابعہ کو رات گئے خیال آیا کہ غنی نے شہزاد کو تو مدعو ہی نہیں کیا۔

غنی سر کھجانے لگا۔ ''صرف وکیل صاحب...''

''صرف کا کیا مطلب... ان کا سارا خاندان ہمیں کیا جانے۔ ویسے تو ہر کام ان کے سپرد کردیا جاتا ہے۔ ایسے موقعے پر کسی کو ان کا نام یاد نہیں رہتا۔''

میں سب سن رہا تھا۔ ''غنی کا مطلب تھا کہ صرف وکیل صاحب یا ان کے ساتھ نور جہاں کو بھی مدعو کیا جائے۔''

رابعہ چہک کے بولی۔ ''اس سے ہمارا کیا رشتہ۔''

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ ''شہزاد کے لیے آپ اتنی جذباتی کیوں ہورہی ہیں خاتون... ان سے کون سا قلبی رشتہ ہوگیا ہے۔ دو دن میں۔''

وہ جھینپی۔ ''اچھا مت بلاؤ... ویسے وہ آجاتے تو ایک گاڑی بھی آجاتی۔ ایک کام کرنے والا بھی مل جاتا۔ کتنے کام ہوں گے صبح۔''

میں اور راجا ہنسنے لگے۔ ''ایسا کرتے ہیں اس کی گاڑی منگوا لیتے ہیں۔ کام کرنے کے لیے ہم ہیں نا...'' راجا بولا۔

میں نے کہا۔ ''نور جہاں کے بغیر وہ آنے والا نہیں ہے۔ میں شرط لگا سکتا ہوں اب تک وہ اس کے دام الفت میں گرفتار ہو چکا ہوگا۔''

رابعہ بگڑ گئی۔ ''اپنے جیسا سمجھ رکھا ہے اسے۔''

''میں تو اپنے جیسا ہی تھا... مگر دیکھو نا، وہ بھولا بھی اور معصوم سا بچہ ہے... اور وہ نور جہاں... توبہ توبہ... آدم خور حسینہ۔''

رابعہ بھاگ گئی لیکن اس نے اندر جا کے شہزاد کو خود فون کر دیا۔ اس کا پتا ہمیں صبح چلا جب ناشتے کی میز پر اسے موجود پایا۔

راجا نے کہا۔ ''یہ لو... بن بلائے مہمان سب سے پہلے پہنچ گئے۔''

وہ بولا۔ ''دیکھا جائے تو بن بلائے آپ ہیں۔ مجھے تو آدھی رات کو جگا کے حکم دیا گیا...'' اس نے رابعہ کی طرف دیکھا۔

رابعہ کا رنگ لال ہو رہا تھا۔ اس نے فوراً بات بدل دی۔ ''اب جلدی سے ناشتا کرو اور نکلو... بہت کام ہیں۔''

شہناز نے کہا۔ ''ہاں... سب کی اپنی اپنی فہرست ہے۔ میں راجا کے ساتھ جا رہی ہوں، دوسری فہرست لیلیٰ بھابی کے پاس ہے۔''

میں نے کہا۔ ''انہیں میں لے جاتا ہوں شیر خان کی گاڑی میں۔''

''اب رہ گئی رابعہ تو... وکیل صاحب اگر آپ کو زحمت نہ ہو۔'' میں نے کہا۔

''زحمت کیسی سر... یہ تو عین رحمت ہے۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

''سب ہنسنے لگے... ''یار اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ناشتا بھی چھوڑ دو۔''

وہ بیٹھ گیا۔ ''اجازت ہے جناب!'' اس نے رابعہ کی طرف دیکھا۔

رابعہ بگڑ گئی۔ ''آپ نے بھی شروع کر دیا ان کی صحبت میں ڈراما۔''

صرف میں نے ہی نہیں دوسروں نے بھی شہزاد کی رابعہ میں دلچسپی اور جواب میں رابعہ کی حوصلہ افزا نظروں کا مفہوم سمجھ لیا تھا۔ یہ دو طرفہ جذباتی پیش قدمی بڑے تواتر سے جاری تھی اور سب دیکھ رہے تھے کہ انہوں نے ایک دوسرے کو پہلی نظر میں پسند کر لیا ہے۔ اس پر اعتراض کون کرتا۔ یہ ہر لحاظ سے ایک خوش آئند اتفاق تھا۔ اس سے رابعہ کی زندگی میں ایک خوشگوار تبدیلی کی امید کی جا سکتی تھی۔ فرخ کی [illegible] میں اس نے بہت بڑا دھوکا کھایا تھا۔ اس بظاہر شریف سادہ لوح نظر آنے والے نوجوان نے اس سے میرا انتقام [illegible] تھا۔ اسے یقین تھا کہ جب میں یونیورسٹی میں پڑھتا تھا تو [illegible] کی بہن کی افسوسناک حالات میں موت میری وجہ سے [illegible] تھی۔ تب سے وہ بدلہ لینے کے چکر میں تھا۔

پھر میں باہر چلا گیا۔ آٹھ سال بعد میں لوٹا تو حالات بہت مختلف تھے۔ میں ایک ریاست کا مالک بن گیا تھا اور [illegible] بار مجھے براہ راست قتل کرنے کی کوشش میں ناکام ہو کے [illegible] نے دوسرا پلان بنایا۔ اس نے ست بدھائی پہنچ کے مجھے [illegible] کرنے کی کوشش کی۔ پھر ناکام ہوا اور پکڑا گیا۔ میرے سامنے اس نے اعتراف کیا کہ وہ اپنی بہن کے قتل کا ذمے دار مجھے سمجھتا ہے۔ جب میں نے اسے حقیقت بتائی تو اس نے ندامت کا اظہار کیا۔ یہ کہا کہ اب تک وہ غلط فہمی کا شکار [illegible] میں نے فراخدلی سے اس کو معاف کیا اور اپنے ساتھ شامل کر لیا۔

تاہم فرخ کے شاطر ذہن نے انتقام کا دوسرا [illegible] مؤثر، اذیت دہ اور رسوا کن طریقہ سوچ لیا تھا۔ اس نے رابعہ سے مراسم بڑھائے اور اس سے محبت کا اظہار کرنے کے [illegible] زندگی بھر ساتھ نبھانے کا عہد کر لیا۔ کچھ میری خوش گمانی کچھ رابعہ کی ناتجربہ کاری۔ میں نے ان کو ملنے دیا اور [illegible] ملاقاتوں کے نتیجے میں رابعہ احتیاط کے تقاضوں کی آخری [illegible] بھی پھلانگ گئی۔ جب اس کے ماں بننے کا یقین ہو گیا تو فرخ بھاگ گیا۔ ایک پیغام چھوڑ کر کہ تم نے میری بہن کو بے [illegible] کیا، میں نے تمہاری بہن سے اس کا بدلہ لے لیا۔ یہ تمہارے اعمال کی سزا ہے۔

بعد میں حادثاتی طور پر وہ بچہ بھی ضائع ہو گیا جسے [illegible] وقوف اور جذباتی رابعہ اپنی محبت کی نشانی سمجھ کے پالنا چاہتی تھی حالانکہ ہم سب اس کے خلاف تھے۔ اس حادثے [illegible] رابعہ پر بہت بڑا اثر ڈالا تھا اور کچھ عرصہ وہ نفسیاتی مریض [illegible] گئی تھی۔ پھر ایک دائمی اداسی کا شکار ہوئی تھی اور جذباتی [illegible] حسی کی چادر اوڑھ کے یہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اب نہ وہ کبھی محبت پر اعتبار کرے گی نہ اپنا گھر بسانے کے خواب دیکھے گی۔ اس نے خود کو ست بدھائی کے تعلیمی پروگرام کے [illegible] اس طرح وقف کر دیا تھا جیسے راہبائیں NUNS خود کو [illegible] کی خدمت کے لیے وقف کرتی ہیں۔

ایسے میں شہزاد کا آنا اور رابعہ کے جذبات کی خزاں [illegible] کو یہ بہار دینا یقیناً ہم سب کے لیے ایک خوش خبری تھی۔ [illegible]

ہے اس کا مجرد زندگی گزارنے کا فیصلہ ہی غیر منطقی اور غیر طبعی تھا۔ وہ جوان تھی اور فطرت کے تقاضے عارضی طور پر نظر انداز کیے جا سکتے ہیں ہمیشہ کے لیے ختم نہیں کیے جا سکتے۔ بھوک کو برداشت کیا جا سکتا ہے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اپنے وجود کا احساس دلاتی رہتی ہے۔

شہزاد کی آمد رابعہ کے وجود میں خوابیدہ محبت کے بیج کے لیے بارش کی پہلی پھوار کی طرح تھی جس میں پھوٹ کر یہ بیج سوکھی زمین سے باہر آنے کی صلاحیت اور خواہش رکھتا تھا۔ دیکھتے دیکھتے رابعہ کے انداز بدل گئے تھے۔ اس کی اداؤں میں شوخی آ گئی تھی۔ اس کی مسکراہٹ میں توس قزح کے رنگ اتر آئے تھے۔ اس کی آنکھیں مسکرانے لگی تھیں۔ اس کی ہنسی میں نغمہ ساز کی دلنوازی آ گئی تھی۔ اس کی چال میں رقص کی کیفیت عیاں ہونے لگی تھی۔

جب وہ شہزاد کے ساتھ شاپنگ کے لیے جانے لگی تو اس کی سج دھج نے سب کو متوجہ کیا۔ بہت عرصے بعد رابعہ کے ملبوس میں رنگ اترے تھے۔ اس نے لب و رخسار کو میک اپ سے مزید نظر نواز بنایا تھا اور سر کا بوجھ محسوس ہونے والے بالوں کو ایسے سلیقے سے سنوارا تھا کہ وہ حسن کی آب و تاب بن گئے تھے۔ جیسے ایک تصویر کے حسن کو اجاگر کرنے والا خوبصورت فریم۔

جب اس نے لیلیٰ بھابی اور شہناز کی نظر دیکھی تو جاتے جاتے ان سے الجھ گئی۔ ''یار ایسے کیا دیکھ رہی ہو۔ شادی کا گھر ہے۔ شادی کا دن ہے۔ تم بھی کچھ کرو... یہ کیا اجاڑ صورت سی پھر رہی ہو۔'' اور چوٹ مارتی ہوئی شہزاد کے ساتھ بیٹھ کے بھاگ گئی۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ شادی ہو اور خواتین بیوٹی پارلر جانا بھول جائیں۔ رابعہ کی بات پر ہنسنے کے باوجود لیلیٰ بھابی اور شہناز نے فوراً ایک دوسرے کو یاد دلایا کہ خریداری کرنے کے علاوہ انہیں بیوٹی پارلر بھی تو جانا ہوگا ریشم کے ساتھ... چلو جلدی کرو۔

دن کیسے گزرا... اس کی تفصیل بیان کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ سب جانتے ہیں کہ شادی والے گھر میں کیا ہوتا ہے اور خواتین کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ شام تک ڈرائیوروں کی حالت خراب ہو چکی تھی۔ نہ کسی کو کھانے کی فرصت ملی تھی نہ آرام کا ایک لمحہ میسر آیا تھا۔ مسلسل بھاگ دوڑ... افراتفری... ادھر چلو... ادھر چلو... یہ رہ گیا... وہ رہ گیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے آج ساری دنیا کے سب کام رک گئے ہیں اور کام ہے تو صرف ایک۔ ریشم اور غنی کی شادی۔

خود لوشہ میاں نے اس تقریب سعید کے لیے زمین آسمان ایک کر دیے۔ نتیجہ رات ہوتے ہی سامنے آ گیا۔ خواتین کی بدحواسی عروج پر تھی۔ ہم حویلی کے سجے ہوئے روشن لان میں ڈبل رول کر رہے تھے۔ ہم لڑکی والے بھی تھے اور لڑکے والے بھی۔ مہمان جوق در جوق آ رہے تھے۔ غنی کے دوست، گرد و نواح کے وی آئی پی اور ان کے اہل خانہ۔ پگڑیاں ٹوپیاں، کلف لگی شلواریں، تیل سے چپڑے بال اور آنکھوں سے دھواں دھار بہتا کاجل۔ عورتوں کے ریشمی کپڑوں کے چیختے چنگھاڑتے لال پیلے رنگ۔ گوٹے کی چکا چوند، چہروں پر سرخی پاؤڈر کی وہ افراط کہ ہاتھ لگانے سے پرانی دیواروں کے رنگ کی طرح جھڑنے لگے۔ بوڑھی بھی دیکھنے میں جوان اور جوان کسی لڑکی جیسی نظر آنے کے فریب میں مبتلا۔ کچھ اپنی شادیوں کے جوڑے گھڑوں میں سے نکال کے جسم پر ایسے فٹ کر آئی تھیں کہ لباس کی شکنوں کا تو پتا نہیں چلتا تھا مگر جسم کی ہر شکن نمایاں نظر آتی تھی۔ اس پر مستزاد ان کی پیداوار۔ اوسطاً ہر عمر کے نونہال۔ کہیں چھ تو کہیں بارہ۔ لگتا تھا اس میں بھی درجن کا ریٹ چلتا ہوگا۔ دھموکے اور دھکے کھاتے، دھاڑتے چلاتے زمین پر لوٹتے اور پابندی کے باوجود کپڑے خراب کرتے بچے بالکل کارٹون کریکٹر لگتے تھے۔

پلاؤ زردے کی ہوا کے ساتھ آنے والی خوشبو ہر پیٹ میں چوہے دوڑا رہی تھی اور چوہوں کی ریس کی آواز پیٹ کے باہر گڑگڑاہٹ کی صورت میں سنی جا سکتی تھی۔ خدا خدا کر کے دلہا نمودار ہوا۔ وہ ایک گھوڑے پر سوار تھا۔ دونوں کے سہرے ایک سے تھے۔ دلہا کے کچھ دوست ڈھول کی تھاپ پر دیوانہ وار رقص کرتے آگے آ رہے تھے۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھ کے حلق کی گہرائی سے عجیب و غریب آوازیں بھی نکال رہے تھے اور بے ہودگی کے مظاہرے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی پوری کوشش کر رہے تھے کیونکہ اس بے ہودگی پر گاؤں کی الھڑ حسینائیں سو جان سے فریفتہ ہونے کے لیے تیار تھیں۔ پھر کسی نے ایسا زبردست پٹاخہ پھوڑا کہ دو بزرگ براتی کرسی سے گر گئے لیکن زندہ اٹھائے گئے۔ ایک دیگ بردار کی دھوتی کھل گئی مگر وہ مجبور تھا۔ دیگ کو نہیں چھوڑ سکتا تھا۔

دلہا کے بے تکلف دوستوں نے یہ مذاق کیا کہ دونوں طرف سے اس کی ٹانگیں پکڑ لیں۔ ایک فریق کہتا تھا ادھر اترو۔ دوسرا کہتا تھا نہیں ادھر سے اترو۔ دلہا نے پہلے زیر لب اور پھر اونچی آواز میں انہیں گالیاں بھی دیں مگر ان پر کیا اثر ہوتا۔ ایسی گالیاں سب ایک دوسرے کو دیتے تھے۔ پھر کسی

فریق نے اقوامِ متحدہ بن کے جھگڑا یوں طے کرایا کہ گھوڑے کی دم کے نیچے جلتی ہوئی سگریٹ لگائی اور گھوڑا نکل کے بھاگا تو دلہا کے نیچے سے نکل گیا اور دلہا تیسری طرف یعنی پیچھے اترا۔ لوگ ہنس ہنس کے دہرے ہو گئے۔ دولہا کے دوستوں نے مذاق کا پورا لطف لیا۔

نکاح کا مرحلہ آیا تو پتا چلا مولوی غائب ہے۔ یہ ذمے داری اسی مولوی کو تفویض کی گئی تھی جس نے پہلے شہناز مخالف گروہ کی قیادت کی تھی۔ پھر فتویٰ دینے والوں میں شامل تھا کہ جس نے بھی فلم "ہیر رانجھا" دیکھی اس کا نکاح ٹوٹ جائے گا اور اس کی سابقہ اولاد بھی ناجائز قرار پائے گی۔ مگر اگلے دن اسکول اور اسپتال کی افتتاحی تقریب میں وہ اپنی تمام سابقہ غلطیوں سے توبہ کر کے معذرت کرنے کھڑا ہو گیا تھا۔ اب وہ سرکاری مولوی کی حیثیت حاصل کرنے کے لیے پوری کوشش کر رہا تھا کیونکہ اس نے ہوا کا رخ پہچان لیا تھا۔ لوگ رانا کے بجائے نواب رفیق کے حامی بن رہے تھے۔

مولوی کو گرفتار کر کے لانے کے لیے چار صحت مند افراد دوڑائے گئے۔ ایک طرف سے وہ گئے۔ دوسری طرف سے ہانپتا ہوا مولوی آ گیا۔ اس نے کہا کہ معاف کرنا تھوڑی دیر ہو گئی۔

معلوم نہیں کس نے چلا کے کہا۔ "تھوڑی دیر...؟ کیا تو... فلاں کام کر رہا تھا؟" یاد رہے کہ دیہات میں پیار سے ہی بہت کچھ کہہ دیا جاتا ہے جس کا کوئی برا نہیں مانتا۔

مولوی نے کہا۔ "میں نے سوچا نماز بھی پڑھا دوں... ایک شرعی فریضہ پہلے ادا ہو جائے۔"

کوئی اور بولا۔ "یہ کیا غیر شرعی فریضہ تھا!؟"

میری مداخلت پر نکاح شروع ہوا۔ غنی کی حد تک تو خیریت رہی۔ جب ریشم کی باری آئی تو گڑبڑ ہو گئی۔ مولوی نے سب نام لے کر اور حق مہر بتا کے پوچھا۔ بیٹا تم نے قبول کیا۔ تو ریشم نے پٹاخ سے انگلش میں کہا "یس۔ آئی ایکسپٹ"۔ مولوی اچھل پڑا اور بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔ اس کے ساتھ موجود گواہوں نے کہا۔ "لاحول ولا قوۃ... کافروں کی زبان... اپنی عربی شریف میں جواب دو"۔ مولوی نے پھر پوچھا اور ریشم نے اسے ڈانٹ کر کہا۔ "پہلی دفعہ میں سنائی نہیں دیا تھا یا سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ کہہ دیا نا کہ آئی ایکسپٹ۔ سب نے سنا ہو گا"۔

اس سے پہلے کہ معاملہ شرعی عدالت میں جاتا اور نکاح کے منسوخ ہونے کی نوبت آتی میں نے دخل دیا اور سمجھایا کہ اس کا بھی وہی مطلب ہے۔ میں نے قبول کیا... اور زبان کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ اگر اسلام قبول کرنے والا انگریز ہو تو اپنے نکاح میں اردو کیسے بولے گا۔ چونکہ میں حاکم تھا اس لیے میری بات کو سند تسلیم کر لیا گیا۔ نکاح ہو گیا اور کشتی شروع ہو گئی۔ پہلی کشتی دلہا سے گلے مل کر مبارکباد دینے کے لیے تھی۔ راجا نے مجھے بروقت پیچھے کھینچ لیا ورنہ اس میں مجھے بھی شریک کر لیا جاتا۔ دوسرا دنگل دعوتِ عام کا منعقد ہوا لیکن یہ سین میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔

اس شادی نے جہاں حویلی کے اندر جشن کی ساری خوشی بھر دی تھی وہیں کچھ اداسی بھی پھیلائی تھی۔ میرے والد بھی یقینی طور پر اداس تھے لیکن خوش نظر آنے کی کوشش کرتے رہے۔ ان کے تصور میں غنی کی جگہ میں تھا اور ریشم کی جگہ شاید فریال۔ یہ منظر ان کی آنکھوں نے خواب کی صورت سوتے جاگتے دیکھا ہو گا لیکن اس کی تعبیر ایک حسرت ہی رہی۔ میں ان سے دور ہی رہا کیونکہ مجھ میں ان سے نظر ملانے کی ہمت نہ تھی۔

ایسی ہی کیفیت لیلیٰ بھابی کی ہو گی۔ انہیں اپنی شادی یاد آتی ہو گی۔ خواہش تو خود رو پودے کی طرح ہوتی ہے۔ ان کے دل نے بھی آرزو کی ہو گی کہ کاش آج فاروقی بھی ہوتا۔ اسے مدعو کرنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لیلیٰ بھابی کے دل میں اب اس کے لیے نفرت ہی نفرت تھی۔ کچھ ان حالات کی وجہ سے جو ان کی ازدواجی زندگی کی تباہی کا سبب بنے تھے۔ اگر ہم بیچ میں نہ آتے تو فاروقی اپنے شیطانی ارادوں میں کامیاب ہو جاتا اور مریم کو قتل کرنے کے الزام میں لیلیٰ بھابی کو پھانسی کے تختے پر پہنچا دیتا۔ پھر پروگرام کے مطابق رابعہ پر ڈورے ڈالتا اور اس سے شادی کرنے کے بعد مجھے اپنے راستے سے ہٹاتا تو خود بخود ست بدھائی کا مالک ہو جاتا کیونکہ میرے بعد اس سب کی مالک صرف رابعہ ہوتی جو آج میرا تھا۔ اس سازش کے علاوہ فاروقی نے بعد میں جس کردار کا مظاہرہ کیا تھا وہ ہم سب کے ساتھ لیلیٰ بھابی کی نفرت میں اضافے کا سبب بنا تھا۔ وہ مجھے چھوڑ کے میرے دشمن کا وکیل ہو گیا تھا اور دوستی کا لبادہ اتار کے دشمنی کر رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ لیلیٰ بھابی نے اگر دل میں کچھ محسوس کیا کہ کاش یوں نہ ہوتا تو ظاہر کچھ نہ ہونے دیا۔

رات کو فریال کی یاد نے تڑپایا۔ وقت جو اس کی محبت کی امانت تھا ہر گزرے لمحے کے ساتھ میری آنکھوں میں زندہ ہو گیا۔ میرا دل اب بھی تسلیم نہیں کرتا تھا کہ اس نے مجھے چھوڑ دیا ہے۔ پہلے یہ غصے کی بات ضرور رہی تھی مگر اب ایک سوچا سمجھا فیصلہ ہے۔ کتنا بڑا جھوٹ بولا تھا اس نے کہ وہ میرے

بچے کی ماں بننے والی ہے۔ اب کہتی ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ یہ صرف تم پر شادی کے لیے دباؤ بڑھانے والی کہانی تھی۔

کہانی... مائی فٹ... کیا میں اتنا بے وقوف ہوں کہ مجھے ایسی کہانیوں سے بلیک میل کیا جائے۔ یہی نور جہاں بھی کہہ رہی ہے لیکن اس نے اسے کلیئر کر دیا تھا کہ وہ مجھ سے کچھ نہیں چاہتی۔ اگر وہ جان بچا کے نکلنے میں کامیاب ہو گئی تو اس کی تمام زندگی کا اپنے ماضی سے کوئی رشتہ نہیں رہے گا۔ بچے سے کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ وہ کس نام سے کس ملک کے کس شہر میں ہو گی اسے نہیں معلوم۔ اور نہ ہی مجھے معلوم ہو گا۔

نور جہاں کا خیال کالے جادو کی طرح کام کرتا تھا۔ پہلے بھی مجھے جب اس کی یاد آتی تھی میں خود کو اس کے پاس جانے سے روک نہیں پاتا تھا۔ اس کی طلب مجھے کسی ہیروئن کے عادی نشے باز کی طلب سے زیادہ بے بس کر دیتی تھی اور میں کسی نہ کسی بہانے سے جھوٹ بول کے لڑ جھگڑ کے اور سب کو ناراض کر کے بھی چلا جاتا تھا۔ نتائج کی پروا کیے بغیر۔ جان ہتھیلی پر رکھ کے۔ میرا دل میرے سامنے دلائل کے انبار لگا دیتا تھا۔ آخر وہ تمہاری خیر خواہ ہے۔ اس نے تم پر کتنے احسان کیے ہیں۔ اپنی جان خطرے میں ڈال کے تمہاری جان بچائی ہے۔ وہ عورت کسی سے نہیں ڈرتی۔ پھر تم کیوں ڈرتے ہو لیکن سب سے طاقتور دلیل اس کے بے پناہ حسن شباب کی شیطانی کشش ہوتی تھی۔

اس وقت پھر میں نے اس کی یاد کو غلبہ پاتے محسوس کیا۔ میرے دل میں خواہش جاگی کہ میں جاؤں اور اس سے ملوں۔ یہ دیوانگی تھی۔ دھوکا تھا۔ خودکشی تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس وقت میں نے اپنی خواہش کا اظہار بھی کیا تو میری ایک نہیں چلے گی۔ راجا اور شہزاد کو مل کر مجھے کسی کمرے میں قید کرنا پڑے تو وہ اس سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔

حویلی میں ہنوز شادی کے بعد کی ایکٹوٹی چل رہی تھی۔ تھکن سے سب چور تھے لیکن سونے پر کوئی آمادہ نہ تھا۔ مجھے سب کے ہنسنے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ریشم کو حجلۂ عروسی میں غنی کے پاس پہنچانے کے بعد خواتین کے موڈ میں شوخی اور شرارت آ گئی تھی۔ پہلے اس کا ہدف راجا اور شہناز بنے۔ پھر شہزاد کی باری آئی تو اس نے بھاگنے کا سوچا۔

رابعہ اسے پکڑ کے میرے پاس آئی۔ "تمہارے وکیل صاحب جانا چاہتے ہیں کزن۔"

میں نے کہا۔ "ان کا ہاتھ تم نے پکڑ لیا ہے۔ پھر یہ کیسے جا سکتے ہیں کزن۔"

رابعہ نے گھبرا کے ہاتھ چھوڑ دیا۔ "کہتے ہیں ابھی جاؤں گا۔ گھر میں خواتین اکیلی ہیں۔ تین ہونے کے باوجود۔"

میں نے کہا۔ "شہزاد صاحب، کچھ ان کا بھی خیال کرنا ہے جو یہاں اکیلی رہ جائیں گی۔ اور بہت اداس ہوں گی آپ کے بغیر۔"

اس نے سر کھجایا۔ "دراصل فون آیا تھا نور جہاں کا۔ وہ کہہ رہی تھی اماں پریشان ہیں۔"

"نور جہاں کو سمجھا دیا ہے میں نے۔" رابعہ بولی۔

میں نے حیرانی سے اسے دیکھا۔ "تم نے بات کی نور جہاں سے۔ میرا مطلب ہے سمجھانے کی۔ سمجھانے کے لیے تو سمجھ کا ہونا ضروری ہے کزن۔"

عین وقت راجا اور شہناز اندر آ گئے۔ شہناز کے ہاتھ میں کافی کی ٹرے تھی۔ میں نے کہا۔ "بھئی ریشم کو کہہ دینا تھا۔"

راجا ہنسا۔ "ہاں... حجلۂ عروسی کا دروازہ بجا کے کہہ دے کہ کافی بنا دو۔"

میں نے کہا۔ "ہاں... کیا تھا اگر چند منٹ کے لیے معذرت کر کے آ جاتی، غنی بالکل برا نہ مانتا۔"

تھک ہار کے بالآخر سب ہی سو گئے۔ اگلا دن مزید مصروفیت کا تھا۔ ہم اٹھے تو اماں ابا کی تیاری مکمل تھی۔ ہم سب ایک قافلے کی صورت میں دوپہر کے بعد روانہ ہوئے اور دو گھنٹے میں اسلام آباد ائرپورٹ پہنچ گئے۔ ابھی تک راولپنڈی کا پرانا ائرپورٹ جو چک لالہ میں تھا اسلام آباد انٹرنیشنل ائرپورٹ کہلاتا تھا۔ حج فلائٹ کی وجہ سے اندر باہر سخت ازدحام تھا۔ ایک ایک حاجی کے ساتھ اس کا پورا خاندان یا قبیلہ اور بعض صورتوں میں ایسا لگتا تھا کہ پورا گاؤں ہی خدا حافظ کہنے پہنچا ہوا ہے۔

اماں ابا کو فلائٹ ٹائم سے تین گھنٹے قبل ائرپورٹ کرنا تھا اور اس میں ابھی وقت تھا۔ ہم سب کا اس رش کی وجہ سے اندر پہنچنا محال تھا۔ غنی نے صبح ہی شیر خان کو ہار لینے بھیج رکھا تھا۔ باری باری ہم سب نے ان سے گلے مل کے ہار ڈالے اور ان کی دعائیں لیں۔ ایسے موقع پر جذبات پر قابو رکھنا ممکن نہیں ہوتا۔ ہم سب کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ سب اپنے لیے دعاؤں کے طالب تھے لیکن سب سے زیادہ آنسو بہانے والی ریشم تھی۔ وہ اپنے لباسِ عروسی میں آ گئی تھی اور سب کی توجہ کا مرکز بھی لیکن یہ کوئی معیوب یا غیر معمولی بات نہ

تھی۔ میں نے ایک اور برات دیکھی جو دلہا دلہن سمیت وہاں موجود تھی۔

اماں کی طبیعت بہت بہتر تھی۔ ابا کی نظر جیسے کسی کو مسلسل تلاش کر رہی تھی۔ وہ لوگوں کے سروں پر سے باہر والے راستے کی طرف دیکھتے تھے اور مایوس ہو جاتے تھے۔ پھر اچانک ان کے لبوں پر ایک مسکراہٹ نمودار ہوئی اور انہوں نے اماں سے کچھ کہا۔ میں نے پلٹ کے دیکھا تو بھونچکا رہ گیا۔ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی سر کے گرد دوپٹا لیے سادہ سفید شلوار قمیص میں فریال آگے آ رہی تھی۔

اس نے قریب آ کے اماں اور ابا کو سلام کیا اور ان کے سامنے ایسے جھکی جیسے قدم بوسی چاہتی ہو۔ انہوں نے اسے گلے لگا لیا۔ ''مجھے معلوم تھا تم ضرور آؤ گی۔'' ابا جی نے کہا۔

اس نے آنسوؤں کو بہنے دیا۔ ''میں کیسے نہ آتی۔ سب سے زیادہ تو مجھے ہی آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔''

اماں نے کہا۔ ''ہم کب تمہارے لیے دعائیں نہیں کرتے بیٹی۔''

''اس آستانۂ پاک پر میرے لیے اور کوئی دعا کرنے والا ہے بھی نہیں۔'' فریال نے کہا۔

اس نے رسمی سلام دعا سب سے کی لیکن بڑے رکھ رکھاؤ کے ساتھ۔ اس کے اور باقی لوگوں کے درمیان اجنبیت کی ایک نظر نہ آنے والی دیوار حائل ہو گئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ جب اماں ابا اندر چلے جائیں گے تو ماحول بدل جائے گا اور باقی لوگ اسے گھیر لیں گے۔ سب کھل کر بات کریں گے اور وہ اتنی غیریت کے ساتھ نکل نہ پائے گی۔ وہ خود بھی یہ جانتی ہو گی۔ ابھی آدھا گھنٹا باقی تھا کہ اس نے اچانک اجازت طلب کی۔ مجمع میں سے دو باڈی گارڈ نمودار ہوئے جو یقیناً کہیں قریب ہی موجود تھے لیکن میری ان پر نظر نہیں گئی تھی۔ وہ اماں ابا سے گلے مل کے رخصت ہوئی۔ باقی سب کی طرف اس نے صرف سر ہلا کے سلام کیا۔ کوئی کچھ نہ بول سکا اور وہ بڑی شاہانہ تمکنت کے ساتھ مجمع میں گم ہو گئی۔

وہاں بہت شور تھا چنانچہ ہم سب نے ہی اپنے اپنے موبائل فون کو رنگ سے ہٹا کے وائبریشن پر کر لیا تھا۔ رخصت کا وقت قریب تھا کہ شہزاد کے فون پر کال آئی۔ اس نے ایک ہاتھ فون پر رکھا اور ایک گوشے میں جا کے کال ریسیو کی۔ پھر وہ ابا جی کی طرف آیا۔

اس نے موبائل فون ابا جی کی طرف بڑھا دیا۔ ''نور جہاں...'' اس نے کہا۔ ابا جی نے فون لے لیا اور ایک کان پر ہاتھ رکھ کے سننے لگے۔ شہزاد نے اسے ہینڈ فری کر دیا تھا چنانچہ اسپیکر بول رہا تھا اور آواز شور میں بھی صاف سنی جا رہی تھی۔ نور جہاں نے وہی کہا جو فریال نے کہا تھا اور ابا جی نے بھی... میں اماں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ان کے چہرے پر ناپسندیدگی کے جذبات عیاں تھے لیکن جب ابا جی نے فون ان کی طرف بڑھایا تو انہوں نے انکار نہیں کیا۔ اماں نے بھی بس دعا دی۔ یہ موقع ہی ایسا تھا کہ ہم جیسے ان سے معافی اور دعا کے طلبگار تھے اور وہ یہی کہہ سکتے تھے کہ اللہ تمہیں خوش رکھے۔ تاہم میرے دل سے جیسے ایک بوجھ سا اتر گیا۔ نور جہاں نے اپنا اخلاقی فرض پورا کیا تھا۔ باقی سب کیا سوچتے ہیں یہ سوچنے کی مجھے ضرورت نہیں تھی۔

ہم بالآخر بڑے بوجھل دل کے ساتھ باہر نکلے۔ ہجوم سے نکل کے میں کار پارکنگ میں اپنی گاڑی تک پہنچا تو مجھے شہزاد کا متوحش چہرہ دکھائی دیا۔ وہ میری راہ دیکھ رہا تھا۔

میں نے اسے غور سے دیکھ کے پوچھا۔ ''شہزاد... کیا بات ہے۔''

اس نے میرا بازو پکڑ لیا۔ ''رفیق صاحب... بڑی گڑبڑ ہو گئی۔''

میں نے کہا۔ ''کیا ہوا...؟''

''میرے پڑوسی نے فون کیا تھا۔'' وہ بولا۔ ''میرے گھر میں ڈاکو گھس گئے تھے، اکیلی عورتوں کو دیکھ کر۔''

''کیا کسی نے مخبری کر دی۔ سب خیریت ہے نا؟''

''خیریت اس لیے نہیں ہے کہ کسی نے پولیس کو فون کر دیا۔ شاید چیخ پکار سن کے۔ فائرنگ کی آواز پر... اور کوئی پولیس کی گاڑی قریب سے گزر رہی تھی وہ پہنچ گئی۔ وہ کچھ لے جا نہیں سکے۔''

''یہ تو اچھا ہوا...''

''اچھا کہاں نواب صاحب... ڈاکو تو خیر پکڑے گئے... لیکن پولیس اب آگے کارروائی کرے گی۔ سب نے بتا دیا ہو گا کہ وکیل صاحب کا گھر ہے۔ میں نے کہا ہے کہ میں پہنچتا ہوں لیکن میرے پہنچنے سے پہلے ہی پولیس نے نور جہاں کو دیکھ لیا اور پہچان لیا تو کیا ہو گا۔'' وہ سخت بدحواس تھا۔

میں نے کہا۔ ''تم فوراً جاؤ۔''

''گھر میں بیان دینے کے قابل صرف نور جہاں ہے۔ میری ماں کو کچھ نظر نہیں آتا۔ خالہ انہیں سنبھال رہی ہوں گی۔ گواہی اور بیان صرف نور جہاں کی ہو گی۔ مجھے اس کو بچانا ہے'' وہ گاڑی میں بیٹھ گیا۔

میں نے پریشانی میں سر ہلایا۔ گاڑی دوسری گاڑیوں ہجوم میں گم ہو گئی۔ باقی سب لوگ اپنی اپنی گاڑیوں کی طرف

چلے گئے تھے۔ اماں ابا کے ساتھ صرف میں تھا۔ دوسری گاڑیاں دور تھیں اور کسی کو کچھ بتانے کا نہ موقع تھا اور نہ فائدہ۔

ائرپورٹ سے نکل کے میں اسلام آباد ہائی وے پر آ گیا اور دائیں جانب مڑ گیا۔ اس طرح ہم سیدھے لاہور جانے والی جی ٹی روڈ پر پہنچ جاتے... یہاں سے دو گھنٹے کی مسافت تھی۔ مجھے ہر لحہ شہزاد کے فون کا انتظار تھا۔ ائرپورٹ سے پنڈی کی لالہ زار کالونی میں اس کے گھر تک کا فاصلہ کم سے کم آدھے گھنٹے کا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ رابعہ اس کی گاڑی میں تھی۔

تقریباً پون گھنٹے بعد میں گوجر خان کراس کر چکا تھا جب مجھے شہزاد کا فون موصول ہوا۔ میں نے بیک ویو مرر میں دیکھا شیر خان کی گاڑی جس میں باقی سب لوگ تھے میرے پیچھے آ رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ''ہاں، ہیلو شہزاد... کیا رپورٹ ہے؟''

وہ بولا۔ ''بس اللہ نے بچا لیا سر! ڈاکو گھر کے اندر کود گئے تھے، گاڑی ان کی باہر کھڑی تھی۔ اتفاق سے ایک نوجوان نے اپنے گھر کی چھت سے دیکھ لیا۔ وہ ہے بڑا جیالا اور من موجی قسم کا جذباتی نوجوان، عام طور پر ایسے لوگوں کو بے وقوف ہی سمجھا جاتا ہے... اس وقت بھی وہ اپنی چھت پھلانگ کے کسی سے ملنے آیا تھا۔''

میں نے ہنس کے کہا۔ ''اور اس رومانوی سین میں ڈاکو آ گئے۔''

''وہ خود سچ بولتا تو 'مشکل' میں پڑ جاتا۔ ہمارے پڑوس میں ایک صوفی صاحب نے حال ہی میں عقد سوئم فرمایا ہے۔ خود ہیں شاید باسٹھ سال کے اور سولہ سترہ سال کی لڑکی بیاہ کے لے آئے۔ خیر... یہ سال دو سال پہلے کی بات ہے۔ دو سال شہر میں گزار کے اور کیبل ٹی وی پر ڈرامے فلمیں دیکھ کے زوجہ نمبر تین کے جذبات بھی جاگے اور مذکورہ نوجوان نے حسب عادت پیش قدمی کی تو اس نے خوش آمدید کہا۔ چھت سے چھت ملی ہوئی تھی... دل سے دل ملنے میں دیر نہ لگی۔''

''یار! ان کی لو اسٹوری بعد میں سنیں گے۔''

''اس نے ڈاکوؤں کو میرے گھر میں دیکھا تو محبوبہ کو چھوڑ ہماری چھت پر آ گیا اور اوپر سے ڈاکوؤں کو للکار... یعنی پنجابی فلموں کے ولن کی طرح۔ ڈاکو نے گھبرا کے ہوائی فائر کیے، وہ نتائج کی پروا کیے بغیر دونوں سے بھڑ گیا۔ ایک کو ٹکر مار کے بیل کی طرح دھکیلتا دیوار تک لے گیا اور اس کی کمر توڑ دی۔ دوسرے نے فائر کیا جو اس کے اوپر سے گزر گیا کیونکہ پہلا بندہ گرا تو ساتھ ہی وہ بھی گر گیا تھا۔ پھر اس نے دوسرے کی طرف رخ کیا، چاروں ہاتھوں پیروں پر چلتا ہوا گیا اور اس کی ٹانگوں میں گھس گیا... نعرہ لگا کے اٹھا تو اسے بھی سر پر اٹھا لیا اور نیچے دے مارا۔ وہ ڈاکو تھے کوئی پہلوان نہیں اور یہ روز اکھاڑے جا کے زور کرتا ہے۔''

''اوہ یار! تم نے تو پورا اسکرین پلے سنانا شروع کر دیا... آخر میں ہوا کیا؟''

''ہونا کیا تھا فائرنگ کی آواز پر لوگ آ گئے... پھر ڈاکو کہاں جاتے لوگوں نے ٹھیک ٹھاک پھینٹی لگائی اور باندھ کے پولیس کو دے دیا۔ وہ نوجوان ہیرو بن گیا۔''

''اور پولیس نے بیان کس کا لیا؟''

''اسی نوجوان نے سب بتایا۔ خواتین اندر سے باہر نہیں آئیں تھیں اور ڈاکو اندر نہیں جا سکے تھے۔ انہیں تو کچھ پتا ہی نہیں چلا۔ فائرنگ کی آواز سنی تو وہ بدحواس ہوئیں اور انہوں نے کھڑکیوں کے پردے ہٹا کے جھانکا... اس وقت پہلوان دونوں ڈاکوؤں سے نبرد آزما تھا۔''

''گویا کسی کی گواہی کی ضرورت نہیں پڑی؟''

''نہیں۔ ڈاکو پورچ میں ہی تھے کہ پہلوان نازل ہو گیا۔ بعد میں اس کی حالت پتلی ہو رہی تھی۔ پہلے تو جوانی کے جوش میں سوچے سمجھے بغیر میدان میں کود گیا، اس کی محبوبہ روتی رہ گئی لیکن بعد میں خوف سے برا حال تھا۔ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ سر جی وہ گولی مجھے لگ جاتی تو کیا ہوتا؟ میں تو مر جاتا... خوامخواہ۔ اب پولیس روز مجھے گواہی کے لیے بلائے گی... ڈاکوؤں سے الگ دشمنی ہو گئی... خوامخواہ۔ ان کے اور ساتھی بھی تو ہوں گے، انہوں نے مجھے چھوڑنا نہیں ہے۔ اٹھا کے لے جائیں گے اور قیمہ کر دیں گے میرا... خوامخواہ۔''

مجھے بڑی ہنسی آئی۔ ''یہ خوامخواہ اس کا تکیہ کلام ہے۔''

شہزاد نے کہا۔ ''ہاں... اس واردات میں دو کامیڈی سین بھی آئے، جب نوجوان پہلوان نے پہلے ڈاکو کو ٹکر ماری اور اسے دیوار پر دے مارا تو خود اس کی دھوتی کھل گئی۔ ظاہر ہے حالت جنگ میں وہ شارٹ بریک نہیں مانگ سکتا تھا کہ ٹھہرو... میں دھوتی باندھ لوں پھر مقابلہ وہیں سے شروع کرتے ہیں۔ پہلا ڈاکو تو لمبا لیٹ گیا تھا، دوسرے کی طرف جب وہ چاروں ہاتھوں پیروں پر لپکا تو صرف بنیان میں تھا۔ ساتھ والی چھت سے اس کی محبوبہ بڑے سسپنس اور اشتیاق سے ہیرو کی حوصلہ افزائی کر رہی تھی۔ شاباش... مار دو اسے بھی... خوف کے باوجود وہ اس کی ہمت افزائی کر رہی تھی اور اس کے لیے دعائیں بھی مانگ رہی ہو گی۔ شور سن کے اس کا

مجازی خدا اوپر آ گیا جو خوابِ غفلت میں سویا پڑا تھا، اسے کچھ بخار تھا۔ اس نے جو اپنی زوجہ کے ساتھ میرے گھر میں جھانکا تو اسے ایک ننگا پہلوان نظر آیا۔ وہ غصے میں بیوی کو لعنت ملامت کرتا کھینچ کے لے گیا۔“

میں اتنا ہنسا کہ اماں ابا کی جدائی سے پیدا ہونے والا بوجھل پن ختم ہو گیا۔ ”یہ تو ٹریجڈی میں کامیڈی پیدا ہو گئی لیکن وکیل صاحب... آپ بھی بڑے فنکار ہیں۔“

”جی بس ذرہ نوازی ہے آپ کی... ورنہ بندہ کس قابل ہے۔“

”بندہ بہت قابل ہے۔ پہلے چور مشہور تھے کہ آنکھوں سے سرمہ چرا کر لے جائیں اور پتا نہ چلے... آپ اسی طرح رابعہ کو لے گئے۔“

وہ گڑبڑایا۔ ”اس کو... چوری تو نہیں کہا جا سکتا۔“

میں نے کہا۔ ”جی... اسے اغوا کہتے ہیں، آپ تو قانون جانتے ہیں ماشاءاللہ۔“

”دوسرے بات قانون کی نہیں۔“

”بجا ارشاد... ایک فلمی ڈائیلاگ بڑا مشہور ہوا تھا... جج نے کہا تھا کہ قانون دل کو نہیں مانتا تو ہیرو نے کہا تھا... جج صاحب! دل بھی قانون کو نہیں مانتا۔“

وہ ہنسنے لگا۔ ”بہتر ہے میں اعترافِ جرم کرلوں۔“

”موقع سے فائدہ اٹھا لیا تم نے برخوردار... اماں ابا ہوتے یہاں تو تم یا رابعہ ایسی جرأت کا مظاہرہ کرتے۔ خیر... ہمیں اعتماد ہے تم پر اور یہ برقرار رہنا چاہیے۔“

”آپ نے ایسا سوچا بھی کیسے کہ میں آپ کے اعتماد کو دھوکا دے سکتا ہوں۔“ وہ برا مان کے بولا۔

”آدمی کی سوچ بنتی ہے تجربات سے... رابعہ اندھے اعتماد کے باعث ایک بار کنوئیں میں گر چکی ہے۔ ہم سب یہ امید رکھتے ہیں کہ تم اسے اس ڈپریشن سے باہر نکالو گے، ویسے وہ ہے کہاں؟“

”باتیں کر رہی ہے... نور جہاں سے۔“

میں نے کہا۔ ”یار خیال رکھنا... باتوں باتوں میں ایک دوسرے کو سنانا شروع نہ کر دیں... سننے والی دونوں میں سے کوئی نہیں ہے۔“

”آثار تو ایسے نہیں ہیں سر! دونوں خوب ہنس رہی ہیں... کچھ دیر پہلے دونوں خاصی دہشت زدہ تھیں۔“

میں نے کہا۔ ”نور جہاں تمہارے گھر میں فٹ ہو گئی۔“

”ایک دم فٹ... میری ماں اور خالہ کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے اس نے... ماننا پڑے گا کہ اسے لوگوں کو اپنا بنانا آتا ہے۔“

اس کی بات کا رخ میری طرف ہی تھا لیکن میں نے کہا کہ اچھی بات ہے اور فون بند کر دیا۔

وہ چھٹی کا دن تھا چنانچہ اسکول اور اسپتال بھی بند تھے۔ حویلی کے اندر سکون تھا جو بیک وقت چار افراد کے نہ ہونے سے سکوت میں ڈھل گیا تھا۔ اماں ابا کی عدم موجودگی زیادہ محسوس ہو رہی تھی۔ عمر کے اس حصے میں ماں باپ پرورش کی معاشی اور عملی ذمے داریوں سے سبک دوش ہو جاتے ہیں لیکن جب تک رہتے ہیں رحمت اور خیر خواہی کے سائبان کی طرح تحفظ کا یقین دیتے ہیں۔ یہ ان کی نیک خواہشات ہی ہوتی ہیں جو اولاد کے حق میں دعاؤں کا روپ دھار لیتی ہیں۔

شام کو راجا اور میں لان پر ٹہلتے رہے، شہناز کو کچھ گرانی محسوس ہو رہی تھی اور لیلیٰ بھابی ڈپریشن کا شکار تھیں۔ وہ دونوں سو رہی تھیں۔ نئی نویلی دلہن ریشم شادی کے ایک دن بعد بڑی بدلی بدلی سی لگ رہی تھی۔ خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی اور وہ چلتی تھی تو رقص کرتی محسوس ہوتی تھی۔ وہ ایک شوخ مزاج اور ذہین لڑکی تھی جس کی فطرت میں بے چینی کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی تھی۔ غنی کو وہ دیوانگی کی حد تک چاہتی تھی۔ شادی سے پہلے بھی اس کا عشق تمام قیود سے آزاد تھا اور اب تو گویا اسے... رابعہ کے الفاظ میں... مستی اور خرمستی کا لائسنس مل گیا تھا۔

غنی اظہارِ محبت کے معاملے میں عام مردوں کی طرح فلمی ہیرو نہیں تھا۔ وہ ذمے دار اور سنجیدہ مزاج تھا چنانچہ ریشم کے نزدیک بدھو اور بور تھا۔ اپنی تیزی اور طراری کے باعث ریشم پہلے بھی اسے کمان کرتی تھی اور وہ جورو کا غلام کہلانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا تھا۔

ریشم کے بجائے وہ چائے کی ٹرے اٹھائے نمودار ہوا تو راجا نے کہا۔ ”یار غنی! تم نے تو مردوں کا نام بدنام کر دیا، ایک دن میں یہ کیا حال ہو گیا تمہارا... چائے بھی وہ اٹھا کے نہیں لائی۔“

وہ مسکرا دیا۔ ”کرنا پڑتا ہے سر!“

راجا نے کہا۔ ”اب کل سے وہ کہے گی جھاڑو دو... برتن دھو کے رکھو... اور ہمارا چیف سیکیورٹی افسر یہ بھی کرے گا۔“

”مجبوری ہے جناب! کرنا پڑے گا۔“ وہ جاتے جاتے بولا۔

راجا نے چائے بنائی۔ ”فکیے پتر...! میرے ساتھ ایسا نہیں ہوگا۔“

میں نے کہا۔ ”آپ بکواس نہ فرمائیں... آپ کے

ساتھ تو اس سے بھی بدتر ہوگا۔ سالے تو زن مریدی میں نام پیدا کرے گا بلکہ تیرا حال تو میں دیکھ رہا ہوں... شادی سے پہلے ہی۔“

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ”میں اگر تیری پالیسی پر عمل کرتا تو یہ نہ ہوتا۔ بیک وقت دو عشق کرتا اور کیا دلیل ہے جناب کے پاس کہ میں کیا کروں... ایک پر میں مرتا ہوں اور دوسری مجھ پر مرتی ہے۔“

”اس میں غلط کیا ہے راجا صاحب!“

”ہاں۔ ایک نے لات مار کے بھگا دیا۔ اب جو اسٹینڈ بائی محبوبہ تھی، وہی کام آئے گی۔ عقلمند لوگ ہنگامی بندوبست رکھتے ہیں... مگر پیارے دوست! تیرے دل پر کیا بیتے گی جب تو اپنی محبوبہ نمبر ون کو پردۂ اسکرین پر کسی ہیرو کی بانہوں میں اس سے پیار جتاتے دیکھے گا۔ پہلے تو پھر بھی شرافت کا زمانہ تھا... ہیروئن دور دور سے گانا گاتی تھی اور ہیرو اس کے پیچھے دوڑتا رہتا تھا۔ پیڑوں کے گرد چکر لگا کے اعلان کرتے رہتے تھے کہ تو میرا چاند میں تیری چاندنی لیکن اب تو گویا..... بے حیائی کے سارے ریکارڈ توڑے جا رہے ہیں... توبہ توبہ۔“

میں نے کہا۔ ”آپ ہوتے میری جگہ تو کیا کرتے؟“

”فکیے پتر! میں ٹوکے سے ٹوٹے ٹوٹے کر دیتا اس کے۔“ وہ دہاڑا۔

”کس کے؟“ میں نے ہنس کے پوچھا۔ ”ہیرو کے یا ہیروئن کے؟“

”فلمساز کے یار... ذمے دار تو وہی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”یہ ارادہ میرا ابھی یہی ہے سلطان نے موقع سے فائدہ اٹھا لیا۔ بدمعاشی سے دال نہیں گلی تو اب شرافت کا چولا پہن کے سامنے آیا ہے لیکن ابھی میں دیکھ رہا ہوں... میرا دل کہتا ہے کہ بھیڑ کی کھال پہن کے بھیڑیا زیادہ دن صبر نہیں کر سکتا، سلطان کی اصلیت فریال کے سامنے آ جائے گی... بہت جلد۔“

”اور پھر وہ لوٹ کر تیرے پاس ہی آئے گی... خوش ہو جا اس خیال سے دل کو بہلاتا رہ۔“

”دیکھ راجا! یہ لیلیٰ مجنوں کے عشق کا دور نہیں ہے اور نہ میں اس عشق کا قائل ہوں جو جان کا طلب گار ہو۔ محبت میرے نزدیک زندگی کا درخت ہے جو پھل پھول دیتا ہے۔ خوشی کا سرچشمہ ہے۔ خون کے آنسو اور محرومی کا عذاب یا دردناک موت نہیں۔ جگر چھلنی ہے، دل گھبرا رہا ہے محبت کا جنازہ جا رہا ہے... اب یہ فلموں میں بھی نہیں چلتا۔“

راجا نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ ”ایک بات... اپنی بھی کچھ ایسا ہی سوچتا ہے سالا... خوشی خوشی ایمن کے ساتھ چلتی ہے تو ٹھیک ورنہ بائی بائی... اپنا جان سالا اتنا فالتو تھیں ہے کہ ایک عورت کے پیچھے مر جاوے۔“

میں نے کہا۔ ”راجا! میں اگر سلطان بن سکتا تو کچھ مشکل نہیں تھا۔ میں اسے اغوا کرا لیتا... یہاں حویلی میں واپس لے آتا... دیکھتا وہ مجھ سے شادی سے کیسے انکار کرتی۔ بھول جاتی ماڈل اور سپر اسٹار بننے کے سارے دعوے... بچے جنتی سال کے سال، نور جہاں جیسی سوکن کو بھی قبول کرتی اور ساری عمر حویلی سے باہر قدم نہ رکھ پاتی۔ کون آتا اس کی مدد کے لیے؟ اقوامِ متحدہ؟... مگر یار... میں رفیق ہوں... سلطان نہیں... اور مجنوں بھی نہیں۔“

”اتنا سیریس مت ہو فکیے پتر! وہ کیا شعر ہے... جذبۂ عشق سلامت ہے تو ہم دیکھیں گے... کچے دھاگے سے چلے آئیں گے سرکار بندھے... اور جذبۂ عشق نہیں ہے تو پھر کیا ہو سکتا ہے صبر کے سوا... بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔“

”راجا! مذاق چھوڑ... نور جہاں کو ہم نے بڑے وقت پر یہاں سے بھیج دیا۔“

”ہم نے نہیں بھیجا... شہزاد لے گیا اور اس معاملے میں واقعی قسمت نے ہماری مدد کی... ورنہ اس وقت نور جہاں ہوتی زنانہ جیل میں اور اس کی ضمانت بھی مشکل ہوتی۔“

میں نے کہا۔ ”سوال یہ ہے راجا، وہاں بھی وہ کتنا عرصہ رہ سکتی ہے؟“

”ہاں۔ مسئلہ اپنی جگہ موجود ہے۔ وہ کب تک بھاگتی رہے گی اور ہم اسے کب تک بچاتے رہیں گے؟“

”میرا خیال ہے کہ اب ہمیں اسے ایک محفوظ مستقبل کی ضمانت کے ساتھ ایک نئی زندگی کے راستے پر ڈال دینا چاہیے جس پر وہ اپنی مرضی سے چل سکے... پورے یقین کے ساتھ۔“ راجا نے کہا۔

”اکیلی؟“

”اکیلی کیوں؟ کوئی ہم سفر اسے ضرور مل جائے گا... خدا نے اسے حسن بھی دیا ہے اور ذہانت بھی دی ہے۔ وہ ہر مرد کے لیے کشش کے اسباب رکھتی ہے... انتخاب ہمیشہ اس کے ہاتھ میں رہے گا۔“

میں نے کہا۔ ”بالکل ٹھیک کہا تو نے لیکن ایسی کون سی جگہ ہے... تیرے خیال میں؟“

”لندن... اگر تو مجھ سے پوچھے... وہاں لاکھوں پاکستانی ہیں... انڈین اور بنگلہ دیشی... جو ایشیائی کہلاتے ہیں

اتنی بڑی کمیونٹی ہے کہ لندن کے ایک حصے کو منی پاکستان یا منی انڈیا کہا جاتا ہے، وہاں وہ ایسے گم ہو سکتی ہے جیسے سمندر میں سوئی۔''

میں نے کہا۔ ''بس تو اسے لندن بھجوا دیتے ہیں لیکن اس سے پہلے نور جہاں کے لیے کسی اور نام سے ایک نیا شناختی کارڈ چاہیے... نیا پاسپورٹ چاہیے۔''

''پیسا کرتا ہے سب کام نواب صاحب! پیسے کا جادو چلتا ہے۔ یہ قانونی ضابطے اور سرحدیں سب غائب ہو جاتی ہیں... جیسے جادوگر کی چھڑی سے مٹھی میں بند سکے غائب ہوتے ہیں، نور جہاں غائب ہو جائے گی اور پھر کسی کو نظر نہیں آئے گی۔'' راجا نے کہا۔ ''سوائے تیرے۔''

''ہاں... مجھے خوابوں میں نظر آئے گی۔''

وہ خفگی سے بولا۔ ''میں خواب کی بات نہیں کر رہا تھا... خواب میں تو مجھے ایشوریا رائے بھی نظر آتی ہے۔''

''ابھی تک ایسی کوئی دوربین ایجاد نہیں ہوئی جس سے کوئی پاکستان میں بیٹھ کے کسی کو لندن میں دیکھ سکے۔''

''تو دوربین سے نہیں... بلکہ نظروں سے دیکھے گا... تو اسے دیکھے بغیر نہیں رہ سکتا... تو جائے گا بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑاتا بلکہ خود گھوڑے کی طرح دوڑتا ہوا۔''

میں نے دبے دبے لہجے میں احتجاج کیا۔ ''یار! بڑے افسوس کی بات ہے... تو ایسا سمجھتا ہے۔''

''میں ویسا ہی سمجھتا ہوں... جیسا ہے پھر بھی کوششیں کر لینے میں کیا ہرج ہے۔ ممکن ہے تجھے شفا نصیب ہو اس کے مہلک عشق سے۔ ہم سب کی دعائیں قبول ہوں اور فریال فلمی دنیا سے لوٹ آئے۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ زیادہ مشکل ہے۔''

''نہیں دوست! جب عشق ہو تو آدمی عقل کے راستے پر نہیں چلتا۔ مجھ سے پوچھا جائے کہ کامیابی کے معیار پر کیا بڑا ہے... ایک سپر اسٹار بننا یا تیرے بچوں کی اماں بننا۔ تو میں کہوں گا کہ تیرے بچوں کی اماں تو رابعہ بھی بن سکتی تھی، تو نے کہا کہ نہیں فریال بنے گی اور تیرے اماں ابا کی نہیں چلی۔ اب تیری نہیں چل رہی، کل کا کیا پتا۔''

''شاید یہ تو نے ٹھیک ہی کہا ہے دوست! جب آدمی کے سامنے مقاصد ہوں... ناموری کے، دولت مندی کے یا تسخیرِ کائنات کے تو شادی ایک بہت چھوٹا... بہت ہی غیر اہم مسئلہ بن جاتی ہے۔ روزمرہ کے معمولات کی اہمیت بھی نہیں رہتی... جذبات اور ان سے پیدا ہونے والے سارے مسائل بالکل پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔ یہ جو بڑے لوگوں کی صف میں آ جاتے ہیں، ان کے لیے بیوی بچوں کی محبت ماں باپ کی دعائیں... آبائی گھر یا وطن کے رشتے... ان سب کے لیے وقت ہی کہاں ہوتا ہے؟''

راجا نے کہا۔ ''تیرے اور فریال کے معاملے میں یہ حادثہ ہوا ہے۔ تم نے اپنی اپنی زندگی کے مقاصد کو الگ کر لیا ہے اور ایک دوسرے کی ضرورت سے زیادہ اہم بنا لیا ہے۔ تیرے لیے آج ست بدھائی کے ترقیاتی منصوبے... زندگی اور موت کا مسئلہ بن گئے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''بنا دیے گئے ہیں... رانا کی مخالفت کے باعث۔''

''جو کچھ بھی ہو۔ وہ کہتا ہے کہ میں یہ سب کرنے نہیں دوں گا، تو اڑ گیا ہے کہ میں کر کے رہوں گا۔ اس محاذ آرائی میں بے چاری فریال کی محبت تو کسی شمار قطار میں نہیں رہی تھی۔ تو نے کہا کہ محبت بھی کریں گے اور شادی بھی لیکن پہلے میں اس دشمن سے تو نمٹ لوں۔''

''یار یہ تو بقا کی جنگ تھی... جو ایسے ہی چلتی ہے۔ اس میں فلمی رومانس کو تمام معاملات پر ترجیح کیسے دی جا سکتی ہے یہ کیسے ممکن تھا کہ میں صرف اس سے عشق کرتا رہتا... اور کچھ نہ کرتا۔''

''مگر گزشتہ چھ آٹھ سال ایسے ہی گزرے تھے۔ آپ صرف اس سے عشق فرماتے رہے... یہاں آتے ہی عشق پر غالب آ گئے عملی مسائل۔ جب فریال بھی یہاں پہنچ گئی تو کوئی مسئلہ ختم ہو گیا... کھانا تیار ہے... جب فرصت ملے گی کھا لیں گے۔ اس ناقدری نے فریال کو احساس دلایا کہ وہ غیر اہم ہے... اہم ہے صرف آپ کی کامیابی۔ اس نے کہا کہ یہ بات ہے تو پھر دیکھو... میں بھی کامیابی کے راستے پر چل کے دکھاتی ہوں... میں بھی ایک مقصد بنا لیتی ہوں... میں بھی اتنی اہم ہو جاتی ہوں کہ تم جیسے میرے پیچھے پھریں۔''

''یہ تو محض ضد والی بات ہے۔''

''ایسا تو سوچتا ہے... وہ نہیں چاہتی کہ اس کی اہمیت صرف نواب رفیق احمد شیرازی کے نام سے ہو۔ وہ خوش ہو تو صرف تیری کامیابی پر... فخر کرے تو صرف تیری بیوی ہونے پر۔ مزید خرابی یہ ہوئی کہ آپ نے محبت کو شاعری کی طرح ایک شوق بنا لیا۔ جسم کی ضرورت کے لیے تو نے نور جہاں کو چن لیا... محبت کے لیے فریال... جنسی طلب کے لیے نور جہاں۔ فریال کے اندر کی عورت کے منہ پر تو طمانچہ پڑا کہ یہ ہے میری اوقات... شوہر بھوک مٹانے کے لیے باہر برگر کھائے یا پیزا... میں گھر کی دال روٹی سامنے رکھے بیٹھی رہوں۔''

خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد میں نے کہا۔ ''مہاراجا! یہ بتا اب میں کیا کروں؟''

''میرے بتائے سے کچھ نہیں ہوگا۔'' اس نے انکار کر دیا۔ ''پھر بھی... بتا تو سہی... شاید کہ میرے دل میں اتر جائے تیری بات۔'' میں نے شعر کو الٹا مفہوم دے دیا۔

''او کے... مجھے بتا... کیا تو ست بدھائی کے سارے ترقیاتی منصوبوں پر لعنت بھیج کے... سب کچھ بیچ کے اور ساری دولت بیرون ملک کسی بینک میں منتقل کر کے... لندن یا پیرس میں سیٹل ہو سکتا ہے ہمیشہ کے لیے۔''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''بس تو فریال کے لوٹ کر آنے کا بھی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تو اسے دیکھتے رہنا... ٹی وی پر... پردۂ اسکرین پر۔ یاد کرنا کہ کبھی ہم میں تم میں بھی چاہ تھی اور بس۔ کبھی کبھی لندن جا کے نور جہاں کے ساتھ دو چار دن گزار آنا۔ ایسی نور جہاں میں بہت... ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں... لعنت بھیج عشق پر۔'' وہ ایک دم اٹھا اور اندر چل پڑا۔

راجا نے لگی لپٹی رکھے بغیر بات کی تھی، دو اور دو چار والی... میں بہت دیر اکیلا بیٹھا سوچتا رہا کہ کیا واپسی ممکن ہے؟ میرے لیے یا فریال کے لیے لیکن واپسی کا راستہ جیسے ناممکنات کے اندھیرے میں گم ہو گیا تھا۔ ہم ایک سو اسی ڈگری کے ٹرن پر مخالف سمتوں میں اپنی اپنی کامیابی کی منزل کا تعین کر چکے تھے۔

رابعہ رات ہونے کے بعد شہزاد کے ساتھ پہنچ گئی۔ شہزاد فوراً واپس جانا چاہتا تھا مگر اسے کھانے کے لیے روکا گیا تو وہ رک گیا۔ کھانے کی میز پر ان دونوں نے ڈاکوؤں کے آنے اور گرفتار ہو کے جانے تک کے واقعات کی رپورٹ ایسے پُرلطف انداز میں بیان کی کہ ہنستے ہنستے سب کا برا حال ہو گیا۔ ایک شخص سب کو رلا بھی سکتا ہے اور ہنسا بھی سکتا ہے۔ رابعہ اور شہزاد کے اندر سے خوشی پھوٹ رہی تھی۔ ان کے مقابلے میں ہم چاروں پر افسردگی طاری تھی جو کھانا ختم ہونے تک خفگی میں بدل گئی۔ اماں ابا کے جانے سے گھر میں جو اداسی کا سماں تھا یا فریال کے انکار نے جو مایوسی کی تلخی پیدا کی تھی، وہ ہنسی میں کھو گئی۔

کھانے کی میز پر شہزاد نے ایک بار بھی گھڑی نہیں دیکھی جس سے ظاہر ہوتا کہ اسے واپسی کی جلدی ہے۔ جب کھانا ختم ہوا تو اس نے اجازت طلب کی۔ اس سے کہا گیا کہ اب اتنی رات کو کہاں جاؤ گے تو وہ آسانی سے رکنے کے لیے بھی تیار ہو گیا۔

راجا نے کہا۔ ''یار! تمہاری والدہ پریشان ہوں گی۔''

رابعہ پٹ سے بولی۔ ''میں انہیں فون کر دیتی ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''کزن! فون تو وہ خود بھی کر سکتا ہے مگر ایک ماں کا دل...''

رابعہ نے کہا۔ ''شہزاد یہاں ہو تو انہیں تسلی رہتی ہے۔''

''اچھا! پھر تو اسے یہیں رہنا چاہیے۔'' راجا بولا۔

میں نے کہا۔ ''راجا صاحب! آج ہی ڈاکو بھی آئے تھے۔''

''تیرا کیا مطلب ہے فیکے پتر! وہ دوبارہ لوٹ کر آئیں گے؟ اور آتے ہیں تو آئیں... ان کا مقابلہ شہزاد کو تو نہیں کرنا ہے۔''

میں نے سر ہلایا۔ ''رائٹ مہاراجا! انہیں وہ مجنوں پہلوان پھر مار بھگائے گا... کوٹھے پھلانگنے والا۔''

''اس بار وہ دھوتی ذرا مضبوطی سے باندھ کے کودے گا اکھاڑے میں۔'' راجا بولا۔ ''تم رک سکتے ہو شہزادے۔''

میں نے کہا۔ ''رابعہ کے اصرار پر نہیں... ہمارے کہنے سے۔''

رابعہ کا رنگ لال ہو گیا اور وہ مصنوعی غصہ دکھاتی بھاگ گئی۔ ''سمجھ لوں گی تم سے کزن!''

شہزاد نے ڈھیٹ بن کے مسکراتے رہنا بہتر سمجھا۔ اب وہ جانے کی کوشش کرتا تو ہم کہاں جانے دیتے۔ ایک طرح سے یہ اچھا بھی ہوا۔

رات کو خواتین کا اجلاس بند کمرے میں جاری تھا اور ہم خنکی ہونے کے باوجود برآمدے میں بیٹھے درپیش مسائل پر سیریس گفتگو کر رہے تھے کہ ریشم کافی کے تین مگ ایک ٹرے میں لیے نمودار ہوئی۔ ہم نے مگ اٹھائے۔ وہ پھر بھی کھڑی رہی۔ اس نے جو عروسی جوڑا نکاح کے وقت پہنا تھا، ابھی تک اسی میں پھر رہی تھی۔ وہ ائرپورٹ بھی اسی طرح دلہن بنی گئی تھی۔ جب شہباز نے نکتۂ اعتراض اٹھایا کہ ریشم یہ جوڑا کیوں خراب کر رہی ہو؟ یہ گھر میں پہننے اور کام کاج کرنے کے لیے تو نہیں ہوتا تو ریشم نے اس کا انگلش میں یہ جواب دیا۔

''برائڈ سوٹ ون نائٹ... باکس کلوز مارننگ... آل لائف ان باکس... دس ویری بیڈ... آئی ناٹ ڈو دس... وین ڈرٹی واش... غنی سے یو ویری بیوٹی فل دس ڈریس۔'' خلاصہ یہ تھا کہ اسے وہ تب تک پہنتی رہے گی جب تک کہ یہ ناقابلِ استعمال نہیں ہو جاتا، بند کر کے نہیں رکھے گی۔

میں نے کہا۔ ''ریشم! کیا بات ہے؟''
اس نے پھر انگلش شروع کی۔ ''یو پرامز فارگیٹ۔''
میں نے کہا۔ ''کوئی وعدہ کیا تھا میں نے... جو بھول گیا؟''

اس نے گھڑے جیسا سر ہلایا۔ ''یو سے... غنی میرج...''
میں نے کہا۔ ''خاتون... آپ کی بڑی عنایت ہوگی اگر آپ اپنی مادری زبان میں یا سلیس اردو میں فرمائیں کہ یہ ناچیز کون سا وعدہ کر کے بھول گیا۔''
اس نے کہا۔ ''سر! آپ نے کہا تھا کہ جب ہماری شادی ہو جائے گی تو آپ ہمیں تحفے میں ایک گھر دیں گے۔''
راجا نے کہا۔ ''نواب صاحب قول پر جان دے سکتے ہیں نادان لڑکی! کل یہ حویلی تمہارے نام لکھ دی جائے گی۔''
میں نے بھی کہا۔ ''ہاں۔ فقیر اپنا بوریا بستر سمیٹ کر جنگل کی راہ لے گا۔''
وہ کچھ مایوس نظر آنے لگی۔ ''معاف کرنا مالک... میں سمجھی تھی آپ سیریس ہیں۔'' اور پلٹ کے واپس چل پڑی۔
میں نے کہا۔ ''مسز عبدالغنی۔ ایک منٹ۔''
وہ رک گئی۔ ''یس سر!''
میں نے پوچھا۔ ''آپ کو یہ گھر چھوٹا لگتا ہے یا کوئی تکلیف ہے اس گھر میں؟''
وہ سخت خفیف ہوئی۔ ''میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا سر! آپ کے احسانات اور مہربانیاں اتنی ہیں کہ ہم ساری عمر خدمت کر کے بھی ان کا بدلہ ادا نہیں کر سکتے۔''
''پھر کیا بات ہے؟''
''بات... کچھ نہیں جناب!'' وہ زمین کو گھورتے ہوئے اپنے پیر کے انگوٹھے سے کریدتی رہی۔
میں نے اٹھ کے اپنا ہاتھ ریشم کے سر پر رکھا۔ ''پاگل لڑکی! مجھے معلوم ہے کہ شادی سے پہلے ہر لڑکی کا یہی خواب ہوتا ہے... اپنا گھر... جہاں اس کی مرضی چلتی ہو... جسے وہ اپنی مرضی سے سجا بنا سکے۔ جہاں شوہر اس کی خوشی کو مقدم سمجھے اور ان کی خلوت میں کوئی دخل انداز نہ ہو۔''
راجا نے سر ہلایا۔ ''دیکھیے فلم میرا گھر میری جنت۔''
ریشم کے چہرے کی شادابی لوٹ آئی۔ وہ کچھ پُرسکون ہوگئی۔
میں نے کہا۔ ''مجھے اپنا وعدہ یاد ہے اور یہ کوئی بھولنے والی بات بھی نہیں تھی۔ تیری حیثیت اس گھر میں ہمیشہ ایک فرد جیسی رہی۔ تیری شادی خود میرے والدین نے حج پر جانے سے پہلے آخری فرض کے طور پر کی۔ اسی طرح جیسے وہ میری چھوٹی بہن کی کرتے۔''
ریشم نے نظر اٹھا کے مجھے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ''مجھے معاف کر دیں سر!''
''کس بات پر... تو نے اچھا کیا ایک فرض مجھے یاد دلایا ورنہ دنیا کے جھمیلوں میں بھول جاتا۔ ایک بات بتا! گھر کہاں چاہیے تمہیں؟ یہاں یا کہیں اور... اسلام آباد، لاہور۔''
''ہم آپ کو چھوڑ کے کہاں جا سکتے ہیں سر! ہمارا دنیا میں اور کون ہے؟''
میں نے کہا۔ ''چل ٹھیک ہے... صبح میں غنی سے بات کرلوں گا۔ کتنا بڑا گھر چاہیے؟ کہاں چاہیے؟''
''میں نے بات کر لی ہے سر... آپ اس سے کچھ مت کہیں... اس نے تو منع کیا تھا مجھے بھی لیکن یہ جو سرونٹ کوارٹر ہیں... سب خالی پڑے ہیں۔ سوائے ایک کے جس میں میری ماں فاطمہ رہتی ہے، باقی لوگ چلے گئے ہیں۔''
''وہ بھی کوئی جگہ ہے۔''
''بس آپ وہی جگہ ہمیں دے دیں... ہم حویلی کے باہر جانا بھی نہیں چاہتے۔ آپ اسی کو ٹھیک کرا دیں۔''
میں نے کہا۔ ''میں سمجھ گیا... بس اب تم بے فکر ہو جاؤ... تمہارا ایک گھر وہیں بنے گا... تمہاری مرضی کے مطابق اور بہت جلد۔''
''تھینک یو سر!'' وہ جذبات سے گلوگیر لہجے میں بولی اور پلٹ کر جاتے جاتے پھر پلٹی۔ ''یہ بات غنی کو مت بتایئے گا سر! وہ ناراض ہو جائے گا۔'' وہ شوخی سے مسکرائی اور بھاگ گئی۔
شہزاد نے اسے جاتے ہوئے دیکھا۔ ''یہ اکبر خان کی لڑکی ہے نا؟''
میں نے کہا۔ ''ہاں۔ وہ خود بھی پہلے اسی سرونٹ کوارٹر میں رہتا تھا... اس کا باپ بھی۔ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''
''ایک خیال آیا تھا مجھے... اکبر خان نے بہت پیسا کمایا... ناجائز اور غیر قانونی ذرائع سے سہی۔''
''انہوں نے خود اس سے تعلق ختم کر لیا تھا۔ اس کا پیسا کبھی قبول نہیں کیا۔ بعد میں اس نے ریشم کی ماں کو طلاق دے دی تھی۔''
''اکبر خان نے پراپرٹی بھی بنائی ہوگی۔'' شہزاد سوچتے ہوئے بولا۔
''بنائی ہوگی... ہمیں اس بارے میں کچھ معلوم نہیں۔''
''میں کچھ اور سوچ رہا تھا... اگر اس کی پراپرٹی ہے... تو اب وہ کسے ملے گی؟'' شہزاد نے کہا۔

میں تقریباً اچھل پڑا۔ ''شہزادے! اس کی واحد وارث ریشم ہے۔''
راجا نے کہا۔ ''جس بیوی کے بارے میں یہ کہا جا رہا ہے کہ وہ اکبر خان کو قتل کر کے فرار ہوگئی۔''
شہزاد نے نفی میں سر ہلایا۔ ''قانون کی رو سے مقتول کا وارث قاتل نہیں ہو سکتا بفرضِ محال وہ گرفتار ہو جائے تو اسے عدالت میں اپنی بے گناہی کے علاوہ دو چیزیں ثابت کرنا ہوں گی۔ ایک یہ کہ وہ مقتول کے نکاح میں تھی۔ نمبر دو... اس کے سوا پراپرٹی کا جائز قانونی وارث کوئی نہیں۔''
''لیکن اس سے پہلے تو اسے اپنی بے گناہی ثابت کرنا ہوگی ورنہ پراپرٹی پر حقِ ملکیت کا دعویٰ بھی بے معنی اور بے بنیاد ہے۔''
شہزاد نے کہا۔ ''راجا صاحب! امکانات صرف دو ہیں... اگر وہ پکڑی جاتی ہے خدانخواستہ... تو اسے ہوگی سزا... کم سے کم عمر قید ورنہ پھانسی... ایسی صورت میں پراپرٹی کا حقِ وراثت بے معنی... اگر وہ نور جہاں نہیں رہتی تو حقِ وراثت کا دعویٰ کون کرے گا؟''
میں نے کہا۔ ''ہر صورت میں ریشم ہی واحد وارث ہے۔''
''ہاں... کیونکہ اس کی ماں کو بھی طلاق ہو چکی ہے۔ بھائی کوئی نہیں... نہ دادا نہ چچا... جو اکبر خان کا تھا، وہ صرف ریشم کا ہوگا... لیکن...''
''لیکن کے آگے بھی فرمایئے۔'' راجا نے کہا۔
''یہ سب اسے ابھی نہیں مل سکتا۔'' شہزاد بولا۔
میں نے کہا۔ ''چلو صبح مل جائے۔ کل پرسوں تک بھی کوئی حرج نہیں۔''
شہزاد ہنسنے لگا۔ ''رفیق صاحب! ابھی وہ پراپرٹی ہے کہاں؟ ہم تو بات کر رہے تھے کہ اگر ہوگی تو کسے ملے گی۔''
''کیا اس کا پتا نہیں چلایا جا سکتا۔'' راجا نے کہا۔
''یہ تو بہت آسان ہے۔ اکبر خان نے کوئی کوٹھی خریدی ہوگی یا بنائی ہوگی تو انہی دو چار شہروں میں... کراچی، لاہور، پنڈی اسلام آباد۔ ہم یہ پتا چلا سکتے ہیں۔ ہر شہر کے مختلف علاقوں کے رجسٹرار الگ ہوتے ہیں۔ مثلاً لاہور کو لیں... گڑھی شاہو کا رجسٹرار الگ ہوگا۔ سنت نگر کا الگ۔ آپ ہر رجسٹرار سے معلوم کر لیں۔''
میں نے کہا۔ ''واہ! آپ اس کام کو آسان کہتے ہیں۔''
''آسانی پیدا ہوتی ہے رشوت سے ورنہ آسان کام مشکل اور مشکل کام بالکل ناممکن بن سکتا ہے۔ جب کوئی پراپرٹی فروخت ہوتی ہے تو اس کے لیے مالک کا نام رجسٹرڈ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ہر مکان خریدنے والا رجسٹرار کے آفس سے معلوم کرتا ہے کہ اس کا مالک کون ہے۔ اسے ایک سرٹیفکیٹ دیا جاتا ہے کہ ہمارے ریکارڈ کے مطابق اس کا آخری مالک یہ شخص ہے۔ آپ ہر رجسٹرار کے ہاتھ پر نقد رقم رکھنے کا وعدہ کریں کہ اکبر خان کے نام کی پراپرٹی کی تفصیل چاہیے۔''
''اکبر خان تو بہت ہوں گے۔''
''آپ ولدیت بھی دیں نا... دو چار دن میں ہر رجسٹرار آپ کو سب بتا دے گا۔ پراپرٹی کیا ہے اور کہاں ہے؟ پھر آپ خود جا کے دیکھ لیں اور تصدیق ہو جائے تو ریشم کی طرف سے حقِ وراثت کا کیس فائل کر دیں۔ اسے وراثت کا سرٹیفکیٹ مل جائے گا۔''
اس انکشاف یا امکان کے تصور میں کچھ دیر ہم سب دم بخود بیٹھے رہے اور یہ سوچتے رہے کہ آخر اس معاملے پر ہم نے اس نظر سے غور کیوں نہیں کیا تھا۔ اکبر خان کی زندگی سے موت تک کے حالات اور واقعات اس کی قانونی اور غیر قانونی سرگرمیوں اور اس کی غیر اخلاقی مصروفیات سے... اس کے کاروباری معاملات اور تعلقات تک سب کچھ تو ہماری نظر میں تھا۔ اس نے دولت کے حصول کو مقصد بنا کے جس راستے پر سفر کیا تھا، اس میں کامیابی بھی اسے بہت جلد ملی تھی اور موت بھی۔ ہزاروں سے لاکھوں اور لاکھوں سے کروڑوں کی منزل تک اور پھر واپس نقطۂ آغاز پر اپنی قبر تک پہنچنے میں اس نے بالکل دیر نہیں لگائی تھی۔
آدمی غربت سے امارت تک یا کچھوے کی چال سے جاتا ہے یا خرگوش کی طرح چھلانگیں مارتا ہوا لیکن ہر صورت میں دولت ہاتھ آنے کے بعد وہ اس کے ڈھیر جمع نہیں کرتا اور اس ڈھیر کی اونچائی دیکھ کے خوش ہونا کافی نہیں سمجھتا عام آدمی کوٹھی یا محل کھڑے کرتا ہے۔ شاندار کاریں خریدتا ہے۔ اور شاہانہ زندگی کے سارے لوازمات جمع کرتا ہے۔ یہ سب اکبر خان نے بھی کیا ہوگا۔ کہاں ہیں وہ اسباب جو اس نے دولت سے حاصل کیے؟
یقیناً نور جہاں کو معلوم ہوگا لیکن اس نے تو کبھی ذکر نہیں کیا اور اکبر خان جب مرا تو فرضی نام سے ایک کرائے کے گھر میں روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ آخر کیوں؟
نور جہاں نے اس راز سے پردہ نہیں اٹھایا تو کیوں؟
بالآخر راجا بولا۔ ''یار! تم کر سکتے ہو یہ کام۔''
میں نے کہا۔ ''خرچ کی فکر مت کرنا، میں دوں گا۔''

''خرچا زیادہ نہیں ہے۔ محنت زیادہ ہے۔ خیر میں لگاتا ہوں کسی کو اس کام پر۔'' شہزاد بولا۔

میں نے کہا۔ ''ممکن ہے اس کے پاس کیش ہو۔''

''کیش ہی ہوگا... کسی بینک اکاؤنٹ میں لیکن بینک والے نہیں بتائیں گے۔'' راجا نے کہا۔

''بیک ڈور سے ساری انفارمیشن مل جاتی ہے راجا صاحب!'' شہزاد نے کہا۔

''لیکن شہزادے! ابھی ریشم کو ہوا بھی نہیں لگنی چاہیے کسی بات کی۔ وہ بالکل ہی پاگل ہو جائے گی۔'' میں نے کہا۔

''آپ نے تو میرا نام ہی شہزادہ رکھ دیا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''مجبوری ہے... میں نواب ہوں... یہ راجا ہے... ایک ہمارا دوست تھا شامی بادشاہ... معلوم نہیں آج کل کہاں ہے؟ عرصہ ہوا اس کی کوئی خیر خبر نہیں۔'' میں نے کہا۔

تقدیر کے کیسے کھیل ہیں۔ اس رات میں نے سونے سے پہلے سوچا۔ اکبر خان کو کہاں لے گئی اور واپس کہاں پہنچایا۔ اب یہ غریب لڑکی جس نے زندگی سرونٹ کوارٹر میں گزار دی۔ غربت اور محرومی کے سوا کچھ بھی نہ دیکھا جو آج بھی اپنی ماں کے ساتھ برتن دھو رہی ہے اور کھانا پکا رہی ہے۔ ہمارے ایسے سلوک کے باوجود خادمہ سے زیادہ نہیں۔ کیا راتوں رات وہ کروڑپتی ہو جائے گی۔ فاطمہ کی زوجیت تو ختم ہوگئی۔ ریشم کی ولدیت ختم نہیں ہوئی اور وہ بدستور اکبر خان کی بیٹی ہے۔ اور غنی... ایک ٹرک ڈرائیور... ریشم سے محبت کرنے والا... کبھی اس نے خواب میں بھی نہ سوچا ہوگا کہ محبت کے ساتھ اسے دولت بھی مل جائے گی۔

پھر بہت دیر گزرے وقتوں کے بہت سے منظر آنکھوں میں بھرے رہے جن میں فریال میرے ساتھ تھی۔ ہر منظر میں اس کے انداز جدا تھے۔ پیرہن کے رنگ مختلف تھے... قوس و قزح جیسے اودے نیلے زرد اور سرخ۔ کہیں دوپٹے یا ساری کے لہراتے آنچل میں۔ کبھی وہ شلوار قمیص میں نظر آتی تو پھول کھل جاتے۔ جگنو سے چمک اٹھتے۔ مسکراتی تو ستارے جھلمل کرتے۔ ہنستی تو آبشار گنگناتے۔ لہرا کے بل کھاتی تو نازک کمر شاخِ گل کی طرح لچکتی پھر نیند میں وہ خواب کی صورت اتر آئی۔ پہلے ایک صابن کے اشتہار میں ادائے حسن کی بجلیاں گراتی رہی پھر رنگ گورا کرنے والی کریم کے لیے اپنا روپ دکھاتی رہی۔

صبح میں جاگا تو کچھ نہ تھا۔

تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ
جب آنکھ کھل گئی نہ زیاں تھا نہ سود تھا۔

شہزاد عدالت میں پیشی بھگتانے کے لیے صبح صبح صرف چائے پی کے بھاگ گیا تھا اور میرے پوچھنے پر رابعہ نے شرمانے کی کوشش کی۔ ''وہ تو ناشتا کیے بغیر ہی جا رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ ریشم کو بھی صبح صبح جگانا کچھ مناسب نہیں سمجھا۔''

''ہاں۔ نئی دلہن کو ہنی مون پیریڈ میں اتنی رعایت تو ہونی چاہیے۔'' میں نے کہا۔ ''تم چائے ہی بنا دیتیں۔''

''وہ میں نے بنا دی بلکہ کچھ بسکٹ تھے۔ وہ بھی رکھ دیے۔''

''اللہ آپ کو جزائے خیر دے اور خدمت کا یہ جذبہ برقرار رکھے، ہمیں تو کبھی پانی نہیں پلایا۔ اتنی صبح اٹھتے بھی پہلے نہیں دیکھا آپ کو۔''

وہ چلائی۔ ''خدا کا خوف کرو کزن! اتنا جھوٹ۔''

میں نے کہا۔ ''اچھا قسم کھا کے کہو۔''

''لو... رات رات بھر جاگ کے پتا نہیں کتنی بار کافی بنائی میں نے اور اٹھتی میں روز اسی وقت ہوں شہناز کے ساتھ۔ اُدھر اس کا کلینک شروع ہوتا ہے اِدھر میرا اسکول لگ جاتا ہے۔''

''اچھا... شہناز مجھے نظر نہیں آ رہی۔''

''وہ کچن میں ہے۔ ناشتا بنا رہی ہے۔ ہم نے طے کیا ہے کہ کم سے کم ایک ہفتہ ریشم کی چھٹی۔''

''کبھی کبھی آپ لوگ بھی صحیح سوچتی ہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ انہیں کہیں تفریح کے لیے بھیج دیا جائے۔ زبردستی... مگر ایک ہفتے کے لیے نہیں پندرہ دن کے لیے۔''

''اور سرکاری خرچ پر... فری۔''

میں نے کہا۔ ''منظور... دیکھو میں تمہاری ہر بات مان لیتا ہوں۔ اتنا خیال ہے مجھے تمہارا۔ انشاء اللہ مستقبل قریب میں وہ مبارک وقت آئے گا میں پندرہ دن نہیں پندرہ ہفتے کے لیے تمہیں ہنی مون پر بھیجوں گا اور مری نہیں۔ سوئٹزرلینڈ... وہ گانا بھی گاؤں گا۔ میری پیاری بہنیا بنی ہے دلہنیا۔''

''ایسی باتوں سے میں خوش نہیں ہوتی۔ وہ دن ابھی دور ہے۔''

''کہاں دور ہے کزن؟ مجھے تو بہت قریب دکھائی دے رہا ہے۔ تمہاری بات تو ہوئی ہوگی۔'' میں نے رازداری سے پوچھا۔

اس نے کشن سے مجھ پر حملہ کیا۔ ''کس سے؟ اتنا بے

شرم سمجھا ہے مجھے... میں اس سے خود بات کروں گی... اپنی شادی کی۔''

میں نے اپنا دفاع کیا۔ ''یار کس بات پر مشتعل ہو رہی ہو آخر؟... میں مانتا ہوں تم اس سے کہیں زیادہ بے شرم ہو جتنا میں سمجھتا ہوں مگر میں شہزاد کی نہیں... نور جہاں کی بات کر رہا تھا۔''

وہ جھینپ کر اور ٹھنڈی ہو کے بیٹھ گئی۔ ''اوہ! تو یہ جانتا چاہیے تھے نواب صاحب! اپنی بات کر رہے تھے۔''

میں نے کہا۔ ''اور کیا... تمہاری بات تو میں نے کی تھی شہزادے سے۔ کل رات بہت دیر سمجھایا ہم سب نے مگر وہ... خیر چھوڑو۔ تمہیں افسوس ہوگا۔''

''بدمعاشی مت کرو... سیدھی طرح بتاؤ اس نے کیا کہا؟''

''اس نے کہا۔ وہ کسی اور سے وعدہ کر چکا ہے اور اس سے محبت بھی کرتا ہے۔ رابعہ اس کے مقابلے میں... کیا مثال دی تھی اس نے... ایسی ہے جیسے بلبل کے مقابلے میں چمگادڑ۔ صورت پر تو آدمی صبر کر لے... دل پر پتھر رکھ لے مگر عقل ایک کلو کی کھوپڑی میں ایک گرام بھی نہیں۔ مجھے تو غصہ آ گیا تھا کزن۔ میں نے کہا کہ شکر کرو تلوار نہیں ہے میرے پاس۔''

وہ ہنسنے لگی۔ ''نور جہاں تمہارے لیے پاگل ہے۔''

''وہ کسی وجہ کے بغیر پاگل ہے... الزام مجھے مت دو۔'' میں نے کہا۔

''کل میری اس سے کافی دیر گفتگو ہوئی۔ سچ تو یہ ہے کزن کہ میں نے اس عورت کو سمجھنے میں تعصب سے کام لیا۔ تم تو خیر صورت پر مرتے ہو مگر اندر سے وہ عورت بہت دکھی اور قابلِ رحم ہے۔ اس کی معصومیت کا خون کرنے والے اکبر خان جیسے بھیڑیے تھے ورنہ اس کی سرشت میں برائی آج بھی نہیں۔''

''یہ فلسفیانہ نتیجہ بڑی جلدی اخذ کیا تم نے۔''

''وہ صرف اچھی زندگی گزارنے کی خواہش مند تھی... میری طرح یا فریال کی طرح۔ بس اچھی صورت اس کی خطا بن گئی۔ جس نے ڈالی بری نظر ڈالی۔ اچھے خواب دکھائے اور بری تعبیر دی۔ اب وہ تمہیں دیوتا سمجھتی ہے لیکن اس کے اندر یہ ڈر ختم نہیں ہوتا کہ کہیں تم بھی شیطان ثابت ہوئے تو کیا ہوگا۔''

''کیا ہوگا؟'' میں نے ایک احمقانہ سوال کیا۔

''وہ کہتی ہے... میں خودکشی کر لوں گی۔ یہ فیصلہ بھی کر چکی ہوں کہ خود کو مزید رعایت نہیں دوں گی۔ زندہ رہنے کے اور جھوٹے بہانے تلاش نہیں کروں گی۔ کیا میری خوبصورتی میری بدبختی ہے کہ میں دل بہلانے کے لیے ایک سے دوسرے مرد کے بستر کی زینت بنتی رہوں، بکتی رہوں کسی طوائف کی طرح... اس سے تو اچھا ہوتا خدا نے مجھے بدصورت بنایا ہوتا۔''

''تمہارے خیالات میں یہ انقلاب دیکھ کے میں حیران ہوں کزن! کہیں یہ فریال کے ایکشن کا ری ایکشن تو نہیں۔''

اس سے پہلے کہ وہ جواب دے پاتی حویلی کے گیٹ پر کچھ شور سنائی دیا۔ اندر سے شہناز نے چلانا شروع کیا۔ ''رابعہ ناشتا کرنا ہے کہ نہیں؟ دیر ہو رہی ہے۔''

رابعہ اٹھی۔ ''آ رہی ہوں آ رہی ہوں... چلو نواب صاحب!''

میں نے کہا۔ ''تم شروع کرو... میں آتا ہوں۔ باہر کوئی آیا ہے مجھ سے ملنے... میں دیکھ لوں۔''

گیٹ کھلنے سے پہلے ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ ملاقاتی کون ہوگا۔ یہ عجیب اتفاق تھا کہ گزشتہ رات ہی ہم نے شامی بادشاہ کو یاد کیا تھا اور صبح اس کا نامہ بر آ گیا تھا۔ وہ دیوانہ اندر آ گیا جو بکار خویش واقعی ہوشیار تھا۔ اسے عام لوگ بڑی عقیدت سے مجذوب سمجھتے تھے لیکن میری معلومات کے مطابق وہ پولیس کا مخبر تھا۔ اس کا ثبوت یوں بھی ملتا تھا کہ نامی گرامی ڈاکو شامی بادشاہ کے اور میرے درمیان رابطہ اس دیوانے کے ذریعے ہوتا تھا۔

ہمیشہ کی طرح اس کے لمبے لمبے بال میلے کچیلے تھے اور گردن کی ہر جنبش کے ساتھ دائیں بائیں ہل رہے تھے۔ اس نے گھٹنوں سے نیچے تک آنے والا لمبا چوغہ پہن رکھا تھا۔ اس پر ہر رنگ کے کپڑے کی پیوند تھی۔ گلے میں پلاسٹک کے رنگین منکوں والی مالا پہنی تھی اور پیروں میں گھنگرو۔ اس نے ایک ہاتھ میں لوہے کے کڑے پہن رکھے تھے جن کو وہ اسی ہاتھ میں پکڑی ہوئی ایک ڈنڈی سے بجاتا تھا تو ان کی چھنک گھنگروؤں کی جھنکار کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتی تھی۔

وہ مستانہ وار رقص کرتے ہوئے گا رہا تھا۔ ''رانجھا رانجھا کر دی میں آپے رانجھا ہوئی۔'' سیکیورٹی گارڈ جو گیٹ پر اور چھت پر متعین تھے، بڑی عقیدت سے ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ وہ اسی طرح پھرتا رہتا تھا۔ کبھی بھی کہیں اور کسی بھی وقت نمودار ہو جاتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ شامی بادشاہ کا کوئی پیغام لے کر آیا ہے۔ یہ شامی بادشاہ نے خود اعتراف کیا تھا کہ اس کے خفیہ طور پر پولیس سے رابطے رہتے

ہیں اور جب وہ کوئی واردات کرتے ہیں تو ایمانداری سے مالِ غنیمت میں سے ایک حصہ پولیس کو بھی پہنچا دیتے ہیں۔ اس کے بدلے میں پولیس ان کی تلاش میں جو سرگرمی دکھاتی ہے وہ محض دکھاوے کی ہوتی ہے۔ وہ مشرق میں ہوں تو پولیس مغرب میں چھاپے مارتی ہے اور جب حقیقی خطرہ ہو تو انہیں پہلے سے خبر مل جاتی ہے۔ یہ مجذوب پولیس کا مخبر تھا لیکن یہ بات عام لوگ نہیں جانتے تھے چنانچہ وہ بے خوف وخطر ہر جگہ پہنچ جاتا تھا۔

میں نے قریب جا کے کہا۔ ''سائیں سرکار! آج تو بڑی موج میں ہو۔''

اس نے گانا روک کے ہاتھ اٹھایا۔ ''کوٹھے وسدے رہن... نصیب جاگدے رہن۔ مٹی سونا بن جائے۔ اگر تو فقیر کو ایک گھڑا لسی کا پلا دے۔ چٹے چاول تے کالے ککڑ دا پلاؤ کھلا دے۔''

مجھے ہنسی بھی آئی مگر وہ جانتے بوجھتے بے سروپا باتیں کرتا تھا اور لوگ اس سے اپنا اپنا مطلب نکالتے تھے۔ چونکہ عام لوگ اس کو بہت پہنچا ہوا خیال کرتے تھے، اس لیے میں بھی اسے پاگل قرار دے کر اس کو بے عزت کرنے سے گریز کرتا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کچھ دیر رکنا چاہتا ہے۔ لسی کا گھڑا پلانے میں تو دیر نہ لگتی لیکن کالے مرغ کا پلاؤ فوراً حاضر نہیں کیا جا سکتا تھا۔

میں نے کہا۔ ''سائیں سرکار کو عزت سے بٹھایا جائے اور ان کی فرمائش فوراً پوری کی جائے۔''

وہ وہیں بیٹھ گیا اور جھومنے لگا پھر اس نے چوغے میں سے ایک مٹی کا ''گلک'' نکالا۔ وہ گول سا مٹی کا برتن جس کے ایک سوراخ میں بچے پیسے ڈالتے رہتے ہیں۔ ''یہ رکھ... قارون کا خزانہ۔ تیری بادشاہت چلتی رہے۔''

میں نے وہ لے لیا اور اسے اپنے کمرے میں لا کے توڑا تو اس میں سے حسبِ توقع ایک کاغذ برآمد ہوا جس کو تعویذ کی طرح بنا کے اندر ڈالا گیا تھا۔ میں نے اسے کھولا تو یہ شامی بادشاہ کا خط تھا جو اس نے خود نہیں لکھا تھا۔ کسی سے لکھوایا تھا۔

''نواب دوست... بہت عرصہ ہوا تم سے ملے۔ کیا کریں ہماری زندگی میں مجبوریاں بہت ہیں۔ رکاوٹیں ہر راستے پر روک لیتی ہیں۔ خیر اب ہم تمہارے قریب ہیں مگر تمہارے مہمان نہیں ہو سکتے۔ اگر تم آج رات نکل آؤ تو ملاقات بھی ہوگی اور تمہارا ایک کام بھی ہو جائے گا۔''

میں نے راجا کو بلایا اور ہم سر جوڑے اس کام کی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کرتے رہے جس کا حوالہ شامی بادشاہ نے دیا تھا۔ خط میں کوئی تفصیل نہ تھی کہ ہم کہاں آئیں۔ کب آئیں اور کیسے مگر یہ اندازہ کرنا دشوار نہ تھا کہ جب میں ارادہ کر کے نکلوں گا تو کوئی نہ کوئی میری راہنمائی کے لیے موجود ہوگا۔

میرے نہ جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ سائیں سرکار کو ان کی خواہش کے مطابق کالے مرغ کا پلاؤ پکا کے پیش کیا گیا اور حسبِ فرمائش لسی کا گھڑا بھی۔ پلاؤ کھا کے اس نے گھڑا اٹھایا اور غٹ غٹ لسی پینے لگا۔ میرا اندازہ تھا کہ ایک یا دو گلاس کے برابر لسی پینا بھی اس کے لیے دشوار ہوگا مگر میری آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں جب اس نے گھڑے کو پیٹ میں انڈیل لیا۔ بے شک گھڑا چھوٹا تھا مگر میں اور راجا مل کے اسے خالی پیٹ بھی خالی نہیں کر سکتے تھے۔ خدا ہی جانے اس کے پیٹ میں کون سا کنواں تھا۔

دن کا کچھ حصہ میں نے اسپتال اور اسکول کے معائنے میں گزارا۔ اسکول ابھی تین کمروں تک محدود تھا۔ ایک میں تقریباً بیس بائیس لڑکے فرش پر بچھی ہوئی دری پر آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ ان کا نظم وضبط قابل تعجب تھا۔ کوئی شرارت کر رہا تھا نہ اونگھ رہا تھا۔ وہ سب بڑے انہماک سے انگریزی پڑھ رہے تھے۔ رابعہ نے بلیک بورڈ پر سی اے ٹی کیٹ جیسے الفاظ لکھ رکھے تھے۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اے بی سی کے سبق سے آگے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی ساری کلاس کھڑی ہو گئی۔ میرے لیے ضروری ہو گیا کہ میں ریاست کے حکمراں کا انداز سرپرستی اختیار کروں۔ میں نے دو چار بچوں سے ان کے نام وغیرہ پوچھے اور ان کے سر پر اپنا دستِ شفقت رکھا پھر رابعہ سے چاک لے کر بلیک بورڈ پر انگلش میں پاکستان لکھا۔ صرف ایک لڑکا اسے پڑھ سکا۔ میں نے اسے ۲ کا نوٹ انعام میں دیا۔ میں نے اردو میں ''قائداعظم'' لکھا۔ کافی غور کے بعد ایک لڑکے نے ہاتھ کھڑا کیا۔ اس نے کہا۔ ''محمد علی جناح...''

میرے ساتھ رابعہ کو بھی ہنسی آ گئی۔ ''نواب صاحب نے یہ نہیں لکھا ہے۔''

وہ بولا۔ ''میں نے مطلب بتایا ہے مس۔''

''لکھا کیا ہے؟'' رابعہ نے پوچھا۔

''قائداعظم۔'' وہ بولا۔ میں نے اسے بھی سو روپے دیے۔ لڑکیوں کے کمرے میں تعداد نصف سے بھی کم تھی مگر حیرت انگیز طور پر ان کی علمی استعداد زیادہ تھی۔ یہاں لیلیٰ بھابی استاد تھیں مگر میرے خیال میں کمال لڑکیوں کی زیادہ توجہ

اور محنت کا تھا۔ وہ گھر جا کے بھی پڑھتی تھیں جب کہ لڑکے باہر کھیل کود میں وقت گزارتے تھے یا کام کرتے تھے۔ میں نے ایک لڑکی سے بورڈ پر پاکستان لکھنے کے لیے کہا تو لکھنے سے پہلے اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''انگریزی میں جناب یا اردو میں۔'' پھر میں نے ''قائداعظم'' اور محمد علی جناح لکھنے کو کہا تو دو لڑکیوں نے لکھا۔ ایک نے انگلش میں۔ دوسری نے اردو میں۔ ظاہر ہے انہیں بھی سو سو روپے ملے۔

اسپتال والے حصے میں بڑی ہڑبونگ مچی تھی۔ ریشم کے نہ ہونے سے شہناز کو اکیلے ہی سب سے نمٹنا پڑ رہا تھا۔ ایک طرف قطار میں پندرہ بیس عورتیں اس سے دگنی تعداد میں بچوں کے ساتھ بیٹھی تھیں جو سب کے سب مختلف والیوم پر رونے چلانے کا مقابلہ کر رہے تھے۔ بیشتر نے صرف قمیص پہن رکھی تھی جس کے دامن سے بار بار ان کی ناک پونچھی جاتی تھی تو اس کی افادیت بھی صفر ہو جاتی تھی۔ عورتیں بھی اپنی فریاد وفغاں سے خود کو سب سے زیادہ دکھی اور اولین توجہ کا مستحق ثابت کرنے کے لیے کوشاں تھیں۔ شہناز نے سب کو ڈانٹ کے بٹھا دیا تھا ورنہ وہ قطار میں کھڑی ہوتی تھیں تو ایک دوسرے کو دھکیلتی تھیں اور ڈاکٹر صاحبہ کی میز پھلانگنے لگتی تھی۔ اب اپنی باری پر ایک اٹھ کے آگے آتی تھی اور دوا لے کے پیچھے سے نکل جاتی تھی۔ واقعی یہ شہناز کا حوصلہ تھا جو ان کی فضول باتوں کے ڈھیر سے کام کی بات نکالتی تھی اور دوا دے کر انہیں کم سے کم وقت میں چلتا کرتی تھی۔ دل جمعی سے سنتی تو شاید دن بھر میں دو چار کی حالت ہی سنتی۔ دوسری طرف قطار میں بیٹھے ہوئے مرد زیادہ صابر تھے اور عورتوں کو تاڑنے کے ساتھ فضول باتوں میں مصروف تھے۔ ان میں بیمار کم ہی لگتے تھے۔

میری آمد نے ایک زلزلہ اور غلغلہ پیدا کیا۔ ایک ساتھ سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ مرد مجھ سے مصافحے کی سعادت حاصل کرنے لپکے۔ عورتیں کچھ دعائیں دینے لگیں کچھ شکایت کرنے لگیں۔ شہناز کو وقتی طور پر علاج معالجے کا عمل روکنا پڑا۔ میں نے رسماً پوچھا کہ دوا سب کو مل رہی ہے نا؟ جواب میں پھر تعریف وتوصیف کا شور اٹھا اور شہناز نے انگلش میں مجھ سے کہا کہ اب آپ تشریف لے جا سکتے ہیں۔ میں نے بھی انگلش میں اپنی خودی کو بلند رکھتے ہوئے کہا کہ ہم جا رہے ہیں، بے عزتی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

دوپہر سے شام تک کے وقت میں نے راجا اور غنی کے ساتھ مختلف انتظامی مسائل ڈسکس کیے۔ راجا کو میں نے ٹرانسپورٹ کے مسائل حل کرنے پر مامور کیا اور طے یہ ہوا کہ فی الحال ایک فور بائی فور ڈبل کیبن پک اپ لی جائے۔ ایک ہائی روف جو ایمبولینس کے طور پر بھی استعمال ہو سکے اور ایک کار۔ غنی کی جذباتی خواہش تھی کہ میں رانا کے مقابلے پر لینڈ کروزر استعمال کروں۔ چم چم کرتی سیاہ جس کے آگے جھنڈا لہراتا ہو۔

میں نے کہا۔ ''غنی! میں اسمبلی کا رکن ہوں نہ کسی پارٹی کا۔''

''پھر کیا ہوا جی... یہاں کون پوچھتا ہے... آپ پاکستان کا جھنڈا لگائیں۔''

میں نے کہا۔ ''وہ ہر شخص نہیں لگا سکتا... جرم ہے۔''

''اچھا تو پھر آپ ایسا کریں...'' اس نے سوچ کے کہا۔ ''ست بدھائی کی ریاست کا جھنڈا لگالیں۔''

''ایسا تو کوئی جھنڈا نہیں۔''

''نہیں ہے تو بنا لیتے ہیں جناب عالی۔ اُدھر حویلی پر بھی لہرائے گا اور گاڑی پر بھی... رعب پڑتا ہے۔''

مجھ سے پہلے راجا نے کہا۔ ''بالکل صحیح کہا تم نے لیکن تمہاری لینڈ کروزر والی تجویز سے مجھے اتفاق نہیں۔ وہ ذرا

غیر محفوظ ہوگی۔ ڈبل کیبن ہائی لکس جو''سرف'' کے نام سے آتی ہے۔ بہتر ہے۔ اس کے پچھلے کھلے حصے میں مسلح محافظ مخالف سمت میں رخ کر کے بیٹھ سکتے ہیں۔ پیچھے سے کوئی حملہ نہیں کرسکتا۔ سامنے تو نظر آتا ہے۔''

غنی نے دوسرا غور طلب مسئلہ پیش کیا۔''جناب عالی! آپ نے بہت پہلے مجھ سے کہا تھا کہ ریاست کی حد بندی کرنے والی دیوار کئی جگہ سے بالکل غائب ہوگئی ہے۔''

میں نے کہا۔''ہاں پھر؟''

''حد یہ ہے کہ پابندی ہونے کے باعث لوگ غیر قانونی طور پر اندر آ کے درخت کاٹتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ خطرہ بھی ہے کہ پٹواری نقشے میں گڑبڑ کر کے ہماری زمین کم کر کے اپنی زمین میں شامل نہ کر دے۔''

میں نے کہا۔''کیا ایسا ہوسکتا ہے؟''

''ریاست کی مشرقی حد رانا کی زمین سے ملتی ہے۔ خرچا تو ابھی ہوگا مگر بعد میں خرچے کے ساتھ مقدمے بازی بھی ہوگی۔ برسوں لگ جائیں گے زمین کا قبضہ واپس حاصل کرنے... ابھی ہم چاروں طرف دیوار کھینچ دیں۔''

راجا بولا۔''چاروں طرف! دیوارِ چین ہو جائے گی وہ تو۔''

غنی نے اپنی تجویز میں ترمیم لائی۔''چلیں مغرب اور جنوب کی طرف ہم تاروں کی باڑھ لگا سکتے ہیں لیکن مغرب میں پکی دیوار ہونی چاہیے اور شمال کی طرف بھی۔ اس پر تار لگا کے ان میں کرنٹ چھوڑ دینا چاہیے۔''

میں نے کہا۔''یہ دیوار کتنی لمبی ہوگی... اندازاً!''

''مشرق کی طرف ایک کلومیٹر سے کچھ کم۔ شمال کی طرف ڈیڑھ کلومیٹر۔ اس کا خرچ؟''

میں نے اس کی بات کاٹ دی۔''خرچ پر مجھے یاد آیا۔ تمہاری تو ابھی حال ہی میں شادی ہوئی ہے غالباً... کل پرسوں۔ اس پر کتنا خرچا ہوا تھا۔ پہلے تو یہ بتاؤ۔''

اس نے کہا۔''آپ کی مہربانی ہے جناب۔''

میں نے اسے ڈانٹا۔''مہربانی کے بچے۔ تمہاری دلہن کہاں ہے؟''

وہ مسکرایا۔''وہیں سر! کچن میں۔''

میں نے کہا۔''شرم نہیں آتی تمہیں۔ دو دن کی دلہن کو تم نے کھانا پکانے میں لگا دیا۔''

''سر! مجھے تو کھانا پکانا نہیں آتا۔''

''بک بک بند کرو۔ رات کو کیا تم یہ حساب کرتے ہو کہ کتنی لمبی دیوار بنے گی، اس میں کتنی اینٹیں لگیں گی اور کیا خرچ ہوگا۔''

وہ کچھ پریشان ہوا۔''نہیں سر!''

میں نے کہا۔''جاؤ... ابھی جاؤ اور تیاری کرو۔ تمہیں شام تک یہاں سے نکل جانا ہے ورنہ...''

وہ گھبرا گیا۔''جناب عالی میرا قصور۔''

میں نے دھاڑ کے کہا۔''تمہارا قصور؟ ایک تو شادی کی ہے تم نے۔''

راجا بولا۔''لو میرج نواب صاحب! لو میرج۔''

''یہ اور سنگین بات ہے۔ ابھی تک تم اپنی دلہن کو ہنی مون پر لے کر نہیں گئے۔ سارے کام اور ساری فکریں چھوڑ دو۔ پندرہ دن کے لیے تم دونوں جاؤ۔ جہاں چاہو جاؤ۔ گھومو پھرو۔ خبردار جو اس سے پہلے واپس آئے۔ تمہارا سارا خرچا ریاست برداشت کرے گی۔''

اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔''لیکن جناب عالی!''

''جاتے ہو یا ہم بلائیں پولیس کو کہ وہ لے جائے تمہیں۔''

شام کو جب وہ دونوں شرماتے ہنستے روانہ ہوئے تو ان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔ ریشم کی ماں فاطمہ رو رہی تھی اور مجھے جھولی پھیلا کے دعائیں دے رہی تھی۔ حد یہ ہے کہ معزز خواتین ایسے ٹپ ٹپ آنسو بہا رہی تھیں جیسے بہن کی رخصتی کا سین ہو۔ واقعی اب حویلی اور خالی ہوگئی تھی۔

ان کے جانے کے بعد مجھے سائیں سرکار کی یاد آئی۔ اس کے ایک عقیدت مند گارڈ نے بتایا کہ سائیں سرکار کی حالت خراب ہے۔ وہ حویلی کے باہر جھاڑیوں میں پڑا پایا گیا۔ اس کا سارا کھایا پیا نکل گیا تھا۔ کچھ آگے سے کچھ پیچھے سے۔ کالے لنگر کے پلاؤ تک ٹھیک تھا۔ ایک گھڑا لسی کا پینے سے وہ تقریباً ہیضے کا شکار ہوگیا۔ راجا کے مطابق لسی اس کے معدے کے علاوہ دل جگر گردوں اور پھیپھڑوں تک پہنچ گئی ہوگی۔ اسے اندر لایا گیا تو وہ سارا ڈراما بھول چکا تھا۔ شہباز کی فوری طبی امداد نہ ملتی تو سائیں سرکار ایک مزار شریف میں رونق افروز ہوتے۔

مجھے تشویش لاحق ہوگئی کہ اب شاہی بادشاہ تک میرا راہبر کون ہوگا۔ مغرب کے بعد میرے فون کی گھنٹی بجی تو میں نے اس پر شہزاد کا نمبر دیکھا۔

میری ہیلو کے جواب میں نور جہاں کی آواز آئی۔

''کنیز تسلیم بجا لاتی ہے نواب صاحب! مزاج عالی؟''

میں چونکا۔''نور جہاں تم کیسی ہو؟''

''اب پوچھ رہے ہو جب میں نے پوچھا۔''

میں نے کہا۔''آج صبح رابعہ سے تمہارے بارے میں ہی بات کر رہا تھا لیکن تمہیں یہاں فون کرنا نہیں چاہیے تھا۔''

''دل کے ہاتھوں تو مجبور نہیں ہوئی تھی۔ خود پر جبر اور صبر کر لیا تھا لیکن ایک ذمے داری نے مجبور کر دیا۔''

''کسی کا پیغام تم تک پہنچانا تھا۔ معلوم نہیں کون تھا۔ مذاق کر رہا تھا یا سیریس تھا۔ فون پر شہزاد کا پوچھا۔ میں نے بتایا کہ وہ تو کورٹ سے واپس نہیں آئے۔ کہنے لگا کہ ان کا موبائل فون نمبر دے دو۔ میں نے کہا کہ مجھے معلوم نہیں۔ اس نے پوچھا کہ آپ کون ہیں ان کی وائف؟ میں نے کہا کہ ان کی شادی ہوئی تو مجھ سے بہرحال نہیں ہوگی۔ وہ خاموش ہوگیا پھر کہنے لگا کہ وہ نواب صاحب کے دوست ہیں۔ اب میں نے سیریس ہو کے کہا کہ ان کی دشمن میں بھی نہیں ہوں۔''

''یہ تم نے جھوٹ بولا۔ اللہ تمہیں معاف کرے۔''

''اللہ ایسا کہنے پر تمہیں معاف کرے۔ خیر۔ اس نے کہا کہ بس ایک پیغام پہنچانا تھا ان تک۔ ان سے کہہ دیں کہ آٹھ بجے روانہ ہوں۔ میں نے کہا کہ کہاں کے لیے روانہ ہوں۔ آپ کون ہیں مگر فون بند ہوگیا تھا۔''

''تم نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ خدا حافظ!''

''ارے سنو... اتنے بے مروت اور کٹھور نہ بنو۔ یہ بتاؤ اب کب آؤ گے؟''

میں نے کہا۔''سوری... اس کا کوئی امکان نہیں... فی الحال۔'' اور فون بند کر دیا۔ گھنٹی پھر بجی لیکن میں نے جواب نہیں دیا۔ گھنٹی بجتی رہی اور پھر بند ہوگئی۔ دوسری بار پھر ایسا ہی ہوا۔ نور جہاں نے ہمت نہیں ہاری اور کال ملاتی رہی۔ اب میرے لیے ایک ہی راستہ تھا کہ موبائل فون کو آف کر دوں۔ یہ میں نے نہیں کیا اور بالآخر اسے جواب دینے پر مجبور ہوگیا۔

''کیوں پریشان کر رہی ہو مجھے۔'' میں نے کہا۔

وہ ہنسی۔''اور کسے پریشان کروں چندا... پریمی کا دکھ پریمی جانے اور نہ جانے کوئی۔''

''تم جانتی ہو... داؤ پر تمہاری زندگی لگی ہوئی ہے اور تمہارے ساتھ میری۔''

''ہاں جانتی ہوں۔ اب سے نہیں... تب سے۔''

''کب سے؟''

''جب سے یہ دل دیوانہ ہوا تمہاری چاہت میں۔ کیا یہ بات تم نہیں جانتے جو مجھ سے پوچھ رہے ہو۔ بتاؤ نا کب تک نہیں آؤ گے آخر۔''

''فی الحال کا لفظ استعمال کیا تھا میں نے۔ کچھ دن کی بات ہے۔''

''پھر کیا ہوگا؟'' وہ جیسے روٹھ گئی۔

''تم لندن پہنچ جاؤ گی۔''

''گھر سے نکالا۔ اب دیس نکالا دے رہے ہو۔ اس کے بعد دل سے بھی نکال دو گے۔ بیچ میں سات سمندروں کی دوری آجائے گی۔''

''وہاں کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ تمہارے لیے!''

''اور تمہارے لیے بھی۔ تم کسی بھی وقت آجا سکو گے پھر میں جی سکوں گی۔ تمہارا انتظار ہوگا تو امید بھی ہوگی لیکن ایک بات بتا دوں ابھی سے۔ اگر تم نے سمجھا کہ نور جہاں سے جان چھڑا لی ہمیشہ کے لیے تو یہ تمہاری بھول ہے۔ میں مرنے سے نہیں ڈرتی۔ میں جان ہتھیلی پر رکھ کے بھی آجاؤں گی۔ یہ جو کچھ میں اپنی جان بچانے کے لیے کر رہی ہوں۔ اپنے لیے نہیں ہے۔ تمہارے لیے ہے۔ تم نہ ہوتے تو مجھے زندگی کی کوئی خواہش نہ ہوتی۔''

''ڈائیلاگ مت مارو۔''

''میں سچ کہہ رہی ہوں۔ میرا دل بھر گیا تھا جینے سے۔ ایسی زندگی کس کام کی جس میں اپنا کوئی نہ ہو!''

میں نے کہا۔''او کے... میں لندن آؤں گا۔''

''صرف مجھ سے ملنے۔''

''صرف تم سے ملنے بابا... اب تو خوش ہو۔ خدا حافظ''

''بس یہ اور بتا دو... میں امید رکھوں؟ تمہارے آنے کی؟'' وہ جلدی سے بولی۔

''یہ تمہاری مرضی... میں کوئی رسک نہیں لے سکتا۔''

''فی الحال...'' وہ ہنسی پھر دوسری طرف سے بولنے کی آواز سنائی دی اور فون بند ہوگیا۔

میں نے پلٹ کے دیکھا تو رابعہ مجسم سوال بنی مسکرا رہی تھی۔

میں نے کہا۔''کزن! مجھے جانا ہے۔''

وہ مسکرائی۔''اور سب کے سامنے جھوٹ بولتے ہو، اتنی ڈھٹائی سے کہ تمہیں نہیں اسے عشق ہے تم سے۔''

''میں کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں کزن... جیسے میرا دل مرغ باد نما ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ سر کھجانے لگی۔''یہ کس نسل کا مرغا ہوتا ہے۔''

''جاہل لڑکی۔ یہ ہوا کا رخ بتانے والا آلہ ہوتا ہے جو مچھت پر لگاتے ہیں۔ ہوا رخ بدلتی ہے تو یہ بھی بدل لیتا ہے۔''

''یار اسے مرغ یا مرغی کہنے کی کیا ضرورت ہے۔''

''اس کا یہ نام میں نے نہیں رکھا۔ کہنے کا مطلب یہ تھا

کہ پہلے فریال کی طرف تھا۔ پھر عشق کی ہوا بدل گئی تو نور جہاں کی طرف ہوگیا۔ اب میں محسوس کرتا ہوں کہ دل تم پر آرہا ہے۔ ہوا جو بدل گئی ہے۔"

وہ ہنسی۔ "آنے دو... مجھے تو بڑی خوشی ہوگی کہ ایک ساتھ دو چاہنے والے پیدا ہوگئے۔"

"دوسرا کون؟ وہ شہزادہ... کیا اس نے باقاعدہ کوئی اعلان کردیا ہے کہ اسے تم سے محبت ہوگئی ہے۔"

"اب تم سے کیا پردہ کزن۔ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔ تیسری طرف تم ہو۔ کیا تم اسے چیلنج کرو گے۔ ڈوئیل کے لیے۔ ایک مارا جائے گا۔ دوسرے سے میں اخلاقاً شادی کرلوں گی۔"

"معاف کیجیے خاتون۔ کافی خوش فہمی ہے آپ کو اپنے بارے میں۔ تفریحاً تو میں محبت کرسکتا ہوں آپ سے اگر اور کوئی نہ ہو مگر آپ کے لیے جان دوں... اتنا پاگل بھی نہیں ہوں اور ابھی تو نور جہاں موجود ہے۔ میں بعد کے امکانات کی طرف اشارہ کررہا تھا جب وہ لندن چلی جائے گی۔ بطور کزن پہلا حق میرا نہیں ہے تم پر!"

"مذاق چھوڑو۔ تم اس سے ملنے گئے تو میں تمہیں قتل کردوں گی... اگر کسی اور نے نہ کیا تو۔" وہ میرے سامنے کھڑی ہوگئی۔

اسی وقت شہناز وہاں آگئی، میں نے کہا۔ "سائیں سرکار اللہ کو پیارے ہوگئے۔"

شہناز مسکرائی۔ "ابھی تو نہیں... مگر حالت پتلی ہے۔"

رابعہ بولی۔ "ذرا مجھے کوئی توپ یا بندوق لا دینا... نواب صاحب پھر کمربستہ ہیں اُدھر جانے کو... نور جہاں کی طرف۔"

شہناز نے مجھے دیکھا۔ "کیا واقعی؟"

میں نے حیرانی سے رابعہ کو دیکھا۔ "تمہارا تو دماغ واقعی چل گیا ہے۔ میں نے کب کہا ہے... مجھے شامی بادشاہ نے بلایا تھا... لیکن اس کا نامہ بر چٹے چاول تے کالے ککڑ دا پلاؤ کھا کے لمبا لیٹا ہوا ہے۔"

رابعہ دانت پیس کے میری طرف بڑھی۔ "ڈراما کررہے تھے میرے ساتھ اتنی دیر سے۔" اس نے میری گردن دونوں ہاتھوں سے دبائی۔

"رابعہ! چھوڑو، یہ تو دونوں ڈرامے کرتے ہی رہتے ہیں۔" شہناز نے ہنستے ہوئے کہا۔

میں نے کہا۔ "بس کزن! مزید زور مت لگاؤ... میں فوت ہوچکا۔"

صورتِ حال میں نے راجا کے سامنے رکھی تو وہ بھی تشویش میں مبتلا ہوگیا۔ "سائیں سرکار کی پیغام رسانی پر شک و شبے کی کوئی بات نہیں۔" راجا نے کہا۔

"اب مجھے اس میں بھی شک کا ایک پہلو نظر آتا ہے۔ آخر شامی بادشاہ نے اپنی تحریر میں پیغام کیوں نہیں بھیجا؟ وہ لکھ نہیں سکتا تھا یا لکھنا نہیں چاہتا تھا؟"

راجا نے کہا۔ "یہ ہم سائیں سرکار سے معلوم کرسکتے ہیں۔"

"وہ کیا بتائے گا... یہ پیغام نہ جانے کہاں لکھا گیا اور کب... سائیں سرکار کون سا وہاں موجود تھا۔ اسے صرف کوریئر کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے... کہ یہ پیغام فلاں کو پہنچادو... اسے خود پتا نہیں ہوگا کہ پیغام کیا ہے۔"

"چلو پوچھ کے دیکھ لیتے ہیں مگر زیادہ شک مجھے جہانگیر کی نور جہاں پر ہے۔"

"کیا مطلب! اس نے جھوٹ بولا ہوگا مجھ سے۔"

"نہیں۔ کسی نے اس سے جھوٹ نہ بولا ہو، وہ کیا جانے فون کرنے والا کون تھا۔ اس نے اپنا تعارف تو نہیں کرایا تھا۔"

"وہ سب ٹھیک ہے لیکن اس کا پیغام سائیں سرکار کے پیغام کے تسلسل میں ہے... حصہ دوم۔ میں سوچ رہا تھا کہ اسی وقت جاؤں... آگے کوئی ضرور ملے گا جو مجھے لے جائے گا۔"

"یہ بہت بڑا رسک لگتا ہے مجھے۔" راجا متفکر ہوگیا۔

"پھر کیا کرنا چاہیے مجھے... میں نہ جاؤں؟"

"چل پہلے سائیں کی مزاج پرسی کرلیں۔ وہ انفارمیشن پاس کیے بغیر ہی اوپر کی فلائٹ نہ پکڑ لے۔" راجا بولا۔

سائیں فرش پر لیٹا ہوا مردہ ہی لگتا تھا۔ اس کے جسم کے اندر سے لسی اور پلاؤ خارج ہوجانے کے بعد پانی نکل رہا تھا جس کو ڈی ہائیڈریشن کہا جاتا ہے۔ شہناز نے ایمرجنسی میں طبی امداد نہ دی ہوتی تو وہ بہت پہلے ہی کوچ کرجاتا۔ اس کے ایک ہاتھ میں گلوکوز کی ڈرپ لگی ہوئی تھی جس سے ری ہائیڈریشن سالٹ قطرہ قطرہ جسم میں پانی کی کمی دور کررہا تھا۔

میرے آواز دینے پر اس نے آنکھیں کھولے بغیر کہا۔ "آگئے ہو عزرائیل صاحب! کلمہ پڑھ لوں؟" پھر اس نے کلمہ پڑھا۔

میں نے کہا۔ "سائیں سرکار! میں موت کا فرشتہ نہیں نواب رفیق ہوں۔"

اس نے آنکھیں کھول کے مجھے دیکھا۔ "بڑا ظالم ککڑ تھا جی، کسی نے اس پر کچھ پڑھ دیا تھا... یا اس میں بدروح تھی۔"

میں نے کہا۔ "دیکھو... ڈراما مت کرو میرے سامنے... یہاں دیکھنے والا اور کوئی نہیں ہے۔ کالے ککڑ کا پلاؤ تو نکل گیا... اب اسی راستے پر میں... لال مرچ پمپ کروں تو یہاں بھنگڑا ڈالتے نظر آؤ گے۔"

"یا میرے مولا...! یہ کی پے گیا روالا۔" وہ کراہا۔

"تم پولیس کے مخبر ہو، مجھے معلوم ہے کہ تم شامی بادشاہ کے لیے بھی کام کرتے ہو۔ یہ پیغام پہنچانے کے لیے کس نے دیا تھا؟"

وہ آنکھیں گول گول گھماتا رہا۔ "اپنا ہی بندہ ہے جی... وہی ہمیشہ پیغام لاتا ہے۔"

"مجھے کچھ شک ہورہا ہے۔"

"شک کا علاج حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا بابا!"

"ہاں۔ مگر میرے پاس ہے... اگر کوئی گڑبڑ ہوئی تو پھر تمہیں بھی اندازہ ہوجائے گا کہ علاج کتنا زبردست ہے۔ ہم آس پاس کے سارے کتوں کی دم سیدھی کرچکے ہیں، اگر ہم جنگل کے بادشاہ سے کہیں کہ گدھے کی آواز نکالو تو وہ نکالتا ہے۔"

وہ گڑگڑانے لگا۔ "فقیر نے آج تک خدمت کی ہے اسے کیوں دہلاتے ہے... دم نکل گیا تو خون ناحق آپ کی گردن پر ہوگا نواب صاحب! شامی بادشاہ سے کوئی مائی کا لال دھوکا کرسکتا ہے... اس کی اگلی پچھلی سات نسلوں کا خانہ خراب ہوجائے۔"

ہم باہر آگئے۔ سائیں سرکار کی حد تک کوئی بات نہ تھی۔ راجا نے اس کے باوجود سیکیورٹی کی ضرورت کو نظرانداز نہیں کیا۔ ٹھیک آٹھ بجے میں گھر سے کرولا کار میں اکیلا ہی روانہ ہوا لیکن پچھلی سیٹ پر راجا لیٹا ہوا تھا اور اس کے پاس بھرا ہوا ریوالور تھا۔ دو گارڈ ڈکی میں بند تھے اور ڈکی تھوڑی سی کھلی ہوئی تھی۔

ہمارے لیے فکرمندی کا دوسرا پہلو حویلی میں کسی بھی ذمے دار شخص کا نہ ہونا تھا، غنی جو حفاظتی امور میں سب سے زیادہ فعال کردار ادا کرتا تھا اسے خود ہم نے رخصت پر بھیج دیا تھا۔ راجا میرے ساتھ تھا اور حویلی میں صرف سیکیورٹی گارڈ تھے۔ کسی موقع پر ان کی طرف سے کسی کوتاہی کی شکایت سامنے نہیں آئی تھی لیکن کچھ معاملات ان کے دائرۂ اختیار سے باہر ہوتے تھے اور وہ فیصلے کے لیے ہماری طرف ہی دیکھتے تھے۔ خواتین لاکھ سمجھدار سہی ناگہانی صورتِ حال سے اس طرح نہیں نمٹ سکتی تھیں جیسے ہم نمٹتے تھے کیونکہ ان کا حویلی سے باہر کے معاملات میں عمل دخل نہ تھا۔

گاڑی رہتاس سے گزر کے سڑک پر پہنچی تو تاریکی میں ڈوبے ہوئے جنگل کے ایک درخت کی اوٹ سے نکل کر کوئی شخص عین سڑک کے درمیان آکھڑا ہوا۔ میں نے راجا کو پہلے ہی خبردار کردیا تھا۔ ہم دونوں نے ریوالور نکال لیے تھے لیکن وہ شخص جس نے کالی چادر اوڑھ رکھی تھی، سڑک کے بیچ میں بڑے سکون کے ساتھ دونوں ہاتھ پھیلائے کھڑا تھا۔ یہ راستہ روکنے سے زیادہ اپنے خالی ہاتھ دکھانے کے لیے تھا۔

میں نیچے اترا تو اس نے ہاتھ اٹھا کے سلام کیا۔ "خیر ہو وڈے نواب صاحب دی۔"

میں نے کہا۔ "کون ہو تم؟"

اس نے چہرے سے چادر ہٹائی۔ "مجھے شامی بادشاہ نے بھیجا ہے جناب عالی!"

میں نے اسے پہلے دیکھا تھا۔ اپنی حویلی میں یا شامی کے ڈیرے پر لیکن مجھے اس کا نام یاد نہ آیا۔ "ٹھیک ہے... کیا مجھے اپنی گاڑی میں جانا ہوگا؟"

"نہیں جناب عالی! ہم گاڑی لائے ہیں۔" اس نے کہا۔

گاڑی مجھے کہیں نظر نہیں آرہی تھی لیکن اس کی بات پر یقین کیا جاسکتا تھا۔

میں نے راجا سے کہا۔ "بس اب تو جاؤ واپس۔"

راجا نے کہا۔ "اپنا موبائل فون بند مت کرنا۔"

جب مجھے لانے والی گاڑی پلٹ کے چلی گئی تو میرے راہبر نے سڑک چھوڑ کے جنگل کا رخ کیا تو میں اس کے پیچھے تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پین ٹارچ تھی جس کی محدود روشنی کا مختصر دائرہ چار فٹ تک راستہ دکھانے کے لیے کافی تھا۔ میں دو بار پہلے بھی شامی بادشاہ کے ڈیرے تک جاچکا تھا۔ وہ اسی طرح خفیہ راستوں کا انتخاب کرتے تھے۔

تقریباً آدھا کلومیٹر یا کچھ زیادہ فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک کچا راستہ آگیا جس پر دن کے وقت تانگے وغیرہ بھی بڑی مشکل سے گزرتے ہوں گے۔ وہاں پہلے مجھے کچھ دکھائی نہیں دیا... پھر ایک سایہ سا نظر آیا، کوئی تاریکی میں موٹر سائیکل لیے کھڑا تھا۔ اس نے بھی مجھے مخصوص انداز میں ہاتھ اٹھا کے سلام کیا۔ "خیر ہووے وڈے نواب صاحب دی۔" اور پھر کک مار کے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی۔ "تشریف رکھو جناب عالی!"

میں موٹر سائیکل پر اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔ مجھے یہاں تک لانے والا وہیں کھڑا رہا۔ موٹر سائیکل کچے راستے پر ہچکولے کھاتی آگے بڑھ گئی۔ فاصلے کا اندازہ کرنا دشوار تھا، مجھے اپنی رسٹ واچ کے روشن ہندسے نظر آرہے تھے۔ گھڑی کے

مطابق میں نے آدھا گھنٹا موٹر سائیکل پر سفر کیا۔ عادت نہ ہونے کی وجہ سے اس سفر میں میرے سارے جوڑ ہل گئے۔ میں احتجاج کر سکتا تھا اور نہ سوال کہ کیا شامی بادشاہ کے پاس اب صرف دو پہیوں والی سواری رہ گئی ہے۔

وہ شخص جنگل کے کچے راستوں سے ایسے واقف تھا جیسے لاہور کے قدیم شہر کے باشندے پُر پیچ گلیوں کو جانتے ہیں۔ گڑبڑ یہ تھی کہ وہ ہیڈ لائٹس کے بغیر ڈرائیونگ کر رہا تھا اور آسمان پر چاند تک نہ تھا کہ اس کی دھندلی روشنی غنیمت ہوتی۔ میں حیران تھا کہ موٹر سائیکل سوار کو راستہ کیسے سوجھ رہا ہے۔ اس نے چمگادڑ کی آنکھیں لگا رکھی ہیں یا کوئی ریڈار اس کی راہنمائی کر رہا ہے۔

بالآخر مجھ سے برداشت نہ ہوا۔ میں نے اس کے کان میں چلّا کے کہا۔ ''آخر تم ہیڈ لائٹس آن کیوں نہیں کرتے ہو؟''

اس نے پلٹ کر جواب دیا۔ ''ہیڈ لائٹ نہیں ہے سر!''

''پھر تم راستہ کیسے دیکھ رہے ہو؟''

اس نے کہا۔ ''میں نے اندھیرے میں دیکھنے والی عینک جو لگا رکھی ہے۔''

میں نے خود کو سخت احمق تصور کیا۔ یہ مجھے پہلے ہی سمجھ لینا چاہیے تھا کہ اس کی عینک کوئی عام عینک نہیں ہے... اور اگر اب تک ہم کسی درخت سے نہیں ٹکرائے یا کسی گڑھے میں نہیں گرے تو یہ محض خوش قسمتی یا اتفاق نہیں تھا۔ آدھے گھنٹے بعد میرا حوصلہ جواب دینے لگا۔

میں نے کہا۔ ''یار اب اور کتنی دور جانا ہے اس گھوڑے پر؟'' وہ جیسے میرے سوال کا ہی منتظر تھا، وہ ایک دم رک گیا۔

''معاف کرنا جنابِ عالی! آپ کو بڑی تکلیف ہوئی... لیکن اُدھر گاڑی نہیں آ سکتی تھی۔''

میں نے جسم کے جوڑ اپنی جگہ بٹھانے کے لیے ہاتھ پیر چلائے اور اِدھر اُدھر دیکھا۔ گاڑی مجھے اب بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے یہ پوچھنے سے گریز کیا کہ آگے کا سفر اونٹ پر ہوگا یا خچر پر۔ پھر میں نے گاڑی کے انجن کی غراہٹ سنی اور ایک سیاہ پجیرو درختوں میں سے نکل کے میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ میں پیچھے والی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ موٹر سائیکل سوار نے مجھے ہاتھ اٹھا کر سلام کیا اور گاڑی کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

کسی اجنبی شہر میں رات کے وقت مجھے اس طرح گھما پھرا کے کہیں لے جایا جاتا تو مجھے سڑک یاد رہتی اور نہ گلی۔ ویران راستوں پر مجھے ڈائریکشن ہی بھول گئی اور یہ اندازہ کرنا بھی دشوار ہو گیا کہ میں مشرق کی طرف جا رہا ہوں یا شمال کی جانب رواں ہوں۔ بالآخر ایک سڑک آ گئی اور گاڑی نے اسپیڈ پکڑی۔ یہ وہی پرانی پجیرو تھی جس پر میں پہلے بھی سفر کر چکا تھا۔ ڈاکوؤں کے لیے گاڑی کا پر آسائش ہونا اہم نہیں ہوتا جتنا تیز رفتار اور بھروسے کے قابل ہونا۔ عام گاڑی صرف وی آئی پی موومنٹ اور خصوصی تقریبات کے لیے مخصوص تھی۔ موٹر سائیکل کے جھٹکوں والے سفر کے بعد مجھے اس میں زیادہ ہی راحت محسوس ہو رہی تھی۔

میرے سفر کا اختتام ڈیڑھ گھنٹے بعد ساڑھے نو بجے ایک بلند فصیل والی عمارت کے گیٹ پر ہوا جو کافی حد تک سرگودھا کی حویلی سے مشابہ تھی۔ ڈرائیور نے ہارن بجایا۔ لکڑی کے بھاری بھرکم گیٹ کے ایک پٹ میں دریچہ سا کھل گیا اور کسی نے باہر جھانک کر اپنا اطمینان کیا پھر گیٹ کھول دیا گیا۔ اس عمارت سے کچھ فاصلے پر مجھے کسی گاؤں کی آبادی کے خدوخال نظر آ رہے تھے۔ گاؤں کے سرِ شام سو جانے کے عادی باسی اس وقت گہری نیند میں ہوں گے لیکن اس عمارت کے اندرونی حصے میں بڑی چہل پہل تھی۔

ایک میدان جیسے احاطے میں شامیانہ لگا ہوا تھا اور تیز روشنی والے مرکری بلب دو دائرں میں جگمگا رہے تھے۔ بیرونی دائرہ بڑا تھا اور پورے پنڈال کو روشن کرتا تھا۔ چھوٹا دائرہ وسط تک محدود تھا اور اس کی روشنی زمین سے تقریباً ایک فٹ اونچے گول چبوترے یا اسٹیج پر چکاچوند پیدا کر رہی تھی۔ پنڈال میں اس وقت بھی بیس پچیس افراد مختلف کاموں میں مصروف تھے۔ جب میں اترا تو میرے کانوں میں ہارمونیم اور طبلے کی تھاپ کی آواز پڑی۔ یہ سازندے تھے جو درمیانی حصے میں بیٹھے اپنے اپنے سازوں کے سر ملا رہے تھے یا وقت گزاری کے لیے سنگت کی مشق کر رہے تھے۔

ابھی میں کسی مجرے کے امکان پر غور ہی کر رہا تھا کہ اندر کی طرف سے شامی بادشاہ نمودار ہوا۔ اسے بیساکھی کے سہارے چلتا دیکھ کے مجھے شاک لگا۔ اس کے پیچھے ایک دراز قد دیو ہیکل پہلوان جیسا شخص لڑھکتا چلا آ رہا تھا۔ وہ ہر طرف جس حد تک پھیل سکتا تھا... پھیل چکا تھا۔ اس کے چہرے پر سیاہ و سفید ڈاڑھی ایک مشت سے زیادہ تھی۔

شامی بادشاہ ہاتھ پھیلا کے گلے ملا۔ ''ارے میرے نواب دوست!... کیا حال ہے تمہارا؟... صدیاں گزر گئیں تمہارا دیدار ہوئے... کہاں ہو یار؟''

میں نے کہا۔ ''شامی بادشاہ... ہم تو وہیں ہیں اپنے ٹھکانے پر... تمہاری بادشاہت کا کچھ پتا نہیں چلتا اور یہ کیا ہوا؟''

اس نے قہقہہ لگا کے ٹانگ کی طرف دیکھا اور پھر بیساکھی سنبھال لی۔ ''کچھ نہیں ہوا دوست! ٹانگ کا فالتو حصہ نکال دیا۔ ان سے ملو... یہ حاجی علمدار شاہ آفریدی خلد آشیانی۔''

حاجی نے شور کرتے ہوئے مجھے گلے لگایا یعنی اپنے پیٹ کے فوم ربر پر رکھ کے دبایا۔ میں کافی اندر تک دھنس گیا، گلے ملنے سے پھر بھی قاصر رہا۔ جب اس نے مجھے آزاد کیا تو مجھے یوں لگا جیسے میں ڈھیلے اسپرنگ دار گدے کی دو تہوں کے درمیان سے نکل آیا ہوں۔

''ابھی سے خلد آشیانی کیوں بولتا ہے مجھے خانہ خراب!'' حاجی نے شامی بادشاہ سے احتجاج کیا اور پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''اس نے تمہارے بارے میں بول بول کے میرا ایک کان خراب کر دیا ہے۔'' پھر وہ ہنسا۔

میں نے دیکھا کہ اس نے ایک کان میں آلۂ سماعت لگا رکھا ہے۔

شامی نے میرے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ ''دراصل کرتوت اس کے اب بھی وہی ہیں جو ہمارے مگر یہ ہمیں دھوکا دیتا ہے پارسا بن کے۔ اس لیے میں کہتا ہوں خلد آشیانی... مرے گا تو جنت میں جائے گا۔''

''او یارا! ہم بڑا گناہ کار ہے۔''

''وہ تو ہے... یہ دیکھ رہے ہو نواب دوست!'' اس نے پنڈال کی طرف اشارہ کیا۔ ''ابھی یہاں بجلیاں چمکیں گی اور دلوں پر گریں گی۔''

میں نے کہا۔ ''کسی محفلِ رقص و سرود کا اہتمام ہے؟''

''ہاں یارا!... آج تھوڑا سا دل بہلانے کا انتظام کیا ہے لنگڑے بادشاہ کے لیے۔ کیا نام تھا اس کا... تیمور لنگ۔'' وہ پھر گلا پھاڑ کے ہنسا۔ ''مگر چلو پہلے پیٹ کا دوزخ بھر لیں... پھر دوزخ میں جانے کے کام کریں۔''

وہ پرانی وضع کی حویلی تھی جیسی کہ زمیندار اپنے ذوق و شوق کے مطابق بنواتے ہیں۔ مجھے ایک ہال جیسے کمرے میں لے جایا گیا جہاں فرشی نشست کا انتظام تھا۔ دبیز قالین پر سفید چاندنیاں بچھی ہوئی تھیں اور سرخ مخملی غلاف والے گاؤ تکیے دیوار کے ساتھ رکھے تھے۔ سب سے زیادہ متوجہ کرنے اور چونکا دینے والی چیز ایک آفت کی پرکالہ تھی جس کے انداز و اطوار... لباس و میک اپ اس کے طوائف ہونے کی دلیل تھے۔ لیکن وہ ماڈرن آؤٹ فٹ میں تھی۔ سلیولیس ٹی شرٹ جو کمر سے چھ انچ اوپر ہی ختم ہو جاتی تھی اور اس کے شوخ رنگ میں کمر کا اجلا پن بار بار ایسے جھلک دکھاتا تھا جیسے بادلوں میں بجلی۔ جوانی کی اٹھان کو اس نے پابند نہیں کیا تھا چنانچہ جسم کی ہر حرکت کے ساتھ دیکھنے والے کی نظر گریبان کی وسعت میں الجھ کے بھٹک جاتی تھی، اس نے ٹائٹ جینز پہن رکھی تھی۔ اس کے تراشیدہ ریشمی بال رخِ روشن کے گرد رقصاں تھے اور ان کی شوخی اسے ادائے ناز سے انہیں بار بار پیچھے کرنے کا موقع فراہم کرتی تھی۔

اس نے مجھ سے بڑی بے تکلفی کے ساتھ ہاتھ ملایا اور ایک خالص طوائفانہ حرکت کی۔ اس نے میری ہتھیلی پر ایک انگلی سے ہلکی سی گدگدی کی جسے کسی نے بھی دیکھا نہ نوٹ کیا۔ ''آپ سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔''

میں نے کہا۔ ''میں تو گمنام سا آدمی ہوں۔''

وہ بل کھا کے ہنسی۔ ''اب رہنے دیں یہ انکسار۔ ہم نے بہت کچھ سن رکھا ہے آپ کے بارے میں شامی بادشاہ سے۔''

شامی نے کہا۔ ''یہ اسٹیج ڈانسر ساحرہ ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ساحرہ یعنی جادوگرنی... اس میں کیا شک ہے۔''

وہ بھی دلفریبی سے ہنسی۔ ''شامی بادشاہ... تم کیا تعارف کرا رہے ہو... ہمیں کون نہیں جانتا... انہوں نے بھی ضرور
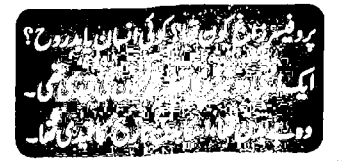
دیکھا ہوگا۔''

میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے کہا۔''جی...اسٹیج پر صرف ایک بار مگر خوابوں میں بار بار۔''

وہ کچھ شوخی سے بولی۔''اچھا جی!... ہماری اجازت کے بغیر؟''

میں نے کہا۔''اب یہ سوال مت کرنا کہ دیکھا تو کیا دیکھا؟''

اس نے شرم سے دہرا ہونے کی اداکاری کی۔''ہائے اللہ...اتنے بےشرم ہیں آپ۔''

ساحرہ کے ساتھ دوسری قدرے عمر رسیدہ لیکن کم عمر نظر آنے کی بھونڈی کوششوں میں مصروف عورت نے آگے بڑھ کے مجھ سے ہاتھ ملایا۔''حضرت اِدھر بھی توجہ فرمایئے... میں انمول ہوں۔'' یہ خالص طوائفوں کا انداز تھا۔

''بھئی یہ کہو کہ اب بھی انمول ہوں۔'' حاجی گلا پھاڑ کے ہنسا۔

شامی نے کہا۔''یار یہ ساحرہ کی ماں ہے...ساحرہ ابھی مڈل ایسٹ اور امریکا میں شو کر کے لوٹی ہے...شیوخ کے عقلِ ہوش لوٹ لیے۔''

میں کہتے کہتے رک گیا کہ ریال کتنے لوٹے۔

''آج ہماری شامت ہے...بجلیاں ہم پر گریں گی۔'' شامی نے کہا۔

ظاہر ہے ساحرہ جیسی عورت سے میں کیا متاثر ہوتا لیکن محفل کا رنگ دیکھ کے میں رنگیلا بن گیا۔''اگر ہوش رہا تو ہم بھی دیکھیں گے۔''

وہ بہت خوش ہوئی۔''آپ خوش نظر بھی ہیں اور خوش ذوق بھی۔ہم خوش کر دیں گے آپ کو۔'' اس نے مجھے آنکھ ماری۔

شاہانہ طعام کے دوران میں نے شامی سے پوچھا۔''تم نے میرے بارے میں کیا بتایا ہے...حاجی کو اور اس... پاجی عورت کو؟''

''کچھ نہیں بتایا... مطمئن رہو... یہ کہا ہے کہ ایک خاندانی رئیس ہیں اور شوقین مزاج ہیں۔ دبئی میں کاروبار ہے اور کراچی میں رہتے ہیں۔''

میں نے احتجاج کیا۔''یار تم جانتے ہو مجھے اس لہو ولعب سے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔''

وہ ہنسا۔''ہاں... ہاں... کتنے متقی و پرہیزگار اور پابند صوم وصلوٰۃ رہے ہو تم...سب پتا ہے مجھے۔''

میں نے کہا۔''ایک شریف آدمی ہوں میں بہر حال۔''

اس نے شریف آدمی کا مفہوم واضح کرنے کے لیے مجھے ایک فحش لطیفہ سنایا اور بولا۔''کیا اب بھی دعویٰ ہے شرافت کا؟''

میں نے کہا۔''چھوڑو یہ بات... مجھے کیوں بلایا تو یہاں؟''

''جلدی کیا ہے دوست!...دماغ سے ساری فکروں کا بوجھ اتارنے کے لیے دو ہی چیزیں ہیں... شراب اور شباب۔''

''مجھے دونوں سے دلچسپی نہیں۔''

''دلچسپی لی جاتی ہے... جیسے اس نے تم میں لینی شروع کر دی ہے۔'' وہ ہنسا۔

''اس کا تو یہی پیشہ ہے۔''

حاجی نے اچانک اندر آ کے کہا۔''یار! باہر نکلو...کچھ شغل میلہ شروع کریں۔''

ایک طرف باہر پنڈال میں بنے ہوئے گول دائرے کے گرد تیس پینتیس افراد حلقہ بنائے بیٹھے تھے اور ان سب کا اشتیاق ہیجان بن گیا تھا۔ وہ سب قریب سے قریب رہ کے نظر کو جلووں کی نمائش سے سیراب کرنا چاہتے تھے، ہمارے لیے دوسری طرف قالین بچھا کے گاؤ تکیے رکھ دیے گئے تھے۔ مجھے چاندنی پر اہتمام جام و مینا بھی نظر آیا۔ اب سازندے درمیان میں آ گئے تھے۔

فحاشی اور عریانی کے اس مظاہرے سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی جس کو رقص کا نام دے دیا گیا ہے۔ اعضا کی شاعری سے زیادہ یہ اعضا کی نمائش ہے جس کا مقصد کاروبار کی توسیع اور قیمت میں اضافے کے سوا کچھ نہیں۔ ایسی محفلیں شوقین مزاج اپنے خلوت خانوں میں کراتے ہیں جو کچھ عام لوگ اسٹیج ڈراموں میں ڈانس کی صورت میں دیکھتے ہیں، وہ فارسی میں ''مشتے نمونہ از خروارے'' ہوتا تھا۔ عام الفاظ میں صرف ٹریلر... اصل فلم کی ایسے ہی اسپیشل شو میں بھرپور نمائش ہوتی ہے جہاں سنسر نہ ہو۔ یہ شو اس حد تک اسپیشل ہوتے ہیں کہ اسٹیج پر جتنا بھی برائے نام لباس آتشِ شوق کو بھڑکانے کے لیے پہنا جاتا تھا یہاں وہ بھی لازمی نہیں ہوتا۔

ساحرہ اسی طرح نمودار ہوئی...اس کا لباس اب شفاف نائلون کا اڑتا ہوا لبادہ تھا جس میں زپ یا بٹن جیسی کوئی چیز نہیں رکھی گئی تھی اور نہ بندِ قبا تھے کہ جلووں کو مستور کرتے۔ وہ ہر طرف سے کھلا بھی تھا اور بند بھی تھا۔ رقص کی ایک حرکت اس کے شعلہ جوالہ بدن اور اس کے تموج کو کسی پہلو سے عیاں کرتی تھی تو دوسری جنبش کسی اور نظارے کا سامان فراہم کرتی تھی۔

رقص کی سنگت کے لیے ایک فاسٹ میوزک سسٹم پر لگایا گیا تھا جس کے بول ایک زمانے میں بے حد متنازعہ رہے تھے۔ ہیروئن سوال کرتی ہے... چولی کے نیچے کیا ہے اور پھر وضاحت کرتی ہے کہ چولی میں دل ہے میرا... تاکہ غلط فہمی دور ہو جائے۔ یہاں رقاصہ اس کی وضاحت دوسرے طریقے سے کر رہی تھی تاکہ غلط فہمی دور نہ ہو...جو ہے وہی دیکھا اور دکھایا جائے۔

ہم خواص تھے اور سچی بات یہ ہے کہ محفل ہمارے لیے سجائی گئی تھی۔ باقی سب ہماری فیاضی کے باعث مفت میں فیض یاب ہو رہے تھے۔ ساحرہ کی ساری ساحری ہمیں مسحور رکھنے کے لیے تھی۔ وہ دیوانِ عام میں بہت کم جاتی تھی، اس کا زیادہ وقت ہمارے حضور میں صرف ہو رہا تھا۔ شامی کو اس رنگ میں ڈوبا ہوا میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ پی رہا تھا اور جھوم بھی رہا تھا۔ اس کے ساتھ حاجی تو جامے سے بلکہ پاجامے سے باہر ہونا چاہتا تھا۔

ہمارے سامنے عوام کا مجمع بھی اپنا سب کچھ وار دینا چاہتا تھا۔ پینے کا...اور دل کھول کے پینے کا بندوبست ان کے لیے بھی تھا۔ اب یہ معلوم نہیں کہ انہیں بھی مساوات رکھتے ہوئے وہی بیش قیمت بدیسی شراب فراہم کی گئی تھی جو اِدھر تھی یا ان کے لیے دیسی مال تھا۔ وہ رفتہ رفتہ بے قابو ہو کے حلق سے مستانہ صدائیں نکالنے لگے اور بعض تو بےخودی میں حد سے گزر جانا چاہتے تھے مگر دوسرے انہیں روک لیتے تھے۔

شوقین مزاج اور رئیس ہونے کا ثبوت دینے کے لیے ہمارے سامنے سو سو کے کرارے نوٹوں کے ڈھیر رکھ دیے گئے تھے۔ ہر ایک منٹ بعد کوئی ایک نوٹ پوری فحاشی کے ساتھ ساحرہ کو نذر کرتا تھا کبھی اپنے دانتوں سے پکڑ کر کہ وہ لب سے لب ملائے بغیر نہ لے سکے... کبھی اس کے کسی عضو بدن سے لگا کے۔ ہر بار ایسی جراٴت رندانہ کی داد تالیاں اور سیٹیاں بجا کے دی جاتی تھی۔ شامی نے مجھے بھی اس کھیل میں شریک ہونے پر مجبور کیا لیکن میں نے انکار کر دیا۔

''مجھے مجبور کرو گے تو میں اٹھ جاؤں گا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہاں یہ سب ہوگا ورنہ میں نہ آتا۔'' میں نے اس وقفے میں کہا جو رقاصہ کو آرام دینے کے لیے رکھا گیا تھا۔ وہ لباس بدلنے اور میک اپ ٹھیک کرنے اندر چلی گئی تھی۔

''نواب دوست!... ہماری زندگی تو جنگلوں ویرانوں میں دھکے کھاتے گزرتی ہے۔ جان کے خوف میں مبتلا رہنے سے ہمارے اعصاب ٹوٹ کے بکھر جاتے ہیں۔ یہ تفریح وہی سکون دیتی ہے جو کسی شاہانہ بیڈ روم میں سونے والے کو ویلیم کی گولی۔''

''میں ویلیم بھی نہیں کھاتا...میرا یہاں کیا کام؟''

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔''کام کی بات صبح کریں گے... پھر تمہیں کوئی افسوس نہیں ہوگا کہ تم میرے بلانے پر آئے۔''

میں نے کہا۔''چلو ٹھیک ہے... مجھے بتاؤ یہ حاجی کون ہے؟''

''یہ بھی پہلے ایک نامی گرامی ڈاکو تھا۔ بڑی دہشت تھی اس کی بھی۔ میں بھی اس کے گروہ میں رہا۔ اس لحاظ سے یہ میرا استاد بھی ہے۔ ایک سوال سب پوچھنا چاہتے ہیں...تم بھی پوچھو گے۔''

''ہاں...یہ ڈاکو کیسے بنا؟''

''یہی سوال ہر تماش بین بھی طوائف سے کرتا ہے۔ اس کا باپ تھا ایک گورے صاحب کا اردلی...ایک دن نشے میں اس نے ایسی فرمائش کی جو یہ پوری نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے شراب بہت پی لی تھی اور عورت کی طلب جاگ اٹھی تھی، اس کی بیوی کسی بات پر خفا ہو کے میکے چلی گئی تھی۔ اس نے اردلی سے کہا کہ جاؤ کہیں سے میرے لیے کوئی عورت لاؤ۔ وہ رات کے وقت عورت لینے کہاں جاتا، صاحب کے گھر میں ایک عورت صفائی کے لیے آتی تھی۔ کہنے لگا کہ اسے بلاؤ... مرتا کیا نہ کرتا...اردلی اس کے گھر گیا۔ اس نے کہا کہ اس وقت تو میرا مرد گھر پر ہے...صاحب کو بولنا مشکل ہے۔ اردلی نے یہی جواب پہنچا دیا۔ صاحب کہنے لگا کہ تمہاری بیٹی یا بیوی ہوگی...اسے لے آؤ۔ اردلی نے ٹالا لیکن وہ سامنے پیسے رکھتا گیا کہ لو، کتنے چاہو لے جاؤ۔ پیسے ہی کے لیے تم سارے نیچ کام کرتے ہو اور پھر بھی غریب رہتے ہو۔ اسی طرح تو گھر چلتے ہیں تمہارے، مجھے معلوم ہے۔ اس پر اردلی نے صاحب کو ہاتھ مار دیا۔ اگلے روز وہ چوری کے الزام میں پکڑا گیا۔ انگریز افسر کے حکم پر پولیس نے اسے خصی کر دیا اور چھوڑ دیا۔ اس کی بیوی پہلے ہی اٹھا لی گئی تھی۔ اس نے خودکشی کر لی... بیوی کو جب موقع ملا وہ فرار ہو کے ایک گھر میں گھس گئی۔ وہ شریف لوگ تھے لیکن انگریز افسر سے دشمنی مول لیتے ہوئے ڈرتے تھے۔ انہوں نے اس کو دوسرے شہر بھیج دیا۔ وہ ایک گھر میں کام کرنے لگی۔ بیٹا آٹھ دس سال کا تھا جب وہ بڑا ہوا تو اسے بڑی تکلیف ہوئی کہ ماں کو اس کی پرورش کے لیے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اکیلی عورت اسے کیا کنٹرول کرتی...وہ غلط صحبت میں پڑ کے چور بن گیا...پھر وہی ہوا۔ پہلے چھوٹے موٹے ہاتھ مارے... پکڑا نہیں گیا تو بڑی وارداتیں کرنے لگا۔ جب کچھ پیسا ہاتھ میں آیا تو رہنے کا ٹھکانا کر لیا اور ماں کو

اپنے ساتھ لے گیا۔ دو چار سال آرام سے گزرے... ماں کو جھوٹ بتاتا رہا کہ آمدنی کا ذریعہ کیا ہے۔ یہ کہتا ہے کہ اس بدقسمت عورت نے دس سال اردلی کی تنخواہ میں اور پھر دس سال گھر میں کام کرتے گزار دیے۔ کم سے کم دس سال تو عیش سے جیتی لیکن اسے پتا نہیں کیوں مرنے کی جلدی تھی... شاید سب ماؤں کی طرح اس نے بھی جان لیا تھا کہ بیٹا کیا کرتا ہے۔ وہ بیمار ہوئی اور فٹافٹ مر گئی۔ اتنی مہلت ہی نہیں دی کہ بیٹا اسے کسی بڑے اسپتال میں اسپیشلسٹ کے پاس لے جاتا... پھر ایک وقت ایسا آیا کہ اِدھر کی زمین اس پر تنگ ہو گئی۔ یہ سرحد پار بھاگ گیا۔ کئی سال مشرقی پنجاب کے سرحدی علاقے میں سکھ بن کے کہرام مچاتا رہا، لمبے لمبے بال رکھ لیے تھے اور پگڑی سر پر رہتی تھی۔ وہاں ایک واردات میں یہ محصور ہو گئے۔ اس نے اکلوتی جوان لڑکی کو ڈھال بنایا، پستول اس کی کنپٹی پر رکھا اور کہا کہ کسی نے راستہ روکا تو مرنے سے پہلے اس کے سر میں سوراخ کر دوں گا۔ لڑکی کے ماں باپ نے خود پولیس کے آگے ہاتھ جوڑے کہ اسے جانے دو۔ یہ نکل گیا... باقی ساتھی بدستور محصور رہے اور پولیس نے مزید نفری طلب کر لی جالندھر سے۔ وہ کب تک مقابلہ کرتے۔ سب کے سب مارے گئے اور ان کے ساتھ لڑکی کے ماں باپ بھی۔ بعد میں جب اس نے لڑکی سے کہا کہ چل جا نیک بخت! ہو سکے تو میری غلطی معاف کر دینا۔ میں تجھے اٹھانا چاہتا تھا اور نہ مجھے پتا تھا کہ تیرے گھر والے نہیں رہیں گے۔ اس نے کہا کہ میں اب کہاں جاؤں؟ لاوارث کر کے مجھے چھوڑنا چاہتا ہے؟ اس نے پوچھا۔ ''میرے ساتھ چلے گی؟'' دراصل جب تک لڑکی اس کے قبضے میں رہی، اس نے لڑکی کی طرف ہاتھ بھی نہیں بڑھایا۔ اسے تسلی دیتا رہا کہ حوصلہ رکھ۔ ذرا پولیس کا پہرا ختم ہو جائے تو میں خود تجھے گھر چھوڑ آؤں گا۔ میرا خیال ہے اس کی شرافت لڑکی کے دل کو بھا گئی۔ وہ پہلے تھا بھی گبرو جوان... ڈھول تو بعد میں بنا۔ لڑکی کے ساتھ یہ واپس آ گیا۔ وہ سکھنی تھی، کلدیپ کور نام تھا اس کا۔ مسلمان ہونے کے بعد فریدہ خانم ہو گئی۔ اب ان کے تین بچے ہیں، یہاں سے ڈیڑھ دو میل دور گجرات میں رہتی ہے۔ کافی بڑا مکان ہے، گاڑی ہے اور زمینداری ہے۔ اس سال بیٹی کی شادی کا سوچ رہا ہے۔ دونوں بیٹے پڑھتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''چور چوری سے جائے ہیرا پھیری سے نہ جائے۔ ایک طرف اتنی شرافت دوسری طرف یہ شوق۔''

شامی ہنسنے لگا۔ ''نواب دوست!... بندہ ایک مٹی کا بنا بت نہیں ہوتا ہم سب نیک بھی ہیں بدمعاش بھی۔ عقلمند بھی ہیں بے وقوف بھی۔ سخی بھی ہیں کنجوس بھی۔ سب کے شوق بھی الگ الگ ہیں۔ چلو باہر چلیں، ڈانس پھر شروع ہو گیا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے کوئی شوق نہیں۔'' لیکن وہ مجھے کھینچ کر لے گیا۔

ساحرہ کے اسٹیمنا پر مجھے حیرانی تھی۔ اس نے تقریباً دو گھنٹے پرفارم کیا اور یہ بڑا محنت طلب کام تھا۔ کوئی پہلوان دو گھنٹے تک اکھاڑے میں نہیں رہ سکتا۔ کوئی مسلسل دو گھنٹے ایسی اچھل پھاند والی ایکسرسائز نہیں کر سکتا۔ ڈانس اس سے زیادہ مشکل ہوتا ہے لیکن اسے پریکٹس تھی اور درمیان میں وہ ایسے وقفے نکال لیتی تھی جو محسوس نہیں ہوتے تھے۔ مثلاً وہ ہم میں سے کسی کے سامنے قربت کا جادو جگانے کے لیے ٹھہر جاتی تھی، کسی ایسے پوز میں جو صبر قرار لوٹ لے اور پھر کسی کی دست درازی سے پہلے تتلی بن کے اُڑ جاتی تھی۔

بالآخر اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔ دیکھنے والے کہاں تھکتے مگر انمول نے کہا کہ بے بی میں دم نہیں رہا اور شو ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔ لائٹس آف کر دی گئیں۔ میرے اندازے کے مطابق وہ ایک لاکھ سے اوپر سمیٹ چکی تھی۔ تھکن اور کوفت سے میرا برا حال تھا لیکن شامی بادشاہ اور حاجی خود کو زیادہ تازہ دم ظاہر کر رہے تھے۔ اندر جا کے میں قالین پر لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر میں شامی بھی لنگڑاتا ہوا میرے قریب آ گیا۔

میں نے کہا۔ ''شامی بادشاہ! تم نے شادی کی؟''

''ہاں یار! کر لی مجبوراً۔ یہ عورتیں گلے پڑ جاتی ہیں۔''

''کیا مرد کا گھر عورت کے بغیر مکمل ہو جاتا ہے۔ تمہارا دوست حاجی ایک سکھنی کو اٹھا لایا۔ تم کہو گے وہ اس کے گلے پڑ گئی؟ خود حاجی کیا کہتا ہے۔''

''وہ تو کہتا ہے جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں۔ مجھے کہاں جا کے ملی کلدیپ کور۔ اسے فریدہ خانم بننا ہی تھا۔''

''اور فریدہ خانم کو معلوم ہے، اس کا شوہر اس وقت کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔''

''دیکھو نواب دوست! عورتوں کی اور مردوں کی دنیا الگ ہے۔ ان کے اور ہمارے ضابطۂ اخلاق ایک نہیں ہو سکتے۔ جو ہم کرتے ہیں، وہ اپنی بیوی کو نہیں کرنے دیتے۔ تم اسے ہماری کمزوری کہو، غلطی کہو یا زبردستی۔ ہم صدیوں کے مزاج کو بدل کے تم جیسے نہیں ہو سکتے۔ ویسے کیا تم پرفیکٹ ہو؟''

میں نے کہا۔ ''نہیں... میں انسان ہوں۔''

''شادی کر لی تم نے... یا ابھی تک ٹال رہے ہو، کیا

نام تھا اس کا؟ ہاں فریال۔''

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ ''شامی بادشاہ! اچھا تم سب کچھ جانتے ہوئے انجان بن رہے ہو۔''

''خفا مت ہونا نواب دوست! ہم تو ایسا ہی سمجھتے تھے کہ تم عام آدمی نہیں ہو ہم جیسے۔ بااصول، باضمیر اتنے کہ شیطان تمہیں گمراہ کرنے کی کوشش بھی کرے تو شرمسار ہو۔''

''میں نے ایسا دعویٰ کبھی نہیں کیا۔''

''ہم سمجھتے تھے یار! غلطی ہماری تھی۔ تم بھی ہم جیسے ہی تھے۔ ایک ساحرہ تمہیں بھی ورغلانے میں کامیاب ہو گئی۔ نام سے کیا فرق پڑتا ہے... نور جہاں ہو یا کچھ اور۔''

میں چپ ہو گیا۔ بحث کے لیے یہ جگہ تھی نہ میں اس موڈ میں تھا۔ میں نے کہا۔ ''دور رہنے کے باوجود تم حالات سے باخبر ہو۔ اس اخبار کا نام کیا ہے جو تمہیں ساری خبریں فراہم کرتا ہے۔''

''خبر اہم ہوتی ہے۔ اخبار کا نام نہیں۔ یہ سچ ہے یا نہیں کہ فریال تمہیں چھوڑ گئی ہے اور اب واپس شوبزنس جوائن کر رہی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''مانتا ہوں شامی بادشاہ! اندر کی کوئی خبر نہ فریال سے پوشیدہ تھی۔ نہ تم سے کچھ چھپا ہوا ہے۔ معلوم نہیں میرا ایسا مہربان اور مخلص کون ہے۔''

''تم اسے غلط نہیں کہہ سکتے، وہ تمہارا خیر خواہ ہے۔ میرا کام نہ تمہیں لیکچر دینا ہے اور نہ یہ بتانا کہ تم غلط کر رہے ہو۔ صرف تمہاری مدد کرنا ہے مجھے۔''

''ابھی تک مجھ پر مدد کی نوعیت واضح نہیں ہوئی۔''

''دیکھو۔ حاجی کی طرح تمہارا دشمن رجب علی رانا تازہ تازہ اس کے تیر نظر کا شکار ہوا ہے۔'' وہ آہستہ سے بولا۔

''ساحرہ کا؟'' میں نے حیرانی سے کہا۔

''آہستہ بولو، اسے تو اپنی فتوحات کا ذکر کرنے میں مزا آتا ہے۔ ہمارے سامنے بڑے نخرے سے کہہ رہی تھی۔ انمول... وہ اس کو بھی نام سے بلاتی ہے اماں وغیرہ نہیں کہتی۔ کتنے پیچھے پڑے ہوئے ہیں رانا صاحب کہ ہمیں بھی درشن دو۔ میں نے انجان بن کے انمول سے پوچھا کہ یہ کس کھیت کی مولی ہیں تو اس نے چہک کے کہا کہ لو... خاندانی رئیس ہیں، اسمبلی کے رکن بھی ہیں... انہیں کون نہیں جانتا۔''

میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''ہوں۔''

''ہوں کیا؟ دروازہ مل گیا، اب گھس جاؤ۔''

میں نے سر کھجا کے کہا۔ ''یہ ذومعنی بات ہو گئی شامی بادشاہ کہاں گھسنے کا مشورہ دے رہے ہو۔''

وہ میرے کان میں بولا۔ ''ساحرہ کو قابو کرو۔''

میں نے معصوم بن کے کہا۔ ''ابھی تو میں پیسے نہیں لایا۔''

وہ ہنس پڑا۔ ''نواب دوست! اس کی نظر تم پر جم کے رہ گئی ہے، تم نے غور کیا؟''

میں نے شرارت سے کہا۔ ''میں اس کی نظر پر نہیں... دیگر چیزوں پر غور کر رہا تھا۔''

وہ بولا۔ ''اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے دیکھنے کی چیز یہاں ایک تم ہی تو ہو۔ ہمارے بیچ میں ایسے رکھے ہوئے ہو جیسے پھٹے ڈھول اور پرانے گھڑے کے بیچ میں گلدستہ۔ مال ہم سے وصول کر رہی ہے جال تم پر پھینک رہی ہے۔ انجان مت بنو نواب دوست!''

میں نے کہا۔ ''اچھا فرض کرو، ایسا ہی ہے۔''

''اس کو اپنے ہی جال میں ایسا جکڑو کہ وہ نکل نہ سکے۔''

میں نے کہا۔ ''شامی بادشاہ! پہلے ہی میری بہت بدنامی ہو رہی ہے۔ اب نور جہاں کو معلوم ہوا تو وہ بھی مجھ پر تھوکنے والوں میں شامل ہو جائے گی۔''

''نہیں معلوم ہوگا، آج کی رات اس پر آخری داؤ آزما کے دیکھو۔ میرا دل کہتا ہے، تمہیں کامیابی ہوگی۔''

''کون سا آخری داؤ شامی بادشاہ!''

''ابھی وہ ریسٹ کر رہی ہے' اپنی خواب گاہ میں۔ حاجی کو میں روک لوں گا۔ تم پہنچ جاؤ بلکہ گھس جاؤ اندر بیل کی طرح۔''

میں نے گھبرا کے کہا۔ ''یار یہ نہیں ہوگا مجھ سے۔''

''کیوں؟ کیا کسی گولی کی ضرورت پڑتی ہے تمہیں؟''

وہ ہنس پڑا۔

میں نے جھینپ کے کہا۔ ''میرا مطلب تھا... وہ کیا کہے گی؟''

''وہ کہے گی آؤ شہزادے بسم اللہ... چشم ماروشن دل ماشاد۔ دیکھو وہ شریف عورت تو ہے نہیں جو تم سے کہے کہ گھر میں ماں بہن نہیں ہیں کیا۔ اسے صرف پیسا نہیں چاہیے، اس کے اندر کی عورت کا بھی دل ہے۔ یہ دل تم پر آ گیا ہے، جو فطری بات ہے۔ اب تم پہلے تو کر دو اظہارِ عشق۔ ماشاءاللہ سے اس کا تمہیں بہت تجربہ ہے۔ اظہارِ عشق تو اس سے حاجی جیسے پھٹے ڈھول بھی کرتے رہتے ہیں۔ تمہاری بات کچھ اور ہے جب دیکھو کہ اس پر اثر ہوا ہے تو کرو آخری وار۔ گرم لوہے پر چوٹ لگا دو۔''

''یار یہ سب ڈائیلاگ بے ضرر ہونے کے باوجود سنسر کی زد میں بھی آتے ہیں۔''

وہ بولتا رہا۔ ”اس سے کہو کہ میرے نکاح میں آجاؤ۔“

میں اچھل پڑا۔ ”نکاح... یار حد کرتے ہو شامی بادشاہ! اس نے بلالیا قاضی پھر کہاں جائے گا شیرازی۔“

”سنو، ایسی ہر عورت کا یہی خواب ہوتا ہے۔ تم جیسا کوئی شاہزادہ گلفام ہو۔ مال وزر کے ڈھیر ہوں۔ نوکر چاکر، موٹر گاڑی، محل، حویلی ہوں تو روز بکنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم جیسا خریدار انہیں کہاں ملتا ہے۔ وہ ایک دم ایسے پگھل جائے گی جیسے آگ کے شعلے پر برف کی ڈلی۔“

”یار! یہ کس آزمائش میں ڈال رہے ہو مجھے۔“

”تم ہوشیار آدمی ہو۔ سلیقے اور قرینے سے ہر کام کرسکتے ہو فطری محبت ہو یا دھوکا۔ اسے بتاؤ کہ تم اس پر مرتے ہو اور اب یا وہ نہیں یا تم نہیں۔ میں شرط لگاتا ہوں ایک گھنٹے میں وہ تم سے کہہ رہی ہوگی کہ یہ میں خواب دیکھ رہی ہوں یا حقیقت ہے۔ یہ تو میری خوش نصیبی کی انتہا ہے۔ تم کہنا کہ انتظامات میں کچھ دن لگ جائیں گے۔ تم اپنی شرائط بتاؤ، شرائط وہ ضرور بتائے گی ورنہ اس کی ماں انمول بتائے گی بعد میں۔ لیکن تم صاف کہہ دینا کہ اب تم میری امانت ہو تو تمہارے اور کہیں مجرے پر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں نے سنا ہے تمہیں کسی رانا نے دعوت دی تھی۔ کون ہے یہ رانا؟ کہاں تھا مجرا؟ وہ بتادے گی کہ مجرا کب اور کہاں تھا۔ تم کہنا کہ مجرا کینسل کردو۔ اس نے ایڈوانس دیا ہے تو دگنا واپس کردو۔ ظاہر ہے وہ ڈرے گی کہ رانا صاحب اسے بے عزتی سمجھیں گے اور خفا ہو جائیں گے۔ تم اپنی بات پر قائم رہنا۔ رقم مجھ سے ابھی لے لو جتنی چاہیے۔ ساحرہ کو دے دینا۔ تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ رانا کہاں ہے اور مجرے کی رات کہاں ہوگا؟“

اچانک مجھ پر امکانات کے بند دریچے کھل گئے اور میں نے ایک بہت بڑی کامیابی کو ایسے دیکھا جیسے اندھیرے میں کھڑا شخص کھلی کھڑکی سے کمرے کے اندر کا روشن منظر دیکھتا ہے۔ بے شک یہ ممکن تھا۔ غالب نے اس کے لیے دامِ ہر رنگِ زمیں کی خوبصورت اصطلاح ایجاد کی تھی۔ اسے کیموفلاج بھی کہتے ہیں۔ چال جو دکھائی نہ دے... وہ سازش جس کا شبہ تک نہ ہو۔ وہ چال جو ذہن میں نہ آئے اور جنگ کا نقشہ پلٹ دے۔

ساحرہ کے آجانے سے ہماری گفتگو کا سلسلہ وقتی طور پر منقطع ہوگیا۔ اس کے ساتھ انمول تھی جسے خود کو ماں کہلاتے شرم آتی تھی۔ طوائفیں اپنی اولاد سے خود کو ایسے ہی باجی یا آپا کہلواتی ہیں۔ حاجی میزبان ہونے کا پورا فائدہ اٹھا رہا تھا

لیکن اب میرا دماغ چل گیا تھا شاید چل پڑا کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ میں نے چند منٹ میں سازش کے اخلاقی پہلو پر خطِ تنسیخ پھیر دیا تھا۔ جنگ کی کوئی اخلاقیات نہیں ہے تو وہ امن کے اخلاقی نظام سے اتنی ہی دور ہے جتنی امن سے جنگ۔ جنگ میں سازش کو سازش نہیں حکمتِ عملی کہا جاتا ہے۔ میں نہ جانے کب سے پڑھتا آرہا تھا اور فلموں میں دیکھتا آرہا تھا کہ عورت کس طرح اپنے حسن وشباب سے عقلوں کو مفلوج کردیتی ہے۔ کبھی ناچ گا کے پہریداروں کو مدہوش کرتی ہے اور قلعے کے دروازے کھلواتی ہے۔ کبھی کلوپیٹرا اور ماتا ہری بن کے حکومتوں کو الٹتی ہے۔

اب یہ کام مجھے کرنا تھا۔ مجھے خود کو ساحرہ کی کمزوری بنا کے فائدہ اٹھانا تھا۔ ایک آبرو باختہ عورت کا استحصال کیا اور اس کے استعمال کا اخلاقی جواز کیسا۔ کامیابی سے بڑی کوئی کامیابی نہیں ہوتی۔ اگر میں رانا کو گرفتار کرانے میں کامیاب ہوگیا تو سب بھول جائیں گے کہ میں نے اس کے لیے ایک طوائف کے ساتھ رات بسر کی تھی اور کیا کھیل کھیلا تھا۔ میں کسی قیمت پر یہ موقع گنوانا نہیں چاہتا تھا۔

شامی بادشاہ کا مشاہدہ درست تھا۔ ساحرہ آئی تو میرے پہلو سے لگ کے اور بڑی بے تکلفی سے میرے کندھے پر سر رکھ کے بیٹھ گئی۔ اس کے بدن سے اٹھنے والی خوشبو بڑی ہیجان انگیز تھی۔

میں نے کہا۔ ”آج تو آپ نے کمال کردیا۔“

وہ اٹھلا کے بولی۔ ”چھوڑیں جی۔ آپ نے کب دیکھا ہماری طرف۔“

میں نے ڈائیلاگ مارا۔ ”ہم ہوش میں کہاں تھے۔ ایسا جادو کیا تھا آپ نے اعضا کی شاعری سے۔ ایک بجلی سی تھی جو مسلسل ہماری نظروں کو ندرہی تھی۔“

”آپ بناتے ہیں حضور؟ ہمیں رقص کہاں آتا ہے۔“

”جادو کرنا تو آتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”سیٹھ صاحب! آپ تو لاجواب کرتے ہیں۔“ وہ ہنسی۔

وہاں شامی اور حاجی کے علاوہ صرف انمول تھی جو اپنی بیٹی کے تازہ شکار کا پھڑ پھڑانا کاروباری دلچسپی کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔ پیش قدمی دونوں طرف سے تھی۔ حوصلہ افزائی دونوں طرف تھی۔ سازگار حالات فراہم کرنے کی ذمے داری شامی بادشاہ نے قبول کرلی تھی۔ نتیجہ یہ کہ صرف آدھے گھنٹے میں وہ جماہیاں اور انگڑائیاں لینے لگی اور اشاروں اشاروں میں نہیں صاف لفظوں میں اس نے مجھے اپنی خواب گاہ میں مدعو کرلیا۔

مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ شامی بادشاہ کے کہنے پر میں جو کھیل ساحرہ کے ساتھ کھیلنے جارہا ہوں اس کا انجام کیا ہوگا۔ ایک بڑی کامیابی یا محض گناہ کی پشیمانی۔ مطلب کی بات تک آنے سے پہلے کی کہانی کچھ نہیں۔ میں نے اظہارِ عشق کیا۔ اپنی ساری صلاحیت اور تجربے کو بروئے کار لاتے ہوئے بہترین ڈائیلاگ بولے۔ شاید اس کی جگہ کوئی اور شریف لڑکی ہوتی تو وہ بھی مار کھا جاتی۔

تاہم اس کے لیے جذبات کے دھارے کا یہ بہاؤ نیا نہیں تھا۔ مجھ سے پہلے بھی نہ جانے کتنے لوگوں نے اس کیفیت اور اس ماحول میں اپنی محبت ظاہر کی ہوگی۔ غیر متوقع کلائمکس اس وقت آیا جب سپیدۂ سحر نمودار ہونے کے ساتھ میں نے اس سے رشتۂ مناکحت جوڑنے کی خواہش کا اظہار کردیا۔

وہ بے یقینی سے دم بخود لیٹی رہی پھر اٹھ بیٹھی۔ ”یہ آپ کیا فرمارہے ہیں؟ کیا میں نے غلط سنا سیٹھ صاحب!“

میں نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ ”تم نے ٹھیک سنا اور مجھے ٹھیک ٹھیک جواب دو۔ مجھ سے شادی کروگی؟“

وہ پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھتی رہی۔ ”آپ پر ابھی تک شراب کا اثر ہے، سیٹھ صاحب!“

میں نے ترنم کے ساتھ ایک شعر پڑھا۔ ”ہائے کم بخت میں نے پی ہی نہیں۔ ہاں تمہارے حسن نے بے خود ضرور کردیا ہے۔“

”یعنی حضور! بے خودی میں ایسا کہہ رہے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”نہیں... ہم بقائمی ہوش وحواس ایسا کہہ رہے ہیں اور یہ بھی سن لو۔ ابھی تک ہم مجرد ہیں۔ ہمارے رشتۂ مناکحت میں ابھی تک کوئی عورت نہیں آئی۔“

”آخر کیوں حضور؟“

”اس تاویل کی کوئی وجہ نہ تھی۔ ہماری نگاہِ انتخاب کے معیار پر کوئی پوری نہ اتری۔ اب تم ہمیں دیکھ لو۔ ہم جیسے ہیں تمہارے روبرو ہیں۔ ہمارا شجرۂ نسب قابلِ فخر ہے۔ ہم نے ولایت سے تعلیم حاصل کی ہے۔ مال ودولت گھر کی لونڈی ہے۔ ہمارا جو ہے تمہارا ہوگا۔“

قصہ مختصر... ساحرہ پر شادیٔ مرگ جیسی کیفیت طاری ہوگئی۔ اسے یقین نہ آتا تھا کہ میرے جیسا خوبرو جوان جو اتنا دولت مند بھی ہے، واقعی اس سے شادی کرنے کے معاملے میں سیریس ہوگیا ہے اور مستقبل ایک باعزت، پرآسائش اور محفوظ زندگی کے ساتھ اس کے اقرار کا منتظر ہے۔ وہ غمزہ و ناز وادا کے کاروبار کو سمجھتی تھی کیونکہ اسے تربیت دی گئی تھی لیکن اس کی عمر کا تجربہ زیادہ نہیں تھا اور مستقبل کے فیصلوں کے لیے اسے تجربہ کاروں کے فیصلوں پر انحصار کرنے کی عادت تھی۔ اگر وہ مکمل خود مختار ہوتی۔ جیسا کہ قانونی طور پر وہ تھی تو مجھے اسی وقت ہاں کردیتی۔

اس نے کہا۔ ”مجھے ماں سے پوچھنا پڑے گا۔“

میں نے اسے اکسایا۔ ”کیوں؟ شادی میں تم سے کررہا ہوں یا ماں سے... پوچھا تو لڑکیوں سے جاتا ہے۔“

وہ ہنسی۔ ”رشتے کی بات بھی تو ماں باپ ہی ماں باپ سے کرتے ہیں۔ لڑکا لڑکی کیا خود طے کرتے ہیں۔“

”چاہیں تو کرسکتے ہیں۔ قانون بھی انہیں اس کا حق دیتا ہے اور شرع بھی یہی کہتی ہے۔“

”مجھے ایک بات کا ڈر ہے۔“

”بولو۔ کھل کے کہو۔“

وہ بولی۔ ”آپ ہیں رئیس اور شوقین مزاج۔ آپ کے جذبات میرے لیے بدل گئے۔ کل کوئی اور آپ کے من کو بھاگئی۔“

میں نے کہا۔ ”ساحرہ!... میں رئیس اور شوقین مزاج ہونے کا الزام قبول کرتا ہوں لیکن تم بھی سمجھ لو کہ میں جذباتی احمق نہیں ہوں جو سوچے سمجھے بغیر ہر کام کرتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کل کیا ہوگا۔ جو تم کہتی ہو وہ کام ناممکن نہیں لیکن کل کو تم میرے بچوں کی ماں بنوگی۔ ایک دو یا چار چھ۔ یہ آپس کی بات ہے مگر پھر تم ماں کے مرتبے پر فائز ہوجاؤ گی جو بیوی کے مقابلے میں بہت افضل اور مضبوط رشتہ ہے۔“

وہ متاثر ہوگئی۔ ”یہ تو آپ نے صحیح فرمایا۔“

”کوئی اپنی بچوں کی ماں کی حیثیت کم کرسکتا نہ اس کے حقوق ختم کرسکتا ہے۔ میرے جیسا آدمی اپنے گھر کو خراب نہیں کرسکتا۔ بیوی کے ساتھ ہر زیادتی کا اثر اس کے اور بچوں کے درمیان احترام کے رشتے کو متاثر کرتا ہے۔ میں ایسا نہیں چاہوں گا کہ بچوں کی نظر میں میری عزت کم ہو کیونکہ مجھے بھی ان کے ساتھ رہنا ہے۔ بشرط زندگی آج سے بیس تیس سال بعد محتاجی میری ہوگی... ان کی نہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ مجھے منظور ہے لیکن صبح میں اماں سے بات تو کرلوں۔“

”دیکھو۔ مجھے معلوم ہے تمہاری ماں کے لیے تم سونے کے انڈے دینے والی مرغی ہو۔ اس نے اپنا بڑھاپا تمہاری کمائی پر گزارنے کے لیے بڑی محنت کی ہے۔ جب اس کی ساری محنت پر کوئی اس طرح پانی پھیرے تو وہ پریشان ہوگی کہ اب آمدنی کا کیا ہوگا، وہ صرف پیسا مانگے گی۔ مستقبل کا تحفظ مانگے گی۔ اپنے لیے بھی اور تمہارے لیے بھی۔ یہی کہے

گی کہ کل کو تمہارا ساحرہ سے دل بھر گیا تو تم اسے ذلیل کر کے نکال باہر کرو گے پھر ہم کہاں جائیں گے۔ ہماری دکان چل رہی ہے۔ اسے کس بھروسے پر اجاڑ دیں۔ کاروبار کو پھر سے جمانا آسان نہیں ہوتا۔ اس کے اندیشے درست ہوں گے لیکن میں اسے مطمئن کرنے کے لیے ہر ضمانت دوں گا۔ اسے جائیداد چاہیے، لے لے...نقد رقم درکار ہے وہ بھی، لے لے۔''

ظاہر ہے ساحرہ اس سے زیادہ کیا توقع کر سکتی تھی۔ صبح ہوئی تو اس نے صاف کہہ دیا کہ اول تو ماں کو آپ منا لیں گے۔ وہ نہ مانی تو میں اسے چھوڑ دوں گی آپ کو نہیں چھوڑوں گی اور یہی ہوا۔ جب اس نے اپنی ماں سے کہا کہ ہم شادی کر رہے ہیں تو اس کو جیسے ہارٹ اٹیک ہو گیا۔ وہ چیخی چلائی روئی پیٹی لیکن پھر جب میں نے اس کے معاشی مستقبل کو محفوظ کرنے کے لیے ہر ضمانت دے دی تو وہ مطمئن ہو گئی۔ انمول نے کسی ماہر کاروباری کی طرح کہا کہ لاہور کے فلاں علاقے میں ایک کنال کی کوٹھی میرے نام کر دو۔ جو ایک کروڑ سے کم کی نہیں ہو گی۔

میں نے کہا۔ ''تمہارے نام کیوں؟ شادی تو میں ساحرہ سے کر رہا ہوں۔''

''اجی حضور! بیوی بن کے عورت کتنی کمزور پڑ جاتی ہے۔ یہ ہم جانتے ہیں۔ آپ کل کو پھر اس سے کسی کاغذ پر دستخط کرا لیں گے تو کوٹھی آپ کے نام ہو جائے گی۔''

''اور تم نے اسے بیچ ڈالا...پھر۔''

''لو جی، بھلا کوئی دودھ دینے والی گائے کو ذبح کرتا ہے؟ اس کے آسرے پر تو گزر بسر ہو گی میری۔''

میں نے کہا۔ ''چلو منظور...اور بتاؤ؟''

''اور کیا حضور! زیور گہنا سب آپ دیں گے وہ ساحرہ کا ہو گا۔ ہاں کچھ نقد میرے نام بھی کر دیتے۔ آخر اپنا کوہ نور ہیرا آپ کو دے رہی ہوں۔ کیا مفت میں ہی لے جائیں گے نادر شاہ کی طرح۔''

میں نے ہنس کے کہا۔ ''تم نے ہمیں محمد شاہ رنگیلا کہہ دیا...خیر۔ بات اچھی لگی ہمیں۔''

''تو حضور ایک کروڑ زیادہ تو نہیں ہوں گے۔''

میں نے سوچ کے کہا۔ ''چلو دیے مگر اب چپ۔ منہ سے کوئی اور شرط نہیں...اقرار کی بات نکلنی چاہیے۔''

وہ کھل اٹھی۔ ''اے حضور۔ میری کیا مجال کہ انکار کروں۔ اللہ سہرے کے پھول مبارک کرے۔ مجھے تو لگتا ہے یہ جوڑی آسمان پر خدا نے خاص طور سے بنائی تھی۔''

دوبارہ ساحرہ سے خلوت میں ملاقات ہوئی تو وہ میرے گلے لگ کے رونے لگی۔ یہ خوشی کے آنسو تھے۔ مجھے افسوس بھی ہوا کہ میں اس کے جذباتی استحصال کا جرم کر رہا ہوں۔ بعد میں جب حقیقت... عیاں ہو گی تو اس کے دل پر کیا گزرے گی مگر میں نے خود کو اس دلیل سے مطمئن کیا کہ جنگ میں بے گناہ بھی مارنے پڑتے ہیں۔ ہر بم برسانے والا جانتا ہے کہ اس سے بچے بھی ہلاک ہوں گے لیکن جنگ ایک مقصد رکھتی ہے جو رحم دلی کو جرم تصور کرتا ہے۔ ساحرہ بھی چند روز میں رو پیٹ کے پھر اپنی زندگی کے ڈھرے پر چل پڑے گی۔ مہینہ بھر بعد میرے بارے میں سوچے گی بھی نہیں اور سال بھر بعد اسے میرا نام تک یاد نہ ہو گا۔

میں نے کہا۔ ''ساحرہ!...لو اب تو فیصلہ ہو گیا۔''

''میں کیا عرض کروں۔ میں کتنی خوش ہوں سیٹھ صاحب!''

میں نے کہا۔ ''اب کچھ شرائط میری بھی سن لو۔''

وہ سنبھل کے بیٹھ گئی۔ ''اب تم ہماری امانت اور ہمارے خاندان کی عزت بن رہی ہو۔ تم پر بہت سی پابندیاں بھی عائد ہوں گی۔''

''سیٹھ صاحب!'' وہ بولی۔ ''کیا آپ مجھے پردے میں بٹھائیں گے۔ اکیلے باہر نہیں جانے دیں گے۔''

''لاحول ولا قوۃ۔ میں اتنا جاہل اور تنگ نظر بھی نہیں ہوں۔ میرا مطلب تھا آج سے بلکہ ابھی سے آپ کے مجرے بند۔''

اس نے سوچ کے کہا۔ ''اگر ایک دن کی مہلت مل جاتی۔''

''کیوں، کیا کسی سے مجرے کی پیشگی وصول کر رکھی ہے؟'' میں نے چیں بہ چیں ہو کے کہا۔

وہ خاموش رہی پھر آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا۔

میں نے کہا۔ ''اب ہماری شریک حیات پیسے کے لیے ناچے۔ یہ ہم سے برداشت نہ ہو گا۔ کون ہے وہ؟''

''رانا رجب علی۔ انہوں نے ایک لاکھ بھجوائے تھے۔''

میں نے کہا۔ ''آج رات کے لیے۔''

''جی ہاں۔ ایک نجی محفل تھی۔ انمول نے اقرار کر لیا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''کہاں ہو گی یہ محفل؟''

''میں نے سنا تھا۔ ان کا بندہ انمول کو بتا رہا تھا کہ جہلم کے کنارے پر رانا صاحب کا ریسٹ ہاؤس ہے۔''

''تم نے دیکھا ہے؟''

وہ بولی۔ ''ایک بار جا چکی ہوں۔ بوری والے سائیں کا مزار ہے۔ مسجد عمر فاروق سے آگے۔ میں نے رات کے وقت دیکھا تھا۔ باہر سرخ ٹائل لگے ہوئے ہیں اور دریا کی

طرف کھلا ٹیرس ہے۔''

میں نے کہا۔ ''انمول سے کہو، وہ ہم سے ایک لاکھ لے اور واپس کرا دے۔''

میرے لیے یہ کہنا آسان تھا۔ انمول پریشان ہو گئی۔ ''حضور! زبان کی بات ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ہمارے لیے عزت و غیرت کی بات ہے۔''

''حضور! آپ کی امانت محفوظ رہے گی۔ بے بی صرف رقص کرے گی۔ بات صرف ڈانس کی ہوئی تھی۔ اس سے زیادہ کی اجازت ہی نہیں دوں گی۔ حالانکہ اس میں خطرہ ہے۔ وہ بہت طاقتور اور بارسوخ لوگ ہیں۔ جانے سے انکار کیا تو اسے توہین کا مسئلہ بنا لیں گے۔ ہم ان کی دشمنی مول نہیں لے سکتے۔''

میں نے کہا۔ ''اچھا...ایک شرط پر ہم اجازت دیں گے۔ ساحرہ کے ساتھ ہم بھی چلیں گے۔''

''کیسے ممکن ہے حضور... میرا مطلب ہے۔ پرائیویٹ محفل میں وہ کسی اجنبی کو داخل ہونے کی اجازت کہاں دیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''ہم بلا اجازت جائیں گے۔ اگر اس نے...کیا نام بتایا تم نے۔''

''رجب علی رانا جناب!''

''ہاں...اس رانا نے تمہاری بات نہ مانی اور رقص کے بعد ساحرہ کے ساتھ زبردستی کی تو تم کیا اسے روک لو گی؟''

وہ گھبرا گئی۔ ''آپ کیا... ہنگامہ کرنا چاہتے ہیں سیٹھ صاحب؟''

میں نے کہا۔ ''نہیں...ہم اسے بتا دیں گے کہ ہم کون ہیں۔ ہم نے انمول کے عہد کا پاس رکھا اور ساحرہ کو آخری پرفارمنس کی اجازت دے دی لیکن اس سے زیادہ کی اجازت نہیں دے سکتے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ مان جائے گا۔''

''مگر آپ جائیں گے کیسے؟''

''بھئی تمہارے ساتھ ایک ڈرائیور ہو گا۔ سازندے ہوں گے یا نہیں۔''

''ایک باجے والا ہو گا، ایک طبلے والا...''

میں نے کہا۔ ''ہم تانپورا لے کر پیچھے بیٹھ جائیں گے۔ تم ہمیں میک اپ مین کے طور پر بھی ساتھ لے جا سکتی ہو۔''

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ ''آپ نے مجھے مشکل میں ڈال دیا۔''

''اس سے زیادہ رعایت نہیں ہو سکتی۔ تمہیں منظور نہیں تو ہم ساحرہ کو ابھی ساتھ لے جاتے ہیں۔ شاہی بادشاہ سے کہتے ہیں کسی نکاح خواں کو بلا لائے۔ گواہ یہاں بہت ہیں۔''

اس نے جلدی سے کہا۔ ''نہیں حضور!...میں نے انکار نہیں کیا۔ آپ ہمارے ساتھ چلیں۔ بس اس کا خیال رکھیں کہ...ہم پر کوئی آفت نہ آئے۔ ہاتھیوں کی لڑائی میں مینڈک پس جاتے ہیں۔ ہم رانا کی طاقت کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور نہ آپ کے مقابل کھڑے ہو سکتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''فکر مت کرو...رئیس خاندانی ہوں تو ایک دوسرے کے لیے دل کشادہ رکھتے ہیں۔''

یکلخت میرے لیے ایک ہنگامی صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ ساحرہ کو اپنے پروگرام کے مطابق یہیں سے رانا کے ریسٹ ہاؤس کے لیے جانا تھا۔ رانا کو یہ معلوم تھا کہ ساحرہ اس وقت حاجی علمدار کے ڈیرے پر ہے مگر یہ بات اسے معلوم نہیں کہ مجرے کے مہمانوں میں شاہی بادشاہ اور نواب رفیق احمد شیرازی بھی شامل ہیں۔

میں نے شاہی بادشاہ کو بتایا کہ میرا کام حسب منشا ہو گیا ہے۔ ساحرہ نے بتا دیا ہے کہ رانا آج رات کہاں ہو گا۔

''پھر؟...اب تو ڈی آئی جی تمہارا یار ہے۔ سیاں بھئے

کوتوال اب ڈر کاہے کا... پکڑ وادواسے۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اگر معاملہ پولیس کے پاس گیا تو ہمارے پہنچنے سے پہلے خبر رانا تک پہنچ جائے گی۔ وہ غائب ہو جائے گا۔"

"اسے گرفتار تو پولیس ہی کرے گی۔"

"وہ بعد کی بات ہے۔ پہلے میں اسے محصور کرنا چاہتا ہوں۔ اس طرح کہ پولیس کا مخبر اسے کچھ بتا سکے نہ وہ فرار ہو سکے۔ اس کارِ خیر میں تم یقیناً میری مدد کر سکتے ہو۔"

"تم چاہتے ہو ہم اب اغوا کریں؟"

"نہیں... تم صبح تک ریسٹ ہاؤس کو گھیرے میں لے لو۔ چڑیا کا بچہ تک پر نہ مارنے پائے۔"

"نواب دوست!... ذرا سوچو... اگر اُڑتی اُڑتی یہ خبر پولیس کے کانوں تک پہنچ گئی تو معلوم ہے کیا ہوگا۔ جو اسے خبردار کرنے آئیں گے، وہ ہمیں گھیر لیں گے۔ میں جانتے بوجھتے اپنے ساتھیوں کو اس خطرے میں نہیں ڈال سکتا اور شاید وہ خود بھی انکار کر دیں گے۔"

"مجھے اس میں کوئی رسک نظر نہیں آتا۔ اگر فون کے تار ہی کاٹ دیے جائیں۔"

"حضور!... یہ موبائل فون کا دور ہے۔ اس کے علاوہ بھی ایک بات ہے۔ آج رات خود ہمارا ایک آپریشن طے ہے۔"

مجھے یوں لگا جیسے شامی بادشاہ بہانے تراش رہا ہے۔ وہ اس کام میں میری مدد کرنا ہی نہیں چاہتا۔ تاہم صرف شک کی بنیاد پر میں اس کے ساتھ مراسم خراب نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے کہا۔ "چلو شامی بادشاہ... میں کچھ اور سوچتا ہوں۔"

ساحرہ اور انمول پر رات کی تھکن کا ایسا اثر تھا کہ وہ ناشتے کے فوراً بعد پڑ کے سو گئی تھیں۔ میں خود بھی رات بھر کا جاگا ہوا تھا اور سونا چاہتا تھا لیکن اب میرے سامنے ایک چیلنج تھا۔ ایک روپوش دشمن کا سراغ مل گیا تھا اور اسے گرفتار دیکھنا فی الحال میری سب سے بڑی آرزو تھی۔ کیونکہ ایک بار وہ تھانے میں میری تذلیل کا تماشا دیکھ چکا تھا اور میری تذلیل بھی کر چکا تھا۔ یہ کینہ پروری نہیں تھی، اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کی حکمتِ عملی تھی جو طاقت کے توازن کا امپریشن برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہوتی ہے۔

میں نے سب سے پہلے شامی بادشاہ کی ڈیوٹی لگائی۔ "ابھی تو وہ ماں بیٹی سو رہی ہیں۔ کوئی ایسا بندوبست کرو کہ جب یہ اٹھیں تو ان کا رانا سے رابطہ نہ ہو۔"

"نواب دوست! فرض کرو میں ان کے موبائل فون خراب کر دوں۔ تو وہ کسی سے موبائل سیٹ مانگ سکتی ہیں۔ نیا منگوا سکتی ہیں۔ قدم قدم پر پی سی او ہیں۔ آخر تمہیں ڈر کیا ہے؟"

"ڈر ہے انمول کی طرف سے۔ ایک طرف اس نے مجھے ساتھ لے جانے پر رضامندی ظاہر کر دی ہے۔ دوسری طرف کہیں وہ رانا کو رازداری کے وعدے پر راز کی بات نہ بتا دے کہ ساحرہ کو ایک خردماغ سیٹھ نے خرید لیا ہے۔ وہ ساحرہ کے ساتھ جانے پر بضد ہے کہ اس آخری مجرے کے بعد ساحرہ کو کسی کی انگلی بھی نہ چھوئے۔ وہ بھیس بدل کے نگاہ رکھنے آ رہا ہے۔ اگر آپ سے کچھ کہے تو برا مت مانیے گا۔ میں آپ کو پہلے سے بتا رہی ہوں تاکہ کوئی بدمزگی نہ ہو۔ آپ تو پرانے قدردان ہیں۔ انمول کاروباری تعلقات خراب نہیں کرے گی۔ کل کا کیا پتا۔ ساحرہ کو پھر دکان سجانی پڑے۔"

"بات تو ٹھیک ہے تمہاری۔ اچھا دیکھو! ویسے تم اپنا پکا بندوبست رکھو۔ معاملہ نازک اور خطرناک ہے۔"

ایک طرف سے مطمئن ہو کے میں نے راجا کو فون کیا۔ "کیا کر رہا ہے تو اس وقت۔ یہ کیسا شور ہے؟"

"ٹھمکیاں مار رہا تھا۔ شہناز نے مجھے ریشم کا رول دے دیا۔ اس کا کمپاؤنڈر بنا ہوا ہوں... ابے چپ... یہ میں نے تجھ سے نہیں کہا فسکیے پتر!"

میں نے کہا۔ "ہاں... بیک گراؤنڈ میں ایک ریں ریں چل رہی تھی، وہ بند ہو گئی ہے۔"

"تو سنا... شامی بادشاہ ملا؟"

"ہاں... مگر پورا نہیں... آدھی ٹانگ کم تھی۔ میرا خیال ہے اب اسے تیمور لنگ کہنا چاہیے۔ لنگڑا بادشاہ وہی ایک تھا۔"

"اس شور میں تیری آواز دب گئی ہے... نقار خانے میں طوطی کی صدا... میں باہر جا کے بات کرتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "یہ مزید بہتر ہے۔ کیونکہ اب جو میں تجھے بتانے جا رہا ہوں، وہ ٹاپ سیکرٹ کلاسیفائیڈ انفارمیشن ہے۔ ایک ڈانسر ہے ساحرہ... اسٹیج پر ہوشربا رقص کرتی ہے۔"

"میں نے دیکھے ہیں اس کے دو رقص۔"

"میں اس سے شادی کر رہا ہوں۔"

"اچھا! اللہ مبارک کرے... اب میں جاؤں؟"

میں نے کہا۔ "بہت افسوس کی بات ہے مہاراجا... تو مخلص ہوتا تو مجھے فون پر جوتے مار مار کے گنجا کر دیتا۔"

"ایک دن ہر عقلمند اور دولت مند آدمی گنجا ہو جاتا ہے پھر میں اتنی محنت کیوں کروں۔"

"اچھا... اب تو واقعی اچھل پڑے گا کیونکہ یہ مذاق کی

بات نہیں ہے... آج رات ہم رانا کو گرفتار کرا سکتے ہیں۔"

وہ بولا۔ "ہم کی وضاحت فرمائیے۔"

"شامی بادشاہ سے مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ رانا اس وقت کہاں روپوش ہے۔ ہمیں آج رات اسے ایک چھاپا مار کارروائی میں گرفتار کرنا ہے۔"

راجا بولا۔ "کیا ہم پولیس مین ہیں؟"

"ہم خدائی فوجدار ہیں۔ وہ پولیس کے مقابلے میں ایسے ہی ہوتے ہیں... جیسے انسانوں کے مقابلے میں جنات۔ اب تو میرا پلان سن لے۔"

راجا نے میرا پلان بڑے تحمل سے سنا۔ درمیان میں اس نے چلا کے کہا کہ میں تیرے باپ کا نوکر نہیں ہوں۔ یہ اس نے شہناز کو مخاطب کیا تھا جو اسے فوراً فون بند کر کے ڈیوٹی پر حاضر ہونے کا حکم دے رہی تھی۔

راجا نے ساری بات سنی تو جوش میں سوڈے کی بوتل کی طرح ابلنے لگا۔ "یار مان گیا میں کہ تجھ سے بڑا حرامی پیدا نہیں ہوا۔ اب مجھے جلدی سے بتا کہ کرنا کیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "نمبر ون... غنی اینڈ ریشم کی چھٹی ہنگامی صورتِ حال کی وجہ سے منسوخ کر... انہیں فوراً واپس رپورٹ کرنے کی تاکید کر، وہ جہاں بھی ہیں۔"

"وہ مری میں ہیں... شام تک آ سکتے ہیں۔"

"وہ سہ پہر تک آ سکتے ہیں۔ ان سے کہنا کہ ہنی مون کی دوسری قسط آئندہ ماہ۔ غنی کے ساتھ تو کمانڈوز کا ایک لشکر ترتیب دے جو آج رات خاموشی سے رانا کے ریسٹ ہاؤس کا محاصرہ کر لے۔ تم لوگوں کے پاس اسلحے کے علاوہ ایک گاڑی ہونی چاہیے جو اپنی نہ ہو۔"

"فرض کر ہم رانا کے ریسٹ ہاؤس کی کسی گاڑی پر قبضہ کر لیں۔ خاموشی سے... اس کے بعد۔"

میں نے کہا۔ "راجا صاحب میں اچھل پڑا ہوں... یقین کریں... اس کے بعد جو ہوگا آپ دیکھیں گے... میں رانا کو لے آؤں گا۔"

"کیسے؟ مکھی بنا کے جادو سے... یا سلیمانی ٹوپی پہنا کے اور مشن میں ناکامی کی صورت میں کیا ہوگا۔"

میں نے کہا۔ "ہم میدانِ حشر میں ملیں گے۔ الو کے پٹھے... کیا ہوگا اور کیا نہیں ہوگا کی بحث میں کیوں پڑتا ہے۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ اندر کی ذمے داری میری... باہر کی تیری۔"

"یار میں آج شہادت کے مرتبے پر فائز ہونے کے موڈ میں نہیں تھا مگر خیر... تو کہتا ہے تو ٹھیک ہے۔"

شام تک میں لمبی تان کے سوتا رہا۔ اٹھا تو بھوک سے برا حال تھا۔ باہر نکل کے دیکھا تو نقشہ بدلا ہوا دکھائی دیا۔ حویلی سنسان پڑی تھی۔ گزشتہ رات کی رونق کسی خواب کا حصہ محسوس ہوتی تھی۔ شامی بادشاہ اپنے حواریوں سمیت غائب تھا۔ اس نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ آج ان کا کوئی آپریشن شیڈول ہے۔ میں نے خوامخواہ اس کے خلوص پر شک کیا۔

حاجی علمدار کی نمائندگی دو خادم کر رہے تھے جو ہماری خدمت کے لیے چھوڑ دیے گئے تھے۔ وہ خود شاید کلد یپ کور عرف فریدہ خانم کو اپنے ایک شریف اور وفادار شوہر ہونے کا یقین دلانے چلا گیا تھا۔ بیوی کی نظر میاں کے جھوٹ کو لاشعور تک دیکھنے کی اہل ہوتی ہے لیکن محض مروت میں وہ یقین کر لیتی ہے بلکہ ظاہر کرتی ہے کہ اس نے یقین کر لیا۔

انمول اور ساحرہ ہنوز خوابیدہ تھیں یہ مجھے ایک ملازمہ نے بتایا۔ ان کا اتنی لمبی نیند سونا ایک ضرورت تھی کیونکہ رات کو انہیں پھر جاگنا تھا۔ میں نے کافی طلب کی اور کچھ کھانے کو... پھر میں نے راجا سے رابطہ کیا۔ غنی توقعات پر پورا اترتے ہوئے ہنی مون منسوخ کر کے ست بدھائی پہنچ گیا تھا اور بہت خوش تھا۔ ریشم اس سے زیادہ خوش تھی۔ انہوں نے یہ بیان شہناز اینڈ کمپنی کے سامنے دیا کہ کیسا ہنی مون جی... ہم تو بور ہو گئے تھے درختوں پہاڑوں کو دیکھ دیکھ کے۔ کام کوئی نہیں... ایک دوسرے کے ساتھ کب تک کمرے میں بند رہیں.. ہمارا ہنی مون یہاں زیادہ اچھا چل سکتا ہے۔ آج آپ نے اچھا کیا واپس بلا لیا ورنہ کل ہم خود آ جاتے۔

میں مطمئن ہو گیا۔ اب مجھے باہر کے معاملات کی فکر نہیں رہی تھی۔ پریشانی صرف یہ تھی کہ میں حلیہ کیسے بدلوں کہ پہچانا نہ جاؤں۔ بقلم خود رانا کے سامنے بیٹھا رہوں مگر اس کی نظر کو شک بھی نہ ہو۔ بہت سوچ بچار کے بعد میں نے ایک مختصر سی فہرست کے ساتھ حاجی کے ایک ملازم کو بازار بھیجا اور کچھ چیزیں منگوائیں۔ ایک کرتا اور ایک دھوتی۔ ایک عینک کی صرف فریم۔ کالے پلاسٹک کا اور گول شیشوں والا۔ ڈاڑھی مونچھ کا ملنا محال تھا۔ سر پر سندھی وضع کی ٹوپی اگر مل جائے۔ میں نے اپنے ذہن میں اپنی ایک ناقابلِ شناخت تصویر بنالی تھی جو مجھے میک اپ سے بنانی تھی۔

ساحرہ اور انمول کی جب آنکھ کھلی تو وہ خاصی پریشان ہوئیں۔ ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اتنی دیر تک کیسے سوتی رہیں۔ میرے خیال میں یہ بھی شامی بادشاہ کی کارستانی تھی۔ مزید پریشانی انہیں حویلی کو خالی دیکھ کے ہوئی۔

"باقی سب لوگ کہاں چلے گئے ساحرہ؟" وہ بولی۔

میں نے کہا۔ "سب کو بھگا دیا میں نے اور ہم ہیں تو

سب کی ضرورت بھی کیا ہے آپ کو... کہیں آپ کے پیسے لے کے تو نہیں بھاگ گئے وہ؟''

ساحرہ ہنسی۔ ''پیسے ہم نے وصول کر لیے تھے۔''

انمول نے کہا۔ ''ہم سے کچھ کہا نہیں تھا کہ انہیں جانا ہے۔ چل بے بی تیاری پکڑ... دیر نہ ہو جائے۔''

ساحرہ نے کہا۔ ''فون پر آپ بتا دیں... ہم کب تک پہنچ جائیں گے۔''

انمول نے سر ہلا کے اپنے موبائل فون پر کوئی نمبر ملانے کی کوشش کی اور کئی بار کوشش کے بعد جھلا کے بولی۔ ''پتا نہیں، اس نامراد فون کو کیا ہو گیا ہے۔ بے بی ذرا مجھے اپنا فون دینا۔''

جب ساحرہ کے فون نے بھی کام نہیں کیا تو شک شبے کی بات ہی نہ رہی کہ شاہی بادشاہ نے ماں بیٹی کے ساتھ ان کے فون بھی سلا دیے تھے۔ وہ نظام میں تو خرابی پیدا نہیں کر سکتا تھا۔ فون کے سرکٹ ہی میں خرابی پیدا کی ہو گی۔ انمول نے پھر بھی ہمت نہیں ہاری اور مجھ سے فون مانگا۔ میں نے بڑے افسوس کے ساتھ اسے مطلع کیا کہ اس نامراد کی نابکار بیٹری خلاص ہے اور میرے پاس چارجر نہیں ہے۔

آخری امید نوکروں سے تھی۔ انہوں نے بڑی شرمندگی سے اعتراف کیا کہ ان کے پاس بیلنس نہیں ہے چنانچہ ون دے ٹریفک پر گزارہ ہے۔ کال آ سکتی ہے جا نہیں سکتی۔ اس کوشش میں مزید وقت ضائع ہو گیا۔

میں نے کہا۔ ''اب چھوڑ دو یہ سب... تیاری پکڑو۔''

ساحرہ نے لباس تبدیل کیا۔ یہ رقص کا لباس نہیں تھا۔ رانا کے ریسٹ ہاؤس میں رونمائی کے لیے تھا۔ ایک ہونے والے شوہر کی حیثیت سے میں نے اس کا کڑی نظر سے جائزہ لیا اور اسے معیوب قرار دے کر پہننے پر اعتراض بھی کیا۔ ساحرہ کے پاس ایسے ہی کپڑے ہوتے تھے۔ جائز طور پر وہ سمجھتی تھی کہ اس کے کپڑے کون دیکھتا ہے۔ کم ہوں تو واہ اور نہ ہوں تو واہ واہ! جب وہ میک اپ کر رہی تھی تو اس دوران میں نے بھی اپنا میک اپ کر لیا۔

میں نے حاجی کے ایک خدمت گار کو بلایا اور اسے حکم دیا ''اپنے کپڑے اتارو۔''

وہ دم بخود رہ گیا۔ ''سارے؟''

وہ سمجھا ہو گا کہ میرا دماغ چل گیا ہے یا پھر میں نشے میں ہوں۔ تعمیل کرنے کے بجائے وہ منتظر رہا کہ میرے احکامات مذاق ہیں تو میں کچھ کہوں۔

میں نے کہا۔ ''وہ نئے کپڑے تم پہن لو جو بازار سے لائے تھے۔ آئی بات سمجھ میں... جلدی کرو۔''

تھوڑی دیر بعد میں خادم کے پرانے بوسیدہ میلے اور بدبودار لباس میں تھا۔ میں نے ٹوپی سر پر جمائی اور بغیر شیشوں والی عینک کا فریم لگایا تو عجیب ہونق نظر آنے لگا۔ وگ یا نقلی ڈاڑھی مونچھ مل جائے تو شک ایک فیصد بھی نہ رہتا۔ میں نے بلیک واٹر کلر منگوایا اور اسے پانی میں حل کر کے اپنے چہرے پر، ہاتھوں پر کہنیوں تک، گردن اور لباس سے نظر آنے والے تمام حصوں پر ایسے پھیلایا کہ اچھے بھلے گورے رنگ کے بجائے میں سیاہ فام نظر آنے لگا۔ یہ رنگ توے جیسا کالا نہیں تھا۔ پانی میں حل کر کے میں نے سیاہی کا صحیح شیڈ تیار کیا تھا اور قدرے فیئر کلر کا ایسا نیگرو نظر آتا تھا کہ اندھیرے میں کپڑوں کے بغیر تو دکھائی نہ دے مگر جیٹ جیکسن دیکھے تو فریفتہ ہو جائے۔

جب میں تیار ہو گیا تو ساحرہ اندر آئی اور ٹھٹک کے بولی۔ ''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ سیٹھ صاحب کے کمرے میں۔''

میں ہنس پڑا۔ ''دیکھو دھوکا کھا گئی نا تمہاری نظر بھی۔''

وہ چونک کے پھر بولی۔ ''یہ آپ ہیں؟ حضور یہ سب کس لیے؟''

میں نے کہا۔ ''احتیاط ضروری ہے... ایسا نہ ہو وہاں کوئی ہمیں بھی جان پہچان کا نظر آ جائے۔''

وہ خاموش ہو گئی لیکن میرے جواب نے انمول کو شک میں ڈال دیا۔ ''اس کی تو کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔''

میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اپنی ضرورت کو میں خود سمجھتا ہوں۔ تم کو بالکل پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔''

''میں کیا کہوں گی آپ کے بارے میں؟ ایسے حلیے کے تو میرے سازندے نہیں ہوتے اور ساز کون سا بجا سکتے ہیں آپ؟''

میں نے کہا۔ ''تم مجھے اپنا ذاتی خادم بتا سکتی ہو۔''

''میرے ساتھ پہلے ایک خادمہ ہوتی تھی سیٹھ صاحب! گستاخی نہ ہو تو کچھ عرض کروں... کیا آپ کو ساحرہ پر اور میرے دعوے پر اعتبار نہیں جو آپ وہاں موجود رہ کے اپنا اطمینان کرنا چاہتے ہیں۔ چوکیداری کریں گے آپ؟''

میں نے کہا۔ ''دیکھو انمول! بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے تمہیں وعدے کا پاس رکھنے کی اجازت دے دی۔ یہی بہت ہے۔ اب تم کو بھی کچھ تو کرنا ہی ہو گا۔''

میرے سخت لہجے نے اسے خاموش کر دیا۔ ان کے ساتھ ایک ہائی ایس تھی جس میں سب سازندے سوار ہوئے اور ساز رکھے گئے پھر انمول اور بے بی کے سوٹ کیس اور

میک اپ باکس۔ سازندے مجھے دیکھ کر چہ میگوئیاں کر رہے تھے کہ یہ حبشی کہاں سے ٹپک پڑا لیکن انمول سے کون پوچھ سکتا تھا۔ وہ کار میں پیچھے بیٹھ گئیں... میں ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا۔

راجا سے میرا کئی بار فون پر رابطہ ہو چکا تھا۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ سورج غروب ہونے تک وہ ریسٹ ہاؤس کے گرد کہیں پوزیشن سنبھال لیں گے۔ آخری بار اس سے بات ہوئی تو اس نے چار مقامات کی نشاندہی کی جہاں کوئی مجھے ہاتھ اٹھا کے سلام کرے گا لیکن اس طرح کہ کسی کو شک نہ ہو۔

وہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کا راستہ تھا۔ گاڑی دریا کے کنارے چلتی رہی اور مختلف تنگ سڑکوں اور گلیوں سے گزرتی پھر دریا کے کنارے پر جا نکلی۔ وہاں مکان کم تھے اور کوئی جدید آبادی وجود میں آ رہی تھی۔ دریائے جہلم جو کبھی پوری آن بان اور شان کے ساتھ ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پانی سے چھلکتا تھا، اب سمٹ کر درمیان میں پانی کے دھارے میں بدل گیا تھا۔ علامہ اقبال نے فرمایا تھا۔ اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز۔ سیاستِ دوراں نے جہلم کے ساتھ اس کے برعکس کیا تھا... ہمارے دریاؤں کے پانی کو سرحد پار ڈیم بنا کے روک لیا گیا تھا یا پھر دیگر جغرافیائی عوامل نے پانی کی قلت پیدا کر دی ہے۔ پہاڑوں پر برف کا نہ پگھلنا یا بارش کا اس علاقے میں کم ہونا بھی اس کے اسباب ہیں۔ صرف برسات کے موسم میں یہ تھوڑی سی جولانی دکھاتا ہے۔

رات ساڑھے آٹھ بجے کار ایک سہ منزلہ عمارت کے گیٹ پر جا رکی۔ اس سے کچھ پہلے وقفے وقفے سے چار جگہ مختلف افراد نے ہاتھ اٹھا کے مجھے اپنی موجودگی کا یقین دلا دیا تھا۔ پیچھے بیٹھی ہوئی ساحرہ اور اس کی ماں نے کچھ نہیں دیکھا تھا۔ میرے ساتھ نتھی ہو جانے سے وہ خوش نہیں تھیں اور پھر جو انداز میں نے اختیار کیا تھا اس نے ان کے دل میں وسوسے ڈال دیے تھے لیکن مجھے پروا نہ تھی۔

گیٹ کھلا تو کار کے پیچھے ہائی ایس بھی اندر داخل ہو گئی۔ ایک طرف آٹھ دس کاریں صف بستہ تھیں۔ سامنے وسیع لان پر کچھ لوگ شغلِ جام و مینا میں مصروف دکھائی دیتے تھے۔ ان میں سے ایک اٹھ کے کار کی طرف بڑھا۔ یہ رانا رجب علی تھا۔

میں نے اسے دوبارہ ٹیرس پر دیکھا۔ درمیان میں تقریباً دو گھنٹے میں محفلِ خاص سے دور رہا۔ مجھے کھانا بھی نوکروں کے ساتھ دیا گیا اور میں دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا رہا کہ نہ جانے اندر کیا ہو رہا ہے۔ اس کی مجھے فکر نہیں تھی کہ ساحرہ کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ مجھے اندیشہ انمول کی طرف سے تھا کہ وہ رانا کے سامنے کچھ بک نہ دے۔ سازندے رانا کے اس ''حسن سلوک'' پر سخت خفا تھے۔ وہ خود کو موسیقار اور فنکاروں جیسے احترام کا مستحق گردانتے تھے جب کہ رانا جیسے جاہلوں کے نزدیک وہ میراثی تھے۔

بالآخر سب کو اوپر طلب کیا گیا۔ ٹیرس شاید ساٹھ ستر فٹ لمبا اور اتنا ہی چوڑا سنگ مرمر کا فرش تھا جس پر قالین ڈال دیے گئے تھے۔ یہاں رقاصہ کے لیے سامنے اسٹیج بنایا گیا تھا اور تمام وی آئی پی پہلی صف سے حسن کے جلوے لوٹ سکتے تھے۔ کمتر درجے کے لوگوں کو چند قدم پیچھے اسٹیج سے تقریباً بیس فٹ دور بٹھایا گیا تھا۔ ساحرہ مجبور تھی کہ رانا کی بغل میں بیٹھے اور اس کی سرعام دست درازی کو بھی برداشت کرے... وہ میری وجہ سے کچھ کھنچتی تھی تو رانا اسے اور کھینچتا تھا۔

اسٹیج زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس کی لمبائی بارہ اور چوڑائی چودہ فٹ ہو گی۔ اس کی وجہ سے ساحرہ کی حرکت محدود ہو گئی تھی۔ رقص کے لیے اس نے پھر وہی لباس پہنا یا منتخب کیا جو گزشتہ شب پہنا تھا۔ اسے پہننا اتنا ہی لاحاصل تھا جتنا نہ پہننا... شیشے کے پیچھے کیسا پردہ۔ سازندے ایک طرف بیٹھے ان کا رخ ناظرین کی طرف تھا جن کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ صفِ اول کے مہمان آٹھ دس تھے۔ ان کے پیچھے بیس بائیس لوگ جو حسن کی خیرات لینے بھکاریوں کی طرح بیٹھے تھے۔ رانا کے ساتھ مگر الگ صوفے پر انمول تھی جسے ایک نسبتاً عمر رسیدہ شخص نے اپنے لیے پسند کر لیا تھا۔ لیلیٰ کا کتا پیارا ہو سکتا ہے تو اس کی ماں کیوں نہیں ہو سکتی۔

معلوم نہیں میرے بارے میں انمول اور ساحرہ نے رانا کو کیا بتایا تھا۔ مجھے سازندوں کے ساتھ بٹھا دیا گیا تھا۔ رانا مجھ سے بہ مشکل تمام دس قدم کے فاصلے پر تھا اور مسلسل ساحرہ سے چھیڑ خانی میں مصروف تھا۔ وہ بار بار میری طرف دیکھتی تھی کہ ہونے والے شوہر کے جذبات کیا ہیں۔ اس نے اپنا مستقبل جو مجھ سے وابستہ کر لیا تھا۔

درمیان میں ایک مختصر وقفہ چائے کے لیے آیا۔ پینے والے وہی پیتے رہے جو پہلے پی رہے تھے۔ رانا پر مجھے حیرت تھی، وہ ہارٹ اٹیک سے بچا تھا۔ شراب اس کے لیے خطرناک تھی اور اس کی صحت شباب کے تقاضوں کی آتش فشانی بھی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن وہ انجام کی پروا کیے بغیر عیاشی و فحاشی کے راستے پر گامزن تھا۔

اچانک میں نے محسوس کیا کہ رانا کی نظر گھوم پھر کے مجھ پر ٹھہرنے لگی ہے۔ یہ میری چھٹی حس تھی جس نے مجھے ہوشیار کیا۔ میرا شک ایک دم انمول کی طرف گیا۔ اس منحوس بڑھیا

کے پیٹ میں مروڑ اٹھ رہے ہوں گے... کہیں اس نے نشے میں کچھ بک تو نہیں دیا۔ سرسری نظر سے دیکھتا تو رانا کا خیال میری طرف نہ جاتا۔ لیکن شک کی نظر سے غور کرتا تو اسے میرے بدلے ہوئے حلیے میں بھی پتا چل جاتا کہ... کون معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں۔

رقص کے دوران رانا اٹھ کر اندر گیا تو میں نے راجا کو سگنل دیا۔ ہمارے موبائل سیٹ وائبریشن پر تھے۔ آواز کوئی بھی نہیں سن سکتا تھا۔ ہم خاموشی سے ایس ایم ایس پڑھ لیتے تھے۔ میں نے اسے پیغام دیا۔ ''ریڈی فار ایکشن'' یہ بھی مخفف تھا۔ آر ایف اے... پھر میں اپنی جگہ سے اٹھا۔ یوں جیسے پانی پینے یا وقتی حاجت رفع کرنا مقصود ہو۔ میں نے نوٹ کیا کہ کچھ لوگ میرے ساتھ ہی حرکت میں آئے۔ اب واضح طور پر ان کی نظر میری نقل و حرکت پر تھی۔

پھر جو ہوا میرے لیے بھی غیر متوقع تھا۔ رانا باہر آیا اور اس جگہ جا بیٹھا۔ اس نے واضح طور پر سر ہلا کے کسی کو سگنل دیا۔ مجھے لگا کے رانا کا کوئی ملازم میرے پیچھے آیا اور اس نے میری گدی پر ریوالور رکھ دیا۔

''چلو... تمہارا ڈراما ختم ہوگیا۔'' اس نے مجھے حکم دیا اور آگے دھکیلا۔ میرے لیے تعمیل کے سوا چارہ نہ تھا۔ اس کارروائی نے محفل کو بھی درہم برہم کر دیا تھا۔ ساحرہ نے پریشان ہو کے رقص روک دیا اور اس کی نظر مجھ پر مرتکز ہو کے رہ گئی۔ انمول نے اس سے چلا کے کہا۔ ''بے بی تم اِدھر کیا دیکھ رہی ہو؟'' لیکن اتنی دیر میں بہت سے مہمان بھی کھڑے ہو گئے تھے۔

رانا نے دہاڑ کے کہا۔ ''اندر لے جاؤ اس کو۔''

معلوم نہیں ایسی حالت میں بھی میرے دماغ نے کس طرح اپنا کام جاری رکھا اور میں نے چلا کے کہا۔ ''بھاگو! یہاں بم رکھا ہے، وہ پھٹنے والا ہے۔''

میرے پکڑے جانے کا منظر سب نے ہی دیکھا تھا۔ وجہ کسی کو معلوم نہ تھی اور نہ اتنی جلدی معلوم ہو سکتی تھی۔ سب نے فرض کر لیا کہ میں کوئی دہشت گرد ہوں۔ تماش بین سب مرد تھے کیونکہ تماشا ایک عورت تھی۔ وہ سب ایک دم اٹھ کے دوڑے۔ مہمانوں کی تعداد آٹھ دس سے زیادہ نہ تھی، انہوں نے اپنی گاڑی کی طرف دوڑ لگائی۔ رانا چلاتا ہی رہ گیا کہ یہ جھوٹ ہے۔

رانا کے ملازمین اور دیگر لوگ جن میں گاڑیوں کے ڈرائیور اور تقریب کا انتظام کرنے والے سب ملا کے بیس بائیس افراد تھے۔ بم سے دور جانے کے لیے گیٹ کی طرف بھاگے اور سرپٹ باہر نکل گئے میں نے سازندوں کو ساز اٹھائے باہر کی طرف دوڑتے دیکھا اور گاڑیوں کے روانہ ہونے کی آوازیں بھی سنیں اور وہ ہیجانی چیخ پکار بھی جو بے بی اور بے بے نے مچائی تھی۔

اس وقت تک گرفتار کرنے والے مجھے اندر پہنچا چکے تھے۔ ان کی مجبوری یہ تھی کہ وہ مجھے چھوڑ کے نہیں بھاگ سکتے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس افراتفری سے فائدہ کیسے اٹھایا جائے۔ ایک فائدہ تو یہ ہوا تھا کہ وہاں لوگ بہت کم رہ گئے تھے۔ یہاں رانا کی خدمت کے لیے گنے چنے لوگ تھے۔ سیکیورٹی گارڈ بھی کم ہی ہوں گے۔

مجھے ایک کمرے میں پہنچا دیا گیا جو ہال جیسا تھا۔ روایتی طور پر یہاں بھی فرشی نشست کا اہتمام تھا اور شاید کچھ دیر پہلے اسی جگہ معزز مہمانوں نے ماحضر تناول فرمایا تھا۔ سفید چاندنی پر روغن کے داغ اس کی گواہی دے رہے تھے۔

باہر ساحرہ چیخ رہی تھی۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے؟... کیوں پکڑا ہے تم نے سیٹھ صاحب کو؟... وہ کسی کو نقصان پہنچانے نہیں آئے تھے۔''

میں نے انمول کی آواز سنی۔ ''مجھے تو پہلے ہی شک تھا۔''

''چپ کر دماں۔'' غصے میں ساحرہ نے اسے انمول نہیں کہا۔

وہ دونوں ایک ساتھ اندر آئیں اور ساحرہ نے مجھے دیوار سے لگا دیکھا تو میری طرف بڑھنا چاہا۔ کسی نے اسے دوسری طرف دھکیلا دیا۔

وہ چلائی۔ ''دیکھو... میری بات سنو... میں بتاتی ہوں۔''

اسی وقت رانا اندر آگیا۔ وہ غصے میں پاگل ہو رہا تھا۔ اس کی محفلِ طرب میں میری موجودگی اتنی ناقابلِ تصور تھی کہ اس کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ بے شک اسے خبردار کرنے والی انمول تھی جس کا ضرور اپنی جوانی میں رانا سے تعلق ہوگا۔ اب اس کی بیٹی کا تھا تو اس کے نزدیک نہ یہ شرم کی بات تھی نہ گناہ کی... یہ کاروبار کی بات تھی۔

رانا نے ساحرہ کے ایک جھانپڑ رسید کیا۔ ''چپ کر فاحشہ! تو ہی اپنے پیچھے لگا کے لائی تھی اس یار کو۔''

ساحرہ نے ایک چیخ ماری۔ ''رانا صاحب! آپ کو ضرور غلط فہمی ہو رہی ہے۔''

رانا نے اس کے دوسرا تھپڑ مارا۔ وہ پھر گر گئی۔ ''تو بتائے گی مجھے کہ یہ غلط فہمی ہے... ابھی رفع کرتا ہوں میں تیری ساری غلط فہمی۔''

رانا کے حکم پر مجھے روبرو کیا گیا۔ ابھی تک میرا منہ دیوار

کی طرف تھا اور میرے ہاتھ بھی اوپر تھے۔ رانا آہستہ آہستہ چلتا ہوا میرے سامنے آیا۔ وہ خود کو تین مسلح محافظوں کی موجودگی میں سو فیصد محفوظ تصور کر رہا تھا۔ ان سب نے ریوالور مجھ پر تان رکھے تھے۔

وہ چند سیکنڈ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھتا رہا پھر اس نے میرے منہ پر ایک تھپڑ مارا۔ ''اتنی ہمت بڑھ گئی تیری نواب کے نطفے۔''

میں نے کہا۔ ''رانا! تین افراد کی فوج پر اتنا بھروسا؟''

اس نے میری بات پر غور کیا۔ ''تمہارے لیے تو ایک ہی گولی کافی ہے۔''

''کیا تم سمجھتے ہو میں واقعی اتنا بے وقوف ہوں! یہاں اکیلا آگیا۔'' میں نے کہا۔ ''تم محصور ہو چکے ہو رانا!''

''بلف مت کرو۔''

میں نے اپنا پُرسکون انداز برقرار رکھا۔ ''رانا!... اپنے جرائم کی فہرست کو اور مت بڑھاؤ... گرفتاری دینے میں تمہارا فائدہ ہے۔''

اس کا اعتماد متزلزل ہونے لگا۔ اس نے پلٹ کر کسی سے کہا۔ ''جا اوئے، باہر دیکھ... پولیس کا محاصرہ ہے یا یہ بکواس کر رہا ہے۔''

وہی ایک لمحہ تھا جس سے فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔ جب رانا کی نظر مجھ پر نہیں تھی۔ میں نے نظروں ہی نظروں میں فاصلے کو دیکھا جو میرے اور رانا کے درمیان تھا اور جو رانا کے اور مسلح محافظ کے درمیان تھا پھر ایک سیکنڈ کے دسویں حصے میں

میرے جسم نے بجلی کی طرح حرکت کی۔ میں نے ایک ہاتھ سے رانا کو دبوچا اور اپنی لات گھما کے محافظ کی گردن پر ماری، وہ نیچے گرا تو اس کا ریوالور میرے قدموں کو چھونے لگا۔ دوسرے لمحے ریوالور میرے دوسرے ہاتھ میں آگیا۔

رانا تڑپا، اس نے ٹانگیں چلائیں اور دونوں ہاتھوں کی کہنی سے میرے سینے پر وار کیا مگر خود کو میری گرفت سے نہ چھڑا سکا۔ نیچے گرے ہوئے محافظ نے میری ٹانگ پکڑنی چاہی تو اسے میری دوسری کک نے ناک آؤٹ کر دیا۔ اب ریوالور میرے ہاتھ میں تھا اور میرے سامنے رانا ڈھال بنا ہوا تھا۔ دوسرے دو محافظ جگہ بدل رہے تھے تاکہ کسی پہلو سے صرف مجھے نشانہ بنا سکیں۔ میں نے ایک کارنر پکڑ لیا۔ ''گن نیچے ڈال لو... ورنہ رانا مارا جائے گا۔'' میں نے پُرسکون رہتے ہوئے حکم دیا۔

گارڈ بے حس و حرکت کھڑے رہے۔ وہ میرے نہیں رانا کے حکم کے پابند تھے۔ رانا کے حلق پر میری کہنی کی گرفت اتنی سخت تھی کہ اس کے لیے سانس لینا بھی مشکل ہوتا جا رہا تھا۔

وہ خاصا بھاری تھا، اس کے جسم کا سارا بوجھ مجھ پر آگیا تھا اور میں دیوار سے نہ لگا ہوتا تو گر جاتا۔

میں نے کہا۔ ''رانا مر جائے گا... تمہاری بے وقوفی سے... تم جانتے ہو رانا دل کا مریض ہے۔''

اب رانا نے ہانپتے ہوئے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ اس کے باقی دو گارڈز نے اسلحہ نیچے گرا دیا۔ میں نے رانا کی گردن پر گرفت کچھ ڈھیلی کی تو وہ ایسے سانس لینے لگا جیسے نزع کی کیفیت میں مبتلا ہو۔

''پیچھے چلو... بالکل پیچھے... دیوار کے ساتھ۔'' میں نے کہا۔

محافظوں نے اپنے آقا کی حالت اور بے بسی دیکھی اور پیچھے ہٹ گئے۔

میں نے رانا کو آگے دھکا دیا۔ اب میرے لیے خطرے کی کوئی بات نہیں رہی تھی۔ رانا منہ کے بل قالین پر گرا۔ میں نے ایک چھلانگ لگائی اور نیچے پڑے ہوئے دونوں ریوالور اٹھا کے اپنی پتلون کی دونوں جیبوں میں ٹھونس لیے۔ ہال میں موت جیسی خاموشی تھی۔ انمول قالین پر الٹی پڑی آنکھیں بند کیے کچھ پڑھ رہی تھی۔ ساحرہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اپنے منہ پر مارے جانے والے رانا کے تھپڑ کا بدلہ لینے کے لیے اس کو ایک لات رسید کی۔ ''چل ایم پی اے کے نطفے... کھڑا ہو جا۔''

وہ آہستہ آہستہ اٹھا۔ ''یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔''

میں نے اس کے بھرپور تھپڑ مارا۔ وہ پھر گر گیا۔ ''تو نے کیا اچھا کیا ہے آج تک... چل تیرا حساب کرتے ہیں۔''

میں نے اسے کالر سے پکڑ کے کھینچا اور پیروں پر کھڑا کر دیا اور دھکے دیتا باہر لے گیا۔ اس کے دم سے خود کھڑے ہوئے محافظوں اور ملازموں کو وارننگ دی۔ ''کسی نے پیچھا کیا تو رانا کو پھر زندہ نہیں دیکھے گا۔''

انمول آگے بڑھ کے چلائی۔ ''ہمیں تو ساتھ لے چلو۔''

میرے کچھ کہنے سے پہلے رانا کے ایک نمک خوار نے اس کی چٹیا پکڑ کے کھینچی۔ ''تو کہاں جاتی ہے کنجری۔'' میں نے ساحرہ کی چیخ بھی سنی لیکن آگے بڑھتا گیا۔ میرا راستہ روکنے والا اب کوئی نہیں تھا۔ میں گیٹ تک ہی پہنچا تھا کہ ایک گاڑی تیزی سے اندر آئی۔ اس کی تیز روشنی میرے چہرے پر پڑی تو وقتی طور پر میں اندھا ہو گیا۔ رانا خود کو چھڑا کے بھاگا۔ میں نے خود کو بہ مشکل بچایا کیونکہ کار کا رخ میری طرف تھا۔

اچانک گاڑی رک گئی اور اس میں سے تین افراد کود کے اُترے پھر اگلے دونوں دروازے کھلے اور مزید دو افراد برآمد ہوئے۔ یہ راجا اور غنی تھے۔

راجا نے چلّا کے مجھے آواز دی۔ ''اُدھر کہاں جا رہا ہے... گاڑی میں بیٹھ۔''

اس کے ساتھ ہی غنی نے رانا کی طرف دوڑ لگائی۔ وہ زیادہ تیز نہیں بھاگ سکتا تھا لیکن میری گرفت سے آزاد ہوتے ہی پلیٹ کے آخری حصے کی طرف جا رہا تھا جہاں اس کے محافظ بے بس کھڑے تھے۔ ان کے پاس اسلحہ ہوتا تو وہ بے دریغ اور اندھا دھند فائرنگ کر کے مجھے کب کا مار چکے ہوتے۔

غنی نے چیتے کی سی پھرتی کے ساتھ رانا کو پھر پکڑ لیا۔ ''اِدھر آ وَجی رانا صاحب! اُدھر کہاں بھاگے جا رہے ہو؟''

پیچھے سے آنے والے تینوں سیکیورٹی گارڈز کے پاس خطرناک قسم کا خودکار اسلحہ تھا جو غنی نے اپنے ذرائع سے حاصل کیا تھا اس ممنوعہ بور کے اسلحے کا لائسنس نہیں دیا جاتا چنانچہ جب تک صورتِ حال کا تقاضا نہ ہو ست بدھائی کی سیکیورٹی فورس اسے استعمال نہیں کرتی تھی۔ تینوں محافظ مقابلے کے لیے تیاری کے ساتھ آئے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ مسلح مقابلے میں ان کی جان بھی جا سکتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے گاڑی کی اوٹ میں پوزیشن سنبھال لی تھی۔ ایک کے پاس کلاشنکوف تھی اور ایک درخت کے تنے کو ڈھال بنا کے مورچہ بند تھا اور اس کی خودکار مشین ایک سیکنڈ میں پورا راؤنڈ چلانے کے لیے تیار تھی۔

رانا نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ مقابلہ وہی گارڈ کر سکتے تھے جن کو وہ حفاظت کے لیے ساتھ رکھتا تھا۔ اس محفوظ اور گمنام جگہ پر وہ میرے جیسے کسی دشمن کے نازل ہونے کی کیسے توقع کر سکتا تھا۔ آدمی فرشتۂ اجل کی بھی ایسے ہی کبھی توقع نہیں رکھتا کہ وہ اچانک کسی ایسی جگہ آئے گا جہاں موت کے خیال کا بھی گزر نہ ہو۔

رانا کو گرفتار کرنے والے تینوں گارڈز نے بھی اپنے چہروں کو سیاہ نقاب سے چھپا رکھا تھا۔ صرف ان کی آنکھیں تھیں جو نقاب کے سوراخ سے باہر کا سارا سین دیکھ سکتی تھیں۔ ان کے جسم پر بھی سیاہ لباس تھا۔ روپوشی کا یہ گر انہوں نے شاہی بادشاہ کے ساتھیوں سے سیکھا تھا جو خود کو رات کی سیاہی میں اسی طرح گم کرتے تھے۔

اب انمول اور اس کی بے بی کہلانے والی ساحرہ بھی باہر آ چکی تھیں۔ کچھ دیر قبل وہ بے خود تماش بینوں کے ہوش و خرد پر اپنے ناز و ادا کی بجلیاں گرا رہی تھیں۔ وہ سارے شمعِ حسن کے پروانے جل کر راکھ ہونے کے بجائے جان بچا کے بھاگ گئے تھے۔ ویران ہو جانے والی محفل کی رونق لُٹ گئی تھی۔ یہ محفل سجانے والا رئیس اپنی دولت کی بے پناہ طاقت کے باوجود کسی بے بس قیدی کی طرح گاڑی میں سوار ہو رہا تھا۔

انمول نے سینہ کوٹ کے دہائی دی۔ ''ارے ہماری گاڑی کہاں لے جا رہے ہو ظالمو... ہم نے تمہارا کیا بگاڑا ہے۔''

ساحرہ نے فریاد کی۔ ''نواب صاحب... آپ نے دھوکا دیا ہمیں۔''

رانا کے محافظوں نے انمول کو چُنیا سے پکڑ کے پیچھے کھینچ لیا۔ ''چپ کر حرامزادی... تو ہی لائی تھی اسے یہاں تک۔''

وہ چلّائی۔ ''ارے کم بختو! مجھ کو الزام کیوں دیتے ہو۔ میں نے ہی تو رانا صاحب کو خبردار کیا تھا۔''

دوسرے نے اس کو واپس دھکیلا۔ ''چپ کر کنجری! لانے سے پہلے نہیں بتا سکتی تھی۔''

انمول گر گئی۔ ساحرہ نے ایک چیخ ماری۔ اس وقت تک رانا کو لے جانے والی گاڑی باہر نکل گئی تھی۔ ایک سیکیورٹی گارڈ اسے چلا رہا تھا۔ باقی دو پیچھے رانا کے آس پاس بیٹھ گئے تھے۔

اب میں بھی پُرسکون تھا اور ہم درخت کے ساتھ بنی ہوئی منڈیر پر پیر ٹکائے کھڑے تھے۔ یہ جگہ اس رقص گاہ سے چالیس پچاس قدم دور تھی جہاں کچھ دیر پہلے ہی سازندوں کے پیچھے بیٹھا رنگِ محفل دیکھ رہا تھا۔

راجا نے میرے کندھے پر تھپکی دی۔ ''چل نیکے پتر! مشن پورا ہو گیا۔'' اس نے ہاتھ کی دو انگلیوں سے وی کا نشان بنایا۔

میں نے قہقہہ لگا کے کہا۔ ''یہ تیرا پلان تھا راجا! تو ایک جینئس ہے۔''

اس نے بڑی انکساری سے کہا۔ ''بندہ نوازی ہے حضور کی جو ایسا سمجھتے ہیں۔''

میں نے جیب سے پہلے ایک ریوالور نکالا۔ اس کی گولیاں اپنی جیب میں ڈال کے اسے رومال سے رگڑ کر صاف کیا اور اس پر اپنے فنگر پرنٹس ملنے کا کوئی امکان نہیں چھوڑا۔ پھر ریوالور کو میں نے میدان میں پھینک دیا۔ دوسرے ریوالور کو خالی اور صاف کرنے کے بعد میں نے گیٹ کے قریب ڈالا۔

راجا نے شہباز کی خیبر کار کو سوئز اور ایک ویران احاطے کی دیوار کے پیچھے کھڑا کیا تھا۔ ہم سکون سے چلتے ہوئے وہاں گئے اور گاڑی میں بیٹھ کے نکل گئے۔ یہاں تک

کا راستہ میرے ذہن میں کچھ کچھ محفوظ تھا مگر اب ڈرائیونگ راجا کر رہا تھا۔ اس نے بڑی مستعدی سے راستے کو ذہن نشین کیا تھا۔ ہم بہ آسانی جی ٹی روڈ تک پہنچ گئے اور گاڑی واپس ست بدھائی جانے والی سڑک پر دوڑنے لگی۔

میں نے کہا۔ ''اگر میں رانا کے پیچھے نہ ہوتا تو کیا تو مجھے پہچان سکتا تھا؟''

''نیکے پتر!'' اس نے کسی لحاظ کے بغیر کہا۔ ''تجھے میں تیری فطری خباثت کے نور سے پہچانتا ہوں جو اس روسیاہی کے باوجود تیرے چہرے سے عیاں ہے۔''

میں بہت خوش تھا اس لیے میں نے اسے معاف کر دیا۔ ''دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ وہ سالی انمول! بالآخر طوائف ہی ثابت ہوئی۔''

''اور کیا ثابت ہوتی۔ وہ جو ہے سو ہے۔''

''اس نے روسیاہی کے سوا کیا پایا۔ نہ مجھ سے وفا کی، نہ رانا کو بروقت خطرے سے آگاہ کیا۔ یا تو جاتے ہی اسے بتا دیتی۔ یا چپ بیٹھی رہتی۔ جو ہوتا ہونے دیتی مگر میرا خیال ہے وہ کشمکش میں پڑ گئی کہ ساحرہ کے وعدے کا پاس رکھے یا رانا سے پرانے تعلق کا۔ ساحرہ کے ذریعے وہ مجھ سے بہت کچھ حاصل کر رہی تھی لیکن اندر سے اسے ڈر تھا کہ بعد میں الزام اسی پر آئے گا کہ نواب رفیق کو سازندوں میں شامل کر کے تو ہی لائی تھی۔ وہ کیسے کہہ سکتی تھی کہ مجھے علم نہیں تھا۔ پہلے وہ سوچتی رہی اور تذبذب میں مبتلا رہی۔ بالآخر اس نے خود کو بچانے کے لیے میرا راز افشا کر دیا... سور کی بچی۔''

''بچے گی وہ پھر بھی نہیں۔ اس پر اتنی دیر چپ بیٹھنے کا الزام آئے گا۔ وہ وہاں پہنچتے ہی چپکے سے رانا کو ہوشیار کر دیتی تو شاید رانا اسے انعام دیتا۔'' راجا بولا۔

میں نے کہا۔ ''بے وقوفی رانا سے ہی ہوئی۔ اس کی نظر بار بار مجھ پر پڑتی رہی اور اس سے مجھے کھٹکا ہوا مگر میرے کچھ کرنے سے پہلے ہی اس کے بندے نے پیچھے سے مجھ پر گن رکھ دی۔ چل چھوڑ، وہ کیا کہتے ہیں... انت بھلا سو بھلا۔ جو جیتا وہی سکندر...''

''ہاں۔ اب یہ کیا سوچنا کہ کیا ہوا کیا نہ ہوا اور کیا ہوتا تو کیا ہو جاتا۔ اصل چیز ہے فتح یا شکست۔''

''آخر ہم فاتح ہیں تو گویا بہت عقلمند ہیں اور ہماری کوئی غلطی بھی غلطی نہیں لیکن راجا صاحب! اب ہم کیا کرنے جا رہے ہیں؟''

''آخر ست بدھائی میں ہم کیا کرتے ہیں۔ لمبی تان کے سوتے ہیں اور باہر کچھ بھی کریں۔ اندر معصوم اور بے خبر بن کے رہتے ہیں۔''

''آج ہم نے کچھ نہیں کیا مہاراجا!''

''نہیں نیکے پتر! ہم تو حویلی سے نکلے ہی نہیں۔''

میں نے قہقہہ مار کے راجا سے ہاتھ ملایا۔ ''سچ کہا تو نے۔''

''یار ہم جھوٹ تو بولتے ہی نہیں۔ حق گوئی ہم پر ختم ہے بے شک جان چلی جائے۔ ہم وہی کہتے ہیں جو سچ ہے۔''

''اور ایسا کئی بار ثابت ہو چکا ہے۔''

''ہاں اور ایک نہیں درجنوں گواہ ہمارے سچ کو ثابت

کرنے کے لیے بھی مل جاتے ہیں۔" راجا ہنسا۔

"ہلچل تو مچ گئی ہوگی۔ ہمارے نکلتے ہی نمک حلال دوڑے ہوں گے پولیس کو بتانے لیکن کل کے اخبار میں ایسی کوئی خبر نہیں ہوگی کہ نجی محفل رقص وسرود سے ایم پی اے رجب علی رانا کا اغوا۔ لواحقین نے نواب رفیق آف ست بدھائی پر شک کا اظہار کر دیا۔ وہ جہلم کے ریسٹ ہاؤس میں روپوش تھے۔"

"بالکل رائٹ! یہ خبر کیسے بن سکتی ہے۔ پہلا نکتہ اعتراض یہ ہوگا کہ کیا رانا صاحب واقعی روپوش تھے اور یہ کیسی روپوشی تھی کہ انہوں نے محفل رقص اور شراب وشباب سے دل بہلانے کا انتظام کر رکھا تھا۔"

"خود ساحرہ اور اس کی ماں شریکِ جرم ہونا نہیں چاہیں گی۔ ورنہ پولیس اور پریس دونوں ان کو ٹارگٹ بنا لیں گے۔"

راجا نے کہا۔ "اگر نوکروں نے تھانے جانے کی بے وقوفی کی تو پولیس ان کے کہنے سے فوراً رپورٹ درج کرنے والی نہیں۔ وہ رانا کے وارثوں سے رجوع کریں گے کہ آپ فرمایئے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔ وارث رابطہ کریں گے قانونی مشیروں سے اور وہ یقیناً یہی مشورہ دیں گے کہ انتظار فرمایئے۔ دیکھیے اغوا کرنے والے اگلا قدم کیا اٹھاتے ہیں۔ رانا صاحب کا سراغ لگانا اتنا آسان نہیں ہے۔ اغوا کنندہ نواب رفیق بھی کوئی ایرا غیرا نتھو خیرا تو نہیں۔ دیکھیں وہ کیا مطالبہ کرتے ہیں۔"

"کیا ہم کوئی مطالبہ کریں گے راجا!" میں نے سوچ کے کہا۔

"نہیں فیکے پتر! ہم کوئی پیشہ ور اغوا کار تو نہیں۔ ہم تو رانا صاحب کو گرفتار کرا دیں گے۔"

"کہاں سے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ جہاں بھی ہوں گے۔" راجا بولا۔

"آخر وہ کہاں ہوں گے؟"

"وہیں جہاں انہیں ہم رکھیں گے۔" راجا بولا۔

میں نے اس کی گدی پر جھانپڑ مارا۔ "الو کے پٹھے بات کی جلیبی کیوں بنا رہا ہے۔ سیدھی طرح بتا وہ رانا کو کہاں لے گئے ہیں۔"

راجا نے گدی سہلائی۔ "سچ پوچھو تو مجھے بھی پتا نہیں۔ غنی نے یہ ذمے داری لی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا نہیں۔ صبح پتا چلے گا۔"

میں نے کہا۔ "اور پولیس رانا کو کب گرفتار کرے گی؟"

"یار میں نے ابھی کچھ طے نہیں کیا۔ جلدی کیسی... گھر چل کے پلان کریں گے۔ قانونی مسئلہ ہے۔ شہزاد کی رائے لینا ضروری ہے پھر بات کریں گے پکی۔"

"بات پکی کی جا سکتی ہے۔ وہ خود یہی چاہتا ہے۔ اب رہی لڑکی کی مرضی تو وہ میں معلوم کر چکا ہوں۔" میں نے کہا۔ "رانا کی گرفتاری سے پٹری بدل کے تو شہزاد کی عمر قید کے مسئلے پر چلا گیا۔ خود بے سہارا پھر رہا ہے دوسروں کی فکر ہے۔"

رات کے دو بجے جی ٹی روڈ پر پنڈی اور لاہور کی طرف سے آنے والی ٹریفک کچھ کم ہو گئی تھی لیکن گاڑی نے دینہ سے رہتاس کی طرف موڑ لیا تو ویرانی اور تاریکی نے ہمارا استقبال کیا۔ چنگی وصول کرنے والا عملہ بھی اس وقت سو یا پڑا تھا۔ سڑک پر نہ کوئی گاڑی آ رہی تھی نہ جا رہی تھی۔ راجا نے ایک کلومیٹر کے بعد گاڑی روک لی۔

"نواب صاحب! میری چھٹی حس نے ابھی ابھی مجھے خطرے کا ایس ایم ایس دیا ہے۔"

"خطرات تو ہمارے دائیں بائیں آگے پیچھے ایسے رہتے ہیں جیسے ایشوریا رائے کے گرد پرستار۔"

"میرے خیال میں اس سڑک سے جانا خطرناک ہوگا۔"

میں نے کہا۔ "پھر کیا کریں؟ دوسری سڑک پتا نہیں کب ملے گی۔ اس وقت تک کیا پھر یہاں کھڑے رہیں گے؟"

وہ اس مذاق سے لطف اندوز نہیں ہوا۔ "ہمارا حویلی پہنچنا ہی ضروری ہے۔ صبح ہونے سے پہلے۔"

"اگر ایک نیلی کا پٹرل جائے۔"

وہ بگڑ گیا۔ "یار تو سیریس ہو جا۔ تو رانا کو اٹھا کے خوش ہے۔ یہ سوچ بعد میں وہاں کیا ہوا ہوگا۔"

"یہ ہم ڈسکس کر چکے ہیں۔"

راجا بولا۔ "پولیس کو رپورٹ کرنے کے علاوہ رانا کے نمک حلالوں نے رانا پیلس میں بھی خبر کر دی ہوگی۔ انہیں بتایا گیا ہوگا کہ ست بدھائی کا نواب بھیس بدل کے آیا تھا اور اپنے ساتھیوں کی مدد سے رانا صاحب کو اٹھا کے لے گیا۔"

میں نے کہا۔ "انہوں نے میرا حلیہ بھی بتا دیا ہوگا۔"

"یہاں رانا کا بڑا بیٹا زوہیب ہے۔ رانا کا اکلوتا جائز وارث جو پہلی خاندانی بیوی سے ہے۔"

"دوسری بے اولاد مر گئی۔ تیسری سے کچھ نہیں ہوا۔"

"رانا زوہیب حسن پڑھا لکھا ضرور ہے لیکن مزاج اور فطرت کے اعتبار سے رانا کا صحیح جانشین ہے۔ پولیس فوری کارروائی کرے نہ کرے۔ وہ باپ کے لیے لشکر لے کر چل پڑے گا۔"

"ست بدھائی پر حملہ کرنے۔ کیا وہ اتنا پاگل ہے؟"

"اس کے دماغ میں یہی آئے گی کہ نواب رفیق خود اس کے باپ کو لے گیا ہے تو اپنی حویلی میں لے گیا ہوگا۔"

میں نے کہا۔ "تو کیا اس کا لشکر حویلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا اور بڑے رانا صاحب کو آزاد کرا لے گا۔ میرا خیال ہے کہ وہ ایسی بے وقوفی نہیں کرے گا۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔ وہ حویلی پر حملہ نہیں کرے گا۔ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ وہاں اس کا استقبال کرنے والے تیار ہوں گے۔ انہیں پہلے ہی اس کا تجربہ ہو چکا ہے۔ وہ حویلی جانے والے راستے پر مورچے قائم کیے بیٹھے ہوں گے۔"

صورتِ حال ایک دم مجھ پر واضح ہو گئی۔ "تو اس سے کہیں زیادہ عقل مند ہے مہاراجا جتنا میں سمجھتا تھا۔"

"جہلم کے اس ریسٹ ہاؤس سے ست بدھائی کی حویلی تک دو گھنٹے کا راستہ ہے۔ ہم کسی اور راستے سے ست بدھائی نہیں جا سکتے اور جی ٹی روڈ تک وہ بھی ایک گھنٹے سے پہلے نہیں پہنچ سکتے۔ جی ٹی روڈ پر کچھ ہو بھی نہیں سکتا۔ وہ ہمارا راستہ روکنے کے لیے اسی سڑک پر موجود ہوں گے۔"

میں راجا کی دور اندیشی کا قائل ہو گیا۔ "بڑے وقت پر مجھے یہ خیال آ گیا ہم آگے گئے تو ہمارے ساتھ بھی وہی ہوگا جو رانا کے ساتھ ہم نے کیا۔ ہم بھی اٹھا لیے جائیں گے اور پھر اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔ قیدیوں کا تبادلہ ہوگا باعزت طور پر۔ پولیس کی نگرانی میں۔"

"کیا کرایا سب برابر... صورتِ حال وہی جو پہلے تھی۔ انگریزی میں کہتے ہیں بیک ٹو اسکوائر ون۔" راجا بولا۔

میں نے کہا۔ "چل پھر انتظار کیسا۔ رانا کے وارث سڑک پر مورچوں میں بیٹھے رہیں۔ رات بھر جنگل میں چھپ کر انتظار کرتے رہیں کہ نواب رفیق کی سواری گزرے تو آگے بڑھ کر آداب بجا لائیں اور کہیں کہ حضور ہم نے آپ کو پہچان لیا۔ آپ گدڑی کے لال بن کے ہمیں دھوکا نہیں دے سکے۔ تشریف لایئے اور مہمان کا اعزاز عطا فرمایئے۔ ہم چلتے ہیں واپس۔ کل توپ خانے اور ٹینک فورس کے ساتھ گزریں گے ادھر سے۔"

راجا نے اسٹیئرنگ پر ہاتھ مارا۔ "یار تیری عقل کو کیا ہو گیا ہے۔ یہ ضروری ہے کہ ہم صبح ہونے سے پہلے حویلی میں ہوں۔ تاکہ یہ ثابت کیا جا سکے کہ ہم تو رات میں ایک لمحے کے لیے کہیں نہیں گئے۔"

"راجا... دوسرا راستہ جہلم کی طرف سے ہے۔ اس پر اکبر خان کے ٹرک آتے تھے لیکن ایک تو ہم نے کبھی وہ راستہ استعمال نہیں کیا۔ دوسرے وہ راستہ غالباً خراب ہے۔ اسی لیے لوگ استعمال نہیں کرتے۔"

"خراب بھی اور کچا بھی۔ ہم اس راستے سے جائیں تو چھ آٹھ گھنٹے لگ جائیں گے اور یہ گاڑی جواب دے گئی تو راستے میں ہی پھنس جائیں گے۔ ٹرک کی بات اور ہوتی ہے۔ وہ اونچے نیچے اور کچے راستوں سے گزر سکتا ہے۔ میں نے سنا ہے درمیان میں دریا بھی پڑتا ہے۔ کبھار میں زیادہ پانی نہ ہو تو ٹرک اسے کراس کر لیتے ہیں۔ کار نہیں گزر سکتی۔"

"یہ تو شیر، گھاس اور بکری والی پچویشن ہو گئی۔ ان کو دریا کیسے پار کرایا جائے۔"

راجا نے اترتے ہوئے کہا۔ "چل آ جا۔ میں نے سوچ لیا۔"

"میں نے کہا۔" "کمال ہے۔ لوگ بغیر دماغ کے بھی سوچ لیتے ہیں۔"

"ہم یہ گاڑی اسی جگہ کھلی چھوڑ دیتے ہیں۔ اس سے خاصا کنفیوژن پھیلے گا۔" راجا نے کہا۔

"میں سمجھ گیا۔ جو لوگ آگے سڑک پر ہتھیار بند ہمارا انتظار کر رہے ہیں وہ انتظار کرتے رہیں گے۔"

"لیکن کب تک... ان کے حساب سے ہمیں دو گھنٹے میں اس راستے سے گزرنا چاہیے۔ وہ دو گھنٹے ضائع کریں گے... اس کے بعد سوچیں گے کہ آخر ہم لوگ ادھر سے گزرے کیوں نہیں۔ ایک خیال ان کے دماغ میں آ سکتا ہے کہ ہم نے دوسرا راستہ لے لیا۔ اس خیال کو وہ بھی مسترد کر دیں گے۔ جیسے ہم نے ناقابلِ عمل سمجھتے ہوئے مسترد کر دیا۔ دوسری بات ان کے دماغ میں یہ آ سکتی ہے کہ ہم رات کے وقت کہیں اور چلے گئے۔ شاید ہم دن کے اجالے میں آئیں گے۔ پھر وہ اپنے مورچوں سے نکل کے اس سڑک پر آ گے آئیں گے۔"

میں نے کہا۔ "یہاں انہیں ہماری کار نظر آئے گی۔ سڑک کے درمیان۔ لاوارث... دروازے کھلے ہوئے۔ یہ بالکل ٹھیک ہے کہ اس سے کنفیوژن پھیلے گا لیکن اس سے ہمیں کیا فائدہ ہوگا؟ ہمارے حویلی پہنچنے کا مسئلہ تو اپنی جگہ رہا۔"

"یہ مسئلہ بھی حل کرتے ہیں فیکے پتر! حوصلہ رکھ۔" راجا نے جی ٹی روڈ کی طرف چلتے ہوئے کہا۔

بیس منٹ بعد ہم پھر جی ٹی روڈ پر تھے۔ ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ایک صوفی صاحب دھوتی پوش سائیکل پر نمودار ہوئے۔ وہ قریب آئے تو راجا ایک دم اس کے سامنے آ گیا۔ سائیکل کے بریک تو ٹھیک تھے مگر راجا نے صوفی کو بریک لگانے کی مہلت کہاں دی۔ وہ "ہو... ہو... ہو۔" کرتا ہوا راجا سے ٹکرا کے گر گیا۔

خفا ہونے سے پہلے اس نے کھل جانے والی دھوتی کو پھر کس کے باندھا۔ "اوئے اندھا ہے کہ پاگل ہے؟"

راجا نے گری ہوئی سائیکل اٹھائی۔ ''آپ نے لائٹ لگائی ہوتی تو اتنا خوفناک حادثہ نہ ہوتا۔ آپ کی سائیکل تو تباہ ہوگئی۔''

میں نے راجا کو ٹٹولا۔ ''بندہ تو بالکل ہی ختم ہوگیا۔''

صوفی نے ہمیں شک کی نظر سے دیکھا۔ ''تم مذاق کر رہے ہو، یہ کیسا مذاق ہے۔''

راجا نے کہا۔ ''ہمیں یہ سائیکل چاہیے۔''

''کیوں چاہیے؟ اور تمہیں سائیکل دے دوں تو میں کیا کروں؟'' صوفی نے جانے کی کوشش کی۔

راجا نے پیڈل پکڑ لیا۔ ''ذرا اِدھر آؤ۔ بات کرتے ہیں۔ سائیکل لینے کے تین طریقے ہیں۔ تم ہمیں تحفے میں دے دو۔''

''اس کے لیے ہم تمہارے شکرگزار ہوں گے اور تمہارے بال بچوں کو دعائیں دیں گے۔'' میں نے کہا۔

''چلو ہٹو۔ تم دونوں نے پی رکھی ہے حرام شے۔'' صوفی بگڑ گیا۔

راجا بولا۔ ''دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ہم سائیکل چھین لیں۔ اپنی بدمعاشی سے اور تم کو چلتا کر دیں۔''

میں نے کہا۔ ''سڑک پر یا اوپر۔''

راجا نے اسے بولنے کی مہلت ہی نہیں دی ''لیکن ہم شریف لوگ ہیں۔ تیسرا طریقہ اختیار کریں گے۔ ہم سائیکل خرید لیں گے۔''

''اویار!'' صوفی نے سر پر ہاتھ مارا۔ ''مجھے نہیں بیچنی تو تم کیسے خرید لو گے۔''

راجا نے اس کی ٹھوڑی کو ہاتھ لگایا۔ ''صوفی صاحب! ضد میں اپنا نقصان مت کرو۔ ہم تمہیں منہ مانگی قیمت دیں گے۔ دو ہزار۔''

''یا میرے مولا۔ کیسے پاگل دے پتروں سے واسطہ پڑ گیا ہے۔'' صوفی نے آسمان کی طرف دیکھ کے فریاد کی۔

''تین ہزار۔ چار ہزار۔'' راجا نے نوٹ نکالے۔

میں نے کہا۔ ''پانچ ہزار، نقد... رسید کے بغیر۔ سائیکل چھوڑ دو اور گھر جا کے بیوی کو خوش کرو۔ صبح نئی سائیکل لے لینا۔''

اب صوفی چپ ہوگیا اور باری باری ہم دونوں کی صورت کو دیکھتا رہا۔ اس بات کا یقین کرنے کے لیے کہ ہم مذاق کر رہے ہیں یا نشے میں تو نہیں ہیں۔ میں نے نوٹ اس کے ہاتھ میں تھما دیے۔ وہ پھر بھی بے یقینی کی کیفیت کا شکار رہا۔ ہماری گفتگو اور اطوار میں ہوش مندی تھی لیکن جو کچھ ہم کر رہے تھے وہ کوئی بقائمی ہوش و حواس نہیں کر سکتا تھا۔ راجا نے سائیکل اس کے ہاتھ سے لے لی۔ ہم واپس چل پڑے۔ ابھی صوفی ہکا بکا وہیں کھڑا تھا۔

میں نے پلٹ کے اس سے پوچھا۔ ''کیا تمہیں بہت دور جانا تھا؟''

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ شاید اس کا گھر قریب ہی تھا اور وہ پیدل جا سکتا تھا۔ سائیکل پر سوار ہونے سے پہلے میں نے اسے ہاتھ ہلا کے خدا حافظ کہا اور راجا کو آگے بٹھا لیا۔ بچپن کے بعد میں نے کبھی سائیکل نہیں چلائی تھی۔ پہلی کوشش کی ناکامی کا نتیجہ یہ نکلا کہ راجا کے ساتھ میں بھی سڑک پر محوِ استراحت نظر آیا۔ چند سیکنڈ تاروں بھرے آسمان کو دیکھنے کے بعد راجا اٹھا۔ اس نے میری سائیکل چلانے کی خاندانی صلاحیت اور دیگر امور پر جو گہرافشانی کی وہ یہاں بیان کرنا لاحاصل ہے۔ اب اس نے مجھے معطل کر کے پائلٹ کی جگہ خود سنبھالی۔

سیدھی سڑک کو راجا نے ایک جگہ ایسے چھوڑا جیسے اس کی آنکھوں نے متبادل راستہ دیکھ لیا ہو۔ اچھی بات یہ تھی کہ تقریباً ففٹی پرسنٹ چاند آسمان پر چالیس واٹ کے بلب کی طرح روشن تھا جو کم وولٹیج کے باعث پوری روشنی نہ دے سکتا ہو لیکن یہ بھی غنیمت تھا۔ یہ آدھا چاند بھی نہ ہوتا تو شاید چند گز ڈرائیونگ کے بعد راجا کسی جھاڑی میں گھس جاتا یا درخت سے ٹکرا جاتا۔

میں نے کہا۔ ''راجا صاحب! آپ کو میں الّو کہنے پر مجبور ہوں۔ چمگادڑ مونث ہوتی ہے۔ تیری آنکھیں اس راستے کو ایسے دیکھ رہی ہیں جیسے یہ لاہور کی مال روڈ ہے جس پر لائٹس جگمگا رہی ہیں۔''

راجا نے انکساری سے اعتراف کیا۔ ''اللہ کا کرم ہے۔'' اور ایک گڑھے سے گزر کے جھاڑیوں میں گھس گیا۔

کپڑے جھاڑ کے اور ہاتھ پیر سہلا کے ہم نے پھر سفر کا آغاز کیا تو راجا نے اعتراض کیا۔ ''یہ گڑھا یہاں ہونا نہیں چاہیے تھا۔''

میں نے کہا۔ ''گرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ گرتے ہیں شہسوار ہی میدانِ جنگ میں لیکن ہم جا کہاں رہے ہیں؟ یہ راستہ...''

''فکیے پتر! جہاز میں بیٹھنے کے بعد پہلے اللہ پر اور پھر پائلٹ پر بھروسا کرنا چاہیے۔'' راجا نے مجھے نصیحت کی۔

میں نے سر ہلایا۔ ''بجا ارشاد۔ یہ تو پوچھا جا سکتا ہے کہ ہم کتنے دن میں ست بدھائی پہنچ جائیں گے؟''

''ہم ایک شارٹ کٹ سے جا رہے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''میرے آباؤ اجداد تو گزرے تھے۔ تیرے باپ نے بھی پہلے دیکھا تھا یہ راستہ۔''

''میری چھٹی حس جسے تو میرا وجدان بھی کہہ سکتا ہے میری رہنمائی کر رہی ہے۔ میں قطبی ستارے سے مدد لے رہا ہوں اور یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہم صحیح سمت میں سفر کر رہے ہیں۔ اگر ہم سیدھے جاتے اور پھر لیفٹ ٹرن لیتے تو یہ نکون کے دو ضلع ہوتے۔ ہم تیسرے ضلع پر رواں ہیں۔ حویلی ادھر ہی ہے۔ بس دعا کر اللہ ہماری سواری کو سلامت رکھے۔ اس کے ٹائر پنکچر نہ ہوں۔''

میرا خیال ہے کہ راجا نے غلط نہیں کہا تھا۔ کوئی نادیدہ قوت تھی جس نے ہمیں راستہ دکھایا اور بھٹکنے نہیں دیا۔ معلوم نہیں کیسے اس جنگل کے درمیان کچے راستے خود بخود سامنے آتے گئے اور ہمارا اندازوں کی بنیاد پر جاری رہنے والا سفر صحیح سمت میں رہا۔ بے شک ہماری رفتار کم رہی لیکن ہم چلتے گئے۔ باری باری ہم ایک دوسرے کا بوجھ ڈھوتے رہے۔ یہ ایک انتہائی مشقت طلب ایڈونچر تھا۔ راجا تمام عمر اس کا حوالہ دیتا رہا کہ اس کی چھٹی حس نے شارٹ کٹ کیسے ایجاد کیا اور اس کی بے مثل خداداد ذہانت نے کس طرح ہمیں سید ھاد شمن کے ہاتھوں میں پڑنے سے بچا لیا۔

وہ ایک گھنٹے کا سفر تھا جو ہم نے چار گھنٹے میں طے کیا اور اللہ سے میں نے کوئی دعا تک نہیں مانگی تھی مگر اس نے واقعی سائیکل کو پنکچر ہونے سے محفوظ رکھا حالانکہ اس راستے پر کانٹے کم نہ تھے۔ جب ہم نے حویلی سے ایک فرلانگ دور دریائے کنہار کا پل کراس کیا تو مشرق میں سورج طلوع ہو رہا تھا۔

اس وقت کے بعد دیگرے اگلے پچھلے دونوں ٹائر پنکچر ہوگئے۔ پائلٹ کی سیٹ پر میں تھا اور راجا آگے لدا ہوا تھا۔ میں نے فلیٹ ٹائروں کے ساتھ پانی کا فاصلہ بڑے جوش اور ولولے کے ساتھ پیڈل مارتے ہوئے اور فلم سکندرِ اعظم کا نہات سال پرانا یہ گانا گاتے ہوئے طے کیا۔ ''چل چل رے نوجوان۔ اونچی تیری شان۔ رکنا تیرا کام نہیں بڑھنا تیرا کام۔''

حسبِ توقع گارڈ نے اپنی رائفل کا رخ میری طرف کر لیا۔ قریب آنے پر جب اس نے راجا کو دیکھا تو حیرت سے اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اس نے مجھ پر زیادہ غور کیا لیکن مجھے پہچاننے سے قاصر رہا۔ اس نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔ ''راجا صاحب! یہ بانگڑو کون ہے؟''

راجا نے کہا۔ ''یہ میرے پھوپی زاد بھائی کے ماموں کے سالے کی تیسری بیوی کے چوتھے فرزند ہیں۔ اب دروازہ کھولو۔''

گارڈ نے دروازہ کھول دیا اور ہم اسی شان سے حویلی میں داخل ہوئے۔ میں نے راجا سے کہا۔ ''یہ سالا گارڈ مجھے نہیں پہچان سکا تو خواتین کیسے پہچانیں گی۔ تو آگے جا۔ کوئی ڈراما کر۔''

راجا اترا تو اس کی ٹانگیں اکڑی ہوئی تھیں۔ ''میں کہتا ہوں کہ رفیق کو تو وہ پکڑ کے لے گئے جن کو وہ پکڑنے گیا تھا۔''

حسبِ توقع کسی نے راجا پر یقین نہیں کیا مگر تصدیق کے لیے صرف رابعہ کو باہر بھیجا گیا۔ وہ احاطے میں شہناز کی خیبر کار کو تلاش کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی کہ میں نے اچانک سامنے آ کے اسے سلام کیا۔ اس نے ایک قدم پیچھے ہٹ کے کہا۔ ''تم... تم کون ہو؟''

میں نے آواز بدل کے کہا۔ ''اللہ کے نام پر میری شادی کرا دو جی۔'' اس نے پریشانی سے کہا۔ ''گارڈ... گارڈ... دیکھو یہ کون حویلی میں گھس آیا ہے۔''

میں اور آگے بڑھا۔ ''اللہ آپ کی مرادیں بھی پوری کرے۔ بس آپ میری شادی کرا دو۔ میں کب سے کوشش کر رہا ہوں۔ کوئی مجھ سے شادی کرنے کو تیار نہیں۔ آپ کو اللہ رسول کا واسطہ۔''

رابعہ چلّائی۔ ''گارڈ... گارڈ... کیا بہرے ہوگئے ہو سب۔ نکالو اس پاگل کو باہر۔ شادی کرا دو۔ دماغ خراب ہے۔''

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''میں پاگل نہیں ہوں جی۔ اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا۔''

اس نے ایک چیخ ماری۔ ''راجا... راجا... مجھے بچاؤ اس پاگل سے۔ ہاتھ چھوڑ میرا کمینے۔''

میں نے ہاتھ نہیں چھوڑا۔ ''میرے ہونے والے بچے دعائیں دیں گے۔ کوئی نہیں تو آپ ہی مجھ سے شادی کر لو جی۔'' میں نے اپنی اصل آواز میں کہا اور قہقہہ مار کے ہنس پڑا۔ اس سے زیادہ برداشت کرنا میرے بس میں نہیں تھا۔

رابعہ کا غصے اور خفت سے حال برا ہوگیا۔ ''تم... ڈرامے باز تھے بہروپیے بھی ہوگئے۔'' وہ غصے میں مجھے مکے مارنے لگی۔

اندر سے راجا برآمد ہوا۔ اس کے پیچھے شہناز تھی اور لیلیٰ بھابی جن کو راجا نے تماشا دیکھنے کے لیے روکا ہوا تھا۔ ان سب کی ہنسی نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ ''یہ سوانگ رچایا تھا صرف مجھے ڈرانے کے لیے۔ شرم نہیں آتی۔'' رابعہ چلّانے لگی۔

میں نے ہنستے ہنستے کہا۔ ''واہ کزن۔ پتا چل گیا کتنی بہادر ہو تم۔''

''اور ماشا اللہ... کیا نظر پائی ہے۔'' راجا ہنستے ہوئے

بولا۔ ''اسے نہیں پہچانا جسے بچپن سے دیکھ رہی ہو۔ ویسے آج بڑا اچھا موقع تھا۔ اس نے پروپوز کیا تھا۔ مان جاتیں تو ریاست مل جاتی۔ جیسے بلی کے ساتھ اونٹ مفت۔''

''اس اود بلاؤ سے جان بھی چھوٹ جاتی۔ نام ہے شہزاد۔ شکل سے بھوت کا ہمزاد۔'' میں نے کہا۔

''چلو بس کرو۔ بہت ڈراما کرلیا۔ جا کے انسانوں کی جون میں آؤ۔'' لیلیٰ بھابی نے مجھے ڈانٹا۔ ''پھر ناشتا کریں۔''

''اوہ... یہ تو میں بھولا ہوا تھا کہ بھوک سے میرے پیٹ میں چوہے بلیاں سب ریس لگا رہے ہیں۔ رات بھر بوجھ ڈھونے سے ٹانگیں بھی ٹیڑھی ہوگئی ہیں۔'' راجا نے دونوں ٹانگوں کو خم کر کے چارلی چپلن کی طرح چلنا شروع کیا۔

میں نے کہا۔ ''میں حلیہ اور کپڑے بدل کے آتا ہوں۔ راجا! تو فون کر کے شہزاد کو بلا لے۔''

راجا نے گھڑی دیکھی۔ ''یار وہ کورٹ جانے کی تیاری کر رہا ہوگا۔''

رابعہ نے کہا۔ ''تمہارے کہنے سے وہ آجائے گا کزن۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''تمہارے سوا وہ کسی کے کہنے سے نہیں آئے گا۔ تم کہو گی تو سر کے بل آئے گا۔''

رابعہ نے تھوڑا سا شرماتے ہوئے ہماری بات مان لی حسبِ توقع شہزاد نے ضروری کام کا عذر پیش کیا۔ رابعہ نے اسے مسترد کر دیا۔ ''بھاڑ میں گیا تمہارا ضروری کام اور چولہے میں گئی عدالت کی پیشی۔ ابھی آنا ہے تمہیں۔''

''کیوں؟''

یار میں کہہ رہی ہوں اس لیے۔ اور کیوں...''

میں نے مٹھی بند کر کے انگوٹھا بلند کیا۔ ''ویل ڈن کزن۔ اسی طرح نکیل ڈال کے رکھو گی تو وہ بھی راجا کی طرح جورو کا غلام بن کے رہے گا۔''

ناشتے کے دوران میں نے گزشتہ شب کی روداد سنائی مگر سنسرشپ کے ساتھ پھر راجا نے سائیکل پرست بدھائی تک کا سفرنامہ پیش کیا۔ سب ہنس رہے تھے کہ مجھے غنی کا فون موصول ہوا۔

''سر! آپ کہاں ہیں اور راجا صاحب...''

''وہیں جہاں ہمیں ہونا چاہیے۔ حویلی میں۔ تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟'' میں نے کہا۔

''آپ کی گاڑی ابھی دیکھی ہم نے۔ لوگوں نے بتایا کہ سڑک کے بیچ میں لاوارث کھڑی تھی۔ کسی نے دھکا دے کر ایک طرف کر دیا اور پولیس کو بھی بتا دیا۔''

میں نے کہا۔ ''گاڑی خراب ہوگئی تھی۔ اس لیے وہیں چھوڑ دی۔''

''اور آپ کیسے گئے سر؟''

میں نے کہا۔ ''کہاں گئے؟ ہم تو رات بھر حویلی میں تھے۔ یہ اپنی ڈاکٹر شہناز گاڑی لے کر دینہ تک گئی تھی۔ واپسی میں بڑی پریشانی اٹھائی اس نے۔ اب تم سوال جواب چھوڑو۔ گاڑی لے آؤ۔ کیا تم اکیلے ہو؟''

''شمشیر خان ہے میرے ساتھ سر!''

''پھر تو کوئی پرابلم نہیں ہوگی۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

غنی تقریباً ایک گھنٹے بعد پہنچا تو راجا نے اسے خوب ڈانٹا۔ ''فون پر اس قسم کی گفتگو کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ شاید تمہیں علم نہیں کہ موبائل فون پر کی جانے والی ساری گفتگو کا ریکارڈ بھی حاصل کیا جا سکتا ہے۔''

اس نے خفت سے کہا۔ ''سوری سر! مجھے معلوم نہیں تھا۔''

میں نے کہا۔ ''تمہاری کل رات کی کارکردگی ایسی تھی کہ تمہاری بڑی سے بڑی خطا معاف کی جا سکتی ہے۔ تم انعام کے مستحق ہو۔''

راجا نے کہا۔ ''اب یہ بتاؤ کل رات...''

میں نے اسے روک دیا۔ ''اجلاس بند کمرے میں ہوگا۔ ہمارے مشیر قانونی کے آجانے کے بعد۔''

خواتین نے سخت احتجاج کیا۔ ''صاف کہو نا کہ ہمارے سامنے بات کرنا نہیں چاہتے۔''

میں نے کہا۔ ''خواتین کی طرح ان کے دماغ بھی نازک ہوتے ہیں۔''

راجا نے تائید میں سر ہلایا۔ ''یس... اگر ہوں تو۔ اور نازک چیز پر بہت بوجھ ڈالا جائے تو وہ خراب ہو سکتی ہے۔ یہ سوچ بچار میں دماغ لڑانے کا سخت کام آپ لوگ ہم پر چھوڑ دیں۔''

اس سے پہلے کہ صنفِ نازک اپنے دفاع کی جنگ دلائل کے بجائے روٹھ کے یا آنسو بہا کے لڑتی شہزاد نمودار ہوگیا۔ آتے ہی اس کی رابعہ سے جھڑپ ہوگئی۔ ''یہ کیا تماشا بنا رکھا ہے تم نے۔ جب چاہا حکم دے دیا کہ آجاؤ۔ تمہاری طرح بے کار نہیں ہوں میں۔''

''مجھے پتا ہے کتنی بیگار بھگت رہے ہو تم۔'' رابعہ نے کہا۔

''ان بیچاروں کا کیا قصور ہے جو وکیل کے نہ آنے سے تاریخ لے کر مایوس جاتے ہیں۔ کتنا نقصان ہوتا ہے ان کا۔''

''ان کی بڑی فکر ہے... میرا کوئی خیال نہیں۔'' رابعہ

نے خالص زنانہ انداز میں روٹھنے کا سگنل دیا۔

''یار وہ موکل ہیں میرے۔ مجھے فیس دیتے ہیں اس کام کی۔ میں فیسیں لے لوں اور کام نہ کروں ان کا۔ ایسے تو گزارا نہیں ہوگا۔''

رابعہ روٹھ گئی۔ ''گزارا میرا تمہارا ابھی نہیں ہوگا۔ تمہارے لیے صرف موکل اہم ہیں۔ میری کوئی اہمیت نہیں۔ جاؤ چلے جاؤ واپس۔''

آخر تم چاہتی کیا ہو۔ میں آگیا ہوں تو کہہ رہی ہو جاؤ۔''

''ہاں جاؤ اور آئندہ کوئی ضرورت نہیں میرے لیے اپنا نقصان کرنے کی۔ میں مر جاؤں تب بھی مت آنا میرے جنازے میں۔'' رابعہ نے رونا شروع کیا۔

''دیکھو'' شہزاد پریشان ہوگیا۔ ''اب تم بلیک میل کر رہی ہو مجھے۔ اچھا بابا۔ غلطی ہوگئی مجھ سے۔ معاف کر دو میرا کہا سنا...''

ان کا یہ جذباتی ڈراما کمرے میں چل رہا تھا لیکن کھلے دروازے سے ہم سب سن رہے تھے۔ کچھ دیر بعد شہزاد مسکراتا ہوا نمودار ہوا تو میں نے اور راجا نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

''یار نک کٹوا دی نامردوں کی۔'' راجا بولا۔

''اتنی جلدی معافی مانگنے کی کیا ضرورت تھی۔'' میں نے کہا۔

وہ مسکراتا ہوا بیٹھ گیا۔ ''پھر کیا کرتا...''

''کہتے کہ اچھا نہیں آؤں گا تمہارے جنازے میں۔ پہلے تم مرو تو سہی۔'' راجا بولا۔ ''قسم خدا کی سیدھی ہو جاتی جلیبی کی طرح۔''

وہ بولا۔ ''آپ سینئر اور تجربہ کار لوگ ہو۔ استاد ہو۔ میں ان معاملات میں اناڑی ہوں۔ میں مانتا ہوں۔ اب یہ بتاؤ کہ صبح صبح میری خدمات کی ضرورت کیوں پڑی؟''

میں نے کہا۔ ''کل رات ہم نے رانا کو اغوا کرلیا ہے۔''

وہ اچھل پڑا۔ ''اغوا کرلیا؟''

''بس... اور اب وہ ہماری قید میں ہے۔'' راجا نے اعلان کیا۔

''لیکن کیوں اغوا کرلیا اسے۔ کہاں ہے۔ اور کیسے؟''

''وہ کہاں ہے؟ یہ رپورٹ ہمارا چیف سیکیورٹی افسر دے گا۔ لیکن دیگر سوالات کا جواب ہم دے سکتے ہیں۔'' میں نے کہا اور پھر اسے اول تا آخر ساری کہانی سنا دی۔

وہ ایسے سنتا رہا جیسے یہ کرائم، ایڈونچر، رومانس اور واہیات ناچ گانوں سے بھرپور کسی فلاپ فلم کی کہانی ہے مگر یہ حقیقی زندگی کا ایک واقعہ تھا جس کے زندہ کردار ہم تھے۔

ساری کتھا سن کے شہزاد پریشان ہوگیا۔ ''نواب صاحب! آپ نے یہ سب کیوں کیا؟''

میں نے کہا۔ ''یار یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ وہ دشمن ہے ہمارا۔''

وہ خفگی سے بولا۔ ''تو اغوا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ قتل کرا دیتے اسے۔ تمام گواہوں کی موجودگی میں۔''

راجا بولا۔ ''پھر لائف میں کوئی ایڈونچر کہاں باقی رہتا۔''

میں نے کہا۔ ''ہاں... وہ مارا جاتا۔ ہمیں پھانسی ہو جاتی۔ کھیل ختم ہو جاتا۔''

''آپ بہت خوش ہیں اس کامیابی پر۔ اس لیے سیریس نہیں ہو رہے ہیں۔'' شہزاد نے احتجاج کیا۔

میں نے کہا۔ ''شہزادے... ہم اسے گرفتار کرانا چاہتے ہیں۔ یہ معمولی سی بات تمہیں سمجھ لینی چاہیے۔''

''تو گرفتار کرا دیتے۔ آپ کو معلوم ہوگیا تھا کہ وہ کہاں ہے۔''

''بے وقوفی کی بات مت کرو۔ ہم پولیس کو بتاتے بڑی رازداری سے اور اتنی ہی رازداری سے پولیس حق نمک ادا کرتے ہوئے اسے خبردار کر دیتی کہ چھاپا کب اور کتنے بجے پڑے گا۔ ہم جاتے تو وہاں ایک چوکیدار سوتا ہوا ملتا۔ ''رانا صاحب؟ کون رانا صاحب'' وہ آنکھیں ملتے ہوئے پوچھتا۔ اپنے رجب علی رانا صاحب! وہ تو پچھلے سال آئے تھے۔ فروری یا مارچ میں۔''

راجا نے کہا۔ ''ایسا ہوتا ہے۔ ہو چکا ہے اور ہوتا رہے گا۔ ہم جانتے ہیں۔''

شہزاد کچھ ایزی ہوا۔ ''چلیں میں مان لیتا ہوں لیکن یہ جو آپ نے علی الاعلان کیا۔ کھلم کھلا۔ سب کے سامنے۔''

''ذرا دھیرج سے کام لو شہزادے۔ ہمارا نام کوئی کیسے لے سکتا ہے۔ کیا کسی نے مجھے یا راجا کو دیکھا؟ غنی اینڈ کمپنی نقاب پوش تھے۔'' میں نے کہا۔

''لیکن ساحرہ... اور اس کی ماں انمول...''

''مہاراجا'' میں نے راجا کی طرف دیکھا۔ ''کیا تم کسی ساحرہ کو جانتے ہو؟ جس کی ماں انمول ہو۔''

''میں صرف ایک ساحرہ کو جانتا ہوں فیکے پتر لیکن وہ خود انمول ہے میرے لیے اور اس کا نام ہے ڈاکٹر شہناز۔'' راجا بولا۔

شہزاد نہیں ہنسا۔ ''وہ اب تک پولیس کو بیان دے چکی ہوں گی۔''

''یہ معزز خواتین۔ جو بھی ہیں اگر پولیس کے سامنے ہمارے خلاف کوئی بات کریں گی تو پریشانی خود ان کے لیے پیدا ہو گی۔ انہیں ثابت یہی کرنا پڑے گا کہ جو کچھ انہوں نے کہا وہ کسی دباؤ یا لالچ کے بغیر کہا اور بقائمی ہوش وحواس کہا۔ اس وقت وہ نشے میں نہیں تھیں۔'' میں نے کہا۔ ''کیونکہ ہم تو حویلی میں تھے اور دو دن سے صاحبِ فراش تھے۔''

''کیا تھے؟'' شہزاد بولا۔

''بیمار تھے۔ حویلیوں اور محلات کی شاہی زبان میں۔'' میں نے کہا۔

راجا نے اس میں اضافہ کیا۔ ''اور یہ ڈاکٹر شہناز بتا سکتی ہیں کورٹ میں کہ نواب صاحب کو کیا بیماری تھی جس کی وجہ سے یہ اٹھ بھی نہیں سکتے تھے۔ ان کو کیا دوا دی گئی۔ کمزوری انہیں آج بھی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اور ایک ڈانسر کے مقابلے میں ایک اتنی مشہور ڈاکٹر کی رائے کو دنیا کی کوئی عدالت مسترد نہیں کر سکتی۔''

شہزاد ہنسنے لگا۔ ''آپ لوگوں کو وکیل ہونا چاہیے تھا۔''

''اور تمہیں راجا یا نواب... مگر جو ہے سو ہے شہزادے۔ صبر کرو اپنی تقدیر پر۔''

''چلیں مان لیا کہ اغوا سے آپ کا تعلق ثابت نہیں ہوا لیکن دشمنی تو بڑھی۔ بہت سے سچ ثابت نہیں ہوتے مگر سچ ہوتے ہیں۔''

''دشمنی ہم بلاوجہ نہیں بڑھا رہے ہیں۔ ہم نے تو پہلے دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا مگر رانا نے اسے نخوت اور حقارت سے جھٹک دیا۔ اب ہم اپنے ہاتھ دکھا رہے ہیں کہ ہماری دوستی کو ٹھکرایا۔ اب دشمنی بھگتو۔ وہ ہماری کمزوری نہیں شرافت تھی۔'' میں نے کہا۔

راجا بولا۔ ''رانا پر یہ ثابت کرنا ضروری ہے کہ ہم کتنے ڈاڈے دشمن ہیں۔ وہ اینٹ ہے تو ہم پتھر۔ وہ سیر ہے تو ہم سوا سیر۔ مجھے معلوم ہے کل رات ہی رانا پیلس میں زلزلہ آ گیا ہو گا لیکن دیکھو ابھی تک نہ اس کے جانثاروں کی فوج شکاری کتوں کے ساتھ حملہ آور ہوئی ہے نہ ہمیں کوئی دھمکی ملی ہے۔ جیسا کہ پہلے ہوتا تھا۔''

راجا نے کہا۔ ''اب وہ سوچ رہے ہیں کہ کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ ہم نے ان کو سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ یہ بھی ہماری بڑی کامیابی ہے کہ اب وہ سوچے سمجھے بغیر ہمارے خلاف قدم اٹھاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ کیا یہ بات تمہاری سمجھ میں آتی ہے؟''

''یہ آج کی دنیا میں بقا کے فن کا سبق ہے شہزادے۔''

شہزاد نے سر ہلایا۔ ''اس وقت رانا کہاں ہے؟''

میں نے کہا۔ ''یہ مجھے بھی نہیں معلوم لیکن معلوم کر لیتے ہیں۔''

''ویسے وہ جہاں بھی ہے صحیح سالم اور خیر و عافیت سے ہو گا۔'' راجا بولا۔

غنی نے بلائے جانے کے کچھ دیر بعد آ کے معذرت کی۔

''وہ دراصل کچھ بندے بلائے تھے میں نے۔ حفاظتی انتظامات بڑھانے کے لیے۔ ان سے بات کر رہا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''تم مزید سیکیورٹی گارڈز رکھنا چاہتے ہو۔''

''چند روز کے لیے سر! مجھے کچھ ایسی خبریں ملی تھیں۔ میں نے دس آدمی تو باہر بٹھا دیے ہیں۔ دس اِدھر اُدھر پھیلانے ہیں۔ ان کے پاس جو باہر کھڑے ہیں کوئی اسلحہ نہیں ہے لیکن کلہاڑیاں ہیں اور لاٹھیاں ہیں۔''

میں نے حیرانی سے کہا۔ ''کلہاڑیاں اور لاٹھیاں؟''

''جی سر! ابھی اسلحہ ہمارے پاس ہے کہاں۔ جو ہے وہ پہلے ہی گارڈز کو دیا جا چکا ہے۔''

''تم سمجھتے ہو... کچھ اور اسلحہ چاہیے؟'' میں نے کہا۔

''ضرورت تو ہے سر! کم سے کم ریوالور ہوں تو ضرورت پڑنے پر اضافی نفری کھڑی کی جا سکے۔ یہ کام کے بندے ہیں۔ ریوالور چلانا نہیں جانتے مگر انہیں سکھایا جا سکتا ہے۔ میں انتظام بھی کر سکتا ہوں۔''

راجا نے کہا۔ ''ابھی یہ کیا کریں گے لاٹھی کلہاڑی سے؟''

''دراصل رانا کے اغوا کی خبر نے بڑی آگ لگائی ہے۔ اس کا بیٹا بہت مشتعل تھا۔ اس نے کل رات ہی اپنے بندے سڑک پر بٹھا دیے تھے۔ آپ کی قسمت تھی کہ سڑک سے نہیں گزرے۔''

راجا بولا۔ ''قسمت نہیں... میری ذاتی دور اندیشی کی صلاحیت۔''

''ان کا خیال تھا کہ رانا صاحب کو آپ یہاں لائیں گے۔ حویلی میں اور ظاہر ہے اکیلے اپنی گاڑی میں بیٹھا کے نہیں لے آئیں گے۔ آپ کے ساتھ حفاظت کرنے والے ہوں گے۔ انہوں نے اپنے اندازے کے مطابق چوگنی فورس اکٹھی کی تھی جو آپ کی محافظ فورس کو بے بس کر دے۔ ایک بندے پر چار بندے ہوں تو مقابلہ کیسا۔ انہیں یقین تھا کہ وہ رانا صاحب کو چھڑا لیں گے اور ان کے ساتھ آپ کو بھی لے جائیں گے۔ کوئی کہتا ہے پچاس بندے تھے کوئی سو بتاتا ہے جو رات بھر جنگل میں چھپے آپ کی راہ دیکھتے رہے۔ سب مسلح نہیں تھے۔ جو مسلح تھے ان کو بھی ہدایت تھی کہ جب تک ان پر گولی نہ چلائی جائے وہ فائر نہ کریں۔ جیسے ہی ہمارا قافلہ نمودار ہو۔ اِدھر اُدھر سے ایک دم ٹوٹ پڑیں۔ سیکیورٹی والوں کو بے بس کر دیں اور ہمیں لٹا دیں۔ باقی سب کو گاڑی میں ڈال کے لے جائیں اور بس خاموش۔ لیکن معاملہ الٹا ہو گیا۔ نہ آپ لوگ آئے نہ رانا صاحب کو لایا گیا۔ وہ دو گھنٹے جھاڑیوں میں چھپے رہے پھر باہر نکلے اور جی ٹی روڈ تک گئے۔ وہاں انہوں نے آپ کی گاڑی دیکھی۔ میرا مطلب ہے ڈاکٹر صاحبہ کی گاڑی۔ انہوں نے اس کو دھکا لگا کے ایک طرف کیا اور آس پاس کا سارا علاقہ چھان مارا۔''

راجا بولا۔ ''مسٹر عبدالغنی... اتنی تفصیلی رپورٹ تم نے کیسے حاصل کر لی؟''

میں نے کہا۔ ''غنی کے وسائل ہیں۔ رانا پیلس کے اندر اس کے مخبر... بلکہ اس کی مخبر موجود ہے۔ اس کے بارے میں غنی نے مجھے اعتماد میں لے کر بتایا تھا۔ چنانچہ آپ کو اس سے زیادہ نہیں بتایا جا سکتا۔''

غنی کچھ شرمایا۔ ''رانا کے بیٹے کا خیال ہے کہ گاڑی دھوکا دینے کے لیے وہاں چھوڑی گئی ہو گی۔ رانا کو اور کوئی ہم سے چھین کر نہیں لے جا سکتا۔ ایسا علاقے میں کوئی نہیں۔''

''کیوں؟ شامی بادشاہ نہیں ہے کیا۔''

''شامی کو ہمارا ساتھی سمجھا جاتا ہے۔ وہ جو ڈانسر تھی ساحرہ اور اس کی ماں نے بھی یہی بتایا ہے کہ نواب رفیق اس کے ڈیرے پر موجود تھے اور وہیں سے ساتھ آئے تھے حلیہ اور بھیس بدل کے۔ اس سے وہ لوگ خاصے پریشان ہیں شامی بادشاہ کے گروہ سے نمٹنا آسان نہیں اور اگر رانا ان کی تحویل میں ہے تو اسے چھڑانا زیادہ مشکل ہو گا۔ شامی سے بات کون کرے گا۔ پولیس اس کے ساتھ ہے اور شامی کسی کی مانتا ہے تو وہ آپ ہیں۔''

راجا خوش ہو کے بولا۔ ''یہ کتنی خوشگوار فرحت بخش اور دلچسپ غلط فہمی ہے۔ بائی داوے۔ رانا کو تم نے کہاں رکھا ہے۔ ہمیں بتا دو۔ ہم کسی کو نہیں بتائیں گے۔ آپس کی بات ہے۔''

غنی ہنسنے لگا۔ ''وہ بالکل محفوظ ہیں سر! بہت آرام سے رکھا ہے انہیں۔ مگر کسی کا خیال بھی وہاں نہیں جا سکتا۔''

''گڈ! تم کمال کے آدمی ہو۔ اگر میں ملک کا صدر ہوتا تو تمہیں کمانڈر انچیف بنا دیتا۔''

''میں ڈائریکٹر جنرل آئی ایس آئی مقرر کرتا۔'' راجا بولا۔

''اہم سوال یہ ہے...'' شہزاد سوچتے ہوئے بولا۔

''کہ اس وقت وہاں کیا ہو رہا ہے اپوزیشن کیمپ میں۔ تم کیا سمجھتے ہو وہ کیا کریں گے۔''

''سر! ان کے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ یا وہ نواب صاحب سے بات کریں گے یا پولیس سے۔ طاقت کے استعمال سے کل رات کچھ بھی حاصل نہیں ہوا۔ بات پھیلے گی تو مزید خرابی ہوگی۔''

''تم نے ایک سو ایک فیصد صحیح فرمایا۔ لیکن غنی کیا وہ جوابی کارروائی نہیں کر سکتے؟''

راجا نے کہا۔ ''مثلاً وہ کیا کر سکتے ہیں؟''

''ایک تو یہی کہ مجھے اٹھالیں۔ یا حویلی کے کسی بھی فرد کو اغوا کرلیں۔ آج نہ سہی کل۔''

''یہ ہو سکتا ہے۔ ہمیں زیادہ محتاط رہنا ہوگا سر! ان کو زیادہ پریشانی ہے رانا کی کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ وہ کوئی نوجوان تو ہے نہیں کہ سختی برداشت کر سکے۔ بیمار بھی ہے۔ وہ جلد از جلد اسے واپس رانا پیلس میں دیکھنا چاہتے ہیں۔'' غنی نے کہا۔

''وہ جلد از جلد رانا پیلس سے بھی بڑے گھر میں ہوگا۔ لوگ اسے جیل کہتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''اس ڈر سے کہ وہ پاگل پن میں حملہ نہ کردیں۔ میں نے بندے کھڑے کردیے ہیں۔ اگر بے وقوفی کی تو یہ کلہاڑیوں اور لاٹھیوں سے مقابلہ کریں گے۔ پھر انسانوں کے سر بھی کٹ کے گریں گے اور کتوں کے بھی۔ اوپر ہمارے گارڈ کھڑے ہیں کلاشنکوف لے کر۔''

میں نے کہا۔ ''غنی! تم نے پانی پت جیسی جنگ کا انتظام کیا ہے۔ اس میں تو بڑی خوں ریزی ہوگی۔''

وہ مسکرایا۔ ''سر! یہ دفعہ ہر کا نوے لگائی ہے میں نے۔ اس تیاری کی خبر بھی انہیں پہنچادی ہے تاکہ وہ رک جائیں۔ اگر کوئی خیال ہے دماغ میں حملہ کرکے حویلی ختم کرنے کا تو دل سے نکال دیں۔ فوج ادھر بھی تیار ہے۔ اب وہ کچھ نہیں کریں گے۔ سوائے مذاکرات کے۔ جو تین فریق کر سکتے ہیں۔ پولیس کے اعلیٰ افسران، شاہی بادشاہ یا آپ۔''

میں نے اسے شاباش دی۔ ''تم نے واقعی بہت ذہانت اور محنت سے ایک ذمے داری نبھائی۔ اب تم جاؤ رات تک آرام کرو۔ تمہاری نئی نویلی دلہن الگ پریشان ہوگی۔ اسے تسلی دو۔''

''اس کی خیر ہے سر!'' غنی بولا۔ ''رات کو کیا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''رات کو ہم تمہارے ساتھ چلیں گے۔ رانا سے ملاقات کے لیے۔''

غنی نے سر ہلایا اور باہر نکل گیا۔ عادت کے مطابق میں ریشم کو پکارنے والا تھا کہ چائے کافی کچھ بھی لادے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ ابھی تو غنی گیا ہے۔ نئی دلہن کا چند روز کا نیا دلہا رات بھر غائب رہے تو ایسی فرض شناسی کس دلہن کو اچھی لگتی ہے۔ رابعہ اور لیلیٰ بھابی اسکول میں مصروف تھیں اور شہناز کلینک میں۔ میں نے بہتر سمجھا کہ اپنا کام خود ہی کرلیا جائے مگر پھر ریشم کی ماں فاطمہ آگئی۔ وہ آج کل کچھ بیمار تھی لیکن اس نے مجھے کچن میں کام نہیں کرنے دیا۔

راجا اور شہزاد اس وقت عبدالغنی رپورٹ کے مختلف پہلوؤں پر غور کر رہے تھے۔ شہزاد یہ جاننا چاہتا تھا کہ ہمارا اگلا قدم کیا ہوگا۔

میں نے کہا۔ ''تمہیں اس لیے بلایا گیا ہے شہزادے کہ تم کچھ مشورہ دو۔ رانا ہمارے پاس ہے۔ ہم اسے تھانے میں پیش نہیں کر سکتے کہ اسے ہم پکڑ کے لائے ہیں۔ اب آپ مفرور مجرم کی گرفتاری ڈالو۔''

''وہ ہمیں اندر ڈال دیں گے۔ اغوا کیس میں اور اغوا بھی کس کا، ایک رکن اسمبلی کا۔'' راجا بولا۔

میں نے کہا۔ ''اگر پولیس کو اطلاع دیں کسی ذریعے سے کہ رانا فلاں جگہ موجود ہے تو وہ جائیں گے اور اسے آزاد کرکے یہ کہیں گے کہ سر لائیے ہمارا انعام۔ دیکھیے کس جانفشانی سے رات دن ایک کرکے ہم نے پتا چلالیا کہ اغوا کاروں نابکاروں نے آپ کو کہاں قید کر رکھا ہے اور بلاشبہ رانا ان کے منہ موتیوں سے بھر دے گا جب ان کے منہ سے ہمارے لیے گالیاں نکلیں گی۔''

''پھر کیا کریں؟'' راجا نے لمبی سانس کھینچی۔

میں نے کہا۔ ''یہ ہوا نا ایک کروڑ روپے کا سوال۔ کس کے پاس ہے جواب؟''

شہزاد نے سر ہلایا۔ ''یہ بہت سنگین مسئلہ ہے۔ ہمیں سوچ سمجھ کے قدم اٹھانا پڑے گا ورنہ یہ معاملہ الٹا ہمارے گلے پڑ جائے گا۔''

''سوچنے کے لیے دماغ۔ وہ ہے صرف میرے پاس۔ یہ کل میں ثابت کرچکا ہوں اس لیے آپ لوگ فکر چھوڑیں۔'' راجا بولا۔

ریشم نے اسکول میں چھٹی کی گھنٹی بجائی حالانکہ یہ اس کے فرائضِ منصبی میں شامل نہیں تھا۔ وہ ڈاکٹر شہناز کی افسر بکار خاص تھی اور اب خود کو ڈاکٹر کہلواتی تھی۔ یہ تماشا بھی میں نے ایک دن دیکھا تھا۔ پرانے لوگ اور بڑے بوڑھے اسے حسبِ سابق ریشم کہتے تھے تو وہ ایک بار انہیں نرمی سے

سمجھاتی تھی کہ وہ ڈاکٹر ریشم ہے۔ دوسری بار سختی سے کہتی تھی کہ اسپتال آئیں تو ڈسپلن کا خیال رکھیں۔ کل کو انہوں نے بے تکلفی سے ڈاکٹر شہناز کو صرف شہناز کہنا شروع کردیا تو انہیں سزا ملے گی۔ تیسری بار یہ گستاخی کرنے والوں کو اس نے قطار کے آخر میں کردیا۔ ''اب تم دو گھنٹے بیٹھو گے تو پھر کبھی نہیں بھولو گے۔'' اور یہ سزا موثر ثابت ہوئی۔

اس کا ارادہ تو تھا کہ چوتھی بار کے مجرم کو کلینک سے نکال دیا جائے لیکن اس کی اجازت شہناز نے نہیں دی۔ دیکھتے دیکھتے وہ ڈاکٹر ریشم ہوگئی۔ چند گھنٹوں کے لیے ہی سہی۔ غنی ہنستا تھا کہ کیا کوئی ایسے زبردستی ڈاکٹر بن سکتا ہے پاگل کی بچی۔ جواب میں ریشم غنی کو اس کی اوقات یاد دلاتی تھی۔ تم بھی تو ٹرک ڈرائیور تھے۔ اب بنے پھرتے ہو چیف سیکورٹی آفیسر۔ ان کی لڑائیاں بے حد پُرلطف ہوتی تھیں کیونکہ ریشم بولتی تھی انگریزی جسے سمجھنا آسان نہیں تھا اور غنی اگر غصے میں ہو تو پوٹھوہاری زبان کی وہ گالیاں بھی دے جاتا تھا جو کسان ہل چلاتے ہوئے بکتے ہیں اور تانگے والا اڑ جانے والے گھوڑے کو دیتا ہے۔

ریشم دوسری بار وہی گھنٹی کھانے کا اعلان کرنے کے لیے بجاتی تھی۔ وہ بڑی دلچسپ لڑکی تھی۔ تیز طرار، شوخ اور پارے کی طرح بے چین لیکن انتہائی ذہین مخلص خدمت گزاری میں آگے اور معصوم۔ چالاکی فریب کاری اور بدنیتی کا وہ مطلب بھی نہیں سمجھتی تھی۔

رابعہ اور لیلیٰ بھابی اسکول سے فارغ ہوکے آئیں تو ہم مہمان خانے میں صوفوں پر نیم دراز دنیا داری کے معاملات میں الجھے ہوئے تھے۔ صوفے پر گر کے رابعہ نے کہا۔ ''اف... پڑھنا واقعی بہت آسان تھا۔ پڑھانا بہت مشکل ہے۔ دماغ خالی ہوجاتا ہے۔''

میں نے اتفاق کیا۔ ''ہاں۔ لیکن تمہارے ساتھ یہ پرابلم بہرحال نہیں ہو سکتی۔ وہ قدرت نے خالی ہی رکھا ہے کزن۔''

''ان سے مت بات کرو۔ یہ ہمارے افلاطون ہیں۔'' لیلیٰ بھابی نے کہا۔ ''ایک دن پڑھائیں نا ان بچوں کو تو پتا چل جائے۔''

راجا نے ان کے سامنے پانی کا گلاس رکھا۔ ''کڑوے گھونٹ کو پی جائیں لیڈیز۔ حسن اور عقل میں ایک چیز خدا نے آپ کو دی اور دوسری ہمیں تو تقدیر سے گلہ کیسا۔ صبر اختیار کریں۔''

شہناز کی ڈیوٹی واقعی سخت تھی۔ اگر ریشم جیسی معاون نہ ہوتی تو وہ دیہاتی بیماروں اور تیمارداروں کے نرغے میں پاگل ہوجاتی۔ ریشم انہیں بیس فٹ دور قطار میں کنٹرول کرتی تھی۔ ایک وقت میں صرف ایک کو شہناز کی ٹیبل تک جانے دیتی تھی۔ کوئی لمبی اور فضول بات کرے تو فوراً اسے ٹوکتی تھی۔ اس کے باوجود شہناز کے لیے مریضوں کا حال سمجھنا اور انہیں علاج کے لیے احتیاط سمجھانا مشکل ہوتا تھا۔ وہ کبھی کبھی ہمیں لطیفے سناتی تھی۔ ایک عورت نے کہا کہ گولی خاک اثر کرے گی۔ اس کی ساس اس پر جادو کروا رہی ہے۔ وہ دوا کا توڑ ہے۔ ایک بزرگ جاننا چاہتے تھے کہ سوئی یعنی انجکشن لگانے سے جسم میں جو اضافی سوراخ ہوگا وہ بند کیسے کیا جائے گا۔ ایک مسئلہ یہ تھا کہ کلینک کا ٹائم ختم ہونے کے باوجود مریض آتے رہتے تھے اور شہناز کے مذہب میں دیر سے آنے والے کو علاج سے انکار کرنا گناہ کے مترادف تھا۔

سہ پہر کے قریب ہم کھانا کھا رہے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ چھیڑ خانی کی لڑائی سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ ریشم نے میرے موبائل پر فون کال ریسیو کی۔ حسبِ عادت اس نے کہا۔ ''ڈاکٹر ریشم ٹاکنگ۔'' اور پھر ایک دم سیدھی ہوگئی۔ ''سلام ابا جی۔ کیسے ہیں آپ۔ اماں کیسی ہیں... جی... جی میں دیتی ہوں۔''

اس نے فون مجھے پکڑا دیا۔ یہ کال اس لیے غیر متوقع تھی کہ عام طور پر ان کا فون رات عشا کی نماز کے بعد آتا تھا۔ پاکستان میں اس وقت رات کے ساڑھے دس گیارہ کا عمل ہوتا تھا اور ہم سب کھانے سے فارغ ہونے کے بعد اطمینان سے گفتگو کرتے تھے۔

میں نے سلام کے بعد پوچھا۔ ''خیریت ہے نا ابا جی۔''

وہ حسبِ عادت پُرسکون لہجے میں بولے۔ ''ہاں... تمہاری اماں کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ وہاں بھی بیمار تو رہتی تھیں۔''

میں نے کہا۔ ''کیا کوئی تشویش کی بات ہے؟''

''نہیں... اللہ مالک ہے رفیق میاں... زندگی اور موت تو اس کے ہاتھ میں ہے۔ میری خواہش ہے کہ ان کی حج کی خواہش ضرور پوری ہوجائے جس کے لیے انہوں نے یہاں تک سفر کیا۔ حالانکہ ان کی صحت اجازت نہیں دیتی تھی۔''

میں نے کہا۔ ''آپ بتاتے کیوں نہیں۔ کیا ہوا ہے اماں کو۔''

''پریشانی سے کیا ہوگا برخوردار۔ بس دعا کرو۔ وہ اسپتال میں ہیں۔ ڈاکٹر تو کہتے ہیں کہ اللہ نے چاہا تو وہ چار دن میں ٹھیک ہوجائیں گی۔ حج میں تو ابھی دس دن ہیں۔''

''ہاں... لیکن وہ مناسکِ حج کیسے ادا کریں گی؟''

''میں کوشش کروں گا کہ ان کی ہمت ساتھ دے تو وہیل چیئر پر بٹھا کے یہ فرض پورا ہو جائے۔ طواف، سعی اور رمی میں کچھ جسمانی توانائی درکار ہوتی ہے لیکن یہاں معذوروں کی مدد کے اسباب ہیں۔ بس اللہ مجھے بھی ہمت دے اور انہیں بھی۔''

میں نے کہا۔ ''آپ اپنی صحت کا خیال رکھیں۔''

''مجھے کیا ہوا ہے۔ اللہ نے چاہا تو ٹھیک ہی رہوں گا۔ اچھا رات کو بات ہوگی۔ ابھی ڈاکٹر مجھے بلا رہا ہے۔ خدا حافظ!''

اس خبر نے سب کا موڈ آف کر دیا اور ماحول کی شگفتگی پر تشویش غالب آگئی۔ میرا دل کہتا تھا کہ معاملہ اس سے کہیں زیادہ سنگین ہوگا جتنا ابا نے بتایا۔ وہ معمولی باتوں کو ہنس کر ٹال دیتے تھے۔ بخار تیز ہو تب بھی بتاتے نہیں تھے۔ خاموشی سے گولی کھا لیتے تھے اور پتا چل جائے تو کہتے تھے کہ ڈاکٹر کے پاس کیا جانا۔ معمولی حرارت ہے۔ ہمیں پریشانی سے بچانے کے لیے انہوں نے جس کو طبیعت کی خرابی قرار دیا تھا شاید وہ اس سے کہیں آگے کی بات تھی۔ ممکن ہے اماں آئی سی یو میں ہوں۔ انہوں نے دعا کے لیے کہا تھا۔ کیا اس کا یہ مطلب تھا کہ دوا کارگر نہیں ہو رہی ہے؟

اپنے اپنے طور پر ہم سب ایک دوسرے کو تسلی دیتے رہے لیکن دل ہی دل میں اندیشوں سے بھی لڑتے رہے۔ اس ماحول میں میرے فون کی رنگ ٹون سنائی دی تو میں نے اسکرین پر نمودار ہونے والے نمبر کو دیکھا۔ یہ بظاہر اجنبی نمبر تھا۔ اس امید پر کہ شاید کوئی رانا کے اغوا کے معاملے پر مصالحت اور مفاہمت کی بات کرے اور کچھ نہیں تو خطرناک نتائج کی دھمکی ہی دے۔ میں نے کال ریسیو کر لی۔

''نواب رفیق احمد شیرازی بول رہے ہیں؟'' کسی نے میری ہیلو کے جواب میں شائستگی سے سوال کیا۔

میں نے کہا۔ ''جی میں عرض کر رہا ہوں۔''

''میں عبداللہ خان ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''کیسے مزاج ہیں آپ کے سر! چارج لے لیا آپ نے یا ابھی اسلام آباد ہی میں ہیں؟''

''مجھے چارج لیے ایک ہفتہ ہو گیا ہے۔''

''کہیے آج کیسے یاد کیا۔ میرے لائق کوئی خدمت۔'' میں نے رسمی کہا۔

''نواب صاحب! مجھے آپ سے ملنا تھا۔'' وہ بولا۔

میں نے کہا۔ ''کمال کرتے ہیں آپ۔ حاکم لوگ حکم دے کر طلب کرتے ہیں۔''

وہ ہنسا۔ ''یہی تو کر رہا ہوں۔ کیا آج رات آپ فارغ ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''آپ کا گھر ہے سر! جب چاہیں تشریف لے آئیں۔''

''آپ نے بڑی خوبصورتی سے پٹری بدل دی۔ ہم تو آپ کے مہمان ہو چکے آج میں میزبان ہونے کی بات کر رہا تھا۔''

ایک پولیس مین کی زبان سے ایسی نستعلیق گفتگو سن کے حیرت ہوئی تھی۔ میں نے کہا۔ ''یہ تکلف صرف بہرِ ملاقات کر رہے ہیں آپ؟''

''جب ملاقات ہوگی تو کام کی بات بھی ہو جائے گی۔''

میں نے سمجھ لیا کہ اس دعوت کے پردے میں مجھے انہی سیاسی معاملات پر مذاکرات کے لیے بلایا جا رہا ہے جو رانا کی اور میری چپقلش سے خراب ہو رہے تھے اور قابو سے باہر ہونے لگے تھے۔ پولیس کے سربراہ کی حیثیت سے امن و امان اس کی ذمے داری تھی لیکن نہ وہ روایتی انداز میں کام کرنے والا افسر تھا اور نہ ہم عام لوگ تھے جن کو ایک تھانیدار طلب کر کے سمجھا دیتا ہے کہ بندے دے پتر بن جاؤ ورنہ دونوں کو ڈک دوں گا۔

میں نے کہا۔ ''آپ فرمائیے میں کس وقت حاضر ہو جاؤں؟''

''میں آپ کی بات دہراتا ہوں۔ آپ کا گھر ہے جب چاہیں تشریف لے آئیں۔'' وہ بولا۔

میں نے کہا۔ ''بہت بہتر! میں حاضر ہو جاؤں گا۔ بس ایک وضاحت مطلوب تھی۔ میری مسز کے عہدے پر تو ابھی تک کوئی بھی خاتون فائز نہیں۔''

''آپ نے موقع نہیں دیا ہوگا ورنہ درخواست گزار تو قطار باندھے منتظر ہوں گے۔ وضاحت والی بات بھی سمجھ گیا۔ والیانِ ریاست اور ہیڈ آف اسٹیٹ اکیلے کہیں نہیں جاتے۔ آپ بھی اپنے مصاحب شہزاد اور میڈیا پرسن کے ہمراہ ہی آئیں گے۔ بس ذرا ان کی تعداد غریب خانے کو اور غریب کو دیکھتے ہوئے محدود رکھیے گا۔''

میں نے ہنس کے کہا۔ ''یقین نہیں آتا کہ ایسی شستہ زبان ایک پولیس افسر بول سکتا ہے۔ جناب والا آپ قطعی پریشان نہ ہوں۔ مجھ سمیت پانچ افراد ہوں گے۔ ایک راجا جسے آپ میڈیا کا نمائندہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ ایک ڈرائیور۔ دو سیکیورٹی گارڈ۔''

''تھینکس نواب صاحب! میں چشم براہ ہوں۔'' اس نے فون بند کر دیا۔

''یہ بات تو سمجھ میں آگئی کہ تجھے ڈی آئی جی عبداللہ صاحب نے بلایا ہے۔ یہ بتا کیوں بلایا ہے؟'' راجا نے کہا۔

''یار اس نے ایسی ادبی گفتگو کی کہ اس کی نیت اور مقصد کے بارے میں اندازہ لگانا بھی مشکل تھا۔'' میں نے کہا۔ ''عجیب آدمی ہے۔''

''عجیب ڈی آئی جی ہے۔ اپنی تصحیح کر لے۔''

میں نے کہا۔ ''اس نے کھانے کی دعوت دی ہے۔ اپنے گھر پر لیکن اشارہ دیا ہے کہ کام کی بات بھی ہوگی۔''

''آپ شرط لگا لیں مجھ سے۔ کام کی بات وہی ہوگی رانا کے بارے میں۔ رانا کے ولی عہد نے اسے بیچ میں ڈالا ہے۔'' شہزاد بولا۔

''ہارنے والی شرط میں نہیں لگاتا۔''

راجا نے مجھے آنکھ ماری۔ ''خوب یاد آیا۔ میرے ہزار روپے نکال نیکے پتر۔''

میں نے کہا۔ ''کس بات کے مہاراجا۔''

''تو نے شرط لگائی تھی کہ رابعہ کو میجر طاہر آفریدی کا رشتہ منظور نہیں ہوگا۔ لیکن اس نے منظور کر لیا تھا ہنسی خوشی۔''

میں نے جیب سے ہزار کا نوٹ نکال کے اسے پیش کیا۔ ''میں بھی کسی کمینے آدمی کا قرض رکھنا نہیں چاہتا۔ تیرا کیا بھروسا۔ ایسے وقت مانگ لے جب میری جیب خالی ہو۔ سب کے سامنے بے عزتی خراب ہو جائے۔''

کن انکھیوں سے میں نے دیکھا کہ شہزاد کا رنگ اڑ گیا تھا۔ یکلخت اس کی شوخ طبعی کا نور ہو گئی تھی اور وہ فکر مند نظر آنے لگا تھا۔ وہ ایک دم باتھ روم جانے کا بہانہ کر کے اٹھا اور اندر چلا گیا۔ راجا نے قہقہہ لگا کے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ''یہ گیا ہوگا سیدھا رابعہ کے پاس۔''

میں نے کہا۔ ''ابھی آئے گا اس سے کچھ سن کے۔''

راجا بولا۔ ''تو نے شہزاد کو ساتھ لے جانے کی بات نہیں کی۔''

''میں نے سوچا کہ وکیل کے نام پر اسے یہ خیال نہ ہو کہ میں ایک ذاتی دعوت کو بھی آفیشل ٹچ دے رہا ہوں۔ غالب نے کہا تھا۔

لازم ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے''

''اور وہاں عبداللہ جان نے بعد از طعام اسی شائستگی سے کہا کہ نواب صاحب! ست بدھائی کی حویلی جانے کا خیال چھوڑیے۔ جب تک رانا صاحب نہیں آتے اس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھیے... پھر'' شہزاد نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''کیا تیرا مطلب ہے وہ مجھے گرفتار کر لے گا۔ اگر میں نے رانا کا پتا نہ بتایا یا اس سے تعاون نہ کیا۔''

''یہ ناممکن نہیں ہے نیکے پتر۔'' راجا نے کہا۔

''یہ ممکن بھی نہیں ہے مہاراجا۔ میں اکیلا نہیں جا رہا ہوں۔''

''بے شک تو اپنے ساتھ فوج لے جا۔ وہ تجھے کسی ڈی آئی جی کے گھر کے اندر سے چھڑا کے نہیں لے جا سکتی۔ اگر وہ تجھے روکنا چاہے گا تو باقی سب کو ہری جھنڈی دکھا دے گا کہ آپ لوگ جا سکتے ہیں۔ میں کیا کر لوں گا اور تیرے محافظ کسی کا کیا بگاڑ لیں گے۔ وہ تو بلا لے گا پولیس کی ساری نفری۔''

''تو سمجھتا ہے کہ دعوت مجھے گرفتار کرنے کا بہانہ ہے۔''

''ہو بھی سکتا ہے۔''

''ایک ڈی آئی جی کو کیا ضرورت ہے ایسا ڈراما کرنے کی۔ کیا وہ میری گرفتاری کے احکامات جاری نہیں کر سکتا؟ مجھے گرفتار کرتے ہوئے ڈرتا ہے؟''

''سیاست نیکے پتر! سیاست۔ وہ بدامنی اور انتشار پھیلانا نہیں چاہتا۔ کسی سے بھی بگاڑ مول لینا نہیں چاہتا۔ اگر تو شرافت سے اس کی بات مان لے گا تو وہ کہے گا تھینک یو نواب صاحب! آپ کے تعاون کا۔ ورنہ ساحرہ یا انمول کے مقدمات کو بنیاد بنا کے تیرے خلاف مقدمہ درج کیا جا سکتا ہے۔''

شہزاد نے سر ہلایا۔ ''میں راجا صاحب سے اتفاق کرتا ہوں۔ رانا کا مغرور ہونا الگ مسئلہ ہے۔ وہ بعد میں پکڑا جائے گا کبھی نہ کبھی۔ پہلے آپ کو بند کیا جائے۔ بعد میں عدالت کی مرضی جیسے چاہے وقت برباد کرے۔ جسے چاہے سزا دے یا باعزت بری کر دے۔''

میں نے کہا۔ ''تم دونوں سمجھتے ہو کہ یہ دعوت ایک ٹریپ ہے۔ لیکن میں اب کیا کروں۔ میں نے دعوت قبول کر لی ہے۔''

''اس مسئلے کا حل بھی راجا نے نکالا۔ ''اگر شام تک صورت حال ایسی ہو جائے کہ تجھے معذرت کرنی پڑے۔''

میں نے کہا۔ ''اس میں کوئی قباحت نہیں۔''

''ہم صورتِ حال کو ایسے بناتے ہیں۔'' راجا نے کہا۔

''دو دن سے آپ علیل تھے۔''

''صاحبِ فراش۔'' شہزاد نے کہا۔

''آپ کو ملیریا تھا یا کوئی بخار۔ شہناز بہتر بتا سکتی ہے۔ آپ حویلی سے تو کیا اپنے کمرے سے باہر نہیں آئے۔''

''نواب گاہ خاص ہے۔'' شہزاد نے پھر تصحیح کی۔

''آج طبیعت کچھ سنبھلی تھی۔ آپ نے دعوت نامہ قبول کر لیا لیکن سہ پہر کے بعد بخار نے پھر پکڑ لیا اور ایسا کہ

یار اتھرمامیٹر توڑ کے نکل گیا۔"

"پارے کے ایک سو آٹھ کے نشان تک پہنچنے سے قبل ہی بندہ اوپر پہنچ جاتا ہے۔" شہزاد نے یاددلایا۔

"تم چپ بیٹھ کے سنو۔ بڑوں کی بات میں بچے نہیں بولتے۔ شام چھ سات بجے شہناز خود ڈی آئی جی صاحب کو فون پر بتاسکتی ہے کہ نواب صاحب کی کیا حالت ہے۔ میں ان کی طرف سے معذرت کرتی ہوں۔ آج وہ نہیں آسکتے۔"

"ٹھیک ہے۔ وہ کہے گا کہ کل سہی۔"

راجا نے کہا۔"یار بیماری لمبی چل سکتی ہے۔ ٹائیفائیڈ تین ہفتے چلتا ہے۔ طبی معاملات پر ہم اظہار رائے کیوں کریں۔ شہناز کوئی بیماری ایجاد کر لے گی۔" راجا نے کہا۔

لیکن ہوا یوں کہ شہناز نے صاف انکار کردیا۔"میں جھوٹ نہیں بولوں گی۔"

"یہ بھی جھوٹ ہے جو تم کہہ رہی ہو۔" راجا نے خفگی کا اظہار کیا۔

شہناز نے اسی بے رُخی سے کہا۔"چلو یہ بھی پتا چل جائے گا۔"

راجا نے مزید ناراضی ظاہر کی۔"میرے سامنے پارسا بنتی ہو۔ آج تک جھوٹ کے سوا کچھ بولا ہے تم نے۔"

اب لیلیٰ بھابی نے اس کی وکالت کی۔"آج تک کی بات چھوڑو۔ خدا جب چاہے کسی کو ہدایت دے۔"

شہناز نے کہا۔"اور تم لوگ چشم بددور۔ اتنے ذہین اور فطین ہو۔ ایک سے بڑھ کر ایک افلاطون۔"

رابعہ نے کورس میں ان کا ساتھ دیا۔"اور ہم ٹھہریں ناقص العقل خواتین۔ ہر بات میں کہتے ہو کہ یہ آپ کے سمجھنے کی نہیں۔"

"تو یہ بات ہے۔" میں نے کہا۔"لیڈیز! فرض کرو ہم مل کے باجماعت، دست بستہ معافی مانگ لیں۔"

"واہ ..ایک نواب ایک راجا اور ایک شہزادے کو غرض نے کتنا مجبور کردیا ہے۔" رابعہ نے کہا۔

راجا نے کہا۔"آپ لوگ ذرا اپنے پاؤں آگے کریں۔"

شہناز نے اسے گھورا۔"وہ کیوں؟"

"ہم اپنی غلطی پر پاؤں پڑ کے معافی مانگنا چاہتے ہیں۔ برا وقت آجائے تو گدھے کو بھی باپ بنانا پڑتا ہے۔"

رابعہ ہنس پڑی۔"بڑے ڈرامابازاور ڈھیٹ ہو سب۔"

میں نے راجا سے ہاتھ ملایا۔"مبارک ہو... سب کی ناراضی ختم۔ رابعہ سب کی طرف سے ہنس رہی ہے۔"

"جیسے میں سب کی طرف سے پاؤں پڑ کے معافی مانگنے کی بات کررہا تھا۔" راجا نے کہا۔"واقعی خواتین کو بے وقوف بنانا ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔"

شام کو شہناز نے ڈی آئی جی عبداللہ صاحب کو فون کیا اور اسے میری کیفیت بتائی۔ وہ سب سنتا رہا اور اخلاقاً تشویش کا اظہار بھی کرتا رہا۔ ہم ہینڈ فری فون پر سنتے رہے۔

شہناز نے کہا۔"اس وقت بھی بخار ایک سو چار پر ہے۔ ظاہر ہے وہ اٹھ بھی نہیں سکتے تو آپ کی دعوت میں کیسے آسکتے ہیں۔"

"دعوت کی کوئی بات نہیں۔ اللہ انہیں صحت دے۔ آپ انہیں کسی اسپیشلسٹ کو دکھادیں۔"

"نہیں... ابھی اس کی ضرورت نہیں۔"

وہ بولا۔"جہلم میں بہت اچھے ڈاکٹر ہیں اور اسپتال بھی۔ آپ چاہیں تو سی ایم ایچ میں بھی انتظام کیا جاسکتا ہے، یا لاہور۔"

"تھینک یو سر!"

"بلاتکلف مجھے فون کردیں۔ ایمبولینس پہنچ جائے گی۔ دعوت کی کوئی بات نہیں۔ یار زندہ صحبت باقی۔"

فون رکھ کے شہناز نے ایک گہری سانس لی۔"کہاں پھنسادیا تم نے مجھے۔ یہ تو بہت کائیاں آدمی ہے۔"

راجا نے کہا۔"ایسے ہی تو ڈی آئی جی نہیں بن گیا۔"

یہ کسی کے خواب وخیال ہی میں نہ تھا کہ عیادت کو بہانہ بناکے وہ خود آدھمکے گا۔ ہم شام کے وقت لان میں کرسیاں ڈالے چائے پی رہے تھے اور خوش فعلیوں میں مصروف تھے کہ گارڈ نے اطلاع دی۔"کوئی عبداللہ صاحب آئے ہیں۔"

ایک دم بھگدڑ مچ گئی۔ راجا نے چٹکی بجائی۔"چل بیمار تو اندر جاکر لیٹ۔"

شہناز بولی۔"میں بھی جاتی ہوں مریض کے ساتھ مگر یہ بتاؤ کہ مریض کی حالت کیسی ہے۔"

راجا بولا۔"میں کیسے بتاؤں۔ نہ میں مریض نہ ڈاکٹر۔"

شہناز بولی۔"اگر اس نے کہا... کہ میں ملنا چاہتا ہوں۔ دیکھوں گا۔"

میں نے کہا۔"میرا خیال ہے یہاں اس سے ملنے میں حرج نہیں۔ پتا چل جائے گا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔"

شہناز نے کہا۔"ابھی اسے روکنا۔ سیدھا اندر مت لے آنا۔"

میں اندر جاکے لیٹ گیا تو شہناز نے جلدی جلدی میری بیماری کا سیٹ لگایا۔ مجھے کمبل اڑھاکے اس نے بیڈ

سائیڈ ٹیبل پر وہ تمام چیزیں سجائیں جو ضروری تھیں۔ دوائیں، تھرمامیٹر اور بلڈ پریشر دیکھنے کے آلات۔ اس نے کمرے میں اسپرے کی بو پھیلادی اور پھر ریشم سے اسٹینڈ منگوایا۔ کسی وجہ اور ضرورت کے بغیر اس نے گلوکوز کی ڈرپ کی سوئی میرے بازو میں پیوست کردی حالانکہ میں نے کہا بھی کہ اس کی ضرورت نہیں۔

عبداللہ تقریباً دس منٹ بعد آیا۔ میں نے نقاہت کے باوجود اٹھنے کی کوشش کی اور مسکرایا۔"آپ نے بڑی زحمت کی۔"

وہ بولا۔"لیٹے رہیے نواب صاحب!" اور کرسی پر بیٹھ گیا جو اس کے لیے ہی رکھی گئی تھی پھر وہ شہناز سے مخاطب ہوا۔"آپ ڈاکٹر شہناز ہیں۔ اس علاقے کی مدر ٹریسا۔ لوگ آپ کے ازحد عقیدت مند ہیں۔"

"یہ لوگوں کی محبت ہے۔ میں اپنا کام کرتی ہوں۔" شہناز نے کہا۔

"نواب صاحب کی حالت کیسی ہے؟" اس نے ایک دم میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔"اس وقت تو بخار نہیں ہے۔"

شہناز بولی۔"اتر تا چڑھتا رہتا ہے۔ مجھے ٹائیفائیڈ کا شک ہے، مگر اس کا ٹیسٹ ایک ہفتے سے پہلے کرایا جائے تو فائدہ نہیں۔ نمونیہ آئے گا۔"

"آپ ڈاٹ ٹیسٹ کراسکتی ہیں۔ ایک دن میں پتا چل جائے گا۔" وہ بولا۔

"یس! لیکن وہ اتنا ریلائیبل نہیں سمجھا جاتا۔" شہناز نے بے پروائی سے کہا۔"آپ کیا پسند کریں گے چائے یا کافی؟"

"میں نواب صاحب کے پاس بیٹھ کے کچھ باتیں کرنا زیادہ پسند کروں گا۔" وہ بولا۔"پینے پلانے کا معاملہ میں آپ پر چھوڑتا ہوں۔"

شہناز کے جاتے ہی میں نے کہا۔"آئی ایم سوری کہ آج آپ کو آنا پڑا۔"

وہ بولا۔"میں بھول گیا تھا کہ پیاسے کو ہی کنویں کے پاس جانا پڑتا ہے۔ نواب صاحب! میں لگی لپٹی رکھے بغیر بات کرنے کا عادی ہوں۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم یہ کھیل ختم کردیں۔ یہ CHARADE۔ دعوت میں نے اس لیے کی تھی کہ مجھے آپ سے کچھ پوچھنا تھا اور آپ نے بیماری کا بہانہ اس لیے کیا کہ آپ کو گرفتاری کا ڈر تھا۔ ایم آئی رائٹ؟"

میں کمبل ٹھیک کرکے سیدھا بیٹھ گیا۔"ویری رائٹ۔ آپ کو میں اس لیے پسند کرتا ہوں کہ آپ ذہین، فرض شناس اور ایماندار ہیں۔"

"پسند میں بھی کرتا ہوں آپ کو۔ آپ روشن خیال، محبِ وطن پاکستانی اور بااصول آدمی ہیں لیکن یہاں ہم ایک دوسرے کی تعریف کرنے میں وقت کیوں ضائع کریں؟"

میں نے کہا۔"وقت ایسی چیز نہیں کہ ضائع کی جائے۔"

وہ آرام سے بیٹھ گیا۔"نواب صاحب! میں بڑی مشکل میں ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں حقیقت کو افسانے سے کیسے جدا کروں۔ ایک کھچڑی ہے دال چاول کی طرح جھوٹ سچ کی۔ آپ میری کچھ مدد کریں گے۔"

"آپ حکم فرمائیے۔"

وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔"جب سے میں یہاں آیا ہوں۔ آپ کے اور رانا صاحب کی محاذ آرائی کے قصے سن رہا ہوں۔ میرے سامنے متضاد بیانات آتے ہیں۔ جو رپورٹس مجھے ملتی ہیں وہ پائیداری سے دی جاتی ہیں۔ کوئی ایک بات کو سچ بتاتا ہے کوئی دوسری بات کو۔ میں خود ہر جگہ جاکے فیکٹس کو ویری فائی نہیں کرسکتا۔"

ریشم کافی لے کر آئی اور ٹرے چھوڑ کے رخصت ہوگئی۔

"میرا طریقہ کار بھی عام پولیس افسروں سے مختلف ہے۔" اس نے کافی اٹھاکے پھر بات شروع کی۔"رانا ایک ایم پی اے ہے۔ آپ رئیس ہونے کے باوجود اس علاقے کی ترقی کے لیے ایک پروگرام رکھتے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ ارکانِ اسمبلی ہمیشہ پولیس پر دباؤ ڈالتے ہیں اور اپنے حریفوں کے خلاف پولیس کو استعمال کرتے ہیں لیکن میں رانا کے کہنے پر آپ کو تنگ نہیں کرسکتا۔ کیونکہ میں آپ کے ترقیاتی پروگرام سے سو فیصد متفق ہوں۔"

میں نے کہا۔"یہ آپ کی مہربانی ہے۔"

"آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو میں اس معاملے میں نہ پڑتا۔ میرے ماتحت خودنمٹ لیتے۔ اب رانا مجھ سے ناخوش ہے۔ اس کی ایک وجہ تو پرانی ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ میری وابستگی اس کی مخالف سیاسی جماعت کے ساتھ ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ دوسری وجہ آپ ہیں۔ میں نے اس کے کہنے پر آپ کے خلاف آنکھ بند کرکے ایکشن نہیں لیا۔ وہ مجھے آپ کا طرف دار سمجھتا ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے۔"

میں نے کہا۔"بتائیے میں آپ کی مشکل کیسے آسان کرسکتا ہوں؟"

وہ کچھ دیر سوچ کے بولا۔"جو پہلے ہوا۔ ابھی میں اس کی بات نہیں کرتا۔ کل رانا کا بڑا بیٹا رانا زوہیب حسن میرے

پاس آیا تھا اور اس نے مجھے ایک عجیب اسٹوری سنائی۔ اس نے آپ پر الزام عائد کیا کہ آپ نے اس کے والد کو اغوا کیا ہے۔ مائنڈ یو... اس نے یہ نہیں کہا کہ اغوا کرالیا ہے۔ اس نے براہِ راست آپ پر الزام عائد کیا کہ اغوا کرنے والے آپ تھے۔"

"اور آپ نے..."

اس نے میری بات کاٹ دی۔ "ابھی میری بات ختم نہیں ہوئی۔ میں نے اس سے کہا کہ یہ بہت سیریس چارج ہے۔ اس نے کہا کہ میرے پاس ایک نہیں ایک درجن گواہ ہیں۔ انہوں نے سب دیکھا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ ٹھیک ہے۔ میں معلوم کرتا ہوں۔ صرف آپ کے کہنے سے میں نواب رفیق کے خلاف مقدمہ درج نہیں کراسکتا۔ میں نے سوچا کہ آپ سے براہِ راست بات کی جائے۔ اس کے لیے میں نے آپ کو مدعو کیا۔"

میں نے کہا۔ "آپ کا ارادہ مجھے گرفتار کرنے کا نہیں تھا!"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "کسی کو گرفتار کرنے کے لیے مجھے بہانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ رانا کے ولی عہد نے گواہوں کی ایک لمبی فہرست دی تھی۔ اس میں کچھ تو ان کے اپنے ملازم تھے۔ ظاہر ہے ان کی گواہی معتبر نہیں سمجھی جاسکتی لیکن چند نام اور بھی تھے۔ مثلاً ایک ڈانسر ہے ساحرہ اور اس کی نائیکہ یا ماں، انمول۔ وہ پولیس کی تحویل میں ہیں اور ان کا بیان من وعن وہی ہے جو زوبیب کا۔ وہ ایک دلچسپ فلمی اسٹوری کی طرح ہے۔"

"اگر آپ جلدی میں نہیں ہیں تو وہ ہی سنا دیں۔" میں نے کہا۔

وہ مسکرایا۔ "ساحرہ کہتی ہے کہ اس کو شامی بادشاہ نے مجرے کے لیے بلایا تھا۔ وہاں سے وہ رانا کے ریسٹ ہاؤس گئی تھی۔"

"شامی وہ مشہور ڈاکو؟"

"جی... اس کے کسی خفیہ ٹھکانے پر آپ بھی موجود تھے۔ آپ نے ساحرہ پر ڈورے ڈالے۔ اظہارِ عشق فرمایا اور پھر شادی کی پیشکش کردی۔ اس کی ماں نے چند شرائط سامنے رکھیں۔ وہ آپ نے منظور کرلیں۔ ظاہر ہے پیشہ ور طوائف جب ڈیرے دار بنتی ہے تو صرف محبت پر آسرا نہیں کرتی۔ شادی سے پہلے وہ انشورنش وصول کرلیتی ہے۔"

"یہ آپ کا تجربہ ہے یا مشاہدہ؟" میں نے کہا۔

"دونو... جب میں پولیس سروس میں نیا تھا تو ایک ماڈل سے شادی کرلی تھی جو دو سال رہی۔ اس کی قیمت مجھے ایڈوانس ادا کرنی پڑی تھی۔ خیر... یہ سب جان لینے کے بعد میں نے آپ سے بات کرنی چاہی تو یہاں سے دوسری کہانی سننے کو ملی۔ پلیز ڈونٹ مائنڈ... میرے لیے دونوں طرف کے بیانات کہانی جیسے ہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ آپ کئی روز سے صاحبِ فراش تھے۔ حویلی سے باہر ہی نہیں نکلے۔ تصدیق کرنے والی تھی ایک مستند ڈاکٹر۔ اس کے مقابلے میں ایک ڈانسر کے بیان کی قانونی اہمیت کچھ نہیں رہتی۔ کل سے اب تک مجھے جو رپورٹس موصول ہوئی ہیں وہ تشویش ناک ہیں۔ کل رانا کے ملازموں کی ایک فوج جس میں بیس سے زیادہ مسلح افراد شامل تھے۔ ست بدھائی آنے والی سڑک کے دونوں جانب جنگل میں چھپے آپ کے آنے کا انتظار کرتے رہے۔ ان کا خیال تھا کہ رانا کو آپ یہاں لا کے حویلی میں غائب کردیں گے۔ جو ایک بار اندر آجائے وہ غائب ہوجاتا ہے۔ انہوں نے آپ کو غائب کرنے کا سوچا لیکن آپ بچ گئے۔ آپ اس سڑک سے گزرے ہی نہیں۔ ورنہ بڑا خون خرابا ہوتا۔ آپ کے ساتھی مقابلہ کرتے۔"

"لیکن میں تو یہاں لیٹا ہوا تھا۔" میں نے کہا۔

"جی... بجا ارشاد... یہی وجہ ہوگی... لیکن انہیں آپ کی گاڑی مل گئی۔ لاوارث کھڑی ہوئی۔"

میں نے کہا۔ "وہ ڈاکٹر شہناز کی گاڑی تھی۔ وہ کچھ دوائیں لینے دینہ گئی تھیں۔ واپسی میں گاڑی بند ہوگئی تھی۔"

"پھر وہ کیسے واپس آئیں؟"

میں نے کہا۔ "وہ لوٹ کے جی ٹی روڈ تک گئیں۔ انہیں جہلم سے پنڈی کی طرف جانے والی ایک خالی ٹیکسی مل گئی۔"

"رانا کے آدمی اس گاڑی کو توڑ پھوڑ دیتے۔ آگ لگاتے لیکن دوسری طرف سے ایک پولیس پارٹی آگئی۔ جو صورتِ حال کو کنٹرول کرنے کے لیے بھیجی گئی تھی۔ اب آپ کو اندازہ ہوا میری پرابلم کا۔ ایک ایم پی اے کے اغوا کا الزام ہے آپ پر۔"

"معاف کیجیے سر! وہ ایم پی اے مفرور مجرم ہے۔ روپوش ہے کہیں اور پولیس اسے گرفتار نہیں کرپارہی ہے۔ دوسری طرف وہ اپنے ریسٹ ہاؤس میں مجرے کرارہا ہے اور میں نے اسے بھری محفل سے اغوا کرلیا۔ سب کے سامنے... کیسے؟"

"کہا یہ جارہا ہے کہ آپ بھیس بدل کے سازندوں میں شامل ہوگئے تھے۔"

میں نے قہقہہ لگایا۔ "ونڈرفل... کیا کہانی ہے اور پھر میں سب کے بیچ میں سے رانا کو اٹھا کے لے گیا۔"

"آپ کے کچھ نقاب پوش ساتھی وہاں پہنچے۔ وہ رانا کو اس گاڑی میں لے گئے جو ساحرہ کی ملکیت تھی۔ اس میں آپ نے بھی ان کے ساتھ سفر کیا تھا۔"

میں نے کہا۔ "نقاب پوشوں کو میرے ساتھی کی حیثیت سے کس نے شناخت کیا۔ میں نے تو خیر بھیس بدل رکھا تھا۔"

"شناخت ناممکن تھی لیکن پھر راجا صاحب آئے اور آپ کو لے گئے۔ ساحرہ کی کار جس میں رانا کو اغوا کیا گیا۔ جی ٹی روڈ سے پہلے کھڑی ہوئی مل گئی۔"

"میرے خلاف آپ کے پاس صرف رانا کی رپورٹ ہے۔ یا کچھ اور بھی ہے۔ گواہ تو میرے زیادہ معتبر ہوں گے۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "کچھ نہیں۔ میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ وہ سب جھوٹ بول رہے ہیں۔ ساحرہ اور اس کی ماں سمیت۔ کیونکہ جھوٹ اتنا مکمل نہیں ہوسکتا کہ سچ لگے۔ SPONTANEOUS نہیں ہوسکتا۔ ساحرہ اور انمول کوئی بہت ذہین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ چالاک قسم کی خواتین نہیں ہیں۔ ایک طوائف کی چالاکی اور ذہانت جسم فروشی کے اصولوں تک محدود ہوتی ہے پھر ہمارا بھی تجربہ ہے نواب صاحب!"

"آپ کہہ رہے ہیں کہ... وہ سچ ہے۔"

"میں آپ کی بات کو بھی جھوٹ نہیں کہہ رہا ہوں۔ یہ بھی سچ کی طرح مکمل اور بے عیب ہے لیکن آپ خود سوچیے۔ سچ ایک ہوسکتا ہے دو نہیں ہوسکتے۔ بنا دیے جائیں تو دس سچ بھی ہوسکتے ہیں۔ یہی ہے میری پرابلم۔"

میں نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔ "مجھے بتائیے میں آپ کے لیے کیا کرسکتا ہوں؟"

"دیکھیے... دس از آف دی ریکارڈ۔ اس پر میں آپ کے خلاف بھی کوئی کارروائی نہیں کروں گا۔ نہ میں کسی جگہ اس کا حوالہ دوں گا۔ یو کین ٹرسٹ می نواب رفیق! غیر جانبداری سے رانا اور آپ کے درمیان مجھے ایک کا انتخاب کرنا ہوگا۔ سپورٹ کے لیے تو میں آپ کی طرف ہوں۔"

میں نے کہا۔ "آپ کیا جاننا چاہتے ہیں۔"

اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔ "کیا آپ کے شامی ڈاکو سے مراسم ہیں؟"

"یہ ذاتی دوستی ہے۔ وڈیروں کی طرح میں ڈاکو پالتا نہیں کہ گرد و نواح میں وہ میری دہشت قائم رکھیں۔"

اس نے دوسرا سوال کیا۔ "آپ رانا کو گرفتار دیکھنا چاہتے ہیں نا؟"

میں نے کہا۔ "یس!"

اس نے کہا۔ "آپ بتادیں وہ کہاں ہے۔ میں اسے گرفتار کروں گا۔ اس لیے نہیں کہ یہ آپ کی خواہش ہے۔ اس لیے کہ کسی بھی مفرور مجرم کو گرفتار کرنا میرا فرض ہے۔"

میں نے طنز سے کہا۔ "کیا پہلے والوں کے لیے یہ فرض نہیں تھا۔"

"میں صرف اپنے لیے جواب دہ ہوں۔" اس نے مختصراً کہا۔

کچھ دیر سوچنے کے بعد میں نے کہا۔ "شاید آپ اس پر یقین نہ کریں لیکن میں حلفیہ بتارہا ہوں کہ ابھی مجھے کچھ معلوم نہیں کہ رانا کہاں ہے لیکن میں معلوم کرنے کی کوشش کروں گا۔"

"اس کوشش کا نتیجہ جلد برآمد ہونا چاہیے نواب صاحب! ورنہ خرابی ہوگی۔"

میں نے سر ہلایا۔ "یہ ہوسکتا ہے کہ کل تک میں آپ کو صحیح انفارمیشن دے سکوں۔ ایسا میں آپ کے وعدے پر کروں گا۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "اس سے ہمارے درمیان اعتماد کا رشتہ اور مضبوط ہوگا۔" اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ "خدا آپ کو جلد شفا دے۔ میری دعوت ملتوی ہوئی ہے۔ منسوخ نہیں۔"

مجھے اندازہ ہوگیا کہ عبداللہ جان کس قماش کا آدمی ہے اور مجھے اس کے ساتھ کیسے چلنا ہوگا۔ اس کی فطرت میں وضعداری ضرور تھی لیکن ادائے فرض کو وہ ذاتی تعلق سے پہلے رکھتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس نے مجھ سے جو وعدہ کیا ہے وہ پورا بھی کرے گا لیکن میری طرف سے کوئی خلاف ورزی برداشت نہیں کرے گا خواہ قانون کی ہو یا وعدے کی۔ اس کا عہدہ کچھ سیاسی مفاہمت اور مصالحانہ چشم پوشی کا تقاضا بھی کرتا تھا لیکن وہ اس حد تک ہی لچک دکھاتا تھا جو اس کے ضمیر اور زندگی کے ضابطۂ اخلاق پر اثر انداز نہ ہو۔

اس کے جاتے ہی میں نے پوری گفتگو راجا کو رپورٹ کی۔ شہناز خفا ہونے لگی۔ "تم نے بیماری کو ڈراما مان لیا۔"

"اس نے بھی مان لیا کہ دعوت محض تفتیش کا بہانہ تھی۔ جب اس نے اپنے پتے شو کردیے تو پھر میرے لیے بھی ضروری ہوگیا۔"

"وہ کہتا ہوگا کیسی جھوٹی ڈاکٹر ہے۔"

"دیکھو بی بی۔ اس دنیا میں جینے کے لیے جو اکیسویں صدی کی دنیا ہے، پچھلی صدیوں کے اصول اور اخلاقی ضابطے کارآمد نہیں رہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ قابلِ عمل نہیں

رہے۔" میں نے کہا۔ "سچ کا بول بالا اور جھوٹے کا منہ کالا۔ ایسا کہاں ہوتا ہے؟ کیا عدالتوں میں انصاف سچ بولنے والے کو ملتا ہے۔ سیاستدان پبلک کے سامنے سچ بولتے ہیں۔ کیا ہم خود صبح سے شام تک قدم قدم پر جھوٹ نہیں بولتے...."

"اچھا اچھا۔ لیکچر مت دو۔ اس کے بعد تم کہو گے کہ پہلے چراغ تلے اندھیرا ہوتا تھا۔ اب اوپر ہوتا ہے۔" وہ واک آؤٹ کر گئی۔

راجا نے افسوس سے سر ہلایا۔ "آخر خواتین میں یہ صلاحیت کیوں نہیں پائی جاتی؟ گرد و پیش کو حقیقت پسندی کی عینک سے دیکھنے کی۔ وہ تصوراتی دنیا میں رہنا کیوں پسند کرتی ہیں۔ محبت میں آئیڈیل۔ اس کے بعد آئیڈیل شوہر۔ آئیڈیل گھر۔ آئیڈیل زندگی۔"

"اسی لیے بعد میں فرسٹریشن اور ڈیپریشن کا شکار ہوتی ہیں۔ خیر! تو عبداللہ جان سے ہونے والے مذاکرات کی روشنی میں کیا تجویز کرتا ہے۔ ہمیں رانا کو اس کے حوالے کر دینا چاہیے؟"

"میں نے کہا ہے کہ میں معلوم کرنے کی کوشش کروں گا وہ کہاں ہے۔ ابھی مجھے علم نہیں۔ یہ ایک سچ ہے۔ اس پر میں حلف اٹھا سکتا تھا۔ پھر وہ رانا کو گرفتار کر لے گا۔"

"رانا اسے غچا دے گیا۔ پھر؟ عبداللہ نے کہہ دیا کہ وہ پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونک کے نکل گیا۔"

"یہ عبداللہ کے اعتماد کی آزمائش ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ ایسا نہیں کرے گا۔ اس پر سیاسی دباؤ یقیناً ہوگا مگر وہ ذہین آدمی ہے۔ اب تک دباؤ برداشت کرتا آیا ہے اور سیاسی جنگل کے خطرات سے بھرے راستوں پر چل کے ہی اس عہدے تک پہنچا ہے لیکن بالفرض محال ایسا ہوا۔ رانا پھر گرفتاری سے بچ گیا ہمارے فول پروف انتظامات کے باوجود۔ تو یار زندہ صحبت باقی۔ ہم بھی یہیں ہیں وہ بھی اور کھیل کے دوسرے کھلاڑی بھی۔ پتا چل جائے گا کہ اناڑی کون ہے۔"

رات کا اندھیرا پھیلتے ہی غنی نمودار ہوا۔ "آپ تیار ہیں سر!"

میں نے کہا۔ "ابھی کچھ دیر پہلے عبداللہ جان آیا تھا۔ تمہیں یقین ہے کہ وہ کوئی جال پھیلا کے نہیں گیا ہے؟"

"دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ ... نظر نہ آنے والا جال۔" راجا بولا۔

"میں نے کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں سر! جب ٹرک چلاتا تھا تو جال ہر قدم پر ہوتے تھے۔ میں کہیں گرفتار نہیں ہوا۔ آپ مجھ پر بھروسا رکھیں میں اتنا اناڑی نہیں ہوں۔"

"پھر کتنے اناڑی ہو؟ تمہارے بیان سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ تم تھوڑے بہت اناڑی ضرور ہو۔" میں نے کہا۔

غنی بولا۔ "وہ ہم سب ہوتے ہیں سر! کھلاڑی صرف تقدیر ہے۔"

"اس ڈائیلاگ سے ہم متاثر ہوئے۔ چلو۔" راجا نے کہا۔

میں باہر نکل کے گیٹ کی طرف بڑھا تو غنی نے مجھے روک دیا۔ "ادھر نہیں سر! ہم اُدھر سے نکلیں گے۔"

میں نے یوٹرن لیا اور ہم سرونٹ کوارٹرز کی طرف چلنے لگے۔ بیشتر کوارٹرز بند پڑے تھے۔ غنی نے ایک کا ہلتا ہوا دروازہ کھولا اور ہمیں ٹارچ کی روشنی دکھائی۔ اندر کا فرش بھی ناہموار تھا۔ غنی نے سامنے والی دیوار کی ایک کھڑکی کھولی جو مشکل سے تین فٹ چوڑی اور چار فٹ اونچی تھی۔ اس میں لگی ہوئی سلاخوں کو وہ پہلے ہی نکال چکا تھا۔ ہم اس کھڑکی سے باہر کود گئے۔ غنی نے کھڑکی پھر بند کر دی۔

باہر رات اپنی پوری ویرانی و تاریکی کے ساتھ خیمہ زن تھی۔ ہمارے سامنے آسمان کے تاریک کینوس پر سائنس ریسرچ سینٹر کا اسٹرکچر پھیلا ہوا تھا۔ اس کے اردگرد جنگل کا مہیب سناٹا تھا اور کھیتوں کی خاموش وسعت تھی۔ آخری دنوں کے چاند نے ہنوز افق کے کسی کنارے سے سر نہیں نکالا تھا اور آسمان پر ستارے روشن ہونے لگے تھے۔

غنی ایک جگہ رک گیا۔ "سفر کچھ مشکل ہوگا۔ اس طرف سے ٹرک ضرور آتے جاتے تھے لیکن کار کے لیے راستہ خطرناک تھا۔"

میں نے کہا۔ "تم تمہید کے بغیر بتا سکتے ہو کہ ہم کیسے جائیں گے، پیدل یا دو ٹانگوں پر؟"

اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ "سواری ہے سر!"

میں نے ایک درخت کے نیچے دیکھا۔ وہ کوئی بکری یا گدھے جیسا جانور نہیں تھا۔ موٹر سائیکل تھی۔ قریب سے ملاحظہ کرنے پر ثابت ہوا کہ اس کو پہلی نہ سہی لیکن دوسری جنگ عظیم میں اتحادی فوجی یقیناً استعمال کرتے ہوں گے۔ حویلی نوادرات کا خزانہ تھی۔ قدیم کاریں ہم خود دریافت کر کے نوادرات کے قدردانوں کے ہاتھ فروخت کر چکے تھے۔ یہ موٹر سائیکل بھی اسی ذخیرے کا حصہ ہوگی لیکن ہم نے پہلے نہیں دیکھی تھی۔

میں نے راجا سے کہا۔ "کیا تو نے سفر کے آغاز کی دعا پڑھ لی۔ ہو سکتا ہے تیرے لیے یہ سفر آخرت ہو۔"

راجا نے کہا۔ "فکے پتر! پتا ہوتا تو سوا روپے کا امام ضامن بھی بندھوا لیتے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔"

میں نے کہا۔ "اس پر سوار ہونے سے پہلے کلمہ تو پڑھ سکتے ہیں۔ پتا نہیں بعد میں مہلت ملے نہ ملے۔ راستہ بھی پل صراط جیسا ہے۔"

غنی نے کسی دشواری کے بغیر موٹر سائیکل کو اسٹارٹ کیا۔ وہ ایک کک میں اسٹارٹ ہوگئی۔ ملٹری ماڈل کی یہ "بی ایس اے" موٹر سائیکل واقعی دوسری جنگ عظیم میں بحر ظلمات کے گھوڑوں کی طرح دوڑتی پھرتی تھی۔ پیغام رساں اسے ریس کے گھوڑے کی طرح دوڑاتے تھے اور یہ دشت تو دشت ہیں صحرا بھی نہ چھوڑے ہم نے۔" کی عملی صورت تھی۔

کسی مستریانہ مہارت کا ثبوت دیتے ہوئے غنی نے اس کی آواز کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ پھٹ پھٹ کی کان پھاڑ آواز کے باعث ہی اسے عرف عام میں پھٹپھٹی کہا جاتا تھا۔ پہلے غنی کے پیچھے راجا بیٹھا اس کے پیچھے میں۔ ہم زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ میرا ہاتھ راجا کی کمر میں اور راجا کا ہاتھ غنی کی کمر میں حلقہ زن تھا۔ اس کے باوجود ایک جگہ میں ٹپک گیا۔ موٹر سائیکل کی ہیڈ لائٹس میں راستے پر نظر رکھنا آسان نہ تھا اور وہ راستہ بھی میدانِ جنگ جیسا تھا۔

اب راجا نے مجھے درمیان میں رکھا۔ اس دعوے کے ساتھ کہ ہم یک جان تین قالب ہیں۔ گریں گے تو سب ورنہ سمجھو چک گئے۔ لیکن ہم خشک دریا کے پاٹ سے گزرے تو موٹر سائیکل گول چکنے پتھروں پر سلپ کر گئی۔ ایک مشہور عالم فلمی گانے کے بولوں کے مطابق۔ کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا۔ اک دل کے ٹکڑے ہزار ہوئے۔"

خود پائلٹ کافی دیر نہیں اٹھ پایا تو ہم نے اسے سہارا دیا۔ تھوڑی بہت چوٹ سب کو آئی تھی مگر غنی دونوں ٹانگوں سے لنگڑاتے ہوئے سخت شرمسار تھا۔ اب پائلٹ کی جگہ میں نے سنبھالی مجھ پر انکشاف ہوا کہ میں کار کے علاوہ دیگر مشینی سواریاں چلانے میں بھی اناڑی نہیں تھا۔ میں اس مشینی گھوڑے کو دو جھاڑیوں میں سے گزار کے بھی لے گیا جس میں سے بظاہر صرف ہوا کا گزر تھا۔ شور سے مجھے اندازہ ہوا کہ سواریوں کے جسم کچھ چھل گئے۔ دوسری مرتبہ لومڑی قسم کے ایک جانور نے (جسے میں نے بعد میں حملہ کرنے والا بھیڑیا قرار دیا) موٹر سائیکل کے نیچے آ کے خودکشی کرنی چاہی مگر میں نے بچا لیا۔

اچانک غنی نے اعلان کیا۔ "بس روک لیں سر!"

میں اس مقام سے کوئی سو گز آگے آنے میں کامیاب رہا۔ وہاں ایک تانگا موجود تھا۔ اس کا پائلٹ غنی کا لنگوٹیا۔ میری رعایا اور ڈاکٹر شہناز کا مریض ہونے کے سہ فریقی رشتے کے باعث فرط عقیدت سے بے حال تھا۔ اس کا ثبوت یوں ملا کہ وہ بے تکلفی میں گھوڑے کو اور غنی کو ایک جیسی گالیاں دیتا رہا۔ مجھے مسلسل "جہاں پناہ" کہتا رہا پھر اس نے ایک قصہ سنایا کہ کس طرح ڈاکٹر شہناز نے اس کی ماں کو موت کی دہلیز سے اس وقت واپس بلا لیا جب وہ آخری سانس لینے والی تھی۔ غالباً اس کے نزدیک یہ افسوس کی بات تھی۔

سڑک اب ایک ہموار کچا راستہ تھی جس پر گھوڑا ہوش سنبھالنے کے بعد سے دوڑ رہا ہوگا۔ مزید کسی حادثے کے بغیر ہم ایک بستی تک پہنچے جہاں بیشتر گھر کچے تھے۔ کہیں کہیں مٹی کے تیل کی لالٹین یا ایسے ہی قدیم چراغ روشن دکھائی دیتے تھے۔ آخری وقت میں ایک حادثہ پیش آ جاتا لیکن پائلٹ کی مہارت نے بچا لیا۔ گھر سے فرار ہونے والی ایک نوجوان بھینس دوڑتی ہوئی آئی اور غالباً گھوڑے کے نیچے سے نکل گئی۔ اس کا واویلا کرتا مالک دو قدم آگے ہوتا تو وہ تانگے کے پہیے میں پھنس کے گول گول گھومتا دکھائی دیتا لیکن وہ پیچھے سے بچ کے گزر گیا۔ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔

بالآخر تانگا اس بستی کے باہر ایک پرانے طرز کی عمارت کے احاطے میں داخل ہوگیا۔ یہ انگریزوں کے زمانے میں تعمیر کی جانے والی پرانے طرز کی عمارت پہلے ڈاک بنگلا کہلاتی تھی۔ اب بھوت بنگلا مشہور تھی۔ انگریز حاکم جب کسی دور افتادہ مقام کا دورہ کرتے تھے تو ان کی رہائش کے لیے جو ریسٹ ہاؤس تعمیر کیے جاتے تھے وہ ڈاک بنگلا کہلاتے تھے۔

لمبائی کے رخ بنے ہوئے تین چار کمروں والی عمارت کے چاروں طرف برآمدہ تھا۔ برآمدے کی چھت کچھ نیچی تھی اور اس کے سامنے گول محرابی دروازوں کی قطار تھی۔ برآمدے سے بیرونی دیوار تک پہلے یقیناً باغ اور سبزہ زار ہوں گے مگر اب خشک گھاس اور جھاڑ جھنکاڑ کے سوا کچھ نہ تھا۔ غیر آباد رہنے والی جگہ کچھ عرصہ ایک پیر کا ڈیرہ بھی بنی رہی۔ دروغ برگردن غنی۔ اپنی شہرت کو کیش کرانے سے پہلے پیر کا قتل ہوگیا۔ اس کی لاش کے بڑی بے رحمی سے ٹکڑے کر دیے گئے تھے۔ جب پولیس نے ان ٹکڑوں کو اکٹھا کر کے جوڑا تو ثابت ہوا کہ ایک نہیں دو لاشیں ہیں۔ دوسری لاش کسی جوان عورت کی تھی۔ پولیس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ پیر کسی کی بیوی کو بھگا لایا تھا اور یہاں روپوشی کے ساتھ پیری فقیری کا بزنس بھی کرنا چاہتا تھا مگر شوہر نے سراغ لگا لیا اور دونوں کو قتل کر کے فرار ہوگیا۔ تب سے یہ جگہ ویران تھی۔ لوگ اِدھر آتے ہوئے

ڈرتے تھے۔ کچھ لوگوں نے رات کے وقت اندر سے کسی عورت اور مرد کے زور زور سے ہنسنے اور چلّانے کی آوازیں بھی سن لیں۔ ایک بزرگوار نے بیان کیا کہ وہ مقتولین سے شرفِ ملاقات بھی حاصل کر چکے ہیں۔ موصوف دن کے اجالے میں بھی اپنی اور پرائی بیوی میں فرق محسوس نہیں کر سکتے تھے۔

معلوم نہیں کیوں گھوڑا زور سے ہنہنایا۔ غنی نے رازداری سے انکشاف کیا کہ غالباً اس نے ارواح کو دیکھ لیا ہے۔ وہ ٹارچ کی روشنی میں راستہ دکھاتا ہمیں عقبی حصے میں لے گیا۔ ایک چابی سے اس نے پرانا تالا کھولا۔ دائیں جانب کی دیوار پر سوئچ بورڈ دیکھ کے مجھے اندازہ ہوا کہ ڈاک بنگلے میں بجلی کا کنکشن بھی تھا۔ غنی نے مین سوئچ کے لیور کو اوپر کیا۔ اس سے کوئی فرق نہ پڑا۔ اندھیرے میں کوئی کمی نہ آئی۔ غنی نے وضاحت کی کہ سوئچ خراب ہے یا اوپر لٹکتی لائٹ کا بلب فیوز ہو چکا ہے۔

اس نے اگلے دروازے کا قفل کھولا اور ہمارے گزر جانے کے بعد بند کر دیا۔ اس کے ہاتھوں نے ایک سوئچ آن کیا۔ اس کے ساتھ ہی تاریک کمرا روشن ہو گیا اور میں نے رانا کو دیکھا۔ وہ سپاٹ خالی کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے گرد آلود فرش پر بیٹھا ہوا تھا اس کے ایک ہاتھ میں ہتھکڑی تھی جس کا دوسرا سرا بند کھڑکی کی فولادی سلاخوں سے منسلک تھا۔ زنجیر کی طوالت اتنی تھی کہ رانا چھ فٹ کے دائرے میں رہتے ہوئے اٹھ بیٹھ سکتا تھا اور فرش پر سو بھی سکتا تھا۔

یہ اس قید خانے میں رانا کی دوسری رات تھی۔ اب اس کی آنکھوں میں شراب کی نہیں بے خوابی کی سرخی تھی۔ رانا کے گرد آلود لباس سے اندازہ ہوتا تھا کہ نیند سے مجبور ہو کے اس نے فرش پر سونا قبول کیا تھا۔ اس کے قریب فرش پر پانی کی ایک بوتل رکھی ہوئی تھی جو اب آدھی خالی تھی۔ ایک ٹرے میں دال چاول بھی آدھے کھائے گئے تھے۔ جسم کی ہر ضرورت آدمی کو لاچار کر دیتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مجھے رانا کو اس حال میں دیکھ کر شاک لگا تھا۔ اسے اغوا کرنے کا مقصد یہ تھا کہ اس کی گرفتاری کو یقینی بنایا جائے۔ اسے قید و بند کی اذیت میں مبتلا کرنا یا ذلیل کرنا اور اس پر کسی قسم کا ذہنی و جسمانی تشدد بھی میرا مقصد نہیں تھا۔

میں لوٹ کے باہر گیا۔ ”غنی۔ یہ کیا ہے۔“

وہ میرے لہجے کی برہمی سے ڈر گیا۔ ”کوئی غلطی ہوئی مجھ سے سر!“

میں نے کہا۔ ”غلطی کے بچے... تمہیں کوئی اور جگہ نہیں ملی تھی رانا صاحب کو قید میں رکھنے کے لیے؟“

”یہ بہت محفوظ جگہ ہے سر!“

میں نے کہا۔ ”غنی! میرا خیال تھا تمہارے پاس عقل ہے۔ اس لیے میں نے تمہیں کچھ سمجھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ بے وقوف آدمی۔ رانا کی عمر دیکھو۔ وہ بوڑھا آدمی ہے۔ اس کے علاوہ دل کا مریض ہے۔ وہ ایسی سختی برداشت کر سکتا ہے؟ اگر وہ مر جاتا پھر؟“

راجا نے بھی افسوس سے سر ہلایا۔ ”رانا کے ساتھ بڑی زیادتی ہو گئی انجانے میں۔“

میں نے کہا۔ ”غنی! وہ جدی پشتی رئیس ہے۔ اس نے زندگی میں صرف آرام اور آسائش دیکھی ہے۔ وہ اسمبلی کا رکن ہے۔ جیل بھی گیا ہو گا کبھی تو اسے اے کلاس ملی ہو گی اور تم نے اسے یہاں سی کلاس سے بھی بدتر قید خانے میں ڈال رکھا ہے۔ یہ کتنی غیر اخلاقی حرکت ہے۔“

غنی نے کہا۔ ”آئی ایم سوری!“

راجا نے کہا۔ ”دیکھو غنی! ہم دشمنی میں بھی شرافت اور وضعداری کے آداب نبھانے کے قائل ہیں۔ ورنہ یہ بدمعاشوں والی جنگ ہو جائے گی۔ کل یہی سلوک ہمارے ساتھ ہو سکتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”خیر پہلے تو جاؤ رانا صاحب کو آزاد کرو اور ان سے ہمارے سامنے معافی مانگو۔ عمر میں وہ تمہارے باپ کے برابر ہے اور تم چاہے عزت نہ کرو لیکن وہ عزت دار کہلاتا ہے۔ اس ڈاک بنگلے کے علاوہ ایسی کوئی جگہ ہے جہاں وہ آرام سے رہے؟“

غنی نے کہا۔ ”اندر والے کمرے میں بیڈ ہے اور فرنیچر بھی پڑا ہے۔ میں صاف کر دیتا ہوں۔“

واپس کمرے میں جا کے میں نے رانا سے کہا۔ ”رانا صاحب۔ آئی ایم ویری سوری۔ یہ سب میری لاعلمی میں ہوا۔ اس کی بے وقوفی سے۔“

رانا نے نفرت سے کہا۔ ”چھوڑ دو یہ ڈراما۔“

میں نے کہا۔ ”یہ ڈراما نہیں۔ حقیقت ہے کہ غلطی میری تھی۔ میں اسے سمجھا نہیں سکا اپنے ملازم کو۔“

غنی نے رانا کے ہاتھوں کی ہتھکڑی کھول دی اور اس سے معافی مانگنے لگا۔ رانا صاحب! مجھے معاف کر دیں۔ آپ کو میری وجہ سے یہ تکلیف اٹھانی پڑی۔ نواب صاحب کا ہرگز یہ مقصد نہیں تھا۔ غلطی میری ہے۔“

رانا نے آزاد ہونے والے ہاتھ کو سہلایا۔ ”دیکھو، اگر

تم مارنا چاہتے ہو مجھے تو مار دو۔“

میں نے کہا۔ ”آپ آیئے میرے ساتھ۔ آپ کو مارنا مقصد ہوتا تو پھر اغوا کرنے کی کیا ضرورت تھی۔“

وہ آہستہ آہستہ میرے ساتھ چلنے لگا۔ ”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنے کمینے دشمن ہو نواب رفیق!“

”رانا! میں وہی ہوں جو تم نے مجھے بنایا۔ بلکہ بننے پر مجبور کیا۔ ورنہ میں نے تو تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا۔“ میں نے درمیانے کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

معلوم نہیں کیوں ڈاک بنگلے کا بیڈ روم ابھی تک اسی طرح آراستہ تھا جیسے انگریزوں کے زمانے میں ہو گا۔ اس کا فرنیچر بہت پرانا اور گرد آلود تھا لیکن آرام دہ تھا۔ غنی کے لیے برسوں کی گرد کو چند منٹ میں صاف کر دینا ممکن نہیں تھا لیکن وہ پھر بھی کپڑے سے صفائی میں مصروف تھا۔

رانا اسپرنگ والے بیڈ پر گر کے لمبے لمبے سانس لینے لگا اور اس چھت کو دیکھتا رہا جس سے جالے لٹک رہے تھے۔

”تم میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کر رہے ہو نواب رفیق! اس اذیت اور ذلت میں کیوں ڈالا ہے مجھے۔ میری جان لینا چاہتے ہو؟“

میں ایک پرانی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ”رانا! جان لینے کے لیے صرف ایک گولی کافی ہوتی ہے۔ جو میں چلا دوں یا کوئی اور میرے حکم پر چلائے فرق نہیں پڑتا۔ حقیقت یہی ہے کہ مجھ سے بھول ہوئی۔ ورنہ میں ہدایات جاری کر دیتا کہ تمہیں قید میں وہی آرام و آسائش فراہم کی جائے جس کے تم عادی اور مستحق ہو۔“

اس نے حقارت سے میری طرف دیکھا۔ ”اس کا مطلب ہے تم مجھے قید میں ضرور رکھو گے۔ جب تک کہ میں مر نہ جاؤں۔ یہ قتل پھر بھی تمہارے ہی نامہ اعمال میں لکھا جائے گا۔“

میں نے کہا۔ ”کل صبح تمہیں رہا کر دیا جائے گا رانا۔“

”جھوٹ بکتے ہو تم۔“ اس کی آواز بلند ہو گئی۔ ”مجھے اچھی طرح معلوم ہے اپنا انجام لیکن نواب رفیق! مجھے سب کے سامنے اغوا کیا تھا تم نے۔ تم بچو گے نہیں۔“

”تم نے دیکھا رانا! ابھی تک مجھے گرفتار بھی نہیں کیا گیا۔ میں آزاد پھر رہا ہوں۔ شاید کسی نے ان کی بات پر اعتبار نہیں کیا جو تمہارے عینی شاہد تھے جو انہوں نے دیکھا تھا سب کو بتایا تو ہو گا۔“

وہ غصے سے بولا۔ ”مجھے معلوم ہے۔ تم بہت چالاک ہو۔ تم نے جھوٹے گواہ تیار کر رکھے ہوں گے۔“

میں نے کہا۔ ”کون جھوٹا ہے اور کون سچا۔ اس کا فیصلہ تو عدالت کرتی ہے لیکن جب اس ریسٹ ہاؤس سے آپ کو اغوا کیا گیا جہاں آپ روپوش تھے اس کا ثبوت ہے اور گواہوں کی مجھے کوئی کمی نہیں۔ عدالت یہ ضرور دیکھے گی کہ کس کا گواہ بہتر ہے۔ ایک پیشہ ور طوائف اور ڈانسر کی ماں یا ایک مستند ڈاکٹر کی۔“

وہ مجھے دیکھتا رہا۔ ”آخر تم کیا چاہتے ہو۔ صاف بات کرتے ہوئے ڈرتے کیوں ہو؟“

میں نے ہنس کے کہا۔ ”میں صرف خدا سے ڈرتا ہوں رانا۔ جیسے کہ ہر مسلمان کو ڈرنا چاہیے۔“

راجا نے کہا۔ ”میں بتاتا ہوں تمہیں رانا کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ایک قاتل گرفتار ہو جائے۔ ہر بات کی حد ہوتی ہے۔ اب تک تم بچتے چلے آ رہے ہو۔ تم نے اپنی بیٹی کو مارا۔ اس کے قاتل کو مارا۔ اس سے پہلے نہ جانے کس کس کے خون سے تم اپنے ہاتھ رنگ چکے تھے۔ تم نے ڈاکٹر شہناز کو اغوا کیا اور دو مہینے اپنی حویلی میں قید رکھا۔ تم اپنے اثر و رسوخ اور اس نظام کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے رہے۔“

رانا کے چہرے پر مسکراہٹ آئی۔ ”یہ فائدہ کون نہیں اٹھاتا اور تم کیا اس نظام کو بدل سکتے ہو؟“

”اس کا اندازہ تمہیں کل ہو جائے گا۔ جب تمہارے ہاتھوں میں وہی ہتھکڑیاں ہوں گی جو مجھے پہنائی گئی تھیں اور تمہیں اس حوالات میں بند کیا جائے گا جس میں مجھے رکھا گیا تھا۔ وہاں اب تمہارا نمک خوار پولیس والا انچارج نہیں ہے۔ کل رات شاید تمہارے ساتھ وہی ہو جو تم نے میرے ساتھ کرنا چاہا تھا۔“

وہ کمزور لہجے میں بولا۔ ”تمہاری یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہو گی۔“

”وقت کی رفتار پلٹ گئی ہے رانا! حالات کا دھارا فی الحال تمہارے خلاف ہے۔ کل یہ بات تمہاری سمجھ میں آ جائے گی۔ تمہارا پیسا، تمہارا اثر و رسوخ یا تمہارا وکیل ایک رات میں تمہاری ضمانت پر رہائی کو ممکن نہیں بنا سکتے اور ہم بھی پورا زور لگائیں گے کہ ایسا نہ ہو۔ تمہارے جرائم بہت سنگین ہیں۔ اگر سیشن کورٹ کے کسی جج نے تمہیں ضمانت پر رہا کیا تو اسے نوکری کے لالے پڑ جائیں گے۔ ہائی کورٹ اس سے پوچھے گی۔“

وہ اٹھ بیٹھا۔ ”نواب رفیق! ہم بات بھی تو کر سکتے ہیں۔“

”کیا بات کر سکتے ہیں؟“ راجا نے کہا۔

''میرا مطلب تھا... مصالحت کا درمیانی راستہ!''

میں نے کہا۔ ''سوری رانا! یہ قانونی معاملہ ہے۔ میں کون ہوتا ہوں کسی قتل اور اغوا کے مجرم سے مصالحت کرنے والا۔ تمہارا بیٹا ہی گیا تھا ڈی آئی جی عبداللہ کے پاس یہی درخواست لے کر اور ڈی آئی جی میرے پاس آیا تھا۔ بظاہر عیادت کے لیے۔ میں نے کہا کہ آخر تم رانا کو گرفتار کیوں نہیں کرتے...؟''

''کریں گے'' اس نے کہا۔ پھر دھیرے سے پوچھا۔ ''مگر وہ ہے کہاں۔'' میں ہنس دیا۔

''دیکھو... گرفتاری میری طرف کا معاملہ ہے۔ بعد کے معاملات سے میں نمٹ لوں گا۔ تم جس قانون کی بات کر رہے ہو۔ وہ ہر وقت میری مٹھی میں رہتا ہے۔''

میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ ''میرا خیال تھا کہ آدمی کو عمر کا تجربہ ملتا ہے تو وہ سیانا ہو جاتا ہے۔ بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ تم نے کچھ نہیں سیکھا۔ ایک سال ہو گیا۔ کیا بگاڑ لیا تم نے میرا۔ اپنی ساری طاقت بدمعاشی اور اثر و رسوخ کے باوجود۔''

''اگر تم سمجھتے ہو کہ ایک دن میں تمہیں سلام کرنے لگوں گا۔ یا تم میرے برابر کے سمجھے جانے لگو گے تو نکال دو اپنے دماغ سے اس خیال کو۔ بے شک زمانہ ایسا ہے کہ کمین اور غیر خاندانی لوگ بھی پیسا کما کے عزت دار ہونے کا دعویٰ کر رہے ہیں۔ کنجر میراثی اور تم جیسے...''

راجا نے کہا۔ ''ذرا اپنی موجودہ حالت پر غور کرو رانا۔ تم کہاں اور کس حال میں پڑے ہو۔ کون جانتا ہے تمہارے بارے میں۔ کب سے تم روپوشی کی زندگی گزار رہے ہو۔ تم قانون کے ڈر سے بھاگ رہے ہو لیکن ہمارے سامنے یہ دعویٰ کر رہے ہو کہ قانون تم سے ڈرتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''فرض کرو ہم ابھی تمہیں مار کے یہاں کہیں دفن کر جائیں، تو کیا ہوگا؟''

''تم... تم ایسا نہیں کر سکتے۔''

میں نے کہا۔ ''ہم کریں گے بھی نہیں لیکن اس کے لیے تمہیں ہمارا ہی شکر گزار ہونا پڑے گا۔ یہ ہمارے اختیار میں تھا۔ ہم پر کبھی الزام نہ آتا۔ اگر ہم شک میں پکڑے بھی جاتے تو تمہارا یہی نظام انصاف ہمیں تحفظ دیتا۔ بڑے بڑے وکیل ہم پر آنچ بھی نہ آنے دیتے۔ یوم حشر سے پہلے پتا بھی نہ چلتا کہ تمہارا ڈھانچا کہاں پڑا تھا۔''

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے مجھے اٹھایا کیوں؟''

''میں نے کہا نا کہ صبح سمجھ میں آ جائے گا۔ اس وقت میں اپنی حویلی میں نہیں ہوں وہیں سے میں ڈی آئی جی عبداللہ جان کو فون کروں گا کہ مجھے اپنے ذرائع سے خبر ملی ہے کہ رانا فلاں جگہ چھپا ہوا ہے۔ وہ پولیس کی نفری لے کر آئے گا اور تمہیں گرفتار کر لے گا۔ اس کے ساتھ اخباری نمائندے بھی آ سکتے ہیں۔''

رانا کا رنگ بدلا۔ ''میرے سارے دشمنوں نے اکا کر لیا ہے۔ کوئی بات نہیں۔ میں سب سے نمٹ لوں گا۔ اس ڈاکو جو خود کو شامی بادشاہ کہتا ہے۔ یہ ڈی آئی جی... اور تم۔''

''میں تمہیں ایک بات سمجھانے آیا تھا۔ نہ سمجھو تو تمہاری مرضی۔ سیاسی دشمنی اگر ذاتی دشمنی نہ بنے تو تمہارے حق میں یہی اچھا ہے ورنہ جو تم کر سکتے ہو میں بھی کر سکتا ہوں۔ تم مجھے مروا سکتے ہو تو ایک گولی تمہارا کام بھی تمام کر سکتی ہے۔ آج کل کیا مشکل ہے۔ کرائے کے قاتل آسانی سے ملتے ہیں۔ تمہاری دستی بم استعمال کرنے کی ایک کوشش ناکام ہو چکی ہے۔ کیا میں تمہارا یہ قرض چکا دوں؟ تمہارے محل میں ٹائم بم لگوا دوں۔ ریموٹ کنٹرول... آج میں برابر کا دشمن ہوں رانا۔ تمہاری ٹکر کا۔ مقابلہ کر کے جینے کا یہ ہنر میں نے تم سے سیکھا ہے۔''

وہ حقارت سے بولا ''کتا کتنا بھی طاقتور کیوں نہ ہو جنگل کا بادشاہ نہیں ہو سکتا۔''

راجا نے کہا۔ ''چھوڑ دو نواب صاحب! رانا کو سمجھانا لاحاصل ہے۔ یہ صدیوں کے غرور کی دیوار ہے۔ گر سکتی ہے جھک نہیں سکتی۔''

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ''جاتے جاتے میں تمہیں خبردار کر دوں۔ آج بھی تمہیں دفن کر کے نہیں جا رہا ہوں لیکن اگلی بار میں تمہیں زندہ گاڑ دوں گا۔ اپنی دشمنی کو شرافت اور قانون کے دائرے میں رکھو گے تو خود بھی محفوظ رہو گے اور تمہارے لواحقین بھی۔''

''ایسی دھمکیوں سے مجھے فرق نہیں پڑتا۔'' وہ بولا لیکن اب اس کا لہجہ واضح طور پر بدلا ہوا تھا۔ اسے یقین آ گیا تھا کہ اس کی زندگی محفوظ ہے لیکن اس کے اعتماد کی بنیادیں ہل چکی تھیں۔

میں نے کہا۔ ''دھمکی یہ ہے رانا کہ آئندہ انتخاب میں اس حلقے سے میں تمہارے خلاف جیت کر دکھاؤں گا۔ یہ میرا چیلنج بھی ہے۔ مجھے روکنے کے لیے تم جو بھی کر سکتے ہو کرو... لیکن پہلے سوچ لینا کہ تمہارا وار بیک فائر نہ کرے۔ نشانہ تم خود نہ بن جاؤ۔'' پھر میں نے دروازے کا رخ کیا۔

''سنو، کیا تم نے طے کر لیا ہے... کل صبح مجھے پولیس کے حوالے کر دو گے؟ ابھی وقت ہے پھر سوچ لو۔'' رانا نے کہا۔

بظاہر اس نے مجھے وارننگ دی تھی کہ نقصان اٹھانے سے پہلے میں اپنا فیصلہ تبدیل کرلوں لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔ وہ خوف زدہ تھا اور یہ چاہتا تھا کہ اس کی رہائی کے عوض ہم سودا کرلیں۔

میں نے رک کر کہا۔ ”اس کی گارنٹی کوئی نہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ کل صبح ضروری نہیں۔ شام بھی ہوسکتی ہے۔ کوئی اور مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا تو مزید تاخیر ہوگی۔ ایک دو دن یا ایک دو ہفتے۔“

وہ نروس ہوگیا۔ ”مسئلہ... کیسا مسئلہ۔“

میں نے کہا۔ ”تمہارے والی وارث اپنی بے وقوفی سے کوئی مسئلہ کھڑا کرسکتے ہیں جس کا خمیازہ بہرحال تم بھگتو گے۔ پھر تمہاری پارٹی ہے۔ تمہاری حکومت ہے۔“

”نواب رفیق... میری ایک بات سنتے جاؤ... ابھی میرا کسی سے بھی رابطہ نہیں۔ میرا موبائل فون مجھ سے لے لیا گیا ہے۔ تم جانتے ہو میں بیمار ہوں۔ دل کا مریض ہوں۔ مجھے دوا باقاعدگی سے کھانی پڑتی ہے اگر تم مجھے زوہیب سے بات کرنے دو۔“

میں نے کہا۔ ”یہ ناممکن ہے۔“ میں پھر دروازے کی طرف بڑھا۔

”ٹھہرو، میں تمہارے سامنے بات کروں گا۔ اگر میرے منہ سے کوئی بھی غلط بات نکلے تو تم فون بند کرسکتے ہو۔ میں اس سے کہوں گا کہ وہ میری دوا بھیج دے۔ تمہارے ذریعے۔“

میں نے ہنس کے کہا۔ ”واہ رانا۔ بہت ہوشیار سمجھتے ہو تم خود کو۔ تم اسے بتانا چاہتے ہو کہ تم میری تحویل میں ہو۔ اگر دوا مجھے دی جائے گی تو تمہیں مل جائے گی۔“

”نہیں... وہ دوا کہیں رکھ جائے۔ وہاں سے تمہارا کوئی آدمی اٹھالے۔“ رانا نے کہا۔

میں نے کہا۔ ”دوا کا نام بتاؤ۔ تمہیں دوا مل جائے گی۔“

”میں سب کو روک سکتا تھا۔ کوئی کچھ نہ کرے۔“ وہ مایوسی سے بولا۔ ”اگر میں انہیں بتادیتا کہ میں خیریت سے ہوں۔ وہ کسی سے بھی رابطہ نہ کریں اور تمہارے خلاف کوئی قدم نہ اٹھائیں۔ کوئی بات نہ کریں۔“

میں نے کہا۔ ”تم میری فکر نہ کرو۔ کرنے دو انہیں جو وہ کرنا چاہتے ہیں۔ میں سب سے نمٹ لوں گا۔“

”دیکھو نواب رفیق! میں تمہیں زبان دے سکتا ہوں۔ مجھ سے سودا کرلو۔ تم مجھے خاموشی سے پولیس کے حوالے کردو۔ میں آئندہ تمہارے کسی کام میں ٹانگ نہیں اڑاؤں گا۔ تم اپنے علاقے میں جو چاہو کرو۔ اسکول بناؤ یا اسپتال۔ سنو... ہم دوست بن کے رہ سکتے ہیں۔“

میں باہر نکل گیا۔ رانا ایک جھوٹا اور مکار آدمی تھا۔ اس کی کسی بات پر میں اعتبار نہیں کرسکتا تھا۔ جو کچھ وہ کہہ رہا تھا فریب کاری تھی۔ یہاں کوئی نہ دیکھنے والا تھا اور نہ سننے والا۔ وہ مجھ سے ہر وعدہ کرسکتا تھا۔ مجھ سے معافی بھی مانگ سکتا تھا۔ شاید میرے پاؤں بھی پکڑ لیتا لیکن اپنے دل میں اسے وہ ذہانت یا ڈپلومیسی کہتا۔ سمجھتا کہ وہ مجھے بے وقوف بنانے میں کامیاب رہا۔ یہ ناممکن تھا کہ وہ حالات سے سبق سیکھے یا اس کی فطرت میں تبدیلی آئے۔

غنی باہر کچھ دل گرفتہ اور شرمندہ سا کھڑا تھا۔ میں نے اس کے کندھے پر دوستانہ انداز میں ہاتھ رکھا۔ ”آئی ایم سوری غنی! جو کچھ تم نے کیا اس میں تمہاری کوئی غلطی نہیں تھی۔ تم نے جو کیا اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق پوری ذمے داری کے ساتھ کیا تھا۔“

”غلطی میری تھی جناب عالی!“

”چلو چھوڑو یہ بات۔ یہ ڈاک بنگلا سڑک سے کتنی دور ہے۔ مجھے تو بالکل اندازہ نہیں ہورہا ہے کہ ہم کہاں ہیں۔“ میں نے کہا۔

راجا نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ”قطبی ستارے کی پوزیشن سے لگتا ہے کہ ہم کہیں پنڈی کی طرف ہیں۔“

”بالکل ٹھیک اندازہ کیا آپ نے۔“ غنی بولا۔

راجا ہنس پڑا۔ ”مجھے تو یہ بھی پتا نہیں کہ قطبی ستارہ کون سا ہے۔“

”سڑک یہاں سے سات آٹھ کلو میٹر دور ہے۔ وہاں ایک روڈ سائڈ تنور ہے۔ دن میں دال روٹی وہیں سے لایا تھا۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے رانا کی طرف سے یہ تشویش لاحق ہے کہ اسے ہارٹ اٹیک ہوا تو وہ مرجائے گا۔ اسے کل تک تو زندہ رہنا چاہیے۔“

”بے غیرت لوگ اتنی آسانی سے نہیں مرتے تو فکر مت کر۔ یہ کل گرفتار ہونے تک زندہ رہے گا۔“ راجا نے کہا۔

رات کے پونے نو بجے ہم پھر پچھلی طرف سے حویلی میں داخل ہوئے تو مجھے ایک اور خیال آرہا تھا۔ اس کا ذکر میں نے راجا سے کیا۔

”اگر ہم رانا کو یہاں سے راولپنڈی لے جائیں۔“

راجا نے کہا۔ ”وہ کیوں۔“

”میں چاہتا ہوں کہ اسے سیٹلائٹ ٹاؤن کی پولیس

گرفتار کرے۔ اس کے بعد ہی رانا اس حوالات میں پہنچے گا جہاں میں تھا۔ یہاں آئے گی مقامی پولیس۔ وہ رانا کو جہلم لے جائے گی۔“

راجا نے کہا۔ ”خواہش میرے سر آنکھوں پر لیکن صبح تک یہ کیسے ممکن ہے۔ کیا ہم ساری رات یہی کرتے رہیں۔ پہلے رانا کو پنڈی لے کر جائیں پھر راتوں رات واپس آئیں تاکہ صبح عبداللہ صاحب کو مطلع کرسکیں کہ مفرور ملزم رانا کو کہاں سے گرفتار کیا جاسکتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”اگر صبح سے شام ہوجائے تو کوئی حرج نہیں۔“

راجا جھنجلا گیا۔ ”لیکن راولپنڈی میں ایسی کون سی جگہ ہے جہاں سے ہم اسے گرفتار کرائیں... چھوڑ نیکے پتر!“

میں خاموش ہوگیا لیکن یہ صورتِ حال چند منٹ میں تبدیل ہوگئی۔ رابعہ شہناز اور لیلیٰ بھابی کو صرف اتنا معلوم تھا کہ ہم نے رانا کا سراغ لگالیا ہے اور اب پکا انتظام کررہے ہیں کہ اس بار وہ بچ کر نکلنے نہ پائے۔ پولیس اسے گرفتار کرنے پر مجبور ہوجائے۔ اسے ہتھکڑی لگے اور وہ عام مجرموں کی طرح حوالات میں بند کیا جائے۔

ان کا خیال تھا کہ اس وقت ہم سب کا چوروں کی طرح پچھلی طرف سے نکلنا ہی اسی مشن کا ایک حصہ تھا۔ کھانے کے دوران ہم نے مزید تصدیق کردی کہ سارے انتظامات مکمل ہیں اور صبح رانا پکڑا جائے گا تو اس کی رسوائی کا تماشا سارا زمانہ دیکھے گا۔ وہاں اخباری نمائندے بھی ہوں گے چنانچہ اس خبر کو پھیلنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

میں نے محسوس کیا کہ رابعہ کچھ خاموش ہے۔ شہناز اور لیلیٰ بھابی کو اس نے کچھ بھی نہیں بتایا تھا لیکن ان کا اندازہ تھا کہ شاید اس کی شہزاد سے لڑائی ہوئی تھی پھر وہ اچانک چلا گیا تھا۔ بعد میں ایک فون آیا تھا جو اسی کا ہوگا۔ معلوم نہیں اس نے کیا کہا کہ رابعہ تب سے خاموش ہے۔ رابعہ نے کئی بار اس سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن ایسا لگتا ہے کہ نمبر نہیں ملا۔ شاید اس نے فون بند کردیا ہے۔

اس وقت میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ سب بھی میرے ایک بے ضرر سے مذاق کا شاخسانہ ہے۔ میں نے رابعہ کو ایک طرف لے جاکے پوچھا۔ ”کزن! کیا مجھے بھی نہیں بتاؤ گی۔ کیا کہا ہے شہزاد نے۔“

وہ مجھے دیکھتی رہی۔ ”یہ تم نے کہا تھا شہزاد سے... کہ ممانے کسی میجر طاہر کا رشتہ منظور کرلیا ہے۔“

مجھے ایک دم ہنسی آگئی۔ ”ہاں... مگر وہ مذاق تھا۔“

اس نے ایک گہری سانس لی۔ ”بس کزن۔ اسے میری بے وقوفی سمجھو۔ مذاق مذاق میں بات بگڑ گئی۔ وہ میرے پاس آیا تو اس کی شکل رونے والی ہورہی تھی۔ کہنے لگا کہ باہر آؤ ذرا۔ تم سے ایک بات پوچھنی ہے۔ میں حیران کہ ایسی کیا بات ہوگئی۔ باہر جاکے کہنے لگا کہ تم نے یہ بات اب تک مجھ سے کیوں چھپائے رکھی؟ میں نے پوچھا۔ ”کون سی بات۔“ کہنے لگا کہ ”تم نے کسی میجر طاہر کا رشتہ منظور کرلیا تھا تو میرے ساتھ یہ پیار کا ناٹک کیوں کیا؟“ میں سمجھ تو گئی تھی کہ کسی نے مذاق کیا ہے مگر اس کے لہجے پر مجھے غصہ آگیا۔ میں نے سوچا کہ چلو اسے مذاق میں ہی بداعتمادی کی سزا کیوں نہ دوں۔ میں نے کہا کہ میں نے کوئی ناٹک نہیں کیا۔ وہ بڑوں کی پسند تھی۔ میں کیسے انکار کرتی اور اس وقت تم کہاں تھے کہ میں انکار کرسکتی۔ لیکن اب اگر تم کہتے ہو تو میں سوچوں گی۔“ بس اس پر وہ منہ پھلا کے چلا گیا کہ میں کیوں کہوں۔ تمہاری زندگی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”چلو ہم بتادیں گے اسے۔“

”تم کیا بتاؤ گے۔ میں نے بعد میں اسے فون کیا تو پہلے فون نہیں ملا پھر اس کا فون آیا۔ بڑے روکھے اور جلے کٹے لہجے میں کہنے لگا کہ بس رابعہ، ایک بات میں بھی بتادوں۔ میری ماں نے ایک لڑکی دیکھ رکھی تھی میرے لیے۔ اب میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ وہ بات کرلیں۔ مجھے لڑکی پسند ہے۔ اس پر مجھے پھر غصہ آگیا۔ میں نے کہا کہ یقیناً مجھ سے اچھی ہی ہوگی جو تمہیں پسند آگئی۔ تم کرلو۔ میری طرف سے جہنم میں جاؤ۔“ بعد میں میرا غصہ اترا تو میں نے سوچا کہ اسے ساری بات بتادوں لیکن اس نے موبائل بند کررکھا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”یار اس میں اداس یا پریشان ہونے والی بھلا کون سی بات ہے۔“

”پریشانی کی بات تو ہے کزن۔ فرض کرو اس نے اپنی ماں سے کہہ دیا کہ بات کریں اور جو ماں اپنے بیٹے کی ہاں کے انتظار میں بیٹھی تھی وہ تو اتنی خوش ہوگی کہ ایک منٹ دیر نہیں لگائے گی۔ اس نے فون اٹھا کے بات کرلی لڑکی والوں سے پھر؟“

”کزن! ایسی باتیں فون پر نہیں کی جاتیں۔ اس کے لیے لڑکے والے باقاعدہ پیغام لے کر جاتے ہیں۔“

”وہ سب بعد کی بات ہے۔ چار چھ بندے لے کر اور مٹھائی کے ٹوکرے اٹھا کے جانا۔ لڑکی والوں کو اطلاع تو پہلے دے دی جاتی ہے۔ ایسا ہوا تو کتنی خرابی ہوگی۔“

میں نے کہا۔ ”اوکے۔ میں بات کرتا ہوں اس گدھے سے۔“

”کزن! میری ایک بات مانو گے؟“ وہ رونے کے

قریب ہوئی۔

''دیکھو بات منوانے کے لیے رونا ضروری نہیں۔ مسکرا کے بات کرو گی تو مانوں گا ورنہ نہیں۔''

وہ مسکرانے لگی۔ ''تم خود جاؤ۔ ابھی!''

''ابھی؟'' میں نے چلّا کے کہا۔

''ہاں ابھی۔''

''تم نور جہاں سے بات کر سکتی ہو۔ مجھے شہزادو نے بتایا تھا کہ تمہاری اور اس کی گاڑھی چھننے لگی ہے۔''

''اس نے کہا اور تم نے مان لیا؟ احمق ہو تم بھی۔ میں کبھی اس سے یہ بات نہیں کر سکتی۔''

''اچھا میں کر لیتا ہوں۔''

''تم صاف انکار کیوں نہیں کر دیتے کہ میں جانا نہیں چاہتا۔ تمہیں کوئی خیال نہیں میرا۔ میری زندگی کا سوال ہے۔'' وہ ایک دم رو پڑی۔

میں نے اسے گلے لگا کے اس کے سر کو چوما۔ ''ارے کزن! تم واقعی پاگل ہو۔ بابا میں جاتا ہوں۔ ابھی جاتا ہوں۔ چلو بند کرو یہ رونا۔''

مسئلہ میں نے راجا سے بیان کیا تو اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ ''ہاتھ ملا فیکے پتر! اب تو جانا ہی پڑے گا۔ غالباً خدا کو یہی منظور ہے۔ میں یہی سوچ رہا تھا۔''

''کیا تجھے معلوم تھا کہ مذاق مذاق میں کیا ہوا؟''

''نہیں... میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔ یہ جو تیرے ابا کے مرحوم دوست تھے۔ برہان الدین! ان کا گھر تو بند پڑا ہوگا۔''

''ہاں۔ ان کا والی وارث کون تھا۔ نہ بیوی نہ بچے۔''

''فرض کر ہم رانا کو اس گھر میں لے جائیں۔ آج رات۔'' راجا بولا۔

میں نے کہا۔ ''خطرناک کام ہے۔ کسی نے دیکھ لیا پھر؟''

راجا نے کہا۔ ''چانس تو لینا پڑے گا۔ تو نے اندر سے دیکھا ہے ان کا گھر؟ سارا جغرافیہ معلوم ہے؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں۔ ایک راستہ پیچھے کی طرف ہے۔ گندی گلی میں۔ ادھر سے دیوار کوئی آٹھ فٹ اونچی ہے۔ ادھر کوئی نہیں ہوتا۔''

''پھر تو کام بن گیا۔'' راجا اٹھ بیٹھا۔ ''تو ایسا کر ایک گاڑی لے کر جا۔ گاڑی کہیں دور کھڑی کر کے گندی گلی کے راستے گھر میں داخل ہو جا۔ آٹھ فٹ کی دیوار پھاندنا کیا مشکل ہے تیرے لیے۔''

''اور کسی نے دیکھ لیا تو؟''

''یار اگر تو ابھی روانہ ہو جائے۔'' راجا نے گھڑی دیکھی۔ ''تو پنڈی پہنچے گا بارہ بجے کے بعد۔ آدھی رات کے وقت تجھے گندی گلی میں دیکھنے والا کون ہوگا۔ اندر جا کے دروازہ کھول۔ اطمینان سے لائٹس آن کر سامنے والا مین گیٹ اندر سے بند ہوگا۔ جب ہم آئیں تو کھول دینا تاکہ گاڑی لے کر ہم سیدھے اندر چلے جائیں۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن گھر میں روشنی دیکھ کے کوئی محلے دار آ گیا۔ یہ دیکھنے کہ اندر کون گھسا ہوا ہے۔''

راجا نے کہا۔ ''یار تو پاگل ہے۔ ابے اندر باہر کی ساری لائٹس جلا کے چور ڈاکو تو قیام فرما نہیں سکتے۔ کسی نے دیکھا تو یہی سمجھے گا کہ برہان الدین کا کوئی وارث ہوگا۔ بیوی، بچے نہ سہی۔ بھائی بہن چچا ماموں خالہ پھوپی کوئی تو ہوگا۔ اتنا متفکر نہیں ہوگا کوئی کسی پڑوسی کے لیے کہ بستر چھوڑ کے یا ٹی وی دیکھ رہا ہو تو پروگرام چھوڑ کے جائے۔ سب سوچتے ہیں کہ صبح دیکھ لیں گے کون آیا ہے۔''

راجا کی بات میں جو دلیل تھی وہ مسترد نہیں کی جا سکتی تھی۔ ''اچھا میں جاتا ہوں۔ تو کیسے آئے گا بعد میں؟''

''میں شیر خان کی گاڑی میں غنی کے ساتھ جاتا ہوں۔ ہم رانا کو وہاں سے اٹھاتے ہیں اور پہنچتے ہیں ایک گھنٹے بعد۔ میں رانا کو وہاں چھوڑ کے واپس... تیرے پاس اچھا بہانہ ہے نور جہاں سے ملنے کا۔ رابعہ نے ڈیوٹی لگا دی ہے ایسی کہ جانا پڑے گا۔''

میں نے ہاتھ گھمایا مگر راجا بچ گیا۔ ''میں کسی بہانے کے بغیر بھی اس سے مل سکتا ہوں۔ کون روکے گا مجھے؟''

''ہاں اب تو فریال بھی نہیں مقابلے پر۔ اس نے خود ہی نور جہاں کو واک اوور دے دیا ہے۔ بلا مقابلہ نور جہاں جیت چکی ہے۔''

''ان کے درمیان کوئی مقابلہ تھا بھی نہیں۔'' میں نے خفگی سے کہا۔

''پھر کیا تھا۔ خیر چھوڑ! یہ کوئی وقت نہیں ہے اس موضوع پر بحث کرنے کا۔ تو نکل جا۔''

شہناز اور لیلیٰ بھابی کی مخالفت اور ناراضی کے باوجود میں روانہ ہو گیا۔ رات کے وقت سڑک نسبتاً خالی تھی۔ خطرہ صرف جی ٹی روڈ تک تھا۔ آگے صرف ڈیڑھ گھنٹے کی ڈرائیو تھی۔ جب میں نے روٹ کراس کیا تو ٹھیک بارہ بج رہے تھے۔ شہناز کی قدرے پرانی خیبر نے تیز رفتاری میں میری خواہشات کا احترام کیا تھا۔ ٹھیک ساڑھے بارہ بجے میں نے گاڑی کو اس جگہ روکا جہاں ایک بار اپنی ٹویوٹا کو کھڑا کیا تھا۔ اس کا پوری طرح جلا ہوا ڈھانچا آج بھی کسی تھانے کے کباڑ خانے

میں یا کسی کباڑی کے گودام میں پرزہ پرزہ پڑا تھا۔

اس جگہ سے برہان الدین کے گھر تک مشکل سے ایک [illegible] کا راستہ تھا۔ بیشتر دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ ایک چائے والا اور اس کے ساتھ پان سگریٹ کے کھوکھے والا [illegible] بھی دکانیں کھولے بیٹھے تھے۔ مجھے کسی نے بھی نوٹس نہیں [illegible]۔ پیدل چلتا ہوا میں برہان الدین کے گھر کی طرف گیا اور [illegible] اسٹریٹ کے بجائے پچھلی طرف کی گندی گلی میں داخل ہو گیا۔

گلی میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ میں ایک بار نور جہاں کے ساتھ اسی راستے سے فرار ہوا تھا۔ لوگوں نے اپنے اپنے گھر کا کوڑا کچرا، ملبا اور کاٹھ کباڑ گلی میں ڈال دیا تھا اور صفائی کی ساری ذمے داری حکومت پر ڈال دی تھی۔ اب صفائی نہیں ہوئی تو گویا حکومت کی نا اہلی۔ ہم تو برابر اپنا کام کر رہے ہیں۔ اضافی بو کھلے گٹروں سے خارج ہو رہی تھی۔ میں اندھیرے میں الو کی طرح دیکھتا اور خود کو کسی گٹر میں غرق ہونے سے بچاتا آگے بڑھتا گیا۔ ایک گھر کے سامنے سے گزرتے ہوئے میرے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ آ گئی۔ یہاں ایک بزرگوار اور ان کی اہلیہ نے مجھے اور نور جہاں کو ایک پرانی کار میں خطرے سے نکالا تھا۔

اچانک ایک دروازہ کھلا اور اندھیرے میں کوئی شخص مجھے سلام کرتا ہوا گزر گیا۔ اس نے عادتاً سلام کیا تھا۔ وہ مجھے بھی گلی کا باسی سمجھا ہوگا۔ اندھیرے میں کسی کی صورت کہاں پہچانی جاتی ہے لیکن میرے دل میں کھدبد ہونے لگی کہ کہیں بعد میں اس نے مجھے پہچان لیا پھر۔

برہان الدین کے گھر میں یوں چوروں کی طرح داخل ہوتے وقت مجھے شرم آئی لیکن دل میں ایک خیال ضرور تھا کہ [illegible] نیک دل شخص نے مجھے بچاتے ہوئے جان دی تھی۔ اس [illegible] روح کو بھی میری اس حرکت سے سکون حاصل ہوگا۔ اپنا [illegible] تا دیل۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو گلی سنسان تھی۔ [illegible] نے جمپ لگا کے ہاتھ اٹھائے اور پھر ہاتھوں کے بل پر [illegible] کو دیوار کے ساتھ ساتھ اوپر کھینچا۔ میرے پیر خود بخود دیوار کے متوازی آ گئے پھر میں اندر کی طرف لڑھک گیا اور [illegible] کی طرح دبے پاؤں فرش پر اترا۔

میرے سامنے سنسان بیک یارڈ تھا۔ اس کے بعد [illegible] دروازہ تھا اور دروازے کی بغل میں کھڑکی۔ اِدھر اُدھر [illegible] پڑا دستیاب نہ تھا۔ میں نے شرٹ اتار کے ہاتھ پر لپیٹی اور کھڑکی کے شیشے پر آہستہ سے مکا مارا۔ شیشہ اندر بکھر گیا۔ میرا ہاتھ محفوظ رہا۔ پوری احتیاط کے ساتھ میں نے کناروں سے جڑے رہ جانے والے شیشے کے نوکیلے ٹکڑوں کو ایک ایک کر کے الگ کیا اور پھر کنڈی کھولی۔

کچھ دیر بعد میری نظریں اندھیرے میں دیکھنے کی عادی ہو گئیں تو مجھے سوئچ بورڈ کا سیاہ رنگ ایک دھبے کی طرح نظر آنے لگا۔ میں نے ایک سوئچ آن کیا پھر دوسرا، ٹیوب لائٹ جھلملا کے روشن ہو گئی۔ کمرے کے اندر سکوت تھا اور ایک سوگوار خاموشی۔ میرا دل صدمے سے بوجھل ہو گیا۔ اس گھر کے مالک کی یاد نے مجھ پر یلغار کی۔ اس نیک روح کو یاد کرتا میں آگے بڑھا۔ ایک ایک کر کے میں نے تمام کمروں کی لائٹس جلائیں اور پھر پورچ میں جا نکلا۔

میں نے برآمدے کی لائٹ جلائی تو مجھے اجڑا ہوا لان دکھائی دیا۔ یہاں میں پہلی بار آیا تھا تو میں نے برہان الدین سے اپنا تعارف کرایا تھا اور اس کے ساتھ بیٹھ کے چائے پی تھی۔ بظاہر گھر میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ تفتیش کے بہانے پولیس خون کے داغ والے قالین اٹھا لے گئی تھی۔ شاید ذرا کی مکین ہو جانے کے بعد وہ کسی کے گھر کی رونق بڑھا رہے ہوں گے اور وہ کیا کچھ لے گئے تھے۔ اس کا اندازہ مجھے نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے پورچ کی لائٹ بھی روشن کر دی گیٹ لائٹس سب کی بند تھیں سوائے ایک گھر کے۔ میں نے غیر ضروری اور شک پیدا کرنے والے چراغاں سے گریز کیا۔

راجا نے ایک گھنٹے کا کہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ شاید رانا کو اٹھانے اور یہاں لانے کے عمل میں اس سے بھی زیادہ وقت لگ جائے گا۔ ابھی تک پاس پڑوس سے کوئی تصدیق کرنے نہیں آیا تھا کہ اندر کون ہے۔ راجا کی بات درست ثابت ہو رہی تھی۔ کسی کو کیا پڑی ہے کہ خود کو زحمت دے۔

کچن میں جا کے میں نے ہر کیبنٹ کو کھولا اور اپنی مطلوبہ اشیا تلاش کرنے میں کامیاب رہا۔ چولہے میں گیس آ رہی تھی۔ نل میں پانی تھا۔ ماچس بھی وہیں رکھی تھی۔ میں نے اپنے لیے چائے تیار کی اور کمرے میں آ کے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ رابعہ نے ٹھیک کہا تھا۔ شہزادا اپنا موبائل فون آف کیے بیٹھا تھا۔ مجبوراً مجھے نور جہاں کا نمبر ملانا پڑا۔

اس نے کچھ دیر بعد نیند کے خمار میں کہا۔ ''ہیلو...''

میں نے کہا۔ ''سو رہی ہو کہ جاگ رہی ہو؟''

شاید پہلے اس نے نمبر پر غور ہی نہیں کیا تھا۔ آواز پر وہ چونکی۔ ''تم... یہ واقعی تمہاری آواز ہے؟ یا میرا خواب جاری ہے؟ مجھے یقین نہیں آتا؟''

میں نے کہا۔ ''کیا یقین نہیں آتا۔''

''شاید تم بھی نہ مانو لیکن چندا خواب میں بھی تم ہی

تھے۔ میں تم سے فون پر بات کر رہی تھی۔ تمہاری قسم! مجھے بتاؤ کیا ایسا ہوتا ہے؟ ہوسکتا ہے کہ آپ جو خواب میں دیکھیں وہ ہو بھی جائے۔ آنکھ کھلے تو پتا چلے کہ وہ خواب کی بات نہیں حقیقت تھی۔"

"اس کی وضاحت خوابوں کی نفسیات پر میرے لیکچر میں کی جائے گی۔" میں نے کہا۔ "جو میں آج رات بھی دے سکتا ہوں۔"

"تم ہو کہاں؟ مجھے لگتا ہے کہیں قریب ہی ہو۔ یہ احساس بے سبب تو نہیں ہوسکتا۔" وہ بے چین ہوگئی۔

میں نے کہا۔ "نور کیا ہوگیا ہے تمہیں؟"

"کیا تم نہیں جانتے؟ جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے۔"

میں نے کہا۔ "اچھا سنو! شہزاد کہاں ہے؟"

"اپنے کمرے میں سو رہا ہوگا۔ یا رو رہا ہوگا۔" وہ ہنسی۔ "جب سے واپس آیا ہے اس کی حالت ایسی ہی ہے۔ میں دیکھتی ہوں۔"

چند منٹ بعد شہزاد کی آواز آئی۔ "ہیلو"

میں نے کہا۔ "تم نے اپنا فون کیوں بند کر رکھا ہے؟"

"بند نہیں کیا۔ میں کہیں رکھ کے بھول گیا ہوں۔ اس کی رِنگ خود میں نے آف کی تھی۔ وائبریشن سے کال ریسیو کر رہا تھا۔"

"اس وجہ سے کتنی خرابی ہوئی۔ کچھ اندازہ ہے؟ مجھے خود آنا پڑا۔"

"کہاں ہیں آپ اس وقت؟"

میں نے کہا۔ "آدھے راستے میں۔"

وہ گھبرا گیا۔ "سب خیریت ہے نا۔ رابعہ تو ٹھیک ہے نا؟"

"صرف رابعہ کو کیوں پوچھ رہے ہو برخوردار۔ ابھی آکے تمہارا دماغ درست کرتا ہوں لیکن دیکھو نور جہاں سے کچھ مت کہنا۔"

"نہیں کہوں گا مگر دماغ درست کرنے کی ضرورت اسے ہے۔ اس نے میرا دماغ خراب کر رکھا ہے۔"

"ایسا لگتا ہے کہ دماغ سب کا ہی خراب ہے۔ لیکن فیصلہ کون کرے۔ سب ایک دوسرے کو پاگل سمجھتے ہیں۔" میں نے ہنس کے کہا۔

اسی وقت باہر سے ہارن سنائی دیا۔ میں نے فون بند کیا اور باہر گیا تو گاڑی کا رخ اندر کی طرف تھا۔ گیٹ بند ہونے کے باوجود اس کی ہیڈ لائٹس نے پورچ میں اجالا پھیلا رکھا تھا۔ میں نے اندر سے گیٹ کھولا تو گاڑی اندر آگئی۔ اسے

شیر خان ڈرائیو کر رہا تھا۔ غنی اور راجا پچھلی سیٹ پر تھے۔ انہوں نے درمیان میں بیٹھے ہوئے رانا کو ہاتھ پکڑ کے اتارا۔ رانا کی آنکھوں پر پٹی تھی اور اس کے منہ پر چار انچ چوڑا ٹیپ تھا۔ وہ غنی کے سہارے چلتا ہوا اندر آیا۔ غنی نے اسے بیڈ پر بٹھا کے منہ پر سے ٹیپ اتارا پھر اس کی پٹی کھولی۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور کچھ کہے بغیر بیڈ پر لیٹ گیا۔ وہ تھکن سے بے حال تھا۔ غنی نے اسے چار گولیاں نکال کے دیں جو انہوں نے راستے میں کسی کیمسٹ سے خریدی ہوں گی۔ رانا نے پانی کے ساتھ وہ گولیاں نگل لیں۔ میرے کہنے پر غنی کچن میں جا کے چائے بنانے لگا۔

"یہ قید خانہ بہتر ہے۔" رانا نے کہا۔ "مجھے یہاں کب تک رہنا ہوگا؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اس کا انحصار حالات پر ہے۔"

چند منٹ بعد میں اپنی خیبر کار میں شہزاد کے گھر کی طرف رواں تھا۔ سیٹلائٹ ٹاؤن سے لالہ زار کالونی تک کم سے کم بارہ کلومیٹر کا فاصلہ تھا۔ دن میں مری روڈ کی ٹریفک سے گزرنا آسان نہ ہوتا۔ اس وقت میں پوری رفتار سے چلا گیا۔ سارے سگنل اس وقت بند تھے۔ سڑک پر بہت کم گاڑیاں تھیں۔ اگلے چوک سے میں سیدھا مال روڈ تک گیا اور پھر پی سی کے سامنے سے گزر کے لالکڑتی کی طرف گھومایا۔ ریج روڈ سے اور پھر گورا قبرستان کے سامنے سے گزرتے ہی لالہ زار کالونی کا آغاز ہوگیا۔ پانچ منٹ بعد میں نے گاڑی کو شہزاد کے گھر کے دروازے پر روکا ہی تھا کہ وہ گیٹ کھول کے باہر آگیا۔

اس کی ماں اور خالہ ایک ہی کمرے میں سوتی تھیں۔ ان کے کمرے سے متصل کمرے کو اب نور جہاں استعمال کر رہی تھی۔ پہلے یہ گیسٹ بیڈ سمجھا جاتا تھا۔ نور جہاں کی حیثیت بھی یہاں مہمان جیسی ہی تھی۔ خلافِ توقع وہ میرے استقبال کے لیے نہیں نکلی۔ اس کے کمرے میں اندھیرا یہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ سو رہی ہے جب کہ میرے یقین کے مطابق یہ ناممکن تھا کہ مجھ سے بات ہو جانے کے بعد وہ اتنی جلدی سو جائے۔

شہزاد کے کمرے میں جا کے میں جوتوں سمیت بیڈ پر دراز ہوگیا۔ "یار میں بہت تھک گیا ہوں لیکن تم سے بات کرنا بھی ضروری تھا۔"

"اگر ہم صبح بات کریں گے تو رات بھر میں کوئی قیامت نہیں آجائے گی۔ آپ سو جائیں۔"

میں نے کہا۔ "کیا تمہیں نیند آرہی ہے؟ نہیں تو جاؤ چائے کافی کچھ بھی لے آؤ... بنالو گے؟"

اس نے سر کھجایا۔ "کافی آسان ہے۔ صرف پانی ابالنا پڑتا ہے تم کہو تو نور جہاں کو جگا دوں۔"

"نہیں اسے سونے دو۔" میں نے کہا۔

شہزاد جب کافی بنا کے لایا تو اس کے ساتھ حلوا بھی تھا۔ "یہ مونگ کی دال کا حلوا ہے۔ امی کو بہت پسند تھا اور جیسا وہ بناتی تھیں کوئی اور نہیں بنا سکتا تھا۔ تم کہو گے کہ ہر ماں کے بیٹے کا یہی مسئلہ ہے۔ اسے ماں کے ہاتھ کا ذائقہ سب سے اچھا لگتا ہے۔"

"یہ تو ہے۔ دراصل فرق مسالوں کا نہیں مامتا کے جذبات کا ہوتا ہے جو کوئی اور شامل نہیں کر سکتا لیکن تم نے سچ کہا۔ یہ تو واقعی بہت مزے کا ہے۔" میں نے کہا۔

"جب تک بینائی رہی وہ بناتی رہیں۔ شبِ برات کے علاوہ بھی میری فرمائش پر بناتی تھیں۔"

میں نے کہا۔ "یہ بھی تمہاری ضد پر بنایا ہوگا۔ نظر نہ آنے کے باوجود۔"

وہ ہنسنے لگا۔ "یہ نور جہاں نے بنایا ہے۔ ایسے ہی باتوں باتوں میں ذکر آگیا تھا۔ وہ کہنے لگی کہ میں بناؤں؟ اماں نے کہا کہ بناؤ۔ اور کیسی عجیب بات ہے۔ اماں نے تو خیر تعریف کی۔ لیکن مجھے پتا نہیں چلا۔ میں نے کھایا تو اماں سے کہا کہ آپ کو دکھائی تو کچھ دیتا نہیں پھر کچن میں جا کے یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ بھی ہنسنے لگیں۔ انہوں نے کہا کہ میں نے کچھ نہیں کیا۔ نور جہاں نے بنایا ہے۔ مجھے یقین نہیں آیا۔ میں سمجھا ماں غلط کہہ رہی ہیں۔ وہ بڑی باکمال لڑکی ہے۔ اماں پر تو جادو کر دیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "اس کے بارے میں یہ عام خیال ہے کہ وہ جادوگرنی ہے۔ اس نے مجھ پر جادو کر دیا ہے۔"

وہ کچھ سوچ کے بولا۔ "کیا یہ غلط ہے؟"

"میرا خیال ہے رابعہ بھی جادوگر ہے۔ تم کیا کہتے ہو؟"

وہ اداسی سے مسکرایا۔ "ایسا ہی لگا تھا مجھے پہلے پہل۔ میں تو سمجھا تھا مجھے اپنی منزل مل گئی ہے لیکن افسوس۔"

میں نے کہا۔ "بالکل ٹھیک سمجھا تھا آپ نے۔ افسوس کیسا۔"

"وہ خوش فہمی تھی میری۔" وہ رونی صورت بنا کے بولا۔ مجھے ہنسی آگئی۔ "یار تم اچھے خاصے ذہین اور سمجھدار آدمی... اس مذاق کو نہیں سمجھ سکے۔ مذاق میں نے اور راجا نے کیا تھا۔ اس نے شوخی میں تمہیں تنگ کرنے کے لیے بات کو آگے بڑھا دیا۔"

"کیا مطلب؟" وہ خفیف ہو کے بولا۔

"مطلب یہی کہ آپ احمق اور گدھے ہیں۔ میجر طاہر نام کے کسی شخص کا کوئی وجود نہیں۔ یار اتنا تو سوچتے کہ اس نے پہلے کسی کو قبول کرلیا ہوتا تو وہ تمہیں لفٹ کراتی؟ اور ہم سب دیکھتے رہتے؟ تم نے کسی سے بات نہیں کی اور آگئے قطع تعلق کا نوٹس دے کر۔ بندۂ خدا رابعہ کے جذبات کا بھی لحاظ نہیں رکھا تم نے۔ وہ بعد میں کتنی پریشان ہوئی۔ اسے وضاحت اور معذرت کا موقع بھی نہیں دیا۔ ایک وار اور کر دیا اس کے دل پر کہ مجھے خاک بھی پروا نہیں... ایسا نہیں کہ دل شکستہ ہو کے خودکشی کرلوں... لڑکی اور بس کا کیا ہے۔ ایک گئی تو دوسری مل جائے گی اور میں نے پکڑ لی ہے دوسری بس۔"

وہ شرمندگی سے سنتا رہا۔ "آئی ایم سوری!"

"سوری؟ کیا صرف سوری کہہ دینے سے بے وفائی کے زخم بھر جاتے ہیں۔ وہ روتی رہی اور بعد میں تم سے بات کرنے کی کوشش کرتی رہی۔ سوچو ذرا کتنے دکھ کی بات ہوگی یہ کسی بھی لڑکی کے لیے کہ وہ مذاق کرے اور دوسرا اتنا سیریس ہو جائے کہ ایک دم سارے عہد و پیماں بھلا دے۔ قطع تعلق کرلے اور اعلان کردے کہ تو نہیں اور سہی... اپنا تو یہی وتیرہ ہے۔ اس کا تم سے تعلق میں اتنا آگے بڑھ جانا کوئی مذاق تھا۔"

"میں ابھی اس سے معافی مانگ لیتا ہوں۔"

"بات یہ ہے شہزادے! تم نے اسے مایوس کیا۔ ہر لڑکی ایسا سمجھتی ہے اور یہ توقع رکھتی ہے کہ جو اس سے محبت کرے وہ اس کے لیے زمانے سے لڑ جائے۔ کوئی میجر طاہر سچ مچ ہوتا تو تم کہتے کہ میں اس کو جان سے مار دوں گا۔ دیکھتا ہوں کون چھینتا ہے تمہیں مجھ سے۔ خیر! جو خرابی ہو سکتی تھی ہوگئی۔ اب یہ بتاؤ کہ جو بکواس تم نے فرمائی تھی اس میں کتنی حقیقت تھی؟ کیا واقعی تم نے اپنی ماں سے کہہ دیا ہے؟"

وہ سر کھجا کے بولا۔ "ابھی کہا تو نہیں... لیکن کل کہہ دیتا۔"

میں نے کہا۔ "شرم آنی چاہیے تمہیں۔ سوچو کتنی خرابی ہوتی اس سے۔ تمہاری زندگی بھی خراب ہوتی رابعہ کی بھی۔ خدانخواستہ تمہاری والدہ اس لڑکی کے گھر بات پکی کرنے چلی جاتیں جسے انہوں نے پسند کر رکھا ہے تو کیا بعد میں تم اس رشتے سے انکار کرتے؟"

"میں نے واقعی بہت جلد بازی کی تھی۔ آپ نے مجھے بچالیا۔"

میں نے کہا۔ "یہ صرف رابعہ کے لیے کیا میں نے۔"

راجا کے فون نے شہزاد کی گلوخلاصی کرادی۔" تو پہنچ گیا۔کوئی خرابی تو نہیں ہوئی۔"

میں نے کہا۔"اگر میں فوراً حالات کو سنبھالنے نہ چل پڑتا تو ضرور ہو جاتی کل۔"

"تو نے مرغا بنایا اس شہزادے کو یا نہیں؟"

میں نے کہا۔"وہ صبح رابعہ سے دست بستہ معافی مانگنے جائے گا۔"

"صبح...وہ پاگل لڑکی جاگ رہی ہوگی۔وہ ابھی بات کیوں نہیں کرتا آخر۔" راجا نے مزید خفگی کا اظہار کیا۔

"رانا کی پوزیشن کیا ہے؟"

"وہ قید اور پھر اس منتقلی سے نیم جاں ہو گیا تھا۔ دوائیں کھا کے گہری نیند سو رہا ہے۔ میرا خیال ہے ان میں کوئی خواب آور گولی بھی ہوگی۔ وہ چھ آٹھ گھنٹے سے پہلے اٹھنے والا نہیں ہے۔"

"اور اس کے بعد؟"

"صبح تک میں بھی آرام کروں گا۔ یہاں سے جاتے وقت ہم رانا کو ایک خواب آور انجکشن دیں گے جو ہم ساتھ لائے تھے۔اس کے لیے زبردستی کرنا پڑے گی۔"

"ہاں۔وہ سمجھے گا اسے زہر کا انجکشن دیا جا رہا ہے۔"

"جب وہ سو جائے گا تو ہم نکل جائیں گے۔تو ایک گھنٹے بعد عبداللہ جان کو فون کر سکتا ہے وہ جس کی ڈیوٹی چاہے لگائے۔دوپہر تک رانا پولیس کو حوالات میں دیکھنے کے لیے اخباروں کے کچھ لوگ پہنچ جائیں گے۔ میں نے ابھی بات کی ہے۔"

"اگر ڈی آئی جی صاحب نے پوچھا کہ اس وقت آپ کہاں سے بات کر رہے ہیں۔"

"تو کہہ سکتا ہے کہ منہ سے۔ یار اتنا ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ کون ہوتا ہے یہ پوچھنے والا۔تو کہہ سکتا ہے کہ میں لاہور کے شاہی قلعے میں ایک طوائف کے کوٹھے پر ہوں۔لیکن جو اطلاع مجھے ملی ہے وہ درست نہ ہو تو جو چور کی سزا وہ میری۔"

بظاہر اس پورے پلان میں کہیں جھول نہ تھا۔ میں نے رانا کی گرفتاری کا معاملہ شہزاد سے پہلے ہی ڈسکس کر لیا تھا۔ برہان الدین مرحوم کے گھر سے اس کی گرفتاری کا آئیڈیا اسے پسند آیا۔"اس سے برہان الدین مرڈر کیس میں ایک نیا ٹوئسٹ آ جائے گا۔"

میں نے کہا۔"پولیس اس کی تفتیش کا رخ بدل کے یہ دیکھے گی کہ رانا کو اغوا کرنے والوں کا برہان الدین کے قاتلوں سے کوئی تعلق کیسے بنتا ہے؟ کیا قاتل وہی تھے جنہوں نے اسے اغوا کیا۔ رانا کچھ بھی کہے۔ جب تک ثبوت اور شہادت سے اس کی تائید نہ ہو رانا کے بیان کی قانونی حیثیت کچھ نہیں بنتی۔"

"ظاہر ہے وہ آپ ہی کا نام لے گا۔ جو کہے گا سچ کہے گا مگر مانے گا کون اور مان لے تب بھی آپ کو کیا فرق پڑتا ہے۔"

"ہاں۔ بس میری ایک خواہش پوری ہو جائے گی۔ اسے حوالات کی سلاخوں کے پیچھے دیکھنے کی۔ اس کے غلام اور اس کی محکوم رعایا بھی دیکھے کہ ان کا ان داتا قانون سے بالاتر اور زیادہ طاقتور سمجھا جانے والا رانا رجب علی عام مجرموں کی طرح حوالات میں ہے۔اس کی فرعونیت کا یہ طلسم ٹوٹ جائے کہ وہ نعوذ باللہ خدا ہے۔"

"غم کیوں کرتے ہیں آپ۔ خدا نے چاہا تو اسے پھانسی بھی ہوگی اور اس کی لاش رانا نگر کے رانا پیلس میں سامانِ عبرت فراہم کرے گی۔ ایک دن ایسا ضرور ہوگا۔" شہزاد جوش سے بولا۔

میں نے کہا "فی الحال تو میں سونا چاہتا ہوں۔"

وہ اٹھا۔"آپ آئیں میرے ساتھ۔ گیسٹ بیڈ ادھر ہے۔"

میں نے کہا۔"کیا...وہ نور جہاں کے استعمال میں نہیں ہے؟"

"نہیں۔ وہ واقعی عجیب لڑکی ہے۔ اکیلے سوتے ہوئے اسے ڈر لگتا ہے۔ اب خالہ اور ای ایک بیڈ پر سوتی ہیں۔ اس نے انہی کے کمرے میں اپنا بیڈ لگا لیا ہے۔ آپ چاہیں تو میرا نائٹ سوٹ استعمال کر سکتے ہیں۔"

"میں انہی کپڑوں میں گزارا کر لوں گا۔" میں نے کہا۔

ایزی رہنے کے لیے میں نے جوتوں کے ساتھ جینز کی پینٹ سے بھی چھٹکارا حاصل کر لیا جو مجھے کچھ ٹائٹ ہو گئی تھی۔ کمرے میں کسی کے آنے کا امکان نہیں تھا۔ میں بنیان اور انڈرویئر میں چادر اوڑھ کے سو گیا۔ معلوم نہیں کب میں گہری نیند سے جاگا تو نور جہاں میرے ساتھ تھی۔ میں گھبرا کے اٹھا۔"تم...اندر کیسے آئیں؟"

اس نے مجھے کھینچ لیا۔"مجھے کون روک سکتا ہے۔"

"دروازہ تو خود میں نے اندر سے بند کیا تھا۔"

وہ ہنسی۔"لیکن کھڑکی خود میں نے کھلی رکھی تھی۔"

"حد کر دی تم نے بھی۔" میں نے اٹھنے کی کوشش کی۔ اس نے مجھے پکڑ لیا۔"ہاں...حد میرے لیے کوئی چیز نہیں۔ میں نے جو کیا اپنی مرضی سے کیا۔ اگر تم سے محبت کی تو اس میں بھی ہر حد کو پھلانگ گئی۔ اس کا نتیجہ ہے کہ آج بھی اپنے وجود میں تمہاری نشانی کو پال رہی ہوں۔"

میں ایک دم سرد پڑ گیا۔"یہ ٹھیک نہیں ہے نور جہاں۔"

"کیا ٹھیک نہیں ہے نواب صاحب!" وہ اٹھ بیٹھی۔ "آخر کس کا ڈر ہے آپ کو۔ اب تو فریال نے بھی آپ کو چھوڑ دیا۔"

میں نے برہمی سے کہا۔"صرف تمہاری وجہ سے۔"

"میری وجہ سے؟ نہیں چندا! وہ اس لیے چلی گئی کہ تم نے اس سے شادی نہیں کی۔ میں نے تو شادی کا مطالبہ بھی نہیں کیا اور کروں گی بھی نہیں۔ مجھ سے ملنے تم خود آتے رہے۔ تم نے ہزار بار جتایا کہ تمہیں مجھ سے نہیں فریال سے محبت ہے۔ لیکن رسم وفا کس نے نبھائی؟ میں نے یا اس نے۔"

میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔"نور جہاں! یہ وقت نہیں ہے ان باتوں کو دہرانے کا۔"

وہ رونے لگی۔"میں کب دہرانا چاہتی تھی۔ میں تو صرف تمہاری راہ دیکھ رہی تھی۔تمہارے کتنے احسان ہیں مجھ پر۔ میں تو انہی احسانات کا بدلہ چکانے کی کوشش کر رہی ہوں اپنی بساط کے مطابق۔ نہ تمہاری محبت جیتنے کے لیے نہ تم سے شرافت اور نیک چلنی کا سرٹیفکیٹ لینے کے لیے۔"

میں نے کہا۔"نور...پلیز!"

وہ اپنا منہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کے رونے لگی۔ "بس تھوڑے دن کی بات ہے۔ میں چلی جاؤں گی۔تم پھر کبھی میری صورت نہیں دیکھو گے۔تم نے اب تک مجھے بچایا ہے۔ اتنی مہربانی اور کرو کہ مجھے جلد از جلد نکال دو۔ اس شہر سے اس ملک سے اور اپنے دل سے۔"

میں نے کہا۔"دیکھو کوئی آ جائے گا۔"

"آتا ہے تو آ جائے۔اب کیا رہ گیا ہے چھپانے کے لیے۔کون نہیں جانتا کہ تم کو ایک فاحشہ نے اپنے جال میں پھنسا لیا ہے۔میری اس سے زیادہ بدنامی کیا ہوگی جو ہو چکی۔ میں کہہ دوں گی کہ میں خود آئی تھی یہاں۔"

میں نے اسے اپنے بازوؤں میں لے کر چوما۔ "او کے۔ او کے۔ میں معافی تو مانگ چکا ہوں تم سے۔ اور کیا کروں بتاؤ۔"

وہ سسکیاں لیتی رہی۔"تم کیا جانو کتنا مشکل تھا یہاں تم سے دور رہنا۔تم سے فون پر بات بھی نہ کرنا۔مگر میں نے برداشت کیا۔ آخر کب تک رہنا ہوگا مجھے اس جیل میں؟"

میں نے کہا۔"میں بہت جلد تمہیں لندن لے جاؤں گا۔ وہاں تمہارا اسٹیبل ہونا آسان ہے۔ میرے بہت دوست ہیں وہاں۔ تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔"

وہ مجھ سے لپٹ گئی۔"تم مجھ سے ملنے تو آؤ گے نا۔"

صبح جب میری آنکھ کھلی تو وہ غائب تھی۔ صرف اس کے وجود کی خوشبو بتاتی تھی کہ گزری ہوئی رات کا مہمان کون تھا۔ اس نے خود مجھے بتایا تھا کہ یہ مخصوص خوشبو وہ پیرس سے منگواتی تھی اور یہ ایسی ہیجان انگیز اثر رکھتی تھی کہ مرد کو اسی طرح لپیٹ لیتی تھی جیسے مکڑی کا جالا کسی پھنس جانے والی مکھی کو بے بس کر دیتا ہے۔

میں نے کلائی کی گھڑی دیکھی تو ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ میری آنکھ کسی کے ناک کرنے سے کھلی تھی۔ میرے یس کہتے ہی شہزاد اندر آ گیا۔"میں نے سوچا آپ کو جگا دوں مگر آپ تو پہلے ہی جاگ رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔"ابھی تمہاری دستک سے جاگا ہوں۔"

وہ بولا۔"راجا نے فون کیا تھا۔ وہ نکل گئے ہیں۔"

"ویری گڈ! کتنی دیر ہوئی؟"

"ابھی دس منٹ پہلے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں ابھی عبداللہ جان سے بات کرتا ہوں لیکن تمہاری بات ہوئی رابعہ سے یا نہیں؟"

"وہ تو ہو گئی تھی رات ہی۔"

"پھر؟ معافی مل گئی۔" میں نے ہنس کے کہا۔

"معافی بڑی سخت شرط پر ملی ہے۔ کہتی ہے دو گواہوں کے سامنے کہو گے قبول ہے تب معاف کروں گی۔ آخر ان لڑکیوں کو شادی کی اتنی جلدی کیوں ہوتی ہے۔"

میں نے کہا۔"فطری بات ہے۔ شادی کے بغیر لڑکی خود کو بہت غیر محفوظ INSECURE محسوس کرتی ہے۔"

"آخر اعتبار اور اعتماد بھی کوئی چیز ہے۔"

میں نے کہا۔"ہاں۔ اس کے لیے جس نے کبھی دھوکا نہ کھایا ہو۔ سانپ کا کاٹا اگر رسی سے ڈرتا ہے تو غلط کیا ہے۔ کیا اس نے تمہیں بتایا؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔"وہ بتا چکی ہے۔ اس نے کہا کہ تمہیں کبھی نہ کبھی معلوم ہو ہی جائے گا۔ لیکن میں فرخ نہیں ہوں۔"

میں نے ڈی آئی جی عبداللہ جان کا نمبر ملاتے ہوئے کہا۔"ایک دن اسے یقین آ جائے گا۔ ہیلو...عبداللہ جان صاحب!"

"بول رہا ہوں۔"

میں نے کہا۔"نواب رفیق احمد شیرازی۔ صبح صبح آپ کا فون کرنا ظاہر کرتا ہے کہ آپ کے پاس رانا صاحب کے بارے میں کوئی اچھی خبر ہے۔"

میں ایک دم محتاط ہوگیا۔ ''خبر تو صرف خبر ہوتی ہے سر! ایک کے لیے اچھی تو دوسرے کے لیے بری۔ میں نے کل رات اپنے کچھ خاص بندے اس کام پر لگائے تھے۔''

''پھر؟ انہوں نے معلوم کرلیا رات بھر میں۔''

میں نے کہا۔ ''آئی ایم سوری! ہتھیلی پر سرسوں اگانے کا آرٹ مجھے نہیں آتا۔ جیسے ہی کوئی بات معلوم ہوئی میں آپ کو بتاؤں گا۔''

''چلیے چھوڑیے۔ طبیعت اب کیسی ہے آپ کی؟''

''میں یہاں راولپنڈی میں ہوں۔ اپنے وکیل شہزاد کے ساتھ۔ ایسا نہ ہو آپ مجھے ست بدحالی میں سمجھیں۔ اس لیے بتا رہا ہوں۔''

''کمال کرتے ہیں آپ۔ خدانخواستہ آپ پر کوئی پابندی تو نہیں ہے کہ اپنی نقل وحرکت سے مطلع کریں۔''

میں نے محسوس کیا کہ اس وقت رانا کے بارے میں بازیابی کی خبر دینا شک وشبے کو جنم دیتا۔ رات کو بات ہوئی صبح وہ مل گیا۔ اس کا مطلب اس کے سوا کیا نکالا جاسکتا ہے کہ وہ وہیں حویلی میں تھا اور اب میں اسے لے کر خود یہاں آیا تھا تو وہ پنڈی میں مل گیا۔''

احتیاط اور دوراندیشی کا تقاضا تھا کہ میں جلد بازی نہ کروں۔ رانا کو فوراً پولیس کے حوالے کرنا کسی صورت مناسب نہ تھا۔ اس سے میری پوزیشن مزید خراب ہوتی۔ میں چند دن بعد یہ ظاہر کرتا کہ پولیس سے تعاون کے جذبے کا مظاہرہ کرتے ہوئے میں نے پوری کوشش کی اور اپنے سارے دستیاب وسائل استعمال کرتے ہوئے پتا چلالیا کہ رانا کہاں ہے۔ مجھ سے کوئی بھی ان وسائل کے بارے میں سوال نہیں کرسکتا تھا۔ اغوا کے تقریباً تمام کیس جن میں کوئی اہم شخصیت ملوث ہو اور پولیس ان کا سراغ لگانے میں ناکام رہے۔ مقامی قبائلی سردار اور مقتدر شخصیات سے مدد لی جاتی ہے اور عام طور پر وہ اپنے اثر ورسوخ سے کام لیتے ہوئے معاملہ طے کرادیتے ہیں۔ تقریباً ایسا ہی رول میرا بھی بن گیا تھا۔

یہ بات میں نے راجا کو بتانا ضروری سمجھا۔ اس نے مجھ سے اتفاق کیا۔ ''تو ٹھیک کہتا ہے لیکن رانا کا کیا ہوگا؟ میرا مطلب ہے قید میں اس کو زندہ رکھنا بھی ایک خطرناک ذمے داری ہے۔ اگر وہ مر گیا تو لینے کے دینے پڑجائیں گے۔''

''اس کا خیال تو رکھنا پڑے گا۔ اس کے آرام اور علاج کا۔''

''اس کے باوجود۔ دل کے دورے کا کوئی پتا نہیں۔ وہ اذیت میں تو رہے گا۔ دوسری بات یہ کہ اس گھر میں ایک رات تو ہمیں کسی نے نہ دیکھا نہ پوچھا لیکن مسلسل آمدورفت رہے گی تو کوئی پڑوسی آجائے۔ اس کا امکان اپنی جگہ۔ خیر! اس کا بھی کوئی حل سوچتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''راجا! دو دن گزر جائیں کم سے کم پھر میری پوزیشن محفوظ ہوگی۔''

اس سے پہلے کہ راجا کچھ کہتا باہر کی گھنٹی بجی۔ آج چھٹی کا دن تھا چنانچہ شہزاد گھر پر تھا اور باہر اپنی گاڑی صاف کررہا تھا۔ اس نے دروازہ کھول کے دیکھا پھر میں نے ڈی آئی جی عبداللہ کی آواز سنی۔

کسی نامعلوم خطرے کے خیال سے میرا دل بیٹھ گیا۔ میں نے کہا۔ ''راجا! پتا نہیں وہ عبداللہ یہاں کیوں آیا ہے۔'' اور فون بند کردیا۔

شہزاد نے پُراعتماد نظر آنے کی پوری کوشش کی اور اسے اندر لے آیا۔ چند سیکنڈ بعد وہ میرے سامنے بیٹھا تھا۔ ''دراصل جب آپ کا فون ملا تو میں ادھر سے گزر رہا تھا۔ میں یہاں وزارت داخلہ میں آیا تھا اپنے کسی کام کے سلسلے میں۔ سوچا آپ سے مل لوں۔''

''آپ نے بہت اچھا کیا۔'' میں پُرسکون رہا۔

''دراصل! برہان الدین مرڈر کیس میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی تھی۔ اس میں جو تفتیشی ٹیم کا سربراہ تھا ایس پی غفور خان کل رات کسی نے اسے فون کیا۔''

وہ بڑے غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس سے اپنی صورت کے تاثرات کو چھپانا اتنا ہی مشکل تھا جتنا محاورے کے مطابق دایہ سے پیٹ چھپانا۔ یقیناً کسی نے گزشتہ رات برہان الدین کے گھر میں ہونے والی کارروائی کے بارے میں کسی نے پولیس کو مطلع کردیا تھا کہ گھر میں لائٹس جل رہی ہیں۔ اب پولیس وہاں جائے گی اور رانا کو برآمد کرلے گی۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ رانا پھر پولیس کے ''تعاون'' سے روپوش ہوجائے گا۔ میری اسے گرفتار اور حوالات کی سلاخوں کے پیچھے دیکھنے کی خواہش پوری نہ ہوسکے گی۔

لیکن اس سے زیادہ دہشت مجھ پر اس خیال سے سوار تھی کہ اچانک نور جہاں اندر سے نمودار ہوگی تو کیا ہوگا۔ میں اس کی آواز سن رہا تھا۔ وہ جاگ چکی تھی۔ اس کی فکر شہزاد کو بھی ہوگی۔ شاید وہ اسی ارادے سے اٹھا تھا کہ چائے لینے جائے اور نور جہاں کو خبردار کرے۔

اسی وقت اندر کا دروازہ کھلا... میرا دل بیٹھ گیا۔

شہزاد نے ماں کو اندر آتا دیکھا تو وہ بڑی فرمانبردارانہ مستعدی سے اٹھا۔ اس کی امی اندر آتے آتے

ٹھٹک کے رک گئی تھیں۔ انہوں نے کسی اجنبی کی آواز پہلے سن لی ہوتی تو شاید وہ ادھر کا رخ بھی نہ کرتیں۔

میں نے کہا۔ ''یہ بیرسٹر شہزاد کی والدہ ہیں۔ ان کی بصارت زائل ہوچکی ہے۔''

ڈی آئی جی عبداللہ نے افسوس سے کہا۔ ''اوہ... کسی بیماری کی وجہ سے یا کسی حادثے میں؟''

میں نے کہا۔ ''بیماری... انہیں ہائی شوگر ہے۔''

''وکیل صاحب کے والد کیا کرتے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''ان کا تو بہت پہلے ہی انتقال ہوگیا تھا۔ یہ جس ایس پی کا ابھی آپ نے ذکر کیا تھا؟''

''غفور خان۔ یہ بہت مستعد افسر ہے۔ میں نے اسے اسپیشل برانچ میں رکھا تھا لیکن میرے جانے کے بعد انتظامی تبدیلی میں اسے پھر یہ علاقہ دے دیا گیا۔ مستعد افسر عموماً ناپسندیدہ رہتے ہیں۔ اچھا... میں چلتا ہوں۔ آپ سے پھر ملاقات رہے گی۔ آپ تو ابھی ٹھہریں گے۔''

میں نے کہا۔ ''نہیں۔ کوئی خاص مصروفیت نہیں ہے۔ میں بھی آج ہی واپس جاؤں گا۔''

اس کے ساتھ باہر آکے میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اسے گھر کے اندر نور جہاں کی موجودگی کا شک بھی نہیں ہوا۔ وہ اتنا ذہین اور تجربہ کار افسر تھا جو جرم کی اور مجرم کی بو سونگھنے میں کتے کی ناک سے زیادہ فطری صلاحیت پیدا کرلیتے ہیں۔

غلطی میری ہی تھی کہ میں نے اسے فون کیا اور یہ بھی بتادیا کہ میں راولپنڈی میں ہوں اور شہزاد کے گھر میں ہوں۔ اس گھر میں وہ عورت بھی تھی جس کے حسنِ بے مثال نے خود اس کے لیے اور دوسروں کے لیے خرابی کے بڑے اسباب پیدا کیے تھے۔ دوسروں میں میرا شمار بھی تھا جس کی زندگی وقت کے ہموار سمندر میں سکون سے اپنی منزل کی طرف بڑھتی ناؤ کی طرح تھی۔ نور جہاں کسی موجِ بلاخیز کی طرح نمودار ہوئی اور اس نے میرے جذبات میں وہ تلاطم برپا کیا کہ کچھ بھی پہلے جیسا نہ رہا۔ بقول شاعر... نہ وہ میں رہا نہ وہ تو رہا، جو رہی تو بے خبری رہی۔ فریال نے اپنی زندگی کی راہ الگ کرلی۔ نور جہاں سے تعلق نے مجھے رسوائی اور اپنوں کی ناراضی کے سوا کچھ نہ دیا۔ اکبر خان کو اس نے اپنی نجات کے لیے قتل کیا لیکن بدنامی مجھے ملی کہ اس نے یہ سب میرے لیے کیا تھا۔ الزام مجھ پر آیا کہ میں نے اسے اکسایا... یا شاید براہِ راست اس قتل میں معاون بنا۔

اب میں نور جہاں کو قانون کی گرفت سے بچانے اور سب سے چھپا کے رکھنے کی سرتوڑ کوشش کررہا تھا اور جو میرے اپنے تھے اس جذباتی غلطی یا جرم کو چھپانے کی کوشش میں میرا ساتھ دینے پر مجبور تھے۔ رشتوں کی مجبوریاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ خود میرا یہ تھا کہ میں نے اپنی ہار مان لی تھی۔ جیسے شراب یا ہیروئین کی لت کے سامنے کوئی بے بس ہوجائے اور اتنا ڈھیٹ بھی کہ دوسروں کی کوشش کو بھی ناکام بنادے۔

نور جہاں میری جسمانی کمزوری بن کے مجھ پر حاوی ہوگئی تھی۔ بس حقیقت کو تسلیم کیے بنا چارہ نہ تھا۔ فریال میری جذباتی کمزوری تھی۔ اس سے بھی انکار یا فرار ناممکن تھا مگر یہ بات دوسروں کو میں کیسے سمجھاتا۔ عام آدمی بلکہ ہر معقول شریف اور نارمل آدمی کے لیے جسمانی اور جذباتی ضرورت کے سارے تقاضے ایک ہی عورت پورے کرتی ہے اور اس سے تعلق کو محبت کا نام دیا جاتا ہے۔ اس پر قصے کہانیاں ناول افسانے ڈرامے اور فلمیں سب لکھے جاتے رہے ہیں اور لکھے جاتے رہیں گے۔

فریال اور نور جہاں کے ساتھ میرے تعلق کا روایتی محبت کے انداز میں کوئی احترام نہیں۔ دوسروں کی تو بات ہی کیا راجا جیسا دوست اور رابعہ جیسی کزن کی رائے میرے بارے میں بہت خراب تھی کہ میں نے کردار کی کمزوری کا مظاہرہ کیا اور نور جہاں جیسی بدکردار عورت کے جال میں پھنس کے فریال کو گنوادیا۔ ہیرے کے بدلے کوئلے کا سودا کرلیا۔ یہ دلیل کون قبول کرتا کہ ہیرا ابھی وہی ہے جو کوئلہ۔ جیسے اپنے مرزا غالب نے کہا تھا۔ قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں۔ یہ ایک کیسے ہوسکتے ہیں۔

میں نے بھی اب اپنا یہ فلسفہ پیش کرنا چھوڑ دیا تھا کہ میری محبت فریال ہے اور نور جہاں کی محبت میں ہوں۔ یہ ازلی دائرہ تکون ویسے تو ہر جگہ ہے۔ ہر کہانی میں ہے مگر میری مجبوری کا عذر نا قابلِ قبول تھا کہ میں فریال کو نہیں چھوڑ سکتا اور نور جہاں مجھے نہیں چھوڑ سکتی تو یہ محبت بھی ضرورت کا نظریہ ہے جسے تسلیم کرلینا چاہیے۔

راجا کہتا تھا کہ یہ مرض ہے جس کا علاج حکیم لقمان کے پاس چاہے نہ ہو اس کے پاس ہے۔ مجھے پنج وقتہ حقے کا پانی اور کریلے کا جوس پلا کے اور سر منڈا کے میرے سر پر دس جوتے روز مارے جائیں تو ان شاء اللہ افاقہ ہوگا اور تیسرے دن میں نور جہاں کا نام بھی بھول جاؤں گا اور صرف فریال کے نام کی مالا جپنے لگوں گا۔ عجیب مضحکہ خیز بات یہ تھی کہ پہلے یہی سارے لوگ جو آج کل نور جہاں کے خلاف ایسے متحد اور متفق ہوگئے تھے جیسے بھٹو صاحب کے مقابلے میں پیارے پیارے نو ستارے۔ پہلے یہی فریال کے خلاف تھے۔ جب

اس نے ماڈل بننے اور پھر فلمی افق پر چمکنے کی کوشش میں خواہش میں چوہدری سلطان کے ساتھ باضابطہ منگنی کا اعلان بھی کر دیا تھا۔ خود میری اماں اسے باقاعدہ بے حیا اور فاحشہ کے لقب سے نوازتی تھیں تو وہ خاموشی اختیار کر کے نیم رضامندی کا اظہار کرتے تھے۔ پھر فریال نے کچھ تو اپنی محبت میں استقامت سے اور باقی حویلی میں رہ کے ان کی خدمت سے سب کا دل جیت لیا تھا۔ فی زمانہ ہدفِ ملامت نور جہاں تھی لیکن میں محسوس کرتا تھا کہ فریال نے گھر چھوڑنے میں عجلت کا مظاہرہ کر کے اور پھر بذریعہ سلطان فلمی دنیا میں واپسی کا راستہ چن کے اپنی حمایت کرنے والوں کو سخت مایوس کیا تھا۔ پہنچی وہیں یہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔

اس کا کچھ نہ کچھ فائدہ بالواسطہ طور پر نور جہاں کو بھی ملا تھا۔ مقابل میں فریال کا ہمہ صفت مثالی کردار تھا تو نور جہاں کا وجود محض خرابی ہی خرابی تھی۔ اب میدان خالی ہو گیا تھا تو موازنہ کس سے؟ عرش کی یہ بلندیاں فرش کی پستیوں سے مل گئیں۔ فریال کون سی فرشتہ ثابت ہوئی کہ نور جہاں کو شیطان قرار دے کر مستقبل کا باب بند کر لیا جائے۔ اب فضا کچھ ایسی بن رہی تھی کہ اسے حالات نے خراب کیا تھا تو اسے اچھا بننے کے لیے بھی حالات فراہم ہونے چاہئیں۔

جب میں لوٹ کے اندر گیا تو شہزاد اور نور جہاں سر جوڑے کسی سنجیدہ گفتگو میں مصروف تھے۔ نور جہاں کا پریشان ہونا برحق تھا۔ شہزاد اسے تسلی دے رہا تھا کہ ڈی آئی جی عبداللہ کا دروازے تک آ کے لوٹ جانا کسی شک کا نتیجہ نہیں تھا وہ صرف نواب رفیق کی دوستی میں ادھر آ گیا تھا۔

''میں تمہیں بتا رہی ہوں شہزاد۔ ایسے لوگ کسی کے دوست نہیں ہوتے۔ یہ پولیس والے...''

''سب پر بلا استثنا ایک حکم صادر نہیں کیا جا سکتا۔''

''ہاں... لیکن اس ڈی آئی جی سے نواب صاحب کی دوستی ہی کتنے دن کی ہے۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن۔ آج تم اسے سمجھنے کا دعویٰ کرو۔''

اب میں نے دخل دینا ضروری سمجھا۔ ''آدمی کو سمجھنے کے لیے ساری عمر اس پر ریسرچ کرنا ضروری نہیں ہوتا۔ پہچاننے والے ایک نظر میں پہچان جاتے ہیں۔''

وہ طنز سے مسکرائی۔ ''اور خیر سے آپ خود کو انہی میں شمار کرتے ہیں اور ایک نظر میں انسان کی شناخت کر لیتے ہیں۔ کیا بات ہے اور کیا خوش فہمی ہے اپنے بارے میں۔''

شہزاد نے کہا۔ ''خاتون پر بھوت سوار ہے کہ انہیں یہاں سے چلے جانا چاہیے کیونکہ اس میں میری اور میرے گھر کی فلاح ہے۔''

''یار یہ جن بھوت ایسی ہی خواتین پر کیوں سوار ہوتے ہیں۔'' شہزاد مسکرانے لگا۔ ''بڑے حسن پرست اور عاشق مزاج ہوتے ہیں کہیں اتر بھی جاتے ہیں۔''

''پہلے جونیئر عامل کوشش کرے۔ ورنہ بڑا عامل خود بھوت ہے۔'' میں نے کہا۔

نور جہاں نے اٹھتے ہوئے کہا ''تم سے بات کرنا فضول ہے۔''

میں نے کہا۔ ''تھینک یو خاتون۔ ہم بھی کچھ کام کی بات کرنا چاہتے تھے جو آپ کی موجودگی میں ممکن نہیں تھی۔''

شہزاد نے دروازہ بند ہوتے ہی کہا۔ ''میں نے راجا کو فون پر سب بتا دیا ہے۔''

''وہ اتنی دور سے کیا کر سکتا ہے؟''

''کر تو ہم بھی کچھ نہیں سکتے۔ اب تک ایس پی غفور خان نے چھاپا مار کے رانا صاحب کو برآمد کر لیا ہوگا۔''

میں نے کہا۔ ''یہ خطرہ تو تھا۔ کوئی شک میں مبتلا ہو کے پولیس کو فون کر دے۔ کچھ لوگ ہوتے ہیں شکی مزاج۔''

''لائٹس جلانا ہماری غلطی تھی۔'' میں نے کہا۔

''یہ معاملہ اور الجھ جائے گا۔ شاید ہمارے خلاف بھی جائے گا۔ رانا ہمارے خلاف بیان دے گا بلکہ دے چکا ہوگا اور جتنا سچ ہے اس میں وہ مزید پیچ شامل کرے گا۔''

میں نے کہا۔ ''اسے تو ہم نہیں روک سکتے لیکن اس کے جواب میں ہم کیا کہیں گے۔''

''یہی... کہ وہ بکواس کرتا ہے۔ دشمنی میں اندھا اور پاگل ہو رہا ہے۔ اس کے سوا ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''آخر کس کس کو جھٹلائیں گے ہم۔ اب تو رانا کی بے بی ساحرہ اور بے بے انمول بھی اس کے سچ کا کورس گائیں گی اور مجھے ہی دنیا کی ہر خرابی کا ذمے دار ٹھہرائیں گی۔''

''بولنے والوں کو بولنے دو نواب صاحب۔ ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں۔ عدالتوں کے اندر یا باہر جنگ جھوٹ اور سچ کی نہیں ہوتی۔ ثبوت اور گواہی کی ہوتی ہے اور یہ دونوں چیزیں بنائی بھی جاتی ہیں۔ خریدی بھی جاتی ہیں۔ یہ دولت، طاقت اور ذہانت کا کھیل ہے جسے ہم آج کل انصاف کہتے ہیں۔''

''یہ تو تم نے ٹھیک کہا مگر بہتر ہوتا اگر میں خود رانا کو گرفتار کراتا۔ اس سے مجھے فائدہ ہوتا۔ عبداللہ جان چاہتا ہے کہ یہ جھگڑا ختم کرا دے۔ ہمارے درمیان سیز فائر ہو جائے۔''

''جو ظاہر ہے کہ مستقل نہیں ہو سکتا۔''

''میری یہ بھی خواہش تھی کہ رانا کو اسی تھانے کی حوالات میں دیکھوں جس میں اس نے مجھے دیکھا تھا۔''

شہزاد نے مجھے تسلی دی۔ ''آپ کی ہر خواہش بروقت پوری نہیں ہو سکتی پھر کبھی سہی۔''

''افسوس یہ ہے کہ اتنی محنت کی اور ڈراما فلاپ ہو گیا۔ عبداللہ نے کہا تھا کہ وہ مستعد آدمی ہے غفور خان اور اس لیے ناپسندیدہ بھی ہے۔ کیا مستعد سے اس کی مراد فرض شناس اور ایماندار لی جا سکتی ہے۔ مستعد تو پولیس بہت ہوتی ہے پکڑنے میں لیکن پکڑنے کے بعد جب مک مکا کا مرحلہ آتا ہے تو مستعدی ہوا ہو جاتی ہے۔''

''آپ کا خیال ہے کہ غفور خان بھی رانا کو پکڑنے میں بڑی مستعدی دکھائے گا لیکن پھر مک مکا ہو جائے گا۔''

''ایسا ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے۔ رانا کی قوتِ خرید بہت زیادہ ہے اور ایسے مردِ قلندر اب کہاں ہوتے ہیں۔ خصوصاً پولیس میں۔ نہ بکنے والے۔ نہ جھکنے والے۔ اس لیے کہا جاتا ہے کہ ناقابلِ فروخت کوئی نہیں ہوتا۔ ہر شخص کی قیمت ہے۔ کم... زیادہ... بہت زیادہ۔''

شہزاد نے بڑے دکھ سے کہا۔ ''دنیا کے بازار میں سب بک رہا ہے۔ اصول، ایمان، صبر، اور پیار۔''

''اور غفور خان۔'' میں نے پُرسوز لہجے میں کہا اور اپنی خشک آنکھوں سے آنسو پونچھے۔ ''کہیں ایسا نہ ہو کہ رانا تم کو ہی خرید لے۔ اس سے پہلے ہی مجھے بھاگ جانا چاہیے۔''

''اور مجھے بھی، تمہارے ساتھ۔'' نور جہاں نے سر اندر ڈال کے کہا۔

میں نے خفگی سے کہا۔ ''میں آج تک کسی لڑکی کے ساتھ نہیں بھاگا اور تم؟''

''بھاگی تو میں بھی نہیں۔ جب اسکول میں تھی تو تین ٹانگ والی دوڑ میں بھاگتی تھی ایک لڑکے کے ساتھ۔'' وہ سوچ کے بولی۔

میں نے کہا۔ ''کیا ایسی کوئی صورت نہیں۔ بس ہم کو یہ معلوم ہو جائے کہ برہان الدین مرحوم کے گھر سے رانا برآمد ہوا یا نہیں۔ زندہ یا مردہ۔''

''ادھر تو میرا کوئی جاننے والا بھی نہیں رہتا۔ کیا میں کسی کو تیار کر کے بھیجوں۔'' شہزاد سوچ میں پڑ گیا۔

نور جہاں اندر آ گئی۔ ''یہ کام میں کر سکتی ہوں۔''

میں نے اسے ڈانٹا۔ ''چپ کر کے بیٹھو۔ ہم سیریس ہیں۔''

''میں بھی مذاق نہیں کر رہی۔ ابھی برقع سر پر ڈال کے نکلوں تو کسی بلک میں بھی راؤنڈ لگا کے آدھے گھنٹے میں واپس۔ ہر قسم کا برقع ہے یہاں...''

میں نے اسے گھور کے دیکھا۔ ''صرف راؤنڈ لگانے سے کچھ بھی نہیں مل سکتا۔''

''کوئی بات ہوگی تو باہر آثار ہوں گے۔ لوگ کھڑے ہوں گے اور کچھ نہ سہی پولیس تو ضرور ہوگی۔ مجھے کون روکے گا۔ سامنے سے پیدل گزر کے بھی جا سکتی ہوں۔ دوبارہ بھی گزر دوں تو کون پہچانے گا تم ادھر بیٹھو گھر میں۔'' وہ بڑے جوش سے بولی۔

میں نے کہا۔ ''ایسا ہو سکتا ہے لیکن بہت بڑا رسک ہے تمہارے لیے فرض کرو۔''

''کیوں فرض کروں میں بلاوجہ۔ کہو تو کہیں سے تمہیں فون کر کے بتا دوں کہ کچھ نہ ہو تو تم بھی آ جاؤ۔''

میں نے کہا۔ ''نہیں نور جہاں.. میرا دل نہیں مانتا۔ یہ تمہارا کام نہیں۔ میں راجا سے کہتا ہوں۔''

''اُفوہ... راجا اتنی دور سے پھر آئے گا۔ تم بھروسا رکھو مجھ پر۔ دیکھو نا خطرہ ہوتا کسی قسم کا تو میں جاتی؟ میں تو ایک پرسنٹ چانس نہیں لے سکتی۔''

شہزاد نے کہا۔ ''اگر غفور خان کو کسی نے کل رات فون کیا تھا تو کیا وہ ابھی تک ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھا ہوگا؟ چلو رات کو نہ سہی صبح تو اس نے ایکشن لیا ہوگا۔ دوپہر ہو رہی ہے اب تو۔''

میں نے کہا۔ ''یار تمہارا کوئی لنک نہیں اس شہر میں؟''

''لنک تو ہیں لیکن میں آپ کی وجہ سے محتاط رہنا چاہتا ہوں۔ ڈی آئی جی آپ کو یہاں دیکھ گیا ہے۔ اب یہاں سے میں رانا کے بارے میں انکوائری کروں تو ایسا نہ ہو کہ لنک مل جائے۔ آپ کا مجھ سے میرا اپنے کسی مخبر سے اور مخبر کا پھر آپ کے کارنامے سے...''

''اچھا میں راجا سے کہتا ہوں۔ بس تم نور جہاں کو مت جانے دو۔ وہ بیٹھے آرام سے گھر میں۔ وہ کوئی ایڈونچر نہ کرے۔''

شہزاد نے اندر جانے کے دو منٹ بعد مجھے مطلع کیا کہ وہ تو گئی... میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ گو اس کی شناخت کا قطعی کوئی امکان نظر نہ آتا تھا لیکن قسمت مخالف ہو تو وہ بھی ہو جاتا ہے جس کا دور دور تک امکان دکھائی نہیں دیتا۔

اگلا ایک گھنٹا میں نے اس بے چین و بے قرار شوہر کی طرح اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے گزارا جو پہلی بار ابا بننے کے چکر میں کسی میٹرنٹی ہوم کے لیبر روم کے باہر کھڑا ہو مگر کھڑا نہ رہ سکتا ہو... میں سخت متفکر اور پریشان تھا کہ یہ میں نے کیا

کیا۔نور جہاں کوخطرے میں ڈال دیا۔ جیسے مذکورہ شوہر ہوتا ہے کہ یہ میں نے بیوی کے ساتھ کیا کیا۔ پریشانی پلس پشیمانی' سسپنس پلس بے بسی۔

ایسے میں راجا کا فون آیا اور اس نے چھوٹتے ہی کہا۔ ''نور جہاں کہاں ہے؟''

ایسے اچانک کیے جانے والے سوال پر میرا بوکھلانا لازمی تھا۔''کیوں...کیا ہوا؟''

''وہ بتا دے کہاں۔'' راجا مزید خفا ہوا۔

میں نے پریشانی سے کہا۔''وہ...دراصل میں نے اور شہزاد نے تو بہت روکا تھا مگر وہ برقع اوڑھ کے نکل گئی... برہان کے گھر کی صورت حال معلوم کرنے۔''

''یار میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم دونوں ایسی بے وقوفی کر سکتے ہو۔ تمہارا کیا خیال ہے برقعے میں ہو تو نور جہاں آزاد ہے کہیں بھی جائے کچھ بھی کرے۔''

میں نے کہا۔''بکواس کیے جا رہا ہے اپنی۔ بتاتا کیوں نہیں کہ کیا ہوا ہے؟''

''وہ بولا۔''وہی جو تمہارا خیال تھا نہیں ہوگا۔ یار کیا یہ کام اس کے کرنے کا تھا؟ چہرہ چھپانے سے وہ اتنی عقلمند بھی ہوگئی کہ جاسوسی کا بیڑا اٹھالیا۔ آخر ہے تو ناقص العقل۔''

میں نے چلاّ کے کہا۔''الو کے پٹھے۔ آخر کیا بے وقوفی کی اس نے۔''

''وہ کھڑی ہوگئی گھر کے سامنے۔ وہاں پولیس تھی اندر باہر۔ کسی سے آواز بنا کے پوچھنے لگی کہ بیٹا کیا ہوگیا یہاں۔ اس کو شاید شک ہوا کہ آواز سے بڑھیا لگتی ہے۔ ہاتھ پیر کسی لڑکی کے ہیں۔ اس نے پوچھا کہ تم کون ہو، اس نے کہا کہ میں یہیں رہتی ہوں۔ اس نے پوچھا کہ یہاں کہاں۔ کون سا گھر ہے۔ بس گھبرا گئی۔ ایک انسپکٹر آگیا۔ اس نے سختی سے کہا کہ سچ بتاؤ۔ تمہارا کیا تعلق ہے اس گھر سے۔ وہ تاڑ لیتے ہیں کہ دال میں کالا ہے۔ اسے روک لیا ہے تفتیش کے لیے۔ لیڈی پولیس کو طلب کیا ہے۔''

''یہ سب تجھے کیسے معلوم ہوا؟'' صدمے سے میرا برا حال ہوگیا۔

''یار میں موجود ہوں یہاں۔ جب مجھے پتا چلا تھا میں اسی وقت روانہ ہوگیا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ صبح صبح ڈی آئی جی عبداللہ جان کا تیرے پاس آنا بے سبب نہیں ہوسکتا۔ یہ کوئی عام اغوا کا کیس نہیں ہے۔ آج کے ہر اخبار میں رانا رجب علی کے اغوا کی خبر ہے۔ آخر وہ ایم پی اے ہے۔ ایس پی فرخ خان اس وقت برہان الدین کے گھر کا محاصرہ کر چکا تھا جب عبداللہ تیرے پاس گیا۔''

''اور رانا...''

''رانا نکل گیا۔ اس نے فرخ خان سے سازباز کرلی۔ ساری محنت اکارت گئی۔ کھایا پیا کچھ نہیں گلاس توڑا بارہ آنے۔''

''اب نور جہاں کا کیا ہوگا پتر؟''

''جی چاہتا ہے مار مار کے تم دونوں کا سر گنجا کردوں۔ اب مجھ سے پوچھ رہا ہے کہ نور جہاں کا کیا ہوگا؟ مجھے فکر ہے تیری...نور جہاں کے ساتھ ہی پھانسی چڑھنے کا خیال ہے تو جا تو بھی گرفتاری دے دے ورنہ ابھی اسی وقت نکل اور یہ اچھی طرح سمجھ لے کہ نور جہاں سے تفتیش ہوگی تو وہ سب اگل دے گی۔''

''یار...کسی طرح اسے نکال۔''

''میں پوری کوشش کر رہا ہوں لیکن تو واپس جا بھی۔'' راجا نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میرا دل سخت دکھی تھا اور نور جہاں کے خیال سے مجھے اپنی عقل پر اتنی ندامت تھی کہ شہزاد کے ہمدردی اور تسلی کے الفاظ بھی لاحاصل تھے۔ مجھ سے بہت بڑی حماقت سرزد ہوئی تھی۔ نور جہاں کو سختی سے بھی روکا جا سکتا تھا۔''نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے۔ رانا کو گرفتار کرانے کی ساری جدوجہد الگ رائگاں گئی اور نور جہاں کو بچانے کی ساری تگ و دو خاک میں مل گئی۔

میں بڑی عجلت میں باہر نکلا۔ ایک خیال یہ کہتا تھا کہ مجھے نور جہاں کو یوں چھوڑ کر فرار نہیں ہونا چاہیے تو دوسرا خیال بے بس کر دیتا تھا کہ یہاں رہ کے بھی میں اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ اگر کرنا ہی ہوگا تو راجا ہے اور شہزاد ہے۔ شہزاد الگ سوگوار اور پشیمان تھا۔ وہ میرے ساتھ باہر تک آیا۔

گیٹ کھولتے ہی میرے دماغ کو شدید جھٹکا لگا۔ بالکل دروازے کے سامنے گاڑی میں راجا اور نور جہاں ہمارے استقبال کے لیے دم سادھے بیٹھے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی انہوں نے بے اختیار ہنسنا شروع کیا اور باہر نکل آئے۔ غصے اور خفت سے میرا اور شہزاد کا حال خراب تھا لیکن ان کے ساتھ ہم بھی صرف ہنس سکتے تھے۔ اپنی عقل پر رو نہیں سکتے تھے۔

میں نے راجا کو گالیاں دیں۔''میری جان نکال لی تو نے سور کے بچے اور تم بھی اس کے ساتھ مل گئیں۔''

نور جہاں کی آنکھوں میں ہنس ہنس کے آنسو آگئے تھے۔''میں کیا کرتی۔ راجا نے کہا کہ ذرا تماشا دیکھو۔''

''تماشا نہیں صورت دیکھو نواب صاحب کی'

شہزاد نے کہا۔''یہیں بیٹھے فون پر بکواس کر رہے تھے آپ۔''

''نہیں۔ یہاں پہنچ کے ہم نے فون بند کیا تھا۔ ابھی پانچ منٹ پہلے۔ باقی ڈائیلاگ راستے میں بولتے رہے۔''

میرے دل پر دکھ اور پریشانی کا ایک کوہ گراں تھا جو ہٹ گیا تو مجھے بڑا سکون ملا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ایک آفت تھی جسے خدا نے ٹال دیا ورنہ میرے اختیار میں نہ تھا کہ میں اس کا تدارک کر سکتا۔ میری یہ حالت دیکھ کے نور جہاں کو شاید بڑا سکون اور اطمینان ملا ہوگا۔ اس اعتماد کی خوشی سی ہوگی کہ وقت کے ساتھ اس سے میرا جذباتی تعلق بھی کتنا مضبوط ہوگیا ہے۔ یہ اب صرف جسمانی تعلق کی بات نہیں رہی۔ اس نے میرے دل میں اپنایت کی چنگاری روشن کرنے کے لیے جو ریاضت کوشش اور قربانی کی تھی اس کا اثر آج محبت کا بھڑکتا شعلہ بن کے میرے احساس کو روشن کر چکا ہے۔ اس کا عکس میرے چہرے پر عیاں پریشانی کے آثار اور میری جذباتی کیفیت میں صاف نظر آ رہا ہے۔

میں بھی انکار نہیں کر سکتا تھا کہ نور جہاں کے گرفتار ہونے کی خبر نے میرے ہوش و حواس مختل نہیں کیے تھے۔ حقیقت یہی تھی کہ میرا ذہن مفلوج ہوگیا تھا اور مجھے اپنے چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا محسوس ہوتا تھا جس میں صرف ایک فریاد کناں صورت تھی۔ رحم طلب اور اشک نشاں آنکھوں سے اپنی بے بسی اور مظلومیت کا واسطہ دیتی نور جہاں کی اور ایک ہی آواز تھی۔ مدد کے لیے پکارتی۔ کسی جیل کی کال کوٹھری سے صدا دیتی نور جہاں کی آواز۔ رفیق مجھے بچالو۔ دیکھو یہ لوگ مجھے پھانسی دینا چاہتے ہیں۔

جب شہزاد نے کہا۔'' آخر یہاں کب تک کھڑے رہیں گے ہم سب۔ آئیں...اندر چلیں۔''

راجا نے کہا۔''نہیں...بیٹھنے کے لیے وقت نہیں ہے۔ یہ تو مجھے نور جہاں کو پہنچانے کے لیے آنا پڑا ورنہ میں رفیق کو بلالیتا۔''

''ابھی جلدی کیا ہے۔ ایک چائے کا کپ تو پی سکتے ہو۔''

''وکیل صاحب۔ مجھے جیسے ہی پتا چلا میں گاڑی لے کر بھاگا۔ دیر کی تو بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔''

''کچھ مجھے بھی تو بتاؤ۔''

راجا نے اس کی بات کاٹ دی۔''تمہیں نور جہاں بتادے گی۔ چل آجا نیکے پتر۔ ٹائم نہیں ہے بالکل بھی۔'' راجا نے گاڑی اسٹارٹ کی۔

نور جہاں گیٹ سے اندر چلی گئی تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا۔''تم واپس تو آؤ گے نا؟''

میں نے کہا۔''ابھی میں کیا کہوں۔ حالات پر سب منحصر ہے۔''

راجا نے گاڑی کو ریورس کیا اور ہاتھ ہلا دیا۔ میں نے کہا۔''اب تو بتا دے۔ نور جہاں تجھے کہاں مل گئی؟''

''پہلے مجھے پوچھنا چاہیے تھا کہ رانا کہاں ہے۔ خیر... ابھی تیرے جذبات پر عقل غالب نہیں آئی۔ یار کیا تجھے واقعی

نور جہاں سے عشق ہوگیا ہے؟''

میں نے اس کی گدّی پر ہاتھ مارا۔ ''فضول بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔''

وہ گدّی سہلانے لگا۔ ''اس غصے کا مطلب ہے کہ تو نے اقرار کرلیا اور اقرار نہ کرنے سے کیا ہوتا ہے فیکے پتر۔ سورج کدھر غروب ہوا تھا اور چاند کدھرے سے نکلا۔ سب دیکھ سکتے ہیں۔ تیری وہ صورت بھی دیکھی تھی میں نے جو گیٹ کھلتے ہی نظر آئی تھی اور وہ بھی جو نور جہاں کو میرے ساتھ دیکھ کر ہوگئی تھی۔ خیر... میں اب آتا ہوں دوسرے موضوع پر جو میرے لیے زیادہ اہم ہے۔ رانا خیر و عافیت کے ساتھ برہان الدین کے گھر میں ہے۔ آج ہم اسے پولیس کی تحویل میں دے سکتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''وہ جو ڈی آئی جی صاحب نے فرمایا تھا۔''

راجا بولا۔ ''یا تو وہ بلف کر رہا تھا۔ کسی نے بھی ایس پی فرخ م خان کو فون نہیں کیا۔''

''اس نام کا کوئی ایس پی ہے۔''

''بالکل ہے... لیکن اس کے آفس میں میرے ایک اندر کے آدمی نے کہا ہے کہ وہاں سے کسی کو کہیں چھاپا مارنے نہیں بھیجا گیا۔ اب یہ ممکن ہے کہ جس نے ایس پی کو فون کیا تھا اس نے کوئی فضول سی بات کی ہو۔ جس پر کوئی ایکشن لینے کا امکان نہیں تھا۔ مثلاً کوئی کہے کہ جب سے برہان الدین صاحب کا مرڈر ہوا ہے رات کو اندر سے ایک سر کٹا برآمد ہوتا ہے۔ اپنا سر ہاتھ میں اٹھائے پھرتا ہے اور لوگوں سے پوچھتا ہے کہ کیا یہ میرے قاتل کا سر ہے!''

میں ہنس پڑا۔ ''ایسی دیوانگی کی بات کوئی ایس پی سے کیوں کرے گا راجا؟''

''ہوتے ہیں خبطی۔ میں نے صرف مثل دی ہے۔ کوئی احمقانہ یا غیر اہم بات ہوگی جس کو ایس پی نے اہمیت نہیں دی۔ یا اس نے کسی انسپکٹر سے کہا کہ جاؤ اس بندے سے مل کے دیکھو معاملہ کیا ہے۔ کوئی ایسی بات ہوتی جیسی تو نے فرض کرلی ہے ڈی آئی جی کے حکم پر تو ایس پی رات کو بیوی کے پہلو سے اٹھ کے دوڑتا۔ ابھی تک کچھ نہیں ہوا تو کچھ ہوگا ہی نہیں۔''

''تو نے دیکھا جا کے؟''

''فیکے پتر... تیری نور چشم نور مجسم نور جہاں کو کہاں سے پکڑ کے لایا ہوں میں، یہ وہیں پھر رہی تھی۔ گوانچی گاں کی طرح۔''

''تو نے کیسے تاڑ لیا ایک پردہ نشیں کو برقعے میں۔''

''افسوس نواب صاحب۔ مجھے تو شرم آتی ہے بتاتے ہوئے کہ آپ کی یہ عفت مآب حسینہ سخت نظر باز ہے۔ اس نے تاڑا مجھے برقعے کے اندر سے۔ ورنہ میں تو ایسا شرم و حیا کا پتلا ہوں کہ اپنی گھر والی کو نہیں دیکھتا بری نظر سے۔ زمین میں گڑ جاتا ہوں اگر کوئی مجھ پر بری نظر ڈالے تو۔''

''دریں چہ شک۔ ایسی شرم تیرے باپ میں بھی ہوتی تو آج تو مست سانڈ کی طرح اِدھر اُدھر نہ دوڑ رہا ہوتا۔ کبھی ایک کے پیچھے تو کبھی دوسری کے۔ بات کرتا ہے گھر والی کی۔ وہ ہے کہاں سالے۔ اور گھر والی کو آدمی بری نظر سے نہیں اچھی نظر سے دیکھتا ہے۔''

''جیسے آپ ہر گھر والی کو دیکھتے ہیں۔ کسی کی بھی ہو۔''

جب اس نے گاڑی روکی تو میں نے کہا۔ ''راجا فرض کرا ب وہاں کوئی ایکٹوٹی ہوئی۔''

''میرا ایک شاگرد وہاں امریکی جاسوسی طیارے اور سیارے کی طرح پھر رہا ہے۔ میں نے اسے صحافت سکھائی تھی۔ وہ بن گیا ایجنٹ زیرو زیرو سیون۔ اکثر پِٹتا ہے پنگے بازی پر باز نہیں آتا۔'' اس نے نمبر ملا کے فون پر کسی سے گفتگو شروع کی۔ ''ہاں گورنر... میں پریذیڈنٹ بول رہا ہوں۔ ابھی تک کچھ نہیں ہوا؟ یار بڑے افسوس کی بات ہے۔ خیر اب تمہاری چھٹی۔ بس ذرا آنکھیں کھلی رکھنا ایسا نہ ہو دشمن تمہارے پیچھے لگ جائیں۔ ایٹم بم مار دیں اور تمہیں پتا ہی نہ چلے۔''

میں نے کہا۔ ''کیا واقعی یہ ایسا چلتا پھرتا پاگل خانہ ہے۔''

راجا ہنسنے لگا۔ ''مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ سرکس میں زیادہ فائدہ ہے۔ پولٹری فارم بناؤں یا ڈیری فارم۔ میں نے کہا کہ ایک کافی ہے۔ مرغیاں اور بھینسیں پیار محبت سے رہ سکتی ہیں۔ کوئی ساس بہو تو نہیں کہ بکنگھم پیلس میں بھی لڑیں۔''

میں نے کہا۔ ''وہ مان گیا۔''

''ہاں فیکے پتر۔ پھر میں نے اسے سمجھایا کہ ایک نظری بات، صحبت کا اثر ہوتا ہے۔ یہ نہ ہو کہ مرغیاں دودھ دینے لگیں اور بھینسیں انڈے۔ بھینس کا انڈا فرائی کرنا اور مرغی کا دودھ دوہنا ایک جیسے مشکل کام ہیں۔'' تب وہ سمجھا کہ میں مذاق کر رہا ہوں۔

ہم برہان الدین کے گھر میں پھر پیچھے گندی گلی کی طرف سے دیوار پھاند کے داخل ہوئے۔ بہت دور سے ایک خاتون نے یہ دیکھا مگر انہیں پڑوسن کے دروازے پر کوڑا پھینک کے غائب ہونے کی اتنی جلدی تھی کہ انہوں نے اس پُراسرار کارروائی کو اہمیت نہیں دی۔

رانا کی جسمانی حالت بہت تسلی بخش تھی۔ غنی نے رانا صاحب کی خدمت اور حفاظت کے لیے وہاں کسی کو مامور کر دیا تھا جو ان کو کھانا پانی اور چائے وغیرہ دیتا رہا اور ان کو باتھ روم لاتا لے جاتا رہا۔ لیکن مکمل طور پر وہ گونگا بہرا بن گیا تھا۔ رانا اس سے بہت کچھ پوچھتا رہا کہ یہ کیا جگہ ہے۔ مجھے کیوں رکھا ہے یہاں۔ اسے مالا مال کرنے کی پیشکش بھی کی تھی اگر وہ رانا کو موبائل فون لا دے۔

رانا بیڈ پر لیٹا چھت کو گھور رہا تھا۔ ''آخر کیا کرنا چاہتے ہو تم۔ کب تک رکھو گے مجھے یہاں؟'' وہ ایک دم بپھر گیا۔

راجا میرے ساتھ صوفے پر بیٹھ گیا۔ ''انجوائے کرو رانا صاحب۔ فرصت ہی فرصت ہے۔ ورنہ دنیا کے جھمیلے بہت ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''اب جانا کہاں ہے۔ زندگی کے جو دن رہ گئے ہیں۔ انہی کو شمار کرو۔ وقت گزاری کے لیے یاد کرو گزرے ہوئے وقت کو۔ دنیا میں رہ کے کیا کرتے رہے۔ وہ اچھا تھا برا... نا سوچو کہ اس کے بدلے تمہارے ساتھ مرنے کے بعد کیا ہوگا۔''

رانا خوفزدہ نظر آنے لگا۔ ''کیا تم مجھے اسی جگہ قید میں رکھو گے۔ اسی حالت میں؟''

''یہ ہماری رحم دلی ہے۔ تم بیڈ پر لیٹے ہو۔ کھانے کو اچھا مل رہا ہے۔ دوا بھی مل جاتی ہے۔''

اس کا رنگ اڑ گیا۔ ''کیا... تم نے فیصلہ کرلیا ہے...؟''

''ہاں... اس گھر کو ہم نے تمہاری ''سب جیل'' قرار دے دیا ہے۔ اسمبلی کے رکن ہو اس لیے اے کلاس کی سہولت حاصل ہے۔ زندگی کا کچھ پتا نہیں کتنے دن باقی ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن جتنے بھی ہیں۔ آرام سے گزارو۔ لوگ آخری عمر کے ایام اللہ اللہ کر کے گزارتے ہیں۔ لوٹا، جانماز اور تسبیح سب یہاں میسر ہیں۔''

''تم ایسا نہیں کر سکتے۔'' وہ دہشت زدہ ہوگیا۔

''رانا! اب تک تمہیں سمجھ لینا چاہیے تھا کہ ہم جو کہتے ہیں کرتے ہیں۔ ایسا کوئی دعویٰ کرتے ہی نہیں جو پورا کرنا ہمارے اختیار میں نہ ہو۔ مثلاً اپنی موجودہ حالت پر غور کرو۔ کیا تم سوچ بھی سکتے تھے کہ ایسا ہو سکتا ہے کہ ہم تمہارے تمام حفاظتی انتظامات کے باوجود تمہیں رقص و سرود کی بھری محفل سے اٹھا لائیں اور سب دیکھتے رہ جائیں۔ کوئی کچھ بھی نہ کر سکے۔ نہ تمہارے جانثار نہ وفادار، نہ نمک خوار۔'' راجا نے کہا۔

میں نے اس کی بات کو آگے بڑھایا۔ ''اب یہ سمجھو کہ جہاں تم ہو یہاں کسی کے خیال کا بھی گزر ممکن نہیں۔ ایک امید ضرور ہوگی تمہیں کہ کبھی نہ کبھی کوئی تمہارا سراغ لگا لے گا لیکن بالآخر تمہیں یقین نہ آئے گا کہ ایسا ممکن نہیں اور اس کی وجہ؟''

راجا نے کہا۔ ''وری سمپل۔ یہ ایک ایسا گھر ہے جس کا اب تک کوئی والی وارث بھی نہیں تھا۔ جب لوگ ہمیں آتا جاتا دیکھیں گے تو فرض کرلیں گے کہ اب ہم یہاں رہتے ہیں۔''

''فرض کیا کرنا۔ ہم خود بتا دیں گے لوگوں کو۔ میں چوہدری چراغ دین۔ یہ میرا بھائی چوہدری بلب دین۔ ہم نے یہ گھر خرید لیا ہے۔ لوگ اسے سچ مان لیں گے۔ کسی وقت تمہاری طرف سے کوئی خطرہ محسوس ہو تو تمہیں مار کے گاڑ دیں گے۔ یہاں یا کہیں اور۔''

''یہ کام تو ہم پہلے بھی کر سکتے تھے۔ بس سوچا کہ تم ویسے ہی مرنے والے ہو۔ ایسے روگ لگے ہوئے ہیں اور عمر بھی بہت ہوگئی ہو۔ پھر تمہارے قتل کا الزام اپنے سر کیوں لیں۔''

وہ چلاّنے لگا۔ ''یہ بکواس بند کرو۔ میرے سامنے میراثیوں کی طرح جگت بازی کر کے تم مجھے ڈرا نہیں سکتے۔''

''تمہارا چلاّنا ظاہر کرتا ہے کہ تم ڈرے ہوئے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''دوسروں کی موت کا تماشا بہت دیکھا ہے تم نے۔ نت نئے عذاب دے کے لوگوں کو مارتے رہے ہو۔ جو تمہارے مقابلے میں کمزور تھے۔ آج خود پکڑے گئے ہو اور زیادہ طاقتور سامنے ہیں جو تم کو واقعی عذاب دے کر ہلاک کر سکتے ہیں تو پیشاب خطا ہو رہا ہے۔''

وہ گالیاں بکنے لگا۔ تمہاری یہ اور تمہاری وہ۔ ''مارنا ہے تو مار دو میں تم سے زندگی کی بھیک تو نہیں مانگ رہا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''اچھا ہم مشورہ کرلیں۔ پھر بتاتے ہیں۔''

کمرے کا دروازہ بند کر کے ہم کچن میں آگئے جہاں ہم نے اپنے لیے چائے بنائی اور یہ طے کیا کہ رانا کو گرفتاری کے لیے کہاں اور کیسے پیش کیا جائے۔ اس کھیل کو مزید طول دینا خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ ایک ایم پی اے کی پُراسرار گمشدگی کی خبروں سے حکومت غافل نہیں رہ سکتی تھی۔ ابھی تک اس معاملے کی سنگینی کو بیان بازی سے بڑھایا نہیں گیا تھا اور گمشدگی کو بھی پُراسرار بتایا گیا تھا۔ اس کو اغوا برائے تاوان یا کسی دشمن کی انتقامی کارروائی سے منسوب نہیں کیا گیا تھا۔

اگلے چوبیس گھنٹوں میں حالات خراب ہو سکتے تھے۔ یہ کہا جا سکتا تھا کہ رانا صاحب لاہور سے اسلام آباد کے راستے میں کہیں غائب ہوگئے اور اس میں ان کے کسی دشمن کا ہاتھ ہے۔ سیاست میں رانا جیسے لوگ دشمنی پالتے ہیں۔ رانا

کے بارے میں ایسا بچ تو لکھا ہی نہیں جا سکتا تھا کہ وہ مجرا دیکھ رہے تھے کہ انہیں نواب رفیق اٹھا کے لے گیا۔ لیکن میرا نام دشمنوں کی فہرست میں سب سے اوپر آ گیا تھا۔ رانا بازیاب نہ ہوتا تو میں اپنی ساری چالاکی، جھوٹے گواہوں کے بیانات اور اپنے وکیلوں کی قانونی موشگافی کے باوجود گرفتاری اور تفتیش سے بچ نہیں سکتا تھا۔

واپس کمرے میں جاکے میں نے رانا سے کہا۔ ''رانا صاحب! ہم نے فیصلہ کرلیا ہے۔''

وہ پُرامید ہوگیا۔ ''کیسا فیصلہ؟''

''یہی کہ آپ کو مزید قید میں نہ رکھا جائے۔'' راجا نے کہا۔

اس کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ ''مجھے پتا تھا۔ تم کمینے ضرور ہو۔ بے وقوف نہیں ہو۔ میں اپنی طرف سے تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ جو بھی تم نے کیا۔ اس کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔''

میں نے راجا کی طرف دیکھا۔ ''آپ کچھ بتائیں گے بھی کیسے۔''

''ہاں۔ کچھ معاملہ میری عزت کا بھی ہے۔'' رانا نے کہا۔

راجا بولا۔ ''بالکل ٹھیک۔ ساحرہ اور اس کی ماں انمول۔ دونوں بدنام طوائفیں ہیں۔ ان سے آپ کا تعلق ثابت نہیں ہونا چاہیے بعد میں بھی۔''

رانا نے نفی میں سر ہلایا۔ ''او نہیں یار۔ ایسے شوق ہم جیسے رئیسوں کی بے عزتی کا سبب نہیں ہوتے۔ وہ دراصل جیسے تم نے بدمعاشی دکھائی اور میرے بندے کچھ نہیں کر سکے۔ یہ ذرا بے عزتی کی بات ہے۔ ان سب سے تو میں بعد میں نمٹ لوں گا۔''

''بعد میں کب؟'' میں نے سادگی سے پوچھا۔

''یہاں سے جانے کے بعد۔'' رانا نے کہا۔

''کہاں جانے کے بعد؟'' راجا نے کہا۔

''او یار۔ واپس جانے کے بعد۔'' رانا کچھ جھنجلا کے بولا۔

راجا نے میری طرف دیکھ کے سر ہلایا۔ ''رانا صاحب غالباً میدانِ حشر میں نمٹنے کی بات کررہے ہیں۔ ہم سمجھے نہیں۔ بے وقوف ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''نہیں راجا۔ بے وقوف رانا ہے۔ یہ سمجھ رہا ہے کہ ہم نے اسے آزاد کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ واپس جانے سے ہماری مراد کچھ اور تھی۔''

راجا بولا۔ ''ہاں۔ ہم وہ بات کررہے تھے کہ بے شک ہم سب اللہ کے بندے ہیں اور اسی کی طرف واپس جانا ہے۔''

رانا کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ ''کیا مطلب؟''

میں نے کہا۔ ''ہم نے فیصلہ یہ کیا ہے کہ آپ کو مرجانا چاہیے۔ مزید زندہ رہنے کی ضرورت نہیں۔''

''بس ایک چوائس دے رہے ہیں۔ یہ کام آپ خود کریں گے یا ہم کریں۔''

میں نے کہا۔ ''ایک طریقہ تو یہ ہے کہ آپ خواب آور گولیاں کھائیں اور کلمہ پڑھ کے سو جائیں۔ پھر آنکھ کھلے گی صوراسرافیل سے اور دوسرا طریقہ یہ کہ ہم آپ کا گلا گھونٹ دیں۔''

راجا بولا ''رانا سیانا ہے۔ حرام موت کا انتخاب کیسے کرسکتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''یہ تو ہے۔ تو رانا اس میں بھی تمہیں چوائس دی جاسکتی ہے کہ ہم تمہیں کیسے ماریں۔''

''اور مارنے کے بعد کیا کریں۔ یہاں گاڑیں یا تمہاری لاش رانا نگر کے علاقے میں پھینک دیں۔''

اچانک رانا کا ہاتھ اپنے دل پر گیا اور وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ اچانک مجھے اس کھیل کے خطرناک ہونے کا اندازہ ہوا جو ہم محض لطف لینے کے لیے کھیل رہے تھے۔ رانا نے قریب رکھی ہوئی میز پر سے ایک گولی اٹھائی اور پانی کے گلاس سے نگل کے سیدھا لیٹ گیا۔

میں نے راجا کو اشارے سے باہر بلایا۔ ''راجا کہیں یہ سچ مچ مرگیا تو مصیبت ہوجائے گی۔ ختم کر یہ کھیل۔''

''ٹھیک ہے۔ میں اس کے ولی عہد سے بات کرتا ہوں۔ اس کے بعد تو اپنے عبداللہ جان کو بتادینا۔'' راجا نے کہا اور اپنے موبائل فون میں ایک نئی سم فٹ کرنے لگا۔

میں نے اندر جاکے کہا۔ ''رانا۔ مذاق ختم اب جو میں کہہ رہا ہوں دھیان سے سنو اور سمجھو۔ کچھ دیر بعد ہم تمہیں چھوڑ دیں گے۔ تمہارا بیٹا زوہیب تمہیں لے جائے گا۔''

''میں کیسے مان لوں کہ یہ بھی مذاق نہیں ہے۔''

''معلوم ہوجائے گا۔ اب یہ چند گھنٹوں کی بات ہے۔ مجھے یہ بتاؤ کہ اس تجربے سے تم نے کیا سبق حاصل کیا؟''

''تم کس تجربے کی بات کررہے ہو؟''

''تمہارے دماغ کا خناس دور ہوا یا نہیں۔ یہ سمجھ میں آیا کہ نعوذ باللہ اپنی طاقت میں تم خدا نہیں تھے۔ وہ جسے تم بڑی حقارت سے نواب کا نطفہ کہتے رہے۔ نو دولتیاں سمجھتے رہے۔ جو ایک معمولی استاد کا بیٹا تھا۔ حسب نسب میں تم سے بہت کمتر تھا۔ اس نے کیسے تمہارے غرور کو شکست دی۔ کیسے تم جیسے خاندانی جاگیردار۔ جدی پشتی رئیس۔ اسمبلی کے رکن اور اس علاقے کے بے تاج بادشاہ سمجھے جانے والے شخص کو یہاں

لا کے ڈال دیا۔ تمہارے محافظ اور جانثار۔ دوست اور وارث۔ کچھ نہ کرسکے۔ ابھی تک بے بسی سے چپ بیٹھے ہیں۔''

رانا نے کہا۔ ''آخر تم کیا چاہتے ہو؟''

''تم سے میں کچھ نہیں مانگ سکتا۔ نہ کوئی عہد نہ ضمانت۔ میری حفاظت کرنے والا کوئی اور ہے جو ہر وقت ہر جگہ میرے ساتھ ہے۔ اسی کی دی ہوئی سانسوں پر تم زندہ ہو۔ ورنہ کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ پہلی رات ہی میرے، ہم پر میرے ساتھی تم کو مار کے کہیں گاڑ دیتے۔ میں نے نہیں خدا نے تمہیں ایک موقع دیا ہے۔ کسی کو کمتر نہ سمجھو۔ ایک چیونٹی بھی ہاتھی کی موت کا سبب بن سکتی ہے۔ دوستی تم کیا کرو گے۔ دشمنی کرنا تو ذرا سوچ سمجھ کے، کہ نواب رفیق احمد شیرازی ہے تمہارے مقابل۔ تم سیر ہو تو وہ سوا سیر۔ اور تم شیر ہو تو وہ شیر ببر۔ اس میں اب شک کی بات ہی نہیں ہونی چاہیے تمہارے لیے۔ سمجھو تو تمہارا اور تمہارے وارثوں کا بھلا۔ ورنہ میں ڈرنے والا نہیں۔''

مجھے یقین تھا کہ میری اتنی لمبی تقریر کا رانا پر ضرور اثر ہوگا کیونکہ وہ چپ چاپ دیکھتا رہا تھا۔ میں نے کسی ردِعمل کا اظہار کرنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ اتنی دیر میں راجا نے اس گھر سے اپنی موجودگی کے تمام آثار اور شواہد مٹا دیے تھے۔ جب ہم ست بدھائی کے لیے روانہ ہوئے تو دوپہر کا سورج ڈھل رہا تھا۔ ہم آدھے راستے میں تھے جب غنی سامنے سے نمودار ہوا۔ اس نے گاڑی روکی اور ہم نے چند منٹ میں اسے پورا پلان سمجھا دیا۔

غنی کے مخالف سمت میں روانہ ہونے کے بعد میں نے راجا سے پوچھا۔ ''تو نے وارثوں کو الرٹ کردیا؟''

''ہاں۔ میری زوہیب سے بات ہوگئی۔'' اس نے اپنا موبائل فون میری طرف بڑھا دیا جس میں ابھی ایک نئی سم لگی ہوئی تھی۔

''اس نے پوچھا نہیں کہ تم کون ہو؟''

''یہ پوچھے بغیر وہ کیسے رہ سکتا تھا۔ میں نے کہا کہ تمہارا اصل باپ بول رہا ہوں۔ مگر بات اس نے سمجھ لی۔''

میں نے پھر رانا کے بیٹے زوہیب کا نمبر ملایا۔ مجھے یقین تھا کہ اب تک اس نے پولیس کو راجا کی فون کال کے بارے میں بتا دیا ہوگا اور شاید پولیس نے اس نمبر کو آبزرویشن پر رکھ لیا ہو۔ عام حالات میں پولیس اتنی مستعدی کا مظاہرہ نہیں کرتی لیکن ایک ایم پی اے کے معاملے میں وہ ذرا بھی سستاہی برتنے کی غلطی نہیں کرسکتے تھے۔ میں نے نمبر ملایا تو زوہیب نے بڑی بے تابی سے کہا۔ ''ہیلو۔''

سائنسی حقیقت یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی آواز نہیں بنا سکتا اور کسی کی آواز کا گراف بنایا جائے تو ہر بار وہی ہوگا خواہ وہ عورت جیسی آواز بنا کے بات کرے یا بھاری بن کے۔ لیکن ایسے گراف بنا کے آواز سے مجرم کی شناخت کے جدید سائنسی طریقے ابھی ہمارے تفتیشی اداروں کے پاس عام نہیں۔ یہاں تو ابھی ڈی این اے جیسے ٹیسٹ کے بارے میں سنا ہے کہ صرف لاہور میں ہوتا ہے چنانچہ مجھے اپنی آواز کے ریکارڈ سے شناخت کی زیادہ فکر نہیں تھی۔

میں نے کہا۔ ''مجھے زوہیب سے بات کرنی ہے۔''

عادتاً وہ پھر پوچھ بیٹھا۔ ''تم کون بول رہے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''میں بھی تمہارا اصل باپ ہوں۔ اب فضول سوال مت کرنا جو میں کہہ رہا ہوں وہ سنو۔''

''میں سن رہا ہوں۔''

''اور کون سن رہا ہے۔ خیر! کوئی بھی سنے۔ مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔''

''تم شامی بادشاہ ہو؟'' اس نے ایک بے وقوفی کا سوال کیا۔

میں نے فلمی ولن کی طرح قہقہہ مارا۔ ''میں نامی گرامی بادشاہ ہوں۔ تمہارا نام نہاد باپ ہمارے قبضے میں ہے۔''

''تم نے کہا تھا کہ اسے چھوڑ رہے ہو۔''

''ہاں۔ کیا تم نے لال رنگ کی ٹویوٹا کار کا بندوبست کرلیا ہے؟''

زوہیب نے کہا۔ ''ہاں۔ کرلیا ہے۔''

''مجھے اس کا نمبر بتاؤ۔'' میں نے کہا۔

اس نے کچھ توقف کیا اور پھر بولا۔ ''آر آئی ایس۔ ڈبل سیون ٹو فور۔''

''یہ کس کی گاڑی ہے؟ اور کس ماڈل کی۔''

''یہ کرائے کی کار ہے۔'' زوہیب نے کہا ''ماڈل دو ہزار چار۔''

''کہاں سے لی ہے؟''

''جہلم سے مل گئی۔ شاہ جمال موٹرز سے۔''

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ اس کار میں تم اپنے گھر سے نکلو گے۔ ٹھیک چار بجے۔ جی ٹی روڈ سے تم لاہور کی طرف جاؤ گے۔ جہلم سے آگے لالہ موسیٰ تک۔ وہاں سے واپس۔ تم سن رہے ہو۔''

''ہاں میں سن رہا ہوں۔''

''گاڑی میں تین بندے ہوں گے۔ تمہارا ڈرائیور، منشی اور خود تم۔ آگے پیچھے اور کوئی گاڑی نہیں ہونی چاہیے۔''

''نہیں ہوگی۔''

''سرائے عالمگیر پر رانا کو تمہارے حوالے کر دیا جائے گا۔ لیکن آگے پیچھے پولیس نظر آئی تو پھر ہم رانا کی لاش دریائے جہلم کے پل سے نیچے پھینک دیں گے۔ اٹھالینا۔ فیصلہ تمہارا ہے کیونکہ رسک بھی تمہارا ہے۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں۔ پولیس نہیں ہوگی۔''

''کچھ دیر میں مجھے معلوم ہو جائے گا کہ تم اپنے وعدے میں کس حد تک سچے ہو۔ پولیس چاہے تو موبائل فون کی گفتگو کا ریکارڈ بھی حاصل کر لیتی ہے۔ لیکن ہم بھی اناڑی نہیں ہیں۔ ہمیں دس پندرہ منٹ میں معلوم ہو جائے گا کہ اس کال کو کہیں ریکارڈ کیا گیا ہے یا نہیں۔''

میں نے کہا کہ یہ بات کسی کو معلوم نہیں ہوگی۔ مجھ پر یقین کرو۔''

میں نے فون بند کر دیا۔ اپنی طرف سے میں نے پوری کوشش کی تھی کہ زوہیب ہماری دھمکی سے اس حد تک دہشت زدہ ہو جائے کہ جو ہم کہیں وہی کرے لیکن تھا وہ بھی رانا کا جانشین۔ اس کی شخصیت کے سائے میں پروان چڑھنے والا۔ اس کے مزاج اور فطرت کا وارث۔ اگر کچھ خصوصیات اس کے خون میں موروثی ہوں گی تو کمی رانا کی تربیت سے پوری کر کے اسے اپنا ثانی بنانے کی پوری کوشش کی ہوگی۔

فرق صرف حالات کا تھا اور کسی حد تک اگلی نسل کی سوچ کا تھا۔ شاید زوہیب آج کے حالات کے پیش نظر وہ نہ کرے جو رانا کرتا رہا۔ یہ اس کے باپ کی زندگی کا سوال تھا۔ شاید اس پر وہ اپنی خاندانی اکڑفوں اور جوانی کے جوش کا رویہ اختیار نہ کرے اور مصلحت کے تقاضوں کو سمجھ لے۔

اسی امید پر میں نے پندرہ منٹ بعد تیسری سم ڈال کے زوہیب کو پھر فون کیا۔ اس بار نیا نمبر دیکھ کے اس نے صرف ہیلو کہا۔ یہ نہیں پوچھا کہ تم کون ہو۔

میں نے چھوٹتے ہی کہا۔ ''زوہیب۔ مجھے پہلے ہی شک تھا کہ تم باپ کو بچانے سے زیادہ مروانے میں دلچسپی رکھتے ہو۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' وہ گھبرایا۔

''وراثت کی ہوس یہی کراتی ہے۔ خواہ مسئلہ کسی سلطنت کے حصول کا ہو یا کسی جاگیر کا۔ رانا مرے گا تو تمہیں کنٹرول ملے گا۔ یہی سوچ کے تم نے وعدہ خلافی کی۔''

''قسم خدا کی۔''

میں نے کہا۔ ''قسم کھانے سے جھوٹ کو سچ صرف عدالت کی کرسی پر بیٹھا ہوا جج مانتا ہے۔ کیونکہ وہ مجبور ہوتا ہے۔ تم نے وہی کیا نا جس سے میں نے منع کیا تھا۔''

''یہ غلط ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اس طرح باپ کے قتل کا الزام تم پر نہیں آ سکتا۔ الزام پولیس کی نااہلی پر آئے گا۔ پتا چل گیا ہے زوہیب کہ تم نے کس سے بات کی ہے اور کس کے ذریعے۔ چلو تمہاری مرضی۔ رانا گھر کی جاگیر اور رانا پیلس کی ملکیت تمہیں مبارک ہو۔ باپ تو ایک دن مر ہی جاتے ہیں۔ یا مار دیے جاتے ہیں اگر انہیں بے مصرف اور غیر ضروری سمجھ لیا جائے۔ ولدیت کے خانے میں نام کافی ہے اور ایک قبر کافی ہے ہر سال برسی پر پھول چڑھانے کے لیے۔''

''میری بات سنو۔''

''بس اب رانا کی لاش اٹھوا لینا۔ اس کے کفن دفن کی تیاری کرو۔ شاندار جنازہ ہونا چاہیے ایک جاگیردار ایم پی اے کا۔ ایک اچھے بیٹے کی طرف سے۔ سو تم جہلم بھی ایسا کرنا کہ دھوم مچ جائے۔''

''دیکھو مجھے ایک موقع اور دو۔'' وہ دھاڑیں مار مار کے رونے لگا۔ ''مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی جو میں نے کسی کی مان لی۔''

''اچھا اب تم چاہتے ہو میں پھر بے وقوف بنوں؟ اس سوراخ میں پھر انگلی ڈالوں جس سے ایک بار ڈسا گیا۔ میں بتا چکا ہوں کہ ہم اناڑی نہیں بہت خطرناک کھلاڑی ہیں۔''

اس کا رونا بالکل جینوئن لگ رہا تھا۔ ''پلیز! تم جو بھی ہو۔ میں ویسا بیٹا نہیں ہوں جیسا تم سمجھ رہے ہو۔ یہ سب تو مجھے ملنا ہی ہے۔ اور کون ہے میرے سوا اور میرے والد کی زندگی کے دن بھی زیادہ نہیں ہیں۔ میں ایسا نا خلف نہیں کہ ان کی زندگی کو مختصر کر کے الزام اپنے سر لوں اور عذاب ساری عمر بھگتوں کہ ان کی موت کا ذمے دار میں تھا۔ مجھے ایک چانس اور دو۔ پلیز! تمہیں اپنے والدین کا واسطہ۔ مجھے معلوم ہے آج کل وہ حج کے لیے گئے ہوئے ہیں۔''

ایک دم میرے اندر جیسے کوئی چیز ٹوٹ گئی۔ یہ بے یقینی، عدم اعتماد اور عداوت کے جذبات کی دیوار تھی۔ میں صرف ایک بیٹا رہ گیا جس سے دوسرا بیٹا پہلی غلطی کی معافی مانگ رہا تھا۔ مجھے یہ شک نہیں گزرا کہ میرے والدین کا نام لے کر وہ میرا جذباتی استحصال کرنا چاہتا ہے یا مجھے بے وقوف بنانے کے لیے اس نے ایک چال چلی ہے۔

مجھے اپنے والد کا خیال آیا۔ میں نے ایک لمحے میں ایک منظر دیکھا۔ وہ فریضہ حج ادا کر رہے ہیں۔ میری ماں کی وہیل چیئر کو دھکا دے رہے ہیں اور طواف کر رہے ہیں۔

میری ماں بیمار تھی۔ آئی سی یو میں تھی۔ خدا نے اسے یہ آخری سعادت اپنی زندگی میں حاصل کرنے کی مہلت دے دی ہے۔ کیا میں اس واسطے کو بھی ٹھکرا دوں۔

میں نے کہا۔ ''او کے زوہیب۔ میں مان لیتا ہوں کہ تم دوسری مرتبہ کسی کے بہکائے میں نہیں آؤ گے۔ میری اگلی ہدایات کا انتظار کرو۔''

راجا گاڑی چلا رہا تھا لیکن دونوں طرف کی گفتگو سے صورتِ حالات کو پوری طرح سمجھ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''چل نیکے پتر۔ یہ چانس اعتبار پر لیتے ہیں۔ دشمن کی مان لیتے ہیں۔ کیا پتا اس نے سچ ہی بولا ہو۔''

''پھر میں عبداللہ جان سے بات کروں؟''

''وہ تو کرنی ہی پڑے گی۔ اور اس کے رویے سے بھی معلوم ہو جائے گا کہ وہ کیا جانتا ہے اور کتنا جانتا ہے۔''

عبداللہ جان سے میں نے پرانے نمبر سے بات کی۔

''آپ کہاں ہیں سر!'' میں نے کہا۔

''میں ڈیوٹی پر۔'' اس نے گول مول جواب دیا۔

''نواب صاحب واپس اپنے دارالخلافہ لوٹ آئے یا ابھی دورے پر ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''میں تو آپ کے جانے کے کچھ دیر بعد ہی ست بدھائی آ گیا تھا۔ کیا آپ کچھ وقت نکال سکتے ہیں میرے لیے؟''

''اگر آپ کی مراد ہے کہ میں حویلی میں حاضری دے سکتا ہوں یا نہیں۔ تو میری معذرت۔ میں مصروف ہوں۔ ہاں آپ تشریف لانا چاہیں تو ضرور آیئے۔''

میں نے کہا۔ ''نہیں۔ میں صرف ایک اہم اطلاع دینا چاہتا تھا۔''

''جی فرمایئے۔ میں ہمہ تن گوش ہوں۔''

وہ اتنی شستہ اور بامحاورہ اردو بولتا تھا کہ لگتا تھا پولیس میں نہیں کوئی ادیب ہے۔ میں نے کہا۔ ''مجھے ابھی ابھی اپنے ایک انتہائی معتبر ذریعے سے علم ہوا ہے کہ رانا صاحب آج کسی وقت اپنے بیٹے کے ساتھ رانا پیلس جائیں گے۔''

''اچھا؟ اس وقت باپ بیٹا کہاں ہیں۔''

''لاہور میں۔ انہوں نے جہلم سے گاڑی کرائے پر لی ہے۔ یہ ایک لال رنگ کی ٹویوٹا کار ہے۔ نمبر سے آپ تصدیق کر سکتے ہیں۔ گاڑی شاہ جمال موٹر سے لی گئی ہے۔ آر آئی ایس ڈبل سیون ٹو فور۔ ماڈل دو ہزار چار۔''

''میں معلوم کرتا ہوں۔''

''یہ تو ظاہر ہے کہ گاڑی رانا صاحب کے نام سے نہیں لی گئی ہوگی۔''

''کوئی اطلاع ہے۔ ان کی آمد کس راستے سے ہوگی؟''

میں نے کہا۔ ''راستہ ایک ہی ہے۔ جی ٹی روڈ۔ وقت کا میں کچھ بتانے سے قاصر ہوں۔ اندازہ ہے کہ وہ رات کی تاریکی میں سفر کریں گے۔''

''آپ کا اندازہ درست ہے۔''

میں نے کہا۔ ''یہ میں آپ کو اس لیے بتا رہا ہوں کہ مجھے آپ سے ایفائے عہد کی امید ہے۔''

''نواب صاحب! آپ سے میں نے جو وعدہ کیا تھا وہ آج پورا ہوگا۔ رانا صاحب کو گرفتار میں خود کروں گا۔''

''دیکھئے۔ یہ ہوسکتا ہے وہ پروگرام بدل دیں۔ ابھی تک میری انفارمیشن درست ہے۔''

''دیکھیے ہم بعض اوقات گمنام کال پر بھی ایکشن لیتے ہیں۔ اگر معاملہ ایسا ہو آپ پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔ میں آپ کی اگلی انفارمیشن کا انتظار کروں گا۔''

''ڈی آئی جی صاحب! بے شک رانا مجھ سے عناد رکھتا ہے۔ لیکن میرے لیے وہ صرف ایک مجرم ہے۔''

''میں بھی آپ کے لیے کچھ نہیں کر رہا ہوں۔ ایک مفرور مجرم کی گرفتاری میرے فرائض میں شامل ہے۔ رعایت میں کسی سے نہیں کرتا خواہ اس کی مجھ سے رشتے داری ہو یا دوستی۔''

''اور اس میں آپ کی نوکری داؤ پر لگ جائے پھر؟''

''آپ نہیں جانتے نواب صاحب کہ کتنی بار میں ایسا کر چکا ہوں۔ اگر آپ اسے ٹیسٹ کیس سمجھتے ہیں تو یوں ہی سہی۔''

فون بند ہو جانے کے بعد میں نے یہ بات راجا کو بتائی۔ ''ابھی تک اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔''

راجا نے کہا۔ ''زوہیب نے بات کی ہوگی کسی انسپکٹر یا زیادہ سے زیادہ ایس پی سے۔ اس نے کہا ہوگا کہ چھوٹے رانا صاحب آپ بالکل بے فکر ہو جائیں۔ یہ آئی جی اور ڈی آئی جی بھی ہم سے ہی کہیں گے۔ وہ خود کہاں نکلتے ہیں اپنے ائر کنڈیشنڈ دفتروں اور گھروں سے۔ عبداللہ نے کہا ہے کہ میں خود اسے گرفتار کروں گا۔''

''تجھے بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے نیکے پتر۔ ایسے مجاہد قسم کے افسر بہت خطرناک ہوتے ہیں۔ وہ تجھے بھی نہیں بخشے گا اگر تیرے خلاف کوئی ثبوت اس کے ہاتھ لگ گیا۔''

''مجھے اندازہ ہے مہاراجا۔ ہم بڑے کھلاڑی بن رہے ہیں۔ یہ صرف قسمت کا کھیل ہے۔ جس دن قسمت نے

ساتھ چھوڑا ہم سے ایسی غلطی سرزد ہوگی جو اناڑی بھی نہیں کرتے۔"

ہم ست بدھائی کے قریب تھے جب میں نے پھر زوہیب سے رابطہ کیا۔ اس وقت پونے چھ بج رہے تھے۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ کتنا مضطرب ہوگا۔ پہلے جو کچھ میں نے کہا وہ سب طے شدہ تھا اصل پروگرام کا علم ہمارے علاوہ صرف غنی کو تھا۔

زوہیب کے ہیلو کہتے ہی میں نے کہا۔ "اب تمہیں لالہ موسیٰ پر نہیں۔ دینہ سے رہتاس جانے والی سڑک کے موڑ سے لالہ موسیٰ کی طرف نہیں راولپنڈی کی طرف جانا ہوگا۔ گوجرخان سے پہلے ہی رانا کو تمہارے حوالے کر دیا جائے گا۔"

اب پلان مکمل تھا۔ میں نے عبداللہ خان کو تھوڑا سا گمراہ کیا تھا کہ رانا کو لاہور سے لایا جائے گا۔ یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ راولپنڈی میں میری موجودگی اور رانا کی برآمدگی کوئی اتفاق بھی نہ لگے۔ اس کے علاوہ رانا کو لانے والے غنی کی حفاظت ضروری تھی کہ وہ پولیس کے ہاتھ نہ لگے اور اغوا کرنے کا سنگین الزام اس پر نہ آئے۔

حویلی کے اندر مجھے بڑا عجیب منظر دکھائی دیا۔ برآمدے میں خواتین تشریف فرما تھیں۔ ایک شخص ان کے سامنے راستے پر گائے کو ٹہلا رہا تھا۔ دوسرا ایک قدآور بکرے کو۔ کچھ فاصلے پر جہاں ہم گاڑیاں کھڑی کرتے تھے مزید نصف درجن کے قریب گائیں کھڑی تھیں اور اتنے ہی بکرے۔ ان کے مالکان اپنی باری کے انتظار میں تھے۔

رابعہ نے بڑی خوش دلی سے کہا۔ "بڑے وقت پر آئے تم کزن۔"

میں اس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ "یہ مقابلۂ حسن کس لیے ہو رہا ہے آخر؟"

لیلیٰ بھابی نے کہا۔ "حد کرتے ہو تم بھی۔ پرسوں عید ہے۔"

راجا بولا۔ "گویا قربانی کے لیے جانور کا انتخاب ہو رہا ہے۔"

ریشم نے ہمیں انگریزی میں مطلع کیا۔ "سکس کاؤ، سکس گوٹ مرڈران حویلی۔"

میں نے کہا۔ "یہ تو چھ ہی ہیں۔ پھر ان سے کیٹ واک کیوں کرائی جا رہی ہے؟"

شہناز نے کہا۔ "یہ لوگ ویسے تو بہترین جانور چن کر لائے ہیں۔ لیکن اطمینان کرنا ضروری ہے۔"

راجا نے کہا۔ "یار دیکھ اس کالے بکرے کو۔ یہ میرے سسر کا اتنا ہم شکل ہے کہ مجھے لگتا ہے مرحوم خود کھڑے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "کیسا جب شادی نہیں ہوئی تیری۔"

اس نے شہناز کی طرف دیکھا۔ "ہو جائے گی شادی بھی۔"

شہناز نے جل کے کہا۔ "رفیق اس موٹی تازہ گائے کو بھی دیکھو۔ میری ساس جیسی چال ہے بالکل۔"

میں نے کہا۔ "پھر تو اس پر خود چھری پھیرنا۔ ویسے تمہاری ساس ہونے کا اعزاز کسے حاصل ہے؟"

"ہوگا ضرور کسی کو۔ تم لوگ کہاں سے آ رہے ہو؟"

"یہ ہم بتا نہیں سکتے۔ جھوٹ کبھی بولا نہیں۔ اس لیے کوئی جواب نہیں دیں گے۔" راجا نے کہا۔

میں نے کہا۔ "اماں ابا کی کوئی خیر خبر؟"

"نہیں۔ ہم آج ٹی وی پر براہ راست حج کی نشریات دیکھتے رہے کہ شاید وہ نظر آئیں۔" رابعہ بولی۔

"پچیس لاکھ سے زائد لوگوں میں، ناممکن۔"

"لیلیٰ بھابی کو شک ہے کہ انہوں نے ایک جھلک دیکھی تھی۔ اللہ کرے سچ ہو۔" شہناز بولی۔ "اماں کی طبیعت کے بارے میں دوبارہ کوئی اطلاع نہیں آئی۔"

"یہاں سے میں نے بھی کوشش کی تھی۔" رابعہ بولی۔ "مگر کوئی نہیں ملی۔"

اب رات ہوگئی تھی۔ قربانی کے جانوروں کا انتخاب مکمل ہوا تو خواتین نے عادت کے مطابق جانوروں کی قیمت کے معاملے پر بحث شروع کی جس کی میرے نزدیک کوئی خاص ضرورت نہ تھی مگر مجھے سخت حیرانی ہوئی جب انہوں نے سارے جانور تقریباً نصف قیمت پر حاصل کر لیے۔

ریشم جب کافی لے کر آئی تو اس کا لباس بدلا ہوا تھا شادی کے بعد اس کے رکھ رکھاؤ میں تو کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی لیکن اپنے لباس کے معاملے میں وہ پہلے سے زیادہ پسند کا خیال رکھنے لگی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس پسند میں اس کے میاں غنی کا زیادہ دخل ہے۔ اس کی شادی بھی حویلی کا ایک تاریخی واقعہ بن گئی تھی۔ عام حالات میں اسے وہی ملتا جو اس کی ماں نے جمع کیا تھا۔ ہر ماں کی طرح۔ جب تک وہ اکبر خان کی بیوی رہی اس کا ہاتھ تنگ رہا پھر جب اکبر خان نے آمدنی بڑھانے کے غیر اخلاقی اور مجرمانہ طریقے اختیار کیے تو اس نے یہ حرام کی آمدنی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اکبر خان اسے طلاق دے کے اس گھر سے ہی نکل گیا تو ریشم کی ماں کے پاس کچھ بھی نہ رہا۔ تاہم اللہ بڑا کارساز ہے۔ ڈیڑھ سو سال پرانی حویلی ساٹھ سال ویران رہنے کے بعد پھر آباد ہوگئی اور جب ریشم کی شادی میرے والدین کی موجودگی میں ہوئی تو حالات بالکل بدل چکے تھے۔ مجھے تو تیاری کے معاملات کا زیادہ علم نہ ہوا کیونکہ ان خالص زنانہ معاملات

سے مجھے کوئی دلچسپی ہی نہ تھی مگر رابعہ شہناز اور بعد میں رابعہ بھابی نے ان کے ساتھ مل کے ریشم کے لیے دل کھول کے خریداری کی تھی۔ اس کی رخصتی جو حویلی کے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جانے کے سوا کچھ نہ تھا، بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ اب وہ شادی میں ملنے والے جوڑے ایک ایک کر کے نکال رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے گائے بکرے خریدتے وقت اس نے ایسا خوبصورت ریشمی جوڑا زیب تن کر رکھا تھا کہ رابعہ، لیلیٰ بھابی اور ڈاکٹر شہناز اس کے سامنے نوکرانی لگ رہی تھیں اور ریشم ان کی مالکن۔

اب وہ لباس بدل کے آئی تو حیرانی مجھے اس کو جینز میں دیکھ کے ہوئی۔ ریشم خوبصورت پہلے بھی تھی اور جوان بھی۔ ایک عوامی محاورے کے مطابق، گدھی بھی حسین لگنے لگتی ہے۔ شادی کے بعد ہر دلہن پر یہ نکھار آتا ہے اور سونے پر سہاگا ریشم کا بھی یہی حال تھا۔ جب میں اس دیہاتی لڑکی کا تصور کرتا تھا جسے میں نے غنی کے ساتھ حویلی کے باہر قبرستان کے ایک کھنڈر نما آسیب زدہ کمرے میں پکڑا تھا تو مجھے آج کی ریشم کو دیکھ کر یقین نہیں آتا تھا کہ یہ وہی لڑکی ہے۔ اس کی شخصیت کا انقلاب عقل کو حیران کر دینے والا واقعہ تھا۔ شہناز اور اس سے پہلے فریال کے ساتھ رہ کے اس نے بہت کچھ سیکھا تھا۔ اس میں سیکھنے اور Adapt کرنے کی غیر معمولی صلاحیت تھی۔ شہناز کے ساتھ اس نے کام شروع کیا تو اس کی حیثیت خادمہ جیسی تھی پھر وہ دیکھتے دیکھتے اہمیت اختیار کر گئی اور اس کی معاون سے معاون خصوصی بن گئی۔ اس کی آبزرویشن اتنی اچھی تھی کہ وہ مرض، مریض اور علاج کے ہر مرحلے کو غور سے دیکھتی رہی اور یادداشت کے بل پر اس نے مخصوص علامات میں دی جانے والی دوائیں دیکھ کے نام بھی یاد کر لیے پھر وہ شہناز سے چوری چھپے خود دوائیں دینے لگی اور اب یہ تھا کہ شہناز اس کو مذاق میں ڈاکٹر ہونے کی سند دے چکی تھی لیکن حقیقت یہ تھی کہ شہناز نے ریشم کو عام امراض کی دوا دینے کا اختیار دے دیا تھا۔ صرف ایمرجنسی میں سہی مگر اس اختیار نے ریشم کو ڈاکٹر ریشم بنا دیا تھا۔ ہم مذاق میں ایسا کہتے تھے اور وہ درحقیقت ایسا سمجھتی تھی۔ اس کی غلط سلط انگریزی بھی مستقل مزاجی کے باعث بہتر ہو رہی تھی۔ وہ ہمارے ہنسنے کا بالکل برا نہیں مانتی تھی۔

مجھے غور سے دیکھتا پا کے ریشم کا رنگ کچھ لال ہوا اور اس نے مسکاتے ہوئے بھاگنے کی کوشش کی۔ "واٹ یو سی سر..."

میں نے کہا۔ "ایک منٹ ڈاکٹر ریشم۔ ماشاءاللہ آج تو آپ ماڈل لگ رہی ہیں۔"

وہ مزید شرمائی۔ "مسٹر غنی سے۔ یو ٹرائی ماڈرن ڈریس۔ آئی سے یس۔ ہپی ہس بینڈ۔ آئی ناٹ ریفوز۔"

میں نے کہا۔ "بیوی کو ایسا ہی فرمانبردار ہونا چاہیے لیکن یہ شہر نہیں ہے تم نے ایسے کپڑے پہن لیے۔"

اس کا چہرہ اتر گیا۔ "یو ڈونٹ لائک۔"

"ریشم۔ میں تو لندن امریکا رہ کے آیا ہوں جہاں عورتیں ایک رومال اوپر اور ایک نیچے باندھ کے پھریں یا اتنا تکلف بھی نہ کریں تو کوئی برا نہیں مانتا۔ تم گاؤں میں ٹی شرٹ اور جینز پہن کے پھرو گی تو..."

"نو سر۔ آنلی ان دی حویلی۔ ناٹ آؤٹ سائیڈ۔"

راجا نے کہا۔ "یار ٹھیک ہے۔ ریشم کے میاں کا دل خوش ہوتا ہے تو تجھے پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ جاؤ ریشم میری طرف سے اوکے ہے۔"

وہ جاتے جاتے رک گئی۔ "واٹ این اوکی سر؟"

"بے شک تم بکنی سوٹ پہن کے سارے گاؤں پر بجلیاں گراتی پھرو۔ قتل عام کرو۔"

"واٹ از بکنی سوٹ سر۔ آئی سے۔ غنی برنگ فاری۔"

میں نے کہا۔ "ہاں... دیکھو وہ آیا کہ نہیں۔"

دراصل مجھے باہر سے کسی گاڑی کی آواز آئی تھی چند منٹ میں غنی کسی توپ سے نکلے ہوئے گولے کی طرح اندر آیا اور عین دروازے کے بیچ میں اس کا ریشم سے ایکسی ڈنٹ ہوا جو کسی ٹرک اور کار کے تصادم کی طرح تھا۔ ریشم نے ایک چیخ ماری اور اپنے میاں سے خالص مادری زبان میں وہ کہا جو اس کے مغربی لباس سے ذرا میچ نہیں کرتا تھا۔

غنی نے جواب میں کہا۔ "فضول بکواس مت کر۔ کچھ نہیں ہوا چڑیل۔"

میں نے کہا۔ "یار اس نے تمہارے لیے اتنے اہتمام سے ڈریس پہنا تھا اور تم نے کہہ دیا چڑیل۔ خیر۔ جلدی سے بتاؤ کیا ہوا؟"

وہ قہقہہ مار کے ہنسا جو یقیناً خلاف آداب تھا مگر خوشی میں وہ آقا و خادم کے حفظ مراتب کو بھی بھول گیا تھا۔ "وہ تو گیا اندر۔"

میں نے راجا سے ہاتھ ملایا۔ "اس کارنامے پر نوبل پرائز تمہیں بعد میں دیا جائے گا۔ پہلے بتاؤ یہ ہوا کیسے؟"

"راولپنڈی سے ہم ٹائم پر نکلے تھے سر۔ رانا کو ہم نے بتا دیا تھا کہ جو ہم کہیں وہ مانو گے تو تکلیف نہیں اٹھاؤ گے۔"

"اس نے تمہیں پہچانا؟"

"کیسے پہچانتا سر۔ ہمارے چہروں پر نقاب تھے۔

دوسوراخ تھے جن میں سے ہم دیکھ سکتے تھے۔ اس نے کہا کہ جو تمہارا دل چاہے کرو۔ ہم نے اسے کہا کہ پیچھے والی سیٹ پر کمبل اوڑھ کے لیٹ جاؤ۔ سر اٹھایا یا آواز نکالی تو ہم باندھ کے بوری میں ڈال دیں گے اور منہ میں کپڑا ٹھونس دیں گے۔ وہ ڈر گیا۔ کہنے لگا کہ میں کچھ نہیں کروں گا۔ ہم نے اسے بتا دیا کہ دروازہ کھولنے کا سوچ بھی نہیں کیونکہ ہم نے اندر سے ہینڈل نکال دیے ہیں۔ اس طرح شیشے بھی اندر سے نہیں کھلتے۔"

"اس نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟"

"پوچھا تھا۔ ہم نے کہا کہ جہاں تم جانا چاہو۔ انمول کے پاس یا ساحرہ کے کوٹھے پر۔ فوڈ اسٹریٹ یا وہ چھلانگ مارنا چاہے تو مینارِ پاکستان۔ اس وقت تو وہ خاموش رہا۔ کچھ دیر بعد بولا کہ۔ "یہ لاہور کی کون سی جگہ ہے؟" میں نے کہا کہ یہ گلبرگ کا علاقہ ہے۔ کیا مکان نمبر بلاک اور اسٹریٹ بھی بتا دوں؟ پھر دل چاہے تو خود آ جانا۔ بس اس کے بعد وہ نہیں بولا۔ لیکن سمجھ گیا کہ اسے لاہور میں کہیں رکھا گیا تھا۔"

"پولیس کو ہم نے بھی یہی بتایا تھا۔" میں نے ہنس کے کہا۔ "وہ لاہور جہلم تک جی ٹی روڈ پر لال رنگ کی ہر گاڑی کو چیک کر رہے ہوں گے خصوصاً ٹویوٹا کو۔"

راجا بولا۔ "نمبر پلیٹ بھی دیکھتے ہوں گے کہ جعلی تو نہیں لگا رکھی۔"

"گاڑی میں بیٹھ کے میں نے تو نقاب اتار دی۔ ڈاڑھی مونچھ نکالی اور عینک، پیچھے اور آگے والی سیٹ کے درمیان پردہ تھا۔

اپنے دو بندے پیچھے تھے۔ رانا کو بیچ میں لٹا کے اوپر کمبل ڈال دیا تھا۔ ان کے نقاب سے لگتا تھا دو برقع پوش عورتیں پیچھے بیٹھی ہیں۔"

"یہ دونوں کون تھے۔ میرا مطلب ہے بھردسے کے تھے۔"

"بھردسے کے نہ ہوتے تو میں لے جاتا سر۔" غنی نے کچھ برا مان کے کہا۔ "چوتھا بندہ گوجر خاں میں اتر گیا تھا۔ اس نے وہاں سے ٹیکسی لی۔ وہ رکی ہی تھی کہ ہمارا بندہ بیٹھ گیا۔ اس میں سے دو پٹھان اترے تھے۔ مزے کی بات یہ ہوئی کہ ان کے پاس تھا ہزار کا نوٹ۔ ٹیکسی ڈرائیور خفا ہونے لگا کہ میں چینج کہاں سے لاؤں۔ انہوں نے کہا کہ ہم کسی سے مانگ لیتے ہیں۔ وہاں کھڑے تھے پھلوں کی ریڑی والے۔ ان کے پاس ہزار کا کھلا کہاں۔ ہو تب بھی وہ دیتے نہیں۔ وہ پٹھان سامنے ہی تھے اور ہر ایک سے چینج مانگ رہے تھے۔ پھر اچانک وہ غائب ہو گئے۔ ٹیکسی ڈرائیور پریشان ہو گیا کہ تین سو گئے۔ ہمارے آدمی نے کہا کہ چلو میں دے دوں گا۔ ظاہر ہے ٹیکسی ڈرائیور خوش بھی ہوا اور حیران بھی۔ پوچھنے لگا کہ وہ آپ کے ساتھی ہیں۔ اس نے کہا تم باتیں چھوڑو اور چلو جہلم۔ ٹیکسی ڈرائیور نے کہا کہ جہلم کے یہاں سے پانچ سو ہوں گے۔ میرے ساتھی نے اسے ہزار کا نوٹ پکڑا دیا کہ یہ سب رکھو اور چلو۔ دینہ سے نکل کے اس نے ایک غیر آباد جگہ پر ٹیکسی رکوانے کا سوچا ہی تھا کہ ڈرائیور نے خود گاڑی روک دی اور سڑک سے چند گز دور ایک چٹان کی اوٹ میں پیشاب کرنے بیٹھ گیا۔ ہمارا بندہ ٹیکسی لے کر چل پڑا۔ آپ نے جو جگہ بتائی تھی وہیں سے اس نے ٹیکسی کو واپس جانے والی سڑک پر موڑا اور لائٹس آف کر کے اس کے فلیشر جلا دیے۔ اندھیرے میں پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ وہ ٹیکسی ہے یا پرائیویٹ کار۔ پنڈی جانے والی گاڑیاں اسی سڑک پر جا رہی تھیں۔ ٹیکسی بالکل ایک طرف کھڑی تھی۔ جب ہم وہاں پہنچے تو میں سمجھ گیا کہ یہی ٹیکسی ہوگی۔ میں نے اپنی گاڑی وہاں لے جا کے روکی اور رانا کو اس میں شفٹ کیا۔ اس سے کہا کہ چپ چاپ لیٹے رہو۔ ہم کھڑے ہیں باہر۔ جب ہم نے رہتاس کی طرف سے ایک گاڑی کو آتے دیکھا تو ہم بھاگ گئے۔ میں سڑک کے دوسری طرف سے دیکھتا رہا۔ اس گاڑی کا رنگ لال تھا۔ نمبر میں نہیں دیکھ سکتا تھا مگر وہ دو ہزار چار کے ماڈل کی کرولا تھی۔ اس میں سے دو جیب اترا اور رانا کا فشی۔ انہوں نے ٹیکسی میں جھانک کے دیکھا اور پھر رانا کو اتار کے اپنی گاڑی میں بٹھا لیا۔ انہوں نے وہیں سے کار کو بیک کیا۔ رن دے کے خلاف اور واپس رہتاس موڑ کی طرف چلے گئے۔ دس منٹ بعد ہم اپنی گاڑی میں روانہ ہوئے اور موڑ پر ٹھہر گئے۔ آدھے گھنٹے بعد پولیس کے سائرن سنائی دیے اور ادھر سے نیلی گھومنے والی لائٹ چمکاتی پولیس کی جیپ نمودار ہوئی۔ اس کے پیچھے ایک موبائل تھی۔ پھر ایک بند گاڑی۔ اس کے بعد پھر ایک موبائل جس میں پولیس کی نفری بھری ہوئی تھی۔ سب سے پیچھے وہی لال ٹویوٹا تھی جس میں بیٹا اپنے باپ کو لے گیا تھا۔ میرا دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔ میرا جی تو چاہتا تھا کہ خوشی سے نعرے لگاؤں اور ڈانس کروں۔ ہم نے بڑی محنت کی تھی جناب اس...کو پکڑنے کے لیے۔" فرطِ جذبات میں غنی نے میرے سامنے رانا کو ایک شاندار گالی بک دی مگر اسے احساس نہیں ہوا۔

میں نے غنی سے ہاتھ ملایا۔ "تم نے ثابت کر دیا ہے غنی کہ تم سے زیادہ اس کام کا اہل کوئی نہیں تھا اور ہم جو تم پر بھروسا کرتے ہیں وہ ٹھیک ہے۔"

راجا نے بھی ہاتھ ملا کے کہا۔ "تم جیسا چیف سیکورٹی افسر تو شاید ایوان صدر کو میسر نہیں۔"

"یہ ایک انتہائی خطرناک کام تھا۔ ذرا سی بھی غلطی ہماری ناکامی کا سبب بن جاتی اور ناکامی کا مطلب ہوتا گرفتاری۔ ہم رانا کے اغوا کے جرم میں اندر ہو جاتے۔"

راجا بولا۔ "اب وہ اندر ہے۔ ہم نے پولیس کے محکمے کی سازش کو ناکام کیا۔ رانا کے اثر رسوخ، اس کی طاقت اور دولت ہر غرور کو شکست دی اور اب وہ قید میں ہے۔"

میں نے کہا۔ "یہ سب عبداللہ جان جیسے ڈی آئی جی کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ بے شک ہمارے سامنے وہ قانون کے معاملے میں اپنی غیر جانبدار، فرض شناسی کی بات کرتا ہے لیکن مجھے یقین ہے رانا کے ساتھ اس کا ذاتی عناد بھی پس منظر میں کار فرما ہے۔"

"ضرور ہوگا۔ اپنے وقت میں رانا نے اسے بہت نقصان پہنچایا اور پریشان کیا تھا۔ اب وقت بدل گیا ہے۔ کبھی کے دن بڑے کبھی کی راتیں۔ رانا کی پارٹی اب اقتدار میں نہیں تو سارے حساب برابر ہوں گے۔"

میں نے کہا۔ "فی الحال تو مجھے رانا کی ضمانت پر رہائی بھی ناممکن ہی لگتی ہے۔ اس کے جرائم بہت سنگین ہیں۔ اغوا اور قتل۔ ایک میں مدعی ہے ڈاکٹر شہناز۔ اغوا اور حبسِ بے جا۔ ذہنی اور جسمانی تشدد کا کیس ہے۔ دوسرے میں اس کی مرحوم بیٹی کا فریق ہے اور اس کا کیس تو ایسا ہے کہ بڑے سے بڑا وکیل رانا کو پھانسی کے تختے پر پہنچنے سے نہیں بچا سکتا۔

راجا معنی خیز انداز میں مسکراتا رہا۔ "جھلیے پتر! یہ تیرے جذبات ہیں جو ایسے ابل کے باہر آ رہے ہیں جیسے کوک کی بوتل کھولی جائے تو جھاگ نکلتا ہے۔ کیا تو مجھے پاکستان کی ستاون سالہ تاریخ میں کوئی ایک کیس بتا سکتا ہے جہاں کسی اسمبلی کے رکن، وزیر سفیر، بیوروکریٹ یا جنرل کو اس کے جرم کی سزا میں جیل میں بھیجا گیا ہو؟"

"جو پہلے نہیں ہوا اب ہوگا راجا۔"

"اب کیا انقلاب آ گیا ہے۔ وہ انقلاب جس کی نوید ہمارے سیاسی لیڈر، مفکر اور دانشور دیتے رہے ہیں۔" راجا نے طنز سے کہا۔ "آخر فیض نے کیوں کہا تھا۔ چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی۔ میں پھر کہتا ہوں۔ جب سے پاکستان بنا۔ کتنے قتل رانا جیسے اربابِ اختیار نے کرائے۔ لیاقت علی خان سے شمار کر۔ کم سے کم تین وزیر اعظم۔ تین گورنر۔"

"تیرا مطلب ہے ہم نے خواہ مخواہ جھک ماری۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "رانا کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ وہ ایسے چھوٹ کے گھر آ جائے گا جیسے اس نے مکھی بھی نہیں ماری۔ شاید الٹا ہم پکڑے جائیں گے۔"

راجا نے کہا۔ "اتنا دل شکستہ نہ ہو جھلیے پتر۔ ہم بے شک رانا کو تختۂ دار تک یا جیل نہیں پہنچا سکتے لیکن ہم نے اپنا وقت ضائع نہیں کیا۔ تیری قسمت کہ تو عوام نہیں ہے۔ تو خواص میں ہے۔ طاقتور ہے۔ اثر رسوخ اور دولت رکھتا ہے۔ اس لیے تو محفوظ رہے گا۔ فائدہ یہ ہوا کہ تو نے اپنے ہونے کا ثبوت دے دیا۔ رانا جیسوں کو ڈنکے کی چوٹ پر بتا دیا کہ میں بھی ہوں اور مجھے ایرا غیرا سمجھنے والے سمجھ لیں کہ مجھ سے پنگا لینا انہیں مہنگا پڑ سکتا ہے۔ یہ فائدہ کم ہے؟"

اسی وقت فون کی گھنٹی بجی۔ یہ ڈی آئی جی عبداللہ جان تھا۔ اس نے کہا۔ "نواب رفیق صاحب!"

میں نے کہا۔ "جی بول رہا ہوں۔"

"آپ کی انفارمیشن سو فیصد درست تھی۔ میں نے رانا رجب علی کو گرفتار کر لیا ہے اور اس کے بیٹے کو بھی۔"

"بیٹے کا کیا قصور تھا؟"

"اعانت مجرمانہ۔ وہ ایک مفرور مجرم کو ساتھ لے جا رہا تھا۔ کرائے کی گاڑی خود چلا رہا تھا۔"

"میں نے اپنی قانونی ذمے داری پوری کی۔ باقی کام آپ کا ہے ڈی آئی جی صاحب مجرم کو سزا دلوانے کا۔"

"نواب صاحب۔ میں اس حکومت کی مشنری کا ایک ادنیٰ سا پرزہ ہوں۔ میری ذمے داری کی حدود یہاں تک ہیں کہ میں کسی مجرم کو گرفتار کروں اور قانون کے حوالے کر دوں۔ یہ بتا دوں کہ اس کا جرم کیا ہے۔ آگے نظام انصاف میں کیا ہو سکتا ہے۔ کیا ہوتا رہا ہے۔ یہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ چھوٹی عدالت سے بڑی عدالت تک اور اعلیٰ ترین عدالت تک قانونی موشگافی کون کرتا ہے؟ بڑے بڑے ناموں والے وکیل۔ جھوٹ کو سچ اور سچ کو جھوٹ بنانے کے عمل کو روکنا میرے بس کی بات نہیں۔"

میں نے کہا۔ "گویا آپ بھی اعتراف کر رہے ہیں کہ رانا کے گرفتار ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا؟"

"فرق پڑ سکتا ہے مجھے لیکن اس کے لیے میں پہلے بھی تیار تھا۔ اب بھی تیار ہوں حالانکہ ممکن ہے میرے اس عمل سے میری ترقی کا راستہ رک جائے۔ میں آئی جی نہ بنوں۔ دوبارہ اوایس ڈی لگ جاؤں۔ لیکن اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ آپ کو یہ کرنا ہے کہ ڈاکٹر شہناز کے ساتھ صبح آ جائیں۔"

"ان کا اب کیا کام ہے؟"

"ملزمان کی شناخت کا ایک ضابطہ ہے۔ وہ پورا کرنا ہوگا۔ آپ کو میرا مشورہ ہے کہ اپنی ضمانت قبل از گرفتاری کی توثیق کرالیں۔"

"لیکن کل تو عدالت کی تعطیل ہوگی۔ پرسوں عید ہے۔"

"نواب صاحب۔ ارجنٹ کام ہوتے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے رانا عید کا دن عدالت میں گزارے گا اپنے بیٹے کے ساتھ۔ جی نہیں۔ اس کے وکیل پہنچ رہے ہیں۔ ان میں آپ کا دوست اور سابق قانونی مشیر بھی ہے۔ فاروقی۔ وہ جج کے گھر سے ضمانت کے احکامات حاصل کر سکتے ہیں۔"

"گھر سے۔ یہ کیسے ممکن ہے؟"

"اعلیٰ عدالتوں کا ہر جج چوبیس گھنٹے جج ہوتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "کیا اس کی ضمانت ہو سکتی ہے ان جرائم کے ساتھ؟"

"میرے خیال میں نہیں۔ مگر وہ ایسے جج کے پاس جائیں گے جو ضمانت منظور کر لے گا۔ بڑے وکیل جانتے ہیں کہ کون سا جج سخت ہے اور کون انکار نہیں کرتا۔"

"لیکن یہ تو قانون میں گنجائش کا مسئلہ ہے۔"

وہ بولا۔ "گنجائش انگریز نے اپنے قانون میں ضرور رکھی تھی لیکن وہ اخلاقیات کو نظر انداز نہیں کرتا تھا۔ مثال لیں ملکہ برطانیہ کی سیکڑوں سال سے اس کو پارلیمنٹ توڑنے کا اختیار حاصل ہے لیکن اسے وہ غیر اخلاقی بات سمجھتے ہوئے اپنے حق کا استعمال نہیں کرتی۔"

"مطلب یہ کہ جج کو اختیار ہے۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

"آخر وہ اعلیٰ عدالت کا جج ہے نواب صاحب۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ اس نے اختیارات کا غلط استعمال کیا تو آپ فیصلے کو ڈویژن بنچ میں چیلنج کر دیں کہ ضمانت منسوخ کی جائے۔ ڈویژن بنچ نہ سنے تو آپ سپریم کورٹ چلے جائیں۔ میں نے کہا نا کہ آگے قانون کا کھیل شروع ہوگا۔ وہ آپ کھیلیں اور آپ کے وکیل۔ خدا حافظ۔"

میں نے راجا سے بات کی تو وہ ہنسنے لگا۔ "عبداللہ اچھا آدمی ہے۔ سچ بولتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "کیا ضمانت پر رہائی سے پہلے نوٹس جاری نہیں ہوتا۔"

"نوٹس جاری ہوتا ہے حکومت کو۔ ایڈووکیٹ جنرل خود جواب نہ دینا چاہے تو کسی ڈپٹی ایڈووکیٹ جنرل کو بھیج دیتا ہے۔ وہ حاضر ہو کے کہہ دیتا ہے کہ ملزم کی ضمانت پر رہائی پر حکومت کو اعتراض نہیں۔ جج اسے رہا کر دیتا ہے۔ اب آپ اپیل کریں کہ ملزم با اثر ہے اور مقدمے کی کارروائی پر اور گواہوں پر اثر انداز ہوگا۔ یہ اپیل شہباز کر سکتی ہے کہ رانا کی ضمانت منسوخ کی جائے۔"

"گویا پھر وہی بلی چوہے کا کھیل۔ وہ پولیس کے ہاتھ آئے گا نہیں۔ عدالت میں حاضر نہیں ہوگا۔"

"اتنا مایوس مت ہو نکے پتر۔ پہلی بات تو یہ کہ اگر کل رانا نے درخواست ضمانت پیش کی تو اس کی عبوری ضمانت ہوگی۔ جس کی توثیق لازمی ہوگی دو چار دن بعد۔ اس وقت ہمارے وکیل اعتراض دائر کر سکتے ہیں۔ اب عدالت میں حاضر نہ ہونا رانا کی مرضی کی بات نہیں ہوگی۔ کبھی اسمبلی کا سیشن ہو یا وہ میڈیکل گراؤنڈز پر حاضر نہ ہو تو اور بات ہے۔" راجا نے وضاحت کی۔

میں نے کہا۔ "راجا صاحب۔ میری بڑی آرزو تھی کہ اسے حوالات کی سلاخوں کے پیچھے دیکھوں۔"

راجا نے سوچ کے کہا۔ "اگر ہم ابھی چلے جائیں تو شاید یہ خوبصورت منظر دیکھ لیں۔"

"چل پھر اٹھ۔ اپنا کیمرا بھی لے چل۔ کیا یہ ممکن ہے کہ صبح کے اخبار میں یہ خبر آ جائے۔ تصویر کے ساتھ؟"

"میں کوشش کرتا ہوں۔" راجا نے کہا۔ "سب میں نہیں تو کسی ایک بڑے اخبار میں شائع ہو جائے۔"

ایک بار پھر ہم حویلی سے نکلے تو خواتین نے بڑا واویلا کیا کہ کھانے کے وقت کہاں جا رہے ہو لیکن ان کو تفصیل سے آگاہ کرنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ غنی نے ایک مسلح گارڈ ہمارے ساتھ بٹھایا اور خود ڈرائیونگ کی۔ دوسری گاڑی میں شیر خان کے ساتھ مزید چار مسلح محافظ پیچھے رہے۔ صورت حال سخت کشیدہ تھی اور غنی کو ڈر تھا کہ دشمن کی طرف سے کارروائی کا اندیشہ ہے۔

جاتے ہوئے ڈاکٹر شہباز کی وفادار خیبر کار ایک جگہ بند ہوگئی تو غنی نے اور شیر خان نے پانچ منٹ میں خرابی تلاش کر لی۔ اگنیشن کوائل کا ایک تار نکل گیا تھا۔ جی ٹی روڈ پر جب ہم جہلم کے قریب تھے گاڑی پھر جھٹکے لینے لگی۔ ایک بار پھر دونوں ماہرین نے سر جوڑ کے مرض تلاش کیا۔ ڈسٹری بیوٹر کیپ کے اندر روٹر کو ریگ مال سے رگڑ کے صاف کیا اور پھر لگایا تو گاڑی رواں ہوگئی۔

میں نے کہا۔ "غنی! کیا یہ گاڑی بھروسے کے قابل نہیں رہی؟"

"ایسی بات نہیں سر۔ نئی گاڑیاں بھی رک سکتی ہیں۔

الیکٹرک فالٹ ہو تو اسے خرابی نہیں کہا جا سکتا۔"

"میں نے کہا تھا کہ ہمیں مزید گاڑیاں درکار ہیں۔"

جواب راجا نے دیا۔ "وہ عید کے روز مل جائیں گی۔ ایک ڈبل کیبن ہائی لکس ہے۔ ایک سوزوکی بولان ہائی روف اور ایک ایسی ہی کرولا۔" اس نے پیچھے اشارا کیا۔ "آج کل ڈیمانڈ زیادہ ہے۔ بکنگ پر بھی سال لگ جاتا ہے۔"

"مگر آن منی دے کر گاڑی مل جاتی ہے۔"

"ہاں۔ سب ملا کے چار لاکھ آن منی دی ہے۔ ورنہ اتنی جلدی ڈلیوری کا سوال ہی نہ تھا۔"

ست بدھائی میں پہلے پولیس چوکی تھی۔ پھر اسے اپ گریڈ کر کے تھانہ بنا دیا گیا۔ وہ جس ڈی ایس پی کے ماتحت تھا اس سے میں مل چکا تھا۔ وہ روایتی طور پر کرپٹ آدمی تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ رانا کو تھانے میں وی آئی پی ٹریٹمنٹ دیتا۔ اگر اسے ہماری طرف سے خطرہ نہ ہوتا اور یہ کیس خود ڈی آئی جی نے اپنی نگرانی میں ہینڈل نہ کیا ہوتا۔

تھانے کے باہر دس پندرہ افراد موجود تھے۔ یہ سب رانا کے حمایتی تھے۔ معلوم نہیں کیسے خبر رانا نگر پہنچ گئی تھی کہ بڑے رانا صاحب کے ساتھ چھوٹے رانا صاحب کو بھی گرفتار کر لیا گیا ہے۔ تھانے کا باہر والا گیٹ بند تھا۔ ہماری گاڑیاں بھی روک لی گئیں۔ غنی اور شیر خان دیگر محافظوں کے ساتھ کچھ فاصلے پر کھڑے ہو گئے۔ اسلحہ دونوں طرف تھا اور تصادم کا سخت خطرہ تھا۔

راجا کے ساتھ اندر جانے کے لیے مجھے ہنگامہ کرنا پڑا۔ میں نے گیٹ پر کھڑے سنتری کو ڈانٹا۔ "تمہیں پتا ہے میں کون ہوں؟ بلاؤ اندر سے کسی افسر کو ورنہ میں فون کرتا ہوں ڈی آئی جی عبداللہ جان کو۔"

وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلا مگر اس نے دوسرے بندے کو اندر بھیجا۔ چند منٹ میں تھانہ انچارج باہر آ گیا۔ ہمیں مطمئن کرنے کے لیے اس نے کانسٹیبل کو ڈانٹا کہ دیکھتے نہیں سامنے کون ہے۔ پھر وہ مجھے اندر لے گیا۔ متعلقہ ڈی ایس پی خود اس کے کمرے میں موجود تھا۔ غالباً وہ ڈی آئی جی کی ذاتی نگرانی کے باعث پہلے ہی پریشان تھا کہ اپنے مربی اور کرم فرما رانا صاحب کی کیا خدمت اور مدد کرے کہ اس کے تعلقات بھی متاثر نہ ہوں اور نوکری پر بھی حرف نہ آئے۔

مجھے دیکھ کے اس کی پریشانی دوچند ہوگئی۔ وہ یقیناً اچھی طرح جانتا تھا کہ رانا کی گرفتاری کے پیچھے کس کا دستِ عنایت ہے اور وہ آج حوالات میں تشریف فرما ہیں تو پولیس کی فرض شناسی کے باعث نہیں ہیں بلکہ اس میں رانا صاحب کے دشمن یعنی نواب رفیق احمد شیرازی کی ذاتی خواہش اور دلچسپی کا دخل تھا۔ گھر کے بھیدی سب جانتے ہیں۔ اسے یہ بھی علم ہوگا کہ موجودہ ڈی آئی جی صاحب سابقہ حکومت میں معتوب تھے۔ اب زیر عتاب رہنے والے برسر اقتدار آئے ہیں یا لائے گئے ہیں تو عبداللہ جان کے اقتدار کو سلام کرنا ضروری ہے کیونکہ وہ شاید آئی جی پنجاب کے عہدے کے لیے زیر غور ہے۔

اس نے کھڑے ہو کے مجھے سلامی دی۔ "نواب صاحب آپ نے کیسے زحمت کی۔ حکم کرتے میں حاضر ہو جاتا۔"

مجھے اس پذیرائی کے انداز سے خوشی ہوئی۔ کم سے کم اتنا تو ہوا تھا کہ اب مجھے رانا کے مساوی عزت و تکریم ملنے لگی تھی اس غرور میں کوئی بات قابل ستائش نہیں سمجھی جا سکتی کہ علاقے میں رعب اور دہشت کے اعتبار سے میں رانا کی ٹکر کا بڑا آدمی سمجھا جا رہا ہوں لیکن یہاں کی سیاست اور ضرورت کے پیمانے ہی ایسے تھے۔ خادم القوم بن کے آپ قوم کے خادم نہیں بن سکتے۔ صرف حاکم بن کے آپ کچھ کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔ بدقسمتی سے آج تک حاکم بننے کے بعد ایسا کسی نے نہ چاہا نہ کیا۔

"مجھے ڈی آئی جی عبداللہ صاحب نے ابھی گھر فون کیا تھا۔ آپ تو جانتے ہوں گے وہ ہمارے پرانے مہربان ہیں۔" میں نے بڑی رعونت آمیز انکساری سے کہا۔ اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ میرا تعلق آج کی برسرِ اقتدار پارٹی سے ہے۔

"جی۔ چائے منگواؤں آپ کے لیے؟"

میں نے ہاتھ کے اشارے سے انکار کیا۔ "عبداللہ جان نے کہا کہ کل ڈاکٹر شہباز کو ملزمان کی شناخت کی رسمی کارروائی کے لیے یہاں آنا ہوگا۔ کیا یہ ضروری ہے؟"

"وہ ایک ضابطے کی کارروائی ہے۔"

میں نے کہا۔ "ڈی ایس پی صاحب۔ رانا صاحب کو بھلا کون نہیں پہچانتا۔ ہم شناخت کر لیتے ہیں۔ صبح آپ حویلی میں آ کے ڈاکٹر صاحبہ سے دستخط کرالیں۔ کیا خیال ہے؟"

ڈی ایس پی نے تھانیدار کی طرف دیکھا کہ تم انکار کر دو۔ اس نے نظر جھکا کے اعتراف کیا کہ افسر اعلیٰ آپ ہیں۔ میں نے انتظار کیے بغیر حوالات کا رخ کیا تو ڈی ایس پی گھبرایا۔ "سر! ادھر نہ جائیں۔"

میں نے خفگی سے کہا۔ "کیوں؟ حوالات کیا ممنوعہ

علاقہ ہوتی ہے؟"

"راناصاحب کوشاید اچھا نہ لگے۔"

میں نے کہا" تم یہاں قانون کو دیکھتے ہو یا کسی کی پسند ناپسند کو۔ اس کے علاوہ مجھے اپنے ایک بندے کے بارے میں پتانہیں چل رہا ہے کہ وہ کہاں غائب ہوگیا۔ کسی نے بتایا ہے کہ اسے بے سبب یہاں بند کردیا گیا ہے۔ میں دیکھ لوں۔"

وہ میرے پیچھے لپکا۔"سر! دیکھیے آپ کے ساتھ راجا صاحب بھی ہیں۔"

میں نے کہا۔"ہاں! تم جانتے ہو وہ میرے دوست اور مشیر ہیں۔"

"وہ ایک صحافی ہیں۔ میں کسی جرنلسٹ کو اجازت نہیں دے سکتا۔" ڈی ایس پی نے کہا۔

"تم مجھے روک بھی نہیں سکتے۔" راجا اکڑ گیا۔

"میں سب کچھ کرسکتا ہوں۔ آپ ایک قانونی معاملے کا تماشا بناؤ گے۔ سنسنی پھیلاؤ گے۔"

"دیکھو ڈی ایس پی صاحب۔ تم نے اب تک قتل اغوا اور حبس بے جا جیسے سنگین جرائم میں ملوث ایک شخص کی پوری پشت پناہی کی۔"

"یہ غلط ہے۔ الزام ہے۔"

"کیا غلط ہے کیا سچ ہے۔ یہ ہم سے بہتر کون جان سکتا ہے۔ تم ہماری مدد سے کہانی بناتے ہو۔ بدلتے ہو۔ اپنی کارکردگی کا ڈراما پبلک کے سامنے پیش کرنے کے لیے پریس کا سہارا لیتے ہو۔ تھانے کے مال خانے کا اسلحہ سجا کے کہتے ہو ہم نے برآمد کیا۔" راجا جھٹکے سے اکڑ گیا۔"تصویریں چھپوانے کے لیے ہمیں بلاتے ہو۔ میں دیکھتا ہوں تم کیسے روکتے ہو مجھے۔"

میں نے کہا۔"ڈی ایس پی۔ بات کو مت بڑھاؤ۔ صحافیوں کی یونین تو بعد میں نمٹنے کی تم سے۔ میرے بندے بھی باہر اشارے کے منتظر کھڑے ہیں۔ ادھر مسلح تصادم ہوجائے گا۔ اگر تم نے رانا کے ساتھ کوئی ترجیحی سلوک کیا۔"

"ایک ایسے شخص کو جس نے خود اپنی بیٹی کا خون کیا۔ ایک لیڈی ڈاکٹر کو اغوا کر کے اپنی حویلی میں قید رکھا اور تشدد کا نشانہ بنایا۔ اس کو تم وی آئی پی ٹریٹمنٹ دو گے تو اپنے لیے مشکلات بڑھاؤ گے۔ صبح کے ہر اخبار میں پوری رپورٹ آجائے گی۔"

ڈی ایس پی پریشان ہوگیا۔"آپ کو سمجھنا چاہیے کہ وہ میرے ایم پی اے ہیں۔ اس علاقے سے منتخب ہوتے رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔"پھر ڈی آئی جی صاحب نے ان کو گرفتار کیوں کیا۔ کیا تم ان سے پوچھو گے۔" میں نے موبائل فون نکالا۔"میں بات کروں؟"

ڈی ایس پی نے مجبوری میں سر ہلایا۔"اچھا جی۔ جیسی آپ کی مرضی لیکن راجا صاحب کچھ ہماری نوکری کا خیال کرنا۔"

"مجھے معلوم ہے اب تمہاری پرموشن کا وقت قریب ہے۔ اگر تم ہم سے تعاون کرو گے تو صحافی تمہیں سپورٹ کریں گے۔"

رانا ابھی حوالات میں تھا۔ اسے کچھ دیر پہلے خود عبداللہ جان نے یہاں بند کرایا تھا۔ فوری طور پر یہ ممکن نہیں تھا کہ اسے حوالات سے نکال کے کسی آرام دہ کمرے میں پہنچا دیا جائے جہاں اس کے لیے بیڈ ہو۔ گھر سے آیا ہوا کھانا ہو اور تھانے میں گھر جیسی راحت کے اسباب فراہم کردیے جائیں۔ رانا کے بیٹے نے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ وہ باپ کے جرم کی لپیٹ میں آگیا تھا اور پکڑا گیا تھا۔

حوالات میں چار دیگر قیدی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک باریش شخص تھا۔ دو نوجوان صورت سے ہی آوارہ گرد اور اچکے لگتے تھے۔ چوتھا ایک ضعیف شخص تھا جو گھٹنوں میں سر دیے رو رہا تھا۔ رانا اس دس بائی آٹھ کے مختصر سے کمرے میں کسی زخمی شیر کی طرح ٹہل رہا تھا جیسے ابھی ابھی جنگل سے پکڑ کے لایا گیا ہو۔

زوہیب نے مجھے غصے اور نفرت سے دیکھا مگر کچھ بولا نہیں۔ رانا ایک دم میری طرف آیا اور حوالات کی سلاخوں کو پکڑ کے کھڑا ہوگیا۔"تو تماشا دیکھنے آیا ہے نا۔ نواب کے نطفے۔"

میں نے کہا۔"وقت وقت کی بات ہے رانا۔ پہلے میں تماشا تھا اور تم تماشائی۔"

وہ مجھے گالیاں دینے لگا۔"تو بہت چالاک بنتا ہے... تو نے اس کنجری کے ساتھ مل کے اغوا کیا۔"

میں نے کہا۔"یہ رانا نشے میں تو نہیں ہے۔"

"میں تجھے چھوڑوں گا نہیں..." وہ چلایا۔

راجا نے اچانک اندر چھپایا ہوا کیمرا برآمد کیا اور کھٹا کھٹ رانا کی تصویریں اتارلیں۔ ایک تصویر میں زوہیب بھی تھا اور اس کے ساتھ دیگر حوالاتی بیٹھے تھے۔ ابھی اس نے تصویریں ہی اتاری تھیں کہ فلیش چمکنے سے ڈی ایس پی کو صورتِ حال کی سنگینی کا اندازہ ہوا۔

رانا نے چیخ کے کہا۔"اوئے ڈی ایس پی۔ تو نے اجازت دی اپنی ماں کے یاروں کو۔ یہ تصویریں اتار رہے ہیں اخبار میں شائع کرنے کے لیے۔"

ڈی ایس پی ایک دم سامنے آگیا۔"راجا صاحب! کیمرا مجھے دے دیں۔"

راجا نے کیمرا پیچھے کیا۔"یہ نہیں ہوسکتا۔"

ڈی ایس پی نے کسی کو آواز دے کے بلایا۔ تھانہ انچارج کے ساتھ دو کانسٹیبل آگئے۔ افسرِ اعلیٰ کے حکم پر وہ راجا سے کیمرا چھیننے آگے بڑھے۔ راجا نے ایک کو دھکا دیا۔"اگر زبردستی کی تو اچھا نہیں ہوگا۔" راجا نے چلا کے کہا مگر ایک کے بعد دوسرا آگیا۔

میں نے کہا۔"ڈی ایس پی صاحب! ایک صحافی پر تشدد ہو رہا ہے میرے سامنے تمہارے حکم پر۔ میں ڈی آئی جی سے بات کرتا ہوں۔"

ابھی میں نمبر ملا ہی رہا تھا کہ راجا نے بھی موبائل فون نکال لیا۔ وہ معلوم نہیں کس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ دونوں کانسٹیبل اس پر پل پڑے اور ان کے درمیان کھینچا تانی اور مار پیٹ شروع ہوگئی۔

میں نے ڈی ایس پی کو وارننگ دی۔ اگر تم نے اپنے بندوں کو نہ روکا تو میں اپنے سیکورٹی گارڈز کو بلاؤں گا۔"

ڈی ایس پی نے اس کے باوجود کوئی حکم جاری نہیں کیا۔ یہ تھانہ انچارج کی دوراندیشی تھی کہ اس نے تھانے میں صورتحال کو خراب ہونے سے بچایا۔ تھانے کی کل نفری پانچ افراد پر مشتمل تھی اور اگر سچ مچ غنی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ آجاتا تو بہت خون خرابا ہوتا۔ تھانے کے عملے کے پاس پرانا متروک اسلحہ تھا اور غنی کے ساتھی جدید ترین کلاشنکوف تک ساتھ لائے تھے۔ ان کا مقصد ہرگز اسے استعمال کرنا نہیں تھا۔ نہ میں اتنا بے وقوف تھا کہ انہیں تھانے میں فائرنگ کے لیے کہتا اور نہ وہ میرے کہنے سے کسی کو شوٹ کرتے۔ ایک معمولی سے اختلاف کو سنگین جرم بنانا پاگل پن کہلاتا۔ میں صرف اپنی طاقت کا مظاہرہ کر کے تھانے میں دہشت پیدا کرنا چاہتا تھا۔

مجھے بڑی خوشی ہوئی جب ڈی ایس پی غصے اور خفت میں واپس جا کے آفس میں بیٹھ گیا اور تھانہ انچارج نے راجا سے کیمرا چھیننے کی کوشش کرنے والوں کو ڈانٹ کے باہر نکال دیا پھر اس نے مجھ سے کہا۔"نواب صاحب! میرے کمرے میں آئیے۔ ہم بیٹھ کے بات کرتے ہیں۔"

جب ہم لوٹ کے تھانہ انچارج کے کمرے کی طرف جارہے تھے تو راجا نے بڑی چالاکی سے ایک دم راستہ بدلا اور باہر کی طرف دوڑ لگائی۔ کسی کے کچھ سمجھنے سے پہلے ہی اس نے غنی سے چلا کے کہا۔"غنی! یہ لے کر بھاگ جاؤ۔" اور کیمرا اس کی طرف اچھال دیا۔ پھر وہ مسکراتا ہوا ہماری طرف آگیا۔

باہر کیا ہوا؟ یہ میں نے اندھیرے کے باعث نہیں دیکھا۔ باہر غنی نے کیمرا کیچ کیا اور ایک سیکورٹی گارڈ سے کہا۔"چل تو نکل جا نٹافٹ۔" اور وہ گارڈ کیمرا لے کر بھاگا تو رات کی تاریکی میں ایسا گم ہوا کہ کسی کے ہاتھ نہ آیا۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔

تھانہ انچارج بھی میرے ساتھ کمرے کے دروازے پر رک گیا تھا۔ اس کا چہرہ غصے سے لال ہوگیا۔"راجا صاحب! یہ آپ نے ٹھیک نہیں کیا۔"

راجا اب بے فکر تھا۔"آپ نے کیا ٹھیک کیا تھا۔ آپ کے ڈی ایس پی صاحب نے کیا ٹھیک کیا تھا۔ میں کیا اتنا بے وقوف ہوں کہ اپنا کیمرا نہ بچاتا۔ اگر ڈاکو آپ سے گن چھیننے کی کوشش کریں تو آپ کیا کریں گے؟"

میں نے کہا۔"راجا نے میرے خیال میں کوئی جرم نہیں کیا۔ جرم اگر ہے تو آپ کا کہ ایک صحافی سے زبردستی کیمرا چھیننے کے لیے اس کو تشدد کا نشانہ بنایا۔ اس کا گواہ میں ہوں۔"

ڈی ایس پی کے نزدیک تھانہ انچارج کی یہ غلطی ناقابلِ معافی تھی کہ اس نے ایک صحافی کو تھانے کی حوالات تک پہنچ کر تصویریں اتارنے کی پھر تصویریں باہر ارسال کرنے کی اجازت دی اور ایم پی اے رانا رجب علی کی عزت کو خاک میں ملانے والوں کو روکنے میں ناکام رہا۔ وہ بڑی مشکل میں پھنس گیا تھا۔

میں نے چلتے وقت تھانہ انچارج کی حوصلہ افزائی کے

لیے کہا۔ ''آپ بالکل فکر مند نہ ہوں۔ میرے نزدیک آپ نے ہوش مندی سے کام لیا ورنہ کچھ پتا نہیں معاملات کس حد تک خراب ہو سکتے تھے۔''

''خرابی تو اب ہوگی۔'' ڈی ایس پی بولا۔ ''تصویریں شائع ہونے سے..''

میں نے کہا۔ ''کیا تمہیں اندازہ نہیں کہ تم راجا پر تشدد کرتے۔ اس کا کیمرا چھین لیتے یا فلم نکال لیتے تو اس کا ردِ عمل کیا ہوتا۔ سارے صحافی تمہارے خلاف ہو جاتے۔ تمہارے خلاف احتجاج ہوتا۔ اخبار ٹی وی اس معاملے کو کہاں لے جاتے۔ وزارتِ اطلاعات ونشریات اور وزارتِ داخلہ اس کا نوٹس لینے پر مجبور ہو جاتیں۔ تم معطل ہو جاتے۔ رانا تمہیں بچا نہیں سکتا تھا۔''

ہم آدھے راستے میں تھے جب میں نے فاروقی کی کار کو سامنے سے آ کے اپنے پاس سے گزرتے دیکھا۔ صرف ایک لمحے کے لیے اس کی اور میری نظریں چار ہوئیں تو مجھے انقلابِ زمانہ پر حیرت سے زیادہ دکھ کا احساس ہوا۔ آدمی وفا کرتا ہے تو قدر نہیں کھوتا۔ ہوس نے فاروقی کو سب کچھ دے کے اس سے سب چھین لیا تھا۔ اس کو پیسے کی کمی نہ تھی لیکن پیسے کی خاطر ہی اس نے دوستی کے رشتوں کو قربان کیا اور میرے دشمنوں سے مل گیا۔ وہ میرا دوست تھا اور دشمن بن گیا۔ یہ بھی ہوس کے سوا کچھ نہ تھا کہ اس نے لیلیٰ بھابی جیسی بیوی کو چھوڑا۔ مریم سے چھپ کے شادی کی اور اسے بھی ایک سازش کی بھینٹ چڑھا دیا۔ ایک تیر سے دو شکار کرنے چاہے۔ مریم کے قتل کے الزام میں وہ لیلیٰ بھابی کو تختۂ دار تک پہنچا دیتا لیکن انہیں اللہ نے بچایا۔ آج فاروقی کے پاس کچھ نہیں تھا۔ نہ وہ دوست نہ اس کی وفادار محبت کرنے والی بیوی۔ اسے نہ پیسا ملا نہ میری جاگیر۔ وہ اب رانا کے ساتھ مل کے دشمنی کو آگے بڑھا رہا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ خوار ہو رہا تھا۔

راجا نے سخت ناراضی کا اظہار کیا۔ ''دیکھے پتر! آدمی کس حد تک گر سکتا ہے۔ یقین نہیں آتا۔ کل تک یہ شخص تیری دوستی اور خلوص کا دم بھرتا تھا۔ آج دشمنی میں رانا سے مل گیا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''زندگی کا تجربہ آدمی کو بہت کچھ سکھاتا ہے۔ میرا خیال ہے تو بھی مارِ آستین ثابت ہو سکتا ہے۔''

اس نے میری بات پر غور ہی نہیں کیا۔ ''اب تجھے واپس جانا ہے اور مجھے لاہور۔''

میں سمجھ گیا کہ اس کو اچانک لاہور جانے کی کیوں سوجھ گئی۔ ''کیا فون پر بات کرنے سے کام نہیں ہو سکتا؟''

خبر شاید لگ جائے لیکن تصویر زیادہ اہم ہے۔ کل دیکھنا اخبار کی اشاعت بڑھ جائے گی۔ پوچھ وہ کیسے؟''

''میں نہیں پوچھوں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ تو کل اس علاقے میں اخبار مفت تقسیم کرائے گا۔''

''ہاں۔ ایسی یادگار تصویر ہوگی اپنے رانا صاحب کی۔ میرے بس میں ہوتا تو ان لارج اور فریم کرا کے ہر گھر میں دیتا کہ دروازے پر ٹانگ لیں۔''

میں نے کہا۔ ''ایک گاڑی دو جگہ نہیں جا سکتی۔''

''گاڑی تو لے جا۔ مجھے دینہ سے بھی کرائے کی کار مل جائے گی۔ میں صبح سے پہلے واپس آنا چاہتا ہوں۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ خود نہ گیا تو کام نہیں ہوگا۔ نہ خبر لگے گی اور نہ تصویر۔ میں سر پر کھڑے رہ کر یہ کام کراؤں گا۔''

میں نے کہا۔ ''راجا! تیرا اتنا بڑا نام ہے۔''

''بڑا نام تھا دیکھے پتر! اب میں خود رپورٹر ہوں نہ ایڈیٹر۔ جو آدمی فیلڈ میں ہو اس کا اختیار چلتا ہے۔ ورنہ سب سالے نظریں پھیر لیتے ہیں۔ ابن الوقت۔ طوطا چشم۔ خبر لگوانے کے لیے بھی اپنے ہی پرانے ساتھی بہانے بنانے لگتے ہیں۔''

''تیرے کالم کی مار بہت دور تک ہے۔''

''کالم کی بات اوپر والوں تک دیر سے پہنچتی ہے اور اس کا تعلق بھی خبر سے نہیں کسی انتظامی معاملے کوتاہی یا پالیسی سے ہوتا ہے۔''

اس کی بات کے دوران ہی میرے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے نمبر دیکھ کے راجا سے کہا۔ ''اللہ خیر کرے۔'' اور پھر فون میں کہا۔ ''ہیلو۔''

دوسری طرف سے عبداللہ جان کی آواز سنائی دی۔ ''نواب رفیق!''

میں نے کہا۔ ''جی! خیریت ہے ڈی آئی جی صاحب!''

''کہاں ہیں آپ اس وقت؟''

میں نے اس کے رویے اور لہجے کے پیشِ نظر غلط بیانی سے گریز کیا۔ ''واپس جا رہا ہوں ست بدھالی۔''

''راجا صاحب بھی آپ کے ساتھ ہوں گے؟''

میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔ ''جی نہیں... وہ تو راستے میں اتر گئے تھے۔''

''کہاں جانے کے لیے۔ کسی اخبار کے دفتر۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے کچھ بتایا نہیں انہوں نے۔ آپ

کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''آپ زحمت کریں اور فوراً واپس آ جائیں۔ راجا صاحب سے آپ کہہ دیں۔ یا مجھے بتا دیں میں بات کر لیتا ہوں۔''

''ایسی کیا بات ہے سر!''

''اگر آپ واقعی نہیں سمجھے تو میں صاف بتا دوں۔ آپ کچھ دیر پہلے پولیس اسٹیشن گئے تھے۔ مجھے ڈی ایس پی نے فون کر کے بتایا۔ جو بھی وہاں ہوا ٹھیک نہیں تھا۔ میں اس پر کوئی ایکشن نہیں لوں گا اگر آپ بھی کچھ سمجھ سے کام لیں۔''

میں نے کہا۔ ''میرے خیال میں وہاں ہم نے کوئی بے وقوفی نہیں کی۔''

''میں نے بھی ایسا نہیں کہا۔ آپ واپس آ جائیں۔ میں بھی آپ کا منتظر ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''کیا واپس تھانے آنے سے قبل مجھے اپنے قانونی مشیر سے بات نہیں کر لینی چاہیے۔ ضمانت قبل از گرفتاری کے لیے؟''

''میں نے کہا نا کہ کوئی ایکشن نہیں لینا چاہتا۔ میں پہلے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''اس کا مطلب اس کے سوا کیا نکلتا ہے کہ آپ نے میری بات نہ مانی تو میں ایکشن لوں گا۔'' میں نے کہا۔

''آپ کو میری زبان پر اعتبار نہیں، نواب صاحب!''

میں نے کہا۔ ''او کے میں آتا ہوں۔''

راجا میری بات سن کے سر پکڑنے لگا۔ ''میں سمجھ گیا وہ کیا کہے گا۔ وہ کہے گا کہ تصاویر اور خبر شائع نہیں ہونی چاہیے۔''

''رانا نے اوپر سے فون کروائے ہوں گے۔''

''وہ فاروقی بھی تو پہنچ گیا ہے۔'' راجا نے خفگی سے کہا۔ ''اب تو ہمارا انکار تو ہم کر سکتے ہیں۔ کوئی سالا ڈی آئی جی مجھے کیسے روک سکتا ہے۔ لیکن اس سے خرابی یہ ہوگی کہ ہم ایک اچھا حمایتی کھو دیں گے۔ مصلحت کے تقاضے نظر انداز کرنا ہم افورڈ نہیں کر سکتے۔''

راجا کی بات میں وزن تھا۔ میں نے غنی سے کہا کہ گاڑی واپس موڑ لے۔ راجا کو میں نے پولیس اسٹیشن سے کچھ فاصلے پر اتارا اور پولیس اسٹیشن میں اکیلا ہی گیا۔ وہاں کا ماحول بالکل بدلا ہوا تھا۔ تھانہ انچارج اپنے ہی کمرے کے دروازے پر کسی کانسٹیبل کی طرح کھڑا تھا اور چائے لانے اور گھنٹی کی آواز پر ''یس سر'' کہہ کے دوڑنے پر مامور ہو۔ اندر اعلیٰ افسر کے ساتھ اعلیٰ ترین افسر جو بیٹھا تھا۔

میرے لیے چق بھی تھانہ انچارج نے بڑے احترام سے اٹھایا۔ اندر میں نے عبداللہ جان کے عین مقابل رانا کو دیکھا۔ ڈی آئی جی کے دائیں ہاتھ پر ڈی ایس پی موجود تھا جو ایک اشارے پر اٹھا اور باہر نکل گیا۔ میں نے اس کی جگہ لے لی۔ رانا کا چہرہ سخت کشیدہ تھا عبداللہ جان نے اس کشیدگی کو کم کرنے کے لیے مسکرا کے مجھ سے ہاتھ ملایا۔

چائے وہاں پہلے سے موجود تھی اور شاید وہ میری آمد ہی کے منتظر تھے۔ عبداللہ جان نے تھرماس سے ایک کپ چائے نکال کے میری طرف اور رانا کی طرف بڑھائی۔ مجھے فاروقی کی غیر حاضری عجیب لگی مگر میں نے سوال نہیں کیا۔ میں نے کہا۔ ''آپ نے حکم دیا تو میں حاضر ہو گیا۔ اب فرمایئے۔''

عبداللہ نے کہا۔ ''پہلے چائے پئیں۔ رانا صاحب آپ بھی۔''

چند سیکنڈ خاموشی میں گزر گئے۔ رانا اور میں ایک دوسرے سے نظر ملانے سے گریز کرتے رہے پھر میں نے کہا۔ ''راجا کو میں نے فون کر دیا تھا۔ وہ بھی آنے والا ہے۔''

راجا نے ایسے ڈرامائی انٹری دی جیسے اسٹیج کے کردار کسی ڈائیلاگ کے ختم ہوتے ہی اپنا کردار ادا کرنے آتے ہیں۔ چوتھی کرسی اس کے لیے خالی تھی۔ چائے کا ایک کپ اس کے لیے بھی موجود تھا۔

عبداللہ نے کہا۔ ''آپ کو غالباً یہ بتانا ضروری نہیں کہ میں نے آپ کو واپس آنے کی زحمت کیوں دی۔''

میں نے کہا۔ ''آپ کو سیکریٹری داخلہ یا وزیر داخلہ جیسی کسی توپ چیز کا حکم ملا ہوگا۔ گورنر یا صدرِ مملکت کے کسی مشیر نے کہا ہوگا کہ سیاست کی بساط الٹ جائے گی اگر...''

اس نے ہاتھ اٹھایا۔ ''نو سر! نہ ایسی بات ابھی تک ہوئی ہے اور نہ میرے ساتھ کوئی کر سکتا ہے۔ سب میرے مزاج کو جانتے ہیں۔''

راجا نے کہا۔ ''یعنی صرف آپ کی خواہش ہے کہ ایک خبر یا تصویر شائع نہ ہو۔ حاکم تو آپ بہرحال ہیں۔''

''میں آپ کے طعنے کا برا نہیں مان سکتا۔ کیونکہ میرے سامنے ایک مقصد ہے۔ آپ کو حکم دیا جائے گا نہ دھمکی دی جائے گی۔ ایک بات اگر آپ سمجھ لیں تو پھر جو آپ کی مرضی۔''

میں نے کہا۔ ''اسی لیے میں لوٹ آیا کہ میں باہمی تعاون کے شعبے کو مجروح نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جس کے لیے میں نے خود بھی ابتدا سے کوشش کی لیکن اسے ناکام بنا دیا گیا۔''

عبداللہ نے چائے ختم کی اور بولا۔ ''میں نے اس

علاقے کا چارج ابھی لیا ہے۔ ممکن ہے کچھ لوگ مجھ پر جانبداری کا الزام لگاتے ہوں لیکن اصل بات یہ نہیں۔ میں جانبداری سے کام نہیں لیتا تو مخالف یہی کہہ سکتے ہیں۔ مجھے قطعی اس بات کی پروا نہیں کہ میرے علاقے میں امن و امان کی اور انتظامی صورتِ حال خراب ہوگی تو اثر میری پروموشن پر پڑے گا۔ میں آئی جی بننے سے رہ جاؤں گا۔ نو سر۔ مجھے اس سے بھی فرق نہیں پڑتا۔ میں نے جتنی گڈول کمالی۔ کافی ہے۔ باقی عزت ذلت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ کسی نواب یا رانا کے ہاتھ میں نہیں۔ کوئی مجھے سیاسی کھیل میں استعمال نہیں کرسکتا۔"

وہ تھوڑی دیر کے لیے رکا اور اٹھ کر دروازے تک گیا۔ اس نے سخت لہجے میں کہا۔ "وکیل صاحب۔ آپ سے میں نے کہا تھا کہ دوسرے کمرے میں بیٹھیے۔"

"میں یہاں بیٹھنے نہیں آیا۔ اپنے مؤکل سے ملنے اور اس کی ضمانت پر رہائی کے لیے آیا ہوں۔" فاروقی نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔ کمرے میں آپ کے مؤکل پر کوئی تشدد نہیں ہو رہا ہے پھر آپ کیا دیکھ رہے ہیں چھپ چھپ کے۔ آپ کو اپنے مؤکل سے ملاقات کا موقع دیا جائے گا۔"

وہ لوٹ کے اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ "آمدم برسر مطلب۔ نواب صاحب۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ میں گرفتاری کے معاملے میں کسی مجرم سے رعایت نہیں کرتا۔ وہ آپ نے دیکھ لیا۔ پھر آپ کو تھانے میں آکے یہ تماشا دیکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ صرف اپنا دل خوش کرنے آئے تھے آپ۔"

میں نے تلخی سے کہا۔ "ذرا رانا صاحب سے پوچھیں۔ آخر یہ سیٹلائٹ ٹاؤن تھانے میں کیا دیکھنے تشریف لائے تھے؟ اور کس حیثیت میں؟"

"چھوڑیں پرانی بات۔ انہوں نے بھی غلط کیا تھا۔ آپ سمجھیں معاملہ برابر ہوگیا۔ آپ نے تھانے کے اندر ہنگامہ کیا۔ تصویریں اتاریں۔"

"تصویریں میں نے اتاریں۔" راجا بولا۔

"وہ مجھے واپس کردیں۔" ڈی آئی جی نے کہا۔

"آئی ایم سوری۔ کیمرا میں نے کسی کو دے دیا۔"

عبداللہ کا موڈ خراب ہوگیا۔ "اگر تصویریں شائع ہوں گی تو ہمارے آپ کے تعلقات دوستانہ نہیں رہیں گے۔ سرکاری ہو جائیں گے۔"

"کیا یہ ایک دھمکی ہے؟" راجا نے کہا۔

"آپ اس کا یہ مطلب نکالنا چاہیں تو میں کیسے روک سکتا ہوں۔ میں صرف تعاون کی درخواست کر رہا ہوں۔ سب کے مفاد میں۔ حالات کو خراب سے خراب تر کی طرف مت لے جائیں۔ آپ کو یہاں رہنا ہے رانا صاحب۔ یہ آپ سے بھی کہہ رہا ہوں۔ آپ ساری دنیا کو اپنی مرضی سے نہیں چلا سکتے۔ اس دنیا کو اپنے مزارعین اور ملازمین یا اپنے گھر تک محدود رکھیں۔ ہر شخص آپ کے حکم کے تابع نہیں ہے اور آپ جتنی جلدی ہو یہ حقیقت... تسلیم کرلیں آپ کے حق میں بہتر ہے کہ دنیا بدل رہی ہے۔ تبدیلی کے اس عمل کو آج تک کوئی نہیں روک سکا ہے۔"

رانا نے کہا۔ "آپ صرف مجھ سے کیوں کہہ رہے ہیں؟"

"کیونکہ آپ کی عزت مجھے خطرے میں نظر آرہی ہے۔"

رانا بگڑ گیا۔ "کس کی مجال ہے جو میری عزت کی طرف انگلی اٹھائے۔"

میں نے کہا۔ "چھوڑیں ڈی آئی جی صاحب۔ آپ کسے سمجھا رہے ہیں۔ یہ پتھر کے خدا کب سے پوجے جا رہے ہیں اور ان کی آنکھیں آنے والے وقت کو دیکھنے سے قاصر ہیں۔ بڑے بڑے بت کیسے پاش پاش ہو رہے ہیں۔"

"اوئے نواب ڈائیلاگ زیادہ مت مار۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں ادھر تجھے۔ ہم جدی پشتی رئیس ہیں۔ بیس بیس کوس تک ہمارے نام کا سکّہ چلتا ہے۔"

راجا نے کہا۔ "میں اجازت چاہتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "کل بیس بیس کوس میں وہ اخبار ہم تقسیم کریں گے۔ جس میں تمہاری تصویر شائع ہوگی۔"

عبداللہ نے کھڑے ہو کے کہا۔ "پلیز! بیٹھ جائیں۔ رانا صاحب۔ راجا صاحب۔ نواب صاحب! مجھے اتنا زچ نہ کریں کہ میں تنگ آکے سب کو بند کردوں۔ پھر جو ہو سو ہو۔ کوئی پھانسی نہیں لگا دے گا مجھے۔ میرے اختیار میں سب کچھ ہے۔"

راجا نے کہا۔ "آپ مجھ سے شروع کریں پہلے مجھے بند کریں۔"

کچھ دیر کے لیے کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ پھر عبداللہ جان نے کہا۔ "میرا خیال ہے ابھی بات کرنا فضول ہے۔ راجا صاحب! میری درخواست ہے کہ آپ اس تصویر اور خبر کو روک سکتے ہیں تو روک دیں۔ ورنہ میں آپ کو چھوڑوں گا..."

رانا نے غصے سے کہا۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟"

"ہاں... میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ کسی صحافی سے میں صرف درخواست کرسکتا ہوں کہ کسی معاملے کو میرے نقطۂ نظر سے سمجھتے ہوئے زیادہ نہ اچھالے اگر میں اسے حکم نہیں دے سکتا کہ کسی گرفتار ملزم کی اسٹوری یا تصویر نہ چھاپے۔ یہاں تو

صحافی پر حملے کو صحافت پر حملہ سمجھ لیا جاتا ہے جیسے مولوی پر حملے کو اسلام پر حملہ۔ مگر میں دونوں ملزمان کو حوالات میں ڈال دوں گا۔"

میں نے محسوس کیا کہ دورانِ گفتگو میری طرف دیکھتے ہوئے عبداللہ جان نے آہستہ سے آنکھ کو دبایا ہے۔ ایسے کہ محسوس بھی نہ ہو۔ شاید یہ میرا وہم تھا۔ میں نے سوچا لیکن میں نے غور کیا تو عبداللہ جان کی دھمکی کے پیچھے ایک سیاسی چال تھی۔

رانا نے کہا۔ "میرا وکیل ضمانت کرانے آگیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "اور مجھے آپ کس جرم میں بند کریں گے؟"

"آپ دونوں سے اندیشۂ نقص امن ہے۔ چھوڑا گیا تو فساد کا ڈر ہے۔ رہ گیا وکیل تو کہاں ہے وکیل۔ ابھی تک تو آیا نہیں۔ آئے گا تو آپ سے ملوا دیں گے۔ وہ ضمانت کرالے گا تو آپ کو چھوڑ ہی دیں گے ورنہ عید آپ دونوں سرکاری مہمان کی حیثیت سے گزاریں گے رانا صاحب۔"

میں نے کہا۔ "بالکل ٹھیک۔ میں آپ کے اختیار اور فیصلے کو چیلنج نہیں کرسکتا۔ خیر میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ عدالت مجھے رہا کردے گی۔"

عبداللہ جان نے تھانیدار کو آواز دی۔ وہ اندر آیا تو عبداللہ جان نے کہا۔ "بھئی دیکھو ذرا رانا صاحب کا وکیل ہے کوئی۔ ابھی تک تو وہ آیا نہیں۔"

ہوشیار ماتحت کو اشارا کافی تھا۔ "ہاں جی۔ ادھر تو کوئی بھی وکیل نہیں آیا۔"

رانا چلّانے لگا۔ "کیا بولتے ہو۔ میں اس سے بات کر چکا ہوں۔ اس کی گاڑی باہر کھڑی ہے۔"

ڈی آئی جی نے کہا۔ "ابھی آپ کو دکھا دیتے ہیں۔ تھانے میں نہ وکیل ہے نہ اس کی گاڑی۔ کیا پتا راستے میں اس کے ساتھ کوئی حادثہ ہو گیا ہو۔"

تھانیدار نے کہا۔ "ہاں جی راستہ بڑا خطرناک ہے۔" اور باہر نکل گیا۔

رانا کا پارا چڑھ گیا۔ "تم میرے ساتھ چالاکی مت دکھاؤ۔ میں اسمبلی کا ممبر ہوں۔ فلور پر یہ مسئلہ اٹھاؤں گا۔"

"ضرور سر! یہ آپ کا استحقاق ہے۔"

میں نے کہا۔ "صبح تک میرا وکیل بھی پہنچ جائے گا۔"

ڈی آئی جی نے پھر تھانیدار کو آواز دی۔ "بھئی ان معزز مہمانوں کو لے جاؤ سرکاری مہمان خانے میں اور کسی کو اندر مت چھوڑو دو دن تک۔ ہاں اخبار والے آئیں تو انہیں مت روکنا۔ راجا صاحب۔ میری طرف سے اجازت ہے جتنی تصویریں چاہو بناؤ۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

تھانیدار نے کہا۔ "چلو جناب!"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "چلو"

رانا کا رنگ اڑ گیا۔ اس کا سارا غرور اور غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ ڈی آئی جی نے خالص تھانیداروں والا داؤ کھیلا تھا۔ رانا کی اکڑ فوں کو وہ اپنے غیر قانونی اختیارات سے خاک میں ملا سکتا تھا۔ اگر وہ فاروقی کو تھانے سے غائب کرا دیتا تو رانا کیسے ثابت کرتا کہ کوئی وکیل اس سے ملنے آیا تھا۔ وہ فاروقی کی گاڑی کو بھی غائب کرا سکتا تھا۔ یہاں سارے بندے پولیس کے تھے۔ وہ سب افسرِ اعلیٰ کے اشارے پر گردن انکار میں ہلانے لگتے کہ انہوں نے تو نہ کسی وکیل کی گاڑی دیکھی نہ وکیل کو دیکھا۔ بعد میں فاروقی کیس کرتا رہے کہ پولیس نے اس کو اغوا کر کے دو دن بند رکھا اور اس کی گاڑی چھین لی۔ گاڑی کسی جنگل سے ملتی اور فاروقی کسی پہاڑ کی غار سے دستیاب ہوتا تو کیا ثابت کرتا اور کیسے۔

لیکن درمیان میں راجا کی ارسال کردہ خبریں اور تصویریں اگر اخبار میں نظر آئیں تو رانا صاحب کی صدیوں کی آن بان اور شان خاک میں مل جاتی۔ ان کی عزت کا جنازہ نکل جاتا۔ نواب رفیق تو ان کے نزدیک عزت دار ہی نہ تھا۔ بھلا ایک کالج کے پروفیسر میں بھی کیا خاندانی بات ہوسکتی ہے۔ تنخواہ لیتا ہے اور پڑھاتا ہے۔ خود مجھے کسی جدّی پشتی عزت کے پامال ہونے کی نہ فکر تھی نہ اندیشہ تھا۔ جاننے والوں کو پتا چل ہی جاتا کہ مجھے بھی اندیشۂ نقص امن کے تحت بند کرنا ایک قانونی ضرورت تھی۔ امی ابا ہوتے تو یقیناً بہت پریشان ہوتے۔ ست بدھائی کی حویلی میں راجا ساری صورتِ حال سمجھا دیتا۔ خواتین جذباتی طور پر سخت ڈسٹرب ہوتیں اور شاید آنسو بھی بہاتیں کہ عید کے دن رفیق میاں حوالات میں ہیں۔ گھر میں ہوتے تو شیر خرما اور پلاؤ کھاتے۔ وہاں کیا کھا رہے ہوں گے۔ علاوہ تیرہ نمبر کے چھتر کے۔

میں عبداللہ جان کے پیچھے پیچھے باہر آیا تو رانا کو بھی اٹھنا پڑا۔ اسے یقین تھا کہ باہر فاروقی کا قانونی مشورہ مشکل صورتِ حال پیدا ہی نہیں ہونے دے گا۔ ڈی آئی جی کسی کام سے یا جانتے بوجھتے کہیں غائب ہو گیا تو رانا نے تھانیدار سے کہا۔ "اوئے وہ اپنا یار فاروقی کدھر ہے؟"

تھانیدار نے گول مول جواب دیا۔ "پتا نہیں جناب۔"

رانا نے دھاڑ کے کہا۔ "پتا نہیں کا کیا مطلب؟ بندہ تھانے میں تھا۔ کوئی سوئی تو ہے نہیں کہ گم گئی۔"

''ہاں۔ آپ دیکھ لیں۔ ہوں گے کہیں۔ میں آتا ہوں۔'' وہ جان چھڑانے کے لیے دوسری طرف نکل گیا۔

رانا نے باہر دیکھا تو احاطے میں فاروقی کی گاڑی کہیں نظر نہ آئی۔ اس نے مختلف کمروں میں جھانک کے دیکھا۔ فاروقی واقعی تھانے میں نہیں تھا۔ خود مجھے سمجھ میں نہ آیا کہ اسے وہاں سے کیسے ہٹایا گیا۔ کوئی چکر دے کر یا زبردستی۔ اس کے بارے میں کوئی کچھ بتانے کے لیے تیار نہ تھا۔

رانا کے چہرے پر ناراضی اور بے بسی کی جھنجلاہٹ کے ساتھ مایوسی پھیل گئی۔ میں نے کہا۔ ''چھوڑیں رانا صاحب۔ چلیں میرے ساتھ۔ اس سال اپنی عید حوالات میں ہی ایک ساتھ گزرے گی۔''

راجا نے کہا۔ ''جلدی کریں پلیز مجھے تصویریں بنا کے روانہ کرنا ہیں۔ ٹائم کم ہے۔''

رانا کے غرور کا تاثر ایک دم فلیٹ ہو گیا۔ اس نے غصے سے دانت پیستے ہوئے میری طرف دیکھا۔ ''مجھے پتا ہے اس... ڈی آئی جی۔'' اس نے درمیان میں ایک گالی شامل کی۔ ''یہ میرا دشمن تم سے مل گیا ہے۔''

تھانیدار پھر نمودار ہوا تو اس کے تیور بدلے ہوئے تھے۔ ''سب لوگ ابھی تک ایک دوسرے کی شکل دیکھ رہے ہو۔ چلو اندر ورنہ مجھے زبردستی کرنا پڑے گی۔''

رانا نے کہا۔ ''ذرا پہلے اپنے ڈی آئی جی صاحب کو بلاؤ۔ مجھے ان سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اچھا میں چلتا ہوں۔''

وہ ان کے کمرے میں جاتے جاتے رکا۔ ''ڈراما مت کرو میرے ساتھ نواب رفیق۔ میں بچہ نہیں ہوں کہ سمجھ نہیں سکتا۔ یہ سب مجھ پر دباؤ ڈالنے کے حربے ہیں۔ اپنی بات منوانے کے لیے۔''

چند منٹ بعد مذاکرات کا دوسرا راؤنڈ شروع ہوا تھا۔ رانا کا موڈ ایک شکست خوردہ ٹیم جیسا تھا جس کے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ یا خودکشی کر لے یا ہتھیار ڈال دے اور وہ ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو۔ عبداللہ جان نے مختصر بات کی۔ ''رانا صاحب آپ اپنی عبوری ضمانت حاصل کر سکتے ہیں تو کر لیں۔ قانونی معاملات سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ میں صرف قانون کی مدد کرتا ہوں اور اپنے علاقے میں کسی کو قانون شکنی کی بالکل اجازت نہیں دیتا۔''

رانا نے پہلو بدل کے کہا۔ ''ڈی آئی جی صاحب! کام کی بات کرو۔''

''میں کام کی بات ہی کر رہا ہوں۔ کوئی لطیفے نہیں سنا رہا ہوں۔'' عبداللہ جان نے برہمی سے کہا۔ ''آپ دونوں عزت دار ہیں میں نہیں چاہتا کہ آپ کے ساتھ مجرموں کی طرح پیش آؤں۔ مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔ یہ میں پہلے بھی کئی بار کہہ چکا ہوں مگر آپ نے میری نہیں سنی۔ آپ لوگ مسلسل لڑ رہے ہو اور اس کی وجہ سے سارا علاقہ ہندوستان پاکستان بن گیا ہے۔ لوگ تقسیم ہو گئے ہیں اور ان کے درمیان مخالف جذبات بڑھتے جا رہے ہیں۔''

''یہ سب نواب رفیق کے آنے کے بعد ہوا۔'' رانا نے شکایت کی۔ ''اس سے پہلے علاقے کے لوگ امن پیار سے رہتے تھے۔''

''رانا صاحب۔ آپ نے پہلے اس علاقے کو اپنی سلطنت سمجھ رکھا تھا۔ حالانکہ ایسا پہلے بھی نہیں تھا۔ کل کو یہاں تیسرا فریق بھی آ سکتا ہے۔ کوئی اس علاقے میں صنعتی مقاصد کے لیے زمین خریدے اور کارخانے لگا دے۔ میرا صرف ایک مشورہ ہے۔ اپنی حد میں رہیے۔ اگر براہِ راست آپ کو نقصان ہو تو قانونی راستہ اختیار کیجیے۔ ورنہ دنیا میں جو ہو رہا ہے ہونے دیں۔ نواب رفیق کے معاملات سے آپ کو سروکار نہیں ہونا چاہیے۔''

بظاہر اس نے ہم دونوں کو تنبیہہ کی مگر رانا کے لیے یہ صرف اس پر قدغن تھی۔ قانون کی بات عام آدمی کے لیے ہو سکتی ہے۔ اس کے لیے نہیں۔ بالواسطہ طور پر ڈی آئی جی کی بات سے میرے مؤقف کی تائید ہوئی تھی۔

رانا یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ تم بکواس کرتے ہو۔ میں وہی کروں گا جو کرتا آیا ہوں۔ طوعاً و کرہاً اس نے سب سنا اور برداشت کیا۔ یہ نہ تو کوئی قانونی معاہدہ تھا اور نہ رانا اس پر عمل درآمد کا پابند تھا۔ خود ڈی آئی جی بھی یہ بات جانتا ہو گا۔ اس نے سارے معاملے سے سیاسی انداز میں نمٹا تھا۔ پہلے رانا کو گرفتار کر کے اپنا فرض ادا کیا۔ پھر مجھے رو کے رہا کہ میں پریس میں اس کی پبلسٹی نہ کروں۔ اپنی بات کہہ دی اور پھر باعزت طریقے سے ہم دونوں کو رخصت کر دیا۔

ہم آدھی رات کے بعد ست بدھائی پہنچے۔ اس نے دونوں متحارب فریقوں کو الگ الگ روانہ کیا۔ ڈی آئی جی عبداللہ جان اس سے پہلے ہم دونوں کا شکریہ ادا کر کے اور ہاتھ ملا کے چلا گیا تھا۔

میں نے تھانیدار سے پوچھا۔ ''رانا کا وکیل کہاں گیا۔ میں نے خود اسے آتے دیکھا تھا۔''

تھانیدار نے کہا۔ ''ہاں۔ وہ بعد میں چلا گیا۔''

میں نے کہا۔ ''یہی تو میں پوچھ رہا ہوں۔ کہاں چلا گیا اور کیسے؟''

''تھانیدار مسکرانے لگا۔ ''نواب صاحب! ہم نے اسے رانا صاحب کے گھر بھیج دیا۔ ہم نے کہا کہ رانا صاحب کچھ دیر بعد آئیں گے۔ وہ چاہتے ہیں آپ وہیں ان کا انتظار کریں۔''

''اور وہ مان گیا۔ اسے شک نہیں ہوا کہ آپ لوگ اسے اپنے مؤکل سے ملنے نہیں دے رہے ہیں۔''

''یقیناً جی۔ ہم بندہ دیکھ کے بات کرتے ہیں۔ ہم نے کہا کہ رانا صاحب کو ڈی آئی جی صاحب خود لے کر آئیں گے۔''

پندرہ منٹ کے وقفے سے مجھے رخصت کیا گیا۔ راجا نے ہم سے اتفاق کیا کہ ڈی آئی جی عبداللہ جان نے اپنی معاملہ فہمی سے صورتِ حال کو خراب ہونے سے بچا لیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے حکم خواہش یا کوشش سے نظام نہیں بدل سکتا۔ نہ وہ ہمیشہ یہاں رہے گا اور نہ اس کے دور میں ہونے والی کسی قسم کی بدامنی سے اس کا کیریئر متاثر ہو گا لیکن اس نے وقتی طور پر جنگ بندی کے حالات پیدا کر دیے تھے اور خود بری الذمہ ہو گیا تھا۔ عدالت اسے ضمانت پر رہا کرے یا نہ کرے۔ بری کر دے یا پھانسی چڑھا دے۔ اسے کیا۔

راجا نے راستے میں مجھ سے کہا۔ ''ٹھیکے پتر یہ اچھا ہی ہوا۔''

میں نے کہا۔ ''اچھا رہے تب بات ہے۔''

''ویسے تو رانا صاحب کی حوالات کے اندر کی تصویریں سب میرے پاس محفوظ ہیں لیکن ان کے شائع ہونے سے یقیناً دشمنی بڑھتی۔ آئندہ کی آئندہ دیکھیں گے۔''

''ہاں۔ رانا کو بھی اچھا سبق مل گیا ہے۔ گرفتاری اور حوالات میں بند رہنے سے اس کو سمجھ آ گئی ہو گی کہ دنیا اب پہلے جیسی نہیں رہی۔ اس کے لیے تو یہ نائن الیون ہے۔''

''اب کچھ عرصہ اس کی شر انگیزی رک جائے گی۔ اسے اپنی عبوری ضمانت کرانی ہے پھر توثیق کے لیے سماعت ہو گی تو ہم سامنے ہوں گے۔ اس کے بعد اپیل اور اس کے بعد مقدمات کی سماعت۔ رانا کے ہاتھ بندھ گئے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''وہ دوسروں کے ہاتھ استعمال کر سکتا ہے اور کرے گا۔''

''ہم بھی پھر کر لیں گے دو دو ہاتھ۔ یہ تو سبق کا پہلا اصول ہے ٹھیکے پتر۔ دشمن کو چوکنا رکھو۔ احساس نہ ہونے دو کہ طاقت کا توازن اس کے حق میں ہے۔''

میں صبح دیر تک سوتا رہا۔ مجھے محسن نے جگایا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں گاڑیاں دیکھ لوں۔ اس کی کوشش سے کمپنی نے تین گاڑیاں فوری طور پر ڈلیور کر دی تھیں۔ ایک سوزوکی ہائی روف تھی۔ دوسری ٹویوٹا والوں کی ڈبل کیبن ہائی لکس۔ جو ایئرکنڈیشنڈ بھی تھی۔ تیسری ٹویوٹا ڈیزل کار تھی۔ یہ ہمارے ذرائع نقل و حمل میں بڑا مفید اضافہ تھا۔ ڈاکٹر شہباز اور ریشم نے سوزوکی بولان کو اپنے لیے ریزرو کر لیا تھا کہ یہ مریضوں کو لانے لے جانے میں بھی کام آئے گی۔

کمپنی کو ادائیگی کر دی گئی تھی۔ ڈلیوری لینے کے فوراً بعد ڈرائیوروں کا مسئلہ سامنے آیا۔ دو ڈرائیور کاروں کے لیے درکار تھے۔ ایک ٹویوٹا ہائی لکس کے لیے اور ایک ایمبولینس کے لیے۔ ابھی ہمارے پاس صرف دو ریگولر ڈرائیور تھے۔ ایک شیر خان اور دوسرا غنی۔ غنی کے ذمے دوسرے کام بھی تھے۔ اسے ڈرائیونگ کے فرض سے سبکدوش کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ تاکہ وہ سیکورٹی اور انتظامی امور پر زیادہ توجہ دے سکے۔ شیر خان نے خواہش ظاہر کی کہ اسے ہائی لکس چلانے دی جائے۔ اس نے کاروں کے لیے دو قابلِ اعتماد ڈرائیور فراہم کرنے کی ذمے داری بھی قبول کی۔

ابھی یہ معاملہ ختم ہوا ہی تھا کہ شہزاد کی کار اندر آ گئی۔ اس کی والدہ آگے بیٹھی تھیں۔ پچھلی سیٹ پر دو برقع پوش خواتین کو دیکھ کے میں چونکا۔ ایک تو اس کی خالہ ہو سکتی تھیں۔ دوسری جب کار سے برآمد ہوئی تو شک و شبے کی گنجائش ہی نہ رہی۔ وہ نور جہاں تھی۔ ان کی آمد نے خاصی سنسنی پیدا کی۔ خواتین نے ان کا استقبال کیا اور اپنے ساتھ اندر لے گئیں۔

شہزاد ہماری طرف آ گیا۔ ''مجھے رابعہ نے کہا تھا'' ''اس نے اعترافِ جرم کے انداز میں کہا اور لان پر ہمارے ساتھ بیٹھ گیا۔

راجا نے کہا۔ ''اور رابعہ جو کہتی ہے وہ آپ کے لیے حکم کا درجہ رکھتا ہے فی الحال۔ رائٹ؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''رائٹ۔ اس نے کہا کہ عید پر تم کیا کرتے ہو؟ میں نے کہا کہ تم بتاؤ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میری فرمانبرداری اسے بے حد پسند آئی اس نے کہا کہ تمہیں عید منانے کے لیے یہاں آ جانا چاہیے بکرے سمیت۔ میں نے کہا کہ قربانی کا بکرا تو میں خود ہوں۔ اس نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ تمہاری قربانی میں کروں گی۔''

''فضول بکواس بعد میں کرنا۔ پہلے یہ بتا کہ اپنی ہمشیرہ کو ساتھ لانے کی کیا ضرورت تھی۔ قربانی کے بکرے۔'' راجا نے خفگی سے کہا۔

اس نے سر کھجایا۔ ''آپ نے غالباً نور جہاں کے بارے میں سوال کیا ہے۔ بہت اچھا سوال ہے۔''

راجا نے جوتا اٹھایا۔ ''جواب اچھا نہ ہوا تو تیری خیر نہیں شہزادے۔''

شہزاد نے میری طرف دیکھا۔ ''لاحول ولاقوۃ۔ اسے کیا میں لایا ہوں؟''

''ہاں۔ آپ کا عشق اسے لایا ہے۔ ذمے دار آپ ہیں اس کی دیوانگی کے۔ میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ رابعہ نے بھی بعد میں کہا تھا کہ تم عید کرنے یہاں آتا۔ نور جہاں نے پہلے ہی مجھے نوٹس دے دیا تھا۔''

''نوٹس؟ کس بات کا؟''

شہزاد نے جواب دینے سے پہلے گہری سانس لی۔ ''میں پہلے بھی بتا دیتا مگر میں نے سوچا سمجھ جائے گی۔ میرے گھر میں چند دن رہنے کے بعد ہی وہ کچھ نروس اور اپ سیٹ تھی۔ میں نے کئی بار اسے دیکھا۔ اسے رات کو نیند نہیں آتی تھی تو باہر ٹہلتی رہتی تھی۔ ایک رات میں نے دیکھا تو میں ڈر گیا کہ اندھیرے میں کون ہے۔ اس نے ٹال دیا کہ کچھ ہاضمہ خراب تھا۔ لیکن ہفتے بھر بعد شور سے میری آنکھ کھلی۔ باہر نکل کے دیکھا تو خالہ اسے سنبھال رہی تھیں۔ وہ نیند میں نکلی اور کسی چیز سے ٹھوکر لگی تو گر گئی۔''

میں نے خفگی سے کہا۔ ''تم نے ذکر تک نہیں کیا۔''

''اس نے منع کر دیا تھا۔'' وہ سادگی سے بولا۔

''اور تم مان گئے۔ عجیب آدمی ہو۔''

''گزشتہ ہفتے سے اس نے ضد شروع کر دی کہ مجھے جانا ہے۔ میں یہاں نہیں رہ سکتی۔ میں نے پوچھا کہ یہاں کیا پریشانی ہے اور جاؤ گی کہاں؟ کہنے لگی کہ دیکھو۔ مجھے یہ جلاوطنی کا فیصلہ بالکل قبول نہیں۔ رفیق مجھے اپنے ساتھ لندن جا کے اور چھوڑ کے واپس آجائے۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ یا پھر مجھے اپنے ساتھ رکھے۔ یا پھر چھوڑ دے مجھے اپنے حال پر۔ بھول جائے مجھے۔ ابھی پرسوں اچانک کہنے لگی کہ مجھے ست بدھائی جانا ہے۔ میرے سمجھانے سے چلانے لگی کہ میں کچھ سننا نہیں چاہتی۔ تم نہیں لے جاؤ گے تو میں خود نکل جاؤں گی۔''

''اس نے مجھ سے بات کیوں نہیں کی؟''

''ایک تو میں نے اسے کہا تھا کہ رفیق پہلے ہی مشکل میں ہے۔ اس کے لیے کیوں مصیبت کھڑی کرتی ہو بس دو چار دن رک جاؤ۔ تب ہی سے میں نے سوچ لیا تھا کہ اب کچھ کرنا پڑے گا۔ میں نے اماں سے کہا کہ نور جہاں کہتی ہے میں عید یہاں نہیں ست بدھائی میں کروں گی۔ کیوں نہ ہم بھی وہیں چلیں؟ اماں نے کہا کہ بیٹا میرے لیے کیا راولپنڈی اور کیا ست بدھائی۔ یہاں بھی اندھیرا وہاں بھی اندھیرا۔ تم خالہ سے پوچھو۔ خالہ فوراً تیار ہو گئیں۔ وہ اماں کے ساتھ گھر میں قید ہو گئی ہیں۔ کہیں بھی آنا جانا نہیں۔ نہ کوئی ہم سے ملنے آتا ہے۔ عزیز رشتے دار پہلے بھی نہیں تھے۔'' وہ چپ ہو گیا۔

میں نے کہا۔ ''اور یوں آپ بغیر نوٹس کے آ گئے۔ خیر آپ کی تشریف آوری پر خوش آمدید لیکن...''

راجا نے کہا۔ ''فیکے پتر۔ ڈراما کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم جانتے ہیں اندر سے تیرے جذبات کیا ہوں گے زبان سے تو کچھ اور کہے گا۔''

میں ناراضی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''راجا۔ یہ سیریس معاملہ ہے۔ دن رات یہ حویلی شکوک و شبہات اور الزامات کی زد میں ہے۔ اس کی بھی میں پروا نہیں کرتا لیکن نور جہاں پر الزام کی آگ ابھی سرد نہیں پڑی۔ یہ آگ ست بدھائی کو اور اس کے ساتھ ہم سب کو جلا کے خاکستر کر دے گی۔''

''بیٹھ جا۔ بیٹھ جا آرام سے۔ ایک دن میں قیامت نہیں آتی۔ عید گزر جائے پھر اس مسئلے کا حل بھی نکال لیں گے۔ سنبھال لیں گے اسے بھی۔'' راجا نے کہا۔

''اسے اب فوراً باہر نکال دینا چاہیے۔ میرا مطلب ہے ملک سے باہر۔'' شہزاد نے کہا۔

میں نے کہا۔ ''اس کے لیے مجھے سب سے موزوں جگہ لندن نظر آتی ہے مگر وہ ایئرپورٹ پر ہی پکڑی جائے گی۔ اس کا نام مطلوب اور مفرور ملزموں کی فہرست میں ہے۔ ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں بھی ہو گی۔''

راجا نے کہا۔ ''میں پہلے اس کے لیے نیا شناختی کارڈ بنواتا ہوں۔ تھوڑے سے بدلے ہوئے حلیے کے ساتھ پھر پاسپورٹ بھی بن جائے گا۔ ایک دو بندے ہیں اپنے۔''

میں نے کہا۔ ''راجا اب اس کام میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔ میں ایسا کرتا ہوں لندن جا کے عائشہ سے اور اس کے باپ سے ملتا ہوں کچھ اور دوست بھی ہیں۔ نور جہاں جائے تو اسے سپورٹ کرنے والے ہوں۔''

ابھی میری بات مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ اندر سے خواتین نے چلانا شروع کیا۔ وہ سب ہمیں نام لے لے کر بلا رہی تھیں۔ ہم گھبرا کے دوڑے کہ ایسی کیا قیامت آ گئی۔ اندر جا کے دیکھا تو خواتین آنکھیں پھاڑے ٹی وی کو پلک جھپکائے بغیر گھور رہی تھیں۔ آواز میں نے پہلے ہی سن لی تھی۔ اندر قدم رکھتے ہی میری نظر ٹی وی پر گئی تو میں جہاں تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔

ٹی وی پر میرے سامنے فریال کا چہرہ تھا۔ مسکراتا ہوا شگفتہ اور میک اپ کے کمال سے حسن کی ایسی تصویر جس کا

وجود تصور میں بھی ممکن نہ ہو۔ آرائش جمال کے ساتھ اس کے لباس اور انداز و اطوار میں بھی وہ جلوہ سامانی تھی جو کسی ماڈل یا فلمسٹار کے لیے متاع غرور ہوتی ہے۔ روشن مستقبل کی ضامن سمجھی جاتی ہے اور خوش بختی سے ہزاروں لاکھوں میں کسی ایک کو عطا ہوتی ہے۔

یہ کسی چینل پر شوبزنس کے پروگرام میں لائیو دکھایا جانے والا انٹرویو تھا۔ فریال کا یہ پہلا انٹرویو ایک مشہور مقبول خاتون لے رہی تھیں جو بیس سال سے خود کو ٹین ایجر دکھانے اور ثابت کرنے میں مصروف تھیں اور اس کوشش میں کامیاب اس لیے تھیں کہ ہر گزرتے سال کے ساتھ حسن تو ماند پڑ رہا تھا مگر شباب کی جوانی بڑھ رہی تھی اور اسی تناسب سے وہ اس کی نمائش عام کرتی جا رہی تھیں۔

فریال کا اعتماد فطری تھا۔ انٹرویو کرنے والی پٹاخہ بڑے جوش و خروش اور بے باکی سے فریال کے انٹرویو کو صرف بریکنگ نیوز کے طور پر پیش نہیں کر رہی تھی وہ اسے ایک دھماکا قرار دے رہی تھی جس کے سامنے پاکستان کا ایٹمی دھماکا بھی غیر اہم ہو جاتا تھا۔ اس نے بار بار ویورز کو بتایا کہ ان تک یہ تہلکہ خیز خبر پہنچانے کا عظیم کارنامہ اس نے اور اس چینل نے سرانجام دیا ہے۔

فریال کو پہلے سے سوال بتا دیے گئے تھے۔ جیسا کہ عام طور پر ہر انٹرویو میں ہوتا ہے اور وہ جواب دینے کے لیے پوری طرح تیار ہو کے آئی تھی۔ پہلا سوال یہی ہو سکتا تھا کہ وہ فلمی دنیا سے کیوں کنارہ کش ہوئی تھی۔ حقیقت تو یہی تھی کہ فریال نے فلمی دنیا میں قدم رکھا ہی تھا کہ سلطان نے اسے اپنے دام میں گرفتار کر لیا تھا اور اس کی پہلی فلم اسٹوڈیو کے فلور تک ضرور پہنچی تھی لیکن تکمیل کے مراحل کا آغاز ہوتے ہی ڈبوں میں بند ہو گئی تھی۔ تاہم جواب اس نے یہ دیا کہ اسے فیملی کی طرف سے دباؤ کا سامنا تھا کہ پہلے وہ اپنی تعلیم مکمل کرے چنانچہ وہ لندن سے اپنی ڈگری لے کر واپس آئی ہے۔

خواتین نے شور مچایا۔ ''کیسا جھوٹ بول رہی ہے۔'' رابعہ بولی۔

''اس کی کون سی فیملی تھی۔'' شہناز نے بھی ناراضی سے کہا۔

اس میں کوئی شک نہیں فریال نے بڑی ڈھٹائی سے جھوٹ بولا تھا مگر نظریہ ضرورت کے مطابق اور پبلسٹی کے مارکیٹ کی ضروریات کے پیش نظر ایسا جواب ہی بہترین سمجھا جا سکتا تھا۔ فریال وہاں سچ بولنے کے لیے نہیں بیٹھی تھی۔ اپنے کیریئر کی پروموشن کر رہی تھی۔

راجا نے خواتین کو ڈانٹا۔ ''اس کی نہیں سنی تو ٹی وی بند کر دو ورنہ اپنی کائیں کائیں بند کرو۔''

مس پٹاخہ نے پوچھا۔ ''فریال۔ آپ نے فلمی دنیا میں واپسی کا فیصلہ بھی اپنی فیملی کے مشورے سے کیا؟''

فریال نے کہا۔ ''جی نہیں۔''

''گویا یہ فلمی دنیا کی کشش تھی جو آپ کو کھینچ لائی۔ آپ سمجھتی ہیں کہ ایک فنکار کے سوا آپ کچھ اور بن ہی نہیں سکتی تھیں۔ آپ کے شوق اور صلاحیت کی تسکین کسی اور شعبے میں ممکن نہیں تھی۔''

''شاید یہی بات ہے۔ لیکن اسے میں اپنی ذمے داری بھی سمجھتی ہوں کہ ایک خداداد صلاحیت کو ملک کی فلمی صنعت کے فروغ کے لیے استعمال کروں۔ ایک موسیقار یا مصور کا فن عوام کی امانت ہوتا ہے۔''

''کیا آپ کو کسی فلمساز کی طرف سے آفر ہوئی ہے؟''

فریال نے طے شدہ جواب دیا۔ ''جی ہاں۔ چند فلمسازوں نے مجھے آفر کی ہے لیکن میں نے کہا ہے کہ اسکرپٹ دیکھے بغیر میں فیصلہ نہیں کر سکتی۔''

خواتین کے لیے اپنے ناپسندیدہ ردعمل کو کنٹرول کر کے سکون سے سوال جواب سننا ناممکن تھا۔ راجا اور شہزاد انہیں بار بار ڈانٹ ڈپٹ سے کنٹرول کر رہے تھے مگر میں بے حسی سے سب دیکھ رہا تھا۔ مجھے نہ صدمہ تھا نہ خوشی۔ میں نہ راضی اور نہ حیرانی یہ سب تو ہونا ہی تھا اور جو کچھ وہ کہہ رہی تھی اس میں بھی جھوٹ سچ سے مجھے کیا فرق پڑ سکتا تھا۔ مجھے صرف ایک بات کا احساس تھا کہ فریال اب مجھ سے دور ہی نہیں بہت دور ہو گئی ہے۔ شاید میری دسترس سے بھی باہر۔ میرے خیالوں اور خوابوں کی دنیا سے بھی دور۔

مس پٹاخہ نے اچانک روایتی انداز میں ایک شوشا چھوڑا۔ ''فریال۔ کیا آپ نے کسی سے محبت کی ہے؟''

فریال نے بڑے پرسکون انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ ''جی ہاں۔''

''کون ہے وہ خوش نصیب۔ کیا ہمارے ناظرین اس کا نام جان سکتے ہیں؟'' مس پٹاخہ نے کہا۔

فریال نے اسکرپٹ کے مطابق کہا۔ ''کوئی ایک نام ہو تو بتاؤں۔''

مس پٹاخہ نے ہذیانی چیخ ماری۔ ''یعنی آپ بار بار محبت کی قائل ہیں۔ ہم نے تو سنا تھا کہ محبت ایک بار ہوتی ہے۔''

''میرے خیال میں ایسا کہنا حقیقت نہیں ہے۔''

مس ثناخہ شوخی سے ہنسی۔ ”خوش قسمتی سمجھتی ہیں اسے آپ یا بدنصیبی۔ آخر آپ کا دل توڑ کے جانے والے کون تھے؟“

”ایسا تو کوئی نہیں۔“ فریال نے کہا۔

”ایک بار کسی مرد نے بے وفائی کی ہوگی۔ اس کے بعد ہی آپ کی زندگی میں دوسرا مرد آیا ہوگا۔“

فریال نے متانت اور بھولپن سے کہا۔ ”مرد؟ میں نے تو کسی مرد کی بات نہیں کی۔“

”محبت تو آپ نے کسی مرد سے ہی کی ہوگی؟“

”کمال ہے۔ محبت مجھے اپنی ماں سے تھی۔ اپنے وطن سے ہے۔ محبت مجھے انسانیت سے ہے۔“

مس ثناخہ نے شور مچا دیا۔ ”دیکھیے... دیکھیے... آپ بڑی صفائی سے بات کو ٹال رہی ہیں... سیاسی جواب کے بجائے ناظرین کو اس خوش نصیب مرد کا نام بتایے جس سے آپ نے محبت کی... جس کے لیے آپ لیلیٰ تھیں تو وہ آپ کے لیے مجنوں تھا۔“

فریال سکون سے مسکرائی۔ ”ایسا تو کوئی نہیں۔“

”یہ کیسے ہوسکتا ہے فریال... ہمارے ناظرین اس پر یقین نہیں کرسکتے؟“

”دیکھیے اگر ہوگا تو میں اس مرد کا نام آپ کے اسی پروگرام میں خود آکے بتاؤں گی۔“

”ایک شخص سے تو ہم بھی واقف ہیں فریال“ مس ثناخہ ایک دم اٹھی اگر آپ کہیں تو ہم اسے بلالیں؟“ لیکن فریال کی طرف دیکھے بغیر اس نے تالی بجانا شروع کردی۔ ”دیورز ہم آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں ملک کے مایہ ناز شہرہ آفاق فلمساز اور ہدایت کار چوہدری۔ سلطان کو۔“

یہ آخری صدمہ کسی سے برداشت نہ ہوا... ایک دم رابعہ نے آگے بڑھ کے ٹی وی بند کردیا۔ ”کمینی... بے شرم...“

شہناز کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔ لیلیٰ بھابی شرمسار نظر آرہی تھی۔ راجا غصے میں چپ بیٹھا تھا۔ صرف شہزاد نے دبے دبے لہجے میں کہا۔ ”یار ٹی وی کیوں بند کردیا؟“

اسے زبردست جھاڑ پڑی۔ ”تمہیں بہت شوق ہورہا ہے تو کہیں اور جاکے دیکھ لو... حد ہوتی ہے کسی چیز کی۔“

شہناز نے کہا۔ ”سچ مجھے بڑا دکھ ہوا۔“

نور جہاں کسی شمار قطار میں نہ تھی کہ اظہارِ رائے کرتی۔ اس نے یہی بہتر جانا کہ چپکے سے کھسک جائے۔ شہزاد کی ماں اور اس کی خالہ وہاں موجود ہی نہیں تھیں۔ میری ذہنی کیفیت عجیب تھی۔ میں چاہتا تھا کہ چوہدری سلطان کو بھی دیکھوں... اس کی بھی سنوں اور اس کے بارے میں فریال کا عوامی ردِعمل بھی دیکھوں... لیکن مجھ میں ہمت نہ تھی کہ میں ٹی وی آن کرنے کا کہوں... جو میرے آس پاس تھے وہ بے حد ناراض اور مشتعل تھے۔ فریال کے ایک انٹرویو نے اس کے خلاف جذبات کا طوفان کھڑا کردیا تھا۔

بیک وقت شہناز رابعہ اور لیلیٰ بھابی کی زبان چل رہی تھی اور وہ سب فریال کو مطعون کررہی تھیں۔ انہیں سمجھانا مشکل تھا کہ فلمی انٹرویو ایسے ہی ہوتے ہیں حالانکہ وہ جانتی تھیں کہ چوہدری سلطان ملک کا مایہ ناز تو کیا کوئی پروڈیوسر ڈائریکٹر بھی نہیں تھا۔ اس کے کریڈٹ پر چند ناکمل فلمیں تھیں جو اس نے فریال جیسی لڑکیوں کو پھانسنے کے لیے اناؤنس کی تھیں یا لالچ میں کی تھیں۔ آج مس ثناخہ زبردستی اس کی ہوس پرستی اور بدمعاشی کو فریال کے ساتھ جذباتی وابستگی ثابت کرنے پر تلی ہوئی تھی تو یہ ایک کاروباری ضرورت تھی۔ مس ثناخہ کو اور چینل کو فریال کے منیجر نے یا سلطان نے اسی کام کے پیسے دیے تھے۔

دوسرا اکڑ داؤ یہ تھا کہ فریال کچھ عرصہ بہرحال سلطان کی منگیتر رہی تھی اور اس خبر کو بھی فلمی اخبارات نے خوب اچھالا تھا۔ کچھ فلمی صحافی اسی کام کے پیسے لیتے ہیں اور شوبز میں کہا جاتا ہے کہ بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا۔ اسکینڈل وجۂ شہرت بنتے ہیں۔

خواتین کا بس چلتا تو وہ ابھی فون کر کے مس ثناخہ کو فریال اور سلطان کو کھری کھری سے بھی زیادہ سناتیں۔ میں، راجا اور شہزاد ان سے ٹی وی کیسے آن کراتے۔ ہم اٹھ کے باہر آگئے اور اسی وقت کسی وجہ کے بغیر میرے دل میں ایک اور خیال آیا۔ جو فطری ردِعمل سمجھا جاسکتا ہے۔ میں نے سوچا کہ فریال کے خلاف ردِعمل نے نور جہاں کو کتنی مسرت دی ہوگی۔ اچانک بساط پلٹ گئی تھی۔ عرش کی یہ بلندیاں فرش کی پستیوں میں بدل گئیں... جب فریال مجسم برائی بنی تو نور جہاں خود بہ خود اچھی ہوگئی۔ قابلِ قبول وہ پہلے بھی ہوگئی تھی لیکن مجبوری میں۔

راجا نے مجھ سے صرف اتنا کہا۔ ”یار سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

میں نے تلخی سے کہا۔ ”نہیں بھی ہوا تو کیا ہوگا... دنیا ختم ہوجائے گی۔“

شہزاد نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ”میں معلوم کرتا ہوں... رانا نے عبوری ضمانت کرالی ہے یا نہیں۔“ اور کسی کو فون کرنے لگا۔

اسی وقت غنی پریشان حال نمودار ہوا۔ اسے اگلے دن بقرعید کے لیے انتظامات کرنے تھے۔ ”جناب عالی... ایک مسئلہ تھا۔“

میں نے کہا۔ ”مسئلہ ہے تو حل کرلو۔“

”آپ کی اجازت درکار تھی جناب... وہ دراصل... میں نے کہا تھا کہ قربانی کے جانور کچھ اور ہوں تو ہم سب میں گوشت تقسیم کردیں۔ آس پاس کے دیہات میں سے جن کو ہم نے پہلے بلایا تھا۔“

میں نے کہا۔ ”یہ تو کارِ خیر ہے... سوچنے کی کیا بات ہے اور تمہیں جتنے جانور درکار ہیں لے لو۔“

اس نے سکون کا سانس لیا۔ ”ایک بندے سے کہہ دیا تھا میں نے... مجھے پتا تھا آپ انکار نہیں کریں گے... وہ جانور لایا ہے۔“

”لایا ہے تو لے لو... لیکن دیکھو... ہڑبونگ نہ ہو۔“

وہ جانے لگا تو راجا نے کہا۔ ”چیف صاحب... کل نماز کا کیا ہوگا؟“

”نماز باہر ہوگی سر... ہم سب کے ساتھ پڑھیں گے... میں نے صوفی غلام محمد کو سمجھا دیا ہے کہ اسے کیا کہنا ہے اور کیا نہیں کہنا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”غنی... یہ کیوں...؟“

وہ بولا۔ ”آپ نہیں جانتے سر... وہ بولنے پر آئے تو اسے روکنا مشکل ہوتا ہے... اور کہیں اس نے آپ کی خوشامد اور رانا کی مخالفت میں بولنا شروع کردیا تو فساد کرا دے گا۔ وہ فتوے صادر کردیتا ہے سوچے سمجھے بغیر۔“

میں نے کہا۔ ”پھر تو ٹھیک ہی کیا۔ اس سے کہنا کہ بس نماز پڑھائے اور خطبے کے بعد دعا کو محدود رکھے۔“

غنی کے جانے کے بعد شہزاد نے مجھے مطلع کیا۔ ”رانا نے عبوری ضمانت حاصل کرلی ہے... عید کی چھٹیوں کے بعد توثیق کرانا ہوگی... اس کے بیٹے کی ضمانت منظور ہوگئی۔“

”یہ تو ہونا ہی تھا۔“

”ہم توثیق کی مخالفت کریں گے... مگر توثیق ہو جائے گی... ہم اپیل میں ہائی کورٹ جائیں گے۔“

”وہاں بھی کچھ نہیں ہوگا... شہزادے... لیکن ٹھیک ہے۔ تم اپنا کام کرو... عدالت اپنی مرضی کرے... اللہ دیکھ رہا ہے۔“ راجا بولا۔

اسی وقت خواتین ایک جلوس کی صورت میں برآمد ہوئیں اور نئی ہائی لکس میں بیٹھ گئیں۔ شیر خان پہلی آزمائشی پرواز پر جانے والے پائلٹ کی طرح میری طرف آیا۔ ”سر

میں لاہور جارہا ہوں۔"

"لاہور؟" اچانک لاہور جانے کی کیا ضرورت پڑ گئی؟"

"وہ...سب کپڑے لینا چاہتی ہیں عید کے لیے...رات تک واپسی ہوگی...ایک سیکورٹی گارڈ ساتھ جائے گا۔" شیر خان نے کہا۔

ظاہر ہے عید پر نئے کپڑے نہ ہوئے تو خواتین کی کیا عید ہوتی... میں سمجھ گیا کہ وہ آدھی رات کے بعد ہی لوٹیں گی۔ کپڑے، جوتے خریدنا کوئی آسان کام نہ تھا... پھر انہیں یقیناً بیوٹی پارلر بھی جانا ہوگا۔ ان کی گاڑی باہر نکلی ہی تھی کہ میرے لیے کال آگئی۔

میں نے کہا۔ "اباجی السلام علیکم...اور عید مبارک۔"

انہوں نے دعا دینے کے بعد کہا۔ "ابھی رابعہ سے بات ہوئی تھی میری...وہ کیا کہہ رہی تھی... پاگل لڑکی۔"

میں نے کہا۔ "اس نے مجھے بتایا نہیں۔"

"کچھ فریال کے انٹرویو کی بات کررہی تھی... کیا وہ سچ ہے؟"

میں نے کہا۔ "چھوڑیں اباجی... یہ سب تو چلتا رہتا ہے...آپ بتائیں اماں کی طبیعت کیسی ہے؟"

"بھئی دیکھنے میں تو ابھی ٹھیک لگ رہی ہیں شاید یہ کچھ یہاں کا اعجاز مسیحائی ہے...ورنہ وہ ٹھیک نہیں ہیں۔"

میں نے تشویش سے کہا۔ "کیا ہوا ہے انہیں؟"

"رفیق میاں...کیا بتاؤں کیا ہوا ہے... بہ ظاہر کچھ بھی نہیں...بس وہ اندر باہر سے گھلتی جارہی ہیں...ایسا لگتا ہے مجھے جیسے صرف حج کے ارکان پورے کرنے کے لیے انہوں نے کچھ پیش قدمی کی رفتار کو روک دیا ہے...ورنہ وہ روانگی کی پوری تیاری کرچکی ہیں...غالباً خدا ان کی خواہش پوری کرے گا۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" میں نے گھبرا کر کہا۔

"وہی جو میں محسوس کررہا ہوں...اور اس میں پریشانی کی کون سی بات ہے... جو دنیا میں آیا ہے اسے جانا ہے... یہاں سے سفرِ آخرت پر روانگی ایک سعادت ہے جو ہر ایک کے نصیب میں نہیں ہوتی...تم کو اللہ کی رضا پر صابر رہنا چاہیے...زندگی ہوگی تو میرے ساتھ ضرور واپس آئیں گی۔"

میں نے کہا۔ "میری ان سے بات کرادیں۔"

اماں کی آواز اتنی کم تھی کہ میں سن ہی نہیں سکا...میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے لیکن اپنے لہجے کو میں نے پُرامید اور حوصلہ افزا رکھا۔ انہوں نے میری بات سنی ہوگی لیکن انہوں نے جواب میں کیا کہا یہ میری سمجھ میں نہیں آیا... وہ ویسے بھی بہت آہستہ بولتی تھیں...اب تھکن اور کمزوری بھی غالب تھی...ان کی آواز ایک سرگوشی بن گئی تھی۔

صبح نماز کے لیے حویلی کے پیچھے اس حصے میں انتظام کیا گیا تھا جہاں پہلے اکبر خان کا سائنسی ریسرچ سینٹر تھا۔ وہ اب بند پڑا تھا۔ غنی نے ہمارے لیے اندر پہلی صف میں جگہ رکھی۔ اس کا خیال تھا کہ باہر کوئی نہیں ہوگا لیکن دیکھتے ہی دیکھتے ہال اور پھر باہر کا لان بھر گیا۔ اردگرد کے دیہات سے لوگ بیل گاڑیوں، سائیکلوں اور تانگوں میں بھی وہاں پہنچے...نماز کا وقت آٹھ بجے تھا مگر صوفی غلام محمد نے آنے والوں کو مہلت دی اور نماز ساڑھے آٹھ بجے شروع ہوئی۔

خطبے کے دوران غنی نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

"جیسے ہی خطبہ ختم ہو...آپ سامنے سے نکل جائیں سر...کسی سے گلے نہ ملیں۔"

میں نے کہا۔ "یہ تو بڑی بداخلاقی ہوگی۔"

"لوگ ایک دم آپ سے گلے ملنے لپکیں گے۔ مجھے پتا چلا ہے کہ رانا نگر سے کافی لوگ نماز میں شریک ہیں۔"

"یہ تو اچھی بات ہے۔"

"یہ خطرناک بات ہے جناب عالی... اب نکل جائیں...ہم اعلان کرادیں گے کہ جو نواب صاحب سے ملنا چاہیں حویلی آجائیں۔"

مجھے مجبوراً اس کی بات ماننا پڑی۔ راجا نے اور شہزاد نے بھی اس کی تائید کی تھی۔ صوفی غلام محمد اب دعا کرارہا تھا اور اس میں میری صحت، درازیِ عمر، خوش حالی اور ترقی کے لیے زمین آسمان کے قلابے ملارہا تھا۔

اچانک باہر ایک شور اٹھا۔ دور سے ایسی آواز سنائی دی جیسے بہت سے کتے چلارہے ہوں۔ وہ تکلیف سے چلارہے تھے۔

میں نے غنی کی طرف دیکھا۔ "غنی...یہ کیا ہے غنی؟"

غنی کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی... "جیسی کرنی ویسی بھرنی۔"

اسی وقت صوفی غلام محمد نے منہ پر ہاتھ پھیر کے دعا ختم کی اور اچھل کے میرے گلے لگ گیا۔ وہ چھوٹے قد کا دبلا پتلا آدمی تھا...ایک دم غنی نے مجھے کھینچ لیا۔ "آپ نکلیں سر..."

بیرک جیسے ہال کے سامنے والے حصے میں ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ اسے غنی نے کھول دیا تھا۔ راجا اور شہزاد نے بھی مجھے لوگوں کی یلغار سے بچانے کی پوری کوشش کی تاہم ہونی کو انہونی کرنا کسی کے اختیار میں نہ تھا۔

بھیڑ میں سے کسی نے آگے بڑھ کر اچانک مجھ پر خنجر سے وار کیا۔ یقیناً خنجر کو اس نے ڈب میں چھپایا ہوگا لیکن اسے خنجر لگائے کسی نے بھی نہیں دیکھا۔ میری پشت اس کی طرف نہ ہوتی تو وہ خنجر کو میرے سینے میں اتارتا۔ اس نے بائیں جانب کی پسلیوں سے خنجر کو میرے دل تک پہنچانا چاہا ہوگا۔ یہ سب چند سیکنڈ کا لیکن مہارت طلب کام تھا۔ قاتل کو یقیناً اپنی مہارت اور پھرتی پر بھروسا ہوگا مگر میرے اردگرد موجود لوگوں میں سے ایک نامعلوم شخص نے قاتل کے ہاتھ کو حرکت کرتے دیکھ لیا۔

میرا وہ ناآشنا عقیدت مند زیادہ تیزی سے حرکت میں آیا اور اس نے دستِ قاتل کو روکنے کی کوشش ضرور کی۔ اس کی یہ کوشش پوری طرح کامیاب نہیں ہوئی وہ میری جان بچانے میں ضرور کامیاب ہوگیا۔ قاتل کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کا نتیجہ یہ نکلا کہ نشانہ چوک گیا۔ خنجر کی نوک نے میرے شانے کو چھیل دیا۔ خنجر کی دھار اتنی تیز تھی کہ کپڑا کٹ گیا اور گہری خراش سے پھوٹنے والی خون کی لکیر نیچے تک پھیل گئی۔

میرے پلٹنے تک بہت سے لوگوں نے ہر طرف سے قاتل کو نرغے میں لے کر جکڑ لیا تھا۔ جس نے قاتل کا ہاتھ سب سے پہلے پکڑا تھا اس نے حملہ آور کی کلائی نہیں چھوڑی تھی اور اس سے خنجر چھیننے میں کامیاب رہا تھا۔ باقی لوگوں نے مار مار کے حملہ آور کو نیچے گرادیا تھا۔ کہا جاسکتا ہے کہ آج کی اصطلاح کے مطابق وہ خودکش حملہ آور ہی تھا۔ اسے خوب اندازہ ہوگا کہ مجھے قتل کرنے کے بعد اس کا بچ کے نکلنا ناممکن ہوگا۔

مجھے ہر طرف چیخ پکار سنائی دے رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھ سکتا غنی اور شیر خان نے مجھے دھکا دے کر دروازے کی طرف ہانک دیا۔ غنی نے چیخ کے کہا۔ "آپ نکل جائیں سر! جلدی کریں۔" اور مجھے پھر آگے دھکیلا۔ انہوں نے مجھے مڑکر دیکھنے کی مہلت بھی نہ دی اور سامنے والے چھوٹے سے گیٹ سے نکال دیا۔

مجھے اپنے پیچھے لوگوں کے شور میں راجا کی آواز سنائی دی تھی۔ وہ لوگوں سے کہہ رہا تھا کہ قاتل کو نہ ماریں۔ اسے زندہ گرفتار کرنا ازحد ضروری تھا مگر لوگ اشتعال میں اتنے جذباتی ہورہے تھے کہ قاتل کو نیچے گرا کر لاتوں جوتوں اور مکوں سے ماررہے تھے۔ نہ میں نے حملہ آور کا چہرہ دیکھا تھا اور نہ اس کا جس نے مجھے بچایا۔ یہ ہوسکتا تھا کہ قاتل کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ہوں۔ انہوں نے حملہ آور کو یقین دلایا ہو کہ وہ اس کی حفاظت اور مدد کے لیے ساتھ رہیں گے اور اسے بحفاظت نکال لائیں گے لیکن درحقیقت وہ اسی کام پر مامور ہوں کہ حملہ آور اپنے مقصد میں کامیاب ہوجائے تو اسے وہیں ماردیں۔ یہ پتا نہ چل سکے کہ قاتل کون تھا اور اسے کس نے بھیجا تھا۔ سمجھا یہ جائے کہ مشتعل لوگوں نے اسے ماردیا جو سب میری رعایا تھے یا میرے عقیدت مند۔ پاکستان کے پہلے وزیراعظم سے آج تک ہر سیاسی قتل کو اسی طرح چھپایا گیا ہے اور قاتل کا سراغ لگانے والے کامیاب رہے ہیں اور ایک پاکستان کیا، خود امریکی صدر کے قاتل کو بھی ایسے ہی ماردیا گیا تھا۔

تاہم راجا اور کچھ دوسرے لوگوں کی دخل اندازی سے مجھ پر قاتلانہ حملہ کرنے والے کو بچالیا گیا۔ اس کا علم مجھے کچھ دیر بعد ہوا جب حویلی میں زاروقطار روتی خواتین کے ساتھ آنسو بہاتی ڈاکٹر شہناز میرے شانے کے زخم کی مرہم پٹی کرچکی تھی اور مجھے ایک پہلو پر آرام سے لٹادیا گیا تھا۔

میں قاتلانہ حملے سے نروس ضرور ہوا تھا لیکن اس کے فوراً بعد میں نے خود کو سنبھال لیا تھا اور بڑی بہادری سے مسکراتے ہوئے میں نے سب کو ڈانٹا ڈپٹا بھی تھا کہ یہ کیا رونا دھونا مچا رکھا ہے۔ ایک معمولی خراش ہی تو آئی ہے۔ لیکن بات خراش کے معمولی یا گہرے ہونے کی نہیں تھی۔ معاملہ خواتین کے جذبات کا تھا جو یہ سوچ سوچ کے ادھ مری ہورہی تھیں کہ قاتل، نصیب دشمناں۔ کامیاب ہوجاتا تو کیا ہوتا۔ عید کی صبح پیش آنے والا یہ واقعہ ایسا نہ تھا کہ اسے معمولی قرار دے کر سب نارمل ہوجاتے۔ اچانک سب کی خوشیوں پر اوس پڑ گئی تھی۔

صورت حال کو سنبھالنے کے لیے مجھے سختی سے کام لینا پڑا۔ سب سے پہلے میں نے شہناز کو جھاڑا۔ "تم تو ڈاکٹر ہو۔ حادثات کے زخمیوں کی دیکھ بھال کرچکی ہو۔ لاشوں کے پوسٹ مارٹم کیے ہیں تم نے پھر یہ کیا بے وقوفی ہے؟ میں نے کسی ڈاکٹر کو مریض کی حالت پر روتے نہیں دیکھا نہ موت پر۔ مجھے کیا ہوا ہے؟ ایک معمولی سی خراش ہی تو آئی ہے۔"

شہناز نے کسی بچے کی طرح ہتھیلی سے آنسو پونچھ کے کہا۔ "خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔"

میں نے رابعہ کی طرف دیکھا۔ "کزن! یہ کیا پاگل پن ہے۔ کیوں ٹسوے بہارہی ہو۔ ایسے ڈراموں سے میں متاثر نہیں ہوتا۔ اور لیلیٰ بھابی۔ آپ ان سب کو سمجھانے کے بجائے خود ان بے وقوفوں کا ساتھ دے رہی ہیں۔ چلیں سب اپنا موڈ ٹھیک کرلیں۔ آج عید ہے۔"

نورجہاں سب کے پیچھے دیوار سے ٹیک لگائے چپ

کھڑی تھی اور پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھ رہی تھی۔ یوں جیسے ان سب کے مقابلے میں جو میرے لیے رنجیدہ تھے وہ اجنبی ہے جسے اپنائیت کے اظہار کی اجازت نہیں۔ کیونکہ ابھی تک اس کے میرے رشتے کو احترام کی سند حاصل نہیں ہوئی۔ رابعہ تو خیر کزن تھی لیکن باقی سب بھی ایک معتبر حوالہ رکھتے تھے۔ نور جہاں پر ابھی تک الزام تھا کہ اس نے تمام اخلاقی قدروں کو پامال کرتے ہوئے مجھ پر غاصبانہ قبضہ جمایا اور زبردستی حویلی میں داخل ہوئی ہے۔

اگر یہ احساس اس کے پیروں کی زنجیر نہ بنتا تو شاید وہ مجھ سے لپٹ کے روتی مگر اس نے اپنے جذبات کو قابو میں رکھا۔ وہ دور کھڑی دیکھتی رہی کہ جو میرے قریب ہیں وہ کس طرح رشتوں کی فصیل بنا کے درمیان میں ہیں اور اس کے وجود کو نظر انداز کرنا غلط نہیں سمجھتے۔

میں اٹھا تھا کہ نور جہاں سے بھی تسلی کے دو بول اتنے ہی پیار سے کہوں لیکن اچانک شہزادا اندر آ گیا۔ ''کیسے ہیں آپ؟'' اس نے کہا۔

''بالکل ٹھیک۔ باہر یہ کیسا شور ہے؟'' میں نے کہا۔

وہ بولا۔ ''لوگ آپ سے عید ملنے آئے ہیں۔ غنی نے سب کو منع کیا تھا کہ آپ کی طبیعت ایسی نہیں لیکن لوگ کہتے ہیں کہ نواب صاحب کو دیکھے بغیر نہیں جائیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''میں چلتا ہوں لیکن پہلے بتاؤ وہ کون تھا؟''

''ابھی کچھ معلوم نہیں۔ لوگوں نے اسے بہت مارا۔ اسے بچانے کی کوشش میں راجا کو اور مجھے خاصی مار پڑ گئی لیکن ہم اسے نکال لائے۔ وہ زخمی اور بیہوش ہے۔ گارڈ اسے حویلی میں لے آئے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''اسے مارنے والے کون تھے؟''

''کچھ اپنے۔ کچھ نا معلوم لوگ۔ اردگرد کے دیہات سے کافی لوگ نماز میں شریک ہونے آئے تھے۔ زیادہ تر کو ہم نے آسانی سے روک دیا تھا۔ کچھ تھے جو قابو میں نہیں آ رہے تھے تو غنی نے ریوالور نکال لیا اور ایک فائر کیا تو سب بھاگ گئے۔''

میں نے کہا۔ ''آواز میں نے بھی سنی تھی۔''

''کچھ مشکوک افراد تھے۔ سب بھاگے تو وہ بھی نکل گئے۔ ڈاکٹر شہباز اس زخمی قیدی کو دیکھ رہی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اسے شہر کے کسی اسپتال میں شفٹ کرنا پڑے گا۔''

''اگر ایسا ہے تو دیر مت کرو۔ اسے مرنا نہیں چاہیے۔ مر گیا تو ہم پوچھ گچھ کس سے کریں گے۔'' میں نے کہا۔

جب میں باہر آیا تو وہاں دو ڈھائی سو افراد کا مجمع تھا جو گارڈز کے روکنے کی پروا کیے بغیر حویلی میں آ گئے تھے۔ مجھے دیکھ کے ایک شور سا اٹھا یہ اظہار مسرت اور تشکر کے کلمات کا شور تھا۔ سب لوگ ایک ساتھ آگے بڑھے اور برآمدے کے کنارے تک آ گئے۔ شہزادا نے میرے لیے ایک کرسی رکھ دی اور مجھے کھینچ کے کرسی پر بٹھا دیا۔ اس نے میرے کان میں کہا کہ میں کسی سے گلے ملنے یا ہاتھ ملانے کی غلطی نہ کروں ورنہ یہ سب فرطِ جذبات میں اور بڑھ کے مجھ سے محبت کا اظہار کریں گے اور مجھے یہ محبت مہنگی پڑے گی۔

میں نے ہاتھ اٹھا کے سب کو خاموش کیا۔ ''میری طرف سے آپ سب کو عید کی خوشیاں مبارک۔''

جواب میں پھر ایک شور اٹھا۔ اس میں عید مبارک کے ساتھ بہت سے دعائیہ کلمات تھے۔ سب لوگ ایک ساتھ بول رہے تھے۔ میں صرف ان کی سن سکتا تھا جو آگے تھے۔ وہ پوچھ رہے تھے کہ میرا حال کیا ہے۔ میرے اس نادیدہ اجنبی دشمن کے بارے میں جاننا چاہتے تھے کہ اس نے یہ مذموم حرکت کیوں کی۔ وہ غصے میں تھے اور اسے کوس رہے تھے۔

میں نے پھر انہیں خاموش کیا اور ایک مختصر تقریر میں ان سب کے خیالات کا شکریہ ادا کیا۔ انہیں بتایا کہ مجھے اللہ نے بچایا اور ایک معمولی خراش آئی ہے۔ حملہ آور یا اس کے عزائم کے بارے میں مجھے کچھ معلوم نہیں لیکن ان میں سے کوئی اسے پہچانتا ہو تو آگے آئے۔ وہ سب اپنی جگہ کھڑے رہے۔

دس منٹ بعد غنی نے ان سب کو حویلی کے احاطے سے نکال دیا لیکن انہوں نے کوئی گلہ نہیں کیا۔ وہ مطمئن ہو گئے تھے کہ نواب صاحب نے عید ملنے سے انکار نہیں کیا اور انہیں عزت دی۔ قربانی کا مرحلہ درپیش نہ ہوتا تو شاید میں حکم دیتا کہ ان سب کی خاطر مدارات کی جائے۔

کچھ دیر بعد اس ناخوشگوار حادثے کے اثرات ختم ہو گئے۔ غنی کی نگرانی میں قربانی کا سلسلہ شروع ہوا۔ بکرے اور گائیں حویلی کی دیوار کے باہر ذبح کیے گئے اور پھر سارا دن گاڑیاں گوشت تقسیم کرنے کے لیے دوڑتی رہیں۔ کچھ کالے بکرے مزید لائے گئے اور میری زندگی کے صدقے میں قربان ہوئے۔ یہ سلسلہ تمام دن چلا۔

مجھے کندھے میں خفیف سے درد کے سوا کوئی تکلیف نہ تھی چنانچہ میں نے بیمار بن کے لیٹنے سے صاف انکار کر دیا۔ ایک گھنٹے بعد میرے ساتھ راجا اور شہزادا کی کوشش سے دوبارہ عید کا پر مسرت ماحول پیدا ہو گیا۔ خواتین کے چہروں پر بھی

مسکراہٹ آ گئی اور انہوں نے بڑے اہتمام سے عید کے ملبوسات اور میک اپ میں مقابلہ حسن جیسے جوش و خروش سے حصہ لیا۔ اس مقابلے میں جج کوئی نہ تھا اور ہوتا تو مجھ سے زیادہ بے بس ہوتا۔ بات میرے جذبات کی نہیں تھی۔ وہاں کون تھا جو نور جہاں کے مقابل ہوتا۔ گزشتہ روز لباس تو سب نے اپنی اپنی پسند سے ہی خریدے تھے مگر نور جہاں نے سادگی میں بھی وہ انداز پیدا کیا تھا جو کسی کی پرکاری میں نہ تھا۔ حسد کا احساس مجھے صرف رابعہ کے رویے سے ہوا لیکن یہ ایک فطری بات تھی۔ کسی حقیقی بہن کی عدم موجودگی میں وہی نند کے منصب پر فائز تھی۔

میں دن بھر سعودی عرب کی کال کا انتظار کرتا رہا اور وقفے وقفے سے سب نے ہی اباجی سے بات کرنے کی کوشش کی مگر نہ جانے کیوں کسی کو نمبر نہیں ملا اور کمپیوٹر سے ایک ہی جواب موصول ہوتا رہا کہ آپ کے ملائے ہوئے نمبر سے فی الحال رابطہ ممکن نہیں ہے۔ سیٹلائٹ کمیونی کیشن کے جدید نظام سے ہر وقت کروڑوں فون منسلک رہتے ہیں اور آواز کے سفر میں زمین سے خلا اور خلا سے زمین تک کہیں کوئی معمولی سی فنی خرابی ہو تو رابطے میں خلل پڑ جاتا ہے۔

دوپہر کا کھانا بھی اس افراتفری کے باعث دیر سے کھایا گیا۔ حویلی کے باہر بھی میلا سا لگا رہا۔ اردگرد کے دیہات میں جہاں مجھ پر ہونے والے قاتلانہ حملے کی خبر گئی وہاں سے لوگ میری خیر و عافیت دریافت کرنے آئے۔ وہ مجھے عید کی مبارکباد بھی دینا چاہتے تھے۔ آنے والوں میں مرد عورتیں بچے سب شامل تھے۔ غنی نے میرے کہنے پر ایک گارڈ کو سمجھا دیا تھا کہ اسے ملاقاتیوں سے کیسے پیش آنا ہے۔ وہ میری طرف سے سب کا شکریہ ادا کرتا تھا اور انہیں بتاتا تھا کہ نواب صاحب کو معمولی زخم آیا ہے لیکن وہ آرام کر رہے ہیں اس لیے مل نہیں سکتے۔ بچوں کو میری طرف سے سو سو روپے عیدی کے دیے گئے۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ گرد و نواح کے ہر گاؤں کی مسجد میں میری صحت یابی کے لیے خصوصی دعا ہر نماز کے بعد کی گئی اور کئی جگہ لوگوں نے کالے بکرے صدقہ کیے۔

یہ جذبات کا اظہار بڑا حوصلہ دیتا تھا۔ اب میں وہ گمنام اجنبی نہیں رہا تھا جس نے دس مہینے قبل حویلی کی ملکیت حاصل کی تھی تو اس کو نہ کوئی جانتا تھا نہ پہچانتا تھا پھر آہستہ آہستہ میری شناخت بنی۔ اس میں میرے رویے یا میری فیاضی سے زیادہ ہاتھ میرا ساتھ دینے والوں کا تھا جو شہری زندگی کے آرام چھوڑ کر اس ویرانے کو آباد کرنے آئے تھے۔

جنہوں نے میرے خواب کو تعبیر دینے کے لیے دن رات ایک کیا تھا۔ اس خواب کا نام ست بدھائی ترقیاتی پروگرام تھا۔ اب یہاں ایک فری اسپتال چل رہا تھا۔ ایک اسکول شروع ہو چکا تھا۔ لوگ مجھے ایک رعایا پرور حاکم سمجھنے لگے تھے۔ جسے رانا ایک استاد کا بیٹا سمجھ کے حقارت سے دیکھتا تھا اور گالی دینے کے لیے نواب کا نطفہ کہتا تھا اور اب سچ مچ کا نواب رفیق تھا جسے غریبوں کے ہمدرد انصاف پرور اور فیاض مسیحا کے طور پر تسلیم کر لیا گیا تھا۔ جو لوگوں کی مشکل زندگی میں آسانی لانا چاہتا تھا۔ جس نے انہیں اچھے خوشحال مستقبل کی امید دی تھی۔ یہ امید رانا کے جھوٹے انتخابی نعروں سے مختلف تھی۔ اس کا عملی روپ لوگوں کے سامنے آ رہا تھا۔

میری نیک نامی کی شہرت کا آغاز کاسو کے معاملے سے ہوا تھا۔ میرے ہاتھوں رانا کا سب سے بیش قیمت شکاری کتا ہلاک ہو گیا تھا۔ کاسو اس کتے کا رکھوالا تھا۔ رانا نے میرے جرم کی سزا کاسو کو دینے کا فیصلہ کیا اور حکم دیا کہ اسے کتے کے ساتھ زندہ دفن کر دیا جائے۔ اس کی بیوی فریادی بن کے میرے پاس آئی تو میں نے کاسو کو رانا کی قید سے نکالا اور اس کے خاندان کو حویلی میں پناہ دے دی۔ جو رانا کے ساتھ دشمنی کا نتیجہ آغاز تھا۔ اس نے کاسو کو لے جانے کی بڑی کوشش کی اور بہت عرصہ کتے کی کھال میں بھس بھر کے رکھا کہ کاسو ہاتھ آئے تو اسے کتے کی ڈمی کے ساتھ گاڑ دے۔ میں نے اس کی ہر کوشش ناکام بنا دی اور بالآخر کاسو کو فیملی کے ساتھ رانا کی دسترس سے بہت دور بھیج دیا۔

اس واقعے نے لوگوں کو حیران کیا کہ کیا ایسا بھی کوئی سو رہا ہے جو رانا کے مقابل کھڑا ہو کے اسے للکار سکے اور اس کی بدمعاشی کی طاقت کے سامنے ڈٹ جائے۔ آج یہ صورتِ حال تھی کہ میری نیک نامی دور دور کے لوگوں کو کھینچ لائی تھی۔ وہ ست بدھائی کے نواب رفیق کے ساتھ عید کی نماز پڑھنے آئے تھے۔ اس سے عید ملنے کے لیے انہوں نے دور دراز کا سفر کیا تھا اور مجھ پر قاتلانہ حملے کی خبر نے آس پاس کے علاقے میں تشویش پھیلا دی تھی۔ اب نہ میں اکیلا تھا اور نہ اجنبی۔ میرے ساتھ لوگ تھے جن کو سیاست میں عوام کہا جاتا ہے۔ وہی میری طاقت تھے جو رانا کی طاقت سے بہت مختلف طاقت تھی۔

مجھ پر قاتلانہ حملے کی سازش پہلے بھی ہوئی تھی۔ ایک شخص دستی بم کے ساتھ اسکول اور اسپتال کی افتتاحی تقریب میں دھماکا کرنے بھیجا گیا تھا لیکن اس نے لوگوں کے جذبات اور تقریب کا ماحول دیکھا تو اس کا ارادہ بدل گیا اور اس نے

خود کو بم سمیت میرے گارڈز کے حوالے کر دیا۔ میں نے اسے معاف کر دیا اور اس علاقے سے دور بھیج دیا۔ وہ یہاں رہتا تو رانا اسے غداری اور نمک حرامی پر مروائے بغیر نہ چھوڑتا۔

خنجر کے ساتھ نمازیوں میں شامل ہونے والا بھی یقیناً رانا کے کیمپ کا آدمی تھا۔ اسے بھی لالچ کے ساتھ دباؤ کے تحت بھیجا گیا ہوگا۔ رانا کے نمک خوار کسی حکم کی تعمیل سے انکار کی جرات نہیں رکھتے تھے۔ انکار کو بغاوت سمجھا جاتا تھا اور اس کی سزا باغی کے ساتھ اس کے خاندان کو بھی بھگتنا پڑتی تھی۔ اس کے بیوی، بچے ماں باپ بھائی بہن سب رانا کے عتاب کا شکار ہوتے تھے۔ جان ہتھیلی پر رکھ کے حکم بجالانے والے کو انعام ملتا تھا۔ رانا کی ایک شاباشی۔ دو چار ہزار روپے یا زمین کا ایک ٹکڑا۔ غلامی سے آزادی پھر بھی نہ تھی۔

اس حملہ آور کو میں نے سہ پہر کے بعد دیکھا۔ شہناز نے مجھے مطلع کیا کہ اب اس کی حالت خطرے سے باہر ہے۔ غنی کے ساتھ میں تہ خانے میں اترا۔ قیدی کو ایک الگ کمرے میں رکھا گیا تھا۔ اس زمیں دوز قید خانے تک کسی کی رسائی ناممکن تھی۔ ایک مسلح محافظ زینے کے آغاز میں کھڑا تھا اور دوسرا کمرے کے باہر۔ قیدی تیس بتیس سال کا عام سا دیہاتی تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے ایک تخت پر سیدھا لیٹا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھوں پیروں پر مجھے پٹیاں بندھی نظر آرہی تھیں۔

شہناز میرے ساتھ تھی۔ اس نے مجھے پوری رپورٹ دی۔ ''لوگوں نے اسے بڑی بے رحمی سے مارا ہے۔ اس کے دونوں بازو ٹوٹے ہیں۔ دو پسلیاں متاثر ہوئی ہیں۔ باقی جسم پر بھی خاصی چوٹیں ہیں۔''

''ذرا اپنی میڈیکل رپورٹ کی زبان میں بتاؤ۔ چوٹیں کیسے آئیں...؟''

وہ میرا مطلب سمجھ گئی اور ہنسنے لگی۔ ''زیادہ چوٹیں عام قسم کی ہیں۔ جو تھپڑ کے لوگوں نے مارے۔ یا لاتیں ماریں، جسم پر سوجن اور نیل ہیں۔ دو پسلیاں بھی ٹھوکریں مارنے سے متاثر ہوئی ہیں۔''

''متاثر ہونے کا کیا مطلب ہے۔ ٹوٹی ہیں؟''

''فریکچر لگتا ہے مگر یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ٹوٹ کے کوئی پسلی دو حصوں میں الگ نہیں ہوئی ہے۔ کریک ہوئی ہے۔ پسلی ٹوٹ جائے تو اندر گھس جاتی ہے اور پھیپھڑوں کو بھی نقصان پہنچا سکتی ہے۔ ایسا نہیں ہوا ورنہ اسے اسپتال لے جانا پڑتا۔ آپریشن سے ہڈی جوڑ کے پلاسٹر کرنا پڑتا۔ دایاں بازو کہنی سے نیچے ٹوٹا ہے۔ اس پر کسی سخت چیز سے وار کیا گیا تھا مثلاً ڈنڈا یا سریا۔''

میں نے کہا۔ ''نماز پڑھنے والا ڈنڈا یا سریا کیسے لایا؟''

''یہ آپ کی تفتیشی ٹیم کو معلوم کرنا چاہیے۔ دوسرا بازو کہنی سے اوپر ٹوٹا ہے۔ اسی طرح جیسے پہلا بازو ٹوٹا لیکن دو زخم جو سر پر ہیں وہ گہرے کٹ ہیں۔ ایسا لگتا ہے کسی نے کلہاڑی سے وار کیا ہو۔''

''ڈاکٹر صاحب۔ کچھ خدا کا خوف کرو۔ کلہاڑی سے سر کے دو ٹکڑے ہو جاتے اور کلہاڑی ایسی چیز نہیں کہ کوئی جیب میں رکھ کر لے آئے۔''

''تم میڈیکل رپورٹ کو چیلنج کر رہے ہو؟''

میں نے سر کھجا کے کہا۔ ''نہیں...آ...''

شہناز نے کہا۔ ''سر کھجانے کے لیے دایاں ہاتھ استعمال کریں نواب صاحب۔ ورنہ کسی ملازم سے کہہ دیں۔ بایاں شانہ زخمی ہے۔''

میں نے زخمی کو غور سے دیکھا۔ ''یہ سب تم نے کیسے کیا؟ میرا مطلب ہے اس کی حالت خاصی خراب تھی۔ شہزادکا خیال تھا کہ شہر کے کسی اسپتال شفٹ نہ کیا تو مر جائے گا۔''

''فریکچر سمپل تھے۔ میں نے اور ڈاکٹر ریشم نے پلاسٹر چڑھایا۔ یہی کام مشکل تھا۔ مرہم پٹی اور زخموں کی صفائی وہ اکیلی بھی کر لیتی ہے۔ یہ خاصی تکلیف میں تھا۔ میں نے ایک انجکشن دے کر کام چلایا۔ ضرورت کی سب دوائیں میرے پاس تھیں۔''

میں نے شہناز کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''تم جو کام کر رہی ہو۔ وسائل نہ ہونے کے باوجود ایسے مشکل حالات میں۔ تمام خطرات کے ہوتے۔ اس پر میں اپنی طرف سے نوبل پرائز دینا چاہتا ہوں۔''

''شکریہ۔ آپ یہ پرائز اپنے پاس رکھیں۔ مجھے اس آدھے ادھورے کلینک کی جگہ اسپتال بنا دیں۔ ایک چھوٹے اسپتال کو چلانے کے لیے بھی کچھ چیزیں ضروری ہیں۔ ورنہ پرابلم ہوتی ہے۔''

''آپ حکم کرو۔''

''ایک تو ایکسرے مشین۔ ایک الٹرا ساؤنڈ مشین۔ ایک ای سی جی کی مشین۔ اس کے علاوہ... عام قسم کے ٹیسٹ کرنے کے لیے لیبارٹری ہونی چاہیے۔''

''شہناز تم کو مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم خود جاؤ اور آرڈر کرو۔ تمہیں معلوم ہوگا کہ کہاں سے کیا چیز ملتی ہے۔ تم پہلے بھی تو شہر میں اپنا کلینک چلاتی تھیں۔ میڈیکل ریپ تمہارے پاس آتے ہوں گے۔ ان سے کہو۔ جس جذبے سے تم یہاں کام کر رہی ہو۔ اس پر میں تمہارا شکر گزار ہوں۔ دیکھنا ایک دن یہاں بہت بڑا اسپتال بنے گا۔ پھر ہم ڈائلاسس مشین بھی لگائیں گے۔ سی ٹی اسکین بھی کریں گے۔ ایم آر آئی بھی۔ سب غریبوں کے لیے فری۔''

''اصل جذبہ تو تمہارا ہے۔ میں ست بدھائی ترقیاتی منصوبے کی تکمیل میں تمہاری مدد کر رہی ہوں۔''

''آج جو میں نے دیکھا۔ لوگوں کی محبت اور عقیدت۔ اس میں سب سے بڑا ہاتھ تمہارا ہے۔''

پیچھے سے غنی نے کہا۔ ''سر!''

میں نے پلٹ کے دیکھا۔ ''آؤ غنی! کیا بات ہے؟''

''ایک بندہ مل گیا ہے۔ وہ ملزم کو جانتا ہے۔ میں نے اسے بلایا ہے کہ شناخت کر لے۔ وہ باہر کھڑا ہے۔''

''اسے لے آؤ۔'' میں نے کہا۔

ایک ادھیڑ عمر کا داڑھی والا شخص اندر آگیا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔ ''سلام مائی باپ۔''

میں نے کہا۔ ''ایسے نہیں بابا۔ مسلمانوں کی طرح اسلام علیکم کہو۔ یہ مائی باپ اور ہاتھ جوڑنا غلط ہے۔ تم کون ہو؟''

''لال بخش موچی۔ تمیال خورد میرا گاؤں ہے۔ اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔''

''تم اسے جانتے ہو؟''

''یہ فضلو ہے۔ باپ ترکھان ہے۔ لکڑی سے چیزیں بنا کے شہر میں دیتا ہے۔ یہ پہلے رانا صاحب کے پاس تھا۔ گاڑی چلاتا تھا۔ گاڑی سے چیزیں نکال کے بیچنے لگا۔ جب گاڑی لے کر شہر جاتا کوئی چیز غائب ہو جاتی۔ یہ کہتا کہ چوری ہوگئی۔ رانا صاحب کو شک پڑ گیا کہ چور یہ خود ہے۔ انہوں نے ایک بندے کو پیچھے لگا دیا۔ اس نے فضلو کے ساتھ مل کر سب پوچھ لیا کہ کون سی چیز کہاں بیچی۔ رانا نے پولیس میں دے دیا۔ انہوں نے اتنا مارا کہ بیوی کے کام کا نہیں رہا۔ بیوی کو رانا صاحب نے پہلے ہی اٹھوا لیا تھا۔ یہ جیل چلا گیا۔ ابھی دو مہینے ہوئے چھوٹ کے آیا تھا۔''

میں نے اس صورتِ حال پر غور کیا۔ ''اور اس کی بیوی؟''

''وہ ابھی تک رانا صاحب کے پاس ہے۔ خوبصورت تھی، رانا نے بعد میں اپنے منشی کو دے دی۔''

''جب شوہر جیل سے رہا ہو کے آیا۔ تو بیوی نے لوٹ کے اپنے گھر جانے کی کوشش نہیں کی؟ اور خود شوہر کیا کرتا رہا۔''

''عورت خود اس کے پاس آنا نہیں چاہتی۔ مزے میں ہے۔ یہ پہلے اسے بہت مارتا تھا۔ اس پر شک کرتا تھا۔ اب عورت کہتی ہے کہ جب وہ مرد ہی نہیں رہا تو میرا شوہر کہاں رہا۔''

میں نے کہا۔ ''ایک منٹ۔ یہ باتیں کس نے بتائیں تمہیں؟ ظاہر ہے خود فضلو اپنے نامرد ہونے کا ڈھنڈورا نہیں پیٹ سکتا۔ یہ ٹھیک ہے کہ پولیس تشدد سے بعض اوقات گردے متاثر ہوتے ہیں اور وقتی طور پر آدمی کی مردانہ قوت بھی نہیں رہتی لیکن وقت کے ساتھ اور علاج سے یہ خرابیاں خود بخود دور ہو جاتی ہیں۔''

''میں نے سنا تھا جناب۔''

''یہی تو میں پوچھ رہا ہوں۔ کس سے سنا تھا؟''

اس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اعتراف کیا۔ ''رانا صاحب کے منشی نے مجھ سے کہا کہ پولیس والوں نے اسے بتایا تھا کہ فضلو کو ہم نے خصی کر دیا ہے۔ تو موج کر اس کی بیوی کے ساتھ۔''

''تمہارا کیا تعلق ہے رانا کے منشی سے کہ اس نے تمہیں یہ بات بتا دی؟''

وہ کچھ گھبرایا۔ ''سرکار! آپ کا شک جائز ہے۔ میں رانا کے منشی کے لیے کام کرتا ہوں۔''

''اسے معلوم ہوگا کہ تم نے نمک حرامی کی ہے۔ ابھی تک کسی نے بھی فضلو کو پہچاننے کی ہمت نہیں کی تھی۔ حالانکہ تم جانتے ہو تو اور بھی بہت لوگ اسے پہچانتے ہوں گے۔ پھر تمہارا کیا بنے گا؟'' میں نے کہا۔

وہ ہاتھ جوڑ کے بولا۔ ''جناب عالی! یہ ٹھیک ہے کہ میں رانا کا نمک کھاتا ہوں لیکن آپ کا ایک احسان تھا۔ وہ اتارنے کے لیے میں نے یہ خطرہ مول لیا۔ آپ نے کاسو کی جان بچائی تھی۔''

میں دم بخود رہ گیا۔ ''کاسو تمہارا کیا لگتا تھا؟''

''وہ میری بہن کا گھر والا تھا۔ میری ایک ہی بہن تھی۔ کاسو کو زندہ دفن کر دیا جاتا تو وہ بھی مر جاتی۔ ان کا بچہ بھی مر جاتا۔ اب میں چلتا ہوں۔ میں چھپ کے آیا تھا۔ اگر کسی کو پتا چل گیا تو میں مارا جاؤں گا۔''

میں نے سر ہلا کے غنی سے کہا۔ ''اس بندے کو نظر میں رکھو۔ معلوم کرو اس نے کتنا جھوٹ بولا ہے اور کتنا سچ۔''

''وہ میں نے معلوم کر لیا ہے سر! یہ سچ بول رہا تھا۔''

بات اب واضح ہو گئی تھی۔ اپنی بیوی واپس لینے کے

لیے فضلو نے رانا کے قدموں پر سر رکھ دیا ہوگا کہ مجھے اپنے کیے کی سزا مل گئی۔ مجھے معاف کر دیں۔ میں ساری عمر آپ کا غلام رہوں گا۔ بس میری بیوی مجھے دلا دیں اور رانا نے بھی سوچا ہوگا کہ اس کو معاف کرنے کے لیے شرط عائد کی جا سکتی ہے کہ جاؤ پہلے ست بدھائی کے نواب کا کام تمام کرو۔ تم نے یہ کام کر دکھایا تو تمہارا کام بھی ہو جائے گا۔ فضلو اپنی بیوی کے لیے بے تاب اور دیوانہ۔ مجبور اور بے بس۔ مانتا نہ تو کیا کرتا۔ قاتلانہ حملے کا طریقہ اسے کسی اور نے سمجھایا تھا یا اس نے خود اپنے دماغ سے سوچا۔ ہر صورت میں ناکامی یا موت صرف فضلو کے لیے تھی۔ اگر وہ مجھے خنجر گھونپنے میں کامیاب ہو جاتا۔ جس کا امکان بہت کم تھا۔ تب بھی خنجر کے ایک وار سے میرا مر جانا یقینی نہ تھا۔ اس کا پکڑا جانا یا مارا جانا یقینی تھا۔ اس کی بیوی اسے کسی صورت نہ ملتی۔

غنی لوٹ کے آیا تو ہم سب حویلی کے لان پر بیٹھے شام کی چائے پی رہے تھے۔ گیٹ پر ابھی میرے لیے نیک خواہشات رکھنے والے آ جا رہے تھے۔ وہ سیدھے سادے دیہاتی مجھ سے عقیدت یا اطاعت ظاہر کرنے کے لیے چھوٹے موٹے تحائف بھی لا رہے تھے۔ یہ دور سلطانی کی روایت تھی جو کسی نہ کسی صورت میں چل رہی تھی۔ بادشاہ سلامت۔ ریاستوں کے نواب یا راجا مہاراجا کی خدمت میں حاضر ہونے والے پہلے نذرانہ پیش کرتے تھے۔ میں کسی صورت ان لوگوں کا حاکم نہیں تھا اور بے وجہ نواب مشہور ہو گیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ مجھے جناب عالی۔ سرکار یا مائی باپ جیسے خطاب سے بھی یاد کیا جائے لیکن یہ لوگ اپنی عادت یا فطرت سے مجبور تھے۔ وہ اپنی چاہت یا پسندیدگی کا اظہار ایسے ہی تحائف سے کرتے تھے۔ گیٹ پر ان اشیا کا انبار لگ گیا تھا۔ اس ڈھیر میں گڑ، جو کا ستو، ...... مکھن اور دیسی گھی۔ یہاں تک کہ سبزیاں اور انڈے تک شامل تھا۔ کوئی ایک مرغی بھی نذر کر گیا تھا۔ میری ہدایت پر غنی نے یہ سب چیزیں گارڈز میں تقسیم کروا دی تھیں۔

میں نے غنی کو اشارے سے بلایا۔ ''غنی! اگر لال بخش موچی کو معلوم تھا کہ مجھ پر قاتلانہ حملہ کرنے والا فضلو حویلی میں قید ہے۔ تو یہ بات اور کتنے لوگوں کو معلوم ہوگی۔ اسے پہچاننے والے بہت ہوں گے۔''

''جی سر! لیکن وہ رانا کے ڈر سے سامنے نہیں آئے۔''

''کیا اب تک اس کے باپ کو پتا نہیں چلا۔'' راجا نے پوچھا۔

''پتا تو یقیناً چل گیا ہوگا۔ وہ ڈر کے مارے نہیں آیا۔''

میں نے کہا۔ ''اس نے تو کوئی جرم نہیں کیا۔''

''لیکن یہاں کا دستور ہے۔ بیٹے کا جرم ہو یا باپ کا۔ سزا پورے خاندان کے لیے ہوتی ہے۔ فضلو کا باپ دونوں طرف سے مشکل میں پڑ گیا ہے۔ ایک طرف رانا کا ڈر ہے۔ دوسری طرف آپ کا اور ہو سکتا ہے وہ یہاں آئے۔ رحم کی اپیل کے ساتھ۔ اسے بھی معلوم ہوگا کہ آپ رانا کی طرح بے رحم اور ظالم نہیں ہیں۔''

اچانک مجھے ایک بات یاد آ گئی۔ ''غنی! عید کی نماز سے پہلے کہیں کتے بھونک رہے تھے۔''

غنی مسکرانے لگا۔ ''ہاں جی! اس کی مجھے خبر ملی تھی۔ رانا کے منشی کو کچھ زیادہ ہی تکلیف ہو رہی ہے۔ اس نے آس پاس کے علاقے سے کچھ پاگل کتے پکڑے تھے۔ کسی نے بتایا تو مجھے بڑی حیرانی ہوئی۔ یہاں کتے ایسے ہی پھرتے ہیں۔ لوگوں کو کاٹ بھی لیتے ہیں۔ سرکاری محکمے شہروں میں کام نہیں کرتے تو گاؤں میں کتے پکڑنے یا مارنے کون آئے گا۔ میں نے پتا کیا تو معلوم ہوا کہ چار کتے ان کے ہاتھ لگے تھے۔ پاگل کتوں کا آسان علاج یہاں بھی ایک ہی ہے کہ انہیں مار دیا جائے۔ عام طور پر یہاں ان کو گوشت میں نیلا تھوتھا ڈال کے کھلا دیتے ہیں۔ لیکن یہ کتے بڑی کوشش سے زندہ پکڑے گئے۔ کافی بھاگ دوڑ ہوئی۔ کتے پکڑنے والے بڑی تیاری سے آئے تھے۔ ٹانگوں پر بوریاں باندھ کے اور ہاتھوں پر کپڑا لپیٹ کے۔ جو بات سب کو عجیب لگی یہ تھی کہ انہوں نے منہ بھی ڈھانپ رکھے تھے۔ سوچنے کی بات ہے جناب کہ کتا کسی کے منہ پر تو حملہ نہیں کرتا۔ ان کا اصل مقصد خود کو چھپانا تھا۔ کسی نے ان کی صورت نہیں دیکھی۔ میں نے پتا کیا تو خبر ملی کہ وہ کتے رانا کے ڈوگ ہاؤس میں ہیں لیکن ان کو الگ رکھا گیا ہے۔''

''یہ خبر کس سے ملی؟'' میں نے پوچھا۔

غنی نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ''اسی سے۔ جو رانا کی حویلی میں ہے۔''

راجا ہنسنے لگا۔ ''فکر مت کرو۔ ریشم کو پتا نہیں چلے گا۔''

غنی نفی میں سر ہلانے لگا۔ ''آپ نہیں جانتے اسے سر! وہ جتنی بھولی بنتی ہے اتنی ہی چالاک ہے۔ چار کان ہیں اس کے اور دو آنکھیں سر کے پیچھے بھی ہیں۔ ہر بات اسے مجھ سے اور آپ سے پہلے معلوم ہوتی ہے۔ جاسوس لگا رکھے ہیں میرے پیچھے بھی۔ خیر جناب اطلاع یہ ملی کہ کتے عید کی نماز کے وقت چھوڑے جائیں گے۔ اس سے پہلے انہیں خوب

شراب پلائی جائے گی۔''

میں نے کہا۔ ''اس منشی کا دماغ بھی کیا چیز ہے۔''

''صرف شیطانی کام سوجھتے ہیں اسے سر! ہو سکتا ہے رانا کو خبر ہی نہ ہو۔ اگر وہ کامیاب ہو جاتا تو میرے خنجر سے رانا کے سامنے اپنی کارکردگی کی رپورٹ پیش کرتا۔ لیکن اس کے دونوں پلان فیل ہو گئے۔''

''دوسرا پلان کیا تھا۔''

''پہلے اس نے ہر گاؤں کے لوگوں سے کہا تھا کہ نماز جمعہ کے بعد فتوے جاری کر دیں کہ جس نے اپنے گاؤں کو چھوڑ کے کسی دوسرے گاؤں میں جمعہ پڑھا یا عید کی نماز ادا کی، اس کی نماز نہیں ہوگی۔ الٹا وہ گنہگار ہوگا۔ ظاہر ہے کسی نے بھی یہ بات نہیں مانی تو انہیں لالچ دیا گیا۔ رانا صاحب کی طرف سے مسجد کی تعمیر اور رنگ روغن کی مد میں پانچ پانچ ہزار روپے دیے جائیں گے۔ اس پر کچھ مان گئے۔ کچھ نہیں مانے تو انہیں بلا کے دھمکی دی گئی کہ امامت سے فارغ کر دیا جائے گا۔ ایک دو بندوں کو اضافی پانچ ہزار بھی دیے گئے۔ اس کے بعد سارے ہی سیدھے ہو گئے۔ سوائے ایک دو کے۔ ہر گاؤں میں یہ بات پھیل گئی۔ رانا کو یقیناً اس کے جاسوسوں نے اس خطرے سے آگاہ کر دیا ہوگا کہ لوگ ست بدھائی جا کے نواب رفیق کے ساتھ عید کی نماز میں شریک ہونے کا سوچ رہے ہیں۔ دیہات میں مسجد کے پیش امام کی بات دین کے معاملے میں سند سمجھی جاتی ہے۔ اس کے باوجود کافی لوگ آ گئے۔ یہ بات نہ ہوتی تو باہر تک مجمع ہوتا۔ آپ دیکھ لیں۔ سارا دن لوگ آتے رہے ہیں اور اب بھی آ رہے ہیں۔ یہ وہی ہیں جو نماز میں شریک ہونے سے رک گئے تھے۔''

میں نے کہا۔ ''کیا وہ پاگل شرابی کتے چھوڑے گئے تھے؟''

''جی سر! مجھے بعد میں پتا چلا کہ ان کی دم کے ساتھ فیتہ باندھ کے آگ لگائی گئی اور ان کا رخ ہماری طرف کر کے چھوڑ دیا گیا۔ وہ سیدھے بھاگے۔ اگر وہ سائنس ریسرچ سینٹر تک پہنچ جاتے تو پتا نہیں کتنے نماز پڑھنے والوں پر حملہ کرتے۔''

''پھر تم نے انہیں کیسے روکا؟''

''کل رات میں نے سینٹر کے باہر بیس فٹ لمبی اور دو فٹ گہری خندق کھدوائی تھی۔ دس بندے تھے۔ ایک گھنٹے میں یہ کام ہو گیا۔ پھر میں نے ساتھ والے گاؤں سے ایک سپیرے کو بلوایا اور اسے کہا کہ مجھے کچھ جنگلی زہریلے سانپ لا دے۔ وہ ادھر کلر کہار کے علاقے سے سانپ پکڑ کے لاتا ہے اور ان کا زہر نکال کے کسی کو دیتا ہے۔ میں نے سنا ہے چکوال اور پنڈ دادن خان کی طرف کوئی حکیم ہے جو سانپ کے زہر سے دوائیاں بھی بناتا ہے۔ اس نے دس چھوٹے سانپ دیے۔ ہوں گے فٹ دو فٹ کے درمیان اور پتلے مگر سپیرے نے کہا کہ ہیں زہریلے۔ وہ میں نے صبح خندق میں چھوڑ دیے اور خندق کے اوپر پتلی پتلی شاخیں رکھ کے گھاس پھوس پھیلا دیا۔ اس طرح سانپ بھی باہر نہیں آئے۔''

''اور آ جاتے پھر؟'' شہزاد نے پوچھا۔

''دو بندے رکھے تھے میں نے۔ وہ انہیں مار دیتے۔ جب کتے تکلیف سے چلاتے اور شراب کے نشے میں سیدھے دوڑتے آئے تو خندق میں گر گئے۔ وہاں سانپوں نے انہیں ڈس لیا۔ سپیرا دوپہر کے بعد آیا تھا۔ اپنے سانپ بھی لے گیا اور چار سو روپے بھی۔ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ پاگل کتوں کو مارنے کے لیے اتنا مشکل طریقہ کیوں اختیار کیا؟ میں نے کہا کہ یہ پاگل کتے بڑے ہوشیار تھے۔ پہلے تھوتھے والا گوشت نہیں کھاتے تھے۔'' غنی ہنسنے لگا۔

ہم سب نے حقیقت پر مبنی یہ دہشت ناک کہانی بڑی حیرت سے سنی تھی۔ حیرانی کے جذبات میں خوف کا عنصر بھی شامل تھا اور فکرمندی کا بھی۔ بے شک غنی نے ذہانت اور حاضر دماغی سے کام لیتے ہوئے اینٹ کا جواب پتھر سے دیا تھا لیکن رانا کے کیمپ کی طرف سے ایسی خطرناک سازشوں کا تصور لامحدود اندیشوں کو جنم دیتا تھا۔ گرفتاری کے بعد رانا کی خاندانی عزت بری طرح مجروح ہوئی تھی۔ یہ بات یقینی تھی کہ اب اس کی دشمنی کے جذبات نئی شدت کے ساتھ سامنے آئیں گے۔ ڈی آئی جی عبداللہ نے کوشش ضرور کی تھی کہ وہ بدلے ہوئے وقت اور حالات کے تقاضوں کو سمجھ لے اور اپنی حد میں رہتے ہوئے دوسروں کی خودمختاری کو تسلیم کرے لیکن نسل در نسل خون میں منتقل ہونے والی فرعونیت کا اثر اتنی آسانی سے زائل ہونے والا نہیں تھا۔

میں نے کہا۔ ''غنی! یہ برائی نہیں تمہاری تعریف ہے۔ رانا کے منشی کے شیطانی دماغ کا مقابلہ کوئی اور نہیں کر سکتا۔''

وہ مسکراتا رہا۔ ''سب کرنا پڑتا ہے جناب عالی! شرافت کی زبان آج کل کون سمجھتا ہے۔ اللہ نے چاہا تو آج رات ہم اپنے رانا صاحب کو عید کی مبارکباد بھی دیں گے۔ بس شیر خان آ جائے۔''

میں نے چونک کے کہا۔ ''کیا کرنا چاہتے ہو تم!''

راجا نے کہا۔ ''کچھ نہیں نواب صاحب۔ تھوڑی سی دل لگی کریں گے رانا صاحب کے ساتھ۔''

شیر خان جیسے انتظار میں تھا کہ گیٹ کھلا اور اس کی گاڑی اندر آگئی۔ وہ گاڑی سے اتر کے ہماری طرف آیا تو اس کے ہاتھ میں کاغذوں کا ایک بنڈل تھا جو اس نے درمیان میں رکھ دیا۔

راجا نے بنڈل کھول کے ایک کاغذ نکالا اور بولا ''واہ!''

شیر خان نے راجا کی طرف اس کا موبائل بڑھایا۔ ''یہ پانچ سو ہیں سر!''

راجا نے وہ پوسٹر میری طرف بڑھا دیا۔ دو فٹ لمبے ایک فٹ چوڑے پوسٹر کے دو تہائی حصے پر وہ تصویر تھی جس میں رانا اور اس کا بیٹا حوالات میں سلاخوں کو تھامے کھڑے تھے۔ نیچے موٹے حروف میں لکھا تھا۔ ''عید مبارک''۔ راجا نے یہ تصویر اپنے موبائل فون سے اتاری تھی۔ ڈی آئی جی عبداللہ نے اسے یہ تصویر اخبارات میں اشاعت کے لیے جاری کرنے سے روک دیا تھا۔ راجا نے بڑی ہوشیاری سے کام لیتے ہوئے اپنا موبائل فون غنی کے حوالے کر دیا تھا ورنہ شاید عبداللہ جان اسے ضبط کر لیتا۔ اب اس موبائل کی تصویر کو شیر خان شہر سے پوسٹرز پر پرنٹ کرا کے لایا تھا۔

میں نے کہا۔ ''کیا یہ عید کارڈ تقسیم ہوں گے؟''

راجا نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ آج رات گرد و نواح کے تمام دیہات میں نمایاں مقام پر چسپاں کرائے جائیں گے۔ صبح عوام رانا صاحب کی عزت افزائی کا نظارہ کریں گے۔''

میں نے کہا۔ ''یار وہ ڈی آئی جی خفا ہوگا۔''

''میں نہیں ڈرتا اس کی خفگی سے۔ اس کی ایک بات مان لی تھی۔ تصویر اور خبر اشاعت کے لیے جاری نہیں کی۔ ہر بات نہیں مانی جا سکتی۔ میں جو بھی کر رہا ہوں اپنی ذمے داری پر کر رہا ہوں۔ تو کہہ دیتا کہ مجھے اس کارروائی کی پہلے سے کوئی اطلاع ہوتی تو میں روک دیتا۔''

میں نے کہا۔ ''اور تو کیا کہے گا؟''

''میں ذمے داری قبول کروں گا۔ رانا چاہے تو میرے خلاف ہتک عزت کا کیس کر دے۔ یہ معاملہ ہے رانا کا اور میرا۔ ڈی آئی جی اپنے قانون کے ساتھ بیچ میں کہیں نہیں آتا۔ رانا سے میں نمٹ لوں گا عدالت میں۔ پہلے وہ ثابت کرے کہ یہ کارروائی میں نے کی تھی۔ تھانے میں تو بہت لوگ تھے۔ ہر ایک کے موبائل فون میں کیمرا تھا۔ جاؤ غنی اور تو ہو گئی مگر کوئی بات نہیں۔ تم اپنا کام کرو۔''

''دیر کیسی؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ ہم عید سے پہلے رات کو لگانا چاہتے تھے۔ تاکہ عید کی صبح رانا کے لیے مبارک ہو۔ مگر راز داری سے کام کرانے میں کچھ دیر ہو گئی۔ خیر کل بھی عید ہے اور پرسوں بھی۔''

میں نے کہا۔ ''راجا صاحب! یہ پنگا لینا ضروری ہے؟''

''اشد ضروری ہے۔ شرافت اور صلح صفائی کی سیاست بہت پہلے ناکام ہو چکی۔ اب تو ایسے ہی ہوگا۔ تو دیکھ کہ حالات کیسے بدل گئے ہیں۔ ہمارے لیے بھی اور رانا کے لیے بھی۔ ہم نے اسے بیک فٹ پر کھیلنے کے لیے مجبور کر دیا ہے۔ جارحیت سب سے بڑا دفاع ہے۔ وہ بدمعاش ہے تو ہم مہابدمعاش ہیں۔ رانا کو اس کا ثبوت دینا ضروری ہے۔ لوگوں کے دل ہم شرافت سے جیت رہے ہیں۔ رانا کو طاقت سے شکست دیں گے۔ رائٹ؟''

''یو آر رائٹ راجا۔'' میں نے قائل ہو کے کہا۔

وہ دن اچھا گزرا۔ شہزاد کی خالہ اور ماں کے آ جانے سے حویلی کی رونق بڑھ گئی تھی۔ زرق برق ملبوسات میں خواتین نے حویلی کے اندر ہی اپنی تفریح کے اسباب پیدا کر لیے تھے۔ شہباز سے عقیدت رکھنے والی مریض خواتین اور بچے بھی دن بھر آتے رہے۔ باقی سب نے عید کے مخصوص مینو کو اپنی مصروفیت کا مرکز بنا لیا اور مقابلے پر کھانے پکائے۔ نور جہاں جو پہلے کچھ بجھی بجھی سی نظر آتی تھی دو پہر کے بعد نارمل ہو گئی تھی۔

نور جہاں کا مسئلہ پیچیدگی کے اعتبار سے کشمیر کا مسئلہ بنا ہوا تھا۔ فریال کی موجودگی میں اس کے اور میرے تعلق کو اسی طرح قبول کیا گیا تھا جیسے مقبوضہ کشمیر پر بھارتی تسلط۔ اس کے خلاف فریال بھی احتجاج کرتی رہتی تھی اور باقی سب بھی اس کی حمایت میں مظاہرے کرتے تھے۔ پہلے میرے دباؤ سے نور جہاں کو ایسے برداشت کیا گیا تھا جیسے وہ فریال کی سوکن ہے جسے اب اس عہدے سے برطرف نہیں کیا جا سکتا۔

اب میری مسلسل وکالت کے نتیجے میں اماں جی نے اسے ایک مظلوم اور بدبخت لڑکی مان کے اس کے سر پر اپنا دست شفقت رکھ دیا تو یہ صورت حال کسی حد تک بہتر ہو گئی۔ اب بھی میں سو فیصد یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ سب نے اسے اکبر خان کے قتل کے الزام سے بری کر دیا ہے۔ شک کا ایک کانٹا ہنوز سب کے دل میں موجود تھا۔

اتفاق سے مجھے اپنے موبائل فون کو چارج پر لگانے کے لیے اوپر جانا پڑا۔ شہزاد کی ماں کے ساتھ نور جہاں کی باتیں چل رہی تھیں۔ اپنی اندھیری دنیا میں تنہا رہنے والی عورت کا موضوع سخن وہ ماضی تھا جس کی یادوں کو اس نے سنبھال کے رکھا ہوا تھا۔ وہ شہزاد کے والد سے اپنی شادی کے واقعات ہنس ہنس کے سنا رہی تھی اور نور جہاں سنا رہی تھی۔ کچن میں روز کا کھانا ریشم کی ماں بناتی تھی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ سب کچھ بہت اچھا پکا سکتی تھی لیکن آج سو فیصد طور پر شہزاد کی خالہ بھی کچن میں ان کی مدد کرنے آ گئی تھی۔ اپنے گھر کی بیزار کن یکسانیت اور تنہائی کے بعد دونوں بہنوں کے لیے حویلی کی گہما گہمی ایک خوشگوار تجربہ ثابت ہو رہی تھی۔

کھانے کے کمرے میں رابعہ شہباز اور لیلیٰ بھابی برتنوں کو کپڑے سے خشک کر کے ترتیب سے لگا رہی تھیں۔ یہ رات کی پرتکلف دعوت کا اہتمام تھا۔ انہیں ساتھ والے کمرے میں میری موجودگی کا علم نہ ہو سکا اور میں نے بلا ارادہ چھپ کے ان کی گفتگو سن لی جس کا موضوع ہی نور جہاں کی ذات تھی۔

رابعہ نے کہا۔ ''ہمارے بے گناہ بہن جی۔ ایسی بیویاں ہی شوہروں کو ٹھکانے لگاتی ہیں۔ یہ کسی ایک کھونٹے سے بندھی رہنے والی اللہ میاں کی گائے نہیں ہوتیں۔''

شہباز نے کہا۔ ''تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے شوہر بڑا نیک اور مثالی تھا۔''

''شوہر جیسا بھی ہو۔'' رابعہ بولی۔

''اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں کہ وہ شوہر تھا۔'' شہباز نے اس کی بات کاٹ دی۔

''ڈاکٹر صاحب! دھواں تو وہیں سے اٹھتا ہے جہاں آگ ہو۔ ایسے ہی تو اس پر قتل کا الزام نہیں آ گیا اور اسے اتنا ہی اسرار ہے اور یقین ہے اپنی بے گناہی کا تو بھاگی کیوں پھر رہی ہے؟''

''تم بھی کیسی باتیں کرتی ہو۔ عدالتوں میں ثبوت اور شہادت کی بنا پر فیصلہ ہوتا ہے۔ کسی کے یقین کی بنیاد پر نہیں۔'' شہباز نے کہا۔

''تم سمجھتی ہو اسے پھنسایا گیا ہے؟''

شہباز نے کہا۔ ''جن لوگوں میں اکبر خان کا اٹھنا بیٹھنا تھا۔ وہ ایسے ہی تھے۔ خطرناک قسم کے مجرمانہ ذہن رکھنے والے۔ وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔''
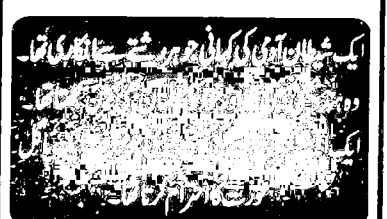
"اکبر خان کے دشمنوں کو اس کی بیوی سے کیا...؟"

"وہ اکبر خان کی بیوی نہیں تھی۔ وہ خود کہتی ہے۔ ایک طرح سے بزنس پارٹنر تھی۔ وہ سازش کا شکار ہوگئی۔"

"کمال ہے ڈاکٹر صاحب! تم نے تو اسے بے گناہ مان لیا ہے۔" رابعہ نے تلخی سے کہا۔

"تمہیں اپنے بھیا پر بھی اعتبار نہیں؟ تم سمجھتی ہو وہ جھوٹ بول رہے ہیں؟" شہناز نے کہا۔

"ان کی بات چھوڑو۔ ان کی مت ماردی ہے اس حسین بلا نے۔ صرف رفتی کی وجہ سے ہم سب اسے قبول کرنے پر مجبور ہیں اور تم بھی ایسا اس لیے کہہ رہی ہو کہ راجا ایسا سمجھتا ہے۔"

"رابعہ! تم غلط بات کر رہی ہو۔ میری یا راجا کی رائے کی کوئی اہمیت نہیں۔ لیکن تم ابا جی کو کیا کہو گی؟ کیا وہ بھی جانب داری سے کام لیتے تھے؟ ان کی عقل اور ان کا تجربہ ہم سب سے زیادہ تھا۔ انہیں نور جہاں کی بے گناہی کا یقین نہ ہوتا تو وہ اس کو اپنی بیٹی بناتے؟"

رابعہ نے خفگی سے کہا۔ "ابا جی نے بڑی زیادتی کی۔ ان کی بیٹی تو میں تھی۔ نور جہاں کو انہوں نے میرے ساتھ کھڑا کر دیا۔"

شہناز نے اپنی بات جاری رکھی۔ "بعد میں اماں نے بھی استخارہ کیا تھا۔ تم اسے بھی غلط کہو گی؟"

"میں کسی کو غلط نہیں کہتی۔ خود غلط ہوں۔" وہ غصے میں باہر نکل گئی۔ "سب مجھے ہی کہتے ہیں۔"

"دیکھا بھابی۔ یہ خواہ مخواہ نور جہاں کی دشمن ہو رہی ہے۔" ڈاکٹر شہناز نے فریاد کی۔ "ایسے ہی بحث کرتی ہے۔"

اب تک چپ رہنے والی لیلیٰ بھابی نے ٹالنے کے انداز میں کہا۔ "اب کیا کریں... اس کی اپنی سوچ ہے۔"

"اب بتائیں آپ کیا سمجھتی ہیں۔ نور جہاں قتل کر سکتی ہے۔"

لیلیٰ بھابی نے کہا۔ "دیکھو شہناز۔ میں تو ایک وکیل کی بیوی تھی۔ اب کوئی مجھ سے پوچھتا کہ کیا تمہارا شوہر وہ سب کر سکتا ہے۔ جو اس نے کیا؟ تو میں سو فیصد یقین کے ساتھ حلف اٹھا کے بھی کہتی کہ میرا میاں تو فرشتہ ہے۔ حالانکہ جو کچھ وہ مجھے بتاتا تھا کہ عدالتوں میں کیا ہوتا ہے۔ اسے سن کے میرا دماغ گھوم جاتا تھا۔ میرا خیال ہے قتل کسی سے بھی سرزد ہو سکتا ہے۔ یہ سب حالات کی بات ہے۔ ایک شریف اور وفادار بیوی بھی قتل کر سکتی ہے۔ محض محبت میں۔ یا نفرت میں۔ قتل رقابت میں ہوتے ہیں۔"

"آپ نور جہاں کے بارے میں بتائیں۔ آپ کی رائے کیا ہے۔"

"شہناز! میرا دل کہتا ہے اس نے قتل نہیں کیا۔ عقل اس کے خلاف کہتی ہے کہ صحیح فیصلہ اگر عدالت نہیں کر سکتی تو میں کیسے کر سکتی ہوں۔ اگر اس نے اکبر خان جیسے آدمی کو قتل کیا تو میرے نزدیک غلط نہیں کیا۔ وہ اس کا شوہر تھا یا نہیں تھا۔ اس سے بھی غرض نہیں۔ اگر وہ اس سے جان چھڑا کے شریفانہ زندگی گزارنا چاہتی تھی تو یہ کوئی جرم نہیں۔"

"یہی تو ہم سب چاہتے ہیں۔ اسے موقع ملنا چاہیے۔ یہ بات رابعہ بھی سمجھ لے تو اچھا ہے۔"

"سمجھ جائے گی وہ بھی۔ ورنہ شہزاد اسے سمجھا لے گا۔ آج پتا نہیں کس بات پر ان کی لڑائی بھی ہوگئی تھی۔"

شہناز نے کہا۔ "مجھے پتا ہے۔ شہزاد نے کہا تھا کہ تم نور جہاں کے ساتھ اپنا رویہ ٹھیک رکھو۔ وہ مجھ سے شکایت کر رہی تھی کہ شہزاد کا دماغ خراب ہوگیا ہے۔ نور جہاں کی حمایت میں حد سے آگے بڑھ گیا ہے۔ مجھ سے کہتا ہے کہ نند ڈالے گند۔ تم بھی یہی کر رہی ہو۔ اب میں رابعہ کو کیا بتاتی کہ خود راجا نے بلاوجہ مجھے ڈانٹ ڈپٹ کی کہ میں پارٹی بن گئی ہوں۔ رابعہ اور لیلیٰ بھابی کے ساتھ۔ اور ہم نور جہاں کو غیر سمجھتے ہیں۔ ایک کو اپنا سمجھا تھا تو کیا ہوا کیسی آنکھیں پھیر کے نکل گئی۔ تم نے اس کا نیا اشتہار دیکھا۔"

اس سے پہلے کہ فریال کی بے وفائی پر لیلیٰ بھابی کا تبصرہ سننے کو ملتا کھانا لانے والوں نے مداخلت کی اور خالص زنانہ اور پرائیویٹ گفتگو کا سیشن ختم ہوگیا۔ نور جہاں کے بارے میں سب کے خیالات سامنے آنے سے مجھے اطمینان حاصل ہوا کہ ایک رابعہ کو چھوڑ کر رائے عامہ نور جہاں کے حق میں ہے۔ مزید اطمینان کی بات یہ تھی کہ راجا اور شہزاد میرے ہمنوا تھے اور انہوں نے نور جہاں کو برابری کی بنیاد پر اہمیت اور عزت دلوانے کی ضرورت بھی محسوس کی تھی۔

کھانے کے بعد ہم سب ایک ہی لاؤنج میں جمع تھے اور وہ گلابی کشمیری چائے پی رہے تھے جو شہزاد کی خالہ نے بڑی محنت سے بنائی تھی۔ اس میں خالص دودھ کی افراط تھی اور ہر قسم کے خشک میوے ڈالے گئے تھے۔ ہم پہلے یہ ڈسکس کرتے رہے کہ حراست میں لیے جانے والے قاتلانہ حملے کے مجرم کو پولیس کے حوالے کرنے سے پہلے اس سے اعتراف جرم کیسے کرایا جائے اور کیسے پوچھا جائے کہ اسے کس نے بھیجا تھا۔ فی الحال وہ زخمی تھا اور اس کی فوری صحت یابی کا کوئی امکان نہ تھا لیکن یہ امکان ضرور تھا کہ صبح اس

واقعے کی تفتیش کے لیے پولیس آجائے اور ملزم کو اپنی تحویل میں لینے پر اصرار کرے۔

پھر ہم رانا کی درخواست ضمانت کی توثیق کے کیس میں اپنی اسٹریٹجی ترتیب دیتے رہے۔ شہزاد نے بتایا کہ وہ مخالفت میں کیا دلائل دینے کا ارادہ رکھتا ہے۔

"میاں شہزادے۔ تم لاکھ دلائل دو اور وہ قائل کرنے والے ہوں۔ تب بھی فرق نہیں پڑ سکتا۔ رانا کی ضمانت کی توثیق ہو جائے گی۔" راجا بولا۔

شہزاد نے کہا۔ "یہ تو ہے۔ مقامی سیشن کورٹ کی سطح پر جج اگر جانبدار نہ ہوں تو اتنے باہمت نہیں ہوتے۔"

"تم تیاری کرو ہائی کورٹ میں اپیل کی۔"

شہزاد نے سر ہلایا۔ "میرا کیس تیار ہے۔ پرسوں رانا کی درخواست ضمانت منظور ہوگی۔ اس سے اگلے دن میں سیشن کورٹ کے فیصلے کے خلاف اپیل دائر کر دوں گا۔"

"تمہارے سامنے فاروقی ہوگا۔" میں نے کہا۔ "پورے پینل کے ساتھ۔"

"ہوا کرے۔ دیکھنا یہ ہے کہ سنگل بنچ میں سماعت کون کرتا ہے۔ اگر وہاں بات نہ بنی تو پھر ڈویژن بنچ سے رجوع کرنا لازمی ہو جائے گا۔"

میں نے کہا۔ "اگر تم بھی ایک پینل بنا لو۔ فوجداری مقدمات کے ماہر وکیلوں میں فاروق عالم اور نثار عثمانی کو رانا نے لے لیا ہے۔ ان کے علاوہ میرے ذہن میں ماجد خان اور مولوی خورشید حیدر کے نام ہیں۔"

"ان کی فیس بہت ہے۔" راجا بولا۔

"فیس ہم دے سکتے ہیں۔ ایک مضبوط اور بڑے نام والے پینل کا اثر ضرور پڑتا ہے۔" میں نے کہا۔ "بس یہ ہے کہ پھر تمہاری حیثیت معاون وکیل کی ہو جائے گی۔ صرف اس لیے کہ تم جونیئر ہو۔ اس لیے نہیں کہ کم قابل ہو۔"

"مولوی خورشید حیدر کے ساتھ میں نے کام کیا ہے۔ وہ مجھے پسند کرتے ہیں۔ ماجد خان کے ساتھ کام کا تجربہ میرے لیے اچھا ہوگا۔ آپ ان دونوں سے بات کر لیں۔" شہزاد نے کہا۔

خواتین نے وہیں اپنی محفل جما رکھی تھی اور وہ باتیں کم کر رہی تھیں دن بھر آنے جانے والوں پر ہنس زیادہ رہی تھیں۔ ایک گوشے میں لگا ہوا ٹی وی خاموشی سے تصویر دکھا رہا تھا۔ ریموٹ سے اس کی آواز بند کر دی گئی تھی۔ اچانک اس کی آواز کھول دی گئی اور خواتین خاموش ہوگئیں۔

ٹی وی اسکرین پر فلمی ستاروں کا عید شو چل رہا تھا جس میں باری باری مختلف مہمان آکے وہی پرانی باتیں دہرا رہے تھے جو وہ ہر چینل سے ہر عید پر کرتے تھے۔ دیکھنے والے محض خوبصورت چہروں کی، رنگین جگمگ کرتے ملبوسات کی اور ان سے جھانکتے چھلکتے ہوش وخرد پر بجلیاں گراتے مرمریں جسموں کی نمائش کے نئے انداز دیکھ رہے تھے۔ درمیان میں کمرشل بریک کے علاوہ کوئی پاپ سنگر نمودار ہو جاتا تھا۔ محض ہونٹ ہلاتے رہنے کی تال اور لے پر رقص کے انداز میں تھرکنے یا گٹار کے ساتھ اچھل کود کرنے۔ گانا تو سی ڈی پر ریکارڈ کیا ہوا ہوتا تھا۔

اچانک رانا شہزاد کی جوڑی نے، جو ایک نئے ہینڈسم ہیرو اور ایک ناکارہ اداکارہ صداکارہ پر مشتمل تھی، نئے مہمانوں کی آمد کا اعلان کیا اور شوبزنس کے حاضرین وناظرین نے جو ہال میں گروپ بنا کے میزوں پر بیٹھے تھے تالیاں بجائیں۔ یہ اعلان کئی بار ہوا ہوگا جو سنا کسی نے نہیں تھا مگر مہمان نمودار ہوئے تو ست بدھائی کی حویلی کے ناظرین پر جیسے بجلی سی گری۔ یک لخت خاموشی چھا گئی اور ٹی وی پر تالیاں سنائی دیں تو ہم نے بھی نظر اٹھا کے دیکھا۔ فریال بڑی نزاکت سے سلطان کے ہاتھ میں ایک ہاتھ دیے اسٹیج کی سیڑھیاں چڑھ رہی تھی۔ سلطان نے محض علامتی طور پر اس کی انگلیاں تھام کے اسے سہارا دے رکھا تھا۔

فریال بادلوں کی طرح سرسراتے مکڑی کے جالے اور آفتاب کی کرنوں سے بنے ہوئے بے داغ سفید ریشمی لباس میں کسی پری کی طرح لگ رہی تھی جو ہوا کے دوش پر کسی تتلی کی طرح پرواز کرتی زمین پر اتری ہو۔ سلطان نے بہت مختصر آستینوں والی رنگین ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کا گریبان سامنے سے کھلا ہوا تھا جس میں سے اس کے گلے میں پڑی ہوئی سونے کی بھاری چین نظر آرہی تھی۔ اس نے اپنے ایک کان میں چھوٹا سا طلائی رنگ بھی لٹکا رکھا تھا۔ اس کا یہ ٹین ایجر والا بدلا ہوا انداز اس کے اسپائک والے ہیر اسٹائل سے میچ کرتا تھا۔ بعد میں کمپیئر خاتون نے اسے "سیکسی" قرار دیا۔

"جمعہ جمعہ آٹھ دن میں یہ اتنی بڑی اسٹار بن گئی۔" رابعہ نے بھلا جلا بھنا تبصرہ کیا۔

"ابھی نہیں تو بن جائے گی۔" شہناز نے کہا۔ "دیکھو اسے پبلسٹی دینے والے کس طرح آگے بڑھا رہے ہیں۔"

"آج تو دن بھر ان کی صورت نظر آتی رہی۔" لیلیٰ بھابی نے کہا۔

"اور آپ دیکھتی رہیں۔" شہناز ہنسی۔ "ایک تو کسی

موبائل فون کا اشتہار تھا۔ دوسرا وہی شیمپو صابن والا۔"

"اچھا اب اس کی بھی سن لو۔" لیلیٰ بھابی نے کہا۔

"کوئی ضرورت نہیں۔ سب کو پتا ہے وہ کیا کہے گی۔" رابعہ نے خفگی سے کہا اور ریموٹ کا بٹن دبا کے ٹی وی بند کر دیا۔

"اُفوہ... تم دوسروں کو تو دیکھنے دو۔" شہناز نے کہا اور پھر ٹی وی چلا دیا۔ "اب کیا فریال کی وجہ سے ٹی وی بند رہے گا؟"

"اور بند رہنے سے کیا فریال کے راستے بند ہو جائیں گے؟" لیلیٰ بھابی نے کہا۔

فریال نے وہی کہا جو اسکرپٹ میں تھا۔ جو سب کہہ رہے تھے۔ اس میں کوئی بھی نئی بات نہیں تھی۔ فریال کا ایک انٹرویو میں نے پہلے بھی دیکھا تھا۔ اس روز وہ اسٹوڈیو میں تھی لیکن آج شو بزنس کے افق پر چمکتے ستاروں کے درمیان تھی۔ جہاں کیمروں کی چکا چوند تھی اور میڈیا اسے براہِ راست دکھا رہا تھا۔ کامیابی کے غرور اور حصولِ مقصد کی خوشی سے روشن مسکراہٹ نے فریال کے چہرے پر اجالا پھیلا دیا تھا۔

میں نے اسے بہت غور سے دیکھا۔ اس کی صورت پر کہیں اپنے ماضی سے بچھڑنے کا ملال نہ تھا۔ مجھ سے دور جانے کا دکھ نہ تھا۔ کوئی ندامت نہ تھی اور کوئی احساس کا عکس نہ تھا جس سے سعد بدحالی کی فریال کا، میری فریال کا... ہم سب کی فریال کا رشتہ ہوتا۔ وہ خوش تھی تو اس کی یہ خوشی بھی اداکاری نہ تھی۔ یہ حقیقی خوشی تھی۔

میں بھی کیا سوچ رہا ہوں۔ میں نے سوچا۔ دکھ یا ملال ندامت یا افسوس اسے ہوگا تو اس وقت کی فریال کا جو اس نے میرے ساتھ صرف میری محبت کے لیے گنوا دیا۔ ورنہ آج وہ پھر شہرت، عزت اور دولت کے سفر کی پہلی منزل میسر نہ ہوتی۔ وہ بہت آگے نکل چکی ہوتی۔ سپر اسٹار کہلاتی۔ کیا ملا اسے نواب رفیق کی محبت میں اور کیا ملتا اسے سعد بدحالی کے ویرانے میں۔ شادی ہو جاتی تو دو چار بچے اور بس۔ تمام عمر کی قید حویلی کی فصیل میں۔

میں نے اپنے سر کو جھٹکا۔ باقی سب بڑے غصے اور افسوس کے باوجود فریال کو دیکھ اور سن رہے تھے۔ ساتھ ساتھ وہ اپنے تبصرے بھی کرتے جا رہے تھے۔ سلطان نے اپنی فلم شروع کرنے کا اعلان کر دیا تھا جو وہ پہلے بھی بتا چکا تھا۔ اس کی فلم کا نام سوہنا بدمعاش یا حسینہ کمرتوڑ ٹائپ تھا اور ظاہر ہے اس میں لیڈ رول فریال کر رہی تھی۔ اس نے دیگر آفرز کے بارے میں بھی بتایا جو اسے معروف فلمسازوں کی طرف سے ہو رہی تھیں۔

اچانک سوال کرنے والی خاتون نے جو چالیس سال میں بھی بیس سال کی ٹین ایجر بننے پر مصر تھی۔ روئے سخن سلطان کی طرف کر لیا۔ اس نے بالوں کو ایک جھٹکے سے پیچھے کیا جس سے اس کے تمام قابلِ دید جسمانی اعضا میں ایک سنسنی خیز تلاطم پیدا ہوا اور اسی کے ساتھ دوپٹا پھسل کر نیچے گرا تو وہ بڑی ادا سے اسے اٹھانے جھکی اور مستعد کیمرا مین نے یہ شاٹ بھی کلوز اپ میں ناظرین کے سامنے پیش کیا۔

"جناب۔ اب ہم آپ کی طرف آتے ہیں۔ آپ تو بڑے چھپے رستم نکلے۔ جو سونے کی چڑیا آپ کے ہاتھ سے نکل کے پھر سے اڑ گئی تھی اسے آپ نے سات سمندر پار سے پھر پکڑ لیا۔" خاتون نے سونے کی چڑیا کے اڑنے اور پکڑے جانے کا ایکشن بھی بھرپور طریقے سے پیش کیا۔

سلطان ہنسا۔ "جی۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

"بات کیسے نہیں۔ تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ اور ہم تو اڑتی چڑیا کے پر گن لیتے ہیں۔" لوگ ہنسے۔

سلطان نے پوچھا۔ "ایسی کون سی افواہ سن لی آپ نے؟"

"افواہ؟" خاتون نے چلا کے ناظرین سے فریاد کی۔ "فریال کو پہلے فلمی دنیا میں لانے والے آپ تھے۔ دوبارہ بھی یہ کارنامہ آپ نے ہی کیوں انجام دیا؟"

"میں نے کسی کو روکا تو نہیں تھا۔"

"چلیے چھوڑیے۔ اچھا یہ بھی افواہ ہے؟" وہ حاضرین کی طرف دیکھ کے رکی۔ "کہ اپنی فلم کے ہیرو آپ خود ہیں۔ بولیے۔ بتائیے دیکھنے والوں کو۔ ایک اور سلطان راہی تو پیدا نہیں ہو سکتا۔ مگر سلطان شاہ آ گیا میدان میں۔ ہے جالو۔" خاتون نے ٹھمکا لگا کے گانا شروع کیا۔ حاضرین نے تالیاں بجا کے ساتھ دیا۔

سلطان نے ہنستے ہوئے اعتراف کیا۔ "جی میں نے سوچا۔ سب کچھ کریں۔ فلمسازی سے ہدایت کاری تک تو اداکاری بھی کر کے دیکھتے ہیں۔"

"اداکار تو آپ زبردست ہیں۔ کیسے چھپے رستم ہیں لیکن پبلک کے سامنے کیا معصوم بنے بیٹھے ہیں... اب ایک کمرشل بریک... پھر دوسری بریکنگ نیوز..."

اس اعلان کے ساتھ ہی خود شہناز نے ٹی وی بند کر دیا۔ صدمے سے خواتین کا برا حال تھا۔ کسی کو بھی یقین نہ آتا تھا کہ فریال ایسے بدل جائے گی۔ جس سلطان کا نام سننا اسے گوارا نہ تھا اب اس کے ساتھ فلموں میں رومانوی سین کرے

گی۔ وہ اس حد تک گر سکتی ہے... یہ کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن وہ یہاں سے سیدھی سلطان کے پاس گئی... اب وہ اس کی دی ہوئی کوٹھی میں رہتی تھی... اسی کی کار میں گھومتی تھی... اسی کے ساتھ ہر جگہ جاتی تھی۔

میری طرح راجا اور شہزاد بھی خواتین کی آتش فشانی دیکھ رہا تھا اور سن رہا تھا... وہ میرے خیال سے چپ تھے ورنہ شاید ان کے جذبات بھی مختلف نہ تھے۔ میرے دل سے صدمے کا اثر زائل ہو رہا تھا۔ اس کی جگہ اشتعال کی آگ بھڑک رہی تھی... مجھے یہ اپنی رسوائی کا تماشا لگتا تھا۔ فریال کو برا بھلا کہنے والے مجھے اپنا مذاق اڑاتے محسوس ہوتے تھے۔ ساری دنیا مجھ پر ہنس رہی تھی۔ چلا چلا کے مجھے بے غیرت کہہ رہی تھی۔ واہ... بہت خوب نواب صاحب... سب کے ساتھ آپ بھی ٹیلی وژن پر اپنی محبت کی نیلامی دیکھ رہے ہیں... خوش ہیں کہ اس کی اتنی قیمت لگ چکی ہے... آپ جیسے عاشق ہوں تو عشق پر لعنت جو اپنی محبوبہ کی رقیب سے شادی کے بعد دعوت ولیمہ کھانے جاتے ہیں اور لوٹ کر کہتے ہیں کہ بھئی قورمہ خوب تھا۔

میرے دماغ میں ایک غبار سا جمع ہو رہا تھا جو شاید کسی آتش فشاں کی طرح پھٹ جاتا مگر غنی کی آواز نے ایک دم مجھے حقائق کی دنیا میں کھینچ لیا۔ معلوم نہیں باقی لوگ کیا باتیں کر رہے تھے اور کیا سوچ رہے تھے... میں نے دیکھا تو نور جہاں ان میں شامل نہ تھی۔ نہ جانے کب وہ خاموشی سے نکل گئی تھی۔

غنی نے کہا۔ "نواب صاحب! وہ بڈھا آیا ہے... فضلو کا باپ۔"

یکلخت فریال کا خیال گم ہو گیا اور وہ سارے خیالات بھی غبار بن کے اڑ گئے جو میرے ذہن میں اٹھنے والی انتقام کے جذبات کی آندھی بن چکے تھے۔

میں ایک دم اٹھا۔ "اچھا... کہاں ہے وہ؟"

غنی نے کہا۔ "باہر کھڑا ہے... آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔"

راجا نے کہا۔ "تم نے اس کی تلاشی لی؟"

"یہ کام گارڈز پہلے ہی کر چکے تھے سر... اس کے پاس ایسی کوئی بھی چیز نہیں... میں نے بھی چیک کر لیا تھا۔"

"تم اسے پہچانتے ہو غنی؟" شہزاد نے کہا۔ "وہ فضلو کا باپ ہی ہے؟"

غنی نے کہا۔ "میں... صورت سے تو نہیں پہچانتا سر لیکن وہ کہہ رہا ہے... اور فضلو کا باپ نظر بھی آتا ہے۔"

راجا بولا۔ "تم ہر ایک کے باپ کو پہچان سکتے ہو... صورت دیکھ کر..."

غنی کچھ جھینپا۔ "وہ دراصل... صورت فضلو جیسی ہے اس کی سر..."

میں نے کہا۔ "وہ بیٹے کو دیکھنے آیا ہوگا۔"

"جی سر... لیکن میں نے سوچا آپ اس سے کچھ پوچھنا چاہیں تو..."

بڈھا واقعی فضلو کا ہم شکل تھا۔ اسے ہمارے سامنے لایا گیا تو غنی اس کے پیچھے ریوالور لیے مستعد کھڑا رہا۔ حالانکہ اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ میں نے اور راجا نے اس سے جو سوالات کیے ان سے کوئی بھی کارآمد اور نئی بات معلوم نہ ہوئی۔ جو اس نے بتایا وہ ہم پہلے سے جانتے تھے۔

"تم صرف دیکھنا چاہتے ہو اپنے بیٹے کو؟" میں نے پوچھا۔

"آپ اسے معاف کر دیں مائی باپ۔" وہ ہاتھ جوڑ کے بولا۔

میں نے کہا۔ "بابا... یہ قانونی معاملہ ہے... اس نے پبلک کے سامنے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔ ہم اسے پولیس کے حوالے کریں گے۔"

"ایسا مت کریں سرکار... پولیس اسے زندہ نہیں چھوڑے گی۔ خود رانا کے بندے اسے مار ڈالیں گے۔" وہ رونے لگا۔

میں نے کہا۔ "افسوس کہ اس معاملے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کی جا سکتی۔ تم رانا کے پاس جاؤ۔"

"اس کا کوئی فائدہ نہیں جناب عالی۔ آپ نے فضلو کی بہن کو بچایا تھا اسے بھی بچا لیں۔" بلاشبہ وہ ایک دکھی باپ تھا جو اپنے بدکردار بیٹے کی زندگی بچانے کے لیے سب کچھ کر سکتا تھا لیکن جانتا تھا کہ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔

میں نے کہا۔ "دیکھو... کاسو کا معاملہ کچھ اور تھا... اگر تمہارا مطلب یہ ہے کہ کاسو کی طرح میں اسے بھی کہیں دور بھیج دوں... تو یہ ناممکن ہے... اول تو فضلو کی حالت ایسی نہیں... پھر اس کے جرم کے گواہ بہت ہیں۔"

راجا نے کہا۔ "اس بات کی ضمانت کون دے گا کہ یہاں سے جانے کے بعد وہ پھر نواب صاحب کی جان لینے کی کوشش نہیں کرے گا؟"

شہزاد نے اس کی تائید کی۔ "ہاں... اس بار وہ خنجر لے کر آیا تھا... دوسری بار وہ ریوالور لے کر آ گیا... پھر؟ یہ ہو سکتا ہے وہ یہاں سے جانے کے بعد رانا سے کہے کہ اسے ایک

موقع اور دیا جائے۔"

فضلو کے باپ نے اپنے آنسو پونچھ لیے۔ "ٹھیک کہتے ہیں آپ سرکار... اس بدبخت کو اب مر ہی جانا چاہیے۔"

میں نے کہا۔ "غنی... جاؤ اسے فضلو سے ملوا دو۔"

غنی نے میرے حکم کی تعمیل کی لیکن اس سے ایک جذباتی غلطی سرزد ہو گئی... فضلو ہوش میں تھا اور باپ کو دیکھ کر اس کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ نکلے... پٹیوں میں لپٹے ہوئے بیٹے کو دیکھ کر فضلو کا باپ بے اختیار دھاڑیں مار مار کے رونے لگا اور بیٹے سے لپٹ گیا۔ اس وقت غنی باہر نکل آیا۔ اس نے کہا کہ خود اس کے لیے اپنے آنسو ضبط کرنا محال ہو گیا تھا۔

فضلو کے باپ نے اس مہلت سے فائدہ اٹھایا اور بیٹے کی مشکل آسان کر دی۔

کچھ دیر بعد غنی کے چیخنے چلانے کی آواز سنائی دی۔ اس وقت شہزاد اور راجا اپنے اپنے کمروں میں سونے کے لیے جا چکے تھے اور میں بھی لیٹ گیا تھا مگر نیند میری آنکھوں سے بہت دور تھی۔ ابھی صبح کے افسوسناک سانحے کا اثر زائل نہ ہوا تھا کہ فریال کے انٹرویو نے میرے جذبات کی دنیا میں ہلچل مچا دی تھی۔

میں نے اوپر سے جھانک کے پوچھا۔ "غنی... کیا بات ہے؟"

غنی نے میری طرف دیکھا۔ "سر... جلدی سے نیچے آ جائیں۔"

میں نے اس کی آواز میں خوف اور پریشانی کو محسوس کر لیا تھا۔ میں زینے سے اتر کے نیچے گیا تو مجھے غنی کی آنکھوں میں آنسو نظر آئے۔

میں نے کہا۔ "غنی... کیا ہوا؟"

اس نے کہا۔ "سرکار... مجھ سے کوتاہی ہو گئی۔ بہت بڑی غلطی ہو گئی۔"

"کچھ بتاؤ تو سہی... آخر ہوا کیا؟"

"اس بڈھے نے فضلو کو مار دیا۔"

میں نے چونک کے کہا۔ "مار دیا؟ کیسے مار دیا؟"

"اس نے فضلو کا گلا گھونٹ دیا۔"

"گلا کیسے گھونٹ دیا تمہاری موجودگی میں۔" میں نے برہمی سے کہا۔

وہ بولا۔ "یہی غلطی ہوئی مجھ سے... میں نے کچھ دیر کے لیے بڈھے کو اکیلا چھوڑ دیا تھا۔"

"مگر کیوں؟ کیا اس نے کہا تھا... اور اس کے کہنے سے کیا ہوتا ہے تم نے اس کی بات کیوں مانی؟"

"سرکار... وہ بیٹے کو دیکھ کر رونے لگا۔ دھاڑیں مار مار کے... خود فضلو کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے بس یہ مجھ سے دیکھا نہ گیا... خود میں کچھ جذباتی ہو گیا اور باہر نکل آیا... ان کے سامنے میں اپنی کمزوری کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا چند منٹ ہی لگے ہوں گے مجھے اتنی دیر میں فضلو کے باپ کو موقع مل گیا... میں اپنی غلطی کا اعتراف کرتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "چلو... جو ہونا تھا ہو گیا۔"

"مجھے ذرا بھی شک ہوتا کہ بڈھا یہ کرے گا تو میں وہاں سے نہ ہلتا۔"

میں نے کہا۔ "یہ بھی تو ہو سکتا ہے غنی کہ فضلو نے باپ سے کہا ہو کہ اس کی مشکل آسان کر دے۔ ورنہ پہلے ہم اس کے ساتھ نہ جانے کیا سلوک کریں گے... پھر پولیس... اور اس کے بعد رانا صاحب... اس کی حالت پہلے ہی خراب تھی باپ نے بھی سوچا کہ اتنی اذیت اٹھا کے بھی فضلو کے لیے زندہ رہنے کا کوئی چانس نہیں... خیر... وہ بڈھا اب کہاں ہے؟"

غنی نے کہا۔ "وہیں... بیٹے کی لاش کے پاس بیٹھا رو رہا ہے۔"

میں غنی کے ساتھ تہ خانے میں گیا تو اس افسوسناک منظر نے مجھے بھی متاثر کیا۔ معلوم نہیں فضلو کے پیدا ہونے پر اور اس کے جوان ہونے پر باپ نے اس سے کیا کیا توقعات وابستہ کی ہوں گی جیسے کہ سب ماں باپ کرتے ہیں لیکن آدمی سوچتا کیا ہے ہوتا کیا ہے۔ کون باپ اس منحوس دن کا تصور بھی کر سکتا ہے جب بداعمال بیٹے کو وہ خود اپنے ہاتھوں سے موت کے گھاٹ اتارنے پر مجبور ہو جائے۔ کہنے کو بہت سے کہہ دیتے ہیں کہ اس سے تو تیرا مر جانا اچھا تھا مگر یہ صرف غصہ بولتا ہے۔ دل سے ایسا کون کہہ سکتا ہے۔

مجھے دیکھ کے بڈھا کھڑا ہو گیا۔ "سرکار... اب یہ آپ کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔" وہ روتے روتے بولا۔

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "یہ تم نے کیا کر دیا۔ کیا پتا میں اسے معاف کر دیتا۔ کہیں دور بھیج دیتا۔"

بڈھا روتا رہا۔ "مجھے معلوم ہے مائی باپ... آپ بڑے دیالو ہیں۔ آپ اسے کچھ نہ کہتے... فضلو نے کہا تھا کہ وہ آپ کے پاؤں پکڑ کے معافی مانگ لے گا اور آپ سے التجا کرے گا کہ مجھے بہن بہنوئی کے پاس بھیج دو۔ کاسو کے پاس۔ اور آپ انکار نہیں کریں گے لیکن اس نے مجھے بتایا کہ وہ پھر آپ پر حملہ کرے گا دوسری بار آپ کے سر میں گولی مارے گا..." "آپ کو دھوکا دیتا معافی مانگ کے... میں نے اس سے کہا کہ بے غیرت... یہ سب تو اس کے ساتھ کرے گا جس نے تیری

بہن کا سہاگ اجڑنے سے بچایا... تیرے بہنوئی کی جان بچائی... تو اسے دھوکا دے کر قتل کرے گا... اس سے پہلے میں تجھے مار دوں گا۔"

میں دم بخود کھڑا رہا۔ اس اعتراف جرم نے مجھے اپنی ہی نظر میں شرمندہ کر دیا تھا اگر کاسو کی جان بچانا میری نیکی تھی جو آج میری غلطی بن گئی تھی۔ ایک باپ نے مجھ پر اپنا بیٹا قربان کر دیا تھا۔ میری جان بچانے کے لیے بیٹے کو قتل کر دیا تھا۔ اس احسان کا بوجھ میرے ضمیر پر آ گیا تھا۔

میں نے کہا۔ "بابا... تم مجھے بتا دیتے۔ میں نمٹ لیتا فضلو سے... یہ تم نے کیا کر دیا۔ تمہاری نیکی قانون کی نظر میں جرم ہے... تم نے قتل کیا ہے... اب میں کیا کروں... تمہیں پولیس سے کیسے بچاؤں؟"

"آپ کچھ نہ کریں سرکار... مجھے پولیس کے حوالے کر دیں... کیا ہوگا آخر... مجھے پھانسی ہو جائے گی۔ مرنے سے پہلے میں سب کو بتا دوں گا۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "پھانسی تمہیں ان حالات میں نہیں ہو سکتی۔ تمہاری عمر بھی زیادہ ہے ہو سکتا ہے عدالت تمہیں کم سے کم سزا دے... یا چھوڑ دے... لیکن ابھی تو تمہارے لیے اور میرے لیے مشکل کھڑی ہو گئی۔"

میں نے غنی سے کہا کہ وہ ابھی جائے اور پولیس چوکی والوں کو اطلاع دے۔ "وہ لاش لے جائیں اور جو کارروائی کرنی ہو کریں۔"

"اس وقت کون ہوگا وہاں سرکار؟"

میں نے خفگی سے کہا۔ "پھر ہم کیا کریں... رات بھر لاش لیے بیٹھے رہیں... اس بڈھے پر نظر رکھنا کبھی یہ خودکشی نہ کر لے۔ ہمارے لیے یک نہ شد دو شد والا معاملہ ہو جائے۔"

"جی سر..." غنی نے کہا لیکن میرے جانے کے بعد اس نے صبح تک کچھ بھی نہیں کیا۔ یہ حکم عدولی نہیں تھی۔ اسے معلوم تھا کہ عید والے دن اور پھر رات کے وقت پولیس چوکی میں الو بول رہے ہوں گے۔ اگر کوئی مت کا مارا صرف خانہ پُری کے لیے ڈیوٹی پر ہوگا تو سو رہا ہوگا اور یہی کہے گا کہ صبح آنا۔ اس وقت تم کس پاگل کے بچے کے کہنے پر اپنی اور میری نیند حرام کرنے نکل کھڑے ہوئے۔

میں واپس اوپر گیا تو میری سونے کی خواہش تک دم توڑ چکی تھی۔ باقی سب لوگ سو رہے تھے۔ مجھے اندر گھبراہٹ ہونے لگی تو میں ایک اور زینہ چڑھ کے چھت پر پہنچ گیا۔ چھت کے عین وسط میں ایک بارہ دری بنی ہوئی تھی۔ یہ ایک کھلا وسیع برآمدہ تھا جس کے چاروں طرف تین تین محرابی دروازے بنا دیے گئے تھے۔ نہ جانے کس نے اس بارہ دری کی چھت پر جانے کے لیے بھی لکڑی کی ایک سیڑھی رکھ دی تھی۔ بارہ دری کے چاروں طرف چھت تھی جو چار وسیع صحن جیسے حصوں میں بٹ گئی تھی۔

آخری دنوں کا چھپا چھپا سا چاند افق سے طلوع ہو گیا تھا اور اندھیرے میں دھندلکا پھیلا رہا تھا۔ کھلے آسمان کی وسعت سے بھی ستارے روشن تھے اور میرے ارد گرد دور تک پھیلی ہوئی ویرانی میں کہیں کوئی صدا نہ تھی ایک جنگل تھا جو اندھیرے کا حصہ نظر آتا تھا۔

میں نے کھلی ہوا میں لمبے لمبے سانس لیے اور ٹہلتے ہوئے اپنے خیالات کے انتشار کو سمیٹتا رہا۔ تازہ ترین واردات فضلو کا قتل تھا لیکن اس کی مجھے زیادہ فکر نہیں تھی۔ پولیس اس معاملے سے بہتر طور پر نمٹ سکتی تھی۔ فضلو کے مر جانے سے رانا کی ذات قاتلانہ حملے کے الزام سے محفوظ ہو گئی تھی۔ میرے کہنے سے یہ ثابت نہیں ہو سکتا تھا کہ فضلو کرائے کا قاتل تھا جسے رانا نے بھیجا تھا۔

اصل فکر کی بات وہ مستقبل تھا جو میرے لیے بھی زیادہ سے زیادہ غیر محفوظ ہوتا جا رہا تھا اور خود رانا کے لیے بھی۔ وہ ایک ناکامی سے دل برداشتہ ہو کے خاموش بیٹھنے والا نہیں تھا۔ کل وہ پھر ایسا ہی کرے گا۔ کسی اور کرائے کے قاتل کو تلاش کر لے گا۔ کسی اور مجبور شخص کے ہاتھ میں گن تھما دے گا کہ جاؤ اس نواب کے نطفے کا خاتمہ کر آؤ۔ پھر جو مانگو گے مل جائے گا۔ فضلو کو اپنی بیوی درکار تھی..... کسی اور کو جاں بخشی کی ضرورت ہوگی۔ کوئی اپنے ہی خاندان کے قرض سے نجات کا خواہاں ہوگا یا غلامی کی زندگی سے چھٹکارا چاہے گا۔ وہ گن اٹھا لے گا۔

اور اس کے جواب میں میرا ردِعمل کیا ہوگا؟ کیا میں ڈر جاؤں گا۔ عدم تشدد کے مسئلے کو اٹھاؤں گا یا اینٹ کا جواب پتھر سے دینے کے لیے میں بھی رانا کو قتل کرانے کے لیے کسی کی خدمات حاصل کر لوں گا' وسائل میرے پاس بھی ہیں اور زندہ مجھے بھی رہنا ہے۔

لیکن کیا یہ زندہ رہنے کا طریقہ ہے۔ کیا ایسے ہم اور ہمارے بعد کی نسلوں کو زندگی کی ضمانت حاصل ہوتی ہے؟ ہم جو اپنے بعد والوں کے لیے ایک بہتر دنیا میں بہتر زندگی کے مواقع فراہم کرنے کے ذمے دار ہیں۔ اس خونی کھیل سے اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکتے۔ مگر یہ بات رانا کو کیسے سمجھائی جائے۔

میرے خیالات کی رو ست بدھائی سے پرواز کر کے مکہ مدینہ تک گئی اور میں نے فکرمندی سے اپنے والدین کے لیے سوچا۔ وہ ایک دن قبل ہی حج کے مناسک سے فارغ ہو چکے تھے۔ آج پاکستان میں عید تھی لیکن انہوں نے کسی کو فون کر کے نہ مبارکباد دی تھی نہ دعا۔ وہ ہم سب سے جذباتی طور پر اتنے لاتعلق ہوئے کیسے رہ سکتے ہیں۔ ضرور کوئی بات ہے۔ میں نے جیب سے موبائل فون نکال کے اباجی کا نمبر بھی ملایا مگر وہاں سے وہی جواب ملا۔ آپ کے مطلوبہ نمبر سے رابطہ ممکن نہیں۔

میں نے موبائل فون جیب میں رکھا ہی تھا کہ زینے کی طرف سے تاریکی میں ایک سایہ متحرک نظر آیا۔ میں رک گیا۔ آہستہ آہستہ چلتی نور جہاں میرے قریب آ گئی۔ اس کے ہاتھ میں کافی کے دو مگ تھے۔ ایک اس نے مجھے تھما دیا۔

میں نے حیرانی سے کہا۔ ''تمہیں کیسے معلوم ہوا...؟''

''سب معلوم ہوتا ہے مجھے۔ کافی پیو۔'' وہ ہنسی اور میرے ساتھ ساتھ چلنے لگی۔

''یہی تو میں جاننا چاہتا ہوں۔ آخر کیسے معلوم ہو جاتا ہے؟'' میں نے کہا۔

''میرے دل میں ایک نظر نہ آنے والی چپ Chip لگی ہوئی ہے۔ ایسی ہی دوسری چپ تمہارے دل میں نصب ہے۔ ان کی فریکوئنسی ایک ہے۔''

''آئی سی۔ تم تو سائنسداں بھی ہو۔''

وہ مسکرائی۔ ''جب تمہارے دل میں کوئی خیال آتا ہے اچھا یا برا۔ تو ایک پیغام میرے دل تک پہنچتا ہے۔ یہاں پریشان ہو۔'' اس نے میرے سینے پر انگلی رکھی۔ ''تو ادھر خبر مل جاتی ہے۔ اُدھر طوفان ہو تو سگنل یہاں موصول ہوتا ہے۔''

میں نے کہا ''پھر یہ عمل یک طرفہ کیوں ہوتا ہے۔ تمہاری طرف سے سگنل میرے دل کو کیوں نہیں ملتا؟''

''یہ اپنے دل سے پوچھو۔'' وہ ہنسی۔ ''آج سارا دن میں دیکھتی رہی اور سوچتی رہی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ تمہاری پریشانی دور کرنے کے لیے مگر کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ مجھے معلوم ہوا تم جاگ رہے ہو۔''

''تم نے دیکھا۔ یا تمہیں سگنل موصول ہوا؟''

''پہلے سگنل موصول ہوا۔ پھر میں نے باہر آ کے دیکھا لیکن اس وقت تم اوپر نہیں نیچے جا رہے تھے۔ کیا ہوا تھا؟''

میں نے کہا۔ ''کچھ نہیں۔ بس ایک مرڈر۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''وہ تو ہوتے رہتے ہیں۔ کوئی بات نہیں۔ پھر تم واپس آئے اور چھت پر چڑھ گئے۔ میں نے دیکھا اور آ گئی۔''

ہم بارہ دری میں بنی ہوئی سنگ مرمر کی بینچ پر بیٹھ گئے۔ وہ میرے ساتھ لگی کافی پیتی رہی۔ میرا ایک ہاتھ اس کے شانوں کے گرد حمائل رہا۔ مجھے اس کے قرب سے جو سکون حاصل ہوا اس کا اعتراف میں کیسے نہ کرتا۔ ایک وہی تھی جو میرے لیے سوچ رہی تھی۔ میرے لیے جاگ رہی تھی۔ میرے ساتھ تھی اور مجھ سے بہت دور فریال تھی جو فلمی دنیا کی چکاچوند ہنگامہ آرائی اور دل فریبی میں اس طرح گم تھی کہ اس کے جذبات کی دنیا میں میرے خیال کا کہیں گزر نہ تھا۔ وہ دولت مندی کے خواب پر محبت کو قربان کر چکی تھی۔ ایک تابناک مستقبل کے لیے ماضی سے ایسے کنارہ کش ہو چکی تھی جیسے مجھ سے تعلق میں نادانستگی میں سرزد ہو جانے والا گناہ ہو۔

نور جہاں نے اچانک کہا۔ ''تم فریال کے بارے میں سوچ رہے ہو نا؟''

میں دم بخود رہ گیا۔ ''تمہیں سگنل موصول ہو گیا؟''

''ہاں۔ تمہیں اب بھی شک ہے؟ میرا دل تمہارے دل کے پیغام کو غلط سمجھ ہی نہیں سکتا۔''

میں نے کہا۔ ''کیا کروں نور۔''

فوراً وہ ایک دم میری طرف پلٹی۔ ''تم نے نور کہا مجھے؟''

''ہاں۔ بس... نور جہاں ذرا بوجھل سا لگتا ہے۔ لیکن تم کو اچھا نہیں لگا تو...''

''نہیں نہیں۔'' اس نے میرا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ ''مجھے بہت اچھا لگا۔ وعدہ کرو آئندہ مجھے ایسے ہی پکارو گے۔ سب کے سامنے بھی۔''

''تم تو پاگل ہو۔ خلوت کی بات اور ہے۔ سب کے سامنے میرا تماشا بن جائے گا۔''

''ٹھیک ہے۔ جب ہم اکیلے ہوں گے تو تم نور کہو گے۔ اب بتاؤ کیا کہہ رہے تھے۔'' وہ میری گود میں سر رکھ کے بینچ پر لیٹ گئی۔

''نور۔ میں نہیں چاہتا کہ اب اس کے بارے میں سوچوں بھی مگر سوچے بنا بھی نہیں رہ سکتا۔ ہر روز کوئی ایسی بات ہو جاتی ہے۔ شاید وہ جان بوجھ کے ایسا کر رہی ہے۔ وہ چاہتی ہے میں اس سے نفرت کرنے لگوں۔''

''اور تم؟ تم ایسا نہیں چاہتے؟ یا ایسا کر نہیں سکتے ہو کیا تم اتنے کمزور ہو؟''

میں نے کہا۔ ''محبت آدمی کو کچھ بھی بنا دیتی ہے۔ کبھی فاتح عالم تو کبھی غلام۔ کبھی اس کی طاقت بنتی ہے تو کبھی بے بسی۔''

''اس کا مطلب ہے فریال کو تم سے محبت نہیں تھی۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو۔'' میں نے کہا۔

''اس لیے کہ نہ وہ کمزور ہے نہ بے بس۔ کتنی آسانی سے وہ تمہیں چھوڑ کے چلی گئی۔ کیا یہ کوئی دوسری قسم کی محبت تھی؟''

''چھوڑو نور۔ کوئی اور بات کرو۔''

''بہتر... تمہیں شاید اچھا نہ لگے لیکن آج میں ایک سچ ضرور کہوں گی۔ سچ یہ ہے کہ اسے تم سے کبھی محبت ہی نہیں تھی۔ وہ تمہیں بے وقوف بنا رہی تھی۔ استعمال کر رہی تھی۔''

''یہ غلط ہے۔ تم جانتی ہو۔''

''صحیح ہے۔ کتنی آسانی سے وہ پہلے تمہیں چھوڑ کے سلطان کی فلم میں ہیروئن بننے چلی گئی تھی اور ہیروئن بنتے بنتے اس کی منگیتر بن گئی... آخر کیوں؟''

''بے وقوفی۔ ناتجربہ کاری۔''

''غلط۔ اس نے جوا کھیلا تھا۔ وہ بازی ہار گئی۔ جو تمہیں نہیں معلوم وہ میں بتاتی ہوں۔ اس نے ایک شرط رکھی تھی سلطان کے سامنے۔ اپنی پہلی بیوی کو چھوڑ دو اور آدھی جائداد میرے نام کر دو۔''

''یہ۔ یہ تمہیں کس نے بتایا؟''

''یہ سلطان نے بتایا تھا۔ اکبر خان کے ایک دوست کو جو فلمساز بھی تھا۔ میرے سامنے۔ دبئی کے ایک ہوٹل میں جہاں ایک پارٹی میں وہ سب اتنی پی چکے تھے کہ انہیں اپنا ہوش نہیں تھا۔ سلطان نے فریال کو گالیاں دیں کہ وہ آخر مجھے کیا سمجھتی تھی۔ چوہدری سلطان اتنا بے وقوف ہے؟ اس کے پاس عقل نہ ہوتی تو وہ اتنا بڑا زمیندار، بزنس مین اور فلمساز ہوتا۔ اس جیسی پتا نہیں کتنی آئیں ہیروئن بننے اور گئیں۔ جو ملا اس پر خدا کا شکر ادا کیا۔ یہ چوہدری سلطان کے لیے شرطیں لگاتی ہے۔ میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔ رنڈی بنا کے کوٹھے پر نہ پہنچایا تو میرا بھی نام سلطان نہیں۔''

''تم جھوٹ بول رہی ہو۔''

''میں تمہیں وہ سچ بتا رہی ہوں جس سے فریال بھی انکار نہیں کر سکتی۔ سلطان کے انکار اور اس کی دھمکی سے ڈر کے وہ پھر تمہاری طرف آئی تھی لیکن سلطان کے چنگل سے نکلنا اتنا آسان نہیں تھا۔ اس نے ٹائم لیا اور لندن پہنچ گئی۔ کیونکہ تم لندن میں تھے۔ وہاں وہ خود کو محفوظ سمجھتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ تم اس سے شادی کر لو گے تو سلطان خود پیچھے ہٹ جائے گا۔ تمہارے لندن میں اچھے مراسم تھے۔ اس نے سوچا ہوگا کہ اب تم پاکستان تو لوٹ کے جاؤ گے نہیں۔ وہاں تمہارا کیا فیوچر تھا۔ تمہارے ماں باپ بھی لندن آ جائیں گے۔ تمہاری نوکری بھی اتنی اچھی تھی کہ تم بہت ترقی کرو گے اور اس کے بعد تمہیں برطانیہ کی شہریت مل جائے گی۔ فریال بھی برطانوی شہری بن جائے گی۔ ایلشیا جو بعد میں عائشہ بن گئی تھی اور اس کا باپ لارڈ ارنسٹ تمہاری مدد کریں گے تو یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔''

میں اسے دیکھتا رہا۔ ''یہ تم عجیب بات کر رہی ہو۔''

''اس میں غلط کیا ہے۔ بتاؤ مجھے۔ فریال کو مایوسی اس وقت ہوئی جب ست بدھائی کی ریاست دنیا کی سب سے بڑی قسمت کی لاٹری بن کے تمہیں مل گئی۔ عائشہ سے تو اسے ڈر نہیں تھا۔ فریال نے تمہیں اس طرح اپنے جال میں پھانس رکھا تھا کہ اور کوئی تمہاری زندگی میں آ ہی نہیں سکتا تھا لیکن تمہارے پاکستان واپس لوٹنے کا فیصلہ اسے مہنگا پڑ گیا۔ اس نے سوچا ہوگا کہ چلو کوئی بات نہیں۔ وہ ست بدھائی پہنچ کے کوشش کرے گی کہ تم اس جائداد کو بیچ کے واپس لندن چلے جاؤ۔ لیکن یہ بھی نہ ہو سکا اور مزید خرابی یہ ہوئی کہ تم نے ست بدھائی میں ایک ترقیاتی منصوبہ بنا لیا۔ تمہارے ساتھ کچھ لوگ آ گئے... اس نے ظاہر تو یہی کیا کہ وہ بھی تمہارے ساتھ ہے لیکن درحقیقت ایسا نہیں تھا۔ وہ فلمی دنیا اور شوبزنس کی لڑکی تھی۔ یہاں سے نکلی تو لندن پہنچ گئی اور تمہارے ساتھ اس نے زندگی کو اپنے انداز سے دیکھا۔ تمہارے ماں باپ لندن آ بھی گئے تو کیا... وہ کتنے دن ساتھ رہیں گے لندن کی ہائی سوسائٹی میں وہ تمہارے ساتھ ہوگی... لندن سے پیرس... سوئٹزرلینڈ... کون سی جگہ دور ہوگی... تم اچھا کما رہے تھے اور وہ زندگی افورڈ کر سکتے تھے جو فریال چاہتی تھی۔ خود سوچو کہ اس کے مقابلے میں ست بدھائی کی زندگی کتنی بے رنگ... فضول اور مشکل تھی۔''

وہ مجھے سمجھا رہی تھی اور عجیب بات یہ تھی کہ مجھے برا نہیں لگ رہا تھا۔ میں سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید اس کی یہ وجہ تھی کہ میں زخم خوردہ تھا... نور جہاں کی باتیں میرے لیے مرہم کی طرح تھیں۔ اس سے قطع نظر کہ مرہم سے زخم بھرے گا یا نہیں... زخم کی ٹیس کم ہو تو اچھا لگتا ہے۔

میرے دل میں ایک سوال کسی پھانس کی طرح باعث آزار تھا اور اس کی خلش نے میری روح تک کو زخمی کر دیا تھا۔ آخر فریال نے ایسا کیوں کیا تھا؟ وہ سلطان سے اتنی نفرت

کرتی تھی اور مجھ سے اتنی محبت تو پھر وہ مجھے چھوڑ کے سلطان کی طرف کیوں لوٹ گئی تھی۔

نور جہاں مجھے اس سوال کا جواب سمجھا رہی تھی۔ مجھے ایسی ہی کسی مسیحائی کی تلاش تھی۔ کوئی مجھے قائل کر سکے کہ فریال کو سمجھنے میں مجھ سے غلطی ہوئی۔ اس کی وہ محبت میری نظر کا فریب تھی۔ اسے وہی کرنا تھا جو اس نے کیا۔ میں بھی یہی سننا چاہتا تھا... شاید اسی لیے میں نے نور جہاں کی بات خاموشی سے سنی۔ کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا... صرف دو مہینے پہلے کوئی مجھ سے کہتا کہ فریال کی محبت دھوکا ہے تو میں ایسا کہنے والے کے منہ پر تھپڑ مارتا... لیکن اب مجھے کسی سہارے کی تلاش تھی جو مجھے دکھ اور پچھتاوے کے اس اندھے کنوئیں سے نکال سکے۔ کوئی ایسا جواز فراہم کر سکے کہ میں فریال سے نفرت کر سکوں۔

اندھیرے میں اس کا ہاتھ آہستہ سے میرے چہرے کی طرف بڑھا اور رک گیا۔ ”تم رو رہے ہو جان؟“

میں نے کہا۔ ”تم میری آنکھوں میں آنسو دیکھنا چاہتی ہو؟“

وہ تڑپ کے اٹھی۔ ”ایسا مت کہو... تمہیں دکھی دیکھ کر میں کتنی دکھی تھی... میں سب دیکھ رہی تھی... سب جانتی تھی اور سب سمجھتی تھی لیکن آج سے پہلے کچھ کہتی تو اس کا اثر الٹا ہوتا... تم مجھ سے بدظن ہو جاتے... سمجھتے میں تمہیں حاصل کرنے کے لیے فریال کے خلاف زہر افشانی کر رہی ہوں۔“

”کیسی حیرانی کی بات ہے... کسی اور نے فریال کو نہیں سمجھا۔“

وہ پھر میری گود میں لیٹ گئی۔ ”سب تمہاری نظر سے دیکھتے تھے... انہیں فریال ویسی ہی نظر آتی تھی جیسی تمہیں... ماں باپ کے ساتھ یہ دھوکا بھی ہوتا ہے وہ اپنے گھر میں اپنے بچے کو ایک شریف اور قابلِ فخر نوجوان بنتا دیکھتے ہیں اور یقین کامل رکھتے ہیں کہ وہ ایسا ہی ہے... باہر سے اس کی مجرمانہ سرگرمیوں کی شکایت بھی ملے تو وہ دنیا کو جھوٹا اور حاسد قرار دیتے رہتے ہیں۔ اصل وجہ یہی ہوتی ہے کہ وہ حقائق سے بے خبر ہوتے ہیں اور شک کی نظر سے اولاد کو دیکھتے ہی نہیں... مجھے ایک بات بتاؤ... فریال نے تمہیں شادی کے لیے کس حد تک مجبور کیا تھا؟“

میں نے کہا۔ ”ہاں... وہ اسی بات پر مجھ سے خفا تھی کہ میں شادی کے معاملے کو ٹال رہا ہوں۔“

”اس نے کتنی محنت کی... تمہیں قابو میں رکھا... پھر تمہارے والدین کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے کتنے پاپڑ بیلے؟“

میں نے کہا۔ ”اس نے تو مجھے جھوٹ بول کے بلیک میل بھی کیا کہ وہ میرے بچے کی ماں بننے والی ہے... تاکہ میں فوراً شادی کر لوں۔“

”یہ تو میں نے بھی کہا تھا... مگر وہ جھوٹ نہیں تھا... نہ میرا مقصد تمہیں بلیک میل کرنا تھا نہ میں نے کبھی تم سے شادی کے لیے اصرار کیا... یہ مت سمجھنا کہ میں موقعے سے فائدہ اٹھا رہی ہوں۔ خود کو اچھا اور فریال کو برا بنا کے پیش کر رہی ہوں۔“

”تمہیں کوئی صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔“

”شاید اس کی محبت بے غرض نہیں تھی۔ اس کے سامنے ایک مقصد تھا... شادی کے بعد وہ تم سے کچھ بھی منوا لے گی... اگر تم ست بدھائی سے جان چھڑا کے اس کے ساتھ باہر نکل جاؤ تو سب سے اچھا... ورنہ تم یہاں رہو وہ لاہور میں رہے... وہاں اس کی سوشل لائف ہوگی اور وہ تمہیں بھی اسی سرکل میں کھینچ لے گی... یا شاید وہ تم سے کہتی کہ میرے لیے ایک فلم بناؤ... اور اس کے شوق کی خاطر تم فلمساز بھی بن جاتے۔“

”میں نے اس کے لیے سب کچھ کیا... یہ بھی کرتا۔“

”مگر یہ کیسی محبت تھی... محبت تو کچھ نہیں مانگتی... محبت کے سوا... اسے تم سے محبت ہوتی تو وہ سب کچھ برداشت کرتی... اور مر جاتی مگر تمہیں چھوڑ کے نہ جاتی... تمہاری خاطر سب کچھ کرتی... ہر دکھ جھیلتی... تم پھر کہو گے کہ میں موازنہ کر رہی ہوں... لیکن کچھ جھوٹ ہو تو بتاؤ... کیا میں نے کبھی تم سے کچھ مانگا؟ خود تمہارے سوا... کبھی کہا کہ مجھ سے شادی کر لو... جان ہتھیلی پر رکھ کے تم سے ملتی رہی... تمہارے دشمنوں کے خلاف میں نے تمہارا ساتھ دیا... اور اکبر خان کو میں نے کس کے لیے قتل کیا... صرف تمہارے لیے... میں احسان نہیں جتا رہی ہوں... وہی کہہ رہی ہوں جو حقیقت ہے... آج بھی میں تم سے کچھ نہیں مانگتی... تمہاری عزت... تمہاری دولت... مجھے کسی سے سروکار نہیں... تم جس سے چاہو شادی کر لو... مجھے کچھ نہ دو... بس اپنے پاس رہنے دو... کوئی مجھے تمہاری داشتہ کہتا ہے کہتا رہے... میں تمہاری کنیز بن کے بھی خوش رہوں گی...“

میں نے جھک کر آہستہ سے اس کی آنکھوں کو چوما۔ آنسوؤں کی تلخی میرے ذائقے میں اتر گئی۔ ”تم رو رہی ہو؟“

اس نے دونوں بازو میرے گلے میں ڈال دیے۔ ”کیا یہ ہو سکتا ہے جان... میں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہ سکتی ہوں... میں یہاں سے جانا نہیں چاہتی۔“

میں نے آہستہ سے اس کے ہاتھوں کو الگ کیا۔ ”تم یہاں کیسے رہ سکتی ہو نور... بہت خطرہ ہے تمہارے لیے۔“

”خطرات میں تم گھرے ہوئے ہو... میں نہیں۔“

”میری بات اور ہے... میں خطرات کا مقابلہ کر سکتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

وہ بولی۔ ”اور میں نہیں کر سکتی؟“

”نہیں... تم میری ذمے داری ہو... اگر تم پکڑی گئیں تو شاید تمہیں بچانا میرے لیے اتنا آسان نہ ہو... کیونکہ شریکِ جرم مجھے بھی سمجھا جائے گا۔“

وہ مسکرائی۔ ”چلو اچھا ہے... تمہارا ساتھ تو ہوگا۔“

”یہ مذاق کی بات نہیں نور... تمہارے لیے ابھی خطرہ ٹلا نہیں ہے۔ ابھی یہ کیس اتنا پرانا نہیں ہوا کہ پولیس بھول چکی ہو اور اکبر خان مرڈر کیس کی فائل ہزاروں ایسی ہی فائلوں کے ساتھ کلوز کر کے کولڈ اسٹوریج میں ڈال دی گئی ہو... اس میں سال دو سال لگتے ہیں... تمہارے کیس میں شاید اس سے بھی زیادہ وقت چاہیے۔“

”وہ کیوں؟“

”وہ اس لیے کہ تمہارا یہ حسن تمہارا سب سے بڑا دشمن ہے... عام مجرموں کے عام سے چہرے یاد نہیں رہتے مگر تمہارا یہ چہرہ جو ایک بار دیکھ لیتا ہے بھول نہیں سکتا۔“

”پھر میں کیا کروں... اپنا یہ چہرہ بگاڑ لوں۔“ وہ ہنسی۔

میں نے کہا۔ ”آسان طریقہ یہی ہے کہ تم غائب رہو... میں تمہیں بہت جلد لندن پہنچا دوں گا۔“

”میں لندن نہیں جاؤں گی۔“

”پھر کہاں جاؤ گی؟“ میں نے کہا۔

”کہیں بھی نہیں... میں اسی حویلی میں رہوں گی... تمہارے ساتھ۔“

”تمہارا دماغ خراب ہے... تمہیں تو یہاں آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔“

”میں بالکل باہر نہیں نکلوں گی... کسی کے سامنے نہیں آ جاؤں گی... میں وعدہ کرتی ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”نور... ایسا نہیں ہو سکتا کہ میں تمہیں دو تین سال کسی تہ خانے میں قیدی کی طرح رکھوں۔“

”آخر اور لوگ بھی تو ہیں یہاں۔“

”پھر وہی فضول بات... تم میں اور ان میں بہت فرق ہے... اور لندن میں تم اکیلی نہیں رہو گی۔“

وہ خوش ہوئی۔ ”تم رہو گے میرے ساتھ؟“

میں نے سر پر ہاتھ مارا۔ ”تم واقعی پاگل ہو... میں تمہارے ساتھ کیسے رہ سکتا ہوں... لیکن میں آتا جاتا رہوں گا۔“

”پرامس... تم آؤ گے کھاؤ قسم۔“

میں نے ہنس کے کہا۔ ”قسم کھانے والے جھوٹے ہوتے ہیں پھر بھی بتاؤ... کس کی قسم پر اعتبار ہے تمہیں۔“

”اپنے اماں ابا کی قسم کھاؤ۔“

میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ ”تمہیں پتا ہے آج کل میں ان کی طرف سے بہت پریشان ہوں... ان کی کوئی خیر خبر نہیں مل رہی ہے۔“

”اللہ خیر کرے گا۔“ اس نے کروٹ لی اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

اب میں کچھ پُرسکون تھا تو نیند سے میری آنکھیں بھی بوجھل ہونے لگی تھیں۔ میں نے اس کے گالوں پر تھپکی دی۔ ”اے لڑکی... یہاں کوئی سونے کی جگہ نہیں ہے۔“

اس نے غنودگی میں کہا۔ ”مگر میں تو سو چکی ہوں... مجھے اٹھا کے لے جاؤ۔“

اپنے بیڈ روم میں پہنچ کے میں نے گھڑی دیکھی تو صبح کے تین بجنے والے تھے... شاید میں دیر تک سویا رہتا لیکن آٹھ بجے سے پہلے ہی راجا نے مجھے جگا دیا۔ ”تیرے سسرالی عزیز ملنے آئے ہیں ٹیکے پتر۔“

”کون سے سسرال سے؟“ میں نے کہا۔ ”کون آیا ہے؟“

”تھانیدار صاحب تشریف لائے ہیں۔“

مجھے یاد آ گیا۔ ”اچھا فضلو کے معاملے میں... کیا ان سے ڈیل کرنے کے لیے شہزاد کافی نہیں۔“

”نواب صاحب... قاتلانہ حملہ آپ پر ہوا تھا... آپ کا بیان کوئی اور تو نہیں دے سکتا۔“

تھانیدار وہی چغد صورت تھکا ہارا اور عمر رسیدہ سب انسپکٹر لال خان تھا جو اٹھائیس سال سے کانسٹیبل بھرتی ہوا ہوگا اور اپنی نااہلی کی بنا پر کچھوے کی رفتار سے رینگتا ہوا بہ مشکل تمام اے ایس آئی بنا تھا۔ اب تک وہ پکا تھانیدار نہیں تھا چنانچہ کارکردگی دکھانے سے زیادہ وہ سفارش کے لیے میری نظرِ کرم کا طالب تھا۔

اس نے بڑی عاجزی سے مجھے سلام کیا۔ ”آپ کیسے ہیں سر مجھے تو آج پتا چلا کہ نماز میں آپ پر قاتلانہ حملہ ہو گیا۔“

میں نے کہا۔ ”جو بات دس کوس تک ہر گاؤں میں کل سب کو معلوم تھی وہ آپ کو آج معلوم ہوئی۔“

اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔ ”ہمیں کسی نے رپورٹ

نہیں کی۔"

میں نے اندھیرے میں تیر چلایا۔ "بندہ گیا تھا لیکن آپ غالباً عید منانے میں معروف تھے۔"

اس کا رنگ ذرا سی دیر کے لیے پھیکا پڑا۔ "کدھر جناب عالی... ہماری ایسی نوکری ہے کہ نہ عید نہ بقر عید... ہو سکتا ہے کسی کام سے آگے پیچھے جانا پڑا ہو... آج کل اس ڈاکو نے بڑی مصیبت ڈالی ہوئی ہے۔"

میں نے انجان بن کے پوچھا۔ "تم کس ڈاکو کی بات کر رہے ہو؟"

"وہی جی... ایک ہی تو جی دار پتر جنا ہے یہاں کی ماؤں نے... میرا ابھی واسطہ نہیں پڑا... لوگ کہتے ہیں صرف دولت مندوں کو لوٹتا ہے یہ بڑے بڑے زمیندار جاگیردار... کارخانوں کے مالک اور اسمگلر... سب سے بڑے ڈاکو خود ہیں... اور غریبوں کی بڑی مدد کرتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "اچھا... تم جاؤ اور اپنا کام ختم کرو جس کے لیے آئے ہو... میرا بیان چاہیے تمہیں۔"

بیان میں نے ابھی نہیں لکھا... لکھ لوں گا تو آپ کو بھجوا دوں گا دستخط کے لیے... یا خود حاضر ہو جاؤں گا۔"

میں نے کہا۔ "بیان میرا وکیل لکھوا دے گا۔"

میرا خیال تھا کہ مشکل کام آسان ہو گیا۔ میں نے اندر جا کے ہاتھ منہ دھویا اور ناشتا کرنے بیٹھا ہی تھا کہ غنی وہی صورت پر بدحواسی کی تحریر لیے آ گیا۔ "سر... بڑی گڑبڑ ہو گئی... اس بڈھے نے مصیبت ڈال دی ہے۔"

"کیا اس نے تھانیدار کو بھی قتل کر دیا؟" میں نے مذاق میں کہا۔

"سر اس نے اپنا بیان بدل دیا ہے... وہ... اب کہتا ہے کہ فضلو کو اس نے نہیں مارا۔"

"پھر کس نے مارا ہے؟"

غنی نے کہا۔ "اس نے بیان دیا ہے کہ جب وہ حویلی پہنچا تو فضلو زندہ تھا... یہاں اس کے سامنے ہم نے فضلو پر تشدد کیا... ہم اس سے کہلوانا یہ چاہتے تھے کہ اسے رانا نے بھیجا تھا... فضلو یہ کہنے کے لیے تیار نہیں تھا... فضلو کے مرنے کے بعد ہم نے اس کے باپ کو بھی تہ خانے میں ڈال رکھا تھا۔ ہم اسے پہلے ڈراتے دھمکاتے رہے... پھر لالچ دیا... اسے کہا کہ وہ چپ رہے گا تو اسے دو لاکھ دیں گے۔"

میں نے جلدی جلدی ناشتا ختم کیا۔ "یہ بڈھا فضلو کا باپ ہی ہے نا؟"

"باپ تو ہے لیکن اسے رانا کی طرف سے پٹی پڑھا کے بھیجا گیا ہے۔"

"کیا مطلب؟ اس نے رانا کے کہنے پر صرف ہمارے خلاف بیان دینے کے لیے بیٹے کو خود مار دیا... کوئی باپ ایسا نہیں کر سکتا۔"

"آپ نہیں جانتے سر... ایک تو باپ پہلے ہی بیٹے سے عاجز تھا۔ چوری میں پکڑے جانے سے پہلے اس کو نشے کی لت تھی... باپ غریب موچی... گھر مشکل سے چلاتا تھا... نشے کے لیے پیسے کہاں سے نکالتا... فضلو نے ماں کے کانوں کی بالیاں اتار کے بیچ دی تھیں... سنا ہے اپنی بہن کے زیور بھی چھین رہا تھا کہ کاسو آ گیا اور اس نے سالے پر کلہاڑی اٹھالی مگر بیچ میں بہن آ گئی تو فضلو بچ گیا۔"

"اس کا کوئی اور بھائی بھی ہے؟"

"یہی تو بدبختی ہے اس کی... دوسرا ہوتا تو فضلو کب کا گھر سے نکال دیا جاتا۔"

"غنی جس ناخلف بیٹے کو اس نے اب تک برداشت کیا تھا اب وہ رانا کے کہنے سے اس کو کیسے مار سکتا ہے؟"

"رانا ایسے نہیں کہتا سر... جیسے آپ کہتے ہیں... اس نے کہا ہو گا کہ یا تو خود جا کے فضلو کو مار دے... اور قتل نواب رفیق پر ڈال دے... اور یہ جو دو لاکھ کی بات بڈھے نے کی ہے... ہو سکتا ہے رانا نے کہا ہو کہ نواب رفیق کے خلاف بیان دے گا تو دو لاکھ دیے جائیں گے... آپ کو اندازہ نہیں سر کہ یہ کتنی بڑی دولت ہے گاؤں کے ایک غریب موچی کے لیے۔"

میں نے کہا۔ "دو لاکھ لے کر اپنے جوان بیٹے کو اپنے ہاتھ سے کتنے لوگ قتل کر سکتے ہیں؟"

غنی نے مجھے سمجھانا جاری رکھا... "آپ بیٹے کو بھی دیکھیں سر... باپ کے لیے عذاب ہے... لوگ سوچتے ہیں کہ ساری عمر رونے سے ایک بار ہی رو لینا اچھا... دو لاکھ کا لالچ اپنی جگہ... میرا خیال ہے رانا نے ساتھ دھمکی بھی دی ہو گی کہ تو نے ایسا نہ کیا تو بڑے گھاٹے میں رہے گا... فضلو بچے گا نہیں... ساتھ تو بھی مرے گا اور تیری بیوی بھی... کاسو تو نکل گیا... فضلو کو ہم ڈالیں گے کتوں کے آگے..."

میں نے کہا۔ "مسٹر غنی... تم نے ہماری عقل پر سے پردہ ہٹا دیا ہے... یہ بتاؤ اب قانون کیا کر رہا ہے؟"

"قانون سے راجا صاحب اور شہزاد صاحب کچھ معاملات طے کر رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "چلو پہلے وہ نمٹ لیں... پھر دیکھتے ہیں۔"

کچھ دیر بعد اس تھانیدار نے جسے میں احمق، کاہل اور جاہل سمجھتا تھا میرے مفروضات کو غلط ثابت کر دیا... صورت

حال کو وہ خطرناک حد تک سنگین پہلے ہی قرار دے چکا تھا۔ اس نے ایک وکیل اور ایک صحافی کے سامنے صرف قانونی پوزیشن پر بات کی اور بڑی عاجزی سے اپنی فرض شناسی کے معاملے میں کسی کمپرومائز پر راضی نہ ہوا... اس نے کہا کہ وہ پہلے نواب صاحب سے بات کرے گا۔

جب بند کمرے میں اس کی اور میری ون ٹو ون بات ہوئی تو وہ کھل کر سامنے آ گیا۔ "نواب صاحب... آپ کی پوزیشن بڑی خراب ہے۔"

میں نے کہا۔ "کس کی نظر میں؟"

"قانون کی نظر میں جناب... آپ نے پہلی غلطی یہ کی کہ قاتلانہ حملے کے مجرم کو یہاں لا کے بند کر دیا... حویلی کوئی تھانہ تو نہیں ہے... آپ پر لازم تھا کہ اسے پولیس کے حوالے کرتے۔"

"پولیس تھی کہاں؟"

"جناب عالی... آپ کے حکم پر ہم کیا اعلیٰ افسران بھی سر کے بل حاضر ہو جاتے ہیں... پولیس کیس درج کرانے کے بعد ملزم کا میڈیکل ہوتا اور سرکاری ایم ایل او... میڈیکولیگل آفیسر..."

"اتنا مجھے معلوم ہے... تم بات کو مختصر کرو۔"

"مختصر ہی کر رہا ہوں جناب... ہم اسے پولیس پہرے میں اسپتال لے جاتے اور اس کا بیان لیتے... دیگر ملزمان کو پکڑتے جن کی پرتشدد کارروائی کے باعث ملزم فضلو کی ایسی حالت ہوئی... اور اگر وہ مر جاتا تو ان کے خلاف غیر ارادی یا اشتعال میں قتل کا کیس درج ہوتا۔"

میں نے کہا۔ "یہ سب کیسے ہوتا... کون لے جاتا اسے تھانے جبکہ تھانے میں کوئی تھا ہی نہیں۔"

"تھانے میں ڈیوٹی افسر ضرور موجود ہوتا ہے سر۔"

"اور تھانے والے اس کو عید کے روز اسپتال کیسے لے جاتے؟ ان کے پاس ایمبولینس تھی؟ اگر اس زخمی کی جان بچانے کے لیے نزدیک ترین اسپتال ہی پہنچا دیا گیا... جو حویلی میں تھا جہاں ایک کوالیفائیڈ اور رجسٹرڈ میڈیکل پریکٹیشنر موجود تھی اور علاج کا انتظام بھی تھا۔"

"لیکن سر... یہ سرکاری اسپتال نہیں ہے۔"

"اچھا چھوڑو... ہم کہہ سکتے ہیں یہ غلطی تھی جو نیک نیتی سے سرزد ہوئی... بالآخر ہم نے خود ہی پولیس کو بتایا۔"

"مگر ملزم کی موت کے بعد... اور اب فضلو کے باپ کے بیان نے بڑی سنگین صورت حال پیدا کر دی ہے۔"

"وہ بکواس کر رہا ہے۔"

"یہ فیصلہ کرنا تو عدالت کا کام ہے سر..." تھانیدار نے بڑی عاجزی سے کہا۔ "صرف اس لیے فضلو کے باپ کا بیان غلط نہیں قرار دیا جا سکتا کہ وہ ایک غریب موچی ہے... اور آپ ایک صاحب حیثیت نواب ہیں۔"

"قانون کی نظر میں محمود و ایاز سب برابر ہیں۔" میں نے طنز سے کہا۔

"جناب والا... کیا آپ سمجھتے ہیں ایسا نہیں ہونا چاہیے... آپ کی انصاف پروری کی تو بڑی دھوم ہے... آپ غریبوں کے بڑے ہمدرد سمجھے جاتے ہیں۔"

"تھانیدار... یہ معاملہ مختلف ہے... میرے خلاف سازش کی گئی تھی... غلطی سے میں نے فضلو کے باپ کو اس سے ملنے دیا... دوسری غلطی کی یہ میں نے... یہ نہیں سمجھا کہ بیٹے کے ساتھ باپ بھی سازش میں شامل ہے۔"

"اس نے براہِ راست تین افراد کو بیٹے کے قتل کا ذمے دار کہا ہے... آپ کو، راجا صاحب کو اور غنی کو... اس کا کہنا ہے کہ عیدگاہ میں لوگوں کے مارنے سے فضلو کو معمولی چوٹیں آئی تھیں۔"

"کیا تم نے دیکھا نہیں... اس کی ہڈیاں توڑ دی تھیں مشتعل ہجوم نے... پلاسٹر یہاں ہم نے چڑھایا۔"

وہ مسکینی سے بولا۔ "بالکل آپ نے چڑھایا... بلکہ ڈاکٹر شہناز نے چڑھایا ہو گا... لیکن فضلو کا باپ کہتا ہے کہ یہ سب کل رات نہیں کیا... اس کے سامنے فضلو کو مار مار کے اس کی ہڈیاں توڑ دی گئیں... پھر جب وہ زخموں کی تاب نہ لا کے مر گیا تو یہ لیپا پوتی کی گئی۔"

میں نے برہمی سے کہا۔ "یعنی ہم نے لاش پر پلاسٹر چڑھایا۔"

"فضلو کا باپ یہی کہتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "اسے میرے سامنے لاؤ... اس کے ہاتھ میں قرآن دو اور کہو کہ حلف اٹھائے۔"

"یہ میرے دائرہ اختیار میں نہیں ہے جناب عالی... میرا کام ہے ایف آئی آر درج کر کے ملزم کو قانون کے حوالے کرنا... ملزم جو بھی ہو۔"

تھانیدار کی نیت اس کے لہجے اور الفاظ سے عیاں تھی۔ وہ فضلو کا کیس نہیں اپنا معاملہ پکا کر رہا تھا... مجھ سے زیادہ اینٹھنے کے لیے کیس کو زیادہ سنگین بنا رہا تھا... مجھے اس کی صورت اور لہجے کی مسکینی نے بہت دھوکا دیا تھا۔ وہ دیوانہ بکار خویش ہوشیار کی عملی تفسیر تھا۔ پولیس میں اس کے ترقی نہ کرنے کے اسباب کچھ بھی ہوں... اپنے معاملات میں وہ کسی

سے پیچھے نہ تھا۔

بالآخر میں نے کہا... نواب رفیق احمد نے جو ست بدھائی کی جاگیر اور حویلی کا مالک سمجھا جاتا تھا بہت عقلمند اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا... لندن امریکا سے ڈگریاں لے چکا تھا اور ڈی آئی جی صاحب کا دوست سمجھا جاتا تھا... ایک گاؤں کے معمولی تھانیدار کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔

میں نے کہا۔ ''تھانیدار... میں اپنے اور دوسروں کی ساری غلطیاں سارے جرائم تسلیم کرتا ہوں... اب بتاؤ تم ہم سب کو تختۂ دار تک جانے سے کیسے بچا سکتے ہو... کھل کے بات کرو۔''

وہ بڑی خوشامدانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''جناب عالی... میں ایک بہت غریب آدمی ہوں... ریٹائرمنٹ قریب ہے... ابھی تک میری تھانیداری کنفرم نہیں ہوئی... ڈی آئی جی صاحب آپ کے دوست ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''کیا مطلب... میں ان سے تمہاری سفارش کروں؟ تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کسی سفارش کو قبول نہیں کرتے۔''

''سب ایسا ہی ظاہر کرتے ہیں سر... آپ کوشش تو کر سکتے ہیں جناب عالی... ان کے ایک فون سے میری ترقی کا راستہ کھل سکتا ہے... ریٹائر ہونے سے پہلے تین پھول والا انسپکٹر بن جاؤں گا آپ کی مہربانی سے۔''

میں نے سر ہلایا۔ ''لال خان... وہ مانگو جو میرے اختیار میں ہو۔''

وہ اپنی ضد پر قائم رہا۔ ''وہ آپ کی بات ٹالیں گے نہیں... ان کے لیے یہ اتنا چھوٹا کام ہے... جیسے آپ کے لیے کسی ضرورت مند کو دو چار سو دینا۔''

''اوکے... میں بات کر کے دیکھوں گا... لیکن کب... یہ وعدہ نہیں کر سکتا... موقع محل اور ان کا موڈ دیکھ کے بات کروں گا... لیکن فرض کرو... وہ نہ مانے تو تم کہو گے میں نے بات ہی نہیں کی۔''

''مجھے آپ کے وعدے پر بھروسا ہے سر... آپ جھوٹا وعدہ نہیں کر سکتے... اگر انہوں نے انکار کیا تو مجھے پتا چل جائے گا... مجھے ٹرانسفر کر دیا جائے گا یا میرے کندھے پر سے یہ ایک پھول بھی ہٹا کے مجھے واپس حوالدار بنا دیا جائے گا۔''

''اور تم یہ رسک لینے کے لیے تیار ہو؟''

وہ مسکرایا۔ ''میں اسے رسک نہیں سمجھتا سر... خطرہ مجھے ہو گا آپ کے حریف رانا صاحب کی طرف سے... جب ان کی سازش ناکام ہو جائے گی میرے تعاون نہ کرنے سے... ان کے خلاف میں کھل کے آپ کا ساتھ دے رہا ہوں... اس کا مجھے خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔''

''تمہیں میری سپورٹ ہمیشہ حاصل رہے گی۔''

وہ ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔ ''میری ایک فیملی ہے جناب عالی... شادی دیر سے کی تھی اس لیے بچے چھوٹے ہیں... ابھی پڑھ رہے ہیں... میری فیملی کو میری سپورٹ حاصل نہ رہی تو ان کا کیا بنے گا؟''

اس کا مطلب سمجھ لینے کے باوجود میں نے کہا۔ ''اب تک تم نے ان کے لیے بہت کچھ فراہم کر دیا ہو گا... جو ان کے محفوظ مستقبل کا ضامن ہو۔''

''کہاں سر... زندگی گزارنے کے لیے قارون کا خزانہ ہو تو بھی کم ہے... میں مارا گیا تو ان کا والی وارث کوئی نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''پولیس کی نوکری میں یہ خطرہ تو سب ہی مول لیتے ہیں... اور اللہ بہر حال سب کا رازق ہے۔''

''اب دیکھیے... آپ کی طرف سے فضلو کے باپ کو دو لاکھ آفر کیے گئے تھے... رانا صاحب نے بھی کیے ہوں گے... غریب کا خیال سب رکھتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''تھانیدار... بہت ہو چکی... تمہیں بھی دو لاکھ مل جائیں گے... ابھی اور نقد...''

''نہیں سرکار... میں رشوت نہیں لیتا... میرا گھر ہے ادھر جہلم سے آگے سرائے عالمگیر میں... پانچ مرلے کا گھر ہے... اس کے ساتھ اتنی ہی زمین پڑی ہے... تین لاکھ مانگ رہا ہے مالک... شاید ڈھائی پونے تین میں مان جائے گا۔''

''اوکے... وہ زمین تمہیں مل جائے گی۔''

''مجھے نہیں حضور... گھر میری بیوی کے نام ہے... زمین بھی اسی کے نام ہو جائے تو اچھا ہے۔''

''ہو جائے گی... اب تم بتاؤ... تم کیا کارروائی کرو گے؟''

''میں فضلو کی ڈیڈ باڈی ڈسٹرکٹ اسپتال بھجواتا ہوں... اس کا اندراج میں کل یعنی عید کے دن کی تاریخ میں کروں گا... اصل واقعہ لوگوں نے دیکھا تھا... عینی شاہد بہت ہیں کہ اس نے آپ پر خنجر سے قاتلانہ حملہ کیا... اس کے بعد مشتعل لوگوں نے اسے مارا... مقدمہ نامعلوم افراد کے خلاف درج ہو گا... فضلو کا باپ اسے بچا کے لے گیا... فضلو زخمی تھا... آپ کی رپورٹ پر ہم نے اسے گرفتار کیا اور تھانے لے گئے... چونکہ سواری دستیاب نہ تھی اس لیے فضلو کے باپ نے غنی کے آگے ہاتھ جوڑے کے سیرے بیٹے کو بچا لو... غنی وہاں آپ کی طرف سے رپورٹ درج کرانے آیا تھا... آپ نے

اجازت دے دی اور ڈاکٹر شہناز نے اس کی مرہم پٹی کر دی... پلاسٹر بھی لگا دیا ٹوٹی ہوئی ہڈیوں پر... اس کے بعد ہم فضلو کو واپس تھانے لے گئے اور اس کی حالت ایسی تھی کہ حوالات میں نہیں ڈالا... ایک کمرے میں رکھا... وہاں مسلح پہرا لگا دیا اور کسی کو ملنے کی اجازت نہیں دی... اس کی ماں کے سوا... وہ اسے رات عشا کی نماز کے بعد دیکھ کر چلی گئی تھی... فضلو کے باپ کو بھی ہم نے تھانے میں نہیں رہنے دیا... وہ باہر بیٹھا رہا... رات کو جب فضلو نے دم توڑا تو بڈھا وہاں موجود تھا... سواری نہ ہونے کے باعث عید کے روز ملزم کو ڈسٹرکٹ اسپتال منتقل کرنا ممکن نہ تھا اور اس کی حالت بھی خطرے سے باہر تھی... فضلو کی میت کو ساتھ لے جانا چاہتا تھا لیکن پولیس نے پوسٹ مارٹم کے بغیر لاش لے جانے کی اجازت نہیں دی۔ وہ تمام وقت تھانے میں بیٹھا رہا... اب آپ لاش کو کسی گاڑی میں میرے تھانے کے ایک بندے کے ساتھ ڈسٹرکٹ اسپتال بھجوا دیں... فضلو کے باپ کو ہم لے جاتے ہیں... اگر وہ لاش کے ساتھ جہلم جانا چاہے تو اس کی مرضی۔''

میں دم بخود بیٹھا رہا۔ کتنی آسانی سے ایک معمولی سب انسپکٹر نے کیس کی نوعیت بدل کے رانا کی سازش کو ناکام بنا دیا تھا۔ بلاشبہ قانون وہ کھیل ہے جسے پولیس کھیلتی ہے۔ جو پیسے سے کھیلا جاتا ہے اور پیسے والے ہی کھیلتے ہیں... عدالت میں یہ کھیل پیسے لینے والے وکیل کھیلتے ہیں اور جو انصاف کرنے کے لیے عدالت کی کرسی پر بیٹھتے ہیں وہ انصاف کا تماشا دیکھتے رہتے ہیں... جو نظام صرف شہادت پر استوار ہو اور جس میں شہادت خریدنے بگاڑنے یا ضائع کرنے کے سار... مواقع برائے فروخت ہوں وہاں انصاف کا نام بدنام نہ ہو گا تو اور کیا ہو گا......

میں نے بھی اپنے لیے انصاف خریدا... کیونکہ محض حقائق کی بنیاد پر انصاف کے ترازو کا پلڑا رانا کے حق میں جھک جاتا... میں نے شیر خان سے کہا کہ وہ ہائی روف میں پولیس کے ساتھ جا کے فضلو کی لاش ڈسٹرکٹ اسپتال جہلم پہنچا دے اور واپس آ جائے... چیختے چلاتے فضلو کے باپ کو پولیس گھسیٹ کر لے گئی... ان واقعات نے بڑی بدمزگی پیدا کی تھی اور عید کا دوسرا دن ہونے کے باوجود میں نے شہزادے سے کہا کہ وہ نور جہاں کو لے کر نکل جائے۔

رابعہ نے احتجاج کیا۔ ''ایسی کیا جلدی ہے آخر۔''

میں نے کہا۔ ''میں نہیں چاہتا کہ کوئی نیا مسئلہ کھڑا ہو جائے... معلوم نہیں کل سے اب تک کسی نے نور جہاں کو دیکھا ہے یا نہیں۔''

''دیکھے گا کون جب میں باہر آئی ہی نہیں۔'' نور جہاں نے کہا۔

''دیکھو نا... عید گزر گئی... ایک پریشانی ابھی بڑی مشکل سے ختم ہوئی ہے... پتا نہیں آگے کیا ہو جائے... پولیس کو یہاں آنے سے روکا نہیں جا سکتا اور تمہاری حویلی میں موجودگی آتش گیر مادے کے ڈھیر سے کم خطرناک نہیں۔ ایک معمولی سی چنگاری سب ختم کر دے گی... میں تمہیں پولیس سے بچانے کی کوشش ضرور کر رہا ہوں... پولیس نے پکڑ لیا تو چھڑاؤں گا کیسے۔'' میں نے برہمی سے کہا۔

شہزاد کا موڈ خراب ہو گیا۔ ''اوکے... غلطی میری تھی۔''

میں نے کہا۔ ''دیکھو... اگر تمہاری والدہ اور خالہ یہاں رہیں تو مجھے بڑی خوشی ہو گی... یہاں ان کا دل لگ گیا ہے۔''

''نور جہاں اکیلی نہیں رہ سکتی... ہم سب چلے جاتے ہیں۔'' شہزادے نے پھولے ہوئے منہ کے ساتھ کہا۔

راجا نے اسے سمجھایا۔ ''شہزادے... تم سے تو کچھ بھی چھپا ہوا نہیں ہے... تم جانتے ہو رانا کے ساتھ کیسی محاذ آرائی جاری ہے... وہ کوئی بھی نئی شرارت کر سکتا ہے۔''

شہزادے نے کہا۔ ''مجھے کیس بھی تیار کرنا ہے۔ چھٹی کل ختم ہو جائے گی پرسوں رانا کی کورٹ میں پیشی ہو گی... ضمانت پر رہائی کے عبوری حکم کی توثیق کے لیے... مجھے مخالفت تو کرنی ہو گی۔''

میں نے کہا۔ ''ہائی کورٹ میں پیشی کے لیے ماجد خان اور نثار عثمانی سے بھی رابطہ کر لو۔''

شہزاد کی نابینا والدہ اور اس کی خالہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ شہزاد نے اچانک واپسی کا فیصلہ کیوں کر لیا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ ایک دن اور حویلی کے پر رونق ماحول میں گزار سکتے تھے۔ خود نور جہاں ناراض تھی جیسے میں اسے خرابی کی ساری [illegible]ردے کر حویلی سے نکال رہا ہوں... وہ جیسے برقعے میں چہرہ چھپا کے آئی تھی ویسے ہی واپس چلی گئی... شیر خان اپنی ہائی لکس میں تین محافظوں کے ساتھ ان کے ساتھ گیا۔

میں نے نور جہاں کے جانے کے بعد سکون کا سانس لیا کہ خطرہ ٹل گیا۔ شاید ایسا ہی نور جہاں کا حویلی میں مجبوراً برداشت کرنے والی خواتین کے گروپ نے بھی محسوس کیا ہو گا۔ رانا نگر اور ست بدھائی کے درمیان ہندوستان پاکستان جیسی سیاسی کشیدگی کی فضا تو روز اول سے قائم تھی لیکن رانا کی گرفتاری بہت بڑا واقعہ بن گئی تھی۔ عام حالات میں وہ کبھی ایسے گرفتار نہ ہوتا وہ شاہانہ انداز میں خود گرفتاری پیش کرتا اور اس کے ساتھ ہی ضمانت پر رہا ہو کے بڑی شان سے لوٹ

آتا۔ ہم نے اسے بھری محفل سے اغوا کیا اور حوالات کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیا۔ اس کے لیے یہ انتہائی ذلت آمیز شکست بن گئی کہ وہ قانون کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال نہ کر سکا اور ایک عام آدمی کی طرح پکڑا گیا۔ رہی سہی کسر اس ذلت کی تشہیر نے پوری کر دی۔

اس واقعے کے بعد ڈی آئی جی عبداللہ جان کی مصالحت اور مداخلت کے باوجود ماحول بہتر نہیں ہوا تھا۔ رانا کے ساتھ دشمنی نے باقاعدہ جنگ کا ماحول بنا دیا تھا۔ فضلو والا واقعہ رانا کی طرف سے پہلا حملہ تھا جسے ہم نے ناکام ہی نہیں بنایا بلکہ اس کے چلائے ہوئے میزائل کا رخ اسی کی طرف موڑ دیا۔ گزشتہ رات ایک حملہ ہم نے ہی کیا تھا جب اس کے تصویر والے پوسٹر عید مبارک کے ساتھ آس پاس کے سب دیہات میں دیواروں پر لگائے گئے تھے۔ اس کے لیے مساجد کے داخلے کا انتخاب کیا گیا تھا جہاں زیادہ سے زیادہ لوگ رانا صاحب اور ان کے ولی عہد کو حوالات کی سلاخوں کے پیچھے دیکھ لیں۔

غنی کی سیکریٹ فورس نے رات کی تاریکی میں یہ کارنامہ سرانجام دیا تھا اور یہ بات یقینی تھی کہ دوپہر تک رسوائی کے اس تماشے نے رانا پیلس کے اندر انتقام کی آگ بھڑکا دی ہو گی۔ فضلو کی ناکامی جلتی پر تیل کا کام کرے گی اور رانا کا اگلا حملہ کیا ہوگا اس کا اندازہ کرنا مشکل تھا لیکن میں خود کو ذہنی طور پر تیار رکھنا چاہتا تھا اس لڑائی میں جو قانون شکنی کے مظاہرے کے سوا کچھ نہ تھی پولیس کا ملوث ہونا یقینی تھا اور پولیس خود آئے یا اسے بلایا جائے ہر صورت میں نور جہاں کی حویلی میں موجودگی بہت بڑا خطرہ تھی۔

دوپہر کے بعد تک غنی جہلم کے ڈسٹرکٹ اسپتال میں فضلو کی ڈیڈ باڈی چھوڑ کے آیا تو خاصے ڈپریشن کا شکار تھا۔ ”سر بڑا دکھ ہوا جب اسپتال والوں نے اس کی لاش ایک کمرے میں فرش پر پھینک دی۔ ایسی بے حسی کے ساتھ جیسے وہ انسان ہی نہیں... وہاں اور بھی پڑے تھے توبہ توبہ ہم میت کو کتنے احترام سے قبر تک پہنچاتے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”تم جذباتی ہو رہے ہو وہاں روز یہی ہوتا ہے اور ڈاکٹر یا اسپتال کا عملہ عادی ہو جاتا ہے ورنہ کام کیسے کریں۔“

”پھر بھی سر... فضلو کی کیا زندگی تھی۔ موت بھی ویسی ہی ملی۔ افسوس تو اس کے باپ کی حالت پر ہے اپنے ہاتھوں سے اپنے بیٹے کو مار ڈالا اور حاصل کچھ نہ ہوا۔ آگے پتا نہیں رانا اس کا کیا حشر کریگا۔ اس سے تو وہ تھانیدار لال خان قائدے میں رہا۔“

میں نے کہا۔ ”تم جاکے آرام کرو کچھ دیر۔ طبیعت بحال ہو جائے گی۔ تم کل سے گھن چکر بنے ہوئے ہو۔“

کھانے کے بعد میں نے ایک بار پھر ابا جی سے بات کرنے کی کوشش کی اور ناکام رہا۔ باقی سب لوگ بھی تھکن اتارنے کے لیے لیٹ گئے تھے۔ راجا نے تو کھانا بھی نہیں کھایا تھا اور سو رہا تھا۔ میری ابھی آنکھ ہی لگی تھی کہ میرے موبائل فون کی گھنٹی نے مسلسل بجنا شروع کیا۔ میں نے اس خیال سے فون اٹھا لیا کہ یہ کہیں ابا جی کی کال نہ ہو لیکن نمبر دیکھا تو عبداللہ جان کا تھا۔

میں سمجھ گیا کہ اس وقت ڈی آئی جی صاحب کے فون آنے کا مقصد کیا ہو سکتا ہے۔ اسے رانا کی شکایت یا اپنے ذرائع سے کوئی رپورٹ ملی ہو گی کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ شاید وہ اس بات پر برافروختہ ہو گا کہ راجا کو جس تصویر کی اخبار میں اشاعت سے روکا گیا تھا وہ اس نے پوسٹر بنا کے دیواروں پر کیوں لگائی۔ رانا بہرحال عام آدمی نہیں تھا۔ وہ اس علاقے سے منتخب ہونے والا صوبائی اسمبلی کا رکن تھا اور یہ ہمیشہ سے اس کے خاندان کی آبائی سیٹ سمجھی جاتی تھی۔

فون بج کے بند ہو گیا تو میں نے اسے آف کیا اور پھر سو گیا مجھے صرف دو گھنٹے سونا نصیب ہوا۔ ایک گارڈ نے راجا کو مطلع کیا کہ ڈی آئی جی صاحب، تشریف لائے ہیں۔ اس کو دروازے پر روکنے کی ہمت کون کرتا۔ اس کی گاڑی اندر آ چکی تھی جب رانا آنکھیں ملتا اس کے استقبال کے لیے اترا۔ اسے مہمان خانے میں بٹھا کے راجا نے مجھے جگایا۔

میں نے کہا۔ ”راجا صاحب! بات بہت بڑھ گئی ہے شاید۔“

”تو فکر ہی نہ کر نیکے پتر۔ جب اوکھلی میں دیا سر تو موسلوں کا کیا ڈر۔ پنگا ہے تو فل پنگا۔“

”اس کا موڈ کیسا ہے؟“

”بظاہر تو اچھا ہے۔ اخلاقاً اس نے یہ بھی کہا کہ وہ عید کے روز کچھ مصروف تھا اپنی فیملی کے ساتھ۔ آج سب سے ملنے نکلا ہے۔ سب سے غالباً اس کی مراد علاقے کے معززین سے ہو گی۔“

”جن میں رانا بھی شامل ہے۔ تو چل میں آتا ہوں۔ ذرا ہاتھ منہ دھو کے کپڑے بدل لوں۔“ میں نے کہا۔

میں تقریباً دس منٹ بعد اترا تو عبداللہ جان بڑے تپاک اخلاق سے گلے ملا۔ خیر و عافیت معلوم کرنے کی رسمی گفتگو ابھی چل رہی تھی کہ چائے آ گئی۔

میں نے کہا۔ ”عبداللہ صاحب! کیا آپ جہاں بھی ہوں۔ ایسے ہی اپنے علاقے میں خود لوگوں سے عید ملتے ہیں؟“

اس نے سوچ کے کہا۔ ”نواب صاحب۔ بلا امتیاز عید ملنا ہماری روایت تھی۔ اس معاملے میں ہم انگریز حاکم کو مورد الزام ٹھہرا سکتے ہیں کہ اس نے ہر تہوار کو خوشامد اور حاکم پرستی کا موقع بنا دیا۔ روایت یہ بن گئی کہ چھوٹے تہوار پر بڑوں کی خدمت میں حاضری کو فرض کی طرح نبھانے لگے۔ تحفے تحائف اور ڈالی کے ساتھ۔ چیف سیکریٹری یا کمشنر قسم کے لوگ کسی سے ڈالی قبول کر لیں تو اس کا سر فخر سے بلند ہو جاتا تھا۔ جسے شرف ملاقات بخش دیں وہ تو سمجھتا تھا دونوں جہاں میں سرخرو ہوا۔ نعوذ باللہ۔“

”اب انگریز نہیں رہے مگر ان کی روایات پر ہم ان سے زیادہ سختی کے ساتھ عمل پیرا ہیں۔“ میں نے کہا۔

”بالکل... کالا صاحب اپنے مزاج میں گورے صاحب سے زیادہ ہی متکبر ہے۔“ عبداللہ نے حسبِ عادت فصیح اردو بولی۔ ”مجھ سے بہت ماتحت ملنے آئے۔ پھر میں پولیس لائن میں بڑے کھانے میں گیا۔ یہ بڑا کھانا تو ہر جگہ ہوتا ہے۔ نچلے درجے کے ماتحت خوش ہوتے ہیں کہ افسران بالا کے ساتھ طعام کی سعادت حاصل ہوئی حالانکہ محمود و ایاز کے لیے پورا حفظ مراتب کا اہتمام ہوتا ہے۔ کھانا بھی الگ۔ بیٹھنا بھی الگ۔“

”آپ نے مجھے شرمندہ کر دیا۔ آپ بڑے ہیں۔ عید ملنے کے لیے مجھے آنا چاہیے تھا۔“

وہ مسکرایا۔ ”بات یہ ہے نواب صاحب کہ میں ایک غرض سے حاضر ہوا ہوں۔ جھوٹ کیوں بولوں۔“

میں نے کہا۔ ”اگر ہم آج کے دن ان شکایات کو موضوعِ سخن نہ بنائیں۔ بیر رانا کو مجھ سے یا مجھے رانا سے نہیں۔“

اس نے ہاتھ اٹھایا۔ ”بالکل نہیں۔ اس پر ہم پھر اپنی بات کریں گے۔ آج ایک اور مسئلہ ہے۔“

میں نے ہنس کے کہا۔ ”مطلب یہ کہ مسئلہ بہرحال لائے ہیں آپ۔“

”زندگی میں مسائل سے مفر کہاں نواب صاحب۔ آپ سے ایک بار تذکرہ ہوا تھا شامی بادشاہ کا۔“

میں چونکا۔ ”جی۔ اس کا نام بہت سے کیس میں ہے۔“

”میں نے اس سے بہت زیادہ سنا ہے جتنا آپ تسلیم کرتے ہیں۔ آج کل وہ میرے علاقے میں بہت زیادہ سرگرم ہے۔ کوئی دن نہیں گزرتا جب کسی واردات کی اطلاع نہ ملے۔ بقر عید سے پہلے چار جگہ سے بہت مہنگے خریدے گئے قربانی کے جانور چوری ہوئے۔ کئی کئی لاکھ کے آسٹریلین بیل۔“

میں نے کہا۔ ”چلیے۔ قربانی کی نیت سے خریدے گئے تھے تو قربانی بہرحال ہو گئی۔“

”ظاہر ہے وہ بیچے نہیں جا سکتے تھے۔ انہیں عید پر قربان کیا گیا اور اسی علاقے میں گوشت غریبوں میں تقسیم کیا گیا۔“

”کیا گوشت پہچانا گیا۔“

”نہیں۔ یہ جانوروں کے مالکان کو فون کر کے بتایا گیا۔ ایک درجن کے قریب دوسری وارداتوں میں لاکھوں روپے نقد اور لاکھوں کا سونا لے گیا۔ میرے مخبر دن رات مستعد ہیں مگر شامی بادشاہ ہاتھ نہیں آتا۔ وہ تو جیسے انسان نہیں چھلاوہ ہے یا جن بھوت۔“

میں نے کہا۔ ”آپ لوگوں سے تو جن بھوت بھی پناہ مانگتے ہیں۔ ایک ڈاکو کیا چیز ہے۔“

وہ کچھ دیر خاموشی سے چائے پیتا رہا۔ ”نواب صاحب۔ میں آپ کے پاس مدد کے لیے آیا ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”کس قسم کی مدد۔ آپ نے وہ لطیفہ سنا ہوگا کہ رات کو دوست دروازے پر آیا تو گھر والا تین چیزیں لے کر نکلا۔ تلوار ایک ہاتھ میں۔ اشرفیوں کی تھیلی دوسرے ہاتھ میں اور پیچھے ایک کنیز۔ اس نے کہا کہ اتنی رات گئے دوست کو کیا ضرورت میرے دروازے پر لائی ہے۔ کسی دشمنی کا خوف ہے تو تلوار لے کر میں چلتا ہوں۔ مالی مسئلہ ہے تو اشرفیوں کی تھیلی حاضر ہے اور عورت کی ضرورت ہے تو یہ کنیز تمہاری۔“

وہ لطیفے سے بالکل محظوظ نہیں ہوا۔ ”مجھے ان تین چیزوں کی کوئی ضرورت نہیں۔“

”چلیے پھر آپ ہی بتا دیجیے۔“

”میں چاہتا ہوں۔ شامی بادشاہ کی کارروائیاں ختم ہو جائیں۔ کم سے کم اس وقت تک جب تک میں یہاں ہوں۔ اب یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اس کے بہت سے طریقے ہیں۔“

”آپ نے ابھی کہا تھا کہ یہاں آپ مجھ سے مدد مانگنے آئے ہیں۔ وہ بات بیچ میں رہ گئی۔“ میں نے کہا۔

”جی نہیں۔ میں اسی طرف آ رہا تھا۔ اگر وہ ہاتھ آ جاتا

تو اور بات تھی۔ یہ نہیں ہوسکتا تو پھر دوسری صورت یہ ہے کہ وہ اس پیشے سے تائب ہوجائے۔ ڈاکے ڈالنا چھوڑ دے۔''

میں نے ہنس کے کہا۔ ''آپ بہت جلد پریشان ہوگئے۔ وہ تو آپ کے آنے سے بہت پہلے سے وارداتیں کررہا ہے۔''

اس نے جیسے میری بات ان سنی کردی۔ ''تیسری صورت یہ ہے کہ وہ اس علاقے سے چلا جائے۔''

''کسی دوسرے ڈی آئی جی کے علاقے میں؟''

''کم سے کم تین مہینے کے لیے۔'' وہ بولا

''میں نے پوچھا۔ ''تین مہینے میں کیا ہوگا؟''

''میری پروموشن ہوجائے گی۔ میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔''

میں نے کہا۔ ''کیا آپ کی پروموشن کو شامی بادشاہ سے مشروط کردیا گیا ہے؟ اسے ماردو۔ پکڑلو یا تائب کرلو۔''

''مشروط تو نہیں۔ مگر ایسا کچھ ہوجائے تو اس کا کریڈٹ مجھے ملے گا۔ اچھی کارکردگی ہو تو اوپر والوں کی توقعات زیادہ ہوتی ہیں۔''

''اوکے۔ یہ فرمایئے کہ میں کیا کرسکتا ہوں؟''

اس نے کہا۔ ''دیکھیے۔ برا مت مانیے گا۔ میری اطلاعات کے مطابق شامی بادشاہ سے آپ کے اچھے مراسم ہیں۔ آپ اس کے دوست ہیں یا سرپرست۔''

''یہ اطلاع آپ نے درست تسلیم کرلی۔''

''اطلاع غلط نہیں ہوسکتی۔ مجھے ایک جگہ سے نہیں۔ کئی ذرائع سے یہ بتایا گیا۔''

اگر میں کہوں کہ یہ جھوٹ ہے۔''

''تو میں آپ کو جھوٹا نہیں کہوں گا۔ میں سمجھوں گا آپ نے میری درخواست کو مسترد کردیا نواب صاحب۔ وہ ڈاکو بڑے لوگوں کا دشمن ہے۔ رانا جیسے لوگوں کا۔ آپ کی اس لیے عزت کرتا ہے کہ آپ کے ذہن میں غریبوں کی فلاح کا خیال ہے۔ وہ خود بھی رابن ہڈ بنا ہوا ہے۔ غریبوں کا حامی اور مددگار۔ میں نے بہت قصے سنے ہیں اس کی غریب پروری اور سخاوت کے۔ کچھ سچ ہوں گے۔ باقی یوں ہی لوگوں نے زیب داستان کے لیے بڑھا دیے ہوں گے۔ میں جانتا ہوں وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی ہے اور یقیناً کسی ظلم زیادتی کے ردعمل میں ڈاکو بن گیا ہے۔ ظلم زیادتی کرنے والے ابھی تو یہی لوگ ہوتے ہیں۔ وڈیرے اور جاگیردار۔ انہیں پالنے والے بھی یہی ہوتے ہیں۔ ایک دوسرے کے خلاف دشمنی میں یہ ڈاکوؤں کو لڑاتے ہیں۔ پھر انہیں پناہ دیتے ہیں اور ان کی غیر قانونی سرگرمیوں کی پردہ پوشی کرتے ہیں۔''

''آپ مجھے ایسا ہی وڈیرا سمجھتے ہیں۔''

''ہرگز نہیں۔ آپ کے پاس میرے آنے کا مقصد کچھ اور تھا۔ یہاں ایسے ہی واقعات ہوتے ہیں کہ کسی ڈاکو نے کسی کے کہنے پر پولیس کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ وہ ایک سابقہ زندگی سے تائب ہوئے اور حکومت نے ان کو معافی دے دی۔ انڈیا کی پھولن دیوی تو فلمی کردار بھی بن گئی لیکن اس کے علاوہ پاکستان میں کئی کیس ہوئے۔''

میں نے کہا۔ ''آپ چاہتے ہیں میں شامی بادشاہ کو اس پر مجبور کردوں؟''

''اگر آپ کرسکتے ہیں...''

''آپ کیوں سمجھتے ہیں کہ وہ مان جائے گا۔'' میں نے کہا۔

''انحصار اس پر ہوتا ہے کہ درمیان میں کون ہے۔ کس حد تک قابلِ اعتماد ہے۔ ایک ڈاکو کے لیے اپنا پیشہ چھوڑنا ممکن ہے شرط یہ ہے کہ اسے تحفظ کی ضمانت حاصل ہو اور یہ امید بھی ہو کہ بعد میں بھی اس کی آمدنی کے لیے ذرائع دستیاب ہوں گے۔ وہ بھوکا نہیں مرے گا۔ پولیس اسے تنگ نہیں کرے گی اور معاشرے میں اس کی عزت بھی بحال ہوجائے گی۔ یوسی... پھولن دیوی کو اسمبلی کا ممبر بنادیا گیا تھا۔''

''تو کیا آپ شامی بادشاہ کو رانا صاحب کے مقابلے میں انتخاب لڑائیں گے؟'' میں نے مذاق میں کہا۔

''کیا ایسا نہیں ہوسکتا؟ آس پاس کے علاقوں میں اس کے کافی حامی ہیں۔ غریب غربا کے ووٹ اسے مل سکتے ہیں اور اگر آپ اس کی حمایت کریں۔''

میں نے کہا۔ ''مذاق کی بات چھوڑیں۔ فرض کریں میں کسی طرح شامی بادشاہ تک آپ کا پیغام پہنچاتا ہوں۔ اسے کہتا ہوں کہ وہ ہتھیار ڈال دے اور ڈاکازنی چھوڑ کے خود کو پولیس کے حوالے کردے تو یہ ضمانت کون دے گا کہ بعد میں کیا ہوگا۔''

''ضمانت میں دوں گا۔ اس کے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہیں ہوگی۔ سابقہ مقدمات ختم کردیے جائیں گے۔''

''اس کے پورے گروہ کے خلاف...؟''

''یس۔ جو بھی ہتھیار ڈالے گا۔ اسے معافی مل جائے گی۔''

میں نے کہا۔ ''عام طور پر پولیس کے وعدے پر اعتبار

نہیں کیا جاتا۔ مجرم سمجھتے ہیں انہیں جعلی مقابلے میں ہلاک کردیا جائے گا اور پولیس کا یہ موقف ہوگا کہ انہوں نے پولیس پر پہلے فائر کھولا۔ پولیس نے اپنا دفاع کیا۔ میں نے پولیس کے ایک افسر سے خود یہ سنا کہ وعدے کی اہمیت ہوتی ہے شریف آدمی کے لیے۔''

''یہ ڈیل میرے آپ کے درمیان ہے۔ میں آپ کو زبان دے رہا ہوں۔ آپ میری طرف سے زبان دیں گے۔''

اور فرض کیجیے جو آپ سے اوپر بیٹھے ہیں۔ وہ مکر گئے؟''

''نواب صاحب... میں اپنا استعفیٰ لکھ کر اور اپنے دستخط کے ساتھ آپ کے پاس رکھوا سکتا ہوں۔ آپ اخبارات کو جاری کردیں یا میرے افسرانِ بالا کو ارسال کردیں۔''

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد میں نے کہا۔ ''شرط پورے گروہ کی ہے یا صرف شامی بادشاہ کی؟''

''شامی بادشاہ ان کا سردار ہے۔''

''ہتھیار ڈالنے کے معاملے میں ہر شخص کا شامی بادشاہ سے اتفاق کرنا ضروری نہیں۔ ممکن ہے نصف ڈر سے یا اس خیال سے کہ بعد میں کیا کریں گے۔ ہتھیار نہ ڈالیں۔ آمدنی اچھی ہے۔''

''لیکن خطرہ ہر وقت ہے مارے جانے کا۔ ایک بات اور ہے نواب صاحب۔ یہ لوگ شوقیہ ڈاکے نہیں ڈالتے، ایڈونچر کی خاطر۔ جان ہتھیلی پر رکھ کے پیسا کمانا ان کو پسند نہیں ہوتا کیونکہ ان کو بھی زندگی سے پیار ہوتا ہے۔ ان کے بیوی بچے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ دل سے تو چاہتے ہیں کہ یہ کام چھوڑ دیں۔ اس کے لیے پیسا بھی جمع کرکے رکھتے ہیں۔ لیکن انہیں موقع نہیں ملتا۔''

''شامی کے ساتھ بعد میں کیا کریں گے؟''

''پولیس میں بھرتی ہونا چاہیں تو میں حاضر۔ کام وہاں بھی یہی ہوگا۔ لوٹ مار۔ لیکن وردی میں اور قانونی۔'' وہ ہنسا۔

میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''اوکے۔ آئی ول ٹرائی۔''

''مجھے آپ سے انکار کی امید نہیں تھی۔'' وہ خوش ہوا۔

''میں سارے آپشن سامنے رکھوں گا۔ جو آپ نے بتائے ہیں۔ وہ تین مہینے کے لیے روپوش ہوجائے۔ اپنی کارروائیاں روک دے یا کہیں اور چلا جائے۔ اس دوران ڈی آئی جی آپ کی جگہ لے لے گا۔ آپ اسے پریس کریں گے کہ شامی کو پکڑو۔''

وہ مسکرایا۔ ''وہ تو لازمی ہے۔ اپنے اپنے علاقے میں امن وامان قائم رکھنے کے لیے مجھے بھی سب کو کہنا پڑے گا۔''

''آپ کے بعد آنے والا ڈی آئی جی بھی مجھ سے رجوع کرے گا۔ یہ تو ایک سائیکل ہے۔''

''ہوسکتا ہے وہ رانا صاحب سے رجوع کرے۔ آپ کا دوست بنے لیکن آپ سے میرا ایک وعدہ ہے۔ اگر آپ نے میری مدد کی تو بالواسطہ طور پر آپ کو میری حمایت حاصل رہے گی۔''

میں نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ ''آف کورس۔ میں آج بھی آپ کا حامی ہوں۔ میرا مطلب ہے آپ کے پروگرام کا۔''

''یہ بڑی حوصلہ افزا بات ہے۔''

وہ بولا۔ ''کیا اب میں کچھ حوصلہ شکن باتیں بھی کرسکتا ہوں؟''

میں نے حیرانی سے کہا۔ ''ضرور۔ لیکن ایسی کون سی بات ہے؟''

وہ بولا۔ ''دیکھیے نواب صاحب۔ آپ پاکستان کے معروضی حالات اور حقائق کو سمجھ لیں تو اچھا ہے۔ آپ کو بعد میں پریشانی اور مایوسی نہیں ہوگی۔ یہ جو خواب آپ دیکھ رہے ہیں۔ جس کا نام ہے ست بدھائی ترقیاتی پروگرام۔ یہ آن پیپر بہت اچھا ہے لیکن قابلِ عمل نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''نواب رفیق۔ آج تک اس ملک کے کسی حکمراں نے خلوصِ نیت اور سنجیدگی سے کوشش کی ہے کہ تعلیم عام ہو؟''

''دعوے تو سب کرتے ہیں۔''

''وہ سب زبانی دعوے ہیں۔ لوگ جب پڑھ لکھ جاتے ہیں تو باشعور ہوجاتے ہیں۔ پھر وہ ناانصافی کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔ استحصال برداشت نہیں کرتے۔ اپنا حق مانگتے ہیں۔ جو تعلیم اس وقت دی جارہی ہے سرکاری طور پر، اس کی کوئی افادیت نہیں۔ صحیح تعلیم اتنی مہنگی ہے کہ بہت کم صرف خوشحال لوگ حاصل کرسکتے ہیں۔ حکومت بھی یہی چاہتی ہے۔ سرمایہ دار کا بچہ تعلیم حاصل کرے۔ سرمایہ دار سب ہیں۔ صنعتکار۔ جاگیردار۔ بیوروکریٹ۔ جنرل۔ وہ چاہتے ہیں کہ جو تھوڑی بہت اچھی ملازمتیں ہیں وہ ان ہی کے بچوں کے لیے مخصوص ہوں۔ وہ بھی حکومت میں آئیں۔ باقی کلرکی کریں یا مزدوری۔''

''یہ صورتِ حال یقیناً افسوسناک ہے لیکن کیا ہمیں

اس کو بدلنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے؟''

''اگر آپ ایسا کریں گے تو آپ حکمرانوں کی مرضی کے خلاف جائیں گے۔ دیکھیے یہ ایک سائیکل ہے۔ اگر معاشی خوشحالی آئے گی تو غریب بھی بچے کو اچھی تعلیم دلانے کی سوچے گا۔ چنانچہ اسے خوشحال نہ ہونے دیا جائے۔ بس روٹی کپڑا مکان۔ بجلی گیس کے بلوں سے ہی باہر نہ نکلنے دیا جائے۔ آپ کے ست بدھائی ترقیاتی منصوبے کی سخت مخالفت ہوگی۔ اس کی راہ میں روڑے اٹکائے جائیں گے۔ ابھی یہ کام رانا کر رہا ہے۔ اس کا مقصد ہی وہی ہے جو حاکم چاہتے ہیں۔ یہاں نہ خوشحالی آئے نہ آگہی۔ اسے سب کی سپورٹ حاصل ہوگی۔ آپ کی مشکلات میں اضافہ ہوگا۔''

میں نے تلخی سے کہا۔ ''پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

''اگر آپ مجاہد غازی یا شہید بننا چاہتے ہیں تو اس کام کو جاری رکھیں۔ اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔ ورنہ چھوڑیے ان چکروں کو۔ یہاں بہت خواب دیکھنے والے آئے اور گئے۔ تعبیر آج آپ کے سامنے ہے۔ آپ بھی اپنی... خیر منائیے۔ زندگی صرف ایک بار ملتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''آج آپ بہت عجیب باتیں کر رہے ہیں۔''

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''ایک شعر آپ نے سنا ہو شاید۔ مانو نہ مانو جانِ جہاں اختیار ہے۔ ہم نیک و بد حضور کو سمجھائے جاتے ہیں۔''

عبداللہ جان کی باتوں میں حقیقت پسندی تھی لیکن میں مایوس ہونے والا نہیں تھا۔ رات کو میری اس معاملے میں راجا سے گفتگو ہوئی اور اس نے بھی اتفاق کیا کہ تعلیم ہمیشہ ہر حکومت کے لیے آخری ترجیح تھی جس کو محض دکھانے کے لیے ترقیاتی عمل کا حصہ بنایا گیا مگر اس کے لیے بجٹ میں سب سے کم رقم رکھی گئی۔

راجا نے کہا۔ ''انگریز تو خواہ مخواہ بدنام تھا۔ آج اس ملک میں کیسا طبقاتی نظام ہے تعلیم کا۔ سب سے نیچے اور سب سے بڑی تعداد میں مسجد اسکول اور مدارس ہیں پھر اردو میڈیم اسکول جو گورنمنٹ چلاتی ہے۔ نہ صحیح اساتذہ ہیں۔ نہ بیٹھنے کی جگہ۔ اسکولوں کی عمارات میں وڈیروں کی اوطاق بنی ہوئی ہے یا مویشی باندھ دیے گئے ہیں۔ اساتذہ کا محض نام لکھا ہوا ہے۔ فوج نے سراغ لگایا تو ان کاغذی یا غیر موجود اسکولوں کی تعداد ہزاروں میں تھی۔ انہیں گھوسٹ اسکولز کا نام دیا گیا تھا۔''

ان سے اوپر گلی محلوں کے انگلش میڈیم اسکول ہیں۔ چوتھے ہیں گرامر اسکول یا پبلک اسکول اور کیڈٹ اسکول۔ وہاں واقعی تعلیم دی جاتی ہے۔ مگر ان کو عام آدمی کہاں افورڈ کر سکتا ہے۔ سب سے اوپر ہیں باہر سے او لیول یا اے لیول کرنے والے۔''

راجا نے کہا۔ ''تو ڈی آئی جی صاحب کی باتوں سے ناامید نہ ہو فیکے پتر۔ علامہ صاحب کا وہ شعر پڑھ۔ تندیِ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب۔ یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے۔''

''ہم تو شاید بادِ مخالف سے بھی اوپر اڑنے کا سوچ رہے ہیں مہاراجا۔''

''ہمیں ڈی آئی جی صاحب کے آئی جی بننے کی دعا مانگنی چاہیے۔ ہمارا کوئی تو حامی ہو۔''

''بات صرف دعا کی نہیں۔ اس نے تو سودے کی بات کی ہے۔ تم میری مدد کرو۔ میں تمہاری مدد کروں گا لیکن سوال یہ ہے کہ ہم شاہی بادشاہ کو ہتھیار ڈالنے کے لیے کیسے راضی کر سکتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

راجا بولا۔ ''کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔ کوشش کے دو ہی نتیجے نکلتے ہیں۔ کامیابی یا ناکامی۔ ففٹی ففٹی کا چانس لیا جا سکتا ہے۔''

''مگر کیسے۔ شاہی بادشاہ ہے کہاں۔ اس سے رابطہ کیسے کیا جائے۔ وہ خود بھی بہت عرصے سے نہیں آیا اور اس کا نامہ بردہ مجذوب بھی غائب ہے۔''

راجا نے کہا۔ ''وہ مل جائے گا کہیں نہ کہیں۔ اگر تلاش کیا جائے۔ یہاں اس کے عقیدت مندوں کی کمی نہیں لیکن ابھی پہلے تو رانا صاحب کی درخواست ضمانت کا مسئلہ ہے۔ صبح اس کی توثیق کے لیے سماعت ہوگی۔''

''معلوم نہیں شہزاد کے دلائل سے کچھ ہوگا یا نہیں۔''

''وہ خود تسلیم کرتا ہے کہ اس مرحلے میں دلائل کا اثر نہیں ہوگا۔ کسی سیشن کورٹ کے جج میں اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ کسی رکن اسمبلی کی ضمانت منسوخ کر کے اسے جیل بھیجنے کے احکامات صادر کر دے۔''

''معلوم نہیں جج کون ہے۔ آخر نچلی سطح پر بھی انصاف تو ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔

راجا بولا۔ ''ہوتا ہے لیکن یہ معاملہ ہے حاکموں کا۔ یہ جج بے چارے ویسے ہی وہاں نہیں ہوتے ہیں۔ سرکاری ملازمت ہے۔ اور حاکم حزبِ اقتدار میں ہو یا حزبِ اختلاف میں۔ ایک ہی رویہ رکھتے ہیں۔ آج اگر ایک ماتحت عدالت نے کسی اسمبلی کے رکن کو جیل بھیج دیا تو کل دوسرے کو بھی ہمت

ہوگی۔ آج اگر حکمراں دوسرے ہیں تو کل رانا صاحب کی حکومت بھی آئے گی۔ یہ سب ایک دوسرے کے مفادات کا ضرور خیال رکھتے ہیں۔ مجھے تو ہائی کورٹ سے بھی امید نہیں۔''

''وہ بہت دور کی بات ہے فیکے پتر۔ درخواست پہلے سماعت کے لیے منظور ہو۔ پھر نوٹس جاری ہوں۔ سماعت کی تاریخ مقرر ہو۔ فیصلے ہونے تک رانا آزاد پھرے گا۔''

''وہ آزاد ہی رہے گا۔ آج تک اسمبلی کا کوئی رکن جیل گیا ہے؟''

راجا نے سر ہلایا۔ ''کرمنل کیس میں کوئی نہیں گیا۔ سیاسی مخالفت اور دشمنی میں ضرور گئے ہیں۔''

صبح ہم ٹھیک آٹھ بجے سیشن کورٹ کے لیے نکل گئے۔ ہمارے آگے شیر خان اپنی ہائی لکس چلا رہا تھا اور اس میں دو مسلح گارڈز سیدھے کھڑے تھے۔ ان کی بندوقوں کا رخ آگے کی طرف تھا۔ درمیان میں کرولا تھی جس کی پیچھے والی سیٹ پر میں راجا کے ساتھ تھا۔ اسے غنی چلا رہا تھا اور اس کے ساتھ بھی ایک گارڈ کلاشنکوف لیے مستعد بیٹھا تھا۔ پیچھے سوزوکی میں پھر دو گارڈز تھے۔

رانا کے ساتھ بھی محافظوں کی فوج آئی تھی۔ یہ طاقت اور شان و شوکت کا مظاہرہ تھا تو اس میں یقیناً رانا کو برتری حاصل ہوئی۔ اس کے ساتھ دس باقاعدہ محافظ تھے تو سب ملا کے پچاس افراد آئے تھے۔ رانا نہ جانے کہاں غائب تھا۔ شاید وہ اندر عدالت کے کسی ماتحت کے کمرے میں مصروف تھا اور جاں نثاری کے مظاہرے میں حد سے بڑھنے والوں کو روک کر دور رکھنے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔

ممکن ہے ڈی آئی جی عبداللہ جان سے صورتِ حال کے کشیدہ ہونے کے پیشِ نظر ماتحت افسران کو حفاظتی انتظامات موثر رکھنے کی ہدایت کی ہو۔ ہمارے اور فریقِ مخالف کے درمیان پولیس فورس ایک دیوار بنی ہوئی تھی۔ ہم نے پہلے ہی غنی کو سمجھا دیا تھا کہ عدالت کے باہر یا اندر کسی قسم کی اشتعال انگیزی بالکل نہیں ہونی چاہیے خواہ رانا کی طرف سے کچھ بھی کہا جائے۔

ہم اب شہزاد کی آمد کے منتظر تھے۔ نو بجنے میں پانچ منٹ رہ گئے تھے اور وہ ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ اس قسم کے معاملات میں فریقِ ثانی موقعے سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ مخالف وکیل نہیں پہنچا تو فوراً عدالتی پیش کار سے کہہ کے آواز لگوا دیتے ہیں اور جج کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ یک طرفہ دلائل کی بنیاد پر فیصلہ صادر کر دے۔

عین وقت پر شہزاد کا ایک ماتحت بدحواسی کے عالم میں نمودار ہوا۔ ''سوری نواب صاحب۔''

میں نے کہا۔ ''شہزاد خود کہاں ہے۔''

''وہ سخت بیمار ہو گئے۔ صبح صبح انہوں نے مجھ سے کہا۔ میرا نام عالمگیر ہے۔''

راجا نے مایوسی سے پوچھا۔ ''اسے کیا ہوا ہے؟''

''الٹیاں آ رہی ہیں اور بخار بھی ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔ انہوں نے مجھے سب سمجھا دیا ہے۔ میں ان کی طرف سے پیش ہوتا رہتا ہوں۔''

عالمگیر کی شخصیت نے مجھے متاثر نہیں کیا۔ وہ میرے اندازے کے مطابق پینتالیس سال کا شخص تھا جس کے بال قبل از وقت سفید ہو چکے تھے۔ اس کا شہزاد جیسے نوجوان بیرسٹر کا ماتحت ہونا میں اس کی حماقت اور چھوٹے قد کا اور کسی حد تک سیاہ فام تھا اور کچھ ناک میں بولتا تھا۔''

''کیا خیال ہے چلیں؟'' عالمگیر نے کہا۔ ''آواز لگ گئی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''آپ چلیں۔ ہم تو صرف تماشائی ہیں۔''

عدالت میں بینچوں پر زیادہ لوگوں کی جگہ نہیں تھی۔ ایک سائڈ پر رانا کے حلیفوں کا قبضہ تھا۔ غنی نے دوسری سائڈ پر ہمارے لیے جگہ رکھی تھی۔ ہم دوسری صف میں تھے۔ راجا نے کچھ لوگوں کو دیکھ کر ہاتھ بھی ہلایا۔ وہ سب اخباری نمائندے تھے۔

میں نے کہا۔ ''ان کو تو نے کہا تھا؟''

راجا نے نفی میں سر ہلایا۔ ''فیصلے کا اندازہ تو بھی کر سکتا ہے اگر ضمانت کی منسوخی کا ڈر ہوتا تو کیا رانا انہیں بلاتا؟ اپنے جیل بھیجے جانے کا تماشا دنیا کو دکھانے کے لیے۔''

فاروقی عین وقت پر جج کے ساتھ ہی نمودار ہوا۔ رانا اس کے پیچھے آیا اور ملزموں کے کٹہرے میں رکھی ہوئی کرسی پر بڑی شان سے بیٹھ گیا۔ وہاں بیٹھنے کی اجازت اسے عدالت نے بیماری کے باعث دی۔ بیماری کا سرٹیفکیٹ فاروقی نے جج کے سامنے رکھ دیا۔

عالمگیر نے بلاوجہ اعتراض کیا جسے جج نے فوراً مسترد کر دیا۔ پھر فاروقی نے درخواست کی کہ رانا صاحب کی عبوری ضمانت کی توثیق کر دی جائے۔ عالمگیر پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ ''جناب والا ملزم کو ضمانت پر رہا کیا گیا تو ڈر ہے کہ وہ مقدمے کی کارروائی پر اثر انداز ہوگا۔''

فاروقی نے کہا۔ ''رانا صاحب ایک معزز اور ذمے دار

شخص ہیں۔ عوام کے دوست ان پر اعتماد کے مظہر ہیں۔ اگر ان کی شہرت اچھی نہ ہوتی تو وہ کبھی صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب نہ ہوتے۔"

عالمگیر نے کہا۔ "جنابِ والا۔ وہ اپنے آبائی حلقے سے خاندانی اثر ورسوخ کی بنا پر منتخب ہوئے تھے اور کسی کے رکن اسمبلی ہونے سے اس کا کردار بہتر نہیں ہوتا۔ وہ اپنے سیاسی تعلقات سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ تفتیش کرنے والوں پر دباؤ ڈال سکتا ہے۔ گواہوں کو ڈرا دھمکا سکتا ہے۔"

فاروقی نے اعتراض کیا۔ "یہ الزام ایک رکنِ اسمبلی کی توہین ہے۔"

"یہاں وہ ایک عام ملزم ہے۔ جس پر ایک ڈاکٹر کو اغوا کر کے حبسِ بے جا میں رکھنے، اپنے محل میں قید کے دوران اس پر تشدد کرنے کے علاوہ خود اپنی بیٹی کے قتل کے الزامات ہیں۔"

"یہ الزامات ابھی ثابت نہیں ہوئے۔"

"ان کی ایف آئی آر موجود ہے اور بیٹی کے قتل ہونے سے پہلے جو بیان مجسٹریٹ کے سامنے دیا تھا وہ خود ایک ثبوت ہے۔ ایسے سنگین الزامات میں ضمانت پر رہائی کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ ابھی تفتیش ہو رہی ہے لیکن پولیس نے کسی کیس میں چالان تک پیش نہیں کیا ہے۔"

فاروقی نے نکتہ اٹھایا۔ "اس سے اور کیا ثابت ہوتا ہے؟ یہی کہ الزامات کے ثبوت نہیں مل سکے۔ تفتیش سے کچھ بھی ثابت نہیں ہوا۔"

جج نے وکیل سرکار کی طرف دیکھا۔ "حکومت کو ضمانت کی توثیق پر کوئی اعتراض ہے۔"

عالمگیر پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ "رانا صاحب خود حکومت ہیں۔ حکومت کیا اعتراض کرے گی۔ ابھی تک پولیس نے ان کا ایک دن کا ریمانڈ نہیں لیا۔"

"یہ غلط ہے۔ پولیس کو گرفتاری کے بعد چودہ دن کا ریمانڈ دیا گیا تھا۔" فاروقی نے کہا۔

اب میں نے اٹھ کے کہا۔ "وکیل صفائی جھوٹ بول رہے ہیں۔ ملزم کو ابھی گرفتار ہوئے تین دن گزر رہے ہیں۔"

جج نے برہمی سے کہا۔ "آپ بیٹھ جائیں۔" عدالت میں ہر شخص کو بولنے کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔"

عالمگیر نے کہا۔ "میرے موکل کی بات درست ہے۔ پولیس نے بالکل ریمانڈ نہیں لیا۔ نہ تفتیش کی۔ پولیس نے تو ملزم کو گرفتار ہی نہیں کیا تھا"

"پھر کیا آپ کے موکل نے گرفتار کیا تھا۔" فاروقی طنز سے بولا۔

عالمگیر نے شور مچایا۔ "عدالت کو بتایا جائے کہ ریمانڈ کس نے دیا اور کب۔ تفتیشی افسر کون ہے؟"

جج نے اس کی سنی ہی نہیں۔ "آپ اصل موقف پر رہیے۔ یہاں درخواستِ ضمانت کی توثیق کا کیس ہے۔"

"ضمانت کی درخواست کس کے سامنے پیش کی گئی تھی اور کب؟" میں نے پھر دخل اندازی کی۔

جج بگڑ گیا۔ "نواب رفیق۔ میں آپ کو توہین عدالت کے جرم میں جیل بھیج دوں گا۔"

عالمگیر نے کہا۔ "میں اپنے موکل کی طرف سے معافی مانگتا ہوں لیکن یہ سوال دہراتا ہوں۔"

"یہ غیر متعلقہ سوال ہے۔ درخواست ضمانت کی توثیق کی جاتی ہے۔" جج نے کہا اور اٹھ گیا۔

عدالت میں موجود رانا کے حامیوں نے نعرے لگائے۔ "رانا کا بول بالا۔ دشمن کا منہ کالا۔" انہوں نے منہ پھاڑ کے اور سامنے ہاتھ رکھ کے بکری جیسی آوازیں بھی نکالیں اور میرے ساتھ آنے والوں کی طرف ہاتھ ہلا ہلا کے فحش اشارے بھی کیے۔ یہ کھلی اشتعال انگیزی تھی۔ رانا کے حامی تصادم چاہتے تھے مگر میں نے غنی کو سختی سے روکا۔ "ان سب کو جانے دو۔"

"جنابِ عالی۔ یہ تو بڑی بے عزتی ہے ہماری۔" غنی نے کہا۔

"تم سمجھتے کیوں نہیں۔ اس سازش کا مقصد ہے تمہیں جوابی کارروائی پر مجبور کرنا اور سب کو پکڑ کے اندر کرانا۔"

راجا نے بھی اسے روکا۔ "ہم کسی غیر قانونی کارروائی کا حصہ نہیں بنیں گے۔"

جن اخبار والوں کو رانا نے مدعو کیا تھا وہ اب اپنے کیمرے فوکس کیے کھڑے تھے۔ ہمارے کورٹ سے باہر آتے ہی رانا بھی اپنے حمایتی لوگوں کے کندھوں پر سوار ہو کے نکلا تو اس کے گلے میں ہار پڑے ہوئے تھے اور وہ لوگوں کی طرف دیکھ کے ایسے ہاتھ ہلا رہا تھا جیسے وہ کوئی عوامی لیڈر ہے جو کسی ڈکٹیٹر کے ہاتھوں طویل قید و بند کی صعوبت اٹھا کے رہا ہوا ہے اور اس کے سامنے عوام کا ٹھاٹیں مارتا ہوا سمندر ہے۔ یہ سب پہلے سے طے شدہ تھا اور کسی ریہرسل کیے ہوئے ڈرامے کی طرح لگتا تھا۔

رانا نے ہماری طرف بڑے غرور، بڑی حقارت اور فتح مندی کی مسکراہٹ کے ساتھ دیکھا۔ اس کی حمایت میں نعرے لگانے والوں نے پھر بیہودہ آوازوں اور اشاروں

سے ہمیں مشتعل کیا مگر میں نے سب کو روک کے رکھا۔

راجا نے کہا۔ "اب مجھے معلوم ہے کل کے کچھ اخبار کیا تصویر اور کیا خبر لگائیں گے۔ رکن قومی اسمبلی رجب علی رانا عدالت کے باہر اپنی بے گناہی کا جشن منانے والوں کے کندھوں پر۔"

"ایسی غلط خبریں توہین عدالت نہیں ہوگی۔"

"بالکل ہوگی۔ لیکن اس چکر میں کون پڑتا ہے کہ کس نے کیا لکھا اور کیوں لکھا۔ نہ کسی کو آج تک ہتک عزت کا کیس کرنے سے کچھ ہوا اور نہ ایسی کسی خبر پر وہ خود فروش صحافی پکڑے گئے جو کچھ بھی چھاپ دیتے ہیں۔ لفافوں کی صحافت کے علمبردار۔ سیکڑوں اخبار ہیں اور سیکڑوں صحافی۔ مستند اور معتبر نام بہت تھوڑے ہیں۔"

ہمارے باہر آنے تک رانا صاحب کا جلوس کوئی دو درجن کاروں کے ساتھ روانہ ہو گیا تھا۔ جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ تمام صحافیوں کو رانا پیلس لے جا کے کھلایا پلایا گیا اور غالباً حسنِ کارکردگی کا انعام لفافے میں دے کر رخصت کیا گیا۔ خود فروش کا ایمان کیا اور اعتبار کیا۔ ان میں سے زیادہ تر نے خبر رانا صاحب کی مرضی کے مطابق نہیں چھاپی اور تصویر گول کر گئے۔ بہانہ ان کے پاس ریڈی میڈ ہوتا ہے۔ ایڈیٹر نے جو سنسر کر دیا یا متن بدل دیا۔ تصویر خراب ہوگئی۔

غنی کو اور اس کے ساتھیوں کو میں نے مزید آدھا گھنٹا روکا کہ کہیں ست بدھائی جاتے ہوئے راستے میں رانا صاحب کے لشکر سے ان کی مڈبھیڑ نہ ہو جائے۔

راجا نے عالمگیر کی کارکردگی پر مایوسی کا اظہار کیا۔ "پتا نہیں شہزاد جیسے بیرسٹر نے آپ کو کیسے معاونِ خصوصی رکھا ہے۔"

"کیوں راجا صاحب۔ میرے پاس پوائنٹ ہی کون سا تھا جس پر میں ضمانت کی مخالفت کرتا۔" وہ برا مان کر بولا۔

راجا نے کہا۔ "آخر خود نواب صاحب کو کیوں بولنا پڑا؟"

"ان کے بولنے سے الٹا نقصان ہوا۔"

راجا نے کہا۔ "تمہارے بولنے سے کون سا فائدہ ہوا اور جھوٹ کو پوائنٹ آوٹ کرنا تمہارا کام تھا۔"

میں نے کہا۔ "چل چھوڑ راجا۔ خود شہزاد ہوتا تو کون سا نتیجہ مختلف ہوتا۔ میرا خیال ہے ہم اسے دیکھ لیں۔"

"ہاں۔ اگر وہ اتنا ہی بیمار ہے۔" راجا بولا۔

غنی نے ہمیں دو گھنٹے میں شہزاد کے گھر کے دروازے پر اتار دیا۔ مجھے بڑی حیرانی ہوئی جب گھنٹی بجانے پر وہ خود ہی دروازہ کھولنے کے لیے آیا۔ وہ شاید اتنی جلدی ہمارے آنے کی توقع نہیں رکھتا تھا۔

اس نے پہلا سوال یہی کیا۔ "کیا ہوا۔ آپ لوگ..."

میں نے کہا۔ "کیا ہو سکتا تھا؟ خصوصاً جب ہماری وکالت کرنے والا ہی نہ پہنچے۔ اس کی ضمانت کی توثیق ہو گئی۔"

وہ سخت حیران ہوا۔ "توثیق ہو گئی؟ مجھے تو معلوم ہوا تھا کہ آج سماعت نہیں ہو گی۔ جج ٹرانسفر ہو گیا ہے۔"

راجا نے کہا۔ ''گھر بیٹھے تمہیں یہ اطلاع کس الو کے پٹھے نے دی اور تم نے یقین کرلیا تو تم خود کیا ہو۔''

میں نے کہا۔ ''اور اپنی جگہ کس بانگڑو کو بھیج دیا تم نے۔''

''میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ آپ لوگ کیا کہہ رہے ہیں آخر۔ اندر آیئے پھر بات کرتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''ہمیں تو معلوم ہوا تھا کہ تم سخت بیمار ہو۔'' ''لاحول ولاقوۃ۔ مجھے کیا ہوا ہے۔'' شہزاد نے کہا۔

راجا بولا۔ ''عالمگیر نے بتایا کہ تمہیں صبح سے الٹیاں آرہی ہیں اور بخار ہے۔''

''کون عالمگیر۔ نہ مجھے الٹی آرہی ہے نہ سیدھی۔ بخار ہو میرے دشمنوں کو۔ آپ گھاس کھا گئے ہیں راجا صاحب۔'' وہ بگڑنے لگا۔

صورتِ حال اب کچھ کچھ مجھ پر واضح ہونے لگی تھی۔

''تمہارا وہ اسسٹنٹ عالمگیر...''

اس نام کا میرا کوئی اسسٹنٹ نہیں ہے اور اس کیس میں بھلا میں اپنی جگہ کسی اسسٹنٹ کو بھیج سکتا تھا؟''

میں نے راجا کی طرف دیکھا۔ ''یہ رانا کی حرکت ہوگی۔ مگر خیر۔ اسے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔''

''میرے آفس میں چھ لوگ کام کرتے ہیں۔ تم سب سے مل چکے ہو۔ کم سے کم ان کو صورت سے ضرور پہچان سکتے ہو۔'' شہزاد نے کہا۔

''شہزادے۔ جب تم نے گھر بیٹھے ایک بے بنیاد خبر کو تصدیق کیے بغیر مان لیا۔ تو ہم اسے تمہارا اسسٹنٹ کیسے نہ مانتے۔ فائل اس کے ہاتھ میں تھی۔ کالا کوٹ بھی پہن رکھا تھا اس نے اور... ہاں واجبی حد تک دلائل بھی دیے۔ آخر کون تھا وہ؟''

''میں کیا بتاؤں۔ مجھے خود رجسٹرار آفس سے اطلاع ملی تھی۔ جب میں نے رجسٹرار کو فون کیا، اس نے تصدیق کردی کہ اے ڈی جے کو تبدیل کردیا گیا ہے۔ جج ٹرانسفر ہوتے رہتے ہیں۔ عام کیس ملتوی ہوجاتے ہیں۔ ارجنٹ کیس سماعت کے لیے کسی اور کو مارک ہوجاتے ہیں۔ مجھے خود پیشکار نے بتایا کہ رانا صاحب کے کیس کی سماعت کل دوسری کورٹ میں ہوگی۔ کیونکہ اس عدالت میں جج نہ جانے کب تک آئے۔''

''گویا رجسٹرار بھی رانا صاحب کی سازش میں شریک ہوا اور جج کا پیشکار بھی۔''

''لیکن اس کا ثبوت کوئی نہیں۔ کل وہ صاف انکار کردیں گے کہ ان کی کسی سے بات ہوئی تھی شہزادے۔ تم تو ان چکروں سے واقف ہو۔ تمہیں شک نہیں ہوا؟'' راجا نے کہا۔ ''کیا سماعت نہ ہو تو رجسٹرار اس طرح ہر وکیل کو گھر فون کرکے بتاتا ہے؟'' میں نے سوال اٹھایا۔

''نہیں۔ لیکن میں نے رجسٹرار سے کہا تھا کہ کوئی ایسی بات ہو تو مجھے بتادے۔ اسے ایک ہزار کا نوٹ بھی دیا تھا۔''

رانا نے پانچ ہزار کا نوٹ دے دیا ہوگا۔ تمہارا نوٹ چھوٹا تھا۔ مار کھا گیا۔ چلو اب جانے دو۔ آئندہ احتیاط۔ ایسی چکر بازیاں ہوتی رہیں گی۔ یہ بتاؤ تم نے ہائی کورٹ میں اپیل کے لیے ماجد خان سے اور نثار عثمانی سے بات کی؟''

''نثار عثمانی نے تو کہہ دیا کہ سیاسی کیس ہے۔ آپ لوگوں کی فیس رائگاں جائے گی۔ ماجد خان راضی ہے۔ اس نے کہا کہ کیس تو ہے فوجداری لیکن ظاہر ہے اوپر سے دباؤ آئے گا۔ اسے سیاسی دشمنی کا شاخسانہ قرار دیا جائے گا لیکن ہم حقائق کی بنیاد پر فائٹ کریں گے۔ سپریم کورٹ بھی جائیں گے۔ آپ ان سے مل لیں تو اچھا ہے۔''

دوپہر کا کھانا ہم نے شہزاد کے گھر پر وہیں کھالیا۔ نورجہاں اس بات پر خفا تھی کہ میں نے اسے زبردستی حویلی سے رخصت کردیا۔ شہزاد نے بتایا کہ کھانا اسی نے بنایا ہے۔

وہ بولا۔ ''دل تو چاہتا تھا کہ تمہارے کھانے میں زہر ڈال دوں۔''

راجا نے کہا۔ ''نیک کام میں دیر کیسی۔ اب ڈال دو۔''

میں نے کہا۔ ''اگلی مرتبہ ہم زہر ساتھ لے کر آئیں گے۔ دونوں مل کر کھالیں گے۔''

راجا بولا۔ ''فلم کا آخری دردناک سین۔ دو روحیں پرواز کرتی بادلوں سے گزر رہی ہیں۔ بیک گراؤنڈ میں گانا چل رہا ہے۔ محبت زندہ رہتی ہے محبت مر نہیں سکتی۔''

اچانک میرے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ لیلیٰ بھابی نے کہا۔ ''کہاں چلے گئے تم لوگ؟''

میں نے کہا۔ ''ہمارا وکیل بھاگ گیا تھا۔''

''اچھا اب جلدی گھر آؤ۔'' لیلیٰ بھابی نے کہا۔

''کیوں؟ خیریت تو ہے نا۔'' میں نے پوچھا۔

''ہاں ہاں۔ بس تم آجاؤ۔'' میں نے محسوس کیا کہ ان کی آواز میں گھبراہٹ ہے۔ وہ شاید کچھ چھپا رہی تھیں۔

میں نے راجا سے ذکر کیا۔ اس نے شہناز سے پوچھنا چاہا تو لائن نہیں ملی۔ رابعہ کے فون کی گھنٹی بجتی رہی۔ مزید تاخیر کرنے کے بجائے ہم نے فوراً واپس روانہ ہونا بہتر سمجھا۔ باہر مجھے غنی کا موڈ بھی بدلا ہوا نظر آیا مگر میرے بار بار

پوچھنے پر بھی اس نے کچھ نہیں بتایا۔ یہی کہتا رہا کہ ریشم مجھ پر خفا ہو رہی تھی کہ عدالت سے گھر آنے کے بجائے تم کہاں چلے گئے۔

میرا ماتھا ٹھنکا۔ یقیناً کوئی ایسی بات تھی جو ابھی نہیں بتائی جا رہی تھی تاکہ ہم خیر و عافیت سے گھر پہنچ جائیں۔ میری چھٹی حس فوراً بیدار ہوگئی اور مجھے کوئی شک نہ رہا کہ ایسی خبر صرف ایک ہی ہوسکتی تھی۔

اور گھر پہنچتے ہی مجھے معلوم ہوگیا کہ میرے اندیشے بے بنیاد نہ تھے... ڈیڑھ گھنٹے قبل موصول ہونے والے اباجی کے فون سے اطلاع ملی تھی کہ اماں نے آج صبح اس دارِ فانی سے عالم جاودانی کا سفر اختیار کیا اور ان کی خواہش کے احترام میں انہیں وہیں جنت البقیع کے قبرستان کی مٹی کے سپرد کردیا گیا...

اناللہ وانا الیہ راجعون۔

میرے لیے اس سانحہ عظیم میں حادثاتی صدمے کا کوئی پہلو نہیں تھا اور کسی حد تک میں نے خود کو ذہنی طور پر پہلے سے تیار بھی کر رکھا تھا لیکن اس کا اثر نہ ہوتا یہ ناممکن تھا۔ یکلخت میں نے ایسا محسوس کیا جیسے میرے سر سے محبت اور شفقت کا وہ سائبان سمٹ گیا ہے جس نے روزِ اول سے مجھے اپنی پناہ اور عافیت میں لے رکھا تھا۔

پوری حویلی ایک سوگوار ماتمی فضا میں ڈوبی ہوئی تھی۔ سب سے زیادہ ضبط کا مظاہرہ لیلیٰ بھابی نے کیا تھا کہ مجھے فون کرتے ہوئے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا۔ شاید اس لیے کہ ان کا اماں سے تعلق زیادہ نہیں رہا تھا اور عمر کا تجربہ بھی ہم سے زیادہ رکھتی تھیں۔ شہناز مجھے دیکھ کے پھر رونے لگی۔ ریشم مزاج کے اعتبار سے انتہائی جذباتی لڑکی تھی اور سب کے لیے انتہائی محبت بھرا دل رکھتی تھی۔ اماں کے ساتھ اس کی جذباتی وابستگی زیادہ رہی تھی۔ وہی ان کی سب سے زیادہ خدمت کرتی تھی اور اماں بھی اس کو سب سے زیادہ دعائیں دیتی تھیں۔ اس کی معصومیت آمیز باتوں پر بعض اوقات اماں کہتی تھیں کہ تو بالکل پاگل ہے ریشم... مثلاً ایک بار اس نے اماں سے کہا تھا کہ میرے لیے دعا کریں کہ شادی کے بعد میرے سات بچے ہوں... تین لڑکیاں بالکل میرے جیسی اور چار لڑکے بالکل غنی کے جیسے... اماں نے پوچھا تھا کہ سات کیوں تو اس نے کہا کہ یہ کسی نے مجھے بتایا کہ سات کا عدد تمہارے لیے مبارک ہوگا... میں ساتویں مہینے میں پیدا ہوئی تھی اور ماں بتاتی تھی کہ تاریخ بھی سات تھی۔ اب ریشم ہی سب سے زیادہ رو رہی تھی۔ رابعہ اندر سے روتی ہوئی آئی اور مجھ سے لپٹ گئی۔

''آج میں پھر یتیم ہوگئی کزن۔''

میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''ایسی باتیں نہ کر... تیرا بھائی ہے ابھی۔''

ایک گھنٹے بعد اباجی کا فون پھر آیا... انہوں نے کہا۔ ''رفیق میاں... اللہ نے تمہاری اماں کی دلی خواہش پوری کی... وہ اسی مقدس مٹی میں دفن ہونے کی دعائیں کرتی رہیں... اللہ سب کے نصیب ایسے نہیں کرتا۔''

میں نے روتے ہوئے کہا۔ ''دو دن سے میں مسلسل فون کررہا تھا۔ آپ کا نمبر نہیں ملا۔''

''ہاں... پہلے تو میرا فون خراب ہوگیا تھا گرنے سے... پھر تمہاری اماں نے منع کردیا کہ کسی کو کچھ نہیں بتانا... بچے پریشان ہوں گے اور کچھ پتا نہیں رفیق کا مجھے لینے یہاں پہنچ جائے... میں جانا نہیں چاہتی اور اسے انکار بھی مشکل ہوگا... میں جھوٹ بولنا نہیں چاہتا تھا... اس لیے فون بند رکھا... ان کی حالت تو ہر گزرتے دن کے ساتھ گرتی جارہی تھی... مجھے تو لگتا تھا کہ انہوں نے پوری تیاری یہاں آنے سے پہلے ہی کرلی تھی۔ ان کو یقین تھا کہ وہ واپس نہیں جائیں گی... خوشی انہیں اس بات کی تھی کہ اللہ نے حج کی سعادت حاصل کرنے کے لیے مہلت عطا کی... اس کے بعد ایک ہی خواہش رہ گئی تھی... آج صبح سوتے میں کسی وقت انہوں نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا... مجھے پتا ہی نہیں چلا ایسی پُرسکون موت تھی۔''

میں نے کہا۔ ''اب آپ کب آرہے ہیں؟''

اباجی نے کہا۔ ''میری شیڈول فلائٹ کل تھی لیکن تمہاری اماں کی حالت سفر کے قابل نہیں تھی... ویسے تو اب میں آسکتا ہوں لیکن کچھ قانونی معاملات ہیں... مجھے دوسری فلائٹ ملتے ہی میں پہنچ جاؤں گا لیکن کچھ کہنا تھا تم سب سے کہ... یہ تمہاری اماں کی خواہش تھی۔ ایک تو وہ چاہتی تھیں کہ اللہ نے ایک ساتھ ان کو دو خوشیاں دیں... اپنے گھر بلایا اور قیامت تک کے لیے مہمان بھی کرلیا۔ ان کی خوشی کو تم لوگ رو کے خراب نہ کرو۔''

میں نے کہا۔ ''اباجی... یہ کیسے ممکن ہے؟''

''سنو... اباجی نے خفگی سے کہا۔ ''انسان کو راضی برضا رہنا سیکھنا چاہیے... اس کے لیے کوشش کرنے سے پہلے یہ نہیں کہہ دینا چاہیے کہ یہ کیسے ممکن ہے... جو دنیا میں آیا ہے اسے ایک دن جانا ہے... جب یہ طے ہے تو رونے دھونے سے کیا ہوگا... اپنی اماں کے لیے اتنا بھی نہیں کرسکتے تم... ویسے بھی سوگ ہوتا ہے صرف تین دن کا... یہ شرع کا حکم ہے... اماں نے وصیت کی تھی کہ حویلی میں کوئی سوئم چہلم کی

تقریبات نہیں ہوں گی... ان کی مغفرت کے لیے قرآن خوانی جتنی چاہو کرو... ساری عمر کرو... مگر میلہ لگا کے نہیں... ہر شخص اپنے گھر بیٹھ کے بھی ایصالِ ثواب کر سکتا ہے... اس کی پروا مت کرنا کہ لوگ کیا کہیں گے۔"

میں نے کہا۔ "جی میں ایسا ہی کروں گا۔"

"تمہاری اماں کی یہ بھی وصیت تھی کہ تم رابعہ کا خاص خیال رکھو... وہ بن ماں باپ کی بچی ہمارے بعد تمہاری ذمے داری ہے... اپنی سگی بہن سے زیادہ تم پر اس کی ذمے داری ہو گی... بس مجھے اور کچھ نہیں کہنا... مجھے امید ہے میرے آنے تک سب کچھ نارمل ہو چکا ہو گا... میں دوبارہ کسی کو روتا پیٹتا دیکھنا نہیں چاہتا... بس اپنا کام کرو... ہماری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔"

"آپ کی اپنی طبیعت تو ٹھیک ہے ابا جی؟"

"ہاں... بس چل رہی ہے... کچھ عمر کا تقاضا ہے کچھ اپنے اکیلے رہ جانے کا احساس سوہانِ روح بن گیا ہے... موسم اور آب و ہوا کا اثر ہے کہ ہاضمہ بگڑ گیا ہے... بخار چڑھتا اترتا رہتا ہے۔"

میں نے پریشان ہو کے پوچھا۔ "آپ اماں کی دیکھ بھال میں اپنی بیماری کا علاج بھولے ہوئے ہوں گے۔"

"ایسا نہیں ہے... میں دوا لے رہا ہوں... یہاں میرے ایک پرانے دوست ہیں... آج ان کے گھر چلا جاؤں گا... پھر فلائٹ ملنے تک وہیں رہوں گا۔"

رسم و رواج میں جکڑے ہوئے دیہی معاشرے میں اپنی ماں کا سوئم دھوم دھام سے نہ کرنا خاصا موضوعِ بحث بنا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اپنی کم علمی اور جاہلانہ سوچ کے باعث لوگ میرے عقائد کو بھی تنقید کا نشانہ بنائیں گے اور میری ناخلفی کو بھی... یہ کہا جائے گا کہ لندن امریکا کی تعلیم نے مجھے دین سے بے گانہ کر دیا ہے اور میرے عقیدے یہاں تک کہ ایمان کی سلامتی پر سوال اٹھائے جائیں گے مگر نہ کسی نے میرے منہ پر کچھ کہنے کی جرأت کی اور نہ میں نے کسی کے سامنے اپنی صفائی پیش کرنے کی ضرورت کو اہم سمجھا۔

اگلے تین دن مجھ سے تعزیت کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھا رہا۔ ان میں اکثریت انہی لوگوں کی تھی جو کسی وجہ سے میرے ساتھ عقیدت کا رشتہ رکھتے تھے لیکن دوسرے دن آنے والوں نے ڈی آئی جی عبداللہ جان کے علاوہ خود رانا رجب علی اور اس کا بیٹا بھی شامل تھے وہ رسمی طور پر چند منٹ کے لیے آئے اور اخلاقی فریضے کے طور پر دعائے مغفرت کر کے رخصت ہو گئے قطع نظر اس سے کہ انہوں نے اسے سیاسی ضرورت سمجھا... معاشرتی یا مذہبی... میں نے ان کا تہ دل سے شکریہ ادا کیا۔

تین دن بعد زندگی معمول پر لانے کے لیے مجھے خاصی سختی سے کام لینا پڑا۔ معاملہ میری ماں کی آخری خواہش پر عمل درآمد کا تھا... شہزاد اپنی ماں اور خالہ کے ساتھ تین دن سے حویلی میں ہی مقیم تھا اور نور جہاں کی موجودگی نے ہم سب کے لیے اضافی پریشانی کے اسباب پیدا کر رکھے تھے... گاؤں کی عورتیں سب ڈاکٹر شہناز اور ریشم کی مریض تھیں کچھ رابعہ اور لیلیٰ بھابی کی شاگرد تھیں تو باقی ان بچوں کی مائیں بہنیں جو اسکول میں پڑھنے کے لیے ہر گھر سے آ رہے تھے... ان سب کے آنے کا کوئی وقت مقرر نہ تھا اور مجھ سے عید ملنے کے لیے آنے والوں کی طرح انہیں باہر ہی سے رخصت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ اندر آ کے باری باری تمام خواتین سے تعزیت کرتی تھیں اور اخلاقاً دعائے مغفرت کے بعد بھی کچھ دیر بیٹھی رہتی تھیں۔

نور جہاں کو میں نے سختی سے ہدایت کر دی تھی کہ وہ اپنے کمرے سے باہر نہ آئے۔ نیچے اترنے کا تو سوال ہی نہیں... یہ پابندی اسے بھی قبول نہ تھی مگر بات وہی تھی... مرتا کیا نہ کرتا... تیسرے دن شہزاد کا ارادہ ہوا کہ اپنی والدہ اور خالہ کو واپس لے جائے تو نور جہاں نے پھر انکار کیا۔

"میں شہزاد کے گھر میں نہیں رہنا چاہتی... میں یہیں رہوں گی۔"

میں نے اسے سمجھایا۔ "آخر وہاں رہنے میں تمہیں کیا پریشانی ہے؟"

"تمہیں میرے یہاں رہنے سے کیا پریشانی ہے اب تو میں کمرے سے بھی باہر نہیں آتی۔"

"پھر وہی ضد... تمہیں اندازہ ہے کہ یہ تمہارے لیے کتنا خطرناک کام ہے... خدانخواستہ کسی کی نظر پڑ جائے تم پر اس کے علاوہ حویلی میں بھی تمہاری موجودگی کسی کو پسند نہیں... سوائے میرے... میری وجہ سے تمہیں سب برداشت کرتے ہیں... اگر کسی نے تمہارے خلاف ایک گمنام کال کر دی کہ تم حویلی میں روپوش ہو۔"

"تمہیں کس سے خطرہ ہے؟ رابعہ سے یا شہناز سے یا لیلیٰ بھابی ایسا کر سکتی ہیں؟"

میں نے کہا۔ "تم ریشم اور اس کی ماں کو بھول رہی ہو... ان کی نظر میں تم اکبر خان کی قاتل ہو... اکبر خان کتنا ہی برا آدمی سہی... فاطمہ کا شوہر تھا۔"

"وہ خود کہتی ہے کہ اکبر خان اسے طلاق دے چکا تھا وہ اس سے نفرت کرتی ہے۔"

"وہ ریشم کا باپ بھی تھا... اس کی قبر یہاں سے چند قدم کے فاصلے پر ہے اور جس عورت کو ریشم اپنے باپ کے قتل کا ذمہ دار سمجھتی ہے وہ اسی حویلی کے اندر رہے اس کی نظروں کے سامنے... یہ کتنی خطرناک سچویشن بن سکتی ہے۔"

وہ خاموش ہو گئی۔ "آخر میں کیا کروں... کہاں جاؤں... کاش تمہیں چھوڑ دینا میرے اختیار میں ہوتا۔"

"تمہیں چھوڑنے کے لیے کس نے کہا ہے۔"

"تم ایسا کیوں نہیں کرتے... مجھے زہر کیوں نہیں دے دیتے... اپنے ہاتھوں سے مجھے کیوں نہیں مار دیتے۔" اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

میں نے اسے سمیٹ لیا۔ "دیکھو جان... یہ تھوڑے دن کی بات ہے... سال دو سال تم لندن میں گزار لو... پھر میں خود تمہیں واپس لے آؤں گا میں نے راجا سے کہا ہے وہ تمہارے لیے ایک نئی زندگی شروع کرنے کے انتظامات کر رہا ہے تمہارا نیا شناختی کارڈ بنے گا... نئے نام سے۔"

اس نے کہا۔ "کیا ہو گا میرا نیا نام؟"

میں نے کہا۔ "نور... نام میں کیا رکھا ہے... تم میرے لیے وہی رہو گی۔"

"تم مجھے نور کہنے لگے تھے... مجھے بہت اچھا لگا تھا۔"

میں نے کہا۔ "گلاب کو کسی نام سے بھی پکارو... گلاب ہی رہے گا۔"

اس نے میری طرف چہرہ اٹھایا۔ "مگر گلاب کو چنبیلی کوئی کہتا نہیں... کوئی ایسا نام ہو جس میں نور آ جائے... مثلاً ماہ نور۔"

"او کے... ماہ نور... لیکن باقی تفصیلات تو بدلیں گی مثلاً تمہاری ولدیت... تاریخ پیدائش... پتا۔"

"میرے ابا کی روح کو کتنی تکلیف ہو گی... ولدیت کون بدل سکتا ہے سب کچھ بدل سکتا ہے آدمی... ایک صورت اور ہے۔"

میں نے کہا۔ "وہ کیا...؟"

"شادی کے بعد عورت کو نیا شناختی کارڈ بنوانا پڑتا ہے تو ولدیت کے خانے میں وہ شوہر کا نام لکھتی ہے میں تمہارا نام لکھوا دوں۔"

"ابھی ہماری شادی کہاں ہوئی ہے؟"

"ابھی نہ سہی... کبھی تو ہو گی... یا تم ساری زندگی فریال کا انتظار کرو گے؟"

میں نے کہا۔ "کل کیا ہو گا... کون جانے... آج تم میری بیوی نہیں ہو... شوہر کی جگہ میرا نام لکھوانے کے لیے میرا شناختی کارڈ چاہیے... اس کے بعد نکاح نامہ چاہیے... ابھی یہ سب نہیں ہے اور یہ رسک بھی نہیں لیا جا سکتا کہ میرا نام تمہارے نام کے ساتھ آئے۔"

"کیوں... بدنامی سے ڈرتے ہو یا گرفتاری سے؟"

"دونوں سے۔" میں نے جھلا کے کہا۔ "کیونکہ یہ سب کچھ میں اپنے لیے بھی کر رہا ہوں... تمہیں کس کے لیے بچا رہا ہوں آخر... کیوں اتنی فکر ہے تمہاری... خدا کے لیے کچھ عقل سے کام لو... میں نے وعدہ کیا ہے تم سے کہ لندن آتا جاتا رہوں گا... ابھی تم راجا کے ساتھ جاؤ... وہ سب انتظامات کر دے گا۔"

"اور جعلی شناختی کارڈ یا پاسپورٹ کے ساتھ کسی نے مجھے پہچان لیا... پھر... میری صورت تو نہیں بدلے گی۔"

"صورت بھی بدل جائے گی... عورتوں کے لیے یہ کیا مشکل ہے۔ بالوں کا اسٹائل بدل دیں... بال ڈائی کرا لیں... مردوں کی طرح انہیں وگ لگانے کی ضرورت نہیں پڑتی... فرض کرو تم لیڈی ڈائنا جیسا ہیئر اسٹائل بنا لو... ایک نازک سا چشمہ لگاؤ... زیرو نمبر کے شیشوں والا... پینٹ شرٹ پہن لو... یا اپنے چہرے کے گرد عبایا باندھ لو... ایک نظر میں تو میں بھی دھوکا کھا جاؤں... راجا کسی میک اپ آرٹسٹ یا کاسمیٹک سرجن کی خدمات حاصل کرے تو تمہارا چہرہ بھی بدلوا سکتا ہے لیکن یہ مجھے کسی قیمت پر منظور نہیں۔"

"اسی چہرے کو تم مصیبت کا ذمے دار کہہ چکے ہو۔" وہ مسکرائی۔

"ہاں... یہ تمہارے اس حسن کی خانہ خرابی کے اسباب کم تو نہیں ہو سکتے۔ اس پر پردہ ڈالا جا سکتا ہے... ناؤ بی اے گڈ گرل... شہزاد کے ساتھ ہی راجا کو خاص طور پر اس لیے بھیج رہا ہوں کہ وہ چار دن میں کسی سے مل ملا کے تمام کام کرا دے... شناختی کارڈ اور ارجنٹ پاسپورٹ وغیرہ... اس کے بعد ویزا کے معاملات بھی سنبھال لوں گا اللہ نے چاہا تو اگلے ہفتے ہی ہم لندن میں ہوں گے۔" میں نے اسے چوما اور باہر نکل آیا۔

شہزاد کے روانہ ہونے تک میں کھڑا رہا۔ اس کی والدہ اور خالہ مجھے دعائیں دیتی رہیں اور صبر کی تلقین کرتی رہیں۔ "ہم نہ جاتے مگر کیا کریں... شہزاد کو اکیلا بھی نہیں چھوڑا جا سکتا... اس کے کورٹ کچہری کے معاملات ہیں۔"

میں نے کہا۔ "اس کی شادی کر دیں تو بیوی سنبھال لے گی سب... اور آپ یہاں آ جائیں... اسے ملنا ہو گا تو آتا

رہے گا۔''

''سچ دل تو ہمارا بھی لگتا ہے یہاں...ابھی موقع نہیں بنتا ورنہ میں بات کرتی۔'' شہزاد کی ماں نے کہا۔

ان کا اشارہ سمجھنے میں مجھے دیر نہیں لگی۔ اس بات کا مطلب یہ تھا کہ رابعہ بہت جلد اپنے گھر کی ہو جائے گی۔ غالباً شہزاد نے دل کی بات ماں سے کہہ دی تھی۔

میں لوٹ کے اندر آیا تو رابعہ دروازے میں کھڑی تھی۔ ''کزن...تم سے ایک ضروری بات کرنی تھی مجھے۔''

میں نے مسکرا کے کہا۔ ''شہزاد کی ماں بھی کچھ کہہ گئی ہیں۔''

اس کے چہرے پر غیر معمولی سختی اور سنجیدگی آ گئی۔ ''نہیں...وہ بات نہیں... مجھے کچھ پوچھنا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''تم اتنی سیریس کیوں ہو کزن؟''

''اس لیے کہ یہ سیریس بات ہے...کیا تمہیں معلوم ہے کہ نور جہاں ماں بننے والی ہے۔''

مجھے سخت شاک لگا۔ ''تمہیں کیسے معلوم؟''

''مجھے ڈاکٹر شہناز نے بتایا ہے۔ اب یہ مت کہنا کہ ڈاکٹر شہناز کو کس نے بتایا...کس کا ہے یہ بچہ؟''

میں نے برہمی سے کہا۔ ''رابعہ... ہمارے گھر میں غیر شادی شدہ لڑکیاں ایسی باتیں نہیں کرتیں... خصوصاً بھائیوں سے۔''

''میں سب بھگت چکی ہوں...اس کے ذمے دار بھی تم تھے کزن... مجھے بچہ سمجھ کے ٹالنے کی کوشش مت کرو...'' اس کا رویّہ جارحانہ ہو گیا۔

میں سوچتا رہا کہ رابعہ کو کیا بتاؤں...انکار ممکن نہیں تھا لیکن میں جھوٹ بول سکتا تھا۔

رابعہ کس قدر جارحانہ موڈ میں تھی۔ اس کا اندازہ رابعہ کے تیور اور اس کے لہجے سے ہو جاتا تھا... چنانچہ جھوٹ بول کے جان چھڑانے کے بجائے میں نے بھی اپنے دفاع میں ایک جارحانہ حکمتِ عملی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔

یہ شاید ایک سال پہلے کی بات تھی جب فرخ نے محبت کے نام پر اس کو دھوکا دیا تھا...اس سے شادی کے عہد و پیمان کیے تھے اور جذبات کے کھیل میں رابعہ کے بطن میں اپنی ہوس کی نشانی چھوڑ کے روپوش ہو گیا تھا... یہ زخم بہت گہرا تھا جسے بالآخر وقت نے بھر دیا تھا اور اب شہزاد نے خرم کی کمی پوری کر دی تھی۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں رابعہ نے اس حادثے کی ذمے داری مجھ پر عائد کر دی تھی۔

میں نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ ''بڑے افسوس کی بات ہے کزن...تم سمجھتی ہو فرخ کے جرم کا ذمے دار میں تھا...''

''یہ اس سے زیادہ افسوس کی بات ہو گی اگر تم انکار کرو...فرخ نے مجھ سے کس کا بدلہ لیا تھا آخر؟'' رابعہ تڑخ کے بولی۔

میری زبان گنگ ہو گئی... یہ بات بہت پرانی ہو گئی تھی لیکن آج بھی ایک تلخ حقیقت تھی جب میں یونیورسٹی کا طالبِ علم تھا تو میں نے فرخ کی بہن سے محبت کی تھی لیکن یہ محبت ہمیں راس نہ آئی۔ وہ رقابت میں اپنی جان سے گئی اور اگرچہ میں نے بعد میں اس کی موت کے ذمے داروں کو ان کے جرم کی سزا دے کر تماشائے عبرت بنا دیا تھا لیکن فرخ کو یقین تھا کہ اس کی بہن کا قاتل میرے سوا کوئی اور نہیں۔ مجھ سے انتقام لینے کے لیے وہ میری لندن سے واپسی کا انتظار کرتا رہا۔ پاکستان میں اس نے دو بار مجھ پر چھپ کے قاتلانہ حملے کیے لیکن خوبیِ تقدیر سے میں ہر بار بچ گیا...پھر وہ مجھے قتل کرنے ست بدحائی پہنچا اور پکڑا گیا... میں نے اسے سمجھایا اور اس کی غلط فہمی دور کر دی۔ بہ ظاہر اس نے میرا مؤقف تسلیم بھی کر لیا بڑے خلوصِ نیت کے ساتھ وہ ہمارے ترقیاتی پروگرام میں شریک ہو گیا اور ہمارے ساتھ ہی رہنے لگا لیکن درحقیقت اس نے رابعہ کو دیکھ کر انتقام کا انداز اور طریقہ کار بدل دیا تھا... مجھے مارنے کے بجائے اس نے میرے ساتھ وہی کرنے کا فیصلہ کیا...جو اس کے یقین کے مطابق میں نے کیا تھا... وہ اپنی بہن کی رسوائی اور موت کا مجرم مجھے سمجھتا تھا...سزا کے طور پر وہ میری بہن کی عزت لوٹ کے اور اسے تمام عمر کے لیے رسوائی کی نشانی دے کر فرار ہو گیا... گو بعد میں حادثاتی طور پر رابعہ اس کے ناجائز بچے کی ماں بننے سے بچ گئی لیکن اس کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ میری وجہ سے ہوا تھا...فرخ نے اسے مجھ سے انتقام لینے کے لیے نشانہ بنایا تھا۔

آج تک رابعہ نے میرے سامنے اشارے کنائے میں بھی ایسی کوئی بات نہیں کی تھی چنانچہ اس کے منہ سے نکلی ہوئی بات میرے لیے کسی تھپڑ سے کم نہ تھی۔ مجھے احساس ہو گیا کہ آج تک رابعہ نے مصلحت یا مجبوری...لحاظ یا شرافت میں یہ بات نہیں کی تھی...ایسا نہیں تھا کہ وہ مجھے قصوروار نہیں سمجھتی تھی۔

رابعہ کی بات سے مجھے سخت صدمہ ہوا تھا۔ اس کے اور میرے درمیان جو اعتماد کا مضبوط رشتہ تھا وہ شیشے کی دیوار ثابت ہوا تھا جو الزام کے ایک ہی پتھر سے بکھر گئی تھی۔

میں نے کہا۔ ''رابعہ... یہاں میرے پاس بیٹھو۔''

رابعہ کو احساس ہو گیا تھا کہ جو بات اس نے سوچے سمجھے بغیر جذبات کی رو میں بہ کر کہہ دی تھی اس نے مجھے کتنی اذیت دی تھی...اس نے کچھ خفت زدہ لہجے میں کہا۔ ''دیکھو کزن... میرا مطلب ہرگز... یہ نہیں تھا...''

میں نے کہا۔ ''چھوڑو، رابعہ... بلاوجہ مجھے دوسرا مطلب سمجھانے کی کوشش کیوں کرتی ہو...تمہاری بات کا صرف ایک ہی مطلب تھا...اور میں نے سمجھ لیا۔''

رابعہ نے سمجھ لیا کہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح اس کے لبوں سے نکلے ہوئے الفاظ بھی واپس نہیں لیے جا سکتے۔ ''کیا تم مجھے معاف نہیں کر سکتے۔ پتا نہیں آج میں نے کیسے یہ بات کہہ دی۔''

میں نے کہا۔ ''تم کیوں معافی مانگتی ہو... مجرم تو میں ہوں...اگر کوئی الزام آتا ہے تو مجھ پر...تم نے آج تک مجھ سے کچھ نہیں کہا تو واقعی بہت برداشت کیا...ورنہ سچ وہی تھا جو بالآخر تمہاری زبان سے نکلا۔''

رابعہ نے تند لہجے میں کہا۔ ''اب اس بات کو ایشو مت بناؤ...اگر یہ سچ بھی تھا تو کیا...جو ہوا تمہاری وجہ سے ہوا...خود تم نے میرے ساتھ کوئی برائی کرنے کا کبھی سوچا نہیں... یہ بات مجھ سے بہتر کون جان سکتا ہے...فرخ نے انتقام تم سے لیا اور نشانہ مجھے بنایا۔ اس حقیقت سے تم بھی انکار نہیں کرتے لیکن میں تمہیں کیسے مجرم سمجھ لوں...اس وقت جب تم فرخ کی بہن کو چاہتے تھے... یا بعد میں جب وہ سازش کا شکار ہوئی... میں اس معاملے میں کہاں تھی؟''

''مگر آج تم سمجھتی ہو...''

''میں کچھ نہیں سمجھتی... سوائے اس کے... کہ دنیا میں تمہارے سوا میرا کسی سے خون کا رشتہ نہیں... میرے لیے سب کچھ تم ہو... ماں باپ... بھائی بہن... ایسا صرف میں نہیں سمجھتی...تم نے ثابت کیا ہے...اپنے قول و فعل سے... مجھے محبت اور عافیت کا احساس دلا کر...اپنی شفقت دے کر... مجھے تحفظ دے کر۔'' وہ میرا ہاتھ پکڑ کے بولی۔ ''اگر میں بے وقوفی میں غلط الفاظ بول گئی...تو کیا میں غیر ہو گئی؟ بولو... میں رابعہ نہیں رہی...تمہاری کزن...تمہاری چھوٹی بہن...''

اس کی آواز گلوگیر ہو گئی تھی۔ میں خفا رہتا تو وہ ضرور رو پڑتی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ سچ کہہ رہی تھی۔ اس نے الفاظ کا غلط انتخاب کیا تھا یا میں نے مطلب غلط سمجھا تھا... حقیقت یہی تھی کہ وہ اپنی لائف کی ایک ٹریجڈی کی وجہ مجھے ضرور سمجھتی تھی لیکن قصوروار نہیں... یہ ایسے ہی تھا جیسے گھر میں مہمان ہارٹ فیل ہونے سے مر جائے تو میزبان خود کو قصوروار سمجھنے لگے کہ نہ میں اسے مدعو کرتا نہ روغنی کھانے کھلاتا نہ اسے دل کا دورہ پڑتا...بقول شاعر:

> وقت کرتا ہے پرورش برسوں
> حادثہ ایک دم نہیں ہوتا

جو حادثہ رابعہ کے ساتھ ہوا اس کے اسباب بھی برسوں پہلے پیدا ہوئے تھے اور اسباب میں نے پیدا نہیں کیے تھے۔ یہ سب سوچ کے میں نے رابعہ کو معاف کر دیا۔ ''او کے...تم کیا کہنے آئی تھیں؟''

''تم نے سنا...نور جہاں نے تمہیں نہیں بتایا تو میں بتا رہی ہوں...اس میں یقین نہ کرنے والی کون سی بات ہے۔'' رابعہ نے کلیئرنس ملتے ہی اپنی بات کو آگے بڑھایا۔ ''مجھ سے تو شہناز نے ذکر کیا کہ شک کی کوئی گنجائش نہیں... میں نے نور جہاں کو واش روم میں دیکھا... وہ واش بیسن پر جھکی ابکائیاں لے رہی تھی...میں نے پوچھا کہ طبیعت تو ٹھیک ہے نا...تو اس کا رنگ فق ہو گیا... ہاضمہ خراب ہوتا تو یہ کیوں ہوتا...وہ کہہ دیتی کہ پیٹ میں گڑبڑ ہے... پیٹ میں دوسری طرح کی گڑبڑ تھی...شہناز اسے کمرے میں لے کر آئی تو وہ نڈھال سی بستر پر گر گئی...اس نے سختی سے کہا کہ نور جہاں...تم مجھ سے چھپانا چاہتی ہو...میں ڈاکٹر ہوں...بس اس کے بعد نور جہاں نے مان لیا۔''

''کیا مان لیا؟''

''یہی کہ وہ ماں بننے والی ہے...اس نے نہیں پوچھا کہ بچے کا باپ کون ہے؟''

''کیوں نہیں پوچھا؟''

''کزن... یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات تھی۔''

میں نے دل کے خوف کو چھپائے رکھا۔ ''تمہارا مطلب ہے اکبر خان؟''

''ظاہر ہے... وہی نور جہاں کا شوہر سمجھا جاتا تھا۔ وہ خود تو انکار کرتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''پھر تم کو کیا پریشانی لاحق ہے کزن؟''

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی تم سے زیادہ بھی احمق ہو سکتا ہے...قبلہ نواب صاحب...اگر اس نے تمہارا نام لے دیا...پھر؟''

''یہ کیا فضول بات ہے۔''

''یہ فضول بات نہیں ہے...ایسی عورتوں سے کیا بعید۔''

میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''رابعہ...تمہارا یہ ہتک آمیز لہجہ اور یہ رویّہ... مجھے بالکل پسند نہیں... کیوں سمجھتی ہو تم نور جہاں کو ایسا؟ جیسے اس حویلی میں وہی ایک قابلِ نفرت و

ملامت ہے... جس کی کوئی عزت نہیں... اور اس کے مقابلے میں تم سب بڑی پاکباز... نیکی اور شرافت کی پتلیاں ہوں... شیطان کا روپ صرف نور جہاں ہے... باقی سب فرشتے ہیں۔"

رابعہ نے کہا۔ "تم تو کرو گے اس کی حمایت... لیکن سوچ لو اس کا انجام۔"

"ضرورت سے زیادہ ہوشیار بننے کی ضرورت نہیں۔ میں بے وقوف نہیں ہوں کہ اپنا برا بھلا نہ سمجھوں... میں دیکھ رہا ہوں کہ تم بالکل روایتی نند کی طرح اس کے خلاف زہر افشانی کا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتیں۔"

"رفیق بھائی... تمہاری سگی بہن ہوتی..." رابعہ نے رونے کی تیاری کی۔

"بکواس مت کرو... یہ سگی سوتیلی کی بات نہیں۔"

رابعہ نے رونا شروع کر دیا۔ "پتا چلے گا اگر اس نے الزام تم پر تھوپ دیا... جادو تو کر ہی دیا ہے... اب بلیک میل بھی کرے گی... معلوم نہیں کس کا گناہ تمہارے سر منڈھ دے گی... اکبر خان شوہر کب تھا... دلال تھا اس کا..."

میں نے غصے میں رابعہ کو تھپڑ نہیں مارا۔ لات مار کے ایک میز الٹی اور باہر نکل گیا۔ دروازے سے باہر نکلتے ہوئے میری ٹکر راجا سے ہوئی۔ اس نے میری صورت اور میری حالت کو غور سے دیکھا۔ "کیا ہوا فیکے پتر... تو نے حویلی میں کوئی بھوت دیکھ لیا ہے۔"

میں اسے جواب دیے بغیر آگے بڑھ گیا۔ سیڑھیوں سے نیچے اترا اور باغ میں فوارے کی منڈیر پر جا بیٹھا۔ میرے دماغ میں آندھی سی چل رہی تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ نور جہاں نے میرا نام نہیں لیا تھا لیکن راز فاش ہو چکا تھا۔ جو بات شہناز نے رابعہ سے کہی تھی وہ یقیناً لیلیٰ بھابی سے بھی پوشیدہ نہ ہو گی شاید رحیم بھی جان چکی ہو... کون کس کی ولدیت ہے؟ اس کا حتمی جواب تو ڈی این اے ٹیسٹ سے ہی ملتا ہے مگر یہاں یہ سب کون جانتا ہے... عورت کی زبان سے نکلا ہوا ایک نام سب سے بڑی سند کا درجہ رکھتا ہے۔

راجا میرے پاس آ کے بیٹھ گیا۔ "رابعہ نے کیا کہا ہے تجھ سے؟"

میں نے راجا کو دیکھا۔ "کیا تو نے اس سے بات کی ہے؟"

"نہیں مگر میں نے دیکھا... وہ اندر بیٹھی رو رہی تھی۔ میں نے پوچھا کہ کیا ہوا تو اٹھ کے چلی گئی۔"

"راجا... نور جہاں کو جلد از جلد لندن پہنچانے کا انتظام کر... ورنہ بہت مشکل ہو جائے گی۔" میں نے کہا۔

"تو مشکلات کے سمندر میں سوئمنگ کر رہا ہے۔ ایک اور مشکل کی کیا پروا... بالآخر وہی ہو گا... مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں۔"

"یار اسے مذاق مت سمجھ۔" میں نے برہمی سے کہا اور پھر اسے سب بتا دیا۔

حسب توقع وہ پہلے حیران ہوا... پھر پریشان اور پھر مجھ پر بہت بگڑا۔ "الو کے پٹھے... پاگل خانے... آخر معاملات کو اس انتہا تک کیوں لے جاتا ہے... جہاں ایک رتی بھی تیرے گلے کا پھندا بن جاتی ہے... تو کوئی اناڑی... ناتجربہ کار اور احمق لونڈا نہیں ہے... ولایت میں یہی سارے کھیل کھیلتا رہا... وہاں تو کسی کا باپ نہیں تھا... یہاں ایسا کیوں ہوا... تجھے پتا نہیں تھا کہ ولایت اور پاکستان میں کیا فرق ہے؟ یہاں اور وہاں عشق کے اصول جدا ہیں۔" پھر اس نے ایک گہری سانس لی۔

"مجھے بہت افسوس ہے راجا... اپنے کیے پر نہیں... تیرے اس لیکچر پر... ایک روایتی سخت گیر جاہل باپ بھی یہی کہتا... میں نے دوست سمجھ کے کچھ کرنے کو کہا تھا... بکواس کرنے کو نہیں۔"

"وہ تو کرنا ہی پڑے گا... ساری عمر کے لیے دوستی کا الزام جو لے لیا ہے اپنے سر... لیکن فیکے پتر... یہ سوال بھی بہت اہمیت رکھتا ہے اس جگہ کہ اس الزام کی صداقت کا کیا ثبوت ہے؟"

"وہ مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتی۔"

راجا پھر بھڑک اٹھا۔ "کیوں؟ کیا وہ انسان نہیں ہے؟ صرف فرشتے جھوٹ نہیں بولتے۔ آخر کیا ہو گیا ہے تیری عقل کو... ابے اس عشق کے کھیل میں سب ہوتا ہے... فریال جیسی لڑکی جھوٹ بول سکتی ہے تو نور جہاں کیوں نہیں بول سکتی؟"

میں نے کہا۔ "ہاں... محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے... مگر۔"

"مگر کیا... تجھ میں ہمت نہیں ہے نور جہاں سے یہ کہنے کی... کہ بی بی پہلے ثابت تو کرو کہ تم حامد کی پگڑی محمود کے سر نہیں باندھ رہی ہو۔ جو عدت کے چار ماہ دس دن رکھے گئے ہیں بیوہ کے لیے... اس میں اور کون سی مصلحت تھی آخر...؟ ابھی تو اکبر خان کو مرے تین ماہ بھی نہیں ہوئے۔"

میں نے کہا۔ "یار تو میری مشکل کو سمجھ... ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا... اگر ڈی این اے ٹیسٹ بھی ہو گا تو بعد میں..."

"بعد میں کب... جب نومولود کے خانہ ولدیت میں نواب رفیق احمد شیرازی لکھ دیا جائے گا... وہ تیرا قانونی

وارث ہو جائے گا تب؟"

میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ "قانونی وارث؟"

"ہاں قانونی وارث... میں تیری مجبوری کو سمجھتا ہوں... اور مجھے رحم بھی آتا ہے تیری بے چارگی پر... اس عورت نے ایسا جادو کر دیا ہے تجھ پر جس کا توڑ نہ کسی بنگالی عامل کے پاس ہے اور نہ دنیا کے کسی ڈاکٹر کے پاس... تو واقعی کچھ نہیں کر سکتا... لیکن ہم جو تیرے دوست ہیں... ہم تو کر سکتے ہیں۔" راجا نے کہا۔

"تو کیا کرے گا... تو اس معاملے میں مت پڑ۔"

"کیوں نہ پڑوں... میں دیکھ رہا ہوں دو عورتوں نے کیسے تجھے عشق کے میدان کی فٹ بال بنا رکھا ہے۔ ایک اِدھر سے کک لگاتی ہے تو دوسری طرف سے دوسری... ذرا دماغ کو حاضر کر اور میری بات دھیان سے سن... اور سمجھ... یہ جو عورت ہے نا نور جہاں... اس نے بڑی ذہانت سے بڑی لمبی جنگ لڑی ہے... فریال سے تیرا قبضہ حاصل کرنے کی جنگ۔"

"فریال خود میدان چھوڑ کر بھاگ گئی۔"

"نہیں... نور جہاں نے اسے بھاگنے پر مجبور کیا۔ فریال کی شکست کے تین اسباب ہیں میری نظر میں... ایک تو نور جہاں کے مقابلے میں وہ واقعی عشق میں کچھ وضعدار تھی۔ اخلاقیات کی قائل تھی۔ وہ تجھ سے شادی کرنا چاہتی تھی تو صرف تیرے لیے... اس کام میں بہت دیر لگی... کچھ حالات کی وجہ سے... کچھ تیری وجہ سے... پھر بیچ میں کود پڑی نور جہاں... نور جہاں کے پاس مردوں کو جیتنے کا سب سے مؤثر ہتھیار تھا... اس کا تہلکہ خیز اور قاتل شباب... وہ اس نے پوری قوت کے ساتھ تجھ پر آزمایا۔ کسی تکلف اور جھجک کے بغیر... کیونکہ وہ اس میں مہارت رکھتی تھی... بلکہ یہی کام کرتی تھی اکبر خان کے لیے... جب تو سامنے آیا تو اس نے ایک بار یہی کھیل اپنے لیے کھیلا... مان لو کہ وہ دل کے ہاتھوں مجبور تھی... اس نے خود جال پھیلایا... خود تجھے ATTRACT کیا... کہاں کی شرم و حیا اور کیسی انجام کی فکر... میں تو اکبر خان کی بیوی ہوں... ڈرنا مجھے چاہیے... تمہیں کس بات کا ڈر... اور نواب صاحب گر گئے اس گڑھے میں... بے خوف و خطر... فریال کچھ بھی نہ کر سکی... سوائے جلنے کڑھنے کے اور کوشش جاری رکھنے کے... لیکن وہ ہار گئی کیونکہ نور جہاں زیادہ طاقتور ثابت ہو رہی تھی... اور وہ زیادہ انتظار نہیں کر سکتی تھی۔ جھوٹ کا سہارا بھی لیا اس نے... تجھے بلیک میل کرنے کے لیے... مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کے کمزور پڑنے کی ایک یہ بھی وجہ تھی جو نور جہاں نے بتائی۔ وہ واقعی ست بدھائی میں ہمیشہ کے لیے رہنے نہیں آئی تھی۔ وہ یہاں نہیں رہ سکتی تھی اور آہستہ آہستہ یہ سمجھ گئی تھی کہ نواب رفیق کو یہاں سے نکال کے واپس لندن لے جانا ممکن نہیں ہو گا... یہ نور جہاں نے بالکل صحیح تجزیہ کیا... وہ رونق ہنگامے کی زندگی چاہتی تھی اور اس نے سوچا ہو گا کہ بالآخر تو اس کے مجبور کرنے سے یا حالات سے گھبرا کے ست بدھائی کا ترقیاتی منصوبہ ترک کر دے گا اور سب کچھ بیچ باچ کے نکل جائے گا... فریال کو یہ ناممکن نظر آنے لگا تھا۔ پھر نور جہاں نے اس سے محبت کی اجارہ داری بھی چھین لی... فریال مایوس ہو گئی... اس نے اندازہ کر لیا کہ یہاں وہ نواب صاحب کی بیگم تو ہو گی مگر نواب صاحب کے دل بہلانے کے انداز و اطوار وہی ہوں گے جو نوابوں کے ہوتے ہیں... یہ نور جہاں نہ ہو گی تو دوسری آ جائے گی..."

"اور اس غلط فہمی کی بنیاد پر اس نے اتنا بڑا قدم اٹھا لیا۔"

"غلط فہمی؟" راجا نے میری بات کاٹ دی۔ "تو کہہ سکتا ہے اسے غلط فہمی... اس کے اندازے بالکل ٹھیک تھے۔"

"خاک ٹھیک تھے... کیا تجھے ایسا لگتا ہے؟"

"ایسا ہے فیکے پتر... ایسا بالکل ہے... تو کبھی فریال کے مجبور کرنے سے ست بدھائی نہ چھوڑتا۔ یہ ترقیاتی منصوبہ ختم نہ کرتا... سب کچھ بیچ کے لندن نہ جاتا... نور جہاں کے ساتھ تیرے مراسم اس کے سامنے تھے۔"

"ناجائز مراسم۔" میں نے تلخی سے کہا۔

"آف کورس ناجائز مراسم... وہ اکبر خان کی بیوی تھی یا نہیں تھی... ہر صورت میں تیرے مراسم کی کوئی اخلاقی حیثیت نہیں تھی... تو اس کی انتہا دیکھ کہ نور جہاں نے اکبر خان کو قتل کر دیا اور تو نے اسے بچانے کی ذمے داری قبول کر لی ہے... فریال کی جگہ کوئی بھی عورت ہوتی تجھے چھوڑ جاتی۔"

"اسے تو رہنا ہی نہیں تھا ست بدھائی میں۔" میں نے کہا۔

"نور جہاں رہے گی؟"

"نہیں... فریال کی جگہ کون لے سکتا ہے۔"

راجا نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔ "تو بالکل ہی پاگل ہو گیا ہے دوست... ابے فریال اب کیوں آئے گی... وہ گئی ہمیشہ کے لیے... ست بدھائی سے اور تیری زندگی سے... اسے بھول جا۔"

میں نے کہا۔ "راجا... میں نے تجھ سے ایک مشکل میں مدد مانگی تھی... تو نے مجھے کہاں الجھا دیا۔"

"کنوئیں میں تو خود گرا ہے... نہ میں نے دھکا دیا ہے تجھے نہ کسی اور نے۔"

میں نے خفگی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''ہاں ہاں وہی بات... بھاڑ میں جاؤ تم سب... نہیں کرنا تجھے کچھ تو مت کر۔''

اس نے مجھے کھینچ کے بٹھا لیا۔ ''غصہ مت کر... ہم سچ کہتے ہیں تو برا لگتا ہے تجھے لیکن فیکے پتر... ہم مخلص میں تیرے ساتھ اس لیے جھوٹ نہیں بول سکتے تیری خوشی کے لیے... چل ٹھیک ہے... میں نور جہاں کو لندن پہنچا دیتا ہوں... اس کے بعد؟''

''اس کے بعد کیا؟ ایک بوجھ تو اترے گا میرے سر سے۔''

''وہ کیسے؟ لندن میں وہ ایک بچے کو جنم دے گی اور کہے گی وہ تیرا ہے... پھر تو کیا کرے گا... مجھے معلوم ہے تجھے یہ بات بھی بری لگے گی لیکن میرا یقین ہے کہ نور جہاں اپنے مقصد میں کامیاب ہوئی۔''

''کون سا مقصد؟''

''جو کام فریال نہ کر سکی... اس نے کر لیا... فریال تیرے بچے کی ماں بنتی شادی کے بعد... نور جہاں کسی نکاح نامے کے بغیر بھی ست بدھائی کا وارث پیدا کر رہی ہے۔''

''یہ کیا بکواس لگا رکھی ہے ست بدھائی کا وارث!''

''تیرے بکواس کہنے سے کچھ فرق نہیں پڑتا تو اس کی قانونی حیثیت دیکھ... اگر اس نے نکاح نامہ بھی بنوا لیا... بالکل اسی طرح جیسے تو اس کے لیے جعلی شناختی کارڈ... اور پاسپورٹ بنوا رہا ہے... پاکستان میں پیسے سے کیا نہیں ملتا کیا وہ ایک نکاح نامہ اور دو گواہ حاصل نہیں کر سکتی...؟ اور لندن کے کسی اسپتال میں اس نے اپنا نام ماہ نور زوجہ رفیق احمد شیرازی لکھوا دیا... پھر؟''

میں اچھل پڑا۔ ''ماہ نور... یہ نام تجھے کیسے معلوم ہوا؟''

راجا مسکرایا۔ ''دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں... کیا تو نے سنا نہیں؟ ایک بات تو نے اکیلے میں نور جہاں سے کہی... اس نے رازداری کے وعدے پر شہناز کو بتا دی... شہناز نے رازداری کے وعدے پر مجھے بتائی... اور بازگشت کی طرح تو پھر مجھ سے یہ نام سن رہا ہے۔''

میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ''تو ٹھیک کہہ رہا ہے راجا؟''

''ابھی وقت ہے فیکے پتر... معاملات تیرے ہاتھ میں ہیں... تو جذبات میں اندھا ہو رہا ہے... آگے تجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ کیا نور جہاں واقعی تیرے عشق میں دیوانی ہے؟ اس حد تک کہ پہلے وہ اکبر خان جیسے دشمن کے مقابلے میں تیری مدد کرتی رہی... جان ہتھیلی پر رکھ کے؟'' وہ ہنسا۔

''اس میں ہنسنے کی کون سی بات ہے؟''

''ہاں... یہ رونے کی بات ہے مگر تیرے لیے... ہنسی مجھے یوں آئی کہ جان ہتھیلی پر رکھ کے تیری مدد کا دعویٰ خود نور جہاں نے کیا... تو نے مانا... جان ہتھیلی پر رکھ کے وہ تجھ سے ملتی رہی... تو نے یہ بھی مانا... پھر اس نے تیرے لیے اکبر خان پر چھری پھیر دی... تو نے مان لیا۔''

میں نے نخوت سے کہا۔ ''اس میں غلط کیا تھا؟''

''کیا سچ وہی ہوتا ہے جو نور جہاں کہتی ہے؟ ذرا جذبات کو ایک طرف رکھ کے سوچ وہ کس قماش کی عورت ہے؟ کوئی شریف زادی ہے یا... وہ تو اکبر خان کے ساتھ بھی شادی کے بغیر ہی رہتی تھی... اور اس کے لیے کام کرتی تھی... جہاں وہ کہتا تھا جاتی تھی... کسی کے ساتھ بھی سو سکتی تھی... صرف دولت کے لیے۔''

میرے جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ میرا چہرہ گرم ہو گیا اور کانوں کی لوئیں تپنے لگیں۔

راجا نے اپنی بے رحم بات جاری رکھی۔ ''اچانک نور جہاں کے سامنے ایک ہمہ صفت کاٹھ کا الو آ گیا۔ خوب صورت... خوب سیرت... اعلیٰ تعلیم یافتہ... اور نواب... کروڑوں اربوں کی جاگیر کا مالک... جسے یہ دولت لاٹری میں ملی تھی... اس نے خود سے کہا... نور جہاں... اکبر خان تو اس کا ملازم تھا... چھوڑ اکبر خان جیسے بے غیرت آدمی کو... اس نواب پر اپنے حسن کا جادو چلا اسے قابو کر۔ یہ پھنس گیا تو اکبر خان جیسے تیرے جوتوں کے تلوے چاٹیں گے اور اس نے جال پھینکا۔ ہمارا سیدھا سادا دل پھینک نوجوان دوست، فیکا پتر اس جال میں پھنس گیا۔ نور جہاں بڑی تجربہ کار عورت تھی۔ وہ جال کے پھندوں کو آہستہ آہستہ ٹائٹ کرتی گئی۔ آج نواب رفیق احمد کے سامنے کوئی راستہ نہیں۔ سوائے نور جہاں سے شادی کے۔ میرا مطلب ہے ماہ نور سے شادی تو اسے کرنی ہی پڑے گی۔ یہاں نہ سہی لندن میں۔ لندن میں قانون کے سامنے کوئی نواب دم نہیں مار سکتا۔ وہ لندن کی کسی کورٹ میں اپنا نکاح نامہ سامنے رکھ دے گی۔ تو کیسے ثابت کرے گا کہ وہ جعلی ہے؟ کیسے ثابت کرے گا کہ وہ نور جہاں ہے۔ ماہ نور نہیں؟''

میں نے اپنا سر تھام لیا۔ ''میں کیا کروں راجا۔''

راجا نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''گھبرا مت۔ ابھی تک تیر بھی تیری کمان میں ہے اور جب تک راجا تیرے ساتھ ہے۔ تیرا دماغ خراب ہونے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں نے سب سوچ لیا ہے۔''

''کیا سوچ لیا ہے راجا؟''

''تیرے سامنے دو راستے ہیں۔ ایک وہ جو نور جہاں

تجھے دکھا رہی ہے۔ تو اس سے شادی کر لے۔''

''یہ سب جاننے کے بعد؟''

''کیا فرق پڑتا ہے۔ اگر تجھے اتنی ہی محبت ہے اس سے اور تو اس سے جدا ہو کے زندہ نہیں رہ سکتا۔''

''ایسا نہیں ہے راجا۔''

''تو پھر دوسرا راستہ واضح ہے۔ نور جہاں سے کہہ تو اس بچے کا باپ نہیں ہے۔ یہ اکبر خان کا بچہ ہے۔ نور جہاں کو اسے جنم نہیں دینا چاہیے۔ ابھی زیادہ دن نہیں گزرے۔''

''وہ ہرگز نہیں مانے گی۔ وہ پہلے بھی انکار کر چکی ہے۔''

''تو نے کہا تھا۔ ابارشن کے لیے؟''

میں نے سر ہلایا۔ ''وہ کہتی ہے میں اسے جنم دوں گی اور بدلے میں کچھ نہیں مانگوں گی۔''

راجا تلخی سے مسکرایا۔ ''ابھی وہ ایسا ہی کہے گی۔ لیکن رفیق۔ ابھی وقت ہے۔ یہ وقت ہاتھ سے نکل گیا تو تیرے لیے انکار ناممکن ہوگا۔ ابھی انکار کر دے۔ اڑ جا اپنی بات پر۔ اس سے کہہ دے کہ اچھا یہ بچہ میرا ہے یا کسی اور کا۔ شادی سے پہلے اس کو پیدا کرنے کے بعد بڑی رسوائی ہوگی۔ پھر میں تم سے شادی نہیں کر سکوں گا۔''

''کیا اس طرح وہ مان جائے گی؟''

''نہیں۔ یہ بچہ ہی اس کی اصل طاقت ہے۔ اس کے ہاتھ میں کسی ٹرمپ کارڈ کی طرح ہے۔ اسے وہ کیسے ضائع کر سکتی ہے۔''

''پھر وہ کیا کرے گی۔''

''وہ انکار کرے گی۔ کہے گی کہ تم جاؤ اپنی دنیا میں۔ مجھے چھوڑ دو میرے حال پر لیکن بعد میں جب وہ مناسب سمجھے گی۔ اس بچے اور ایک نکاح نامے کے ساتھ نمودار ہوگی، اپنا حق وصول کرنے۔ اپنی اولاد کے لیے وراثت کا حق مانگنے کے لیے اور تو نے حق نہ دیا تو معاملہ جائے گا عدالت میں۔ معمولی جائدادوں کے تنازعہ میں ایسا ہوتا ہے۔ ست بدھائی کی ریاست اور حویلی تو بہت بڑی چیز ہے۔ اسے یہ بچہ ضائع کرنا ہی ہوگا فیکے پتر۔''

''لیکن کیسے... کیا ہم زبردستی کر سکتے ہیں؟''

''زبردستی کے بغیر چارہ نہیں۔''

''کیا مطلب۔ ہم اسے بے ہوش کر کے ڈاکٹر شہناز سے کہیں گے کہ آپریشن کلین اپ کر دے۔''

راجا مسکرایا۔ ''یہ بھی ہو سکتا ہے۔ مگر ایک طریقہ اور بھی ہے۔''

''وہ کیا...؟''

راجا بولا۔ ''تو اس سے بات کر کے دیکھ۔ پھر بلیک میلنگ کر۔''

میں نے کہا۔ ''یار پہیلیاں مت بجھا۔ میرا دماغ کام نہیں کر رہا ہے۔''

''دیکھ۔ وہ تجھے بلیک میل کرنا جانتی ہے۔ تو اس کو صاف بتا دے کہ اس کے سامنے دو راستے ہیں۔ ایک جاتا ہے اسپتال کی طرف۔ دوسرا جاتا ہے جیل کی طرف۔ یا وہ ابارشن پر راضی ہو جائے اور ہم اسے لندن میں سیٹل کرا دیتے ہیں۔ یا... ہم فون پر ڈی آئی جی عبداللہ صاحب کو مطلع کر دیتے ہیں کہ اکبر خان کی قاتل نور جہاں کا سراغ مل گیا ہے۔''

میں نے راجا کی طرف غور سے دیکھا۔ ''یعنی... میں اسے دھمکی دوں پولیس کے حوالے کرنے کی۔ نہیں راجا یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔''

''یہ تجھے کرنا پڑے گا اور سن۔ وہ سوچنے کے لیے وقت مانگے گی۔ تیرا جواب دوٹوک ہونا چاہیے۔ نو۔ فیصلہ ابھی اسی وقت کرو۔ اگر تو نے وقت دیا تو وہ غائب ہو جائے گی۔ اگر تو یہ کر سکتا ہے تو ٹھیک ورنہ اپنے معاملات کو خود جیسے چاہے ہینڈل کر۔''

مجھے یوں لگا جیسے راجا کی سفاک جراحی نے میری آنکھوں پر سے پردہ ہٹا دیا ہے اور اب میں حقیقت کو ایک مختلف روپ میں دیکھ سکتا ہوں۔ اگر وہ سچ تھا جو راجا نے مجھے سمجھایا تھا تو اس کی صداقت کو آزمایا جا سکتا تھا۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ نور جہاں کی نیت معلوم ہو جائے گی۔

میں نے کہا۔ ''او کے راجا۔ میں نور جہاں کو آزماؤں گا۔ اور اسے سوچنے کا موقع بھی دوں گا۔ بات سن میری۔ اگر اس نے مہلت سے فائدہ اٹھایا اور فرار ہونے کی کوشش کی۔ تو ہم فرار کے ہر راستے پر کھڑے ہوں گے۔''

راجا نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ''اب تو اس طرف سے بے فکر ہو جا۔ نور جہاں لندن جائے گی۔ یا پھر تھانے۔''

میں نے جتنا راجا کی بات پر غور کیا مجھ پر اس کے دلائل کی صداقت واضح ہوتی چلی گئی۔ شاید اس کی وجہ میری بے اعتمادی اور بے یقینی کی وہ کیفیت تھی میں جس سے گزر رہا تھا۔ معاملات ست بدھائی کے ہوں یا جذبات کے۔ اچھائی کی امید میں اٹھایا جانے والا میرا ہر قدم کسی خرابی کی سمت لے جاتا تھا۔

محبت کے معاملے میں مجھ سے زیادہ خوش قسمت بھی کوئی نہ تھا اور بدقسمت بھی۔ میری پہلی محبت جو یونیورسٹی میں میری ہم جماعت لڑکی تھی۔ اس کے عشق کی پاکیزگی اور شدت کو یاد

کر کے آج بھی میں اداس ہو جاتا تھا۔ ہر داستانِ محبت کی طرح اس کا انجام بھی ایک المیہ بن گیا۔ وہ رقابت کی آگ تھی جس نے ہمارے خواب نگر کو جلا کے راکھ کر دیا۔

برسوں بعد میرے دل کے ویرانے کو فریال نے آباد کیا اور رفاقت کے ایک لمبے سفر میں اس نے میرا ساتھ بھی دیا حالانکہ اس سفر میں ایک بار چاہت کے سیدھے بے خطر اور اجالوں بھرے راستے سے وہ شو بزنس کی دنیا کے شہرت عزت اور دولت کے راستے پر بھٹک گئی تھی مگر اس راہ پر بدنامی کے کانٹے تھے۔ ہوس پرستی کے جنگل میں بھوکے بھیڑیے گھومتے تھے اور قیمت صرف حسن و شباب کی تھی۔ بالآخر جیت میری محبت کی ہوئی۔ لیکن اب جا کے یہ معلوم ہوا کہ اس کی واپسی بھی بے سبب نہ تھی۔ اچانک میرے نام کروڑوں کی لاٹری نکل آئی تھی۔ قسمت نے مجھے غریبی کے فرش سے اٹھا کے دولت مندی کے عرش پر پہنچا دیا تو فریال نے ایک ٹکٹ میں دو مزے لینے کی حکمتِ عملی اختیار کی۔ وہ مجھ سے محبت بھی کر سکتی تھی اور مجھے شو بزنس کی گلیمرس لائف میں بھی لا سکتی تھی۔ وہ صرف محبت پر قناعت نہیں کر سکتی تھی جس میں اس کا رول بالآخر میری بیوی اور میرے بچوں کی ماں تک محدود ہو کر رہ جائے۔ وہ چراغِ خانہ بھی بننا چاہتی تھی اور شمعِ محفل بھی۔ جب اسے اندازہ ہوا کہ یہ ممکن نہ ہوگا تو اس نے بڑی آسانی سے محبت کو چھوڑ دیا۔ شہرت کی دنیا میں واپس چلی گئی۔ دولت اور عزت تو اسے میرا ساتھ دے کر بھی ملتی مگر وہ گلیمر۔ روشنیوں کی چکا چوند اور پرستاروں کے ہجوم ست بدھائی میں کہاں ملتے۔

تیسری عورت نور جہاں تھی جو بظاہر مجھ سے محبت کے سوا کسی چیز کی طلبگار نہ تھی۔ اس نے اپنا آپ مجھے سونپ دیا اور بدلے میں مجھ سے محبت تک نہ مانگی۔ اپنی زندگی داؤ پر لگا دی اور احسان کی بات کبھی نہ کی۔ اپنی بے غرضی کی ادا سے اس نے مجھے جیت لیا حالانکہ اس کی اصل طاقت وہ حسنِ بے مثال اور شباب لاجواب تھا جس کے سامنے کوئی عابد و زاہد بھی پارسائی کے عہد پر قائم نہ رہ سکتا تھا۔ آج معلوم ہوا کہ اس کی ساری مہربانیاں بھی بے سبب نہ تھیں۔ وہ محبت نہ تھی۔ ایک سازش تھی جس میں وہ کامیاب نظر آتی تھی۔ اس نے اپنی سب سے بڑی حریف فریال کو اس کی کمزوری کے ہتھیار سے شکار کیا اور مجھے ایسے جیت لیا جیسے فتح اس کا حق تھی۔ راجا نے اس کی سازش کا سارا کھیل سمجھ لیا تھا اور مجھے سمجھا دیا تھا۔

چوتھی عائشہ تھی۔ میرے لیے اس نے غیر مشروط طور پر سب کچھ چھوڑنا قبول کر لیا تھا۔ اپنا گھر، اپنا دھن اور اپنا مذہب۔ وہ ایلیشا سے عائشہ بن گئی تھی۔ لندن چھوڑ کے میرے ساتھ ست بدھائی آنے پر اتنی بضد تھی کہ مجھ سے پہلے پاکستان کا ویزا اور ٹکٹ حاصل کر چکی تھی۔ اس کا باپ لارڈ ارنسٹ سیاسی اثر رسوخ رکھنے والا کروڑ پتی تھا۔ میں اسی کی فرم میں ملازم تھا۔ لیکن میں سمجھتا تھا کہ عائشہ پر نوعمری کے جذبات کی یلغار ہے۔ ایک عالی نصب دولت مند انگریز لڑکی پاکستان جیسے پس ماندہ ملک میں معاشرتی پابندیوں کے ساتھ گھر کی چار دیواری میں کیسے زندہ رہ سکتی تھی۔ میں نے اسے بڑی بے رحمی سے ٹھکرا دیا۔ آج مجھے احساس تھا کہ محبت میں ایک وہی بے غرض تھی۔

نور جہاں کا راز اب راز نہ رہا تھا۔ یہ اوپن سیکریٹ تھا جس پر بات کوئی نہ کرتا تھا۔ بالخصوص میرے سامنے میرا دل رکھنے کے لیے۔ مجھے مزید آزردہ نہ کرنے کے لیے۔ لیکن ان کی نظروں میں پوشیدہ سوال عیاں تھا۔ اب تم کیا کرو گے نواب رفیق احمد شیرازی۔ ایک طرف تمہارے لیے وہ مسائل ہیں جن کو سیاسی کہا جا سکتا ہے۔ انتظامی مسائل الگ ہیں۔ ان کے ساتھ تمہارے جذباتی مسائل ایک طوفان کھڑا کر سکتے ہیں۔ تم کہاں کہاں کس کس محاذ پر لڑو گے۔ جذبات سے نہیں عقل سے سوچو گے تو صحیح فیصلے کر سکو گے۔

غنی نے ایک نیا سیکیورٹی پلان ترتیب دیا تھا۔ اس نے میرے ساتھ شیر خان کو اہم ذمے داریوں میں شریک کر لیا تھا اور حویلی کے اندر باہر آنے جانے کے راستوں پر حفاظتی فورس بڑھا دی تھی۔ اس نے نئے ڈرائیور ملازم رکھے تھے اور کوئی ایک درجن گارڈ۔ میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ ان تمام معاملات میں مجھ سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔ وہ راجا کو بتا دے۔ یہ سب مجھے پسند نہیں تھا لیکن ضروری تھا۔

شام کو شہباز نے میرے سامنے ایک تجویز رکھی۔

''اسپتال کو حویلی سے نکال کے اس عمارت میں منتقل کر دیا جائے جو پہلے سائنس ریسرچ سینٹر کے نام سے مشہور تھی۔

میں نے کہا ''حویلی کے اندر جگہ کم پڑ رہی ہے۔''

''یہ بات نہیں۔ غنی کا خیال ہے کہ اس وقت بھی علاج کے لیے سو کے قریب مریض آتے ہیں۔ ان کا تعلق دس میل کے دائرے میں پھیلے ہوئے پندرہ بیس دیہات سے ہوتا ہے۔ اس تعداد میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔ ان کی اکثریت ناآشنا لوگوں پر مشتمل ہے۔ آگے چل کے اس میں مزید اضافہ ہوگا۔ مگر بیماروں میں شامل ہو کے کوئی رانا کا بھیجا ہوا تخریب کار بھی اندر آ گیا تو اپنا کام کر جائے گا۔ سب کو چیک کرنا آسان نہیں۔''

میں نے غور کرتے ہوئے کہا۔ ''غنی کو سیکیورٹی کی بہت فکر ہے۔''

''کیوں نہ ہو۔ رانا کی دشمنی اب کھل کر سامنے آ رہی ہے۔ ایک بندہ یہاں بم رکھنے آیا تھا۔ وہ تو اللہ نے اس کے دل میں نیکی ڈالی اور اس نے ارتکاب سے پہلے ہی اعترافِ جرم کر لیا۔ ورنہ پتا نہیں کیا ہوتا۔ پھر عید کی نماز میں تم پر خنجر سے حملہ کرنے والا پکڑا گیا۔ اس مصیبت سے خدا نے بچا لیا تو اس کا باپ پہنچ گیا اور بیٹے کو خود مار کے الزام ہم پر لگانے کی کوشش کی۔''

رابعہ نے یاد دلایا۔ ''نمازِ عید کے اجتماع پر پاگل کتے چھوڑ دینے کا شیطانی منصوبہ بھی غنی نے ناکام بنا دیا۔''

میں نے کہا۔ ''اسپتال کو شفٹ کرنے سے خطرہ کم ہوتا ہے تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ اسکول تو اندر ہی رہے گا۔''

''جو اسکول میں آتے ہیں۔ ان میں اکثریت بچوں کی ہے۔'' رابعہ نے مجھے مطلع کیا۔ ''اس وقت ابتدائی جماعت میں تیس لڑکیاں ہیں۔ پانچ سے دس سال کی۔ چالیس لڑکے ہیں۔ پندرہ سال تک کے۔ زیادہ عمر کی خواتین صرف سات ہیں۔ چالیس سے پچاس سال کی۔ انہیں پڑھنے کا شوق ہے لیکن ان پر گھر کی ذمے داریاں ہیں۔ وہ ریگولر نہیں ہیں۔ گیارہ سال سے اوپر کی لڑکیوں کو ہم نے انہی کے ساتھ رکھا ہے۔ ان کی تعداد سترہ ہے۔ عام طور پر یہاں تو.... پندرہ سال کی لڑکی بیاہ دی جاتی ہے۔ زیادہ عمر کے مرد بھی کم ہیں۔ دن کے وقت جوان کھیتوں میں کام کرتے ہیں۔ لڑکے آوارہ گردی میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔ پڑھنے کا شوق رکھنے والے چھ بڈھے ہیں۔ چالیس سال سے زائد عمر کے۔ جوان لڑکے یا مرد صرف نو ہیں۔''

''کیا اتنے عرصے میں یہ تعداد کم نہیں ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''یقیناً یہ صورتِ حال حوصلہ افزا نہیں۔ لیکن ہم تعلیم کا شوق پیدا کرنے کے لیے بہت سے پلان بنا رہے ہیں۔ کچھ لالچ دینے کے لیے انعامی اسکیم کا اعلان کریں گے۔ خصوصاً لڑکوں کے لیے۔ ہر حاضری پر دس روپے۔ غیر حاضری کا جرمانہ پانچ روپے۔ عورتوں کو گفٹ دیں گے۔ جس کی حاضریاں سب سے زیادہ ہوں گی اسے ریشمی سوٹ، دوسرے نمبر پر جیولری سیٹ، چوڑیاں بندے وغیرہ، تیسری کے لیے میک اپ کا سامان۔ لپ اسٹک نیل پالش اور پاؤڈر وغیرہ۔ امید ہے اس سے تعداد بڑھے گی اور حاضری بھی۔'' لیلٰی بھابی نے بتایا۔

میں نے کہا۔ ''میں سمجھتا ہوں اس میں اضافہ کیا جائے۔''

رابعہ نے کہا۔ ''وہ ہم بعد میں کریں گے۔ پہلے اس کا اثر دیکھ لیں۔''

راجا نے ایک اچھا سوال اٹھایا۔ ''آپ لوگوں کا نصابِ تعلیم کیا ہے۔ کتابیں کس کورس کی ہیں؟''

رابعہ نے وضاحت کی۔ ''ابھی ہم کوئی کتاب نہیں پڑھا رہے پہلے ہم اردو لکھنا پڑھنا سکھائیں گے۔ سب کی کاپیاں ہمارے پاس رہتی ہیں۔ پنسل بھی کلاس میں فراہم کی جاتی ہے۔ یہاں وہ لکھنے کے ساتھ پڑھنے کی مشق کرتے ہیں۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ کس کی پروگریس بہتر ہے۔ چھ مہینے بعد ہم انہیں الگ کریں گے جو روانی سے پڑھنے اور لکھنے کے قابل ہو جائیں گے۔ ان کے لیے حساب کی کلاس شروع ہو جائے گی۔''

راجا نے کہا۔ ''انگریزی کیوں نہیں؟''

''یہاں انگریزی کی ضرورت کسی کو نہیں۔ پھر بھی ہم دیکھیں گے کہ کون سال بھر بعد جمع تفریق کر سکتا ہے اور اردو میں اتنی استعداد پیدا کر چکا ہے کہ اخبار پڑھ سکے۔ خط لکھ سکے۔ اسے انگریزی پڑھنے کا شوق ہوگا تو پڑھا دیں گے۔ ہم کسی قومی سلیبس کے مطابق نہیں چل رہے ہیں۔ لوگوں کی ضرورت کے مطابق تعلیم دے رہے ہیں۔ جو یہاں ان کے کام آئے۔''

میں نے کہا۔ ''او کے۔ مسئلہ تھا اسپتال کو باہر شفٹ کرنے کا۔''

''ہاں۔ اسکول میں پڑھنے والے ایک طرح سے رجسٹرڈ ہیں۔ روز وہی ہوتے ہیں۔ کوئی نیا آ جائے تو اس کے کوائف معلوم کر لیے جاتے ہیں۔ بیشتر تو ایک میل کے دائرے میں رہتے ہیں۔ زیادہ دور پڑھنے کوئی نہیں آئے گا لیکن مریض دور دور سے آتے ہیں۔'' ڈاکٹر شہباز نے کہا۔ ''انہیں حویلی میں نہ آنے دیا جائے تو بہتر ہے۔''

میں نے کہا۔ ''تم جیسے چاہو کرو۔''

''میرے ذہن میں اور کچھ بھی ہے۔ میں اس بیرک کے ایک حصے میں داخلے کے لیے وارڈ بناؤں گی۔ ایک بچوں کا، دوسرا عورتوں کا۔ باقی حصے میں کمرے بن جائیں گے۔ ایک ویٹنگ روم۔ ایک ڈسپنسری۔ ایک معائنے کا کمرا۔ میں نے آرڈر دے دیا ہے۔ شاید مہینے بھر میں ایکس رے مشین آ جائے گی۔ ایک کمرا اس کے لیے ہوگا۔ ایک میں لیبارٹری۔ بیرک کے اندر بہت جگہ ہے اور باہر بھی۔''

"تمھیں کافی کام کرانا پڑے گا۔" میں نے کہا۔

"صرف دیواریں اٹھانی ہیں۔ غنی کا کہنا ہے کہ ایک مہینے میں سب ہو جائے گا۔"

راجا نے کہا۔ "اچھا ہوگا اگر ہم اسکول بھی حویلی سے باہر لے جاتے۔ اندر والے رہائشی حصے میں کسی کا آنا جانا ہی نہ ہوتا۔ سوائے ان کے جو حویلی میں رہتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "یہ کیوں نہیں ہوسکتا آخر؟"

"اس کے لیے پوری عمارت کھڑی کرنی پڑے گی۔" رابعہ بولی۔

"پوری عمارت کیا۔ چار چھ کمرے ہوں گے ابھی۔ میرا تو مشورہ ہے کہ ساتھ ہی یہ کام بھی شروع کرادو۔" میں نے کہا۔

راجا نے میری تائید کی۔ "یہ ٹھیک ہے۔ اسپتال بھی باہر اور اسکول بھی۔"

میں نے کہا۔ "حویلی صرف رہائشی مقاصد کے لیے ہوگی تو ہماری پرائیویسی میں کوئی ڈسٹرب نہیں ہوگا۔ اس کے علاوہ حویلی میں جگہ محدود ہے۔ ہمیں آنے والے وقت کی ضروریات کو بھی مدِ نظر رکھنا چاہیے۔"

راجا بولا۔ "ہاں۔ یہ اسکول ایک دن کالج بنے گا۔ پھر ایک یونیورسٹی۔ اسپتال کے شعبے بنیں گے۔ خواب دیکھنے میں کیا حرج ہے۔"

میں نے کہا۔ "راجا صاحب۔ خواب ہی تعبیر پاتے ہیں۔ جو خواب نہ رکھتا ہو وہ انسان کیسے ہوسکتا ہے۔"

شہناز نے کہا۔ "ست بدھائی ترقیاتی پروگرام بھی ایک خواب ہے۔ ہم سب کا۔"

ایک ٹیلی فون کال نے مجھے انتظامی نوعیت کی اس میٹنگ سے اٹھنے پر مجبور کردیا۔ میں نے موبائل فون کے اسکرین پر شہزادو کا نمبر دیکھا اور باہر آ گیا۔ "جی وکیل صاحب کوئی تازہ خبر۔"

"خبر تو آپ کی طرف سے آتی ہے۔ کیا ہوا اس قاتل کے قتل والے کیس کا؟" وہ بولا۔

میں نے کہا۔ "وہ معاملہ تین لاکھ میں نمٹ گیا۔ فضلو کے باپ کی کوشش ناکام ہوگئی۔ قتل اس نے کیا تھا۔ الزام بھی اسے ہی قبول کرنا پڑا۔ تھانیدار لال خان کو زمین کے ایک ٹکڑے کی ضرورت تھی۔ وہ اسے مل جائے گا۔ رانا کی یہ سازش بھی ناکام ہوگئی۔"

"میں نے اس کی ضمانت منسوخ کرانے کے خلاف ہائی کورٹ میں دائر کی جانے والی پٹیشن تیار کرلی ہے۔"

"پھر انتظار کیسا۔ پٹیشن فائل کردو۔"

"آپ کے دستخط ضروری ہیں۔ اس کے علاوہ اب آپ کی طرف سے پیش ہوں گے ماجد خان۔ میں ان کی معاونت کروں گا۔ وہ بیس لاکھ لیں گے۔ وکالت نامہ آپ کو سائن کرنا ہے۔"

میں نے کہا۔ کل میں سارے کام نمٹادوں گا۔ تم کیا سمجھتے ہو، رانا کی ضمانت منسوخ ہو جائے گی؟"

"اسے ضمانت پر رہا نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ایڈیشنل سیشن جج کے پاس اس کا کوئی قانونی اختیار نہیں تھا۔"

"قانون کی بات مت کرو شہزادے۔ اس ملک میں قانون صرف غریب کے لیے ہے۔" میں نے کہا۔

"آپ کیوں مایوس ہوتے ہیں۔ آپ خدانخواستہ غریب تو نہیں ہیں نواب صاحب۔" شہزادو بولا۔

میں نے کہا۔ "اسی لیے تو مقابلے پر ڈٹا ہوا ہوں۔"

میں نے طے کرلیا تھا کہ صبح ہائی کورٹ میں دائر کی جانے والی پٹیشن پر سائن کرنے اور ماجد خان کو وکالت نامہ دینے کے لیے راولپنڈی جاؤں گا تو نور جہاں سے بھی دوٹوک بات کرلوں گا۔ اسے میری سپورٹ چاہیے تو میری بات ماننی ہوگی۔ جواب سے اس کے عزائم معلوم ہو جائیں گے۔

رات کے کھانے سے فارغ ہو کے میں راجا کے ساتھ باغ میں چہل قدمی کرتا رہا۔ آسمان پر بارہویں، تیرہویں تاریخ کا چاند چمک رہا تھا اس سے ہر طرف مدھم سا اجالا پھیل گیا تھا۔ ہم اپنے حریف رانا کی طرف سے مستقبل میں کی جانے والی شرانگیزی کے امکانات پر غور کررہے تھے۔ اب معاملات اختلاف سے بڑھ کر کھلی دشمنی تک آ گئے تھے۔

اچانک رات کے سکوت کو فائرنگ کی آواز نے منتشر کردیا۔ پہلے دو فائر ہوئے۔ پھر وقفے وقفے سے فائرنگ ہونے لگی۔ ایسا لگتا تھا کہ دو فریق ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہیں۔ آواز بھی دور سے آرہی تھی۔ ان کی سمت وہی تھی جہاں ست بدھائی کی حدود میں جنگل پھیلا ہوا تھا۔ اس کے بعد دریائے کہار ایک قدرتی سرحد بن گیا تھا۔ دریا سے پار بھی ایسا ہی جنگل تھا لیکن وہ رانا نگر کی حدود میں تھا۔ دریا کا پاٹ ایک موڑ کے بعد کافی پھیل گیا تھا۔ برسات کے موسم میں طغیانی آنے سے پانی کناروں تک ضرور پہنچ جاتا تھا ورنہ عام دنوں میں پانی کا تیز دھارا بل کھاتا، چھوٹی چھوٹی جھیلوں کو بھرتا اور کہیں دو شاخوں میں بٹ کے پھر ایک ہوتا چلا جاتا تھا۔ دریا کے خشک حصے میں چھوٹے بڑے گول کچے پتھر چکنی مٹی پر بچھے نظر آتے تھے۔

فائرنگ پر میرے قدم رک گئے۔ "راجا۔ یہ کیا ہے؟"

راجا نے کچھ دیر بعد جواب دیا۔ "مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ ہماری حدود میں لڑائی ہورہی ہے۔"

"لڑائی کس کے درمیان۔ کیا رانا صاحب کی فوج نے حملہ کردیا ہے ست بدھائی کو ختم کرنے کے لیے؟"

راجا نے تشویش سے کہا۔ "یہ ڈاکو بھی ہوسکتے ہیں۔ جن کا مقابلہ پولیس سے ہو۔"

اب مجھے بھی فکر لاحق ہوگئی۔ "اس علاقے پر صرف شاہی بادشاہ کی حکومت ہے۔ اور ڈی آئی جی صاحب پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ آج کل اس کا گروہ پریشانی کا سبب بنا ہوا ہے۔"

سوال یہ ہے کہ غنی کہاں ہے؟" راجا نے کہا۔

فائرنگ اب بند ہوگئی تھی۔ میں نے غنی کے بارے میں معلوم کیا تو اس کی لائق فائق بیوی نے مجھے انگریزی میں مطلع کیا کہ "ہی ان سائڈ ناٹ ایوننگ فرام آؤٹ" جس کا مطلب تھا کہ وہ اندر نہیں ہے اور شام سے باہر ہی ہے۔

خواتین ٹی وی کے سامنے بیٹھ کے اسپتال اور اسکول کی توسیع کے پروگرام کی تفصیلات طے کررہی تھیں۔ فائرنگ کی آواز نے انہیں بھی متوجہ کیا مگر راجا نے سرسری انداز میں کہا کہ ہوگی کہیں کوئی شادی۔ انہوں نے آتش بازی اور فائرنگ کے فرق پر زیادہ توجہ نہیں دی اور پھر اپنی توجہ ٹی وی پر مرکوز کردی جس میں اسٹار پلس کے کسی ڈرامے کا شادی والا سین چل رہا تھا۔

میں نے گیٹ پر جاکے گارڈ سے معلوم کیا۔ اسے بھی صرف اتنا پتا تھا کہ غنی اپنے ساتھ چار بندے لے کر مغرب کے بعد گاڑی میں کہیں گیا تھا۔ شیر خان کو معلوم ہوگا۔ میں نے شیر خان کو تلاش کیا۔ حویلی کے نچلے حصے میں اب اسپتال اور اسکول کے علاوہ مہمان خانہ بھی تھا۔ مہمان خانے کے بھی دو حصے تھے۔ ایک ہال ڈائننگ روم کہلاتا تھا۔ اس کے پیچھے دو کمرے ان مہمانوں کے لیے خواب گاہ بنا دیے گئے تھے جو کبھی حویلی میں قیام پذیر ہوں۔ ابھی تک ان کے استعمال کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ پھر بالکل آخری حصے میں دو کمرے تھے۔ ان میں سے ایک شیر خان کے تصرف میں تھا۔

شیر خان کی فیملی ایک بیوی اور دو بچوں پر مشتمل تھی۔ وہ سب پشاور نوشہرہ کے درمیان کسی گاؤں میں رہتے تھے۔ شیر خان کے والدین نہیں تھے۔ بھائی چار تھے جو تلاش روزگار میں کراچی چلے گئے تھے اور وہیں آباد ہو گئے تھے۔ صرف ایک چھوٹا بھائی بے روزگار تھا اور وہ شیر خان کی فیملی کے ساتھ آبائی گھر میں رہنے پر مجبور تھا۔ شیر خان ہفتہ دس دن میں گھر کا چکر لگا لیتا تھا۔ وہ انتہائی فرض شناس آدمی تھا اور ایک رات سے زیادہ کبھی باہر نہیں رہتا تھا۔

"سر... آپ۔" مجھے دیکھ کے شیر خان اٹھ کھڑا ہوا۔ "سر۔ آپ مجھے بلاتے۔"

میں نے کہا۔ "شیر خان۔ غنی تمھیں کچھ بتا کے گیا تھا؟"

"اس نے بولا تھا۔ کسی کو بتانا نہیں۔ کوئی پکی بات نہیں تھی۔ اسے اطلاع ملی تھی کہ کچھ لوگ آج رات شرارت کریں گے۔"

میں نے کہا۔ "شرارت، کیسی شرارت؟"

"جنگل میں آگ لگائیں گے۔" شیر خان نے کہا۔

میں نے برہمی سے کہا۔ "تم اسے شرارت کہتے ہو۔ تخریب کاری لبو؟ اور غنی بے وقوف صرف چار آدمی لے کر گیا ہے۔ اسے چاہیے تھا کہ مجھے بتاتا۔ ہم پولیس فورس بلاتے۔ سب کو پکڑ لیتے۔"

شیر خان نے کہا۔ "سوری سر..."

میں نے کہا۔ "چھوڑو سوری کو۔ میرے ساتھ چلو۔"

ہم دو محافظوں کے ساتھ نکلے مگر تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ سامنے سے غنی کی جیپ نمودار ہوئی۔ اس کی ہیڈ لائٹس آف تھیں۔ جیپ سامنے آ کے رکی تو مجھے دیکھ کے غنی کچھ گھبرایا۔

میں نے کہا۔ "غنی۔ کہاں سے آرہے ہو؟ یہ فائرنگ کیسی تھی۔"

غنی نے کہا۔ "کچھ نہیں سر۔ میں راؤنڈ لگانے گیا تھا۔"

میں نے کہا۔ "جھوٹ مت بولو۔ شیر خان نے بتایا ہے کہ تمھیں جنگل میں آگ لگانے کی اطلاع ملی تھی۔"

غنی نے شیر خان کی طرف دیکھا۔ "جی سر۔ کوئی پکی بات نہیں تھی اس لیے میں نے آپ کو بتانا ضروری نہیں سمجھا۔"

"پھر یہ فائرنگ کیوں ہوئی۔ کس نے کی؟"

غنی نے کہا۔ "فائرنگ ہم نے نہیں کی سر۔ میں نے دریا کے اس طرف آٹھ بندے لگا دیے تھے۔ کسی کو دریا پار کرتا دیکھیں تو ہوائی فائر کریں۔ اس طرح تو شرپسند بھاگ جائیں گے۔ وہ مقابلہ کریں تو ان کے ساتھ کوئی رعایت نہ کی جائے۔ لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی سر۔ فائرنگ ادھر ہی ہوتی رہی۔ دریا پار کے جنگل میں۔ معلوم نہیں کس کے درمیان۔"

میں نے کہا۔ "وہ معلوم ہو جائے گا۔ لیکن غنی۔ آگ

لگانے کی سازش کیا رانا کر رہا ہے؟"

"اور کون ہے آپ کا دشمن سر۔"

میں نے کہا۔ "جنگل تو ہر طرف بہت دور تک پھیلا ہوا ہے۔ تم کہاں کہاں ان کا راستہ روکو گے؟"

غنی نے مجھے سمجھایا۔ "سر یہی ایک جگہ ہے جہاں سے وہ آگ لگا کے فوراً واپس جا سکتے ہیں۔ یہاں ان کی ہماری زمین کے درمیان صرف دریا کی چوڑائی ہے اور یہاں وہ گھوڑوں پر سوار ہو کے آئیں تو دریا سے پانچ منٹ تن میں گزر سکتے ہیں۔ اگر آج وہ کوشش کرتے تو صبح ان کی لاشیں دریا میں پڑی ملتیں۔"

"غنی۔ میں خونریزی نہیں چاہتا۔" میں نے برہمی سے کہا۔

"سر۔ آپ اطمینان رکھیں۔ میں بھی براہِ راست تصادم کو روکنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ جب مجھے یہ اطلاع ملی کہ رانا کا منشی بہرام جنگل میں آگ لگانے کی سازش کر رہا ہے تو میں نے پہلا کام یہ کیا کہ رانا نگر کی طرف اپنے بندے پھیلا دیے۔ آج دن میں بیس آدمی اس طرف گشت کر رہے تھے۔ سب کے پاس اسلحہ تھا۔ مجھے پتا تھا کہ بہرام کے جاسوس ہمارا بندوبست دیکھ لیں گے۔ اسے معلوم ہو جائے گا کہ ہم تیار ہیں اور کسی نے ہمیں بے خبر سمجھنے کی غلطی کی تو لاشیں گریں گی۔ پھر میں نے کچھ باتیں لوگوں کے ذریعے پھیلائیں۔ ایک یہ کہ ہم نے سو بندے جنگل میں لگا دیے ہیں اور ان سب کے پاس کلاشنکوفیں ہیں۔ اندھیرے میں دیکھنے والی دوربینوں کے علاوہ ان کے پاس دستی بم ہیں۔"

"اور تم کیا سمجھتے ہو۔ اس سے وہ ڈر گئے ہوں گے؟ آخر ان کے بھی جاسوس ہوں گے۔"

"پروپیگنڈا ضروری ہوتا ہے سر۔ اس کا اثر بھی ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ رانا سے زیادہ تو اس کا منشی بہرام ہوا ہی پن کر رہا ہے۔ آپ پر خنجر سے قاتلانہ حملہ کرنے والے فضلو کو اسی نے بھیجا تھا۔ فضلو کی بیوی بہرام کے پاس ہے۔ اس نے فضلو سے کہا تھا کہ یہ کام کرو تو بیوی تمہیں مل جائے گی۔ فضلو پکڑا گیا تو بہرام ہی اس کے باپ کے پاس گیا تھا۔ اسے پٹی پڑھائی تھی کہ وہ بیٹے سے ملنے جائے اور اسے حویلی میں ہی مار ڈالے تو رانا صاحب کی طرف سے اس کو دو لاکھ روپے انعام میں دیے جائیں گے۔"

"کیا رانا نے ایسا نہیں کیا تھا؟"

"نہیں سر۔ فضلو کے باپ کو کچھ بھی نہیں ملا۔ فضلو کی ماں گئی تھی رانا صاحب کے پاس روتی دھوتی۔ بہرام نے اسے رانا صاحب سے نہیں ملنے دیا۔ اب وہ فضلو کے باپ کو بھی مروا دے گا۔"

"تمہیں یہ خبریں کہاں سے مل جاتی ہیں؟"

غنی مسکرانے لگا۔ "میں نے آپ کو بتایا تھا جناب۔ میرا ایک ذریعہ ہے۔ رانا محل کے اندر۔ اسے ہر بات معلوم ہوتی ہے۔"

"رانا کو معلوم ہونا چاہیے کہ اسے خود اس کے خیر خواہ کتنا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔"

"میں نے اس کا بھی انتظام کر لیا ہے سر۔ رانا کو بہرام کی بدمعاشی کی رپورٹ مل جائے گی۔ لیکن بہرام انکار کرے گا اور رانا کو اس پر اتنا بھروسا ہے کہ کچھ ہوگا نہیں۔ میری دھمکی بہرام پر اثر کرے گی کہ بیٹا تم لگاؤ آگ جنگل میں۔ تمہارے رانا محل کو جلا کے راکھ نہ کیا تو میرا بھی نام غنی نہیں۔"

"صرف دھمکی کافی نہیں غنی۔"

"میں نے حفاظتی انتظام بھی کیا ہے سر۔ جنگل کے درمیان سو سو فٹ کی جگہ صاف کرنے کا کام کل سے شروع ہو جائے گا۔ پورے جنگل کو آٹھ دس حصوں میں الگ کر دیا جائے گا۔ آگ خدانخواستہ لگی تو ایک حصے کو جلائے گی۔ دوسرے حصے تک نہیں پھیلے گی۔ حویلی تک پہنچنے کا تو سوال ہی نہیں۔ آپ مطمئن رہیں۔"

میں نے کہا۔ "آئی ایم سوری غنی۔ تمہارے ہوتے مجھے فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ تمہاری نظر ہر طرف ہے۔"

وہ بولا۔ "پھر بھی سر۔ ایک گزارش ہے۔"

میں نے کہا۔ "بولو۔"

"اس میں خرچہ کافی ہوگا۔ لیکن ہمیں ست بدھائی کے گرد حفاظتی دیوار بنانی چاہیے۔ اس کے اوپر خاردار تار بھی ہو۔ پھر سو گز کے بعد چوکی۔ اس پر سرچ لائٹ اور ایک پہرے دار۔"

میں نے اس کی پیٹھ ٹھونکی۔ "تم خرچ کی فکر نہ کرو۔ حفاظتی انتظامات پرفیکٹ ہونے چاہئیں۔ اب چلو۔"

میں واپس حویلی میں پہنچا تو راجا بڑے اضطراب کے عالم میں برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ "کیا ہوا۔ شامی بادشاہ ملا؟"

میں نے حیرانی سے کہا۔ "کیا میں شامی بادشاہ سے ملنے گیا تھا؟"

اس نے کہا۔ "ابھی ڈی آئی جی عبداللہ جان نے کال کیا تھا۔"

میں نے کہا۔ "میں تو اپنا موبائل چھوڑ گیا تھا۔"

"مجھ سے بات ہوئی۔ اس نے کہا کہ شامی بادشاہ کے گروہ کی اس علاقے میں موجودگی کا پتا چلا ہے اور اطلاع یہ بھی ہے کہ وہ رانا نگر کے علاقے میں واردات کریں گے۔ میں نے اسے بتا دیا کہ ابھی کچھ فائرنگ ہو رہی تھی۔ نواب رفیق معلومات حاصل کرنے ادھر ہی گئے ہیں۔"

میں نے تشویش سے کہا۔ "اس کا مطلب ہے۔ شامی بادشاہ نے رانا نگر میں کارروائی کی ہے۔"

"تو عبداللہ جان سے بات کر لے۔"

میں نے نمبر ملایا تو عبداللہ جان کی آواز آئی۔ "نواب رفیق۔ کیا پتا چلا۔ اچھی خبر ہے یا..."

میں نے کہا۔ "آئی ایم سوری۔ آپ کے لیے میرے پاس کوئی خبر نہیں۔ نہ اچھی نہ بری۔"

"آپ نے کچھ تو دیکھا ہوگا۔ فائرنگ کہاں ہو رہی تھی؟"

میں نے کہا۔ "فائرنگ ضرور ہوئی تھی۔ لیکن زیادہ نہیں۔ اور وہ میرے علاقے میں نہیں ہوئی تھی۔ رانا کے علاقے میں تھی۔"

"اس کا مطلب ہے شامی نے رانا کو لوٹا ہوگا۔"

میں نے پوچھا۔ "ابھی تک آپ مجھ سے زیادہ بے خبر ہیں؟ آپ کی پولیس فورس نے یا رانا نے آپ کو فون پر بھی اطلاع نہیں دی۔"

"یہ ہو سکتا ہے کہ شامی ناکام لوٹ گیا ہو۔ ہم نے رانا کو پہلے سے خبردار کر دیا تھا۔ وہ خود بھی جانتا تھا کہ آج کل شامی کی سرگرمیاں اس کے علاقے میں کتنی بڑھ گئی ہیں۔ اس نے اپنی حفاظت کا انتظام کر رکھا ہوگا۔"

میں نے کہا۔ "آپ اس سے پوچھ کیوں نہیں لیتے؟"

"میں آپ کی رپورٹ کے انتظار میں تھا۔ اس سے ابھی معلوم کرنا ہوگا لیکن نواب رفیق۔ آپ کو کچھ کرنا چاہیے۔ شامی کے سلسلے میں۔"

میں نے کہا۔ "دیکھیے۔ آپ فون پر مجھ سے کیا کہلوانا چاہتے ہیں؟"

"میں نے آپ سے مدد کی درخواست کی تھی۔"

میں نے کہا۔ "ایک قانون پرست شہری کی حیثیت سے میں آپ کی ہر ممکن مدد کروں گا۔ جب بھی ضرورت ہوگی۔"

اس نے کہا۔ "آپ بہت کچھ کر سکتے ہیں نواب رفیق۔ اس سے رابطہ ہو تو اسے قائل کریں کہ اس میں سب کا فائدہ ہے۔"

میں نے کہا۔ "ہیلو... ہیلو... آپ کی آواز سنائی نہیں دے رہی ہے۔ ہیلو..." پھر میں نے فون بند کر دیا۔

راجا نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "کیا کہہ رہا تھا۔"

میں نے کہا۔ "یار فون پر میں ایسی کوئی بات نہیں کر سکتا جو میرے لیے قانونی مسئلہ بن جائے۔ اس نے بات کی تھی تو آف دی ریکارڈ کی تھی کہ میں شامی پر اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے اسے حکومت کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کروں۔ حکومت اسے عام معافی دے گی اور اس کے خلاف تمام مقدمات ختم کر دیے جائیں گے۔ مگر میں نے اس وقت بھی کہا تھا کہ میرا شامی سے کوئی رابطہ نہیں۔"

"رابطہ ہو جائے تب بھی مجھے یہ بات ممکن نظر نہیں آتی۔ ہم کوئی ولی اللہ نہیں کہ ہمارے کہنے سے ایک ڈاکو کی کایا کلپ ہو جائے۔ وہ ڈاکے ڈالنا چھوڑ دے اور شرافت کی زندگی اختیار کر لے۔" راجا بولا۔

میں نے کہا۔ "وہ اکیلا نہیں ہے۔ اس کے ساتھ پورا گروہ ہے۔ یہ اس کی فیملی ہے جس کا وہ سربراہ ہے۔"

راجا نے کہا۔ "سب سے بڑی بات یہ کہ کسی کی بات کا کیا اعتبار۔ عبداللہ بھی ہے تو ایک پولیس والا ہی۔ اگر وہ اپنے وعدے سے پھر جائے اور دلیل یہ دے کہ دشمن سے جنگ میں اخلاقیات کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ دھوکے فریب اور جھوٹ کی حکمتِ عملی کو کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا ہے۔ پھر ایک ڈی آئی جی کی کیا حیثیت کہ وہ حکومت کی طرف سے بات کرے۔"

میں نے کہا۔ "پھر بھی۔ میں کوشش کروں گا۔ میں شامی سے بات کر سکتا ہوں۔ میں نے وعدہ کیا تھا کہ میرا کوئی رابطہ ہوا تو میں حکومت کی طرف سے اس کو پیغام پہنچا دوں گا۔ رہی ضمانت کی بات۔ تو شامی بادشاہ نے بھی کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔ وہ پکی ضمانت طلب کرے گا۔"

"اگر اس نے سنجیدگی سے اس پیشکش پر غور کیا۔ مجھے اس کا امکان ایک فیصد بھی نہیں لگتا۔" راجا نے کہا۔

میں سونے جا رہا تھا کہ ڈسٹرب کرنے والی ایک اور خبر آ گئی۔ یہ ابا جی کا فون تھا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ بڑی پریشانی میں پڑ گئے ہیں۔ ان کے سارے کاغذات، سفری دستاویزات اور نقد رقم والا بیگ گم ہو گیا ہے۔

میں نے کہا۔ "وہ کیسے گم ہو گیا؟"

"گم کیا ہوا۔ چوری ہو گیا میری غفلت سے۔ میں نمازِ جمعہ کے لیے وضو کر رہا تھا اور بیگ اپنے ساتھ ہی رکھ لیا تھا۔ اسی کے اوپر گھڑی تھی۔ بس ایک لمحے کے لیے نظر چوکی اور

بیگ غائب۔ حالانکہ میں بہت محتاط تھا۔ میرے دوست نے بتایا تھا کہ ایسے واقعات یہاں بھی ہو جاتے ہیں۔"

"پھر اب کیا ہوگا؟"

"میں نے پولیس کو رپورٹ کی۔ پھر سفارت خانے والوں کو لکھ کر دیا۔ اب دیکھو۔ خدا اس کے دل میں نیکی ڈالے جس نے ارض مقدس کی ایک مسجد میں ایسا کیا۔ وہ نقد رقم اور گھڑی رکھ لے۔ میرے کاغذات لوٹا دے۔ ایسا ہو جاتا ہے۔"

"سفارت خانے والے کیا کہتے ہیں؟"

"وہاں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ پتا نہیں کب دوسرا پاسپورٹ ملے گا۔ اس کے بغیر واپسی مشکل ہوگی۔"

میں نے کہا۔ "آپ پریشان نہ ہوں۔ میں یہاں راجا سے کہتا ہوں کہ اپنا اثر و رسوخ استعمال کرے۔ پیسے میں کل ہی بھجوا دوں گا۔"

"پیسوں کا کوئی مسئلہ نہیں۔ میں اپنے دوست سے لے لوں گا اور پاکستان پہنچ کے بھیج دوں گا۔ حالانکہ وہ لے گا نہیں مجھے معلوم ہے۔ تم ذرا پاکستان کی ایمبیسی میں کسی سے بات کرو۔"

میں نے کہا۔ "وہ میں کرلوں گا لیکن ابا جی۔ وہاں چور ہوتے ہیں جو مسجد جیسے نمازی کو نہیں بخشتے تو پیسے لے کر کام کرانے والے ایجنٹ بھی ہوں گے۔ خصوصاً ہمارے سفارت خانے میں۔"

"میرے دوست نے بھی بتایا ہے کہ ماشاء اللہ وہاں رشوت خوب چلتی ہے۔ حج کے سیزن کو بڑی کمائی کا زمانہ سمجھتے ہیں۔ ریٹ زیادہ ہوں گے لیکن کام ہو جائے گا۔ ہیں تو خیر سے سب اپنے ہم وطن۔"

"آپ پیسوں کو نہ دیکھیے۔ ایک کی جگہ دس بھی دینے پڑیں تو کوئی حرج نہیں۔"

خلافِ توقع ابا جی نے کہا۔ "نہیں بیٹا۔ میں ایسا نہیں کروں گا۔ میرے دوست نے بھی کہا تھا کہ رشوت کے بغیر کام نہیں ہوگا۔ بہت دھکے کھانے پڑیں گے۔ میں نے کہا کہ مجھے دھکے کھانا منظور ہے۔ میں انتظار کرسکتا ہوں۔ پہلے ہی مجھے معلوم تھا کہ رشوت لینے والا اور دینے والا دونوں جہنمی ہیں۔ اب تو حج کی سعادت بھی حاصل ہوگئی ہے۔ پھر میں جہنمی حاجی کیوں بنوں۔"

میں نے کہا۔ "ابا جی۔ مجبوری کی بات اور ہے۔"

"ایسی کوئی مجبوری نہیں۔ حرام کو حلال صرف اس صورت میں قرار دیا گیا ہے جب مسئلہ زندگی بچانے کا ہو۔ ذرا ذرا سی تکلیف میں نظریہ ضرورت کے تحت حرام کو حلال قرار نہیں دیا جاسکتا۔ کرتے ہوں گے سب۔ میں نہیں کروں گا۔ آخر کب تک پاسپورٹ نہیں دیں گے سفارت خانے والے۔"

میں کہنا چاہتا تھا کہ سعودی عرب میں قوانین بہت سخت ہیں اور مقررہ مدت سے زیادہ قیام کرنے والوں کو وہ بلا رعایت جیل میں ڈال دیتے ہیں۔ میں نے یہی سنا تھا کہ وہاں مقیم تمام غیر ملکیوں کے پاس ہر وقت ہر جگہ اجازت نامہ یا اقامہ ہونا ضروری ہے۔ لیکن میں نے صرف اتنا کہا کہ "کہیں آپ کے لیے قانونی مسائل نہ پیدا ہو جائیں۔"

ابا جی نے کہا۔ "نہیں۔ اب پولیس بھی جانتی ہے اور خود سفارت خانے والے بھی۔"

اس کے باوجود میں بہت دیر تک اس پریشانی میں سو نہیں سکا۔ ابا جی کی طبیعت کا کچھ بھروسا نہیں تھا۔ اماں کے نہ ہونے سے وہ خود کو کتنا تنہا محسوس کرتے ہوں گے اور پھر پردیس میں۔ یہاں ہوتے تو اپنوں کے درمیان دل بہل جاتا۔

ابھی آدھی رات باقی تھی کہ غنی نے مجھے جگا دیا۔ "سر" اس نے باہر سے دروازے پر دستک دی۔ "نواب صاحب۔"

مجھے نہیں معلوم وہ کتنی دیر سے دروازہ بجا رہا تھا۔ وہ محتاط بھی تھا اور اسے ادب آداب کا خیال بھی تھا۔ اس کی جگہ راجا ہوتا تو بالآخر دروازہ بھی توڑ دیتا۔ آنکھ کھول کے میں نے گھڑی دیکھی تو ساڑھے تین بجے تھے۔ میں نے سر جھٹک کے کہا۔ "ایک منٹ غنی۔" اور لائٹ جلا کے اپنا نائٹ گاؤن پہنا۔ "یس... آجاؤ۔" میں نے کہا۔

دروازہ نہ اندر سے مقفل تھا اور نہ میں نے چٹخنی لگائی تھی۔ غنی اندر آگیا۔ "آئی ایم سوری سر۔"

میں نے کہا۔ "تکلفات چھوڑ دو۔ خیریت تو ہے نا۔"

"سب خیریت ہے سر۔ کوئی آپ سے ملنے آیا ہے۔ کوئی عورت ہے برقعے میں۔ کہتی ہے اسے شامی بادشاہ نے بھیجا ہے۔"

میں نے چونک کے کہا۔ "عورت کو اور اس وقت؟"

"مجھے خود حیرانی ہے سر۔ باہر بارش بھی ہو رہی ہے۔"

میں نے کہا۔ "کہاں ہے وہ عورت؟ تم نے دیکھ لیا ہے اچھی طرح۔ وہ کوئی بم وغیرہ تو نہیں لائی ہے؟"

"ریشم نے اس کی تلاشی لی تھی۔ گارڈز نے اسے گیٹ کے باہر ہی روک رکھا تھا۔ میں ریشم کو جگا کے لے گیا اور اس

نے وہیں گارڈ روم میں اس کا برقع اتروایا۔ پھر کپڑے اتروائے میرے کہنے پر۔ اس کے پاس ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔"

میں نے کہا۔ "تم نے پوچھا نہیں۔ وہ شامی کی کیا لگتی ہے۔"

"وہ کہتی ہے کہ بات صرف آپ سے کرے گی۔"

میں غنی کے ساتھ ہولیا۔ "چلو۔ شامی بادشاہ کا پیغام لے کر تو وہ مجذوب آتا تھا۔ پولیس کا مخبر۔ وہ ڈرامے باز قلندر۔ وہ کہاں گیا؟"

"پتا نہیں سر۔ بہت عرصہ ہوا میں نے بھی نہیں دیکھا۔"

"وہ عورت کہاں ہے؟"

"نیچے برآمدے میں بیٹھی ہے۔ سارے کپڑے بھیگے ہوئے تھے۔ ریشم مہمان خانے میں نہیں لے گئی۔"

میں نے سیڑھیاں اترتے ہوئے کہا۔ "یار اس کو کپڑے تو بدلوا دیتے۔ سردی ہے۔"

"ریشم نے کہا تھا۔ اس نے انکار کردیا۔" غنی میرے پیچھے رہا۔

وہ تاریک برآمدے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ برقع اس نے ابھی تک نہیں اتارا تھا۔ ریشم اس سے کچھ فاصلے پر تھی۔ ایک گارڈ چند قدم دور گن لیے کھڑا تھا۔ میں نے کہا۔ "جب یہ اطمینان کرلیا ہے کہ اس کے پاس کچھ نہیں تو پھر تم توپ لیے کیوں کھڑے ہو؟" میں نے گارڈ کو ڈانٹا اور پھر ریشم سے کہا۔ "چلو مہمان خانہ کھولو۔ خاتون کو اندر لے کر آؤ۔"

ریشم نے محسوس کیا کہ اس وقت میں انگریزی سننے کے موڈ میں بالکل نہیں ہوں۔ وہ عورت کو خاموشی سے اندر لے آئی۔ میں نے ریشم کو حکم دیا کہ وہ فوراً چائے بنا کر لائے۔ عورت نے اپنا برقع اتار کے ایک طرف ڈال دیا۔

وہ شاید تیس سال کی ہوگی۔ اس کا رنگ کچھ سانولا تھا لیکن چہرے کے نقوش میں بڑا دکھ بھرا تیکھا پن تھا۔ اس کے کپڑے بھی اندر سے بھیگ چکے تھے جس سے اس کے گیلے ہوئے تناسب بدن کے سارے خطوط کی دلکشی واضح ہو رہی تھی۔ تاہم اس میں نزاکت نہیں تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں مضبوط تھے اور چہرے کے تاثرات میں سختی تھی۔

میں نے نرمی سے کہا۔ "تمہیں شامی بادشاہ نے بھیجا ہے؟"

"ہاں جی۔ آپ کو شک ہو تو اس سے بات کرلو۔" اس نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کے ایک موبائل فون نکالا۔ "میرا نام تو گلاب جان تھا۔ سب گولی کہتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "گلاب جان۔ شامی بادشاہ نے اس وقت تمہیں ہی کیوں بھیجا؟"

"کیونکہ اور کوئی اعتبار کے قابل نہیں تھا۔" وہ اکھڑ لہجے میں بات کرتی تھی اور اسے میری نوابی کی ذرا پروا نہ تھی۔ "سب سالے کاکروچ ہیں۔"

میرے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔ "تم پر بہت اعتماد ہوگا شامی کو۔ اور تم نے ثابت بھی کردیا ہے کہ تم اس قابل ہو۔ لیکن گلاب جان تم یہاں تک کیسے آگئی ہو اس موسم میں۔ اور اس وقت۔"

"گولی کے لیے وقت کچھ نہیں۔ رات رات بھر گھوڑے پر سفر کیا ہے۔ گھوڑا باہر کھڑا ہے۔"

میں نے کہا۔ "اچھا باقی باتیں بعد میں کریں گے۔ تم میرے کہنے سے یہ گیلے کپڑے بدل لو۔ ابھی چائے آرہی ہے۔"

"اپنے پاس ٹائم نہیں ہے۔" وہ ٹھنک کے بولی۔ "آپ کو بلایا ہے شامی نے۔"

میں نے کہا۔ "کہاں ہے وہ خود۔ مجھے جانے میں اعتراض نہیں۔ مگر۔"

اس نے پھر موبائل فون میری طرف بڑھا دیا۔ "آپ اس سے بات کرلو اپنی تسلی کے لیے۔ اور چلو۔"

میں نے موبائل فون کو کان سے لگایا تو دوسری طرف سے شامی بادشاہ کی آواز سنائی دی۔ "نواب دوست۔ میں تمہاری کال کا انتظار کر رہا تھا۔"

میں نے کہا۔ "شامی۔ کیا میرا ابھی اسی وقت آنا ضروری ہے؟"

"ضروری نہ ہوتا تو میں گولی کو بھیجتا؟"

میں نے پریشانی سے کہا۔ "لیکن یہ تو گھوڑے پر آئی ہے۔"

وہ ہنسا۔ "یہ تم کو بھی لے آئے گی۔ اسی گھوڑے پر۔ اس کے پیچھے بیٹھ جاؤ۔ فکر مت کرو۔ یہ بہت اچھی شہسوار ہے۔"

میں نے کہا۔ "شامی..."

اس نے میری بات کاٹ دی۔ "دیکھو دوست۔ تمہاری شاہی سواری اس وقت میری موت کا باعث ہوسکتی ہے۔ تم تو کار میں اپنے مسلح محافظوں کے ساتھ نہیں۔ اکیلے آنا ہوگا۔ گولی کی طرح بارش میں بھیگتے ہوئے۔ کیا تم ڈر رہے ہو؟"

میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "نہیں۔ میں آرہا ہوں۔ لیکن خدا کے لیے اپنی گولی سے کہو کپڑے بدل لے۔ چائے پی لے۔ ورنہ سردی سے مرجائے گی۔"

شامی نے قہقہہ لگایا۔ "گولی مرتی نہیں مارتی ہے۔

اسے کچھ نہیں ہوگا۔ تم اپنی فکر کرو اور وقت مت ضائع کرو۔"

اس کے ساتھ ہی شامی کی طرف سے گفتگو کا سلسلہ بھی منقطع کر دیا گیا تو میں بڑے شش و پنج میں پڑ گیا۔ ابھی تک غنی کے سوا کسی کو بھی رات کے آخری پہر میں ہونے والی اس ملاقات کے بارے میں علم نہیں تھا۔ اگر میں چپکے سے نکل جاتا تو میری اس جرأت مندانہ حرکت کو احمقانہ سمجھا جاتا اور بعد میں مجھے بڑی لعنت ملامت کا سامنا ہوتا اور خدانخواستہ میرے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ جاتا تو غنی کی شامت آ جاتی۔

اس کے برعکس میں غنی کو رازداں بنا کے اور خاموش رہنے کا حکم دے کر نکل جانے کے بجائے اپنی کابینہ کا اجلاس طلب کرتا اور ان سے مشورے میں اجازت کا طالب ہوتا تو یہ بات ایک سو ایک فیصد یقینی تھی کہ مجھے گولی کے ساتھ کوئی نہ جانے دیتا۔ پروٹوکول کے قوانین کے مطابق میرے ساتھ باڈی گارڈز کا ہونا لازمی قرار دیا جاتا۔ بارش میں گھوڑے پر گولی کے پیچھے بیٹھ کر جانے کا کیا سوال۔ یہ غیر محفوظ تھا اور میری شان کے خلاف۔ فیصلہ یہ ہوتا کہ اور کوئی نہ سہی۔ غنی ضرور میرے ساتھ رہے گا۔

لیکن ایک گھوڑے پر گولی جیسی پائلٹ کے ساتھ دو شہسوار مردوں کے بیٹھنے کی گنجائش بھی نہ تھی۔ گولی بہت آگے گھوڑے کی گردن پر سوار ہو جاتی تب بھی سب سے پیچھے کی سواری کو اس کی دم پکڑ کے لٹکنا پڑتا۔

چائے آنے تک میں نے فیصلہ کر لیا تھا۔ بعد میں جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ ابھی میں نہ تاخیر کا متحمل ہو سکتا تھا اور نہ التوا کا۔ مجھے ابھی اور اسی طرح جانا تھا۔ حویلی کے اندر ابھی تک صرف دو افراد نے گولی کو دیکھا تھا۔ گیٹ کے گارڈز کا دیکھا کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔

ریشم سمجھدار تھی۔ میرے لیے بلیک کافی لائی تھی اور گولی کے لیے ریڈی میڈ چائے کا مگ۔ بہت ناگواری کے ساتھ گولی نے میری چائے پینے کی درخواست کو شرفِ قبولیت بخشا اور چائے کو پھونک مار مار کے اور سڑپ سڑپ کر کے ختم کرتی رہی۔

میں نے غنی سے کہا "دیکھو میں گولی کے ساتھ جا رہا ہوں۔"

حسبِ توقع میاں بیوی نے احتجاجی شور بلند کیا۔ غنی نے اردو میں اور ریشم نے عادت کے مطابق اپنی شاندار انگریزی میں۔

میں نے ان دونوں کو ڈانٹ کے خاموش کر دیا۔ "یہ حکم ہے میرا۔ تم میرے واپس آنے تک کسی کو کچھ نہیں بتاؤ گے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے سر۔ سب گارڈز سے پوچھیں گے۔"

"میں نے کہا۔ "تم کہہ سکتے ہو کہ وہ شامی بادشاہ سے ملنے گئے ہیں اور جاتے وقت انہوں نے مجھے سختی سے منع کر دیا تھا کہ کسی کو کچھ نہ بتاؤں۔"

"اینڈ آئی واٹ سے سر؟"

میں نے کہا۔ "آپ کے پیٹ میں خاموش رہنے سے درد نہ ہو تو آپ بھی اپنے میاں کی زبان بول سکتی ہیں۔ وہی کہہ سکتی ہیں جو غنی کہے گا۔ ورنہ بہتر ہوگا کہ آپ بے خبر بن جائیں۔ یہ کہیں کہ میں سو رہی تھی۔"

غنی سخت تشویش میں مبتلا تھا۔ "سر۔ آپ پھر سوچ لیں۔ یہ کسی طرح مناسب نہیں۔ بلکہ خطرناک ہے۔"

"تم فکر مت کرو۔ میرا شامی بادشاہ سے ملنا ضروری ہے اور وہ بلا رہا ہے تو ضرور کوئی خاص بات ہوگی۔"

"لیکن آپ کا اکیلے جانا..."

میں نے کہا۔ "اکیلا نہیں۔ میں گولی کے ساتھ جا رہا ہوں اور میں نے شامی بادشاہ سے بات کر لی ہے۔ جانتے بوجھتے وہ مجھے خطرے میں نہیں کھینچ سکتا تھا۔ یقیناً گولی کے ساتھ جانا خطرناک نہیں ہوگا۔ اسی لیے تو گولی ایسے موسم میں اور اس وقت آئی ہے۔"

غنی سے زیادہ ریشم کی نظریں گولی کو ایسے دیکھ رہی تھیں جیسے اس کے بس میں ہوتا تو وہ گولی کو گولا مار دیتی۔ لیکن گولی نہ حویلی کے شان و شوکت والے ماحول سے متاثر تھی اور نہ خوف کا مفہوم سمجھتی تھی۔ وہ ڈرتی تو ایسے خراب موسم میں اور اس وقت اکیلی گھوڑے پر سوار ہو کے جنگل سے کیسے گزر کر آتی۔

جب غنی کی مخالفت نے حکم عدولی کی حد کو چھوا تو میں نے ایک روایتی سخت گیر آقا کے لہجے میں نوٹس دے دیا۔ "غنی۔ اگر تم نے میرے کہے پر عمل نہ کیا تو مجھے سوچنا پڑے گا کہ آئندہ کسی معاملے میں تم پر اعتبار کیا جائے یا نہیں۔ تم کسی اور کے نہیں میرے ملازم ہو۔"

ریشم کا چہرہ اتر گیا۔ "غنی نے میری بات سنی لیکن اس کا کوئی خاص اثر نہیں لیا۔ اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "آپ مالک ہیں۔ بعد میں جو سزا چاہیں دیں لیکن اس وقت میں وہی کروں گا جو میرے نزدیک درست ہوگا۔ میں ہرگز آپ کو اکیلا نہیں جانے دوں گا۔"

میں نے دل ہی دل میں اس جاںنثار کے جذبے کو سراہا مگر سخت ناراضی سے کہا۔ "کیا کرو گے تم۔ گاڑی میں محافظوں کی فوج میرے ساتھ جائے گی تو میرے ساتھ شامی

بھی مارا جائے گا۔"

"میں آپ کے ساتھ چلوں گا سر۔"

"لاحول ولا قوۃ۔ ہم ایک گھوڑے پر کیسے جا سکتے ہیں اور دوسرا گھوڑا ہے نہیں..." میں نے کہا۔

"میں پیدل ساتھ چلوں گا۔"

"اور گھوڑا کیا کرے گا۔ ٹہلتا ہوا جائے گا۔" میں نے پوچھا۔

"میں ساتھ دوڑوں گا۔ گھوڑے کی رفتار اس وقت کم ہوگی۔"

ریشم نے خفگی ظاہر کی۔ "یو میڈ گون..."

"چپ کر انگریز کی بچی۔ جا کے سو جا۔" غنی بگڑ گیا۔

غنی سمجھنے والا نہیں تھا۔ اسے میرے حکم کی پروا نہیں تھی اور یہ ڈر بھی نہیں تھا کہ بعد میں اسے کیا سزا ہوگی۔ اگر میں اس کی نہ مانتا تو وہ سیدھا جا کے راجا کو جگا دیتا اور سب کو جمع کر لیتا۔ مجبوراً میں نے اپنی خودی کا پرچم سرنگوں کرتے ہوئے کہا۔ "اچھا... چلو تم بھی۔ ضدی آدمی۔"

اس کے بعد غنی نے کچھ ہنگامی اقدامات کیے۔ اس نے کہیں سے پلاسٹک کی ایک شیٹ نکالی اور میرے حوالے کی۔ یہ مجھے بارش میں بھیگنے سے محفوظ رکھنے کے لیے تھی۔ خود غنی کے لیے اس کی دلدار وفادار بیوی ریشم نے کسی میز پر سے ٹیبل کور اتارا جو واٹر پروف تھا۔ وہ بار بار ایک بات پوچھ رہی تھی۔ "آخر تم گھوڑے کے ساتھ کیسے دوڑو گے۔"

تنگ آ کے غنی نے کہا۔ "ساتھ چل تو بھی۔ پتا چل جائے گا۔"

میں نے گولی سے کہا۔ "گھوڑے کو زیادہ ایکسی لریٹر مت دینا۔ فرسٹ گیئر میں رکھنا۔" مگر وہ اس مذاق کو سمجھنے سے قاصر رہی۔ ریشم نے ہمیں ایسے ہی آہ و فغاں اور دیدہ گریاں کے ساتھ رخصت کیا جیسے کسی اسلامی تاریخی ناول کی ہیروئین شبِ عروسی کی صبح اپنے مجازی خدا کو میدانِ کارزار میں شہید ہونے کے لیے روانہ کرتی تھی۔

بارش اس وقت بھی جاری تھی لیکن اس کا زور کم ہو گیا تھا۔ اس سے اچھی بات یہ ہوئی کہ ہوا تھم گئی۔ گیٹ سے نکلتے وقت غنی نے گارڈ سے کہا۔ "تم سے کوئی کچھ بھی پوچھے اپنی زبان بند رکھنا۔"

گارڈ کی صورت ایسی ہو گئی جیسے غنی نے اسے کریلے کا جوس پینے کا حکم دے دیا ہو۔ "مگر سر..." اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

"بکواس بند۔ تم کہہ سکتے ہو کہ گیٹ سے گزر کے کوئی نہیں گیا۔ یا کہہ دینا میں سو گیا تھا۔"

میں نے اس کی مشکل آسان کی۔ "گارڈ تم کہہ دینا کہ مجھے نواب صاحب نے کچھ نہیں بتایا کہ کہاں جا رہے ہیں اور خاموش رہنے کا حکم دیا۔ مجھے امید ہے صبح ہونے سے پہلے میں واپس آ جاؤں گا میں راجا صاحب سے بات کر لوں گا۔"

گارڈ نے اطمینان کا سانس لیا۔ "یس سر۔"

اب وہ سفر شروع ہوا جو مجھے مشکل بلکہ ناممکن لگتا تھا۔ میں گولی کے پیچھے بیٹھا تو مجھے خود کو سنبھالنے کے لیے اس سے چمٹ کر بیٹھنا پڑا اور اس کی کمر کے گرد ہاتھ بھی ڈالنا پڑے۔ ایک زمانہ تھا کہ لندن میں کچھ عرصہ میں نے شہسواری کا شوق بھی پورا کیا تھا مگر گھوڑوں کے ساتھ میری نہیں بنی۔ غالباً وہ متعصب انگریز مزاج کے گھوڑے تھے جو مجھے بار بار گراتے رہے۔ بالآخر میں نے گھڑسواری چھوڑ کے مارشل آرٹ کی کلاس جوائن کر لی۔

اگر یہ کسی فلم کا رومانی سین ہوتا تو بڑا ہیجان انگیز ہوتا۔ ایک طرحدار حسینہ گھوڑے پر۔ اس کے پیچھے ہیرو۔ دونوں بارش میں بھیگتے ہوئے اور ایک دوسرے سے یوں ملے ہوئے جیسے دو لب۔ گھوڑے کی حرکت کے ساتھ جسموں کی حرارت سے جذبات یوں بھڑکتے ہوئے جیسے لوہے اور مقناطیس کی رگڑ سے آگ بھڑکے۔ لیکن افسوس کہ حقیقت کسی فلمی سین سے یکسر مختلف تھی۔

اول تو گولی کوئی عورت ہی نہ تھی۔ میرے نزدیک وہ ڈاکو تھی۔ جس کا جذبات سے دور کا تعلق بھی نظر نہ آتا تھا۔ پھر میں سر پر برستی بارش اور گھوڑے کی کسی بھی ٹھوکر سے لڑھک کر کیچڑ میں گر جانے کے ڈر میں مبتلا تھا۔ گھوڑے کی عمر کیا تھی اور نظر کمزور تھی یا نہیں اس کا اندازہ نہ تھا۔ پھر مجھے شدت سے غنی کے ساتھ دوڑنے کا ملال تھا۔ پھر گھوڑے کی رفتار زیادہ ہو سکتی تھی مگر غنی کی نہیں چنانچہ گولی اسپیڈ کو کنٹرول کر رہی تھی اور میں اسے۔ ابھی ہم نے پل کراس ہی کیا تھا کہ پہلے میرے سر سے واٹر پروف شیٹ اڑ گئی۔ پھر ایسا ہی غنی کے ساتھ ہوا۔

مجھے آقا اور غلام کے اس فرق پر ندامت ہو رہی تھی مجھے حضرت عمرؓ کا واقعہ یاد آیا کہ کس طرح اونٹ پر وہ اور غلام باری باری سفر کرتے تھے۔ لیکن مجھے اس روایت پر عمل کرنے کی توفیق نہ ہوئی۔ غنی کا حوصلہ اور اسٹیمنا تو قابلِ رشک تھا ہی۔ مجھے اس کے جذبہ جاںنثاری پر حیرت بھی ہوئی رشک بھی آیا اور ندامت بھی محسوس ہوئی جس نے صرف میری حفاظت کے خیال سے اپنی جان کو اس آزمائش بھی مبتلا کیا۔

میں سوچ ہی رہا تھا کہ ایسے غنی کب تک گھوڑے کے ساتھ دوڑ سکتا ہے؟ شاید ایک میل بھی نہیں کہ اچانک گھوڑا رک گیا۔ اب تک میں نے گھوڑے کی آواز بھی نہیں سنی تھی۔ یا وہ بچ مچ کا بے زبان تھا یا گولی نے اسے اپنے ہنر سے اسی طرح میوٹ کر دیا تھا۔ جیسے بچے ریموٹ سے ٹی وی کی آواز بند کرتے ہیں۔ گولی نے میرے کہنی مار کے کرخت آواز میں کہا۔ ''اترو۔''

میں اتر گیا۔ بلکہ زیادہ صحیح یہ ہوگا کہ گر گیا۔ غنی نے مجھے سنبھال لیا۔ ابھی اس اسٹاپ اوور پر حیران ہی تھا کہ قریب کے درختوں اور جھاڑیوں میں سرسراہٹ سی ہوئی اور ایک سایہ سا نمودار ہوا۔ گولی اس کے پیچھے چل پڑی۔ میں گولی کے پیچھے رہا اور غنی میرے پیچھے۔ اس جھنڈ سے گزرتے ہی میں نے سیاہ رنگ کی ایک چھوٹی سی کار دیکھ لی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور غنی کے ساتھ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ جو بطورِ خاص مجھے لانے کے لیے بھیجی گئی تھی۔ یقیناً شامی بادشاہ اتنا احمق نہیں تھا کہ مجھے گولی کے ساتھ گھوڑے کی پیٹھ پر لمبے سفر کے عذاب میں ڈالتا۔

جھاڑیوں سے نکلنے والے شخص نے گولی کو چابی دی اور خود گھوڑے پر سوار ہو کے نہ جانے کدھر روانہ ہو گیا۔ اب میری سمجھ میں آ گیا کہ گولی یہ کار چلا کے یہاں تک لائی تھی اور یہاں سے گھوڑے پر حویلی پہنچی تھی۔ یہ تقریباً ایک کلومیٹر کا فاصلہ تھا جو اس نے بارش میں طے کیا۔ بہرحال ایک عورت کے لیے رات کے اندھیرے میں جنگل کا یہ سفر بھی بڑے حوصلے کی بات تھی۔

سیٹ پر ایک تولیا پڑا تھا جس سے میں نے اپنا چہرہ اور سر خشک کیا۔ گولی نے یہ تکلف ضروری نہیں سمجھا اور کار اسٹارٹ کی تو میں نے سوال کیا۔ ''کیا گاڑی کو بھی تم گھوڑے کی طرح چلاؤ گی۔ بغیر ہیڈ لائٹس کے۔''

''تم فکر مت کرو۔'' اس نے غرا کے کہا اور اپنی آنکھوں پر ایک عجیب سی عینک لگالی۔ ''مجھے اس کی ضرورت نہیں۔''

میں سمجھ گیا کہ وہ اندھیرے میں دیکھنے کے لیے استعمال ہونے والی مخصوص عینک ہے۔ گولی کو راستہ اسی طرح نظر آ رہا ہوگا جیسے ہیڈ لائٹس روشن ہوں۔ اس سے پہلے بھی دو بار مجھے شامی بادشاہ کے ڈیرے پر لے جایا گیا تھا تو ایسے ہی پُراسرار انداز میں۔ مجھے لے جانے والے ایسے راستوں سے آشنا ہوتے تھے جو عام نہ تھے۔ گولی بھی گاڑی کو دائیں بائیں گھماتی کسی ٹینک کی طرح چلا رہی تھی جو راستے کی رکاوٹ سے بے نیاز ہو۔ وہاں سڑک نہیں تھی اور کچے راستے پر بھی اندھیرا تھا لیکن گاڑی نہ کسی درخت سے ٹکرائی اور نہ جھاڑی میں گھسی۔

آدھے گھنٹے بعد میری توقع کے مطابق مجھے دوسری گاڑی میں سوار کرا دیا گیا۔ یہ بڑی گاڑی تھی جسے میں پہچان گیا۔ ایک بار پہلے بھی مجھے اسی پرانی پجیرو میں لے جایا گیا تھا۔ پجیرو کے ڈرائیور کی صورت بھی مجھے دیکھی بھالی لگی۔ گولی اب اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ مزید آدھے گھنٹے کے سفر کے بعد پجیرو ایک ایسی جگہ رک گئی جہاں بظاہر زندگی کے آثار مفقود تھے۔

ڈرائیور نے ایک کچی فصیل نما دیوار کے پھاٹک پر دستک دی اور ایک صحن سے گزر کے میں نے برآمدے میں شامی بادشاہ کا سایہ سا دیکھا۔ ''خوش آمدید۔ خوش آمدید۔'' اس نے مجھے گلے لگا کے کہا۔

''کیا خوش آمدید شامی بادشاہ۔ اس وقت تو دل چاہتا ہے تمہیں گولی مار دوں یا گولی کو مار دوں۔'' میں نے کہا۔

وہ ہنس پڑا۔ ''مجھے بڑی خوشی ہے کہ تم آ گئے نواب دوست۔''

میں نے کہا۔ ''گولی کے سامنے کون انکار کر سکتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ گولی بڑے وقت پر لگی۔ میرا مطلب ہے آئی۔ میں خود تم سے ملنے کے لیے اس ڈرامے کا منتظر تھا۔ قلندر بابا عرف دیوانہ جاسوس۔ آج کل وہ کہاں ہے۔ نظر ہی نہیں آتا۔''

''اس کا مجھے بھی پتا نہیں۔ کہیں مارا نہ گیا ہو۔'' شامی بادشاہ مجھے ایک دروازے سے اندر لے گیا۔ یہ دروازہ بند کرنے کے بعد دوسرے دروازے تک ہم نے اندھیرے میں سفر کیا۔ دوسرا دروازہ ایک روشن کمرے میں کھلا جہاں فرش پر چٹائی بچھی ہوئی تھی اور کوئی ایک درجن افراد بے سدھ پڑے تھے۔ چھ دائیں طرف اور اتنے ہی بائیں طرف۔ میں ان کے درمیان سے گزر کے تیسرے کمرے میں پہنچا۔ یہاں بھی چٹائی کے سوا کچھ نہ تھا۔

شامی بادشاہ نے کہا۔ ''بیٹھو نواب دوست۔ آج ہم تمہیں ایک کرسی تک پیش نہیں کر سکتے۔ اور نہ کوئی خاطر تواضع کر سکتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''اس کی ضرورت نہیں لیکن یہ کیا جگہ ہے؟''

''یہ ایک دن کی پناہ گاہ ہے۔ ہم سب کل رات یہاں سے نکل جائیں گے۔ کہاں جائیں گے۔ یہ معلوم نہیں۔''

''یہ مکان کس کا ہے؟''

''معلوم نہیں۔ یہاں سے ایک فرلانگ کے فاصلے پر ایک گاؤں ہے۔ یہ کافی عرصہ دراز سے ویران پڑا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''تم کچھ پریشان لگ رہے ہو۔''

''صرف لگ نہیں رہا۔ میں پریشان ہوں۔'' اس نے ایک آہ بھری۔

میں نے کہا۔ ''ایسا میں پہلی بار دیکھ اور سن رہا ہوں۔ حالانکہ آج کل تمہارے بہت چرچے ہیں۔''

''کیا چرچے ہیں؟''

''تمہاری وارداتوں کے۔ بہت مال اکٹھا کیا ہے۔''

وہ بگڑ گیا۔ ''جھوٹ۔ سب میرے دشمنوں کا پروپیگنڈا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''تم کس دشمن کی بات کر رہے ہو۔ دوست تو تمہارا شاید میں ہی ہوں۔ یہ گولی کون ہے؟''

''میرے ساتھ بائیس بندے تھے۔'' وہ کچھ دیر بعد بولا۔ ''سب وفادار تھے۔ بھروسے کے قابل۔ ہم چوریاں نہیں کرتے تھے۔ ڈاکے ڈالتے تھے اور صرف مال لوٹتے تھے۔ کسی کی عزت نہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوا اور نہ ڈاکو سب کچھ کرتے ہیں۔ جہاں گئے مال کے ساتھ عورت بھی اٹھا لی۔ کسی کی بیوی ہو بیٹی یا بہن۔ رات بھر اسی گھر میں کھایا پیا عیش کیا اور جاتے جاتے بول دیا کہ اپنی عزت کی رپورٹ مت لکھوانا تھانے میں۔ مال گیا تو پھر آ جائے گا۔ عزت بھی مسروقہ مال کے ساتھ برآمد نہیں ہوتی۔ سمجھدار ایسا ہی کرتے ہیں۔ لیکن نواب دوست۔ میں نے ایسا نہیں ہونے دیا۔ کسی کو کچھ نہیں کرنے دیا۔ یہی سمجھایا کہ دیکھو ہم ڈاکو ہیں۔ بدمعاش نہیں۔ ہم مال چھینتے ہیں۔ عورت کی عزت چھیننے والے بزدل اور بے غیرت ہوتے ہیں اور مال بھی ہم ان سے چھینتے ہیں جنہوں نے غریبوں سے چھینا... ان کا حق مار کے۔ سرکار سے چھینا ٹیکس بچا کے۔ ہم کالا دھن چھینتے ہیں۔ کالے کرتوتوں کی کمائی چھینتے ہیں۔ مگر کالے دھن والوں کے گھر کی ماں بہن یا بیٹی کی عزت تو ویسی ہی ہوتی ہے جیسی غریب عورت کی۔ اگر تمہارے پاس مال ہے تو جاؤ۔ دنیا کے بازار سے عورت لے لو۔ بہت مل رہی ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''اور تمہاری مانتے تھے سب؟''

''ہاں۔ بچوں کو پیار سے سمجھاؤ تو وہ بھی مان جاتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''آج کل اصول کہاں چلتے ہیں۔ نہ سیاست میں نہ تجارت میں۔ تم عجیب بات کرتے ہو کہ ڈاکو اصول کے پابند تھے۔''

''کیا تم جانتے نہیں۔ بے ایمانی کرنے والے سب سے زیادہ ایمانداری دکھاتے ہیں۔ رشوت کا مال۔ بھتا۔ چوری کا مال۔ نیچے سے اوپر تک سب کو اس کا حصہ بڑی باقاعدگی سے پہنچتا ہے۔ ایک پیسا اِدھر سے اُدھر نہیں ہوتا۔ رشوت خور، دلال اور ایجنٹ پیسا لے کر دھوکا نہیں دیتا۔ کام کے معاملے میں زبان کا پکا ہوتا ہے۔ خیر...''

''تم نے بھی بڑی نیک نامی کمائی ہے بدنامی کے اس کاروبار میں۔ تمہیں غریبوں کا مددگار سمجھا جاتا ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ کچھ دیر بعد بولا۔ ''ہمارا دوسرا اصول تھا۔''

غنی نے باہر سے دستک دی اور اندر سر ڈال کے بولا ''سر۔ فون ہے آپ کے لیے۔ راجا ہی کا ہوگا۔''

میں نے موبائل فون لے لیا۔ راجا نے چلانا شروع کیا۔ ''یہ کیا حرکت ہے۔ بتائے بغیر کہاں نکل گیا آدھی رات کو بارش میں۔''

میں نے کہا۔ ''شور نہ کر۔ میں شامی بادشاہ کے ساتھ ہوں۔ ہو سکتا ہے صبح واپسی میں دیر ہو جائے۔ کیا صبح ہو گئی۔ سورج نکل آیا؟''

''ابھی ساڑھے چار بجے ہیں۔'' وہ اور بگڑا۔

''پھر تجھے کیا خواب آیا تھا؟''

''مجھے ریشم نے بتایا۔ رو رہی تھی بے چاری۔''

''بے چاری نہیں الو کی پٹھی۔ اس سے میں آ کے نمٹوں گا۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

شامی بادشاہ نے اپنی بات پھر شروع کی۔ ''دوسرا اصول یہ تھا کہ جب تک کوئی ہماری جان کا دشمن نہ ہو۔ کسی کی جان نہیں لیتی۔ سب ٹھیک چل رہا تھا لیکن پھر ایک جگہ دونوں باتیں ہو گئیں۔ وہ بندے گئے ایک گھر میں۔ وہ محکمۂ انسداد رشوت ستانی کا افسر تھا۔ مال خوب جمع کیا تھا اور نئی نئی شادی کی تھی۔ مال اس نے بلا چوں و چرا دے دیا۔ نئی دلہن کا سارا زیور بھی سامنے رکھ دیا لیکن میرے ایک بندے کی نیت خراب ہو گئی۔ قصور اس کا بھی نہیں تھا۔ وہ جوان آدمی تھا اور جب وہ گھر میں گھسے اور پھر بیڈ روم میں تو وہ سو رہے تھے۔ تم سمجھ سکتے ہو کہ نئے دلہا دلہن کیسے سوتے ہیں۔ دلہن کو موقع بھی نہ ملا کپڑے پہننے کا اور اس نے چادر میں خود کو چھپانا چاہا تو ڈاکو نے چادر چھین لی۔ بولا کہ ایسے ہی اچھی لگ رہی ہو۔ دلہا نے سارا مال خزانہ دینے کے بعد بڑی منت سماجت کی مگر ڈاکو کے جذبات بھڑک اٹھے تھے۔ اس نے دلہن کو دبوچا تو دلہا بیچ میں آ گیا۔ دوسرے ڈاکو نے اسے مار دیا اور پھر دونوں نے صبح

تک اس بیوی کی عزت لوٹی جس کا شوہر سامنے مرا پڑا تھا۔ مجھے انہوں نے کچھ نہیں بتایا۔ اخبار دیکھا تو پتا چلا۔ میں نے ان سے پوچھا تو انہوں نے اپنے جرم کا اقرار کرلیا۔ میرے دماغ کا فیوز اڑ گیا۔ میں نے ریوالور نکال لیا تھا۔ اصل مجرم کو شوٹ کرنے کے لیے۔ جس نے پہل کی تھی۔ دوسرے شریکِ جرم نے میرا ہاتھ پکڑلیا اور ریوالور چھیننے کی کوشش کی۔ میں نے اس کو لات مار کے گرادیا اور کہا کہ پہلے تجھ سے نمٹ لوں مگر اس کی حمایت میں تیسرا کھڑا ہوگیا۔ پھر چوتھا۔"

"یعنی بغاوت ہوگئی تمہارے خلاف؟"

"ہاں۔ آٹھ میرے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے کہا کہ میں مجرم کو معاف نہیں کرسکتا۔ انہوں نے کہا کہ تم بھی ڈاکو ہو۔ تم کون ہوتے ہو ہمیں سزا دینے والے۔ رکھو اپنے اصول اپنے پاس۔ ہم جارہے ہیں...اور وہ چلے گئے۔ انہوں نے اپنا گروہ بنالیا۔ انہوں نے میرا نام بدنام کردیا ہے۔ وہ میرے نام سے وارداتیں کررہے ہیں لیکن اس کے ساتھ وہ سب کررہے ہیں جو میں نے کبھی نہیں کیا تھا۔ وہ عورتیں اٹھارہے ہیں اور تاوان مانگ رہے ہیں۔ دھمکی دیتے ہیں کہ تمہاری بیٹی کو کسی بردہ فروش کے ہاتھ بیچ دیں گے تو ہمیں زیادہ پیسے مل جائیں گے۔ لوگ خاموشی سے عزت کا یہ تاوان ادا کرتے ہیں۔ وہ سارا پچھلا حساب برابر کررہے ہیں۔ جہاں واردات کرتے ہیں کسی عورت کو نہیں چھوڑتے۔ انہوں نے قتل بھی بہت کیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر طرف کہرام مچا ہوا ہے۔ شامی بادشاہ کے گروہ کو ختم کرنا اور شامی بادشاہ کو سرِعام پھانسی دینے کے مطالبے سے پولیس پریشان ہے۔ میرے سر کی قیمت پچاس لاکھ مقرر کی جارہی ہے۔"

میں نے کہا۔ "اور یہ بارہ ساتھی جواب بھی تمہارے ساتھ ہیں۔"

"یہ بھی سخت پریشان ہیں۔ جو کل تک ساتھی تھے وہ دشمن بن گئے ہیں۔ پولیس ان کی سرپرستی کرنے لگی ہے۔ وہ ہم سب کے بارے میں معلومات فراہم کررہے ہیں۔ میرے ساتھیوں کے سر کی قیمت بھی پانچ اور دس لاکھ تک لگادی گئی ہے۔"

میں نے پھر پوچھا۔ "یہ گولی کون ہے؟"

"نواب دوست۔ یہ میری گھر والی ہے۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ "شامی بادشاہ۔ ایک بار اپنے ڈیرے پر تم نے ایک لڑکی سے ملوایا تھا۔ میرے ساتھ فریال تھی۔ وہ بڑی سلجھی ہوئی اور پڑھی لکھی لڑکی تھی۔"

شامی نے ٹھنڈی سانس لی۔ "ہاں۔ وہ ڈر گئی۔ اس نے مجھ سے شادی نہیں کی۔ میں نے بھی معاف کردیا اسے۔ سندھ میں ایک بڑا نامور ڈاکو تھا۔ بڑا جی دار۔ سردار بخش نام تھا اس کا۔ جب میں پنجاب سے نکل کے سندھ گیا تو اس نے پیغام بھیجا کہ میرا علاقہ چھوڑ دو۔ میں نے جواب دیا کہ نکال سکتے ہو تو نکال دو۔ ایک جگہ اس کا میرا ٹکراؤ ہوگیا۔ خوب فائرنگ ہوئی۔ میرے دو بندے مارے گئے۔ سردار بخش کے چار۔ پھر رینجرز آگئی۔ ہم بچ کر نکلنے میں کامیاب رہے۔ سردار بخش تمام ساتھیوں کے ساتھ ہلاک ہوگیا۔ گولی اس کی بیوی تھی۔ یہ شوہر کے ساتھ ہر جگہ جاتی تھی۔ اس نے مجھے تلاش کرلیا اور ایک دن میں نے دیکھا تو میرے سر پر ریوالور لیے کھڑی تھی۔ میں سو رہا تھا۔ یہ اندر آگئی۔ میں نے کہا کہ کون ہو تم۔ بولی کہ میں سردار بخش کی بیوہ اس کی موت کا بدلہ لینے آئی ہوں۔ میں نے کہا کہ اسے کیا میں نے مارا تھا؟ یہ بولی کہ تم نے مخبری کی اور رینجرز کو اس کا پتا بتایا تھا۔ میں نے کہا کہ کیا تمہارا شوہر یہ کرسکتا تھا؟ ایسا تو بزدل اور نامرد کرتے ہیں۔ پھر وہ ڈاکو نہیں ہوتے۔ اسے باتوں میں لگا کے میں نے ریوالور چھین لیا۔ یہ عورت ذات میرا کیا مقابلہ کرتی۔ میں نے نیچے گرا کے ریوالور اس کے سینے پر رکھ دیا اور کہا کہ اب بول۔ تجھے کوئی بچا نہیں سکتا لیکن میں اس بہادر سردار بخش کے نام پر تجھے چھوڑتا ہوں۔ پھر میں نے وہی ریوالور اسے دے کے کہا۔ لے اب مار گولی مجھے۔"

میں نے کہا۔ "بڑا زبردست ڈراما کیا تم نے شامی بادشاہ۔"

"یہی سمجھو۔ بس یہ میرے قدموں میں گرگئی۔ کہنے لگی کہ دنیا میں میرا کوئی نہیں رہا۔ مجھے اپنی نوکرانی بنالو۔ میں نے کہا کہ تو سردار بخش کی عزت تھی۔ میں تجھے کیسے بے عزت کرسکتا ہوں۔ تم نے دیکھ ہی لیا ہوگا کہ وہ کس قسم کی عورت ہے۔ وہ میری خاطر جان دے بھی سکتی ہے اور لے بھی سکتی ہے۔"

"ایک بات پوچھوں۔ سچ سچ بتاؤ گے؟"

وہ مسکرانے لگا۔ "نواب دوست۔ کیا میں تم سے جھوٹ بول سکتا ہوں؟"

میں نے پوچھا۔ "یہ شادی کرنے کے بعد۔ کیا آج تک تمہیں کبھی احساس ہوا کہ تم نے ایک جذباتی غلطی کی۔"

وہ کچھ دیر چپ رہا۔ "بڑی عجیب ہے یہ بات۔ البتہ اب مجھے خیال آتا ہے کہ اگر میں اس لڑکی سے شادی کرلیتا۔ جس سے تم پہلے ملے تھے تو شاید وہ ایک جذباتی غلطی ہوتی۔ اس

کا میرا کوئی جوڑ نہ تھا۔ بعد میں وہ پچھتاتی۔ میں بھی سوچتا کہ میری زندگی تو خراب تھی۔ اس کی میرے ساتھ ہوگئی۔ گولی کے ساتھ میں اور میرے ساتھ وہ ایسے فٹ ہیں جیسے جوتوں کا جوڑا کسی کے پیروں میں۔"

خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا تو میں نے اپنی گھڑی دیکھی۔ صبح کے ساڑھے پانچ بج گئے تھے۔ مطلع ابر آلود نہ ہوتا تو کچھ دیر میں سورج نکل آتا۔ شامی بادشاہ نے ایک کھڑکی کھول کے دیکھا۔ باہر بارش دھیمے سروں میں جاری تھی اور اندھیرا ہنوز غالب تھا۔

"ابھی کچھ دیر بعد تمہیں چائے بھی پلائیں گے۔ ناشتا بھی کرائیں گے۔" شامی نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔ "یہ بہت اچھا ہے کہ بارش جاری ہے۔ اس موسم میں کسی کے اِدھر آنے کا کوئی امکان نہیں۔"

"شامی بادشاہ۔ پوچھو میں تم سے کیوں ملنا چاہتا تھا۔"

وہ ہنسا۔ "اچھا۔ کیوں ملنا چاہتے تھے تم؟"

میں نے کہا۔ "قدرت جب کچھ کرانا چاہتی ہے تو اس کے اسباب خود بخود پیدا ہوجاتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "کیا کبھی تم نے سوچا کہ تمہیں اس پیشے سے تائب ہوجانا چاہیے؟"

"اور کسی سینما کے سامنے مونگ پھلی کی ریڑھی لگانی چاہیے۔"

میں نے کہا۔ "پیسا تو بہت ہوگا تمہارے پاس۔ کوئی بزنس کرنے کے لیے۔"

وہ چپ ہوگیا۔ "ایسا تو ہر ڈاکو سوچتا ہے۔ خصوصاً وہ جس کی فیملی بھی ہو۔ جو بیوی بچے والا ہو۔"

"اب تمہاری بیوی ہے۔ آگے چل کے بچے بھی ہوں گے۔"

"سچ تو یہ ہے نواب دوست کہ پہلے یہ خیال نہیں آتا تھا اور اس کی وجہ کوئی بھی نہیں۔"

"یار کم سے کم میرے سامنے اسے گلاب جان کہو۔"

"میں اسے گلابو کہتا ہوں۔ اکیلے میں۔ اس سے شادی کے بعد بھی میرے خیالات میں کوئی انقلاب نہیں آیا تھا۔ وہ میرا ساتھ دینے اور حوصلہ بڑھانے والی عورت ہے۔ لیکن مجھے لگتا ہے کہ میری خوش نصیبی کے دن پورے ہونے والے ہیں۔ گزشتہ ایک مہینے سے ہم سب عدم تحفظ کے احساس کا شکار ہیں۔ ہر وقت ایسا لگتا ہے جیسے شامت اعمال ہر طرف سے ہمیں محصور کررہی ہے۔ کیونکہ ہمارے اپنے ساتھی ہمارے دشمن بن گئے ہیں۔ گھر کے بھیدی لنکا ڈھاتے ہیں۔

وہ ہمارے تمام خفیہ ٹھکانوں سے واقف ہیں۔ ہم کہاں پناہ لیں۔ زمین ہمارے لیے تنگ ہوتی جارہی ہے۔"

میں نے کہا۔ "شامی بادشاہ۔ میں تمہارے لیے ایک آفر لایا ہوں۔ جو بہت بروقت ہے اگر تم نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا تو ہوسکتا ہے تمہارے اندیشے درست ثابت ہوجائیں۔"

وہ مجھے گھورنے لگا۔ "کیسی آفر نواب دوست۔"

میں نے کہا۔ "تحفظ اور سلامتی کی آفر۔ حکومت کی طرف سے۔"

"حکومت کی طرف سے؟" تم کب سے حکومت کے ایجنٹ بن گئے؟ کیا آفر ہے حکومت کی؟" وہ تند لہجے میں بولا۔

"بہت آسان اور سادہ۔ تم ہتھیار پھینک کے خود کو قانون کے حوالے کردو۔ تمہیں معاف کردیا جائے گا اور تمہارے خلاف سارے کیس بھی ختم ہوجائیں گے۔"

اس نے ایک تلخ قہقہہ لگایا۔ "واہ...کیا حکومت خود چل کے تمہارے پاس آئی تھی؟ یا تم نے ایوان صدر جاکے مذاکرات کیے تھے؟"

میں سنجیدہ رہا۔ "تمہیں مجھ پر اعتبار نہیں؟"

"دنیا میں تمہارے سوا کون ہے قابلِ اعتبار۔"

میں نے کہا۔ "پھر میرا مذاق کیوں اڑا رہے ہو؟ جو میں نے کہا اس میں ہنسنے کی کیا بات تھی؟"

وہ سیریس ہوگیا۔ "مجھے بتاؤ نا۔ تم حکومت کسے کہہ رہے ہو؟"

میں نے کہا۔ "پولیس کے اعلیٰ ترین عہدے پر فائز ایک شخص نے خود مجھ سے کہا ہے۔ وہ اس طرح خود کو میرا دوست کہتا ہے جیسے تم کہتے ہو اور میں اس پر بھی اتنا ہی اعتبار کرتا ہوں۔"

"تم ڈی آئی جی عبداللہ جان کی بات کررہے ہو؟"

"ہاں۔ وہ بہت جلد پنجاب کا آئی جی ہونے والا ہے۔ وہ خود یہ آفر لے کر میرے پاس آیا تھا۔"

"تم نے اس سے کوئی ضمانت تو مانگی ہوگی۔"

"لیکن...اپنا اطمینان حاصل کیے بغیر میں یہ آفر تم تک کیسے پہنچا سکتا تھا۔ اس نے مزید یہ کہا کہ تمہیں باعزت زندگی گزارنے کے تمام مواقع حاصل ہوں گے۔ تمہارے خلاف ماضی کی بنیاد پر کوئی انتقامی کارروائی نہیں کی جائے گی اور نہ کسی بھی موقع پر ماضی کو حوالہ بنایا جائے گا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ جو پیشکش تمہارے لیے ہے اس کا اطلاق تمہارے

ان تمام ساتھیوں پر بھی ہوگا جو تمہارے ساتھ اپنی سابقہ جرائم کی زندگی کو ترک کریں گے۔"

"ساری بات ہی ضمانت کی ہے۔" وہ بولا۔

میں نے کہا۔ "بالکل صحیح کہا تم نے... میں ہرگز اتنا بے وقوف نہیں کہ اپنا اطمینان کیے بغیر اپنے دوست کو قانون کو جال کے طور پر استعمال کرنے والے کسی عیار پولیس افسر کے حوالے کردوں... ہرگز نہیں.... میں ایک طرح نہیں سو طرح کسی یقین دہانی کو پرکھنے اور فریب کاری کے سارے امکانات دور کرنے کے بعد ہی بات کو آگے بڑھاؤں گا... پہلی شرط ہے تمہارا عندیہ۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ میری کوشش تمہاری فلاح کے مقصد کو پورا کرتی ہے میں تم سے مخلص ہوں اور تم مجھ پر اعتماد کرسکتے ہو... تو جواب ہاں یا نہ میں دو... اس کے بعد میں کوئی حکمتِ عملی بنانے کی سوچوں گا۔"

"تم میرا جواب ابھی چاہتے ہو؟"

"ظاہر ہے... دیر خود تمہارے حق میں تباہ کن ہوگی۔ اس وقت جو حالات ہیں ان پر تمہارا کوئی کنٹرول نہیں... تم محصور ہوتے جارہے ہو... یہی وقت ہے اس پیشکش سے فائدہ اٹھانے کا... ابھی پیشکش دینے والوں کو اندازہ نہیں کہ تمہاری پوزیشن کمزور پڑنے لگی ہے... جس دن انہیں یہ اندازہ ہوگیا اس دن وہ اپنی آفر واپس لے لیں گے اس لشکر سے صلح کے مذاکرات کون کرتا ہے شکست جس کا مقدر بن چکی ہو اور نظر آتی ہو... تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "پھر بھی... مجھے کچھ وقت دو میں سب سے بات کرلوں۔"

"یہ ٹھیک ہے... اب تک تم نے ان کی قیادت کی ہے اس راستے کو چھوڑ کے دوسرے راستے کو اختیار کرتے ہو تو انہیں یہ احساس کیوں ہو کہ تم نے ذاتی مفاد میں ان کو بے آسرا چھوڑ دیا۔ اب بھی تم ان کی راہنمائی کرو گے لیکن وقت کا مسئلہ سب سے اہم ہے۔"

"میں سمجھ گیا... تم مجھے تین دن دو۔"

میں نے ہاتھ بڑھایا۔ "مجھے کتنی خوشی ہوئی اس بات سے کہ تم نے میری بات سنی اور سمجھی۔ میں بیان نہیں کرسکتا... یہاں سے ہماری دوستی کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔"

اس نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ "کبھی کبھی میں سوچتا ہوں... آخر اس دوستی میں قدرِ مشترک کیا ہے... ایک ڈاکو... ایک نواب... ایک زمانے کا ٹھکرایا ہوا ہے دوسرا شخص... ایک تعلیم یافتہ خاندانی شخص... ایک بلند آدرش رکھنے والا... دوسرا خرابی اور بربادی کا باعث... ایک شیطان کا پیروکار دوسرا رحمان کا۔"

میں نے کہا۔ "ایسی باتیں مت کرو... خدا اپنی دنیا میں انصاف اور توازن ایسے ہی رکھتا ہے... ہم بندے کیا جانیں کس کی کون سی سوچ اسے خدا کی بارگاہ میں کہاں پہنچا دے۔ ابلیس جو فرشتوں کا سردار تھا راندۂ درگاہ ہوا... کیا اس کے برعکس نہیں ہوتا...؟"

"تین دن بعد میں تم سے رابطہ کروں گا۔"

"یہ تین دن تم کہاں گزارو گے؟" میں نے کہا۔

"یہ میں خود نہیں جانتا تو تمہیں کیسے بتاؤں؟"

میں نے کہا۔ "میرا مطلب تھا۔ اب تمہیں کوئی رسک نہیں لینا ہے اور خود کو محفوظ رکھنا ہے۔"

"ایک بات تم بھی سمجھ لو نواب صاحب... میں کسی حکومت کو نہیں جانتا... یہ آفر لے کر تم آئے ہو میرے پاس... میں اور میرے بارہ ساتھی خود کو تمہارے حوالے کریں گے... آگے کی ساری ذمے داری تم پر۔"

میں نے کہا۔ "انشااللہ سب اچھا ہوگا۔ اچھائی کی راہ دکھانے والا بھی تو وہی ہے... مجھے اس پر بھروسا ہے لیکن حکومت سے الگ ایک آفر تمہارے اس دوست کی طرف سے بھی ہے... یہ نوابی تو قسمت کا ایک مذاق ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں... ورنہ میں وہی ہوں جسے رانا بڑی حقارت سے ماسٹر کا بیٹا کہتا ہے... یہ بھی مجھ پر اللہ کا احسان ہے کہ میں استاد کا بیٹا ہوں جو تعلیم دیتا ہے... کسی منافق سیاست دان... راشی اور بدعنوان بیوروکریٹ... یا کسی فسادی ملا کا بیٹا نہیں۔"

"تمہاری کیا آفر ہے؟"

"تم اپنے ساتھیوں سمیت میری طاقت بن جاؤ... ست بدھائی میں رہو... وہاں تمہارے کرنے کے لیے بہت کام ہیں جہاں تمہاری یہ توانائی جو آج تک منفی سمت میں استعمال ہوتی رہی... مثبت رخ اختیار کرسکتی ہے۔ تم وہ کام کرسکتے ہو جو فلاح کے کام ہیں... جن میں خیر ہے... دولت دنیا کی ہو یا آخرت کی... کمائی کی حد نہیں... آدمی اپنی کوشش سے کماتا ہے۔"

"تم تو کسی واعظ کی طرح بول رہے ہو؟"

میں نے کہا۔ "نہیں... میں وضاحت کررہا ہوں... پتا نہیں تم سب کے پاس کتنا سرمایہ ہے... کون کیا کرنا چاہتا ہے بعد میں... اور کیا کرسکتا ہے... میرے پاس روپیہ پیسا زرو جواہر کچھ نہیں مگر ایک دوسری طرح کی خوشی کی دولت بے حساب ہے... اسے جتنا لوٹ سکتے ہو لوٹ لو۔"

"کسی اور کی بات میں نہیں کرسکتا لیکن یہ میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہوگی۔ میرا اپنا کون سا گھر ہے تم اپنے گھر کے دروازے میرے لیے کھول رہے ہو... تھینک یو ویری مچ۔" اس نے میرا ہاتھ دبا کے چھوڑ دیا۔

میں نے کہا۔ "اچھا اب اس سے زیادہ باتوں کے لیے میرے پیٹ کے فیول ٹینک میں کچھ ڈالو... چائے ناشتا... ورنہ میں گیا کام سے۔"

وہ ہنسا۔ "پیٹ خالی ہو تو نہ دماغ کی مشین چلتی ہے نہ دل کی... دیکھتا ہوں گلابو نے کیا انتظام کیا ہے؟"

گلابو نے لکڑیاں جلا کے چائے بنائی تھی۔ کھانے میں صرف روٹیاں تھیں یہ بھی اس نے الٹے توے پر تھوپی تھیں۔ معلوم نہیں چائے کا سامان اور آٹا بھی کہاں سے لایا گیا تھا مگر اس میں کوئی شاعرانہ مبالغہ نہیں کہ وہاں ان ڈاکوؤں کے درمیان بیٹھ کر میں نے گرم روٹی چائے میں ڈبو کے کھائی تو مجھے ست بدھائی کی ڈائننگ ٹیبل پر سرد ہونے والے اس ناشتے سے زیادہ مزہ آیا جس میں دنیا کی ہر نعمت موجود ہوتی تھی۔ یہ سب احساس اور وقت کی بات ہے۔

آٹھ بجے راجا کا فون پھر موصول ہوا۔ میں نے اسے تسلی دی کہ میں خیریت سے ہوں اور دوپہر سے پہلے ہی واپس پہنچ جاؤں گا۔ گلابو اب ایک بالکل بدلے ہوئے روپ میں میرے سامنے آئی۔ نہ صرف یہ کہ اس نے اچھے کپڑے پہن لیے تھے بلکہ وہ مصنوعی کرختگی جو اس نے اپنی صورت پر طاری کر رکھی تھی اور اپنے لہجے میں پیدا کی تھی خود بہ خود غائب ہوگئی تھی۔ اس کے تین روپ بالکل مختلف انداز رکھتے تھے۔ شامی بادشاہ کے لیے وہ اس کے دل کی ملکہ تھی۔ میرے لیے ایک خوش اخلاق اور ملنسار میزبان اور باقی سب کے لیے ماں کا روپ رکھنے والی عورت جو سب کے لیے اچھا سوچتی تھی۔

جب میں واپس ہوا تو میرا سفر ایسے بے سمت نہیں تھا جیسے رات کے اندھیرے میں محسوس ہوا تھا۔ مجھے یہاں لانے والی گاڑی کہیں بھی نہ تھی۔ ایک شخص میری راہنمائی کے لیے ساتھ ہو لیا۔ ہم کھیتوں کی منڈیروں پر پانی سے بھرے گڑھوں... نالیوں اور نالوں کے درمیان چلتے ہوئے ایک کچے راستے تک پہنچے تو میرے راہنما نے انگلی سے اشارہ کر کے بتایا۔ "بس ادھر سیدھے چلتے جاؤ۔" اور واپس چل پڑا۔ غنی نے سخت برا منایا۔

میں نے کہا۔ "اتنا تو بتادے کہ یہ راستہ کہاں لے جائے گا؟"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ "مجھے نہیں معلوم۔"

مجھے یہ بات کچھ عجیب اور خلافِ معمول لگی کہ شامی نے مجھے لانے کے لیے اپنی بیوی کو گھوڑے پر بھیجا اور آگے گاڑی بھی آئی لیکن مجھے واپسی پر پیدل روانہ کردیا گیا ہے تاہم یہ شکایت دو تین کلومیٹر چلنے کے بعد دور ہوگئی۔ یہ دو تین کلومیٹر کا سفر بھی آسان نہ تھا۔ میں کیچڑ میں چلتا رہا حالانکہ اوپر سے بارش نہیں پڑ رہی تھی مگر رات بھر میں پانی نے کچھ راستے کو نالا بنا دیا تھا۔ اس کے درمیان میں دو گہری نالیاں تھیں جو تانگے ریڑھے یا بیل گاڑی کے پہیوں نے گہری کردی تھیں۔ دونوں طرف کنارے خشک تھے لیکن ان پر چلتے ہوئے میں بار بار پھسلتا تھا اور غنی مجھے سنبھالتا تھا۔

اچانک میں نے خود کو ایک پتلی سی سڑک پر پایا اور مجھے اپنے سامنے کوئی آبادی دکھائی دی غور کرنے پر میں نے اپنا محلِ وقوع سمجھ لیا۔ یہ رہتاس کے قلعے کے اندر کی آبادی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں ست بدھائی سے دس کلومیٹر دور تھا۔ رات کے وقت میں نے جتنا فاصلہ طے کیا وہ کچھ نہیں تھا۔ بس مجھے حفاظتی ضرورت کے تحت گھما پھرا کے منزلِ مقصود تک لے جایا گیا تھا۔

غنی کے ساتھ میں پچھلی طرف سے آبادی میں داخل ہوا اور بیس منٹ بعد اس سڑک پر جا پہنچا جو دینہ کی طرف سے آرہی تھی۔ اگر میں مخالف سمت میں چلتا تو شاید پیدل ہی ست بدھائی پہنچ جاتا لیکن راہ میں کہیں دریائے کہار ضرور آتا اور اس بارش کے بعد اسے پُل سے ہی عبور کیا جاسکتا تھا۔

میں کسی سواری کے انتظار میں چند قدم چلا اور یہ سوچتا رہا کہ اس وقت آگے پیچھے سے رانا رجب علی اینڈ کمپنی کی کوئی گاڑی نمودار ہوجائے تو ڈرائیور کو میرے اوپر سے گاڑی گزار کے کتنی خوشی ہوگی۔ میں فون کردیتا تو شیر خان کو فوراً گاڑی میں روانہ کردیا جاتا اور غنی ایسا ہی چاہتا تھا مگر میں نے اسے روک دیا۔ وہ کسی مستعد محافظ کی طرح ہر طرف دیکھتا ہوا میرے ساتھ چلتا رہا۔ مجھے اس راستے سے پیدل جانا ایک اچھا تجربہ لگا۔

اس وقت مجھے بڑی خوش گوار حیرت ہوئی جب بہت سے لوگوں نے مجھے پہچان کے سلام کیا۔ چند ایک نے عقیدت مندی سے مصافحہ کیا اور بڑی عاجزی کے ساتھ درخواست کی کہ میں ایک پیالی چائے کی پی کے انہیں عزت دوں۔ میں نے غنی کے احتجاج کے باوجود یہ دعوت قبول کرلی۔ وہ ایک چھوٹا سا چائے خانہ تھا جس کے باہر لکڑی کے بنچ اور تخت پڑے ہوئے تھے۔ میں وہاں بیٹھا تو میرے اردگرد دس پندرہ افراد اکٹھے ہوگئے وہ مجھ سے بولتے رہے

کہ میرے دورے کا کیا مقصد ہے کیا میں یہاں بھی کوئی اسکول یا اسپتال قائم کرنا چاہتا ہوں؟ میں نے یہ سیاسی بیان داغنے میں حرج نہ سمجھا کہ ابھی میں جائزہ لے رہا ہوں۔
مجمع بڑھنے لگا تو غنی کی پریشانی بھی بڑھ گئی۔ بالآخر مجھے اس کی بات ماننا پڑی۔ وہیں سے ایک نیاز مند نے مجھے تانگے میں ست بدھائی پہنچانے کی پیشکش کی اور میرے قبول کرنے سے ایسے خوش ہوا جیسے میں نے اسے اپنی کابینہ میں شامل کرلیا ہو۔
دس کلومیٹر کا یہ فاصلہ تانگے نے ایک گھنٹے میں طے کیا۔ غنی کے نزدیک یہ ایک خطرناک ایڈونچر تھا اور میں نے بہت زیادہ سیکیورٹی رسک لیا۔ تانگا جب ست بدھائی کے پل پر سے گزرا تو میں نے دیکھا کہ دریا میں اتنا پانی ہے کہ اسے میں تیر کے بھی عبور نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے غنی سے کہا کہ یہ سب پانی جمع کیا جائے جو بہ کر ضائع ہوگا تو اس سے کتنے فائدے حاصل ہوسکتے ہیں۔ غنی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میری اسکیم سے زیادہ میری سیکیورٹی کی فکر نے اسے دبلا کردیا تھا۔
جب تانگا گیٹ کے سامنے رکا تو سیکیورٹی گارڈ اڈے... کوئی تانگا آج تک حویلی کے دروازے تک نہیں پہنچا تھا۔ یہ حفاظتی نقطہ نظر سے ویسے ہی خلاف ورزی تھی جیسے بھارتی طیارہ پاکستان کی حدود میں داخل ہوجائے۔ قریب آنے پر انہوں نے مجھے دیکھا تو سٹپٹائے اور سلیوٹ کے بعد پلٹ کر گیٹ کھولنے دوڑے۔
اندر پہنچنے کے بعد کیا ہوا... یہ اندازہ کیا جاسکتا ہے مگر میں نے ایک دفاعی حکمتِ عملی پہلے ہی سوچ لی تھی۔ میں نے کسی کی بات کا کوئی جواب نہ دینے کا فیصلہ کیا تھا لیکن بند کمرے میں اتنا شور شرابا ہوا اور ست بدھائی کے حکمراں کے خلاف راست اقدام کا خطرہ پیدا ہوگیا تو مجھے سب بتانا پڑا... مخالفین نے مذمت سے لعنت ملامت تک سب کچھ کیا لیکن آخر کار میری وضاحت قبول کرلی گئی۔
موقع ملتے ہی میں نے ڈی آئی جی عبداللہ جان کو فون کیا۔ میں نے کہا۔ ”آج کس وقت آپ فارغ ہوں گے؟“
”کسی بھی وقت نہیں“ اس نے خوش دلی سے کہا۔ ”دراصل یہاں ایک شادی کا سیاسی اجتماع ہے... اس میں وزیرِ داخلہ بہ قلم خود تشریف لا رہے ہیں... وہ میرے باس ہیں۔“
”آپ ان کے استقبال کی تیاریوں میں لگے ہوئے ہیں؟“
”یہ میرے فرائض میں شامل ہے... سیکیورٹی اور پروٹوکول... پولیس کی زیادہ تر نفری اسی کے لیے وقف رہتی ہے... امن و امان اور قانون کی عمل داری کے مسائل اس ملک میں ہیں بھی نہیں...“
میں نے ہنس کے کہا۔ ”چلیے پھر میں نے ڈسٹرب کیا... اس کے لیے میری طرف سے معذرت۔“
”آپ نے مجھے ایک اور ڈیوٹی یاد کرادی... اس شادی میں آپ کے لیے بھی دعوت نامہ ہے میرے پاس... میرے آفس میں رکھا ہے۔“
میں نے حیرانی سے کہا۔ ”شادی کس کی ہے؟“
اس نے جہلم کی ایک سکہ بند سیاسی شخصیت کا نام لیا۔ ”ان کے بیانات سے آپ ضرور محظوظ ہوتے رہے ہوں گے۔“
”میں جانتا ہوں وہ لوٹا پارٹی کے بانی ارکان میں شمار ہوتے ہیں لیکن میرا ان سے کیا واسطہ؟“
”نواب صاحب... آپ ایک سیاسی شخصیت بن چکے ہیں۔“
میں نے کہا۔ ”اچھا! یہ میرے لیے ایک اطلاع ہے۔“
”رانا صاحب کا نام آپ سے اوپر ہے... لیکن آپ کو بھی آنا ہے... اور مجھے آپ کو لانا ہے۔“
”یعنی میں انکار نہیں کرسکتا۔“
”میں کارڈ آپ کو بھجواتا ہوں... ممکن ہے آپ کی ملاقات کچھ ایسے لوگوں سے ہو جن کی آپ کو آئندہ ضرورت پڑے... اب کوچۂ سیاست میں آپ نے قدم رنجہ فرمادیا ہے تو یہ سب ناگزیر ہے... تعلقاتِ عامہ... یہ لفظ سب کور کرلیتا ہے... سیاسی وابستگی... کاروباری تعلق... سماجی رشتے... ذاتی مراسم۔“ اس نے کہا۔ ”یہ SURVIVAL کے رشتے ہیں۔“
”میں سمجھ گیا... ان کے بغیر کوئی چنا بھی بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔ یہ فرمائیے کہ میں اپنے سیکریٹری یا پی آر او کو ساتھ لا سکتا ہوں؟“
”بالکل لاسکتے ہیں... لیکن ان کو وی آئی پی انکلوژر سے الگ دوسری کیٹگری میں اپنے جیسے لوگوں کے ساتھ بیٹھنا ہوگا اگر شوفر بھی ہوگا تو تیسری کیٹگری میں... اچھا مجھے اجازت۔“
دعوت نامہ مجھے تین گھنٹے بعد ایک موٹر سائیکل سوار نے پہنچادیا... معلوم نہیں وہ ڈی آئی جی صاحب کے عملے کا بندہ تھا یا کوریئر سروس کا نمائندہ... وہ باہر ہی سے غنی کو کارڈ دے کر رخصت ہوگیا... راجا نے بڑی دلچسپی سے کارڈ کو دیکھا... یہ شادی بھی دو ایسے خاندانوں کو رشتے کی زنجیر سے باندھ رہی

تھی جو سیاست میں ہمیشہ ایک دوسرے کے حریف سمجھے جاتے تھے... پبلک کیا جانے کہ اوپر کی سطح پر کوئی لال جھنڈے والی پارٹی کے پالتو کتے کی طرح بھونکتا ہو یا سبز جھنڈے والی جماعت کے لیے... جیسے ہر کتا بہرحال کتا ہوتا ہے... ایسے ہی ان سب کا آپس میں نسلی رشتہ تھا... وہ سب حکمراں نسل سے تعلق رکھتے تھے۔
میں راجا کے ساتھ پورے پروٹوکول سے گیا۔ آگے پیچھے سیکورٹی گارڈ... درمیان میں میری گاڑی... روانگی سے پہلے راجا نے ایک نئی حرکت کی... اس نے خواتین کی مدد سے ایک جھنڈا ڈیزائن کیا۔ یہ بڑا رنگ برنگا جھنڈا تھا... اس میں چاروں خواتین نے الگ الگ رنگ کے پرانے ریشمی ملبوس سے اپنا حصہ ڈالا تھا۔ نیلے پیلے لال اور ہرے رنگ کے چار مستطیل ٹکڑے ایسے جوڑے گئے تھے کہ سلائی نظر نہ آتی تھی۔ درمیان میں ایک سیاہ دائرہ تھا جس پر ریشم نے سفید ریشمی دھاگے سے کشیدہ کاری کے کمال کا مظاہرہ کیا تھا اور نصف دائرے میں ”ست بدھائی“ کے حروف کاڑھے تھے... بیچ میں ایک ستارہ تھا۔
راجا نے یہ رنگین جھنڈا غنی کی مدد سے کار پر لگایا۔ ”آج سے اسے ست بدھائی کا سرکاری پرچم قرار دیا جاتا ہے۔“
رابعہ نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ”کل سے ایسا ہی پرچم حویلی پر لہرائے گا۔“
میں نے کہا۔ ”مجھے بھی انہی چار رنگوں والی ٹوپی پہنادو بلکہ ریاست کی حدود میں اس کا استعمال لازمی قرار دے دو۔“
ریشم نے انگریزی میں فرمایا۔ ”آئی فلیگ انوینٹ... آئی پرائز گیٹ مسٹ“ جس کا مطلب یہ تھا کہ میں نے جھنڈا ایجاد کیا ہے چنانچہ مجھے انعام ملنا چاہیے۔
شہناز نے کہا۔ ”تم کچھ اور بھی ایجاد کررہی ہو... کیا غنی نے اس کا کوئی انعام دیا ہے۔“
جب وہ شرما کے اور منہ چھپا کے بھاگی تب مجھ ناقص العقل کو یہ بات لیلی بھابی نے سمجھائی کہ وہ امید سے ہے۔
ایک وسیع میدان میں اس شادی کے انتظامات کیے گئے تھے۔ یہ ایک کالج کا گراؤنڈ تھا۔ ایک عجیب اتفاق یہ ہوا کہ میں پہنچا تو رانا اپنی گاڑی سے اتر رہا تھا۔ اس کی گاڑی پر ”ایم پی اے“ کی چمک کے حروف والی پلیٹ ضرور ہوتی تھی لیکن جھنڈا کوئی نہیں تھا۔ استقبال کرنے والوں نے میری گاڑی کے جھنڈے کو کسی نامعلوم ملک کا جھنڈا سمجھ لیا اور فرض کرلیا کہ اسلام آباد سے اس ملک کا سفیر شادی میں شرکت کے لیے پہنچا ہے... وہ سب کیمرے اٹھا کے میری گاڑی کی طرف دوڑے... ان کے ساتھ میڈیا کے رپورٹر بھی بھاگے اور میں نے اس صورتِ حال کو دو طرح انجوائے کیا۔ ایک میڈیا والوں کی غلط فہمی دیکھ کر اور دوسرا رانا کی صورت پر حسد کے جذبات دیکھ کر... بیک وقت مجھ پر تین وڈیو کیمروں کی لائٹ پڑی اور متعدد اخبار نویسوں کے فلیش چمکے۔
میں نے سوٹ کے ساتھ ٹائی باندھ رکھی تھی اور راجا نے بھی۔ اس نے رانا کی صورت دیکھی تو مزید ڈراما کیا۔ وہ آگے آگے چلنے لگا اور ہاتھ کے اشارے سے سب کو راستہ دینے کے لیے کہتا رہا۔ ”ہز ایکسیلنسی پریس کے کسی سوال کا جواب نہیں دیں گے۔“
اخبار والوں نے حسبِ توقع سیاسی سوالات داغ دیے تھے۔ میرے بالکل قریب آکے ایک رپورٹر نے مائک تقریباً میرے منہ میں ٹھونس دیا۔ یور ایکسیلنسی... آپ کیا سمجھتے ہیں اس شادی سے دونوں جماعتوں میں اشتراک کے امکانات روشن ہوں گے؟“
میں نے مسکرا کے فرنچ میں جو کچھ کہا اس کا ترجمہ یہ بنتا تھا کہ اے میری محبوب آخر تم کب تک مجھے اپنی قربت سے محروم رکھو گی... یہ ایک گانے کے بول تھے... مجھے لندن میں قیام کے دوران کچھ فرنچ ضرور آگئی تھی لیکن اتنی نہیں کہ میں روانی سے بول یا پڑھ سکوں... اخبار نویس میرے جواب پر سٹپٹایا اور اس نے راجا سے پوچھا۔ ”ہز ایکسیلنسی نے کیا فرمایا۔“
راجا نے متانت سے کہا۔ ”وہ فرماتے ہیں کہ چاند اور سورج کے درمیان فاصلے میں بھی کشش ہے۔“
اس وقت تک میں پنڈال میں داخل ہوگیا تھا۔ راجا کی وضاحت نے اخبار نویس کو چکرا دیا ہوگا... اس نے فافث پوچھا۔ ”ہز ایکسیلنسی کا کس ملک سے تعلق ہے؟“
”ڈیموکریٹک اسلامک ری پبلک آف ست بدھائی سے۔“ اور میرے پیچھے اندر آگیا۔ اس نے میرے کان میں کہا۔ ”قسم اللہ کی ٹھیکے پتر... مزہ آگیا آج رانا کی شکل دیکھ کے... ساتھ ہمارے استقبال کو دیکھ کر بچ کباب ہوگیا ہے۔“
میں نے کہا۔ ”واقعی جلنے کی بو آرہی ہے دور سے بھی۔“
اس غلط فہمی کی گڑبڑ میں کسی نے دعوت نامہ دیکھنے کی زحمت یا جرأت ہی نہیں کی اور میرے ساتھ راجا بھی وی آئی پی گیٹ سے اس پنڈال میں پہنچ گیا جہاں سارے سیاست داں، بیوروکریٹ، جنرل اور صنعت کار یا وڈیرے صوفوں پر تشریف فرما تھے۔ وہاں نہ میں کسی کو جانتا تھا اور نہ کوئی مجھے۔

مجھ سے زیادہ لوگوں کو را جا پہچانتا تھا۔ اس کے بتانے پر میں خود کئی لوگوں سے ایسے ملا جیسے ان سے شناسا ہوں۔ وہ ہے محکمۂ موسمیات کا ڈائریکٹر جنرل... میں نے اس سے ہاتھ ملا کے کہا۔ ''اوہ ہو... کیسے چوہدری صاحب... کیسے ہیں آپ؟'' تو اخلاقاً اس نے بھی مسکرا کے ہاتھ ملایا اور میرا حال پوچھا۔ ایسا کئی لوگوں کے ساتھ ہوا۔ وہ اپنی یادداشت میں میرا نام تلاش کرتے رہے کہ مجھ سے کب اور کہاں ملے تھے۔ جب میں اس اجتماع میں تھا تو یقیناً کوئی وی آئی پی تھا۔ اس لیے کیسے پوچھا جاسکتا تھا کہ آپ کون ہو؟

میری یہ ایکٹوٹی رانا نے بڑے تجسس اور پریشانی کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دیکھی۔ شاید اسے یہ تشویش بھی ہوگی کہ ارباب اختیار کے حلقے میں میرے مراسم اتنے لوگوں سے کب اور کیسے ہوگئے۔ یہاں یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ ہر ایک کو بتاتا پھرتا کہ میری حقیقت کیا ہے۔

تقریب دیر سے شروع ہوئی تھی۔ وزیر داخلہ کے علاوہ اس اجتماع میں صوبائی اسمبلی کے ڈپٹی اسپیکر اور تین وزرائے مملکت بھی شریک تھے۔ رات بارہ بجے کھانا چل رہا تھا کہ ایک خوش پوش نوجوان نے میرے قریب آ کے کہا۔ ''مسٹر رفیق احمد شیرازی!''

میں نے چونک کے اسے دیکھا کہ مجھے نواب نہ کہنے والا کون ہوسکتا ہے اور سر ہلا کے کہا۔ ''جی... فرمایئے۔''

''محترم وزیر داخلہ آپ سے ملاقات کے متمنی ہیں۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''میں ان کا پولیٹیکل سیکریٹری ہوں... غضنفر علی۔''

میں نے کہا۔ ''وہ کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں؟''

''اس کا مجھے علم نہیں... تشریف لایئے۔'' وہ بولا۔

میں کھانا ختم کر چکا تھا چنانچہ اس کے ساتھ ہولیا۔ وہ مجھے پنڈال سے گزار کے اندر لے گیا جہاں وزیر داخلہ صاحب نے کالج کے پرنسپل کا کمرا اس ملاقات کے لیے کھلوا لیا تھا۔ مجھے اس کا نام بھی معلوم تھا اور ٹی وی پر اس کی صورت میں نے بار بار دیکھی تھی۔

اس نے بڑی خوش اخلاقی سے مگر اٹھے بغیر ہاتھ بڑھا کے کہا ''آیئے جناب... تشریف رکھیے... کیسے ہیں آپ؟''

میں اس کے سامنے بیٹھ گیا تو پی اے باہر چلا گیا۔ وزیر صاحب کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے اپنا اعتماد بحال رکھا اور کہا۔ ''آپ نے اپنی مصروفیت میں سے وقت نکالا اس ملاقات کے لیے... اس کے لیے میں حقیقتاً آپ کا شکرگزار ہوں کہ آپ نے عزت افزائی کی لیکن یہ نہیں سمجھا کہ مقصد کیا ہے؟''

''ابھی سمجھا دیتے ہیں جی... کیا نام ہے آپ کا... ہاں رفیق احمد... کیا نواب اور شیرازی کہنا ضروری ہے؟''

میں نے کہا۔ ''اس تکلف کی قطعی ضرورت نہیں۔''

''رفیق احمد... تم یہ سب کیوں کر رہے ہو؟'' اس نے خاصے سپاٹ بلکہ ناگوار لہجے میں کہا۔

''میں سمجھا نہیں آپ کا اشارہ کدھر ہے؟''

''یار اتنے ناسمجھ تو نہیں ہو تم... یہ تم نے کون سی ریاست قائم کرلی ہے ریاست کے اندر... جس کے تم خود ہی حکمران بن بیٹھے ہو۔''

اب میں مقصدِ ملاقات سمجھ گیا... میں نے کہا۔ ''ضرور کسی نے آپ کو غلط اطلاع دی ہے... ست بدھائی میری آبائی جاگیر ہے... لوگوں نے مجھے نواب کہنا شروع کردیا ہے میرے منع کرنے کے باوجود... میں ایک قانون کا پابند پاکستانی ہوں۔''

''پھر تم یہ کام کیوں کر رہے ہو جو حکومت کرتی ہے؟''

سمجھنے کے باوجود میں نے کہا۔ ''میں قانون کے دائرہ اختیار سے باہر کچھ نہیں کرتا... آپ کس کام کے حوالے دے رہے ہیں؟''

''تمہارے علاقے میں حکومت نے صحت اور تعلیم کی سہولت فراہم کرنے کے لیے سب کچھ کیا ہے... کروڑوں روپے صرف کیے ہیں۔''

''ضرور کیے ہوں گے... لیکن ہر شہر میں یہاں تک کہ اسلام آباد میں بھی پرائیویٹ اسکول اور اسپتال ہیں۔''

''مگر یہاں تم حکومت کو بدنام کرنے کے لیے ایسا کر رہے ہو۔ سیاسی فائدہ اٹھانا چاہتے ہو۔'' وہ اب باقاعدہ خفا تھا۔

''یہ غلط مفروضہ ہے... میرے مخالفین کا پروپیگنڈا ہے۔''

''کون ہے تمہارا مخالف... رانا رجب علی؟ جس کی تین نسلوں نے اس علاقے کے عوام کی فلاح و بہبود کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر رکھی ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''کون سا اسکول یا اسپتال قائم کیا ہے انہوں نے... میں ضرور دیکھنا چاہوں گا۔''

اس نے ایک فائل اٹھالی۔ ''پتا یہ چلا ہے کہ تم یہاں کوئی ڈیم بھی بنانا چاہتے ہو؟ تم کالا باغ ڈیم کیوں نہیں بناتے؟''

میں نے کہا۔ ''ڈیم بنانا میرا کام ہی نہیں۔''

اس نے کہا۔ ''سنا ہے تم اگلے الیکشن میں رانا صاحب

کے مقابلے پر آنا چاہتے ہو؟''

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''جی سر... بالکل صحیح سنا ہے آپ نے۔''

''اور اس کے لیے تم نے ایک پارٹی میں شمولیت بھی اختیار کرلی ہے۔'' وزیر داخلہ کا لہجہ پُرعتاب تھا۔

میں نے کہا۔ ''شامل ہونے کی بات نہیں... میں پہلے سے اس میں ہوں... شاید آپ کے علم میں نہ ہو... مجھے پارٹی نے ٹکٹ دینے کا فیصلہ بھی کرلیا ہے... حالانکہ الیکشن ابھی دور ہیں۔''

اس کا چہرہ بگڑ گیا۔ ''کس بنا پر تمہاری پارٹی نے یہ احمقانہ فیصلہ کیا... کیا تمہارے ووٹ ہیں اس علاقے میں... اب سے دو سال پہلے تمہارا نام کوئی نہیں جانتا تھا... اور آج اس علاقے کے عوام میں تمہارا دوست ایک بھی نہیں... سب دشمن ہیں۔''

میں نے مسکرا کے کہا۔ ''پہلے میری ضمانت ضبط ہوجائے گی... رانا صاحب کو فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔''

''مسٹر رفیق... میں تمہیں خبردار کرتا ہوں... تمہارے خلاف مسلسل شکایات موصول ہورہی ہیں کہ تم علاقے کے عوام کو گمراہ کر رہے ہو... ان میں اشتعال پھیلا رہے ہو... تمہارے مراسم ڈاکوؤں سے ہیں اور تمہاری حویلی ایک عیاشی کا اڈا بنی ہوئی ہے... جب سے تم نے لڑکیوں کو پڑھانے کے لیے حویلی میں بلانا شروع کیا ہے... فحاشی بڑھ گئی ہے۔''

میں نے خاموش رہنا اور برداشت کرنا بہتر سمجھا۔

''آپ کہیے میں سن رہا ہوں... لیکن جواب نہیں دوں گا... جب تک کہ الزام کسی عدالت میں نہ لگایا جائے۔''

وہ چراغ پا ہوگیا۔ ''یہ بھی بہت جلد ہوگا... مردوں نے ہمیں بتایا ہے کہ ان کے گھر کی عزت محفوظ نہیں... لڑکیوں کے یارانے بڑھ گئے ہیں۔ وہ عاشقانہ خط لکھتی ہیں... پڑھنے کے بہانے حویلی میں غلط قسم کے لوگوں سے ملتی ہیں... ایک لیڈی ڈاکٹر ان کے حمل گراتی ہے... گاؤں میں نوزائیدہ بچے پڑے ہوئے ملے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''پھر آپ نے مجھے کیوں چھوڑ رکھا ہے ابھی حکم دیں میری گرفتاری کا... میرے خلاف سارے کیس رجسٹر کرا دیں... آپ کا ایک اشارہ کافی ہے لیکن اس سے پہلے اپنے منتخب نمائندے کو قانون کے کٹہرے تک تو لے جایئے جس کے خلاف قتل... اغوا اور حبسِ بے جا جیسے سنگین جرائم کے مقدمات درج ہیں۔''

اس نے ایک دم اپنا لہجہ بدل لیا۔ ''نواب رفیق احمد شیرازی تم حکومت کے خلاف نفرت پھیلا رہے ہو۔''

''میں ایسا کوئی کام نہیں کر رہا ہوں... اور نہ کروں گا... برطانیہ میں دولتِ مشترکہ کے لیے خارجہ کمیٹی کے ایک رکن ہیں لارڈ ارنسٹ... وہ مجھے ذاتی طور پر جانتے ہیں اور ضرورت پڑی تو میں پاکستان کے چوٹی کے وکیلوں کے ساتھ برطانیہ سے لارڈ ارنسٹ کی کمپنی کے قانونی مشیر کو بلاؤں گا... میں اس کمپنی کا اعزازی ڈائریکٹر بھی ہوں۔''

میں نے دیکھا کہ وزیر داخلہ کے چہرے کے تاثرات ایک دم بدلے۔ ''میں سمجھتا ہوں آپ کو ترقیاتی کام عوام کے منتخب نمائندے رانا رجب علی کے ساتھ مل کر کرنے چاہئیں۔''

''کیا آپ نے انہیں قائل کرلیا ہے؟''

''وہ میں کرلوں گا... پہلے تم ان کے ساتھ صلح کرو۔''

''اور میں انکار کروں... پھر؟ کیا مجھے تباہ کردیا جائے گا... مجھ پر مقدمات بنا دیے جائیں گے... میری زمین پر قبضہ ہوجائے گا۔ حویلی بم سے اڑا دی جائے گی... آپ کھل کے کیوں نہیں کہتے... ابھی الیکشن میں وقت ہے... پولیس اور سارے انٹیلی جنس کے ادارے آپ کی کمان میں ہیں... لیکن میں بھی بتا دوں کہ اس سے حکومت کو بدنامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔''

اس نے میز پر مکا مارا۔ ''ہمارے پاس مصدقہ اطلاعات ہیں کہ تم نے اپنی پرائیویٹ آرمی بنالی ہے... مسٹر شیرازی... تم پر بغاوت کی سازش کا کیس بنتا ہے۔''

''بنتا ہے تو ضرور بنائیں... لیکن پرائیویٹ سیکیورٹی گارڈز تو آپ کے بھی ہوں گے... سیکورٹی کمپنی کسی کو بھی فراہم کرسکتی ہے۔''

''ان کے پاس لائسنس ہوتا ہے... تمہیں یہ لائسنس کس نے دیا ہے کہ اپنی فوج بناؤ... اور علاقے میں دہشت پھیلاؤ... وہ کلاشنکوف لے کر تمہارے ساتھ چلتے ہیں... ممنوعہ بور کا اسلحہ رکھنا جرم ہے۔''

میں نے کہا۔ ''آج کا اخبار اٹھا کے دیکھیے... ایک پیر اور مولانا کے آگے پیچھے کتنے لوگ کلاشنکوف اٹھائے چل رہے ہیں... کیا آپ نے ان کا لائسنس چیک کیا؟ اور ابھی جو میزبانوں نے شادی کی خوشی میں کلاشنکوف کے راؤنڈ چلائے ہیں......''

وہ دھاڑنے لگا۔ ''شٹ اپ... تم جانتے نہیں تم کس سے بات کر رہے ہو... میں چاہوں تو تمہارے خلاف ایک سو ایک مقدمات کھڑے کر دوں۔ کوئی عدالت تمہاری ضمانت

منظور نہ کرے... ساری عمر جیل میں سڑا سکتا ہوں میں تمہارے سارے خاندان کو... تمہیں غائب کرا سکتا ہوں... ایسے کہ ساری عمر تمہارے لواحقین کو تمہارا سراغ نہ ملے۔"

میں نے کہا۔ "بے شک آپ یہ سب کچھ کر سکتے ہیں... مگر ابھی اس ملک میں ایک نظام انصاف زندہ ہے... پہلے اسے ماردیں... مگر اس کے اوپر جو انصاف کرنے والا بیٹھا ہوا ہے... اس کا ہاتھ آپ کیسے پکڑیں گے... کیا آپ نے سنا نہیں کہ مارنے والے سے بچانے والے کا ہاتھ زبردست ہے... اور آپ کی یہ خدائی کتنے دن کی ہے... اس کو بھی دھیان میں رکھیں... خدا حافظ۔"

میں نے فلمی ہیرو کی طرح ایک جذباتی تقریر داغ دی تھی۔ کمرے سے باہر آتے ہی مجھے احساس ہوا کہ غصے میں عقل کا دامن ہاتھ سے چھوڑ کے میں نے شاید اپنے پیروں پر کلہاڑی مار لی ہے لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ جو سچ تھا وہ میرے منہ سے نکل گیا۔ جذبات کی اس طوفانی لہر کو مصلحت کے تقاضوں کا بند باندھ کے روکنا میرے بس میں نہ رہا تھا۔

باہر آکے میں نے دیکھا کہ بیشتر مہمان رخصت ہو چکے ہیں لیکن رانا بڑی شان سے براجمان ہے۔ اس کی نظروں میں میرے لیے ایک سوال تھا کہ کھو تواب کے نطفے... کیسی رہی ملاقات؟ رانا سے عداوت مول لینے کا انجام دیکھا؟ اس کے لبوں پر ایک فاتحانہ حقارت آمیز اور پرغرور مسکراہٹ تھی۔

میں نے راجا سے کہا۔ "چل اٹھ... ابھی وقت ہے ہم نکل جائیں۔"

اس نے حیرانی سے مجھے دیکھا۔ "ایسا کیا ہو گیا ٹیکے پتر؟"

میں نے اس کا بازو کھینچا۔ "بس کھیل ختم ہوا... اپنی حماقت سے۔"

"ارے کچھ منہ سے بول... آخر ہوا کیا ہے؟" راجا نے خوش دلی سے پوچھا۔

اس وقت تک مجھے احساس ہو چکا تھا کہ میں کتنی بڑی بے وقوفی کر چکا ہوں... میں نے راجا کو سب بتا دیا۔ لیکن مجھے بڑی حیرت ہوئی جب اس نے مجھے نہ برا بھلا کہا نہ لعنت ملامت کی۔ وہ آرام سے بیٹھا باہر دیکھتا رہا۔ میرے خاموش ہونے کے بعد اس نے کہا۔ "اور کیا ہوا؟"

میں نے بگڑ کے کہا۔ "راجا... یہ جو بھی ہوا... کیا یہ کم تھا؟"

اس نے ہنس کے کہا۔ "کچھ نہیں یار تو ڈر گیا... اب اس کی تو ماں بہن ایک کر دیتا... سالے کو اس کی اوقات یاد دلا دیتا۔"

میں نے کہا۔ "راجا... کیا تو پاگل ہو گیا ہے... کل شاہی فوجیں ست بدھائی پر چڑھائی کر دیں گی... تہس نہس کر دیں گی حویلی کو... ہم پھر شاہی قلعے میں رہیں گے... سرکاری مہمان بن کے... ختم ہوا ست بدھائی کا ترقیاتی پروگرام۔"

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ مارا۔ "ایسا کچھ نہیں ہو گا ٹیکے پتر... تو دیکھتا جا... ایسے کئی وزیر بھگت چکے ہیں ہم... کلہاڑی تو نے نہیں اس نے ماری ہے اپنے پاؤں پر... اس نے اپنی اننگ کھیل لی... اب شروع ہوتی ہے ہماری اننگ... دیکھ یہ پہلا چھکا۔"

راجا نے موبائل ٹیلی فون سے کوئی نمبر ملایا۔ "ہاں میرے لختِ جگر... ایٹم بم بنا لیا تو نے... شاباش ہے... آفرین ہے میرے سائنس دان پر۔ اب دیکھتا جا... دھما کا کب ہوتا ہے؟" پھر اس نے فون بند کر دیا۔

میں نے پوچھا۔ "یہ کون تھا؟ کس ایٹم بم کی بات کر رہا تھا تو؟"

"اتنی جلدی کیا ہے... سب سامنے آجائے گا ٹیکے پتر۔"

میں نے خفگی سے کہا۔ "راجا میں اتنا اپ سیٹ ہوں..."

"اپ سیٹ مت ہو... کوئی اچھی بات سوچ... وزیر داخلہ کو بھول جا... ایشوریا رائے کے بارے میں سوچ... اس کا تصور کر... اپنی پسند کے کپڑوں میں... یا کپڑوں کے بغیر... تیری مرضی۔"

میں سمجھ گیا کہ اس وقت میرا کوشش کرنا لا حاصل ہو گا۔ راجا کچھ بتائے گا نہیں۔ اس کے رویے سے میری کچھ ڈھارس بندھی تھی۔ اس کے پاس میرے دفاع کے لیے کچھ تھا جس پر اسے بہت اعتماد تھا۔ سوال یہ تھا کہ ایسی کیا چیز ہو سکتی ہے... راجا صرف ایک صحافی تھا... کیا وہ اس خیال سے مطمئن ہے کہ کسی پریس کانفرنس میں میری اور وزیر داخلہ کی ساری گفتگو کا بھانڈا پھوڑ دے گا۔ کسی ثبوت کے بغیر... اگر وہ ایسا کرتا ہے تو یہ مزید خرابی ہو گی... وزیر صاحب کے لیے انکار کرنا اتنا ہی آسان ہے جتنا مجھے اٹھوانا یا میرے خلاف مقدمات درج کرانا... جھوٹ تو وزیر ایسے بولتے ہیں جیسے وہ سانس لیتے ہیں۔

گاڑی پھر حویلی میں داخل ہوئی تو رات کے دو بجے تھے۔ راجا اب بھی بہت اچھے موڈ میں تھا۔ میں نے ایک بار پھر کوشش کی۔ "راجا... یہ کیا رویہ ہے... میں اتنا پریشان ہوں۔"

"ڈیل کارنیگی کی کتاب "پریشان ہونا چھوڑیے... جینا شروع کیجیے۔" تیرے پاس نہیں ہے تو کوئی بات نہیں... آنکھیں بند کر کے سو جا اور نیلے خواب دیکھ... صبح بات کریں گے۔"

میں بھنّا کے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ راجا کا اعتماد مجھے پُرسکون کرنے کے لیے کافی نہیں تھا۔ میں سونے کی کوشش میں جاگتا رہا۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ سکون کے لیے مجھے کسی دوا کی طلب محسوس نہیں ہوئی۔ مجھے نور جہاں کی یاد آئی۔ یہ جادو اس کے پاس تھا کہ صرف اپنی قربت سے وہ میرے دل میں دماغ میں بھڑکتی آگ کو بھی شبنم کی طرح سرد کر سکتی تھی۔ ایسا کئی بار ہوا تھا جب میں پریشان تھا اور اس نے یوں میری پریشانی کو اپنے وجود میں جذب کر لیا تھا جیسے بعض سپیرے منہ سے چوس کر خطرناک سانپ کا زہر نکال دیتے ہیں۔

مجھے احساس تھا کہ میں نے وزیر داخلہ کی دشمنی مول لے کر بہت بڑی حماقت کی ہے۔ شاید میں سیاست کر ہی نہیں سکتا۔ اس کے لیے بہت زیادہ منافقت چاہیے۔ مصلحت اور مصالحت کا وہ جذبہ چاہیے کہ آدمی سب برداشت کر سکے۔ بے شرم اور بے غیرت ہو جائے اپنے خیالات کی یلغار سے تنگ آکے میں نے شہناز سے رجوع کیا۔ تھوڑے سے تامل کے بعد اس نے مجھے اپنے بیگ سے ایک خواب آور گولی نکال کے دے دی۔ اسے میرے رویے اور میری صورت سے اندازہ ہو گیا تھا کہ مجھے یہ دوا ملنی چاہیے۔

جب دوا کے اثر سے میں سویا تو میری نیند ڈسٹرب رہی اور دوا کا اثر بھی زیادہ دیر نہیں رہا۔ پریشانی اور تفکرات کے جراثیم نے دوا کی طاقت کو شکست دے دی اور چار گھنٹے بعد میں اٹھ بیٹھا۔ اس وقت تک سورج طلوع ہو چکا تھا۔ میں نے غسل پہلے کیا۔ اس سے مجھے کچھ فرحت ملی۔ پھر میں نے کافی طلب کی اور باہر لان میں ٹہلنے لگا۔

راجا ابھی سو رہا تھا۔ میں نے ایک موٹر سائیکل کی آواز سنی جو گیٹ پر آکے رک گئی۔ کچھ دیر بعد گارڈ نے مجھے ایک پیکٹ لا کے دیا۔ میں نے اسے کھول لیا کیونکہ اس پر کسی کا نام نہیں لکھا ہوا تھا۔ اس کے اندر سے ایک ٹیپ برآمد ہوا۔

میں نے اسے الٹ پلٹ کے دیکھا اور گارڈ سے پوچھا۔ "یہ کون لایا تھا... اپنا نام بتایا اس نے؟"

"نہیں سر!... کہنے لگا راجا صاحب کو دینا ہے۔ اور واپس چلا گیا۔ جوان لڑکا تھا۔" گارڈ نے کہا۔

اسی وقت راجا آنکھیں ملتا نمودار ہوا۔ ٹیپ کو دیکھ کے اس نے نعرہ لگایا۔ "مل گیا ایٹم بم۔"

میں نے کہا۔ "راجا... کیا ہے اس ٹیپ میں؟"

راجا مسکرایا اور بولا۔ "آجا اندر... اپنی آواز بھی سن لے۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ "یہ... اس گفتگو کا ٹیپ ہے جو وزیر داخلہ نے مجھ سے کی؟"

راجا نے قہقہہ مارا۔ "تو نے ایک فلم کا وہ ڈائیلاگ ضرور سنا ہو گا... میں وہ بلا ہوں شیشے سے پتھر کو توڑ دوں۔"

میں نے کہا۔ "لیکن... تجھے کیسے معلوم ہو گیا تھا پہلے سے... اور وہاں ٹیپ ریکارڈر کیسے لگایا تو نے؟"

"ٹیکے پتر... جب مجھے معلوم ہوا کہ وزیر داخلہ صاحب نے تجھ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی ہے تو میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کیا کہیں گے۔ وہ کالج کے پرنسپل کا کمرا تھا۔ قسمت اچھی تھی کہ مجھے کچھ وقت مل گیا۔ وزیر صاحب کا پی آر او اور میں ایک ساتھ کام کر چکے ہیں۔ اس نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا۔ میں نے باقی انتظام کیا۔ ٹیپ اس کمرے میں نہیں تھا۔ وہاں دو ایف ایم مائک تھے۔ ریکارڈنگ کسی اور نے باہر کی... آسنتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "اور اب تو اسے پریس کانفرنس میں سنوائے گا؟"

"ضروری نہیں... پہلے وزیر صاحب سن لیں... ایک کاپی انہیں بھی دیں گے..." راجا نے کہا۔

اندر کمرے کا دروازہ بند کر کے راجا نے ٹیپ کو کیسٹ پلیئر میں لگایا اور آن کر دیا۔ چند سیکنڈ کی سرسراہٹ کے بعد کمرے میں ایک آواز ابھری مگر یہ نہ میری آواز تھی نہ وزیر صاحب کی... یہ لتا کا گانا تھا... بلو نہ تم تو دل گھبرائے..."

میں نے راجا کی طرف دیکھا۔ اس کا رنگ اڑ گیا تھا۔

اس دلچسپ ترین کہانی کے بقیہ واقعات چھٹے حصے میں ملاحظہ فرمائیں

قسمت کے پھیر میں اُلجھے ایک نوجوان کی داستان

اناڑی

احمد اقبال

6

اناڑی الڑا

قسمت کے پھیر میں اُلجھے ایک نوجوان کی کتھا، حالات اور واقعات کا بہاؤ اُسے دیارِ غیر لے گیا جہاں وہ اناڑی تھا مگر خود کو کسی کھلاڑی سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ ایسا کھلاڑی جسے کسی بساط پر شکست نہیں دی جا سکتی تھی۔ اس کا اناڑی پن اُسے کھلاڑیوں کے مقابل کامیابیاں دلاتا رہا۔ اُسے پردیس راس آ گیا تھا جہاں کی ہنگامہ خیزیاں اس کا دل لبھاتی تھیں مگر دوسری طرف دیس میں اُس کی لاٹری کھل گئی، ایسی لاٹری کہ جس کے بعد اُسے لوٹنا تھا۔ اناڑی سے کھلاڑی بننے کے بعد...... وہ لوٹا...... تو ہنگامے اور شرارتیں اُس کے ساتھ تھیں۔ قدم قدم پر آنسو اور لحہ لحہ قہقہوں سے لبریز اُس اناڑی کی کہانی جس کا دل دو حصوں میں منقسم تھا۔

خوب صورت و گل رنگ جذبوں سے گندھی ایک تیز رفتار کہانی

میں نے کہا ”راجا... یہ کیا ہے؟“

راجا سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ ایسا لگتا تھا کہ راجا کے پلان میں کوئی سنگین گڑبڑ ہو گئی ہے یا کر دی گئی ہے۔ وزیرِ داخلہ کے ساتھ میری گفتگو ریکارڈ ہی نہیں کی گئی یا پھر ٹیپ بدل دی گئی۔

یہ صرف چند سیکنڈ کے اندیشے تھے۔ پھر اچانک لتا کی آواز بند ہو گئی اور ٹیپ ریکارڈ کے اسپیکر سے میں نے خود اپنی ہی آواز سنی۔ راجا کا چہرہ کھل اٹھا۔ میری آواز کے بعد محترم وزیرِ داخلہ کی آواز آئی تھی۔ ہم نے رسمی سلام دعا کا تبادلہ کیا تھا۔ آواز کچھ دور سے آتی محسوس ہوتی تھی والیوم بڑھانے سے تھوڑی سی سرسراہٹ میں اضافہ ہوتا تھا مگر گفتگو بالکل صاف سنی اور لکھی جا سکتی تھی۔

غالباً کیسٹ میں ٹیپ لگانے والے کو نئی ٹیپ نہ مل سکی اور اس نے لتا کے گانوں کی کوئی ٹیپ لگا کے ریکارڈنگ کر لی۔ یہی وجہ تھی کہ پلے کا بٹن دبانے سے چند سیکنڈ تک ایک گانے کے بول سنائی دیے تھے۔ پھر لتا کی آواز پر ہماری گفتگو ریکارڈ ہو گئی تھی۔

”یار میں تو پریشان ہو گیا تھا کہ یہ کیا ہو گیا۔“ راجا نے کہا۔

میں نے کہا۔ ”اب پہلے سن لے کہ وزیر صاحب نے کیا فرمایا تھا۔ تبصرہ بعد میں کرنا۔“

یہ گفتگو پندرہ منٹ کی تھی جس کا ہر لفظ صاف سنا اور سمجھا جا سکتا تھا۔ مجھے پھر اندازہ ہوا کہ غیر محتاط گفتگو میں میرا لہجہ بھی کسی حد تک جارحانہ ہو گیا تھا۔ وزیرِ داخلہ کی تو بات ہی کیا ایک معمولی ایس ایچ او یہ گستاخی برداشت نہ کرتا۔ جب یہ گفتگو ختم ہوئی تو لتا نے پھر گانا شروع کیا۔

راجا نے کیسٹ ریکارڈ بند کر دیا۔ ”ٹھیکے پتر! تو کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گیا تھا۔“

میں نے کہا۔ ”ہاں راجا جی۔ میرا بھی خیال ہے کو بے سیاست میں رہنا ہے تو مجھے اپنے مزاج اور فطرت کو بدلنا ہی ہو گا۔ خودی کو بلند رکھنے کی روش چھوڑ کے ہر ذلت کو ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے قبول کرنا۔ زبردست کے جوتے اٹھانا یا کھانا اور زیردست کو جوتے کی نوک پر رکھنا۔ منافقت، جھوٹ اور بے اصولی۔ مطلب پرستی اور کینہ پروری۔ یہ سب ابھی مجھے نہیں آئی۔“

”جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں۔ وقت بدل گیا ہے۔ شاعرِ مشرق کے ایسے تمام اشعار ان کے کلام سے ہی خارج کر دیے جائیں۔ مثلاً وہ... آئین جواں مردی

حق گوئی و بے باکی۔ خودی کو کر بلند اتنا۔ وغیرہ۔"

"یہی تو کیا تھا نواب رفیق احمد شیرازی نے۔ اب جلاب لگے ہوئے ہیں۔ تو کچھ کر یار۔"

اس نے مجھے تسلی دی۔ "ابے قبل از مرگ واویلا۔ پہلے سرکار کو کچھ کرنے دے۔" راجا نے کہا۔

"کیا مطلب ہے تیرا۔ جب وہ ست بدھائی کی اینٹ سے اینٹ بجادیں اور ہماری حکومت کا وہی حشر کر دیں جو نادر شاہ نے دلی کا کیا تھا۔ اس کے بعد ہم سوچنا شروع کریں۔"

"نہیں اب سوچنا کیا۔ وزیرِ موصوف کا ردِعمل سامنے آجائے گا آج کل میں۔ دیکھتے ہیں حملہ کس طرف سے ہوتا ہے۔ وہ پرانا شاطر ہے۔ پہلی چال سے اندازہ ہو جائے گا کہ وہ کیا کرتا ہے۔ پھر ہم جوابی چال سوچ سمجھ کے چلیں گے تاکہ اسے بھی سمجھ آجائے کہ مقابلے پر اناڑی نہیں ہیں۔"

میں نے کہا۔ "تیرا کیا اندازہ ہے۔ کیا ہوگا؟"

"میرا خیال ہے کہ ہمارے خلاف مقدمات درج کر دیے جائیں گے۔ اشارا وہ دے چکا ہے۔ اس کے نزدیک اسپتال قائم کرنا اور اسکول چلانا حکومت کے خلاف نفرت پھیلانے کی سازش ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ محکمۂ تعلیم یا وزارتِ صحت کے حکام دھاوا بولیں اور رپورٹ میں سفارش کریں کہ اسکول اور اسپتال بلا اجازت چلائے جا رہے ہیں اور ان کی حالت اتنی خراب ہے کہ انہیں فوراً بند کیا جانا چاہیے۔ ڈاکٹر شہناز کی میڈیکل کی ڈگری جعلی قرار دی جاسکتی ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ علاقے میں شرحِ اموات میں اضافہ ہوگیا ہے اور بیماریاں پھیل رہی ہیں۔ ہم جعلی ادویات دے رہے ہیں..."

میں نے کہا۔ "راجا۔ میں اس سے اتفاق نہیں کرتا کہ پہلے دشمن کو وار کرنے کا موقع دیا جائے۔ پھر اپنا دفاع کیا جائے۔"

"او کے تیرا کیا خیال ہے؟"

"میرا خیال ہے کہ جنگ شروع ہونی ہی نہیں چاہیے۔"

"مگر جنگ تو شروع کر دی ہے تو نے۔"

"میں نے نہیں راجا۔ اس کی ابتدا وزیر صاحب نے کی۔ اس نے مجھے رعب میں لانا چاہا اور میں نے رعب میں آنے سے انکار کر دیا۔ بلکہ سیاسی زبان میں اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔ کیا میں نے غلط کیا؟"

"غلط نہیں کیا تو پھر اب ڈرنا کیسا۔"

میں نے کہا۔ "عالمی سیاست میں بھی تو یہی ہوتا ہے۔ جو خود کو زبردست سمجھے وہ خطرناک نتائج کی دھمکی دیتا ہے۔ طاقت سے ڈراتا ہے۔ بیان بازی کی توپ سے دنادن گولے داغے جاتے، جیسے بھارت کرتا ہے، پھر پاکستان بھی مونچھوں کو تاؤ دے کر جواب دیتا ہے کہ لالہ جی آجاؤ میدان میں۔ ہمارے پاس بھی ایٹم بم ہے۔ بس اس کے بعد دونوں ڈائیلاگ اور ڈپلومیسی کا راستہ اختیار کر کے کشیدگی دور کرنے لگتے ہیں۔"

"اس مرحلے پر مذاکرات کی بات کو ہماری کمزوری سمجھا جائے گا۔"

میں نے کہا۔ ہم بیک ڈور ڈپلومیسی کا راستہ اختیار کریں گے۔ کسی ذریعے سے وزیر صاحب کو معلوم ہو جائے گا کہ ان کی گفتگو ریکارڈ کر لی گئی تھی۔

راجا نے چٹکی بجائی۔ "بالکل ٹھیک اور یہ پیغام اپنے ڈی آئی جی عبداللہ صاحب بھی پہنچا سکتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "مجھے یوں بھی اس سے ملنا تھا۔ حکومت کی پیشکش میں نے شاہی کے سامنے رکھ دی تھی۔ اب شاہی کا جواب حکومت تک پہنچانا ہے۔ میرا یہ ثالث کا کردار بہت اہمیت اختیار کر گیا ہے۔ کل اسے مصروفیت تھی۔ آج بات کی جاسکتی ہے۔"

صبح دس بجے تک ڈی آئی جی صاحب آفس نہیں پہنچے تھے۔ اس کے پی اے نے بتایا کہ وہ گزشتہ شب بہت دیر سے گھر لوٹے تھے۔ شاید دیر سے آئیں گے۔ میں نے پیغام چھوڑ دیا کہ وہ جب بھی تشریف لائیں مجھ سے بات کر لیں۔

"کس سلسلے میں نواب صاحب؟" پی اے نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ "ڈی آئی جی صاحب نے مجھے ایک ذمے داری سونپی تھی۔ اسی معاملے میں بات کرنی تھی۔"

آدھے گھنٹے میں عبداللہ جان کا فون آگیا۔ "آئی ایم سوری نواب رفیق۔ کل رات میں تین بجے تک مصروف رہا۔ اس کی وجہ سے کچھ طبیعت بھی مضمحل تھی۔ شاید دفتر نہ آؤں۔"

میں نے کہا۔ "چلیے آپ آرام کیجیے۔"

"میرے پی اے نے گھر فون کیا۔ لیکن میں سمجھ نہیں پایا۔ آپ سے کیا کام کہا تھا میں نے؟"

میں نے کہا۔ "آپ کو یاد نہیں۔ حکومت کی طرف سے آپ نے ایک پیشکش کا ذکر کیا تھا۔ ڈاکوؤں کے ایک گروہ کے لیے۔"

"اوہ یس۔ کمال ہے اتنی اہم بات مجھے یاد نہیں رہی۔ بتائیے آپ کی کیا بات ہوئی؟" وہ بولا۔

میں نے کہا۔ "عبداللہ صاحب۔ اس قسم کی گفتگو فون پر نہیں ہو سکتی۔ یہ باہمی اعتماد کا معاملہ ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ آپ مناسب سمجھیں تو شام کو میرے غریب خانے پر تشریف لے آئیں۔ بلکہ جو حاضر ہو تناول فرمائیں۔" عبداللہ نے حسبِ عادت نفیس اردو میں کہا۔

میں نے کہا۔ "ابھی تو میں راولپنڈی جا رہا ہوں۔ کچھ نجی معاملات کے سلسلے میں۔ رات تک فراغت ہوگئی تو ضرور حاضر ہو جاؤں گا۔ تاہم وعدہ نہیں کر سکتا۔ دیر بھی ہو سکتی ہے۔"

"میرے لیے دیر کا کوئی تصور نہیں رہا۔ دراصل مجھے بھی آپ سے ایک ضروری بات کرنی تھی۔"

"کس سلسلے میں؟" میں نے کہا۔

وہ ہنسا۔ "نواب صاحب! اس قسم کی گفتگو فون پر نہیں ہو سکتی۔"

آخر ڈی آئی جی صاحب مجھ سے کیا ضروری بات کرنا چاہتے تھے؟ میں نے فون بند کرتے ہوئے سوچا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کے پاس وزیرِ داخلہ صاحب نے اسی وقت غصے میں یہ حکم صادر فرما دیا ہو کہ جائز ناجائز۔ قانونی یا غیر قانونی کوئی بھی طریقہ اختیار کر دلیکن اس نواب رفیق احمد شیرازی کا دماغ درست کر دو۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ میرے ساتھ تعاون کا رویّہ رکھنے والے ایک فرض شناس پولیس محکمے کے سربراہ کی موجودگی نے مجھے حالات پر قابو پانے میں بڑی مدد دی تھی۔ وہ بہت سلجھا ہوا معاملہ فہم اور شریف آدمی تھا چنانچہ رانا کے مقابلے میں اس نے اپنی غیر جانبداری کا تاثر مجروح نہیں ہونے دیا لیکن میرے ساتھ حوصلہ افزا دوستانہ رویّہ رکھا۔ میں اس سے کسی قسم کی غیر قانونی امداد کا طالب بھی نہ تھا۔ میں صرف یہ چاہتا تھا کہ معاملات کو قانون کے مطابق طے کیا جائے۔ عبداللہ یہی کر رہا تھا جس سے مجھے کچھ تحفظ مل گیا تھا ورنہ رانا تو مجھ سے جنگل کے قانون کے مطابق ڈیل کرنے کا آرزومند تھا۔ یہ علاقہ ایک جنگل ہی تو تھا جہاں وہ جنگل کا بادشاہ بنا ہوا تھا اور کسی کو اس کے خلاف دم مارنے کی مجال نہ تھی۔

راجا سے میں نے اپنی تشویش کا اظہار کیا۔ "یار کیا اب یہ ڈی آئی جی بھی میرا دشمن ہو جائے گا۔ کیونکہ باس مجھ سے ناراض ہے۔"

"نوکری کا اصول تو یہی ہے مکھے پتر۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دی باس از آل ویز رائٹ۔ وہ فائدے میں رہتے ہیں۔"

"کیا صرف اپنے فائدے کو دیکھتے ہوئے عبداللہ جان مجھے پولیس مقابلے میں ہلاک کرنے کے احکامات جاری کر سکتا ہے؟"

"ابے کہیں یار۔" راجا نے سوچ کے کہا۔ "یہ جو ڈی آئی جی قسم کے افسر ہوتے ہیں۔ یہ آدھے سیاستداں بن جاتے ہیں۔ عوامی اور انتظامی معاملات سے ڈیل کرتے کرتے۔ یہ تو ایک چپراسی بھی جانتا ہے کہ وزیر کی نوکری کچی ہوتی ہے اس کی پکی ہے۔ ڈی آئی جی کو کس کا ڈر۔"

"تیرا مطلب ہے عبداللہ جان اس کو ٹال دے گا۔"

"وہ ٹال سکتا ہے۔ اور وزیر اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"

میں نے کہا۔ "پھر شاید وہ آئی جی نہ بن سکے۔"

"ممکن ہے اس کے آئی جی بننے تک خود وزیرِ داخلہ نہ رہیں۔ لیکن رہے تب بھی عبداللہ جان کا راستہ کوئی نہیں روک سکتا۔ اس کی ترقی کے لیے آئی جی اور سیکریٹری داخلہ کا متفق ہونا ضروری ہے۔ وہ چاہے تو بڑے ڈپلومیٹک طریقے پر وزیر صاحب کو ٹال سکتا ہے۔ الٹا ایسا چکر چلا سکتا ہے کہ خود وزیرِ داخلہ صاحب کو چکر آجائیں۔"

راجا کی بات نے مجھے خاصا مطمئن کیا۔ حویلی کے اندر معمول کے مطابق اسپتال میں مریض آ رہے تھے اور اسکول میں پڑھائی جاری تھی۔ غنی نے گزشتہ روز کی قرارداد پر عمل درآمد کرتے ہوئے اسپتال کو حویلی سے باہر سائنس ریسرچ سینٹر کی عمارت میں منتقلی کا کام ہنگامی بنیادوں پر شروع کرا دیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اگلے چھ ماہ تک غنی کو بہت سے تعمیراتی منصوبے مکمل کرنا تھے۔ اسپتال کی منتقلی سب سے آسان کام تھا۔ بیرک کے اندر کچھ دیواریں اٹھا کے شہناز کی ہدایات کے مطابق کمرے نکالنے تھے۔ ان میں کھڑکی دروازے لگانا اور الیکٹرک فٹنگ کرانا ایک مہینے میں ہوسکتا تھا۔ دوسرا کام چھ کمروں کی تعمیر تھا جہاں اسکول شفٹ کیا جاسکے۔

جو کام مجھے سب سے مشکل نظر آ رہا تھا وہ ست بدھائی کے گرد ایک حفاظتی دیوار بنانے کا تھا اور غنی یہ کام چار ماہ کی مدت میں پورا کر لیتا تو میں اسے بہترین کارکردگی قرار دیتا۔ مشکل یہ تھی کہ اس کے لیے سب سے اہم ذمے داری ہم سب کو سکیورٹی فراہم کرنے کی تھی۔ شیر خان کے آنے سے غنی کی ذمے داریوں کا بوجھ کافی کم ہوا تھا۔ شیر خان اب حویلی کے اندر رہنے والوں کی تمام ضروریات پوری کرنے کا ذمے دار تھا۔ وہ اسپتال اور اسکول کے معاملات میں بھی مدد

کرتا تھا اور ایک اچھا منتظم ثابت ہو رہا تھا۔ اپنی مدد کے لیے اس نے گاؤں سے چھوٹے بھائی گلاب خان کو بھی بلوالیا تھا اور گلاب خان نے ست بدھائی کے وزیرِ ٹرانسپورٹ کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔ اس وقت گلاب خان کی کمان میں چھ گاڑیاں تھیں جن کے لیے وہ چھ ڈرائیور لے آیا تھا۔ یہ سب اس کے آزمودہ اور بھروسے کے آدمی تھے۔ یہ لوگ دن رات کسی کام سے ضرورت کی کوئی چیز لانے یا کسی کو کہیں پہنچانے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔

شہزاد کی کال پھر موصول ہوئی تو مجھے یاد آیا کے میں نے اس سے کیا وعدہ کیا تھا۔ وہ رانا کی عارضی ضمانت کی منظوری کے خلاف ہائی کورٹ میں دائر کرنے کے لیے اپیل تیار کرچکا تھا لیکن میرے دستخطوں کے بغیر یہ رجسٹرار کے سامنے پیش نہیں کی جاسکتی تھی۔

جب میں چلنے لگا تو راجا نے مجھے دوسری بات یاددلائی۔ ''تجھے ایک اور کام بھی کرنا ہے فیکے پتر۔''

''وہ کیا راجاجی۔'' میں نے بے خیالی میں کہا۔

''تجھے نور جہاں سے بات کرنی ہے۔ دوٹوک۔''

میں نے آہستہ سے سر ہلایا۔ ''ہاں...''

راجا نے میرا ہاتھ پکڑ کے کہا۔ ''آواز نہیں نکل رہی ہے ابھی سے۔ سامنے جاکے سب بھول جائے گا۔ وہ جادوگرنی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ایسی بات نہیں ہے راجا۔''

میں نے ایک نئے ڈرائیور کو اپنے ساتھ لے لیا۔ وہ سابق فوجی اور بہترین نشانے باز تھا۔ میرے انکار کے باوجود غنی نے اس کے ساتھ دوسرا اسکیورٹی گارڈ بٹھادیا۔ یہ وہی سیاہ کرولا تھی جس میں گزشتہ شب میں ریاست کا جھنڈا لگا کے شادی کی تقریب میں شریک ہوا تھا۔ غنی نے جھنڈے کو لپیٹ کر اس پر پلاسٹک کا کور چڑھادیا تھا کہ گاڑی میں میری غیر موجودگی واضح ہوجائے لیکن اس قسم کے پروٹوکول کی یہاں کیا اہمیت تھی۔ گاڑی کے شیشے پابندی کے باوجود سیاہ تھے اور مجھے دن کی روشنی میں بھی کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

میں اپنے خیالات میں محو تھا اور خود کو ذہنی و جذباتی طور پر آزمائش کے اس مرحلے کے لیے تیار کررہا تھا جب خلوت میں نور جہاں سے مجھے اس کا پرستار بن کے نہیں، نواب رفیق کی حیثیت سے بات کرنی ہوگی۔ اس کی قربت کا ایسا جادو تھا جس کا توڑ نہ تھا۔ وہ میرے حواس پر ایسے چھا جاتی تھی جیسے نشہ جو ہوش چھین لے۔ یہ صرف اس کے ریشمی بدن کا دہکتا لمس ہی نہیں ایک خوشبو کا ہیجان خیز شیطانی

اثر بھی ہوتا تھا جو وہ استعمال کرتی تھی۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ مردوں کے شہوانی جذبات میں آگ لگانے والی یہ خصوصی خوشبو وہ فرانس سے منگواتی تھی۔

میں نے طے کیا کہ اس سے کسی خواب گاہ کی خلوت میں نہیں بلکہ صرف تنہائی میں گفتگو کروں گا۔ باہر لان پر بیٹھ کے۔ کسی ریسٹورنٹ میں یا سڑک کے کنارے گاڑی روک کے۔ جہاں اس کا جادو مجھ پر اثر نہ کرے۔ میں نے سوچا یہی تھا کہ رات سے پہلے لوٹ آؤں گا تاکہ ڈی آئی جی صاحب کی دعوتِ طعام میں شرکت کا فرض بھی پورا ہوجائے اور ان سے کام کی بات بھی ہوجائے۔ تاہم مجھے اندیشہ تھا کہ نور جہاں مجھے روکے گی۔ شہزاد بھی اصرار کرے گا کہ رات کو سفر کا خطرہ مول لینے کی کیا ضرورت ہے۔ چنانچہ میں نے ڈی آئی جی صاحب سے وعدہ نہیں کیا تھا۔

دو گھنٹے بعد میں نے شہزاد کے دروازے کی کال بیل بجائی۔ انٹرکام کے اسپیکر سے میں نے نور جہاں کی آواز سنی۔ ''کون ہے؟''

میں نے کہا۔ ''آیا ہے تیرے در پہ سوالی۔''

میری آواز پہچان کے وہ ہنسی۔ ''مسٹر سوالی۔ سوال کیا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''سوال خاصا فحش ہے۔ ہاں یا نا میں جواب دینا پڑا تو سب سنیں گے۔ جو میرے ساتھ ہیں۔''

وہ یقیناً شرمائی ہوگی۔ دل ہی دل میں مجھے بے شرم کہا ہوگا لیکن خوشی اس کے لہجے سے عیاں تھی۔ ایک منٹ بعد میں نے اسے روبرو دیکھا اور دیکھتا رہ گیا۔ گھر میں دو عمر رسیدہ خواتین تھیں ان میں سے ایک کو کچھ نظر ہی نہ آتا تھا چنانچہ وہ ضرورت سے زیادہ ایزی ڈریس میں تھی۔ سیاہ جینز پر ایک ڈھیلی ڈھالی سیاہ رنگ کی بغیر بازوں والی بنیان اور بس۔ بنیان کا گلا کشادگی میں اعتدال کی حد سے بڑھا ہوا تھا تو اس کی لمبائی کمر کی اس حد سے بھی پہلے ختم ہوجاتی تھی جہاں سے جینز کی بیلٹ شروع ہوتی تھی۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے اور آنکھیں ہنوز نیند کے خمارے سے بوجھل کسی خواب میں گم تھیں۔

میں نے فوراً اپنے پیچھے دروازہ بند کرلیا۔ ''یارواٹ از دس۔ ایسے ہوشربا فلمی پوز میں دیدارِ عام...''

''حضور۔ کیا آپ کے نزدیک یہ سخت بے حیائی کا مظاہرہ ہے؟''

میں نے کہا۔ ''بات صرف میری نہیں۔ ڈرائیور کے علاوہ میرے سیکیورٹی گارڈ بھی ہیں۔ سڑک پر سے گزرنے

والے ہیں۔''

وہ میرے ساتھ چل پڑی۔ ''افوہ۔ اب کیا میں گیٹ تک بھی برقع پہن کے آؤں؟''

میں نے کہا۔ ''نور۔ لوگ باتیں بناتے ہیں۔''

''جتنی چاہیں باتیں بنائیں۔ مجھے فرق نہیں پڑتا۔'' وہ خفگی سے بولی۔

میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''مجھے تو پڑتا ہے۔''

اس نے فوراً میری ناپسندیدگی کا اندازہ کرلیا۔ ''اوکے۔ اوکے۔ میں آئندہ خیال رکھوں گی۔ دراصل میں سورہی تھی۔''

میں نے مسکرا کے کہا۔ ''اس وقت۔''

''ہاں۔ کھانے کے بعد غنودگی محسوس ہوتی ہے۔ اور گھر میں رہ کے کروں بھی تو کیا۔ بےکاری سے بیزاری...''

اندر سے شہزاد کی خالہ نے پکارا۔ ''نور جہاں۔ کون ہے۔''

نور جہاں نے کہا۔ ''ایک سوالی ہے خالہ۔''

''توبہ ہے۔ یہ فقیر بھی اب گھنٹی بجا کے باہر بلاتے ہیں۔'' وہ بات کرتے کرتے سامنے آگئیں۔ پھر مجھے دیکھتے ہی حیرانی سے بولیں۔ ''ارے۔ تم ہو؟''

میں نے کہا۔ ''خالہ السلام علیکم۔''

انہوں نے دعا دی۔ ''جیتے رہو۔ کیا ست بدھائی سے آرہے ہو؟'' اور پھر نور جہاں کو غور سے دیکھا۔ وہ فوراً اندر سٹک گئی۔

میں نے کہا۔ ''مجھے شہزاد نے بلایا تھا۔''

میں کچھ دیر ان سے باتیں کرتا رہا۔ انہوں نے ابا کے بارے میں پوچھا کہ کب تک آرہے ہیں۔ میں نے بتایا ان کے ساتھ کیا سانحہ ہوا۔ اب نئی سفری دستاویزات ملیں گی تو آئیں گے۔ پھر میں اسی بیڈروم میں چلا گیا جو ہمیشہ مہمانوں کے لیے وقف رہتا تھا لیکن وہاں آج تک میرے سوا کسی نے قیام نہیں کیا تھا۔ نور جہاں کچھ دیر بعد لباس بدل کے نمودار ہوئی۔

میں نے کہا۔ ''یہ کیا نوکرانیوں والے کپڑے پہن لیے۔''

اس نے منہ پھلا کے کہا۔ ''نواب صاحب کو قابلِ اعتراض جو لگ رہا تھا میرا ماڈل نظر آنا۔ ماڈل تو صرف فریال بن سکتی ہے۔''

میں ہنس پڑا۔ ''گویا تم احتجاجی مظاہرہ کررہی ہو؟ سچ بتاؤں؟ مجھے سخت جلن محسوس ہوتی ہے جب کوئی تمہیں پُرستائش نظر سے بھی دیکھے۔ رہی میری نظر تو میرے لیے تمہارا یہ انداز بھی اتنا ہی قاتل ہے۔''

''آپ بکواس فرماتے ہیں۔''

''یہ سچ تھا۔ بکواس اب فرماتا ہوں کہ میری نظر لباس کو نہیں۔ لباس کے اندر تمہیں ایسے دیکھتی ہے جیسے... سمجھ لو ایکسرے مشین۔''

اس نے میرے ساتھ بیٹھ کے میرے کندھے پر سر رکھ دیا۔ ''تم تھکے ہوئے ہوگے۔ اتنا لمبا سفر کیا ہے۔''

میں نے اس کے گرد ایک بازو حمائل کردیا۔ ''دو گھنٹے کا پتا بھی نہیں چلا۔ البتہ بھوکا ضرور ہوں۔''

''سنو۔ چلو کہیں چلتے ہیں۔ صرف میں اور تم۔ تم کھانا بھی کھالینا'' اس نے ملتجی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

میں نے کہا۔ ''آل رائٹ۔ میں سیکیورٹی گارڈز اور ڈرائیور کو باہر بٹھادیتا ہوں۔ خالہ سے کہہ دیتا ہوں ان کے کھانے کا کچھ کردیں۔ تم اتنی دیر میں چینج کرلو۔''

اس کا چہرہ چمک اٹھا۔ ''مجھے دس منٹ لگیں گے۔'' وہ دروازے تک جاکے پلٹی۔ ''کیا پہنوں میں؟''

میں نے کہا۔ ''کچھ بھی۔ جو تمہیں اچھا لگے۔ اچھا تو سب لگتا ہے۔''

''نہیں۔ جو تمہیں اچھا لگے۔ وہ بتاؤ۔'' اس نے بڑی ادا سے کہا۔

میں نے خود کو یاد دلایا کہ مجھے اس کے ناز و انداز اور عشوہ طرازی کے سامنے کمزوری کا شکار نہیں ہونا ہے۔ ''ابھی میرے لیے اس کی اہمیت نہیں ہے۔ کچھ بھی پہن لو۔''

اس نے شوخی سے کہا۔ ''...... پھر وہی پہن لیتی ہوں۔ بعد میں مت کہنا۔''

میرا خیال ہے کہ عورت ایک نظر میں بھانپ لیتی ہے کہ اس پر پڑنے والی پہلی نگاہ نے مرد کے دل پر کیا اثر کیا ہے۔ یہ نور جہاں نے دیکھ لیا تھا۔ بہتر ہوتا اگر میں خود اس سے کسی مناسب لباس کی فرمائش کردیتا کیونکہ بعد میں اس نے پھر وہی بلیک جینز اور سلیولیس بنیان پہن لی جس کی تباہ کاری کا وہ مشاہدہ کرچکی تھی۔

پہلے اس کے پاس بہت سی خوبصورت ساریاں تھیں۔ جب وہ اکبر خان کی بیوی تھی (یا کہلاتی تھی) اور مجھ سے ملنے کے لیے چھپ چھپ کے آتی تھی تو بڑے اہتمام سے کوئی ایسی ساری پہنتی تھی جو اس کے حسن و شباب کی تابانی کو خیرہ

کن بنا دے۔

مثلاً ایک سیاہ ساری تھی جس میں حرکت کے ساتھ جگنو سے چمکتے رہتے جیسے اس کے گرد پروانہ وار طواف کر رہے ہوں۔ ایک آسمانی رنگ کی ساری کے چمکیلے ستاروں کو دیکھ کر لگتا تھا کہ اس نے تاروں بھرے آسمان کو اپنا ملبوس بنا لیا ہے۔ ایک زرد بسنتی ساری میں اس کا جسم سرسوں کے کھیت کی طرح مژدہ بہار بن کے لہلہاتا تھا۔

جب وہ اکبر خان کی نام نہاد زوجیت کی زنجیر توڑنے میں ناکام رہی اور بالآخر اسے قتل کر کے اسیری سے رہائی پانے میں کامیاب ہوئی تو اپنی جان کے علاوہ صرف وہی ساتھ لا سکی جو چھوڑ نہیں سکتی تھی۔ اس نے بیگ میں اپنا تمام بیش قیمت زیور بھر لیا اور اپنے ہر بینک اکاؤنٹ کی چیک بک لے لی تھی۔ پہلی فرصت میں اس نے تمام رقم نکلوالی تھی اور اپنے پاس رکھتی تھی۔ اس نے فرضی نام سے بھی کوئی نیا بینک اکاؤنٹ کھولنے کا رسک ہی نہیں لیا تھا۔

اس کے بعد سے نور جہاں کی زندگی ایک مسلسل فرار تھی۔ روپوشی کے اس دور میں ست بدھائی کی حویلی ہی نور جہاں کی سب سے بڑی پناہ گاہ رہی تھی یا اب شہزاد کا گھر تھا۔ شوق سے زیادہ اس نے ضرورت کے لیے کپڑے خریدے تھے فریال رابعہ اور شہناز کے ساتھ اس نے میانہ روی اختیار کی اور نمائشی قسم کے ملبوسات استعمال کرنے سے گریز کیا۔

اور نہ اسے کسی ایسی پارٹی میں جانے کی مجبوری تھی جہاں دولت مندی کی چمک دمک کے ماحول میں کوئی مقابلۂ حسن درپیش ہونہ کسی زردار ہوس پرست کلائنٹ سے کوئی لاکھوں کروڑوں کا سودا کرنے کے لیے اس کا دل جیتنے کا مسئلہ تھا۔

اس کے باوجود اپنے حسنِ انتخاب سے نور جہاں نے جو ساریاں خریدی تھیں وہ سادگی و پُرکاری کا حسین امتزاج کہی جا سکتی تھیں اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جب وہ پورے اہتمام سے ساری باندھتی تھی تو اس کے جسم کی تمام حشر سامانی بڑے بھرپور تاثر کے ساتھ سامنے آتی تھی۔ اس کے حسن کا ماہِ کامل طلوع ہوتا تھا تو گردوپیش کے ستاروں کی چمک پھیکی پڑ جاتی تھی۔ شہناز ہو فریال ہو یا رابعہ۔ سب اپنے رشک اور حسد کے باوجود مقابلۂ حسن سے دستبردار ہونے پر مجبور ہوتی تھیں۔

کن مین اور ڈرائیور برآمدے میں کرسیاں ڈال کے بیٹھ گئے تھے اور میں نور جہاں کے انتظار میں گیٹ سے باہر گاڑی میں بیٹھا تھا کہ وہ بیگ جھلاتی نمودار ہوئی۔ سیاہ بنیان میں اس کے عریاں بازوؤں کی سفیدی دمک رہی تھی اور گلے سے دعوتِ نظارہ دیتے جسم کی گلابی مرمر کا تموج کسی بھی مرد کے جذبات میں تلاطم برپا کر سکتا تھا۔ رہی سہی کسر بنیان اور جینز کے درمیان کا تھوڑا سا فاصلہ پوری کرتا تھا جہاں سیاہی کے درمیان کمر کا اجلاپن کالے بادلوں میں چمکنے والی بجلی کی طرح جھلک دکھاتا تھا۔

میرا چہرہ کانوں تک گرم ہو گیا۔ یقیناً اس حسن کی آتش فشانی کا بے باک مظاہرہ انہوں نے بھی دیکھا ہوگا جو میرے ملازم اور جانثار کہلاتے تھے۔ ان غریب اور غیر تعلیم یافتہ طبقے سے تعلق رکھنے والوں کی سوچ مختلف تھی۔ انہوں نے ضرور مسکراتے ہوئے معنی خیز تبصرے بھی کیے ہوں گے کہ اپنے نواب صاحب کا مزاج یہاں رہ کے بھی وہی ولایتی ہے۔ لیکن اب کچھ کہنا بے سود تھا۔ خود میں نے ہی نور جہاں کو کھلی چھٹی دی تھی کہ وہ جو چاہے پہنے۔

گاڑی میں بیٹھنے کے بعد نور جہاں نے کن انکھیوں سے میری طرف دیکھا۔ ”کیوں؟ تمہیں اچھا نہیں لگا میرا یہ انداز۔“

میں نے جذبات سے عاری لہجے میں جواب دیا۔ ”بات صرف میری نہیں۔ دنیا کی پسند ناپسند کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔“

”بھاڑ میں جائے دنیا۔ میری دنیا صرف تم ہو۔“ اس نے میری طرف جھک کے کہا۔ ”اچھا اب یہ بتاؤ مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟“

”بھوکا آدمی صرف کھانے کی جگہ جاتا ہے۔“

”اونہوں۔ کوئی فلمی جواب دو۔“ وہ اٹھلائی۔

”اوکے۔ میں چاہتا ہوں تمہیں بادلوں کے اُس پار لے جاؤں جہاں سے تم چاند کو چھو لو۔ ستاروں کی کہکشاں ہماری راہ گزر ہو۔ نیچے ہمالہ کی چاندی جیسی برف والی چوٹیاں دھوپ میں جھلمل کرتی نظر آئیں اور سمندر کی بیکراں نیلگوں وسعت میں آسمان جھلکے۔“

وہ کھلکھلا کے ہنسی۔ ”ارے بس بس۔ تم تو شاعر ہو گئے پتر۔ دل خوش کر دیا میرا۔ آگے فرماؤ۔“

میں نے آہ بھری۔ ”مگر افسوس کہ نہ یہ گاڑی اڑ سکتی ہے اور نہ اس میں اتنا پٹرول ہے۔ چنانچہ میں تمہیں علی بابا کے چھپر ہوٹل ڈی پھونس لے جا رہا ہوں جہاں ہم بان کی منجی پر بیٹھ کے تنور کی روٹی اور چنے کی دال کھائیں گے۔“

وہ پھر ہنسی۔ ”ہاؤ رومینٹک۔“

”جو محنت کش وہاں اپنا پیٹ بھرتے ہیں۔ ان کے لیے تو اس دال روٹی میں کوئی رومانس نہیں۔“

”ٹھیک کہتے ہو تم۔ رومانس تو آدمی کے اندر ہوتا ہے۔ کبھی کبھی ایسے جاگتا ہے جیسے بہار میں پھولوں کے رنگ جاگتے ہیں اور اس وقت ہر طرف رومانس ہی رومانس نظر آتا ہے۔ دل چاہتا ہے ہنسنے کو۔ جیسے اس وقت بھی بات بے بات ہنس رہی ہوں۔ جانتے ہو کیوں؟ کیونکہ میں خود کو اس چڑیا کی طرح محسوس کر رہی ہوں جس کو پنجرے سے آزاد کر دیا گیا ہو اور وہ خوشی سے پر پھیلائے پرواز کر رہی ہو۔ صرف اپنی آزادی کا لطف لینے کے لیے۔ یہ جو لباس میں نے پہنا ہے۔ مجھے پتا تھا کہ تم کو اچھا نہیں لگے گا مگر یہ بھی اپنی آزادی کی سرخوشی کے لیے ہے۔ میرے بس میں ہو تو اسے بھی اتار پھینکوں۔“

میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ”جب دنیا کی پروا نہیں۔ تو یہ ڈر کیسا۔ پوری کر دو اپنی خواہش۔“

”کیا واقعی؟ تمہاری اجازت ہے؟“

میں نے ڈر کے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”نور۔ تم پاگل ہو گئی ہو۔“

وہ پھر بے وجہ ہنسی۔ ”ہاں۔ لیکن یہ پاگل پن مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔ ورنہ پاگل تو قید میں بھی ہو رہی تھی۔ تمہاری حویلی ہو یا یہ گھر۔ ہر جگہ مجھے اپنے گرد ایک دیوار محسوس ہوتی تھی۔ خوف کی دیوار۔ تم سمیت ہر شخص ایک جیلر تھا۔ نگران اور محافظ۔ ہر وقت احساس دلانے والا کہ میری حد اس دیوار تک ہے کیونکہ اس کے باہر خطرہ ہے۔ گرفتاری کا، قید کا، پھانسی کے پھندے کا اور میں زندہ رہنے کے لیے زنداں کو قبول کرنے پر مجبور تھی۔ لیکن کب تک رفیق۔ آخر کب تک؟ میری قوتِ برداشت کے میٹر کی سوئی زیرو پر آ رہی ہے۔“

میں نے اس کے ہاتھ پر نرمی سے ہاتھ رکھا۔ ”ایزی نور۔ ایزی۔ یہ بتاؤ ہم کہاں کچھ دیر بیٹھ کے باتیں کر سکتے ہیں۔ کھانا تو صرف میں کھاؤں گا۔“

اس نے کہا۔ ”میں ایک جگہ بتاؤں۔ ذرا دور ہے اور پتا نہیں اس وقت وہاں کھانے کو کچھ نہ ملے۔ مری کے راستے میں بارہ کھو سے آگے ایک ریسٹورنٹ ہے۔ آرچرڈ۔“

میں نے کہا۔ ”خاتون۔ میں ڈنر کی نہیں، لنچ کی بھوک کے عذاب سے گزر رہا ہوں۔ ایسا نہ ہو خود گزر جاؤں۔“

”اچھا تو دامنِ کوہ چلو۔ وہاں اس وقت خلوت ملے گی۔“

”یعنی الو بول رہے ہوں گے۔ ان میں ہم بھی شامل ہو جائیں گے۔“ میں نے گاڑی کا رخ اسلام آباد کی طرف موڑ دیا۔ ”مجھے راستہ بتاتی جاؤ۔“

اس نے کہا۔ ”کیوں نہ ہم مری چلے جائیں۔“

”مری؟ یعنی میں مر ہی جاؤں۔ بھوک سے۔“

”راستے میں سینڈوچ کھا لینا۔ چائے کافی کولڈ ڈرنک سب ملتے ہیں۔ میں نہیں مرنے دوں گی تمہیں۔“

”سوری میڈم۔ نہ اس وقت موڈ ہے اور نہ ٹائم۔ مجھے رات کو واپس بھی جانا ہے۔“

اس کا چہرہ اتر گیا۔ ”آج ہی... ایسی کیا جلدی ہے۔ کل چلے جانا۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں رک نہیں سکتا۔“

”میری خاطر بھی نہیں؟“

”نہیں۔ میں نے ڈی آئی جی عبداللہ جان کو ٹائم دے رکھا ہے۔ اس نے مجھے رات کے کھانے پر مدعو کیا ہے۔“

”رات کا کھانا ہم مری میں کھا لیتے۔“ وہ حسرت بھرے لہجے میں بولی۔

میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”سمجھا کرو نور۔ ڈی آئی جی کے ساتھ یہ میٹنگ انتہائی اہم اور ضروری ہے۔ اب بولو کدھر جانا ہے؟“

اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ”بائیں ہاتھ۔ پھر سیدھے۔ دامنِ کوہ تک۔“

دامنِ کوہ قدرت کے شاداب حسن اور دلفریب نظاروں کے ساتھ چمن آرائی کے کمالِ فن کا نمونہ ہے۔ جہاں ایک بلندی سے پورے اسلام آباد کا منظر کسی خوبصورت تصویر کی طرح پھیلا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ شام کے بعد رات تک یہاں تفریح کرنے والوں کا ہجوم رہتا ہے لیکن اس وقت زیادہ تر ہم جیسے خلوت کے متلاشی لو برڈز تھے جو ہر کنج عافیت اور گوشہ تنہائی میں براجمان تھے۔ قالین جیسے سبز گھاس کے لان پر۔ سرسبز شاخوں سے ڈھکی بنچوں پر کیاریوں کی منڈیروں پر۔

یہاں چھوڑے جانے والے جانور بھی خود کو انسانوں سے محفوظ سمجھنے لگے تھے۔ ہر طرف بندر پھر رہے تھے۔ موج مستی میں رقص کرتے دکھائی دیتے تھے اور اجلے سارس یا راج ہنس۔ نیچے سے اوپر تک بالکل بے آواز دوڑنے والی رنگین الیکٹرک کاریں ساکت کھڑی تھیں۔ دو چار یا آٹھ مسافر لے جانے والی ان کاروں کی رفتار اور خاموشی پہلی نظر میں بہت حیران کن لگتی تھی اور یہ خیال ضرور آتا تھا کہ ایسی بیٹری والی گاڑیاں شہر میں کیوں نہیں کہ نہ دھواں ہو نہ شور۔

میں قصداً نور جہاں کو کسی محفوظ گوشہ خلوت میں نہیں

لے گیا۔ مجھے احساس تھا کہ اس کے رومینٹک موڈ کی یلغار میرے مقصد اور ارادے کو ایسے بہا لے جائے گی جیسے سمندر سے اٹھنے والی طوفانی لہر ریت کے گھروندے کو لے جاتی ہے۔ میں اسے ریسٹورنٹ میں لے گیا۔

اسلام آباد کے پوش علاقے میں فیشن کا ہر رنگ نظر آتا ہے اور دیکھنے والوں کی نظر معیوب یا غیر معیوب کے چکر میں نہیں پڑتی۔ چنانچہ نور جہاں کے نظارہ حسن نے بھی دیکھنے والوں کو مبہوت ضرور کیا مگر اس حد تک جیسے پہلی بار آنے والوں کو رات کے وقت یہاں سے اسلام آباد کی روشنیوں کا نظارہ دم بخود کر دیتا ہے۔

ریسٹورنٹ کے اندر ایک کے سوا تمام میزیں خالی تھیں۔ ایک میز پر دو نوجوان لڑکے اور دو لڑکیاں سر جوڑے بیٹھے تھے۔ انہوں نے ہمیں سرسری دلچسپی سے دیکھا اور پھر اپنی باتوں میں محو ہو گئے۔ میں نے ان سے بہت دور کونے کی ایک میز کا انتخاب کیا جہاں سے دامن کوہ کی پوری پہاڑی کا منظر نیچے تک دکھائی دیتا تھا۔

ایک ویٹر نے مجھے مطلع کیا کہ لنچ ٹائم کے بعد صرف اسنیکس سرو کیے جاتے ہیں۔ میں نے اپنے لیے سینڈوچ طلب کیے اور کافی۔ نور جہاں نے صرف کولڈ ڈرنک پسند کی۔ اس نے کہنیاں میز پر ٹکائیں اور اپنے ہاتھوں کے پیالے میں چہرہ رکھ کے آگے جھک گئی۔ اس طرح جو نظارہ مجھ سے چند انچ کے فاصلے پر آ گیا وہ میری عقل ضبط کرنے کے لیے کافی تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یہ خیال بھی آیا کہ نور جہاں جانتے بوجھتے ایسا کر رہی ہے اور اس کا مقصد مجھے اپنی ٹرانس میں لے کر کسی کٹھ پتلی کی طرح استعمال کرنا تھا۔ میرے کانوں میں راجا کی آواز آئی۔ وہ ایک جادوگرنی ہے فیکے پتر۔

میں پیچھے ہٹ گیا۔ ”ایسے کیا دیکھ رہی ہو مجھے۔“

”دیکھ رہی ہوں تمہیں اور تمہارے انداز کی مصنوعی بیگانگی کو۔ تم اپنے جذبات کی راہ میں عقل کی دیوار کھڑی کر رہے ہو۔ لیکن ڈرتے ہو کہ یہ دیوار گر نہ جائے۔ کیوں رفیق؟“

میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”ابھی تم نے خود کو قیدی کہا تھا۔ میں تم سے زیادہ اپنی مجبوریوں کے حصار میں قید ہوں۔ پلیز۔ میری بھی مدد کرو۔ جیسے میں تمہاری مدد کر رہا ہوں۔“

وہ سیدھی ہو کے بیٹھ گئی۔ ”میں؟ میں کیا کر سکتی ہوں جان۔“

”نورا! خطرے کی ایک تلوار ہے جو ہم دونوں کے سر پر منڈلا رہی ہے۔ یہ خوف میرے اعصاب پر سوار ہے کہ کہیں ہم پکڑے نہ جائیں۔ مجرم اور شریکِ جرم کی حیثیت قانون کی نظر میں ایک ہے۔“

”پھر کیا کرنا چاہیے ہمیں؟“

”میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔ تمہیں جلد از جلد آزاد کر دیا جائے۔“

”کیا مطلب؟“ وہ چونکی۔

”مطلب یہ کہ نور جہاں کو مار دیا جائے۔ ایسے غائب کر دیا جائے جیسے وہ تھی ہی نہیں۔ میرے سوا اسے کوئی نہ دیکھ سکے۔ تلاش کرنے والے حشر تک زمانے کی خاک چھانتے پھریں۔“

”یہ ہم پہلے بھی ڈسکس کر چکے ہیں۔“

”اب اس پر عمل درآمد کا وقت آ گیا ہے۔ یہ کام راجا کرے گا۔ وہ تمہیں مہ نور بنا دے گا۔ حکومتِ پاکستان کا جاری کردہ شناختی کارڈ اس کا ثبوت ہوگا۔ اس کے بعد پاسپورٹ اور پھر دو ہفتے میں لندن کا ویزا، مگر شناخت صرف نام سے نہیں بدلتی۔ تمہارا یہ چہرہ بھی بدلا جائے گا۔ تم جانتی ہو یہ خواتین کے معاملے میں زیادہ آسان ہے۔“

”ہاں۔ وگ لگا کے اور کنٹیکٹ لینز سے۔“

”نہیں۔ تبدیلی عارضی نہیں ہوگی۔ تمہارا یہ ہیر اسٹائل بالکل مختلف ہوگا۔ راجا کا خیال ہے کہ لیڈی ڈائنا کا۔“

اس نے خفگی سے میری بات کاٹ دی۔ ”میں اپنے یہ بال قربان نہیں کر سکتی۔“

میں نے بھی برہمی دکھائی۔ ”زندگی قربان کرنا منظور ہے؟ میری بھی اور اپنی بھی۔ بے وقوف لڑکی۔ بال پھر بڑے ہو جائیں گے دو چار سال میں اور دیکھو۔ تم کو وہی کرنا ہے جو میں کہوں گا۔“

اس نے سوالیہ نظریں اٹھائیں۔ ”ورنہ؟“

”ورنہ؟ تم خود سوچ لو۔ اگر کسی دن اس مسلسل فرار سے اور روپوشی سے تنگ آ کے تمہارا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا۔ تم آزاد زندگی کے جنون میں اسی طرح گھر سے نکل گئیں۔ جیسے آج نکلی ہو۔ تو لازمی قانون کے جال میں پھنس جاؤ گی۔ صرف اس لیے کہ تم نور جہاں ہو۔ کوئی عام عورت نہیں ہو۔ جنہوں نے تمہیں دیکھا ہے آج تک بھولے نہیں ہیں۔ اندازہ کر لو کہ اس کے بعد کیا ہوگا پہلے تمہارے ساتھ۔ پھر میرے ساتھ۔ باقی زندگی کیسی گزرے گی۔ کہاں گزرے گی۔“

”تم مجھے دہشت میں مبتلا کر رہے ہو۔“

”نہیں نور۔ میں تمہیں اس خطرے سے آگاہ کر رہا ہوں جسے تم نظر انداز کر رہی ہو۔ جنگل میں آدمی کے سامنے بھیڑیا ہو تو وہ خطرے کو حقیقی سمجھ کے مقابلہ کرتا ہے لیکن اس خطرے کو حقیقی نہیں سمجھتا جو کہیں بھی اچانک سامنے آ سکتا ہے۔“

اس نے ہتھیار ڈال دیے۔ ”آخر تم مجھ سے کیا چاہتے ہو جان؟“

”نمبر ون۔ ابھی تم کو ایسی کوئی حرکت نہیں کرنی ہے جس کے نتیجے میں ہماری ساری جدوجہد جو ہم کامیابی کے لیے کر رہے ہیں، یکلخت ناکامی میں بدل جائے۔ اس زندگی سے سمجھوتا کرو جو تم آج گزار رہی ہو۔ اچھے کل کے لیے اس قید کو بھی قبول کرو۔ برداشت کرو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ صرف ایک مہینے بعد مہ نور لندن میں ہوگی۔ بالکل محفوظ۔“

”آخر لندن میں کیوں؟“ وہ تنک کے بولی۔

میں نے کہا۔ ”اور کوئی جگہ ہے تو تم بتا دو۔ میں لندن کو اس لیے محفوظ سمجھتا ہوں کہ وہاں میرے دوست اور مددگار بہت ہیں۔“

”صاف کیوں نہیں کہتے کہ تم مجھے ہمیشہ کے لیے جلاوطن کرنا چاہتے ہو۔ سات سمندر پار۔ جہاں سے میں لوٹ کے نہ آ سکوں اور تمہیں مجھ سے چھٹکارا مل جائے۔“

میں نے کہا۔ ”تم میری نیت پر شک کر رہی ہو۔ تمہاری خاطر میں نے اپنی عزت کیا اپنی زندگی تک داؤ پر لگا رکھی ہے۔ سب کی ناراضگی مول لی ہے۔“

وہ تلخی سے ہنسی۔ ”بڑا دکھ ہے تمہیں فریال کے ناراض ہو کر جانے کا۔ جب میرا کانٹا درمیان سے نکل جائے گا تو وہ لوٹ آئے گی۔“

”ایسی فضول بات کیوں کرتی ہو۔“ میں نے بگڑ کے کہا۔

”مجھے معلوم ہے۔ تم اسے منا کے لاؤ گے کہ دیکھو میں نے اس کو دل سے اور گھر سے ہی نہیں ملک سے بھی نکال پھینکا ہے۔“

میں نے اونچی آواز میں کہا۔ ”بکواس بند کرو۔“

اس نے مجھ سے بھی زیادہ اونچی آواز میں کہا۔ ”اگر یہ بکواس ہے تو کہو کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔“

”آہستہ آہستہ۔ لوگ سن رہے ہیں۔“ میں نے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی۔ ”کیا الفاظ کی گواہی اتنی اہم ہے۔ جب تک کوئی فلمی انداز میں آئی لو یو نہ کہے۔ سب بے کار ہے۔“

”بے کار اس لیے لگتا ہے کہ تم نے میری ضرورت کے آگے ہتھیار ڈالے ہیں۔ کبھی میری محبت کا اعتراف نہیں کیا۔ اس طرح جیسے تم فریال سے کرتے تھے۔“

”او کے نور۔ آئی لو یو۔“ میں نے مسکرا کے کہا۔

”اگر ایسا ہے تو اس کا ثبوت بھی دو۔“

”لاحول ولاقوۃ۔“ میں نے جھنجلا کے کہا۔ ”جو کچھ میں نے کیا ہے تمہارے لیے اور کر رہا ہوں۔ اس کے باوجود تم ثبوت مانگتی ہو۔“

اس نے آگے جھک کے میری آنکھوں میں جھانکا اور بولی ”ہاں۔ مجھ سے محبت ہے تو مجھے اپنی نظروں سے دور کیوں کرنا چاہتے ہو؟ سنو میری بات۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ نور جہاں کا وجود ایسے مٹایا جا سکتا ہے جیسے وہ کبھی تھی ہی نہیں۔ حکومتِ پاکستان کے جاری کردہ شناختی کارڈ میں میرا نام ہوگا مہ نور بنتِ فلاں فلاں۔ نام کے ساتھ میری صورت اس حد تک بدل جائے گی کہ تمہارے سوا کوئی مجھے پہچان ہی نہ پائے گا۔ تو پھر میرا لندن جانا کیوں ضروری ہے؟ میں کراچی میں، لالہ موسیٰ میں۔ سیالکوٹ میں یا تمہارے بالکل قریب جہلم میں کیوں نہیں رہ سکتی۔ بولو۔“

میں نے واقعی خود کو لاجواب محسوس کیا۔ ”ہاں... میں نے اس پہلو سے سوچا نہیں تھا۔“

”تو اب سوچو۔ مجھے بتاؤ کہ مہ نور آخر ست بدھائی کی حویلی میں کیوں نہیں رہ سکتی؟“

”اس سے شکوک پیدا ہوں گے۔ وہ منسلک ہے اس میں۔“

”جب کل لندن سے آ کے رہی تھی۔ جو تمہارے جانی دشمن کی بیٹی تھی۔ تو تم نے سارے رسک لے لیے تھے اور آج عائشہ آ جائے تو کیا تم شکوک کی پروا کرو گے؟ نظریۂ ضرورت کے تحت تم ہر جھوٹ بول سکتے ہو۔ بولتے رہے ہو۔ سیاہ کو سفید سفید کو سیاہ ثابت کرنا تمہارے لیے کوئی مشکل نہیں ہو سکتا۔ پھر تم مہ نور کو اپنی کزن کیوں نہیں ثابت کر سکتے جو لندن میں تھی۔ اپنی دوست کلاس فیلو یا کولیگ کیوں نہیں کہہ سکتے۔ کون شک کرے گا تمہارے بیان پر؟“

جب وہ خاموش ہو گئی تو کوئی جواب نہ ہونے کے باعث میں بھی خاموش رہا۔ نور جہاں اپنے دماغ میں ایسی دلیل لائے گی۔ یہ میں نے سوچا بھی نہ تھا اور نہ راجا نے۔

نور جہاں نے سوال کیا۔ ”کیا میں نے کچھ غلط کہا؟“

میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”نہیں بلکہ تم نے کسی حد تک میری مشکل آسان کر دی۔ مسئلہ آدھا رہ گیا۔ صرف

تمہاری شناخت بدلنے کا۔لیکن ایک اس سے بھی زیادہ سنگین مسئلہ ہے۔"

"وہ کیا؟"

میں نے اپنے آپ کو تیار کیا۔"وہ بھی میرا اور تمہارا مسئلہ ہے۔کیا تمہیں معلوم ہے کہ یہ راز اب راز نہیں رہا۔ ڈاکٹر شہناز نے تمہاری کیفیت سے اندازہ کرلیا ہے۔اس نے رابعہ سے کہا۔رابعہ نے مجھ سے سوال کیا۔"

نور جہاں کا چہرہ سرخ ہوگیا۔"پھر؟"

"پھر کیا؟تم خود اندازہ کرلو۔"

وہ بولی۔"میرا اندازہ ہے کہ تم نے صاف انکار کردیا ہوگا۔"

"تمہارا اندازہ بالکل غلط ہے۔یہ خود رابعہ نے کہا کہ تم اسی طرح مجھ پر دباؤ ڈال رہی ہو جیسے فریال نے کوشش کی تھی۔"

"لیکن اس نے جھوٹ بولا تھا۔"نور جہاں نے تیز لہجے میں کہا۔

"رابعہ بھی ایسا ہی سمجھتی ہے تمہارے بارے میں۔"

"کیا مطلب؟" میں بھی جھوٹ کا سہارا لے رہی ہوں۔ایک طرف ڈاکٹر صاحب کی رائے ہے۔"

میں نے کہا۔"اس کا مطلب تھا۔تم بھی مجھے بلیک میل کرنا چاہتی ہو۔شادی کے لیے۔"

نور جہاں نے غصے سے کہا۔"یہ میرا تمہارا معاملہ ہے۔وہ تمہیں الٹی سیدھی پٹی کیوں پڑھا رہی ہے۔نند ہونے کا ثبوت دے رہی ہے نا۔"

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اصل بات نور جہاں کو کیسے بتاؤں۔یہ کیسے کہوں کہ رابعہ کا الزام اس سے کہیں زیادہ سنگین ہے جتنا وہ سمجھ رہی ہے۔اس نے تو صاف کہا تھا کہ وہ کسی اور کا گناہ تمہارے سر منڈھ کے فائدہ اٹھانا چاہتی ہے۔ راجا یہ سمجھتا ہے کہ تم ابارشن پر اس لیے راضی نہیں کہ یہ بچہ قانون کی نظر میں میرا وارث ہوگا۔

"دیکھو۔تمہارے دل میں جو بات ہے۔کہہ ڈالو۔" نور جہاں نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔

"نور جہاں۔یہ بہت سنگین معاملہ اس لیے ہے کہ اس کا اثر براہِ راست میرے سیاسی مستقبل پر پڑتا ہے۔میرے پروگرام پر پڑتا ہوے۔اس مرحلے پر میں کسی قسم کی بدنامی مول نہیں لے سکتا۔"

"بالکل ٹھیک۔اس مسئلے کا تو آسان حل یہ ہے کہ تم مجھ سے شادی کرلو۔"

"نور۔شادی سے مسئلہ حل ہوسکتا تھا۔لیکن دیکھو ابھی میری ماں کا چہلم بھی نہیں ہوا۔ایک مہینا تو ہے کم سے کم۔پھر میرے والد بھی یہاں نہیں ہیں اور جب تک اس فیصلے پر عمل درآمد ہوگا۔بہت دیر ہوجائے گی۔دیر تو پہلے ہی ہوگئی ہے۔"

"دیر تم نے کی اور مزید کرنا چاہتے ہو۔شادی نہیں کرنا چاہتے تو مت کرو۔میں نے کب تمہیں مجبور کیا تھا۔"

"تم میری مجبوری کو نہیں سمجھ رہی ہو۔اگر شادی کے پانچ چھ مہینے بعد تم ماں بن جاؤ گی تو کیا باتیں نہیں بنائی جائیں گی۔میرے تمہارے تعلق پر انگلیاں اٹھانے والے کہیں گے کہ دیکھا۔ثبوت سامنے آگیا نا اور یہ مت کہنا کہ لوگوں کی باتوں کو ایک کان سے سن کے دوسرے سے اڑا دینا چاہیے۔ میں ایسا نہیں کرسکتا۔میں لوگوں کی اپنے کردار کے بارے میں رائے خراب کرنا افورڈ نہیں کرسکتا۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔"پھر کیا ہوسکتا ہے۔ پھر چھوڑ دو مجھے میرے حال پر۔"

"یہ بھی نہیں ہوسکتا۔ابھی سے یہ کہا جارہا ہے۔"میں نے کہا۔"کہ تم... اکبر خان کے بچے کو میرا نام دینا چاہتی ہو۔"

وہ مجھے پلک جھپکائے بغیر دیکھتی۔"تم جانتے ہو یہ سچ نہیں۔"

"فرق میرے جاننے سے نہیں پڑتا۔"

وہ چلائی۔"کیوں نہیں پڑتا۔یا یہ کہو کہ تم اپنے بچے کو بھی اپنا کہنا نہیں چاہتے۔"

میں نے کہا۔"چلاؤ مت۔ہم دونوں کے لیے ایک ہی باعزت راستہ ہے۔"

"میں سمجھ گئی تمہارا مطلب۔لیکن جان۔میں نے پہلے ہی بتادیا تھا کہ میں ایسا نہیں کرسکتی۔کبھی نہیں کروں گی۔"

"دیکھو۔مجھے آزمائش میں مت ڈالو۔ابھی ہم شادی نہیں کرسکتے۔شادی ضرور کریں گے لیکن اس بچے کی بدنامی کے ساتھ نہیں۔"

"جھوٹ بولتے ہو تم۔ مجھے معلوم ہے تم وقت گزار رہے ہو۔تم کبھی مجھ سے شادی نہیں کروگے۔خیر۔مجھے اس رشتے کی سند چاہیے بھی نہیں۔یہ بچہ ہی میری محبت کی سند ہے۔"

میں نے آخری کوشش کی۔"بچے پیدا کرنے کے لیے ایک عمر پڑی ہے۔اگر تم نے میری بات نہ مانی تو۔"

"تو کیا؟پھر وہی دھمکی؟"وہ تڑخ کے بولی۔

"تم کچھ بھی سمجھ لو۔"

"سمجھنے کو اب کیا رہا ہے۔تم نے صاف کہہ دیا ہے کہ اس بچے کے ساتھ تم مجھ سے تعلق نہیں رکھ سکتے۔ٹھیک ہے۔ جیسی تمہاری مرضی۔اس کا اندازہ تو مجھے پہلے سے تھا نواب صاحب!"

خاموشی کا ایک طویل اعصاب شکن وقفہ ہمارے درمیان حائل ہوگیا جس میں ہم دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے سے نظریں چراتے رہے۔مجھے جو کہنا تھا میں نے کہہ دیا تھا۔نور جہاں نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔اب ہم ایک دوراہے پر کھڑے تھے جہاں سے ہمیں مخالف سمتوں میں جانا تھا لیکن یہ ناممکن تھا۔اس لیے کہ ہم اپنی مرضی سے قدم بڑھانے کے لیے آزاد نہیں تھے۔ہمارے پیروں میں تعلق کی زنجیر تھی جسے توڑنا کسی کے بس میں نہ تھا۔

اچانک نور جہاں نے میری طرف آگے جھک کر کہا۔ "رفیق ایک شخص بہت دیر سے مجھے گھور رہا ہے۔"اس کے لہجے میں خوف تھا۔

"کون شخص۔"میں نے پلٹ کے دیکھا۔وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر اکیلا بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔

خطرے کی گھنٹی ایک دم پورے زور سے بج اٹھی۔پہلے سے میں نے اندازہ کرلیا کہ وہ شخص کون ہوسکتا ہے۔اس کا ہیئرکٹ سے زیادہ اس کے تیور بتاتے تھے کہ اس کا تعلق پولیس یا کسی خفیہ ادارے سے ہوسکتا ہے۔میرے سامنے دو ہی راستے تھے۔یا میں ثابت قدمی سے انتظار کروں کہ وہ شخص مجھ سے بات کرے یا نور جہاں کو لے کر نکل جاؤں۔"

اگر میرا شک درست تھا تو وہ شخص مجھے فرار نہیں ہونے دے گا۔اس نے نور جہاں کو شناخت کرلیا ہے تو ایک مفرور اور اشتہاری مجرم کی گرفتاری بہت بڑا کارنامہ ہوگی۔اسے انعام بھی ملے گا اور ترقی بھی ملے گی۔میں نے آہستہ سے کہا۔"نور جہاں۔میں اس سے بات کرتا ہوں۔ تم موقعے سے فائدہ اٹھاؤ اور نکل جاؤ۔جو بھی ہو۔میں اسے روکوں گا۔"

اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔"اور تم خود..."

میں نے کہا۔"میری فکر مت کرو۔میں نکل آؤں گا۔ ایسا لگتا ہے کہ اس نے تمہیں پہچان لیا ہے۔"

"یہ کون ہے۔کوئی پولیس کا آدمی۔"

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔"باہر دیکھو۔ہماری گاڑی دائیں طرف پارکنگ لاٹ میں کھڑی ہے۔تم بائیں طرف جاؤ گی۔وہ نیچے سڑک دکھائی دے رہی ہے جس سے ہم آئے تھے گھوم کر۔تم اس ڈھلوان سے اترو گی تو سیدھا سڑک پر پہنچ جاؤ گی۔وہیں رک کر میرا انتظار کرنا۔میں گاڑی لے کر آتا ہوں۔دیر ہوجائے تو گھبرانا نہیں۔"

"اور...اور تم نہ آئے۔پھر؟"

"تم کو زیادہ دیر رکنے کی ضرورت نہیں۔پندرہ منٹ دیکھنا۔پھر گھر چلی جانا۔سڑک سے نیچے جاؤ گی تو تمہیں کوئی نہ کوئی ٹیکسی مل جائے گی۔تم لفٹ بھی لے سکتی ہو۔گھبرا کے بھاگنا نہیں۔ادھر لیڈیز واش روم ہے۔جاؤ۔" میں آہستہ سے اٹھا۔

وہ شخص کولڈ ڈرنک سامنے رکھے دوسرا سگریٹ جلا رہا تھا کہ میں اس کے سر پر پہنچ گیا۔اس نے بیٹھی ہوئی آواز میں غرا کے پوچھا۔"کیا بات ہے مسٹر؟"

میں نے کہا۔"یہ تم بتاؤ۔اتنی دیر سے تم میری بیوی کو گھور رہے تھے۔تمہیں کسی نے شرافت سے شریف لوگوں میں بیٹھنا نہیں سکھایا؟"

وہ اس کتے کی طرح اٹھا جس کی دُم پر کسی نے پیر رکھ دیا ہو۔"تیری تو ماں کی شرافت..."

میں نے اس کی گردن دبوچ لی۔ ''تیری ساری بدمعاشی دومنٹ میں نکل جائے گی۔ پھونک نکلتے ہی۔''

اس نے ایک جھٹکے سے میرا ہاتھ الگ کیا۔ ''تو جانتا نہیں ہے۔ میں انسپکٹر شہروز ہوں۔''

''کیا ثبوت ہے؟'' میں نے دھاڑ کے کہا۔

''تیرے پاس کیا ثبوت ہے کہ وہ کنجری تیری بیوی تھی۔ میں نے پہچان لیا ہے اسے۔ وہ قتل کر چکی ہے اپنے شوہر کو اور مفرور ہے۔''

میں نے اس کے سر پر ایک مکا رسید کیا۔ ''میری بیوی کو کنجری کہا تم نے۔''

وہ چکرا کے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کا ہاتھ اپنے ریوالور کی طرف بڑھا ہی تھا کہ میں نے اسے کھینچ لیا۔ ریسٹورنٹ میں بیٹھے ہوئے دو افراد تیزی سے باہر نکل گئے۔ دو ویٹرز شور مچاتے ہوئے دوڑے۔ ''سر یہ کیا ہو رہا ہے؟''

میں نے انسپکٹر شہروز کے پیٹ میں پنچ مارا۔ وہ بلبلا کے آگے جھکا تو میرا گھٹنا پوری قوت سے اس کے منہ پر لگا۔ وہ پلٹ کے پیچھے گرا اور زمین پر لوٹنے لگا۔ قریب آنے والے دونوں ویٹرز بھاگ کے دور چلے گئے۔ ان میں سے ایک کاؤنٹر پر رکھے فون کی طرف لپکا۔

میں نے مہلت سے فائدہ اٹھایا اور دروازے کی طرف دوڑ لگائی۔ پارکنگ ایریا تک پہنچنے میں مجھے دو منٹ بھی نہیں لگے۔ اس وقت تک وہاں خاصی ہڑبونگ مچ گئی تھی۔ میرا تعاقب کرنے کی ہمت کسی نے نہیں کی۔ جب میں کار اسٹارٹ کر چکا تھا تو مجھے فائر کی آواز سنائی دی۔ یقیناً یہ فائر اس انسپکٹر شہروز خان نے کیا ہوگا۔

میں نے اسے ایک جیپ کی طرف بڑھتا دیکھا۔ اس وقت وہاں اور کوئی گاڑی نہیں تھی۔ میں نے اپنا ریوالور نکال کے نشانہ لیا اور جیپ کے ٹائر پر فائر کیا۔ فائر میں نے ایک ہاتھ باہر نکال کے کیا تھا۔ میرا دایاں ہاتھ اسٹیئرنگ پر تھا۔ نہ جانے کیسے گولی نشانے پر جا لگی اور جیپ کا ٹائر ایک دھماکے سے پھٹ گیا۔

میری گاڑی اس وقت تک اسپیڈ پکڑ چکی تھی اور میرے سامنے گیٹ آ گیا تھا۔ لیکن یہ گاڑیوں کے اندر آنے کا راستہ تھا۔ میری قسمت اچھی تھی کہ دوسری طرف سے کوئی گاڑی اندر نہیں آئی ورنہ آمنے سامنے سے ٹکر ہو جاتی۔ اس شخص نے اچھل کے اپنی جان بچائی جو یہاں آنے والی کاروں کو پارکنگ کا ٹکٹ دینے پر مامور تھا۔ میں واپسی پر باہر جانے والے راستے سے گزرتا تو دوسرا شخص مجھ سے ٹکٹ واپس لیتا۔ یہ ٹکٹ میرے پاس ہی رہ گیا۔

سڑک پر آتے ہی میں نے ایکسلریٹر دبایا۔ آگے اترائی تھی۔ گاڑی کی رفتار ایک اسی پر پہنچ گئی۔ پھر میں نے بریک لگائے کیونکہ آگے موڑ تھا۔ بیک ویو مرر میں مجھے اپنے پیچھے کوئی گاڑی دکھائی نہ دی۔ میرا یہ اندازہ تھا کہ سڑک پر نور جہاں کو موجود ہونا چاہیے۔ اسے کافی وقت ملا تھا اور نشیب سے اترتی تو وہ اسی جگہ پہنچتی۔

وہاں میں نے سلور گرے کلر کی ایک ہنڈا سوک کو کھڑا دیکھا۔ یہ کسی کار کے رکنے کی جگہ نہ تھی۔ جب میں نے رفتار کم کر کے اس کار کو اوورٹیک کیا تو مجھے اسٹیئرنگ وہیل پر ایک جانی پہچانی صورت نظر آئی۔ وہ بڑی تشویش کے ساتھ باہر جھانک رہی تھی۔

پھر میں نے ایک جوان صحت مند آدمی کو دیکھا۔ وہ کسی عورت کو سڑک پر سے اٹھا رہا تھا۔ عورت بے ہوش تھی۔ اس پر نظر پڑتے ہی میرا دل اچھل کے حلق میں آ گیا۔ یہ عورت نور جہاں تھی۔

''پیچھے لٹا دو اسے۔'' اسٹیئرنگ پر بیٹھی ہوئی عورت نے کہا اور پیچھے والا دروازہ کھول دیا۔

میرا پیر ایک دفعہ بریک پر گیا۔ میری گاڑی رکی اور پھر چل پڑی۔ ایک سیکنڈ میں صورتِ حال میری سمجھ میں آ گئی تھی۔ گھبراہٹ اور پریشانی میں اوپر سے اترنے والی نور جہاں ٹھوکر کھا کے یا لڑکھڑا کے گری اور نشیب پر سے لڑھکتی ہوئی سڑک پر آ کے گری۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ سلور گرے کار کے سامنے آ گری ہو اور کار نے اسے ناک آؤٹ کر کے کچھ دور پھینک دیا ہو۔

میرے دماغ نے بروقت مداخلت نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اگر میں رک کے وضاحت کرتا اور نور جہاں کو اپنی گاڑی میں شفٹ کراتا تو جلدی کے باوجود اس کام میں پانچ سات منٹ صرف ہو جاتے اور یہ ہو سکتا تھا کہ اتنی دیر میں وہ خبیث انسپکٹر شمروز آ پہنچتا۔ کسی دوسری گاڑی والے سے قانون کے نام پر مدد حاصل کرنا اس کے لیے دشوار نہ تھا۔

میں نے سلور گرے کار کا نمبر نوٹ کر لیا تھا۔ اگلے موڑ تک پہنچنے سے پہلے ہی مجھے سلور گرے کار کی خاتون ڈرائیور کا نام بھی یاد آ گیا۔ وہ مشہور ایکٹرس شانی تھی۔ اس کا اصل نام تو شاہینہ بانو تھا مگر فلموں میں وہ شانی کے نام سے جلوہ گر ہوئی تھی۔ وہ ایک بدنام ڈانسر تھی جو اسٹیج پر بھی سنسنی خیز عریاں رقص کرنے میں نام پیدا کر چکی تھی۔

جب میں تیز رفتاری کے ریکارڈ قائم کرتا ہوا سڑک

کے موڑ تک پہنچا تو سلور گرے ہنڈا مجھے بیک ویو مرر میں بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ نور جہاں کو شانی سے نہ لے کر میں نے بڑی اچھی سی دانش مندی کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ ہو سکتا تھا کہ انسپکٹر شمروز خان نے فون یا اپنی جیپ کے وائرلیس سے آگے پیغام دے دیا ہو کہ اوپر سے آنے والی بلیک کرولا کو روکو۔ آگے کسی چوک یا سگنل پر پولیس مجھے روک سکتی تھی۔ نور جہاں میرے ساتھ ہوتی تو شمروز خان کی ناکامی پل بھر میں کامیابی بن جاتی۔

اب میری پوزیشن قدرے محفوظ تھی۔ میں انکار ضرور کر سکتا تھا کہ میرے ساتھ کوئی عورت نہیں تھی۔ میں کسی نور جہاں کے ساتھ دامنِ کوہ کے ریسٹورنٹ میں نہیں تھا۔ میں تو نواب رفیق احمد شیرازی آف ست بدھائی ہوں جو اپنے اٹارنی شہزاد احمد سے قانونی مسائل ڈسکس کر کے اب واپس جا رہا ہوں۔

نور جہاں کے بارے میں مجھے تشویش ضرور تھی۔ معلوم نہیں اسے کتنی چوٹیں لگی ہوں گی۔ لیکن یہ امید بھی تھی کہ شانی اسے اسپتال ضرور پہنچا دے گی۔ شانی اچھی عورت چاہے نہ ہو کام اس نے اچھائی کا کیا تھا۔ ورنہ یہاں کون کسی کی مدد کرتا ہے۔ وہ چاہتی تو نظر چرا کے گزر جاتی۔ اب یہ بعد میں شانی سے معلوم کیا جا سکتا تھا کہ وہ نور جہاں کو کس اسپتال میں لے گئی تھی۔ ممکن ہے راستے میں نور جہاں کو ہوش آ جائے اور شانی خود اسے شہزاد کے گھر چھوڑ دے۔

میرے فیصلے کے فوائد چند منٹ میں سامنے آ گئے۔ ابھی میں اسلام آباد ہائی وے پر اترا ہی تھا کہ سگنل سے پہلے مجھے پولیس نے روک لیا۔ وہ موٹر سائیکل پر اور پیدل سڑک کے درمیان کھڑے ہر گزرنے والی گاڑی کو ٹارچ لائٹ سے چیک کر رہے تھے۔ معلوم نہیں کب اور کہاں میری گاڑی پر لگے ہوئے چار رنگوں والے جھنڈے کے اوپر سے پلاسٹک کا کور اتر گیا تھا۔ شاید ہوا کے دباؤ سے اڑ گیا ہوگا۔ اب کار پر ریاست ست بدھائی کا جھنڈا بڑی شان سے پھڑپھڑا رہا تھا۔

اسلام آباد میں جھنڈے والی گاڑیوں کی بہتات ہے۔ جن پر پاکستان کا جھنڈا ہو وہ یقیناً وزیر یا صدر جیسے وی آئی پی کی گاڑی ہوتی ہے لیکن ان کے علاوہ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے جھنڈے ہیں۔ بے شمار سفارت خانوں کے جھنڈوں والی گاڑیاں تھیں اور اقوامِ متحدہ کے اداروں کی۔ ان جھنڈوں کی شناخت عام پولیس مین کو نہیں ہو سکتی۔ ان کے نزدیک تو جھنڈے والی ہر گاڑی کو سلیوٹ لازمی ہے۔ پھر میری گاڑی بھی نئی اور سیاہ رنگ کی تھی۔ اس کے باوجود انہوں نے مجھے روکا۔

ایک سارجنٹ نے سلیوٹ کر کے پوچھا۔ ''سر! آپ کہاں سے تشریف لا رہے ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''فیصل مسجد سے۔''

دوسرے نے کار کے اندر ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ ''اندر تو کوئی بھی عورت نہیں ہے سر!'' اس نے اپنے افسرِ اعلیٰ کو مطلع کیا۔

میں نے کہا۔ ''مسئلہ کیا ہے۔ تمہیں یہ فلیگ نظر نہیں آتا۔ یہ سفارت خانے کی گاڑی ہے۔''

''کس ملک کا سفارتخانہ سر!'' وہ عاجزی سے بولا۔

''ست بدھائی۔'' میں نے کہا۔ ''اور میں ایمبیسڈر ہوں۔ کیا اب یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ میں ڈپلومیٹک اینکلیو جا رہا ہوں۔''

اس نے پھر مجھے سلیوٹ کیا۔ ''سوری فار دی ٹرابل سر۔''

میں نے گاڑی آگے بڑھا دی اور پھر بیک ویو مرر میں دیکھا۔ انہوں نے ایک اور سیاہ کرولا کو روک لیا تھا۔ ظاہر ہے انسپکٹر شمروز خان نے نمبر نہیں دیکھا تھا ورنہ میرا بچ کے نکلنا محال تھا۔ گاڑی پر خود بخود لہرانے والا جھنڈا معاون ثابت ہوا لیکن سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ گاڑی میں نور جہاں کے نہ ہونے سے میری گاڑی مشکوک نہ رہی۔ انسپکٹر شمروز نے نور جہاں کا حلیہ بھی بتایا ہوگا اور یہ بھی کہا ہوگا کہ وہ ایک مفرور قاتلہ ہے جس کی گرفتاری پر انعام ہے۔

بعد میں مجھے اپنے بچ نکلنے پر ہنسی بھی آئی لیکن میں نے اپنی حاضر دماغی یا ذہانت پر ناز کرنے سے زیادہ خدا کی مدد کا شکریہ ادا کیا۔ مجھے اب آگے کی فکر کرنا تھی۔ محفوظ راستے پر آتے ہی میں نے راجا کو فون کیا۔ میں نے کہا۔ ''راجا جی! سوال بعد میں کرنا۔ پہلے میری سن لے۔'' اور پھر اسے کم سے کم الفاظ میں انسپکٹر شمروز خان سے جھڑپ کی روداد سنا دی۔ ''بس قسمت اچھی تھی کہ میں پکڑا نہیں گیا۔''

''اب تو کہاں ہے؟ اور تیری قاتل حسینہ کہاں ہے؟''

میں نے کہا۔ ''میں طوفانی رفتار سے پہنچ رہا ہوں ست بدھائی تاکہ وہاں اپنی موجودگی ثابت کر سکوں۔ تجھے کرنے ہیں تین کام۔ سب سے پہلے فون کر شہزاد کے گھر۔ میرے ڈرائیور اور محافظوں سے کہہ دے کہ وہ بلا تاخیر وہاں سے نکل آئیں۔ کوئی بھی گاڑی پکڑیں اور ست بدھائی پہنچ جائیں۔''

''ٹھیک۔'' دوسرا حکم عالی جاہ۔

''ایک ایکٹریس ڈانسر ہے شانی۔ اسٹیج پر بڑے پاکیزہ روحانی رقص پیش کرنے میں نیک نام ہے۔''

راجا نے چلّا کے کہا۔''اب کیا اس کے عشق میں مبتلا ہوگیا ہے فیکے پتّر۔ میں جانتا ہوں اسے۔''

''اس وقت نورجہاں کے بارے میں صرف وہی جانتی ہے کہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے۔ مجھے اس کا فون نمبر چاہیے۔''

''سوری! وہ کبھی میری محبوبہ نہیں رہی ورنہ نمبر میری ڈائری میں مل جاتا۔'' راجا نے کہا۔

''راجاجی۔ کسی فلمی صحافی سے پوچھو۔ ایسی شہرہ آفاق رقاصہ کا نمبر تو ہر بالغ و نابالغ پاکستانی شہری کے دل پر نقش ہونا چاہیے۔ یہ فون نمبر معلوم ہوتے ہی مجھے ایس ایم کردے۔ آخری کام یہ ہے کہ یہ ساری بات شہزاد کو بتادے۔ میری اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ وہ کورٹ میں تھا۔ شاید اب گھر پہنچ گیا ہو۔ اس سے کہنا کہ ہائی کورٹ میں جو اپیل رانا کی ضمانت کی منسوخی کے لیے دائر کرنی ہے۔ اس پر میرے دستخط خود کرلے۔ آج کی تاریخ میں اور کل درخواست دائر کردے۔''

اس وقت تک میں جی ٹی روڈ پر پہنچ چکا تھا اور میری گاڑی سو کلومیٹر کی رفتار سے مندرہ کی جانب بڑھ رہی تھی۔ یہ

میری خوش قسمتی تھی کہ میں نے تیز رفتاری میں روڈ سائن پر توجہ ہی نہیں دی اور کہیں بھی موٹروے پولیس نے مجھے چیک نہیں کیا ورنہ رفتار کی حد توڑنے پر کئی بار میرا چالان ہوجاتا۔

میں نے ترکی ٹول پلازا کراس کیا ہی تھا کہ میرے فون کی بیل بجی اور مجھے راجا کا نام نظر آیا۔''جی راجا صاحب۔ کیا خبر ہے۔''

''خبر اچھی نہیں ہے فیکے پتّر۔ شانی کا فون نمبر مجھے مل گیا تھا لیکن اس سے بات ابھی نہیں ہوئی۔ کیونکہ وہ گھر پر نہیں اسپتال میں ہے۔ نورجہاں کے ساتھ۔''

''نورجہاں ٹھیک ہے؟''

''مجھے کیا معلوم۔ گھر والوں نے مجھے شانی کا موبائل فون نمبر دینے سے انکار کردیا۔ دیتے بھی کیوں۔ نہ جانے کتنے دیوانے مانگتے ہوں گے۔''

''تونے کہا نہیں کہ میں بھی صحافی ہوں۔''

''یہی تو غلطی ہوگئی مجھ سے۔ شانی خود صحافیوں سے ناراض ہے اور گھر پر جس سے بات ہوئی وہ اس کی ماں تھی۔ اس کا خیال ہے کہ اس کی بے بی بہت معصوم ہے۔ اسے تو... کا مطلب بھی نہیں پتا۔ یہ صحافی ہیں جو اسے بدنام کرتے ہیں۔ خیر پھر میں نے دوسری بار فون کیا تو کہا کہ وہ میری بیوی کو کسی اسپتال میں لے گئی ہے۔ اس کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا۔ شانی کی گاڑی سے۔ مجھے اپنی بیوی کی خیریت معلوم کرنی ہے۔ پھر بڑی بی نے کہا کہ اچھا پانچ منٹ بعد فون کرنا۔ میں بے بی سے پوچھ لوں۔ پانچ منٹ بعد اس نے مجھے شانی کا موبائل نمبر دیا لیکن وہ بند تھا۔ میں نے پھر گھر فون کیا اور پوچھا کہ وہ کس اسپتال میں ہے۔ اب میں اسپتال جارہا ہوں۔''

''کون سے اسپتال؟''

''شانی پمز لے گئی تھی اسے۔ میرا خیال ہے دو گھنٹے لگیں گے لیکن تو فکر نہ کر۔ میں صورتِ حال کو سنبھال لوں گا۔''

''تیرے ساتھ کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔''شیر خان اور ایک گارڈ۔''

میں نے کہا۔''میں بڑی الجھن میں پڑگیا ہوں۔ آگے جاؤں یا واپس۔ میں آدھے راستے میں ہوں۔''

''میں نے کہا نا کہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ تو گھر پہنچ اور پھر آرام سے جا عبداللہ جان سے ملنے۔''

''آرام سے میں کیسے رہ سکتا ہوں۔ پریشانی تو رہے گی کہ پتا نہیں نورجہاں نے شانی سے کیا کہا ہوگا ہوش میں آنے کے بعد۔ شانی نے اسپتال والوں کو کیا بتایا ہوگا۔''

''یار میں تجھے فون کرکے بتاتا ہوں۔ ابھی ایک گھنٹے میں۔ تیرا ادھر آنا مزید مسائل نہ کھڑے کردے۔ اس ایک مسئلے سے جیسے تو نمٹ سکتا ہے، ویسے ہی میں بھی نمٹ سکتا ہوں۔ بھروسا رکھ مجھ پر۔ اللہ بہتری کرے گا۔''

میں نے کہا۔''چل ٹھیک ہے راجا۔ میں منتظر ہوں تیرے فون کا۔''

اسلام آباد سے ست بدھائی تک کا راستہ جو عام طور پر دو گھنٹے میں طے ہوتا تھا میں نے ڈیڑھ گھنٹے میں طے کیا اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ میں کسی حادثے سے دوچار نہیں ہوا۔ میری رفتار بہت زیادہ تھی اور میں ذہنی انتشار کا شکار بھی تھا۔

راجا کی کچھ بتائے بغیر اچانک روانگی نے خواتین کو بدحواس کیا تھا۔ جب میں پریشان حالی کی تصویر بنا پہنچا تو ان پر باقاعدہ گھبراہٹ سوار ہوگئی۔ رابعہ نے مجھے اپنے کمرے میں جاتا دیکھا تو میرے پیچھے لپکی۔

''آخر یہ کیا ہورہا ہے کزن؟'' اس نے ایک ہاتھ کمر پر رکھ کے تیکھے لہجے میں سوال کیا۔

میں صوفے پر گرگیا۔''کہاں کیا ہورہا ہے؟ تم کس کی بات کررہی ہو؟ میں نے آج سارا دن خبریں نہیں سنیں۔''

''بات کو مت ٹالو۔ ابھی راجا صاحب کچھ بتائے بغیر بھاگے ہیں گاڑی لے کر۔ پوچھا تو شہناز پر گرم ہوگیا کہ کیا ضروری ہے جہاں جاؤں تمہیں بتا کے اور تم سے اجازت لے کر جاؤں؟ ہر بات عورتوں کو بتانے کی نہیں ہوتی۔''

''یہ تو اس نے ایک عالمی سچائی بیان کی ہے۔''

''اور اب تم چلے آرہے ہو بھاگے ہوئے۔ شکل ایسی بنا رکھی ہے جیسے بھوت تمہارے پیچھے لگا ہوا ہے۔''

میں نے کہا۔''تین چڑیلوں کو دیکھ کر ایسی حالت ہوگئی ہے میری...''

''مت بتاؤ۔ بھاڑ میں جاؤ۔'' وہ پیر پٹختی واپس گئی۔

میں نے کہا۔''ریشم سے کہنا کافی دے جائے۔ اور دروازہ آہستہ بند کرنا...''

حسبِ توقع اس نے پلٹ کے کہا۔''میں خود لاتی ہوں کافی۔ زہر ملا کے۔'' اور دھڑ سے دروازے کو اپنے پیچھے بند کرگئی۔

اس وقت میں تھوڑی سی تنہائی اور سکون چاہتا تھا۔ جوتے اتار کے میں نے واش روم کا رخ کیا۔ ابھی ساڑھے سات بجے تھے۔ ڈی آئی جی عبداللہ جان سے ملاقات کے لیے میں آٹھ سے ساڑھے آٹھ کے درمیان جاتا تو بہ آسانی ساڑھے نو تک پہنچ سکتا تھا۔

تکان دور کرنے کے لیے میں نے غسل کیا اور خود کو کافی بہتر محسوس کیا۔ ریشم کافی لے کر آئی تو مگ میز پر رکھ کے خاموشی سے سٹک گئی۔ غالباً اسے رابعہ سے معلوم ہوگیا تھا کہ میرا موڈ خراب ہے۔ اسی وقت میرا فون گنگنایا اور میں نے راجا کا نام دیکھا۔

''یس مہاراجا۔ سب ٹھیک ہے نا؟''

اس نے کچھ تذبذب کے ساتھ کہا۔''ہاں۔ کسی حد تک۔''

''راجا۔ کھل کے بات کر۔ نورجہاں ٹھیک ہے۔''

''نورجہاں ٹھیک ہے۔ اسپتال کے ایک کمرے میں ہے۔ سورہی ہے۔ جہاں اس کا نام مسز قزلباش لکھا گیا ہے۔''

''یہ قزلباش کون ہے؟''

''یہ مجھے بھی نہیں معلوم۔ شانی نے مجھ سے کہا کہ میں کیا کرتی۔ کوئی نام تو بتانا تھا اور لڑکی بے ہوش تھی۔ میں نے اس کا بیگ بھی دیکھا۔ اس سے کچھ پتا نہیں چلا۔''

''اس نے یہ کیوں ضروری سمجھا کہ نورجہاں کو کسی قزلباش کی بیوی بتائے۔ وہ رخسانہ فرزانہ شبانہ۔ کچھ بھی بتا سکتی تھی۔''

''نام کا مسئلہ بعد میں پیدا ہوا۔ اسپتال والوں نے پہلے کیس لینے سے انکار کردیا تھا۔ شانی نے کہا تھا کہ یہ لڑکی مجھے سڑک پر بے ہوش پڑی ملی تھی۔ انہوں نے کہا کہ یہ پولیس کیس ہے۔ پہلے شانی کا خیال تھا کہ وہ چپکے سے نکل جائے۔ اسپتال والے جانیں اور نورجہاں۔ اسے احساس ہورہا تھا کہ یہ ہمدردی اسے مہنگی پڑ جائے گی۔ پھر اتفاق سے شانی کا ایک پرستار ڈاکٹر آگیا۔ وہ بہت سینئر ڈاکٹر ہے۔ شانی نے اس سے اپنی پرابلم کا ذکر کیا۔ یہ کہا کہ لڑکی اچانک میری گاڑی کے سامنے آگئی۔ رفتار کم ہونے کے باوجود میں گاڑی نہ روک سکی۔ یہ گاڑی سے ٹکرائی اور بے ہوش ہوگئی۔ میں اسے وہیں چھوڑ کے فرار ہوسکتی تھی لیکن اخلاقی ذمے داری جانتے ہوئے یہاں لے آئی۔''

میں نے کہا۔''اور کیا درحقیقت ایسا ہی ہوا تھا؟''

''یس۔ ایسا ہی ہوا تھا۔ شانی نے مجھے بتایا کہ سڑک پر کوئی نہیں تھا۔ وہ اچانک اوپر سے ٹپک پڑی۔ جہاں سے کسی کے سڑک پر آجانے کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔ بائیں ہاتھ پر خاصی چڑھائی ہے اور جنگل ہے۔ معلوم نہیں وہ وہاں کیا کررہی تھی۔ ادھر سے کیوں آئی۔ وہ اوپر سے کودی یا گری۔ اور بس۔ گاڑی کے سامنے آگئی۔ خیر۔ اس شناسا ڈاکٹر نے شانی کی مدد کی اور نورجہاں کو ایمرجنسی والے اسٹریچر پر لے گئے۔ شانی اس ڈاکٹر کے کمرے میں بیٹھی رہی۔ آدھے گھنٹے بعد ایک لیڈی ڈاکٹر نے پوچھا کہ اس خاتون کے شوہر کا کیا نام ہے۔ اسے بلاؤ۔''

''یہ ضرورت کس لیے پیش آئی؟''

''یار کچھ اپنی عقل بھی استعمال کر۔ وہ اوپر سے گرتی پڑتی آئی اور سڑک پر ایک گاڑی سے ٹکرا گئی۔ اس کا نتیجہ کیا نکل سکتا تھا؟''

میں نے سانس روک کے پوچھا۔''تیرا مطلب ہے...''

''یس... شی لاسٹ ہر بے بی۔''

''اوہ۔'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''تجھے افسوس ہورہا ہے الو کے پٹھے۔ ویسے خدا کا شکر ادا کر جس نے تجھے بڑی پریشانی سے بچالیا۔ ہمیں کچھ بھی نہیں کرنا پڑا۔ حادثاتی طور پر سب ٹھیک ہوگیا۔ خود نورجہاں اس کی ذمے دار ہے۔''

میں نے کہا۔''اور وہ خود... کیا اسے معلوم ہے؟''

''ابھی نہیں۔ اس کا ڈی این سی ہوا ہے۔ ابھی ایستھیزیا کے زیرِاثر بے ہوش ہے لیکن بالکل فکر کی بات نہیں۔ اسے کچھ نہیں ہوا۔ دوچار دن میں بالکل ٹھیک ہوجائے گی۔ جب میں شانی سے ملا اور اس کے بارے میں پوچھا تو شانی کی جان میں جان آئی۔ اس نے کہا کہ کیا تم ہی اس کے شوہر ہو۔ میں نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ وہ بولی کہ میں نے تمہارا نام قزلباش لکھوادیا تھا۔ میں کیا کرتی۔ میں نے کہا کہ شانی۔ تم نے جو کچھ کیا اس کے لیے میں تمہارا بے حد شکرگزار ہوں۔ ایسی نیکی کی توفیق خدا نے مجھے آج تک نہیں بخشی۔ آج کل تو زمانہ ایسا ہے کہ لوگ اپنی جان بچاتے ہیں۔ کسی کو مار بھی دیں تو سڑک پر چھوڑ کے بھاگ جاتے ہیں۔ پھر میں نے بتایا کہ میرا نام راجا ہے اور میں ایک صحافی ہوں۔ اب کرنا خدا کا یوں ہوا کہ وہ میرے نام سے واقف تھی۔ میرے کالم پڑھتی تھی۔ اس نے کہا کہ راجا صاحب! میں تو بڑی عاجز ہوں ان دو دو ٹکے کے فلمی رپورٹرز سے۔ یہ پاپا رازی ہر جگہ ہر وقت میرا تعاقب کرتے ہیں اور لکھ دیتے ہیں جو ان کے دل میں آتا ہے۔ الٹا سیدھا۔ میں نے اسے تسلی دی کہ اس کا نام کہیں نہیں آئے گا اور میں اس کی انسان دوستی نیک دلی اور اخلاقی جرأت پر ایک کالم ضرور لکھوں گا۔ وہ مجھے اگلے شو کے لیے اپنے مہمانِ خصوصی کے طور پر مدعو کر کے اور یہ وعدہ لے کر گئی ہے کہ میں ضرور آؤں گا۔''

میں نے کہا۔ ''راجا... وہ سالا شمروز خان اسے تلاش کرتا ہوا اسپتال تو نہیں پہنچ جائے گا؟''

''عقل سے کام لے فیکے پتر۔ وہ کیسے پہنچ جائے گا؟ پھر اتنا بڑا اسپتال ہے۔ جہاں پتا نہیں نور جہاں نام کی کتنی مریض خواتین ہوں گی۔ اسے کون جانے دے گا زنانہ وارڈ میں۔ اور پھر یہاں اس سے بھی بڑے کئی اسپتال ہیں۔ پولی کلینک۔ شفا انٹرنیشنل۔ ہولی فیملی جیسے چھوٹے پرائیویٹ اسپتالوں کے علاوہ۔ ناممکن۔''

''رات کو وہاں تو رہے گا؟''

''نہیں۔ میں نے شہزاد سے کہا تھا۔ وہ اپنی خالہ کو لے کر آرہا ہے۔ وہ نور جہاں کو سنبھال لیں گی۔''

''کیا... انہیں معلوم ہے...؟''

''ابے عقل کے اندھے۔ تو ایسا کیوں سمجھتا ہے کہ جب تک اخبار کی سرخی نہ بنے یا پاکستان ٹیلی ویژن نہ دکھائے کسی کو حقیقت نظر نہیں آسکتی۔ کیا باقی سب واپس آگئے ہیں۔ تیرا ڈرائیور اور گارڈ۔''

''میرا خیال ہے آگئے ہوں گے۔ ابھی میں نے دیکھا نہیں۔''

''رات کو کسی وقت شہزاد بھی اپنی والدہ کے ساتھ پہنچے گا۔ یہ اچھا ہے کہ اس کے گھر میں کوئی نہ ہو۔ بالفرضِ محال شمروز خان سراغ لگا کر تجھے پکڑنے وہاں جائے۔''

میں نے کہا۔ ''راجا۔ اس فرشتہ سیرت رقاصہ نے جو کسی فرشتہ غیب کی طرح نور جہاں کی مدد کے لیے نمودار ہوئی تھی۔ شوہر کا نام تو قزلباش بتادیا۔ دیگر کوائف کیا بتائے؟ ان کا پتا اور یہ کہ وہ کیا کرتے ہیں۔''

''پتا اس نے اپنا ہی بتادیا تھا۔ قزلباش صاحب کے بارے میں کہا کہ وہ بزنس کرتے ہیں۔ فون نمبر بھی اپنا ہی دیا۔ اسپتال میں یہ خانہ پُری تو کرنی ہی پڑتی ہے۔''

''ایک موبائل فون نور جہاں کے پاس بھی تھا۔''

''یہ پوچھا تھا میں نے۔ شانی نے کہا کہ موبائل فون ہوتا تو مجھے کیا مسئلہ تھا۔ میں اس کی میموری میں سے کوئی بھی نام نکال کے فون کردیتی لیکن فون کام نہیں کررہا تھا۔ غالباً اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ گری تو سیٹ کو نقصان پہنچا۔

''آج تو واقعی بال بال بچے ہم۔''

''چل اب آئندہ کی خیر مانگ۔ شہزاد آگیا ہے اور دیکھ۔ غنی کو میں نے بریف کردیا تھا۔ اول تو اس کا امکان مجھے نظر نہیں آتا کہ یہ شمروز خان کوئی بڑا جاسوسِ اعظم ثابت ہو اور میری بو سونگھتا ہوا ست بدھائی پہنچے۔ لیکن اس نے زیادہ ہوشیاری دکھائی تو غنی ہی اس سے نمٹ لے گا۔ اسے بتادے گا کہ تین دن سے نواب صاحب حویلی سے باہر نہیں نکلے۔''

روانگی سے قبل میں نے عبداللہ جان کو فون کیا۔ ''میں نے سوچا پہلے آپ کی موجودگی کنفرم کرلوں۔''

اس نے کہا۔ ''تشریف لائیے۔ میں چشم براہ ہوں۔''

''دراصل آپ جیسے حکامِ بالا کی اچانک مصروفیت نکل آتی ہے۔''

اس نے کہا۔ ''بجا ارشاد۔ لیکن ایسا ہوتا تو میں آپ کو مطلع کرنا کبھی نہ بھولتا۔ ورنہ آپ کہتے۔ طاقت مہماں نہ داشت۔ خانہ بہ مہماں گزاشت۔''

میں نے کہا۔ ''اب آپ فصیح اردو سے فارسی پر آگئے۔ ذرا مطلب بھی سمجھادیجیے۔''

وہ ہنسا۔ ''مطلب یہ کہ مہمان داری سے بچنے کے لیے میزبان گھر چھوڑ کے بھاگ گیا۔''

زندگی میں کامیابی کچھ لوگوں کو لاٹری میں نکلنے والی دولت کی طرح خوش قسمتی سے ملتی ہے لیکن بیشتر کی ترقی کا

جب صلاحیت اور محنت ہی ہوتا ہے۔ زندگی کے تمام معاملات میں جذبات سے خالی نہ ہونا اور دماغ کو ٹھنڈا رکھتے ہوئے راہِ عمل متعین کرنا بھی ایک صلاحیت ہے جو ڈی آئی جی عبداللہ جان کے رویے میں صاف نظر آتی تھی۔

وہ ہر حال میں اپنا راستہ کسی کلکولیٹر جیسے دماغ کی مدد سے متعین کرسکتا تھا۔ کبھی ظاہر نہیں ہونے دیتا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور کیا کررہا ہے۔ اس کے دل میں کیا ہے اور زبان پر کیا۔ نہ اس کی دوستی کا پتا چلتا تھا اور نہ دشمنی کا۔ کچھ لوگ بڑے کھرے ہوتے ہیں لیکن ان پر منافقت کا ٹھپا نہیں لگایا جاسکتا کیونکہ ان کے قول و فعل کا تضاد بھی ایک منطقی جواز رکھتا ہے۔

عبداللہ جان ایسا ہی آدمی تھا جسے سمجھنا مشکل تھا۔ میں نہ اس کی حمایت پر تکیہ کرسکتا تھا اور نہ اس کی مخالفت مول لے سکتا تھا۔ بظاہر وہ بہت نفیس اور شائستہ انسان تھا اور پولیس جیسے بدنام زمانہ محکمے میں مس فٹ نظر آتا تھا لیکن اس کی ترقی اس کی اہلیت کا ثبوت تھی۔

کچھ دیر کی رسمی گفتگو کے بعد حرفِ مطلب اس کی زبان پر آگیا۔ میں خود بھی سمجھ رہا تھا کہ وقت محدود ہے اور میں نصف شب تک صرف گپ شپ نہیں کرسکتا۔

''کہیے نواب صاحب آپ کا مشن کس حد تک کامیاب رہا؟''

میں نے کہا۔ ''کون سا مشن۔ اچھا میں سمجھا۔ آپ شاہی بادشاہ کو قائل کرنے کی بات کررہے ہیں۔''

''پہلے تو یہ بتائیے اس سے رابطہ کیسے ہوا۔ ہمارے ہاتھ تو وہ آتا نہیں۔''

میں نے خوبصورتی سے ٹال دیا۔ ''کیا اس کی اہمیت ہے سر؟''

''نہیں۔ اہمیت تو مقصد کی ہوتی ہے۔'' وہ پینترا بدل گیا۔

''اخبار والے متحد رہتے ہیں۔ مصدقہ ذرائع سے معلوم ہوا ہے اور آپ لوگ کہتے ہیں کہ پولیس ذرائع کے مطابق۔ عقلمندوں کو اشارہ کافی ہوتا ہے۔ ظاہر ہے یہ بھی غیر اہم ہے کہ گفتگو فون پر ہوئی یا بالمشافہ۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''بالکل۔ یہ بھی غیر اہم ہے کہ کب اور کہاں بات ہوئی۔''

میں نے کہا۔ ''میں نے آپ کی پیشکش اس کے سامنے رکھی اور اس نے میری بات سنی۔ مجھے امید ہے وہ مان جائے گا۔ لیکن قدرتی طور پر اس کے ذہن میں شکوک نے کچھ

سوالات کو جنم دیا۔ ابھی میرے پاس کسی کا جواب نہیں تھا۔ کیونکہ جواب آپ فراہم کریں گے۔"

اس نے اتفاق کیا۔ "سوالات مجھے بتایئے لیکن کھانا جاری رکھیے۔ اگر یہ دعوت شیراز نواب شیرازی کے خوان نعمت سے مطابقت نہیں رکھتی تو میری معذرت۔"

دعوت شیراز کا حوالہ غالباً حافظ شیرازی سے منسوب ہے جو ایران کے شہر شیراز کے نامور شاعر تھے۔ کسی دعوت میں سادگی کی یہ انتہا ہوگی کہ وہ دریا کنارے بیٹھ کر روٹی کو دریا کے پانی میں بھگو کر کھاتے رہے اور اس شانِ قلندری کو دعوت شیراز کہا گیا۔ میں اپنے نام کے ساتھ شیرازی لگاتا تھا چنانچہ عبداللہ جان کے حوالے نے مجھے حیران کردیا۔

میں نے کہا۔ "فرض کریں شامی خود کو قانون کے حوالے کرتا ہے تو کس کے حوالے کرے۔ قانون کون ہے؟"

"یہ طے کیا جاسکتا ہے۔"

"رائٹ۔ یہ ٹھوس ضمانت کون دے سکتا ہے کہ وہ قانون کا نمائندہ ہے جس کی ضمانت پر بھروسا کیا جاسکتا ہے۔ آپ قانون کے نمائندے ہیں۔ وزیرِ داخلہ ہے۔ یا چیف جسٹس ہے۔ کون ایک آدمی ہے جو یہ کہے کہ میں ذمے دار ہوں۔ نمبر دو۔ وزیر داخلہ یا وزیر قانون بھی سیاست داں ہوتے ہیں۔ آج جیل کے اندر۔ کل جیل ان کے انڈر۔ کہہ کے مکر جانا یا بدل جانا سیاست کا چلن ہے۔ کسی کے وعدے کی ضمانت کیا ہوگی۔"

"میں نے کہا تھا۔ آپ میرا دستخط شدہ استعفیٰ رکھ لیں۔ وعدہ خلافی ہوگی تو میں خود اسے میڈیا کی موجودگی میں آئی جی صاحب کے حوالے کردوں گا کہ وعدہ خلافی پر میں بطورِ احتجاج مستعفی ہوتا ہوں۔"

"گستاخی معاف۔ یہ ایک پاؤں کے بعد دوسرے پر کلہاڑی مارنے والی بات ہے۔ خدانخواستہ شامی ہتھیار ڈالنے آئے اور اسے ماردیا جائے یا پکڑلیا جائے۔ یہ ایک نقصان۔ پھر آپ اپنی اچھی بھلی نوکری قربان کریں۔ یہ دوسرا نقصان۔ شامی جان سے گیا آپ نے عمر بھر کی کمائی گنوائی۔ حاصل کیا ہوا؟"

"چلیے پھر آپ ہی بتایئے۔"

میں نے کہا۔ "ابھی میں نے سوچا نہیں اس لیے میرے ذہن میں کچھ نہیں۔ آپ ہی سوچیے۔ شامی نے سوچنے کے لیے تین دن مانگے تھے۔ ان میں سے ایک گزر گیا ہے۔ اتنا ہی وقت ہمیں بھی کافی ہونا چاہیے۔"

"اوکے۔ دو دن میں قطعی صورت سامنے آجائے گی۔"

میں نے کہا۔ "چند چیزیں آپ طے شدہ سمجھ لیں۔ شامی کے ساتھ اس کے دس ساتھی ہتھیار ڈالیں گے۔ معافی اور تمام مقدمات کی واپسی کے وعدے پر اور اس یقین دہانی پر کہ انہیں باعزت شریفانہ زندگی گزارنے کے مواقع فراہم کیے جائیں۔"

"یہ پیشکش کی بنیاد ہے۔"

"اگر یہ موقع آتا ہے اور کوئی اجتماع یا تقریب ہو تو جس میں متعلقہ تمام فریق آمنے سامنے ہیں اور ضروری ہے کسی دستاویز پر دستخط کریں۔ معتبر گواہ ہوں کی موجودگی میں۔ تو یہ سب میری ست بدھائی کی حویلی میں ہوگا۔ کسی آفس یا کورٹ میں نہیں۔"

"اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہوسکتا۔"

"اس میں میری حیثیت صرف ایک ثالث کی ہے۔ میں فریق ہوں اور نہ گواہ۔ مگر کسی کی وعدہ خلافی یا بدعہدی سے نقصان مجھے ضرور ہوگا۔ یہ میں جانتا ہوں۔ پھر بھی محاورے کے مطابق۔ پنگا لے رہا ہوں۔ کیونکہ آپ نے مجھ پر اعتماد کا اظہار کیا ہے اور فریق ثانی بھی ایسا ہی ہے۔ آسان اور محفوظ راستہ یہ تھا کہ میں صاف انکار کردیتا کہ میں اس بکھیڑے میں کیوں پڑوں اور پنگا میں اس لیے نہیں لے رہا ہوں کہ بے وقوف یا اناڑی ہوں۔ میں ایک کلکیولیٹڈ گیم کھیل رہا ہوں جس میں کامیابی کے امکان روشن ہیں اور یہ کامیابی خود میری پوزیشن کو مستحکم کرسکتی ہے۔"

"آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔ دو دن بعد میں ایک فائنل پلان آپ کو دوں گا۔"

میں نے کہا۔ "یہ بات ہم یہاں ختم کرتے ہیں۔"

وہ اٹھا۔ "لیکن ابھی آپ کو جانے کی اجازت نہیں ہوگی۔"

"کیا یہ ایک پولیس افسر کا حکم ہے۔" میں نے ہنس کے کہا۔

"جی۔ ایک کپ چائے یا کافی پی لیں۔ پھر آپ آزاد ہیں۔"

میں نے کہا۔ "اس کے بغیر میں خود بھی نہ جاتا کیونکہ ابھی میں نے اپنی بات تو کی ہی نہیں۔"

"ہاں۔ کل یہ بات اس لیے نہیں ہو پائی تھی کہ میں بے حد مصروف تھا۔ مجھے تو یہ بھی بعد میں معلوم ہوا کہ وزیر داخلہ صاحب سے آپ کی کوئی ملاقات ہوئی۔ آپ کے جانے کے بعد انہوں نے مجھے طلب فرمایا۔"

"وہ بہت خفا ہوں گے۔"

"وجہ آپ کو بہتر معلوم ہوگی کہ وہ کیوں خفا تھے۔ مجھے اندازہ بھی ہے لیکن میں اس پر بات نہیں کروں گا۔ انہوں نے کہا کہ یہ نواب رفیق احمد شیرازی۔ یہ آپ کے لیے کوئی پرابلم تو پیدا نہیں کررہا ہے۔ میں نے کہا کہ ابھی تک تو نہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ حکومت کے نوٹس میں کچھ باتیں آئی ہیں۔ اس علاقے کے نمائندے رانا رجب علی ہیں۔ یہ ان کے لیے مسائل کھڑے کررہا ہے۔"

"انہوں نے آپ کی ڈیوٹی لگادی ہے۔ مجھے سمجھانے کے لیے۔"

"نہیں۔ آپ کا دماغ درست کرنے کے لیے۔" عبداللہ نے کہا۔

"خراب دماغ کیسے ہوتا ہے۔ آپ تو اس کے ماہر ہیں۔" میں نے کہا۔

"دیکھیے۔ میں نے پہلے بھی آپ سے کہا تھا۔ وہ ایک مخلصانہ قسم کا مشورہ تھا۔ لائف کو انجوائے کریں۔ ان حالات کو درست کرنے کے خبط میں مبتلا نہ ہوں جو نصف صدی سے بدتری کی جانب رواں ہیں۔ اصولی طور پر میں آپ کا ہم خیال ہوں۔ عملی طور پر مخالف۔"

"کیا یہ دوعملی نہیں ہے۔"

"یہ مجبوری ہے۔ آپ بند کے ایک شگاف کو بند کرسکتے ہیں۔ جب بڑھتے بڑھتے وہ شگاف اتنا بڑا ہوجائے کہ بند کو بہا کرلے جائے تو کیا آپ بہاؤ کو روک سکتے ہیں۔ آپ خود بہ جائیں گے۔ میں تو آپ کو یہی مشورہ دوں گا تاکہ جان بچایئے اور بھاگ جایئے۔"

کچھ دیر بعد میں نے کہا۔ "آپ کی مجبوری ہے نوکری۔"

اس نے اقرار میں سرہلایا۔ "یہ نوکری میرے خاندان کی ضرورت ہے اس کے سوا میرے پاس کچھ نہیں۔ میرے ماں باپ نے بڑی مشکل سے میری کفالت کی تھی۔ وہ پولیس میں سب انسپکٹر تھے۔ اس عہدے تک وہ پینتیس سال نوکری کرنے کے بعد پہنچے تھے۔ انہیں بھی وہی امراض لاحق تھے۔ فرض شناسی اور ایمانداری کے۔ وہ واقعی سمجھتے تھے کہ رشوت جہنم کا ایندھن ہے اور انہوں نے حرام کھایا تو یہ ان کی اولاد کے خون میں شامل ہوجائے گا۔ یہ اثر تھا ان کے اپنے والد کی تعلیم کا جو ڈاکخانے کے باہر منشی تھے۔ لوگوں کے خط لکھتے تھے اور منی آرڈر فارم پُر کرتے تھے۔ سنجیدگی سے مانتے تھے کہ رزق کی فراہمی اللہ کی ذمے داری ہے چنانچہ انہوں نے دو شادیاں کیں اور بڑا انصاف رکھا۔ دونوں بیویوں کے سات سات بچے ہوئے۔ سب نے روکھی سوکھی کھائی موٹے چھوٹے کپڑے پہنے اور خدا کا شکر ادا کیا۔ میرے والد کو پولیس کی نوکری ملی تو ان کے ابا نے سامنے بٹھا کے قرآن پر عہد لیا کہ وہ ظلم نہیں کریں گے اور رشوت نہیں لیں گے۔ ابا نے یہ عہد نبھایا۔ شاید ان کی بھی مجبوری تھی۔ اپنے باپ سے اور خدا سے کیے ہوئے عہد کو توڑنے کی ان میں ہمت نہیں تھی۔ روزِ محشر وہ سرخرو ہوں گے یا نہیں۔ اس کا تو مجھے علم نہیں لیکن محکمے کی نظر میں ان کے عمال ناپسندیدہ رہے۔ تاہم چند افسرانِ بالا کی وجہ سے ان کی نوکری چلتی رہی۔ وہ قیدیوں کو جیل سے کچہری لے جانے والی گاڑی کے نگراں تھے کہ راستے میں گاڑی پر حملہ ہوا۔ کچھ ڈاکو اپنے ساتھیوں کو چھڑانا چاہتے تھے۔ انہوں نے ابا سے بات کی تھی کہ وہ مقابلہ ضرور کریں لیکن گولیاں دائیں بائیں اوپر نیچے چلاتے رہیں۔ یہ ایک لاکھ کا سودا تھا جو تیس سال پہلے اتنے ضرور ہوتے تھے جتنے آج کے دس لاکھ۔ ابا نے انکار کردیا اور اپنے افسرانِ بالا کو خبر پہنچادی۔ افسران بالا نے ابا سے کہا۔ اب تم فکر نہ کرو۔ دوسری طرف ڈاکوؤں سے کہا کہ تم فکر نہ کرو۔ میرے پاس ثبوت کچھ نہیں۔ جب حملہ ہوا تو مقابلہ شروع ہونے سے پہلے ہی پہلی گولی ابا کو لگی۔ یہ ان کے اپنے ایک ماتحت نے چلائی تھی۔ ابا کا نشانہ لے کر۔"

میں دم بخود سن رہا تھا۔ "آپ کو یہ معلوم کیسے ہوا۔"

"بہت عرصہ بعد جب میں خود پولیس میں بھرتی ہوا تو ان کے ایک دوست نے بتایا تھا کہ میں نے ایسا سنا ہے۔ ابا کی وفات کو شہادت کہا گیا۔ وہ ڈاکوؤں کا مقابلہ کرتے ہوئے مارے گئے تھے۔ خود آئی جی صاحب پولیس لائن میں ان کی نمازِ جنازہ میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ انہوں نے بیوہ کو نقد دس ہزار، انعامی سند اور یہ یقین دہانی کرائی تھی کہ اس سے سرکاری کوارٹر خالی نہیں کرایا جائے گا اور انٹر کے بعد اس کے بیٹے کو پولیس میں نوکری دے دی جائے گی۔ وہ دس ہزار کتنے دن چلتے۔ لیکن رہنے کی جگہ تھی اور سال بھر بعد مجھے شہداد پور کے پولیس ٹریننگ سینٹر بھیج دیا گیا جہاں سے میں اے ایس آئی بن کے نکلا۔ ابا کی زندگی کے دونوں پہلو مجھ پر اثر انداز ہوئے۔ ایک ان کا کردار اور دوسرا ان کا انجام۔ میں نے ظلم نہیں کیا۔ رشوت بھی نہیں لی لیکن ہر موقعے سے فائدہ ضرور اٹھایا۔ میں نے ان کی طرح شہادت کے مرتبے پر فائز ہوکے اپنی بیوی کو صرف انعامی سند کے ساتھ چھوڑنا قبول نہیں کیا۔ میرا بیٹا بھی نہیں تھا جو باپ دادا کی روایت کو

آگے بڑھاتا اور محکمۂ پولیس میں ان کا جانشیں بن سکتا۔ میری صرف چار بیٹیاں ہیں جن کو دیکھ کر میرا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے۔ ان میں سے دو ڈاکٹرز ہیں۔ ان کے شوہر بھی ڈاکٹرز ہیں۔ ایک کالج میں پڑھاتی ہے اور اچھی شاعر ہے۔ چوتھی لندن اسکول آف اکنامکس سے ماسٹر کر رہی ہے۔ میرے پاس جو بھی ہے۔ یہی تنخواہ ہے اور یہی نوکری میرا اثاثہ ہے۔ میں نے لاہور میں اپنا مکان بنالیا ہے اور امید رکھتا ہوں کہ آئی جی کے عہدے پر ریٹائرمنٹ میرے کیریئر کی معراج ہوگی۔ مجبوری یہ ہے کہ اس مرحلے پر میں اپنی نوکری کو قربان نہیں کرسکتا۔ کسی آدرش پر یا اصول پر۔ آج زمانہ مختلف ہے۔ اوپر والے مجھے آج بھی او ایس ڈی بنا کے ہٹا سکتے ہیں۔ جیسے پہلے ہٹایا تھا۔ میرے خلاف بدعنوانی رشوت ستانی اور کرپشن کے مقدمات قائم ہوسکتے ہیں۔ میری پنشن بھی خطرے میں پڑسکتی ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ مجھ پر سیاسی نوعیت کے کیس بنادیے جائیں۔ نیب جیسے ادارے میرے پیچھے لگ جائیں۔"

میں نے کہا۔ "میں سب سمجھتا ہوں۔"

"لیکن آپ کو فرق نہیں پڑتا۔ آپ کے پاس چوائس ہیں۔ آپ یہ جاگیر بیچ کے جاسکتے ہیں۔ کراچی میں انڈسٹری لگا سکتے ہیں۔ لندن میں سیٹل ہوسکتے ہیں۔ پھر آپ کن چکروں میں پڑ گئے ہیں۔"

میں نے مسکرا کے کہا۔ "یہ میری مجبوری ہے ڈی آئی جی صاحب۔ مجھے جو کرنا ہے وہ ضرور کروں گا۔ کل وزیر داخلہ صاحب نے مجھے کھلی دھمکی دی تھی۔ اس سے مجھے کوئی فرق نہیں پڑا۔ میں رانا کا دشمن نہیں۔ رانا میرے منصوبوں کا دشمن ہے۔ میں اسپتال اور اسکول بند نہیں کرسکتا۔ میں یہاں لوگوں کو روزگار ضرور دوں گا۔ کارخانے ضرور لگاؤں گا۔ اور ممکن ہوا تو ڈیم بھی بناؤں گا۔"

وہ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ "آپ اچھے آدمی ہیں نواب صاحب۔ لیکن زمانہ بہت خراب ہے۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "زمانے کو ٹھیک کون کرے گا؟ میں اسے مزید خراب کرنے کا الزام اپنے سر کیوں لوں۔"

اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ "ایک مشورہ ہے۔ ڈی آئی جی کی حیثیت سے نہیں۔ دوست کی حیثیت سے۔"

میں نے کہا۔ "میں اس کی قدر کروں گا۔"

"رانا کا تعلق آج حزبِ اختلاف کی جماعت سے ہے۔ لیکن وہ ایک صوبے میں حکومت کے اتحادی بھی ہیں۔ یہ ڈراما یہاں چلتا رہتا ہے۔ اسی لیے وزیر داخلہ اس کی حمایت کر رہے ہیں۔ آپ سیاسی چال چلیں اور برسرِ اقتدار جما[عت] میں شامل ہو جائیں۔"

میں نے ہنس کے کہا۔ "وہ کیسے؟"

"اس کا بندوبست میں کرتا ہوں۔ میں آپ[کی] ملاقات وزیر اعلیٰ کے مشیر سے کراتا ہوں۔ آپ پارٹی فنڈ [میں] چندہ دیں۔ پچاس لاکھ اور وزیر اعلیٰ کو اسکول کا افتتاح کر[نے] کے لیے بلالیں۔ اس کی حمایت حاصل ہوگی تو آپ[کی] پوزیشن بہت مضبوط ہو جائے گی۔ کیا پتا آپ ہی کو ا[گلے] انتخاب میں پارٹی سے ٹکٹ مل جائے۔ بڑے مہرے [اور] چھوٹے مہرے کو پیٹنا سیاست کی بساط پر کوئی غیر اخلاقی با[ت] نہیں۔ میں وزیر داخلہ کے مقابلے میں آپ کی یہی مدد کر[سکتا] ہوں۔"

میں نے کہا۔ عبداللہ صاحب! کیا ایسا نہیں ہوسکتا [کہ] شاہی بادشاہ وزیر اعلیٰ صاحب کے سامنے ہتھیار ڈالے۔"

وہ مسکرایا۔ "میرے ذہن میں یہی تھا۔ مگر وزیر داخ[لہ] ہائی پاس کرنے میں میری مدد کو میری نافرمانی سمجھا جائے [گا]۔ کم سے کم وزیر داخلہ ایسا ہی سمجھے گا۔ یہ کام آپ خود کریں۔"

"مگر کیسے۔ میری وزیر اعلیٰ تک رسائی کہاں ہے۔"

"راجا صاحب آپ کے دوست ہیں تو کیا پروا۔ صحا[فی] سب کچھ کرسکتے ہیں۔ ہر حکومت صحافیوں سے اس [لیے] ناراض رہتی ہے کہ وہ نکتہ چینی اور مخالفت کرتے ہیں۔ ا[گر] آپ وزیر اعلیٰ کو پبلک میں اپنا امیج بہتر بنانے کا موقع د[یں] گے تو وہ کیوں نہیں لے گا۔ وہ اس موقعے سے پورا فا[ئدہ] اٹھائے گا اور آپ کو اپنے دوستوں میں شامل کرنا چاہے گا۔"

میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ "اگر مجھے سیاست [میں] کامیابی ملی تو وہ آپ کے اس مشورے کے طفیل ہوگی۔"

اس کی بات پر میں واپسی کے سفر میں بھی غور کرتا ر[ہا]۔ وہ بلاشبہ ایک زمانہ شناس آدمی تھا اور اس کا مشورہ کسی ذا[تی] غرض پر مبنی نہیں تھا لیکن کیا یہ ممکن ہوگا کہ میں ذاتی مفاد [کے] لیے ایک سیاسی قوت کا سہارا لوں؟ پتا نہیں اس کے بعد مج[ھے] اور کیا کچھ نہ کرنا پڑے۔ یہاں تو آج کے دوست کل [کے] دشمن۔ کل کے دشمن آج کے دوست کا فارمولا چلتا ہے۔ م[یں] ایسی قلابازیاں کھا سکتا ہوں؟

ڈی آئی جی کے مشورے کا ذکر میں نے اگلے دن را[جا] سے کیا۔ راجا نے سوچ کے کہا۔ "اس کی بات دل کو لگتی ہے لیکن فیکے پتر۔ یہ وزیر دفاع یا وزیر اعلیٰ۔ ان میں سے کون کا[م کا] ہوگا..."

میں نے کہا۔ "یار کل کی کل دیکھیں گے۔ ابھی تک..."

اس کا کوئی ردِعمل سامنے نہیں آیا ہے۔ اگر اس نے ڈی آئی جی صاحب سے کہا ہے کہ اس نواب کا دماغ درست کر دو۔ تو تیرا دماغ درست کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ ہوگا۔ پھر یہ ڈی آئی جی تیری کوئی مدد نہیں کر سکے گا۔"

"مجھے معلوم ہے۔ لیکن اس نے ایک راستہ دکھادیا ہے۔ کیا اس کی یہ مدد کافی نہیں ہے۔"

"چل ٹھیک ہے۔ میں بندوبست کرتا ہوں۔"

رابعہ شہناز اور لیلیٰ بھابی کو اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کھیل کے پیچھے کوئی پریشانی کی بات ضرور ہوگی۔ شاید ہماری صورتوں پر اس پریشانی کی تحریر نظر آتی تھی۔ ہم لاکھ سب ٹھیک ہے کہتے رہیں اور مطمئن مسکراہٹ والے چہروں سے کچھ ظاہر نہ ہونے دیں ان کی تیز نظروں سے کچھ چھپانا مشکل تھا۔

رابعہ سب سے منہ چڑھی اور لحاظ نہ کرنے والی تھی۔ اس نے مجھے موقع پاتے ہی گھیر لیا۔ "آخر تم لوگ کیا چھپا رہے ہو؟"

میں نے معصومیت سے کہا۔ "اپنے اعمال۔ اپنے کرتوت۔ اپنے عزائم۔ ہم سب چھپا رہے ہیں۔ مگر اللہ سب دیکھ رہا ہے۔"

"دیکھ تو ہم بھی رہے ہیں۔ کل سے دوڑ بھاگ لگی ہوئی ہے۔ ایک آتا ہے ایک جاتا ہے۔"

میں نے پھر ڈائیلاگ مارا۔ "ہاں بہن۔ اس سنسار کی یہی ریت ہے۔ دنیا فانی ہے۔"

"تم لوگ ہمیں بھروسے کے قابل نہیں سمجھتے نا۔ جاہل مردوں کی طرح۔ کام سب لیتے ہو ہم سے۔" وہ بگڑنے لگی۔

"تم خواتین کے استحصال کے خلاف مظاہرہ کرو۔"

"مطلب یہ کہ تم نہیں بتاؤ گے؟"

میں نے کہا۔ "کیا شہناز بھی راجا سے کچھ معلوم نہیں کرسکی؟"

"وہ تم سے زیادہ ڈھیٹ ہے۔ مگر کوئی بات نہیں۔ میں ابھی ابا جی کو فون کرتی ہوں کہ یہاں پتا نہیں کیا کھچڑی پک رہی ہے۔"

"وہ کہیں گے کہ پک جائے تو سب مل کے کھالینا۔ ویسی گھی ڈال کے۔"

وہ بھنا کے اٹھ کھڑی ہوئی تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ "میں کہتی ہوں ابا جی سے کہ یہاں حالات بہت خراب ہیں۔ آپ کو لاعلم رکھا جا رہا ہے۔"

میں نے کہا۔ "تم بلیک میل کر کے ابا جی کو کیوں پریشان کرتی ہو۔"

"وہی پوچھیں گے تم سے۔ انہیں دینا الٹے سیدھے جواب۔"

اتنی دیر میں شہناز غصے میں آتش فشاں بنی اندر آگئی۔ راجا اس کے پیچھے بڑے خوشامدانہ انداز میں چل رہا تھا۔ مجھے دیکھ کے اس نے آنکھ ماری۔ میں سمجھ گیا کہ اسے بھی سچ نہ بولنے کا مسئلہ درپیش ہے۔

وہ رابعہ کے ساتھ بیٹھ گئی۔ "تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

میں نے راجا سے پہلے کہا۔ "ہاں۔ ہم دونوں بھی بڑے جھوٹے ہیں۔ یہ تم نچی خواتین کی بدقسمتی ہے۔"

رابعہ نے شور مچایا۔ "دیکھا تم نے۔ ڈھٹائی کی بھی حد ہوتی ہے۔ مگر میں نے بھی سوچ لیا ہے۔ میں ابا جی سے کہتی ہوں کہ فوراً آجائیں۔ یہاں سخت گڑبڑ ہے۔ تباہی و بربادی سر پر منڈلا رہی ہے۔ ہماری جان و مال اور عزت سب خطرے میں ہیں۔ جھوٹ میں بھی بول سکتی ہوں۔"

شہناز نے سوچ کے کہا۔ "ابا جی پریشان ہوں گے رابعہ۔ مجھے معلوم ہے یہ لوگ کیا چھپا رہے ہیں۔ شہنشاہ جہانگیر کی نور جہاں نے کوئی گل کھلایا ہے۔ اس نے کوئی نئی پریشانی پیدا کی ہے۔ شرط لگالو مجھ سے۔"

اصل حقیقت سے ان کا ذہن ہٹانے کے لیے میں نے بہتر سمجھا کہ ان کو اپنی پریشانی کا ایک سبب بتادیا جائے۔ گزشتہ رات شہزادہ اپنی ماں کو لے کر حویلی آگیا تھا۔ اس کی ماں گرد و پیش کے حالات سے بے خبر رہتی تھیں۔ وہ کچھ دیکھنے سے قاصر تھیں لیکن ان کی بہن اسپتال میں نور جہاں کے ساتھ تھی اور جلد یا بدیر دونوں بہنوں کے ذریعے ساری بات دوسروں تک پہنچنا لازم تھا۔

نور جہاں کا وجود حویلی میں رہنے والوں کے لیے ایک دائمی مسئلہ تھا۔ جب وہ اکبر خان کی بیوی تھی۔ مبینہ طور پر۔ تب بھی مسئلہ تھا۔ اس کی بدنامی مسئلہ تھی۔ مجھ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے مسئلہ تھی۔ اکبر خان کے قتل میں ملوث کیے جانے کے باعث مسئلہ تھی اور اب تازہ ترین یہ کہ امید سے تھی اس لیے مسئلہ تھی۔

میں نے نور جہاں کے ساتھ پیش آنے والے حادثے کی اصل وجہ نہیں بتائی لیکن یہ بتادیا کہ وہ اسپتال میں ہے۔ "مجھے نہیں معلوم کہ ایسا کیوں ہوا۔ وہ میرے ساتھ تھی جب اس کی طبیعت خراب ہوئی۔ میں اسے اسپتال لے گیا اور اسپتال والوں نے اسے داخل کرلیا۔ میں وہاں نہیں

ٹھہر سکتا تھا۔ میں نے شہزاد سے کہا۔ شہزاد نے اپنی خالہ کو وہاں چھوڑا اور خود اپنی والدہ کے ساتھ یہاں آگیا۔“

راجا نے اتنی ہی سنجیدگی سے میرے جھوٹ کو بتایا۔ ”میں نے رفیق سے کہا کہ تمہارا تو نام ہی اس کیس میں نہیں آنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کوئی تمہیں پہچان لے۔ میں نے اسے واپس بلالیا۔“

”اور تم کسی مشکل میں پڑ جاتے پھر۔“ شہناز نے کہا۔

”کیسی مشکل۔ میں ایک صحافی ہوں۔ میرا نام کبھی نور جہاں کے ساتھ کسی نے نہیں لیا۔ صحافی تو ہر جگہ پہنچ جاتے ہیں۔ پرائم منسٹر ہاؤس کی پریس کانفرنس سے تھانے تک اور پارلیمنٹ سے اسپتال تک۔ میں نے اس کا نام کچھ اور لکھوالیا ہے۔ مسز قزلباش۔ ڈاکٹروں سے بات کرلی ہے۔“

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد شہناز نے کہا۔ ”اس کی طبیعت کیسی ہے اب؟“

راجا نے کہا۔ ”شہزاد رات کو آیا تھا تو ٹھیک تھی۔ میرا مطلب ہے خطرے سے باہر۔“

”تم مجھے لے کر کیوں نہیں گئے۔ میں ڈاکٹر سے پوچھتی کہ... آخر ایسا کیوں ہوا۔“ شہناز نے کہا۔

میں نے کہا۔ ”کیا وجہ کی کوئی اہمیت ہے۔ فرض کرو اس نے اپنی مرضی سے ایسا کیا۔ تم سب یہی چاہتی تھیں۔“

رابعہ نے چند سیکنڈ کے بعد کہا۔ ”ہاں۔ ایسا نہ ہوتا تو زیادہ پریشانی ہوتی۔ اسے بھی۔ ہمیں بھی۔“

میں نے کہا۔ ”بس یہی تھی ہماری مصروفیت کی اصل وجہ۔ رات کو مجھے ڈی آئی جی صاحب نے دعوت پر بلایا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ کچھ اعلیٰ سرکاری حکام رانا کے کہنے پر میرے خلاف ہوگئے ہیں۔“

راجا نے کہا۔ ”صاف بتا فیکے پتر۔ وزیر داخلہ نے نوٹس دیا ہے کہ رانا کی مخالفت بند کرو اور یہ ساری سرگرمیاں ختم کرو جن سے اس کی سیاسی ساکھ خراب ہوتی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”مطلب یہ کہ اسپتال اور اسکول بند کرو۔ اگر میں ست بدھائی کا ترقیاتی منصوبہ چلانا ہی چاہتا ہوں تو رانا صاحب کی حمایت سے چلاؤں۔ انتخابات میں ان کے حریف بننے کا خیال بھی دل میں نہ لاؤں۔ ورنہ۔“

”ورنہ کیا؟“ رابعہ نے پوچھا۔

”ورنہ حکومت کی مخالفت کے نتائج بھگتنے ہوں گے۔ جھوٹے مقدمات۔ گرفتاری۔ جیل۔ انہوں نے کہا کہ حکومت کی طاقت سے ٹکرانا میرے بس کی بات نہیں چنانچہ مجھے فوراً سے بھی پیشتر رانا صاحب کی اطاعت قبول کرلینی چاہیے۔ یہاں سے آئندہ بھی وہی اسمبلی کے نمائندے منتخب ہوں گے۔“

”پھر تم نے کیا کہا کزن؟“

”میں نے فلسٹار محمد علی کی طرح گرج کے کہا۔ ”باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم۔ سو بار لے چکا ہے تو امتحاں ہمارا۔ ایسی زبردست فی البدیہہ تقریر کی میں نے کہ وزیر داخلہ آبدیدہ ہوگیا۔ بے وقوف لڑکی۔ میرے کہنے کے لیے کیا تھا؟“ میں نے کہا۔

راجا بولا۔ ”بقول شاعر۔

تھی شب تاریک چور آئے جو تھا سب لے گئے
کر ہی کیا سکتا تھا بندہ کھانس لینے کے سوا۔

میں نے کہا۔ ”اب تم ہی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا۔ تم کیا کرلوگی؟ ہمارا دماغ کھا کے اور پریشان کررہی ہو ہمیں۔“

خواتین کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی۔ ان کے لیے یہ خبر ہی بڑی حوصلہ شکن تھی کہ جس اسپتال اور اسکول کے لیے انہوں نے دن رات ایک کیے تھے اور جس سے انہوں نے دور دراز کے علاقوں میں اپنے نیک کام میں دھاک بٹھادی تھی اسے حکومت کی نظر میں نہ نیکی سمجھا جارہا ہے اور نہ کارِ ثواب بلکہ حکومت کے خلاف منافرت پھیلانے کی سازش قرار دیا جارہا ہے۔

میں نے شہزاد کے بارے میں پوچھا تو رابعہ نے بتایا۔ ”وہ تو صبح ہی نکل گئے تھے۔“

”کیا تم نے کچھ کہہ دیا تھا۔“ راجا بولا۔ ”کوئی فرمائش کردی تھی۔“

رابعہ مسکرائی۔ ”ایسا حکم کا غلام کوئی نہیں ہے تم سب میں۔“

”میں ہوں۔ پوچھ لو شہناز سے۔“ راجا بولا۔

”وہ گئے ہیں تمہاری طرف سے پٹیشن فائل کرنے۔“ رابعہ بولی۔

باہر سے شہزاد کی امی نے پکارا۔ ”ارے بیٹا شہناز۔“ شہناز باہر لپکی مگر اس وقت تک وہ دروازے تک آگئی تھیں۔ ”وہ فون آیا تھا اسپتال سے۔ تمہیں بلایا ہے۔“

”مجھے بلایا ہے۔“ شہناز نے کہا۔

”نہیں۔ رفیق کو۔“ انہوں نے کہا۔ ”یہ نور جہاں کو کیا ہوا ہے۔ کوئی مجھے بتاتا ہی نہیں۔“

میں نے کہا۔ ”کوئی فکر کی بات نہیں۔ ایک معمولی سا ایکسی ڈنٹ ہوگیا تھا۔ وہ بے ہوش ہوگئی تھی اس لیے اسپتال لے جانا پڑا۔“

میں نے باہر آکے راجا سے مشورہ کیا تو اس نے مخالفت کی۔ ”تیرا جانا کسی صورت مناسب نہیں۔ بہت ضروری ہے تو فون پر بات کرلے۔“

”اس کے پاس فون نہیں ہے۔“

”خالہ کے پاس ہے۔“ راجا بولا۔

”نہیں۔ خالہ نے اسپتال کے فون سے بات کی ہوگی نا۔“

راجا نے چڑ کے کہا۔ ”یار تو کیسے جاسکتا ہے زنانہ وارڈ میں اور ایسی کون سی ضروری بات ہے آخر۔ میں پوچھ لیتا ہوں۔ مجھے ویسے بھی جانا ہے۔ اخبار کے کام سے۔“

میں نے لجاجت سے کہا۔ ”یار میں تیرے ساتھ چلتا ہوں۔ اگر موقع ملا تو میں بات کرلوں گا۔ ممکن ہے وہ باہر آجائے۔“

راجا نے غنی کو طلب کیا۔ ہم نے سفید رنگ کی ہنڈا سوک کا انتخاب کیا جس پر کوئی جھنڈا نہیں تھا۔ شیشے اس کے بھی سیاہ تھے۔ غنی نے اپنے ساتھ ایک کلاشنکوف بردار سیکیورٹی گارڈ کو آگے رکھا۔ راستے میں اس نے مجھے بتایا کہ اس نے شامی بادشاہ کی مجرمانہ سرگرمیوں پر ایک کالم لکھا ہے۔

میں نے کالم دیکھا۔ اس میں شامی ڈاکو کے گروہ کی کارروائیوں کو بڑھا چڑھا کے پیش کیا گیا تھا کہ اس نے علاقے کے لوگوں کا جینا حرام کررکھا ہے۔ عام آدمی بھی خود کو غیر محفوظ سمجھتا ہے اور حکومت کو اس کے سدباب کے لیے مؤثر اقدام اٹھانا چاہئیں کیونکہ مقامی پولیس اب تک کچھ کرنے میں ناکام ہے۔

اس کے بعد راجا نے اپنی طرف سے یہ تجویز کیا تھا کہ جیسے سندھ میں بعض ڈاکوؤں کے معاملے میں مقامی وڈیروں کے اثر رسوخ کو استعمال کیا گیا اور بہت سے تاوان کے لیے اغوا کیے جانے والے رہا کرائے گئے ایسے ہی مقامی انتظامیہ علاقے کے بااثر افراد سے مدد حاصل کرے۔ اس نے سندھ کے مشہور ڈاکو ناگ منی کا حوالہ دیا جس نے ایک زمانے میں اپنی دہشت پھیلا رکھی تھی۔ پھر ایک رات اس نے کسی صوفی کے ڈیرے پر بسر کی اور اس کے دل پر ایسا اثر ہوا کہ اس نے ایک سیاسی پیر خاندان کو وسیلہ بنا کے ہتھیار ڈالنے کی پیشکش کی۔ حکومت نے اس کے گروہ کو عام معافی دے کر اس کے خلاف تمام مقدمات ختم کرنے کی ضمانت دی اور ناگ منی نے اس پیر خاندان کے ڈیرے پر پولیس کے اعلیٰ حکام کی موجودگی میں خود کو قانون کے حوالے کردیا۔ اب وہ اس علاقے میں باعزت زندگی گزار رہا ہے۔

راجا نے دوسری مثال پھولن دیوی کی دی اور وزیر اعلیٰ سے اپیل کی کہ وہ شامی بادشاہ کے مسئلے پر اسی طرح قابو پانے کے لیے مقامی انتظامیہ اور عوامی حمایت رکھنے والے باعزت افراد سے رابطہ کرے۔ اس نے پولیس کے نئے سربراہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھا تھا کہ وہ معاملہ فہم اور دور اندیش ہیں چنانچہ ان سے مدد لی جائے تو رانا رجب علی یا پھر نواب رفیق احمد شیرازی کا اثر رسوخ شامی بادشاہ کو قائل کرنے کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے کہ وہ ہتھیار پھینک کے خود کو قانون کے حوالے کردے۔ لیکن اس کے لیے حکومت کو بھی شامی بادشاہ کے خلاف تمام مقدمات ختم کرکے اسے باعزت شہری کی حیثیت سے زندگی گزارنے کا موقع دینا ہوگا۔

میں راجا کی سیاسی دور اندیشی کا قائل ہوگیا۔ اس نے بڑی خوبصورتی سے ڈی آئی جی عبداللہ جان کو حکومت کی طرف سے نامزد کرنے کا اشارہ دے دیا تھا اور اس کے ساتھ ہی اپنی غیر جانبداری برقرار رکھتے ہوئے میرے ساتھ رانا رجب علی کو بھی بااثر عزت دار افراد میں شامل کیا تھا۔

بے شک علاقے میں نمائندگی کا اعزاز رانا رجب علی کو حاصل تھا اور سیاسی اہمیت بھی اسے حاصل تھی لیکن شامی بادشاہ سے اس کی دشمنی کی جڑیں بہت گہری تھیں۔ دوسرے رانا مخالف سیاسی جماعت کا آدمی تھا۔ اس کی جماعت ایک کمزور کولیشن پارٹنر تھی۔ اگر وزیر اعلیٰ کے کیمپ میں کوئی اس کالم کا نوٹس لیتا اور یہ ذمے داری رانا رجب علی پر ڈالی جاتی تو بال لوٹ کے حکومت کے کورٹ میں آتی۔ رانا یقیناً انکار کرتا۔

اس کے بعد دوسرا نام میرا تھا۔ حکومت کا نمائندہ بن کے ڈی آئی جی رانا رجب علی کے بعد مجھ سے رابطہ کرتا اور کسی کو شک بھی نہ ہوتا کہ یہ سب طے شدہ اسکرپٹ کے مطابق ہے۔

میں نے راجا کی تعریف کی۔ ”تیری چال زبردست ہے۔“

راجا مسکرایا۔ ”کل کچھ خبریں بھی لگائی جائیں گی۔ شامی ڈاکو کے گروہ کی سرگرمیوں کے بارے میں۔ نمایاں طور پر اور بڑھا چڑھا کے۔“

میں نے کہا۔ ”یہ کالم بھی کل ہی لگے گا۔ پکی بات ہے؟“

”میں نے بات کرلی ہے۔“

”اور اگر اس کا اثر نہ ہوا۔ پھر؟“ میں نے کہا۔

"پھر اگلی چال سوچیں گے۔ میں کوشش کروں گا کہ وزیراعلیٰ کا پی آر او نوٹس لے۔ ایک زمانہ تھا کہ اس کے ساتھ میں نے بھی پولیس کے ڈنڈے کھائے تھے اور پھر ایک ہی حوالات میں رات گزاری تھی۔ وہ جانتا ہے مجھے اور ممکن ہے میرے کالم بھی اس کی نظر سے گزرتے ہوں۔"

گاڑی اسپتال کے احاطے میں پہنچ کے رک گئی۔ راجا نے مجھے سختی سے ہدایت کی کہ میں باہر نہ آؤں اور خود اندر چلا گیا۔ اس وقت شام کے چار بجنے والے تھے اور مجھے بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔ اسپتال کا کینٹے ٹیریا میرے سامنے تھا میں نے غنی کو بھیج کے کچھ منگوانا بہتر سمجھا۔ وہ تقریباً خشک سینڈوچ، ایک بسکٹ کا ڈبا اور کولڈ ڈرنک کا ایک ٹن لے آیا۔ میں نے بسکٹوں کو ترجیح دی۔ پھر غنی اور سیکیورٹی گارڈ کو کینٹین پر بھیج دیا۔ میں گھڑی دیکھ کے انتظار کرتا رہا۔

راجا تقریباً چالیس منٹ بعد نمودار ہوا۔ "سوری یار مجھے کچھ دیر لگی۔"

"کچھ دیر۔ آپ نے ایک گھنٹا ضائع کیا۔"

"ضائع نہیں کیا پگلے پتر۔ نور جہاں کو وارڈ سے پرائیویٹ روم میں شفٹ کرایا۔ اتفاق سے ابھی ایک خالی ہوا تھا۔"

"اس کا مطلب ہے اب میں اسے دیکھ سکتا ہوں۔"

راجا نے اقرار میں سر ہلایا۔ "چھ بجے تک ملاقات کا وقت ہوتا ہے۔ وہ تجھے یاد بھی کر رہی ہے لیکن ہم عام راستے کو استعمال نہیں کریں گے۔"

"کوئی خفیہ راستہ بھی ہے۔"

"آجا میرے ساتھ۔" راجا نے کہا اور آگے چل پڑا۔

خفیہ راستے پیچھے لیبارٹری سے گزر کے جانے کا تھا۔ سفید لیب کوٹ پہنے مختلف ٹیسٹ رپورٹ بناتے چند لوگوں نے ہمیں گھور کے دیکھا جو ڈیسکوں پر جھکے کیمیکل کی بوتلوں اور ٹیسٹ ٹیوبوں سے کھیل رہے تھے۔ اندر کچھ عجیب و غریب مشینوں کی گونج بھی تھی اور دواؤں کی مخصوص بو پھیلی ہوئی تھی۔ ہم اس دروازے سے باہر گئے جس پر لکھا تھا۔ "داخلہ منع ہے" اور ایک گارڈ اسی لیے کھڑا کر دیا گیا تھا کہ غیر متعلقہ افراد کو اندر نہ آنے دے۔

نور جہاں کا کمرا فرسٹ فلور پر پہلا تھا۔ میں دروازہ کھول کے اندر گیا تو میں نے نور جہاں کو سفید چادر کے نیچے ساکت لیٹا ہوا دیکھا۔ صرف اس کا چہرہ باہر تھا۔ اس نے سر گھما کے مجھے دیکھا اور پلک جھپکائے بغیر دیکھتی رہی۔ راجا نے شہزاد کی خالہ سے کہا "چلیے آپ بھی کچھ دیر باہر کی ہوا کھالیں۔ کل سے تیمارداری کر رہی ہیں۔" وہ سمجھدار خاتون فوراً باہر چلی گئی۔

میں کرسی نور جہاں کے قریب کر کے بیٹھ گیا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ وہ ہاتھ بالکل سرد تھا۔ "کیسی ہو نور۔"

"تم دیکھ لو۔ زندہ ہوں۔" اس نے آہستہ سے کہا۔ "تمہاری جان نہیں چھوٹی مجھ سے۔"

میں نے کہا۔ "کیسی باتیں کرتی ہو۔"

"ہاں۔ دیکھ لو۔ پہاڑ سے گری سڑک پر۔ کار سے ٹکرائی۔ وہ بھی گنوا دیا جسے جان سے زیادہ عزیز رکھا تھا۔ خود نہیں مری۔" اس کی آواز بھرا گئی۔

میں نے اٹھ کے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ "میری محبت تمہاری محافظ تھی۔ تم کیسے مر سکتی ہو۔"

اس کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلے۔ "وہ تو ہو گیا... جو تم چاہتے تھے۔ شاید سب چاہتے ہوں گے۔ ان کی دعا قبول ہو گئی۔"

میں نے کہا۔ "ایسی باتوں سے خود کو دکھی مت کرو۔ زندگی میں حادثات ہوتے ہیں۔ بس اب جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ۔"

"اور دفع ہو جاؤ۔ باہر۔"

"یہ میرے اور تمہارے اچھے مستقبل کے لیے ضروری ہے۔" میں نے کہا۔

"ایسا تم سمجھتے ہو۔ میں نہیں۔ مجھے اپنا مستقبل کہیں دکھائی ہی نہیں دیتا۔"

میں نے کہا۔ "نور! مستقبل اسپتال میں لیٹے لیٹے نظر نہیں آتا۔ اسے تلاش کرنا پڑتا ہے۔ اس کے لیے جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔"

"میری ہمت ختم ہو رہی ہے جان۔ جینے کی امنگ جو پہلے تھی۔ اب باقی نہیں رہی۔ بس ایک پشیمانی کا احساس ہے کہ میں نے جو بھی کیا غلط تھا۔"

"شاید مسلسل حادثات اور پریشان کرنے والے حالات نے تمہیں ڈپریشن میں مبتلا کر رکھا ہے۔ تمہیں نفسیاتی مشورے کی ضرورت بھی ہے۔ لیکن پہلے تمہاری جسمانی صحت کی بحالی ضروری ہے۔"

اس نے میری بات کاٹ دی۔ "سچ کہو رفیق۔ کیا تم ایسا نہیں سمجھتے کہ میں نے اپنی عمر گنوائی۔"

"لاحول ولاقوۃ۔ ابھی تمہاری عمر کیا ہے۔"

وہ بولتی رہی۔ "میں نے ہر سودا گھاٹے کا کیا۔ زندگی

کے ہر فیصلے سے خود اپنی تباہی مول لی۔ آج کیا ہے میرے پاس...‘‘

میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ’’میں بتاتا ہوں تمہیں۔ تمہارا سب سے بڑا اثاثہ کیا ہے۔‘‘

وہ تلخی سے مسکرائی۔ ’’میرا یہ حسن اور یہ جوانی جس کی دولت مند بڑی سے بڑی قیمت دیتے رہے۔‘‘

میں نے اپنی بات بدل دی۔ ’’غلط۔ تمہارا سب سے بڑا اثاثہ ہے تمہاری ذہانت۔ قوتِ فیصلہ اور اعتماد۔ اس میں تو کچھ کلام نہیں کہ جو ملکوتی حسن خدا نے تمہیں دیا کسی اور کو نہیں دیا۔ کیا یہ احساس تمہیں خوشی نہیں دیتا کہ دنیا کی ساری عورتیں تم سے کم تر ہیں۔ خدا نے تمہیں خصوصی عنایت کا مستحق سمجھا۔ دینے والا تم پر اتنا مہربان ہوا تو کیا تمہیں یہ خزانہ عطا کرنے والے کا شکر گزار نہیں ہونا چاہیے۔‘‘

’’لیکن میں نے یہ کیا کہ اس خزانے کو ناقدروں کے ہاتھوں میں لٹنے کے لیے دے دیا اور وہ مجھے لوٹتے رہے۔ کاغذی سکوں کے بدلے۔ میں محبت سے محروم رہی۔ صرف نفرت حقارت رسوائی اور دربدری کمائی۔ اس حسن کا قدرداں پھر بھی نہ ملا۔‘‘ اس کی آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔

میں نے کہا۔ ’’میں ہوں نا۔ یا تم مجھے بھی انہی میں شمار کرتی ہو۔ اکبر خان جیسے لوگوں میں۔‘‘

اس نے آنکھیں بند کر کے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

’’کیا ہوتی ہے محبت۔ تم نے کب احساس دلایا مجھے کہ تمہارے دل میں میری محبت ہے؟ ہاں میں ضرورت تھی تمہاری۔ محبت تھی فریال۔ ضرورت اور محبت اپنی اپنی جگہ آج بھی ہیں۔ کیا یہ غلط ہے؟‘‘

میں بڑی مشکل میں پھنس گیا تھا۔ ’’ہاں۔ یہ غلط ہے۔ کیونکہ فریال جا چکی ہے۔‘‘

’’لیکن یہ احساس تم نے مجھے نہیں ہونے دیا کہ اس کی جگہ تم نے مجھے دے دی ہے۔ تم نے کب کہا کہ تم مجھ سے محبت کرنے لگے ہو۔ میں بھی اس کا اعتراف کرتی رہتی ہوں۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’دیکھو نور۔ جذبے ہمیشہ کھوکھلے الفاظ سے بالاتر ہوتے ہیں۔ نیت اور ارادے کی اہمیت ہے۔‘‘

’’میں نہیں مانتی۔ آخر عدالت میں حلف اٹھانے کے لیے زبان سے اقرار کیوں لازمی ہے۔ زندگی بھر کا رشتہ استوار کرنے کے لیے دو بول پڑھوانا اور اقرار کرنا کیوں ضروری ہے۔ اللہ رسول نے کلمے کو شرط اول قرار دیا ہے۔ زبان سے اقرار...‘‘

میں سمجھ گیا تھا کہ وہ میری زبان سے اقرارِ محبت کی منتظر ہے جب کہ میں ابھی حتمی طور پر وثوق سے اور سو فیصد ایمانداری سے اعتراف کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا کہ میں نے فریال کے خیال کو ہمیشہ کے لیے دل سے خارج کر دیا ہے اور مجھے نور جہاں سے وہی عشق ہو گیا ہے جو محبت کی انتہا ہوتی ہے۔ بے شک میں جذباتی طور پر اس کے بہت قریب ہو گیا تھا اور جسمانی تعلق نے نور جہاں کو میرے لیے ناگزیر کر دیا تھا مگر میرے خیال میں اس کے لیے میرے جذبات ابھی وہ نہیں تھے جو فریال کے لیے تھے۔

اگر میں نظریہ ضرورت کے تحت منافقت کو جائز سمجھتا تو کہہ دیتا کہ نور۔ آئی لو یو۔ میں فریال سے زیادہ تم سے محبت کرتا ہوں لیکن میرے کسی فیصلے پر پہنچنے سے قبل ہی ایک نرس ناک کر کے اندر آ گئی۔ اس نے بلڈ پریشر اور ٹمپریچر لینے کے بعد ایک چھوٹی سی ٹرے میں رکھی ہوئی گولیاں نور جہاں کو دیں۔

چارٹ پر اندراج کرتے کرتے نرس نے اچانک کہا۔ ’’میڈم ایک بات پوچھوں اگر آپ ناراض نہ ہوں۔‘‘

نور جہاں نے شائستگی سے کہا۔ ’’ایسی کیا بات ہے۔‘‘

’’میڈم۔ کیا آپ فلم اسٹار ہیں۔ یا ماڈل۔‘‘ نرس بولی۔

’’ نور جہاں مسکرائی۔ ’’یہ خیال کیوں آیا تمہیں۔‘‘

’’میں نے آپ کو دیکھتے ہی یہ محسوس کیا تھا۔ یاد نہیں آتا کس فلم میں دیکھا یا ٹی وی ڈرامے میں۔‘‘ اس نے چین بند کیا۔

نور جہاں نے کہا۔ ’’ایسی کوئی بات نہیں۔ میں صرف مسز قزلباش ہوں اور بس۔ شادی سے پہلے میرا نام نور تھا۔‘‘

’’مہ نور بلوچ۔‘‘ نرس بولی اور پھر خود ہی اپنی بات کی تردید کر دی۔ ’’وہ بھی بہت خوبصورت ہیں۔ لیکن ان کو میں پہچانتی ہوں۔‘‘

نرس چلی گئی مگر اس کی بات نے مجھے تشویش میں مبتلا کر دیا۔ شناخت اور آشنائی کے احساس کی وجہ وہ تصاویر تھیں جو بہت عرصہ قبل اخبارات میں شائع کرائی گئی تھیں۔ شاید ہر دیکھنے والے کے لاشعور میں اس حسن بے مثال کا نقش آج بھی قائم تھا اور یہی سب سے خطرناک بات تھی۔ نور جہاں کا حسن ہی اس کی پہچان بن گیا تھا۔ وہ عام شکل و صورت والی عورت ہوتی تو کسی کو یاد نہ رہتی۔

اب یہ امکان اپنی جگہ تھا کہ نرس اپنی الجھن کا ذکر کسی دوسری نرس سے کرے اور اس کے بعد ڈیوٹی پر آنے والی نور جہاں کو زیادہ غور سے دیکھے۔ لاشعور میں محفوظ یادوں کا

معاملہ ایسا ہی ہوتا ہے۔ جیسا آدمی سوچتا ہے۔ ذہن پر زور دیتا ہے تو اسے کچھ یاد نہیں آتا۔ بعد میں کسی وقت اچانک لاشعور کے نہاں خانوں سے کوئی نام نکل آتا ہے۔ دراصل دماغ اپنی تلاش ختم کر دیتا ہے مگر دماغ کا ایک خانہ جسے ہم لاشعور کہتے ہیں یادوں کے اسٹور میں تلاش جاری رکھتا ہے اور جیسے ہی مطلوبہ نام ملتا ہے اسے ذہن کے حوالے کر دیتا ہے۔

ایسا نور جہاں کے ساتھ بھی ہو سکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ کوئی ڈاکٹر اسے دیکھے اور کھٹ سے پہچان لے۔ ہر شخص کی میموری الگ ہوتی ہے۔ کچھ لوگ فوٹو جینک میموری کے مالک ہوتے ہیں۔ کسی شخص یا مقام کو دیکھتے ہی انہیں دیگر تفصیلات یاد آ جاتی ہیں۔

’’تم پریشان ہو گئے نرس کی بات سے۔‘‘ نور جہاں نے پوچھا۔

میں نے چونک کے سر ہلایا۔ ’’کیا یہ پریشانی کی بات نہیں ہے؟ فرض کرو اسے اصل بات بھی یاد آ جاتی۔‘‘

’’یہ خطرہ تو میں اپنی صورت کے ساتھ لیے پھرتی ہوں۔ اور یہ بہرحال ایک پبلک پلیس ہے۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’میں ڈاکٹر سے بات کرتا ہوں۔‘‘

اسی وقت ایک ڈاکٹر اندر آ گیا۔ وہ درمیانی عمر کا سنجیدہ صورت شخص تھا۔ اس نے عادتاً پوچھا۔ ’’کیا حال ہے مسز قزلباش۔ یو لک مچ بیٹر۔‘‘ وہ چارٹ دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ ’’کیا آپ انہیں ریلیز کر سکتے ہیں؟‘‘

اس نے سر گھما کے مجھے دیکھا۔ ’’ناٹ ٹوڈے۔ ان کی طبیعت یقیناً بہت بہتر ہے لیکن ابھی انہیں ریلیز نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے علاوہ میں ڈیوٹی میڈیکل افسر ہوں۔ ان کی معالج ڈاکٹر شگفتہ ناز ہیں۔ فیصلہ وہی کریں گی۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’وہ اس وقت کہاں ہیں؟‘‘

’’مسٹر قزلباش۔ ان کی ڈیوٹی شام پانچ بجے ختم ہوتی ہے اور پروسیجر کے مطابق بھی مریضوں کو صبح دس بجے کے بعد اور پانچ بجے سے پہلے ہی ریلیز کیا جاتا ہے۔ جلدی مت کریں۔ ہو سکتا ہے وہ کل اجازت دے دیں۔‘‘

ابھی ڈاکٹر کمرے میں ہی تھا کہ راجا اور شہزاد کی خالہ لوٹ آئے۔ ملاقات کا وقت ختم ہو گیا تھا۔ پرائیویٹ روم میں ہم مزید آدھا گھنٹا رک سکتے تھے۔ پھر کوئی آتا اور ہمیں نکالتا کہ آپ لوگ ابھی تک بیٹھے ہیں۔ میں نے یہ شرمندگی اٹھانا غیر ضروری سمجھا۔

باہر نکلتے ہی میں نے راجا سے اپنی تشویش کا ذکر کیا لیکن اس نے کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ ’’یہاں سے اسے کہاں لے جائیں؟ شہزاد کے گھر اور وہاں طبیعت خراب ہو تو پھر کسی ڈاکٹر کو بلائیں۔ اگر اس ڈاکٹر نے پہچان لیا کہ یہ نہ ملکۂ ترنم ہیں نہ مسز شہنشاہ جہانگیر بلکہ قاتل نور جہاں ہیں۔ پھر کیا ہو گا فیکے پتر؟‘‘

میں نے ایک احمقانہ بات کی۔ ’’اگر دروازے پر ’’ڈونٹ ڈسٹرب‘‘ کا سائن لگا دیا جائے۔‘‘

راجا نے مجھے گھور کے دیکھا۔ ’’دماغ چل گیا ہے تیرا؟ ابے یہ کوئی ہوٹل ہے؟ ڈونٹ ڈسٹرب کا کیا مطلب ہے۔ نہ ڈاکٹر آئے نہ نرس۔ فرشتہ اجل تو آ جائے گا پھر بھی۔ اگر آنا ہوا۔‘‘

ہم پہلے ایک اخبار کے دفتر گئے۔ وہاں ایک عجیب و غریب چیز کرسی ادارت پر بیٹھی تھی۔ ساٹھ سالہ مدیر ہو بہو مرزا غالب کی تصویر تھے۔ وہی چہرہ اور حلیہ۔ وہی ٹوپی اور فرغل ٹائپ لمبا کوٹ۔ ہاتھ میں فرشی حقے کی نے۔ مجھے یہ نمونہ دیکھ کے سخت حیرانی ہوئی۔

’’آؤ بے ریاست کے راجا۔ تم تو ہو گئے ہو محرم کا چاند۔ عید کا اس لیے نہیں کہتا کہ سال میں دو بار دکھائی دے جاتا ہے۔‘‘

’’مرزا قالب صاحب۔ بدقسمتی ہے میری کہ یہاں قلم گھس رہا ہوں۔ باہر لکھتا تو ہر لفظ کی قیمت وصول کرتا۔ اب تک کوئی ریاست خرید لیتا۔‘‘ راجا نے اپنا کالم ان کے سامنے رکھ دیا۔ ’’یہ صبح شائع ہو گا۔ ورنہ...‘‘

انہوں نے رک کے کہا۔ ’’صبح؟ میاں تم یوں کرو۔ ہمارا جنازہ اٹھالو ابھی۔ صبح تک انتظار کا تکلف بھی کیوں۔‘‘

’’کیا میں نے ایسی کوئی دھمکی دی؟‘‘

’’نہیں دی تو کیا اب دو گے۔ ہمیشہ دیتے ہو۔ میاں غضب خدا کا۔ جو کالم دو دن پہلے آنا لازمی تھا۔ وہ اب لا رہے ہو دو گھنٹے پہلے جب کاپی جوڑی جا رہی ہے۔‘‘

’’مرزا قالب۔ آدھے گھنٹے میں کمپوزنگ ہو جائے گی۔ پھر پریشانی کیا ہے۔‘‘

’’اور وہ جو ہم جوڑ چکے ہیں۔ تمہارے کالم کی جگہ۔ مرغی خانوں کے سیاسی مسائل۔ اسے ہٹا دیں گے تو صبح کالم نگار آ جائے گا ہماری جان لینے۔ مرغی کی طرح ذبح کر دے گا ہمیں۔‘‘

راجا نے دلاسا دیا۔ ’’آپ مذکر ہیں۔ آپ نے آج تک انڈا بھی نہیں دیا۔ پھر کوئی آپ کو مرغی کی طرح کیسے ذبح کر سکتا ہے۔‘‘

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کالم کو کمپوزنگ سیکشن میں بھیج دیا۔ میں حیران تھا کہ یہ مرزا غالب جیسے مرزا قالب کیا چیز ہیں۔ اخبار کی اچھی گڈول تھی۔ اس کا دفتر بھی بہت بڑا اور شاندار تھا۔ وہاں کام بھی جدید انداز میں ہو رہا تھا لیکن اس کا ایڈیٹر کارٹون لگتا تھا۔

راجا نے تو وہیں میرا تعارف کرایا۔ ''یہ میرے دوست ہیں۔ نواب رفیق احمد شیرازی۔ ریاست ست بدھائی کے حکمراں۔''

''زہے نصیب۔ زہے نصیب'' اس نے مجھ سے مصافحہ کیا۔ ''کسی حقیقی نواب نے اس کباڑ خانے میں قدم رنجہ فرمایا بقلم خود۔ راجا اور نواب ایک ساتھ تشریف لائے۔ بخت جاگا غریب خانے کا۔''

میں نے ہاتھ ملایا۔ ''آپ دلچسپ آدمی ہیں۔''

''حضور یہی غنیمت ہے کہ آدمی ہیں ورنہ۔ آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا۔ میرے پیر و مرشد فرما گئے ہیں۔ خیر فرمائیے کیا نوش فرمائیے گا۔ سیاہ قہوہ افرنگ سے بادہ افرنگ تک سب حاضر کیا جا سکتا ہے بقلم خود۔''

راجا اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں نے آپ کے کرائم رپورٹر کو بھی ایک خبر لکھوائی تھی فون پر بقلم خود۔ یہ نہ ہو وہ لگنے سے رہ جائے۔''

''آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ کرائم رپورٹر ہے تو شدید قسم کا نطفہ ناتحقیق۔ لیکن ایسا ہوا تو ہم اسے توپ دم کر دیں گے بقلم خود۔ او خوب یاد آیا۔ یہ چیک لیتے جائیں۔''

باہر آ کے میں نے کہا۔ ''یار یہ کیا ڈراما ہے۔ مرزا قالب۔ اتنے بڑے اخبار کا ایڈیٹر۔''

''یہ واقعی ڈراما ہے۔ بہت ہنس مکھ اور یار باش آدمی ہے۔ بہت کوالی فائیڈ بھی ہے۔ مرزا غالب سے اتنی عقیدت ہے کہ مرزا قالب کے نام سے روز قطعہ لکھتا ہے۔'' راجا نے بتایا۔ ''اس نے خود مجھے بتایا کہ جب یہ آکسفورڈ زیر تعلیم تھا تو اس پر شیکسپئر سوار ہو گیا۔ تو نے شیکسپئر کی تصویر دیکھی ہے نا۔ لمبے لمبے بال مونچھیں اور چھوٹی سی ڈاڑھی۔ اس نے وہی حلیہ بنا لیا اور ظاہر ہے سب میں مذاق بنا۔ گورے یہ بات کیا سمجھتے۔ انڈیا پاکستان کے طلبا میں یہ اپنا تعارف ''شیخ پیر'' کے طور پر کراتا تھا۔ شیکسپئر کی تقلید میں، جیسے اب مرزا قالب بنا ہوا ہے مرزا غالب کی عقیدت میں۔ لائف میں جتنا نان سیریس ہے پروفیشن میں اتنا ہی سیریس ہے۔ صحافت کو آج بھی بزنس نہیں مشن سمجھتا ہے۔''

''گھر میں کھانے کو ہوگا نا؟''

''وہ بھی ہے۔ لیکن اخبار چلتا ہے۔ خود کئی بار جیل جا چکا ہے۔ اس کی بیوی بڑی سمجھدار ہے اور اس کی صحیح جانشین لائف پارٹنر۔ جیسے ہی یہ جیل جاتا ہے وہ اخبار سنبھال لیتی ہے۔ لیکن کہتا ہے بچوں کو صحافی وغیرہ نہیں بناؤں گا۔ اب پیسا سب سے اہم ہو گیا ہے۔ وہ پولیس یا فوج میں افسر ہوں گے تو ملک کے مالک بنیں گے۔ یا سیاست میں جائیں گے تو بھی۔''

میں اس کی دلچسپ باتیں سن رہا تھا کہ میرا فون بجنے لگا۔ ہم اس وقت تک واپسی کا آدھا راستہ طے کر چکے تھے۔ نمبر میرے لیے نیا تھا چنانچہ میں نے محتاط ہو کے کہا۔ ''ہیلو۔''

''السلام علیکم۔ نواب رفیق احمد شیرازی۔''

میں نے کہا۔ ''جی۔ بول رہا ہوں۔''

''میں دینہ کا بینک منیجر ہوں۔ آپ کہاں ہیں اس وقت؟''

میں نے کہا۔ ''پنڈی سے واپس آ رہا ہوں۔ گوجر خان سے آگے ہوں۔''

''ویری گڈ۔ ویری گڈ۔ پھر تو آپ چند منٹ کے لیے برانچ پر رک سکتے ہیں۔ آپ کے اکاؤنٹ کی اسٹیٹمنٹ تیار ہے۔ وہ لے لیں۔''

اگرچہ وہ اتنی ضروری نہیں تھی لیکن میں نے غنی سے کہا کہ وہ بینک پر گاڑی روک لے۔ تقریباً چالیس منٹ کے بعد غنی نے گاڑی کو مین جی ٹی روڈ سے دینہ مارکیٹ کی طرف موڑا اور بینک کے سامنے کھڑا کر دیا۔ مجھے بینک کو تاریکی میں ڈوبا ہوا دیکھ کے حیرانی ہوئی۔ رات کے ساڑھے آٹھ بجے اس کا کھلا ملنا کوئی انوکھی بات نہ ہوتی۔ بینک اسٹاف عام طور پر دیر تک بیٹھ کے حساب کتاب کرتا ہے۔ حیرانی مجھے اس بات پر ہوئی کہ ابھی منیجر نے خود مجھے فون کیا تھا اور اب بینک بند کر کے جا چکا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں راجا سے کچھ کہتا ایک شخص بینک کی طرف سے غنی کے پاس آیا اور اس نے غنی کو ایک موبائل فون دیا۔ ''یہ نواب صاحب کو دے دو۔ شامی بادشاہ سے بات کر لیں۔ پھر سم ضائع کر دیں۔''

اور غنی کے جواب میں کچھ کہنے سے پہلے ہی اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ اس نے ایک چادر اس طرح لپیٹ رکھی تھی کہ چہرہ بھی صاف نظر نہ آتا تھا۔

میں سمجھ گیا کہ شامی بادشاہ نے ایسا کیوں کیا۔ وہ مجھ سے میرے فون نمبر پر بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ضرورت پڑنے پر موبائل فون کی گفتگو کا ریکارڈ بھی حاصل کیا جا سکتا

ہے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی اور میری گفتگو کا سراغ لگایا جا سکے۔ میں نے فون کی سم نکال کے رکھ لی۔

اسکرین پر ایک نمبر روشن ہوا جو کسی نے ایس ایم ایس کیا تھا۔ ایس ایم ایس کرنے والے کا بھی نام نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ وہی پراسرار شخص ہوگا جو موبائل فون دینے آیا تھا۔ میں نے اس نمبر سے آپشن لے کر کال کی تو کہیں گھنٹی بجنے لگی۔

پھر شامی کی آواز آئی۔ ''کیا حال ہے نواب دوست۔''

میں نے کہا۔ ''شامی بادشاہ۔ اللہ کا احسان ہے۔ کہو اس وقت کیسے یاد کیا۔''

''میں نے تم سے تین دن مانگے تھے۔ مگر فیصلہ دو ہی دن میں کر لیا۔''

میں نے کہا۔ ''ویری گڈ۔ کیا فیصلہ کیا؟''

''میں نے تمہاری بات مان لی۔ دوستوں کی بات ماننا پڑتی ہے۔'' شامی بادشاہ نے کہا۔

''مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ بس آج ہی آگے بات کرتا ہوں۔''

''میں نے اور میرے دس ساتھیوں نے اپنی زندگی اور موت کے فیصلے کا اختیار تمہیں دے دیا ہے۔''

''تم بھروسا رکھو مجھ پر۔ اللہ نے چاہا تو جو ہوگا اچھا ہی ہوگا شامی بادشاہ۔'' میں نے کہا۔

آج کا دن بھی خیر و عافیت کے ساتھ گزر گیا تھا۔ ابھی تک وزیر داخلہ صاحب کے عتاب کی کوئی نشانی نظر نہیں آئی تھی۔ راجا کا خیال تھا کہ وہ کوئی اناڑی نہیں ہے رانا جیسا۔ وہ سوچ سمجھ کے قدم اٹھائے گا اور پکا کام کرے گا۔

''تو کچھ اندازہ کر سکتا ہے۔ وہ کہاں ہاتھ ڈالے گا۔''

راجا نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''اگر اس کی طاقت کو دیکھا جائے تو فیکے پتر۔ تو ہر طرف سے غیر محفوظ ہے۔ لیکن کل کی مہلت اور مل جائے۔''

''کل کیا ہوگا۔ اور کل کے بعد۔''

''ابھی ہم خالی ہاتھ ہیں۔ ہو سکتا ہے کل ہمارے ہاتھوں میں جوابی وار کے لیے نہ سہی وار کو روکنے کے لیے کچھ ہو۔ میں نے بندوبست پکا کیا ہے کہ محترم وزیر اعلیٰ کا پی آر او میرے کالم کا نوٹس لے۔ میری چال کامیاب ہو جائے۔''

حویلی میں پہنچنے کے بعد مجھے پہلی خبر شہزاد نے دی۔ ''ہم نے رانا کی عارضی ضمانت کی منسوخی کے لیے جو اپیل دائر کی تھی وہ رجسٹرار نے اعتراض لگا کے واپس کر دی۔'' شہزاد بہت خفا تھا کیونکہ اعتراض بے معنی تھے۔

میں نے پوچھا۔ ''یہ کھیل اسی طرح چلے گا شہزادے۔ تم انصاف کی امید رکھے بغیر انصاف کے لیے لڑتے رہو۔''

''کل میں اعتراضات دور کر کے پھر اپیل فائل کروں گا۔ اور کل اپنے ساتھ ماجد خان کا وکالت نامہ بھی لگا دوں گا۔'' شہزاد نے کہا۔ ''تم لوگ بتاؤ راولپنڈی سے آ رہے ہو۔ نور جہاں کا کیا حال ہے۔''

میں نے کہا۔ ''حال ٹھیک ہے اس کا۔ دیگر تفصیلات آپ کے لیے اور خواتین کے لیے راجا صاحب دیں گے۔ میں معذرت چاہتا ہوں۔''

برآمدے کی سیڑھیاں اتر کے میں باغ میں چلا گیا اور عبداللہ جان کا نمبر ڈائل کیا۔ گھنٹی چار مرتبہ بجی۔ پھر اس کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو۔''

میں نے کہا ''سر۔ میں نے آپ کو ڈسٹرب تو نہیں کیا؟''

''کمال کرتے ہیں آپ۔ ہم تو کہلاتے ہی پبلک سرونٹ ہیں۔ چوبیس گھنٹے سرکار کے ملازم۔ بیوی کہتی ہے کہ تم تو بس نام کے شوہر ہو۔ میرے نام کے ساتھ تمہارا نام لگ گیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ نیک بخت ہم کام کے شوہر ہیں۔ یہ بھی تم ہی کہتی ہو کہ رات دن بس کام کام کام۔ تم تو نام کی بیوی ہو نہ کام کی۔ کام سب نوکر کرتے ہیں۔''

میں نے ہنس کے کہا۔ ''لگتا ہے بھابی سے یہی بحث چل رہی تھی۔''

وہ بولا۔ ''نہیں۔ بحث میں دو آدمی ہوتے ہیں۔ وہ میرے کان کھا رہی تھیں۔ دماغ کھا رہی تھیں۔ میں صرف پی رہا تھا۔ اپنا غصہ۔ کچھ اور نہ سمجھیے گا۔''

میں نے کہا۔ ''ایک ضروری بات کے لیے فون کیا میں نے۔''

''تھینک یو نواب صاحب۔ ورنہ غیر ضروری باتیں نہ جانے کتنی دیر سننی پڑتیں۔'' وہ خوشگوار موڈ میں تھا۔

میں نے ہنس کے کہا۔ ''ایک ذمے داری قبول کی تھی میں نے آپ کی طرف سے۔''

اس کا ذہن فوراً صحیح مسئلے پر آ گیا۔ ''آپ شامی بادشاہ کی بات کر رہے ہیں۔ کیا اس نے رابطہ کیا ہے؟''

''مجھے اس کی طرف سے بڑا پازیٹو سگنل ملا ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ بولا۔ ''یعنی وہ ہتھیار ڈالنے کے پروپوزل سے اگری کرتا ہے۔''

"جی۔ اس نے مجھے بطور ثالث قبول کرلیا ہے۔ اب مجھے آپ کا جواب چاہیے۔"

"میری وزیرِ داخلہ سے بات ہوئی تھی۔ اس نے میری تجویز کو سراہا کہ شامی خود کو قانون کے حوالے کرنے اور غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈالنے کے لیے تیار ہے تو اس کو معافی بھی دی جاسکتی ہے۔ آپ بات کریں۔"

"پھر رکاوٹ کیا ہے؟" میں نے کہا۔

وہ بولا۔ "رکاوٹ کوئی نہیں۔ دراصل میں نے وزیرِ داخلہ کو یہ نہیں بتایا کہ بات بھی ہوچکی ہے۔ آپ کے نام پر وہ بھڑک جاتا اور کچھ عجیب نہیں کہ سارا معاملہ ہی الٹا پڑ جاتا۔ وہ کہتا کہ یہ نواب رفیق بھی اس کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ اصل مجرم تو یہ ہے جو شامی ڈاکو کی سرپرستی کررہا ہے۔ میں نے مذاکرات کا اختیار حاصل کیا ہے ابھی۔"

"وہ بعد میں بھی ایسا کہہ سکتا ہے۔"

"یہ سیاست ہے نواب صاحب۔ کل میں رانا رجب علی سے درخواست کروں گا کہ شامی بادشاہ تک حکومت کی پیشکش پہنچائے۔ اپنا اثر رسوخ استعمال کرتے ہوئے اسے ہتھیار ڈالنے پر مجبور کرے۔ ظاہر ہے وہ انکار کرے گا کہ یہ میرے بس کی بات نہیں۔ میں وزیرِ داخلہ کو بتاؤں گا کہ رانا رجب علی نے تعاون سے انکار کیا ہے۔ پھر میں گرد و نواح کے ایک دو اثر رسوخ رکھنے والوں سے بھی کہوں گا اور مجھے معلوم ہے کہ ان کا جواب کیا ہوگا۔ آپ کا نام آخر میں آئے گا۔ میں کہوں گا کہ نواب رفیق نے قانون سے تعاون کیا اور یہ کام کردکھایا جو کسی اور کے لیے ممکن نہیں تھا۔"

"یہ کام آپ کل کرسکتے ہیں۔ جس سے بات کرنی ہے فون پر کرلیں۔ وزیرِ داخلہ صاحب کو بھی بتادیں۔ کیا ہتھیار ڈالنے کے موقعے پر وہ یہاں نفس نفیس موجود ہوں گے؟"

"ست بدھائی آنا شاید اسے منظور نہ ہو۔"

میں نے کہا۔ "میں آپ کو پہلے ہی بتاچکا ہوں۔ شامی صرف یہاں ہتھیار ڈالے گا۔ میرے سامنے۔ میری حویلی میں اور کہیں نہیں۔"

"یہ ایک مشکل ضرور ہے۔"

میں نے کہا۔ "کیا آپ وزیرِ اعلیٰ سے بات نہیں کرسکتے؟"

"نہیں۔ یہ پروٹوکول کی خلاف ورزی ہوگی۔ میں آئی جی صاحب کو بتاسکتا ہوں۔ اگر وہ مناسب سمجھیں تو وزیرِ اعلیٰ سے براہِ راست بات بھی کرسکتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "چلیے جیسے آپ مناسب سمجھیں۔"

میں اس گفتگو سے مطمئن تھا۔ ڈی آئی جی کی حکمتِ عملی درست تھی۔ ایک ایسے شخص سے جو رانا کی حمایت پر مجھ سے دشمنی پر کمربستہ تھا کسی بھی معاملے میں براہِ راست میرا نام لینا مناسب نہیں تھا۔ وہ کبھی مجھے ثالث بنانا قبول نہ کرتا۔ یہ بالواسطہ طور پر میری اہمیت کو تسلیم کرنے اور مجھے عزت دینے کے مترادف ہوتا۔ اس کا اثر الٹا ہوتا۔ وہ کہتا کہ نواب رفیق اور شامی ڈاکو کا گٹھ جوڑ ہے۔ اس کے خلاف کیس بنایا جاسکتا ہے۔

میں نے ڈی آئی جی کے ذہن کو وزیرِ اعلیٰ کی طرف موڑ لیا تھا۔ اب مجھے امید تھی کہ وہ آئی جی کو بیچ میں ڈالے گا اور وزیرِ اعلیٰ سے بات کرنے کی درخواست کرے گا اور آئی جی انکار نہیں کرے گا۔ یہ اس کے ماتحت کی اور خود اس کے محکمے کی اعلیٰ کارکردگی کا کارنامہ بن جائے گا کہ انہوں نے شامی ڈاکو کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے ختم کردیا۔ جو طاقت سے نہیں ہورہا تھا اپنی معاملہ فہمی اور سیاسی سمجھ بوجھ سے حل کرلیا۔

مجھے امید تھی کہ صبح کے اخبار میں شائع ہونے والا راجا کا اس موضوع پر کالم بھی اپنا کام کرگیا تو شاید وزیرِ اعلیٰ خود مجھے بلالے اور پھر یہ تقریب ست بدھائی کی حویلی کے بجائے چیف منسٹر ہاؤس میں ہو، اَن گنت کیمروں کے سامنے۔ وزیرِ اعلیٰ سیاسی پبلسٹی کے اس موقعے سے پورا فائدہ اٹھانا چاہے گا۔

رات کو سونے سے پہلے میں نے ابا جی سے بات کرنے کی کوشش کی لیکن ان کے دوست جن کے گھر پر وہ مقیم تھے انہوں نے کہا کہ ابا سو رہے ہیں۔

میں نے پوچھا۔ "آج جلدی سوگئے۔ ان کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"طبیعت اتنی خراب نہیں ہے۔ دراصل انہیں مسلسل بخار چل رہا ہے حالانکہ یہاں کے بہترین اسپتال میں ان کا چیک اپ ہوا۔ دوا بھی باقاعدگی سے لے رہے ہیں۔ شاید اسی لیے سوگئے۔"

میں نے کہا۔ "انہیں اکیلے رہ جانے کا دکھ بھی ہوگا۔"

"رفیق بیٹا۔ یہ تو ایک قدرتی بات ہے۔ اس دکھ کا علاج نہ میرے پاس ہے اور نہ کسی ڈاکٹر کے پاس۔ ان سے یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ بہت زیادہ نہ سوچا کریں اور خوش رہیں۔"

میں نے کہا۔ "انکل بس آپ انہیں جلد از جلد پاکستان بھجوادیں۔ یہاں ہم سب مل کے انہیں سنبھال لیں گے۔ ایک تو اجنبی ملک پھر شریکِ حیات سے محرومی۔ اپنوں سے

دوری اور بیماری کے ساتھ قیام کی مدت میں یہ غیر متوقع اضافہ۔ آپ تو سمجھتے ہیں۔"

"بالکل سمجھتا ہوں۔ اس عمر میں آدمی اپنوں کے درمیان ہی سکون پاتا ہے۔ اپنا گھر، اپنا محلہ، اپنا شہر، اپنا ملک اور اپنے لوگ۔"

"سفری دستاویزات ملنے میں اور کتنے دن لگیں گے؟"

"میں کیا بتاؤں۔ سفارت خانوں کا ماحول اور ان کی کارکردگی بدترین سرکاری دفتر جیسی ہے۔"

"پھر کیا مشکل ہے۔ کسی ایجنٹ کو پکڑیں اور معاملہ طے کرلیں۔ ارجنٹ کام کے پیسے اس کے ہاتھ پر رکھیں۔"

"یہی تو اصل مشکل ہے بیٹا۔ تمہارے ابا بر ضد سوار ہے کہ یہاں آکے حج کرنے کے بعد بھی میں وہی کروں۔ مجھے یہ سمجھاتے ہوئے بھی شرم آتی ہے کہ تم جہنم میں جانے کی فکر چھوڑو۔ پاکستان جاؤ۔ ضابطے قاعدے کے مطابق کام میں دیر تو ہوگی۔"

میں اس مشکل کا حل سوچتا رہا۔ بلاشبہ احکام دوٹوک اور واضح ہیں کہ رشوت لینے اور دینے والا دونوں جہنمی ہیں۔ اب میں اپنے باپ سے کیسے کہوں کہ آپ حاجی کے ساتھ جہنمی بھی ہوجائیں۔ پھر میرے گناہگار ذہن میں کان کو دوسری طرف سے پکڑنے کا خیال آیا۔ ہم سب بند دروازوں کے سائے میں اپنی عیاری سے کوئی راستہ نکال لیتے ہیں۔ معلوم نہیں یہ کس گاؤں یا قصبے کی بات ہے۔ مسئلہ میں نے بہت پہلے کسی اخبار میں دیکھا تھا۔ میاں سے روٹھ کے بیوی میکے جابیٹھی تھی۔ میاں نے واپس لانے کے بڑے جتن کیے مگر ناکام رہا۔ بیوی نے ایک دن طیش میں کہہ دیا کہ اب نہ آنا۔ میں اپنے گھر سے تمہارے ساتھ جاؤں تو مجھ پر تین طلاق۔ مسئلہ سنگین ہوگیا تو کسی سیانے مولوی نے حل اپنی ذہانت یا عیاری سے بتایا۔ بیوی کہتی ہے کہ میں اپنے گھر سے تمہارے ساتھ جاؤں۔ اگر یہی الفاظ تھے تو وہ یوں کرے کہ چھت کے اوپر سے پڑوسی کے دوسرے گھر میں اتر جائے اور وہاں سے شوہر کے ساتھ چلی جائے۔ اپنے گھر سے نہ جائے۔

تو ایسے ہی میں نے سوچا کہ چلو ابا جی رشوت دے کر کام نہ نکالیں۔ ایجنٹ کی معرفت یہ کام کوئی اور بھی تو کراسکتا ہے۔ ہم جیسے قدم قدم پر رشوت دیتے چلے آئے ہیں۔ مجبوری کی آڑ میں ایک بار اور یہ کام کرلیں گے تو کیا فرق پڑے گا۔ گناہوں کے سمندر میں پہلے ہی غرق ہیں۔ لوٹا بھر گناہ سے سمندر کون سا بڑھ جائے گا۔ راجا کسی طرح لنک نکال لے گا۔ مقصد تو ابا جی کو نئی سفری دستاویزات کا اجرا بھی ہے۔

اس رات میں کچھ سکون سے سویا۔ میں تھکا ہوا بھی بہت تھا۔ صبح باہر نکلا تو خاموشی دیکھ کر یاد آیا کہ اتوار ہے۔ شہزادہ اور مس رابعہ بڑے رومینٹک موڈ میں فوارے کی منڈیر پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھے تھے۔ ان کے مشن کو اب سرکاری منظوری حاصل ہوچکی تھی۔ شہزادہ کی والدہ نے کھل کے بات نہیں کی تھی لیکن اشاروں میں مجھ پر موضوع واضح کردیا تھا۔ میں نے طے کیا کہ ابا جی کے واپس آتے ہی یہ فرض بھی ادا کردیا جائے۔

کافی پینے کے ساتھ میں نے اسپتال میں نور جہاں کو فون کیا۔ میرے پوچھنے پر اس نے کہا۔ "طبیعت ویسے تو ٹھیک ہے جان۔ لیکن..."

"لیکن کیا۔"

"سوچتی ہوں۔ یہاں سے نکل کے کہاں جاؤں گی۔ وہیں۔ اسی گھر میں۔ جہاں کرنے کو کچھ نہیں۔ صبح سے شام کرنے کے سوا۔"

"بس اب تھوڑے دن کی بات ہے۔"

"دیکھو۔ یہ تھوڑے دن کا بہلاوا مت دو مجھے۔ میں تمہیں بتارہی ہوں کہ میں اکیلی نہیں رہوں گی۔ نہ یہاں نہ باہر۔ میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔"

"نو آف کورس۔ تم میرے ساتھ رہوگی۔"

"تمہاری زندگی کا حصہ بن کے۔ میں کچھ کرنا چاہتی ہوں تمہارے لیے۔ بچے پیدا کرنے کے علاوہ بھی۔"

فون کرکے میں پھر مشکل میں پڑ گیا تھا۔ اتفاق سے ڈاکٹر صبح کا راؤنڈ لگانے آگئی اور نور جہاں کو فون بند کرنا پڑا۔ یہ مسئلہ اپنی جگہ بہت سنگین ہوتا جارہا تھا۔ فریال ہم سب سے بہت دور چلی گئی تھی اور بظاہر اس کی واپسی اب ممکن نظر نہ آتی تھی لیکن اس کی جگہ نور جہاں کو دینا آسان نہ تھا۔ شاید وقت گزرنے کے ساتھ ایسا ہوجاتا۔

فراغت کا احساس مجھے اس انتظار کی طرح لگتا تھا جب آدمی ریلوے پلیٹ فارم پر فارغ کھڑا ہوکے بھی ٹینشن میں ادھر دیکھتا رہتا ہے جدھر سے ٹرین کو آنا ہو۔ ہجوم اور شور کے درمیان۔ نظر کبھی گھڑی پر تو کبھی سگنل پر۔ سکون اور ٹھہراؤ کا وہاں کیا کام۔

میرے ذہن پر بہت سے حل طلب مسائل کا بوجھ تھا۔ نور جہاں صرف ایک مسئلہ تھی۔ اس سے الگ شامی بادشاہ کا معاملہ تھا جس میں میری کوشش کا دخل ضرور تھا لیکن میرے

اختیار میں کچھ بھی نہیں تھا۔ راجا نے اخبار منگوائے تھے۔ وہ بھی منتظر تھا کہ اس کی کوشش کا کیا نتیجہ نکلے گا۔ ایک بے یقینی کا خوف جناب وزیر داخلہ صاحب کی طرف سے تھا کہ وہ کچھ کرتے ہیں یا نہیں اور کرتے ہیں تو کیا کرتے ہیں۔ اینڈ آف کورس۔ رانا صاحب کی طرف سے خاموشی بھی کسی طوفان کا پیش خیمہ لگتی تھی۔

غنی نے سائنس ریسرچ سینٹر میں اسپتال کی منتقلی کا کام بڑے زور شور سے شروع کیا تھا۔ عام اصطلاح میں جنگی بنیادوں پر۔ اس میں جتنا دخل ضرورت کا تھا اس سے زیادہ دباؤ ڈاکٹر ریشم کا تھا۔ پلان کے مطابق ہر مریض کو سب سے پہلے ریشم کے پاس خود کو رجسٹر کرانا، اس کا نام پتا ایک کارڈ پر درج کرنے کے بعد ریشم کو اس کی جنس عمر، ازدواجی حیثیت وغیرہ کا اندراج کرنا تھا۔ اس کے بعد مریض کا وزن اور بلڈ پریشر نوٹ کر کے اسے کارڈ سمیت ڈاکٹر شہناز کے کمرے میں بھیجنا تھا۔ وہاں شہناز اس کی بیماری کے مطابق جو دوائیں لکھتی وہ بھی کارڈ پر لکھتی۔ کارڈ پر ایک نمبر تھا جو مریض کا حوالہ تھا اور اسے ہمیشہ یاد رکھنا تھا۔ ظاہر ہے دیہاتی مریض جو سو تک گنتی نہیں جانتے یہ نمبر یاد نہیں رکھ سکتے تھے چنانچہ ریشم کے لیے نام کے حروف کی ترتیب سے کارڈ رکھنا تھے۔ یہ سارا کام اسپتال کو منظم انداز میں چلانے کے لیے تھا لیکن ریشم اس لیے پرجوش تھی کہ اب اسے ایک الگ کرا میز کرسی کے ساتھ ملے گا جہاں باہر اس کے نام کی تختی پر ڈاکٹر ریشم لکھا جائے گا اور مریض اس پر یلغار نہیں کر پائیں گے۔ باہر بیٹھا ہوا چپراسی انہیں ایک ایک کر کے اندر بھیجے گا اور ریشم انہیں کارڈ تھما کے آگے روانہ کرے گی۔

غنی نے تعمیراتی سامان اکٹھا کر لیا تھا اور مزدوروں کی ایک ٹیم راج مستریوں کے ساتھ دیواریں اٹھانے میں جتی ہوئی تھی۔ اسپتال کے لیے تعمیراتی کام تقریباً مکمل تھا اور اندازہ یہ تھا کہ اس ہفتے میں رنگ روغن کے ساتھ بجلی کی فٹنگ ہو جائے گی اور فرنیچر ڈال دیا جائے گا۔ اگلے دو ہفتوں میں اسکول کا الگ عمارت میں شروع ہونا ممکن نظر آتا تھا۔ آج چھٹی تھی لیکن باہر وہی چہل پہل اور مصروفیت کا شور تھا جو عام دنوں میں ہوتا تھا۔

راجا کو اور مجھے اخبار کا انتظار تھا۔ جوگیاں سے صبح دس، گیارہ بجے کے بعد صرف دو اور دو اخبارات مل جاتے تھے جو زیادہ مقبول تھے۔ باقی اخبارات لانے کے لیے شیر خان کو دینہ بھیجا گیا تھا۔ وہ ایک گھنٹے بعد اخبارات کا پلندا لے کر آیا تو کچھ اپ سیٹ تھا۔

''سر! کچھ لوگ آئے ہیں باہر۔ دو گاڑیوں میں۔''

میں نے کہا۔ ''کون لوگ ہیں۔ کیا چاہتے ہیں؟''

''کہتے ہیں گورنمنٹ کے آدمی ہیں۔ چیکنگ کے لیے آئے ہیں۔''

میرا ماتھا ٹھنکا۔ ''کس کی چیکنگ۔ اچھا کسی ایک کو بلاؤ۔''

راجا نے کہا۔ ''ہاں۔ جوان کا افسر ہو۔''

میں نے کہا۔ ''راجا جی۔ ایکشن شروع ہو گیا۔''

راجا نے اخبار کے صفحے پلٹتے ہوئے کہا۔ ''ایکشن نہیں۔ ری ایکشن۔''

شیر خان کے ساتھ ایک عمر رسیدہ بیوروکریٹ ٹائپ شخص اندر آیا۔ وہ سوٹ میں تھا اور اس کے پیچھے دو نوجوان فرمانبردار شخص فائلیں اٹھائے چل رہا تھا۔

میں نے مہمان خانے میں اس کا استقبال کیا۔ ''میں رفیق احمد شیرازی ہوں اور یہ میرے صحافی دوست اور دست راست' راجا۔''

اس نے سر ہلا کے کہا۔ ''میں جانتا ہوں۔'' اور بیٹھ گیا۔

میں نے کہا۔ ''لیکن میں آپ کو نہیں جانتا۔ کہیں ایسا نہیں کہ برات غلط دروازے پر پہنچ گئی ہو؟''

اس نے اپنی افسرانہ متانت میں فرق نہیں آنے دیا۔

''میرا نام ہے غوث علی شاہ۔ میں چیف منسٹر کے سیکریٹریٹ میں انسپکشن ونگ کا سیکشن افسر ہوں۔''

راجا نے کہا۔ ''اس کا کوئی ثبوت دکھائیے۔''

اس کا موڈ بگڑ گیا۔ ''کیا مطلب؟''

راجا نے کہا۔ ''آپ کے پاس کوئی شناختی کارڈ ہے محکمے کا۔ میں کیسے مان لوں کہ آپ وہی ہیں جو کہہ رہے ہیں۔ آپ اگر خود کو ڈائریکٹر جنرل ایف آئی اے کہہ دیں یا وزیراعظم کا معاون خصوصی برائے ماہی گیری۔ تو مجھے کیا پتا۔ میں کسی کو پہچانتا نہیں۔''

وہ سخت جز بز ہوا۔ ''راجا صاحب۔ دس از سیریس میٹر۔''

''میں آپ سے کب مذاق کر رہا ہوں۔'' راجا نے کہا۔

وہ کچھ دیر راجا کو گھورتا رہا۔ ''او کے۔ آپ تصدیق کر لیں۔ میں فون نمبر دیتا ہوں۔'' اس نے پلٹ کے اپنے پی اے سے کچھ کہا۔

اب میں نے مداخلت کی۔ ''چلیں رہنے دیں۔ میں

مان لیتا ہوں آپ کی بات۔ اب یہ بتا دیں کہ کس سلسلے میں زحمت کی۔''

اس نے بریف کیس کھول کے ایک لیٹر نکالا اور میری طرف بڑھا دیا۔ ''مجھے ست بدعنوانی کی انسپکشن کے احکام ملے ہیں۔''

''یعنی آپ ریاست کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ میری طرف سے اجازت ہے۔ آپ کہیں تو ایک گائیڈ ساتھ کر دوں۔''

''آپ سمجھے نہیں۔ مجھے آپ کے زیرِ انتظام اسکول اور اسپتال کے معاملات اور ریکارڈ کو چیک کرنا ہے۔ اکاؤنٹس دیکھنے ہیں۔ انکم ٹیکس۔ کیپٹل گین ٹیکس اور ویلتھ ٹیکس کے گوشوارے حاصل کرنے ہیں۔ آمدنی اور خرچ کا آڈٹ شدہ اکاؤنٹس کا معائنہ کرنا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ پبلک کی شکایات ہیں۔ اس پر اپنی رپورٹ دینی ہے۔''

جتنی دیر وہ بولتا رہا میں اور راجا اسے ایسے دیکھتے رہے جیسے وہ جاپانی زبان میں شاعری سنا رہا ہے اور ہم کچھ نہ سمجھنے کے باوجود سننے پر اخلاقاً مجبور ہیں۔ اس کی بات ختم ہونے کے بعد میں نے کہا۔ ''اور اگر میں یہ سب نہ کرنے دوں۔ یا ہمارے پاس آڈٹ انسپکشن کے لیے ریکارڈ ہی نہ ہو۔''

اس نے برا سا منہ بنایا۔ ''پھر ہم اپنی رپورٹ میں یہی لکھ دیں گے۔''

''ہوں۔'' میں نے سوچ کے کہا۔ ''اس سے کیا ہوگا؟''

''متعلقہ محکمے آپ کے خلاف قانونی کارروائی کریں گے۔ اور کیا ہوگا۔'' وہ جھنجلا گیا۔ ''نوٹس بھیج دیں گے۔''

راجا نے اور میں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کے سر ہلایا۔ جیسے یہ بات ہماری سمجھ میں آ گئی ہے۔ ''اور ہم نوٹس وصول نہیں کریں گے تو دوسرا نوٹس آئے گا۔ پھر تیسرا۔ فائنل نوٹس کے بعد ہمارے خلاف عدالتی کارروائی کا آغاز ہوگا۔ دیوانی اور فوجداری عدالتوں میں۔ سمن جاری ہوں گے۔''

راجا نے کہا۔ ''ہم سمن وصول نہیں کریں گے۔ ہر بار بلیف ناکام لوٹ جائے گا۔ پھر نوٹس چسپاں کر دیا جائے گا یہاں۔ اس کے بعد اخبار میں شائع ہوگا۔ بالآخر ہم حاضر ہو کے کسی بہت بڑے وکیل کی معرفت جواب داخل کر دیں گے اور ضمانت بھی لے لیں گے۔ نیچے سے اوپر مختلف عدالتوں میں ہم کتنا وقت گزار سکتے ہیں۔ دس سال؟''

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''اس کا مطلب ہے آپ قانون سے کھیلنا چاہتے ہیں۔ لیکن میں آپ کو بتا دوں۔ یہ سب اتنا آسان نہیں ہوگا جتنا آپ سمجھ رہے ہیں۔ صوبائی حکومت پر سخت سیاسی دباؤ ہے کہ آپ کی غیر قانونی سرگرمیوں کا نوٹس لے۔ آپ نے تعاون نہ کیا تو وزارتِ داخلہ فوری کارروائی کا حکم جاری کر دے گی۔ آپ کے ساتھ وہ بھی گرفتار ہو جائیں گے جو غیر قانونی معاملات میں آپ کے شریک کار ہیں۔''

''ہمیں قانونی دفاع کے حق سے محروم تو نہیں کیا جائے گا۔''

وہ مجھے افسوسناک نظروں سے دیکھتا رہا۔ ''کس قانون کی بات کرتے ہیں آپ نواب صاحب۔ حکومت جب چاہتی ہے اس ملک کے وزیراعظم کو بھی پھانسی پر لٹکا سکتی ہے۔ قتل کرا سکتی ہے۔ جلاوطن کر سکتی ہے۔ آپ کی عمر میرے مقابلے میں بہت کم ہے۔ جو میں نے دیکھا ہے آپ نے نہیں دیکھا۔ یہاں قانون صرف زبردست کا ہے۔ یہ جنگل کا معاشرہ ہے۔ اندھیر نگری ہے۔''

میں نے کہا۔ ''مسٹر غوث علی شاہ۔ اب آپ کی زبان سے سچ نکلا ہے تو میں آپ کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ اپنے لشکر کو اندر بلا لیں۔ آپ سب میرے مہمان ہیں۔ بڑی دور سے آئے ہیں۔''

اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''نواب رفیق۔ مجھے تمام صورتِ حال کا علم ہے۔ میری ہمدردی آپ کے ساتھ ہے لیکن نوکری میں حکومت کی کرتا ہوں۔ کچھ میری مجبوری کا خیال فرمائیے۔ میں شاہ کا وفادار ہوں۔ بینگن کا نہیں۔ اس ملک کی بیوروکریسی بدنام ہے جس کا میں ایک حقیر سا پرزہ ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ملک کا نظم و نسق ہم ہی چلا رہے ہیں۔''

''چنانچہ ملک کا جو حال ہو رہا ہے۔''

اس نے راجا کی بات کاٹ دی۔ ''اس کے ذمے دار ہمارے سیاسی یا فوجی آقا ہیں۔ میں ان کے حکم کے خلاف نہیں جا سکتا۔ آپ مجھے بزدل کہیں یا خود غرض۔ لیکن حقیقت یہی ہے کہ میرے اختیار میں بھی کچھ نہیں۔''

اس کے بعد صورتِ حال بدل گئی۔ اس کے ماتحت عملے کے لیے اسکول میں جگہ فراہم کر دی گئی۔ کرسیاں اور میز ڈال کے انہوں نے فائلیں کھول لیں۔ میں نے غوث علی شاہ کو سب دکھایا اور بتایا۔ اس نے اپنا ظاہری سخت رویہ برقرار رکھا جو ایک چھاپا مارنے والی ٹیم کے سربراہ کا تھا لیکن اس نے مجھے اطمینان دلایا کہ اس کی رپورٹ میرے خلاف ہونے کے باوجود قانونی طور پر کمزور ہوگی اور عدالت میں بالآخر میرے مخالفین میرا کچھ نہیں بگاڑ پائیں گے۔

لیکن... یہی لیکن تمام معاملات و مسائل پر بھاری تھا۔

مجھے ہی کچھ کرنا ہوگا۔ ان سب کے لیے جو ایک ذاتی لڑائی میں میرے معاون ہوں گے۔ سامنے آئے بغیر لاقانونیت کی جنگ سے نمٹنے کے لیے مجھے خفیہ راستے دکھائیں گے۔ ہر سازش سے آگاہ کریں گے۔ جوابی چال بتائیں گے۔

ان دو غلے لوگوں نے اپنی نمک حرامی کا معاوضہ بھی بتایا۔ یہ بھی بتایا کہ وہ مجھے بالواسطہ تحفظ فراہم کرنے کی فیس کب کہاں اور کیسے وصول کریں گے۔ حکومت بدلتی رہتی ہے۔ وزیر آتے جاتے رہتے ہیں۔ اگر مجھے سیاست کرنی ہے تو ہاتھ کھلا رکھنا چاہیے۔ قانون کا شکنجہ صرف غریب کے لیے ہے۔ میں امیر آدمی ہوں۔ مجھے کس کا ڈر۔

میں نے راجا سے مشورہ کیا۔ ''یہ مگر مچھ تو ہمیں سالم نگل جانا چاہتے ہیں۔''

راجا نے مجھ سے اتفاق کیا۔ ''اگر ہم نے ان کے مطالبات پورے کردیے تو ان کے منہ اور کھل جائیں گے۔ یہ ہمیں بلیک میل کر رہے ہیں۔''

''پھر کیا کرنا چاہیے۔ یہ خون چوسنے والے ہیں۔ جن کو Extortionist کہا جاتا ہے۔ ہم پروٹیکشن منی کتنی دیں گے اور کب تک۔ اگر سب یہ حرام خور لے گئے تو ست بدھائی ترقیاتی پروگرام کیسے چلے گا؟''

میں نے کہا۔ ''یو آر رائٹ۔ مگر میں کیا کروں۔''

''جھوٹا وعدہ فیکے پتر۔ بے شک ان کتوں کو ٹالا نہیں جاسکتا لیکن انہیں ابھی علم ہی نہیں کہ ہم انہیں بائی پاس کر چکے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''ابھی تک کچھ بھی نہیں ہوا راجا جی۔''

''ہوگا۔ ہوگا۔ تو انہیں گھما۔ وقت گزار۔''

راجا کی اسکیم غلط نہیں تھی۔ چھاپا مار ٹیم کا سربراہ میرے ساتھ اسپتال کا معائنہ کر رہا تھا اور شہناز کو بتا رہا تھا کہ اس کے خلاف آس پاس کے لوگوں کی طرف سے کتنی شکایات موصول ہو چکی ہیں۔ اس کے غلط علاج سے کئی خواتین اور بچوں کی اموات ہوئیں۔ لوگوں نے مطالبہ کیا ہے کہ لیڈی ڈاکٹر کی ڈگری کی تحقیقات کرائی جائیں۔

ظاہر ہے کہ شہناز بہت اپ سیٹ تھی۔ غوث علی شاہ کے ساتھ آنے والی معائنہ ٹیم کے ارکان بڑے اچھے ایکٹر تھے۔ ان کے رویے سے یہ ثابت ہوتا تھا جیسے ہم سب جو یہاں مفادِ عامہ کے کام کر رہے ہیں وہ دھوکے فراڈ اور جعلسازی کے سوا کچھ نہیں۔ میرے سارے دعوے جھوٹے اور ہم سب کی ڈگریاں جعلی ہیں چنانچہ اب انسپکشن ٹیم دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرے گی تو خلقِ خدا کو ہمارا اصل چہرہ نظر آئے گا اور انشاءاللہ ان کی کوشش سے ہم سب کو پھانسی نہ ہوئی تو تمام عمر کے لیے ہم جیل میں چکی پیسنے کے لیے ضرور بھیجے جائیں گے۔

اس ٹیم کا سرغنہ غوث علی شاہ میرے ساتھ ڈیل کرنے کی کوشش میں مصروف تھا اور ایک اچھا سودا کا رابجٹ تھا۔ وہ ظاہر اور ثابت کر رہا تھا کہ اسے دس کروڑ مل جائیں تو میرے لیے یہ ایک فائدہ مند سودا ہے لیکن مجھے یہ رقم زیادہ لگتی ہے تو وہ اپنی فطری رحمدلی سے کام لیتے ہوئے مجھے کچھ رعایت بھی دے سکتا ہے۔

دوپہر سے کچھ پہلے یہ کھیل اچانک ختم ہوگیا۔ فون راجا کے پاس آیا۔ وہ مجھ سے دور تھا لیکن اس کے چہرے کی پرمسرت چمک اور ہونٹوں کی مسکراہٹ دیکھ کے میں نے اندازہ لگالیا کہ اچھی خبر ہے پھر اس نے ایک انگوٹھا بلند کر کے اور آنکھ مار کے مجھے سگنل دیا اور فون لے کر میری طرف آگیا۔

''چیف منسٹر کا پبلک ریلیشن افسر۔ ندیم پرداز کمالی۔''

میں نے کہا۔ ''ہیلو ندیم صاحب۔ کیسے ہیں آپ!''

اس نے کہا۔ ''نواب صاحب۔ چیف منسٹر صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ آج شام سات بجے۔''

میں نے کہا۔ ''مجھ سے؟ خیریت تو ہے۔''

''بالکل خیریت ہے۔ کوئی ذمے داری سونپنا چاہتے ہیں آپ کو۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ لیکن آج۔''

''دراصل ان کے شیڈول میں یہی وقت ہے۔ اس کے بعد اگلے تین دن وہ بے حد مصروف ہوں گے۔''

میں نے کہا۔ ''دراصل یہاں ان کی انسپکشن ٹیم والے آئے ہوئے ہیں۔ ان کے رویے سے لگتا ہے کہ شام تک وہ مجھے جیل بھجوادیں گے۔''

وہ ہنس کے بولا۔ ''ایسی کیا بات ہے۔''

''ان کا خیال ہے کہ ست بدھائی ترقیاتی پروگرام کے نام پر میں بہت بڑا فراڈ کر رہا ہوں۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ ڈی آئی جی عبداللہ جان تو آپ کی بہت تعریف کر رہے تھے۔''

''پھر وہ بھی گئے کام سے۔ دراصل وزیرِ داخلہ صاحب خفا ہیں مجھ سے۔ یہ اسی کا شاخسانہ ہے۔ وہ اس علاقے کے رکن صوبائی اسمبلی رجب علی رانا کی پارٹی سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ نہیں چاہتے کہ میں اس علاقے میں کوئی کارِ خیر کروں۔ اسپتال یا اسکول بناؤں۔ یا لوگوں کی حالت

بہتر بنانے کے لیے کوئی بھی کام کروں تاکہ رانا رجب علی کی وڈیرا شاہی اسی طرح چلتی رہے جیسے چل رہی ہے۔''

ندیم پرداز سنتا رہا پھر بولا۔ ''بس سمجھ گیا نواب صاحب۔ میں ابھی دس منٹ کے بعد پھر آپ سے بات کرتا ہوں۔''

میں نے فون راجا کو واپس کیا اور دوبارہ غوث علی شاہ سے مذاکرات میں مصروف ہوگیا۔ ''شاہ صاحب۔ یہ شکایات کہاں سے ملی ہیں آپ کو ڈاکٹر شہناز کے خلاف؟''

''آس پاس کے دیہات سے۔ وہ غیر قانونی طور پر اسقاط کرا رہی ہیں۔ علاقے میں بدکردار عناصر کی مدد کر رہی ہیں۔ زچگی کے کیس خراب ہونے سے کئی اموات ہوئی ہیں۔ وہ جعلی ادویات والوں سے سستی دوائیں خرید کے کمیشن لیتی ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''کیا میں یہ شکایات دیکھ سکتا ہوں۔''

اس نے مجھے ایک فائل تھمادی۔ اس میں چالیس پچاس کاغذات لگے ہوئے تھے۔ میں نے چند صفحات پلٹ کر دیکھے۔ جعلسازی بڑے بھونڈے طریقے سے کی گئی تھی۔ یہ دو تین کاپیوں سے پھاڑے گئے کاغذات پر دو تین مختلف بال پین سے لکھی ہوئی درخواستیں تھیں۔ ہینڈ رائٹنگ بھی دو یا تین افراد کی تھی۔ نام پتے بھی یقیناً فرضی ہوں گے لیکن سرکاری فائل کو چیلنج کیسے کیا جاسکتا تھا۔

غوث علی شاہ نے اسکول کے بارے میں بھی شکایت کا ذکر کیا۔ تعلیم کے ذریعے نوجوان لڑکیوں کو بے راہ روی سکھائی جارہی تھی۔ لڑکیاں صرف لو لیٹرز لکھ رہی تھیں۔ یاریاں لگانے کے بعد عاشقوں کے ساتھ فرار ہو رہی تھیں۔ بیویوں نے شوہروں کے خلاف باغیانہ طرزِ عمل اختیار کرلیا تھا۔ ہم کفر اور الحاد کو بھی فروغ دے رہے تھے۔ دینی تعلیم کے خلاف تھے اور روشن خیالی کے نام پر فحاشی پھیلا رہے تھے۔ سب سے سنگین مسئلہ ٹیکس چوری کا تھا۔ زمین پر ناجائز قبضے کا تھا۔ ست بدھائی کے حق ملکیت کا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے میں نے زبردستی سرکاری زمین ہتھیالی ہے اور فراڈ کر کے حویلی کا مالک بن بیٹھا ہوں۔ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا۔ اس کا فیصلہ عدالت کرے گی لیکن اس سے پہلے میرے خلاف تمام تفتیش اور تحقیقاتی ادارے اپنی رپورٹ دیں گے۔

میں نہایت احمقانہ سادگی کے ساتھ پریشان اور خوفزدہ نظر آنے کی اداکاری میں مصروف تھا کہ راجا نے پھر مجھے فون دیا۔ میں نے ندیم پرداز سے بات کی اور پھر فون غوث علی شاہ کو تھمادیا۔ ''چیف منسٹر ہاؤس سے فون ہے۔''

وہ حیران ہوا۔ ''میرے لیے؟''

میں نے گھڑے جیسا سر ہلایا اور بڑی معصومیت سے غوث علی شاہ صاحب کے چہرے کے بدلتے رنگ دیکھتا رہا۔ یس سر کے سوا اس کے منہ سے کچھ نکل ہی نہیں رہا تھا۔

پانچ سات منٹ بعد اس نے فون بند کر کے اپنے ماتھے سے پسینا صاف کیا۔ خفت اور پریشانی سے زیادہ اسے دس کروڑ کی ڈیل ختم ہونے کا صدمہ تھا۔

آدھے گھنٹے بعد انسپکشن ٹیم کے ارکان کسی شکست خوردہ لشکر کی طرح مراجعت کر گئے۔ ظاہر ہے اس سے حویلی کے اندر خوشی کی لہر دوڑ گئی اور ایک فتح مندی کے جشن کا سماں پیدا ہوگیا۔

میں نے غوث علی شاہ سے پوچھا۔ ''یہ درخواستوں کا پلندا کس نے تحریر کیا تھا؟''

''مجھے نہیں معلوم۔ مجھے بس فائل دی گئی تھی۔''

''میرا مطلب ہے آپ نے اپنے اسٹاف سے تو نہیں لکھایا تھا؟ اس میں مجھے دو تین ہینڈ رائٹنگ نظر آئیں۔ مجھے حیرانی تھی کہ دیہاتی اتنی اچھی اور صاف اردو لکھنے لگے ہیں۔''

''دیکھیے نواب صاحب۔ ابھی تو یہ معاملہ ختم ہوگیا۔ یہ ایک پاور گیم ہے۔ اس کی ایک بازی آپ نے جیت لی ہے۔''

''آپ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ گیم جاری ہے۔''

وہ مسکرایا۔ ''گیم اس وقت تک ختم نہیں ہوتا جب تک کوئی ایک کھلاڑی اٹھ نہ جائے۔ یا اٹھا نہ دیا جائے۔ کھیل سے یا دنیا سے۔ اس ملک کی تاریخ میں اٹھانے بٹھانے کا سلسلہ ایسے ہی چلتا رہے گا۔''

''اور آپ اپنے مبارک ہاتھوں سے یہ کارِ خیر کرتے رہیں گے؟''

وہ ہنسا۔ ''ہم؟ اجی نواب صاحب۔ ہم کیا اور ہماری اوقات کیا۔ جو ہاتھ سیاست کی بساط پر چال چلتے ہیں۔ وہ نظر نہیں آتے لیکن کون نہیں جانتا وہ کس سپر پاور کے ہاتھ ہیں۔''

میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ ''مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں۔''

اس نے کہا۔ ''اپنے دل میں کوئی بات نہ رکھیے۔ معلوم نہیں ہم پھر کب اور کہاں ملیں گے۔''

''ابھی تو خیر سے آپ کی ریٹائرمنٹ بہت دور ہے۔''

''ہاں لیکن میری جگہ بیٹھنے کے لیے بہت لوگ ہر وقت

کوشش میں مصروف ہیں۔'' وہ بولا۔

میں نے کہا۔ ''موقعے کی جگہ تو فقیر بھی پکڑتا ہے۔''

ان کے جانے کے بعد میں نے شامی بادشاہ کے ارسال کیے ہوئے موبائل فون میں وہی سم پھر لگائی۔ اسے ایک بار پھر استعمال کرنے میں فوری خطرہ کوئی نہیں تھا تاہم یہ احتیاط لازم تھی کہ خفیہ نوعیت کی گفتگو کے لیے ہر بار سم بدل دی جائے۔

پہلے ایک عورت نے ''ہیلو...'' کہا اور میں نے شامی بادشاہ سے گفتگو کی خواہش ظاہر کی تو اس نے رانگ نمبر کہہ کے لائن کاٹ دی۔ میں نے پھر کوشش کی تو لائن مصروف ملی۔ چند منٹ بعد میرے ہاتھ میں فون کی گھنٹی بجی تو میں نے دیکھا کہ یہ کوئی نیا نمبر ہے۔

شامی بادشاہ نے مجھ سے کہا۔ ''خیر ہووے۔ نواب دوست کی۔''

میں نے کہا۔ ''خیر ہو اس دوستی کی۔''

''کیسے یاد کیا دوست؟''

میں نے کہا۔ ''میں نے حکومت کے نمائندے سے بات کی ہے۔ پہلے اس علاقے کے پولیس چیف سے بات ہوئی تھی لیکن اس کے بعد خود چیف منسٹر کی طرف سے آفر آئی ہے۔''

''میں نے تو تمہیں سارے اختیارات دے رکھے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''پہلے یہ طے ہوا تھا کہ تم میرے گھر آؤ گے۔ لیکن اب مجھے چیف منسٹر صاحب نے فون کرکے یہ خواہش ظاہر کی ہے۔''

''نواب صاحب۔ وہ سیاسی فائدہ اٹھانا چاہتا ہوگا اور اس کے لیے بندوق آپ کے کندھے پر رکھ رہا ہے۔''

''یہ بات میں سمجھتا ہوں۔ لیکن چیف منسٹر کی گارنٹی بہت بڑی ہے۔ زیادہ بھروسے کے قابل ہے۔''

''چیف منسٹر کو میں ذاتی طور پر نہیں جانتا۔ اس ڈی آئی جی کو جانتا ہوں۔ اس کے وعدے پر مجھے اعتبار ہے۔ چیف منسٹر ہاؤس میں جاکے تم خود بے اختیار ہو جاؤ گے۔ بہتر ہے معاملات تمہاری حویلی میں طے پائیں۔'' شامی نے کہا۔

میں نے کہا۔ ''او کے۔ میں بات کرتا ہوں۔ اگر چیف منسٹر خود یہاں آنا منظور کرلے۔''

''اس کے لیے علاقے کا دورہ کرنے کے بہانے کہیں بھی جانا کیا مسئلہ ہے۔ اس انتظامی دورے میں اگر دوست بدحالی کی حویلی اچانک پہنچ جائے' یا ایسا لگے کہ اچانک پہنچا ہے۔ پہلے سے طے کچھ نہیں تھا تو اسے بھی زیادہ پبلسٹی ملے گی اور تمہیں بھی نواب دوست۔''

اس کی دلیل نے مجھے قائل کرلیا۔ ''بالکل صحیح خیال ہے تمہارا۔ میں یہ تجویز چیف منسٹر تک پہنچاتا ہوں۔ آگے دیکھو کیا ہوتا ہے۔''

''ایک دن کی مہلت مجھے بھی ملنی چاہیے۔ پتا نہیں اپنا ٹھکانا کہاں ہو۔ چیف منسٹر کا دورہ تو طوفانی قسم کا ہوگا۔ وہ ہوا کے گھوڑے پر سوار آئے گا اور چلا جائے گا۔''

میں نے سوچ کے کہا۔ ''یہ تو ہے۔ تمہیں پہلے سے کہیں قریب میں موجود رہنا پڑے گا۔''

''یہ ہوسکتا ہے بشرطیکہ میرے تمہارے سوا کسی تیسرے کو ہوا بھی نہ لگے ورنہ یہ عیار لوگ میرے ہتھیار ڈالنے سے پہلے ہی مجھے گرفتار کرلیں گے۔''

''تم کس کی بات کررہے ہو؟''

''یہی۔ پولیس اور خفیہ والے۔ وہ سارا کریڈٹ لے جانا چاہیں گے اور حکومت بھی۔ ہم مفت میں مارے جائیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''تمہاری ذمے داری میں نے قبول کرلی ہے۔ اب تم بےفکر ہو جاؤ۔''

میرا خیال تھا کہ اس مسئلے پر دوبارہ ڈی آئی جی صاحب سے بات کرنا ضروری ہوگا۔ فون پر دیگر تفصیلات ڈسکس کرنا ممکن بھی نہیں تھا اور محفوظ بھی نہیں۔ جب اصولی طور پر اتفاقِ رائے ہو جاتا تو پھر میں اگلا قدم اٹھا سکتا تھا اور شامی بادشاہ سے کہہ سکتا تھا کہ اب کسی وقت وہ میرے پاس آجائے۔ پھر میں ڈی آئی جی یا چیف منسٹر سے کہوں کہ وہ جب چاہیں مذاکرات اور معاہدے کے لیے تشریف لے آئیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ایک دن کے نوٹس پر چیف منسٹر نہ آسکے۔ اس کی اپنی انتظامی اور سیاسی مصروفیات پہلے سے طے ہوتی ہیں۔

ایسی صورت میں شامی بادشاہ کو تمام ساتھیوں کے ہمراہ کہیں چھپا کے رکھنا آسان کام نہ تھا۔

میں اسی مسئلے پر راجا اور غنی سے بات کرنے کی سوچ رہا تھا کہ شہزاد نمودار ہوا۔ اس کی شکل ایسی ہو رہی تھی جیسے اس نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔ اس کے لیے بات کرنا مشکل ہو رہا تھا۔

اسپتال سے اس کی خالہ نے فون کیا تھا۔

میں نے تشویش سے پوچھا۔ ''شہزادے! کیا ہوگیا؟ خیریت ہے نا؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا اور کرسی پر گر گیا۔ کافی کوشش کے بعد اس کے حلق سے پھنسی پھنسی آواز نکلی۔ ''نہیں... خیریت نہیں ہے۔''

راجا نے میری طرف دیکھا۔ ''آخر کیا ہوا۔ منہ سے بول۔''

''وہ... نور جہاں...''

یکلخت مجھے یوں لگا جیسے دن کے اجالے کو تاریکی نے نگل لیا ہے۔ میرے چاروں طرف سنسنان جنگل ہے جس میں بدروحوں کے مکروہ شیطانی قہقہے گونج رہے ہیں۔ ہاہاہا... دیکھا قبلہ نواب صاحب! اس طرح جاں سے گزرتے ہیں گزرنے والے۔ آپ نے اس سے جینے کی خواہش تک چھین لی تھی۔ وہ جی کے کیا کرتی' اور اب کون ہے جو آپ سے اس کا خوں بہا طلب کرسکے۔ آپ کے دامن پر تو کوئی داغ بھی نہیں...

میں نے جذبات سے عاری سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''وہ مرگئی؟ خودکشی کرلی اس نے؟''

شہزاد گھبرا کے کھڑا ہوگیا۔ ''لاحول ولا قوۃ۔ خدا نہ کرے۔ آپ ایسا سوچ بھی کیسے سکتے ہیں۔''

راجا بگڑ گیا۔ ''ابے تو بتاتا کیوں نہیں۔''

''وہ اسپتال سے کہیں چلی گئی ہے۔'' شہزاد نے کہا۔

راجا نے دہرایا۔ ''کہیں چلی گئی ہے؟ کہاں چلی گئی ہے...؟''

شہزاد نے جیسے اعترافِ جرم سے انکار کیا۔ ''نہیں معلوم... خالہ نے کہا کہ وہ نہا کے کپڑے بدلنے واش روم گئی تھیں۔ اس وقت وہ آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔ انہیں پندرہ بیس منٹ ہی لگے ہوں گے مگر وہ باہر آئیں تو اس کا بیڈ خالی تھا۔''

''پھر؟'' راجا بیٹھ گیا اور مجھے بھی ہاتھ کے اشارے سے کہا کہ بیٹھ جاؤ۔

''خالہ نے سب سے پوچھا۔ نرسوں سے، کاؤنٹر سے، گیٹ پر موجود لوگوں سے۔ خالہ بہت پریشان تھیں۔ رو رہی تھیں۔''

میں نے کہا۔ ''شہزاد۔ آخر وہ کہاں جاسکتی ہے۔ اس کی حالت ایسی نہیں تھی۔''

''اس کے جسم پر اسپتال کے کپڑے تھے... ایسے میں اسپتال والے کہاں نکلنے دیتے ہیں۔''

شہزاد نے نفی میں سر ہلایا۔ ''خالہ غسل کے بعد جو کپڑے بدلنا چاہتی تھیں... وہ ان کے بیڈ پر رکھے تھے۔ نور جہاں وہی پہن کے نکل گئی۔ اسپتال کے کپڑے چھوڑ گئی۔ شام کو ملاقاتی آتے ہیں۔ گیٹ پر کوئی نہیں دیکھتا کہ کون آیا کون گیا۔ جو مریض چل پھر سکتے ہیں وہ باغ میں اپنی فیملی کے ساتھ رہتے ہیں لیکن اسپتال کے کپڑوں میں باہر جانا چاہیں تو یقیناً انہیں گیٹ سے کوئی نہیں نکلنے دے گا۔ ایسے تو مریض بل ادا کیے بغیر بھاگ جائیں۔''

''میں نہ کچھ سن رہا تھا نہ سمجھ رہا تھا۔ نور جہاں کی اداس بیمار صورت میری نظروں کے سامنے منجمد ہوگئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ویرانی تھی۔ تم نے مجھ سے یہ آرزو بھی چھین لی؟''

راجا سر پکڑے بیٹھا تھا۔ ''آخر وہ کہاں گئی ہوگی؟''

''کہاں جاسکتی ہے وہ۔ میرے گھر میں تو کوئی نہیں ہے۔ تالا پڑا ہوا ہے اور اسے لوٹ کے وہاں جانا ہوتا تو اسپتال کیوں چھوڑتی۔'' شہزاد بولا۔

راجا نے کہا۔ ''اس ڈانسر سے پوچھا۔ جو نور جہاں کو اسپتال لے گئی تھی۔''

''سب سے پہلے اسی کو فون کیا تھا۔''

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں جاتا ہوں۔''

راجا نے کہا۔ ''کہاں جاتا ہوں؟ تجھے اندازہ ہے کچھ وہ کہاں گئی ہوگی۔ کہاں تلاش کرے گا اسے؟''

''پھر کیا کروں؟ یہاں بیٹھ کے بھی کیا ہوگا؟''

راجا نے مجھے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھ کے بٹھا دیا۔ ''حوصلہ رکھ ٹیکے پتر! میرا دل کہتا ہے کہ وہ مل جائے گی۔''

میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ''اپنے دل سے پوچھ کے مجھے بتا۔ وہ کہاں ملے گی اور کب... میں جاؤں گا۔''

''تو کیا اسے گلی گلی تلاش کرے گا؟ سڑکوں پر ڈھونڈے گا؟ پاگل مت بن۔'' راجا نے سخت لہجے میں کہا۔

میں نے شہناز کو دیکھا اور لیلیٰ بھابی کو اور پھر رابعہ کو۔ وہ میرے چاروں طرف فکر مند چہرے لیے چپ کھڑی تھیں۔ ان کے پیچھے ریشم تھی جو دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھ رہی تھی۔ وہ سب نور جہاں سے زیادہ میرے لیے پریشان تھیں۔ ان کے دل میرے لیے دکھی تھے۔

اچانک مجھے خود سے شرم آئی۔ یہ میں کیا کررہا ہوں۔ سستی جذباتیت لے گی۔ میں نے تو ابتدا ہی سے فرض کرلیا تھا کہ انتہا ہو چکی اور نور جہاں نے خودکشی کرلی ہے۔ ایسا نہیں تھا۔ اسے مرنا ہوتا تو اتنا تردد بھی کیوں کرتی۔ جان دینے سے اسے اسپتال میں کون روکتا۔ نور جہاں کا ایسی چالاکی سے نکلنا ہی یہ ثابت کرتا ہے کہ اپنی عقل پر اس کو کنٹرول حاصل تھا۔ وہ زندہ رہے گی اور زندہ رہی تو مل بھی جائے گی۔ آج تا سہی

کل، ایک ہفتے ایک مہینے یا ایک سال بعد۔ دنیا ویسے ہی بہت چھوٹی ہوگئی ہے۔ نور جہاں کی دنیا تو اور بھی محدود ہے۔

اس وقت راجا نے میرے کندھے پر دوبارہ ہاتھ رکھا۔ ''وہ آئے گی۔ خود آئے گی فیکے پتر!''

میں نے سر ہلایا۔ ''شاید تو ٹھیک کہتا ہے راجا۔''

رابعہ میرے سامنے آگئی۔ ''دیکھو تم سے دور وہ نہیں جاسکتی کزن... مجھے معلوم ہے۔''

میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''یو آر ویری رائٹ کزن۔ میں کچھ زیادہ ہی اپ سیٹ ہوگیا۔ آل رائٹ راجا۔ تو شہزاد کے ساتھ اسپتال جا خالہ کے پاس۔ مجھے تو لاہور جانا ہے۔ چیف منسٹر سے میٹنگ ہے۔''

راجا کے چہرے پر اطمینان آگیا۔ ''میں بھی تیرے ساتھ ہی چلوں گا۔ اپنی خالہ کو شہزاد لے آئے گا یہاں۔''

شہزاد نے کہا۔ ''آج نہیں۔ آج رات تو ہم اپنے گھر میں رہیں گے۔ کیا پتا وہ آہی جائے۔''

میں نے مایوسی سے کہا۔ ''نہیں شہزاد! اسے لوٹ کے جانا ہوتا تو اسپتال سے کیوں نکلتی۔ لیکن ٹھیک ہے۔ آج ہی واپس آنے میں بہت رات ہوجائے گی۔ رسک لینے کی کیا ضرورت ہے۔''

راجا نے کہا۔ ''ہوسکتا ہے رات کو ہم بھی آجائیں۔ ہماری میٹنگ زیادہ سے زیادہ آدھے گھنٹے کی ہوگی۔ آٹھ بجے لاہور سے نکلے تو رات بارہ بجے پنڈی پہنچ جائیں گے۔''

لیلیٰ بھابی نے خفگی سے کہا۔ ''میٹنگ اتنی ضروری ہے؟''

میں نے کہا۔ ''اس میٹنگ کی بہت اہمیت ہے میرے لیے۔''

''میٹنگ!'' انہوں نے بڑے زخمی لہجے میں کہا۔ ''نور جہاں سے زیادہ اہم ہے؟ واقعی... تم مرد کاروبار کرسکتے ہو۔ محبت نہیں۔ جان لے سکتے ہو۔ جان دینا تمہارے لیے گھاٹے کا سودا ہے۔'' اور احتجاجی انداز میں واک آؤٹ کر گئیں۔

کسی جذباتی ردِعمل کا شکار ہونا میں افورڈ نہیں کرسکتا تھا۔ وقت کے ساتھ محبت کے انداز بھی پہلے جیسے نہیں رہے۔ شاعر پہلے ہی اعتراف کرچکے تھے کہ اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا اور یہ بھی کہ... تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے۔ محبت کے لیے جو فرصت اور فراغت مجنوں یا فرہاد جیسے عاشق کے اماموں کو میسر رہی وہ اب کہاں۔ ایک نے دشت نوردی اختیار کی اور لیلیٰ لیلیٰ پکارتے پھرے۔ دوسرے نے بھی جوئے شیر لانے میں زندگی صرف کی۔ اب عام آدمی محبت کے ساتھ کلرکی بھی کرتا ہے یا رکشا چلاتا ہے۔

میں عام آدمی سے زیادہ ذمے داریوں کے بار تلے دبا ہوا تھا۔ مجھے تو فرقت میں آہ بھرنے کی فرصت نہ تھی۔

ہم سب الگ الگ گئے۔ شہزاد پہلے نکلا۔ میں غنی کو پیچھے چھوڑ کے جانا چاہتا تھا لیکن اس کی دلی خواہش تھی کہ خود مجھے چیف منسٹر ہاؤس لے کر جائے۔ وہ میری سیکیورٹی کے معاملے میں کچھ ضرورت سے زیادہ ہی محتاط اور پریشان رہتا تھا۔ وہ اب اپنے معاملات میں اتنا خود مختار ہوگیا تھا کہ بعض اوقات میرے احکامات کی پروا بھی نہیں کرتا تھا۔ مثلاً جب میں گولی کے پیچھے ایک گھوڑے پر بیٹھ کے گیا تھا تو رات کے اندھیرے اور بارش کے باوجود غنی میرے ساتھ ایسے گیا تھا کہ گھوڑے کے ساتھ دوڑتا رہا تھا۔ بلاشبہ یہ فرض شناسی اور جانثاری کی انتہا تھی چنانچہ میں بھی اس کی نافرمانی کا برا نہیں مان سکتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس میں بھی نیک نیتی اور وفاداری کے جذبات شامل ہوتے ہیں۔

مجھے چیف منسٹر ہاؤس لے جانا اس کے لیے ایک اعزاز تھا۔ وہ ایک معمولی ٹرک ڈرائیور تھا جو برسوں کراچی سے خیبر تک ہر قسم کا سامان لاتا لے جاتا رہا۔ گھریلو سامان سے سامانِ تجارت اور چرس ہیروئن اور اسلحے تک۔ ست بدحائی میں اسے عزت اور اہمیت ملی تھی۔ چیف سیکیورٹی آفیسر کوئی سرکاری عہدہ نہ تھا لیکن ایک بہت بڑی ذمے داری ضرور تھی جسے غنی اپنی فطری ذہانت اور عقل کی مدد سے بہ طریقِ احسن نبھا رہا تھا۔ اس کی محنت اور کارکردگی کی جتنی بھی تعریف کی جاتی کم تھی۔

غنی ہمارے حسنِ سلوک سے بھی بہت متاثر تھا۔ ریشم کی طرح اسے بھی گھر کے ایک فرد جیسی عزت حاصل تھی اور وہ اس میں بڑا فخر محسوس کرتا تھا۔ وہ میرا شوفر، محافظ، پی اے اور مشیر سب کچھ تھا۔ اور روز بروز اس کی اہمیت بڑھتی جارہی تھی۔ یہ سب بے سبب نہیں تھا۔ اس نے خود کو ہر ذمے داری کا اہل ثابت کیا تھا۔ کوئی بھی غنی کو کسی بھی وقت کچھ بھی کرنے کو کہہ دیتا تھا اور وہ اس اعتماد پر پورا اترتا تھا۔

ریشم نے پہلے ہی سب کے دل جیت لیے تھے۔ اب غنی کے ساتھ یہ میاں بیوی کی ٹیم ست بدحائی کے لیے اتنی ہی ناگزیر تھی جتنی ہم سب کے لیے۔ ایک طرف ریشم کی خدمت گزاری لاجواب تھی تو دوسری طرف اس کی دلچسپ انگریزی اور معصوم شوخی سب کے دل کو بھاتی تھی۔ میاں بیوی میں جتنی محبت تھی وہ ہم نے ان کی شادی سے پہلے بھی دیکھی تھی۔ شادی کے بعد اس رشتے میں رفاقت کے جذبے کا اضافہ ہوگیا تھا اور کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ پہلے کی طرح وہ آج بھی

ایک دوسرے کو چاہتے تھے اور اتنا ہی لڑتے بھی تھے۔ ان کی ذمے داریوں کی نوعیت ضرور الگ تھی لیکن لگن ایک جیسی تھی۔ انہیں کچھ نہ کچھ نئی سوجھتی رہتی تھی۔

پہلے ریشم نے شوخی میں ست بدحائی کا ایک جھنڈا ایجاد کیا تھا۔ لال نیلے پیلے اور ہرے رنگ کے ٹکڑے جوڑ کے اس نے سفید ریشمی دھاگے سے خود کاڑھا تھا۔ غنی نے یہ کیا کہ جھنڈے کو میری کار پر لہرا دیا۔ جب میں نے اعتراض نہیں کیا تو انہوں نے ایک قدم آگے بڑھایا اور ایک جھنڈا حویلی کے مین گیٹ پر بھی لہرا دیا۔ ظاہر ہے اس جھنڈے کی کوئی سرکاری حیثیت تو تھی نہیں کہ سرکار اعتراض کرتی۔ خود میں نے اسے سیریس نہیں لیا تھا لیکن مخالفت نہ کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ریشم کا ڈیزائن کردہ جھنڈا ست بدحائی کی شناخت بن گیا۔

جب چیف منسٹر ہاؤس جانے کا معاملہ اٹھا تو غنی کو سب سے زیادہ خوشی ہوئی۔ اس نے ریشم سے کہا کہ ''پہلے میں نواب صاحب کو ڈی آئی جی کے گھر لے گیا تھا۔ اب چیف منسٹر ہاؤس لے جاؤں گا۔ دیکھنا ایک دن ان کو ایوانِ صدر بھی میں ہی لے کر جاؤں گا۔'' ریشم سخت مرعوب ہوئی۔ اس کا میاں وی آئی پی ہوگیا تھا۔

اچانک مجھے پتا چلا کہ غنی نے چھ ڈرائیوروں کے لیے یونیفارم پہننا لازمی کردیا ہے۔ یونیفارم بہت سادہ تھی۔ سفید شلوار قمیص اور سیاہ واسکٹ۔ خود کو دوسروں سے ممتاز کرنے اور میری نوابی کی ''ٹور'' بڑھانے کے لیے اس نے اپنی واسکٹ کو گرین رکھا اور سر پر سفید پگڑی رکھ لی۔ اب دیکھا جائے تو یہ بڑے معزز لوگوں کا لباس تھا۔ جو کسی حد تک سرکاری عمائدین بھی پہنتے تھے۔ چونکہ میں باہر رہنے کے باعث مغربی لباس کا عادی ہوچکا تھا اس لیے عموماً سوٹ پہنتا تھا۔ گرمی میں پینٹ شرٹ یا ٹی شرٹ استعمال کرتا تھا۔ غنی نے لباس سے خود کو ممتاز کرلیا اور معزز ہوگیا۔ یہ شاید اس کے کسی لاشعوری احساسِ کمتری کی تسکین کا ایک انداز تھا۔

شہزاد کی روانگی کے کچھ دیر بعد میں نے راجا کے ساتھ روانگی کا ارادہ کیا تو غنی اپنے لباسِ فاخرہ میں نمودار ہوا۔ ''سر کیسی ہے میری یہ سرکاری یونیفارم۔''

راجا نے تعریفی انداز میں کہا۔ ''یار اصل نواب تم ہی لگ رہے ہو۔''

اس نے عاجزی کا اظہار کیا۔ ''ہم تو نمک خوار ہیں آپ کے۔ کیوں ہمیں شرمندہ کرتے ہیں۔''

غنی کی زوجہ اپنے مجازی خدا پر صدقے واری جاتے ہوئے بولی۔ ''سر ہاؤ غنی سی ان دس ڈریس۔ ویری شاندار۔''

میں نے کہا۔ ''دیکھو اسے نظر نہ لگا دینا۔''

وہ خوش ہوئی۔ ''اف رانا رجب علی کم۔ ہی لک سرونٹ آف غنی۔ آئی سے ٹرو؟''

اس کا مطلب کچھ یہ تھا کہ اس وقت رانا بھی اس کے میاں کے مقابل ہو تو اس کا ملازم لگے۔ کیا اس میں صداقت نہیں ہے؟

میں نے کہا۔ ''میڈم... آپ نے انگلش میں فرمایا ہے تو غلط کیسے ہوسکتا ہے۔''

غنی نے بڑے اسٹائل سے اپنی پگڑی کو درست کیا۔ ''سر میں سوچ رہا ہوں کہ سوا نو بجے والی مونچھیں بھی رکھ لوں۔ دونوں طرف ایک بالشت کی۔''

ریشم نے سخت خفگی ظاہر کی۔ ''آر یو میڈ... تو مونچھ... یو لک جنگلی۔''

''جنگلی کی بچی... رعب پڑتا ہے مونچھوں سے۔'' غنی بولا۔

ریشم نے اعلان کیا۔ ''میں تیری مونچھوں کو جنگلی جھاڑی کی طرح کھینچ کے اکھاڑ پھینکوں گی۔''

غنی نے غرا کے کہا۔ ''اور میں چھوڑوں گا تجھے۔ چوٹی کاٹ دوں گا۔''

ریشم نے چراغ پا ہو کے کہا۔ ''ہاتھ لگا کے دیکھ میرے بالوں کو۔ گنجا کردوں گی آلو کی طرح۔ کوّے ٹھونگیں ماریں گے۔''

''تیری ہڈیاں نہ توڑ دیں تو غنی نام نہیں میرا۔''

''میں نے بھی تیرا قیمہ نہ کیا تو...''

راجا نے تنگ آ کے کہا۔ ''ابھی تو چلو خدا کے لیے۔ جو کرنا ہے واپس آ کے کرنا۔''

میں بیٹھنے لگا تو رابعہ نے میرا بازو تھام لیا اور امام ضامن باندھنے لگی۔ وہ زیرِ لب کچھ پڑھ رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ''یہ کیا ڈراما ہے کزن؟''

وہ بولی۔ ''اللہ کا بڑا احسان ہے جس نے یہ دن دکھایا۔ آج تم چیف منسٹر ہاؤس جارہے ہو۔ اپنے کام سے نہیں۔ ایک مسئلہ حل کرنے کے لیے حکومت نے تمہاری ضرورت محسوس کی ہے۔''

میں نے پیچھے کھڑی ہوئی لیلیٰ بھابی اور شہناز کے چہروں کو دیکھا کچھ دیر پہلے پائے جانے والے فکر و غم کے جذبات پر فخر و مسرت کے جذبات بھی آگئے تھے۔ شہناز نے کہا۔ ''یہ واقعی بڑے اعزاز کی بات ہے۔''

گاڑی حویلی سے نکلی تو میں نے محسوس کیا کہ راجا بھی بہت پُرجوش ہے۔ یہ کوئی بہت پرانی بات نہیں تھی جب میں

نے ست بدھائی کا حق ملکیت حاصل کیا تو ایک اجنبی تھا جسے یہاں نہ کوئی جانتا تھا نہ پہچانتا تھا۔ بہت کم وقت میں انتہائی مخالف حالات کے باوجود میں نے اپنی اہمیت تسلیم کرالی تھی۔ آس پاس کے علاقے میں رہنے والے اب مجھے نواب رفیق کے نام سے جانتے تھے اور مجھے عزت کا وہ مقام حاصل ہو چکا تھا جو اس علاقے کے جدی پشتی خود کو حاکمِ اعلیٰ سمجھنے والے رجب علی رانا کو موروثی طور پر حاصل نہ تھا۔ رانا اور اس کے باپ دادا جن لوگوں کے ووٹ لے کر صوبائی اسمبلی میں جاتے رہے اور بیان بازی سے اس علاقے کے عوام کی نمائندگی کے دعوے بھی کرتے رہے عملی طور پر خود کو ان کے جان و مال عزت آبرو کا مالک اور ان داتا سمجھتے تھے۔ ان کے ساتھ وہی سلوک روا رکھتے تھے جو دورِ جہالت میں غلاموں کے ساتھ ہوتا تھا۔

آج اگر میں بہت کم وقت میں انہی لوگوں کے لیے ایک ایسا قابلِ پرستش نجات دہندہ اور انقلاب کا سفیر بن گیا تھا جو ان کی صدیوں کی غربت جہالت اور ذلت کو ختم کرنے کی بات کرتا تھا تو وہ دل سے میری عزت کیوں نہ کرتے۔ بہت مختصر وقت میں جو کچھ ہم نے ان پس ماندگانِ خاک کی عزتِ نفس کو بحال کرنے کے لیے کیا تھا اور ان کو ایک اچھے مستقبل کی راہ دکھانے کے لیے کیا تھا وہ ہمارے نزدیک نقطۂ آغاز تھا لیکن ہمارے حسنِ سلوک اور فلاحی اقدام نے انہیں ہمارا گرویدہ بنادیا تھا۔ ان کی نظر میں ست بدھائی آنے والے اچھے وقت کی علامت بن گئی تھی جب یہ نہیں کہا جائے گا کہ تم جو ہو اپنی بدقسمتی سے ہو اور یہ نوشتہ تقدیر تو منجانب اللہ ہے جسے بدلا نہیں جاسکتا۔ خوشحالی ان کے در پر ہی دستک دے گی۔ وہ جبر و ذلت کی چکی میں پسنے پر مجبور نہیں ہوں گے اور ان کی بہو بیٹیاں بھی حویلی والیوں کی طرح عزت دار سمجھی جائیں گی۔

بلاشبہ یہ توقعات ہنوز ایک خواب جیسی تھیں اور ہم ایک چھوٹے سے معاشرے کو بھی اپنی خواہش یا کوشش سے بدل کے مثالی نہیں بنا سکتے تھے۔ ہر فلاحی انقلاب کی راہ میں رانا جیسے لوگ ہمیشہ دیوار بنتے آئے ہیں تاہم اسے میں تائیدِ ایزدی سمجھتا تھا کہ رفتہ رفتہ رانا کا امیج شیطان کا تو میرا فرشتے کا ہونے لگا تھا۔ ایک طرف شاہی بادشاہ جیسے ڈاکو میری دل سے عزت کرتے تھے تو دوسری طرف پولیس کا ڈی آئی جی خود چل کے میرے پاس آتا تھا اور اعلانیہ نہ سہی عملاً میرا حامی تھا اور آج مجھے چیف منسٹر ہاؤس میں طلب کیا گیا تھا کہ میں اپنی گڈوِل اور اختیار سے ایک انتظامی مسئلہ حل کرنے میں حکومتِ وقت کی مدد کروں۔

راجا نے مجھے سوچ میں غرق دیکھا تو بولا۔ ''تو نور جہاں کے بارے میں فکرمند ہے فیکے پتر!''

میں چونکا۔ ''نہیں راجا۔''

''میں ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''آخر اس نے ایسا کیوں کیا؟''

''کوئی فائدہ نہیں راجا۔ ان لڑکیوں کے پاگل پن کا منطقی جواز تلاش کرتے رہے تو ہم خود پاگل ہو جائیں گے۔''

''آپ کسرِ نفسی سے کام لے رہے ہیں۔ ہم پاگل ہیں۔'' راجا بولا۔

''میں نے کہا۔'' پہلے فریال اور اب نور جہاں۔ کیا ہم سوچ سکتے تھے کہ وہ انتہائی قدم اٹھانے والی ہیں۔ ہم بعد میں خیال کے گھوڑے اِدھر سے اُدھر دوڑاتے رہے کہ اس کی یہ وجہ ہوگی۔ وہ وجہ ہوگی۔''

''وجہ کے بغیر کچھ نہیں ہوتا قبلہ نواب صاحب۔ یہ اسباب و علل کی دنیا ہے۔ کاز اینڈ ایفیکٹ۔'' راجا نے کسی فلسفی کی طرح کہا۔

''اوکے ... پہلے بھی آپ نے اسباب کی نشاندہی فرمائی تھی۔ اور اتفاق سے آپ کا نظریہ درست ثابت ہوا تھا کہ فریال کیوں چلی گئی۔''

''افسوس کہ تو ایک سائنسی تجزیے کو اتفاق قرار دیتا ہے فیکے پتر۔ میں نے دو اور دو کو چار کر کے دیکھا تھا۔ جو تو نہیں دیکھ سکتا تھا کیونکہ تیری عقل پر جذبات کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ فریال کو جانا ہی تھا۔''

''ایسے ہی اب نور جہاں کو بھی جانا تھا۔''

''ہاں۔ کیونکہ وہ اپنی سازش میں ناکام ہو گئی تھی۔ اس کا پلان فیل ہو گیا تھا۔ اس نے تجھے استعمال کر کے ست بدھائی کی دولت اور جاگیر پر قبضہ حاصل کرنے کی سوچی تھی۔ اس نے محبت کا جال پھیلایا۔ سوری، دامِ ہوس پھیلایا اور تو پھنس گیا۔''

میں نے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں نہیں سن رہا ہوں۔''

''میں پھر بھی سناؤں گا.... اگر وہ تیرے بچے کو جنم دینے میں کامیاب ہو جاتی۔''

میں نے چلّا کے کہا۔ ''تو کیا ہوتا۔ کون سی قیامت آجاتی۔ کون سا آسمان گر پڑتا۔''

راجا نے سوچ کے سوال کیا۔ ''کیا تو اس سے شادی کر لیتا؟''

''ہاں۔ آخر کسی سے مجھے شادی کرنی ہی ہے۔ اگر فریال نہیں تو پھر نور جہاں کیوں نہیں؟''

''پھر ٹھیک ہے۔ کیا یہ بات تو نے نور جہاں کو بھی بتادی تھی؟ میرا مطلب ہے اسے پروپوز کر دیا تھا۔ کہہ دیا تھا واضح الفاظ میں کہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں؟''

میں نے خفت سے کہا۔ ''صاف الفاظ میں تو نہیں... لیکن میں نے انکار بھی نہیں کیا تھا۔''

''مطلب یہ کہ ہمیشہ کی طرح اور اپنی عادت کے مطابق اسے بھی آپ لٹکا کے کام چلا رہے تھے۔ نوسر، یہ فریال اور نور جہاں جیسی لڑکیاں، کیا کہتے ہیں Ambitious کو، بلند ارادوں والی لڑکیاں صرف بہلاوے پر آپ کا غیر معینہ مدت تک دل نہیں بہلائیں گی۔ وہ ہوتی ہیں اللہ میاں کی گائے ٹائپ گھریلو لڑکیاں جو آس کی ڈور سے بندھی بیٹھی رہتی ہیں سالہا سال اور ٹائم ضائع کرتی رہتی ہیں۔ بعض اوقات خود ضائع ہو جاتی ہیں۔''

''راجا! ایک بات بالکل واضح ہے۔ جو نہ سمجھنا چاہے اس کی مرضی۔ شادی میرے لیے ٹاپ پرائرٹی نہیں ہے کہ میں سب سے پہلے یہ کام کروں۔ پھر دنیا کے دوسرے کام۔''

''مگر لڑکیوں کی سوچ یہی رہتی ہے۔ پہلے شادی...''

''آئی ایم سوری راجا۔ فریال کے اپنے عزائم ہوں گے۔ نور جہاں کے اپنے۔ لیکن کیا انہیں میری زندگی کے مقاصد کو نہیں سمجھنا چاہیے تھا؟ شریکِ حیات ہی میرا ساتھ نہیں دے گی تو اور کون دے گا۔ اس معاملے میں شہناز کی تعریف کرنا پڑتی ہے۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ جب تک آپ سدھریں گے نہیں۔ وہ صورتِ حال جوں کی توں برقرار رکھے گی۔''

''مجھے یقین ہے کہ اب میں سدھر گیا ہوں۔''

''اسے بھی یقین آئے۔ وہ دیکھ رہی ہوگی کہ یہ مجبوری ہے۔ اِدھر اُدھر منہ مارنے کے لیے کچھ نہیں ہے۔ یا تو واقعی بندے دا پتر بن گیا ہے۔''

راجا نے ایک آہ بھری۔ ''اب تیرے سامنے کیا جھوٹ کہوں فیکے پتر۔ ایک مثل مشہور ہے کہ بندر بڈھا ہو جائے مگر الٹی قلابازی نہیں چھوڑتا۔ جورو کا غلام ٹائپ شوہر میں کیسے بن سکتا ہوں۔''

''مذاق کی بات چھوڑ راجا۔ یہ نور جہاں آخر گئی کہاں ہوگی؟''

راجا نے کہا۔ ''یار کہیں ایسا تو نہیں۔ اسے کسی نے پہچان لیا ہو؟ جیسے وہ نرس کہہ رہی تھی کہ آپ کو کہیں دیکھا ہے۔''

''یہی تو سب سے بڑا خطرہ ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ وہ ڈر گئی ہو۔ فوری گرفتاری سے بچنے کے لیے اسے فرار کے سوا کوئی راستہ نظر نہ آیا ہو۔''

راجا نے پوچھا۔ ''یار ہو سکتا ہے تجھے برا لگے۔ مگر کیا تیرے علاوہ اس کو پناہ دینے والا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔''

میں نے مجروح لہجے میں کہا۔ ''ہو سکتا ہے۔ وہ چیز ہی ایسی ہے کہ مجھ سے پہلے بھی نہ جانے کتنے اس کی خاطر جان بھی دینے کو تیار ہوں گے۔''

''چل پھر بے غم ہو جا۔ وہ ایسے ہی کسی عاشقِ صادق کو استعمال کرے گی۔ آزمائے گی کہ وہ اس کے لیے کیا کچھ کر سکتا ہے۔ اسے کچھ عرصہ چھپا کے رکھنا تو کوئی مشکل کام نہیں۔''

میں نے آزردگی سے کہا۔ ''معاوضہ وصول کیے بغیر کون یہ کام کرے گا۔''

راجا نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''بلا وجہ خود کو

دکھی مت کر۔ میں مانتا ہوں کہ نور جہاں کا ماضی کوئی بہت زیادہ قابلِ فخر نہیں۔ لیکن پہلے وہ حالات کی اسیر تھی۔ اس نے بہت کچھ کیا یا اسے کرنا پڑا جو غلط تھا۔ لیکن اب وہ اس دلدل سے نکل آئی ہے۔ خواہش اور ارادے کی مضبوطی نہ ہوتی تو وہ اتنا عرصہ بھی ہمارے ساتھ کیوں رہتی۔ بہت پہلے اپنی پرانی زندگی کی طرف لوٹ جاتی ؟"

"کیسے لوٹ جاتی۔ راہ میں پھانسی کا پھندا جو لٹک رہا تھا۔"

"دیکھ فیکے پتر۔ اس نے اکبر خان کی قید سے اور اس زندگی سے نجات پانے کے لیے اسے قتل کر دیا۔ کیا یہ معمولی بات ہے؟ ہر عورت ایسا نہیں کر سکتی۔ یہ قدم اس نے ایک محفوظ اور باعزت زندگی حاصل کرنے کے لیے اٹھایا تھا۔"

"جو میں اُسے دینا چاہتا تھا۔ اس کے تحفظ کو یقینی بنانے کے لیے میں نے کتنے لوگوں کی ناراضی مول لی تھی۔ پھر اس نے مجھے بلیک میل کرنا کیوں ضروری سمجھا؟ ایک بچے کا سہارا لے کر ست بدھائی پر قبضہ کرنے کا خیال اس کے دل میں کیوں آیا۔ اگر وہ میرا ساتھ دیتی تو یہ سب اسی کا ہوتا۔"

راجا نے کہا۔ "وہ میرا ایک نظریہ تھا۔ جو غلط بھی ہو سکتا ہے۔"

"یعنی وہ واپس آ سکتی ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں! آ سکتی ہے۔ کیوں نہیں آ سکتی۔ اگر اس کی محبت میں نیک نیتی ہوگی تو وہ کسی اور کے پاس کیوں جائے گی۔"

میں نے خفگی سے کہا۔ "ابھی تو کچھ اور بکواس کر رہا تھا۔"

"میرا مطلب تھا۔ وہ وقتی سہارا لے گی۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ کسی اور کے ساتھ رہنے لگے گی۔ ابھی دیکھو..."

ایک خاصے مشکل سیکیورٹی چیک کے مراحل طے کرنے کے بعد جس میں ہمارے شناختی کارڈ کے علاوہ اندر نہ جانے کس کس سے ہماری ملاقات کے دن اور وقت کی تصدیق ضروری سمجھی گئی۔ ہم بالآخر چیف منسٹر کے پروٹوکول آفیسر تک پہنچے۔ وہاں راجا کا جاننے والا پبلک ریلیشن آفیسر پہلے سے موجود تھا۔ اس سے خاصی آسانی پیدا ہوئی۔

پی آر او بھی راجا کی عمر کا صحافی تھا اور ان دونوں کے درمیان اچھی انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ اسے دوستی بہر حال نہیں کہا جا سکتا تھا۔ پروٹوکول افسر نے ہمیں مطلع کیا کہ وزیرِ اعلیٰ سیاسی نوعیت کے ایک اہم اجلاس کی صدارت فرما رہے ہیں چنانچہ ملاقات طے شدہ وقت پر ممکن نہیں۔ ہمیں انتظار کرنا ہوگا جو طویل بھی ہو سکتا ہے۔ مرده بدست زنده۔ ہم یہاں آ گئے تھے تو انتظار کیسے نہ کرتے۔ وہ ہمیں مہمانوں کے کمرے میں چھوڑ کے چلا گیا۔

پی آر او کا نام نصیر الدین شیدائی تھا۔ شیدائی اس کے نام کا حصہ نہیں تھا اس کا تخلص تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ "نواب صاحب! یہ ہو سکتا ہے کہ آپ کی ملاقات ڈنر کے بعد ہو۔ ابھی آپ چائے نوش فرمائیں۔"

میں نے کہا۔ "یہ حکمِ حاکم ہے تو عدمِ تعمیل کی گنجائش کیا؟"

وہ ہنسا۔ "حضور حاکم تو آپ ہیں۔ ہم صرف ملازمت کر رہے ہیں اور شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار ہیں۔ اس پر ہماری نوکری چل رہی ہے۔ جس دن یہ وزیرِ اعلیٰ نہیں ہوگا ہم پھر کسی اخبار میں ہوں گے۔"

راجا نے کہا۔ "شیدائی صاحب۔ میری پیش گوئی ہے کہ ایک دن آپ وزیرِ اطلاعات ہوں گے۔ مرکزی نہ سہی صوبائی۔"

وہ بولا۔ "ایسا تو لوگ آپ کے بارے میں بھی کہتے تھے۔ آپ نے تو صحافت ہی چھوڑ دی۔ کالم نگاری تک محدود ہو گئے۔"

"کالم کے ذریعے میں نے صحافت سے ناتا جوڑ رکھا ہے۔"

"دراصل فیلڈ میں کام کرنا بہت خطرناک بھی ہو گیا ہے راجا مشکل ہونے کے ساتھ۔ خیر مجھے بتاؤ یہ ست بدھائی آخر ہے کہاں؟"

"ایسے کیا بتا دوں۔ کسی دن خود آ کے دیکھ لو۔ سی ایم صاحب کے لیے ہم ایک پروپوزل کے ساتھ آئے ہیں۔ انہوں نے منظور کر لیا تو وہ ست بدھائی آئیں گے۔"

وہ کچھ حیران ہوا۔ "کیا پروپوزل ہے؟"

"سوری یار۔ ان کی اجازت کے بغیر یہ ڈسکس کرنا مناسب نہیں۔ تم تو صحافتی اخلاقیات کو سمجھتے ہو۔ ڈونٹ مائنڈ دس۔"

"نہیں راجا۔ میں تو صرف مدد کرنا چاہتا تھا۔" شیدائی نے کہا۔

چائے بڑی پُر تکلف تھی اور کیوں نہ ہوتی۔ وزیرِ اعلیٰ سے وزیرِ اعظم تک سب کے ٹھاٹھ باٹھ شاہانہ تھے۔ شاید پبلک منی کو ایسی بے دردی کے ساتھ انگریز حاکم بھی ذاتی شان و شوکت پر لٹاتے ہوں گے جیسے ہمارے منتخب حکام نواز رہے تھے۔

چائے کے دوران راجا اور شیدائی مل کے ملکی حالات کا ماتم کرتے رہے۔ سیاست میں کتنی کرپشن ہے۔ کتنی

بدانتظامی ہے۔ ملک کتنی تیزی سے تنزلی کی طرف جا رہا ہے۔ ہر معاملے میں موازنہ ہمسایہ ممالک سے۔ بھارت ہمارے ساتھ آزاد ہوا تھا۔ چین ہمارے بعد۔ وہ کتنا آگے نکل گئے ہیں۔

پھر گفتگو نے ست بدھائی کی طرف رخ موڑ لیا۔ میں نے کم سے کم الفاظ میں اپنے متعلق بتایا کہ کس طرح مجھے حقِ ملکیت حاصل ہوا اور نہ چاہنے کے باوجود میں نواب رفیق بنا دیا گیا۔ راجا نے رانا رجب علی کا ذکر کیا۔ شیدائی اس کے ماضی و حال سے بخوبی واقف تھا۔ اس جیسے ہی اس ملک پر راج کر رہے تھے ملک کی معیشت کو یہ خون چوسنے والے عفریت ایک ایسے انجام کی طرف دھکیل رہے تھے جس کا ذکر کرنا بھی بدشگونی تھی۔

اس ملاقات کا ایک فائدہ ہوا۔ راجا نے شیدائی کو مکمل کے بتا دیا کہ ہمارے عزائم کیا ہیں اور کس طرح رانا ہماری راہ میں روڑے اٹکا رہا ہے۔ شیدائی نے بڑے غور سے اور دلچسپی سے سب سنا۔

پھر اس نے کہا۔ "راجا... یہ تمہارے دوست کس چکر میں پڑ گئے رانا سے دشمنی مول لینے کے لیے سیاسی طور پر مضبوط ہونا ضروری ہے۔"

میں نے کہا۔ "مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔"

"لیکن آپ کا سیاست سے دور کا بھی تعلق نہیں نواب صاحب!"

میں نے کہا۔ "رانا نے مجھے سیاست سکھا دی ہے اور اب میں نے بھی طے کر لیا ہے کہ مقابلہ سیاسی میدان میں ہے تو میں سیاست کروں گا۔"

وہ ہنسنے لگا۔ "سیاست کریں گے آپ؟"

"کیوں؟ کیا اس کے لیے کوئی خاص کوالیفیکیشن درکار ہوتی ہے جو میرے پاس نہیں۔"

"ابھی نہیں۔ لیکن مجھے پتا نہیں۔ کیا آپ خلافِ ضمیر پر کام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں؟ اس حمام میں نہا سکتے ہیں جہاں سب ننگے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "شیدائی صاحب! آپ نے کیوں فرض کر لیا ہے کہ حالات ہمیشہ ایسے ہی رہیں گے۔ درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا۔ بالآخر سوچ میں انقلاب آئے گا۔ عوام کی قوتِ برداشت جواب دے جائے گی تو کوئی مسیحا اٹھے گا۔ ناانصافی لوٹ مار ہمیشہ کب چلی ہے۔"

"کاش ایسا ہو میری زندگی میں۔" شیدائی متاثر ہوا۔

میں نے کہا۔ "ایسا تب ہوگا جب آپ بھی میرا ساتھ دیں گے۔"

اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ "میں ویسے تو ایک بزدل آدمی ہوں۔ کوئی مجاہد نہیں لیکن اخلاقی طور پر میں آپ کے ساتھ ہوں۔ اور جو کر سکا وہ ضرور کروں گا۔"

تقریباً پون گھنٹے بعد پروٹوکول افسر دوبارہ نمودار ہوا اور ہمیں چیف منسٹر کے مشیر اعلیٰ برائے داخلی امور کے پاس لے گیا۔ وہ ایک سابق فوجی تھا۔

"میرا نام کرنل صلاح الدین کاظمی ہے۔" اس نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے پُر جوش مصافحہ کیا۔

میرے دل میں ناامیدی کی ایک لہر اٹھی۔ "رفیق احمد شیرازی۔"

"مجھے شیدائی نے آپ کے متعلق بریف کیا تھا۔ پھر کل میری جہلم کے ڈی آئی جی عبداللہ جان سے میٹنگ ہوئی۔ اس نے مجھے کچھ اور معلومات دیں۔ مجھے تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں کہ میں امپریس ہوا۔"

"تھینک یو۔" میں نے کہا۔

"میری چیف منسٹر سے بات ہوئی ہے۔ یوں ان کے پاس ہر فریق کی بات تفصیل سے سننے کے لیے وقت نہیں ہوتا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں سمری بنا کے پیش کروں۔ جو سمری میں نے بنائی ہے وہ آپ دیکھ سکتے ہیں۔ اس نے ایک فائل میرے سامنے رکھ دی۔ یہاں ہم جو بات کریں گے اعتماد کی بنیاد پر کریں گے۔ اس کے بعد میں فائنل سمری چیف منسٹر کو دوں گا۔"

میں نے کہا۔ "کیا اس کا مطلب ہے کہ میری ان سے براہِ راست کوئی بات نہیں ہوگی۔"

"ضرور ہوگی۔ لیکن پہلے وہ سمری دیکھیں گے۔ پھر آپ کو بتائیں گے کہ ان کا فیصلہ کیا ہے۔ آپ یہ سمری ملاحظہ کریں۔"

میں نے وہ سمری دیکھی جو انگریزی میں تیار کی گئی تھی۔ اس میں اختصار کے ہنر سے دریا کو کوزے میں بند کیا گیا تھا۔ کرنل صاحب نے دیگر تمام معاملات سے صرف نظر کرتے ہوئے بتایا تھا کہ ڈاکوؤں کا ایک گروہ جس کی قیادت شامی بادشاہ کرتا ہے کس علاقے میں سرگرم ہے اور اس نے انتظامیہ کے لیے کیسے سنگین مسائل پیدا کر دیے ہیں۔ اب تک قانون کی مشنری اس سے نمٹنے میں ناکام رہی ہے چنانچہ تجویز یہ ہے کہ اسے ڈپلومیسی سے حل کیا جائے۔ اس کے لیے مقامی اثر رسوخ رکھنے والے افراد کا تعاون ضروری ہے جو کچھ لو اور کچھ دو کی بنیاد پر ثالث کی حیثیت

سے اپنا کردار ادا کریں۔

سمری یہاں ختم ہوجاتی تھی۔ میں نے فائل واپس کرنل صاحب کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ سب تو ٹھیک ہی ہوگا۔ لیکن مجھے یہاں کیوں بلایا گیا ہے؟''

کرنل نے کہا۔ ''میں بتاتا ہوں۔ اصولی طور پر اس تجویز سے مجھے بھی اتفاق ہے لیکن اس پر عمل درآمد کا طریقہ کار طے ہونا باقی ہے۔ میں نے ڈی آئی جی صاحب سے پوچھا تھا کہ وہ بااثر افراد کون ہوسکتے ہیں جو بیک ڈور ڈپلومیسی میں کوئی مؤثر کردار ادا کرسکتے ہیں۔ اس نے رانا رجب علی کا نام لیا۔''

میں نے کہا۔ ''یہ بہت مناسب تجویز تھی۔ ان کا خاندان عرصہ دراز سے سیاست میں ہے اور صوبائی اسمبلی میں علاقے کی نمائندگی کرنے کی وجہ سے وہ یقیناً بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔''

کرنل نے چہرے سے کوئی تاثر نہیں دیا۔ ''میں نے عبداللہ سے اتفاق کرتے ہوئے اسے رانا رجب علی سے رجوع کرنے کو کہا۔ لیکن یہ کوشش کارگر نہ ہوئی۔''

میں نے سخت تعجب کا اظہار کیا۔ ''کیوں؟ کیا شامی بادشاہ نے بات کرنے سے انکار کردیا؟''

''نہیں۔ رانا نے معذرت کرلی۔ اس نے کہا کہ یہ ناممکن ہے۔ شامی کو اس نے کتے کی دُم قرار دیا جو سیدھی نہیں ہوسکتی۔ وہ ایسے کسی کام میں ہاتھ ڈالنا ہی نہیں چاہتا تھا جس کا انجام ناکامی پہلے سے طے ہو۔''

راجا نے آہستہ سے تبصرہ کیا۔ ''کوشش کرنے میں پھر بھی حرج نہیں تھا۔''

''ہاں۔ لیکن رانا نے اس تجویز کی سخت مخالفت کی اور کہا کہ حکومت کو ایسے قانون شکن عناصر کے سامنے کمزوری ظاہر نہیں کرنی چاہیے۔ اس سے دوسرے چور ڈاکو بھی شیر ہوجائیں گے۔ شامی ڈاکو کی سرکوبی کے لیے زیادہ طاقت استعمال کرنے سے حکومت کی رٹ قائم ہوگی۔ اگر اسے پکڑنے یا مارنے کے لیے پیرا ملٹری فورس کی مدد بھی حاصل کرلی جائے تو حرج نہیں۔ مختصر یہ کہ اس نے انکار کردیا۔ اس کے بعد عبداللہ جان نے آپ کا نام تجویز کیا۔''

میں نے چونکنے کی اداکاری کی۔ ''میرا؟''

کرنل نے سر ہلایا۔ ''اس نے بتایا کہ آپ ایک مختلف انداز سے علاقے میں اپنا حلقہ اثر رکھتے ہیں۔ اس نے کہا کہ نواب رفیق خاصے پاپولر ہیں اور بالکل بھی روایتی نواب نہیں۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں اور متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔''

''مجھے ایسی رائے دینے پر ڈی آئی جی صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اس مسئلے پر ان سے میری بات ہوئی تھی۔''

''پھر؟ کیا آپ نے کوشش کی؟''

میں نے کہا۔ ''آف کورس میں نے انہیں اپنے تعاون کا یقین دلایا۔ ایک قانون کا احترام کرنے والے شہری کی حیثیت سے یہ میرا فرض بنتا ہے کہ میں قانون کی مدد کروں۔''

''آپ کا شامی سے کوئی رابطہ تھا؟''

میں نے اس کی عیاری کو سمجھ لیا۔ ''رابطہ کیا جاسکتا ہے۔ جہاں چاہ ہے وہاں راہ ہے۔ اور میری براہِ راست شامی سے بات بھی ہوئی۔ میں اس کی تفصیلات میں نہیں جاؤں گا۔ مختصراً یہ کہ وہ اپنے دس ساتھیوں کے ساتھ ہتھیار ڈالنے اور آئندہ کے لیے مجرمانہ سرگرمیوں سے تائب ہونے کے لیے تیار ہے۔''

''لیکن اس کی کچھ شرائط ہیں۔'' وہ طنزیہ انداز میں مسکرایا۔

''ابھی خود آپ نے فرمایا تھا کہ معاملات کچھ لو اور کچھ دو کی بنیاد پر طے ہوتے ہیں۔''

''بالکل ٹھیک۔ وہ حکومت سے کیا چاہتا ہے؟''

''کچھ نہیں۔ صرف اس بات کی ضمانت کہ اسے شریفانہ زندگی گزارنے کا موقع دیا جائے گا۔ اس کے خلاف اور اس کے ساتھیوں کے خلاف تمام دیوانی اور فوجداری مقدمات واپس لے کر ختم کردیے جائیں گے اور آئندہ بھی اس کے ماضی کی بنیاد پر اس کے خلاف کوئی تادیبی کارروائی نہیں کی جائے گی۔''

''یہ تو گویا پہلے سے طے شدہ ہے۔ کہ ایسا ہی ہوگا۔''

''اسے ایک بھروسے کی ضمانت چاہیے۔ وہ ڈرتا ہے کہ حکومت کی طرف سے ایسی پیشکش میں اسے گرفتار کرنے کے لیے دھوکے کا جال ثابت ہوئی تو وہ مارا جائے گا اور مارنے والے مونچھوں پر تاؤ دے کر کہیں گے کہ دیکھا۔ جو کام طاقت سے نہیں ہوتا تھا وہ ہم نے ہوشیاری سے کرلیا۔ وعدہ خلافی کی کیا اہمیت ہے ایسے مجرموں کو پکڑنے کے لیے۔''

''اس کے اندیشے غلط ہیں۔''

''میں ایسا نہیں سمجھتا۔ اس کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ کوئی اچھی ساکھ رکھنے والا ضامن ہو۔''

''ضامن آپ ہوسکتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''کس بنیاد پر۔ کیا چیف منسٹر صاحب یقین دلا سکتے ہیں کہ جب وہ ہتھیار ڈالنے آئے گا تو اسے گرفتار نہیں کیا جائے گا۔ یا پولیس راستے میں ہی اسے ہلاک نہیں کردے گی۔''

''میں آپ کو چیف منسٹر کی طرف سے یہ آفر کرتا ہوں کہ وہ آپ کے ساتھ آجائے۔ یہاں چیف منسٹر ہاؤس میں میڈیا کے سامنے ہتھیار ڈالے۔''

میں نے کہا۔ ''آئی ایم سوری۔ یہ تجویز میں نے شامی کے سامنے رکھی تھی۔ اس نے انکار کردیا۔ اس نے کہا کہ نواب رفیق! میں آپ کو جانتا ہوں۔ آپ آئے ہیں اس لیے میں نے انکار نہیں کیا۔ رانا آتا تو میں اسے یرغمال بنالیتا۔ دو کروڑ کا تاوان لے کر چھوڑتا۔ میں آپ پر بھروسا کرسکتا ہوں کسی اور پر نہیں۔ ہتھیار میں ڈالوں گا ست بدھائی کی حویلی میں آپ کے سامنے۔ ورنہ نہیں۔''

کرنل سوچ میں پڑگیا۔ ''یہ تو بہت مشکل ہے۔''

''کیا مشکل ہے؟''

''چیف منسٹر ایک اہم سیاسی عہدہ ہے۔ وہ ایک ڈاکو سے ملنے جائے؟''

میں نے کہا۔ ''آپ غلط توضیح کررہے ہیں۔ چیف منسٹر صاحب میرے مہمان ہوں گے۔ وہ ڈاکو کے ڈیرے پر نہیں جائیں گے۔ ڈاکو خود ان کے پاس چل کے آئے گا۔''

کرنل نے خفگی سے کہا۔ ''لیکن چیف منسٹر کو کیا ضرورت ہے آپ کا مہمان ہونے کی۔ وہ کیا اتنے فارغ اور غیر اہم ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''کرنل صاحب۔ جب وہ کسی چھوٹی سی سڑک یا کسی قصبے کی سرکاری ڈسپنسری کا افتتاح کرنے کے لیے وقت نکالتے ہیں اور میڈیا میں خود کو پروجیکٹ کرتے ہیں۔ ایسے میں یہ بھی ایک عوامی فلاح کا مسئلہ ہے۔ لوگوں کے جان و مال کو تحفظ فراہم کرنے کی ایک اسکیم ہے۔ اس سے ان کی سیاسی دانش مندی کا گراف بڑھے گا۔ گھٹے گا نہیں۔ رہی ست بدھائی کا انتخاب کرنے کی بات تو یہ مجبوری ہے۔ اس کو بھی کور کیا جاسکتا ہے۔ اگر کسی کو معلوم نہ ہو کہ یہ شامی بادشاہ کی شرط تھی اور کام بھی ہوجائے تو کیا حرج ہے۔''

کرنل مجھے دیکھتا رہا۔ ''وہ کیسے؟''

میں نے کہا۔ ''وزیراعلیٰ پنجاب کے ہر علاقے کا دورہ کرتے ہیں۔ لوگوں کے مسائل حل کرنے کے لیے۔ ایسے ہی کسی دورے میں وہ اچانک ست بدھائی پہنچ جائیں۔ جیسے کہ اچھے حاکم رعایا کا حال معلوم کرنے کے لیے کسی پروگرام یا سرکاری شیڈول کے بغیر جاتے ہیں۔ ایک مختصر اسٹاپ اوور۔ وہاں میں ان کا استقبال کروں۔ پھر اچانک شامی بادشاہ آجائے۔ میڈیا تو پہلے سے موجود ہوگا۔ بعد میں بتادیا جائے کہ یہ وزیراعلیٰ کی ڈپلومیسی تھی اور سیاسی دانش مندی تھی کہ ایک بہت بڑا مسئلہ حل ہوگیا۔''

''گویا وزیراعلیٰ نے شامی بادشاہ کو یہ آفر کی۔''

''جی نہیں... شامی بادشاہ ایسا چاہتا تھا اور وزیراعلیٰ نے اسے یہ موقع فراہم کیا۔ ڈاکو اپنے پیشے سے تائب ہوگئے۔ علاقے میں امن وامان قائم ہوگیا اور لوگوں کے جان و مال کو تحفظ مل گیا۔''

کرنل ایک دم قائل ہوگیا۔ ''بالکل ٹھیک۔ ابھی کچھ دیر بعد میں آپ کی ملاقات وزیراعلیٰ سے کراتا ہوں۔ پہلے میں یہ سمری مکمل کرلوں۔ اس میں آپ کا پروپوزل شامل کرنا ہوگا۔''

''آپ کیا سمجھتے ہیں۔ چیف منسٹر اس سے اختلاف نہیں کریں گے؟''

''عام طور پر وہ معقول بات بلا حجت مان لیتے ہیں۔ میں ان کا شیڈول دیکھ لوں کہ جہلم کے آس پاس مستقبل قریب میں ان کا کوئی دورہ ہے تو کب۔ آج اتفاق سے ان کی یہ میٹنگ آگئی۔ خیر یہ اچھا ہی ہوا۔ مجھے آپ سے بات کرکے سمری بنانے کا موقع مل گیا۔'' وہ اٹھا اور اندر غائب ہوگیا۔

اس خیال سے خفیہ کیمرے نگرانی نہ کررہے ہوں میں نے اور راجا نے اپنی اسکیم کی کامیابی پر ہاتھ ملا کے خوشی کا اظہار کرنے سے بھی گریز کیا۔ یہاں تک کہ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارے کرنے سے بھی۔ ہم بڑی متانت سے بیٹھے رہے۔ ایک بٹلر ہمارے لیے چائے کی دوسری ٹرالی چھوڑ گیا۔ رات کے ساڑھے آٹھ بجے تھے۔ مجھے آج رات نصف شب سے پہلے واپسی ممکن نظر نہ آئی تھی۔

ایک گھنٹے بعد کرنل پھر نمودار ہوا اور اس نے دوسری سمری میرے سامنے رکھ دی۔ یہ میری خواہشات اور توقعات کے مطابق تھی۔ اس میں چیف منسٹر کو یہ تجویز دی گئی تھی کہ وہ تین دن بعد دینہ کے ایک اسکول میں پوزیشن ہولڈر طلبا کو انعام دینے کی تقریب کے بعد ست بدھائی کا مختصر دورہ کریں اور وہاں شامی ڈاکو کے ہتھیار ڈالنے کے بعد اس کے لیے عام معافی کا اعلان کردیں لیکن یہ بات میڈیا کو ست بدھائی جانے تک معلوم نہ ہو۔ خدانخواستہ شامی بادشاہ کی نیت بدل گئی اور وہ ہتھیار ڈالنے نہ آیا تو چیف منسٹر کی پوزیشن خراب ہوگی۔ ست بدھائی میں چیف منسٹر ایک اسکول کا افتتاح

کریں اور ایک فلاحی اسپتال کا سنگِ بنیاد رکھیں۔

میرا دل خوشی سے باغ باغ ہوگیا۔ رانا پر تو بجلی گرے گی کہ اسکول اور اسپتال کو سرکاری سرپرستی حاصل ہوگئی اور نواب رفیق نے شاہی بادشاہ سے ہتھیار ڈلوا کے اتنا بڑا سیاسی میدان مار لیا۔ کوئی چیف منسٹر شاید آج تک رانا نگر نہ گیا ہو جہاں ایک جدی پشتی ایم این اے کا خاندان صدیوں سے حکومت کررہا تھا۔ اس "نواب کے نطفے" نے کیا چکر چلایا کہ چیف منسٹر خود چل کے ست بدھائی آگیا؟

"اب آپ کی ملاقات ڈنر کے بعد ہوگی" کرنل نے کہا۔ "عشائیے میں آپ بھی شریک ہوں گے۔ آیئے میرے ساتھ۔"

ہم ایک عظیم الشان ڈائننگ ہال میں پہنچا دیے گئے جہاں کم سے کم پچاس افراد کے لیے ایک طویل ڈائننگ ٹیبل تھی۔ اس کی لمبائی کے رخ پانچ فانوس جگمگا رہے تھے۔ جو پارٹی عمائدین ملاقات کے لیے بلائے گئے تھے وہ چیف منسٹر کے قریب تھے۔ ہمیں پروٹوکول کے مطابق جگہ دی گئی لیکن نہ کسی نے ہمیں غور سے دیکھا نہ ہمارے بارے میں کوئی سوال کیا۔ جہاں اور بھی کئی لوگ تھے جو ڈنر میں شریک تھے لیکن سیاست سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے۔ ڈنر سوا گھنٹے بعد رات گیارہ بجے ختم ہوا۔

چیف منسٹر سے ہماری ایک مختصری رسمی ملاقات نصف گھنٹے بعد ان کی اسٹڈی میں ہوئی۔ بظاہر اس کا رویہ بہت شائستہ لیکن رسمی اور کسی حد تک سرد مہری کا تھا۔ اس نے میرے ست بدھائی یا اس کے ترقیاتی منصوبے کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا۔ صاف محسوس ہوتا تھا کہ اسے صورتِ حال پر بریفنگ مل چکی ہے۔ اس کا اندازہ اس فائل سے ہی ہوتا تھا جس میں ہم نے اس کے مشیر داخلہ کرنل صاحب کی سمری دیکھی تھی۔ چیف منسٹر ایک مشہور سیاسی خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور اس کی سیاسی بنیاد مضبوط تھی۔ وہ غیر سیاسی معاملات میں اپنی کمٹمنٹ (Commitment) لانا ہی نہیں چاہتا تھا۔

ہم رسمی طور پر بڑے تکلف سے ایک چائے کا کپ پی کر رخصت ہوئے تو مجھے بہت اطمینان تھا۔ بہت ہوشیاری سے کھیلے گئے ایک کھیل میں جیت ہمارے مقصد کی ہوئی تھی۔ راجا نے اپنے کالم اور کچھ خبروں سے ایک چال چلی تھی۔ ڈی آئی جی نے اسے ظاہری غیر جانبداری سے آگے بڑھایا تھا۔ پھر راجا کے پی آر او دوست شیدائی صاحب نے کالم کا نوٹس لیا تھا اور مشیر داخلہ کرنل صاحب نے ڈی آئی جی کی تجویز قبول کرتے ہوئے وزیرِ اعلیٰ کے سامنے سمری پیش کردی تھی۔

اس سمری سے کچھ ظاہر نہیں ہوسکتا تھا کہ میرے شاہی ڈاکو سے خصوصی مراسم پہلے سے چلے آتے ہیں۔ اس سے رانا کی اور میری دشمنی کا بھی پتا نہیں چلتا تھا۔ یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ میں ست بدھائی کی سیاست میں وزیرِ اعلیٰ کی بالواسطہ حمایت سے کوئی ذاتی فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ اس بساط پر چال چلنے والوں میں سے کوئی بھی اناڑی نہیں تھا۔ اناڑی خود وزیرِ اعلیٰ کو بھی نہیں سمجھا جاسکتا۔ وہ ایک انتظامی مسئلہ حل کرنے کے لیے مجھے استعمال کررہا تھا اور جس سے سیاسی فائدہ ہونے کی توقع تھی۔

چیف منسٹر ہاؤس سے باہر آتے آتے رات کے بارہ بج گئے۔ پروٹوکول افسر نے ہمیں الوداع کہا۔ شیدائی صاحب کہیں نظر نہ آئے۔ غالباً وہ بھی اپنی غیر جانبداری کا بھرم رکھنا چاہتا تھا۔

گاڑی کے سڑک پر آتے ہی راجا نے میرے ہاتھ پر ہاتھ مار کے نعرہ بلند کیا۔ "وہ مارا پاپڑ والے کو۔"

میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ "تیری اسکیم کامیاب رہی راجا۔"

"وہ کیا ہے فیکے پتر۔ بگڑی بن جاتی ہے جب فضلِ خدا ہوتا ہے۔"

میں نے گا کے کہا۔ "وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔" غنی نے حیرانی سے پیچھے دیکھا۔ "آپ تو اچھا گاتے ہیں سر۔"

"تم مراثی کہہ رہے ہو مجھے گستاخ۔" میں نے اسے ڈانٹا۔

راجا بولا۔ "صرف تین دن بعد اچانک ایٹمی دھماکا ہوگا۔ رانا کا صدمے سے ہارٹ فیل ہی نہ ہوجائے۔"

"بس یہ خبر لیک آؤٹ نہ ہو راجا۔ ورنہ رانا کا سازشی ذہن کوئی چکر چلا دے گا۔ ہمارا سارا پلان فیل ہوجائے گا۔"

"اسے اتنی مہلت ہی نہیں ملے گی اور یہ بات اوپر والے گنے چنے افراد کو معلوم ہے۔ ان کی حمایت حاصل نہ ہوتی تو یہ بیل منڈھے نہ چڑھتی۔ جو اچانک ہونا ہے وہ اچانک ہی ہوگا۔ خواہ خاموشی سے اس کی ساری تیاری ہو۔"

میں نے کہا۔ "راجا! کیا ہم خواتین کو شریکِ راز کریں گے؟"

"نہیں فیکے پتر۔ پھر یہ راز کہاں رہے گا۔"

"کیا تیرا بھی ایمان ہے کہ راز کی بات عورت ذات کو بتانا ایسا ہی ہے جیسے چور کو خزانے کی چابی دینا۔" میں نے پوچھا۔

اس نے سر ہلایا۔ "میں اس معاملے میں ایک متعصب

مرد ہوں۔ پھر تو دیکھ کہ انہیں اچانک جو خوشی ملے گی۔ وہ کتنی زیادہ ہوگی۔"

"ٹھیک کہا تو نے۔ بصورتِ دیگر تین دن وہ دہرے اعصابی دباؤ کا شکار رہیں گی۔ ایک انتظار کی بے چینی۔ ایک راز کو راز رکھنے کی اذیت۔"

"ہم نے ایک قہقہہ مار کے پھر ہاتھ ملایا۔ نصف شب کے بعد بھی جی ٹی روڈ پر لاہور کی طرف سے آنے والی ٹریفک رواں دواں تھی اگرچہ اس میں اتنی کمی آگئی تھی کہ سڑک خالی نظر آتی تھی۔ اس کا فائدہ غنی نے اٹھایا اور صرف دو گھنٹے میں ہم پھر ست بدھائی میں تھے۔

شہزاد کی کوئی کال نہ مجھے موصول ہوئی تھی اور نہ راجا کو۔ چیف منسٹر ہاؤس میں سیکیورٹی کے ضابطوں کے مطابق ہمارے موبائل فون ہم سے لے لیے گئے تھے لیکن واپسی پر ہم نے دیکھا تو کسی پر بھی مس کال نہیں تھی۔ اس سے کچھ پوچھنا عبث تھا۔ نور جہاں کا سراغ ملا ہوتا تو وہ ہمیں اطلاع دینے میں دیر نہ کرتا۔

خلافِ توقع حویلی میں سب جاگ رہے تھے۔ دہرے انتظار کی بے چینی نے ان کی آنکھوں سے نیند اڑا دی تھی۔ ایک انتظار انہیں بھی شہزاد کی طرف سے نور جہاں کے بارے میں اچھی خبر کا تھا لیکن زیادہ انتظار ہماری واپسی پر کسی بڑی خبر کا تھا۔ ایک دوسرے سے کیے ہوئے عہد کے مطابق ہم گاڑی سے اترے تو ہمارے چہرے بھی اترے ہوئے تھے۔

رابعہ نے سب سے پہلے سوال کیا۔ "تمہاری شکل پر بارہ بجے ہوئے ہیں کزن حالانکہ اس وقت ڈھائی بجے ہیں۔ کیا ہوا؟"

میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "کچھ بھی نہیں ہوا۔ تم جاؤ ریشم سے کہو کافی لائے۔"

"سارا دن کافی۔ رات کو کافی۔" وہ بڑبڑاتی چلی گئی۔

اب شہناز کی باری تھی۔ "کیا چیف منسٹر نے تمہاری بات بھی نہیں سنی؟"

راجا نے کہا۔ "وہ بہرا نہیں ہے۔"

"پھر؟ کیا ایک کان سے سن کے دوسرے کان سے اڑا دی۔"

میں نے کہا۔ "اس کا دوسرا کان بند تھا۔ نہاتے ہوئے پانی چلا گیا تھا۔"

شہناز خفا ہونے لگی۔ صاف کیوں نہیں کہتے کہ مقصد حاصل نہیں ہوا۔ اس نے تمہاری ثالثی کی تجویز سے اتفاق نہیں کیا۔"

ظاہر ہے اس کے بعد لیلیٰ بھابی کے پوچھنے کی کوئی بات نہیں رہ گئی تھی۔ وہ ہمارے پاس بیٹھ گئیں تو میں نے پوچھا۔ "بھابی! شہزاد کی طرف سے کوئی اطلاع؟"

انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔ "رابعہ نے فون کیا تھا کچھ دیر پہلے تو اس نے بتایا کہ ابھی تک نور جہاں لاپتا ہے۔"

"کیا وہ گیا تھا اس ڈانسر کے گھر؟"

"ہاں۔ شانی بہت پریشان ہوئی کہ نیکی کر کے مصیبت میں پڑ گئی۔ اس کو اسپتال والوں نے فون کیا تھا۔"

میں نے کہا۔ "ہاں! انہیں فکر ہوگی اپنے بل کی۔"

"بل تو شہزاد کی خالہ نے کلیئر کردیا تھا۔ لیکن اسپتال والوں نے اسے بتایا کہ مسز قزلباش کسی کو بتائے بغیر اسپتال سے غائب ہوگئی ہیں۔ اگر آپ کو ان کے بارے میں کچھ معلوم ہو تو ہمیں ضرور بتائیں۔ وہ کیا بتاتی... شہزاد نے اسے تسلی دی کہ اس کا نام کہیں نہیں آئے گا۔ وہ شہزاد کے گھر بھی نہیں گئی۔ اس نے کسی سے بھی فون پر بات تک نہیں کی۔ خود اس کا فون بند ہے۔"

میں نے کہا۔ "بند نہیں ہے۔ وہ گر کے خراب ہوگیا تھا۔ لیکن وہ خراب سیٹ لے کر نہیں پھر رہی ہوگی۔ اس نے نیا سیٹ لے لیا ہوگا اور نمبر وہی ہوگا۔ بس وہ کسی سے بات کرنا نہیں چاہتی۔"

بھابی ایک آہ بھر کے اٹھ گئیں۔ "اللہ اسے ہدایت دے۔ اب کچھ اس کی زندگی پر ان لوگوں کا اختیار تھا جو اس کا استحصال کرتے رہے۔ ہم نے تو بڑی نیک نیتی سے اس کی مدد کی تھی۔ اس کی بھلائی ہی چاہی تھی۔"

میں نے کہا۔ "بس بھابی۔ ہم کوشش ہی کرسکتے تھے۔ اس کی تقدیر کے لکھے کو بدل نہیں سکتے تھے۔"

"مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آتا کہ آخر یہ لڑکیاں کیا چاہتی ہیں۔ پہلے وہ فریال۔ ارے بھئی اتنا ہی شوق تھا دولت کے ساتھ شہرت کا تو پھر چھوڑا کیوں تھا اس شوبزنس کی دنیا کو۔ کیوں اتنا وقت ضائع کیا۔ اب تک ریما اور میرا سے زیادہ مشہور ہوتی۔ دولت مند ہوتی۔ یہاں کیا لینے آئی تھی۔"

میں نے کہا۔ "چھوڑیں بھابی۔ آپ کیوں فکر کرتی ہیں۔"

"کیا رفیق، اس نور جہاں کے لیے کیا نہیں کیا تم نے اور کس چیز کی کمی تھی یہاں۔ عزت آبرو کی زندگی اسے بھی راس نہیں آئی۔ چلو اس کی مرضی۔ تم کو اپنا جی ہلکا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ زمانے بھر کی پریشانیاں کیا کم ہیں تمہارے لیے۔ میں دیکھ رہی ہوں تمہاری صحت پہلے جیسی نہیں رہی۔"

میں نے ہنس کے کہا۔ "مجھے کچھ نہیں ہوا بھابی۔ بس آج کچھ تھکن زیادہ ہے۔"

وہ لائٹ بجھا کے اور دروازہ بند کر کے چلی گئیں تو میں اندھیرے کی چادر پر اپنے تصور سے تصویریں دیکھتا رہا۔ آج ہی میں نے لاہور میں کئی جگہ سائن بورڈز پر فریال کی تصویریں دیکھی تھیں۔ ایک مشہور کمپنی نے موسم گرما کے لیے لان کے لیے پرنٹس لگائے تھے۔ وہ شوخ رنگوں کے ساتھ اپنی پُرکشش ادائے حسن اور لبھانے والی مسکراہٹ کے ساتھ زمانے بھر کو دعوتِ نظارہ دے رہی تھی۔ کچھ آرائش حسن کے ماہرین کا کمال تھا تو باقی اس کی نسوانیت کی مارکیٹنگ کرنے والوں کا کہ اس کا روپ ہر دل پر بجلی گراتا تھا۔ دوسری جگہ میں نے اسے ایک شیمپو کے اشتہار میں بال بکھراتے دیکھا۔ وہ صرف ایک تولیا لپیٹے ہوئے تھی اور تولیے پر اس کی گرفت سے لگتا تھا کہ وہ کسی بھی لمحے گر جائے گا۔ اس کے شانے اور بازو اتنے گداز اور گلرنگ تھے کہ تصور باقی جسم کی رعنائی کو تولیے کے بغیر بھی دیکھنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔

فریال بڑی تیزی سے شوبزنس میں اپنی جگہ بنا رہی تھی۔ میں نے اس کی آنے والی دو فلموں کے بل بورڈ بھی دیکھے۔ لکشمی چوک میں دو فلمسازوں کے دفاتر پر آویزاں تھے۔ فلموں کے نام ویسے ہی تھے جیسے رکھے جا رہے تھے۔ فلانا گجر اور فلانا بدمعاش۔ فریال کے پوز بھی عوامی پسند کے مطابق تھے۔ یہ سب دیکھ کر میرے دل پر عجیب سا اثر ہوا تھا۔ میری نظر میں گزرے ہوئے ماہ و سال کا نقشہ سا پھر گیا تھا۔ لیلیٰ بھابی کا سوال بڑا جائز تھا کہ یہی سب کرنا تھا تو پھر اس نے وقت کیوں ضائع کیا۔ یہاں کیا لینے آئی تھی۔

فریال کے گھاؤ کو نور جہاں نے پُر کیا تھا۔ یا کم سے کم میں نے یہی سمجھا تھا کہ قدرت کے قانونِ تلافی۔ لا آف Compensation نے بروقت مجھے ایک جذباتی سہارا فراہم کر کے مکمل تباہی سے بچا لیا ہے۔ آدمی کے اندر جینے کی خواہش، زندگی سے چمٹے رہنے کی لگن اور ماضی سے دامن چھڑا کے مستقبل کی طرف بڑھتے رہنے کی جبلت بڑی مضبوط ہوتی ہے۔ میں نے انہیں بھی مرتے نہیں دیکھا جو اکلوتے جوان بیٹوں کو خود قبرستان میں منوں مٹی تلے دبا آئے۔ انہیں بھی نہیں جو فٹ پاتھوں پر ادھورے جسموں کے ساتھ غلاظت میں پڑے زندگی سے کراہیت پیدا کرنے والی بدصورتی کا نمونہ تھے۔

میں نے بھی فریال کی جگہ نور جہاں کو دے دی تھی۔ جو پہلے خود مجھے ناممکن نظر آتا تھا کہ دل لگی آگے چل کے دل کی لگی بن جائے گی۔ اس کی خاطر میں زمانے سے بھڑ گیا تھا۔ اس کی زندگی کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا تھا اور بالکل ایک انتقامی رویّے کے ساتھ۔ فریال نے مجھے ٹھکرا کے میری انا کو مجروح کیا تھا۔ میری محبت کو میرے لیے ایک سزا بنا دیا تھا۔ میں نے جواب میں "تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی" کے اصول پر عمل کرتے ہوئے فوراً ہی نور جہاں کو اس کی جگہ دے دی تھی۔ اپنے دل کے سنگھاسن پر بھی اور اپنے گھر میں بھی۔

اس بار واقعی مجھے سنبھلنا مشکل ہو رہا تھا۔ کوئی خیال کوئی امید مجھے سہارا نہیں دے سکتی تھی۔ میری زندگی ایک بھیانک خلا میں معلق تھی۔ یہ احساس مجھے کچوکے لگاتا تھا کہ یہ بھی محبت نہیں تھی۔ فریال کے لیے محبت کی منزل کچھ اور تھی اور نور جہاں کے لیے کچھ اور لیکن ان دونوں نے مجھے محبت کے نام پر اپنے مقصد کے حصول کی سیڑھی کے طور پر استعمال کرنا چاہا تھا۔ اہم سیڑھی نہیں ہوتی۔ مقاصد اہم ہوتے ہیں۔ جیسے جنگ میں صرف فتح اہم ہوتی ہے۔ نہ سپاہی اور نہ جنرل۔

نور جہاں کا معاملہ قدرے مختلف تھا۔ اس کے جانے سے مجھے صرف یہ احساس نہیں تھا کہ میں نے اپنی کوئی بیش قیمت چیز کھو دی ہے۔ میرا کوئی ایسا نقصان ہو گیا ہے جس کی تلافی ممکن نہیں۔ میں صرف دل شکستہ اور دکھی بھی نہیں فکر مند اور پریشان بھی تھا کیونکہ میرے نزدیک وہ انتہائی غیر محفوظ ہو گئی تھی۔ اس کے لیے کہیں ایسی کوئی جائے پناہ نہیں تھی جہاں اسے گرفتاری کے خطرے سے مکمل تحفظ حاصل ہو۔ جیسے کہ ست بدھائی بنا تھا کیونکہ یہاں میرے ساتھ دوسرے بھی اس کو بچائے رکھنے کے لیے اتنے ہی مستعد تھے۔ ہم سب نے اس کے گرد ایک ایسا حفاظتی حصار قائم کر رکھا تھا جس میں اول تو کسی کا داخل ہونا ممکن ہی نہ تھا لیکن ایسا ہوتا تو ہم سب اسے یوں چھپا لیتے تھے جیسے خطرے کے وقت مرغی اپنے بچوں کو پروں کے نیچے چھپاتی ہے۔

باہر کی دنیا میں ویسے تو ہر مرد ہی اس کا دشمن تھا۔ میں اس سے غلط نہیں کہتا تھا کہ اس کا سب سے بڑا دشمن خود اس کا حسنِ بے مثال اور شباب آتش فشاں ہے جو ہر مرد کے جذبات میں آگ لگاتا ہے اور اسے حاصل کرنے کے لیے اکساتا ہے۔ عام عورت کا حسن و شباب کسی رشتے کی پناہ میں رہتا ہے خواہ وہ بھائی اور باپ کا ہو یا شوہر کا۔ نور جہاں ایسے رشتوں سے محروم تھی۔ نہ اس کا گھر تھا اور نہ خاندان۔ وہ کھلے آسمان تلے پڑے ہوئے مال و زر کے خزینے کی طرح تھی جسے ہر چور ڈاکو لے جا سکتا تھا۔

اس کے ساتھ اصل خطرہ قانون کی گرفت کا تھا۔ اس

پر اپنے شوہر کے قتل کا الزام تھا۔ قتلِ عمد زیر دفعہ تین سو دو ضابطہ فوجداری کا جس کی سزا تعزیرات پاکستان کے تحت موت تھی۔ ورنہ عمر قید۔ اس کی حیثیت ایک مفرور مجرم کی تھی جس کے لیے عدالت نے اشتہار جاری کر دیے تھے اسے کوئی بھی شناخت کرنے والا پکڑ کے پولیس کے حوالے کر سکتا تھا اور اس خطرے کو وہ یوں ساتھ لیے پھرتی تھی جیسے خود اپنا اشتہار اپنے ساتھ لیے پھر رہی ہو۔ اس کی وجہ میں بار بار اسے بتا چکا تھا۔ اسے ایک بار دیکھنے والا آسانی سے بھلا نہیں سکتا۔ ایک عام عورت کا حسن ہر روز اور زندگی میں نہ جانے کتنی بار دل پر اثر کرتا ہے لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ ایشوریا رائے کو صرف ایک بار دیکھنے والا اسے پھر دیکھے تو نہ پہچانے؟

حال ہی میں دامنِ کوہ کے ایک ریسٹورنٹ میں اسے ایک انسپکٹر نے تاڑ لیا تھا اور وہ گرفتاری سے بال بال بچی تھی۔ اسپتال میں ایک نرس نے اسے ماڈل سمجھا تھا۔ اس کے ذہن میں نور جہاں کے حسن کا نقش محفوظ تھا بس اسے یاد نہ آیا کہ اس کا چہرہ کہاں دیکھا تھا اور کب ورنہ شاید وہ اسپتال میں بھی گرفتار ہو جاتی۔ اس کے غائب ہونے کی خبر سن کے پہلے میں اسی اندیشے سے دوچار ہوا تھا کہ اسی نرس نے یا کسی اور نے نور جہاں کو پہچان لیا ہو گا اور وہ جان بچا کے فرار ہونے پر مجبور ہو گئی۔ لیکن ایسا ہوتا تو وہ اسپتال سے نکل کے مجھے یا راجا کو فون کرتی۔ بتاتی کہ وہ کہاں چھپی ہوئی ہے۔

اس کی طرف سے رابطہ نہ ہونا کچھ خطرات کی نشاندہی کرتا تھا۔ ایک یہ کہ وہ گرفتاری کے ڈر سے بھاگی لیکن گرفتار ہونے سے نہ بچ سکی۔ ایسا ہوتا تب بھی وہ کسی نہ کسی کو مدد کے لیے بلاتی۔ مجھے نہ سہی شہزاد کو فون کر کے بتاتی کہ وہ کہاں اور کس تھانے میں ہے۔ لیکن اس کی طرف سے مکمل خاموشی یہ ظاہر کرتی تھی کہ اس نے ہم سب سے ناتا توڑ لیا ہے۔ وہ مجھے چھوڑ گئی ہے۔

کیوں؟... اس کیوں کا ایک جواب وہ تھا جو راجا نے فراہم کیا تھا۔ اپنے مقصد میں ناکامی کے بعد وہ میرے ساتھ رہنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ اس کا پلان ہی یہ تھا کہ جائز و ناجائز کی پروا کیے بغیر میرے بچے کی ماں بنے اور اس طرح ست بدھائی کی جاگیر حویلی اور دولت کا ایک وارث سامنے لے آئے۔ حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے۔ یہ وارث وجود میں آنے سے پہلے ہی ایک حادثے کی نذر ہو گیا۔ میں اس پر واضح کر چکا تھا کہ ابھی نہ میں شادی کر سکتا ہوں اور نہ شادی کے بغیر ایک بچے کا باپ بننے کی بدنامی افورڈ کر سکتا ہوں۔ یہ ناممکن تھا کہ اب اسے پھر چانس ملے۔ جذبات کی وارفتگی اور بے خبری میں ایک بار ایسا ہو گیا تھا۔ اب میں ہوشیار تھا میں نے صاف کہہ دیا تھا کہ نور جہاں کو اس بچے سے نجات حاصل کر لینی چاہیے۔ ایسا نور جہاں کی رضامندی سے نہ ہوا مگر ایک حادثے میں ہو گیا۔

یہ ہو سکتا تھا کہ راجا کی بلیک میلنگ والی تھیوری سو فیصد درست نہ ہو۔ نور جہاں سچ مچ مجھ سے اتنی محبت کرتی ہو کہ میرے بچے کو میری نشانی سمجھ کے رکھنا چاہتی ہو۔ کم سے کم زبان سے وہ ایسا ہی کہتی تھی۔ لیکن ایسا ہوتا تو وہ کچھ بتائے بغیر غائب کیوں ہوتی۔

شاید سچ کے آثار عیاں ہونے تک میں اپنے خیالوں کے گرداب میں غوطہ زن رہا اور کروٹیں بدل بدل کے سونے کی کوشش بھی کرتا رہا۔ نہ جانے کیوں مجھے وہ لڑکی یاد آتی رہی جسے نہ فریال کی طرح شہرت کی تمنا تھی اور نہ نور جہاں کی طرح دولت کی۔ پیدائشی طور پر خدا نے اسے سب کچھ دے رکھا تھا۔ وہ ایک برطانوی لارڈ کی بیٹی تھی اور اکلوتی۔ حسب نسب اور اثر رسوخ کے ساتھ قدرت نے اسے دولتِ حسن عطا کرنے میں بھی بڑی فیاضی سے کام لیا تھا۔ اس کے مقابلے میں میری کوئی اوقات ہی نہ تھی۔ میں تو اس کے باپ کا ایک ملازم تھا۔ لیکن اس نے مجھ سے محبت کی تو اپنا سب کچھ چھوڑنے پر تیار ہو گئی۔ اس نے اپنا مذہب چھوڑا۔ ایلشیا سے عائشہ بن گئی۔ آخری وقت تک وہ میرے ساتھ آنے کے لیے بضد تھی۔ وہ اپنا گھر اور برطانیہ جیسا ملک چھوڑ کے میرے ساتھ پاکستان میں زندگی گزارنے کے لیے تیار تھی۔ کسی پیشگی شرط اور مطالبے کے بغیر۔ اب مجھے نہ فریال کی چاہت بے غرض لگتی تھی اور نہ نور جہاں کی محبت اور عائشہ بہت پیچھے رہ گئی تھی۔

صبح راجا مجھے ٹانگ کھینچ کے نہ اٹھاتا تو میں اسی طرح پڑا سوتا رہتا۔ میں ہڑبڑا کے اٹھا اور گھڑی دیکھی تو گیارہ بج رہے تھے۔ "سوری کہ میں نے آپ کے نیلے خواب کو ڈسٹرب کیا۔ فیکے پتر!"

میں نے کہا۔ "معلوم ہے میں کب سویا تھا؟ اور میرے سونے سے تجھے کیا پریشانی تھی مہاراجا۔"

اس نے اعلان کیا۔ "وقت کم ہے اور مقابلہ سخت۔ جو سوتا ہے وہ کھوتا ہے۔ کھوتے دا کھر ہے...... شہزاد کا فون بھی آیا تھا۔ وہ ایک خاص مہمان کے ساتھ پہنچ رہا ہے۔"

میرا دل دھڑکا۔ "کیا نور جہاں اس کے گھر پہنچ گئی؟"

"نہیں یار... اس کی تو کوئی اطلاع ہی نہیں۔" راجا سیریس ہو گیا۔

سے اس نے میرا بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ ''کزن! تم اپنے آپ کو بہت ہوشیار سمجھتے ہو نا؟''

میں نے عاجزی سے اعتراف کیا۔ ''ہاں۔ تمہارے مقابلے میں۔''

''اور تمہارا خیال ہے میں بے وقوف ہوں۔''

''خیال نہیں، یہ حقیقت ہے۔ اللہ نے تمہیں جیسا بنایا...''

اس نے مجھے ترچھی نظر سے دیکھا۔

''مجھے پتا چل گیا۔''

''چلو اچھا ہے۔ آئندہ اختلاف اور بحث کی گنجائش نہیں رہی تم نے مان لیا کہ ہم عقلمند ہیں اور تم بے وقوف۔''

''مجھے پتا چل گیا کہ کون آ رہا ہے۔ عمران خان آ رہا ہے نا؟''

میں نے ظاہر کیا جیسے میں اچھل پڑا ہوں۔ ''کیسے... کس نے بتائی تمہیں یہ بات؟''

''یہ چھوڑو۔ کیا یہ اطلاع درست ہے۔ ہاں یا نہیں؟''

میں نے لہجے میں کہا۔ ''بائی ڈیر کزن۔''

وہ چلا کے بولی۔ ''ہاں یا نہیں؟''

''ہاں بابا ہاں۔ مگر دیکھو۔ اس کو اپنے تک محدود رکھنا۔ کسی اور کو نہ پتا چلے۔ دراصل ہم ایک دھماکا کرنا چاہتے تھے۔ جیسے کہ نواز شریف نے ایٹمی دھماکا کیا تھا۔ تم نے ضرور ہماری باتیں سن لی ہوں گی۔''

اس نے جوش میں میرا ہاتھ پکڑا اور اندر لے گئی۔

''میں نہیں بتاؤں گی کسی کو بھی۔ لیکن یہ سب ہوا کیسے؟''

''بس اللہ مسبب الاسباب ہے۔ اس سے رابطہ ہو گیا اور تم جانتی ہو وہ ایسا ہی آدمی ہے۔ عوامی فلاح کے بڑے بڑے کام کیے ہیں اس نے۔ وہ مان گیا مگر شرط یہ رکھی ہے کہ پبلسٹی بالکل نہ ہو۔''

رات کے کھانے کی میز پر خواتین کا اندرونی جوش اور اضطراب واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا تھا۔ وہ ظاہر کر رہی تھیں کہ کسی کو کچھ نہیں پتا لیکن سب جانتی تھیں اور ان کی ساری ناراضی ختم ہو کے بے پناہ خوشی میں ڈھل گئی تھی۔ راجا اور میں دل ہی دل میں مسکراتے رہے اور ظاہر نہ کرنے کا ڈراما کرتے رہے۔ جب سچ سامنے آئے گا تب کیا ہوگا۔ یہ سوچ کے خوش ہوتے رہے۔ خواتین کو شدت سے بے وقوف بنائے جانے کا احساس ہوگا مگر اس وقت ان کے غصے کی آگ پر تسلی کا ٹھنڈا پانی پڑ چکا ہوگا کہ عمران خان نہ سہی چیف منسٹر آیا۔ یہ اس سے بھی بڑی بات ہے۔ وہ ہمارے جھوٹ کو معاف کر دیں گی۔

ابھی تک ہم نے شہزاد کو بھی شریکِ راز نہیں کیا تھا۔ رات کو انتظامی کمیٹی کے ایک اجلاس میں اسے اصل بات معلوم ہوئی تو وہ بھونچکا رہ گیا۔ ہمارے سامنے مسئلہ تھا استقبال کی تیاری کا۔ اگر چیف منسٹر اعلانیہ آتا تو یہاں سے وہاں تک سرکاری انتظامات ہوتے۔ سیکیورٹی اور پروٹوکول کا مسئلہ ہوتا۔ ہم بھی سارے راستے کو سجانے اور ست بدھائی کے گرد و نواح سے ساری دنیا کو بلا کے استقبال کے لیے کھڑا کر دیتے۔

لیکن وہ ''اچانک'' آ رہا تھا۔ دو دن میں کیا ہو سکتا تھا۔ ہم حویلی کو نیا رنگ و روغن نہیں کرا سکتے تھے۔ سارے میں چراغاں نہیں کر سکتے تھے اور جھنڈیاں نہیں لگا سکتے تھے۔ آرائشی دروازے کھڑے کرتے یا ڈھول بجانے والے سب پوچھتے کون آ رہا ہے۔ گھر میں تو عمران خان کا نام چل گیا۔ باہر والوں کے سامنے یہ بیان بھی نہیں دیا جا سکتا تھا۔ طے یہ ہوا کہ اسپتال کو سجایا جائے اور اسکول کی جگہ کو۔ مشہور یہ کیا جائے کہ خود نواب رفیق احمد شیرازی بھی مہمانِ خصوصی ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ اطلاع رانا تک پہنچے گی تو وہ بہت مذاق اڑائے گا کہ بیچارا احساسِ کمتری کا مارا ہوا ہے۔ دنیا میں اور کہیں تو مہمانِ خصوصی بنایا نہیں جاتا۔ اپنے ہی گھر میں بن گیا۔

تاہم مجھے ایک اندیشہ تھا۔ عوام کی سطح پر چیف منسٹر کا دورہ کتنا ہی ''اچانک'' کیوں نہ ہو۔ سرکاری سطح پر نہیں ہو سکتا۔ اس کے انتظامی عملے کو بے خبر نہیں رکھا جا سکتا۔ یہ بھی ناممکن ہے کہ وزیرِ اعلیٰ کہیں جائے اور اس علاقے کے عمائدین کو تقریب میں نہ بلایا جائے۔ سرکاری سطح پر اس کی پبلسٹی نہیں ہوگی لیکن کام سرکاری طریقے سے ہی ہوگا۔ اس علاقے کا نمائندہ رانا رجب علی ہے۔ اسے بے خبر رکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وزیرِ اعلیٰ کے استقبال کے لیے اس کا بنفسِ نفیس موجود ہونا اس کے فرائضِ منصبی کا حصہ ہے۔

میں نے اس کا ذکر راجا سے کیا تو اس نے مجھ سے اتفاق کیا کہ وزیرِ اعلیٰ کے اچانک آنے کا بھی پروگرام بنے گا۔ حیرانی کا عنصر شاید میڈیا کے لیے رکھا جائے ورنہ صرف عوام کے لیے ہوگا۔

میں نے کہا۔ ''رانا ضرور گڑبڑ کرے گا۔''

''وہ کیا کر سکتا ہے۔'' راجا نے مجھے تسلی دی۔ ''چیف منسٹر کا فیصلہ بدلنا اس کے اختیار کی بات نہیں۔ دو دن تو رہ گئے ہیں۔''

''وہ ہماری تقریب کو ہائی جیک نہ کر لے۔ خود

استقبال کے سارے انتظامات سنبھال لے۔ یہ مشہور کر دے کہ علاقے میں صحت اور تعلیم کے فروغ کے لیے اس نے وزیرِ اعلیٰ کو بلایا ہے۔ وہ اسی کی وجہ سے آیا ہے۔''

راجا نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وزیرِ اعلیٰ کے آنے کا اسے پتا ضرور چلے گا۔ مگر وہ کیوں آ رہا ہے۔ اصل مقصد کیا ہے۔ یہ وہ نہیں جان سکتا۔''

''کیا چیف منسٹر ہاؤس سے بھی خبر لیک آؤٹ نہیں ہو سکتی؟''

''تو... چیف منسٹر یہ رسک کیسے لے سکتا ہے۔ اگر شامی ڈاکو نہ آیا کسی بھی وجہ سے تو اسی کی پوزیشن کتنی خراب ہوگی۔ تو اس طرف سے بے فکر ہو جا۔ رانا ابھی تڑپ رہا ہے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ مگر وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ یہ طے ہے رانا سوچ سوچ کے پاگل ہو جائے گا کہ چیف منسٹر کو کیسے روکے اور ہماری کوشش کو کیسے ناکام کرے۔ اس کے لیے بہت بے عزتی کی بات ہوگی کہ اسے یہاں حاضری دینی پڑے گی۔ وہ کسی بہانے سے بچ بھی نہیں سکتا۔ اگر اس نے خود کو غیر حاضر رکھا تو یہ سیاسی حقارت کا اشارا سمجھا جائے گا۔''

میں نے کہا۔ ''ابھی ایسا کوئی اشارا نہیں ملا کہ رانا کو وزیرِ اعلیٰ کے پروگرام سے آگاہ کر دیا گیا ہو لیکن کل نہ سہی پرسوں تک اسے لازمی پتا چل جائے گا۔ اس کے بعد یہ راز کوئی راز نہیں رہے گا۔ وہ اپنے مشیروں کو بتائے گا۔ ان سے پوچھے گا کہ یہ لواب کیا کرنا چاہیے۔ پھر یہ خبر عام ہو جائے گی۔''

راجا نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ رانا کو اطلاع ضرور دی جائے گی لیکن یہ بھی سمجھا دیا جائے گا کہ وہ استقبال کا اہتمام نہ کرے۔ دورے کو خفیہ رکھا گیا ہے۔ وہ ست بدھائی کی تقریب میں شریک ہونے آ جائے مگر جلسے جلوس کی ضرورت نہیں۔''

راجا اور غنی اتنے تھکے ہوئے تھے کہ بات کرتے کرتے اونگھنے لگتے تھے۔ وہ سونے چلے گئے تو میں نے بھی اپنے کمرے کا رخ کیا۔ میرے ذہن پر بہت سے معاملات اور مسائل کا بوجھ تھا۔ چیف منسٹر کا آنا انتظامی مسئلہ تھا جس سے راجا اور غنی ہی نمٹ سکتے تھے۔ اسی طرح قانونی مسائل شہزاد اور اب ماجد خان نے سنبھال لیے تھے۔ میری پریشانی کے تین اسباب ایسے تھے جن کا حل نہ میرے اختیار میں تھا نہ کسی اور کے پاس تھا۔

پہلا مسئلہ تو نور جہاں کا ہی تھا۔ وہ ایسے گم ہوئی تھی کہ اپنا کوئی سراغ چھوڑ کے نہیں گئی تھی۔ اس کی جدائی کا صدمہ ایسا نہ تھا کہ میں عقل و ہوش کھو بیٹھوں لیکن اس کی سلامتی کا خیال یقیناً سوہانِ روح تھا۔ کہیں وہ غلط ہاتھوں میں نہ پڑ جائے۔ گرفتار نہ ہو جائے۔ یہ خیال مجھے اندر سے بے چین رکھتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ جہاں بھی ہے مجھے فون کر کے بس اتنا بتا دے کہ وہ خیر و عافیت کے ساتھ اور محفوظ ہے۔

دوسرا مسئلہ شامی بادشاہ سے رابطے کا تھا۔ ابھی تک نہ اس کا فون آیا تھا اور نہ اس نے میرے فون کا جواب دیا تھا اور یہ خوف میرے اعصاب پر غالب آ رہا تھا کہ میرے پاس صرف دو دن اور ہیں۔ اگر یہ بھی ایسے ہی گزر گئے تو بہت برا ہوگا۔ تاہم ایک امید تھی کہ شامی بادشاہ کے ساتھ کوئی سانحہ پیش نہ آیا تو وہ اپنے وعدے کا پاس رکھے گا اور اپنے دوست کو مشکل میں نہیں ڈالے گا۔

تیسرا مسئلہ اباجی کا تھا جو حج پر ایسے گئے تھے کہ لوٹ کر ہی نہیں آئے تھے۔ پہلے اماں حج کی سعادت حاصل کر کے اپنی خواہش کے مطابق جنت البقیع میں دفن ہوئیں۔ پھر اباجی کی سفری دستاویزات گم ہو گئیں اور نئی دستاویزات ملنے کے انتظار میں وہ اپنے کسی دوست کے گھر قیام کرنے پر مجبور ہوئے۔ یہ قیام اس لیے طول اختیار کرتا جا رہا تھا کہ اباجی رشوت دے کر دستاویزات حاصل کرنے پر راضی نہ تھے۔ وہ بیمار بھی ہو گئے تھے اور میں اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ ان کی مدد کر سکوں۔ اگر میں سعودی عرب جانا چاہتا تو ویزا حاصل کرنے میں کافی وقت لگتا اور پھر بھی میں انہیں واپس کیسے لاتا۔ سفری دستاویزات حاصل کیے بغیر وہ میرے ساتھ سفر نہیں کر سکتے تھے۔

رات ساڑھے گیارہ بجے میں نے سعودی عرب میں اباجی کے دوست کو فون کیا۔ لیکن اباجی سے میری بات نہ ہو سکی۔ وہ سو رہے تھے۔ ان کے دوست نے بتایا کہ سفری دستاویزات ابھی تک نہیں ملیں۔ سفارت خانے والے آج کل پر ٹالنے کے ماہر تھے اور اباجی اپنی ضد پر قائم تھے کہ رشوت دے کر جہنمی نہیں بنوں گا۔ انہوں نے اپنے دوست کو بھی قسم دے رکھی تھی کہ یہ کام تم مت کرنا ورنہ عذاب مجھ پر ہی آئے گا۔

میں نے کہا۔ ''انکل... ایسے کب تک چلے گا آخر؟''

''میں کوشش کر رہا ہوں۔ ہم سفارت خانے کے اعلیٰ افسران کے بعد خود سفیر محترم سے مل چکے ہیں۔ وہ صرف تسلی دیتے ہیں۔ دستاویزات تو نیچے والے ہی دیں گے نا اور ان کے منہ کو حرام ایسا لگا ہے کہ وہ شاید اپنے باپ کو بھی بخشنے والے نہیں۔''

''اباجی کی طبیعت کیسی ہے؟''

''طبیعت کا میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ بالکل ٹھیک ہے۔ علاج بہترین ہو رہا ہے لیکن افاقہ معلوم نہیں کیوں نہیں ہوتا۔ خود ڈاکٹروں کی سمجھ میں نہیں آتا۔ لیکن تم فکر نہ کرو۔ میں ان کا پورا خیال رکھ رہا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو بہت جلد وہ تمہارے پاس ہوں گے۔''

فون بند کرنے کے بعد میں ٹانگ پر ٹانگ رکھے چھت کو دیکھتا رہا۔ مجھ پر مایوسی کا ایسا غلبہ تھا کہ دماغ میں صرف برے خیالات آتے تھے۔ اباجی کے دوست ہر بار ایسی ہی باتیں کرتے تھے اور میں ہنس کر خاموش ہونے کے سوا کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔

اچانک دروازے کو آہستہ سے دھکیل کر شہزاد کی خالہ اور پھر ان کے پیچھے اس کی ماں اندر آگئیں۔ میں اٹھ بیٹھا۔ ''خالہ! خیریت تو ہے نا؟''

''اللہ خیریت ہی رکھے بیٹا۔'' شہزاد کی نابینا ماں نے کہا اور اپنی بہن کا ہاتھ تھامے چلتی ہوئی میرے بیڈ پر آکے بیٹھ گئیں۔

''دراصل میں نے لائٹ دیکھی تو آپا سے کہا کہ رفیق جاگ رہے ہیں۔ تم سے ایک بات کرنی تھی۔''

شہزاد کی ماں نے کہا۔ ''دن میں موقع ہی نہیں ملا۔''

میں نے کہا۔ ''آپ کہیے۔ ایسی کیا بات ہے۔''

''اندازہ تو تمہیں بھی ہوگا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ رابعہ اور شہزاد۔ خود شہزاد نے مجھ سے کہا تھا۔ ہوسکتا ہے رابعہ نے تم سے بات کی ہو۔ تمہارے سوا کون ہے اس کا۔''

میں نے کہا۔ ''اس نے کچھ نہیں کہا۔ لیکن مجھے معلوم ہے۔''

''میں نے سوچا کہ تم سے بات کرلوں۔ تم تو جانتے ہو شہزاد کو۔ رابعہ کے ماں باپ کی جگہ تم ہو۔ میں تم سے رابعہ کو مانگتی ہوں۔''

میں نے ان کا ہاتھ تھام کے کہا۔ ''آپ مطمئن رہیے۔ جو آپ چاہتی ہیں وہی ہوگا۔ میں آپ کو بھلا کیسے انکار کرسکتا ہوں لیکن پکی بات اباجی کے آنے کے بعد ہی ہوگی۔ ان کی طرف سے بھی میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ بہت خوش ہوں گے۔ شہزاد سے اچھا رشتہ رابعہ کے لیے نہیں ہوسکتا۔''

انہوں نے ایک گہری سانس لی۔ ''تم نے میرے دل کا بوجھ ہلکا کردیا۔ جو ہوگا تمہارے ابا کے آنے کے بعد ہی ہوگا۔ یہ مجھے بھی معلوم تھا لیکن میں نے سوچا پہلے تم سے کہہ دوں۔''

خوشی دونوں بہنوں کے چہروں سے عیاں تھی۔ وہ تھوڑی دیر بیٹھ کے چلی گئیں۔ میرے لیے اس پروپوزل میں حیرانی کی بات کوئی نہیں تھی۔ ہم سب ہی دیکھ رہے تھے کہ معاملات کس رخ پر جارہے ہیں اور سب مطمئن تھے کہ ایک حادثے کے بعد رابعہ کی زندگی میں پھر خوشیاں لوٹ آئی ہیں اور اس کا مستقبل پہلے سے زیادہ محفوظ اور پُرمسرت ہوگیا ہے۔ اللہ جو کرتا ہے بہتر ہی کرتا ہے۔

لائٹ بجھا کے میں نے سونے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ باہر سے شور شرابا سنائی دیا۔ برآمدے میں گشت پر مامور کسی سنتری نے چلاّ کے کہا۔ ''اوئے بتادیا نا ایک بار کہ سرکار سوگئے ہیں۔''

پھر میرے کانوں نے ایک مانوس آواز سنی۔ یہ اسی خود ساختہ دیوانے یا مجذوب کی آواز تھی جو شاہی بادشاہ کے لیے نامہ بری کرتا تھا۔ وہ باہر نعرے لگا رہا تھا اور اس کے پیروں میں گھنگرو کھنک رہے تھے۔ میں نے لائٹ جلائی اور چادر اوڑھ کے باہر نکل آیا۔ سنتری مجھے سیلوٹ کرکے پیچھے ہٹ گیا۔ میں برآمدے سے اترا اور گیٹ کی طرف گیا جہاں وہ مستی میں ناچ رہا تھا۔ گا رہا تھا اور نعرے لگا رہا تھا۔ ''مولا ہی مولا۔ باقی سب رولا ہی رولا۔'' اس کے پیروں میں بندھے ہوئے گھنگرو ایک بہت اچھی ...... تال کا ساتھ دے رہے تھے جسے وہ فرش پر مارتا جارہا تھا۔ اس کے گرد چار پانچ سنتری بڑی عقیدت اور احترام سے حلقہ بنائے موجود تھے۔

مجھے دیکھتے ہی اس نے نعرہ لگایا۔ ''آگیا۔ آگیا میرا پیارا۔ سب کا راج دلارا۔ فلک کی آنکھ کا تارا۔ میں نے کہا تھا وہ نہیں سوتا۔ دیکھ لو وہ جاگ رہا ہے سور کے بچو۔ حرامزادو۔'' اس نے پہرے داروں کو بڑی گھن گرج کے ساتھ گالیاں دیں۔ انہوں نے یہ بھی بڑی عقیدت سے سنیں۔ ان کے نزدیک تو وہ بڑا پہنچا ہوا مردِ قلندر تھا۔

میں نے کہا۔ ''سائیں بابا کیسے ہو۔ بہت عرصے بعد نظر آئے کہاں رہے اتنے دن؟''

اس نے اوپر انگلی اٹھائی۔ ''اس کا حکم۔ بس اس کا حکم۔ چلا جا مشرق کی طرف جدھر سے سورج نکلتا ہے۔ پھر حکم ہوا کہ لوٹ جا۔ ست بدھائی جا۔ میں واپس آگیا۔ سورج میرے پیچھے آرہا ہے۔''

وہ بالکل بھی فاترالعقل نہیں تھا۔ ایسی باتیں وہ جان بوجھ کے کرتا تھا۔ سننے والے سادہ لوح دیہاتی بڑے متاثر ہوتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ معرفت کا کلام تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ ڈراما کرتا ہے۔ وہ پولیس کا مخبر تھا اور شاہی بادشاہ

سے بھی رابطہ رکھتا تھا۔ دیوانہ بن کے وہ ایک وسیع علاقے میں پھرتا تھا اور ہر بات کی خبر رکھتا تھا۔

میں نے کہا۔ ''سائیں بابا اندر آؤ۔ ہمیں بھی خدمت کا موقع دو۔''

وہ میرے ساتھ چل پڑا۔ مہمان خانے میں آتے ہی اس کا سارا ڈراما ختم ہوگیا۔ ''نواب صاحب۔ شاہی بادشاہ نے پوچھا ہے کہ کب آنا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''دیکھو۔ اس سے فوراً جاکے کہو کہ سارے معاملات طے پاچکے ہیں۔ وہ فوراً آجائے۔ آخر وہ فون پر بات کیوں نہیں کرتا مجھ سے؟''

اس نے ایک لمبی سیاہ رنگ کی قمیص پہن رکھی تھی جو لمبائی میں اس کے ٹخنوں تک پہنچی تھی۔ اس میں ہر رنگ کے کپڑوں کے پیوند لگے ہوئے تھے۔ گلے میں اس نے ہمیشہ کی طرح پلاسٹک کی رنگین منکوں کی مالائیں لٹکا رکھی تھیں۔ اندر ہاتھ ڈال کے اس نے ایک موبائل فون برآمد کیا۔

''شاہی نے کہا ہے کہ پرانا فون ضائع کردو۔'' اس نے نیا فون میری طرف بڑھادیا۔ ''اب میں چلتا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہے تو بتاؤ۔''

اس نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔ ''ایک بادشاہ۔ ایک نواب اور ایک راجا کی مہربانی کافی ہے۔''

وہ پھر ناچتا گاتا باہر نکلا۔ سنتری اس کے ہاتھ چومتے رہے۔ اس سے کہتے رہے کہ ہمارے لیے دعا کرنا۔ مجھے پھر ان سادہ لوح لوگوں پر بہت افسوس ہوا جو ایسے فریب کار لوگوں کو اپنی حاجت روائی کا ذریعہ اور وسیلہ سمجھ کے ایک طرح شرک کے مرتکب ہوجاتے تھے مگر وہ اس سے بھی بے خبر تھے۔ ان کی سمجھ میں یہ معمولی سی بات نہیں آتی تھی کہ سب کو دینے والا ایک خدا ہے اور وہ سب کی سنتا ہے تو پھر وہ اسی سے کیوں نہیں مانگتے۔

اس وقت میرے سوا سب لوگ سوئے پڑے تھے۔ دن بھر کی مصروفیت نے انہیں تھکن سے بے حال کردیا تھا۔ سوائے میرے کسی کو بھی سائیں بابا کے آنے جانے کی خبر نہ ہوئی۔ میں نے واپس اپنے کمرے میں آکے دیکھا تو موبائل فون کے اسکرین پر ایک نمبر ٹھہرا ہوا تھا۔ میں نے اس نئے نمبر پر کال کی۔

دوسری طرف سے شاہی بادشاہ کی آواز سنائی دی۔ ''خیر ہووے نواب دوست کی۔''

میں نے کہا۔ ''خیر ہو شاہی بادشاہ کی۔ تم نے تو مجھے پریشان کردیا تھا۔ میں مسلسل فون کالز کررہا تھا۔ تمہاری طرف سے کوئی جواب نہیں۔''

وہ ہنسا۔ ''جواب کون دیتا۔ میں تو ہر کال کے بعد سم اور سیٹ دونوں ضائع کردیتا ہوں۔ تم سے بھی کہا تھا کہ ایک بار بات کرکے سیٹ کو ضائع کردینا۔''

''یار اتنا بھی ڈرنے کی ضرورت نہیں۔''

''تم نہیں جانتے نواب دوست۔ سائنس بڑی ترقی کرگئی ہے۔ اب موبائل فون پر گفتگو کا سارا ریکارڈ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ میں نہیں چاہتا میری وجہ سے تم کو پریشانی ہو۔ خیر... اب کیا حکم ہے میرے لیے۔''

''شرمندہ مت کرو۔ دوستوں کو حکم نہیں دیا جاتا۔ ان سے صرف درخواست کی جاتی ہے۔ میری بات ہوگئی ہے خود وزیراعلیٰ سے۔ تمام معاملات ہماری مرضی کے مطابق طے پاچکے ہیں۔ اب یہ بتاؤ تم کب آسکتے ہو؟''

وہ بولا۔ ''بلانے والے تم ہو۔ مجھے تم پر بھروسا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''وزیراعلیٰ دو دن بعد آئے گا۔''

میں نے اسے اپنی ملاقات کا پورا احوال بتادیا۔ وہ سنتا رہا اور پھر بولا۔ ''اگر تمہیں اطمینان ہے تو ٹھیک ہے۔''

''مجھے بتادو تم کب آؤ گے۔ اور کیسے؟''

وہ بولا۔ ''ابھی سے کیسے بتادوں۔''

''دراصل مجھے فکر صرف تمہاری ہے۔ تم نے مجھ پر بھروسا کیا ہے تو ساری ذمے داری مجھ پر آگئی ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہوجائے۔ چیف منسٹر وعدہ خلافی نہیں کرسکتا لیکن میرے اور تمہارے دشمن کچھ بھی کرسکتے ہیں۔ ایک بار تم ست بدھائی کی حویلی میں داخل ہوجاؤ۔ پھر کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ فلمی ڈائیلاگ کے مطابق۔ میری لاش پر سے گزر کے ہی کوئی تم تک پہنچ سکتا ہے۔''

وہ ہنسا۔ ''میں جانتا ہوں۔ اسی لیے تمہاری دوستی کی قدر کرتا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو میرے تمہارے دشمن کچھ نہیں کرپائیں گے۔ سب اچھا ہی ہوگا۔ میری فکر مت کرو۔ میں پہنچ جاؤں گا۔ اس موبائل فون کو دوبارہ مت استعمال کرنا۔ توڑ کے پھینک دینا۔''

''اور تم سے پھر بات کرنی ہو تو؟''

''اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اچھا نواب دوست۔ پھر ملیں گے۔''

میں نے خدا حافظ کہہ کے فون بند کردیا اور پھر شاہی بادشاہ کی ہدایت کے مطابق اسے زمین پر مار کے توڑ دیا۔ اس کے ٹکڑے میں نے ڈسٹ بن میں ڈال دیے۔ میری ایک فکر دور ہوگئی تھی۔ میں نے لائٹ آف کی اور سوگیا۔ صبح

پھر میں خود نہیں اٹھا۔ دس بجے اٹھایا گیا۔

اٹھانے والی ریشم تھی جو مذاق مذاق میں ڈاکٹر ریشم ہوگئی تھی۔ وہ جوش میں کوک کی بوتل کی طرح ابل رہی تھی۔ اس کا چہرہ خوشی سے تمتمارہا تھا اور سانس پھول رہی تھی ہکلا کے رک رک کے وہ اردو میں بولتی تو میرے لیے سمجھنا دشوار ہوتا۔ انگریزی تو روسی یا جرمن زبان کی طرح ہوگئی تھی۔

اس نے کہا۔ ''سر... ٹو کار... ون جیپ پولیس۔ گارڈ اسٹاپ اینگری۔ غنی گو۔''

میں نے کہا۔ ''ریشم سانس لے کر سکون سے بات کر۔ انگریزی تیرے حلق میں پھنس رہی ہے۔ اردو میں بتا کیا قیامت آگئی ہے۔''

اس نے ایک گہرا سانس لے کر کہا۔ ''سر دو گاڑیوں اور ایک جیپ میں کچھ لوگ آپ سے ملنے آئے ہیں۔ سیکیورٹی گارڈز نے انہیں روکا تو وہ بہت خفا ہوئے کہ تم جانتے نہیں ہم کون ہیں۔ پھر غنی گیا اور انہیں اندر لے آیا۔ اب وہ راجا صاحب کے ساتھ مہمان خانے میں ہیں اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔''

میں نے اٹھ کے ہاتھ منہ دھویا اور کپڑے بدل کے مہمان خانے میں گیا۔ وہاں سات افراد موجود تھے۔ ان میں دو پولیس افسران تھے۔ میں نے صرف شیدائی صاحب کو پہچانا اور سمجھ گیا کہ وہ چیف منسٹر سیکریٹریٹ کے عملے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہاں باادب باملاحظہ ہوشیار کی صدا لگانے کا دستور تو نہ تھا لیکن میرے آتے ہی راجا احترام سے کھڑا ہوا تو باقی سب کو بھی اٹھنا پڑا۔ راجا نے فرداً فرداً سب سے مجھے متعارف کرایا۔ سب سے ہاتھ ملانے کے بعد میں نے انہیں بیٹھنے کے لیے کہا۔ ڈیکورم اور پروٹوکول کے اس مظاہرے سے وہ سب یہ سمجھنے پر مجبور ہوئے کہ وہ کسی عام آدمی کے گھر میں نہیں ایک نواب کی حویلی میں ہیں ورنہ وہ چیف سیکریٹریٹ اسٹاف ہونے کے زعم میں تھے۔

شیدائی نے کہا۔ ''نواب صاحب! یہ کرنل صلاح الدین کاظمی کے معاون ہیں۔ وحید بٹ۔''

وحید بٹ نے مجھ سے کہا۔ ''کرنل صاحب کے لیے سمری میں نے ہی تیار کی تھی۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ معاملات کہاں تک پہنچے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے بتایا گیا تھا کہ چیف منسٹر صاحب کے دورے کی تفصیلات ظاہر نہیں کی جائیں گی۔''

شیدائی نے کہا۔ ''ایسا ہی ہوگا۔ لیکن روٹین کے مطابق سیکیورٹی کلیرنس ضروری ہے۔ اس کے بعد ہی پروگرام فائنل ہوگا۔''

میں نے پوچھا۔ ''کیا اس کے لیے حویلی کی تلاشی جائے گی؟''

''اوہ نو... اندر کے ذمے دار آپ خود ہیں اور ہم آپ پر بھروسا کرتے ہیں۔ ہم ذرا باہر کا جائزہ لینے آئے تھے روٹ ہم نے دیکھ لیا۔ اب آپ ہمیں اس جگہ کا معائنہ کرادیں جہاں چیف منسٹر کو اسپتال کا افتتاح کرنا ہے اور ایک اسکول کا سنگِ بنیاد رکھنا ہے۔'' پولیس کے ایس پی نے کہا۔

میں نے کہا۔ ''غنی میرا چیف سیکیورٹی آفیسر ہے۔ وہ آپ کو ہر جگہ دکھادے گا۔''

وہ ہر طرف پھیل گئے۔ انہوں نے باہر چاروں طرف گھوم پھر کے دیکھا اور جیسا کہ غنی نے مجھے بعد میں بتایا۔ ایس پی صاحب نے ان مقامات کی نشاندہی کی جہاں سادہ کپڑوں میں پولیس اہلکاروں کو کھڑا کرنا ضروری تھا۔ انہوں نے اسپتال کی عمارت کے اندر اور باہر کلوز سرکٹ کیمرے بھی نصب کیے وہاں کام کرنے والوں کے علاوہ حویلی کے محافظوں اور ملازموں نے یہ ساری کارروائی بڑے تذبذب اور تجسس سے دیکھی۔ یہاں آج تک کسی وی آئی پی نے قدم تک نہیں رکھا تھا۔ وہ ایسے حفاظتی اقدامات کی ضرورت اہمیت کو سمجھنے سے قاصر تھے۔

شیدائی اس کارروائی سے لاتعلق دوپہر تک ہمارے ساتھ مہمان خانے میں موجود رہا۔ اس نے اعتراف کیا کہ ''اچانک'' قرار دیا جانے والا دورا ابھی ایک شیڈول کے مطابق ہوگا لیکن میڈیا اور عوام کو اس دورے کے مقاصد کا علم یہاں آکے ہی ہوگا۔

''کیا رانا رجب علی کو تقریب میں شرکت کا دعوت نامہ ارسال کردیا گیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ابھی تک نہیں۔ وہ جہلم کی تقریب میں موجود ہوا اور وہاں اسے بتادیا جائے گا۔ خود جہلم کے ارکان اسمبلی بھی ساتھ آئیں گے۔'' شیدائی نے کہا۔

میں نے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کافی لوگ ہوں گے۔''

''ہاں۔ سو ڈیڑھ سو چیف منسٹر کے ساتھ آئیں گے۔ میڈیا کے لوگ ہوں گے۔ کسی قسم کی بدنظمی نہ ہو تو آپ کے حق میں اچھا ہے۔ آپ کے لیے یہ بہت بڑا موقع ہوگا۔ سپاسنامہ مختصر ہونا چاہیے۔ اس کا اسکرپٹ شام تک مجھے بھجوادیں۔ وزیرِ اعلیٰ کا ایک گھنٹے قیام کا ارادہ ہے۔''

میں نے کہا۔ ''آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ ایک گھنٹے میں یہ سب کیسے ہوگا۔ میں تو یہ سوچ کے نروس ہورہا ہوں۔''

''آپ پریشان نہ ہوں ایک کا ڈیڑھ گھنٹا ہوجائے گا تو کوئی حرج نہیں۔ آپ انہیں صبح ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے ریسیو کریں گے۔ دس منٹ انہیں پنڈال تک پہنچانے کے۔ دس پندرہ منٹ سب سنانے کے، دس منٹ جواب کے، یہ ہوا آدھا گھنٹا۔ اسی طرح دس منٹ اسپتال کا افتتاح کرنے کے اور دس منٹ ہی سنگِ بنیاد کے۔ پھر سارے مہمان پنڈال میں جائیں گے جہاں چائے تیار ہوگی۔''

''کیا صرف چائے؟''

''بس۔ وزیرِاعلیٰ کے لیے سادہ چائے۔ باقی مہمانوں کی آپ جیسے خاطر تواضع کرنا چاہیں۔ ایک راز کی بات بتادوں۔ راجا صاحب کے مشورے سے دس صحافیوں کو چن لیں۔ انہیں خاموشی اور رازداری سے لفافے تھمادیے جائیں۔ دس ہزار فی کس کافی ہوں گے۔''

اسپکشن اور پروٹوکول والے دوپہر کا لنچ کھا کے رخصت ہوئے تو سہ پہر ہوگئی تھی۔ راجا نے ان سب سے ڈیل کرنے میں بہترین پی آر کا مظاہرہ کیا تھا اور انہیں پوری طرح مطمئن کردیا تھا کہ ست بدھائی کی ریاست کے حکمران اور عوام پوری طرح چیف منسٹر کے ساتھ ہیں اور رہیں گے۔

اس کے بعد سخت بھگدڑ مچی۔ ایک دم تین سو مہمانوں کو ریسیو کرنے، بٹھانے اور ان کی خاطر تواضع کا خصوصی انتظام کرنا کوئی آسان نہ تھا۔ ابھی درمیان میں ایک دن باقی تھا مگر مجھے لگتا تھا کہ وقت ہاتھ سے نکلا جارہا ہے۔ خواتین کو ابھی تک شک نہیں ہوا تھا کہ یہ تیاری اور اہتمام عمران خان کے لیے نہیں کسی اہم سیاسی شخصیت کے لیے ہے۔ ان کے خیال میں سب بڑے لوگ اسی دھوم دھام اور اہتمام سے آتے ہیں۔

اب میرے لیے بھی شک کی کوئی گنجائش نہ رہی تھی کہ رانا کو قبل از وقت ہی سب معلوم ہوجائے گا لیکن اب شاید چیف منسٹر کے پروگرام کو بدلنا یا کسی سازش اور پروپیگنڈے سے پروگرام کو ناکام کرنا ممکن ہی نہ ہوگا۔ خصوصاً اس وقت جب رانا کو چیف منسٹر کے ست بدھائی آنے کے اصل مقاصد کا علم یہاں آنے کے بعد ہوگا۔

کسی کو حویلی کے اندر کچھ پتا نہیں تھا کہ دوسرا کہاں ہے اور کیا کررہا ہے۔ مجھے تو اس مصروفیت میں سخت افراتفری کا احساس ہورہا تھا لیکن راجا اور غنی مطمئن تھے کہ سب ٹھیک جارہا ہے۔ خواتین اپنی تیاری میں مصروف تھیں۔ زیادہ تیاری ان کی اپنی تھی۔ عمران خان ان سب کا مشترکہ ہیرو تھا اور وہ اس کے سامنے کسی ہیروئن کی طرح پیش ہونا چاہتی تھیں۔

رات کو سب تھک کر سوئے۔ خود میں اتنا مصروف رہا تھا کہ باقی سب کچھ بھول گیا تھا۔ سوتے کے لیے لیٹا تو پھر فریال کی اور نور جہاں کی یاد آئی اور ان سب کی کمی شدت سے محسوس ہوئی جو ہمارے ساتھ اس تقریب میں موجود نہیں ہوں گے۔ اماں تو خیر اس دنیا ہی سے کنارہ کش ہوگئی تھیں مگر اباجی اپنی مجبوری کے باعث شرکت سے محروم رہ گئے تھے۔ میرے نزدیک یہ بہت بڑی کامیابی تھی جو ہمارے مستقبل کا نقشہ بدل سکتی تھی۔

میں سوگیا تھا جب تکیے کے نیچے سے میرے فون نے گنگنانا شروع کیا تو میری آنکھ کھل گئی۔ فون ایک بار بج کے بند ہوگیا تھا۔ اس کے اسکرین پر کلاک رات کا ڈیڑھ بجارہا تھا۔ میں نے نمبر کو غور سے دیکھا لیکن وہ میرے لیے اجنبی تھا۔ اجنبی نہ ہوتا تو مجھے نام نظر آتا۔

میں نے غنودگی میں کہا۔ ''ہیلو۔'' لیکن دوسری طرف خاموشی رہی۔ پہلے میں نے فون بند کرنے کا سوچا۔ یہ رانگ نمبر بھی تو ہوسکتا تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ یہ وہی نہ ہو جس کے لوٹ آنے کا، جس کی خبر پانے کا اور جس کی آواز سننے کا اشتیاق وانتظار مجھے سوتے جاگتے رہتا ہے۔ خواہ نظر یہ آتا ہو کہ نہ میں نے اس کی بات کی نہ اسے یاد کیا اور نہ اس کے بارے میں سوچا۔

میں نے کہا۔ ''ہیلو... کون ہے؟''

پھر کوئی نہ بولا تو میرے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔

میں نے کہا ''بولتی کیوں نہیں؟ تم نور جہاں ہو نا۔ مجھے معلوم ہے تم نور جہاں ہو۔ مجھے یقین تھا کہ تم فون کروگی۔ کہاں چلی گئی ہو تم مجھے چھوڑ کے۔ بولو؟''

دوسری طرف سے کسی نے پُرسکون ٹھہری ہوئی آواز میں آہستہ سے کہا۔ ''میں نور جہاں نہیں ہوں۔''

یہ الفاظ میرے کان کے قریب ہونے والے فائر کے دھماکے سے کم نہیں تھے۔ ''فریال؟'' میں ایک دم اٹھ گیا۔ ''اس وقت...''

اس نے کہا۔ ''ہاں۔ تم سو رہے تھے؟''

''یہی سمجھو۔ لیکن تم اس وقت کیوں جاگ رہی ہو اور مجھے فون کرنے کی ضرورت کیوں پیش آگئی تمہیں؟''

''میرے لیے یہ بہت مشکل فیصلہ تھا۔ بہت روکا میں نے خود کو۔ لیکن اور کوئی نہیں تھا۔''

میں نے کہا۔ ''فریال۔ کیا بات ہے؟ تمہاری آواز سے لگتا ہے کہ تم پریشان ہو۔''

''دیکھو۔ میں جانتی ہوں... اس تعلق کو دوری میں بدلنے کی ذمے دار میں ہوں۔ میرا کوئی حق نہیں بنتا تم پر۔''

وہ رک رک کر خوفزدہ لہجے میں بول رہی تھی۔ ''تم سمجھو گے کہ میں تمہیں یوز کرنے کا سوچ رہی ہوں۔ لیکن ... لیکن مجھے معلوم ہے۔ تم کسی کو انکار نہیں کر سکتے۔ غیر ہوں یا دشمن۔ اگر انہیں تمہاری مدد کی ضرورت پڑ جائے۔''

''اتنا کافی ہے فریال۔ بولو بات کیا ہے۔'' میری نیند اب غائب ہو چکی تھی اور میں ذہنی طور پر مستعد تھا۔

''رفیق۔ کیا سلطان تم سے ملا تھا ست بدھائی آ کے؟''

میں نے حیرانی سے کہا۔ ''وہ مجھ سے ملنے کیوں آئے گا؟''

''تمہاری اس سے فون پر بھی کوئی بات نہیں ہوئی؟''

''نہیں۔ اگر وہ کوشش کرتا تب بھی میں خود اس سے نہ ملتا۔ نہ فون پر بات کرتا۔ تم بتاؤ آخر بات کیا ہے؟''

اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''رفیق۔ تمہارے دو دشمن آپس میں مل گئے ہیں۔ رانا رجب علی اور چوہدری سلطان۔''

''کیسے مل گئے ہیں؟'' مجھے ایک شاک لگا۔

''مجھے نہیں معلوم کیسے مل گئے ہیں۔ رانا خود یہاں آیا تھا۔ تقریباً دو مہینے پہلے۔ اس کے بعد سلطان کتنی بار اس سے ملنے رانا نگر گیا۔ یہ بھی مجھے نہیں معلوم۔ تین بار میں نے ان دونوں کو ساتھ دیکھا۔''

''کہاں... گجرات میں؟''

''ایک مرتبہ گجرات میں۔ میں لاہور ہی میں رہتی ہوں۔ کسی کام سے گجرات گئی تھی۔''

''سلطان سے ملنے۔ اس کے گھر؟''

وہ رک کے بولی۔ ''میرا ایک گھر وہاں بھی ہے۔''

''ہاں۔ جو سلطان نے تمہارے نام کر دیا تھا۔ میں نے وہ کوٹھی دیکھی ہے۔'' میں نے تلخی سے کہا۔ ''اور گاڑی بھی۔''

فریال نے کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ ''دوسری بار وہ سلطان کے ساتھ ہی اسٹوڈیو آ گیا۔ وہاں میری شوٹنگ چل رہی تھی۔''

''اسی فلم کی۔ جس میں سلطان تمہارے مقابل ہیرو ہے؟''

فریال نے کہا۔ ''ہاں۔ تیسری مرتبہ الحمرا میں ایک تقریب تھی۔ وہاں رانا بھی تھا۔ تقریب کے دوران میں وہ دونوں اٹھ کر کہیں چلے گئے تھے۔''

میں نے کہا۔ ''تھینکس۔ تم نے مجھے بتا دیا۔ لیکن میں کیا کر سکتا ہوں؟''

''دیکھو۔ میں اتفاق سے گجرات پہنچ گئی تھی۔ سلطان کو میرے آنے کی اطلاع نہیں تھی۔ جب میں پہنچی تو وہ دونوں ڈرائنگ روم میں تھے۔ میں سیدھی اندر چلی گئی اپنے کمرے میں۔ انہیں میری آمد کا پتا نہیں چلا۔ خادمہ نے مجھے بتایا کوئی رانا صاحب آئے ہیں۔ شک مجھے گاڑی دیکھ کر ہی ہو[ا] تھا۔ پھر میں نے جھانک کے دیکھا تو رانا سامنے دکھائی د[یا]۔ میں نے کبھی سلطان کے منہ سے رانا کا ذکر نہیں سنا تھا۔ نہ [وہ] دوست تھے نہ کاروباری شریک۔ ان کی گفتگو چھپ کر سننے کا کوئی طریقہ نہ تھا۔ میں چائے لے کر اندر پہنچ گئی۔ جیسا کہ مجھے توقع تھی۔ رانا نے مجھے نہیں پہچانا۔ شاید اسے وہاں ست بدھائی کی فریال کی موجودگی کا شک بھی نہیں ہو سکتا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''ویسے بھی اس نے تمہیں کب دیکھا تھا۔''

''ہاں۔ اس کا میرا آمنا سامنا ہونے کی نوبت کبھی نہیں آئی تھی۔ سلطان نے کہا کہ رانا صاحب یہ ہیں مستقبل کی سپر اسٹار مگر اس سے پہلے کہ وہ میرا نام بتاتا رانا نے بڑے گھٹیا طریقے سے قہقہہ مار کے کہا کہ ''ہم تو ان کے حال کو دیکھ کر ہی حال ہیں۔'' جب میں نے اسے چائے پیش کی تو اس نے پیالی لے کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا۔ ''کبھی تشریف لائیں ست بدھائی۔ ہمیں بھی خدمت کا موقع دیں۔ کوئی شوٹنگ رکھ لیں۔'' میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا اور میرے ساتھ سلطان کا موڈ دیکھ کر رانا نے بہتر سمجھا کہ اس بات کو آگے نہ بڑھا[یا] جائے۔ میں الگ بیٹھ گئی تو رانا نے پھر سلطان سے وہی بات شروع کر دی جو میرے آنے سے پہلے ہو رہی تھی۔ اس نے مجھے جیسے نظرانداز کر دیا اور بولا کہ ''اپنے چوہدری صاحب... حرامزادہ نوابزادہ تو بہت خوش ہوگا۔'' وہ توقف کر کے پھر بو[لا] ''ٹاہلی (شیشم) کا فرنیچر پاکستان میں گجرات [میں] اچھا کہاں بنتا ہے اور اس کے علاقے میں ٹاہلی کے جنگل ہیں۔ وہ فرنیچر کا کارخانہ لگانا بھی چاہتا ہے۔ بس اتنی ہی بات سنی تھی میں نے۔ پھر چوہدری سلطان نے بڑی صفائی سے ... کر دیا۔ اس نے کہا کہ آج رات اپنے ڈار صاحب نے ... پر بلایا ہے۔ ڈار صاحب ایک اچھے فلم ڈائریکٹر ہیں۔ سلطان نے کہا کہ آپ لاہور سے ڈرائیو کر کے آئی ہیں۔ فر[یش] ہو جائیں۔ میں بھی اسی ڈنر کے لیے گجرات گئی تھی۔ ڈار صاحب ایک فلم کی شوٹنگ کا شیڈول ملائیشیا میں رکھنا چاہتے تھے۔ میں وہاں سے اٹھ گئی۔''

میں نے کہا۔ ''یہ کب کی بات ہے؟''

''میں نے بتایا نا... دو ماہ قبل کی۔''

میں نے کہا۔ ''لیکن اس وقت تم نے مجھے بتانا ضرو[ری] نہیں سمجھا۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہی۔ ''سوچا ضرور تھا۔ ہمت نہ ہوئی۔ تم یقین کر لیتے اس کا یقین نہیں تھا۔''

''پھر آج کیوں بتا رہی ہو؟''

ایک اور خاموشی کے وقفے کے بعد اس نے کہا۔ ''وہ دراصل... سلطان غائب ہے... ایک ہفتہ ہو گیا ہے اس کا کچھ پتا نہیں چل رہا ہے۔ پولیس میں رپورٹ تو دوسرے دن ہی لکھوا دی گئی تھی۔''

''پولیس نے تم سے بھی پوچھا ہوگا؟''

''ہاں... مجھ سے تین بار تفتیش کی گئی۔ دو مرتبہ پولیس کے ایک افسر خود گھر آئے تھے۔ تیسری مرتبہ مجھے تھانے بلا لیا تھا۔''

''میرا خیال ہے میرے بجائے تمہیں کسی وکیل سے بات کر لینی چاہیے۔''

''اپنے وکیل سے میری بات ہو چکی ہے۔ اب تم اپنی فکر کرو۔''

میں نے کہا۔ ''سلطان سے میرا کیا تعلق؟''

''مجھے تم سے اس سوال کی توقع نہیں تھی۔ تعلق کیسے نہیں۔ تمہارا تعلق ہی دشمنی کا ہے۔ گجرات میں پہلی بار اس کا میرا آمنا سامنا ہوا تھا تو اس کی بات پر سلطان نے مجھے کمرے سے چلتا کر دیا تھا۔ لیکن کیا بعد میں اس نے رانا سے نہیں کہا ہوگا کہ آپ انجانے میں بڑی غلط بات کر گئے؟ پھر اس نے بتا دیا ہوگا کہ میں کون ہوں۔ اب مجھے نہیں معلوم کہ بعد میں کیا ہوا۔ ممکن ہے رانا کو سب معلوم ہو اور وہ سلطان کے پاس اسی نیت سے آیا ہو کہ اسے تمہارے خلاف استعمال کر سکے۔''

''کیا سلطان استعمال ہو سکتا ہے؟''

''انجانے میں کون نہیں ہو سکتا۔ اس کے علاوہ سلطان بہرحال اتنا عیار اور چالاک نہیں ہے جتنا رانا۔ ممکن ہے ست بدھائی میں فرنیچر کا کارخانہ قائم کرنے کا مشورہ ایک چال ہو۔ ایک تیر سے دو شکار کرنے کا منصوبہ ہو۔ سلطان بھی تمہارا دوست تو نہیں ہے۔ رانا دو دشمنوں کو لڑا دے۔ ایک کے ہاتھوں دوسرے کو تباہ کرا دے۔''

''تم بہت دور کی کوڑی لا رہی ہو۔''

وہ خفا ہوئی۔ ''یہ کیا بے وقوفی کی بات ہے۔ فرض کرو رانا نے ہی سلطان کو غائب کیا ہو۔ مروا دیا ہو۔ شک کس پر جائے گا۔ مجھ پر یا تم پر۔ رانا کہہ دے گا کہ اس کا ارادہ ست بدھائی جا کے فرنیچر کا ایک کارخانہ قائم کرنے کا تھا۔ وہ پرانی دشمنی ختم کر کے نواب رفیق کے ترقیاتی پروگرام میں شریک ہونا چاہتا تھا۔ اب پتا نہیں نواب رفیق نے اس کے ساتھ کیا کیا۔ کیا اس کی لاش تمہارے علاقے سے دریافت نہیں کی جا سکتی؟ گواہ پیدا نہیں کیے جا سکتے کہ اسے تمہارے علاقے میں یا تمہارے ساتھ دیکھا بھی گیا تھا۔ اب سمجھ میں آئی میری بات!''

میں نے کہا۔ ''آ گئی۔ لیکن میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ نہ سلطان کو تلاش کر سکتا ہوں اور نہ اپنی ضمانت قبل از گرفتاری کے لیے درخواست دائر کر سکتا ہوں۔ جب کچھ ہوگا تو وہ بھی بھگت لوں گا۔ پھر بھی مجھے آگاہ کرنے کا شکریہ۔''

اس نے کہا۔ ''ایک بات پوچھوں؟''

''تم ہر بات پوچھ سکتی ہو۔ پیشگی اجازت کے بغیر۔''

وہ بولی۔ ''نور جہاں کہیں چلی گئی ہے۔ تمہیں بتائے بغیر؟''

''ہاں۔ میں واقعی بہت برا آدمی ہوں۔ ثابت ہو گیا۔''

''تم اسی کی آواز سننے کے لیے جاگ رہے تھے نا؟ میں نے تمہیں ڈسٹرب کیا۔ ایک بات بتانا رہ گئی۔ مجھے شک ہے کہ میری نگرانی کی جا رہی ہے۔ گھر کے باہر بھی اور شاید اندر بھی۔''

''اندر کون ہے؟''

''میرا خانساماں چلا گیا تھا۔ میں نے خود نکال دیا تھا۔ دوسرے ہی دن ایک شخص آ گیا کہ مجھے رکھ لیں۔ میں نے رکھ لیا۔ پھر ایسا ہی معاملہ گیٹ پر ڈیوٹی دینے والے سنتری کے ساتھ ہوا۔ وہ نوکری چھوڑ کے چلا گیا اور اگلے ہی دن ایک شخص آ گیا۔ کہنے لگا کہ میں دونوں کام کر سکتا ہوں۔ چوکیداری بھی اور مالی کا کام بھی۔ اسے بھی میں نے رکھ لیا۔ مجھے لگتا ہے وہ دونوں ہی پولیس کے آدمی ہیں۔ یا پولیس نے ان کی ڈیوٹی لگا دی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''نکال دو انہیں۔''

''صرف شک کی بنا پر۔ اچھے ملازم کہاں ملتے ہیں۔ مگر تم... باقی لوگ کیسے ہیں...''

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا لائن کٹ گئی۔ میں نے چند منٹ انتظار کیا کہ شاید وہ دوبارہ فون کرے۔ پھر خود اس کا نمبر ملایا۔ گھنٹی بجتی رہی۔ میں نے تین بار کوشش کی لیکن جواب نہیں ملا۔ گھنٹی بجنے کے بعد آپریٹر کے جواب کا ٹیپ چل پڑتا تھا۔ آپ کے مطلوبہ نمبر سے جواب موصول نہیں ہو رہا ہے۔ میں نے اس نمبر کو فریال کے نام کے ساتھ سیو کر لیا۔

ایسا روز ہی ہو رہا تھا۔ رات کو میں سونے لیٹتا تھا تو دن بھر کے فکر و غم جن کو میں مصروفیات میں ٹال جاتا تھا۔ ذہن

کے نہاں خانوں میں دھکیل کر بند کرتا جاتا تھا۔ ایک ساتھ مجھ پر یلغار کرتے تھے۔ فراغت ملتے ہی ہر سمت سے گھیر لیتے تھے اور میں اپنی تنہائی میں ان سے پناہ مانگتا تھا کہ خدا کے لیے مجھے سکون کی نیند سونے دو۔ میں ساری دنیا کی طرح دن بھر زندگی کے مسائل سے نمٹنے کے بعد آرام کی نیند کا خواہش مند ہوں۔ لیکن سارے مسائل اپنا حل اور ذہن میں دبے ہوئے سوال اپنا جواب مانگتے تھے۔ اس کشمکش میں نیند آنکھوں سے دور رہتی تھی اور میں کروٹیں بدلتا رہتا تھا۔ سوچتا رہتا تھا۔ پھر کہیں آخرِ شب میں یا آغازِ سحر سے پہلے ذہنی تھکن اس انتہا کو پہنچ جاتی تھی کہ دماغ مزید برداشت نہیں کر پاتا تھا اور نیند مجھ پر یوں غالب آتی تھی جیسے جسم پر بے ہوشی طاری ہوتی ہے۔ پھر میں دیر تک سویا پڑا رہتا تھا۔ میری سحر خیزی کی پرانی عادت ختم ہو رہی تھی۔

روز مجھے کوئی نہ کوئی اس وقت جگانے آتا تھا جب کہیں میری ضرورت بالکل ہی ناگزیر ہو جاتی تھی۔ ساڑھے نو بجے رابعہ نے ہی مجھے بیدار کیا۔ بہن ہونے کے ناتے وہ زیادہ منہ چڑھی تھی اور دوسروں کے سامنے بھی اپنے حق کا بے دریغ استعمال کرتی تھی ورنہ یہ ہمت صرف راجا کر سکتا تھا۔ باقی سب لوگ تکلف اور احترام کے باعث ایک حد سے آگے نہیں بڑھتے تھے۔

رابعہ نے مجھے جگانے کے لیے میری ناک میں بتی گھمائی۔ میں ہڑبڑا کے اٹھا تو وہ ہنسی۔ ''کیا خواب میں ڈر گئے کزن؟''

میں نے کہا۔ ''ہاں۔ تمہیں دیکھ لیا تھا کہ میک اپ کے بغیر دلہنوں والا سرخ جوڑا پہن رکھا ہے۔ اور وہ بیچارا...''

اس نے میری بات کاٹ دی۔ ''ضرور تم نے اپنی کسی ہونے والی گھر والی کو دیکھا ہوگا۔ کوئی پری تو قابو آئی نہیں۔ جو ملتی ہے چھوڑ کے بھاگ جاتی ہے۔ اب چڑیل ہی آئے گی خواب میں۔ چلو نکلو باہر۔ آخر یہ معاملہ کیا ہے کزن۔ کیوں پڑے رہتے ہو دوپہر تک۔ کوئی نشہ تو نہیں کرنے لگے ہو خدانخواستہ۔''

میں نے کہا۔ ''ایک منٹ یہاں بیٹھو بہن۔''

وہ بیٹھ گئی۔ ''کوئی خاص بات ہے؟''

''زیادہ بننے کی ضرورت نہیں۔ خود بھیجا تھا منت سماجت سے انہیں۔ ایک کو دکھائی کچھ نہیں دیتا۔ دوسری عقل کی اندھی ہے۔''

وہ غرائی۔ ''اچھا۔ اچھا۔ یہ ہے تمہاری رائے۔ کزن...''

میں نے کہا۔ ''جھوٹ کیا ہے اس میں۔ اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی دے رہی ہیں کالی دیوی کے چرنوں میں۔''

اس نے جھوٹ موٹ کے غصے میں مجھے تکیے سے ما[illegible] شروع کیا۔ ''میں کالی دیوی ہوں؟''

میں نے اس سے تکیہ چھین لیا۔ ''کیا بنے گا اس [illegible] جارے کا۔ میں نے تو بتا دیا تھا کہ رابعہ پر دورے پڑتے [illegible] پاگل پن کے۔ اچھا، خیر مذاق ختم۔ انہوں نے مجھ سے رشتہ مانگا تیرا۔ کل رات۔''

''پھر۔ تم نے کیا کہا؟'' وہ مجھے خاموش دیکھ کر بولی۔

''میں نے کہا۔ مجھے سوچنے دیں اور اپنا خیال [illegible] بتا دیا کہ اگر یہ شادی ہوگئی تو چلے گی نہیں۔ یہ آپ بھی سو[illegible] لیں۔''

''جھوٹ بکتے ہو تم۔ ایسا نہیں کہا ہوگا تم نے۔''

میں سیریس رہا۔ ''میں نے کہا کہ رابعہ کو میں پیدائش سے جانتا ہوں۔ اس کے اور میرے والدین کی بڑی خواہش تھی۔ بچپن میں ہماری منگنی بھی کر دی گئی تھی۔ لیکن اس معاملے میں اور یہ واحد معاملہ تھا۔ جس میں، میں نے اپنے والدین کی بات بھی نہیں مانی۔ ایک اور کزن تھا رابعہ کا۔ رابعہ اسے پسند کرتی تھی۔ بیوقوف ہونے کے باوجود اس نے بھی انکار کر دیا۔''

رابعہ کا رنگ فق ہوگیا۔ ''تم ایسا نہیں کہہ سکتے۔''

میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''کیوں؟ اس میں غلط کیا تھا؟'' اور معاملہ ذمے داری کا ہو تو بات صاف کرنی چاہیے۔ کل کو خدانخواستہ...''

وہ چلائی۔ ''کیا خدانخواستہ...''

میں نے کہا۔ ''کزن۔ کیا شہزاد کو خرم کے معاملے کا علم ہے؟''

اس کی آواز گلوگیر ہوگئی۔ ''اگر نہیں ہے تو تم بتا دو۔ جو [illegible] ہے سب بتا دو۔ اس سے زیادہ بتا دو۔''

میں نے اپنا سر جھکا لیا۔ ''سوری کزن۔ میں نے وہی کیا جو میرے ضمیر کے مطابق... درست تھا۔ انہیں سچ بتا دیا۔ آگے ان کی مرضی۔ اس وقت تو وہ منہ لٹکا کے چلی گئیں۔ کہنے لگیں کہ... خیر... تمہیں شہزاد خود بتا دے گا اور تمہیں میرے جھوٹ سچ سے کیا۔ تم دونوں عاقل بالغ ہو۔ جو چاہو کرو [illegible] میں کیسے آنکھ بند کر کے ہاں کہہ دیتا۔ ابا جی آئیں گے [illegible] کر دینا میری شکایت۔''

وہ ایک دم اٹھی ہی تھی کہ میں نے پکڑ لیا۔ ''چھوڑو مجھے۔ تم ایسا کمینہ پن کرو گے۔ مجھے اندازہ نہیں تھا۔'' وہ غصے میں آگ بگولا ہو رہی تھی۔

مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔ میں نے اسے پکڑ کے پیار سے اس کے سر کو چوما۔ ''ہے نا واقعی پاگل۔ اتنی آسانی سے مان لی یہ بات حالانکہ بچپن سے تو جانتی ہے مجھے۔ میں ایسی بات کر سکتا تھا بے وقوف۔ وہ بھی تیرے بارے میں؟''

وہ خفت زدہ نظروں سے مجھے دیکھتی اور روتی رہی۔ ''تم واقعی بڑے کمینے ہو کزن۔ کیوں رلایا مجھے؟''

میں نے ہنس کے کہا۔ ''یار آخر تیرا ہی کزن ہوں۔ چل خوش ہو جا۔ اللہ سارے زمانے کی خوشیاں دے تم دونوں کو۔ بس ابا جی آ جائیں پھر تم دونوں کو باندھتے ہیں شادی کے بندھن میں۔ چٹ منگنی پٹ بیاہ۔ مگر ایک بات بتا۔ کیا صبح سے اب تک اس الو کے پٹھے شہزاد... نے تجھے کچھ نہیں بتایا۔''

وہ شرما کے مسکرائی۔ ''ان سے میری ملاقات ہی کہاں ہوئی۔ لاہور چلے گئے صبح صبح... اپیل دائر کرنے۔''

میں نے قہقہہ لگایا۔ ''ابھی سے نام لینا چھوڑ دیا۔ دلہنیا... وہ... ان سے...'' وہ باہر نکل گئی۔

باہر افراتفری اپنے عروج پر تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ خلائی مخلوق نے ست بدھائی پر حملہ کر دیا ہے۔ لوگ اِدھر سے اُدھر بھاگتے نظر آ رہے تھے۔ چلا چلا کے ایک دوسرے سے کچھ کہہ رہے تھے۔ حویلی کے احاطے میں دو ٹرک کھڑے ہوئے تھے اور ان سے سامان اتار کے آگے پہنچایا جا رہا تھا۔ یہ سب اگلے دن کی تقریب کا اہتمام تھا۔ ویسے تو سب ہی اس انتظامی ہنگامے میں شریک تھے مگر غنی قدرتی طور پر سب سے زیادہ حواس باختہ تھا۔

جب میں نے اس سے راجا کے بارے میں پوچھا تو وہ ایسے ہکا بکا کھڑا آنکھیں گھماتا رہا جیسے میرا سوال روسی زبان میں تھا۔ ''راجا صاحب؟'' اس نے سر کھجاتے ہوئے ایک طرف اشارا کیا پھر دوسری طرف۔ ''اِدھر ہوں گے۔ نہیں۔ شاید اُدھر۔''

میں نے راجا کو اسکول کی سائٹ پر پکڑ لیا۔ ''یار مجھے ایک بات کرنی تھی تجھ سے۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''ہاں بول۔'' اور پھر کسی کو ہدایات دینے میں مصروف ہوگیا۔ کچھ دیر بعد اسے میرا خیال آیا۔ ''بول نا فیکے پتر۔''

میں نے چلا کے کہا۔ ''کیا اکیلا بولتا رہوں؟ تجھے فرصت ہے سننے کی۔''

اس نے معذرت کی۔ ''یار بس آج کا دن ہے۔ تو دیکھ رہا ہے نا کام ابھی کتنا پھیلا ہوا ہے اور اوپر سے سارے فون مجھے آ رہے ہیں۔ تیری موج ہے۔ اب سو کے اٹھا ہے نواب کے گھوڑے۔''

میں اسے پکڑ کے اور کھینچ کے لے گیا۔ ہم اسپتال کے ایک کمرے میں گئے۔ وہاں کچھ لوگ ایکس رے مشین نصب کرنے کے بعد اس کی کارکردگی چیک کر رہے تھے۔ دوسرے میں لیبارٹری تھی اور ایک نوجوان میز پر رکھی شیشیوں کو الماری میں ترتیب سے رکھتا جا رہا تھا۔ ابتدائی طور پر لیبارٹری میں بنیادی ٹیسٹ کرنے کی سہولت فراہم کی گئی تھی۔ بلڈ، اسٹول اور شوگر، حمل کے اور ہیپاٹائٹس یا ٹی بی جیسی عام بیماری کے ٹیسٹ۔ ڈاکٹر شہباز کے کمرے میں صرف ایک الیکٹریشن تھا۔ اسے میں نے باہر نکال دیا۔ پھر میں نے راجا کو فریال کے فون کے بارے میں بتایا۔

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ''پہلے مجھے بتا دے کہیں تو نے رقابت میں سچ مچ تو اسے نہیں مروا دیا۔''

میں نے کہا۔ ''رانا سے کچھ بعید نہیں۔ دوستی گانٹھ کے اسے گھر بلایا اور مار کے اِدھر کہیں دفنا دیا ہو۔''

''میں سلطان کو اتنا بے وقوف ماننے کو تیار نہیں۔''

''یار عقلمند آدمی بھی چکر میں آ جاتا ہے۔ اس کی عقل فوراً گھاس چرنے چلی جاتی ہے۔ اسے اپنے سامنے کھائی نظر نہیں آتی۔ صحیح مشورے کی طرف سے اس کے کان بند ہو جاتے ہیں۔''

راجا نے ہمدردی سے کہا۔ ''ہاں۔ تجھے کئی بار کا تجربہ ہے۔ لیکن بات ہے سلطان کی۔ اس کی رانا سے دوستی ہو سکتی ہے۔ دونوں کی دشمنی کے اسباب جدا ہیں۔ ایک کی وجہ ہے جذباتی دوسرے کی سیاسی۔ اور تجھے نقصان پہنچانے کے لیے یہ اتحاد ناممکن نہیں۔ مگر رانا اسے ڈگڈگی بجا کے بچہ جمورا بنا لے اور اس سے کچھ بھی کرا سکے۔ یہ مشکل ہے۔''

''کیوں مشکل ہے؟''

''میں بتاتا ہوں۔ پہلی بات تو یہ کہ فی زمانہ چوہدری سلطان اور تیرے درمیان دشمنی کا احساس تو ہے۔ لیکن وہ جذبہ اور جوش نہیں جو رقابت کی وجہ سے تھا۔ وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا۔ فریال اسے واپس مل گئی۔ وہ خود کو فاتح اور تجھے شکست خوردہ سمجھتا ہے۔ اب وہ تیرے خلاف کوئی کارروائی کیوں کرے؟ یہ اس کے نزدیک تو وقت کا زیاں ہے۔''

''تو بہت سمجھتا ہے اس کے جذبات کو۔''

راجا نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''دوسری بات۔ رانا اس کو پٹی پڑھائے کہ پہلے رقیق سے دوستی کرو۔ تعلق بڑھاؤ۔

اس کے ساتھ کاروباری شریک بن جاؤ اور پھر مناسب وقت پر اسے تباہ کر دو۔ رانا ایسے مشورے کو ہرگز قبول نہیں کرے گا۔ کسی پاگل سے کہو کہ کانٹے دار درخت پر چڑھو۔ یا ایک شاخ پر جا کے بیٹھو اور کلہاڑے سے اسی شاخ کو کاٹنے لگو' تو وہ بھی کہے گا کہ کیا مجھے پاگل سمجھ رکھا ہے۔"

"یعنی فریال کا شک بے سبب ہے؟"

"شک درست ہے۔ اسباب اس نے غلط بتائے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ رانا نے اس سے تعلقات بڑھائے، خود فائدہ اٹھانے کے لیے۔ سلطان نے اس میں اپنا فائدہ دیکھا۔ وہ اتنا بڑا جاگیردار، اسمبلی کا ممبر اور دولت مند شخص ہے۔ عقل سے کون کام لیتا ہے؟ ایک وڈیرا یا ایک کاروباری شخص، تاجر، صنعتکار؟"

میں نے کہا۔ "جواب سے مطلع فرمایئے۔"

وہ بولا۔ "ایک کے لیے مونچھ اور شملے کا اونچا رہنا ہی اہم ہے۔ دوسرے کے لیے صرف فائدہ۔ رانا بھی سلطان کو بانس پر نہیں چڑھا سکتا۔ وہ بزنس مین ہے۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ صیاد خود اپنے دام میں آجائے۔ سلطان سے فائدے کے لیے تعلق قائم کیا۔ رانا کو کسی فلم میں سرمایہ کاری کی طرف راغب کیا۔ رانا جیسے لوگ آسانی سے پھنس جاتے ہیں۔ پھنسانے کے لیے سلطان کے پاس حسن و شباب کے جال ہمیشہ اسٹاک میں موجود رہتے ہیں۔ رانا صاحب پھنس گئے۔ سلطان نے اسے اپنی کامیابی سمجھ لیا۔ رانا سے تعلق بڑھا کے دوستی میں یا کاروباری معاہدے میں بدل دیا ہوگا اور سلطان خوش کہ اس نے مرغا پھانس لیا۔ رانا مطمئن کہ قربانی کا بکرا مل گیا۔ سلطان کا بھروسے میں مارا جانا عین ممکن ہے۔ رانا نے اسے مدعو کیا ایسے کہ کسی کو پتا نہ چلا اور مار کے غائب کردیا۔ اب دنیا اسے ڈھونڈتی پھرے۔ رانا کی پوزیشن قانونی طور پر محفوظ ہوگئی۔ یقیناً کسی نے سلطان کو رانا کے ساتھ جاتے دیکھا بھی نہیں ہوگا ورنہ سب سے پہلے اسی سے پوچھا جاتا۔"

"بات تیری ایک سو ایک فیصد درست اور میری سمجھ میں آگئی۔ لیکن ہم کیا کریں؟"

"ہم کیا کر سکتے ہیں نیکے پتر۔ فرض کر ایسا ہی ہوا کہ رانا نے سلطان کو مار کے ہماری زمین پر کہیں گاڑ دیا۔ تو ہم اپنی ساری زمین کا ایکس رے کیسے کریں؟ اس کے علاوہ رانا چپ کیوں بیٹھا ہے؟ پولیس کو اطلاع کیوں نہیں دیتا کہ مقتول فلاں جگہ دفن ہے۔ قاتل فلاں ہے۔ وجہ قتل یہ ہے۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ باقی کام پولیس کرے گی۔ اطلاع کسی مخبر کے ذریعے یا گمنام رہ کے بھی دی جاسکتی ہے۔ خود رانا کا فون کرنا ضروری نہیں۔"

میں نے کہا۔ "کیا رانا موقعے کا منتظر ہے۔"

"یہ ہوسکتا ہے۔ بالکل ہوسکتا ہے۔ لوہے کو اس وقت چوٹ لگاؤ جب وہ گرم ہو۔"

"یہ لوہا کب گرم ہوگا؟" میں نے سوچ کے کہا۔

"کل ایسا ہوسکتا ہے۔ لیکن گھبرانے کی بات نہیں۔ ابھی جو کچھ ہے ہمارا مفروضہ ہے۔"

"سلطان کا غائب ہونا مفروضہ نہیں ہے۔ تھانے میں اس کی رپورٹ درج کرائی جاچکی ہے۔ فریال سے تفتیش ہوئی ہے۔ میری باری کل کی آج بھی آسکتی ہے۔ میں اس کا رقیبِ روسیاہ ہوں زمانہ جانتا ہے۔"

"دیکھ جو ہونا ہے وہ ہوگا اور ہم بھگت لیں گے۔ تفتیش بھی ضرور ہوگی اور حقائق بھی سامنے آئیں گے۔ کل کا دن خیریت سے گزر جائے پھر ہم اپنے اندیشے کی بنیاد پر ضمانت قبل از گرفتاری بھی لے سکتے ہیں۔ کل تک پولیس بھی تجھ پر ہاتھ ڈالنے کی ہمت نہیں کرے گی۔ میرا مطلب ہے ابھی کوئی تفتیش کرنے بھی نہیں آئے گا۔ پرسوں دیکھ لیں گے۔"

راجا کی ذہانت اور حاضر دماغی میرا بہت بڑا سہارا تھی۔ وہ بالکل غیر جذباتی انداز میں سوچتا تھا اور پریشان ہونا جانتا ہی نہیں تھا۔ جتنا عرصہ میں باہر رہ کے پڑھتا رہا اور امریکا برطانیہ کے ماحول میں شہزادہ بن کے عیش کرتا رہا اس نے پاکستان میں رہ کے صحافت کی اور اس خارزار میں زندہ رہنے کے سب راستوں پر چل کے دیکھا۔ چور ڈاکو سے سیاست داں تک اور کلرک سے افسرِ اعلیٰ تک سب کیا کرتے ہیں، کیا نہیں کرتے اور کیسے جرم کر کے بھی مجرم نہیں کہلاتے۔ قانون سے بچنے کے کتنے چور راستے ہیں اور بند دروازوں سے نکلنے کے کتنے طریقے۔ یہ سب اسے معلوم تھا جو میں نہیں جانتا تھا۔

فریال نے مجھے بروقت خبردار کر کے بڑی نیکی کمائی تھی لیکن اس میں تجدید تعلق کی خواہش یا کوشش کا ایک فیصد بھی دخل نہ تھا۔ وہ اپنے لیے پریشان تھی اور میری وجہ سے تھی۔ نہ میں اس کے لیے کچھ کرسکتا تھا اور نہ وہ میرے لیے۔ گزشتہ رات اس سے گفتگو کا سلسلہ یکلخت منقطع ہوگیا تھا اور پھر بحال نہ ہوسکا تھا۔ دن میں کئی بار میں نے اسی نمبر پر...... بات کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوسکا۔

نور جہاں کے بارے میں اس کے آخری سوال کا موقع میں نے خود ہی فراہم کر دیا تھا۔ نہ میں اسے نور جہاں سمجھتا اور نہ اسے کچھ معلوم ہوتا۔ نور جہاں ایک اذیت ناک احساس کی طرح میرے خیالوں میں ہمہ وقت موجود تھی۔ مصروفیت کے علاوہ دوسری فکروں میں یہ اذیت اسی طرح دب جاتی تھی جیسے گولی کھانے سے درد وقتی طور پر ختم ہوجاتا ہے۔

شام تک معاملات اطمینان بخش حد تک ہمارے قابو میں آچکے تھے۔ تیاری مکمل ہوگئی تھی اور انتظامات کا جائزہ لینے والے سرکاری اہلکار بھی مطمئن تھے۔ وہ گرد و نواح میں دور دور تک نظر نہ آنے والی سیکیورٹی کا جال بچھا چکے تھے۔

یہ ناممکن تھا کہ اس تمام ہنگامہ خیزی اور ہلچل کی خبر دور دور تک نہ جاتی۔ اپنی دانست میں ہم بھی غلط بیانی سے مطمئن تھے کہ لوگ اسے سچ مان رہے ہیں اور عمران خان کے استقبال کے لیے بڑے پُرجوش ہیں مگر اصل بات اتنے لوگوں کو معلوم تھی کہ افواہ بن کے پھیل رہی تھی۔ رانا کے بارے میں ہم کسی خوش فہمی کا شکار نہیں رہ سکتے تھے کہ اسے چیف منسٹر کے "اچانک" ہونے والے دورے کی خبر مصدقہ ذرائع سے نہیں ملی ہوگی۔

افواہ خود حویلی کے اندر۔ خواتین تک پہنچ گئی تھی۔ شام کو ہم پکڑے گئے۔ دن بھر کی بھاگ دوڑ میں ہم سب کو کھانے کی میز پر بھی ایک ساتھ بیٹھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ جسے جب موقع ملا اس نے کھالیا۔ شام کو خواتین نے ایک سازش کے تحت ہم دونوں کو چائے پر بلالیا۔ شہناز نے راجا سے کہا کہ ضروری کام ہے۔ رابعہ نے مجھے پہلے ہی روک لیا تھا کہ "ایسی بھی کیا افراتفری۔ آرام سے چائے پی لو۔"

جب ہم چائے پر اکٹھے ہوئے تو پتا چلا کہ ہم تو عدالت میں ہیں اور مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے ہیں۔ مدعی تینوں خواتین تھیں جو سخت خفا تھیں کہ ہم نے ان سے جھوٹ بولا۔ انہیں بے وقوف بنایا۔ ان پر اعتماد نہیں کیا۔

راجا نے فوراً اعترافِ جرم کرلیا۔ "یہ واقعی جھوٹ تھا۔ عمران خان نہیں چیف منسٹر آرہا ہے۔ لیکن ہم مجبور تھے۔"

میں نے کہا۔ "اس کے علاوہ۔ جھوٹ کون نہیں بولتا۔"

رابعہ نے کہا۔ "میں نے کبھی تم سے جھوٹ نہیں بولا۔"

"یہ بھی تو جھوٹ ہے۔" میں نے کہا۔

شہناز نے کہا۔ "ہم سے کیا خطرہ تھا آخر۔ کیا ہم دوسروں کو بتا دیتے؟"

ان سب کو غصہ کم تھا مایوسی زیادہ تھی۔ چیف منسٹر کی حیثیت کچھ بھی ہو۔ وہ عمران خان کی طرح ان کا ہیرو تو نہیں ہوسکتا۔ انہوں نے عدم اعتماد کے ایشو کو ناراضی کی وجہ بنا دیا اور پھر رات تک بڑی سخت سرد جنگ جاری رہی۔ لیکن رات ہونے سے پہلے ایک دھماکا ہوگیا جو کسی حد تک متوقع تھا۔ غنی کے ذرائع نے تیسرے پہر ہی یہ اطلاع فراہم کردی تھی کہ رانا پیلس میں چیف منسٹر کی آمد کی خبر، صبح موصول ہوگئی تھی اور اب وہاں بڑی کھلبلی مچی ہوئی ہے۔ اس کے کچھ دیر بعد ہی مجھے ڈی آئی جی نے فون کیا۔

میں نے کہا۔ "حضور کوتوالِ شہر۔ آج میں فون کا نہیں آپ کی بقلم خود تشریف آوری کا منتظر تھا۔"

اس نے جواب میں کہا۔ "قبلہ نواب الملک ست بدھائی' میں نے سوچا کہ خود کو ان تمام امور سے دور ہی رکھوں۔ چیف منسٹر کی سیکیورٹی میری ذمے داری ہے۔ وہ میں پوری کررہا ہوں۔"

"کہیے اس وقت کیسے یاد کیا۔"

وہ بولا۔ "ایک بریکنگ نیوز تھی آپ کے لیے۔ کچھ دیر پہلے مجھے رانا نے فون کر کے کہا کہ وہ آپ سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "آئی ایم سوری۔ اس وقت میں نہیں آسکتا۔ مجھے بہانے کرنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے اس سے ملاقات کا بھی کوئی شوق نہیں۔"

"رفیق صاحب۔ ملاقات کے لیے وہ آپ کے پاس آنا چاہتا ہے۔ ست بدھائی کی حویلی میں۔"

مجھے سخت حیرانی ہوئی۔ "یہ میں کیا سن رہا ہوں۔ اس نے کوئی وجہ بھی بتائی ہوگی کہ وہ اپنی خودی کے پرچم کو کیوں سرنگوں کررہا ہے۔ کیا یہ حاکمِ اعلیٰ کا حکم ہے کہ وہ اپنی مونچھ نیچی کرلے۔"

"دیکھیے... میں نہیں سمجھتا کہ کوئی بھی اسے یہ حکم دے سکتا ہے۔ جو اس نے کہا یہ ہے کہ وہ تعاون اور خیر سگالی کے جذبات..."

مجھے بے اختیار ہنسی آئی۔ "سر۔ کیا وزیراعلیٰ کے دورے کی خبر سے رانا پر پاگل پن کا دورہ پڑ گیا ہے؟"

"گستاخی معاف نواب رفیق۔ آپ ابھی سیاست سیکھ رہے ہیں۔ طفلِ مکتب ہیں رانا کے مقابلے میں۔ گدھے کو نظریہ ضرورت کے تحت باپ بنانے کا اصول پرانا ہے۔ بے شک اس کے ست بدھائی آنے کی یہی وجہ ہوگی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ آپ کو مطلع کروں اور قائل بھی، کہ رانا نے دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے تو آپ اسے جھٹک کر خود کو اناڑی ثابت نہ کریں۔ بلکہ اسے ویلکم کر کے اپنے کھلاڑی ہونے کا ثبوت دیں۔"

''آپ چاہتے ہیں کہ میں اس کی بات مان لوں۔ جب میں پُرامن بقائے باہمی کی درخواست لے کر اس کے پاس گیا تھا؟''

''نواب صاحب۔ میری آپ سے درخواست ہے کہ پرانی باتیں بھول جائیں۔ دیر آید درست آید۔''

میں نے برہمی سے کہا۔ ''وہ مجھے اور آپ کو بے وقوف بنانا چاہتا ہے ڈی آئی جی صاحب!''

''مجھے معلوم ہے۔ کیا حرج ہے یہ سب جانتے ہوئے بھی مصلحت کے تحت خاموش رہنے میں؟ سمجھداری کا تقاضا ہے کہ آپ مسکرا کے اس کا استقبال کریں۔ اسے خوشدلی سے چائے کی ایک پیالی پیش کریں۔ آپ کی وضعداری کا تقاضا ہے کہ گھر آئے دشمن کو بھی مہمان جانیں اور اسے عزت دیں۔''

''آپ مجھے منافقت کا سبق پڑھا رہے ہیں۔''

''مصالحت، سیاست، منافقت، ضرورت، کیا فرق پڑتا ہے اس سے کہ آپ اپنے رویّے پر کون سا لیبل لگاتے ہیں۔ کل کا ایونٹ آپ کے لیے انتہائی اہم ہے۔ رانا نے اس کی اہمیت کو سمجھ لیا ہے تو یہ آپ کی بہت بڑی کامیابی ہے۔ اس موقع کو ضائع مت کریں۔''

''اوکے... آپ اس کو کہہ دیں کہ جم جم آؤ۔ چشمِ ماروشن دلِ ماشاد۔'' میں نے کہا۔

ڈی آئی جی کی بات میری سمجھ میں آگئی تھی۔ کل کی تقریب کی اہمیت کا صحیح اندازہ مجھے اب ہوا تھا۔ یکلخت میرا قد اتنا اونچا ہوگیا تھا کہ مجھے کمتر اور حقیر سمجھ کے حقارت سے دیکھنے والے مجھے جھک کر سلام کرنے پر مجبور تھے۔ رانا کو خوب اندازہ ہوگا کہ اس کے خود چل کر میرے گھر آنے کو اس کی رعایا کس نظر سے دیکھے گی مگر عزت اور بے عزتی رانا جیسے لوگوں کے لیے ایسے الفاظ تھے جو وقت کے ساتھ مطلب بدل کے استعمال کیے جاسکتے تھے۔

میں نے راجا کو مطلع کیا اور چند منٹ میں یہ خبر حویلی میں ایک ہنگامہ خیز اطلاع بن گئی۔ جس نے سنی اس نے پہلے اسے مذاق اور پھر افواہ سمجھ کے یقین کرنے سے انکار کیا۔ دوسرا ردِعمل شدید جذباتی برہمی کا تھا۔ خواتین نے مطالبہ کیا کہ رانا کو صاف انکار کردیا جائے۔ اسے بتا دیا جائے کہ اِدھر کا رخ بھی کیا تو اتنے جوتے پڑیں گے... یہاں سے منہ کالا کرکے اور گدھے پر بٹھا کے واپس کریں گے... میں نے انہیں ٹھنڈا کیا۔

میں نے کہا۔ ''معزز خواتین۔ پلیز جذباتی نہ ہوں۔ ٹھنڈا پانی پی کے دس بار گہری لمبی سانس لیں۔''

راجا بولا۔ ''یا آنکھیں بند کرکے دل ہی دل میں کہیں۔ مجھے عقل سے کام لینا چاہیے۔ بے شک وہ میرے پاس نہیں ہے۔''

کسی ردِعمل سے پہلے میں نے کہا۔ ''یہ غصے کی نہیں خوشی کی بات ہے۔''

''تمہارے لیے ہوگی'' رابعہ نے تنک کے کہا۔

''مائی ڈیر کزن... ذرا سوچو، غور فرماؤ، ہمارا سب سے بڑا دشمن خود چل کے ہمارے دروازے پر آرہا ہے۔ یہ اس کا اعترافِ شکست نہیں تو اور کیا ہے کہ اس نے پُرامن بقائے باہمی اور خیرسگالی کی بات کی ہے۔''

شہناز نے افسوس سے سر ہلایا۔ ''وہ ایک زہریلا سانپ ہے۔'' لیلیٰ بھابی نے فوراً تائید کی۔ ''ڈنک مارنے والا بچھو ہے۔''

میں نے کہا۔ ''کیا ہم یہ بات نہیں سمجھتے اب ہم ایسے اناڑی ہیں کہ رانا کی باتوں میں آجائیں گے۔''

''وہ آپ لوگوں کو بے وقوف بنا رہا ہے۔'' رابعہ نے کہا۔ ''کیونکہ وہ سمجھتا ہے آپ میں یہ صلاحیت ہے۔''

''دیکھو کزن۔ ہمارے لیے کل کی تقریب بہت اہم ہے۔ اس کی کامیابی پر ہمارے مستقبل کے ہر پلان کی کامیابی کا دارومدار ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ اس میں کسی قسم کی بدمزگی بدنظمی یا انتشار ہو۔ خطرہ صرف رانا کی طرف سے تھا۔ اگر وہ خود ہمارے ساتھ چیف منسٹر کا استقبال کرنے والوں میں شامل ہونا چاہتا ہے تو سوچو یہ کامیابی کس کی ہے۔''

''وہ اس کا سارا کریڈٹ لے جائے گا۔'' شہناز نے کہا۔

''وہ کیسے؟ اسپتال ہمارا، اسکول ہمارا، تقریب ہماری۔ وہ مجبور ہوگیا ہے اپنی انا کو قربان کرکے ہمارا ساتھ دینے پر۔ حالانکہ اس مجبوری میں بڑی بے عزتی ہے۔ خود اس کی نظر میں۔ لوگوں کی نظر میں۔''

راجا نے بات کو آگے بڑھایا۔ ''ابھی وہ مونچھ نیچی کرکے آئے گا اور ہم مونچھوں پر تاؤ دے کر کہیں گے کہ۔ گھر آیا میرا پردیسی۔ پیاس بجھی میری اکھیوں کی۔'' راجا نے اپنی بے سری آواز میں گایا۔

خواتین کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ رابعہ ہنسی کو نہ روک سکی۔ ان کا غصہ ختم ہوا تو گویا مخالفت بھی ختم ہوگئی۔ اب بڑی عجلت میں رانا کے استقبال کی پالیسی پر غور کیا گیا۔ ان کا استقبال غنی کرے گا۔ راجا ان کو مہمان خانے میں لائے گا۔ پھر چائے پیش کی جائے گی۔ ہم ڈپلومیسی سے کام لیتے ہوئے

رانا کو ویلکم کہیں گے۔ اور ماضی کا کوئی حوالہ نہ مستقبل کے لیے کوئی وعدہ۔

ابھی یہ بحث جاری تھی کہ ایک بار پھر ڈی آئی جی صاحب کا فون موصول ہوا۔ ''مجھے صرف یہ بتانا تھا کہ وہ آٹھ بجے آئیں گے۔''

''ان کے ساتھ کتنے لوگ ہوں گے؟'' میں نے پوچھا۔

''کوئی نہیں... سوائے ایک ڈرائیور کے۔ اسلحہ کسی کے پاس بھی نہیں ہوگا۔''

''آپ ضمانت دے رہے ہیں؟''

''یہی سمجھ لیں۔ پلیز ان کے ساتھ عام ملاقاتی جیسا سلوک نہ کریں۔ مثلاً ان کی تلاشی نہ لی جائے۔''

''آپ مطمئن رہیں۔ ہم اپنی وضعداری پر قائم رہیں گے۔ کسی کم ظرفی کا مظاہرہ نہیں کریں گے۔''

''ان کے مسلح محافظ دوسری گاڑی میں ہوں گے لیکن یہ گاڑی باہر ہی رہے گی۔''

مجھے یہ شک تھا کہ رانا کو اس ملاقات پر آمادہ کرنے میں اگر خود ڈی آئی جی کی کوشش کا دخل نہیں تو پھر اوپر سے یہ اشارہ ملا ہوگا کہ ابھی وقت ہے۔ اگر وہ سیاسی مصلحت سے کام لے تو عین وقت پر خفت اٹھانے سے بچ جائے گا۔ اور یہ بات رانا کی سمجھ میں آگئی تھی۔

رانا ٹھیک آٹھ بجے آیا۔ پروگرام کے مطابق اس کی گاڑی کو گیٹ سے اندر آنے دیا گیا۔ گیٹ پر موجود گارڈز نے اسے سیلوٹ بھی کیا اور جب وہ برآمدے کے قریب اترا تو خود راجا نے آگے بڑھ کر اس کا استقبال کیا اور اسے مہمان خانے میں لے گیا جہاں میں خود موجود تھا۔

میں نے آگے جاکے رانا سے ہاتھ ملایا۔ ''زہے نصیب۔ آپ نے ہمیں عزت بخشی۔''

وہ مسکرایا۔ ''آپ کیسے ہیں نواب صاحب؟''

یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے مجھے نواب کا نطفہ کہنے کے بجائے نواب کہہ کے مخاطب کیا تھا۔ میں نے کہا۔ ''اللہ کا کرم ہے۔ آپ کی دعا ہے۔''

راجا نے پوچھا۔ ''رانا صاحب۔ طعام سے قبل آپ کیا لیں گے؟''

اس نے کہا۔ ''دیکھیے۔ میں صرف چائے پیوں گا، چینی کے بغیر۔ کھانا نہیں کھاؤں گا۔ مجھے جلد واپس جانا ہے۔ رانا پیلس میں کسی کو مدعو کیا ہے۔''

''جیسی آپ کی مرضی۔'' میں نے کہا۔

''دوسری بات۔ میں نواب صاحب سے اکیلے میں بات کروں گا۔ ون ٹو ون۔'' اس نے دستار کو جما کے کہا۔

میں نے راجا کی طرف دیکھا تو اس نے آنکھ کے اشارے سے رضامندی ظاہر کی اور باہر چلا گیا۔ میرے نزدیک یہ اپنے فطری احساسِ برتری کو مجروح ہونے سے بچانے کی آخری کوشش تھی کہ اسے صرف اپنے ہم منصب سے بات کرنی ہے۔ مجھے اس نے نواب مان لیا ہے مگر راجا صرف نام کا راجا ہے۔

حسبِ توقع اس نے کہنا شروع کیا۔ ''نواب صاحب! میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس علاقے میں ہم دونوں عزت دار ہیں۔ لوگوں کی نظر میں ہماری عزت اسی صورت میں برقرار رہ سکتی ہے جب ہم بھی ایک دوسرے کو عزت دیں۔''

میں نے کہا۔ ''اس میں تو کوئی شک کی بات نہیں۔''

''اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے ماضی کے اختلافات کو ختم کردیں اور ایک ہوجائیں۔ اس سے ہماری طاقت میں اضافہ ہوگا۔ اگر ہم مل کے اس علاقے کی ترقی کے لیے کام کریں...''

جب وہ بول رہا تھا تو مجھے دل ہی دل میں ہنسی آرہی تھی۔ وقت نے رانا کو کہاں لاکھڑا کیا تھا۔ مجھے ایک لطیفہ یاد آیا۔ جنگل کے بادشاہ کو ایک پنجرے میں جکڑ کے لایا گیا تو وہ سخت مشتعل تھا۔ جب اسے کھانے کے لیے گھاس دی گئی تو وہ غصے میں بہت دھاڑا کہ میں اپنی مرضی سے شکار کرکے گوشت کھانے والا گھاس کیسے کھا سکتا ہوں۔ اسے کہا گیا کہ گوشت ملے گا لیکن پہلے گدھے کی آواز نکالو۔ وہ مزید طیش میں آیا اور بھوکا رہنے کو ترجیح دی۔ شام کو پھر یہی ہوا۔ شیر نے گدھے کی بولی بولنے سے انکار کردیا لیکن کب تک۔ تیسرے دن بھوک نے وہ حال کردیا کہ جنگل کا بادشاہ گدھے کی آواز میں ڈھینچوں ڈھینچوں کرنے لگا۔

کچھ ایسا ہی رانا کے ساتھ ہو رہا تھا۔ جو کچھ وہ بول رہا تھا مجبوری اس سے بلوا رہی تھی۔ یہ اس کی اپنی آواز نہیں تھی۔ چیف منسٹر ست بدحالی آرہا تھا۔ وہ رانا نگر جاتا اور مجھے رانا پیلس میں حاضری دینی پڑتی تو میرا استقبال کتنی مختلف انداز میں ہوتا۔ شاید اس کا منشی یا گارڈ مجھ سے کہتا کہ آگئے تم نواب کے نطفے۔ نکل گئی ساری اکڑفوں۔

رانا نے کہا۔ ''پھر کیا خیال ہے نواب صاحب!''

میں چونکا۔ ''جی... کس بارے میں؟''

اس نے مسکرا کے کہا۔ ''ہم ایک ہوسکتے ہیں۔ آپ کی عزت ہماری عزت بن جائے اور ہماری عزت آپ کی۔''

میں کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ چائے آگئی۔ اسے ایک پیالی پیش کرنے کے بعد میں نے کہا۔ ''یہ تو میرے دل کی بات ہوگی۔''

''یعنی آپ بھی چاہتے ہیں کہ دونوں خاندان ایک ہوجائیں۔'' وہ بولا

میں چونک پڑا۔ ''جی؟ میں آپ کی بات کا مطلب نہیں سمجھا۔''

''نواب صاحب۔ ویسے تو آج تک ہمارے رشتے خاندان سے باہر نہیں ہوئے لیکن یہ ذات برادری کے معاملات کا زمانہ نہیں۔''

میرا دماغ اب گرم ہونے لگا تھا۔ ''آپ کس رشتے کی بات کررہے ہیں رانا صاحب۔''

''میرا ایک ہی بیٹا ہے زوہیب۔ اس کے سوا میں کس رشتے کی بات کرسکتا ہوں۔'' رانا نے کہا۔ ''آپ کی کوئی بیٹی تو ہے نہیں لیکن آپ کی جو رشتے کی بہن ہے۔ رابعہ...''

میرے دماغ میں جیسے آتش فشاں پھٹ گیا۔ چائے کا کپ میرے ہاتھ سے گرتے گرتے بچا۔ میرے لیے یقین کرنا مشکل ہورہا تھا کہ میں نے جو سنا غلط نہیں تھا۔ میں نے رانا کی گردن دبوچ کے اور دھکے دے کر باہر نکالنے کی خواہش پر بڑی مشکل سے قابو پایا۔ اگر میں ہنگامہ کرتا تو صورت حال بہت خراب ہوجاتی۔ جو بات میرے کانوں کے سوا کسی نے نہیں سنی تھی اسے نشر کرنے میں خود میرے لیے بڑی خرابی تھی۔

معلوم نہیں اس وقت کیسے میرے اندر مصلحت اندیشی کا خیال میرے مزاج کے غیظ وغضب پر حاوی آگیا۔ ایک سیاسی چال کی ضرورت نے مجھے کوئی انتہائی قدم اٹھانے سے روک لیا۔ شاید یہ احساس میرے لاشعور میں جڑ پکڑ چکا تھا کہ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی سیاست کے میدان میں قدم رکھ دیا ہے اور اگر مجھے کامیابی حاصل کرنی ہے تو اپنے سیاسی حریف کو سیاسی چالوں سے سیاسی شکست دینا ہوگی۔

مجھے ڈی آئی جی صاحب نے سمجھایا تھا۔ شیدائی صاحب نے کہا تھا۔ اس سے پہلے شامی نے کہا تھا۔ وزیرِ داخلہ صاحب کے انداز برہمی نے سمجھایا تھا۔ چھاپہ مارنے والی انسپکشن ٹیم کے سربراہ نے سمجھایا تھا کہ مجھے سیاست کے اسرار ورموز کو سمجھنا چاہیے۔ جو کچھ میں کررہا ہوں وہ میری نظر میں فلاح وبہبود کے ترقیاتی منصوبے ہیں مگر دوسرے اسے کیا سمجھ رہے ہیں اور کس نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ میں سیاسی عزائم رکھتا ہوں۔

چنانچہ یہ سیاست ہے تو ہے۔

میں نے بڑی منافقت سے مسکرا کے کہا۔ ''رانا صاحب! میں آپ کے خیالات کی قدر کرتا ہوں... لیکن...''

''لیکن کیا...'' اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ ''بس فیصلہ کیجیے۔''

میں نے کہا۔ ''اتنی جلدی بھی کیا ہے...''

''اگر اصولی طور پر آپ متفق ہیں...''

میں نے کہا۔ ''دیکھیے۔ ایک تو میں اکیلا کوئی بھی فیصلہ کرنے کا مجاز نہیں۔''

''یہ فیصلے بڑے کرتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''بالکل اور میرے بڑے والد صاحب ہیں۔ ابھی وہ حج کرکے نہیں لوٹے۔ ان کے آنے کے بعد میں ان سے بات کروں گا۔''

''وہ آپ کی بات سے اختلاف نہیں کریں گے۔ دیکھیے نا اس میں سب کی بہتری ہے۔ دو عزت دار خاندانوں کا ایک ہونا۔''

میں نے کہا۔ ''اس کے علاوہ۔ رابعہ کی مرضی بھی معلوم کرنا ضروری ہے۔''

وہ ہنسا۔ ''کمال کرتے ہیں آپ نواب صاحب۔ ہمارے خاندان میں لڑکیوں کی تقدیر کے فیصلے ان سے پوچھ کے نہیں کیے جاتے۔''

''زمانہ بدل چکا ہے رانا صاحب!''

رانا نے ایک آخری کوشش کی۔ ''آپ کون سا غلط فیصلے کریں گے اگر اس رشتے کو منظور کرلیں۔ کوئی بھی لڑکی ہماری بہو بن کے اپنی قسمت پر ناز کرسکتی ہے۔ زوہیب جیسا گبرو جوان...''

میں نے محسوس کیا کہ وہ ہر صورت میں مجھ سے اقرار سننے کے لیے بے چین ہے۔ اسے صاف انکار بھی خرابی پیدا کرسکتا تھا اور میں چاہتا تھا کہ ابھی کچھ عرصہ وہ اسی آس میں بیٹھا رہے کہ میں اس کے پھیلائے ہوئے جال میں گرفتار ہوجاؤں گا۔ رانا کی نیت کا فتور بہت واضح تھا۔ یہاں لڑکی والوں کو زیردست سمجھا جاتا ہے۔ رابعہ کو بہو بنا کے وہ مجھ پر اپنا دباؤ بڑھانے کی سوچ رہا تھا۔ لڑکی پر ظلم وستم اور طلاق کی دھمکی دے کر اس کے ماں باپ اور بھائیوں سے ہر ناجائز مطالبہ تسلیم کرانے کی گھٹیا سوچ معاشرے پر حاوی ہے۔

افسوس کی بات یہ تھی کہ رانا کی کوئی بیٹی نہیں رہی تھی۔ ایک بیٹی گل تھی جو ہر لحاظ سے اس قابل تھی کہ ہمارے گھرانے کی بہو بنتی تو ہم اس پر فخر کرتے مگر رانا نے خود اسے قتل کرادیا تھا۔ اس کی بیٹی ہوتی تو پھر یہ کہتا کہ رانا صاحب! ایک طرف

کیوں۔ رشتے کو دونوں طرف سے مضبوط کرلیں۔ میں اپنی بہن زوہیب کو دوں تو وہ اپنی بیٹی مجھے دیدے۔ رانا کو یقیناً آگ لگ جاتی۔ وٹے سٹے کی شادی میں ہر خرابی دوطرفہ ہوتی ہے۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جاسکتا ہے اور یہ رانا کا مقصد ہی نہ تھا۔

میں نے کہا۔ ''رانا صاحب۔ اگر آپ میری بات کرتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن آپ مجھے کچھ مہلت دیں کہ میں رابعہ کو بھی راضی کرلوں اور اپنے والد صاحب کے ساتھ باقی اہلِ خانہ کو بھی قائل کروں۔ تب تک آپ کسی سے کچھ نہ کہیں۔''

اس کا چہرہ مایوسی کی تصویر بن گیا۔ ''نواب صاحب۔ میرا خیال تھا کہ آپ اپنے فیصلے کرنے میں آزاد ہیں۔ آپ کا حکم چلتا ہے۔''

میں نے اس کی بات کو نظرانداز کردیا۔ ''خدانخواستہ اس کا کوئی چانس نہیں مگر ایک فیصد امکان کو سامنے رکھتے ہوئے فی الحال کسی طرف سے کوئی بات نہ کرنے میں بہتری ہے۔ تاکہ کل کو کسی کی سبکی نہ ہو۔ آپ کی عزت پر بھی حرف نہ آئے اور ہماری عزت پر بھی۔''

اس کا موڈ خراب ہوگیا۔ ''ٹھیک ہے۔ پھر میں چلتا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''کل ملاقات ہوگی۔''

اس نے تلخی سے کہا۔ ''انشاء اللہ'' اور بادل ناخواستہ ہاتھ ملا کر باہر نکل گیا۔

اس کا آنا اور جانا ست بدھائی کی تاریخ کا ایک سنسنی خیز باب تھا۔ اسے وزیرِ اعلیٰ کی آمد کے تناظر میں ایک سیاسی مجبوری کے حوالے سے دیکھا جارہا تھا۔ کسی کے وہم وگمان میں نہیں آسکتا تھا کہ اس نے مجھ سے رابعہ کا رشتہ مانگا ہوگا۔

حویلی کے اندر باہر کی گہما گہمی اور ایکٹوٹی کو رانا نے بھی دیکھا ہوگا لیکن اس بارے میں رانا نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔ اس کے لیے یہ بہت تکلیف دہ اور شرمندگی رکھنے والا موضوع ہوتا۔ اس کے آباؤ اجداد کی ساری مگر کمزور تاریخ میں ایسا قابلِ ذکر واقعہ پیش نہیں آیا تھا۔ اس نے جس مسئلے کو اپنے زہریلے پروپیگنڈے سے میرا جرم بنادیا تھا وہی میرے لیے باعثِ افتخار ہوگیا تھا۔ مجھ سے خفا ہوجانے والے صوبائی وزیرِ داخلہ کے نزدیک میں اسپتال اور اسکول کھول کے حکومت کے خلاف بدگمانی کے جذبات کو فروغ دینے کا سبب بنا تھا مگر وہ جرم اب ایک کارنامہ بن گیا تھا کیونکہ صوبائی حکومت کے سربراہ نے اسے کارنامہ سمجھا تھا۔

رانا پر میں نے واضح کردیا تھا کہ ابھی وہ دونوں خاندانوں کے ایک کرنے کی اپنی تجویز کا کسی سے ذکر نہ کرے۔ میرے انکار کی صورت میں اس کی سبکی ہوگی۔ مجھے یقین تھا کہ اب وہ چپ رہے گا لیکن ابا جی کے آنے تک مایوس نہیں ہوگا۔ فوری طور پر مجھے تھوڑی سی مہلت مل گئی تھی۔ اس امید میں کہ میں اس کے پھیلائے ہوئے جال میں ضرور گرفتار ہوجاؤں گا وہ فی الحال ہر قسم کی شرانگیزی سے باز رہے گا۔

اس کے جاتے ہی مجھ پر خواتین نے پریس کے نمائندوں کی طرح یلغار کی۔ میں نے بڑی صفائی سے اصل بات چھپالی۔ انہیں میرے کسی جواب پر جھوٹ کا گماں نہیں ہوا اور انہوں نے یقین کرلیا کہ رانا صرف چیف منسٹر کے دورے کی تفصیل جاننے آیا تھا اور میں نے بتادیا کہ وہ اسپتال کا افتتاح فرمائیں گے اور اسکول کا سنگِ بنیاد رکھیں گے۔

رات کو مجھے موقع ملا تو میں نے راجا کو اصل بات بتائی۔ وہ دم بخود رہ گیا۔ ''تو مذاق کررہا ہے فیکے پتر۔''

میں نے کہا۔ ''راجا۔ کیا رابعہ کا نام لے کر میں ایسا بے ہودہ مذاق کرسکتا ہوں۔''

ساری بات سن کے راجا نے کہا۔ ''تو نے اس... کو مارا نہیں۔''

''میں تو اسے جان سے ماردیتا۔ معلوم نہیں کیسے میری عقل کے بریک فیل نہیں ہوئے۔ میں نے اقرار بھی نہیں کیا۔ انکار بھی نہیں کیا۔ بڑی ہوشیاری سے اسے بلف کیا۔ یہ تاثر دیا کہ مجھے تو رشتہ منظور ہے مگر ابا جی کا بھروسا نہیں۔ ان کے آنے پر ہی فیصلہ ہوگا۔ تب تک وہ کسی سے بات نہ کرے۔ خدانخواستہ۔ بالفرضِ محال۔ میرے منہ میں خاک۔ انہوں نے انکار کردیا تو رانا صاحب کی کتنی بے عزتی خراب ہوگی۔''

راجا ہنس پڑا۔ اس نے میری پیٹھ تھپکی۔ ''تو نے واقعی کمال کردیا۔ ثابت کردیا کہ تو اناڑی نہیں ہے۔ لٹکادیا سالے کو انکار اور اقرار کے درمیان۔ نہ وہ کسی سے بات کرسکتا ہے۔ نہ کوئی بدمعاشی۔''

میں نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ اسے انکار کی توقع ہوگی۔ یہاں آنے سے پہلے اس نے کسی کو نہیں بتایا ہوگا کہ وہ ست بدھائی کیوں جارہا ہے۔ یہی کہا ہوگا کہ چیف منسٹر کے استقبال کی بات کرنی ہے۔ یہ بالکل ناممکن تھا کہ ہم میں سے کوئی اس کی بات مان لیتا لیکن ناممکن اگر ممکن ہوجائے تو وہ

واپسی میں اعلان کر دیتا کہ وہ کیا زبردست کارنامہ سرانجام دے کر آیا ہے۔ ست بدھائی والوں کو بے وقوف بنا کے ان کی دمی (بیٹی) مانگ لی ہے۔ اب آیا ہے اونٹ پہاڑ کے نیچے۔ دیکھنا میں ان کی ساری اکڑفوں کیسے نکالتا ہوں۔ ناک سے لکیریں نکالیں گے میرے سامنے۔"

"لیکن کامیابی نہیں ہوئی تو وہ چپ سادھ کے بیٹھ جائے گا۔ تیرا اندازہ بالکل ٹھیک ہے۔" راجا بولا۔

"اس امید میں کہ اس کا داؤ چل جائے۔ وہ ایسی کوئی بات بھی نہیں کرے گا جس سے تعلقات میں خرابی آئے۔ یہی میں چاہتا تھا۔ کل کی تقریب میں وہ دشمن نہیں دوست بن کے شریک ہوگا۔ بلکہ صوبائی وزیرِ داخلہ ساتھ ہوا تو رانا اسے بھی روک دے گا کہ فی الحال کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ست بدھائی اور رانا نگر کے درمیان دوستانہ تعلقات کی فضا پیدا ہوگئی ہے۔"

رات تک تمام تیاریاں مکمل ہوگئی تھیں۔ راجا نے سپاسنامہ تیار کر لیا تھا اور شیر خان کے لائے ہوئے فریم میں لگا دیا تھا۔ شہناز نے اسے کئی بار پڑھا۔ ہر بار راجا نے اس کو تلفظ کی کسی غلطی پر ٹوکا۔

وہ چڑ گئی۔ "اتنی مشکل اردو لکھنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"اردو آسان ہے مگر تم انگلش میڈیم کی پڑھی ہوئی جاہل..."

"تمہارا مہمانِ خصوصی کیا اردو میڈیم ہے؟ وہ بھی نہیں سمجھے گا۔ آدھی تو فارسی ہے۔" شہناز نے کہا۔

"اب کچھ نہیں ہوسکتا۔ نہیں پڑھا جاتا تو مجھے دے دو۔ میں پیش کر دوں گا۔" راجا بولا۔

شہناز نے فوراً پسپائی اختیار کی۔ "نہیں۔ اتنا مشکل بھی نہیں میں پریکٹس کروں گی تو ٹھیک ہو جائے گا۔"

خواتین کا سب سے اہم مسئلہ ذاتی زیبائش و آرائش کا تھا۔ رات تک ان کی میٹنگ میں لباس کا انتخاب ہی موضوعِ بحث رہا اور اس امکان پر غور ہوتا رہا کہ اگر وہ صبح صبح جہلم کے کسی اچھے بیوٹی پارلر چلی جائیں تو کیا گیارہ بجے تک واپسی ممکن ہے۔ لیکن بیوٹی پارلر تو کھلتے ہی گیارہ بجے ہیں... افسوس! بیچ بیچ میں شہناز کے سپاسنامہ یاد کرنے کی آواز سنائی دیتی رہی۔

مجھے سب سے زیادہ تشویش شامی بادشاہ کی طرف سے تھی۔ اس کے وعدے کے باوجود ایک ڈر میرے دل میں بیٹھا ہوا تھا کہ وہ نہ آیا تو کیا ہوگا۔ راجا نے کئی بار مجھے تسلی دی کہ وہ ضرور آئے گا اور بالفرضِ محال نہ آیا تو اس میں تیرا کیا قصور ہوگا۔ ایک ڈاکو کے وعدے پر تو نے بھی اعتبار کیا تھا۔ صرف ثالث بنا تھا۔ ضامن نہیں ورنہ کوئی تیری جگہ ہو... سو فیصد یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا کہ وہ ضرور آئے گا۔ کیوں نہیں آیا؟ یہ معلوم ہو جائے گا۔

ان تمام باتوں سے میری تسلی نہیں ہو سکتی تھی۔ رات مجھ سے اسی فکر میں کھانا بھی نہیں کھایا گیا۔ ہر ایک اپنی پریشانی میں مبتلا تھا۔ کھانے کا ہوش کسی کو نہیں تھا۔ راجا کو مسلسل فون موصول ہو رہے تھے۔ میڈیا کے ' چیف منسٹر ہاؤس سے وزارتِ داخلہ سے اور نہ جانے کہاں کہاں سے۔

میرا فون رات دس بجے کے قریب بجا۔ میں نے... کیا تو دوسری طرف سے شامی بادشاہ نے جواب دیا۔ "... حال ہے نواب دوست؟"

میں نے کہا۔ "خدا کا شکر ہے کہ تم نے رابطہ کیا۔ ... بڑی فکر تھی۔"

"فکر کس بات کی؟"

"یہی... کہ تم نہ آئے تو کیا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"ارے یار یہ شامی بادشاہ کا وعدہ ہے۔ جان دے... بھی پورا ہوگا۔ تم بتاؤ کس وقت پہنچنا ہوگا۔"

"اگر تم گیارہ ساڑھے گیارہ بجے آجاؤ... تو حویلی... رہ سکتے ہو۔ میرا مطلب ہے ابھی۔ رات کے وقت... اشارہ ہوگا تمہاری چیف منسٹر سے ملاقات کرا دی جائے گی۔"

"میں کوشش کروں گا۔ لیکن صبح تک نہ آسکا تب... وقت پر پہنچ جاؤں گا۔ تمہیں شرمندگی نہیں اٹھانی پڑے گی۔" وہ بولا اور فون بند کر دیا۔

اب میں مطمئن اور پُرسکون تھا۔ راجا اور... سر جوڑے اگلے دن کے پروگرام کی جزئیات پر بحث کر... تھے کہ غنی گھبرایا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ "سر! ایک... ہوگئی ہے۔"

میں نے سوالیہ نظر اٹھا کے پوچھا۔ "کیا بات ہے... تم اتنے بدحواس کیوں ہو؟"

"سر! ایک لاش ملی ہے... حویلی کے پیچھے... قبرستان کے باہر سے۔"

میں اور راجا ایک ساتھ اٹھے۔ "کس کی لاش؟"

"یہ تو پتا نہیں سر۔ جانوروں نے نکال لی تھی..."

غنی کے ساتھ ہم باہر کی طرف نکلے۔ میرے ذہن... ایک ہی خیال تھا جو راجا کے دماغ میں بھی ہوگا۔

غنی اس بدحواس گھوڑے کی طرح بھاگ رہا تھا جس نے ویران سڑک پر آسیب دیکھ لیا ہو۔ "جلدی چلیں سر۔"

میں نے اسے روکا۔ "غنی، اس طرح تم سب کو دہشت میں مبتلا کر دو گے۔"

وہ رک گیا۔ "اگر لاش برآمد ہوگئی تو سب کو معلوم ہو جائے گا۔"

"کیا مطلب؟ لاش ابھی برآمد نہیں ہوئی!"

اس نے گھڑے جیسا سر ہلایا۔ "لیکن شک کی بات کوئی نہیں۔ کل رات ایک جانور نے زمین کھودنے کی کوشش کی۔ چھت پر موجود گارڈ کے خیال میں وہ بھیڑیا تھا۔ اس نے لائٹ ڈالی تو وہ بھاگ گیا۔"

"واٹ نان سنس۔ تم کل رات کی بات بتا رہے ہو۔ آج کا سارا دن گزر گیا۔"

وہ گارڈ صبح ڈیوٹی ختم کر کے گھر چلا گیا تھا سر۔ ابھی پھر آیا تو اس نے مجھے بتایا پھر میں نے جا کے دیکھا۔ زمین واقعی کسی بھیڑیے نے کھودی تھی۔"

میں نے برہمی سے کہا۔ "بے وقوف آدمی تم نے اتنے یقین کے ساتھ کہا تھا کہ لاش ملی ہے۔"

"زمین کھودنے سے کپڑے نکلے ہیں سر۔ کسی عورت کے۔ میں نے سوچا آپ دیکھ لیں پھر جیسا آپ کہیں۔ میں کسی کو زمین کھودنے پر لگا دوں یا مٹی برابر کر دوں۔"

میرے سر پر سے جیسے پہاڑ جیسا فکرمندی کا بوجھ اتر گیا تھا۔ یہ غنی کی بے وقوفی تھی کہ تصدیق کیے بغیر اس نے محض شک کی بنیاد پر ایک بات کہہ دی تھی۔ اس چور کی طرح جو اندھیرے گھر کے کسی کونے میں چھپا بیٹھا ہو۔ خوف میرے ذہن میں موجود تھا کہ فریال نے مجھے جس خطرے سے خبردار کیا تھا وہ حقیقت کا روپ دھار کے میرے سامنے آجائے گا۔ ایک ہفتے سے لاپتا چوہدری سلطان کی لاش حویلی کے آس پاس کہیں ست بدھائی کی حدود سے برآمد ہو جائے گی اور پھر رانا مونچھوں پر تاؤ دے کر کہے گا کہ کہیے نواب صاحب۔ کیسی رہی جوابی چال؟ کون اناڑی ہے اور کون کھلاڑی۔ آیا سمجھ شریف میں؟ مجھ پر تم نے بیٹی کے قتل کا مقدمہ کھڑا کر کے فرض کر لیا تھا کہ مجھے تختہ دار پر پہنچا دیا۔ اب اپنے رقیب کو مار کے تم خود کہاں کھڑے ہو؟

غنی کے ساتھ میں نے جائے واردات کا معائنہ کیا۔ وہ جگہ خودرو جھاڑیوں میں گھری ہوئی ہموار زمین تھی اور ہمارے خاندانی قبرستان سے بہ مشکل تمام چالیس پچاس قدم کے فاصلے پر تھی۔ اس قبرستان میں ایک تو اسی مردِ قلندر کی قبر تھی جس نے مرتے مرتے بددعا کی تھی تو میرے دادا کے پردادا کے ساتھ جوان بیٹوں نے باری باری اس جگہ کو اپنی ابدی آرام گاہ بنایا۔ اس کے بعد والے بھی یہیں آسودہ خاک تھے اور حقِ وراثت مجھے ملنے کے بعد یہاں تین مزید قبروں کا اضافہ ہوا تھا۔ ان میں ایک میری دادی کی قبر تھی۔ دو قبریں چچا اور چچی کی تھیں۔ اس طرح ست بدھائی کی پُرنحوست تاریخ کا سفر جاری تھا۔

بے اختیار ایک سوال نے میرے خیالوں پر یلغار کی۔ کیا اب چوہدری سلطان کے قتل کے جرم میں پھانسی پانے کے بعد ست بدھائی کا یہ وارث بھی اپنے خاندان کے ساتھ جا لیٹے گا اور حویلی کی منحوس تاریخ میں ایک اور باب کا اضافہ ہوگا؟

اس فضول سوال کو میں نے اسی طرح ذہن سے جھٹک دیا جیسے غلطی سے بجلی کی ننگی تار کو چھو لینے والا اپنا ہاتھ جھٹک دیتا ہے۔ یہ صرف پریشاں خیالی اور تفکرات کی یورش کا نتیجہ تھا کہ ایسا خیال میرے دماغ میں آیا۔

میں نے غنی کے ساتھ اس جگہ کا معائنہ تیز ٹارچ لائٹ کی روشنی میں کیا۔ بے شک کسی جانور نے اپنے پنجوں سے زمین کھودی تھی اور وہ جانور بھیڑیے، گیدڑ یا لومڑی جیسا ہی تھا۔ یہ جانور بے سبب زمین نہیں کھودتے۔ انہیں خون کی بو کھینچتی ہے۔

جس گارڈ نے رات کی خاموشی میں آوازوں پر متوجہ ہو کے کھودی ہوئی زمین دیکھی تھی اسے بلایا گیا۔ اس نے کہا کہ جانور کو وہ نہیں دیکھ سکا۔ اس نے آواز نکالی تو جانور بھاگ گیا تھا۔ تاہم اس نے گڑھے میں کپڑے دیکھ لیے تھے اور بہتر یہی سمجھا تھا کہ مٹی برابر کر دے۔

میں نے پوچھا۔ "تم نے اس وقت غنی کو اطلاع کیوں نہیں دی تھی؟"

گارڈ کچھ پریشان ہوا۔ "سر! یہ رات کے دو بجے کی بات ہے۔ میں نے کسی کو جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ سب اتنے تھکے ہوئے تھے۔"

"تم نے اپنے کسی ساتھی سے بھی نہیں کہا؟"

"کہا تھا سر۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ اپنا منہ بند کر ورنہ کسی مصیبت میں پڑ جائے گا۔ میں نے اسی وقت مان لیا

اور ڈیوٹی کے بعد گھر جا کے سو گیا۔ شام کو میں نے اپنے بھائی سے ذکر کیا تو اس نے بہت غصہ کیا کہ مصیبت میں تو اب پڑے گا۔ ابھی جا کے غنی کو بتا دے۔''

میں نے غنی کی طرف دیکھا۔ ''یہ تو بے وقوف ہے لیکن دیکھو اسے الٹا مشورہ دینے والا سیانا کون تھا۔ اس کی چھٹی کرو۔''

میرے کہنے پر غنی نے کھودی گئی مٹی ہٹائی تو نیچے سے مٹی میں بھرے ہوئے کپڑے برآمد ہوئے۔ غنی نے ان کو پھیلا کے جھاڑا۔ یہ اوسط جسامت رکھنے والے کسی مرد کی قمیص تھی۔ اگر اس پر خون کے داغ تھے تو وہ مٹی کے رنگ میں دب گئے تھے۔ قمیص پرانی تھی اور کچھ پھٹی ہوئی بھی نظر آتی تھی۔

غنی نے اسے ایک طرف رکھ دیا۔ ''مٹی برابر کر دوں سر؟''

میں نے کہا۔ ''نہیں۔ اور کھدائی کرو۔''

اندر سے بیلچے منگوا کے مزید زمین کھودی گئی تو ایک شلوار بھی نکل آئی۔ قمیص اور شلوار کا رنگ ایک ہی تھا۔ یہ سمجھ میں نہ آنے والی بات تھی۔ اگر کوئی یہاں کسی لاش کو دباتا تو پہلے کپڑے کیوں اتارتا۔ اور لاش کو گاڑنے کے بعد اوپر کپڑے رکھ کے مٹی کیوں برابر کرتا۔ راجا نے میرے خیال کی تائید کی اور ہم نے غنی کو مزید محنت سے روک دیا۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ آدھی رات کے بعد غنی نے کھدائی میں برآمد ہونے والے کپڑوں کو ایک بالٹی میں ڈال کے پانی سے دھویا۔ صرف قمیص پر خون کے داغ تھے۔ جو مٹی اتر جانے کے بعد نمایاں ہو گئے لیکن یہ کس مقتول کے کپڑے تھے؟ اپنی جاسوسی صلاحیت والا دماغ لڑانے کے باوجود ہم اس پُراسرار معاملے کی تہ تک پہنچنے میں ناکام رہے۔

دوبارہ سونے کی کوشش بھی اب لاحاصل تھی لیکن آنے والی صبح اپنے دامن میں بے پناہ مصروفیات رکھتی تھی اور اس کے بعد سارا دن بھاگ دوڑ کا تھا چنانچہ میں پھر لیٹ گیا لیکن اب چوہدری سلطان کا خیال میرے اعصاب پر زیادہ شدت سے سوار تھا۔ آخر وہ کہاں روپوش ہے اور کیوں؟ اگر کسی نے اسے اغوا کیا ہے تو اس کا مقصد تاوان وصول کرنا ہوگا یا دشمنی کا کوئی پرانا حساب برابر کرنا تھا۔ یہ اغوا برائے تاوان کی واردات ہوتی تو اب تک رقم کا مطالبہ سامنے آ جاتا۔ عام طور پر اغوا کرنے والے چوبیس گھنٹے میں لواحقین سے رابطہ کر لیتے ہیں۔

سلطان کے دشمن بھی ہوں گے۔ اس کی فطرت اور خصلت میں دوست سے زیادہ دشمن بنانے کی پوری صلاحیت تھی۔ نہ جانے کتنی لڑکیاں اس کے سبز باغ دیکھتے ہوئے اپنی متاع آبرو گنوا چکی تھیں۔ انہیں ہیروئین بنانے یا ان سے شادی کرنے کا چکر چلا کے سلطان نے ان کو جی بھر کے لوٹا تھا اور استعمال کے بعد بے کار ہو جانے والے ٹشو پیپر کی طرح پھینک دیا تھا۔ بے شک وہ سب ایسی باغیرت اور باحیثیت شریف زادیاں نہ تھیں لیکن ایسا فرض کرنا بھی غلط ہوگا کہ وہ سو فیصد بدکردار یا رو دھو کے صبر کر لینے والی لڑکیاں تھیں۔ یا ان میں سے کسی کے والی وارث غیرت مند نہ تھے۔

اور کیا خود فریال ایک ایسی ہی فریب خوردہ لڑکی نہ تھی؟ اس خیال نے جیسے مجھ پر امکانات کے اس بند دروازے کو کھول دیا جو اب تک میری نظر سے اوجھل تھا۔

اس خیال نے مجھے اٹھ کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا کہ کیا یہ کارِ خیر خود فریال نہیں کر سکتی؟ کیا یہ ناممکن ہے کہ خود اس نے چوہدری سلطان کو ایسے ٹھکانے لگا دیا ہو کہ دنیا میں کسی کا خیال تک اس کی طرف نہ جائے اور یومِ حشر تک اس راز پر لاعلمی کا پردہ پڑا رہے؟

اس خیال نے مجھے اتنا مضطرب کیا کہ میں اپنے بیڈ روم سے نکلا اور میں نے راجا کو اٹھا دیا۔

راجا مجھ سے زیادہ مضبوط اعصاب کا مالک تھا اور اس کا اعتراف بھی کرتا تھا کہ وہ اپنے دماغ کی سوچ کو سوئچ سے کنٹرول کر سکتا ہے۔ تمام تفکرات اور پریشانیوں کو سوئچ آف کر کے وہ تازہ دم ہونے کے لیے سو سکتا ہے۔

اس نے آنکھیں مل کے کہا۔ ''اب کیا ہو گیا فیکے پتر؟''

میں نے کہا۔ ''صبح ہو گئی مہاراجا۔ خوابِ غفلت سے جاگ۔''

''کہیں تو نے چوہدری سلطان کی لاش تو نہیں نکال لی۔ بقلم خود...''

میں نے کہا۔ ''یار کچھ ایسی ہی بات ہے۔ کچن میں آ جا۔''

''کیا لاش کچن میں رکھی ہے؟'' وہ میرے پیچھے چل پڑا۔

میں نے کافی بنانے کے لیے الیکٹرک کیتل میں پانی ڈال کے سوئچ آن کیا ہی تھا کہ باہر سے اذان کی آواز آئی۔ حویلی سے قریب ترین مسجد بھی جس گاؤں میں تھی وہ بھی ایک کلومیٹر پر ہوگا چنانچہ میں نے اور راجا نے باہر کے لان پر اکٹھے نماز ادا کی اور پھر فوارے کی گول دیوار پر بیٹھ کے کافی پینے لگے۔

میں نے راجا پر اپنا خدشہ ظاہر کیا۔ ''یار کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ مس فریال نے چوہدری سلطان کو خود، قتل کر دیا ہو۔''

''بالکل ایسا ہی ہوا ہوگا فیکے پتر۔ مجھے سو فیصد یقین

قتل کرنے کے بعد وہ لاش کو یہاں لائی اور ست بدھائی میں دفن کرنے کے بعد۔''

میں نے کہا۔ ''اگر تو نے سنجیدگی سے میری بات نہ سنی تو میں تجھے قتل کر کے ست بدھائی میں دفنا دوں گا۔''

''ابے سنجیدگی کے گھوڑے۔ کیوں سوچتا رہتا ہے تو ایسی الٹی سیدھی باتیں۔''

''دیکھ پہلے میری پوری بات سن لے۔ آخر میں نے بھی تیری بکواس سنی تھی کہ فریال نے مجھے اس لیے چھوڑا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ لندن پیرس لے جانے کے منصوبے میں ناکام ہو گئی تھی اور خود یہاں نہیں رہ سکتی تھی۔''

''وہ بکواس نہیں تھی۔ حقیقت تھی۔''

''پھر تو نے نور جہاں کے بارے میں کہا کہ میرا وارث پیدا کر کے وہ ست بدھائی کی مالک بننا چاہتی تھی۔ اب میری بات بھی دھیان سے سن۔ فریال جب مجھے چھوڑ کے گئی تو چوہدری سلطان کے پاس ہی کیوں گئی تھی؟ وہ شخص جس سے فریال دنیا میں سب سے زیادہ نفرت کرتی تھی۔ جو اس کے نزدیک شیطان تھا۔ مجسم برائی۔''

''عورت کے دماغ کی بھول بھلیاں ایسی ہوتی ہیں کہ خود عورت ان میں بھٹک جاتی ہے۔'' راجا نے لاجواب ہونے کا اعتراف نہیں کیا اور ایک بے معنی بات کی۔

''نہیں دوست۔ اس کے ذہن میں ایک منصوبہ تھا۔ دنیا میں اور کوئی نہیں تھا جو اس کی فلمی دنیا میں واپسی اور کامیابی کا ضامن بنتا۔ اپنے بل پر فریال ایسا کرتی تو دردر بھٹکتی پھرتی۔ پتا نہیں کون کون اسے خواب دکھاتا اور خواب گاہ میں لے جاتا۔ فریال نے فلمی دنیا میں رہ کے سب دیکھا تھا۔ اسے اندازہ ہوگا کہ ستارے جو فلمی دنیا کے آسمان پر اپنی چمک دکھا کے ٹوٹے وہ گمنامی میں کھو گئے۔ ٹوٹے تارے دوبارہ آسمان پر نہیں جگمگاتے۔ کیا میں فلمی تاریخ سے مثالیں دوں؟''

راجا نے سر ہلایا۔ ''اس کی ضرورت نہیں۔''

''مگر فریال نے ناممکن کو ممکن بنانے کا سوچا تو اس کے دماغ میں چوہدری سلطان کا خیال آیا۔ اسے استعمال کیا جا سکتا ہے اور وہی ایک شخص ہے جو انتہائی ذوق و شوق سے استعمال ہوگا۔ فریال کی کامیابی کو اپنا مقصدِ حیات بنا لے گا۔ بشرطیکہ غور فرمایے راجا صاحب۔ یہی نکتہ اہم ہے۔ بشرطیکہ اسے یقین دلایا جائے کہ فریال اسے استعمال نہیں کر رہی ہے۔ اس کے سامنے اپنی بے وقوفی کا اپنی شکست کا اعتراف کر رہی ہے۔ وہ نواب رفیق احمد شیرازی کو چھوڑ کے چوہدری صاحب کے پاس لوٹ آئی ہے۔ کیونکہ اس کا جانا ہی غلط تھا۔ یہ وقت نے اور تجربے نے اسے سکھا دیا ہے کہ محبت ایک کتابی بکواس ہے۔ جھوٹ ہے۔ رفیق کا اصل چہرہ سامنے آیا تو اسے احساس ہوا کہ زندگی کی حقیقت کچھ اور ہے۔ قصہ مختصر... اس نے اپنی پشیمانی اور المیہ اداکاری سے چوہدری سلطان کو یقین دلا دیا کہ وہ جیت گیا۔ ہار ہوئی نواب رفیق کی۔ فاتح اعظم چوہدری سلطان زندہ باد۔''

''میں کچھ قائل ہونے لگا ہوں فیکے پتر۔'' راجا بولا۔

''آگے سن... یہ ہو سکتا تھا کہ چوہدری سلطان لوٹ کر آنے والی شکست خوردہ عورت کو ٹھوکر مار کے کہتا کہ دفع ہو جا۔ اب تیرے لیے اس دل میں کوئی جگہ نہیں لیکن راجا صاحب! جب سکندر نے راجا پورس کو شکست دی اور اسے قیدی بنا کے سامنے لایا گیا تو پورس نے بھی یہی ڈراما کیا تھا۔ ایسا دھوبی پاٹ مارا اپنے ڈائیلاگ سے کہ سکندر اعظم فاتح اعظم کو چت کر دیا۔ سکندر نے پوچھا کہ تمہارے ساتھ اب کیا سلوک کیا جائے۔ پورس کہتا کہ یہ مجھ سے کیا پوچھتے ہو پاگل دے پتر۔ مگر اس نے بڑے وقار سے کہا کہ ''وہی جو بادشاہ بادشاہوں کے ساتھ کرتے ہیں۔'' اور سکندر کو چقندر کر دیا۔ یہی فریال نے کیا ہوگا۔ جب ایک بے وقوف مرد کی انا کے غبارے میں ہوا بھر دی جائے اور ہوا بھرنے والی فریال جیسی عورت ہو تو وہ ہوا میں اڑنے لگتا ہے۔ فریال نے اس کو اپنی عظیم فتح کے غرور میں مبتلا کر دیا اور پھر اس کے سامنے ایک چیلنج رکھ دیا کہ نواب رفیق کی نوابی کے منہ پر جوتا مارنے کا یہی طریقہ ہے کہ مجھے وہ عزت شہرت ملے تمہارے ساتھ جس کے سامنے رفیق کی حیثیت اور اوقات صفر ہو جائے۔ وہ لاکھوں پرستاروں میں سے ایک ہو اور بس۔ وہ مجھے سینما کے پردے پر دیکھے ورنہ خوابوں میں اور چوہدری سلطان نے یہ چیلنج قبول کر لیا۔ صرف ایک وعدے پر کہ وہ چوہدری سلطان کی ہو جائے گی لیکن پہلے اسے رفیق سے اپنی ذلت کا بدلہ لینا ہے۔ مجھے ذلیل کرنے اور مجھے شکست دینے کی خواہش برسوں سے چوہدری سلطان کے دل میں ایسے موجود تھی جیسے راکھ میں دبی ہوئی چنگاری۔ فریال نے اس چنگاری کو ہوا دے کر آتش فشاں کر دیا۔''

راجا بولا۔ ''کسی بھی احمق کو بانس پر چڑھانا آسان ہوتا ہے۔''

''خصوصاً ایک عورت کے لیے۔'' میں نے کہا۔ ''فریال اس کی کمزوری بھی رہی تھی اور آج بھی ہوگی۔ چوہدری سلطان نے اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا اور اس پر نئے سرے سے

عاشق ہوگیا۔ اس نے فریال کو یقین دلایا ہوگا کہ تم دیکھنا میں اس نواب کی اولاد کا کیا حال کرتا ہوں۔ اس نے خوشی سے بے حال ہو کے ایک کوٹھی فریال کو گفٹ کردی۔ ایک کار نذر کی اور اپنے دل کے ساتھ خزانے کے دروازے بھی اس پر کھول دیے۔''

ایک ٹھکرائی ہوئی عورت ایک زخم خوردہ ناگن سے زیادہ خطرناک ہوجاتی ہے۔'' راجا نے کسی فلسفی کی طرح فرمایا۔

میں نے ہنس کے کہا۔ ''تو کیا سمجھ رہا ہے؟ فریال سچ مچ مجھ سے ناراض تھی اور اپنی توہین کا انتقام لینا چاہتی تھی؟''

''اگر اس نے یہ سب کیا۔ جو تو نے فرض کرلیا ہے تو آخر کیوں کیا؟'' راجا نے سر کھجایا۔

''راجا! اس کا پلان ہی یہ تھا۔ ایک تیر سے دو شکار کرنا۔ اسے اچھی طرح اندازہ ہوگا کہ چوہدری سلطان اس کے لیے وہ سب کرنے پر راضی ہوجائے گا جو وہ چاہتی ہے تو بدلے میں اس سے کیا طلب کرے گا؟ چوہدری کے پاس پیسا تھا۔ اثر رسوخ تھا اور فلمی دنیا کے مراسم تھے۔ اس نے بڑے شوق اور اہتمام سے فریال کی واپسی کا پروگرام ترتیب دیا۔ یہ ہم سب نے دیکھا۔ فریال پہلے ٹی وی پر مہمان بن کے نمودار ہوئی۔ کبھی ایک شو میں کبھی دوسرے میں۔ ہر شو میں چوہدری سلطان فخر سے سینہ پھلائے اس کے ساتھ تھا۔ پھر وہ ایک اشتہار میں جلوہ گر ہوئی۔ نہ صلاحیت کی فریال کے پاس کمی تھی نہ حسن و شباب کی۔ باقی کام کیمرے نے کیا اور اسے پروموٹ کرنے والوں نے کیا... ایڈ ایجنسی نے اور سلطان کے پیسے نے کیا۔ وہ مختلف اشتہارات میں نظر آئی۔ ہر بار نئی جلوہ گری کے ساتھ۔ اس کی ہیجان انگیز تصویر شہر کے چوراہوں پر لگے ہوئے بل بورڈز پر مسکرانے لگی۔ شو بزنس کے کور سے لے کر سنڈے میگزین کے سنٹر اسپریڈ تک ہر جگہ فریال ہی فریال نظر آئی۔ اسے ایک فلم کا کنٹریکٹ ملا، پھر دوسری کا۔ تو بھی جانتا ہے راجا کہ یہ پبلسٹی کا زمانہ ہے۔ امریکا میں تو ایسا تھا۔ پاکستان میں اب سیاسی لیڈر بھی اپنا امیج بنانے کے لیے بین الاقوامی ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں کی خدمات حاصل کرتے ہیں۔ چوہدری سلطان کے پیسے نے یہی کیا۔ اس نے فریال کو پھر وہی گلیمرس ماضی دے دیا جو پیچھے رہ گیا تھا۔ اسے پھر شہرت کے افق پر چمکا دیا۔ اس کے بعد کیا ہوا؟''

راجا چونکا۔ ''اگر یہ بھی آپ ہی بتا دیتے تو اچھا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''اس کے بعد چوہدری سلطان نے کہا کہ جو تم نے کہا تھا وہ میں نے کر دکھایا۔ میں نے اپنا وعدہ پورا کیا اور تمھیں شہرت کے آسمان کی بلندی تک پہنچا دیا۔ اب تم بھی اپنا وعدہ پورا کرو۔ فریال کو اچھی طرح علم ہوگا بالآخر یہ نوبت آئے گی۔ اس نے درمیانی وقفے میں رویے سے بھی ظاہر نہیں ہونے دیا کہ اس کی نیت میں ہے۔ وہ مجھ سے اظہارِ نفرت اور چوہدری سلطان التفات ظاہر کرتی رہی۔ اس نے ایک بار بھی مجھے یا ست بدھائی میں کسی کو فون نہیں کیا۔ چوہدری سلطان نے پر نگاہ رکھی ہوگی۔ اس کے فون تک ٹیپ کیے ہوں گے کا رویہ دیکھ کر اسے یقین آگیا ہوگا کہ فریال واقعی مجھ سے جذباتی رشتے منقطع کرچکی ہے لیکن اس عرصے میں فریال اپنا ہوم ورک پورا کرلیا تھا۔ اس نے چوہدری سلطان ذریعے اپنا مقصد حاصل کرلیا تھا۔ وہ فلمی دنیا میں اور سپر ماڈل کی حیثیت سے کامیاب ہوچکی تھی۔ اب چوہدری سلطان سے جان چھڑانی تھی۔ ظاہر ہے وہ سلطان سے یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ میں نے تو آپ کو سیڑھی کے طور استعمال کیا تھا اور اوپر پہنچ جانے کے بعد مجھے کسی سیڑھی کی ضرورت بھی نہیں۔ اس نے سلطان کو قتل کردیا۔''

''ویری گڈ! سامنے بلایا اور گولی ماردی۔''

''چوہدری سلطان غائب ہوگیا اور شاید روزِ محشر سے پہلے کہیں نہ ملے۔ جب تک لاش نہ ملے نہ قتل ثابت ہوتا ہے نہ قتل کا الزام آتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''دیکھ پتر! یہ قتل کا دوسرا کیس ہے جس پر تو کام ہے۔ ایک محبوبہ نمبر دو نے کیا۔ اس میں لاش آلۂ قتل سب پولیس کو مل گیا مگر قاتل غائب ہے۔ محبوبہ نمبر ون کیس میں خود مقتول غائب ہے۔ ان حالات کے پیشِ نظر جاسکتا ہے کہ مستقبل قریب میں تیری محبوبہ نمبر تین یعنی بھی کسی کو قتل کرے گی اور اس میں پُراسرار قتل کا تیسرا سامنے آئے گا۔'' راجا ہنسنے لگا۔

''راجا تو سیریس کیوں نہیں ہوجاتا۔'' میں نے خفگی سے

''ابھی جو کچھ تو نے کہا۔ کیا تو اس میں سیریس ہے

میں نے کہا۔ ''راجا! تو فریال کو نہیں جانتا۔ اس کس طرح چوہدری سلطان کا مقابلہ کیا تھا سالہا سال سال تو اس نے لندن میں گزار دیے تھے اور میں جانتا کے چار سال تک چوہدری سلطان نے کس طرح اسے کیا تھا۔ آزاد ہونے کے باوجود وہ آزاد نہیں تھی۔ کسی گدھ کی طرح چوہدری سلطان اس کی واپسی کا انتظار تھا۔ اس نے لندن میں بھی فریال کو شکار کرنا چاہا کامیاب نہیں ہوا۔ فریال نے جان کی بازی لگا دی کے قابو میں نہیں آئی اور جب میری واپسی کا وقت آیا

لندن سے فرار ہوگئی ایسے کہ خود مجھے پتا نہیں چلا۔ سلطان کسی کتے کی طرح اس کی بو سونگھتا پھرا۔ بالآخر اسے معلوم ہوگیا کہ وہ ست بدھائی کے قلعے میں محصور ہے اور میری حفاظت میں ہے۔ اس حصار کو توڑنے کی سکت اس میں نہیں تھی چنانچہ وہ خون کے گھونٹ پی کے بیٹھ گیا۔ پھر فریال یہاں سے نکل کے سلطان کے پاس چلی گئی؟ کیا یہ سمجھ میں آنے والی بات ہے؟''

''میری ناقص عقل میں تو نہیں آئی۔'' راجا نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''وجہ میں نے بتا دی۔ یہاں سے نکل کے فریال اپنی زندگی کو بالکل غیر محفوظ سمجھتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ جیسے ہی یہ بات سلطان کے علم میں آئے گی وہ پرانا حساب برابر کرنے کے لیے اسے یوں دبوچ لے گا جیسے کوئی عقاب کسی زخمی چڑیا کو دبوچ لے۔ چڑیا نے ایک سیاسی داؤ کھیلا۔ وہ عقاب کی پناہ میں چلی گئی۔ اس نے اپنے قاتل سے حفاظت مانگ لی۔ خود کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ اس کے سامنے ڈال دیا کہ اب میرے ساتھ جو سلوک چاہو کرو۔ تم جیت گئے، میں ہار گئی اور اس الو کے پٹھے نے سینہ پھلا کے کیا کہا؟ وہی کہا جو سکندر نے پورس سے کہا تھا۔ بازی فریال نے جیت لی۔ وہ سلطان کی مدد سے سپر اسٹار اور ماڈل بن گئی لیکن اس تمام عرصے میں وہ اپنے پلان نمبر دو پر عمل کے لیے تیاری کرتی رہی۔ اس وقت کے لیے جب سلطان کہے گا کہ اب وعدے کا قرض ادا کرنے کی باری تمہاری ہے۔ اس کے پاس پیسا تھا۔ اختیار تھا۔ اس نے سلطان کا اعتماد حاصل کیا اور اس کے ساتھ بھی خفیہ طور پر کسی اور کی خدمات حاصل کرلیں۔ کسی کو خرید لیا یا پھانس لیا۔ فریال کے لیے دونوں کام ناممکن نہیں تھے۔ فلمی دنیا میں ہر قماش کے لوگ ہیں۔ فرض کرو اسے اپنے مطلب کا آدمی مل گیا۔ وہ سلطان کو وعدۂ وصل پر کہیں لے گئی۔ دنیا دے اس نکرے جتھے بندہ نہ بندے دی ذات ہووے۔ کسی دریا کے کنارے ریسٹ ہاؤس میں۔ کسی گمنام جگہ پر۔ مری یا نتھیا گلی کے کسی لاجنگ ہاؤس میں۔ خاموشی سے، رازداری سے۔ مگر وہاں سے وہ اکیلی واپس آئی۔ اسی روز یا اگلے روز اور اپنے معمولات میں مصروف ہوگئی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ اسے ناموری اور شہرت مل گئی۔ وہ شو بزنس میں قدم جمانے میں کامیاب رہی۔ ایک کوٹھی کی اور ایک کار کی مالک بن گئی۔ لیکن سب سے بڑھ کر یہ کہ محفوظ ہوگئی۔ جس شخص سے اسے خطرہ تھا۔ جس سے اسے دنیا میں سب سے زیادہ نفرت تھی۔ وہ غائب ہوگیا۔''

راجا میری صورت دیکھتا رہا۔ ''ابھی تک تیری کہانی میں رانا رجب علی کا کردار نہیں آیا۔ وہ سلطان کے پاس کیسے پہنچ گیا۔''

میں نے کہا۔ ''یار میں کیا بتاؤں لیکن رانا کا سلطان کے پاس جانا بھی فریال کے حق میں تائیدِ ایزدی سے کم نہ تھا۔''

''کیا یہ محض ایک اتفاق تھا۔ یا ان دونوں کو ملوانے میں بھی فریال کا کوئی کردار ہوسکتا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''میں صرف قیاس آرائی کرسکتا ہوں۔ پورے یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا لیکن اس طرح فریال کو حالات کی مدد حاصل ہوگئی۔ آخر ایک ہفتے بعد اس نے مجھے فون کرکے یہ سب کیوں بتایا؟ صرف اس لیے کہ صورتِ حال میرے علم میں رہے۔ جب پولیس اپنی تفتیش کا آغاز کرے گی تو سب سے پہلے فریال سے پوچھ گچھ ہوگی۔ اس کے بعد میری باری آئے گی۔ شک کسی اور پر کیسے جاسکتا ہے۔ میں اپنے دفاع میں یہی کہوں گا کہ رانا مجھ سے دشمنی نکال رہا ہے۔ خوامخواہ مجھے ملوث کررہا ہے کیونکہ مجھے ملوث کیا جاسکتا ہے۔ درحقیقت قتل خود اسی نے کیا ہوگا کسی کاروباری معاملے میں اختلاف کے باعث یا کسی اور وجہ سے۔ جو شخص اپنی بیٹی کو قتل کرا سکتا ہے وہ سب کچھ کرسکتا ہے۔ ثبوت کے بغیر پولیس نہ مجھے نامزد کرسکتی ہے اور نہ گرفتار کرسکتی ہے۔ رانا مجھے الزام دے گا تو میں رانا کو۔ فریال بھی بدخواہوں کو الزام دے گی۔ کہے گی کہ سلطان اس کا محسن تھا۔ ان کی منگنی کئی سال پہلے ہوئی تھی۔ اب تو شادی کا پروگرام طے تھا۔ فریال کے پاس اپنی بے گناہی کے گواہ بھی بہت ہوں گے۔ پولیس کو کیس فائل کرنے کے لیے جتنی رقم درکار ہوگی وہ اسے ہر جگہ سے مل جائے گی۔ رانا سے، مجھ سے، فریال سے، ظہور المطلوب۔ یعنی یہی ہونا چاہیے اور ہوتا ہے۔ دو مہینے بعد دنیا سلطان کا نام بھی بھول چکی ہوگی۔ فریال شو بزنس میں آگے بڑھ رہی ہوگی۔ رانا اور میں اپنی اپنی دنیا میں اسی طرح مگن ہوں گے، جیسے آج ہیں۔ یار یہ پاکستان ہے۔ یہاں مجرم صرف وہی ہوتا ہے جو غریب ہو۔ غربت اس کا جرم بن جاتی ہے۔ قانون کی ہر دفعہ اس کے کھاتے میں ڈالی جاسکتی ہے۔ پولیس کے پاس نہ فرصت ہے نہ دماغ کہ ان معاملات کی تفتیش کرے جن میں کسی کا بھلا نہ ہو۔ اکبر خان کا کیس اس کی ایک مثال ہے۔''

راجا نے سر ہلایا۔ ''پہلے تو نے نور جہاں کو بچانے کے لیے تن من دھن کی بازی لگا دی تھی۔ کیا اب فریال کے لیے پھر میدان میں کودنے کا خیال ہے۔''

''ابھی تک تو نہیں ہے۔ میرا خیال ہے فریال اپنا دفاع خود کرنے کی اہل ہے۔ اس کے پاس پیسا ہے۔ وہ کوئی بڑا وکیل کر سکتی ہے۔ ان شوبزنس والوں کے ساتھ پولیس کے اعلیٰ افسران کے رابطے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ابھی تک تو یہ صرف میرا ایک مفروضہ ہے۔ میں فریال کو سمجھتا ہوں، وہ ایسا کر سکتی ہے۔ لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فریال نے کچھ نہ کیا ہو۔ یہ سلطان کے کسی دشمن کی کارروائی ہو۔ یا فریال کا شک درست ہو۔ یہ کام رانا نے کیا ہو۔''

''سب سے زیادہ وزن مجھے تیری بات میں محسوس ہونے لگا ہے کہ فریال نے بڑی چالاکی سے سلطان کو استعمال کیا اور پھر اپنے راستے سے ہٹا دیا اور خود محفوظ ہو گئی۔'' راجا نے کہا۔

افق پر مشرق کی جانب پھیلنے والی سرخی طلوعِ آفتاب کا اعلان کر رہی تھی۔ حویلی میں آج خلافِ معمول سب منہ اندھیرے ہی اٹھ بیٹھے تھے اور آخری وقت کی تیاری کی گہما گہمی کا آغاز ہو چکا تھا۔ راجا کی یا میری ضرورت صرف اس وقت محسوس ہوتی تھی جب کوئی انتظامی یا مالی فیصلہ درکار ہو چنانچہ ہماری گفتگو میں کسی نے دخل اندازی نہیں کی۔

ناشتے کے بعد بھی افراتفری کی کیفیت میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ محترم وزیرِاعلیٰ کی اچانک آمد کا پروگرام ایک اوپن سیکریٹ کی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے۔ جیسے یہاں ست بدھائی کی حویلی میں رہنے والوں کو علم تھا۔ ویسے ہی رانا نگر کے رانا پیلس میں کسی سے کچھ پوشیدہ نہ رہا تھا۔ ضلعی پولیس اور انتظامیہ کے تمام ذمے دار اہلکار اور سرکاری حکام کو معلوم تھا کہ جہلم کی تقریب میں شرکت کے بعد وزیرِاعلیٰ کا رخ واپس لاہور کی جانب نہیں بلکہ ست بدھائی کی طرف ہو گا۔ گردونواح میں جتنے لوگ وی آئی پی شمار کیے جاتے تھے۔ بشمول تحصیلدار، نمبردار، پٹواری وغیرہ کو بتا دیا گیا تھا کہ ان کی حاضری لازمی ہو گی۔ اگر کچھ نہیں جانتے تھے تو وہ غریب جو عوام کہلاتے تھے۔

گزشتہ شام مجھے غنی نے بڑی دلچسپ اطلاع دی تھی کہ دینہ سے رہتاس کی طرف آنے والی اور پھر ست بدھائی کی ذیلی سڑک سب کی استرکاری تو ممکن نہیں تھی مگر تمام گڑھے بھر کے رولر چلا دیا گیا ہے چنانچہ پیوند رکھنے والی سڑک ہی اس حد تک ہموار کر دی گئی ہے کہ وزیرِاعلیٰ صاحب کی گاڑی کو جھٹکا محسوس نہ ہو اور صرف چوبیس گھنٹے پہلے اس سڑک کی خستہ حالی اور شکستگی کا راز فاش نہ ہو۔

یہ بھی انتظامیہ کی خوش خیالی ہوتی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ ان کے عمومی دورے سے پہلے کتنے خصوصی اقدامات سے سب کچھ لیپ پوت کے اچھا بنا دیا جاتا ہے۔ نہ کہیں غلاظت، نہ ٹوٹی پھوٹی سڑک۔ نہ ابلتے گٹر اور نہ کوڑے کے ڈھیر۔ راتوں رات کھلے مین ہول پر نئے ڈھکنے لگ جاتے ہیں اور اسٹریٹ لائٹس کے کھمبوں پر بلب۔ مجال ہے جو کہیں ریڑھی والے یا فقیر نظر آ جائیں۔

حاکم بھی سدا حاکم نہیں رہتے۔ پروٹوکول اور شان و شوکت کا دور گزر جاتا ہے تو وہ انہی سڑکوں اور گلیوں کا اصل نقشہ پھر دیکھتے ہیں اور کسی حاکم کے آنے پر ان کے بدلنے کا نظارہ بھی دیکھتے ہیں۔ یہ کھیل ہم سب نے پہلے بھی دیکھا تھا اور آج پھر دیکھ رہے تھے۔ حیرت کسی کو نہ تھی۔ مجھے اطلاع ملی کہ دریائے کہار کا قدیم پل بھی نیا کر دیا گیا ہے۔ پولیس کے اہلکاروں نے سارے راستے پر اپنی اپنی ڈیوٹی سنبھال لی تھی اور سادہ لباس والے بھی ہر طرف پھیل چکے تھے۔ ان لوگوں کے کھانے پینے اور خاطر تواضع کی ذمے داری میری تھی اور غنی نے اس کا انتظام کر دیا تھا کہ انہیں پینے کے لیے حسبِ ضرورت چائے پانی مل جائے۔

میری ساری فکریں صرف ایک معاملے پر مرتکز ہو کر رہ گئی تھیں اور وہ تھا شامی بادشاہ کا بروقت پہنچنا۔ اسپتال کا افتتاح یا اسکول کا سنگِ بنیاد ایسے ہی تھے جیسے کسی فلم سے پہلے چلائے جانے والے دوسری فلموں کے ٹریلر یا اشتہارات۔ مجھے سابقہ تجربے کی بنیاد پر پورا بھروسا تھا کہ شامی بادشاہ وعدے کے مطابق ضرور آئے گا۔ اس کے باوجود ایک خوف دل سے نہ نکلتا تھا کہ وہ کسی بھی وجہ سے نہ آیا تو کیا ہو گا۔ اس میں قصور میرا نہ ہونے کے باوجود ساری خرابی میرے حصے میں آئے گی۔ مجھے یہ اندازہ بھی نہ تھا کہ اس تقریب کی اصل غرض و غایت سے کتنے لوگ آگاہ ہوں گے۔ ست بدھائی کی حویلی کے اندر میرے اور راجا کے علاوہ یہ بات شہزادکو، غنی اور شیر خان کو معلوم تھی۔ تمام خواتین کے علم میں تھی جن میں ریشم اور اس کی ماں شامل تھیں۔ شاید ایسی ہی صورتِ حال رانا پیلس میں ہو گی۔ ضلعی انتظامیہ اور پولیس کے اعلیٰ عہدیداروں نے کس کس کے ساتھ اس اوپن سیکریٹ پر بات کی ہو گی۔ اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا میری گھبراہٹ بڑھ رہی تھی۔

ہر احتیاط کو بالائے طاق رکھتے ہوئے میں نے مسلسل اپنے موبائل فون پر شامی بادشاہ سے رابطے کی کوشش جاری رکھی کہ کسی صورت اس کی طرف سے یقین دہانی حاصل

ہو جائے لیکن مجھے کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ ہر بار آپریٹر کا ٹیپ پر چلنے والا جواب سن کے میری جھنجلاہٹ بڑھ جاتی تھی۔ آپ کے مطلوبہ نمبر سے جواب موصول نہیں ہو رہا ہے۔ پھر مجھے شامی پر طیش آنے لگا۔ ''آخر وہ فون کیوں نہیں کر رہا ہے۔''

راجا نے مجھے تسلی دی۔ ''اتنا پریشان نہ ہو فیکے پتر۔ وہ آجائے گا۔''

میں نے کہا۔ ''اسے سوچنا چاہیے کہ میری پوزیشن کتنی نازک ہے۔''

قریب سے گزرتے ہوئے غنی نے کہا۔ ''راجا صاحب ایک منٹ میرے ساتھ آیئے۔'' دونوں مین گیٹ سے باہر نکل گئے جہاں ایک طویل شامیانے کو قناتوں سے تین حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ ایک حصے میں اسٹیج تھا جہاں مہمانِ خصوصی، اہم شخصیات اور میڈیا کے نمائندوں کے لیے بیٹھنے کا انتظام تھا۔ اسٹیج پر صرف تین کرسیاں تھیں۔ چیف منسٹر کے لیے اونچی بیک اور نقش و نگار والی گولڈن چیئر تھی۔ دائیں طرف میرے لیے اور بائیں ہاتھ پر راجا کے لیے عام کرسی تھی۔ سامنے میز پر سادہ سفید کور ڈال کے گلدان میں تازہ پھول رکھ دیے گئے تھے۔ تھوڑا سا بائیں جانب وہ اوسٹرم تھا جس پر مائک نصب تھا۔

اس کے سامنے نشستوں کی ترتیب کچھ یوں تھی کہ دائیں ہاتھ پر صوفوں کی دو قطاریں تھیں جو ست بدھائی کی حویلی والوں کے لیے تھیں۔ بائیں ہاتھ پر میڈیا کو جگہ دی گئی تھی۔ بالکل مقابل کی نشستوں پر پہلی صف میں مہمانِ خصوصی کے ساتھ آنے والے وی آئی پی بٹھائے جاتے۔ ان میں رجب علی رانا بھی شامل تھا۔ پیچھے دیگر مہمانوں کے لیے کرسیاں تھیں۔

شامیانے کے دوسرے حصے میں جو صرف چیف منسٹر کے ساتھ میں آنے اور جانے والوں کے لیے مخصوص تھا پُرتکلف چائے کا اہتمام تھا۔ تیسرا حصہ دوپہر کے کھانے میں شریک ہونے والے معزز مہمانوں کے لیے تھا۔ راجا کا خیال تھا کہ وزیرِاعلیٰ کے جلوس میں شامل نصف افراد کھانے کے لیے ضرور رک جائیں گے جن میں میڈیا کے لوگ بھی ہوں گے۔

راجا کا اور میرا چیف منسٹر کے پی آر او سے اور پروٹوکول افسر سے مسلسل فون پر رابطہ تھا۔ اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہاں چیف منسٹر کی آمد میں دو گھنٹے کی تاخیر تو لازمی ہو گی۔ اس کو دینہ میں ایک فنکشن سے فارغ ہو کے آنا تھا اور وہاں وہ خود گھنٹا بھر لیٹ پہنچا تھا تو رہی سہی کسر تقریب کے منتظمین نے پوری کر دی تھی۔ ایسا ہوتا ہے۔ بے چارہ چیف منسٹر کہیں وقت پر پہنچنا بھی چاہے تو ہزار سیاسی اور انتظامی امور میں سے کوئی بھی اس کی راہ میں حائل ہو جاتا ہے یا غیر متوقع صورتِ حال سامنے آجاتی ہے۔ لیکن جہاں وہ جاتا ہے وہاں بھی کچھ لوگ موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور اس کے سارے ٹائم شیڈول کو ڈسٹرب کر دیتے ہیں۔

راجا کو غنی اس لیے بلا کے لے گیا تھا کہ خود ہمارے پروگرام پر چیف منسٹر کا پروگرام اثر انداز ہو رہا تھا۔ یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ ست بدھائی پہنچنے تک وہ کتنا لیٹ ہو گا۔

راجا کی تشویش پر میں نے کہا۔ ''سوائے صبر سے انتظار کرنے کے ہم کیا کر سکتے ہیں راجا۔ یہاں وقت کی پابندی ممکن ہی نہیں۔''

''بات صرف صبر کی نہیں۔ کھانے کی ہے۔ دو بجے کے بعد چائے کا کون سا وقت ہو گا۔'' غنی نے کہا۔

''غنی... چیف منسٹر کھانا نہیں کھا سکتا۔ اس کو سیکیورٹی کلیرنس نہیں ملے گی۔''

''یعنی وہ عام لوگوں والا کھانا کھائے گا تو بیمار پڑ جائے گا۔''

''یہی سمجھ لو۔ وہ تو پانی تک اپنا لائے گا پینے کے لیے لیکن اس کے ساتھ جو ڈیڑھ دو سو افراد کا قافلہ ہو گا۔ انہیں ہم چائے نہ پلائیں تو لنچ دے سکتے ہیں۔'' راجا بولا۔

''پھر مسئلہ کیا ہے؟''

''مسئلہ یہ ہے سر۔'' غنی نے وضاحت کی۔ ''ڈیڑھ دو سو افراد چائے نہیں پئیں گے تو چائے کا سامان بچ جائے گا۔ چلیے اس کی کوئی بات نہیں مگر کھانا وہی ہو گا جو ہم سب کھائیں گے۔ اس وقت اضافی انتظام نہیں کیا جا سکتا۔''

میں نے کہا۔ ''یار ہم ان کے ساتھ نہیں کھائیں گے بعد میں چائے پی کے گزارا کر لیں گے۔''

''نہیں سر۔ میں نے اس کا بندوبست کر لیا ہے۔ کھانا سب ساتھ کھائیں گے۔ اور ان شاء اللہ کمی بھی نہیں ہو گی۔''

راجا نے کہا۔ ''غنی نے کچھ کھانا تقسیم کرنے کے لیے رکھا تھا۔ ہم نے مدعو تو کسی کو نہیں کیا لیکن یہ اندازہ ہے کہ شاید ڈیڑھ دو سو افراد بن بلائے آجائیں۔ پتا تو چل ہی گیا ہے آس پاس کے لوگوں کو کہ یہاں کچھ ہو رہا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اب انہیں بھگا دو گے کھانا کھلائے بغیر۔ کتنے افسوس کی بات ہے۔''

''آپ فکر نہ کریں۔ ایک آسان طریقہ تو یہ ہے کہ

انہیں نزدیک ہی نہ آنے دیا جائے کہ سیکیورٹی کا مسئلہ ہے۔ راجا صاحب کہتے ہیں کہ ہمارے وزیراعلیٰ صاحب کا کچھ پتا نہیں۔ وہ عوامی سیاست کرتے ہیں۔ انہوں نے فرمادیا کہ روکو مت آنے دو۔ تو ہم کیا مطلب نکالیں گے۔ روکو۔ مت آنے دو۔ یا روکو مت۔ آنے دو۔''

''یار تم نے کیا سوچا ہے۔'' میں نے گھڑی دیکھی۔

''جیسا آپ کا حکم۔ کہیں تو سب کو سو سو روپے دے کر چلتا کیا جائے۔ جمع ہونے ہی نہ دیں۔ یا کہہ دیں کہ رات کو آنا۔ رات تک میں کچھ بندوبست کرلوں گا۔''

میں نے کہا۔ ''غنی جیسا چاہو کرلو۔ مجھے فکر ہو رہی ہے شاہی بادشاہ کی۔''

خواتین نے اپنی تیاری گیارہ بجے ہی شروع کردی تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ ڈاکٹر شہناز نے اپنی معاون خصوصی ریشم کے ساتھ حویلی اور اسپتال کے درمیان کوئی سو چکر لگائے ہوں گے۔ جہلم سے کسی بیوٹی پارلر کی مالک کو بطورِ خاص مدعو کیا گیا تھا اور وہ صبح ہی اپنے ماہرین کی ٹیم کے ساتھ پہنچ گئی تھی۔ لباس کے انتخاب کا مرحلہ پہلے ہی طے ہوگیا تھا۔ اب یوں لگتا تھا کہ اس بار مس ورلڈ کا مقابلہ جشن ست بدھائی میں منعقد کیا جارہا ہے۔ اس مرتبہ نور جہاں ہی نہیں تھی چنانچہ بازی ریشم کے ہاتھ لگتی نظر آرہی تھی۔ اس کی حیثیت ایک خادمہ کی تھی مگر اسے وہی اہمیت حاصل تھی جو حویلی کی دیگر خواتین کو تھی۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کس کے دل میں ریشم سے حسد کے جذبات پیدا ہوتے ہوں گے۔ کسی نے اس کا اظہار اپنے رویے سے نہیں ہونے دیا اور ریشم کی تعریف بھی دل کھول کے کی۔

خوشی اور غرور کے جذبات نے ریشم کو دیوانہ کررکھا تھا۔ وہ تتلی کی طرح اِدھر سے اُدھر پھر رہی تھی اور جوش میں زیادہ غلط انگریزی بول رہی تھی۔ میں نے برآمدے میں شہزاد کی ماں اور خالہ کو کرسی ڈالے سکون سے بیٹھے دیکھا تو ان کے پاس چلا گیا۔ شہزاد کی ماں اپنی بے نور آنکھوں سے کچھ دیکھ نہیں سکتی تھی۔ وہ صرف آوازوں سے گہما گہمی اور تقریب کی رونق کا اندازہ کررہی تھی۔ اس کی بہن اسے آنکھوں دیکھا حال سنا رہی تھی۔ کہاں کیا ہو رہا ہے۔ کس نے کیسے کپڑے پہنے ہیں۔

اس سے پہلے کہ میں ان سے کوئی بات کرتا میرے ہاتھ میں فون کی گھنٹی بولنے لگی۔ میں نے نمبر پر غور نہیں کیا کیونکہ گزشتہ دو دن سے مجھے چیف منسٹر کے سیکریٹریٹ سے بھی فون آرہے تھے۔

میں نے کہا۔ ''ہیلو... نواب رفیق ہیئر۔''

دوسری طرف سے شامی بولا۔ ''خیر ہو نواب دوست کی ہا

میں نے کہا۔ ''یار شامی... کہاں ہو تم۔''

''ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی... کچھ ہماری خ نہیں آتی۔''

میں نے کہا۔ ''غالب کی نہیں اپنی زبان میں بتاؤ۔ آئے کیوں نہیں؟''

وہ بولا۔ ''کیا تمہارا سرکاری مہمان آگیا۔''

''اسے چھوڑو۔ تم نے کہا تھا کہ ایک بجے سے پ آجاؤ گے۔''

وہ ہنسا۔ ''مجھے ایک ایک پل کی رپورٹ مل ر ہے۔ ابھی تو دینہ سے بھی نہیں چلا۔''

''مجھے سخت پریشانی ہو رہی تھی۔''

''یار کیسے دوست ہو۔ دوست کی زبان پر اعتبار نہیں جب کہہ دیا کہ آئیں گے تو پھر موت ہی اپنا راستہ روک سک ہے۔''

میں نے کہا۔ ''او کے۔ چیف منسٹر کو شاید مزید ا ڈیڑھ گھنٹا لگے گا۔ تم قریب ہی ہونا؟''

''تم دیکھنا شامی کیسی ڈرامائی انٹری دے گا۔ اِد تمہارے مہمانِ خصوصی نے تقریر ختم کی۔ اُدھر ہم حاضر۔''

میں نے کہا۔ ''اچھا ہوتا۔ اگر تم پہلے سے یہاں مو ہوتے کل رات ہی آجاتے۔''

''اعتبار تم پر تو تھا اور ہے دوست لیکن کسی اور پر نہیں مگر تمہارے لیے شامی رسک لے گا۔''

''رسک کیسا دوست۔ چیف منسٹر نے مجھے زبان ہے۔''

وہ ہنسا۔ ''اناڑی ہو تم سیاست میں۔ زبان پر اعت کرتے ہو اور وہ بھی ایسے لیڈروں کی۔''

میں نے کہا۔ ''تم کیا سمجھتے ہو وہ کوئی چکر بھی دے ہے؟''

''نواب دوست۔ ابھی تک اس کی طرف سے ک ایسا بیان آیا ہے؟ پریس میں یا پبلک میں؟ کہ شامی ہتھ ڈال دے تو اس کے خلاف تمام مقدمات ختم کردیے جا گے۔''

میں چونکا۔ ''بیان۔ آج میں نے اخبارات نہیں دیکھے'' ''میں نے دیکھے تھے۔ کہیں کوئی خبر نہیں۔ کوئی اعلا نہیں۔ تمہارے راجا صاحب ایک پریس ریلیز جاری کر تھے۔ وہ ست بدھائی کے حکمراں نواب رفیق احمد شیرا

کے پرسنل سیکریٹری اور پی آر او ہیں یا نہیں؟"

میں نے کہا۔ "تم نے ٹھیک کہا۔ ایک منٹ ٹھہرو۔ میں راجا سے بات کرلوں۔"

"میں تمھیں پھر فون کرتا ہوں۔" اس نے کہا اور لائن کٹ گئی۔

شامی کی بات نے مجھے متفکر کردیا تھا۔ میں نے راجا کو باہر جا کے پکڑا۔ "راجا کیا حکومتِ پنجاب کی طرف سے کوئی اعلان ہوا ہے چیف منسٹر کا کوئی بیان آیا ہے انہوں نے کوئی پریس ریلیز جاری کی ہے؟"

"ہم کوئی پریس ریلیز چیف منسٹر کے حوالے سے کیسے دے سکتے تھے۔ جب کہ اس کا دورہ خفیہ تھا۔"

"لیکن حکومت پنجاب کی طرف سے یا وزارتِ داخلہ کی جانب سے شامی کو ایسی کوئی پیشکش کی گئی ہے۔"

راجا نے کہا۔ "ضرور کی گئی ہوگی۔ جو سمری وزیراعلیٰ کے سامنے رکھی گئی اس میں یہ تھا کہ وزارت داخلہ کا کوئی ترجمان یا خود وزیرداخلہ شامی بادشاہ کو یہ آفر دے گا۔"

"تو نے خود دیکھا تھا؟"

"ہاں۔ کیا تو نے وہ سمری نہیں پڑھی کی فیکے پتر۔ اس کا آخری پیرا یہی تھا۔"

میں نے کہا۔ "سوری راجا۔ ایسا نہیں ہوا۔"

"کیا مطلب؟" راجا چونکا۔

میں نے کہا۔ "پریس میں وزارت داخلہ کا کوئی اعلان نہیں شامی بادشاہ کو عام معافی دینے کا۔"

راجا کی پریشانی قدرتی تھی۔ "یہ تجھے کیسے معلوم ہوا؟ کیا تو نے اخبارات دیکھے ہیں۔"

"مجھے خود شامی نے ابھی ابھی اطلاع دی ہے۔ اس نے آج کے سارے اخبارات دیکھ لیے ہیں۔ مجھے دال میں کچھ کالا نظر آتا ہے راجا۔" میں نے کہا۔

راجا پریشان ہوگیا۔ "یہ تو کیا کہہ رہا ہے؟"

"میں صحیح کہہ رہا ہوں۔ شامی کی جان خطرے میں ہے۔ ہمارے پاس کیا ثبوت ہے کہ اسے ہتھیار ڈالنے کی صورت میں عام معافی دے دی جائے گی۔ اس سمری کو صرف تو نے دیکھا ہے یا میں نے۔"

"وزیراعلیٰ اتنا بڑا دھوکا نہیں کرسکتا۔"

میں نے کہا۔ "کیوں نہیں کرسکتا۔ اگر ایک ڈاکوؤں کے گروہ کا اتنی آسانی سے صفایا کیا جاسکے تو اس کے لیے جھوٹ کا جال بچھانا اس کی سیاسی دانش مندی کہلائے گا۔"

"میں وزیراعلیٰ کو جانتا ہوں۔ اس کا کردار ایسا نہیں ہے۔ وہ قائل نہ ہوتا تو جھوٹ نہ بولتا۔ صاف کہہ دیتا کہ میں اس تجویز سے اتفاق نہیں کرتا۔ اس کے علاوہ ڈی آئی جی عبداللہ جان بیچ میں ہے۔"

میں نے کہا۔ "الو کے پٹھے۔ اس کے یا میرے بیچ میں ہونے سے یا تیری گواہی سے کیا فرق پڑتا ہے۔ کیا کرے گا ڈی آئی جی۔ استعفیٰ دے گا یا جیسا کہ اس نے وعدہ کیا ہے۔ شاید یہ بھی نہ ہو اور اس نے استعفیٰ دیا تو یہ بھی ڈراما ہوگا تاکہ الزام اس پر نہ آئے۔ اس کا استعفیٰ قبول نہیں کیا جائے گا۔ شامی کی جان خطرے میں ڈال دی ہے میں نے۔"

راجا کا رنگ فق ہوگیا۔ "اگر اس نے خود تجھے بتایا ہے کہ نہ سرکاری بیان ہے اور نہ اعلان۔ تو پھر وہ کیوں آئے گا؟"

"وہ آرہا ہے۔" میں نے چلّا کے کہا۔ "کیونکہ ضامن میں بنا ہوں۔ خود کو اس کا دوست کہتا ہوں اور وہ اتنا بھروسا کرتا ہے میری دوستی پر اور میری زبان پر۔"

راجا چلایا۔ "اسے منع کردے۔ روک دے۔"

"اور وزیراعلیٰ کو بھی..." میں نے شامی کا فون ملایا۔

"نہیں۔ اسے آنے دے۔" راجا نے اپنی گھڑی دیکھی۔ "وہ نکلنے والا ہوگا۔"

راجا کا فون اسی وقت بولا۔ راجا نے کہا "ہیلو۔ اچھا دس منٹ میں۔ ٹھیک ہے۔ راستہ آدھے گھنٹے کا ہے۔ ہم منتظر ہیں۔ سوا دو ڈھائی بج جائیں گے۔ اوکے۔ ہاں، میں سمجھ گیا مگر شیدائی صاحب۔ ایک بات بتائیں۔ جو سمری وزیراعلیٰ کے سامنے رکھی گئی تھی اس میں یہ تھا کہ وزارت داخلہ کی طرف سے اعلان کیا جائے گا۔ ہاں۔ ظاہر ہے اس کے بغیر شامی کو کیسے پتا چلے گا۔ اگر وہ آئے گا تو اسی پیشکش کے جواب میں۔ نہیں۔ میں آج اتنا مصروف تھا کہ کوئی اخبار نہیں دیکھا۔ اخبارات یہاں آتے بھی نہیں۔ دینہ جا کے لانے پڑتے ہیں ہر روز۔ آپ نے بتادیا تھا۔ نوٹیفکیشن ہو گیا تھا؟ آپ ذرا کنفرم کرلیں۔ پھر مجھے بتائیں۔ ابھی..."

راجا کی بات سے میں سمجھ گیا تھا کہ چیف منسٹر سیکریٹریٹ سے وزارتِ داخلہ کو مطلع کردیا گیا تھا کہ حکومت نے کیا فیصلہ کیا ہے۔ اخبار میں پریس ریلیز دینا۔ یا کانفرنس میں اعلان کرنا صوبائی وزارتِ داخلہ کا کام تھا۔ ان کا کوئی ترجمان کرتا یا خود وزیرداخلہ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا تھا۔

راجا نے گھبراہٹ میں کہا۔ "شامی سے رابطہ نہیں ہوا؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "تو نے دیکھا! وہ...

باس کے ساتھ بھی ہاتھ کرگیا۔" میں نے صوبائی وزیرداخلہ کو بہت بڑی گالی دی۔

"یہ ڈبل گیم ہے۔ اس نے جانتے بوجھتے چیف منسٹر کو ڈبل کراس کیا ہوگا۔ میں معلوم کرتا ہوں۔" راجا اب نروس ہورہا تھا۔

"میرا شامی سے رابطہ نہیں ہورہا ہے۔ مجھے اس کو ہر قیمت پر روکنا ہے ورنہ وہ سب کتے کی موت مارے جائیں گے۔"

"ادھر چیف منسٹر نکل گیا ہے دینہ سے۔ خیر اس سے تو میں نمٹ لوں گا۔ بس تو شامی کو روک دے۔"

"ابھی وہ خود رابطہ کرے گا۔ اس نے کہا تھا۔"

"ہم سے کتنی بڑی غلطی ہوئی۔ شامی بالکل ٹھیک کہتا ہے۔ پہلے اعلان تو آئے۔"

"وہ پہلے کچھ نہیں کرسکا تھا۔ اس نے جو بندے ست بدھائی بھیجے تھے میرے خلاف قانونی کارروائی کے لیے۔ انہیں واپس جانا پڑا تھا۔ یہ اس کی دوسری سبکی تھی۔ وہ اس کا بدلہ لینا چاہتا ہے۔"

"میں اس کی... دوں گا۔ اسے اندازہ نہیں کہ اس نے کس سے پنگا لیا ہے۔ راجا سے بڑا حرامی نہیں ہے وہ۔" راجا نے مختلف نمبر ڈائل کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ "سالا کوئی نہیں مل رہا ہے۔ یا فون اٹھاتا نہیں یا نمبر انگیج ملتا ہے۔ میرا منہ کیا دیکھ رہا ہے۔ نمبر ملا شامی کا... ورنہ وہ مارا جائے گا۔"

راجا کا چہرہ سرخ ہورہا تھا۔

میں نے کہا۔ "راجا۔ دونو طرف سے کوششیں کی جائیں گی تو دونوں کے نمبر انگیج ملیں گے۔ میں نے کہا تھا کہ میں معلوم کرتا ہوں۔ اس نے کہا کہ ابھی میں پانچ منٹ بعد فون کروں گا۔ پانچ منٹ تو ہوگئے۔ پانچ کیا دس منٹ ہوگئے۔"

راجا نے شاؤٹ کرکے کہا۔ "کون۔ دیکھو میں راجا ہوں۔ آخر مجھے نمبر کیوں نہیں مل رہا ہے وزارت داخلہ کا۔ مجھے ابھی اسی وقت وزیرصاحب سے بات کرنی ہے۔ آئی ڈیم کیئر۔ اس معاملے کی اہمیت میٹنگ سے زیادہ ہے۔ تم نے فوراً نہ بتایا اور ابھی بات نہ کرائی تو تم بھی مارے جاؤ گے اور وزیرصاحب کی ساری سیاست... کے راستے نکل جائے گی۔ ہاں ایسی ہی زبان استعمال کرتا ہوں میں۔ راجا نام ہے میرا۔ میں خالی کھوکھلی دھمکی نہیں دیتا۔ اگر اس نے مذاق سمجھا تو مارا جائے گا۔ ہاں میں بھی ریکارڈ کررہا ہوں۔ اسے بتادو کہ میرے پاس ایٹم بم ہے۔ سمجھ آئی؟"

اگلے دس منٹ تک میں نے اور راجا نے دیوانہ وار کوشش کی لیکن نہ میری شامی سے بات ہوئی۔ نہ اس کی وزیرداخلہ سے۔ پھر اس نے ڈی آئی جی عبداللہ جان کو سب بتانے کی کوشش کی مگر وہ چیف منسٹر کے جلوس میں سیکیورٹی ڈیوٹی پر مامور تھا اور اس کی گاڑی کے پیچھے چل رہا ہوگا۔ اس خیال سے ہم دونوں پر Panic سوار تھی کہ شامی میری زبان پر اعتبار کرتے ہوئے ست بدھائی کی طرف چل پڑا تو کیا ہوگا؟ کیا وہ خیروعافیت کے ساتھ پہنچ جائے گا۔ یا راستے میں ہی مارا جائے گا۔ اس کے سر کی قیمت پچاس لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ اس کے گروہ میں شامل ہر ڈاکو قانون کو مطلوب تھا۔ انہیں مار دینا پولیس کا بہت بڑا کارنامہ سمجھا جاتا۔

اچانک میری کامیابی کی ساری خوشی خاک میں مل گئی تھی۔ میرے لیے یہ ایک ذلت آمیز شکست بن رہی تھی۔ جو کامیابی رانا کی ہوگی۔ وزیرداخلہ کی ہوگی۔ میرا دوست اور سہارا سمجھا جانے والا شامی اپنے گروہ سمیت مارا جائے گا۔ کیونکہ وزیرداخلہ کی توہین کا مرتکب ہوا تھا۔ میں نے اس کی بات نہیں سنی تھی۔ اس کا حکم نہیں مانا تھا۔ اسے بے عزت کیا تھا جب اس نے میرے خلاف انتقامی کارروائی کا آغاز کیا تھا تو میں نے اسے ناکام کردیا تھا۔ رانا کو کتنا صدمہ ہوگا کہ اس کی ہر سیاسی چال الٹی پڑرہی ہے۔ اس کا اثر رسوخ کام نہیں کررہا ہے لیکن اس نے ہار نہیں مانی تھی اپنی کوشش ترک نہیں کی تھی۔ اور آج ایسا لگتا تھا کہ آخری جیت اسی کی ہونے والی ہے۔

راجا کی اور میری ہر کوشش رائگاں گئی۔ نہ میں شامی سے بات کرسکا اور اسے ادھر کا رخ کرنے سے روک سکا۔ نہ وزیرصاحب نے راجا کی دھمکی سے متاثر ہوکے اس سے بات کرنا ضروری سمجھا۔ معلوم نہیں کیوں شامی نے بھی مجھے فون نہیں کیا حالانکہ اس نے کہا تھا کہ وہ دوبارہ فون کرے گا۔ یہ خوف میرے اعصاب پر سوار ہورہا تھا کہ میری پوزیشن خراب ہونے سے بچانے کے لیے وہ جذباتی آدمی ست بدھائی کی طرف روانہ ہوجائے گا۔

مجھے یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ شامی آخر کس سمت سے آئے گا ورنہ میں کسی کو روانہ کردیتا کہ اس کو راستے میں ہی روک لے اور واپس کردے۔ سڑک کے راستے سے اس کا آنا ممکن نہیں تھا۔ اس راستے پر پولیس موجود تھی اور دینہ سے روانہ ہونے والا جلوس بہت آگے تک پہنچ چکا تھا۔ کچھ ہی دیر میں چیف منسٹر کا قافلہ نمودار ہونے والا تھا۔

راجا کا غصے سے برا حال تھا اور میرا صدمے سے۔ شامی نے ایک چھوٹا سا نکتہ اٹھایا تھا لیکن وہ بہت بڑا

سوال بن گیا تھا۔ میں اپنی عقل پر ماتم کررہا تھا کہ یہ بات مجھے یا راجا کو پہلے کیوں نہیں سوجھی۔ اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں خدا سے دعا مانگی کہ وہ شامی کو سوچ سمجھ کے قدم اٹھانے کی توفیق دے۔ مجھ سے رابطہ نہ ہونے اور میری طرف سے کوئی یقین دہانی حاصل نہ ہونے پر وہ اپنا ارادہ بدل دے۔

دور سے سائرن کی آواز سنائی دی۔ یہ چیف منسٹر کے ایسکورٹ کی موٹرسائیکل کا سائرن تھا۔ ہم اس آرائشی دروازے کی جانب دوڑے جو دریا کے پل اور حویلی کے دروازے کے درمیان کھڑا کیا گیا تھا۔ پل کے آخری حصے سے حویلی تک رنگین جھنڈیاں لگی ہوئی تھیں اور استقبال کرنے والے صف بستہ تھے۔ یہ مقامی دیہات کے لوگ تھے جو تیاریاں دیکھ کے خود ہی جمع ہوگئے تھے۔ گیٹ کے بعد رنگین زرد اور سرخ کپڑوں میں ڈھول بجانے والے تھاپ پر رقص کرنے والے کھڑے تھے۔

جیسے ہی جلوس کے آگے چلنے والی بھاری بھرکم موٹر سائیکل سائرن بجاتی پل سے گزری غنی نے ڈھول والوں کو اشارہ کیا اور وہ حرکت میں آگئے۔ چند منٹ بعد چیف منسٹر کی گاڑی آئی تو وہ کچھ دیر اس کے سامنے ناچتے رہے۔ پھر غنی کے اشارے پر انہوں نے راستہ چھوڑ دیا اور گاڑی عین حویلی کے گیٹ تک آگئی۔ ساتھ آنے والی دوسری گاڑیاں دائیں بائیں موڑ دی گئیں۔

میں نے چیف منسٹر کا استقبال کیا اور کوشش کی کہ اپنی پریشانی کا اظہار چہرے سے نہ ہونے دوں۔ میرے بعد راجا نے اس سے ہاتھ ملایا اور اسے اپنے ساتھ شامیانے کی طرف لے گیا۔ وہاں سب لوگ اپنی اپنی جگہ پر پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔ راجا اور میں چیف منسٹر کے ساتھ اسٹیج پر جا بیٹھے۔ غنی نے باقی لوگوں کو حسب مراتب بیٹھنے میں ان کی مدد کی۔

موبائل فون اب میرے بائیں ہاتھ میں تھا میں نے اس کی گھنٹی بند کردی تھی لیکن شامی کا فون آتا تو موبائل سیٹ میرے ہاتھ میں تھرتھرانے لگتا۔ اس وقت میرا دماغ دو حصوں میں بٹا ہوا تھا۔ ایک حصہ چیف منسٹر کی طرف متوجہ تھا لیکن دوسرا حصہ شامی کے غم میں ڈوبا ہوا تھا۔ شاید کچھ ایسی ہی کیفیت راجا کی ہوگی۔

جلوس کے ساتھ تیس چالیس گاڑیاں تھیں۔ ان میں سیکیورٹی فراہم کرنے والے اہلکاروں کے علاوہ میڈیا کے لوگوں کی گاڑیاں بھی شامل تھیں جواب اپنے اپنے کیمرے فوکس کررہے تھے۔ ٹی وی کے نمائندوں نے تقریب کے آغاز سے ہی ریکارڈنگ شروع کردی تھی۔ اخبار والے اپنے کیمرے چمکا رہے تھے۔

شہناز نے ڈائس پر آکے کمپیئرنگ شروع کی۔ اس نے پہلے گاؤں کے مولانا صاحب کو تلاوت کے لیے بلایا۔ اس وقت راجا اٹھ کے نیچے گیا اور اس نے پروٹوکول افسر کے قریب جاکے کچھ کہا۔ اس نے ساتھ بیٹھے ہوئے پی آر او سے سرگوشی میں بات کی۔ میں سمجھ گیا کہ راجا ان سے کیا ڈسکس کررہا ہوگا۔ میری نظر نے اپنے سامنے کی پہلی قطار میں براجمان رانا رجب علی کو دیکھا۔ وہ اپنے ولی عہد زوہیب کے ساتھ آیا تھا اور اگرچہ ان کے لبوں پر ایک دوستانہ مسکراہٹ تھی مگر میں اندازہ کرسکتا تھا کہ اس وقت ان کے سازشی ذہنوں کی سوچ کیا ہوگی۔

جب شہناز نے دوبارہ اسٹیج پر آکے سپاسنامہ پڑھنا شروع کیا تو میں نے دائیں طرف ان سب کی طرف دیکھا جو ست بدھائی کی حکمراں فیملی کا حصہ بن کے انتہائی معتبر اور معزز ہوگئے تھے۔ رابعہ کے ساتھ لیلیٰ بھابی تھیں۔ پھر ریشم تھی اور اس کی ماں فاطمہ تھی۔ آگے شہزاد کی ماں اور خالہ تھیں۔ ان کی حیثیت کے مطابق ان کی جگہ سب سے الگ تھی اور آگے تھی۔ ان کے چہرے خوشی سے دمک رہے تھے اور قدرتی طور پر ان کے انداز واطوار میں جو فخر کا احساس تھا وہ غرور میں ڈھل گیا تھا۔ ان کے پیچھے والی کرسیوں پر حویلی کے اندر اور باہر کام کرنے والوں کی فیملی تھی اور ان کے جذبات بھی مختلف نہ تھے۔ عورتیں بچے خوب سج دھج کے آئے تھے۔ یوں جیسے وہ کسی شادی میں مدعو ہیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ اہم سمجھے گئے تھے۔ انہیں دھتکارا نہیں گیا تھا بلکہ مہمان بنا کے کرسیوں پر بٹھایا گیا تھا۔

پروگرام کے مطابق راجا کو میرے ساتھ اسٹیج پر موجود رہنا تھا لیکن وہ چیف منسٹر کے پرسنل سیکریٹری اور پروٹوکول افسر کے ساتھ گفتگو میں مصروف رہا اور وہ باری باری موبائل فون پر نہ جانے کس کس سے بات کرتے رہے۔ شامی سے میرا رابطہ نہیں ہوا تھا۔ میں نے طے کرلیا تھا کہ اگر وہ خیروعافیت کے ساتھ پہنچ گیا تو ٹھیک ورنہ چیف منسٹر کو صاف بتادوں گا کہ اس کے نہ آنے کا سبب کیا ہے۔ وعدہ خلافی اس نے نہیں کی۔ اسے وزارت داخلہ کی طرف سے نہ کوئی اشارہ ملا نہ کوئی یقین دہانی حاصل ہوئی کہ ہتھیار پھینکنے کی صورت میں اس کے خلاف تمام مقدمات ختم کردیے جائیں گے۔ پھر وہ روپوشی سے نکل کے ست بدھائی آنے کا خطرہ کیسے مول لے سکتا تھا۔

شہناز نے سپاسنامہ پڑھنے کے بعد چیف منسٹر کے سامنے آکے اسے پیش کیا۔ میں نے بتایا کہ ڈاکٹر شہناز ایک مشنری جذبے کے ساتھ یہاں کام کرنے آئی ہیں ورنہ شہر میں ان کی پریکٹس بہت اچھی چلتی تھی اور آمدنی بھی بہت تھی۔

اس کے بعد مجھے کچھ کہنا تھا۔ میں نے اپنی تقریر تیار کرلی تھی لیکن اب اس میں تھوڑا سا ردوبدل ضرور ہوگیا۔ میں نے مختصراً اپنے بارے میں اور ست بدھائی کی جاگیر اور حویلی کے بارے میں بتایا اور پھر ان منصوبوں پر آگیا جو میرے ذہن میں تھے۔ کسی کا نام لیے بغیر میں نے کہا کہ ”میرے کوئی سیاسی عزائم نہیں تھے لیکن بدقسمتی سے کچھ لوگوں نے میرے ترقیاتی منصوبوں کو اپنے لیے ایک خطرہ تصور کیا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ یہاں لوگوں کو عزت ملے روزگار اور تعلیم ملے۔ انہیں یہ اندیشہ آج بھی لاحق ہے کہ غریبوں کی ہمدردیاں سمیٹ کر درحقیقت میں اگلے الیکشن کے لیے ووٹ بینک بنارہا ہوں۔ انہوں نے میرے خلاف ہر قسم کی سازش کی جس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں۔ بے شک مجھے اور میرا ساتھ دینے والوں کو بہت نقصان بھی اٹھانا پڑا لیکن اللہ کا شکر ہے جس نے مجھے آگے بڑھتے رہنے کی ہمت اور توفیق عطا کی۔“

میں ذرا سی دیر کے لیے رکا۔ راجا کے لیے یہ سب غیر متوقع نہیں تھا۔ میں نے رانا رجب علی کو بے چینی سے پہلو بدلتے دیکھا۔ اس کے ساتھ بیٹھا ہوا ڈی آئی جی عبداللہ جان زیرلب مسکراتا رہا۔ زوہیب جوان آدمی تھا۔ اس نے شاید یہ محسوس کیا کہ اس کے باپ کو یہاں بلا کے بالواسطہ طور پر ذلیل کیا جارہا ہے۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ جاننے والے جان گئے تھے کہ میں نے کس کی طرف اشارہ کیا ہے لیکن نام میں نے کسی کا بھی نہیں لیا تھا۔

چند سیکنڈ کے توقف کے بعد میں نے کہا۔ ”لیکن... جناب چیف منسٹر صاحب! میرے لیے بڑے دکھ اور پریشانی کی بات ہے کہ یہ حکومت جو عوامی فلاح کے لیے دن رات کوشاں ہے۔ اس کے کچھ لوگ حکومت کو بدنام کرنے کی سازش میں مصروف ہیں اور انہوں نے آپ کی پارٹی کی سیاسی ساکھ کو تباہ کرنے کے لیے میرے خلاف سازش کرنے والوں کا ساتھ دیا۔“

چیف منسٹر کچھ حیران ہوا اور چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔ راجا نے پیچھے سے سر کی خفیف جنبش کے ساتھ اشارہ کیا کہ میں سب کہہ دوں۔ سامنے کی قطار میں چیف منسٹر کا پرسنل اسٹاف کچھ ڈسٹرب ہوا مگر میں نے اپنی بات جاری رکھی۔

”....آپ حیران ہوں گے جناب والا۔ حال ہی میں آپ کے ایک وزیر نے مجھے ایک تقریب میں یہ کہا کہ میرے فلاحی منصوبے حکومت کو بدنام کرنے کی سازش ہیں۔ یہ کام حکومت کے کرنے کا ہے چنانچہ مجھے فوراً اپنے اسکول اور اسپتال کے علاوہ دیگر ترقیاتی منصوبے ختم کردینے چاہئیں۔ میرے انکار پر انہوں نے مجھے خطرناک نتائج کی دھمکی دی اور عملی طور پر میرے خلاف غیر قانونی مقدمات قائم کرنے کی کوشش کا آغاز ہوگیا۔ میں اس کی تفصیل میں جاکے آپ کے لیے مشکل پیدا نہیں کرنا چاہتا اس لیے میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھے تحفظ فراہم کیا جائے۔ میں عوام کی حالت بہتر بنانے میں حکومت کی ہر کوشش کی تائید کرتا ہوں اور آپ کو اپنی حمایت کا یقین دلاتا ہوں۔“

چیف منسٹر کے چہرے پر نمودار ہونے والی بے اطمینانی اور ناراضی کے جذبات ایک دم بدل گئے۔ راجا نے بروقت تالیاں بجانے کا اشارہ کردیا اور میں نے محسوس کیا کہ ایک غیر سیاسی تقریر کو سیاسی رنگ دے کر میں نے ایک پوائنٹ اسکور کرلیا ہے۔ میں نے اعلان تو نہیں کیا تھا کہ میں آپ کی سیاسی جماعت میں شامل ہورہا ہوں مگر سمجھا یہی گیا۔

رانا کی حالت اب قابلِ دید تھی۔ اس کے چہرے پر مسلط مصنوعی مسکراہٹ اور منافقت آمیز دوستانہ انداز غائب ہوگئے۔ اسے شاید مجھ سے ایسی سیاسی چال کی ہرگز امید نہ تھی۔ وہ جدی پشتی سیاست کا کھلاڑی مجھے ایک طفلِ مکتب اور اناڑی سمجھتا آیا تھا مگر وقت نے مجھے بہت کچھ سکھادیا تھا۔

مجھے اندازہ تھا کہ چیف منسٹر کا وقت قیمتی ہے لیکن میں یہ بھی سمجھتا تھا کہ جو موقع مجھے آج ملا ہے اس سے آج ہی پورا فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ وہیں کھڑے کھڑے میں نے ایک ٹرمپ کارڈ پھینک دیا۔ میں نے کہا کہ میں وزیراعلیٰ کے خوشحالی پروگرام میں ایک کروڑ کے عطیے کا اعلان کرتا ہوں۔ ایسے تمام عطیات درحقیقت سیاسی رشوت کا درجہ رکھتے ہیں لیکن جس معاشرے اور حکومت کی بنیاد میں رشوت کا استعمال کنکریٹ کی طرح کیا جاتا ہو وہاں اپنا مطلب نکالنے اور اپنا راستہ بنانے کے لیے حرام کو حلال سمجھنا پڑتا ہے۔ یہی نظریہ ضرورت ہر جگہ سکہ رائج الوقت بنا ہوا تھا۔

ایک بار پھر تالیاں بجائی گئیں۔ یہ بازی میں نے جیت لی تھی۔ اپنے غیر سیاسی ہونے کا اعلان کرکے میں نے بہت بڑی سیاسی چال چلی تھی اور ان کے منہ پر جوتا مارا تھا جو مجھے اس میدان میں اناڑی سمجھے بیٹھے تھے۔ میں نے اپنی

تقریر ختم کی تو وزیراعلیٰ نے بڑے گول مول الفاظ میں میری تعریف کے بعد مجھے اپنی حمایت کا یقین دلایا اور وعدہ کیا کہ حکومت کی طرف سے مجھے پورا تحفظ فراہم کیا جائے گا۔ صوبے میں مخلوط حکومت تھی۔ وہ جانتا تھا کہ رانا کا تعلق اس کی حریف جماعت سے ہے۔ پہلے میں نے اس کا حوالہ دیا تھا۔ بعد میں وزیر کا ذکر کیا تو اسے سمجھنا مشکل نہ ہوا کہ میں کس کی بات کررہا ہوں۔ اسے یہاں رانا کے مقابلے میں اپنی جماعت کے کسی مضبوط حامی کی ضرورت تھی۔ اس نے کچھ کہے بغیر سمجھا یا کہ اس کی جماعت میرا ساتھ دے گی۔

شامی کا ابھی تک کوئی پتا نہ تھا۔ نہ اس کی طرف سے کوئی اطلاع تھی اور پیغام۔ مجھے کچھ اطمینان ہونے لگا تھا کہ شاید اب شامی نہیں آئے گا۔ یقیناً اس سے چیف منسٹر کا موڈ بہت خراب ہوتا کیونکہ باقی سب محض زیب داستاں کے لیے تھا۔ اصل کہانی شامی بادشاہ کے ہتھیار ڈالنے اور حکومت کے معافی دینے کے اعلان کی تھی۔ میں نے اپنا لائحہ عمل طے کیا تھا۔ اگر شامی خیروعافیت کے ساتھ پہنچ گیا تو میری سیاسی فتح مکمل۔ اگلے دن کے اخبارات کی سرخیاں اور تصویریں نواب آف ست بدھائی کے حوالوں سے بھری ہوں گی کہ انہوں نے اپنے اثر رسوخ سے کام لیتے ہوئے کتنا بڑا مسئلہ حل کرنے میں مدد کی۔

جب چیف منسٹر کی تقریر ختم ہوئی تو ہم اسے حویلی کے اندر لے گئے۔ اس نے حویلی کی قدامت میں خاصی دلچسپی ظاہر کی۔ میں اسے حویلی کے اس حصے میں لے گیا جس کا نام فریال نے نگارخانہ رکھا تھا۔ یہاں حویلی کے پرانے حکمرانوں کی قدآدم روغنی تصاویر لگی ہوئی تھیں۔ فریال نے اس پر بڑی محنت کی تھی۔ دیواروں پر نیا رنگ کرانے کے علاوہ اس نے ہر طرف اسپاٹ لائٹس لگوادی تھیں جو براہِ راست ہر تصویر کو روشن کرتی تھیں۔

چیف منسٹر یقیناً متاثر ہوا اس کی دلچسپی کا اظہار اس کے سوالات سے بھی ہورہا تھا اور وقت کی تنگی کا مسئلہ نہ ہوتا تو شاید وہ حویلی کے تاریخی پس منظر کے بارے میں ضرور معلومات حاصل کرتا۔ اس کے معاون عملے میں جو سیکریٹری اور پروٹوکول افسر قسم کے لوگ تھے وہ اسے مسلسل یاد دلا رہے تھے کہ اس کے شیڈول میں آگے کیا ہے۔ سیکیورٹی والے ایک سائے کی طرح ساتھ تھے اور انہوں نے اچھا ہی کیا تھا کہ گنے چنے چند افراد کو ہی حویلی کی زیریں منزل کے اس ہال میں اترنے دیا تھا۔

ساتھ آنے والوں میں رانا رجب علی اور اس کا بیٹا بھی تھے۔ شاید ان کے لیے زندگی میں یہ پہلا اور آخری موقع تھا کہ انہوں نے میری خاندانی تاریخ کی جھلک کا نظارہ کیا۔ اس کے نزدیک تو میں کوئی قابلِ فخر تاریخی پس منظر رکھتا ہی نہیں تھا۔ میرا باپ بچوں کو تنخواہ پر پڑھانے والا سرکاری ملازم تھا اور بس... چنانچہ وہ مجھے بڑی حقارت سے اور طنز سے نواب کا نطفہ کہہ کے میری تذلیل کرتا تھا۔ آج اس نے دیکھا کہ جاگیر چھوٹی سہی لیکن میرے آباؤاجداد کی شان وشوکت کسی راجے مہاراجے سے کم نہ تھی۔

میں دیکھ سکتا تھا کہ رانا رجب علی کے چہرے پر کئی اندرونی اذیت کے آثار ہیں۔ جو عزت مجھے آج بن مانگے اور اچانک مل گئی تھی اس کا صدمہ ہی کم نہ تھا۔ ایسا صرف شامی بادشاہ جیسے نامی گرامی ڈاکو سے دوستی کے باعث ہوا تھا۔ وہ میرے کہنے پر ہتھیار ڈالنے کے لیے رضامند نہ ہوتا تو وزیراعلیٰ کو کیا پڑی تھی کہ ست بدھائی کے چھوٹے سے اسپتال کا افتتاح کرنے آتا۔ حویلی میں میرے باپ دادا کی باوقار تصویریں دیکھ کر رانا نے یقیناً شدید احساسِ کمتری محسوس کیا ہوگا۔ اسے سخت شاک پہنچا ہوگا کہ میں تو اس سے کہیں زیادہ خاندانی ہوں۔

ساری بات صرف سوچ کی ہوتی ہے۔ ایسے ہی جاہلانہ حقیقت کا مظاہرہ میں کرتا تو رانا کو اپنے سے کم تر اور حقیر سمجھتا۔ یہ کہتا کہ تم کیا ہو؟ ہل چلا کے زمین سے غلہ اگانے والے کسان اور کیا۔ بڑا چھوٹا ہر زمیندار غلہ اگاتا ہے۔ غلہ بیچتا ہے یا جانور پال لیتا ہے۔

رانا کی ذہنی کیفیت کا اندازہ کرکے مجھے بڑی خوشی ہورہی تھی۔ شاید آج کے بعد وہ اپنا رویّہ بدل لے۔ راتوں رات میری پوزیشن بدل گئی تھی۔ مجھے سیاسی طاقت بھی حاصل ہوگئی تھی اور نام ونسب کی خاندانی حیثیت بھی۔ میں نے موقعے سے فائدہ اٹھانے میں کوئی کسر باقی نہیں رہنے دی۔ دس منٹ کے مختصر وقفے میں اپنے دادا پردادا اور ان کے دادا پردادا کا ذکر کرتے ہوئے میں نے کوئی سند نہ رکھنے والے قدیمی حوالے بھی شامل کردیے۔ مجھے اندازہ تھا کہ سیاستدانوں اور بیوروکریٹ کے اس مختصر اجتماع میں شاید کوئی تاریخ داں نہیں ہوگا۔ میں نے بڑے اعتماد سے جھوٹ بولا۔ فلاں کو فلاں انگریز گورنر جنرل نے یہ اعزاز دیا تھا۔ فلاں نے یہ کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ فلاں کو ملکہ وکٹوریا نے لندن طلب کیا تھا۔

مجھے حیرانی ہوئی جب رانا نے بڑے طنز سے کہا۔ ”نواب رفیق! انڈین ہسٹری تو ہم سب نے پڑھی

ہے۔ اس میں یہ سب کیوں نہیں ہے؟“

میں نے بڑے وقار سے مسکرا کے کہا۔ ”رانا صاحب! برطانوی سلطنت میں چھ سو رجواڑے تھے۔ ان میں حیدرآباد دکن اور بھاولپور جیسی بڑی بڑی ریاستیں بھی تھیں اور ست بدھائی جیسی چھوٹی بھی۔ ان سب کا ذکر کسی تاریخ میں نہیں ملتا لیکن میں اب اپنی خاندانی تاریخ مرتب کرا رہا ہوں۔ ایک برطانوی تاریخ داں اس پر ریسرچ کررہے ہیں۔ کتاب برطانیہ سے شائع ہوگی تو آپ کی خدمت میں ضرور پیش کی جائے گی۔“

رانا کو چیف منسٹر کی بات نے مزید رسوا کیا۔ ”ایک کاپی ہمارے لیے بھی ریزرو کرلیں نواب صاحب۔“

اس کے پرنسل سیکریٹری نے کہا۔ ”سر! ٹائم کم ہے۔“

”وزیراعلیٰ نے میرے ساتھ نگارخانے میں دس منٹ ہی گزارے تھے۔ وہاں سے وہ سیدھا اسپتال گیا جہاں ڈاکٹر شہناز اور ریشم نے اس کا استقبال کیا۔ ریشم نے چیف منسٹر سے بات کرنے کے لیے خاص طور پر انگریزی کے جملے رٹ کر یاد کیے تھے۔ شہناز نے اس کا تعارف کرایا۔ ”یہ ہے میری اسسٹنٹ ریشم۔“

ریشم نے جس سکون اور اعتماد کے ساتھ چیف منسٹر سے ہاتھ ملا کے تمام انگریزی بولی اور سب کو حیران کردیا۔ کوئی بھی اندازہ نہیں کرسکتا تھا کہ اسے انگریزی نہیں آتی اور عام دنوں میں جو انگلش وہ بولتی ہے اس سے بدنامی گوروں کی ہوتی ہے۔ اس کی ادائیگی درست تھی اور ظاہر ہے یہ بھی ریہرسل کا نتیجہ تھا۔ اگر چیف منسٹر نے اسے دوبار ڈاکٹر ریشم کہہ کے مخاطب کیا تو یہ اس کا قصور نہیں تھا۔

چیف منسٹر نے فیتہ کاٹا۔ سب نے دعا مانگی۔ پانچ منٹ میں اس نے اسپتال کا دورہ ختم کرلیا جہاں ہر شخص اس سے ہاتھ ملانے کے لیے بے قرار تھا۔ چند قدم کے فاصلے پر لیلیٰ بھابی اور رابعہ اپنے اسکول کے افتتاح کے لیے چشم براہ تھیں اور انہوں نے زیادہ اردو ہی بولی لیکن ایک انگلش اخبار کے رپورٹر کو انگلش میں ہی جواب دیا کہ اسکول کب تک مکمل ہونے کی توقع ہے۔

شامی کے نہ آنے سے مجھے کچھ اطمینان حاصل ہوگیا تھا۔ اس نے رسک نہ لے کر بڑی دوراندیشی کا ثبوت دیا تھا۔ ایک بے اطمینانی پیدا کرنے والا یہ خیال تھا کہ کہیں اس نے بروقت نمودار ہونے کا ارادہ نہ کیا ہو۔ اسے چیف منسٹر کے پروگرام میں تاخیر کی خبریں مل رہی تھیں۔ ضرور اس نے اپنا کوئی مخبر دینہ کی تقریب میں شامل کیا ہوگا۔ اگر ایسا تھا تو اس نے کسی کو پہلے سے یہاں کیوں نہیں بھیجا تھا جو اسے پل پل کی رپورٹ ارسال کرتا رہتا اور اگر ایسا کوئی شخص یہاں تھا تو اس پر لازم تھا کہ مجھ سے باغنی سے رابطہ رکھتا۔

اصل پریشانی کا سامنا مجھے آگے ہونے والا تھا جب اسکول کا سنگِ بنیاد رکھنے کے بعد چیف منسٹر چائے پینے کے لیے الگ لگے ہوئے شامیانے میں جائے گا۔ راجا نے پی آر او شیدائی صاحب اور پروٹوکول افسر سے تو بات کرلی تھی کہ چیف منسٹر کی ہدایات کے باوجود وزارتِ داخلہ کی طرف سے نہ کوئی اعلان آیا ہے نہ پیشکش چنانچہ شامی بادشاہ کا آنا قطعی غیر یقینی ہوگیا ہے لیکن ابھی تک انہیں موقع نہیں ملا تھا کہ یہ بات اپنے باس کے گوش گزار کرسکتے۔

پانچ منٹ بعد جب میں چیف منسٹر کے ساتھ صوفے پر بیٹھا تو اس نے معنی خیز نظروں سے میری طرف دیکھ کے سوال کیا۔ ”ہاں جی نواب صاحب! یہ سب تو ہوگیا۔ اب کیا پروگرام ہے؟“

میں نے شیدائی صاحب کی طرف دیکھا۔ ”راجا صاحب نے آپ کو بتا دیا ہوگا...“

شیدائی صاحب نے سر ہلایا۔ ”جی...“ اور پھر آہستہ سے چیف منسٹر سے کہا۔ ”سر اور کوئی پروگرام نہیں۔“

چیف منسٹر کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ ”کیا مطلب؟ ہمیں کچھ مہمانوں سے ملوایا جانا تھا؟“

میں نے کہا۔ ”سر کیا ہم چند منٹ اکیلے میں بات کرسکتے ہیں!“

وزیراعلیٰ نے اپنے معاونین کی طرف دیکھا کچھ سوچا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم شامیانے کے آخری کونے میں جا کھڑے ہوئے۔ وہاں میرے علاوہ صرف شیدائی صاحب تھے۔ وہ چیف منسٹر کے موڈ کو سمجھتا تھا۔ ”سر وہ ہماری طرف سے ایک کوتاہی ہوگئی۔“

”کوتاہی؟ کس کی طرف سے“ چیف منسٹر بگڑ گیا۔

میں نے کہا۔ ”نہ آپ کی طرف سے اور نہ میری طرف سے۔“

”میں یہاں پہیلیاں بوجھنے نہیں آیا ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”سر! آپ مجھے صرف دو منٹ دیں تو میں وضاحت کردوں۔“

اس کے ماتھے کی ہر شکن برہمی کا اظہار کررہی تھی مگر اس نے خاموشی اختیار کی تو میں نے کہا۔ ”سر آپ کے سامنے جو سمری رکھی گئی تھی اس میں یہ نکتہ ملحوظ رکھا گیا تھا کہ صوبائی حکومت کی طرف سے شامی کو ہتھیار ڈالنے کی صورت میں

عام معافی دینے کی پیشکش ہوگی۔ وزارت داخلہ کے ترجمان کی طرف سے ایک مشروط اشارہ ہوگا کہ صوبائی حکومت شامی کو یہ رعایت دینے پر غور کرسکتی ہے۔ لیکن وزارت داخلہ نے ایسا نہیں کیا۔"

چیف منسٹر نے شیدائی کی طرف دیکھا۔ "کیا یہ ٹھیک ہے؟"

شیدائی نے تائید میں سرہلایا۔ "میں نے تصدیق کی ہے۔ نہ ایسی کوئی پریس ریلیز جاری ہوئی ہے نہ کوئی نیوز کانفرنس بلائی گئی۔ پریس والے بالکل بے خبر ہیں۔"

"اور کون ہے اس کا ذمے دار؟"

"معلوم ہو جائے گا سر۔"

چیف منسٹر کا غصہ اور بڑھ گیا۔ "کب معلوم ہو جائے گا؟ کیا فائدہ ہوا میرے یہاں آنے کا۔ میں نے اپنا وقت ضائع کیا؟ مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا گیا؟"

اس وقت راجا نمودار ہوا۔ اس نے شیدائی صاحب کو ایک آڈیو کیسٹ تھمادی۔ "یہ آپ خود سن لیں یا چیف منسٹر صاحب کو بھی سنوادیں۔"

"اس میں کیا ہے؟" چیف منسٹر نے کہا۔

میں نے کہا۔ "سر میں نے آپ کے سامنے ایک وزیر کا ذکر کیا تھا۔ آپ سے تحفظ مانگا تھا۔ یہ کیسٹ سننے کے بعد آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ آج کے پروگرام کو کیسے سبوتاژ کیا گیا ہے۔"

"تم مجھے نام بتاؤ اس وزیر کا۔"

میں نے کہا۔ "سر! آج اگر وزارتِ داخلہ کی طرف سے اعلان جاری ہو جاتا تو شامی یہاں موجود ہوتا۔"

وزیراعلیٰ نے مجھے گھورا۔ "تمہارا حوالہ وزیرداخلہ کی طرف تھا؟"

"یس سر... میں نتائج سے نہیں ڈرتا۔ اس نے جانتے بوجھتے ایسا کام کیا کہ آپ کے سامنے میری پوزیشن خراب ہو۔ آپ کا قیمتی وقت ضائع ہوا لیکن اس سے زیادہ نقصان میرا ہوا۔ میرا اعتبار خراب ہوا۔ شامی نے مجھے فون کرکے ابھی کچھ دیر پہلے کہا کہ حکومت تو چپ بیٹھی ہے پھر میں یہ رسک کیسے لے سکتا ہوں۔"

"اس کا جو بھی ذمے دار ہوگا معلوم ہو جائے گا۔"

میں نے کہا۔ "ایک منٹ سر۔ شامی اپنے وعدے پر قائم ہے۔"

"کیا مطلب؟ میں بار بار ست بدھائی حاضری دینے آؤں گا۔ آخر تم نے مجھے سمجھا کیا ہے؟"

میں نے کہا۔ "سر! میں اس کی ذمے داری قبول کر... ہوں۔ اب شامی وہاں حاضر ہوگا جہاں آپ حکم دیں گے۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو ایک ڈاکو کی طرف سے؟"

"یہ اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے۔ بس وزارتِ دا... کی طرف سے ایک پریس ریلیز جاری ہو جائے کہ شا... گروہ غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دے تو اس کے خلا... مقدمات ختم کرنے کے امکانات کا جائزہ لیا جائے گا... شامی پر نہ سہی۔ مجھ پر اعتبار کرسکتے ہیں۔"

چیف منسٹر نے کچھ نہیں کہا اور چائے پیے بغیر ر... ہوگیا اسے روکنے کی میری ہر کوشش بے اثر ثابت ہوئی... میری یا شیدائی صاحب کی وضاحت سے مطمئن نہیں تھا... اسے صرف یہ احساس تھا کہ شاید میں نے شامی بادشاہ... ہتھیار ڈالنے کی بات کو محض چارے کے طور پر استعمال کیا... تاکہ وہ ست بدھائی آکے میرے اسپتال اور اسکول کا افتتا... کرے۔ اس کا میں نے پورا فائدہ اٹھایا تھا لیکن اصل مق... محض ایک پُرکشش دھوکا تھا۔

پی آر او شیدائی صاحب نے راجا سے کہا کہ چیف م... کا غصہ وقتی ہے اور جائز بھی۔ جب تحقیقات کا نتیجہ سا... آئے گا تو اسے یقین آجائے گا کہ وزیرداخلہ صاحب ... ذاتی عناد میں یہ سب کیا گیا اور میرے پلان کو سبوتاژ کر... کے ساتھ چیف منسٹر کو مجھ سے بدظن کرنے میں کامیاب رہا...

دیکھنے والے سب دیکھ رہے تھے۔ اندازہ تو سب... ہوگیا تھا کہ اچانک کسی بات نے چیف منسٹر کو ناخوش کر... ہے۔ چند اخبار والوں نے اس سے ٹوہ لینے کی کوشش بھی کی... وہ بھی اناڑی نہیں تھا۔ اس نے کچھ ظاہر نہ کرنے ... مسکراہٹ کے ساتھ سب کو ٹال دیا اور ایک ہنگامی ضرورت... فوراً لاہور پہنچنے کا بہانہ بنالیا۔

جب چیف منسٹر نے چائے نہیں پی تو اس کے سا... آنے والے کیا کرتے۔ انہیں بھی کچھ کھائے پیے بغیر اس... ساتھ ہی واپس جانا پڑا۔ ہماری تقریب پر اوس پڑ گئی تھ... خوشی سے چمکتے چہروں پر مایوسی کے ساتھ اندیشوں کے سا... منڈلانے لگے تھے۔

پیچھے رہ جانے والوں میں چند تجسس کے ما... اخبار نویس اور ایک ٹی وی کا نمائندہ بھی تھا۔ انہوں نے... کو گھیر کے بڑی چالاکی سے رازداری سے اور دوستانہ... میں چیف منسٹر کی برہمی اور اچانک روانگی کا سبب جا... پوری کوشش کی لیکن راجا ایک کائیاں تھا۔ اس نے سب ... کے ٹال دیا اور ان کے اس خیال کو بے بنیاد قرار دیا کہ...

کسی بات نے چیف منسٹر کو ناراض کردیا۔ کیا اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے ان کی کابینہ کے ایک وزیر کی شکایت کی تھی؟ وہ وزیر کون تھا؟ مجھے اس سے کیوں شکایت پیدا ہوئی؟ راجا نے چیف منسٹر کو جو کیسٹ دیا تھا وہ کیا تھا؟

راجا پرانا صحافی تھا اور چکر میں ڈالنے والوں کو چکر دینے کی پوری صلاحیت رکھتا تھا۔ اس نے حقیقتِ حال کسی پر نہ کھلنے دی لیکن رانا سے برداشت نہ ہوا۔

میں نے اسے کھانے کے لیے مدعو کیا تو اس نے معذرت کرلی۔ میں نے اسے سب کے سامنے اتنی ہی عزت دی تھی جس کا وہ مستحق تھا۔ اس نے اپنے بیٹے کو پہلے ہی رخصت کردیا تھا۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور پہلی بار مجھے نواب رفیق کہہ کے مخاطب کیا۔ "آپ تو جانتے ہیں نواب رفیق میرا کھانا پرہیزی ہوتا ہے۔"

میں اسے گاڑی تک چھوڑنے گیا۔ "یہ اچھا نہیں لگتا رانا صاحب۔"

اس نے دوستانہ انداز میں میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "آپ نے تو واقعی کمال کردیا۔ چیف منسٹر کو قابو کرلیا۔"

میں نے کہا۔ "وہ عوامی مزاج رکھنے والا آدمی ہے۔ کسی نے اسے میرے ترقیاتی منصوبوں کے بارے میں بتادیا ہوگا۔"

"او جی راجا جیسے صحافی آپ کے ساتھ ہوں تو اطلاع ایک چیف منسٹر کو کیا ساری دنیا کو مل جاتی ہے۔ لیکن میں نے کچھ اور بھی سنا تھا۔" اس کا لہجہ اچانک رازدارانہ ہوگیا۔

میں نے کہا۔ "کیا سنا تھا؟"

"پتا نہیں افواہ تھی یا کسی نے بات پھیلادی۔ آج کچھ پروگرام تھا کہ شامی ڈاکو ہتھیار پھینکے گا اور اپنے وزیراعلیٰ صاحب اسے معافی دیں گے۔"

میں نے سخت حیرت کا اظہار کیا۔ "اچھا؟ آپ کو کس نے بتایا؟"

"بس جی۔ کنکر جتنی خبر چھپ جاتی ہے۔ پہاڑ جیسی بات کسی کے چھپانے سے نہیں چھپ سکتی۔"

میں نے رکھائی سے کہا۔ "مجھے حیرت ہے کہ آپ نے اتنے سیاسی تجربے کے باوجود ایسی بے بنیاد بات پر یقین کرلیا۔"

"یقین نہیں کیا اسی لیے تو آپ سے پوچھا۔ ویسے نواب رفیق انگریز بڑے سیانے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ دھواں وہیں سے اٹھتا ہے جہاں آگ ہو۔"

"انگریزوں کے ملک میں آٹھ سال گزار کے آیا ہوں میں۔ اور آپ مجھے بتا رہے ہیں کہ وہ سیانے ہیں۔"

"میرے بارے میں آج تک کسی نے ایسا نہیں کہا کہ میرے کسی ڈاکوؤں کے گروہ سے دوستانہ مراسم ہیں۔"

میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔ "میرے بارے میں یہ کون کہتا ہے؟"

"جھوٹ سچ سامنے آجاتا ہے۔ دیر سویر کی کوئی بات نہیں۔ آخر ہم نے بھی یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے۔ بے شک ڈگریاں ہمارے پاس آپ جیسی نہیں ہیں۔ ہم تو آپ کے پاس خود چل کے آئے تھے کہ خیر سے آپ بھی عزت دار ہو۔ دو عزت دار گھرانوں کا میل ہو جائے۔"

میں نے طنز سے کہا۔ "آپ کے خیالات میں یہ تبدیلی کیسے آئی اور کب آئی؟ میں ایک تنخواہ دار ٹیچر کی اولاد آپ کے لیے اتنا قابلِ عزت کیسے ہوگیا؟ اس کے علاوہ رانا صاحب۔ میں عزت دار سمجھتا ہوں باکردار شخص کو۔ خواہ وہ کمین ہو۔ ڈاکو ہو یا..."

جانتے بوجھتے میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ آخری لفظ کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ وڈیرا جاگیردار۔ ایم پی اے۔ رئیس اعظم، میرے خندہ زیرلب نے رانا کو چراغ پا کردیا لیکن موقع ایسا نہیں تھا کہ وہ برہمی کا اظہار کرتا۔

"پتا نہیں جی آپ کے نزدیک کردار کیا ہے۔" اس نے ہاتھ مصافحے کے لیے آگے بڑھایا۔

میں نے یہ وضاحت بھی کردی۔ "شاید ایک مثال سے فرق آپ پر واضح ہو جائے۔ اگر ایک شخص فاقے سے ہو اور وہ دیکھے کہ کسی نے پانچ دس روپے کا نوٹ گرادیا ہے لیکن اسے خبر نہیں۔ تو وہ نوٹ اٹھا کے مالک کو دے دے۔ وہ باکردار ہے۔ بے کردار تو غالب کے بقول۔ ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔ مثلاً وہ سب جو کروڑوں کما کے لاکھوں کا انکم ٹیکس نہیں دیتے... حلفیہ بیان داخل کردیتے ہیں کہ وہ خسارے میں ہیں۔"

"اس کے باوجود نواب صاحب۔ آپ ہماری تجویز پر غور کریں ٹھنڈے دل سے۔ اتفاق میں بڑی برکت ہے۔"

اس نے مجھے مزید کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دیا اور گاڑی آگے بڑھادی۔ دیگر معززین بھی مجھ سے ہاتھ ملا کے اور مجھے مبارکباد دے کر رخصت ہوتے گئے۔ غنی اب فاضل ہو جانے والا کھانا محتاجوں میں تقسیم کرنے کے لیے لائن لگوا رہا تھا۔ سہ پہر کے ساڑھے تین بج چکے تھے۔ تھکن سے سب کا حال خراب تھا لیکن بھوک کا احساس کسی کو نہیں تھا۔

اچانک اس حصے میں جہاں باورچی کھانا پکا رہے تھے

ایک شور مچ گیا۔ یہاں دیگ پکانے والے نائی تھے جو نسل در نسل یہی کام کرتے آرہے تھے۔ دیہات میں نائی روایتی طور پر خوشی غمی کے مواقع پر گھر گھر سندیسے بھی لے جاتے تھے اور کھانا پکانے میں بھی ماہر سمجھے جاتے تھے چنانچہ وہ دور دور تک تمام دیہات میں رہنے والوں کو جانتے اور پہچانتے تھے۔

میں نے ایک شخص کو قید سے فرار کی کوشش کرتے دیکھا لیکن اتنے لوگوں کے بیچ میں سے نکل کے وہ کہاں جاتا۔ دو تین افراد نے وقت پر اسے پکڑا اور زمین پر گرا کے مارنا شروع کردیا۔ اس کے ساتھ ہی غنی کے چلّانے کی آواز آئی۔ ”کھانا روک دو۔ کسی نے کھانا نہیں کھانا۔“

خواتین اندر جا چکی تھیں اور شاید کہیں تھکی ہاری آج کی تقریب پر خوشی سے بے حال ہورہی تھیں۔ راجا اندر سے نمودار ہوا۔ ہم نے قریب جا کے مارنے والوں کو روکا۔ اس وقت تک مار کھانے والا قریب مرگ ہوگیا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا اور وہ چلّاتے ہوئے زمین پر لوٹ رہا تھا۔ ٹھوکروں سے اس کی پسلیاں ٹوٹ گئی تھیں۔

میں نے غنی سے پوچھا۔ ”کون ہے یہ؟“

غنی کا چہرہ غصے سے لال ہورہا تھا۔ ”اسے خلیفہ بشیر نے دیکھ لیا سر۔ یہ کھانے میں کچھ ڈال رہا تھا۔“

”کس کے کھانے میں؟“

”دیگ میں سر! بلکہ ڈال چکا تھا۔ خلیفہ سے میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ باہر کا بندہ کوئی نظر آئے تو پکڑ لو۔ سب اس کے اپنے بندے کام کررہے تھے۔ یہ پہلے ایک کوشش کرچکا تھا۔ تین طرف قناتیں لگی ہیں۔ راستہ ایک ہی تھا اندر باہر آنے جانے کے لیے۔ وہاں جو بندہ کھڑا کیا گیا تھا وہ خلیفہ کا بھانجا تھا۔ اس نے روک دیا پھر یہ پیچھے سے قنات اٹھا کے کتے کی طرح اندر آگیا۔“

مجھے سخت تشویش ہوئی۔ ”کیا ڈالا تھا اس نے دیگ میں؟“

”زہر ہوگا جناب عالی۔ لال رنگ کی بوتل تھی۔ ساری الٹ دی حرامی نے حالانکہ خلیفہ نے دیکھ لیا تھا۔ وہ چلّایا اور اسے پکڑنے دوڑا مگر یہ اپنا کام کرچکا تھا۔“ غنی نے بتایا۔

”وہ بوتل کہاں ہے؟“ راجا نے پوچھا۔

”خلیفہ نے قبضے میں لے لی ہے۔ ابھی اس میں کافی زہر ہے۔“

”دیگ میں سے کسی کو کھانا تو نہیں دیا؟“

”نہیں سر۔ اسے میں نے سیل کرکے رکھوا دیا ہے۔ آج تو بس اللہ نے بچا لیا جناب۔ کوئی نہ دیکھتا اور یہ... ڈال دیتا ہر دیگ میں زہر تو آج قیامت آجاتی۔“

میں نے کہا۔ ”غنی! یہ تمہارے سیکیورٹی کے انتظامات کا بھی نتیجہ ہے۔ تم نے واقعی ہم سب کو مکمل تباہی سے بچا لیا۔ تمہاری جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ میں ذاتی طور پر تمہارا شکرگزار اور احسان مند ہوں۔“

غنی نے بے حد انکساری سے کام لیا۔ ”بندہ کچھ نہیں کرسکتا جناب عالی۔ سب میرے مولا کا کرم ہے۔“ لیکن جب میں نے اسے سینے سے لگا کے اس کی پیٹھ تھپکی تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

اس نے آنکھیں صاف کرکے کہا۔ ”ہم آپ کا نمک کھاتے ہیں سر۔ دعا کرتے ہیں ہماری عمر آپ کو لگے۔“

میں نے کہا۔ ”اس سے پوچھو یہ کون ہے۔ کس نے بھیجا تھا اسے؟“ راجا بولا۔ ”یہ پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ اسی نے بھیجا ہوگا جو ابھی کہہ رہا تھا کہ اتفاق میں بڑی برکت ہے۔“

یہ خبر بڑی تیزی سے پھیلی۔ ”کھانا لینے والوں نے ایک دم اپنے ہاتھ روک دیے۔ خلیفہ بشیر نے بہت سمجھایا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ صرف ایک دیگ خراب ہوئی تھی جو الگ رکھ دی گئی ہے مگر دیکھتے دیکھتے قطار میں کھڑے ہوئے اور شامیانوں میں بھرے ہوئے لوگ کھانا چھوڑ کے نکل گئے۔ جو تھوڑا بہت کھا چکے تھے وہ حلق میں انگلی ڈال کے الٹی کرنے لگے۔ پندرہ بیس افراد نے جن میں چند عورتیں بچے بھی شامل تھے چلّانا اور رونا شروع کردیا۔ ان کا خیال تھا کہ ان کا آخری وقت قریب ہے۔ میں نے اندر سے شہناز کو اور ریشم کو بلا کے کہا کہ انہیں کچھ بھی کھلا دیں۔ کوئی گولی، انجکشن دے دیں۔

شہناز نے ریشم کے ساتھ مل کر اس ہنگامی صورتِ حال کو بڑی مشکل سے قابو میں کیا۔ نفسیاتی خوف سے تڑپنے اور ہائے ہائے کرنے والوں کو ایک گھنٹے بعد بالآخر یقین آگیا کہ ڈاکٹر صاحب کی بروقت امداد نے آج انہیں مرنے سے بچا لیا۔ وہ لوگ شام ہوتے ہی اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ اس وقت تک آس پاس کی ساری آبادی میں یہ بات پھیل گئی تھی کہ نواب رفیق کی دعوت میں کھانے میں زہر ملا دیا گیا۔ یہ بھی سننے میں آیا کہ زہریلے کھانے سے بہت لوگ بے ہوش ہوئے۔ کچھ نے سنا کہ مرگئے۔ یہ بھی مشہور ہوا کہ خود نواب صاحب اور حویلی کے دوسرے لوگ زہرخورانی کا شکار ہوئے۔ یہ ساری باتیں مجھے اگلے روز معلوم ہوئیں۔ جو بات میرے لیے حیرت کا باعث بنی یہ تھی کہ اس سازش کو کسی اور

سے نہیں اسی ایک شخص سے منسوب کیا گیا جو میرا دشمن تسلیم کیا جاتا تھا۔

گرفتار کیے جانے والے شخص نے اس کا اعتراف بھی کرلیا کہ مجھے رانا کے منشی نے یہ زہر کی بوتل دی تھی اور اس کام کے دس ہزار نقد ادا کیے تھے اور کامیابی کی صورت میں مزید دس ہزار دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اس کا تعلق آس پاس کے کسی علاقے سے نہیں تھا اور اسی لیے وہ پکڑا بھی گیا تھا کہ اجنبی تھا۔ خلیفہ بشیر سے پہلے اس کے بھانجے نے اسے تاڑ لیا تھا اور اپنے ماموں کو بھی مطلع کررہا تھا کہ پتا نہیں کون سور کی نسل والا زبردستی اندر آنا چاہتا تھا۔ ماموں اس کے بعد زیادہ چوکس ہوگئے تھے۔

اس اعصاب شکن سانحے کا اثر کم کرنے کے لیے میں نے راجا کے ساتھ مل کے تحریک چلائی۔ خواتین کا دہشت سے برا حال تھا اور وہ یہی سوچ سوچ کے پریشان ہورہی تھیں کہ رانا کی سازش کامیاب ہوجاتی تو کتنے ہلاک ہوجاتے۔ شاید ہلاک ہونے والوں میں ہم بھی ہوتے۔

میں نے کہا۔ ”چلو بھئی۔ بس کرو یہ باتیں۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ سب خیریت رہی۔“

راجا نے کہا۔ ”ہاں۔ میرا تو بھوک سے حال خراب ہورہا ہے۔ فاطمہ بی بی کھانا لگاؤ فٹافٹ۔“

ہماری کوشش کامیاب رہی جب کھانا سامنے آیا تو سب کی بھوک جاگ اٹھی۔ ہم نے دوسری باتیں چھیڑ دیں۔ آج ست بدھائی کی تاریخ کا ایک سنہرا باب لکھا گیا ہے۔ کیا شاندار تقریب تھی۔ لوگ برسوں یاد رکھیں گے۔ سارے کام ٹھیک ہوجائیں گے۔ دشمنوں کے عزائم خاک میں مل گئے۔ میں نے ثابت کردیا کہ میں کتنا بڑا سیاست داں ہوں۔ ایم پی اے میں نے خواہ مخواہ کہا۔ ایک کروڑ کا چندہ دے کر میں نے مستقبل کے الیکشن میں اپنی کامیابی یقینی بنالی ہے۔

سب بہت تھکے ہوئے تھے۔ کھانے کے بعد مہمان خانے میں صوفوں پر نیم دراز ایسی ہی باتوں میں مصروف رہے۔ وہیں چائے پی اور اپنی کامیابی کا جشن مناتے رہے۔ میرے سوا کسی نے بھی فریال کو یا نور جہاں کو یاد نہیں کیا۔ اگر کیا تو ان کا نام لینے سے گریز کیا۔ باہر غنی ان سے نمٹتا رہا جو اسباب سمیٹ رہے تھے۔

میں نے رابعہ کو چپ دیکھ کر پوچھا۔ ”تم کیوں اداس ہوگئیں؟“

اس نے کہا۔ ”بس ایسے ہی خیال آرہا تھا ان کا جو آج ہمارے ساتھ نہیں۔“

میں نے کہا۔ ”ٹھیک کہا تم نے۔ چلو باقی تو اللہ کی مرضی۔ اس نے انہیں اپنے پاس بلا لیا، کم سے کم ابا جی آجاتے۔“

شہناز نے بڑی ہوشیاری سے بات کا رخ بدل دیا۔ ”وہ بھی دور ہیں۔ شہزاد یہاں ہوتے ہوئے بھی تقریب سے غیر حاضر رہا۔“

راجا نے کہا۔ ”بھئی کیا کریں۔ اسے لاہور جانا پڑا۔“

لیلیٰ بھابی نے خفگی دکھائی۔ ”کیا آج ہی کا دن رہ گیا تھا ہائی کورٹ میں اپیل دائر کرنے کے لیے؟“

میں نے کہا۔ ”اداس مت ہو بہنا۔ وہ آنے والا ہوگا۔“

رابعہ نے پلٹ کے وار کیا۔ ”تم اداس نہیں ہو بالکل بھی۔ نہ فریال کے لیے نہ نور جہاں کے لیے؟“

لیلیٰ بھابی نے طنز سے کہا۔ ”سب مرد ایسے ہی ہوتے ہیں رابعہ۔“

میں نے اس بات کا جواب نہ دینا بہتر سمجھا۔ ”میں تو بس شامی کے بارے میں سوچ سوچ کے پریشان تھا۔ وہ نہیں آیا تو اچھا۔ آجاتا تو بہت ہی اچھا ہوتا۔“

راجا بولا۔ ”چیف منسٹر بہت سمجھدار ہے۔ جب اسے حقیقت معلوم ہوگی تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔“

رابعہ نے سادگی سے کہا۔ ”کیا وہ وزیرداخلہ کو برطرف کردے گا؟“

راجا ہنسنے لگا۔ ”وزیرداخلہ کوئی کلرک یا چپراسی نہیں ہوتا۔ ہاں یہ ضرور ہوگا کہ ہم اس کی ریشہ دوانیوں سے محفوظ ہوجائیں گے کیونکہ اب ہم زیادہ مضبوط کیمپ میں شامل ہوگئے ہیں۔“

”کل کے اخبارات دیکھنا۔“ لیلیٰ بھابی نے کہا۔

”اس سے پہلے آج رات کی خبریں دیکھنا ٹی وی پر۔“ شہناز بولی۔

”بس ذرا سی کسر رہ گئی۔ شامی بھی آجاتا تو ہمارے نام کا ڈنکا بج جاتا۔“ راجا بولا۔

”وہ عجیب آدمی ہے۔ اس کے بعد نہ کوئی خبر ہے نہ پتا۔“ میں نے کہا۔

راجا بولا۔ ”آدمی کہاں بادشاہ ہے وہ۔ اپنی مرضی کا مالک۔“

”اس کی بھی کیا زندگی ہے۔ ایک لفظ میں بیان کیا جائے تو صرف خوف۔ یا اسے دنیا سے یا دنیا کو اس سے۔ میں تو کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ ایک پوری عمر کی مسافت آدمی یوں

کیسے گزار سکتا ہے کہ ہر ہر لمحہ قرار سے فرار۔'' میں نے کہا۔

راجا بولا۔ ''ہاں اور جینے کا مقصد صرف لوٹ مار۔ لوگ گھر بناتے ہیں، بساتے ہیں، اپنے بعد بچوں کے لیے خواہش رکھتے ہیں کہ آگے ان کے بچے کامیابیوں کا سفر دیکھیں تو اس کی خوشی بھی اپنے حساب میں شمار کریں۔ مگر جس کا گھر ہی نہ ہو اس کے لیے رشتے بھی نہیں۔ وہ ساٹھ ستر یا اسی سال کیسے جیتا ہے اور کیوں؟''

راجا نے کہا۔ ''اتنا کوئی ڈاکو کہاں جیتا ہے فیکے پتر۔''

''شاید اسی لیے جب میں نے شامی کو اس زندگی کی طرف آنے کی دعوت دی جو میری تیری اور ہم جیسے دنیا کو آباد رکھنے والے انسانوں کی زندگی ہے۔ برباد کرنے والوں کی نہیں تو اس نے فوراً لبیک کہا۔ شاید وہ پہلے ہی ایسا سوچ رہا تھا۔ ایسا چاہتا تھا لیکن اسے کسی نے بلایا ہی نہیں تھا سلامتی کی طرف، فلاح کی طرف۔''

اب رات ہو گئی تھی۔ غنی کے ساتھ شیر خان اور میرے دوسرے مددگار اب بھی باہر مصروف تھے۔ وہ تقریب کا اہتمام کرنے والوں کو ادائیگیاں کر رہے تھے اور حساب کتاب سے نمٹ رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی وہ میری خیر و عافیت معلوم کرنے اور مجھے مبارکباد دینے کے لیے دور دور سے آنے والوں کو سمجھا بجھا کے اور مطمئن کر کے رخصت کر رہے تھے کہ نواب صاحب اور سب خیر و عافیت سے ہیں مگر آرام کر رہے ہیں۔

فرصت ملتے ہی میں نے اباجی کو فون کیا اور میری خوش قسمتی کہ وہ مل بھی گئے۔ آواز سے ہی وہ کمزور اور کچھ تھکے ہوئے لگ رہے تھے لیکن میرے سوال پر انہوں نے کہا کہ ''الحمدللہ صحت میری بالکل ٹھیک ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ایک حاجی کو جھوٹ بھی نہیں بولنا چاہیے۔''

وہ ہنسنے لگے۔ ''اب تم کیا مجھے ابا کے بجائے حاجی صاحب کہو گے؟''

میں نے کہا۔ ''آپ نے ضد باندھ لی تھی کہ آئندہ رشوت دینے کا گناہ نہیں کروں گا تو وہ ساری عمر دستاویزات نہ ملیں۔''

''دیکھ لو صبر کا پھل۔ میں جہنمی ہونے سے بچ گیا اور دستاویزات بھی مل گئیں۔''

''اچھا۔ پھر کب ہے آپ کی واپسی؟''

''بس یہ حج فلائٹس کا رش گزر جائے۔ اس کے بعد ہی کسی جہاز پر جگہ ملے گی۔''

اچھا ہوتا اگر اماں کا چہلم یہاں ہوتا۔''

وہ خاموش ہو گئے۔ ''دیکھو بیٹا۔ ویسے تو ہم مغفرت اپنے اپنے اعمال کی بنیاد پر ہو گی۔ پھر بھی کرتے ہیں۔ روز ہر نماز کے بعد میں جتنی تلاوت کر سکتا کر لیتا ہوں۔ شمار نہیں کرتا کہ کتنے قرآن ختم ... ثواب تمہاری ماں کو ایصال کرتا ہوں۔ آگے جو اس غفورالرحیم کا فیصلہ۔ چہلم تو محض ایک دنیاوی رسم ہے۔''

میں نے فوراً موضوع بدل دیا۔ ''اباجی اگر وہاں پاکستانی چینل نظر آتا ہو تو آج خبریں ضرور دیکھ لیں۔''

''اچھا؟ ایسی کیا بات ہے۔ چینل تو بہت سے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''شاید آپ ہم سب کو دیکھیں گے۔ ایک بہت بڑی تقریب تھی۔ چیف منسٹر نے خود ہمارے اسپتال کا افتتاح کیا۔ ہم نے پرانے سائنس ریسرچ کے اسپتال بنا دیا ہے۔ مکمل اسپتال۔''

میں انہیں بڑے جوش سے بتاتا رہا اور وہ خوش ہو کر سنتے رہے۔ دعائیں دیتے رہے۔ میں نے کہا۔ ''ہم نے آپ کی کمی کو بہت محسوس کیا اور اماں کی بھی۔ آج وہ ہوتیں تو کتنی خوش ہوتیں۔ رابعہ اپنے والدین کے لیے ... تھی۔''

''رفیق ہر زندگی کا سفر کہیں تو ختم ہوتا ہے۔ یہ قدرت کا نظام ہے۔ آج کے دن کی خوشی اور کامیابی پر اللہ کا شکر کرنا چاہیے۔ اچھا اب مجھے نماز کے لیے جانا ہے۔ اذان ہو رہی ہے۔''

میں اپنے کمرے سے باہر آیا تو رابعہ کی اور شہزاد کی بڑی زوردار جھڑپ جاری تھی۔ رابعہ سخت خفا تھی کہ وہ ... دن غیر حاضر رہا۔ اپیل دائر کر کے وہ دو بجے تک بھی لوٹ آتا تو چیف منسٹر سے مل سکتا تھا۔

اس نے سمجھانے کی کوشش کی۔ ''یہ میرے اختیار میں نہیں تھا۔ رجسٹرار نے اپیل ہی دیر سے لی۔''

''کورٹ کیا رات تک کام کرتی ہے اور اس کے بعد لاہور سے یہاں تک آنے میں چھ گھنٹے لگتے ہیں کیا؟''

''میں نے کہا نا ایک اور کام میں پھنس گیا تھا۔''

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔''

''لاحول ولاقوۃ۔ آخر کیا سننا چاہتی ہو تم؟ میں کہ شاہی محلے کے کسی کوٹھے پر چلا گیا تھا مجرا دیکھنے۔ تم آیا ہوں اور اوپر سے یہ بک بک۔'' وہ پاؤں پٹختا ہوا چلا گیا۔ رابعہ نے وہی کیا جو وہ کر سکتی تھی۔ اس ... شروع کر دیا۔

اس وقت تو میں نے رابعہ کو سمجھا بجھا کے خاموش کر دیا کہ اگر آج شہزاد اس تقریب میں حاضر نہ تھا تو ظاہر ہے اس کی ذمے داری نے اسے مجبور رکھا ورنہ وہ ہم سب کے ساتھ ہوتا۔ لیکن نہ جانے کیا بات تھی کہ رابعہ اپنی بات پر اڑی رہی۔ ''وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ اگر وہ چاہتا تو آ سکتا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''کزن یہ کیا فضول بات ہے۔''

''تم مجھے ایک بات بتاؤ۔ اپیل کس نے دائر کی ہے؟ شہزاد نے یا ماجد خان نے۔''

میں نے کہا۔ ''شہزاد اس کی مدد کر رہا تھا۔''

''کیا مدد کر رہا تھا۔ اپیل کوئی بھاری چٹان تھی؟ یا گاڑی کو دھکا لگانے جیسا کام تھا۔''

''رابعہ۔ تم کج بحث ہو۔ ماجد خان تمام معاملات سے اتنا باخبر نہیں۔ اگر اپیل دائر کرنے میں تاخیر ہو جاتی...''

''تم نے ماجد خان سے پوچھا؟'' اس نے میری بات کاٹ دی۔ ''ذرا پوچھو۔ تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ شہزاد جھوٹ بول رہا ہے۔''

وہ احتجاجی انداز میں اندر چلی گئی تو مجھے حیرانی ہوئی کہ آخر وہ اتنے یقین کے ساتھ ایک بات کیوں کہہ رہی ہے۔ اپیل دائر کرنے کے بعد شہزاد کہاں جا سکتا ہے۔ ظاہر ہے وہ لوٹ کے ست بدحالی آیا ہو گا۔ وہ کہیں اور جاتا تو بتا دیتا۔ ماجد خان سے یہ بات پوچھنا مناسب نہ تھا۔ میں نے موقع ملتے ہی شہزاد کو باہر بلا لیا۔

''یہ کیا معاملہ ہے۔ رابعہ کیوں اڑی ہوئی ہے اس بات پر کہ تم نے جھوٹ بولا ہے؟''

''اس کا دماغ خراب ہے۔''

''آج اچانک اس خرابی کی کوئی وجہ تو ہو گی۔ نہیں ہے تو پھر اسے سمجھاؤ۔ مناؤ۔''

''سر آپ بلاوجہ پریشان نہ ہوں۔ یہ اس کا اور میرا ذاتی معاملہ ہے۔'' وہ بے رخی سے بولا۔

اس کا رویہ پہلے کبھی میرے ساتھ ایسا جارحانہ نہیں ہوا تھا۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ پھر اندر گھس گیا۔ مجھے اپنی بے عزتی پر غصہ کم آیا۔ یہ احساس زیادہ ہوا کہ دال میں کچھ کالا ہے اور شاید رابعہ کا شک بے سبب نہیں۔ معیوب سمجھنے کے باوجود میں نے ماجد خان کو فون کیا۔

اس نے کہا۔ ''آپ کو معلوم ہو ہی گیا ہو گا۔ اپیل منظور ہو گئی۔ نوٹس بھی جاری ہو گئے۔''

''اچھا؟ سماعت کی تاریخ کب ہے؟''

''سات دن بعد۔ شہزاد نے بتایا نہیں آپ کو؟ مجھے یقین ہے کہ عدالت پہلا سوال یہ اٹھائے گی کہ اب تک چالان کیوں پیش نہیں کیا گیا؟ تفتیشی افسر کی شامت آئے گی۔''

میں نے کہا۔ ''شہزاد ابھی پہنچا نہیں۔''

''یہاں سے تو میں نے اسے گیارہ بجے فارغ کر دیا تھا۔ اس نے کہا کہ ست بدحالی میں آج چیف منسٹر کو آنا ہے۔ اسپتال کا اور اسکول کا افتتاح تھا۔ میں نے کہا کہ ایسی بات تھی تو مجھے فون کر دیتے۔ تمہارا آنا کوئی ضروری تو نہیں تھا۔''

میں نے کہا۔ ''ہو گا کوئی مسئلہ۔ گاڑی خراب ہو سکتی ہے۔ خیر آپ کا بہت شکریہ۔'' میں نے فون بند کر دیا ورنہ ماجد خان کہتا کہ وہ فون تو کر سکتا تھا پھر میں کیا کہتا۔ اب یہ سوال میرے ذہن میں بھی سر اٹھا چکا تھا کہ آخر ایسی کیا بات ہو گئی کہ شہزاد جھوٹ بولنے پر مجبور ہوا؟

رات کی خبروں میں ست بدحالی کی تقریب کا حال تو نشر ہوا لیکن وہ چند منٹ کی رپورٹ تھی۔ قومی خبرنامے کے محدود وقت میں اس کا مفصل احوال نہیں آ سکتا تھا۔ تاہم مختلف خبرناموں میں سب نے اپنی اپنی جھلک دیکھی اور خوشی منائی۔ گلہ راجا سے کیا گیا تو اس نے صاف کہا کہ وہ ٹی وی کا منیجنگ ڈائریکٹر نہیں ہے۔ کل مجھ سے یہ مت پوچھنا کہ اخبارات نے اس تقریب پر سپلیمنٹ شائع کیوں نہیں کیا یا پورے صفحے پر رنگین تصاویر کیوں نہیں دیں۔ ہیڈ لائن کیوں نہیں بنائی۔ یہ ضلع کی خبر ہے۔ ڈسٹرکٹ پیج پر ہی آئے گی۔

رات کو میں رابعہ سے پوچھنا چاہتا تھا کہ آخر شہزاد کی کس بات سے اس کو شک ہوا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ وہ یقیناً کچھ چھپا رہی تھی۔ لیکن میں نے جا کے دیکھا تو وہ سو چکی تھی۔ باقی سب بھی اتنے تھک گئے تھے کہ خلافِ معمول جلدی سو گئے۔

غنی نے راجا سے پوچھ کے اپنے قیدی کو پولیس کے حوالے کرنے کا معاملہ بھی اگلے دن پر ٹال دیا تھا۔ ملزم نے اعتراف جرم کر لیا تھا لیکن اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ پولیس کے سامنے جا کے وہ مکر بھی سکتا تھا۔ میں نے غنی کو تاکید کی کہ ملزم کا خیال رکھے۔ یہ نہ ہو کہ رات کو وہ خودکشی کر لے یا کوئی اسے مار دے۔ جیسے کہ ایک بار پہلے ہو چکا تھا۔

میں خود اتنا تھک چکا تھا کہ بستر پر گرتے ہی سو گیا۔ میری آنکھیں نیند سے پہلے ہی بند ہو رہی تھیں۔ صبح بھی میں دیر تک سویا پڑا رہتا لیکن میرے تکیے کے قریب رکھا ہوا فون بجنے لگا۔ اس وقت تک میری نیند کی ضرورت بہرحال پوری ہو چکی تھی۔ میں نے آنکھیں کھول کے موبائل فون کی روشن

اسکرین کو دیکھا تو اس میں صبح کے آٹھ بجے تھے۔ پہلے میں نے سوچا کہ کال ریسیو نہ کروں۔ فون خود ہی بج کے چپ ہو جائے گا کیونکہ نمبر نیا تھا۔

پھر مجھے خیال آیا کہ شاہی بادشاہ ہر بار ایک نئی سم ڈال کے بات کرتا ہے۔ کہیں اس نے یہ جاننے کے لیے رابطہ نہ کیا ہو کہ چیف منسٹر نے اس کے نہ آنے پر کس قسم کے ردِعمل کا اظہار کیا اور آئندہ کے لیے میرے اور چیف منسٹر کے درمیان کوئی لائحہ عمل طے ہوا ہے یا نہیں۔

میں نے کال ریسیو کی اور خوابیدہ لہجے میں ہیلو کہا۔ لیکن جواب میں دوسری طرف سے کسی نے ''خیر ہو نواب دوست کی'' نہیں کہا۔ اب میری نیند اڑ چکی تھی۔ میں نے پھر ہیلو کہا اور اٹھ بیٹھا۔ میرا ذہن فریال کی طرف گیا لیکن اس بار میں نے کسی کا نام لینے کی غلطی نہیں کی۔ پہلے اچانک فریال کی کال ریسیو ہونے پر میں نے سمجھا تھا کہ نور جہاں نے فون کیا ہوگا اور اس کے روٹھ کر کہیں چلے جانے کا راز فریال پر افشا کر دیا تھا۔

میں نے کہا۔ ''بھئی کون ہے۔ کس سے بات کرنی ہے؟''

دوسری طرف سے آواز آئی۔ ''میں نے تمھیں جگا دیا۔''

میرے دماغ میں ایسا دھماکا ہوا کہ میرے چودہ طبق روشن ہو گئے اور میں خود کو چلا کے نور جہاں کا نام لینے سے نہ روک سکا۔ پھر میں نے آواز پر قابو پایا اور بولا۔ ''نور جہاں۔ کہاں ہو تم؟''

اس نے سپاٹ اور کسی حد تک اداس لہجے میں کہا۔ ''اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے جان۔''

''دیکھو ایسا مت کہو۔ فرق مجھے پڑتا ہے۔ تمھیں شاید نہ پڑتا ہو۔'' میں نے کہا۔

وہ بولی۔ ''ہاں مجھے واقعی فرق نہیں پڑتا۔ اب بھی تم اسی طرح نظر کے سامنے ہو۔''

''نور۔ خدا کے لیے یہ فلمی اور زنانہ ناولوں والے ڈائیلاگ مت بولو۔ مجھے بتاؤ تم کہاں ہو؟''

''نہیں جان، یہ میں نہیں بتا سکتی۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔

''کیوں نور۔ مجھے بتاؤ تم نے ایسا کیوں کیا تھا؟ آخر یوں اسپتال سے کچھ بتائے بغیر غائب ہو جانا کسی وجہ کے بغیر۔''

''وجہ کے بغیر تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ پہلے ایک نرس نے اور پھر ایک ڈاکٹر نے مجھے پہچان لیا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''اس خوف سے تم فرار ہو گئیں؟ چلو ٹھیک ہے لیکن اس کے بعد سے اب تک تم کہاں تھیں؟ تمھیں اندازہ ہے کہ اس سے میری پریشانی میں کتنا اضافہ ہوا۔''

''تمہارے پاس تو پریشانیوں کا ایک سمندر ہے۔ میرے نہ ہونے سے کوئی سیلاب نہیں آیا ہوگا۔ مجھے معلوم ہے۔''

''غلط ہے تمہارا خیال۔'' میں نے خفگی سے کہا۔

''جب فریال گئی تھی تو کیا تمہاری نیندیں اڑ گئی تھیں؟ تم نے کھانا نہیں چھوڑ دیا تھا؟ بولو... چپ کیوں ہو؟ ابھی میں نے اخبار دیکھا۔ اس میں تمہاری تصویر تھی چیف منسٹر کے ساتھ۔ میں نے پوری رپورٹ پڑھی۔ تم اسی طرح مصروف ہو۔ شاید پہلے سے بھی زیادہ مصروف ہو۔''

میں نے کہا۔ ''نور... میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔''

''ہاں۔ یہ تم نے آدھی بات ٹھیک کہی۔ تمھیں میری ضرورت ہوگی لیکن تم میرے بغیر رہ سکتے ہو۔ اب تک رہے اور آئندہ بھی رہو گے۔ لوگ آتے جاتے رہے ہیں۔ کسی کے نہ ہونے سے دنیا کو فرق نہیں پڑتا۔ تم اپنی خواہشات اور امنگوں کے ساتھ AMBITIONS کے ساتھ آگے بڑھتے جاؤ گے۔ فریال کا فیصلہ آج مجھے غلط نہیں محسوس ہوتا۔ اس کے لیے اپنی زندگی اہم تھی۔ اپنی خواہشات اور کامیابیاں اہم تھیں۔''

''کیا تم بھی اسی کی طرح سوچتی ہو؟'' میں نے اس سے کہا۔ ''کچھ اور ہیں تمہاری AMBITIONS۔''

''نہیں۔ قطعی نہیں۔ مجھے کسی چیز کی آرزو نہیں تھی۔ دولت کی نہ کامیابی کی' نہ طاقت کی نہ شہرت کی۔ حالانکہ لوگ غلط نہیں کہتے تھے کہ میں ساری دنیا کو تسخیر کر سکتی تھی لیکن تسخیر ہوتی رہی۔''

''آخر میرا کیا قصور تھا۔ میں نے تمھیں کوئی شکایت کا موقع دیا۔''

''نہیں۔''

''پھر تم نے مجھے کیوں چھوڑا؟''

''اب چھوڑو اس بات کو۔ ایک نہ ایک دن تم سمجھ لو گے۔''

میں نے ضد کی۔ ''ابھی کیوں نہیں... اچھا میری بات سنو نور۔ پلیز واپس آ جاؤ۔ میری خاطر۔''

''واپس میں تمہاری خاطر ہی آؤں گی لیکن ابھی نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے کوئی وجہ تو بتاؤ۔''

اس نے چند سیکنڈ بعد کہا۔ ''میں تمہاری پریشانی بن کے تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی۔''

''کون کہتا ہے کہ تم میرے لیے پریشانی کا سبب تھیں۔''

''وہ آہستہ سے ہنسی۔ ''کسی کو کچھ کہنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا خود میں نہیں جانتی؟ اور تم بھی جانتے ہو کہ کہنے والے کیا کہتے تھے۔ پھر انجان بن کے مجھ سے یہ کیوں پوچھ رہے ہو۔''

''سب کی بات مت کرو۔''

وہ چلا کے بولی۔ ''کیوں نہ کروں سب کی بات۔ سب کی باتیں سنتی رہی میں اور برداشت کرتی رہی۔''

''لیکن میں تو تمہارے ساتھ تھا۔'' میں نے کمزور لہجے میں کہا۔

''ہاں ایک تم۔ تم سے زیادہ مجھے سہارا دیا تمہارے ابا نے۔ انہیں میں کیا کہوں۔ وہ انسان نہیں فرشتہ ہیں۔ ولی ہیں، وہ جو بھٹکے ہوئے، گرے ہوئے، حقیر اور ذلیل سمجھے جانے والے میرے جیسے انسانوں کو اٹھا کے سینے سے لگاتے ہیں۔ انہیں پیار دیتے ہیں جن کو دنیا نفرت سے ٹھوکریں مارتی ہے، سنگسار کرتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ گناہ گار ہے تو اسے جینے دو۔ موقع دو کہ یہ خود کو سنبھالے، سنوارے۔ تم نے کچھ نہیں کیا میرے لیے نواب رفیق احمد شیرازی۔''

میں نے کہا۔ ''شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔''

وہ رونے لگی۔ ''ذرا دیکھو اس مقابلے میں دوسروں نے کیا نہیں کیا؟ کس نے مجھے فاحشہ نہیں کہا۔ طوائف سے بدتر اور خطرناک نہیں سمجھا۔ انہوں نے میرے وجود کو اسی طرح برداشت کیا جیسے کوئی صحت مند جسم پر رستے ہوئے ناسور کو برداشت کرتا ہے۔ نفرت اور کراہیت کے ساتھ۔ کوئی موقع نہیں جانے دیا کسی نے۔ اپنی زبان سے ڈنک مارنے کا۔''

''تمہارا غصہ جائز ہے نور۔ میں سمجھتا ہوں۔''

وہ چلا کے بولی۔ ''نہیں۔ تم بھی نہیں سمجھتے مگر تم کچھ نہیں کر سکتے۔ باقی سب کے ساتھ تمہارے رشتے پرانے ہیں۔ زیادہ مضبوط ہیں۔ میری خاطر تم ان سب کو نہیں نکال سکتے تھے۔ چنانچہ تم مجھے نکالنا چاہتے تھے۔''

''ایسا میں تمھیں قانون کی گرفت سے بچانے کے لیے کر رہا تھا۔''

''جھوٹ۔ یہ محض ایک بہانہ تھا۔ اصل بات یہی ہے کہ میرے لیے تمہاری اتنی بڑی حویلی میں جگہ نہیں تھی۔ تم خود بدنامی سے اور گرفتاری سے ڈرتے تھے۔ میرا تمہارا تعلق کسی کو برداشت ہی نہ تھا۔ میں نے تو کبھی شادی پر اصرار نہیں کیا۔ میں نے تو فریال کے ہوتے ہوئے بھی تم سے محبت کے نام پر کوئی حق نہیں مانگا تھا۔ لیکن جب میں نے بتایا کہ اس تعلق کا نتیجہ سامنے آنے والا ہے۔ تو تم نے کیا مطالبہ کیا تھا؟ اسے ضائع کر دو۔ تم ابھی شادی نہیں کر سکتے۔ بدنامی افورڈ نہیں کر سکتے۔ اس وقت بھی میں نے یہی کہا تھا کہ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ اس بچے کے نام پر بھی میں کچھ نہیں مانگ رہی تھی۔'' وہ اب باقاعدہ رو رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ''پلیز نور۔ مجھے معاف کر دو۔ یہ رونا بند کرو۔''

وہ خود کو سنبھال کر بولی۔ ''تم کیا سمجھتے ہو۔ مجھے معلوم نہیں کہ کس نے کیا کہا تھا؟ کہنے والوں نے صرف تم سے نہیں کہا۔ براہِ راست مجھے بھی کہا۔''

میرا دماغ گرم ہونے لگا۔ ''کس نے... مجھے بتاؤ۔''

''سوری جان۔ نہ میں تلخی چاہتی ہوں۔ نہ تمہیں کسی کے خلاف کرنا چاہتی ہوں۔ بس یہ بتانا چاہتی ہوں کہ مجھے کسی نے بخشا نہیں۔ تم ان کے اپنے تھے میں غیر تھی۔ ہر تیر کے ہدف کا نشانہ میں بنی۔ مجھے بتاؤ۔ کیا یہ نہیں کہا گیا تھا کہ اس بچے کے ذریعے میں ست بدھائی پر قابض ہونا چاہتی ہوں؟''

میرے ذہن کو جیسے بجلی کا جھٹکا لگ گیا۔

''تمہاری خاموشی تمہارا اعترافِ جرم ہے۔ تم نے یہ سب سنا اور اس کا حل ایک ہی جانا۔ بچے کو دنیا میں نہ آنے دیا جائے اور مجھے اس دنیا سے رخصت کر دیا جائے۔ ست بدھائی کی دنیا سے۔ سب کی یہی مرضی تھی۔ ایک مسئلہ تقدیر نے حل کر دیا۔ ست بدھائی کا وارث دنیا میں آنے سے پہلے ہی رخصت ہو گیا۔ پھر میں نے سوچا کہ دوسرا میں خود کیوں نہ حل کر دوں۔ تمہاری ساری پریشانی دور ہو جائے۔ یہ قدم میں نے اس حادثے کے بعد اٹھایا تھا اور اس سے پہلے بہت سوچا تھا۔ مجھے معاف کر دینا جان۔''

خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد میں نے کہا۔ ''کیا اب تم کبھی نہیں آؤ گی؟''

''یہ تم نے کیسے فرض کر لیا جان۔ میری مجبوری یہ ہے کہ میں تم سے دور نہیں رہ سکتی۔ رہ سکتی تو مر نہ جاتی۔''

''پھر کب آؤ گی؟''

''ابھی میں کچھ نہیں بتا سکتی۔'' اس نے کہا۔

''کہاں ہو۔ یہ تو بتا سکتی ہو؟'' میں نے بے بسی سے پوچھا۔

''اگر میں کسی شہر یا قصبے کا نام لوں تو کیا فرق پڑے گا۔ پنڈی یا لاہور میں بھی تم مجھے نہیں تلاش کر پاؤ گے خواہ مجنوں بنے گلی گلی نور نور پکارتے پھرو۔ حالانکہ ایسے دیوانے اب کہاں مجنوں جیسے۔'' وہ ہنسی۔

میں نے کہا۔ ''نور۔ چلو صرف ایک بار مل لو۔''

''دیکھو چندا۔ جب میں تمہارے سامنے آؤں گی تو تم مجھے پہچان بھی نہیں سکو گے۔ وہ نور جہاں نہیں۔ نور ہوگی۔ ماہ نور۔ جو کام تمہارے لیے مشکل بنا ہوا تھا وہ میں خود کر رہی ہوں۔ میں نور جہاں کا وجود ہی ختم کر دوں گی۔ یہ تم سے میں نے کہا تھا کہ جب میرا نام ولدیت حلیہ شناخت سب اتنا بدل جائے گا تو پھر میرے لیے لندن جانا کیوں ضروری ہے۔''

''تم خود کو خطرے میں ڈال رہی ہو۔''

''کیا تمہارے ساتھ میں خطرے میں نہیں پڑی تھی؟ حویلی پر چھاپے پڑے۔ تمہارے ابا کے وہ دوست، کیا نام تھا ان کا، وہ مارے گئے اور ہم پچھلی گلی سے نکل کے بھاگے۔ پھر اسی حال ہی میں جب ہم اسلام آباد میں تھے۔ دامن کوہ کے اس ریسٹورنٹ میں کیا ہوا تھا۔ ایک انسپکٹر نے مجھے پہچان لیا تھا۔ کچھ تم نے ہمت کی کچھ میں نے اور کچھ تقدیر نے ساتھ دیا ورنہ اس دن پکڑے جانے میں کون سی کسر رہ گئی تھی۔ اسپتال میں ایک ڈاکٹر نے مجھے پہچان لیا۔''

''یہی تو مسئلہ ہے نور۔''

''لیکن اب یہ صرف میرا مسئلہ ہے۔ اور قسمت نے ساتھ دیا جان تو تم دیکھنا۔ ایک دن ماہ نور تمہارے سامنے آجائے گی تو تم خود پوچھو گے۔ آپ کو کس سے ملنا ہے خاتون۔'' وہ شوخی سے ہنسی۔

''ایسا کب ہوگا۔ میں سخت بے چین ہوں۔''

''چلو۔ بہت جلد۔ تمہاری زندگی میں ایک اور لڑکی آئے گی۔ اگر تم نے تب تک اپنے دل کے دروازے کھلے رکھے اور اسے آنے دیا۔ کوئی پہلے سے براجمان ہوگی تو دروازہ بند کر کے کہے گی کہ مائی معاف کرو۔ کوئی اور در دیکھو۔'' نور ہنس پڑی۔

میں نے کہا۔ ''ایسا نہیں ہوسکتا۔''

''یہ نہ کہو ٹیکے پتر۔ تمہارا دل تو سرکاری مہمان خانہ بنا ہوا ہے پہلے سے۔ جیسے کسی تھانے میں یا ریلوے کے چیئر مین جیسے عہدیدار کے کمرے میں بورڈ پر پہلے آنے والوں کے نام لکھے ہوتے ہیں۔ کون کب سے کب تک رہا۔ ایسے ہی تمہارے دل میں نام لکھے ہوئے ہیں۔ کیا میں گنوا دوں؟''

میں نے خفت سے کہا۔ ''کیا تمہارے دل میں نہیں ہیں؟''

''سچ جان۔ کتنا مزہ آئے گا جب ہم پھر محبت کا ڈراما شروع کریں گے۔ مساۃ بھاگ بھری بمقابلہ نواب رفیق احمد شیرازی۔ اگر یہ کسی کو میدان حشر میں معلوم ہو کہ بھاگ بھری تو وہی خصماں نو کھانی نور جہاں تھی تو کیا سین ہوگا...'' ابھی اس کی کھنکناتی ہنسی میرے کانوں میں رس گھول رہی تھی کہ فون چپ ہوگیا۔

میں نے کہا۔ ''ہیلو۔ ہیلو نور۔ نور۔'' اور وہ نمبر بار بار خود ملا کے خود گفتگو کا سلسلہ بحال کرنا چاہا مگر ہوا وہی جو مرزا غالب کے ساتھ ہوا تھا۔ جان لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں۔ واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں۔ سوائے نمبر کو سیو کرنے کے میں کیا کر سکتا تھا۔

وہ پورا دن تقریباً بے عملی کا تھا۔ ایک دو اخبارات نے جو جہلم سے شائع ہوتے تھے چیف منسٹر کے دورے کو زیادہ تفصیل سے کور کیا تھا۔ باقی نے جگہ کے مطابق اہمیت دی تھی۔ دوپہر سے کچھ پہلے مجھے پی آر او شیدائی صاحب کا فون موصول ہوگیا۔

اس نے کہا۔ ''آپ تو سیاست داں بن گئے ایک ہی جست میں۔''

میں نے کہا۔ ''ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ قانون اس کا باپ سمجھا جا سکتا ہے۔''

وہ ہنسنے لگا۔ ''میں نے چیف منسٹر صاحب کو مطمئن کر دیا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''کیا انہوں نے وہ کیسٹ سنا۔''

''اس کی مہلت نہیں ملی۔ وہ کل شام کی فلائٹ سے کراچی چلے گئے تھے۔ آپ کا شامی سے پھر کوئی رابطہ ہوا؟''

میں نے کہا۔ ''ابھی تک اس کی کوئی خبر نہیں۔ جیسے ہی میری کوئی بات ہوگی راجا آپ کو بتا دے گا۔ میں شامی کو خود لے کر آؤں گا۔''

''آپ بہت پُر یقین ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''ساری خرابی وزارت داخلہ کا اعلان نہ آنے سے ہوئی۔ وہ بے وقوف نہیں تھا کہ رسک لیتا۔''

وہ بولا۔ ''پریس ریلیز کل جاری ہو جائے گی۔ آپ اطمینان رکھیں۔''

میں نے اس کے بعد ڈی آئی جی عبداللہ جان سے رابطے کی تین بار کوشش کی لیکن پتا چلا وہ گزشتہ رات اسلام آباد چلے گئے تھے۔ انہیں فوری طور پر طلب کیا گیا تھا۔ راجا نے اس خیال کا اظہار کیا تھا کہ اب شاید عبداللہ جان کے آئی

جی پنجاب مقرر ہونے کا وقت آگیا ہے لیکن یہ خالص سیاسی عہدہ ہے۔ مرکزی حکومت چیف سیکریٹری اور آئی جی میں سے ایک اپنا بندہ رکھتی ہے۔ ایسا ہی صوبائی حکومت کرتی ہے۔ دونوں عام طور پر ہر عہدے کے لیے تین تین نام تجویز کیے جاتے ہیں اور ایک پر اعتراض ہو تو دوسرے پر اتفاق ہو جاتا ہے۔

مجھے فارغ پا کے شہزادہ آگیا۔ ''سر۔ آپ کچھ کریں۔''

میں نے کہا۔ ''مثلاً قوالی کروں یا دھمال؟''

وہ ہنسنے لگا۔ ''میرا مطلب تھا اس پاگل کو سمجھائیں۔''

میں نے سر کھجایا۔ ''یہاں ہر شخص بشمول میرے دوسرے کی نظر میں پاگل ہے۔''

وہ میرے پاس بیٹھ گیا۔ ''رابعہ میری ایک نہیں سن رہی۔''

''تم کیا سنانے گئے تھے پہلے یہ بتاؤ۔ کل اس نے تم پر بہت سنگین الزام عائد کیا تھا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔''

''میں جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''مگر اب میں بھی رابعہ کے ساتھ ہوں۔ کیا میں تحقیق و تفتیش سے حاصل ہونے والے شواہد پیش کر دوں''

وہ سمجھ گیا۔ ''میں جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ سچ کو چھپا رہا تھا۔''

''آئی سی۔ یہ تو دلچسپ کیس ہے اور اس کا فیصلہ بھی کورٹ کی ڈویژن بنچ کو ہی کرنا چاہیے۔'' میں نے راجا کو دیکھ کے آواز لگائی۔ ''سر ابھی عجلت میں آپ کہاں بھاگے جا رہے ہیں؟''

''میں تحقیق کرنے جا رہا ہوں۔'' اس نے گھڑی دیکھی۔

''کس سے؟''

''ظاہر ہے شہناز سے۔ تو نے کیا اپنی طرح سمجھ رکھا ہے مجھے؟''

میں نے کہا۔ ''ہرگز نہیں۔ تجھے تو ہر سہ ماہی میں کسی سے سچا عشق ہو جاتا تھا پہلے مگر اتنی جلدی کیا ہے؟''

''اگر آج میں نے ایسا نہ کیا تو شہناز نے مجھے نوٹس دیا ہے کہ وہ زہر کا انجکشن لگا دے گی مجھے۔''

میں نے تشویش سے کہا۔ ''اس نے گاؤں کے پاگل کتوں کو مارنے کے لیے دوا منگوائی تھی مگر وہ تجھ پر کہاں اثر کرے گی۔''

راجا بیٹھ گیا۔ ''مجھے یاد آیا کہ انجکشن میں نے لانے کے بعد الماری کو تالا لگا کے رکھے تھے۔ میں چابی ہی نہیں دوں گا۔ مسئلہ کیا ہے۔''

میں نے ساری بات بتا دی۔

راجا نے افسوس سے کہا۔ ''جھوٹ کا کیا فائدہ اگر وہ پکڑا جائے۔ ہم سے کچھ سیکھو شہزادے۔''

''آخر میرا موقف کیوں تسلیم نہیں کیا جا رہا ہے؟ میں نے سچ کو چھپانے کی کوشش کی تھی۔ اس سچ کو جو سچ تھا ہی نہیں۔''

میں نے راجا کی طرف دیکھا۔ ''سچ بھی نہیں تھا۔ جھوٹ بھی نہیں تھا۔ پھر کیا فلمی عشق تھا؟''

شہزاد نے ایک لمبی سانس لے کر لمبا منہ بنالیا۔ ''یہ معاملہ ابھی کوئی تین دن پہلے کا ہے۔ کسی نے رابعہ کو فون کیا اور اسے میری پہلی بیوی کے بارے میں بتایا۔ یہ کہا کہ اس کا نام ثریا ہے اور وہ لاہور میں رہتی ہے۔''

راجا نے سر ہلایا۔ ''میں سمجھ گیا۔ اس کا نام ثریا نہیں تھا اور وہ لاہور میں نہیں رہتی تھی چنانچہ یہ سچ بھی نہیں اور جھوٹ بھی نہیں۔''

شہزاد نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''اس نے مجھ سے پوچھا کہ یہ ثریا کون ہے۔ میں نے کہا کہ خوب گاتی بھی تھی۔ فلم انمول گھڑی میں نور جہاں کے ساتھ اس نے جو گانا گایا تھا۔ ''اڑن کھٹولے پہ اڑ جاؤں۔'' وہ بگڑ گئی کہ میں مذاق نہیں کر رہی ہوں۔ میں نے کہا کہ میں بھی تو سیریس جواب دے رہا ہوں۔ اس نے پوچھا کہ لاہور میں ثریا کون ہے؟ میں پھر نان سیریس رہا۔ اس سے کہا کہ نہ جانے کتنی ہوں گی لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو۔ اس نے کہا کہ میں تمہاری بیوی ثریا کے بارے میں پوچھ رہی ہوں۔ جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے کہا کہ یہ کیا بکواس فرما رہی ہیں آپ۔ پھر اس نے مجھے بتایا کہ کسی نے فون پر اس سے کیا کہا تھا۔ ظاہر ہے یہ غصہ آنے والی بات تھی۔ میں نے کہا کہ کل ایک فون اور آجائے گا میری دوسری بیوی کے بارے میں جو کراچی میں ہے۔ کس الو کے پٹھے نے ایسی بے سروپا بات کی تھی تم سے؟ تم نے پوچھا نہیں تھا۔ نہیں پوچھا تھا تو مجھے بتاؤ۔ میں پوچھتا ہوں۔ اس نے مجھے نمبر دے دیا لیکن جیسی کہ توقع تھی۔ اس نمبر سے کسی نے جواب نہیں دیا۔ یہ پیغام آتا رہا کہ آپ کے مطلوبہ نمبر سے فی الحال رابطہ ممکن نہیں۔ خیر۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ اس نے بھی مان لیا کہ کسی نے شرارت کی تھی لیکن راجا صاحب دوسرے دن اس بندے نے پھر فون کیا۔ جب رابعہ نے اسے گرم گرم سنائیں تو ہنسنے لگا کہ مس رابعہ۔ تمہارا شہزادہ اور کیا کہہ سکتا تھا۔ میں بتاتا ہوں اس کی شادی کب ہوئی تھی۔

اس کا ایک بچہ بھی ہے گلریز۔ پورا نام گلریز شہزاد۔ میں اس کا ایڈریس بھی دے سکتا ہوں۔ لکھ لو۔ رابعہ پھر چکر میں آگئی۔ جو اس نے بتایا لکھ لیا۔"

"دراصل۔ عورت کو سکھ سے زیادہ دکھ راس آتا ہے۔ اسی لیے وہ شک اور وہم کے روگ پالتی ہے۔" راجا نے کسی ماہر نفسیات کی طرح فرمایا۔ "اور معلوم ہے میری برسوں کی تحقیق کیا کہتی ہے۔ اس کا شک غلط نہیں ہوتا ٹیکے پتر۔"

میں نے کہا۔ "آپ اپنی مثال دیں یا شہزاد کی۔ میرا نام لیا تو "

"تو کیا؟" راجا نے غرا کے کہا۔

میں نے آہستہ سے کہا۔ "وہ بھی ٹھیک ہی ہوگا۔"

شہزاد مسکرانے لگا۔ "اسی روز رات کو رابعہ سے میری سخت جھڑپ ہوئی۔ وہ لڑکی ہے یا سونامی۔ وہ تو مجھے تباہ کر دیتی اگر... میں اس کے جھانپڑ نہ مارتا۔"

"حکیم کے نزدیک یہ ہسٹریا کے دورے کا مجرب نسخہ ہے۔" میں نے کہا۔

"جب اس کی عقل ٹھکانے آئی تو میں نے کہا کہ چلو کل میرے ساتھ لاہور چلو۔ میں تمہیں اس پتے پر لے جاتا ہوں۔ لیکن اس وقت یہ ممکن نہیں تھا۔ وہ بھی بہت مصروف تھی۔ کل اس شرپسند حرامزادے نے آخری کام یہ کیا کہ رابعہ کو پھر فون کیا۔"

"اسی نمبر سے؟"

"نہیں۔ نمبر وہ ہر بار بدل دیتا تھا۔ یہ اب بہت آسان ہوگیا ہے۔ سو روپے میں ایکٹیو سم مل جاتی ہے۔ فٹ پاتھ پر لوگ لیے بیٹھے ہیں۔ اس نے پوچھا کہ خاتون آپ اس سے ملیں؟ رابعہ نے اسے گالیاں دیں کہ آخر تم کون ہو۔ کیوں مجھے پریشان کرتے ہو۔ سچے ہو تو سامنے آکے بات کرو لیکن وہ بے غیرت کہنے لگا کہ سامنے آؤں گا تو شہزاد مجھے قتل کر دے گا۔ تم یوں کرو کہ اس عورت سے بات کرلو۔"

"اس نے فون نمبر بھی دے دیا؟" راجا بولا۔

"ہاں۔ اور مس رابعہ نے آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ نمبر ملا دیا۔ دوسری طرف سے کسی عورت نے جواب دیا۔"

"یہ موبائل فون کا نمبر تھا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ یہ لینڈ لائن کا نمبر تھا سو فیصد لاہور کا۔ رابعہ نے یہ کیا کہ براہِ راست اسے میری بیوی نمبر ون مان کے گالیاں دینا اور کوسنا شروع نہیں کیا۔ اس نے پوچھا کہ آپ کون بول رہی ہیں۔ جواب میں اس نے پوچھا کہ آپ کو بات کس سے کرنی ہے۔ رابعہ نے کہا کہ مجھے ثریا سے بات کرنی ہے تو اس نے کہا کہ میں ثریا بول رہی ہوں [illegible] فرمائیے۔"

"رابعہ کے دل کو پہلا شاک لگا ہوگا۔"

"ہاں۔ اس نے پوچھا کہ کہاں سے بات کر رہی ہو تم۔ پھر اسے وہ پتا بتایا جو رابعہ کو اس کے نادیدہ خیرخواہ نے [illegible] تھا۔ عورت نے تصدیق کی اور پھر پوچھا کہ تم کون ہو۔ رابعہ نے اپنے بارے میں کچھ بتانے کے بجائے پوچھا کہ تم نے شہزاد سے شادی کی ہے۔ اس کے لہجے سے وہ عورت ثریا [illegible] بگڑ گئی اور بولی کہ ہاں کی ہے پھر؟ تمہیں کیا تکلیف ہے۔ رابعہ نے چلا کے پوچھا کہ شہزاد سے ایک بچہ بھی ہے تمہارا گلریز شہزاد۔ ثریا نے بھی چلا کے کہا کہ ایک ہوں یا دس۔ تم ہوتی کون ہے پوچھنے والی۔ بس اس کے بعد اللہ دے اور بندہ لے۔ دونوں سوکنوں کی فون پر ایسی جنگِ عظیم ہوئی کہ طعنوں کوسنوں دھمکیوں اور گالیوں کا اسلحہ خانہ خلاص ہوگیا۔"

راجا نے کچھ دیر بعد پوچھا۔ "اب تم کیا کروگے۔ تمہارا بھانڈا پھوٹ گیا۔"

"کیا مطلب ہے آخر ایسی فضول بات کا؟"

"مطلب یہ کہ پہلی سے اجازت لیے بغیر دوسری شادی رچا رہے تھے شہزادہ گلفام۔"

اس نے برا مان کے کہا۔ "یار میں آپ سے مدد مانگنے آیا تھا۔"

"ہم کیا مدد کریں تمہاری۔ فی الحال ایک پر ہی گزارا کرو۔ رابعہ اب تمہیں قتل بھی کر دے تو جائز ہوگا۔"

شہزاد نے مجھ سے کہا۔ "رفیق صاحب آپ بتائیے۔"

میں نے کہا۔ "میں کیا بتاؤں۔ جب ثابت ہوگیا۔"

وہ چلانے لگا۔ "کیا ثابت ہوگیا۔ کچھ ثابت نہیں ہوا۔ کسی نے رابعہ کو بھڑکایا ہے جھوٹ بول کے اور اس کے ساتھ سازش میں وہ عورت بھی شریک ہے جس نے رابعہ سے ثریا بن کے بات کی تھی۔"

میں نے کہا۔ "یعنی یہ جانے بغیر کہ بات کرنے والی عورت کون ہے۔ اس نے سارے جھوٹ ایسے بولے جو تمہارے خلاف ثبوت بن گئے۔ جو کسی نے رابعہ سے کہا تھا، سچ ثابت ہوگیا۔"

راجا بولا۔ "یا یہ ایک اتفاق تھا۔ ایسے اتفاقات تو فلموں میں بھی نہیں ہوتے۔ اس میں سازش کا پہلو تلاش کرنا اس ناچیز کے لیے اتنا ہی دشوار ہے جتنا اپنے حسنِ بے مثال میں خامی تلاش کرنا۔"

شہزاد کچھ دیر بے وقوفوں کی طرح خلا میں دیکھتا

رہا۔ "میں خود اس سے ملنے گیا تھا۔"

"بیوی نمبر ون سے؟" راجا بولا۔ "کیا میں اچھل پڑوں؟"

شہزاد نے اقرار میں سر ہلایا۔ "کل جو تاخیر ہوئی۔ میری واپسی میں تو اس کی یہی وجہ تھی۔ جھوٹ میں نہیں بول رہا تھا۔ لیکن سچ بھی کیسے بتاتا۔"

"یار اس ملاقات کی فلم چلاؤ۔ ٹریلر چلا کے تم نے مجھے سخت بے چین کر دیا ہے۔" راجا بولا۔

"کل میں نے بڑی مشکل سے وہ ایڈریس تلاش کیا۔ ایک گلی ہے دھرمپورے کی، چوبچہ صاحب کے پاس۔ ٹیکسی نے مجھے بہت دور گلستان کالونی میں اتار دیا تھا۔ میں پیدل جھک مارتا اس گھر تک پہنچا۔ وہ ایک منزلہ مکان تھا۔ جو بند پڑا تھا۔ پڑوس کے ایک گھر کا دروازہ بجایا تو ایک ننگ دھڑنگ انسان کا بچہ نمودار ہوا۔ وہ مجھے ایسے دیکھتا رہا جیسے میں مریخ کی مخلوق ہوں۔ میرے سر پر اینٹینا لگا ہوا ہے اور کان کی جگہ اسپیکر ہیں۔ وہ فاتر العقل تھا۔ ماں اسے پکڑ کے اندر لے گئی اور دروازہ میرے منہ پر ایسے دھڑ سے بند کر دیا جیسے میں اس کے لختِ جگر کو اٹھا کے لے جانے والا تھا۔ خیر دوسری طرف سے ایک مردِ معقول برآمد ہوا اور اس نے مجھے مطلع کیا کہ یہ مکان تو کوئی چھ مہینے سے ایسے ہی بند ہے۔ مالکان چلے گئے ہیں گلشنِ راوی۔ مہینے میں ایک بار آکے بل وغیرہ لے جاتے ہیں۔ مکان بک نہیں رہا ہے فی الحال۔ بس اس کے بعد بات میری سمجھ میں آگئی۔"

راجا نے کہا۔ "لیکن ہماری ناقص عقل میں نہیں آئی۔ کیوں ٹیکے پتر۔"

میں نے بہتر سمجھا کہ راجا سے اتفاق کروں۔ "معاملہ پُراسرار ہے۔"

"واپسی پر میں نے کافی دماغ لڑایا۔" شہزاد بولا۔

"کسی سے۔ کمزور چیز کا نقصان ہو جاتا ہے برخوردار۔" راجا بولا۔

شہزاد نے نوٹس نہیں لیا۔ "اس گلی میں یقیناً اس حرامزادے کی کسی سے جان پہچان ہے۔ ساتھ والے کسی گھر میں۔ یا پیچھے والے گھر میں۔ اس مبینہ ثریا زوجہ شہزاد کے علم میں یہ بات ہے کہ وہ گھر بند پڑا ہے جس کے مالکان اب گلشن راوی میں رہتے ہیں۔ انہوں نے فون ڈس کنیکٹ نہیں کرایا ہے۔ عام طور پر لوگ نہیں کراتے۔ فون لگا ہوا ہو تو مکان کی بہتر قیمت مل جاتی ہے۔ وہ ہر مہینے لائن رینٹ دے رہے ہوں گے۔ اسی خاتون نے جو رابعہ کو میرے خلاف بدگمان کرنے والے شخص کی آلہ کار ہے۔ چھت کے اوپر سے کنکشن جوڑ لیا۔ نمبر وہی ہے۔ جواب دوسرے گھر سے ملتا ہے اور وہاں سے رابعہ کو وہی بتایا گیا۔ جو ضروری تھا۔"

راجا نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ مارا۔ "آفرین ہے شرلاک ہومز کے بچے۔"

میں نے کہا۔ "تمہاری بات سمجھ میں آتی ہے لیکن یہ سب تم ثابت کیسے کرو گے؟ کیسے پتا چلاؤ گے کہ وہ عورت کون ہے اور کس گھر میں کنکشن جوڑے بیٹھی ہے۔ ابھی تو تمہیں اس بندے کا نہیں پتا۔ اس کی مددگار کا کیسے پتا چلاؤ گے۔"

"ویری سمپل۔ یہ چھت پر چڑھ جائے گا اور دیکھے گا کہ جوڑے ہوئے کنکشن کا تار کدھر جا رہا ہے۔ بس یہ تار کے سہارے سیدھا اس گھر میں جا اترے گا جہاں اس کی مبینہ بیوی نمبر ون موجود ہوگی۔"

"راجا صاحب۔ فلم میں ابھی انٹرول آیا ہے۔" شہزاد مسکرایا۔

"اچھا ابھی آگے فرما، ویسے فلم بڑی سپر ہٹ ہے۔" راجا بولا۔

"کل ہی رابعہ نے پھر فون گھما دیا اور اس ثریا بھوپالی سے معافی مانگی کہ گزشتہ روز وہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی۔ جواب میں اس حرافہ نے بھی معافی مانگی اور پھر رابعہ نے اسے بڑے رقت آمیز انداز میں دنیا کے سب سے بڑے دغاباز عاشق یعنی اس خاکسار کے بارے میں بتایا۔ رابعہ نے کہا کہ مجھے تو بس اللہ نے بچا لیا۔ کسی فرشتہ غیب نے فون کر کے بتایا کہ اس کی تو شادی ہو چکی ہے اور اس کا ایک بچہ بھی ہے۔ اس نے تو کئی مہینے سے میرے ساتھ محبت کا چکر چلا رکھا ہے اور میرے گھر والوں سے رشتہ بھی مانگ چکا ہے جو منظور کرلیا گیا ہے۔ سچی بات ہے بہن کہ میں خود پاگل تھی۔ اس نے مجھ پر ایسا جادو چلایا تھا۔"

"میری آنکھوں میں آنسو تیر رہے ہیں ٹیکے پتر۔" راجا بولا۔

"مگرمچھ کے آنسو۔" میں نے کہا۔ "کوئی بھی بہا سکتا ہے۔"

"باقی داوے حضرات۔" دونوں مظلوم اور بدقسمت خواتین نے روتے روتے یہ بھی تصدیق کرلی تھی کہ وہ کمینہ عاشق عرف ذلیل شوہر ایک ہی شخص ہے۔ یعنی کہ یہ خاکسار۔" شہزاد سینے پر ہاتھ رکھ کے آگے جھکا۔

"لیکن ثریا تو ایک فرضی کردار ہے۔ ایکٹریس ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ میرا خیال ہے۔ جو غلط ہوا تو سوچ کیا ہوگا۔ ثریا

نے ہنگامہ کھڑا کر دیا ہوگا اپنے شوہر کے سامنے کہ تم دوسری شادی کر رہے ہو۔ حالانکہ وہ شہزاد میں نہیں ہوں اور نہ ثریا کو شہزاد نے رابعہ کے لیے کوئی پیغام دیا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''آپ اپنی سازش والی تھیوری پر قائم رہیں۔ نہ یہ عورت ثریا ہے اور نہ کسی شہزاد کی بیوی۔ وہ بکواس کر رہی ہے۔ کسی کے کہنے پر۔''

''رائٹ اور اب سامنے آتا ہے وہ سوال ملین ڈالر والا... کہ اس ڈرامے کا اسکرپٹ کس کا ہے۔ کس نے کیا یہ سب حرامی پن اور کیوں... تو میں رات بھر اس پر غور فرماتا رہا اور اس کا جواب آسانی سے تلاش کر لیا۔''

''کیا نام میں بتاؤں؟'' راجا نے کہا۔

''نام ہے زوہیب ولد رانا رجب علی۔ جس کا پیغام لے کر خود رانا صاحب تشریف لائے تھے۔''

راجا نے پھر بے خبری میں شہزاد کے کندھے پر زور سے ہاتھ مارا۔ ''آفرین ہے تجھ پر شرلاک ہومز کے بچے۔''

''راجا صاحب۔ میرا بیلنس آؤٹ کر دیا ہے آپ نے دائیں طرف سے۔'' شہزاد اپنا شانہ سہلانے لگا۔

میں نے کہا۔ ''پہلے مسئلہ ہے تمہارے دماغی بیلنس کے آؤٹ ہونے کا۔ تم نے مجرم کو پکڑ لیا۔ پوری سازش سامنے آگئی۔ رانا نے پلاننگ بالکل ٹھیک کی۔''

''اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ حویلی کے اندر کی باتوں سے کس حد تک باخبر رہتا ہے۔'' راجا بولا۔ ''کون پہنچاتا ہے اسے ساری خبریں؟''

''دونوں طرف کی سیکریٹ سروس ایکٹیو ہے۔ غنی نے اپنی ایک سابق محبوبہ کو اندر کا ایجنٹ مقرر کر رکھا ہے۔ رانا نے اسی انفارمیشن کی بنا پر ایک طرف رابعہ کو شہزاد سے اسی طرح کاٹنے کی سازش کی جیسے بھارت نے مشرقی پاکستان کو کاٹا تھا۔ دوسری طرف اپنی غیرت اور غرور پر بے شرمی اور بے حیائی کی نقاب ڈالے ست بدھائی پہنچ گیا اپنے سپوت کے لیے رشتہ مانگنے۔ اس آدمی کی ذلالت کی کوئی حد ہے؟''

''اور کم عقلی کی۔ اس نے کیا سمجھا تھا کہ ہم اس رشتے پر فخر اور خوشی سے پھول کے کپّا ہو جائیں گے، کہیں گے کہ یہ تو عین ہماری عزت افزائی ہے اور رابعہ کو اس کے حوالے کر دیں گے۔'' راجا نے غصے سے کہا۔

''آخر کیا سوچ کے اس نے ایسا کیا تھا؟'' شہزاد بولا۔

''بہت سے مقاصد ہوں گے اس کے پیش نظر۔ ہمیں بے عزت کرنا، بے دخل کرنا، کمزور کرنا اور بالآخر یہاں سے وہاں تک اپنی حکومت قائم کرنا۔ اس کا دماغ اب کام نہیں کرتا ورنہ وہ ایسا سوچتا بھی نہیں خیر' ابھی تو مسئلہ ہے فریادی کا۔''

راجا نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ''فکر نہ کر بچہ۔ تیرے سب دکھ دور ہو جائیں گے۔ جا... ہاتھ باندھ کے اس کے چرنوں میں بیٹھ اور سب کہہ دے۔''

''ہاں جی۔ یہی تو مسئلہ ہے۔ کیسے کہوں۔ وہ سننے کو تیار ہی نہیں اور سن بھی لے گی تو یقین نہیں کرے گی۔ خواتین کے عام عقیدے کے مطابق مرد ایک چھوٹے جھوٹ کو چھپانے کے لیے کئی بڑے جھوٹ بولتے ہیں۔ ہر جھوٹ پہلے والے جھوٹ سے بڑا ہوتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''تم فکر مت کرو۔ میں خود بات کروں گا رابعہ سے۔ کیا ایک تہلکہ خیز انکشاف میں کروں؟''

راجا نے کہا۔ ''بول کہ لب آزاد ہیں تیرے نکے پتر۔''

میں نے انہیں بتایا۔ ''آج نور جہاں نے فون کیا تھا۔''

''اف۔ میں پھر اچھل پڑا۔ اور بھونچکا بھی رہ گیا'' راجا بولا۔ ''کیا حرج ہے اگر یہ اسٹوری آپ ایک نیوز کانفرنس میں بریک کرتے۔ کھانے کی میز پر۔''

میں نے کہا۔ ''یہ ٹاپ سیکریٹ اسٹوری ہے۔''

ابھی کہانی ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ ڈاکٹر ریشم ایک دھماکے سے اندر آئیں۔ ''ایوری باڈی فوڈ ویٹنگ۔ غنی مارننگ گو۔ ناؤ کم۔ ہی سے یو ٹاک ارجنٹ۔ گو ود ہم۔ آئی سے فوڈ فرسٹ۔''

ہم سب نے اس کی بات کا مطلب سمجھ لیا۔ ہمیں کھانے پر بلایا جا رہا تھا۔ ادھر غنی کو مجھ سے کوئی ضروری کام پڑ گیا تھا اور وہ مجھے اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔

میں نے کہا۔ ''ریشم۔ یو آر لکنگ بیوٹی فل۔ اس ڈریس میں۔''

وہ خوشی سے بے حال ہوگئی۔ ''سر۔ آ مرڈر غنی۔''

راجا نے کہا۔ ''یہ واضح نہیں ہوا کہ تم قتل کرو گی یا کر چکی ہو۔''

''لیکن اس بے چارے کا جرم؟'' میں نے چلتے ہوئے پوچھا۔

''ہی لک ی۔ ون ٹائم ناٹ سے دس۔ فرام ٹو مارد۔''

مطلب یہ تھا کہ کل سے وہ دیکھ رہا ہے لیکن اس نے ایک بار بھی ریشم کی تعریف نہیں کی چنانچہ وہ واجب القتل ہے۔

کھانے کی میز پر مجھے خلاف توقع کشیدگی محسوس ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ گزشتہ روز کی شاندار تقریب کا احوال اخباروں میں دیکھ کر خواتین کی خوشی کا گراف پھر آسمان کو چھو رہا ہوگا لیکن ایسا نہیں تھا۔ اس کی وجہ بھی فوراً معلوم ہوگئی۔

رابعہ نے احتجاجی بھوک ہڑتال کر رکھی تھی۔ ہم الگ بیٹھے شہزاد کی دکھ بھری کہانی سن رہے تھے۔ دوسرے کمرے میں خواتین رابعہ کے ساتھ شہزاد کی سنگدلی پر آنسو بہا رہی تھیں۔ کمینگی کی حد ہے۔ ایک بیوی موجود ہے۔ ایک بچہ بھی ہے۔ اور کس بے شرمی سے رابعہ کے ساتھ اظہار محبت کر رہا تھا۔ پیغام تک دے دیا۔ دوسری شادی کرنا چاہتا تھا۔ ان سب کے نزدیک وہ واجب القتل تھا۔

خواتین نے ہمدردی میں رابعہ کے ساتھ بھوک ہڑتال میں تو شرکت نہیں کی۔ وہ اسے کھینچ کر کھانے کی میز پر لے آئیں اور اس سے وعدہ کیا کہ مجرم کو آج ہی اس کے جرم کی سنگینی کے مطابق عبرتناک سزا دی جائے گی۔ رابعہ نقش فریادی بنی بیٹھی تھی اور شہزاد کی طرف دیکھ ہی نہیں رہی تھی ہم تینوں کی بشاشت اور بے فکری دیکھ کے خواتین کا غم و غصہ بڑھ رہا تھا۔ دنیا کے تمام مردوں کے خلاف۔

لیلیٰ بھابی نے بات کا آغاز کیا۔ ''تمہیں پتا ہے رابعہ کے ساتھ کیا ہوا؟''

میں نے متانت سے کہا۔ ''اس پر ہم کھانے کے بعد بات کریں گے۔''

میرا فیصلہ بڑی ناگواری سے مانا گیا۔ کھانا ابھی ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ غنی نمودار ہوگیا۔ اس نے بتایا کہ کھانے میں زہر ملانے کا کیس درج کرانے کے بعد ملزم کو پولیس کے حوالے کر دیا گیا ہے۔

''لیکن ایک اور بات ہے۔'' اس نے میرے قریب آ کے کہا۔

میں نے کہا۔ ''پہلے تم ریشم سے کہو۔ ان کپڑوں میں تم بہت حسین لگ رہی ہو۔ پھر یہ بتاؤ کہ کل کیوں نہیں کہا تھا؟''

غنی بھونچکا رہ گیا۔ ''سر! آپ چاہتے ہیں میں جھوٹ بولوں؟''

اب ریشم کا رنگ غصے سے لال ہوگیا۔ ''آئی بیوٹی فل نو؟''

غنی نے کہا۔ ''اوہ نو... تو ایک بدشکل چڑیل لگ رہی ہے مجھے۔''

ریشم ٹیبل پر سے ایک چمچہ اٹھا کے دوڑی۔ ''آئی مرڈر یو۔''

غنی باہر نکل گیا۔ اس کے پیچھے ریشم نے چمچہ پھینکا تھا لیکن وہ ریشم کی ماں کے سر میں لگا جو اندر کچھ لے کر آ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ سے ڈونگا گر گیا۔ وہ ریشم پر چلانے لگی۔ ''دماغ خراب ہوگیا ہے تیرا لڑکی۔ تمیز تہذیب سب بھول چکی ہے۔'' ہم سب کا ہنستے ہنستے برا حال ہوگیا۔

اس سے پہلے کہ رابعہ کا کیس پھر اٹھایا جاتا میں غنی کے ساتھ نکل گیا۔ ''یہ مسئلہ راجا ہی حل کر سکتا ہے۔ یہ قائم مقام چیف جسٹس بننے کا اہل ہے۔'' میں نے کہا۔

راجا نے دوسرا چمچہ میز پر مارا۔ ''آرڈر۔ آرڈر۔ استغاثہ اپنا کیس پیش کرے۔''

غنی کی صورت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ خاصا مضطرب ہے۔ ''سر آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔''

''کہاں؟'' میں نے کہا۔

''تھانے سر۔ میں ابھی کچھ دیر پہلے آیا ہوں۔ ایک بڑی افسوسناک خبر ملی ہے مجھے۔ وہ جو قلندر بنا پھرتا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''شامی بادشاہ کا نامہ بر؟''

''جی سر۔ اس کی لاش ملی ہے۔''

اچانک میرے ذہن میں تشویش کی لہر اٹھی۔ ''کہاں سے ملی ہے؟''

''پولیس نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔ وہ کچھ چھپا رہے ہیں۔ آپ چل کے معلوم کریں۔ مجھے صرف اتنا پتا چلا ہے کہ اس کو کسی نے گولی ماردی تھی۔ اس کی لاش جہلم کے مردہ خانے میں ہے۔''

''پھر تو راجا کو ساتھ لے جانا ضروری ہوگا۔'' میں نے کہا۔

رابعہ کیس کی سماعت بیچ میں رک گئی۔ میں نے راجا کو اپنے ساتھ بٹھایا اور اسے ساری بات بتائی۔ ''ویسے تو اس کا مارا جانا کوئی ایسی بات نہیں۔ وہ دونوں طرف مخبری کرتا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن میرے دل میں کچھ اور اندیشے جنم لے رہے ہیں۔''

راجا سوچ میں پڑ گیا۔ ''تیرا مطلب ہے؟''

''ہاں۔ شامی بادشاہ کے نہ آنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے۔ اسے آنے ہی نہ دیا گیا ہو۔ راستے میں ہی مار دیا گیا ہو۔''

''اتنی بڑی بات چھپی نہیں رہ سکتی۔'' راجا بولا۔

''وزیر اعلیٰ نے کچھ اور چاہا تھا۔ اس کی منظوری بھی دے دی تھی۔ لیکن یہ بات کسی کو معلوم ہونے نہیں دی گئی۔ کسی نے جانتے بوجھتے اسے روکا۔''

''کسی نے کیا مطلب؟ اسی وزیر داخلہ نے اور کس نے۔''

''بس۔ شاید اسی لیے خبر ابھی تک پھیلی نہیں۔ یہ ایک سیاسی مسئلہ بن گیا ہوگا۔ صبح سے ڈی آئی جی عبداللہ جان نہیں مل رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

''اگر یہ پولیس مقابلہ ہوگا تو معلوم ہو جائے گا۔''

آہستہ آہستہ میرے دل میں رنج وغم اور مایوسی کا اندھیرا پھیل رہا تھا اور میرے احساسِ جرم کی اذیت بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے کہا۔'' راجا... وہ مجھ سے کیے ہوئے وعدے کی خاطر مارا گیا۔''

''وہ اتنا بے وقوف نہیں تھا یار۔ اس نے خود ہی تجھ سے کہا تھا کہ حکومت نے اپنے وعدے کے مطابق اعلان نہیں کیا۔''

''ہاں لیکن وہ دوستی کے معاملے میں کتنا جذباتی تھا۔ اس نے کہا تھا کہ صرف موت ہی میرا راستہ روک سکتی ہے۔''

راجا نے مجھے تسلی دی۔''یار ابھی سے خود کو دکھی کرنے سے کیا حاصل۔ وہ اپنی پناہ گاہ سے نکلا ہی نہیں ہوگا۔''

''نہیں راجا۔ ایسا ہوتا تو وہ پھر مجھ سے رابطہ کرتا۔ اس نے وعدہ کیا تھا۔ ان دغا باز کتوں نے اسے موقع ہی نہیں دیا۔ پولیس نے اس کی اور میری ٹیلی فونک گفتگو سے اس کا سراغ لگا لیا ہوگا۔''

راجا باہر دیکھتا رہا۔''پولیس کا ایسا ہی کردار ہے۔ وہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔ پھر بھی حوصلہ رکھ یار۔''

لیکن جتنا میں سوچتا تھا اتنا ہی میرا یہ یقین بڑھتا جاتا تھا کہ رانا کی سازش کامیاب ہوگئی۔ اس نے وزارت داخلہ کو میرے اور شامی کے تعلقات کے بارے میں پہلے ہی سب کچھ بتا رکھا تھا۔ وزیر داخلہ نے براہِ راست رانا کی حمایت میں مجھے بے عزت کیا تھا اور مجھے دھمکی دے دی تھی کہ رانا سے مخالفت مجھے مہنگی پڑے گی۔ بے شک میرے پاس اس گفتگو کا ریکارڈ تھا لیکن اس سے میں وزیر کے عہدے پر فائز کسی شخص کا کیا بگاڑ سکتا ہوں۔ وہ اپنے اثر رسوخ اور طاقت کی بنا پر کابینہ میں شامل کیا گیا ہوگا۔ وہ کوئی عام شخص نہیں کہ وزیر اعلیٰ اس کے خلاف کوئی قدم اٹھا سکے۔ خاص طور پر اس صورت میں جب اس کے خلاف براہِ راست ملوث ہونے کا کوئی ثبوت ہی نہ ہو۔ جو کیا ہوگا پولیس نے کیا ہوگا اور اسے ایک کارنامہ سمجھا جائے گا۔ ابھی تک پولیس کی نظر میں اور حکومت کے لیے وہ ایک انتہائی مطلوب خطرناک مجرموں کا گروہ تھا۔ پولیس کیا جانے کہ اس کی حکومت سے کوئی ڈیل ہو رہی تھی۔

گاڑی جہلم کے ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر اسپتال میں داخل ہوئی اور رک گئی۔ راجا کے اور میرے اتر جانے کے بعد غنی گاڑی کو پارکنگ ایریا کی طرف لے گیا۔ میرے پاؤں من من بھر کے ہو رہے تھے۔ میرے دل کو احساسِ زیاں کی ندامت کی اور غم والم کی شدید اذیت نے جکڑ لیا تھا۔ رہ رہ کے مجھے خیال آتا تھا کہ وہ میرا یاروں کا یار جو دنیا کے لیے دہشت کی علامت تھا دوستی پر اعتبار کا بھرم رکھنے کے چکر میں مارا گیا۔ ایک نواب اور ایک ڈاکو کی کیا دوستی اور ایسی دوستی جس میں آدمی وعدے پر جان گنوا دے۔

مردہ خانے کا ماحول بے حد بھیانک تھا۔ مجھے وہاں اپنے علاقے کی پولیس چوکی کا نگراں مل گیا جو ہنوز کچا تھانیدار تھا۔ اس نے بڑی عیار مسکراہٹ کے ساتھ آگے بڑھ کر مجھ سے مصافحہ کیا۔''جنابِ نواب صاحب۔ ہم تو آپ کی نظرِ کرم کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔''

میں نے بدمزگی سے کہا۔''کیا تمہیں وہ پلاٹ نہیں ملا؟''

''پلاٹ تو مل گیا جنابِ عالی آپ کی مہربانی سے۔ لیکن اپنی تھانیداری پکی نہیں ہوئی۔ آپ نے ڈی آئی جی صاحب سے ہماری سفارش نہیں کی۔''

میں نے بے رخی سے کہا۔''تم اچھی طرح جانتے ہو وہ سفارش قبول نہیں کرتے۔ کہیں معاملہ الٹا نہ ہو جائے۔''

''حضور نواب صاحب۔ ہاتھی کے دانت کھانے کے اور ہوتے ہیں دکھانے کے اور۔''

میں نے کہا۔''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''میں ڈیوٹی پر ہوں سر۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

''یہاں کوئی لاش لائی گئی ہے۔ ایک دیوانہ مجذوب قسم کا بندہ ہمارے علاقے میں بھی پھرتا رہتا تھا۔'' راجا نے پوچھا۔

''آپ دیکھ لیں اندر جا کے سر۔ یہ جو چوڑا کھڑا ہے مردہ خانے کے دروازے پر۔ اسی سے کہیں۔ ایک ہا پکڑا دیں ہاتھ میں۔'' اس نے بڑی رازداری سے کہا۔''ادھر سے میں بھی اشارہ کر دیتا ہوں لیکن پتا نہ چلے کسی کو...''

سو کے ایک نوٹ نے مردہ خانے کے گیٹ پر لگے تالے کو کھول دیا۔ اندر اندھیرا تھا۔ چھت سے آویزاں سو واٹ کا ایک بلب بھی اندر کے ماحول کو روشن کرنے میں ناکام تھا۔ شاید یہ موت کا اندھیرا تھا جو یہاں در و دیوار سے لپٹا رہتا تھا اور اس کی پُرہول فضا میں بکھرا رہتا تھا۔ لاش فرش پر بھی پڑی تھیں۔ یہ سب گرد و نواح سے لائے گئے مرد، تھے۔ ان کا ابھی پوسٹ مارٹم ہونا تھا۔ جوان بوڑھے بچے۔ ایک طرف دو عورتیں الٹی پڑی تھیں۔''

اس وحشت ناک اور آدمی کے بے توقیری کے منظر

سے میری ہڈیوں میں بھی سردی اتر رہی تھی۔ مردہ خانے سے باہر زندگی کی ساری توانائی اور خوبصورتی کے مقابلے میں ان بے جان پڑی ہوئی لاشوں پر خندہ زن موت کا نظارہ کتنا عبرت آموز تھا۔ راجا جھک جھک کر ہر لاش کے چہرے پر غور کر رہا تھا۔

اچانک اس نے کہا۔'' یہ اس کی لاش ہے۔''

میں نے اس لاش کو دیکھا جسے راجا نے پلٹ کے سیدھا کر دیا تھا۔ میرے کانوں میں ایک صدا گونجی۔ مولا ہی مولا۔ باقی سب رولا ہی رولا۔ پھر فضا گھنگروؤں کی جھنکار سے بھر گئی۔ حق۔ حق۔ حق۔ وہ دیوانہ ایسا بھاری بھرکم سوٹا زمین پر مار کے رقص کر رہا تھا۔ سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا۔ حق۔ حق۔ حق۔

راجا نے کہا۔''چل یار۔ میں نے دیکھ لیا۔ اس کے سینے اور سر میں گولیاں لگی ہیں۔''

''یعنی پولیس مقابلہ ہوا ہے۔'' میں نے بے حسی سے کہا۔ باہر کھڑا ہوا تھانیدار کچھ بتانے پر تیار نہ تھا یا وہ حقیقت سے بے خبر تھا۔ راجا نے اسے براہِ راست پانچ اور پھر دس ہزار تک دینے کی بات کی۔''کیا تمہارے علاقے میں کہیں کوئی پولیس مقابلہ ہوا ہے؟''

''میرے علم میں نہیں ہے سرکار۔ ورنہ میں ضرور بتا دیتا۔'' وہ اپنی بات پر قائم رہا۔

''اگر شامی بادشاہ کے بندے مقابلے میں مارے جاتے تو کیا ان کی لاشیں بھی یہاں نہ لائی جاتیں؟'' میں نے کہا۔

وہ بولا۔''میں تو بہت چھوٹا سا افسر ہوں جنابِ عالی۔ ایسے بڑے بڑے فیصلے اوپر ہوتے ہیں۔ آپ ڈی آئی جی صاحب سے کیوں نہیں پوچھتے؟''

''اس قلندر کی لاش کہاں سے ملی تھی؟'' راجا نے پوچھا۔

''پولیس چوکی سے دو میل دور۔ حویلی کی طرف والے جنگل میں۔ ایک بات کہوں سر۔ شامی بادشاہ ایسے مارا جانے والا بندہ نہیں ہے۔ وہ تو چھلاوہ ہے چھلاوہ۔ سامنے سے کئی بار غائب ہو گیا۔ پولیس کے محاصرے سے ایسے نکل گیا جیسے ہوا لوہے کے جال سے گزر جاتی ہے۔''

اس کی باتیں احمقانہ تھیں مگر میرے دل کو بڑا سکون مل رہا تھا۔ اندر سے ایک آواز اٹھتی تھی جو کہتی تھی۔ خدا کرے ایسا ہی ہو۔ ایسا ہی ہو۔ چلتے ہوئے راجا نے اس سے سوال کیا۔''جس علاقے سے یہ لاش ملی تھی۔ کیا وہاں تم نے کچھ محسوس کیا تھا؟ تمہارا تو پولیس کا کافی تجربہ ہے۔ کوئی علامات تھیں کہ وہاں سے دوسری لاشیں بھی اٹھائی گئی ہوں۔ تم نے کوئی خون وغیرہ دیکھا ہو۔''

اس نے پھر گھڑا جیسا سر ہلا دیا۔''نہیں سر۔''

''کیا آس پاس کسی نے فائرنگ کی آواز سنی تھی؟''

''مجھے نہیں معلوم سر۔''

میں کچھ دیر صدمے سے نیم جاں کھڑا رہا پھر راجا نے میرا ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور میں تھکے تھکے قدموں سے اس کے ساتھ چل پڑا۔

''جنابِ نواب صاحب۔'' میں نے پیچھے سے ایک آواز سنی۔

میں نے پلٹ کے دیکھا۔''کیا بات ہے؟''

کچا تھانیدار بڑے پُراسرار انداز میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہماری طرف آ رہا تھا۔''جنابِ عالی۔ معاملہ میری نوکری کا ہے۔''

وہ یقیناً کچھ بتانا چاہتا تھا۔ میں نے برہمی سے کہا۔''آخر تم کیا چاہتے ہو۔ کتنا پیسا چاہیے۔ بولو۔''

''بات پیسے کی نہیں ہے سر۔''

''نوکری کی فکر بھی مت کرو۔ میں تمہیں اس سے دگنی تنخواہ پر زندگی بھر کے لیے ملازم رکھ لوں گا۔'' میں نے کہا۔

وہ تذبذب میں کھڑا رہا۔''ایک عورت ہے سر۔ وہ شامی کے گروہ میں تھی۔ کہتے ہیں بیوی تھی اس کی۔''

میں نے اور راجا نے ایک ساتھ کہا۔''گولی؟''

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔''شاید یہی نام تھا اس کا۔''

''کہاں ہے وہ؟ زندہ ہے یا مار دی گئی۔ بولو۔'' راجا نے کہا۔

میں نے کانپتے ہاتھوں سے اپنا پرس نکالا۔ اس میں سے ہزار ہزار کے سارے نوٹ نکال لیے۔''راجا۔ تیرے پاس کتنے ہیں۔''

راجا نے گنے بغیر اپنے نوٹ نکال لیے اور اس لالچی شخص کو پکڑا دیے جو صرف ایک اطلاع کی پوری قیمت وصول کرنا چاہتا تھا۔ اس کی صورت سے لگتا تھا جیسے وہ اب بھی مطمئن نہیں مگر اس نے نوٹ اِدھر اُدھر دیکھ کے اپنی جیب میں ٹھونس لیے۔

''دیکھیے جنابِ عالی۔ کسی کو معلوم نہ ہو کہ میں نے آپ کو یہ بات بتائی تھی۔'' اس نے مردہ خانے کی طرف دیکھا۔ راجا اور میں سمجھ گئے۔

مردہ خانے کے اندر میں نے بہت سی لاشوں کے درمیان دو عورتوں کی لاشیں بھی پڑی دیکھی تھیں۔ یہ سب

لاوارث لوگوں کی لاشیں تھیں یا ان کی جو تدفین سے پہلے قانون کے مطابق پوسٹ مارٹم کے لیے یہاں لائی گئی تھیں۔ یہ لوگ طبعی موت مرتے تو سرکاری اسپتال میں مردہ خانے کے فرش پر ایسی بے حرمتی کے ساتھ نہ پڑے ہوتے۔ ان کی موت کے اسباب حادثاتی تھے یا وہ قتل ہوئے تھے۔

دونوں عورتوں کی لاشیں فرش پر الٹی پڑی تھیں چنانچہ میں نے ان کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ میں نے اس کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی کیونکہ میں شامی بادشاہ کے نامہ بر، پولیس کے مخبر اور جعلی مرد قلندر کی لاش دیکھنے گیا تھا۔

تھانیدار کی بات سن کر میرے دل کو شدید صدمہ پہنچا اور دیکھے بغیر ہی مجھے یقین آگیا کہ ان دو میں سے ایک عورت گولی ہوگی۔ گولی وہ عورت تھی جو پہلے کسی اور ڈاکو کی بیوی تھی۔ وہ مارا گیا تو گولی اس کے قتل کا انتقام لینے کے لیے شامی کے پاس پہنچی کیونکہ اس کے یقین کے مطابق اس کے شوہر کا قاتل وہی تھا مگر شامی اسے یقین دلانے میں کامیاب رہا کہ یہ جھوٹ ہے۔ پھر وہ شامی کی پناہ میں آگئی اور بالآخر شامی نے اس سے شادی کرلی۔ وہ ایک انتہائی نڈر، باہمت اور جاں نثار عورت تھی۔

غنی نے میرے چہرے سے میرے دکھ کا اندازہ کرلیا۔ ''آیئے چلیں سر۔ جو ہونا تھا سو ہوگیا۔''

غنی نے تھانیدار کی طرف دیکھا۔ ''یہ تو کہتا ہے اسے کچھ معلوم نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''میں دیکھوں گا غنی۔ اگر ایک لاش گولی کی ہے۔''

تھانیدار نے گھبرا کے کہا۔ ''گولی کی لاش......''

''ہاں۔ اگر شامی بادشاہ کا خاص آدمی وہ قلندر مارا گیا...... اس کی بیوی ماری گئی...... تو پھر شامی کو بھی مار دیا گیا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''سر...... میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ مجھے نہیں معلوم گولی کہاں ہے۔ اس کی لاش یہاں نہیں ہے۔''

غنی نے کہا۔ ''اندر دو عورتوں کی لاشیں پڑی ہیں۔''

''ان میں شامی بادشاہ کی بیوی کوئی نہیں ہے۔ مجھے یہ کسی نے نہیں بتایا۔ خود میں نے گولی کو نہیں دیکھا۔''

غنی نے غصے میں نوٹ اس کے ہاتھ سے چھین لیے۔ ''پھر کیا بات تھی جو تم بتانے جا رہے تھے۔ اتنی راز داری سے؟''

اس نے مردہ لہجے میں کہا۔ ''مجھے معلوم یہ ہوا تو سر...... کہ وہ زخمی ہے۔ اسے سرکاری اسپتال میں رکھا گیا ہے۔ سخت پہرے میں۔''

میں نے غنی سے لے کر نوٹ تھانیدار کو واپس کردیے۔ ''اچھا۔ یہ تمہیں کس نے بتایا۔ چلو یہ بھی چھوڑو۔ وہ کس سرکاری اسپتال میں ہے؟''

اس نے نوٹ فوراً جیب میں ڈال لیے۔ ''راولپنڈی کے پولیس ہیڈ کوارٹر کے اسپتال میں۔''

غنی نے پوچھا۔ ''یہ اطلاع تمہیں یہاں کس نے دی؟''

''ہے کوئی بندہ۔ مجھے اس کا نام نہیں معلوم۔ اس نے فون کیا تھا کہ وہ آج نہیں آسکتا۔ اس کی ڈیوٹی لگ گئی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اس بندے کو یہاں آنا تھا؟''

''جی سر۔ لیکن میں اس کا نام نہیں بتاؤں گا۔'' تھانیدار نے قطعی لہجے میں کہا۔ ''خواہ آپ مجھے ایک لاکھ دیں یا دس لاکھ۔''

میں نے کہا۔ ''نام کی کوئی اہمیت بھی نہیں ہے۔ اطلاع کا درست ہونا ضروری ہے۔'' میں نے کہا۔

ظاہر ہے اس کے بعد میرا وہاں ٹھہرنا بے مقصد ہوتا۔ مجھے معلوم ہو چکا تھا کہ شامی بادشاہ کے گروہ کا پولیس سے مقابلہ ضرور ہوا ہے۔ اس میں ایک مخبر ہلاک ہوا تھا اور شامی کی بیوی زخمی ہوکر... پولیس کے ہاتھ لگ گئی تھی۔ باقی لوگوں کے بارے میں فرض کیا جاسکتا تھا کہ کچھ تو مارے گئے ہوں گے اور کچھ پکڑے بھی گئے ہوں گے۔ شاید کچھ جان بچا کے فرار ہونے میں کامیاب رہے ہوں۔ شامی بادشاہ کے ساتھ کیا ہوا؟ یہ معلوم کرنا بھی آسان نہ تھا مگر میں لاتعلق ہوکر نہیں بیٹھ سکتا تھا۔

مجھے جتنا صدمہ تھا اس سے زیادہ غصہ تھا۔ شامی بادشاہ کے خلاف ساری کارروائی کا ذمے دار وہی صوبائی وزیر داخلہ تھا جو رانا کی حمایت میں میرے خلاف تھا۔ اس نے مجھے حکم دیا تھا کہ میں اپنے ترقیاتی منصوبے ختم کردوں اور حکم عدولی پر مجھے دھمکی دی تھی کہ وہ مجھے تباہ کردے گا۔ چیف منسٹر سے میرے رابطے کے بعد وہ میرے خلاف تو کچھ نہ کرسکا مگر اس نے میری کامیابی کو ناکامی میں بدل دیا۔

شامی کے اپنے ساتھیوں سمیت ہتھیار ڈالنے کی اطلاع ٹاپ سیکرٹ تھی لیکن کہیں نہ کہیں سے یہ انفارمیشن لیک ہوگئی اور اس نے بڑی عیاری اور مکروفریب کی سازش سے

ایک طرف اس خبر کو اشاعت سے روکا کہ حکومت نے شامی بادشاہ کو ہتھیار ڈالنے کی صورت میں تمام مقدمات سے بری کرنے اور اس کو ساتھیوں سمیت ایک باعزت زندگی گزارنے کی پیشکش کی ہے۔

دوسری طرف اس نے اپنی ہر خفیہ ایجنسی کو ست بدھائی کے نواح میں مامور کردیا اور اپنی ماتحت پولیس کو ست بدھائی جانے والے ہر راستے پر اسلحہ دے کر بٹھا دیا کہ شامی بادشاہ عام راستے سے گزر کر... جائے یا خاص راستے سے حویلی پہنچے سے پہلے ہی اس کو وارننگ دیے بغیر مار دو...... اور غالباً ایسا ہی ہوا۔

وزیراعلیٰ کی وجہ سے معاملہ سنگین اور پیچیدہ بن گیا تھا۔ وہ اپنی پیشکش میں مخلص تھا اور کسی قسم کی وعدہ خلافی نہیں چاہتا تھا۔ جب شامی بادشاہ وعدے کے مطابق ہتھیار ڈالنے نہیں پہنچا تو وہ مجھ سے بدگمان ہوا اور یہ سمجھا کہ صرف اسے ست بدھائی بلانے کے لیے میں نے ایک جھوٹ کا سہارا لیا تھا۔

جب صورتِ حال اس پر واضح ہوئی کہ اس پلان کو فیل کرانے میں خود اس کی وزارتِ داخلہ ملوث ہے جس نے حکومت کی پیشکش کے بارے میں پریس ریلیز جاری نہ ہونے دی اور کوئی اعلان نہ ہونے کے باعث شامی نے بھی رسک نہیں لیا تو اس کا دل میری طرف سے ضرور صاف ہوگیا۔ پھر ہم نے وزیر داخلہ کے رویے کی شکایت کرتے ہوئے اسے میری اور وزیر صاحب کی نجی گفتگو پر مبنی کیسٹ پیش کی۔ یہ کیسٹ اس نے فرصت ملتے ہی سن لی ہوگی۔

اب خدانخواستہ شامی بادشاہ وزارتِ داخلہ بلکہ وزیر داخلہ کے حکم پر دھوکے سے گھیر کے مار دیا گیا تھا تو چیف منسٹر یقیناً اس پر سخت برہم ہوگا۔ عام حالات میں شامی بادشاہ اور اس کے گروہ کا مارا جانا یقیناً بہت بڑی کامیابی سمجھا جاتا لیکن اب چیف منسٹر نے سمجھ لیا ہوگا کہ سازش کس نے کی اور کیوں کی۔ وزیر داخلہ نے جو قدم شامی ڈاکو کے گروہ کو ختم کرنے کے لیے اٹھایا وہ درحقیقت مجھے نقصان پہنچانے کے لیے تھا۔ چیف منسٹر کی نظر میں میری پوزیشن خراب کرنے کی کوشش تھی لیکن اس کی سازش بے نقاب ہوگئی۔ میں نے زبانی بتانے کے بعد اس کے خلاف ایک کیسٹ بطور ثبوت پیش کردی۔

یقیناً وزیراعلیٰ نے اسے اپنے خلاف ایک سازش سمجھا ہوگا۔ جو وہ چاہتا تھا وہ نہیں ہونے دیا گیا۔ وہ ڈاکوؤں کے ایک گروہ کو معاف کرکے شریفانہ زندگی گزارنے کا موقع دینا چاہتا تھا۔ وزیر داخلہ نے اس سے یہ موقع چھین لیا۔

راجا کے ساتھ راولپنڈی کی طرف جاتے ہوئے ہم نے بڑے دکھی دل کے ساتھ اس صورتِ حال کو ڈسکس کیا۔ ابھی تک شامی ڈاکو کے گروہ کی پولیس مقابلے میں ہلاکت کی خبر عام نہیں ہوئی تھی تو اس کی وجہ صرف یہی تھی کہ وزارتِ داخلہ اور وہ پولیس اہلکار جو شامی کے گروہ کو مارنے کے ذمے دار تھے اب پریشان ہوں گے کہ وزیراعلیٰ کو کیا جواب دیں۔

کسی بھی پولیس مقابلے کے بارے میں پریس یا پبلک کے سامنے ہر قسم کی غلط بیانی کی جاسکتی تھی مگر چیف منسٹر کو بے وقوف بنانا بالکل ناممکن تھا۔ اس سوال کا جواب کوئی کیسے دے گا کہ حکومت کی پیشکش کے بارے میں چوبیس گھنٹے گزر جانے کے باوجود پریس ریلیز کیوں جاری نہیں ہوئی۔

اب وزیراعلیٰ اپنے وزیر داخلہ سے کیا کہتا ہے۔ ذمے دار پولیس حکام کے خلاف کیا ایکشن لیتا ہے۔ یہ سب میرے لیے بے کار تھا۔ وہ شخص مارا جا چکا تھا جو خود کو میرا دوست کہتا تھا اور مجھے اپنا دوست سمجھتا تھا۔ اعتبار اور خلوص کے رشتے پر اتنا یقین رکھتا تھا کہ میرے کہنے کو کافی سمجھتے ہوئے چل پڑا تھا۔ یہ جانے بغیر کہ راہ میں فرشتہ اجل کے ایجنٹ گھات میں ہیں۔ اس نے تو کہہ دیا تھا کہ میرا راستہ صرف موت روک سکتی ہے ورنہ میں آؤں گا۔ ضرور آؤں گا۔

موت نے اسے حویلی نہیں پہنچنے دیا تھا۔ اب اس کی لاش نہ جانے کہاں بے گور و کفن پڑی ہوگی۔ جانتے بوجھتے یہ ''غلطی'' کرنے والے وزیراعلیٰ کے سامنے کوئی نہ کوئی قابلِ قبول وضاحت پیش کردیں گے۔ وزیراعلیٰ کیا کرے گا؟ زیادہ سے زیادہ کسی کو معطل کردے گا یا ٹرانسفر کردے گا۔ یہ سب تو ہوتا رہتا ہے۔ اس سے شامی بادشاہ جیسا دوست تو مجھے واپس نہیں ملے گا۔ ابھی میں اتنا اہم بھی نہیں کہ میری خاطر وزیراعلیٰ اپنی حکومت کے ایک وزیر کو عہدے سے الگ

کر دے۔ بہت جلد یہ خبر تمام اخباروں کو جاری کر دی جائے گی۔ تمام ٹی وی چینلز پر نشر ہو جائے گی کہ نامی گرامی ڈاکو شاہی بادشاہ جس نے علاقے کے لوگوں کا جینا اجیرن کر رکھا تھا پولیس مقابلے میں ہلاک کر دیا گیا۔ اس کے زندہ یا مردہ ہاتھ آنے پر پچاس لاکھ کا انعام تھا۔

اس کے بعد رانا اور وزیر داخلہ ایک دوسرے کو مبارکباد دیں گے۔ ہاتھ ملائیں گے کہ اس نواب کے نطفے کی ساری سیاست کا خانہ خراب کر دیا۔ اس نے وزیر اعلیٰ کو بلا کر... اسپتال اور اسکول کا افتتاح تو کرا لیا مگر اصل مقصد پورا نہ ہوا۔ رفیق کی بدمعاشی کی ساری طاقت شاہی کے دم سے تھی اسی علاقے میں اپنی دہشت پھیلا رکھی تھی۔ خس کم جہاں پاک۔ دونوں مارے گئے اپنے اناڑی پن کی وجہ سے۔ نواب رفیق بھی اور شاہی بادشاہ بھی۔ بھلا زمانہ کسی پر اعتبار کرنے کا ہے اور وہ بھی سیاست میں!

میری نظر میں شاہی بادشاہ کا مسکراتا ہوا چہرہ ابھر رہا تھا اور اس کی بارعب آواز تھی۔ خیر ہو وے نواب دوست کی۔ مجھے اس سے ہونے والی ہر ملاقات یاد آ رہی تھی۔ کئی بار مجھے پراسرار و پُرفریب راستوں سے اس کے ڈیرے تک بھی لے جایا گیا تھا۔ خود مجھے یہ اندازہ کرنا مشکل ہوتا تھا کہ میں نے مختلف گاڑیوں میں گھنٹوں کا سفر چند کلومیٹر تک محدود پُرپیچ راستوں پر کیا تھا یا یہ مسافت سیکڑوں کلومیٹر کی تھی۔

بار بار میرے تصور میں کسی نامعلوم مردہ خانے کا منظر آ جاتا تھا جہاں میلے پتھریلے لہو آلود فرش پر ایک قطار میں دس لاشیں پڑی تھیں۔ سب اپنے خون میں بھری ہوئی۔ گولیوں سے چھلنی۔ نیم تاریک ماحول کو موت کے سفاک سائے اور بھیانک بنا رہے تھے۔ پولیس کے اعلیٰ افسران کے سامنے تفتیشی اہلکار باری باری ہر ہلاک کیے جانے والے ڈاکو کی فردِ جرم پڑھ رہے تھے۔ پولیس کا ایک فوٹو گرافر تصویر اتارنے کے لیے ہر لاش پر جھک کے فلیش کو چمکاتا اور آگے بڑھ جاتا تھا۔ "اور سر یہ ہے ان کا سرغنہ۔ شاہی...... جو شاہی بادشاہ کہلاتا تھا۔ سات گولیاں لگی ہیں اس کو۔"

راجا مسلسل کوشش کرتا رہا کہ کسی ذمے دار حکومتی شخصیت سے اس پولیس مقابلے کی تصدیق ہو سکے لیکن اول تو فون ہی نہیں ملتے تھے۔ فون بند تھے یا انگیج ہونے کی خبر دیتے تھے۔ راجا کے دوست نصیر الدین شیدائی نے حلفیہ کہا کہ ایسا کوئی افسوسناک واقعہ پیش آیا ہے تو ابھی تک اعلیٰ سطح پر ہی ڈسکس ہو رہا ہے۔ اسے کسی نے اعتماد میں نہیں لیا۔ یہی حال دیگر اخباری نمائندوں کا بھی تھا۔ وہ بھی راجا کی طرح اصل حالات سے بے خبر تھے۔

میں نے جی ٹی روڈ سے اسلام آباد ہائی وے کی طرف مڑنے کے بعد کہا۔ "راجا۔ کیا یہ بہتر نہ ہوتا اگر ہم چیف منسٹر سے ملنے کی کوشش کرتے؟"

"اب شاید اس سے ملاقات آسان نہ ہو۔" راجا بولا۔

میں نے کہا۔ "کوشش کرنے میں کیا تھا؟"

"تو نہیں سمجھتا فیکے پتر۔ مصروفیت کا عذر وہ ہمیشہ رکھتے ہیں لیکن ضرورت کے مطابق وقت نکال سکتے ہیں۔ اب اسے کیا ضرورت ہے کہ وہ ہم سے ملے؟ تیری بک بک سننے کے لیے؟ اپنی شکایت تو نے وزیر اعلیٰ صاحب کے گوش گزار کر دی تھی۔ اس کے بعد وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ اب تو وزیر اعلیٰ کو شرمندہ کرے گا کہ اس نے بروقت کارروائی کیوں نہیں کی تھی۔ تو مطالبہ کرے گا کہ وزیر داخلہ کو برطرف کر کے اس پر مقدمہ چلایا جائے۔"

"کیا اس وزیر داخلہ کی وجہ سے وزیر اعلیٰ کی پوزیشن خراب نہیں ہوئی؟" میں نے کہا۔

"بالکل بھی نہیں۔ اگر وزیر اعلیٰ کی طرف سے بیان آ جاتا اور شاہی بادشاہ کو پیشکش کر دی جاتی پھر یقیناً وزیر داخلہ پر الزام آتا۔ ابھی تک تو یہ پیشکش ایک سمری تک محدود تھی جو تو نے دیکھی یا میں نے، یا دو چار خاص لوگوں نے۔ شاہی بادشاہ کی پوزیشن ابھی تک وہی تھی۔ اشتہاری مجرم جس کے سر کی قیمت پچاس لاکھ تھی۔ اگر وہ مار دیا گیا تو وزیر داخلہ پر ہرگز الزام نہیں آتا کہ اس نے وزیر اعلیٰ کے احکامات کو نظر انداز کیا۔"

میں نے تلخی سے کہا۔ "مطلب یہ کہ کچھ بھی نہیں ہوگا۔ میں نے جو چندہ دیا تھا جو تحفظ مانگا تھا اور تو نے جو کیسٹ پیش کیا تھا۔"

"جذباتی مت ہو فیکے پتر۔ چندہ دے کے تو نے وزیر اعلیٰ کو خرید نہیں لیا۔ اس سے تجھے فائدہ ضرور ہوگا۔ اب تو وزیر اعلیٰ کی نظر میں آ گیا ہے۔ کچھ اور خدمت کرے گا تو آگے بھی بڑھ سکے گا لیکن ابھی سے احسان جتانے لگا اور ان کی عنایت کو اپنا حق سمجھ کے طلب کرنے لگا تو میرا کھیل یہیں ختم ہو جائے گا۔ رہی کیسٹ کی بات، تو وزیر اعلیٰ اسے ایک کارڈ کے طور پر استعمال کرے گا۔ اپنی حلیف جماعت کے سربراہ کو بتائے گا کہ ان کے وزیر داخلہ نے کیسی غیر ذمے داری سے کام لیا ہے۔ سربراہ صرف سنے گا اور کہے گا کہ چلو جی، یہ کوئی ایسی بات نہیں۔ شکایات ہمارے پاس بھی ہیں آپ کی پارٹی کے خلاف مگر اتفاق میں برکت ہے۔"

"یعنی میرے لیے صورت حال وہی رہے گی۔"

راجا نے مجھے تسلی دی۔ "نہیں...... وزیر داخلہ کو اشارہ ...نا جائے گا کہ یہ نواب رفیق اپنا بندہ ہے۔ رانا کو بھی سمجھا دیا ...ئے گا کہ ہوشیار۔ تم نے پالیسی نہ بدلی تو تمہاری جگہ لینے ...آ گیا ہے میدان میں۔"

اسی وقت راجا کے فون کی گھنٹی بجی اور میں نے راجا کی ...رت کے تاثرات تیزی سے بدلتے دیکھ کر... اندازہ ...لیا کہ خبر اچھی نہیں۔ چند منٹ بعد میرے خدشات کی ...دیق ہو گئی۔

راجا نے فون بند کر کے ایک گہری ٹھنڈی سانس ...۔ "خبر ریلیز کر دی گئی ہے۔ سرکاری ٹیلی ویژن سے نشر بھی ...کی ہے۔"

میں نے ڈرتے دل کے ساتھ پوچھا۔ "کیا؟"

"شاہی بادشاہ کہلانے والے نامی گرامی ڈاکو کے گروہ ...ایا کر دیا گیا ہے۔ ایک پولیس آپریشن میں وہ اپنے دس ...یوں سمیت ہلاک ہو گیا ہے۔"

"اناللہ وانا الیہ راجعون۔" میرے لبوں سے بے ...ختہ نکلا۔

"گورنر کے علاوہ وزیر اعلیٰ نے پولیس کی اس ...کردگی کو سراہا ہے۔ مقابلے میں چار پولیس والے ہلاک ...ئے اور چھ زخمی۔"

"اس کی بیوی کا کوئی ذکر نہیں؟"

"نہیں۔ ایک گھنٹے بعد ڈی آئی جی صاحب کی پریس ...نفرنس ہے۔"

میں نے کہا۔ "عبداللہ جان کی؟"

"نہیں۔ ڈی آئی جی حیدرآباد۔ یہ پولیس مقابلہ ...لہ کے اس علاقے میں ہوا ہے جو کچے کا علاقہ کہلاتا ہے ...ڈاکوؤں کی پناہ گاہ کے طور پر مشہور ہے۔ یہ پولیس اور ...جرز کا مشترکہ آپریشن بتایا جا رہا ہے۔"

میں نے بڑے دکھ سے کہا۔ "راجا۔ اتنے بڑے ...ن کی آخر ضرورت کیا تھی؟"

"فارسی میں کہتے ...... رموز مملکت خسرواں واشد۔ ...ت کی باتیں حکمراں ہی سمجھ سکتے ہیں۔"

"وہ تو یہیں تھا۔ اتنا قریب کہ ایک مختصر نوٹس پر ست...ی کی حویلی پہنچ جاتا۔"

"اعلان میں اسی لیے دیر لگی۔ ان سب کی لاشیں ...ا سے سمیٹ کر سیکڑوں میل دور سندھ کے کچے کے ...ے میں لے جائی گئیں۔ غالباً کسی ہیلی کاپٹر میں۔ اب سندھ کے صحافیوں کو لے جا کے وہ جگہ دکھائی جائے گی جہاں یہ مقابلہ ہوا تھا۔ سب جھوٹ... مگر یہ ملک تو چل ہی جھوٹ پر رہا ہے۔ اتنا جھوٹ دنیا میں اور کہیں نہیں بولا جاتا ہوگا فیکے پتر۔ جس بے شرمی سے عوامی لیڈر کہلانے والے میڈیا پر آ کے جھوٹ بولتے ہیں۔"

"لیکن اس جھوٹ کا فائدہ راجا؟"

راجا سخت تلخ ہو رہا تھا۔ "تجھے جھوٹا ثابت کرنا اور کیا۔ اب تو کس منہ سے کہے گا کہ شاہی بادشاہ ہتھیار ڈالنے کے لیے آ رہا تھا۔"

"مگر یہ سچ ہے۔"

"جھوٹ اور سچ ثابت ہوئے بغیر صرف الفاظ ہیں۔ جو پولیس اہلکار اس مقابلے میں شریک تھے وہ مقابلے کا حکم دینے والے اور آپریشن کی نگرانی کرنے والوں کے علاوہ بہت لوگ سچ جانتے ہیں۔ کیا تو ثابت کر سکتا ہے ان کے جھوٹ کو؟"

"وزیر اعلیٰ اتنا بے وقوف نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

راجا ہنسا۔ "ہاں۔ وہ بے وقوف نہیں ہے چنانچہ جب اس کا وزیر داخلہ ایک رپورٹ پیش کرے گا کہ شاہی بادشاہ کے گروہ کو کیسے اور کہاں ختم کیا گیا۔ یہ کارنامہ کس نے سرانجام دیا۔ اس میں حصہ لینے والوں کو بہادری کا کیا انعام ملنا چاہیے۔ کس کس کی ترقی ہونی چاہیے۔ شہیدوں کے خاندان کو کتنے لاکھ معاوضہ دیا جانا چاہیے...... تو وزیر اعلیٰ یہ نہیں کہے گا کہ...... صلہ شہید کیا ہے تب وتاب جاودانہ۔ وہ تو تعریفی انداز میں سر ہلا کے رپورٹ پر دستخط کر دے گا۔"

میں نے تشویش سے کہا۔ "گویا اب وزیر داخلہ میرے لیے زیادہ خطرناک ہو جائے گا؟ وہ مجھے وزیر اعلیٰ کی نظر میں جھوٹا اور دھوکے باز ثابت کرے گا کہ شاہی بادشاہ تو کہیں دور دور نہیں تھا۔ رفیق نے جھوٹ بول کے آپ سے اپنا اسکول اور اسپتال کا افتتاح کرا لیا۔"

"نہیں۔ ایسا نہیں ہوگا۔ کیونکہ وزیر اعلیٰ بھی ان میں شامل ہوگا جن کو حقیقت کا علم ہے۔"

"یہ کیسا دوغلا پن ہے۔ کیسی منافقت ہے راجا؟"

راجا نے آہ بھری۔ "یہاں اسی کا نام سیاست ہو گیا ہے۔ کہنے کو ہمارا وزیر اعلیٰ ایک جماعت کا ہے۔ وزیر داخلہ کا تعلق دوسری جماعت سے ہے لیکن ان کی مخلوط حکومت ہے۔ انہوں نے اقتدار کی خاطر تعاون کا سمجھوتا کر رکھا ہے اور کسی تیرے جیسے سچ کا ڈھول بجانے والے کے لیے وہ اپنے درمیان کوئی اختلافات پیدا نہیں کر سکتے۔"

"میں لعنت بھیجتا ہوں ایسی سیاست پر۔"

راجا نے مجھے تھپکی دی۔ "جذباتی مت ہو ٹیکے پتر۔ اب تو نے ایک کروڑ کے چندے کا اعلان کر دیا ہے تو شک کسی کو نہیں رہا۔ تو نے وزیرِاعلیٰ کی پارٹی جوائن کر لی ہے۔ تو حمام میں شامل ہو گیا ہے جہاں سب ننگے ہیں۔ ایک دن تو خود اپنے کپڑے اتار پھینکے گا۔ جیسے تو نواب بن گیا۔ ایسے ہی لیڈر بھی بن جائے گا۔ وقت سب سکھا دے گا تجھے۔"

اس لیے گاڑی کو اسپتال کے احاطے میں دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا تھا۔ یہ کوئی بہت بڑا اسپتال نہیں تھا۔ اس کی دو منزلہ عمارت پو شیپ میں بنی ہوئی تھی اور پولیس ہیڈ کوارٹر کا حصہ تھی۔ مین گیٹ کے سامنے ہیڈ کوارٹر کے دفاتر تھے۔ پچھلے حصے میں رہائشی بنگلوں اور کوارٹروں سے پہلے اس اسپتال میں داخل ہونے کا راستہ الگ کر دیا گیا تھا۔ یہاں صرف پولیس کے عملے کی ملازمت کرنے والے اور ان کے اہلِ خانہ علاج معالجے کے لیے آ سکتے تھے چنانچہ سیکیورٹی کے انتظامات کوئی خاص نہیں تھے۔

بیرونی حصے اور عمارت کی حالت سے بھی خستہ حالی عیاں تھی اور اندازہ ہوتا تھا کہ پولیس کے علاوہ بجٹ میں یہاں آنے والوں کو ملنے والی طبی سہولیات کا معیار کیا ہو گا۔ میں نے شفا انٹرنیشنل جیسے بین الاقوامی معیار کے چمکتے دمکتے اسپتال بھی دیکھے تھے جہاں مریضوں سے زیادہ شاندار کاروں کا رش نظر آتا تھا۔ مجھے حیرانی ہوئی کہ گولی جیسی عورت کو زخمی حالت میں یہاں کیوں لا کے رکھا گیا تھا۔

راجا نے اس کی وجہ بتائی۔ "پہلا مقصد ہے رازداری۔ دوسرا نگرانی اور تیسرا تفتیش۔ سب پولیس کی تحویل میں، علاج تو ہر جگہ ہو جاتا۔"

میں نے کہا۔ "اس کی تصدیق کیسے ہو گی کہ گولی یہاں ہے؟"

"ابھی کچھ سوچتے ہیں۔" راجا نے کہا۔

ہم اسپتال کی کینٹین کے ایک گوشے میں بیٹھ گئے۔ وہاں ہر چیز گندی تھی۔ دیواریں، میز کرسیاں، چائے کی پیالیاں۔ ماحول جس میں سستے سگرٹوں کا دھواں بھرا ہوا تھا اور بو تھی۔ تاہم چائے گرم مل گئی۔

"ہم نے اس کے تھانیدار کی اطلاع پر آنکھ بند کر کے یقین کر لیا اور یہاں بھاگے چلے آئے۔" میں نے کہا۔

راجا بولا۔ "اس کا سالا جھوٹ نہیں بول سکتا اپنے جیجا سے۔"

"اس کا سالا یہاں ہے؟"

راجا نے سر ہلایا۔ "جبھی تو وہ ایک لاکھ اور دس لاکھ لے کر بھی بتانے سے انکاری تھا کہ اطلاع کس نے دی۔ بیوی اسے جوتے مارتی۔"

"تو جانتا ہے کسی کو یہاں؟"

"بہت سے لوگ مجھے جانتے ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں ٹیکے پتر۔ کوئی کام کا بندہ نظر آئے۔"

کام کا بندہ فوراً ہی آ گیا۔ وہ ایک نوجوان کانسٹیبل تھا۔ سیاہ رو مگر ہیرو ٹائپ۔ اس وقت وہ وردی میں نہیں ٹی شرٹ اور جینز میں تھا اور بڑے اسٹائل سے بنے بالوں پر ہاتھ پھیرتا ایک کاؤنٹر کی طرف سگریٹ خریدنے جا رہا تھا۔ جب وہ سگریٹ جلا کے بڑے اسٹائل سے کش لیتا واپس ہوا تو راجا نے اسے آواز دی۔ "ہیلو اکشے کمار۔"

اس نے چونک کر... دیکھا اور تیر کی طرح راجا کی طرف آیا۔ اس کی صورت بھی کافی حد تک اکشے کمار سے مشابہت تھی۔ "راجا صاحب!" وہ خوش ہو کے بولا اور ہاتھ ملا کے بیٹھ گیا۔ "آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

"وہی جو ہم کرتے ہیں۔ تم سناؤ ہیرو۔ کوئی چانس بھی ملا یا نہیں۔"

وہ جھینپ کر... مسکرایا۔ "کہاں سر۔ آپ سے کہا تھا۔ یہ فلمی صحافی بھی تو آپ کے دوست ہوں گے۔ کسی سے ملوا دیں۔"

"ملوا دیں گے ہیرو۔ موٹر سائیکل کون سی ہے آج کل؟"

"وہی یاماہا سر۔ آٹھ سال پہلے کا ماڈل۔"

راجا نے کہا۔ "اسپورٹس؟"

"نہیں جی۔ اسپورٹ ماڈل لینا ضرور ہے۔ ٹو ففٹی۔ اس کے لیے مال جوڑ رہا ہوں۔"

"دس ہزار کا ایک کام کرو گے؟"

اس نے چونک کے ادھر ادھر دیکھا۔ "کام کس کا ہے؟"

"میرا......" راجا نے اطمینان سے جواب دیا اور جیب سے دس ہزار کے نوٹ نکال کر... پھر جیب میں رکھ لیے۔

اکشے کمار نے ایک کش لے کر سگرٹ کو زمین پر جوتے سے مسلا اور بولا۔ "میرے بس میں ہو گا تو ضرور کروں گا۔ آپ سے سودے بازی بھی نہیں کر سکتا۔ کام بتائیں۔"

راجا نے کہا۔ "آج ایک ڈاکو مارا گیا ہے پولیس مقابلے میں۔ اس کی بیوی کو زخمی حالت میں یہاں رکھا گیا ہے۔ معلوم کر دو وہ کہاں ہے۔"

اکشے کمار سوچ میں پڑ گیا۔ "آپ کا اس سے کیا تعلق ہے سر؟"

راجا نے میری طرف دیکھا۔ "کچھ عرصے قبل وہ ان

کی بہن کو اغوا کر کے لے گیا تھا اور اس سے شادی کر لی تھی۔ دیکھنا چاہتے ہیں کہ کیا یہ وہی عورت ہے۔ بس ایک نظر دیکھنا ہے۔ وہی ہوئی تو پھر اسے بچانے کے لیے کچھ کریں گے۔"

اکشے کمار نے میری طرف دیکھا۔ "یہ کون ہیں؟"

راجا مسکرایا۔ "چودھری سلطان کا نام سنا ہے؟ گجرات کے بہت بڑے زمیندار ہیں۔ کئی فلمیں پروڈیوس کر چکے ہیں۔ آج کل ایک نئی ایکٹریس ہے فریال۔ اس کے ساتھ فلم کی شوٹنگ چل رہی ہے۔"

اکشے کمار بڑے جوش سے بولا۔ "میں نے سائن بورڈ دیکھے ہیں۔"

راجا مسکرانے لگا۔ "یہی ہیں چوہدری سلطان۔"

اکشے کمار کی حالت غیر ہو گئی۔ صاف ظاہر تھا کہ مال کمانے کے لیے اس نے پولیس کی نوکری کر لی تھی ورنہ وہ شوقین مزاج نوجوان تھا۔ اس نے بڑی عقیدت کے ساتھ میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ "سر جی۔ آپ سے مل کے بڑی خوشی ہوئی۔ آج موقع دیں ہمیں خدمت کا۔ رات کا کھانا......"

راجا نے اسے ٹوک دیا۔ "پہلے کام۔ پھر دام۔ پھر طعام۔"

وہ سیدھا بیٹھ گیا۔ "راجا صاحب میں پتا کرتا ہوں۔ لیکن یہ کام آسان نہیں ہو گا۔"

"یہ تم کون سی نئی بات بتا رہے ہو مجھے۔ آسان کام ہوتا تو میں خود نہ کر لیتا۔ سوچ لو۔ تقدیر نے تمہارے دروازے پر دستک دی ہے۔ دروازے تو اور بھی ہیں۔" راجا نے عیاری سے کہا۔

وہ جلدی سے بولا۔ "نہیں سر...... میں نے انکار تو نہیں کیا۔ لیکن ایک وعدہ آپ بھی کریں۔ رات کا کھانا چودھری صاحب اور آپ میرے ساتھ کھائیں گے۔ ادھر اسلام آباد میں دامن کوہ سے اوپر جائیں تو پیر سوہاوہ ہے۔ وہاں نیا ریسٹورنٹ بنا ہے۔ منال۔"

"منال؟ خیر اس کا انحصار ہے تمہاری کارکردگی پر۔"

میں نے اکشے کمار کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "میں غور کر رہا تھا تم تو بالکل بنے بنائے اکشے کمار ہو۔"

وہ خوشی سے پھول گیا۔ "کیا آپ کو بھی ایسا لگتا ہے؟ میرے یار دوست کہتے ہیں کہ اکشے کمار کا رنگ بھی بالکل میرے جیسا ہے۔ فلم میں اسے میک اپ سے گورا دکھاتے ہیں۔"

میں نے مسکرا کے سر ہلایا۔ "یہ بالکل صحیح ہے۔ کیمرے کے سامنے حور نظر آنے والی کسی ہیروئن کو میک اپ کے بغیر دیکھو تو چڑیل لگے گی۔ یہاں تک کہ ایشوریا رائے بھی۔ میں نے دیکھا ہے۔"

وہ دم بخود رہ گیا۔ "لیکن سر...... وہ تو ملکہ حسن تھی۔"

میں نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "بتاؤ اسے راجا صاحب کہ حقیقت کیا ہے۔ ایسے مقابلے کیسے جتائے جاتے ہیں۔ عالمی سیاست اور کاروباری دنیا میں کیا ہوتا ہے۔"

"جانے دو اکشے کمار۔ یہ باتیں آسانی سے تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ تم صورتِ حال دیکھ کے ہمیں بتاؤ۔ ہم بیٹھے ہیں یہاں۔"

وہ بڑے جوش سے اٹھا۔ جانے کے لیے مڑا اور پھر رکا۔ "ایک بات ہے راجا صاحب۔ ناراض مت ہونا۔"

"بولو ہیرو۔ کوئی پرابلم ہے؟"

"پرابلم میری نہیں۔ یہ ہو سکتا ہے۔ دوسروں کا منہ بھی بند کرنا پڑے۔ راستہ صاف کرنے کے لیے کوئی رکاوٹ ہو تو ہٹانی پڑتی ہے۔"

راجا نے مشورے کے انداز میں مجھ سے سرگوشی کی۔ "یہ سور کا تخم لالچ میں پڑ گیا ہے۔ اور پیسے مانگ رہا ہے۔"

میں نے کہا۔ "راجا یہ ہو سکتا ہے۔ شامی کی بیوی کو سخت پہرے میں رکھا گیا ہو گا۔ پہرے دار ایسے کہاں مانیں گے۔ یہاں حرام سب کے منہ کو ایسا لگا ہوا ہے کہ سلام کا جواب دینے کے بھی پیسے مانگتے ہیں۔"

راجا نے سر ہلایا۔ "ٹھیک ہے اکشے کمار۔ چودھری صاحب کہتے ہیں کہ ان سے تم خود معاملات طے کرو۔ جو تم کہو گے ہم دے دیں گے مگر ذرا خیال سے۔ مالِ مفت دلِ بے رحم والی بات نہ ہو۔"

"آپ بھروسا رکھیں سر۔" وہ پلٹ کے دروازے سے باہر نکل گیا اور جاتے جاتے ویٹر سے کہہ گیا کہ ہمیں اور چائے پلائے لیکن ہم سے پیسے نہ لے۔ ہم اس کے مہمانِ خصوصی ہیں۔

"یہ کیا چیز پکڑی ہے تو نے راجا۔" میں نے کہا۔

"ایک سے ایک نمونہ ملتا ہے یہاں ٹیکے پتر۔ یہ دنیا ایک عجائب خانہ ہے۔" راجا نے فلسفیانہ متانت سے کہا۔

"اس کے دماغ میں یہ غلط فہمی کیسے پیدا ہو گئی کہ یہ اکشے کمار ہے۔"

"خدا کا شکر ہے کہ اس نے خود کو شاہ رخ خان نہیں سمجھا ورنہ یار لوگ بانس پر چڑھا تے ہیں۔ سب مل کے بے وقوف بناتے ہیں اور یہ بنتا ہے۔ پہلے خود اس نے کسی سے کہا ہو گا کہ میری صورت اکشے کمار سے کتنی ملتی ہے۔ اس سے

پہلے خود کو آئینے میں دیکھتا رہا ہوگا۔“

”میرا خیال ہے کہ شاید اس کی ناک کچھ ویسی ہی ہے۔“

”اب یہ پاگل کا بچہ سنجیدگی سے خود کو اکشے کمار سمجھتا ہے۔ اس چکر میں ہے کہ کوئی فلم ساز بھی یقین کرلے اور اکشے کمار کی کسی فلم کی پاکستانی کاپی بنائے تو اسے اپنے اداکاری کے جوہر دکھانے کا موقع ملے اور وہ جھنڈے گاڑ دے گا۔ پتا نہیں کس کس کو تصویریں ارسال کرچکا ہے۔ کسی سے پانچ منٹ کی ایکشن مووی بنوالی ہے۔ کہتا ہے اکشے کمار دیکھ لے تو شاگرد ہو جائے۔ میرا خیال ہے کہ وہ خودکشی کرلے۔“

”تجھے کہاں ملا تھا یہ نمونہ؟“

”یار اس کا باپ پولیس میں سب انسپکٹر تھا۔ اس نے لاہور میں کہیں چھاپا مارا۔ معاملہ کسی کنجری سے رقابت کا تھا۔ اس نے ہوٹل کے ایک کمرے سے چار بندوں کو اٹھالیا۔ خبر کی زبان میں داد عیش دیتے ہوئے۔ اس کی یاں لاہور کے شاہی محلے کی بڑی اثر رسوخ رکھنے والی عورت تھی۔ پکڑے جانے والوں میں ایک مستری شیر حاجی بلا اچھرے والا بھی تھا۔ اس نے بعد میں سب انسپکٹر کو لکشمی پر گھیر کے مار دیا۔ پولیس نے اسے ڈکیتی کی ناکام واردات بنادیا اور سب انسپکٹر شہید قرار دے دیا گیا۔ اس کی بیوی کو تین لاکھ روپے مل گئے اور ڈی آئی جی لاہور نے اس کے بیٹے کے لیے پولیس میں نوکری کی سفارش کی۔ تین لاکھ تو ملے نہیں۔ بیوی چیک لیے پھرتی رہی۔ کسی نے اسے میرے پاس پہنچا دیا۔ میں نے کوشش کی تو اسے تین لاکھ مل گئے۔ چھ مہینے گزرے تھے کہ یہ آگیا۔ کہنے لگا کہ ڈی آئی جی صاحب نے نوکری کا وعدہ کیا تھا مگر وہ ملتے ہی نہیں۔ میں نے کسی اور سے کہا۔ ایک کالم میں اس کا ذکر آگیا کہ جو پولیس والے ادائے فرض کرتے ہوئے بہادری سے جان دیتے ہیں ان کے لواحقین بعد میں کیسے در در کی ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں اور کوئی پوچھتا نہیں۔ اس کے نتیجے میں اکشے کمار کو نوکری بھی مل گئی۔ یہ تو سب انسپکٹر بننے کا آرزومند تھا۔ کانسٹیبل رکھ لیا گیا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ ایک مصیبت اپنے پیچھے لگالی ہے میں نے۔ ٹریننگ پوری ہوئی تو یہ ٹریفک میں چلا گیا اور بس۔ آنکھ بند کرکے لگ گیا کمائی پر۔ ایک بار کسی رپورٹر کو روک لیا۔ اس نے تڑی دی تو اس نے میرا نام استعمال کیا کہ میں راجا صاحب کا بھائی ہوں۔ رپورٹر جانتا تھا کہ میرا بھائی کوئی نہیں۔ اس نے ایس پی ٹریفک کو بتادیا اور یہ معطل ہوگیا۔ پھر اس کی بہن آئی۔ میں نے اس رپورٹر کے پاس بھیج دیا۔“

میں نے کہا۔ ”ایک منٹ۔ اس کی وضاحت فرمائیے کہ بہن کیسی تھی اور آپ نے اسے کتنے دن بعد اپنے دوسرے رپورٹر کے پاس بھیجا؟“

راجا ہنسنے لگا۔ ”چھوڑ فیکے پتر۔ یہ پرانی باتیں ہوگئیں یہ قصے ہیں تب کے جب آتش جواں تھا۔ یہ سالا اکشے کہیں نہ کہیں مل جاتا ہے۔ اس خانہ ہمہ آفتاب است۔ بہن اسٹیج آرٹسٹ ہے۔ شاید کسی فلم میں بھی اس کا ڈانس تھا۔“

میں نے کہا۔ ”یہ بعد میں تجھے تنگ کرے گا کہ چودھری سلطان سے ملواؤ۔“

”اس بارے میں اکشے کمار کا دماغ درست کردوں گا۔ بے وقوف آدمی نے مجھے مجبور کردیا ہے۔ سوچو ذرا اس کے پورے خاندان پر میرے کتنے احسانات ہیں اور اس کے بدلے میں آج میرے ساتھ کیا کیا ہے۔ پہلی بار اس سے کام پڑا تھا۔ اس نے قیمت وصول کرتے ہوئے کوئی شرم محسوس نہیں کی۔ دس ہزار میں یہ کام خوشی خوشی کرنے والے بہت مل جاتے۔“ راجا کو اب غصہ آگیا تھا۔

اکشے کمار آدھے گھنٹے میں نمودار ہوا۔ ”سر جی۔ یہ تو چلا لیا ہے میں نے کہ کوئی عورت ہے۔ اس کو کل رات لایا گیا تھا۔ پیچھے کی طرف ایک فالتو کمرا ہے جس میں ٹوٹا پھوٹا سامان پڑا تھا۔ ایک پرانا بیڈ بھی رکھا ہوا تھا۔ جسے بہ وقت ضرورت استعمال کیا جاتا ہے۔“ وہ فحش انداز میں آنکھ مار کے مسکرایا۔ ”عورت زیادہ زخمی نہیں ہے۔“

”اس عورت کو وہیں رکھا گیا ہے؟“ راجا بولا۔

”ہاں جی۔ اسی بیڈ پر۔ کمرے سے فالتو سامان نکال دیا گیا ہے اور ادھر دو بندوں کی ڈیوٹی لگادی گئی ہے۔ ایک سے میری بات ہوگئی ہے۔“

”دوسرا کیا کہتا ہے؟“

”دوسرا سو رہا ہے۔ وہ باری باری ڈیوٹی دے رہے ہیں۔ ایک سے بات ہوگئی کافی ہے۔ وہ خود دوسرے کو بتادے گا۔ لیکن آپ کو کچھ انتظار کرنا پڑے گا۔ اور کچھ خرچہ۔“

”کتنا خرچہ۔ اور کتنا انتظار اکشے کمار؟“

اکشے کمار نے سر کھجایا۔ ”خرچہ تقریباً اتنا ہی ہے۔ میں نے دونوں کو پانچ پانچ میں راضی کرلیا ہے۔ انتظار کرنا پڑے گا رات بارہ بجے تک۔“

راجا نے گھڑی دیکھی۔ ”ابھی تو آٹھ بجے ہیں۔“

”دراصل۔ وہ ڈرتے ہیں۔ افسرانِ بالا کا معاملہ ہے۔ میں نے کہا کہ اس عورت کے ملاقاتی ہیں تو انہوں نے

کانوں کو ہاتھ لگایا کہ ہماری نوکری چلی جائے گی۔ میں نے انہیں تسلی دی کہ کسی کو پتا نہیں چلے گا۔ انہوں نے پوچھا کہ کون ملنا چاہتا ہے۔ میں نے جھوٹ بول دیا کہ دو عورتیں ہیں۔“

”اکشے کمار۔“

”سر آپ میری بات سن لیں۔ مجھے ڈر تھا کہ مردوں کا سن کر وہ انکار نہ کردیں۔ عورتوں کے معاملے میں سب نرم پڑ جاتے ہیں۔ میں نے کہا کہ ایک اس کی بہن ہے اور ایک بھابی۔ دس منٹ بات کریں گی اور چلی جائیں گی۔ تم بے شک ان کی تلاشی لے کر اپنا اطمینان کرلینا۔“

”تم پاگل ہو اکشے کمار۔“

”سر۔ آپ کو داد دینی چاہیے میری ذہانت کی۔ آپ کو برقعے میں لا کے دوں گا۔“

”اور برقعے میں ہمارا یہ حسین چہرہ... جس پر دو دن کی شیو بڑھی ہوئی ہے۔ کیا یہ زنانہ دکھائی دے گا؟“ میں نے پوچھا۔

”چہرے کا میک اپ کرلیں۔ زنانہ کپڑے پہن لیں۔

پھر بھی انہوں نے ہاتھ پھیر کے دیکھا تو ہماری مردانگی......“ راجا خفگی سے بولا۔

”آپ مجھ پر بھروسا کریں سر۔ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ میں کہہ دوں گا کہ پٹھان عورتیں ہیں۔ کسی مرد کو چہرہ نہیں دکھائیں گی۔ ہاتھ لگانا تو دور کی بات ہے۔ زنانہ پولیس تلاشی لے سکتی ہے۔“

”یہ پولیس ہیڈ کوارٹر ہے۔ یہاں زنانہ پولیس بھی ہوگی۔“

”نہیں سر۔ آدمی رات کو کیسے لائے گا کوئی زنانہ پولیس کو گھر سے اٹھا کے آپ تسلی رکھیں۔ کوئی آپ کو چیک نہیں کرے گا۔ بس آپ پیسے نکالیں۔“

راجا نے میری طرف دیکھا اور میں نے سر ہلا دیا۔ جو اس کی نظر میں اکشے کمار کی بے وقوفی تھی وہ میری نظر میں ایک نئی صورتِ حال کی تصویر بنا رہی تھی اور میرا ذہن نئے امکانات پر غور کرنے میں مصروف ہوگیا تھا۔

راجا نے اسے دس ہزار ادا کردیے۔ ”اگر وہ پیشگی طلب کررہے ہیں تو انہیں ادا کردو۔ تمہارے پیسے بعد میں۔“

اس کا چہرہ اتر گیا۔ ”کیا آپ کو اعتبار نہیں مجھ پر جناب!“

میں نے اسے سمجھایا۔ ”ہم اتنی بڑی رقم جیب میں لے کر نہیں چلے تھے۔ ابھی بندوبست کرلیں گے۔“

اکشے کمار نے کہا۔ ”کوئی بات نہیں سر۔“ اور پھر غائب ہوگیا۔

”حرامزادہ۔“ راجا نے بے حد خفگی کا اظہار کیا۔ ”احسان فراموش۔“

میں نے کہا۔ ”مہاراجا۔ میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔“

راجا نے میرے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ ”کمال ہے...... وہی میں بھی سوچ رہا ہوں۔“

”اس میں کمال کیسا۔ سب باکمال لوگ ایک ہی انداز سے سوچتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر بعد میں کیا ہوگا؟“

”جواری یہ نہیں سوچتے اور ہم اتنے اناڑی جواری بھی نہیں ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”ہار سے مت ڈر۔“

”نو رسک نو گیم۔ ابھی بہت دیر ہے۔ ہمارے پاس سوچنے کے لیے بہت وقت ہے۔“

”نہیں فیکے پتر۔ تو نے سوچ لیا۔ میں نے سمجھ لیا۔ بس اکشے کمار کو شک نہ ہو۔“ راجا نے کہا۔

”کیا اس نے واقعی اپنے بھائی بندوں کو رشوت دی ہوگی؟“

راجا نے نفی میں سر ہلایا۔ ”مجھے بھی شک ہے۔ یہ رقم بھی اس نے اپنی جیب میں ڈال لی۔“

اکشے کمار بڑا شاداں و خنداں نمودار ہوا۔ وہ خوش کیوں نہ ہوتا۔ اچانک بیس ہزار اس کی جیب میں آگئے تھے۔ یہ اس کی چار مہینے کی تنخواہ سے بھی زیادہ رقم تھی۔ ملاقات کا وقت ابھی دور تھا۔ وہ ہمیں کھانا کھلانے لے گیا۔ اکشے کمار کے دماغ پر فلمی بھوت سوار تھا اور سوچے سمجھے بغیر راجا نے مجھے چودھری سلطان بنا کے مشکل میں ڈال دیا تھا۔ بے شک میں اس جبلی کانسٹیبل کو بڑے اعتماد سے بے وقوف بنا سکتا تھا۔ مجھے چودھری سلطان کے ہر ادھورے رہ جانے والے فلمی منصوبے اور اس کی ہر نامراد ہیروئن کے انجام کے بارے میں سب کچھ معلوم تھا۔ میں اسے فریال کے ماضی حال اور مستقبل کی ہر بات بتا سکتا تھا مگر میرا ذہن کچھ اور سوچنا چاہتا تھا اور پاکستانی اکشے کمار کے سوالات مجھے مسلسل ڈسٹرب کررہے تھے۔ میری یہ فلم کب مکمل ہوگی۔ کب ریلیز ہوگی میں نے اپنی اگلی فلم کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے۔ اس کی ہیروئن کون ہوگی۔ ہیرو کون ہوگا۔“

رات ساڑھے دس بجے کے بعد میری جان چھوٹی جب اکشے کمار نے کہا کہ اب چلنا چاہیے کیونکہ اسے کچھ بندوبست کرنا ہوگا۔ ”ایک برقع ہے اماں کا مگر اسے شک پڑ جائے گا۔ اس کا قد بھی کم ہے۔“

”پھر کیا کروگے؟“ راجا نے پوچھا۔

”مجھے جانا پڑے گا بازار.... وہاں میرا ایک دوست

رہتا ہے۔ اس کی بیوی اور بہن دونوں لمبی ہیں اور ان کے پاس برقعے بھی وہ ہیں، شٹل کاک ٹائپ۔"

میں اس کی نیت کو سمجھ گیا۔ "دیکھو...... ہم تمہارے ساتھ نہیں جاسکتے۔ ہمیں بھی ایک کام سے سیٹلائٹ ٹاؤن جانا ہے۔"

"تم ٹیکسی میں چلے جاؤ۔" راجا نے کہا۔ "ہم بارہ بجے سے پہلے لوٹ آئیں گے۔ تم کہاں ملو گے؟"

اس نے رضامندی ظاہر کی۔ "وہیں کینٹین میں۔"

میں نے کہا۔ "نہیں۔ پارکنگ ایریا بہتر ہے۔"

اس کے چلے جانے کے بعد ہم نے اپنے پلان کو فائنل کیا۔ راجا نے غنی کو طلب کرلیا تھا اور اس نے کہا تھا کہ وہ گیارہ بجے تک دوسری گاڑی میں پہنچ جائے گا۔ راجا سے اس کی بات ساڑھے آٹھ بجے ہوئی تھی۔ غنی کے لیے دو گھنٹے بھی کافی تھے۔

غنی اپنے ساتھ سفید ہنڈا سوک لایا تھا اور ہدایت کے مطابق گاڑی کو ڈسٹرکٹ پولیس ہیڈکوارٹر سے کافی فاصلے پر روک کر ہمارا انتظار کررہا تھا۔ راجا نے اسے دور سے ہی دیکھ لیا اور اپنی گاڑی اس کے قریب نہیں لے گیا۔ ہم سیدھے گیٹ سے گزرے اور پارکنگ ایریا میں جارکے۔

غنی پانچ منٹ بعد نمودار ہوا۔ اسپتال کا نقشہ ہمارے سامنے تھا۔ باتوں باتوں میں راجا نے اکشے کمار سے معلوم کرلیا تھا کہ جس کمرے میں شامی بادشاہ کی بیوی اور اب بیوہ کو قید میں رکھ کے علاج کیا جارہا ہے وہ کس سمت میں ہے۔

اسپتال کے اندر وہ رونق نہیں تھی جو دن میں نظر آتی تھی لیکن لوگوں کے آنے جانے پر کوئی پابندی نہ تھی۔ یہ سرکاری اسپتال تھا اور صرف پولیس کے لیے مخصوص تھا چنانچہ اوقات ملاقات صرف ضابطے کی کارروائی پوری کرنے کے لیے ایک بورڈ پر لکھ دیے گئے تھے۔ عملاً یہاں ہر مریض کے لواحقین ہر وارڈ میں آجارہے تھے اور نائٹ اسٹاف کی طرف سے کسی پر روک ٹوک نہ تھی۔

اندر کا نقشہ بہت جلد ہماری سمجھ میں آگیا۔ یہ اتنا بڑا اسپتال نہیں تھا جس کے کاریڈور کی بھول بھلیوں میں ہم راستہ بھول جاتے۔ گھومتا پھرتا وہ غلطی سے ایک برآمدے یا کوریڈور کے آخر میں پہنچ گیا۔ اس کے دونوں طرف ڈاکٹروں کے کمرے تھے جو اس وقت بند پڑے تھے۔ اس کے بعد ایک زینہ آگیا جو کسی انتظامی ضرورت کی وجہ سے تختے لگا کے بند کردیا گیا تھا۔ اس زینے کی بغل میں چند قدم کے فاصلے پر ایک دروازہ بائیں طرف اس کھانچ میں تھا جو زینے کے نیچے تکون کی شکل میں رہ گئی تھی۔ اسے عارضی ضرورت کے لیے باتھ روم بنادیا گیا تھا اور جو اس راز سے باخبر تھے وہ ضرورت کے وقت یہاں جسم کا فاضل پانی خارج کرنے آجاتے تھے۔ بالکل سامنے دوسرا دروازہ تھا جو بند تھا۔

غنی پلٹنے کو تھا کہ خفیہ باتھ روم میں سے ایک باوردی کانسٹیبل سرکاری اسلحہ اٹھائے برآمد ہوا اور اس نے غراکے غنی سے پوچھا کہ وہ کون ہے اور یہاں کیوں آیا تھا۔ غنی چونکا مگر گھبرایا نہیں۔ اس نے عاجزی سے اعتراف کیا کہ وہ اپنے چاچے کو تلاش کررہا ہے جس کے پیٹ کا آپریشن ہوا تھا۔ معلوم نہیں وہ کون سے وارڈ میں ہوگا۔

شاید غنی کے لہجے کی مظلومیت اور اس کی صورت پر برستی معصومیت نے کانسٹیبل کو اس کی بے گناہی کا قائل کرلیا۔ اس نے ایک گالی دے کے کہا کہ ادھر دفع ہو۔ آگے کسی سے وارڈ کا پوچھ لے۔ اور پھر بندوق کو کسی لاٹھی کی طرح تھام کے کھڑا ہوگیا۔ غنی نے بڑے وثوق سے اعلان کیا کہ گولی کو اسی دروازے کے پیچھے رکھا گیا ہے ورنہ وہاں پہرا لگانے کی ضرورت کوئی نہیں تھی۔

اس کے بیان کو بنیاد بنا کے ہم نے نقشے پر غور کیا اور اسپتال کی عمارت کے عقبی حصے میں جاکے دیکھا۔ وہاں دومنزلہ عمارت کی سپاٹ دیوار میں چھ کھڑکیاں تھیں۔ تین نیچے اور تین اوپر۔ نچلی منزل پر دائیں بائیں کی کھڑکیاں روشن تھیں اور اندر کسی وارڈ کا منظر تھا۔ درمیان والی کھڑکی ہی ہم سب کے یقین کے مطابق اس کمرے کی کھڑکی ہوسکتی تھی جس میں گولی قید تھی۔

غنی نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا۔ "اگر گاڑی اس کھڑکی کے ساتھ لا کے کھڑی کردی جائے تو اسے یہاں سے نکالا جاسکتا ہے۔"

راجا نے نفی میں سر ہلایا۔ "مسٹر عبدالغنی۔ کھڑکی بند ہے لیکن میں شرط لگا سکتا ہوں کہ پیچھے سلاخیں ہوں گی۔"

میں نے اس سے اتفاق کیا۔ "اس کمرے کو گولی کا قید خانہ قرار دینے والے اتنے احمق نہیں ہوسکتے کہ گولی کے لیے فرار کو اتنا آسان چھوڑ دیتے کہ وہ جب موقع ملے کھڑکی کھول کے نکل جائے۔ اسے کاریڈور سے گزار کے لے جانا ہوگا۔"

"وہ کیسے؟ اگر اس قابل ہوئی کہ اپنے پیروں پر چل سکے۔ پھر بھی یہ مشکل ہوگا۔ اور اسے اٹھا کے لے جانا پڑا تو بالکل ہی ناممکن۔ ہم خود برقعے میں ہوں گے۔ گود کا بچہ برقعے میں نظر نہیں آتا لیکن ایک فل سائز کی عورت ناممکن۔" میں نے کہا۔

راجا بولا۔ "فرض کرو وہ اپنے پیروں پر چلنے کے قابل ہوئی۔ پھر؟"

میں نے کہا۔ "پھر کوئی مشکل نہیں۔ دو برقع پوش خواتین اندر جائیں گی۔ ایک نواب رفیق احمد شیرازی آف ست بدھائی۔ دوسرے آپ۔"

غنی نے مداخلت کی۔ "ایک میں۔ دوسرے راجا صاحب۔"

میں نے اسے ڈانٹا۔ "تم چپ کرو۔ تم اندر دو مسلح پولیس والوں کو ناک آؤٹ نہیں کرسکتے۔ تم اکشے کمار کو باتوں میں لگا کے دور لے جاؤ گے۔ تم کہہ سکتے ہو کہ تم چودھری سلطان کے دست راست ہو۔ سیکریٹری ہو۔ اور وہ سارے فیصلے تمہارے مشورے سے کرتے ہیں۔ ایک بے وقوف آدمی کو بے وقوف بنانا کیا مشکل ہے غنی۔"

غنی نے سر ہلایا۔ "جیسا آپ کا حکم!"

"کمرے میں سے ایک برقع پہن کے میں نکلوں گا۔ دوسرے برقعے میں گولی باہر آئے گی۔"

"معلوم نہیں وہ کس حد تک زخمی ہے۔ چل سکتی ہے یا نہیں۔" راجا بولا۔

میں نے کہا۔ "اکشے کمار نے کہا تھا' وہ زیادہ زخمی نہیں ہے۔"

"راجا صاحب بعد میں کیسے نکلیں گے؟" غنی کو نئی تشویش لاحق ہوئی۔

"میرے پاس ایک جادوئی نقش ہے۔ اسے کہتے ہیں پریس کارڈ۔ وہ پاس ہو تو کوئی بلا راستے میں حائل نہیں ہوتی۔" راجا نے کہا۔

میں نے کہا۔ "اچھا اب وقت کم ہے۔ غور سے سنو' میرا پلان کیا ہے۔ راجا اور میں برقع پوش ہو کے اندر جائیں گے۔ ایک مسلح گارڈ اندر موجود ہے۔ اسے میں ناک آؤٹ کرکے لٹادوں گا۔ کم سے کم آدھا گھنٹا وہ چوں نہیں کرے گا۔ پھر دوسرے کو اندر بلاؤں گا اور اسے بھی ٹھیک سے نیچے چھپادوں گا۔ اس کے بعد میں گولی کے ساتھ نکلوں گا۔ تمہارا کام ہے اتنی دیر میں اکشے کمار کو باتوں میں لگا کے باہر لے جانا۔"

"باہر کہاں جناب عالی!" غنی نے وضاحت چاہی۔

"باہر جہاں ہماری گاڑی موجود ہے۔ سیاہ کرولا۔ میں گولی کو مین گیٹ سے باہر لے جاؤں گا اور سفید گاڑی میں بٹھادوں گا۔ میرا اندازہ ہے کہ اس میں دس سے پندرہ منٹ صرف ہوں گے۔ پندرہ منٹ بعد تم اس ہیرو سے کہو گے کہ راجا صاحب کا پتا کرے کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوگئی۔ اس کے روانہ ہوتے ہی تم دوڑ لگاؤ گے' باہر کھڑی سفید گاڑی کی طرف جس میں گولی موجود ہوگی۔ تم اسے ساتھ لے کر فوراً نکل جاؤ گے۔ اور سیدھے جاؤ گے ست بدھائی۔"

"آپ بعد میں آئیں گے؟"

"ہاں۔ میں گولی سے برقع اتروا کے واپس اسپتال کے اندر جاؤں گا۔ کوشش ہماری یہی ہوگی کہ برقعے میں اکٹھے واپس آئیں۔ اکشے کمار کو باہر ہی ملیں۔ ورنہ دونوں برقعے میں اکشے کمار کو وہیں واپس کروں گا۔ اپنی گاڑی کے پاس۔"

راجا نے کہا۔ "یہ زیادہ مناسب ہے غنی تم اکشے کمار کو وہیں روکے رکھو۔ میں بھی وہیں پہنچ جاؤں گا۔"

میں نے کہا۔ "میں اسے دس ہزار دے کے ہاتھ ملاؤں گا اور اس کا شکریہ ادا کروں گا۔ ہم اس کے سامنے گاڑی میں بیٹھ کے رخصت ہوجائیں گے۔ بعد میں جب ہنگامہ ہوگا کہ گولی فرار ہوگئی اور وہ برقع پوش خواتین جو اس کی بہن اور بھابی بن کے آئی تھیں۔ انہوں نے محافظوں کو ناک آؤٹ کرکے یہ کام کیا تو اکشے کمار مصیبت میں ضرور پڑے گا لیکن اس بارے میں وہ بیان نہیں بدلے گا کہ گولی کو نکال کرلے جانے والے کوئی اور ہوں گے۔ وہ دونوں یعنی راجا نامی صحافی اور فلمساز چودھری سلطان۔ وہ تو میرے سامنے گئے تھے اور ان کے ساتھ کوئی نہیں تھا۔"

"بعد میں کیا ہوتا ہے اس کے ساتھ۔ یہ ہم کیوں سوچیں فیکے پتر۔ اس لالچی احسان فراموش آدمی کو سزا ملنی چاہیے۔" راجا نے کہا۔

اکشے کمار محتاط انداز میں ادھر ادھر دیکھتا ہوا نمودار ہوا۔ اس نے ایک بیگ ہمارے حوالے کیا۔ "اس میں دو برقعے ہیں چوہدری صاحب اور دو شلواریں۔ مجھے خیال آگیا کہ برقعے کے نیچے سے آپ کی مردانہ پتلونیں نظر آئیں تو گڑبڑ ہوجائے گی۔ میں زنانہ چپل بھی لے آیا ہوں۔"

راجا بولا۔ "آج پتا چلا کہ تمہارے پاس عقل بھی ہے۔ صرف شکل نہیں۔"

"سر پتا نہیں کیوں...... مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ کوئی گڑبڑ نہ ہوجائے۔ میری نوکری......"

راجا نے اس کے شانے پر ہاتھ مارا۔ "ارے یار ہم ہیں تو نوکری کی کیا فکر؟"

میں نے کہا۔ "ویسے بھی تم نوکری چھوڑ کے فلموں میں کام کرنا چاہتے ہو۔ پھر نوکری جانے سے کیوں ڈرتے ہو؟"

"میرا مطلب تھا...... جیل نہ جانا پڑ جائے۔"

راجا نے اسے تسلی دی۔ "ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ حوصلہ رکھو۔"

میں نے بھی راجا کی طرح پتلون کے اوپر ہی شلوار چڑھائی۔ وہ مردانہ شلواریں تھیں۔ میں نے شلوار کو اتنا نیچا باندھا کہ میرے پیر ہی نظر نہ آئیں۔ برقع تو ہمارے ٹخنوں سے ایک بالشت اوپر ہی ختم ہو رہا تھا۔ زنانہ چپل بھی چھوٹے تھے۔ کوئی ہمارے مردانہ پاؤں کی جسامت پر غور کرتا تو گڑبڑ ہو جاتی۔

اکشے کمار ہمیں اپنے ساتھ لے گیا۔ اس نے ہمیں دور سے دروازہ دکھایا اور مسلح سنتری کو ہاتھ سے اشارہ کر دیا کہ ہمیں جانے دے۔ وہ غنی کے ساتھ واپس لوٹ گیا۔

دروازے پر کھڑا ہوا پولیس مین پرانا تھا۔ اس کے بازو پر لگی ہوئی دو سرخ پٹیاں اس کے ترقی یافتہ ہونے کی علامت تھیں۔ وہ شاید لانس نائیک تھا اور پولیس کے محکمے میں دس پندرہ سال گزار چکا تھا۔ اس نے اپنی مونچھوں پر ہاتھ پھیر کے ہمیں غور سے دیکھا۔ اس وقت وہ نقاب اٹھا کے چہرہ نمائی پر اصرار کرتا تو گڑبڑ ہو جاتی لیکن پانچ ہزار اسے یقیناً مل گئے تھے چنانچہ اس نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ”مائی! زیادہ دیر مت لگانا۔ ہماری نوکری کا خیال کرنا۔“

دروازہ اپنے پیچھے بند ہوا تو میں نے دس بائی دس کے کمرے میں ایک لوہے کے بیڈ پر گولی کو لیٹا ہوا دیکھا۔ کمرے سے کاٹھ کباڑ ضرور نکال دیا گیا تھا لیکن اس کی صفائی نہیں کی گئی تھی۔ ایک اور پولیس مین بندوق دونوں ٹانگوں میں دبائے کرسی پر بیٹھا تھا۔

گولی کی آنکھیں بند تھیں۔ یہ پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ سو رہی ہے یا بے ہوش ہے۔ اچھی بات یہ تھی کہ ایک پٹی اس کے بائیں شانے پر نظر آ رہی تھی۔ دوسری دائیں ہاتھ پر کہنی سے نیچے۔ اس کی ٹانگیں سلامت تھیں۔ تاہم دونوں ٹانگوں کو ہتھکڑی ڈال کے لوہے کے بیڈ کے ساتھ مقفل کر دیا گیا تھا۔ اس امکان پر ہم نے غور نہیں کیا تھا۔ یکلخت مجھے یوں لگا جیسے میرے سارے پلان کی عمارت ریت کی دیوار کی طرح گر گئی ہے۔ بیڑی سے لوہے کے بیڈ کو الگ کرنا بھی اتنا ہی ناممکن تھا جتنا بیڈ سمیت گولی کو اسپتال سے لے جانا۔

معلوم نہیں اندر کے محافظ کو کس بات پر شک ہوا کہ وہ ایک دم کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنی رائفل کا رخ ہماری طرف کر دیا۔ ”نقاب اٹھا کے چہرہ کراؤ ذرا۔ میں اپنا اطمینان کرنا چاہتا ہوں۔“

اس کی آواز پر گولی نے آنکھ کھولی۔ دو برقع پوش عورتوں کو دیکھ کر اس کا چونکنا لازمی تھا۔ وہ اٹھ بیٹھی۔ ”کون ہو تم دونوں؟“

میں نے سنتری کے حکم کی تعمیل میں چند سیکنڈ صرف کیے۔ کوئی بھی حقیقی پردہ دار عورت ایسے کسی حکم کی فوراً تعمیل نہ کرتی۔ میں نے راجا کی طرف سر گھمایا اور راجا نے میری طرف۔

سنتری نے پھر کہا۔ ”چلو شکل دکھاؤ مجھے۔ میں بھی تو دیکھوں تم کیسی حور پری ہو؟“

میں نے آہستہ سے نقاب اوپر کیا اور پھر بجلی کی طرح حرکت میں آیا۔ میرے ایک ہاتھ نے سنتری کا منہ دبایا اور دوسرا ہاتھ کسی ہتھوڑے کی طرح اس کی کنپٹی پر لگا۔ اس کے ہاتھ سے بندوق گر گئی اور وہ آواز نکالے بغیر ڈھے گیا۔ اس سے پہلے کہ شکار کو بیڈ کے نیچے غائب کرتا باہر والا دروازہ کھلا اور دوسرا شکار اندر آ گیا۔ اندر کے معاملات خاموشی سے نمٹ جاتے تو ہم اسے ایک منٹ بعد خود بڑے پیار سے بلاتے۔ شاید اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ برقع پوش خواتین کے اندر جانے سے کوئی سنگین گڑبڑ ہو گئی ہے۔

راجا بھی اتنی دیر میں اپنا برقع اتار کے پھینک چکا تھا۔ اس نے میرے پہلے شکار کے ہاتھ سے گرنے والی بندوق اٹھائی ہی تھی کہ دروازے کے باہر کھڑے ہوئے لانس نائیک کو اس کی قضا اندر کھینچ لائی۔ اس نے بندوق سیدھی کر کے بہ آوازِ بلند ایک گالی کے ساتھ یہ حکم جاری کیا ہی تھا کہ ”خبردار...... سیدھے کھڑے ہو جاؤ“ کہ راجا نے اپنے ہاتھ میں آنے والی بندوق کو اندھے کی لاٹھی کی طرح گھمایا۔ اس نے بندوق کی نالی پکڑ رکھی تھی۔ بندوق کا دستہ لانس نائیک کے سر پر عین اسی جگہ لگا جہاں میں ہاتھ مار کے اسے ناک آؤٹ کرتا۔ لانس نائیک کے حلق سے ویسی ہی آواز نکلی جیسی بکرے کے حلق سے چھری پھیرتے وقت نکلتی ہے۔ پھر وہ سجدے میں گر گیا۔

گولی نے رونمائی کی رسم ہوتے ہی میرا چہرہ دیکھ لیا تھا۔ اس نے دوسرا سوال نہیں کیا اور ایک منٹ میں دو محافظوں کے زمیں بوس ہونے کا نظارہ بڑی دلچسپی سے دیکھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ ہماری تشریف آوری کا کیا مقصد ہو سکتا ہے۔

میں نے راجا سے کہا۔ ”جلدی سے دیکھ۔ کسی کی جیب میں بیڑی کی چابی ہے یا نہیں۔“

”چابی اس کے پاس ہے بھائی۔“ گولی نے پہلے گرنے والے کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے کہا۔ ”تمہیں چلنا ہے ہمارے ساتھ۔ ہمت ہے؟“

”جب تم نے اتنی ہمت کی......“ اس کی آواز گلوگیر ہو گئی۔

میں نے اس کی ہتھکڑی کھولی۔ ”چلو...... رسمی باتوں کا ن نہیں۔ لو یہ برقع پہن لو۔“

وہ آہستہ آہستہ بیڈ سے اتری۔ ”میرا بایاں ہاتھ بھی ام نہیں کرتا۔“

میں نے برقع اس کے سر پر ڈال دیا۔ ”اچھا راجا۔ ہم رہے ہیں۔“

”میری فکر مت کر فیکے پتر۔ میں آ جاؤں گا۔“ راجا نے ہاتھ ملایا۔ ”ان دونوں کو ہتھکڑی لگا کے دروازہ مقفل ر دوں گا۔“

میں گولی کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتا ہوا کوریڈور سے زرا۔ سامنے سے آنے والی ایک نرس اور ایک ڈاکٹر ٹائپ ں نے ہماری طرف دیکھا تک نہیں۔ وہ شاید اپنے خیال ں میں گزرتے ہوئے کسی وارڈ میں چلے گئے۔ پھر سامنے ے دو نرسیں اردلی اسٹریچر کو دھکا لگاتے آئے۔ اسٹریچر پر ور کے نیچے کوئی ساکت لیٹا ہوا تھا۔ چادر پر خون کے ے تھے۔

کسی دشواری کے بغیر میں نے گولی کو گیٹ سے زار کے کار تک پہنچا دیا۔ ”اب تم یہاں بیٹھو۔ یہ برقع مجھے ے دو۔“ اس نے برقعہ مجھے اتارنے کا موقع دیا۔ ”تم لہاں جا رہے ہو نواب بھائی؟“

نواب بھائی میرے لیے ایک نیا رشتہ اور نیا خطاب ا۔ اس سے پہلے گولی کا شوہر مجھے نواب دوست کہتا ا۔ ”ابھی غنی آ کے تمہیں لے جائے گا۔“

”اور تم؟“

میں نے اسے تسلی دی۔ ”میں دوسری گاڑی میں آ رہا ال۔ پیچھے پیچھے۔“

میں کار کا دروازہ بند کر کے پلٹا۔ کار اندھیرے میں تھی نانچہ اس کے اندر بیٹھی ہوئی گولی کو باہر سے کوئی نہیں دیکھ سکتا ا۔ میں تیزی سے لوٹ کر اسپتال کی طرف گیا۔ ایک برقع ری بغل میں تھا۔ راجا مجھے دروازے سے باہر نکلتا نظر آیا۔ ں نے اپنا رخ تبدیل کیا۔ راجا نے ایک دیوار کے سائے ں مجھ سے برقع لیا اور انگوٹھا بلند کر کے بولا۔ ”آپریشن گولی کامیاب فیکے پتر۔“

میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ ”زبردست مہاراجا۔“

ایک بار پھر ہم برقعے میں اکشے کمار کے روبرو گئے۔ وہ غنی کے ساتھ گفتگو میں منہمک تھا اور ہماری طرف اس کی پشت تھی۔ ہمیں اچانک روبرو دیکھ کر وہ چونکا۔ ”آ گئے آپ لوگ۔ کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی؟“

”گڑبڑ کیا ہوتی ہے۔“ راجا نے برقع اسے تھمایا۔

پھر میں نے بھی ایسا ہی کیا۔ ”ویسے تو یہ سارا معاملہ ہی گڑبڑ تھا۔ لیکن تمہارا مطلب ہے کوئی ہنگامہ یا شور شرابا۔ تو فی الحال سب ٹھیک ہے۔“

”بعد میں کچھ ہوا تو تم جانو۔“ راجا بولا۔

وہ کچھ پریشان ہوا۔ ”بعد میں کیا ہو گا؟“

”غیب کا علم تو مجھے نہیں۔ لیکن فرض کرو، راز فاش ہو گیا تو پھنسو گے تم۔ ہم تو صاف انکار کر دیں گے۔ تمہیں پہچاننے سے ہی۔“

”یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سر؟“

”ڈیئر اکشے کمار۔ آخر بیس ہزار کس بات کے وصول کیے ہیں تم نے؟ اور اتنی بڑی قیمت ہم نے کیوں چکائی تھی؟“ راجا بولا۔ ”اگر کوئی غلط کام... جرم یا گناہ کیا تو تم نے۔ سزا بھی تم ہی بھگتو گے۔“

”آپ میری مدد تو کریں گے نا۔“ اکشے کمار کی مردہ آواز نکلی۔

”بالکل نہیں۔ یاد کرو پہلے کتنی بار میں نے تمہاری مدد کی تھی؟ تمہاری ماں دو بار آئی تھی میرے پاس روتی ہوئی۔ میں نے اسے تین لاکھ دلوائے۔ پھر تمہاری بہن بھی آئی تھی اور میں نے تمہیں پولیس کی یہ نوکری دلائی جس میں آج تم ڈھائی لاکھ کی اسپورٹس موٹر سائیکل خریدنے کا خواب دیکھ رہے ہو۔ لیکن جب مجھے تمہاری مدد کی ضرورت پڑی تو کیا تم نے مجھے بخش دیا؟ کوئی لحاظ کیا میرا؟ نہیں...... تم نے مجھ سے بھی بیس ہزار کی رشوت لی۔ اب کس منہ سے تم یہ سوال کرتے ہو کہ تم مشکل میں پڑے تو کیا میں تمہاری مدد کروں گا؟ میں تم جیسے احسان فراموش کی...... پر لات مار کر... کہوں گا کہ دفع ہو جاؤ اور اپنی شکل مجھے پھر مت دکھانا۔“ راجا بات کرتے کرتے سخت طیش میں آ گیا تھا۔

میں نے گاڑی اسٹارٹ کی تو راجا میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ اکشے کمار شرمسار، مشتعل، حیران پریشان وہیں ساکت کھڑا رہا۔ اس کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کا مستقبل فلمی مستقبل تباہ ہو چکا ہے۔ خود اپنی بے وقوفی سے۔ جو اس کے ساتھ ہونے والا تھا اس کا ابھی وہ کیسے اندازہ کر سکتا تھا۔

گاڑی باہر نکلی تو میں نے کہا۔ ”تو نے میرا دل خوش کر دیا راجا۔“

راجا مسکرانے لگا۔ ”سالے پر چودہ طبق روشن کر دیے میں نے۔ اکشے کمار کی اولاد۔ ابھی اس کی سزا باقی ہے۔ پتا چلے گا اسے کہ بیس ہزار کتنے مہنگے پڑے۔ مجھے اس پر سخت

طیش تھا۔"

"چل چھوڑ۔ ہمارا کام ہوگیا ورنہ مجھے بالکل یقین نہیں تھا کہ جو میں نے سوچا ہے وہ کسی دشواری کے بغیر ہوجائے گا۔ پریشان تو میں گولی کے پیروں میں بیڑ؟ دیکھ کے ہوگیا تھا۔"

"چابی نہ ملتی تو زنجیر کو فائر کر کے اڑاتے۔"

"اور پورے اسپتال کو متوجہ کرتے۔ یہ ایسی جگہ تھی جہاں سے ہم گولیاں چلاتے ہوئے نکل ہی نہیں سکتے تھے۔ پولیس ہر طرف سے ہمیں گھیر لیتی۔"

"چل یار اب اس کی کیا فکر کرنی جو نہیں ہوا۔ یہ سوچ کہ آگے کیا کرنا ہے۔" راجا بولا۔

"اکٹھے کمار ایک تیرا نام لے گا دوسرا چودھری سلطان کا۔ اپنی جان بچانے کے لیے اسے سچ بتانا پڑے گا۔ کوئی یقین کرے نہ کرے۔"

راجا ہنسا۔ "ثبوت نہ ہو تو... تجھے وہ جانتا نہیں اور اپنی بے گناہی کے گواہ میں بنالوں گا۔ تو مجھے مری روڈ پر اتار کے جا۔ وہاں ایک بڑے توپ قسم کے اخبار کا دفتر ہے۔ وہاں میں نے کئی سال کام کیا تھا۔ آج بھی کم سے کم میرے نصف درجن مخلص دوست اور جانثار ہیں۔ میرے کہنے سے وہ قسم کھانے پر بھی تیار ہوجائیں گے کہ میں شام سے انہی کے ساتھ تھا۔"

میں نے کہا۔ "چودھری سلطان بھی آج کل لاپتا ہے۔"

"دراصل مجھے ایک انفارمیشن لینی ہے۔ مجھے شک ہے کہ پولیس نے شامی ڈاکو سے مقابلے کے بعد گولی کو جائے واردات سے غائب کردیا۔ اس کا کسی رپورٹ میں ذکر ہی نہیں ہوگا۔ اس آپریشن کے اصل ذمے داروں نے کہا ہوگا کہ شامی کی بیوی کو یہاں سے ہٹادو اور کسی محفوظ مقام پر رکھو۔ اس سے بعد میں تفتیش کریں گے۔ یہ دے گی پوری انفارمیشن۔ شامی کی بیوی ہر واردات کی تفصیل بتائے گی۔ اس کا بیان تفتیشی رپورٹ میں شامل ہوتا اور عدالت کے روبرو رکھا جاتا۔ تفتیش کے دوران یہ تشدد سے ہلاک بھی ہوجاتی تو کوئی قیامت نہ آتی۔"

میں نے کہا۔ "اگر تیری بات درست ہوئی اور مجھے لگتا ہے کہ درست ہوگی تو افسرانِ بالا بہت تلملائیں گے۔"

"ہم نے اس عورت کو بچالیا۔ ورنہ اس میں سے انفارمیشن نچوڑ کر نکالنے کے لیے نہ جانے کب تک اسے ٹارچر برداشت کرنا پڑتا۔ اس فن کے ماہرین آسانی سے مرنے بھی نہیں دیتے۔"

"سوال یہ ہے کہ ہم اسے کہاں رکھیں گے؟"

"اس سوال کا جواب گولی سے تفصیلی گفتگو کے بعد دیا جاسکتا ہے۔ بس تو مجھے یہاں اتار دے۔"

رات کے ڈیڑھ بجے میں نے راجا کو نالہ لئی کا کراس کر کے ایک عمارت کے سامنے اتارا۔ نیچے قالین پردے والوں کے شوروم تھے۔ اوپر بھی بلڈنگ کا صرف حصہ روشن تھا جس میں اخبار کا دفتر تھا۔ میں سیدھا پل کے نیچے سے گزرا اور بائیں طرف گھوم کے ضلع کچہری والی سڑک پر سے گیا۔ یہی سڑک سیدھی آر ی ہاؤس اور ایوب پارک کے سامنے سے گزر کے جی ٹی روڈ سے مل جاتی ہے۔ اس وقت سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی چنانچہ بیس منٹ بعد میں راولپنڈی سے نکل کے دینہ کی طرف رواں تھا۔ میرے موبائل فون کی گھنٹی بجی تو میں نے کال ریسیو کی۔ "ہاں غنی۔"

"آپ کہاں ہیں سر؟"

میں نے کہا۔ "روات کے قریب۔ اور تم؟"

"میں نے دینہ کراس کرلیا ہے۔ سب خیریت ہے؟"

میں نے کہا۔ "بالکل خیریت ہے۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔"

تقریباً پون گھنٹے بعد میری گاڑی ست بدھائی کی حویلی میں داخل ہوئی تو وہاں سب جاگ رہے تھے۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ ہم گولی کو کہاں سے اور کیسے نکال کے لائے ہیں۔ شہناز نے گولی کو اپنے چارج پر لے لیا تھا اور اس کے زخموں کا معائنہ کرنے کے بعد اسے علاج کے بہانے نیند کا انجکشن بھی لگادیا تھا چنانچہ میرے پہنچنے سے قبل ہی وہ سکون سے سو چکی تھی۔

خواتین کی افسردگی جائز تھی۔ گولی زخمی تھی اور اس نے پولیس مقابلے میں اپنے بہادر شوہر کو اپنی آنکھوں کے سامنے مرتا دیکھا تھا۔ اس کے باوجود نہ وہ دیوانہ وار چیخ و پکار کررہی تھی اور نہ شوہر کے لیے آنسو بہارہی تھی۔ صرف رابعہ نے اس خیال کا اظہار کیا کہ مسلسل مجرمانہ سرگرمیوں اور شب و روز کی خونریزی میں شریک رہنے سے اس کا دل پتھر ہوگیا ہے۔

میں نے گولی کو تہ خانے میں منتقل کرانے کے بعد اس کی سیکیورٹی کو یقینی بنانے کے لیے مزید احکامات جاری کیے حالانکہ اس کی ایسی ضرورت نہ تھی۔ غنی نے سب دیکھا تھا۔ وہ اس مہم میں ہمارے ساتھ شریک تھا۔ اس کا ذہن ہمیں ہر قسم کے خطرات اور مسائل سے محفوظ رکھنے میں ہماری ہدایات کا محتاج کبھی نہ تھا۔ جب تک اسے ذمے داری نہیں سونپی گئی وہ ہماری نظر میں ایک بے وقوف اور کامل قسم کا ٹرک ڈرائیور

تھا جس سے ریشم جیسی لڑکی محبت کی بے وقوفی میں مبتلا تھی لیکن ایک ڈرائیور سے ہمارے چیف سیکیورٹی افسر کے عہدے پر فائز ہونے تک غنی کے جوہر کھلے تھے۔ اس کی ذہانت، معاملہ فہمی، فرض شناسی اور سب سے بڑھ کر اس کی جانثاری نے سب کو بے حد متاثر کیا تھا اور آج ہم سب اس پر اتنا انحصار کرتے تھے کہ اس سے اندر باہر کی کوئی بات نہیں چھپاتے تھے۔

غنی ہمارا بیش قیمت اثاثہ تھا۔ وہ بیک وقت شوفر، محافظ، مشیر، رازدار... اور قابل اعتماد ساتھی سب کچھ تھا۔ پہلے اسے تنخواہ دی جاتی تھی۔ ریشم نے ہم سے وعدہ لیا تھا کہ شادی کے بعد ہماری طرف سے ان کو تحفے میں رہائش کے لیے علیحدہ گھر دیا جائے گا۔ عام لڑکیوں کی طرح اس نے بھی اپنے گھر کو اپنی جنت بنانے کے خواب دیکھ رکھے تھے لیکن شادی ہوئی تو ان کے حالات بالکل بدل گئے تھے۔ ملازم سے وہ گھر کے فرد کی حیثیت اختیار کرچکے تھے اور اب حویلی میں رہنے والوں کی طرح خاندان کا ایک حصہ بن گئے تھے۔ انہیں کچھ مانگنے کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ وہ مالک تھے۔ اور اس عزت افزائی پر جتنے خوش تھے اس سے زیادہ فخر کرتے تھے۔

پولیس ذرائع نے تصدیق کردی تھی کہ شامی بادشاہ کے نام سے شہرت پانے والے اور دہشت گردی میں معروف ڈاکوؤں کے گروہ کو رینجرز اور پولیس نے مشترکہ آپریشن میں ختم کردیا گیا تھا۔ ٹی وی پر ان کی لاشیں بھی دکھائی گئی تھیں اور حیدرآباد کے پولیس حکام نے بڑھ چڑھ کر دعوے بھی کیے تھے جو سب جھوٹ تھے۔ پورے آپریشن کی کہانی فرضی تھی اور ایک سازش کے تحت گھڑی گئی تھی۔ اس کے پیچھے وزیر داخلہ کا شاطر ذہن کارفرما تھا۔ اب وہ چیف منسٹر کو یقین دلاسکتا تھا کہ ست بدھائی کے نواب رفیق نے اس سے جھوٹ بولا تھا کہ شامی بادشاہ ہتھیار ڈالنے آئے گا۔ وہ کہیں قریب تو کیا پنجاب میں ہی نہیں تھا۔ پھر اس نے نواب رفیق سے کب اور کیسے ملاقات کی اور کیسے یقین دلایا کہ وہ اپنے ساتھیوں سمیت ہتھیار ڈالنے آجائے گا۔

اپنی دانست میں وزیر داخلہ نے معاملہ الٹا میرے خلاف اور اپنے حق میں کرلیا تھا۔ شامی ڈاکو کو ہتھیار ڈالنے کی تقریب کے بارے میں کوئی پریس ریلیز جاری نہیں کی گئی تھی تو بالکل نہیں رہی تھی۔ اچھا ہی ہوا تھا ورنہ حکومت پنجاب کے لیے صرف سبکی ہوتی۔ گناہ بے لذت کی شرمندگی ہوتی۔ اس نے مجھ سے میرا ایک دوست چھین لیا تھا جس کی طاقت کو میں اپنی طاقت سمجھتا تھا۔ ایسا بالکل نہیں تھا۔ میں نے کبھی شامی کو کسی مخالف یا دشمن کو ڈرانے دھمکانے کے لیے استعمال نہیں کیا تھا۔ میں تو الٹا اسے راہِ راست پر لانے اور اس کو شریف زندگی گزارنے کے لیے قائل کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

سازش کرنے والے کامیاب ہوگئے تھے۔ راجا کا کہنا غلط نہ تھا کہ وزیراعلیٰ سیاست کے میدان کا پرانا شہسوار ہے۔ وہ آنکھ بند کر کے ہر جھوٹی کہانی پر اعتبار نہیں کرسکتا۔ وہ پولیس مقابلوں کی حقیقت سے بھی واقف ہوگا اور میرے خلاف رانا کی ریشہ دوانیوں سے بھی۔ وہ سمجھ لے گا کہ رانا اور وزیر داخلہ کا گٹھ جوڑ ہے جو میری اچھائی کو بھی برائی بنارہا ہے لیکن وہ کھل کے ایسا نہیں کہہ سکتا نہ وہ اپنی حلیف جماعت کے وزیر کو ناراض کرسکتا ہے اور نہ میری حمایت کرسکتا ہے۔

میں نے کسی پلان اور مشورے کے بغیر ایک کروڑ کے چندے کا جو اعلان کیا تھا وہ میری دوراندیشی کی علامت بن گیا۔ اس طرح میں کھل کے رانا کے مقابل آگیا تھا۔ میں نے اپنے سیاسی عزائم واضح کردیے تھے اور یہ بھی اعلان کردیا تھا کہ میں چیف منسٹر کی پارٹی کا حامی ہوں۔ مجھے خاک بھی علم نہیں تھا کہ اس پارٹی میں کون لوگ ہیں یا اس کا منشور کیا ہے۔ اپنے پیارے وطن کی سیاست ان جھمیلوں سے آزاد تھی۔ یہاں سیاست سب سے منافع بخش پیشہ اور اقتدار کے حصول کا واحد مقصد ذاتی مفاد کا فروغ ہوتا تھا۔ ملک یا عوام کی بات کھلی منافقت تھی جس کا مظاہرہ جلسے جلوسوں میں اور ٹی وی پروگرام یا پریس کانفرنس میں بڑی بے شرمی سے ہوتا تھا۔

کیا ایسی سیاست میرا مقصد تھی؟ میں نے سوچا۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ میں تو کسی قسم کی سیاست سے بھی لاتعلق رہنا چاہتا تھا لیکن اب یہ مشکل بلکہ میرے لیے ناممکن بنادیا گیا تھا۔ دریا پار اترنا ہے تو پانی میں اترنا ہی ہوگا۔ پانی گندا ہو یا صاف، تیرنا آتا ہے یا نہیں، یہ مت سوچو، ورنہ کنارے پر کھڑے رہو۔ لہریں گنتے رہو۔

اچانک میرے ذہن میں ایک نیا خیال آیا۔ کیا میرے دوست سمجھے جانے والے ایماندار اور فرض شناس ڈی آئی جی صاحب بھی اس سازش میں شریک ہوئے یا استعمال ہوئے؟ یہ کیسے ممکن تھا کہ انہی کے علاقے میں کارروائی ہو اور انہیں ہوا تک نہ لگنے دی جائے۔ چوبیس گھنٹے سے زیادہ ہوگئے۔ انہوں نے مجھ سے رابطہ نہیں کیا۔ ان سے رابطے کی میری ہر کوشش ناکام رہی۔ شاید اعلیٰ سطحی اجلاس کے لیے وہ اسلام آباد گئے ہوں۔ ممکن ہے انہیں حیدرآباد بھی جانا پڑا

ہو لیکن اس کے بعد؟ یہ شرمندگی کا احساس ہے یا کچھ اور کہ انہوں نے مجھے کچھ بتانا ضروری نہیں سمجھا۔ اتنے بڑے افسر کو کسی کے سامنے وضاحت پیش کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔

صبح میرے سو کر اٹھنے سے پہلے ہی ڈی آئی جی عبداللہ جان میرے ذہن میں موجود تمام شکوک دور کرنے اور تمام سوالوں کے جواب دینے کے لیے اس طرح آموجود ہوا جیسے کسی ٹیلی پیتھی کے عمل سے گزشتہ شب میرے دماغ میں پیدا ہونے والے خیالات کی لہریں اس کے دماغ نے موصول کرلی ہوں۔

سحر خیز راجا ہی اتفاق سے سویا ہوا تھا چنانچہ مجھے عبداللہ جان کے آنے کی اطلاع بدحواس ریشم نے اپنی گوراشاہی انگلش میں دی۔ ''سر ہی کم۔ ڈی آئی جی۔ غنی سٹ ہم ان ڈرائنگ روم۔ ہی سے۔''

اچانک جگائے جانے کے بعد ذہن کو بیدار اور مستعد ہونے میں چند سیکنڈ لگتے ہی ہیں۔ اوپر سے ریشمی انگلش کی یلغار۔ پھر بھی بات میری سمجھ میں آگئی۔ ریشم پر جھنجلانے کے بجائے میں نے واش روم کا رخ کرتے ہوئے اسے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔ ''تم چلو! میں آتا ہوں۔''

کم سے کم وقت میں منہ پر پانی کے چھینٹے مار کے اور لباس بدل کے میں نے مہمان خانے کا رخ کیا۔ عبداللہ جان کھڑا ہوا تو میں نے ہاتھ ملا کے کہا۔ ''سر! ایسے مجھے شرمندہ نہ کریں۔ ایک تو آپ عمر میں مجھ سے بڑے پھر مہمان اور اتنے بڑے افسر۔''

وہ مصافحہ کرکے بیٹھ گیا۔ ''آئی ایم سوری۔ آپ کو نیند سے ڈسٹرب کیا۔''

''بالکل نہیں۔ میں عموماً اس سے پہلے ہی اٹھ جاتا ہوں۔ پہلے بتائیے آپ ناشتا کریں گے میرے ساتھ یا چائے لیں گے؟''

وہ بولا۔ ''ہم سرکاری ملازمت پیشہ لوگ ناشتا بہت جلدی کرلیتے ہیں۔ میں اس وقت دفتر میں حاضری لگا کے آیا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''کمال ہے۔ ٹھیک وقت پر پہنچو تو اب ماتحت بھی گوارا نہیں کرتے۔ خیر فرمائیے صبح دم کیسے زحمت کی۔''

وہ کچھ توقف کے بعد بولا۔ ''نواب صاحب! آپ کے ذہن میں یقیناً بہت سے سوالات ہوں گے۔ ممکن ہے مجھ سے جواب لینے کی کوشش بھی کی ہو آپ نے۔ میں نے ہمیشہ کوشش کی تھی کہ آپ کے ساتھ جہاں تک ممکن ہو... اپنے تعلق کو رسمی یا آفیشل نہ رکھوں۔''

میں نے کہا۔ ''لیکن ایسا ہمیشہ ممکن نہیں ہوتا۔ میں آ[illegible] کی مجبوری کے عذر کو سمجھتا ہوں۔''

''اس وقت بھی میرا یہ وزٹ اور میری گفتگو آفیشل نہ سمجھی جائے۔ یہ سب آف دی ریکارڈ ہے۔''

میں نے کہا۔ ''آپ کو وضاحت دینے کی کیا ضرورت ہے ڈی آئی جی صاحب۔''

''ضرورت میں خود محسوس کرتا ہوں۔ اس لیے کہ میں اپنے بارے میں آپ کی رائے کو اہمیت دیتا ہوں۔ مجھے اندازہ ہے کہ شامی بادشاہ کے مارے جانے کا آپ کو کو صدمہ ہوگا۔ وہ آپ کا دوست تھا۔''

''آپ مجھ پر الزام تو نہیں لگا رہے ہیں؟''

''میں کسی کے منہ پر تعریف کرتا نہیں۔ لیکن کہنا پڑتا ہے کہ آپ میں کوئی بات تھی۔ جس نے ایک طرف مجھے متاثر کیا تو دوسری طرف ایک ڈاکو پر ایسا اثر ڈالا کہ وہ آپ کے کہنے سے اپنی زندگی کا انداز بدلنے پر راضی ہوگیا۔ جرائم کی زندگی سے تائب ہوکے شریف اور قانون کا احترام کرنے والے انسان کی زندگی اختیار کرنے کا فیصلہ اس نے آپ کے کہنے پر کیا۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''دیکھیے۔ آپ خوامخواہ اور اللہ کا درجہ دے رہے ہیں۔ نیت اور خواہش اس کی اپنی تھی توفیق دینے والا خدا ہے۔''

''بہرحال۔ آپ نے جو سوچا تھا اور شامی نے جو چاہا تھا۔ وہ نہیں ہوا۔ آپ کی جگہ میں ہوتا تو یہ صدمہ میرے لیے بھی بہت بڑا ہوتا۔ آپ یقیناً مجھے بھی اس کا ذمے دار سمجھ رہے ہوں گے۔''

''آپ سے مجھے ڈبل گیم کی توقع نہیں تھی۔ خصوصاً اس لیے کہ آپ نے بھی ایک ذمے داری قبول کی تھی۔ مجھے یقین دلایا تھا کہ ناکامی کی صورت میں آپ اپنا استعفا میرے حوالے کردیں گے۔''

اس نے پہلو بدلا۔ ''استعفا ابھی لکھا جاسکتا ہے لیکن ایسا نہ ہو بعد میں آپ کو حقائق کا علم ہو تو آپ کو احساس ہو کہ آپ نے میرے ساتھ اور میری فیملی کے ساتھ بڑا ظلم کیا۔ پھر اس کی تلافی ممکن نہیں ہوگی۔''

''میں آپ کی بات سن رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

وہ بولا۔ ''یقین کرنا نہ کرنا آپ کی مرضی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے اس تمام کارروائی سے بے خبر رکھا گیا۔ حالانکہ یہ علاقہ آپ کے زیر انتظام تھا۔''

''سیاسی اور سرکاری سطح پر یہ بہت چھوٹی سازش تھی۔ بدقسمتی سے ہماری تاریخ ایسی سازشوں کے ذکر سے بھری پڑی ہے۔ حقائق کا چہرہ انتہائی مکروہ ہے جن سے عوام کو بے خبر رکھا گیا۔ آج بھی رکھا جاتا ہے۔ سرکاری اعلان آپ نے بھی دیکھا۔ میں نے بھی۔ اس پر تبصرہ لاحاصل ہے۔ سچ نہ میں بول سکتا ہوں' نہ آپ کو بولنا چاہیے۔''

میں نے کہا۔ ''پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

''میں نے پہلے بھی کہا تھا۔ آپ کے سامنے دو راستے ہیں۔ یا وہ راستہ چھوڑ دیں جس پر آپ چل رہے ہیں۔ دولت مندوں کی طرح عیش کریں۔ یہاں یا دنیا کے کسی بھی ملک میں رہیں۔ آپ کے لیے کوئی سرحد نہیں۔ انسان کا گورا کالا ہونا خرابی پیدا کرتا ہے۔ دھن نہ کالا ہوتا ہے نہ سفید۔ آپ بین الاقوامی شہری اور وی آئی پی بن سکتے ہیں۔''

''اور میں ایسا نہ چاہوں تو پھر؟''

''پھر یہ راستہ ٹھیک ہے جس پر آپ نے جس سفر کا آغاز کیا ہے۔ سیاست کا راستہ۔ لیکن پھر آپ اچھے اخلاقی نظریات اور اصولوں پر سمجھوتا کرنے کے لیے ہر وقت تیار رہیں۔ اپنے ضمیر صاحب کو مفادات کی گولی دے کر سلا دیں' زیادہ بہتر ہوگا کہ ریوالور کی گولی سے ختم کردیں۔'' وہ ہنسا۔

میں نے کہا۔ ''مشورے کا بہت شکریہ۔ چائے پی لیجیے۔''

اس نے چائے کا ایک گھونٹ لیا اور بولا۔ ''میں جا رہا ہوں۔''

''کہاں؟'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ''آپ کی پروموشن ہوگئی ہے؟''

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''حالانکہ مجھے بالکل اس کی توقع نہیں تھی۔''

''میری طرف سے دلی مبارکباد۔ آپ اس کے مستحق تھے۔''

وہ تلخی سے مسکرایا۔ ''اسی لیے مجھے توقع نہیں تھی۔ پہلے بھی میں نے دیکھا ہے جو مستحق تھے وہ محروم رہے۔ کبھی کبھی ..... فیصلے کرنے والوں سے بھی غلطی ہوجاتی ہے۔''

''اب آپ لاہور چلے جائیں گے؟''

''ظاہر ہے۔ میری سروس کے صرف دو سال رہ گئے تھے۔ میں چاہتا ہوں عزت سے ریٹائر ہوجاؤں۔''

میں نے کہا۔ ''آپ کو کچھ اندازہ ہے' آپ کی جگہ کون لے گا' یا یہ فیصلہ آپ کریں گے۔''

''میں آپ کو دھوکے میں رکھنا نہیں چاہتا۔ آپ کے حریف پورا سیاسی دباؤ ڈال رہے ہیں کہ بندہ ان کی مرضی کا آئے۔ میں کچھ نہیں کرسکتا سوائے پوسٹنگ آرڈر جاری کرنے کے۔ آپ محتاط ہوجائیں۔ اب تک آپ نے اناڑی ہونے کا ثبوت نہیں دیا۔ میں امید کرسکتا ہوں کہ سیاست میں آپ آسانی سے مار نہیں کھائیں گے۔ اب میں چلتا ہوں۔''

میں اس کے ساتھ باہر تک گیا۔ ''ایک آخری سوال۔ کیا یہ ہوسکتا ہے کہ شامی کی لاش میرے حوالے کردی جائے' اس کی تدفین کے لیے؟''

عبداللہ جان نے نفی میں سر ہلایا۔ ''آپ اس کے وارث نہیں بنتے۔ اگر اس کا کوئی ہوتا۔ بہن' بھائی یا بیوی ہی ہوتی۔ کیا نام تھا اس کا؟''

میں نے کہا۔ ''گولی۔ کیا وہ بھی ماردی گئی؟''

''نہیں۔ وہ بچ کے نکل گئی۔'' عبداللہ جان نے بڑے یقین سے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

میں نے اس کی گاڑی کو گیٹ سے نکلتے دیکھا۔ پولیس کے محکمے کا سربراہ ہونے کے باوجود وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کا یقین کتنا بے بنیاد ہے۔ جس عورت کے بارے میں اس کے نچلے درجے کے ماتحتوں نے کہا تھا کہ وہ بچ کر نکل گئی انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ شامی بادشاہ کی بیوی کو کتنی گولیاں لگی تھیں۔ اسے کیسے غائب کیا گیا تھا اور کہاں رکھا گیا تھا۔ اگر اسے بتایا جاتا کہ وہ اسی حویلی کے تہ خانے میں موجود ہے جس کے مہمان خانے کی میز پر بیٹھ کے وہ چائے پی رہا ہے تو وہ کتنا حیران ہوتا اور کتنی بے عزتی محسوس کرتا۔

بلاشبہ ایک خدائے مطلق ہے جو آسمان پر رہ کے زمین پر انسانوں کے ظاہر و باطن کو بھی ...... دیکھنے کی قدرت رکھتا ہے۔ انسان کی نظر کیا اور عقل کیا اور اس کی سربراہی اور آگہی کے دعوے کیا!

اس وقت تک حویلی میں سب ہی جاگ چکے تھے۔ سب کو ڈی آئی جی صاحب کی تشریف آوری کا علم ہوگیا تھا۔ راجا نے مہمان خانے سے دور رہ کے اپنی ناراضی کا اظہار کیا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ عبداللہ جان کی پروموشن ہوگئی ہے لیکن اس کی آمد کا مقصد اطلاع دینا نہیں تھا۔ وہ بتانے آیا تھا کہ اس کو شامی بادشاہ کے مارے جانے کی سازش سے بے خبر رکھا گیا تھا اور کوئی وجہ نہیں کہ اس کی وضاحت قبول نہ کی جائے۔ اسے تو یہ بھی علم نہیں تھا کہ گولی کو پولیس نے زخمی حالت میں پکڑ کے قید کرلیا تھا اور گزشتہ شب کچھ لوگ اسے قید سے نکال کر لے گئے ہیں۔ بیچارہ اپنے عالیشان کمرے میں مقید آئی جی' عدالت عالیہ کی کرسی پر بیٹھا ہوا جج' اقتدار کے اعلیٰ ترین ایوان میں قیام پذیر کوئی بھی وزیراعلیٰ یا وزیراعظم' گورنر یا صدر' جھوٹ کو کیسے پرکھے۔ سچ کو کیسے جانے۔ الہ دین .... کا چراغ کس کے پاس ہے؟

شہناز نے رات اسی کمرے میں گزاری تھی اور اب وہ اسپتال میں مریضوں سے نمٹ رہی تھی۔ لیلیٰ بھابی کے ساتھ رابعہ بھی معمول کے مطابق اپنے اسکول میں معروف تھی چنانچہ گولی کے پاس شہزاد کی خالہ کرسی ڈالے بیٹھی تھیں۔ گولی ہوش میں تھی اور جاگ رہی تھی۔ تیمارداری کرنے والوں نے اس کا لباس بھی بدل دیا تھا۔

میں دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''کیسی طبیعت ہے...... بھابی؟''

اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''دیکھ رہے ہو زندہ ہوں۔ مگر تم مجھے یہاں کیوں اٹھا لائے ہو نواب بھائی۔''

میں نے کہا۔ ''یہ میری ذمے داری تھی۔''

''میں کسی کی ذمے داری بننا نہیں چاہتی'' اس نے ناگواری سے کہا۔

''دیکھو۔ تم یہاں بالکل محفوظ ہو اور تم پر کوئی پابندی بھی نہیں ہے۔ جب تم ٹھیک ہو جاؤ گی تو جہاں چاہو چلی جانا۔ شامی میرا دوست تھا......''

وہ چلائی۔ ''تھا کیا مطلب......؟''

میں نے کہا۔ ''ہم پھر بات کریں گے۔ ابھی تم آرام کرو۔''

''ٹھہرو۔'' اس نے مجھے حکم دیا۔ ''میں سب کو بتا چکی ہوں۔ تم بھی سن لو۔ میں بیوہ نہیں ہوئی ہوں۔ وہ جو کہتے ہیں کہ شامی مارا گیا۔ بکواس کرتے ہیں کتے۔ تمہاری وہ ڈاکٹر شہناز، وہ سمجھتی ہے کہ میرے دماغ پر صدمے کا اثر ہے۔ وہ مجھے سکون کے انجکشن لگا کے بے ہوش رکھنا چاہتی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے انجکشن کی سرنج چھین کے توڑ دی۔ صبح سے میں تمہیں پوچھ رہی تھی۔ کہاں ہے وہ نواب جو اس کا دوست کہتا تھا خود کو۔''

میں پھر بیٹھ گیا۔ ''ہاں۔ ہم دوست تھے۔''

''پھر یہ سب کیسے ہوا؟'' وہ چیخ کے بولی۔ ''میں نے تو نہیں روکا تھا اسے مگر وہ اپنی ضد پر اڑا رہا کہ میرا نواب دوست انتظار کر رہا ہوگا۔ میں اسے کیسے مایوس کروں۔ اس کی پوزیشن خراب ہوگی سب کے سامنے۔ کتنا بھروسا تھا اسے تم پر۔'' اس کے لہجے میں نفرت اور حقارت آگئی۔

میں نے کہا۔ ''تم کیا سمجھتی ہو؟ میں نے دھوکا دیا اسے؟ وہ میری وجہ سے مارا گیا؟'' میں نے بہ مشکل اسے پانی کا گلاس تھما دیا۔

''اس نے پانی کا گلاس مجھ پر کھینچ مارا۔ میں نے جھکائی دے کر خود کو بچایا ورنہ گلاس میرے سر پر لگتا۔'' بکواس مت کرو۔ کون...... کہتا ہے کہ وہ مارا گیا۔''

شہزاد کی خالہ گھبرا گئی۔ ''بیٹی ذرا ہوش سے کام لو۔''

میں نے کہا۔ ''آپ جائیں خالہ۔''

گولی میرے اندازے کے مطابق شامی سے سال دو سال بڑی بھی تھی لیکن سخت کوش زندگی نے اس کے جسم پر چربی جمع نہیں ہونے دی تھی۔ اس کے چہرے کے نقوش میں سختی ضرور آگئی تھی لیکن اس کے چہرے کی نسوانی دلکشی برقرار تھی۔ کل سے اب تک اس نے سنبھل کے بات کی تھی لیکن غصے میں اس کے منہ سے بے اختیار ایک فحش مردانہ گالی نکل گئی تھی۔ شہزاد کی خالہ نے میرے سامنے لوگوں کو بڑی عزت واحترام سے بات کرتے دیکھا تھا۔ وہ خود بھی پرانی وضع کی سادہ مزاج عورت تھیں۔ میری اجازت پاتے ہی وہ فرار ہو گئیں۔

گولی اب اپنا چہرہ دونو ہاتھوں میں چھپائے رو رہی تھی۔ میں نے بہتر سمجھا کہ اس کے دل کا غبار نکل جانے دوں۔ کچھ دیر بعد میں پانی کا دوسرا گلاس بھر کے لایا اور نرمی سے کہا۔ ''لو۔ یہ پانی پیو اور پھر مجھے بتاؤ۔ شامی کے ساتھ کیا ہوا؟''

اس نے پانی لے لیا اور دو گھونٹ پی کے ایک گہری سانس لی۔ ''میں نے تمہیں گالی دی نواب بھائی۔''

میں نے کہا۔ ''وہ کوئی بات نہیں۔ یہ بتاؤ میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ شامی کے ساتھ دھوکا کرنے کا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''مجھے معلوم ہے۔ یہ یقین نہ ہوتا تو کیا میں تمہارے ساتھ یہاں آتی لیکن خدا کے لیے ایسا مت کہو کہ وہ مارا گیا۔''

''کیا اس کا مطلب ہے۔ وہ زندہ ہے؟ مجھے پوری بات بتاؤ۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔''

''اسے زندہ ہونا چاہیے۔'' وہ دیوار کو گھورتے ہوئے بولی۔ ''جب ہم ست بدھائی والے راستے پر تھے تو گھوڑے پر میں اس کے ساتھ تھی۔ اس نے کہا کہ ''گولی! ڈاکو کا بھی کوئی یار ہوتا ہے؟ جو ایسا کہتا ہے جھوٹ کہتا ہے۔ مکاری کرتا ہے۔ لیکن میرا دوست ایک نواب ہے۔ سچا اور کھرا۔''

میں نے پوچھا کہ اس پر اتنا اعتبار کیوں؟'' وہ بولا کہ تجھے کیوں اعتبار ہے مجھ پر۔ آدمی کی ایک پہچان ہوتی ہے۔ جیسے سنار خالص سونے کو پہچانتا ہے۔ ایسے ہی میں بھی اپنے تجربے سے انسان کو پہچان سکتا ہوں۔ وہ نواب خالص انسان ہے۔ دیکھ اگر مجھے کچھ ہو جائے تو۔'' میں نے کہا کہ ایسی بات کیوں کرتے ہو۔ بس اسی وقت گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی۔ اس کے سارے ساتھی اِدھر اُدھر آگے پیچھے گھوڑوں پر تھے۔ اس

نے کہا تھا کہ ایک ساتھ جلوس بنا کے مت چلو۔ میں نے دو کو گرتے دیکھا۔'' اس نے رک کر اپنے آنسو پونچھے۔

میں نے کہا۔ ''فائرنگ کرنے والے کون تھے؟''

میرا سوال احمقانہ تھا اس نے پانی کا پورا گلاس خالی کر کے مجھے دیا۔ ''پولیس مین اور کون۔ وہ درختوں پر چڑھے بیٹھے تھے۔ تمہیں بھی معلوم نہیں ہوگا۔ انہوں نے حویلی کی طرف آنے والے تمام راستوں کو بند کر دیا تھا۔ ہر درخت پر آدمی بٹھا دیے تھے۔ وہ گھنے پتوں میں چھپے ہوئے تھے اور دم سادھے بیٹھے تھے۔ ہمارے دو ساتھی پہلے جھلے۔ میں نے ہی دیکھے۔ میں نے ان کو اور گھوڑوں کو زمین پر ٹانگیں رگڑتے دیکھا۔ شامی نے چلا کے کہا۔ ''بھاگو، اور خود اپنے گھوڑے کو ایک دم موڑ لیا۔ اس وقت پھر فائر ہوا۔ گولی میرے کندھے پر لگی۔'' اس نے شانے کی طرف دیکھا۔

''اس وقت تک شامی محفوظ تھا؟''

''میں نے چیخ ماری تو اس نے پیچھے دیکھا اور پوچھا۔ کہاں لگی ہے گولی؟ میں نے بتایا کہ کندھے پر تو اس نے کہا خیر ہے۔ میرے پیٹ میں لگی ہے اور گھوڑے کو دائیں بائیں موڑ کے جنگل سے نکلنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر مجھے دوسری گولی لگی۔ کلائی سے ذرا اوپر۔ اس کے بعد گھوڑا گرا۔ شامی نے میرا ہاتھ پکڑا اور اپنے ساتھ کھینچا۔ اس نے کہا کہ ہمت کر گولی۔ ہم نکل جائیں گے لیکن میری ہمت جواب دے گئی۔ مجھے چکر آ گیا اور میں گر گئی۔''

خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا۔ پھر میں نے پوچھا۔ ''اور شامی؟ وہ اس وقت تک زندہ تھا؟''

''ہاں نواب بھائی میں نے گرنے سے پہلے اسے قسم دلائی۔ اسے ایک ہی گولی لگی تھی۔ اس نے زخم پر میرا دوپٹا کس کے باندھ لیا تھا۔ اس نے کہا کہ گولی۔ موقع ملے تو نواب دوست کے پاس چلی جانا۔ اس کے بعد میری آنکھ کھلی تو میں وہاں تھی' جہاں سے تم نے مجھے نکالا۔''

میں نے گولی کا حوصلہ بڑھانے کے لیے کہا۔ ''شامی ضرور نکل گیا ہوگا۔''

میں اس سے کیا کہتا کہ پولیس کے دعوے کیا ہیں۔ وہ مارے جانے والے تمام ڈاکوؤں کی لاشوں کو ٹی وی پر دکھا رہی ہے ان کی تصادیر پریس کو جاری کر دی گئی ہیں۔

پھر اچانک مجھے ایک اور خیال آیا۔ کیا پولیس کا دعویٰ غلط نہیں ہو سکتا؟ انہوں نے جھوٹ کے تانے بانے پر ایک کہانی کی بنیاد رکھی تھی۔ سازش کے ماسٹر مائنڈ نے کسی بہت بڑے انعام کے لالچ میں' جو نقد، ترقی یا زمین کی صورت میں ہو سکتا تھا۔ اپنے نام نہاد آقاؤں... کے سامنے بڑے پُرغرور یقین کے ساتھ دعویٰ کیا ہوگا کہ آج شامی بادشاہ کی زندگی کا آخری سورج طلوع ہو چکا ہے جسے غروب ہوتے وہ نہیں دیکھے گا۔

لیکن ایسا دعویٰ کوئی انسان کرے تو پھر اس قادرِ مطلق کی ذات پر حرف آتا ہے (نعوذ باللہ) جس کے اختیار اور شمار میں اپنی ہر مخلوق کی آتی جاتی سانس کا شمار ہے۔ جو کسی دوسرے فانی انسان کے علم میں نہیں۔

کیا پتا گولی کا یقین ہی صحیح ہو۔ مارنے والے سے بچانے والے کا ہاتھ ہمیشہ زبردست ہوتا ہے۔ اگر شامی کسی دستِ غیب کی پناہ میں نکل گیا ہوگا تو اسے زندگی کے آخری دن کے سورج کو غروب ہوتا دیکھنے کی اجازت نہ دینے والا کس منہ سے اعتراف کرے گا کہ اس کا دعویٰ غلط تھا؟

پولیس آپریشن کو کامیاب قرار دینا ان کے لیے ضروری تھا جو طے کر چکے تھے کہ شامی کے گروہ کو شرافت کی زندگی کی طرف لوٹنے کی مہلت نہ دیں گے۔ نواب رفیق احمد شیرازی آف ست بدھائی کو چیف منسٹر کے سامنے سرخرو نہ ہونے دیں گے۔ وہ اپنی ناکامی کا اعتراف کیسے کر سکتے تھے۔

ایسا پہلے بھی ہوا۔ پولیس نے کسی اشتہاری مجرم کو گرفتار کرنے یا ہلاک کرنے کا دعویٰ کیا جو بعد میں جھوٹ ثابت ہوا۔ پولیس کے ریکارڈ میں شامی اور اس کے گروہ کے سب ارکان کی تصویریں ضرور ہوں گی لیکن پریس یا پبلک کے ارکان انہیں نہیں پہچان سکتے تھے۔ جب ان کی لاشیں دکھائی گئی ہوں گی تو تصدیق کرنے والی خود پولیس ہوگی۔ ان کے دعوے کو چیلنج کون کر سکتا تھا کہ یہ شامی نہیں ہے۔ یا یہ اس کے ساتھی نہیں ہیں۔

شامی کے گروہ کے بیشتر یا سب ارکان مارے گئے ہوں گے۔ ان کے جسم اور چہرے خاک وخون سے آلودہ ہوں گے۔ موت کے کرب سے ان کی صورتوں کو مزید مسخ کر دیا گیا ہوگا۔ پولیس کے ریکارڈ پر ان کی تصویریں بہت پہلے کی ہوں گی۔ ان میں سو فیصد مشابہت تلاش کرنا صرف انہی کے لیے ممکن تھا جو اس خونیں ڈرامے کو ڈائریکٹ کر رہے تھے۔

شاید یہ ایک آرزو تھی اور آرزو بھی ایسی فریب زد

بہر حال ایسا نہیں تھا۔ میں چاہتا تھا ایسا ہو جائے چنانچہ میں امکانات تلاش کر رہا تھا۔ کاش ایسا ہو جائے کہ گولی کی زبان سے نکلی ہوئی بات درست ثابت ہو جائے۔ تو لاشیں ان کی ہوں جو شامی کے ساتھی تھے۔ دسویں اس کی نہ ہو جو خود

شامی تھا۔ ایک فیصد ہی سہی۔ کوئی امید تو ہو کہ شامی واقعی نکل گیا تھا۔ کسی روز اچانک وہ نمودار ہو۔ ہاتھ پھیلا کے قہقہہ لگائے اور کہے۔ نواب دوست۔ لو میں آ گیا۔

گولی نے میرے خیالات کا طلسم توڑ دیا۔ ''تم نے بہت خطرہ مول لیا نواب بھائی مجھے یہاں لا کے۔''

''بھائی بھی کہتی ہو اور ایسی غیریت کی باتیں بھی کرتی ہو۔'' میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ''شامی جب بھی آئے گا۔ یہیں آئے گا۔ تم بے خوفی سے یہاں رہو۔ اس نے بھی تم کو یہی تاکید کی تھی۔''

دن کا باقی حصہ میں نے اخبار دیکھتے اور ٹی وی پر اس خصوصی پریس کانفرنس کی ریکارڈنگ دیکھتے گزار دیا جس میں کیمروں نے ہر لاش کے چہرے کا کلوز اپ دکھایا تھا۔ وہ دس لاشیں ایک قطار میں رکھی ہوئی تھیں۔ ان کا سارا اسلحہ ایک میز پر سجایا گیا تھا۔ کچھ پولیس افسر اور جوان جنہوں نے اس کارِ خیر میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا، اپنے کارنامے کو پریس کے سامنے فخر سے پیش کرنے کی اداکاری میں مصروف تھے۔

بظاہر شک و شبہے کی کوئی بات نہ تھی۔ میں شامی کے گروہ کے لوگوں کو پہچانتا تھا۔ وہ بار بار میرے مہمان رہے تھے۔ کئی بار میں ان کے ڈیرے پر گیا تھا۔ مجھے اپنے ساتھ لے جانے والے اپنے ہی خون میں غلطاں فرشِ خاک پر تصویرِ عبرت بنے پڑے تھے۔

شامی کو میں نے بھی بہت غور سے دیکھا۔ راجا نے بھی۔ شک مجھے بھی ہوا راجا کو بھی۔ یہ چہرہ ملتا جلتا ہے مگر شامی کا نہیں ہے۔ ہم نے ایک دوسرے سے کہا۔ غور سے دیکھ۔ ہمارے یقین کا پنڈولم ہاں اور نہیں کے درمیان ڈولتا رہا۔ وہ ایک مسخ شدہ چہرہ تھا۔ شاید اسے زیادہ مسخ اس لیے کیا گیا تھا کہ ناقابلِ شناخت بنا دیا جائے۔ اس کے باوجود مشابہت محسوس ہوتی تھی۔

میرا دل دکھ کے بوجھ سے ٹوٹ رہا تھا۔ ''راجا۔ صحیح تصدیق تو فنگر پرنٹس سے ہوگی۔ وہ پولیس کے پاس ہیں۔''

''کل تک پوسٹ مارٹم رپورٹیں جاری ہو جائیں گی لیکن ہم اسے چیلنج نہیں کر سکتے۔''

''کیا خیال ہے؟ گولی سے تصدیق کر لیں؟''

''کوئی فائدہ نہیں۔ اس کی آنکھوں پر جذبات کی پٹی بندھی ہے۔ وہ میرے یقین کے ساتھ پولیس کے دعوے کو بھی مسترد کر دے گی۔''

''کیا یہ معلوم ہو سکتا ہے راجا کہ ان سب لاشوں کو کہاں دفن کیا جائے گا؟''

''ہاں۔ لیکن اس کا فائدہ؟ کیا تو ایک مٹی کے ڈھیر سے مطمئن ہو جائے گا کہ اس کے نیچے تیرا دوست ہے۔ ایصالِ ثواب کے لیے فاتحہ تو ہم یہاں بھی پڑھ سکتے ہیں۔ قرآن خوانی یہاں بھی کی جا سکتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''جو اس آپریشن کے اصل کردار تھے۔ ان کا پتا تو آسانی سے چلایا جا سکتا ہے۔''

''ہاں! لیکن اس سے بھی کیا ہوگا۔ اس میں سو پچاس مسلح پولیس والے ہوں گے اور درجن بھر نچلے درجے کے افسران جو صرف تعمیل کرتے ہیں۔ ہاں وہ جس نے اس سازش کو کامیاب کرنے کی ذمے داری قبول کی۔ وہ ایک ہی ہوگا۔ افسرِ خاص۔ اسے ہی انعام ملے گا۔''

''اس کا پتا بہرحال چلایا جا سکتا ہے۔''

''کیا فائدہ۔ زندگی کوئی خوفناک انتقام والی فل آف ایکشن فلم نہیں ہو سکتی۔ جیسے بساط پر مہرے پٹتے جاتے ہیں مگر بازی اس وقت تک جاری رہتی ہے جب تک شاہ کو مات نہ ہو۔ ایسے ہی سیاست کا کھیل چلتا ہے۔ اقتدار کی بازی سے کبھی ایک باہر تو کبھی دوسرا۔''

شامی کے مارے جانے کا یقین سب ہی کو تھا۔ سوائے گولی کے۔ اس کا اعتماد غیر متزلزل تھا۔ یہ صرف اس کا خیال تھا جس نے مجھے اپنے دوست کا سوگ منانے سے روکا۔ جس نے دوسروں کو سوگواری کے اظہار سے روکا اور اس کی مغفرت کے لیے قرآن خوانی کا اہتمام کرنے سے باز رکھا۔ لیکن پھر حویلی میں غم یوں آیا جیسے آندھی کے ساتھ اندھیرا آتا ہے۔

شام کے وقت مجھے ایک فون موصول ہوا۔ فون کرنے والے نے بتایا کہ وہ سعودی عرب سے آج ہی جہلم پہنچا ہے اور اس کے پاس میرے لیے ایک لیٹر ہے جو اسے ایئرپورٹ پر روانگی سے قبل دیا گیا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ''یہ خط کس کی طرف سے ہے؟''

اس نے جواب دیا۔ ''لفافے پر بھیجنے والے نے اپنا نام نہیں لکھا ہے۔ مجھے یہ خط ایک دوست نے دیا تھا جو مجھے سی آف کرنے آئے تھے۔ انہیں بھی خط کسی دوست نے دیا تھا لیکن ان کو میں نہیں جانتا۔ اس پر آپ کا نام پتا ہے۔ میں خود حاضر ہوتا لیکن ایک تو مجھے لانے والا کوئی نہیں ہے دوسرے میں خود ضعیف و علیل ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''آپ زحمت نہ کریں۔ میں حاضر ہو جاتا ہوں۔''

لیکن میں نے غنی سے تذکرہ کیا تو اس نے مجھے روک

دیا۔ ''... یہ خط میں بھی لا سکتا ہوں۔''

اس کی بات درست تھی۔ میں نے اسے پتا سمجھا دیا اور وہ تقریباً دو گھنٹے بعد واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک براؤن لفافہ تھا۔ اس پر اپنا نام پتا دیکھتے ہی میں نے اباجی کی تحریر کو بھی پہچان لیا اور یہ بھی جان لیا کہ خط میں کیا ہوگا۔ اسے کچھ بھی کہا جا سکتا ہے۔ میری چھٹی حس، ٹیلی پیتھی، وجدان، لفافہ کھول کے خط پڑھنے سے قبل ہی مجھے اندازہ نہیں بلکہ پورا یقین تھا کہ اس میں خیریت کی اطلاع نہیں ہو سکتی۔

میں نے اپنے دل کو مضبوط کیا۔ اس وقت میرے سامنے راجا کے ساتھ شہناز تھی پھر رابعہ آ کے میرے سامنے بیٹھ گئی۔ ''کس کا خط ہے؟'' اس نے یہ سوال اپنے فطری تجسس کے باعث کیا تھا۔

میں نے کہا۔ ''اباجی کا۔''

میرے الفاظ پر سب چونکے۔ ''اباجی نے خط لکھا ہے۔'' راجا بولا۔

میں نے لفافہ کھولا تو اندر سے اباجی کے مخصوص اندازِ تحریر برآمد ہوئی۔ سفید کاغذ، برابر حاشیہ، سیدھی سطور، متناسب حروف، انہوں نے لکھا تھا۔

''فرزند عزیز! اللہ تمہیں اور تمہارے ساتھ سب کو خوش و خرم اور صحت مند رکھے۔

جس وقت یہ سطور تمہاری نظر سے گزریں گی میرا وجودِ خاکی اس عالمِ فانی سے اٹھ چکا ہوگا۔ مجھے قطعی طور پر اندازہ کرنا محال ہے لیکن محسوس یہ ہوتا ہے کہ اب وقتِ رخصت قریب ہے چنانچہ میں دستیاب فرصت کو غنیمت شمار کرتے ہوئے تم سے مخاطب ہوں۔

سب سے پہلے تو میں اپنی غلط بیانی پر تم سے معافی کا طلبگار ہوں۔ ایسا کرنے کی میری ایک مصلحت اور مجبوری تھی جس کا ذکر میں آگے کروں گا۔ یہاں میری سفری دستاویزات گم نہیں ہوئی تھیں۔ اس عذر پر میں نے یہاں اپنے قیام کو طول دیا۔ اس جھوٹ کے پیچھے میری اپنی ایک خواہش پوشیدہ تھی کہ کسی طرح تمہاری والدہ مرحومہ کی طرح مجھے بھی دیارِ حبیب میں تاابد قیام کی سعادت حاصل ہو جائے اور میری مٹی مدینے کی مٹی ہو جائے۔

شاید ابھی تم میرے جذبات کی نوعیت اور شدت کو نہ سمجھ پاؤ۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تمہاری ماں نے ساتھ چھوڑا تو دکھ اپنی جگہ۔ مجھے ایسا لگا جیسے میں معذور تھا اور مجھ سے بیساکھی چھین لی گئی ہے۔ مجھے قطعی اندازہ نہ تھا کہ میں اس عورت کے سہارے کا کتنا محتاج تھا۔ میں عادات کی بات نہیں کر رہا ہوں کہ وہ میری ضروریات کا خیال رکھتی تھی۔ وقت پر میری پسند کے مطابق کھانا چائے دینے سے قمیص میں بٹن ٹانکنے تک۔ نہیں۔ یہ کام میں خود بھی کر لیتا تھا اور دوسرے بھی کر دیتے تھے۔ مگر اس کا ایک جذباتی سہارا میرے لیے بڑا مضبوط تھا۔ جو اس کے سوا کوئی اور فراہم نہیں کر سکتا تھا۔ ایک بات عموماً کہی جاتی ہے کہ میاں بیوی ایک گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ الگ الگ تو نظر آتے ہیں مگر ساتھ چلتے ہیں۔ اور یہ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں عملی طور پر ایک پہیے کی گاڑی رہ گیا ہوں جو چل نہیں سکتی۔

دوسری مشکل مجھے اس وقت پیش آئی جب یہاں سے میری وطن واپسی کا وقت آیا۔ ایک عجیب ذہنی الجھن میرے پاؤں کی زنجیر بن گئی کہ بیوی کو یہاں چھوڑ کے میں کیسے چلا جاؤں پھر ایک رات مجھے رشک نے مغلوب کیا کہ وہ بازی لے گئی۔ خود جگہ لے لی جنت البقیع میں۔ کیا اس کی طرح میں ذی شرف نہیں ہو سکتا؟ کیوں نہیں ہو سکتا۔

تم ضرور کہو گے کہ میرے دماغ پر تمہاری اماں کی موت کا اثر تھا۔ ہاں...... بالکل ایسا ہی تھا۔ میرا دماغ چل گیا تھا لیکن خراب نہیں ہوا تھا۔ خراب ہوتا تو مجھے یہ چالاکی کیسے سوجھتی کہ اپنی تمام شناختی اور سفری دستاویزات کو گم کر دوں اور اسے بہانہ بنا کے یہاں بیٹھا رہوں۔ اللہ مجھے معاف کرے۔ اور یہ حقیقت میں نے اپنے دوست سے بھی چھپائی...... اور تمہیں بھی شک نہیں ہونے دیا۔ جب میری علالت کا سلسلہ شروع ہوا تو میرے دماغ میں ایک اور عجیب خیال آیا کہ خدا نے میری سن لی ہے اور اب شاید وہی ہو جائے گا جس کے لیے میں کوشش کر رہا ہوں۔

میں نے یہ خط لکھ کے اپنے دوست کے پاس رکھوا دیا ہے کہ اگر مجھے کچھ ہو جائے تو یہ تمہیں ارسال کر دیا جائے ورنہ جاتے وقت میں واپس لے لوں گا۔ وہ حیران ہوئے اور ہنسے بھی کہ ان شاء اللہ بہت جلد اپنا وصیت نامہ تم خود اپنے ہاتھوں سے پھاڑو گے۔

مجھے تم سے زیادہ کچھ نہیں کہنا۔ تمہاری سوچ پر مجھے فخر ہے۔ تمہارے اندازِ زندگی پر مجھے رشک آتا ہے۔ تمہارے کردار سے مجھے خوشی ملتی ہے۔ اپنی خوش نصیبی کا شمار کرو اور سوچو کہ کیا خدا کا شکر ادا کرنا بندے کے بس کی بات ہے۔ آج تمہارے پاس سب کچھ ہے۔ اس سے اچھی بات یہ ہے کہ تمہیں اس پر غرور نہیں اور مزید کی ہوس نہیں۔ تم سمجھتے ہو کہ یہ سب یہیں رہ جاتا ہے اور انسان کے ساتھ اس کی نیکیاں ہی جاتی ہیں۔ اللہ نے تمہیں نیک ارادے، مواقع اور اچھے رفیق

وشیر بھی دیے ہیں چنانچہ مجھے میرا یقین ہے کہ تم اپنے مقاصد میں کامیاب رہو گے۔ عزت دینے والا وہی ہے۔ جب تم دوسروں کے لیے کرو گے تو وہ تمہارے لیے کرے گا۔

ایک خلش میرے دل میں ہے۔ اخلاقی شرعی اور قانونی طور پر تمہارا ست بدھائی کا مالک و وارث ہونا کسی طور غلط نہیں۔ اگر یہ معاملہ شرع کے قانون وراثت کے مطابق طے پاتا تو وارث ہم دو ہوتے۔ میں اور تمہارے مرحوم چچا لیکن ایک وارث نے اپنی زندگی میں سب کچھ تمہیں دے دیا تو کچھ غلط نہیں کیا۔

اب نہ میں، نہ تمہارے چچا۔ میرے وارث تم اور چچا کی وارث رابعہ۔ میرا بھائی ایک احساسِ محرومی لے کر دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس کا مجھے ہمیشہ قلق رہا۔ اگر رابعہ اور تم ایک ہو جاتے تو یہ خلش مٹ جاتی لیکن قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔ اگر تم چاہو تو اب بھی کچھ کر سکتے ہو۔ بے شک رابعہ کو تم اپنی ذمے داری جانتے اور مانتے ہو۔ رابعہ بھی صابر و قانع نظر آتی ہے لیکن تم کیا جانو اس کے دل میں کبھی یہ خیال آتا ہو کہ میرا باپ ایک وارث ہوتا تو آدھی ریاست میری ہوتی۔

میرے بعد یہ تمہارے سوچنے کی بات ہے۔ فریال کے لیے میں کچھ نہیں کہوں گا۔ ہر شخص اپنی زندگی کے فیصلے میں خود مختار ہے۔ لیکن نور جہاں کے لیے میرے دل میں ایک نرم گوشہ ہے۔ اس کی فطرت میں اچھائی تھی جو حالات کی برائی میں دب گئی۔ شیطان کے مقابلے میں انسان کمزور ہے۔ آج وہ صراطِ مستقیم کی طرف دیکھتی ہے تو میری نظر میں وہ گناہ گار ہوں گے جو اسے دھتکاریں گے......"

اباجی نے اور بہت کچھ لکھا تھا۔ ان کے پاس فرصت تھی اور وہ دل کی ہر بات مجھ سے کہنا چاہتے تھے۔ انہوں نے راجا سے ریشم تک سب کی تعریف کی تھی اور ہمارے ترقیاتی منصوبے کی کامیابی کے لیے دعا بھی کی تھی۔ یہ کہا تھا کہ ہم نہیں ہوئے تو کیا۔ عالم ارواح میں ہمیں خوشی ضرور ملے گی۔

بات صرف میرے چہرے کے تاثرات تک محدود نہیں تھی۔ خط کے آغاز ہی میں میری آنکھوں سے سیلِ اشک رواں کر دیا تھا۔ چہ خط پڑھنے کے بعد مجھے کسی سے کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ جو وہاں موجود تھے جان گئے تھے کہ آج میرے ساتھ وہ سب بھی یتیم ہو گئے ہیں۔

اباجی نے سختی سے تاکید کی تھی کہ صبر اختیار کیا جائے اور سعودی عرب کا اندازِ زندگی کی مثال دی تھی کہ وہ عملاً زندگی کو اللہ کے اختیار میں مانتے ہیں اور تسلیم کرتے ہیں کہ موت کا ایک دن متعین ہے پھر رونا دھونا کیسا۔ اللہ کی رضا ہے تو اسے خوشدلی سے قبول کرنا چاہیے۔ چیخ پکار کا مطلب تو احتجاج ہوا اور اللہ کی رضا پر ناراضی کا اظہار تو گناہ ہے۔

یہ خبر چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ ایک مرتبہ پھر تعزیت کرنے والوں نے حویلی پر یلغار کی۔ ان میں اپنے پرائے سب ہی تھے۔ غالب نے کہا تھا۔

ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحہ غم ہی سہی۔ نغمہ شادی نہ سہی

تو عملاً ہمارے معاشرے میں شادی اور موت دونوں پر نمود و نمائش اسراف اور دھوم دھڑکے والی تقریبات کو خاندان اور معاشرے میں شان اور عزت کی بنیاد بنا لیا گیا ہے۔ میں نے اپنی اماں کے لیے بھی ابا کی ہدایات کے مطابق سادگی اختیار کی تھی اور شرع کے مطابق سوگ کو تین دن سے آگے جاری بھی نہ رکھا تھا۔ اب پھر وہی ہوا۔ لوگوں نے بہت باتیں بنائیں کہ میں نے ماں باپ کے سوئم چہلم پر دیگیں نہیں چڑھائیں تو گویا پیسا بچایا۔ میرے عقائد پر بھی جاہل لوگوں نے تبصرے کیے مگر میں نے پروا نہیں کی۔ مجھے یقین تھا کہ بالآخر انسان کی نیکیاں غالب رہتی ہیں۔ اس کا کردار اور اعمال اسے عزت دلاتے ہیں۔ جہالت یا عناد پر مبنی برائیوں کا تاثر عارضی ثابت ہوتا ہے۔ قرآن خوانی اور دعائے مغفرت کا سلسلہ حویلی میں صبح و شام چلتا رہا۔

اس دوران مجھے نصیر الدین شیدائی کا فون بھی موصول ہوا اس نے کہا کہ چیف منسٹر صاحب مجھ سے اظہارِ تعزیت کریں گے۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ عبداللہ جان کا فون لاہور سے آیا جو اب آئی جی ہو گئے تھے۔ حیرت مجھے وزیر صاحب کے فون پر ہوئی۔ بے شک یہ ہماری معاشرتی قدروں میں شامل ہے کہ ہم خوشی میں چاہے شریک نہ ہوں غم میں دشمن سے بھی ہمدردی کے دو بول ضرور بول لیتے ہیں۔ حیرانی کی بات یہ تھی کہ فون کرنے والے سیاسی لوگ تھے اور بالواسطہ طور پر میری سیاسی اہمیت کو تسلیم کر رہے تھے۔ ورنہ ان میں سے کسی کے ساتھ بھی میرے ذاتی تعلقات نہیں تھے۔ فون کرنے والوں میں کچھ نام بھی اجنبی تھے۔ راجا نے مجھے بتایا کہ وہ پارٹی کے عہدے دار تھے۔

دوسری رات ہم سب کھانے سے فارغ ہو کے ایک ساتھ بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ رابعہ نے وہ بات کہہ دی جو میرے اور شاید سب کے دل میں تھی۔

"انہوں نے تعزیت نہیں کی نا۔ نہ فریال نے نہ نور جہاں نے۔"

شہناز بولی۔ "حالانکہ انہیں خود آنا چاہیے تھا۔"

لیلیٰ بھابی نے بات آگے بڑھائی۔ "کتنے مہربان تھے اباجی مرحوم ان دونوں پر۔ اپنا ہاتھ ان کے سر پر ہمیشہ رکھا۔"

میں نے کہا۔ "چلو چھوڑو۔ ہو گی ان کی کوئی مجبوری۔"

رابعہ نے چیخ کے کہا۔ "ہاں۔ ایک کو شوٹنگ سے فرصت نہیں ہو گی۔ ہر اشتہار میں جلوہ دکھا رہی ہے۔ دونوں ہاتھوں سے پیسا سمیٹ رہی ہے۔"

راجا نے کہا۔ "یار یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ انہیں پتا ہی نہ ہو۔"

شہناز نے کہا۔ "کیوں؟ تم بتا رہے تھے اخبار میں خبر تھی۔"

راجا نے کہا۔ "ہر شخص ہر اخبار کی ہر خبر نہیں پڑھتا۔"

شہناز بولی۔ "تم بلاوجہ اس کی حمایت نہ کرو۔"

رابعہ نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "دوسری کی تو بات ہی کرنا فضول ہے۔"

میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "رابعہ۔ اسٹاپ دس۔" اور غصے میں باہر نکل گیا مگر مجھے معلوم تھا اس کا اثر الٹا ہو گا۔ خصوصاً رابعہ پر لیکن اگلی صبح کے واقعات نے راجا کا اور میرا موقف درست ثابت کر دیا۔

وہ تیسرا دن تھا۔ زندگی کے معمولات پہلے کی طرح شروع ہو گئے تھے۔ شہناز اپنی اسسٹنٹ ریشم کے ساتھ اسپتال میں تھی۔ رابعہ اور لیلیٰ بھابی اسکول میں تھیں اور ہم شہزاد سے قانونی مسائل ڈسکس کر رہے تھے۔ دو دن بعد رانا کی ضمانت کی منظوری کے خلاف ہائی کورٹ میں ہماری اپیل کی ساعت تھی اچانک غنی نمودار ہوا۔ "سر پولیس کے ایک ایس پی آئے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "تعزیت کے لیے؟"

"نہیں سر۔ وہ لاہور سے آئے ہیں۔ ان کے ساتھ فریال بی بی ہیں۔"

یہ کھلبلی مچانے والی اطلاع تھی۔ شہزاد نے ایک دم اپنے کاغذات سمیٹے۔ راجا نے کہا۔ "میں دیکھتا ہوں۔" اور باہر نکل گیا۔

چند منٹ بعد میں نے مہمان خانے میں قدم رکھا تو ایک صوفے پر فریال کو گم صم بیٹھا دیکھا۔ اس کے دائیں بائیں دو پولیس والے تھے۔ فریال کے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔ خود ایس پی صاحب ایک الگ صوفے پر تشریف فرما تھے۔

مجھے دیکھتے ہی فریال اٹھی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے پہلے ہی رواں تھے۔ اب اس نے ہچکیوں سے رونا شروع کیا۔ میں نے اس کا سر اپنے کندھے سے لگا کے اسے تسلی دی۔ "فریال۔ اللہ کی رضا کو قبول کرو۔"

اگرچہ مجھے صورتِ حال کے بارے میں کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن ایس پی کے سامنے اپنی بے خبری اور لاعلمی کا مظاہرہ ضروری تھا۔ فریال اب بھی ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی اور اس کی حالت دیکھ کر میرا دل کٹ رہا تھا۔ غالب نے ہی کہا تھا۔

"رات کے وقت مے پیے ساتھ رقیب کو لیے۔ آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں۔"

فریال کی واپسی کی آرزو پہلے ہم سب کو تھی۔ میں نے اس کے لیے بھرپور کوشش بھی کی تھی۔ پھر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اس کے واپس آنے کی آس بھی ختم ہوتی گئی اور اب تو نہ کسی کو خواہش تھی اور نہ امید کہ وہ پھر پہلے کی طرح لوٹ کر ہمارے ساتھ رہنے لگے۔

آج وہ آ گئی تھی لیکن اس پر قتل کا الزام تھا اور اس کے دونوں ہاتھ قانون نے ہتھکڑی میں جکڑ رکھے تھے۔ کہاں وہ عزت کہ اسے حویلی کے حکمراں کے دل کی حکمرانی حاصل تھی اور کہاں یہ ذلت کہ وہ اپنی مرضی سے دو قدم چلنے کے لیے اور حویلی کے دوسرے کمرے تک جانے کے لیے آزاد نہ تھی۔

میں نے ایس پی کے ساتھ بیٹھے ہوئے اس کی وردی پر لگی ہوئی نام کی چھوٹی سی تختی پڑھ لی۔ "ایس پی فیاض صاحب۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ کیا سلسلہ ہے۔ فریال کو آپ نے کیوں گرفتار کیا ہے؟"

وہ چالیس سال سے اوپر کا قدرے فربہ بدن اور سیاہ رو شخص تھا جس کی صورت سے سفاکی اور عیاری ٹپکتی تھی۔ "آئی ایم سوری سر۔ میں نے ایسے وقت میں آپ کو زحمت دی جب آپ پہلے ہی ایک صدمے سے دوچار ہیں۔ مجھے پتا چلا کہ آپ کے والد کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔ پہلے ان کے لیے دعا۔"

رسمِ دنیا۔ عادت یا ضرورت کے تحت اس نے دونوں ہاتھ دعا کے انداز میں اٹھا دیے۔ بالکل میکانکی انداز میں ان دونوں نے بھی ہاتھ اٹھائے جو فریال کو اپنی تحویل میں لیے بیٹھے تھے۔ کچھ دیر لب ہلا کے انہوں نے علامتی طور پر ہاتھوں کو منہ پر پھیرا۔

میں نے کہا۔ "اللہ کی مرضی ایس پی صاحب۔ یہاں سے تو وہ حج کرنے گئے تھے۔"

"یہ سعادت بھی کسی کسی کو حاصل ہوتی ہے۔" وہ بولا۔ "میں ہرگز اس وقت تفتیش کے لیے نہ آتا مگر کیا کریں۔ ڈیوٹی از ڈیوٹی۔"

میں نے کہا۔ ”آف کورس۔ ادائے فرض کی راہ میں کوئی چیز حائل نہیں ہونی چاہیے۔“

”مس فریال پر الزام ہے کہ انہوں نے چوہدری سلطان کو قتل کرادیا یا کردیا۔ آپ جانتے ہیں نا گجرات کے چوہدری سلطان کو؟“

میں نے کہا۔ ”میں انکار بہرحال نہیں کرسکتا۔ لیکن قتل کرنا اور قتل کرانا، یہ دو الگ معاملات ہیں۔“

اس نے عیاری سے کہا۔ ”جب چالان پیش ہوگا تفتیش کے بعد تو ظاہر ہے ضابطہ فوجداری کی ایک ہی دفعہ لگے گی۔“

”دیکھیے۔ نہ میں وکیل ہوں اور نہ قانون جانتا ہوں۔“

راجا ایک دم اٹھا۔ ”میں شہزاد کو بلا لیتا ہوں۔“

میں نے اسے روک دیا۔ ”پہلے میں ایس پی صاحب سے اکیلے میں بات کرلوں۔“

راجا میرا مطلب سمجھ کے باہر چلا گیا تو میں نے کہا۔ ایس پی صاحب۔ آپ بہت دور سے آئے ہیں۔ تفتیش جس طرح چاہیں کریں۔ قانون سے تعاون کو میں اپنی ذمے داری سمجھتا ہوں لیکن حویلی کی کچھ روایات ہیں۔ آپ میرے مہمان بھی ہیں۔ بلاتکلف فرمایئے کہ آپ کیا لیں گے؟“

اس نے رسمی تکلف کا مظاہرہ کیا۔ ”نواب صاحب۔ ہم ڈیوٹی پر ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”کوئی آپ کو ڈیوٹی سے نہیں روکے گا۔ اگر آپ لوگوں نے کھانا نہیں کھایا ہے......“

اس نے کہا۔ ”تھینک یو سر۔ کھانا ہم نے راستے میں کھالیا تھا۔“

”ٹھیک ہے، پھر میں چائے کا کہتا ہوں۔“

ایس پی نے اپنی بات پھر شروع کی۔ ”آج دس دن سے چودھری سلطان لاپتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”ایک منٹ سر۔ میں ایک گزارش کروں؟“

”آپ حکم کریں سر۔“ وہ عیاری سے بولا۔

میں نے کہا۔ ”جب تک مس فریال یہاں ہیں۔ ان کے ہاتھوں کو آزاد کردیں۔ آپ کہیں تو میں دروازے پر مسلح محافظ تعینات کردوں۔ مجھے ان کو اس حال میں دیکھ کر بہت اذیت ہورہی ہے۔ یہ آپ کا احسان ہوگا مجھ پر۔“

”چلو جی۔ جیسی آپ کی مرضی۔“ اس نے بڑی شان سے سپاہیوں کی طرف دیکھ کے سر ہلایا۔ فریال کی ہتھکڑی کھول دی گئی۔

اسی وقت ایک ساتھ حویلی کے مکینوں نے یلغار کی۔ دروازے سے پہلے رابعہ اندر آئی، پھر شہناز، لیلیٰ بھابی اور ریشم آئیں۔ ان کے پیچھے شہزاد کی ماں اور خالہ، پھر راجا اور شہزاد۔ ایک دم کمرے کے اندر کا جذباتی ماحول بدل گیا۔ خواتین نے سب گلے شکوے اور پرانی باتیں بھلا کے باری باری فریال سے گلے ملنا اور رونا شروع کردیا۔ نہ کسی نے میری سنی نہ ایس پی کی۔ مہمان خانے میں اشکوں آہوں اور ہچکیوں کا طوفان آگیا۔ فریال کے ساتھ بیٹھے ہوئے پولیس مین بھی گھبرا کے دور ہٹ گئے۔

”ابھی چند منٹ میں سب ٹھیک ہوجائے گا۔“ میں نے معذرت خواہانہ انداز میں ایس پی سے کہا۔

ایس پی نے سر ہلایا۔ اس صورتِ حال کو وہ سختی سے کنٹرول کر ہی نہیں سکتا تھا۔ پانچ دس منٹ میں خواتین باری باری فریال کے گلے لگ کے رو چکیں اور شکوے شکایات کرچکیں تو میں نے کہا۔ ”چلو بھئی باقی بعد میں۔“

رابعہ نے آنسو پونچھ کے براہِ راست ایس پی کو مخاطب کیا۔ ”سر ہم اسے اندر لے جائیں۔ دوسرے کمرے میں؟“

ایس پی کے کچھ بولنے سے پہلے شہناز بولی۔ ”ہماری ذمے داری ہے۔ یہ کہیں نہیں جائے گی۔“

”مجھے پورا بھروسا ہے آپ پر، لیکن آئی ایم سوری۔ میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔ یہ بہت سیریس معاملہ ہے اور ہم تفتیش کرنے آئے ہیں۔“

”پھر ہم یہاں بیٹھ جائیں۔ فریال کے پاس؟“ رابعہ بولی۔

میں نے کہا۔ ”تم لوگ بات کو سمجھا کرو۔ تھوڑی دیر بعد آجانا۔“

اس وقت چائے آگئی اور ایس پی نے میری معلومات کے لیے کیس کے حقائق بیان کرنا... شروع کردیے جو مجھے پہلے ہی معلوم تھے۔ اب سوال جواب کی ذمے داری ہماری طرف سے شہزاد نے سنبھال لی۔

”نواب صاحب آپ کی چودھری سلطان سے دشمنی تھی؟“

”کس معاملے میں؟“ شہزاد بولا۔

”فریال کے معاملے میں وکیل صاحب۔“ ایس پی نے کہا

”آپ بہت پرانی بات کررہے ہیں اور اسے دشمنی کہنا بہرحال غلط ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ رقابت کہا جاسکتا ہے۔“

ایس پی نے کہا۔ زر، زمین اور زن۔ قتل کے اسباب سمجھے جاتے ہیں۔ اس میں رقابت صرف زن کے معاملے میں ہوتی ہے۔ یہ سب ہمیں خود مس فریال نے ... ہے کہ ایک زمانے میں چودھری صاحب بضد تھے فریال

شادی پر۔ کیونکہ ان کی منگنی کا اعلان بھی کر دیا گیا تھا' لیکن مس فریال چلی گئیں لندن جہاں نواب صاحب پہلے سے موجود تھے۔"

"ان تمام واقعات کو دہرانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے صرف یہ بتائیں کہ آپ نے مس فریال کی گرفتاری کس بنیاد پر کی ہے؟" شہزاد نے کہا۔

"شک کی بنیاد پر۔ یہ انہی کے ساتھ رہتی تھیں۔ چودھری صاحب نے ان کو ایک کوٹھی اور کار گفٹ کی تھی۔"

"کیا ایف آئی آر میں ان کا نام ہے؟" شہزاد نے پوچھا۔

"بالکل ہے۔ شک نواب صاحب پر بھی ظاہر کیا گیا ہے۔" ایس پی بولا۔

"کس نے لکھوائی ہے یہ ایف آئی آر اور کب؟"

"ایف آئی آر چودھری سلطان کے بہنوئی نے درج کرائی ہے۔" ایس پی نے کہا۔ "یا سالے نے؟ میں آپ کو دکھاتا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "رہنے دیں۔ سالا نہیں ہو سکتا۔ وہ ابھی تک امریکا میں تھا اور اس نے اپنی بہن کے قتل کی ایف آئی آر درج کرائی تھی۔ چو ی سلطان کے خلاف۔ وہ چودھری سلطان کی پہلی بیوی تھی۔ اس کے بعد بہت عرصے سے چودھری سلطان مفرور تھا۔"

شہزاد نے کہا۔ "وہ ایف آئی آر دیکھی ہے آپ نے تو مجھے بتائیے کہ کیا اس میں فریال پر براہِ راست قتل کا الزام عائد کیا گیا ہے یا کہا گیا ہے کہ وہ قتل کرنے میں یا کرانے میں معاون تھی؟"

ایس پی نے ناگواری سے کہا۔ "معاف کیجیے۔ کیا آپ ان کے وکیل ہیں؟"

"ابھی تک تو نہیں ہوں۔ لیکن وکیل بننے میں کیا دیر لگتی ہے۔ میں ابھی ان سے وکالت نامہ سائن کرا لیتا ہوں۔" شہزاد نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میں نے کہا۔ "بہتر ہوگا کہ ہم اپنی گفتگو کو انفارمل رکھیں۔"

"تفتیش انفارمل نہیں ہو سکتی نواب صاحب۔" ایس پی نے کہا۔

"ابھی تفتیش شروع کہاں ہوئی ہے۔" میں نے ماحول کو زیادہ خراب ہونے سے بچانے کی کوشش کی۔

ایس پی نے اپنا بریف کیس طلب کیا۔ "کاپی تو نہیں ہے میرے پاس۔ میں آپ کو اوریجنل ایف آئی آر دکھا سکتا ہوں۔"

جتنی دیر میں شہزاد نے ایف آئی آر کا مطالعہ کیا کمرے میں خاموشی رہی۔ فریال خود نہیں آئی تھی لائی گئی تھی چنانچہ احساسِ ذلت کے شدید ردِعمل میں مبتلا تھی۔ اس کے لیے ایک دم ابلنے والے ہمدردی کے جذبات میں بھی ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ پھر شاید راجا نے اشارہ کر دیا اور خواتین ایک ایک کر کے نکل گئیں۔ فریال نے خود کو اس ماحول میں مزید اجنبی اور ناپسندیدہ محسوس کیا ہوگا لیکن کل اور آج کے وقت کے فرق کو مٹایا نہیں جا سکتا تھا۔

شہزاد نے سر اٹھایا۔ "ایس پی صاحب۔ آپ نے یہ ایف آئی آر دیکھی نہیں۔"

"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟"

"اس لیے کہ ایف آئی آر میں بھی فریال کا نام نہ قتل کرنے والوں میں ہے نہ کرانے والوں میں۔ یہ لکھا ہے کہ وہ قتل کا ایک سبب تو ہو سکتی ہے۔ پر ہے نہیں۔ اسی طرح جیسے کوئی زمین کا ٹکڑا یا جائداد کسی مالک یا وارث کے قتل کا سبب ہو سکتی ہے۔ ایک عورت کی وجہ سے رقابت میں قتل ہو جاتا ہے۔"

ایس پی نے خفگی سے کہا۔ "یہ کیا دلائل شروع کر دیے آپ نے۔ یہ عدالت نہیں ہے وکیل صاحب۔"

"کل آپ کو عدالت میں زیادہ مشکل ہوگی۔ اس لیے بہتر ہے کہ آپ میری بات ابھی سن لیں۔ آپ رقابت کے جذبات میں قتل کے شبہے میں نواب رفیق سے پوچھ گچھ کر سکتے ہیں۔ فریال کا کوئی اور پرستار ہے تو اس سے یا کسی کاروباری حریف سے معلومات حاصل کر سکتے ہیں مگر فریال کو آپ نے کس بنیاد پر گرفتار کیا ہے؟"

"یہ آپ کورٹ میں چیلنج کریں۔"

"ہتھکڑی کیسے لگا دی ہے اسے آپ نے ایس پی صاحب؟" شہزاد گرم ہو گیا۔ "عدالت تو بعد میں پوچھے گی۔"

"پہلے آپ پوچھیں گے مجھ سے؟ آپ کون ہیں میرے افسر؟" ایس پی نے بگڑ کے کہا۔

"آپ افسر کی بات کرتے ہیں۔ میں ابھی آپ کی بات کراتا ہوں آئی جی عبداللہ جان سے۔" شہزاد نے فون نکالا۔

میں نے اسے روک دیا۔ "ان سے ہم بعد میں بات کریں گے۔ ایس پی صاحب۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ جو بھی ہو قانون کے مطابق ہو۔"

شہزاد نے کہا۔ "یہ ایف آئی آر درج کرائی گئی چودھری سلطان کے لاپتا ہونے کے ایک ہفتے بعد۔ صرف تین دن پہلے۔ کیوں؟ اس کے وارثوں کو اور لواحقین کو ایک ہفتہ کوئی تشویش نہیں ہوئی؟ عام طور پر کوئی غائب ہو جائے اور چوبیس گھنٹے اس کا سراغ نہ ملے تو لوگ گمشدگی کی رپورٹ لکھوانے کے لیے تھانے پہنچ جاتے ہیں۔"

"اس میں میری کیا غلطی ہے؟" ایس پی بولا۔

"آپ نے معلومات ان سے بھی حاصل کی ہوں گی۔ کس کس سے پوچھا آپ نے۔ انہوں نے چودھری سلطان کو کہاں کہاں تلاش کیا! کس کس سے معلوم کیا؟ کسی اخبار میں اشتہار دیا؟ کہیں تصویر شائع کرائی۔ ٹی وی پر اعلان جاری کیا؟" شہزاد نے قانون کی توپ کا رخ ایس پی کی طرف کر کے نان اسٹاپ گولے چلانے شروع کیے۔

"یہاں میں صرف نواب رفیق سے چند سوالات کرنے کے لیے آیا تھا۔" ایس پی نے محسوس کیا کہ ماتحتوں کے سامنے اس کی پوزیشن خراب ہوتی جا رہی ہے۔ "آپ مجھے اپنا کام کرنے دیں۔"

"آپ یہاں من مانی نہیں کر سکتے ایس پی صاحب۔" میں نے شہزاد کی حمایت میں کہا۔ "میں اگر آپ سے تعاون کر رہا ہوں تو اس کا غلط مطلب نہ لیں۔ میں مجبور نہیں ہوں۔ میں یہ بھی کر سکتا تھا کہ آپ کو حویلی میں داخل ہونے سے روک دیتا۔"

شہزاد سخت غصے میں تھا۔ "آخر کس بنیاد پر یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ چودھری سلطان کا قتل ہو گیا ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اسے کسی نے اغوا کر لیا ہو اور مجھے یہ بتائیے کہ تفتیش آپ کو نواب صاحب سے کرنا تھی۔ آپ فریال کو یہاں کیوں لائے؟ وہ بھی ہتھکڑی لگا کے۔ نواب صاحب آپ آئی جی سے بات کریں۔"

"آپ نہیں جانتے اس کیس میں وزارتِ داخلہ کے احکامات......"

اب راجا نے کہا۔ "وزارتِ داخلہ کے یا وزیر داخلہ کے؟ ایس پی صاحب مس فریال کوئی عام عورت نہیں۔ عوامی شخصیت ہیں۔ پبلک فگر۔ ان کے ساتھ کچھ بھی ہوگا اس کی تفصیل پریس میں آئے گی۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ آپ کے محترم وزیر داخلہ ہمارے چیف منسٹر کے پبلک امیج کو نقصان پہنچانے کے درپے ہیں۔ آپ کی تو کوئی حیثیت ہی نہیں۔ آپ حکم کے غلام ہیں۔ آپ زیادہ سے زیادہ معطل ہوں گے یا ٹرانسفر ہو جائیں گے۔ سیاسی شہرت تو چیف منسٹر کی خراب ہوگی۔ میرا خیال ہے مجھے نصیرالدین شیدائی کو مطلع کر دینا چاہیے۔"

"وہ کون ہے؟" ایس پی کچھ پریشان ہوا۔

"پوچھیں یہ کیا چیز ہے؟ یہ چیف منسٹر کے پی آر او ہیں۔ پبلک ریلیشن آفیسر۔ پرانے صحافی اور میرے پرانے دوست۔"

میں نے اپنا فون ایس پی کی طرف بڑھایا۔ "اپنے محکمے کے نئے سربراہ کا فون نمبر آپ کے پاس ضرور ہوگا۔ ان سے میری بات کرا دیں۔"

ایس پی کا حوصلہ جواب دے گیا۔ "سر۔ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ میں اور آپ چند منٹ اکیلے میں بات کر لیں۔"

"کیوں نہیں۔" میں نے کہا۔ "آیئے میرے ساتھ۔"

ہم برآمدے میں جا کھڑے ہوئے۔ ایس پی نے واضح الفاظ میں اعتراف کر لیا کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے وزیر داخلہ کے ایما پر ہو رہا ہے۔ اسی کے اشارے پر چودھری سلطان کے بہنوئی نے ایف آئی آر درج کرائی پھر رانا رجب علی نے کہا کہ چودھری سلطان کے اور میرے درمیان رقابت پرانی تھی لیکن اب اس کے دل میں کوئی عناد نہیں کیونکہ فریال اس کے پاس لوٹ آئی ہے اور ان کی شادی بہت جلد ہو رہی ہے۔ رانا نے کہا کہ وہ میرے ساتھ مل کے اس علاقے میں فرنیچر بنانے کا کارخانہ لگانا چاہتا تھا۔ گجرات کے فرنیچر کی مانگ ساری دنیا میں ہے اور ست بدھائی میں ٹاہلی (شیشم) کی لکڑی بہت اچھی پائی جاتی ہے۔ وہ مجھ سے بات کرنے کے لیے ست بدھائی آنا چاہتا تھا اور آخری ملاقات میں اس نے کہا تھا کہ وہ ایک دو روز میں آ جائے گا۔

"چنانچہ آپ نے فرض کر لیا کہ وہ یہاں آیا اور میں نے اسے مار کے کہیں گاڑ دیا۔"

"تفتیش ہمیشہ مفروضات پر آگے بڑھتی ہے سر۔"

"اب آپ کیا کریں گے؟"

ایس پی نے نفی میں سر ہلایا۔ "کچھ نہیں۔ آپ کا بیان لوں گا اور واپس چلا جاؤں گا۔ مس فریال کو ہم نے ابھی یہاں آنے سے پہلے ان کے گھر سے گرفتار کیا تھا۔ ابھی ان کی گرفتاری نہیں ڈالی ہے۔"

"لیکن ہتھکڑی لگا دی ہے۔" میں نے غصے سے کہا۔

"مجبوری تھی سر۔ وزیر داخلہ ایسا چاہتے تھے کہ ان کو یہاں اسی طرح لایا جائے۔"

میں نے کہا۔ "دیکھو ایس پی صاحب۔ میں نے چیف منسٹر سے بات کی تو تمہارا وزیر داخلہ صاف مکر جائے گا کہ اس نے تمہیں ایسا کوئی حکم جاری کیا تھا۔ پھنس جاؤ گے تم۔"

ایس پی سوچ میں پڑ گیا۔ "شاید آپ ٹھیک فرما رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "بہتر یہی ہوگا کہ تم فریال کو چھوڑ دو۔ وہ پھر پوچھے تو اس سے کہو کہ لکھ کر حکم دے۔ فریال کے وکیل نے

پریس کانفرنس میں اس لاقانونیت کے خلاف احتجاج کی دھمکی دی ہے۔"

"رائٹ سر۔ جیسا آپ کہیں گے ویسا ہی ہوگا۔"

اس کے بعد معاملات آسان ہو گئے۔ فریال جب آزاد ہو گئی تو اسے نقل و حرکت کی آزادی بھی مل گئی۔ جتنی دیر میں ایس پی نے میرا بیان لینے کی رسمی کارروائی کی فریال اندر رہی لیکن جیسا کہ مجھے بعد میں پتا چلا اندر اس کی زیادہ آؤ بھگت نہیں ہوئی اور سرد مہری کے اس رویّے سے مایوس ہو کے اس نے لنچ تک رکنے سے انکار کر دیا۔

فریال پولیس کی گاڑی میں ساتھ ہی آئی تھی۔ واپس وہ راجا کے ساتھ ست بدھائی کی گاڑی میں گئی۔ ایس پی کو ہم نے دوپہر کے کھانے تک روکا۔ اسے دوستانہ جذبات کے ساتھ "تحفے تحائف" دے کر رخصت کیا گیا۔ رانا کے ترکش کا ایک اور تیر رائگاں گیا۔

راجا کو شہزاد نے ساری اسٹریٹیجی سمجھا دی تھی۔ راجا کے ساتھ فریال سیدھی پریس کلب گئی۔ پریس کلب میں لنچ کا وقت تھا اور صحافیوں کی خاصی بڑی تعداد موجود تھی۔ ایک گھنٹے میں کچھ اور بھی پہنچ گئے تو فریال نے پریس کانفرنس میں اپنی گرفتاری پر سخت احتجاج کیا۔ اس نے کہا کہ پولیس نے اپنی حدود سے تجاوز کیا۔ یہ ساری کارروائی بلاجواز اور غیر قانونی تھی اور اس کا اعتراف ایس پی فیاض نے خود نواب رفیق، مشہور صحافی راجا اور بیرسٹر شہزاد کے سامنے کیا کہ انہیں یہ غیر قانونی احکامات اوپر سے موصول ہوئے تھے۔ فریال نے نام لیے بغیر کہا کہ ایک صوبائی وزیر مسلسل نواب رفیق کے خلاف سیاسی ریشہ دوانی میں مصروف ہیں اور چیف منسٹر کو اس کا نوٹس لینا چاہیے کیونکہ اس قسم کی حرکتوں سے حرف ان کی نیک نامی پر آتا ہے۔ میں خود چودھری سلطان کے لاپتا ہونے سے پریشان ہوں۔ میرے لیے وہ صرف ایک فلمساز ہی نہیں مستقبل کے شریکِ حیات بھی ہیں۔ ان کے بہنوئی پر دباؤ ڈال کے مجھے زبردستی اس سیاست میں گھسیٹا گیا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

راجا رات کو لوٹا تو اس نے مجھے یہ ساری تفصیل فراہم کی۔ یہ اتفاق کی بات ہی تھی۔ بدنیتی کی بنیاد پر میرے خلاف کوئی قدم اٹھانے والے کھسیانی بلی کی طرح کھمبا نوچ رہے تھے۔ جھنجلاہٹ میں سوچے سمجھے بغیر کی جانے والی یہ حرکت خود انہی کے حق میں خرابی کا سبب بنی۔ اگلی صبح فریال کی پریس کانفرنس اخبارات میں شائع ہو گئی۔

دو روز یوں گزرے کہ لگتا تھا زندگی کی رفتار میں سکوت کا عنصر غالب آنے لگا ہے۔ شاید پے در پے ناکامیوں نے حریفوں کے حوصلے پست کر دیے تھے یا انہیں کچھ عرصے کے لیے اپنی جارحانہ کارروائیوں کا سلسلہ روک کے دفاعی حکمتِ عملی اختیار کرنے پر مجبور کر لیا ہے پھر ایک روز راجا کو اندر کے ذرائع نے یہ خبر دی کہ چیف منسٹر نے اس صورتِ حال کا نوٹس لیتے ہوئے اپنی حلیف جماعت سے شکایت کی تھی۔ اس کے سربراہ سے رانا کو الگ بلا کے میرے ساتھ محتاط رویّہ اختیار کرنے کا مشورہ دیا تھا اور اپنے وزیرِ داخلہ سے پوچھا تھا کہ کیا وہ اپنے موجودہ محکمے سے مطمئن ہے؟ عقلمند کو اشارہ کافی ہوتا ہے۔ وزیرِ داخلہ کے دل میں چور تھا۔ اسے یہ سوال کھٹک گیا کہ شاید اس کی پارٹی کے سربراہ نے اِدھر اُدھر سے ملنے والی خبروں کے باعث یا چیف منسٹر کی شکایت پر اسے وزارتِ داخلہ کے بجائے کوئی اور قلمدان سونپنے کا اشارہ دیا ہے۔

حویلی کے اندر کے معمولات میں بھی ٹھہراؤ سا محسوس ہوتا تھا۔ غنی نے اپنی توجہ اسکول کی تعمیر پر زیادہ رکھی اور ایک شام رابعہ نے اس یقین کا اظہار کیا کہ اسی مہینے کے آخر تک اسکول پر چھت پڑ جائے گی۔ ابا جی کا صدمہ تازہ تھا۔ اکثر رات کو مجھے اپنے والدین سے محرومی کا احساس یہ یاد دلاتا تھا کہ میری ذمے داریاں بڑھ گئیں ہیں۔

وہ خط جس میں ابا جی نے رابعہ کے بارے میں لکھا تھا کہ مجھے جاگیر کا نصف حصہ اس کے حوالے کرنے پر سوچنا چاہیے میرے پاس تھا۔ اسے میں نے اپنے تک محدود رکھا ہوا تھا۔ ابا جی کا احساس ایک فطری بات تھی اور انہوں نے مجھے بھی بتا دیا تھا کہ وہ کیا سوچتے ہیں لیکن انہوں نے مجھے حکم نہیں دیا تھا۔ فیصلہ مجھ پر چھوڑ دیا تھا۔

میں نے کسی فوری اور جذباتی فیصلے سے گریز کیا۔ اس مسئلے کو مہاراجا سے بھی ڈسکس کرنا چاہتا تھا۔ رابعہ کی ذات پہلے بھی لیلیٰ بھابی کے سابق شوہر اور میرے سابق دوست اور قانونی مشیر کے لیے پُرکشش ہو گئی تھی کہ وہ میری جانشین ہو سکتی تھی۔ اگر میں نہ رہتا تو اس جاگیر اور حویلی کی ملکیت کا اور کوئی دعویدار بھی نہیں تھا۔ فاروقی نے مجھے راستے سے ہٹانے کی اور دوسرے مرحلے میں رابعہ کو قابو کرنے کی منصوبہ بندی کی تھی لیکن اس کا یہ مجرمانہ پلان صرف اس لیے ناکام ہو گیا کہ فاروقی نے ایک بہت بڑی بے وقوفی کی تھی۔ اس نے میرے خلاف اپنی بیوی کو استعمال کرنا چاہا تھا۔

تازہ ترین سازش رانا کی طرف سے ہوئی تھی۔ وہ رابعہ کے لیے اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر آ گیا تھا۔ مجھے حیرانی تھی کہ کوئی شخص اتنا بھی گر سکتا ہے۔ کس امید پر اس کے ذہن

میں ایسے احمقانہ خیال نے جنم لیا؟ کیا میں اتنا بے وقوف تھا کہ اس کی دو معزز خاندانوں کے ایک ہو جانے کی تجویز کو قبول کر لیتا۔ اس کی طرف سے ہونے والی تمام ذلت آمیز کارروائیوں کو بھول کے اس سے رشتے داری قائم کر لیتا؟ وہ یقیناً سٹھیا رہا تھا۔

رابعہ کا رشتہ شہزاد سے تقریباً طے تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اس کی رسمی منظوری ابا جی دیں۔ درمیان میں کسی کی شرانگیزی سے پیدا ہونے والی غلط فہمی نے مجھے ابا جی سے بات نہ کرنے دی۔ پھر ابا جی ہی نہ رہے۔ ظاہر ہے ابھی اس مسئلے پر بات کرنا بھی مناسب نہ ہوتا۔

ایک مسئلہ اور تھا جو بلاوجہ درمیان میں اٹکا ہوا تھا۔ جو کچھ شہزاد نے مجھے صاف صاف بتایا تھا، اس کے بعد میرے دل میں شک کے جالے کا وجود بھی نہیں رہا تھا لیکن نہ جانے کیوں رابعہ کا دل اس کی طرف سے صاف نہیں ہوا تھا۔ یقیناً شہزاد نے اس کو قائل کرنے کی بہت کوشش کی ہو گی۔ قسمیں کھائی ہوں گی۔ ہاتھ جوڑے ہوں گے اور ناک سے لکیریں نکالنے پر بھی آمادہ ہو گا لیکن رابعہ کی بدگمانی برقرار تھی۔ وہ شہزاد سے بات نہیں کر رہی تھی اور شہزاد بھی کیا کرتا۔ کب تک اپنی بے عزتی کراتا۔ وہ بھی لاتعلق نظر آتا تھا لیکن مجھے اندازہ تھا کہ اندر ہی اندر دونوں کی جذباتی کیفیت کیا ہو گی۔ اب وہ دونوں ہی مجھ سے توقع کرتے ہوں گے کہ میں ایک ثالث اور بزرگ کا یا دوست کا کردار ادا کرتے ہوئے انہیں سامنے بٹھا کے بچوں کی طرح سمجھاؤں۔ ڈانٹ ڈپٹ کروں یا حکم دوں مگر مجھے اس کا موقع نہیں مل رہا تھا۔

ہر رات سونے سے پہلے دن بھر کے واقعات میرے ذہن پر یلغار کرتے تھے یا پرانی یادیں، پرانی باتیں، لوگ جو بچھڑ گئے، آئے اور چلے گئے اور وہ کام جو رہ گئے اور وہ جو باقی ہیں۔ بہت کچھ تھوڑی دیر کے لیے میرے خیالات میں انتشار کا سبب بنتا تھا۔ کیونکہ ایسا تو ممکن ہی نہ تھا کہ میں تکیے پر سر رکھوں اور سو جاؤں۔ نیند کو مجھے منا کے آنکھوں تک لانا پڑتا تھا۔

آج پھر مجھے نورجہاں کی یاد آئی۔ ابا جی نے اپنے خط میں اس کا ذکر بھی خاص طور پر کیا تھا لیکن وہ نہ جانے کہاں گم تھی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ پھر آئے گی۔ کب؟ یہ اس نے نہیں بتایا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کہیں سے مجھے دیکھ رہی ہے۔ میرے حال سے باخبر ہے۔ اندھیرا ہوتے ہی اس کا ہیولا تاریکی سے جنم لیتا تھا۔ پھر اس کے قرب کی خوشبو جاگتی تھی۔ اس کی آواز کی، اس کی ہنسی کی لے پھوٹتی تھی۔ پھر میں سوجاتا تھا مگر وہ خواب میں کبھی نہیں آئی تھی۔

مگر آج مجھے اس کے قریب ہونے کا احساس اپنا واہمہ لگا۔ یہ خیال غلط تھا کہ وہ میرے حال سے باخبر ہے۔ ایسا ہوتا تو وہ مجھے فون ضرور کرتی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ ابا جی نے کس طرح اس کے سر پر ہاتھ رکھ کے اسے اپنی بیٹی بنا لیا تھا۔ کیا اسے ابھی تک پتا نہیں کہ وہ دستِ شفقت اٹھ چکا ہے؟

اگلی صبح لاہور ہائیکورٹ میں رانا کی درخواست ضمانت کے خلاف ہماری اپیل کی سماعت بھی متوقع تھی لیکن ماجد خان کو اندرونی ذرائع سے یہ اطلاع مل گئی کہ رانا کے وکیل نے تین دن کے التوا کی درخواست لگا دی ہے کیونکہ رانا کسی وفد کے ساتھ ملک سے باہر تھا۔

میں نے پوچھا۔ "کیا ایک ملزم جو عبوری ضمانت پر اجازت کے بغیر عدالت کے دائرہ اختیار سے باہر جا سکتا ہے؟"

وہ ہنسنے لگا۔ "آپ تو خیر سے خود وکیل ہیں۔"

میں نے کہا۔ "تھا تو نہیں۔ لیکن قانون سے کھیلتے اور قانون کو جھیلتے تھوڑا بہت بن رہا ہوں۔"

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس کے لیے یہ پروڈکشن آرڈر خود اسپیکر نے جاری کیا تھا اور اجازت غالباً اسی انڈر اسٹینڈنگ پر ملی ہے کہ وہ تین دن بعد حاضر ہو جائے گا۔"

شہزاد کو ہم نے پہلے ہی روانہ کر دیا تھا۔ فرصت کو غنیمت جانتے ہوئے میں نے رابعہ کو پکڑ لیا۔ "مجھے کچھ کہنا ہے تم سے۔"

"میں اسکول جا رہی تھی۔" وہ گھڑی دیکھ کے بولی۔

"دس منٹ دیر سے چلی جاؤ گی تو شاگرد تمہیں مرغا نہیں بنا دیں گے۔ میرا مطلب ہے مرغی۔"

اوکے۔ فرمائیے۔" وہ بیٹھ گئی۔

میں نے کہا۔ "آخر تمہاری اور شہزاد کی یہ کولڈ وار کب تک چلتی رہے گی۔ اب تو خاصی ٹھنڈ پڑ رہی ہے۔"

"یہ جانتے ہوئے بھی کزن کہ اس ذلیل آدمی نے کس طرح تمہیں مجھے اور پھر سب کی آنکھوں میں دھول جھونکی۔ جھوٹ بولا۔" وہ بگڑ گئی۔

"اس نے مجھے سب کچھ سچ بتا دیا ہے۔"

"یوں کہو کہ اس نے ایک جھوٹ پر دوسرے جھوٹ کا پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ آدمی کی بے شرمی کی بھی کوئی حد ہونی چاہیے۔"

"میرا خیال ہے کہ وہ جھوٹ نہیں تھا۔ جو اس نے کہا۔"

"تم تو کرو گے اس پر یقین۔ چور کا گواہ ڈاکو۔"

میں نے کہا۔ "میں تمہاری کسی بات کا برا نہیں مان

سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے خلاف سازش کی گئی تھی۔"

"یہ خوب ہے۔ سازش کے نظریے کو آپ نے اس کے حق میں دلیل بنالیا۔ حالانکہ سازش میرے خلاف کی تھی اس نے۔"

"دیکھو۔ وہ اپنی بے گناہی کا ہر ثبوت دے سکتا ہے۔ اس کی طرف سے میں ضمانت دیتا ہوں۔"

"آخر تم کیوں اس کی وکالت کرر ہے ہو کزن۔ تمہاری بہن میں ہوں۔ یہ دیکھو کہ میں کیا چاہتی ہوں۔"

"میں جانتا ہوں تم کیا چاہتی ہو۔ سب جانتے ہیں۔"

"غلط فہمی ہے سب کی۔ اب میں شہزاد کو نہیں چاہتی۔" وہ چلّا کے بولی۔

میں نے مذاق کیا۔ "پھر کسے چاہتی ہو؟"

"تم میری بات کو سیریس نہیں لے رہے ہو۔ پھر تم سے بات کرنے کا فائدہ۔" وہ جانے کے لیے کھڑی ہوگئی۔

"مائی ڈیر کزن۔ اتنا غصہ ٹھیک نہیں۔" میں نے اس کو پھر بٹھادیا۔ زندگی کے فیصلے جوش سے نہیں ہوش سے کیے جاتے ہیں۔ اباجی یہاں ہوتے تو اب تک تمہارے لیے شہزاد کے پیغام کی منظوری دے چکے ہوتے۔"

کوئی فرق نہ پڑتا اس سے۔ منگنی کوئی شرعی یا قانونی حیثیت نہیں رکھتی۔ میں اباجی کے سامنے بھی کہہ دیتی کہ یہ رشتہ ختم کردیں۔ ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ مجھے بروقت معلوم ہوگیا۔"

"تمہیں کچھ بھی معلوم نہیں۔ جلدی میں کوئی ایسا فیصلہ مت کرو جس پر تمہیں زندگی بھر پچھتانا پڑے۔"

"زندگی میں ایک بار نہیں دو بار میں نے جذبات کی رو میں بہ کر غلط فیصلے کیے۔ دماغ کے بجائے دل سے سوچا لیکن اب ایسا نہیں کروں گی کزن۔ میری طرف سے صاف انکار ہے۔ تم زبردستی نہیں کر سکتے۔"

میں نے مایوسی سے کہا۔ "زبردستی کون کرسکتا ہے؟"

"میں نے شہزاد سے کہہ دیا تھا۔ اس کے باوجود شہزاد نے تمہیں وکیل بنا کے بھیج دیا۔ اسے غلط فہمی ہوگی کہ تمہیں انکار نہیں کیا جاسکتا۔ انکار تو میں آخری وقت میں بھی کردیتی کہ مجھے قبول نہیں۔"

"مجھے پتا ہے تم کتنی بہادر ہو۔" میں نے تلخ لہجے میں طنز کیا۔

وہ جانے کے لیے اٹھی اور پھر رک گئی۔ "کیا یہ صحیح ہے...... کہ میرے لیے رانا رجب علی اپنے بیٹے زوہیب کا رشتہ مانگنے آئے تھے؟"

"ہاں۔"

"اور تم نے انکار کردیا؟"

میں نے کہا۔ "میرے بس میں ہوتا تو اسے جھٹا مار کے نکال دیتا۔ میں نے شرافت اور وضعداری میں اسے ٹال کے رخصت کردیا۔"

"مجھے یہ رشتہ منظور ہے۔"

ایک لمحے کے لیے مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ مجھے یوں لگا جیسے رابعہ مذاق کررہی ہے لیکن وہ سیریس تھی۔

"کیا کہا تم نے؟"

"وہی جو تم نے سنا۔ اب کہلوادو کہ تمہاری طرف سے کوئی اعتراض نہیں۔"

"تم پاگل تو نہیں ہوگئی ہو؟"

"کمال ہے۔ جب میں جذبات کے بجائے عقل سے فیصلہ کررہی ہوں تو تم مجھے پاگل کہہ رہے ہو۔" وہ ہنسی۔ "زوہیب پڑھا لکھا ہے۔ ہینڈسم ہے۔ رانا صاحب کا اکلوتا وارث ہے اور کیا چاہیے۔ تم دیکھنا اس پر کیسے الو کی لکڑی پھیرتی ہوں میں۔ ساری جائداد اپنے نام نہ لکھوالی تو رابعہ نام نہیں۔"

"اگر تم ایسا سوچ رہی ہو تو واقعی میں پاگل ہوگئی ہو کیونکہ اس کا الٹ بھی ہوسکتا ہے۔"

"الٹ ہونے میں میرا کیا نقصان ہے کزن؟ کون سا چھپن کروڑ کی چوتھائی ہے میرے پاس۔ یا کون سا خطرہ ہے کہ آدھی جاگیر نکل جائے گی جس کی میں مالک تھی۔" وہ قہقہہ مار کے ہنسی۔ دروازے کی طرف بڑھی اور باہر نکلنے سے پہلے رک کے پلٹی۔ "ڈونٹ ایور فارگیٹ نواب صاحب۔ میں عاقل و بالغ اور فیصلوں میں خودمختار ہوں۔ آفٹر آل اٹ از مائی لائف۔"

میں سخت صدمے کی کیفیت میں وہیں بیٹھا رہا۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ رابعہ مجھ سے اس لہجے میں بھی بات کرسکتی ہے۔ غصے میں انسان غلط بولتا ہے غلط فیصلے کرتا ہے۔ خودکشی سے قتل تک کچھ بھی کرسکتا ہے۔ لیکن مجھے صدمہ اسی بات کا تھا کہ رابعہ غصے میں نہیں تھی۔

بعض اوقات ایک تنکا کسی چٹان کو لڑھکا دیتا ہے۔ کوئی معمولی سا غیر اہم واقعہ زندگی کا رخ بدل دیتا ہے۔ فرخ نے رابعہ کو پہلا جذباتی صدمہ پہنچایا تھا اور یہ صدمہ اتنا شدید تھا کہ اس نے برداشت تو کرلیا تھا لیکن اس کی قوت برداشت ختم ہوگئی تھی۔ یا اس آخری کنارے پر تھی جس کے بعد کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ پہلے وہ تباہی کے غار میں نہیں گری تھی۔ آخری کنارے پر ہم نے اسے روک لیا تھا۔ اب شہزاد کے بارے میں اس اطلاع نے کہ وہ پہلے سے شادی شدہ اور ایک بچے

باپ ہے اس کا دماغ الٹ دیا۔ اس میں تصدیق تفتیش کے لیے حوصلہ اور صبر ہی نہیں تھا۔

یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ دیوانگی میں مطالبہ کررہی تھی کہ میں اس کے لیے زوہیب کا رشتہ منظور کرلوں' وہ اسے عین عقلمندی سمجھ رہی تھی۔ پہلے ایک نشہ آور دوا مقبول ہوئی تھی۔ ایل ایس ڈی۔ اسے کھا کے نوجوان خوشی اور خود اعتمادی کی اونچی ہوا میں اڑنے لگتے تھے۔ بہت سے بلند عمارات سے کود کے مرگئے۔ انہیں یقین تھا کہ وہ اڑ سکتے ہیں۔ ایسی ہی ذہنی کیفیت رابعہ کی تھی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ زوہیب کو بے وقوف بنا کے اس کے دل پر قبضہ کرلے گی اور ایسا جادو چلائے گی کہ وہ اپنی دولت جائداد سب اس کے نام کردے گا۔ بے عقل لڑکی۔ یہ نہیں جانتی کہ ایسے رئیس زادوں کے سینے میں دل ہوتا ہی نہیں۔ اس کے علاوہ۔ چھری خربوزے پر گرے یا خربوزہ چھری پر۔ نتیجہ وہی ایک رہتا ہے۔

اپنے پاگل پن میں وہ بات بھی رابعہ کی زبان پر آگئی تھی جو نہ جانے کب سے اس کے دل میں تھی۔ اس نے مجھے طعنہ دے دیا تھا کہ یہاں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ نہ اس کے پاس چھپن کروڑ کی چوتھائی ہے نہ جاگیر کہ کوئی ہتھیا لے۔ نواب میں ہوں۔ وہ صرف نواب کی بہن کہلاتی ہے۔ اس کھوکھلے اعزاز کے سوا اس کے پاس کچھ نہیں۔

اباجی نے اپنے آخری خط میں ایک خلش کا ذکر کیا تھا۔ یہ خلش رابعہ کے دل میں بھی تھی۔ اسے بھی حق تلفی کا احساس تھا اور زوہیب کے رشتہ جوڑنے کی خواہش کا اظہار ایک خواہش کی غمازی کرتا تھا کہ چلو یوں نہ سہی یوں سہی۔ رانا گڑھ کا وارث زوہیب ہوگا تو کیا اس کی بیوی بھی مالک نہیں ہوگی۔ بعد میں وہ دو کرے یا چار۔ پہلی ہی خاندانی رہتی ہے لیکن اس احمق لڑکی نے یہ نہیں سوچا تھا کہ ایسے بگڑے ہوئے رئیس زادے اگر چاہیں تو عورت کو پاؤں کی جوتی کی طرح اتار کے پھینک بھی دیتے ہیں۔ کسی دریا میں' کسی جنگ کے چھ فٹ گہرے گڑھے میں۔ رانا کے گھرانے میں تو انسانوں کو کتوں کے آگے ڈالنے یا کتوں کے ساتھ دفن کرنے کی روایت بھی تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ میں یہاں بیٹھا سوچتا رہا تو میرا دماغ خراب ہوجائے گا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میں نے اباجی کا آخری خط جو ایک طرح سے وصیت نامہ بھی تھا پوری طرح کوئی آگاہ نہیں اور ابھی تک کسی سے کچھ کہا بھی نہیں تھا۔ اگر میں ایسا کرتا تو آج اس دباؤ میں ہوتا کہ رابعہ کو نصف کا مالک بنادوں۔ بصورت دیگر مجھ پر ناخلف نافرمان ہونے کا الزام آتا۔

لیکن کیا رابعہ کی موجودہ ذہنی کیفیت میں یہ ممکن تھا؟ میری جگہ مرحوم اباجی ہوتے تو ایسی باتیں سن کے رابعہ کے منہ پر تھپڑ مارتے۔ ابھی تو اس کی موجودہ ذہنی کیفیت میں اسے یہ سمجھانا بھی ناممکن ہوتا کہ جو کچھ وہ سوچ رہی ہے وہ خودکشی کے مترادف ہے۔ کیونکہ خود زوہیب اور اس کا باپ یہی سوچ رہے ہیں۔ وہ انہیں شکار کرنا چاہتی ہے اور وہ رابعہ کے شکار کی منصوبہ بندی کررہے ہیں۔ شکار وہی ہوگا جو کمزور ہوگا۔

اس موقع پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا۔ جنگل میں کوئی شخص بندوق لیے پھر رہا تھا کہ اس پر شیر نے حملہ کیا۔ شیر اتنا قریب تھا کہ وہ شخص نشانہ ہی نہ لے سکا اور جھکائی دے کے بیٹھ گیا۔ شیر اس کے اوپر سے گزر گیا۔ شیر کے پلٹنے تک شکاری اٹھ کے بھاگا اور اس کی جان بچ گئی۔ اگلے دن سے اس نے جنگل میں جا کے قریب سے نشانہ لینے کی پریکٹس شروع کردی۔ ایک دن اسے شیر کی آواز سنائی دی تو اس نے پیڑ پر چڑھ کے دیکھا۔ شیر چھوٹی چھلانگ لگا کے شکار کو دبوچنے کی پریکٹس کررہا تھا۔

میں اسی ادھیڑبن میں تھا کہ راجا نمودار ہوا۔ اس نے میرے پاس بیٹھ کے ٹھنڈی سانس لی۔ "اداس مت ہو فیکے پتر۔ لندن میں ایک گورے نے مجھ سے کہا۔ چار نمبر بس اور تین نمبر محبوبہ کو کیا یاد کرنا۔ وہ تو نکل گئیں۔ اب پانچ نمبر بس اور چار نمبر محبوبہ آئے گی۔"

"میں کسی کو یاد نہیں کررہا تھا۔ نہ کسی کی راہ دیکھ رہا تھا۔"

"یہ بھی اس عمر میں ٹھیک نہیں۔ سواری کرو نہ کرو۔ آتی جاتی بسوں اور لڑکیوں کی طرف سے آنکھیں بند مت کرو۔ اتنی رہبانیت بھی اچھی نہیں۔"

میں نے کہا۔ "کیا اس وقت بکواس کرنے کے سوا تیرے پاس کوئی کام نہیں؟"

"نہیں۔ میں ابھی کوٹھی کے پاس تھا۔ اس نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں جاؤں اور معلوم کروں کہ ان سب کو کہاں دفن کیا گیا تھا جو کہ پولیس مقابلے میں مارے گئے تھے۔ تدفین کے عینی شاہد کون ہیں اور وہ کیا کہتے ہیں۔"

"اسے یقین نہیں کہ شامی مارا گیا ہے؟"

"وہ یقین کرنا نہیں چاہتی۔ میں اسے انکار بھی نہیں کرسکتا۔ میں جاؤں اور بڑی محنت سے پتا چلالوں کہ شامی کہاں دفن ہے اور پھر یہ بات اسے بتادوں تو وہ مجھے مارے گی۔ یہ اس کے دماغ کی خرابی ہے مگر وہ مانے تب۔"

میں نے کہا۔ "ایسے ہی نفسیاتی عارضے میں رابعہ مبتلا ہے۔"

''شہزاد بھی کہہ رہا تھا کہ وہ پاگل ہوگئی ہے۔ میں نے کہا کہ پاگل نہ ہوتی تو تم جیسے بھوت پر فریفتہ کیوں ہوتی۔''

میں نے کہا۔ ''یار اسے نمونہ کہہ کے تو نے مجھے دادی یاد دلا دی۔ اب کوئی بھی مجھے اس کی طرح نمونہ کہنے والا نہیں۔''

''کیا تیری اپنی کزن سے کوئی جھڑپ ہوئی ہے؟''

''وہ زوہیب سے شادی کرنا چاہتی ہے۔'' میں نے کہا اور راجا کو ساری بات بتادی۔

راجا سخت تشویش میں مبتلا ہوگیا۔ ''اب کیا ہوگا فیکے پتر فرض کرو وہ اڑ گئی۔ عاقل و بالغ تو ہے وہ۔''

میں نے برہمی سے کہا۔ ''عاقل و بالغ ہونے سے وہ سمجھتی ہے کہ میری مرضی کے بغیر کورٹ میں جا کے زوہیب سے شادی کرلے گی۔''

''یا بھاگ کے رانا نگر چلی جائے گی۔''

''میں واقعی اسے قتل کردوں گا۔ لیکن یہ نہیں ہونے دوں گا۔'' میں نے کہا۔

''غصے میں تو ایک روایتی نواب اور وڈیرے کی طرح سوچ رہا ہے۔ جب کوئی مسئلہ اعصاب پر سوار ہو اور اس کا حل سمجھ میں نہ آتا ہو تو سب سے بہتر یہ ہوتا ہے کہ اس کو بھلا دیا جائے۔ دماغ سے خارج کردیا جائے۔''

''جیسے آپریشن کر کے رسولی نکالتے ہیں؟''

''فیکے پتر۔ کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہوتا جس کا حل نہ ہو۔ کچھ تو حل ہو سکتے ہیں۔ کچھ وقت مانگتے ہیں۔ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ تو کہہ دے اس سے کہ بہنا جو تیری خوشی وہ میری خوشی۔''

''تو پاگل ہوگیا ہے؟''

''ساری دنیا کو پاگل مت سمجھ۔ پاگل بنا۔ وقت گزار۔ مہلت لے۔ فرض کر ہم مل کے ایک کھیل کھیلیں۔ میں، تو اور شہزاد۔''

''کیسا کھیل؟''

''ادھر اپنی کزن سے کہہ دے کہ دفع کرو شہزاد کو۔ زوہیب واقعی بہتر ہے۔ رانا صاحب کو بتادیں کہ ہم کاٹھ کے الو ہیں۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ ان کے چکر میں آگئے ہیں۔ ہمیں رشتہ منظور ہے۔''

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میرا دماغ خراب نہیں ہے کہ ایسے کھیل میں فریق بنوں۔''

راجا نے مجھے پکڑ لیا۔ ''یار بے وقوف بن کے بے وقوف بنانے میں جو مزہ ہے' اس کی بات ہی کچھ اور ہے۔ پھر دیکھتے ہیں رانا کیا کرتا ہے اور زوہیب کیا کرتا ہے۔ یہ کھیل کب تک چلتا ہے اور ہم کیسے اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ کیوں نہ رابعہ خود رانا کے ولی عہد کے منہ پر تھوک دے۔ ہمیں نہ کچھ کہنا پڑے نہ کرنا پڑے۔ ہم سب کے ساتھ تماشائے رسوائی دیکھتے رہیں۔ جیسے کوئی دیوانہ ہاکی سے کتے کو فل شاٹ مار کے کہے ''گول'' اور کتا بھوؤں بھوؤں کرتا بھاگے۔ تو لوگ ہنس ہنس کے دہرے ہو جاتے ہیں۔ رابعہ اگر پاگل ہے ہم رانا کو کتا بنادیں۔''

میں نے سر کھجا کے کہا۔ ''تو بڑی دور کی کوڑی لایا ہے۔ بات شاید ٹھیک ہے تیری لیکن ابھی میری سمجھ میں نہیں آسکتی۔''

''آجائے گی۔ آجائے گی۔ یہ جو اپنا سی ایس او ہے۔ مسٹر عبدالغنی۔ کل یہ بھی بڑی دور کی کوڑی لایا تھا۔ اس وقت میں شہباز کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے ایک اپیل تیار کر رہا تھا۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ میں بندے دا پتر واقعی بن چکا ہوں۔ تصدیق نامہ جاری کردہ نواب رفیق احمد شیرازی آف ست بدھائی، المعروف، فیکا پتر۔ منسلک ہے۔ چنانچہ اس حقیر فقیر خبیث و کمین کو حقیقی شوہر کی پوسٹ پر فائز کر کے خدمت کا موقع فراہم کیا جائے۔''

میں نے ہنس کے کہا۔ ''میری تصدیق سے کچھ نہیں ہوگا۔''

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ''میں بھی دل کو بہلا رہا تھا یار۔ غنی نے میرے سامنے ایک تجویز رکھی۔ اس نے کہا کہ یہ معاملہ آج نہیں تو کل پھر اٹھے گا۔ اس کی مراد چوہدری کی گمشدگی سے تھی۔ خدا کرے وہ مل جائے لیکن کہیں یہ نہ ہو کہ اسے مار کے ست بدھائی میں نہ گاڑ دیا گیا ہو۔ ہمیں چیک کرلینا چاہیے۔''

میں نے کہا۔ ''ایک کونے سے کھدائی شروع کریں۔ سارے ست بدھائی کو کھود ڈالیں۔''

''افسوس کی بات یہ ہے کہ میں نے بھی ایسا ہی کہا تھا۔ مگر وہ مجھ سے زیادہ ذہین ثابت ہوا۔ اس نے کہا کہ ایک جگہ سے میں نے زمین میں دفن کپڑے نکالے تھے۔ کتوں کے ساتھ ہم ایک سروے کریں۔ ایکسرے قسم کا۔ کہیں کچھ ہوگا تو کتے بُو سونگھ کے نشاندہی کردیں گے۔''

''یہ کوئی آسان کام ہے۔ کتوں کی مدد سے ایک ایک انچ زمین کو سونگھ کر دیکھنا اور پھر ایسے کتے کہاں ہیں۔''

''میں نے بھی یہی اعتراضات اٹھائے تھے۔ اس نے کہا کہ بے شک کام مشکل ہے لیکن ناممکن نہیں ہے۔ کتے وہ لائے گا۔''

''پھر اسے کہو کہ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔''

''وہ چاہتا تھا کہ ہم اس کے ساتھ آپریشن کی نگرانی کریں۔ بلکہ اسے شکایت تھی کہ ہم سیکیورٹی کے معاملات کو اتنی اہمیت نہیں دیتے۔ ہم نے ابھی تک اس دیوار کی تعمیر کی پروگریس نہیں دیکھی جو ست بدھائی کے گرد کھینچی جارہی ہے۔''

''اس کا گلہ جائز ہے۔''

کتے فوری طور پر دستیاب نہیں تھے۔ غنی نے بتایا کہ کچھ عرصہ اس نے پشاور میں اینٹی نارکوٹکس فورس کے ایک انسپکٹر کے ساتھ گزارا تھا۔ وہ اس کا ڈرائیور تھا۔ فورس کے پاس ایسے خصوصی اور تربیت یافتہ کتے تھے جو منشیات کی بو سونگھ سکتے تھے۔

میں نے کہا۔ ''کتوں کی ناک کے بارے میں حیرت انگیز کہانیاں مشہور ہیں مثلاً کتے آتش گیر مادے یعنی Explosives کا سراغ لگانے میں اور مفرور مجرموں کو کپڑے سونگھ کر تلاش کرلیتے ہیں لیکن یہ کتے بہت قیمتی ہوتے ہیں۔ تمہیں یا مجھے کون دے گا؟''

''مانگنے سے کوئی نہیں دے گا۔ ان کو کرائے پر نہیں چلایا جاتا اور ان کی حفاظت بھی بہت کی جاتی ہے۔ لیکن میں لے آؤں گا۔''

میں نے زیرِ تعمیر دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔ ''تم کیسے لے آؤ گے؟''

''چُرا کے سر۔'' اس نے سادگی سے کہا۔ ''دیکھیے یہاں سے دیوار غائب کردی گئی تھی۔ یہاں ست بدھائی اور رانا نگر کی سرحدیں ملتی ہیں۔ مقصد ہوگا ہماری زمین ہتھیانا۔ چار سو گز تک وہ اندر جاتے مگر میں نے کہا کہ پیچھے چھوڑو۔ پہلے اسے مکمل کرو۔''

''کتنی بلند ہوگی یہ دیوار؟''

''آٹھ فٹ۔ اوپر دو فٹ کی خاردار تاریں۔ ان میں کرنٹ۔ میں نے آپ کو بتایا تھا۔''

''ضرور بتایا ہوگا۔''

راجا نے کہا۔ ''تم ذکر کر رہے تھے چوری کا۔ کتوں کی چوری...... کیا واقعی یہ اتنا ہی آسان کام ہے؟''

غنی نے کہا۔ ''میرے لیے آسان بن گیا ہے۔ کتے مجھ سے ہلے ہوئے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''کیا کتے انسپکٹر کے گھر پر رہتے ہیں؟''

''جی سر۔ میں نے ملازمت کے دوران ایسا کیا کہ کتے بدل دیے۔ اصلی منشیات کا سراغ لگانے والے دو کتے اپنے گھر لے آیا اور بالکل ویسے ہی دو کتے ان کی جگہ رکھوا دیے۔''

میں بھونچکا رہ گیا۔ ''اس فرض شناس شخص نے ایسا کیوں کیا تھا غنی؟''

''منشیات اسمگل کرنے والوں کو تحفظ اور آسانی فراہم کرنے کے لیے سر۔ اسے ہر ماہ بڑی معقول رقم ملتی تھی پروٹیکشن کی۔ جو کتے اصل کی جگہ رکھے گئے ان کی ناک بے کار تھی۔ یہ کام وہ کر ہی نہیں سکتے تھے چنانچہ وہ کسی گاڑی یا ٹرک کے آس پاس چکر لگا کے اور سونگھ کے یا زیادہ سے زیادہ بھونک کے اسے چھوڑ دیتے تھے۔ معائنے کے بعد وہ ٹانگ اٹھا کے کسی بھی پہیے پر دھار مار کے سائن کردیتے تھے۔''

میں دل ہی دل میں انسپکٹر کی دانش مندی پر واہ واہ کرتا رہا اور پھر پوچھا۔ ''اس نے وہ کتے اپنے پاس کیوں رکھے۔ میرا مطلب ہے مار ڈالتا۔''

''نہیں سر۔'' غنی مسکرایا۔ ''وہ بے وقوف نہیں تھا۔ وہ اسمگلروں پر دباؤ رکھتا تھا کہ میرا حصہ پہنچاتے رہنا ورنہ کتے میرے پاس ہیں۔ میں کسی بھی دن نقل کی جگہ پھر اصل لے آؤں گا۔''

میں نے راجا کی طرف دیکھ کے اتفاق میں سر ہلایا۔ ''بے شک وہ آدمی عقلمند تھا، بلکہ ہے۔''

''میں نے دو سال اس کے ساتھ کام کیا۔ اب بھی جانا ہوتا ہے کبھی کبھی۔ کتے مجھے پہچانتے ہیں۔ دُم ہلاتے آجاتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے غنی۔ تم انہیں چُرا لاؤ۔ اللہ تمہارا حامی و ناصر ہو۔''

ہم رات ہونے سے پہلے لوٹے تو عجیب منظر دیکھا۔ ایک عورت ایک سوٹ کیس اور ایک بچے کے ساتھ گیٹ سے باہر بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھ کے وہ آگے آئی اور ہاتھ اٹھا کے مجھے سلام کیا۔

گارڈ نے کہا۔ ''سر! یہ آپ سے ملنے کے لیے بیٹھی ہے۔''

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ بائیس چوبیس سال کی خوش شکل لڑکی تھی۔ لڑکے کی عمر مشکل سے تین چار سال ہوگی۔ ''کون ہو تم بی بی؟'' میں نے کہا۔

''جنابِ عالی! میں شہزاد کی بیوی ہوں۔'' اس نے بڑی مظلومیت سے کہا۔ ''اور یہ بیٹا ہے شہزاد کا۔ میں لاہور سے آئی ہوں۔''

میں اپنی جگہ بت بنا کھڑا اسے دیکھتا رہا۔

یہ میرے لیے ایک شدید ذہنی صدمہ تھا۔ اب تک جو بات جھوٹ تھی راناؔ کے سازشی ذہن کی تخلیق تھی اور شہزاد کے کردار کو دیکھتے ہوئے ناممکن دکھائی دیتی تھی وہ جیتی جاگتی حقیقت کا روپ دھار کے سامنے آ گئی تھی۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں بہت دیر سے اس عورت پر نظریں جمائے کھڑا ہوں جو یقیناً ایک معیوب بات تھی۔ میں نے گارڈ سے پوچھا۔ ''اگر یہ مجھ سے ملنے آئی تھی تو تم نے اسے گیٹ پر کیوں بٹھا رکھا ہے؟''

گارڈ کچھ نروس ہوا۔ ''سر! آپ باہر تھے۔''

میں نے خفگی کا اظہار کیا۔ ''جب میں گھر سے باہر ہوتا ہوں تو کیا میرے ملنے والوں کو بھی باہر اسی طرح بٹھایا جاتا ہے؟''

''سوری سر! لیکن یہ ابھی دو منٹ پہلے ہی آئی تھی۔ میں اندر اطلاع کرنے ہی والا تھا۔''

میں نے سر ہلا کے عورت کو اشارہ کیا۔ ''آؤ میرے ساتھ۔'' اس نے ایک گود میں بچے کو اٹھایا اور دوسرے ہاتھ میں سوٹ کیس اٹھانے لگی۔ ''میں بڑی مشکل سے یہاں تک پہنچی تھی سرکار!''

میں نے کہا۔ ''سوٹ کیس چھوڑ دو۔ یہ لے آئے گا۔''

راجا اور غنی بھی اس صورت حال کو حیرانی اور شک کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ شہزادہ کی وضاحت کو ہم سب نے بلا چون و چرا تسلیم کر لیا تھا اور اس کی پہلی شادی کے انکشاف کو راناؔ کے دماغ کی شر انگیز کارروائی قرار دیا تھا۔ ان حالات میں کہ راناؔ نے اپنے سپوت زوہیب کا رشتہ رابعہ کے لیے مانگ رکھا تھا۔ یہ سازش ناممکن نہیں لگتی تھی کہ راناؔ نے پہلے مرحلے میں رابعہ کو شہزاد سے بدظن کرنے کا پلان بنایا ہو۔

اچانک صورت حال میں ڈرامائی تبدیلی آئی تھی۔ وہ عورت جو خود شہزاد کی پہلی بیوی ہونے کی دعوے دار تھی اپنے بچے کے ساتھ لاہور سے ست بدحالی پہنچ گئی تھی اور شہزاد پر ہمارے اندھے اعتماد کی عمارت دھڑام سے گر گئی تھی۔ ابھی شہزاد لاہور گیا ہوا تھا۔ میں نے بہتر سمجھا کہ خاموشی سے بات کر لوں۔ یہ بات سمجھنے کے بعد راجا اور غنی مجھ سے آگے نکل گئے۔ عورت آہستہ آہستہ چل رہی تھی اور اس کے ساتھ چلتے ہوئے میرے ذہن میں اندیشوں کی یلغار تھی۔ میں چاہتا تھا کہ اس عورت پر یقین نہ کروں۔ شہزاد کو ویسا ہی سمجھتا رہوں جیسا وہ نظر آتا تھا لیکن اب یہ ممکن نہیں رہا تھا۔ جھوٹ شہزاد نے بولا تھا۔ یہ عورت جھوٹی کیسے ہو سکتی تھی جو اتنی دور سے اپنے بچے کے ساتھ اپنا حق مانگنے آئی تھی۔

مجھے جتنا رنج تھا اس سے زیادہ تشویش تھی۔ غصہ تھا کہ میری عقل و نظر کو کیا ہو گیا تھا کہ میں شہزاد کا اصل چہرہ نہ دیکھ پایا اور اس کے کردار کو نہ سمجھ سکا اور ایک میں ہی کیا، ہم سب دھوکا کھا گئے؟ یہاں تک کہ اس کی ماں نے اور خالہ نے کچھ بھی نہیں بتایا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ انہیں بھی شہزاد نے لاعلم رکھا ہو۔

صرف ایک رابعہ تھی جس نے شہزاد کی بے گناہی کو تسلیم نہیں کیا تھا اور اس کی صفائی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ شاید یہ عورت کی ساتویں حس ہوتی ہے جو اسے اپنے محبوب یا شوہر کے کردار کی معمولی سی لغزش سے بھی باخبر رکھتی ہے۔ مرد کی نظر بہکتی ہے یا راہِ عشق میں اس کے قدم بھٹکتے ہیں تو عورت کی یہی ساتویں حس اسے چوکنا کرتی ہے۔ اس ساتویں حس کا تعلق دل سے ہوتا ہے۔ چھٹی حس سب کی ہوتی ہے مگر اس کا تعلق دماغ سے رہتا ہے۔

گیٹ سے مہمان خانے تک کا فاصلہ طے کرتے ہوئے میں نے یہ سب سوچا۔ خیالات کی ایک رو تھی جو میرے احساس کو تہ و بالا کر گئی۔ اگر شہزاد کے رابعہ سے جذباتی تعلق کا مسئلہ نہ ہوتا تو میں اس عورت کو خوش آمدید کہتا۔ اب میرے اعصاب پر ایک ہی پریشانی سوار تھی کہ محبت میں یہ دوسرا دھوکا کھانے کے بعد رابعہ کا کیا ہو گا؟ وہ پہلے ہی شہزاد سے سخت بدگمان اور بدظن تھی۔ ہم سب اسے وقتی ناراضی سمجھ کے اہمیت نہیں دے رہے تھے لیکن حقیقت کا مکروہ چہرہ سامنے آئے گا تو رابعہ کیا کرے گی؟

عورت میرے کہنے پر بیٹھ گئی۔ اس کا بچہ اجنبی ماحول میں کچھ سہما ہوا اس سے چمٹا رہا۔

میں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ ''یہاں تک تم کیسے آئی ہو؟''

اس نے سادگی سے کہا۔ ''دینہ تک بس میں۔ اس کے بعد ویگن میں اور یہاں تک رکشا میں۔''

میں نے اپنی نظر اسی پر رکھی۔ ''اکیلی؟''

اسے شاید اس جرح کی امید نہیں تھی چنانچہ اس نے کچھ دیر سوچ کے جواب دیا۔ ''نہیں جناب! ایک چچا میاں ساتھ آئے تھے۔ میرے پڑوس میں رہتے ہیں۔''

مجھے یقین تھا کہ ثریا میری عدالت انصاف میں اپنے حق کا کیس لڑنے کے لیے پوری تیاری کے ساتھ آئی ہو گی۔ عقل کہتی تھی کہ اب مزید کسی ثبوت یا شہادت کی ضرورت نہیں رہی۔ شہزاد کا جرم ثابت ہو گیا ہے۔ اس کے باوجود میں نے اپنے اطمینان کے لیے اس سے کچھ سوالات پوچھنا ضروری سمجھا۔ میں نے کہا۔ ''دیکھو لڑکی، کیا نام ہے تمہارا؟''

''ثریا جناب عالی! یہ میرا بیٹا ہے گلریز۔''

''سب سے پہلے تو مجھے یہ بتاؤ...... کہ میں کیسے مان لوں تم ہی ثریا ہو؟''

اس نے اپنا بیگ کھول کر ایک شناختی کارڈ نکالا۔ ''آپ دیکھ سکتے ہیں سر! میری تصویر زیادہ پرانی نہیں ہے۔''

میں نے شناختی کارڈ دیکھا۔ تصویر اسی کی تھی اور اس پر نام بھی ثریا شہزاد لکھا تھا۔ اس پر جو پتا درج تھا وہ لاہور کا ضرور تھا لیکن وہ نہیں تھا جو مجھے شہزاد نے بتایا تھا۔ وہ پتا دھرمپورے میں کسی گلستان کالونی کے مکان کا تھا۔ شناختی کارڈ جعلی نہیں تھا اور صرف ڈیڑھ سال قبل جاری ہوا تھا۔

میں نے شناختی کارڈ واپس کر دیا۔ ''تمہارا موجودہ پتا کچھ اور ہے؟''

''جی۔ جب ہماری شادی ہوئی تھی تو یہ پتا تھا۔''

''کتنا عرصہ ہو گیا اس شادی کو؟''

وہ بولی۔ ''تین سال۔ ساڑھے چھ مہینے۔ یہ میرا بیٹا گلریز اب ڈھائی سال کا ہے۔ یہ ٹھیک ایک سال بعد پیدا ہوا تھا۔ اسی دن جب ہماری شادی ہوئی تھی یعنی ستائیس نومبر۔ اس کی سالگرہ اور ہماری شادی کی سالگرہ ایک ہی دن پڑتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''کوئی ثبوت ہے تمہارے پاس اس شادی کا۔ مثلاً نکاح نامہ؟''

اس کا چہرہ دکھی ہو گیا۔ ''آپ سمجھ رہے ہیں میں جھوٹ بول رہی ہوں؟ نکاح نامہ بنا تھا۔ میں نے اس پر دستخط بھی کیے تھے۔ جب نکاح ہوا تھا تو نکاح نامہ کیوں نہیں ہو گا لیکن اس کی میرے پاس کوئی کاپی نہیں اور آپ پوچھیں گے کیوں؟ تو جناب عالی! کاپی بعد میں ملتی ہے۔ ایک میاں کو ایک بیوی کو۔ نکاح خواں رجسٹرار اپنے ساتھ لے جاتا ہے اور چند دن بعد مہر وغیرہ لگا کے دیتا ہے رجسٹریشن کے بعد۔ مجھے تو نہیں معلوم کہ شہزاد اس نکاح رجسٹرار کو کہاں سے لایا تھا اور معلوم ہوتا تب بھی کیا نکاح نامے کی کاپی لینے کے لیے بیوی جاتی ہے؟''

میں نے دل ہی دل میں کچھ شرمندگی محسوس کی۔ ''تمہارا مطلب یہ ہے کہ نکاح نامہ شہزاد کے پاس ہو گا۔''

''بالکل یہی مطلب ہے میرا اور بعد میں کیا میں اس سے مطالبہ کرتی کہ لاؤ میری کاپی میرے حوالے کرو؟'' وہ اب زیادہ اعتماد کے ساتھ تیز لہجے میں بات کر رہی تھی۔ ''کہیں ایسا ہوتا ہے؟''

میں نے سر اٹھا کے کہا۔ ''تو کیا شہزاد تم سے کہاں ملا تھا؟''

''لاہور میں۔''

میں نے کہا۔ ''مگر وہ تو راولپنڈی میں رہتا ہے۔''

''میرے ابا پر قتل کا مقدمہ تھا۔ سیشن کورٹ میں ان کو سزائے موت سنائی گئی تھی۔ ہائی کورٹ کی اپیل میں شہزاد ہمارا وکیل تھا۔ ہر پیشی پر اس سے ملاقات ہوتی تھی۔ وہ بہت ہمدردی کرتا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''تمہارے ابا نے کس کو قتل کیا تھا؟''

''میری ماں کو۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ ''اب یہ مت پوچھیں کہ میری ماں نے کیا کیا تھا؟''

''وہ بات بتانے کے قابل نہیں یا تم سمجھتی ہو کہ جرم تمہاری ماں نے کیا تھا۔ باپ نے نہیں؟''

''آپ جو چاہیں سمجھ لیں۔''

میں نے کہا۔ ''اس کیس میں شہزاد ایک دردمند دل رکھنے والا ہیرو بن کے سامنے آیا ہو گا۔ اس نے تمہارے ابا کو باعزت طور پر بری کرا کے تمہارا دل جیت لیا ہو گا۔''

''تین سال ہوئے ابا کو پھانسی ہو گئی۔'' اس نے میری بات کاٹ دی۔

مجھے ایک شاک لگا۔ ''آئی ایم سوری۔ کیا سپریم کورٹ نے بھی ان کی اپیل مسترد کر دی تھی؟''

''ظاہر ہے اور اس کے بعد صدر نے رحم کی اپیل بھی۔ جب وہ کال کوٹھڑی میں تھے تو شہزاد نے ان سے میرا رشتہ مانگ لیا تھا۔ اور انہوں نے منظور کر لیا تھا۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ ان کے بعد دنیا میں میرا کوئی نہیں۔ وہ ہماری شادی میں بھی کیسے شریک ہو سکتے تھے۔''

خاموشی کے ایک مختصر سوگوار وقفے کے بعد میں نے پوچھا۔ ''تمہارے دیگر رشتے دار تو ہوں گے؟''

''کوئی نہیں۔ دور کے کچھ عزیز پہلے بھی نہیں ملتے تھے۔ جب ابا جیل گئے تو سب سے نام کا رشتہ بھی ختم ہو گیا۔ نہ کوئی جنازے میں شریک ہوا نہ کسی نے مجھ سے تعزیت کی۔''

معلوم نہیں ثریا کی بات میں کتنا جھوٹ تھا اور کتنا سچ لیکن اس کی بات نے اس کے لیے میرے دل میں ہمدردی کے جذبات پیدا کر دیے تھے۔ اس کی کہانی میں ایک قائل کرنے والی سچائی جھلکتی تھی۔ یہ کسی فلم کی کہانی نہیں ہو سکتی تھی۔ کوئی جھوٹ پر مبنی افسانہ نہیں ہو سکتا تھا۔

ابھی تک کسی کو بھی حویلی میں ثریا کی آمد کا علم نہیں تھا یا شاید راجا نے کسی کو دخل در معقولات کی اجازت نہیں دی تھی ورنہ اتنی دیر میں تو ہنگامہ بپا ہو جاتا۔ کم سے کم رابعہ ضرور دھاڑتی ہوئی آ جاتی۔ یہ تو ظاہر تھا کہ اس عورت کو رات کے

وقت حویلی سے نکالا نہیں جاسکتا تھا۔ کم سے کم آج کی رات وہ ایک بن بلائے ناپسندیدہ مہمان کی حیثیت رکھنے کے باوجود ہمارے ساتھ ہوگی...... کیسے؟ یہ ایک مشکل سوال تھا۔

ثریا نے پوچھا۔ ''نواب صاحب! وہ کہاں ہیں...شہزاد؟''

میں چونکا۔ ''وہ لاہور گئے ہوئے ہیں۔ ہمارے ایک کیس کے سلسلے میں۔ شاید کچھ دیر میں آجائیں گے۔ یہ بتاؤ کہ تم نے کچھ کھایا ہے اور تمہارے بچے نے؟''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن اس کی خاموشی نے سب کہہ دیا تھا۔ میں نے ریشم کو طلب کیا۔ ''دیکھو' یہ ہماری مہمان ہیں۔ ان کے لیے کھانا لاؤ اور اس بچے کے لیے دودھ۔''

مہمان کے لفظ پر ریشم نے جیسی شعلہ بار نظروں سے ثریا کو دیکھا اس سے میں سمجھ گیا کہ حویلی میں ثریا کی آمد نے مخالف جذبات کا طوفان کھڑا کردیا ہے لیکن حقیقت کتنی بھی ناپسندیدہ کیوں نہ ہو اس کے وجود کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اب یہ میری ذمے داری تھی کہ میں اس کی تہ تک پہنچوں۔

میں نے کہا۔ ''ثریا! ایک بات ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئی۔ شہزاد کی ماں کو بھی اپنے بیٹے کی اس شادی کا علم نہیں۔ حالانکہ وہ ان کا اکلوتا بیٹا ہے۔''

وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ ''نواب صاحب! اس میں سمجھ میں نہ آنے والی کون سی بات ہے۔ اس نے نہیں بتایا ہوگا انہیں۔''

''لیکن کیوں؟ اسے کس کا ڈر تھا؟ اس کے والد تو ہیں نہیں اور ماں آنکھوں سے دیکھ نہیں سکتی۔''

''یہ آپ اسی سے پوچھیں نواب صاحب! مجھے تو اس نے کہا تھا کہ جیسے دنیا میں تمہارا کوئی نہیں' ایسے ہی میں اکیلا ہوں۔''

میں اسے بے یقینی سے دیکھتا رہا۔ ''اور ساڑھے تین سال تک وہ پنڈی میں رہا۔ تمہیں اس نے لاہور میں رکھا۔ تم نے کہا نہیں کہ مجھے بھی راولپنڈی لے چلو؟''

''اس کا کہنا تھا کہ پنڈی میں وہ ایک لاء فرم میں کام کرتا ہے۔ رات کو انہی کے آفس میں سو جاتا ہے۔ لاہور میں میرا اپنا گھر تھا۔ ابا کے بعد میں ہی اس کی مالک ہوگئی تھی۔ اس کا اور کوئی وارث نہیں تھا لیکن وہ شاہدرہ میں تھا۔ ہائی کورٹ سے بہت دور اور وہ کوئی اچھی آبادی نہیں تھی۔''

میں نے کہا۔ ''تمہارے ابا کیا کرتے تھے؟''

اس نے خجالت سے نظر جھکالی۔ ''وہ...... موچی تھے۔ جس گلی میں ہمارا گھر تھا' اس کے آخر میں سڑک تھی۔ وہیں ایک حجام کی دکان کے سامنے ان کا ٹھکانا تھا۔ شہزاد کے کہنے پر ہم نے وہ گھر بیچ دیا۔ وہاں رہنا یوں بھی مشکل ہوگیا تھا کہ لوگ باتیں بناتے تھے۔ مجھے عجیب نظروں سے دیکھتے تھے اور شہزاد کو کہتے تھے۔ بیٹی نے بھی اچھا سودا کیا ہے۔ اب میں آپ سے کیا چھپاؤں نواب صاحب! جب ہی یہاں آگئی ہوں۔ میری ماں بھی میرے جیسی ہی تھی۔ میرا مطلب ہے خوبصورت تھی۔ کم سے کم میرے باپ کے مقابلے میں۔ ایک موچی کی بیوی بن کے وہ خوش نہیں تھی اور نہ اس کی آمدنی سے مطمئن تھی۔ ابا تو سارا دن سڑک پر دھوپ میں بیٹھا جوتیاں گانٹھتا رہتا تھا۔ ماں کسی نہ کسی سے دوستی گانٹھ لیتی تھی۔ اس نے ابا سے کہا کہ وہ پڑھانے جاتی ہے۔ وہ میٹرک پاس تھی لیکن جاتی وہ کہیں اور تھی۔ یہ بات کب تک چھپی رہ سکتی تھی پھر بھی دس سال گزر گئے۔ اس کے بعد میرے باپ کو شک ہوا اور لوگ بھی اس کے منہ پر کہنے لگے تو فساد شروع ہوگیا۔ اس نے ماں کے گھر سے نکلنے پر پابندی لگادی تھی۔ اس وقت تک میں بھی سیانی ہوگئی تھی۔ جب میں اسکول چلی جاتی تھی تو ماں کے چاہنے والے آجاتے تھے۔ بس ایک دن جب میں واپس آئی تو دیکھا لوگ جمع ہیں۔ ماں کی اور ایک مرد کی لاشیں گھر میں پڑی تھیں۔ پولیس میرے باپ کو لے گئی۔ ظاہر ہے وہاں میرا ابھی رہنا مشکل تھا۔ اس گھر کے بہت تھوڑے پیسے ملے۔'' اس نے دوپٹے کے پلو سے اپنے آنسو خشک کیے۔

اس وقت تک میرا دل موم کی طرح پگھل چکا تھا۔ میری ساری ہمدردی اس لڑکی کے ساتھ ہوگئی تھی اور مجھے شہزاد سے سخت نفرت محسوس ہورہی تھی۔ اس پر اتنا طیش آرہا تھا کہ وہ سامنے ہوتا تو شاید میں اسے خوب مارتا۔ اگر یہ سب سچ تھا اور مجھے اس کے سچ ہونے میں کوئی شبہ بھی نہ تھا' تو شہزاد نے ایک لاوارث اور مظلوم لڑکی کے ساتھ سخت زیادتی کی تھی۔ اس نے اپنی نابینا ماں کو دھوکے میں رکھا تھا اور اب رابعہ کو بےوقوف بنارہا تھا۔

اب تک جو کچھ مجھے ثریا نے بتایا تھا اس کی بہ آسانی تصدیق کی جاسکتی تھی مثلاً اس کے باپ کے جرم اور اس کی سزا کا پورا عدالتی ریکارڈ ہوگا۔ شہزاد سے پوچھا جاسکتا تھا کہ نکاح نامہ کہاں ہے۔ شناختی کارڈ میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ فوری مسئلہ ثریا کو حویلی میں مہمان کی حیثیت سے جگہ فراہم کرنے کا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ یہ کوئی آسان کام نہیں ہوگا۔

جب ریشم کھانا لے کر آئی تو ناگواری کے آثار اس کی صورت سے عیاں تھے مگر میزبانی کا یہ فریضہ وہ بادل ناخواستہ سرانجام دے رہی تھی چنانچہ سب سے پہلے مجھے اس کا دماغ

درست کرنا پڑا۔ وہ ایک ٹرے میں دو روٹیاں، سالن کی پلیٹ اور ایک کپ میں دودھ لائی تھی۔

میں نے اسے ٹوکا۔ ''ریشم! یہ کیا ہے۔ کیا مہمانوں کو کھانا اس طرح پیش کیا جاتا ہے؟ جاؤ۔ جو پکا ہے سب لے کر آؤ ٹرالی میں...... اور دودھ گلاس میں لاؤ۔ کیا اس دودھ سے ایک بچے کا پیٹ بھر سکتا ہے؟''

میرے سخت لہجے اور تیور دیکھ کر وہ ڈر گئی اور کچھ دیر بعد ٹرالی دھکیلتی ہوئی واپس آئی تو پوری طرح باادب باملاحظہ ہوشیار تھی۔ ٹرالی میں وہ سب تھا جو ہم کچھ دیر بعد ڈنر میں کھاتے۔ میں نے اسے مزید حکم دیا کہ جب تک ثریا کھانا ختم نہ کرے وہ دروازے کے باہر موجود رہے پھر میں نے ثریا سے کہا۔ ''اور کسی چیز کی ضرورت ہو تو اسے آواز دے لینا۔ اس کا نام ریشم ہے۔''

زنان خانے میں آدھا کام راجا نے کرلیا تھا۔ اس نے لیلیٰ بھابی، شہناز اور رابعہ کے اشتعال اور احتجاج پر ڈپلومیسی سے قابو پالیا تھا۔ شہزاد ابھی تک واپس نہیں آیا تھا چنانچہ ابھی تک اس کی ماں سے کسی نے ذکر نہیں کیا تھا کہ آپ کی بہو جس کے وجود سے ابھی تک آپ بے خبر ہیں ہمارے مہمان خانے میں اپنی حیثیت تسلیم کرانے کے لیے آکی بیٹھی ہے۔

قدرتی طور پر سب سے زیادہ رابعہ کا مزاج برہم تھا۔ ''کیا وہ گئی؟''

میں نے کہا۔ ''بےوقوفی کی بات مت کرو۔ اس وقت وہ کہاں جاسکتی ہے؟''

''جہاں چاہے جائے۔ یہ حویلی کیا ہوٹل ہے کہ جس کا جی چاہے یہاں آکے قیام وطعام کی سہولت مانگ لے۔''

میں نے کہا۔ ''رابعہ! اپنے جذبات قابو میں رکھو۔ جھوٹ سچ کا پتا چل جائے گا۔''

''پتا کیا چل جائے گا۔ میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کزن۔''

''کیسے کہہ دیا تھا؟ کیا تم غیب کا علم جاننے کی دعوے دار ہو؟ ابھی وہ آئی ہے۔ اس نے مجھے پوری بات بتانی ہے۔''

''پوری بات کیا شہزاد نے نہیں بتائی تھی؟''

میں نے کہا۔ ''ابھی وہ آجائے گا تو ہم انہیں آمنے سامنے بٹھا کے بات کریں گے۔ جھوٹ سچ کا فیصلہ بغیر تصدیق کے نہیں ہوسکتا اور ایک بات تم اچھی طرح سمجھ لو۔ اگر وہ عورت جھوٹ بول رہی ہے تب بھی میں کسی کو اجازت نہیں دوں گا کہ اسے ذلیل کرے۔ یہ کام شہزاد بہتر طور پر کرسکتا ہے۔ آج کی رات وہ یہاں رہے گی تو اس کی حیثیت مہمان جیسی ہوگی۔ ہم اپنی میزبانی کی روایات برقرار رکھیں گے اور آئندہ بھی۔ خواہ مہمان بن کر آنے والا ہمارا بدترین دشمن ہی کیوں نہ ہو۔''

راجا نے موضوع بدلنے کے لیے گھڑی دیکھی۔ ''آخر شہزاد ابھی تک کیوں نہیں آیا؟''

شہناز بولی۔ ''ہاں۔ عام طور پر رات ہونے تک پہنچ جاتا ہے۔''

رابعہ نے تلخی سے کہا۔ ''اسے پتا چل گیا ہوگا نا۔''

میں نے کہا۔ ''ہم مزید اس کا انتظار نہیں کریں گے۔ ریشم سے کہو کہ کھانا لگائے اور ہاں! اس کے سونے کے لیے مہمانوں والی خواب گاہ میں انتظام کیا جائے۔''

اپنی بات منوانے اور مخالفت کے جذباتی ردعمل کو کنٹرول کرنے کے لیے مجھے ایک سخت گیر حکمراں اور خاندان کے سربراہ کا کردار ادا کرنا پڑا۔ اس کے لیے میں نے اپنا لہجہ قدرے درشت اور چہرہ سنجیدہ رکھا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ کھانے کی میز پر کوئی ناخوشگوار بحث نہیں ہوئی۔ راجا نے میری مدد کی اور شہناز نے راجا کی' چنانچہ ٹینشن میں صرف رابعہ رہی۔ شہزاد کی ماں بصارت سے محرومی کے باعث سب کے ساتھ میز پر کھانے میں جھجک محسوس کرتی تھی۔ بہن اس کی مدد کرتی تھی اور کھانا ان کے کمرے میں پہنچادیا جاتا تھا۔

عجیب بات یہ ہوئی کہ رات دس بجے تک شہزاد لوٹ کر نہیں آیا اور اس سے رابطے کی ہر کوشش ناکام رہی۔ اس کے موبائل سے جواب بھی موصول نہیں ہورہا تھا۔ ثریا کو اس کے بچے کے ساتھ خاموشی سے مہمانوں کی خواب گاہ میں پہنچادیا گیا تھا۔ وہ بتاچکی تھی کہ اس کا باپ ایک معمولی موچی تھا۔ اس نے حویلی کبھی خواب میں بھی نہ دیکھی ہوگی۔ وہ بے حد مرعوب اور خوفزدہ تھی۔ میرے ہمدردانہ رویے کے باوجود اعصابی دباؤ کا شکار تھی اور بار بار پوچھتی تھی کہ آخر شہزاد ابھی تک کیوں نہیں آیا۔

میں اس سے ملنے گیا تو وہ بیڈ پر گھٹنے اپنے بازوؤں کے حلقے میں سمیٹے بیٹھی تھی۔ اس کا بچہ سوچکا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے سر اٹھایا۔

''تمہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟'' میں نے اخلاقاً پوچھا۔ وہ آب دیدہ ہوگئی۔ ''نواب صاحب! آپ کا میں کس منہ سے شکریہ ادا کروں۔ مجھے تو ڈر تھا کہ آپ میرے ساتھ نہ جانے کیا سلوک کریں۔''

میں نے کہا۔ ''بہتر ہوگا کہ تم سوجاؤ۔ تم بہت تھکی ہوئی ہو......''

اس نے فرمانبرداری سے سر ہلایا اور آنکھیں بند کرکے لیٹ گئی لیکن اس نے کہا کہ میں لائٹ بند نہ کروں۔ شہزاد

آنے والے ہوں گے۔“

میں نے کہا۔ ”شہزاد سے تم کل بھی بات کرسکتی ہو۔ کیا پتا وہ آج رات نہ آئے۔“

شہزاد کے نہ آنے سے میری پریشانی میں بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ مجھے بھی شک ہو رہا تھا کہ شاید اسے ثریا کے حویلی میں پہنچ جانے کی خبر مل گئی ہوگی لیکن ایسے وہ کب تک بچ سکتا ہے۔ راجا اور شہناز باغ میں فوارے کے پاس ٹہل رہے تھے اور اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ وہ کس مسئلے پر بات کررہے ہوں گے۔ رابعہ اپنے کمرے میں لیلیٰ بھابی کے ساتھ بند تھی اور میں یہ بھی سمجھ سکتا تھا کہ وہ کتنے شدید جذباتی بحران سے گزر رہی ہوگی۔

میں یہ طے کرنے سے قاصر تھا کہ ثریا سے واضح ہونے والی آدھی حقیقت میں اسے شریک کرنا مناسب ہوگا یا نہیں۔ یہ آدھی حقیقت مجھے ہر پہلو سے جائزہ لینے پر پوری حقیقت نظر آتی تھی۔ میں نے راجا سے مشورہ کیا اور پھر یہی فیصلہ کیا کہ جو کچھ ثریا نے بتایا ہے وہ رابعہ کو ضرور بتادیا جائے۔ شترمرغ کی طرح ریت میں منہ چھپانے سے خطرہ نہیں ٹلتا۔ ہم سب رات بھر سچائی سے ڈرتے ہوئے گزاردیں، اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ شہزاد کے نہ آنے سے یہ احساس بڑھ رہا تھا کہ وہ مجرم ہے چنانچہ اپنی شکل نہیں دکھا رہا۔

میں نے اپنے کمرے میں میٹنگ کی اور وہ سب اختصار کے ساتھ بتادیا جو مجھے ثریا سے معلوم ہوا تھا۔ میں نے ہر ایک کی صورت پر اس کے ردعمل کو بھی دیکھا۔ یہ غیر متوقع نہیں تھا۔ سچائی سے انکار یا انحراف آسان نہیں ہوتا۔ جھوٹ کی تردید مشکل نہیں ہوتی۔

راجا نے ایک سیاسی تبصرہ بہتر سمجھا۔ ”یار بعض لوگ بڑی ذہانت سے جھوٹ بولتے ہیں جو سچ سے زیادہ قائل کرنے والا لگتا ہے۔ یہ لڑکی...“

رابعہ نے زہریلے لہجے میں راجا کی بات کاٹ دی۔ ”یہ لڑکی سچی ہے۔ میں لکھ کے دے سکتی ہوں۔ حلف اٹھا سکتی ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”ٹیک اٹ ایزی کزن۔ سب معلوم ہوجائے گا۔“

اس نے پلٹ کے کہا۔ ”چھوڑو کزن۔ مجھے تو پہلے ہی معلوم تھا اور میں نے تم سے کہا بھی تھا مگر تم نے یقین نہیں کیا تھا۔“

”رابعہ! جب تک شہزاد کا موقف سامنے نہ آئے۔“ شہناز نے راجا کی پالیسی پر عمل کیا۔

رابعہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔ تم جاگتے رہو اس کے انتظار میں۔ میں سونے جارہی ہوں۔“

”آخر کیا بنے گا اس کا؟ کیا یہ خود سے جھوٹ بول سکتی ہے۔ خود کو دھوکا دے سکتی ہے؟“ لیلیٰ بھابی نے رابعہ کے جانے کے بعد افسوس سے سرہلایا۔

شہناز بولی۔ ”مجھے اس کی شخصیت میں ایک عجیب تبدیلی کا احساس ہو رہا ہے۔ اگر میں کہوں کہ یہ نروس بریک ڈاؤن کی ایک صورت ہے تو شاید غلط نہ ہو۔ وہ ظاہر کرتی ہے کہ اسے بالکل پروا نہیں۔ پہلے وہ بے وقوف تھی کہ خرم نے محبت میں دھوکا دیا تو وہ اپنی جان لینے پر تل گئی تھی۔ یہ تو ایسا ہی ہے کہ ظالم کو سزا دینے کے بجائے مظلوم اپنے آپ کو سزا دے۔“

میں نے کہا۔ ”بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔ مگر کیا یہ خطرناک بات نہیں ہے؟“

”بالکل ہے۔ ایسا شخص ظالم اور اذیت پسند ہوجاتا ہے۔ وہ اپنے ساتھ ہونے والے ظلم کی سزا دوسروں کو دینے لگتا ہے۔ جو بے قصور ہوتے ہیں۔ یہ Metamorphosis ایسی ہی ہوتی ہے۔ جیسے کوئلہ ایک دہکتا ہوا انگارہ بن جائے۔“

میں نے کہا۔ ”اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں رانا کے بیٹے زوہیب کا رشتہ منظور کرلوں۔ یہ پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے۔“

میری بات نے سب کو چونکا دیا۔ ”اس نے غصے میں کہا ہوگا تاکہ شہزاد کو اذیت ہو۔“ لیلیٰ بھابی نے کہا۔

”اس نے شہزاد سے بھی کہا ہوگا۔ لیکن وہ غصے والی بات اب نہیں رہے گی۔ انتقام اور سزا دینے کی خواہش بن جائے گی۔“ میں نے کہا۔

راجا نے میری تائید کی۔ ”ہوسکتا ہے وہ سختی سے اقرار کرے۔“

”پھر ہم کیا کریں گے؟“ شہناز نے سادگی سے سوال کیا۔

میں نے کہا۔ ”اگر رابعہ پاگل ہوئی ہے، ہم تو نہیں ہوئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اب شہزاد نہیں آئے گا۔ بہتر ہے کہ ہم بھی سوجائیں تاکہ ہمارے دماغ کو کچھ سکون ملے۔ شہزاد سے ہم کل بات کرسکتے ہیں۔“

”ہاں۔ آخر وہ کب تک نہیں آئے گا۔ اس کی ماں اور خالہ یہاں ہیں اور وہ اتنا بے وقوف بھی نہیں کہ بھاگ جائے۔ اس کے نہ آنے کی وجہ کچھ اور ہوگی۔“

ایسا اکثر ہونے لگا تھا۔ میں سونے لیٹتا تھا تو کوئی بہت سنگین مسئلہ میرے سر پر سوار ہوجاتا تھا۔ عام لوگوں کی طرح پرسکون انداز میں دن گزار کے تکیے پر سر رکھتے ہی نیند کی آغوش میں پہنچ جانے کی خواہش کرنا بھی میرے لیے اب

ناممکن ہوگیا تھا۔ ایسا زندگی کا چلن ہے۔ غریب محنت کش کا پیٹ بھرا ہو تو اسے دنیا کا کوئی مسئلہ پریشان نہیں کرتا۔ نہ سیاسی نہ سماجی، نہ معاشی نہ نفسیاتی۔ دولت مند اور بڑے کہلانے والے لوگ سکون کی اس دولت سے محروم ہی رہتے ہیں۔ نیند کی گولیاں کھاتے ہیں پھر بھی ذہنی اور اعصابی دباؤ میں گرفتار رہتے ہیں۔

کچھ ایسا ہی مذاق تقدیر نے ایک تنگ دست وکم حیثیت مگر فرض شناس اور ایماندار پروفیسر کے بیٹے کے ساتھ کیا تھا کہ کسی وجہ کے بغیر اسے اربوں مالیت کی جاگیر حویلی کا مالک بنادیا تھا۔ اسے تو امیروں جیسے ٹھاٹ باٹ عطا کردیے تھے اور اسے باحیثیت لوگوں میں شامل کردیا تھا لیکن بدلے میں اس سے بہت کچھ لے بھی لیا تھا۔ چنانچہ اب میں تفکرات و مسائل، مشکلات اور پریشانیوں کے سمندر میں غوطہ زن رہنے لگا تھا۔ ذہنی سکون سے محروم ہوچکا تھا۔ میرے دل کا اطمینان رخصت ہوگیا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ یہی شب و روز کا معمول رہا تو میں ایک دن اعصابی مریض بن جاؤں گا۔

کچھ دیر میرا ذہن ادھر سے ادھر بھٹکتا رہا۔ میں کروٹیں بدلتا رہا اور بالآخر سوگیا۔ سحر خیزی کی جو عادت ابا نے بچپن سے ڈالی تھی کچھ عرصہ پہلے تک برقرار تھی۔ بلکہ لندن میں ہر چھٹی والے دن بھی صبح اٹھ جانے پر دوست میرا مذاق اڑاتے تھے تو میں جواب میں انہیں علامہ اقبال کا ایک شعر سناتا تھا۔

زمستاں کی ہوا میں گرچہ تھی شمشیر کی تیزی
نہ چھوٹے مجھ سے لندن میں بھی آداب سحر خیزی

انہیں بتانا پڑتا تھا کہ زمستاں کہتے ہیں موسم سرما کو اور لندن میں جب برف پڑتی ہے اور ہوا چلتی ہے تو واقعی تلوار کی کاٹ رکھتی ہے۔

اب میں دیر سے اٹھتا تھا۔ بعض اوقات اٹھایا جاتا تھا تو میرا جسم کسلمندی کا شکار ہوتا تھا۔ میں نے جوگنگ اور ایکسر سائز سب چھوڑ رکھی تھی۔ لاحول ولاقوۃ۔ بھلا یہ بھی کوئی شوق ہیں رئیسوں اور نوابوں کے۔ حضور آپ دوپہر تک خواب گاہ میں استراحت فرمائیں۔ رقص و سرود، شراب و شباب جیسے مشاغل نہ ہوں تو نوابی کا کیا مزہ۔ اسی میں اپنی آٹھ سو سال کی حکومت نکل گئی تو کیا ہوا۔

میں نے گھڑی دیکھی تو ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ نیم غنودگی میں اپنے ذہن میں آنے والے خیالات پر لعنت بھیجی اور باہر نکلا تو حویلی میں ایک غیر معمولی سناٹا محسوس ہوا۔ ساڑھے دس بجے رابعہ اور لیلیٰ بھابی تو ہوتی ہیں اپنے اسکول میں۔ ڈاکٹر شہناز اور ڈاکٹر ریشم مصروف ہوں گی اسپتال میں لیکن باقی لوگ کہاں ہیں؟ راجا اور ممی، شہزاد اور...... پھر اچانک مجھے ثریا کا خیال آگیا۔

ریشم کی ماں فاطمہ نے پوچھا۔ ”سرکار کافی لاؤں یا ناشتا؟“

میں نے کہا۔ ”اب ناشتا ہی کروں گا۔“ میں نے کہا۔ ”یہ بتاؤ سب لوگ کہاں ہیں؟“

”کون سب لوگ؟ شہزاد صاحب صبح آئے تھے۔ آٹھ بجے کے قریب۔ اپنی والدہ کو اور خالہ کو لے کر چلے گئے۔“

”چلے گئے؟ کہاں چلے گئے؟“ میں نے چلا کے کہا۔

وہ ڈر گئی۔ ”مجھے نہیں معلوم سر۔ اس وقت راجا صاحب بھی سو رہے تھے۔ سب سو رہے تھے۔ کسی کو بھی کچھ بتا کے نہیں گئے۔“

”راجا کہاں ہے؟“

راجا اسی وقت ثریا کے کمرے کی طرف سے نمودار ہوا۔ اس کا ستا ہوا چہرہ دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہے۔ وہ ڈائننگ ٹیبل پر میرے ساتھ ہی بیٹھ گیا۔ ”دیکھے پتر! بہت گڑبڑ ہوگئی ہے۔ بہت چالبازی کی ہے۔ اس کمینے نے۔“ وہ شہزاد کو گالیاں دینے لگا۔

”مجھے پتا چلا ہے کہ وہ صبح صبح آیا اور اپنی ماں کو لے گیا۔“

”ہاں۔ وہ میرے ہاتھ آجاتا یا تیرے تو زندہ نہ بچتا۔ خیر، میں چھوڑوں گا نہیں اس......“

میں نے کہا۔ ”ایزی راجا۔ مجھے شک نہیں یقین آگیا کہ ثریا اس کی بیوی ہے۔“

”ہاں اور معلوم ہے اس...... نے کیا ذلالت دکھائی؟“ راجا نے جیب سے ایک لفافہ نکال کے میرے سامنے رکھ دیا۔ ”جاتے جاتے یہ لفافہ وہ گارڈ کو دے گیا تھا کہ نواب صاحب اٹھیں تو انہیں دے دینا۔“

میری نظر آٹھ انچ لمبے اور چار انچ چوڑے براؤن لفافے پر جم گئی جس کا ایک کنارا کھلا ہوا تھا۔

”کیا ہے اس میں؟“

راجا نے دانت پیس کے کہا۔ ”پانچ ہزار روپے!“ اس نے میز پر مکا مارا۔ ”اور ایک طلاق نامہ۔“

میرا دل بیٹھ گیا۔ ”اس نے ثریا کو طلاق دے دی؟“

”ہاں۔ وہ کمینہ شیطان کی اولاد۔ بزدلوں کی طرح بھاگ گیا۔ اس میں ہمت نہیں تھی ثریا کا مقابلہ کرنے کی اور اب مجھ میں ہمت نہیں ہے کہ یہ بات ثریا کو بتا سکوں۔“

فاطمہ نے ناشتے کی ٹرے میرے سامنے رکھی لیکن اب میری بھوک اڑ چکی تھی۔ ہم دونوں کچھ دیر چپ بیٹھے رہے۔ فاطمہ نے ایک مگ میں میرے لیے کافی بنائی، دوسرے میں

راجا کے لیے۔ پھر خاموشی سے چلی گئی۔

میں نے کہا۔ ''راجا!! اب کیا ہوگا؟''

''کیا ہوگا۔ کس کا کیا ہوگا؟ اس ...... کا کچھ بھی نہیں ہوگا۔ ہم اسے جان سے بھی ماردیں تو ثریا کا گھر آباد نہیں کرسکتے اور ہم ایسا کریں گے بھی کیوں۔ ہمارا کیا رشتہ ہے اس لاوارث لڑکی سے۔''

میں نے کہا۔ ''اور کس کو معلوم ہے یہ بات؟''

''ابھی صرف مجھے اور تجھے لیکن بالآخر سب کو معلوم ہوجائے گی۔ تو جا اور ثریا کو بتادے۔ میں گیا تھا اسی نیت سے مگر میرا حوصلہ جواب دے گیا۔''

''کیا ہم اور کچھ نہیں کرسکتے؟'' میں نے شدید غصے کے باوجود اپنے دماغ کو قابو میں رکھا ہوا تھا۔

''ہم بہت کچھ کرسکتے ہیں۔ ہم یہ کرسکتے ہیں کہ ابھی پیچھے پیچھے اس کے گھر جائیں اور اسے جان سے ماردیں یا اسے کہیں کہ طلاق نامہ واپس لے لو اس بے آسرا لڑکی کو گھر میں بیوی بنا کے رکھو۔ قانونی چارہ جوئی کا طریقہ بھی ہے لیکن اس کا ماہر شہزاد ہے۔ ہم نہیں۔ ثریا جیسی ہزاروں لاکھوں لڑکیاں مرد کے یک طرفہ طلاق کے حق کی وجہ سے دربدر ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''ہم اس کی ماں سے بات کرتے ہیں۔''

''چھوڑ فیکے پتر۔ جس اندھی ماں کو اس نے آج تک اندھیرے میں رکھا' جھوٹ اور مکروفریب سے کام چلایا' وہ ثریا سے زیادہ بے بس ہے۔ عورت ہونے کے ناتے وہ ثریا کے ساتھ ہونے والے ظلم وزیادتی پر آنسو بہاسکتی ہے لیکن اپنے اکلوتے جوان بیٹے کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی۔ مائیں تو حد سے زیادہ مجبور ہوتی ہیں۔ باپ موجود ہوتا تو بیٹے کا کیا بگاڑ لیتا۔''

میں نے کہا۔ ''معلوم نہیں وہ اپنی ماں اور خالہ کو کیا جھوٹ بول کے اپنے ساتھ لے گیا ہوگا۔''

''ابھی اس کا فون بند ہے۔ لیکن تو شرط لگالے مجھ سے۔ اس کا گھر بھی بند ملے گا۔ اسے ڈر ہوگا کہ ہم پیچھے پیچھے جائیں گے اور ہنگامہ کریں گے۔ ثریا کے لیے نہ سہی رابعہ کے لیے سہی۔ دھوکا اس نے دونوں کو دیا ہے۔''

''کیسی عجیب بات ہے۔ فاروقی پر بھی ہم نے اتنا ہی اعتماد کیا تھا۔ اس کی بیوی آج یہاں پناہ لیے بیٹھی ہے۔ اب یک نہ شد دو شد والا معاملہ ہوجائے گا۔ شہزاد کی مطلقہ بھی ہماری ذمے داری بن جائے گی۔ اسے کہتے ہیں بدقسمتی۔ ورنہ وکیل ــــ اسے زیادہ قابل احترام اور قانون پرست اور کون لوگ ہوتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

راجا نے سر ہلایا۔ ''اس حرامزادے فاروقی کو دیکھو۔ لاکھوں کمارہا تھا مگر جاگیر پر قبضے کے لالچ میں اس نے رابعہ پر ڈورے ڈالنے کی پوری کوشش کی۔ بیوی کو بلیک میل کیا کہ اپنے ہاتھوں سے تجھے زہر دے کر اس کے منصوبے کو کامیاب بنادے۔ تیرے بعد رابعہ ہی سب کی وارث ہوگی۔ پھر اس نے دوسری شادی کرلی اور اسے مار کے بیوی کو اس قتل میں ملوث کرنا چاہا۔ آدمی کی ذلالت کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔''

میں نے تلخی سے کہا۔ ''اور آج بھی وہ ہمارے دشمنوں سے مل کے ہمیں نقصان پہنچانے کی کوشش میں مصروف ہے۔''

دوپہر تک ہم نے اس صورت حال پر اچھی طرح سوچ بچار کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ قانونی طور پر ہم شہزاد کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ سارا فساد جاگیر کا تھا۔ کروڑوں اربوں روپے کی ملکیت کے لالچ نے فاروقی کا ایمان خراب کیا تھا مگر وہ پہلے سے شادی شدہ تھا چنانچہ اس کا پلان ناکام ہوا۔ شہزاد کو بھی کچھ عرصے بعد دولت حاصل کرنے کا یہ آسان راستہ نظر آنے لگا تو اس نے بھی رابعہ پر ڈورے ڈالے اور اسے قدرتی طور پر یہ فائدہ حاصل رہا کہ وہ نہ صرف غیر شادی شدہ تھا بلکہ خوبرو جوان بھی تھا۔ رابعہ خود بخود اس کی طرف مائل ہوگئی۔

آگے جا کر وہ رابعہ کو کیسے استعمال کرتا۔ اس کا اندازہ کیا جاسکتا تھا۔ شادی کے بعد بیوی پوری طرح شوہر کے قبضے میں ہوتی ہے۔ معلوم نہیں کیسے اس کے منصوبے کی کامیابی کی راہ میں رانا نے ٹانگ اڑادی۔ کہتے ہیں کتے کا دشمن کتا ہی ہوتا ہے۔ اس کیس میں یہی ثابت ہوا۔ رانا نے اپنے پلان کو کامیاب بنانے کے لیے شہزاد کا پتا کاٹ دیا اور اس کے لیے ثریا کو ٹرمپ کارڈ کے طور پر استعمال کیا۔

اسپتال دو بجے بند ہوتا تھا۔ اسکول کی چھٹی ایک بجے ہوجاتی تھی۔ میں ثریا سے ملنے گیا۔ وہ بہت مطمئن نظر آرہی تھی۔ اسے خلاف توقع ہماری حمایت حاصل ہوگئی تھی۔ یہاں آنے سے پہلے اسے ڈر ہوگا کہ وہ کسی نواب کی حویلی میں قدم تک نہ رکھ سکے گی اور نوابوں کا روایتی مزاج رکھنے والا رئیس احمد شیرازی بھی اس کی ایک نہیں سنے گا۔ سب دولت مند مغرور بے حس اور ظالم ہوتے ہیں۔ یہ تاثر عام ہے۔

ثریا نے نہادھو کے کپڑے بھی بدل لیے تھے اور رات کے مقابلے میں زیادہ خوبصورت اور پُراعتماد نظر آرہی تھی لیکن ابھی تک اس میں اتنا حوصلہ پیدا نہیں ہوا تھا کہ جس کمرے میں اسے رکھا گیا تھا اس سے باہر نکل کے حویلی میں ادھر ادھر

گھوم پھر سکے۔ اس کا ڈھائی سال کا بیٹا چلنا سیکھ چکا تھا اور تھوڑا بہت بولتا بھی تھا۔ وہ عام بچوں کی طرح اجنبی ماحول سے ذرا بھی ہراساں نہ تھا اور مزے سے ادھر ادھر لڑھکتا پھر رہا تھا۔ جب میں نے اسے بلایا تو وہ میری گود میں آگیا۔

میں نے کہا۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

ثریا میرے حسن سلوک سے بے حد متاثر تھی۔ ''نام بتاؤ......''

بچے نے منہ پھلا کے کہا۔ ''گل۔''

اس وقت میں نے زیادہ غور سے دیکھا تو مجھے اس بچے کی صورت میں شہزاد کی بہت زیادہ شباہت کا احساس ہوا۔ ''تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہے یہاں۔ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟''

''آپ مجھے شرمندہ نہ کریں حضور۔ میں بہت ڈری ہوئی تھی۔ نہ جانے میرے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔ آپ نے مجھے مہمان بنا کے رکھا۔ بس اتنی مہربانی اور کریں کہ مجھے شہزاد سے ملادیں۔ نواب صاحب میں جھوٹ نہیں بول رہی ہوں۔ یہ ٹھیک ہے کہ نکاح نامہ میرے پاس نہیں ہے لیکن کچھ ثبوت میں اپنے ساتھ لائی ہوں۔ تصویریں ہیں میری اور شہزاد کی۔ میرے ابا کی۔ میں آپ کو دکھاتی ہوں۔'' اس نے اپنا ہاتھ سوٹ کیس کی طرف بڑھایا۔

میں نے اسے روک دیا۔ ''رہنے دو۔ مجھے کسی بھی ثبوت کی ضرورت نہیں۔ سچائی کسی ثبوت کی محتاج نہیں ہوتی۔ نظر آجاتی ہے۔''

''شہزاد کب تک آئے گا نواب صاحب؟''

''مجھے نہیں معلوم۔ کیا تمہارے پاس اس کا فون نمبر بھی نہیں ہوتا؟''

وہ بولی۔ ''ایک نمبر ہے۔ وہ بند ہے دو مہینے سے۔ وہ کہتا ہے کہ تمہیں کیا ضرورت ہے۔ میں خود فون کرلیتا ہوں۔ خود آجاتا ہوں۔''

بہت سوچ سمجھ کے میں نے اپنی بات شروع کی۔ ''دیکھو ثریا۔ مجھے ایسا لگتا ہے...... کہ شہزاد نے تمہارے حالات سے فائدہ اٹھایا۔ تمہارے خوبصورت ہونے میں کوئی شک نہیں۔ لیکن تم بالکل اکیلی تھیں اور مجبور۔''

اس کی آنکھوں میں خوف اتر آیا۔ ''کیا مطلب ہے آپ کا جناب؟''

میں نے کہا۔ ''دنیا ایسے دھوکے بازوں سے بھری پڑی ہے جو لوگوں کی مجبوری سے ناجائز فائدے اٹھاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ شہزاد نے بھی تمہارے ساتھ ایسا ہی کیا۔ اس نے تمہیں دھوکا دیا۔''

وہ چلائی۔ ''میرا شہزاد دھوکے باز نہیں ہوسکتا نواب صاحب۔''

میں اسے دیکھتا رہا۔ ''تم بہت معصوم ہو۔ ابھی دنیا کو دیکھا نہیں ہے۔ مجھے بتاؤ کیا ماں ایسی ہوتی ہے جیسی تمہاری ماں تھی۔ نہیں ہوتی نا۔ وہ تو پیار، قربانی، پاکیزگی اور بے غرضی کا پیکر ہوتی ہے لیکن کیا ایسی ہی تھی تمہاری ماں؟ نہیں تھی نا؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میری بدقسمتی۔''

''ایسا لگتا ہے ثریا کہ بدبختی کے آسیب نے ابھی تک تمہارا پیچھا نہیں چھوڑا ہے۔ ہوسکتا ہے شہزاد...... اب تمہیں قبول کرنے پر راضی نہ ہو۔''

''وہ ایسا کیسے کرسکتا ہے نواب صاحب۔ آخر میں بیوی ہوں اس کی۔'' ثریا نے دہشت سے کہا۔

''وہ اس سے انکار کرسکتا ہے۔ جو آدمی اس حد تک گر جائے وہ ہر بات سے انکار کرسکتا ہے۔ کہہ سکتا ہے نکاح نامہ جھوٹا ہے۔''

''اور یہ بچہ......'' وہ ہسٹریا میں مبتلا ہونے لگی۔

''دیکھو۔ مجھے پتا چلا ہے کہ اس نے اپنی شادی کو خفیہ رکھا تھا۔ اس کی ماں کو بھی علم نہیں۔''

''ماں؟ اس کے والدین ہیں؟''

''صرف ماں ہے مگر وہ نابینا ہے اور اپنی بیوہ بہن کو ساتھ رکھتی ہے۔ راولپنڈی کے علاقے ہارلے اسٹریٹ میں ان کا ذاتی مکان ہے۔ وہ میرا وکیل تھا اس لیے میرا اکثر وہاں جانا رہتا ہے۔''

''پھر مجھے بھی لے چلیں وہاں نواب صاحب۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔'' وہ اب رونے لگی تھی۔

میں نے کہا۔ ''آئی ایم سوری۔ اب شاید وہ اس گھر میں نہیں ملے گا۔ اور اتنی بات سمجھ لو۔ اگر تم نے اسے کورٹ یا بار روم میں تلاش کرلیا تو وہ تمہیں پہچاننے سے بھی انکار کردے گا۔''

وہ چلائی۔ ''یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟''

میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''وہ تمہیں جھوٹا اور بلیک میلر کہہ سکتا ہے۔ شہزاد ایک وکیل ہے۔ قانون سے کھیلنا جانتا ہے اور قانون تمہاری کیا مدد کرے گا۔ قانون اس کے ساتھ ہوگا۔ کیونکہ قانون کسی لاوارث اور غریب کا ساتھ نہیں دیتا۔ حالانکہ بنایا اسی لیے جاتا ہے کہ کمزور کو تحفظ فراہم کرے مگر کتابی باتوں میں اور عملی زندگی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔''

''نواب صاحب۔ ضرور آپ کی اس سے بات ہوئی

ہے۔کیا یہ سب اس نے کہا ہے؟“

”بات تو نہیں ہوئی لیکن......“

وہ پھر چلائی۔”لیکن کیا...... کیا وہ مجھے اپنی بیوی نہیں مانتا؟“

میں نے دل مضبوط کر کے کہا۔”اس نے یہ رشتہ ہی ختم کر دیا ہے۔“

”رشتہ کیسے ختم ہوسکتا ہے؟“

میں نے لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا۔”دیکھ لو۔ یہ وہ کل رات تمہارے لیے چھوڑ کے نکل گیا۔ اپنی ماں اور خالہ کے ساتھ۔“

ثریا نے کانپتے ہاتھوں سے لفافہ کھولا اور طلاق کی مختصر تحریر کو دیکھا۔ حق مہر کے پانچ ہزار روپے اس کے دوسرے ہاتھ میں تھے۔ اس کی پھٹی ہوئی آنکھیں کاغذ کے اس پرزے پر جمی تھیں۔ اس کا جسم طوفان کی زد میں آئے ہوئے پتے کی طرح لرزنے لگا۔ پھر اس نے ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہوگئی۔

میں کچھ ایسے ہی ردعمل کے لیے تیار تھا۔ میں نے فوراً فاطمہ کو طلب کیا۔ اس نے ثریا کو سیدھا لٹایا اور اس پر پانی کے چھینٹے مارے۔ اسپتال کے اوقات کار ختم ہونے میں ابھی ایک گھنٹا باقی تھا مگر میں نے شہناز کو طلب کرلیا۔ وہ باقی مریضوں کو اپنی معاون خصوصی ڈاکٹر ریشم کے رحم و کرم پر چھوڑ کے آگئی تھی۔

شہناز نے تمام صورتِ حال کو بہ آسانی سنبھال لیا۔ ثریا پر صدمے کا اثر تھا۔ شہناز نے اسے سکون آور انجکشن دے کر سلا دیا۔ فاطمہ بچے کو اپنے ساتھ لے گئی۔ ایک گھنٹے بعد ثریا کی الم ناک کہانی سب نے سن لی۔

قدرتی طور پر سب سے زیادہ غصہ رابعہ کو تھا۔”تم نے دیکھا‘ میرا شک بے بنیاد نہیں تھا۔ وہ تمہیں بھی بے وقوف بناتا رہا کزن اور مجھے بھی۔ اب اس کی بداعمالی کی سزا میرے ساتھ تم بھی بھگتو گے۔“

”اور وہ بے چاری تو بھگتے گی ہی جو خوار ہوتی یہاں تک بڑی آس لے کر آئی تھی۔“ لیلیٰ بھابی نے بڑے دکھی لہجے میں کہا۔

شہناز نے افسوس سے سر ہلایا۔”بھلا کوئی کہہ سکتا تھا کہ وہ اتنا مخلص نظر آنے والا اور اتنی اپنایت کا اظہار کرنے والا ایسا مکار ثابت ہوگا۔ ہم سب دھوکا کھا گئے۔“

”اوروں کی کیا بات کرتی ہو۔ اس کی اپنی ماں بے خبر رہی‘ انہیں بھی پتا نہیں چلا کہ ان کے سپوت نے چپکے سے شادی رچالی ہے اور یہاں وہ تمہارے اور میرے سامنے کہانیاں سناتا رہا۔“ رابعہ آتش فشاں بنی ہوئی تھی۔

یہ سارا غم و غصہ لاحاصل تھا۔ جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔ راجا نے اس کے باوجود شہزاد کے گھر جا کے اس کا دماغ درست کرنے اور اس کی ماں کو اپنے فرشتہ سیرت بیٹے کا شیطانی چہرہ دکھانے کی کوشش ضرور کی تھی، میرے منع کرنے کے باوجود لیکن راجا کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس کے گھر میں تالا پڑا ہوا تھا۔ شہزاد کو معلوم ہوگیا تھا کہ اس کے جھوٹ کا بھانڈا پھوٹ چکا ہے۔ ہم سب کا سامنا کرنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ شاید اس نے خدا کا شکر ادا کیا ہوگا کہ کم سے کم اس کی ماں اور خالہ کی نظر میں وہ برا نہیں بنا۔

شہزاد ایک وکیل تھا۔ وہ کچھ دن کے لیے اپنی ماں اور خالہ کو لے کر روپوش ہوسکتا تھا۔ کسی گمنام ٹھکانے پر منتقل ہوسکتا تھا۔ وہ اپنا گھر بھی بیچ سکتا تھا لیکن اس پیشے میں رہ کے لاپتا نہیں ہوسکتا تھا۔ اسے بالآخر بار روم میں یا کسی کورٹ سے نکلتے ہوئے پکڑا جاسکتا تھا۔ اس کا فائدہ کچھ بھی نہ ہوتا۔ طلاق وہ تحریری طور پر دے چکا تھا واپس نہیں لی جاسکتی تھی۔ اب شرعی اور فقہی اعتبار سے یہ ممکن نہیں تھا۔ قانونی طور پر زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا تھا کہ ثریا اس پر بچے کی پرورش کے اخراجات کا کیس کر دیتی۔ بعد میں ثریا نے یہ منظور نہیں کیا۔

اچھی بات صرف یہ ہوئی تھی کہ ہم نے اپنے قانونی معاملات پہلے ہی شہزاد سے لے کر ماجد خان کے سپرد کردیے تھے۔ اس کی وجہ بے اعتمادی نہیں تھی۔ ماجد خان بہت سینئر نامور قانون داں تھا۔ اگر ہم ایسا نہ کرتے تو ایک بار پھر وہ صورت حال پیدا ہو جاتی جو فاروقی سے قانونی معاملات کر شہزاد کے سپرد کرتے وقت ہوئی تھی۔

ثریا شام تک سوتی یا روتی رہی۔ جب اس کی دوا کے زیر اثر غنودگی ختم ہوتی وہ آنسو بہانے لگتی تھی۔ اس کے ساتھ ایک مجھے ہی نہیں بلکہ سب کو بے حد ہمدردی تھی۔ یہاں تک کہ رابعہ جو چند روز قبل ایک سوکن بن کے فون پر اسے فون پر بے عزت کر چکی تھی اسے تسلی دینے اور حوصلہ رکھنے کی تلقین میں سب سے آگے نظر آتی تھی۔ اب وہ مظلوم ہوگئی تھی۔ اس کے حالات ایسے تھے کہ اس کے لیے سب کا دکھی ہونا فطری امر تھا۔

یہ سوال اٹھا ہی نہیں تھا کہ اب وہ کہاں جائے گی۔ طے کرلیا گیا تھا کہ اب وہ یہیں رہے گی۔ لیکن ثریا کو بھی حالات سے سمجھوتا کرنے میں بہت دن لگے۔ پہلے دو دن اس نے زبردستی کے باوجود کھانا نہیں کھایا لیکن وہ کب تک

روتی اور کہاں تک سوگ مناتی۔ وہ بار بار کہتی تھی کہ مجھے اس بن باپ کے بچے کے لیے جینا ہی پڑے گا۔ ماں بھی نہ رہی تو اس کا کیا بنے گا۔ اس کو صبر و ہمت کے ساتھ جینے اور حالات کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ دینے کی ساری کوشش خواتین نے مل کر کی۔ اس میں ہم مردوں کے کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔

انسان بڑی سخت جان چیز ہے۔ زندگی سے اس کا پیار دیکھنا ہو تو فٹ پاتھوں پر پڑے مفلوج و معذور بدہیت اور نامکمل جسموں کو دیکھیے۔ وہ بھی زندگی سے چمٹے رہنا چاہتے ہیں۔ وہ بھی زندہ رہتے ہیں جن سے زندگی کا واحد سہارا کسی حادثے میں چھوٹ جاتا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ جیسے خرم کی بے وفائی کے جرم کو رابعہ نے بھلا دیا۔ جیسے فاروقی سے الگ ہو کے لیلیٰ بھابی نے ایک نئی دنیا بسالی۔ ایسے ہی ثریا بھی اس صدمے سے جانبر ہو کے زندگی کے راستے پر آگے چل پڑے گی۔ اس کا بچہ ابھی کچھ سمجھتا ہی نہیں تھا۔

اس واقعے کے دوسرے دن کا سورج غروب ہونے کے بعد حویلی کے اندر آنے والا جذبات کا طوفان تقریباً تھم چکا تھا۔ راجا اور میں باغ میں ٹہلتے ہوئے کافی پی رہے تھے۔ ہمارے ارد گرد بطخیں، مور اور ہرن پھر رہے تھے۔ یہ پالتو جانور ہم سے اتنے مانوس تھے کہ ہماری موجودگی سے بے نیاز رہتے تھے اور کبھی بچوں کی طرح ہمارے پاس آ کے توجہ اور پیار مانگتے تھے۔ یہ غنی کے لائے ہوئے دو مالی تھے جنہوں نے دن رات ایک کر کے اس ویرانے کو بہار عطا کی تھی جہاں نصف صدی سے بھی زیادہ عرصہ خانہ ویرانی کا راج تھا اور یہ باغ ایک اجاڑ دشت بن کر رہ گیا تھا جس میں سانپ اور نیولے جیسے جنگلی جانوروں نے ڈیرا ڈال رکھا تھا۔ اب یہاں سبزے کا فرش تھا۔ خوش رنگ پھولوں کے تختے تھے سرسبز درخت تھے اور درمیان میں فوارہ چلتا تھا۔ پالتو جانور بھی غنی نے ذاتی دلچسپی سے اکٹھے کیے تھے۔

موضوع اب نہ شہزاد کی ہوسناک کمینگی تھی اور نہ ثریا کی مظلومیت یا اس کے بچے کا مستقبل۔ مسئلہ رابعہ کا تھا۔ جب خرم اسے چھوڑ گیا تھا تو جذباتی طور پر وہ اتنی کمزور ثابت ہوئی تھی کہ اس نے شدید مایوسی کے عالم میں خود اپنی جان لینے کی کوشش بھی کی تھی۔ حیرت انگیز طور پر اس مرتبہ شہزاد کی فریب کاری کا اثر بالکل الٹا ہوا تھا۔ یہی میرے لیے بھی تشویش کی بات تھی۔

راجا نے مجھے بتایا۔”وہ تو شہزاد کا نام سننا بھی نہیں چاہتی۔ میں نے صرف اتنا کہا تھا کہ شہزاد کو اس کے کیے کی سزا ضرور دوں گا۔ رابعہ بگڑ گئی کہ راجا صاحب۔ آپ کا جو دل چاہے کریں مگر میرے سامنے شہزاد کی کوئی بات نہ کریں۔“

میں نے کہا۔”زخم خوردہ ناگن اور عورت دونوں شدید انتقامی ردعمل کا شکار ہوتی ہیں۔“

”یار ایسا ہی ہوتا تو ہم اسے نارمل سمجھتے۔“

”ابھی چند روز پہلے اس نے مجھ سے بھی بڑی عجیب بات کی تھی۔“

”اس نے کہا تھا کہ زوہیب کا رشتہ منظور کرلیا جائے۔ تو نے بتایا تھا مجھے۔ اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ پاگل ہوگئی ہے۔“

”راجا ایک اور بات بھی کہی تھی اس نے۔ اس سے مجھے شک ہوتا ہے کہ دیوانہ بکار خویش ہوشیار والی بات بھی غلط نہیں۔ اس نے کہا تھا کہ یہاں میرے پاس کون سی چھپن کروڑ کی جو تھائی ہے جو وہ چھین لے گا۔ یوسی۔ اس کو احساس ہے کہ حویلی میں اس کا کچھ نہیں۔ نہ جاگیر نہ جائداد۔ وہ اتنی ہی کم مایہ ہے جتنے حویلی کے دیگر ملازم۔ شاید اس نے مجھے یہ احساس دلانے کی کوشش کی تھی کہ میں اسے بہن مانتا ہوں تو بہن کا حق بھی دوں۔ حیثیت بھی دوں۔“

راجا رک گیا۔”یو آر ویری رائٹ ٹھیکے پتر۔“

میں نے اپنی بات جاری رکھی۔”ایک ناانصافی کا احساس اس کے دل کی گہرائی میں موجود ہے۔ جس نے بھی مجھے اس جاگیر جائداد کا مالک بنا دیا۔ قانونی طور پر اس نے کچھ غلط نہیں کیا۔ اخلاقی طور پر دوسرے وارثوں کے ساتھ زیادتی کی۔“

”رابعہ کی ماں نے تو کھل کر زہر اگلا تھا۔“

”صدمہ چچا کو بھی تھا۔ ان کی موت چاہے حادثاتی قرار دی گئی ہو۔ لیکن کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ بالواسطہ طور پر یہی احساس محرومی تھا جس نے ان کی ناگہانی موت کے اسباب پیدا کیے۔“

”رابعہ ایسا سمجھ سکتی ہے۔“

”لیکن اس نے کبھی ظاہر نہیں کیا تھا۔ تو یہ خط پڑھ لے۔“ میں نے جیب میں سے اباجی کا آخری خط نکال کے اس کی طرف بڑھایا جسے ان کا وصیت نامہ بھی کہا جاسکتا تھا۔

راجا نے اسے سرچ لائٹ کے رخ کر کے پڑھا۔ شاید دو بار پڑھا اور مجھے واپس کر دیا۔”ہوں۔“ وہ کچھ دیر بعد بولا۔

ہم ساتھ چلتے ہوئے گفتگو کر رہے تھے۔”ہوں کیا...... سمجھ شریف میں کیا آیا؟“

راجا بولا۔”اباجی چاہتے تھے کہ رابعہ کو جائداد یا جاگیر میں حصے دار بنایا جائے۔“

”ہاں...... البتہ حصہ کتنا ہو یہ انہوں نے مجھ پر چھوڑ دیا تھا۔“

راجا بولا۔ ’’انہوں نے یہ نہیں لکھا تھا کہ تجھے ایسا کرنا چاہیے اور اگر تو نے ایسا کیا فیکے پتر.. خصوصاً موجودہ حالات میں تو یہ بہت بڑی بے وقوفی ہوگی۔ کوئی پاگل ہی اس شاخ کو کاٹے گا جس پر وہ خود بیٹھا ہو۔‘‘

’’تو نے حالات کی بات کی۔ میں بھی حالات پر غور کرتا ہوں تو ایسا کرنا غلط لگتا ہے۔ لیکن دوسری طرف شرمندگی محسوس ہوتی ہے کہ میں نے ابا جی کی آخری خواہش پوری نہ کی تو......‘‘

راجا نے میری بات کاٹ دی۔ ’’تو کیا ہوگا۔ روزِ محشر وہ دامن گیر ہوں گے کہ ناخلف بیٹے......تو نے میرا کہا کیوں نہیں مانا۔ ان کی روح دکھی ہوگی۔ تو ایسا کچھ نہیں ہوگا۔‘‘

’’سوچتا میں بھی یہی ہوں۔‘‘

’’دیکھو۔ جب ابا جی نے یہ لکھا تھا تو رابعہ کا مستقبل شہزاد کے ساتھ نظر آتا تھا۔ اسی لیے انہوں نے سوچا ہوگا کہ رابعہ بھی ایک مضبوط حیثیت کی مالک ہو۔ وہ صرف کہنے کو کسی نواب کی بہن نہ ہو اور میں ان کی سوچ کو بالکل درست سمجھتا ہوں۔ لیکن انہیں اگر آج کے حالات کا علم ہوتا۔ یہ پتا چلتا کہ رانا صاحب نے رابعہ کے کندھے پر رکھ کے بندوق چلانے کی پلاننگ کی ہے اور زوہیب کے لیے رابعہ کا رشتہ مانگا ہے تو کیا وہ ایسا کہتے؟‘‘

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ’’اگر میں بھی ایسا چاہتا تو خود مجھے روک دیتے۔‘‘

’’بالکل ٹھیک۔ ایسا تو سوچنا بھی مت فیکے پتر۔‘‘

’’مجھے تو ایسا لگا۔ جیسے ابا جی کے ذہن میں یہ بات بھی رابعہ نے ڈالی ہوگی۔ براہِ راست نہ سہی۔ بالواسطہ طور پر ان کے سامنے ایسی ہی کسی بات سے اپنی محرومی کا اظہار کیا ہوگا۔‘‘

’’اسے جانے دے کہ رابعہ نے ان کے ذریعے اپنے دل کی بات تجھے پہنچائی۔ یہ سوچ کہ اگر اس نے براہِ راست مطالبہ کر دیا پھر کیا ہوگا؟‘‘

’’مجھے لگتا ہے کہ وہ ایسا کرے گی۔ آخر زوہیب کا رشتہ منظور کرنے کا مطالبہ وہ کس لیے کر رہی ہے؟ مجھے احساس دلانے کے لیے کہ تم نہ دو مگر زوہیب رانا نگر کا وارث ہے۔ میں اس کی بیوی بن کے وہ سب کچھ حاصل کر سکتی ہوں جو تمہارے رشتے سے مجھے نہیں ملا اور اس نے باقاعدہ دھمکی دے دی ہے کہ میں عاقل و بالغ ہوں۔ خود فیصلہ کر سکتی ہوں۔‘‘

’’اگر اس نے اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی تو آپ کیا کریں گے نواب رفیق احمد شیرازی؟‘‘

میں نے فرضی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔ ’’راجا صاحب۔ پھر ہم ایک روایتی نواب کے انداز میں کہیں گے۔ بلکہ مغلِ اعظم کے پرتھوی راج کی آواز بنا کے فرمائیں گے۔ نادان شہزادی۔ جلال اکبری کو مت للکارو۔ ہمارے جیتے جی ایسا نہیں ہوگا۔ ایسا نہ ہو کہ روزِ حشر جب صور پھونکا جائے تو اس بدبخت زوہیب کو مغل سلطنت کے کسی گمنام گوشے میں زمین کی سات تہوں کی گہرائی سے نکل کر آنا بھی دشوار ہو جائے۔‘‘

راجا ہنسنے لگا۔ ’’شیکسپیر نے ٹھیک کہا تھا۔ ہم سب ایکٹر ہیں۔‘‘

گیٹ سے ایک گاڑی اندر آئی اور اس میں سے مسٹر عبدالغنی بڑے جوش سے اتر کے ہماری طرف آئے۔ ’’سر! میں دونوں کو لے آیا ہوں۔‘‘

راجا نے کہا۔ ’’یار کون دونوں؟ ہم نے تو ایک بھی نہیں منگوائی تھی۔‘‘

غنی مسکرانے لگا۔ ’’میں دونوں سراغرساں کتے چرا لایا ہوں۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’آفرین ہے تم پر۔ یہاں تم چیف سیکیورٹی افسر ہو اور ادھر کتے چراتے ہو؟‘‘

راجا نے کہا۔ ’’کہاں ہیں وہ کتے۔ تمہاری جیب میں؟‘‘

غنی نے گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔ ’’دونوں اس میں پڑے ہیں۔‘‘

’’کیا مطلب پڑے ہیں۔ زندہ یا مردہ؟‘‘ ہم نے گاڑی کا رخ کیا۔

’’ہوش میں نہیں ہیں سر ورنہ قابو آتے؟‘‘ غنی نے کہا۔

دو کتے گاڑی کی ڈکی میں ساکت و صامت پڑے تھے۔ وہ اچھے خاصے صحت مند اور لارج سائز کتے تھے۔ ہنڈا سوک کی ڈکی اتنی بڑی نہ ہوتی تو شاید وہ مشکل سے آتے۔ ان دونوں کا رنگ اندھیرے میں پتا نہ چلتا مگر ڈکی کھولنے سے اندر لائٹ جل گئی تھی۔ وہ گہرے رنگ کے چھوٹے بالوں والے کتے تھے۔ چونکہ مجھے کتوں سے کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی اس لیے میں ان کی نسلی صفات کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ غنی نے بتایا تھا کہ یہ سراغرساں کتے ہیں جو بو سے منشیات اور اسلحے وغیرہ کا پتا چلا سکتے ہیں۔

میں نے کہا۔ ’’غنی۔ تمہیں ہلال راہزنی بعد میں دیا جائے گا پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے یہ خطرناک کارنامہ اکیلے کیسے سرانجام دیا؟‘‘

’’میں نے آپ کو بتایا تھا۔ ایکسائز ڈیپارٹمنٹ کا ایک افسر ہے۔ میں کافی عرصہ اس کا ڈرائیور رہا۔ یہ کتے اس کو محکمے کی طرف سے دیے گئے تھے کہ وہ خیبر ایجنسی کی طرف کسی

پوسٹ پر اسمگلنگ کے حوالے سے سراغ لگانے کے استعمال کرے۔ وہاں سے ہر چیز جاتی ہے۔ اسے فرض ...ن کا مرض لاحق ہوتا تو وہاں پوسٹ ہی نہ کیا جاتا۔‘‘

راجا نے اس سے اتفاق کیا۔ ’’وہاں اسمگلر اپنے ...ے لگواتے ہیں۔ جیسے ڈاکو اپنے علاقے میں اپنی مرضی ... افسر پوسٹ کراتے ہیں۔‘‘

’’وہ گھر بیٹھے لاکھوں کماتا تھا۔ اصل کتے وہ گھر لے گیا ...ان کی جگہ عام کتے استعمال ہونے لگے تھے جو سونگھ ...بھی نہیں بتا سکتے تھے کہ اندر فلمی ہیروئین ہے یا پاؤڈر ...یا ہیروئن۔ وہ کتے ہر ٹرک یا گاڑی کو خوب سونگھتے تھے ...سٹم حکام سے کلیئرنس مل جاتی تھی۔ اصل کتے مجھ سے ...ل گئے تھے۔‘‘

راجا نے کہا۔ ’’مل گئے تھے یا تم نے ہلا لیے تھے۔‘‘

غنی ہنس پڑا۔ ’’سچی بات تو یہ ہے سر......کہ میری نیت ...ع سے خراب تھی۔ میں انہیں چوری کر کے بیچ دیتا۔ ...وں ملتے۔‘‘

راجا بولا۔ ’’ہم سے تم کیا لو گے؟ سودا کرو۔‘‘

غنی نے خفت سے کہا۔ ’’آپ مجھے شرمندہ کر رہے ...ہیں سر۔ میرے کہنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔‘‘

’’چلو غنی۔ ان کو لے جاؤ۔ ان کو کہاں رکھنا ہے، کیسے رکھنا ...ہے یہ تمہارا مسئلہ ہے۔‘‘ میں نے اس کے شانے پر تھپکی دی۔

غنی کی اس چوری نے حویلی میں خاصی سنسنی پیدا کر دی ...تھی۔ ہوش میں آنے کے بعد کتوں نے غرانا اور بھونکنا شروع ...کیا تو ان کی آواز ہر جگہ سنی گئی۔ تھوڑے بہت خوف کا اظہار ...سب نے کیا۔ کتا اچھا خاصا شریف اور وفادار پالتو جانور شمار ...ہوتا ہے لیکن اکثر لوگوں کے دل میں یہ خوف رہتا ہے کہ کتا ...آخر تو کتا ہے۔ جیسے سانپ۔ کیا پتا کب کاٹ لے۔ خود میں ...بھی کتے سے ایک محتاط فاصلہ رکھنا اپنی ٹانگ کی سلامتی کے ...لیے ضروری سمجھتا ہوں۔

سب سے برا حال ریشم کا تھا۔ کتے سرونٹ کوارٹر کی ...طرف ایک خالی حصے میں رکھے گئے تھے۔ میں انتظامات کا ...جائزہ لینے گیا تو ریشم کی اپنے میاں سے جھڑپ چل رہی تھی ...ہم نے باہر رک کر ان کی گفتگو سنی۔

’’کیا مطلب ہے آخر اس بات کا، کیا اب یہ یہیں ...رہیں گے؟‘‘

غنی نے کہا۔ ’’تجھے کیا انگریزی میں سمجھاؤں؟ ایسی ...کون سی مشکل بات کہہ دی ہے میں نے۔ بھئی جیسے تو رہتی ...ہے ویسے ہی......‘‘

ریشم نے چلّا کے کہا۔ ’’کیا تو مجھے ان کتوں سے ملا رہا ہے؟‘‘

غنی ہنس پڑا۔ ’’ہے نا الٹی کھوپڑی۔ ارے تو بلبل ہے۔ یہ کتے ہیں۔ تجھے بس ان کا خیال رکھنا ہے۔ انہیں نہلانا دھلانا اور کھانا دینا۔‘‘

’’سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ کتے نہیں آدم خور جانور ہیں۔ کسی روز مجھے کھا جائیں گے۔‘‘

’’انشاءاللہ۔‘‘ غنی نے کہا۔ ’’میرا مطلب ہے اگر اللہ نے چاہا تو ورنہ کچھ نہیں ہوگا۔ یہ بڑے معصوم اور بے ضرر ہیں۔‘‘

’’نہیں غنی۔ یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔ کسی دن تو آ کے دیکھے گا کہ تیری بلبل ان کے پیٹ میں ہوگی اور بلبل کی روح بھٹک رہی ہوگی حویلی میں چمگادڑ کی طرح۔ میرا خون تیری گردن پر ہوگا۔‘‘

’’یہ کیا بات ہوئی تجھے کھائے کتا اور خون میری گردن پر۔‘‘ غنی نے اسے چھیڑنے کے لیے کہا۔

’’مجھے پتا ہے تو ان کو اسی لیے لایا ہے۔ مگر میں نے بھی ان کو زہر نہ دیا تو میرا نام ریشم نہیں۔ میں یہ کام ہرگز نہیں کروں گی۔‘‘

’’تیرا تو باپ بھی کرے گا۔‘‘ غنی نے کہا۔

’’ہاں باپ سے کرا لے اگر کرا سکتا ہے۔ میں نے کہہ دیا مجھ سے نہیں ہوگا۔‘‘

غنی نے پیار سے کہا۔ ’’ریشم! آخر اپنے بچوں کا بھی تو خیال رکھے گی تو......‘‘

’’کیا؟ تو...... تو میرے بچوں کو۔ کتے کے بچوں کو برابر سمجھتا ہے۔ دماغ چل گیا ہے تیرا؟‘‘ ریشم چلانے لگی۔

میں نے اندر جا کر یہ جھگڑا ختم کیا۔ ’’غنی! کتوں کی دیکھ بھال کے لیے کوئی ملازم رکھ لو۔ ریشم کو کیوں مجبور کرتے ہو۔ دن میں یہ شہباز کے ساتھ ہوتی ہے۔ پھر گھر میں بھی ماں کا ہاتھ بٹاتی ہے۔‘‘

ریشم نے میری طرف شکرگزاری اور غنی کی طرف فاتحانہ نظروں سے دیکھا اور باہر نکل گئی۔ میں نے غنی کو مزید ہدایات دیں کہ جب تک کتے حویلی میں رہنے والوں سے مانوس نہیں ہو جاتے، وہ ان کو کھلا نہ چھوڑے۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ ایسا ہی ہوگا اور کچھ دن بعد یہی کتے حویلی کی حفاظت کریں گے۔

اگلے دن میں نے ایک اخبار کے اندرونی صفحے پر چھوٹی سی خبر دیکھی کہ پنجابی فلمیں بنانے والے ایک فلمساز چودھری سلطان کی پراسرار گمشدگی کے سلسلے میں پولیس نے فلم اسٹار فریال کو پوچھ گچھ کے لیے طلب کیا تھا لیکن انہوں نے مقامی

عدالت سے ضمانت قبل از گرفتاری حاصل کرلی ہے۔ پولیس کے ذرائع نے بتایا کہ وہ اپنی تفتیش کا دائرہ مزید وسیع کرنے پر غور کررہی ہے۔

میں اندازہ کرسکتا تھا کہ تفتیش کا دائرہ کہاں تک وسیع ہوسکتا ہے۔ ابھی تو میں نے پولیس کو ٹال دیا تھا لیکن یہ معاملہ اتنی آسانی سے ختم ہونے والا بہرحال نہیں تھا۔ جب اوپر سے دباؤ آئے گا تو کوئی خصوصی تفتیشی ٹیم بنادی جائے گی اور وہ پھرست بدھائی آدھمکے گی۔

میرے اندازے کے مطابق اگر چودھری سلطان کا قتل واقعی ہوچکا تھا تو اس میں دو ہی افراد ملوث ہوسکتے تھے۔ اگر یہ رانا کی سازش تھی جس کا مقصد مجھے قتل کے شبہے میں گرفتار کرانا تھا۔ کیونکہ میں چودھری سلطان سے ذاتی پرخاش رکھتا تھا اور ہم رقابت کے باعث پرانے دشمن تھے۔ تو مجھے فوری طور پر اپنے دفاع کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔

اگر چودھری سلطان کو خود فریال نے اپنی جان چھڑانے کے لیے قتل کیا ہے تو مجھے فریال کی فکر کرنی چاہیے۔ اس نے حویلی میں وکالت نامے پر سائن کرکے شہزاد کو اپنا وکیل مقرر کردیا تھا جو اب ہرگز اعتماد کے قابل نہیں رہا تھا۔

سہ پہر کے بعد غنی مجھے اور راجا کو اپنے ساتھ لے گیا۔ اس وقت تک کتے پوری طرح مستعد ہوچکے تھے۔ بلاشبہ وہ غنی سے بہت زیادہ مانوس تھے اور اس کے اشاروں پر چلتے تھے۔ میرے منع کرنے کے باوجود غنی نے ان کے پٹے کھول دیے اور انہیں باغ میں لے آیا۔ وہاں اس نے کتوں پر اپنے کنٹرول کا پورا مظاہرہ کیا۔ ظاہر ہے ان کے درمیان حاکم و محکوم کا رشتہ نیا نہیں تھا۔ غنی جو حکم دیتا تھا وہ اس کی تعمیل کرتے تھے۔

اس مظاہرے نے مجھے کافی متاثر کیا۔ خواتین پہلے تو دور برآمدے میں کھڑی تھیں پھر میرے اصرار اور غنی کے اطمینان دلانے پر وہ آہستہ آہستہ آگے آئیں اور کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔ ان میں ثریا بھی شامل تھی۔ اس کا ڈھائی سالہ بچہ گل ابھی خوف نام کی کسی چیز سے واقف نہ تھا۔ وہ کتوں کے کھیل سے بہت خوش ہوا۔ غنی نے اسے گیند دی۔ "یہ لو......تم پھینکو......"

گل نے گیند پھینکی۔ غنی نے ایک کتے کو اشارہ کیا۔ وہ لپکا اور گیند لا کے گل کے قریب ڈال دی۔ ریشم کچھ دیر چائے کی ٹرے لیے دور کھڑی رہی اور غنی کو آوازیں دیتی رہی کہ آکر لے جائے۔ پھر غنی نے کہا۔ "دیکھتی نہیں میں کام کررہا ہوں اور مری کیوں جاتی ہے۔ دیکھ اتنا چھوٹا سا بچہ کیسے کھیل رہا ہے۔"

ریشم کو مجبوراً آنا پڑا۔ اس کے برعکس ثریا نے کو سے کسی قسم کے خوف کا مظاہرہ نہیں کیا تھا بلکہ اپنے بچے کو ان کے قریب جانے سے بالکل نہیں روکا تھا۔ اس نے دیکھا تھا کہ کتے غنی کا حکم مانتے ہیں پھر بھی مجھے ڈر تھا کہ غنی اگر کوئی شرارت کی یا ویسے ہی ریشم کو شک ہو کہ کتے اس طرف لپک رہے ہیں تو وہ ٹرے چھوڑ کر چیخ مار کے الٹے پاؤں بھاگ لے گی۔

خدا کا شکر ہے کہ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ریشم چائے کی ٹرے چھوڑ کر الٹے پاؤں چلی گئی۔ اس نے غنی کی یہ درخواست بالکل قبول نہیں کی کہ وہ بھی آکے کتوں کے ساتھ دوستی کرے۔ اس نے بڑی متانت سے انگریزی میں فرمایا۔ "یو ڈاگ لَو انسان ہاؤ" جس کا ترجمہ تو یہ ہوتا تھا کہ کتے ہو انسانوں سے کیسے محبت کرسکتے ہو؟ کہنا وہ چاہتی تھی "تم کتوں سے محبت کرسکتے ہو انسانوں سے نہیں۔"

میں نے غنی سے پوچھا۔ "یہ تم کس نام سے پکار رہے ہو ان کتوں کو۔ شیرا اور بہادر تو سمجھ میں آتا ہے۔ آگے کیا ہے؟"

غنی نے کہا۔ "ایک کا پورا نام ہے شیر شاہ۔ دوسرا بہادر شاہ۔ جس انگریز نے ان کو پالا اور سدھایا تھا اسی نے یہی نام رکھے تھے۔"

میں نے خفگی سے کہا۔ "تمہیں معلوم ہے یہ کس کے نام ہیں؟ شیر شاہ سوری وہ شہنشاہ تھا جس نے یہ روہتاس کا قلعہ بنوایا۔ لیکن اس کا سب سے بڑا کارنامہ جرنیلی سڑک تھی جسے ہم آج بھی گرینڈ ٹرنک روڈ کے نام سے جانتے ہیں۔ یہ سڑک پشاور سے کلکتہ تک جاتی تھی۔ سوچو ذرا اس دور میں کتنا عظیم کام تھا۔"

غنی نے سر کھجایا۔ "آپ جی ٹی روڈ کی بات کررہے ہیں۔ جو لاہور سے پشاور تک ہے؟"

"بالکل اسی کی بات کررہا ہوں اور بہادر شاہ کون تھا بہادر شاہ ظفر۔ جس سے انگریزوں نے حکومت چھینی اور معزول کرکے رنگون میں بند کردیا تھا اور پھر اس کا وہیں انتقال ہوگیا۔ آج بھی اس کا مزار برما کے شہر رنگون میں ہے۔"

غنی نے میری بات آگے بڑھائی۔ "انگریز جان بوجھ کے مسلمانوں کو ذلیل کرنے کے لیے کتوں کے ایسے نام رکھتے تھے۔ میں نے کتوں کے نام اکبر اور بابر تک سنے ہیں۔"

"ذرا سوچو کہ ہم کتوں کے نام چارلس اور ولیم رکھیں جو موجودہ برطانوی شہزادے ہیں، تو کیا برطانوی حکومت باقاعدہ احتجاج نہیں کرے گی۔"

غنی نے کہا۔ "انہوں نے بیروں اور چپراسیوں کی وردی کیا بنائی تھی۔ تقریباً ویسی ہی جیسا لباس مسلمان شہنشاہ پہنتے تھے۔ وی آئی پی قسم کے حاکموں کے خاص چپراسی تو سنہرا پٹکا اور سنہرے پھندنے والی تاج جیسی پگڑی آج بھی استعمال کرتے ہیں۔"

"ان کو نئے نام سے تربیت دینی پڑے گی مگر میں کرلوں گا۔" غنی نے کہا۔

سوچے سمجھے بغیر رابعہ بولی۔ "ایک کا نام رکھ دو زرم۔ دوسرے کا شہزاد۔ بے عزتی اگر ہے تو کتوں کی۔"

ثریا کا رنگ اڑ گیا۔ "گل کے باپ کو کتا تو نہ کہیں جی۔"

میں نے رابعہ کو ڈانٹا۔ "سوچے سمجھے بغیر نہ بولا کرو۔"

وہ برا مان کے اٹھ گئی۔ "پھر رکھ دو بش اور کلنٹن۔"

ان کے نام بڑے سوچ بچار کے بعد "آن" اور "بان" رکھے گئے۔ شان اس لیے مسترد کیا گیا کہ وہ ہمارا ایک قابلِ فخر ہیرو ہے۔ آن اور بان کے نئے ناموں سے مانوس ہونے میں کتوں کو مہینا بھر لگ گیا لیکن گھر کے وہی افراد جو ان سے خوف کھاتے تھے، چند دن میں ان سے اتنے فری ہوگئے کہ خود ریشم ان کو اپنی انگریزی میں حکم دینے لگی۔ اور کمال یہ کہ وہ اس کو سمجھنے بھی لگے۔ تاہم یہ بعد کی باتیں ہیں۔

اگلے دن راجا نے مجھے مطلع کیا۔ "فریال کا نام ایف آئی آر میں ڈال دیا گیا ہے۔"

"کس الزام میں؟"

"ظاہر ہے۔ چودھری سلطان کے قتل کے شبہے میں۔"

میں نے کہا۔ "یعنی پولیس نے مان لیا ہے کہ اس کو اغوا نہیں کیا گیا اور نہ وہ اپنی مرضی سے روپوش نہیں ہے بلکہ اسے قتل کردیا گیا ہے۔"

"دیکھو فنکے پتر۔ یہ سب بحث عدالت میں وکیل کرسکتے ہیں۔ پولیس تفتیش کے لیے شک میں جسے چاہے پکڑ سکتی ہے۔ یہاں ایسا ہوتا ہے۔ غریب لاوارث کئی کئی دن تک ٹارچر برداشت کرتے ہیں۔ کچھ نہ پتا ہوگا تو چھوڑ دیتے ہیں کہ جاؤ۔ شکر ادا کرو کہ تم پر جرم ثابت نہیں ہوا اور تم پھانسی سے بچ گئے۔ لوگ مرجاتے ہیں تشدد سے۔ یہاں بے سبب گرفتاری اور ٹارچر کے خلاف پولیس کے خلاف ہرجانے کا کیس کوئی نہیں کرتا۔ حالانکہ قانون موجود ہے۔"

"تو کیا چاہتا ہے۔ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" میں نے کہا۔

وہ بولا۔ "سب سے پہلے تو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ ہم غریب لاوارث نہیں ہیں۔ فوری طور پر تجھے ضمانت قبل از گرفتاری کی درخواست دائر کردینی چاہیے۔ میں سمجھتا ہوں وہ منظور ہوجائے گی۔ اس کے بعد ہمیں اپنے طور پر چودھری سلطان کو تلاش کرنا چاہیے۔ خود اپنی بچت کے لیے...زندہ یا مردہ۔ آخر وہ ہے کہاں؟"

راجا کا مشورہ بے حد مبنی برحقیقت تھا۔ یہ معاملہ گجرات سے تعلق رکھتا تھا لیکن میری گرفتاری جہلم سے ہوتی تو مقامی پولیس آتی یا پھر گجرات سے کوئی خصوصی پولیس ٹیم اس پر مامور کی جاتی۔ راجا کے ساتھ میں فوراً گجرات روانہ ہوگیا۔ ہماری گاڑی کو خود غنی نے ڈرائیو کیا اور ایک مسلح گارڈ اس کے ساتھ بیٹھا۔ شیر خاں ہائی لکس کے ساتھ پیچھے رہا۔ ایک گارڈ اس کے ساتھ تھا۔ دو پچھلے حصے میں مستعد بیٹھے تھے۔

ہم نے گجرات کے ایک نامور وکیل کی خدمات حاصل کرلیں کیونکہ ہم فوری طور پر ماجد خاں کو لاہور سے نہیں طلب کرسکتے تھے۔ شہزاد وہ وکیل تھا جو قانونی معاملات یا فوری مدد کے لیے ہر وقت دستیاب ہوتا تھا مگر فاروقی کی طرح اس نے بھی ہمارے اعتماد کو دھوکا دیا تھا۔ فی الحال ہم کسی کو بھی مستقل بنیادوں پر اپنا قانونی مشیر رکھنے کا نہیں سوچ رہے تھے۔

میری ضمانت قبل از گرفتاری کی درخواست دوپہر ایک بجے سے پہلے تیار ہوگئی اور سیشن کورٹ میں پیش کردی گئی۔ ہم نے اپنے وکیل کو اس بات کا پورا اختیار دے دیا تھا کہ عدالت کے یا پولیس کے جس اہلکار سے کام لینا ہو اسے رشوت کے معاملے میں ہماری طرف سے کھلی چھٹی ہے۔ بس کام ہونا چاہیے۔ پیسا غیر اہم ہے۔

سیشن کورٹ سے مدعا علیہ کو اگلے دن کے لیے نوٹس جاری کردیے گئے اور ہمارے وکیل نے بڑی رازداری سے ہمیں بتایا کہ نوٹس کی تعمیل میں کوئی آئے نہ آئے، ہم صبح ٹھیک نو بجے عدالت میں ضرور پیش ہوں۔ ضمانت قبل از گرفتاری ہوجائے گی۔ کل خرچ تقریباً دو لاکھ۔ جب..... ہم چلنے لگے تو اس نے مسکرا کے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ "جج صاحب کی گھڑی دس منٹ آگے ہے۔ اس کا خاصا خیال رکھنا۔"

اس وقت یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ راجا نے بھی شاید اس پر غور نہیں کیا۔ کچہری کے احاطے میں اپنی گاڑی تک جاتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ آخر سیشن جج صاحب اپنی گھڑی دس منٹ آگے کیوں رکھتے ہیں؟ کیا انہیں دوسروں سے پہلے عدالت میں اپنی کرسی پر رونق افروز ہونے کا شوق ہے؟ عدالتی اہلکاروں کے بارے میں عام شکایت اس کے برعکس یہ ہے کہ وہاں سب تاخیر سے آتے ہیں۔ ہمارے جج صاحب کیا دس منٹ پہلے آکے دوسرے ماتحتوں کو

مجبور کرتے ہیں کہ وہ بھی کم سے کم پانچ منٹ پہلے آئیں تا کہ عدالت کی کارروائی ایک منٹ ضائع کیے بغیر ٹھیک نو بجے شروع ہو سکے۔

اب تین بج رہے تھے اور بھوک سے سب کا برا حال تھا۔ ہم دریائے چناب کے کنارے ایک بڑے خوش منظر اور مشہور ہوٹل میں گئے۔ کھانا ہم سب نے ایک ہی جیسا اور ایک ہی ہال میں بیٹھ کے کھایا لیکن راجا اور میں الگ میز پر کچھ دور بیٹھے۔

مینو کا مطالعہ فرماتے ہوئے میں نے پوچھا۔ ''اپنے راجا صاحب۔ آخر یہ کیا شوق ہے جج صاحب کو گھڑی دس منٹ آگے رکھنے کا۔''

راجا کی نظر ایک طرح دار حسینہ پر تھی جس کا جسم لباس کے ہوتے ہوئے بھی بے لباس لگ رہا تھا۔ ''اسے ایسا کوئی شوق نہیں۔''

''مگر وکیل نے کہا تھا۔''

''ویکھے پتر۔ ہم نے دو لاکھ رشوت دی ہے۔ اس میں سے ایک لاکھ یعنی شیئر کا حصہ کون وصول کرے گا؟ وہی جج۔ ایک لاکھ کوئی مجھے دے تو میں اپنی گھڑی ایک گھنٹا آگے کرلوں۔ صرف ایک دن کے لیے۔''

بات ایک دم میری سمجھ میں آگئی۔ ''یعنی کل اس کے ماتحت عدالتی اہلکاروں کی گھڑی میں بھی دس منٹ پہلے ہی نو بج جائیں گے۔''

''ظاہر ہے۔ قیمت تو سب نے وصول کی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''میں اپنی گھڑی ابھی سے دس منٹ آگے کر لیتا ہوں۔''

راجا ہنسا۔ ''میں پہلے ہی کر چکا ہوں۔''

جب ہم کھانے سے فارغ ہوئے تو غنی میرے پاس آیا۔ ''سر! ایک مسئلہ ہو گیا ہے گاڑی میں۔''

میں نے کہا۔ ''اسے ٹھیک کرالو۔ گجرات میں ایک سے بڑھ کر ایک ورکشاپ ہے۔''

''ہم شیر خان کی گاڑی میں چلے جاتے ہیں۔'' راجا نے کہا۔

''نہیں سر۔ میرا مشورہ ہے کہ آج رات آپ اسی ہوٹل میں گزار لیں۔ دیکھیں نا۔ پانچ تو بج رہے ہیں۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں رات ہو جائے گی۔ صبح ہمیں پھر جلدی آنا ہے۔''

راجا نے کہا۔ ''گرچہ چھوٹی ہے ذات بکری کی۔ دل کو لگتی ہے بات بکری کی۔''

میں نے کہا۔ ''تم کتنی دیر میں واپس آؤ گے؟''

''پتا نہیں سر۔ گھنٹا دو گھنٹا لگ جائے۔ یا زیادہ۔ گاڑی دکھاؤں گا کسی اچھی ورکشاپ میں۔ وہ کتنا ٹائم لگاتے ہیں

''او۔کے! تم جاؤ۔ حویلی میں بتا دو کہ ہم صبح ہی آ گے۔ ہم نے تمہاری تجویز کو شرف قبولیت بخشا۔''

''شیر خاں یہیں رہے گا۔ آپ کے ساتھ۔'' غنی نے جاتے جاتے کہا۔ ''کمرے میں بک کرا دیتا ہوں۔''

رات تک ہم نے ہیر کے گجرات کی سیر کی۔ سمجھا جانے والا یہ شہر اتنا چھوٹا بھی نہیں بلکہ صنعتی اعتبار سے بہت بڑا ہے۔ گجرات کی کون سی صنعتی پیداوار ہے جو عالمی شہرت نہیں۔ گجرات کے پنکھے۔ گجرات کا فرنیچر یعنی کراکری۔ جوتے اور چمڑے کی مصنوعات، ہر چیز میں کوالٹی کا عالمی معیار۔ یہ یہاں انڈسٹری بھی ہے کاٹیج انڈسٹری بھی۔ شیر خاں کا ایک رشتے دار گجرات میں برسوں سے تھا۔ وہ شیر خاں کے طلب کرتے ہی اپنائیت سے فوراً حاضر ہوا اور اس نے چند گھنٹے میں گجرات ایسے دکھایا کہ ہم خود کوشش کرتے تو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ وہ ایک ایسا میزبان ثابت ہوا جس کے جذبہ مہمان نوازی کے آگے ہماری ایک نہیں چلی۔

رات گئے ہم ہوٹل واپس پہنچے تو جتنے تھکے ہوئے تھے اس سے زیادہ ریفریش ہو گئے تھے۔ روز مرہ کی تمام والی مصروفیات سمیٹ کر یہ ایک بالکل نئی قسم کی تفریح تھی۔ ہمارے میزبان نے تو چلتے چلتے راجا سے رازدارانہ انداز میں یہ بھی پوچھا تھا کہ اگر رات کی تفریح بھی مطلوب ہو تو فرمائیں۔ گجرات کا حسن بھی مشہور ہے۔ وارث شاہ نے رن گنجاں دی۔ گنجاں اسی گجرات میں ہے۔ راجا اکیلا ہوتا تو اس پیشکش کے جواب میں کیا کہتا لیکن میری وجہ سے اس نے کہا کہ بس جتنا تم نے کہا وہی کافی ہے۔

مجھے یہ جان کر بڑی حیرانی ہوئی کہ غنی ابھی تک نہیں لوٹا ہے۔ ''اس کا پھر فون آیا تھا۔'' شیر خان نے کہا۔ ''گاڑی ٹھیک ہو گیا ہے۔ بس وہ آ رہا ہے۔''

سیشن جج کی کورٹ سے چودھری سلطان مدعی اس کے بہنوئی کو نوٹس جاری کر دیا گیا تھا اور موصول بھی ہو گیا تھا۔ لیکن وہ معمول کے مطابق بعد ہی پہنچا۔ ہم سب نے گزشتہ رات ہی گھڑیوں کو تھا۔ ٹھیک پونے نو بجے ہم کورٹ میں تھے۔ اس وقت روز کی گہما گہمی کا آغاز ہو رہا تھا۔ بیشتر عدالتوں کے موجود تھے مگر عدالتی اہلکار ابھی تشریف نہیں لائے تھے۔

ٹھیک نو بجے یعنی پاکستان کے معیاری وقت کے مطابق نو بجنے میں دس منٹ پر ہماری پیشی کے لیے آواز لگائی

گئی۔ ہمارا وکیل بھی موجود تھا لیکن مدعی غیر حاضر تھا۔ اس کے وکیل نے اعتراض کیا کہ ابھی دس منٹ باقی ہیں تو جج نے اسے ڈانٹ دیا اور عدالت میں موجود ہر شخص کی طرف دیکھ کے سوال کیا۔ ''کیا ٹائم ہوا ہے؟''

سب نے بیک آواز کہا۔ ''نو بج کے پانچ منٹ۔''

جج نے یکطرفہ فیصلہ سناتے ہوئے ہماری ضمانت قبل از گرفتاری منظور کرلی۔ شخصی ضمانت کے علاوہ پچاس ہزار کا مچلکہ...... مخالف وکیل بہت جز بز ہوا لیکن ایسے حربے عدالتوں میں عام استعمال ہوتے ہیں۔ جب ہمارا وکیل ضمانت کے مچلکے داخل کر رہا تھا تو فریق مخالف کا وکیل آگیا۔

''یار یہ فاؤل ہے۔'' اس نے شکایت کی۔

ہمارے وکیل نے ہنس کے کہا۔ ''او غیر فاؤل بھی چلتا ہے کھیل میں۔ تو نہیں کرتا؟ ابھی پچھلی بار......

وہ چپکے سے کھسک گیا۔ پھر مدعی نمودار ہوا۔ اس نے مجھے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ قریب آکے اس نے کہا۔ ''آپ ہی ہو نواب رفیق؟ میں چودھری سلطان کا بہنوئی ہوں۔ فاضل بھٹی۔''

میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ ''اوہ آپ مدعی ہیں خیر سے۔''

وہ بولا۔ ''آپ نے ایسے ہی ضمانت کرائی۔ میرا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ آپ پر بھی شک ظاہر کروں۔ حالانکہ مجھے معلوم ہے آپ کی سلطان سے دشمنی تھی۔''

''پھر تو میرا ضمانت قبل از گرفتاری حاصل کرنا غلط نہیں۔''

''بات یہ ہے جی میں تو سمجھتا ہوں سارے معاملے کو۔ وہ عورت ایسی ہی ہے۔ لیکن خود میرا سالا کون سا اللہ کا نیک بندہ تھا۔''

راجا نے کہا۔ ''پھر تم نے یہ ایف آئی آر کیوں درج کرائی؟''

''او جی۔ ایک تو میری گھر والی نے شور ڈالا ہوا تھا' اس کنجری کے خلاف کہ میرے بھائی کے پیچھے پڑی ہے۔ کیا نام ہے اس کا۔ فریال۔ خیر اس کو میں نے چپ کرا دیا تھا کہ تیرا بھائی انہی فلمی پریوں میں راجا اندر بن کے رہنے کا شوقین ہے۔ ایک نہ ایک دن ایسے ہی مرنا تھا اسے۔ مگر بعد میں ایک پولیس افسر نے مجھے بلا کے کہا کہ تم رپورٹ لکھاؤ فریال کے خلاف۔ وہ کہیں دور پار سے میری بیوی کا رشتے دار بھی ہے۔''

راجا نے کہا۔ ''بھٹی صاحب۔ آج کل میں آپ کو اسی کا فون آئے گا کہ نواب رفیق کے خلاف بھی ایف آئی آر لکھواؤ اور آپ انکار نہیں کر سکو گے۔ ہم نے جو کیا ٹھیک ہی کیا۔''

''پر میری طرف سے دل میلا نہ کرنا۔ میری مجبوری تھی۔'' وہ ہاتھ ملا کے بولا۔

میں نے کہا۔ ''اللہ تمہاری ہر مشکل آسان کرے اور ہماری بھی۔''

راجا نے عدالتی احکامات کی ایک مصدقہ نقل حاصل کی اور غنی کے ذریعے جہلم پولیس تک پہنچائی۔ مجھے فریال کا بھی خیال آیا تھا لیکن راجا نے مجھے مطلع کیا کہ ضمانت قبل از گرفتاری لینے کے بعد وہ لاہور چلی گئی تھی جہاں اس کی کوئی شوٹنگ تھی۔ گجرات میں وہ کوٹھی ضرور تھی جو چودھری سلطان نے اس کے نام کر دی تھی مگر اس میں فریال رہتی نہیں تھی۔

حویلی میں پہنچنے کے کچھ دیر بعد مجھے ماجد خان کا فون موصول ہوا۔ ''میں نے رانا رجب علی کے خلاف دوسرا کیس فائل کر دیا ہے۔ وہ عبوری ضمانت پر تھا۔ عدالت سے اجازت لیے بغیر وہ اس کے دائرہ اختیار سے باہر نہیں جا سکتا تھا۔ مطلب یہ کہ کراچی بھی نہیں جبکہ وہ لندن میں پہنچا ہوا ہے۔''

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اگلی پیشی پر بھی وہ حاضر نہیں ہوگا۔''

''پیشی پرسوں ہے۔ لندن سے وہ ساتھ آٹھ گھنٹے میں پہنچ سکتا ہے۔'' ماجد خان نے کہا۔ ''اگر چاہے تو......''

میں نے کہا۔ ''آپ کیا سمجھتے ہیں۔ عدالت سے ضمانت کی توثیق ہو جائے گی؟''

''اب کوئی چانس نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''سیاسی دباؤ بہت ہوگا۔''

''ہاں۔ اس سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا مگر کیا کریں۔ ہم صرف قانونی لڑائی لڑ سکتے ہیں نواب صاحب۔ یہ بتائیے۔ وہ جو پہلے آپ کا قانونی مشیر تھا۔ شہزاد کیا اسے آپ نے برطرف کر دیا ہے؟''

''جی۔ مجبوری تھی۔ جو میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔'' میں نے کہا۔

''یہ آپ کا ذاتی معاملہ ہے۔ اس نے ساری فائلیں میرے حوالے کر دی ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''اب آپ ہی کو تمام معاملات سے نمٹنا ہوگا اور فیس کی بالکل فکر نہ کریں جو آپ کہیں گے پیش کر دیا جائے گا۔''

''نہیں نواب صاحب۔ اللہ نے بہت دیا ہے اور دے رہا ہے۔ پیسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' وہ کچھ تامل کا شکار تھا۔

''پھر کیا مسئلہ ہے؟''

''ایک تو ٹائم۔ ایک زمانہ تھا کہ میں نے خود کو مشین بنا رکھا تھا مگر اب میں کم کیس لیتا ہوں۔ کچھ وقت اپنے لیے اور

فیملی کے لیے نکالتا ہوں۔ اس عمر میں وہ خوشیاں زیادہ قیمت رکھتی ہیں جو آپ کو اپنے پوتوں نواسوں سے ملتی ہیں۔ یہ بات ابھی شاید آپ کی سمجھ میں نہ آئے۔"

میں نے کہا۔ "پھر بھی سر۔ میرے لیے تو آپ کو وقت نکالنا ہی ہوگا۔ آپ کا احسان ہوگا مجھ پر۔"

"اچھا بھئی نواب صاحب! کچھ کرتے ہیں۔" اس نے فون بند کر دیا۔

غنی کچھ دیر بعد حاضر ہوا۔ "آج وہ کام بھی کر لینا چاہیے۔"

میں نے بے خیالی میں کہا۔ "کس کام کی بات کر رہے ہو یار؟"

"سر۔ کتے بالکل ریڈی ہیں۔" اس نے یوں سرگوشی میں کہا جیسے اس کو ڈر ہو کہ کوئی سن لے گا۔ "اور اللہ کے فضل سے جس کام کے لیے میں کل گیا تھا۔ وہ بھی ہو گیا۔"

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ "کل تم میرے ساتھ تھے۔"

"جی سر لیکن گاڑی خراب نہیں ہوئی تھی۔"

میں چونکا۔ "گاڑی خراب نہیں ہوئی تھی؟"

"میں نے آپ سے جھوٹ بولا تھا۔ اگر سچ بتاتا تو آپ منع کر دیتے۔" اس نے ایک بنڈل میرے سامنے رکھ دیا جو اب تک اس کی بغل میں دبا ہوا تھا۔ "میں یہ لینے گیا تھا۔"

میں نے بنڈل کو دیکھا۔ "اس میں کیا ہے؟"

"چودھری سلطان کی ایک شلوار اور ایک بنیان۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ "یہ تم کہاں سے لے آئے اور کیسے؟"

"اس کی کوٹھی ہے یہاں۔ جو اس نے اپنی فریال بی بی کو دے رکھی ہے۔ وہاں کوئی نہیں رہتا۔ ایک چوکیدار تھا۔ جب اذان ہوئی تو وہ نماز پڑھنے چلا گیا اور میں اندر گھس گیا۔ میرا خیال تھا اندر کوئی نہیں ہے لیکن ایک نوکرانی تھی۔ اس نے مجھے دیکھ کے چیخ ماری تو میں نے ریوالور نکال لیا۔ اس کی آواز بند ہو گئی۔ میں نے کہا کہ جتنا مرضی چلا۔ تیری آواز باہر نہیں جائے گی۔ پھر میں نے ریوالور اس کی پیشانی پر رکھا۔ وہ تھر تھر کانپنے لگی اور بولی کہ آخر کیا چاہتے ہو تم۔ میں نے کہا کہ میرے ساتھ چودھری سلطان کے کمرے میں چل۔ وہ آگے ہو لی۔ چودھری سلطان کا کمرا مقفل تھا۔ اس نے چابی لگا کے کھولا۔ میں نے کہا کہ اپنا منہ دیوار کی طرف کر کے کھڑی ہو جا۔ مڑ کے دیکھا تو لاش یہیں چھوڑ جاؤں گا۔ وہاں سے میں نے یہ کپڑے لیے۔ اس ملازمہ سے پوچھا کہ یہ کس کے ہیں؟ اس نے تصدیق کی کہ چودھری صاحب کے ہیں۔

میں نے انہیں کاغذ میں لپیٹ کر بغل میں دبایا اور اس سے کہا کہ میں جا رہا ہوں۔ آگے تیری مرضی۔ یہاں سے جو چاہے اٹھا لے۔ جب چوکیدار نماز پڑھ کے آئے تو شور مچا دینا کہ ڈاکو آئے تھے۔ سب میرے نام لگا دینا۔ نہیں اس نے بعد میں کیا اٹھایا کیا نہیں۔ چیزیں تو بہت تھیں۔ میں تو بھاگ آیا۔" اس کا انداز بڑا پُرجوش تھا۔

"اگر تم پھنس جاتے پھر؟" میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "کام تو بے شک تم نے بڑا کیا۔"

وہ خوش ہوا۔ "کیا خیال ہے پھر سر چلیں؟ راجا صاحب نے کہا ہے کہ وہ آتے ہیں پانچ منٹ میں۔"

ہم عصر کے بعد دونوں کتوں کو ہائی لکس گاڑی کے پیچھے والے کیبن میں بٹھا کے روانہ ہوئے۔ اس ڈبل کیبن پک اپ کے دونوں کیبن ایئر کنڈیشنڈ ہوتے ہیں لیکن موسم خوشگوار ہو گیا تھا۔ ہم نے کھڑکیاں بھی کھلی رکھیں۔ دونوں کتے ایسی مہمات کے عادی تھے۔ وہ اپنی لمبی لمبی زبانیں باہر نکالے ست بدھائی کا جائزہ لیتے رہے۔

پورا پلان غنی کے دماغ میں تھا۔ ہم جنگل میں ایک طرف سے داخل ہوئے۔ جاگیر کے جنگل کو غنی نے آٹھ حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ایک حصہ دوسرے سے تقریباً ۱۰۰ گز دور تھا۔ درمیان کا علاقہ درختوں سے صاف کر لیا گیا تھا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ کوئی دشمنی میں آگ لگائے تو ایک حصے کی آگ سارے جنگل کو لپیٹ میں نہ لے۔ آگ لگانے کی ایک ناکام کوشش کے بعد غنی نے یہ بندوبست کیا تھا۔ اگر ہوا تیز ہو تو دو سو گز کا فاصلہ کافی ہوتا ہے۔ آگ ایک حصے سے آگے نہیں پھیل سکتی تھی۔

جنگل کے اس حصے کے گرد حفاظتی دیوار کی تعمیر بھی تقریباً مکمل ہو چکی تھی جو رانا کی زمینوں سے ملتا تھا۔ درمیان میں صرف دریائے کنہار تھا جو سال کے بیشتر حصے میں اتنا سمٹ جاتا تھا کہ اسے مختلف مقامات سے عبور کیا جا سکتا تھا۔ مقامی لوگ جانتے تھے کہ کہاں اس کا پھیلاؤ زیادہ ہے اور گہرائی کم۔ خطرہ اسی طرف سے زیادہ تھا۔

غنی نے دیوار کے ساتھ گاڑی روک دی اور پیچھے سے کتوں کو اتار لیا۔ یہ کتوں کے تعاون سے انسانی سراغرسانی کا ایک انوکھا مشن تھا۔ میں اس کی کامیابی کے بارے میں زیادہ پُرامید نہیں تھا لیکن میں نے غنی سے اپنی مایوسی کا از وقت اظہار کرنا مناسب نہ جانا۔

غنی نے چودھری سلطان کے جسم کی بو والے کپڑے باری باری دونوں کتوں کو سونگھنے کے لیے دیے۔ ابھی وہ دو

میرے تجویز کردہ نام آن اور شان کے عادی نہیں تھے۔ وہ پرانے ناموں سے غنی کی ہدایت پر عمل کررہے تھے۔ دونو کتے باری باری کپڑوں کو سونگھتے رہے۔ غنی نے ایک کی زنجیر اپنے ہاتھ میں رکھی۔ دوسرے کی راجا کو تھمادی۔

''نادموو۔'' غنی نے حکم دیا۔ ''شیر شاہ۔ بہادر شاہ موو۔''

دونوں کتے چل پڑے۔ راجا کے اور غنی کے درمیان دس گز کا فاصلہ تھا۔ کتوں کی زنجیر اس سے آدھی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ زمین کو سونگھتے آگے بڑھ رہے تھے۔ وہ کبھی دائیں جاتے تھے کبھی بائیں۔ انہوں نے تقریباً ایک فرلانگ مربع کا علاقہ بیس منٹ میں دیکھ لیا بلکہ سونگھ لیا ان کی پُرجوش بے چینی دیکھ کے یوں لگتا تھا جیسے وہ کچھ نہ کچھ دریافت کرکے ہی دم لیں گے۔

مجھے اس مہم جوئی اور جستجو سے کارآمد نتائج حاصل ہونے کی بہت کم توقع تھی۔ شاید راجا بھی میری طرح صرف تجسس سے مجبور تھا اور ہمارے لیے یہ ایک نیا اور دلچسپ تجربہ تھا۔ کہیں سے سلطان کی لاش کا سراغ مل جانا ایک موہوم سا مفروضہ تھا۔ غنی زیادہ پُرامید تھا۔ وہ جو کچھ کررہا تھا نیک نیتی اور خلوص کے ساتھ ہمیں تحفظ فراہم کرنے کے لیے ہی کررہا تھا۔

میرا اندازہ تھا کہ اس رفتار سے ہم نے پورے جنگل کا چپا چپا چھانا تو اس کام کے لیے کئی گھنٹے درکار ہوں گے۔ رات دس گیارہ بجے تک کتوں کے پیچھے پیچھے کچھ کھائے پیے بغیر چلتے رہنا آسان کام نہ تھا۔ ایک گھنٹے بعد ہی ہم رک کر دم لینے پر مجبور ہوگئے۔ ہمارے کندھوں پر صرف پانی کی بوتلیں تھیں۔ راجا نے بڑی حسرت سے کہا کہ کاش ہم نے گرم کافی سے بھرا ہوا تھرماس بھی ساتھ رکھا ہوتا۔

تلاش کا دوسرا اور تیسرا مرحلہ مکمل ہونے میں رات کے دس بج گئے۔ ابھی تک ہماری کوشش لاحاصل تھی اور میرے اندازے کے مطابق ہم نے جنگل کا نصف حصہ ہی دیکھا تھا۔ اندھیرے میں راستہ دیکھنے کے لیے ہم سب نے اپنی اپنی ٹارچ روشن کررکھی تھی۔ مسلسل جلانے سے ان کے سیل کمزور ہو چکے تھے اور لائٹ مدھم ہونے لگی تھی۔

ایک جگہ راجا نے ہانپتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''میری تو ہمت جواب دے رہی ہے فیکے پتر۔''

میں نے کہا۔ ''راجا صاحب۔ حوصلہ رکھیں۔ ہمیں واپس بھی جانا ہے۔ گاڑی بہت دور پیچھے کھڑی ہے۔''

''آخر ہم انسان ہیں۔ کوئی سراغرساں کتے نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''اس غنی کو دیکھو۔ ذرا احساس نہیں کہ ہم نواب ہیں۔ بحرِ ظلمات کے گھوڑے نہیں۔''

اسی وقت انہونی ہوگئی۔ ایک جگہ کتے رک گئے اور انہوں نے ایک دائرے میں گھومتے ہوئے زمین پر پنجے مار[نے] اور غرانا شروع کردیا۔ غنی انہیں کمانڈ دیتا رہا۔ ''کم آن بوائے۔ اچھی طرح چیک کرو۔ دیکھو کیا ہے یہاں۔ کچھ ہے؟ دیکھو۔ بی شیور۔'' غالباً اسلحہ اور منشیات کا سراغ لگانے کے لیے ان کو ایسے ہی ہدایات دی جاتی ہوں گی۔

غنی نے بڑے جوش سے کہا۔ ''سر۔ یہاں کچھ ہے۔ زمین کے نیچے۔''

میں نے کہا۔ ''کچھ کا کیا مطلب ہے مسٹر غنی۔ مردہ، آئل یا میٹھا پانی؟''

''کتے صرف ایک سراغ پر چل رہے ہیں سر۔ کپڑوں کی بو پر۔ ہمیں یہاں کھود کے دیکھنا پڑے گا۔''

راجا نے بے یقینی سے پوچھا۔ ''اور یہاں سے سچ مچ چودھری سلطان کی لاش نکل آئی...... پھر؟''

''پھر کیا راجا۔ لاش کو وارثوں کے حوالے کردیں گے اور خود رضا کارانہ طور پر جیل چلے جائیں گے۔''

غنی نے کہا۔ ''میں کھدائی کا سامان لے کر آتا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''غنی۔ اس جگہ کو مارک کرلو۔ ابھی تو ہم زمین کھودنے کے لیے بھی کسی کو نہیں لائے اور اس کام میں پوری رات لگ سکتی ہے۔''

غنی نے کچھ سوچا۔ ''اچھا سر۔ آپ بھی میرے ساتھ چلیں۔ ہم حویلی سے کھدائی کرنے والوں کو لاتے ہیں۔ جگہ میں نے دیکھ لی ہے۔''

''کیا یہ کام آج ہی ختم کرنا ضروری ہے؟'' راجا بولا۔

''آج نہیں تو پھر کل رات تک انتظار کرنا پڑے گا۔''

غنی نے تقریباً دس فٹ قطر کے دائرے کی نشاندہی کے لیے پتھر رکھنے شروع کیے۔ ''دن میں یہ کام نہیں ہوسکتا۔''

دلچسپی اب میری بھی بڑھ گئی تھی اور یہ خیال میرے دل میں خوف کے ساتھ تجسس آمیز خطرات کی گھنٹی بجا رہا تھا کہ یہاں سے سچ مچ چودھری سلطان کی لاش نکل آئی تو صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے کیا کریں گے۔ ابھی تک نے اس امکان پر سیریس ہو کے نہیں سوچا تھا۔

واپس جاتے ہوئے راجا نے کہا۔ ''یار لاش کسی اور کی بھی ہوسکتی ہے۔ اس علاقے میں نہ جانے کتنے لوگ مار کے گاڑے گئے ہوں گے۔''

میں نے کہا۔ ''لیکن وہ چودھری سلطان کی شلوار بنیان پہننے والے نہیں ہوسکتے۔ کتے کی ناک صرف ایک مخصوص

کام کررہی ہے۔''

حویلی میں ہم نے ایک گھنٹا گزارا۔ کھانے اور کافی پینے کے بعد جب ہم تازہ دم ہوگئے تو غنی اور شیر خان کدال بیلچے لیے نمودار ہوئے۔

غنی نے کہا۔ ''میں نے سوچا کہ زیادہ لوگ نہ ہوں۔ ہم دونوں کافی ہیں۔''

شیر خاں نے اس کی بات آگے بڑھائی۔ ''آپ آرام کرو سر۔ اگر کچھ ملا تو ہم آپ کو بتائے گا۔''

یہ تجویز بری نہیں تھی لیکن اس وقت تک راجا کا اور میرا تجسس بڑھ کے اندیشوں میں ڈھل چکا تھا اور ہم نے فیصلہ کیا کہ ہمیں اس مہم کے نتائج سامنے آنے تک سائٹ پر موجود رہنا چاہیے۔

خواتین کو ہم نے اِدھر اُدھر کی باتوں سے بہلا کے ٹالنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ ''میرے آباؤاجداد نے یہاں ایک خزانہ دبایا تھا۔ اگر وہ مل گیا تو کل میں رانا کو رانا نگر سمیت خرید لوں گا۔''

رابعہ نے کہا۔ ''یہ سوچو کہ چودھری سلطان کی لاش نکل آئی تو کیا کروگے؟''

''گویا تم سب جانتی ہو کزن لیکن ابھی ہم تمہارے سوال کا جواب نہیں دے سکتے۔'' میں نے انہیں گھورتے ہوئے مذاقاً کہا۔

''میرا خیال ہے کہ لاش ہم یہاں اٹھا لائیں گے تاکہ آپ لوگ بھی دیکھ لیں۔ گلی سڑی، ٹوٹی پھوٹی، جیسی بھی ہو۔''

شہناز نے کہا۔ ''یہ ٹھیک ہے۔ میں تھوڑا بہت پوسٹ مارٹم یہاں بھی کرسکتی ہوں۔''

لیلیٰ بھابی نے کانپتی آواز میں کہا۔ ''خبردار جو ایسی کوئی حرکت کی۔ یہ حویلی بن جائے گی بھوت بنگلا۔''

بات مذاق کی ہرگز نہیں تھی مگر مذاق بن گئی تھی۔ ہم نے خواتین کو سنسنی خیز قیاس آرائیوں میں مصروف چھوڑا اور خود واپس جائے واردات پر پہنچ گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ ہم سے زیادہ شیر خاں کی حالت خوف سے پتلی ہے لیکن وہ نہیں چاہتا تھا کہ پٹھان ہو کر اپنی بزدلی کی وجہ سے بدنام ہو۔

کھدائی رات کے بارہ بجے شروع ہوئی تو دور دور تک جنگل میں ہو کا عالم تھا۔ چاند کی آخری تاریخوں کی وجہ سے اندھیرا بھی زیادہ گہرا محسوس ہوتا تھا۔ زمین پر کدال پڑنے کی آواز سناٹے میں دور تک سنی جارہی ہوگی مگر ان پرندوں کے سوا جو اپنے آشیانوں میں بے چین ہورہے تھے یہ آواز سننے والا کوئی نہ تھا۔

ایک گھنٹے میں شیر خاں اور غنی دونوں ہانپ گئے۔ اس وقت تک دس فٹ قطر کا دائرہ ایک فٹ گہرا بھی نہیں ہوا تھا۔ میں نے راجا سے اخلاقاً بھی نہیں کہا کہ ہم بھی ہاتھ بٹاتے ہیں۔ یہ ہماری شان کے خلاف تھا۔ نہ ہم یہ کام کرسکتے تھے اور نہ ہمارے نمک خوار کرنے دیتے۔

''مجھے لگتا ہے کہ اس محنت سے حاصل کچھ نہیں ہوگا۔'' میں نے اپنا خیال ظاہر کیا۔ غنی اور شیر خاں اب پھر کھودنے میں مصروف ہوگئے تھے۔

راجا نے کہا۔ ''یار۔ کیا وہ کتے بالکل گدھے ہیں؟ ان کی ناک اتنی ہی فضول ہے جتنی کسی گدھے کی۔''

''مگر غنی کو ان کی صلاحیت پر اعتماد ہے۔''

راجا بولا۔ ''میں وہ سوال پھر اٹھاتا ہوں۔ یہاں سے سچ مچ چودھری سلطان نکل آیا تو ہم کیا کریں گے؟''

''سب سے پہلے تصدیق کریں گے کہ وہ چودھری سلطان ہی ہے۔''

''وہ کیسے؟ اس سے کہیں گے کہ اپنا شناختی کارڈ دکھاؤ۔''

میں نے کہا۔ ''ہماری ڈاکٹر شہناز نے دعویٰ کیا تھا کہ اسباب اور لوازمات نہ ہونے کے باوجود وہ تھوڑا بہت پوسٹ مارٹم کرسکتی ہے۔''

''پوسٹ مارٹم میں لاش کے نام یا ولدیت کا پتا نہیں چلتا۔''

میں نے جھلا کے کہا۔ ''یار یہ تو پتا چل جاتا ہے کہ مرحوم کیا تھے؟ مرد یا عورت۔ عمر کیا تھی۔ قد کتنا تھا۔ کیسے مارے گئے۔''

ایک دم شیر خاں کے چلانے کی آواز آئی۔ ''او غنی۔ اِدھر دیکھ۔ یہ کیا ہے۔'' اور اچھل کر...... گڑھے سے نکل آیا۔ ''استغفراللہ۔ استغفراللہ۔ ادھر تو ایکدم لاش ہے۔''

غنی نے گڑھے میں جا کے دیکھا۔ ''تیرا تو پسینا چھوٹ رہا ہے ڈر سے۔ لا کدال مجھے دے۔ یہ مردہ کیا تجھے چھڑ مار دے گا۔''

میں اور راجا ایک ساتھ دوڑے۔ ٹارچ لائٹ میں جو میں نے دیکھا وہ یقیناً سنسنی خیز تھا۔ مٹی میں سے ایک ہاتھ باہر نکل آیا تھا۔ اب غنی نے زیادہ احتیاط کے ساتھ مٹی ہٹانی شروع کی۔ تین فٹ نیچے کی مٹی نمی کے باعث سخت بھی نہیں تھی۔ آدھے گھنٹے میں ایک لاش نمایاں ہوگئی لیکن اس کی شناخت ناممکن تھی۔ لاش گل سڑ چکی تھی اور مٹی میں لتھڑی ہوئی تھی۔ بدبو ایسی بھیانک تھی کہ ناک پر رومال رکھنے کے باوجود میرا دماغ پھٹا جارہا تھا۔ معلوم نہیں غنی کس مٹی کا بنا ہوا تھا کہ سب برداشت کررہا تھا اور اپنے کام میں مصروف تھا۔

میں کچھ دیر کے لیے گڑھے سے دور چلا گیا اور گہرے لمبے سانس لینے لگا۔ کچھ دیر بعد راجا بھی میرے پاس آ کے بیٹھ گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی ذہنی طور پر اس شاک کے لیے تیار نہ تھا۔ لاش نظر آ جانے کے بعد خدشات نے خطرات کی صورت اختیار کر لی تھی۔ میں نے کتوں کی سراغرسی کا صرف ذکر سنا تھا یا پڑھا تھا یا فلموں میں دیکھا تھا۔ اسی لیے غنی کا اعتماد مجھے غیر حقیقی محسوس ہو رہا تھا۔

اچانک شیر خان کھڑے کھڑے گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ اس کی قوتِ برداشت جواب دے گئی تھی۔ میں نے غنی کو آواز دی۔ ''غنی۔ تم بھی نکل آؤ باہر اور شیر خاں کو ادھر لے آؤ۔''

غنی مکمل تیاری کے ساتھ آیا تھا۔ اس نے شیر خاں کو گھسیٹ کر ہمارے قریب لٹایا اور اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ وہ چند منٹ میں ہوش میں آ گیا اور شرمندہ سا اٹھ بیٹھا۔ ''معاف کرنا صاب......''

میں نے اسے تسلی دی۔ ''ایسا ہوتا ہے شیر خاں۔ سب کے اعصاب ایک سے مضبوط نہیں ہوتے۔''

غنی نے اس کا مذاق اڑایا۔ ''یہ نام کا بہادر ہے سر۔ اس کا نام شیر خاں سے بدل کے گیدڑ خاں رکھ دیں۔ آخر میں بھی تو برداشت کر رہا ہوں۔''

''تم آدمی نہیں۔ بھوت ہے۔'' شیر خاں نے خفگی سے کہا۔

''اچھا ناراضی چھوڑ۔ یہ گولی کھا لے۔ ڈاکٹر صاحب نے دی تھی۔ طبیعت ٹھیک ہو جائے گی۔'' غنی نے ایک شیشی کھول کے ایک گولی خود بھی کھائی اور مجھے اور راجا کو بھی پیش کی۔ شہناز ایک ڈاکٹر تھی اور اسے اندازہ تھا کہ پرانی لاش نکلے گی تو اس کا تعفن ہمارے اعصاب پر کیا اثر ڈالے گا۔ یہ گولی اسی اثر کو زائل کرنے کے لیے ہو گی۔ میں نے سوچا۔

غنی نے ایک تھرماس میں گرم بلیک کافی نکال کے ہمیں پیش کی۔ ہمارے حکم پر شیر خاں نے اسے کڑوی دوا سمجھ کے پی لیا۔ کچھ دیر میں ہم سب کی حالت میں نمایاں بہتری آ گئی تھی۔

''اب میں حویلی جاتا ہوں سر۔ ڈاکٹر شہناز نے کہا تھا کہ ضرورت پڑے تو مجھے لے جانا۔'' غنی اٹھ کھڑا ہوا۔

میں نے راجا کی طرف دیکھا۔ ''ضرورت یقیناً ہے۔ لیکن کیا وہ برداشت کر لے گی؟''

راجا ہنسا۔ ''وہ ایسے نہ جانے کتنے مردوں کی چیر پھاڑ کر چکی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''غنی۔ اس بدبو کا بھی کچھ علاج کرو۔''

اس نے ایک بیگ سے جو وہ کندھے پر لٹکا کے لایا تھا کوئی اسپرے نکالا اور پھر گڑھے میں اتر گیا۔ وہ کچھ دیر بعد نکلا اور لاش کو ایک پلاسٹک شیٹ سے ڈھک دیا۔ ہم نے اسے اندھیرے میں گاڑی کی طرف جاتے دیکھا۔

''انسان جھوٹ بولتے ہیں فیکے پتر... کتے نہیں۔'' راجا نے کہا۔

''مجھے بالکل شک نہیں رہا کہ یہ چودھری سلطان ہی ہو گا۔'' میں نے کہا۔

''اسے قتل کر کے یہاں گاڑا گیا۔ دونوں کام رانا نے کیے۔ یہ فریال کے بس کی بات ہرگز نہیں تھی۔'' راجا بولا۔

میں نے کہا۔ ''مقصد تو بالکل واضح ہے لیکن اب تک وہ چپ کیوں بیٹھا ہے؟ اس نے پولیس کو ادھر کیوں نہیں بھیجا؟''

راجا نے کہا۔ ''وہ سوچ سمجھ کے ہر قدم اٹھا رہا ہے۔ اسے کوئی جلدی نہیں۔ اسے یقین ہے کہ اس مرتبہ کام پکا ہے۔ پہلے چودھری سلطان غائب ہوا۔ شبہے میں فریال کا نام آیا اور پھر تیرا۔ یہ بہت اچھا ہوا کہ تو نے اپنی ضمانت قبل از گرفتاری لے لی۔ کل پرسوں میں رانا لندن سے واپس آئے گا تو پولیس کو اس قتل کا سراغ دے گا۔ کسی مخبر کے ذریعے یا گمنام فون سے۔ چودھری سلطان کے بہنوئی کو بلا کے پھر کہا جائے گا کہ نواب رفیق کے خلاف بھی پرچہ کٹاؤ۔ کوئی خصوصی تفتیشی ٹیم تشکیل دی جائے گی جو لاش برآمد کرنے کے لیے چھاپا مارے گی۔''

''انہیں یہ تو معلوم ہو جائے گا کہ لاش یہاں تھی۔ زمین بھی کھودی ہوئی نظر آئے گی۔''

''مگر لاش نہیں ملے گی۔ اس کے بغیر کیس نہیں بنتا فیکے پتر۔ ہمیں زیادہ پکا کام کرنا ہے۔ رانا کی تو......''

''مگر لاش کو کیسے غائب کریں گے؟'' میں نے کہا۔

راجا بولا ہم کیا کریں گے۔ جو کرے گا غنی کرے گا۔ میں تو اس شخص کی ہمت اور صلاحیت پر حیران ہوں۔''

''شیر خاں نے ٹھیک کہا تھا۔ وہ آدمی نہیں بھوت ہے مگر راجا، میں واقعی اس کے احسانات کا بار محسوس کرتا ہوں۔ جن کا بدلہ بھی نہیں چکایا جا سکتا۔''

ٹھیک کہتا ہے تو۔ غنی نہ ہوتا تو... بڑی مشکل ہوتی ہمارے لیے۔ اب تو اس پر اتنا انحصار کرنے لگے ہیں ہم کہ کبھی وہ نہ ہوا تو ہم خود کو بالکل بے دست و پا محسوس کریں گے۔''

غنی ایک گھنٹے بعد لوٹا۔ ہم نے دور سے گاڑی کی روشنی دیکھی۔ گاڑی دیوار کے قریب رک گئی پھر ٹارچ کی روشنی میں دو سائے ہماری طرف بڑھنے لگے۔ پھر شہناز نے قریب آ کے کہا۔ ''کیا حال احوال ہے راجوں نوابوں کا؟''

میں نے آہ بھر کے کہا۔ ''حال کا کیا پوچھتی ہو ڈاکٹر بہت پتلا ہے۔''

وہ مسکرائی اور غنی کے ساتھ گڑھے کی طرف بڑھ گئی۔ شیر خاں نے اس کی مدد کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اکیلے غنی نے پلاسٹک شیٹ ہٹا کے باہر بچھائی۔ پھر لاش کو کھینچ کے نکالا اور شیٹ پر ڈال دیا۔ اس کے اوپر گوشت برائے نام ہی رہ گیا تھا۔ کچھ گل سڑ کے مٹی میں مل گیا تھا۔ کچھ حشرات الارض نے کھا لیا تھا۔

شہناز نے اسباب میسر نہ ہونے کے باوجود ٹارچ کی تیز روشنی ڈال کے لاش کا معائنہ کیا۔ اس نے دوپٹے کو اپنی ناک پر باندھ لیا تھا مگر مجھے معلوم تھا کہ اس سے بدبو نہیں رک سکتی تھی۔ تقریباً چالیس فٹ دور کھڑے راجا اور میں اس کی شدت کو محسوس کر سکتے تھے۔ اس نے کبھی ٹانگ اٹھا کے، کبھی ہاتھ پکڑ کے، کبھی منہ کھول کے اور اِدھر اُدھر سے ٹھوک بجا کے پتا نہیں کیا کچھ دیکھا۔ اسے پوسٹ مارٹم کرنے کا خاصا تجربہ تھا لیکن باقاعدہ پوسٹ مارٹم لیبارٹری میں ہر قسم کے کیمیکل اور آلات کی مدد سے ہوتا ہے۔ یہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ مشاہدے کی مدد سے اندازے قائم کر رہی تھی۔

ایک گھنٹے بعد وہ باہر آئی اور ہمارے پاس بیٹھ گئی۔

''اف۔ پتا نہیں میں بے ہوش کیوں نہیں ہوئی۔''

راجا نے اسے کافی پیش کی۔ ''تم چاہو تو اب ہو جاؤ۔''

شہناز نے کافی لے لی۔ ''دراصل عادت نہیں رہی۔ بہت عرصہ ہو گیا۔''

میں نے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب۔ کیا دیکھا آپ کی نگاہِ مردہ شناس نے؟''

وہ مسکرائی۔ ''میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتی کہ یہ تمہارا ہی رقیبِ روسیاہ تھا یا کوئی اور۔ قیاس کہتا ہے کہ اس کی موت کو بیس سے پچیس روز ہو چکے ہیں۔''

راجا نے سر ہلایا۔ ''چودھری سلطان کو غائب ہوئے بھی اتنے ہی دن ہوئے ہیں۔''

''یہ اسی کے قد و قامت کا مرد تھا۔ قد تقریباً پونے چھ فٹ۔ وزن ایک سو ساٹھ پونڈ سے اوپر۔''

''موت کی وجہ؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اس کا پتا ایسے نہیں چل سکتا لیکن مجھے گولی کا زخم نظر نہیں آیا۔''

''فیکے پتر۔ اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ قتل کرنے والوں نے کیا طریقہ اختیار کیا۔''

''شناخت کی دیگر علامات کو دیکھنا بھی یہاں ممکن نہیں۔ مثلاً آنکھوں یا بالوں کا رنگ۔ فنگر پرنٹس۔''

''میرا خیال ہے آپ نے ناحق زحمت فرمائی۔ اتنا تو ہم بھی دیکھ سکتے تھے۔'' راجا نے کہا۔

''آخر تصدیق کیسے ہو کہ یہ چودھری سلطان ہی ہے۔'' میں نے کہا۔

''بہت آسان ہے۔ آپ لوگ لاش اٹھا کے سرکاری اسپتال چلے جائیں۔ لاہور یا پنڈی یا مرحوم کے آبائی شہر گجرات۔ جہاں ایف آئی آر درج ہے۔ مدعی کو طلب کر لیں۔ ہر بات معلوم ہو جائے گی۔ یہ بھی کہ آپ لوگوں میں سے اس کو کس نے ہلاک کیا اور کیسے۔ میں چلتی ہوں۔ میرا کام کوئی نہیں۔''

''ڈیئر ڈاکٹر شہناز۔ آپ کا علم، تجربہ، مشاہدہ، قیاس، وجدان، دل و دماغ اور چھٹی حس۔ یہ کیا کہتے ہیں؟ کیا یہ چودھری سلطان ہو سکتا ہے؟'' میں نے اس کی ناراضی دور کرنے کے لیے کہا۔

''مجھے نہیں معلوم۔ راجا بتائے گا۔''

''یہ راجا قدرناشناس۔ اس سے زیادہ عقل تو آپ کے پاس اور ڈاکٹر ریشم کے پاس ہو گی۔ اس کی بات کا برا نہ منائیں۔ اس وقت تو بدبو ناقابلِ برداشت ہے لیکن کتوں کی ناک کی شہادت سب سے اہم ہے جو ہمیں سیدھا اس جگہ لائے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ چودھری سلطان کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔'' میں نے کہا۔

''چلو فیصلہ ہو گیا۔ مشہور تو ہے کہ ایسے ہی رقیب کو رقیب پہچانتا ہے۔ سوال اب یہ ہے کہ اب اس کا کیا کریں۔ کیا ڈسپوزل کیا جائے۔''

ہمارے درمیان ایک مختصر میٹنگ ہوئی۔ حسبِ توقع غنی نے ساری ذمے داری قبول کر لی اور ہمیں ساری فکروں سے آزاد کر دیا۔ ''یہ جگہ تو رانا صاحب نے پسند کی تھی۔ صبح میں یہاں کھدائی شروع کراتا ہوں۔ یہ گڑھا کچھ اور پھیل جائے گا۔ آس پاس کافی جگہ ہے۔ اگر کوئی آئے گا تو اسے بتا دیا جائے گا کہ یہاں اینٹوں کا بھٹہ لگایا جا رہا ہے۔ ست بدھائی میں تعمیر کا جو کام ہوتا رہتا ہے اور آئندہ بھی ہو گا۔ اس کے لیے اینٹیں یہاں تیار ہوں گی۔''

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''غنی۔ میں کیسے تمہارا شکریہ ادا کروں۔ میری ساری فکریں اور پریشانیاں تم دور کر دیتے ہو۔ نہ تمہاری خدمات کا کوئی معاوضہ ہے نہ انعام۔''

''سر...... میرے لیے اتنی عزت بھی بہت ہے جو آپ

دیتے ہیں۔ اب آپ جائیں۔ صبح تک یہاں کچھ بھی نہیں ہوگا۔ اس گڑھے کی مٹی تک بہت دور لے جاکے دریا میں ڈال دی جائے گی۔ بس لاش کے بارے میں بتادیں۔ اسے غائب کرنا ہے یا دریا پار لے جاکے رانا کے علاقے میں دبادیں۔ اس کے تیر کا رخ اسی کی طرف موڑ دیں۔''

راجا نے کہا۔''تجویز بہت شاندار ہے لیکن کوئی خطرہ مول لینے کی ضرورت نہیں غنی۔''

میں نے کہا۔''ہاں۔ تمہاری ہوشیاری سے ہم اس الزام سے بچ گئے، اتنا کافی ہے۔ لیکن کیا تم دونوں یہ کام کرلوگے؟''

''ابھی صبح ہونے میں دیر ہے۔ میں اضافی لیبر لگادوں گا۔ یہ سب آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔'' غنی نے کہا۔

ہم واپس حویلی پہنچے تو صبح کے تین بجے تھے۔ ثریا کے کمرے میں لیلیٰ بھابی سوچکی تھیں۔ ریشم کے ساتھ رابعہ تجسس میں جاگ رہی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ شہناز کی طرف لپک کے آئیں۔''کیا پتا چلا؟''

حیرت انگیز طور پر شہناز نے کہا۔''وہ چودھری سلطان ہی تھا۔''

مجھے اندازہ تھا کہ ہماری واپسی تک بھی یہی موضوعِ سخن رہا ہوگا۔ فریال کی اور میری لو اسٹوری کی وہ سنسنی خیز اور قابلِ ملامت تفصیلات جن کا علم نووارد لیلیٰ بھابی یا ثریا کو نہیں ہوسکتا تھا بڑی دلچسپی سے سنی گئی ہوگی۔ ظاہر ہے اس کے انجام پر خوشی منانے کا تو کوئی سوال نہ تھا لیکن کسی کو دکھ بھی نہ تھا۔ بات وہی تھی کہ جیسے اعمال ویسا انجام۔ دوسروں کے لیے برا چاہنے والے کا اچھا انجام کیسے ہوسکتا تھا۔

راجا کے ساتھ میں بھی بہت تھکا ہوا تھا چنانچہ انہی کپڑوں میں بستر پر لیٹا اور سوگیا۔ صبح جب میری آنکھ کھلی تو گیارہ بج رہے تھے۔ بظاہر زندگی اپنے معمول پر رواں دواں تھی۔ شہناز اور ریشم کے لیے یہ وقت اسپتال میں مریضوں کے دیکھنے کا تھا۔ مریضوں کی تعداد میں ہر گزرتے دن کے ساتھ اضافہ ہوتا جارہا تھا اور دواؤں کا بجٹ پہلے کے مقابلے میں دگنا بڑھ چکا تھا۔ مشنری اور لیبارٹری کے اخراجات شامل کیے جاتے تو اسپتال چلانے کی لاگت شاید تین گنا ہوگئی تھی۔

تاہم یہ غیر متوقع نہیں تھا۔ اصل مسئلہ وسائل کا نہیں وقت کی کمی کا سامنے آرہا تھا۔ بیماری نہ ٹائم دیکھتی ہے نہ دن۔ شہناز نے اوقات کار میں دو گھنٹے کا اضافہ کردیا تھا اور اب کلینک میں تین بجے تک مریضوں کو دیکھا جاتا تھا۔ اس کے باوجود کچھ لوگ رہ جاتے تھے۔

شہناز کی وجہ سے ہم بھی کھانا تین بجے کھاتے تھے۔ مزید وقت بڑھانا ممکن نہیں تھا۔ اب مریضوں کی زیادہ تعداد سے نمٹنے کا یہ حل نکالا گیا تھا کہ ریشم ایک بجے کے بعد ان مریضوں کو اگلے دن آنے کا کہہ کے رخصت کردیتی تھی جو سیریس نہیں ہوتے تھے اور انتظار کرسکتے تھے۔ شہناز نے تجویز دی تھی کہ کلینک کے اوقات شام کو بھی رکھے جائیں۔ صبح نو سے ایک اور شام پانچ سے نو۔ لیکن اس کی تجویز کو سب نے مسترد کردیا۔ سب سے زیادہ شور کرنے والا راجا تھا۔ اس نے کہا کہ''تم چھوڑو مجھے اور ہم سب کو۔ وہیں اسپتال میں ٹھکانا بنالو۔ چوبیس گھنٹے مریضوں کو دیکھو۔ ہمیں ڈالو چولہے میں۔''

شہناز خود بھی دل سے ایسا نہیں چاہتی تھی لیکن دوسری طرف وہ مایوس لوٹ کر جانے والوں کی حالت سے اور ان کی بے سبب فریاد وفغاں سے پریشان ہوتی تھی۔ اب ایک متبادل تجویز پر غور ہورہا تھا کہ کوئی ڈاکٹر لایا جائے۔ کسی لیڈی ڈاکٹر کا یہاں آکے کام کرنا مشکل نظر آتا تھا خواہ اسے کتنی ہی تنخواہ دی جائے۔ مرد ڈاکٹر سے خواتین مریضوں کے لیے مسئلہ پیدا ہوتا تھا۔ تاہم تلاش جاری تھی۔

اسکول چلانے والی ٹیم مزے میں تھی۔ لڑکے لڑکیوں کی تعداد میں کبھی اضافہ ہوجاتا تھا تو فصل کی کٹائی کے دنوں میں حاضری برائے نام رہ جاتی تھی۔ زیادہ عمر کے لوگ چند روز آتے تھے پھر بور ہوکے بھاگ جاتے تھے۔ علم بڑی دولت ہے مگر اس دولت کو بھی ہم دنیاوی دولت کی طرح قبر میں تو نہیں لے جاسکتے۔ آخرت میں تو اعمال ہی کام آئیں گے۔ اس خیال سے وہ دل کو تسلی دیتے تھے۔ اعمال ان کے وہی رہتے تھے۔

راجا نہ جانے کہاں تھا۔ میں ناشتے سے فارغ ہوا تو مجھے غنی کا خیال آیا۔ وہ اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔ معلوم نہیں گزشتہ رات وہ کب فارغ ہوا تھا۔ یقیناً وہ صبح میں ہی آیا ہوگا۔ میں نے اسے سونے دیا اور سوچا کہ گولی کا حال پوچھ لوں۔ زخم ٹھیک ہونے تک وہ شہناز کے حکم پر کمرے تک محدود تھی۔

ابھی میں کچھ فاصلے پر تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا اور ثریا کا بچہ باہر آیا۔ اس کا نام تو گلریز تھا مگر ثریا نے بتایا کہ پیار سے اسے بوبی کہا جاتا تھا۔ وہ اسی نام سے پکارنے پر متوجہ ہوتا تھا چنانچہ وہ سب کے لیے بوبی ہوگیا تھا۔ اس کی شرارتوں اور معصوم حرکتوں نے سب کا دل موہ لیا تھا اور چند

روز میں وہ بھی سب سے اتنا مل گیا تھا کہ کبھی ایک کی گود میں چڑھا ہوا نظر آتا تو کبھی دوسرے کے ساتھ کھیل کود میں دکھائی دیتا تھا۔ اس کی شوخ حرکتوں نے حویلی میں ہنسی اور خوشی کے نئے رنگ بکھیر دیے تھے۔

اس سے پہلے کہ میں بوبی کو بلاتا دروازہ کھلنے سے اندر کی آوازیں میرے کانوں سے ٹکرائیں۔ معلوم نہیں کس بات پر گولی چلا رہی تھی اور ثریا دبے دبے لہجے میں کچھ کہنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھی۔ میں نے دروازے کے قریب رک کے سنا۔

''لڑکی۔ تم بے وقوف تو ہو ایک نمبر۔ بزدل بھی ہو۔ اس حرامزادے نے تمہیں ٹشو پیپر کی طرح استعمال کیا اور پھینک دیا۔ یہ بچہ بھی تمہارے منہ پر مار گیا کہ پالو۔''

''دیکھو مجھے بالکل پتا نہیں تھا۔''

''او یار اب تو پتا چل گیا نا کہ وہ سالا کتنا حرامی تھا۔ اب کچھ کرو۔ ایسے وہ کیسے بھاگ گیا۔ تم سے پہلے بھی اس نے معصوم لڑکیوں کو اسی طرح خراب کیا ہوگا۔ آگے جس سے شادی کرے گا اس کی زندگی بھی برباد ہوگی۔''

''اب میں کیا کروں آخر؟''

''تم کچھ مت کرو۔ میں اس الو کے پٹھے کو اٹھوا سکتی ہوں۔ ارے گولی کوئی ایسی ویسی چیز نہیں ہے۔ میرا پہلا شوہر بھی مرد کا بچہ تھا اور یہ شامی بادشاہ۔ ایک کروڑ ایک لاکھ شریف زادے میں اس پر صدقہ کرکے وار دوں۔''

''لیکن وہ تو مر چکا ہے۔''

گولی آگ بگولا ہوگئی۔''کون...... کہتا ہے۔ تم بھی ایسا دوبارہ مت بولنا۔ میں یہاں اس لیے نہیں لیٹی ہوں کہ زخمی ہوں۔ میں شامی کا انتظار کررہی ہوں۔ وہ آئے گا۔ یکھنا آئے گا اور بس اس کے بعد تمہارا وہ کتا شوہر نہیں بچے گا۔'' وہ غصے میں مردانہ گالیاں بکتی رہی۔

''گولی۔ تم سمجھتی کیوں نہیں ہو۔ وہ مجھے طلاق دے چکا ہے۔ جب وہ میرا شوہر نہیں رہا۔''

''ارے ایسا کیا اس...... کے باپ کا راج ہے۔ طلاق کیسے دے سکتا ہے وہ۔ ایک کاغذ کے پرزے کی کیا اہمیت ہے۔ تی...... مذاق سمجھتا ہے شادی کو؟ جب چاہا ختم کردیا اور ختم تو پھر وہ بھی ختم۔ تیرے کو کیا فرق پڑتا ہے۔ مطلقہ ہونے سے بیوہ ہونا اچھا۔ زندہ رہے گا تو کبھی سامنے آئے گا۔ تیرے کو دکھ ہوگا۔''

ثریا گھبرا کے اٹھی اور اسی وقت میں نے طے کیا کہ اندر چلا جاؤں۔ دروازے کے اندر قدم رکھتے ہی اس کی اور میری ٹکر ہوئی۔ میں نے اسے سنبھال کے گرنے سے بچالیا۔''کیا ہوگیا۔ کہاں بھاگی جارہی ہو؟''

اس نے بوکھلا کے کہا۔''وہ...... بوبی نکل گیا ہے باہر۔''

میں گولی کے پاس جا بیٹھا۔''کیا حال ہے بھابی؟''

''ایک دم فس کلاس نواب بھائی۔'' گولی اٹھ بیٹھی۔''آپ کو خیال آگیا میرا؟''

میں نے کہا۔''معاف کرنا۔ دو دن کچھ ایسی مصروفیت میں گزرے کہ مجھے خود اپنا ہوش نہیں تھا۔''

''شامی کا کوئی پیغام ملا؟''

میں نے افسوس سے کہا۔''آخر تم کب تک اس کے خیال میں بیٹھی رہوگی۔ حقیقت تمہارے تسلیم نہ کرنے سے بدل نہیں سکتی۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔''

''میں نہیں مان سکتی۔ تم اس کے دوست تھے تو میں بیوی تھی۔ چوبیس گھنٹے ساتھ رہتی تھی اور جب وہ زخمی ہوا تو اس کے ساتھ میں ہی تھی۔ تم یقین کیوں نہیں کرتے میری بات کا۔ وہ نکل گیا تھا۔'' گولی چلانے لگی۔

میں اسے دیکھتا رہا۔ وہم، خبط، جنوں، عشق۔ سب خیال کے کرشمے ہیں۔ یقین کی دیوار کو ایٹم بم سے بھی گرایا نہیں جاسکتا۔ انسان اپنے یقین کے ساتھ مرجاتا ہے۔ مرتے مرتے بھی اس کی زبان گواہی دیتی ہے کہ حق کیا ہے۔

وہ مجھے خاموش دیکھ کر بولی۔''نواب بھائی۔ کیا تمہیں میرا یہاں رہنا اچھا نہیں لگتا؟''

میں نے کہا۔''کیسی باتیں کرتی ہو تم گولی۔''

''نہیں۔ تم عزت دار ہو۔ ڈرتے ہو کہ میرے یہاں رہنے کی خبر عام ہوگی تو تم مشکل میں پڑ جاؤگے۔''

''ایسی باتیں کرکے تم مجھے ذلیل کررہی ہو۔ شامی میرے لیے بھائی جیسا تھا اور ڈرتا میں اپنے اور اس کے تعلق سے بھی نہیں تھا۔ حویلی اس کا دوسرا گھر تھی۔ وہ بھی خود کو یہاں محفوظ سمجھتا تھا۔''

اس کے چہرے پر اطمینان آگیا۔''اسی لیے تو یہاں بیٹھی ہوں۔ وہ جب بھی آئے گا۔ یہاں آئے گا۔ اس نے کہا تھا۔''

''تم جیسی عورت کو سمجھنا چاہیے۔ ساری زندگی اس کے انتظار میں نہیں گزاری جاسکتی جو چلا گیا۔ ہمیشہ کے لیے۔''

''یہی تو تم نہیں سمجھ سکتے نواب بھائی۔ تمہارے اور میرے یقین میں فرق ہے۔ جیسے کافر اور مسلمان کے یقین میں فرق کو دلیل یا بحث سے ختم نہیں کیا جاسکتا۔ جان چاہے چلی جائے۔ ایمان رہتا ہے۔''

میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''چلوتم خوش رہو۔تمہارے ساتھ ہم بھی اس کے واپس آنے کا انتظار کریں گے۔خدا کرے کہ تمہارا یقین ہی درست ہو۔''

وہ بولی۔''نواب بھائی۔''

''کیابات ہے گولی۔''میں نے ٹھہر کر پوچھا۔

''وہ......راجا کہہ رہا تھا۔وہ مجھے اس جگہ لے جاسکتا ہے جہاں ان سب کو دفن کیا گیا ہے۔''

''اچھا؟ مجھے راجا نے نہیں بتایا۔''

''حیدرآباد کے نزدیک کوئی قبرستان ہے۔''

میں نے کہا۔''جب تم اس بات پر یقین رکھتی ہو کہ شامی زندہ ہے۔تو پھر قبرستان جاکے کیا کروگی۔''

وہ سادگی سے بولی۔''قبرستان جاکے لوگ کیا کرتے ہیں؟''

''دعائے مغفرت کرتے ہیں۔مرنے والوں کے لیے۔''

وہ بولی۔''میں بھی دعا کروں گی۔ان کے لیے جو مرگئے اور...... وہ قبر بھی دیکھوں گی' جس کو شامی کی قبر بنادیا ہے پولیس والوں نے۔''

''قبر کو دیکھنے سے کیا ہوگا''

''مجھے پتا چل جائے گا جھوٹ سچ کا۔''

میں نے سر پکڑ کے کہا۔''کیاتم قبر کھود کے دیکھوگی؟تم پاگل ہوگئی ہو گولی؟''

''مجھے قبر کھودے بغیر ہی معلوم ہوجائے گا کہ قبر شامی کی ہے یا کسی اور کی۔راجا سے کہو مجھے وہاں لے جائے۔''

اس پاگل پن کا کوئی علاج نہیں تھا۔میں نے بہتر سمجھا کہ ہار مان لوں۔''ٹھیک ہے۔راجالے جائے گا تمہیں۔''

میں باہر نکلا تو راجا اکیلا بیٹھا ناشتا کررہا تھا۔میں نے اسے گولی سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا۔

وہ بولا۔''جگہ تو معلوم ہوگئی ہے لیکن وہاں جاکے اس نے قبر کھودنے کی ضد کی تو مشکل ہوجائے گی۔''

''وہ کہہ رہی ہے کہ میں بس ایک نظر دیکھوں گی تو مجھے پتا چل جائے گا کہ قبر شامی کی ہے یا کسی اور کی۔تولے جاسے۔''

راجا نے سر ہلایا۔''لے جاؤں گا۔مجھ پر تو ابھی تک رات کی تھکن سوار ہے۔یار کیا واقعی وہ چودھری سلطان تھا۔دیکھ یار۔زندگی کے کیسے کھیل ہیں۔فریال نہ تجھے ملی نہ اسے۔وہ تجھے مارنا چاہتا تھا مگر خود مارا گیا۔''

''ابھی اس کی تصدیق نہیں ہوئی ہے۔''

''اگرنہیں مارا گیا ٹیکے پتر تو یہ بھی نہیں معلوم کہ آخر... وہ بندہ کون ہے جس نے ست بدھائی کو اپنی آخری آرام گاہ کے طور پر قبول کیا۔اس کی تصدیق ہونی چاہیے۔غنی کہاں ہے؟''

میں نے کہا۔''آخری اطلاعات کے مطابق وہ سورہا تھا۔گھوڑے بیچ کر۔''

''جوسوتا ہے وہ کھوتا ہے۔''راجا نے کہا اور میرے منع کرنے کے باوجود اسے طلب کرلیا۔وہ تقریباً دس منٹ بعد ہاتھ منہ دھو کے نمودار ہوا تب اس کی صورت سے تھکن اور کم خوابی کے آثار عیاں تھے۔

راجا نے پوچھا۔''مسٹر عبدالغنی۔اپنے چودھری صاحب کہاں ہیں؟''

اس نے کچھ سوچا اور پھر سمجھ کے مسکرانے لگا۔''ابھی ست بدھائی میں ہی ہیں۔ایک پلاسٹک بیگ میں اور پلاسٹک بند ہے ایک بوری میں۔بوری بالکل محفوظ ہے۔''

''بوری کس کو پہنچانے کا خیال ہے؟''

وہ مسکرایا۔''جو آپ حکم کریں سر۔کہیں تو اپنے رانا صاحب کو تحفے میں بھیج دیں۔''

میں نے کہا۔''اس کا صحیح پوسٹ مارٹم ضروری ہے تاکہ تصدیق ہوجائے کہ وہ چودھری سلطان ہے۔کوئی اور نہیں۔''

راجا نے کہا۔''اگر لاش تھانے پہنچ جائے تو پولیس کا کام کتنا آسان ہوجائے گا۔یا اپنے فاضل بھٹی صاحب کے گھر۔رپورٹ انہوں نے ہی لکھوائی ہے تاکہ ان کی پریشانی بھی ختم ہو کہ سالے صاحب حاضر ہیں۔''

غنی ہنسنے لگا۔''یہ بھی ہوجائے گا سر۔''

''کیسے بھیجوگے نہیں۔ڈاک سے یاریلوے سے۔''راجا بولا۔

''اس کی آپ فکر نہ کریں سر۔''

''فکر کیسے نہ کریں۔تم بڑے چالاک خاں ہوشیار خاں بنتے ہو۔اعتماد اچھی چیز ہے لیکن حد سے زیادہ ہو تو مروا بھی دیتا ہے۔'' میں نے کہا۔''تم خود کہیں پھنس جاؤگے۔''

''جیسا آپ کا حکم سرکار۔''وہ عاجزی سے بولا۔

دوپہر کے وقت میں نے اس جگہ کو جاکے دیکھا جہاں سے ہم نے گزشتہ رات ایک لاش برآمد کی تھی۔وہاں آٹھ دس مزدور تقریباً تیس فٹ چوڑا اور چھ سات فٹ گہرا گول تالاب جیسا گڑھا بنا چکے تھے۔جب میں نے اس سے پوچھا تو انہوں نے بتایا کہ یہاں اینٹوں کا بھٹہ ہوگا۔گڑھے سے نکلنے والی مٹی کو دریا کے پانی سے گوندھ کے اور گارے میں بھوسا ملاکے بھٹے کی دیواروں کی لپائی کے لیے دریا سے مزید پانی لایا جارہا تھا۔بے اختیار میرے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔اب لے آئیں رانا صاحب اسکاٹ لینڈ یارڈ کے سراغرساں' یہاں کیا ملے گا۔رانا صاحب خود وضاحت کرتے پھریں گے

کہ انفارمیشن مصدقہ تھی تو غلط کیسے ہوگئی۔

میں واپس پہنچا تو راجا نے مجھے مطلع کیا۔''ٹیکے پتر۔تھا جس کا انتظار وہ شاہکار آگیا۔''

''مجھے کسی کا انتظار نہیں تھا۔''

''وردی والے مہمان آرہے ہیں۔غنی نے مجھے فون پر اطلاع دی ہے کہ وہ سامنے سے آرہے تھے اور میرا خیال ہے کہ تیری گرفتاری کے وارنٹ ضرور ہوں گے ان کے پاس۔خانہ تلاشی کے ہوں نہ ہوں۔''

''خانہ تلاشی کی ضرورت بھی نہیں۔ایسا بے وقوف یہاں کون ہے کہ اپنے گھر کو قبرستان بنائے۔چودھری صاحب کو برآمد کرنے کے لیے انہیں جنگل کی خاک چھاننے کی ضرورت بھی نہیں۔یہ رانا صاحب کا کارنامہ ہوگا تو وہ معلومات بھی پوری دیں گے کہ فلاں جگہ دیکھو۔''

راجا کا اندیشہ درست ثابت ہوا۔پندرہ بیس منٹ بعد جیپ میں ایک ڈی ایس پی' ایک انسپکٹر اور دو ہتھکڑی بردار ماتحت نمودار ہوئے۔ڈی ایس پی کی حالت اس جنگل کے بادشاہ جیسی ہورہی تھی جسے سرکس والے سدھانے کے لیے پکڑ لائے ہوں۔

ڈی ایس پی نے نہایت اکڑفوں کے ساتھ کہا۔''ہم تشریف رکھنے نہیں آئے ہیں۔ملزم کہاں ہے؟''

''یہاں کوئی ملزم نہیں۔'' راجا نے مسکینی سے کہا۔''آپ غلط جگہ آگئے ہیں غالباً۔''

''دیکھو اوئے صحافی صاحب۔تم میرا نام نہیں جانتے۔''

''جیسے آپ میرا نام نہیں جانتے۔''راجا نے کہا۔

''اس نواب رفیق کو کہو کہ شرافت سے باہر آکے گرفتاری دے دے ورنہ۔''

''ورنہ آپ اندر جاکے پکڑلیں گے۔میں بھی تو آپ کو اندر ہی بلا رہا ہوں۔نواب رفیق کبھی پرائم منسٹر کو ریسیو کرنے بھی نہیں آتے۔''

مجسم قہر وغضب کی تصویر بنا وہ ایسے اندر آیا جیسے نادر شاہ دلی کو ختم کرنے کے بعد قلعے میں داخل ہوا ہوگا۔راجا نے اسے خاصا انتظار کرایا اور اس کی مصنوعی جھنجلاہٹ کا لطف لیتا رہا۔نواب صاحب استراحت فرمارہے تھے۔اب غسل فرمارہے ہیں۔اب لباس تبدیل کررہے ہیں۔

اس نے چائے پینے سے ایسے انکار کیا جیسے اس میں زہر ملا ہوا ہو حالانکہ اس کے ساتھ آنے والے ٹی ٹرالی میں بھرے ہوئے لوازمات کو بڑی للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

بالآخر میں نے بڑے شاہانہ وقار کے ساتھ مہمان خانے میں قدم رنجہ فرمایا۔میرے دشمن رانا اور اس کے مددگار وزیر داخلہ صاحب نے اس بار چمن کے ان بندوں کو بھیجا تھا جو نہ میرے رعب میں آئے اور نہ لالچ میں۔کسی تعارف کے بغیر اس نے کہا۔''آپ نواب رفیق ہو۔میرے پاس آپ کی گرفتاری کا وارنٹ ہے۔''

میں نے وارنٹ لے لیا۔''کس سلسلے میں؟''

''یہ آپ پڑھ سکتے ہو تو دیکھ لو۔آپ پر چودھری سلطان کو قتل کرنے کا الزام ہے۔''

میں نے وارنٹ پر سرسری نظر ڈالی۔پھر ضمانت قبل از گرفتاری کے احکامات اس کی طرف بڑھادیے۔''آپ بھی انگریزی پڑھ سکتے ہو تو دیکھ لو۔''میں نے کہا۔

احکامات دیکھتے ہی ڈی ایس پی کی حالت اس دلہا جیسی ہوگئی جس کو عین نکاح کے وقت دلہن نے مسترد کردیا ہو۔وہ بے یقینی کے ساتھ احکامات کو دیکھتا رہا۔اپنے ماتحتوں کے سامنے اس کی عزت کے غبارے کی ساری ہوا نکل گئی تھی۔

راجانے کہا۔ ”یہ بالکل اصلی ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”ایک بات بتاؤ مجھے ڈی ایس پی۔ اگر نہ میں باہر آتا نہ تمہیں اندر گھسنے دیتا تو تم کیا کرتے؟“

”میں اندر آ کے تمہیں پکڑ لیتا۔ مجھے کون روک سکتا تھا۔“

میں نے راجا کی طرف دیکھا۔ ”گیٹ بند کرادو۔ گارڈز سے کہو کہ پوزیشن سنبھال لیں۔ جب تک ہماری اجازت نہ ہو کوئی باہر نہ جانے پائے۔ ڈی ایس پی صاحب تا حکمِ ثانی حویلی میں رہیں گے۔“

ڈی ایس پی کا رنگ اڑ گیا۔ ”تمہیں اندازہ ہے کہ یہ کتنا بڑا جرم ہے۔ پولیس کے کام میں دخل۔ پولیس کو حبسِ بے جا میں رکھنا۔“

میں اٹھا اور دروازے تک پہنچ کے رک گیا۔ ”کون سی پولیس۔ کیسا حبسِ بے جا۔ یہاں تو کوئی بھی نہیں آیا۔“

راجانے پوچھا۔ ”حضور نواب صاحب۔ مہمانوں کو کون سے تہ خانے میں رکھا جائے۔ غلاموں والے یا مجرموں والے؟“

”یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“ ڈی ایس پی کی زبان میں لکنت آ گئی۔ نہ وہ غصہ کر سکتا تھا اور نہ منت سماجت۔ اس کے ماتحت خاموش بیٹھے یہ انوکھا تماشا دیکھ رہے تھے جو انہوں نے کبھی سوچا نہ ہوگا۔

میں نے ایک دم موڈ بدل لیا اور ہنس کے کہا۔ ”حضور ڈی ایس پی صاحب۔ ہم تو بس ایسے ہی دل لگی کر رہے تھے۔ آپ کے ساتھ گستاخی کر سکتا ہے کوئی اور گھر آئے مہمانوں کی خاطر داری حویلی کی روایت ہے۔ آپ نے اپنا فرض ادا کیا۔ اب چائے پینے میں کوئی حرج نہیں۔“

ڈی ایس پی کے رویّے میں ایک حیرت انگیز تبدیلی آئی۔ اس کے چہرے کی مصنوعی رعونت اور خشونت کا نقاب اتر گیا۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور ایزی ہو کے مسکرانے لگا۔ ”آپ اچھا ڈراما کر لیتے ہیں نواب صاحب۔ چائے ہم ضرور پئیں گے لیکن آپ کے ساتھ۔“

میں پھر بیٹھ گیا۔ ”جیسا آپ کا حکم۔ میری تو خواہش ہوتی کہ آپ اب ماحضر بھی تناول فرما کے جائیں۔“

”بہت شکریہ۔ دراصل ایک ذمے داری اور سونپی گئی ہے مجھے۔“ وہ کچھ تذبذب کا شکار ہو گیا۔ ”ایک مسئلہ ہے۔“

”کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں؟“ میں نے خود اسے چائے بنا کے پیش کی۔ ”آپ کے نئے آئی جی عبداللہ جان یہاں اکثر آ جاتے تھے۔ میرے پرانے مہربان ہیں۔ بڑے نفیس آدمی ہیں۔ اگر ان سے کوئی کام ہے تو بلا تکلف بتائیں۔“

ڈی ایس پی نے اپنے ماتحتوں کی طرف دیکھا۔ وہ افسر کی نظر پہچانتے تھے۔ انسپکٹر پہلے اٹھا۔ باقی دو اس کے پیچھے باہر نکل گئے۔

”تم بیٹھو گاڑی میں۔ میں آتا ہوں۔“ ڈی ایس پی نے کہا۔

”وقت ہوتا آپ کے پاس تو میں حویلی دکھاتا۔ جب وزیرِ اعلیٰ صاحب تشریف لائے تھے تو ان کے پاس بہت کم وقت تھا پھر بھی انہوں نے کچھ خاص حصے ملاحظہ کیے اور بہت متاثر ہوئے۔“

ڈی ایس پی کو شاید یہ سب معلوم ہی نہیں تھا۔ اس کی اتنی اوقات کہاں کہ آئی جی کے اور وزیرِ اعلیٰ کے حوالوں کے بعد نظر اٹھا کے بات بھی کر سکتا۔ ”جناب عالی۔ آپ تو جانتے ہیں۔ ہم جیسے بس حکم کے غلام ہوتے ہیں۔ اوپر والے جو کہیں۔ یس سر کہنا پڑتا ہے۔“

”مجھے معلوم ہے ڈی ایس پی۔ تم اپنی پریشانی بتاؤ۔“

”وہ دراصل کسی نے یہ مخبری کی تھی کہ مقتول کی لاش بھی یہاں دفن ہے۔“

میں نے کہا۔ ”یہاں۔ یعنی حویلی میں؟“

”نہیں سر۔ حویلی سے باہر۔ آپ کی ریاست کی حدود میں۔ یہ جو دو سپاہی آئے ہیں۔ ان میں سے ایک کو معلوم ہے۔ کل وہ جگہ دیکھ گیا تھا۔“ ڈی ایس پی نے کہا۔

”کل؟ کل کس وقت۔ ہماری ریاست کی حدود میں کوئی پرندہ بھی پر مارے تو ہمیں اطلاع مل جاتی ہے مگر خیر۔ کہاں ہے وہ جگہ؟“

”پیچھے کہیں جنگل میں۔“

میں نے کہا۔ ”کیا آپ کو وہ لاش بھی برآمد کرنے کی ذمے داری سونپی گئی ہے؟“

”جی سر۔ اگر آپ کی اجازت ہو۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ آپ قانونی کارروائی کریں۔ میری مدد کی ضرورت ہے تو بتائیں۔“

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ”میں معافی چاہتا ہوں۔ میرا رویہ مناسب نہیں تھا۔ دراصل مجھے غلط بتایا گیا تھا آپ کے بارے میں۔“

میں نے کہا۔ ”کوئی بات نہیں۔ اگر ممکن ہو تو واپسی میں کھانا ہمارے ساتھ کھائیں۔ ابھی آپ ہیں تو ہماری ریاست کی حدود میں۔“

اب جو ڈی ایس پی کے ساتھ جائے واردات پر ہوا اس کی رپورٹ مجھے بعد میں وہاں کام کرنے والوں میں سے

ایک شخص نے دی۔ اس نے بتایا۔ ”پولیس والے جیپ سے اتر کے دیکھتے رہے۔ ان کے افسر نے سپاہی سے پوچھا۔ ”اوئے۔ یہی جگہ تھی وہ؟“

سپاہی نے ہکلا کے جواب دیا۔ ”بالکل۔ بالکل جناب۔“

افسر گرم ہو گیا۔ اوئے بالکل دے پتر۔ تو اس وقت ہوش میں نہیں تھا یا ابھی ہوش میں نہیں ہے۔“

سپاہی نے عادت کے مطابق ہکلا کے کہا۔ ”سر...... میں...... میں......“

”اوئے بکرے کی اولاد۔ آگے بول۔“

”میں نے چا...... چا...... چاروں طرف۔ درختوں...... پر...... نشان...... ما......“

افسر نے کہا۔ ”اوئے کبھی چاچا پر رک جاتی ہے تیری گاڑی کبھی ماما پر۔ کدھر ہیں وہ نشان؟“

سپاہی نے چار درختوں پر کوئلے یا سیاہی سے کراس دکھائے۔ وہ جگہ درمیان میں تھی۔ افسر نے مجھے بلایا اور پوچھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ میں نے کہا کہ جنابِ عالی اینٹوں کا بھٹہ بنانے کے لیے کام ہو رہا ہے۔ اس نے پوچھا کب سے ہو رہا ہے۔ میں نے کہا کہ ہفتہ ہو گیا۔ پچھلی جمعرات کو کام شروع کیا تھا۔ افسر نے سپاہی کے ایک ہاتھ رسید کیا اور بولا۔ مجھے پتا ہے تو ادھر آیا ہی نہیں ہوگا۔ حرام خور! اب تیری پیٹی اترے گی۔ سپاہی بے چارہ بڑ بڑا دیا پیا۔ قسمیں کھاتا رہا لیکن افسر کا غصہ کم نہیں ہوا۔ وہ جیپ میں بیٹھ کے واپس چلا گیا۔

قدرت کے کھیل انوکھے ہیں۔ اگر مجھے اپنی ضمانت قبل از گرفتاری منظور کرانے گجرات نہ جانا پڑتا تو غنی کو بھی وہاں موقع نہ ملتا کہ وہ فریال کی کوٹھی میں گھس کے رانا کے بیڈ روم سے اس کے دو کپڑے چرا لائے۔ ان کپڑوں کے بغیر کتے ہماری کیا مدد کرتے۔ سب ایک ٹائم کے مطابق ہوتا رہا۔ کہیں کسی وجہ سے ایک دن کی تاخیر ہو جاتی تو آج میری گرفتاری یقینی تھی۔ چودھری سلطان کی لاش برآمد ہو جانے کے بعد کہاں کی ضمانت اور کیسی رہائی۔ رانا اپنا پورا زور لگا دیتا کہ میں پھانسی پا کے ہی قید سے رہائی پاؤں۔

ڈی ایس پی خلافِ توقع ایک گھنٹے میں پھر آیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ کتنا مایوس ہوگا لیکن اس کی صورت دیکھ کے تو مجھے ترس کے بجائے ہنسی آ گئی۔ میرا شک یقین میں بدل گیا کہ اسے بطورِ خاص اس خاص کام کے لیے منتخب کیا گیا ہوگا اور کامیابی کی صورت میں اسے صرف تعریف یا سند کا نہیں بلکہ پروموشن کا وعدہ کیا گیا ہوگا۔ کسی ڈی ایس پی کے لیے ایس پی بن جانا ایسا ہی خواب ہوتا ہے جیسے کسی سب انسپکٹر کے لیے تین پھول والا...... ایس ایچ او بن جانا۔ اس کا یہ خواب چکنا چور ہو گیا تھا۔

میرے سامنے اس نے ناکامی پر کسی مایوسی کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کتنا پرفیکٹ منافق ہوگا۔ اس نے کہا۔ ”کسی نے بکواس کی تھی جناب۔ آپ کا کوئی دشمن ہوگا۔“

میں نے بھی منافقت دکھائی۔ ”یہاں میرا کون دشمن ہو سکتا ہے۔ ویسے دشمن کس کے نہیں ہوتے؟“

”اب دیکھیے نا سر۔ خدانخواستہ آپ کسی دشمن کو قتل کریں گے تو کیا اسے اپنے ہی گھر کے آنگن میں گاڑیں گے۔“

میں نے کہا۔ ”آپ کہاں گاڑو گے؟“

وہ کچھ شپٹایا۔ ”میں؟...... میں کیوں قتل کروں گا۔ دشمن تو میرا ابھی کوئی نہیں۔“

میں نے اصرار کیا۔ ”فرض کریں اگر کرنا پڑے۔“

”وہ جی...... ساری دنیا پڑی ہے۔ جہاں چاہو دبا دو ایک بندے کا کیا ہے۔ جلا کے راکھ بنا دو۔ ٹوٹے ٹوٹے کر کے دریا میں یا سمندر میں بہا دو۔“

”چلیں جی چھوڑیں۔ آپ نے اچھا کیا واپس آ گئے۔ کھانا تیار ہے۔“ میں نے کہا۔

تھوڑے سے اصرار پر وہ مان گیا۔ کھانے کا وقت تھا اور اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ حویلی کی ضیافت چھوڑی تو پیٹ بھرنے کے لیے پھر کسی کیفے ڈی پھونس یا غریب نواز ہوٹل کی دال ماش پر اکتفا کرنا پڑے گا۔ کھانے کے دوران اس نے مجھ سے رقابت کی اس خونی کہانی کے بارے میں آف دی ریکارڈ بات کرنے کی کوشش کی۔ فریال کے میرے اور سلطان کے درمیان عشق و محبت رقابت اور دشمنی کا سلسلہ کب سے چل رہا تھا۔ یہ فریال کس قسم کی عورت ہے؟ اس کا اور کسی سے بھی چکر ہے؟ یہ تو فلموں میں کام کرنے والی...... کیا کسی...... سے کم ہوتی ہیں۔ نوابوں کے تو شوق ہوتے ہیں طوائفوں کو داشتہ بنانے کے۔ وہ ایک جاہل بے وقوف اور کم عقل آدمی تھا۔

میں نے اس سے پوچھا کہ ”اب تک کی تحقیقات میں کیا سامنے آیا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ قتل کرنے والا کوئی اور ہو اور فائدہ اٹھانا چاہتا ہو ہمارے پرانے رقابت کے رشتے کا؟ آخر وہ کہاں جا سکتا ہے۔ جب تک لاش نہ مل جائے قتل تو ثابت نہیں ہوتا۔ اس کے دشمن اور بھی ہوں گے۔ میں نے سنا ہے اس نے اپنی پہلی بیوی کو بھی قتل کیا تھا۔ اس کا سالا امریکا

سے آیا تھا۔ اپنی بہن کے قاتل کو تختہ دار تک پہنچانے کے لیے بہت پُرجوش تھا مگر پاکستان میں بندہ اثر ورسوخ رکھتا ہو اور پیسا کھلے ہاتھ سے خرچ کرے تو اسے سات خون معاف۔"

اسے بہت سی باتوں کا علم نہیں تھا۔ اسے تو بس ایک ٹارگٹ دیا گیا تھا۔ فلاں جگہ جاؤ۔ وہ جگہ نشان زدہ ہے۔ وہاں چودھری سلطان کی لاش گاڑی گئی ہے۔ وہ نکال لاؤ۔ نواب رفیق کی گرفتاری کے وارنٹ اضافی تھما دیے گئے تھے لیکن نہ اسے نواب رفیق کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ اس نے رانا کو نکیل ڈال دی ہے اور نہ یہ معلوم تھا کہ اس کے ہاتھ کتنے لمبے ہیں۔ اسے یقین دلایا گیا ہوگا کہ اس میں نہ رسک ہے نہ محنت اور پریشانی۔ لاش بالکل ریڈی ہے۔ جاؤ اور نکال کے لے آؤ اور جس کے علاقے سے لاش ملی ہے اس کے وارنٹ ہیں تو پھر گرفتاری میں کیا دشواری ہو سکتی ہے۔

ڈی ایس پی سخت خفت اٹھا کے گیا۔ باتوں باتوں میں ہم نے اسے ٹھیک ٹھاک ذلیل کیا تھا۔ محاورے کے مطابق بھگو بھگو کے جوتے مارے تھے۔ اسے یقین آگیا تھا کہ یہاں سے وہ اپنے ماتحتوں سمیت زندہ سلامت واپس جا رہا ہے تو یہ بھی میری مہربانی ہے ورنہ میں اسے غلاموں یا مجرموں کے تہ خانے میں باندھ کے ڈال دیتا تو برآمد کون کرتا؟ ثابت کیسے ہوتا کہ ان میں سے کوئی ادھر آیا بھی تھا۔ ست بدھائی کی حویلی کو اس نے نہ جانے کیا سمجھا تھا۔ شہر میں تو پانچ مرلے کا گھر بنا کے لوگ سنگِ مرمر کی تختی جڑ دیتے ہیں خورشید پیلس۔ نورمحل۔ قصرِشیریں۔

اس کے جانے کے بعد مجھے غنی کی فکر لاحق ہوئی۔ وہ میرے سامنے لیس سر کہنے والا ہر کام اپنی عقل کے مطابق کرتا تھا۔ چونکہ آج تک اس کی وجہ سے نہ کہیں میری پوزیشن خراب ہوئی تھی اور نہ کوئی نقصان ہوا تھا اس لیے حکم عدولی کے زمرے میں آنے والی خودمختاری پر بھی اس کو تعریف ہی ملی تھی۔ اب وہ چودھری سلطان کی لاش کو ٹھکانے لگانے نکلا تھا تو معلوم نہیں اس کی کھوپڑی میں کیا تھا۔

اس نے اپنا فون بھی بند کر رکھا تھا چنانچہ کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔ رات کو خود اس نے فون کر کے بتایا کہ وہ خیر وعافیت کے ساتھ اپنا کام ختم کر کے واپس آ رہا ہے تو میری تسلی ہوئی۔

شام کو ہم سب بھی باغ میں اکٹھے بیٹھے چائے پیتے ہوئے آج دن بھر کے واقعات پر ہنستے رہے اور خدا کا شکر بھی ادا کرتے رہے۔ بوبی ہر وقت باغ میں پرندوں کے پیچھے دوڑنے کے لیے تیار رہتا تھا۔ اس وقت بھی وہ موروں اور بطخوں کے ساتھ کھیل رہا تھا اور اس کے معصوم خوشی سے بھرپور قہقہے ہم سب کو خوش کر رہے تھے۔ مجھے ثریا سے کچھ کہنے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ خواتین نے مل کے اسے قائل کر لیا تھا کہ وہ دنیا میں اکیلی نہیں ہے۔ وہ ہم سب کے ساتھ رہے گی۔ اتنی محبت اور اتنا خلوص چھوڑ کے وہ کہاں جا سکتی تھی۔ اس سے سب کو دلی ہمدردی تھی اور خود ثریا کے لیے محل کے عیش وآرام اور تحفظ کی ضمانت چھوڑ کے اپنے گھر میں تنہا رہنا دنیا کا مقابلہ کرنا اور اس بچے کو پالنا ایک ڈراؤنا خواب بن گیا تھا۔ ثریا کی جذباتی کیفیت کے پیشِ نظر یہ طے کر لیا گیا تھا کہ شہزاد کا نام بھی نہیں لیا جائے گا۔ دیکھا جائے تو اس فیصلے کا فائدہ رابعہ کو بھی پہنچا تھا۔

رابعہ کی عجیب کیفیت تھی۔ وہ نارمل نظر آنے کی پوری کوشش کرتی تھی لیکن کسی بھی وقت سب کے درمیان رہ کے بھی اچانک ذہنی طور پر غیر حاضر ہو جاتی تھی۔ وہ سب سے کٹ کر اپنی سوچ کے دھارے میں نہ جانے کس طرف نکل جاتی تھی۔ یہ سب نوٹ کرتے تھے مگر کچھ کہتے نہیں تھے۔ اس قسم کے جذباتی حادثے کے بعد کون نارمل رہ سکتا ہے۔

اندھیرا پھیلا تو سبزے اور فوارے کی نمی کے باعث مچھروں نے یلغار کی۔ بوبی نے نیکر پہن رکھی تھی۔ ثریا اسے اندر لے گئی۔ شہناز اس کے ساتھ اٹھ گئی۔ لیلیٰ بھابی کمرے سے باہر ہی نہیں آئی تھیں۔ وہ آج کل کچھ زیادہ ہی پابند صوم وصلوٰۃ ہو گئی تھیں اور مغرب کے وقت کی نماز کو عشا سے ملانے لگی تھیں۔ درمیان میں وہ تسبیح لیے نہ جانے کیا پڑھتی رہتی تھیں۔

راجا اور گولی کافی فاصلے پر ٹہلتے ہوئے غالباً حیدرآباد جا کے ان قبروں پر دعائے مغفرت مانگنے کا پروگرام بنا رہے تھے جن میں شامی بادشاہ کے پولیس مقابلے میں ہلاک کیے جانے والے ساتھی دفن تھے۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ کسی کے لیے مغفرت کی دعا مانگنا مقصود ہو تو اس کے لیے مٹی کے اس ڈھیر پر کھڑا ہونا لازمی ہے جس کے نیچے کسی کا جسدِ خاکی موجود ہو۔ دعا کسی کے لیے کہیں بھی کی جا سکتی ہے تاہم اس سے کسی کے جذبات کو تسکین حاصل ہوتی ہو تو وہ قبر پر جائے۔ اپنے عقیدے کے مطابق پھول چڑھائے۔ چراغ روشن کرے یا اگربتیاں جلائے۔

گولی کا مسئلہ کچھ اور ہی تھا۔ نہ جانے کیوں اس کے دماغ میں یہ خیال سما گیا تھا کہ وہ قبر دیکھ کے تصدیق کر سکتی ہے کہ اس میں شامی دفن ہے یا کوئی اور۔ میرے نزدیک یہ

کل پن تھا اور ناممکن تھا۔ اگر اس کو پہلے ہی یقین تھا کہ شامی زندہ ہے پھر اسے قبر پر جانے کی کیا ضرورت تھی۔ مجھے شک تھا کہ اس کے دماغ میں کچھ اور ہے جو وہ ہمیں نہیں بتا رہی۔ تاہم راجا نے اس کے ساتھ جانے کی ذمے داری قبول کر لی تھی۔ یہ کام وہی کر سکتا تھا۔

اچانک وہاں صرف میں اور رابعہ رہ گئے۔ میں نے کہا۔ "کزن۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ تم کچھ کہنا چاہتی ہو۔"

"ہاں۔ کہا تو پہلے بھی تھا لیکن اس سے کیا ہوا۔"

میں نے کہا۔ "اس بات کو بھول جاؤ۔ جو ناممکن ہے وہ ناممکن ہے میرے لیے۔ ویسے تم خودمختار ہو۔"

"میں خودمختار ہوں؟" وہ طنز سے بولی۔ "کیسے کزن؟ اس لیے کہ میری عمر قانونی طور پر چوبیس سال ہے۔ کیا کسی لڑکی کے لیے صرف بالغ ہونا کافی ہوتا ہے خودمختاری حاصل کرنے کے لیے؟"

"اور کیا ہونا چاہیے تمہارے خیال میں؟"

"اپنے ایمان سے کہو۔ معاشی خودمختاری کے بغیر یہ قانونی خودمختاری کی بات محض بکواس ہے یا نہیں؟ اگر میں خودمختار زندگی گزارنے کا فیصلہ کروں تو کیا ہے میرے پاس؟ کوئی ایسی ڈگری بھی نہیں کہ مجھے باعزت ملازمت مل سکے؟"

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد میں نے کہا۔ "میں بہت اچھی طرح سمجھ گیا تم کیا کہنا چاہتی ہو۔"

"خود کو میری جگہ رکھو کزن۔ تم مالک ہو۔ یہ سب کچھ۔ جاگیر، حویلی، روپیہ پیسا، حکومت اور حیثیت۔ سب تمہارا ہے۔ میرا کیا ہے۔ تم سے نام کا رشتہ۔ میں شہزادی لکھ سکتی ہوں اپنے نام کے ساتھ۔ پرنسس رابعہ...... لیکن میرے ہاتھ خالی ہیں۔ اپنی ہر ضرورت کے لیے میں تمہاری محتاج ہوں۔"

"آئی ایم سوری۔ میں نے اس حقیقت کو خود نہیں سمجھا۔ تمہیں یہ سب کہنا پڑا۔ مجھے واقعی شرمندگی ہے۔"

"میرے نصیب دھوکا نہ دیتے اور میری رخصتی ہوتی خرم کے ساتھ یا شہزاد کے ساتھ تو مجھے شاہانہ جہیز ضرور ملتا لیکن شوہر کے گھر میں ہر ذاتی ضرورت کے لیے میں شوہر کے سامنے ہاتھ پھیلاتی۔ میں ایک عام لڑکی ہوتی۔ جیسے ثریا تھی۔ بے شک وہ مرعوب ہوتا لیکن میری اپنی طاقت کیا ہوتی۔ یہ زیورات، لاکھوں کے سیٹ۔"

"پلیز رابعہ۔ میں سمجھ گیا۔ میں تمہارا بینک اکاؤنٹ کھلوا دیتا ہوں۔ بتاؤ اس میں کتنی رقم ٹرانسفر کروں۔ میں بینک چیک دے سکتا ہوں۔"

وہ ہنسنے لگی۔ "واہ۔ کیا فیاضی ہے۔ کیا دریا دلی ہے۔"

میرا سر گرم ہونے لگا۔ "رابعہ۔ تمہیں کیا چاہیے؟"

"تایا مرحوم اس ناانصافی کو تسلیم کرتے تھے جو میرے ساتھ ہوئی تھی۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

"میرا خیال ہے ناانصافی کی بات ہوتی تو وہ مجھ سے بھی کرتے۔" میں نے کہا۔

"تم قانون کے حوالے سے اپنا دفاع کرو گے۔ مجھے معلوم ہے۔ میں اخلاقی حق کی بات کر رہی ہوں۔" اس کا لہجہ سخت ہو گیا۔

"کون سے حق کی؟"

"حقِ وراثت کی اور کس کی؟" وہ برہمی سے بولی۔ "قانونی طور پر سب تمہیں مل گیا۔ قصوروار تم نہیں۔ میں مانتی ہوں مگر کیا تم محسوس بھی نہیں کرتے کہ وارث تم نہیں۔ میرے اور تمہارے والد تھے۔"

"اگر وہ مر جاتے اور فیصلہ حقِ وراثت کے قانون کے مطابق کیا جاتا تو یقیناً ایسا ہی ہوتا۔ اگر لندن میں میرے تمہارے دادا نے اپنی زندگی میں سب مجھے دے دیا تو قانونِ

وراثت کا سوال کہاں اٹھا؟"

وہ تلخی سے بولی۔"مجھے پتا تھا۔تم قانون کی بات کرو گے۔ یہ صدمہ لے کر میرے ماں باپ مر گئے۔ میں تمہارے رحم و کرم پر رہ گئی۔"

"رابعہ۔تم آج اتنے عرصے بعد یہ سب کہہ رہی ہو؟"

اس نے میری بات کاٹ دی۔"کیا اب بھی نہ کہوں۔اتنا وقت گزر گیا انتظار میں۔ میں نے تمہیں مہلت دی کہ شاید تمہیں خیال آجائے لیکن تم کو احساس ہی نہیں۔"

"تم جائداد اور جاگیر میں حصے دار بننا چاہتی ہو؟"

"یس۔ بے شرم اور بے غیرت بن کر مجھے اپنا حق مانگنا پڑ رہا ہے۔خیرات میں...... میں مفلس شہزادی بن کے محل میں کب تک رہوں؟ مجھے تو کوئی مرتبہ بھی نہیں ملا۔میرے حقوق دوسروں سے زیادہ نہیں۔ میں انہی میں سے ایک ہوں جو یہاں رہتے ہیں۔"

"او کے۔اب میرا فیصلہ بھی سن لو رابعہ۔ یہ نہیں کہ میں نے اس مسئلے پر کبھی سوچنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ میں طے کر چکا تھا کہ جو حق تمہیں قانون کی رو سے نہیں ملا۔وہ میں بھائی کی حیثیت سے تمہیں ضرور دوں گا۔ یہ میں نے طے نہیں کیا تھا کہ تمہارا حصہ آدھا ہوگا یا شرع کے مطابق ایک تہائی یا دو حصے میرے ایک تمہارا۔ لیکن تم بھی مالک بن جاتیں۔میرا دل اتنا تنگ نہیں ہے۔پھر مجھے احساس ہے کہ اب تم میری ذمے داری ہو۔لیکن میں ایسے چکروں میں پھنس گیا اور آج بھی پھنسا ہوا ہوں کہ تمہارے لیے عملی طور پر کچھ نہیں کر پایا۔"

"خیر۔دیر آید درست آید۔اب فیصلہ کر لو۔"

میں نے کہا۔"فی الحال میں نے فیصلہ ملتوی کر دیا ہے۔تمہارے فیصلے کی وجہ سے۔"پھر میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"میرا کون سا فیصلہ ہے جسے تم بہانہ بنا رہے ہو؟"

میں نے کہا۔"سوچو۔تم نے مجھ کیا دھمکی دی تھی؟ کہ میں نے زوہیب کے لیے تمہارا رشتہ منظور نہ کیا تو تم اپنا قانونی طور پر خود مختار ہونے کا حق بھی استعمال کر سکتی ہو۔ یاد ہے نا؟ تو جب بات ہو قانونی حق کی تو پھر اخلاقی حقوق یاد نہیں دلانے چاہئیں۔اب یہ ناممکن ہے کہ میں آدھی یا ایک تہائی میں تمہیں وارث بنا دوں اور تم یہ سب لے کر چلی جاؤ رانا نگر۔ جو میرا ہے وہ میرے دشمنوں کی ملکیت بن جائے۔"

میں نے غصے سے کہا اور رابعہ کو لاجواب چھوڑ کے واک آؤٹ کر گیا۔

میرے آخری الفاظ اتنی اونچی آواز میں بولے گئے تھے کہ راجا اور گولی بھی رک گئے تھے۔ میں نے برآمدے میں پہنچ کے پلٹ کے دیکھا تو وہ دونوں رابعہ کے پاس بیٹھے تھے۔ رابعہ یقیناً رو رہی تھی۔ رابعہ کے رویے سے پہلے مجھے حیرانی ہوئی تھی کہ وہ اس قسم کی بات بھی کیسے کر سکتی ہے۔ میں اس کے لیے زوہیب کا رشتہ منظور کر لوں۔ یہ سوچنا بھی میرے نزدیک پاگل پن تھا۔ پہلے اس نے مجھے احساس دلایا تھا کہ زوہیب سے شادی کر کے اس کی کوئی حیثیت تو تسلیم ہوگی۔ یہاں تو وہ کچھ بھی نہیں۔

آج اس نے لحاظ مروت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کھل کے بات کی تھی۔ اس نے وراثت میں اپنا حق مانگ لیا تھا۔ اس کا مجھے بہت دکھ تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ رشتوں کے ادب آداب، مروت اور اخلاق کو بالائے طاق رکھ کر ایسے لہجے میں مجھ سے بات کرے گی۔ یوں اپنا حق مانگے گی۔ جیسے میں اس کا مقروض ہوں۔

میں سخت طیش کی کیفیت میں اپنے کمرے میں اِدھر سے اُدھر ٹہلتا رہا۔ رابعہ کے اور میرے تعلقات میں ایک کھنچاؤ آگیا تھا۔ اس کشیدگی نے آج رشتوں میں دراڑ ڈال دی تھی۔ جو اس کے دل میں تھا زبان پر آگیا تھا اور جو مجھے کہنا تھا میں نے دوٹوک کہہ دیا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے اب ہمارے تعلقات کبھی معمول پر نہیں آئیں گے۔

بدگمانی میری سوچ کو خراب کر رہی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے فاروقی کی سازش کے پیچھے بھی رابعہ کی اس خواہش کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔ یہ جاگیر حویلی اور زمین کا مالک بننے کی خواہش اس کے دل میں ہوگی۔ اس لیے فاروقی سے پوچھا ہوگا کہ اسے اپنا حق کیسے مل سکتا ہے۔ حق کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا مگر فاروقی نے رابعہ کی خواہش دیکھتے ہوئے ایک سازش تیار کی۔ اگر میں مر جاؤں اور رابعہ سے شادی کر لے تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔

کیا پتا شہزاد سے بھی رابعہ کو محبت نہ ہو۔ اسے وہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے استعمال کرنا چاہتی ہو۔ جب ہاتھ سے نکل گیا تو رابعہ کو صدمہ صرف یہ ہوا کہ اس کی یہ اسکیم بھی ناکام رہی۔ کیا اس کا مطلب یہ نہیں کہ میری جگہ لینے کے لیے وہ کسی بھی انتہا تک جا سکتی ہے؟ کچھ بھی کر سکتی ہے؟ مثلاً یہ کہ مجھے راستے سے ہٹا دے۔ یہ بات تو اسے اچھی طرح معلوم ہوگی کہ میرے بعد سب کچھ اسی کا ہے۔

مجھے اب اس کی طرف سے محتاط رہنا چاہیے۔ میں نے فیصلہ کیا۔ یہ وراثت کی جنگ ہی تھی جس میں تخت پر بیٹھنے کے

ے بھائی نے بھائی کا گلا کاٹا باپ کو قتل کیا۔

اچانک میرے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے دیکھا تو کوئی اجنبی نمبر تھا۔ میں نے کال ریسیو کرنے کا بٹن دبا کے کہا۔"ہیلو۔"

دوسری طرف سے کچھ دیر بعد کسی عورت نے آہستہ سے کہا۔"ہیلو۔"

میں نے کہا۔"آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟"

"آپ سے۔"جواب آیا۔

میں نے آواز اور لہجے پر غور کیا۔آخر یہ کون خاتون ہیں۔کیا کسی نے شرارت میں کال کی ہے۔"آپ کون ہیں خاتون؟"

عورت نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی۔"پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے۔"

میں نے چلّا کے کہا۔"نور جہاں۔کہاں ہو تم؟"

"وہیں۔جہاں مجھے ہونا چاہیے۔"اس نے شوخ لہجے میں کہا۔

"پلیز نور۔تنگ مت کرو۔ مجھے بتاؤ کہاں ہو تم۔ میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔

"ملنا چاہتے ہو تو آجاؤ۔"اس نے ہنس کے کہا۔

"آجاؤں۔"کہاں آجاؤں؟"

وہ پھر ہنسی۔"وہیں۔اسی وقت۔"

اس کے ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔ میں نے بے تابی سے جوابی کال کی۔ جواب ملا۔"جس فون پر آپ کال کر رہے ہیں وہ بند ہے۔"میں نے دوسری بار پھر تیسری بار کوشش کی مگر نور نے موبائل کو آف کر دیا تھا۔

"وہیں؟"میں نے سوچا۔وہ مجھے بلا رہی ہے مگر میں کہاں جاؤں؟ اس نے تو پتا بتائے بغیر فون ہی بند کر دیا۔ بھلا وہیں سے کوئی کیا سمجھ سکتا ہے۔ اور تب میرے دل نے کہا۔وہیں کا مطلب بھی نہیں سمجھتے تم جیسے مجنوں کے لیے لیلیٰ کا ایک اشارہ کافی ہونا چاہیے۔ ارے عقلمند۔ وہیں کا مطلب ہے وہیں۔ جہاں پہلے ملتے تھے۔

میں ایک دم باہر آیا۔غنی ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ دنا میں اب کوئی نہیں تھا۔ایک گاڑی سامنے کھڑی تھی۔ میں نے سوچا کہ راجا کو شریکِ راز کر لوں پھر طے کیا کہ فون پر بتا دوں گا۔میں نے گاڑی اسٹارٹ کرنے کے لیے چابی لگائی تھی کہ پھر فون بجا۔

یہ دوسرا نمبر تھا۔ میں نے کہا۔"ہیلو۔"

"رفیق۔تم آسکتے ہو ابھی؟"کسی عورت نے کہا مگر یہ نور جہاں نہیں تھی۔

اس آواز کو پہچاننے کے لیے مجھے ذہن پر دباؤ ڈال کر سوچنے کی اور اپنی یادداشت کا امتحان لینے کی قطعی ضرورت نہیں تھی۔ یہ اسی کج ادا کی صدا تھی جس نے ایک عرصے تک مجھے اپنی انا پرستی پر اعتبار کی خوش گمانی میں مبتلا رکھا اور جب محبت میں ثابت قدم رہنے کی آزمائش کا وقت آیا تو میرے ارمانوں کا خون کر کے اپنا راستہ بدلنے میں دیر نہیں لگائی۔

یہ یقیناً فریال کی ہی آواز تھی۔ مجھے اس نتیجے پر پہنچنے میں دیر نہیں لگی۔اس وقت فریال کا مجھے فون کر کے فوراً بلانے کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہو سکتا تھا کہ اسے میری یاد نے بے قرار کر دیا ہے اور وہ پرانے تعلق کو پھر سے استوار کرنا چاہتی ہے۔ نہ اس کے دل میں ایسی کوئی خواہش ہو سکتی تھی اور نہ یہ امید کہ ابھی تک میں اس کے عشق میں ایسا دیوانہ ہوں کہ اس کا اشارہ پاتے ہی سر کے بل دوڑتا چلا آؤں گا۔

میں سمجھ گیا کہ وہ یقیناً مجھ سے مدد کی طلب گار ہوگی اور مشکل میں پھر اسے رفیق یاد آیا ہوگا جو خفا ہو سکتا تھا مگر اتنا بے مروت اور کمینہ نہیں ہو سکتا تھا کہ انکار کر دے۔ وہ سلطان کی بے سبب اور پُراسرار گمشدگی کے بعد سے قانونی مشکلات میں گرفتار تھی۔شاید اسے اس کڑے وقت کے لیے ساتھیوں نے مایوس کیا ہوگا کہ اس نے پھر مجھ سے رجوع کیا۔

جب پولیس اسے زنجیروں میں جکڑ کے ست بدھائی کی حویلی میں میرے سامنے لائی تھی تو میں نے شہزاد کی مدد سے اتنا ضرور کیا تھا کہ اسے غیر قانونی حراست سے آزاد کرا دیا تھا۔ تاہم وہ کیس ابھی ختم نہیں ہوا تھا اور چودھری سلطان کی لاش مل جانے کے بعد یقیناً اس میں نئی جان پڑ گئی ہوگی۔

میں اس وقت نور جہاں کے حسنِ بے مثال، اس کی آواز کی سرگم اور اس کی قربت کے خمار آفریں لمحات کے تصور میں ڈوبا ہوا تھا۔ کسی حد تک مجھے فریال کی یہ بے وقت کی پکار بھی ناگوار لگی۔ مجھے اس طلبی پر جھنجلاہٹ محسوس ہوئی۔ پہلے میں نے سوچا کہ اسے صاف بتا دوں کہ مجھے نور جہاں نے بلایا ہے۔ اس وقت فرشتۂ اجل بھی مجھے لے جانا چاہے تو میں نہ جاؤں ۔ مشکل یہ تھی کہ میں کال ریسیو کر چکا تھا۔اب بھی ٹالنے کا ایک طریقہ تھا کہ میں ہیلو ہیلو ہی کرتا رہتا اور ظاہر کرتا کہ اس کی آواز مجھ تک نہیں پہنچ رہی ہے لیکن ایسی کمینگی کا مظاہرہ میرے لیے ممکن نہ تھا۔

فریال نے کہا۔"رفیق! تم سن رہے ہو......؟"

میں نے کہا۔"میں سن رہا ہوں۔"

"تم کہاں ہواس وقت؟"

فریال کے سوال نے میری مشکل آسان کردی۔"لاہور میں۔تم بتاؤ میری یاد کیوں آئی تمہیں؟"

اس نے چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد کہا۔"آئی ایم سوری۔میرا اب تم پر کیا حق ہے۔مجھے تم کو فون کرنا ہی نہیں چاہیے تھا۔"

میں نے جلدی سے کہا۔"دیکھو۔میرا یہ مطلب نہیں تھا۔پلیز مجھے بتاؤ مسئلہ کیا ہے پھر میں دیکھتا ہوں۔"

وہ کچھ مایوس ہوئی۔"اس کا مطلب ہے تم کہیں مصروف ہو' یہ مصروفیت زیادہ اہم ہے؟"

"فریال۔کیا یہ بتانا ضروری ہے کہ میری رہائش لاہور میں نہیں ست بدحائی میں ہے اور یہاں میں شاہی محلے میں کسی کا مجرا دیکھنے نہیں آتا۔تم خود کہاں ہواس وقت۔کیوں فون کیا ہے مجھے؟"

وہ میرے سخت لہجے سے ہراساں ہوئی۔"وہ۔دراصل پولیس نے مجھے پھر گرفتار کرنے کے لیے چھاپا مارا تھا۔میرے گجرات والے گھر پر۔"

"تو تم گجرات میں ہو۔"

"میرا کچھ معاملہ چل رہا تھا۔میرا مطلب ہے، میں اس گھر کو سیل کرنا چاہتی تھی اور ایک خریدار بھی مل گیا تھا مجھے۔"

میں نے طنز سے کہا۔"ہاں یہ کوٹھی تمہاری ہے۔اب تو وہ بھی نہیں رہا جس نے تمہیں یہ تحفہ دیا تھا۔"

"میں مصیبت میں ہوں۔اس لیے تم کچھ بھی کہو سن لوں گی۔سلطان نے اپنی زندگی میں ہی مجھے یہ اختیار دے دیا تھا۔میں نے کہا تھا کہ جب مجھے یہاں رہنا نہیں تو پھر اس کوٹھی کو رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔اتفاق سے ایک شخص اپنی گلبرگ کی کوٹھی کے بدلے میری کوٹھی لینے پر تیار ہو گیا۔فائدہ اسی کا تھا۔ضرورت دونوں کی تھی۔کل صبح عدالت میں کاغذات پر دستخط ہو جاتے۔لاہور والی کوٹھی قانونی طور پر مجھے پہلے ہی مل چکی ہے۔"

"دیکھو۔میں ڈرائیونگ کر رہا ہوں۔فون پر لمبی بات نہیں کرسکتا۔مجھے مسئلہ بتاؤ۔"

"ابھی کچھ دیر پہلے پولیس مجھے گرفتار کرنے کے لیے آئی۔ایک انسپکٹر تھا اس علاقے کا۔اس نے کہا کہ چودھری سلطان کی لاش مل گئی ہے۔"

میں نے چونکنے کی اداکاری کی۔"لاش مل گئی ہے؟ کہاں سے؟"

"پولیس کا کہنا ہے کہ کوئی بوری میں بند لاش کو تھانے کے دروازے پر ڈال گیا تھا۔"

"اور ان کا خیال بلکہ یقین ہے کہ ایسا تم نے کیا ہے۔"

"اس کیس میں نامزد ملزم اب صرف میں ہوں جس پر پولیس کو سب سے زیادہ شک ہے۔"

"کیا اس وقت تم پولیس کی تحویل میں ہو؟ تھانے کی حوالات میں؟"

"نہیں۔میں نے انسپکٹر کو چکما دیا کہ میں تیار ہو جاؤں۔اس نے کہا کہ آپ کو شوٹنگ کے لیے کسی اسٹوڈیو میں نہیں تھانے میں جانا ہے اور سرکاری مہمان بن کے رہنا ہے۔میں نے کہا کہ اچھا میں صرف کپڑے بدلوں گی۔اس نے بڑی بدمعاشی سے کہا کہ کپڑے کیا کرنے ہیں۔جب ہم تفتیش کرتے ہیں تو بندے کی کھال بھی اتار لیتے ہیں۔تو میں نے واش روم جانے کی اجازت طلب کی تو وہ بولا کہ بی بی۔ابھی سے جلاب لگ گئے۔ابھی تو ہم نے صرف تھانے جانے کی بات کی ہے۔اس کی باتوں سے اندازہ کرنا مشکل نہ تھا کہ آگے تھانے میں میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔میں کچن میں گھسی۔وہ سمجھا واش روم ہے۔کچن کا دوسرا دروازہ پیچھے کی طرف والے باغ میں کھلتا ہے۔"

"یعنی تم فرار ہو گئیں۔"

"اور میں کیا کرتی رفیق۔خوف سے واقعی میرے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگے تھے۔میں نے ساتھ والی کوٹھی کی دیوار پھاندی اور ان کے گیٹ سے باہر نکل گئی۔میری قسمت اچھی تھی کہ باہر نکلتے ہی مجھے ایک رکشا مل گیا۔"

"اچھا اب کہاں ہو تم؟"

"ریلوے اسٹیشن پر۔ویٹنگ روم میں۔میرے پاس لاہور جانے کے لیے اے سی کلاس کا ٹکٹ بھی ہے۔ریل گاڑی آنے والی ہے۔"

"یعنی تم رات ساڑھے دس بجے لاہور پہنچو گی۔"

"ساڑھے گیارہ۔ریل کار ایک گھنٹا لیٹ ہے۔لیکن اس کے بعد میں کہاں جاؤں گی۔میرا گھر، اسٹوڈیو، ہوٹل مجھے کوئی جگہ محفوظ نہیں لگتی۔"

میں نے جی ٹی روڈ پر لاہور کی طرف اپنا سفر جاری رکھا۔"آخر کیا سوچا ہے تم نے۔ایسے فرار ہو کے تم کب تک بچ سکتی ہو۔"

"اسی لیے تو فون کیا ہے تمہیں۔یہ اچھا ہے کہ تم لاہور میں ہو۔کیا تم مجھے ریلوے اسٹیشن پر لینے آسکتے ہو؟"

میں پھر انکار نہ کرسکا۔"آجاؤں گا۔لیکن اس کے بعد؟"

"میں کیا بتاؤں۔میرا دماغ کام نہیں کر رہا ہے۔"

"او کے۔او کے۔تم ملو پھر کچھ سوچتے ہیں۔"میں نے فون بند کردیا۔میرے رومانٹک موڈ کا بیڑہ غرق ہو گیا تھا ریلوے اسٹیشن جا کے فریال کو تلاش کرلیتا اور اسے اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھالیتا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔فریال کے ساتھ میں نور جہاں سے ملنے کیسے جاتا۔تقدیر میرے ساتھ عجیب تماشا کر رہی تھی۔پہلے ایک نور جہاں کا معاملہ تھا۔اب فریال کو بھی میں ہی بچاؤں یک نہ شد دو شد۔مفرور قاتل حسینہ نمبر ون نور جہاں۔مفرور قاتل حسینہ نمبر دو فریال۔دونوں سے محبت کا گناہگار میں، نواب رفیق احمد شیرازی۔الو کا پٹھا، گدھا، شامت کا مارا۔

جب ہائی وے پولیس نے روک کے میرا چالان کیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ میں اپنا سارا غصہ گاڑی پر نکال رہا تھا اور ستر میل دور رفتار کے علاقے میں سو کی رفتار پر جا رہا تھا۔پولیس اہلکار نے جھنڈے والی گاڑی اور میرے تیور دیکھتے ہوئے بڑی شرافت سے کام لیا اور مجھے خبردار کیا کہ اس علاقے میں رات کے وقت اتنی رفتار خود میرے حق میں خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور پانی پیا۔

میرا دماغ کچھ ٹھنڈا ہوا تو میں نے سوچا کہ کیوں نہ نور جہاں کو یہ سب بتادوں اور اس سے کہوں کہ آج کی ملاقات کو کل پر اٹھا رکھے۔اب ایک مشکل آپڑی ہے تو اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔یہ کام بھی آسان نہ تھا۔آج کی محبوبہ کو بتایا جائے کہ میرے گزرے ہوئے کل کی محبوبہ مشکل میں ہے اس لیے میں آج ملنے نہیں آسکتا۔کیونکہ اس کی مدد کرنا میرے لیے زیادہ اہم ہو گیا ہے۔

ایک عام لڑکی ایسی بات پر رقابت اور حسد کے جذبات سے آتش فشاں کی طرح پھٹ جاتی کہ میری طرف سے تم بھاڑ میں جاؤ اسی کے ساتھ۔میں جانتا تھا کہ اسے ناگوار ضرور گزرے گا مگر نہ وہ مجھ سے خفا ہو گی اور نہ بدگمان۔وہ بس آہ بھر کے کہے گی کہ ٹھیک ہے چندا۔یوں ہے تو یوں ہی سہی۔ہم انتظار کریں گے تیرا قیامت تک۔وہیں، اسی جگہ، کل بھی، کل کے بعد بھی۔ہاں! ایسی ہی تھی وہ اور اس کی محبت بھی۔

لیکن جب میں نے اس کے نمبر پر کال کیا تو مجھے یہ جواب ملتا رہا کہ آپ کے مطلوبہ نمبر سے جواب موصول نہیں ہو رہا ہے۔میں نے کوشش ترک کردی اور سوچا کہ چلو یہ بھی اچھا ہی ہوا۔اب اسے بقلم خود ساری صورتِ حال سمجھا دوں گا۔خود اسی سے پوچھوں گا کہ جان! اب تم ہی بتاؤ میں کیا کرتا۔تم کہتی ہو تو میں اسے لینے ریلوے اسٹیشن نہیں جاتا۔اپنا کیا وہ خود بھگتے گی مگر وہ میرے ساتھ فریال کو ریسیو کرنے چل پڑی پھر؟

یہ سوچ کے مجھے اپنے آپ پر ہنسی بھی آئی۔واہ میکے پتر۔اسے تم اپنی خوش نصیبی کہو گے یا بدنصیبی۔شاعر لوگ روتے رہ گئے کہ وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا اب اس کا حال سنائیں کیا۔اور تم ہو کہ ماضی حال اور مستقبل کے ہر عشق سے یوں وابستہ ہو جیسے وقت کچھ بھی نہیں۔گویا آج اور کل سب ایک ہیں۔دل کے صنم خانے کو عجائب خانے کی طرح سمجھ کے بیٹھے ہو۔محبوبہ نمبر ون۔زمانہ عشق سن فلاں تا فلاں۔محبوبہ نمبر دو۔زمانہ عاشقی اور سن......تا سن......محبوبہ نمبر تین کی دل پر حکومت۔سن فلاں تا فلاں۔اللہ کرے زورِ شباب اور زیادہ۔یہ دل کا صنم خانہ ہے کہ دکانِ عشق۔

گاڑی مال کی طرف سے نہر کے کنارے گھومی تو لاہور کی رات کا جادو ماحول کے حسن میں اتر آیا تھا۔نہر کے کناروں پر نصب سیکڑوں ننھے ننھے رنگین قمقمے اپنا عکس آبِ رواں میں اتار چکے تھے اور ستاروں کی ایک کہکشاں زمین پر الگ آباد نظر آتی تھی۔زندہ دلانِ لاہور اس ماحول اور موسم کی رنگینی سے پوری طرح لطف اندوز ہو رہے تھے۔وہ جو نو آموز تھے۔وہ کچھ سہمے کچھ شرمائے تاریک گوشوں کی پناہ میں سرگوشیاں کرتے نظر آتے تھے۔پرانے کھلاڑی ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے نہر کے کناروں پر شوخی اور مستی میں مگن تھے اور انہیں سڑک پر سے گزرنے والی سیکڑوں ہزاروں گاڑیوں کی روشنی میں دیکھنے والی کسی گستاخ نظر کی پروا ہی نہ تھی۔ان میں میاں بیوی بھی تھے جو اپنے بچوں سمیت پکنک منا رہے تھے۔

مجھے وہ وقت یاد آیا جب میں چوری چھپے پہلی بار یہاں نور جہاں سے ملا تھا۔گاڑی کو اسی جگہ ایک طرف پارک کر کے میں باہر نکل آیا اور پُرسکون رات کی نمناک ٹھنڈک کو اپنی سانسوں میں اتارنے لگا۔وہ بھی کیا عشق تھا۔کتنی بار میں یہاں آیا اور ہر بار اس کے حسن کی تابانی کو ایک نئے انداز میں جلوہ گر پایا۔وہ جان ہتھیلی پر رکھ کے آتی تھی اور میں دل ہتھیلی پر رکھ کر لاتا تھا۔وہ کیسی بے خودی کیسی مجبوری اور کیسی کشش تھی جو ہمیں تمام خطرات کے باوجود اس جگہ لے آتی تھی۔

انتظار کا وقت گزارنے کے لیے میں نے ست بدحائی

میں راجا سے بات کی اور اسے صاف بتادیا کہ میں کہاں ہوں۔ حسبِ توقع راجا نے سخت برہمی کا اظہار کیا کہ میں نے اسے بھی اعتماد میں نہیں لیا لیکن کچھ دیر بعد اس نے حالات کو سنبھالنے کی ذمے داری قبول کرلی۔ ”عیش کر پیکے پتر۔ جب تک ہم ہیں تجھے کیا غم۔ مگر دیکھ۔ دو کشتیوں کا مسافر مت بن۔ ڈوب جائے گا۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے تیرنا آتا ہے۔“ اور فون بند کردیا۔

میں نے پھر گھڑی دیکھی کیونکہ مجھے لاہور کے ریلوے اسٹیشن پہنچ کے ریل کار سے اترنے والی فریال کو اپنے ساتھ لانا تھا۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ میں زیادہ سے زیادہ مزید آدھا گھنٹا انتظار میں گزارلوں۔ ایک ہی جگہ کھڑے رہنا بھی دشوار تھا۔ میں نہر کے کنارے پر اپنی کار سے پچاس قدم آگے اور پچاس قدم پیچھے ٹہلتا رہا۔ میری نظر میں نور جہاں کا تصور تھا اور ایک خیال تھا کہ وہ ابھی اچانک اور کسی نیم تاریک گوشے سے نکل کے سامنے آجائے گی اور ہنس کے کہے گی کہ میں کب سے تمہاری بے قراری کا تماشا دیکھ رہی تھی۔ مجنوں ہو تم بھی۔

میری گاڑی سے سو گز دور بجلی کے کھمبے کے نیچے ایک سفید رنگ کی مہران کار کھڑی تھی۔ اس کا بونٹ اٹھا ہوا تھا اور ایک لڑکی انجن پر جھکی کوئی خرابی تلاش کرنے کی کوشش کررہی تھی۔ دو بار میں اس کے خاصا قریب ہوا اور میں نے دیکھا کہ وہ گاڑی بند ہوجانے سے خاصی پریشان ہے۔ کتنی بار اس نے سیٹ پر بیٹھ کے گاڑی کو اسٹارٹ کرنا چاہا لیکن کچھ نہیں ہوا تو وہ پھر باہر نکل کے انجن میں اِدھر اُدھر ہاتھ مارنے لگی۔

ظاہر ہے وہ مکینک نہیں تھی۔ ایک تجربہ کار ڈرائیور ان چھوٹی موٹی معمولی خرابیوں کو تلاش کرلیتا ہے جو اچانک کسی چلتی ہوئی گاڑی کے رک جانے کا سبب بنتی ہیں لیکن رات کے وقت اندھیرے میں یہ دیکھنا ہی آسان نہیں ہوتا کہ کون سا تار کسی جھٹکے سے نکل گیا ہے یا ٹوٹ گیا ہے۔ کوئی راہگیر بھی اس کی مدد کرنے کے لیے نہیں رک رہا تھا اور گاڑیاں زن زن گزرتی جارہی تھیں۔ میں نے سوچا کہ کیوں نہ اس اکیلی لڑکی کی کچھ مدد ہی کردوں۔ فریال آئے گی تو مجھے پتا چل جائے گا۔ وہ میری کار دیکھ لے گی جو سو گز دور تھی۔

میں سڑک عبور کرکے اس لڑکی کے پاس پہنچا۔ وہ میرے اندازے کے مطابق چوبیس پچیس سال کی اور کسی الٹرا ماڈرن فیملی سے تعلق رکھنے والی لڑکی تھی۔ اس کے بال کٹے ہوئے تھے اور وہ فل شرٹ کے ساتھ جینز میں ملبوس تھی۔ بالوں کو اس نے ڈائی کراکے STREAKS بنوائی تھیں۔

اس کی آنکھوں پر سنہرا نازک سا چشمہ تھا۔

میں نے قریب جاکے انگلش میں کہا۔ ”کیا میں آپ کی کوئی مدد کرسکتا ہوں؟“

وہ چونک کے پلٹی۔ اس کے چہرے کے نقوش تاریکی میں رہے۔ گاڑی اسٹریٹ لائٹ کے نیچے ضرور تھی مگر وہ خود اوپر اٹھے ہوئے بونٹ کی وجہ سے روشنی میں نہیں تھی۔ پھر بھی مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ حسین ہے۔

میں نے کہا۔ ”دیکھیے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ وہ سامنے میری گاڑی کھڑی ہے۔ یہاں میں کسی کا انتظار کررہا تھا۔ دیکھا آپ اکیلی ہی گاڑی کی خرابی دور کرنے کی کوشش کررہی ہیں۔“

اس نے چہرے کے دونوں جانب جھولتی زلفوں کو ہٹایا ”پتا نہیں چلتے چلتے کیا ہوگیا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”ایک نظر میں بھی دیکھ لوں؟“

”کیا آپ مکینک ہیں؟“ اس نے پُرامید لہجے میں سوال کیا۔

میں نے مسکرا کے کہا۔ ”کیا میں صورت سے مکینک لگتا ہوں؟ اگر کچھ نہ ہوا تو دھکا لگا کے دیکھ لیں گے۔ شاید اس طرح گاڑی اسٹارٹ ہوجائے۔ آپ بیٹھیے۔“

”دھکا کون لگائے گا۔ یہاں تو کوئی بھی نہیں۔“

میں نے کہا۔ ”میرا خیال ہے۔ میں اس چھوٹی سی کار کو ہلا سکتا ہوں۔ حالانکہ مجھے ٹارزن ہونے کا کوئی دعویٰ نہیں۔ کچھ نہ ہوا تو پھر میں آپ کی گاڑی کو اپنی گاڑی سے باندھ کے بھی لے جاسکتا ہوں اور آپ گاڑی یہاں چھوڑ دیں تو میں آپ کو گھر چھوڑ سکتا ہوں۔“

”نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔ میں نے فون کردیا ہے۔ میرا بھائی آجائے گا۔“

میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے میری پیشکش قبول نہیں کی۔ اگر ایسا ہوجاتا تو میرے لیے بڑی مشکل ہوجاتی۔ شاید ہمدردی کے اظہار میں، میں حد سے آگے بڑھ گیا تھا۔ یہ بھی بھول گیا تھا کہ میں نور جہاں کا انتظار کررہا ہوں اور مجھے فریال کو لینے بھی جانا ہے۔ شاید جوانی میں جذبات ایسے ہی بے لگام ہوتے ہیں۔ حسین لڑکی مشکل میں ہو تو ہر نوجوان کا دل مدد کے لیے بے تاب ہوجاتا ہے۔ کسی بوڑھے کو طاقت سے زیادہ وزن اٹھاتے دیکھ کر کوئی آگے نہیں بڑھتا۔ گاڑی میں خرابی تلاش کرتے ہوئے مجھے یہ خیال بھی آیا۔

خرابی مجھے فوراً نظر آگئی۔ ڈسٹری بیوٹر کیپ سے لگے

ہوئے کنڈنسر کا تار نکل گیا تھا یہ پتلا سا تار ایک کلپ کے ساتھ جڑا ہوتا ہے۔ میرے پاس انٹرنیشنل ڈرائیونگ لائسنس تھا۔ برطانیہ امریکا میں یہ ضروری سمجھا جاتا ہے کہ جس کے پاس لائسنس ہو وہ کار کے بارے میں بھی تھوڑی بہت واقفیت ضرور رکھتا ہو تاکہ ٹریفک کے رش میں گاڑی رک جائے تو وہ خود ہی معمولی خرابی کو خود دور کرلے۔

خرابی دریافت کرتے ہی میں نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی ہوئی خاتون سے کہا۔ ”چلیے گاڑی اسٹارٹ کیجیے۔“

اس نے سیلف کے سوئچ میں چابی گھمائی اور گاڑی فوراً اسٹارٹ ہوگئی تو میں نے بونٹ بند کردیا۔ ابھی میں سامنے سے ہٹا ہی تھا کہ خاتون نے ایکسی لریٹر دبایا اور گاڑی میرے پاس سے مجھے تقریباً چھوتی ہوئی گزری اور ٹریفک کے بہاؤ میں شامل ہوگئی۔ غصے سے میرا برا حال ہوگیا۔ بدتمیز، جاہل، بے وقوف لڑکی۔ میں نے دل ہی دل میں اسے گالیاں دیں۔ اتنی شرافت اور اخلاق بھی نہیں کہ شکریہ ہی ادا کردیتی۔ یہ برگر کلاس کی اولاد ایسی ہی بداخلاق اور بے مہار ہے۔ پہن لی مختصر سی ٹی شرٹ اور ٹائٹ جینز۔ ابا نے گاڑی دلادی کہ جاؤ عیش کرو۔ تمیز تہذیب نہ اولیول نے سکھائی نہ گھر والوں نے۔

بہت دیر تک میں اندر ہی اندر غصے میں کھولتا رہا۔ نور جہاں پر میرا غصہ اور بڑھ گیا جس کا ہنوز کہیں پتا نہ تھا۔ میں اپنی گاڑی کا سہارا لیے کھڑا خود اپنی جذباتی بے وقوفی پر افسوس کرتا رہا۔ میرا بھی دماغ خراب ہے۔ ایک فون پر بھاگا چلا آیا۔ نور جہاں سے پوچھتا کہ بی بی۔ اب کس کا ڈر ہے تمہیں؟ یہ چھپ چھپ کے عشق کرنے کا ڈراما کس لیے؟ آجاؤ کسی بھی وقت ست بدھائی۔ تمہارے لیے سارے راستے اور سارے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔

پھر میں نے گھڑی دیکھی تو گیارہ بجنے والے تھے۔ اب انتظار لاحاصل تھا۔ میں ڈیڑھ گھنٹے سے سوکھ رہا تھا اور اسے اتنی توفیق نہیں ہوئی تھی کہ فون پر نہ آنے کی یا تاخیر کی وجہ ہی بیان کردیتی۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔

شام سے اب تک میں نے کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔ اگر نور جہاں سے ملاقات ہوجاتی تو ہم کہیں کچھ کھا پی لیتے۔ اب مجھے بھوک تو نہیں تھی لیکن پیاس سے میرے حلق میں کانٹے سے پڑ رہے تھے۔ نہر کے کنارے کنارے جانے والی سڑک الٹے ہاتھ پر گڑھی شاہو کی طرف مڑگئی تو میں نے پہلی نظر آنے والی دکان سے ایک کولڈ ڈرنک لی اور ایک سانس میں خالی کردی۔

ریلوے اسٹیشن یہاں سے دس منٹ کی مسافت پر تھا۔ میں نے گہرے لمبے سانس لے کر خود کو پُرسکون کیا اور آہستہ آہستہ علامہ اقبال روڈ پر چل پڑا۔ اس وقت پہلی بار مجھے خیال آیا کہ میں نے اس بدتمیز لڑکی کو پہلے بھی کہیں دیکھا تھا۔ شاید وہ کوئی ماڈل، ٹی وی یا فلم کی کوئی ایکٹریس تھی۔ خیال میں کہیں کوئی نقش تھا جو شناسائی کا یہ احساس پیدا کرتا تھا۔ وہ ہی دکھاتی ہیں ایسے ناز و انداز اور نخرے۔ ریل کار کے انتظار میں پلیٹ فارم پر ٹہلتے ہوئے بھی میں اس ماڈل یا ایکٹریس کا نام یاد کرنے کی بے سود کوشش کرتا رہا۔

پھر ریل کار کی ایک بوگی سے فریال برآمد ہوئی۔ بالکل خالی ہاتھ اور گھبرائی ہوئی۔ اِدھر اُدھر خوفزدہ نظروں سے دیکھتی۔ ہجوم میں مجھے تلاش کرتی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ تیر کی طرح میری طرف آئی۔ ”تم آگئے؟“

”کیوں؟“ میں نے طنز سے کہا۔ ”تمہارا خیال تھا کہ نہیں آؤں گا۔“

اس کی نظر جھک گئی۔ ”ہاں۔ میرا خیال تھا تم خفا ہو۔ کیا پتا بعد میں ارادہ بدل لو۔“

میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”افسوس فریال۔ اتنا عرصہ ساتھ رہنے کے باوجود نہ تم نے مجھے سمجھا اور نہ میں نے تمہیں۔“

وہ خاموش رہی اور میرے ساتھ چلتی اسٹیشن سے باہر آگئی۔ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد اس نے پوچھا۔ ”اب ہم کہاں جارہے ہیں؟“

میں نے کہا۔ ”یہ ابھی تک میں نے سوچا نہیں تھا۔ تم بتاؤ۔“

اس نے باہر دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ ”میں کیا بتاؤں۔“

”دیکھو۔ اب رونا مت شروع کردینا۔ ایک پرابلم ہے، تمہاری زیادہ لیکن میری بھی۔ اس کا کوئی حل نکالیں گے۔ پہلے ایسا کرتے ہیں کہ کہیں بیٹھ کے کھانا کھاتے ہیں۔ میں نے دوپہر سے کچھ نہیں کھایا۔ تم نے بھی نہیں کھایا ہوگا مجھے معلوم ہے۔“ میں نے آہستہ سے اس کے ہاتھ کو تھپکا۔

اس نے ایک انگلی سے دونوں آنکھوں سے چھلکنے والے قطرہ اشک کو جھٹک دیا اور اداسی سے مسکرائی۔ میں نے شملہ پہاڑی کے عقب میں ایک ریسٹورنٹ کا انتخاب کیا جو نسبتاً پُرسکون اور الگ ہونے کی وجہ سے محفوظ تھا۔ آرڈر دینے کے بعد میں نے سوالات کے سلسلے کو کچھ دیر کے لیے ملتوی کردیا۔

آدھے گھنٹے کا یہ وقفہ اسے پُرسکون کرنے میں مددگار ثابت ہوا۔ میرے ذہن میں پہلا سوال یہ تھا کہ فریال کو آج کی رات کہاں رکھوں اور خود کہاں رہوں؟

بلاشبہ یہ بہت آسان ہوتا کہ میں کسی بھی فائیو اسٹار ہوٹل کا انتخاب کرتا۔ اپنا کچھ بھی نام لکھواتا اور فریال کو اپنی مسز ظاہر کر کے رات کسی ڈبل بیڈ میں گزار دیتا۔ فریال ہرگز اعتراض نہ کرتی۔ شاید اسے تجدید تعلق کا بہانہ بنا لیتی مگر میرے ضمیر نے کہا کہ فٹے چتر۔ یہ فریال کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کے مترادف ہوگا۔ تمہیں کیا پتا کہ وہ تم سے پھر تعلق کی آرزومند ہے یا نہیں۔ اس نے تو تم سے پرانے تعلق کی وجہ سے مصیبت میں مدد مانگی تھی۔ اب تم ایک مصیبت زدہ سے ہمدردی کی قیمت وصول کرنا چاہو تو کہہ سکتے ہو کہ ایک ایکٹریس اور ماڈل کو کیا فرق پڑے گا۔

اچانک مجھے ماجد خان کا خیال آیا۔ اگرچہ ابھی تک اس کے ساتھ میرے تعلقات اس حد تک دوستانہ نہیں ہوئے تھے جتنے فاروقی کے ساتھ رہے تھے یا شہزاد سے تھے مگر ہمارے درمیان اعتماد اور احترام کا ایک رشتہ بہرحال قائم ہو چکا تھا۔ کیا مجھے اس سے مشورہ کرنا چاہیے؟ میں نے سوچا اور پھر گھڑی دیکھی۔ رات کے بارہ بج رہے تھے۔ کیا اس وقت ماجد خان جیسے سینئر وکیل کو قانونی مشاورت کے لیے بیدار کرنا مناسب ہوگا؟

عقل کا مشورہ اس کے خلاف تھا مگر میں نے ماجد خان کا نمبر ملایا۔ جب اس نے پہلی بیل پر ہیلو کہا تو مجھے کچھ اطمینان ہوا کہ وہ نیند میں نہیں تھا۔ میں نے کہا۔ ”میں رفیق احمد شیرازی بول رہا ہوں۔“

اس نے خوش اخلاقی سے کہا۔ ”آپ کا نام دیکھ لیا تھا میں نے۔“

میں نے کہا۔ ”میں نے آپ کو نیند میں ڈسٹرب تو نہیں کیا؟“

”بالکل بھی نہیں۔ میں اسٹڈی میں ہوں۔ رات دو بجے تک میں کیس تیار کرتا ہوں۔ کہیے کیسے یاد کیا اس وقت؟“

میں نے کہا۔ ”ماجد صاحب۔ مجھے احساس ہے کہ میں زیادتی کر رہا ہوں لیکن مجھے آپ سے فوری مشورے اور مدد کی ضرورت نے مجبور کر دیا ہے۔“

”آپ فرمائیے۔ میں سن رہا ہوں۔“ اس کی خوش اخلاقی میں کوئی فرق نہیں پڑا۔

میں نے کہا۔ ”شاید فون پر یہ بات نہیں ہو سکتی۔ کیا میں حاضر ہو سکتا ہوں۔ اس وقت۔ بے شک آدھی رات کو مجھے اچھا نہیں لگتا۔“

اس نے ہنس کے میری بات کاٹ دی۔ ”نواب صاحب۔ تکلف میں کیوں وقت ضائع کرتے ہیں۔ بس آجائیے۔ میں منتظر ہوں۔“

فریال نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس نے خود کو میرے حوالے کر دیا تھا اور اس یقین کے ساتھ کہ میں جو کروں گا اس کے حق میں اچھا ہی ہوگا۔ میں پہلے کبھی ماجد خان کے گھر نہیں گیا تھا۔ گھر تلاش کرنے میں مجھے کچھ دشواری ہوتی اور شاید میں دو چار گلیوں میں بھٹکتا لیکن اتفاق سے میں نے اسے کار کی تیز روشنی میں اپنے گھر کے سامنے مختصر لان میں ٹہلتا دیکھ لیا اور کار اس کے قریب روک دی۔

”میں آپ ہی کو دیکھ رہا تھا۔“ اس نے ہاتھ ملا کے کہا۔ ”رات کے وقت نمبر نظر نہیں آتے اور یہ ڈیفنس سوسائٹی ہے۔ یہاں پڑوسی کو پڑوسی کا نام معلوم نہیں ہوتا۔ ویسے بھی اس وقت صرف چوکیدار جاگ رہے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”یہ فریال ہیں۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”میں نے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا۔“

وہ ہمیں اپنی اسٹڈی میں لے گیا جہاں گرم چائے پہلے سے تیار رکھی تھی۔ اس نے چہرے سے کسی قسم کے تاثرات کا اظہار کیے بغیر پورا مسئلہ سکون سے سنا۔ میں نے کوشش کی کہ اپنے، فریال کے اور سلطان کے تعلق کا پس منظر اختصار سے بیان کر سکوں پھر میں نے سلطان کی لاش کے دریافت ہونے کی ساری کہانی بتا دی۔ کہتے ہیں وکیل اور ڈاکٹر سے کچھ بھی نہیں چھپانا چاہیے۔ میں نے بھی ماجد خان سے کچھ نہیں چھپایا۔

”اب آپ بتائیں فریال کو اور مجھے کیا کرنا چاہیے۔“ میں نے آخر میں کہا۔

ماجد خان نے پوری بات دھیان سے سنی تھی۔ وہ سماعت کے دوران پوری طرح الرٹ رہنے کا عادی تھا۔ میری بات کے جواب میں وہ مسکرایا۔ ”آپ نے وہ لطیفہ تو سنا ہوگا ایک شکاری بتا رہا تھا کہ جنگل میں شکار کے دوران اچانک شیر اس کے سامنے آگیا۔ خوف کے مارے اس کے ہاتھ سے بندوق گر گئی اور وہ بھاگ بھی نہ سکا۔ سننے والوں میں سے کسی نے پوچھا کہ پھر آپ نے کیا کیا؟ شکاری چڑ کر بولا کہ یار اس کے بعد مجھے کیا کرنا تھا۔ جو کرنا تھا شیر کو کرنا تھا۔“

میں نے کہا۔ ”مطلب یہ کہ آپ بھی کچھ نہیں

کر سکتے۔“

”بظاہر تو ایسا ہی لگتا ہے۔ دیکھتے ہیں ڈی ایس پی نے کیا کارروائی ڈالی ہے۔“ اس نے قریب رکھا ہوا فون اٹھایا اور کسی اعلیٰ پولیس افسر سے بات کی۔ ”سوری یار۔ میں مخل تو نہیں ہوا؟ کسی خواب میں یا ذاتی مصروفیت میں؟“

ذاتی مصروفیت کا لفظ ذو معنی تھا۔ فریال کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

ماجد خان نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”یار دوست آخر ہوتے کس لیے ہیں۔ رنگ میں بھنگ ڈالنے کے لیے۔ خیر۔ بھنگ تو بعد میں پینا۔ گجرات کا ایک ڈی ایس پی ہے۔ چیمہ۔ وہ گیا تھا ایک ماڈل اور ایکٹریس فریال کو گھر سے اٹھانے۔ لیکن وہ ملی نہیں اور ملتی کیسے۔ وہ میرے ساتھ تھی۔ کیوں اور کیسے رہنے دے۔ بس تھی۔ وہ چیمہ بھی اسی لیے گیا تھا۔ اب شکاری ہوں دو...... اور سنہری چڑیا ایک...... تو خالی ہاتھ لوٹنے والا تو جھنجلائے گا نا۔ پتا نہیں اس نے کیا کارروائی ڈالی ہوگی غصے میں۔ مجھے معلوم کر کے بتا۔ ہاں ابھی۔ گھڑی؟ ابے اس بحث میں مت پڑ۔ وہ میری کلائنٹ ہے۔ مشورے کے لیے آئی تھی۔ واپس نہیں۔ اسکی...... بس۔“

فون رکھ کے اس نے معذرت آمیز انداز میں فریال کو دیکھا۔ ”آئی ایم سوری۔ لائر انگلش میں وکیل کو بھی کہتے ہیں اور جھوٹے کو بھی۔ مطلب ایک ہی ہے۔ آج کل اس پیشے کی بنیاد ہی جھوٹ پر ہو گئی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”میں نے یہاں آ کے ٹھیک کیا۔ جو کام وکیل کر سکتے ہیں اور کوئی نہیں کر سکتا۔“

وہ مذاق میں بولا۔ ”نہیں نواب صاحب۔ میں تو خود اپنے لیے بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ بیوی سمجھتی ہے صبح سے شام تک میں صرف جھوٹ بولتا ہوں۔ کسی کو سلام کا جواب دوں تب بھی۔“

میں نے کہا۔ ”آپ نے جس کو فون کیا تھا۔ وہ آپ کا قریبی دوست ہے؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”کزن ہے میرا بچپن سے ہماری دوستی ہے۔ آج کل ایس ایس پی ہے کرائم برانچ میں۔“

گھنٹی بجنے سے اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ اس نے ریسیور اٹھا لیا۔ ”ہاں کیا اطلاع ہے۔ اچھا؟ خیر ایسا تو میں بھی کرتا اگر نامراد ہونا پڑتا۔ اب مجھے بتا میں اسے کیسے بچاؤں۔ یہ تو میں کہہ نہیں سکتا کہ وہ میرے ساتھ تھی۔ اچھا یار میں اس کے ساتھ تھا۔ کان کو ادھر سے پکڑ لے۔ ہاں۔ ٹھیک ہے۔“

کچھ دیر وہ صرف سنتا رہا اور سر ہلا کے ہاں اور ٹھیک ہے کہتا رہا۔ پھر فون رکھتے ہوئے بولا۔ ”چل عیش کر۔ باقی بھنگ پی لے۔“

چند سیکنڈ خاموشی میں گزر گئے پھر میں نے کہا۔ ”اب کیا حکم ہے فریال کے لیے؟“

”حکم از دی ویری سمپل۔ یہ جائیں اور گرفتاری دے دیں۔“

فریال کا رنگ اڑ گیا۔ اس نے میری طرف دیکھ کے کہا۔ ”گرفتاری......؟“

”یس۔ فرار ہونے سے معاملہ بہت سیریس ہو جائے گا۔ تھانے میں کچھ نہیں ہوگا۔ ایک رات ضرور گزارنی پڑے گی آپ کو۔ اس کے بعد ہم نمٹ لیں گے۔ ہم آپ کو جیل بھجوا دیں گے۔“

”جیل؟“ فریال بڑی مشکل سے بولی۔ ”مجھے وہاں کتنا عرصہ رہنا پڑے گا؟“

ماجد خان نے نفی میں سر ہلایا۔ ”آئی ڈونٹ نو۔ اب قانون تو یہ ہے کہ عورت کو کسی تھانے میں رات کے وقت نہ رکھا جائے۔ اکیلا نہ رکھا جائے۔ دن میں وہ آپ کو تفتیش کے لیے طلب کر سکتے ہیں۔ لیکن زیادتی کوئی نہیں ہوگی۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔ پولیس کا رویہ ضرور سخت اور بعض اوقات غیر شریفانہ ہوتا ہے لیکن وہ بھی کیا کریں۔ ان کا واسطہ شریف لوگوں سے کم پڑتا ہے۔ پولیس آپ کا پندرہ دن کا ریمانڈ مانگے گی۔ جسمانی ریمانڈ۔ میرا ایک اسسٹنٹ اس کی مخالفت کرے گا لیکن اصل بات نہ قانون کی ہے نہ دلیل کی۔ سب کو معلوم ہوگا کہ آپ کے پیچھے کون ہے پھر آپ خود بھی کوئی گمنام شخصیت نہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ سیشن جج فوراً جوڈیشل ریمانڈ نہ دے۔ اس سے آپ پریشان نہ ہوں۔ پندرہ دن گزار لیں۔“

مجھے سخت مایوسی ہوئی۔ ”ماجد صاحب۔ تھانے میں پندرہ دن؟“

”نواب صاحب۔ یہ کیس قتل کا ہے اور مقتول بھی کوئی ایرا غیرا نہیں تھا۔ اس کے وارث بھی پوری کوشش کریں گے کہ قاتل کو چوبیس گھنٹے میں پھانسی دلوا دیں لیکن جو کچھ آپ نے بتایا۔ اس میں قانونی سقم بہت ہیں۔ سب سے پہلے تو ابھی ثابت ہونا باقی ہے کہ وہ لاش چودھری سلطان ہی کی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”ضمانت پر رہائی کی کوئی صورت نہیں؟“

”قتل کے کیس میں اتنی جلدی ضمانت کی توقع کیسے کی جا سکتی ہے۔ ریمانڈ کی مدت گزر جائے۔ اس اثنا میں صورت

حال واضح ہو جائے گی پھر کوشش کریں گے۔ ان کو جو ڈر ہے کہ تھانے میں تشدد ہوگا تو اطمینان رکھیں۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا لیکن......''

''لیکن کیا'' فریال نے نیم مردہ لہجے میں پوچھا۔

''تھانہ بہر حال تھانہ ہوتا ہے۔ گھر نہیں ہوتا۔''

جب اس کے وال کلاک نے دو بجائے تو میں نے بہتر سمجھا کہ اب اٹھ جانا چاہیے۔ ویسے بھی کرنے یا کہنے کو اب کیا رہ گیا تھا۔ باہر آتے ہوئے فریال کا چہرہ زرد ہو رہا تھا۔ اس پر ابھی سے تھانے کی دہشت سوار ہو رہی تھی۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ پولیس کا امیج نہ قانون کے محافظوں کا ہے اور نہ مددگاروں کا۔ عام آدمی کی نظر میں تھانہ ایک ٹارچر سیل ہے جہاں جلاد صفت، سفاک، بدکردار اور راشی پولیس لوگوں کی کھال کھینچتی ہے۔ خصوصاً ان کی جو لاوارث اور غریب ہوں۔ کوئی عورت ایک رات تھانے میں گزار آئے تو اس کی اتنی بھی عزت نہیں رہتی جتنی ایک رات کسی کے ساتھ گھر سے باہر گزارنے والی عورت کی۔

واپس گجرات کی طرف جاتے ہوئے میں نے فریال کا مورال اوپر کرنے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اسے ماجد کے الفاظ پر یقین نہیں تھا اور ہوسکتا ہے اس کے دل میں کہیں یہ خیال بھی ہو کہ مجھے مدد کے لیے بلا کے اس نے غلطی کی۔ میں بھی اسے پولیس کے حوالے کرنے جا رہا تھا۔

میرے نزدیک یہی محفوظ راستہ تھا۔ قانون کی باریکی کو نہ سمجھنے کے باوجود میرا خیال تھا کہ ابھی تک سارا کھیل مفروضات اور شکوک وشبہات کا ہے۔ نہ یہ ثابت ہے کہ وہ لاش چودھری سلطان کی تھی نہ اس کا ثبوت ہے کہ اسے فریال نے قتل کیا ہے۔ میرے معاملے میں تو پھر بھی رقابت کے جذبات کو وجہ قتل بنایا جاسکتا تھا۔ فریال کے معاملے میں یہ بھی غلط ہوتا۔ وہ سلطان کی منگیتر تھی اور ان کی شادی بہت جلد ہونے والی تھی۔ یہ بات انہوں نے بارہا ٹی وی شو میں اور فلمی صحافیوں سے انٹرویو میں کہی تھی۔

صبح ساڑھے تین بجے میں نے پورے اعتماد کے ساتھ گاڑی تھانے میں عین انچارج کے کمرے کے سامنے روکی اور نیچے اتر کے رعب دار آواز میں ایک سنتری سے سوال کیا۔ ''انچارج صاحب ہیں؟''

دروازے پر کھڑے سنتری نے سر ہلایا اور مجھے غور سے دیکھ کر پلٹا ہی تھا کہ اندر جا کے انچارج صاحب سے ملاقات کی اجازت حاصل کرے۔ اس کے ساتھ ہی میں بھی اٹھا کے اندر پہنچ گیا۔ تھانوں کے انچارج عام طور پر دن میں دستیاب نہیں ہوتے۔ روایتی انداز میں کہہ دیا جاتا ہے کہ وہ گشت پر ہیں یا تفتیش کے لیے گئے ہیں۔ دیگر تمام سوالات کا جواب ایک ہی ہوتا ہے، پتا نہیں۔ لیکن آدمی رات کے وقت وہ ضرور مل جاتے ہیں۔ یہی وقت تفتیش، پرچا کاٹنے یا نہ کاٹنے اور ہر پارٹی سے مقدمے کی نوعیت پر ڈیل کرنے کا ہوتا ہے۔

میرے ساتھ فریال بھی اندر پہنچ گئی۔ تھانیدار نے مجھے بڑی ناگواری سے اور اپنے ماتحت کو سخت نظروں سے گھورا۔ وہ غالباً تمام معاملات سے نمٹ چکا تھا اور اب مالِ غنیمت سمیٹ کر واپس گھر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔

میں نے ہاتھ بڑھا کے کہا۔ ''میں نواب رفیق احمد شیرازی، آف ست بدھائی۔'' اور کرسی کھینچ کے بیٹھ گیا۔ ''اور یہ ہیں فریال۔''

تھانیدار نے مجبوراً مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ''آپ لائے ہیں ان کو گرفتاری دینے کے لیے؟''

میں نے بے نیازی سے کہا۔ ''ابھی ایس ایس پی صاحب سے کس کی بات ہوئی تھی؟''

''بات تو میری ہوئی تھی۔ لیکن نواب صاحب! یہ تھانہ ہے۔ ہم قتل کے کیس میں نامزد کسی ملزم کو عزت سے کرسی پیش کرنے لگیں تو پھر کر چکے تفتیش۔'' اس نے غصے میں گھنٹی پر ہاتھ مارا۔

ایک کانسٹیبل نے سلیوٹ مارا۔ ''یس سر۔''

''دیکھو۔ یہ وہی چودھری سلطان کے قتل میں نامزد ملزمہ ہے۔ دن میں اپنے چیمہ صاحب کو چکما دے کر نکل گئی تھی۔ اسے لاک اپ میں ڈالو۔''

میں نے کہا۔ ''ایک منٹ۔ کیا یہاں خواتین کے لیے کوئی الگ لاک اپ ہے؟ لیڈیز پولیس ہے؟''

تھانیدار نے میری بات سنی اَن سنی کر دی اور گرجا۔ ''اوئے...... سنا نہیں میں نے کیا کہا۔ اٹھا کے لے جا اس کنجری کو۔''

میں نے فریال کی طرف دیکھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ابھی بے ہوش ہو کے گر جائے گی۔ غالباً کرائم سرکل کے ایس ایس پی کے فون کا تھانیدار پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ ویسے بھی تھانے کا بادشاہ تھا اور اپنی مملکت میں مرضی کا مالک۔ افسرانِ بالا بھی حکم عدولی پر اس کا کیا بگاڑ سکتے تھے۔ وہ صاف انکار بھی کر سکتا تھا کہ اس کی کسی سے کوئی بات ہی نہیں ہوئی اور دوبارہ بات ہونے تک وہ سب کچھ کر گزرتا۔ وہ ظاہر یہ کر رہا تھا کہ ایسے کسی فون کو وہ قطعی اہمیت نہیں دیتا اور اسے

انجام کی بھی پروا نہیں۔ زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا۔ چند دن کی معطلی یا کسی دوسرے تھانے میں ٹرانسفر۔

یا وہ میرے ساتھ سودے بازی کا گیم کھیل رہا تھا۔ اگر وہ اپنی سختی، بے رحمی اور خودمختاری کا تاثر نہ دے تو میں سمجھوں گا کہ وہ ایک فون سے ڈر گیا۔ پھر میں سودے کی بات ہی کہاں کروں گا۔ یہ ایک دوسرے کو بلف کرنے کا گیم تھا جس میں بالادستی اسی کو حاصل رہتی جو زیادہ اچھا ایکٹر ثابت ہوتا۔ میرے پاس دو بڑے کارڈ تھے۔ تھانیدار کو صرف ایک کا اندازہ ہوسکتا تھا۔ ایک بڑا کارڈ بلینک چیک تھا، دوسرا عبداللہ جان تھا جو اب آئی جی ہوگیا تھا۔ اگر بلینک چیک نہ چلتا تو فریال کو بچانے کے لیے میں یہ دوسرا کارڈ بھی شو کر دیتا۔

میں نے چہرے پر بڑی ہی عیار، خوشامدانہ اور معنی خیز مسکراہٹ سجا کے کہا۔ ''تھانیدار صاحب۔ ویسے تو آپ بااختیار ہو۔ چاہو تو مجھے بھی بند کر دو۔ میری ضمانت قبل از گرفتاری کے باوجود۔ مگر آپ کام وہ کرتے ہو جس میں نقصان کسی کا نہ ہو۔ فائدہ سب کا ہو۔''

وہ ماتھے پر شکن ڈال کے غرایا۔ ''کیا مطلب؟''

میں نے کہا۔ ''مطلب بہت آسان ہے۔ ایک یہ کاغذ کا پرزہ ہے جسے چیک کہتے ہیں۔ دوسرا یہ...... اس پر ایک نمبر لکھا ہوا ہے۔ اگر یاد نہیں تو پتا کرو کس کا ہے اور پھر بتاؤ۔''

چیک میری جیب میں تھا۔ آئی جی عبداللہ جان کا فون نمبر میں نے تھانیدار کی میز پر سے ایک کاغذ کا پرزہ اٹھا کے لکھا۔ پھر دونوں کاغذ اس کے سامنے رکھ دیے۔ وہ باری باری دونوں کو دیکھتا رہا۔

میں نے کہا۔ ''اگر فیصلہ مشکل ہو رہا ہے تو ٹاس کر لو۔''

تھانیدار کا ماتحت کوئی خفیہ اشارہ پا کے لوٹ گیا تھا۔ فریال قدرے پُرسکون ہو کے دوبارہ کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔ میرا داؤ چل گیا تھا۔

اس نے آئی جی عبداللہ جان کا فون نمبر ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ ''میں اس سے ڈرنے لگوں تو کر چکا تھانیداری۔ پتا نہیں کس کس کے پاس یہ نمبر ہوگا۔''

میں نے اپنا موبائل فون اس کی طرف بڑھا دیا۔ ''یہ نمبر تو اس میں بھی ہے۔ ہمت ہے اتنی تو ملاؤ اور کہو کہ نواب رفیق احمد شیرازی بات کرنا چاہتے ہیں۔ حالانکہ ان کی نیند ڈسٹرب ہوگی لیکن ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ وہ تم سے کچھ نہیں کہیں گے۔ مجھ سے بات ضرور کریں گے۔''

تھانیدار پسپا ہونے لگا۔ وہ میز پر رکھے موبائل فون کو ایسے دیکھ رہا تھا جیسے وہ کسی بم کا ریموٹ کنٹرول ہے۔ میں نے موبائل کو وہیں رہنے دیا اور اس کے سامنے سے بلینک چیک اٹھا لیا۔ ''یو میڈ دی رائٹ چوائس۔ اب میں سیلف کا ایک چیک لکھتا ہوں۔ ہیرو۔ صبح کسی کو بھیج کے کیش منگوا لینا...... اور یہ ہرگز نہ بھولنا کہ ٹرمپ کارڈ ابھی میں نے استعمال نہیں کیا، وہ محفوظ ہے۔''

تھانیدار کی صورت شکست اور ذلت کے جذبات سے اور بگڑ گئی لیکن اب اس کی فرعونیت اور حاکمیت کے غبارے سے ہوا نکل چکی تھی۔ میں نے چیک پر پچاس ہزار کی رقم لکھی اور اپنے دستخط دونوں طرف ثبت کر کے اس کی طرف بڑھا دیا۔ شاید رقم اس کی توقع سے بہت کم تھی۔ معاملہ تھا قتل کا۔ ملزم تھی ایک نامور ماڈل اور سامنے تھا ایک نواب۔ اسے لاکھوں کی نہ سہی ایک لاکھ کی امید ضرور ہوگی مگر اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔

صبح کے چار بجے میں تھانے سے گاڑی لے کر نکلا تو معاملات حسبِ منشا طے کر لینے کے باوجود میری پریشانی برقرار تھی۔ فریال کو حوالات میں بند نہیں کیا گیا تھا۔ اسے ایک اسٹور میں چارپائی ڈال کے بند کر دیا گیا تھا۔ بان کی چارپائی پر صرف ایک دری تھی اور ایک میلا کچیلا خستہ حال تکیہ۔ کمرے کو باہر سے تالا لگا دیا گیا تھا۔ اندر پینے کے پانی کا جگ اور گلاس ضرور رکھ دیے گئے تھے۔ فریال سے کہہ دیا گیا تھا کہ کسی بھی ضرورت کے لیے وہ دروازہ بجائے تو کوئی آجائے گا۔

فریال سخت پریشان اور خوفزدہ تھی لیکن اس نے ماجد خاں کی بات سمجھ لی تھی کہ تھانہ بہر حال گھر نہیں ہوتا۔ اسے تھانیدار کے وعدے پر اعتبار نہیں تھا کہ ملزمہ کو آرام سے رکھا جائے گا۔ خود میں ذہنی اور جسمانی طور پر اتنا تھک گیا تھا کہ سیدھا ایک ہوٹل میں گیا اور بیڈ پر گر کر سو گیا مگر نیند میری قسمت میں ہی نہ تھی۔

میری آنکھ لگتے ہی موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ فون کرنے والا بھی اتنا مستقل مزاج تھا کہ ایک بار گھنٹی بند ہو جاتی تھی تو پھر نمبر ملا لیتا تھا۔ تنگ آ کے میں نے تکیے کے قریب رکھا ہوا موبائل فون اٹھایا اور دیکھے بغیر کہا۔ ''ہیلو۔''

''گھوڑے بیچ کے سو رہے ہو نا۔ دغاباز، جھوٹے، بے وفا۔''

میری نیند ایسے اڑ گئی جیسے کسی نے میرے سر میں ڈنڈا مار دیا ہو۔ میں نے برہمی سے کہا۔ ''مجھے گالیاں دے رہی ہو؟ شرم نہیں آتی تمہیں۔''

''مجھے شرم کیوں آئے۔ تم نہیں پہنچے وعدہ کر کے۔''

''بکواس مت کرو۔ میں آیا تھا۔''

''جھوٹ! میں ڈیڑھ گھنٹا گزار رہا۔ تم نہیں آئیں۔''

''میں آئی تھی۔ تم نے نہیں دیکھا۔''

میں نے چلا کے کہا۔ ''میں اندھا نہیں ہوں۔''

اس نے بھی چلا کے کہا۔ ''تم ایک چھمک چھلو کی مدد کر رہے تھے۔ وہ مہران کار میں تھی۔ پرکٹی چڑیل۔ لال ٹی شرٹ میں۔ اس کا فون نمبر لے لیا ہے نا؟ کہاں رہتی ہے وہ؟''

میں دم بخود رہ گیا۔ ''تم نے واقعی دیکھا؟''

''جی میں نے واقعی دیکھا۔ اپنی ان گناہگار آنکھوں سے۔ کہو تو یہ بھی بتا دوں کہ اس کی ٹی شرٹ اور پتلون کے درمیان کتنا فاصلہ تھا اور تم اس کی پتلی کمر کا کتنا حصہ کتنی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔''

''نور۔ فضول الزام تراشی سے کیا فائدہ۔ میں صرف اس کی مدد کر رہا تھا۔''

''ہاہا...... فلمی کہانیاں ایسے ہی جنم لیتی ہیں۔ کتنی دلچسپی سے تم اس کی مدد کر رہے تھے۔ اس کا اندازہ تو وہیں ہو گیا تھا مجھے۔ تم نے دیکھا ہی نہیں مجھے۔ میرا خیال تک تمہارے دماغ سے نکل گیا۔''

اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ اپنا دفاع کرنے کے بجائے میں الزام قبول کرلوں اور خود کو ''عدالت'' کے رحم وکرم پر چھوڑ دوں۔ اس میں کوئی شک کی بات نہیں رہی تھی کہ وہ آئی تھی اور جو کچھ ہوا اس نے دیکھا بھی تھا لیکن جو کچھ اس نے دیکھا اس پر وہ اتنا غصے میں آگئی تھی کہ اس نے ایک منٹ رکنا گوارا نہیں کیا۔ وہ آئی اور بے بنیاد رقابت کے جذبات میں مبتلا ہو کے چلی گئی۔ اس نے رک کر انتظار نہیں کیا۔ میرے قریب آکے پوچھا تک نہیں کہ میں کس کی مدد کر رہا ہوں اور کیوں؟

میں نے کہا۔ ''دیکھو نور، میں اپنی غلطی مان لیتا ہوں۔ میری گاڑی وہاں موجود تھی۔ تم نے دیکھی ہوگی۔ مجھے وہیں موجود رہنا چاہیے تھا۔ خواہ قیامت آتی یا زلزلہ آجاتا۔''

اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہوں، دوسری طرف سننے والا کوئی نہیں ہے۔ نور جہاں نے غصے میں فون بند کر دیا تھا اور اب مجھے معلوم تھا کہ میرے فون کرنے پر جواب کیا آئے گا۔ پھر یہی ہوا۔ میں نے نمبر ملایا تو ٹیپ کیا ہوا پیغام چل پڑا۔ آپ کے مطلوبہ نمبر سے جواب موصول نہیں ہو رہا ہے۔ خلش اور جھنجلاہٹ کا بدلہ میں نے موبائل فون سے لیا۔ میں نے کہا ''ایسی کی تیسی۔'' اور فون کو دیوار پر کھینچ مارا۔ فون کا قصور کوئی نہیں تھا۔ وہ اتنے غصے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے ٹکڑے ہو گئے۔ میں نے تکیے پر سر رکھا، آنکھیں بند کیں لیکن سو نہ سکا۔

صبح اس کا اثر میرے ذہن پر بھی تھا اور جسم پر بھی۔ میں تھکن کا شکار تھا اور میرا جسم ایسے ٹوٹ رہا تھا جیسے مجھے رات بھر بخار تھا۔ ایک طرف فریال کا خیال تھا تو دوسری طرف نور جہاں کا لیکن ایک میں ذہنی پریشانی تھی تو دوسرے میں جذباتی اذیت۔ دیوار کے ساتھ پڑے ہوئے موبائل فون کے ٹکڑے مجھے احساس دلا رہے تھے کہ میں اپنے اعمال وافعال پر عقل کے اختیار سے بھی محروم ہو چکا ہوں۔

نہانے، ناشتے میں بلیک کافی پینے اور درد کا احساس مٹانے والی ایک گولی لے کر میں نے خود کو آج کے دن کے لیے تیار کیا۔ صبح صبح کسی موبائل فون شاپ کا کھلا ملنا محال تھا جہاں سے میں نیا سیٹ خریدوں۔ میں نے ہوٹل کی لابی کا فون استعمال کیا۔

راجا نے چھوٹتے ہی کہا۔ ''تو گجرات میں ہے۔ گیا تھا نور جہاں سے ملنے کے بہانے۔ رات گزاری سابق محبوبہ کے ساتھ۔ کیا بات ہے تیری بھی فیکے پتر۔ عاشق کا ڈبل رول کرنے والے سچے عاشق!''

میں نے کہا۔ ''میری سنے بغیر اپنی بک بک شروع کر دیتا ہے۔ کیوں میری کردار کشی پر تلا ہوا ہے۔ تو میرا دوست ہے کہ دشمن؟''

''میں بھی ڈبل رول کر رہا ہوں۔''

''مائی ڈیئر راجا۔ جیسے بھی ہو آجا۔ یہ نمبر ہے گجرات کے ایک ہوٹل کا۔ رات میں یہاں تھا۔ فریال تھانے کی حوالات میں بند تھی اور نور جہاں کا کچھ پتا نہیں کہ کہاں تھی۔ مجھ سے اس کی ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ لیکن فریال کے ساتھ میں ماجد خان سے ملنے گیا تھا۔ پھر میں نے وہی کیا جو ماجد خان نے کہا۔''

''فریال نے گرفتاری دے دی؟''

''یہی مشورہ دیا تھا ماجد خان نے۔ اپنے کسی کزن سے فون بھی کرایا تھا جو کرائم برانچ میں ایس ایس پی ہے مگر وہ تھانیدار ایک نمبر کا حرامی۔ فریال کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہتا تھا جو کسی بھی تھانے میں فریال جیسی عورت کے ساتھ ہو سکتا ہے جس پر قتل کا الزام بھی ہو۔ میں نے آئی جی سے بات کرنے کی دھمکی دی پھر بھی سالے نے پچاس ہزار وصول کر لیے۔''

''پھر اب کیا کرنا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''ماجد خان کے کہنے کے مطابق۔ فوری طور پر ضمانت پر رہائی کا کوئی امکان نہیں۔ اس کا ایک اسسٹنٹ آج آئے گا۔ پولیس تفتیش کے لیے پندرہ دن کا جسمانی ریمانڈ مانگے گی۔ ہم اس کی مخالفت کریں گے لیکن اس کا فائدہ نہیں۔ جج ریمانڈ دے گا۔ ہم یہی کر سکتے ہیں کہ اس دوران فریال کو ذہنی اور جسمانی تشدد سے بچائیں۔''

راجا نے کہا۔ ''یہ شاید اتنا آسان نہ ہو...... مگر خیر۔ میں آتا ہوں ابھی دو گھنٹے میں۔ تو کہاں ملے گا؟''

''میں ماجد خان سے بات کرتا ہوں اور پھر جاتا ہوں تھانے۔ پتا نہیں فریال کس حال میں ہوگی۔ تو بھی وہیں آجا۔''

''فکر مت کر۔ یہ پاکستان ہے فیکے پتر۔ قانون یا طاقتور کے ساتھ ہے یا دولت مند کا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ویسے تو آئی جی سے بھی بات کی جا سکتی ہے لیکن یہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔ ہمارے مسائل تو چلتے رہیں گے۔ وہ کہاں تک مدد کرے گا۔ لحاظ اور مروت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔''

''یار، کرنے کو ہم کیا چیف منسٹر سے بات نہیں کر سکتے۔ اس کی پارٹی کے لیے ہم نے اتنی بڑی رقم چندے میں دی تھی لیکن ابھی نہیں، ہمیں اپنے سارے کارڈز سنبھال کے رکھنے چاہئیں اور سنبھل کر استعمال کرنے چاہئیں تاکہ ضائع کوئی نہ ہو۔''

راجا کی بات نے مجھے بڑا حوصلہ دیا۔ آسمانوں پر خدا کا سہارا یقیناً سب سے بڑا ہے لیکن زمین پر ایک اچھے دوست کا سہارا میسر آجائے تو آدمی کا حوصلہ دو چند ہو جاتا ہے۔ تھانے کی طرف جاتے ہوئے میں نے ہر سمت نظر دوڑائی لیکن صبح نو بجے صرف جنرل اسٹور یا کھانے پینے کی دکانیں کھلی تھیں۔ موبائل فونز کی مارکیٹ عام طور پر دوپہر تک بند رہتی ہیں۔ میں پی سی او سے کال کر سکتا تھا لیکن مجھے ماجد خان کے آفس کا نمبر زبانی یاد نہیں تھا۔ نمبر میرے فون کی سم میں محفوظ تھا۔ سم میری جیب میں تھی اور فون سیٹ کے بغیر بے کار تھی۔

پھر میری نظر ایک پی سی او پر گئی جہاں شوکیس کے اوپر تین فون پبلک کے استعمال کے لیے رکھے تھے مگر شوکیس کے اندر مجھے پرانے موبائل فون نظر آرہے تھے۔ میں نے فوراً گاڑی روک لی۔ دیکھنے میں وہ چھوٹی سی دکان موبائل فونز کا بہت بڑا ذخیرہ ثابت ہوئی۔ دکاندار نے مجھے دیکھا پھر میری کار کو اور اندر سے گتے کا ایک ڈبا اٹھا لایا جس میں ہر قسم اور ہر قیمت کے اسمگل کیے ہوئے موبائل فون سیٹ موجود تھے۔ کچھ اتنے قیمتی سیٹ تھے کہ وہاں میں ان کی موجودگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن خیر سے اسمگلنگ نے ملک میں اشیائے تعیش کی ایسی فراوانی پیدا کر دی ہے کہ سرکاری بیانات میں جب غربت کی بڑھتی ہوئی شرح کی تردید کی جاتی ہے تو ملک میں بڑھتے ہوئے موبائل فون کی تعداد کو دلیل کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

ماجد خان کے ماتحت وکیل سے بات کرنے کی مجھے ضرورت ہی نہیں پڑی۔ وہ مستعد اور فرض شناس شخص پہلے سے تھانے میں موجود تھا اور فریال سے مل چکا تھا۔ پولیس نے ملزمہ کو عدالت میں پیش کر کے پندرہ روز کا جسمانی ریمانڈ حاصل کرنے کی تیاری کر لی تھی اور انہیں میرا انتظار تھا کہ میں سب کو اپنی کار میں کچہری لے جاؤں۔ پولیس کے پاس اپنی کوئی ٹرانسپورٹ کہیں نہیں ہوتی۔

فریال کی حالت سے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ تھانے میں چند گھنٹے گزار کے وہ کتنی پریشان ہے۔ ظاہر ہے اسٹور کے بند کمرے میں چارپائی پر اسے نیند کہاں آئی ہوگی۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں جیسے وہ روتی رہی ہو۔ میں نے ڈیوٹی افسر سے بات کر کے فریال سے چند منٹ علیحدگی میں بات کرنے کی اجازت حاصل کر لی۔ میں اب زیادہ پُراعتماد تھا۔ یہ اعتماد میں نے قیمت ادا کر کے خریدا تھا۔ آئی جی کے حوالے سے حاصل کیا تھا اور اب میرے ساتھ ایک وکیل ہی نہیں صحافی بھی تھا۔ ان دونوں نے ڈیوٹی افسر کے ذریعے تھانے کے عملے کو یقین دلا دیا کہ نواب صاحب بڑی اسامی ہیں۔ انہیں خوش رکھو گے تو عیش کرو گے اور ناراض کیا تو پھر کسی کی خیر نہیں۔

ایس ایچ او صاحب کا کمرا اس وقت فارغ تھا۔ اندر پہنچتے ہی فریال نے مجھ سے لپٹ کر جو رونا شروع کیا تو میں پریشان ہو گیا۔ روتے روتے اس کی ہچکی بندھ گئی اور وہ ایک ہی بات دہراتی رہی۔ ''رفیق! خدا کے لیے مجھے یہاں سے نکالو ورنہ میں مر جاؤں گی۔''

میں نے اسے الگ کر کے کرسی پر بٹھایا۔ پانی پلایا اور کہا۔ ''دیکھو۔ میں نے بڑی مشکل سے یہ مہلت حاصل کی ہے۔ مجھے بتاؤ کیا تمہارے ساتھ کوئی برا سلوک ہوا ہے؟''

جواب میں جو کچھ اس نے روتے روتے بتایا وہ انتہائی شرمناک اور اذیت ناک تھا۔ اس نے کہا کہ پہلے تو وہ ان کی چیخ پکار سن کر کانپتی لرزتی رہی جن سے تھانے میں تفتیش کی جا رہی تھی۔ اس کے بعد نہ جانے کس کے حکم پر وہ فریال کو وہاں لے گئے۔ اس جگہ کو وہ ڈرائنگ روم کہہ رہے تھے۔

وہاں فریال نے جو دیکھا نا قابلِ بیان حد تک لرزہ خیز تھا۔ ایک شخص کو ننگا کر کے الٹا لٹکا دیا گیا تھا اور پولیس کے اہلکار اس پر مسلسل مشقِ ستم کر رہے تھے۔ انہوں نے ملزم کی بید سے اور تیرہ نمبر کے چھتر سے اتنی پٹائی کی تھی کہ اس کی کھال ادھڑ گئی تھی۔ جگہ جگہ سے خون رس رہا تھا۔ جب وہ ان زخموں پر نمک ملا پانی ڈالتے تھے تو وہ ذبح کیے ہوئے بکرے کی طرح چلاتا تھا۔ کئی بار وہ بے ہوش ہوا اور فریال نے سمجھا کہ مر گیا۔

فریال کو پولیس والوں نے ایک دیوار کے سہارے کھڑا کر دیا تھا۔ وہ کچھ دیر بعد وہیں بیٹھ گئی۔ اسے کہا گیا کہ اگلی باری تمہاری ہے۔ تم سے پوچھیں گے کہ چودھری سلطان کو کیسے مارا تھا، کب مارا تھا اور کیوں؟ تمہارا پورا اعترافِ جرم تمہاری زبان سے سنیں گے۔ ایسا ہوا نہیں لیکن جو کچھ ہوا فریال کے لیے نا قابل تصور تھا۔ پولیس والوں کی فحش حرکات اور گندی زبان کا عذاب الگ تھا۔ فریال کے لیے وہ بتانا بھی مشکل تھا۔

یہ سب سن کے مجھے طیش تو بہت آیا مگر تھانے میں کسی کا راج نہیں چلتا۔ میں صرف فریال کو ہر عذاب اور اذیت سے بچانے کی کوشش کر سکتا تھا۔ پولیس کا رویہ اور تھانے کا کلچر تو نہ آئی جی بدل سکتا تھا اور نہ الہٰ دین کے چراغ کا جن۔ فریال کے ساتھ یہ سلوک صرف ایک بات کی نشاندہی کرتا تھا کہ اسے وی آئی پی ٹریٹمنٹ دلوانے کے لیے مجھے اس سے کہیں زیادہ رقم خرچ کرنا ہوگی جتنی میں نے خرچ کی تھی۔ فریال کو صبح ناشتے میں بدذائقہ اور ٹھنڈی چائے کے ساتھ ایک سوکھا ہوا پاپا دیا گیا تھا۔ اس کو ضرورت پڑنے پر جس جگہ لے جایا گیا تھا وہ لیٹرین کہلاتی تھی اور مجرموں کے استعمال کے لیے بنائی گئی تھی۔

اس جگہ اتنی غلاظت اور بدبو تھی کہ وہاں ایک لمحہ گزارنا محال تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ہفتوں سے اس جگہ کی صفائی نہیں کی گئی۔ فریال نے کہا کہ میں بے ہوش ہو جاتی لیکن یہ احساس غالب آیا کہ اگر میں اس گندگی میں گر گئی تو یہ لوگ شاید مجھے آخری غسل بھی نہیں دیں گے۔

میں نے سب بڑے حوصلے سے سنا، اس دوران باہر سے پولیس کے اہلکار دہائی دیتے رہے کہ پیشی میں دیر ہو رہی ہے۔ میرے نزدیک فریال کی حالت ایسی تھی کہ اسے عدالت نہیں اسپتال لے جانا ضروری تھا لیکن میں بے بس تھا۔ فریال کو خود بھی اندازہ نہیں ہوگا کہ کتنی بار اس نے ایک ہی بات دہرائی۔ مجھے یہاں سے نکالو ورنہ میں مر جاؤں گی۔ میرے پاس وقتی طور پر جھوٹی تسلی کے سوا کیا تھا کہ فکر نہ کرو، عدالت سے آج تمہاری ضمانت پر رہائی ہو جائے گی۔

ماجد خان کا نمائندہ ماتحت وکیل نوجوان ہونے کے باوجود قانونی موشگافی میں ماہر تھا۔ اس کا اعتماد اور اندازِ خطابت متاثر کن تھا اور نظر آتا تھا کہ مستقبل میں وہ ماجد خان سے بھی بڑا وکیل ہوگا۔ چھوٹی عدالت میں بڑے وکیل کا ویسے ہی دبدبہ ہوتا ہے اور بدعنوان قسم کے ماتحت جج خود اپنے احساسِ جرم سے بھی دبے رہتے ہیں۔

جب ایف آئی آر کے ساتھ فریال کو پیش کیا گیا اور پبلک پراسیکیوٹر نے پولیس کی طرف سے تفتیش کے لیے پندرہ دن کے جسمانی ریمانڈ کی درخواست کی تو حامد خاں نے، یہ ماجد خان کے ماتحت وکیل کا نام تھا، ایک دم اٹھ کے اعتراض دائر کر دیا اور ساتھ ہی کہہ دیا کہ اگر آپ نے عادت کے مطابق اسے مسترد کیا تو آپ کو اس کی جواب دہی عدالتِ عالیہ میں کرنی پڑے گی۔

جج چراغ پا ہو گیا۔ ”تم مجھے دھمکی دے رہے ہو۔ کون ہو تم؟ میں اس عدالت میں تمہیں پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔ نئی نئی پریکٹس شروع کی ہے تو عدالت میں پیش ہونے کے آداب سیکھو۔“

حامد خان نے متاثر ہوئے بغیر کہا۔ ”جنابِ والا۔ میں دس سال سے ماجد خان اینڈ کمپنی کی نمائندگی کر رہا ہوں اور ہائی کورٹ میں بھی پیش ہوتا ہوں۔ آج تک مجھ پر توہینِ عدالت کا مقدمہ نہ بننے کا مطلب اس کے سوا کیا نکالا جا سکتا ہے کہ مجھے عدالت میں پیش ہونے کے آداب آتے ہیں۔ رہی بات دھمکی کی...... تو یہ آپ کی فہم ہے۔ میں صرف حقائق بیان کر رہا تھا۔“

جج نے اپنی خودی کو بلند رکھنے کی کوشش کی۔ ”اچھا عدالت کا وقت برباد نہ کرو۔ کہو تمہیں کیا کہنا ہے؟“

حامد خان نے ایف آئی آر کو بنیاد بنا کے کیس کے پرخچے اڑا دیے۔ ”یہ ایک شخص کے لاپتا ہونے کی رپورٹ ہے۔ کس بنیاد پر پولیس نے فرض کر لیا ہے کہ وہ قتل ہو چکا ہے۔ کیا اس کی لاش ملی ہے؟“

پبلک پراسیکیوٹر نے فوراً دخل اندازی کی۔ ”جناب والا لاش مل گئی ہے۔“

”کہاں سے؟“ حامد خان ایک دم پلٹا۔ ”اس خاتون کے گھر سے؟“

”سر، کوئی بوری میں بند لاش کو تھانے کے سامنے ڈال گیا تھا۔“

حامد خان نے کہا۔ ”اور اس پر چٹ لگی ہوئی تھی کہ:

لاش چودھری سلطان کی ہے یا آپ نے خود ملزمہ کو لاش وہاں گراتے دیکھا تھا؟“

عدالت میں کچھ لوگ ہنس پڑے۔

حامد خان نے کہا۔ ”جواب دیجیے۔ کیا لاش کا پوسٹ مارٹم کرانے کے بعد رپورٹ سے ثابت ہو چکا ہے کہ وہ چودھری سلطان کی لاش ہے؟“

”لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دیا گیا ہے۔“

حامد خان نے کہا۔ ”اور اگر رپورٹ میں وہ لاش اسامہ بن لادن کی ثابت ہوئی، پھر؟“

ایک بار پھر عدالت میں قہقہہ پڑا۔ جج نے سخت غصے میں میز پر ہتھوڑا مار کے آرڈر آرڈر پکارا۔ ”بات مختصر کرو۔“

حامد خاں نے کوئی نوٹس نہیں لیا اور سوالات سے پبلک پراسیکیوٹر کا ناک میں دم کر دیا۔ ”آلۂ قتل کیا تھا؟ وجہ قتل بتائیے۔ قتل کہاں ہوا؟ اس وقت یہ عورت کہاں تھی جسے ملزم بنا کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا گیا ہے۔ اسے قتل سے کیا فائدہ ہو سکتا تھا۔ اس کی تو مقتول سے شادی ہونے والی تھی جو یہ اپنی مرضی اور خوشی سے کر رہی تھی۔ اس نے پبلک میں بارہا اس کا اقرار کیا ہے۔ کیا چودھری سلطان کا دشمن اور کوئی نہیں تھا؟ میں نے سنا ہے کہ اس نے زندگی میں دوست کم اور دشمن زیادہ بنائے تھے مثلاً اس کا ایک سالا امریکا میں ہے۔ چودھری سلطان نے اس کی بہن یعنی اپنی بیوی کو قتل کر دیا تھا جس کی ایف آئی آر موجود ہے مگر وہ سالا امریکی ہونے کے باوجود اپنے بااثر بہنوئی کا کچھ نہیں بگاڑ سکا تھا کیونکہ قانون کو چودھری سلطان نے خرید لیا تھا۔ کیا یہ قتل وہ سالا امریکی نہیں کر سکتا؟“

آخر میں اس نے فریال کو ویمن پولیس اسٹیشن کے بجائے عام تھانے میں رات بھر رکھنے کے خلاف اور وہاں پولیس کے رویّے کے خلاف بڑی سخت زبان استعمال کی۔ ”آخر کس قانون کے تحت اکیلی عورت کو تھانے میں روکا گیا؟ پولیس مزید پندرہ دن اسے ذہنی و جسمانی تشدد میں مبتلا رکھنا چاہتی ہے۔ تھانوں میں ریپ کے واقعات عام ہیں۔ زیرِ تفتیش ملزم ہلاک کر دیے جاتے ہیں اور کوئی پرسش نہیں ہوتی۔“

آخر میں اس نے کہا کہ میں جسمانی ریمانڈ کی مخالفت کرتا ہوں۔ مس فریال ایک نامور اداکارہ اور ماڈل ہیں۔ ان کی ضمانت کے لیے یہاں کئی لوگ موجود ہیں اور وہ عام لوگ نہیں ہیں۔

میں نے حیرانی سے راجا کی طرف دیکھا تو اس نے مجھے آنکھ ماری ”دیکھے چتر، آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔“

مجھے کیسے اندازہ ہو سکتا تھا کہ راتوں رات فریال کی گرفتاری کی خبر محاورے کے مطابق جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی ہے۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ گھر سے فریال کے فرار کے بعد اس کے گھر کے ملازموں نے خبر پھیلائی۔ قاضی کے گھر کے چوہے بھی سیانے مشہور ہیں۔ فریال کے گھریلو ملازم چشم دید گواہ تھے۔ انہوں نے سب سے پہلے فریال کے سیکریٹری کو اطلاع دی۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ گھر میں کون سے فلم انڈسٹری کے کرتا دھرتا آتے ہیں اور کتنے فلمی صحافی۔ انہوں نے سب کو فون کر دیا تھا۔ نتیجہ یہ کہ صبح کے تقریباً تمام اخبارات نے یہ خبر شائع کی تھی۔

خبر کے بارے میں کہا ضرور جاتا ہے کہ وہ صرف خبر ہوتی ہے اور صحافی سو فی صد غیر جانبداری سے وہی بتاتا ہے جو ہوتا ہے۔ لیکن عملاً ایسا کہاں ہے۔ ہر خبر کا ایک اینگل ہوتا ہے، پیش کرنے کا انداز۔ اس میں صحافی کے جذبات اور مقاصد ضرور شامل ہو جاتے ہیں۔ اس سے خبر میں مثبت یا منفی پہلو شامل ہو جاتا ہے۔

فریال کے کیس میں یہی ہوا۔ بیشتر صحافیوں نے اس کو قطعی بے گناہ اور اس کی گرفتاری کو پولیس کی دھاندلی، دیدہ دلیری اور بدمعاشی قرار دیا تھا۔ نتیجہ یہ کہ صبح فلمی صنعت کے جغادری خود ضامن بننے پہنچ گئے تھے اور حامد خان کے کہتے ہی تین افراد کھڑے ہو گئے۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ وہ فلم پروڈیوسرز ایسوسی ایشن کا صدر ہے۔ دوسرا ڈسٹری بیوٹرز کی تنظیم کا صدر تھا اور تیسرا نمائش کنندگان یعنی سینما اونرز کا۔ تاہم جج نے اس مرحلے پر ضمانت کی درخواست کو خارج از امکان قرار دیا۔

تاہم عدالت پر قانونی اور معاشرتی دباؤ کا نتیجہ یہ نکلا کہ فریال کو جسمانی ریمانڈ پر پولیس کی تحویل میں نہیں دیا گیا بلکہ جوڈیشل ریمانڈ پر جیل بھیج دیا گیا۔ میں، راجا، حامد خان اور دوسرے بہت سے فریال کے ساتھ ہی جیل پہنچے۔ پولیس کے مقابلے میں جیل حکام سے نمٹنا آسان تھا۔ جیل سپرنٹنڈنٹ نے اپنے آفس میں ہم سے بات کی اور کہا کہ قانونی طور پر تو وہ بے بس ہے لیکن اپنے خصوصی اختیارات کے تحت وہ مس فریال کو جیل میں گھر سے زیادہ آرام فراہم کر سکتا ہے اور جب تک وہ اس کی مہمان ہوں گی انہیں کوئی تکلیف یا شکایت نہیں ہوگی۔

اس انتظام پر مجھے... بہت ریلیف محسوس ہوا۔ میری ذے داری اب پوری ہو چکی تھی۔ فلمی صنعت میں فریال کے پرستار، حامی اور انڈسٹری کو چلانے والے یہ کام مجھ سے بہتر طور پر کر سکتے تھے۔ ان کے پاس وقت بھی تھا وسائل بھی تھے اور فریال کو جلد آزاد کرانا ان کی ضرورت بھی تھی۔ بلاشبہ میں نے اپنے سرلیس ہو جانے کو محسوس کیا لیکن مجھے یہ اطمینان ضرور تھا کہ میں نے (محمد بن قاسم کی طرح) ایک لڑکی کی پکار پر لبیک کہا اور اسے بچانے کے لیے عملاً دن رات ایک کر دیا۔ گزشتہ رات اگر میں اس کی کال کو نظر انداز کر دیتا۔ نور جہاں وقت پر آ جاتی یا میں فریال کو ریسیو کرنے نہ پہنچ پاتا تو شاید صورتِ حال مختلف ہوتی۔

نور جہاں بدستور لاپتا تھی اور میرے لیے ناکام و نامراد لوٹ جانے کے سوا چارہ نہ تھا۔ میں حیران تھا کہ وہ کب آئی اور چلی گئی۔ کیا واقعی میں اس بدتمیز، بداخلاق لڑکی کی مدد یا اس کے جلوۂ حسن میں اتنا مگن ہو گیا تھا کہ مجھے گرد و پیش کی خبر ہی نہ رہی تھی۔ جلوۂ حسن والی بات سوفی صد غلط تھی۔ میں نے مرد ہونے کے ناتے ایک اخلاقی فرض نبھایا تھا، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ زیادہ سے زیادہ اسے منصف مزاجی.... قرار دیا جا سکتا تھا۔ غلطی نور جہاں کی تھی۔ حسد یا رقابت کے جذبات نے اس کی عقل کا فیوز بھک سے اڑا دیا ورنہ وہ رک کے بات تو کرتی۔ وہ آئی اور ایک ناقابلِ برداشت سین دیکھ کر نکل گئی۔

تیسرے پہر میں راجا کے ساتھ ایک ریسٹورنٹ میں کھانا کھا رہا تھا۔ راجا نے مجھے چھیڑنے کے لیے پوچھا۔ ''یار، ویسے وہ تھی کون فیکے پتر!''

میں نے کہا۔ ''مجھے کیا پتا۔ اس کا نام پتا نہیں پوچھا میں نے۔''

''کار کا نمبر تو ضرور دیکھا ہوگا۔''

''آخر کار کا نمبر میں کیوں دیکھتا؟'' میں نے بھنّا کے کہا۔

''اے تاؤ مت کھا۔ نمبر ہوتا تو ہم اسے ٹریس کر لیتے۔ آج کل ویسے بھی تو فارغ ہے۔''

''فارغ سے تیری کیا مراد ہے؟'' میں نے میز پر مکا مارا۔ شیشے کے ٹاپ والی ٹیبل پر رکھے ہوئے سارے برتن کھنک گئے۔ ایک چمچہ نیچے گرا۔ ہال میں بیٹھے ہوئے سب لوگوں نے مجھے سر گھما کے گھورا۔ ایک ویٹر ہماری طرف لپکا اور ''یس سر!'' کے جواب میں ''کچھ نہیں'' سن کے چلا گیا۔

راجا نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''دیکھ نا۔ فریال تو گئی جیل۔ مگر تجھ پر لعنت بھیج کے وہ پہلے ہی جا چکی تھی۔ نور جہاں بھی سمجھ گئی تجھے۔ ایک وہ بھولی ہوئی ہوں داستاں بچھڑا ہوا خیال ہوں۔ عائشہ آف ولایت شریف اس کا بھی شمار رفتگاں میں کیا جا سکتا ہے۔ کمال ہے یار۔ تیرے پاس ایک مستقل محبوبہ کی اسامی پھر خالی ہے۔''

''راجا۔ میرا عشق سچا ہے، تو دیکھ لینا ایک دن یہ سب لوٹ کے آئیں گی اور میں کسی کو مایوس نہیں کروں گا۔''

''ہاں دل میں جگہ ہو گی تو شرع میں گنجائش نکل ہی آئے گی۔ کم سے کم چار کے لیے۔''

میں نے کہا۔ ''راجا صاحب۔ آخر اس کیس کا انجام کیا ہوگا۔ یہ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ اگر چودھری سلطان کے قتل کے پیچھے رانا کی سازش تھی اور مقصد مجھے ملوث کرنا تھا تو پھر فریال کیوں اندر ہے اور میں کیوں باہر ہوں؟''

راجا نے کہا۔ ''حوصلہ رکھ فیکے پتر۔ جلدی کا کام شیطان کا۔ ہوگا بالآخر یہی...... اور اب تک تجھے پھانسی ضرور ہو جاتی اگر سلطان کی لاش ست بدھانی کی حدود سے برآمد ہو جاتی۔ اس کے لیے تجھے احسان مند ہونا چاہیے بلکہ تمام عمر ان کے پاؤں دھو دھو کے پینا چاہئیں۔''

''میں واقعی غنی کا احسان مند ہوں۔''

''غنی کی نہیں، میں ان دو کتوں کی بات کر رہا تھا جو پہلے شیر شاہ اور بہادر شاہ تھے، اب آن اور بان ہیں۔ لاش کا سراغ غنی نے نہیں ان کتوں نے بروقت لگا لیا۔''

میں نے سوچ کے کہا۔ ''مہاراجا۔ وہ لاش کس کی تھی؟ جو پوسٹ مارٹم آپ کی نامزد منکوحہ ڈاکٹر شہناز نے کیا، اس پر سوفی صد اعتبار نہیں کیا جا سکتا، میرا مطلب ہے وہ جن حالات میں ہوا۔''

''اچھا ہوا تو نے وضاحت کر دی۔ میں تجھے قتل کرنے ہی والا تھا۔ کوئی میری ہونے والی بیوی کی لیاقت میں شک کرے، یہ ہم سے برداشت نہیں ہوتا۔ بچ گیا تو بال بال۔''

میں نے کہا۔ ''کیا اس ڈھانچے کا پوسٹ مارٹم آج ہوگا؟ یہ جاننے کے لیے کہ وہ راجا سلطان ہے یا گنگو تیلی۔''

''اسی نکتے پر میں بھی غور فرما رہا تھا۔ وہ جو مدعی ہے اس کیس میں، کیا نام ہے اس کا؟''

''فاضل بھٹی۔ وہ سلطان کا بہنوئی تھا۔ اس نے تو صاف بتا دیا تھا کہ پولیس نے اسے دباؤ ڈال کے فریق بنایا اور ایف آئی آر لکھوائی ورنہ اس کی ہم سے کیا دشمنی۔''

راجا نے گھڑی دیکھی۔ ''چل پھر اٹھ، ابھی سب پتا لگ جائے گا۔ بس اپنے بھٹی صاحب مل جائیں۔''

بھٹی صاحب کا غریب خانہ کافی تلاش کے بعد ملا۔ چودھری سلطان کے قتل نے اسے کچھ نمایاں کر دیا تھا ورنہ وہ بہت گمنام سا آدمی تھا۔ چودھری سلطان جیسے رئیس کی بہن کا گھر واقعی غریب خانہ تھا۔ اس کا سلطان کی شاندار حویلیوں سے دور کا بھی رشتہ نظر نہ آتا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ کوئی اسکول ٹیچر تھا اور سلطان نے اسے ماں کے کہنے پر ٹیوشن پڑھانے کے لیے رکھا تھا۔ سلطان کا باپ اور خود سلطان لڑکیوں کی تعلیم اور آزادی کے مخالف تھے مگر شوہر کے مرنے کے بعد ماں کا حکم چلنے لگا تھا۔ استادِ محترم نے علم کی روشنی میں عقل کا راستہ کم دکھایا۔ دل کی زبان میں سپنوں کی نگری کی ایسی سیر کرائی کہ طالبہ اپنے خاندان کی ناک کٹوا کے اس دو ٹکے کے ٹیچر کے ساتھ نکل گئی۔

یہ بڑا سنگین جرم تھا اور چودھری سلطان گجرات کے سب سے بارونق چوک میں اپنے جیجا جی کی کھال کھینچ کے اس میں بھس بھرتا اور عزت کے لیے لٹکا دیتا لیکن بدقسمتی سے وہ دو ٹکے کا ٹیچر ایک بڑے مضبوط خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ ظاہر ہے اس فلمی حادثے کے بعد دونوں خاندانوں میں ٹھن گئی اور ایک نے دھمکی دی تو دوسرے نے چیلنج دیا کہ آ جاؤ مقابلے پر اگر ہمت ہے۔ دیکھتے ہیں کون کس کی لاش گراتا ہے۔ جو کل تمہارے خاندان کی عزت تھی اب ہماری عزت ہے۔ کچھ بڑے، کچھ علما اور کچھ قانون داں بیچ میں پڑے تو صلح صفائی ہو گئی مگر چودھری سلطان نے بہن سے قطع تعلق کر لیا۔ اس نے ماں سے بھی کہا ہوگا کہ دیکھ لیا لڑکیوں کو پڑھانے کا انجام اور شاید آئندہ کے لیے لڑکیوں پر تعلیم کے دروازے بند کر دیے گئے ہوں گے مگر کیا بند دروازے محبت کرنے والوں کا راستہ روک لیتے ہیں؟

فاضل بھٹی ہمیں ایک حجام کی دکان پر مونچھیں سیٹ کراتا ملا۔ ہم نے اس کے باہر آنے کا انتظار کیا۔ اچانک ہمیں دیکھ کر وہ چونکا۔

''آپ جی...... کیا نام ہے نواب رفیق؟''

میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ ''بالکل ٹھیک پہچانا تم نے۔ کیا ہم کہیں بیٹھ کے بات کر سکتے ہیں؟''

راجا نے کہا۔ ''ہمارا خیال تھا کہ آج تم سے عدالت میں ملاقات ہوگی۔''

''وہ تو جناب، میں نے بتایا تھا، پولیس نے زبردستی فریق بنایا مجھے کیونکہ سلطان میرے سالے کا اور کوئی تھا نہیں۔ باپ مر گیا۔''

میں نے کہا۔ ''یہ کب ہوا؟ ان کا تو اسپتال بھی تھا۔''

''ہاں جی، وہ اپنے ہی اسپتال میں فوت ہوا۔ اللہ اس کی مغفرت کرے۔ بڑا چنگا بندہ تھا۔ سلطان تو حرامی تھا۔''

میں نے کہا۔ ''چلو جانے دو۔ مرنے والے کو ایسا نہیں کہتے۔''

''لو جی۔ میں کوئی گالی دے رہا ہوں۔ میں تو حقیقت بتا رہا ہوں۔ ابھی اس کی ماں چاہے تسلیم نہ کرے۔ قیامت والے دن لگ پتا جائے گا کہ اس کا اصل باپ کون تھا۔ نہ باپ کی شکل صورت نہ عادت اطوار۔ میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ وہ شادی کے لائق نہیں تھا۔ اس کی ماں کو دیکھو۔ بندہ آج بھی حیران رہ جاتا ہے۔ وہ کیسی عورت تھی، اپنی بالو کی سہیلی۔ بالو کو جانتے ہو؟ ایک فلم اسٹار کی ماں۔''

میں نے اسے بڑی مشکل سے روکا۔ ''یہ سب چھوڑو۔ کیا تم مجھے ان پولیس افسران کے نام بتا سکتے ہو جنہوں نے تمہیں ایف آئی آر درج کرانے پر مجبور کیا تھا۔''

''آپ کو بتا سکتا ہوں۔ عدالت میں نہیں بتاؤں گا۔'' اس نے چالاکی سے کہا۔

''وہ کیوں؟''

''پھر وہ پھندا میرے گلے میں فٹ کر دیں گے۔ آپ کو سمجھنا چاہیے کہ ہمارے درمیان دشمنی کی ایک وجہ موجود ہے۔ میری گھر والی......''

''چودھری سلطان کا اپنی بہن سے بھی کوئی رابطہ نہیں تھا۔''

''لو جی۔ وہی تو قصوروار بنی تھی۔ آپ بتاؤ کیا مرضی سے شادی کرنا عورت کا حق نہیں شرع میں؟''

میں نے کہا۔ ''میں کوئی مفتی نہیں ہوں۔''

راجا نے کہا۔ ''وہ اتنا بڑا رئیس، دولت مند، شوقین مزاج، عیاش اور فلمساز...... اور بہن ایسی حالت میں! برا مت ماننا۔ ہم نے تمہارا گھر دیکھا ہے ابھی۔''

اس نے آہ بھری۔ ''سر جی، ایک ٹیچر کی تنخواہ ہی کیا ہوتی ہے۔ اوپر سے چار بچوں کا خرچہ۔ اسی اسکول میں پڑھتے ہیں جہاں میں ٹیچر ہوں۔ فیس معاف ہے مگر وہاں تعلیم کے سوا سب ملتا ہے۔''

''دیکھو، ہم ایک سودا کریں گے...... نقد۔ اس سے تمہاری زندگی بدل جائے گی۔ تمہاری اگلی نسل کی تقدیر سنور جائے گی۔ اب نہ سلطان ہے اور نہ اس کا باپ۔ پھر تمہیں ڈر کس کا ہے؟''

اس نے غور سے مجھے اور راجا کو دیکھا۔ ''کھل کے بات کرو جی۔''

''او کے۔ تم عدالت میں یہ بیان دینے کا کیا معاوضہ لوگے کہ تمہیں پولیس نے ایف آئی آر درج کرانے پر مجبور کیا تھا۔ ان کے نام بھی بتاؤ گے۔''

میں نے کہا۔ ''اس کے بدلے تمہاری جان کی حفاظت کی ذمے داری ہماری ہوگی۔''

''جان تو اوپر والے نے لینی ہے۔''

''بالکل ٹھیک۔ ہم سب کی جان اس کے قبضۂ اختیار میں ہے اور زندگی جتنی ہے اس میں کوئی ایک سانس کا اضافہ نہیں کرسکتا۔ اس کے باوجود کیا ہم اپنی حفاظت نہیں کرتے؟ سیکیورٹی گارڈ نہیں رکھتے۔ بجلی کے پلگ میں انگلی نہیں ڈالتے۔ سڑک کے بیچ میں نہیں چلتے۔'' میں نے کہا۔

راجا نے کہا۔ ''ہماری معلومات کے مطابق سلطان کے پاس اب کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ اس کے باپ نے سب ایک ٹرسٹ کے نام کردیا تھا۔''

''ہاں، اسے یقین تھا کہ سلطان بعد میں کیا کرے گا۔ اس نے سلطان کے لیے پچاس ہزار روپے ماہانہ مقرر کیے تھے۔''

''اور اپنی بیٹی کے لیے کیا چھوڑا تھا؟''

''کچھ نہیں، ایک پھوٹی کوڑی نہیں۔ مجھے تو پکا یقین ہے کہ باپ کو خود سلطان نے مارا۔'' فاضل بھٹی بولا۔

''اس قتل سے اسے کیا حاصل ہوا؟''

فاضل بھٹی نے کچھ سوچا۔ ''دیکھو جی۔ میں وہی بتا رہا ہوں جو میں نے سنا۔ سلطان نے باپ کو نشے میں دھمکی دی کہ سب میرے نام کرو ورنہ میں تمہیں جان سے ماردوں گا۔ بڈھے نے انکار کیا کہ تو کون سی میری اولاد ہے۔ تجھے میں ایک پیسا نہیں دوں گا۔ اس پر سلطان نے اس کا گلا دبادیا اور پھر لے گیا اسی اسپتال۔ کسی ڈاکٹر سے لکھوالیا کہ دل کا دورہ پڑا تھا۔ ڈاکٹر جانتا تھا کہ اب وہ سلطان کا ملازم ہے۔ پیسے الگ لیے ہوں گے اس نے۔ یہ تو بعد میں پتا چلا کہ بڈھے نے جو کہا تھا وہ پہلے ہی کرچکا تھا۔''

''ایسی صورت میں تمہاری بیوی کے سوا دوسرا دعوے دار بھی نہیں...... اور نہ رشتے دار، میرا مطلب ہے خون کا رشتہ۔''

اس نے نفی میں سرہلایا۔ ''آپ کچھ سودے کی بات کررہے تھے۔''

راجا نے کہا۔ ''دیکھو، ہم دس لاکھ تمہیں دیں گے، بیان بدلنے کے۔ بیان کے بعد تم یہاں سے نکل جاؤ گے۔''

''کیسی بات کرتے ہو جی۔ میری نوکری؟''

میں نے کہا۔ ''تم ہمارے ساتھ جاؤ گے۔ تم کو اسکول میں ٹیچر کی نوکری ہم دیں گے، دگنی تنخواہ پر۔ ساری عمر کے لیے۔ مکان دیں گے اور تمہاری بیوی، بچوں کو پنشن۔ تم ست بدھائی میں رہو گے۔''

وہ منہ کھولے بیٹھا رہا۔ اس کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہورہا تھا۔ آفر بہت بڑی تھی لیکن شاید وہ سوچنا چاہتا تھا۔ بیوی سے مشورہ کرنا چاہتا تھا۔

راجا نے بڑی ہوشیاری سے اگلی چال چلی۔ ''اب دوسری آفر ہے تمہاری بیوی کے لیے۔''

وہ پھر چونکا۔ ''وہ کچھ نہیں کرسکتی۔''

''اسے کرنا پڑے گا۔ سلطان کی لاش کا پوسٹ مارٹم ہوگا تو اسے ضرور طلب کیا جائے گا۔ شناخت کے لیے۔''

''وہ ڈھانچے سے کیا شناخت کرے گی۔''

راجا نے کہا۔ ''یہی تو ساری بات ہے۔ اگر وہ کہہ دے کہ لاش چودھری سلطان کی نہیں۔ تو پولیس اس سے زبردستی نہیں منواسکتی۔ صرف اس کام کے ہم اسے بھی دس لاکھ دیں گے۔ اس کے لیے کون سا خطرہ ہے۔ نہ اسے بھائی سے ایسی محبت تھی کہ وہ جھوٹ بولنے سے انکار کرے۔ لاش کو صحیح شناخت کرنے پر اسے کچھ بھی نہیں ملے گا۔''

فاضل بھٹی پریشان ہوگیا۔ دنیا ایک سے ایک بڑے چالبازوں سے بھری پڑی ہے۔ سب لفظوں سے جال بنتے ہیں اور خواب دیکھنے والی آنکھوں کو تعبیر دینے کے جھوٹے وعدے کرتے ہیں تو حلف اٹھا کے خدا رسول اور قرآن کو ضامن بناتے ہوئے نہیں شرماتے۔ ایک اسکول ٹیچر کے لیے دس لاکھ کی رقم اتنی بڑی تھی کہ اسے وہ صفر شمار کرکے سمجھ سکتا تھا مگر چھ صفروں والی رقم ہاتھ میں آئے تو کتنی بڑی لگتی ہے اس کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ یہاں اسے اور اس کی بیوی کو جنہوں نے محبت کی شادی (یا حماقت) کرکے زندگی سے ندامت اور ملامت کے سوا کچھ نہیں پایا تھا۔ غربت اور احساسِ محرومی کے سوا کچھ نہیں دیکھا تھا۔ وہ راتوں رات دولت مندی کی جادونگری میں پہنچ سکتے ہیں۔ اس کا یقین وہ امتحانی سوال بن گیا تھا جو سمجھ میں ہی نہ آتا ہو۔ وہ جواب کیا دے۔

فاضل بھٹی بوکھلا گیا تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اسے بمشکل تمام تین چار لاکھ ملتے اور تنخواہ نصف ہوجاتی۔ یہاں ہم اسے تمام عمر کے لیے دگنی تنخواہ پر کام کرنے کی پیشکش کررہے تھے۔ رہنے کو مکان۔ مکمل تحفظ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ قارون کا خزانہ بخش رہے تھے جس میں بیس لاکھ جمع تھے۔ اور یہ سب حاصل کرنے کے لیے اسے اور اس کی

بیوی کو دو ہی کام کرنے تھے۔ ایک بیان دینا تھا اور گھربار سمیٹ کر اس جگہ کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دینا تھا جہاں کی مٹی سے، گلیوں سے، بازاروں سے اور لوگوں سے اس کا رشتہ اتنا ہی پرانا تھا جتنا اس کی عمر گزشتہ کا سفر۔ وہ کیا کرے؟ تقدیر کی اتنی بڑی لاٹری کو ٹھکرادے یا جلاوطنی قبول کرلے۔

ابھی وہ کسی فیصلے پر نہیں پہنچا تھا کہ ایک سرمنڈا بارہ تیرہ سال کا لڑکا دوڑتا ہوا آگیا۔ ''ابا، ابا، گھر پر پولیس آئی ہے۔'' اس نے حواس باختہ لہجے میں اطلاع دی۔

فاضل بھٹی فوراً گھر جانے کے لیے تیار ہوگیا تو راجا نے کہا ''دیکھو۔ پولیس کے سامنے ہم سے ملاقات اور اس گفتگو کا حوالہ دو گے تو حاصل کچھ نہیں ہوگا۔ نہ اِدھر سے نہ اُدھر سے۔''

میں نے کہا۔ ''فیصلہ تو اب تمہیں کرنا ہی ہوگا۔''

وہ سرہلا کے اپنے برخوردار کے ساتھ نکل گیا تو ہم نے ڈسٹرکٹ اسپتال پہنچنے میں دیر نہیں کی۔ راجا کا خیال تھا کہ اب پولیس چودھری سلطان کی بہن کو شناخت کے لیے لائے گی۔ لاش ناقابلِ شناخت ہوجانے پر بھی بعض اوقات کوئی ایسی چیز رہ جاتی ہے جس کو قریبی لوگ پہچان سکتے ہیں۔ مثلاً گھڑی، چشمہ، کوئی انگوٹھی یا لاکٹ۔ اگلے دن پوسٹ مارٹم رپورٹ عدالت کے سامنے پیش ہونا تھی اور اسی پر سارے کیس کا دارومدار تھا۔

راجا نے بڑی ہوشیاری سے کہیں اپنا پریس کارڈ دکھا کے اور کہیں قائداعظم کی تصویر دکھا کے اسپتال کے عملے کا تعاون حاصل کرلیا۔ صحافی راستہ بنانے اور معلومات تک رسائی حاصل کرنے کے سارے جائز اور ناجائز ہتھکنڈے جانتے ہیں۔ حاصل شدہ معلومات خاصی پریشان کن تھی۔ رپورٹ میں اس بات کا قوی امکان ظاہر کیا گیا تھا کہ ناقابلِ شناخت لاش چودھری سلطان کی ہی ہے۔

فاضل بھٹی اور اس کی بیوی کو ہمارے سامنے اندر لے جایا گیا۔ راجا نے اِدھر اُدھر کچھ فون کیے تھے۔ دس منٹ بعد مقامی پریس کلب کا صدر اور سیکریٹری نمودار ہوئے۔ انہوں نے راجا سے ہاتھ ملایا اور اس کے ہمراہ اندر چلے گئے جہاں پوسٹ مارٹم کے بعد چودھری سلطان کی بہن اپنے بھائی کی شناخت کررہی تھی۔ میں نے خود کو اس معاملے سے الگ اور دور رکھا۔

انتظار کا وقفہ طویل ہوتا گیا۔ آدھ گھنٹا گزر گیا۔ میرے خیال میں یہ چند منٹ کی کارروائی تھی۔ ایک گھنٹا پورا ہونے کو تھا کہ پولیس، صحافی، ڈاکٹر اور شناخت کے گواہ سب باہر

آ گئے۔ ان کے درمیان سخت بحث چل رہی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ معاملہ الجھ گیا ہے۔ اس وقت تک رات کا اندھیرا پوری طرح پھیل چکا تھا۔ میں چھپتا چھپاتا برآمدے کے اتنا نزدیک پہنچ گیا جہاں سے ساری بحث صاف سنی جاسکتی تھی۔

چودھری سلطان کی بہن نے اسے بھائی کی لاش ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ اس پر پولیس سخت برہم تھی اور ڈاکٹر بھی مایوس تھا لیکن بعض بڑے توپ قسم کے صحافی اڑ گئے تھے کہ مقتول کی بہن سے زبردستی غلط بیان لینے کی کوشش کیوں کی جارہی ہے اور انہیں دھمکیاں کیوں دی جارہی ہیں۔ پولیس آخر کیا چاہتی ہے؟ کیا یہ کسی دباؤ کا نتیجہ ہے یا رشوت کا۔ ہم نے تو جو دیکھا اور سنا ہے وہی رپورٹ بھی کریں گے اور ضرورت پڑی تو عدالت میں گواہی دینے بھی پہنچ جائیں گے۔

ظاہر ہے اس کے بعد نہ ڈاکٹر اپنی مرضی سے کچھ کرسکتا تھا اور نہ پولیس فوری طور پر اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانے کی کارروائی شروع کرسکتی تھی۔ وہ طیش میں فاضل بھٹی اور اس کی بیوی کو وہیں چھوڑ کر چلے گئے۔ میاں بیوی سخت خوفزدہ تھے اور بار بار سوال کررہے تھے کہ کیا ہم اپنے وعدے پر قائم ہیں یا انہیں آزمائش میں ڈال کے اور اپنا کام نکال کے نکل جائیں گے؟

راجا نے ان دونوں کو میرے حوالے کیا۔ ''میرا خیال ہے تو ان کے ساتھ نکل جا۔ میں ابھی آتا ہوں۔''

فاضل بھٹی نے شور مچایا۔ ''ہمارے بچے بھی ہیں۔''

اس کی بیوی کا نام صنوبر تھا۔ وہ الگ ہائے ہائے کررہی تھی۔ ''پتا نہیں اب ہمارا کیا ہوگا۔ میں نے کہہ دیا جو کہنا تھا۔ اب ہماری خیر نہیں۔ یااللہ اب ہم کہاں جائیں گے، کیا کریں گے۔ فاضل کچھ تو بول۔''

فاضل نے کہا۔ ''او پاگل۔ دیکھ یہ ہیں اپنے نواب رفیق۔ بہت بڑے آدمی ہیں۔ میں نے تجھے بتایا تھا کہ انہوں نے کیا وعدہ کیا ہے۔''

صنوبر نے دوپٹے کو سر پر رکھ کے مجھے سلام کیا۔ ''حضور۔ ہم بہت غریب، لاوارث ہیں۔ اپنا بھائی پہلے جان کا دشمن تھا۔''

میں نے پلٹ کے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ''اتنا گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں صنوبر۔ میں اپنے وعدے پر کس طرح قائم ہوں، یہ تم دیکھ لوگی۔ ست بدھائی میں کوئی تم پر انگلی نہیں اٹھا سکے گا۔''

راجا خلافِ توقع فوراً نمودار ہوگیا۔ ''یار، میں ذرا ان کے ساتھ گیا تھا۔ وہ جو یہاں کے صحافی ہیں۔ خیال تھا کہ انہیں ڈنر پر لے جاؤں گا مگر انہوں نے کہا کہ راجا صاحب، مہمان آپ ہیں۔ خبر لگوانے کے لیے ہمیں انوائٹ کررہے ہیں تو شرمندہ کررہے ہیں۔''

''پھر...... میں بھٹی صاحب کی فیملی کو لے جاؤں، ست بدھائی؟''

''نہیں، کل عدالت میں پوسٹ مارٹم رپورٹ پیش ہوگی تو ان کا پھر بیان ہوگا۔''

''اور آج کی رات؟'' فاضل بھٹی پریشان ہوگیا۔

راجا نے کہا۔ ''آج کی رات کچھ بھی نہیں ہوگا۔ میں نے تم دونوں کو سیکیورٹی فراہم کرنے کا بندوبست کرلیا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''راجا! سیکیورٹی بھی تو پولیس ہی فراہم کرے گی۔''

راجا نے کہا۔ ''انہیں کوئی جلدی نہیں۔ آج کی رات وہ ایسی کوئی کارروائی نہیں کریں گے۔ انہیں کیا معلوم کہ یہ ست بدھائی جانے کا فیصلہ کرچکے ہیں۔''

راجا کی بات نے مجھے بھی قائل کیا اور میں نے فاضل بھٹی کو اور اس کی بیوی کو سمجھایا کہ ابھی کوئی قیامت نہیں آرہی۔ وہ سکون سے اپنے گھر میں بچوں کے ساتھ رہیں اور تیاری کریں۔ کسی کو بھی نہ بتائیں کہ وہ ست بدھائی جارہے ہیں۔ البتہ یہ مشہور کردیں کہ یہاں رہنا مشکل ہوتا جارہا ہے۔ ہم کراچی جانے کا سوچ رہے ہیں۔ کل شام وہ سامان اٹھائیں اور نکل جائیں۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ ابھی ہمیں کم سے کم ایک دن اور گجرات میں گزارنا تھا۔ ہم نے فاضل بھٹی اور صنوبر کو ان کے گھر کے سامنے ڈراپ کیا۔ ان کا اعتماد بحال کرنے کے لیے میں نے دس دس لاکھ کے دو چیک لکھ لیے تھے جو سیلف اور بیرر تھے۔ یہ میں نے ان کے حوالے کیے تو ان کے چہروں سے خوف اور پریشانی کا تاثر غائب ہوگیا اور ایک دم مسرت واطمینان کے جذبات سے ان کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔ انہوں نے مستقبل کے خوبصورت خوابوں بھری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

پھر فاضل بھٹی نے کہا۔ ''اللہ آپ کا اقبال بلند کرے، آپ کی بادشاہت قائم رکھے۔''

میں نے ہنس کے کہا۔ ''بھٹی صاحب! میں نہ بادشاہ ہوں نہ نواب لیکن وعدے کا پکا ضرور ہوں۔ اگر تم چاہو تو کل کیش بھی لے سکتے ہو۔ میرا اکاؤنٹ آن لائن ہے۔''

راجا بولا۔ ''اتنی بڑی رقم ساتھ رکھنا ٹھیک نہیں۔ بہتر ہوگا اگر اسے تم اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرادو۔ یا ست بدھائی پہنچ کے نقد لے لو۔''

فاضل بھٹی نے دونوں چیک میری طرف بڑھائے۔ ''ہمیں اعتبار ہے آپ پر نواب صاحب۔ وہیں لے لیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''ابھی چیک اپنے پاس ہی رکھو۔''

رات کے کھانے کے لیے راجا کو مقامی پریس کلب نے انوائٹ کیا تھا۔ راجا چاہتا تھا کہ میں بھی اس کے ساتھ چلوں۔ مدعو نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن میں نے محسوس کیا کہ میں اس محفل میں مس فٹ ہوجاؤں گا۔ میں نے واپس ہوٹل جانے کا فیصلہ کیا۔ یہ ذمے داری راجا نے قبول کرلی تھی کہ وہ شہباز کو مزید ایک دو روز گجرات میں رہنے کی اطلاع کردے گا۔ ہم فریال کا مسئلہ حل کرکے آئیں گے۔ (راجا نے مجھے بعد میں بتایا کہ جواب میں شہباز نے ہم دونوں کے بارے میں کیسے غلط الفاظ استعمال کیے جو فریال جیسی عورت کے لیے فی سبیل للہ خوار ہورہے تھے۔ اس کے چاہنے والے کیا کم ہیں کہ تم لائن میں لگ کے اپنے نمبر بنارہے ہو۔ اس نے ہمیں ٹھرکی کا خطاب بھی عنایت کیا۔)

میں اپنے ہوٹل پہنچا تو کاؤنٹر کے پیچھے کھڑا منیجر میری طرف لپکا۔ ''سر، میرے پاس آپ کا کنٹیکٹ نہیں تھا ورنہ میں آپ کو ضرور مطلع کرتا۔''

میں نے محتاط ہو کے کہا۔ ''کیا مجھ سے ملنے آیا تھا کوئی؟''

''نہیں سر، پہلے ایک پیغام موصول ہوا تھا۔ نواب رفیق احمد شیرازی آپ ہی ہیں؟ یہاں تو آپ نے صرف رفیق احمد لکھا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''اس سے فرق نہیں پڑتا۔ پیغام کس کا تھا؟''

اس نے روانی میں کہا۔ ''آپ کی ساس صاحبہ کا۔''

''میری ساس!'' میں نے بے اختیار کہا مگر اپنی ہنسی کو روک لیا۔

''اس کے بعد یہ آیا کوریئر سروس سے، دوپہر دو بجے'' اس نے مجھے ایک فلاور بوکے تھما دیا۔ ''اور یہ کارڈ۔''

میں نے گلدستے کے ساتھ موصول ہونے والا کارڈ لے لیا اور حیران ہوتا رہا کہ یہ دلنواز بندوبست کس کی عنایت ہوسکتی ہے۔ اپنے کمرے میں آکے میں نے خوشبو سے مہکتا لفافہ چاک کیا۔ اندر ایک اجنبی تحریر میں لکھا ہوا تھا۔ ''ہیلو ہینڈسم۔ اگر آج رات میری گاڑی اسی جگہ اور اسی وقت پھر خراب ہوجائے، اتفاق سے۔ تو کیا تم ٹھیک کرنے آؤ گے؟''

پیغام انگریزی میں تھا۔ اس نے مجھے تھوڑا سا چکر میں ڈالا لیکن میں سمجھ گیا کہ یہ سارا ڈراما نور جہاں کے سوا کوئی نہیں کرسکتا۔ مجھے غصہ بھی آیا، جھنجلاہٹ بھی ہوئی اور ہنسی بھی آئی۔ وہ لڑکی جس کی کار میں نے اسٹارٹ کرنے میں مدد کی تھی، اتنی بداخلاق تھی کہ اس نے میرا شکریہ تک ادا نہیں کیا تھا۔ نہ اردو میں نہ انگریزی میں۔ وہ کیا جانے میں کون ہوں اور کہاں ہوں۔ نور جہاں نے دن میں فون کیا اور میرے نہ ملنے پر کہہ دیا کہ میں ان کی ساس بول رہی ہوں۔

ایسا لگتا تھا کہ وہ اپنے گزشتہ رات کے رویّے کی تلافی کرنا چاہتی تھی۔ جب اس نے مجھے ایک اجنبی لڑکی کے ساتھ مصروف دیکھا تو دماغ خراب ہوگیا اور وہ رکے بغیر سیدھی نکل گئی۔ اس لڑکی کو نور جہاں نے چھمک چھلو اور پرکٹی پری جیسے خطابات سے نوازا تھا جن سے زنانہ حسد کے جذبات یوں ٹپکتے تھے جیسے رس گلے سے شیرا۔

شاید بعد میں اسے زیادتی کا احساس ہوا ہوگا۔ اس لیے مجھے پھر بلا بھیجا تھا مگر شرارت سے باز نہیں آئی تھی۔ حوالہ پھر اسی لڑکی کا دے دیا تھا جس سے میرا دوبارہ اس زندگی میں ملنا ہی بعید از امکان تھا۔ مگر اس سے میرے لیے پریشانی یہ پیدا ہوگئی تھی کہ میں کروں تو کیا کروں۔ ساڑھے آٹھ بج چکے تھے۔ اگر میں فوراً بھی گاڑی لے کر نکلتا تو ساڑھے دس بجے سے پہلے اس جگہ نہیں پہنچ سکتا تھا جہاں نور جہاں نے پھر بلایا تھا۔ اس امکان کو مسترد نہیں کیا جاسکتا کہ راستے میں دیر لگ جائے۔ کہیں ٹریفک جام ہو، کوئی حادثہ ہوجائے۔ حادثے کا مطلب ہے گاڑی کہیں لگ جائے یا کوئی مجھ سے ٹکرا جائے۔ اس میں نقصان تو ہوتا ہی ہے۔ تصفیہ ہونے سے پہلے بک بک میں بہت وقت ضائع ہوتا ہے۔

دیر کسی بھی وجہ سے ہو۔ اگر میں وقت پر نہ پہنچ سکا تو خاتون پھر روٹھ کے نکل جائیں گی۔ انتظار کرنا تو صرف مرد پر لازم ہے۔ عورت کے لیے تو شرم کی بات ہے۔ میں نے امید نہ ہونے کے باوجود بہتر سمجھا کہ ایک بار کوشش کرلوں۔ شاید وہ فون ریسیو کرلے لیکن پھر وہی ہوا۔ غالب کی زبان میں...... یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں۔ واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں۔

مجھے اندازہ تھا کہ وہ جان بوجھ کے مجھے تنگ کرنے کے لیے کال ریسیو نہیں کرتی۔ میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ میں

فوراً روانہ ہو جاؤں تب بھی رات ساڑھے دس بجے سے پہلے لاہور نہیں پہنچ سکتا۔ دیر ہو جائے تو وہ میرا انتظار کرے مگر مسئلہ وہی تھا کہ بتاؤں کیسے؟ میں نے کوشش کی تو اس کا موبائل فون نمبر جیسے مجھے چڑانے لگا۔ ''آپ کے مطلوبہ فون سے جواب موصول نہیں ہو رہا ہے۔''

اس بار میں نے غصہ موبائل فون پر اتار کے اپنا نقصان نہیں کیا۔ میں نے ایک ایس ایم ایس لکھا۔ ''میں آ رہا ہوں۔ دیر ہو جائے تو تھوڑا سا انتظار کر لینا۔'' اور نور جہاں کے نمبر پر ارسال کر دیا۔ پھر میں نے بہتر سمجھا کہ راجا کو بھی اپنے لاہور کے پروگرام سے مطلع کر دوں۔ راجا اپنے کسی ہم پیشہ دوست کے ساتھ مصروف تھا چنانچہ اس نے صرف اتنا ہی کہا کہ عیش کر فیکے پتر۔ کیونکہ تیرے نصیب میں عیش کرنا لکھا ہے۔

میں اب خاصا مطمئن تھا کیونکہ فریال اب پولیس کے عقوبت خانے میں نہیں تھی۔ سپرنٹنڈنٹ جیل ایک ریٹائرڈ میجر اور خاصا معقول آدمی تھا۔ وہ صحافیوں سے بنا کے رکھتا تھا۔ وہ میرے ساتھ بھی عزت سے پیش آیا تھا اور اس نے فریال کو بھی مطمئن کر دیا تھا کہ اس کو جیل میں قیام کے دوران ہر سہولت حاصل رہے گی۔

محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔ ہم فریال کو چھڑا تو نہیں سکتے تھے لیکن پیسا خرچ کر کے ہم نے ایک سچ کو جھوٹ میں بدل دیا تھا۔ وہ چودھری سلطان کے سوا کسی کی لاش نہیں ہو سکتی تھی جسے ہم نے ثابت کر دیا تھا کہ اس کی لاش نہیں۔ اصولی طور پر قتل کے جرم کا ایک مقتول کی عدم موجودگی میں کیس ہی نہیں بنتا۔ اگر چودھری سلطان کی لاش مل جاتی اور یہ بھی ثابت ہو جاتا کہ اس کی موت کسی حادثے یا طبعی حالات کا نتیجہ نہیں تو پھر اسے قتل سمجھا جا سکتا تھا اور اس کے بعد ہی یہ سوال پیدا ہو سکتا تھا کہ اسے کس نے قتل کیا اور کیوں۔

جب تک چودھری سلطان کی لاش نہیں ملتی کسی پر قتل کا الزام کیسے آ سکتا ہے۔ بس وہ لاپتا ہے۔ تلاش کرنے والے اسے تلاش کریں۔ جرائم کی کہانیوں میں آلۂ قتل اور وجہ قتل کو بھی اتنا ہی اہم سمجھا جاتا ہے۔ قانون دیکھتا ہے کہ قتل دشمنی یا فوری اشتعال کا نتیجہ نہیں اور سازش یا منصوبہ بندی کا نتیجہ ہے تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس قتل سے فائدہ کس کو پہنچا؟ فریال کا تو نقصان ہوا۔ اس کا منگیتر نہیں رہا جس سے اس کی شادی ہونے والی تھی۔ کسی جبر یا دباؤ کے نتیجے میں نہیں، اس کی اپنی رضامندی سے جس کا اظہار وہ بارہا پبلک شوز میں کر چکی تھی۔

مجھے یقین تھا اور خوشی بھی ...... کہ میری اور راجا کی بروقت کارروائی نے فریال کو کال کوٹھری سے بچا لیا۔ اگر وہ سزائے موت سے بچ جاتی تب بھی عمر قید لازمی تھی اور اس کی عمر کا سب سے خوبصورت اور بیش قیمت حصہ، جب وہ حسن وشباب کے سارے خزانوں سے مالا مال تھی اور ساری فلمی دنیا اس کے اشارۂ ابرو کی غلام تھی، جیل کی چار دیواری میں اخلاق باختہ جرائم پیشہ عورتوں کے درمیان مشقت کرتے اور عذاب جھیلتے گزر جاتا۔ اس کے حسن وشباب کو ہوس پیشہ گدھ نوچ نوچ کے کھا جاتے۔

چودھری سلطان کی کہانی ختم ہو گئی تھی۔ اس کی لاش اب روز محشر سے پہلے کسی کو نہیں ملے گی۔ شک فریال پر کیا جائے یا مجھ پر قتل کے الزام سے ہم بری الذمہ تھے۔ اب ساری بات وقت کی تھی۔ آج مرے کل دوسرا دن۔ دنیا سب کو بھول جاتی ہے اور پولیس کے پاس تو روز نئے کیس آتے ہیں۔ اسے کہاں فرصت کہ پرانی فائلوں میں سر کھپائے۔ فریال بھی بہت جلد باہر آ جائے گی۔ فلمی صنعت کا سارا اثر رسوخ اور پیسا اس کی پشت پناہی کرے گا۔

میں اپنے خیالات میں محو عادت کے مطابق ذہن میں پہلے سے موجود راستے پر چلتا جا رہا تھا۔ طویل عرصہ ڈرائیونگ کرتے رہنے کے بعد ایسا ہوتا ہے کہ آپ کے دماغ کا ایک حصہ پوری طرح ڈرائیونگ کے فرائض سنبھال لیتا ہے اور خود کار طریقے پر سارے امور انجام دیتا ہے کہ کہاں رفتار بڑھانی ہے' کہاں بریک لگانے ہیں' کہاں سگنل پر رکنا ہے اور کہاں مڑنا ہے۔ آپ ٹریفک رش سے کسی کو بھی چھوئے بغیر گزر جاتے ہیں۔ اس دوران آپ کے دماغ کا دوسرا حصہ کچھ اور سوچتا رہتا ہے۔ زندگی کے مسائل اور معاملات، آج یا کل کی بات۔ بعض اوقات آپ اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے کسی شخص سے باتیں بھی کرتے رہتے ہیں اور راستہ طے ہوتا جاتا ہے۔

یہی میرے ساتھ ہو رہا تھا۔ جب میں نے ... مال سے نہر کی طرف گاڑی موڑی تو ساڑھے دس سے پانچ منٹ اوپر ہو گئے تھے۔ اب دو تین کلومیٹر کی مسافت تھی پانچ، سات منٹ بعد میں پھر وہیں ہوتا جہاں گزشتہ شب تھا۔

میرے ساتھ گاڑیوں نے ہر لین میں ٹرن لیا تھا۔ میں بائیں ہاتھ کی آخری لین میں تھا چنانچہ میرے دائیں جانب سے تیز رفتار گاڑیاں گزرتی جا رہی تھیں۔ بائیں ہاتھ پر کوٹھیاں تھیں اور تھوڑے تھوڑے سے فاصلے پر کوئی گلی اس سڑک سے مل جاتی تھی۔

پھر اچانک وہ ہوا جو بیان بھی نہیں کیا جا سکتا اور تصور میں بھی نہیں آ سکتا کیونکہ سننے یا پڑھنے والے کو میں اپنی ذہنی کیفیت اور دہشت کے تجربے سے نہیں گزار سکتا۔ میں نے اچانک بائیں طرف دو تیز روشنیوں کو دیکھا۔ پھر ایک زبردست دھماکا ہوا۔ مجھے کسی نامعلوم قوت نے کار سمیت زمین سے کئی فٹ اوپر اچھال دیا۔ ابھی میں اوپر ہی تھا کہ مجھے اپنے کار میں نہ ہونے کا احساس ہوا۔ نہ معلوم کیسے میں کار سے نکل گیا تھا۔ اگلے ہی لمحے میرا وجود نہر کے پانی میں غرق ہو گیا۔ میری کار مجھ سے پہلے نہر میں ڈوب گئی تھی لیکن میرے اور کار کے درمیان آٹھ دس فٹ کا فاصلہ تھا۔

نہر کے پانی کا بہاؤ بھی اسی سمت میں تھا جدھر میں جا رہا تھا۔ ایک حیوانی جبلت کے تحت میں نے پانی میں گرتے ہی بہاؤ کے ساتھ تیرنا شروع کر دیا۔ میں جلد از جلد اس جگہ سے دور جانا چاہتا تھا۔ ایک اندر کی آواز تھی جو مجھے خبردار کر رہی تھی۔ مجھ سے چلا چلا کے کہہ رہی تھی کہ نکل جاؤ قاتلوں کے نرغے سے۔ رات کے اندھیرے سے فائدہ اٹھاؤ اور جان بچاؤ۔ کنارے کا رخ ہرگز نہ کرنا۔

اس وقت تک میری سمجھ میں بہت کچھ آ چکا تھا۔ بائیں ہاتھ کی ایک ذیلی سڑک سے ایک بہت بڑی گاڑی' غالباً ٹویوٹا کی ڈبل کیبن ہائی لکس کسی شیر کی طرح غراتی نکلی تھی۔ اس نے پوری قوت سے میری کار کو بائیں طرف سے ٹکر ماری تھی۔ اسے محض اتفاق ہی سمجھا جا سکتا ہے کہ میرے دائیں ہاتھ پر اس وقت دوسری کوئی گاڑی نہیں تھی ورنہ میں اپنی گاڑی سمیت اس میں گھس جاتا اور بیچ میں سینڈوچ ہو جاتا یا دونوں گاڑیاں نہر میں گرتیں۔

گاڑی اس تصادم سے اچھلی تو اس کا دروازہ کھل گیا یا ونڈ اسکرین نکل گیا اور بچانے والے نے مجھے اس میں سے باہر نکال لیا۔ اگر میرے ساتھ بائیں ہاتھ پر کوئی ہوتا تو شاید دروازے کے ساتھ ہی وہ بھی چرمر ہو جاتا۔ میں تصادم کی قوت سے اوپر اچھلا۔ گاڑی مجھ سے بھاری تھی۔ وہ پہلے نیچے گری۔ میں کچھ آگے جا کے پانی میں گرا۔

مجھے نہیں معلوم کہ میری کار کو اس طرح ٹکر مارنے والی گاڑی کا کیا ہوا۔ اس کا یقیناً زیادہ نقصان نہیں ہوا ہو گا۔ وہ بہت مضبوط گاڑیاں ہوتی ہیں اور عموماً ان کے آگے اضافی فولادی بمپر بھی لگائے جاتے ہیں۔ اس حادثے میں غلطی کا امکان صفر تھا۔ یہ ایک حملہ تھا' قاتلانہ حملہ جس کے لیے قاتل پہلے سے مورچہ بند بیٹھے تھے اور میرا انتظار کر رہے تھے۔

تقریباً بیس پچیس گز بعد میں نے نہر کے میلے گدلے پانی سے سر نکالا اور کنارے کی ایک جھاڑی کو پکڑ لیا۔ نہر کی گہرائی دس فٹ اور چوڑائی شاید تیس فٹ ہوتی۔ یہ کوئی دریا نہیں تھا جس میں' میں ڈوب جاتا۔ جب میں نے پیچھے کی طرف دیکھا تو وہاں بہت سی گاڑیوں کے رکنے سے ٹریفک جام ہو گیا تھا۔ لوگ اتر اتر کے نہر میں گرنے والی کار کو دیکھ رہے تھے۔ ممکن ہے کچھ لوگ نہر میں بھی اترے ہوں کہ گاڑی میں پھنسے ہوئے افراد کو نکال لیں۔ جنہوں نے یہ حادثہ ہوتے دیکھا ہو گا انہیں تو شاید یقین ہو گا کہ کار میں کوئی زندہ نہیں بچا ہو گا۔

وہ گاڑی جس نے مجھے ٹکر ماری تھی' کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ ہوتی تو کچھ لوگ اس کے گرد بھی جمع ہوتے مگر میرا خیال ہے بھرپور قوت سے ٹکر مارنے کے بعد وہ گاڑی مڑ کے دوسری گاڑیوں کی بھیڑ میں شامل ہو گئی اور اِدھر اُدھر سے راستہ بناتی نکل گئی۔ اس کا پیچھا کرنے کی ہمت کون کرتا؟ جو ایسی جذباتی غلطی کرتا، اس کی اپنی گاڑی بھی تباہ ہو جاتی۔ بھیڑ بکریوں جیسی چھوٹی موٹی نازک کاریں اس مست ہاتھی جیسے طاقتور ٹرک کا کیا مقابلہ کرتیں؟

اچانک میری نظر ایک متحرک سائے پر گئی جو میری طرف آ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی چیز تھی جو اسلحہ ہی ہو سکتا تھا۔ اس نے چلا کے دوسرے کنارے پر چلنے والے شخص سے کہا ''نہیں' وہ ...... گاڑی میں نہیں ہے۔''

درمیان میں میرے لیے نام کی جگہ ایک گالی استعمال کی گئی تھی۔ میں نے خود کو جھاڑیوں کے تاریک وجود میں چھپا لیا۔ نہر کے دونوں کناروں پر ایک دوسرے سے تیس فٹ کے فاصلے پر میرے دو مبینہ قاتل مجھے تلاش کر رہے تھے۔ میرے پاس اپنی حفاظت کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ میرے کپڑے پانی میں شرابور تھے اور کپڑوں میں جو کچھ تھا' بھیگ گیا تھا۔ میرا پرس' موبائل فون اور ریوالور میرے ساتھ ہی غرق ہوئے تھے اور ناقابلِ استعمال ہو چکے تھے۔

دوسرے کنارے کے شخص نے کہا ''وہ اتنا آگے نہیں گر سکتا۔''

''تو نے دیکھا تھا اسے؟'' میری طرف والا شخص چلا کے بولا۔ وہ اب مجھ سے صرف تین فٹ دور کھڑا تھا۔

تیس فٹ دور دوسرے کنارے والے نے بھی چلا کے جواب دیا ''نہیں' وہ ضرور نکل کے بھاگ گیا۔''

''کیسے نکل کے بھاگ گیا؟ اس کی تو ساری ہڈیاں ٹوٹ گئی ہوں گی۔'' میرے نزدیک کھڑا ہوا شخص بے خیالی میں ایک ایک قدم آگے بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ میں دم سادھے

ساکت کھڑا تھا۔ میرا نصف دھڑ پانی میں ڈوبا ہوا تھا اور نصف جھاڑی کے سائے میں تھا۔

مجھے کیا کرنا چاہیے؟ اسی طرح سانس روکے انتظار کرنا چاہیے کہ قاتل مایوس ہو کے لوٹ جائیں یا ان سے نمٹ لینا چاہیے؟ میرے سر پر کھڑے قاتل نے میرے سائے کو بھی جنبش کرتے دیکھ لیا تو وہ فائر کرنے میں دیر نہیں لگائے گا۔

وہ ایک لمحہ تھا جب کنارے پر کھڑے شخص کا پاؤں میرے دائیں ہاتھ سے چند انچ کے فاصلے پر آ کے رک گیا۔ وہی لمحہ تھا جب میں کچھ کر سکتا تھا۔ میں نے ایک دم اس کی پنڈلی پکڑ کے اسے جھٹکے سے کھینچا تو وہ ڈھلوان کنارے سے سیدھا پانی میں آیا۔ اس سے پہلے کہ وہ حلق سے آواز نکالتا' میں نے اس کا منہ دبا دیا اور اس کا سر پانی کے نیچے کر دیا۔ دوسرے کنارے پر چلنے والے کو کسی ہلچل کا احساس نہیں ہوا۔

دو منٹ سے بھی کم وقت میں میرا شکار بے دم ہو گیا۔ نیالا پانی اس کے پھیپھڑوں میں بھر گیا تھا۔ وہ پھڑ پھڑایا مگر خود کو میری گرفت سے نہ چھڑا سکا۔ جھٹکے سے اس کا اسلحہ کنارے پر ہی گر گیا تھا۔ یہ سائلنسر لگا ہوا ایک ریوالور تھا۔ باہر نکل کے میں نے ریوالور اٹھا لیا اور بلا تردد دوسرے کنارے پر آہستہ آہستہ چلنے والے کے سر کا نشانہ لے کر ٹریگر دبا دیا۔

ایک ہلکا سا دھماکا ہوا۔ دوسرے کنارے پر چلنے والا اچھلا اور نہر میں گر گیا۔ گولی نے اس کے سر کو اڑا دیا تھا۔ میرا نشانہ خطا نہیں ہوا تھا۔ کسی گزرنے والے نے کچھ بھی نہیں دیکھا تھا۔ رات کے وقت وہاں سے صرف کاریں گزر رہی تھیں۔ پیدل چلنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔

میں نے ریوالور کو بھی نہر میں پھینکا اور کنارے کے ساتھ ساتھ اسی سمت میں روانہ ہو گیا جدھر میں جا رہا تھا۔ میرے اندر کا خوف اور دہشت ایک حیوانی غصے میں ڈھل گئے تھے اور میں نے مارنے والوں کو مار دیا تھا۔ اس کے باوجود میرے ہاتھ پاؤں قابو میں نہیں تھے۔ میرے جوتوں میں پانی اور کیچڑ بھرا ہوا تھا اور میرے کپڑوں سے پانی میرے جسم پر بہ رہا تھا۔

میں اسٹریٹ لائٹ سے دور نہر کے کنارے پر چل رہا تھا چنانچہ کسی نے مجھے دیکھا بھی ہو گا تو اس حلیے میں کوئی چرسی آوارہ گرد سمجھا ہو گا۔ میں چلتا گیا۔ آدھے گھنٹے بعد میں اس جگہ پر تھا جہاں حادثہ نہ ہوتا تو میں پانچ منٹ میں پہنچ جاتا۔

وہاں میں نے ایک ناقابلِ یقین منظر دیکھا۔ وہ سرخ کار اسی جگہ کھڑی تھی جہاں میں نے پچھلی رات اسے دیکھا تھا۔ اس کا بونٹ اٹھا ہوا تھا اور وہ بدتمیز' بداخلاق' چھمک چھلو عرف پرکٹی پری اسی طرح انجن میں کوئی خرابی تلاش کرتی نظر آ رہی تھی۔

میں چکرا گیا۔ کیا واقعی مجھے وہ پھولوں کا تحفہ اور پیغام اسی لڑکی نے بھیجا تھا۔ سوال یہ تھا کہ کیسے؟ کون تھی وہ؟ اس نے میرا سراغ کیسے لگایا؟ وہ تو میرا شکریہ تک ادا کیے بغیر نکل گئی تھی۔ ایک طرف سخت مایوسی تھی کہ نور جہاں پھر نہیں ملی۔ آخر وہ کتنی دیر انتظار کرتی...... لیکن اس نے مجھے بلایا ہی نہیں تھا تو وہ آئی کہاں ہو گی اور یہ چھمک چھلو......!

میں ایک دم آگے بڑھا اور پیچھے جا کے کہا "آخر یہ کیا ڈراما ہے' کون ہو تم؟"

لڑکی ایک دم پلٹی۔ اس نے ایک نظر مجھے دیکھا۔ وہ بالکل گزشتہ روز کے لباس اور حلیے میں تھی۔ پھر اس نے ہنسنا شروع کیا "آج کیا تم نہر میں تیر کے آئے ہو؟"

ایک دم میرا دماغ الٹ گیا اور میں نے اسے دبوچ لیا "تم!...... یہ تم ہو...... نور......"

وہ چلائی "یہ کیا کر رہے ہو۔ چھوڑ دو مجھے جنگلی' وحشی......"

میں نے کہا "دل چاہتا ہے تمہارا گلا دبا دوں۔ اتنا بڑا ڈراما کیا میرے ساتھ۔ الو کی پٹھی!"

میری آنکھیں اب بھی اس پر بے یقینی سے جمی ہوئی تھیں۔ اس کے وہی کٹے ہوئے بال تھے' بدلا ہوا چہرہ اور لباس۔ لیکن آج اس نے اپنی آواز نہیں بدلی تھی۔ مجھے اس پر جتنا غصہ تھا اس سے زیادہ اپنے آپ سے شرمندگی تھی کہ میں کتنا عقل و نظر کا اندھا ہوں کہ ظاہری تبدیلی سے دھوکا کھا گیا اور بدلے ہوئے روپ میں نور کو پہچان نہیں سکا۔

"اب ایسے کیا دیکھ رہے ہو...... اور یہ حالت کیا بنا رکھی ہے۔ کپڑے کیوں بھیگے ہوئے ہیں...... گاڑی کہاں ہے؟"

میں نے کہا "نور...... نور' پہلے یہاں سے چلو۔ میں سب بتاتا ہوں۔"

اس نے بونٹ بند کر کے دروازہ کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ "کہاں چلوں......؟" اس نے کہا۔

"بس یہاں سے نکلو پہلے پھر دیکھیں گے۔" میری نظریں اس کے چہرے سے ہٹتی ہی نہیں تھیں۔ ایک سوال آسیب کی طرح مجھ سے چمٹ گیا تھا۔ آخر کل میں اسے کیوں نہیں پہچان سکا تھا؟ مانا اس کا ظاہر بدلا ہوا تھا۔ آواز اس نے مجھے آزمانے کے لیے جان بوجھ کر بدلی ہو گی مگر میرے

دل نے گواہی کیوں نہیں دی؟ مجھ کو بتایا کیوں نہیں کہ ٹھیکے پتر' غور سے دیکھ...... سمجھ' یہ نور جہاں ہے۔ بے وقوف...... اندھے۔"

نور جہاں نے سیدھی سڑک پر اپنا سفر جاری رکھا۔ وہ میری حالت پر بہت متفکر تھی۔ بالآخر مغلپورہ کے نزدیک اس نے گاڑی کو سڑک کے کنارے روک لیا جہاں چند گاڑیاں تھوڑے فاصلے کے ساتھ پہلے ہی موجود تھیں۔ وہاں شام کو ایک گول گپا مارکیٹ وجود میں آ جاتی تھی۔ یہ رونق اسی کے دم سے تھی۔

"جان...... خدا کے لیے کچھ بتاؤ۔" نور جہاں نے مجھے جھنجوڑا۔

میں چونکا "نور...... میں بچ گیا۔ مجھ پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔"

"کب......؟"

"ابھی جب میں تم سے ملنے آ رہا تھا۔ معلوم نہیں میں کیسے زندہ ہوں۔ بس خدا ہی جانتا ہے۔ معلوم نہیں کیوں وہ مجھے زندگی کی مہلت دیتا چلا جا رہا ہے۔ دشمنوں نے تو کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔" میں نے کہا اور پھر اسے اپنی گاڑی پر ہونے والے حملے کے بارے میں سب بتا دیا۔

"مجھے تم کو فوراً ڈاکٹر کے پاس لے جانا چاہیے۔ مگر ایسی حالت میں کیسے لے جاؤں۔" اس نے گاڑی اسٹارٹ کی۔

"نور...... میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"یہ تم کیا جانو...... میڈیکل چیک اپ ضروری ہے لیکن میں تم کو پہلے گھر لے جاؤں گی۔"

"گھر...... کس کے گھر؟"

"اپنے شوہر کے گھر۔ شادی کر لی ہے نا میں نے' ایک کروڑ پتی سے۔ اس کا محل ہے' نوکر چاکر سب ہیں۔ ساس' سسر بھی۔ شوہر مجھ پر جان چھڑکتا ہے۔ میرے حکم کا غلام ہے اور دیکھنے میں بھی ایسا ہے کہ تم اس کے سامنے چپڑاسی لگتے ہو۔ تم جیسے دس نواب وہ اپنے جوتے صاف کرانے کے لیے خرید لے۔"

میں نے ہنس کے کہا "اس سے کہو مجھے بھی رکھ لے۔"

وہ جل کے بولی "ہنس رہے ہو...... بے شرم' یہ نہیں کہ معافی ہی مانگ لو مجھ سے کہ نور' میری آنکھیں ہی نہیں دماغ بھی خراب ہے۔"

"میں مانتا ہوں۔ دل' دماغ' جگر' گردے' آنکھیں...... کان' نیچے سے اوپر تک میری کوئی چیز ٹھیک نہیں۔"

وہ ایک دم سیریس ہو گئی "تم کیا جانو۔ کتنا دکھ ہوا مجھے' میرا دل ٹوٹ گیا۔ میرا یقین' اعتبار سب خاک میں مل گیا۔ میں سمجھتی تھی کہ تم دیکھتے ہی مجھے پہچان لو گے' دم بخود رہ جاؤ گے کہ نور' یہ تم کیا بن گئیں۔ آواز بدلنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ مگر تم......" وہ چپ ہو گئی۔ اس کی آنکھ سے ایک آنسو نکلا جو اس کے رخساروں پر بہتا اس کی گود میں جا گرا۔

"نور...... میرے پاس اپنی صفائی میں کہنے کے لیے کچھ نہیں۔"

"تم نے میرا دل توڑ دیا۔ وہ بات غلط ہو گئی کہ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ ہم دل کی بات کہے بغیر بھی سمجھ لیتے ہیں کیونکہ جب عشق ہوتا ہے تو دل کی دھڑکن زبان بن جاتی ہے۔ دو دل ایک ہی فریکوئنسی پر آ جاتے ہیں' جذبات کی فریکوئنسی......"

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے اسے اپنی طرف کھینچا مگر وہ کھنچ کر دور ہو گئی "رہنے دو یہ چونچلے۔" اس نے گاڑی اسٹارٹ کی۔

میں نے کہا "جان' تمہارے سر کی قسم! بعد میں یہ خیال ضرور آیا تھا مجھے کہ میں نے تمہیں کہیں دیکھا ہے۔ کچھ آشنائی کے آثار مجھے محسوس ہوئے تھے...... لیکن تبدیلی اتنی زیادہ تھی...... جو میں تصور نہیں کر سکتا تھا۔"

"لوگ بکواس کرتے ہیں کہ ہوا کا جھونکا محبوب کی طرف سے آئے تو محبت کرنے والے پہچان لیتے ہیں۔"

میں نے نخوت سے کہا "اگر میں تمہارے اتنا قریب ہوتا...... تو تمہارے وجود کی خوشبو سے پہچان لیتا۔ تمہارے لمس کو پہچان لیتا لیکن میں تو اس چھمک چھلو سے دور دور رہا۔ اسے ہاتھ تک نہیں لگایا۔"

"رہنے دو اب یہ ساری باتیں۔"

"میرے تصور میں تو تمہارا کچھ اور ہی روپ تھا۔ میں اسی میں گم تھا۔ یہی سوچ رہا تھا کہ تم کون سی ساری پہن کر آؤ گی۔ وہی نیلے آسمان کے رنگ والی جس پر ستاروں جیسے پھول ہیں یا وہ بسنتی جو آنے والی بہار کی نوید ہوتی ہے...... یا وہ لال جو میرے ارمانوں کا رنگ...... یا وہ کالی جس میں تمہارا حسن ایسے جگمگا اٹھتا ہے......"

وہ میری طرف دیکھ کے مسکرائی "بس کرو، بس کرو۔ مجھے پتا ہے تم کتنے چرب زبان اور خوشامدی ہو۔ شاعری پر اتر آؤ تو دیوان لکھ سکتے ہو۔"

میں نے کہا "ہم مرد ایسے ہی کام نکالتے ہیں۔ مگر یہ بتاؤ کہ تم مجھے کہاں لے جا رہی ہو؟"

''کہا نا اپنے گھر۔ اب کچھ میری بھی سن لو۔ میں نے دو کمروں کا ایک پورشن کرائے پر لے لیا ہے۔ یہ کہا ہے کہ میرے شوہر دوبئی میں کام کرتے ہیں۔''

''ویری گڈ! کام کیا کرتے ہیں؟''

''گدھے چراتے ہیں' سرکس میں جوکر ہیں۔ مجھ سے کسی نے پوچھا ہی نہیں تو میں کیا بتاتی؟ اکیلی عورت کو کرائے پر بھی گھر نہیں ملتا۔ یہ فرض نہیں کیا جاتا' مان لیا جاتا ہے کہ وہ کال گرل ہے یا طوائف۔''

''تو مجھے تم نے دکھانے کے لیے طلب کیا ہے...... کہ یہ ہے وہ کاٹھ کا الو جسے میں نے پال رکھا ہے؟''

''بالکل...... اور اب تمہاری نمائش کروں گی۔ اپنا رول سمجھ لو' ہم کو اسی کے مطابق ڈائیلاگ بولنے ہیں اور بی ہیو کرنا ہے...... میں معتبر ہو جاؤں گی۔''

''یس میڈم! اگلی مرتبہ میں سفید ڈاڑھی لگا کے آ جاؤں گا۔ تم سب سے ملوا دینا کہ میرے سسر ہیں۔''

گاڑی ایک دم رک گئی ''یہ عمارت ہے۔ مالک مکان بڈھا بڑھیا بہت نیک اور سیدھے ہیں...... لیکن اوپر ایک سؤر کا بچہ مجھے آتے جاتے ایسے دیکھتا ہے جیسے مجھے کھا جائے گا۔ اس کا خیال وہی ہے کہ میں نے جھوٹ بول کے مکان لے لیا' اصل میں وہی ہوں۔ باہر جاتی ہوں تو کسی گاہک کے پاس۔ رات کو دروازہ اسی لیے بند رکھتی ہوں کہ اندر کوئی ہوتا ہے۔ ایک خاتون اسی قسم کی نیچے ہیں۔''

''یعنی تم مجھے جوتے کی طرح استعمال کرو گی۔ ان کے منہ پر مارو گی کہ دیکھو سؤر کے بچو! یہ ہے میرا شوہر میڈ ان دوبئی۔''

وہ شوخی سے مسکرائی ''تمہیں لائسنس دلوا دیا میں نے کسی بھی وقت آنے جانے کا۔''

میں ایک تاریک زینے سے اوپر گیا۔ تین منزلہ عمارت کے وسط کا ایک پورشن نور جہاں کے پاس تھا۔ اس میں صرف دو ہی کمرے تھے۔ ایک کو اس نے بیڈ روم بنا رکھا تھا' دوسرے کو ڈرائنگ روم سمجھا جا سکتا تھا۔

میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور نور جہاں کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ میری گود میں اور میرے بازوؤں کے حلقے میں قید ہو گئی ''اب بتاؤ تمہارے ساتھ اس دھوکا دہی پر کیا سلوک کیا جائے؟ اپنی سزا تجویز کرو۔''

''سزا کے لیے پوری رات پڑی ہے۔'' وہ میری آنکھوں میں جھانک کے ہنسی ''جلدی کس بات کی۔''

اس کے لبوں' آنکھوں اور گالوں کو چوم کے میں نے واضح کیا کہ تاخیر میرے لیے ممکن نہیں۔ اس نے خود کو مجھ سے چھڑایا ''مجھے بھی گیلا کر دیا۔''

''میرے پاس تو یہی کپڑے ہیں' اتار دوں؟''

''ٹھہرو...... میں ایک چادر لاتی ہوں۔ تم دھوتی باندھ کے گزارہ کر سکتے ہو۔ صبح تک یہ کپڑے سوکھ جائیں گے۔ میں استری کر دوں گی۔''

میں نے کہا ''یہاں دیکھنے والا کون ہے؟''

اس نے آنکھیں نکالیں ''کیا مطلب......؟''

میں نے کہا ''مطلب یہ کہ میں تمہاری شلوار قمیص پہن لوں گا۔''

وہ ہنس پڑی ''پہن لو اگر آ جائے۔''

جب اس نے وارڈروب میں سے بالکل میرے سائز کا نیا شلوار قمیص سوٹ نکالا تو میں حیران رہ گیا ''یہ پہلے سے خرید رکھا تھا تم نے؟''

''ایک اچھی بیوی کو شوہر کی ہر ضرورت کا علم ہوتا ہے کہ وہ آئے گا تو اسے پہننے کے لیے کیا چاہیے اور کھانے کے لیے کیا۔ تم کپڑے بدلو میں کھانا لگاتی ہوں۔''

میں نے کہا ''تم نے پکایا ہے؟''

وہ جاتے جاتے پلٹی ''کھا کے دیکھنا کہ ہوٹل سے منگوایا ہے یا میں نے پکایا ہے۔ تم تو ہوٹل کا نام بھی بتا سکتے ہو ذائقے سے۔''

اس کی بات درست تھی۔ بعد میں اس نے بتا دیا کہ کھانا اس نے گزشتہ روز بڑی محنت سے پکایا تھا کیونکہ اسے یقین تھا کہ میں اسے پہچان جاؤں گا تو وہ مجھے گھر لے آئے گی لیکن واپس آ کے اس نے بھی کچھ نہیں کھایا اور روتی رہی۔ کھانا اٹھا کے اس نے فریج میں رکھ دیا۔ آج بہرحال مجھے آنا تھا۔

''تم واقعی پاگل ہو۔'' میں نے کہا۔

اس نے پیار سے میرے ایک تھپڑ مارا ''ایک پاگل جو پلے پڑ گیا ہے۔ پاگل بن کے ہی رہنا پڑے گا اب تو۔''

پھر وہ مجھے بتاتی رہی کہ اس نے کس طرح خود کو بدلا۔ اس نے اپنا سارا زیور بیچا۔ یہ سیکنڈ ہینڈ گاڑی لی' پھر ماہ نور کے نام سے اپنا نیا شناختی کارڈ بنوایا جس میں ہر چیز غلط تھی مگر پیسا خرچ کرنے سے صحیح ہو گئی۔ اس شناختی کارڈ کی مدد سے اس نے پاسپورٹ بھی حاصل کر لیا اور ایک انگلش میڈیم اسکول میں نوکری بھی۔ اب نور جہاں کہیں نہیں تھی، وہ ماضی کا ایک حصہ بن گئی تھی اور جب میں نے اسے نہیں پہچانا تو دوسرا کون پہچانے گا؟

میں نے یہ ساری باتیں حیرانی اور ستائش کے ملے جلے

جذبات کے ساتھ سنیں ''یہ سب تم نے اکیلے ہی کر لیا نور؟''

''نہ کرتی تو کیا کرتی۔ تم نے تو طے کر لیا تھا کہ میرا نام اور چہرہ بدل کے مجھے ملک بدر کر دو گے۔ میں کیوں جاؤں تمہیں چھوڑ کے باہر۔ جاؤں گی تو تمہارے ساتھ ہی جاؤں گی۔''

میں نے کہا ''تم حیرت انگیز لڑکی ہو۔''

''دیکھ لو' اب میں ایک نئی زندگی شروع کر چکی ہوں۔ کسی کی محتاج نہیں ہوں۔ میں اپنے پیروں پر کھڑی ہوں۔ بس ایک عقلمندی کی تھی میں نے کہ میں اپنے نام نہاد شوہر اکبر خان کے گھر سے خالی ہاتھ نہیں نکلی تھی۔ اس وقت بھی مجھے احساس تھا کہ سب سے زیادہ کام آتا ہے پیسا۔ میرے زیورات گیارہ لاکھ میں بکے۔ میں نے سب ایک جگہ نہیں دیے۔ تھوڑے تھوڑے کر کے مارکیٹ میں سب کو دیے۔ بینک میں میرا کیش تین لاکھ تھا، وہ الگ ہے۔ میں نے لاہور کے کئی بیوٹی پارلرز سے رابطہ کیا۔ ان کے پاس کاسمیٹک سرجری بھی ہے۔ وہ حیران ضرور ہوں گے کہ میرے چہرے میں کوئی خرابی نہیں پھر میں اس کو بدلنا کیوں چاہتی ہوں؟ تم آڈرے ہیپ برن کو جانتے ہو؟''

میں اچانک کیے جانے والے اس سوال پر چونکا ''ہاں'' ماضی کی بڑی نامور اداکارہ تھی۔ اس نے فلم ''رومن ہالیڈے'' میں ایک شہزادی کا رول کیا تھا۔''

''وہی...... اور جب تم نے مجھے دیکھا تو تمہیں ''آڈرے ہیپ برن'' یاد آئی' اس کی صورت کے نقوش تمہارے لاشعور میں تھے مگر تمہیں اس کا نام یاد نہیں آیا۔ نور جہاں کی طرف تمہارا دھیان جا ہی نہیں سکتا تھا۔''

میں نے کہا ''پھر تم مجھے قصوروار کیوں سمجھتی ہو؟''

''تمہیں نہیں، تمہارے اس دل کو۔'' اس نے میرے سینے پر مکا مارا ''جسے تم نے گیسٹ ہاؤس بنا رکھا ہے۔ ایک گیا اور دوسرا آ گیا...... لیکن اب ایسا نہیں ہو گا۔''

''اب کیا ہو گا؟ کوئی آ گئی تم سے بھی اچھی...... پھر؟''

''مجھ سے اچھی کون ہو سکتی ہے۔ اب میں ہوں تو بس ہوں۔ کوئی آئے تو سہی' خنجر گھونپ دوں گی تمہارے دل میں۔ قیمہ کر دوں گی۔ پھر گاتے پھرنا اک دل کے ٹکڑے ہزار ہوئے' کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا۔''

''دیکھو' مجھے چار کی اجازت ہے۔''

''میں ایک کے قابل نہیں چھوڑوں گی۔ تالیاں بجاتے پھرنا ساری عمر۔''

مجھے پتا ہی نہیں چلا اور صبح ہو گئی۔ اس کو ست بدھائی کے تمام معاملات کی خبر تھی۔ اباجی کے انتقال سے چیف منسٹر کی آمد تک۔ میں نے اسے چودھری سلطان کے قتل اور پھر فریال کی گرفتاری کے بارے میں بتایا۔ وہ بڑی دلچسپی سے سنتی رہی۔ اٹھنے کا نہ اس کا ارادہ تھا، نہ میرا دل چاہتا تھا لیکن مجھے واپس جانا تھا۔

اس نے مجھے اپنی گرفت سے آزاد کر دیا ''ابھی کیسے جا سکتے ہو تم؟''

''جان' مجبوری ہے۔''

''مجبوری میری نہیں ہے۔ مجھے دنیا کو دکھانا ہے کہ میرے پاس اپنا ایک شوہر ہے۔ میں بھی معزز اور معتبر ہوں۔''

اس نے میرے لیے ناشتا بنایا۔ پھر میرے کپڑے استری کیے جو رات بھر میں خشک ہو گئے تھے۔ میں اس کے انہماک کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ اس کی صورت میں پہلے زیادہ دلکشی تھی یا اب؟ چہرے کے نقوش میں ہیئر اسٹائل میں تبدیلی کے سوا سب کچھ وہی تھا لیکن مجھے ایسا لگتا تھا جیسے حالات کی مجبوری نے مجھے نور جہاں کے بدلے آڈرے ہیپ برن کو قبول کرنے پر مجبور کر دیا ہے اور میں اس مجبوری سے سمجھوتا ضرور کر سکتا ہوں لیکن اس کے باوجود دل سے یہ خلش نہیں جاتی کہ میں نے نور جہاں کو کھو دیا ہے۔ وہ حسن خدا کی عطا تھی۔ یہ انسانی ہنرمندی کا کرشمہ تھا۔ پہلے وہ ملکۂ کوہسار مری کے پہلے نظارے کی طرح مبہوت کر دیتی تھی، اب وہ اسلام آباد کے کسی خوبصورت پارک میں چمن آرائی کے فن کا شاہکار تھی۔ ان کا کیا موازنہ۔

تاہم وہ ماہ نور بن جانے کے باوجود وہی نور جہاں تھی۔ اس کے انداز' اس کے جذبات' اس کی مجھ سے والہانہ محبت اور بے غرض خود سپردگی کی ادا' کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔

اپنا لباس بدلتے ہوئے اس نے شرما کے کہا ''ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟''

میں نے کہا ''جب تم سامنے ہو تو میں اور کیا دیکھوں اور کیوں دیکھوں؟''

''چلو آؤ جلدی سے۔ میں تمہیں سب سے ملوا دوں۔''

اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور گیٹ بند کر دیا۔ سب سے پہلے وہ مجھے اوپر لے گئی۔ اندر سے ایک کالا بھجنگ باکسر ٹائپ شخص برآمد ہوا اور مجھے نور کے ساتھ دیکھ کر ٹھٹکا۔ نور نے مسکرا کے میرا تعارف کرایا ''یہ ہیں میرے ہسبینڈ رفیق صاحب۔ کل ہی دوبئی سے آئے تھے۔ میں نے سوچا آپ سے ملوا دوں۔''

صدیقی نے اخلاقاً ہمیں اندر مدعو کیا۔ وہ خاصا دل شکستہ

اور مایوس نظر آتا تھا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں نے ہاورڈ سے ایم بی اے کیا ہے اور میں لندن میں چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بھی تھا تو اس نے مجھ سے میرے دوبئی کے کام کے بارے میں کوئی سوال ہی نہیں کیا۔ وہ ہنوز غیر شادی شدہ تھا اور اپنی بہن کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کی بہن نے بہتر اخلاق کا مظاہرہ کیا اور چائے سے ہماری تواضع بھی کی۔

آخر میں نور مجھے مالک اور مالکۂ مکان سے ملوانے لے گئی۔ مکان مالک پلاننگ کمیشن میں سیکشن افسر کے عہدے سے ریٹائر ہوا تھا۔

انہوں نے اپنے بچوں کو اچھی تعلیم دلوائی تھی' اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ وہ سب اچھا کمانے اور اچھے مستقبل کی تلاش میں باہر نکل گئے تھے۔ بڈھا بڑھیا کو پیسے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ پنشن کے علاوہ انہیں کرائے سے معقول آمدنی ہو رہی تھی۔ ان کی ساری فکر یہ تھی کہ وہ نہ رہے تو اس گھر کا مالک کون ہوگا اور کرائے داروں کا کیا بنے گا؟ باہر سے اس کی ملکیت کا دعوے دار کون آئے گا؟ کسی کو دلچسپی ہے نہ ضرورت۔

''سوچتا ہوں انہی کو مالک بنا دوں۔ سارے بے گھر اور غریب کرائے دار ہیں۔ شاید اللہ کو میری یہ نیکی پسند آ جائے۔ یہ ایک صدقہ جاریہ ہوگا۔ تمہارا کیا خیال ہے؟''

میں چونکا ''جی...... کم سے کم میں اپنے بارے میں کہہ سکتا ہوں کہ مجھے مستحق افراد میں نہ شامل کریں۔''

''اگر اس کو بیچ کر رقم کسی رفاہی ادارے کو دیتا ہوں تو خیال یہی آتا ہے کہ یہ سب کہاں جائیں گے جو برسوں سے رہتے چلے آئے ہیں۔ وہ تو بس' اس گھر میں رہنے والا نوجوان حادثے میں مارا گیا جو گھر نور کو ملا۔ ایک سال گزر گیا۔ اس کا والی وارث کوئی نہیں آیا تو میں نے سامان ایدھی کو دے دیا۔''

باہر آ کے نور نے اعلان کیا ''میں یہ گھر چھوڑنے والی نہیں۔''

''تم ست بدھائی نہیں جاؤ گی؟''

''نہیں' کبھی نہیں۔''

''دلہن بن کے بھی نہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''دلہن...... کون ہوتی ہے دلہن؟ لال کپڑوں میں لپٹی بجی سجائی وہ عورت جو اپنی قربانی دینے کے بعد صبح صرف بیوہ رہ جاتی ہے؟ تمام عمر کے لیے۔ مجھے بتاؤ میں کیا ہوں؟ جب تم آتے ہو میں دلہن بن جاتی ہوں' کسی طرح بھی میرے جذبات اس دلہن سے مختلف نہیں ہوتے جو حجلۂ عروسی میں اپنے دولہا کا انتظار کرتی ہے۔''

میں نے کہا ''تم فلسفی ہوتی جا رہی ہو۔ مجھے بتاؤ ایسے تم کب تک رہو گی یہاں؟ ساری زندگی......؟''

''ہاں' اگر گزر جائے تو اچھا ہے۔ اس سے زیادہ میں چاہتی بھی نہیں۔ میں اسکول میں پڑھاتی رہوں تم دوبئی سے آتے رہو کبھی کبھی۔ باقی دنیا سے...... یا ست بدھائی سے مجھے کیا لینا دینا۔''

''دیکھو' ابھی مجھے جانا ہے اس لیے میں تم کو قائل کرنے کے لیے بحث نہیں کر سکتا کہ ایسے زندگی نہیں گزاری جا سکتی۔''

''اب تم کہاں جاؤ گے' قاتلانہ حملے کی رپورٹ لکھوانے؟''

''قاتلانہ حملے کا میں کوئی ذکر نہیں کروں گا۔ صرف یہ کہوں گا کہ گاڑی کا اسٹیئرنگ بے قابو ہو گیا تھا۔ مجھے جھپکی آ گئی تھی۔ گاڑی نہر میں گر گئی اور پھر مجھے نہیں معلوم' نہر میں سے مجھے کس نے نکالا۔''

''نہر میں سے دو لاشیں بھی برآمد ہوئی ہوں گی۔''

''دو کیا دس لاشیں بھی برآمد ہوں تو مجھے کیا۔ میں گجرات سے آیا تھا اور اس کے بہت مضبوط گواہ ہیں۔''

''کیا اس اتفاق میں کوئی تعلق تلاش نہیں کیا جائے گا کہ جہاں گاڑی گری' لاشیں بھی وہیں سے ملیں؟''

''سوئٹ ہارٹ! اپنے نازک دماغ پر قانونی موشگافی کا زور مت ڈالو۔ ہو سکتا ہے لاشیں نہر میں بہ کے آگے چلی گئی ہوں۔ الگ الگ مقامات سے ملی ہوں۔''

''تم معلوم بھی نہیں کرو گے...... کہ وہ کون تھے؟''

''یہ خود ہی معلوم ہو جائے گا۔ میری زندگی تو ایک وار گیم کی طرح چل رہی ہے۔ دیکھتے ہیں کب تک چلتی ہے' تم اب آرام کرو۔''

''پھر کب آؤ گے۔'' وہ میرے قریب آ گئی ''کبھی بنا بلائے بھی تو آ جاؤ۔''

اس سے پہلے کہ میں نور کی بات کا جواب دیتا اور اسے فیئر ویل کس کرتا' میرے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ جب میں نہر میں گرا تو پانی میں میرا سیٹ بھیگ کے ناکارہ ہو گیا تھا۔ میں نے اس کی سم نکال کے خشک ہونے کے لیے رکھ دی تھی۔ صبح میں نے نور سے ذکر کیا تو اس نے مجھے اپنا موبائل فون دے دیا اور میں نے اس میں اپنی سم فٹ کی تو وہ ٹھیک تھی۔

یہ...... کال راجا کی تھی ''یار' تو کہاں ہے؟'' اس نے چھوٹتے ہی سوال کیا۔ مجھے اس کی آواز میں بڑی وحشت محسوس ہوئی۔

میں نے کہا ''میں نے تجھے بتا دیا تھا۔''

''اچھا' اب یہاں آ جا فوراً......''

میں نے کہا ''راجا۔ میرے پاس گاڑی نہیں ہے۔''

''کیوں...... گاڑی کہاں گئی؟''

''نہیں میں۔'' میں نے کہا اور اسے مختصر الفاظ میں قاتلانہ حملے کے بارے میں بتا دیا۔

''تو ٹیکسی میں آ جا' فافٹ...... میں ڈسٹرکٹ اسپتال میں ہوں۔''

میں نے کہا ''آخر ہوا کیا ہے تجھے؟''

''مجھے کچھ نہیں ہوا۔'' وہ بگڑ کے بولا ''فون پر سب نہیں بتا سکتا۔ تو دیر مت کر۔'' راجا نے فون بند کر دیا۔

میں بڑی مشکل میں پڑ گیا۔ راجا نے کوئی تفصیل نہیں بتائی تھی۔ خود اسے کچھ نہیں ہوا تھا تو اس کا یہ مطلب تھا کہ معاملہ چودھری سلطان کی پوسٹ مارٹم رپورٹ کا ہوگا جو آج سیشن کورٹ میں پیش کی جانی تھی۔ اس سلسلے میں مدعی فاضل بھٹی اور اس کی بیوی صنوبر کو بھی پیش ہو کے اپنا بیان ریکارڈ کرانا تھا۔

دوسری طرف میرے لیے بھی اپنی گاڑی کے نہر میں گرنے کی رپورٹ درج کرانا ضروری تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ گاڑی کو اب تک پولیس نے نہر سے ضرور نکال لیا ہوگا۔ ممکن ہے عینی شاہدوں کے بیان پر پولیس نے کسی نامعلوم گاڑی کے خلاف بھی رپورٹ لکھی ہو جو ٹکر مارنے کے بعد فرار ہو گئی تھی۔ اگر نہر سے دو لاشیں برآمد ہو گئی تھیں تو شاید پولیس نے فرض کر لیا ہوگا کہ گاڑی کے وہی مالک تھے۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ کیا پولیس نے وہ سائلنسر لگا ریوالور بھی برآمد کر لیا تھا؟ ایک لاش کے سر میں گولی کا سوراخ ہونے سے یہ نظریہ قائم کر لیا تھا کہ گاڑی چلاتے ہوئے ان کے درمیان کسی بات پر جھگڑا ہوا اور ایک نے ریوالور نکال کے گاڑی چلانے والے کو گولی مار دی جس سے گاڑی نہر میں جا گری۔

اصل بات تھانے جا کے ہی معلوم ہو سکتی تھی۔ اس معاملے میں غیر ضروری تاخیر میرے لیے قانونی مسائل پیدا کر دیتی۔ نور خود مجھے ڈرائیو کر کے پولیس اسٹیشن لے جانے کے لیے تیار تھی مگر میں نے اسے روک دیا اور خود اس کی گاڑی لے گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے غنی کو فون کیا کہ وہ بلا تاخیر سیکیورٹی گارڈز کے ساتھ لاہور پہنچے۔

میں نے جائے حادثہ پر جا کے دیکھا۔ میری گاڑی نہر سے نکال کے کنارے پر رکھ دی گئی تھی۔ اس کی باڈی کو پانی میں گرنے سے زیادہ نقصان نہیں ہوا تھا لیکن اندر کیچڑ بھر گئی تھی اور شارٹ ہونے سے ساری وائرنگ جل گئی ہوگی۔ سڑک سے گزرنے والوں کے لیے گاڑی ایک عبرت کا نشان بن گئی تھی کہ بے احتیاطی کا انجام کیا ہوتا ہے؟

جب میں گاڑی کا معائنہ کر رہا تھا تو دیگر دو حضرات بھی اسے یوں ملاحظہ فرما رہے تھے جیسے گاڑی انہی کی ہو۔ ایک نے حادثے کی وجہ جاننے کے لیے جو سوال کیا اس کا جواب دوسرے شخص نے بڑے یقین سے دیا کہ ڈرائیور نشے میں دھت ہوگا۔ جب میں نے اس سے پوچھا کہ اس حادثے کی رپورٹ لکھوانے کے لیے مجھے کون سے تھانے سے رجوع کرنا چاہیے تو وہ چونکا۔

''گاڑی آپ کی ہے؟'' اس نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

میں نے کہا ''اگر آپ کی ہے تو آپ بتا دیں' رپورٹ کہاں لکھوائی ہے؟''

دوسرا سوچ کے بولا ''دیکھو جی' تھانے دو ہیں' نہر کے ادھر تھانہ دھرمپورہ' ادھر گڑھی شاہو۔ ان کے درمیان حد کا جھگڑا چلتا ہی رہتا ہے۔ نہر میں سے کوئی لاش برآمد ہو تو دونوں ایک دوسرے پر تفتیش ڈالتے ہیں۔ لاش کو نہر کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے پر پہنچا دیتے ہیں۔

میں نے کہا ''گاڑی کی لاش تو ادھر رکھی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ مجھے گڑھی شاہو جانا چاہیے۔''

پہلے شخص نے بغور میرا معائنہ کرنے کے بعد کہا ''گاڑی نہر میں کیسے گر گئی؟''

میں نے کہا ''یہ فیصلہ تو آپ نے ابھی کر دیا تھا کہ میں نشے میں دھت ڈرائیونگ کر رہا تھا۔''

وہ شرمندہ نہیں ہوا ''آپ کی حالت سے نہیں لگتا کہ آپ گاڑی میں تھے۔''

میں نے کہا ''میں گاڑی کی چھت پر بیٹھا تھا۔ گاڑی خود بخود چل رہی تھی۔ جب گاڑی سوئمنگ کے لیے نہر میں کودی تو میں نے جمپ لگائی اور اسپائیڈر مین کی طرح کنارے پر اتر گیا۔ مجھے خراش تک نہیں آئی اور نہ میرے کپڑوں پر شکن۔''

پہلا شخص فوراً روانہ ہو گیا۔ میں نے دوسرے سے کہا۔ ''میرا دل چاہتا تھا کہ اس حرام زادے کو بھی نہر میں پھینک دوں۔''

میری بات پر دوسرا شخص بھی چل پڑا۔ میں نور کی چھوٹی سی خوبصورت لال مہران دوڑاتا تھانہ گڑھی شاہو میں داخل ہوا اور سیدھا تھانہ انچارج کے کمرے میں گھس گیا۔ گیٹ کے

سنتری سے اندر موجود پولیس کی نفری تک کسی نے میرے جارحانہ انداز کو پسند نہیں کیا۔

میں خالی کمرے میں کرسی گھسیٹ کر بیٹھا ہی تھا کہ ایک سب انسپکٹر کچھ بوکھلایا ہوا' کچھ خفا اندر آیا "خیر سے کون ہو جی آپ؟ ایسے اندر آ کے بیٹھ گئے ہو۔"

میں نے اس کی بات کاٹ کے بے نیازی سے کہا۔ "انچارج کہاں ہے؟"

وہ کچھ کنفیوز ہوا "آپ حکم کرو۔ میں ڈیوٹی افسر ہوں۔"

میں نے کہا "رجسٹر لے کر آؤ اور میری رپورٹ لکھو۔"

میرے تیور دیکھ کے وہ کچھ محتاط ہو گیا۔ "پہلے آپ کچھ فرماؤ...... آپ کون ہو' معاملہ کیا ہے؟"

میں نے اسے نظر اٹھا کے ایسے دیکھا جیسے وہ اپنے سوالات سے میری توہین کا مرتکب ہوا ہے۔ "میں نواب رفیق احمد شیرازی ہوں۔ تم نہیں جانتے مجھے...... مگر تمہارے آئی جی عبداللہ صاحب جانتے ہیں۔ ایسے کھڑے منہ کیا دیکھ رہے ہو' رپورٹ لکھو۔"

میرا یہ رعونت آمیز گفتگو کا انداز اپنا کام کر گیا۔ سب انسپکٹر نے لیس سر کہا اور پلٹ گیا۔ وہ کچھ دیر بعد آیا اور میرے دائیں جانب بیٹھ گیا۔ رجسٹر اس کے سامنے تھا لیکن رپورٹ لکھنے میں اسے اب بھی تامل تھا۔

"آپ پہلے وقوعہ بتاؤ جناب! رپورٹ ہم لکھ لیں گے۔"

"کل رات میری گاڑی نہر میں گر گئی تھی۔" میں نے ہاتھ کے اشارے سے سمت کی وضاحت کی۔

وہ چونکا "خیر سے وہ آپ کی گاڑی تھی؟"

میں نے اسے سخت نظروں سے گھورا "میری نہ ہوتی تو میں کسی اور کی گاڑی کی رپورٹ لکھوانے آتا؟"

اس کا موڈ بدل گیا "تفتیشی افسر کی رپورٹ کہتی ہے کہ گاڑی کو سائڈ سے ٹکر ماری گئی تھی۔"

"کیا تفتیشی افسر نے اس گاڑی کا پتا چلا لیا جس نے ٹکر ماری تھی؟"

"ٹکر کسی ٹرک نے ماری تھی۔ وہ نکل گیا۔ آپ اس وقت گاڑی میں تھے، میرا مطلب ہے گاڑی خود چلا رہے تھے؟"

میں نے کہا "گاڑی آٹو میٹک ہے۔ صرف گیئر کی حد تک۔ چلا میں ہی رہا تھا۔"

اس نے نظروں سے میرا طبی معائنہ کر کے رائے دی۔ "ایسا لگتا تو نہیں' آپ کی حالت دیکھ کر۔ آپ کے جسم پر خراش بھی نہیں آئی۔ آپ کے کپڑے بالکل خشک اور صاف ہیں...... اور آپ بارہ گھنٹے بعد رپورٹ درج کرانے آئے ہو' اتنی دیر آپ کہاں تھے؟"

میں نے کہا۔ "جب تم رپورٹ لکھو گے تو سارے سوالات کا جواب مل جائے گا۔ سوالات کرتے رہو گے تو وقت ضائع ہو گا میرا۔"

وہ بگڑ گیا "وقت آپ ضائع کر رہے ہو ہمارا' نواب صاحب!"

چق اٹھا کے دوسرا سب انسپکٹر اندر آیا۔ اس نے غصے میں ٹوپی اتار کے میز پر ماری اور معلوم نہیں کسے گالیاں دیں۔ "...... دے پتر' دونوں لاشیں ہماری طرف ڈال دی ہیں۔ خیر ایک کو میں نے مغلپورہ پر ڈال دیا ہے' مقتول کو۔ دوسرے کا لکھ دیا ہے کہ تیرتے ہوئے ڈوب گیا۔" پھر اس کی نظر مجھ پر گئی "یہ کون ہے؟"

"یہ خود کو نواب بتاتا ہے' وہ گاڑی اس کی تھی۔"

"یہ کون سی ریاست کا نواب ہے؟" اس نے مضحکہ خیز انداز میں میرا معائنہ کیا "پاگل پور کا یا خواب نگر کا؟" اس نے قہقہہ لگایا۔

دوسرے نے گالی دی "...... کہتا ہے آئی جی صاحب جانتے ہیں اسے۔"

"ضرور جانتے ہوں گے۔ شکل سے ہی اشتہاری لگتا ہے۔"

میں نے دھاڑ کے کہا "اپنی بکواس بند کرو...... اور نمبر ملاؤ آئی جی صاحب کا۔ وہ خود تمہیں دیں گے ہر سوال کا جواب۔ فون نمبر معلوم ہے یا میں بتاؤں؟" میں نے موبائل نکالا۔

ان دونوں کو سانپ سونگھ گیا۔ میں نے آئی جی عبداللہ جان کا نمبر ملایا۔ قسمت اچھی تھی کہ انہوں نے ریسیو بھی کر لیا۔ وہ کہیں مصروف ہوتے یا میٹنگ میں ہوتے تو مجھے مشکل پڑ جاتی۔

"عبداللہ صاحب......!" میں نے کہا۔

دوسری طرف سے ان کے کسی پی اے یا سیکریٹری نے پوچھا "آپ اپنا نام بتایئے۔"

میں نے کہا "نواب رفیق احمد شیرازی!"

چند سیکنڈ گزر گئے۔ پھر عبداللہ جان کی آواز آئی "بھئی نواب صاحب' خوب یاد کیا۔ کل ہی مجھے آپ کا خیال آیا تھا۔"

میں نے کہا "حضورِ والا' اب ڈر لگتا ہے آپ سے بات

کرتے ہوئے بھی۔ اتنے بڑے افسر ہو گئے ہیں۔"

اس نے کہا "آپ کی تو اب خبر بھی نہیں ملتی۔"

میں نے کہا "خبریں بہت مگر سب نچلی سطح تک محدود رہتی ہیں۔"

"کہیے' کیسے یاد فرمایا' آپ آئیں نا کسی روز......"

میں نے کہا "ضرور آؤں گا۔ فرصت کشاکشِ غمِ دوراں سے مل گئی۔"

میں نے جانتے بوجھتے اپنے موبائل کا اسپیکر آن رکھا تھا تاکہ کمرے میں موجود دونوں سب انسپکٹرز گفتگو کا ہر لفظ سن لیں۔ ان پر سکتہ سا طاری تھا اور وہ دم سادھے بیٹھے تھے۔

میں نے کہا "کل ایک حادثہ پیش آ گیا تھا میرے ساتھ۔"

"خیریت سے تو ہیں نا آپ؟"

"آپ کی دعاؤں کے طفیل...... لیکن اب رپورٹ لکھوانے یہاں گڑھی شاہو تھانے آیا ہوں تو کچھ پرابلم ہو رہی ہے۔ یہ اپنے تفتیشی افسر صاحب سوالات پر سوالات کر رہے ہیں۔ پتا نہیں کیا چاہتے ہیں' مجھے جلدی ہے گجرات پہنچنے کی۔"

"کون ہے تھانہ انچارج! میری بات کرائیں۔"

میں نے فون تفتیشی افسر کی طرف کھسکا دیا جس کی حالت اب ایسی ہو رہی تھی جیسے اس کے پیٹ میں بدہضمی سے مروڑ اٹھ رہے ہوں۔ ظاہر ہے ہکلا ہکلا کے وہ "لیس سر' سوری سر...... نہیں سر!" کے سوا کچھ بول ہی نہ سکا۔ جب فون بند ہوا تو اس نے اتنی گہری سانس لی جیسے دورانِ گفتگو اس کی سانس حلق میں اٹکی ہوئی تھی۔

ایسے لوگوں کی یقیناً کمی نہیں جو اپنے اعتماد یا اپنی شخصیت کی بنا پر بہت کچھ بنے پھرتے ہیں۔ جعلی فوجی افسر۔ ڈی ایس پی یا صحافی۔ آئے دن ان کے پکڑے جانے کی خبریں بھی اخبار کی زینت بنتی ہیں۔ غالباً مجھے بھی اس تھانے میں ایسا ہی کوئی اونچا اڑنے والا غبارہ سمجھا گیا جس کی حقیقت ظاہر ہوتے ہی اس کی ساری ہوا نکل جاتی ہے اور وہ محض ایک چیتھڑا رہ جاتا ہے۔

میں نے دونوں حواس باختہ افسران کی طرف دیکھا۔ "پھر اب کیا خیال ہے میں پاگل پور کا نواب ہوں میں اشتہاری نظر آتا ہوں۔"

"سر۔ ہم سے غلطی ہو گئی۔" ان دونوں کے منہ سے کورس کے انداز میں ایک ساتھ نکلا۔ انہوں نے جھینپ کر ایک دوسرے کو دیکھا اور ایک خاموش ہو گیا۔

دوسرے نے کہا۔ ”ہم غریب لوگ ہیں سر، آپ نے شکایت کر دی تو ہماری نوکری چلی جائے گی۔ آپ حکم کریں کیا رپورٹ لکھنی ہے؟“

میں نے سوچ کے کہا۔ ”اب اگر میں رپورٹ نہ لکھوانا چاہوں......؟“

انہوں نے ایک دوسرے سے نظروں ہی نظروں میں سوال کیا کہ بندہ نہ پاگل ہے نہ نشے میں۔ پھر معاملہ کیا ہے؟

میں نے کہا۔ ”میری گاڑی نہر میں گر گئی تھی میری غلطی سے، تم نے نکال لی۔ اب اسے میرے حوالے کردو۔ ذرا سروس وغیرہ کرا کے رکھنا۔ میں یا میرا کوئی ملازم لے جائے گا۔“

ڈیوٹی افسر نے رجسٹر بند کر دیا۔ ”جیسا حکم نواب صاحب۔“

میں نے کہا۔ ”تمہارے لیے ایک اور حکم ہے۔“

وہ پھر چوکنا ہو گیا۔ ”فرمایئے۔“

میں نے کہا۔ ”نہر سے دو لاشیں نکالی گئی ہیں۔ ایک کے سر میں گولی کا سوراخ ہے۔“

”لیس سر!“ ڈیوٹی افسر کی پریشانی بڑھ گئی۔

”وہ لاشیں کہاں ہیں؟ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”لاشیں۔ وہ تو میو اسپتال کے مردہ خانے میں رکھ دی گئی ہیں۔ پوسٹ مارٹم کے لیے۔“

میرے مزید احکامات جاری کرنے سے پہلے ہی غنی اپنی ڈبل کیبن پک اپ میں دندناتا ہوا تھانے میں داخل ہوا۔ ایک سیکیورٹی گارڈ اس کے ساتھ تھا۔ چار پیچھے سے کود کے اترے۔ تھانے میں کھلبلی مچ گئی کہ شاید تھانے پر کسی مسلح گروپ نے حملہ کر دیا ہے۔ پولیس والے اسلحہ اٹھا کے پوزیشن لینے لگے۔

میں نے ڈیوٹی افسر سے کہا۔ ”یہ میرے سیکیورٹی گارڈز ہیں۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔“

”نواب صاحب کدھر ہیں؟“ غنی نے دھاڑ کے کہا۔

میں نے ڈیوٹی افسر سے کہا۔ ”یہ میرا چیف سیکیورٹی افسر ہے، اسے اندر لے آؤ۔“

غنی نے اندر آ کے مجھے سیلوٹ مارا۔ ”آپ خیریت سے ہیں سر؟“

میں نے سر ہلایا۔ ”دیکھو غنی۔ باہر جو سرخ رنگ کی مہران کھڑی ہے۔ اس میں تھانیدار صاحب کے ساتھ میو اسپتال جاؤ۔ وہاں دو افراد کی لاشیں رکھی ہیں، ان کو نہر سے نکالا گیا ہے۔ ایک کے سر میں سوراخ ہے۔ دیکھو وہ کون ہیں۔ اگر پہچان نہ سکو تو ان کی تصویریں ساتھ لے آنا۔ شام تک میری گاڑی یہاں آ جائے گی۔ دیکھ لینا اس کی سروس ٹھیک ہوئی ہے یا نہیں۔ گاڑی نہر میں گر گئی تھی۔“

”وہ کیسے سر؟“ غنی نے کہا۔

میں نے دھاڑ کے کہا۔ ”فضول سوال کرنے کی ضرورت نہیں۔ جیسا میں نے کہا ہے ویسا کرو۔ اگر میں شام تک نہ آؤں تو گاڑی لے جانا۔“

تھانہ اس وقت میری کمان میں تھا کیونکہ آئی جی صاحب نے خود تھانے والوں کو سمجھا دیا تھا کہ انہیں میرے ساتھ کس طرح پیش آنا ہے۔ میری کسی بات پر نہ سوال کیا جا سکتا نہ اعتراض۔

”مجھے اب جانا ہے گجرات۔“ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ”یہاں کوئی تعاون نہ کرے تو مجھے بتانا۔“

”لیس سر!“ غنی نے کہا۔ ”آپ نے جو کام میرے سپرد کیا ہے وہ شیر خاں کر سکتا ہے۔ میں آپ کے ساتھ گجرات جاؤں گا۔“

میں نے سر ہلا کے منظوری دی اور ڈبل کیبن پک اپ میں پیچھے بیٹھ گیا۔ غنی پھر ڈرائیور کی جگہ آ گیا۔ اس کے ساتھ ایک گن مین تھا۔ باقی دو پیچھے کھلے حصے میں مستعد بیٹھے رہے۔ ایک گارڈ کو شیر خاں کے ساتھ بھی چھوڑ دیا گیا تھا۔ تھانے والوں نے آج ایک اصلی تے وڈا نواب دیکھا تھا جو براہِ راست آئی جی صاحب سے بھی بات کر سکتا تھا۔ ان کی پتلونیں ڈھیلی ہو رہی تھیں۔

جب میں گجرات کے ڈسٹرکٹ اسپتال پہنچا تو راجا بڑی بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا اور سخت خفا تھا۔ ”میں نے کہا تھا کہ فوراً آ جا۔ مگر تجھے چھٹی ہوئی تھی وہ بلا۔“

میں نے متانت سے کہا۔ ”میں تھانے سے آ رہا ہوں۔ غنی اس کا گواہ ہے۔ کل رات مجھ پر ایک قاتلانہ حملہ ہوا تھا جس میں قاتل مارے گئے۔“

راجا میرے ساتھ چل رہا تھا اور میں اس کے ساتھ۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ مجھے جانا کہاں ہے؟ اسپتال کے ایک برآمدے سے گزرتے ہوئے میں نے کم سے کم الفاظ میں گزشتہ رات کے واقعات کا خلاصہ پیش کر دیا۔ بظاہر بہت زیادہ متوجہ نہ ہونے کے باوجود وہ سر ہلاتا گیا۔

پھر کسی تبصرے کے بغیر اس نے کہا۔ ”یہاں بڑی گڑبڑ ہو گئی یار!“

میں نے کہا۔ ”کیا چودھری سلطان بقلم خود حاضر ہو گیا؟“

”کچھ ایسا ہی سمجھ لے۔ رات کو فاضل بھٹی کی پوری فیملی کو بڑی بے رحمی سے قتل کر دیا گیا۔“

میں رک گیا۔ ”ساری فیملی کو؟“

”ہاں، بچوں سمیت۔ ان کے سر کسی ہتھوڑے سے پاش پاش کر دیے گئے۔ یہاں اسے ہتھوڑا گروپ کی کارروائی قرار دیا گیا ہے۔ یہ ہتھوڑا گروپ کچھ عرصے سے خبروں میں ہے۔“

”اس کا مجھے علم ہے۔“

راجا نے کہا۔ ”یہ ہتھوڑا گروپ کے نام پر کسی اور کی کارروائی ہے جو نہیں چاہتے تھے کہ آج عدالت کے سامنے مدعی فاضل بھٹی اور اس کی بیوی پھر یہ بیان دیں کہ مرنے والا چودھری سلطان نہیں ہے۔ اوپر سے دباؤ ہے کہ اس ڈھانچے کو جو ست بدھائی سے برآمد ہوا تھا ہر صورت میں چودھری سلطان ثابت کیا جائے۔“ راجا ایک برآمدے کے آخر میں رک گیا۔

”دباؤ رانا صاحب کی لابی کا ہے۔“

”ظاہر ہے۔ فاضل بھٹی اور اس کے بچے تو فوراً مر گئے تھے۔ صنوبر یعنی چودھری سلطان کی بہن نہ جانے کیسے زندہ رہی۔“

”اب وہ کہاں ہے؟“

”صنوبر آئی سی یو میں ہے۔ باقی سب کی لاشیں مردہ خانے میں ہوں گی۔“

”واردات کی اطلاع کیسے ملی۔ کس نے دی؟“

”یار، اب میں کیا بتاؤں۔ ایسی باتوں پر یقین کون کرتا ہے مگر میرے دل میں ایک خلش سی تھی کہ کہیں ہم سے کوتاہی ہو گئی۔ رات دو بجے تک میں چند صحافیوں کے ساتھ تھا۔ کھانے کے بعد ہم گپ لگاتے رہے۔ پھر میں چلا گیا ہوٹل۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اب تجھ سے کیا پردہ۔ اتنے عرصے بعد میں نے کچھ پی لی تھی، سب کے ساتھ۔ پھر بھی میں مدہوش نہیں تھا۔ میں نے سوچا کافی پی لوں۔ ہوٹل کا کچن بند تھا۔ رات کی ڈیوٹی پر مامور کلرک نے بتایا کہ اس وقت کافی کہاں مل سکتی ہے۔ میں گاڑی لے کر نکل کھڑا ہوا۔ سچ تو یہ ہے یار، مسئلہ نشے کا تھا اور نہ کافی کی طلب کا۔ کوئی اور پریشانی تھی جو میں سمجھ نہیں سکا۔ راستے میں اچانک کسی وجہ کے بغیر مجھے فاضل بھٹی کا خیال آیا...... کہ میں اسے دیکھ لوں۔ وہ خیریت سے ہے یا نہیں۔ میں بالکل نہیں جانتا کہ میں نے ایسا کیوں سوچا۔ لیکن اس کے بعد میں جا پہنچا فاضل بھٹی کے گھر۔ اس وقت بجے ہوں گے رات کے ساڑھے تین۔

بظاہر سب ٹھیک تھا اور میں اس کے گھر کے سامنے سے گزر جاتا اگر مجھے اس کے گھر کا دروازہ کھلا نظر نہ آتا۔ یہ رات کو دروازے کھول کے سونے کا زمانہ نہیں ہے؟ اور پھر فاضل بھٹی، جو پہلے ہی ڈرا ہوا تھا۔ بس میں نے ایک دم بریک لگائے اور اندر چلا گیا۔ پہلے تو میں سمجھا سب مرے پڑے ہیں۔ وہ اتنا بھیانک منظر تھا۔ خود فاضل بھٹی دروازے کے پاس الٹا پڑا تھا، آگے بچے تھے۔ سب کے سر بڑی بے رحمی سے پاش پاش کیے گئے تھے۔ کمرے میں خون ہی خون تھا جو جم چکا تھا۔ اس کی بُو نے میرا حال خراب کر دیا۔ مجھے متلی ہوئی اور پھر چکر آیا۔ میں بھاگ کے باہر آیا اور فرش پر گر گیا۔ صحن کے کچے فرش پر الٹا پڑا رہا۔ پھر ہمت کر کے اٹھا اور خود کو سنبھالا۔ پانی پیا اور منہ پر پانی ڈالا۔ اس وقت مجھے صنوبر کے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ میں پھر اندر گیا۔ وہ چارپائی کے نیچے تھی۔ اس نے کراہتے ہوئے بڑی مشکل سے کہا۔ ”ہائے، ظالموں نے سب کو مار دیا۔“ میں نے پوچھا کہ کس نے مگر وہ کچھ نہ بتا سکی۔ میں نے اسی وقت تھانے فون کیا اور اسپتال سے ایمبولینس منگوائی۔ میں نے بتا دیا کہ میں کون ہوں اور اگر کسی نے سستی دکھائی تو میں صبح ہونے سے پہلے چیف منسٹر کو بتا دوں گا۔ ظاہر ہے اس کے بعد سب بھاگے ہوئے آئے۔“

”اب اس کا کیا حال ہے، صنوبر کا؟“

”اس کے بچنے کا تو سوال ہی نہیں۔ ڈاکٹر کوشش کر رہے ہیں کہ ایک بار وہ ہوش میں آ جائے۔ میں نے ایک مجسٹریٹ کو بلا لیا ہے، ایک ڈی ایس پی کو۔ اگر وہ مرنے سے پہلے کوئی بیان دے سکی۔“

”یہ کام کس نے کیا مہاراجا؟“

”خود پولیس نے اور کس نے۔ اب تو دیکھ لینا۔ کورٹ میں جو رپورٹ پیش ہو گی اس میں یہی ہو گا کہ مقتول کی بہن نے چودھری سلطان کو شناخت کر لیا تھا، گواہوں کی موجودگی میں۔ عدالت میں بیان کی نوبت ہی نہیں آئی۔“

میرا دل رنج سے بوجھل تھا۔ طاقتور لڑتے ہیں، کمزور

مرتے ہیں۔ بے جرم ضعفی کی سزا مرگ مفاجات۔ یہ بے مایہ حقیر اور فقیر جن کی اوقات حشرات الارض جیسی ہے ضائع ہونے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ ان کا خوں بہا کوئی طلب نہیں کرتا۔ ان کے قاتل اپنے لہو آلودہ ہاتھوں کے ساتھ انصاف کرنے والوں کے سامنے خندہ زن رہتے ہیں اور سب کی بے بسی کا مذاق اڑاتے رہتے ہیں۔

اچانک آئی سی یو کا دروازہ کھلا اور ایک نرس نے سر نکال کے پوچھا۔ ''راجا صاحب! بیڈ نمبر تیرہ کی مریضہ ہوش میں آگئی ہے لیکن ڈاکٹرز کا کہنا ہے کہ اس کے پاس چند منٹ ہیں۔''

''کیا میں اس سے مل سکتا ہوں؟'' راجا نے کہا۔

''وہ کسی نواب رفیق کو بلا رہی ہے۔''

''نواب رفیق میں ہوں۔'' میں تیزی سے آگے بڑھا۔

نرس مجھے دونوں جانب لگے ہوئے بیڈز کی قطار سے گزار کے آگے لے گئی۔ ہر بیڈ پر زندگی اور موت کی کشمکش جاری تھی۔ بے ہوش مریضوں کے سرہانے لگے ہوئے روشن حروف اور متحرک لکیروں والے مانیٹرز ان کے اندر کی حالت کو ظاہر کررہے تھے۔ دل کی دھڑکن' بلڈ پریشر' نبض کی رفتار۔ امید و ناامیدی کا پلڑا کبھی ایک طرف جھک جاتا تھا تو کبھی دوسری طرف۔

صنوبر آخر سے پہلے والے بیڈ پر تھی۔ اس کے ہاتھوں میں خون اور گلوکوز کی ٹیوبوں کو شریانوں میں اتار دیا گیا تھا۔ بے اختیار میری نظر مانیٹر پر گئی۔ دل کی دھڑکن بے ترتیب تھی مگر میں اوپر نیچے ہوتی لکیروں سے کچھ اندازہ نہیں کرسکتا تھا۔ اس کا بلڈ پریشر خطرناک حد تک کم تھا اور نبض کی رفتار کم ہوتی جارہی تھی۔

میں اس کے قریب گیا تو اس کی آنکھیں میری طرف گھوم گئیں۔

میں نے کہا ''صنوبر! میں نواب رفیق ہوں۔''

اس کے لب ہلے۔ میں نے کان لگا کے سنا ''نواب صاحب!...... آپ آگئے...... ایک امانت تھی۔''

میں نے کہا ''کیسی امانت؟''

اس نے ایک چھوٹا سا بٹوا تکیے کے نیچے سے نکالا۔

''یہ...... آپ لے جائیں...... ہمیں ضرورت نہیں رہی۔''

کچھ فاصلے پر بیٹھے ہوئے مجسٹریٹ اور ڈی ایس پی میری طرف متوجہ ہوگئے ''یہ کیا ہے؟''

میں نے انہیں جواب دینا ضروری نہیں سمجھا ''صنوبر! مجھے بہت افسوس ہے' یہ سب میری وجہ سے ہوا۔''

''نواب...... صاحب...... ایک بات......''

میں نے پھر اپنے کان نیچے کیے تاکہ اس کے الفاظ میری سمجھ میں آسکیں۔ وہ سرگوشی بھی بڑی مشکل سے کررہی تھی۔ اس کی سانس اکھڑ رہی تھی۔

''وہ...... وہ...... سلطان نہیں تھا...... خدا گواہ ہے۔''

یہ اس کے آخری الفاظ تھے۔ یکلخت اس کی گردن ڈھلک گئی۔ دل کی دھڑکن بتانے والے مانیٹر پر لہریں بناتی روشن لکیر ایک دم سیدھی ہوگئی۔ بیپ کی آواز ایک مسلسل سیٹی میں بدل گئی۔ ڈاکٹر دوڑے' نرسوں نے انجکشن لگائے اور مردے کو زندہ کرنے کی آخری کوشش کے تمام مرحلے پورے کیے۔ پھر اپنی کوشش ترک کرکے لاش کو چادر سے ڈھک دیا۔

باہر آکے میں ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ ''راجا...... وہ زندہ ہے۔''

''صنوبر زندہ ہے؟''

''صنوبر نہیں' چودھری سلطان۔ اس کی بہن نے یہی بتانے کے لیے مجھے بلایا تھا۔ اسی سچ کے اظہار کے لیے اپنی آخری سانسوں کو روکا ہوا تھا۔''

''مگر کل...... کل اس نے کہا تھا......''

''وہ جھوٹ اس سے ہم نے بلوایا تھا۔'' میں نے مٹھی میں دبا ہوا چھوٹا سا بٹوا راجا کی طرف بڑھا دیا۔

راجا نے بٹوا کھولا۔ اس میں دو کاغذ کے ٹکڑے تھے۔ خون میں رنگے ہوئے۔ دس دس لاکھ کے دو چیک جو ہم نے فاضل بھٹی کو اور اس کی بیوی کو دیے تھے۔

آخری وقت میں خدا کو گواہ بنا کے صنوبر نے سچ بول دیا تھا۔ وہ چودھری سلطان کی لاش نہیں تھی۔ یقیناً بہن نے کسی نشانی سے پہچان کے تصدیق کی ہوگی۔

اچانک میرے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے کہا ''ہیلو۔'' تو کوئی دوسری طرف سے ہنسنے لگا۔

پہلے تو میں نے بے خیالی میں پوچھ لیا۔ ''کون ہو تم؟'' مگر وہ شخص اسی طرح ہنستا چلا گیا۔ اس کی ہنسی واضح طور پر تمسخر اڑانے والی اور مصنوعی تھی۔

میرے ہاتھ میں انسانی خون میں رنگے ہوئے کاغذ کے وہ دو ٹکڑے تھے جو دس دس لاکھ کے چیک تھے لیکن ضائع ہوگئے تھے اور کسی کے بھی کام نہ آسکے تھے۔ میرے ذہن پر فاضل بھٹی کی فیملی کے سفاکانہ قتل کا بہت گہرا صدمہ تھا۔ اور ایسے میں کسی نے بڑی ٹائمنگ کے ساتھ مجھے فون

کیا تھا۔ محض میری جدوجہد کی ناکامی پر ہنسنے کے لیے۔ قانون کی بے چارگی کا مذاق اڑانے کے لیے اور مجھے احساس دلانے کے لیے کہ وڈے نواب صاحب۔ تم کچھ بھی کرلو۔ سفارشیں لڑالو، پیسا لٹاؤ، چالاکی کرو، ہوگا وہی جو ہم چاہیں گے۔

میں نے بہت غور کیا کہ ایسی مصنوعی ہنسی کے پیچھے کون ہوسکتا ہے۔ کنکھیوں سے میں نے اپنے آس پاس بھی نظر دوڑائی' لیکن وہاں کم سے کم ایک درجن افراد مختلف مقامات پر موبائل فون کان سے لگائے کھڑے تھے اور مجھے یوں ہنستا ہوا کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ یہ ایسی جگہ تھی جہاں آنسو بہانے والے تو بہت ہوتے تھے کسی پر ہنسنے والا کوئی دیوانہ ہی ہوسکتا تھا۔

میں نے نمبر دیکھا اور فون بند کردیا۔ نمبر میرے لیے اجنبی تھا۔ ٹیلی کمیونیکیشن کے جدید نظام میں نمبر سے کال کرنے والے کا سراغ لگانا ممکن تھا لیکن یہ ایک طویل پے چیدہ اور لاحاصل عمل تھا۔ آخر میں پتا چلتا تھا کہ کسی نے بوگس نام سے سم خرید کے استعمال کی تھی۔

راجا نے پوچھا۔ ''کس کا فون تھا؟''

''ہتھوڑا گروپ کا۔'' میں نے کہا۔ ''کسی ایسے شخص کا جس نے کیس کو سچ کی طرف نہیں جانے دیا۔ قانون کا راستہ روک دیا۔''

''نام نہیں بتایا اس نے اپنا؟''

''وہ صرف مجھ پر اور میری بے بسی پر ہنستا رہا۔ اب مجھے افسوس ہورہا ہے۔ میں یہ تو کہہ سکتا تھا کہ سور کے بچے! ابھی کھیل ختم نہیں ہوا۔ دیکھتے ہیں آخر میں کون کس پر ہنستا ہے۔''

اندر سے ڈی ایس پی اور مجسٹریٹ بڑے فاتحانہ انداز میں مسکراتے ہوئے برآمد ہوئے۔ ''بڑا افسوس ہوا جی۔ پوری فیملی کو ختم کردیا۔'' ڈی ایس پی نے منافقت سے کہا۔

میں نے کہا۔ ''آپ کی کوئی رشتے داری تھی مرنے والوں سے؟''

وہ کچھ خفا اور حیران ہوا۔ ''نہیں جی۔''

میں نے کہا۔ ''پھر آپ کو کس بات کا افسوس ہورہا ہے۔ آپ تو ہر روز یہ تماشا دیکھتے ہوں گے۔''

مجسٹریٹ نے فوراً بات بدل دی۔ ''چلو جی' مرنے سے پہلے اس نے بیان تو دے ہی دیا۔''

میں نے کہا۔ ''کس نے بیان دیا؟ اس عورت نے؟''

''ہاں جی۔ میں اسی لیے فوراً پہنچ گیا تھا کہ عدالت میں پیش کرنے کے لیے اس کا بیان لے لوں' اگر وہ دے سکے۔ وہ شناخت کی واحد گواہ تھی۔''

راجا نے تلخی سے کہا۔ ''اس نے بیان دے دیا آپ کی مرضی کے مطابق۔''

مجسٹریٹ نے راجا کو گھورا۔ ''میری مرضی؟ اس نے جو کہا وہ میں نے لکھ لیا۔ کیا یہاں میں اس پر تشدد کرسکتا تھا؟''

''کب لیا آپ نے بیان؟'' راجا بگڑ گیا۔ ''میں کہاں تھا؟''

''میں کیا بتاؤں آپ کدھر تھے۔ ڈاکٹر موجود تھا۔ اس نے کہا کہ تھوڑا سا وقت ہے۔ آپ چاہیں تو بیان لے لیں۔ ڈاکٹر گواہ ہے۔ اس نے ڈاکٹر کے سامنے بیان پر انگوٹھا لگایا تھا۔''

ڈی ایس پی نے کہا۔ ''نزاعی بیان کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ عدالت اسے سچ مانتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اور سچ آپ کے نزدیک یہ ہے کہ وہ لاش چودھری سلطان کی ہے۔ اس کی بہن نے شناخت کی مگر میں اسے تسلیم نہیں کرتا۔''

مجسٹریٹ مسکرا کے چل پڑا۔ ''آپ کی جیسی مرضی۔''

''لیکن میں پوسٹ مارٹم رپورٹ کو چیلنج کروں گا۔'' میں نے برہمی سے کہا۔

''یہ بھی آپ کی مرضی۔'' ڈی ایس پی نے مجسٹریٹ کے الفاظ دہرائے اور چند قدم چل کے رک گیا۔ ''نواب صاحب۔ اس نے آپ کو کیا دیا تھا؟''

''کس نے؟''

''متوفی صنوبر زوجہ افضال نے۔''

''کچھ نہیں۔ دینے کے لیے اس کے پاس جان کے سوا کیا تھا اور وہ اس نے خدا کو دی۔''

''کوئی چھوٹی سی ڈبیا تھی۔''

میں نے بھنا کے کہا۔ ''ہاں۔ اس میں کوہ نور ہیرا تھا جو میں نے نگل لیا۔ تم برآمد کرسکتے ہو تو کر کے دکھاؤ۔''

ظاہر ہے اس جواب کے بعد وہ غصے میں سائلنسر سے دھواں چھوڑتے روانہ ہوگئے۔ اگر میں عام آدمی ہوتا تو وہ بیچ اپنا آہنی ہاتھ ڈال کے وہ ہیرا برآمد کرلیتے۔ ان کا آہنی ہاتھ یا مالِ مسروقہ کبھی برآمد نہیں کرتا۔ قانونی کارروائی پوری ہوگئی تھی اور عدالت کے پاس اس کو مسترد کرنے کا کوئی جواز نہ تھا۔ ہمیشہ کی طرح سچ کو بھی قتل کردیا گیا تھا۔

سیشن کورٹ میں ہم انصاف کا ڈراما نہیں فریال کو دیکھنے گئے جسے وہاں پیشی کے لیے جیل سے لایا گیا تھا۔ وہ گزشتہ روز کی طرح بدحال تو نہیں تھی لیکن کچھ تھکی تھکی اور افسردہ نظر آتی تھی۔ پولیس نے انعام کی امید میں اس کے ساتھ یہ رعایت برتی تھی کہ اسے ہتھکڑیاں نہیں لگائی تھیں۔ یہ ثابت ہونے سے کہ مرنے والا چودھری سلطان ہی تھا فریال

کی رہائی کی ساری امیدیں دم توڑ گئی تھیں۔ کیا جھوٹ ہے اور کیا سچ ہے۔ اس کا فیصلہ جج تو ثبوت دیکھ کر ہی کر سکتا ہے۔

جب چودھری سلطان کے قتل کا مقدمہ پیش ہوا تو مجرموں کے کٹہرے میں کھڑی فریال صورت سے برسوں کی بیمار لگ رہی تھی۔ آج بھی عدالت میں فلمی دنیا کی اہم شخصیات موجود تھیں۔ وہ سب فریال کی ضمانت پر رہائی چاہتے تھے۔ اس لیے نہیں کہ انہیں فریال کی بے گناہی کا یقین تھا۔ انہیں اپنے پیسے کی فکر تھی جو فلموں میں لگا ہوا تھا۔ فریال رہا نہیں ہوگی تو شوٹنگ رک جائے گی۔ ان کا سرمایہ ڈوب جائے گا۔ ظاہر ہے اس فلمی خبر کی کوریج کے لیے چند فلمی صحافی بھی بہت سرگرم نظر آ رہے تھے۔

ہماری توقعات کے عین مطابق استغاثہ نے پوسٹ مارٹم رپورٹ پیش کر کے ثابت کیا کہ وہ لاش چودھری سلطان کی تھی اور مرحوم کی واحد خونی رشتے دار ان کی بہن نے گزشتہ روز چند اہم شواہد کی مدد سے اپنے بھائی کو ڈاکٹر کے سامنے شناخت کر لیا تھا۔

حامد خان اٹھ کھڑا ہوا۔ ''جب تک صنوبر زوجہ افضل بھٹی اس عدالت کے روبرو اپنا بیان ریکارڈ نہیں کراتی پولیس کے حاصل کردہ بیان کی کوئی اہمیت نہیں۔''

گواہ کو گزشتہ رات اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ ہتھوڑا گروپ نے قتل کر دیا۔''

''اس لیے کہ اس عورت نے پولیس کی مرضی کے مطابق بیان دینے سے انکار کر دیا تھا۔'' حامد خان نے کہا۔

سرکاری وکیل نے اس کا جواب دیا۔ ''ایسے واقعات ان دنوں پنجاب کے مختلف اضلاع میں اور لاہور میں پیش آ رہے ہیں۔ اس کے علاوہ صنوبر زوجہ فاضل بھٹی نے مرنے سے پہلے مجسٹریٹ، ایک پولیس افسر اور ایک ڈاکٹر کی موجودگی میں اپنا بیان ریکارڈ کرایا تھا اور گواہوں کی موجودگی میں اس پر اپنے انگوٹھے کا نشان بھی ثبت کیا تھا۔''

جج نے کہا۔ ''حامد خان۔ عدالت نزع کی کیفیت میں دیے گئے بیان کی صداقت پر شبہ نہیں کر سکتی۔''

حامد خان نے کہا۔ ''کیا مرحومہ کا فنگر پرنٹ پہلے پولیس یا عدالت کے ریکارڈ پر تھا؟ جس سے موازنہ کر کے ثابت کیا جا سکے کہ یہ صنوبر زوجہ فاضل بھٹی کے انگوٹھے کا نشان ہے؟''

جج کے یا وکیل استغاثہ کے بولنے سے پہلے ایک شخص اٹھ کھڑا ہوا۔ ''جناب والا میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔''

وہ چالیس بیالیس سال کا دبلا پتلا باریش شخص تھا جس نے اسپتال کے پیرامیڈیکل اسٹاف کی یونیفارم پہن رکھی تھی۔

''تم کون ہو؟''

''سر میرا نام جلال الدین ہے۔ میں ڈسٹرکٹ اسپتال میں کام کرتا ہوں اور آپریشن تھیٹر اٹینڈنٹ ہوں۔ جو کچھ میں بتانا چاہتا ہوں اس کا براہِ راست اس کیس سے تعلق ہے۔ مجھے اپنا بیان ریکارڈ کرانے کی اجازت دی جائے۔''

جج نے اسے گواہوں کے کٹہرے میں بلا لیا۔ حلف اٹھانے کے بعد اس نے چند رسمی قسم کے سوالات کے جوابات بڑے سکون اور اطمینان سے دیے۔ پھر اس نے کہا۔ ''جناب والا! ابھی مرحومہ صنوبر زوجہ فاضل بھٹی کا جو بیان عدالت میں پیش کیا گیا وہ جھوٹا اور جعلی تھا۔''

عدالت میں ایک دم شور مچ گیا۔ دونوں وکیل ایک ساتھ کھڑے ہو گئے۔ حامد خان کا مخالف سرکاری وکیل چاہتا تھا کہ گواہ کو عدالت کا وقت برباد کرنے سے روکا جائے کیونکہ اس کیس میں حاصل کردہ بیان کے گواہ معتبر اور قانونی ہیں۔

حامد خان نے شور مچایا کہ اس طرح سچ کو دبایا جا رہا ہے اور ایک چشم دید گواہ کو اپنے ضمیر کے مطابق حقائق بیان نہیں کرنے دیے گئے تو یہ ناانصافی ہوگی اور اندیشہ یہی ہے کہ آج رات ہتھوڑا گروپ کے نام پر اسے بھی مار دیا جائے۔

جج نے بڑی مشکل سے صورتِ حال کو کنٹرول کیا اور جلال الدین کو اپنا بیان جاری رکھنے کی اجازت دی۔ اس نے کہا۔ ''جناب والا۔ اب تو یہ شیوہ بن گیا ہے کہ اپنے عقیدے پر راسخ رہنے والا سب کی آنکھوں میں کھٹکتا ہے اس کو تنگ نظر متعصب ملا بنا دیا جاتا ہے۔ اس کے حلیے کا مذاق اڑایا جاتا ہے اور اسے فاتر العقل قرار دینے کی کوشش کی جاتی ہے۔ آخر کیوں؟ صرف اس لیے کہ وہ حرام کھانے والوں اور غلط کام کرنے والوں کو روکتا ہے۔''

جج نے اسے ٹوکا۔ ''مسٹر جلال۔ اپنے بیان کو واقعات تک محدود رکھیں۔ وہی بتائیں جو آپ نے دیکھا اور سنا۔''

''میں وہی بتاؤں گا جناب والا لیکن سب سے پہلے یہ بتانا ضروری تھا کہ مجھے کس لیے فاتر العقل قرار دینے کی بات ہو رہی ہے۔ عدالت اگر چاہے تو میرے بارے میں کسی ماہرِ نفسیات سے رائے طلب کر سکتی ہے۔ میں نے عدالت میں پیش کیے گئے بیان کو اس لیے جھوٹا کہا کہ جھوٹا ہے۔ یہ بیان مرحومہ نے اپنے ہاتھ سے نہیں لکھا۔ یہ مجسٹریٹ صاحب نے تحریر کیا۔''

''ظاہر ہے مجسٹریٹ وہاں اسی لیے موجود تھا۔ وہ عورت نزع کے عالم میں خود اپنا بیان کیسے لکھتی؟'' استغاثہ

کے وکیل نے کہا۔

''بالکل صحیح کہا آپ نے وکیل صاحب لیکن یہ صحیح نہیں ہے کہ بیان مرحومہ کا تھا۔ یہ اس کی موت کے بعد لکھا گیا اور آپ نے اس پر لاش کے انگوٹھے کا نشان خود لگایا۔''

''یہ جھوٹ ہے۔'' وکیلِ استغاثہ نے شور کیا۔

جج نے اسے روک دیا۔ ''مسٹر جلال الدین آپ اپنا بیان جاری رکھیں۔''

''میں اس وقت آئی سی یو میں تھا۔ میری ڈیوٹی وہاں نہیں تھی۔ میں ایک ڈاکٹر کو اطلاع دینے گیا تھا کہ ایک اپینڈکس کا مریض جس کا فوری آپریشن ہونا تھا۔ آپریشن ٹیبل پر آنت کے پھٹنے سے مر گیا ہے۔ کیونکہ ڈاکٹر صاحب اپنی ڈیوٹی کرنے کے بجائے آئی سی یو میں پولیس کی مدد کر رہے تھے۔''

''یہ سراسر جھوٹ ہے۔'' ایک شخص اٹھ کھڑا ہوا۔ ''مجھ پر الزام ہے۔ میں وہاں ایک مریض کے بارے میں معلوم کرنے گیا تھا۔ میری ڈیوٹی آئی سی یو میں نہیں تھی۔''

''یہی تو میں کہہ رہا ہوں جناب والا۔ یہ آپریشن چھوڑ کے وہاں کیوں گئے تھے۔ آپریشن تھیٹر کا سارا اسٹاف گواہ ہے کہ وہ ایک گھنٹا ان کے انتظار میں بھی کھڑے رہے اور اس دوران مریض مر گیا۔ مرحومہ صنوبر زوجہ فاضل بھٹی کا بیان آئی سی یو میں ڈیوٹی دینے والے کسی ڈاکٹر کے سامنے کیوں نہیں لیا گیا؟ اس کے لیے آپریشن تھیٹر کے ایک ڈاکٹر کو کیوں طلب کیا گیا۔ اس لیے جناب والا کہ آئی سی یو میں ڈاکٹر بہت مصروف ہوتے ہیں اور ان سب نے پولیس کے ساتھ اس سازش میں شریک ہونے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ ہر انسان کا ضمیر مردہ نہیں ہوتا جناب والا۔ ان ڈاکٹروں کے لیے کسی قریب المرگ شخص سے جھوٹا بیان منسوب کرنا ممکن نہیں تھا۔ ان کا ضمیر پیسے سے نہیں خریدا جا سکتا تھا۔''

عدالت میں اب سکوت طاری تھا۔ جلال الدین بولتا رہا۔ ''جناب والا۔ میرے بیان کی تائید اسپتال کے ریکارڈ سے کی جا سکتی ہے۔ آپریشن تھیٹر کا اسٹاف انکار نہیں کر سکتا کہ سرجن کے نہ آنے سے اپنڈکس کے اس مریض کی جان آپریشن ٹیبل پر ضائع ہو گئی۔ یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ ایک ڈاکٹر بیک وقت آپریشن تھیٹر اور آئی سی یو میں کیسے ڈیوٹی پر ہو سکتا ہے۔ صنوبر زوجہ فاضل بھٹی کی موت آئی سی یو میں ہوئی تھی۔''

جج نے سوال کیا۔ ''آخر تم کیا ثابت کرنا چاہتے ہو؟ کیا وہ لاش چودھری سلطان کی نہیں تھی؟''
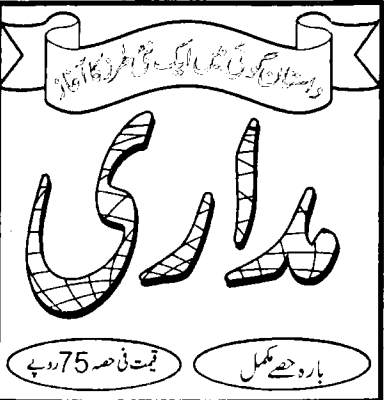
''نہیں جناب والا۔ ایک دن پہلے صنوبر زوجہ فاضل بھٹی نے جو متوفی سلطان احمد کی بہن تھی اسے اپنا بھائی ماننے سے انکار کر دیا تھا۔''

''کیا تم وہاں بھی موجود تھے؟'' وکیل استغاثہ نے کہا۔

''جیسا کہ میں نے ابتدا میں بتایا جناب والا۔ میرا تعلق ایک دینی جماعت سے ہے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں جو چند روپوں کی خاطر اپنا ایمان بیچ دیتے ہیں۔ میرا کامل اعتقاد ہے کہ مجھے اپنے ہر قول و فعل کی جواب دہی میدان حشر میں اس رب العزت کے سامنے کرنی ہے جس کے قبضے میں میری جان ہے۔ میرا ایک برادرِ نسبتی مردہ خانے میں ہے۔ اسے میں نے ہی ایک خالی اسامی پر وہاں رکھوایا تھا۔''

''کیا وہ بھی تمہاری تقلید میں دینی جماعت کا رکن ہے؟'' وکیلِ استغاثہ نے ازراہِ تفنن سوال کیا۔

''میری تقلید میں نہیں جناب۔ اپنی تہم ورضا سے۔ وہ ایک پابند شرع اور دیندار شخص ہے۔ مردہ خانے میں کام کرنے کی تنخواہ میں گزارا کرتا ہے اور اس کے بعد ثواب کے لیے بلا معاوضہ غسل میت اور کفن دوزی کرتا ہے۔ اس نے خود چودھری سلطان کی بہن صنوبر زوجہ فاضل بھٹی کا بیان سنا تھا۔ اس نے لاش کو دیکھنے کے بعد تسلیم نہیں کیا تھا کہ وہ اس کا بھائی ہے۔''

''کیا وہ پوسٹ مارٹم کرنے والے ڈاکٹروں سے زیادہ قابل ہے؟''

''اسے شناخت کے لیے بلایا گیا تھا۔ ایک اس کی انگلی میں وہ انگوٹھی پھنسی ہوئی تھی جو اسے پہلی شادی پر منگنی کے وقت اس کے چچا نے پہنائی تھی۔ اس پر اردو کے دو حرف کندہ تھے۔ س اور ش۔ اس کے چچا کی امی کا نام شازیہ تھا۔ انہیں سین اور شین کی جوڑی کہا جاتا تھا۔ یہ سب صنوبر نے کہا اور میں نے بھی سنا۔''

''انگوٹھی گر گئی ہوگی یا کسی نے اتار لی ہوگی۔'' جج نے کہا۔

''نہیں جناب والا۔ یہی تو ساری بات ہے۔ اس انگلی میں چاندی کی ایک انگوٹھی پھنسی ہوئی تھی جس پر انگریزی حرف زیڈ یا این لکھا ہوا تھا۔ سیدھا پڑھیں تو زیڈ۔ دوسری طرف سے دیکھا جائے تو این۔ پھر اس کے بائیں پاؤں میں ایک کڑا تھا۔ چاندی کا کڑا جو سلطان کی ماں نے منت کے طور پر باندھا تھا۔ منت اس نے شاہ دولہ کے مزار پر یہ مانی تھی کہ بیٹا ہوگا تو وہ اسے شاہ دولہ کو دے دے گی لیکن بعد میں اس کی نیت خراب ہوگئی اور اس نے بیٹا دینے سے انکار کر دیا۔ اس کا شوہر اور ساس سسر بہت ناراض ہوئے اور اسے بہت ڈرایا کہ وہ سب عذاب کا شکار ہوں گے مگر وہ نہ مانی۔

''یہ سب تمہارے برادرِ نسبتی نے سنا جو تم بتا رہے ہو۔ وہ خود کہاں ہے؟''

''وہ بھی عدالت میں موجود ہے جناب والا۔''

جج نے برہمی سے کہا۔ ''اسے گواہوں کے کٹہرے میں لایا جائے۔''

پچھلی صفوں سے اٹھ کے ایک اور باریش مگر زیادہ عمر کا آدمی حاضر ہوگیا۔ اس نے اپنا نام مولوی شبیر حسین بتایا۔ اس نے پہلے گواہ کی ساری گفتگو من وعن دہرائی اور کہا کہ مردہ خانے میں دو نامعلوم افراد نے اس عورت سے جھگڑا بھی کیا تھا کہ وہ غلط بیانی کر رہی ہے۔ اس پر صنوبر رونے لگی کہ میں کیسے اس شخص کو اپنا بھائی مان لوں جسے میں جانتی نہیں۔ میرا بھائی مجھ سے خفا ہے لیکن زندہ ہوگا۔ اللہ اسے لمبی عمر دے۔ چاندی کا وہ کڑا اس کے پاؤں میں تمام عمر رہا۔ وہ پہلے ڈھیلا تھا۔ پھر بالکل نچلے حصے کے برابر آ گیا تھا۔ اسے کاٹے بنا اتارا نہیں جا سکتا تھا لیکن ماں نے کہا تھا کہ یہ غلطی کبھی نہ کرنا۔ شاہ دولہ کے مزار پر کسی نے اس سے کہا تھا کہ منت پوری نہیں کرے گی تو اسے کفارہ ادا کرنا ہوگا۔ اس نے سوا سیر چاندی اور ساڑھے سات تولہ سونا چڑھانے کے علاوہ پیر سائیں کا دیا ہوا یہ کڑا ابھی تمام عمر کے لیے پہنانے کا وعدہ کیا تھا۔ سلطان خود بھی ماں کے اس وعدے پر قائم رہا مگر اس لاش کے پیر میں کوئی کڑا نہیں ہے۔''

جج نے کہا۔ ''وہ دونوں نامعلوم افراد کون تھے اور مردہ خانے میں کیا کر رہے تھے؟''

مولوی شبیر نے کہا۔ ''جب میں نے ان سے پوچھا کہ وہ کون ہیں تو وہ باہر نکل گئے لیکن جاتے جاتے انہوں نے صنوبر زوجہ فاضل بھٹی کو گالیاں اور دھمکیاں دی تھیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ تجھ سے تو ہم نمٹ لیں گے گشتی۔''

جج نے کہا۔ ''تم انہیں پھر دیکھو گے تو پہچان لو گے؟''

''بالکل جناب۔''

ان دو مولویوں کے بیان نے کیس کا نقشہ بدل دیا۔ حامد خان نے استغاثہ کے سارے دعووں کے پرخچے اڑا دیے۔ اس نے کہا کہ واحد چشم دید گواہ کو عدالت میں بیان دینے سے پہلے ہی قتل کر دیا گیا ہے اور واردات کو ہتھوڑا گروپ سے منسوب کر کے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ چودھری سلطان کا قتل ثابت ہی نہیں ہوتا۔ وہ صرف لاپتا ہے اور میری

موکلہ کے خلاف دباؤ کے تحت لکھوائی جانے والی ایف آئی آر جھوٹی ہے۔ اس کو ضمانت پر رہا کیا جائے ورنہ ہم عدالتِ عالیہ کا دروازہ کھٹکھٹائیں گے۔''

صورتِ حال میں اس ڈرامائی تبدیلی سے مجھے بہت اطمینان حاصل ہوا۔ فریال کی ضمانت دینے والے بہت تھے۔ اس کے لیے مجھے متفکر ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ فریال پر اب قتل کا الزام ہی نہیں رہا تھا۔ عدالت نے اس کی دس لاکھ کی ضمانت منظور کر لی جو ایک پروڈیوسر نے جمع کرا دی۔

عدالت کے باہر کافی لوگ جمع تھے۔ وہ سب شوبزنس کے لوگ تھے۔ کارکن، ساتھی، صحافی، محافظوں نے اسے پچھلی طرف سے نکال دیا مگر وہ کچھ دیر ایک کمرے میں رکی اور اس نے مجھے بلوایا۔ میں جانتا تھا کہ اب وہ صرف رسمی باتیں کرے گی جن کا رسمی جواب ہوگا۔ تم نے میری بڑی مدد کی۔ میں یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گی اور میں کہوں گا کہ یہ تو میرا اخلاقی فرض تھا۔

جب میں کمرے میں پہنچا تو راجا میرے ساتھ تھا لیکن وہ اکیلی تھی اور شاید اکیلے میں ہی کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اس نے کچھ بھی نہیں کہا۔ بس میرا ہاتھ پکڑا اور چوم لیا۔ ''تھینک یو رفیق۔'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور اس کی آنکھوں سے ٹپکنے والے آنسوؤں کے گرم قطرے میرے ہاتھ پر گر گئے۔

پھر وہ راجا کی طرف متوجہ ہو کے بولی۔ ''رفیق کا ساتھ کبھی مت چھوڑنا۔ میری طرح۔'' اور پلٹ کے باہر نکل گئی۔

باہر آ کے میں نے ان دونوں مولوی سالے بہنوئی کو ادھر ادھر تلاش کیا لیکن عدالت میں اپنا بیان ریکارڈ کرانے کے بعد وہ غائب ہوگئے تھے۔ حامد خان نے درخواست کی تھی کہ دونوں اہم گواہوں کی حفاظت کا انتظام کیا جائے ورنہ انہیں بھی مدعی فاضل بھٹی اور اس کی گواہ بیوی کی طرح ختم کر دیا جائے گا۔ جج نے اس سلسلے میں پولیس کو احکامات بھی جاری کیے تھے لیکن ایسے کاغذی احکامات پر کون بھروسا کرتا ہے۔ حفاظت کرنے والا وہی ایک خدا ہے۔ تمام عمر کی ذمے داری کون لے سکتا ہے۔

فاضل بھٹی کے خاندان کے یوں ختم کیے جانے کا مجھے بہت دکھ تھا اور شہر میں اس واردات نے خاصی سنسنی پھیلائی تھی۔ وارثوں نے کوشش کر کے سہ پہر تک پوسٹ مارٹم کی رپورٹس حاصل کر لی تھیں اور ان کی تدفین عصر کے بعد رکھی گئی تھی۔

ہم سوگواروں کے ساتھ باہر گلی میں لگی ہوئی کرسیوں پر بیٹھے تھے کہ چوبیس پچیس سال کا ایک خوبرو اور صحت مند جوان آدمی ہمارے قریب آیا۔ وہاں آنے والے سب ہی اس سے تعزیت کر رہے تھے جس سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ فاضل بھٹی کا کوئی قریبی عزیز تھا۔ میں نے کورٹ روم میں بھی دیکھا تھا۔

''نواب صاحب۔ میں راشد بھٹی ہوں۔ فاضل بھٹی میرے بڑے بھائی تھے۔ میری یہاں گجرات میں پنکھوں کی چھوٹی سی فیکٹری ہے۔'' وہ بولا اور مجھے اپنا کارڈ دیا۔

''مجھے تمہارے بھائی کی فیملی کے اس سفاکانہ قتل پر واقعی بہت افسوس ہے۔''

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ''یہ ہتھوڑا گروپ کی واردات نہیں تھی۔''

''میں نے کہا۔'' یہ کون نہیں جانتا۔''

''بھائی صاحب کی اور چودھری سلطان کی دشمنی تھی۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے معلوم ہے۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ انہیں فریال کے خلاف پرچا درج کرانے کے لیے کس نے مجبور کیا تھا؟''

''پولیس نے اور کس نے سر۔''

میں نے کہا۔ ''تم کسی پولیس افسر کا نام نہیں جانتے؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''ایک دن پہلے بھائی صاحب نے کہا تھا کہ پولیس کو چودھری سلطان کی لاش مل گئی ہے اور بھابی کو اسے شناخت کرنا ہوگا۔ وہ اسپتال آ جائیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ بھائی بہن کی بڑی ناراضی تھی لیکن یہ اطلاع پا کے بھابی بہت روئی تھی۔ اسے امید تھی کہ ایک نہ ایک دن بھائی کا دل پسیج جائے گا۔ باپ نے تو مرتے دم تک معاف نہیں کیا تھا۔ شام کو میں انہی کے ساتھ تھا۔ دوسرے رشتے دار بھی تھے اور بھابی سے تعزیت کے لیے آئے تھے۔ اس وقت دو بندے بھائی صاحب سے ملنے آئے تھے۔''

''تم نے انہیں دیکھا تھا۔''

''بالکل دیکھا تھا۔ وہ بھائی صاحب کو بلا کے ایک طرف لے گئے تھے۔''

راجا نے کہا۔ ''دوبارہ انہیں دیکھو گے تو پہچان لو گے؟''

''پہچان لوں گا۔ بھائی صاحب تھوڑی دیر بعد واپس آئے تو انہوں نے بڑے افسوس سے کہا کہ کسی کو احساس نہیں بہن کی اس خبر سے کیا حالت ہے۔ مجھے ڈرا دھمکا رہے تھے کہ اپنی بیوی کی زبان کو قابو میں رکھنا۔ کچھ الٹا سیدھا نہ بول دے۔ وہ لاش چودھری سلطان کی ہے۔ بس یہی کہنا ہے اس کو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس بات کا آخر کیا مطلب

ہے۔ بھئی لاش چودھری سلطان کی ہے تو وہ اور کیا کہے گی۔ بہن ہے آخر۔"

نمازِ جنازہ میں عام شہری بھی شریک تھے کیونکہ اس لرزہ خیز واردات کی خبر دور دور تک پھیل گئی تھی۔ پولیس کے اعلیٰ افسران نے روایتی انداز میں بیان دیا کہ مجرم بہت جلد کیفرِ کردار کو پہنچا دیے جائیں گے۔ ایک سرکاری بیان وزیراعلیٰ کی طرف سے بھی جاری ہوا کہ آئی جی کو ہتھوڑا گروپ کے خلاف آہنی ہاتھوں سے نمٹنے کے لیے خصوصی ٹاسک دیا گیا ہے۔

میں نے ...... اپنی گاڑی واپس بھیج دی تھی اور یہ پیغام بھی بھجوا دیا تھا کہ آج رات بھی ہم نہ آئیں تو کوئی فکرمند نہ ہو۔

اب ہم دونوں ڈبل کیبن پک اپ میں لاہور واپس جا رہے تھے۔ اس میں آگے غنی کے ساتھ ایک سیکیورٹی گارڈ تھا اور دو پیچھے والے حصے میں مستعد بیٹھے تھے۔ ہم دونوں پر اس سانحے کا اثر تھا اور ہم اپنے اپنے خیالات میں الجھے ہوئے تھے۔

کچھ دیر بعد راجا نے کہا۔ "کس سوچ میں گم ہے نیکے پتر؟"

"کچھ نہیں مہاراجا۔ ہستیٔ ناپائدار کا بھی کیا تماشا ہے۔ کل رات تک فاضل بھٹی اور اس کی بیوی کے پاس بیس لاکھ کے چیک تھے۔ ایک محفوظ اور خوشحال مستقبل کے خواب تھے اور ہمارے وعدوں پر اعتبار تھا۔ آج کچھ بھی نہیں۔ مٹی کے ڈھیر ہیں۔"

"ان کی موت کے ذمے دار ہم کسی صورت نہیں۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"ہاں، فرق اس سے پڑتا ہے کہ جس چودھری سلطان کو ہم نے مردہ مان لیا تھا۔ وہ زندہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ زندہ ہے تو کہاں ہے؟"

میں نے کہا۔ "اور وہ کون تھا جس کو ست بدھائی میں گاڑا گیا تھا۔ غلطی کس سے ہوئی اور کہاں؟ چودھری سلطان کے کپڑے غنی لایا تھا۔ انہی کی بو سے کتوں نے لاش کا سراغ لگایا۔ غلطی کتوں سے ہوئی یا غنی کسی اور کے کپڑے اٹھا لایا تھا۔"

"چودھری سلطان کے گھر میں۔ اس کے بیڈروم میں اور کس کے کپڑے ہو سکتے تھے؟"

"یہ فریال بہتر بتا سکتی ہے۔"

راجا نے تلخی سے کہا۔ "ہاں۔ گھر تو اس کا ہے۔ سلطان کی عدم موجودگی میں وہاں کون مہمان ہوا؟ اس کے بیڈروم میں رہا۔"

میں نے کہا۔ "راجا۔ فریال کو چھوڑ۔ میں اسے کوئی پاکباز اور عفت مآب حسینہ ثابت کرنا نہیں چاہتا۔ وہ شوبزنس میں ہے اور اپنا برا بھلا خود سمجھتی ہے۔ وہ کوئی نیک نامی کمانے اس لائن میں نہیں گئی۔ لیکن فرض کر چودھری سلطان کو اس مہمان کے اپنی خواب گاہ میں ایک رات گزارنے کی خبر ملتی ہے۔ وہ ایک تیر سے تین شکار کرنے کا پلان بناتا ہے۔ وہ فریال کے اس مہمان کو ٹھکانے لگاتا ہے اور پھر رانا صاحب کے ساتھ مل کے ایک سازش کرتا ہے میرے خلاف۔ اس کو وہاں سلطان کے کپڑے پہنا کے گاڑ دیا جاتا ہے لیکن ہمارے کتے بو پر اس کا سراغ لگا لیتے ہیں اس سے رانا کا سارا پلان فیل ہو جاتا ہے۔ اگر ہم نے لاش کو غائب نہ کیا ہوتا تو پولیس کرتی۔"

"یہ کارنامہ مسٹر عبدالغنی نے سرانجام دیا تھا، ہم نے نہیں۔"

"او کے۔ رانا آخری کوشش یہ کرتا ہے کہ چودھری سلطان کی بہن سے لاش کو شناخت کرا لے اور اس میں بھی ناکام ہوتا ہے تو اس کے یا چودھری سلطان کے بندے انہیں ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔ سچ بولنے سے پہلے۔"

"شاید ایسا ہی ہو۔ اس کے بندوں کو یہ امید نہیں ہوگی کہ سلطان کی بہن ان کا پتا بنایا کھیل بگاڑ دے گی۔" میں نے کہا۔

"اس کا ارادہ ہی نہیں ہوگا۔ لاش کو دیکھنے سے پہلے اس کا خیال بھی یہی ہوگا کہ لاش اس کے بھائی کی ہے۔ شوہر نے سمجھایا ہوگا کہ دولت کی دیوی پہلی بار مہربان ہوئی ہے۔ چل تھوڑا سا جھوٹ بول دے۔ بھائی نے تجھے کیا دیا ہے۔ یہ بیس لاکھ لے کر ہم کہیں چلے جائیں گے اور وہ راضی ہوگئی۔ لیکن اسپتال جا کے اس پر انکشاف ہوا کہ اسے جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔ وہ لاش سچ مچ اس کے بھائی کی نہیں تھی۔ اس نے ہمت کی اور یہی کہہ دیا۔" راجا بولا۔

میں نے کہا۔ "چل فرض کر لیتے ہیں کہ ایسا ہی ہوا۔ لیکن راجا صاحب۔ سوال گھوم پھر کے وہیں آتا ہے کہ آخر سلطان کہاں ہے؟ کیا وہ اتنا بے وقوف ہو سکتا ہے کہ اپنے قتل کے جھوٹے الزام میں مجھے یا فریال کو پھنسا دے اور خود کہیں چھپ کر بیٹھا رہے۔ جب تک ہمیں پھانسی نہ ہو جائے۔ یہ کیا اتنا آسان ہوتا ہے۔ سیشن میں برسوں لگ جاتے ہیں۔ پھر ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ۔ سلطان اتنا عرصہ روپوشی میں گزار سکتا ہے؟"

راجا نے سر ہلایا۔ "بالکل ٹھیک۔ اب ہمیں سراغ لگانا ہوگا کہ وہ کہاں گیا اور جو سلطان بنا کے دفن کیا گیا وہ کون تھا۔ کیا یہ بات فریال کے علم میں نہیں ہوگی؟"

میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "راجا۔ میں اپنی ابتدائی تھیوری پر قائم ہوں۔ سلطان کا پتا خود فریال نے صاف کیا ہے مگر اتنی صفائی سے کہ اس کے دامن پر کوئی داغ نہیں۔ کوئی شک کی نظر بھی نہیں اٹھا سکتا اس کی طرف۔ اب وہ شادی سے انکار نہیں کر سکتی تھی۔ ہر جگہ وہ سلطان سے اپنی وابستگی کا اعلانیہ اعتراف بھی کرتی رہی تاکہ اس کی طرف کسی کا دھیان ہی نہ جائے اور سلطان کا کانٹا ہمیشہ کے لیے درمیان سے نکالنے کا پلان بھی کرتی رہی اور سلطان غائب ہو گیا۔ جیسے وہ کبھی تھا ہی نہیں۔ دوسری طرف اس نے رانا کو مجرم بنانے کی سازش کی۔ وہی ایک تیر سے دو شکار۔ نہ اس کا بدخواہ رہے نہ میرا۔ وہ اب کسی سلطان کی محتاج نہیں۔ فلمی دنیا میں اس کے قدم جم چکے۔ چنانچہ سلطان آؤٹ۔ رانا میری راہ میں روڑے اٹکا رہا ہے، چلو اسے بھی ہٹاؤ۔"

تھانہ گڑھی شاہو کے احاطے میں میری کار لشکارے مار رہی تھی۔ اس کو اندر سے بھی ایسا صاف کر دیا گیا تھا جیسے ابھی شوروم سے نکلی ہے۔ گاڑی کے اندر ایئر فریشنر کا اسپرے بھی کر دیا گیا تھا اور ایس ایچ او صاحب بقلمِ خود بسر و چشم میرے سامنے موجود تھے۔

"جناب۔ نواب صاحب! آپ کی گاڑی حاضر ہے۔" اس نے چابی میری خدمت میں پیش کی۔ "میں نے ان دو اہلکاروں کو معطل کر دیا ہے جنہوں نے آج صبح آپ کی شان میں گستاخی کی تھی۔"

میں نے کہا۔ "ایک اور کام بھی کہا تھا میں نے۔"

"جی جناب عالی۔ وہ دونوں لاشیں جو نہر سے نکلی ہیں۔ مردہ خانے میں رکھی ہیں۔"

"کیا ان کی شناخت ہوئی ہے؟" راجا نے پوچھا۔

تھانہ انچارج نے قدرے ناگواری سے اسے دیکھا۔ "نہیں ہوئی مگر آپ نے ہم سے تفتیش کیوں شروع کر دی ہے!"

میں نے کہا۔ "غالباً آپ ان سے واقف نہیں۔ یہ راجا ہیں، مشہور صحافی۔ ان کے کالم تہلکہ خیز ہوتے ہیں۔"

تھانیدار کی صورت کے تاثرات اتنی تیزی سے بدلے کہ مجھے ہنسی آئی مگر میں نے روک لیا۔ "معاف کرنا جناب۔ مجھ سے پہچاننے میں غلطی ہوئی۔ ابھی تک لاشیں لینے کوئی نہیں آیا ہے۔"

"ان کا پوسٹ مارٹم ہو چکا ہے؟"

"جی سر...... ان میں ایک بندے کے سر میں گولی تھی۔ وہ ہم نے محفوظ کر لی ہے۔"

"اور آلۂ قتل؟"

اس نے مایوسی سے سر ہلایا۔ "وہ ابھی تک نہیں ملا۔"

میں نے کہا۔ "مل جائے گا۔ آپ ابھی تفتیشی افسر کو اس جگہ بھیجو جہاں سے میری گاڑی نکالی گئی تھی۔"

وہ بے وقوفوں کی طرح میری شکل دیکھنے لگا۔ "یہ آپ کیسے جانتے ہو؟"

میں نے کہا۔ "الہام ہوتا ہے مجھے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

جب تھانیدار اس کے باوجود بے حس و حرکت بیٹھا رہا تو راجا بولا۔ "معلوم ہوتا ہے الہام کا مطلب آپ کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اگر آپ نے فوری طور پر تلاش کا حکم نہ دیا تو ہم خود غوطہ خوروں کی خدمات حاصل کر لیں گے۔ نہر میں پل سے پانی میں چھلانگ مارنے والے بڑے ماہر غوطہ خور ہوتے ہیں اور پیسے لے کر یہ کام خوشی خوشی کریں گے۔"

اب تھانیدار کو حرکت میں آنا پڑا۔ ایک پارٹی تشکیل دی گئی جس میں اونگھتے خاں سونگھتے خاں شامل تھے۔ احکامات سن کے ان کے چہروں پر یوں ہوائیاں اڑنے لگیں جیسے انہیں بحرالکاہل کی تہ سے کوئی ٹائم بم نکالنے کا مشن سونپ دیا گیا ہو۔

تھانے میں ہمارے استقبال، احترام اور تعمیل احکام کی یہ کیفیت تھی جیسے میں وڈا نواب ہی نہیں خود ہی آئی جی بھی ہوں۔ دن میں میری وساطت سے دو سب انسپکٹران نے براہِ راست آئی جی صاحب سے جھاڑ کھانے کی سعادت حاصل کی تھی جو عام زندگی میں اپنے کسی ایس پی سے براہ راست مخاطب ہونے کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔ مزید یہ ہوا کہ میرے ساتھ میڈیا کی ایک توپ بھی آگئی۔ اب خود انچارج صاحب کی پتلون ڈھیلی ہو رہی تھی۔

پرتکلف چائے کا انتظام پہلے سے تھا اور ضرورت کے عین مطابق تھا کیونکہ گجرات میں کھانے کے بعد ہم روانہ ہوگئے تھے اور میں نے سارا دن چائے نہیں پی تھی۔ میرے شریفانہ بلکہ دوستانہ رویے نے انچارج صاحب کو کچھ ہمت عطا کی۔

اس نے کہا۔ "جناب نواب صاحب۔ گستاخی نہ ہو تو ایک سوال پوچھوں؟"

میں نے کہا۔ "تم گستاخی سمجھتے ہو تو پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔"

وہ مسکرانے لگا۔ "سر۔ عینی شاہدین نے بتایا ہے کہ آپ کی گاڑی کو کسی لینڈ کروزر جیسی بڑی گاڑی نے اچانک سائڈ سے نکل کے ٹکر ماری تھی۔"

میں نے کہا۔ "اچھا؟ مجھے پتا نہیں چلا۔"

وہ کچھ جز بز ہوا۔ "جناب عالی۔ پسنجر سائڈ سے گاڑی تباہ ہوگئی ہے۔ پچھلا دروازہ اندر گھس گیا ہے۔ آپ کہتے ہیں

پتا نہیں۔"

میں نے کہا۔ "میں نے ابھی تک وہ سائڈ دیکھی ہے جدھر میں تھا۔ وہ تو ٹھیک ہے۔"

"آپ رپورٹ لکھوانا نہیں چاہتے۔ آپ کی مرضی۔"

میں نے کہا۔ "اگر میں رپورٹ لکھوادوں۔ تو کیا آپ اس گاڑی کا سراغ لگالیں گے؟"

"وہ سر...... ہم کوشش ضرور کریں گے مگر بہت مشکل ہوتا ہے۔ پتا نہیں گاڑی کہاں سے آئی تھی، کدھر گئی۔ ہوسکتا ہے ڈینٹ پینٹ کے لیے کسی ورکشاپ میں کھڑی ہو۔"

میں نے ہنس کے کہا۔ "میرے رپورٹ نہ لکھوانے کی یہی وجہ تھی۔ کیا فائدہ آپ کا اور اپنا وقت ضائع کروں۔ آپ کے ریکارڈ پر ایک اور جرم آجائے جس کا سراغ نہیں ملا۔"

اس نے نظریں چراتے ہوئے موضوع بدلا۔ "آپ بڑے آدمی ہو۔ آپ کے دشمن بھی چھوٹے آدمی نہیں ہوسکتے۔ ہماری تو کوئی اوقات ہی نہیں۔ بس حکم کے غلام ہیں۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "تم بادشاہ ہو۔ صحیح معنوں میں اس ملک پر تمہاری حکومت ہے۔ اپنے دشمنوں کو میں جانتا ہوں۔ میں خود ان سے نمٹ لوں گا۔ تھینک یو ویری مچ۔ اب ذرا مجھے ان دو بندوں کا بھی دیدار کرادو۔"

میری گاڑی کی پسنجر سائڈ واقعی تباہ ہوگئی تھی۔ اس کے دونوں دروازے اندر گھس گئے تھے لیکن تھانیدار نے مجھے بتایا کہ اس کی چال میں فرق نہیں پڑا۔ بے شک ماہر ڈینٹر گاڑی کو پھر اصل حالت میں لاسکتا تھا اور پینٹ ہوجانے کے بعد عام آدمی کی نظر اندازہ نہیں کرسکتی تھی کہ یہ ایکسیڈنٹ کے بعد پھر بنائی گئی ہے لیکن مجھے معلوم تھا کہ اب وہ کبھی اوریجنل کنڈیشن میں نہیں آسکتی۔ اس کو بنوا کے نکال دینا ہی بہتر تھا۔

میری گاڑی کے ساتھ ہی نور کی سرخ ڈبیا جیسی مہران کھڑی تھی لیکن ہم مردہ خانے اس ڈبل کیبن پک اپ میں گئے جس کی پچھلی سیٹ میرے راجا... اور خاصے پھیلے ہوئے تھانیدار کے لیے کافی تھی۔ غنی کے حفاظتی انتظامات کے مطابق ایک گارڈ آگے تھا اور دو پیچھے مسلح بیٹھے تھے۔ تھانیدار اس شان وشوکت کے مظاہرے سے امپریس ہوا۔

لاہور کے میو اسپتال کے مردہ خانے میں جگہ کی قلت ہمیشہ رہتی ہے۔ لاہور بڑا شہر ہے۔ حادثات وجرائم میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جارہی ہے پھر گردونواح کے اضلاع سے بھی غیر طبعی موت مرنے والے یہیں پہنچتے ہیں۔

نئے پرانے مردوں سے بھرے ہوئے اس کھلے قبرستان کا نظارہ صرف عبرت آموز ہی نہیں لرزہ خیز بھی ہوتا ہے۔ مردہ اور لاوارث انسان کچھ نہیں۔ صرف ڈی کمپوز ہوتا ایک جانور ہے۔ میت کا احترام یہاں ایک بے معنی لفظ ہے۔ لاشیں اوپر نیچے آڑھی ترچھی ایک دوسرے پر پڑی تھیں۔ ٹوٹی پھوٹی، خون آلود، نامکمل اعضا کے ساتھ۔

راجا کے علاوہ ایک پکے تھانیدار کے ساتھ ہونے سے یہ ہوا کہ ہمیں مردوں کے اس انبار میں ہر لاش کو الٹ پلٹ کے اس کا چہرہ نہیں دیکھنا پڑا۔ ہم ناک پر رومال رکھے اس سڑتے گوشت اور بودینے والے خون کے درمیان سے گزرے۔ پھر مردہ خانے کے مہتمم نے ایک جگہ پڑی ہوئی دو لاشوں پر ٹارچ کی روشنی ڈالی۔

ابھی مرنے والوں کے چہرے بگڑ کر ناقابل شناخت نہیں ہوئے تھے۔ ایک کا سر سائڈ سے کھل گیا تھا لیکن لہو کو نہر کے پانی نے دھودیا تھا۔ میری اور غنی کی نظریں ملیں تو غنی نے نفی میں سر ہلا کے میرے لب پر نہ آنے والے سوال کا جواب دے دیا۔ اس نے انہیں پہلے نہیں دیکھا۔

میرے حکم کے مطابق ان دونوں کے چہرے کی کلوز اپ بنالی گئی اور تصویر مجھے فراہم کردی گئیں۔ ہم لوٹ کر گڑھی شاہو کے پولیس اسٹیشن گئے۔ میں نے راجا کے مشورے سے اپنی گاڑی وہیں چھوڑ دی۔ اس کا مشورہ درست تھا کہ اس گاڑی کو بنوا کے بیچنے کا دردِ سر مول لینے کی بھی کیا ضرورت ہے۔ پرانی گاڑیوں کے کسی ڈیلر سے بات ہوجائے تو وہ گاڑی کو اسی حالت میں لے جائے گا اور نئی بنا کے کسی اناڑی گاہک کو زیادہ منافع میں بھی بیچ دے گا۔

راجا کو میں نور جہاں سے ملاقات کی ساری روداد سنا چکا تھا۔ اسے بھی نور جہاں کو نور کے بدلے ہوئے روپ میں دیکھنے کا شوق تھا مگر ست بدھائی سے شہناز کے مسلسل فون موصول ہورہے تھے۔ راجا اسے تمام معاملات کی رپورٹ دے رہا تھا لیکن شہناز کی نظر میں وہ سو فیصد سچا اور قابلِ اعتماد کبھی نہ تھا۔ وہ عدم اطمینان کا شکار تھی اور دسویں مرتبہ "آخری وارننگ" دے چکی تھی کہ اب لوٹ آؤ ورنہ...... اس ورنہ کے آگے کچھ نہیں تھا صرف جذبات تھے۔ دھمکی کوئی نہیں تھی۔ صرف آنسو تھے۔ چنانچہ راجا فوراً سے پیشتر واپس جانا چاہتا تھا۔

میں نے کہا۔ "مجھے نور کو گاڑی لوٹانی ہے۔"

راجا نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ "دیکھے پتر۔ استادوں سے چالاکی۔"

میں نے کہا۔ "تو سمجھ رہا ہے میں گاڑی کو بہانہ بنا رہا ہوں۔"

"میں تیری رگ رگ سے واقف ہوں۔"

میں نے کہا۔ "مہاراجا۔ میرے دل میں ایک خلش ہے۔"

"خلش دل میں نہیں کہیں اور ہے۔"

میں نے کہا۔ "نہیں یار۔ میں سچ جاننا چاہتا ہوں۔ نور ہے نہیں۔ فریال ہے۔"

"اور تجھے خوش فہمی ہے کہ وہ تیرے سامنے اقرار کرلے گی۔"

"یس۔ جذباتی استحصال یعنی ایموشنل بلیک میلنگ۔ ایک فن ہے۔"

"اس میں عورت بہت آگے ہے۔ مارا جاتا ہے مجنوں یا فرہاد۔"

میں نے کہا۔ "پیارے دوست۔ برسوں ساتھ رہ کے بھی تو سمجھتا ہے کہ تیرا یہ شاگرد اناڑی ہے؟ تو مجھے بس ایک دن اور دے۔"

راجا نے کہا "یعنی آج کی رات کے علاوہ؟ چل جیسی تیری مرضی۔ مجھے تو صبح ہر صورت میں گولی کے ساتھ جانا ہے۔ ورنہ میں بھی تیرے ساتھ چلتا۔ کباب میں ہڈی بن کے۔"

غنی کو میری سیکیورٹی کی فکر مجھ سے زیادہ تھی۔ میرے سختی سے منع کرنے کے باوجود وہ سرخ رنگ کی مہران کار کے پیچھے چلتا رہا اور مجھے اس عمارت کے دروازے تک چھوڑ کے گیا جس میں نور نے ایک حصہ کرائے پر لے رکھا تھا۔

وہ میرے لیے سراپا انتظار تھی۔ اس کی کار میرے پاس تھی چنانچہ اسے یقین تھا کہ میں لوٹ کے ضرور آؤں گا۔ میری کال بیل کے جواب میں اس نے یوں دروازہ کھولا جیسے وہ پہلے سے دروازے کے پیچھے موجود اپنے دل کی دھڑکن میں میرے قدموں کی آہٹ سن رہی تھی۔ اگر میں گھنٹی کا بٹن نہ دباتا تب بھی دروازہ خود بخود کھل جاتا۔

میں نے اسے اور اس کے حسن کے خزانوں کو اپنی بھرپور تابانی کے ساتھ روبرو دیکھا اور ایک بار پھر دم بخود رہ گیا۔ اگر حسن دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے تو شاید میری نظر کی یہی حد تھی۔ اس سے زیادہ حسن کا کوئی جلوہ میری نظر میں سما ہی نہیں سکتا تھا۔ شاید کسی اور کو وہ اتنی حسین نہ لگتی ہو۔ شاید میرے دل کے جذبات نے میری نظر میں حسن کے معیار کو نور جہاں تک محدود کردیا ہو۔

میری نظر میں ذوقِ جمال بھی خاصی مختلف ہے۔ اس کا میں اعتراف کرتا ہوں کہ عورت کے حسن وشباب کی رعنائی کو سب سے زیادہ سحر آفریں بنانے والا لباس مجھے ساری لگتی ہے۔ اس کے بعد شلوار قمیص اور پھر غرارے شرارے لیکن خوبصورت سے خوبصورت چہرہ اور جسم رکھنے والی لڑکی مختصر سی شرٹ اور جینز میں میرے لیے ایسی ہوجاتی ہے جیسے بغیر نمک کا قورمہ یا بریانی۔

نور جہاں نے مختصر بازوؤں والی سیاہ ریشمی قمیص پہن رکھی تھی جس کے گول گلے کا پھیلاؤ دونوں شانوں کی مدار ڈھلوان سے پیچھے کمر کی اجلی گہرائی تک بھی اتنا ہی پھیلا ہوا تھا جتنا سامنے سے بدن کے گداز کی آخری حد تک۔ پھر کمر کے سمٹتے دائروں کے ساتھ ساتھ قمیص کا دامن شلوار کے گھیر میں گم ہوجاتا تھا۔

اس نے مجھے دیکھا اور میری مدہوشی کو اور بے خودی کو اور یہ دیکھا کہ میں کتنا تھکا ہوا اور بے بس ہوں اور آہستہ سے اس نے اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا اور مجھے احتیاط سے محبت اور توجہ سے سنبھال کے اندر لے گئی۔

آہستہ سے اس نے میرے ماتھے کو چوما۔ "تم بہت تھک گئے ہو۔ کیا کرتے رہے سارا دن؟"

میں نے اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ "وہ سب کرتا رہا جو میں کرنا نہیں چاہتا تھا اور اس وقت بھی میں کچھ کرنا نہیں چاہتا۔ بس تم ایسے ہی میرے پاس رہو۔ مجھے بڑا سکون مل رہا ہے۔"

اس نے ہنس کے سر اٹھایا۔ "چلو اٹھو۔ نہالو پہلے۔ پانی گرم ہے پھر کپڑے بدل کے آجاؤ۔ میں نے تمہاری پسند کی کچھ چیزیں بنائی ہیں۔" اس نے مجھے کھینچا اور واش روم کی طرف دھکیل دیا۔

میں نے پلٹ کے کہا۔ "اگر میں آج نہ آتا پھر؟"

"یہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا۔" اس نے مجھے اندر دھکیل کے دروازہ بند کردیا۔

اسے معلوم تھا کہ میں چائنیز کھانا پسند کرتا ہوں مگر مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ ایک ایکسپرٹ کک بھی ہے۔ اگر وہ نہ بتاتی تو میں یہی سمجھتا کہ کھانا شہر کے کسی مشہور چائنیز ریسٹورنٹ سے لایا گیا ہے۔ اس کے رویے اور اس ماحول کا اثر جادو کی طرح ہوا تھا۔ پہلے میری بھوک چمک اٹھی جو صبح سے اپنا احساس دلانے میں ناکام تھی۔ پھر جیسے احساس نے سارے در بند کردیے اور غمِ دوراں کہیں باہر ہی رہ گیا۔ اس تین کمروں کے مختصر سے اپارٹمنٹ میں صرف وہ رات رہ گئی جس میں نور تھی، اس کے قرب کی مہک تھی۔ اس کے وجود کی سارا درد وغم سمیٹ لینے والی مسیحائی تھی اور سکون کے سمندر جیسی جذب کرلینے والی راحت تھی۔

رات کے کسی مدہوش لمحے میں جب وہ میری رگ جاں سے بھی قریب تر تھی میں نے کہا۔ "نور میرے ساتھ چلو۔"

''کہاں چلوں؟'' اس نے شوخی سے کہا۔

''میرے ساتھ، ست بدھائی۔ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔''

''پھر ست بدھائی ہی کیوں۔ رہو میرے ساتھ۔'' وہ ہنسی۔

''تم جانتی ہو۔ میں کتنا مجبور ہوں۔''

''کیا میں مجبور نہیں ہوں؟ میں کیسے ست بدھائی جاسکتی ہوں۔ میں نور ہوں، نور جہاں نہیں اور نور جہاں تھی تو تمہارے دل کے سوا میرے لیے اس حویلی میں جگہ کہاں تھی؟ وہ کتنی بڑی حویلی تھی۔ اس کی وسعت کے مقابلے میں میرا یہ گھر تمہارے سرونٹ کوارٹر جیسا ہے۔ کیا تم یہاں رہ سکتے ہو۔ نواب رفیق احمد شیرازی۔''

میں اندھیرے میں نظر نہ آنے والی چھت کو گھورتا رہا۔ اس کے سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میں تو یہاں صرف ایک رات گزارنے آیا تھا۔ صبح مجھے پھر جانا تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ میں نہ جاؤں۔ جب صبح کے اجالے نے کھڑکی کے شیشوں سے اور پردوں سے گزر کے ایک نئے دن کا اعلان کیا تو نور نے مجھے ہلا کے کہا۔ ''اے۔ دیکھو کیا وقت ہو رہا ہے۔ تمہیں جانا ہے؟''

میں نے آنکھیں کھولیں تو وہ مجھ پر جھکی ہوئی تھی۔ ''کہاں جانا ہے مجھے؟''

''فریال سے ملنے۔''

''یہ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟'' میں نے ہاتھ بڑھایا۔

وہ پیچھے ہٹ گئی۔ ''تم سے اور کس سے۔ اٹھو، میں نے ناشتا بنالیا ہے۔''

''کیا تمہیں معلوم ہے...... وہ کس مشکل کا شکار ہے؟''

''ہاں، اخبار والے ایسی چٹپٹی خبریں خوب بڑھا چڑھا کے شائع کرتے ہیں۔ بتاؤ کل کیا ہوا؟''

میں نے ناشتا کرتے ہوئے اسے سب بتادیا۔ اسے ان دونوں کی تصویر بھی دکھادی جو مجھ پر قاتلانہ حملے میں ملوث تھے۔ اور اب خود ہی مردہ خانے میں تصویرِ عبرت بنے پڑے تھے یا لاوارث قرار دیے جانے کے بعد مٹی میں مل چکے تھے۔

''غور سے دیکھو۔ کیا تم کسی کو پہچانتی ہو؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں نے پہلے انہیں کبھی نہیں دیکھا۔''

''اکبر خان کے ساتھ بھی نہیں؟''

اس کے چہرے پر..... ناگواری کے آثار نمودار ہوئے۔ ''میں کیا جھوٹ بول رہی ہوں تم سے۔ دیکھا ہوتا تو بتادیتی۔''

''آئی ایم سوری۔ ان کو غنی نے بھی نہیں پہچانا حالانکہ وہ گرد و نواح کے زیادہ تر لوگوں کو جانتا ہے، خاص طور پر رانا کے گرگوں کو...... لیکن مجھے شک ہے یہ اسی کے بندے تھے۔ وہ گجرات سے میرے پیچھے لگے ہوں گے۔''

''کیا یہ کام وہ گجرات میں نہیں کرسکتے تھے؟ اس کے لیے انہیں تمہارے پیچھے لاہور تک آنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہوسکتا ہے رانا کا دماغ الٹ گیا ہو۔ اس کی ہر چال الٹی پڑ رہی تھی، ہر سازش ناکام ہوتی جارہی تھی۔ اس نے کہا ہو کہ ختم کرو اس نواب کے نطفے کو۔ نہ ہوگا بانس نہ بجے گی بانسری۔ بعد میں جو ہوگا اس سے نمٹ لیں گے۔''

''رانا ایسی بے وقوفی نہیں کرسکتا۔ وہ پہلے ہی ایک قتل اور اغوا کے مقدمے میں پھنسا ہوا ہے اور گرفتاری سے بچنے کے لیے بھاگا پھر رہا ہے۔ مگر تم ایک بات بتاؤ۔ فریال ضمانت پر رہا ہوگئی۔ دو چشم دید گواہوں کے بیان کے بعد اس پر قتل کا الزام بھی نہیں رہا، پھر اب تم اس کے لیے کیوں پریشان ہو۔ اس کے مداح اور پرستار فلمی صنعت کے بااثر لوگ ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے فریال سے ایک سوال پوچھنا ہے۔ چودھری سلطان کہاں گیا؟''

''یہ تم فون پر بھی پوچھ سکتے ہو۔ وہ کہے گی مجھے نہیں معلوم۔''

''میرا خیال ہے کہ...... اسے معلوم ہے۔'' میں نے کہا اور اپنے موبائل فون پر فریال کا نمبر ملایا۔

اس نے غنودگی میں کہا۔ ''ہیلو۔''

''ابھی تک سو رہی ہو؟'' میں نے کہا۔

''رفیق۔ شاید میں نے غلط کہا۔ میں آنکھیں بند کیے پڑی تھی سونے کی کوشش میں ناکام ہو کے میں نے پہلے ایک خواب آور گولی کھائی پھر دوسری......''

''خواب آور گولیاں تمہارے پاس کہاں سے آئیں؟''

''یہ کیا فضول سوال ہے۔ ہوٹل کی لابی میں ایک فارمیسی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''تم...... ہوٹل میں ہو؟''

''ہاں، رات میں اپنے گھر نہیں گئی۔ میرا مطلب ہے...... گئی تو تھی لیکن وہاں رات کو نہیں رہی۔ میں بہت خوفزدہ تھی۔ تم سے نہیں کہہ سکی کہ میرے ساتھ چلو۔ رات کسی کو بتائے بغیر پیچھے سے نکل گئی اور ہوٹل میں آگئی۔ برقعہ اوڑھ کے۔''

''مینیجر نے کوئی سوال نہیں کیا؟''

''کیا تھا۔ میں نے کہا کہ میں پبلسٹی سے بچنا چاہتی ہوں۔ اخبار والے مجھے چین نہیں لینے دیتے۔ میں دو چار دن یہاں رہوں گی مگر کسی کو پتا نہ چلے۔ اس شریف آدمی نے تعاون کا وعدہ کیا۔''

''کہاں ہے یہ ہوٹل۔ اس کا نام بتاؤ اور تم کس کمرے میں ہو؟''

''میں نہیں بتاسکتی۔ میں کسی سے ملنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔''

''دیکھو، میرا تم سے ملنا بے حد ضروری ہے۔''

فریال کا فون بند ہوگیا۔ مجھے سخت طیش آیا لیکن چند منٹ بعد ہی میرے فون کی گھنٹی بجی۔ میرے لیے وہ ایک اجنبی نمبر تھا۔ میرے ہیلو کے جواب میں فریال کی آواز آئی۔ ''آخر ایسا کیا کام ہے......''

میں نے خفگی سے کہا۔ ''فون کیوں بند کیا تھا تم نے۔''

''اس میں بیلنس ختم ہوگیا تھا۔'' وہ بولی۔ پھر اس نے مجھے ہوٹل کا نام اور اپنا روم نمبر بتادیا۔

میں نے کہا۔ ''دیکھو، اب سے ایک گھنٹے بعد میں ہوٹل کے پارکنگ ایریا میں تمہارا انتظار کروں گا۔ ایک سرخ رنگ کی مہران کار ہے، اس کا نمبر بہت سادہ ہے لکھ لو۔''

وہ بولی۔ ''میں برقعے میں آؤں گی۔'' اور ہنسی۔

''تم کہو تو میں بھی برقعے میں آجاؤں۔ یہ فون کس کا ہے؟''

''ہوٹل کے مینیجر کا۔ گڈ مین دی لالٹین۔ اس کا نام لال دین ہے۔ تم واقعی آرہے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''تم دیکھ لوگی۔''

نور ظاہری عدم دلچسپی سے یہ گفتگو سن رہی تھی۔ ایک بار کسی دستک پر اٹھ کے دروازے تک بھی گئی۔ یہ صدیقی صاحب تھے جو غالباً یہ دیکھنے آئے تھے کہ نور کا دبئی سے آنے والا شوہر موجود ہے یا رات بھر کے کسی مہمان کی طرح صبح ہوتے ہی نکل گیا۔

معلوم نہیں کیوں نور جہاں نے اسے اندر بلالیا اور وہ میرے سامنے آ کے بیٹھ گیا۔ اس کا آنا بلا مقصد تھا چنانچہ وہ ادھر ادھر کی ہانکتا رہا۔ ''دبئی میں آپ کیا کرتے ہیں؟'' اس نے رسمی سا سوال کیا۔

میں نے کہا۔ ''کچھ بھی نہیں، جو کرتے ہیں دوسرے کرتے ہیں۔''

نور نے اسے ایک کپ چائے پیش کی۔ ''ان کا مطلب ہے کام تو نوکر اور ملازم ہی کرتے ہیں۔''

''اچھا اچھا۔ کوئی کمپنی ہے آپ کی؟''

میں نے کہا۔ ''آپ کیا کرتے ہیں؟ نور پر نظر رکھنے کے علاوہ۔''

وہ بوکھلایا۔ ''جی...... وہ دراصل...... خیال تو رکھنا ہی پڑتا ہے۔ یہ اکیلی جو رہتی ہیں۔ آپ واقعی خوش نصیب ہیں کہ ایسی بیوی ملی۔''

''آپ کو بھی مل جائے گی۔ تلاش جاری رکھیں۔ اور نور ہی پسند ہے تو کیا خیال ہے، آپ کو گفٹ کر جاؤں۔ وہاں کوئی اور دیکھ لوں گا۔ وہ تو پرستان ہے۔''

''آپ کیسی باتیں کرتے ہیں، میں چلتا ہوں۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

میں نے کہا۔ ''میں بھی آپ کی وجہ سے رک گیا تھا۔ میری ایک میٹنگ تھی۔''

وہ دروازے میں پھر رکا۔ ''رفیق صاحب! اگر دبئی میں میرے لیے کوئی چانس ہے تو مجھے بلالیں۔ میں انٹر پاس ہوں۔''

''کام کیا کرسکتے ہیں؟ نور جیسی بیوی تلاش کرنے کے علاوہ؟''

وہ جھینپا۔ ''ہر کام کرسکتا ہوں۔ باہر تو کچھ بھی معیوب سمجھا نہیں جاتا۔ پیسے اچھے ملتے ہیں۔''

''مجھے تم جیسے شخص کی ضرورت تھی۔ میرے جوتے پالش کردے، شیو بنادے۔ مالی ہو۔ کھانا اچھا پکاتا ہو۔ گھر صاف کردے۔ کپڑے دھودے۔''

''جی......'' وہ بوکھلا گیا۔

''تم نے کہا تھا نا کہ ہر کام کرسکتے ہو۔''

وہ دروازہ دھڑ سے بند کر کے نکل گیا۔ نور کا ہنستے ہنستے برا حال ہوگیا۔ ''اب میں اس سے پوچھتی رہوں گی کہ دبئی جانا ہے؟''

میں نے خود کو بلکہ نور نے مجھے انگلش فلمی اسٹائل سے رخصت کیا۔ آدھے گھنٹے بعد میں ہوٹل کے پارکنگ لاٹ میں تھا۔ وہاں ایک سے بڑھ کر ایک شاندار قیمتی اور لمبی چوڑی کاروں کے درمیان میری مہران شدید احساس کمتری کا شکار نظر آتی تھی۔ میں دائیں طرف دیکھ رہا تھا جہاں ہوٹل کا مرکزی دروازہ تھا۔ فریال بائیں طرف سے آئی اور دروازہ کھول کے ساتھ بیٹھ گئی۔

میں نے اس کے برقعے کو دلچسپی سے دیکھا۔ ''تم فریال ہی ہونا۔ یہ نہ ہو کہ میں کسی اور کو لے جاؤں۔''

''ہاں، فریال جیسی تو بہت پھرتی ہیں۔'' وہ تلخی سے بولی۔ ''جیب میں پیسا اور دل میں جگہ ہونی چاہیے۔''

میں خفگی میں یہ کہتے کہتے رک گیا کہ دنیا کہے تو کہے۔ خود تم اپنے آپ کو ایسا کیوں کہتی ہو۔ گاڑی کو باہر لا کے میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ''فریال! تمہیں کس کا ڈر تھا...... کہ تم

خود اپنے گھر جاتے ہوئے ڈرتی ہو۔"

اس نے کچھ سوچ کے جواب دیا۔"پتا نہیں...... شاید یہ فاضل بھٹی اور اس کی فیملی کے قتل کی دہشت تھی۔"

"تمہارے دروازے پر سیکیورٹی گارڈ ہوگا۔ تمہارے ملازم ہوں گے۔ تم پولیس سے بھی پروٹیکشن مانگ سکتی تھیں۔"

"میں نے کہا نا، مجھے نہیں معلوم میں نے ایسا کیوں کیا۔ شاید تمام حفاظتی انتظامات اور اتنے لوگوں کے ہوتے بھی مجھے احساس تھا کہ میں اکیلی ہوں۔ ضرور اس کی وجہ میرا نفسیاتی خوف ہوگا۔"

میں نے کہا۔"تمہاری رہائی ضمانت پر ہوئی ہے فریال۔ تم کو اس طرح روپوش نہیں رہنا چاہیے۔"

وہ باہر دیکھتی رہی۔"میں...... کچھ دیر کے لیے تنہا ہونا چاہتی تھی۔"

"کیا اب ہم گھر جا سکتے ہیں، تمہارے گھر؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا اور برقعہ اتار کے پچھلی سیٹ پر ڈال دیا۔ اس کی صورت دیکھ کے میں تشویش میں مبتلا ہوگیا۔ اس کے بال پریشان تھے۔ کپڑے شکن آلود۔ ایسا لگتا تھا کہ اس نے کئی دن سے منہ تک نہیں دھویا ہے۔ وہ بیمار نظر آتی تھی۔ اس کی آنکھوں کے لال ڈورے اور حلقے بے خوابی سے زیادہ کسی اور کیفیت کی غمازی کرتے تھے۔ شاید وہ پیتی رہی تھی۔

اپنے گھر کے بیڈروم میں پہنچ کے اس نے ایک گہری سانس لی اور اپنے بیڈ پر گر گئی۔ میں شاہانہ انداز میں سجے ہوئے کمرے میں اس کے بیڈ سے چند فٹ کے فاصلے پر لگے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا۔ جب میں نے پلٹ کے دیکھا تو وہ آنکھیں بند کیے سو رہی تھی۔ میں نے آہستہ سے اس کے جوتے اتارے اور اسے بیڈ پر سیدھا لٹا دیا۔ اس نے نیم باز آنکھوں سے مجھے دیکھا اور پھر سو گئی۔

میں آہستہ سے دروازہ بند کر کے باہر آ گیا۔ کوریڈور میں مجھے ایک ادھیڑ عمر کی عورت نظر آئی جو ملازمہ ہی ہو سکتی تھی۔ میں نے اسے کافی لانے کا کہا اور خود لاؤنج میں بیٹھ گیا۔ وہاں ٹی وی کے ساتھ سی ڈی پلیئر اور بہت سی سی ڈیز بے ترتیبی سے پڑی تھیں۔ میں نے کافی پیتے ہوئے ان سی ڈیز کو لگا کے دیکھا۔ زیادہ تر اس کی اشتہاری فلموں کی شوٹنگ کے سین تھے۔ پھر ایک فلم میں مجھے چودھری سلطان نظر آیا۔ اس کے ساتھ جو شخص تھا، اس پر نظر پڑتے ہی میں چونکا۔ میں نے سی ڈی کو واپس چلا کے اس سین کو روک دیا۔ شک کی کوئی بات ہی نہیں تھی۔ یہ وہی شخص تھا جو نہر کے کنارے کنارے چلتا ہوا مجھے تلاش کر رہا تھا کہ میرا سایہ بھی حرکت کرے تو مجھے گولی مار دے۔ اسے میں نے ایک دم پانی میں گھسیٹ کر غرق کر دیا تھا۔ اس کے سائیلنسر لگے ریوالور سے میں نے دوسرے کنارے پر چلنے والے کو شوٹ کر دیا تھا۔ اس کی تصویر میرے پاس تھی لیکن تصویر کے بغیر بھی میں اسے شناخت کرنے میں غلطی نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے سی ڈی کو آگے چلا دیا۔ یہ کسی زیر تکمیل فلم کی شوٹنگ تھی جس میں فریال کے ساتھ خود سلطان لیڈ رول کر رہا تھا۔ چند مناظر ایسے تھے کہ میں نے سخت حسد محسوس کیا حالانکہ میں جانتا تھا یہ اسٹوڈیو ریکارڈنگ ہے لیکن سلطان کے انداز میں ایک ایسی وارفتگی اور قربت کی تڑپ تھی جسے دیکھنے والے شاید اچھی اداکاری کہیں مگر وہ مجھے ہوس کی بے قراری نظر آئی۔

پھر اچانک ایک ڈانس شروع ہوگیا۔ کسی تھرڈ کلاس پنجابی کلچر کو بدنام کرنے والی فلم کی طرح فریال گاؤں کے کنویں سے ڈول بھر بھر کے پانی نکال رہی تھی۔ اس کے شوخ رنگوں والے چمکیلے اور چست کپڑے اس کے بدن کو شرمناک طور پر اجاگر کر رہے تھے اور کیمرا انہی حصوں کو فوکس کر رہا تھا جو تماش بینوں میں سنسنی خیزی کا سبب بن سکتے تھے۔ اس نے پانی کا گھڑا اپنی کمر اور کولہوں پر بیلنس کیا اور ایک کھیت سے گزرنے لگی۔ اچانک فصلوں میں سے سلطان نمودار ہوا اور فریال گھڑا چھوڑ کے اس سے لپٹ گئی۔ میرا چہرہ گرم ہونے لگا۔ یہ فلمی سین سہی مگر فریال کا یوں سلطان سے ہم آغوش ہونا اور اس کا فریال کے جسم سے کھیلنا میرے نزدیک فحاشی تھی۔ ممکن ہے سین کو سنسر کر دیا جاتا لیکن میں نے سنا تھا کہ پنجابی اور پشتو کی بعض فلموں میں ایسے "ٹوٹے" دوبارہ جوڑ دیے جاتے ہیں اور مقامی حکام کی ملی بھگت سے آن سنسرڈ فلم چلتی رہتی ہے۔

یکلخت میں نے فریال کو اپنے قریب کھڑا پایا۔ میں نے ریموٹ کا بٹن دبا کے ٹی وی کو آف کر دیا۔ وہ ایسے کھڑی تھی جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔"تمہیں یہ سب اچھا نہیں لگا ہوگا؟"

میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔"مجھے معلوم ہے فلموں میں کیا ہوتا ہے۔ آئی ایم سوری کہ میں نے تمہاری اجازت کے بغیر یہ شوٹنگ دیکھ لی۔"

وہ کچھ شرمندہ سی میرے پاس بیٹھ گئی۔"مجھے نیند آ گئی تھی۔"

"اب تم کیسا محسوس کر رہی ہو؟"

"بہت بہتر۔ تم نے کچھ لیا؟"

"ہاں۔ کافی اور چند بسکٹ۔"

"کھانے کا وقت ہو رہا ہے اور مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے۔ میں ابھی آتی ہوں نہا کے اور کپڑے بدل کے۔ تم ٹی وی دیکھو، جو میری آنے والی فلم کا سین تھا۔ دو ماہ بعد فلم ریلیز ہو جاتی......"

"اور یقیناً اس سال کی بہترین فلم قرار پاتی۔ آسکر لیتی۔"

وہ میرے غصے کو نظر انداز کرتی ہوئی باہر نکل گئی۔ میں نے غصے میں ٹی وی کو پھر آن کیا لیکن فریال کا وہ رقص فاسٹ فارورڈ کر دیا۔ فلم کے مختلف سین مختلف مواقع پر ریکارڈ کیے گئے تھے اور الگ الگ سی ڈیز پر تھے۔ میرے نزدیک وہ انتہائی لغو اور لچر فلم تھی جس میں سلطان کسی ہیرو سے زیادہ بدکردار اور احمق نوجوان نظر آتا تھا۔ یہ تمام سین ایڈیٹنگ کے بعد جوڑے جاتے تو شاید کہانی کا بھی کچھ اندازہ ہوتا جو ایسی فلموں میں عموماً نہیں ہوتا۔

اچانک ایک سین پر میں پھر رک گیا۔ مار دھاڑ سے بھرپور ایک سین میں سلطان آٹھ دس بندے گرا چکا تھا اور خالی ہاتھ ہی لاٹھیوں اور کلہاڑیوں والے درجن بھر حملہ آوروں کا مقابلہ کر رہا تھا۔ ایک سین میں سلطان نے حملہ آور سے لاٹھی چھین کے گھمائی تو آگے پیچھے دو بندے گرے۔ ان میں سے ایک وہ تھا جو میری گولی سے مارا گیا تھا اور نہر سے اس کی لاش ملی تھی۔

میں نے ٹی وی بند کر دیا اور تھانہ گڑھی شاہو فون کیا۔ میرا نام سنتے ہی گزشتہ روز والا ڈیوٹی افسر اٹین شن ہوگیا۔"یس سر!"

میں نے کہا۔"کل رات انچارج صاحب نے نہر سے آلۂ قتل برآمد کرنے کے لیے ایک پارٹی بھیجی تھی۔"

"آلۂ قتل تو کوئی نہیں ملا سر جی۔"

"مجھے یہی امید تھی۔" میں نے فون بند کر دیا۔

کھانے کے بعد میں نے کہا۔"فریال! میں تمہارے ساتھ وقت گزارنے نہیں، تم سے کچھ پوچھنے آیا ہوں۔"

"مجھے اندازہ تھا۔"

"تم نے فون پر مجھ سے جھوٹ کہا تھا کہ تم پر خواب آور گولیوں کا اثر ہے، تم نشے میں تھیں؟"

"اگر سمجھتے ہو تو پوچھ کیوں رہے ہو؟" وہ تلخی سے بولی۔

"کیوں ضرورت پڑی تمہیں اس کی۔ کیا تھا جو تم بھول جانا چاہتی تھیں؟ تم نے اپنی حالت دیکھی، تم بیمار لگتی ہو۔"

اس نے ایک گہری سانس لی۔"میں بیمار ہوں۔ میں نفسیاتی مریض ہوتی جا رہی ہوں رفیق۔ یہی حالت رہی تو میں پاگل ہو جاؤں گی۔"

"بغیر وجہ کے تو کچھ نہیں ہوتا فریال! یہ ڈر، خوف اور یہ فرار۔ آخر کس لیے۔ کون سا احساسِ جرم ہے جو تمہیں پریشان کر رہا ہے۔ آخر کیا کیا ہے تم نے فریال؟"

وہ کچھ دیر خلا میں گھورتی رہی۔"میں نے...... سلطان کو قتل کر دیا ہے۔"

بوجھل خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا جس میں فریال بت بنی بیٹھی رہی اور میں اسے دیکھتا رہا۔"مجھے...... یہ اندیشہ تھا۔ یہ سب کیسے ہوا فریال؟"

"بس۔ آہستہ آہستہ وہ اپنا شکنجہ میرے گرد ٹائٹ کرتا گیا۔ میں کہاں تک لڑتی، کیسے مزاحمت کرتی۔ میرے پاس ایک ہی دلیل تھی۔ میں اسے ٹالتی رہی کہ ابھی نہیں، شادی کے بعد۔ لیکن دام میں گرفتار ہرنی کب تک کسی بھوکے بھیڑیے کا مقابلہ کر سکتی ہے۔"

میں نے اسے خاموشی سے روتے دیکھا۔"کیا تمہیں اس کا اندازہ نہیں تھا بے وقوف لڑکی۔"

"وہ عادی شرابی تھا۔ اس نے مجھے بھی پلا دی۔ ہر روز پلاتا رہا۔ جب میں شادی کی بات کرتی تھی تو وہ ہنستا تھا' شادی تو ہو گئی اور کیسی ہوتی ہے شادی۔ تمہاری ہر رات سہاگ رات ہے۔"

اچانک میرے دماغ میں ایک خیال آیا۔"کیا...... اس نے...... ان سہاگ راتوں کی...... فلم بھی بنائی ہوگی؟"

آنسو فریال کے رخساروں پر بہتے جا رہے تھے۔ وہ آہستہ آہستہ ہسٹریا کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میں نے بہتر سمجھا کہ ابھی بات ختم کر دوں۔ میں نے اسے سنبھالا اور پانی پلایا۔ وہ مجھ سے چمٹ کر زار و قطار روتی رہی، ہچکیاں لیتی رہی۔"یہی ہونا چاہیے تھا...... میرے جیسی لڑکی کے ساتھ۔"

آدھے گھنٹے بعد وہ آنسو پونچھ کے اٹھی۔ اس نے الماری میں سے ایک بوتل نکالی اور اپنے لیے جام بھر کے حلق میں انڈیل لیا۔ دوسرا جام بھر کے وہ میرے پاس آ بیٹھی۔"اس سے مجھے سکون ملتا ہے۔"

میں نے کچھ نہیں کہا۔ میں نے اپنی جیب میں سے دو تصویریں نکالیں اور میز پر ڈال دیں۔"انہیں جانتی ہو؟"

اس نے میز پر ایک سرسری نگاہ ڈالی۔"ہاں......"

میں نے کہا۔"تم نے انہیں استعمال کیا۔"

"نہیں، تمہارے پاس یہ تصویریں کہاں سے آئیں؟"

میں نے سختی سے کہا۔"میرے سوال کا جواب دو۔"

"یہ شروع سے سلطان کے ساتھ تھے۔" اس نے ایک جام اور بھرا۔"میں اسے قتل کرنا چاہتی تھی۔ پہلے دن سے۔"

''تم نے سوچا ہوگا کہ اسے فلمی دنیا میں سیڑھی کے طور پر استعمال کروں گی۔ اور جب اوپر پہنچ جاؤں گی تو اسے دھکا دے کر نیچے گرا دوں گی اور یہ تمہارے نزدیک بہت آسان بھی تھا۔''

''غلط سمجھا تھا میں نے۔ خود چودھری سلطان نے اپنی الگ حکمت عملی بنالی تھی کہ اس بار وہ زور زبردستی کے ہتھکنڈے نہیں آزمائے گا۔ وہ سچ مچ میرا دل جیتنے کی کوشش کرے گا اور اپنی عقل کے مطابق اس نے ایسا ہی کیا۔ خوش فہمی سب کو ہو جاتی ہے کہ نہ ممکن کو ممکن بنایا جا سکتا ہے۔''

''چنانچہ تمہارا دل جیتنے کے لیے۔'' میں نے دل پر زور دے کر کہا۔ ''اس نے سب سے پہلے تمہیں ایک کوٹھی گفٹ کی یہاں۔ پھر ایک بیش قیمت کار دے دی۔ کیا یہ غلط ہے کہ اس نے تمہیں ایک طوائف کی طرح سمجھا جس کا دل صرف دولت سے جیتا جاتا ہے۔''

فریال کا رنگ فق ہوگیا۔ کچھ کہنے کی کوشش میں اس کے ہونٹ کپکپا گئے۔ ''ایسا ہی سمجھتی ہے دنیا۔ شوبزنس کی دنیا میں شرافت کی سند کا کیا مطلب...... اور تم اب میرے ساتھ نہیں، دنیا کے ساتھ ہو۔ میں یہ بات بھول گئی تھی۔''

میں نے شرمندگی سے کہا۔ ''آئی ایم سوری۔ میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا۔ میں سلطان کے ذہن کی بات کر رہا تھا۔''

''وہ سب کو ایسا ہی سمجھتا تھا۔'' فریال نے آنکھوں میں آجانے والے آنسو ہتھیلی سے صاف کیے۔ ''اس نے میرے لیے ایک فلم کا اعلان بھی کر دیا۔ یہ خود میں نے اس سے کہا کہ میرے ساتھ وہ خود لیڈ رول کیوں نہیں کرتا۔ میں نے ہی اسے قائل کیا کہ اس میں کیا کمی ہے۔ صلاحیت ہے اور صورت بھی۔ وہ خوشی سے پاگل ہوگیا۔ وہ ہر جگہ میرے ساتھ ٹیلی وژن شوز میں گیا تو خود میں نے کہا کہ اب ہم بہت جلد شادی بھی کرلیں گے۔ میرے کہنے پر یہ سوال ایک صحافی نے کیا تھا کہ آپ کی منگنی کا کیا ہوا؟ میری بات نے سلطان کو سچ مچ دیوانہ کر دیا۔''

میں نے کہا۔ ''ایک منٹ۔ کیا اس نے کبھی تم سے نہیں پوچھا کہ تم اتنا عرصہ رفیق کے ساتھ گزارنے کے بعد لوٹ کر میرے پاس ہی کیوں آئی ہو؟''

''پوچھا تھا۔ اور میں نے بتا دیا۔''

''کیا بتا دیا؟''

میں نے کہا۔ ''رفیق پہلے مجھ سے یقیناً محبت کرتا تھا لیکن اب وہ نواب رفیق ہے۔ اس نے نوابی طور طریقے اختیار کر لیے ہیں۔ پورا حرم آباد کر لیا ہے۔''

''تم نے کہا ہوگا۔ اس نے ایک دوست کی بیوی ہتھیالی۔ اس کی کزن وہیں ہے۔ ایک کنیز ہے ریشم۔''

وہ رونے لگی۔ ''مجھے معاف کر دو۔ میں پاگل ہوگئی تھی۔''

میں نے کہا۔ ''شرم آنی چاہیے تمہیں فریال! خیر۔ یہ ساری باتیں چھوڑو۔ تم نے اسے کیسے قتل کیا؟''

''اسے خود میں نے قتل نہیں کیا۔ میں نے یہ قتل کروایا، کسی اور سے۔''

''کس سے......؟ رانا رجب علی سے؟''

وہ کچھ دیر خاموش رہی۔ ''جب میں نے جسمانی تعلق کے معاملے میں مزاحمت کی تو اس کا رویہ بدلنے لگا۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ نکاح کے دو بول کیا، جب چاہیں گے پڑھوا لیں گے۔ تم کہتی ہو تو ابھی بلا لیتے ہیں ایک ملا اور دو گواہ۔ پھر ایک حد ایسی آگئی کہ اس نے زبردستی کی اور کرتا رہا۔ میں نے اپنی حفاظت کے لیے جتنے بھی انتظامات کیے تھے، سب بے مصرف ثابت ہوئے۔ اس کے بعد معاملہ الٹا ہوگیا۔ میں اس کی منت کرتی رہی کہ مجھ سے شادی کرلو۔ اور وہ مجھے ذلیل کرتا رہا کہ میرے جیسا خاندانی آدمی کسی ایکٹرس یا ماڈل سے شادی کر سکتا ہے! ہم تو شوقین مزاج لوگ ہیں۔ شوبزنس کی دنیا میں دل بہلانے جاتے ہیں۔ آٹھ سالوں میں جتنا بے عزت میں نے اسے کیا تھا۔ اس سے کہیں زیادہ بے عزت میں ہوئی۔ اور اس کے بعد میرے لیے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ میں اس کو جان سے مار دوں۔ خود میرے لیے یہ کام مشکل ہوتا۔ میں نے اس کے لیے لوگ تلاش کیے۔''

''یعنی کرائے کے قاتل؟''

''تم کہہ سکتے ہو۔ ان کی سلطان سے دشمنی بھی چل رہی تھی۔ ان کے پاس سلطان کو قتل کرنے کی ایک وجہ پہلے سے موجود تھی۔''

''کون تھے وہ لوگ؟''

''وہ نہیں، ابھی جن کی تصویریں تم نے مجھے دکھائیں۔ یہ دو بھائی ہیں نصیر گجر اور بشیر گجر۔ نام سے تم اندازہ کر سکتے ہو کہ آغاز میں وہ گوالے تھے۔ بھینسوں کے کاروبار میں دولت مند ہوگئے۔ کروڑ پتی بن گئے۔ اس کے بعد ہیرا منڈی کے کوٹھے چھوڑ کے انہوں نے تفریح کے لیے فلمی دنیا کا رخ کیا اور چودھری سلطان کے ہتھے چڑھ گئے۔ اس نے تاڑ لیا کہ ان سے مال کیسے کھینچا جا سکتا ہے۔ اس نے انہیں نئی نئی لڑکیاں دکھائیں اور پیش بھی کر دیں۔ کچھ پرانی تھیں مگر ان بے وقوفوں کو کیسے پتا چل سکتا تھا۔ پھر چودھری سلطان نے ترپ کا پتا نکالا۔ میرے جیسی ایک شریف خاندان کی پڑھی لکھی اور بہت خوبصورت لڑکی سامنے کر دی کہ فلم بناؤ۔ یہ

ہے تمہاری ہیروئن مگر اسے ایسی ویسی لڑکی مت سمجھنا۔ انہوں نے تو چودھری سلطان کو اپنا دوست، مشیر اور مرشد سب کچھ مان رکھا تھا۔ فوراً فلم سائن کر لی۔ ایڈوانس بھی دے دیا گیا۔ ڈائریکٹر خود چودھری سلطان صاحب ہوئے۔ شوٹنگ شروع ہوئی اور ختم ہوگئی۔ لڑکی خراب ہو کے اپنے گھر گئی۔ گجر برادران فلم کی تین ریلوں کے ساتھ پھکو ہو کے واپس اپنی بھینسوں کی دنیا میں گئے اور پھر دودھ بیچنے سے شروع کیا مگر ان کی سمجھ میں آگیا کہ انہیں لوٹا گیا ہے اور لٹیرا ہے چودھری سلطان۔ ان کا کچھ جھگڑا ہوا۔ مار پیٹ تک نوبت پہنچی مگر پولیس نے معاملہ رفع دفع کرا دیا۔ میں نے انہی سے رابطہ کیا اور صاف بات کی۔ ہمارا دشمن ایک ہے۔ مقاصد ایک ہیں۔ میں یہ کام نہیں کر سکتی، تم کرو تو تمہارا نقصان میں پورا کروں گی لیکن یہ سمجھ لینا کہ تم نے کہیں بات کی تو میری طرف سے صاف انکار ہوگا۔ ان کے پاس لاہور میں دس مرلے کا ایک مکان تھا، کہیں مغلپورہ کی طرف۔ میں نے کہا کہ مجھے یہ کوٹھی بیچنی ہے۔ اس کی قیمت کم سے کم بھی پچاس لاکھ ہے۔ تمہارا مکان زیادہ سے زیادہ دس لاکھ کا ہوگا۔ ہم باہمی رضامندی سے ایکسچینج کر لیتے ہیں۔ تمہیں چالیس لاکھ مل جائیں گے۔ یہ رقم اتنی بڑی تھی کہ وہ انکار کر ہی نہیں سکتے تھے۔''

''انہوں نے چودھری سلطان کو کیسے قتل کیا؟''

''میں نے ان سے کہا کہ تمہیں وہی کرنا ہے جو میں کہوں۔ انہی دنوں میں رانا رجب علی اور چودھری سلطان کے درمیان رابطے ہو رہے تھے۔ میں تمہیں اس بارے میں بتا چکی ہوں۔ میں اسے اتفاق نہیں سمجھ سکتی تھی۔ چودھری سلطان تو عادت کے مطابق سمجھ رہا تھا کہ ایک مرغا اور پھنسا۔ مگر رانا کا اس کے پاس آنا مجھے کھٹکا۔ جب میں نے غور کیا تو حقیقت خود بخود سامنے آگئی۔ رانا کا فلمسازی سے دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ لیکن اس کی تم سے دشمنی سب پر عیاں تھی۔ میں نے سوچا کہ کیا وہ سلطان کو تمہارے خلاف استعمال کر سکتا ہے۔ کر سکتا ہے تو کیسے؟ اور جواب بھی خود سامنے آگئے۔ تمہاری اور چودھری سلطان کی رقابت پر مبنی دشمنی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی۔ اگر وہ چودھری سلطان کو قتل کرا دے تو کون پکڑا جا سکتا ہے؟ خصوصاً ان حالات میں کہ لاش بھی ست بدھائی سے ملے اور خود پولیس برآمد کرے۔ آلہ قتل وہ خود فراہم کر لیتے ہیں اور وجہ قتل سب کے سامنے ہوگی تو نواب رفیق کے گلے میں پھانسی کا پھندا پڑنے سے کون بچائے گا۔ اس کے بعد میں نے رانا سے بات کی۔''

میں نے کہا۔ ''میں اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ تمہارا ذہن اس حد تک سازشی ہے۔''

اس نے ایک آہ بھری اور بوتل انڈیل کر اپنے لیے ایک اور جام بھرا۔ ''وقت سب سے بڑا استاد ہے۔ تم اپنی مثال لو نواب رفیق۔ کیا تم نے سوچا تھا کہ کبھی رانا رجب علی جیسے مکار اور عیار شخص کو ناکوں چنے چبوا دو گے؟ وقت آنے پر تم نے وہ کر دکھایا جو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔''

''تم نے رانا کو بلایا؟''

''نہیں، وہ سلطان سے ملنے آیا تھا اور سلطان کو اچانک لاہور جانا پڑ گیا تھا۔ میں نے اسے بٹھایا۔ ظاہر ہے وہ مجھے جانتا تھا۔ میں نے باتوں باتوں میں پوچھا کہ آپ کے دشمن کی گڈی تو بہت اونچی ہوا میں اڑ رہی ہے۔ اس نے کہا کہ آپ کا تو محسن تھا آپ کو خوش ہونا چاہیے۔ میں نے کہا کہ وقت بدل گیا ہے رانا صاحب۔ کل کے محسن آج کے دشمن اور آج کے دشمن کل کے محسن۔ دنیا کی یہی ریت ہے۔ وہ بولا کہ مس فریال۔ آپ دیکھنا اس گڈی کو میں کیسے ہتھے پر سے کاٹتا ہوں۔ ڈولتی ہوئی سیدھی آپ کے قدموں میں آکر گرے گی۔ میں نے کہا کہ رانا صاحب۔ آپ پہلے ہی پھنسے ہوئے ہیں۔ ایسا نہ ہو، دوسرا پاؤں بھی دلدل میں رکھ دیں۔ بندوق ہمیشہ دوسرے کے کندھے پر رکھ کے چلانی چاہیے۔ وہ حیران ہو کے بولا کہ بی بی تم تو بڑی سیانی باتیں کرتی ہو، اپنی عمر کے حساب سے۔ صاف کہو جو کہنا ہے۔ میں نے کہا کہ ہم دونوں ایک تیر سے دو شکار کر سکتے ہیں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ چودھری سلطان کی نواب رفیق سے دشمنی تھی۔ اور دشمنی کی وجہ تھی میں۔ ایک سے میں نے پیچھا چھڑا لیا۔ لیکن آسمان سے گری تو کھجور میں اٹک گئی۔ سلطان سے پیچھا چھڑانا مشکل ہوگیا ہے۔ وہ بولا کہ میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں، حکم کریں۔ میں سمجھ گئی کہ خود اس کے دماغ میں پہلے سے کوئی پلان تھا لیکن اب وہ چاہتا ہے کہ میں پہلے بولوں۔ میں نے کہا کہ رانا صاحب۔ فرض کریں چودھری سلطان غائب ہو جائے یا اغوا ہو جائے۔ اغوا کرنے والے اسے آپ کے پاس پہنچا دیں۔ آپ پر الزام آنے کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔ آپ بھی اسے غائب کر دیں۔ وہ چکرا گیا۔ کہنے لگا کہ میں ذرا موٹی عقل کا آدمی ہوں، ذرا کھل کے بات کرو۔ میں نے کہا کہ رانا صاحب! نواب رفیق کا دشمن آپ کے قبضے میں، فائدہ اٹھائیں۔ اسے مار کے ست بدھائی میں گاڑ دیں جہاں سے اسے پولیس برآمد کرے، اس میں کیا مشکل ہے۔ آگے میں سنبھال لوں گی کہ مجھے نواب رفیق پر شک ہے۔ جب لاش برآمد ہو جائے گی تو قتل عمد کا کیس خود بخود اس کے خلاف درج

ہو جائے گا۔ رانا تمہاری دشمنی میں اندھا اور پاگل ہو رہا تھا۔ کہنے لگا کہ کڑ یے۔ تو نے اپنا کام ٹھیک کیا تو باقی مجھ پر چھوڑ۔ اس نواب کے نطفے نے میری زندگی عذاب کر رکھی ہے۔ بس اس کے بعد ایسا ہی ہوا۔ میں نے ایک دن گجر برادران کو بلایا۔ میری نتھیا گلی میں شوٹنگ چل رہی تھی لیکن یہ معلوم ہوا کہ رانا مجھ سے ملنے آ رہا ہے۔ وہ مجھے سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ چیک کرنا چاہتا تھا کہ میں کہاں ہوں اور کس کے ساتھ ہوں۔ واقعی نتھیا گلی میں شوٹنگ کر رہی ہوں یا مری میں کسی کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہی ہوں۔ گھر کی ایک خادمہ نے مجھے فون پر بتایا کہ چودھری صاحب گھر سے نکلے ہیں، آپ ہوشیار رہیں۔ غالباً خادمہ کو بھی ڈر تھا کہ میں کہیں اور نہ پکڑی جاؤں مگر مجھے ڈرنے کی کیا ضرورت تھی۔ گجر برادران اشارے کے منتظر تھے۔ انہوں نے مری کے راستے میں ہی چودھری سلطان کو اٹھالیا۔ اس کی کار واپس لا کے گھر میں کھڑی کی اور چودھری سلطان کو لے جا کے رانا رجب علی کی خدمت میں پیش کر دیا، کسی کے ذریعے۔"

"گویا تم نے سب کو بے وقوف بنایا۔" میں نے کہا۔

فریال نے ایک گہری سانس لی۔ "سوائے تمہارے۔ تمہیں میں نے خبردار کر دیا تھا کہ رانا کیا کر سکتا ہے۔ گجر برادران، رانا رجب علی اور میں۔ ہم سب کا ایک ہی مقصد تھا، چودھری سلطان سے اپنا حساب برابر کرنا۔ لیکن ہر ایک یہ سمجھ رہا تھا کہ الزام اس پر نہیں آ سکتا۔"

"اور اس کے بعد رانا نے وہی کیا جو کہا تھا۔" میں نے اٹھ کر ٹہلتے ہوئے کہا۔

"ہاں، مجھے معلوم ہو گیا تھا۔"

میں نے پلٹ کے کہا۔ "کیسے معلوم ہو گیا تھا؟"

"خود اس نے بھی بتایا تھا اور میں نے اپنے ذرائع سے بھی معلوم کر لیا تھا۔"

میں ایک دم رک کر اس کے سامنے جھکا۔ "کیا؟ کیا پتا چلا تھا تمہیں؟ ست بدھائی میں کہاں تھی وہ جگہ؟ کیا کسی نے شناخت کیا تھا اسے؟" میری آواز چلانے کی حد تک بلند ہوگئی۔

"آخر کیا مطلب ہے تمہارا؟"

میں نے چلا کر کہا۔ "تم ایک بے وقوف عورت ہو لیکن خود کو بہت چالاک اور عقلمند سمجھتی ہو۔ رانا سے اور سلطان سے بھی بڑھ کر۔ لیکن ہو تم وہی ناقص العقل مخلوق۔"

وہ پھر چلائی۔ "آخر کیا مطلب ہے تمہارا؟"

میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ "کیا تم مجھے وہاں لے جا سکتی ہو جہاں تمہارے یقین کے مطابق۔ رانا نے چودھری سلطان کو مار کے گاڑا؟ دیکھی ہے تم نے وہ جگہ۔ اس کی نشاندہی کر سکتی ہو؟"

"ہاں، گجر برادران خود تو نہیں مگر ان کے بندے وہاں موجود تھے۔ انہوں نے مجھے فون کر کے بتایا کہ انہوں نے غنی کو وہ جگہ دکھا دی ہے اور غنی نے کہا ہے کہ......"

"جھوٹ بولا انہوں نے تم سے۔" میں نے دھاڑ کے کہا۔ "غنی کو کسی نے کچھ نہیں بتایا۔ اور جھوٹ اس لیے بولا کہ وہ وہاں گئے ہی نہیں ہوں گے۔ گجر برادران کی تو خوف سے حالت خراب ہوگی۔ مگر ان کے بندوں نے بھی جائے واردات سے دور ہی رہنا بہتر سمجھا ہوگا۔ انہوں نے جھوٹ بول کے کام چلایا......"

"مگر...... مگر غنی نے اسی جگہ سے لاش نکال لی تھی۔"

"جھوٹ، بکواس۔ غنی نے اس جگہ سے ایک لاش ضرور نکالی تھی مگر تم نے کورٹ میں سن لیا، وہ لاش چودھری سلطان کی نہیں تھی۔ اس کے بہن بہنوئی نخص تمہارے جھوٹ پر قربان ہو گئے۔ انہیں سچ بولنے کی سزا ملی۔ انہیں کسی ہتھوڑا گروپ نے نہیں، انہی لوگوں نے مارا جو یہ چاہتے تھے کہ وہ جھوٹ بولیں۔ بہن کہہ دے کہ یہ لاش میرے بھائی کی ہے۔ انہیں لالچ بھی دیا گیا اور دھمکی بھی دی۔ کل یہ سب تم نے دیکھا اور سنا۔ کیا تمہیں معلوم ہے انہوں نے جھوٹ کیوں نہیں بولا۔ سچ کے بدلے اپنی جان دینا کیوں قبول کیا؟"

فریال میری صورت دیکھتی رہی اور روتی رہی۔

"میں نے ان کی گواہی خرید لی تھی فریال۔ میں نے ان کو دس دس لاکھ کے دو چیک دیے تھے کہ وہ عدالت میں جھوٹ بول دیں۔ اس وقت تک مجھے بھی یقین تھا کہ وہ لاش چودھری سلطان کی ہے۔ میں نے کہا تھا کہ تم انکار کر دو۔ کہہ دو کہ لاش میرے بھائی کی نہیں ہے۔ وہ ڈرتے تھے۔ میں نے کہا کہ تم میرے ساتھ چلو۔ فاضل بھٹی ایک ٹیچر تھا۔ میں نے اسے تمام عمر کے لیے اپنے ست بدھائی کے اسکول میں دگنی تنخواہ پر ملازمت آفر کی تھی۔ اور وہ مان گئے تھے مگر انہیں جھوٹ بولنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ جیسا کہ تم نے خود عدالت میں سنا اور دیکھا۔ مجھے بچایا ان دو خدا ترس حق پرست مولوی سالے بہنوئی نے اور تمہیں بھی۔ معلوم نہیں اب ان کا کیا انجام ہوگا۔ ادھر دیکھو، یہ کیا ہے؟"

فریال نے ان لہورنگ کاغذ کے ٹکڑوں کی طرف دیکھا جو میرے ہاتھ میں تھے۔ یہ دس دس لاکھ کے چیک تھے۔

"یہ تھی وہ قیمت جو میں نے مدعی اور اس کی بیوی یعنی سلطان کی بہن کی گواہی خریدنے کے لیے ادا کی تھی۔ مجھے

نہیں معلوم کہ لاش سچ مچ اس کی ہوتی، چودھری سلطان کی تو وہ کیا کرتے۔ لیکن مردہ خانے میں جا کے دیکھو کبھی۔ وہ قبرستان سے بھی زیادہ عبرت آموز جگہ ہے۔ آدمی قبر کے کنارے کھڑا ہو کے جھوٹ بول سکتا ہے۔ مردہ خانے میں یہ ممکن ہے۔ صنوبر کو ایسا جھوٹ بولنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ اس نے وہ کہہ دیا جو سچ تھا اور اس پر قائم رہی۔ مرنے سے پہلے اس سے جو نزاعی بیان منسوب کیا گیا تھا وہ جعلی تھا۔ اس نے میرے سامنے دم توڑا تھا اور یہ بیس لاکھ کے چیک اس نے مجھے لوٹا دیے تھے۔ یہ اسی کا خون ہے فریال جو آج میری اور تمہاری رہائی کا سبب بنا۔"

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا جس میں خادمہ نے دروازے سے جھانک کے ڈرتے ڈرتے کہا۔ "کھانا تیار ہے میڈم!" اور فریال کے اشارے پر واپس چلی گئی۔

"چودھری سلطان زندہ ہے فریال۔" میں نے کہا۔

اس نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا۔ "مجھے...... تھوڑی سی پینے دو پلیز......" اس نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

مجھے اس کی حالت پر رحم آ گیا۔ وہ آہستہ سے اٹھی اور پھر ایک کیبنٹ تک گئی جس میں مختلف رنگ کی شراب کی بوتلیں سجی ہوئی تھیں۔ اس نے ایک بوتل کو منہ سے لگایا اور کچھ شراب حلق سے اتار کے واپس رکھ دی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ نشے کی عادی ہو چکی ہے۔

"سب نے مجھے دھوکا دیا...... سب نے۔"

میں نے کہا۔ "یہ مردوں کی دنیا ہے، اسے تم اپنی مرضی سے چلانا چاہتی تھیں اور وہ بدمعاش مردود تھے۔"

"جب مجھے اندازہ ہوا کہ چودھری سلطان مرا نہیں۔ اور میرا پلان فیل ہو گیا ہے۔ تو میں گھر سے بھاگ کے ہوٹل میں جا چھپی تھی۔ میں بہت ڈری ہوئی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں۔"

"بات سیدھی سی ہے فریال۔ تم نے یہ موقع فراہم کیا اور میرے دو دشمن مل گئے۔ معلوم نہیں انہوں نے کیسے سلطان کے کپڑے پہنائے اور ست بدھائی میں گاڑ دیا۔ اور پولیس کو بھی مطلع کر دیا کہ لاش کہاں سے برآمد ہوگی۔ یہ تو بچانے والے ہاتھ کا کمال ہے جو مارنے والے ہاتھ سے زبردست تر۔ اس نے غنی کو وسیلہ بنا دیا اور پولیس وہاں سے کوئی لاش نہ برآمد نہ کر سکی۔ جو لاش ہم نے دریافت کی تھی وہ غنی نے اور پولیس تک پہنچا دی تھی۔ اس یقین کے ساتھ کہ وہ سلطان کی لاش ہے۔ عدالت میں پھر غیب سے نمودار ہونے والے دو فرشتوں نے جھوٹ کو جھوٹ ثابت کر کے مجھے اور تمہیں بچا لیا۔ لیکن کیا تم نے سوچا ہے کہ کہانی آگے کیسے چلے گی؟"

فریال پر نشہ غالب آ رہا تھا۔ وہ ہنسنے لگی۔ "کون سی کہانی؟"

میں نے کہا۔ "کیا چودھری سلطان تمہیں بخش دے گا؟ جو سازش تم نے اس کے خلاف تیار کی تھی، اس کی تمہیں کوئی سزا نہیں دے گا؟"

"مگر وہ ہے کہاں؟"

"کہیں تو ہے۔ ہو سکتا ہے وہ رانا رجب علی کی قید میں ہو۔ جب تک اس کا سراغ نہیں ملتا۔ تمہاری پوزیشن مشکوک رہے گی اور میری بھی۔ تم اپنی حفاظت کا بندوبست کرو۔ پرانے سیکیورٹی گارڈ ہٹا دو۔ ممکن ہے وہ سلطان سے ملے ہوئے ہوں۔"

"میری مدد کرو رفیق! پلیز۔"

میں نے کہا۔ "آئی ایم سوری فریال۔ اب یہ ممکن نہیں۔ نہ تم لوٹ کے ست بدھائی جا سکتی ہو، نہ میں تم سے کسی جذباتی وابستگی کا اظہار کر سکتا ہوں۔ وہ وقت گزر گیا۔ ہمیں یہی ظاہر بھی کرنا ہے کہ اب ہمارا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں۔"

"وہ...... وہ مجھے چھوڑے گا نہیں رفیق۔"

"اسی لیے میں نے کہا ہے کہ اپنی حفاظت کرو۔ سلطان کب تک غائب رہ سکتا ہے۔ ایک نہ ایک دن وہ سامنے آئے گا۔"

"کیا پتا' وہ ملک چھوڑ کے ہی چلا گیا ہو۔"

میں نے حیرانی سے کہا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"اس کے لیے راستے بند ہوتے جا رہے تھے۔ صرف وہ گجر برادران ہی نہیں، اس کی جان کے دشمن اور بھی تھے۔ جن سے وہ ہر وقت خائف رہتا تھا۔ وہ رانا کی منت سماجت کر کے نکل گیا ہو۔ اس نے اندازہ کر لیا ہو کہ یہ گجر برادران اب اسے چھوڑیں گے نہیں۔"

"مگر...... اس کا بزنس...... زمین جائداد؟"

فریال ہنسی۔ "کون سا بزنس، کیسی زمین اور جائداد۔ باپ نے سب کچھ تو ٹرسٹ کے حوالے کر دیا تھا۔ نہ کرتا تو عیاش بیٹا سب اڑا دیتا۔ سلطان کے پاس تھا بھی کیا۔ جو اس کے نام تھا یا اس کی بیوہ کے نام۔ وہ سب اس کی شوقین مزاجی کی نذر ہو گیا تھا۔ وہ مقروض تھا اور اس کے قرض خواہ معمولی لوگ نہیں تھے۔"

فریال کی بات نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ "اگر ایسا

ہے تو یہ تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟“

اس نے ترنگ میں کہا۔ ”تم نے پوچھا ہی کب۔“

اس کی ملازمہ نے دوبارہ یاد دہانی کرائی کہ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے تو فریال اٹھی۔ ایک بار لڑکھڑائی مگر سنبھل گئی۔ وہ ظاہر یہی کرنا چاہتی تھی کہ اس پر نشہ غالب نہیں ہے لیکن اس کی حرکات و سکنات میں ربط نہیں تھا اور نشہ اس کی آنکھوں میں اترا ہوا تھا۔

میرا ساتھ دینے کے لیے اس نے تھوڑا بہت کھایا لیکن بڑی بے رغبتی سے۔ میں نے فریال کی بات پر غور کیا تو امکانات کے نئے در کھلتے چلے گئے۔ بالکل...... یہ عین ممکن تھا کہ گجر برادران نے سلطان کو وعدے کے مطابق رانا کے حوالے کر دیا ہو۔ گجر برادران کو اپنے نقصان کی فکر زیادہ تھی۔ فریال نے مجھے پہلے بھی بتایا تھا کہ وہ لاہور میں کسی سے یہ پراپرٹی ایکس چینج کر رہی ہے۔ یہ آج معلوم ہوا کہ وہ خریدار کون تھے۔

رانا کے پاس پہنچ جانے کے بعد سلطان نے ضرور پوچھا ہوگا کہ گجر برادران اگر مجھے اپنے نقصان کا ذمے دار سمجھتے تھے اور اسی لیے میرے دشمن ہو رہے تھے تو انہوں نے مجھے آپ کے پاس کیوں پہنچایا؟ کیا آپ نے انہیں اس کی کوئی قیمت ادا کی تھی؟ اور ادا کی تھی تو کیوں؟ یہ بڑے فطری اور منطقی سوالات تھے۔ شاید رانا نے جواب بھی بتا دیا ہو کہ میری تمہارے ساتھ کیا دشمنی اور یہ کام کرنا ہوتا تو میں خود ہی کر سکتا تھا۔ مجھے کیا پڑی تھی کہ کسی کو پیسے دے کے تمہیں اغوا کرواؤں۔ یہ کارِ خیر سرانجام دینے والی خیر سے تمہاری اپنی محبوبۂ دلنواز، منگیتر۔ لاکھوں دلوں کی دھڑکن۔ ادائے حسن کی معصومیت کا شاہکار۔ اور تمہارے رقیبِ روسیاہ نواب رفیق کی زوجیت کی آس میں آٹھ سال گنوا کے ماڈل اور ایکٹرس بن جانے والی مس فریال ہے۔

سلطان پر چودہ طبق روشن ہو گئے ہوں گے۔ حقیقت بعض اوقات اتنی ہی سفاک ہوتی ہے۔ خود میرے دل نے کب مانا تھا کہ فریال مجھ سے محبت ضرور کرتی تھی۔ لیکن ایسی نہیں کہ میرے ساتھ ست بدھائی کے ویرانے میں خوش رہ سکے۔ روایتی فلمی ہیروئن تو ناچ گا کے کہہ سکتی ہے کہ چل چلیے دنیا دے اس نکرے جتھے بندہ نہ بندے دی ذات ہووے۔ مگر فریال میرے ساتھ لندن پیرس میں رہنا چاہتی تھی یا مجھے اپنے ساتھ فلم نگری کی چکاچوند میں لے جانا چاہتی تھی اور جب اس نے دیکھا کہ یہ کسی طور ممکن نہ ہوگا تو اس نے ٹاٹا بائی بائی کہا اور میری دنیا سے واک آؤٹ کر گئی۔

پھر میرے دونوں دشمنوں نے ایک دوسرے کے سامنے فریال کی ساری سازش کو بے نقاب کر دیا اور ایک یا ایک سے زیادہ عقلمندی کے فیصلے کیے۔ پہلا یہ کہ فی الحال سلطان غائب ہو جائے۔ ملک سے فرار ہو کے پھر لندن جا بیٹھے۔ اسے تمام خطرات، قرض خواہوں اور بدخواہوں سے نجات مل جائے گی۔ رانا صاحب یہ کریں کہ سلطان کے لباس میں کوئی سلطان کے قد و قامت کا بندہ ست بدھائی کی حدود میں دفن کرا دیں اور کچھ انتظار کریں کہ وہ مٹی میں مل جائے۔ سلطان کے غائب ہونے کا شک خود بخود فریال پر جائے گا یا مجھ پر۔ پھر کسی مناسب وقت پر پولیس لاش برآمد کرے، اسے چودھری سلطان قرار دلوائے اور مجھے پکڑے۔ ہوالمطلوب۔

اب رہی اس فاحشہ فریال کی بات جو خود کو اس کرمنل پلان کا ماسٹر مائنڈ سمجھتی ہے۔ اس سے عبرت آموز انداز میں نمٹنے کی کوئی جلدی نہیں۔ طے شدہ طور پر مجھے کوئی فوری خطرہ محسوس نہیں ہو سکتا تھا۔ سلطان میری جان لینے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتا تھا اور جب فریال اس کے پاس لوٹ آئی تو گویا فساد کی جڑ ہی نہ رہی۔ رانا کے ساتھ معاملات چلتے رہیں گے۔ انہوں نے اخبارات میں عدالتی کارروائی ملاحظہ کر لی ہوگی اور انہیں کہا بھی گیا ہوگا کہ کسی نامعلوم بدبخت کو چودھری سلطان قرار دلوانے کی اسکیم تو فیل ہو گئی۔ بہن بہنوئی کی زبان ہتھوڑا گروپ سے بند کرائی تو نہ جانے کہاں سے دو مولوی قسم کے سالہ بہنوئی نمودار ہو گئے۔ چلو ایک ناکامی سے کیا ہوتا ہے۔ یار زندہ صحبت باقی۔ نواب رفیق احمد شیرازی آف ست بدھائی۔ تم سے نمٹنے کے نہ راستے بند ہوئے ہیں نہ طریقے ختم ہوئے ہیں۔

فریال کے مستقبل کا فیصلہ خود فریال کو کرنا تھا۔ میں نے اسے سمجھا دیا کہ وہ کسی صورت محفوظ نہیں۔ رانا سے اس کو براہِ راست کوئی خطرہ نہیں لیکن چودھری سلطان اسے سزا دیے بغیر نہیں چھوڑے گا۔ اگر اسے فلمی دنیا میں رہنا ہے تو پھر چوکس رہنا ہوگا۔ میں اسے صرف مشورے دے سکتا تھا کہ وہ اپنی رہائش بدل دے۔ محافظ بدل دے۔ محتاط رہے اور چودھری سلطان کی گولی سے بچے۔ ایسی آخری بات سے زیادہ فضول بات کیا ہو سکتی ہے۔ کیا لیاقت علی خاں مرحوم سے جان ایف کینیڈی تک کوئی اس ایک گولی سے بچ سکا ہے جس پر ان کا نام ہو؟

میری نصیحتوں نے فریال کو مزید خوفزدہ کیا۔ میرے منع کرنے کے باوجود اس نے اور پی۔ شراب سر میں چڑھی تو اس نے بولنا شروع کیا۔ نشے میں زبان سے خود بخود سچ نکلا

ہے کیونکہ پاسبانِ عقل تو مدہوش پڑا ہوتا ہے۔ وہ روتی رہی اور اس نے مجھے اتنا مجبور کیا کہ میں رات وہیں رک گیا۔ میں نے راجا کو مطلع کر دیا کہ فریال کی حالت ایسی نہیں کہ میں اسے چھوڑ کے آسکوں۔

راجا کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ اعتراض نور کو ہوا۔ میں نے سارا دن باہر گزار دیا تھا۔ اس کی گاڑی میرے پاس تھی چنانچہ اسے انتظار تھا کہ کسی بھی وقت میں اس کی گاڑی واپس لے کر ضرور آؤں گا۔ ادھر میرے ذہن میں یہ تھا کہ کسی وقت کلفٹن روڈ جا کے کسی اچھے کار ڈیلر سے بات کروں۔ اسے تھانے میں کھڑی ہوئی اپنی گاڑی دکھاؤں اور وہ مناسب قیمت لگائے تو بدلے میں کوئی اچھی سی گاڑی خرید لوں لیکن دن سارا فریال کو سمجھاتے سمجھاتے گزر گیا۔

رات دس بجے بالآخر نور کا فون آ گیا۔ ''کہاں ہیں سرکار! اور کتنا انتظار کرائیں گے؟''

میں نے کہا۔ ''آئی ایم سوری نورا!''

''کیا سوری۔ دن میں کچھ کھایا نہیں اور شام کو سوچا تھا کہ اگر تم مان گئے تو کسی چاندنی لاؤنج میں بوفے کریں گے۔ پہلے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے، اب چوہے کھا کے ایک بلی دوڑ رہی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''نورا! تم کھانا کھالو۔ میں آج نہیں آسکوں گا۔''

اس کا موڈ ایک دم خراب ہو گیا۔ ''کیوں، کسی حوالات میں بند ہو؟''

''نہیں، یہ بات نہیں۔''

''اب ضرور تم کوئی جھوٹ بولو گے۔ سچ ہوتا تو اب تک بتا چکے ہوتے۔''

میں نے کہا۔ ''میں فریال کے ساتھ ہوں۔ اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔''

''طبیعت رات بھر میں ٹھیک ہو جائے گی نا۔ اچھے عیسیٰ ہو مریضوں کا خیال اچھا ہے۔ خیر میری طرف سے این او سی۔ ہاں سزا ضرور دوں گی۔''

''اس کا تمہیں اختیار ہے۔ مجھے ہر سزا قبول ہو گی۔''

''تمہیں نہیں، اپنے آپ کو۔ اب میں کھانا کھائے بغیر ہی سو جاؤں گی، احتجاجاً۔ مجھے بھوکا رکھنے کے ذمے دار تم......'' اس نے فون بند کر دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اب وہ بات نہیں کرے گی اور اس کا فون بند ہی ملے گا۔

فریال کے ذہنی انتشار کا مجھے خوب اندازہ ہو گیا تھا۔ گھر کے باہر مسلح گارڈز کھڑے تھے۔ اندر خدمت کے لیے ملازم تھے۔ ڈرائیور بھی سرونٹ کوارٹر میں ہی رہتا تھا۔ اس کے باوجود وہ خوفزدہ تھی۔ اسے یہ احساس پریشان کر رہا تھا کہ چودھری سلطان زندہ ہے اور اب نہ جانے کب فرشتۂ اجل کے روپ میں نمودار ہو جائے۔ وہ ایک سفاک اور بے ضمیر آدمی تھا۔ اس کا فریال کو خوب تجربہ تھا۔

شراب کا عادی اسے سلطان نے بنایا یا اس ماحول نے جس میں اس کے روز و شب گزر رہے تھے۔ آدمی خود اندر سے کمزور نہ ہو تو باہر سے اس پر برائی کیسے اثر انداز ہو سکتی ہے۔ وجہ کچھ بھی ہو، اب وہ شراب کو ذہنی اور اعصابی سکون کا ذریعہ سمجھنے پر مجبور تھی۔ غالب کی زبان میں۔

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

ایک وقت آئے گا جب وہ شراب نہیں پیئے گی۔ شراب اسے پیئے گی۔ اور کچھ عجب نہیں کسی زیادہ تباہ کن نشے کی لت اسے لے ڈوبے۔ شو بزنس کی دنیا میں مارلن منرو سے لے کر مائیکل جیکسن تک اپنی تمام شہرت اور دولت کے باوجود محض سکون کی تلاش میں اس لت کا شکار ہوئے۔

مجھے فریال کے مستقبل کی فکر ضرور تھی لیکن میں اس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اسے تحفظ کی یقین دہانی میں کیسے کراتا۔ وہ اعتماد سے محروم ہو چکی تھی اور اسے بہت جلد نفسیاتی معالج کی ضرورت بھی پڑ سکتی تھی۔ میں اس کے لیے دکھی ضرور تھا لیکن بے چین نہیں تھا...... ست بدھائی کی بے رونق زندگی سے اکتا کے اس چکا چوند کی دنیا میں وہ اپنی مرضی سے آئی تھی۔

صبح وہ ہنوز گہری نیند میں تھی کہ میں نے خاموشی سے نکل جانے کا فیصلہ کیا۔ اس کی خادمہ نے مجھے روکا کہ میں ناشتا کر لوں لیکن نہ جانے کیوں میں خود اب فریال کے معاملات میں زیادہ انوالو ہونے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس نے اپنے لیے جو راستہ منتخب کیا تھا اس پر نہ میں فریال کا ساتھ دے سکتا تھا اور نہ اسے اس راستے سے واپس لا سکتا تھا۔

جب میں باہر نکل رہا تھا تو ایک کار اندر آئی۔ میں رک گیا۔ دوسری کار میرے قریب سے گزر کے رکی اور اس میں سے شہزاد اترا۔ چند لمحے ہم ایک دوسرے کے سامنے کھڑے رہے۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

میں نے اسے نظر انداز کر دیا۔ ''بہت خوب شہزاد! تمہیں یہاں دیکھ کے میں حیران نہیں، پریشان ضرور ہوا ہوں۔''

''آپ مجھ سے خفا ہیں؟'' وہ خفت سے بولا۔

''میرے پاس فضول باتوں کے لیے وقت نہیں ہے۔''

''میں اب مس فریال کا قانونی مشیر ہوں۔''

''صرف قانونی؟ پھر میں نے تمہیں کورٹ میں کیوں نہیں دیکھا۔ تم یقیناً اس کے مالی معاملات کو زیادہ دیکھتے ہو گے۔''

اس نے ناگواری سے کہا۔ ''وہ مجھ پر بھروسا کرتی ہے۔''

میں نے تلخی سے کہا۔ ''یہی میری پریشانی ہے۔ تم پر بھروسا کرنے والے ہی مارے جاتے ہیں۔ میں کوشش ضرور کروں گا کہ اسے خبردار کر دوں۔ وہ جس راستے پر جا رہی ہے اس میں وہ تمہارا آسان شکار بن سکتی ہے۔''

''چھوڑیے نواب صاحب! کس کس کی فکر کریں گے آپ۔ یہ تو بہتی گنگا ہے۔ آپ کے بعد میں نے بھی ہاتھ دھو لیے تو کیا۔'' وہ بولا۔

میں نے اس کے منہ پر تھپڑ رسید کرنے کی خواہش پر بڑی مشکل سے قابو پایا۔ میرے موڈ کو بھانپتے ہوئے وہ ایک دم پلٹا اور اندر چلا گیا۔ جب کوئی خود کنویں میں گرنا چاہتا ہو اور اسے کنویں میں دھکا دینے والے بھی ہوں تو خدا کے سوا اسے کون بچا سکتا ہے۔ مجھے لگا کہ فریال کے ساتھ ہمدردی میں، میں نے محض اپنا وقت ضائع کیا۔

نور صبح صبح مجھے دروازے پر دیکھ کے دم بخود رہ گئی اور پھر ہنسنے لگی۔ اس نے ایک ڈول گھما کے مجھے مارا۔ ''میں سمجھی دودھ والا ہے۔'' اور پھر مجھ سے لپٹ گئی۔ ''سچ، میں رات بھر سو نہیں سکی۔''

میں اسے اندر لے گیا۔ ''فاقہ ہو تو نیند کہاں آتی ہے۔''

''فاقہ کریں میرے دشمن۔'' اس نے مجھے بیڈ پر دھکیل دیا۔ ''میں نے فون پر آرڈر دے کر پیزا منگوایا اور خوب ڈٹ کے کھایا۔''

میں نے کہا۔ ''زیادہ کھانے سے بھی نیند نہیں آتی۔''

وہ میرے قدموں میں بیٹھ گئی اور اپنا سر میری گود میں رکھ دیا۔ ''مجھے اس خیال سے نیند نہیں آئی کہ تم اس کے ساتھ ہو۔ رات بھر میں اس کی طبیعت بالکل بحال ہو گئی ہو گی۔''

''طعنے مت دو۔ تین دن سے میں گھر سے دور ہوں۔''

''اس میں پریشانی کیسی۔ کیا بادشاہ سلامت کی غیر حاضری میں کوئی سلطنت پر قابض ہو جائے گا۔ تین کے چار دن ہو جائیں، پانچ ہو جائیں۔''

میں نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ ''نور، میرے ساتھ چلو۔ ہے اتنی ہمت؟''

''میری ہمت کی بات کرتے ہو؟'' اس نے شوخی میں میرے منہ پر طمانچہ مارا۔ ''سب کچھ جانتے ہوئے بھی۔ اب تو میں نور جہاں بھی نہیں ہوں، نورا ہوں۔''

''پھر کیا ہوا۔ میں جو ہوں تمہارے ساتھ۔''

وہ ہنسی۔ ''تم تو سب کے ساتھ ہو۔ رات کو فریال کے ساتھ تھے، اب میرے ساتھ ہو۔''

میں نے کہا۔ ''کیا صرف باتوں سے پیٹ بھرو گی، اپنا اور میرا۔''

وہ بیڈ پر لیٹ گئی۔ ''یار مجھے تو نیند آ رہی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''او کے میڈم۔ ناشتا میں بنا کے لاتا ہوں۔''

میں نے اسے بتایا کہ فریال کس راستے پر چل پڑی ہے۔ ''میں اس کی کیا مدد کروں۔ جب شہزاد جیسے طفیلیے۔''

''طفیلیے...... وہ کیا ہوتے ہیں؟''

''PARASITES'' میں نے کہا۔ ''جو خود کچھ نہیں کرتے، دوسروں کے وجود پر اپنی زندگی گزارتے ہیں۔ جیسے امر بیل۔ وہ جس درخت سے چمٹ جائے خود ہری بھری رہتی ہے اور پھیلتی جاتی ہے مگر درخت سوکھ جاتا ہے۔ امر بیل کی اپنی کوئی جڑ نہیں ہوتی۔ جیسے پیٹ میں پلنے والے کیڑے ہوتے ہیں۔''

''شہزاد تو وکیل ہے۔''

''لیکن اس نے اندازہ کر لیا ہے کہ اس میں کچھ ہے جو لڑکیوں کو اس کی طرف کھینچتا ہے۔ شخصیت یا سیکس اپیل...... یا زبان کا جادو۔ لڑکیوں کی اس کمزوری کو اس نے اپنی طاقت بنا لیا۔ پہلی بار نادانی میں شادی کر بیٹھا۔ بعد میں ان سے دہرا فائدہ لیتا رہا۔ ان کا مال کھینچتا رہا اور ان کے جذبات سے کھیلتا رہا۔ اس کا ایک شکار تھی رابعہ۔ اب اس نے فریال پر ڈورے ڈالے ہیں۔ میں نے معلوم کیا ہے کہ وہ دولت مند بیواؤں کے کیس لیتا تھا جو شوہروں سے شاکی تھیں، ان کی مصروفیت یا عدم توجہی کے باعث۔ اس نے ان میں طلاق تک کرا دی۔ اب بتاؤ، میں فریال کو اس کے چنگل سے کیسے بچاؤں جبکہ وہ خود اس حال میں ہے کہ ڈوب رہی ہے اور اسے کسی کا سہارا چاہیے۔''

نور نے سر اٹھایا۔ ''میں اس کی مدد کر سکتی ہوں۔''

میں بھونچکا رہ گیا۔ ''تم...... وہ کیسے؟''

''یہ تم مجھ پر چھوڑ دو...... اگر کسی طرح میں اس کے ساتھ رہ سکوں۔''

میں نے کہا۔ ''ایک مشورہ دیا ہے میں نے اسے۔ اپنا سارا سیکیورٹی اسٹاف بدل دے۔''

''تو کہو کہ سیکریٹری رکھ لے مجھے۔ تو کیا وہ مانے گی؟''

"تم سیریس ہو؟"

"اگر تم ہو تو میں بھی ہوں۔ وہ مجھے پہچان نہیں سکتی۔ میں چوبیس گھنٹے اس کے ساتھ رہوں گی اور تمہیں سب بتاتی رہوں گی۔ مجھے یقین ہے کہ میں اس کا اعتماد بھی حاصل کرلوں گی۔"

میں نے کچھ دیر سوچا "ٹھیک ہے۔ مگر سوچ لو، یہ بہت بڑی اور مشکل ذمے داری ہے۔"

"میں ہر چیلنج قبول کرسکتی ہوں۔ تم بھی تو میرے لیے ایک چیلنج سے کم نہیں تھے۔ جب میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا تھا تو یہ چیلنج قبول کرلیا تھا...... کہ تم میرے ہو۔ میرے لیے بنائے گئے ہو۔"

میں نے ہنس کے کہا۔ "ایسی بات ہے؟"

"ایسی ہی بات ہے۔ دیکھ لو کتنے آگ کے دریا عبور کرکے میں ساحلِ مراد تک پہنچی ہوں۔"

"اور اگر اب کوئی تمہیں مجھ سے چھین لے...... پھر؟"

وہ ہنسی۔ "پھر تم دیکھنا محبت کی اس کہانی کا بھی وہی انجام ہوتا ہے یا نہیں، جو رومیو جیولیٹ جیسی رومانی داستانوں کا ہوتا ہے۔ نہ تم رہو گے نہ میں رہوں گی۔ بس ہماری کہانی رہ جائے گی۔"

"تم واقعی پاگل ہو، بالکل پاگل۔ لیکن میں بات کرکے دیکھتا ہوں۔"

خلافِ توقع جب فریال نے ریسیور اٹھایا تو وہ بالکل ہوش میں تھی۔ میں نے کہا۔ "میں ابھی ست بدھائی پہنچا ہوں۔ سوچا پوچھ لوں تم کیسی ہو۔"

"بس ٹھیک ہوں۔ لیکن میرے اندر کا خوف نہیں جاتا۔ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ ابھی سلطان آجائے گا۔"

"دیکھو، میں نے تم سے کہا تھا کہ پرانا سیکیورٹی اسٹاف سلطان کا وفادار ہوگا، اسے بدل دو۔ اگر تم کہو تو میں کچھ قابلِ اعتماد لوگوں کو بھیج دوں۔"

"واقعی۔ تمہاری بڑی مہربانی ہوگی میرے حال پر۔ حالانکہ اب میں ہرگز اس قابل نہیں۔"

میں نے کہا۔ "فضول باتیں مت کرو۔ جو محافظ آئیں گے، غنی کے حوالے سے آئیں گے۔ ان میں ایک ڈرائیور بھی ہوگا۔ اپنے موجودہ اسٹاف کو مہلت دیے بغیر رخصت کردو۔ نوٹس اور تنخواہ ان کے ہاتھ پر رکھو۔ نئے لوگ تمہارے حکم کے غلام ہوں گے، کسی اور کے نہیں۔ یہ بتاؤ تمہارا سیکریٹری کون ہے؟"

"ایک عورت ہے، کرسچن ہے۔ مسز ڈی سوزا۔ ڈی سوزا اس کا تیسرا اور آخری شوہر تھا۔ عمر ابھی بتیس سال ہے۔ دیکھو اور کتنے اس عہدے پر فائز ہوتے ہیں۔"

"تم اسے اتنا ناپسند کرتی ہو تو رکھا ہوا کیوں ہے؟"

"وہ سلطان کی چوائس تھی۔ اس کے کہنے کے مطابق فلمی دنیا کے معاملات کو بہت اچھی طرح سمجھتی ہے۔"

"اور کیا واقعی ایسا ہے؟"

"ہرگز نہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ وہ صبح سے شام تک میری ہر ایکٹیوٹی پر نظر رکھتی ہے اور اس کی رپورٹ سلطان کو دیتی ہے۔"

"او کے۔ کل ایک خاتون تم سے ملنے آئیں گی۔ ان کا نام ہے ماہ نور۔ کل مسز ڈی سوزا کی چھٹی کردو۔ اسے دو گھنٹے دو کہ اپنا سامان اٹھالے...... اور ماہ نور کو میرے کہنے سے اپائنٹ کرکے دیکھو۔"

"تمہارا انتخاب غلط نہیں ہوسکتا لیکن رفیق۔ تم یہ سب کیوں کررہے ہو میرے لیے؟ میں تمہارا شکریہ کیسے ادا کروں۔"

"شکریہ مت ادا کرو۔ صرف ایک وعدہ کرو۔ اگر تم مجھے مخلص سمجھتی ہو تو میرے مشورے پر عمل کرو۔ میرے خیال میں اگر کوئی تمہیں سنبھال سکتا ہے تو وہ ماہ نور ہے۔ تمہیں اس کی بات ماننا پڑے گی ورنہ......"

"ورنہ کیا؟"

"میں آکے تمہیں ایسی مار لگاؤں گا۔" میں نے کہا اور فون بند کردیا۔

ماہ نور نے سچ مچ ایک بہت بڑا چیلنج قبول کرلیا تھا۔ میں حیران تھا کہ یہ کیسی عورت ہے۔ اسے ذرا حسد نہیں ہوتا۔ یہ پروا بھی نہیں کرتی کہ آٹھ سال تک میں جس عورت کے لیے پاگل رہا۔ کہیں پھر اس کے چکر میں نہ پڑ جاؤں۔

اس نے مجھے یقین دلایا۔ "میں سب ٹھیک کرلوں گی۔ تم دیکھنا، صرف ایک مہینے میں فریال شراب چھوڑ دے گی۔ کوئی اور نشہ کرنے کا تو سوال ہی نہیں۔ سیکیورٹی گارڈز تمہارے اعتماد کے ہوں گے۔ میری اجازت کے بغیر پرندے کو وہاں پر مارنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ سلطان گھسنے کی کوشش تو کرے، کتے کی موت مارا جائے گا۔ اور شہزاد...... ایک ہفتے بعد دیکھنا، فریال اسے کیسا ذلیل کرکے نکالتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "بس بس۔ اتنا بڑا بول مت بولو کہ بعد میں شرمندگی ہو۔"

دوپہر کے بعد میں نور کے ساتھ ہی نکلا۔ وہ ڈرائیو کرکے مجھے مختلف کار ڈیلرز کے پاس لے گئی۔ ایک گاڑی مجھے پسند آئی اور اس کا سودا ہوگیا میں نے اسے دونوں

گاڑیوں کے فرق کی ادائیگی بھی کردی۔ شام تک میں نور کو ہدایات دیتا رہا اور سمجھاتا رہا کہ اسے فریال کے ساتھ رہ کے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے۔ میں نے اس سے خفیہ رابطہ اور رپورٹس لینے کے لیے ایک الگ موبائل فون خرید کردیا اور اسے بتادیا کہ میں اس سے رابطہ نہیں کروں گا۔ اسے جب موقع ملے وہ مجھ سے بات کرلے۔ اس نے ایک بار بھی نہیں پوچھا کہ آخر اب میں فریال کے لیے یہ سب کیوں کررہا ہوں۔ ایسی عجیب لڑکی تھی وہ!

تین دن بعد شام کو میں ست بدھائی پہنچا تو حالات میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔ راجا وعدے کے مطابق گولی کے ساتھ حیدرآباد گیا ہوا تھا جہاں گولی کو دیکھنا تھا کہ کس قبر کو پولیس نے شاہی بادشاہ کی قبر قرار دیا ہے اور اس کے ساتھی کہاں دفن ہیں۔ پولیس کی نشاندہی کے بغیر یہ کام ممکن نہیں تھا چنانچہ راجا کا ساتھ جانا ضروری تھا۔ ڈاکٹر شہناز اور لیلیٰ بھابی کا موڈ نارمل تھا۔ صرف رابعہ مجھ سے کھنچی ہوئی تھی لیکن میں نے اس کے رویے کو بالکل اہمیت نہیں دی۔ ایسا لگتا تھا کہ اب اس کے اور میرے درمیان کشیدگی کی جو خلیج حائل ہوگئی ہے وہ بڑھتی جائے گی۔

میں نے بہت زیادہ تفصیل میں جائے بغیر اپنی گزشتہ تین دن کی مصروفیت کے بارے میں اتنا ہی بتایا جتنا میرے نقطۂ نظر سے ضروری تھا۔ میں نے بتادیا کہ جو لاش ست بدھائی کی حدود سے دریافت ہوئی تھی وہ چودھری سلطان کی ثابت نہیں ہوئی۔ چنانچہ فی الحال نہ فریال پر کوئی قتل کا الزام ہے نہ مجھ پر شک۔ چودھری سلطان کا ملنا البتہ ہم دونوں کے مفاد میں ہے۔ میں نے سلطان کے بہن بہنوئی اور عدالت میں حق گوئی کا مظاہرہ کرنے والے دو مولویوں کے بیان کا حوالہ ضرور دیا مگر یہ بات گول کرگیا کہ سلطان کے بہن بہنوئی کو سچ بولنے پر ہتھوڑا گروپ نے کس بے رحمی سے مارا تھا۔

اس کے بعد فریال کا ذکر آیا تو میں نے صرف اتنا کہا کہ وہ صرف نروس بریک ڈاؤن اور فرسٹریشن کا شکار ہے اور عام انسانی کمزوری کا مظاہرہ کرتے ہوئے شراب کا سہارا لے رہی ہے لیکن اس کی حالت کو دیکھتے ہوئے یہ لگتا ہے کہ شاید وہ زیادہ خطرناک نشے کی لت کا شکار بھی ہوجائے گی۔

جذباتی نقطۂ نگاہ سے یہ خواتین کے لیے سخت افسوس ناک بات تھی۔ لیلیٰ بھابی سب سے زیادہ دکھی نظر آئی تھیں۔ "خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری اس لڑکی نے۔"

رابعہ نے تلخی سے کہا۔ "پھر افسوس کیسا، اگر پاؤں کٹ گئے۔"

شہناز نے اسے تہدیدی نظروں سے دیکھا۔ "رابعہ...... ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ اس کے ساتھ اچھا ہورہا ہے۔ کتنے دن کی بات ہے کہ...... وہ ہمارے ساتھ تھی۔ ہر کام میں پیش پیش۔ اس حویلی کی حالت بدلنے میں سب سے زیادہ وہی مستعد تھی۔"

لیلیٰ بھابی نے تائید کی۔ "نگار خانہ دیکھ لو۔ وہ اکیلی لگی رہی۔ پتا نہیں اچانک اسے کیا ہوا؟"

رابعہ نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ "آپ اتنا انجان بن کے کیوں بات کرتی ہیں آخر۔ سب جانتے ہیں کہ اچانک کچھ نہیں ہوا۔ دیکھ ہم بھی رہے تھے مگر اس سے زیادہ کر بھی کیا سکتے تھے۔ اسے جانا پڑا، ایک فاحشہ کی وجہ سے جس نے اس کی جگہ پر غاصبانہ قبضہ جمالیا تھا۔"

میں نے برہمی سے کہا۔ "رابعہ، تمہیں نور جہاں کے بارے میں اس قسم کی زبان استعمال نہیں کرنی چاہیے۔"

اس نے پلٹ کر جواب دیا۔ "کیوں؟ کیا وہ کسی بڑے شریف خاندان سے آئی تھی۔ بڑے اعلیٰ اخلاق و کردار کی مالک تھی۔"

میں نے کہا۔ "رابعہ! پلیز اسٹاپ دس۔"

وہ تڑخ کے بولی۔ "کیوں؟ لیلیٰ بھابی وجہ جاننا چاہتی تھیں کہ فریال کیوں چلی گئی۔ الزام تم پر آرہا ہے تو مجھے شٹ اپ کرنا چاہتے ہو۔ اس عورت کا کیا ماضی تھا، سب جانتے ہیں مگر آج وہ کہاں ہے؟ تم جانتے ہو۔"

شہناز نے صورتِ حال کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ "چھوڑو رابعہ، اب ان باتوں کا ذکر کرنے سے کیا فائدہ۔"

"میں کسی سے نہیں ڈرتی شہناز! جب فائدے نقصان کی بات ہورہی ہے تو میں کیوں نہ کہوں کہ نور جہاں نہ آتی تو فریال آج بھی یہاں ہوتی۔ اسے یہاں کون لایا تھا۔ اس ہائی سوسائٹی کی کال گرل نے اپنے شوہر کو مارا تو اسے قانون کے حوالے کرنے کے بجائے کس نے یہاں پناہ دی؟"

میں نے دھاڑ کے کہا۔ "تم اپنی بکواس بند کروگی یا نہیں۔"

وہ چیخ کر بولی۔ "گلا دبادو میرا کزن۔ ورنہ تو میں مرتے دم تک سارے زمانے کو یہ سچ بتاتی رہوں گی۔ ایک فریال کی کیا، تم نے میری بھی زندگی تباہ کی۔ خرم سے تم نے مجھے ملوایا۔ اس کا خمیازہ میں نے بھگتا۔ شہزاد کو تم لائے۔ ثریا اور میں آج اپنی قسمت کو رورہے ہیں۔"

اس سے زیادہ سننے کی مجھ میں تاب نہ تھی۔ میں غصے میں اٹھ کے اندر چلا گیا۔ رابعہ کی ہر بات میرے ضمیر پر ایک تازیانہ تھی لیکن میں یہ بھی سمجھتا تھا کہ آج اچانک اس نے ایک بہن، کزن اور دوست کا کردار چھوڑ کے میری ذات کو ہدف کیوں بنالیا ہے۔ وہ اتنی بے رحمی سے مجھ پر الزامات کے

کوڑے کیوں برسا رہی ہے۔

یہ بات وقت کی نہیں تھی۔ اسے اکسانے اور ورغلانے والوں نے میرے خلاف محاذ آرائی پر مجبور کر دیا تھا۔ اسے یہ احساس دلایا تھا کہ نواب رفیق غاصب ہے۔ اس نے ساری جاگیر اور جائداد پر قبضہ کرلیا ورنہ اس میں تمہارا بھی حصہ ہوتا۔ ست بدھائی کی ایک وارث تم بھی تھیں لیکن رفیق نے لندن میں بیٹھ کے سازش کی اور سب کچھ اپنے نام کرالیا۔ اگر قانون فیصلہ کرتا تو رفیق کے والد اور تمہارے والد برابر کے حصے دار ہوتے۔ اسی صدمے نے ان کی جان لی اور تم آج رفیق کے در پر اس کے رحم وکرم پر اور اس کے ٹکڑوں پر پل رہی ہو۔ جو تمہارا حق تھا وہ احسان کی صورت میں مل رہا ہے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ رابعہ کا کیا کروں۔ وہ بہت اچھی طرح جانتی تھی کہ ست بدھائی کا آخری وارث جسے جہاز کے کریش میں مردہ فرض کرلیا گیا تھا لندن میں مفلوج پڑا تھا۔ اس نے خود میرا سراغ لگایا۔ مجھے اس خاندانی جائداد اور جاگیر کے بارے میں بتایا اور پھر اپنی زندگی میں ہی سب کچھ میرے نام کر دیا۔ اگر وہ یہ سب نہ کرتا تو پہلی بات یہ کہ کسی کو ست بدھائی کے بارے میں معلوم ہی نہ ہوتا۔ نہ میرے والد کو نہ رابعہ کے والد کو۔ دوسری بات یہ کہ وہ مجھے وارث مقرر کیے بغیر اور قانونی طور پر ست بدھائی کا مالک بنائے بغیر مرجاتا اور پچاس ساٹھ سال بعد رابعہ کے اور میرے والد کو یہ بات معلوم ہو جاتی جس کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے تو شاید وراثت کا قضیہ نسل در نسل چلتا۔ آخری مالک فوت ہوا برطانیہ میں۔ جائداد اور جاگیر، پاکستان میں۔ کون سا قانون اپلائی ہوگا۔ کون وارث تلاش کرے گا، فیصلہ کیسے ہوگا؟

ڈیڑھ سو سال سے زائد پرانی، انگریزوں کی بخشی ہوئی اس جائداد اور جاگیر ست بدھائی کے مالک میرے چھ سات پشت پہلے کے آبا و اجداد تھے۔ پھر یہ کس کے بعد کس کو ملی، یہ حقائق تاریخ کے صفحات میں گم ہو چکے تھے۔ میں اس وقت تعلیم مکمل کر کے لندن میں جاب کر رہا تھا جب مجھے اچانک ایک بوڑھے اور مفلوج شخص نے طلب کیا اور بتایا کہ وہ کون ہے۔ وہ پچاس سال سے لندن میں تھا اور وہیل چیئر پر ہی حرکت کر سکتا تھا۔ انڈیا سے لندن آتے ہوئے وہ جہاز سمندر میں گر گیا تھا جس پر وہ سوار تھا۔ یہ فرض کرلیا گیا تھا کہ اس کے سارے مسافر سمندر میں جہاز کے ساتھ ہی غرق ہو گئے لیکن ایک آدمی بچ گیا تھا جو ست بدھائی کا حکمراں تھا۔

پھر اسے بتانے کا موقع ملا اور نہ مجھے پوچھنے کا کہ اس نے میرا سراغ کیسے لگایا۔ اس کے لیے مرحوم نے کسی سراغ رساں ادارے یا وکیل کی خدمات حاصل کی ہوں گی۔ مجھے اپنے خاندان کی خونی تاریخ سے روشناس کرنے کے بعد اس نے مجھے بتا دیا کہ چونکہ اب اس کی زندگی کا چراغ بجھنے کو ہے اس لیے وہ ست بدھائی، حویلی اور اپنا سب کچھ مجھے دے رہا ہے اور میں یہ حقِ ملکیت پاکستان جا کے حاصل کر سکتا ہوں۔

میں سمجھتا ہوں کہ اصل وارث میرے اور رابعہ کے والد تھے۔ ان دونوں بھائیوں میں سب کچھ برابر تقسیم ہونا چاہیے تھا لیکن یہ تب ہوتا جب قانونِ وراثت لاگو ہوتا۔ اپنی زندگی میں ایک شخص اپنا سب کچھ کسی کو بھی دے سکتا ہے۔ ایک فرد کو، کسی خیراتی ادارے کو یا کسی ٹرسٹ کو۔ اگر اس نے سب مجھے دے دیا تو اس میں میرا کیا قصور۔ نہ میں نے اس کے لیے کوشش کی تھی اور نہ سازش۔

میری چچی اس صدمے سے پاگل ہو گئیں۔ چچا نے انہیں مار دیا اور خود پھانسی چڑھ گئے۔ انہوں نے حوالات میں خودکشی نہ کی ہوتی تب بھی انجام یہی ہوتا۔ میری دادی کی جان بھی اسی صدمے نے لی۔ میرے والد نے یہ کبھی نہیں کہا کہ غلطی میری تھی۔ مگر یہ ضرور کہا کہ جو ہوا غلط ہوا۔ خود مجھے احساس تھا کہ اخلاقی طور پر رابعہ کو اس کا حق ضرور ملنا چاہیے مگر عین اس وقت جب میں فیصلہ کر چکا تھا کہ رابعہ کو اپنے والد کی وصیت کے مطابق ایک تہائی دے دوں، رابعہ نے ایک ایسا فیصلہ کرلیا کہ مجھے اپنا ارادہ منسوخ کرنا پڑا۔

رابعہ اب میرے دشمن رانا رجب علی کے بیٹے زوہیب سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ وہ نہیں سمجھ رہی تھی کہ رانا جب اپنے بیٹے کا پیغام لے کر آیا تھا تو اس کے سازشی دماغ میں کیا منصوبہ تھا۔ اس طرح بظاہر وہ دشمنی ختم کر کے مجھ سے رشتہ قائم کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے بعد رابعہ ان دشمنوں کے قبضے میں ہوتی جو مزاج اور فطرت کے اعتبار سے روایتی وڈیرے تھے۔ ظالم، بے ضمیر اور فرعون مزاج۔ وہ رابعہ کو وسیلہ بنا کے میرے خلاف جائداد حاصل کرنے کی قانونی جنگ شروع کرتے جو چلتی رہتی۔

میرے لیے ناممکن تھا کہ میں رانا کے بیٹے زوہیب کا رشتہ منظور کرلوں لیکن شہزاد کی بے وفائی کے بعد رابعہ چاہتی تھی کہ میں زوہیب کے رشتے سے انکار نہ کروں بصورت دیگر وہ بالغ ہے اور اپنا اچھا برا خود طے کر سکتی ہے۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں ست بدھائی کی وراثت میں رابعہ کو شریک کرنے کا فیصلہ خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف ہوتا۔ چنانچہ میں نے دونوں فیصلے رابعہ کی مرضی کے خلاف کیے

اب اس کے اور میرے درمیان فاصلے بڑھ رہے تھے اور میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اسے کیسے سمجھاؤں اور اس مسئلے کو کیسے حل کروں۔

رابعہ کا رویہ میرے خلاف جارحانہ ہوتا جا رہا تھا اور میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا کرنے والی ہے۔ میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ ریشم نے ڈرتے ڈرتے دروازے سے اندر آ کے لائٹ آن کی اور بولی۔ ''سر! یو آل رائٹ؟ ڈارک سلیپ۔ آئی کم ٹیل ڈنر ریڈی۔'' جس کا مطلب یہ تھا کہ سر آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔ اندھیرا کر کے کیوں سو رہے ہیں۔ چلیے کھانا تیار ہے۔

کھانے کے دوران شہناز نے اپنے اسپتال کے بارے میں بتایا کہ شاید ہفتہ دس دن میں ایک ڈاکٹر آ جائے۔ لیلیٰ بھابی نے اطلاع دی کہ نئے اسکول کی عمارت تقریباً مکمل ہو چکی ہے اور امید ہے، ایک دو ہفتے میں ہم وہاں شفٹ کر جائیں گے۔ رابعہ سر جھکائے کھانا کھاتی رہی۔

رات کو میری بات پہلے فریال سے ہوئی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ وعدے کے مطابق میں اس کے لیے سیکیورٹی اسٹاف اور سیکریٹری بھیج رہا ہوں یا نہیں؟ تسلی دینے اور یقین دہانی کرانے کے سوا میں کیا کر سکتا تھا۔ نور جہاں کے ماہ نور بن جانے کا ذکر میں نے ابھی تک کسی سے نہیں کیا تھا۔ میں ڈرتا تھا کہ اس سے نور کے لیے مسائل نہ کھڑے ہو جائیں۔ ابھی تک میں خود شش و پنج کا شکار تھا کہ اب آخر مجھے فریال کے لیے یہ سب کرنے کی کیا ضرورت ہے اور کیا اس طرح میں خود کو مزید مسائل میں نہیں الجھا رہا ہوں۔ نور کو فریال کی سیکریٹری بنا کے بھیجنا کوئی عقلمندی ہے یا ایک جذباتی حماقت!

اگر میں خود کو قائل کرنے میں کامیاب ہو جاتا کہ فریال سے اب میرا کوئی تعلق نہیں اور مجھے اس کے لیے کچھ سوچنے یا کرنے کی ضرورت بھی نہیں تو شاید میں بہت سی پریشانیوں سے محفوظ ہو جاتا لیکن وقت کے ساتھ انسان کے جذبات کی جڑیں گہرائی میں اترتی جاتی ہیں۔ لوگ پرانے گھر، پرانی گلیاں، پرانی کار، آبا و اجداد کے وقت کی چیزیں۔ سب سے ایسے وابستہ ہو جاتے ہیں کہ انہیں چھوڑ نہیں سکتے۔ جگہ یا کھانے کو کم ہو تو پالتو جانوروں کو گھر سے نہیں نکال پاتے۔ انسانی رشتے تو اس سے کہیں زیادہ بے بس کرنے والے ہوتے ہیں۔

اس کے باوجود مجھے یقین تھا کہ جب راجا کو یہ سب معلوم ہوگا تو وہ میری کلاس ضرور لے گا۔ میرے مقابلے میں وہ کم جذباتی تھا اور فریال یا نور کے معاملے میں اس کے لیے عقل سے سوچنا ممکن تھا جو میرے لیے نہیں تھا۔ اس نے آخر میں مجھے فون کیا جب میں سونے کی تیاری کر رہا تھا۔

''تو کہاں غوطے کھا رہا ہے، دو کشتیوں کے مسافر۔''

میں نے کہا۔ ''میں خیر و عافیت کے ساتھ ست بدھائی میں ہوں۔ تیری کب واپسی ہوگی راجا؟''

''میں کیا عرض کروں نواب صاحب۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ میں ایک خالی دماغ والا گدھا ہوں۔''

''اچھا ہے اپنے بارے میں تجھے خوش فہمی کوئی نہیں۔''

''آخر مجھے کیا پڑی تھی کہ اس ڈاکو حسینہ عرف گولی کے لیے ریوالور بن گیا، جسے وہ جیسے چاہے استعمال کرے۔''

میں نے کہا۔ ''راجا! مجھے تشویش لاحق ہو رہی ہے، آخر اس نے تجھے کیسے استعمال کیا؟''

''مجھے مروت نے مروا دیا فیکے پتر۔ میں صاف انکار کر دیتا، کہہ دیتا کہ تمہیں یقین نہیں تو جاؤ۔ خود قبر تلاش کرو اور خود کھودو۔ جو ڈھانچہ ملے اس سے شناختی کارڈ مانگ لینا کہ تم شامی بادشاہ ہو یا مصری غلام؟ میں نے بڑی مشکل سے پولیس کی مدد حاصل کی اور کل رات ہم شہر سے باہر ایک قبرستان گئے۔ مجھے پتا چلا کہ لاوارث لاشوں کو وہاں گاڑ دیا جاتا ہے۔ کفن اور نماز جنازہ کی رسم پوری کی جاتی ہے یا نہیں، مجھے نہیں معلوم۔ وہاں یہ تیسری جنس کے لوگ، خواجہ سرا بھی لائے جاتے ہیں۔ میرے ساتھ پولیس کا ایک حوالدار تھا۔ اس نے ایک جگہ دس قبروں کی نشاندہی کی۔ حلفیہ کہہ رہا تھا کہ پولیس مقابلے میں ہلاک ہونے والے شامی اور اس کے ساتھیوں کی قبریں یہی ہیں۔ ایک قبر کے لیے اس نے کہا کہ شامی کی ہے۔ اس کی قسموں کا کیا اعتبار مگر لاشیں گاڑنے وہ خود لایا تھا، ایک ٹرک میں ڈال کے۔ اس نے مانا کہ ڈاکوؤں کو اسی حالت اور لباس میں دفنا دیا گیا تھا جس میں وہ ہلاک ہوئے تھے۔ شامی کی قبر کے پیچھے ایک کتبہ لگا ہوا تھا۔ بہار بیگم، تاریخ وفات ضرور تھی مگر نہ باپ کا نام نہ شوہر کا۔ غالباً کوئی کھسرا ہوگا۔ یہی نشانی ہے۔ اب اس بیوہ کو دیکھو جسے بتایا جا رہا ہے کہ اس کا میاں یہاں دفن ہے۔ اور وہ ہے کہ ہنس رہی ہے۔ گالیاں دے رہی ہے اس حوالدار کو۔ اور گالیاں بھی ایسی کہ تو رانا کو نہیں دے سکتا۔ توبہ!''

میں نے کہا۔ ''اس نے نہیں مانا؟''

''نہیں، حوالدار نے جواب میں زیادہ پاورفل گالیاں دیں۔ میں نے اسے بڑی مشکل سے ٹھنڈا کر کے روانہ کیا۔ پانچ ہزار لیے تھے اس نے۔ قابو میں تب آیا جب میں نے کہا کہ اب بھونکنا بند کر دو ورنہ میں بتا دوں گا تمہارے ایس پی

صاحب کو اور یہ پانچ ہزار بہت مہنگے پڑیں گے۔ خیر وہ تو چلا گیا، پھر میں نے گولی سے کہا کہ تم پاگل تو نہیں ہو۔ وہ کہنے لگی کہ تم لوگ مجھے پاگل بنانا چاہتے ہو مگر میں ماننے والی نہیں۔ یہ قبر شامی کی ہو ہی نہیں سکتی۔ میں نے کہا کہ تم نے کیا نظر سے ایکسرے کرلیا ہے؟ بولی کہ تم خود کھدائی کرا کے دیکھ لو۔ میں اس سے کیا کہتا۔ باری باری وہ ہر قبر پر گئی اور سر ہلاتی رہی۔ نہیں، یہاں بھی نہیں۔ یہ بھی نہیں۔ وہ یہاں ہے ہی نہیں۔ تنگ آ کے میں نے کہا کہ اچھا میں تو چلتا ہوں۔ تم کہو تو چند مزدور بھیج دوں۔ وہ رات بھر میں ساری قبریں کھود کے دکھا دیں گے۔ وہ میرے ساتھ چل پڑی اور بولی ''راجا صاحب! ابھی آپ گولی کی بات پر یقین نہیں کر رہے ہو مگر دیکھ لینا۔ شامی آئے گا۔ ضرور آئے گا۔ وہ زندہ ہے۔''

''اس پاگل پن کا تو کوئی علاج نہیں۔''

''یہ اس کا یقین ہے۔ اس نے تو مجھے بھی سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ کہیں یہ سچ ہی نہ ہو۔ خدا کرے ہو۔ پولیس کے مقابلے میں گولی کا سچ ہو تو میں کہہ سکتا ہوں کہ پولیس سے کچھ بعید نہیں، اس نے جھوٹ بولا ہو۔''

''لیکن جھوٹ سچ کو پرکھنے کا کوئی طریقہ نہیں۔''

''کوئی نہیں۔ ایک عام شریف آدمی پولیس کے جھوٹ کو چیلنج کرنے کے لیے کورٹ میں جا سکتا ہے۔ دوبارہ قبر کشائی اور میڈیکل بورڈ کے ذریعے پھر پوسٹ مارٹم کی درخواست بھی کر سکتا ہے۔ تیرے میرے جذبات کچھ بھی ہوں، قانون کی نظر میں وہ ایک خطرناک ڈاکو تھا۔ اس کے لیے میں خود کو مشکل میں نہیں ڈال سکتا۔ بس ٹھیک ہے۔ وہ زندہ ہوگا تو کسی دن آ ہی جائے گا۔ گولی کرے انتظار۔''

''تو کب واپس آ رہا ہے؟''

''میرا تو ارادہ ہے صبح۔ یہاں سے کراچی اور وہاں جو پہلی فلائٹ ملی۔ ابھی تک گولی نے کچھ بھی نہیں کہا ہے۔ پتا نہیں اس کے دماغ میں کیا چل رہا ہے۔ چل چھوڑ۔ وہاں کیا ہوا؟''

''راجا، تو جانتے بوجھتے انجان کیوں بن رہا ہے۔ میں ایک دن اور رک گیا تھا۔''

''فریال کے پاس۔''

میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، وہ بہت ڈری ہوئی ہے۔''

راجا ہنسا۔ ''تو نے اس کا ڈر کیسے دور کیا نکّے پتر۔''

میں نے کہا۔ ''تو آئے گا تو بتاؤں گا۔ معاملات یہاں زیادہ پیچیدہ صورت اختیار کر گئے ہیں اور اس وقت میں مزید جاگنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔''

راجا مجھے گالیاں دینے لگا۔ ''چل سو جا۔ تین رت جگے جو کیے ہیں۔''

صبح میں دیر تک سوتا رہا۔ کسی نے مجھے نہیں جگایا۔ آنکھ کھلی تو دوپہر ہونے کو تھی۔ غسل کے بعد میں نے ڈٹ کے ناشتا کیا، بھوک سے میرا برا حال تھا۔ حویلی میں اس وقت کوئی بھی نہیں تھا۔ ڈاکٹر شہناز اپنی معاون ریشم کے ساتھ اسپتال میں تھی۔ لیلیٰ بھابی رابعہ کے ساتھ اسکول میں تھیں اور ثریا نے اکیلے رہنے سے بہتر سمجھا تھا کہ بوبی کے ساتھ اسکول چلی جائے۔

میں اب غنی کو بلوانے والا تھا کہ وہ خود ہی نمودار ہو گیا۔ اس نے میری طرف آتے ہوئے نئی گاڑی کو غور سے دیکھا لیکن اس بارے میں کوئی سوال کرنے کے بجائے اس نے کسی ڈاکٹر مہدی حسن کے آنے کی اطلاع دی۔

میرے لیے یہ نام اجنبی نہ تھا۔ پاکستان کے مایہ ناز غزل گائک مہدی حسن کے علاوہ میں ایک ڈاکٹر مہدی حسن کو نام سے بھی جانتا تھا اور صورت سے بھی جو غالباً پنجاب یونیورسٹی میں شعبۂ صحافت کے سربراہ اور بڑے نامور سیاسی تجزیہ کار تھے لیکن ان کا مجھ سے ملنے کے لیے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بہرحال میں نے انہیں مہمان خانے میں بلوا لیا۔

وہ ساٹھ یا ستر سال کے دھان پان سے بزرگوار تھے شاید اسی لیے اتنے فٹ تھے کہ اپنی گاڑی خود چلا کے لائے تھے۔ وہ لباس سے بھی مہذب اور شائستہ لگتے تھے اور درحقیقت بہت ہی شریف النفس انسان تھے۔

تعارف کے رسمی کلمات کے بعد انہوں نے اعتراف کیا۔ ''میرا خیال تھا کہ نواب رفیق کوئی میری عمر کے ہوں گے۔ آپ ڈاکٹر شائستہ کو جانتے ہوں گے۔''

میں نے کہا۔ ''بہت اچھی طرح۔''

''اس کے والد، اللہ انہیں غریق رحمت کرے، گورنمنٹ کالج میں پڑھاتے تھے۔ میرے بہت اچھے دوست بھی تھے اور رشتہ دار بھی۔''

میں نے کہا۔ ''فرمائیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں مگر اس سے پہلے یہ فرمائیے، آپ چائے لیں گے یا کافی؟''

''چائے۔ نواب رفیق! مجھے شائستہ نے آپ کے بارے میں تفصیل سے بتایا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ اس کی رائے میرے بارے میں زیادہ اچھی نہیں ہو سکتی۔''

وہ مسکرائے۔ ''غلط سوچتے ہیں آپ۔ اس نے آپ کی

تعریف نہ کی ہوتی تو میں لاہور سے یہاں آتا! میری رہائش لاہور میں ہے۔ میرا ایک بیٹا ہے۔ بیٹی بھی ہے ایک، وہ میرے ساتھ رہتی ہے۔ دونوں اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلینڈ گئے تھے۔ بیٹی نے وہاں شادی کر لی ایک پاکستانی سے اور وہ اس کے ساتھ ہی یہاں آ گیا۔ میرا خیال تھا کہ ہم ایک اسپتال قائم کریں گے لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ میرا داماد مارا گیا، وہ شعبۂ حادثات میں تھا۔ وہاں کوئی زخمی لایا گیا جس کا بچنا محال تھا۔ وہ مر گیا تو لواحقین نے ہنگامہ کیا اور اسے ڈاکٹر کی غفلت کا نتیجہ قرار دیا۔ جھگڑے میں میرا داماد زخمی ہوا۔ اس کے سر میں ڈانگ لگی تھی۔ وہ ایک ہفتے بے ہوش پڑا رہا، پھر مر گیا۔'' اس نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی۔ ''میرے بیٹے کو بچپن ہی میں پولیو ہو گیا تھا۔ اس نے ڈاکٹری کی تعلیم تو مکمل کر لی لیکن وہ سرجن نہ بن سکا، جس کا اسے بے حد شوق تھا، آرتھوپیڈک سرجن، ہڈیوں کا ڈاکٹر۔ قدرت کی ستم ظریفی دیکھو۔ اس کی اپنی ہڈیاں...... خیر میں یہاں اپنا دکھڑا رونے تو نہیں آیا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''آئی ایم سوری مہدی صاحب۔''

''دراصل میں خود بھی سرجن ہی تھا۔ زیادہ وقت باہر رہا۔ پھر جذباتی ہو کے لوٹ آیا، رشتوں کی خاطر۔ خاندان، گھر، زمین، یہاں آ کے مجھے اندازہ تو ہو گیا تھا کہ یہاں رشتوں میں بھی صرف منافقت ہے۔ لیکن میں نے دیکھا کہ یہاں پیسا کمانے کے لیے دو پیشے بڑے اچھے ہیں، تعلیم اور صحت۔ اسکول کھول لو یا اسپتال بنا لو۔ میں نے اسپتال بنا لیا۔ کوشش کر کے مختلف محکموں اور کمپنیوں کے پینل پر ہو گیا اور دواساز کمپنیوں کو بھی خوب فائدہ پہنچایا۔ اتنا پیسا کمایا کہ میں کہیں اور نہیں کما سکتا تھا اور مجھے واپس لوٹ کر آنے کا افسوس بھی نہیں رہا کیونکہ دولت یہاں آپ کو عزت اور اہمیت دلواتی ہے۔ آپ بڑے آدمی کہلاتے ہیں۔ وی آئی پی اور وی وی آئی پی، جس کا باہر کوئی تصور نہیں۔''

ریشم چائے لے کر آئی تو وہ ذرا سی دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ میں نے اسے چائے بنا کے دی جو اس نے شکریہ ادا کر کے لے لی۔

''نواب رفیق! آپ مکافاتِ عمل کے نظریے کو درست سمجھتے ہیں؟''

اس کے غیر متوقع سوال نے مجھے چونکایا۔ ''کیا مجھے نہیں سمجھنا چاہیے؟''

''کم نہیں، یہاں جب میں اپنے آس پاس دیکھتا ہوں تو ایسا نہیں لگتا کہ کسی کو اس کے اعمال کی سزا اسی دنیا میں بھی ملتی ہو جیسے مجھے ملی۔ رشوت خور، دین فروش، وطن فروش، سب عیش کر رہے ہیں۔ خوب ظلم کرتے ہیں، لوٹ مار کرتے ہیں اور جب چاہتے ہیں ملک چھوڑ کے باہر آباد ہو جاتے ہیں۔ ان کی عزت بھی ہے، اہمیت بھی۔ اولادیں بھی شاہانہ زندگی گزار رہی ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ ظالم کی رسی دراز کرتا ہے۔ کب تک اور کہاں تک؟ مجھے تو اس نے فوراً پکڑ لیا۔ آئی ایم سوری۔ میں بار بار موضوع سے بھٹک جاتا ہوں۔ دماغ کے بریک فیل ہونے لگے ہیں۔ آخری عمر آ گئی ہے۔ اب پچھتانے اور توبہ کرنے سے بھی کیا ہوگا۔ پھر بھی سوچتا ہوں، کچھ نہ کرنے سے کچھ کرنا بہتر ہے۔ پیسوں کا مجھے مسئلہ نہیں۔ سوچا تھا اپنا اسپتال بناؤں گا لیکن پھر خیال آتا ہے کہ کس کے لیے؟ کوٹھی بھی بہت بڑی بنائی تھی۔ باغ بھی بہت بڑا لگایا تھا کہ جب پوتے نواسے بھی ہوں گے تو خوب چہل پہل ہوگی۔ اب اس میں ہم تین سوگواروں کے سوا کوئی نہیں۔ بیوہ بیٹی ہے، وہ بھی ڈپریشن کی مریض۔ کچھ نہیں کرتی۔ شوہر کے مرنے کے بعد ساری دنیا سے لاتعلق ہو گئی ہے۔ ماہرین نفسیات بھی ہار گئے۔ پینتیس سال میں پچاس کی لگتی ہے۔ بیٹھے بیٹھے اس کا وزن بڑھ رہا ہے۔ کسی چیز میں دلچسپی نہیں۔ پریکٹس کرتی رہتی تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ اس کی کوئی اولاد ہی ہوتی...... مگر میاں بیوی لندن ہی سے طے کر کے آئے تھے کہ ابھی سے بچوں کے جھنجٹ میں پڑنا مناسب نہیں ہوگا۔ کچھ عرصے بعد دیکھیں گے۔ وہاں ایسے ہی ہوتا ہے۔ فیملی پلان کی جاتی ہے۔ ایک بچہ پیدا کرنا ہے تو کب اور دوسرا ضروری ہے تو کیوں۔ بیٹے کی شادی بھی نہیں ہوئی۔ اس نے کی نہیں۔ کہتا ہے اپنے ساتھ کسی لڑکی کی زندگی بھی خراب کروں۔ حالانکہ دیکھنے میں ٹھیک ہے۔ وہیل چیئر کے علاوہ بیساکھی کے سہارے بھی چل لیتا ہے۔ شائستہ نے مجھے بتایا کہ آپ کو ایک ڈاکٹر کی ضرورت ہے؟''

میں خاصی محویت سے اس کامیاب انسان کی ناکامیوں کا نوحہ سن رہا تھا۔ ''جی...... ضرورت تو ہے مگر......''

''شائستہ نے بتایا تھا کہ لیڈی ڈاکٹر چاہیے۔ اب بدقسمتی سے لیڈی ڈاکٹر بھی ہے جو جسمانی طور پر ٹھیک ہے مگر ذہنی طور پر بے مصرف ہے۔ آپ میرے بیٹے سے ملیں، اسے آزمائیں۔ شاید آپ کا کام چل جائے۔''

میں نے کہا۔ ''کیوں نہیں، لیکن ڈاکٹر مہدی! آپ یہاں تک آئے ہیں۔ آپ کو اندازہ ضرور ہوا ہوگا کہ یہ جگہ آبادی سے کتنی دور ہے۔ یہاں کوئی سوشل لائف نہیں ہے، جیسی کہ شہروں میں ہوتی ہے۔ ہم حویلی کے اندر ایک فیملی کی

طرح رہتے ہیں۔ شہر کوئی دور نہیں۔"

"نواب صاحب!"

میں نے کہا۔ "پلیز۔ آپ سے یہ سننا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ آپ میرے والد کی عمر کے ہیں، صرف رفیق کہیں تو مجھے خوشی ہوگی۔"

وہ مسکرائے۔ "رفیق! شائستہ نے مجھے اور بھی بہت کچھ بتایا تھا، تمہارے عزائم اور پروگرام کے بارے میں۔ اس بات کو دو ہفتے ہوگئے۔ ان دو ہفتوں میں بہت سوچا میں نے، مجھے کچھ کرنا چاہیے۔ میں نے اپنے بیٹے سے بھی ڈسکس کیا۔ اس نے مجھے فل سپورٹ دی۔ وہ بے حد ذہین اور نیک ہے۔ یہ میں اس لیے نہیں کہہ رہا ہوں کہ وہ میرا بیٹا ہے۔ میں نے دنیا دیکھی ہے۔ میں ان الفاظ کا مطلب سمجھتا ہوں۔ اس کے حالات نے اسے ایسا بنا دیا ہے۔ بیٹی سے تو کچھ بھی پوچھنا لاحاصل تھا۔ وہ گھر سے نہیں نکلتی۔ کتابیں پڑھتی رہتی ہے یا انٹرنیٹ پر بیٹھی رہتی ہے۔ احمد حسن، یہ میرے بیٹے کا نام ہے۔ اس نے مجھے کہا کہ ڈیڈی! آپ معلوم کریں یہ نواب رفیق کون ہے؟ واقعی کچھ کر رہا ہے یا محض ریکٹ ہے۔ پلیز ڈونٹ مائنڈ۔ اس نے آس پاس بھی دیکھا ہے۔ نام کچھ اور ہوتا ہے کام کچھ اور۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ ڈاکٹر شائستہ سے میرا تعلق براہِ راست نہیں۔ بلکہ سچ پوچھیں تو دوستی بھی نہیں۔ وہ ایک خاتون کی سہیلی ہیں اور میں نے ان کا نام ڈاکٹر غیر شائستہ رکھ چھوڑا تھا۔ پتا نہیں کیوں انہیں مجھ سے پرخاش تھی۔ کبھی بات کرتی ہیں تو کچھ سنانے کے لیے۔"

"صاف گو اور کھرے لوگ اکثر ایسے ہی لگتے ہیں۔ اسی نے تمہاری اتنی تعریف کی کہ مجھے آنا پڑا۔"

میں کھڑا ہوگیا۔ "آیئے۔ میں آپ کو دکھاتا ہوں کہ ست بدھائی آج کیا ہے اور میں اسے کیا بنانا چاہتا ہوں۔"

اس نے حویلی کو سرسری طور پر باہر سے دیکھا۔ پھر میں اسے اسپتال لے گیا جہاں ڈاکٹر شہناز مریضوں میں گھری ہوئی تھی اور اپنی پوری کوشش کے باوجود ڈاکٹر ریشم ان کو کنٹرول کر کے باری باری بھیجنے میں ناکام تھی۔ وہ شہناز کے جذبے اور رویے دونوں سے متاثر ہوا۔ اتنا ہی متاثر وہ شہناز کی معاونِ خصوصی ڈاکٹر ریشم کی انگریزی سے ہوا۔ اس نے اپنا تعارف خود کرایا تھا۔

اسکول کی طرف جاتے ہوئے اس نے کہا۔ "یہ لڑکی، ڈاکٹر ریشم۔ یہ ڈاکٹر تو نہیں لگتی مجھے۔"

میں نے ہنس کے کہا۔ "کہتی تو ہے۔ کہنے دیں۔ کہنے میں کیا حرج ہے۔"

وہ بوڑھا آدمی تھا اور کچھ دمے کا مریض بھی۔ غالباً اسے گرد و غبار سے الرجی تھی۔ اس نے دو بار پھر لیا۔ "نواب...... میرا مطلب ہے رفیق! مجھے خوشی ہے کہ میرا آنا بے مقصد نہیں رہا۔ میں مایوس واپس نہیں جا رہا ہوں۔ شاید شائستہ نے مجھے پورا نہیں بتایا تھا۔ یہاں تم اس سے کہیں زیادہ کر رہے ہو۔"

میں نے کہا۔ "وہ لندن میں بیٹھی ہے۔ اسے کیا معلوم۔"

"میں اب چلتا ہوں۔ ہو سکا تو کل ہی اپنے بیٹے کے ساتھ پھر آؤں گا۔"

میں نے کہا۔ "آپ کی وجہ سے ابھی تک میں نے کھانا نہیں کھایا۔"

"وہ...... دراصل میں پرہیزی کھانا لیتا ہوں۔ بہت کم کھاتا ہوں۔ اس عمر میں ضرورت اہم ہوتی ہے، عادت نہیں۔"

میں نے اسے روک لیا۔ "چلیے میرا ساتھ دیجیے۔ آپ میرا ساتھ دینے ہی تو آئے ہیں۔"

وہ مان گیا۔ اس نے تھوڑا سا دہی لیا۔ ایک بسکٹ اور کچھ پھل۔ "رفیق! احمد یہاں خوش ہوگا۔ اور تم بھی یہ محسوس کرو گے کہ وہ واقعی دکھی انسانیت کی خدمت کرنا چاہتا ہے۔ ویسے تو ڈاکٹر بننے کے شوقین، سارے بچے یہی ڈائلاگ مارتے ہیں۔ لیکن ایک دو مسئلے ہیں میں انہیں مشکلات نہیں کہوں گا۔"

"آپ فرمایئے۔"

"وہ ہر روز آ جا نہیں سکتا۔ کیا وہ یہاں رہ سکتا ہے؟"

میں نے کہا۔ "اسے یہاں رہنا پڑے گا۔ کیا اتنی بڑی حویلی کافی نہیں؟"

وہ بولا۔ "پھر میں اکیلا رہ جاؤں گا۔ مجھ سے بات کرنے والا کوئی نہیں رہے گا۔ بے شک بیٹی ہے مگر اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔"

میں نے کہا۔ "میں آپ کا مسئلہ سمجھ گیا۔ آپ یہاں رہ سکتے ہیں لیکن پھر بیٹی کو کس کے سہارے چھوڑیں گے؟"

"میری اور بیٹے کی دیکھ بھال وہی کرتی ہے۔"

"میں آپ سب کو یہاں رہنے والوں کی طرف سے اس حویلی اور اس فیملی میں ویلکم کرتا ہوں۔ یہ رسمی بات نہیں۔ جب آپ دوسروں سے ملیں گے تو خود اندازہ کر لیں گے کہ آپ کی آمد سے وہ کتنے خوش ہیں۔ ڈاکٹر مہدی حسن! ہمیں آپ کی ضرورت ہے۔ ہو سکتا ہے یہاں آپ کو وہ اطمینان

قلب اور خوشی مل جائے۔ جس کا بدل کوئی نہیں۔"

وہ جب رخصت ہوا تو شک و شبے کی کوئی گنجائش نہ رہی تھی کہ وہ بہت جلد لوٹ کر آئے گا۔ وہ جس امید میں یہاں تک آیا تھا وہ پوری ہوئی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ ایک انتہائی بابرکت اور نیک شگون تھا۔ اسے تائیدِ ایزدی کہا جا سکتا تھا۔ میں اسے باہر تک چھوڑنے گیا۔

غنی کو میں نے واپسی پر اپنا منتظر پایا۔ اس نے کہا "سر، میں آپ سے اکیلے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

"اس وقت یہاں اور کون ہے، بولو۔"

اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ "مجھے رابعہ بی بی کے بارے میں کچھ بتانا تھا۔"

میں اسے اندر لے گیا۔ "مجھے معلوم ہے آج کل اس کا دماغ کچھ زیادہ ہی خراب ہو رہا ہے لیکن تم اس کی فکر مت کرو۔ میں سب ٹھیک کر لوں گا۔ پہلے تم میری بات سن لو۔ کل سے مجھے موقع نہیں ملا۔ ابھی یہ ڈاکٹر مہدی آ گئے۔"

"آپ حکم کریں سر۔"

میں نے کہا۔ "تمہارے پاس اس وقت سیکیورٹی گارڈز کی تعداد کیا ہے؟ اچھے اور بھروسے کے قابل۔"

"کوئی بھروسے کے قابل نہ ہوتا تو یہاں کیوں ہوتا جناب!"

میں نے کہا۔ "دیکھو، مجھے چار آدمی دو۔ جو سب سے بہتر ہوں۔ عام اسلحہ چلانا جانتے ہوں اور ایک ڈرائیور...... اپنے لیے نہیں۔"

وہ کچھ حیران ہوا۔ "پھر کس کے لیے سر؟"

"وہ لاہور میں ڈیوٹی دیں گے۔ تنخواہ یہاں سے دگنی ملے گی اور ہم دیں گے۔ پہلے دیکھو کون جانے کے لیے تیار ہوتا ہے، پھر میں بتاؤں گا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔"

"جی سر۔"

میں نے کہا۔ "غنی! اس کام میں وفاداری کے علاوہ رازداری کی بہت اہمیت ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی انہیں پیسے سے خریدنے کی کوشش بھی کرے۔ وہ ست بدھائی نہیں لاہور ہے۔"

"ڈرائیور تو شیر خان سے بہتر کون ہوگا سر۔ باقی چار افراد کے نام میں بتاؤں گا۔"

"یہ کام جلدی کا ہے غنی۔"

"سر، میں رات تک سب کر لوں گا۔" وہ بے چینی سے پہلو بدل کے بولا۔

میں نے کہا۔ "اچھا اب تم کہو۔ اگر بہت ضروری ہے۔"

"سر، آپ ناراض نہیں ہوں گے! میں اتنا عرصہ آپ کی خدمت کر چکا ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ میں سنی سنائی پر یقین نہیں کرتا لیکن اپنی آنکھیں کھلی رکھتا ہوں۔"

اس کے لہجے نے مجھے چونکایا۔ "تم نے کچھ دیکھا ہے؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "جنابِ عالی! آپ کے دشمن کوئی گہری چال چل رہے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "ان کو چھوڑو، رابعہ کی کیا بات تھی؟"

وہ تذبذب میں مبتلا رہا۔ "سر! رانا صاحب کا بیٹا......"

میں نے کہا۔ "کیا ہوا اسے؟"

وہ اٹک اٹک کے بولا۔ "ان کا اور رابعہ بی بی کا......"

میرے دماغ کو ایک جھٹکا لگا۔ "ان کا کیا! یہ ٹھیک ہے کہ وہ رانا پاگل کا بچہ...... اپنے بیٹے کا رشتہ لایا تھا۔"

"ان کا رابطہ ہے، رابعہ بی بی اور زوہیب حسن کا۔" غنی نے ہمت کر کے اپنے سر سے کوئی بوجھ اتار پھینکا۔

میرا چہرہ گرم ہوگیا۔ "غنی! تم جانتے ہو اس بات کا مطلب؟"

غنی نے مٹھی کھولی جس میں اس نے بہت دیر سے کچھ دبا رکھا تھا۔ یہ ایک کاغذ کا پرزہ تھا جو اس نے میری طرف بڑھا دیا۔ "آپ قسم لے لیں میرے ہونے والے بچے کی جان کی۔ میرے سوا ابھی تک یہ کسی نے نہیں دیکھا۔"

میں نے وہ کاغذ جو کئی تہوں میں تھا، کھولا۔ اس کا پہلا لفظ پڑھتے ہی میرے دماغ میں ایک اور دھماکا ہوا۔ یہ "جانِ من رابعہ" سے شروع ہوتا تھا۔ لکھنے والے کا خط صاف تھا۔ اس نے بغیر لکیر والے کسی کاپی سے پھاڑے ہوئے سفید کاغذ پر یہ تحریر بال پوائنٹ سے لکھی تھی۔ جیسے جیسے میں اسے پڑھتا گیا، میرے خون کا ابال بڑھتا گیا۔

یہ زوہیب حسن کی طرف سے لکھا گیا رابعہ کے نام ایک محبت نامہ تھا، بالکل روایتی قسم کا۔ یہی کہ جب سے تمہیں دیکھا ہے میرے دن کا چین اور راتوں کا قرار چھن گیا ہے۔ چھ مہینے تک میں تمہیں یہ بتانے کی ہمت نہ کر سکا کیونکہ ہمارے درمیان خاندانی دشمنی کی خلیج ہے اور تم نہ جانے جواب میں کیا کرو۔ لیکن اس سے زیادہ برداشت کرنا میرے بس میں نہیں۔ اب جو ہو سو ہو۔ چاہے تم یہ محبت نامہ اپنے نواب بھائی کے سامنے رکھ دو اور وہ مجھے گولی مار دیں۔"

صفحہ دونوں جانب سے بھرا ہوا تھا۔ آخر میں اس نے لکھا تھا کہ تمہاری خاطر میں یہ گھر، خاندان، جائداد سب چھوڑنے کو تیار ہوں۔ مجھے تمہاری ساری شرائط منظور ہوں گی۔ ابھی میں بہت زیادہ اپ سیٹ ہوں کہ معلوم نہیں تمہارے یا میرے گھر والوں کو پتا چلا تو اس کا نتیجہ کیا نکلے گا لیکن ساری بات تو میری اور تمہاری مرضی کی ہے۔ اگر تم ایک

بار...... صرف ایک بار مجھ سے مل لو تو میں اور بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد جیسی تمہاری مرضی۔ تم کہو گی تو میں آئندہ تمہیں اپنی صورت نہیں دکھاؤں گا اور کوشش کروں گا کہ تمہیں بھول جاؤں۔ اگر تم نے چاہا تو میں تمام عمر تمہیں اپنے دل کی رانی بنا کے رکھوں گا......

پورا خط پڑھ کے میرا وجود ایک آتش فشاں بن گیا۔ رابعہ کا رد یہ میرے سامنے تھا لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ باپ بیٹا مل کے اس کے خلاف سازش کا کیسا جال پھیلا رہے ہیں۔

میں نے کہا۔ ''غنی! یہ خط تمہیں کہاں سے ملا اور کب؟''

اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''بے شک قصور میرا تھا۔ مجھے ریشم نے بتایا کہ رابعہ بی بی کے پاس ایک نیا موبائل فون ہے۔ اس پر وہ رات کو کسی سے بات کرتی ہیں۔ اندھیرے میں لیٹ کر اور بہت آہستہ آہستہ۔ میں نے اسے جھاڑا کہ تو کیوں چھپ چھپ کے سنتی ہے مالکوں کی باتیں۔ وہ میرے پیچھے پڑ گئی کہ غنی، میرا دل کہتا ہے کہ کچھ ہے۔''

''یہ کب کی بات ہے؟''

''ایک ہفتہ پہلے کی سر۔ ایک دن ریشم وہ موبائل اٹھا لائی۔ رابعہ بی بی باتھ روم گئی تھیں۔ موبائل فون تکیے کے نیچے تھا۔ میں نے فٹافٹ اس میں رسیو ہونے والی کالز دیکھ کے کہا کہ جا اسے وہیں رکھ آ پھر میں نے ریشم کو ایک گارڈ کا موبائل فون لا کے دیا اور کہا کہ یہ نمبر ملا۔ ریشم نے نمبر ملایا تو ...... دوسری طرف سے زوہیب نے کہا ہیلو۔ ریشم نے میری ہدایات کے مطابق سرگوشی میں پوچھا۔ ''کون......؟ تو اس نے کہا رابعہ! میں زوہیب ہوں۔ بولو؟''

میں سکتے کی کیفیت میں بیٹھا رہا۔ غنی کو جھٹلانا ناممکن تھا۔ معلوم نہیں یہ کھیل کب سے چل رہا تھا لیکن اس کا الٹا سیدھا ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ خط پر کوئی تاریخ نہیں تھی۔ یہ بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ خط لکھنے والا زوہیب حسن ہی تھا اور یہ اسی کی ہینڈ رائٹنگ تھی یا کسی نے یہ خط اس کے نام سے لکھ کے فساد پھیلانا چاہا تھا مگر وہ موبائل فون......!

میں نے کہا۔ ''غنی تم نے بتایا نہیں، یہ خط تمہارے پاس کہاں سے آیا؟''

''یہ بھی مجھے ریشم نے لا کے دیا تھا سر۔ وہ رابعہ بی بی کے کمرے کی صفائی کر رہی تھی۔ جھاڑو دینے والی نے بیڈ کے نیچے جھاڑو پھیری تو یہ کاغذ بھی آ گیا۔ ریشم نے کہا کہ یہ کیا ہے اور کاغذ اٹھا لیا۔ وہ سمجھی کہ کوئی کام کا کاغذ ہوگا۔ پڑھا تو اس کی حالت غیر ہو گئی۔ یہ دو دن پہلے کی بات ہے۔ اس نے مجھے کل یہ کاغذ دیا۔''

''رابعہ کو پتا نہیں چلا؟''

''میں نے ریشم سے کہا تھا کہ رابعہ بی بی پر نظر رکھ۔ مگر ذرا دھیان سے۔ اسے شک نہیں ہونا چاہیے کہ تو جاسوسی کر رہی ہے۔ انہوں نے خط تلاش کیا ہوگا۔ نہیں ملا تو ریشم سے پوچھا کہ میرے تکیے کے نیچے ایک کاغذ تھا، تو نے دیکھا؟ ریشم نے انجان بن کے کہا کہ کیسا کاغذ بی بی جی۔ رابعہ بی بی نے کہا کہ اس پر اسکول کا کچھ ضروری حساب کتاب لکھا ہوا تھا۔ ریشم نے انکار کر دیا کہ میں کیا آپ کے تکیے کے نیچے سے کچھ نکال سکتی ہوں۔''

میرے دماغ میں سائیں سائیں ہو رہی تھی اور چند سوالات میرے دماغ میں یوں گردش کر رہے تھے جیسے تاریک ویران مقبروں کی چھتوں کے درمیان چمگادڑیں اپنے پر پھڑ پھڑاتی رہتی ہیں۔ آخر یہ سلسلہ کب شروع ہوا اور کیوں؟ ابھی شہزادی فریب کاری کا پردہ چاک ہوئے دن ہی کتنے گزرے ہیں۔ اور زوہیب نے جو خاندانی دشمنی کی خلیج کی بات کی ہے۔ تو کیا اسے علم نہیں تھا کہ باپ تو اس کے لیے یہاں پیغام بھی دے چکا اور ذلیل ہو کے واپس بھی جا چکا۔ پہلے کیا ہوا تھا؟ زوہیب نے محبت نامہ بھیجا تھا یا رانا اس کا رشتہ لے کر آیا تھا؟ زوہیب نے کب رابعہ کو دیکھا کہ اس پر فریفتہ ہو گیا۔ کیا رانا یہ بات جانتا تھا یا بیٹے کی رضا کے بغیر ہی آ گیا تھا؟ یہ ان دونوں کی ملی بھگت ہے...... سچ کیا ہے؟

میرا دماغ گھومنے لگا۔

میرے کانوں میں غنی کی آواز آئی۔ ''ایک بات اور تھی سر! اگر آپ خود اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہیں۔''

میری نظر غنی پر جم گئی۔

''جی سر۔'' غنی نے تھوک نگلا۔ ''آج رات، نئے اسکول میں۔''

''تمہیں کس نے بتایا غنی؟''

غنی نے اپنا ریوالور میرے ہاتھ میں دے دیا۔ ''اگر یہ غلط ثابت ہو سر، تو آپ کو اختیار ہے مجھے گولی مار دیں۔''

رات نو بجے میں تو تعمیر شدہ اسکول کی تاریک عمارت میں غنی کے ساتھ دم سادھے بیٹھا ہوا تھا۔ اسکول میں ابھی بجلی نہیں لگی تھی۔ میرے ذہن میں خلا تھا۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ آج میرے ہاتھوں سے کون مارا جائے گا؟ غنی، زوہیب یا رابعہ؟

پھر میں نے ایک آہٹ سنی اور اندھیرے میں ایک سایہ دیکھا۔

آسمان پر دسویں گیارہویں تاریخ کا چاند کافی اوپر اٹھ آیا۔ تکمیل کے آخری مراحل طے کرنے والے چاند کا تین چوتھائی حصہ تاریک جنگل میں دھندلکے جیسا اجالا پھیلا رہا تھا۔

میری نظر اس متحرک سائے پر تھی جو درختوں کے ایک جھنڈ میں داخل ہو کے اب پھر کھلی زمین پر نکلا تھا تو چاندنی نے اس کے خدوخال واضح کر دیے تھے...... میرے لیے شک کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ وہ زوہیب ہی تھا۔ میرا خون ایک بار پھر میری رگوں میں سنسنانے لگا۔ میں نے ریوالور پر اپنی گرفت مضبوط کی۔

اچانک غنی نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

''سر......!''

میں نے برہمی سے کہا۔ ''یہ کیا ہے غنی...... میرا ہاتھ چھوڑ......''

''نہیں سر......! آپ گولی نہیں چلائیں گے...... پلیز سر...... میں آپ کو ایسا نہیں کرنے دوں گا......''

''دیکھو...... کیا میں کسی بے غیرت بھائی کی طرح دیکھوں کہ میری بہن میرے دشمن سے ملنے آئی ہے...... اور کچھ نہ کروں......''

''ایسا کچھ نہیں ہوگا سر...... میں نے سب انتظام کر لیا ہے...... یہ آپ کا دشمن ہے تو میرا بھی ہے...... اس نے ہمارے علاقے میں قدم رکھا ہے تو آخر کیا سمجھ کے، ہم بے خبر سو رہے ہیں......''

میں نے کہا۔ ''آخر تم کیا کرو گے......؟''

''کچھ نہیں...... لیکن بندہ ایسے غائب ہو جائے گا جیسے کبھی یہاں آیا ہی نہیں تھا...... بس خاموشی سے تماشا دیکھیے۔ ہمارے ہوتے آپ کو کچھ کرنے کی کیا ضرورت ہے سر......'' غنی نے سرگوشی میں کہا۔

میں اس کی بات ماننے پر مجبور ہو گیا...... ''او کے...... میرا ہاتھ اب تو چھوڑو......''

غنی نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ ''تھینک یو سر کہ آپ نے میری بات مان لی۔''

''نہ مانتا تو تم کیا کرتے؟''

''میں آپ کو قسم دینے پر مجبور ہو جاتا...... آپ کے والدین کی۔'' میں نے غنی کی طرف دیکھا لیکن میرے کچھ بولنے سے پہلے زوہیب کے پیچھے سے تین سائے نمودار ہوئے...... وہ دبے پاؤں آگے بڑھے اور اچانک بڑی پھرتی سے انہوں نے کوئی سیاہ چادر یا کمبل پیچھے سے زوہیب پر ڈال دیا...... میں نے زوہیب کی آواز نہیں سنی مگر اسے رہائی کے لیے جدوجہد کرتے ضرور دیکھا۔

زوہیب جسمانی طور پر کمزور نہیں تھا لیکن وہ ناز و نعم میں پلا ہوا رئیس زادہ تھا۔ اس کے برعکس زوہیب کو بے بس کر کے گرفتار کرنے والے اس کام میں ماہر لگتے تھے۔ وہ زوہیب سے یوں چمٹ گئے کہ زوہیب کمبل کی تاریک قید سے رہائی حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ چند سیکنڈ میں انہوں نے زوہیب پر ڈالے ہوئے کمبل کو اس کے جسم پر غلاف کی طرح لپیٹ دیا اور ایک رسی سے کمبل کو ایسے باندھا کہ زوہیب ہاتھ پاؤں چلانے سے بھی معذور ہو گیا...... پھر وہ اس متحرک سائے کو اس کی مخالف سمت میں لے گئے اور جنگل میں غائب ہو گئے۔

میں نے یہ تماشا حیرانی اور دلچسپی کے ساتھ دیکھا۔ شک کی کوئی بات ہی نہ تھی۔ یہ غنی کے تربیت یافتہ سیکیورٹی والے تھے۔ جنہوں نے غنی کی ہدایات کے مطابق عمل کیا تھا اور بندہ واقعی ایسے غائب ہو گیا تھا جیسے کبھی یہاں آیا ہی نہیں تھا۔

''بس اب چلیں سر......'' غنی نے کہا۔ ''آپ نے اپنے یہاں آنے کے بارے میں کسی کو بتایا تو نہیں تھا؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ لوگ زوہیب کو کہاں لے گئے ہیں؟''

''اسے وہ ایک محفوظ مقام پر پہنچا دیں گے...... آپ جائیے...... کھانے پر آپ کا انتظار ہو رہا ہوگا۔'' غنی بولا۔

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''ویل ڈن غنی...... تم نہ ہوتے تو آج وہ میرے ہاتھوں مارا جاتا......''

غنی مسکرایا اور پلٹ کے نہ جانے کدھر روانہ ہو گیا۔

میں لوٹ کے آہستہ آہستہ حویلی کی طرف چل پڑا۔ بے شک غنی نے مجھے بروقت روک کے اچھا کیا تھا مگر مسئلہ ہنوز برقرار تھا۔ شاید پہلے سے زیادہ سنگین ہو گیا تھا لیکن میں یہ محسوس کرتا تھا کہ میری پوزیشن مضبوط اور بہتر ہو گئی ہے۔ مجھے وقت مل گیا ہے کہ میں زوہیب کو سننے کے بعد رابعہ کو سمجھا سکوں یا اس سازش کو رابعہ کے سامنے بے نقاب کر سکوں جس کا مقصد رابعہ کو استعمال کر کے مجھے کمزور کرنا اور مجھ سے اپنی ہر بات منوانا تھا۔ رات کا کھانا لگایا جا چکا تھا اور صرف میرا انتظار تھا۔ رابعہ تیز لہجے میں بولی۔ ''کہاں غائب ہو گئے تھے کھانے کے وقت؟'' میں نے مسکرا کے گھڑی دیکھی اور پرسکون لہجے میں کہا۔

''ہم لوگ عام طور پر دس بجے کھانا کھاتے ہیں...... اور ابھی دس نہیں بجے......''

ریشم نے ڈش میرے سامنے رکھی...... ''سر غنی ویٹر

سو......"

میں نے کہا...... "کتنا اچھا لگتا اگر لوگ پوچھتے کہ ریشم اور غنی کہاں ہیں......؟ غضب خدا کا...... ایک دلہن جس کے ہاتھوں کی مہندی بھی نہیں اتری...... پوچھ رہی ہے کہ اس کا دلہا کہاں ہے...... یہ ہم بتائیں؟"

ریشم کہنے لگی...... "سری ویری بزی...... ورلڈ ٹائم...... وائف نو ٹائم......"

میں نے ٹھنڈی سانس لی...... "کیا زمانہ آ گیا ہے...... نہ شرم نہ حیا...... دلہن سرِعام مطالبہ کر رہی ہے کہ اس کے دلہا کو کچھ نہیں کرنا چاہیے...... بس ہر وقت اس کے گھٹنے سے لگ کر بیٹھے رہنا چاہیے......"

کن انکھیوں سے میں رابعہ کا جائزہ لے رہا تھا...... اس کے چہرے پر ایک تناؤ تھا جو اس کے دل کی کیفیت کا آئینہ دار تھا۔ اندر سے وہ ایک مجرمانہ کشمکش کا شکار تھی اور بڑی بے رغبتی سے کھا رہی تھی۔

لیلیٰ بھابی نے اسے ٹوکا...... "رابعہ...... کیا بات ہے۔ تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"میری طبیعت کو کیا ہوا ہے......؟" وہ تنک کے بولی۔

شہناز نے کہا۔ "میں نے کوئی ایسی بات تو نہیں کہی...... بس میں دیکھ رہی ہوں...... تمہارے مزاج میں کچھ تندی آ گئی ہے۔"

رابعہ اٹھ کھڑی ہوئی...... "دراصل...... بھوک نہیں لگ رہی ہے مجھے...... میں اپنے کمرے میں جا کے آرام کرنا چاہتی ہوں......"

میں نے شہناز سے کہا۔ "مجھے بھی اس کی طبیعت ٹھیک نہیں لگتی...... تم کھانے کے بعد ذرا دیکھ لو......"

رابعہ پلٹی...... "کوئی ضرورت نہیں...... میں ٹھیک ہوں۔"

رابعہ کا کمرا اس راہداری کے آخر میں تھا جس کے دونوں طرف سب کے بیڈ رومز کے دروازے کھلتے تھے۔ اس کے بعد ایک لاؤنج میں جگہ تھی جس میں دائیں طرف کچن تھا اور بائیں ہاتھ پر عقبی حصے کا زینہ تھا جو اوپر کی منزل پر لے جاتا تھا۔ اس زینے کے پیچھے ایک دروازہ تھا جسے چور دروازہ سمجھا جا سکتا تھا کیونکہ یہ کوریڈور میں سے نظر نہیں آتا تھا۔ غالباً رابعہ کو باہر جانے کے لیے اسی دروازے کو استعمال کرنا تھا۔

لیکن اب مجھے نہ کوئی اندیشہ تھا نہ پریشانی...... اس خیال سے مجھے اطمینان تھا کہ اب رابعہ کو انتظار کے صبر آزما لمحات سے گزرنے کے بعد بالآخر مایوس واپس آنا تھا...... وہ جس سے ملنے کے خواب آنکھوں میں لے کر جا رہی تھی وہ کسی نامعلوم مقام پر بے بس و مجبور تھا۔ جہاں نہ کسی کو اس کے غضب کی پروا تھی اور نہ اس کے مرتبے کی...... وہ محض ایک عام سا بندہ تھا اور غالباً اس وقت رومانی تصورات کی جگہ اس کے دماغ پر اپنی سلامتی کو لاحق خطرات کا غلبہ تھا۔

کھانے کے بعد میں کچھ دیر شہناز کے ساتھ باغ میں بیٹھا رہا اور ہم دونوں ڈاکٹر مہدی حسن فیملی کی صورت میں آنے والی غیبی امداد کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ اندرونی طور پر ہم دونوں انتظار کے اضطراب کا شکار تھے۔ شہناز کو تشویش تھی کہ گولی کے ساتھ جانے والا راجا ابھی تک واپس کیوں نہیں آیا۔ مجھے غنی کا انتظار تھا جس نے بڑی صفائی سے زوہیب کو ایسے غائب کر دیا تھا جیسے ہماری انٹیلی جنس کے ادارے سرحد پار سے ملک میں تخریبی کارروائی کی نیت سے داخل ہونے والے کو غائب کرتے ہیں۔

شہناز کے اضطراب میں صرف محبت تھی۔ محبت کا مفہوم ہی انتظار ہے، خواہ اس کا ظاہری انداز مختلف ہو۔ ماں ایسی ہی جذباتی خلش کے ساتھ انتظار کرتی ہے کہ بیٹا ابھی تک لوٹ کے گھر کیوں نہیں آیا۔ بیویاں کھانا میز پر سجائے تشویش میں مبتلا رہتی ہیں کہ شوہر نے واپسی میں اتنی دیر کیوں کر دی؟

میرے ذہن میں جذباتی مسائل کا ایک انبار تھا جو آپس میں الجھ گئے تھے۔ یہ میری اپنی حماقت یا جذباتی کمزوری کا نتیجہ تھا کہ میں سب کچھ درست ہوتے ہوئے بھی بے سکون تھا۔ جب میں لندن جیسے شہر سے ست بدھائی جیسے ویرانے میں وارد ہوا تھا تو اپنی خوش نصیبی پر نازاں تھا کہ خدا نے مجھ گنہگار کو اپنے کرم سے مالا مال کر دیا...... میرے پاس اعلیٰ تعلیم تھی...... عزت تھی اور فریال کی محبت تھی...... اس خزانے کو خطرہ کہیں سے نہ تھا پھر اچانک نور جہاں نمودار ہوئی۔ اس نے میرے سامنے اعتراف کیا تھا کہ جب میں نے تمہیں دیکھا تو فیصلہ کر لیا تھا کہ تم میرے لیے ہی بنائے گئے ہو...... اس کے حسنِ بے مثال نے مجھے اتنا ہی متاثر کیا تھا جتنا کوئی بھی مرد ہو سکتا تھا۔ اس وقت وہ اکبر خان کی بیوہ تھی۔ کم سے کم کہلانے کی حد تک۔ اس کے فیصلے سے کوئی فرق نہ پڑتا اگر سات سال تک پوری شدت اور استقامت کے ساتھ میرا ساتھ دینے والی زبان اسے راستہ نہ دیتی۔

یہی ایک وجہ تھی جو بالآخر نور جہاں کی فتح اور فریال کی شکست کا سبب بنی...... فریال کی آرزو تھی کہ وہ میرے ساتھ رہے مگر ست بدھائی میں نہیں...... لندن، پیرس اور نیویارک کی ہنگامہ پرور دنیا میں...... اس کے برعکس نور جہاں کو صرف

میرا ساتھ درکار تھا۔ وہ کہیں بھی ہو...... کیسا بھی ہو...... میں اس سے شادی کروں نہ کروں...... اسے دوسری بیوی بنا لوں یا بکفِ داشتہ...... اسے نہ فریال سے حسد تھا اور نہ فریال کے حسد کی پروا تھی۔

انجام کار نور جہاں نے اپنی غیر مشروط محبت سے فریال سے مجھے چھین لیا...... فریال کی محبت اپنے تقاضوں کی کمزوری سے ہار گئی اور وہ میری بے وفائی کو بہانہ بنا کے میری دنیا سے نکل گئی۔ اصل بات یہ تھی کہ میرے ساتھ زندگی گزارنے کے جو خواب اس نے دیکھے تھے ان میں زندگی کا انداز کبھی وہ نہ تھا جو انتہائی غیر متوقع طور پر اچانک اس کے سامنے آ گیا...... امریکا سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد میں لندن میں سیٹل ہو چکا تھا۔ میرے پاس ایک اعلیٰ عہدہ تھا ایک انتہائی روشن مستقبل...... پھر تقدیر کے ہاتھ نے ایک دم پانسا پلٹ دیا اور مجھے ست بدھائی کا نواب بنا دیا...... یہ میں نے کبھی خواب میں بھی نہ سوچا تھا۔

باہر کی دنیا کا محاذ الگ تھا جس میں میرا مقابلہ رانا رجب علی یا چودھری سلطان جیسے دشمنوں سے تھا۔ اس کا اثر اندر کی دنیا کے معاملات پر نور جہاں کی یلغار سے پڑا۔ اس کا مقابلہ شاید کوئی مرد نہ کر پاتا...... اگر میں مغلوب ہو گیا تو یہ میری کمزوری تھی۔ ایسا دعویٰ میں نے کبھی نہیں کیا تھا کہ میں ناقابلِ تسخیر ہوں۔ نور جہاں جیسی عورت میری زندگی میں پہلے آئی بھی کہاں تھی...... ایک مشہور قول کے مطابق...... وہ آئی...... اس نے دیکھا اور اس نے فتح کر لیا۔ آج بھی مجھے حالات کی یہ کروٹ ناقابلِ یقین نظر آتی تھی جس نے ناممکن کو ممکن بنا دیا تھا...... سب ہی کو ایک الگ رنگ میں ڈھال دیا تھا اور سب کچھ الٹا کر دیا تھا۔ وہ بدنامی جو نور جہاں کے روز و شب پر اندھیری رات کی طرح محیط تھی فریال کی دنیا پر پھیل گئی تھی۔ آج نور جہاں نیک نام تھی، زندگی کے ڈرامے کے اداکاروں نے آپس میں اپنے رول بدل لیے تھے جیسے اچھائی اور برائی دو لباس تھے۔ نور جہاں نے نور بن کے فریال کا رول لے لیا تھا اور فریال نے نور جہاں کا کردار قبول کر لیا تھا۔ یہ ایک ایسی حقیقت تھی جو کھلی آنکھوں سے سب کو نظر آتی تھی۔

شہناز بہت افسوس کرتی رہی کہ فریال کس طرح خود کو رسوا اور برباد کر رہی ہے...... شوبزنس بھی ایک بزنس ہے...... ہالی وڈ میں ایسا ہی ہے اور اب کسی حد تک بالی وڈ میں بھی...... مگر پاکستان میں ہنوز روزِ اول والا معاملہ ہے...... یہاں آج بھی شوبزنس کو رسوائی کی ایک دلدل سمجھا جاتا ہے جس میں قدم رکھنے والا اسی طرح اپنا دامن بے داغ نہیں رکھ سکتا جیسے کوئلے کی کان میں کام کرنے والا سیاہی سے نہیں بچ سکتا۔

شہناز نے بے خیالی میں پچاسویں بار گھڑی دیکھی۔ "اب تو راجا صاحب آنے سے رہے۔"

میں نے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب...... آپ نے بڑی غلطی کی جو اسے گولی جیسی عورت کے ساتھ جانے دیا۔"

شہناز مسکرائی۔ "میرے روکنے سے کیا وہ رک جاتا؟"

میں نے مذاقاً کہا۔ "اسے لگا دیتا تھا کوئی انجکشن...... سنا ہے اب تو ایسے انجکشن ایجاد ہو گئے ہیں کہ شیر کو لگا دو تو بکری بن جائے......"

اپنے اندر کے خوف کو دبا کے شہناز نے کہا۔ "گولی اسے کہاں لے جا سکتی ہے؟"

میں نے کہا۔ "بی بی...... کچھ عقل سے کام لو...... وہ ڈاکو کی بیوی تھی...... گن پوائنٹ پر جو چاہے کرا لے...... اور خود راجا کا کیا بھروسا ہے۔ لعنت ست بدھائی اور صحافت پر...... ڈاکوؤں کا گروہ بنانے میں فائدہ ہے...... وہی ملک میں عیش کر رہے ہیں......"

شہناز پھر اصل موضوع کی طرف پلٹ گئی۔ "فریال کو ضرورت ہے مورل سپورٹ کی...... اور نفسیاتی علاج کی...... اگر وہ لندن چلی جائے ڈاکٹر شائستہ کے پاس......"

میں نے کہا۔ "اگر آنا ہو گا تو وہ لوٹ کے بھی آ جائے گی اپنی مرضی سے۔ مجھے لگتا ہے کہ ہمارا یہ اسپتال بہت جلد ایک بہت بڑا میڈیکل کمپلیکس بن جائے گا۔ جس میں دور دور سے مریض ہر قسم کے علاج کے لیے آئیں گے۔"

"ہاں...... مجھے بھی یقین ہے کہ قدرت ہماری مدد کر رہی ہے۔ اب دیکھو نا ہمیں ایک ڈاکٹر کی ضرورت تھی...... تین آ رہے ہیں...... ڈاکٹر مہدی حسن کی عمر زیادہ ہے اور امید ہے وہ پریکٹس ہی نہیں کرتے...... مگر ہیں تو تجربہ کار ہڈیوں کے ڈاکٹر...... پھر ان کا بیٹا...... احمد حسن......"

"لڑکی ڈاکٹر ہونے کے ساتھ مریض بھی ہے۔"

"یہاں آ کے ٹھیک ہو جائے گی...... دوسروں کو بھی ٹھیک کرنے لگے گی۔ تم دیکھنا......"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "یہ باقی لوگ اندر کیا کر رہے ہیں؟"

شہناز میرے ساتھ چلنے لگی۔ "لیلیٰ بھابی پہنچی ہوں گی ثریا کے ساتھ...... ان کی آج کل گاڑی چھن رہی ہے۔"

"دونوں کا درد مشترک ہے...... اور کیسا عجیب اتفاق ہے کہ دونوں کے شوہر وکیل ہیں مگر مجرمانہ ذہن رکھتے ہیں۔"

"وہ جو ثریا کا بیٹا ہے...... گلریز عرف ہیلو...... اسے لیلیٰ بھابی نے لے لیا ہے۔"

"لے لیا ہے کیا مطلب......؟"

"پتا نہیں کیوں...... ثریا اس کے ساتھ یوں پیش آتی

ہے جیسے وہ کوئی UNWANTED چائلڈ ہے...... جو زبردستی اسے پیدا کرنا پڑا۔ اس پر تھوپا گیا اور باپ دھوکے سے نکل گیا۔ وہ ماتا کی زنجیر میں بندھ کے نہیں رہنا چاہتی۔ مکمل آزادی چاہتی ہے......"

"عجیب بات ہے......"

"ہاں...... وہ ماضی کی ہر تلخ یاد کو ماضی میں دفن کر دینا چاہتی ہے...... ایک نئی زندگی کو ایک نئی کتاب کی طرح شروع کرنا چاہتی ہے اور لیلیٰ بھابی کا حال اس کے برعکس ہے...... وہ اولاد کے لیے ترستی رہیں...... سارے جتن کیے مگر ماں نہ بن پائیں...... لہٰذا ابو بی کو اب وہ پالیں گی۔"

"اور ثریا کیا کرے گی......؟"

"وہ کہتی ہے میں پڑھوں گی...... بی اے ایم اے...... پی ایچ ڈی...... سب کر دوں گی اور جب یہاں کا اسکول بڑھتے بڑھتے کالج بن جائے گا تو اس میں ہی پڑھاؤں گی...... کبھی کہتی ہے باہر چلی جاؤں گی...... روز ایک بوائے فرینڈ بناؤں گی...... شادی کسی سے نہیں کروں گی...... مردوں کی دنیا میں عورت آزاد ہو کے کیا کچھ کر سکتی ہے......"

"سب وقتی اثر ہے...... آدمی کچھ نہیں جانتا کل کیا ہونے والا ہے......"

برآمدے میں کھڑی ریشم نے انگلش میں سوال کیا۔ "یو نو میڈم رابعہ ان روم ناٹ...... آئی گو...... سی......"

میں نے کہا۔ "اس وقت رابعہ کہاں جا سکتی ہے...... میں دیکھتا ہوں۔"

شہناز میرے ساتھ چل پڑی۔ ...... "اس کا موڈ ہی عجیب ہو رہا ہے...... جارحانہ اور تلخ...... مگر سب چپ رہتے ہیں کہ ڈپریشن کا اثر ہے۔" وہ ایک دم پلٹی۔ "ریشم...... تم نے اوپر دیکھا......؟"

"یس میڈم...... اپ ڈاؤن...... آل روم......"

شہناز پھر میرے ساتھ ہو گئی۔ "کہیں وہ ماں باپ کی قبروں کی طرف نہ نکلی ہو۔"

میں نے کہا۔ "مشکل ہے...... اسے گیٹ سے گزر کے اور پورا چکر لگا کے جانا پڑے گا۔ اتنی ہمت نہیں ہے اس میں...... اسکول میں دیکھ لیتے ہیں۔"

میری بات ابھی ختم بھی نہیں ہوئی تھی کہ اسکول کے سائے میں مجھے حرکت کا احساس ہوا میں رک گیا۔ غور سے دیکھنے پر ایک انسانی شبیہ نظر آئی۔ جیسے سیاہ کینوس پر ایک سیاہ سایہ، باقی تین اطراف میں چاند کا دھندلا سا اجالا تھا۔

میں نے رخ بدل کے پوچھا۔ "کون ہے......؟"

رابعہ تاریکی سے نکل آئی۔ وہ دیوار کے ساتھ چمٹ کے کھڑی ہوئی تھی...... مجھے معلوم تھا کہ یہاں اس وقت اور کوئی نہیں ہو سکتا جو چوروں کی طرح چھپا کھڑا ہوگا...... رابعہ وہاں زوہیب کا انتظار کر رہی تھی۔

شہناز نے حیرانی سے کہا۔ "رابعہ...... تم یہاں کیا کر رہی ہو اس وقت؟"

رابعہ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "کچھ نہیں...... اسکول میں کچھ دیکھنے آئی تھی۔"

شہناز نے سر ہلایا۔ "آخر کیا ہے وہ کاغذ...... تم صبح بھی پوچھتی پھر رہی تھیں سب سے۔"

وہ تنک کے بولی۔ "اب تمہیں کیا بتاؤں...... اور کیوں بتاؤں...... تھا ایک کاغذ جو میرے لیے اہم تھا۔"

"ٹھیک ہے...... نہ بتاؤ...... مگر تم اتنی اپ سیٹ کیوں رہنے لگی ہو آخر......" شہناز نے نرمی سے کہا۔

"اپ سیٹ کس نے کیا ہے مجھے...... کیا میں خود ہی اپنی مرضی سے ہو رہی ہوں؟ کسی وجہ کے بغیر؟ تمہاری لائف تو سیٹ ہے نا...... دوسروں کی فکر مت کرو۔"

میں نے کہا۔ "نشیب و فراز تو سب کی زندگی میں آتے ہیں کزن۔" رابعہ نے مزید تلخ ہو کر کہا۔ "ہاں...... لیکن یہاں فراز صرف تمہاری زندگی میں ہے...... اور نشیب میرے لیے......" پھر وہ تیز تیز قدم اٹھاتی آگے نکل گئی۔

صاف ظاہر تھا کہ اس طرح پکڑے جانے پر اس کی فرسٹریشن میں ایک مجرمانہ شرمساری ہو گی اور جب اس نے موبائل فون پر رابطے کی کوشش کی ہو گی تو اسے مسلسل ایک ہی جواب سننے کو ملا ہوگا...... آپ کے مطلوبہ نمبر سے کوئی جواب موصول نہیں ہو رہا ہے۔ غیر متوقع طور پر میرے اور شہناز کے آ جانے سے وہ احساسِ جرم میں بھی گرفتار ہو گئی۔ ممکن ہے اس کو رابعہ نے میری دخل اندازی سمجھا ہو۔

شہناز نے افسوس سے سر ہلایا۔ "اگر ایسا ہی رہا تو یہ نفسیاتی مریض ہو جائے گی۔"

"ہو جائے گی کیا...... ہو گئی ہے...... لیکن تم اس کا علاج کرنے کی کوشش کرو گی تو وہ کہے گی پاگل تم ہو...... بہتر ہے اسے اس کے حال پر چھوڑ دو...... اللہ بہتر کرے گا۔"

غنی رات میرے سونے تک نظر نہیں آیا تھا۔ اس سے تو میرا کوئی رابطہ تھا اور نہ ریشم کا...... سونے سے پہلے میں

نے اس عجیب اور خطرناک صورت حال پر غور کیا۔ زوہیب کے لاپتا ہو جانے سے کیا دھماکا خیز صورت حال پیدا ہو گی۔ ان کا ولی عہد محل میں سے ایسے غائب ہو جائے کہ کسی کو بھی پتا نہ چلے...... یہ کیسے ہو سکتا ہے...... رانا نے گھر والوں سے پھر گھر کے محافظوں سے پوچھا ہوگا۔ وہ کب گیا...... کیسے گیا...... گاڑیاں بھی سب کھڑی ہیں۔ وہ کیا جانے کہ آدمی جب مجنوں ہو جاتا ہے تو اپنی لیلیٰ کی تلاش میں ایسے ہی نکلتا ہے مگر کیا واقعی ایسا ہے کہ زوہیب کو رابعہ سے دیوانہ کرنے والا عشق ہو گیا ہو؟ عقل اس سوال کا جواب نفی میں دیتی تھی۔ اس عشق کے پردے میں کہیں غرض مندی کی عیاری تھی۔ زوہیب حسن بیٹا تھا رانا جیسے باپ کا جس کا شاطر ذہن ہر قدم پر کوئی سیاسی چال سوچتا تھا اور ذاتی تعلقات کو بھی فائدے کے پیمانے پر تول کر رشتہ استوار کرتا تھا۔ میری نظر میں وہ ایک مہرہ تھا جسے آگے بڑھانے والا ہاتھ اس شخص کا تھا جسے میں حالات کے تناظر میں اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھنے پر مجبور تھا۔

رابعہ کو میں پیدائش کے روزِ اول سے جانتا تھا اور وہ ایک رشتے دار سے زیادہ ایک اچھی دوست تھی۔ اس نے ہمیشہ مشکل میں میرے لیے آسانی پیدا کی تھی۔ میری اپنی کوئی بہن نہ تھی چنانچہ اسی کو میں نے بہن کہا اور مان لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب رابعہ کی ماں نے ہمیں ازدواجی بندھن میں جکڑنا چاہا تو میرے ذہن نے اس نئے رشتے کو قبول نہیں کیا۔ رابعہ کی ماں کے نزدیک یہ ست بدھائی کی مالک بننے کا واحد راستہ رہ گیا تھا لیکن میں رابعہ کو بہن کے سوا اور کچھ سمجھ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کی ایک وجہ فریال بھی تھی جس نے میری شریکِ حیات کا درجہ بہت پہلے حاصل کر لیا تھا۔

میرا خیال تھا کہ کچھ ایسے ہی جذبات و احساسات رابعہ کے بھی ہوں گے۔ اس نے اپنے رویے سے میرے سامنے ایسا ظاہر بھی کیا مگر اب میں یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ کہیں وہ رابعہ کا اعترافِ شکست کا جذبہ تو نہیں تھا۔ اس نے دیکھا کہ فریال سے الگ میرا کوئی وجود نہیں تو اس نے خود بخود ایک قدم پیچھے ہٹ کے بہن کے منصب پر رہنا بہتر جانا اگر صدر کا عہدہ خالی نہیں تو وزارتِ عظمیٰ میں سہی۔ ایسا نہ ہو کہ اچانک کوئی اس پر بھی خود کو فائز کر لے۔

شاید اسے مزید افسوس ہوا ہوگا جب نور جہاں نے فریال کو میری زندگی سے بے دخل کر کے اس کی جگہ پر قبضہ کر لیا۔ ایسی کوشش رابعہ نے کی ہی نہیں تھی۔ بہن بن کے وہ آدھا حقِ وارثت مانگ سکتی تھی ورنہ کچھ بھی نہیں۔ یکے بعد دیگرے خرم اور پھر شہزاد کے ہاتھوں محبت کا فریب کھانے کے بعد رابعہ کی قوتِ برداشت جواب دینے لگی تو اس نے مخالف جذبات کی توپوں کا رخ میری طرف موڑ دیا۔ "تم نے مجھے میرے حق سے محروم رکھا۔ تم نے مجھے خرم سے ملوایا تھا اور خرم نے مجھ سے تمہارا انتقام لیا۔ تم اس کی بہن کی موت کا سبب بنے تھے۔ اس نے تمہاری بہن کو ہدف بنا لیا...... شہزاد کو بھی تم لائے تھے...... تم نے ہی اسے میری طرف دھکیلا اور اس کے ساتھ رشتہ جوڑا تھا۔"

مجھے رابعہ پر افسوس ہونے لگا۔ ہر صورت میں وہی گھاٹے میں رہی۔ اس کو خیال ضرور آیا ہوگا کہ وہ بھی نور جہاں کی طرح فریال کو ہٹا کے اپنے کزن کو اپنا شوہر بنانے کی کوشش کرتی۔ شرعی اخلاقی اور قانونی طور پر اس میں کچھ غلط نہ ہوتا...... شاید رابعہ اب ایسا سوچتی ہو...... نور جہاں کا مقابلہ دنیا کی کوئی عورت نہیں کر سکتی تھی...... رابعہ کیا کرتی...... لیکن ہار ہر صورت میں اس کا مقدر بنی...... بہن بن کے بھی۔

اب اس کی فرسٹریشن نے ایک منفی انداز اختیار کر لیا تھا۔ اس نے کہا کہ اچھا تم مجھے میرا حق نہیں دیتے۔ میرے نہیں بنتے اور میرے مقابلے میں نور جہاں جیسی بدنام فاحشہ پر مرتے ہو تو پھر میرے لیے بھی راستہ کھلا ہے...... میں تمہارے دشمنوں کی صف میں شامل ہو جاتی ہوں۔ جب میرا بھلا نہ ہوا تو...... پھر یہ وار آزمانے میں کیا حرج ہے کہ میں یہ دوستی رشتے داری بھول کے دشمنی کی راہ پر چل پڑوں۔

آج رشتوں کے یہ سلسلے عجیب و غریب شکلیں بدل رہے تھے۔ میں بہت کچھ چھپا رہا تھا۔ ان سے بھی جو مجھ سے سو فیصد اعتماد کے رشتے میں منسلک ہیں...... میں نے راجا کے سوا کسی کو ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی کہ گزشتہ راتوں میں سے میری ایک رات فریال کے ساتھ بھی گزری تھی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ نور جہاں کہاں ہے اور کس حال میں ہے...... کسی کو خبر نہ تھی کہ ماہ نور بن جانے کے بعد وہ کہاں رہتی ہے...... اور تازہ ترین واردات یہ تھی کہ میں نے فریال کو تحفظ فراہم کرنے کی ذمے داری قبول کر لی تھی۔ کوئی مجھ سے پوچھتا کہ میں نے ایسا کیوں کیا تو میرے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ جواب اس بات کا بھی نہ تھا کہ ماہ نور نے فریال کے خراب سے خراب تر ہوتے حالات کی اور خود فریال کو سنبھالنے کی ذمے داری سنبھال لی تھی۔ کسی قسم کی رقابت کے جذبات اس کے دل میں نہ تھے۔ اس نے محض میری خوشی کے لیے ایسا

کیا۔ کیا محبت کا اس سے بڑا کوئی اور امتحان ہو سکتا ہے۔

ساڑھے آٹھ بجے خلافِ معمول میں جلدی اٹھ گیا۔ سب سے پہلا خیال مجھے غنی کا آیا۔ صرف غنی ہی نہیں رات کو کسی وقت راجا بھی لوٹ آیا تھا لیکن وہ دونوں اپنی تھکن اتار رہے تھے۔ حویلی کے دیگر معمولات روز کی طرح چل رہے تھے۔ شہناز اور ریشم اسپتال میں تھیں۔ لیلیٰ بھابی اور رابعہ اسکول میں...... ثریا اپنے کمرے میں تھی جہاں سے میں ٹی وی پر کوئی فلم چلنے کی آوازیں سن سکتا تھا۔

شہناز کے بتانے سے پہلے ہی میں نے ثریا کے بدلے ہوئے انداز دیکھ لیے تھے۔ وہ اپنی نئی لائف کو انجوائے کر رہی تھی۔ وہ شہزاد کی دی ہوئی بدنصیبی کو اپنی زندگی سے ایسے دور کر رہی تھی جیسے کوئی کپڑوں سے گرد جھاڑتا ہے۔ قسمت اسے یہاں فریادی بنا کر لائی تھی مگر پھر یہ ہوا کہ شہزاد نے اسے اپنی زندگی سے نکال پھینکا جیسے دودھ سے مکھی تو ہم نے اسے اپنا لیا۔ اس کی بدنصیبی یکلخت خوش نصیبی کا عنوان بن گئی۔

ثریا اب پھر سے ایک لڑکی بن جانے کی آرزو مند تھی۔ اس نے نئے فیشن کے ملبوسات بنوائے تھے اور وہ سارے شوق پورے کر رہی تھی جن کا وہ خواب بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ انتہا یہ ہے کہ اس نے بلو کو بھی اپنی زندگی سے نکال پھینکا تھا کیونکہ نئے خوابوں کے ساتھ زندگی کے نئے سفر میں وہ پرانی یادوں کو ساتھ رکھنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ دنیا میں سابقہ مسز شہزاد یا بلو کی ماں نہیں...... صرف ثریا جبیں نظر آنا چاہتی تھی چنانچہ اس نے بلو کو ابھی سے لیلیٰ بھابی کے حوالے کر دیا تھا تاکہ بڑا ہونے تک خود کو ان کی ممتا کا حصہ سمجھنے لگے۔

میں برآمدے میں کرسی ڈال کے بیٹھ گیا...... ریشم کی ماں فاطمہ میرے لیے کافی لے کر آئی۔ اس کی صحت پہلے کے مقابلے میں بہت بہتر ہو گئی تھی...... اس کی وجہ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ حویلی کے اندر اسے آرام ہی نہیں عزت بھی ملی تھی اور فراغت بھی حاصل تھی۔ یوں دیکھنے میں اور کہنے کو وہ خادمہ تھی اور کچن سنبھالتی تھی لیکن اسے گھر کے ایک فرد کی حیثیت حاصل تھی اور ہم سب اسے بڑی عزت سے بلاتے تھے۔ ریشم اس کی بیٹی تھی جو سب کی منہ چڑھی تھی اور غنی سے شادی کے بعد فاطمہ اپنی بیٹی داماد کو دیکھ دیکھ کے نہال ہوتی تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ کہنا چاہتی ہے...... ''کیسی ہو تم فاطمہ؟''

''اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے...... آپ کا احسان ہے جناب......''

میں نے کہا...... ''کوئی مسئلہ ہے؟''

''مسئلہ تو نہیں جناب عالی...... آپ سے ایک بات پوچھنی تھی۔ اگر آپ اجازت دیں...... اور ناراض نہ ہوں۔''

''کہو فاطمہ...... ایسی کیا بات ہے......''

''وہ اکبر خان...... جیسا بھی تھا میرا شوہر رہا مرتے دم تک...... ریشم اس کی بیٹی ہے...... اس نے طلاق نہیں دی تھی مجھے......''

میں نے اسے غور سے دیکھا...... اس میں کیا شک ہے......''

''وہ زندگی میں کیا کچھ کرتا رہا...... اس سے غرض نہیں...... وہ برائی کے راستے پر چلتا رہا۔ یہ معاملہ اس کے اور خدا کے درمیان ہے۔''

''فاطمہ...... جو کہنا ہے...... کھل کے کہو۔''

''اسی حویلی میں اس کی مجھ سے شادی ہوئی تھی...... یہ ابھی کل کی بات لگتی ہے...... آج وہ اس دیوار کے پچھواڑے اسی مٹی میں سو رہا ہے...... برے کاموں کے برے نتیجے...... جہاں اس کا قتل ہوا تھا...... میں نے سنا ہے وہ کرائے کا مکان تھا...... جہاں وہ فرضی نام سے رہتا تھا......''

نور جہاں کا نام اس نے جانتے بوجھتے نہیں لیا تھا...... اس کے لہجے میں مرنے والے کے لیے آج بھی نفرت تھی...... نہ وہ خود اور نہ اس کی بیٹی کبھی اسے یاد کرتی تھیں...... وہ تو اس کا ذکر تک سننا پسند نہیں کرتی تھیں۔

فاطمہ نے چند سیکنڈ کے توقف کے بعد کہا...... ''کیا یہ صحیح ہے کہ لاہور میں اس کی ایک کوٹھی تھی؟''

مجھے کافی کا آخری گھونٹ کچھ زیادہ ہی تلخ محسوس ہوا۔ ''ہاں...... تھی......''

''اس میں اب کون رہتا ہے سر...... کون ہے اس کا مالک......؟''

اب میں نے ساری بات سمجھ لی۔ ''مجھے نہیں معلوم......''

''اگر اس نے کسی اور سے شادی نہیں کی تھی اور ریشم کے علاوہ اس کی اولاد بھی کوئی نہیں تو کیا جو کچھ اکبر خان کا تھا اس کے مرنے کے بعد اس کے وارثوں کو نہیں ملنا چاہیے......''

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد میں نے کہا...... ''ملنا تو چاہیے مگر اس کے لیے بھی قانون کے مطابق کارروائی ہوگی...... کیا تمہارے پاس کوئی نکاح نامہ وغیرہ ہے؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اس وقت یہ قانون نہیں تھا سر۔ بس دو بول پڑھائے جاتے تھے۔''

میں نے کہا۔ ''اچھا...... میں اپنے وکیل سے کہوں گا...... وہ تمہارا حقِ وراثت کا کیس فائل کر دے...... لیکن پہلے یہ معلوم کرنا پڑے گا کہ اکبر خان نے کیا کچھ چھوڑا تھا۔ اس کوٹھی کے علاوہ...... ضرور کسی بینک میں اس کا پیسا بھی پڑا ہوگا۔ یہ تمہارا اور ریشم کا حق ہے...... تمہیں مل جائے گا......''

''اللہ آپ کو دنیا کے بعد آخرت میں بھی سرخرو کرے...... میری بات کا یہ مطلب نہ لیں سر...... کہ میں یہاں خوش نہیں ہوں اور یہاں سے جانا چاہتی ہوں...... میری آرزو ہے کہ مجھے بھی ست بدھائی کی مٹی ملے......''

میں نے کہا۔ ''میں سمجھ گیا فاطمہ......''

''میری زندگی کے اب دن ہی کتنے رہ گئے ہیں...... لیکن ریشم اور غنی کے سامنے تو پوری عمر پڑی ہے......''

اچانک میں نے اپنے سامنے غنی کو دیکھا...... اس کا چہرہ ناگواری کے جذبات کی تصویر بنا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ سامنے آنے سے پہلے اس نے فاطمہ کی اور میری ساری گفتگو سن لی تھی۔ ''تم ہماری فکر مت کرو اماں......''

فاطمہ کا رنگ اڑ گیا۔ ''وہ تو...... میں ایسے ہی کہہ رہی تھی۔''

''ایسے ہی تم ایسی ہی باتیں کیوں کرتی ہو......؟'' غنی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

میں نے اسے ٹوکا...... ''غنی...... میں سمجھتا ہوں فاطمہ نے جو کچھ کہا بالکل ٹھیک کہا...... اکبر خان کی جائداد کو لاوارث تو نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اچھا ہوا فاطمہ نے مجھے ایک ایسی بات یاد دلا دی۔ پھر جو میں بھولا ہوا تھا۔''

''مجھے نہیں چاہیے اکبر خان کی جائداد......''

میں نے ہنس کے کہا۔ ''اچھا تو اسے خیرات کر دینا۔ ریشم سے کہنا کسی فلاحی ادارے کے نام کر دے۔''

فاطمہ چپکے سے سرک گئی کیونکہ اس نے داماد صاحب کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ لیے تھے۔ ''اسے اپنا سسر مانتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے۔''

میں نے اسے ٹھنڈا کرنے کے لیے کہا۔ ''مگر تم اسے عاق بھی نہیں کر سکتے...... نام کا رشتہ رہتا ہے۔''

''جو کچھ اس نے حرام کی کمائی سے اس دنیا میں بنایا تھا...... اس میں سے ایک پیسا لینا مجھے منظور نہیں......''

''او ہو تمہیں زبردستی کوئی نہیں دے رہا ہے...... لیکن فاطمہ کی بات غلط نہیں تھی...... وہ جائداد لاوارث پڑی رہے

گی تو کوئی اس پر قابض ہو جائے گا...... اگر وہ ریشم کو مل جائے اور خود ریشم اسے کسی نیک کام میں لگا دے تو اجر ملے گا ریشم کو...... اچھا اب سنو...... مجھے بتاؤ رات تم کب واپس آئے؟“

”مجھے کافی دیر ہو گئی تھی سر......“

میں نے کہا۔ ”وہ کون تھے جو اسے اٹھا کر لے گئے؟“

”اپنے ہی بندے تھے سر......“

”اور اسے رکھا کہاں ہے تم نے......؟“

”وہ بالکل محفوظ جگہ پر ہے...... اس کے آرام کا پورا خیال رکھا جائے گا...... آپ چلیں گے تو دیکھ لیں گے......“

میں نے کہا۔ ”نہیں...... یہ بہت سنگین معاملہ ہے، اس کے نتائج انتہائی خطرناک نکل سکتے ہیں۔“

”آپ جیسا حکم کریں سر ویسا ہی ہوگا۔“

میں نے کہا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا...... زوہیب نے ایسی بے وقوفی کیوں کی...... اگر وہ کسی محافظ کی گولی کا نشانہ بن جاتا پھر...... آخر وہ آیا کیسے......؟“

غنی نے کہا۔ ”اس کی گاڑی مل گئی تھی سر......“

”وہ گاڑی پر آیا تھا......“

”یس سر...... رانا پور سے ست بدھائی تک دس کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”وہ کار اب کہاں ہے......؟“

غنی مسکرایا۔ ”پتا نہیں سر...... میں نے تو اسے سرائے عالمگیر کے ایک پولیس اسٹیشن کے سامنے چھوڑا تھا...... کیا آپ اس سے ملیں گے؟“

”ابھی راجا سے بات کرتا ہوں...... میری عقل میں تو اس مسئلے کا کوئی حل ہی نہیں آتا۔ یہ بتاؤ...... تمہیں ایک ذمے داری سونپی تھی میں نے۔“

”شبیر خان کے ساتھ چار سکیورٹی گارڈز چلے گئے سر...... اب تک تو انہوں نے ڈیوٹی سنبھال لی ہو گی...... میں نے انہیں سختی سے تاکید کی تھی کہ وہ یہاں کسی سے کوئی بات نہیں کریں گے...... خواہ کچھ بھی ہو...... پہلے شیر خان کو بتائیں گے...... شیر خان مجھے رپورٹ کرے گا۔“

”ویری گڈ غنی...... بعض اوقات مجھے خیال آتا ہے کہ تم نہ ہوتے تو میں کیا کرتا۔ میری ہر مشکل کو تم آسان بنا دیتے ہو۔ بس ذرا بیگم کا خیال رکھنا...... عورتیں پیٹ کی ہلکی ہوتی ہیں...... اس کی زبان سے کچھ نکل گیا......“

”تو میں اسے قتل کر دوں گا...... یہ میں نے اسے بھی بتا دیا ہے سر...... وہ مجھ سے بہت ڈرتی ہے۔“

راجا چابیاں گھماتا ہوا نمودار ہوا تو غنی اندر چلا گیا......

میں نے اس سے پوچھا۔ ”رات تو اکیلا ہی واپس آیا...... گولی کہاں ہے؟“

”گولی کو جہاں ہونا چاہیے...... اور میں نکل آیا اس پاگل عورت کے خوفناک چنگل سے...... شہناز کو ایک کالا بکرا صدقہ کرنا چاہیے اپنے سہاگ کی سلامتی پر۔“

”ایسا کیا ہو گیا آخر؟“

”یار میں چلا گیا مروت میں...... بڑی غلطی کی...... میں کہتا کہ بی بی جب تمہیں کسی کی سنی ہی نہیں تھی...... تو پھر اتنی دور جانے کی کیا ضرورت تھی...... اس نے تو پولیس کے ایک چشم دید گواہ پر چڑھائی کر دی...... وہ بھی تھا پولیس والا...... ان دونوں کے درمیان جو مکالمہ ہوا......“ راجا نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

”وہ تیرے ساتھ نہیں آئی...... تو کہاں گئی......!“

راجا نے کہا۔ ”وہ چاہتی تھی کہ میں اس کے شوہر کا سراغ ملنے تک اس کے ساتھ رہوں...... میں نے ہاتھ جوڑے کہ بی بی اول تو میں صحافی ہوں...... سراغرساں نہیں...... اور شامی بادشاہ کا سراغ لگانے کے لیے تو شاید مجھے اوپر تک جانا پڑے...... میری ایک یتیم بیوی ہے۔“

”ہونے والی بیوی......“ میں نے تصحیح کی۔

”اور چھوٹے چھوٹے بچے ہیں...... ہونے والے بچے......“

”بچے چھوٹے ہی ہوتے ہیں۔“

راجا بولتا رہا۔ ”اس نے کہا کہ اپنی بکواس بند کرو اور دفع ہو جاؤ...... میں لوٹ کے ست بدھائی آؤں گی تو اپنے شوہر کے ساتھ...... ورنہ نہیں آؤں گی۔“

”تو ایسے ہی چھوڑ کے آ گیا اسے......“

”ایسے ہی کا کیا مطلب ہے فیکے پتر...... دو دن میں نہ جانے کتنے لوگ اس سے ملنے آئے...... بڑی خوفناک شکلوں اور مونچھوں والے...... وہ سب گولی کے سامنے آتے تھے تعزیت کے لیے...... سر جھکا کے رونی صورت بنا کے...... بڑی عقیدت اور احترام کے ساتھ...... بس ادھر انہوں نے شامی کو مرحوم کہا یا اس کی مغفرت کی دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور ادھر ان کی شامت آ گئی...... گولی ایسی گالیاں دیتی تھی کہ میری پتلون گیلی ہونے لگتی تھی...... وہ کوئی شریف لوگ نہیں ڈاکو تھے نواب صاحب...... گالیاں کھا کے اور وہ بھی ایک عورت سے...... ان کا چہرہ غصے میں آتش فشاں بن جاتا تھا...... ان کی مونچھیں بھی کانپنے لگتی تھیں...... میں سمجھتا تھا کہ

بس اب ہوئی ڈز ڈز...... ادھر گولی کی لاش پڑی ہو گی ادھر میری...... بے شک وہ شامی بادشاہ کے مرید تھے مگر اس کا حق گولی کو کہاں سے حاصل ہو گیا کہ وہ انہیں ذلیل کرے...... میرا خیال ہے کہ گولی انہی میں سے کسی کے ساتھ چلی گئی ہو گی۔“

”تجھے نہیں معلوم......؟“

”نہیں...... گولی کو میں نے بتا دیا تھا کہ میں صبح واپس چلا جاؤں گا...... رات کے وقت ایک بندہ آیا میرے پاس اور بولا کہ راجا صاحب...... گولی نے سلام بولا ہے، آپ کا شکریہ ادا کیا ہے اور کہا ہے کہ آپ جاؤ...... اس نے نواب رنگین کے لیے بھی یہ پیغام دیا ہے کہ وہ بہت اچھے آدمی ہیں...... شامی ان کا ایسے ہی دوست نہیں بنا تھا...... اور مجھ پر ان کے بڑے احسانات ہیں...... اللہ نے زندگی دی تو کسی دن سب کا بدلہ چکا دوں گی خواہ اس کے لیے مجھے اپنی جان دینی پڑے...... ان سے کہنا میرے لیے دعا کریں...... مجھے اپنا شامی مل گیا تو میں سب سے پہلے ست بدھائی آؤں گی...... اندازہ کر یار اس شخص نے یہ پورا پیغام کسی ٹیپ ریکارڈ کی طرح پڑھ دیا اور چلا گیا...... میں بیٹھا رہ گیا بے وقوفوں کی طرح......“

”یعنی اپنے نیچرل پوز میں...... چل اٹھ ناشتا کریں کچھ...... میں بھی قریب المرگ ہوں......“

راجا سے میں نے کچھ بھی نہیں چھپایا...... وہ بظاہر خاموشی سے سنتا رہا لیکن مجھے معلوم تھا کہ اس کے دماغ کے کمپیوٹر نے نئی موصول شدہ اطلاعات کی بنیاد پر کام شروع کر دیا ہے...... میں نے خاصے اختصار سے کام لیا تھا۔ اس کے باوجود آدھا گھنٹا گزر گیا...... پھر میں نے کہا...... ”تو چپ کیوں ہے...... کیا سوچ رہا ہے؟“

”یہ جو فریال اور ماہ نور کا معاملہ ہے نا فیکے پتر...... یہ تیرا کھیل ہے...... جیسے چاہے کھیل......“

”یار یہ سیریس معاملہ ہے......“

”سیریس کس کے لیے...... آپ بکواس فرماتے ہیں نواب صاحب...... آپ کبھی ایک سے اور کبھی دوسری سے عشق فرماتے ہیں...... دونوں سے شادی کر لیں یا کسی سے نہ کریں...... یہ دردِ سر ہے ان دونوں خواتین کا جن کو اللہ نے صرف صورت دی ہے...... سیرت پر میں کوئی تبصرہ نہیں کرتا مگر عقل اللہ نے کسی ایک کو بھی دی ہوتی تو تیرا یہ احمقانہ کھیل کب کا ختم ہو جاتا...... اب انہیں اعتراض نہیں تو میں کون...... اللہ تم تینوں کو اسی طرح خوش اور شاد و آباد رکھے......“

”مجھے تیرے مشورے کی ضرورت تھی......“ میں نے خفت سے کہا۔

”آپ کو کسی کے مشورے کی ضرورت نہیں...... نہ کوئی اعتراض کرنے والا ہے اور نہ کر سکتا ہے...... رہی رابعہ کی بات...... یعنی رابعہ کے زوہیب سے افیئر کی بات...... تو اس معاملے میں تو بہت اناڑی...... اور احمق ثابت ہوا...... الو کے پٹھے...... یہ معاملات عقل سے طے کیے جاتے ہیں...... نہ کہ جذبات سے...... تجھ سے زیادہ دماغ کا استعمال غنی نے کیا کہ تجھے کنٹرول کیا...... سوچ ذرا کہ تو غصے میں اسے گولی مار دیتا تو کیا ہوتا......“

میں نے برہمی سے کہا۔ ”تیرے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے تھا؟ میں ہار لے کر کھڑا رہتا اور اس کا استقبال کرتا کہ تشریف لائیے برادران لاء...... آپ کا آنا مبارک......“

”تو نے بات کیوں نہیں کی اس سے...... سیدھی صاف اور دو ٹوک...... غنی کون ہوتا ہے ہمارے گھر کے ذاتی معاملات کو اس طرح خراب کرنے والا...... وہ لاکھ قابل اعتماد ہو...... آخر ملازم ہے......“

”میں کیا کرتا...... تو بھی یہاں نہیں تھا۔“

”دیکھ فیکے پتر...... یہ غنی بہت سر چڑھ گیا ہے...... اس نے مجھے کیوں نہیں بتایا...... کہ وہ زوہیب کو اغوا کر کے کہیں بند بھی کرے گا...... کس نے اجازت دی اسے یہ انتہائی قدم اٹھانے کی...... یار رابعہ تیری بہن...... اس کے معاملات میں غنی کیسے آ سکتا ہے؟ اور کس حیثیت میں......؟“

راجا اتنا ناراض تھا کہ میں نے خاموشی میں ہی عافیت جانی۔ ویسے بھی اس کے کسی سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ جو کہہ رہا تھا...... مجھے بالکل ٹھیک لگ رہا تھا۔ خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد راجا نے کہا۔ ”اس وقت زوہیب کہاں ہے......؟“

میں نے کہا۔ ”مجھے نہیں معلوم...... چل کے دیکھتے ہیں......“

”تو...... یہ تحقیق تفتیش ہم بعد میں کریں گے...... کہ آخر رابعہ کا اس سے رابطہ کیسے ہوا اور معاملات اس حد تک کیسے بڑھ گئے...... ہمیں پتا ہی نہ چلا...... ابھی تو فون کر رانا کو...... تاکہ معاملات مزید خراب نہ ہوں......“

”میں رانا کو فون کروں......؟“

”بس...... اس سے کہہ کہ تشریف لائے اور اپنے سپوت کو لے جائے...... اس کے ساتھ یہ سلوک ہم نے

کیا...... یہ ہماری مجبوری تھی ...... ہم اسے گولی بھی مار سکتے تھے لیکن ہم نے بہتر سمجھا کہ آپ کو بتا دیں...... اگلی بار ایسا ہی ہوگا...... ہمیں نہیں معلوم اس نے ہمارے علاقے میں چوروں کی طرح داخل ہونے کی حماقت کیوں کی۔ آپ خود اس سے پوچھیں......"

راجا ایک دم اٹھ کے دوڑا...... بلو جولان پر بطخوں کے پیچھے بھاگ رہا تھا اچانک فوارے کی دیوار پر چڑھ گیا تھا...... فوارے کے تالاب میں پانی تین فٹ سے کم ہی ہوتا تھا مگر بلو کی عمر کے بچے کے لیے یہ بھی خطرناک تھا وہ بلو کو پکڑ کے واپس لایا اور چلانے لگا۔ "ثریا...... کیا کر رہی ہو، اندر گھسی ہوئی ہو...... ثریا......"

ثریا دروازہ کھول کے برآمدے تک آئی۔ "کیا ہوگیا؟"

"ہوا تو نہیں...... ہو جاتا...... تمہارا بیٹا کہاں ہے...... تمہیں ہوش نہیں۔"

ثریا نے سخت ناگواری سے کہا۔ "راجا بھائی...... یہ میرا نہیں شہزاد کا بیٹا ہے۔" اور پھر اندر گھس گئی۔

ثریا کے جواب نے مجھے اور راجا کو حیران کر دیا۔ اپنی کوکھ سے جنم لینے والے بچے کے لیے میں نے کبھی عورت کا ایسا غیر جذباتی لاتعلقی کا رویہ نہیں دیکھا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ بلو ہمیشہ کے لیے لیلیٰ بھابی کی ذمہ داری بن گیا ہے، انہی کو وہ اپنی ماں سمجھے گا اور کہے گا۔ ثریا آج نہیں تو کل دوبارہ کسی سے دل لگا لے گی اور پھر شادی کر کے کہیں اور چلی جائے گی تو بلو سے اس کی ملاقات حشر میں ہی ہوگی جہاں لوگ اپنی ماں کے نام سے اٹھائے جائیں گے۔

راجا سخت خفا ہوا۔ "کیسی ماں ہے...... اپنی اولاد سے شوہر کی زیادتی کا بدلہ لے رہی ہے...... دو دن میں کیسی بدل گئی ہے......"

میں نے کہا۔ "وہ زیادہ دن یہاں رہنے والی نہیں ہے راجا۔"

"مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے...... اس کا بھیس دیکھو...... میک اپ دیکھو اور شوق دیکھو...... ہر وقت انڈین فلمیں دیکھتی رہتی ہے۔"

بالآخر مجھے رانا کی لائن مل گئی...... اس نے میرا نمبر اور نام دیکھ لیا ہوگا۔ اس نے کہا...... "جی نواب صاحب......"

میں نے کہا۔ "میں تم سے ملنا چاہتا ہوں......"

"مگر میں ملنا نہیں چاہتا...... ابھی میں بہت پریشان ہوں......"

"تمہیں آنا پڑے گا...... مجھے معلوم ہے رانا کہ تم کس کے لیے پریشان ہو...... اپنے بیٹے کے لیے......؟"

اس نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ "یہ تم کیسے جانتے ہو...... کیسے پہنچی تم تک یہ خبر......"

میں نے انجان بن کر کہا۔ "کون سی خبر......"

"ابھی تم نے کہا تھا کہ تم اپنے بیٹے کے لیے پریشان ہو۔"

"ہاں...... میں نے سنا تھا...... وہ بیمار ہے۔"

وہ پھر چلایا۔ "جھوٹ بولتے ہو تم...... نواب کے نطفے...... تمہیں سب پتا ہے...... تم نے ہی اٹھوایا ہے اسے......"

"ہاں...... اسے میں نے ہی اٹھوایا تھا...... لیکن اپنے علاقے سے...... وہ کل رات میری حویلی میں پکڑا گیا تھا......"

رانا مجھے گالیاں دینے لگا۔ "بکواس کرتے ہو تم...... تم نے اغوا کیا ہے اسے...... اس کی گاڑی سرائے عالمگیر سے ملی ہے۔"

"ٹھیک ہے...... پھر گاڑی سے پوچھ لو کہ وہ خود کہاں ہے...... یا پولیس سے کہو مجھے پکڑ لے...... میرے خلاف زوہیب کے اغوا کی رپورٹ لکھے اور...... میں دیکھتا ہوں تمہیں بیٹا ملتا ہے یا نہیں......" میں نے غصے میں فون بند کر دیا۔

میرے اندازے کے مطابق چند سنٹ میں اس کا فون آ گیا۔ میں نے گھنٹی بجنے دی۔ فون ایک بار بند ہوا پھر چیخنے لگا تو میں نے بٹن دبا کے بے رخی سے کہا۔ "کیا کچھ گالیاں رہ گئی تھیں رانا صاحب۔"

اس نے شکست خوردہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آئی...... آئی ایم سوری۔ کل رات سے میں سخت ٹینشن میں تھا۔ رات بھر سویا نہیں۔ تم جانتے ہو میں بلڈ پریشر کا پرانا مریض ہوں۔"

میں نے کہا۔ "تمہیں خود پر زیادہ کنٹرول رکھنا چاہیے ورنہ کسی روز دماغ کی رگ پھٹنے سے مر جاؤ گے۔"

"نواب رفیق! میرا بیٹا کہاں ہے؟"

"اگر تم یہ کال ریکارڈ کر رہے ہو تب بھی مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں چاہتا تھا کہ یہ پولیس کیس نہ بنے۔ اگر تم نے میرے خلاف اغوا کا کیس بنایا تو زوہیب کو نقصان ہوگا۔"

"نہیں نہیں۔ میں کوئی پبلسٹی نہیں چاہتا۔"

"اس نے ست بدھائی کی قانونی حدود کو پار کیا اور چوروں کی طرح حویلی میں پکڑا گیا۔ اسکول کے اندر میرے گارڈز نے اسے گرفتار کر لیا۔ وہ اسے شوٹ بھی کر سکتے

تھے۔"

"اس وقت وہ کہاں ہے؟" رانا مضطرب ہو کے بولا۔

میں نے کہا۔ "میرے پاس آؤ اور اپنے بیٹے کو لے جاؤ۔ ابھی تک میں نے کسی کو اس سے پوچھ گچھ کی اجازت نہیں دی ہے کہ آخر وہ یہاں کیا لینے آیا تھا۔ اسے گرفتار کرنے والے تین گارڈز کے سوا کسی کو معلوم ہی نہیں کہ وہ کہاں ہے۔ سچ پوچھو تو خود مجھے بھی نہیں معلوم کہ گارڈز نے اسے کہاں رکھا ہے۔"

"میں ابھی آتا ہوں اور نواب رفیق آئی ایم سوری۔ میں نے تمہیں گالیاں دیں۔"

"تم ایک بیمار اور ذہنی طور پر معذور شخص ہو۔ میں تمہیں معاف کرتا ہوں۔"

رانا کی مخصوص لینڈ کروزر آدھے گھنٹے میں حویلی کے گیٹ پر تھی۔ اسے ریسیو کرنے کے سارے انتظامات غنی نے پروٹوکول کے مطابق مکمل کیے تھے۔ گاڑی کو گیٹ پر ہی روک لیا گیا۔ ایک شوفر کے علاوہ جو خود بھی مسلح تھا۔ اس کے ساتھ پیچھے تین مسلح سیکیورٹی گارڈز بیٹھے ہوئے تھے۔ انہیں بھی اندر آنے کی اجازت نہیں ملی۔ رانا کو راجا نے ریسیو کیا جو سرکاری طور پر میرا پروٹوکول افسر اور پی آر او سب کچھ تھا۔ حویلی کے دو سیکیورٹی گارڈز اس کے پیچھے چلتے رہے۔ برآمدے کی سیڑھیاں اتر کے میں نے رانا کا استقبال کیا اور اسے اپنے ساتھ مہمان خانے میں لے گیا۔

رانا کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ بیک وقت اس کے لیے کئی عذاب تھے وہ تھکن اور بیماری سے مضمحل تھا۔ بیٹے کی پراسرار گمشدگی نے اس کا نروس بریک ڈاؤن کر دیا تھا اور اب اسے خود چل کے میرے پاس آنے کی سبکی اٹھانا پڑی تھی لیکن بیٹے کی بازیابی سے بڑھ کر اس کے لیے کچھ بھی اہم نہیں تھا۔ زوہیب اس کا اکلوتا بیٹا تھا اور اس عمر میں وہ چوتھی شادی کر لیتا تب بھی اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

اس کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ آنکھوں میں بے خوابی کی تھکن تھی اور اندرونی ہیجان کے باعث وہ لرزہ براندام تھا۔ مجھے اس پر ترس آیا۔ ایک معمولی حادثہ، کوئی جذباتی سانحہ یا ذہنی صدمہ کیسے آدمی کی فرعونیت کے بت کو پاش پاش کرتا ہے۔ کیسے اس کے غرور کی سربلندی کو خاک میں ملاتا ہے۔ مجھے معلوم تھا کہ اس عمر میں فطرت نہیں بدلتی۔ یہ وقت گزر جائے گا تو رانا پھر وہی رانا ہوگا۔ وہ میرا دوست نہیں بن جائے گا۔ میرا احسان مند نہیں ہوگا۔ اگر یہ بات پھیل گئی تو وہ مجھے ہی الزام دے گا کہ میں نے زوہیب کو اغوا کیا اور حبس بے جا میں رکھا۔

"نواب رفیق! کہاں ہے زوہیب؟" رانا نے میری خاموشی سے گھبرا کر کہا۔

"زوہیب ابھی آ جاتا ہے لیکن کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ اس نے یہ بے وقوفی کیوں کی؟"

رانا نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے یقین نہیں آتا مگر تم کہتے ہو تو مان لیتا ہوں۔ زوہیب ایسا نہیں ہے۔"

میں مسکرایا۔ "وہ کیسا ہے یہ میں بھی جانتا ہوں۔ ضرب المثل تم نے بھی سنی ہوگی۔ باپ پہ پوت پتا پر گھوڑا۔ بہت نہیں پر تھوڑا تھوڑا۔ بیٹا اگر باپ پر جائے تو باپ سمجھتے ہیں انہیں دوسری زندگی مل گئی لیکن یہ تمہارے بیٹے کی دوسری زندگی ہے۔ کل میں نہ ہوتا تو وہ ضرور کسی گارڈ کی گولی کا نشانہ بن جاتا۔ گھر جا کے اس کی زندگی کا صدقہ دینا۔"

"میں...... اس سے ضرور پوچھوں گا۔ اس نے ایسی حرکت کیوں کی تھی۔" رانا نے پہلو بدل کے کہا۔

ریشم بڑے سلیقے سے ایک ٹرالی کو دھکیلتی اندر آئی۔ اس نے بڑی روانی سے کہا۔ "گڈ مارننگ سر۔ ویلکم ٹو ست بدھائی۔"

رانا نے بے چینی سے کہا۔ "میں اس وقت کچھ بھی نہیں لے سکتا۔"

"یہ ہماری روایت ہے سر۔ آپ ہمارے مہمان ہیں۔" ریشم کو یقیناً کسی نے یہ جملہ رٹا دیا تھا۔ اس کی انگریزی گرامر کے ساتھ چل رہی تھی۔

"اچھا...... مجھے پانی دے دو۔ صرف پانی۔"

میں نے اسے تسلی دی۔ "آپ بالکل فکر مند اور پریشان نہ ہوں۔ آپ کا بیٹا بالکل خیریت سے ہے۔ پلیز چائے تو لیں۔"

"میں چائے نہیں پیتا۔"

"او کے سر! پھر آپ جوس لے لیں۔" ریشم نے کہا۔

رانا مجبور ہو گیا۔ اس نے گلاس میں سے چند گھونٹ لیے اور رکھ دیا۔ "دیکھیے نواب صاحب۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"اچھا چلیے میں آپ کو زوہیب کے پاس لے جاتا ہوں۔ آپ خود اس سے معلوم کر سکتے ہیں کہ ہم نے اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی۔ ریاست بلکہ حویلی کی حدود میں داخل ہونا اس کی غلطی تھی جس پر گارڈز نے اسے گرفتار کیا۔ آپ ضرور پوچھیں کہ اس نے یہ بے وقوفی کیوں کی تھی اور

مجھے بتائیں۔"

اب آگے پیچھے تین گاڑیاں روانہ ہوئیں۔ رانا اپنی گاڑی میں بیٹھا۔ اس کے سکیورٹی گارڈز بھی اسی گاڑی میں رہے۔ دوسری گاڑی میں راجا کے ساتھ میں تھا اور اسے غنی ڈرائیو کررہا تھا۔ تیسری گاڑی سب سے پیچھے تھی اس میں ہمارے سکیورٹی گارڈز تھے۔

روہتاس کی حدود کا آغاز ہونے سے پہلے ہی گاڑی ایک چھوٹی سی کوٹھی میں داخل ہوگئی۔ اس کا گیٹ کھلا پڑا تھا اور زندگی کے آثار مفقود تھے۔ غنی نے سارے مسلح گارڈز کو باہر روک دیا جو آمنے سامنے ایسے کھڑے ہوگئے جیسے بھارت پاکستان کی فوجیں سرحد پر رہتی ہیں۔ سب سے پیچھے والی گاڑی کے ایک گارڈ نے غنی کو وڈیو کیمرا تھمایا تو مجھے پتا چلا کہ غنی نے کتنا پکا کام کیا تھا۔

ہم چار آدمی اندر گئے۔ رانا اور میں، راجا اور غنی۔ غنی نے ایک قفل کھولا اور پیچھے ہٹ گیا۔ راجا نے کنڈی کھولی اور اندر چلا گیا۔ اس کے پیچھے رانا اور میں سب کے بعد کمرے میں داخل ہوا۔ غنی نے اس پورے منظر کو ریکارڈ کیا اور پھر اندر آگیا۔ یہ ایک بیڈروم تھا جس پر زوہیب سیدھا لیٹا چھت کو گھور رہا تھا۔

راجا کو اور پھر میرے ساتھ اپنے باپ کو اندر آتا دیکھ کر وہ ایک دم اٹھا۔ بے یقینی سے اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں اور وہ پلک جھپکائے بغیر ساکت و جامد بیٹھا تھا۔ یہ بڑا عجیب سین تھا جس کی غنی نے مکمل عکس بندی کی۔ باپ بیٹے کی شکل دیکھنے والی ہورہی تھی۔

رانا نے اپنے جذبات کو قابو میں رکھا۔ بیٹے کے صحیح سلامت مل جانے کی خوشی کا ایک لمحہ تھا۔ پھر بیٹے کی اس حرکت پر رانا غصے سے مغلوب ہوگیا جس کی وجہ سے آج اسے اتنی ذلت اٹھانی پڑی تھی۔ تاہم اس نے صرف اتنا کہا۔ "تو نے ایسا کیوں کیا زوہیب؟"

زوہیب باپ کے سامنے شرمسار کھڑا تھا۔ "مجھ سے غلطی ہوگئی ابا جی۔"

"میں نے کہا۔" رانا صاحب۔ دیکھ لیں آپ کا بیٹا صحیح سلامت ہے۔ اس کو خراش تک نہیں آئی ہے۔ پوچھ لیں اس سے اگر کسی نے اس کو انگلی بھی لگائی ہو۔"

رانا کا سر میں نے پہلی بار جھکا ہوا دیکھا۔ "تھینک یو نواب صاحب۔"

میں نے کہا۔ "یہ آپ اس سے گھر جا کے پوچھیں کہ اس نے ایسی بے وقوفی کیوں کی جس میں اس کی جان بھی جا سکتی تھی لیکن یہ میں زوہیب کو خود بتا دینا چاہتا ہوں کہ اسے دوسرا موقع نہیں دیا جائے گا۔ دوبارہ ایسی حرکت پر اسے گولی ماردی جائے گی۔"

"میں آپ کا احسان مند ہوں نواب صاحب۔ اولاد نے میرا سر آپ کے سامنے جھکا دیا۔"

میں نے کہا۔ "ڈاکٹر شہناز کو آپ نے ڈیڑھ ماہ اپنی قید میں رکھا تھا۔ میں آپ کے ولی عہد کو ڈیڑھ سال رکھ سکتا تھا۔ آپ پولیس لے آتے یا فوج۔ بیٹے کو ست بدھائی سے بازیاب نہیں کرا سکتے تھے۔ راتوں رات میں اسے ایسی جگہ پہنچا دیتا جہاں آپ کے خیال کی رسائی بھی ممکن نہ تھی۔ پھر میں آپ کو بلیک میل کرتا۔ آپ سے ہر بات منوا لیتا۔ لیکن میں اپنے سیاسی یا نظریاتی اختلاف میں انسانیت کی سطح سے نہیں گرتا۔ تمہاری میری دشمنی ہے تو اس کا نشانہ تمہارے میرے گھر کی عورتوں یا بچوں کو نہیں بننا چاہیے۔"

راجا نے کہا۔ "چھوڑیے نواب صاحب۔ آپ کسے سمجھا رہے ہیں۔ سانپ کی خصلت بھی کہیں احسان کرنے سے بدلتی ہے۔ آپ اسے دودھ پلائیں تو کیا وہ کاٹے گا نہیں؟"

رانا نے دکھی نظروں سے راجا کو دیکھا۔ "آج میں واقعی خود اپنی نظر میں بھی ذلیل ہوا ہوں۔"

میں نے کہا۔ "تم جا سکتے ہو۔ ایک احسان ضرور کیا ہے میں نے۔ اسے قرض تسلیم کرنا یا نہ کرنا تمہاری مرضی ہے۔"

مجھے اندیشہ ضرور تھا کہ کہیں زوہیب کے بولنے سے ساری صورتِ حال خراب نہ ہوجائے۔ اگر وہ موقعے سے فائدہ اٹھانا چاہتا تو وہیں بولنا شروع کردیتا کہ اسے غیر قانونی طور پر ست بدھائی میں داخل ہونے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی تھی۔ کیا بات تھی جس نے اسے اتنا بے اختیار کردیا تھا کہ وہ جان اور آبرو کو داؤ پر لگا کے چوروں کی طرح حویلی میں داخل ہوا اور پکڑا گیا۔ اس نے اپنا منہ بند رکھا اور باپ کے ساتھ نکل گیا۔

غنی نے باہر آکے کہا۔ "رانا صاحب۔ ہم اس کیسٹ کی ایک کاپی آپ کو بھی دے سکتے ہیں اگر آپ چاہیں۔ اس میں کل رات سے اس وقت تک کی ریکارڈنگ ہے۔"

میں نے کہا۔ "یہ صرف اس لیے ہے کہ آپ میرے خلاف زوہیب کے اغوا یا حبس بے جا کا مقدمہ نہ بنائیں۔ اپنی عزت اپنے ہاتھ میں ہے۔ میری طرف سے اس معاملے کو یہیں ختم سمجھیں۔"

رانا نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ "ایک بار پھر شکریہ نواب صاحب! میں آپ کا احسان مانتا ہوں۔"

جب وہ بیٹے کے ساتھ روانہ ہوا تو یہ سین بھی غنی کے وڈیو کیمرے کی آنکھ نے ریکارڈ کرلیا۔ اس سے ہماری قانونی پوزیشن بہت محفوظ ہوگئی تھی اور ہمارے ہاتھ میں ایک کارڈ آگیا تھا جسے ہم وقتِ ضرورت رانا کے خلاف کہیں بھی استعمال کرسکتے تھے۔

ان کے جانے کے بعد میں نے راجا سے کہا۔ "تو نے مجھے بڑی خرابی سے بچا لیا راجا۔"

"تو نے رانا کے خلاف ایک بہت بڑی اخلاقی فتح حاصل کی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اخلاقیات کو اہم نہیں سمجھتا۔ کل وہ پھر وہی ہوگا جو آج تک تھا۔"

میرے نزدیک ابھی یہ مسئلہ آدھا حل ہوا تھا۔ راجا کی دور اندیشی نے معاملات کو خراب ہونے سے بچا لیا تھا خدانخواستہ زوہیب مارا جاتا یا رانا کو بعد از خرابی بسیار علم ہوتا کہ ہم نے اسے قید میں رکھا ہے تو شاید ست بدھائی اور رانا نگر کے درمیان عراق ایران جنگ چھڑ جاتی۔ اب مجھے جنگ کے بغیر ہی فتح حاصل ہوگئی تھی۔ رانا مجبور ہوگیا تھا کہ خود چل کر میرے پاس آئے اور میرا احسان اٹھائے۔

آج ایک بار بھی اس نے مجھے نواب کا نطفہ نہیں کہا تھا۔ کہتا بھی کیسے، اس کی مونچھیں نیچی ہوگئی تھیں۔ اس کی زبان مجھے نواب صاحب نواب صاحب کہتے اور میرا احسان تسلیم کرتے لڑکھڑا رہی تھی۔ آئندہ کے لیے اس کا رویہ کیا ہوگا۔ یہ مستقبل کی بات تھی۔

مسئلے کا دوسرا آدھا حصہ بھی کم مشکل نہ تھا۔ یہ تھا رابعہ سے نمٹنا۔ اس سے اعترافِ جرم کرانا اور اسے قائل کرنا کہ زوہیب سے اس کا تعلق اتنا ہی ناممکن ہے جتنا آگ اور پانی کا میل۔ موجودہ رویے کو دیکھتے ہوئے مجھے یہ کام بھڑ کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے سے زیادہ مشکل لگتا تھا۔ تاہم میں کسی کشمکش و پیچ میں نہیں تھا۔ رابعہ کو سارے رشتے منقطع کر کے جانا ہے تو حویلی کا دروازہ کھلا ہے۔ ایک بار جانے کے بعد نہ کبھی وہ لوٹ کر آئے گی اور نہ زوہیب کے ساتھ اس کا داخلہ ممکن ہوگا۔ سپاہی جو اپنی صفوں کو چھوڑ کے دشمنوں کے ساتھ مل جائے دشمن ہی ہوتا ہے۔ شاید اس سے بھی زیادہ ناقابل معافی۔

غنی کے بارے میں راجا کے جذبات سے مجھے اتفاق نہیں تھا کہ وہ محض ایک ملازم ہے تو اسے میرے نجی معاملات میں دخل اندازی کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔ اس کا خلوص نیت اسے رشتے داروں سے افضل و برتر مقام کا مستحق ثابت کرتا تھا۔ متعدد مواقع پر اس نے میری حفاظت کی خاطر اپنی جان کی پروا نہیں کی تھی۔ مجھے وہ وقت یاد تھا جب آدھی رات کو بارش میں شامی کی بیوی گولی مجھے گھوڑے پر اپنے پیچھے بٹھا کے لے گئی تھی تو دوسرا گھوڑا نہ ہونے کے باعث غنی بارش اور کیچڑ میں گھوڑے کے ساتھ بھاگتا رہا تھا۔

یہ غنی ہی تھا جس نے بروقت مجھے زوہیب کے عزائم سے آگاہ کیا تھا اور مجھے گولی نہیں چلانے دی تھی۔ اس نے زوہیب کو بحفاظت قید میں رکھا تھا اور اس کی گاڑی تک غائب کردی تھی کہ کہیں مجھ پر اس کے اغوا کا الزام نہ آئے۔ اور غنی کے دماغ نے ہی زوہیب کی گرفتاری سے رہائی تک کے واقعات کی وڈیو فلم بنانے کا انتظام کیا تھا۔ اب میں ثابت کرسکتا تھا کہ وہ چوروں کی طرح آیا تھا لیکن میں نے اسے سزا دیے بغیر باپ کے حوالے کردیا تھا۔ اس کی رخصتی تک سب کیمرے کی آنکھ نے محفوظ کرلیا تھا۔

رانا کی حویلی میں آمد کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ رابعہ کو اسکول سے واپس آنے کے بعد یا ممکن ہے اس سے پہلے ہی یہ اطلاع مل گئی ہو۔ گزشتہ رات زوہیب کے نہ آنے سے وہ خاصی ڈسٹرب تھی۔ اس کے ذہن میں فوراً شکوک کی آندھی چلنے لگی ہوگی کہ رانا کا آنا اور ہم سب کا جلوس کی صورت میں اس کے ساتھ جانا چہ معنی دارد؟ کہیں خدانخواستہ گزشتہ رات ایسی ویسی کوئی بات تو نہیں ہوگئی؟ مثلاً زوہیب کو محافظوں نے پکڑ لیا ہو یا گولی کا نشانہ بنا دیا ہو۔ اس سے رابعہ کا فون پر بھی رابطہ نہیں ہوا ہوگا جو ایک الگ پرتشویش بات تھی۔

ہمارے لوٹ کر ست بدھائی کی حویلی میں داخل ہونے سے پہلے ہی رابعہ کا اسکول ختم ہوگیا تھا۔ وہ برآمدے میں کھڑی تھی اور جب راجا کے ساتھ میں کار سے اترا تو اس نے مجھے دیکھا لیکن کوئی سوال کیے بغیر پلٹ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اندر معلوم نہیں کس بات پر لیلیٰ بھابی کے چلانے کی آواز آرہی تھی۔ وہ ثریا پر ناراض ہورہی تھیں۔ شاید اس نے پھر بولی کو نظر انداز کیا ہوگا یا اس کے بارے میں کوئی غلط بات کی ہوگی۔

ہمارے پہنچنے کے کچھ دیر بعد ڈاکٹر شہناز بھی لوٹ آئی۔ ریشم کی ماں نے میز پر کھانا لگا دیا تھا۔ تھکی ہوئی ہونے کے باوجود ریشم ماں کا ہاتھ بٹاتی رہی۔ جب رابعہ میز پر آکے بیٹھی تو مجھے اس کا سپاٹ چہرہ دیکھ کے حیرانی ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ غم و اندوہ کی تصویر بنی ہوئی ملے گی اور تشویش سے اس کا حال خراب ہوگا۔

یہ سوال سب سے پہلے لیلیٰ بھابی نے کیا۔ "سنا ہے رانا صاحب آئے تھے یہاں، بقلم خود!"

"آپ نے بالکل صحیح سنا بھابی۔" راجا بولا۔

"پھر تم سب لوگ برات لے کر کہیں گئے تھے۔"

"یہ بھی آپ نے غلط نہیں سنا۔" راجا بولا۔

"مطلب یہ کہ سیدھی طرح نہیں بتاؤ گے؟"

راجا مظلوم شکل بنا کے بولا۔ "اب میں اتنا سیدھا بھی نہیں ہوں بھابی۔ پوچھنا تو پڑے گا آپ کو ورنہ میں کیوں بتاؤں کہ وہ امن اور دوستی کا پیغام لے کر آئے تھے۔"

شہناز نے خفگی سے کہا۔ "اچھا بھائی۔ مت بتاؤ مگر جھوٹ تو نہ بولو۔"

میں نے گالوں پر ہاتھ مارے۔ "بھائی؟ راجا تو نے سنا۔ توبہ توبہ تیرا انکار تو ہونے سے پہلے ہی ٹوٹ گیا۔"

راجا بولا۔ "میری اماں بھی شادی سے پہلے ابا کو بھائی کہتی تھیں۔ ساری کزن بھائی بناتی ہیں پہلے۔ اور ممکن ہے شہناز کا مطلب اس بھائی سے ہو جو انڈر ورلڈ میں ہوتے ہیں اور ترقی پا کے دادا کہلاتے ہیں۔"

بھابی نے رخ میری طرف کیا۔ "تم بتاؤ نواب رفیق کہاں گئے تھے رانا کے ساتھ؟"

میں نے کہا۔ "راجا غلط نہیں کہہ رہا ہے۔"

میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے رابعہ کو مسکراتے دیکھا۔ اس نے کہا۔ "میں بتا سکتی ہوں یہ لوگ کہاں گئے تھے۔"

راجا کی حیرانی مجھ سے زیادہ تھی۔ "تمہیں کیا پتا...... اور پتا ہے تو پہلے ہمیں بتانا۔ خواتین پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔"

خواتین نے ایک ساتھ احتجاج کیا۔ ساری آوازوں میں ثریا کی آواز بھی شامل تھی۔ میری عقل خبط ہونے لگی کیونکہ رابعہ ہنس رہی تھی۔ آج اس کا مزاج بھی روز کی طرح برہم نہیں تھا ورنہ وہ بات بے بات کاٹنے کو دوڑتی تھی۔

ابھی کھانا ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ گیٹ کھلا اور ایک سوزوکی ہائی روف اندر داخل ہوئی۔ اس میں آگے ڈرائیور کی جگہ میں نے ڈاکٹر مہدی حسن کو بیٹھا دیکھا۔ اس کے ساتھ والی سیٹ پر جو شخص نظر آ رہا تھا وہ اس کا بیٹا احمد حسن ہی ہو سکتا تھا۔

راجا کے ساتھ میں ان کے استقبال کے لیے آگے بڑھا۔ سوزوکی ہائی روف برآمدے کی سیڑھیوں کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی۔ گیٹ ابھی تک کھلا ہوا تھا۔ چند منٹ کے وقفے سے ایک چھوٹا ٹرک اندر آیا جس میں سامان لدا ہوا تھا۔ سب سے پہلے خود ڈاکٹر مہدی حسن اترا۔ اس نے مجھ سے مصافحہ کرنے کے بعد اپنے بیٹے کے لیے دروازہ کھولا اور اسے پیچھے سے ایک بیساکھی نکال کے دی۔

ڈاکٹر مہدی حسن نے اپنے بیٹے کا تعارف کرایا۔ مجھے احمد حسن کو دیکھ کے جتنی خوشی ہوئی تھی اس سے زیادہ اس کی زندگی میں پولیو سے رونما ہونے والی معذوری کو دیکھ کے دکھ ہوا۔ وہ میرے اندازے کے مطابق اٹھائیس تیس سال کا جوان آدمی تھا۔ اس کی صحت ہر لحاظ سے بہت اچھی تھی۔ اس کا قد مجھ سے بھی نکلتا ہوا تھا۔ رنگ صاف اور آنکھیں ذہانت سے روشن تھیں۔ خرابی صرف اس کے ایک پیر میں تھی جس کی وجہ سے وہ بائیں بغل کے نیچے بیساکھی رکھ کے چلتا تھا۔ یہ نہ کوئی ایسی بدصورتی تھی اور نہ بے بس کر دینے والی معذوری۔ اس نے ڈاکٹر بن کے ثابت کر دیا تھا کہ وہ کسی سے کم نہیں لیکن دیکھنے والوں کی نظر اسے احساس دلاتی تھی کہ وہ نارمل لوگوں جیسا صحت مند نہیں۔ سب کچھ کر سکتا ہے لیکن بھاگ دوڑ نہیں سکتا یہاں تک کہ بیساکھی نہ ہو تو چل پھر بھی نہیں سکتا۔

احمد حسن نے بڑی دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ ہم سب سے مصافحہ کیا جو اسے خوش آمدید کہنے کے لیے گاڑی کے گرد جمع ہو گئے تھے۔ "مجھے تو یہ جگہ الف لیلوی لگتی ہے۔ قصے کہانیوں کی حویلی اور یہ قدرت کا حسن، یہ خوبصورت ماحول۔"

میں نے کہا۔ "ہم سب آپ کے منتظر تھے۔ ڈاکٹر احمد حسن! ہم آپ کو اپنے اس خاندان میں بڑا اچھا اضافہ سمجھتے ہیں۔"

وہ بولا۔ "جب سے ڈیڈی نے وزٹ کے بعد مجھ سے تذکرہ کیا، اس جگہ کا اور ان لوگوں کا جو یہاں رہ کے کام کر رہے ہیں۔ میرا اشتیاق بے حد بڑھ گیا تھا۔"

مہدی حسن سامان کے ٹرک ڈرائیور کو کچھ ہدایات دینے گیا ہوا تھا۔ میں نے باری باری احمد حسن کا سب سے تعارف کرایا۔ یہ ڈاکٹر شہناز ہیں۔ یہ رابعہ اور لیلیٰ بھابی۔ انہوں نے اسکول سنبھال رکھا ہے۔ یہ ابھی آئی ہیں، ثریا!! اور یہ ڈاکٹر شہناز کی معاون خصوصی ڈاکٹر ریشم۔ راجا سے تو آپ واقف ہی ہوں گے۔ بڑے توپ صحافی ہیں۔ میرے دوست اور دست راست۔"

احمد حسن کو وہ لوگ اندر لے گئے تو میں نے اس کے والد سے سوال کیا۔ "آپ کی بیٹی نہیں آئی؟"

اس نے افسوس سے سر ہلایا۔ "وہ اپنی مرضی کی مالک ہے اور بہت موڈی ہے۔ اس کے موڈ کا بھی کچھ پتا نہیں چلتا۔ جب میں نے اسے یہاں کے بارے میں بتایا تو وہ بھی بہت پرجوش نظر آ رہی تھی۔ مگر راتوں رات اس کا موڈ بدل گیا۔ اس نے ہمیں تیاری کرتے دیکھا تو کہنے لگی کہ میں نہیں جا رہی۔ اپنے کمرے میں کمپیوٹر پر بیٹھی رہی۔ باہر تک نہیں آئی۔"

"پھر...... اس کا کیا ہوگا؟"

"کچھ نہیں۔ وہ اکیلی رہ سکتی ہے۔ اپنی دیکھ بھال کر سکتی ہے۔ ظاہر ہے وہ کوئی بچی نہیں ہے۔ زیادہ توجہ دی جائے تو چیخنے چلانے لگتی ہے کہ مجھے کسی کی مدد نہیں چاہیے۔ کوئی مجھ پر ترس نہ کھائے۔ مجھے معلوم ہے تم لوگ مجھے پاگل سمجھتے ہو۔ سارے پاگل دوسروں کو پاگل سمجھتے ہیں۔" مہدی حسن نے ایک گہری سانس لی۔

میں نے کہا۔ "چلیے اللہ نے چاہا تو کسی روز اس کا موڈ بھی بن جائے گا یہاں آنے کا۔ اور میں شرط لگا سکتا ہوں کہ ایک بار آنے کے بعد وہ بھی نہیں جائے گی۔ ہم ایک بالکل مختلف دنیا بسا کے بیٹھے ہیں اور اس دنیا کو جنت بنانا ہم سب کا مشترکہ خواب ہے۔"

"وہ میں نے دیکھ لیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ احمد یہاں اجنبیت محسوس نہیں کرے گا۔ وہ بہت گڈ ٹیمپرڈ اور سوشل ہے۔ ہنسنے ہنسانے والا۔ اپنی بہن کے بالکل برعکس۔ مگر میں تم سے اتفاق کرتا ہوں۔ وہ یہاں آئے گی تو تمہاری دنیا میں ایڈجسٹ ہو جائے گی۔"

ان باپ بیٹے کا یہاں آنا متوقع تھا لیکن یہ امید مجھے بہرحال نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی آ جائیں گے۔ ابھی ہم نے ڈسکس بھی نہیں کیا تھا کہ اگر وہ آئیں گے تو کہاں رہیں گے اور کیا کریں گے۔ حویلی کا اوپر والا فلور پھر خالی تھا کیونکہ اسپتال اور اسکول نئی عمارت میں منتقل کیے جانے کے بعد نیچے کی منزل خالی ہو گئی تھی۔ نیچے رہنا ہر لحاظ سے قابل ترجیح تھا۔ نیچے اٹیچڈ باتھ والے آٹھ بیڈ رومز تھے جو نئی کوٹھیوں کے بیڈ رومز کے مقابلے میں دگنے بڑے تھے۔ چار بیڈ رومز طویل کاریڈور کے دائیں جانب تھے اور چار دوسری طرف۔ ان دونوں باپ بیٹے کو ان کی مرضی اور اتفاق رائے سے پہلا بیڈ روم دے دیا گیا۔ جس میں کبھی میرے والدین کی رہائش تھی۔ یہاں سے کچن یا گارڈن اور اسپتال سب جگہ کا فاصلہ کم تھا۔ اس کے بالکل مقابل والے کمرے میں راجا اور میں اکٹھے ہو گئے۔ ایک کمرے میں لیلیٰ بھابی پہلے سے ڈاکٹر شہناز کے ساتھ تھیں۔ رابعہ شروع سے الگ تھی۔ اب ایک کمرا ثریا کو دیا گیا کیونکہ اس کے ساتھ گلریز عرف بولی تھا، ثریا کا بیٹا۔ لیکن ماں نے بیٹے کو اپنی زندگی سے بے دخل کیا تو ترتیب بدل گئی۔ ثریا کے ساتھ ڈاکٹر شہناز آ گئی اور بھابی کے ساتھ بولی ہو گیا۔ آخر کے کمرے میں ایک طرف ریشم اور غنی تھے۔ اس کے مقابل والے کمرے میں ریشم کی ماں فاطمہ۔

آٹھ بیڈ رومز کے علاوہ نیچے چار اسٹور رومز تھے جن کو وقتِ ضرورت باتھ روم بنوا کے بیڈ روم کی شکل دی جا سکتی تھی۔ مہمان خانہ تھا اور کچن تھا۔ تقریباً اتنی ہی گنجائش اوپر نکلتی تھی۔ اس میں ہمارے سکیورٹی گارڈز اور ڈرائیورز سوتے تھے۔ ان سب کے لیے دو بیڈ رومز کھول دیے گئے تھے۔ باقی بند رہتے تھے۔ حویلی میں صبح آ کے مغرب تک کام کرنے والے ملازمین کی تعداد زیادہ تھی۔ ان میں مالی تھے اور جھاڑ پونچھ کا کام کرنے والی عورتیں جو قریب کے گاؤں سے آتی تھیں۔ اوپر کے حصے میں مہمان خانے کی جگہ لائبریری تھی اور ایک میوزیم جس میں خاندانی نوادرات بھرے پڑے تھے۔ تہ خانے میں وہ ہال تھا جسے نگار خانے کا نام فریال نے دیا تھا۔ اس میں میرے آبا و اجداد کی قدِ آدم روغنی تصاویر لگائی گئی تھیں۔ فریال نے اس پر بڑا کام کیا تھا۔ اس نے نگار خانے میں نیا رنگ کرانے کے بعد نئی لائٹس لگوائی تھیں جو براہ راست ہر تصویر کو روشن کرتی تھیں تو تصویر میں جان پڑ جاتی تھی۔ میری ایک خواہش ابھی تک شرمندۂ تکمیل تھی کہ میں اپنے اماں ابا کی ایسی ہی تصویر بنوا کے لگواؤں۔ ان کے حج پر جانے اور جنت البقیع میں ابدی گھر بنا لینے کے بعد یہ آرزو مزید شدت اختیار کر چکی تھی لیکن مجھے ابھی تک کسی مصور کو منتخب کرنے کا موقع نہیں ملا تھا جو پرانی تصاویر کے مقابلے پر میرے والدین کی تصویر بھی ویسی ہی بنا سکے۔

احمد حسن کو حویلی کا تفصیلی دورہ کرانے کی ذمے داری خواتین نے قبول کر لی تھی۔ تین یعنی ڈاکٹر شہناز، رابعہ اور ثریا۔ ریشم خاصی مایوس تھی کہ اسے عین وقت پر ڈراپ کر دیا گیا کیونکہ اس کی جگہ ثریا نے حاصل کر لی تھی۔ ورنہ وہ اپنی انگریزی کے دریا بہا دیتی اور نئے مہمان پر اس کی لیاقت کا خاصا رعب پڑتا۔ احمد حسن کی خوشی دیدنی تھی۔ ایک طرف حویلی کے قدیم تاریخی ماحول کا طلسماتی حسن تھا تو اس کے دائیں بائیں، آگے پیچھے وہ میزبان اور گائیڈ تھیں جو اپنے اپنے انداز حسن میں یکتا تھیں اور حسن اخلاق میں ایک سے بڑھ کر ایک۔ وہ تو واقعی ایسا محسوس کرتا ہوگا کہ وہ خوبصورتی کے ان گنت پہلو رکھنے والی ایک نئی دنیا میں پہنچ گیا ہے۔

شہناز کا رویہ ہمیشہ ایک جیسا رہتا تھا۔ رابعہ کے موڈ کی تبدیلی کو میں نے احمد حسن کے آنے سے پہلے ہی نوٹ کرلیا تھا اور یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ یہ تبدیلی ہم سب کی توقعات کے برعکس کیوں ہے؟ وہ پہلے کافی تلخ اور بدمزاج ہورہی تھی۔ زوہیب حسن کے معاملے میں میرے شدید مخالف ردعمل نے اسے آتش فشاں بنادیا تھا۔ چونکہ باقی سب بھی میرے ہم نوا تھے اس لیے وہ سمجھتی تھی کہ ہم اس کے مقابلے میں ایک ہوکے اس کی خوشیوں کی راہ میں دیوار بن گئے ہیں۔ وہ سب سے بدگمان اور ناراض تھی۔

صورتِ حال اب بھی وہی تھی۔ رابعہ کے زوہیب سے رشتے کے معاملے میں مکمل بالاتفاق رائے تھا کہ یہ ناممکن ہے۔ یہ رابعہ کا پاگل پن ہے اگر وہ سمجھتی ہے کہ ہم اپنے دشمنوں سے یہ رشتے داری کرسکتے ہیں۔ اسے ہماری قدیم قبائلی سوچ یا ضد نہیں قرار دیا جاسکتا تھا۔ ہم سب اس کے مضمرات کو سمجھتے تھے اور یہ جانتے تھے کہ اس سے ہمارے لیے اور خود رابعہ کے لیے کیا سنگین مسائل پیدا ہوں گے۔ زوہیب کے علاوہ رابعہ کسی کو بھی پسند کرتی سب اس کی خوشی دیکھتے لیکن وہ اپنی خوشی سے کنویں میں گرنا چاہے اور ساتھ ہمیں بھی ڈبونے کی سازش کا شکار ہو، یہ کسی کو منظور نہ تھا۔ مزید خرابی میرے انکار نے پیدا کی تھی۔ ''وہ زوہیب کے ساتھ ہی رہنا چاہتی ہے تو ہم اسے زبردستی حویلی میں روک کے نہیں رکھیں گے لیکن پھر یہ قیامت تک نہ ہوگا کہ اس کا ہم سے تعلق رہے اور اسے جائداد میں سے کچھ ملے۔''

صورت حال اب بھی وہی تھی۔ نہ اس کے اور زوہیب کے تعلق پر کوئی سمجھوتا ہوا تھا نہ اسے اخلاقاً ست بدھائی کی جاگیر میں ایک شریک بنانے پر۔ الٹا اس کا گزشتہ رات کے بعد سے اب تک زوہیب سے رابطہ نہ ہونا۔ اسکول میں رات کے وقت مشتبہ انداز میں پکڑا جانا۔ پھر رانا کا حویلی میں آنا اور ہمارا اس کے ساتھ جانا ایسے معاملات تھے جو رابعہ کے مخالف جذبات کی آتش فشانی کو دوچند کرسکتے تھے مگر اس کے برعکس وہ ایک دم پرانی رابعہ بن گئی تھی۔ آخر کیوں؟ یہ سوچ سوچ کے میری عقل خبط ہورہی تھی۔

میں، راجا اور ڈاکٹر مہدی حسن باغ میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ میں نے اسے اختصار کے ساتھ حویلی کی قدیم تاریخ سے پہلے ہی روشناس کرادیا تھا۔ اب اسے اپنے پروگرام کے بارے میں بتایا۔ ہم کیا کرچکے ہیں، کیا مزید کرنا چاہتے ہیں۔ ہماری راہ میں کیا رکاوٹیں ہیں۔ کون سے پتھر ہیں، کون سی چٹانیں اور کون سے پہاڑ حائل ہیں۔

مہدی حسن کی باتوں سے میں نے اندازہ کیا کہ وہ اپنا سب کچھ ہمارے حوالے کرنا چاہتا ہے۔ اسے یقین ہے کہ احمد یہاں سے کبھی جانا نہیں چاہے گا اور اس کی بہن بھی ایک دن آجائے گی۔ خود اس کی عمر کے آخری ایام اگر یہاں ست بدھائی ترقیاتی پروگرام میں ہمارے ساتھ کام کرتے گزر جائیں تو اس سے بہتر وہ اپنی گزشتہ زندگی کے گناہوں کا کفارہ ادا نہیں کرسکتا۔

رات کے کھانے پر ہم سب پھر اکٹھے ہوئے تو احمد حسن سب میں یوں گھل مل گیا تھا جیسے وہ آج سے نہیں برسوں سے ہم سب کے ساتھ ہے۔ وہ بلاشبہ ہنس مکھ اور زندہ دل تھا۔ اس کے لطیفوں سے خواتین کا ہنس ہنس کے برا حال تھا اور احمد حسن کا باپ ڈاکٹر مہدی حسن اسے دیکھ دیکھ کر بڑی محبت اور شفقت سے مسکرا رہا تھا۔ اس کا بیٹا خوش تھا تو وہ خوش تھا اور شاید یہ سوچنے میں حق بجانب تھا کہ بیٹی بھی آجاتی تو اس ماحول میں اس کا سارا غم دور ہوجاتا۔ ڈپریشن ختم ہوجاتا اور ہم سب کے تعاون سے وہ رفتہ رفتہ نارمل ہوجاتی۔

رات کو احمد ہمارے ساتھ لاؤنج میں بیٹھا کافی پیتا رہا۔ ہم سے مستقبل کے ہر پلان میں اپنا رول ڈسکس کرتا رہا۔ وہ بے حد پرجوش اور پرعزم تھا۔ ڈاکٹر مہدی حسن معذرت کرکے اٹھ گئے تھے کہ تم نوجوان لوگ گپ لڑاؤ، میں رات کو کافی پیوں گا تو پھر رات بھر جاگتا رہوں گا۔ جو تھوڑی بہت نیند اس عمر میں مل جاتی ہے اس سے بھی محروم ہوجاؤں گا۔ میں نے نوٹ کیا کہ نئے فیملی ممبرز کے اضافے نے سب کے موڈ میں بڑی خوشگوار تبدیلی پیدا کی ہے۔ شاید ہر وقت کے ساتھ اور مصروفیت کی یکسانیت نے غیرمحسوس طریقے پر ہم سب کو بور کردیا تھا۔ معمولات کے دائرے سے باہر نہ نکلنے والوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ رشتے کتنے بھی پرخلوص اور قریبی کیوں نہ ہوں Excitement کھودیتے ہیں۔ جیسے میاں بیوی کی ازدواجی زندگی ''من تو شدم تو من شدی'' کے باوجود بے رنگ محسوس ہونے لگتی ہے۔ وہ ایک دوسرے سے دور بھی نہیں ہوسکتے اور قریب ہوں تو ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کرتے۔ کہنے سے پہلے وہ ایک دوسرے کی بات سن لیتے ہیں۔ اظہار سے پہلے جذبات کے اقرار کو جان لیتے ہیں۔

بالآخر میں اور راجا بیڈروم میں اکٹھے ہوئے تو آدھی رات سے اوپر کا وقت تھا۔ میں نے کہا۔ ''یار، ان باپ بیٹے کے آنے سے کتنا فرق پڑا ہے۔''

''وہ تو میں دیکھ رہا ہوں کہ فرق کس کو کتنا پڑا ہے۔ اور

ابھی سے میرے دل میں اس لنگڑے کے لیے رقابت کے جذبات پیدا ہوگئے ہیں۔''

میں نے ہنس کے کہا۔ ''ایسی کیا بات ہوگئی راجا۔''

''تونے دیکھا نہیں۔ وہ سالا کیسا راجا اندر بنا گھوم رہا تھا۔ اس کی ڈیڑھ ٹانگ کے باوجود سب اس پر بیک وقت فریفتہ ہیں۔ یہ میں برداشت نہیں کرسکتا۔ کل میں شہناز کو قتل کردوں گا۔''

''شہناز کو کیوں راجا؟''

''میرا اسی پر بس چلتا ہے۔ ایسے ہنس ہنس کر مجھ سے باتیں نہیں کرتی۔ میرے لطیفوں پر اسے ہنسی نہیں آتی۔''

''تونے رابعہ کا موڈ دیکھا؟''

''بالکل دیکھا۔ یہ لڑکی بے شرمی کی حد تک بے مہار ہورہی ہے۔ اپنی کزن کو سنبھال ٹھیکے پتر۔ ایک سے فارغ ہوتی ہے تو فوراً دوسرے عشق کا سنگِ بنیاد رکھ دیتی ہے۔''

''ایسی کوئی بات نہیں راجا۔ ہاں اس کے موڈ کی یہ تبدیلی خود میرے لیے الجھن کا باعث ہے۔ کیا اسے پتا چل گیا ہے کہ رانا صاحب کی آمد کس تقریب میں تھی۔'' میں نے کہا۔

''ہاں۔ شہناز نے اسے بتادیا ہے۔''

''اوہ...... شہناز کو آپ نے بتایا ہوگا۔ خیر معاف کیا۔ سوال یہ ہے کہ اس پر الٹا اثر کیوں ہوا؟ میرا خیال تھا کہ وہ چیخے گی چلائے گی۔ خودکشی کی کوشش کرے گی۔ پھر بھاگ جانے کی دھمکی دے گی، زوہیب کے ساتھ!''

''یار، ابھی کتنے دن ہوئے ہیں شہزاد سے قطع تعلق کو؟ اور سوچے سمجھے بغیر وہ زوہیب کے ساتھ پھنس گئی۔''

''یہ ایک قابلِ اعتراض لفظ ہے۔''

''میں پھر یہی کہوں گا کہ وہ پھنس گئی۔ زوہیب نے اسے پھانس لیا۔ اس نے تو زوہیب کو نہیں پھانسا ہوگا۔ عقل کہاں گئی اس کی؟''

''گھاس کھانے۔'' میں نے کہا۔

''میں ابھی سے بتا رہا ہوں تجھے۔ اب اس کی شادی ہوجانی چاہیے فوراً۔ اس سے جوانی سنبھالی نہیں جارہی۔ مجھے تو آج شک ہورہا تھا کہ وہ اس اجنبی پر بھی ڈورے ڈال رہی ہے۔''

''بکواس بند کر اپنی۔ میری بہن کے بارے میں ایک لفظ بھی اور کہا تو تیرا سر ادھر پڑا ہوگا، میرے قدموں میں۔ یہ سیکس فرسٹریشن نہیں ہے۔ فرائیڈ کے گھوڑے۔''

''پھر کیا ہے؟''

''پتا چل جائے گا۔ وہ خود بتادے گی یا میں پوچھ لوں گا کہ آخر وہ کیا چاہتی ہے۔ کیا کررہی ہے، یہ کیا ڈراما ہے؟''

''اور تو اور وہ سابق مسز شہزاد۔ تونے اس کے پھن دیکھے؟ کیسی بے حیائی کے مظاہرے کرتی ہے وہ۔''

''راجا۔ وہ بے حد غریب گھر کی لڑکی ہے۔ شہزاد کے ساتھ ایک خوشحال زندگی گزارنے کا خواب بھی دھوکا ثابت ہوا۔ وہ کیا کرے؟ اپنی بدقسمتی پر آنسو بہاتی رہے تمام عمر اور اس کا فائدہ؟''

''اس نے تو بیٹے کو بھی چھوڑ دیا۔''

میں نے کہا۔ ''یہ سب شہزاد سے نفرت کا ردِعمل ہے اور کچھ نہیں۔ پہلی بار اسے فراغت اور عیاشی کی زندگی کا تجربہ ہوا ہے۔ اسے انجوائے کررہی ہے تو کرنے دے۔ یہ اس کے حق میں اچھا ہے۔''

''وہ پھر مس ثریا جبیں بننا چاہتی ہے۔''

''یہ ایک تعمیری جذبہ ہے۔ آدمی اپنے کھنڈر پر رونے کے بجائے اسے گرا کے نیا گھر بنانے کی کوشش کرے۔ میں نے شہناز سے کہا تھا کہ اس کی ضروریات کا خیال رکھے۔ ثریا کو فری ہینڈ مل گیا ہے کہ جو چاہے کرے۔ خرچ پر کوئی پابندی نہیں۔ اس کی حالت کسی فاقہ زدہ جیسی ہورہی ہے جسے فائیو اسٹار ہوٹل کے بوفے میں کہا جائے کہ کھاؤ جو پسند ہے۔ جتنا چاہو کھاؤ لیکن وہ کرہی کیا رہی ہے۔ کچھ نئے فیشن کے کپڑے بنوائے ہیں۔ میک اپ کا سامان لائی ہے۔ فلمیں دیکھتی ہے اور گانے سنتی ہے۔''

''اس کے بعد کسی سے دل لگائے گی۔''

''ظاہر ہے۔ اس کی عمر یہی سب کرنے کی ہے۔ کچھ دن میں اس کی فرسٹریشن ختم ہوجائے گی تو وہ نارمل ہوجائے گی۔ ابھی اسے کرنے دو جو کرتی ہے۔ مس ثریا جبیں بھی ہمارے لیے بہتر ہے سابقہ مسز شہزاد نہیں۔ کیا تو سمجھتا ہے کہ وہ بھی ڈاکٹر احمد حسن پر ڈورے ڈال رہی تھی؟''

میرے سوال کا جواب راجا کے خراٹے نے دیا۔ یہ صرف اس کے بس کی بات تھی کہ چند سیکنڈ میں باتیں کرتے کرتے سوجاتا تھا۔ مجھے سونے کے لیے بہت جتن کرنے پڑتے تھے۔ سب سے اچھا طریقہ یہی ہوتا تھا کہ میں کوئی کتاب پڑھوں۔ اس معمول پر میں ہمیشہ عمل پیرا رہا لیکن یہاں کتاب مجھے دستیاب نہ تھی۔ یہ میری کوتاہی تھی کہ میں شہر جاتا تھا تو کتاب نہیں خریدتا تھا۔ اس وقت مجھ پر دیگر مسائل سوار ہوتے تھے اور میرا ذہن کبھی ایک بات کی فکروں میں الجھا رہتا تھا تو کبھی دوسری طرف کے معاملات میں۔ رات

تک میرا دماغ کسی کوڑے کے ڈھیر جیسا ہو جاتا تھا جس میں سب نے کچھ نہ کچھ پھینکا ہو۔ میں خود کو سکون آور یا خواب آور گولیاں کھانے کا عادی بنانا نہیں چاہتا تھا۔ ڈاکٹر شہناز اس معاملے میں بہت سخت تھی۔ چنانچہ میں کم خوابی کو قبول کر رہا تھا۔

میں نے لائٹ آف کی اور باہر آ گیا۔ اس وقت ایک بج رہا تھا میں نے سوچا کہ نور سے بات کروں اور پوچھوں کہ وہ فریال کی مدد کے لیے اس کے پاس پہنچ گئی ہے یا اس نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ وقتی جوش میں اس نے مجھ سے وعدہ ضرور کر لیا تھا لیکن کیا پتا بعد میں عقل نے کہا ہو کہ نور اس کی نہیں اپنی فکر کرو۔ یہ محبت کی بے غرضی اور فراخدلی کہیں خود تمہارے مستقبل کے لیے خطرہ نہ بن جائے۔ فریال اپنی تباہی کی ذمے دار خود ہے۔ تم اسے بچاتے بچاتے خود نہ ڈوب جاؤ۔ آج رفیق دل و جان سے تمہیں چاہتا ہے مگر کل تک وہ فریال کا دیوانہ تھا۔ اپنے آنے والے کل کو فریال سے بچاؤ۔

کیا اس وقت نور جاگ رہی ہوگی؟ میں نے سوچا۔ نہیں اس وقت فون کرنا مناسب نہیں۔ اس سے دن میں بھی بات ہو سکتی ہے۔ لیکن نور تو خود ایسے ہی آدھی رات کے بعد مجھے فون کرتی رہی ہے۔ اگر میرے فون نے اسے سوتے سے اٹھا دیا تو کون سی قیامت آ جائے گی۔ نور خوش ہی ہوگی۔ متضاد خیالات کی کشمکش کے ساتھ میں باغ میں اِدھر سے اُدھر ٹہل رہا تھا کہ میں نے ایک سایہ متحرک دیکھا۔ یہ رابعہ تھی جو برآمدے کی سیڑھیاں اتر کے میری طرف آ رہی تھی۔

میں رک گیا اور پھر ایک ایزی چیئر پر بیٹھ گیا۔ رابعہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی میرے سامنے آ کے بیٹھ گئی۔ ”مجھے تم سے کچھ کہنا تھا کزن۔“

میں نے کہا۔ ”ایسی کیا بات تھی جس نے تمہیں بیدار رکھا؟“

وہ مسکرائی۔ ”آخر تم بھی تو جاگ رہے ہو۔ کیا یہ باغ میں سیر کرنے کا وقت ہے کزن؟“

میں نے کہا۔ ”پہلے میں ایک بات کہوں۔ آج اتنے عرصے بعد تمہارے لبوں پر مسکراہٹ دیکھ کے مجھے واقعی خوشی ہو رہی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آج دوپہر کے بعد سے تمہارے موڈ کی خوشگوار تبدیلی نہ صرف میرے لیے بلکہ دوسروں کے لیے بھی سخت حیرانی کا باعث ہے۔“

اس نے ایک گہری سرد سانس لی۔ ”میں تمہیں یہی بتانا چاہتی تھی کہ گزشتہ چند ہفتوں میں تمہارے ساتھ اور دوسروں کے ساتھ میرا رویہ کیوں غلط تھا۔ میں بڑی الجھن میں اور سخت پریشانی کا شکار تھی۔“

”تم اپنی پریشانی مجھے بتا سکتی تھیں۔“

”میں نے سوچا تھا پھر ڈر گئی۔ اس کی دھمکی سے۔“

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ ”کس کی دھمکی سے؟“

اس نے پھر ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ”اس حرامزادے زوہیب کی دھمکی سے۔ اس نے کہا تھا، وہ تمہیں قتل کرا دے گا۔ اگر میں نے اس کی مرضی کے مطابق کام نہ کیا۔“

”میں کچھ سمجھا نہیں کزن۔“

”میں تمہیں شروع سے بتاتی ہوں۔ بات اس سے پہلے کی ہے جب اس کا باپ تمہارے پاس آیا تھا، میرا ہاتھ مانگنے۔ مجھے نہیں معلوم زوہیب نے مجھے کہاں دیکھا اور کب وہ مجھ پر فریفتہ ہو گیا۔ ایک رات اس نے مجھے فون کیا لیکن اپنا نام نہیں بتایا۔ لڑکے لڑکیاں اب ایک دوسرے کو اس قسم کی کرینک کالز کرتے ہیں۔ خصوصاً فری نائٹ پیکج آ جانے کے بعد۔ موبائل فون کمپنیوں نے ہمارے ٹین ایجرز کو یہ رعایت دے کر کتنا فائدہ حاصل کیا ہے، اس کا کوئی حساب نہیں۔ بہرحال غلطی میری تھی۔ میں اس کی کال نہ سنتی لیکن اس نے بڑی منت سماجت کی کہ میں ایسا نہ کروں۔ میں نے کہا کہ اچھا بولو۔ اسے بولنا کیا تھا، اظہارِ عشق میں سارا زور میاں صرف کر دیا۔ وہی باتیں کہ جب سے تمہیں دیکھا ہے یہ ہو گیا ہے اور وہ ہو گیا ہے۔ اور تم نہ ملیں تو میں اپنی جان لے لوں گا۔ میں نے اس کا بہت مذاق بھی اڑایا کہ یہ کس فلم کے ڈائیلاگ بول رہے ہو۔ بات یہ ہے کزن، ہم لڑکیوں کو بھی ایسی باتیں اچھی لگتی ہیں۔ دل لگی میں ہی سہی۔ کچھ دیر بعد میں نے فون بند کر دیا۔ یہ کہتے ہوئے کہ اپنی خودکشی کی وڈیو فلم مجھے ضرور بھیجنا۔ اس کا نمبر میرے پاس آ گیا تھا۔ جب میں نے ملایا تو کسی نے کال ریسیو نہیں کی۔ دوسرے دن اس نے فون نہیں کیا مگر تیسرے دن پھر وہی باتیں۔ مجھے مذاق سوجھا۔ میں نے کہہ دیا کہ میں اسی کے فون کا انتظار کر رہی تھی اور کچھ ایسی ہی باتیں جن سے اسے حوصلہ ملے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کون ہے؟ کیا کرتا ہے تو اس نے جواب دیا کہ عاشق ہوں۔ تم سے عشق کے سوا کچھ نہیں کرتا۔“

میں نے اسے ٹوکا۔ ”یہ سب شہزاد کے جانے سے پہلے ہوا؟“

”ہاں۔ میں صرف مذاق کر رہی تھی۔ اسے الو بنا رہی تھی۔ اس کی باتوں سے لطف لے رہی تھی۔ پھر ایک رقعہ آ گیا جس میں شہزاد نے کمینگی دکھائی اور میں بہت ڈسٹرب رہی۔ شہزاد کے جانے کے تین دن بعد اس نے پھر فون کیا۔

میں بہت دکھی تھی۔ اسے سب بتا دیا کہ میرے ساتھ شہزاد نے محبت میں کیسا دھوکا کیا ہے۔ ایسے اجنبی دوست اب تقریباً سب لڑکیوں نے بنا لیے ہیں۔ کچھ تو انٹرنیٹ کی دوستیاں ہیں۔ کچھ ایسی ہی کالز سے ہو جاتی ہیں۔ بعض اوقات ملاقات کی نوبت بھی نہیں آتی اور کبھی یہ دوستی تمام عمر کی رفاقت میں بدل جاتی ہے۔ اس نے میری بات سنی اور پھر اچانک ایک ایسی بات کہہ دی جس نے مجھے دم بخود کر دیا۔ اس نے کہا کہ وہ باہر کھڑا ہے۔ وہ اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کے مجھ سے ملنے آیا ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ زوہیب ہوگا۔ میں نے سوچا کہ دیکھوں تو سہی آخر کون ہے یہ دیوانہ۔ میں نیند نہ آنے کے سبب باہر ہی ٹہل رہی تھی اور رو رہی تھی اپنی بدنصیبی پر۔ کبھی سوچتی تھی خودکشی کر لوں۔ کبھی اس کے برعکس خیال یہ آتا تھا کہ شہزاد اور اس جیسے مرد اگر محبت کے نام پر دغا دیتے ہیں۔ استحصال کرتے ہیں تو اس کی سزا میں کیوں بھگتوں۔ میں کیوں مروں، میں انہیں کیوں نہ مار دوں۔ خیر...... میرا دماغ خراب ہو رہا تھا۔ میں اس اجنبی سے ملنے چلی گئی۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے ایک بات بتاؤ۔ یہ شہزاد والا معاملہ تو بعد میں ہوا۔ تم نے اس سے پہلے ہی محاذ آرائی کا رویہ اختیار کر لیا تھا، خصوصاً میرے ساتھ۔“

وہ خاموش ہو کے پیر کے انگوٹھے سے زمین کریدتی رہی۔ ”میرے پاس اپنی صفائی میں کہنے کو کچھ نہیں ہے کزن۔ اس وقت میرا دماغ شہزاد نے خراب کیا تھا۔“

”مجھے۔ بلکہ ہم سب کو یہ شک تھا کہ تم کسی کے بہکانے پر ایسا کر رہی ہو۔“

رابعہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ”میں بہت بے وقوف ہوں۔ اس کے بہکاوے میں آ کے تمہارے ساتھ بہت غلط رویہ اختیار کیا۔ تم میرے بھائی دوست کزن سب کچھ ہو۔ اس نے مجھے مجبور کیا کہ اپنا حق مانگو۔ میں تمہاری مدد کروں گا۔ نواب صاحب کو عدالت میں گھسیٹ لوں گا۔ سب مجھ سے ناراض تھے۔ جو اتنے اچھے مہربان اور مخلص دوست تھے۔ میرے جارحانہ رویے کی وجہ سے سب مجھ سے دور دور رہنے لگے تھے۔ میں سب کو منا لوں گی۔ سب سے معافی مانگ لوں گی۔“

میں نے اس کے ہاتھ پر تھپکی دی۔ ”چلو بھول جاؤ اس بات کو۔ یہ تو اچھا ہی ہوا کہ شہزاد کی اصلیت کسی بڑی خرابی سے پہلے ہی سامنے آ گئی۔ ورنہ سوچو کہ تمہاری اس سے شادی ہو جاتی اور پھر پتا چلتا کہ اس کی ایک بیوی اور بچہ پہلے سے موجود ہیں۔ تم کیا کرتیں؟ جو مجھے عدالتوں میں گھسیٹنے کے لیے تمہیں استعمال کر رہا تھا۔ وہ تمہارا کیا حال کرتا؟ خیر آگے کہو، تم اس اجنبی دوست سے ملنے گئیں۔“

”میں بہت تنہا اور بے سہارا محسوس کر رہی تھی۔ اس کی وجہ میرا غلط رویہ تھا۔ گھر والے مجھ سے خفا تھے۔ مجھے رونے کے لیے کسی کا کندھا میسر نہیں تھا۔ میں ٹہلتی ہوئی باہر نکل گئی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ اسکول کے پیچھے چھپا ہوا ہے۔ میں ادھر چلی گئی اور پھنس گئی۔ پہلے تو زوہیب کو دیکھ کے مجھے شاک لگا لیکن اس نے مجھے پلٹ کر بھاگنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ اس نے مجھے پکڑ لیا اور میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ کہنے لگا کہ ایک منٹ میری بات سن لو۔ اسی لیے میں نے ابھی تک اپنا نام تمہیں نہیں بتایا تھا۔ میں کیا کر سکتی تھی۔ وہ چھ فٹ کا صحت مند جوان آدمی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”آخر وہ اندر کیسے پہنچ گیا؟“

”اس نے تو کہا کہ میرا راستہ کون روک سکتا ہے۔ ضرور اس نے کسی محافظ کو ساتھ ملایا ہوگا۔ پیسے یا دھمکی دے کر۔ وہ واقعی جان ہتھیلی پر رکھ کے آیا تھا۔“

”تمہارے لیے؟ تم سمجھتی ہو وہ واقعی تم سے محبت کرتا ہے؟“ میں نے کہا۔

رابعہ چند سیکنڈ خاموش رہی۔ ”زبان سے اس نے یہی کہا لیکن میں اس پر کیسے اعتبار کر سکتی تھی اور وہ لاکھ مخلص ہو مگر کہیں آگ پانی کا میل ممکن ہے؟ اس نے کہا کہ تمہاری باتوں نے مجھے اتنا حوصلہ دیا۔ اب میں آ گیا ہوں تو آرام سے بیٹھ کے میری بات سن لو۔ میں نے سر ہلایا تو اس نے میرے منہ پر سے ہاتھ ہٹا لیا۔ میرے پاؤں کانپ رہے تھے۔ میں بے ہوش ہونے والی تھی۔ اس نے مجھے دیوار کے سہارے بٹھا دیا اور خود بھی میرے ساتھ بیٹھ گیا۔ ایک بار پھر اس نے وہی باتیں شروع کر دیں کہ میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مجھ سے شادی کر لو۔ تو میں نے کہا کہ تم ضرور پاگل ہو گئے ہو کہ ایسی باتیں کر رہے ہو۔ میرا بھائی مجھے مار ڈالے گا لیکن یہ رشتہ منظور نہیں کرے گا۔ وہ غصے میں آ گیا۔ بولا میں تمہارے بھائی کو اس سے پہلے مار ڈالوں گا، اگر وہ ہمارے درمیان حائل ہوا۔ پھر میں نے کہا کہ تم کیا سمجھتے ہو کہ اس طرح تم مجھے حاصل کر لو گے۔ میں خود تم پر تھوکتی ہوں۔ لعنت بھیجتی ہوں تمہاری محبت پر اور تمہارے خاندان پر۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ مجھے فون کرنے والے تم ہو۔ وہ پھر منت سماجت پر اتر آیا کہ تم کہو گی تو میں وہ گھر، خاندان سب چھوڑ دوں گا۔ میں تمہارے ساتھ رہنے آ جاؤں گا۔ میں نے کہا کہ اس حویلی

میں رہنے والوں کو اتنا بے غیرت مت سمجھو۔ اگر میں ابھی ایک آواز لگادوں تو یہاں سے تمہاری لاش کے ٹکڑے بھی نہ ملیں۔ اس نے میرے منہ پر ایک تھپڑ مارا کہ میری شرافت کو میری کمزوری مت سمجھو۔ یہ صرف تمہاری محبت ہے کہ میں تمہاری منت ساجت کررہا ہوں۔ اگر میں چاہوں تو ابھی تمہیں اٹھا کے لے جاؤں۔ اس نے مجھے جیب سے ایک انجکشن نکال کے دکھایا کہ تمہاری آواز بند کرنا تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اگر تمہارا خیال ہے کہ یہاں میں اکیلا آیا تھا تو اس سے بڑھ کر بے وقوفی کی کیا بات ہوسکتی ہے۔ میرے محافظ اندھیرے میں چھپے ہوئے ہیں۔ میں چاہوں تو شادی کے بغیر ہی تمہیں اپنے محل میں رکھ سکتا ہوں۔ جیسے میرے باپ نے ڈاکٹر شہناز کو رکھا تھا۔ کسی کو پتا ہی نہیں چل سکتا کہ تم کہاں ہو۔ سب یہی سمجھتے رہیں گے کہ تم گھر سے نکل گئیں۔ کہیں کسی کنویں میں چھلانگ لگا کے خودکشی کرلی۔ لیکن میں واقعی تم سے محبت کرتا ہوں۔ تمہارے ساتھ عزت سے شادی کرکے زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہوگی۔ مجھے رانا رجب علی کا بگڑا ہوا رئیس زادہ نہ سمجھو۔ بے شک اب تک میں ایسا تھا مگر تمہاری محبت نے مجھے بدل دیا ہے۔ میری کایا کلپ کردی ہے۔ تمہارے سوا میں کسی عورت کی طرف آنکھ اٹھا کے بھی دیکھوں تو مجھے گولی ماردینا۔ میں ہکا بکا اس کی باتیں سن رہی تھی اور وہ میرا ہاتھ تھامے بیٹھا تھا۔ کبھی میرے ہاتھ کو آنکھوں سے لگاتا تھا کبھی چومتا تھا۔ ایک بار اس نے مجھے بھی چوم لیا۔ اچانک میری بے خبری کے باعث اور میں نے تھپڑ مارنا چاہا تو اس نے پھر میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے کہا کہ وہ اپنے باپ کو میرا ہاتھ مانگنے بھیجے گا۔ نواب رفیق سے کہنا انکار نہ کرے۔ میں نے وہیں بتادیا کہ رانا کو کیا جواب ملے گا۔ حقیقت یہ ہے کزن کہ میں بہت ڈرگئی تھی۔ وہ واقعی مجھے اٹھا کے لے جاسکتا تھا۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش بھی کی مگر وہ ہے تو رانا کا بیٹا۔ بالآخر اپنی اصلیت دکھادی۔ کہیں اندھیرے میں تصویریں اتارنے والا کیمرا نصب تھا یا شاید اس کا کوئی محافظ کیمرا لیے تصویریں اتاررہا تھا۔ یہ اس قسم کا Dgital کیمرا تھا جو عکس محفوظ کرتا جاتا ہے۔ اس نے کہا کہ میں پکا کام کرتا ہوں۔ تم جانے کے لیے آزاد ہو مگر میں تمہیں کچھ دکھانا چاہتا ہوں۔ جانے سے پہلے وہ ضرور دیکھ لو۔ وہ باہر گیا اور فوراً ہی لوٹ آیا۔ اس نے کیمرا مجھے دیا کہ لو۔ اس بٹن کو دباتی جاؤ اور تصویریں دیکھتی جاؤ۔ یہ ہماری ملاقات کی تصاویر ہیں۔ تم نے مجھے یہاں بلایا تھا۔ تم خود مجھ سے ملنے یہاں آئی تھیں۔ اور ملاقات میں ہم کیا کرتے رہے۔ خلوت میں پاس پاس بیٹھے ہم نے کیا باتیں کی ہوں گی۔ اس کا صرف اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ تصویریں بولتی نہیں۔ دیکھنے والے خود سمجھ لیتے ہیں کہ تصویر کیا کہہ رہی ہے۔

جب میں نے وہ تصویریں دیکھیں تو میرا ہارٹ فیل ہونے لگا۔ ہر تصویر میں ہم ساتھ بیٹھے تھے۔ یہ کسے معلوم کہ مجھے زبردستی بٹھایا گیا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ چوما یا مجھے۔ سب تصویروں میں نظر آتا تھا۔ اس نے بڑی فاتحانہ شان سے کہا کہ ان تصویروں کو استعمال کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں۔ بس تم میری محبت کو قبول کرلو اور اپنے کزن سے کہو کہ انکار نہ کرے۔ ورنہ یہ سمجھ لو کہ میں بھی رانا کا بیٹا ہوں۔ تمہیں اٹھا لے جاؤں گا۔ کوئی میرے راستے میں حائل ہوا تو اسے قتل کرادوں گا یا کردوں گا۔

میں خوف سے بے حال بیٹھی رہی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں اس سے کیا کہوں۔ جاتے وقت اس نے پھر کہا کہ مجھ پر اعتبار کرو۔ میں کوئی اچھا آدمی نہیں ہوں مگر تمہارا غلام بن کے رہوں گا۔ اس کے بعد وہ چلا گیا اور میں لوٹ کے آئی تو میری حالت خراب تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں۔ نہ میں زوہیب کی دھمکی کو نظر انداز کرسکتی تھی اور نہ ان تصویروں کو جو اس کے پاس تھیں۔ پتا نہیں کیسے میں نے اپنے آپ کو خودکشی سے روکا۔ میں نے سوچا کہ مجھے کچھ ایسا کرنا چاہیے کہ زوہیب کی ساری بدمعاشی نکل جائے اور وہ پھر مجھ سے محبت کا نام نہ لے۔ مجھے شک تھا کہ گھر کے اندر جتنے ملازم کام کرنے آتے ہیں ان میں سے کوئی اس کا جاسوس ہے مگر اس کا پتا چلانا مشکل تھا۔ اس سے شادی کا کیا سوال، میں اسے ایسی سزا دینا چاہتی تھی کہ وہ یاد رکھے۔ میں نے کسی کو کچھ نہیں بتایا۔ زوہیب کا باپ آیا اور انکار سن کے لوٹ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس سے زوہیب کتنا مشتعل ہوگا چنانچہ میں نے گھر میں ایک ڈراما کیا۔ میں نے تم سے مطالبہ کیا کہ زوہیب کے لیے میرا رشتہ قبول کرلیا جائے۔ ظاہر ہے یہ ناممکن تھا اور میری اس بات کے نتیجے میں تمہارے میرے درمیان نفرت کی ایک خلیج حائل ہوگئی۔ سب مجھ سے ناراض ہوگئے لیکن یہ بات زوہیب تک پہنچ گئی۔

اس نے مجھے فون کیا اور میں نے ظاہر کیا کہ مجھے اس کی پاگل پن والی محبت نے متاثر کیا ہے۔ اس کا جنون اور بڑھ گیا۔ وہ مجھے ہر رات فون کرتا تھا۔ دوبارہ وہ مجھ سے ملنے نہیں بھی آیا۔ معلوم نہیں کیسے وہ ہمارے محافظوں کی نظر میں نہیں آیا۔ میں اس سے ملی تو اسے یقین دلانے میں کامیاب رہی

کہ وہ صبر کرے اور شرافت سے کام لے تو ہماری شادی ہوسکتی ہے۔ اس نے انتظار کرنے کا وعدہ کیا اور شرافت کا ثبوت یوں دیا کہ ایک روز وہ کیمرا مجھے دے دیا جس میں میری تصاویر تھیں کہ تم رکھ لو۔ اب تو تمہیں میری نیت پر اعتبار آنا چاہیے۔ میں نے کہا کہ اوّل تو میں رفیق کو منالوں گی لیکن وہ نہ مانا تو میں اپنی مرضی سے بھی شادی کرسکتی ہوں۔ وہ ایسا میرے چکر میں آیا کہ کل رات محافظوں کے بغیر اکیلا ہی مجھ سے ملنے آگیا۔ اور مارا گیا۔"

میں چونک پڑا۔ "مارا گیا؟ یہ تم سے کس نے کہا۔"

رابعہ گھبرا گئی۔ "کیا مطلب؟ وہ مارا نہیں گیا؟"

میں نے کہا۔ "وہ سو فیصد زندہ ہے کزن۔"

"مگر کیوں۔ اس کا وہ خط خود میں نے لکھا تھا۔ اور ایسے رکھا تھا کہ ریشم دیکھ لے۔ جب وہ خط غائب ہوا تو میں سمجھ گئی تھی کہ ریشم نے تم تک پہنچادیا۔"

"میں اسے شوٹ کردیتا کزن! لیکن غنی نے مجھے روک لیا پھر ہمارے محافظوں نے اسے گرفتار کرلیا۔"

"میں...... میں سمجھی...... رانا صاحب اس کی لاش لینے آئے ہوں گے۔ اوہ مائی گاڈ۔ تم نے اسے مارا کیوں نہیں کزن۔ میں نے تو اسے آسان شکار بنا کے تمہارے نشانے پر لانے کے لیے بڑی محنت کی تھی۔"

"رانا اپنے ولی عہد کو اپنے ساتھ لے گیا۔ ہم ایسا نہ کرتے تو بڑی مشکل میں پڑجاتے۔ رانا ہمارے خلاف اغوا کا کیس بنادیتا۔ قتل کا الزام براہِ راست ہم پر آتا۔ ہم نے اس پر احسان کیا۔"

"احسان؟ تم سمجھتے ہو وہ احسان مانے گا؟" رابعہ چلائی۔

"تم کیا جانو کزن۔ وقت کے کس موڑ پر آدمی کی زندگی اپنا رخ بدل لے۔ تاریخ ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے جہاں کسی کی ایک نیکی نے چور کو ولی اور ڈاکو کو قطب کے مرتبے تک پہنچادیا۔ میری کیا بساط کہ اپنا ان سے موازنہ کروں لیکن کیا ہوا تھا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے ساتھ۔ جب وہ بچپن میں حصول تعلیم کے لیے جارہے تھے تو ڈاکوؤں نے پکڑ لیا تھا۔ ماں نے کہا تھا کہ بیٹا جھوٹ کبھی نہ بولنا۔ چنانچہ ڈاکو نے پوچھا کہ لڑکے تیرے پاس کیا ہے نکال۔ آپ نے کہا کہ ماں نے کچھ رقم واسکٹ کے اندر سی کے محفوظ کردی تھی۔ ڈاکو دم بخود رہ گیا اور اس واقعے سے اتنا متاثر ہوا کہ راہِ راست اختیار کی۔"

رابعہ کی تشویش کم نہیں ہوئی۔ "میں جانتی ہوں اولیا اور صوفیانِ کرام کے اخلاق سے متاثر ہوکے ہی یہاں کے لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا مگر وہ زمانہ اور تھا کزن۔ وہ لوگ بھی اور تھے۔ زوہیب تو زخم خوردہ سانپ ہوگیا ہے۔"

میں نے رابعہ کو ہاتھ تھام کے اٹھایا۔ "اللہ کے بعد مجھ پر بھروسا رکھو کزن۔ میں اس سانپ کا سر کچل سکتا ہوں۔ افسوس کہ تم نے مجھ سے زیادہ اپنی عقل پر بھروسا کیا۔ بے عقل لڑکی!"

وہ میرے ساتھ چلنے لگی۔ "پھر میں کیا کرتی؟"

"اگر تم نے پہلے دن ہی مجھے شریکِ راز کرلیا ہوتا۔ یہ جو کچھ آج مجھے بتایا ہے پہلے دن ہی بتادیا ہوتا تو تمہیں اتنا عرصہ سارا عذاب اکیلے نہ اٹھانا پڑتا۔ خیر...... اب جو ہوا سو ہوا۔ تم ساری فکریں چھوڑ دو۔ ایک بات بتاؤ مجھے، کیا یہ زوہیب ہی تھا جس نے ثریا کے بارے میں انفارمیشن دی تھی؟"

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "وہ مجھے شہزاد سے بدگمان کرنا چاہتا تھا۔ دوسری طرف اس نے ثریا کو بتادیا تھا کہ تمہارا شوہر ایک اور شادی کے چکر میں ہے۔ اسی نے ثریا کو یہاں کا پتا دیا تھا۔"

"ہمیں بھی یہی شک ہوا تھا مگر اسے ہم نے جھوٹا پروپیگنڈا سمجھا تھا۔ غلطی میری تھی کہ میں نے پہلے خرم پر اعتبار کیا پھر شہزاد پر۔ اور دونوں بار میری غلطی کا خمیازہ تم نے بھگتا۔"

رابعہ نے ایک آہ بھری۔ "اسی کو نصیب کہتے ہیں کزن۔ تمہارا کیا قصور ہے اس میں۔"

"چلو اب اچھی بچی کی طرح جا کے سو جاؤ۔ تمہاری فکر کرنے کے لیے تمہارا یہ بھائی ہے نا۔" میں نے اس کے ماتھے پر بوسہ دے کر اپنے کمرے کا رخ کیا لیکن ہوا وہی جس کا مجھے ڈر تھا۔ نیند آنے کا وقت گزر چکا تھا اور میرا دماغ اس نئی صورتِ حال کی پیچیدگی میں الجھ گیا تھا۔ ایسا میں نے رابعہ کے سامنے نہیں کیا تھا مگر زوہیب کے ساتھ اپنی عقل سے نمٹنے کا فیصلہ اس کی کم عقلی کا ثبوت تھا۔ اوّل تو گمنام فون پر کسی اجنبی سے دوستی ایک احمقانہ قدم تھا۔ ممکن ہے شہر کی لڑکیاں شوقیہ ایسے کھیل سے مزے لیتی ہوں لیکن یہاں رابعہ کی حوصلہ افزائی زوہیب کو حویلی کے اندر تک کھینچ لائی تھی۔ اس سے ملنے کے بعد وہ چالاکی اور عیاری کے ساتھ بچھائے ہوئے محبت کے جال میں پھنس گئی تو اس نے اکیلے میں اس سے نمٹنے کی کوشش کی۔ بلیک میلنگ کا شکار ہوئی تو خود ہی زوہیب کو مروانے کے لیے حویلی کے اندر بھی ڈراما کیا۔

اگر وہ سیدھی میرے پاس آکے بتا دیتی کہ گزشتہ رات زوہیب نے دھوکے سے اس کو ٹریپ کرلیا تھا تو اسے اپنی جان پر یہ دہرا عذاب نہ لینا پڑتا۔ ایک طرف ہم سب سے دوری اور بے اعتمادی کا۔ دوسری طرف زوہیب کی زبردستی والی محبت کا اور یہ زمانہ وہ تھا جب اس کا دل بھی شہزاد کی فریب کاری سے زخم خوردہ تھا۔ نادان لڑکی...... شہزاد کے اکسانے پر مجھ سے اپنا حق مانگ بیٹھی۔ آخر یہ کیا تھا؟ محبت کے معاملے میں وہ اتنی کمزور کیوں تھی کہ ہر ایک اسے دھوکا دے کر چلا جاتا تھا؟

صبح ہوتے میری آنکھ لگی تو پھر میں دوپہر تک سوتا رہا۔ رابعہ شاید سوئی ہی نہیں تھی۔ وہ اسکول جانے سے پہلے وہ کیمرا میرے تکیے کے نیچے رکھ گئی تھی جس میں زوہیب کی اس کے ساتھ تصویریں تھیں۔ جاگنے کے بعد میں نے کروٹ لی تو مجھے ایک سخت ابھار سا محسوس ہوا اور میں نے کیمرا نکال لیا۔ کمرے میں پردے پڑے ہونے سے روشنی کم تھی۔ کھٹا کھٹ بٹن دبا کے میں نے اس رات کے سارے عکس دیکھ لیے جو رابعہ کی رسوائی کا سبب بن سکتے تھے۔ یہ تصاویر عام ہو جاتیں تو ست بدھائی کی حویلی کی بدنامی کے قصے ہر زبان پر آجاتے۔ ایک جذباتی غلطی زوہیب سے بھی سرزد ہوئی تھی۔ اپنی محبت کا یقین دلا کے رابعہ نے یہ ثبوت حاصل کر لیے تھے لیکن اس کا یہ مطلب بہرحال نہیں تھا کہ زوہیب نے اپنی شکست سے کچھ سیکھا ہوگا۔ شاید وہ پہلے سے زیادہ خطرناک انداز میں وار کرے گا۔ ایک دشمنی سیاسی نوعیت کی تھی جو اس کا باپ نبھا رہا تھا۔ اب بیٹا ذاتی دشمنی کے ساتھ اس جنگ میں شامل ہو جائے گا۔ باپ کے پاس عمر کا تجربہ تھا۔ بیٹے کے پاس جوانی کا جوش۔

راجا نے مجھ سے اتفاق کیا کہ ان حالات میں سیکیورٹی مزید بڑھانا ضروری ہوگا۔ اس نے غنی کو طلب کیا اور اس سے سخت لہجے میں باز پرس کی۔ ''آخر اس کی ہمت کیسے ہوئی حویلی کے اندر آنے کی۔ گارڈز کہاں تھے۔ یہ کیا سکیورٹی ہے۔ کس کی نااہلی ہے؟''

غنی کا چہرہ اتر گیا۔ ''سوری سر! میں مانتا ہوں کہ ایسا صرف گارڈز کی غفلت سے ہوا۔ لیکن ایک تو گارڈز کم ہیں۔ میرا مطلب ہے وہ رات کے وقت اس پورے جنگل پر نظر رکھنے کے لیے کافی نہیں جو ہماری حدود میں پھیلا ہوا ہے۔ یہاں سے دریا تک۔''

''یہ بات تمہیں پہلے بتانی چاہیے تھی۔ ہم کچھ کرتے۔''

''اس طرف یعنی رانا نگر کی طرف ہم گارڈز کی تعداد میں دس گنا اضافہ کر دیں پھر بھی کم ہے۔ اور باقی تین طرف سے ہماری سرحد پھر بھی کھلی ہوگی۔ رات کو اس جنگل میں کوئی چوروں کی طرح آجائے تو گارڈز اسے کیسے روک سکتے ہیں۔''

''یعنی تم اپنی نااہلی کا اعتراف کر رہے ہو۔''

غنی کو راجا کے اس رویے نے کچھ حیران کیا۔ ''سر! میں نے اسی لیے دیوار کھینچنے کی بات کی تھی۔ آپ نے دیکھا ہوگا کام ہو رہا ہے۔ اگر ہر سمت سے ست بدھائی کے گرد حصار قائم کیا جائے تو دیوار کی لمبائی تین میل کے قریب ہوگی۔ میرا خیال تھا کہ دیوار سے صرف رانا نگر کی مداخلت کو روکا جائے۔ باقی حصے میں خاردار تاریں ہوں جن میں رات کے وقت کرنٹ چھوڑ دیا جائے۔ کوئی تار کاٹے تو الارم بجے۔ لیکن آپ کہتے ہیں تو ہم ہر طرف دیوار کھڑی کر دیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''غنی! ہمیں تمہاری نیت اور صلاحیت پر پورا بھروسا ہے۔ اخراجات کی فکر مت کرو۔ فصیل ہر طرف کھینچ دو اور واچ ٹاور بنا دو، ہر سو گز کے فاصلے پر سرچ لائٹس لگا دو۔''

''آپ چل کے دیکھ لیں سر! میں بالکل اسی طرح کا حفاظتی انتظام کر رہا ہوں۔''

راجا نے کہا۔ ''دوسری بات گھر کے اندر جو ملازم آتے ہیں۔ ان میں کوئی رانا کا جاسوس ہے۔''

''اگر ایسا ہے تو میں معلوم کرلوں گا سر!''

''غنی نے اپنے جاسوس رانا کی حویلی میں چھوڑ رکھے ہیں۔'' میں نے کہا۔

غنی نے ایک وڈیو فلم ہمیں پیش کی۔ ''یہ آپ دیکھ لیں۔''

غنی کے جانے کے بعد میں نے راجا سے کہا۔ ''تو نے جس لہجے میں غنی سے بات کی۔ وہ اسے اچھا نہیں لگا ہوگا۔''

''یار کرنا پڑتا ہے یہ بھی۔ اسی کو سیاست کہتے ہیں۔ اچھا سلوک اپنی جگہ لیکن آقا اور غلام کے درمیان ایک حدِ فاصل ضروری ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اگر وہ ناراض ہو کے چلا گیا تو؟''

''کوئی شخص دنیا میں ناگزیر نہیں ہوتا کیے پتر کہ وہ نہ رہا تو پورا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ بیشتر سرکاری ملازم اس خوش فہمی کا شکار ہوتے ہیں کہ کوئی دفتر یا محکمہ ان کے بغیر چل ہی نہیں سکتا۔ لیکن ان کی ریٹائرمنٹ کے بعد کوئی کل کا لونڈا

جوفلاں جگہ روپوش تھے۔

فریال کی پوزیشن بھی وہی تھی جو رابعہ کی۔ وہ خود اپنے بچھائے ہوئے جال میں گرفتار تھی۔ جن پر تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے۔ سلطان کو اپنی زندگی سے اور اس دنیا سے خارج کرنے کے لیے اس نے بڑی ہوشیاری سے ایک پلان بنایا تھا مگر اس پر عمل درآمد کے لیے کسے منتخب کیا؟ رانا رجب علی جیسے دو غلے شاطر کو اور ان گوجر برادران کو جو بیک وقت کاٹھ کے الو اور الو کے پٹھے تھے۔ وہی اب فریال کے خلاف جرم کے گواہ کی حیثیت اختیار کر چکے تھے۔

میرا معاملہ اگر حویلی کے دیگر لوگوں کے علم میں آجاتا تو وہ مجھے راجا کی طرح رعایت نہ دیتے۔ مخالفت کا ایک طوفان کھڑا ہو جاتا کہ آخر میں کیا چاہتا ہوں، کیا کر رہا ہوں اور کیوں کر رہا ہوں؟ نور جہاں اپنی شناخت بدل کے ماہ نور بنے اور باہر چلی جائے۔ یہ تو سب کو منظور تھا مگر وہ ماہ نور کی حیثیت سے حویلی کے خاندان میں شامل ہو جائے۔ یہ شاید ابھی ناممکن تھا۔ اس سے میرے تعلق کی اتنی مخالفت نہیں تھی جتنی اس بات کی ہوتی کہ میں فریال سے بھی مل رہا ہوں اور اب ستم بالائے ستم ماہ نور خود فریال کے ساتھ ہے اور اس کی دیکھ بھال کر رہی ہے اور میں اس کی حفاظت کا ذمہ لے چکا ہوں۔ سب کا متفقہ فیصلہ یہی ہوتا کہ میرا دماغ خراب ہو چکا ہے یا عقل سے محروم ہو گیا ہوں اور اپنی تباہی کا سامان کر رہا ہوں۔

کچھ تعلق ایسے ہوتے ہیں جو سمجھ میں نہیں آتے۔ نہ اپنی اور نہ کسی اور کی۔ لیکن رشتوں کو توڑنا یا جوڑنا کوئی کھیل نہیں ہوتا۔ کچھ ایسا ہی میرے ساتھ تھا۔ اپنی خواہش اور کوشش کے باوجود میں نہ فریال کو اپنی زندگی سے خارج کر سکتا تھا اور نہ اس سے ذہنی تعلق کو یکسر ختم کر سکتا تھا۔ اس سے نفرت تو بہت دور کی بات ہے۔ آٹھ سال کی اتنی قربت کے بعد یہ ناممکن تھا کہ وہ مشکل میں ہو، مدد کی طالب ہو اور میں انکار کر دوں۔

رابعہ کے رویے کی کایا کلپ سب کے لیے ناقابلِ فہم تھی لیکن یہ ایک مثبت تبدیلی تھی جس پر سب نے خوشی اور اطمینان کا اظہار بھی کیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ رابعہ نے دوسروں کو کیا بتایا اور کیسے بتایا۔ ظاہر ہے اس نے اعتراف کر لیا ہوگا کہ یہ سب اس کا ڈراما تھا یا اس کی بے وقوفی تھی۔ رات کو راجا نے مجھ سے پوچھا تو میں نے اسے اپنی رابعہ سے ہونے والی گفتگو تفصیل سے بتائی۔

راجا نے افسوس سے کہا۔ ”یار جب ان سے کہا جائے کہ خود کو عقلمند سمجھنا چھوڑ دو۔ اللہ نے تمہیں ناقص العقل بنایا ہے تو یہ برا مانتی ہیں مگر ذرا دیکھو خاتون نے اپنے لیے اور ہمارے لیے کیسی مصیبت کھڑی کر دی۔ مذاق مذاق میں فون پر ایک اجنبی دوست بنا لیا۔ ادھر مس فریال نے بھی یہی کیا۔“

”بات یہ ہے راجا کہ عقل تو کم نہیں کسی کے پاس لیکن جتنی ہے وہ زندگی کو حسن اور سلیقے سے گزارنے کے لیے ہے۔ محبت کرنا، گھر بسانا اور اپنی دنیا کے معاملات چلانا اور بات ہے۔ مردوں کی سازشی دنیا کو سمجھنا اور اس کا مقابلہ کرنا ان کے بس کی بات نہیں۔“

”آگے نہ جانے کیا ہوگا۔ زوہیب اور اس کے باپ سے شرافت کی اُمید تو نہیں کی جا سکتی۔“

میں نے کہا۔ ”کل کی فکر چھوڑ راجا۔ جیسے آج تک نمٹا ہے ایسے ہی نمٹ لیں گے۔ چل ہم وہ فلم دیکھ لیں۔ ایک ہیرو کی گرفتاری جو دعویٰ رکھتا ہے کہ وہ جان ہتھیلی پر رکھ کے آیا تھا۔“

”میرا خیال ہے پہلے ہم سنسر بورڈ کی نظر سے دیکھ لیں کہ اس کی نمائش خواتین کے لیے مناسب ہے یا نہیں۔“

میں نے اس سے اتفاق کیا۔ ”آخر ہم ہی ان کے اخلاق و کردار کے ٹھیکے دار ہیں۔“

یہ فلم دیکھنے کا موقع ہمیں رات کو ملا۔ اس کے لیے ضروری انتظامات غنی نے اوپر کی منزل پر لائبریری میں کیے۔ فلم کا پہلا سین ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ کیمرے کے لیے چاند کی دھندلی روشنی ناکافی تھی۔ غالباً فوٹوگرافر نے دور سے فلم بندی کی تھی۔ زوہیب پہلے سائے کی طرح نمودار ہوا۔ پھر زوم کر کے کلوز اپ لیا گیا تو اس کا چہرہ نمایاں ہو گیا۔ اس کی گرفتاری کے منظر میں بھی ہمارے لیے نئی بات کوئی نہیں تھی اور یہ سین دھندلا تھا۔ پھر اچانک زوہیب اس کمرے میں جنگل سے پکڑے جانے والے خونخوار شیر کی طرح دھاڑتا نظر آیا۔ اب لائٹ پوری تھی اور ہم تمام آوازیں بھی سن سکتے تھے۔ زوہیب گالیاں اور دھمکیاں دے رہا تھا۔ ”بہت مہنگی پڑے گی تم سب کو یہ حرکت۔ تم نے کیا سمجھ کے یہ سلوک کیا میرے ساتھ۔“

غنی کی آواز آئی۔ ”ایک مجرم سمجھ کے۔“

زوہیب نے غنی کو گالیاں دیں۔ ”جن کے بھروسے پر تو اکڑ رہا ہے غنی وہ تجھے بچا نہیں سکیں گے۔“

غنی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”تم کیوں آئے تھے حویلی میں؟“

”یہ پوچھنے والا تو کون ہوتا ہے؟“ مزید گالیاں۔

”تم نے کیا سمجھ رکھا تھا۔ یہاں سب اندھے رہتے

ہیں۔ سارے نشے میں غافل پڑے ہوں گے۔“

”دیکھو غنی۔ بہتر ہوگا کہ تم مجھے واپس پہنچا دو۔“

غنی نے گرج کے کہا۔ ”بکواس بند کروا اپنی۔ یہاں سے اب تمہاری لاش ہی جائے گی۔ اگر تم نے شرافت سے نہ بتایا کہ تم چوروں کی طرح کیوں آئے تھے۔ کیا ہوتا اگر ہمارے گارڈز تم پر گولی چلا کے تمہیں کتے کی طرح مار دیتے۔ مجھے دوسرے طریقے بھی آتے ہیں زبان کھلوانے کے۔“

”میں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ تم دو ٹکے کے ملازم میرے منہ لگتے ہو، مجھے دھمکاتے ہو۔“ زوہیب نے بھی دہاڑ کے کہا۔

”اس کا مطلب ہے تم شرافت سے کچھ نہیں بتاؤ گے۔ ایک رات میں تمہاری ساری بدمعاشی نکل جائے گی۔ صبح تک تم کو رانا کی اولاد سے بندے کا پتر نہ بنا دیا تو میرا بھی نام غنی نہیں۔“

پہلی مرتبہ زوہیب کے چہرے پر خوف نظر آیا مگر اس نے اپنی اکڑفوں برقرار رکھی۔ ”میں نواب رفیق سے بات کرنا چاہتا ہوں۔“

”پہلے مجھ سے بات کرو۔ میں ضروری سمجھوں گا تو نواب صاحب سے بھی بات کرا دوں گا۔ وہ میرے معاملات میں دخل نہیں دیتے۔ صبح تک مجھے ان کو بتانا ہے کہ دشمن نے اتنی جرأت کیسے کی۔“

”اگر میں نے سچ بتا دیا تو تمہارے نواب رفیق کی عزت آبرو کا جنازہ نکل جائے گا۔“

”دیکھو مجھے سختی پر مجبور مت کرو۔ نواب کی عزت آبرو کی طرف انگلی اٹھانے والا ابھی تک پیدا نہیں ہوا۔“ ”بولو تم کیوں آئے تھے۔ بولو گے نہیں تو مجھے زبان کھلوانا آتا ہے۔ ابھی تمہیں ننگا کر کے الٹا لٹکا دیا جائے گا اور تمہاری ایسی چھترول ہوگی جو تھانے میں کسی لاوارث کی بھی نہیں ہوتی۔ تو تم ریکارڈ کی طرح بجنے لگو گے۔“

”تم ایسا نہیں کر سکتے۔ میرا باپ تم سب کی ماں بہن......“

غنی نے چلا کے کہا۔ ”اوئے اس...... کو ننگا کر کے الٹا ٹانگ دو۔ یہ ایسے نہیں بتائے گا۔ اس کو مرچوں کی دھونی دو...... میں مرچیں بھر دو۔“

رانا رجب علی کے ولی عہد نے کبھی کسی غنی جیسے معمولی حیثیت کے ملازم سے ایسی گالیاں نہیں سنی ہوں۔ اس کا باپ علاقے کا حاکم تھا۔ علاقے کا تھانیدار، تحصیلدار، ایس پی۔ سب اس کو سلام کرتے تھے۔ اس کی دہشت پورے علاقے پر قائم تھی۔ کمی کمین اور ذاتی ملازم کیا آس پاس کے دیہات میں کسی کی مجال نہ تھی کہ اس کے سامنے اونچی آواز میں بات بھی کر سکے۔ لیکن یہاں وہ بے بس تھا۔

ذرا سی دیر میں انہی تینوں نے جو اسے اٹھا کے لائے تھے اور غنی نے اس کے سارے کپڑے اتار کے اسے ننگا کر دیا۔ اس نے پوری مزاحمت کی لیکن وہ ناز و نعم میں پلا ہوا جاگیردار۔ میرے سخت جان، سخت کوش اور سخت دل نمک خواروں کا مقابلہ کہاں کر سکتا تھا۔ ذرا سی دیر میں انہوں نے زوہیب کا لباس تار تار کر دیا۔ پھر وہ خاموشی سے باہر نکل گئے۔

زوہیب کا سارا غرور خاک میں مل گیا۔ اس کی آنکھوں میں اپنی ذلت سے آنسو آ گئے تھے۔ جب اس نے دیکھا کہ اب سچ مچ اسے الٹا لٹکانے اور اس کے اندر دونوں طرف سے مرچیں بھرنے اور اسے تیرہ نمبر کے چھتر سے سچ بولنے پر مجبور کرنے کی تیاری مکمل ہو گئی ہے تو اس نے کہا۔ ”اچھا...... اچھا میں بتاتا ہوں لیکن کیا اس کے بعد تم مجھے جانے دو گے؟“

”صبح یہ فیصلہ خود نواب صاحب کریں گے۔ ہم نے تمہاری قبر کھود لی ہے۔ وہ کہیں گے تو تمہیں مار کے دفن کر دیا جائے گا۔ قیامت تک کسی کو پتا نہیں چلے گا کہ رانا کا ولی عہد کہاں غائب ہو گیا۔“

اس کے بعد آواز غائب ہو گئی۔ زوہیب کچھ بتا رہا تھا مگر کیمرا صرف تصویر ریکارڈ کر رہا تھا۔ دس منٹ بعد غنی بھی دروازہ بند کر کے نکل گیا۔ کمرے میں ذرا سی دیر کے لیے اندھیرا پھیل گیا۔ دوبارہ روشنی ہوئی تو رانا کا سپوت اسی بے لباسی میں کمرے کے اندر دیوانہ وار چکر لگا رہا تھا۔ کبھی وہ بیڈ پر بیٹھ جاتا تھا۔ ایک بار اس نے دیوار کی طرف رخ کر کے پیشاب بھی کیا کیونکہ اس کمرے میں کوئی باتھ روم نہیں تھا۔ یہ مختلف اوقات میں ریکارڈ کیے ہوئے سین تھے۔ ڈیڑھ گھنٹے کی کیسٹ میں پوری رات کی روداد تھی۔ زوہیب چلاتا بھی رہا تھا...... ضرور وہ کسی کو آواز دے رہا ہوگا مگر اس کی سننے والا کوئی نہیں تھا۔ ایک سین میں وہ سلور کے گندے گلاس سے پانی پی رہا تھا۔ دوسرے میں اسے مٹی کے پیالے سے چائے پیتے دکھایا گیا تھا۔

لیکن آخری سین میں وہ پھر کپڑے پہنے بیٹھا تھا۔ اس کے اپنے کپڑے اتارنے والوں نے پھاڑ دیے تھے۔ اب وہ نئے صاف ستھرے کپڑے پہنے بیٹھا تھا۔ کمرا بالکل صاف تھا۔ بیڈ پر چادریں بدلی ہوئی تھیں۔ ایک ٹیبل پر ناشتے کے

برتن نظر آرہے تھے۔ اس سے صرف یہ ثابت ہوتا تھا کہ زوہیب کو قید میں بڑے آرام سے رکھا گیا اور اس کے ساتھ شایانِ شان سلوک ہوا۔ یہ سب اس کے باپ کو دکھانے کے لیے تھا اور زوہیب کو جھوٹا ثابت کرنے کے لیے تھا کہ اس کے ساتھ بہت برا ذلت آمیز سلوک کیا گیا تھا۔

آخری سین وہی تھا جو ہم سب نے دیکھا تھا۔ رانا ہمارے ساتھ کمرے میں آیا اور زوہیب کو اپنے ساتھ لے گیا۔ غنی نے اس وقت تک کیمرے کو ہم پر فوکس رکھا جب تک رانا ہم سے ہاتھ ملا کے گاڑی میں نہیں بیٹھا اور گاڑی چلی نہیں گئی۔

غنی نے بڑی ذہانت کا ثبوت دیا تھا۔ اگر زوہیب نے اپنی آمد کی یہ وجہ بتائی تھی کہ اسے رابعہ نے بلایا تھا تو اسے ریکارڈ نہیں کیا گیا تھا۔ اصل حصہ وہ تھا جس میں اس کی گرفتاری اور پھر رہائی دکھائی گئی تھی۔ قید میں گزاری ہوئی ایک رات کی منظر کشی صرف زوہیب کی ذلت و رسوائی کا ریکارڈ تھا۔ اسے ہم وقت ضرورت استعمال کر سکتے تھے۔

راجا نے پھر ناخوشی کا اظہار کیا۔ ''غنی کو تفتیش کا حق کس نے دیا آخر؟''

میں نے کہا۔ ''راجا۔ وہ ہمارا چیف سیکیورٹی افسر ہے۔ کیا اسے یہ حق حاصل نہیں ہونا چاہیے۔''

''یہ عام مجرموں کا معاملہ نہیں تھا۔''

''میرا خیال ہے اس نے زوہیب پر جسمانی تشدد بالکل نہیں کیا لیکن زوہیب کا دماغ ضرور درست کر دیا۔ اس میں تو کوئی حرج نہیں۔ میں نے غنی سے پوچھا تھا۔ اس نے بتایا کہ یہ فلم اس نے زوہیب کو بھی دکھا دی تھی۔ اور اسے سمجھا دیا تھا کہ اس نے اپنی زبان بند نہ رکھی تو ہم اس فلم کے ٹوٹے ریلیز کر دیں گے جو گھر گھر دیکھے جائیں گے کہ رانا صاحب کے ولی عہد نے ایک رات ہماری قید میں کیسے گزاری تھی۔''

''اس میں غنی پر الزام آئے گا۔''

''میں نے کہا نا۔ پوری فلم نہیں، ہم وہی حصے الگ نکال سکتے ہیں جن میں رانا کسی نامعلوم مقام پر قید ہے۔ جن میں نہ غنی نظر آئے نہ کوئی اور۔ آواز کا تو کوئی مسئلہ نہیں۔ صاف بھی کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس فلم کا آخری سین ہمیں تحفظ فراہم کرتا ہے۔ یہ ثابت کرتا ہے کہ ہم نے ان کے بیٹے کو مہمانوں کی طرح رکھا اور وہ اسے باعزت طور پر لے گئے۔''

راجا نفی میں سر ہلاتا اٹھ گیا۔ ''یہ جو بھی ہوا ٹھیک پتر۔ اچھا نہیں ہوا۔ بہتر ہوتا ہم زوہیب کو گرفتار کرنے سے پہلے ہی رانا کو بلاتے اور وہ خود دیکھ لیتا کہ اس کے بیٹے نے ٹریس پاس کیا ہے لیکن ہم نے اسے گولی نہیں ماری۔ حالانکہ ہم مار سکتے تھے۔''

''چل چھوڑ راجا۔ میں نہیں سمجھتا کہ رانا ہمارے بلانے سے وقت پر آ جاتا۔ زوہیب باپ کے سامنے کچھ بھی کہے۔ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ اسے رابعہ نے بلایا تھا۔ ہم نے تو ثابت کر دیا ہے کہ وہ ہمارے علاقے سے گرفتار ہوا تھا اور ہم نے اسے پکڑ کے صحیح سلامت رانا کو واپس دے دیا۔''

رات کو میری غنی سے بات ہوئی تو اس نے بتایا کہ زوہیب نے اپنی ذلت کا تماشا دیکھ لیا تھا۔ ''میں نے اسے بتا دیا تھا کہ چپ چاپ لوٹ جائے۔ اگر اس نے منہ سے کوئی غلط لفظ نکالا تو پھر اس کی ذلت کا تماشا دنیا دیکھے گی۔ رابعہ بی بی کا نام بھی اس کی زبان پر نہیں آنا چاہیے۔''

میں نے فلم غنی کو لوٹا دی۔ ''اسے سنبھال کے رکھو۔ کیا پتا اس کی ضرورت پڑ ہی جائے۔''

اگلے روز مہدی حسن نے صبح ناشتے کے بعد لاہور جانے کی خواہش ظاہر کی۔ ''میں ذرا انیتا کو دیکھ آؤں، اپنی بیٹی کو۔ ممکن ہے دو دن میں اس کا خیال بدل گیا ہو۔ اس نے ہمیں مس کیا ہو اور میرے ساتھ آنے پر راضی ہو جائے۔''

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ ''آپ اسے زیادہ مس کر رہے ہیں۔''

''کیا کروں، باپ ہوں نا۔'' وہ بے بسی سے بولا۔

اسی وقت فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ یہ فریال کا فون تھا۔ میں معذرت کر کے کچھ دور چلا گیا۔ ''کیسی ہو فریال۔''

''میں بہت ناراض ہوں تم سے۔'' وہ برہمی سے بولی۔

''ایسی کیا بات ہو گئی؟'' میں نے کہا۔

''یہ کیا چیز مسلط کر دی ہے تم نے مجھ پر۔''

میں نے پوچھا۔ ''تم کس کی بات کر رہی ہو؟''

وہ بولی۔ ''یہ جو سیکریٹری بن کے آئی ہے، ماہ نور۔ میری زندگی اجیرن کر دی ہے اس نے۔ یہ میری ملازم ہے کہ باس۔''

''آخر ہوا کیا۔ کچھ بتاؤ بھی۔''

''وہ سیکریٹری نہیں اماں بن گئی ہے میری۔ اپنی مرضی سے میں کچھ نہیں کر سکتی۔ ہر وقت کی روک ٹوک ہے۔''

میں سمجھ گیا۔ ''وہ تمہیں شراب پینے سے روکتی ہو گی۔''

''یہ اس کے فرائض میں شامل نہیں ہے۔''

میں نے کہا۔ ''دیکھو۔ تم نے کو آپریٹ کرنے کا وعدہ

کیا تھا۔ اب اسے اپنا کام کرنے دو۔ وہ جو کچھ کر رہی ہے تمہارے مفاد میں ہے۔''

''بھاڑ میں گیا میرا مفاد۔ میں نے اسے کہہ دیا ہے کہ وہ جائے، مجھے اس کی ضرورت نہیں لیکن وہ بلائے جان ہو گئی ہے۔ کہتی ہے کہ تم ایسے مجھے نکال نہیں سکتیں۔ کیوں نہیں نکال سکتی میں اسے۔ بولو۔ وہ میری ملازمہ اور ماتحت ہے...... یا میں اس کی؟''

''تم نے اس وقت بھی پی رکھی ہے فریال۔''

''ہاں...... میری مرضی۔ تمہیں معلوم ہے، اس سور کے بچے نے مجھے فون کیا تھا۔''

''کس نے؟''

''سلطان نے اور کس نے۔ اس نے مجھے گالیاں دیں۔ ڈرایا دھمکایا۔''

میں نے چونک کر کہا۔ ''تمہیں سلطان نے فون کیا۔ کہاں ہے وہ؟''

''لندن میں۔ میں نے نمبر دیکھ لیا تھا لیکن وہ کسی پبلک بوتھ سے بول رہا تھا۔ رفیق! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ میں بہت پریشان ہوں۔ کسی دن وہ اچانک نازل ہو جائے گا اور مجھے گولی مار کے فرار ہو جائے گا۔'' اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

''فریال۔ وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ ہمیں پتا چل گیا وہ زندہ ہے۔''

''یہ کیسے اچھی بات ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آئی۔''

''دیکھو۔ پہلے تو پتا ہی نہیں چل رہا تھا کہ وہ زندہ ہے یا مر چکا ہے۔ اب یہ معلوم ہونے کے بعد کہ وہ لندن میں ہے۔ ہم اس کا سراغ بھی لگا لیں گے۔ اسے پکڑ لائیں گے یہاں۔''

''کیسی باتیں کرتے ہو، کیا پتا وہ کس نام سے گیا تھا اور لندن کیا کوئی گاؤں ہے؟ اتنے بڑے شہر میں تم اسے کیسے تلاش کرو گے؟ اس سے پہلے ہی وہ کسی دن آئے گا، مجھے شوٹ کرے گا اور اطمینان سے واپس چلا جائے گا۔''

میں نے کہا۔ ''فریال! تم ان گارڈز پر بھروسا کر سکتی ہو۔''

''گارڈز کیا چوبیس گھنٹے میرے ساتھ رہیں گے۔ میں گھر میں تو بیٹھی نہیں رہ سکتی۔ پہلے ہی میرے شیڈول ڈسٹرب ہو رہے ہیں۔ ایسا کتنے دن چل سکتا ہے۔ ابھی تو میں نے کہا ہے کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے لیکن سب جانتے ہیں حقیقت کیا ہے۔''

''تم جاؤ۔ اپنا کام کرو، ایسے گھر میں چھپ کر بیٹھنے سے تمہیں نقصان ہو گا۔ تمہارا سب کچھ داؤ پر لگا ہوا ہے۔''

''میرے پاس کیا رہ گیا ہے نواب صاحب۔ سب کچھ تو گیا۔''

میں نے کہا۔ ''تمہیں اپنے کیریئر کو بچانا ہے۔ تمہارے سامنے کامیابی کے راستے کھلے ہوئے ہیں۔ لیکن تم نے خود کو نہ سنبھالا تو یہ غرض مند جو تمہاری صلاحیت میں سرمایہ کاری کرتے ہیں۔ تمہاری مقبولیت کو کیش کراتے ہیں۔ سب پیچھے ہٹ جائیں گے۔ یہ گھاٹے کا سودا کرنے والے نہیں ہوتے جو آج تمہارے آگے پیچھے پھر رہے ہیں۔''

''اپنے کیریئر کے لیے میں سب کچھ کر سکتی ہوں۔ لیکن یہ جو میرے سامنے سلطان کا بھوت آ کے کھڑا ہو گیا ہے۔''

میں نے اسے تسلی دی۔ ''دیکھو ایک گمنام کال سے تمہیں اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ وہ سلطان ہی تھا۔''

''میں اس کی آواز پہچانتی ہوں۔''

''آواز کا کیا ہے۔ ریکارڈ کر کے ٹیپ کہیں سے بھی چلایا جا سکتا ہے۔ بہرحال تم مجھے وہ نمبر دو۔ لندن میں میرے اچھے کنٹیکٹ ہیں۔ میں کسی کو پیچھے لگاتا ہوں کہ اس نمبر کا سراغ لگائے۔''

''میں نے بتایا تھا کہ وہ پبلک کال آفس سے بات کر رہا تھا۔''

''یہ تم یہاں بیٹھ کے اتنے یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتی ہو۔ کیا پتا اس کے کسی ملازم یا روم میٹ نے کہہ دیا ہو کہ یہ پبلک کال آفس ہے۔ اسے یقین ہو گا کہ تم اسے کال بیک ضرور کرو گی۔ ویسے وہاں کی پولیس پبلک بوتھ سے کال کرنے والوں کا سراغ بھی لگا لیتی ہے۔ تم نمبر بتاؤ۔''

میں نے نمبر نوٹ کیا اور فون بند کر دیا۔ میں نور سے بھی بات کرنا چاہتا تھا لیکن ہمارے درمیان یہ طے تھا کہ وہ مجھے خود رپورٹ کرے گی۔ چودھری سلطان کی لندن میں موجودگی کی اطلاع میرے لیے بیک وقت اطمینان بخش بھی تھی اور پریشان کن بھی۔ اطمینان کی بات یہ تھی کہ اس کا سراغ مل گیا۔ حسبِ توقع وہ ملک سے فرار ہو گیا تھا۔ لندن روپوشی کے لیے سب سے بہتر چوائس ہو سکتا تھا۔ سلطان نے اسی کا انتخاب کیا تھا۔ وہاں لاکھوں کی تعداد میں ساؤتھ ایشیا کے لوگ تھے اور پاکستانی بھی انڈین ہی سمجھے جاتے تھے۔ ان میں کسی ایک شخص کا فرضی نام کے ساتھ گم ہو جانا بہت آسان

تھا اور اس کا سراغ لگانا یقیناً بہت مشکل لیکن کوشش سے پہلے ناکامی کو قبول کر لینا بھی غلط تھا۔

فریال کی پریشانی کا یہ سبب بھی غلط نہ تھا کہ جو شخص ایک بار جعلی شناختی کارڈ بنوالے اور الحمدللہ وطنِ عزیز میں ہر غیر قانونی کام کرنے والے موجود تھے۔ آپ ان کا حق محنت ادا کریں اور بے فکر ہو جائیں۔ وہ شناختی کارڈ کے بعد پاسپورٹ بھی فراہم کریں گے اور اس کے بعد ہرا یرے خاں غیرے خاں کے لیے بہت آسان ہے کہ وہ نتھو خاں خیراں خاں بن کے جہاں چاہے آئے جائے۔ بیک وقت دو جگہ پایا جائے اور جہاں چاہے اپنی موجودگی ثابت کر دے۔

خود ماہ نور نے ملک میں رہتے ہوئے یہ سارے مراحل آسانی سے طے کر لیے تھے۔ وہ نور جہاں جس پر اکبر خاں کے قتل کا الزام تھا کہیں سرکاری ریکارڈ میں دفن ہو گئی تھی۔ اس کی جگہ ماہ نور نے نیا جنم لیا تھا۔ اٹھائیس سال کی عمر میں وہ پردہ غیب سے ظہور میں آ گئی تھی اور اپنا وجود تسلیم کرا چکی تھی۔ سلطان اپنے دشمنوں کے لیے مر گیا تھا یا لاپتا ہو گیا تھا۔ اس سے اپنا قرض وصول کرنے کے خواہش مند اور انتقام لینے کے لیے خنجر بکف ہونے والے جھک مارتے پھر رہے تھے لیکن چودھری سلطان کے لیے یہ بہت آسان تھا کہ وہ جب چاہے غلام علی جیسے نام سے پاکستان جانے والی کسی بھی فلائٹ پر بیٹھ جائے۔ رات کے وقت پاک سرزمین پر لینڈ کرے اور اسی طرح رات کی تاریکی میں کسی روز اچانک فریال کے سامنے نمودار ہو۔ سائیلنسر لگے پستول سے دو فائر کرے اور خاموشی سے نکل جائے۔ فریال بلاشبہ سخت خطرے میں تھی۔ اس نے جو خطرناک گیم کھیلا تھا اس میں وہ اناڑی ثابت ہوئی تھی۔ اس کی ہر چال الٹی ہو کے بالآخر خود اس کی شکست کا سبب بنی تھی۔ وہ لندن سے بھاگ کے پاکستان آئی تھی اور ست بدھائی کی حویلی میں قلعہ بند ہو کے بیٹھ گئی تھی۔ حویلی سے فرار کے بعد اس نے سخت نادانی کی تھی کہ انہی کے ساتھ اگلی بازی شروع کر دی تھی جو ایک بار اپنی ہار مان چکے تھے۔ وہ دوسری بازی نہیں ہار سکتے تھے۔

ڈاکٹر مہدی حسن پھر نمودار ہوئے۔ ''رفیق۔ میں چلتا ہوں۔ اللہ نے چاہا تو شام تک لوٹ آؤں گا ورنہ کل......''

میں نے اچانک فیصلہ کر لیا۔ ''اگر میں بھی آپ کے ساتھ چلوں۔''

وہ خوش ہو گیا۔ ''اس سے اچھی کیا بات ہو گی۔''

''ٹھیک ہے۔ آپ مجھے دس منٹ دیں اور اپنی گاڑی یہیں چھوڑ دیں۔ میں آپ کو لے چلتا ہوں اپنی گاڑی میں۔''

میں نے کہا۔

لیکن میں نے راجا سے بات کی تھی اس نے سخت مخالفت کی۔ ''ابھی ایسی کیا ضرورت ہے کہ آپ گھر سے نکلیں۔ نکلنا ہی ہے تو غنی کو اور ایک سیکیورٹی گارڈ کو ساتھ ہونا چاہیے۔''

میں نے کہا۔ ''راجا! میرا خیال ہے کہ مجھے کوئی خطرہ نہیں اور مجھے جانا ہے فریال کے پاس۔ میں کسی اور کو ساتھ نہیں لے جا سکتا۔''

''پھر تو انہی کی گاڑی میں جا۔ ڈاکٹر مہدی حسن کی گاڑی کو یہاں کوئی نہیں پہچانتا۔''

راجا کی بات میں منطق تھی۔ میں ڈاکٹر مہدی حسن کے ساتھ بیٹھ گیا اخلاقاً میں نے ڈرائیونگ کی پیشکش بھی کر دی تھی لیکن اس نے کہا۔ ''نو پرابلم۔'' گاڑی اور ڈرائیور ہم عمر تو خیر نہیں تھے لیکن گاڑی کا ماڈل خاصا پرانا تھا اور ست بدھائی تک آنے والے راستے کی ناہمواری اور شکستہ حالی کو دیکھتے ہوئے اس سے اچھی کارکردگی کی اُمید نہیں کی جا سکتی تھی لیکن کچھ دیر بعد میرا یہ اندیشہ غلط ثابت ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے پرانے وقتوں کی ساتھی کار کو بہت سنبھال کے رکھا تھا چنانچہ اس میں سے نہ کوئی صدائے آہ و فغاں آ رہی تھی اور نہ وہ چلتے ہوئے ہانپ رہی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ ڈاکٹر صاحب خود بڑے محتاط ڈرائیور تھے اور انہوں نے گاڑی کو ساٹھ کلومیٹر کی رفتار سے اوپر جانے ہی نہیں دیا۔

کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد انہوں نے کہا۔ ''رفیق! دو دن یہاں رہ کے میں نے دیکھ لیا۔''

میں چونکا۔ ''کیا دیکھا ڈاکٹر صاحب۔''

''یہی کہ احمد حسن اور ثنا کے لیے تمہارا خاندان سب سے بہتر ہے۔''

میں نے سر گھما کے کہا۔ ''جی...... میں سمجھا نہیں۔''

وہ ہنسے۔ ''بھئی میرا یہ مطلب نہیں جو تم سمجھے ہو۔ دراصل میری اپنی کوئی فیملی نہیں تھی۔ تقسیم کے وقت ہم ہجرت کر کے یہاں آئے تھے۔ ایک ماموں اور دو چچا وہیں رہ گئے تھے کچھ دور کے عزیز بھی تھے۔ ہمارے سوا کسی نے ادھر آنا پسند نہیں کیا۔ میرا ایک بھائی تھا وہ سن پینسٹھ کی جنگ میں شہید ہوا۔ زندہ رہتا تو بہت ترقی کرتا۔ جنرل نہ سہی، بریگیڈیر تو ضرور بنتا۔ ایک بہن شادی کے معاملے میں اختلاف کے باعث گھر چھوڑ گئی تھی۔ میرا خیال ہے کہ اس معاملے میں میرے والدین کو موردِ الزام نہیں سمجھا جا سکتا۔ وہ شادی کے معاملے میں زبردستی کے قائل نہیں تھے لیکن وہ شخص اس وقت

خاصے مشکوک کردار کا حامل تھا۔ اور کام بھی غلط ہی کرتا تھا۔ کوئی بھی باپ یہاں تک کہ میرے جیسا لبرل باپ بھی اسے اپنی بیٹی نہ دیتا۔ بعد میں وہ غلط کام کرنے والا آدمی دولت مند اور معزز ہو گیا۔ ہم پرانے خیال کے لوگ آج بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں کہ دولت مند ہونا خوبی نہیں۔ کردار اہم ہے لیکن دنیا کے معیار بدل گئے ہیں۔ وہ آدمی شادی سے پہلے جیل تک کاٹ آیا تھا۔ خیر...... جب اس نے دولت کمائی تو وہ معزز بھی ہو گیا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ اس نے میری بہن کو چھوڑا نہیں۔ آج اس کے بھی بچے جوان ہیں لیکن اس نے کسی سے تعلق نہیں رکھا۔ آج وہ سمجھتی ہے کہ اس کا فیصلہ درست تھا۔ ہم سب غلط تھے۔ لہٰذا ان بچوں کے رشتے دار نہیں۔''

''آپ کے بھائی کے بچے......''

''اس کی شادی ہی کہاں ہوئی تھی۔ وہ کیپٹن تھا۔ کمانڈوز میں شامل تھا۔ میری بیوی اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھی۔ ماں باپ مر گئے تو ننھیال کے رشتے بھی ختم ہو گئے۔ اور یہی بات ہے رفیق! یہاں آج کی دنیا میں کون کسی کا۔ سب رشتے غرض مندی کے ہیں۔ خلوص محبت اور وضعداری متروک الفاظ بنتے جا رہے ہیں۔ چنانچہ میں خاصا فکرمند ہو جاتا تھا بعض اوقات کہ بعد میں یعنی میرے بعد ان دونوں کا کیا بنے گا۔ لیکن اللہ بڑا مسبب الاسباب ہے۔ اس نے مجھے یہاں بھیج دیا۔ ویسے تو میں نے ست بدھائی کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ یہاں آ کے دیکھا تو بڑا عجیب لگا کہ چند لوگ اکٹھے ہو گئے ہیں۔ خون کا رشتہ تمہارا صرف رابعہ سے ہے۔ باقی سب ایک مقصد کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں جس کی بنیاد نیک نیتی اور خلوص پر ہے اور جس لگن کے ساتھ تم لوگ کام کر رہے ہو وہ ایک مثال ہے۔ بلاشبہ ایسی مثالوں کی کمی نہیں پاکستان میں۔ اپنے عمران خان کا نام تو پوری قوم کے لیے دنیا میں باعثِ فخر ہے۔ مگر اور بہت ہیں مثلاً وہ جو پروفیسر تھا پہلے، اب گانے گاتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ابرار الحق''

''ہاں وہی۔ وہ اور دوسرے بہت سے لگے ہوئے ہیں کارِ خیر میں بڑی لگن کے ساتھ۔ تمہارا یہ جو ست بدھائی کا ترقیاتی پروگرام ہے۔ یہ مجھے کسی خواب کی طرح لگا، ایک نئی دنیا کا خواب۔ تم یہاں اسکول و اسپتال بناؤ گے۔ فیکٹریاں قائم کرو گے۔ سب کو روزگار اور رہائش دو گے۔ بجلی کے لیے ڈیم بنانا بھی تمہارے پروگرام میں شامل ہے۔ اپنی بے حساب دولت کو ایسے رفاحِ عامہ کے لیے وقف کر دیا ہے تم نے۔ امریکا اور لندن میں تعلیم حاصل کر کے ایسے ویرانے کو آباد کرنا چاہتے ہو۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خدا کیسے آدمی کو وسیلہ بناتا ہے۔ شاید اس دولت جائداد اور جاگیر کا کوئی اور وارث ہوتا تو عیش کرتا۔ ایسا سوچتا بھی نہیں جو تم کر رہے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''آپ کب تک مجھے شرمندہ کریں گے سر۔''

وہ بولے۔ ''بھئی میں تو حقیقت کا اعتراف کر رہا تھا اور یہ بتانا چاہتا تھا کہ میں نے اپنا سب کچھ تمہارے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ایسا مت کریں ڈاکٹر صاحب، آپ کے وارث موجود ہیں۔ یہ ان کے ساتھ زیادتی ہو گی۔''

''وہ بھی ایسا ہی چاہیں گے۔''

''اگر وہ چاہیں گے تو جو کرنا ہے خود کر لیں گے۔ آپ یہ فیصلہ انہی پر چھوڑ دیں۔ اگر وہ ہمارا ساتھ دینا چاہیں تو ہم انہیں اس حویلی سے بڑھ کر اپنے دل میں جگہ دیں گے۔ لیکن کیا پتا کل کو ان کے خیالات بدل جائیں۔ وہ کوئی بہتر کام کرنا چاہیں۔''

ڈاکٹر مہدی حسن نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ''برا نہ ماننا رفیق میاں۔ میں تمہیں آزما رہا تھا۔ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم کیا کہتے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''اس میں برا ماننے کی کون سی بات ہے۔ کسی بھی شخص پر اعتماد کرنے سے پہلے اسے آزمانا چاہیے۔''

''اپنی اولاد کی حق تلفی میں کبھی نہ کرتا۔ میں بھی جانتا ہوں کہ وہ اپنے اچھے برے کا فیصلہ خود کر سکتے ہیں۔ آگے زندگی ان کی اپنی ہے۔ لیکن تم خوش ہوتے تو مجھے مایوسی ہوتی۔''

ڈاکٹر مہدی حسن ایک شفیق انسان تھے۔ بزرگوں کی طرح انہوں نے مجھے رفیق میاں کہا تو مجھے اچھا لگا۔ مجھے ابا کی یاد آئی جو مجھے اسی طرح مخاطب کرتے تھے۔ شاید بدلتے وقت کی اقدار کے ساتھ معاشرے کی سوچ میں یہ تبدیلی آئی ہے کہ بزرگ اپنے ہی گھر میں رحمت کے بجائے زحمت کا باعث سمجھے جا رہے ہیں۔ میں اپنے ساتھ دوسروں کے لیے بھی یقین سے کہہ سکتا تھا کہ ڈاکٹر مہدی حسن جیسے بزرگ کی ست بدھائی حویلی میں موجودگی سے سب خوش تھے۔

میں ان کی باتوں کو سعادت مندی اور دلچسپی سے سن رہا تھا کہ اچانک کچھ ہوا۔ میرا خیال ہے میں نے ایک دھماکا سنا۔ پھر گاڑی ایک دم بے قابو ہوئی اور میں نے ڈاکٹر مہدی

حسن کو اسٹیئرنگ وہیل سے لڑتا دیکھا لیکن یہ چند سیکنڈ کی ناکام کوشش تھی۔

اچانک دنیا الٹ گئی۔ آسمان اور زمین اوپر نیچے ہوگئے اور میں نے خود کو اس کنکر کی طرح محسوس کیا جسے ڈبے میں ڈال کے ہلایا جارہا ہو۔ میرا سر ڈیش بورڈ سے اور پھر گاڑی کی چھت سے ٹکرایا۔ ہوش گنوانے سے پہلے میں اتنا ضرور سمجھ گیا تھا کہ گاڑی الٹ گئی ہے۔ اور اس کا سبب غالباً اگلے ٹائرز کا پھٹنا تھا۔ گاڑی اتنی زیادہ تیز نہیں تھی لیکن بے قابو ہوئی تو سائیڈ میں ایک نالہ سا تھا۔ گاڑی نے اس کی ایک فٹ اونچی دیوار کو عبور کیا تو الٹ گئی۔

مجھے کچھ اندازہ نہیں کہ میری بے ہوشی کا یہ وقفہ کتنا طویل تھا۔ بے ہوشی سے ہوش کی جانب یہ سفر ایسا تھا جیسے اندھیرے اجالے کے آنے جانے کا احساس۔ دن سے رات اور پھر رات سے دن۔ لیکن بالآخر میں اپنی آنکھیں کھلی رکھنے اور گرد و پیش پر فوکس کرنے میں کامیاب رہا۔

وہ کوئی ان دیکھی جگہ تھی۔ کوئی کمرا تھا جس میں مجھے خالی چارپائی پر لٹا دیا گیا تھا۔ چارپائی بان کی تھی اور میرے جسم کی کھال میں چبھ رہی تھی۔ اس ایک چارپائی کے سوا کمرے میں کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک دیوار پر بہت کم پیلی روشنی دینے والا بلب جل رہا تھا۔ کمرے میں آنے جانے کے لیے ایک ہی دروازہ تھا۔ ایک کھڑکی باہر سے بند تھی۔ اندر کی طرف لوہے کی سلاخیں تھیں۔

میں نے اٹھنے کی کوشش سے پہلے اپنے جسم کا جائزہ لیا۔ میرے ہاتھ پاؤں سلامت تھے۔ ٹوٹے ہوتے تو میں حرکت نہیں کرسکتا تھا۔ میری پسلیوں میں خفیف سا درد تھا۔ شاید چارپائی پر ایک کروٹ لیٹنے سے یا بیرونی چوٹ کے باعث۔ میرا سر البتہ اندر سے بہت بھاری ہو رہا تھا۔ جب میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو مجھے ایسا لگا جیسے سر کے اوپر رکھی ہوئی چٹان لڑھک کر دائیں سے بائیں طرف چلی گئی ہے۔

آدھے گھنٹے بعد میری حالت میں مزید بہتری آئی تو میں اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ مجھے پیاس لگ رہی تھی لیکن کمرے میں پینے کا پانی نہیں تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ یہ کسی دیہاتی کا گھر ہے۔ حادثے کے بعد وہ مجھے اٹھا کے اپنے گھر میں لے آیا ہوگا پھر مجھے ڈاکٹر مہدی حسن کا خیال آیا۔ اور ایک خیال کہ وہ گاڑی چلا رہے تھے جب گاڑی الٹ گئی تھی۔ آخر کیوں؟ گاڑی کے ٹائر کیوں پھٹ گئے تھے؟ وہ بالکل نئے ٹیوب لیس ٹائر تھے۔ ایک سیکنڈ پہلے ہی دھماکا ہوا تھا۔ شاید دو دھماکے ہوئے تھے۔ ٹائر پھٹنے کی ایسی آواز نہیں ہوتی۔ کسی نے گاڑی پر فائر کیا تھا۔ غالباً ٹائروں کو نشانہ بنایا گیا تھا۔ اس راستے پر یہ کارروائی خارج از امکان نہیں تھی۔

میں لڑکھڑاتا ہوا دروازے تک جانے کی کوشش میں ایک بار فرش پر گرا لیکن پھر اٹھ گیا۔ دروازہ باہر سے مقفل تھا۔ میں نے اسے اندر سے بجایا۔ پھر کھڑکی کھولنے کی کوشش کی۔ میں نے چلّا کے کہا۔ ”ہیلو، کوئی ہے؟“ اور دوبارہ دروازے پر ہاتھ مارے۔

باہر کی خاموشی میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ میں واپس آکے چارپائی پر بیٹھ گیا۔ مجھے ڈاکٹر مہدی حسن کی فکر ہو رہی تھی۔ آخر وہ کہاں ہیں؟ کیا وہ دوسرے کمرے میں ہیں؟ خدانخواستہ...... خدانخواستہ اس حادثے میں وہ ہلاک تو نہیں ہوگئے؟

جب دروازہ کھلا اور ایک ساتھ دو مسلح افراد اندر آئے تو مجھے کوئی شک نہ رہا کہ میں قیدی ہوں۔ وہ خوفناک شکلوں والے لمبے چوڑے محافظ کسی کے حکم کے غلام تھے۔ انہوں نے میرے کسی سوال کا جواب نہیں دیا اور جب میں نے ایک کا ہاتھ پکڑنا چاہا تو اس نے دھکا دے کر مجھے چارپائی پر گرا دیا۔ مجھ پر کمزوری غالب تھی ورنہ ان دونوں سے مسلح ہونے کے باوجود نمٹنا میرے لیے مشکل نہ تھا۔

آخر میں کسی کی قید میں ہوں۔ اس سے زیادہ میرے لیے یہ جاننا اہم تھا کہ ڈاکٹر مہدی حسن کہاں ہیں۔ چند منٹ بعد ایک جوان لڑکی اندر آگئی۔ اس کے ہاتھ میں کھانے کی ٹرے تھی۔ وہ پستہ قد اور بھرے بھرے جسم والی قبول صورت اور جوان لڑکی تھی مگر وہ بہت سہمی ہوئی تھی۔

میں نے کہا۔ ”آخر تم لوگ بتاتے کیوں نہیں۔“

لڑکی نے کہا۔ ”یہ بول نہیں سکتے۔ گونگے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”تم تو بول سکتی ہو۔ تم بتا دو۔“

لیکن دونوں محافظوں میں سے ایک نے اسے بازو سے پکڑ کے کھینچا اور کمرے سے باہر پھینک دیا۔ وہ دروازے کے قریب گری مگر کپڑے جھاڑ کے کھڑی ہوگئی اور میری طرف دیکھے بغیر چلی گئی۔

اسی وقت دروازے میں ایک شخص نمودار ہوا۔ میں بھونچکا رہ گیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا میرے سامنے آیا۔

”نواب صاحب کے مزاج عالی کیسے ہیں؟“ اس نے مجھ پر جھک کے کہا اور پھر میرے چہرے پر ایک تھپڑ مارا۔ میں چارپائی سے گر گیا۔

اس شخص کے رویے نے مجھے مزید حیران کیا۔ میں نے لندن میں قیام کے دوران جو مارشل آرٹ کی تربیت لی تھی وہ مجھے بھولی نہیں تھی۔ یہ بات مجھے تھپڑ مارنے والا نہیں جانتا تھا کہ وہ میرے لیے کتنا آسان شکار ہے۔ اگر میں چاہتا تو اسے دبوچ کے اپنی ڈھال بنا لیتا اور اس کے بعد یہ بہت آسان ہوتا کہ میں دونوں گونگے محافظوں کو ہتھیار پھینکنے پر مجبور کر دیتا۔

میں نے ایسا نہیں کیا کیونکہ میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ وہ شامی بادشاہ کے گروہ میں شامل تھا اور شامی جب پہلی بار میری دعوت پر ست بدھائی آکے میرا مہمان ہوا تھا اس وقت بھی یہ شخص ان چار افراد میں شامل تھا جو شامی کے ساتھ آئے تھے۔

میں آہستہ آہستہ اٹھا اور سیدھا کھڑا ہوگیا۔ ”مجھے تمہارا نام اس وقت یاد نہیں لیکن تم شامی بادشاہ کے خاص آدمی ہو۔“

اس کی آنکھیں غصے میں انگارہ بنی ہوئی تھیں۔ ”اپنی گندی زبان سے نام مت لے شامی بادشاہ کا۔“

میں نے سکون سے کہا۔ ”کیوں نام نہ لوں۔ وہ میرا دوست تھا۔“

”دوست۔“ اس نے پھر دانت پیس کے میرے منہ پر تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ گھمایا۔ ”تجھ سے دشمن اچھے......“

اب میں نے اپنا دفاع ضروری سمجھا۔ میں نے جھک کے خود کو بچایا ورنہ اس کا بھرپور تھپڑ میرے گال پر پڑتا۔ میرا ہاتھ اوپر اٹھا اور اس کی کلائی پر جم گیا۔ ایک مسلسل حرکت سے میں نے اسے پورا گھما دیا اور وہ میرے سامنے آیا تو اس کا چہرہ بھی گونگے محافظوں کے مقابل ہوگیا۔

میرے دائیں ہاتھ نے اس کی گردن کو کہنی کے شکنجے میں جکڑ لیا۔ اس نے تڑپ کے زور لگایا لیکن خود کو میری گرفت سے چھڑا نہ سکا۔

”بس۔“ میں نے غرا کے کہا۔ ”ایسا نہ ہو کہ زور لگانے سے تمہاری گردن کا منکا ٹوٹ جائے۔“

اس نے اچھلنا اور زور لگانا ترک کر دیا۔ میں نے تھوڑا سا دباؤ ڈالا تو اس کے حلق سے خرخراہٹ سنائی دینے لگی۔ اس نے بڑی مشکل سے منہ کھول کے سانس لیا۔ ”چھو...... چھو...... چھوڑو...... مجھے۔“

میں نے کہا۔ ”ان دونوں گونگے پہلوانوں سے کہو کہ اپنا اسلحہ زمین پر رکھ کے دور چلے جائیں۔ دیوار سے لگ کے کھڑے ہو جائیں۔“

اس نے انہیں ایک ہاتھ سے کچھ اشارے کیے۔ میں نے کہنی کے دباؤ کو تھوڑا سا کم کیا تاکہ وہ سانس لے سکے۔ محافظوں کی حالت پہلے ہی غیر تھی۔ وہ دیکھ رہے تھے کہ انہیں حکم دینے والا کتنا بے بس ہے۔ اپنے بھاری بھرکم وجود اور خطرناک اسلحے کے باوجود وہ اس کی مدد کرنے سے قاصر تھے۔ اشارہ پاتے ہی انہوں نے جھک کر اسلحہ فرش پر رکھا اور خود چار قدم پیچھے ہٹ کے دیوار سے لگ گئے۔

میں نے اپنے قیدی کو گھما کے ایک طرف پھینکا۔ وہ چارپائی پر اوندھے منہ گر گیا۔ میں نے ٹھوکر مار کے ایک ریوالور کو چارپائی کے نیچے کھسکا دیا اور دوسرا خود اٹھا لیا۔ چارپائی سے ٹکرا کے گرنے والا ڈاکو اب اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا لیکن بازی پلٹ چکی تھی۔ مجھ پر آدم خور شیر کی طرح غرانے والا بھیگی بلی بنا کھڑا تھا۔

”اب ہم بات کرسکتے ہیں۔ پہلے نام بتاؤ اپنا۔“ میں نے کہا۔

وہ اپنے ہونٹوں کو دانتوں سے کاٹتا رہا اور مٹھیاں بھینچ کے کھولتا رہا لیکن بولا نہیں۔

میں نے کہا۔ ”چلو نہیں بتانا چاہتے تو نہ بتاؤ۔ میں تمہیں پاٹے خاں کا خطاب دیتا ہوں۔ تم میرے ساتھ ایسا سلوک کیوں کر رہے تھے پاٹے خاں۔ جب کہ تم جانتے ہو شامی بادشاہ میرا دوست تھا۔“

”تمہاری دوستی نے ہی مروایا اسے۔ میں نے بہت سمجھایا تھا اسے کہ ایک ڈاکو صرف ڈاکو ہوتا ہے۔ اس کا دوست کوئی نہیں ہوسکتا۔“ وہ ایک دم پھٹ پڑا۔ ”لیکن اس نے میری ایک نہیں سنی۔ کہتا تھا یہ نواب دل کا کھرا بندہ ہے۔ دیکھ لیا انجام۔“

میں اسے دیکھتا رہا۔ ”تم سمجھتے ہو شامی کو میں نے مروا دیا۔“

”ہاں۔ دوست بن کے دغا بازی تم نے کی نواب رفیق۔ وہ بھروسے میں مارا گیا۔ تمہارے کہنے سے وہ چیف منسٹر کے سامنے ہتھیار ڈالنے آرہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ تم اسے معافی دلوا دوگے۔ پھر وہ ایک باعزت شخص کی طرح زندگی گزارے گا۔ ست بدھائی میں تمہارے ساتھ رہے گا۔“

”بالکل ٹھیک سوچا تھا اس نے۔“

”مگر تم نے کچھ اور سوچا تھا۔ تمہیں چیف منسٹر کی حمایت درکار تھی۔ ایک ڈاکو سے دوستی کر کے تمہیں کیا ملتا۔ وہ ڈی آئی جی تمہارا دوست تھا۔ اسے ترقی مل گئی۔ اتنا بڑا کارنامہ سرانجام دیا اس نے۔ ڈاکوؤں کے پورے گروہ کا خاتمہ

کردیا۔ وہ آئی جی بن گئے تمہاری مدد سے۔"

"بس؟ یا کچھ اور کہنا ہے۔" میں نے پاٹے خاں کے خاموش ہو جانے کے بعد کہا۔ "اگر میں کہوں کہ یہ غلط ہے۔ شامی میرا دوست تھا۔ میں نے اسے مروانے کی کوئی سازش نہیں کی تھی تو تم یقین نہیں کرو گے۔"

اس نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔ "سچے بننے کے لیے تم جیسے لوگ قرآن بھی اٹھا لیتے ہو۔"

"تم کون سی عدالت عالیہ کے جج ہو کہ میں مجرم کی طرح تمہارے سامنے اپنی صفائی پیش کروں۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "وقت آنے پر جھوٹ سچ سامنے آجائے گا۔ تم اس وقت شامی بادشاہ کے ساتھ تھے جب پولیس نے اسے گھیر لیا۔ ست بدھائی کی طرف آتے ہوئے۔"

"میں ساتھ ہوتا تو آج میری قبر بھی وہیں ہوتی۔ حیدرآباد میں سب کے ساتھ۔"

"تم اس کے ساتھ کیوں نہیں تھے؟"

"اس لیے کہ میں سمجھتا تھا یہ چال ہے۔ پولیس نے یہ جال بچھایا ہے تمہاری مدد سے۔ ہم یارا لگ ہو گئے تھے۔"

"تم نے اپنا گروہ بنا کے وہی کام جاری رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ پھر تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ شامی مارا گیا۔ جب تم ساتھ ہی نہیں تھے؟"

"ان میں سے کسی کو بچ کر نکلنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ پولیس نے چن چن کے سب کو مارا تھا۔"

"گولی ایسا نہیں مانتی۔"

وہ چونکا۔ "گولی؟"

میں نے کہا۔ "اس کی بیوی۔ وہ عورت ہونے کے باوجود شامی بادشاہ کے ساتھ تھی۔ اگر تم یہ بات اس کے سامنے کہو کہ شامی مارا جا چکا ہے تو شاید وہ تمہیں مار دے پاٹے خاں۔"

"صدمے نے اس کے دماغ پر اثر کیا ہوگا اور وہ تمہیں کہاں مل گئی؟"

"وہ حویلی میں تھی۔ دو مہینے سے۔"

اس کی آنکھیں مجھ پر فوکس ہو گئیں۔ "تمہاری حویلی میں؟"

"اور کیا اپنے باپ کی حویلی میں؟ یا شوہر کی حویلی میں؟ وہ زخمی حالت میں آئی تھی۔ علاج سے ٹھیک ہو گئی۔ شامی نے اس سے کہا تھا کہ سیدھی نواب رفیق کے پاس جانا۔"

پاٹے خان سوچتا رہا۔ "اب کہاں ہے وہ؟"

میں نے کہا۔ "مجھے نہیں معلوم۔ اس کا کہنا تھا کہ شامی زخمی ضرور ہوا تھا لیکن موقعے پر ہلاک نہیں ہوا تھا۔ وہ نکل گیا تھا گولی۔ جیسے تیسے میرے پاس پہنچ گئی۔"

"وہ سمجھتی ہے شامی زندہ ہوگا۔"

"ہاں۔ اس نے حیدرآباد جا کے ان سب کی قبریں دیکھیں۔ جو محاصرے میں مارے گئے تھے۔ پولیس نے دس قبروں کی نشاندہی کی تھی۔ ان میں ایک شامی کی تھی لیکن گولی نے پولیس سے کہا کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ ان میں سے کوئی قبر شامی کی نہیں۔"

"کیا...... اس نے...... اندر دیکھا تھا۔"

"نہیں وہ آنکھوں سے زیادہ اپنے دل کو مانتی ہے۔ اچھا اب یہ سب چھوڑو۔ مجھے بتاؤ میری گاڑی پر فائرنگ تم نے کی تھی۔"

اس نے مجرمانہ انداز میں سر جھکا لیا۔

مجھے سخت طیش آیا۔ "پاگل کے بچے۔ اس میں میری جان جا سکتی تھی۔ پتا تمہیں کچھ نہیں شامی زندہ ہے یا مر گیا۔ تم میری جان لینے پر تل گئے۔"

اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ "یہ بے وقوفی کی میں نے نواب صاحب۔"

"بے وقوفی اور جرم کا فرق معلوم ہے؟" میں نے دھاڑ کے کہا۔ "بے وقوفی کو معاف کیا جا سکتا ہے جرم کی سزا ہوتی ہے۔"

وہ اسی طرح کھڑا رہا۔ "آپ جو سزا چاہیں دیں۔"

میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "گاڑی میں میرے ساتھ ایک بوڑھا آدمی تھا۔ وہ زندہ ہے کہ مر گیا؟"

وہ نفی میں سر ہلانے لگا۔ "مجھے نہیں معلوم جناب۔"

"کیا مطلب۔ تم نے دیکھا نہیں تھا؟" میرا غصہ اور بڑھ گیا۔

"دیکھا تھا۔ لیکن ہم اسے وہیں چھوڑ کے آگئے تھے۔ صرف آپ کو اپنے ساتھ لے آئے تھے۔"

"میرا دل چاہتا ہے مار مار کے تمہاری کھال ادھیڑ دوں۔ یاد رکھو اسے کچھ ہوا تو میں تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ یہ کب کی بات ہے؟"

"کل دوپہر کی۔"

"اور تم کہاں لے کر آئے ہو مجھے؟ وہ جگہ جہاں حادثہ ہوا تھا یہاں سے کتنی دور ہے؟"

"وہ...... ادھر ہے...... بیس تیس میل پرے۔"

میں نے آگے بڑھ کے اسے گدی سے پکڑا اور

دروازے کی طرف دھکا دے کر کہا۔ "چلو جیسے مجھے لائے تھے ایسے ہی واپس لے جاؤ اور اپنے ان کتوں سے کہنا کہ پیچھا نہ کریں۔ انہوں نے کوئی بے وقوفی تمہاری طرح کی تو میں تمہاری کھوپڑی اڑا دوں گا۔ ساری گولیاں تمہارے سر میں اتار دوں گا۔"

میں نے کمرے سے باہر آکے دیکھا۔ وہ کچا پکا دو کمروں کا مکان تھا جس کے وسیع صحن کی قد آدم دیوار بھی کچی تھی۔ ایک ڈاڑھی والا بے چینی سے برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ وہ لڑکی جو ملازمہ تھی یا ان میں سے کسی ایک کی یا پھر شاید سب کی گھر والی...... دیوار سے ٹیک لگائے سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ دو افراد دوسرے کمرے میں سر تک چادریں تانے چارپائی بچھائے سوئے تھے یا سونے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان سب کو اندازہ ہو گیا تھا کہ کمرے کے اندر کھیل کا پانسا پلٹ چکا ہے۔ پاٹے خان نے شامی بادشاہ سے اصولی اختلاف کرتے ہوئے ہتھیار نہ ڈالنے کا فیصلہ کیا تھا اور اس کا ساتھ دینے والوں نے اپنا الگ گروہ بنا لیا تھا لیکن شامی بادشاہ کے لیے ان کے جذبات نہیں بدلے تھے۔ اس کے ساتھ ہونے والی دغا بازی پر وہ سب ہی مشتعل تھے...... میری گرفتاری کا مقصد کچھ اور تھا لیکن حقائق سامنے آجانے کے بعد صورتِ حال یکسر بدل گئی تھی۔

میں نے صحن میں رک کے کہا۔ "پاٹے خاں...... میرا موبائل فون......"

"میرا نام ولی داد ہے جناب عالی...... ہم سے بڑی غلطی ہوئی...... اب آپ ہم پر بھروسا کریں...... میں کہاں شامی بادشاہ کی برابری کا دعویٰ کر سکتا ہوں...... لیکن کبھی وقت آئے تو آزما لینا ولی داد کو بھی......"

میں نے کہا۔ "باتوں میں وقت مت ضائع کرو۔"

ولی داد نے اندر سے وہ سب چیزیں لا کے میرے حوالے کر دیں جو مالِ غنیمت کی طرح تقسیم ہو گئی تھیں۔ میرا موبائل فون اس لڑکی نے بڑی ناخوشی اور مجبوری سے اپنے گلے میں ہاتھ ڈال کے برآمد کیا تو وہ اس کے جسم کی طرح گرم تھا اور نم آلود بھی۔ میری کلائی کی گھڑی رضاکارانہ طور پر اس ڈاڑھی والے نے اتار دی جو بھیگی بلی بنا ایک طرف کھڑا تھا۔ میرا پرس اندر سونے والے ایک ڈاکو نے واپس کیا۔ رقم ان سب نے مل کر پوری کی۔ ولی داد کی طرح وہ سب اپنی بے وقوفی پر شرمندہ تھے۔

باہر صحن کی دیوار کے ساتھ ایک پرانی موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ ولی داد نے اسے سیدھا کر کے کک لگانی شروع کی اور بالآخر اسے اسٹارٹ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

"آپ بیٹھو جناب عالی......" اس نے پھٹ پھٹ کے شور میں مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا اور پھر اپنے ساتھیوں کی طرف منہ کر کے بولا۔ "تم سب نکلو...... ایک ایک کر کے میں آجاؤں گا۔"

مجھے کوئی غرض نہیں تھی کہ وہ نکل کر کہاں جائیں گے۔ میرے لیے اس مشینی گھوڑے کی سواری ایک کٹھن مرحلہ تھی۔ ایک تو موٹر سائیکل خستہ حال اور قدیم تھی۔ اس کے شاک ابزاربر۔ بیٹھ گئے تھے۔ انجن جتنا شور کرتا تھا اس سے زیادہ دھواں دیتا تھا۔ پھر کچا راستہ ناہموار تھا اور میں اس قسم کی سواری کے لیے بالکل ان فٹ تھا۔ کار کے حادثے میں میرے جسم کی ہڈیاں ٹوٹنے سے بچ گئی تھیں مگر ساری چولیں ہل گئی تھیں لہٰذا بدن کے متاثرہ حصے ایسی مشقت برداشت نہیں کر سکتے تھے لیکن اس ویرانے میں اور کوئی سواری دستیاب بھی تو نہ تھی۔

میں نے دو تین کلومیٹر کے بعد محسوس کیا کہ میری ہمت جواب دے رہی ہے...... کسی گڑھے یا پتھر کا جھٹکا لگا تو میں نیچے گر جاؤں گا۔ اسی وقت سڑک آگئی۔ پہلے میں نے ولی داد سے اس کے کان میں چلا کے کوئی بات کی تھی تو اس نے غلط سنا تھا جواب دیا تھا تو میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ یہ ناممکن تھا کہ اس شور میں جو پھٹے ہوئے سائلنسر سے خارج ہو رہا تھا اور اس زلزلے جیسی تہ و بالا کرنے والی پوزیشن میں موبائل فون پر بات کی جا سکتی۔

خدا خدا کر کے یہ مصائب کا سفر تمام ہوا اور میں نے خود کو اس سڑک پر پایا جو دینہ سے ست بدھائی کی طرف جاتی تھی جو اس وقت مجھے موٹروے سے زیادہ شاندار محسوس ہوئی۔ جب ولی داد نے ایک جگہ انجن کو بند کر کے موٹر سائیکل روکی تو مجھے یوں لگا جیسے مجھے کسی نے کنکر روڑے اور سیمنٹ کھلانے والے گھومتے ہوئے کنکریٹ مکسر سے نکال لیا ہوا۔ دنیا یکلخت پرسکون اور خاموش ہو گئی تھی۔

نیچے اتر کے میں نے ایک گہری لمبی سانس لی اور خود کو لڑکھڑا کر گرنے سے روکا۔ "ولی داد...... اب اندازہ ہوتا ہے کہ شامی بادشاہ کے مقابلے میں تم کتنے گھٹیا ڈاکو ہو...... اس کے ساتھ میں نے جب سفر کیا کسی عالی شان لینڈ کروزر میں کیا...... تم یہ واہیات دو پہیوں والی سواری استعمال کرتے ہو۔"

وہ کچھ خفیف سا ہوا...... "ایسی بات نہیں ہے سر شامی کے پاس کون سی اپنی گاڑی تھی وہ بھی چھینی ہوئی ہوتی تھی۔"

''اور یہ موٹر سائیکل؟ اگر یہ تم نے خریدی ہے۔'' میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ ''تو اس کی قیمت بھی قسطوں میں ادا کی ہوگی۔ حادثے کے بعد تم مجھے اسی دو پہیوں والی ایمبولینس میں لے گئے تھے؟''

''نہیں سر...... ہماری ایک جیپ پکڑی گئی۔ ایک ورکشاپ میں کھڑی ہے، کل تک آ جائے گی۔''

میں نے کہا۔ ''یہ کیا جگہ...... تھی جہاں تم نے مجھے قید رکھا۔''

''یہ...... پتا نہیں...... کچھ عجیب سا نام ہے اس گاؤں کا...... ہم خود یہاں روپوش تھے...... ایک مہینا ہو گیا...... ہم جہاں جاتے ہیں ناکامی ہوتی ہے۔ پتا نہیں کون مخبری کرتا ہے۔ پہلے منگلا کی طرف...... پھر جہلم کے علاقے میں...... چکوال کے مضافات اور پنڈ دادن خان میں...... ہر جگہ پولیس کو معلوم ہوتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''پولیس تو تمہاری محافظ اور حصے دار بھی جاتی ہے۔''

''ایسا ہی ہوتا تھا...... ہر واردات کے بعد ہم ایک تہائی علاقے کے تھانے میں پہنچاتے رہے ہیں لیکن کبھی کبھی پولیس بھی مجبور ہو جاتی ہے اگر آپ جیسے پیچھے پڑ جائیں...... تو۔''

''تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ شامی بادشاہ کو دھوکے سے مروانے کے بعد میں اس کے باقی ساتھیوں کو بھی ختم کرنا چاہتا تھا چنانچہ میں نے پولیس پر دباؤ ڈالا...... آئی جی صاحب میرے دوست ہیں...... چنانچہ پولیس نے تمہارے خلاف کارروائی کی...... میرے کہنے پر......؟''

وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ اس کی اس خاموشی میں اعتراف تھا کہ وہ ایسا ہی سمجھتا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ ''ہمارے دو بندے مارے گئے...... دو زخمی حالت میں پکڑے گئے اور اسپتال میں لیٹے ہیں۔''

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''ولی داد...... اس غلط فہمی کو دل سے نکال دو...... شامی کو میں نے دل سے دوست بنایا تھا۔ اس میں کوئی دھوکا فریب یا دوغلا پن نہیں تھا اور شامی کو تم کیا سمجھتے ہو؟ کیا وہ کسی کی صورت سے یا باتوں سے دھوکا کھا سکتا تھا؟ وہ ایک انتہائی ذہین آدمی تھا۔ اس نے اعتماد کرنے سے پہلے مجھے پرکھ لیا تھا...... اسی لیے اس نے اپنی بیوی سے کہا تھا کہ وہ اور کہیں نہ جائے، کسی پر بھروسا نہ کرے...... اور گولی نے ایسا ہی کیا تھا......''

ولی داد نے بے چینی سے ادھر ادھر دیکھا۔ ''نواب صاحب آپ کو بہت تکلیف دی ہم نے...... اس وقت ہم خود بڑی مصیبت میں ہیں۔ اپنی جان بچانے کے لیے چھپتے پھر رہے ہیں ورنہ آپ کو گھر پہنچاتے۔ غصے میں ہم سے بہت بڑی غلطی ہو گئی۔ ہم نے سمجھا کہ آپ کی وجہ سے ہم پر یہ برا وقت آیا ہے۔ اتفاق ہے کہ آپ ادھر سے گزر رہے تھے۔ ہم سڑک کے کنارے چھپے ہوئے تھے...... دیکھ رہے تھے کہ پولیس ہمارے پیچھے آتی ہے یا نہیں۔ آپ پر نظر پڑ گئی۔''

''اور سوچے سمجھے بغیر تم نے گولی چلا دی۔'' مجھے پھر غصہ آنے لگا۔ ''میں تمہیں بتا رہا ہوں ولی داد کہ جو بوڑھا آدمی میرے ساتھ تھا اگر وہ زندہ نہ ملا تو میں تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا...... تم اب جاؤ۔''

وہ سخت پشیمان، پریشان اور ڈرا ہوا کھڑا رہا پھر ایک دم آگے بڑھ کر اس نے میرے پاؤں پکڑنے کی کوشش کی۔

''آپ بڑے آدمی ہو نواب صاحب...... شامی بادشاہ یہ بات ایسے ہی نہیں کہتا تھا۔ میں بہت چھوٹا اور حقیر ہوں۔''

میں پیچھے ہٹ گیا۔ ''لیکن تمہارا جرم بہت بڑا ہے۔''

''میں مانتا ہوں جناب عالی...... آپ جو سزا دو جائز ہے لیکن کبھی آپ کو میری ضرورت ہو تو مجھے شامی کی جگہ سمجھنا۔ میں جان دے کر بھی اس غلطی کا کفارہ ادا کروں گا۔''

میں نے کہا۔ ''وقت آیا تو دیکھیں گے ولی داد...... ابھی تم جاؤ...... لیکن میرا یہ احسان مت بھولنا۔ تم نے غلطی نہیں بہت سنگین جرم کیا تھا محض نادانی میں...... اس لیے میں تمہیں معاف کر رہا ہوں۔''

اس نے پھر ہاتھ جوڑے اور اپنی موٹر سائیکل کو کک مارنے لگا۔ بالآخر وہ اسٹارٹ ہو گئی اور وہ اسی پتلی سی سڑک پر روانہ ہو گیا جس پر ایک گھنٹے کے سفر نے میری حالت خراب کر دی تھی۔ میرے جسم کا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا اور میرے لیے وہاں کھڑا رہنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔

میں روڈ سائڈ پر بنی ہوئی ایک پلیا پر بیٹھ گیا۔ ابھی تک مجھے موقع ہی نہیں ملا تھا کہ راجا سے بات کر سکوں۔ مجھے پورا یقین تھا کہ سڑک پر ہونے والے اس حادثے کی اطلاع حویلی تک پہنچ گئی ہوگی۔ یہ ناممکن تھا کہ کل سے اس وقت تک نہ حویلی سے کوئی نکلا ہو نہ ادھر سے گزر کے حویلی تک گیا ہو۔ وقفے وقفے سے اس سڑک پر سے ٹریفک گزرتی رہتی تھی۔ حادثہ روڈ سائڈ پر ہوا تھا، کسی نے ڈاکٹر مہدی حسن کی الٹ جانے والی گاڑی ضرور دیکھ لی ہوگی اس کے بعد نہ جانے کیا ہوا ہوگا۔

میرے دل میں ڈاکٹر مہدی حسن کی طرف سے ایک

خوف بیٹھا ہوا تھا اور میں احساس جرم کا شکار بھی تھا۔ میرے مقابلے میں وہ عمر رسیدہ شخص تھا، اگر میں حادثے کے نتیجے میں بے ہوش ہو گیا تھا اور میرے جسم کی چولیں ہل گئی تھیں تو نہ جانے اس پر کیا گزری ہوگی۔ وہ کس حالت میں ہوگا اور کہاں ہوگا۔ کسی اسپتال کے وارڈ میں پڑا ہوگا یا مردہ خانے میں...... اس کے وارثوں کو خبر بھی ہوگی یا نہیں......؟

اور اس نیک دل بوڑھے کے اس انجام کی ساری ذمے داری مجھ پر عائد ہوتی تھی...... اس کا قصور کچھ نہیں تھا اور نہ کوئی اسے مارنا چاہتا تھا۔ وہ صرف میرے ساتھ ہونے کی وجہ سے مارا گیا تھا۔ کیا پتا ابھی تک کسی کو خبر ہی نہ ہو...... حویلی میں سب بے خبر اور مطمئن بیٹھے ہوں۔ یہ فرض کیے بیٹھے ہوں کہ ڈاکٹر صاحب اپنے گھر پہنچ چکے ہوں گے...... اور میں بھی وہیں گیا جہاں دل مجھے لے گیا۔

ہمت کر کے میں نے جیب سے اپنا موبائل فون نکالا۔ آخر اس سڑک کے کنارے میں کب تک بیٹھا رہ سکتا تھا۔ میرے سامنے سے دو ٹرک، چند کاریں اور موٹر سائیکلیں اور تانگے ریڑھے گزر چکے تھے مگر ان میں سے کوئی بھی ٹیکسی یا کرائے کی گاڑی نہیں تھی جو مجھے ست بدھائی پہنچا سکے۔ اس کے لیے کسی کو حویلی سے بلانا ضروری تھا۔

موبائل کا اسکرین لمحہ بھر کے لیے روشن ہوا اور بجھ گیا۔ اس کی بیٹری ڈاؤن تھی۔ عام طور پر میں اس بات کا خاص خیال رکھتا تھا کہ باہر جاتے وقت میرا فون پوری طرح چارج ہو۔ ضرورت پڑنے پر میں گاڑی کا چارجر بھی استعمال کر لیتا تھا۔ معلوم نہیں اس ڈاکو حسینہ نے مال مفت سمجھ کے اس کا کتنا بے دریغ استعمال کیا تھا۔ صرف بیٹری ہی نہیں شاید اس نے میرا بیلنس بھی ختم کر دیا ہوگا۔

مجھے سخت طیش آیا۔ عجیب بے بسی اور بے چارگی تھی کہ میں نواب رفیق احمد ست بدھائی جیسی ریاست کا مالک اربوں کا مالک...... اتنا عقلمند اور ہوشیار...... اعلیٰ تعلیم یافتہ اور بااختیار...... اس وقت سڑک کے کنارے کسی آوارہ گرد یا فقیر کی طرح ایک پلیا پر اکیلا بیٹھا تھا جس کا ساری دنیا سے رابطہ ٹوٹ چکا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ میں کون ہوں یا کہاں ہوں گویا میں اس بچے کی طرح محسوس کر رہا تھا جو کسی اجنبی شہر کے میلے میں گم ہو گیا ہو۔

آخر مجھے کیا کرنا چاہیے...... پیدل تو ست بدھائی جانے کا سوال ہی نہ تھا۔ میں نے ایک آدھ کار کو ہاتھ سے روکنا چاہا لیکن وہ سیدھی گزر گئی۔ کوئی رک جاتا تو میں بتا سکتا تھا کہ میں کون ہوں اور کس مشکل میں ہوں۔ مجھے ست بدھائی کوئی نہ لے جاتا مگر یہ تو ہو سکتا تھا کہ مجھے اپنے موبائل فون سے راجا کو ایک کال کرنے دیتا۔ پیسے میری جیب میں کافی تھے۔ میں کال کی قیمت بھی ادا کر سکتا تھا اور ست بدھائی تک لے جانے کا معاوضہ بھی لیکن نہ کوئی گاڑی خالی تھی نہ کسی نے روکنے کی زحمت کی۔ یہاں دور دور تک کوئی پی سی او بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔

ایک پرابلم اپنی پوزیشن معلوم کرنے کی تھی۔ مجھے یہ علم نہیں تھا کہ میں کہاں کھڑا ہوں...... ست بدھائی اس سڑک پر دائیں جانب ہے یا بائیں جانب اگر میں ایک سمت میں چلنے لگوں تو دینہ پہنچوں گا یا نیلہ بوگیاں، ایک ٹرک بھوسے سے بھرا ہوا گزرا۔ ایک ریڑھے میں دودھ کے ڈرم تھے۔ مجھے افسوس بھی ہوا کہ نہ میں مصیبت زدہ نظر آتا ہوں اور نہ معزز...... میں سڑک پر لفٹ مانگنے والا عام آدمی ہوں جسے سب نظر انداز کرتے جا رہے ہیں...... ایک بار پھر میں نے ان ڈاکوؤں کو دل ہی دل میں گالیاں دیں جن کی غلط فہمی نے مجھے اس حال تک پہنچایا تھا اور اس لڑکی کو کوسا جس نے موبائل فون کو میرے لیے بے مصرف بنا دیا تھا۔

اسی وقت میری نظر ایک کار پر پڑی جو برق رفتاری سے میری طرف آ رہی تھی۔ پریشانی اور غصے میں میرا دماغ کام نہیں کر رہا تھا ورنہ میں سڑک پر ایسے کھڑا ہونے کا رسک نہ لیتا۔ میں نے اس خیال کو اہمیت بھی نہیں دی کہ میں کوئی عام آدمی نہیں ہوں...... میں اکیلا بے خوف و خطر نہیں پھر سکتا تھا...... میں جہاں جاتا ہوں محافظ میرے ساتھ رہتے ہیں کیونکہ ہر جگہ مجھے اپنے دشمنوں سے خطرہ ہے اور کچھ نہ سہی...... کم از کم میں نے اپنی طرف تیزی سے بڑھنے والی گاڑی کو کچھ دیر پہلے دیکھ لیا ہوتا...... مجھے اتنا وقت مل جاتا کہ میں چھپ جاتا لیکن اب یہ بھی ممکن نہ تھا۔

سیاہ رنگ کی نئی لینڈ کروزر بالکل میرے سامنے آ کر ٹھہر گئی۔ اس کے آگے پیچھے پیتل کی گول پلیٹ پر بڑے بڑے حروف سے عوام کو مطلع اور خبردار کیا گیا تھا کہ یہ کسی عام آدمی کی نہیں ایم پی اے کی گاڑی ہے چنانچہ اس کے نیچے آ کے مرنے والا اپنے نقصان کا خود ذمہ دار ہوگا۔ قانون اس کی کوئی مدد نہیں کر سکے گا۔ وارننگ ان کے لیے بھی تھی جو خود کو قانون نافذ کرنے والا...... ادارہ سمجھتے تھے کہ یہ گاڑی قانون سے بالاتر ہے۔

گاڑی کے رکتے ہی پیچھے والے دروازوں سے مسلح محافظ بڑی مستعدی سے چھلانگ لگا کے اترے۔ ایک نے آگے والا دروازہ کھولا...... باقی نے میرے گرد حصار قائم

کرلیا پھر رانا صاحب نے بڑے شاہانہ وقار کے ساتھ قدم رنجہ فرمایا۔ وہ مکمل وی آئی پی ڈریس میں تھا...... سیاہ شیروانی، چیئر مین لٹھے کی اجلی کھڑ کھڑاتی شلوار اور سر پر طرہ امتیاز والی پگڑی جس کا کلف لگا شملہ اس کے قد میں ایک ہاتھ کا اضافہ کرتا تھا یا رانا کو قد بڑھ جانے کا احساس ضرور دلاتا تھا۔

صورت حال سے نمٹنے کے لیے میں ...۔ اپنی خودی کو بلند کرنے کے سوا کیا کرسکتا تھا۔ میرا حلیہ، میرے کپڑے، پریشان بال...... بڑھی ہوئی شیو اور میری خستہ حالی چھپائی نہیں جاسکتی تھی۔

''اوہو...... بھئی یہ تو سچ مچ اپنے نواب رفیق ہیں۔'' اس نے میرے قریب آ کے کہا۔ ''میں تو سمجھا تھا نظر کا دھوکا ہوگا۔'' پھر اس نے اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے آگے بڑھایا۔

میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ ''اندیشہ مجھے بھی تھا کہ کہیں آپ کا میرا آمنا سامنا نہ ہوجائے...... میرے ستارے گردش میں ہیں۔''

''خیر سے آپ کہاں بھٹک رہے ہیں......؟ اور اس حال میں، کہیں راج پاٹ چھوڑ کے بن باس تو نہیں لے لیا؟'' اپنے مذاق پر وہ خود ہی ہنس دیا۔ اس کے محافظ بڑے خوشامدانہ انداز میں مسکرانے لگے۔

میں نے کہا۔ ''ایک بات فارسی میں ہے...... آپ کے لیے آسان اردو میں ترجمہ بھی کروں گا۔ صدر ہر جا کہ نشیند صدر است...... بادشاہ کسی حال میں بھی ہو کہیں بھی ہو بادشاہ ہی رہتا ہے۔''

''چھوڑو جی اپنے نواب صاحب یہ پرانی باتیں...... جنگل کے بادشاہ کو دیکھو ذرا چڑیا گھر میں جا کے...... میں تو جا رہا تھا اجلاس میں شرکت کے لیے مگر آپ کو دیکھا تو ارادہ بدل دیا...... آؤ تشریف لاؤ۔''

میں نے کہا۔ ''وہ...... بات یہ ہے رانا صاحب......''

''ایسی کیا جلدی ہے نواب رفیق...... گاڑی میں بیٹھو...... گھر چل کے تسلی سے بات کرنا۔'' اس نے مونچھوں پر ہاتھ پھیرا۔

''تھینک یو رانا صاحب کہ آپ نے مجھے گھر چھوڑنے کے لیے اپنا اجلاس چھوڑا؟'' میں گاڑی کی طرف بڑھا۔

''گھر بھی چھوڑ دیں گے آپ کو...... ابھی تو آپ ہمارے گھر کے قریب ہو...... ہمارے مہمان رہو گے کچھ دن......'' وہ پھر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

مجھے خوش فہمی پہلے بھی نہ تھی۔ رہی سہی کسر رانا کے الفاظ نے پوری کردی۔ اس نے اپنا مہمان بنانے کے لیے کچھ دیر کی دعوت نہیں دی تھی۔ کچھ دن کہا تھا اور یہ اندازہ وہ خود کرسکتا تھا کہ یہ مہمان داری کیسی ہوگی۔ اس کے الفاظ نے اس کے عزائم واضح کردیے تھے۔ رانا وہی پرانا کینہ پرور دشمن تھا۔ اس نے زوہیب کے معاملے میں میری فراخدلی کے مظاہرے کا احسان تسلیم نہیں کیا تھا۔ اسے قید کرنے اور قید میں اس کے ساتھ ہونے والی بدسلوکی پر ذلت محسوس کی تھی۔ معلوم نہیں زوہیب نے واپس گھر پہنچ کر باپ کو کتنا سچ بتایا تھا اور کتنا جھوٹ۔ یہ میں نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ رانا کے دل میں مجھ سے دشمنی کے جذبات میں کئی گنا اضافہ ہوچکا ہے اور وہ خوش ہے کہ اسے اتنی جلدی حساب برابر کرنے کا موقع مل گیا۔

میرے لیے مزاحمت کی گنجائش ہی نہ تھی۔ بیک وقت چار مسلح محافظوں نے مجھے گھیرے میں لے لیا تھا اور میں خود آگے قدم نہ بڑھاتا تو وہ مجھے دھکیل کر لے جاتے۔ میں نے صورت سے ناگواری کے جذبات کا اظہار بھی لاحاصل سمجھا اور ایسے دوستانہ انداز میں مسکراتا رہا جیسے رانا کی مہمان نوازی کے اس مظاہرے کو میں نے اپنی عزت افزائی سمجھتے ہوئے قبول کیا ہے اور میرے دل میں کوئی اندیشہ نہیں۔

تاہم میرا دماغ مستعد تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ مجھے فوراً رہائی پانے کے لیے فرار کا راستہ تلاش کرنا چاہیے یا...۔ رانا کے گھر پہنچ جانے کے بعد مناسب موقعے کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔ عقل کہتی تھی کے بعد میں شاید کچھ کرنا میرے اختیار میں نہ رہے۔ رانا مجھے کوئی موقع کہاں دے گا۔ وہ فول پروف انتظامات کرے گا اور اس صورت حال سے پورا فائدہ اٹھائے گا۔ میں یہ ثابت کر ہی نہیں سکتا کہ اس نے مجھے سڑک کے کنارے سے اغوا کیا ہے۔ وہ بہ آسانی ثابت کردے گا کہ میں اس کے علاقے سے پکڑا گیا ہوں۔ بالکل اسی طرح جیسے میں نے ثابت کیا تھا کہ زوہیب میرے علاقے سے پکڑا گیا تھا۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ رانا میرے ساتھ ویسا ہی سلوک کرے جیسا میں نے اس کے بیٹے کے ساتھ کیا تھا۔ وہ اس سے بدتر سلوک کرسکتا تھا۔ سب کچھ اس کے اختیار میں تھا۔

میں اب رانا کی جگہ بیٹھا ہوا تھا اور خود رانا نے ڈرائیونگ سنبھال لی تھی۔ ڈرائیور کو اس نے پیچھے بھیج دیا تھا جہاں تین محافظ پہلے ہی موجود تھے۔ گاڑی نے سڑک پر یوٹرن لیا۔ وہ اسٹیئرنگ وہیل پر تھوڑا سا دائیں جانب جھکا۔ ''اوئے پیچھے دیکھو۔'' اس نے ڈرائیور سے کہا۔

''کوئی نہیں جناب عالی۔'' ڈرائیور نے کہا اور اس

کے ساتھ باقی محافظوں نے بھی سر گھما کے پیچھے دیکھا۔

میرے خیال میں یہ فضول بات تھی۔ رانا خود بھی بیک ویو مرر میں پیچھے دیکھ سکتا تھا۔ پتا نہیں کیسے میرے دماغ میں بجلی سی چمکی اور مجھے خیال آیا کہ...۔ یہی وہ لمحہ ہے جس پر میں داؤ کھیل سکتا ہوں۔ خیال سے عمل تک اس لمحے کا سفر خود بخود مکمل ہوگیا۔ سوچنے سمجھنے کی مہلت کہاں تھی۔ جو ہوا خود ہی ہوگیا۔

میرا دایاں ہاتھ بڑی سرعت سے اس ڈور لاک کی طرف بڑھا جو رانا کی طرف تھا۔ ادھر کا دروازہ ایک دم پورا کھل گیا۔ رانا کا کندھا اس پر ٹھہرا ہوا تھا۔ سہارے سے محروم ہوتے ہی رانا کا توازن بگڑا۔ وہ مزید دائیں طرف جھکا تو اسٹیئرنگ وہیل ضرورت سے زیادہ گھوم گیا۔ اسی وقت میں نے بائیں جانب ڈور لاک کو بائیں ہاتھ سے کھولا اور سڑک پر کود گیا۔ اس وقت رانا خود کو باہر گرنے سے بچانے کی جدوجہد کررہا تھا۔ گاڑی سڑک پر سے اتر چکی تھی اور پیچھے بیٹھے ہوئے محافظوں کی ساری توجہ رانا پر تھی چنانچہ مجھے چند سیکنڈ کا وقفہ میسر آیا جس میں یہ ممکن نہ تھا کہ محافظ اپنی گن کا رخ میری طرف کرکے فائر کھول دیں۔

میں نے قدم زمین پر لگتے ہی سڑک کراس کرنے کے لیے دوڑ لگائی۔ میرا خیال ہے کہ اس سے پہلے میں کبھی اس رفتار سے نہیں دوڑا تھا۔ سڑک مشکل سے بیس فٹ چوڑی تھی۔ پھر آٹھ دس فٹ کی کچی جگہ تھی اور اس کے بعد جھاڑ جھنکاڑ اور درختوں کا سلسلہ شروع ہوجاتا تھا تاہم میرا جنگل کی طرف بھاگنا سودمند نہ ہوتا۔ چند منٹ کے وقفے سے ہی سہی لیکن رانا کے محافظ بالآخر میرے تعاقب میں دوڑتے اور میں آگے بھاگتا رہتا۔ وہ اندھا دھند فائرنگ کرتے۔ جنگل اتنا گھنا نہ تھا کہ میں اس تعاقب میں کسی کو ایک بار بھی نظر نہ آتا۔ انجام یہ ہوتا کہ میری راہ میں دریا حائل ہوجاتا۔ دریا میں پانی تو اس موسم میں گھٹنوں کے برابر رہتا تھا لیکن درمیان میں پانی کے دھارے سے پہلے دونوں کناروں پر دریا کا خشک پاٹ تھا جس میں ریت اور گول کنکر بچھے ہوتے تھے۔ جب طغیانی آتی تھی تو یہ سارا پاٹ پانی سے بھر جاتا تھا۔ اگر ابھی مجھے اس سپاٹ خالی میدان اور پھر پانی سے گزرنا پڑتا تو یہ تقریباً ایک فرلانگ کا فاصلہ تھا جس میں کنارے سے مجھے بہ آسانی نشانہ بنایا جاسکتا تھا۔

یہ سب میرے ذہن میں تھا چنانچہ سڑک سے اترتے ہی میں نے کچھ بائیں جانب ایک سیاہ پتھر کی چٹان کا رخ کیا جس کی بلندی بارہ چودہ فٹ سے زیادہ نہ تھی۔ وسعت میں چٹان شاید پچاس فٹ کے دائرے میں پھیلی ہوئی ہوگی۔ چشم زدن میں جھاڑیوں سے نکل کے میں چٹان کے پیچھے چلا گیا۔ گھوم کر اس جگہ آیا جہاں سے میں تھوڑا سا سر نکال کے سڑک پر ہونے والی کارروائی کا مشاہدہ کرسکتا تھا۔

آوازیں مجھ تک پہنچ رہی تھیں۔ سب سے نمایاں رانا کی آواز تھی جو زخم خوردہ شیر کی طرح دھاڑ رہا تھا لیکن اس میں وہ گھن گرج نہ تھی جو دل دہلا دے۔ وہ بوڑھا شیر تھا۔ اس کی آواز سے حکم کے غلام ڈرتے تھے چنانچہ وہ گاڑی سے نکل کے جنگل کی طرف دوڑ رہے تھے۔ خودکار ہتھیار ان کے ہاتھوں میں تھے۔ اگر وہ بدحواس نہ ہوتے تو ایک لائن میں ایک دوسرے کے پیچھے نہ دوڑتے۔ چار افراد ایک دوسرے سے کچھ فاصلہ رکھ کے مجھے تلاش کرتے لیکن رانا کی للکار انہیں بدحواس کررہی تھی۔

میں نے دیکھا کہ گاڑی سڑک سے اتر کے رکی تو ایک سو اسی درجے کے زاویے پر گھوم گئی تھی۔ ایسا اس لیے ہوا کہ رانا نے خود کو گرنے سے بچانے کے لیے اسٹیئرنگ وہیل نہیں چھوڑا تھا اور اس کے پھر سنبھلنے اور بریک لگانے تک گاڑی نے اپنا رخ اسی سمت میں کرلیا تھا جدھر سے وہ آرہی تھی۔

میرے خیال میں رانا کا ڈرائیونگ کرنے کا فیصلہ غلط تھا۔ اس کی عمر اور عمر سے بڑھ کر جسمانی اور اعصابی بیماریوں نے اسے کمزور کردیا تھا لیکن اپنی معذوری کو ظاہر کرنا یا تسلیم کرنا رانا کی شان کے خلاف تھا۔ اگر وہ ڈرائیور کے ساتھ ہی بیٹھا رہتا اور مجھے پیچھے محافظوں کے درمیان بٹھاتا تو میرا فرار ہونا بالکل ناممکن ہوجاتا۔ خیر...... اگر ایک شخص غلطی نہ کرے تو دوسرے کو فائدہ اٹھانے کا وہ موقع کیسے فراہم ہو جو تقدیر کی خوبی یا دست غیب کی مدد سے حاصل ہوتا ہے۔

''ایسے کتے بھونکتے ہوئے آگے لپک رہے تھے۔ ان کے لاحاصل شور کو بھونکنا ہی کہا جاسکتا تھا۔ اب وہ ایک دوسرے کو ہدایات دے رہے تھے۔ ''تو ادھر جا۔ تو وہاں دیکھ۔ وہ آگے ہے۔ سیدھا بھاگا تھا۔ بچ کے کہاں جائے گا، دیکھتے ہی گولی مار دینا۔''

رانا سے ایک اور بے وقوفی سرزد ہوئی۔ وہ سڑک کے کنارے اپنی گاڑی کے ساتھ اکیلا رہ گیا۔ اس کی نظریں اسی سمت میں لگی ہوئی تھیں جدھر میں فرار ہوا تھا۔ وہ سخت طیش میں تھا اور پل بھر میں اپنی بہت بڑی کامیابی کے یوں ناکامی میں بدل جانے سے اندر ہی اندر کسی آتش فشاں کی طرح کھول رہا تھا۔ وہ بلڈ پریشر کا پرانا روگی تھا اور اسے دل کا عارضہ بھی لاحق تھا۔ یہ ٹینشن اس کے لیے جان لیوا بھی ثابت

ہو سکتی تھی۔

غالباً اس نے خشک حلق کو تر کرنے کے لیے پانی یا کسی دوسرے توانائی دینے والے مشروب کی ضرورت محسوس کی اور وہ گاڑی میں آگے اسی طرف سے چڑھا جہاں سے میں نے جست لگائی تھی اور جہاں مجھ سے پہلے وہ خود بیٹھا ہوا تھا۔

''لک فیکے پتر۔'' ایک آواز نے کہا اور مجھے چٹان کی اوٹ سے سڑک کی جانب دھکیل دیا۔ میں نے ایک زقند لگائی اور سڑک کراس کر گیا۔ شوں سے کوئی چیز مجھے چھوتی ہوئی گزر گئی۔ یہ دینہ کی طرف سے آنے والی ویگن تھی۔ اس کے ڈرائیور کو بھی ایسا ہی لگا ہوگا کہ نہ جانے کوئی جانور تھا یا کچھ اور جو نظر آنے سے پہلے گزر گیا۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے کی تاخیر ہو جاتی تو یہ ویگن میرے اوپر سے گزر جاتی یا مجھے بچانے کی کوشش میں الٹ جاتی۔

رانا ابھی تھرماس کو منہ سے لگا کے کچھ پی رہا تھا۔ اس کا منہ اوپر اٹھا ہوا تھا۔ آنکھیں چھت پر لگی ہوئی تھیں۔ میں ڈرائیور کی سائڈ سے جمپ لگا کے گاڑی میں گھسا اور سنبھلنے سے پہلے رانا کو قابو کر لیا۔ اس کا ریوالور میرے ہاتھ میں آیا تو میرا ہاتھ اٹھا اور رک گیا۔ اس کے سر پر وار کر کے میں اسے ناک آؤٹ کر سکتا تھا لیکن ہو سکتا تھا کہ وہ مر جائے۔ حیرت اور خوف سے پھٹی ہوئی اس کی آنکھوں میں بے یقینی تھی، خوف تھا اور شاید ایک التجا بھی۔ ''مجھے مارے بغیر بھی تو تم وہ کر سکتے ہو جو کرنا چاہتے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''رانا۔ خبردار جو آواز حلق سے نکالی۔''

اس نے بڑی مشکل سے اقرار میں سر ہلایا۔ میں نے اس کی طرف کا دروازہ بند کیا پھر اپنی طرف کا۔ چابیاں اگنیشن سوئچ میں لگی ہوئی تھیں۔ چند سیکنڈ میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ جیت کس کی ہوئی ہے اور ہار کس کی۔ گاڑی کا رخ پہلے ہی دینہ کی طرف تھا۔ یعنی ست بدھائی کی طرف تھا۔ انجن اسٹارٹ ہوتے ہی گاڑی نے دوڑنا شروع کیا۔ اس وقت میری تلاش یا میرے شکار کے لیے دریا کی طرف دوڑنے والے اندھا دھند فائرنگ کر رہے تھے۔

چند منٹ کی اعصابی جنگ ختم ہو گئی تھی۔ میں نے بڑی کوشش سے رانا پر ظاہر کیا کہ میں بالکل نارمل ہوں۔ رانا کے لیے جیت کا ہار میں بدل جانا ایک حادثہ تھا۔ ایک ایسا سانحہ جس کے لیے وہ بالکل تیار نہ تھا۔ اس کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ جان بچا کے بھاگنے والا نواب رفیق اچانک بھوت کی طرح نمودار ہو اور بازی پلٹ دے۔۔۔ پہلے وہ رفیق کو لے جا رہا تھا۔ اب رفیق اسے لے جا رہا ہے۔ وہ بے یقینی کے سکتے میں تھا لیکن رانا وہ شخص تھا جس سے گرگٹ بھی رنگ بدلنا سیکھے۔

دیکھتے دیکھتے اس کی صورت کے تاثرات بدل گئے۔ ایک گہری سانس لے کر اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''معاف کرنا۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی لیکن تم کو کیا ہوا۔ اتنے غصے میں کیوں ہو؟''

میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''پھر کیا مجھے خوش اخلاقی کے ساتھ تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ آپ مجھے اغوا کر کے لے جا رہے تھے۔''

اس نے حیرانی سے دہرایا۔ ''اغوا؟ میں تو تمہیں اپنا مہمان بنا کے لے جا رہا تھا۔''

میرا دل چاہا کہ اس کے منہ پر ایک تھپڑ ماروں۔ ''مہمان یا قیدی؟''

''کیسی بات کرتے ہو تم نواب رفیق۔ آخر یہ کیسے سمجھ لیا تم نے کہ میرا ایسا کوئی ارادہ تھا۔ کیا میں نے ایسا کہا تھا۔''

''بکواس مت کرو ورنہ میں تمہیں چلتی گاڑی سے باہر پھینک دوں گا۔'' میں نے دھاڑ کے کہا۔

''اگر تمہیں ایسا کرنے سے خوشی ہوتی ہے تو تمہاری مرضی۔ لیکن پہلے یہ بتا دو کہ میری کس بات سے تمہیں شک ہوا؟''

''شک؟ یہ میرا شک ہے؟'' میں نے ادھر اشارہ کیا جہاں اس کے محافظ مجھے تلاش کر رہے تھے۔ ''تمہارے کتے جو میرے پیچھے لگے وہ میرا شک تھا؟ انہوں نے جو فائر کیے مجھ پر۔ وہ میرا وہم تھا؟''

''وہ تمہاری حفاظت اور سلامتی کے لیے گئے تھے۔ شاید تمہیں معلوم نہیں۔ اس علاقے میں ڈاکو چھپے ہوتے ہیں۔''

''بس کرو رانا۔ بے غیرتی اور بے شرمی کی کوئی حد ہوتی ہے۔ کیا وہ ڈاکوؤں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ میں جانتا تھا کہ تمہاری فطرت بدل نہیں سکتی۔ سانپ کو دودھ پلانے سے کچھ نہیں ہوتا۔ بچھو کی فطرت ہے ڈنک مارنا۔ میں نے تمہارا بیٹا صحیح سلامت لوٹا دیا۔ اس کو تم احسان نہیں مانتے۔ اچھا ہوتا میں پولیس کو بلا کے اس کی لاش دیتا کہ یہ میرے علاقے میں داخل ہوا تھا۔ مارا گیا۔''

وہ دکھ سے سر ہلانے لگا۔ ''مجھے اس نے سب بتایا کہ قید میں اس کے ساتھ کیا ہوا لیکن پھر بھی۔''

''پھر بھی کیا؟ وہی تم میرے ساتھ کرنا چاہتے تھے۔''

''نہیں نواب رفیق۔ میں نے تو تمہیں ایسے سڑک کے کنارے اکیلا کھڑا دیکھا تو پریشان ہوا کہ ماجرا کیا ہے۔ تم

رانا نگر سے صرف پانچ کلو میٹر دور تھے۔''

میں نے تلخی سے کہا۔ ''تم کہنا چاہ رہے ہو کہ تمہارے رکنے کا مقصد میری مدد کرنا تھا۔''

''اور کیا ہو سکتا تھا۔ ایسا کیا کہا تھا میں نے جس کا تم نے غلط مطلب نکالا۔ میں نے چند دن مہمان رکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اس میں کیا برائی تھی؟ میں زبردستی کیسے کر سکتا تھا۔ تم کہتے تو میرے محافظ اسی گاڑی میں تمہیں ست بدھائی چھوڑ کر آتے۔''

گاڑی اب دریائے کہان کے پل پر تھی۔ میرا غصہ برقرار تھا لیکن میں نے اس پر قابو پا لیا تھا۔ ''دیکھو رانا میں چاہوں تو تمہیں ایسے غائب کر دوں جیسے تم تھے ہی نہیں۔ کس نے دیکھا ہے مجھے تمہارے ساتھ؟ صرف تمہارے محافظوں نے۔ ان کی بات پر یقین کون کرے گا کہ نواب رفیق ایسے سڑک کے کنارے لاوارث آوارہ گرد کی طرح کھڑا تھا اور مسلح محافظوں کے ساتھ اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے لیے نکلنے والے رانا صاحب کو وہ گاڑی سمیت اغوا کر کے لے گیا۔ مسلح محافظوں کی نظر کے سامنے۔''

''مجھے یقین ہے کہ تم ایسی کوئی بے وقوفی نہیں کر سکتے۔''

''بس یہی فرق ہے تم میں اور مجھ میں۔ تم سب کچھ کر سکتے ہو رانا۔ میں ایک موقع اور دے رہا ہوں تمہیں۔ ابھی ہمارے اختلافات صرف سیاسی ہیں۔ اسے ذاتی دشمنی نہ بناؤ۔ ورنہ یہ اغوا اور قتل کا سلسلہ شروع ہو گیا تو رکے گا نہیں۔ کوئی بھی محفوظ نہیں رہے گا۔ نہ ہم نہ تم۔ نہ تمہارے وارث۔ صرف قبریں ہوں گی۔ یہ زمین اور ماضی کے افسانے۔ مخالفت کرو۔ قتل و غارت گری مت کرو۔ مرنے مارنے سے ڈرنے والے ہم بھی نہیں۔ ہماری نہ سہی اپنی فکر کرو۔ اپنوں کی سلامتی کے لیے سوچو۔''

اس دلچسپ ترین کہانی کے بقیہ واقعات ساتویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں

قسمت کے پھیر میں اُلجھے ایک نوجوان کی داستان

اناڑی

احمد اقبال

7

اناڑی

قسمت کے پھیر میں اُلجھے ایک نوجوان کی کتھا، حالات اور واقعات کا بہاؤ اُسے دیارِ غیر لے گیا جہاں وہ اناڑی تھا مگر خود کو کسی کھلاڑی سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ ایسا کھلاڑی جسے کسی بساط پر شکست نہیں دی جا سکتی تھی۔ اس کا اناڑی پن اُسے کھلاڑیوں کے مقابل کامیابیاں دلاتا رہا۔ اُسے پردیس راس آ گیا تھا جہاں کی ہنگاماں خیزیاں اُس کا دل لبھاتی تھیں مگر دوسری طرف دیس میں اس کی لاٹری کھل گئی، ایسی لاٹری کہ جس کے بعد اُسے لوٹنا تھا۔ اناڑی سے کھلاڑی بننے کے بعد..... وہ لوٹا..... تو ہنگامے اور شرارتیں اُس کے ساتھ تھیں۔ قدم قدم پر آنسو اور لمحہ لمحہ قہقہوں سے لبریز اُس اناڑی کی کہانی جس کا دل دو حصوں میں منقسم تھا۔

خوب صورت وگل رنگ جذبوں سے گندھی ایک تیز رفتار کہانی

میں نے گاڑی کو ست بدھائی کے گیٹ پر روکا اور اتر گیا۔ رانا چپ تھا۔ ایسا لگتا ضرور تھا کہ اس پر میری بات کا اثر ہوا ہے لیکن یہ اثر وقتی ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ کرنا دشوار تھا۔ ''پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر۔'' یہ علامہ اقبال نے رانا جیسے لوگوں کے لیے ہی کہا تھا۔ جو دنیا کو تباہ کرتے ہیں اور خود بھی تباہ ہو جاتے ہیں مگر اس سے کوئی سبق نہیں سیکھتے۔ ایسا ہوتا تو ایک چنگیز خان کے بعد نہ ہلاکو ہوتا نہ ہٹلر۔ ایک جنگ عظیم کے بعد دوسری جنگ نہ ہوتی۔

بالآخر وہ ڈرائیونگ سیٹ پر کھسکا اور گاڑی کو موڑ کر لے گیا۔ میرے محافظ اٹین شن کھڑے تھے اور کسی نے میری آمد کی خبر حویلی کے اندر بھی پہنچا دی تھی۔ میں اندر گیا تو راجا گیٹ کی طرف آ رہا تھا۔ باقی سب لوگ اس وقت موجود نہیں تھے۔ ''تو رانا کے ساتھ تھا؟ وہ چھوڑ کے گیا ہے تجھے؟'' راجا نے گھبراہٹ میں کہا۔ ''مگر تو گیا تھا ڈاکٹر مہدی حسن کے ساتھ۔''

''ہاں۔ اندر چل بتاتا ہوں۔ پہلے مجھے بتا ڈاکٹر صاحب کیسے ہیں۔''

''ان کو کیا ہوا؟ تو کیسی الٹی بات کر رہا ہے ٹیکے پتر۔ میں کیا بتاؤں۔ وہ تیرے ساتھ تھے۔''

''ان کا کسی سے رابطہ نہیں ہوا۔ احمد حسن کا بھی نہیں؟''

''نہیں۔ ہم سب کوشش کرتے رہے۔ تو کہاں تھا؟ ڈاکٹر مہدی حسن کہاں ہیں؟'' راجا کی پریشانی بڑھ گئی۔

اپنے کمرے میں پہنچ کے میں نے خود کو کرسی پر گرا دیا۔ ''راجا۔ کیا واقعی یہاں کسی کو کچھ معلوم نہیں؟''

''کیا معلوم نہیں۔ تو بات کر کھل کے۔'' راجا بگڑ گیا۔

میں نے ایک گلاس پانی پیا اور ایک گہری سانس لے کر خود کو پرسکون کیا۔ ''راجا۔ کیا کل سے اب تک کسی نے بھی ڈاکٹر صاحب سے یا مجھ سے رابطے کی کوشش نہیں کی۔''

''کوشش کی تھی۔ سب کا مجھے پتا نہیں۔ میں نے تیرے موبائل فون پر بات کرنے کی کوشش کی تو نہ جانے کس عورت نے ہیلو کہا اور میں نے پوچھا کہ نواب رفیق کہاں ہیں تو اس نے ہنس کے کہا رانگ نمبر۔ میں سمجھا نمبر غلط مل گیا ہوگا۔ دوبارہ کوشش کی تو رابطہ نہیں ہوا پھر میں نے چیک کیا۔ پہلی بار بھی میں نے غلط نمبر ڈائل نہیں کیا تھا۔ کس کے پاس تھا تیرا فون؟ وہ فریال اور نور جہاں کی آواز نہیں تھی۔ کوئی خادمہ تھی؟''

میں نے کہا۔ ''نہیں۔ وہ ڈاکوؤں کا ڈیرا تھا۔ انہوں نے مجھ سے سب کچھ لے لیا تھا۔ میرا فون، گھڑی، پرس۔ ڈاکٹر مہدی حسن کے ساتھ میں لاہور ہی جا رہا تھا وہ روہتاس سے نکلتے ہی ایک جگہ سڑک کے کنارے چھپے بیٹھے تھے۔ انہوں

نے گاڑی پر فائر کیے اور ٹائر پھاڑ دیے۔ گاڑی ڈاکٹر صاحب چلا رہے تھے۔ وہ اس پر قابو نہ رکھ سکے۔ گاڑی بائیں جانب کی ایک پلیا سے ٹکرا کے الٹ گئی اور نیچے جا گری۔ وہاں کوئی نالہ تھا یا گڑھا تھا۔ میں نے دیکھا نہیں۔ میں بے ہوش ہو گیا تھا۔ ہوش آیا تو ڈاکوؤں کو دیکھا۔''

''وہ تجھے اٹھا کے کیوں لے گئے تھے۔ اور ڈاکٹر مہدی حسن؟''

میں نے کہا۔ ''مجھے ان کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔ وہ ڈاکو ان کو وہیں چھوڑ گئے تھے۔ وہ شامی کے گروہ میں تھے۔ جب شامی نے ہتھیار ڈالنے کا فیصلہ کیا تو وہ الگ ہو گئے تھے۔ ان کو شامی بادشاہ کے مارے جانے پر سخت غصہ تھا۔ ان کا خیال تھا کہ میں نے ان سے دغا کی۔ وہ مجھے اس کی سزا دینا چاہتے تھے۔ میں نے بتایا کہ یہ غلط ہے اور شامی کے بارے میں اس کی بیوی کہتی ہے کہ وہ زخمی ہوا تھا۔ مرا نہیں تھا۔ اس نے گولی سے کہا کہ وہ ست بدھائی کی حویلی پہنچ جائے۔ وہی سب سے محفوظ جگہ ہے۔ شامی فرار ہو گیا تھا لیکن اس نے کہا تھا کہ وہ بھی ست بدھائی میں آئے گا۔ جب بھی موقع ملا۔ گولی بالکل ماننے کو تیار نہیں کہ وہ مارا گیا تھا۔ میں نے کہا کہ شامی کو مجھ پر شک ہوتا تو کیا وہ اپنی بیوی سے ست بدھائی جانے کا کہتا؟ اس بات نے انہیں قائل کیا۔ انہوں نے مجھے چھوڑ دیا۔''

''اور ڈاکٹر مہدی حسن۔ خدا کرے وہ زندہ ہوں۔ کل رات ان کے بیٹے احمد حسن نے ان سے بات کرنے کی کوشش کی تھی مگر رابطہ نہیں ہوا۔ اس نے کہا کہ ڈیڈی اپنا فون کہیں رکھ کے بھول گئے ہیں یا بیٹری ڈاؤن ہوئی ہے اور انہیں پتا نہیں چلا۔''

''اس نے بہن سے نہیں پوچھا۔''

''ٹینا سے؟ وہ تو پاگل ہے۔ موبائل فون نہیں رکھتی۔ گھر کے فون کا یہ ہے کہ اکثر خراب پڑا رہتا ہے۔''

''بڑی حیرانی کی بات ہے راجا کہ اس حادثے کی خبر یہاں نہیں پہنچی۔ شاید نیچے گر جانے والی گاڑی پر کسی کی نظر نہیں پڑی۔''

''اوہ مائی گاڈ۔ کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ...... گاڑی ابھی تک وہیں پڑی ہوگی۔'' راجا اٹھ کھڑا ہوا۔

میں نے کہا۔ ''میں بھی چلتا ہوں۔''

''تیری حالت ٹھیک نہیں۔''

''میں ٹھیک ہوں۔ پانچ منٹ رک جا۔''

میں نے ہاتھ منہ دھو کے لباس بدلا۔ اتنی دیر میں فاطمہ میرے لیے کافی بنا لائی تھی۔ مکھن کے ساتھ دو سلائس کھا کے بعد میں نے پیناڈول کی دو گولیاں نگلیں اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گارڈ غنی کے ساتھ مستعد بیٹھا تھا اور غنی ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ پیچھے راجا کے ساتھ بیٹھ کے میں نے اسے رانا سے ملاقات کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔

راجا سنتا رہا۔ ''میں نے کہا تھا ناں پتر۔ رانا کی نسل کے جانور نیکی اور احسان کا مطلب بھی نہیں سمجھتے۔''

''آج تو اس نے حد کر دی۔ خیر۔ میں نے بھی اسے بتا دیا ہے کہ وہ معاملات کو دشمنی کی انتہا تک لے جانا چاہتا ہے تو ہم بھی تیار ہیں پھر بچے گا کوئی نہیں۔''

راجا نے غصے سے کہا۔ ''اور یہ بتانے کے بعد تو نے اسے پھر جانے دیا۔''

''میرے لیے اسے جان سے مار دینا بہت آسان تھا راجا۔ میں اس کی گاڑی کو پل سے نیچے گرا دیتا یا دینہ کی طرف لے جا کے ویسی ہی کسی پلیا سے نیچے گرا دیتا مگر اس سے کیا ہوتا۔ وہ مر جاتا۔ ہم مصیبت میں آ جاتے۔ رانا صوبائی اسمبلی کا رکن ہے۔ علاقے پر اس کے خاندان کی حکومت قائم ہے۔ مشکل میں ہم پڑتے۔ بہت کشت و خون ہوتا۔ یہ سب ہم افورڈ نہیں کر سکتے کیونکہ ہمیں بہت سے کام کرنے ہیں اور ہم نے ابھی کام شروع کیا ہے۔ ہم دشمنی اور تصادم کی راہ سے گریز کریں گے جہاں تک ممکن ہوگا۔ شاید رانا کو بھی یہ بات سمجھ آ جائے......''

راجا نے ایک گہری سانس لی۔ ''شاید ایسا ہی ٹھیک ہوگا۔ جوش کے بجائے ہوش۔''

''رانا کو یہ دنیا داری کے سارے جھمیلے چھوڑ دینے چاہئیں۔ اس کی عمر زیادہ ہو گئی ہے لیکن اصل خرابی یہ ہے کہ ذہنی اور جسمانی طور پر وہ اس قابل نہیں رہا ورنہ عمر کے ساتھ عقل اور تجربہ بڑھتا ہے تو دنیا کے معاملات سے بہتر طور پر نمٹنے کی صلاحیت آ جاتی ہے۔''

''اس کا دماغ خراب ہوتا جا رہا ہے۔''

''دماغ ہی کیا۔ کون سا روگ ہے جو اسے لاحق نہیں۔ ساری عمر من مانی کی۔ بدمعاشی کی سیاست کی۔ کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا۔ اب حالات پہلے جیسے نہیں، کوئی چیز قابو میں نہیں۔ جو حکم دینے سے تھراتے تھے، اب چیخنے دھاڑنے سے نہیں ڈرتے۔ جاگیرداری، حاکمیت، سیاست، سب کے انداز بدل گئے ہیں۔''

''رہی سہی کسر ہم نے پوری کر دی۔ ایک نئی دنیا کے چیلنج کا سامنا کرنا اس کے بس کی بات نہیں رہی۔ اس عمر میں لوگ آخرت کی فکر کرتے ہیں۔ وہ دنیا میں الجھا ہوا ہے اور دنیا کو اپنے طریقے سے چلانا چاہتا ہے۔''

''زوہیب اس کا جانشین ہے۔ وہ سب کچھ اس کے سپرد کیوں نہیں کر دیتا۔ ممکن ہے اس سے حالات میں بہتری آئے۔''

میں نے کہا ''اورنگ زیب کی طرح اسے جانشین پر بھروسا نہیں ہوگا۔ وہ سب کچھ خود کرنا چاہے گا۔ آخری وقت تک، مغلیہ حکومت کے زوال کا سب سے بڑا سبب یہی تھا۔ اورنگ زیب نے انچاس سال حکومت کی مگر اس کے جانشین اس قابل ہی نہ تھے۔''

میرے کہنے سے غنی نے گاڑی روک لی۔ میری نظر نے دور سے ٹوٹی ہوئی پلیا کو دیکھ لیا تھا۔ وہ ایک چھوٹا سا برساتی نالہ تھا جو خشک پڑا تھا۔ برسات کے موسم میں شاید یہ پانی سے بھر جاتا ہو۔ اس پانی کو سڑک کے نیچے دو فٹ قطر کے دو پائپ رکھ کے گزار دیا گیا تھا۔ دوسری طرف نالہ دریائے کہان سے مل جاتا ہوگا۔ ایسے بہت سے برساتی نالے برسات میں اپنا پانی دریائے کہان میں ڈالتے تھے تو وہ بیچ بیچ کا دریا نظر آنے لگتا تھا ورنہ ابھی تو وہ ایک برساتی نالے جیسا دکھائی دیتا تھا۔

عین سڑک کے نیچے جہاں دو فٹ قطر کے دو پائپ لگائے گئے تھے ایک چھوٹا سا تالاب خود بخود بن گیا تھا جس کی وسعت اور گہرائی بہت زیادہ نہیں تھی۔ جب طوفانی قسم کی بارش سے ایک دم پانی آتا ہوگا تو یہاں اس کو کھلا راستہ نہیں ملتا ہوگا۔ پانی اس رکاوٹ سے ٹکرا کے شور کرتا ہوگا اور جمع ہو جاتا ہوگا اور بعد میں آہستہ آہستہ پائپوں سے گزرتا ہوگا، گاڑی اسی موسمی جھیل میں گری تھی چنانچہ سڑک پر سے گزرنے والے پلیا پر سے جھانکے بغیر اسے دیکھ نہیں سکتے تھے۔

گاڑی کے نظر نہ آنے کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ نشیبی جھیل جیسی جگہ کے کنارے پر ایک درخت تھا۔ اس کے نیچے سے جڑوں کی مٹی پانی کے ریلے میں تھوڑی تھوڑی نکلتی گئی تھی۔ اب یہ اندر کی طرف جھک گیا تھا اور گرنے ہی والا تھا۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ سب کچھ اس وقت کے لیے ہو رہا تھا جب ڈاکٹر مہدی حسن کی کار یہاں سے گزرے، اس پر فائرنگ ہو اور وہ الٹ کر نیچے جائے۔

میں قدرت کے اس حسن انتظام سے بچ گیا تھا۔ کار جب الٹ کر نیچے گئی تو درخت پر گری۔ کار سیدھی نیچے گرتی تو چھت کے ساتھ ہی ہمارے سر بھی پچک جاتے اور ہماری لاشوں کو چادر کاٹ کے نکالا جاتا۔ درخت نے ہمیں کیچ کیا لیکن اس کا جھکا ہوا جسم اس صدمے کی تاب نہ لا سکا اور زمین پر سر بسجود ہو گیا۔ کار آہستہ سے نیچے اتر گئی۔

یہ سب میں نے نیچے جا کے دیکھ لیا۔ کار چاروں پہیوں پر سیدھی کھڑی ہوئی تھی۔ اس کی ایک لائٹ بھی نہیں ٹوٹی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ کوئی کار کو سڑک سے نیچے گھما کے لایا اور یہاں کھڑی کر دی۔ کار کا ڈرائیور اپنی سیٹ پر اسی طرح موجود تھا۔ سیٹ بیلٹ باندھے سر کو پشت سے لگائے وہ آنکھیں بند کیے سو رہا تھا۔

میں نے ایک دم دروازہ کھولا اور ڈاکٹر صاحب کو ہلا کے آوازیں دیں۔ ڈاکٹر صاحب، ڈاکٹر صاحب! لیکن ان کی آنکھیں بند رہیں پھر میں نے گھبرا کے ان کا ہاتھ تھاما اور نبض دیکھی۔ نبض کی رفتار اتنی آہستہ تھی کہ مجھے دیر سے محسوس ہوئی پھر میں نے سینے پر سر رکھ کے ان کی دھڑکن سننی چاہی اور ناکام رہا لیکن ڈاکٹر صاحب کے جسم میں زندگی کی حرارت باقی تھی۔

''یہ زندہ ہیں راجا!'' میں نے چلا کے کہا۔

راجا میرے پیچھے مضطرب کھڑا تھا۔ ''پھر نکال انہیں باہر۔ دیر کیوں کر رہا ہے؟''

میں نے چند منٹ میں ڈاکٹر مہدی حسن کو سیٹ بیلٹ سے آزاد کیا اور کندھے پر اٹھا لیا۔ ہم سب تقریباً دوڑتے ہوئے اوپر سڑک کی طرف گئے۔ اس وقت ایک سائیکل پر جانے والے دو افراد بھی وہاں رک کے بڑے تجسس سے ساری کارروائی دیکھ رہے تھے۔ شاید ان میں سے ایک نے سوال بھی کیا تھا کہ گاڑی نیچے کیوں کھڑی ہے مگر میں نے یا راجا نے جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔ میں نے پیچھے بیٹھ کے ڈاکٹر صاحب کو لٹایا اور ان کا سر اپنی گود میں رکھا۔ راجا ان کے ہاتھ ملتا رہا۔ ان پر پانی کے چھینٹے ڈالتا رہا۔ انہیں آوازیں دیتا رہا اور غنی کو بلاوجہ ڈانٹتا رہا کہ گاڑی تیز چلائے۔ بیس منٹ بعد ہم دینہ میں تھے۔ وہاں کے سب سے اچھے سمجھے جانے والے اسپتال میں بھی آئی سی یو کی سہولت نہیں تھی لیکن ہماری خوش قسمتی سے اسپتال کو چلانے والا ایک امریکا پلٹ ڈاکٹر تھا۔ وہ ڈاکٹر مہدی حسن کا ہم عمر ہی ہوگا۔ بعد میں اس نے بتایا کہ وہ بیوی اور دو ڈاکٹرز بچوں کو امریکا میں چھوڑ کے اکیلا واپس آ گیا تھا اور اس نے وہیں اسپتال بنایا تھا جہاں وہ پیدا ہوا تھا۔

وہ تجربے کار اور ماہر ڈاکٹر تھا۔ اس نے ڈاکٹر مہدی حسن کو اسپتال کے ایک کمرے میں لٹا کے خود ہی ہنگامی بنیادوں پر جان بچانے کے اقدامات کیے اور ساتھ ساتھ

ہمیں تسلی بھی دیتا گیا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ چالیس منٹ بعد جب ہم چالیس بار اندر جھانک کر ایک ہی سوال کر چکے تھے کہ ڈاکٹر صاحب کی طبیعت اب کیسی ہے؟ اس نے اعلان کیا کہ اب ان کی حالت خطرے سے باہر ہے اور ہم چاہیں تو انہیں کسی بڑے شہر کے بڑے اسپتال میں لے جاسکتے ہیں۔

میں نے راجا سے مشورہ کیا اور یہ طے کیا کہ معالج کی رائے پر بھروسا کیا جائے۔ خطرہ ٹل گیا ہے تو پھر کہیں اور جانے کی کیا ضرورت ہے۔ ہاں ڈاکٹر مہدی حسن کے بیٹے کو ضرور بلالیا جائے۔ اسپتال کے مالک امریکا پلٹ ڈاکٹر کا نام آفندی تھا۔ اس نے ہمیں اپنے کمرے میں بٹھا کے کہا ''مریض سے زیادہ تو آپ کی حالت تشویش ناک ہو رہی ہے' آپ کے والد ڈاکٹر ہیں' مگر آپ خود جاہل ہیں۔''

مجھے بڑی خفت ہوئی۔ میں نے اسے ڈاکٹر صاحب کے بارے میں' پھر اپنے بارے میں اور حادثے کے بارے میں بھی بتایا۔

آفندی نے ہمارے لیے چائے منگوائی۔ ''پڑھے لکھے ہونے کے باوجود آپ کا رویہ وہی تھا۔ جو یہاں آنے والے عام دیہاتی کا ہوتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں جیسے نعوذ باللہ زندگی اور موت میرے ہاتھ میں ہے۔ اتنا ڈسٹرب کرتے ہیں کچھ کام کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ پھر ہر ایک کے سوالات۔ پورا خاندان اور قبیلہ جمع ہو جاتا ہے۔ میں کس کس کو سمجھاؤں اور کتنی بار؟''

میں نے کہا ''آئی ایم سوری!''

''دیکھیے...... سوچیے' اگر خدا کو یہ منظور نہ ہوتا تو آپ اور ڈاکٹر مہدی حسن اب تک سپرد خاک ہو جاتے۔ کل سوئم ہوتا آپ کا لیکن آپ کو خراش تک نہیں آئی اور ڈاکٹر مہدی حسن کی سانس یہاں آنے تک چلتی رہی' یہ سب کس نے کیا اور کیوں؟''

راجا نے کہا ''زندگی ایسے ہی سبق پڑھاتی ہے۔''

''اب دیکھیے' مجھے حادثے کا اندازہ نہیں ہوا' اگر آپ نے پہلے یہ سب بتا دیا ہوتا تو میں کہتا کہ یہ پولیس کیس ہے۔ ڈسٹرکٹ اسپتال جائیں۔ یہاں دو بار میں بھی مشکل میں پڑ چکا ہوں۔ رشوت دے کے جان چھڑائی تھی۔ میں اپنی جان بچاتا تو شاید' میں پھر کہتا ہوں کہ شاید...... مریض کی جان ڈسٹرکٹ اسپتال پہنچنے تک نہ بچتی۔ وہاں کے قانونی چکروں میں دیر بھی ہو سکتی تھی۔''

شام تک اسپتال میں ملاقاتی بھر جاتے لیکن ہم نے ڈاکٹر مہدی حسن کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد پریشانی پھیلانا مناسب نہیں سمجھا۔ آفندی مقامی آبادی میں مقبول تھا۔ لوگ سمجھتے تھے اس کے ہاتھ میں شفا ہے پھر وہ لالچی نہیں تھا۔ ذاتی فائدے کے لیے غیر ضروری اور مہنگی دوائیں نہیں لکھتا تھا۔ بے سبب انجکشن یا ڈرپ نہیں لگاتا تھا اور پیسے دوسرے ڈاکٹروں کے مقابلے میں کم لیتا تھا۔ ہوس زر معاشرے کو جس اخلاقی زوال میں مبتلا کیا تھا اس سے دیگر پیشوں کی طرح ڈاکٹر بھی متاثر ہوئے تھے۔ یہ شکایت عام تھی کہ دواساز کمپنیوں سے مل کر ڈاکٹر بلاوجہ اور بہت زیادہ دوائیں لکھ دیتے ہیں اور مریض کی جیب یا اس کی صحت کو ہونے والے نقصان کی پروا نہیں کرتے۔ کئی لیبارٹریز بنا لیتے ہیں یا کمیشن لیتے ہیں اور مریضوں کے وہ مہنگے ٹیسٹ کراتے ہیں جن کی قطعی ضرورت نہیں ہوتی۔ لیڈی ڈاکٹر عام ڈلیوری کے کیس کو سیزرین بنادیتی ہیں تو ڈاکٹر پیٹ درد کی شکایت لے کر آنے والے کی اینڈکس کا آپریشن کر دیتا ہے۔

آفندی ایسا کچھ نہیں کرتا تھا کیونکہ امریکا سے وہ بہت کما کر لایا تھا اور یہاں اس کی ضروریات محدود تھیں۔ الٹا وہ اپنے مریضوں کو لالچی اور جعلی ڈاکٹرز کے چکر سے بچانے کے لیے سمجھاتا رہتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ مقامی ڈاکٹرز مافیا اس کے سخت خلاف تھی۔ وہ اس کے خلاف جھوٹا پروپیگنڈا کرتے تھے کہ یہ خود جعلی ہے۔ پتا نہیں امریکا میں کسی اسپتال میں فرش پر پوچا مارتا تھا یا کسی دواساز کمپنی میں لوڈر تھا۔ یہاں آ کے ڈاکٹر بن گیا لیکن اس کے علاج سے مستفید ہونے والے اس پروپیگنڈے کی نفی کرتے تھے اور ان کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی پھر آفندی کے ساتھ وہی ہوا جو ہمارے ساتھ ہوا تھا۔ آفندی کی ایک نرس بھی تھی جو چوبیس گھنٹے اسپتال میں ہی رہتی تھی۔ عمر میں وہ آفندی کی بیٹی کے برابر ہوگی لیکن یہ بات پھیلائی گئی کہ ڈاکٹر کے اس کے میاں بیوی والے مراسم ہیں اور وہ نکاح کے بغیر ساتھ رہتے ہیں تاہم اکثریت نے ایسی باتوں کو اہمیت نہیں دی اور کہا کہ ہمیں تو علاج سے غرض ہے اور اس کے ہاتھ میں شفا دینے والا تو خدا ہی ہے۔

شام تک ڈاکٹر آفندی کے ساتھ باتوں کا یہ سلسلہ وقفے وقفے سے جاری رہا۔ ہم ڈاکٹر مہدی حسن کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے جہاں اسے فوری توانائی کے لیے گلوکوز کی ڈرپ لگا دی گئی تھی۔ آفندی کو جب فرصت ملتی تھی' وہ ہمارے پاس آ کے بیٹھ جاتا تھا۔

ہمارے ذہن میں ایک اور الجھن بھی تھی۔ جب ہم کھانے کے لیے باہر گئے تو میں نے اس کا ذکر راجا سے کیا۔

''یار' ہم ڈاکٹر صاحب کو کیا بتائیں گے' میں کیا کہوں گا؟''

راجا نے سر ہلایا ''ٹھیک ہے پتر! بہت غور کرنے کے بعد تیرا دوست اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ انسان کو سچ کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے' کسی بھی حال میں۔''

''معاف فرمایئے...... میں ایسا نہیں سمجھتا۔ بعض وقات سچ سے نقصان ہو جاتا ہے۔ جھوٹ سے خرابی نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر مہدی حسن جب ہوش میں آئیں گے تو سوال کریں گے کہ میں یہاں کیوں ہوں؟ اور کب سے ہوں؟ کیوں کا جواب انہیں یاد آ گیا تو پھر تاریخ بھی یاد آ جائے گی۔ وہ پوچھیں گے کہ میں آج صبح یہاں آیا' تو کل سے اب تک کہاں تھا؟''

''یہ تو ان کا برخوردار احمد حسن بھی بولے گا کہ نواب صاحب' آپ ابا کے ساتھ گئے تھے۔ نہ ابا گھر پہنچے نہ آپ کے ساتھ واپس آئے۔ حادثہ ہوا تو آپ نے بتایا کیوں نہیں؟ اکیلے کیسے چلے گئے اور کہاں؟ پھر رات بھر کیا ہوا' کیا ابا یہاں پڑے رہے؟ آپ خود کہاں رہے اور آپ نے ابا کو آج اسپتال کیوں پہنچایا؟ کیا جواب دے گا تو ایسے سوالات کا؟ کوئی جھوٹ بولے گا تو اسے کور کرنے کے لیے دس جھوٹ اور بولنے پڑیں گے۔''

میں نے کہا...... ''تو ٹھیک کہتا ہے راجا' میں اعتراف جرم کر لوں گا۔''

''جرم...... کیسا جرم! تیرا کیا قصور تھا اس میں۔ جو ہوا اس کے پیچھے حالات و واقعات کا ایک سلسلہ ہے۔ جب مہدی حسن اور اس کا بیٹا یہاں رہیں گے تو کیا انہیں معلوم نہیں ہوگا...... رانا کون ہے اور اس کے ساتھ ہماری کیا دشمنی ہے۔ شاہی بادشاہ کون ہے اور اس کے ساتھ تیری دوستی کیوں تھی؟ اس دشمنی اور دوستی کے نتیجے میں کیا ہوا؟''

میں نے کہا۔ ''اور آیندہ کیا ہو سکتا ہے۔ اس کا علم انہیں ہونا چاہیے ورنہ وہ کہیں گے کہ ہمیں بے خبر رکھا گیا۔ ست بدھائی اور اپنے ارادوں کے بارے میں صرف اچھا اچھا بتایا گیا۔ خرابی کیا ہے' خطرات کیا ہیں' یہ سب معلوم ہوتا تو ہم سوچ کے فیصلہ کرتے۔''

''اگر یہ سلسلہ جاری رہا ٹھیکے پتر' ہماری سیاسی دشمنی نے ذاتی لڑائی کی حیثیت اختیار کر لی' تو پھر وہ سارے کام کیسے ہوں گے جو ہم کرنا چاہتے ہیں؟ اگر مخالفین نے اسپتال کے عملے کو' اسکول اسٹاف کو اور ہمارا ساتھ دینے والوں کو بھی نشانہ بنایا' انہیں بھی اپنا دشمن جانتے ہوئے ان پر حملے کیے۔''

میں نے کہا۔ ''راجا! ڈاکٹر مہدی حسن پر یہ حملہ رانا کی طرف سے نہیں ہوا تھا۔ اس کے علاوہ شہناز کی مخالفت کا جو طوفان ابتدا میں کھڑا ہوا تھا اور جس کے نتیجے میں رانا نے اسے اغوا بھی کرا لیا تھا' وہ صورت حال اب نہیں ہے۔ ہمارا اسکول بن گیا' نیا اسپتال قائم ہو گیا۔ سب ٹھیک چل رہا ہے۔''

''ہاں' ابھی ٹھیک ہے تو اس کی وجہ ہے۔ ایک تو ہمیں ڈی آئی جی عبداللہ صاحب کی حمایت حاصل رہی۔''

''اب وہ آئی جی ہے۔''

''دوسری وجہ یہ ہوئی کہ شاہی بادشاہ کے گروہ کی طاقت ہمارے ساتھ رہی، جواب نہیں ہے۔ تیسری وجہ یہ کہ چیف منسٹر ہمارے اسپتال کا افتتاح کرنے آ گیا۔''

میں نے کہا ''راجا جی! اصل بات یہ ہے کہ ہم نے ہمت نہیں ہاری۔ رانا کا مقابلہ کیا۔ ہم خوف زدہ ہو کے اور دبک کے نہیں بیٹھے۔ آئی جی اور چیف منسٹر تو بیٹھے ہیں لاہور میں اور ان کے پاس زیادہ اہم کام ہیں۔ پچھلے ایک ہفتے میں رانا کی طرف سے دو بار اشتعال انگیزی ہوئی ہے۔ ایک بار اس کا ولی عہد ہماری حدود میں گھس آیا اور دیکھا جائے تو اس نے ہماری عزت و غیرت کو للکارا۔ کل رانا نے مجھے اغوا کرنے کی کوشش کی۔''

راجا سوچ میں پڑ گیا ''کیا کرنا چاہیے ہمیں؟''

''ہمیں خاموش ہو کے نہیں بیٹھنا چاہیے۔ اینٹ کا جواب پتھر سے دینا چاہیے۔''

راجا نے میری بات کاٹ دی۔ ''تیرے خیال میں' ہم زوہیب کو گولی مار دیتے یا تو آج رانا کو ختم کر دیتا' تو سب ٹھیک ہو جاتا۔''

''نہیں۔ مگر ہمیں دباؤ بڑھانا چاہیے' قانونی دباؤ۔ ہم نے اسے قانون کے شکنجے میں اچھا کس لیا تھا۔ پہلے فاروقی دغا دے گیا پھر شہزاد۔ ماجد خان کا نام بڑا ہے لیکن وہ شاید موکل کا موڈ دیکھتا ہے۔ فیس تو اسے مل ہی جاتی ہے۔ کیس کی پیروی کے لیے ہمیں اس پر دباؤ ڈالنا ہوگا۔ ورنہ سیاسی حریفوں کے درمیان مقدمے بازی میں عدم دلچسپی کا مظاہرہ ہو تو معاملہ رفتہ رفتہ تاریخوں کی نذر ہو جاتا ہے اور پھر کولڈ اسٹوریج میں چلا جاتا ہے۔''

راجا بولا۔ ''ہمیں ماجد خان کو بتانا پڑے گا کہ ہم آج بھی سیریس ہیں۔ رانا پر ایک مقدمہ بیٹی کو قتل کرانے کا ہے۔ دوسرا شہناز کو اغوا کرانے اور حبس بے جا میں رکھنے کا۔ دونوں میں اس کی ضمانت سیشن کورٹ نے غلط منظور کی تھی لیکن ہائی کورٹ میں منسوخی کی درخواست پر تین مہینے بعد بھی کچھ نہیں ہوا۔ پولیس کیس کو دبانا چاہتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ایک بار بڈھے کو ہتھکڑیاں لگ جائیں، اسے جیل بھیج دیا جائے، پھر ہم مقدمے کو آگے بڑھائیں گے۔''

ڈاکٹر مہدی حسن نے شام کے وقت آنکھیں کھول دیں۔ ان کو نہ چوٹیں آئی تھیں اور نہ زخم۔ شاک کے بعد کمزوری اور پھر چوبیس گھنٹے سے زیادہ کھائے پیئے بغیر پڑے رہنے سے ان کی حالت خراب ہوئی تھی۔ ہوش میں آنے کے بعد ان کی حالت بہت جلد سنبھل گئی لیکن ہم نے انہیں باتیں کرنے سے روک دیا۔

وہ خفا ہوگئے۔ ''اسٹ از دس۔ تم لوگ بتاتے کیوں نہیں؟''

میں نے کہا ''کل بتائیں گے۔''

''کیوں۔ آج کیا ہے، جب میں کہہ رہا ہوں کہ میری طبیعت ٹھیک ہے۔''

ڈاکٹر آفندی نے انہیں ڈانٹا۔ ''یہ فیصلہ تم کیسے کرسکتے ہو؟''

''میں ایک ڈاکٹر ہوں، ڈاکٹر کا باپ ہوں۔''

''یہاں تم صرف مریض ہو۔ چپ کرو ورنہ لگاتا ہوں انجکشن۔'' ڈاکٹر آفندی نے کہا۔ ''میں کسی ڈاکٹر کے باپ سے نہیں ڈرتا۔''

ڈاکٹر مہدی حسن نے سمجھ لیا کہ ہم سب نے ایکا کرلیا ہے چنانچہ ان کی نہیں چلے گی۔ انہوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ ''او کے! او کے۔ لیکن کیا مجھے بھوکا بھی رکھو گے۔ اس گلوکوز پر میں کب تک گزارہ کروں؟''

میں نے کہا۔ ''آپ کیا کھانا چاہتے ہیں؟''

''یہ امریکن ڈاکٹر سب کچھ کھانے دے گا؟'' انہوں نے آہستہ سے پوچھا۔

''سب کچھ۔ زہر کے سوا۔'' آفندی نے زور سے کہا۔

''یہاں لیڈر قوم کا غم اور مال کھاتے ہیں، عوام دھکے، گالیاں، جوتے ڈنڈے، جھوٹی قسمیں، سب کھاتے ہیں۔''

''ساری دنیا میں کھاتے ہیں۔ پاکستان کو بدنام مت کرو، تم اگر امریکی ہو تو......''

''میں تم سے زیادہ پاکستانی ہوں...... ورنہ واپس دینہ کیوں آتا؟''

بہت جلد ان کی دوستی ہوگئی۔ آفندی نے ہمیں بھی روکا کہ منگلا کی تازہ مچھلی کھلاؤں گا۔ خاص طور پر میرے لیے آتی ہے۔ چکن روسٹ مجھ سے اچھا پاکستان میں کوئی نہیں بنا سکتا۔ آزمائش شرط ہے لیکن میں نے اور راجا نے معذرت کرلی۔ احمد حسن باپ کی وجہ سے مجبور تھا۔ دونوں برا... ڈاکٹروں کے درمیان مریض اور مسیحا کا رشتہ اب ہم خیال، ہم عمر اور ہم مزاج دوستوں جیسا ہوگیا تھا۔ انہوں نے احمد حسن... زبردستی ہمارے ساتھ بھیج دیا۔

رات کو ہم نے احمد حسن کے سامنے حالات کی پور... تصویر رکھ دی۔ ہم رات کے کھانے کے بعد نصف شب تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اس نے بڑے غور سے سب سنا... سوالات بھی بہت کیے لیکن نہ اس نے تشویش کا اظہار کیا خوف اور پریشانی کا۔ اس نے آخر میں کہا کہ آپ نے ا... کیا مجھے بھی شریک راز کرلیا۔ ورنہ غلط فہمیاں جنم لے سک... تھیں۔ حقائق بعد میں سامنے آتے تو مجھے افسوس ہوتا۔''

جب وہ سونے کے لیے چلا گیا تو راجا نے کہا۔ ''احمد حسن، کتنا باہمت اور پرامید رہنے والا نوجوان ہے۔ معذور... نے اسے مایوسی نہیں دی۔''

''زندگی کے روشن پہلو پر نظر رکھنے والے ہی ا... آس پاس دوسروں کو بھی روشنی دے سکتے ہیں۔ اس کی بات... نے میرا حوصلہ بڑھایا ہے لیکن راجا، رانا کا مسئلہ مجھے بہت... کنفیوز کرتا ہے۔ وہ صرف بھونکنے یا کاٹنے والا کتا نہیں... پاگل کتا ہوتا جارہا ہے۔''

''ایسے کتے کو گولی مارنی پڑتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''آگے چل کے وہ کیا کرے گا۔ کچھ اندازہ نہیں ہوتا۔ اب تو دیکھ کہ کیا یہ اس کی عقل کی خرابی نہیں۔ اس نے رابعہ کو ہتھیار بنا کے ہمارے خلاف استعمال کرنے کا سوچا۔ زوہیب کو لگا دیا رابعہ کے پیچھے کہ تم اس پر ڈورے ڈالو۔ فریب خوردہ لڑکی ہے۔ آسانی سے تمہارے جال میں پھنس جائے گی۔ آگے میں سنبھال لوں گا۔''

''رابعہ اپنی حماقت سے پھنس گئی تھی، اللہ نے بچالیا۔''

''اللہ نے آج مجھے بھی بچالیا مگر رانا کی حرکت کتنی غلط تھی۔ آخر اسے کیسے سمجھایا جائے؟''

راجا اٹھ کھڑا ہوا۔ ''تو یہ فکر نہ کر نیکے پتر۔ وقت سب سے بڑا استاد ہے۔ آج بھی اسے بازی پلٹ جانے سے اپنی بے وقوفی کا احساس ضرور ہوا ہوگا۔ آئندہ وہ ایسا نہیں کرے گا۔ اور کرے گا تو نمٹ لیں گے یار۔ سوجا، رات بہت ہوگئی ہے۔''

میں ذہنی کم ہمتی، جذباتی افسردگی اور جسمانی تکان سے دوچار تھا اور سوچ رہا تھا کہ آخر ایسا کیوں ہے؟ کیا میں ڈپریشن کا شکار ہورہا ہوں......؟ بظاہر تو اس کے ایسے کوئی اسباب نہیں...... لوگ رات دن محنت کرتے ہیں...... کام کی

زیادتی، جذباتی مسائل، رکاوٹیں اور حادثات زندگی کا حصہ ہیں۔ حالات ایسے ہی بنتے بگڑتے رہتے ہیں پھر میں بے سکون کیوں ہوں؟ بعض اوقات میری نیند و بھوک اڑ جاتی ہے...... میں یکسوئی سے زندگی کے معمولات کو جاری رکھنے میں دشواری محسوس کرتا ہوں۔ میری زندگی میں بھی اور میرے آس پاس جو خوبصورتی ہے اور جینے میں جو لطف ہے اس کے احساس سے کیوں دور ہوتا جارہا ہوں۔

شاید مجھے اپنے معمولات کی تیز رفتاری کو کچھ کنٹرول کرنا چاہیے اور خواہشات کی پرواز کو...... سوچنا چاہیے کہ سب ایک دم نہیں ہوسکتا اور سب میں نہیں کرسکتا کیونکہ نعوذ باللہ میں خدا نہیں ہوں میں سب سے اوپر نہیں ہوں تمام رشتوں کا نگراں، تمام معاملات کا منتظم اعلیٰ، ساری ترجیحات طے کرنے کا حتمی اختیار رکھنے والا...... میرے لیے سب کچھ اہم ہوگیا ہے۔ سوائے اپنی ذات کے بس میں خود کو نظر انداز کررہا ہوں۔

سونے سے پہلے ہر روز میرا دماغ اسی طرح کے...... یکدم یلغار کرنے والے خیالات کی زد میں آجاتا تھا۔ سوچنا بری بات نہیں لیکن ہر وقت سوچنا...... اس وقت بھی سوچنا جب اس کی ضرورت نہ ہو۔ جیسے سونے کی کوشش کرنے کے بجائے میں سوچ رہا ہوں۔ نیند کو لانے کے کیا طریقے ہیں۔ کوئی دلچسپ کتاب ہو، میرے ایک استاد کہتے تھے ''مویشی منڈی چلے جاؤ، گھوڑے گنو...... یا گائیں، کسی حسین منظر کا یا وقت کا تصور کرو۔''

گھنٹی بجی تو میں نے رات کے اندھیرے میں فون کے روشن اسکرین کو دیکھا...... رات کے ڈیڑھ بجے سو میل کی دوری پر اس نے جان لیا کہ میں بے سکون ہوں؟ وہ ٹھیک کہتی تھی کہ کچھ کہنے کی کیا ضرورت ہے۔

میں نے کہا۔ ''ہیلو...... کیسی ہو نور......''

وہ ہنسی۔ ''یہ تم بتاؤ تمہیں کیسی لگتی ہوں...... سو رہے تھے؟''

''نہیں...... یہ سوچ رہا تھا کہ...... نیند کیوں رات بھر نہیں آتی۔ بس آنکھیں بند کیے لیٹا ہوا تھا۔''

''تم ٹھیک تو ہونا...... ایسا کیا ہوگیا؟''

میں نے کہا۔ ''ہوا کچھ نہیں...... بس ایک جذباتی ڈپریشن تھی۔''

''میرے پاس آجاتے...... فون ہی کرلیتے۔''

میں نے کہا۔ ''ہاں، جو تم کرسکتی ہو...... کوئی اور نہیں کرسکتا۔''

وہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ ''کیا تم خود کو روکتے ہو یا پھر کوئی اور تمہیں روکتا ہے......''

میں نے کہا۔ ''کس بات سے......؟''

''میرے پاس آنے سے...... مجھے فون کرنے سے؟''

''کیسی باتیں کرتی ہو نور...... تمہارے میرے درمیان تو تقدیر بھی حائل نہیں ہوسکتی......''

''ڈائیلاگ اچھا ہے لیکن یہی لگتا ہے مجھے۔''

میں نے کہا۔ ''پاگل ہو تم۔''

''اس میں کیا شک ہے۔ میں ہی فون کرتی ہوں۔ میں ہی تمہاری ہر خوشی پر اپنی خوشی قربان کرتی ہوں...... اور تمہیں پھر بھی خوش نہیں رکھ سکتی۔ تم میری خوشی کی پروا نہیں کرتے۔''

''کیا ہوگیا ہے نور...... تم جذباتی ہورہی ہو۔''

وہ رقت آمیز لہجے میں بولی۔ ''ہاں، جذبات تو میرے ہونے ہی نہیں چاہئیں کیونکہ میں تمہارے استعمال کی چیز ہوں...... ایک خوبصورت کار کی طرح صرف تمہیں آرام دینے کے لیے۔''

''خدا کے لیے نور...... تم نے رونا شروع کردیا تو...... یہاں میں کیا کروں گا۔'' میں نے بے بسی سے کہا۔

وہ رونے لگی۔ ''کیا ضرورت ہے تمہیں کچھ کرنے کی...... رو دھو کے چپ ہو جاؤں گی میں...... یہ محبت نہیں، جذباتی غلامی کا ایک طوق ہے جو میں نے اپنے گلے میں ڈال لیا ہے...... خود اپنی مرضی سے...... جب تمہارا دل چاہتا ہے آتے ہو، میرے ساتھ ایک رات رہتے ہو اور خوشی خوشی چلے جاتے ہو...... مجھے دیکھو......''

''پلیز جان...... ایسا مت کہو۔''

''کیوں؟ سچ بھی نہ بولوں...... تمہاری خاطر میں نے نور جہاں کو مار دیا...... کیونکہ نور جہاں نے تمہارے لیے اپنے شوہر کو قتل کردیا تھا اور تم پر الزام تھا ایک بدکردار بدنام عورت سے ناجائز مراسم کا...... لیکن اس سے کیا فرق پڑا مجھے؟ کچھ نہیں...... تم اب بھی میرے نہیں ہو اور میں کیا کررہی ہوں۔ ایک پاگل عورت کی دیکھ بھال تم نے میرے سپرد کردی ہے۔ جرم اس کا بھی وہی ہے جو میرا تھا...... لیکن تم اس کی حفاظت بھی کررہے ہو، اس کے لیے فکر مند بھی ہو...... کوئی دوسری عورت یہ رسک کبھی نہ لیتی۔ تمہارا کیا پتا کل کو تم پھر اسے اپنا لو...... مجھے تو قتل کردینا چاہیے اسے......''

میں نے فون بند کردیا۔ مجھے غصہ بھی تھا، رنج بھی۔

اس نے مجھے بات ہی نہیں کرنے دی ورنہ میں اسے بتاتا کہ دو دن پہلے میں اسی سے ملنے کے لیے نکلا تھا، ڈاکٹر مہدی حسن کے ساتھ... لیکن نہیں پہنچ سکا تو اس میں میری نیت یا ارادے کو دخل نہیں تھا۔ اسے کیا حق پہنچتا ہے کہ ایسے الزامات لگا کر خود اپنی نظر میں رسوا کرے۔ الو کی پٹھی...... ہسٹریا میں بکتی چلی جا رہی تھی...... جو منہ میں آیا کہہ دیا۔ دماغ خراب کر دیا میرا۔

میں نے اٹھ کے پانی پیا اور کمرے میں دو چکر لگا کے گہرے لمبے سانس لیے...... کاش وہ کہیں قریب ہوتی...... یہ ممکن ہوتا کہ میں اس کے ہسٹریا کا علاج کر سکوں۔ بات فاصلے کی بھی نہیں درمیان میں یہ رات حائل نہ ہوتی۔ میرے کانوں میں نور کی آواز آئی۔ ''واہ نواب صاحب لوگ تو سمجھتے ہیں آپ بڑے سپرمین ہیں، آپ کے ارادے کی راہ میں پہاڑ حائل ہو تو سرمہ ہو جائے...... بات یہ ہے کہ میں ست بدھائی ترقیاتی منصوبہ نہیں، صرف ایک عورت ہوں...... کمزور اور بے بس۔ فرہاد نے تو پہاڑ کاٹ دیا تھا اور شیریں کے لیے دودھ کی نہر نکال لی تھی...... نہ میں شیریں نہ تم فرہاد......''

کپڑے بدل کر باہر آنے میں مجھے پانچ منٹ لگے۔ میں نے ایک کاغذ کے پرزے پر لکھا۔ ''مجھے نور نے بلایا ہے...... میں رک نہیں سکتا۔'' اور اسے راجا کے سرہانے موبائل فون کے نیچے دبا کے رکھ دیا۔ حویلی میں سناٹا تھا، کہیں سے کسی جانور کے بولنے کی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ حویلی کی چھت پر سیکیورٹی گارڈ ٹہل رہے تھے، سرچ لائٹس میں ان کی نظر حویلی کے چاروں طرف دور تک دیکھ سکتی تھی۔

جب میں نے گاڑی کا دروازہ بند کیا تو گیٹ پر کھڑے ہوئے گارڈ کی نظر مجھ پر تھی۔ میں نے آہستہ سے کار کا انجن اسٹارٹ کیا۔ بالکل نئی کار کے انجن میں محض سرسراہٹ نہیں ہوئی...... گیٹ میرے اشارے پر کھل گیا۔ میں نے ایک لمحے کے لیے گاڑی روکی۔ ''میں نے راجا صاحب کو بتا دیا ہے...... میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔''

''یس سر......'' گارڈ نے فرمانبرداری سے کہا اور اٹینشن کھڑا رہا۔ اگر یہ دیوانگی تھی تو اسے الزام سمجھنا لاحاصل تھا۔ شاید دل کی نہ ماننا اور عقل سے کام لینا اس وقت میرے بس میں بالکل نہیں رہا تھا۔ ہر شخص کی زندگی میں بے اختیاری کے ایسے مرحلے آتے ہیں۔ جب لوگ قتل کر دیتے ہیں یا شہید ہو جاتے ہیں۔ مہاتما بدھ نے راج پاٹ اور محل کا عیش و آرام چھوڑ دیا...... ایڈورڈ ہشتم نے کہا کہ اس برطانیہ عظمیٰ کی بادشاہت کیا ہے جس پر آفتاب غروب نہیں ہوتا تھا...... یہ عورت مسز سمپسن زیادہ اہم اور ناگزیر ہے...... وہ معمولی شکل وصورت کی بیوہ اور شاہی خاندان کی نہیں مگر میرے لیے وہی سب کچھ ہے...... اور عقل نے تو زندگی کا راستہ دکھایا لیکن کچھ انتہائی سیانے لوگوں نے دل کی مانتے ہوئے موت قبول کی۔

چنانچہ میں نور کے آنسو پونچھنے نکل کھڑا ہوا ہوں تو مجھے یہ سوچنے کی کیا ضرورت ہے کہ کون کیا کہے گا...... میں بہت مطمئن اور پرسکون تھا۔ سڑک کی سیاہ پٹی میری گاڑی کے دو پہیوں کے نیچے سے دوڑتی ہوئی گزرتی جا رہی تھی۔ صبح ہنوز بہت فاصلے پر تھی جب میں نے گاڑی کو فریال کے گھر کے باہر روک دیا۔

وہاں میرے اپنے بھیجے ہوئے گارڈ کھڑے تھے۔ انہوں نے مجھے سیلوٹ کیا اور ایک دوسرے کی طرف حیرانی و پریشانی سے دیکھا۔ گیٹ لائٹس کے علاوہ پورچ میں ایک لائٹ جل رہی تھی۔ میں لاؤنج سے گزرا اور ایک کمرے کے دروازے پر رک گیا۔ دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ میں نے اسے آہستہ سے دھکیلا اور اندر داخل ہو گیا۔

میں نے اندھیرے میں اسے اپنے مقابل دیکھا۔ وہ ایسے کھڑی تھی جیسے میرے استقبال کے لیے آگے بڑھی ہو۔ اس نے مجھے اپنی بانہوں میں سنبھال لیا، یوں جیسے میں کوئی بہت نازک اور ٹوٹ جانے والی چیز ہوں۔ ''مجھے معلوم تھا تم آؤ گے...... آؤ پاس۔'' ہم باہر نکل آئے۔

ہم نے کوئی بات نہیں کی، ڈرائیونگ اب وہ کر رہی تھی۔ میں سیٹ پر سر پیچھے کیے آنکھیں کھولے اسے دیکھتا رہا۔ گاڑی رکی تو میں نے گلی میں دوسری گاڑیوں کو دیکھا۔ ہمیں دیکھنے والی بھی وہی گاڑیاں تھیں۔ آہستہ آہستہ وہ مجھے اوپر لے گئی۔ اس نے اپنے فلیٹ کا دروازہ کھولا اور مجھے بستر پر لٹا دیا۔ ''بس اب سو جاؤ۔'' اس نے کہا اور یہ نہ حکم تھا نہ التجا تھی۔ یہ جادوئی الفاظ تھے کہ میری آنکھیں خود بخود بند ہو گئیں۔ بے خبری میں آنے والی موت کی طرح نیند نے مجھے آلیا۔

پھر اس کی خوشبو نے مجھے بڑے پیار سے جگایا اور میں نے دیکھا تو وہ مجھ پر جھکی ہوئی تھی۔ اس کے بکھرے ہوئے بال میرے چہرے اور میری آنکھوں پر پھسل رہے تھے۔ وہ شرارت سے ہنسی۔ ''اٹھو گے نہیں مہاراج۔''

میں نے اسے اپنے اوپر کھینچ لیا۔ ''کیوں، ضروری ہے اٹھنا۔'' اور اس کے وجود کی ساری نرمی اور حرارت کو اپنے

اندر جذب کرتا رہا۔ ''صبح کیوں ہو گئی۔''

وہ ہنسی۔ ''صبح...... کس صبح کی بات کر رہے ہو، دوپہر کے بعد شام آ گئی...... پوستی کہیں کے......''

میں اٹھ بیٹھا۔ ''تم ایک خطرناک نشہ ہو۔''

اس نے اپنے بال سمیٹے۔ ''چلو یہ کافی پی لو پھر نہا کے تیار ہو جاؤ۔ میں تو تیار ہوں۔''

''اب کہاں جانا ہے؟'' میں نے کہا۔

''واپس جہاں سے میں آئی تھی۔ جہاں سے تم آئے تھے۔ سارا دن فون آئے...... میں نے فون ہی بند کر دیا تھا۔''

''فون بند رکھو، دروازے بند رکھو...... مجھے کہیں نہیں جانا۔''

''تمہیں ست بدھائی جانا ہے نواب رفیق احمد شیرازی......'' اس نے میری ناک پکڑ کے ہلائی۔ ''اور مجھے ڈیوٹی پر، فریال کے پاس۔''

''دونوں جائیں بھاڑ میں۔'' میں نے جماہی لے کر کہا۔

وہ مجھے حیران نظروں سے دیکھتی رہی۔ ''یہ تم کہہ رہے ہو۔ فریال تمہاری پہلی محبت تھی...... بلکہ ہے...... اور ست بدھائی وہ شریکِ حیات جس کو تم نے دیکھے اور جانے بغیر قبول کر لیا تھا اور پھر اس کی محبت نے فریال کو تمہاری زندگی سے بے دخل کر دیا...... کیونکہ اس کے بچے ہو گئے تھے۔''

میں ہنس پڑا۔ ''ست بدھائی کے بچے...... وہ بیوی ہے؟''

''ہاں...... اس کا نام تمہارے نام کے ساتھ جڑ گیا تھا، ہمیشہ لیے...... ایک فیملی کی طرح تم اس کی خوشی کو مقدم رکھتے تھے۔ ست بدھائی کا اسپتال، ست بدھائی کا اسکول انہیں تم بچوں کی طرح پال کے بڑا کر رہے ہو، دن رات ایک کر رہے ہو ان کی خاطر...... اور ابھی سے ہونے والے بچوں کے بارے میں سوچ رہے ہو۔''

''اچھا...... ان کے نام بھی بتا دو۔''

''ایک فیکٹری جس میں ست بدھائی کے رہنے والے کام کریں گے۔ ست بدھائی کے جنگل سے شیشم کی لکڑی حاصل ہو گی۔ ایک ماڈل لیبر کالونی، ایک ڈیم دریائے کیہان پر جو بجلی فراہم کرے گا۔''

میں نے اس کے شانے تھام لیے۔ ''بہت اچھی اور درست مثال دی تم نے۔''

''اس سوتن نے فریال کو تم سے دور کر دیا، ست بدھائی نے۔ اب تم پوچھو گے کہ پھر میں کیا ہوں...... یہ جو نواب ہوتے ہیں نا بگڑے ہوئے، ان کی محبوبہ کوئی نہیں ہوتی...... یہ داشتہ رکھ لیتے ہیں۔''

میں باتھ روم جاتے جاتے رک گیا۔ ''کر دی نا بالآخر میری بے عزتی...... پھول پھینکنے والے ہاتھ جب اچانک جوتا کھینچ ماریں......''

''اوہ آئی ایم سوری...... مجھے معاف کر دو پلیز! میں تمہیں ناراض نہیں دیکھ سکتی۔''

''او کے...... او کے...... جو کچھ تم نے میرے لیے کہا، اس کے بعد میرے لیے سب کچھ تم ہو۔''

''مگر ست بدھائی کے بعد۔'' وہ شرارت سے مسکرائی۔

''نہیں، اس سے بھی پہلے۔ آزمانا ہے تو بولو...... میں ابھی...... اسی وقت تمہارے ساتھ جا سکتا ہوں...... کہیں بھی۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''گھوڑا آگے، گاڑی پیچھے...... جب سے دنیا بنی ہے ایسا ہی ہے...... اور رہے گا۔''

غسل نے مجھے بڑی فرحت دی۔ اتنی کہ میں نے اونچی آواز میں گانا شروع کر دیا۔ ''یہ لڑکی ہے کہ پھلجڑی...... میٹھی جلیبی کھٹی کڑہی...... جو میرے پیچھے پڑی۔'' یہ خوشی میری زندگی سے نہ جانے کب ایسے نکل گئی تھی جیسے بھیڑ بھاڑ میں جیب سے پرس گر جاتا ہے اور پتا نہیں چلتا۔ جب میں لندن میں تھا...... یا امریکا میں تھا...... تو کتنا ایکٹو، خوش باش، کھلنڈرا اور ہنسنے والا نوجوان تھا۔

نور نے کافی کے ساتھ جو کچھ رکھا تھا وہ میں سب کھا گیا، اس کے حصے کا بھی۔ ''میں اب بھی بھوکا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''بس اب گھر جا کے کھانا۔''

''کیا یہ...... گھر نہیں ہے......؟'' میں نے سخت حیرانی ظاہر کی۔

''دیکھو وہاں سب تمہیں مس کر رہے ہوں گے۔ پریشان ہوں گے۔''

''تم صرف میری فکر کرو۔ انہیں میں بتا دوں گا کہ میں چھٹی منا رہا ہوں۔ فریال ضرور حیران ہو گی کہ بن بتائے تم کہاں چلی گئیں۔''

''ہاں...... اگر وہ لوٹ آئی ہو گی۔''

میں نے کہا۔ ''وہ کہیں گئی ہوئی تھی؟''

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''میں نے صورتِ حال کو کافی حد تک کنٹرول کر لیا تھا۔ وہ بہت بگڑی، چیختی چلاتی......

بے عزت کیا مجھے...... نکل جانے کو کہا لیکن میں نے اس کو شراب نہیں پینے دی۔ جہاں جہاں اس نے شراب چھپا کے رکھی تھی، میں نے غائب کردی...... اسے باہر نہیں جانے دیا، شراب لانے کے لیے وہ اسٹوڈیو گئی...... شوٹنگ میں حصہ لیا...... میں نے سب کو کہہ دیا تھا کہ میڈم کو جو دینا ہے مجھے لا کر دو۔ وہاں مجھ سے تعاون کرنے والے زیادہ تھے۔ پروڈیوسر، ڈائریکٹر سمجھتے تھے کہ یہ ان کے انٹرسٹ میں ہے۔ انہوں نے بھی نچلے درجے کے ملازموں کو وارننگ دی کہ کسی نے شراب لا کے دی تو اس کی خیر نہیں۔ ایک ڈاکٹر نے میری مدد کی۔ وہ ایک اسکرپٹ رائٹر کی بیوی ہے۔ اس نے کہا کہ کسی بھی نشے کو ایک دم ترک کرنے سے وقتی خرابی ہوتی ہے۔ Withdraw Symptoms سے بے خوابی، بدمزاجی، نروس بریک ڈاؤن، سب کچھ ہوتا ہے۔ پاگل پن جیسے دورے بھی پڑ جاتے ہیں، دواؤں سے انہیں کنٹرول کیا جاسکتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ فریال نے ذہنی طور پر یہ مان لیا تھا کہ میں جو کررہی ہوں اس کی بہتری کے لیے ہے۔ ایک ہفتے میں اس کی حالت سنبھل گئی۔ معلوم ہے ایک دن اس نے کیا کہا؟"

میں نے کہا۔ "وہی جو میں کہتا ہوں، تم بہت اچھی ہو۔"

"نہیں...... کہنے لگی نور...... میں کیسے شکریہ ادا کروں تمہارا...... تم نے مجھے بچالیا ورنہ دنیا میں کون ہے میرا...... اور سب کی طرح تمہیں بھی لگتا ہوگا کہ میں کتنی خوش قسمت ہوں...... خدا نے مجھے سب کچھ دے رکھا ہے۔"

میں نے کہا۔ "اس میں کیا شک ہے میڈم۔ سب کچھ تو ہے آپ کے پاس۔"

وہ بولی۔ "کیا ہے میرے پاس......؟"

میں نے کہا۔ "اللہ نے اتنی پیاری صورت دی ہے، لاکھوں میں ایک۔ اتنے پرستار ہیں آپ کے...... دولت، عزت، شہرت سب حاصل ہے۔"

وہ بڑی اداسی سے مسکرائی۔ "صورت تو شاید تمہاری مجھ سے بہت اچھی ہے۔ تم اس لیے خوش قسمت ہو کہ تم سے کوئی محبت بھی کرتا ہوگا...... تمہارے ماں باپ، بہن بھائی ہوں گے، گھر اور خاندان ہوگا۔"

میں نے کہا۔ "پھر تو میں بھی آپ کی طرح بدقسمت ہی ہوں کہ میرا بھی کوئی گھر یا خاندان نہیں۔"

وہ بولی۔ "جس صورت پر سب فدا ہیں نور...... وہ کون ہیں......؟ دو طبقے...... ہوس پرست اور تماشائی...... محبت یہ کیا کریں گے جو عزت نہیں دے سکتے۔ اپنی بہنوں اور بیٹیوں کو ہم سے دور رکھتے ہیں۔ طوائف اور ایکٹریس یا ماڈل میں فرق نہیں سمجھتے۔ فلمی دنیا اور بازارِ حسن کو ایک سی جگہ سمجھتے ہیں۔ حسن اور جوانی سدا نہیں رہتے نور...... نہ دولت سے خریدے جاسکتے ہیں اور نہ محبت ملتی ہے۔"

میں نے تھوڑا سا کریدا۔ "محبت تو آپ نے بھی کی ہوگی۔"

وہ دکھی ہوگئی۔ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ "چھوڑو...... اب اس کے ذکر سے بھی کیا حاصل۔ جب آدمی خود قدر نہ کرے...... تو اس کے پاس کچھ نہیں رہتا۔ بادشاہ بھی فقیر ہوجاتے ہیں۔ میں ایک جواری ہوں، محبت اتنا بڑا خزانہ تھا میرے پاس کہ سنبھال کر رکھتی تو آخری سانس تک اپنی امیری پر غرور کرتی...... بس میں نے جوا کھیلا اور سب ہار گئی۔ تم ایسی غلطی مت کرنا۔ آج جو بھیڑ ہے نا میرے گرد، یہ سب چھٹ جائے گی۔ چاہنے والے غائب ہوجائیں گے۔ ایسا نہیں ہوتا، پہلے ایک محبت کرنے والا شوہر ہوتا ہے پھر ایک محبت کرنے والا بچہ آجاتا ہے پھر دوسرا...... تیسرا...... پھر ان کے بچے آجاتے ہیں۔ چاہنے والے گھٹتے نہیں بڑھتے جاتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "آپ ایسا سمجھتی ہیں میڈم۔ تو ابھی وقت ہے آپ واپس جاسکتی ہیں۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں نور، اب میرے اختیار میں نہیں رہا۔ اس نے ہی کسی اور کو زندگی کا ہم سفر چن لیا ہے۔ میرا خیال اب بھی ہے اسے لیکن ایسے ہی جیسے کوئی پرانے پڑوسی کا رکھتا ہے۔ دراصل وہ طبعاً نیک اور شریف آدمی ہے۔ آج بھی میری مدد کرتا ہے ترس کھا کے۔ وہ کسی کو بھی مصیبت میں نہیں دیکھ سکتا۔ ظلم اور ناانصافی نہیں دیکھ سکتا۔ وہ ایک رئیس ہے...... وڈیرا یا نواب کچھ بھی سمجھ لو لیکن اس کے دل میں اپنی غریب رعایا کے لیے رحم ہے...... وہ بھی اسے پوجتے ہیں، اپنا نجات دہندہ سمجھتے ہیں۔"

بس اس کے بعد وہ چپ ہوگئی پھر بولی۔ "نور یہ تم نے کیا باتیں چھیڑ دیں۔ میرا دل دکھی ہوگیا ہے...... مجھے تھوڑی سی شراب لا دو، غم بھلانے کے لیے۔ صرف آج ایک بار...... میرا وعدہ...... آج کے بعد نام بھی نہیں لوں گی شراب کا۔"

معلوم نہیں کیوں مجھے اس پر ترس آگیا۔ ڈاکٹر کے کہنے پر میں نے تھوڑی سی چھپا کے رکھی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ حالت خراب ہو تو تھوڑی سی دے دینا...... میں نے لا دی پھر میں نے کہا۔ "میڈم...... یہ شہزاد...... آپ کا وکیل، یہ

خطرناک آدمی ہے۔اس کی چھٹی کردیں۔"

اس نے حیرانی سے کہا۔"تم کیسے جانتی ہو؟"

میں نے کہا۔"یہ لالچی اور سازشی آدمی ہے...... یہ جو آپ کے پاس کبھی کبھی آتے ہیں...... رفیق صاحب، جنہوں نے مجھے بھیجا ہے، وہ کہہ رہے تھے۔ اس سے پوچھنا کتنی شادیاں کر چکا ہے۔، کس کس پر ڈورے ڈال چکا ہے...... میں نے تو جھوٹ بھی بول دیا کہ میڈم وہ مجھ پر بھی نظر رکھتا ہے۔"

فریال نے چونک کے پوچھا۔"تم سے کچھ کہا اس نے۔"

میں نے کہا۔"کہا بھی ہے لیکن میں نے اس کی نیت پہلے ہی بھانپ لی تھی۔آپ نے کچھ نہ کہا تو میں نکال دوں گی اسے۔"

وہ بولی۔"نکال دو لیکن مجھے ایک وکیل چاہیے۔"

میں نے کہا۔"وکیل بہت......"

اگلے ہی دن میں نے گارڈ سے کہا کہ شہزاد کو اندر نہ آنے دے۔آفس میں روک لے۔اس نے کہا کہ میں میڈم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔میں نے ایک لفافہ اس کے حوالے کردیا کہ یہ آپ کی اس ماہ کی فیس ہے ایگریمنٹ کے مطابق...... شرائط کے مطابق معاہدہ ختم...... اب آپ جاسکتے ہیں۔ وہ مجھ پر بگڑا کہ یہ سب تمہاری سازش ہے...... تم نے فریال کو اپنے شیطانی شکنجے میں جکڑ لیا ہے...... اسے بے بس کردیا ہے...... اور یہ سب اس نواب رفیق کی بدمعاشی ہے۔ میں اس سے بھی نمٹ لوں گا۔میں نے کہہ دیا کہ جو آپ کا جی چاہے کریں...... یہاں نظر نہ آئیں ورنہ میں پولیس کو بلالوں گی۔"

نور کی رپورٹ سے مجھے دکھ بھی ہوا تھا اور خوشی بھی۔ نور نے سارے معاملات بہت کم وقت میں ٹھیک کرلیے تھے۔دکھ فریال کے دکھ پر تھا۔اسے احساس ہوگیا تھا کہ جس راستے پر وہ چل نکلی ہے اس پر بالآخر وہ تنہا رہ جائے گی لیکن وہ سمجھتی تھی کہ واپسی نہ ممکن ہے۔شاید وہ ٹھیک ہی سمجھتی تھی۔

میں نے کہا۔"نور...... کیا اس نے اعتراف نہیں کیا کہ یہ جو نواب رفیق آتے ہیں اور میرا اتنا خیال رکھتے ہیں......"

نور نے میری بات مکمل ہونے سے پہلے کہا۔"نہیں، میرے سامنے اس نے اعتراف نہیں کیا لیکن مجھ سے کیا پوشیدہ تھا، میں چاہتی تو یہ اعتراف بھی کرالیتی لیکن فائدہ، کل ایک فلمی ہیرو اسے لینے آئے تھے۔اب وہ فلمساز بننا چاہتے ہیں۔کیا پتا ڈائریکٹر بھی خود ہی ہوں۔ان کے ساتھ معاملات ہو رہے ہیں۔دونوں کے نام پر فلم چل جائے گی۔"

میں نے کہا۔"وہ رات کو نہیں آئی؟"

"نہیں...... اس نے فون پر بتا دیا تھا، پہلے دیکھ لوں۔ اس نے مجھے کال کیا یا نہیں۔" نور نے اپنا موبائل فون اٹھالیا۔

پھر مجھے ہی خیال آیا کہ اس طرح روپوش رہنے کی کیا ضرورت ہے۔راجا نے بھی اب کچھ کہنا چھوڑ دیا ہے کہ دو کشتیوں کا مسافر ڈوبنا چاہتا ہو تو اسے ایک حد تک روکا جاسکتا ہے...... باقی سب اتنا ہی کہتے جتنا راجا کہتا ہے...... راجا دوست ہے اور دوستی نبھاتا ہے۔

میں نے اپنے موبائل فون کو آن کیا تو اس پر جو مس کالز تھیں وہ راجا یا رابعہ کی تھیں۔باقی غیر معروف نمبر تھے...... میں نے نمبر ملایا تو کال ملنے کے بعد چند سیکنڈ تک بہت سی آوازوں کا شور سنائی دیتا رہا جس میں نمایاں آواز ثریا کی تھی۔

پھر راجا نے شاید باہر آ کے کہا۔"ہاں فیکے پتر......"

میں نے کہا۔"راجا...... یہ کیا ہنگامہ تھا؟"

"کچھ نہیں یار...... ثریا کی جنگ چل رہی تھی لیلیٰ بھابی سے...... بوبی کے مسئلے پر۔تو نے کیوں فون کیا؟"

میں نے کہا۔"یہ نہیں پوچھے گا کہ میں کہاں ہوں؟"

"نہیں...... چوروں کی طرح فرار ہوا تھا تو ہوگا ان میں سے کسی ایک کے ساتھ...... اور ظاہر ہے خوش بھی ہوگا۔"

میں نے کہا۔"یار میرا ارادہ آج بھی واپسی کا نہیں ہے۔ایک چھٹی اور مل سکتی ہے۔"

"گھر تو لوٹ کرنہ آئے...... تو وہاں بیٹھ کے بھی ست بدھائی کے معاملات کنٹرول کرسکتا ہے۔ جیسے اورنگ زیب پچیس سال دکن میں بیٹھ کے دہلی پر حکومت کرتا رہا۔"

"اتنا دور جانے کی کیا ضرورت تھی مہاراجا...... اسلام آباد کے ایوان صدر سے پورے ملک کو کنٹرول کیا جاتا ہے۔"

"لیکن یہاں ایک نہیں دو معاملات آگئے ہیں۔آج رات تیرے نہ آنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا لیکن کل......"

میں نے کہا۔"کل میں ضرور آجاؤں گا، معاملات کیا ہیں؟"

"یار ایک پیغام ملا ہے گولی کا...... وہ شامی بادشاہ کو لا رہی ہے۔"

"شامی زندہ ہے؟" میں نے کہا۔

"پیغام کے صحیح یا غلط ہونے کی تصدیق نہیں ہوئی۔ لوم یہ ہوا ہے کہ شامی کی حالت ٹھیک نہیں۔ وہ زخمی ہے ید...... اب گولی اسے کیسے لائے گی، کب لائے گی...... ہ جانے۔اچھا ہوتا وہ فون پر مجھ سے بات کرلیتی ہم انتظام ردیتے۔"

"شاید اسے فون پر بات کرنا غیر محفوظ لگتا ہو۔ دوسرا ملہ کیا ہے؟"

"وہ بھی ایک غیر مصدقہ اطلاع ہے۔ سلطان کے ے میں، وہ رانا کی قید میں ہے۔"

"یہ اطلاع دینے والا کون ہے؟"

"غنی کا کوئی سلسلہ ہے، وہ خاتون نہیں جس کا وہ زباتی اور جسمانی استحصال کرتا تھا اور اسے جاسوسی کے لیے ستعال کرتا تھا۔ رانا کے محل کی کوئی حسینہ تھی۔شادی کے بعد ی یہ رابطہ تھا مگر ریشم کو پتا چل گیا۔ ظاہر ہے اس نے نظریہ رورت کی دلیل کے جواب میں غنی کو جوتے مارے کہ اب چکر نہیں چلے گا۔ چنانچہ یہ کوئی اور سورس ہے جس کے قابلِ تاد ہونے کا ابھی خود غنی کو یقین نہیں لیکن وہ کہتا ہے کہ یہ زمائے بنا کیسے کہا جاسکتا ہے کہ جھوٹ کیا ہے اور سچ کیا۔"

"آزمانے کا طریقہ کیا ہوگا؟"

"فیکے پتر...... یہ جب ہم ملیں گے تو سوچیں گے...... ی تیرے لیے جو مسائل زیادہ اہم ہیں تو ان پر توجہ دے ات بھر......" اس نے فون بند کردیا۔

اب مغرب کا وقت ہو رہا تھا...... میں نے نور کو آواز ی تو اس نے واش روم میں سے جواب دیا۔"تیار ہو رہی ں...... آتی ہوں تم اپنے کپڑے دیکھ لو...... الماری میں ہا......"

وارڈ روب میں اپنے سائز کے کپڑے میں پہلے بھی کھ چکا تھا اور استعمال کر چکا تھا۔اس فلیٹ میں نور نے مجھے نا شوہر مشہور کر رکھا تھا جو دبئی میں ملازمت کرتا ہے لیکن ے اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا۔ میں نے صرف ٹی شرٹ بدل کیونکہ جینز جو میں نے پہن رکھی تھی ٹھیک تھی۔

دس منٹ بعد نور تیار ہو کے نکلی تو مجسم اور مکمل قیامت ی اور میرے عقل و ہوش پر بجلی گرانے کے سارے اسباب ے لیس تھی۔ ہر خوبصورت عورت بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ہر رت جانتی ہے کہ اس کی طاقت کیا ہے اور کسی مرد کی لزوری کیا ہے اور اس سے بھرپور فائدہ کیسے اٹھایا جاسکتا ہے...... نور مجھے بے خود دیکھ کے شرمائی۔ خوش ہوئی اور ی...... اس نے پوچھا کہ ایسے کیا دیکھ رہے ہو اور میں نے وہی کہا جو وہ سننا چاہتی تھی جو سچ بھی تھا کہ اس کے جلوۂ حسن کی چکا چوند نے مجھے اندھا کردیا ہے...... میں کیا دیکھوں نظر میں اور کچھ ہے ہی نہیں۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟" اس نے گاڑی میں بیٹھنے کے بعد پوچھا۔

"اس کا فلمی جواب وہی ہے۔ دنیا دے اس نکرے جتھے بندہ نہ بندے دی ذات ہووے...... لیکن اس کے لیے قطب شمالی یا ہمالیہ کی چوٹی پر جانا ضروری نہیں...... ایک جگہ ہے میرے ذہن میں...... ایک نائٹ پکنک پوائنٹ۔"

"رکو۔سچ مچ ایسی ہی جگہ ہے وہ پکنک پوائنٹ تو وہاں کھانے کو بھی تازہ ہوا کے سوا کچھ نہیں ملتا ہوگا۔"

میں نے سر کھجا کے کہا۔"یہ تو ہے۔خونِ دل پینے کو اور زخم جگر کھانے کو۔یہ سزا ملتی ہے لیلیٰ تیرے دیوانے کو۔"

وہ اڑ گئی۔"مگر لیلیٰ کو سزا کیوں ملے۔ میں کچھ لے لوں کم سے کم اپنے کھانے کے لیے۔"

"رائٹ۔ پھر میں تمہیں کھالوں گا جیسے دانہ کھاتی ہے مرغی۔ پھر مرغی کو کھالیتا ہے آدمی۔"

فلائٹ میں تقریباً بیس منٹ کی تاخیر ہوئی۔نور نے گرم کافی سے تھرماس بھرلیا۔فریج میں سے مکھن ڈبل روٹی نکالے۔ کچھ بسکٹ رکھ لیے۔ پھر مجھے شرم آئی اور میں نے راستے میں ایک جگہ سے کلب سینڈوچ اور بروسٹ لے لیے۔ گاڑی نے راوی کا پل کراس کیا اور جی ٹی روڈ پر دوڑنے لگی تو نور کا تجسس جاگا۔"جھوٹے۔ہم دینہ جا رہے ہیں۔"

"پاگل۔ بے وقوف۔دینہ جانے کے لیے میں جھوٹ بولوں گا؟ تم خود اپنی عقل استعمال کرتیں تو یہ سوال ہی نہ کرتیں۔نور کو میں دینہ کیسے لے جاسکتا ہوں اپنے ساتھ۔"

وہ شرمندہ سے زیادہ اداس ہوگئی۔"ہاں۔ایسا تو مجھے سوچنا بھی نہیں چاہیے۔"

پندرہ بیس منٹ خاموشی میں گزر گئے تو میں نے کہا۔"یوں اپنا موڈ خراب مت کرو۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور باہر دیکھتی رہی۔

میں نے کہا۔"جان۔ایک دن تمہیں دینہ ضرور لے جاؤں گا میں۔"

اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔"تیرے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا۔"

"یہ جھوٹ نہیں ہے۔میں بھی جانتا ہوں کہ ایسے ہمیشہ نہیں چل سکتا۔اس کے لیے مجھے تھوڑا سا وقت چاہیے۔

سوچنے کے لیے، پلان کرنے کے لیے۔"

"پلان......" وہ غرا کے بولی۔ "محبت بھی تم پلان کرتے ہو۔ شادی پلان کرو گے۔ پھر فیملی پلاننگ آئے گی۔ ست بدھائی ترقیاتی پلان میں یہ بھی ہے۔"

میں نے بریک پر پاؤں رکھا۔ "یہی مصیبت ہے تم عورتوں کی۔ فوراً طعنے دینے لگتی ہو۔ کیا فائدہ آگے جانے کا جب تمہارا موڈ ہی ٹھیک نہیں۔ ہم واپس چلتے ہیں۔ تمہیں گھر ڈراپ کر کے میں بھی چلا جاؤں گا۔"

اس نے ایک دم میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ "تم ناراض ہو گئے؟ اچھا مجھے معاف کر دو۔ واقعی بہت بے وقوف ہوں میں۔ جذبات میں عقل کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتی ہوں۔" اس نے اپنا سر میرے کندھے پر رکھ دیا۔

"یہ کیا کر رہی ہو۔ میں گاڑی چلا رہا ہوں۔ اور دیکھو سامنے سے آنے والے دیکھ رہے ہوں گے۔"

"دیکھنے دو۔ یہی کہیں گے کہ بڑی بے شرم عورت ہے۔ وہ میں ہوں۔ تمہیں منانے کے لیے اس سے زیادہ بھی ہو سکتی ہوں۔"

"من گیا بابا میں من گیا۔ مجھے منانے کے لیے آنسو نہیں۔ تمہاری ہنسی چاہیے۔"

"بابا...... بابا ہو گے تم خود۔ میں تو بے بی ہوں۔" وہ ہنس پڑی۔

جہلم سے آگے چاند نکل کے اوپر آ گیا۔ یہ چودھویں سے پہلے کا چاند تھا۔ تھوڑا سا نامکمل لیکن اتنا ہی روشن۔ سڑک کے نشیب و فراز میں پوٹھوہار کا علاقہ شروع ہوا۔ اونچی نیچی پہاڑیاں جن پر درخت تھے تو صرف کیکر کے۔ زمین سنگلاخ تھی اور پتھریلی۔ چھوٹے چھوٹے ٹیلے بارش کی یلغار سے کٹ کے مٹی کی ڈھیریوں میں تبدیل ہو گئے تھے اور سڑک کے دونوں طرف یہ پہاڑیاں۔ کٹاؤ والی زمین۔ ٹیلے اور کھائیاں ایک عجیب منظر پیش کرتے تھے جہاں دور دور تک پانی نہیں تھا۔ کھیت نہیں تھے چنانچہ آبادی بھی نہیں تھی۔

ایک جگہ میں نے آگے پیچھے دیکھ کر گاڑی کو گھمایا اور سڑک سے اتار لیا۔ یہ ایک کچا راستہ تھا۔ معلوم نہیں پیدل جانے سے یہ ہمیں کہاں لے جاتا۔ ایک ہموار جگہ پر میں نے پھر گاڑی کو گھمایا اور ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی میں دوسرا ٹرن لیا۔ آگے گہری کھائی تھی۔ خوفزدہ نور نے ایک چیخ ماری۔ اس کے ساتھ ہی میں نے بریک مارے اور گاڑی رک گئی۔ میں نے نیچے اتر کے دیکھا اور اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ "آؤ۔ یہی ہے وہ پکنک پوائنٹ۔"

نور باہر آ کے ویرانے کو دیکھنے لگی۔ "یہ......"

"میں نے کیا کہا تھا۔ کوئی دور دور تک نظر آ رہا ہے تمہیں؟"

"ابھی نظر نہیں آ رہا ہے۔ لیکن کچھ دیر بعد شیر، چیتے اور آدم خور بھیڑیے نظر آنے لگیں گے۔ شاید وہ ہمیں اس وقت بھی دیکھ رہے ہوں کہ اللہ نے ڈنر کا انتظار تو کر دیا۔"

میں نے ہنس کے کہا۔ "یہاں صرف لومڑیاں اور گیدڑ ہو سکتے ہیں مگر وہ انسان کی شکل سے نفرت کرتے ہیں۔ نکالو اپنا سامان۔"

"جان۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"کس سے ڈر لگ رہا ہے۔ مجھ سے؟" میں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ "ابھی تھوڑی دیر میں تمہارا سارا ڈر دور ہو جائے گا۔ پھر تم اس تنہائی اور سکون کو انجوائے کرو گی۔"

وہ آہستہ آہستہ اوپر کی جانب قدم بڑھانے لگی۔ پہاڑی کے اوپر تک مشکل سے سو فٹ کی اونچائی تھی اور یہ ایسی جگہ تھی جہاں سے نہ کوئی ہماری گاڑی کو دیکھ سکتا تھا اور نہ ہمیں۔ اوپر پہنچنے کے بعد مجھے بیس پچیس فٹ قطر کی ہموار جگہ دیکھ کے اطمینان ہوا۔

میں نے سامان نیچے رکھ دیا۔ "اب بتاؤ کیسی ہے یہ جگہ...... بیٹھو۔"

اس نے ناہموار زمین کو دیکھا۔ "یہاں......؟"

"بڑی غلطی ہو گئی۔ گھر سے قالین بھی لے آتے۔ اچھا تم ٹھہرو، میں گاڑی میں سے کور لے آتا ہوں۔"

"نہیں۔ میں ساتھ چلوں گی۔"

"ارے بابا دو منٹ لگیں گے۔ وہ کھڑی ہے ہماری گاڑی سامنے۔" میں نے کہا لیکن وہ میرے ساتھ چل پڑی۔

میں نے گاڑی کا کور نکالا تو نور نے دو کشن بھی اٹھا لیے۔ واپس اوپر جاتے ہوئے اس نے ایک درخت سے شاخ توڑ لی۔ "جھاڑو" اس نے مسکرا کے کہا۔

کور بچھانے سے پہلے اس نے جگہ کو صاف کیا۔ "کیڑے مکوڑے ہوں گے۔" اس نے کہا پھر کور کے اوپر کشن رکھ کے بیٹھ گئی۔

میں دوسرے کشن کو سر کے نیچے رکھ کے لیٹ گیا۔ "کافی نکالو۔"

چاند اب تقریباً ہمارے اوپر آ گیا تھا۔ اس کا دھند جیسا اجالا چاروں طرف پھیلے ہوئے منظر کو روشن کر رہا تھا۔ نور نے مجھے کافی دی اور میرے قریب بیٹھ گئی۔ اس کا خوف کسی حد

تک دور ہو گیا تھا۔ کچھ دیر ہم خاموشی سے کافی پیتے رہے اور سامنے کے منظر کی ویرانی، خاموشی اور سکون کو اپنے احساس میں جذب کرتے رہے۔

ماحول کے طلسم نے آہستہ آہستہ نور کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ کشن میرے قریب رکھ کر لیٹ گئی۔ "مجھے ایسا لگتا ہے کہ ہم دونوں کے سوا اس پوری دنیا میں کوئی نہیں۔"

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ "آدم اور حوا کی طرح ہمیں اس دنیا میں اتار دیا گیا ہے کہ جاؤ اپنی جنت خود آباد کرو۔"

"یا ہم چاند پر اتر چکے ہیں۔"

میں نے ہنس کے کہا۔ "ہاں، مجھے چاند پر چرخہ کاتنے والی بڑھیا کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ تم کہاں ہو میرے بچو۔ بس اپنا گھر یہاں بنا لو۔"

اس نے اپنا چہرہ میری طرف کر لیا۔ "ہاں کیونکہ ست بدھائی میں تو جگہ ہے نہیں اس گھر کے لیے۔"

"طعنے مت دو میری بلبل۔"

"مجھے فلمی مکالموں سے مت بہلاؤ۔ میں خواب دیکھتے ساری زندگی نہیں گزار سکتی۔ مجھے تمہارے ساتھ رہنا ہے، ست بدھائی میں۔"

"یہ تو میں بھی چاہتا ہوں۔ بس تھوڑا سا انتظار۔"

اس نے میری پسلی میں کہنی ماری۔ "بہت کر لیا میں نے انتظار بھی اور میں فریال نہیں ہوں کہ تنگ آ کے تمہیں چھوڑ جاؤں۔ نہ میں ڈرتی ہوں کسی سے کہ کون کیا کہتا ہے اور کیا سمجھتا ہے۔ ہمارے تمہارے بیچ میں کوئی نہ آئے ہاں۔"

میں نے کہا۔ "مگر اب تم نور جہاں نہیں ہو، نور ہو۔"

"پھر......؟"

"دیکھو۔ اگر میں فریال سے یا نور جہاں سے شادی کر لیتا تو کوئی مسئلہ نہ ہوتا، کوئی حیران نہ ہوتا۔ تمہارا تو نام بھی کسی نے نہیں سنا۔"

"پھر کیا ہوا۔ اگر تم کہو کہ آج ہی مجھ سے ملے اور مجھ سے شادی کر لی تو کیا باقی سب مل کے تمہیں عاق کر دیں گے؟"

میں نے ہنس کے کہا۔ "نہیں، اتنا بڑا جھوٹ میں بول نہیں سکتا۔ وہ بھی ان کے سامنے جو اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں ایسا کر ہی نہیں سکتا جو میرے مزاج کو سمجھتے ہیں۔"

"میں کچھ نہیں جانتی۔ تم کچھ کرو۔"

میں نے سر ہلایا۔ "خاتون میں سوچ رہا ہوں بلکہ سوچ چکا ہوں۔ تم ست بدھائی آؤ اسی طرح جیسے ابھی ڈاکٹر مہدی حسن اور ان کا بیٹا آئے ہیں۔ باعزت طور پر۔ ایک باعزت بیک گراؤنڈ لے کر اور کہو کہ جب میں نے ست بدھائی کے ترقیاتی پروگرام کے بارے میں سنا تو میں بہت متاثر ہوئی۔"

"متاثر تو میں اتنی ہوں......"

"بیچ میں مت بولو۔ فرض کرو تم کہو میں نے لندن میں سنا۔"

کہنیوں کے بل ہو کے اس نے شرارت سے کہا۔ "کس سے سنا؟"

میں نے اپنے دونوں بازو اس کے گرد لپیٹ دیے۔ اس نے اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا۔ "تم لندن سے آؤ گی۔"

"پہلے بھی تم مجھے سات سمندر پار بھیج رہے تھے۔"

"وہ اور بات تھی۔ میں تمہیں نہیں نور جہاں کو بھیج رہا تھا، اس کی جان بچانے کے لیے تاکہ وہ نور بن کے لوٹے۔ اب میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔"

وہ ایک دم اٹھی۔ "سچ؟" اس نے خوشی میں میرے ماتھے کو میری آنکھوں اور گالوں کو چوما۔ "ہم دونوں جائیں گے ایک ساتھ۔" اس نے میرے لبوں پر اپنے لب رکھ دیے۔

میں نے اس کے بالوں کو اپنے چہرے کے گرد سایہ فگن دیکھا۔ چاند اس کالی گھٹا میں روپوش ہو گیا۔ سکون اور خاموشی میں نور کے وجود کی خوشبو بھر گئی۔ اس کے قرب کی نرم حرارت نے مجھے اسیر کر لیا، بے بس کر دیا۔ میں بھول گیا کہ میں کیا سوچ رہا تھا، کیا کہہ رہا تھا۔

خود فراموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد نور نے کہا۔ "میرے لندن سے آنے کے لیے میرا لندن جانا ضروری ہے؟"

"کیا مطلب؟" میں آسمان کو دیکھتا رہا۔

"ہم کہیں بھی رہیں۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں، فریال کے علاوہ راجا لندن جا رہا ہے۔ یہ ڈاکٹرز فیملی جو اب ہمارے ساتھ ہے یہ لندن میں تھے۔ میں چاہتا ہوں تم باوقار اور مستند طریقے سے آؤ۔ وہاں ایک ڈاکٹر شائستہ ہے......"

"اور وہ ہے...... عائشہ...... جو پہلے ایلیشا تھی۔"

"وہ بھی ہے۔ اس کے باپ کی فرم تھی جہاں میں بڑی اچھی پوزیشن میں تھا۔ وہ بہت اچھا آدمی تھا۔ اس کی بیوی سخت متعصب تھی اور مجھے اتنا ناپسند کرتی تھی کہ اس نے مجھے قتل کرانے کی کوشش بھی کی تھی اور بالآخر مجھے برطانیہ سے

نکلوادیا، ایک کالے ہندوستانی سے۔ وہاں ہر ایشیائی کو انڈین کہتے ہیں۔ وہ اپنی بیٹی کے مجھ سے تعلق پر چراغ پا تھی۔ مجھے کیا وہ شاید اپنی بیٹی کو بھی قتل کرادیتی مگر مجھ سے شادی ہرگز نہ کرنے دیتی۔ اس کا باپ بالکل برعکس بالکل متعصب نہیں تھا۔ وہ تو چاہتا تھا کہ میں عائشہ سے شادی کر کے وہیں سیٹل ہو جاؤں اور اس کی فرم کو سنبھال لوں۔ اس کا بیٹا کوئی نہیں تھا۔ پھر اسے بیٹی کا بہت خیال تھا۔ خیر، وہ ماضی کا قصہ ہے۔ میں تمہیں اس سے ملوادوں گا۔ تم کچھ دن ان کے ساتھ رہو۔ ان کی فرم میں ٹریننگ لو یا کوئی شارٹ کورس کرلو۔''

نور نے خلافِ توقع میری تجویز کو مسترد نہیں کیا۔ وہ غور سے سنتی رہی۔ ''شارٹ کورس کتنا لانگ ہوتا ہے۔''

''چھ مہینے۔ تمہیں انٹیریئر ڈیزائننگ سے کوئی دلچسپی ہے؟''

''ہر عورت انٹیریئر ڈیزائنر ہوتی ہے۔ گھر سجانا سنوارنا ہمیشہ سے عورتوں کا ہی کام تھا۔''

''چلو پھر طے۔ تم یہ کورس کر کے آؤ گی اور ہمارے ساتھ رہو گی۔ حویلی، اسپتال، اسکول سب کو خوبصورت بناؤ گی۔ میری زندگی کے علاوہ۔''

''میں کوئی وعدہ نہیں کرسکتی۔ یہ ہوسکتا ہے کہ میں پہلے ہی بھاگ آؤں۔ ہاں تم چھ مہینے ساتھ رہنے کا وعدہ کرو۔''

''تم پاگل ہو۔ میں چھ دن بھی غیر حاضر رہوں گا تو پیچھے نہ جانے کیا ہو جائے گا۔''

''محض خود فریبی ہے آپ کی۔ یعنی کیا ہوگا؟ کوئی آپ کی ریاست پر قبضہ کرلے گا۔ جیسے کہ پہلے ہوتا تھا۔ کوئی راجا حملہ کردیتا تھا ایک راجا تو ہے وہاں بھی۔''

''تمہیں وہی کرنا ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔''

''تم بھی نوٹ کرلو۔ یہ ہوسکتا ہے میں چھ ہفتے بھی اکیلی نہ رہوں اور بھاگ آؤں۔ میری سند کی تصدیق کون کرے گا، میں کہہ دوں گی کہ میں کوالیفائیڈ ڈیکوریٹر ہوں۔''

''اگر میں اپنی قسم دے دوں؟''

''کوئی فائدہ نہیں، تم میرا جذباتی استحصال نہیں کرسکتے۔''

میں نے کہا۔ ''اس وقت میں اور کیا کررہا ہوں؟''

''کچھ نہیں، جو کیا ہے میں نے کیا ہے۔ چھینا ہے تمہیں فریال سے۔ جیسے فریال نے عائشہ سے چھینا تھا۔ بس وہ قبضہ برقرار نہیں رکھ سکی۔ میں چھوڑنے والی نہیں ہوں۔ مردگی تو مار کے۔''

''مرے کو کیا مارو گی اور اس سے زیادہ تم پر مرنے والا کون ہوگا۔ دیکھو ایک ریاست کا نواب، برطانیہ امریکا سے کوالیفائیڈ ایم بی اے تمہارے ساتھ کہاں پڑا ہے۔ کوئی سوچ سکتا ہے؟ تصور کرسکتا ہے اس کا؟ مگر اس میں کوئی شک نہیں تم نے کر دکھایا۔ یہی اس نے کیا تھا، عائشہ نے جو ایک عالی نسب لارڈ کی بیٹی تھی۔ اکلوتی تھی اس کی خوبصورتی کے چرچے تھے۔ وہ ایسے مرمٹی مجھ پر کہ سب کچھ چھوڑ دیا۔ گھر مذہب، ماں باپ سے رشتہ۔ وہ تو ملک چھوڑنے پر تیار تھی۔ پاسپورٹ، ویزا۔ یہاں تک کہ اسی فلائٹ پر سیٹ بھی لے چکی تھی جس سے مجھے آنا تھا۔ مگر جو کام تم نے کیا، وہ نہ کرپائی۔ فریال سے مجھے نہ چھین سکی......نور......! تم سن رہی ہو؟''

لیکن وہ نہیں سن رہی تھی۔ وہ سو چکی تھی۔ اس کی سانس بڑی پُرسکون تھی۔ میں بول رہا تھا اور وہ نہ جانے کیا خواب دیکھ رہی تھی۔ میں اسے دیکھتا رہا۔ اس نے نیند میں بھی ایک ہاتھ سے مجھے پکڑ رکھا تھا۔ جیسے اسے ڈر ہے کہ کہیں میں اسے اکیلا چھوڑ کے نہ نکل جاؤں۔ پاگل لڑکی۔ حقیقت یہی تھی کہ اس نے مجھے اپنی دیوانگی والی غیر مشروط محبت سے جیتا تھا۔ فریال کی محبت بالآخر مشروط ثابت ہوئی۔ جو وہ چاہتی تھی وہ میں نہیں کرسکتا تھا۔ نور جہاں نے اپنی ذات کی نفی کی تھی۔ میری خوشی کے لیے اپنی خوشی کو قربان کردیا تھا۔ میرے جذبات کو مقدم سمجھا تھا۔ پھر یہ کیسے ہوسکتا تھا کہ جیت اس کی نہ ہوتی۔

معلوم نہیں کب نیند نے مجھے بھی آلیا۔ پھر میری آنکھ کھلی تو رات کا سفر ابھی باقی تھا۔ چاند کافی آگے نکل گیا تھا۔ تاریک آسمان میں ستارے دمک رہے تھے۔ میں نے نور جہاں کو دیکھا۔ وہ کمر پر ہاتھ رکھے کھڑی تھی۔ چاندنی اس کے جسم کے ہر خم وقوس کو روشن کررہی تھی۔ وینس کے مجسمے کی طرح اس کا بدن حسن اور تناسب کا شاہکار نظر آتا تھا۔

میں اٹھا تو وہ ایک دم پلٹی۔ میں اس کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ ''کیا دیکھ رہی ہو؟''

''دیکھ نہیں رہی تھی۔ پرواز کررہی تھی۔ میں وہاں تک گئی اور پھر وہاں تک۔'' اس نے ہاتھ اٹھا کے انگلی سے اشارہ کیا۔ ''کتنی خوبصورت ہے یہ جگہ، بالکل خواب کے کسی منظر کی طرح۔ مگر اسے محسوس کیا جاسکتا ہے۔''

''تمہیں بھوک نہیں لگی؟''

وہ ہنسی۔ ''بھوک ہی سے آنکھ کھلی۔ ورنہ سوتی رہتی صبح تک۔ سب ٹھنڈا ہو گیا ہوگا۔''

''میرے جذبات کے سوا۔'' میں نے کہا۔

ہم سب کھا گئے۔ مگر وہ سب بچ گیا جو نور گھر سے لائی تھی۔ کھانے کے بعد بھی ہم باتیں کرتے رہے۔ میں نے پوچھا۔ ''کیسا لگا تمہیں یہ پکنک پوائنٹ۔''

''جان۔ ہم پھر آئیں گے یہاں، شادی کے بعد۔ مجھ سے وعدہ کرو۔''

''ہم ہر روز نہ سہی، ہر ہفتے مہینے میں ایک بار آسکتے ہیں۔''

''نہیں۔ بس ایک دفعہ آئیں گے، صرف ایک بار۔ اپنی سہاگ رات مجھے اس حویلی کے کسی سجے سجائے کمرے میں نہیں گزارنی۔ کسی فائیو اسٹار ہوٹل کے برائیڈل سویٹ میں بھی نہیں۔''

''پگلی لڑکی۔'' میں نے اس کے بالوں کو چہرے پر سے ہٹایا اور اسے چوما۔

''نہیں جان، مجھے بتاؤ کیا یہ نہیں ہوسکتا؟ ہوسکتا ہے نا......''

''کیا اب چلیں......چار بجے ہیں۔''

''مجھے میری بات کا جواب دو۔'' وہ میرے سینے پر مکے مارنے لگی۔

''او کے۔ او کے۔ تشدد سے منوا رہی ہو نا۔ انکار کیسے کرسکتا ہوں میں۔ تمہارے حسن وشباب کا تھانہ ہے اور نازوادا کی چھترول۔''

ہم گھر پہنچے تو سورج نکلنے کو تھا لیکن نور نے کہا کہ اتنی جلدی کیا ہے۔ ہم پھر سو گئے۔ میں دوپہر کے بعد اٹھا۔ غسل کر کے کپڑے بدلے اور اسے چوم کے نکل آیا۔ اس نے تھوڑی سی آنکھیں کھول کے مجھے دیکھا مسکرائی اور پھر سو گئی۔ میری حالت اس شرابی جیسی تھی جس نے تمام رات مے خانے میں گزار دی ہو۔ میں ابھی تک نشے میں تھا اور گزری ہوئی رات کا ہر لمحہ میرے خیالوں میں بس گیا تھا۔ میں نیم مدہوشی میں ڈرائیونگ کررہا تھا اور اگرچہ گاڑی مجھے دینہ کی طرف لے جارہی تھی لیکن میرا تصور پیچھے نور کے ساتھ تھا۔

جب گاڑی حویلی میں داخل ہوئی تو اچانک جیسے خواب ٹوٹ گیا۔ میں ایک خیالی دنیا کی سرحد عبور کر کے حقیقت کی دنیا میں پہنچ گیا۔ وہاں سب لوگ کھانے کی میز پر تھے۔ میں ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ کسی نے مجھ سے نہیں پوچھا کہ میں کہاں تھا اور کس کے ساتھ تھا۔ احمد حسن کو دیکھ کے مجھے شرمندگی کا احساس ہوا۔ میں نے ایک بار بھی نہیں پوچھا تھا کہ اس کے والد کی طبیعت کیسی ہے۔ اب وہ ٹیبل پر موجود تھے۔ آخری کنارے پر جہاں کبھی میرے ابا بیٹھتے تھے۔ وہ پرہیزی کھاتے تھے اور وہ بھی بہت کم۔

راجا نے اچانک میری طرف جھک کے کہا۔ ''یہ ہوسکتا ہے کہ آج رات شامی پہنچ جائے۔''

میں چونکا۔ ''یہ کس نے بتایا؟''

''خود گولی نے فون کیا تھا۔ اس کو دو گولیاں لگی تھیں۔ وہ چل نہیں سکتا، کھڑا بھی نہیں ہوسکتا۔''

میں فکر مند ہو گیا۔ ''ہم علاج کے لیے اسے باہر بھجوا دیں گے یا یہاں کسی اچھے اسپتال میں......''

ڈاکٹر مہدی حسن نے کہا۔ ''نہیں۔ ہم اس کا علاج خود کریں گے۔''

''اسے سرجری کی ضرورت ہوگی۔'' میں نے کہا۔

وہ بولے۔ ''احمد ایک اچھا ڈاکٹر ہے، اس کا باپ سرجن ہے۔''

احمد حسن نے کہا۔ ''آپ سرجن تھے پاپا۔''

''تھے کا کیا مطلب۔'' وہ مصنوعی خفگی سے بولے۔

''مطلب یہ کہ برسوں سے آپریشن نہیں کیا آپ نے۔''

''مینڈک کا بچہ کبھی تیرنا بھولتا ہے؟ خواہ اس کی ساری عمر خشکی پر گزرے۔ تمہاری دادی کہتی تھیں کہ ایک طوطا تین سال رہا ان کے پاس۔ اسے بولنا سکھایا۔ چوری کھلائی۔ سردی گرمی سے بچا کے رکھا مگر ایک دن کھڑکی کھلی رہ گئی۔ وہ یوں پھر سے اڑ گیا۔ ایسے ہی دادا تھے تمہارے طوطا چشم۔ ساٹھ سال کی عمر تک کون سی خدمت تھی جو میں نے نہیں کی۔ پاؤں تک دباتی تھی اور صلہ کیا دیا انہوں نے کہ سوکن لا کے بٹھادی۔ خود اس کے پاؤں دابتے تھے میں نے دیکھا۔''

سب ہنسنے لگے۔ ہنسنے والوں میں خود ڈاکٹر صاحب شامل تھے۔ میں نے ان کی تائید کی۔ ''آپ کی مہارت کم نہیں ہوسکتی۔''

''لیکن رفیق صاحب۔ ابھی یہاں آپریشن تھیٹر کی سہولیات کہاں ہیں۔ نہ سرجری کے آلات ہیں نہ وہ دوائیں اور سب سے بڑھ کر ایکس رے مشین۔''

میں نے کہا۔ ''آپریشن کون سا ابھی ہورہا ہے۔ باقی سب کچھ منگوایا جاسکتا ہے۔''

''سب مل جاتا ہے رفیق میاں۔ مجھے معلوم ہے ایک جگہ ایکس رے مشین بھی پڑی ہے۔ اللہ اس کی مغفرت کرے، ہمارے ایک دوست نے جرمنی سے منگوائی تھی۔ اسپتال بنالیا تھا۔ اس کی بیوی بھی ڈاکٹر تھی۔ برٹش نیشنل۔ اصلی میم۔ اس کے ساتھ پاکستان آگئی تھی۔ شادی کو آٹھ سال ہوگئے تھے۔ بڑے جذبے کے ساتھ وہ لوٹ کے پاکستان آیا تھا اور بیوی اس کے ساتھ تھی لیکن اللہ کو کچھ اور

منظور تھا۔ تم نے سنا ہوگا یا اخبار میں پڑھا ہوگا۔ وہ مری گئے تھے۔ دونوں کیبل کار میں بیٹھے۔ اس کا کیبل ٹوٹ گیا۔"

"اوہ مائی گاڈ۔" شہناز اور ثریا نے بیک وقت کہا۔

"پھر......؟"

"پھر کیا۔ اتنی بلندی سے نیچے گرے تو کون بچ سکتا ہے۔ دونوں اپنے سارے خواب لیے رخصت ہوئے۔ بعد میں اسپتال چلانے والا کوئی تھا ہی نہیں۔ اس کی فیملی میں بڑا بھائی ڈاکٹر تھا۔ چھوٹی بہن تھی لیکن وہ باہر تھے کسی نے پاکستان آنا گوارا نہیں کیا۔ وہ پراجیکٹ ختم ہوگیا۔ عمارت بند پڑی تھی۔ میں نے سنا تھا کہ بڑا بھائی آنے والا ہے۔ کسی کو اٹارنی بنا کے واپس چلا جائے گا۔ دو ہی وارث بچے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "آپ نے دیکھا ہے وہ اسپتال۔ تکمیل کے دوران یا بعد میں؟"

"ہاں۔ بہت سے لوگ اس میں دلچسپی رکھتے ہیں کہ اسپتال خرید لیں لیکن ان کا کوئی چچا ہے۔ وہ صرف عمارت لینا چاہتا تھا۔ ذاتی رہائش کے لیے۔ اسے اسپتال سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ ایک فلور کا اضافہ کر کے وہاں سپر اسٹور بنانا چاہتا ہے۔ غالباً وہی اٹارنی ہوگا۔"

"آپ بات کریں۔ اسپتال کا تمام ساز و سامان ہم اٹھا لیتے ہیں۔ فرض کریں ہم پوری نقد ادائیگی کر دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں کتنا وقت لگے گا اس ایکسرے مشین کو یہاں نصب کرتے ہیں۔ وہ نئی ہی ہے نا؟"

"بالکل نئی۔ وارنٹی پیریڈ بھی ہوگا شاید۔ آپریشن تھیٹر بھی مکمل تھا لیکن جگہ کہاں ہے ہمارے اسپتال میں۔"

"آپ بات کریں جگہ کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔" شہناز نے کہا۔ "ایکسرے مشین روم تو رکھا تھا ہم نے۔"

"آپریشن تھیٹر بن جائے گا۔ تب تک حویلی کا ایک کمرا کام آئے گا۔ اور ڈاکٹر صاحب، مجھے قیمت کا کچھ پتا نہیں۔ سودا آپ کریں۔ بس یہ موقع ہاتھ سے نکلنا نہیں چاہیے ورنہ پھر بہت دیر لگے گی اگر ہم نے مشین امپورٹ کی۔"

ڈاکٹر مہدی حسن اٹھ گئے۔ "میں ابھی پوچھتا ہوں۔"

خواتین پہلے ہی اٹھ گئی تھیں۔ میں نے نوٹ کیا کہ لیلیٰ بھابی اور ثریا میں بول چال تک بند ہے۔ وجہ تنازع بوبی تھا۔ ایک بچہ اتنی جلدی ماں پر اپنے حق سے کیسے دستبردار ہوتا۔ ثریا چاہتی تھی کہ وہ اسے ماں کے نام سے بھی نہ پکارے۔ اس کا رویہ اتنا خراب تھا کہ سوتیلی ماں بھی ڈھائی سال کے بچے پر نہ کرتی۔ یہ بات کسی کو پسند نہ تھی۔ لیلیٰ بھابی نے اسے برا بھلا کہا تو ان کی لڑائی ہوئی۔ بوبی پہلے ہی ماں کے رویے سے بددل تھا۔ اب وہ اس سے بات کرتے ہوئے بھی ڈرتا تھا اور لیلیٰ بھابی کے ساتھ ہی رہتا تھا مگر اس کی نظریں بتاتی تھیں کہ وہ دکھی ہے۔ فریاد کر رہا ہے اور شکایت کر رہا ہے۔

ماں بے حس ہو چکی تھی۔ وہ بوبی سے اس کے باپ کی بے وفائی کا بدلہ لے رہی تھی۔ ایسا نہ کسی نے دیکھا تھا نہ سنا تھا۔ میاں بیوی الگ ہو جائیں، ایک دوسرے کی صورت دیکھنے کے روادار نہ ہوں لیکن بچوں کا معاملہ ایسا ہوتا ہے کہ قانونی اور غیر قانونی جنگ جاری رہتی ہے۔

ثریا نے ممتا کے اس یقین کو باطل کر دیا اور بیک وقت سب کی نظر سے گر گئی لیکن اسے پروا نہ تھی۔ وہ احمد حسن کے پیچھے لگی ہوئی تھی۔ یہ سب کو نظر آ رہا تھا۔

میں راجا کو تلاش کر رہا تھا کہ رابعہ نے ایک دروازے سے جھانک کر کہا۔ "ذرا ایک منٹ ادھر آؤ۔"

میں اندر چلا گیا۔ وہاں لیلیٰ بھابی پہلے سے موجود تھیں۔ انہوں نے بڑی ناراضی سے کہا۔ "تم تو بس باہر کے ہو گئے ہو۔ گھر میں کیا ہو رہا ہے اس کی کچھ خبر نہیں۔"

مطلب سمجھ لینے کے باوجود میں نے کہا۔ "گھر میں آپ سب سے بڑی ہیں، میں کیوں فکر کروں۔"

"بے شرمی کی کوئی حد ہوتی ہے۔" وہ پھٹ پڑیں۔ "ثریا کو دیکھ رہے ہو۔ سب کے سامنے احمد حسن پر ڈورے ڈال رہی ہے۔ بچے کی ایسی دشمن ہو گئی ہے کہ بس چلے تو چھوڑ آئے اسے یتیم خانے میں۔"

میں نے کہا۔ "ڈیئر بھابی۔ آپ کیوں پریشان ہوتی ہیں۔ بچہ آپ کے ساتھ خوش ہے۔ آپ اس کے ساتھ خوش رہیں۔"

رابعہ نے بگڑ کے کہا۔ "یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کزن۔"

میں نے کہا۔ "تم کیا چاہتی ہو آخر۔ میں نکال دوں اسے؟"

"نہیں، وہ کہاں جائے گی۔" بھابی نے کہا۔

"تم بات کرو اس سے۔ اسے سمجھاؤ۔"

"مگر کیا بات کروں، کیا سمجھاؤں۔ وہ کہے گی یہ میرا ذاتی معاملہ ہے! اور احمد حسن کیا احمق ہے۔ اس کا باپ کافی نہیں ہے اسے سمجھانے کے لیے۔ وہ مجھ سے زیادہ معاملہ فہم اور تجربہ کار ہے۔ سب دیکھ رہا ہے۔ کیا پتا وہ بیٹے سے بات بھی کر چکا ہو۔"

"گویا تمہاری کوئی ذمے داری نہیں؟"

"کزن، میں کیا تھانیدار ہوں؟ فرض کرو احمد حسن

پھنس گیا۔ اسی طرح جیسے سب پھنس جاتے ہیں۔ میں، تم، بھابی اور ثریا۔ سب فریب خوردہ ہیں۔ عقل سب کے پاس تھی مگر کیا ہوا۔ اگر احمد حسن نے اسے پسند کر لیا تو یہ عقل کا نہیں نظر کا، دل کا اور جذبات کا مسئلہ ہوگا۔ میں کیوں دخل دوں اس میں؟ تم بتاؤ تمہارے ساتھ اس کا رویہ خراب ہے؟"

رابعہ کا منہ سوج گیا۔ "میں نمٹ سکتی ہوں اگر وہ میرے ساتھ بدتمیزی کرے۔"

لیلیٰ بھابی نے کہا۔ "بدتمیزی وہ کسی سے نہیں کرتی۔ کوئی خفا ہو تو فوراً منا لیتی ہے۔ معافی مانگ لیتی ہے۔"

"ایک نمبر کی ڈرامے باز ہے۔" رابعہ نے رائے دی۔

راجا نے مجھے باہر سے آواز دی۔ "یار کہاں گھسا ہوا تھا۔"

میں نے کہا۔ "کمال ہے میں تجھے تلاش کرتا ہوا ادھر آ گیا تھا۔"

ہم باغ کے آخری حصے میں سرسبز گھاس پر بیٹھ گئے۔ حسب توقع راجا نے پہلا سوال یہی کیا۔ "ایسی کیا آفت آ گئی تھی کہ تجھے آدھی رات کو اٹھ کے جانا پڑا۔"

میں نے کہا۔ "راجا یہی سمجھ لے کہ دماغ خراب ہو گیا تھا میرا۔ دورہ پڑا تھا مجھ پر۔"

"یہ میرے سمجھنے کی بات نہیں۔ تجھے سمجھنا چاہیے کہ یہ نوجوان لڑکوں جیسی عاشق مزاجی کا مظاہرہ تجھے سوٹ نہیں کرتا۔ نہ تیری عمر ہے اور نہ تیرے منصب کے شایان شان۔"

"منصب...... مائی فٹ۔ راجا تو کیسی باتیں کر رہا ہے۔ میں وہی رفیق احمد ہوں اور دل کے معاملات کا منصب سے کیا تعلق۔ عشق ہو جائے تو ستر سال والا بھی سترہ سال کا بن جاتا ہے۔"

وہ مجھے دیکھتا رہا۔ "پھر تو ایسا کر یہ راج پاٹ چھوڑ دے۔ ست بدھائی بخش دے کسی کو۔ لعنت بھیج سارے ترقیاتی پروگرام پر جس کی وجہ سے ہم سب تیرا ساتھ دے رہے ہیں۔ الو کے پٹھے ہیں ہم سب جو اپنا وقت برباد کر رہے ہیں۔ اچانک تیرے لیے عشق زیادہ اہم ہو گیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "راجا۔ تیرا غصہ بھی جائز ہے لیکن میرا یہ مطلب نہیں تھا۔"

"پھر کیا مطلب تھا؟ میں تجھے بتا دوں کہ تیرا منصب کیا ہے۔ کس کی ہے یہ ریاست۔ نواب کون کہلاتا ہے؟ اس سارے علاقے میں دس دس کوس تک لوگ کے ایک نجات دہندہ کی طرح دیکھتے ہیں۔ آئی جی عبداللہ صاحب سے شامی بادشاہ جیسے ڈاکو تک سب کس پر اعتماد کرتے ہیں۔ رانا میرا نہیں تیرا دشمن ہے۔ اور ابھی دو دن پہلے کیا ہوا تھا؟ اس کے باوجود......"

میں نے کہا۔ "آئی ایم سوری راجا۔ میں اپنی غلطی مانتا ہوں۔"

"غلطی؟ یہ بے وقوفی تھی۔ کمال ہے آپ ایک لڑکی کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ داؤ پر صرف آپ کی زندگی نہیں ہم سب کا مستقبل بھی ہے۔ میں اور شہناز کیا جھک مارنے آئے ہیں یہاں۔ اور یہ باپ بیٹا، جو اس وقت بھی پتا نہیں کس کس کو فون کر رہے ہیں کہ وہ ایکس رے مشین اور آپریشن تھیٹر کا سامان ہمیں مل جائے۔"

میں نے کہا۔ "راجا، نظام کو ایک آدمی کے نہ ہونے سے فرق نہیں پڑنا چاہیے۔ دی شو مسٹ گو آن۔"

"دیکھ نکے پتر۔ اس حویلی کے اندر تیری حیثیت ایک فیملی کے سربراہ کی ہے۔ تیرے جذبے سے متاثر ہو کے ہم بھی آئے ہیں اور یہ باپ بیٹا بھی۔ اور بھی لوگ آئیں گے لیکن اس سے الگ تیری میری دوستی کا رشتہ ہے۔ رابعہ کے رشتے کا تیرے منصب سے کوئی تعلق نہیں۔ تجھے کسی کا خیال نہیں؟ تو صرف نور جہاں کا ہے اور اگر ہے تو اسے لے آ۔ شادی کر لے اس سے، سب قبول کریں گے تیرے فیصلے کو۔"

میں نے کہا۔ "مجھے اور شرمندہ مت کر۔"

راجا نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "میں تجھے کیوں شرمندہ کروں گا۔ میں تجھے احساس دلا رہا ہوں کہ تو ہمارے لیے کتنا اہم ہے۔ یہاں ہزاروں لاکھوں لوگوں نے تجھ سے کتنی امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں۔ وہ بڑے پُرامید ہیں کہ رانا کی جگہ تو اسمبلی کا رکن منتخب ہوگا تو اس علاقے کی قسمت بدل جائے گی۔ اور یہ بات تجھے بھی تسلیم کر لینی چاہیے کہ تیری جگہ لینے والا کوئی نہیں۔ نہ میں نہ ڈاکٹر شہناز، نہ کوئی اور۔ یہ بات رانا بھی جانتا ہے۔ وہ صرف تیری جان کا دشمن ہے اور اسی لیے ساری سیکیورٹی ہے۔"

"راجا میں نے کہا نا کہ آئندہ محتاط رہوں گا۔ اب کوئی اور بات کر۔ یہ بتا شامی کے بارے میں خبر کیا ہے؟"

"پہلی خبر تو بڑی غیر مصدقہ تھی۔ پتا نہیں کون تھا جو ہمارے ایک سیکیورٹی گارڈ کے پاس آیا۔ سائیکل پر تھا لیکن اپنا چہرہ بکل میں چھپا رکھا تھا۔ کہنے لگا کہ شامی بادشاہ نے نواب دوست کو سلام بولا ہے۔ بس اتنا کہہ کے نکل گیا۔ گارڈ کے روکنے پر بھی نہیں رکا۔ گارڈ نے اندر والے گارڈ سے کہا۔ اس نے مجھے بتایا۔ بہت سوچنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا

کہ یہ مذاق نہیں ہوسکتا۔ شامی ایسے ہی پہلے بھی رابطہ رکھتا تھا۔ وہ دیوانہ بابا اس کا نامہ بر تھا جو بعد میں مارا گیا۔ سائیکل پر آنے والے کو ڈر تھا کہ اسے کوئی پہچان نہ لے۔ اس لیے چہرہ بکل میں چھپا کے آیا تھا۔ پھر پیغام کے الفاظ میں نواب دوست صرف شامی کہہ سکتا تھا۔ اگر نواب صاحب ہوتا تو مجھے شک پڑتا۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ شامی کی بیوی کا یقین غلط نہیں ثابت ہوا۔ شامی زندہ تھا۔ سلام بھیجنے کا مقصد بھی یہی تھا۔"

میں نے کہا۔" پیغام لانے والا سائیکل پر آیا۔ تو اس سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ خود شامی بھی قریب ہی موجود ہوگا۔"

"ہوسکتا ہے اور نہیں بھی۔ وہ رات کو آیا تھا۔ اندھیرا پھیل جانے کے بعد۔ آدھی رات کے بعد میرے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ فون کرنے والی گولی تھی، کہنے لگی نواب صاحب سے بات کراؤ۔ میں نے پوچھا کہ تم کون ہو تو ہنسنے لگی کہ راجا جی۔ میں نے کیا کہا تھا، تم سب مانتے نہیں تھے۔ مذاق اڑاتے تھے میرا۔ میں نے اسے تلاش کرلیا۔" میں نے کہا۔"گولی؟ شامی زندہ ہے، کہاں ہے؟" کہنے لگی کہ میں کب سے نواب بھائی سے بات کرنے کی کوشش کررہی تھی۔ وہ کہاں ہیں؟ ان کا فون کیوں بند ہے؟"

میں نے کہا۔"میرا فون واقعی بند تھا۔ اس نے کہا تھا......"

راجا نے مجھے لات مارنے کی کوشش کی۔ اس نے کہا۔ "سالے مجنوں کی اولاد، لیلیٰ کے غلام۔ ویسے تو کس کی بات کررہا ہے؟ فریال کی یا نور کی؟"

"راجا صاحب۔ اب آپ سے کیسا پردہ۔ میں نے ان دونوں کو چھوڑ دیا ہے ـــ نئے عشق شروع کیے ہیں آپ کی دعا سے۔ آپ آگے فرمائیے۔"

"میں نے پوچھا کہ شامی ٹھیک ہے نا تو کہنے لگی کہ بس زندہ ہے۔ اسے ایک گولی کمر میں لگی تھی جو ابھی تک اندر ہی پھنسی ہوئی ہے۔ اس کی وجہ سے وہ چل پھر نہیں سکتا۔ کھڑا بھی نہیں ہوسکتا۔ میں ایک ڈاکٹر کو لائی تھی۔ اس نے کہا کہ بڑا آپریشن ہوگا، لاہور کراچی یا اسلام آباد کے اسپتال میں لیکن گارنٹی کوئی نہیں۔ میں نے پوچھا کہ اگر باہر لے جاؤں تو بولا کہ ہاں پھر زیادہ چانس ہے۔ ابھی تو شامی بضد ہے کہ مجھے نواب دوست کے پاس لے کر چلو۔" میں نے کہا کہ پھر دیر نہ کرو۔ ہم کچھ انتظام کرلیں گے۔ گولی نے روتے ہوئے کہا کہ مجھے معلوم ہے اس کا علاج ست بدھائی میں نہیں ہوسکتا لیکن میں کیا کروں...... وہ مانتا نہیں۔ اپنی ضد پر اڑا ہوا ہے۔

حالانکہ اس کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ بس اتنا ہی سنا تھا میں نے کہ پیچھے سے شامی کے دھاڑنے کی آواز آئی۔ وہ بیوی کو گالیاں دے رہا تھا کہ فضول بکواس کیے جارہی ہے۔ یہ سب بتانے کی کیا ضرورت تھی۔ اتنی لمبی کال پکڑی جاسکتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی فون بند ہوگیا۔"

"چلو اب شامی کے زندہ ہونے کی تصدیق تو ہوگئی۔ وہ آجائے یہاں پھر ہم سنبھال لیں گے۔"

"گولی خاصی مایوس اور دل شکستہ تھی۔ شامی کی حالت کچھ ٹھیک نہیں لگتی۔ وہ جتنا جلد آجائے اچھا ہے۔"

میں نے کہا" تقریباً دو مہینے ہوگئے۔ اگر اسے گولی لگی تھی تو اتنا عرصہ اس کا جسم میں رہنا بڑی خطرناک بات ہے۔"

"ہاں۔ میں نے ڈاکٹر مہدی حسن سے بھی بات کی تھی۔ انہوں نے کہا کہ سب کچھ گولی کی لوکیشن پر منحصر ہے۔ ریڑھ کی ہڈی کو فریکچر نہیں کیا ہے پھر تو امید کی جاسکتی ہے کہ معذوری سے بچ جائے۔ لیکن زخم ابھی تک خراب کیوں نہیں ہوا۔ یہ الگ مسئلہ ہے۔ ایسا ہوتا ہے مگر بہت کم کہ کوئی گولی جسم میں کسی جگہ پھنس جاتی ہے اور اسے چھیڑا نہیں جاسکتا۔ نکالنے میں رسک ہوتا ہے۔ وہ جہاں ہے وہیں رہے۔ جنگ عظیم کے ایسے کیس ہیں۔"

میں نے کچھ دیر بعد پوچھا۔" یہ سلطان کے رانا کی قید میں ہونے کی خبر کیا ہے؟"

"ایک غیر مصدقہ افواہ...... لیکن آج رات کو معلوم ہوجائے گا۔ شک تو ہمیں بھی تھا۔"

"فرض کرا ایسا ہوا...... پھر؟"

"ہم کیا کرسکتے ہیں۔ اس سے خطرہ ہے تو فریال کو۔ اور کم سے کم میں اب فریال کے بارے میں بالکل نہیں سوچتا۔"

"لیکن میں نے اس کی حفاظت کی ذمے داری قبول کی ہے۔"

"تو کیا چاہتا ہے؟ ہم رانا کی حویلی پر حملہ کرکے سلطان کو رہا کرائیں اور عدالت میں پیش کردیں؟ اس سے کیا ہوگا؟ فریال پر اس کے قتل کا الزام نہیں رہے گا مگر خطرہ بڑھ جائے گا۔ سب کچھ فریال نے خود کیا ہے آج اگر وہ اتنا ڈرتی ہے تو یہاں آجائے' حویلی میں۔ سلطان اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا ورنہ بھگتے۔"

"مطلب یہ کہ میں اسے مرنے دوں؟"

"مطلب صاف ہے۔ اسے شوبزنس اپنی زندگی سے

زیادہ عزیز ہے تو شوبزنس والے اس کی حفاظت کریں۔ اس کو سکیورٹی فراہم کریں۔ یہ جو تو نے گارڈز بھیجے ہیں' میں اصولی طور پر اس کے خلاف ہوں۔ اس نے جب تجھ سے ناتا بھی توڑ لیا تو پھر تو اس کے لیے کیوں پریشان ہے؟ یہ بات اس سے صاف کیوں نہیں کہہ دیتا کہ بی بی' اب اپنے معاملات سے خود نمٹو۔ سلطان سے معافی مانگو' اس کے پاؤں پڑو' وہ شادی کے لیے بضد ہے تو شادی کرلو۔ ہمیں معاف کرو۔"

راجا اٹھا اور غصے میں اندر چلا گیا۔

راجا کی بات سن کے مجھے سخت غصہ آرہا تھا۔ آخر وہ اتنا بے حس اور بے مروت کیسے ہوسکتا ہے کہ جس سے برسوں تعلق رہا ہو اس کی کسی مشکل وقت میں مدد نہ کرے۔ خواہ مشکل خود اسی کی پیدا کردہ ہو۔ غلطی ہم سب کرتے ہیں تو خمیازہ بھی خود ہی کو بھگتنا پڑتا ہے لیکن اس کے باوجود پڑوسی ہو یار شتے دار' دوست ہو یا شناسا' یہاں تک کہ اجنبی کسی مصیبت میں گرفتار ہو اور مدد مانگے تو انکار نا ممکن ہوتا ہے۔ فریال کے ساتھ تو معاملہ ہی کچھ اور تھا۔ یہ نا ممکن تھا کہ جو راجا نے کہا تھا وہ میں فریال سے کہہ دیتا کہ بی بی رات گئی بات گئی۔ اب میرا تمہارا کون سا رشتہ ہے کہ میں اپنا کام چھوڑ کے تمہاری مدد کے لیے دوڑوں۔ تم مرو یا جیو' مجھے کیا؟

میرا غصہ کچھ دیر میں اتر گیا۔ فریال کے لیے جو میرے جذبات تھے وہ کسی اور کے نہیں ہوسکتے تھے۔ اس کے علاوہ راجا میری سلامتی کے خیال سے پریشان تھا۔ اس کی پریشانی میں صرف خلوص کا جذبہ تھا۔ اگر میں آدھی رات کو اکیلا نہ گیا ہوتا تو کسی کو کیا اعتراض تھا۔ صرف دو دن قبل ہی رانا مجھے اغوا کرکے لے جانے میں تقریباً کامیاب ہوگیا تھا۔ اب ہر جگہ اپنی پوری سیکیورٹی کے بغیر جانا دشمنوں کو موقع فراہم کرنے کے مترادف تھا۔

رات کو راجا نے پہل کی اور مجھ سے معافی مانگ لی۔

"یار' میں غصے میں کچھ زیادہ ہی بول گیا۔"

میں نے کہا۔" تیری جگہ میں ہوتا تو اس سے بہت زیادہ کرتا' جوتے لگاتا۔"

وہ ہنس پڑا" اچھا! سو جوتے کھائے گا کہ سو پیاز!"

"دونوں کھا رہا ہوں پہلے سے۔ لیکن اب میں نے طے کرلیا ہے راجا۔ میں نور سے شادی کرلوں گا۔ اس کی میں کیا تعریف کروں' تو پھر گالیاں دے گا کہ ایسی ہی باتیں تو نے فریال کے لیے بھی کہی تھیں۔ مگر یار اس کے عشق کی انتہا دیکھ کہ مجھے خود سے شرم آتی ہے۔ ایسے میں کسی کے عشق میں فنا نہیں ہوسکتا...... کہ اپنی ہستی بھی نہ رہے...... کہ میں کچھ نہیں۔"

"ہم بڑے کمینے ہیں فیکے پتر! دل لگی کے لیے دل لگاتے ہیں لیکن یہ لڑکیاں جذبات کے معاملے میں بڑی کمزور مخلوق ہیں۔ تو شہناز کو کیا سمجھتا ہے' بڑی رکھائی سے اور سختی سے پیش آتی ہے میرے ساتھ۔ میں آج اسے چھوڑ دوں اور کسی سے دل لگالوں تو یہ پتھر موم کی طرح پگھل جائے گا۔ میرے قدموں میں گر جائے گی روتے روتے۔ ساری دھمکیاں اکڑفوں بھول کے ہاتھ جوڑے گی کہ اچھا جس سے چاہو شادی کرلو' بس مجھے مت چھوڑو۔ میں تمہاری نوکرانی بن کے رہ لوں گی۔"

"خوش فہمی ہے آپ کی۔ وہ آپ کو قتل کردے گی جیسے نور مجھے۔ آزمائش شرط ہے۔"

"تو کیا مجھ سے زیادہ جانتا ہے اسے؟"

"تو کرکے دیکھ۔"

وہ چلّا کے بولا" ابے احمقِ اعظم! میں شادی کررہا ہوں' بہت جلد...... اگلے مہینے۔"

میں دم بخود رہ گیا" تو نے بتادیا ہے اسے؟"

"کیوں نہ بتاتا۔ تیری طرح وہ تو نہیں ہوں...... جو نامرد سے بھی زیادہ ہوتا ہے...... سٹی گم ہوگئی' بھول گئی ساری شوخی۔"

"کون ہے وہ...... جس سے تو شادی کررہا ہے؟"

"شہناز اور کون؟" وہ اکڑ کے بولا اور پھر ہنس پڑا۔

میں نے اس کے ایک مکا مارا۔"سور کے بچے! ڈراما کررہا تھا میرے سامنے۔ یار کتنے عرصے بعد اتنی اچھی خبر ملی ہے سننے کو۔ کب کیا تم نے یہ فیصلہ' کس کو بتایا؟"

"ہاں' ابھی بتایا ہے تجھے۔ فیصلہ بھی آج کیا ہے بلکہ ابھی۔ اب تک دوسروں کو پتا چل ہی چکا ہوگا۔"

اس کا خیال درست ثابت ہوا۔ اندر ایک دم چیخ و پکار مچ گئی۔ جب ہم نے جھانک کے دیکھا تو شہناز سب کے بیچ میں شرم سے لال ہوئی بیٹھی تھی۔ رات گئے تک ایک طوفانِ بدتمیزی برپا رہا۔ حویلی کے اندر جیسے بھونچال آگیا تھا۔

پھر یوں ہوا جیسے خوشی سے ناچتے، گاتے، شور مچاتے مجمع میں کوئی اچانک فائر کردے۔ ایک دم موسیقی رک جائے' گیت رک جائے' ناچنے والوں کے قدم رک جائیں اور قہقہے رک جائیں۔

میں نے دروازے میں کھڑے گارڈ کی طرف دیکھا "کون آیا ہے؟"

"شامی...... شامی بادشاہ جناب عالی!" گارڈ نے

ہکلا کے جواب دیا۔
غنی سب سے پہلے نکلا۔ اس کے پیچھے میں' برآمدے میں آتے ہی میں نے سامان لانے لے جانے والے ایک پرانے خستہ حال ٹرک کو دیکھا جس میں جنگل سے کاٹی ہوئی لکڑیاں بھری ہوئی تھیں۔ ٹرک ڈرائیور شلوار قمیص پر بلوچی ٹوپی پہنے ... کھڑا تھا۔ وہ سیاہ رو دبلا پتلا اور کوتاہ قامت تھا لیکن جسم کی یا چہرے کی مناسبت سے اس کی مونچھیں بہت بڑی تھیں۔ اس نے عینک بھی لگا رکھی تھی۔ غنی نے گارڈ کو روک دیا" تم نے شاہی بادشاہ کو دیکھا؟"
گارڈ نے جواب دیا "نہیں' لیکن یہ...... اس نے کہا۔"
"یہ کون ہے' تم جانتے ہو اسے؟" غنی نے اپنا ریوالور نکال لیا۔
ٹرک ڈرائیور آگے آیا اور اس نے بڑے ڈرامائی طریقے پر اپنی مونچھوں کو چہرے سے الگ کردیا۔ پھر عینک اتاردی اور تب مجھے ایک اجنبی چہرے میں شناسائی کے آثار واضح نظر آئے۔ وہ شاہی بادشاہ کی بیوی گولی تھی۔ اس کے زردی مائل اجلے رنگ پر سیاہی بھی اپنی شناخت چھپانے کی کوشش کا نتیجہ تھی۔
ہم سب نے تقریباً ایک ساتھ کہا" گولی۔ تم......!"
"افسوس تم بھی مجھے نہ پہچان سکے نواب بھائی!" اس نے کہا۔
"یہی کامیابی ہے تمہاری۔" میں نیچے اترا" شاہی کہاں ہے؟"
اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا" پیچھے۔"
ٹرک کا پچھلا نصف حصہ درختوں کی شاخوں سے کاٹی ہوئی لکڑی سے بھرا گیا تھا۔ آگے والے حصے میں ایک چارپائی پر شاہی لیٹا ہوا تھا۔ غنی نے اس چارپائی کو احتیاط سے اتروایا اور اندر پہنچا دیا۔ ہم سب اس کے گرد جمع ہوگئے۔
میرے سامنے جو شخص پڑا ہوا تھا وہ شاہی بادشاہ سے مشابہہ ضرور تھا لیکن اس میں شاہی بادشاہ والی کوئی بات نہ تھی۔ اس کا مضبوط' صحت مند جسم آدھا بھی نہیں رہا تھا۔ اس کے کلین شیو تر و تازہ چہرے کی جگہ ایک سُتا ہوا چہرہ تھا جس پر کالے سفید بالوں کا یکساں تناسب رکھنے والی ڈاڑھی تھی۔ اس کی پرعزم عقابی آنکھوں میں زندگی کی چمک مفقود تھی۔ صبا رفتار گھوڑوں کا شہسوار۔ کالے دھن کو تجوریوں میں قید کرنے' بیویوں اور داشتاؤں کے گلے میں سونے کے بھاری طوق بنا کے اور ہتھکڑیوں جیسے کڑے بنا کے ہاتھوں میں پہنانے والے دولت مندوں پر آسمانی بجلی کی طرح قہر بن کے ٹوٹ پڑنے والا شاہی بادشاہ ہمارے سامنے خود ٹوٹا پھوٹا معذور پڑا تھا۔
اس کے لبوں پر ایک دکھ بھری مسکراہٹ نمودار ہوئی "نواب دوست! اس روز میں نہ پہنچ سکا ہتھیار ڈالنے۔"
میں نے جھک کر اس کا ہاتھ تھام لیا" مجھے اور شرمندہ نہ کرو' یہ سب میری وجہ سے ہوا۔"
اس نے میرا ہاتھ دبایا" خود کو الزام نہ دو۔ تقدیر اسی کہتے ہیں۔ شاہی دوستوں کو شرمندہ نہیں کرتا۔ اس دن بھی نہ کرتا۔"
راجا بولا۔" چھوڑو اس بات کو۔ یہ بتاؤ کیسے ہو تم؟"
وہ مسکرایا" تمہارے سامنے ہوں جیسا بھی ہوں۔"
پھر اس نے چہرہ میری طرف کیا" میں نے کہا تھا نا دوست مرنے سے پہلے ضرور آؤں گا۔ دیکھ لو' میں مرنے کے لیے آگیا ہوں۔"
"ایسی باتیں کیوں کرتے ہو شاہی! ہم تمہیں مرنے نہیں دیں گے۔ بس اب خاموش' کوئی مایوسی کی بات نہیں کرنی۔" میں نے کہا۔
گولی چپ چاپ ایک طرف کھڑی رو رہی تھی" ایسی ہی باتوں سے میرا کلیجا چھلنی کردیا ہے اس نے۔"
شہناز نے فوری طور پر ایک کمرے میں شاہی کے لیے فوری طبی امداد کا بندوبست کردیا تھا۔ شاہی کو وہاں منتقل کردیا گیا۔ اگلے ایک گھنٹے میں شہناز کے ساتھ مہدی حسن اور احمد حسن پر مشتمل ڈاکٹروں کی ٹیم نے اس کا تفصیلی معائنہ کیا اور تمام دستیاب سہولتوں کے مطابق طبی امداد فراہم کی۔
ایک گھنٹے تک ہم مضطرب بیٹھے رہے یا اس کمرے کے دروازے تک چکر لگاتے رہے جس کی حیثیت "آئی سی یو" جیسی ہوگئی تھی۔ خواتین نے گولی کو زبردستی گرما گرم کافی پلائی اور پھر غسل کرکے کپڑے بدلنے کے لیے باتھ روم میں دھکیل دیا۔ وہ برابر گولی کو تسلی دیتی رہیں کہ اب فکر کرنے کی کوئی بات نہیں۔ ضرورت پڑے گی تو ہم شاہی کو کراچی کے آغا خان اسپتال بھی لے جاسکتے ہیں اور لندن بھی۔
ایک گھنٹے بعد ہم نے شاہی کو پھر دیکھا تو وہ سو رہا تھا۔ یہ سکون دینے والی اور درد کا احساس مٹانے والی دواؤں کی بھاری مقدار کا اثر تھا۔ شاہی کے کپڑے بدل دیے گئے تھے اور صاف ستھرے بستر پر اس کی حالت میں نمایاں بہتری محسوس ہوتی تھی۔
شہناز اندر ہی رہی۔ باقی سب کو باہر نکال دیا گیا جن

میں گولی بھی شامل تھی۔ ڈاکٹر مہدی حسن نے کسی مصلحت اندیش اور معاملہ فہم مسیحا سیاست داں کی طرح بڑا محتاط مگر امید افزا بیان جاری کیا" میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ لیکن میں مایوس نہیں ہوں۔ فوری طور پر یہ بھی ناممکن ہے کہ ہم اسے لاہور یا کراچی کے بہترین اسپتال میں منتقل کردیں جہاں زندگی بچانے کے ہنگامی اقدام ممکن ہوتے ہیں، آلات اور ادویات۔"
"آپ کچھ نہیں کرسکتے؟" گولی مایوسی سے چلّائی۔
"ہم کررہے ہیں، جو کچھ ہمارے بس میں ہے۔ جو گولی پیٹ میں لگی تھی' دائیں جانب! وہ ریڑھ کی ہڈی کو دبا رہی ہے۔ لیکن خوش قسمتی سے ہڈی محفوظ ہے۔ یہ میرا اندازہ ہے، صحیح پوزیشن ایکس رے میں آئے گی۔ اگر ہڈی کو نقصان ہوتا تو شاید وہ ہمیشہ کے لیے معذور ہوجاتا مگر ایسا نہیں ہے' زخم زیادہ خراب ہوا ہے۔"
"دوائیں تو لائی تھی میں۔" گولی نے ایک پیکٹ سا آگے بڑھا دیا۔
احمد حسن نے اس میں سے ہر دوا کو نکال کے دیکھا اور مطمئن ہوکے سر ہلایا" اسی لیے وہ اب تک زندہ ہے۔ یہ سب اینٹی بائیوٹک ہیں' کس نے لکھی تھیں؟"
"نام تو مجھے یاد نہیں۔ میں نے کہا کہ میرا میاں زخمی ہے۔ اس کے شانے اور پیٹ پر کلہاڑی کے وار سے زخم آئے ہیں۔ ڈاکٹر نے پہلے تو کہا کہ یہ پولیس کیس ہے' ڈسٹرکٹ اسپتال جاؤ۔ پھر میں نے منت سماجت کی کہ پولیس تو دشمنوں سے ملی ہوئی ہے۔ مروا دے گی اسے تو ڈاکٹر کو رحم آگیا۔ اس نے دوا لکھ دی اور کہا میرا نام مت لینا۔"
مہدی حسن نے سر ہلایا" صبح ہم دوائیں منگوالیں گے۔"
غنی نے کہا" ڈاکٹر صاحب! آپ دوائیں لکھ دیں۔ میں ابھی چلا جاتا ہوں۔ صبح تک واپس آجاؤں گا۔ جہلم سے نہ ملیں تو لاہور چلا جاؤں گا۔ وہاں کے اسپتالوں کے کیمسٹس چوبیس گھنٹے کھلے رہتے ہیں۔"
"ٹھیک ہے۔ پہلے ہم زخم کو ٹھیک کرتے ہیں تاکہ زہر پورے جسم میں نہ پھیلے۔ دو چار دن میں ہمارے پاس ایک اسپتال کا پورا ساز و سامان آجائے گا۔ آپریشن تھیٹر اور ایکس رے مشین سمیت...... پھر ہم کرلیں گے۔"
"کیا کرلیں گے۔" گولی نے سادگی سے کہا۔
"وہ سب کچھ جو بڑے اسپتال میں ہوتا ہے یا باہر...... صرف اس صورت میں کہ...... ہمیں موقع ملے۔ یہ اعتماد کی

ناہید سلطانہ اختر کے شہرۂ آفاق قلم سے ایک طویل شاہکار ناول

زندان میں پھول

چار پیارے خوبصورت بچے جو گلاب کی پنکھڑیوں سے بھی زیادہ نرم و نازک تھے

بات ہے۔ اگر آپ سب لوگ سمجھتے ہیں کہ انہیں فوراً شفٹ کرنا چاہیے...... اور یہ ممکن بھی ہے تو پھر میں بھی اصرار نہیں کروں گا۔"
میں نے کہا" اگر آپ سمجھتے ہیں کہ علاج یہاں ممکن ہے......"
"علاج ناممکن نہیں ہے اور احمد حسن کا بھی یہی خیال ہے کہ اس میں کوئی بڑا چیلنج یا رسک نظر نہیں آتا۔"
"زندگی اور موت ہر جگہ اللہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے ڈاکٹر صاحب! یہاں بھی اور وہاں بھی۔" گولی نے کہا۔
"میں بھی اگر یہ محسوس کرتا کہ یہ میرے بس سے باہر ہے تو میں کوشش کی بات بھی نہ کرتا۔ ہم نے یعنی میں نے' شہناز نے اور میرے بیٹے احمد حسن نے ایک ٹیم کی حیثیت سے کیس کو دیکھا۔ کام مشکل نہیں' ہمیں تھوڑی سی مہلت چاہیے...... اس کے لیے دوا سے زیادہ دعا اہم ہے۔"
وہ رات تقریباً جاگتے ہی گزری۔ گولی کو شہناز نے بتائے بغیر خواب آور گولی دے دی تھی۔ وہ بیٹھے بیٹھے سوگئی۔ صرف شہناز تھی جو شاہی کے کمرے میں کرسی ڈالے بیٹھی رہی۔ پھر ڈاکٹر مہدی حسن نے اسے بھی زبردستی سونے کے لیے بھیج دیا کہ تمہیں صبح پھر اسپتال جانا ہے اور میرا کیا ہے' سارا دن آرام ہی کرتا ہوں۔ اس عمر میں نیند ویسے ہی کم آتی ہے۔
میری آنکھ لگی ہی تھی کہ راجا نے مجھے جگا دیا۔ میں آنکھیں ملتا ہوا اٹھا۔ صبح کے آٹھ بجنے والے تھے۔ دھوپ اوپر کے روشندان کے شیشوں سے دیوار پر پڑ رہی تھی" سب ٹھیک ہے نا راجا...... شاہی......!"
"شاہی کو کچھ نہیں ہوا...... پولیس آئی ہے، گرفتاری کے وارنٹ لے کر۔" راجا نے کہا۔
میرا دل بیٹھ گیا" شاہی کے حویلی میں پناہ لینے کی خبر کسی مخبر نے دشمنوں تک پہنچا دی تھی۔ کیا اب وہ شاہی کو اسی حالت میں لے جائیں گے؟"

میں نے کہا۔ ”یہ کیسے ہوا راجا؟“

راجا نے بے خیالی میں پوچھ لیا۔ ”کیا کیسے ہوا؟“

”یہی کہ رات کو شاہی بادشاہ یہاں پہنچا۔ گولی کہتی ہے کہ راستے میں کسی نے بھی چیکنگ نہیں کی پھر صبح صبح پولیس اسے گرفتار کرنے بھی آ پہنچی؟ ضرور کسی نے مخبری کی ہوگی۔“ میں بیڈ سے اترا۔

راجا نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”دیکھ پتر، میرے لخت جگر، نور کے نور نظر۔ وہ شاہی بادشاہ کو نہیں تجھے گرفتار کرنے آئے ہیں۔“

میں چونکا۔ ”مجھے! کس جرم میں مہاراجا؟“

”تیرے جرائم کی فہرست میں پہلے ہی بڑی لچک ہے۔ اسے قانون کے مضبوط ہاتھ کھینچ کے جتنا چاہیں لمبا کر دیں۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”میں غسل فرما کے اور لباس بدل کے تشریف لاتا ہوں۔ تو کچھ چائے پانی سے یا میرے نوٹوں سے ان کا دل بہلا۔“

اسمارٹ قسم کے ڈی ایس پی کے ساتھ ایک اتنا پتلا اے ایس آئی تھا کہ وردی اس کے جسم پر ہینگر کی طرح لٹکی نظر آتی تھی لیکن یہ کمی اس نے اپنی مونچھوں کو سوا نو کی پوزیشن پر کلف لگا کے پوری کی تھی۔ رہی سہی کسر اس کی آواز سے پوری ہوتی تھی جو پھٹے بانس جیسی اور انتہائی کرخت تھی۔ جیسے کسی نے اسکوٹر میں بس کا پریشر ہارن لگا دیا ہو۔ باقی تین روایتی قسم کے ماتحت تھے۔ کاہل، بیزار صورت، بدحال کانسٹیبل۔

میری تشریف آوری سے پہلے راجا نے ایک ڈرامائی فضا بنا دی تھی۔ نواب صاحب بیدار ہو چکے ہیں۔ نواب صاحب غسل فرما رہے ہیں۔ اب ناشتے سے فراغت پا کے وہ اخبارات ملاحظہ فرما رہے ہیں۔ بس اب ان کا نزول ہوا ہی چاہتا ہے۔ راجا نے بعد میں مجھے بتایا کہ اے ایس آئی نے پریشان ہو کے پوچھا تھا کہ ان کے نزول میں کتنی دیر لگتی ہے۔

راجا نے ایک دم کہا۔ ”نواب صاحب آ گئے۔“ اور ایک دم کھڑا ہو گیا۔ ڈی ایس پی۔ اے ایس آئی اور اس کے ماتحت خود بخود کھڑے ہو گئے۔ انہیں بعد میں یقیناً افسوس ہوا ہوگا کہ ایک مجرم کو تعظیم دینے کے لیے وہ کیوں اٹھے جسے وہ گرفتار کرنے گئے تھے۔

میں نے سرپرستانہ انداز میں ہاتھ اٹھایا۔ ”بھئی بیٹھو۔“

راجا نے مؤدبانہ عرض کی۔ ”بدنصیب دشمناں...... حضور والا کو گرفتار کرنے کی نیت سے آئے تھے۔“

میں نے کہا۔ ”اچھا؟ پھر اب کیا نیت ہے ان کی۔ ویسے یہ ابھی تک کچھ واضح نہیں ہوا کہ انہوں نے ہمیں کس سلسلے میں گرفتار کرنے کا سوچا تھا۔“

راجا نے سر کھجایا۔ ”وہ حضور...... کوئی قتل وغیرہ فرمایا تھا آپ نے۔“

میں یوں ہنسا جیسے یہ بڑا دلچسپ لطیفہ تھا۔ ”کیا؟ ہمارا مطلب ہے کہ یہ کس بدبخت کے قتل ہونے کی بات کر رہے ہیں۔ کسی پرانے قتل کا معاملہ ہے یا ہم نے جو حال ہی میں کیے، ان کی بات ہے۔“

جواب ڈی ایس پی نے دیا۔ ”دیکھیے سر! آپ کے دیگر قانونی معاملات سے تو میرا کوئی تعلق نہیں۔ جو کیس میرے سپرد کیا گیا ہے اس کا تعلق چودھری سلطان کے قتل سے ہے۔“

میں نے حیرانی سے کہا۔ ”اسے تو ہم نے قتل نہیں کیا۔“

”لیکن آپ کا نام قتل کی اس ایف آئی آر میں ہے جو آپ کے اور مس فریال کے خلاف لکھوائی گئی ہے۔“

”کیا ایف آئی آر لکھوانے سے جرم ثابت ہو جاتا ہے؟“

”جی نہیں۔ پھر بھی تفتیش تو کی جاتی ہے۔ اس کیس میں وزیر داخلہ کے حکم سے جو خصوصی ٹیم تشکیل دی گئی ہے۔ اسے تین دن میں رپورٹ پیش کرنی ہے۔“ ڈی ایس پی نے کہا۔

”اچھا۔ کہاں ہے وہ ٹیم......؟“

ڈی ایس پی نے جز بز ہو کے کہا۔ ”میں اس کا سربراہ ہوں۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”اچھا اچھا...... تو پھر آپ تفتیش کریں۔ گرفتاری کا مسئلہ تو نہیں ہے نا۔“

ڈی ایس پی نے کہا۔ ”قتل کی تفتیش میں گرفتاری بھی کرنی پڑتی ہے۔ اتنا تو آپ کو بھی علم ہوگا اور مجھے احکامات یہی دیے گئے ہیں۔“

میں نے سوچ کے کہا۔ ”پھر آپ یوں کریں، رپورٹ دے دیں کہ احکامات کی تعمیل کرتے ہوئے اسپیشل پولیس پارٹی نواب رفیق احمد شیرازی کو گرفتار کرنے ست بدھائی پہنچی تھی لیکن گرفتاری عمل میں لانے سے قاصر رہی۔ کیونکہ نواب صاحب موجود نہ تھے۔“

راجا نے کہا۔ ”میں یہی سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا ڈی ایس پی صاحب کو لیکن یہ ماننے کو تیار نہیں۔“

”کمال کرتے ہیں آپ۔ یہ میں کیسے مان لوں جبکہ نواب صاحب میرے سامنے بیٹھے ہیں۔“

راجا نے کہا۔ ”دیکھیے بات ہے رپورٹ کی۔ نواب صاحب کے سامنے بیٹھے ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اب آپ اتنی دور سے آئے تھے ہم نے مہمان سمجھ کے بٹھا لیا۔ یہ ہماری وضعداری ہے ورنہ......“

”ورنہ کیا؟“ ڈی ایس پی نے محسوس کیا کہ اسے ایک چیلنج کا سامنا ہے اور ماتحتوں کے سامنے اس کے اختیارات کی نفی کی جا رہی ہے۔

”ورنہ گارڈ آپ کو باہر ہی سے رخصت کر دیتا اور یہ کسی غریب کے گھر کا دروازہ نہیں جسے آپ کی سپاہ اپنی ٹھوکروں سے گرا کے اندر داخل ہو جاتی۔ نہ آپ یہ دیواریں پھاند سکتے ہیں۔“

ڈی ایس پی مزید خفا ہوا۔ ”میرے پاس خانہ تلاشی کے اختیارات ہیں مسٹر راجا۔“

راجا نے غیر سنجیدہ لہجہ برقرار رکھا۔ ”اوہ...... آپ کی مراد غالباً سرچ وارنٹ سے ہوگی۔ ذرا مجھے دکھایے۔“

ڈی ایس پی نے جیب میں سے ایک کاغذ نکالا اور آگے بڑھا دیا۔ ”یہ جعلی نہیں ہیں۔ آپ تصدیق کر سکتے ہیں۔“

راجا نے وارنٹ پر ایک نظر ڈالی۔ ”لیکن یہ محض کاغذ کا ایک پرزہ ہے۔ اگر میں اسے پھاڑ کے پھینک دوں یا گولی بنا کے نگل لوں تو آپ کے پاس کیا رہے گا؟“

”پھر میں آپ کو بھی گرفتار کر لوں گا۔“

راجا نے پرتمسخر انداز میں کہا۔ ”اچھا...... کس جرم میں؟ قانون کی وہ دفعہ بتایے جس کے تحت سرچ وارنٹ کھانا جرم ہے اور یہ آپ ثابت کیسے کریں گے، ان ماتحتوں کی گواہی سے؟“

ڈی ایس پی راجا کو گھورتا رہا۔ ”راجا صاحب، آپ کو سیریس ہو جانا چاہیے۔ یہ بہت سیریس معاملہ ہے۔ آپ کار سرکار میں مداخلت کے مجرم ہوں گے۔“

”اور آپ کی کارکردگی کو کتنا سراہا جائے گا کہ آپ ایک کو پکڑنے آئے تھے، دو کو پکڑ کر لے گئے۔ ایک نواب اور ایک صحافی لیکن سوال وہی ہے ڈی ایس پی صاحب کہ یہ آپ کیسے کریں گے۔“

میں ایک دم اٹھا۔ ”ابھی تک چائے کیوں نہیں آئی۔ میں دیکھتا ہوں۔“ باہر جاتے ہوئے میں نے ڈی ایس پی کی نظر بچا کے راجا کو آنکھ ماری۔

میں نے اندازہ کر لیا تھا کہ میرے پرانے حریف وزیر داخلہ کے حکم پر افسر بکار خاص مقرر کیا جانے والا یہ ڈی ایس پی راجا کے معاندانہ رویے سے قابو میں نہیں آ رہا۔ وہ یقیناً وزیر داخلہ صاحب کا خاص چمچہ ہوگا جسے یقین دلایا گیا ہوگا کہ اس نے یہ معرکہ سر کر لیا تو اسے ترقی ملے گی یا اپنی پسند کے علاقے میں پوسٹ کر دیا جائے گا۔ وہ رشوت کے پیسے جیب میں ڈال کے واپس جانے پر آمادہ نہیں تھا چنانچہ راجا اسے دوسرے طریقے سے ڈیل کر رہا تھا۔

دروازے کے باہر رک کر میں اندر کی گفتگو سنتا رہا۔

ڈی ایس پی نے کہا۔ ”آپ مجھے سختی پر مجبور نہ کریں۔“

”سختی نرمی آپ کا ذاتی معاملہ ہے۔ میں نے صرف یہ پوچھا تھا کہ آپ نواب صاحب کو گرفتار کیسے کریں گے؟“

راجا نے کہا۔ ”یہ لیجیے اپنا سرچ وارنٹ، سنبھال کر رکھیے۔“

”آخر کیا مطلب ہے اس فضول بات کا۔ یہ نفری میں کس لیے لے کر آیا ہوں۔“

”ڈی ایس پی صاحب۔ ایک آدمی کو گرفتار کرنے کے لیے آپ اکیلے بھی بہت تھے۔ ان میں سے ہر ماتحت یہ اختیار رکھتا ہے کہ جسے چاہے کسی بھی جرم میں پکڑ کے لے جائے۔ کیا آپ کو معلوم ہے انگریز کے دور میں ایک معمولی سپاہی آتا تھا اور مجرم کو رسی سے باندھ کے اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ نہ مجرم مزاحمت کرتا تھا نہ ہی... فرار کی کوشش۔ اب آپ مجھے بتایے کیا آپ کے ڈی آئی جی صاحب میں ہمت ہے کہ مسلح پولیس ٹرک میں بھر کے لے جائیں اور کسی ایسے بندے کو گرفتار کر لائیں۔ مثلاً...... کسی وڈیرے یا سردار کو۔“

”آپ فضول باتوں سے میرا وقت نہ ضائع کریں راجا صاحب۔ نواب صاحب سے کہیں کہ گرفتاری دے دیں۔“

”میں کیسے کہوں۔ مجھے معلوم ہی نہیں کہ وہ ہیں کہاں......“

”کیا؟ وہ ابھی یہاں بیٹھے تھے، اندر ہوں گے۔“ ڈی ایس پی نے تیز لہجے میں کہا۔

”یہاں بیٹھے تھے؟ میں نے تو نہیں دیکھا۔ کل وہ کہیں تشریف لے گئے تھے، اپنے ذاتی کام سے...... مجھے بھی بتا کے نہیں گئے تھے۔“

”آپ مجھے مجبور کر رہے ہیں خانہ تلاشی پر۔“

راجا نے کہا۔ ”جی نہیں۔ آپ الٹی بات کر رہے ہیں۔ میں آپ کو مجبور کر رہا ہوں کہ آپ خانہ تلاشی کے چکر میں نہ پڑیں اور شرافت سے واپس تشریف لے جائیں۔ ورنہ آپ نقصان میں رہیں گے۔“

”آپ دھمکی دے رہے ہیں مجھے۔“ ڈی ایس پی دہاڑا۔

راجا نے میز پر ہاتھ مارا۔ ”بس...... حد سے نہ بڑھیں ڈی ایس پی صاحب۔ آپ پبلک سرونٹ ہیں۔ تمیز تہذیب سے بات کریں۔ میں واقعی آپ کو دھمکی دے رہا ہوں۔ اگر آپ نے خانہ تلاشی کی حماقت کی تو پھر میں بھی مجبور ہو جاؤں گا کہ چشم دید گواہ کی حیثیت سے آپ کے خلاف حکام بالا کو

میڈیا کے ذریعے، خبر ئے کالم سے یا پریس کانفرنس سے مطلع کروں کہ آپ نے خانہ تلاشی کے دوران کس قدر گالم گلوچ اور بدتمیزی کی۔ کتنی توڑ پھوڑ مچائی اور خواتین کے ساتھ کیسا ناشائستہ رویہ اختیار کیا۔ نہ مجھے بیان دینے والوں کی کمی ہے اور نہ گواہوں کی۔ نواب رفیق تو آپ کو ملیں گے نہیں خواہ آپ سارا دن حویلی میں بھٹکتے پھریں۔ اس کے سارے تہہ خانے، خفیہ کمرے اور چور راستے چھان ماریں۔''

ڈی ایس پی کی کوئی آواز نہ آئی۔ عملاً اس کی بولتی بند ہوگئی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں راجا کی ہمت اور ذہانت کو سراہا۔

''ایک شخص اٹھارہ سال اپنے خاندان کے ساتھ حویلی میں قید رہا۔ یہ پرانے وقتوں کی بات ہے۔ غالباً اس علاقے کا تحصیلدار تھا یا ڈپٹی کمشنر۔ جو اس وقت کے انگریز حاکم کا نمائندہ ہوتا تھا اور اسے کوئی برآمد نہ کرسکا۔ آپ بھی پانچ افراد ہیں۔ اچھا ہے کچھ لے کر چلے جائیں انعام واکرام اور نوکری کرتے رہیں۔ وہ محاورہ سنا ہوگا آپ نے کہ آنا اپنی مرضی سے ہوتا ہے مگر جانا دوسرے کی مرضی سے۔''

ڈی ایس پی کی مری ہوئی آواز سنائی دی۔ ''شاید...... ٹھیک ہی فرمارہے ہیں آپ۔''

''شاید نہیں یقیناً۔ تم ابھی نوجوان ہو۔ آہستہ آہستہ اس ملک کے معاملات کو سمجھنے لگو گے۔ تقدیر کی ایک لائن ہے شکر ادا کرو کہ تم اس طرف ہو جدھر حاکم ہیں۔ رعایا یعنی محکوم عوام لائن کے دوسری طرف ہیں۔ یہ وزیرِ داخلہ آج ہے کل نہیں ہوگا۔ انتخابات قریب ہیں لیکن تمہاری افسری پکی ہے۔ ترقی کرنے کے لیے ضروری ہے کہ تم اس گٹھ جوڑ میں شامل رہو جو ہم سب کے مفاد میں ہے۔''

وہ بے دلی اور تلخی سے ہنسا۔ ''جس کے خلاف آپ کا میڈیا شور کرتا رہتا ہے۔''

''ہاں۔ وہ بھی ضروری ہے چور مچائے شور۔''

اس کے بعد معاملات خوش اسلوبی سے طے پائے۔ افسرِ اعلیٰ نے ماتحتوں کو باہر جانے کا حکم دیا۔ پھر ڈیوٹی پر کسی سے چائے بھی قبول نہ کرنے کے دعوے دار ڈی ایس پی نے ہمارے ساتھ دوستانہ ماحول میں پرتکلف چائے پی۔ ست بدھائی کے بارے میں معلومات نے اس کو حیران کردیا۔ خصوصاً اس بات نے کہ پنجاب کے موجودہ آئی جی ایک دوست کی حیثیت سے نواب رفیق کو بھی بلاتے رہتے ہیں اور خود بھی یہاں آتے رہتے ہیں۔ ایک گمنام ریاست کے بارے میں اس کی ساری غلط فہمی دور ہوگئی۔ اس کے ماتحتوں کو باہر میرے ماتحتوں نے چائے دی۔

پھر ڈی ایس پی نے بتایا کہ چودھری سلطان مرڈر کیس میں اچانک اس کارروائی کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ اس نے کہا۔ ''یہ جو آج کل وزیرِ داخلہ ہیں (سہولت کے لیے ہم فرض کرسکتے ہیں کہ ان کا نام عجب شاہ کریلہ تھا) اپنے کریلہ صاحب۔''

میں نے کہا۔ ''یہ وہی نیم چڑھا کریلا ہے۔''

ڈی ایس پی مسکرایا۔ ''ہے تو یہ پیش کے ساتھ کرُیلا۔ مگر سب ہی کریلہ کہتے ہیں۔ اسی علاقے سے منتخب ہوئے تھے جہاں میرا ابھی آبائی گھر ہے اور کچھ زمین ہے۔ ہماری برادری کے سارے ووٹ ان کو پڑے تھے۔ آپ یوں سمجھ لیں کہ انہوں نے میری سفارش کرکے ایک قرضہ اتارا۔ میرے والد برادری کے سربراہ اور بڑے اثر ورسوخ والے آدمی ہیں۔''

''چنانچہ تمہاری پوسٹنگ بھی اپنے علاقے میں ہوئی۔''

''نہیں، ابھی نہیں۔ دراصل وہاں کا جو ایس ایچ او ہے، اس نے مخالفت کی۔ آپ تو جانتے ہوں گے کہ عوام پر اصل حکمرانی ایس ایچ او ہی کرتا ہے۔ ہماری افسری آپ کی صحافت یا لیڈری سب سے بڑھ کر طاقت اسی کی ہوتی ہے۔ خیر مجھے بھی زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ وہاں برادری اور تعلقات والے بڑا دباؤ ڈالتے ہیں۔ اسلام آباد یا کراچی جیسی جگہ پر صحیح افسری چلتی ہے۔ تو اپنے کریلہ صاحب نے مجھے طلب کیا۔ پہلے یہ جتایا کہ میری یہ افسری ان کی عنایت ہے، پھر فرمایا کہ ایک خاص کام کے لیے مجھے اپنے خاص آدمی کی ضرورت ہے۔ اصل بات تو مجھے بعد میں پتا چل گئی۔ لیکن مجھ سے بات کرتے وقت وہ دُہرے نشے میں تھے۔ ایک نشہ شراب کا تھا، دوسرا اس کے شباب کا جو اُن سے چھٹی ہوئی تھی۔ اب میں کیا بتاؤں کس حالت میں تھی۔ اس نے میرے جیسے معمولی حکم کے غلام کے سامنے حجاب یا احتیاط کو غیرضروری سمجھا۔ حالانکہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ، بڑی معزز اور شریف سمجھی جاتی ہے۔ خیر...... انہوں نے جو زبان استعمال کی وہ تو میں نہیں دُہرا سکتا۔''

راجا نے کہا۔ ''کوئی حرج نہیں۔ ہم نظرِ ثانی شدہ نہیں اصل ٹیکسٹ سننا پسند کریں گے۔''

ڈی ایس پی نے تھوڑا سا تامل کیا۔ ''وہ...... وہ کہنے لگے کہ ایک بندہ ہے پتا نہیں کہاں سے کم ذات ادھر آ کے نواب بن گیا۔ بگڑے چماروں کو ریاست مل جائے تو کیا وہ خاندانی ہوجاتے ہیں۔ ایک دفعہ...... میرے ہتھے لگ گیا۔ میں تو اس کی ماں...... دیتا لیکن وہ...... ہمارا وزیرِ اعلیٰ...... وہ...... بیچ میں آگیا۔ اس کتے کی اولاد نواب کے تعلقات ایک کنجری سے تھے...... نام تو نے بھی سنا ہوگا۔ فریال! آج کل...... بڑی فلموں شلموں میں نظر آرہی ہے۔ کئی سال پہلے بھی آئی تھی۔ ایک زمیندار تھا گجرات کا چودھری سلطان۔ اس کے ساتھ یاری لگائی۔ پھر یہ نیا یار مل گیا...... اس کے ساتھ بھاگ گئی ولایت...... ادھر رہی کئی سال...... پھر اس کے ساتھ ہی واپس آگئی اور پھر اُسی پہلے یار کے پاس پہنچ گئی۔ اس سے کوٹھی لی، کار لی۔ اس نے اشتہاروں میں کام دلایا اور فلموں میں بھی۔ کچھ عرصہ ہوا اس کا یہ...... چودھری سلطان...... غائب ہوگیا۔ کچھ پتا نہیں کدھر مرگیا...... اس کنجری نے پھنسالیا ہوگا نیا یار اُس سے مروادیا ہوگا۔ قتل کا کیس اس پر بن جاتا لیکن وہ...... نواب آگیا اس کی مدد کرنے۔ اس نے بچالیا گرفتاری سے۔ کیس ابھی ختم نہیں ہوا۔ اب تم تو جانتے ہوتا کہ دو دن بعد میرے بیٹے کی شادی ہے۔ ہم نے سوچا کہ کچھ شغل میلہ کرلیا جائے اور بھی بلائی تھیں ناچ گانے کے لیے۔ اس...... فریال سے بھی کہا تو اس نے انکار کردیا۔ کہنے لگی...... کہ میں مجرے نہیں کرتی......''

میں نے کہا کہ ''ہم پیسا دیں گے۔ بولو کتنا چاہیے......''

مگر اس نے سب کے سامنے میری بے عزتی کردی کہ ''مجھے آپ شاہی محلے کی نہ سمجھیں......''

''او یار...... اس میں میرے سمجھنے کی کون سی بات ہے؟ تو ہے کون...... اور تو نے کیا سمجھا ہے عجب خان کریلہ کو...... تیری تو ماں بھی ناچے گی اور بہنیں بھی۔'' یہ سب انہوں نے میرے سامنے کہا۔ فریال نے ان کا پیغام لے کر جانے والے ان کے سیکریٹری کو انکار کیا تھا بلکہ سیکریٹری نے کچھ دھمکی بھی دی تو فریال نے اسے گیٹ آؤٹ کہنے کے ساتھ ہی اپنے گارڈ طلب کرلیے تھے کہ اس بدتمیز آدمی کو اٹھا کے باہر پھینک دو۔ اس نے واپس آکے کریلہ صاحب کو اپنی بے عزتی کی روداد نمک مرچ لگا کے ہی سنائی ہوگی۔ کریلہ صاحب کے پاس اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ وہ خود بات کریں اور فریال نے یہ معلوم ہونے کے باوجود کہ فون پر خود وزیرِ داخلہ ہیں ان سے صاف کہہ دیا کہ وہ مجرے نہیں کرتی اور اسے پیسے یا دھمکی دے کر مجبور نہ کیا جائے۔ بس اس کے بعد کریلہ صاحب کا پارہ چڑھ گیا۔ فریال کو شاید ڈر ہوگا کہ اس کے انکار کا نتیجہ مشکلات پیدا کردے گا چنانچہ اس نے فوراً فلمی صنعت کے کچھ سرکردہ لوگوں کو مطلع کیا اور ان کے ذریعے فلمی صحافیوں کو یہ خبر پہنچادی گئی۔ کریلہ صاحب نے پکا بندوبست کرلیا تھا کہ رات کو ان کے بندے فریال کو اٹھالیں گے اور کریلہ صاحب کی خدمت میں پیش کردیں گے۔ پروگرام کچھ ایسا بنالیا گیا تھا کہ فریال کو تمام رات ننگا نچوایا جائے گا اور اس رقص کی عکس بندی ہوگی۔ پتا نہیں ان کے کس مشیر نے یہ صلاح دی تھی لیکن ایسا کرنے سے پہلے ہی کریلہ صاحب کو فریال کے دفاعی انتظامات کی خبر مل گئی۔ غصے میں انہوں نے دوسرا کام کیا۔ اسی رات پولیس نے فریال کو اٹھالیا۔ اس کے خلاف پہلے سے سلطان کے قتل میں شبہ ظاہر کیا گیا تھا۔ پولیس اسے تفتیش کے لیے لے گئی۔''

ڈی ایس پی کی بات میں وقفہ آیا تو میں نے کہا۔ ''یہ کب کی بات ہے ڈی ایس پی صاحب؟''

اس نے کہا۔ ''پرسوں رات کی۔''

''اور فریال اب کہاں ہے؟''

''وہیں...... تھانے میں۔ تھانہ اسپیشل پولیس۔''

میرا دل بیٹھ گیا۔ ''انہوں نے یقیناً اس سے اعترافِ جرم کرالیا ہوگا۔''

''ہاں جی اور اس نے آپ کو شریکِ جرم کیا ہے۔ اس کے بیان کے مطابق اس کے کہنے پر آپ نے چودھری سلطان کو قتل کرکے اس کی لاش غائب کردی۔ آلۂ قتل فریال کی نشاندہی پر برآمد کرلیا گیا ہے۔ لاش کی برآمدگی کے لیے مجھے بھیجا گیا ہے کہ آپ کو گرفتار کرکے وہیں پہنچادوں، اسپیشل پولیس کے تھانے میں۔''

چند سیکنڈ کے ہولناک وقفے میں میرا تصور بڑے اذیت ناک مناظر پیش کرتا رہا۔ عام تھانوں میں پولیس کسی مجرم کے ساتھ کیا بہیمانہ تشدد کا طریقہ اختیار کرتی ہے یہ عام لوگ بھی جانتے ہیں۔ ایک رات تو بہت لمبی ہوتی ہے۔ فریال یا میرے جیسے شخص کی قوتِ برداشت اتنی بھی نہیں ہوتی کہ وہ ایک گھنٹا اس اذیت اور ذلت کو برداشت کرسکے جو تھانوں کے عقوبت خانوں سے منسوب ہے۔

راجا نے بڑی برہمی ظاہر کی۔ ''آپ جانتے ہیں ڈی ایس پی صاحب کہ اس قسم کے اعترافِ جرم کی عدالت میں کوئی حیثیت نہیں ہوتی جو پولیس تھانوں میں حاصل کرلیتی ہے۔''

''مجھے معلوم ہے راجا صاحب لیکن میں کیا کرسکتا ہوں۔''

میں نے اس کی تائید کی۔ ''ہاں راجا۔ یہ تو حکم کی تعمیل میں مجھے گرفتار کرنے آئے تھے۔ انہوں نے ہمیں انفارمیشن بھی دی اور مہلت بھی۔ ان کا شکریہ ادا کرکے رخصت کرو پھر ہم کچھ کرتے ہیں۔''

شکریہ محض زبانی نہیں تھا۔ راجا نے ایک سرکاری اہلکار

کی دیانت داری اور ذمے داری کو نقد قیمت دے کر خرید لیا۔ ہم جیسے ان گنت شریف لوگ ہر روز ہر جگہ مجبوری کے عذر پر یہی کر رہے تھے۔ ملک میں کرپشن کا رونا رو رہے تھے اور خود کرپشن کو فروغ دینے کے عمل کا حصہ تھے۔ تاہم یہ مرغی اور انڈے والا سوال ہے کہ عام آدمی کرپشن کے معاملے میں مجبور ہے یا مختار۔

ڈی ایس پی کے جاتے ہی میں نے نور کو فون کیا۔ ''نور تم کہاں ہو؟'' میں نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

وہ اترا کے ہنسی۔ ''تمہارے دل میں۔ تمہارے خوابوں اور خیالوں میں۔''

''دیکھو...... سیریس ہو جاؤ۔''

''او کے سر۔ نان سیریس میں پہلے بھی نہیں تھی۔''

میں نے کہا۔ ''تمہیں معلوم ہے فریال اس وقت کہاں ہے؟''

''نہیں...... میں نے تمہیں بتا دیا تھا کہ ایک مشہور فلمی ہیرو اسے لے گیا تھا۔''

''یہ دو دن پہلے کی بات ہے۔''

''ہاں۔ اس رات تم مجھے فریال کے گھر سے اپنے ساتھ لے گئے تھے میرے گھر۔ دوسرا دن اور دوسری رات میں تمہارے ساتھ تھی۔''

''پھر پرسوں میں واپس آ گیا تھا۔ پرسوں تمہاری فریال سے کوئی بات ہوئی تھی؟''

''نہیں۔ وہ لوٹ کے نہیں آئی تھی۔ میں نے کل بھی پوچھا تھا اور آج بھی مگر اس کا موبائل فون بند تھا۔ گھر کے ملازموں نے کہا کہ وہ واپس نہیں آئی ہیں پھر میں جا کے کیا کرتی۔''

''تم کس قسم کی سیکریٹری ہو۔ تین دن سے فریال لاپتا ہے۔ تم نے کچھ کیا؟''

''میں کیا کرتی۔ فریال اپنی مرضی کی مالک ہے۔''

''تم نے فرض کر لیا کہ وہ ابھی تک اسی فلمی ہیرو کے ساتھ ہے؟'' میں نے بگڑ کے کہا۔

''اور میں کیا فرض کرتی۔ وہ کسی کے ساتھ کہیں بھی جا سکتی ہے۔ کہیں بھی رہ سکتی ہے۔ میں کیا اس کی اماں ہوں؟''

''کم از کم تمہیں مجھے بتانا چاہیے تھا۔ اس ہیرو کو فون کر لینے میں بھی حرج نہیں تھا۔''

''جان کچھ بتاؤ آخر ہوا کیا ہے فریال کو۔ تم اتنے پریشان کیوں ہو؟''

میں نے کہا۔ ''اسے پرسوں رات ہی پولیس نے اٹھا لیا تھا۔ معلوم نہیں کہاں سے۔ گھر سے گرفتار کیا ہوتا تو ملازمین کو معلوم ہوتا۔ تم ذرا اس ہیرو سے پوچھو۔ فریال کب تک اس کے ساتھ تھی۔''

''میں ابھی معلوم کر کے بتاتی ہوں۔''

نور کا فون چند منٹ بعد ہی آ گیا۔ ''وہ کہتا ہے کہ ہم نے رات کا کھانا ایک ریسٹورنٹ میں ساتھ کھایا تھا۔ پھر وہ میرے ساتھ ایک پروڈیوسر سے ملنے گئی تھی۔ وہاں سے میں اپنے گھر آ گیا تھا اور پروڈیوسر نے اسے اپنی گاڑی میں گھر بجھوا دیا تھا۔ وہ پہلے گئی تھی۔''

''اگر یہ سچ ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ پولیس فریال کے گھر کے باہر موجود تھی۔ انہوں نے فریال کو باہر ہی سے اٹھایا اور گاڑی میں ڈال کے ساتھ لے گئے۔ پولیس نے اس سے چودھری سلطان کے قتل کا اعتراف بھی کرا لیا ہے۔ اور یہ بیان بھی حاصل کر لیا ہے کہ اس کے کہنے پر قتل میں نے کیا تھا۔ آلۂ قتل کا تو کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ پولیس آئی تھی مجھے گرفتار کرنے کہ مجھ سے لاش برآمد کرا لے۔''

نور نے پریشان ہو کے کہا۔ ''پھر......؟''

''پھر کیا۔ پولیس کو میں نے واپس بھیج دیا۔ اب کچھ کرتا ہوں اس کی اور اپنی جان بچانے کے لیے۔''

''اور میں...... میں کیا کروں؟''

''تم ابھی کچھ مت کرو۔ میں پھر بتاؤں گا کہ تمہیں کیا کرنا ہے۔'' میں نے فون بند کر دیا۔

اب راجا کے ساتھ میرا فوری طور پر لاہور جانا ضروری ہو گیا تھا۔ اسے ست بدائی سے گئے زمانہ ہو گیا تھا لیکن فریال کے ساتھ میرا ایک تعلق برقرار تھا۔ اس جذباتی مسئلے نے میرے لیے ایک کے بعد دوسری پریشانی کے اسباب پیدا کیے تھے۔ لیکن میں اپنی فطرت سے مجبور تھا۔ دوسرے سب فریال سے خفا تھے اور یہ چاہتے تھے کہ میں فریال کے اپنے پیدا کردہ مسائل سے مکمل لاتعلقی اختیار کر لوں۔ اگر اس نے اپنی زندگی کا راستہ اپنی مرضی سے اختیار کیا ہے تو پھر اس راستے کی مشکلات سے بھی خود ہی نمٹے۔ یہ میری کمزوری تھی کہ میں برسوں کے تعلق کو یکسر بھلا کے ایسی بے حسی کا رویہ نہیں اپنا سکتا تھا کہ فریال پر کوئی بھی آفت آئے۔ وہ مرے یا جیے۔ میں نہ اس کی پروا کروں اور نہ اس کے بارے میں سوچوں۔ خود فریال میری اس کمزوری سے واقف تھی اور جانتی تھی کہ میں اتنا سنگدل کبھی نہیں ہو سکتا چنانچہ مشکل وقت میں وہ مجھے یاد کرتی تھی تو اس یقین کے ساتھ کہ میں اس کی مدد سے انکار نہیں کروں گا۔

خود راجا کو مجھ سے شکایت تھی کہ جب فریال نے مجھے چھوڑ دیا تو پھر میں اسے کیوں نہیں چھوڑتا اور وہ میری جان

کیوں نہیں چھوڑتی۔ میں کیوں دو کشتیوں کا مسافر بن کے ڈوبنے والے کام کر رہا ہوں۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ راجا نے میری کمزوری کو ایک معذوری سمجھ کے قبول کر لیا تھا جس کا علاج نہ تھا۔ دوستی کے رشتے سے وہ بھی مجبور تھا کہ میرا ساتھ دے۔

لاہور جانے سے پہلے میں شامی کو دیکھنے گیا۔ موثر علاج، صحیح نگہداشت، آرام اور خوراک ملنے سے اس کی حالت میں نمایاں تبدیلی آئی تھی۔ وہ حرکت نہیں کر سکتا تھا کیونکہ کمر سے نیچے اس کا دھڑ مفلوج تھا۔ اس کے بائیں شانے پر بھی گولی کا زخم کافی گہرا تھا۔ بیوی نے اسے کھینچ کر تکیے کے سہارے تھوڑا سا اوپر اٹھا دیا تھا۔ اب اس کے کپڑے صاف تھے۔ شیو بنا دی گئی تھی اور بال بھی بے ترتیب نہیں تھے تو وہ خاصا صحت مند اور مطمئن لگ رہا تھا۔ شاید اس اطمینان کے پیچھے یہ احساس تھا کہ اب وہ محفوظ ہاتھوں میں ہے اور یہ یقین تھا کہ وہ زندہ رہے گا۔

مجھے دیکھ کر وہ خوشدلی سے مسکرایا اور اس نے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھایا۔ ''تم نے دیکھا نواب دوست۔ میں آ گیا...... وعدے کے مطابق۔''

میں نے اس کے ہاتھ کو تھام لیا۔ ''میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ مجھے خوشی ہوئی۔ خوشی اس روز ہو گی جب تم پھر مجھے گھوڑے پر اپنے ساتھ بٹھا کے لے جاؤ گے یا میرے ساتھ چلو گے۔''

وہ مجھے دیکھتا رہا۔ ''کیا ایسا دن آئے گا؟''

''ضرور آئے گا یقین رکھو۔ دیکھو اپنی بیوی کی طرف۔ ہم سب ناامید تھے لیکن اس کے اعتماد میں کمی نہیں آئی۔ بالآخر یہ تمہیں یہاں لے آئی، زندہ سلامت۔''

وہ ہنسا۔ ''ورنہ تم سب تو مجھ پر فاتحہ پڑھ چکے تھے۔ راجا صاحب نے تو میری قبر بھی دیکھ لی تھی اور دکھا دی تھی۔''

راجا نے سر ہلایا۔ ''یہ گولی کے یقین کا معجزہ ہے شامی بادشاہ۔ اب یہ تمہیں مرنے نہیں دے گی۔ تمہاری کوشش اس کی دعا سے کامیاب ہو گی۔''

''میں یہ معذور زندگی جینا نہیں چاہتا نواب دوست۔''

میں نے کہا۔ ''تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔ بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔ بس چند دن کی بات ہے۔ تم نے دیکھا یہاں بہت کچھ بدل گیا ہے۔ ہمارا ساتھ دینے والے اور لوگ بھی آ گئے ہیں۔''

''ہاں۔ وہ ڈاکٹر مہدی حسن اور اس کا بیٹا۔ دونوں کمال کے لوگ ہیں۔ اتنا عمر رسیدہ ہونے کے باوجود مہدی حسن کا حوصلہ جوان ہے اور اس کا بیٹا معذور ہونے کے باوجود صحت مند لوگوں سے زیادہ کام کرتا ہے۔''

گولی نے کہا۔ ''اتنا مصروف ہونے کے باوجود بڑے ڈاکٹر صاحب دن میں کئی چکر لگاتے ہیں۔ جب موقع ملتا ہے گپ شپ کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔''

راجا نے کہا ''باپ بیٹا آج کل ایک اسپتال کا سارا ساز و سامان خرید کے یہاں منتقل کرنے کے چکر میں لگے ہوئے ہیں اس لیے فرصت کم ہے۔''

شامی نے کہا۔ ''ہاں، صبح بھی مجھ سے کہہ رہے تھے کہ بس اب چند دن میں تمہارا آپریشن ہو گا۔ تیار ہو جاؤ۔ یہ سب خدا کی طرف سے ہے نواب دوست۔ تم نے انسانی فلاح کی نیت کی۔ خدا تمہیں پہلے ہی اس کے لیے منتخب کر چکا تھا۔''

میں نے ہنس کے کہا۔ ''اب مجھے اتنا بھی بانس پر نہ چڑھاؤ۔''

''نہیں نواب دوست۔ آخر یہ خیال اس نے میرے دل میں کیوں نہیں ڈالا۔ رانا کے دل میں کیوں نہیں ڈالا۔ یہ خدا نے طے کیا کہ تم کو لندن سے یہاں بھیجا جائے۔ کیونکہ تم ہی اس کے لیے موزوں سمجھے گئے۔ پھر وسائل خدا نے خود فراہم کیے اور مجھے یقین ہے کہ کرتا رہے گا۔ جیسے کہ اس ڈاکٹرز کی فیملی کو یہاں بھیج دیا۔''

میں نے کہا۔ ''اچھا شامی! مجھے ایک کام سے لاہور جانا ہے، تم آرام کرو۔ کھاؤ پیو اور خوش رہو۔ یہاں سب تمہارے دوست اور اپنے ہیں اور تمہیں صحت مند دیکھنا چاہتے ہیں۔''

وہ بے حد جذباتی ہو رہا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے آنکھوں سے لگایا۔ ''مجھے بہت افسوس رہے گا کہ بدخواہوں نے ہمارا راستہ روک دیا۔ میرے دس ساتھی قبروں میں پہنچا دیے۔ ورنہ آج وہ بھی تمہارے ساتھ ہوتے۔''

راجا نے اسے تسلی دی۔ ''آنے والے اچھے وقت کو دیکھو شامی بادشاہ۔ سوچنا ہی ہے تو گزرے ہوئے کل کو نہیں آنے والے کل کے بارے میں سوچو۔''

غنی کی خواہش تھی کہ سیکیورٹی کے لیے ایک گاڑی ہماری گاڑی کے پیچھے چلے لیکن میں نے انکار کر دیا۔ راجا نے بھی کہا کہ جو محافظ ہمارے ساتھ جا رہے ہیں وہی کافی ہیں۔ بالآخر یہ طے ہوا کہ ہم کار میں نہیں ڈبل کیبن پک اپ میں جائیں گے۔ اس میں غنی کے ساتھ آگے ایک محافظ کے پاس سیٹ کے نیچے کلاشنکوف تھی۔ لائسنس والے خودکار ریوالور ان دونوں کے علاوہ راجا کے اور میرے پاس بھی تھے۔ ہم پیچھے والے کیبن میں تھے اور ہمارے پیچھے کھلی جگہ میں دو

من پیچھے نظر رکھنے کے لیے موجود تھے۔

لاہور جانے والی جی ٹی روڈ پر آ کے میں نے ڈی آئی جی عبداللہ جان سے رابطہ کیا۔ آفس میں ان کے کسی معاون نے کال ریسیو کی...... ''آپ کون صاحب بول رہے ہیں؟'' اس نے محتاط لہجے میں سوال کیا کیونکہ عام لوگوں کی طرح میں نے آئی جی صاحب کو نہیں عبداللہ جان کو پوچھا تھا۔

میں نے کہا۔ ''میں نواب رفیق احمد شیرازی آف ست بدھائی ہوں۔''

''جی سر...... آپ کو ان سے کیا کام ہے؟''

''یہ میں انہی کو بتاؤں گا۔ تم میری ان سے بات کراؤ۔''

وہ بولا۔ ''آئی جی صاحب تو آج آفس نہیں آئے۔''

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ میں ان کے گھر یا موبائل فون پر بات کر لیتا ہوں۔''

آئی جی جیسے کسی بھی اعلیٰ سرکاری عہدیدار کے سیکریٹری اور پی اے بڑے کائیاں اور گھاگ ہوتے ہیں۔ وہ لہجے، رویے اور انداز سے جان لیتے ہیں کہ مخاطب کون ہے۔ اس کے باوجود وہ ذاتی یا سرکاری تعلق کی نوعیت جانے بغیر بڑے صاحب سے براہِ راست کسی کا رابطہ نہیں کراتے۔ ٹالنے کے ماہر ہوتے ہیں اور عزت یا بے عزتی کو دو پٹریاں سمجھتے ہیں جن پر نوکری کی گاڑی چلتی ہے۔

موبائل فون پر بھی میری عبداللہ جان سے براہ راست بات نہیں ہوئی۔ کال ان کی بیگم نے ریسیو کی۔ ''جی نواب صاحب...... وہ آرام کر رہے ہیں۔ دراصل آج ان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ آفس بھی نہیں گئے۔''

میں نے کہا۔ ''جی مجھے معلوم ہوا تھا۔''

پس منظر سے عبداللہ جان کی آواز سنائی دی۔ ''کون ہے؟ کیا نواب رفیق ہیں؟ لاؤ ادھر دو مجھے۔''

مسز عبداللہ جان نے کچھ خفت سے کہا۔ ''یہ لیں بات کرلیں۔'' پھر میں نے عبداللہ جان کی آواز سنی۔ ''السلام علیکم سر...... بخدا آپ نے تو ہمیں پشیمان اور حیران کر دیا۔''

میں نے کہا۔ ''پشیمانی تو مجھے ہونی چاہیے۔ آفس سے علم ہو جاتا کہ آپ علیل ہیں تو ہرگز ڈسٹرب نہ کرتا۔''

''اجی نہیں قبلہ۔ علالت کیسی، معمولی حرارت تھی۔ کچھ اپنی بہانہ ساز فطرت کہ چلو اس بہانے ہی کام چوری کی جائے۔ کچھ نصف بہتر کی دیرینہ حسرت کہ ہم سرکاری وقت میں سے ایک دن ہی ان کے لیے بھی نکالیں۔ بخدا یہی معروفیت کا جنجال ہے کہ اپنی فیملی بھی عدم توجہی سے نالاں رہتی ہے۔''

عبداللہ جان کی گفتگو کا وہی نستعلیق انداز تھا۔ وہ اردو ایسی بولتے تھے جیسی اکثر لوگ لکھ بھی نہیں سکتے۔ میں نے کہا۔ ''پھر تو یہیں سے لوٹ جانا چاہیے۔''

''ارے نہیں بھئی۔ آپ کہاں ہیں...... از کجامی آید ایں آواز دوست۔''

میں نے کہا۔ ''لاہور کے راستے میں۔ دفتر میں ملنے کا خیال تھا۔''

''دفتر میں کہاں وقت ملتا ہے نواب صاحب۔ آپ سیدھے گھر آ جائیے۔ کچھ دوستی کی تجدید ہی ہو جائے۔''

میں نے شرمندگی سے کہا۔ ''ہم بھی ایسے دوست ہیں جو کام پڑنے پر یاد کرتے ہیں۔''

وہ ہنسا۔ ''پھر کیا ہوا۔ دوست آخر ہوتے کس لیے ہیں۔''

عبداللہ جان کے رویے نے مجھے کافی حوصلہ دیا۔ وہ بلاشبہ ایک خاندانی آدمی تھا۔ وضعداری اور شرافت کے سارے اصول جن پر عام لوگ عام زندگی میں بڑا یقین رکھتے ہیں۔ جب دولت مندی یا اعلیٰ اختیارات اور جاہ وجلال والے منصب کی راہ پر چل نکلتے ہیں تو ایسے پیچھے رہتے جاتے ہیں جیسے عزیز واقارب۔ پہلے دور کے اور پھر قریب کے۔ چنانچہ عبداللہ جان جیسا ظرف رکھنے والے شخص کا رویہ حیران بھی کرتا تھا اعتماد بھی دیتا تھا اور خوشی بھی جو رشتوں کو بدستور اہم سمجھتے ہیں، عہدوں کو نہیں۔

مجھے اندازہ تھا کہ اسپیشل پولیس کے تھانے میں فریال تک میری براہِ راست رسائی نہیں ہوگی خواہ میں کتنے ہی نوابی کروفر کے ساتھ جاؤں۔ ایک تو وہاں بااختیار افسر خود بھی حاکمانہ فرعونیت کے مظاہرے میں ایک سے بڑھ کر ایک ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ معاملہ ہمارے محترم صوبائی وزیر داخلہ کی ناراضی کے سبب خصوصی حیثیت اختیار کر گیا تھا۔ یہ میری خوش نصیبی تھی کہ ایک طرف اگر شامی بادشاہ جیسا ڈاکو میری دوستی کا دم بھرتا تھا تو دوسری انتہا پر عبداللہ جان' انسپکٹر جنرل پولیس بن جانے کے باوجود مجھے عملاً دوست سمجھتا تھا۔

راجا تمام راستہ نہ جانے کس کس سے فون پر مصروف گفتگو رہا تھا۔ اس کے لیے کچھ دوستی کے تقاضے اہم تھے تو کچھ صحافت کے پیشے سے پرانی وابستگی کے۔ اگر وہ میرا دوست نہ ہوتا تب بھی فریال جیسی لڑکی پر پولیس اور وزیر داخلہ کا یہ جبر وتشدد برداشت نہ کرتا۔ اور کوئی فریاد اس کے کانوں تک پہنچتی تو وہ ذاتی معروفیت یا خوف کے باعث اپنے کان بند نہ کرتا۔ راجا نے اس معاملے میں فریال کے

ساتھ ہونے والی زیادتی کو ہر حوالے سے میڈیا کے سامنے لانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس لیے نہیں کہ فریال سے میرا کوئی جذباتی رشتہ تھا۔ صرف اس لیے کہ یہ زیادتی تھی، یہ ظلم تھا۔ ایک ایکٹریس اور ماڈل یا شاہی محلے کی ڈانسر کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ انکار کر سکے۔

راجا نے مجھے آئی جی صاحب کے سرکاری قصر عالی شان کے دروازے پر ڈراپ کیا۔ وہاں کھڑے ہوئے مسلح پولیس گارڈز کو پہلے سے میری آمد کی خبر تھی۔ وہ ڈبل کیبن پک اپ میں مسلح محافظوں کی تعداد سے بھی امپریس ہوئے تھے۔ اس کے باوجود انہوں نے بند دروازے کے اندر کسی سے انٹرکام پر بات کی تو گیٹ اندر سے کھولا گیا۔

عبداللہ جان نے ایک وسیع اور خوش رنگ لان پر ہمارا استقبال کیا۔ لان کے چاروں طرف پھول تھے۔ بالکل سفید رنگ کی بے حد آرام دہ کرسیوں میں سے ایک پر اس کی ہم عمر مگر فربہ اندام بیوی بیٹھی تھی۔ یقیناً اپنے زمانے میں اس کا حسن بھی قیامت خیز رہا ہوگا۔ کھنڈر بتا رہے تھے عمارت عظیم تھی۔ عام افسروں کی بیگمات کی طرح بے فکری، مالی آسودگی اور کاہلی نے اس پر چربی چڑھا دی تھی۔ اگر وہ خود کو فٹ رکھتی تو آج بھی خوبصورت ہوتی۔ رہی سہی کسر اس کی عینک نے پوری کر دی تھی جو نازک اور فیشن ایبل ہوتی تو اس کے چہرے پر سجتی۔ مگر اس نے موٹے فریم اور بڑے بڑے شیشوں والی عینک لگا رکھی تھی۔ تاہم خوش اخلاقی میں وہ اپنے شوہر سے کم نہ تھی۔ یا شاید عام بیویوں کی طرح اس نے خود کو شوہر کے مزاج کے مطابق بنا لیا تھا۔

راجا نے چائے سے بھی معذرت کر لی۔ ''مجھے ایک ضروری کام نہ ہوتا تو یقیناً میں آپ کی صحبت سے مستفید ہوتا۔''

عبداللہ جان کی بیوی بھی کام کے بہانے سے اٹھ گئی۔ اسے پہلے سے علم ہوگا کہ ست بدھائی سے آنے والے رفیق احمد اور عبداللہ جان جیسے دوستوں کے درمیان اس کی موجودگی غیر ضروری ہے اور شاید یہ بھی کہ ان کے درمیان ہونے والی گفتگو میں وہ مخل ہوگی۔

چائے آنے تک ہم ادھر ادھر کی رسمی باتیں کرتے رہے۔ میں نے ست بدھائی کے معمولات کا ذکر کیا تو اس نے اپنی عدیم الفرصتی کا...... جب ایک ملازم چائے رکھ کے چلا گیا تو میں نے اپنی آمد کی غرض وغایت بیان کی۔ مجھے احساس تھا کہ آج اس نے طبیعت کی ناسازی کے باعث چھٹی کی تھی اور یہ چھٹی وہ اپنی فیملی کے ساتھ گزارنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں نے سمندر کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی اور ایک طویل داستان کو اختصار کے ساتھ آدھے گھنٹے میں سمیٹ لیا۔

وہ سکون اور اطمینان سے سنتا رہا۔ حالات کے پس منظر سے وہ پہلے بھی واقف تھا چنانچہ واقعات کو سمجھنا اس کے لیے دشوار نہ تھا۔

کچھ دیر بعد میں نے کہا۔ ''اب آپ ہی بتائیے میں کیا کروں؟''

اس نے خالی کپ میز پر رکھا۔ ''دیکھیے رفیق صاحب۔ یہ جو فریال کا مسئلہ ہے یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ آپ جب جائیں تو اس سے مل لیں اور اسے اپنے ساتھ لے جائیں۔ بلاشبہ اس کے ساتھ بہت زیادتی ہوئی لیکن کیا، کیا جائے۔ ہمارا سوشل اور پولیٹکل سیٹ اپ ایسا ہی ہے۔ شاید آپ کو یاد ہو، بہت پہلے ابتدائی برسوں میں ایک گورنر کے ساتھ اسی قسم کا ایک واقعہ پیش آیا تھا۔ وہ بھی ایک مشہور ایکٹریس اور ڈانسر تھی۔ لیکن وہ دبا دیا گیا تھا۔''

میں نے مایوسی سے کہا۔ ''آپ کا مطلب ہے...... یہ بھی دبا دیا جائے......''

وہ مسکرایا۔ ''نہیں سر...... آپ اس کو جتنا چاہیں اچھالیں۔ یہ میڈیا کا دور ہے۔ اس سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ نہ میں اوپر والے باس سے پوچھ سکتا ہوں کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ نہ نیچے والے ماتحتوں کو سزا دے سکتا ہوں کہ انہوں نے فریال سے یہ...... بدسلوکی کیوں کی؟''

''مطلب یہ کہ آپ کچھ نہیں کر سکتے؟''

وہ ہنسنے لگا۔ ''بالکل غلط مطلب نکالا آپ نے۔ اس نظام کی اصلاح کے لیے میں واقعی کچھ نہیں کر سکتا لیکن آپ کے لیے سب کچھ کر سکتا ہوں۔ قانون کسی کو زیادتی کی اجازت نہیں دیتا۔ فریال زیادتی کرنے والوں کے خلاف عدالت میں کیس کرے۔ یہ مشکل ہے تو ایک شکایت مجھے ارسال کرے۔ آپ کا دوست راجا اتنا بڑا صحافی ہے۔ وہ اس کیس کا ذکر اپنے کالم میں کرے۔ فریال سے کوئی پریس کانفرنس کرا دے۔ رپورٹ اخبارات میں شائع کرائے۔''

''یہ سب وہ کر رہا ہے۔''

''پھر دیکھیے میں ذمے داروں کو کیا سزا دیتا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''انہی نچلے درجے کے ذمے داروں کو؟''

''ظاہر ہے۔ میں کسی ایس پی یا ڈی آئی جی کو معطل یا برطرف کرنے کا کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ میری جگہ کوئی دوسرا آئی جی نوٹس بھی نہ لیتا۔ ایسے تو سیکڑوں واقعات ہر روز ہر جگہ ہوتے رہتے ہیں۔''

''اگر آپ کے وزیر داخلہ خفا ہو گئے...... پھر؟''

''اس کی مجھے پروا نہیں۔ ایسے کئی وزیر آئے اور گئے۔ اپنی نوکری پکی ہے نواب صاحب۔ لیکن فریال کے معاملے میں قانونی پوزیشن ذرا خراب ہے۔ جب تک چودھری سلطان کا پتا نہیں چل جاتا آپ کی اور فریال کی پوزیشن کلیئر نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ ایک تو آپ اپنے انٹرسٹ میں اس کا سراغ لگائیں اور اس کیس میں ہائی کورٹ سے ضمانت کی توثیق کرالیں۔ سال دو سال گزر جائیں تو آپ ایف آئی آر سے اپنا نام بھی نکلوا سکتے ہیں۔ اس بات کا اطمینان رکھیے کہ جب تک میں یہاں ہوں پولیس آپ کے خلاف کوئی غیر قانونی قدم نہیں اٹھائے گی۔ نہ آپ کو پریشان کرے گی۔''

میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''تھینک یو...... میرا خیال ہے کہ اب مجھے فریال سے ملنا ہے۔''

عبداللہ جان نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ''اب آپ کھانا کھا کے ہی جائیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''وہ پھر کبھی سہی۔''

''پھر کبھی کو چھوڑیے۔ معلوم نہیں پھر یہ فرصت کا موقع ملے نہ ملے۔ ملاقات کب ہو کہاں ہو...... کچھ پتا نہیں۔ آج آپ آئے ہیں تو میں دوست ہونے کے ناتے آپ سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ میں ہدایت جاری کر دیتا ہوں۔ آپ راجا سے کہیے وہ فریال کو جہاں مناسب سمجھے لے جائے۔ اگر یہاں بھی لے آئے تو کوئی حرج نہیں۔''

ظاہر ہے اس کے بعد میرے لیے انکار کی گنجائش ہی نہ رہی۔ میں نے راجا سے بات کی اور آئی جی صاحب تھوڑی دیر کے لیے اندر تشریف لے گئے اور پھر آ کے میرے سامنے بیٹھ گئے۔

''میں نے سنا ہے کہ آپ کا ست بدھائی والا اسپتال بہت جلد ایک مکمل اسپتال بن جائے گا۔''

میں نے کہا۔ ''پھر تو آپ کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ اس کام میں مجھے ڈاکٹر مہدی حسن کیلی کا بھرپور تعاون حاصل ہے۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''وہ کیا کہا ہے غالب نے۔ گو میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار۔ لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رہا۔''

''بس مجھے رانا کی طرف سے دھڑکا لگا رہتا ہے۔''

اس نے میری بات کاٹ دی۔ ''نواب صاحب۔ آپ ابھی سیاست کے اس خارزار میں نووارد ہیں۔ اس لیے زیادہ پریشان ہیں۔ میری تو عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں۔''

میں نے کہا۔ ''آپ کے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ ''یہ عمر اور تجربے کی بات ہے رفیق صاحب جو میں آپ کو سمجھانا چاہتا ہوں۔ آپ نے تو ابھی سیاست کے میدان میں قدم رکھا ہے۔ آپ کسی بھی حکومت کو لے لیں۔ اسے چلاتے ہیں سیاست داں اور بیوروکریٹ۔ بیوروکریسی بھی دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ملٹری اور سول بیوروکریسی۔''

''یہ تو میں سمجھتا ہوں۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں آپ نہیں سمجھتے۔ ان کو سپورٹ کرنے والے دو طبقے ہیں۔ ایک جاگیردار وڈیرے...... دوسرے مذہبی وڈیرے، آپ کیا ہیں؟''

میں چونکا۔ ''میں کیا ہوں؟''

''جی۔ اپنی ولایت کی تعلیم کو چھوڑیے۔ یہاں آپ سے بڑی بڑی ڈگریوں والے بقول شاعر پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں۔ لیکن ایک کوالیفکیشن ہے آپ کے پاس جو آپ کو سیاست کا اہل بناتی ہے۔ آپ جاگیردار طبقے میں شامل ہوگئے ہیں۔ حسنِ اتفاق سے یا حادثاتی طور پر۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا۔ مگر یہاں جو پرانے وڈیرے ہیں وہ آسانی سے آپ کو اپنی صف میں گھسنے نہیں دیں گے۔ وہ مزاحمت کریں گے کیونکہ وہ آپ کے مقابلے میں خاندانی ہیں۔ انہیں اپنے نسب پر ناز ہے۔ اسی طرح جیسے خاندانی رئیس آج کے نودولتیوں کے خلاف تعصب رکھتے ہیں۔''

''اب وہ خاندانی رئیس کہاں ہیں۔ سب نودولتیے ہی معزز ہیں۔''

''رائٹ...... اسی طرح آپ کو بھی ان جاگیرداروں میں اپنی جگہ بنانی ہے۔ زبردستی گھسنا ہے ان میں۔''

میں نے حیرانی سے کہا۔ ''وہ کیسے؟''

عبداللہ جان ہنسا۔ ''آپ اتنے اناڑی بھی نہیں ہیں نواب رفیق احمد شیرازی۔ بس کسرِ نفسی سے کام لے رہے ہیں۔ ورنہ آپ گھس چکے ہیں سیاست میں۔ چیف منسٹر وہاں اپنے مطلب سے آیا تھا۔ آپ نے بڑی ذہانت سے اپنے مقصد کے لیے استعمال کرلیا۔ دس کروڑ کا چندہ دے کر آپ نے بڑا اچھا کارڈ کھیلا تھا۔''

میں نے ہنس کے کہا۔ ''وہ بھی آپ ہی کا مشورہ تھا۔''

''اب دوسرا کارڈ کھیل دیں رفیق صاحب...... ایک بڑا اچھا موقع ہے۔''

''وہ کیا؟''

''چلیے باقی باتیں کھانے کی میز پر ہوں گی۔ آئیے۔'' وہ مجھے اندر کھانے کے کمرے میں لے گیا۔

اس کی بیوی نے کم وقت میں بھی خاصا اہتمام کرلیا تھا۔ کھانے کی میز پر عبداللہ جان نے میرا تعارف اپنے دونوں بچوں سے بھی کرایا۔ بڑی لڑکی ایم بی بی ایس کے

تھرڈ ایئر میں تھی۔ لڑکا بی اے کر چکا تھا اور ایم بی اے کے لیے باہر جانے کے چکر میں تھا۔ ان سب کے اطوار میں عبداللہ جان کی وضعداری اور شائستگی کا رنگ نمایاں نظر آتا تھا۔ دو چھوٹے بچوں کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ کہیں گئے ہیں۔ کھانے کے دوران میں صرف عمومی گفتگو ہوئی۔

کھانے کے بعد وہ مجھے اپنی اسٹڈی میں لے گیا جو اس کا آفس بھی تھی اور ایک شاندار لائبریری بھی۔ شعروادب کے اس ذخیرے میں میرے اندازے سے زیادہ کتابیں ہوں گی۔

ایک ایزی چیئر پر بیٹھ کے کافی پیتے ہوئے عبداللہ جان نے پھر بات شروع کی۔ ''نواب صاحب۔ یہ لڑائی جھگڑے، قانونی مقدمات، ان سے رانا ڈرنے والا نہیں ہے۔ وہ آپ کے لیے مسلسل پریشانی کے اسباب پیدا کرتا رہے گا۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ بڈھا ہوگیا ہے اور بیمار بھی رہتا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ اگلے انتخابات میں اس کا بیٹا بلا مقابلہ اس کی جگہ صوبائی اسمبلی کی سیٹ پکڑ لے۔ لیکن آپ کی مقبولیت اس کے لیے ایک خطرہ بن گئی ہے۔''

''میرا پروگرام سیاسی ہرگز نہیں تھا۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''آپ جس ترقیاتی پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کا سوچ رہے ہیں۔ اس کے لیے سیاسی طاقت ضروری ہے اور وہ آپ حاصل کرسکتے ہیں۔''

''وہ کیسے؟''

''بس رانا کی سیاسی حیثیت کو چیلنج کردیں۔ اس کے جدی پشتی اقتدار کے سامنے ڈٹ جائیں۔ دیکھیے، حالات اب پہلے جیسے نہیں رہے۔ خصوصاً ان پرانے پیشہ ور پاپی سیاستدانوں کے لیے۔ ملک کو نئی سیاسی قیادت چاہیے۔ آپ جیسے تعلیم یافتہ مخلص اور باہمت نوجوان جن کے ہاتھ صاف ہیں ان کرپٹ اور لٹیرے حکمرانوں کو جڑ سے اکھاڑ کے پھینک سکتے ہیں۔ حالانکہ ان کی جڑیں بہت گہری ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''آپ میرے سیاسی مشیر کیوں نہیں بن جاتے۔''

وہ بولا؟ ''سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے۔ جب آپ سیاست کے میدان میں دھم سے کود دیں گے تو مشیر اور کارکن سب مل جائیں گے۔ راجا آپ کے ساتھ ہے۔ جلسہ جلوس۔ جوشیلی تقاریر۔ پریس کانفرنس۔ یہ سب آپ کرسکتے ہیں۔ میڈیا کو ساتھ ملائیں، خریدیں، میڈیا کی سیاست میں وہی طاقت ہوگئی ہے جو تاش کے پتوں میں یکے کی ہوتی ہے۔''

''یہ تو آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔''

''وزیر داخلہ سے راجا کو نمٹنے دیں۔ فریال کی ایک پریس کانفرنس اس کا امیج بگاڑ دے گی۔ آپ ملیں چیف منسٹر سے۔ اسے کہیں کہ وہ نئے اسپتال کا افتتاح کرنے بھی آئے۔ ایک مکمل اسپتال کے قیام کا اعلان پریس کانفرنس میں کریں۔ چار صفحے کا رنگین سپلیمنٹ شائع کرائیں۔ یہ پبلسٹی کا زمانہ ہے۔ پبلسٹی کی بنیاد بھی مبالغے پر ہوتی ہے۔ چیف منسٹر پبلسٹی چاہتا ہے۔ وہ آئے گا۔ آپ اس کی پارٹی میں شمولیت کا اعلان کردیں۔''

''میں نے تو اس کی پارٹی کا منشور بھی نہیں دیکھا۔''

''چھوڑیں منشور کو۔ اوپر جانے کے لیے ایک سیڑھی درکار ہوتی ہے۔ سیڑھی کس نے گھڑی کی ہے۔ کہاں کی بنی ہوئی ہے۔ یہ سب غیر اہم ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ چیف منسٹر خود آپ کو اس علاقے کے لیے ٹکٹ دلوائے گا، رانا کے مقابلے میں۔ پھر آپ جیت سکتے ہیں نواب صاحب۔''

''کیونکہ سرکاری مشینری میرے لیے استعمال ہوگی؟''

''یہ ایک وجہ ہے۔ دوسری زیادہ اہم اور بڑی وجہ آپ خود ہیں۔ شرط لگانے والے احمق نہیں ہیں کہ کسی کمزور گھوڑے پر داؤ لگائیں۔ اگر آپ طے کرلیں تو مجھے آپ کی فتح صاف نظر آرہی ہے۔ اس کے بعد سارے ترقیاتی پروگرام یوں پورے ہوں گے۔'' اس نے چٹکی بجائی۔

جب ڈھائی گھنٹے بعد میں عبداللہ جان کے گھر سے نکلا

تو میرا ذہن خاصا بدلا ہوا تھا۔ میں سنجیدگی سے سوچ رہا تھا کہ عبداللہ جان کے دیے ہوئے مشورے پر عمل کرنا ہی میرے مسائل کا حل ہے۔ اسی دوران مجھے راجا کا فون بھی موصول ہوگیا تھا۔ اس نے فریال کو واپس اپنے گھر پہنچا دیا تھا اور وہیں پر انتظار کر رہا تھا۔ میرے پہنچنے سے پہلے ان کے درمیان کیا بات ہوئی۔ اس کا علم مجھے بعد میں ہوا۔

جب میں پہنچا تو فریال سو رہی تھی۔ راجا نے کہا۔ ''وہ ٹھیک ہے، پولیس نے اسے سونے نہیں دیا تھا رات بھر۔ اعتراف جرم حاصل کرنے کے لیے۔''

''اور کیا، کیا تھا؟''

راجا نے جھنجلا کے کہا۔ ''کیا ہوتا ہے تھانوں میں۔ تو جانتا نہیں یا مجھ سے سننا چاہتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ میں نے فریال سے نہیں پوچھا۔ مجھ میں ہمت نہیں تھی۔ وہ اگر تجھے بتاتی ہے تو اسی سے سن لینا۔''

میں نے کہا۔ ''تو خفا کیوں ہو رہا ہے۔ اسے تو لایا ہے پولیس کی تحویل سے چھڑا کے۔ تو نے کیا دیکھا، کیا محسوس کیا؟''

راجا نے ایک گہری سانس لی۔ ''اوکے۔ مجھے معلوم تھا کہ اس تک پہنچنا آسان نہیں ہوگا چنانچہ وہاں جانے سے پہلے میں نے متعدد اخبارات کے کرائم رپورٹرز سے رابطہ کیا۔ کچھ سالے ابن الوقت۔ ہر دور میں فائدہ اٹھانے والے، خوشامدی چمچے، انہوں نے ٹال دیا لیکن دو چار نے ادھر ادھر فون کیے اور ایک میرے ساتھ بھی گیا۔ اسپیشل پولیس والوں نے فریال کو الگ رکھا تھا۔ ایک مہا حرامی قسم کا ایس پی تھا۔ اس نے صاف انکار کر دیا۔ کہا کہ آپ خود دیکھ لو۔ نہ روزنامچے میں اندراج۔ نہ کوئی ایف آئی آر۔ حوالات میں کوئی نہیں۔ ڈیوٹی پر حاضر عملے سے پوچھ لو۔ پھر اتنی دیر میں کہیں سے کوئی فون آگیا۔ ایس پی نے ٹالنے کی بہت کوشش کی۔ یس سر یس سر بھی کرتا رہا اور انکار بھی کہ میں کس کی مانوں آپ کی یا بڑے صاحب کی۔ اچھا ہوتا اگر آپ پہلے ان سے بھی بات کر لیتے۔''

''کون بڑا صاحب؟''

''وہی کڑوا کریلہ۔ صوبائی وزیر داخلہ اور کون۔'' راجا بولا۔

میں نے کہا۔ ''میں سمجھ گیا۔ فون عبداللہ جان کا ہوگا۔''

''ہاں۔ اچانک ایس پی صاحب کا رنگ اڑ گیا۔ پتا نہیں ادھر سے عبداللہ جان نے کیا کہا۔ ایک دم اس کا لہجہ ہی بدل گیا۔ کہنے لگا کہ نہیں نہیں سر۔ آپ غصہ مت ہوں۔ میرا ہرگز یہ مقصد نہیں تھا۔ میری کیا مجال جو آپ کے حکم کو ٹالوں۔ سالے کو پسینا آگیا۔ فون رکھ کے اس نے ٹوپی سر پر رکھی اور بولا کہ چلیں میرے ساتھ۔ وہ ہمیں شالیمار باغ سے آگے داروغہ والا کی طرف لے گیا۔ وہاں ایک کوٹھی میں نجی حوالات بنا رکھی ہے۔ سی آئی اے اور اسپیشل پولیس والے کسی بندے کو غائب کرتے ہیں تو وہاں رکھتے ہیں۔ تفتیش میں تھرڈ ڈگری کے سارے طریقے وہیں آزماتے ہیں۔ بندہ مر جائے تو کہیں گاڑ کے چپ سادھ لیتے ہیں۔ ادھر ادھر کے لوگوں کو شک پڑ جائے تو جگہ بدل بھی لیتے ہیں۔ یہ سب ہوتا ہے۔ نہ جانے کتنے بندے ایسے ہی لاپتا ہو جاتے ہیں۔ خیر...... وہاں فریال ایک کمرے میں تھی۔ اس کے ساتھ کوئی جسمانی تشدد تو نہیں کیا گیا لیکن جو کچھ اس نے دیکھا یا اسے دکھایا گیا۔ وہ پھر نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہوگئی ہے۔''

''او مائی گاڈ۔ اتنی مشکل سے وہ ٹھیک ہوئی تھی۔''

''ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی وہ مان گئی تھی۔''

''یعنی جو انہوں نے کہا۔ اس نے لکھ کر دے دیا تھا؟''

''نہیں نیکے پتر۔ اس حرامزادے نے سب جھوٹ بکا تھا' اس ڈی ایس پی نے جو تجھے گرفتار کرنے آیا تھا۔''

''کیا مطلب؟''

''مطلب یہ کہ فریال نے چودھری سلطان کے قتل کا کوئی اعتراف نہیں کیا تھا۔ نہ اس نے تیرا نام لیا تھا کہ تو نے اسے قتل کر کے کہیں گاڑ دیا ہوگا۔ وہ مان گئی تھی کہ وزیر داخلہ عجب خاں کریلہ کے بیٹے کی شادی میں رقص کرے گی۔''

میرے دماغ کا فیوز بھک سے اڑ گیا۔ ''یہ تو کیا بکواس کر رہا ہے۔ فریال ایسا نہیں کر سکتی۔''

''اس کی جگہ کوئی بھی ہوتا یہی کرتا۔'' راجا نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''اگر وہ نہ مانتی تو آج تجھے وہاں لایا جاتا۔ وزیر صاحب کو یقین تھا کہ یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ اور اس ایس پی کو بھی۔ انہوں نے بندہ بھیجا تھا کہ بس جاؤ اور نواب رفیق کو اٹھا لاؤ۔ فریال کو بتا دیا گیا تھا کہ آج دن میں کیا ہوگا۔ جو گزشتہ رات دوسروں کے ساتھ ہوا تھا وہی نواب صاحب کے ساتھ ہوگا۔ اور نواب صاحب سو بار لکھ کر دیں گے کہ انہوں نے چودھری سلطان کو قتل کیا۔ کیسے قتل کیا۔ لاش کا ڈسپوزل کیسے کیا۔ پھر فریال کیسے نہ مانتی۔ کل رات وہ ناچے گی۔''

''مگر میں فریال کو ایسا نہیں کرنے دوں گا راجا۔''

راجا ہنسا۔ ''کیوں؟ تو کیا کرے گا؟ اس کی عصمت و عفت کا محافظ بن کے ہیرو کی طرح گنڈاسا اٹھا کے بڑک مارتا ہوا جائے گا وہاں اور محفل میں سے فریال کو اٹھا کے لے آئے گا!''

''آئی جی عبداللہ جان نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ فریال لکھ کر شکایت کرے۔ میں ان سب کو برطرف کر دوں گا۔''

''کون سب؟ شکایت وہ کس کے خلاف کرے گی؟ اور کیا شکایت کرے گی۔ پاگل مت بن۔''

''یہ ظلم ہے راجا۔''

''کوئی ظلم نہیں۔ وہ فلموں میں ڈانس کرتی ہے یا نہیں۔ فلم کے سیٹ پر بھی تماشائی تو ہوتے ہیں۔ کسی شادی کی محفل میں ناچ لے گی تو کون سی اس کی عزت میں فرق پڑ جائے گا۔ اور بھی دو ڈانسرز ہیں جو پرفارم کریں گی۔ فریال سے زیادہ نامور ہیں۔''

احساس شکست، شرمندگی اور غصے کے ملے جلے جذبات نے میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت خبط کر دی۔ ''راجا، راجا خدا کے لیے سوچ۔ یہ ظلم ہے کہ نہیں۔ تو نے کہا تھا کہ اس کے خلاف آواز اٹھائے گا۔ فریال کو پریس کانفرنس میں پیش کرے گا۔ اس وزیر داخلہ کی ایسی تیسی ہو جائے گی۔ یہ اچانک تجھے کیا ہوا۔''

''اچانک کچھ نہیں ہوتا نیکے پتر۔ وہ کیا شعر ہے جو تو اکثر پڑھتا ہے۔ وقت کرتا ہے پرورش برسوں۔ حادثہ ایک دم نہیں ہوتا۔ جب فریال نے حویلی کی یعنی تیری محبت کی عمر قید سے رہائی حاصل کرنے اور شوبزنس کی گلیمرس دنیا میں لوٹ کر جانے کا ارادہ کیا ہوگا تو بہت دن سوچا ہوگا۔ ایسے ہی بیٹھے بیٹھے ایک لمحے میں طے نہیں کر لیا ہوگا کہ اس کے لیے کون سی زندگی اچھی ہے۔ اس کے دل نے اور دماغ نے دونوں طرف کھینچا ہوگا۔ دونوں طرف کی تصویر دکھائی ہوگی اور جب اس نے اپنی موجودہ زندگی کے حق میں فیصلہ کیا ہوگا تو یقیناً اپنا فائدہ دیکھ کے کیا ہوگا۔ لیکن یہ نہیں کہ وہ انجان تھی۔ وہ گاؤں دیہات سے یا کسی نچلے طبقے کی لڑکی تھی جو ہیروئن بننے کے شوق میں گھر سے بھاگ کر آئی ہے تو اسے اندازہ نہیں ہوتا کہ عزت، شہرت اور دولت کی منزل کے راستے میں بدکاری، ذلت اور رسوائی کے کتنے گڑھے ہیں۔ اسے سب معلوم تھا کہ یہاں کیا ہوتا ہے اور کیا نہیں ہوتا۔ وہ پہلے بھی اس کا تجربہ کر چکی تھی اور سب جانتی تھی۔''

میں نے کہا۔ ''یہ سب اس نے کہا تجھ سے یا تو نے اسے بھی کھری کھری سنائیں۔''

''کسی نے کسی سے کچھ بھی نہیں کہا۔ اس نے خود سمجھ لیا اور اچھا ہوا مزید خرابی سے پہلے سمجھ لیا۔ اس نے کہا کہ راجا، کیا فائدہ خود کو اور اپنے ساتھ سب کو آزمائش میں ڈالنے کا۔ میرے ایک ڈانس کرنے سے بات ختم ہوتی ہے تو یہ آسان راستہ ہے۔ پھر میں نے بھی اسے سمجھایا۔''

''کیا سمجھایا؟''

''یہی کہ ست بدھائی میں رہنے والے نواب رفیق احمد شیرازی کی دنیا الگ ہے۔ ذمے داریاں مختلف ہیں۔ وہ تمہارے لیے کیا کر سکتا ہے اور کب تک۔ بالکل اسی طرح جیسے تم اس کے لیے کچھ کرنے سے قاصر ہو۔''

''تو نے اسے کہا کہ میرا پیچھا چھوڑ دے؟''

''صاف الفاظ میں ایسے نہیں لیکن میرا مطلب وہ سمجھ گئی۔ میں نے کہا کہ عبداللہ جان آئی جی ہے تو کیا۔ وہ بہت دور ایسی جگہ اپنے آفس میں بیٹھا ہے جہاں پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ کسی کی رسائی نہیں۔ نہ کسی فریادی کی نہ کسی فریادی کی۔ سارا نظام تو انہی نچلے درجے کے افسروں ماتحتوں پر چلتا ہے۔ کل کو نہ یہ آئی جی ہوگا اور نہ یہ وزیر داخلہ مگر باقی سب ہوگا۔ یہ تھانے، اسپیشل پولیس، سی آئی اے اور ان کے کرتا دھرتا۔ تم ایک بہت کمزور اور چھوٹی سی مچھلی ہو اور یہ سب خونی مگرمچھ۔ خون ان کے منہ کو لگا ہوا ہے۔ تمہارا نواب رفیق کیا ان سب کو ختم کر سکتا ہے۔ ہاں دوسرا طریقہ ہے جان بچانے کا۔ بھاگ جاؤ، جنگ میں بقا کا یہی اصول ہے۔ دشمن قوی ہے تو پسپائی اختیار کر لو۔ اب تو جا۔''

''اور تو کب آئے گا؟''

''میں نے چیف منسٹر کے اسی پی آر او کو فون کیا تھا۔ اس کے ساتھ آج رات میٹنگ ہے۔ میں اسے قائل کرتا ہوں کہ چیف منسٹر سے بات ہو جائے۔ کیا وہ بھول گیا ہے کہ ہم نے اسے دس کروڑ کا چندہ دیا تھا، پارٹی فنڈ میں۔''

میرے ذہن میں عبداللہ جان سے ہونے والی گفتگو آئی۔ ''یار عبداللہ جان نے بھی یہی مشورہ دیا تھا کہ چیف منسٹر کی پارٹی جوائن کر لو۔ اسپتال کی توسیع ہو رہی ہے تو اسے پھر افتتاح کے لیے بلاؤ۔ خوب دھوم دھڑکے سے۔ اور اعلان کر دو رانا کے حلقے سے انتخابات میں کھڑا ہونے کا۔''

راجا مسکرا دیا۔ ''نیکے پتر۔ اس آئی جی کے دماغ میں یہ بات آج آئی ہے۔ ہمیں یہی کرنا تھا اور یہی ہوگا انشاءاللہ۔''

جب میں فریال سے ملے بغیر فریال کے گھر سے نکلا تو کچھ دل شکستہ، خفا اور مایوس بھی تھا۔ یہ احساس تھا کہ ہم نے مقابلے سے پہلے مصالحت کا راستہ اختیار کرتے ہوئے پسپا ہونا قبول کر لیا۔ زندگی کے جذباتی فیصلے دکھ اور پچھتاوے کے سوا کیا دیتے ہیں۔ راجا نے غلط نہیں کہا۔ ہم بیک وقت مخالف سمتوں میں آگے نہیں بڑھ سکتے۔ فریال کی اور میری زندگی کے راستے جدا ہو چکے ہیں، تو وقت گزرنے کے ساتھ دوری

بڑھتی جائے گی۔ بالآخر ہمیں احساس ہوگیا ہے کہ اب ہم ایک دوسرے کے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ ایک وقت آئے گا جب ہم بالکل لاتعلق اور اجنبی ہو جائیں گے۔ کبھی ملیں گے ہی نہیں اور پھر یہ بھی بھول جائیں گے کہ کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا۔ زندگی ایسی ہی سفاک ہے۔

فریال کی گاڑی پورچ میں کھڑی تھی جو درحقیقت چودھری سلطان کی گاڑی تھی۔ چابی اس میں لگی ہوئی تھی اور شیر خاں کچھ فاصلے پر گیٹ کیپر کے ساتھ گپ لگا رہا تھا۔ ان دونوں کو فریال کی حفاظت کے لیے ست بدھائی نے بھیجا گیا تھا۔ چنانچہ جب میں نے شیر خاں کو طلب کر کے چلنے کے لیے کہا تو اس نے یہ پوچھنے کی جرأت نہیں کی کہ کہاں جانا ہے۔ غنی باہر ڈبل کیبن پک اپ میں اپنی سیکیورٹی فورس کے ساتھ موجود تھا۔ وہ آگے آیا۔

میں نے کہا۔ ''غنی، راجا صاحب یہیں ہیں۔ میں ابھی کچھ دیر میں لوٹ کے آتا ہوں پھر ہم ساتھ ہی چلیں گے۔''

''لیکن سر......''

میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''یہ فریال کی گاڑی ہے اور پھر شیر خاں میرے ساتھ ہے خطرے کی بات نہیں، تم یہاں ٹھہرو۔''

پھر میں نے شیر خاں سے نور کے گھر چلنے کے لیے کہا۔ اسے پتا سمجھانے کی کوشش کی تو اس نے کہا۔ ''جناب عالی ہم سیکریٹری صاحب کو کئی بار گھر چھوڑنے گیا ہے۔''

غیر متوقع طور پر مجھے اپنے سامنے پا کے نور کھل اٹھی۔ ''تم کہو گے ڈائلاگ مارتی ہے لیکن یہ سچ ہے کہ مجھے تمہارا انتظار تھا۔ میرے دل نے کہا تھا......''

''تمہاری وہی فریکوئنسی والی تھیوری۔ جو میرے دل میں آیا وہ تمہارے دل تک پہنچ گیا۔ وائرلیس جذبات کی لہروں پر۔''

وہ اٹھلائی۔ ''کہہ دو کہ یہ غلط ہے۔''

میں نے اسے اپنی بانہوں میں گھیر لیا۔ ''تیاری تو کہیں جانے کی تھی۔ گھر میں تو کوئی ایسے بن ٹھن کے نہیں رہتا۔''

اس نے نظریں اٹھائیں۔ ''تیاری کسی خاص مہمان کا استقبال کرنے کے لیے بھی تو ہوتی ہے۔''

میں نے اسے چھوڑ دیا۔ ''اچھا تو میری حیثیت اب مہمان کی ہوگئی؟ مہمان کی خاطر تواضع کا کیا انتظام ہے؟ کیا پیش کرو گی خاطر مدارات کے لیے۔''

وہ ہنسی۔ ''مہمان کے لیے سب حاضر ہے۔ اسے کیا چاہیے۔ جان و دل، خونِ جگر، گردے پھیپھڑے یا پھر......''

میں ایک صوفے پر گر گیا۔ ''اونہوں...... پیٹ تو بھرا ہوا ہے۔''

''اور نیت......'' اس نے شوخی سے بال سمیٹے۔

''وہ بھی ٹھیک ہے فی الحال...... ضرورت ہے بہت اچھی کافی کی جو محبت بھرے پکوڑوں اور چاہت کے شامی کبابوں کے ساتھ ملے۔''

''ملے گی...... ملے گی...... بس تھوڑا سا صبر کرنا پڑے گا۔ جذبات کے قیمے والے سموسے اور کٹلٹس بھی ہیں۔''

میں اس کے بیڈ پر اس کے تکیے پر سر رکھ کے لیٹ گیا۔ تکیے میں سے اس کی خوشبو پھوٹ رہی تھی۔ بستر اس کے وجود کی مہک میں بسا ہوا تھا۔ میرا دماغ جو نیند سے پہلے پریشان خیالی کے جنگل میں بھٹکتا تھا یکلخت جیسے کسی خواب کی وادی کے خوش رنگ نظارے سے مسحور ہوگیا۔ اس کی خوشبو میں کھو گیا۔ نور نے آہستہ سے میرے شانے پر اپنا ہاتھ رکھا...... ''جان...... راجا کا فون ہے۔''

میں چونک کے اٹھا اور اس کے ہاتھ سے موبائل فون لے لیا۔ ''رات ہوگئی۔ تم نے مجھے سونے دیا۔''

راجا نے کہا۔ ''یہ کیا حرکت ہے فیکے پتر۔ ہم تیرے انتظار میں سوکھ رہے ہیں۔ تو سو رہا ہے؟''

''سوری یار۔ نیند آگئی۔ میرا تو ارادہ تھا کہ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں واپس پہنچ جاؤں۔''

''اگر یہ ارادہ بدل چکا ہے تو بتا دے؟''

میں نے کہا۔ ''میرا خیال ہے تو جا۔ میں اسی گاڑی میں شیر خاں کے ساتھ تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔''

راجا نے فون بند کر دیا تو میں نے گھڑی دیکھی۔ ''دو گھنٹے سونے دیا تم نے مجھے؟''

''راجا کا فون نہ آتا۔ اور وہ اصرار نہ کرتا تو میں اب بھی نہ جگاتی۔''

''اور وہ سب کہاں گئے، اسبابِ مہمان نوازی۔'' میں نے جماہی اور انگڑائی لی۔

وہ مسکرائی۔ ''تم ہاتھ منہ دھو لو میں لاتی ہوں یا اب کھانے کا موڈ ہے تو......''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کھانے کے بعد کیا ہوگا۔ مجھے معلوم ہے۔ راجا مجھے قتل کر دے گا۔ آج اس پر خون سوار ہے۔''

چائے پیتے ہوئے میں نے اسے اپنے ہنگامی دورے کی وجہ بھی بتا دی۔ ''راجا تمہارا دوست نہیں، تمہارا دماغ ہے۔'' نور نے کہا۔

''ہاں دماغ ہے تم دل ہو۔ میں وہ ہوں جو نہ ادھر ہے نہ ادھر۔ کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے۔''

''مجھے ڈر تھا تم برا نہ مانو۔ لیکن میں یہ کام نہیں کر سکتی۔ تمہاری خاطر میں نے کوشش ضرور کی تھی کہ فریال کی مدد کروں۔''

میں نے کہا۔ ''یہ تمہارے ساتھ زیادتی ہوگی تم سے ایسی توقع رکھنا میری بے وقوفی تھی۔ آئی ایم سوری۔''

''بے وقوف میں بھی ہوں۔ جو سپر وومن بننے کی کوشش کرتی رہی۔ نہ حسد نہ رقابت۔ نہ تم سے کوئی توقع۔ یہ خود فریبی تھی میری۔ میں عام عورت ہوں، جذباتی اور کمزور۔ خود غرض اور حریص۔ غیر مشروط محبت بکواس ہے۔ مجھے تمہارا ساتھ چاہیے۔ تمہاری محبت چاہیے۔ مکمل...... وہ کیا کہتے ہیں کرسچن شادی کے وقت۔ جب تک موت ہمیں جدا نہ کر دے۔''

''اس وقت تم نے مجھے حیران کر دیا اور دیوانہ بنا لیا اپنا' سچ بول کے۔ اپنی کمزوری یا غلطی مان کے۔'' میں نے اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں کے درمیان رکھ لیا۔

اس نے میری آنکھوں میں دیکھا۔ ''فریال کا خیال دل سے نکال دو گے؟ میری خاطر......''

''اس کی جگہ دل میں کب تھی؟ وہاں تو تم براجمان ہو۔''

''اسے میں نے نہیں نکالا۔ یہ الزام تم نہیں لگا سکتے مجھ پر۔ نہ وہ ایسا کہہ سکتی ہے۔ وہ خود گئی اپنی مرضی سے۔''

''فتح کے بعد قبضہ طاقتور کا ہی ہوتا ہے۔''

''میں نے پاسپورٹ کے لیے درخواست جمع کرا دی ہے۔ ایک ایجنٹ نے کہا ہے پندرہ دن میں مل جائے گا۔'' نور نے اعلان کیا۔

''یہ بڑا اچھا کیا تم نے۔''

وہ بولتی رہی۔ ''اس کے بعد...... میں لندن کے لیے ویزا لوں گی۔ تم بھی اپلائی کر دو۔''

''کیا مطلب۔ ہم یہ ملک چھوڑ کے جا رہے ہیں۔''

''نہیں۔ تم مجھے چھوڑ کے واپس آجانا۔ تمہارے وہاں بہت دوست ہیں۔ میں زیادہ دن نہیں رہوں گی۔ ایک دن اچانک نازل ہو جاؤں گی ست بدھائی میں کہ مجھے تمہاری ولایتی محبوبہ ایلیشا عرف عائشہ نے بھیجا ہے۔ میں ایک ماہر انٹیریئر ڈیکوریٹر وغیرہ ہوں اور ست بدھائی ترقیاتی پروجیکٹ میں سب کے ساتھ کام کروں گی۔''

اور اس کے بعد...... مس ماہ نور۔''

''اس کے بعد تم اپنا نیا عشق شروع کرو گے مجھ سے...... نمبر تین یا چار، جو بھی ہے۔ اور ظاہر ہے تمہارے پیار کو ٹھکرانے والی لڑکی پاگل ہی ہو سکتی ہے۔''

''جو تم ہو......''

''مگر اس معاملے میں نہیں۔'' وہ ہنسی۔ ''باقی سب عادی ہو چکے ہیں تمہارے عاشقانہ مزاج کے لیکن یہ فائنل ہے۔ ایک دم فائنل۔ اس کے بعد......''

''کیا ہے اس کے بعد؟'' میں نے کہا۔

''دی اینڈ۔ میری تمہاری شادی۔ فلم خلاص۔ تماشائیوں کو اس سے کیا کہ بعد میں کیا ہوا۔ کتنے لڑکے ہوئے کتنی لڑکیاں۔'' وہ ہنسی۔

''اور انجام یہ نہ ہوا، پھر؟ کہانی میں ٹوئسٹ آگیا کوئی مثلاً یہ کہ فریال لوٹ آئی۔''

''تو پھر دی اینڈ یوں ہوگا۔'' اس نے انگلی کو ریوالور کی طرح میرے سر پر رکھا۔ ''ٹھائیں...... ایک گولی...... پھر ٹھائیں...... دوسری گولی...... ہیرو ہیروئن قریب پڑے مر رہے ہیں۔ ہاتھوں میں ہاتھ ہے۔ ان کا خون مل کر ایک دھارا بن گیا ہے۔ پس منظر میں گانا چل رہا ہے۔ رہے گا ملن یہ ہمارا تمہارا۔ دونوں کی روحیں بادلوں میں ساتھ ساتھ اڑتی جا رہی ہیں۔'' وہ ہنس ہنس کے دُہری ہوگئی۔

میں نے کہا۔ ''مجھے دونوں دی اینڈ منظور ہیں۔''

اس رات راجا کی اور چیف منسٹر صاحب کے افسر تعلقات عامہ کی ملاقات بہت دیر سے ہوئی۔ وہ راجا کا پرانا ساتھی تھا لیکن اچھی بات یہ تھی کہ اس میں مروت تھی اور وہ تعلقات کو اچھے برے وقت کے حساب سے نہیں رکھتا تھا۔ راجا نے مجھے بتا دیا کہ وہ اگلے روز ہی واپس آئے گا۔ شیر خان مجھے فریال کی گاڑی میں ست بدھائی چھوڑ کے فوراً ہی واپس چلا گیا تھا۔ صبح سویرے پولیس کے نازل ہونے اور پھر ہم دونوں کے کچھ بتائے بغیر جانے سے خواتین پریشانی میں مبتلا تھیں۔ میں نے انہیں بہت تسلی دی کہ سب خیریت ہے مگر شہناز کی تسلی پھر بھی نہ ہوئی۔

اس رات فریال نے بھی مجھ سے فون پر بات کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ چار چھ گھنٹے سو کے اس نے گزشتہ رات کی کمی پوری کر لی ہوگی اور اس کے بعد؟ کیا اس رات کے پرعذاب تجربے کی یاد کو بھلانے کے لیے فریال نے دوبارہ شراب کا سہارا لیا ہوگا؟ اب اسے روکنے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ ضرور فریال کی راجا سے کوئی ایسی بات ہوئی کہ اس نے مجھ سے رابطہ نہیں کیا۔ اسے معلوم تو ہوگا کہ میں نے ہی عبداللہ جان سے مل کر اس کی رہائی ممکن بنائی۔ یا وہ سمجھتی ہے کہ میں نے کچھ نہیں کیا۔ اسے راجا نے چھڑایا' اپنے تعلقات سے۔ میں ست بدھائی سے نکلا ہی نہیں۔ میرے لاتعلقی کے اس انداز کا اس نے برا مانا ہوگا ورنہ وہ میرا شکریہ تو ادا کرتی۔

پھر مجھے خیال آیا کہ فریال کو احساس ذلت ہے۔ یہ خیال ہے کہ اس کی وجہ سے میری پھر رسوائی ہوئی۔ اس نے میری عزت نفس کو مجروح کیا۔ اور اس کینہ پرور صوبائی وزیر داخلہ کے سامنے ناچنے پر آمادگی ظاہر کر کے خود کو بچایا جس کے ساتھ میری سیاسی پرخاش یا عداوت کی وجہ رانا تھا۔ اگر ایسی ہی بات ہے تو پھر کیا مجھے اس کو فون کر کے ہمدردی اور تسلی کے چند الفاظ کہنا میرا اخلاقی فرض نہیں بنتا۔

میں نے کئی بار ارادہ کیا اور خود کو روک لیا۔ راجا کا رویہ مجھے کھٹک رہا تھا۔ اس نے خود بھی کچھ نہیں کیا تھا اور مجھے بھی سختی سے روک دیا تھا کہ اس معاملے میں جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ فریال نے اسے انا کا مسئلہ نہیں بنایا۔ بات ختم ہوگئی۔ غالباً ایسی ہی کچھ بات اس نے فریال سے بھی کہی ہوگی کہ بی بی اپنے مسائل سے خود نمٹو۔ جب تعلق کو تم نے خود ہی ختم کرلیا تو پھر بات بے بات اس ست بدھائی کے گھوڑے کو ہر بحر ظلمات میں کیوں دوڑاتی ہو۔

وجہ کچھ بھی ہو۔ میرے اور فریال کے درمیان جذباتی خلیج تو پہلے سے حائل تھی۔ اب ایسا لگتا تھا کہ ظاہری مراسم بھی مشکل ہوں گے۔ اس کا واضح ثبوت اگلے روز ہی سامنے آ گیا۔ مجھے نور کا فون موصول ہوا۔

''ابھی فریال نے مجھے فون پر بہت برا بھلا کہا۔''

''کس خوشی میں؟''

''میں نے اسے فون کر کے بتایا تھا کہ اب میں اس کی سیکریٹری نہیں ہوں۔ وہ کسی اور کو رکھ لے۔ وہ بگڑ گئی کہ یہ کون سا طریقہ ہے۔ تمہیں ملازمت چھوڑنے سے پہلے بتانا چاہیے تھا۔ کوئی نوٹس دیے بغیر اس طرح گھر بیٹھ گئی ہو۔ میں نے کہا کہ خاتون میں نے کون سا کنٹریکٹ سائن کیا تھا اور کون سی شرائط ملازمت پر دستخط کیے تھے۔ میں تو تنخواہ بھی چھوڑ رہی ہوں۔''

''وہ اپ سیٹ ہوگی۔''

''مجھے اندازہ ہے۔ اسی لیے میں نے اس کے رویے اور لہجے کو نظر انداز کر دیا اور آرام سے بات کی۔۔۔ اور سوری بھی کہا لیکن اب مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ کہیں وہ مجھے نقصان نہ پہنچائے۔ مجھ سے لڑنے نہ آجائے۔ یہاں آ کے ہنگامہ کرے۔''

میں نے ہنس کے کہا۔ ''وہ کچھ نہیں کرے گی۔''

صبح ڈاکٹر مہدی حسن نے میرے کمرے میں آ کے مجھے جگا دیا۔ ''بھئی معاف کرنا تمہارے آرام میں مخل ہو رہا ہوں لیکن مجبوری تھی۔'' وہ میرے پاس ہی ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔

میں نے آنکھیں ملتے ہوئے گھڑی دیکھی۔ ''آپ کیوں شرمندہ کر رہے ہیں مجھے۔ آٹھ بجے ہیں، کون جلدی ہے۔''

''رفیق! کل رات میری اس پارٹی سے بات ہوئی تھی جن سے میں نے اسپتال کا سامان لیا ہے۔''

''یہ تو بڑی اچھی خبر ہے۔''

''سارے معاملات طے پا چکے ہیں۔ اب وہ چاہتے ہیں کہ ہم لاہور جا کے ان کو ادائیگی کر دیں۔ ان کے اور میرے وکیلوں نے اگریمنٹ بنا لیا ہے۔ میں چاہتا تھا کہ سائن کرنے سے پہلے تم دیکھ لیتے پھر ہم ادائیگی کرتے۔''

میں نے کہا۔ ''آپ کے وکیل نے آپ کے مفاد کے خلاف کوئی بات معاہدے میں شامل نہیں کی ہوگی۔ میں کیا دیکھوں۔''

''ویسے تو وہ پرانا وکیل ہے۔ دوست بھی ہے، پھر بھی تم ایک نظر ڈال لیتے تو اچھا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب! مجھے ساتھ چلنے میں کوئی اعتراض نہیں لیکن اس قسم کے اگریمنٹس کی قانونی زبان وکیل ہی بہتر سمجھتے ہیں۔ راجا لاہور میں ہے۔ آپ چاہیں تو میں اس سے کہہ دوں۔ وہ ماجد خاں کو بلا لے۔''

انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''آپ کی موجودگی ضروری ہے۔ سائن آپ کو ہی کرنے ہیں، خریدار آپ ہیں۔''

میں نے حیرانی سے کہا۔ ''میں خریدار ہوں؟'' پھر اچانک ساری بات میری سمجھ میں آ گئی۔ ''یعنی ادائیگی مجھے کرنی ہے۔ میں چلتا ہوں۔''

وہ مسکرانے لگے۔ ''ادائیگی تو ہو چکی۔ میرے وکیل نے پے آرڈر دے دیا ہے، پوری رقم کا۔ سامان میں نے پہلے ہی دیکھا تھا۔ وہ ایک مکمل اسپتال ہے اور اس کا صرف سامان فروخت نہیں کیا گیا ہے۔ پورا اسپتال عمارت سمیت لینے کی شرط تھی۔''

''یہ تو آپ کو بہت مہنگا پڑا ہوگا۔''

''ہاں۔ عمارت کی ہمیں ضرورت نہیں تھی لیکن وہ پارٹی جس کا یہ اسپتال تھا ساز و سامان اور عمارت کا الگ الگ سودا کرنے پر راضی نہیں تھی۔ ایسے خریدار بھی تھے لیکن قیمت کر کے پیچھے ہٹ جاتے تھے۔ میں نے کچھ بہتر آفر دے دی اور وہ بھی چاہتے تھے کہ سال بھر ہو گیا، ڈیل کسی سے فائنل ہو۔ میں نے ایک بینک سے لون لے لیا۔''

''بینک سے لون لینے کی کیا ضرورت تھی۔ آپ مجھے بتاتے۔''

''رفیق میاں۔ ساری زندگی میں ننانوے کے پھیر

میں رہا ہوں۔ گھاٹے کا سودا کبھی نہیں کیا۔ ڈاکٹر سے زیادہ بنیا ہوں میں۔ سودا کرنے سے پہلے میں نے سارا حساب کر لیا تھا۔ میرے خیال میں یہ بھی بہت فائدے کا سودا تھا۔ ایسا کسی خریدار نے سوچا ہی نہیں کہ بعد میں اسپتال کے ساز و سامان کا سودا الگ کرے اور عمارت الگ بیچ دے۔ وجہ یہ کہ اسپتال ایکوپمنٹ کے خریدار نہیں تھے۔ صرف ایکوپمنٹ لے کر کوئی کیا کرے گا، کہاں لگائے گا۔ اس کے لیے عمارت بھی چاہیے۔ دیکھا جائے تو ساری قیمت اس بلڈنگ کی ہے۔ میں نے سوچا کہ ایکوپمنٹ ہم یہاں لے آتے ہیں۔ عمارت کا سودا کسی اور سے کر لیتے ہیں۔ نیت اچھی ہو تو اللہ کی طرف سے بھی اسباب پیدا ہو جاتے ہیں۔ اتفاق سے میں نے اخبار میں اشتہار دیکھا۔ ایک پارٹی کو ہوٹل کے لیے موزوں جگہ پر عمارت درکار تھی۔ جگہ وہ کمرشل تھی اور ہوٹل کے لیے زیادہ موزوں تھی۔ اسپتال ذرا مین روڈ سے ہٹ کے ہونے چاہئیں۔ جہاں شور شرابا، دھواں اور گرد و غبار نہ ہو۔ میں نے ہوٹل بنانے والی پارٹی سے رابطہ کیا۔ انہیں جگہ دکھائی۔ کہا کہ یہ میرا اسپتال ہے۔ میں باہر جا رہا ہوں۔ اس کے ساز و سامان کی بات ہو گئی ہے۔ بلڈنگ پسند ہے تو بتاؤ۔ میں نے حساب لگا کے قیمت بتائی اور انہوں نے کہا ڈن......''

ریشم کی ماں نے دستک دے کر اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ ریشم امید سے تھی اور شہناز نے اسے سختی سے منع کر دیا تھا کہ وہ گھر کے کام کاج سے دور رہے۔ جو مدد وہ اسپتال میں کرتی تھی وہی اس کے لیے کافی تھی۔ وہ آرام سے بیٹھنے والی نہیں تھی اور ہلکا پھلکا کام کرتی نظر آجاتی تھی مگر ایک تو اس کی شوخی و طراری کم ہو گئی تھی۔ دوسرے وہ سامنے آنے سے بھی احتراز کرتی تھی چنانچہ ہم اس کی شاندار انگریزی سے بھی کم لطف اندوز ہو رہے تھے۔ اس کی ماں کی مدد کے لیے ایک عورت کو ملازم رکھ لیا گیا تھا۔ پھر بھی میرے کام خود فاطمہ کرتی تھی۔ وہ پوچھنے آئی تھی کہ میں کافی پیوں گا یا ناشتا کروں گا۔ میں نے اسے کہا کہ ناشتا یہیں لے آنا۔

''آپ تو زبردست بزنس مین بھی ہیں ڈاکٹر صاحب۔'' میں نے کہا۔

''روپے پیسے کے معاملے میں گھاٹا مجھے نہیں ہوا۔ لیکن رفیق میاں۔ اتنی عمر گزر جانے کے بعد سمجھ میں آتا ہے کہ روپیا ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ اس دنیا میں اہم ہے خوشی، اطمینان اور دل کا سکون۔ اسی طرح جیسے دوسری دنیا کے لیے نیکیاں اور اچھے اعمال۔ ان کا حساب اوپر والا جانے۔ دنیا میں مجھے کیا ملا۔ بیوی بہت پہلے ساتھ چھوڑ گئی۔ ابھی تمہاری وہ عمر نہیں۔ میری عمر میں بیوی صرف ایک عورت نہیں ہوتی۔ سب سے بڑی ضرورت بن جاتی ہے۔ ساری دنیا میں وہی ایک آپ کے ساتھ رہتی ہے۔ ہر وقت، ہر جگہ، دو ٹانگوں میں سے ایک نہ رہے۔ کچھ ایسی ہی حالت ہو جاتی ہے۔ پھر اولاد سے کیا ملا۔ پوتوں نواسوں کو کھلانے کی خوشی سے بھی میں محروم ہوں۔ بیٹی کو تم نے دیکھا۔''

میں نے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب۔ دل گرفتہ نہ ہوں۔ جو ملا بہت ہے۔ جو نہیں ملا وہ بھی مل جائے گا۔ خدا دیر کرتا ہے اندھیر نہیں۔''

''سوری...... میں اپنا دکھڑا رونے بیٹھ گیا۔ یہ سمجھانے کی عمر تو میری تھی مگر تم مجھے سمجھا رہے ہو۔ قصہ مختصر...... میں نے اسپتال فروخت کرنے والی پارٹی سے ڈیل فائنل کی۔ ہوٹل کی خریدار پارٹی سے معاملات طے کر لیے۔ اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے والا معاملہ تھا۔ بینک نے فوری طور پر لون کا انتظام کر دیا۔ میں آج قبضہ لوں گا۔ پراپرٹی میرے نام ٹرانسفر ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔ اس درمیان میں ایکوپمنٹ یہاں شفٹ ہو جائے گا۔ ہوٹل بنانے والی پارٹی جو بیعانے کی رقم دے گی اس سے میں بینک لون کا ایک حصہ کلیئر کر دوں گا۔ باقی رقم ملے گی تو حساب برابر۔ یوں سمجھو کہ جو منافع ملے گا اس کے بعد اسپتال کا سارا ایکوپمنٹ ہمیں فری۔''

''آپ نے تو کمال کر دیا۔''

''اگر میں یہاں نہ آتا تو شاید ایسا سوچتا بھی نہیں۔ لیکن دیکھو اچھی نیت میں کتنی برکت ہوتی ہے۔ اچھا اب تم ناشتا کر لو تو ہم چلیں۔''

میں نے کہا۔ ''ایک بات کی وضاحت رہ گئی۔ آپ نے کہا کہ خریدار میں ہوں۔ میں نے تو ایک پیسا خرچ نہیں کیا۔''

وہ کچھ دیر سوچتے رہے۔ ''رفیق میاں مجھے خریدار کے نام سے کیا فرق پڑتا ہے یا میرے وارثوں کو۔ کسی نہ مجھے ہے نہ انہیں۔ یہ سارا ترقیاتی منصوبہ جس میں اسپتال شامل ہے۔ تمہارا برین چائلڈ ہے۔ جو کرنا ہے تمہیں کرنا ہے۔ میری کتنی زندگی باقی ہے۔ آگے چل کے کوئی مسئلہ نہ ہو۔ اس لیے میں نے خریدار کی جگہ تمہارا نام رکھا تھا۔ تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔''

میں نے کہا۔ ''اعتراض کیسا۔ یہ تو آپ کا احسان ہے مجھ پر۔''

''پھر وہی احسان اور شکریے والی بات۔ رفیق میاں۔ میری نیکی کو مت برباد کرو۔ میں کچھ کرنا چاہتا ہوں

مرنے سے پہلے۔ تمہارے لیے نہیں، ان کے لیے جو اسپتال میں اپنے دکھ لے کر آئیں گے اور سکھی ہو کے جائیں گے۔ بہت دیر سے سہی لیکن کچھ خوشی دوسروں کی خوشی سے مل جائے۔''

اس کے بعد میرے لیے مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہ رہی۔ اس مرتبہ میں نے بھی ڈاکٹر صاحب کو گاڑی ڈرائیو نہیں کرنے دی۔ گزشتہ رات کسی وقت راجا نے غنی کو واپس بھیج دیا تھا اور یہ پیغام بھی بھجوا دیا تھا کہ اسے گاڑی کی ضرورت نہیں۔ وہ آ جائے گا۔ چیف منسٹر کے پی آر او کے ساتھ میٹنگ ہو تو گاڑی کا کیا مسئلہ۔ خود وزیر اعلیٰ ہاؤس میں درجنوں گاڑیاں غیر سرکاری کام کے لیے ہر وقت موجود رہتی ہیں۔

غنی ان تھک قسم کا فرض شناس آدمی تھا جو کسی مشین کی طرح ہر وقت ہر جگہ ساتھ جانے کے لیے تیار رہتا تھا۔ کھائے پیے اور آرام کیے بغیر۔ مشین بھی ایک کام کے لیے بنائی جاتی ہے اور مسلسل زیادہ استعمال سے خراب ہو سکتی ہے مگر غنی شاید ہر کام کر سکتا تھا۔ میں نے اسے بنیادی طور پر سیکیورٹی کا ذمے دار بنایا تھا۔ سیکیورٹی کوئی ایک کام نہیں تھا۔ اس کے متعدد پہلو تھے۔ ست بدھائی کے اندر باہر۔ حویلی میں، حویلی کے مکینوں کی اور آنے جانے والوں کی سیکیورٹی۔ اسکول اور اسپتال کی اور تمام تقریبات کی سیکیورٹی۔ یہ آسان کام نہیں تھا اور غنی نے اپنی مدد کے لیے پوری فورس بنا رکھی تھی جن کی کارکردگی پر نظر رکھنا ایک الگ کام تھا لیکن ترجیحی طور پر اس نے خود کو میری حفاظت کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ پہلے شیر خاں بھی تھا جو مجھے کہیں بھی لانے لے جانے میں غنی کی مدد کرتا تھا۔ بعد میں ڈرائیورز کی تعداد چھ ہو گئی لیکن غنی کو شاید کسی پر اعتماد نہ تھا کہ یہ خدمت وہ خود سرانجام دیتا تھا۔

لاہور کا سفر آدھا طے ہوا تھا کہ مجھے راجا کی کال موصول ہوئی۔ ''یہ نواب صاحب کی سواری کدھر جا رہی ہے؟''

''تجھے معلوم نہیں؟''

''معلوم ہوتا تو تجھ سے کیوں پوچھتا۔ میں نے ابھی دیکھا۔''

میں نے کہا۔ ''میرا خیال ہے، ہم شام تک یا رات تک لوٹ آئیں گے۔ میں ڈاکٹر مہدی حسن کے ساتھ جا رہا ہوں۔ اسپتال کے ایکوپمنٹ کی ڈیل فائنل ہو گئی ہے۔ تو بھی ایک ڈیل کرنے گیا تھا۔''

''وہ ہو جائے گی۔ ٹائم فریم کوئی نہیں۔ پہلے ہمارا کام پورا ہو جائے، اسپتال کی توسیع کا۔ اس کی پبلسٹی اتنی ہو کہ چیف منسٹر کے نوٹس میں لائی جا سکے۔ ذرا میری بات کرا ڈاکٹر صاحب سے۔''

میں نے موبائل فون ڈاکٹر مہدی حسن کو دے دیا۔ ہنستے رہے اور مسکراتے رہے۔ معلوم نہیں راجا نے ان سے کیا کہا۔ ان کے یک طرفہ جملوں سے کچھ اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ رات کو واپسی پر انہوں نے بتایا کہ راجا نے کہا تھا کہ اس برخوردار نواب صاحب کو سختی سے پٹا ڈال کے رکھیں اور ادھر ادھر کہیں نہ جانے دیں۔ عادتیں بگڑی ہوئی ہیں۔ وہ ادھر ادھر بھاگنے کی کوشش ضرور کرے گا۔

لاہور میں ہمارا شیڈول اتنا ٹائٹ تھا کہ کہیں اور جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ ویسے بھی فریال کے مسئلے کا اپنے ذہن سے خارج کرنے میں بالآخر مجھے بہتری کے اسباب نظر آنے لگے تھے۔ یہ مشکل ضرور تھا ناممکن نہیں۔ نو اب کوئی مسئلہ ہی نہیں تھی۔ وہ خود اپنے اور میرے تعلق کے مسئلے کو حل کرنے میں دن رات کوشاں تھی۔ کبھی میں سوچتا تھا کہ میری زندگی میں آنے والی ان تین لڑکیوں نے کس طرح میری زندگی کو متاثر کیا تھا تو مجھے ان میں کوئی بھی قدرِ مشترک نظر نہ آتی تھی۔ سوائے اس کے کہ وہ حسین تھیں۔

سب سے پہلی فریال متوسط طبقے سے تعلق رکھتی تھی اور شاید یہی اس کا کمپلیکس تھا۔ وہ عزت شہرت اور دولت سب ایک ساتھ حاصل کر لینا چاہتی تھی جو شاید ممکن نہیں تھا۔ اگر وہ عزت اور دولت پر قناعت کرتی تو میرا ساتھ نہ چھوڑتی لیکن ست بدھائی میں وہ شہرت میسر نہ آتی جو فلمی افق کے چمکتے دمکتے ستاروں کو لاکھوں پرستار دیتے ہیں۔ فلمی دنیا میں شہرت کے ساتھ دولت تھی مگر عزت نہیں تھی۔ چنانچہ وہ بھٹک رہی تھی۔ محبت کو اس نے ایک جال کے طور پر استعمال کیا تھا۔ پہلے چودھری سلطان پر پھر مجھ پر...... اور اب پھر تنہا تھی۔

دوسری ایک عالی نسب دولت مند انگریز لارڈ کی اکلوتی بیٹی تھی جو اپنے جذباتِ عشق کے بلاخیز سیلابی ریلے میں کسی تنکے کی طرح بہہ گئی تھی۔ میری خاطر اس نے اپنا گھر اور ملک تو کیا مذہب تک چھوڑنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ وہ آج بھی عائشہ تھی یا نہیں؟ مجھے کچھ خبر نہ تھی۔ ایسے تیز و تند شراب کا نشہ بن کر طاری ہونے والا عشق اسی تیزی سے اتر بھی جاتا ہے اور اپنے پیچھے پچھتاوے چھوڑ جاتا ہے۔ شاید آج اسے صرف میرا نام یاد ہوگا اور وہ آغازِ شباب کے اس عشق پر خود بھی ہنستی ہوگی۔ اس نے اپنے باپ کا بزنس سنبھال لیا ہوگا جہاں میری حیثیت صرف ایک ملازم جیسی تھی۔ ممکن ہے اس نے شادی بھی کر لی ہو۔ اس کے بچے بھی ہوں یا وہ ہنوز اپنے آئیڈیل کی تلاش میں سرگرداں ہو۔ وہ میرے لندن سے آ جانے کے بعد ایک جذباتی صدمے سے دوچار ہوئی تھی تو اس نے

نفسیات کا سہارا لیا تھا اور کسی نشہ چھڑانے والے اسپتال میں زیرِ علاج بھی رہی تھی۔ اس کا میرا اب کوئی رابطہ نہ تھا۔

تیسری نور سب سے جدا تھی۔ قدرت نے اسے بے پناہ حسن کی دولت سے مالا مال کیا تھا لیکن یہی خوش نصیبی اس کی بدبختی بن گئی اور اسے تسخیر کی قوت آزمانے کا شوق ان راستوں پر لے گیا جہاں حسن کے سوداگروں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اس کے حسن و شباب کی غارت گر قوت کو ایسے استعمال کیا جیسے دنیا میں جنگ و جدل کے ٹھیکے دار اپنے فائدے کے لیے اسلحے کی تجارت کرتے ہیں۔ وہ باہمت لڑکی تھی کہ اس خطرناک گروہ کے چنگل سے نکل آئی۔ اپنے بدنام ماضی کی رسواکن داستانوں کے باوجود وہ میرے سہارے پر ایک محفوظ مستقبل کا راستہ اختیار کرنے میں کامیاب رہی تھی۔ محبت اس کی وہ طاقت تھی جس سے اس نے صرف مجھے ہی نہیں تسخیر کیا تھا۔ فریال کو بھی شکست دی تھی۔

''رفیق میاں۔ کس سوچ میں گم ہو۔'' میرے کانوں میں ڈاکٹر مہدی حسن کی آواز آئی تو میں چونکا۔

''جی...... کوئی خاص بات نہیں۔'' میں نے کہا اور اس پرانے طرز کی کوٹھی کو دیکھا جس کے ڈرائیو وے پر گاڑی ٹھہر گئی تھی۔ آگے تین گاڑیاں پہلے سے موجود تھیں۔ ان میں ایک بلیک کلر کی مرسیڈیز تھی۔ دوسری پجیرو۔ سب سے آگے کھڑی ہوئی مہران ان کے مقابلے میں بے بی کار لگتی تھی۔

''بھئی یہ ہے ہمارا گھر۔ اسے غریب خانہ کہتے ہوئے شرم آتی ہے۔''

میں نے جدید اور قدیم کے امتزاج کی صورت میں چار کنال کے پلاٹ پر بنی ہوئی کوٹھی کو دیکھا جو شاید تیس چالیس سال پہلے اس وقت بنی ہوگی جب گلبرگ آباد ہو رہا تھا۔ اس کا انداز نہ وکٹورین تھا اور کچھ مغل۔ چھت کے ڈھلوان حصوں پر کھپریل کی آرائش تھی۔ دائیں جانب مخروطی ٹاور والا گول کمرا تھا جس کی کھڑکیاں ہر طرف کھلتی تھیں۔ نیچے برآمدے سے بارہ دری کا تاثر ملتا تھا۔ سامنے ایک گول باغ تھا جس میں سرو کے درخت بیرونی دیوار کے ساتھ صف بستہ تھے۔ درمیان میں رومن اسٹائل کا فوارہ تھا۔ سبزے کا قالین جیسا فرش اور چاروں طرف آرائش گل میں کسی ماہر باغبان کی مہارت جلوہ گر دکھائی دیتی تھی۔

''وہ لوگ پہلے پہنچ گئے۔'' ڈاکٹر مہدی حسن نے قدرے خفت سے کہا۔ ''ویری بیڈ۔''

''ہمیں کچھ جلدی نکلنا چاہیے تھا۔'' میں نے کہا اور ڈاکٹر صاحب کے پیچھے ایک دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔

دروازہ ایک وردی والے ویٹر نے کھولا تھا۔ گھر کی اندرونی آرائش بھی ڈاکٹر مہدی حسن کی دولت مندی کا منہ بولتا ثبوت تھی۔

وسیع ڈرائنگ روم میں مہمانوں کی نشست کے تمام حصے الگ بھی تھے اور یکجا بھی۔ مقصد یہ ہوگا کہ مہمان زیادہ ہوں تو ان کے اکٹھے بیٹھنے سے جلسہ گاہ کا منظر نہ لگے۔ حضرات ایک حصے میں محفل جمائیں تو خواتین دوسرے حصے میں اپنی باتیں کرنے کے لیے آزاد ہوں جو بیشتر مردوں کے نزدیک بے مقصد اور سطحی ہوتی ہیں۔ اسکینڈل، سنسنی خیز انکشافات، کچن پالیٹکس، فیشن ٹرینڈز کے مقابلے۔ غیبت۔

چار سنجیدہ صورت ادھیڑ عمر کے بھاری بھرکم افراد صوفوں پر بیٹھے بلکہ پڑے تھے۔ ڈاکٹر مہدی حسن نے تاخیر کی معذرت کی اور میرا تعارف کرایا۔ ''یہ میرے بیٹوں جیسے عزیز دوست۔ نواب رفیق احمد شیرازی آف ست بدھائی۔ اسپتال کے خریدار......''

''ست بدھائی؟ یہ کوئی ریاست ہے؟'' ایک نے کہا۔

''کبھی نام نہیں سنا۔'' دوسرا بولا۔

ڈاکٹر مہدی حسن نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بہت سے نایاب ہیرے ابھی تک دریافت نہیں ہوئے۔ جیسے چاند کے بیشتر حصے گمردہ ہیں۔''

پہلا سوال کرنے والے نے کہا۔ ''کیا ہم کام کی بات کریں۔''

''پہلے بتائیں، آپ لوگوں نے کچھ لیا؟''

''فی الحال کسی چیز کی ضرورت نہیں۔'' دوسرے نے ایک بریف کیس کھولا۔

''ہم لمبے سفر سے آئے ہیں۔ ہمیں ضرورت ہے۔'' ڈاکٹر مہدی حسن نے کہا۔ اور اسی ویٹر کو احکامات جاری کیے جس نے ہمارے لیے وہ دروازہ کھولا تھا۔

کاغذی کارروائی مکمل ہونے میں تقریباً ایک گھنٹہ صرف ہو گیا۔ اگر میں دیکھے بغیر سائن کر دیتا تو یہی کارروائی دس منٹ میں ختم ہو جاتی۔ اسپتال فروخت کرنے والی پارٹی کے وکیل کا اصرار تھا کہ میں ایسا ہی کروں کیونکہ ڈاکٹر صاحب کے وکیل نے اگریمنٹ خود بنایا ہے۔

آہستہ آہستہ میں نے اس تاثر کو دور کر دیا کہ میں وہ نواب نہیں جیسے کہ امراؤ جان ٹائپ فلموں میں دکھائے جاتے ہیں۔ میں نے بتایا کہ ہاورڈ سے ایم بی اے کرنے کے بعد میں کتنا عرصہ لندن میں رہا اور لارڈ ارنسٹ کی فرم کے ایک ڈائریکٹر کی حیثیت سے کیا تنخواہ لے رہا تھا تو ان کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ بے حد انکساری کے ساتھ میں نے انہیں مرعوب کر لیا۔

ہم سب نے اگریمنٹ پر اپنے اپنے دستخط ثبت کیے۔ پھر ڈاکٹر مہدی حسن کے وکیل نے پوری رقم کا پے آرڈر ان کے حوالے کیا اور انہوں نے رسمی طور پر چابیاں دے کر ہاتھ ملائے۔ ایک دوسرے کو مبارکباد دی۔ بیسٹ آف لک کہا اور رخصت ہو گئے۔

ڈاکٹر صاحب نے ایک گہری سانس لی۔ ''اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ سب ہو گیا۔'' پھر خود ہی ہنسے۔ ''نہیں...... ایک مرحلہ طے ہو گیا۔ دوسرا ہے اسپتال کو خالی کرنا۔ ایکوپمنٹ وہاں پہنچانا۔ تیسرا بلڈنگ ان کے حوالے کرنا جو اسے ہوٹل بنائیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''وہ بھی طے ہو جائیں گے۔ اب آپ مجھے وہ دکھائیں گے جو آپ نے خریدی ہے۔''

''اسپتال'' وہ بولے۔ ''چلتے ہیں ادھر بھی۔ ایک کپ کافی کا اور پی لو اور میری بیٹی ٹینا سے بھی مل لو۔ کیا خیال ہے؟''

''کیوں نہیں۔ وہ کہاں ہیں؟''

''وہ اپنے کمرے سے نہیں نکلتی۔ آؤ میرے ساتھ۔'' وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

کوٹھی کے عقبی حصے میں انہوں نے ایک دروازے پر انگلی سے دستک دی۔ ''ٹینا...... تم سے ملنے کوئی آیا ہے۔''

اندر سے کوئی آواز نہیں آئی۔ ڈاکٹر مہدی حسن نے دروازے کو دھکیلا اور مجھے آنے کا اشارہ کیا۔ اندر داخل ہوتے ہی میری توجہ پہلے ایک لڑکی پر اور پھر کمرے کی حالت پر مرتکز ہوئی۔ لڑکی یا عورت کمپیوٹر اسکرین کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے ہماری طرف دیکھنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ کمرے کی کباڑ خانے جیسی حالت اس کے مکین کی ذہنی کیفیت کا پتا دیتی تھی۔ کوئی بھی چیز وہاں نہیں تھی جہاں اسے ہونا چاہیے تھا۔ کتابیں رسالے فرش پر بکھرے ہوئے تھے۔ چائے کے برتن بیڈ پر تھے۔ ٹی وی پر میک اپ کا سامان رکھا ہوا تھا۔

ڈاکٹر مہدی حسن نے مجھے دیکھا اور سر ہلایا۔ ''ٹینا...... دیکھو کون ملنے آیا ہے تم سے۔''

''ابھی میں مصروف ہوں۔'' اس نے انگریزی میں جواب دیا۔

''بری بات...... یہ مہمان ہیں اور بڑی دور سے آئے ہیں۔''

''مجھ پر کیا احسان کیا ہے۔ کیا میں نے بلایا تھا انہیں اور آنا ہی تھا تو بتا کے آتے۔'' اس کے لہجے میں برہمی یا ناگواری نہیں تھی۔ بس ایک جیسا سپاٹ لہجہ تھا۔ ہر تاثر سے عاری۔

اب میں نے کہا۔ ''میں انتظار کروں تمہارے فارغ ہونے کا یا پھر کبھی آؤں۔''

معلوم نہیں میری آواز میں کیا اثر تھا کہ وہ ایک دم چونک کے مڑی اور ایک لمحے کے لیے جیسے منجمد ہو گئی۔ انتہائے حیرت سے وہ پلک جھپکانا بھی بھول گئی اور اس کی نظریں مجھ پر جم کے رہ گئیں۔ پھر اس کے سپاٹ چہرے کا تاثر بدلا۔ بے رونق آنکھوں میں زندگی کی خوشی جھلکی۔ اس کے خشک ستے ہوئے لبوں پر مسکراہٹ یوں پھوٹی جیسے بادلوں کی جھری سے روشنی کی کرن۔ اس کے بے رنگ رخساروں پر لالی بکھری اور وہ لہرا کے ایک دم اٹھی۔

''تم...... تم آ گئے۔ مجھے یقین تھا کہ تم آؤ گے۔''

ڈاکٹر صاحب نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی۔ ''ٹینا۔ یہ نواب رفیق ہیں۔ ست بدھائی سے آئے ہیں۔''

ٹینا نے کچھ بھی نہیں سنا۔ ''میں جانتی تھی وحید...... تم اپنی ٹینا سے دور نہیں رہ سکتے۔'' وہ میرے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

اس وقت میں نے اپنے مقابل ایک ایسی عورت کو دیکھا جو اپنی تنہائی کے زنداں میں کسی کے تصور کے ساتھ زندہ تھی۔ ساری دنیا سے بے تعلق ہو کے صرف اپنے خیالوں کا جہاں بسائے بیٹھی تھی۔ کھانا پینا اوڑھنا پہننا سب اس کے لیے قید بامشقت کے کام تھے جو اسے کرنے پڑتے تھے۔ تاہم وہ میرے تصور سے بالکل مختلف تھی۔ ڈاکٹر مہدی حسن کے بیان سے میں نے اس کا جو پیکر تراشا تھا وہ ایک بہت موٹی، بھاری بھرکم اور بدصورت عورت کا تھا۔ اس کے بھرے بھرے جسم کو موٹاپے کا شکار نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ ابھی تک اس کا بدن متناسب تھا۔ وہ بدصورت ہرگز نہیں تھی۔ خشک بال کھجانے سے الجھے ہوئے تھے اور برش نہ ہونے سے بکھر گئے تھے۔ معلوم نہیں وہ کب سے نہائی نہیں تھی۔ اس کے کپڑے بھی میلے تھے اور ان سے بُو اٹھ رہی تھی۔ اگر وہ نہا دھو کے لباس بدل لیتی اور تھوڑا سا میک اپ کر لیتی تو بلاشبہ اچھی لگتی۔

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اس کی یہ غلط فہمی کیسے دور کروں کہ نہ میں وحید ہوں اور نہ ہم پہلے کہیں ملے ہیں۔ مجھے ڈاکٹر مہدی حسن نے کسی وحید کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

وہ میرے مقابل فرطِ جذبات میں کانپ رہی تھی اور آنسو اس کی آنکھوں سے خود بخود بہہ نکلے تھے۔ ''اتنی دیر کیوں کی تم نے وحید...... لندن اتنی دور تو نہیں ہے۔''

ڈاکٹر مہدی حسن نے مجھے ہاتھ سے اشارہ کیا جس کا مطلب میں نہیں سمجھ سکا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ ٹینا کو سمجھانا

چاہیے کہ مجھے وحید سمجھنا اس کی غلط فہمی ہے یا خاموش رہنا چاہیے۔ وہ مجھ سے توقع کر رہی تھی کہ اسے قریب کر کے اپنی بانہوں میں سمیٹ لوں۔ سینے سے لگا لوں۔ چوموں اور کہوں کہ مجھے معاف کر دو۔ میں نے تمہیں بہت انتظار کرایا لیکن اب میں آگیا ہوں۔ اتنا میں نے سمجھ لیا تھا کہ وحید اس کا کوئی بچھڑا ہوا پیار تھا۔

مجھے ڈاکٹر مہدی حسن نے یہ ضرور بتایا تھا کہ ٹینا کا شوہر بھی ایک ڈاکٹر تھا جس سے اس نے انگلینڈ میں شادی کی تھی لیکن پاکستان واپس آنے کے بعد اسے شعبۂ حادثات میں کچھ لوگوں نے اشتعال کی کیفیت میں قتل کر دیا تھا۔ لیکن کیا اس کا نام وحید تھا؟ یہ مجھے علم نہیں تھا۔

میں نے ڈاکٹر صاحب کو اشارہ کیا اور وہ بڑے دکھی اور پشیمان چہرے کے ساتھ باہر چلے گئے۔ میں نے ٹینا کو شانوں سے تھام کے کرسی پر بٹھا دیا۔ وہ مسلسل بول رہی تھی اور رو رہی تھی۔ ''وحید...... اب تم مجھے چھوڑ کے تو نہیں جاؤ گے نا...... بولو؟''

میں نے کہا۔ ''خود کو سنبھالو ٹینا۔ یہ کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے اپنی۔ تم کیا تھیں اور کیا بن گئی ہو۔ اپنے کپڑے دیکھو، حلیہ دیکھو۔''

اس نے میرے کندھے پر سر رکھ دیا۔ ''اب تم آگئے ہو تو میں بھی ٹھیک ہو جاؤں گی۔ تم جانتے ہو کتنے اچھے کپڑے پہنتی تھی میں۔ تم کہتے تھے کہ عورت ہمیشہ عورت رہتی ہے۔ ڈاکٹر یا جنرل بن جائے آپریشن تھیٹر ہو یا میدانِ جنگ۔ قاتل یا بہادر نظر آنا نہیں چاہتی۔ بس خوبصورت اور دلکش نظر آنا چاہتی ہے۔ اچھے کپڑے اور میک اپ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔''

''اچھا چلو اپنی حالت ٹھیک کرو۔ کب سے نہائی نہیں ہو۔ کیسے کباڑ خانے میں رہتی ہو۔ اتنی سلیقہ مند تھیں تم۔''

''میں سب کر لوں گی۔ بالکل ٹھیک ہو جاؤں گی پہلے جیسی۔ تم آگئے ہو نا......'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

میں پھر کھڑا ہو گیا۔ ''ٹھیک ہے۔ میرے واپس آنے تک......''

وہ چلائی۔ ''تم کہاں جا رہے ہو؟ نہیں...... اب میں تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گی۔''

میں نے کہا۔ ''ڈونٹ بی سلی۔ ایک کام ہے مجھے۔''

''میں سمجھ گئی۔ تمہیں اپنا سامان لینے جانا ہو گا۔ رائٹ......''

میں نے کہا۔ ''رائٹ...... میں یوں گیا اور یوں آیا۔'' میں نے چٹکی بجائی۔

''میں بھی چلوں تمہارے ساتھ۔''

''تم...... تم کیا کرو گی۔ تم اتنی دیر میں بالکل ہی ہو جاؤ جیسی کہ تم تھیں۔''

''وہ بھی ابھی ہو جاتی ہوں۔'' اس نے ایک دم چوم لیا اور پھر واش روم کی طرف بھاگی۔ اس نے ڈریسنگ روم کی الماری میں سے ایک بلیک اور ریڈ جوڑا نکال کے دکھایا۔ ''تمہاری پسند......''

''ٹینا۔ میری بات سنو۔'' لیکن وہ واش روم میں گھس گئی۔

میں باہر آیا تو ڈاکٹر مہدی حسن چپ کھڑے دیوار پر لگی ایک تصویر کو دیکھ رہے تھے۔ یہ ٹینا کی تصویر تھی جس میں وہ دلہن بنی کرسی پر بیٹھی تھی۔ اس کے پیچھے شیروانی اور پگڑی میں دولہا بنا ہوا شخص مجھ سے ذرا بھی مشابہ نہیں تھا۔ دلہن کے تو ہر لڑکی حسین ہی لگتی ہے لیکن یہ کسی بیوٹی پارلر کی مہارت کا کرشمہ نہیں تھا۔ پرانی ٹینا واقعی حسین تھی۔

میں ان کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔ ''یہ ٹینا کا شوہر۔ وحید؟''

ڈاکٹر مہدی حسن نے دکھی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ''شوہر تو ہے مگر اس کا نام وحید نہیں تھا۔ علی ظفر تھا۔''

مجھے کچھ حیرت کا شاک لگا۔ ''پھر...... وحید کون ہے؟''

انہوں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''میں نے یہ نام ٹینا کے لبوں سے پہلی بار سنا ہے۔ کیا تم نے اسے بتا دیا...... کہ تم وحید نہیں ہو۔''

''یہ...... ممکن نہیں تھا شاید۔ میں نے کوشش نہیں کی۔''

انہوں نے ایک دم میرا ہاتھ پکڑ کے کھینچا۔ ''چلو ہم نکل جائیں۔''

میں ان کے ساتھ چل پڑا۔ ''بعد میں کیا ہو گا؟''

''کیا ہو گا؟ کچھ بھی نہیں، وہ پھر پہلے کی طرح ہو جائے گی۔ جیسی وہ دو سال سے ہے، اپنے کمرے کی قیدی۔''

مجھے ان پر بہت ترس آیا۔ یہ ایک دکھی باپ کا دل بول رہا تھا۔ وہ میرے سامنے کچھ شرمسار بھی تھے۔ اچانک ان کے سامنے ایک نام آگیا تھا، وحید...... کچھ کہنا مشکل تھا کہ وہ اپنی بیٹی کی زندگی کے اس راز سے واقعی بے خبر تھے یا انجان بن رہے تھے۔ اگر یہ انکشاف تھا تو ایک صدمہ تھا۔ ان کا یہ خیال غلط ثابت ہو گیا تھا کہ ٹینا کی یہ حالت شوہر کی موت کے بعد اس کی جدائی کے صدمے سے ہوئی تھی۔

خود میرے ذہن میں بہت سے الجھن پیدا کرنے والے سوالات اٹھ رہے تھے۔ شوہر کا نام علی ظفر تھا تو پھر وحید کون تھا۔ وحید مراد، عبدالوحید یا وحید خان۔ ٹینا کے ذہن نے

علی ظفر کی موت کو قبول کر لیا تھا۔ یہ مان لیا تھا کہ اب وہ لوٹ کے نہیں آسکتا۔ مگر اسے وحید کا انتظار تھا۔ اُمید تھی اور یقین تھا کہ وہ ضرور آئے گا۔ کیا وحید اس سے محبت کرتا تھا؟ یا وہ وحید کو چاہتی تھی...... اور یہ محبت یک طرفہ تھی کہ دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی۔ کب لگی تھی یہ آگ؟ شادی سے پہلے لگی تھی تو اس نے علی ظفر کی بیوی بننا کیوں قبول کیا؟ لندن میں اس کو مجبور کرنے والا کون تھا۔ یہ فیصلہ اس نے اپنی مرضی سے کیا ہو گا پھر دو سال بعد وحید کے آنے کا انتظار کیوں۔

مجھے اچانک ایک اور خیال آیا۔ کہیں یہ انہی دو سالوں کی محبت تو نہیں؟ اپنی تنہا زندگی میں اس نے انٹرنیٹ پر کسی کو دوست بنا لیا۔ وقت گزاری کا یہ بھی ایک طریقہ ہے۔ اور کوئی اس کی زندگی کے دکھ میں شریک نہ تھا۔ کوئی اس کا فسانۂ غم نہیں سنتا تھا۔ شاید انٹرنیٹ پر کسی نے اس کی سنی۔ اس سے غمگساری کی۔ وہ اس جیسا ہی کوئی تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے شریکِ غم ہو گئے۔ اپنا دکھی دل ایک دوسرے کو دکھاتے رہے اور یہ ہمدردی دوستی میں بدلی، پھر محبت میں۔ انٹرنیٹ پر ایسا ہوتا ہے۔ دو دنیاؤں کے اجنبی مل جاتے ہیں تو اجنبی نہیں رہتے۔

گاڑی پھر رکی تو میں نے ایک سہ منزلہ عمارت کو دیکھا جو شاید دو کنال پر محیط تھی۔ ڈاکٹر مہدی حسن نے چابی سے دروازہ کھولا۔ وہ کچھ خاموش ہو گئے تھے۔ ان کی خوشی پر افسردگی سے زیادہ ندامت غالب آگئی تھی۔ وہ مجھ سے نظریں چرا رہے تھے۔ جیسے انہیں ڈر ہو کہ کہیں میں ان سے وحید نام کے اس شخص کے بارے میں سوالات نہ شروع کر دوں جسے وہ بالکل نہیں جانتے تھے مگر ان کی بیٹی اسی کے لیے چشم براہ تھی۔

میں نے انہیں مبارکباد دی۔ ''یہ تو بڑی اچھی جگہ ہے۔ کیوں نہ ہم خود یہاں ہوٹل بنا لیں؟''

وہ مسکرانے لگے۔ ''تم چلا سکتے ہو تو ضرور بناؤ۔''

اسپتال کے گراؤنڈ فلور پر ریسیپشن کاؤنٹر تھا۔ او پی ڈی کا ہال تھا۔ آگے ڈاکٹروں کے کمرے تھے۔ ان کے باہر لگی ہوئی تختیاں ابھی تک موجود تھیں۔ میں نے آپریشن تھیٹر دیکھا تو حیران رہ گیا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے افسوس ہوا کہ کسی کی محنت اور مہارت سے بنایا گیا آپریشن تھیٹر استعمال نہ ہوا۔ ہر چیز پر دھول مٹی کی تہ تھی۔ آپریشن ٹیبل، لائٹس، آپریشن کے دوران استعمال ہونے والی مشینیں اور مانیٹر۔ میں نے یہ سب ست بدھائی کے اسپتال میں تصور کیا تو افسوس پر خوشی غالب آگئی۔ میرا حوصلہ اور عزم دوچند ہو گیا۔ ایک کمرے میں ایکسرے مشین پر پلاسٹک پڑا ہوا تھا۔ مشین غالباً استعمال ہی نہیں ہوئی تھی۔ ساتھ والا کمرا اچھا لوجیکل لیبارٹری تھا۔

میں نے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب! میں بتا نہیں سکتا کہ میرا دل اس وقت کیا محسوس کر رہا ہے۔ آپ نے وہ کام کیا ہے......؟''

''میں نے نہیں...... تم نے۔ تم نے وہ کام کیا کہ خدا نے مجھے تمہارے پاس بھیجا۔ ابھی اور لوگ بھی آئیں گے میری طرح۔ تم دیکھنا۔''

''آپ کا کیا خیال ہے؟ اس تمام ایکوپمنٹ کو یہاں سے اٹھانے اور ست بدھائی پہنچانے۔ لگانے اور استعمال کرنے میں کتنا وقت لگے گا؟''

ڈاکٹر مہدی حسن نے سوچ کے کہا۔ ''یہ وہی لوگ بتا سکتے ہیں جو یہ کام کرتے ہیں۔ لیکن ایک بات مجھے معلوم ہے۔ اگر مجھے یہ ساز و سامان باہر سے منگوانا پڑتا تو نہ جانے کہاں کہاں سے اجازت نامہ۔ این او سی۔ امپورٹ لائسنس اور منظوری لینا ضروری ہوتا۔ سرکاری سرخ فیتے والی ہر فائل کو آگے بڑھانے کے لیے رشوت کے پہیے لگانے پڑتے۔ پھر باہر کی فرموں کو آرڈر دیتے ہی مال نہیں مل جاتا۔ جیسے پرچون کی دکان سے دال چاول مل جاتے ہیں۔ بعض اوقات بلکہ اکثر اوقات ان کے پاس پہلے کے آرڈر ہوتے ہیں۔ نہ ہوں تب بھی یہ سامان وہاں سے روانہ کیے جانے اور یہاں موصول ہو کے ہم تک پہنچنے میں جو وقت لگتا۔ شاید سال بعد ہم اس قابل ہوتے......''

میں نے کہا۔ ''اس کا کچھ اندازہ مجھے بھی ہے۔ یقیناً یہ ہماری قسمت ہے کہ سب کچھ فوراً ہو گیا۔ میں بات کر رہا تھا اس وقت کی جواب لگے گا۔''

''میں نے کہا نا۔ یہ آسان کام نہیں ہے۔ اگر مہینے بھر میں ہو جائے تو میں سمجھوں گا جلدی ہو گیا۔''

''میں کچھ اور سوچ رہا تھا۔ شامی کے بارے میں۔ اسے مزید ایک مہینا اسی حالت میں گزارنا پڑے گا۔''

''فوراً کیا ہو سکتا ہے۔''

''ہو سکتا ہے ڈاکٹر صاحب۔ اگر ہم اسے یہاں لے آئیں۔ اس کی سرجری ہو جائے۔ یہاں تو سب سیٹ ہے۔ تھوڑی سی صفائی ستھرائی چاہیے۔ وہ ایک دو دن میں ہو جائے گی۔ مشینری کو ہم آپریشن کے بعد ہٹائیں۔''

''دیٹ از ویری مچ پوسیبل۔ بہت اچھا خیال آیا تمہارے دماغ میں اور بروقت۔ کل پرسوں میں صفائی ہو جائے تو آپریشن ممکن ہے۔''

''صفائی کون کرے گا۔ اور اس کے بعد ٹیسٹنگ کہ سب ٹھیک ہے، قابلِ استعمال ہے۔''

''اس کی فکر مت کرو۔ چالیس سال گزارے ہیں میں نے اسی پیشے میں۔ آپریشن تھیٹر کا اسٹاف، پیرامیڈیکس، ٹیکنیشن معاون ڈاکٹر، سب آجائیں گے اس آپریشن کے لیے۔ ان سے بات بھی کرلیں گے کہ کون ست بدھائی جانے کے لیے راضی ہے۔ آج کل بے روزگاری کا مسئلہ ہے۔''

میں نے کہا۔ ''آپ اچھا اور تجربے کار اسٹاف لے جانے کے لیے میری طرف سے ہر آفر دے سکتے ہیں۔ ڈبل تنخواہ، رہائش، خوراک، آمدورفت کی سہولت۔''

''وہ میں کرلوں گا۔'' انہوں نے میرے کندھے پر تھپکی دی۔

اب رات ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر مہدی حسن نے دروازہ بند کیا اور میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئے۔ میں نے غنی سے کہا کہ پہلے ایم ایم عالم روڈ چلے۔ ہم کھانا کھا کے واپسی کا سفر اختیار کریں گے۔ اس نے گاڑی کا رخ موڑا ہی تھا کہ ڈاکٹر مہدی حسن کے فون کی بیل بج اٹھی۔ انہوں نے ہیلو کے بعد بڑی پریشانی اور تشویش سے ''اچھا؟'' کہا۔ پھر کچھ سوچتے رہے اور بولے۔ ''اچھا، اچھا میں آتا ہوں۔''

میں نے پوچھا۔ ''خیریت ہے ڈاکٹر صاحب!''

''ہاں...... تم مجھے گھر چھوڑ دو اور جاؤ۔ میں کل آؤں گا۔''

میں نے پھر پوچھا۔ ''آپ پریشان لگ رہے ہیں۔''

خلافِ توقع وہ برہم ہوگئے۔ ''بھئی کچھ کام پڑ گیا ہے مجھے۔ کیا ضروری ہے کہ تمہیں ہر بات کی تفصیل بتائی جائے۔''

ظاہر ہے اس کے بعد کوئی سوال کرنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے انہیں گھر کے دروازے پر چھوڑتے وقت پوچھ لیا۔ ''کل آپ کو جب آنا ہو بتا دیں۔ گاڑی آجائے گی۔''

انہوں نے عجلت میں کہا۔ ''ہاں ہاں۔ بتا دوں گا۔'' اور فوراً اندر چلے گئے۔ انہوں نے مجھ سے اندر آنے کے لیے نہیں کہا۔

اب تک ایک بہت بڑا کام ہوجانے کی جو خوشی تھی وہ تشویش میں بدل گئی۔ مجھے اس میں کوئی شک نہ تھا کہ گھر سے آنے والا فون ان کی بیٹی ٹینا نے کیا ہوگا یا گھر کے ملازم نے ٹینا کے بارے میں کوئی ایسی اطلاع دی ہوگی جس نے ڈاکٹر صاحب کو بدحواس کر دیا۔ میں نے ارادہ بدل کے غنی سے واپس ست بدھائی چلنے کے لیے کہا اور سوچنے لگا کہ کیا اس نفسیاتی مریضہ نے بعد میں اپنے وحید کو نہ پا کے کوئی ہنگامہ کیا تھا۔ یا کوئی انتہائی قدم اٹھا لیا تھا...... مثلاً اقدام خودکشی۔

ست بدھائی کی حویلی میں آج کے دن کی رپورٹ نے بڑا جوش اور جذبہ پیدا کیا۔ ہم سب رات گئے تک شامی کے پاس بیٹھے رہے۔ یہ اس کے لیے بڑی اُمید افزا خبر تھی کہ دو دن بعد اس کا آپریشن ہوجائے گا۔ مشینری اس کے بعد اکھاڑی جائے گی۔ ہم اس مشینری کو یہاں لگانے کے پلان ڈسکس کرتے رہے۔ اس بات پر مکمل اتفاقِ رائے تھا کہ جلدی نہ کی جائے۔ اس کے لیے اسپتال کی موجودہ عمارت میں ایک الگ بیرک بنائی جائے۔ غنی کے خیال میں موجود بیرک کے برابر دوسری بیرک کی تعمیر ایک ماہ میں مکمل کی جاسکتی تھی۔ شہناز کے ساتھ احمد حسن کی رائے بھی یہ تھی کہ اگلے مرحلے میں دو بیرکس بنا کے زنانہ اور مردانہ وارڈ بنائے جائیں جہاں مریضوں کو داخل کیا جائے۔ پھر رفتہ رفتہ وارڈوں کی تعداد میں اضافہ ہو۔

نصب شب کے قریب سب سونے کے لیے اٹھ رہے تھے کہ غنی نے ایک ایمبولینس میں ڈاکٹر مہدی حسن کے آنے کی اطلاع دی۔ سب سے آگے میں گیا۔ ایمبولینس اس وقت تک برآمدے کے ساتھ کھڑی ہوگئی تھی۔ میں نے ڈاکٹر مہدی حسن کا افسردہ پریشان اور دکھی چہرہ دیکھا۔ وہ چپ کھڑے تھے۔ پیچھے سے ایک اسٹریچر نکالا جا رہا تھا۔ اسٹریچر پر ٹینا کسی مردے کی طرح لیٹی ہوئی تھی۔

باقی سب لوگ اس صورتِ حال کو سمجھنے سے قاصر تھے اور برآمدے میں ہی رک گئے تھے۔ راجا نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ میں نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں صبر سے کام لینے کا اشارا کیا اور سیڑھیاں اتر گیا۔ احمد حسن اس وقت تک اپنی بہن کے پاس پہنچ چکا تھا۔

''ڈیڈی۔ اسے کیا ہوا ہے؟''

مہدی حسن نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''کچھ نہیں شی از اوکے۔ اسے اندر لے جا کے لٹاؤ۔''

احمد حسن کو اس جواب نے مطمئن نہیں کیا۔ ''یہ تو بے ہوش ہے۔''

مہدی حسن نے کہا۔ ''اس نے سلیپنگ پلز لے لی تھیں لیکن خطرے کی کوئی بات نہیں۔''

ٹینا کو شہناز کے کمرے میں ایک بستر پر لٹا دیا گیا۔ میں نے خواتین کو صرف اتنا بتانا ضروری سمجھا کہ یہ احمد حسن کی بہن ٹینا ہے اور جیسا کہ پہلے سے معلوم ہے، نفسیاتی مریضہ ہے۔ معلوم نہیں کس بات پر اس نے خواب آور گولیاں کھا لیں۔ اس کا باپ بھی ڈاکٹر ہے اور بھائی بھی چنانچہ تشویش کی کوئی بات نہیں۔

ڈاکٹر مہدی حسن سخت جذباتی دباؤ میں تھے لیکن باہمت آدمی تھے۔ شہناز نے اور احمد حسن نے سمجھداری سے

کام لیتے ہوئے ان کو کمرے سے نکال دیا۔ ''آپ ایزی ہو جائیں۔ ٹینا کا خیال رکھنے کے لیے ہم ہیں نا۔''

میں نے بھی کہا۔ ''آپ خود ڈاکٹر ہیں۔ سب سمجھتے ہیں۔''

''مشکل یہ ہے کہ میں ایک باپ بھی ہوں۔'' انہوں نے کہا لیکن ہماری بات مان لی۔ وہ بتانا چاہتے تھے کہ ٹینا نے یہ حرکت کیوں کی اور اسے وہ یہاں کیوں لائے ہیں لیکن میں نے انہیں مجبور کر دیا کہ ابھی انہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ہم صبح بھی بات کرسکتے ہیں۔ شہناز نے ان کے لیے گولیاں نکال کے دیں جو ثریا نے انہیں زبردستی کھلا دیں۔ پھر انہیں بیڈ پر لٹا کے لائٹ آف کی اور باہر آگئی۔

میں نے ایک بار پھر شہناز سے کنفرم کیا کہ ٹینا کی حالت واقعی خطرے سے باہر ہے۔ اس نے بتایا کہ ٹینا کے ڈیڈی اسے یہاں لانے سے پہلے کسی اسپتال لے گئے ہوں گے کیونکہ ٹینا کا معدہ واش کیا جاچکا ہے اور اب وہ صرف غنودگی میں ہے۔ اٹھے گی تو بالکل ٹھیک ہوگی۔

سارا دن کی مصروفیت نے مجھے بھی بہت تھکا دیا تھا۔ اگر میں راجا کو اس وقت یہ بتانے بیٹھ جاتا کہ ٹینا نے خودکشی کی کوشش کیوں کی تھی تو شاید صبح ہوجاتی۔ میں شب بخیر کہہ کے اپنے کمرے میں گیا اور ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ مجھے لیٹتے ہی نیند بھی آگئی ورنہ میں سوچ رہا تھا کہ شہناز سے خصوصی رعایت حاصل کرتے ہوئے اپنے لیے بھی خواب آور گولی حاصل کرلوں۔ اس معاملے میں شہناز بہت سخت تھی اور ہمیں اس قسم کی گولیوں کے نقصانات پر لیکچر دیتی رہتی تھی۔ نیند لانے کے دس طریقے گنوانے کے بعد وہ کہتی تھی کہ پھر بھی نیند نہ آئے تو جاگتے رہو۔ بٹ نو گولی۔

پریشانی کا اثر تو سب کے ذہن پر تھا۔ میں نے ایک کھٹکا سنا تو میری آنکھ کھل گئی۔ گھڑی دیکھی تو صبح کے چھ بجے تھے۔ میری خواہش تھی کہ کم سے کم نو دس بجے تک سوتا رہوں لیکن چند منٹ میں مجھے اندازہ ہوگیا کہ اب یہ ممکن نہیں ہوگا۔ میرا دماغ پوری طرح بیدار اور مستعد ہوچکا تھا۔ میں نے باہر نکل کے دیکھا تو ڈاکٹر مہدی حسن اپنے کمرے میں جا رہے تھے۔ وہ شاید بیٹی کو دیکھنے گئے تھے۔ اس عمر میں انہیں نیند ویسے ہی کم آتی تھی۔ بیٹی کی طرف سے ایک نئی پریشانی میں مبتلا ہونے سے خواب آور گولیوں کا اثر بھی زیادہ دیر نہیں رہا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو دوپہر تک غافل پڑا رہتا۔

میں نے ڈاکٹر صاحب کو جانے دیا ورنہ وہ صبح صبح وضاحتوں کے چکر میں پڑ جاتے۔ دبے پاؤں شہناز کے کمرے تک جا کے میں نے اندر جھانکا تو ایک عجیب منظر دیکھا۔ احمد حسن ایک کرسی پر غصے میں بھرا بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے ثریا چپ کھڑی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ معلوم نہیں ان کے درمیان کیا بات ہوئی تھی اور احمد حسن نے کیا کہہ دیا تھا۔ میرے سو جانے کے بعد شاید کسی وقت احمد حسن نے شہناز کو بھی سونے کے لیے بھیج دیا ہوگا کہ ٹینا کے پاس میں ہوں۔ اور ثریا جو مہدی حسن کے پاس بیٹھی تھی ان کے سو جانے کے بعد یہاں آگئی ہوگی۔

میں نے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ تھوڑا سا دروازہ کھلا تھا چنانچہ میں نے یہ سین دیکھ لیا ہے اور دبے پاؤں واپس چلا گیا۔ مجھے ثریا پر افسوس ہوا۔ اس بے وقوف لڑکی کو احمد حسن بھا گیا تھا۔ معلوم نہیں یہ محبت تھی یا مصلحت۔ دل کی بات تھی یا دماغ کی۔ حویلی میں اسے تحفظ حاصل تھا اور یہ موقع ملا تھا کہ وہ ایک پُرمسرت زندگی کے خوابوں کو تعبیر دے سکے۔ اس کے لیے ایک ایمرجنسی پلان کے تحت اس نے احمد حسن کا انتخاب کرلیا۔ شاید اس کے ذہن میں یہ خیال تھا کہ نہ وہ بہت حسین ہے اور نہ اب کنواری لڑکی۔ وہ ایک بچے کی ماں سمجھی جاتی ہے اور ہے۔ لیکن دوسری طرف احمد حسن کون سا پرفیکٹ ہے۔ وہ بھی معذور ہے۔ ایک خامی اس میں ہے تو ایک احمد حسن میں لیکن دونوں کی خامیاں مستقبل کی اچھی زندگی پر اثر انداز نہیں ہوں گی۔ اگر وہ ایک دوسرے کو قبول کرلیں۔

یہ سب کچھ دانش مندی اور سلیقے سے بھی ہوسکتا تھا لیکن ثریا نے معلوم نہیں کیوں سب کچھ بڑی عجلت میں کیا۔ جیسے اسے ڈر تھا کہ اس نے پہل نہ کی تو اس ڈاکٹر پر کوئی اور قابض ہوجائے گا۔ کوئی اور صرف رابعہ ہوسکتی تھی۔ رابعہ کی پوزیشن ثریا کے مقابلے میں بہت مضبوط تھی۔ سب سے پہلے تو وہ حویلی کے مالک کی بہن تھی۔ پھر وہ زیادہ خوبصورت اور تعلیم یافتہ تھی۔ اور ابھی تک اس کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی۔ ڈاکٹر احمد حسن کو زندگی یہیں گزارنی تھی تو رابعہ اس کے لیے موزوں شریکِ زندگی بن سکتی تھی۔ غالباً یہی سب سوچ کے اس نے ایک جارحانہ حکمتِ عملی اختیار کی۔ اس نے بوبی کو اپنی زندگی کے ایک بدنما داغ کی طرح دور کیا۔ ماما کے جذبے کو اس نے نکاح نامے کی طرح اپنے مستقبل کے لیے نقصان دہ سمجھ کے ضائع کر دیا۔ پھر مس ثریا بننے کے لیے اس نے اپنا گیٹ اپ بدل دیا۔ اس کا جسم ٹھیک تھا۔ اسے ثریا نے جدید ترین فیشن کے لباس سے سجا دیا۔ نوجوانی کے رنگ ڈھنگ اختیار کیے اور مرد کے دل کو تسخیر کرنے کے سارے حربوں کے ساتھ احمد حسن پر ٹوٹ پڑی۔ ظاہر ہے اس کی کھلی جارحیت کو کسی نے پسند نہیں کیا۔

راجا نیند پر پورا کنٹرول رکھتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اس کے دماغ میں ایک ٹائمر ہے جسے وہ اپنی مرضی سے سیٹ کرسکتا ہے۔ وہ سولہ اٹھارہ گھنٹے بھی سوسکتا ہے۔ وقت کی دستیابی کے حساب سے ایک گھنٹا، آدھا گھنٹا یا پندرہ منٹ سو کے بھی اٹھ سکتا ہے۔ ایسا بہت سے لوگ کرسکتے ہیں مگر ان میں میرا شمار نہیں تھا۔ مجھے راجا سے رشک محسوس ہوتا تھا۔ وہ اس وقت بھی سویا پڑا تھا۔ میں نے اسے جگایا تو وہ گھڑی دیکھ کے اٹھ گیا۔ خلافِ توقع اس نے مجھے برا بھلا نہیں کہا۔ ابھی سب سو رہے تھے۔ جتنی دیر میں راجا منہ دھو کے نکلا میں نے کافی کے لیے پانی چولہے پر رکھ دیا تھا۔

کافی کی خوشبو پھیلی تو ڈاکٹر مہدی حسن باہر نکلے اور کچن میں پہنچ گئے۔ ''اچھا آپ کافی بنا رہے ہیں۔ بھئی ہمیں مت بھولیے گا۔''

میں نے ایک کپ پانی کا اضافہ کیا تو مجھے ان کے بیٹے کا خیال آیا جو بہن کی خاطر پوری رات ایک منٹ کے لیے نہیں سویا تھا۔ میں نے اس کے لیے بھی ایک مگ پانی اور ڈال دیا۔ ٹینا پُرسکون تھی چنانچہ احمد حسن بھی باہر آ کے ہمارے ساتھ بیٹھ گیا۔ ابھی سورج طلوع ہوا ہی تھا چنانچہ باغ کی فضا میں صبح کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔

ٹینا کی وجہ سے اسپتال کا معاملہ زیادہ اہم ہونے کے باوجود پس منظر میں چلا گیا تھا۔ احمد حسن سب جانتا تھا۔ وہ سکون سے بیٹھا کافی پیتا رہا اور شاید ثریا کے بارے میں سوچتا رہا۔ ڈاکٹر مہدی حسن نے ٹینا کے بارے میں ایک باپ کی حیثیت سے اپنی فکرمندی پر بات کی۔ یہ بتایا کہ وہ پہلے کیا تھی اور اب کیا بنتی جا رہی ہے۔ گزشتہ رات اس نے وہی کیا تھا جس کا مجھے بھی ڈر تھا۔ جب وہ نہا دھو کے کپڑے بدل کے اور سولہ سنگار کر کے تیار ہوگئی تو اس نے مجھے پوچھا اور نوکروں نے بتایا کہ وہ تو بڑے ڈاکٹر صاحب کے ساتھ چلے گئے۔ ٹینا کا نروس بریک ڈاؤن ہوگیا۔ اس نے چیخ پکار مچائی۔ نوکروں پر بگڑی کہ تم سب جھوٹ بولتے ہو اور گھر کے سارے کمروں میں مجھے تلاش کرتی پھری۔ وہ جہاں گئی اپنی مایوسی کا غصہ چیزوں پر نکالا۔ ہر چیز کو الٹ پلٹ دیا۔ توڑ پھوڑ کی اور بالآخر اپنے کمرے میں جا کے باقی غصہ یوں نکالا کہ اپنے کپڑے پھاڑے۔ دھاڑیں مار مار کے روتی رہی اور وحید کو گالیاں دیتی رہی۔ پھر سکون آور دوائیں جو اس کے علاج میں شامل تھیں اور وہ خود احتیاط سے استعمال کرنا جانتی تھی، ساری نگل کے سوگئی۔

اس پر ایسے شدید ہسٹریا کا حملہ نوکروں نے بھی پہلے نہیں دیکھا تھا۔ اس کا ڈیپریشن اپنی ذات تک محدود تھا چپ ہو جاتی تھی۔ کھانا چھوڑ دیتی تھی یا رات بھر جاگتی رہتی لیکن ہنگامہ آرائی اس نے کبھی نہیں کی تھی۔ جارحیت اس مزاج میں کبھی نہ تھی اور یہی تبدیلی ٹینا کے باپ اور بیٹے لیے باعثِ پریشانی بن گئی تھی۔

ایک بار پھر یہ سوال اٹھا مگر اس مرتبہ راجا اور احمد کی طرف سے۔ یہ وحید کون ہے؟ اس کا صحیح جواب خود دے سکتی تھی۔ اس کے باپ اور بھائی جو سمجھتے تھے کہ انہیں کی زندگی کے ہر گزرے ہوئے پل کی خبر ہے اور وہ اس شخصیت، فطرت اور مزاج کے ہر پہلو سے آشنا ہیں۔ با بے خبر تھے۔ اگر ٹینا نے مجھے وحید سمجھا تھا تو میرے جیسا تھا جو لندن میں بیٹھا تھا اور ٹینا بڑی پُراسرار خاموشی سے کے آنے کا انتظار کر رہی تھی۔

احمد حسن بیٹھے بیٹھے اونگھنے لگا تو ہم نے اسے مجبور کر کہ وہ کچھ دیر سو جائے۔ بظاہر وہ پُرسکون تھا لیکن میرا خیال کہ اس کے ذہن پر بیک وقت دو مسائل کی یلغار ہے۔ ا بہن کا مسئلہ تھا تو دوسرا اس لڑکی کا جو جتنا وہ پیچھے ہٹ رہا آگے بڑھتی جا رہی تھی۔

یہ سوال جو میرے ساتھ راجا کے ذہن میں بھی ہو ڈاکٹر مہدی حسن نے خود کر دیا۔ ''تم کہو گے کہ میں ٹینا یہاں کیوں لے آیا۔'' وہ کچھ دیر ہماری خاموش صورت دیکھتے رہے۔ ''بتاؤ پھر میں کیا کرتا۔ اگر وہیں اس کے پا رک جاتا تو کیا وہ ٹھیک ہو جاتی؟''

راجا نے ہمت کر کے پوچھا۔ ''آپ سمجھتے ہیں یہاں وہ ٹھیک ہو جائے گی؟''

''میں نے چانس لیا ہے۔ بیک وقت ایک معا ،ایک باپ اور ایک جہاں دیدہ شخص کی حیثیت سے لیکن...'' وہ رک گئے۔

میں نے کہا۔ ''لیکن؟''

''لیکن داؤ پر تم کو لگایا ہے۔'' انہوں نے جے اعترافِ جرم کر لیا۔ ''کہ تم میری مدد کرو گے۔''

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد میں نے کہا۔ ''آ چاہتے ہیں کہ میں وحید بن جاؤں۔ ٹھیک ہے اگر میں آ کے لیے اتنا بھی نہ کروں تو یہ میری احسان فراموشی ہوگی۔''

انہوں نے تڑپ کے کہا۔ ''میرے احسان کی با مت کرو۔ احسان تمہارا ہوگا مجھ پر؟''

راجا نے کہا۔ ''یہ طریقہ علاج کامیاب ہوگا، اس کیا گارنٹی ہے؟''

''کوئی گارنٹی نہیں۔ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''ڈاکٹر صاحب۔ مجھے آپ سے دلی ی ہے اور میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں لیکن یہاں یلا نہیں ہوں۔ مجھے باقی سب لوگوں کو بھی اس کھیل میں کرنے کے لیے اعتماد میں لینا ہوگا۔ خیر یہ کوئی بہت کام نہیں۔ باقی سب میرے اپنے ہی ہیں لیکن کیا آپ وچا ہے، اس طریقہ علاج سے ٹینا کو ٹھیک ہونے میں کتنا لگے گا۔''

انہوں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''جتنا بھی وقت لگے۔..... یہ میں نے نہیں سوچا تھا۔''

''یہ کچھ عرصہ چل سکتا ہے ایک لمبا عرصہ نہیں۔ کیونکہ وحید نہیں، رفیق ہوں۔ حویلی کے اندر ڈراما کرسکتا ہوں۔ حد تک...... اور اس امکان کو بہر حال ذہن میں رکھیں کہ الٹا ہوگیا تو کیا ہوگا؟ فرض کیجیے ٹینا کو معلوم ہوگیا اور آ گیا کہ اس سے جھوٹ بولا گیا تھا۔ میں وحید نہیں ہوں .....''

ڈاکٹر مہدی حسن کا چہرہ تاریک ہوگیا۔ ''میرا خیال ...... مجھے ٹینا کو واپس لے جانا چاہیے۔ کسی نفسیاتی کلینک ......''

راجا نے کہا۔ ''نہیں...... اب ہم بھی کوشش کرنے پہلے ہی ناکامی کا اعتراف نہیں کرسکتے...... آپ مطمئن جائیں۔''

ڈاکٹر مہدی حسن نے باری باری شکرگزاری کے اظہار لیے میرا اور راجا کا ہاتھ دبایا۔ ''میرا خیال ہے میں اسے نظر دیکھ لوں۔''

ان کے جانے کے بعد میں نے مایوسی سے راجا کو کہا۔ ''یہ میں کیسے کرسکتا ہوں راجا۔ اس سے جھوٹ بولوں نبھاؤں یہ ڈبل رول۔''

راجا نے میرے کندھے پر ہاتھ مارا۔ ''تو سب کرسکتا ہے لیکے پتر۔ ایک آئیڈیا ابھی ابھی آیا ہے میرے دماغ ۔ دیکھ دوغلا پن تو ہم سب کرتے ہیں۔ زندگی بھر دُہری میت سب کی ہوتی ہے۔''

''مہاراجا فلسفہ مت جھاڑ میرے سامنے۔ حل بتا اس کل کا۔''

''رو دن۔ اگر صرف دو دن ڈراما کرنا ہو...... یا زیادہ سے زیادہ تین چار دن...... تو ہم سب ایک اسکرپٹ پر کام رسکتے ہیں۔''

''اسکرپٹ کیا ہے؟''

''اس پر میرے دماغ نے کام شروع کر دیا ہے۔ لیکن دماغ کی مشین صحیح کام کرے گی ناشتے کے بعد...... چل اندر۔''

جو اسکیم راجا نے مجھے ناشتے کے بعد سمجھائی وہ مجھے بھی زبردست لگی۔ اس نے یہ ذمے داری بھی لے لی کہ وہ حویلی کے اندر باقی لوگوں کو بھی قائل کر لے گا اور وہ اس کارِ خیر میں دل سے شریک ہوں گے۔ میرا رول ناشتے کے فوراً بعد شروع ہوگیا۔ اب میں وحید تھا اور نواب رفیق احمد شیرازی کا رول راجا نے قبول کر لیا تھا۔

جب ٹینا جاگی تو میں اس کے کمرے میں اس کے سامنے تھا... کچھ دیر مجھے بے یقینی سے دیکھنے کے بعد اس نے آنکھیں پھر بند کرلیں۔ اس نے چند سیکنڈ بعد دیکھا تو میں وہیں موجود تھا۔

میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور پیار سے کہا۔ ''کیسی ہو تم ٹینا ڈارلنگ۔''

اس نے کمزور لہجے میں کہا۔ ''تم...... وحید...... وحید تم کہاں چلے گئے تھے مجھے چھوڑ کے۔''

میں نے کہا۔ ''آئی ایم سوری! ایک ایمرجنسی ہوگئی تھی لیکن تم نے یہ کیا بے وقوفی کی حرکت کی تھی...... بولو؟''

وہ رونے لگی۔ ''میں سمجھی تم اب نہیں آؤ گے۔''

''تمہیں اندازہ ہے، تمہارے ڈیڈی اور بھائی کتنے پریشان ہوئے۔''

اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ ''یہ کیا جگہ ہے...... کوئی اسپتال؟''

''نہیں۔ تم ٹھیک ہو جاؤ، پھر بتاتا ہوں۔ اٹھ کے ناشتا کرو میرے ساتھ۔ لباس تبدیل کرو۔'' میں نے اسے ہاتھ پکڑ کے سہارا دیا۔

ایک گھنٹے بعد وہ میرے ساتھ باہر آئی۔ اسے میں نے اتنا ضرور بتا دیا تھا کہ یہ میرے دوست کی حویلی ہے۔ نواب رفیق احمد شیرازی ست بدھائی کے مالک ہیں۔

وہ کچھ کنفیوز ہوئی۔ ''وحید یہ نام...... کہاں سنا ہے میں نے پہلے......؟''

میں نے کہا۔ ''دیکھا ہوگا کسی اخبار میں۔''

میں نے اسے راجا سے ملوایا۔ ''یہ ہیں میرے دوست۔ انہوں نے مجھے لندن سے بلوایا تھا۔''

دوسرے کردار جیسے جیسے سامنے آتے گئے، ٹینا سے ملتے رہے۔ وہ سب بہت محتاط تھے کہ مجھے وحید اور راجا کو رفیق کہیں۔ میں نے اسے راجا کے ساتھ حویلی دکھائی۔ پھر بتایا کہ ست بدھائی میں ایک ترقیاتی منصوبہ ہے۔ نواب

رفیق نے اسی سلسلے میں مجھے بلایا تھا۔

کئی جگہ وہ تھک کر بیٹھ گئی، پھر چلنے لگی۔ حویلی نے اسے مسحور کرلیا تھا۔ "پھر...... کیا سوچا ہے تم نے۔ یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ تم آجاؤ تو میں بھی آجاؤں گی۔"

"تم یہاں رہو گی۔"

"ہاں۔ ڈیڈی اور بھائی پہلے ہی ہیں۔ میں بھی ڈاکٹر ہوں اور گائنا کولوجی میں ڈپلوما ہے میرے پاس۔"

میں نے کہا۔ "لیکن...... تمہاری طبیعت جو ٹھیک نہیں رہتی۔"

"میں بہت تنہا تھی وحید۔ میرا دکھ کوئی نہیں سمجھتا۔ میں کسی کو کچھ بتا بھی نہیں سکتی۔ سب سمجھتے ہیں میں پاگل ہوں۔ اب تم آگئے ہو تو میں ٹھیک ہوجاؤں گی۔ بالکل ٹھیک ہوجاؤں گی۔ پھر ہم دونوں یہاں کام کریں گے۔"

میں نے کہا۔ "ابھی میں صرف دو دن کے لیے آیا تھا لیکن اب شاید مستقل آجاؤں تمہاری وجہ سے۔"

ڈاکٹر مہدی حسن کا نسخہ کام کرگیا تھا۔ ٹینا کی ذہنی حالت کا انقلاب کسی ناقابل یقین معجزے سے کم نہ تھا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہی لڑکی کل تک ابنارمل تھی۔ ساری دنیا سے کٹی ہوئی اپنی دنیا میں قید تنہائی کا عذاب کاٹ رہی تھی اور یہ عذاب کسی اور نے نہیں خود اس نے اپنی ذات پر مسلط کیا تھا۔ اسے نفسیاتی مریض سمجھ کے سب نے چھوڑ دیا تھا۔

معلوم نہیں وہ کون وحید تھا جس کے نام میں جادو تھا۔ جو میں نہیں تھا مگر اس سے میری مشابہت بھی فائدہ مند ثابت ہوئی تھی۔ جب نقل نے جادو کا اثر کیا تھا تو اصل کا کمال کیا ہوگا لیکن سوال وہی تھا کہ اصل وحید ہے کہاں۔ اس کے بارے میں کوئی بھی کچھ نہیں جانتا تھا۔

ٹینا کی ذہنی کیفیت میں یہ کایا کلپ مجھے کسی فلمی اتفاق جیسی نظر آتی تھی۔ سر میں ایک چوٹ لگی تو یادداشت چلی گئی۔ پھر کسی نے ڈنڈا ماردیا تو سب یاد آگیا۔ پاگل خانوں اور کسی حد تک نفسیاتی اسپتالوں میں مریضوں کا علاج الیکٹرک شاک سے بھی کیا جاتا ہے اور بعض اوقات اس کے حیرت انگیز نتائج نکلتے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی ٹینا کو الیکٹرک شاک لگا تھا لیکن اس وقت نہ مجھے اندازہ تھا اور نہ اس کے باپ کو معلوم تھا کہ اس الیکٹرک شاک سے ٹینا کا علاج ہوسکتا ہے۔

اب میں دیکھ رہا تھا کہ ٹینا کے ساتھ یہ جھوٹ یا دھوکا اس کے مرض کا شافی علاج بن گیا تھا لیکن اس جھوٹ کو جاری رکھنا اور نبھانا بہت مشکل اور خطرناک کام تھا۔ ابھی تک ٹینا نے وحید کے بارے میں کوئی مشکل میں ڈال دینے والا سوال نہیں کیا تھا۔ ایسا حوالہ نہیں آیا تھا جس سے پول کھل جاتا۔

میں کسی بازیگر کی طرح تنے ہوئے رسے پر سنبھل کے چل رہا تھا حالانکہ مجھے اس کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ کسی بھی وقت لڑکھڑا کے گرسکتا تھا۔ ٹینا ایک سوال کر[illegible] جس کا میں غلط جواب دیتا اور یہ کھیل ختم ہوجاتا۔ اسے م[illegible] ہوجاتا کہ میں دھوکے باز ہوں۔ شاید اس کے بعد ٹینا [کی] حالت پہلے سے بھی زیادہ خراب ہوجاتی۔

یہ کھیل میں نے بڑی عیاری اور ذہانت سے کھ[یلا]۔ زیادہ وقت میں بولتا رہا۔ میں اسے حویلی اور اپنے پروگر[ام] کے بارے میں بتاتا رہا۔ یہ ایک نئی دلچسپ اور الف لیل[ہ] ماحول رکھنے والی دنیا تھی۔ وہ اس میں کھوگئی۔ اصل چیز ساتھ تھا، وحید کا ساتھ تھا۔ میں نے اسے ماضی میں جانے نہیں دیا۔ ایک ڈر میرے دل میں بیٹھا رہا کہ نہ جانے کب اچانک وہ کوئی ایسی بات کہہ دے جو میری سمجھ میں نہ آ[ئے]۔ وحید کی عادات واطوار۔ اس کا خاندانی پس منظر۔ اس کی تع[لیم] اور پیشہ، کسی چیز کے بارے میں مجھے معلوم نہیں تھا۔ میں نہ[یں] جانتا تھا کہ انہوں نے کیسا وقت ساتھ گزارا۔ کہاں گزارا؟

دوپہر کے کھانے کے بعد ٹینا سوگئی۔ وہ بہت تھک[ی] تھی۔ ذہنی طور پر وہ بہت خوش اور پرجوش تھی لیکن جسم[انی] طاقت جواب دے گئی تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ [مجھے] اس ڈرامے کے انتہائی مشکل رول سے نکل کر دوبارہ ر[فیق] بننے کا موقع ملا۔

ڈاکٹر مہدی حسن نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا کہ ان کا [نسخہ] کتنا کارگر ثابت ہوا ہے۔ یہ اندھیرے میں چلایا ہوا [تیر] نشانے پر جا لگا تھا۔ ان کی بیٹی جو کسی نفسیاتی طریقے سے ٹھیک نہیں ہورہی تھی اسے ایک جادوگر نے محبت کے منتر سے ٹھیک کر[دیا] تھا۔ اور کمال کی بات یہ تھی کہ وہ جادوگر نہیں محض ایکٹر تھا[جو] جادوگر کا کردار کررہا تھا۔ وہ اپنی کامیابی سے اتنے مطمئن [تھے] کہ اسپتال کو شای کے آپریشن کے قابل بنانے کے [لیے] لاہور چلے گئے تھے۔ جاتے جاتے وہ شای کو خوش خبر[ی] سنا گئے تھے کہ دو دن بعد اس کی سرجری ہوگی۔ وہ لاہور [سے] ایک اور ماہر آرتھوپیڈک سرجن کا تعاون بھی حاصل کرلی[ں] گے جو ان کا دوست ہے۔ ایک مہینے بعد وہ چاہے تو دوڑتا ہ[وا] لاہور سے ست بدھائی آسکتا ہے۔

میں نے راجا سے بات کی اور پھر ٹینا کے بھا[ئی] سے۔ "یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ٹینا راتوں رات ٹھیک ہوگئی لیکن وہ ست بدھائی میں نہیں رہ سکتی۔"

"کیوں نہیں رہ سکتی۔" بھائی نے ایک احمقانہ سوال کیا۔

"اس لیے کہ میں وحید نہیں رفیق ہوں۔" میں نے ضبط سے کام لیا۔ "کل تک یہ ڈراما چلا سکتا ہوں، مستقل نہیں۔"

راجا نے بھی کہا۔ "اس میں ٹینا کے لیے بہت بڑا رسک ہے۔ جیسے ہی یہ راز فاش ہوگا کہ اس کے ساتھ ہم سب نے مل کے فراڈ کیا، اس کی حالت پہلے سے زیادہ خراب ہوجائے گی۔"

احمد حسن نے سر ہلایا۔ "آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ پلیز اس مسئلے کا کوئی حل نکالیے۔"

میں نے کہا۔ "حل ہے...... میں ٹینا سے کہہ دوں گا کہ مجھے واپس لندن جانا ہے۔ لیکن میں کچھ عرصے بعد واپس آجاؤں گا۔ تب تک وہ وہیں رہے۔"

"وہ نہیں مانے گی۔ وہ کہے گی کہ ڈیڈی یہاں ہیں اور بھائی یہاں ہے۔ میں بھی یہاں کام کروں گی۔ آخر وہ یہاں کیوں نہیں رہ سکتی۔"

"میرا خیال ہے۔ میں اس سے اپنی بات منوا سکتا ہوں۔ کہہ سکتا ہوں کہ میرے آنے تک وہ ست بدھائی نہ جائے۔"

"اس نے وجہ پوچھی کہ کیوں نہ جاؤں...... پھر؟"

"وجہ کچھ نہیں...... مجھے پسند نہیں اور میں کیا کہہ سکتا ہوں اور اگر اس نے بحث کی یا میری زبردستی قبول نہ کی تو پھر آپ کو بھی اس کے ساتھ رہنے کے لیے ست بدھائی سے جانا پڑے گا۔"

"یہ سب کچھ چھوڑ کے؟" احمد حسن سخت مایوس ہوا۔

"آپ طے کرلیں، کس کی اہمیت زیادہ ہے؟ بہن کی صحت اور زندگی کی یا میرے ساتھ ست بدھائی کے ترقیاتی پروگرام میں ہاتھ بٹانے کی۔"

وہ خاموش رہا۔ انتخاب آسان نہیں تھا۔ وہ کوئی فوری فیصلہ کرنے سے قاصر تھا۔

میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ "کل میں اسے واپس لے جاؤں گا۔ وہیں، آپ کے گھر۔ ڈاکٹر مہدی حسن ابھی وہاں ہیں۔ شاید اگلے ہفتے بھی رہیں گے۔ اگر وہ چاہیں تو بیٹی کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ ممکن ہے بیٹی ان کے ساتھ رہنے پر راضی ہوجائے۔ اسے اکیلے رہنا منظور نہ ہو۔ ڈاکٹر صاحب کو بیٹی کے لیے تھوڑی سی قربانی دینی پڑے تو دینی چاہیے۔ یہاں کام چلتا رہے گا ان کے بغیر بھی لیکن بیٹی کے لیے ایک باپ کے بغیر رہنا مشکل ہوگا۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" احمد حسن نے کہا۔

"اب رہی بات ایک جذبے کی جو ڈاکٹر مہدی حسن کو یہاں لایا۔ وہ جذبہ لاہور میں بھی بے مصرف نہیں ہے۔ میں لندن سے ٹینا کو فون کرواتا رہوں گا۔ تاکہ اس کی حالت سنبھلی رہے۔ اس کے بعد......؟"

راجا نے چٹکی بجا کے میری بات کاٹ دی۔ "ایک منٹ فیکے پتر۔ تیری بات سے میرے دماغ میں ایک اور کھڑکی کھل گئی ہے۔ اگر کوئی وحید بن کے لندن سے کال کرسکتا ہے تو وحید...... اصل وحید بھی کرسکتا ہے۔"

"اصل وحید کہاں ہے مہاراجا؟"

"کیا اسے تلاش نہیں کیا جاسکتا۔ یہ دنیا بہت چھوٹی ہوگئی ہے۔ ایسا سب کہتے ہیں پھر لندن کیا ہے، اس چھوٹی سی دنیا کا ایک شہر۔"

"او کے...... فرض کرو ہم نے اسکاٹ لینڈ یارڈ سے درخواست کی۔ اور انسانی ہمدردی کے ناتے انہوں نے کہا کہ یہ ہے تو تمہارا اپنا کام مگر تم اپنی نااہلی اور ناکامی کا اعتراف کرتے ہو تو ہم کوشش کرتے ہیں اور گوہر مطلوب مل گیا......"

"گوہر کون؟" احمد حسن نے سادگی سے پوچھا۔

میں نے ہنسی روک کے کہا۔ "اصل وحید مل گیا۔ تو کیا ہم اسے قائل نہیں کرسکتے کہ وہ ٹینا کی صحت یابی کے کام میں ہماری مدد کرے۔"

"یہ ہوسکتا ہے۔ بالکل ناممکن نہیں ہے مگر اس کی بیوی؟"

"بیوی؟ اس کی بیوی کہاں سے آگئی بیچ میں۔" میں نے کہا۔

راجا نے ایک آہ بھری۔ "وحید کسی ٹریجک لو اسٹوری کا کردار ہے۔ ٹینا اس سے محبت کرتی تھی۔ شاید وہ ٹینا سے محبت نہیں کرتا تھا ورنہ یہ جدائی ہی کیوں آتی اور ٹینا کسی علی ظفر سے شادی کیوں کرلی۔ شادی اس نے بھی کرلی ہوگی۔ ایسی کوئی بیوی نہیں ہوتی فیکے پتر جو اپنے شوہر کو سابق محبوبہ سے دوبارہ رابطہ کرنے دے۔ خواہ مسئلہ اس کی صحت اور زندگی کا ہو۔ یہاں تو وحید ہی اس مرض کا علاج ہے۔ کیا وہ اجازت دے گی کہ ٹینا کو بچانے کے لیے وحید ضروری ہے تو اسے لے جاؤ۔"

میں راجا کی دلیل کو مسترد نہیں کرسکتا تھا۔ میں نے کہا۔ "راجا یہ محض ایک چانس کی بات ہے۔ پانچ دس فیصد سہی۔ چانس تو ہے کہ اس نے شادی نہ کی ہو یا کرکے چھوڑ دی ہو۔ وہاں سب ہوتا ہے۔ پھر وحید ہمیں دستیاب ہو۔"

"دستیاب ہونے کے باوجود اس نے ہماری نہ مانی پھر؟"

"پھر ہم اسے ماریں گے۔ بلیک میل کریں گے۔ اغوا کرکے لے آئیں گے۔ ابھی سے ایک منفی سوچ رکھنے کی کیا ضرورت ہے راجا۔ ہر کوشش اگر کامیاب نہیں ہوتی تو کیا

کوشش بھی نہ کریں۔'' میں نے بھنا کے کہا۔

اگلے دن میں ٹینا کو اس کے گھر لے گیا۔ اس سے اپنی ہر بات منوانے کے لیے مجھے زبردستی کا سہارا ہی لینا پڑا۔ وہ ڈرتی تھی کہ ناراض ہو کے کہیں میں پھر اسے نہ چھوڑ جاؤں۔ وہ مان گئی کہ میرے مستقل طور پر لندن سے آنے تک وہ اسی گھر میں رہے گی۔ ٹھیک رہے گی۔ اپنا خیال بھی رکھے گی اور دوسروں کا بھی۔ محبت میں کسی کو بلیک میل کرنا کتنا آسان ہوتا ہے۔ ایک بچہ روٹھ جاتا ہے تو اسے منانا پڑتا ہے۔ ماں کہتی ہے دودھ نہیں بخشوں گی تو بیٹا اپنی محبت کو قربان کر کے اس کی مرضی سے شادی کر لیتا ہے اور ساری عمر روتا ہے۔ شیریں نے فرہاد کو بلیک میل کیا۔ میں نے ٹینا کو......

ڈاکٹر مہدی حسن بڑے انہماک سے اپنے اسپتال کے آپریشن تھیٹر کی صفائی کرا رہے تھے۔ وہ اپنے پیشے میں خاصے نامور تھے چنانچہ ان کے لیے طبی عملے کی فراہمی کوئی مسئلہ نہیں تھی۔ شامی بادشاہ کے آپریشن کے لیے انہوں نے اپنے ایک ہم پیشہ آرتھوپیڈک سرجن کی خدمات حاصل کر لی تھیں جس کا نام ہی کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ پوری فیس وصول کرنا اس کا حق تھا۔ خود ڈاکٹر مہدی حسن اعتراف کر چکے تھے کہ ساری عمر وہ اپنے پیشے کو پیسے بنانے میں مصروف رہے تھے۔ اصل مسئلہ راز داری کا تھا۔

دوسرے دن ہی میں نے ٹینا سے رخصت بھی لی۔ اس وعدے پر کہ میں واپسی میں زیادہ دن نہیں لگاؤں گا اور اس کے بعد ہم...... ظاہر ہے میاں بیوی کی حیثیت سے مل کے ست بدھائی میں رہیں گے۔ اسے وہ جگہ بہت پسند آئی تھی اور باپ اور بھائی کو دیکھ کر اس میں بھی خدمت خلق کا جذبہ جوش مارنے لگا تھا۔ رہی سہی کسر ''وحید'' نے پوری کر دی تھی جو ست بدھائی کی وجہ سے آیا تھا، ٹینا کی وجہ سے نہیں۔ ٹینا اب کسی قیمت پر اسے چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔

آپریشن سے ایک دن پہلے شامی بادشاہ کو ست بدھائی سے لاہور شفٹ کر دیا گیا۔ چونکہ میرا ان کے گھر جانا ممکن نہیں تھا اس لیے شامی کو اسپتال کے ایک کمرے میں رکھا گیا جہاں اس کے ساتھ گولی تھی یا میں تھا۔ اور کسی کو خود میں نے وہاں آنے کی اجازت نہیں دی۔ بے سبب بھیڑ لگانے کا فائدہ کوئی نہیں تھا۔ رات کو میری ملاقات اس دوسرے ڈاکٹر سے بھی ہوئی۔ شامی کے تمام نئے ٹیسٹ کی رپورٹس دیکھنے کے بعد اس نے بڑے محتاط انداز میں آپریشن کے کامیاب ہونے کی پیش گوئی کی۔ خود مہدی حسن نے احتیاط سے کام لیا۔ شامی کی بیوی بار بار پوچھتی تھی کہ شامی ٹھیک ہو جائے گا نا؟ وہ چل پھر سکے گا۔ عام لوگوں کی طرح سارے کام کرے گا؟ مہدی حسن ''انشاء اللہ'' سے کام چلاتے رہے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میڈیکل سائنس کی ساری ترقی اور ڈاکٹرز، سرجن کی ساری معجزنما مہارت کے باوجود یہ حقیقت کیسے بدل سکتی ہے جو ہمارے ایمان کا حصہ ہے کہ سب کچھ خدا کے ہاتھ میں ہے۔ وہی سب سے بڑا مسیحا ہے جو شفا بھی دیتا ہے زندگی بھی اور موت بھی۔ ہم سب کیا اور ہمارے دعوے کیا۔

اسی رات وہ ڈاکٹر بھی آیا جو اتھیسز یا کا ماہر سمجھا جاتا تھا اور اس نے بندر پورٹوں کے علاوہ بھی شامی کے تفصیلی معائنے میں بہت کچھ دیکھا۔ یہ ایک ٹیم ورک تھا جس میں سب کی مہارت کے ساتھ ہم آہنگی ضروری تھی۔ فرطِ جذبات سے شامی بھی رات بھر سوتا جاگتا رہا اور اس کی بیوی بھی شامی پرانی باتیں کرتا رہا۔ وہ کیا تھا۔ کیا بن گیا۔ اس نے کچھ کیا۔ کیا دیکھا۔ زندگی سے کیا سبق سیکھا۔ کیا پایا کیا گنوایا اب ایک نئی زندگی ملے گی تو وہ کیسے گزارے گا، کیا کرے گا۔

آپریشن سات گھنٹے جاری رہا۔ میرے پاس بل پر فون آتے رہے۔ کبھی راجا کا تو کبھی شہناز کا یا ڈاکٹر احمد حسن کا۔ آپریشن تھیٹر کے باہر ہمارے لیے کرسیاں رکھ دی گئی تھیں۔ میں نے وہیں بیٹھ کے چائے کافی پی۔ کھانا کھایا اور گولی کو بھی کھلایا۔ بالآخر چار بجے شامی کو ایک اسٹریچر پر باہر لایا گیا، وہ بے ہوش تھا۔ آپریشن پوری طرح کامیاب رہا اور ڈاکٹروں کی ٹیم پرامید تھی کہ مہینے بھر میں وہ اتنا ہی فٹ ہو جائے گا جتنا پہلے تھا۔ یہ پورا مہینا اسے ڈاکٹر مہدی حسن کے گھر میں رکھنے کا فیصلہ بھی کیا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ اس کی دیکھ بھال خود ڈاکٹر مہدی حسن کریں اور ان کی ٹینا کرے۔

گولی سب سے زیادہ جذباتی ہو رہی تھی۔ وہ بار بار خوشی سے آنکھوں میں آ جانے والے آنسو پونچھتی تھی اور میرے ساتھ ڈاکٹر مہدی حسن کے ہاتھ چومتی تھی۔ ہمارے منع کرنے کے باوجود بار بار کہتی تھی کہ یہ آپ کا احسان ہے۔ آپ دوست ہی نہیں فرشتے ہو۔ آپ نے مجھے بھی خرید لیا ہے۔ شامی تو پہلے ہی آپ کا غلام تھا۔ اس نے ملازموں کے ذریعے سات کالے بکروں کا صدقہ دلوایا اور خود داتا صاحب کے مزار پر چادر چڑھانے گئی۔ اس نے وہاں چالیس دیگوں کی منت مانی کہ شامی ٹھیک ہو جائے گا تو اس کے ساتھ آئے گی اور غریبوں میں تقسیم کرے گی۔ اگلے دن وہ میاں میر صاحبؒ کے مزار پر گئی۔ محبت اور عقیدت کے جذبات میں فرق بھی کیا ہے۔

راجا کا اور میرا اگلا پورا ہفتہ دُہری مصروفیت میں

لاہور آتے جاتے گزرا۔ اسپتال کے ساز و سامان کو احتیاط سے اکھاڑ کے پیک کرنا اور لوڈ کرا کے ست بدھائی پہنچانا ایک مشکل، نازک اور مہارت کا کام تھا۔ ایک پوری ٹیم نے یہ کام بڑی خوش اسلوبی سے پورا کیا۔ جب اسپتال خالی ہو گیا تو دوسری پارٹی آ گئی جو عمارت کا قبضہ لے کر اسے ہوٹل بنانا چاہتی تھی۔ تاہم ان معاملات سے میرا براہ راست کوئی تعلق نہیں تھا۔

ست بدھائی میں اب ایک نئی مصروفیت شروع ہو چکی تھی۔ ہنگامی طور پر راج مزدور طلب کیے گئے تھے اور تعمیراتی سامان کی فراہمی کو غنی نے یقینی بنایا تھا۔ نئی بیرک کی ڈیزائننگ کوئی تکنیکی مسئلہ نہیں تھی لیکن اس میں ڈاکٹر شہناز اور اس سے زیادہ احمد حسن کی رائے کو اہمیت دی گئی۔ ان کی دلچسپی اور ورکنگ ریلیشن شپ کا یہ عالم تھا کہ وہ ہر وقت کاغذوں پر نقشے بناتے رہتے تھے اور پلان ڈسکس کرتے رہتے تھے۔

ایک دن راجا پھولا ہوا منہ لے کر آیا۔ ''یار اب کچھ نہ کچھ ہوگا۔''

''لڑکا یا لڑکی۔ ریشم اور غنی کیا چاہتے ہیں۔''

''وہ جائیں بھاڑ میں۔ یہ لنگڑا مارا جائے گا۔ میں اس کی دوسری ٹانگ بھی توڑ دوں گا۔ اس نے میری بیوی کو پھنسا لیا ہے۔''

''آپ غالباً ہونے والی بیوی کا حوالہ دے رہے ہیں۔''

''اسے مذاق مت جان فیکے پتر۔ یہ جو ڈاکٹر ہوتی ہیں نا۔ دل سے یہ ڈاکٹر ہی کو چاہتی ہیں۔ مجبوری میں صحافی سے دل لگا لیا تھا۔ مجبوری میں تو شیر بھی گھاس کھاتا ہے۔ آدمی ٹڈے کھاتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''چل صبر کر۔ جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں۔ تجھے بھی مل ہی جائے گی کوئی اور۔ صحافی نہ سہی رپورٹر...... لیکن یہ سب تیری وجہ سے ہوا۔''

''میری وجہ سے؟'' راجا دھاڑا۔ ''اس کے لیے میں نے بندے دا پتر بننا قبول کیا۔ سارے جوانی کے شوق چھوڑے۔ بالکل راہبانہ زندگی اختیار کی۔ اور کیا کروں......؟''

''شادی پھر بھی نہیں کی، یہ کس کا قصور ہے؟''

''تیرا اور کس کا۔ اگر تو چاہتا تو کیا یہ مشکل تھا۔ بلا لیتا کسی قاضی کو سو روپے دے کر۔ ہمیں پکڑ کے سامنے بٹھا دیتا۔ دس روپے کے چھوارے خرچ ہوتے۔ باراتی سب موجود تھے۔ ہم کیا انکار کرتے۔ مجھ پر رقت طاری ہو رہی ہے۔ آج میرا باپ ہوتا تو میری کب کی شادی ہو جاتی۔ اب تک چار چھ بچے ہوتے ہمارے۔ کیا پتا ان کے بھی بچے ہوتے۔''

میں نے کہا۔ ''راجا۔ تیری بات میرے دل میں تیر کی طرح لگی۔ بس اب مزید دیر نہیں ہوگی بچے۔ آج سے تو مجھے اپنا باپ سمجھ۔ اگلے مہینے تیرا بیاہ پکا۔''

''اگلے ہفتے کیوں نہیں ابا جی۔ یہ کیا حرامی پن ہے۔''

''چپ کر سور کے بچے۔ باپ کے سامنے زبان چلاتا ہے۔'' میں نے کہا۔

ہنستے ہنستے راجا ایک دم سیریس ہو گیا۔ ''یہ جو تو نے کہا فیکے پتر۔ اب یہ ہو جانا چاہیے، اگلے مہینے۔ شہناز نے منظوری دے دی ہے۔''

''اچھا۔ یہ تو ایک خبر ہے...... یہ ہوا کیسے؟''

راجا نے شرمانے کی اداکاری کی۔ ''یار اس نے کہا کہ اب مجھے یقین آ گیا ہے کہ تم نے کوالیفائی کر لیا ہے۔ اپنے عمل سے۔''

''بس تو پھر طے......'' میں نے کہا لیکن اچانک میں نے شیر خان کو دیکھا۔ ''راجا۔ یہ شیر خان یہاں کیا کر رہا ہے؟''

''نوکری کر رہا ہے اور کیا۔''

میں نے کہا۔ ''یہ فریال کے ساتھ تھا۔''

''تھا...... اب نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ سب سیکیورٹی گارڈ بھی واپس آ گئے ہیں جن کو تو نے بھیجا تھا۔''

''مگر کیوں؟ اس کی حفاظت......؟''

راجا نے میری بات کاٹ دی۔ ''اپنی حفاظت وہ خود کر سکتی ہے فیکے پتر۔ یہ اس نے کہا ہے بلکہ کہلوایا ہے۔ کیونکہ خدا کے بعد اب زمین پر اس ذمے داری کو کسی اور نے قبول کر لیا ہے۔''

''کس نے؟'' میں راجا کو دیکھتا رہا۔

''جس کے پاس بہت بہتر وسائل ہیں۔ مثلاً پولیس فورس۔ کیونکہ وہ صوبے کا وزیر داخلہ ہے۔ فریال کے اس سے اتنے اچھے...... فیملی ریلیشن ہیں کہ فریال اس کے بیٹے کی شادی میں شریک ہوئی اور وہاں اپنے فن کا مظاہرہ بھی کیا۔''

''تو مجھے ذلیل کر رہا ہے۔''

''ایک جھانپڑ مار کے میں تیرا دماغ درست کر دوں گا الو کے پٹھے۔ وہ تیری کیا لگتی ہے کہ اس کے کچھ کرنے سے تیری عزت ذلت کا مسئلہ پیدا ہو۔''

مجھے یہ کڑوا گھونٹ نگلنے میں کچھ وقت لگا۔ پھر میں نے حقیقت کو تسلیم کر لیا۔ ''راجا۔ تو نے کیا کہا تھا اس سے؟''

''اب چھوڑ۔ یہ بہت ضروری تھا۔ ایسا مجھے کرنا پڑا۔ حق میرا صرف تجھ پر تھا لیکن ایک ذہن نہ سمجھتا ہو تو دوسرے کو بھی سمجھانا چاہیے۔ میرا سارا خلوص اور ساری نیک نیتی

یکطرفہ طور پر تیرے لیے تھی اور ہے۔فریال سے میرا تعلق تیرے واسطے سے تھا۔ اور آئندہ بھی جو عورت تیری زندگی کے سفر میں تیرے ساتھ ہوگی۔ اس کے ساتھ میرا بھی رشتہ ہوگا۔ جب فریال نے ازخود یہ تعلق برقرار نہیں رکھا تو میں اور ہم سب کا تعلق صرف تجھ سے رہ گیا۔''

میں نے کہا۔''پھر بھی...... کیا کہا تو نے؟''

''یار تو خود بھی اندازہ کرسکتا ہے۔یہی کہا میں نے کہ خاتون! آپ اب میرے دوست کی جاں بخشی کریں۔ بہت استحصال کرلیا آپ نے اس کا۔ اس نے ٹھیکہ نہیں لیا ہے تمام عمر آپ کا خیال رکھنے کا اور بے وقوفی میں کیا ہے تو اسے میں ختم کرتا ہوں۔ اگر صوبائی وزیر داخلہ سے آپ کے مراسم ہیں تو آپ کو کس بات کی کمی۔ گارڈز آپ کے دروازے پر ہوں گے آپ کی گاڑی کے آگے پیچھے چلیں گے۔ اب تو آپ پر لازم ہے کہ رفیق کی مدد کریں۔ اس کے خلاف جو ذاتی عناد رکھتے ہیں محترم وزیر داخلہ، وہ ختم ہو۔ رفیق کے خلاف مقدمات داخل دفتر ہوں اور اس کے دشمنوں کا خانہ خراب ہو۔ مراسم سے فائدہ اٹھائیں مس فریال۔''

''اور وہ سنتی رہی تیری بکواس۔ تھپڑ نہیں مارا تیرے منہ پر۔''

''نہیں۔ حالانکہ مجھے بھی اس کی پوری توقع تھی۔ اس نے کہا کہ راجا صاحب۔ آپ مطمئن ہوجائیں۔ آج کے بعد رفیق پر میری کوئی ذمے داری نہیں۔ نہ میری وجہ سے اس کے لیے مسائل پیدا ہوں گے بلکہ ویسا ہی ہوگا جیسا آپ نے کہا۔ خود میں نے یہی سوچ کے عجب خان کریلہ کو خود فون کیا تھا کہ میں آپ کے بیٹے کی شادی میں آؤں گی۔ آپ مجھے مدعو کریں عزت کے ساتھ۔ ہم فنکار لوگ ہیں اور آپ فن کے قدرداں۔ بس وہ چڑھ گیا بانس پر۔ خود آگیا دعوت نامہ لے کر۔ ایک لاکھ کا چیک بھی دے دیا تھا۔ میں نے پھاڑ کے پھینک دیا کہ آپ نے تو حسنِ سلوک سے میرا دل جیت لیا ہے۔ میں نے اسے کھانے کے لیے روکا تھا۔ وہ رات وہیں رک گیا۔''

میرے دماغ کو ایک جھٹکا لگا۔''رات کو...... فریال کے گھر؟''

''ہاں۔ تجھے شک ہے تو فریال سے پوچھ لے۔ کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا تو پڑتا ہے۔ میں تو کہتا ہوں اب دماغ سے کام لیا ہے اس نے۔ دیکھنا کتنا فائدہ ہوگا۔ ایک راستہ پکڑ لیا بالآخر۔''

''راجا۔ تجھے میرے جذبات کا کوئی خیال نہیں۔''

''دیکھ پتر۔ جذبات پر کنٹرول رکھ۔ جذبات سب کے لیے ہونے چاہئیں۔ دوستی کے، پیار کے، رشتوں کے ان کی سرحدیں متعین ہونی چاہئیں۔ جذبات کا ایک رخ دوسرے کو نہ کاٹے۔ اور کسی راستے پر ون وے ٹریفک نہ۔ آئی بات سمجھ میں؟''

''یہ بہت برا ہوا راجا۔''

''دنیا میں سب ہوتا ہے۔ اچھا بھی برا بھی۔ زندگی اسی کا نام ہے۔ فریال نے جذباتی رشتے چھوڑ کے کاروباری رشتے اپنائے تو اس کی مرضی۔ اس نے ایک بڑی مزے کی بات کی۔ کہنے لگی کہ یہ جو آج صوبائی وزیر داخلہ ہے۔ معلوم ہے یہ ہمیشہ نہیں رہے گا لیکن اس کے بعد جو آئے گا ہوگا تو وہ بھی مرد ہی۔ یہ وزارت آج تک کسی عورت نے سنبھالی۔'' راجا قہقہہ لگا کے اٹھ گیا۔

میں وہیں بیٹھا رہا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں نے زندگی کے آٹھ برس گنوا دیے ہیں۔ جن کو میں نے متاعِ جاں کی طرح دنیا سے بچا بچا کے اور دل سے لگا کے رکھا تھا۔ وہ محبت زر و جواہر کا ایسا انمول خزانہ تھی جو خوش قسمتی سارے در کھول کے قدرت نے مجھے عطا کیا تھا۔ حقیقت سے کتنی مختلف تھی۔ وہ کنکر پتھر تھے جن کو میں نے حرزِ جاں اور ان کا مالک ہونے پر غرور کرتا رہا۔ آج ساری دنیا جیسے پر خندہ زن ہے۔ بے وقوف۔ عقل کے اندھے۔ پاگل۔

ڈاکٹر مہدی حسن کی اچانک آمد نے مجھے سنبھلنے پر مجبور کردیا۔ میں نے ان کا حیرانی سے استقبال کیا۔''ڈاکٹر صاحب۔ خیریت تو ہے؟''

وہ میرے پاس بیٹھ گئے۔''بالکل خیریت ہے۔ تمہارا وہ دوست شاہی بادشاہ دلچسپ آدمی ہے۔ اس کی قوت ارادی تو کمال ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مہینا بھر نہیں وہ پندرہ دن میں آجائے گا یہاں۔''

''اس میں کمال آپ کا زیادہ ہے۔''

''اونہوں......'' انہوں نے اوپر انگلی اٹھائی۔''اس نے ایک اشارے سے سارا انتظام کیا۔ مجھے یہاں بھیجا۔ شاہی کو زندہ رکھا۔ اس اسپتال کا سودا کرادیا۔ آپریشن آخری مرحلہ تھا۔ اس میں بھی کامیابی اسی نے دی۔''

میں نے کہا۔''ٹینا کا کیا حال ہے؟''

''میں اسی کا شکریہ ادا کرنے آیا تھا۔ تم نے وہ کام کیا ہے......''

میں نے ان کی نقل اتاری۔''اونہوں۔ اس نے ایک اشارے سے سارا انتظام کیا۔ مجھے وہاں بھیجا۔ وحید بنا کے۔''

وہ ہنس پڑے۔''حقیقت یہ ہے کہ میں بہت خوش ہوں۔ بس ایک خیال سے پریشانی ہوتی تھی کہ کیا وہ ایسی ہی رہے گی جیسی آج کل ہے۔ آخر کب تک حقیقت چھپائی جاسکتی ہے۔ کسی دن کہیں بھی وہ پھر تمہارے سامنے آگئی اور اسے پتا چل گیا۔''

میں نے کہا۔''میرا خیال ہے، اب وہ ٹھیک رہے گی۔''

''کہتے تو دوسرے ڈاکٹر بھی یہی ہیں۔ لیکن میری تسلی کے لیے سو فیصد یقین کے ساتھ نہیں۔ کل اچانک شائستہ کا فون آیا۔ وحید کا پتا چل گیا ہے۔''

میں تقریباً اچھل پڑا۔''وحید کا پتا چل گیا ہے۔''

انہوں نے جوش اور مسرت سے سر ہلایا۔''مجھے افسوس ہوا کہ پہلے مجھے یہ خیال کیوں نہیں آیا۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ اس کے والد گورنمنٹ کالج میں پڑھاتے تھے اور میرے دوست تھے۔ عزیز بھی تھے۔ شائستہ سے عزیز داری دور کی ہے اور وہ خود بھی دور ہے۔ لیکن میرا بہت لحاظ کرتی ہے۔ میں نے اس کے سامنے یہ مسئلہ رکھا۔ یہ بھی بتایا کہ تم نے اس معاملے میں کیا کردار ادا کیا۔ اپنا بھی بتایا کہ میں اور احمد تمہارے ساتھ ہیں۔ پھر میں نے پوچھا کہ یہ وحید آخر کون ہے۔ تم کو معلوم ہونا چاہیے کیونکہ ٹینا جب تک لندن میں تھی تم سے ملتی تھی۔ خاصی دوستی تھی تمہاری۔ اس نے کبھی ذکر کیا؟ شائستہ نے کہا کہ ذکر ضرور کیا تھا اور میں جانتی ہوں وہ کون ہے۔''

میں نے کہا۔''اچھا...... شائستہ کو معلوم ہے۔''

''ہاں۔ وہ ایک پاکستانی آرکیٹکٹ ہے۔ مصور اور مجسمہ ساز بھی ہے۔ اس کے خیال میں وہ خبطی سے کچھ زیادہ ہے۔ عجیب چیز ہے۔ لمبے لمبے بال۔ داڑھی مونچھ۔ ہر قسم کا نشہ کرتا ہے۔ اکیلا رہتا ہے لیکن صبح کہیں شام کہیں۔ ایک مخصوص دانشور قسم کے حلقے میں بہت پاپولر ہے۔''

''کام کاج کوئی نہیں کرتا؟''

''یہ میں نے بھی پوچھا تھا۔ شائستہ نے کہا کہ ایسے لوگ گزارے لائق کما ہی لیتے ہیں۔ فلیٹ اس کا بڑی اچھی جگہ پر ہے۔ گاڑی بھی قیمتی ہے۔ یہ سب پیسے کے بغیر نہیں ہوتا مگر یہ بھی مشہور ہے کہ اس کو قدردانوں سے بہت کچھ مل جاتا ہے۔ ان میں بیشتر خواتین ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے دولت مند جو پورٹریٹ بنواتی ہیں یا مجسمہ۔ شائستہ نے اس کا ذکر بڑی نفرت اور حقارت سے کیا کہ پتا نہیں ایسے لوگ جن کی زندگی میں نہ کوئی سلیقہ ہے نہ ڈسپلن۔ نہ اصول نہ معمول۔ ان کو لوگ کیسے پسند کرتے ہیں خصوصاً عورتیں۔''

میں نے کہا۔''یہ تو کوئی راسپوٹین قسم کا کردار بنتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب۔ اس کے ساتھ میری ایک فیصد مشابہت نہیں بنتی۔ پھر ٹینا نے کیسے مجھے وحید سمجھ لیا۔''

''یہ میں نے بھی کہا۔ وہ بولی کہ چار سال ہوگئے میں نے اسے نہیں دیکھا۔ ٹینا نے بھی ایک بار ذکر کیا تھا اور بڑے شوق سے ملوایا تھا۔ میں نے تو کہا کہ لعنت تم پر۔ یہ انسان ہے کہ حیوان۔ مگر اس کا دماغ خراب ہورہا تھا۔ ٹینا نے علی ظفر سے شادی کرلی تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔''

''ڈاکٹر صاحب۔ کیا علی ظفر سے ٹینا نے پسند کی شادی کی تھی؟''

''ایسا ہی ہوگا۔ لندن میں وہ خود مختار تھی۔ کسی کا دباؤ نہیں تھا اس پر۔ وہ ایک ہی اسپتال میں کام کرتے تھے۔ پھر یہاں آگئے تھے۔''

''برا نہ مانیے گا۔ کیا وہ وحید سے صرف متاثر تھی؟''

وہ کچھ دیر سوچتے رہے۔ ''میں سمجھتا ہوں معاملہ اس سے زیادہ تھا۔ لیکن وہ آدمی کسی کے قابو میں آنے والا کہاں تھا۔ پتا نہیں کتنی ہوں گی جو چاہتی ہوں گی کہ اس سے شادی کرلیں۔ مگر وہ کسی سے کرے تب۔ میں نے شائستہ سے کہا کہ اس کا سراغ لگائے۔ ایسا شخص آسانی سے تلاش کیا جاسکتا ہے۔ لیکن رات کو یہی سوال میرے ذہن میں گردش کرتا رہا کہ اس نے تمہیں وحید کیوں سمجھا؟''

''یہ واقعی ناقابل فہم ہے۔''

''ایک امکان نظر آیا مجھے۔ شائستہ چار سال پہلے کی بات کررہی تھی۔ وحید کا چار سال پہلے کا حلیہ بتارہی تھی۔ کیا پتا اب وہ ایسا نہ ہو۔ جب شائستہ سے ملا تو ایسا ہی ہپی اور حوش چیز ہو۔ بعد میں انسان کا بچہ بن گیا ہو۔ اپنی مرضی سے یا کسی کے کہنے سے''

''آپ کا مطلب ہے...... ٹینا کے کہنے سے؟''

''دنیا میں ناممکن کچھ بھی نہیں...... اور جھاڑ جھنکاڑ صاف ہونے کے بعد اس کا جو چہرہ ٹینا نے دیکھا ہو۔ وہ تمہارے جیسا ہو۔''

میں نے سرہلایا۔ ''ایسا ہوسکتا ہے لیکن پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ٹینا نے اس جنگلی کو انسان بنادیا اور وہ ٹینا کے کہنے سے بن گیا۔ اتنا اثر تھا ٹینا کا۔ تو پھر شادی کیوں نہیں کی؟''

''یہ تحقیق طلب معاملہ ہوگا۔ وہ شادی کا قائل نہیں تھا یا...... شادی کے قابل نہیں تھا۔ میں ایک ڈاکٹر کے ذہن سے سوچتا ہوں۔ چلو ٹینا سے نہ سہی۔ کسی سے تو کرتا۔ چوائس اس کا تھا۔ خیر، پتا چل جائے گا۔ شائستہ کی رپورٹ آنے دو۔''

''ڈاکٹر صاحب، فرض کریں اس کا سراغ مل گیا پھر؟ وہ لوٹ کے پاکستان کیوں آئے گا؟ ایسے شخص کو بھلا کون قائل کرسکتا ہے۔''

وہ مایوس نظر آنے لگے۔ ''کوشش کے بغیر میں نہیں کہوں گا کہ ماؤنٹ ایورسٹ سر نہیں ہوسکتی، اس عمر میں۔'' پھر وہ ہنسے اور بولے۔ ''یار اتنی دیر ہوگئی ابھی تک چائے کو بھی نہیں پوچھا تم نے؟''

ڈاکٹر مہدی حسن کی شخصیت نے مجھے حیران کردیا۔ اس عمر میں بھی وہ ناامیدی کے قائل نہیں تھے۔ جدوجہد کیے بغیر ہار نہیں مانتے تھے۔ ان کی قوت ارادی ان کی جسمانی صحت سے کہیں زیادہ قابلِ رشک تھی۔ وہ آج بھی ایک بیٹے اور بیٹی کے لیے زندگی آسان بنارہے تھے۔ ان کے راستوں کے کانٹے چن رہے تھے۔ انہیں اس سے فرق نہیں پڑتا تھا کہ بیٹا جسمانی طور پر معذور ہے اور بیٹی ذہنی طور پر۔ بے شک یہ معذوری ایسی نہیں تھی کہ وہ ایک اچھی اور کامیاب زندگی نہ گزار سکیں۔ ڈاکٹر مہدی حسن کی عمر کے لوگ عملی زندگی سے ریٹائر ہونے کے بعد پوتوں نواسوں والی زندگی انجوائے کررہے تھے۔

اگلے دن رات کو سونے سے پہلے مجھے نور نے فون کیا۔ ''تم کس چکر میں ہو جی؟ لاہور کے اتنے چکر لگائے مجھے فون تک نہیں کیا۔''

میں نے کہا۔ ''دراصل میں تمہارے چکر سے نکل گیا ہوں۔ پلیز ڈونٹ مائنڈ۔''

''میں بھی جارہی ہوں ولایت۔ پاسپورٹ مل گیا ہے۔ جانے سے پہلے تمہیں قتل کردوں گی۔''

میں نے کہا۔ ''ضرور ضرور...... اچھے شعر پر کہتے ہیں مکرر ارشاد۔ ہم اچھی صورت پر کہتے ہیں۔ مکرر قتل۔ ایک بار تو کرہی چکی ہو اور کتنی بار کروگی؟''

''تم نے اخبار دیکھا؟''

''کون سا اخبار۔ کب کا اخبار؟''

''جناب کریلہ صاحب کے فرزند ارجمند کی شادی خانہ آبادی کی رپورٹ والا اخبار۔ رنگین تصاویر کے ساتھ۔''

میں نے کہا۔ ''فریال کے رقص کی تصویر دیکھی تم نے؟''

''ہاں۔ خاص طور پر شاید تمہارے لیے لگائی گئی ہوگی۔''

میں نے کہا۔ ''کوئی اور بات کرو۔''

اسی وقت لیلیٰ بھابی نے دروازہ کھول کے جھانکا۔ میں نے فون بند کردیا۔ (جس کا نور نے یہ مطلب نکالا کہ میں نے غصے میں فون بند کردیا) ''آیئے بھابی۔''

وہ میرے پاس آکے بیٹھ گئیں۔ ''ایک خاص بات کرنی تھی تم سے دیور جی۔''

میں حیران ہوا کیونکہ عرصہ ہوا انہوں نے مجھے دیور جی کہنا چھوڑ دیا تھا، جب فاروقی نے انہیں چھوڑا تھا۔ میں نے کہا۔ ''فرمایئے۔''

''میں...... میں جانا چاہتی ہوں، واپس۔''

مجھ پر حیرت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ''واپس۔ فاروقی کے پاس؟''

انہوں نے سرہلایا۔ ''میں یہاں نہیں رہ سکتی۔''

''یہ...... آپ کا فیصلہ ہے یا اس نے کہا ہے؟'' میں دم بخود بیٹھا رہا۔

بھابی کے چہرے پر ایک رنگ آیا۔ ''اس نے ہی کہا ہے۔''

خاموشی کا ایک وقفہ آیا۔ ''ٹھیک ہے بھابی لیکن اس کا کیا ہوگا؟''

بوبی کا؟'' انہوں نے آہ بھری۔ ''اس کی وجہ سے تو مجھے ماننی پڑی یہ بات۔ وہ میرے ساتھ جائے گا۔''

''آپ نے ثریا سے پوچھا؟ فاروقی کو بتایا؟''

انہوں نے اقرار میں سرہلایا۔ ''ثریا خوش ہے۔ اس کی جان چھوٹی۔ فاروقی کہتا ہے۔ اللہ نے ایک بیٹا دے دیا تمہیں بالآخر۔ ہم مل کے اسے پالیں گے اور میں نے مان لی اس کی بات۔ صرف بوبی کے لیے۔ اگر وہ اس ڈائن ماں کے پاس رہا تو وہ اسے مارڈالے گی۔ وہ اس کی دشمن ہورہی ہے۔''

''نئی بات کیا ہوئی۔''

''تم نے بھی دیکھا ہوگا۔ کیسے پنجے جھاڑ کے احمد حسن کے پیچھے پڑگئی ہے۔ پریشان کردیا ہے اسے۔ کل اس کے ابا آئے تھے تم سے ملنے۔ یہی بات کرنے آئے ہوں گے، اپنے بیٹے کی۔''

میں نے چوکنا ہوکے کہا۔ ''نہیں...... انہوں نے احمد حسن کی تو کوئی بات نہیں کی۔''

بھابی کے کچھ کہنے سے پہلے باہر سے ایک چیخ سنائی دی۔ میں ایک دم اٹھ کے دوڑا۔ ثریا کے کمرے کے بند دروازے پر شہناز اکیلی کھڑی تھی۔ راجا ابھی کمرے سے نکلا تھا۔

مجھے دروازے کے نیچے سے ایک سرخ لکیر آگے بڑھتی دکھائی دی...... یہ خون تھا۔

شہناز کی صورت پر ہوائیاں اڑرہی تھیں اور کچھ کہنے کی کوشش میں اس کے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ مجھ سے پہلے راجا نے بھی کمرے کا دروازہ کھولنا چاہا لیکن دروازہ اندر سے بند تھا۔

شہناز نے دروازے پر ہاتھ مارا اور چلا کے کہا۔ ''ثریا! دروازہ کھولو۔''

ثریا کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ خون کی لکیر اتنی دیر میں کچھ اور آگے بڑھ گئی۔ یہ تازہ خون تھا جسے دل بڑی یکسانیت کے ساتھ شریانوں میں رواں رکھتا ہے تو زندگی رواں رہتی ہے۔ یہ جسم سے نکل کے فرشِ خاک پر بہنے لگے تو آدمی ایک مشتِ خاک ہوجاتا ہے۔

راجا نے فلمی اسٹائل میں شانے سے ٹکر مار کے دروازے کو کھولنے کی واجبی سی کوشش کی۔ یہ پرانی شیشم کی لکڑی کے ٹھوس دروازے یوں ٹوٹنے والے نہ تھے۔ میں کسی کو کچھ لانے کا حکم دیتا تو تعمیل ہونے تک مزید وقت ضائع ہوتا۔ اسٹور یہاں سے چند قدم دور تھا اور مجھے معلوم تھا کہ وہاں فالتو کاٹھ کباڑ کے علاوہ ہر قسم کے اوزار آلات بھی پڑے رہتے ہیں۔

لائٹ جلا کے ایک نظر دیکھتے ہی مجھے ایک گیتی نظر آئی۔ پھر ایک خاصا بڑا ہتھوڑا مل گیا جو شاید پتھر توڑنے اور سریے کاٹنے میں کام آتا ہوگا۔ میں اسے اٹھا کے دوڑا۔ یہ مشکل سے تین چار منٹ کا وقفہ ہوگا لیکن اتنی دیر میں دروازے کے باہر بدحواس خواتین نے وحشت زدہ ہوکے رونا شروع کردیا تھا۔ ان کی دستک اور چیخ پکار کا اندر سے کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔

ہتھوڑے کی پہلی ضرب نے گول چمکیلے تالے کو ہلادیا۔ دوسری ضرب نے اس کی چوکھٹ کے ساتھ گرفت کو ختم کردیا۔ دروازہ کھلا تو سب سے آگے میں اور میرے پیچھے راجا اندر پہنچا۔ میری نظر نے ثریا کو بیڈ پر نہیں بلکہ دروازے سے چندفٹ کے فاصلے پر لیٹا ہوا دیکھا۔ وہ بالکل ساکت اور سیدھی قالین پر پڑی تھی اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔ ثریا کا ایک ہاتھ کلائی پر سے کٹا ہوا تھا جہاں سے خون مسلسل بہہ رہا تھا۔ یہ ہاتھ قالین پر ہوتا تو خون بہہ کر باہر تک نہ آتا۔ قالین میں ہی جذب ہوجاتا۔ باہر کسی کو بھی پتا نہ چلتا۔

نیچے بیٹھتے ہی میں نے سب سے پہلے ثریا کی کلائی کو دیکھا۔ اس میں میرے اپنے ہاتھ خون آلود ہوگئے۔ راجا نے ثریا کا دوپٹا پھاڑا اور کلائی پر مضبوطی سے باندھ دیا۔ اس وقت تک میں نے ثریا کے دل کی دھڑکن اور نبض کی رفتار دیکھ لی تھی۔

رابعہ اور لیلیٰ بھابی مسلسل روتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔ ''رفیق، کیا ثریا مرگئی۔ بتاؤ؟''

شہناز نے ایک ڈاکٹر کے حوصلے سے کام لیتے ہوئے ثریا کے پاس بیٹھ کر اس کی آنکھوں کو کھول کے دیکھا۔ پھر اسٹیتھسکوپ لگا کے دل کی دھڑکن شمار کی جو اس کی مستعد معاون ریشم بروقت لے آئی تھی۔

''اسے اوپر لٹاؤ۔'' شہناز نے راجا سے کہا اور اسٹیتھسکوپ دے کر ریشم سے بلڈ پریشر کی پیمائش کا آلہ لے لیا۔ لیلیٰ بھابی اور رابعہ کو یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ ثریا زندہ ہے۔ اب ان کا سوال بدل گیا تھا۔ وہ بار بار پوچھ رہی تھیں۔ ''کیا یہ زندہ رہے گی؟'' آنسو بہانے کا عمل ساتھ جاری تھا۔

شہناز نے ان کی طرف دیکھا۔ ''اللہ کا شکر ہے۔ وقت پر پتا چل گیا۔ کافی خون ضائع ہوگیا ہے لیکن یہ بچ جائے گی۔''

میں نے بھی اس اعلان کے ساتھ سکون اور اطمینان کی گہری سانس لی اور افسوس سے سرہلایا۔ ''پاگل لڑکی۔''

"اس نے ایسا کیوں کیا کزن؟" رابعہ نے اپنے آنسو پونچھے۔

اس سوال کا صحیح جواب دیا جا سکتا تھا لیکن میں نے ٹال دیا۔ "جب یہ ہوش میں آ جائے تو اسی سے پوچھنا۔ اب بہتر ہوگا کہ آپ شہناز کو کام کرنے دیں۔"

میری بات مکمل ہونے سے پہلے احمد حسن اندر آ گیا۔ "یہ کیا ہے...... کیا ہوا ہے ثریا کو؟"

جواب رابعہ نے دیا۔ "اس نے خودکشی کی کوشش میں اپنی کلائی کاٹ لی۔"

احمد حسن کا رنگ فق ہو گیا۔ "کلائی کاٹ لی......"

میں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔ "شی ول بی او کے۔"

اس نے جیسے میری بات ہی نہیں سنی۔ وہ قریب جا کے ثریا پر جھک گیا۔ "کافی خون بہہ گیا ہے؟"

شہناز نے اس کی طرف دیکھے بغیر اپنا کام جاری رکھا۔ "ہاں لیکن کوئی خطرہ نہیں۔ تم بھی دیکھ لو۔"

احمد حسن نے یہ سوال نہیں کیا کہ ثریا نے یہ بے وقوفی کیوں کی۔ میری طرح وہ بھی اس سوال کا جواب جانتا تھا اور جواب میں اس کے چہرے پر اعتراف جرم کی طرح پڑھ سکتا تھا۔ وہ سینے پر ہاتھ باندھ کے سیدھا کھڑا ہو گیا اور پلک جھپکائے بغیر ثریا کو دیکھتا رہا۔

ریشم امید سے تھی۔ رابعہ نے غلطی کی اور اس سے کہہ دیا کہ وہ فرش صاف کر دے ورنہ خون جم جائے گا۔ یہ انتہائی ناخوشگوار فریضہ تھا لیکن ریشم نے انکار نہیں کیا۔ وہ ایک بالٹی میں تھوڑا سا پانی لائی اور فرش کو گیلے کپڑے سے رگڑنے لگی۔ اچانک اس نے ابکائی لی اور وہیں فرش پر گر گئی۔

شہناز نے ناراضی سے کہا۔ "اوہ۔ اسے کہاں لگا دیا اس کام پر۔"

رابعہ نے کہا۔ "مجھے کیا معلوم تھا یہ اتنی نازک مزاج ہے۔"

"یہ نازک مزاجی کی بات نہیں رابعہ۔ بہت سے لوگ نہ خون دیکھ سکتے ہیں نہ اس کی مہک برداشت کر سکتے ہیں۔ یہ Surgical شاک ہوتا ہے۔ اس کی حالت تو ویسے ہی ٹھیک نہیں۔"

یہ نئی ایمرجنسی زیادہ سیریس نہیں تھی۔ ریشم کو کھینچ کے کچھ فاصلے پر سیدھا لٹا دیا گیا۔ احمد حسن نے بھی کہا کہ اسے کسی دوا کی ضرورت نہیں۔ کچھ دیر میں اسے خود ہی ہوش آ جائے گا۔ ثریا کی دیکھ بھال کے لیے شہناز کافی تھی۔ ریشم کے پاس لیلیٰ بھابی بیٹھ گئیں۔ ہم چار افراد کمرے میں غیر ضروری تھے۔ راجا اور احمد حسن خود ہی میرے ساتھ باہر نکل آئے۔ رابعہ کو میں نے نکالا اور زبردستی سونے کے لیے بھیج دیا۔ راجا میں اور احمد حسن کچھ دیر کوریڈور میں کھڑے رہے۔ اگرچہ شہناز نے سب کو یقین دلا دیا تھا کہ فکر یا پریشانی کی کوئی بات نہیں لیکن نیند سب کی اڑ گئی تھی۔ راجا نے رضاکارانہ طور پر کچن سے کافی بنا کے لانے کا ارادہ ظاہر کیا۔

احمد حسن آہستہ آہستہ میرے ساتھ چلنے لگا۔ "رفیق صاحب! میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔"

میں نے دوستانہ انداز میں اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "ایسی جلدی کیا ہے آخر۔"

وہ میرے لہجے سے چونکا۔ "آپ کو معلوم ہے......"

"مجھے اندازہ ہے۔ کسی احساس جرم میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں احمد حسن۔ تم نے کچھ نہیں کیا۔" میں برآمدے کی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

وہ میرے سامنے بیٹھ گیا۔ "لیکن یہ میری وجہ سے ہوا ہے۔"

"میں ایسا نہیں سمجھتا۔ یہ ثریا کی بے وقوفی ہے اور کچھ نہیں۔ میں اسے سمجھا لوں گا۔"

"میں نے بھی اسے بہت سمجھایا تھا مگر وہ سمجھتی ہی نہیں۔ میں آپ کو بتانے والا تھا۔"

میں نے کہا۔ "بتانے والی کون سی بات تھی۔ ہم سب دیکھ رہے تھے۔"

وہ اپنی صفائی پیش کرنے لگا۔ "یقین کیجیے میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی جس سے غلط فہمی پیدا ہو۔"

"جذبات کے کھیل میں یہ بھی ہوتا ہے۔ سارا کھیل یک طرفہ ہو جاتا ہے۔ کبھی مرد کی طرف سے کبھی عورت کی طرف سے۔ لڑکیاں زیادہ جذباتی ہوتی ہیں۔ تم بے وقوفی کہہ لو۔ مرد بعض اوقات زبردستی کرتے ہیں لیکن زندگی کی گاڑی ایک پہیے پر نہیں چل سکتی۔"

"پھر آپ اسے سمجھایئے۔"

میں نے کہا۔ "میں پوری کوشش کروں گا اور امید ہے وہ سمجھ جائے گی۔ دراصل وہ بھی ایک فریب خوردہ مظلوم لڑکی ہے۔ پرانے زخم ابھی مندمل نہیں ہوئے۔ نئے زخم کہاں برداشت کر سکتی ہے۔"

"مجھے ڈر ہے وہ دوبارہ یہ حرکت نہ کرے۔"

"ایسا عام طور پر نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ تو ماہرین نفسیات ہی بتا سکتے ہیں۔ کوئی ایک بار اپنی جان لینے کی کوشش میں ناکام ہو جائے تو دوسری کوشش نہیں کرتا۔ شاید اپنی بے وقوفی کا احساس ہو جاتا ہے۔ سمجھ میں آ جاتی ہے کہ زندگی بڑی نعمت اور قابل قدر چیز ہے۔ ایک بار گنوا کے کتنا بڑا نقصان

ہو جاتا۔ جس کی تلافی بھی ممکن نہ تھی۔"

"خدا کرے وہ سمجھ جائے ورنہ۔"

"ورنہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

"میں چلا جاؤں گا یہاں سے۔ حالانکہ مجھے بہت افسوس ہوگا۔"

میں نے کہا۔ "تم ایسا کچھ نہیں کرو گے۔ ہم سب یہاں رہیں گے۔ یہ زندگی کے مسائل بھی ہمارے اپنے ہیں۔ حل ہو جائیں گے۔"

ثریا کی ایمرجنسی دو دن برقرار رہی۔ اس کی دیکھ بھال پوری طرح شہناز نے کی۔ وہ اسپتال جاتی تھی تو ریشم کو ہدایات دے کر اس کے پاس چھوڑ جاتی تھی۔ باقی وقت ہم سب چکر لگا کے اس کا حال پوچھتے رہتے تھے۔ خون بہنے سے اس کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ وہ بے حد کمزور ہو گئی تھی۔ ہوش میں آنے کے بعد وہ روتی رہی۔ اس کی دلجوئی سب نے کی۔ سب سے زیادہ اسے لیلیٰ بھابی نے سمجھایا۔ اسے اپنی حرکت پر دکھ سے زیادہ شرمندگی تھی۔ وہ شہناز سے پوچھتی رہی کہ رفیق بھائی تو مجھ سے بہت خفا ہوں گے۔ دوسرے دن اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور رونے لگی۔

"رفیق بھائی۔ مجھے معاف کر دیں۔ مجھے معلوم ہے آپ سخت ناراض ہیں۔"

میں نے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ "یہ ناراضی کی بات نہیں ہے ثریا۔ افسوس کی بات ہے۔ خدانخواستہ تمہیں کچھ ہو جاتا تو۔"

"اچھا تھا۔ آپ کی جان بھی چھوٹ جاتی۔"

میں نے کہا۔ "ایسی بے وقوفی کی بات کرو گی تو میں واقعی ناراض ہو جاؤں گا۔ تم یہاں آ گئی ہو تو پھر ہم سب کی طرح اس خاندان میں شامل ہو اور ہمیشہ رہو گی۔ ہم سب تمہیں خوش دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"خوشی کیا مانگنے سے مل جاتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "کوشش کرنے سے ضرور مل جاتی ہے۔ چلو اب تم آرام کرو۔"

فوری طور پر مجھے اس مسئلے کا حل نظر نہیں آ رہا تھا۔ دل کے معاملے میں کسی کو دماغ کی بات سمجھانا ناممکن ہو جاتا ہے۔ چند دن پہلے میں نے جو سین دیکھا تھا اب پوری طرح میری سمجھ میں آ رہا تھا۔ اخلاق اور شائستگی سے کام لیتے ہوئے احمد حسن نے ثریا کو ٹالنے کی اور یہ سمجھانے کی پوری کوشش کی تھی کہ محبت کرنا اس کے اختیار کی بات نہیں لیکن ثریا نے شاید یہ سمجھ لیا تھا کہ مرد کے دل کا قلعہ کتنا ہی مضبوط کیوں نہ ہو عورت اگر ہمت نہ ہارے تو اسے بالآخر تسخیر کر ہی لیتی ہے۔

اے بس آرزو کہ خاک شدہ۔ ثریا کی امیدوں کا محل زمیں بوس ہو گیا جب احمد حسن نے تنگ آ کے اخلاق اور مروت کو بالائے طاق رکھا اور سخت حوصلہ شکن اور دوٹوک الفاظ میں اسے بتا دیا کہ وہ محض اپنا وقت ضائع کر رہی ہے۔ وہ اسے سخت ناپسند کرتا ہے اور اگر دنیا میں وہ آخری لڑکی ہو تب بھی اس سے شادی کرنے پر خودکشی کو ترجیح دے گا۔ یہ الفاظ وہی ہیں جو احمد حسن نے استعمال کیے تھے اور مجھے بعد میں بتائے۔ اس کے بعد میں نے اتفاق سے دروازہ کھول کے جھانکا تو احمد حسن سخت طیش میں تھا اور ثریا رو رہی تھی۔

ثریا نے سخت ذلت و رسوائی محسوس کی اور اپنی شکست کو احمد حسن کے لیے سزا بنا دیا کہ تم خودکشی مت کرو۔ میں کر لیتی ہوں۔ بظاہر طوفان آ کے گزر گیا تھا اور پیچھے تباہی کے آثار چھوڑ گیا تھا۔ اس کے بعد کیا ہوگا؟ ثریا اور احمد حسن کے تعلقات کی نوعیت کیا ہوگی۔ احمد حسن تو شاید معاف کر دے اور بھول جائے لیکن کیا ثریا اپنے جذباتی رشتے ختم کر کے دوبارہ اس کے ساتھ ویسے ہی رہ سکے گی جیسے رابعہ رہتی ہے۔ وہ اپنے دل سے اس کی محبت ختم ہونے کے بعد پیدا ہونے والی نفرت پر کیسے قابو پائے گی۔ مجھے دونوں کام ایک جیسے مشکل لگتے تھے۔ نہ میں احمد حسن کو قائل یا مجبور کر سکتا تھا کہ وہ ثریا کو پسند کرے اور نہ ثریا پر اختیار رکھتا تھا کہ اسے کہیں اور دل لگانے کا مشورہ دوں۔ وہ پہلے ہی ایک نفسیاتی شاک میں تھی۔ وہ اپنی دھوکے سے ہونے والی شادی اور طلاق کو اپنی زندگی سے یوں کاٹ کے الگ کرنا چاہتی تھی جیسے سرجن کسی ناسور زدہ عضو کو کاٹ کے جسم سے الگ کر دیتا ہے۔ اس حد تک کہ وہ اپنے بیٹے سے بھی جان چھڑانے کا فیصلہ کر چکی تھی جو اس کی شادی شدہ زندگی کی نشانی تھا۔ وہ پھر ایک کنواری لڑکی بن کے نئی زندگی کو ایک بار پھر اسی مقام سے شروع کرنا چاہتی تھی جہاں شہزاد نے اسے ورغلایا تھا مگر زندگی کے گزرے لمحے کون اپنی یادوں سے نکال سکتا ہے۔

اس مسئلے پر سوچنا لاحاصل تھا۔ میں بھی اس نتیجے پر پہنچا کہ جو ہونا ہے ہو جائے گا۔ احمد حسن کو ہم کسی قیمت پر جانے نہیں دیں گے۔ ثریا اپنی مرضی کی مالک اور مختار ہے۔ وہ خود آئی تھی اور اب جانے کا فیصلہ کر لے گی تو وہ عاقل و بالغ ہے۔ ہم اسے ضرور سمجھائیں گے لیکن زبردستی روکنے کا کوئی سوال نہیں۔

میرے تین دن سخت بھاگ دوڑ اور مصروفیت میں گزر گئے۔ لاہور سے ڈاکٹر مہدی حسن اپنی نگرانی میں تمام

اسباب کو احتیاط سے پیک کرا کے روانہ کر رہے تھے اور دن کے مختلف اوقات میں یہ سامان ٹرکوں پر ست بدھائی پہنچنا تھا تو اسے اتنی ہی احتیاط سے اتروانے اور رکھوانے کا کام کسی اور پر نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ اندازہ یہ تھا کہ اس ایکوپمنٹ میں سے کچھ ہمارے اسپتال کی موجودہ عمارت میں لگ جائے گا لیکن باقی کے لیے اضافی تعمیر ضروری ہوگی۔ غنی نے کم سے کم وقت میں یہ کام کرنے کی ذمے داری قبول کر لی تھی اور میں دیکھ رہا تھا کہ وہ دن رات بھاگا پھر رہا ہے۔

ایک کامیاب آپریشن کے بعد شامی بادشاہ تیزی سے صحت یابی کی جانب بڑھ رہا تھا۔ ڈاکٹر مہدی حسن کے گھر میں اس کی دیکھ بھال اور تیمارداری کے سارے فرائض ان کی بیٹی ٹینا نے سنبھال لیے تھے۔ وہ خوش بھی تھے اور متفکر بھی کہ ٹینا کا مجھے دیکھ کر اپنے نفسیاتی مرض کے چنگل سے نکل آنا کسی معجزے سے کم نہ تھا لیکن وہ جانتے تھے کہ یہ معجزوں کا زمانہ نہیں۔ یہ عقل و نظر کا ایک فریب تھا جس نے ٹینا کو خوش فہمی کا شاک دیا تھا۔ جیسے کوئی بے خوابی کا مریض انجکشن سے پرسکون ہو کے سو جائے۔ انجکشن کا اثر ختم ہوگا تو کیا ہوگا۔ یہی خیال ڈاکٹر مہدی حسن کو پریشان کرتا تھا۔ اگر ٹینا پر حقیقت کھل گئی کہ میں وحید نہیں تو وہ واپس اپنے ڈیپریشن کی قید میں چلی جائے گی۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے لیکن ایسا نہ ہونے دینا کس کے اختیار میں تھا؟ کسی دن وہ اچانک ست بدھائی آ جائے۔ اپنے باپ سے اور بھائی سے ملنے اور اپنے وحید کو یعنی مجھے دیکھ لے۔ یا لاہور میں کہیں اس کا میرا آمنا سامنا ہو جائے تو اسے پتا چلے کہ وہ سب جھوٹ تھا۔ نہ میں وحید ہوں اور نہ لندن گیا ہوں۔ اس کا علاج صرف ایک تھا کہ وحید کو لندن سے لایا جائے۔ یہ بھی کسی کے اختیار میں نہ تھا۔ ابھی تو کسی کو معلوم ہی نہ تھا کہ وحید آخر کہاں ہے اور معلوم ہو جائے تو کیا وہ ٹینا کے لیے اس حد تک جائے گا کہ یہاں آ جائے۔ اب تک کیا پتا اس کی شادی ہو چکی ہو۔ اس کے بچے ہوں۔

راجا اور میں شام کے وقت لان پر آلتی پالتی مارے انہی معاملات پر گفتگو کر رہے تھے کہ ڈاکٹر مہدی حسن کی گاڑی اندر آ گئی۔ انہوں نے ہمیں دیکھا اور سیدھے ہماری طرف آ گئے۔ وہ کچھ تھکے ہوئے تھے لیکن اس سے زیادہ پریشان نظر آتے تھے مگر کوشش کر رہے تھے کہ ان کی پریشانی ہم پر ظاہر نہ ہو۔

''بھئی پہلے چائے۔'' انہوں نے ایک کرسی پر گر کے کہا۔

''کیوں نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''کیسے حالات ہیں وہاں۔ جہاں سے آپ آئے ہیں؟''

انہوں نے سفید بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ ''ٹھیک ہیں ا کا شکر ہے اسپتال کا ساز و سامان میں نے سب پیک کرا تھا۔ کافی تو پہنچ گیا ہے باقی بھی آ جائے گا کل تک۔ تمہ دوست ریکور کر رہا ہے۔''

''اور ٹینا.....''

''وہ بھی ٹھیک ہے۔ اسے دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ بھی لگتا ہے جیسے وہ بڑی مہارت اور کامیابی سے کسی ہوئے رسے پر چل رہی ہے۔ نہ جانے کب توازن بگڑ تو......'' وہ اچانک چپ ہو گئے۔

ایک خادمہ نے درمیان کی میز پر چائے رکھی ا خاموشی سے لوٹ گئی۔ ریشم کو گھر کے کاموں سے کچھ ریلیف دینے کے لیے چند نئی خادمائیں رکھی گئی تھیں جو سب کی س حویلی میں کام کرنے والے مردوں کی بیوی بیٹی یا بہن تھیں ابھی مجھے سب کے نام بھی معلوم نہ تھے۔ انہیں حویلی میں ک کے آداب خود ریشم سکھا رہی تھی۔

میں نے نوٹ کیا کہ ڈاکٹر مہدی حسن کی خاموشی م کوئی راز پنہاں ہے۔ چائے پیتے ہوئے وہ کچھ سوچ ر تھے۔ ''آپ کچھ اپ سیٹ ہیں ڈاکٹر صاحب؟''

وہ چونکے۔ ''اپ سیٹ...... نہیں۔''

''کوئی خاص بات ہے؟''

انہوں نے چائے کا کپ رکھ دیا۔ ''خاص با تو ہے..... اور سچ پوچھو تو اسی لیے مجھے آنا پڑا۔ مجھے معلوم ہوا کہ یہ جو لڑکی ہے ثریا۔ اس نے اپنی جان لینے کی کوشش کی تھی۔''

''جی...... عجیب حرکت کی اس نے۔''

''مجھے احمد نے بتایا تو دکھ ہوا۔ میں نے اکثر د ہے اسے کہ بڑے انہماک اور جذبے کے ساتھ اس کی ا کرتی ہے، اسپتال میں۔ اتنی پیاری لڑکی ہے۔ بدقسمتی۔ اس کی شادی کا تجربہ ناکام رہا۔ احمد حسن سے کل را دوبارہ بات کی تھی میں نے۔ میں تو کب سے سوچ رہا کہ احمد کو اب شادی کر لینی چاہیے۔ مائیں پیچھے پڑ بیٹوں کو مجبور کر دیتی ہیں۔ میری بات کو وہ ٹال جاتا تھا۔ تھا کہ اپنے ساتھ کسی اور کی زندگی کیوں خراب کروں۔ نے کوشش چھوڑ دی تھی۔''

میں نے انہیں غور سے دیکھا۔ ''کیا اب وہ تیار ہے؟''

انہوں نے اقرار میں سر ہلا دیا۔ ''یس...... میں اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ اچھا برا وقت زندگی میں آ ہے۔ ٹینا کے ساتھ جو ہوا ایک حادثہ تھا۔ ہو سکتا ہے کبھی

اس کے اثر سے نکل آئے۔ یہ لڑکی ثریا ہر لحاظ سے مجھے پسند تھی۔ صورت سیرت، عادات و اطوار۔ ایک آدمی کو اور کیا چاہیے۔ اسے سہارے کی ضرورت بھی ہے اور میں نے احمد کے ساتھ اس کی کچھ جذباتی وابستگی بھی دیکھی ہے۔ ممکن ہے میرا وہم ہو۔''

میں نے لپک کر کہا۔ ''یہ ہرگز آپ کا وہم نہیں۔''

''احمد حسن نے کہا کہ میری تو ہمت نہیں پڑتی۔ آپ بات کریں۔''

میں نے کہا۔ ''اگر احمد حسن آپ کی بات نہیں ٹال سکتا تو ثریا مجھے انکار نہیں کر سکتی اور جب میاں بیوی راضی۔''

انہوں نے تردید میں سر ہلایا۔ ''نہیں رفیق میاں تم غلط سمجھے۔ وہ ثریا سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔''

میں نے حیرانی سے کہا۔ ''پھر؟ وہ کس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہے۔ ''رابعہ سے۔''

مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے کان کے قریب پستول رکھ کے فائر کر دیا ہو۔ مجھے سنبھلنے میں چند سیکنڈ لگے۔ ''رابعہ سے؟''

''یہی مسئلہ تھا جس کے لیے خود مجھے آنا پڑا۔ میں رات بھر سوچتا رہا کہ بات کروں یا نہ کروں۔''

میں نے کہا۔ ''کیا اس نے یہ بات...... رابعہ کی رضامندی سے کی ہے؟ اس نے آپ کو کچھ بتایا؟''

انہوں نے پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ ''اس نے صرف اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا اور میں بڑی مشکل میں پڑ گیا۔ ظاہر ہے پہلے میں نے اسے ہی سمجھایا کہ مجھے یہ کسی صورت قابل عمل نہیں لگتا۔ خصوصاً ان حالات میں کہ رابعہ کی اس شادی میں کوئی دلچسپی نہیں۔ میں نے اسے بہت کریدا کہ آخر یہ خیال اسے کیوں آیا اور اس نے کیسے فرض کر لیا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔''

''پھر اس نے کیا کہا؟''

''کچھ نہیں۔ کہنے لگا کہ لوگ بالکل انجانے ہوتے ہیں نہ لڑکے نے لڑکی کو دیکھا ہوتا ہے نہ لڑکی شادی سے پہلے لڑکے کی صورت دیکھتی ہے۔ پھر بھی رشتے ہوتے ہیں اور شادیاں کامیاب ہوتی ہیں۔ خود آپ کی شادی بھی ایسے ہی ہوئی تھی۔ یہاں اتنی خراب صورت حال بھی نہیں۔ میں نے اسے دیکھا ہے۔ اس نے مجھے۔ ہم ایک دوسرے کو سمجھتے ضرور ہیں۔ محبت ہونا کیا ضروری ہے شادی سے پہلے۔ بعد میں نہیں ہو سکتی؟''

''بات اس کی سو فیصد درست ہے۔''

انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ''لیکن ایسا ہو نہیں سکتا۔ یہ مجھے بھی معلوم تھا۔ پھر بھی بیٹے کی وجہ سے میں نے ہمت کی۔ آئی ایم سوری۔''

میں نے کہا۔ ''کمال کرتے ہیں آپ بھی۔ سوری کہہ کے مجھے شرمندہ نہ کریں۔ آپ نے کون سی غلطی کی ہے لیکن مجھے بتائیے کہ میری جگہ آپ ہوتے اس سچویشن میں تو کیا کرتے؟''

''میں رابعہ سے بات کر کے دیکھتا۔''

''رائٹ...... یہی میں بھی کروں گا اور اس کا فیصلہ آپ کو بتا دوں گا۔'' میں نے زور دیتے ہوئے کہا۔

''جیسے آپ نے اپنے بیٹے کو سمجھایا۔ ایسے ہی میں بھی اپنی بہن کو صرف سمجھا سکتا ہوں۔ باپ تو بعض اوقات حکم چلاتے ہیں۔ زبردستی بھی کر جاتے ہیں۔ میں ہرگز ایسا نہیں کروں گا۔ وہ خود عاقل بالغ اور سمجھدار ہے۔ ایک دم تو فیصلہ نہیں کرے گی۔ اگر پہلے سے اس کے دل میں کچھ نہیں ہے تو وہ سوچنے کے لیے وقت لے گی۔ لینا بھی چاہیے۔ زندگی کے ایسے فیصلے آسان نہیں ہوتے۔ بدقسمتی سے رابعہ کے ساتھ دھوکے بہت ہوئے۔ سانپ کا کاٹا اگر رسی سے بھی ڈرنے لگے۔ تو دس از نیچرل۔''

''بالکل۔ مجھے کوئی جلدی نہیں اور نہ احمد نے ایسی کوئی بات کی ہے۔ وہ تو اتفاق سے خود میں نے یہ بات چھیڑی اور ثریا کا نام لیا تو اس نے کہا کہ اگر میں رابعہ کے لیے کہتا تو شاید وہ سوچتا کیونکہ اس مختصر سے عرصے میں جو اس نے یہاں گزارا وہ رابعہ سے امپریس ہوا ہے لیکن اور کچھ نہیں اگر نواب رفیق کو اعتراض نہ ہو اور وہ خود رابعہ کے سرپرست کی حیثیت سے فیصلہ کریں' اس کی رضامندی سے تو اچھا ہے ورنہ بات یہیں ختم کر دینا بہتر ہوگا۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولے۔

میں نے کہا۔ ''آپ اب آرام کریں۔ انشاء اللہ جو ہوگا اچھا ہی ہوگا۔''

وہ چند قدم چل کے پلٹے۔ ''رفیق میاں، ایک بات بتاؤ گے سچ سچ۔''

میں نے ہنس کے کہا۔ ''آپ سے میں جھوٹ کیوں بولوں گا۔''

''تم خود کو کسی دباؤ میں محسوس نہ کرنا۔ بعض اوقات معاملات اتنی تیزی سے آگے بڑھتے ہیں کہ غلط فہمی ہو جاتی ہے۔''

''غلط فہمی کیسی؟''

''تمہارے دل میں یہ خیال تو نہیں کہ یہ سب میری

پلاننگ ہے۔ میں اپنے بچوں کے مستقبل کی طرف سے فکرمند ہوں اس لیے...''

''ڈاکٹر صاحب میری عمر کا تجربہ آپ کے برابر نہیں لیکن اتنی عقل ضرور ہے میرے پاس کہ میں انسانوں کی نیت اور فطرت کو سمجھتا ہوں۔''

ان کے چہرے پر اطمینان کی مسکراہٹ آئی۔ ''تمہیں بھی خوشی ہوگی اگر ایسا ہی ہوا۔ جیسا میں چاہتا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''خوشی یقیناً ہوگی لیکن ہر خوشی پر اپنا اختیار نہیں ہوتا۔ مل جائے تو اچھا نہ ملے تو اس کی رضا۔''

وہ سر ہلا کے چلے گئے اور مجھے عجیب الجھن میں چھوڑ گئے۔ اگر میری رضامندی کی بات ہوتی تو میں ابھی ڈاکٹر صاحب کو ہاں کر دیتا لیکن میری پوزیشن کسی بڑے بھائی جیسی بھی نہیں تھی۔ رابعہ یہ سمجھتی تھی اور ایسا سمجھنے میں حق بجانب تھی کہ میری وجہ سے اس کی زندگی میں بدبختی آئی۔ ہر بار، بار بار۔ اگر میں کہوں کہ جو کچھ ہوا اس کا نصیب تھا اور نصیب پر میرا کیا اختیار تو یہ خود کو الزام سے بچانے کی بھونڈی کوشش ہوگی۔

سب سے پہلے یہ تمام جائداد اور جاگیر مجھے اس لیے ملی کہ میں لندن میں تھا ورنہ اس کا قانونی وارث میں نہ ہوتا۔ وہ دونوں بھائی ہوتے میرے والد اور اس کے والد۔ ان کے بعد آج وہ بھی نصف کی مالک ہوتی لیکن آج اس کی حیثیت کچھ بھی نہیں۔ اس کی ماں اس صدمے سے پاگل ہوگئی اور باپ اسے قتل کر کے پھانسی چڑھنے سے پہلے ہی مر گیا۔

رابعہ نے جو پہلی شادی کی اس کی اپنی پسند تھی لیکن اس سے محبت کرنے والے نے بہت بڑا دھوکا کیا تھا۔ اس نے مجھ سے اپنی بہن کا انتقام لینے کے لیے یہ سارا کھیل رچایا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ میں نے اس کی بہن کو بے آبرو کیا اور اس نے خودکشی کی تو میری وجہ سے وہ میری بہن کو شادی کے بعد ایسے موڑ پر چھوڑ گیا کہ رسوائی کے خوف سے وہ بھی خودکشی کر لے۔ رابعہ ہم سب کی کوشش سے زندہ رہی مگر الزام مجھ پر رہا کہ میرے کیے کی سزا اسے ملی۔ دوسری بار اسے زندگی کی طرف لوٹانے والا شہزاد میرا وکیل تھا۔ ایک زبردست ایکٹر اور پیشہ ور کھلاڑی لیکن ثریا کے نمودار ہونے سے پہلے اس کی اصلیت کا اندازہ کوئی نہیں کر سکا تھا۔ خود ثریا بھی نہیں۔ آج اس کا ذمے دار صرف مجھے نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔ لیکن بدقسمتی سے میں بڑا بھائی تھا۔ نواب رفیق تھا۔ بہت پڑھا لکھا اور جہاں دیدہ۔ عقلمند اور دور اندیش۔ میں کیسے دھوکا کھا گیا؟

ان حالات میں مجھے رابعہ سے ایک نئے رشتے کی بات کرنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ ابھی اس کے لیے وقت بھی مناسب نہ تھا۔ شہزاد کی بے وفائی کے زخم ہنوز مندمل نہ ہوئے تھے کہ درمیان میں کسی وجہ کے بغیر رانا صاحب کا سپوت کو[د] پڑا۔ میرے ساتھ دشمنی کے کھیل میں باپ بیٹے نے ہدف کسے بنایا؟ رابعہ کو۔ بے چاری رابعہ۔ وہ میری بہن بھی نہیں تھی مگر سمجھی جاتی تھی۔ اس کا یہ حق بھی پورا نہ تھا۔ اس کی ماں نے تو چاہا تھا کہ رابعہ شریک حیات بن کر مجھ پر اور میری جاگیر پر پورا اختیار حاصل کر لے لیکن فریال ایک ناقابل تسخیر پہاڑ کی طرح درمیان میں حائل تھی۔

اب میں یہ نئی بات چھیڑتا تو رابعہ ہاتھ جوڑتی کہ بس اور تماشا نہ بناؤ مجھے۔ میری زندگی مجھے اپنی مرضی سے جینے دو۔ اچھا برا جیسا ہے میرا نصیب تمہاری تجربہ گاہ نہیں۔ بیوی تو میں بن نہیں سکتی تھی۔ بہن بھی نہ بنی۔ دونوں کے حقوق سے تم نے مجھے محروم رکھا۔ اتفاق سے میں اور تم کزن ہیں کیونکہ ہم اپنی مرضی اور اختیار کے بغیر دو سگے بھائیوں کے گھر میں پیدا ہوگئے۔ اس رشتے کو یہیں تک محدود رہنے دو تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔

راجا نے مجھ سے اتفاق کیا کہ اس وقت رابعہ سے کوئی بات نہیں کی جا سکتی پہلے ثریا ٹھکرائے جانے کے جذباتی صدمے سے سنبھل جائے۔ اس کے بعد احمد حسن خود ہی رابعہ کی طرف ملتفت ہو اور اس کے ردعمل کو دیکھے۔ اگر کوئی شدید قسم کا منفی ردعمل سامنے نہیں آتا تو پھر امید کے ساتھ لیکن محتاط رہتے ہوئے آہستہ آہستہ پیش رفت کرے۔ ساتھ رہ کے اور ہم سب کی خاموش حمایت سے یہ کام مشکل ضرور ہو گا مگر ناممکن نہیں۔

سونے سے پہلے میں ثریا کو دیکھنے گیا۔ وہ تکیے کے سہارے نیم دراز ٹی وی پر کوئی فلم دیکھ رہی تھی اور جسمانی طور پر اس کی حالت میں بہتری نظر آ رہی تھی۔ اس کے گالوں کا رنگ پہلے جیسا دمکتا ہوا سرخ نہیں رہا تھا لیکن خون کی کمی سے چہرے پر آ جانے والی سفیدی نے اس کی دلکشی میں اضافہ کر دیا تھا۔ اس کی سیاہ آنکھیں پہلے سے زیادہ سیاہ اور بڑی بڑی لگتی تھیں۔ مجھے دیکھ کے وہ کچھ شرمندگی سے مسکرائی اور ٹی وی بند کر دیا۔

میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ ''کیسی ہو ثریا؟'' میں نے آہستہ سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

اس نے نظریں جھکا لیں۔ ''جی...... زندہ ہوں۔ آپ سب کی کوشش سے۔''

میں نے کہا۔ ''گویا اپنی خواہش کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ اب بھی تم مرنا ہی چاہتی ہو اور جیسے ہی موقع ملا پھر کوشش کرو گی؟''

وہ چپ رہی۔ ''ایسے جینے کی تمنا کرنے سے بھی کیا حاصل بھائی جان۔''

''کیوں؟ اتنی بری بھی نہیں ہے یہ زندگی۔ ان عورتوں کی زندگی دیکھی ہے جو اسپتال میں لائی جاتی ہیں؟ جو صدیوں سے انہی کچے تنگ و تاریک گھروں میں پیدا ہو رہی ہیں اور مر رہی ہیں کتنی مظلوم اور کمزور ہیں۔ رات دن ظلم کی چکی میں پس رہی ہیں۔ جن کی نہ عزت آبرو ہے نہ کوئی حیثیت۔ جو بیچ دی جاتی ہیں یا مار دی جاتی ہیں۔ اپنے سے تین چار گنا عمر کے مرد کے ہاتھ فروخت ہو جاتی ہیں۔ کیا ہے ان کے پاس؟ نہ پہننے کو ملتا ہے نہ کھانے کو۔ نہ عورت ہونے کا غرور۔ نہ ماں یا بہن ہونے پر فخر۔ اس کے باوجود وہ زندہ ہیں۔''

اس نے سر جھکا لیا۔ ''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

''میرے کہے بغیر تم خود سوچو کہ خدا تم پر کتنا مہربان ہے۔ صرف شکل صورت کو نہیں اپنی حالت کو بھی دیکھو۔ تم آج کہاں ہو۔ کیا یہ ناممکن تھا کہ جب شہزاد کی بے وفائی کے بعد تم نے گھر سے قدم نکالا، تو تم غلط ہاتھوں میں پڑ جاتیں۔ بردہ فروش تمہیں لے جاتے۔ خدا نے ایک اور موقع دیا تمہیں ورنہ اس وقت تمہارا یہ جسم گل سڑ رہا ہوتا۔ زمین میں چھ فٹ نیچے تمہیں کیڑے کھا رہے ہوتے۔ تم پڑی ہوتیں تاریک اور سنسان قبرستان کے کسی گوشے میں۔''

وہ رونے لگی۔ ''مجھے پتا نہیں کیا ہو گیا تھا۔''

میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''ثریا۔ کیا عورت کے سامنے زندگی کا صرف ایک ہی مقصد ہونا چاہیے؟ شادی اور شادی ناکام ہو جائے تو اسے سمجھ لینا چاہیے کہ اب زندہ رہنے کا کوئی فائدہ نہیں؟''

وہ خاموش رہی اور زمین کو گھورتی رہی۔

''کیا تم سمجھتی ہو کہ تمہارے پاس ذہنی صلاحیت کوئی نہیں۔ چنانچہ نہ خواہش ہے نہ حوصلہ کہ تم کوئی بڑا کام کر سکو؟''

اس نے نظریں اٹھائیں۔ ''کیسا بڑا کام؟''

''بڑا کام صرف کسی پہاڑ کو تسخیر کرنا ہی نہیں ہوتا۔ ہر وہ کام بڑا ہے جو آپ کو تسکین دے۔ فخر دے۔ خوشی دے۔ تم دیکھو کہ ہم سب ایک مقصد کے لیے کام کر رہے ہیں۔ اپنا اپنا کام۔ وہ بھی تم جیسی ہی عورتیں ہیں جو حکومت کر رہی ہیں اور خلا میں پرواز کر رہی ہیں۔ شاید میں اپنا وقت ضائع کر رہا ہوں۔ تمہیں سمجھانا بے کار ہے۔ تم سب جانتی ہو۔'' میں اٹھا

اور دروازہ بند کر کے باہر نکل آیا۔

ثریا سے میں براہ راست یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس نے یہ انتہائی قدم احمد حسن کے ہاتھوں اپنی محبت کی تذلیل کے بعد اٹھایا تھا تو اس کی نوبت ہی کیوں آئی تھی۔ کیوں وہ اتنی دیوانی ہوگئی تھی کہ محبت کی ہتھکڑی اٹھائے احمد حسن کو گرفتار کرنے کے لیے اس کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔ یہ دیکھے بغیر کہ دنیا اس کی دیوانگی کا تماشا دیکھ رہی ہے اور اس پر ہنس رہی ہے۔ محبت تو وہ خوشبو ہے جو کسی سمت سے بھی آنے والے کو کھینچ لیتی ہے۔ مسحور کر لیتی ہے۔

احمد حسن شریف اور مہذب تھا۔ اس نے یقیناً پہلے ثریا کو ٹالا ہوگا۔ اپنے رویے سے سمجھانا چاہا ہوگا کہ وہ اس کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دے سکتا پھر شاید بے مروت ہو کے الفاظ میں یہی کہہ دیا ہو کہ وہ اس کا پیچھا چھوڑ دے۔ جب میں نے اتفاق سے دیکھ لیا کہ احمد حسن غصے میں ثریا کی سخت بے عزتی کر رہا ہے۔ شاید وہ آخری مرحلہ تھا جب احمد حسن کی قوتِ برداشت جواب دے گئی تھی۔ اس کے بعد ہی ثریا نے اپنی کلائی کاٹ کے خودکشی کی کوشش کی۔ تاہم میرے ذہن میں شک کا ایک کانٹا موجود تھا کہ اس کی یہ کوشش بھی سچ مچ اپنی جان لینے کے لیے نہیں تھی۔ یہ بھی احمد حسن کو متاثر کرنے اور اس پر دباؤ بڑھا کے اقرار محبت پر مجبور کرنے کی آخری کوشش تھی۔ ثریا کو ہم نے دروازے کے قریب پڑا پایا تھا جو ایک ناقابل فہم بات تھی۔ اسے مرنا تھا تو واش روم میں جاتی یا بیڈ پر لیٹ کے یہ کام کرتی۔ دروازے کے قریب لیٹ کر کلائی کاٹنے کا مقصد ہی یہ تھا کہ خون بہہ کر دروازے سے باہر جائے تو کوئی دیکھ لے۔ مرنے سے پہلے اسے بچا لیا جائے۔

اب ثریا سے یہ سب کہنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ احمد حسن پر اس ڈرامے کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ میری طرح دوسروں نے یہی محسوس کیا ہوگا کہ ثریا کو ذلت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا۔ دوبارہ وہ ایسی حماقت نہیں کرے گی لیکن ہم سب اسے مزید احساسِ ذلت دلاتے تو اس کا یہاں رہنا مشکل ہو جاتا۔ باہر جاکے جانے اس کے ساتھ کیا ہوتا۔ اس کے ذمے دار ہم ہوتے۔ حویلی میں وہ محفوظ تو تھی۔

نور مجھ سے خفا تھی۔ میں جانتا تھا کہ اس کی خفگی ایک ادائے دلربا کے سوا کچھ نہیں۔ ابھی تک میں نے یہی دیکھا تھا کہ نور کی محبت میں نہ کوئی شرط ہے نہ مطالبہ۔ اس نے ازخود اپنی کمزوری کا اعتراف بھی بارہا کیا ہے کہ اس کی محبت یک طرفہ ہے۔ اگر میں اسے نہ چاہوں تو نہ وہ شکایت کرے گی نہ مایوس ہوگی۔ میں اس سے شادی کروں یا کسی اور سے ۔ا[illegible] فرق نہیں پڑتا۔ یہ محض دکھاوا نہیں تھا۔ عملی طور پر وہ ایسی تھی۔ اسے میں چند روز اور فون نہ کرتا تو وہ اپنی ناراضی بھ[illegible] کے مجھے منانے لگتی۔ فرصت ملی تو میں نے سوچا کہ کیوں[illegible] آدابِ عاشقی کے تقاضے پورے کرتے ہوئے میں ہی ا[illegible] مناؤں اور اسے خوش ہونے کا موقع دوں۔ روٹھنا اس کا ہے تو منانا میرا فرض ہے۔

اس کی آواز پر میں نے کہا۔ ''کیسی ہو نور۔ اچھی ہو[illegible]

اس نے رکھائی سے جواب دیا۔ ''پتا نہیں۔''

میں ہنس پڑا۔ ''کیا پتا نہیں۔''

''یہی کہ اچھی ہوں یا بری۔ تمہاری نظر میں کیا ہ[illegible] کچھ نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے اندازہ تھا کہ تمہارا مزاج [illegible] ہوگا۔ چنانچہ ایک جذباتی پراثر تقریر دل پذیر عرض کرتا ہو[illegible] ایک استادِ محترم نے بڑی محنت سے لکھ کر دی تھی اور گزشتہ برسوں میں بیس بار کا تو ذاتی تجربہ ہے۔''

وہ ہنس پڑی۔ ''شرم تو نہیں آتی۔''

''نہیں۔ شرمانا لڑکیوں کا کام ہے۔ لڑکے بے[illegible] ہوتے ہیں۔ یہ طے ہے پہلے سے۔''

''تم بڑی پریشانی سے بچ گئے ہو فون کر کے۔''

''وہ کیسے۔ خدانخواستہ تم نے کچھ کھا کے سو جانے ٹھان لی تھی۔'' میں نے دردناک لہجے میں کہا۔

''میں نے طے کر لیا تھا کہ صبح اپنا سامان اٹھا کے [illegible] بدھائی پہنچ جاؤں۔ تم اچانک مجھے اپنے سامنے دیکھتے تو کیا ہوتا۔''

''میرے ہوش اڑ جاتے۔ دماغ کا فیوز اڑ جا[illegible] ہاتھوں کے طوطے اڑ جاتے۔ اور وہ طائر روح۔''

''بکومت۔ میں اڑ کے جا رہی ہوں۔ کب کہاں[illegible] اور کیوں مت پوچھنا کیونکہ تم میرے ساتھ جا رہے ہو۔[illegible] لندن کا ویزا لگ گیا ہے۔''

''ایک ویزے پر ہم دونوں جائیں گے۔ و[illegible] گڈ! ٹکٹ بھی ایک ہوگا۔ آخر ہم یک جان دو قالب ہیں۔''

''دیکھو۔ میں اکیلی نہیں جاؤں گی۔ ویزے کے [illegible] اپلائی کر لو فوراً۔ تمہیں دیر نہیں لگے گی۔''

''اوکے میڈم۔ جیسا آپ کا حکم۔ مجھے ویسے بھی لند[illegible] جانا تھا۔ اچانک مجھے پتا چلا ہے کہ وہاں میرا کوئی جڑوا[illegible] بھائی ہے۔''

''جڑواں بھائی۔ یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔''

''اس کا نام وحید ہے۔'' میں نے ہنستے ہو[illegible]

کہا۔ ''تم ڈاکٹر احمد حسن کو جانتی ہو نا۔''

''وہ لنگڑا جراح۔ آرتھوپیڈک سرجن۔''

''اس کی بہن ہے ٹینا۔'' میں نے کہا۔

''وہ پاگل...... ماہرِ امراضِ نسواں۔''

میں نے کہا۔ ''وری بیڈ نور۔ کسی کی معذوری پر اس قسم کے نام دینا بری بات ہے۔ کل کو خدانخواستہ کوئی معذوری مجھے لاحق ہو جائے یا تمہیں۔''

''آئی ایم سوری۔ میرا مقصد کسی کی تذلیل نہیں تھا۔''

''ویسے بھی ٹینا پاگل ہرگز نہیں ہے۔ وہ ایک قسم کے نفسیاتی شاک میں ہے۔ ایک شاک اس نے کسی طرح برداشت کر لیا تھا۔ یہ دوسرا اس کی زندگی پر کالی رات بن کے چھا گیا جو ختم ہی نہیں ہوتی۔''

''ذرا آسان عام فہم زبان میں فرمایئے۔''

''بھئی ہم نے شامی کو سرجری کے بعد ڈاکٹر مہدی حسن کے گھر شفٹ کر دیا۔ اس اسپتال کا تمام ساز و سامان اکھاڑ کے ست بدھائی شفٹ کرتا تھا۔ میں جب شامی کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کے گھر گیا تو ٹینا کو پہلی بار دیکھا۔''

''کیا وہ بہت خوبصورت ہے؟ مجھ سے بھی زیادہ۔''

''آخر تم عورتوں کو یہ فکر کیوں لاحق ہو جاتی ہے سب سے پہلے؟ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی تم سے بھی زیادہ خوبصورت ہو۔''

''کیوں نہیں ہو سکتا......''

''میرے لیے نہیں ہو سکتا۔ جان من حسن ہوتا ہے دیکھنے والے کی نظر میں اور میری نظر میں تم ہو تو دوسرا کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ بھی سب سے حسین تھی کسی کی نظر میں اور اس کا نام تھا وحید۔ اب یہ مجھے نہیں معلوم کہ آخر اس محبت کا انجام شادی پر کیوں نہیں ہوا۔ جیسا کہ ہماری فلمی کہانیوں میں ہوتا ہے اور زندگی میں ضروری سمجھا جاتا ہے۔''

''تمہارے نزدیک یہ غلط ہے؟''

''غلط صحیح کی بات نہیں۔ جسے ہم محبت سمجھتے ہیں، وہ لگن وہ تڑپ، بے قراری اور دیوانگی۔ ایک طلب ہوتی ہے۔ شادی کے بعد طلب نہیں رہتی تو وہ محبت بھی نہیں رہتی لیکن ایک اور زیادہ گہری پائیدار وقت کے ساتھ ساتھ بڑھنے والی محبت شروع ہوتی ہے۔''

''یہ عجیب فلسفہ ہے۔''

''یہ فی الحال آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا۔ ٹینا کی اس محبوب سے شادی نہیں ہوئی۔ معلوم نہیں کیوں ممکن ہے وہ محبت اور شادی کو الگ الگ رکھتا ہو یا کوئی اور بات ہو۔ ٹینا نے اس صدمے کو برداشت کر لیا لیکن اس کے دماغ پر اثر باقی رہا پھر علی ظفر نے اسے پسند کر لیا یا شاید خود ٹینا نے علی ظفر کو چانس دیا جو پہلے سے ٹینا کی محبت کا طلبگار ہوگا اور آس لگائے بیٹھا ہوگا۔ ڈاکٹر علی ظفر پاکستان آنے کے بعد بلاوجہ مارا گیا۔ میرا مطلب ہے بڑے غیر متوقع حادثے میں۔ اس کی ڈیوٹی شعبۂ حادثات میں تھی۔ وہاں ایسے ہی کیس آتے ہیں۔ روڈ ایکسیڈنٹ یا فائرنگ میں جاں بلب مریضوں کے۔ لواحقین ہنگامہ کرتے ہیں کہ ڈاکٹر سب کو چھوڑ کے ان کے مریض کو پہلے دیکھے۔ بعض اوقات یہ ناممکن ہوتا ہے۔ بعض اوقات ڈاکٹر جان بوجھ کے اپنا ٹائم اسے دیتے ہیں جس کے بچنے کا امکان ہو کہ وہ کوشش کریں تو کارآمد ہو۔ اس پر ہنگامہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر اسے نہیں دیکھ رہا ہے جس کی حالت زیادہ خراب ہے۔ ایسا ہی کوئی مریض دم توڑ گیا اور لواحقین مشتعل ہو گئے کہ ڈاکٹر کی عدم توجہی سے اس کی جان گئی۔ انہوں نے ڈاکٹر کو مارا اور کسی مہلک چوٹ کے باعث وہ مر گیا۔ یہ دوسرا شاک ٹینا کے لیے تباہ کن ثابت ہوا۔ تم یوں سمجھو کہ کوئی ماں جس کے دو بیٹے ہوں۔ ایک کی حادثاتی موت کا جذباتی صدمہ برداشت کر لے اور دوسرے کو زندگی کا سہارا بنا لے تو دوسرے کی موت سے کیا وہ ٹوٹ پھوٹ نہیں جائے گی؟ لوگ کہیں گے پاگل ہو گئی۔''

''اب مجھے واقعی اس سے ہمدردی محسوس ہوتی ہے۔''

''اب سنو میرے ساتھ کیا ہوا۔ جیسے ہی ٹینا نے مجھے دیکھا اسے یوں لگا جیسے میں وحید ہوں۔ اس حد تک مشابہت نظر آئی کہ اس کے دماغ نے اور دماغ سے زیادہ دل نے مجھے وحید مان لیا۔''

''ہائے ری میری قسمت۔ تمہاری ایک اور دعوے دار پیدا ہو گئی۔ اب میں کیا کروں؟''

میں نے کہا۔ ''تم وہی کرو جو میں کرنے جا رہا ہوں لیکن پہلے پوری بات سن لو۔ وحید کو یعنی مجھے دیکھ کر ٹینا پر وہی اثر ہوا جو کبھی کبھی ذہنی مریضوں پر الیکٹرک شاک کا ہوتا ہے۔ وہ ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ یکلخت جیسے وہ کسی حصار سے نکل آئی ہو جیسے وہ کسی طلسم کے زیر اثر پتھر کی ہو گئی تھی جو اچانک طلسم ٹوٹ گیا اور وہ پھر ٹینا بن گئی۔ وحید کی ٹینا۔ لیکن مشکل میرے لیے ہو گی کیونکہ میں وحید نہیں تھا۔''

وہ طنز سے ہنسی۔ ''پھر کیا ہوا۔ یعنی ایک سین وحید بن کے ٹینا کے ساتھ بھی کر لیا۔ محبت کے ڈرامے تو بہت کیے ہیں تم نے۔ ہیروئین کبھی عائشہ کبھی فریال تو کبھی میں۔ آج ٹینا آ گئی۔ کل کا کیا پتا......''

''آ گئی ہونا اپنے کمینے پن پر۔ پرابلم سمجھ نہیں رہی ہو۔ طعنے دینے شروع کر دیے ہیں۔''

''کیا میں نے کچھ غلط کہا؟''

''بکواس فرمائی آپ نے۔ میرے لیے جان چھڑانا مشکل ہو گیا تھا لیکن میں جھوٹ بول کر بہانے کر کے بھاگ لیا۔ اس کے باپ مہدی حسن کے اتنے احسانات ہیں مجھ پر۔ انہوں نے کہا کہ تمہاری وجہ سے یہ ممکن ہوا جو ناممکن تھا۔ تم نے انکار کیا کہ تم وحید نہیں ہو تو ٹینا کا حال پھر پہلے جیسا ہو جائے گا۔''

''گویا ڈراما کامیاب رہا تو چلے گا۔ پبلک پسند کر رہی ہے۔''

''نہیں۔ میں بہانہ کر کے ست بدھائی بھاگ آیا۔ ٹینا سے کہا کہ میں واپس لندن جا رہا ہوں۔ کچھ دن بعد ہمیشہ کے لیے واپس آ جاؤں گا۔ وہ بالکل ٹھیک ہے اور شامی کی دیکھ بھال کر رہی ہے لیکن میں شامی کو دیکھنے نہیں جا سکتا بلکہ ہر وقت ڈرتا رہتا ہوں کہ کہیں ٹینا یہاں نہ پہنچ جائے۔''

''بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ دیکھو حضور نواب صاحب اس کنیز کی طرف سے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اگر آپ یہ ڈبل رول کرتے رہیں۔ میرے لیے رفیق اور ٹینا کے لیے وحید کار خیر ہی ہے۔''

''فضول بات مت کرو۔ یہ ناممکن ہے۔''

''ٹینا تمہیں چھوڑے گی نہیں اور چھوڑنے والی میں بھی نہیں۔ چنانچہ کسی روز زبردست خون خرابہ ہوگا۔ میں کہوں گی کہ یہ رفیق ہے وہ کہے گی وحید ہے۔ تمہارا ہندوستان پاکستان بن جائے گا۔''

''میں نے وحید کا سراغ لگا لیا ہے۔''

وہ چونکی۔ ''کیا؟ وحید مل گیا ہے۔''

''سنتی تم ہو نہیں۔ اپنی کہے جاتی ہو۔ لندن میں ڈاکٹر شائستہ ہے تم جانتی ہو؟''

''ہاں۔ فریال کی سہیلی۔''

''اس نے کچھ اتا پتا دیا لیکن وہ تو عجیب بات کرتی ہے کہ چار پانچ سال پہلے یہ وحید صاحب کوئی زبردست ہپی تھے۔ لمبے لمبے بال۔ جھاڑ جھنکاڑ ڈاڑھی مونچھیں۔ آرٹسٹ ہیں اور انتہائی موڈی اور لاابالی۔ ممکن ہے ہر قسم کا نشہ بھی کرتے ہوں۔''

''مگر ٹینا نے تمہیں وحید کیسے سمجھ لیا۔ وہ واقعی پاگل ہے۔''

''ایک امکان یہ ہے کہ شائستہ نے اسے بہت عرصہ پہلے دیکھا تھا۔ شاید بالوں کا جنگل صاف ہونے کے بعد جو چہرہ نمودار ہوا ہو وہ مجھ سے اتنا مشابہ ہو جیسے کہ میرا جڑواں بھائی۔''

''پھر اب تم کیا کرو گے؟''

''پہلے میں اسے تلاش کروں گا لندن میں پکڑ کے یہاں لاؤں گا۔ اگر وہ شرافت سے قائل ہو جا تو ٹھیک ورنہ......''

''ورنہ کیا، اغوا کر کے لاؤ گے؟ فلمی طریقے سے''

''پھر کچھ سوچیں گے یار لیکن اصل بات تم نے پکڑی۔ اب مجھے بھی لندن جانا ہے۔ ظاہر ہے میں تمہا ساتھ کو ترجیح دوں گا۔''

''بڑی مہربانی ہے آپ کی اس ناچیز پر۔ ورنہ آ کے ساتھ جانے کا طے کر لیتے تو......''

''تو تم کیا کر لیتیں؟''

''ایک قتل اور کرتی۔'' اس نے ٹھنڈی ر لی۔ ''ٹینا کا اور مجھے مستقبل میں امکانات خاصے روشن آتے ہیں کہ ایسا ہی ہوگا۔ کیونکہ اس وحید نامراد کا ہا آنا اور ٹینا کو زوجیت میں قبول کرنا۔ آج یہ سب ناممکن تو انتہائی مشکل ہوگا۔''

''یہ تو میں بھی مانتا ہوں۔''

وہ بولتی گئی۔ ''دیکھو نا۔ اس نے پہلے شادی نہیں تو اب کیوں کرے گا۔ ٹینا کو قبول نہ کرنے کی کوئی وجہ تو ہو پھر یہ کہ اب تک وہ کنوارا پھر رہا ہو، اس کی کیا ضمانت ویسے بھی اسے کیا پڑی ہے کہ ولایت کا پرستان چھوڑ پاکستان آئے۔ تم آتے؟''

''میں...... ایمانداری کی بات تو یہ ہے کہ نو۔ مجھ پڑا ست بدھائی کا نواب بننے کے لیے۔ ہاں ٹینا جیسا ہوتا تو میں انسانی ہمدردی کی بنیاد پر غور کرتا اور خود نہ آ اسے لے جاتا۔ میرا جا کے اسے قائل کرنا ایک مشن ہے۔''

''یہ مشن امپاسبل ہے۔''

''یہاں بہت سے مشن امپاسبل ہیں میرے سا خود کو ہی لو۔ اللہ معاف کرے۔ قانون کی آنکھوں میں دھول جھونک کر تمہیں نور بنا دیا۔''

نور سے باتوں میں مجھے وقت کا احساس ہی نہیں اچانک اس کی آواز آنی بند ہو گئی تو مجھے پتا چلا کہ میر موبائل فون کی بیٹری خلاص ہو چکی ہے۔ ظاہر ہے اس بعد سونا ضروری تھا لیکن میں اتنا ریلیکس ہو چکا تھا کہ مجھے فوراً ہی آ گئی۔

اگلے روز فاروقی اپنی بیوی کو واپس لے جانے لیے پہنچ گیا۔ لیلیٰ بھابی اس بارے میں پہلے ہی بتا چکی چنانچہ یہ غیر متوقع نہیں تھا۔ میں اسپتال میں تھا جہاں

ے مطابق شہناز اپنے کمرے میں خواتین مریضوں کو دیکھ ی تھی۔ ریشم دروازے کے سامنے کرسی میز لگائے بڑے ب سے بیٹھی تھی اور اپنے سامنے سو ڈیڑھ سو مریض عورتوں وں کے ایک شور مچاتے بے ہنگم ہجوم کو بڑی کامیابی سے نٹرول کر رہی تھی۔ پہلے مریضوں کو باری سے اندر بھیجنے کے لیے قطار میں بٹھایا جاتا تھا اور اس کا خاص خیال رکھا جاتا تھا لہ بدنظمی اور دھاندلی نہ ہو۔ بیشتر خواتین باری کے اصول کو ب کے لیے اچھا سمجھتی تھیں لیکن ہر روز جھگڑے بھی ہوتے تھے۔ کچھ محض عمر کی بنا پر ترجیح مانگتی تھیں کچھ معمولی بیماری پر ایسا رامار چاتی تھیں جیسے دیر کی صورت میں ان کا دوا ملنے سے پہلے عالم بالا کو سدھار جانا یقینی ہے اور ان کی موت کا سبب رف باری کا اصول ہوگا جس کی ذمے دار سنگدل ریشم ہے ر میدان حشر میں وہ اس کا گریبان پکڑیں گی۔

ریشم نے سب سے نمٹنا سیکھ لیا تھا۔ حقیقی طور پر شدید یل کو اور بہت عمر رسیدہ کو وہ پہلے ہی بھیج دیتی تھی تاہم اس حالے میں آخری فیصلہ ڈاکٹر ریشم کا ہوتا تھا جس کے خلاف ہیں اپیل نہ تھی۔ بعد میں جب مریضوں کی تعداد اتنی بڑھ ئی کہ قطار کے آخری سرے کو نظر میں رکھنا ممکن نہ رہا تو ریشم نے گتے کے ٹکڑوں والے نمبر بنائے۔ ان چوکور ٹکڑوں پر گول ہمی اور ریشم کے دستخط تھے۔ جو مریض نمبر لیتا تھا اندر آرام سے آلتی پالتی مار کے مریضوں کے ہجوم میں بیٹھ جاتا تھا۔ شم کے مقابل خواتین کا اجتماع کسی جلسے جیسا ہو گیا تھا۔ ایسا مجمع بیرک کے دوسرے کنارے والے گیٹ پر احمد حسن کے لیے موجود تھا۔ اب ثریا اس کی معاون نہیں تھی تو یہ کام لب رضا کار لڑکا کر رہا تھا۔ مستقبل میں بھی اس کا امکان نظر آتا تھا کہ ثریا پھر اپنی خدمات احمد حسن کے لیے وقف رے۔ ابھی تو ان کے تعلقات اتنے کشیدہ تھے کہ وہ ایک سرے کی صورت دیکھنے کے روادار نہ تھے۔ میں نے بھی حسن سے بات کرنا موخر کر دیا تھا۔

جس پرانی بیرک کو اسپتال کی شکل دی گئی تھی اس کی بائی ساٹھ فٹ اور چوڑائی پینتیس فٹ تھی۔ چنانچہ اس میں ر کمرے دائیں طرف اور چار ہی بائیں طرف بنائے گئے تھے۔ درمیان میں پانچ فٹ کا راستہ چھوڑنے کے بعد ہر کمرا رہ بائی پندرہ فٹ کا ہو گیا تھا۔ دائیں طرف کے پہلے اور خری کمرے کو ڈاکٹر استعمال کر رہے تھے۔ درمیان کے کمروں میں سے ایک دوائیوں کا اسٹور تھا اور ایک میں فالتو سباب پڑا تھا۔

ڈاکٹر مہدی حسن کے ساتھ میں نے بائیں طرف کی قطار کا جائزہ لیا تو کافی گنجائش نظر آئی۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال تھا کہ ایک کمرے کو ہم پیتھالوجیکل لیبارٹری بنا سکتے ہیں۔ دوسرے میں ایکسرے مشینیں نصب کی جا سکتی ہیں۔ اس کے بعد والے دو کمروں کو ملا کے ایک کر دیا جائے تو آپریشن تھیٹر بن جائے گا۔ میرے نزدیک جگہ کے استعمال میں اتنی کنجوسی کی ضرورت نہیں تھی دوسری بیرک کی تعمیر شروع ہو چکی تھی اور ایک مہینے بعد ہر ضرورت کے لیے وافر جگہ ہوگی۔

ڈاکٹر مہدی حسن نے سر ہلایا۔ ''جگہ کی بات نہیں۔ ایک مہینے تک کوئی کام نہیں ہوگا۔ سب سے پہلے ہمیں آپریشن تھیٹر اور ایکسرے مشین کے لیے ہائی ٹینشن لائن چاہیے۔ کم سے کم دو سو پچاس میگاواٹ کا ٹرانسفارمر نصب ہوگا۔''

میں نے کہا۔ ''پھر تو ہو چکا کام۔ واپڈا والے خوب دوڑائیں گے۔ کیونکہ جب تک وہ دوڑائیں گے نہیں ہم ہار مان کے ان کی خدمت میں کوئی نذرانہ پیش نہیں کریں گے۔''

مہدی حسن ہنسنے لگے۔ ''ایسا ہوتا ہے یقیناً لیکن ہمارے ساتھ نہیں ہوگا۔ واپڈا کا ایک ڈپٹی چیف انجینئر ہے۔ کئی بار کہہ چکا ہے کہ خدمت کا موقع دیجیے۔ وہ ایک قرض اتارنا چاہتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے اس کے بیٹے کو جو آج کل ایس پی ہے۔ دوسری زندگی میری وجہ سے ہی ملی تھی۔ ڈاکوؤں کا پیچھا کرتے ہوئے اسے تین گولیاں لگی تھیں۔ ایک شولڈر میں دوسری پسلیوں میں جو ریڑھ کی ہڈی تک پہنچی لیکن ہڈی کو نقصان نہیں ہوا۔ تیسری گولی ٹانگ میں لگی تھی۔ آپریشن میں نے کیا تھا۔ خدا نے اسے ہمیشہ کے لیے مفلوج ہونے سے بچا لیا۔ کافی پرانی بات ہے۔''

''اور آپ کا خیال ہے کہ اسے یہ قرض یاد ہوگا؟''

''بھئی دیکھتے ہیں آزما کے۔ یادداشت کیسی ہے اس کی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کام جیسے بھی ہو۔ کرانا تو ہوگا۔ اسی دوران ہم میڈیکل کمپنی سے لوگوں کو بلا کے اس کام میں لگا دیتے ہیں۔ وہ ایکسرے مشین نصب کریں اور آپریشن تھیٹر کی انسٹالیشن میں لگ جائیں۔ اس میں مہینا لگ جائے گا۔''

''ایک مہینے بعد وہ بیرک بھی تیار ہوگی۔''

''رفیق میاں۔ کیوں نہ ہم اسے ان ڈور وارڈ بنا دیں۔ ساٹھ فٹ کی لمبائی میں ایسے ہی دو وارڈ نکل آئیں گے۔ بارہ فٹ چوڑے۔ ایک طرف زنانہ دوسری طرف مردانہ۔ ایک وارڈ میں بہ آسانی ڈس بیڈ لگائے جا سکتے ہیں۔''

میں ایک دم قائل ہو گیا۔ ''بالکل ٹھیک ہے آپ کا خیال۔ آپ کام شروع کرائیں۔ میں تیسری بیرک شروع کراتا ہوں۔''

''اس کی کیا ضرورت ہے؟''

''ضرورت بعد میں پڑے گی۔ ہم زنانہ مردانہ وارڈ الگ کر سکتے ہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ چار بلاک ضروری ہیں۔ ایک ڈاکٹرز کے لیے اور اسٹور، ایک میں لیبارٹری اور آپریشن تھیٹر۔ دو وارڈز آج کی ضرورت کے مطابق۔ بعد میں جو اضافہ ہوگا وہ بعد کی بات ہے۔''

اس مرحلے پہ راجا نے نمودار ہو کے مجھے مطلع کیا۔ ''وہ آیا ہے فاروقی۔ اپنی بیوی کو بازیاب کرانے۔''

مجھے کچھ صدمہ ہوا کیونکہ ایک طرف فاروقی کا سابقہ کردار تھا اور دوسری طرف اس تمام عرصے میں لیلیٰ بھابی کے ساتھ ہو جانے والی جذباتی وابستگی جب وہ ہمارے ساتھ تھیں۔ یہ خیال کسی کو کبھی نہیں آیا تھا کہ اچانک وہ ہمیں چھوڑ کے واپس اسی شوہر کے ساتھ ..... چلی جائیں گی جس نے ان کے ساتھ بہت زیادتی کی تھی۔ وفا کے بدلے جفا کی تھی اور انہیں اتنے دکھ دیے تھے کہ وہ دن رات خون کے آنسو روتی تھیں۔

میں نے بے زاری سے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔ لیلیٰ بھابی جانا چاہتی ہیں تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔''

''تو ملے گا نہیں ان سے؟''

میں نے کہا۔ ''راجا۔ ان سے کہہ یہاں آ کے مجھ سے مل لیں۔''

''دراصل وہ چاہتی ہیں کہ تو بھی فاروقی سے ملے۔ میں تو مل چکا ہوں۔ وہ مہمان خانے میں بیٹھا ہے۔''

میرا موڈ آف ہو گیا۔ ''حقیقت یہ ہے کہ میں اس شخص کی صورت نہیں دیکھنا چاہتا لیکن چل۔ لیلیٰ بھابی کی خاطر یہ بھی سہی۔''

راجا کے چہرے پر افسردگی تھی۔ ''دیکھ یار کوئی ایسی بات نہ کرنا جس سے لیلیٰ بھابی کو دکھ ہو۔''

''یہ تو فاروقی کے رویے پر منحصر ہے۔'' میں نے کہا۔

فاروقی مجھے دیکھ کر اٹھا لیکن آگے بڑھ کر ہاتھ ملانے کے بجائے میں اس سے دور ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بوجھل خاموشی میں گزر گئی۔ فاروقی مجھ سے نظریں چرانے کی کوشش کرتا رہا پھر اس نے ہمت کر کے کہا۔ ''یار رفیق جو کچھ ہوا کیا ہم اسے بھلا نہیں سکتے؟''

میں نے تلخی سے جواب دیا۔ ''نہیں فاروقی صاحب۔''

''میں نے جو کیا اس کے لیے میں معافی مانگتا ہوں۔''

میں نے زہر آلود لہجے میں جواب دیا۔ ''تیر تلوار اور گولی کے زخم مندمل ہو جاتے ہیں۔ الفاظ کے نہیں فاروقی صاحب۔ یہ ناممکن ہے کہ جو کچھ آپ نے کہا اسے میں یاد سے نکال دوں۔''

''ہم اچھے دوست تھے۔''

راجا نے کہا۔ ''ایسی باتوں سے اب کیا فائدہ وکیل صاحب''

وہ بولتا رہا۔ ''معلوم نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا تم کہہ ہو میرا دماغ خراب ہو گیا تھا۔ شیطان غالب آ گیا تھا پر۔ میں نے اچھے برے کی تمیز کھو دی تھی۔ انسان ہوں میں بھی۔''

راجا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''آپ کو اپنی صفائی کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں آپ کسی عدالت پیش نہیں ہوئے۔ نہ ہم نے آپ پر کوئی فردِ جرم عائد کی۔ اپنی بیوی کو ساتھ لیں اور جائیں۔''

وہ کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔ ''میں اسے آرام رکھوں گا۔''

''ہم کوئی ضمانت نہیں مانگ رہے ہیں۔'' میں نے کہ

راجا بولا۔ ''آپ کی بیوی ہے وہ جیسے چاہیں رکھیں

فاروقی اس سلوک کے لیے تیار ہو کے آیا تھا۔ ''لیلیٰ آپ نے بڑی عزت اور محبت کے ساتھ رکھا۔ آئندہ بھی یہ ا گھر ہوگا۔ میکے جیسا۔ وہ جب چاہے آ سکتی ہیں اور آپ بھی۔

لیلیٰ بھابی خاموشی سے اندر آ کے میرے ساتھ گئیں۔ ان کے ساتھ ببلو تھا۔ وہ ان سے لگ کر بیٹھا اجنبی کو دیکھتا رہا جس کے ساتھ اسے جانا تھا۔ لیلیٰ بھابی اسے بتا دیا تھا کہ اب وہی اس کے پاپا ہیں اور ہمیں انہی ساتھ رہنا ہے۔ اس نے یقیناً سوال جواب کیے ہوں۔ لیلیٰ بھابی نے اسے کسی طرح مطمئن بھی کر دیا ہوگا لیکن بچ کے ساتھ اس کی آنکھوں میں خوف بھی واضح نظر آتا تھا۔

لیلیٰ بھابی کی آنکھوں میں ابھی تک آنسو تھے۔ ا یقیناً کافی رونا دھونا ہوا تھا۔ حویلی کے سب مکینوں ساتھ لیلیٰ بھابی کے جذباتی رشتوں کی جڑیں بہت گ ہو چکی تھیں۔ یہ خیال کبھی کسی کے دل میں آیا ہی نہیں تھا اچانک وہ ہمیں چھوڑ کے واپس جانے کا فیصلہ بھی کر سکتی کیونکہ فاروقی کے ساتھ ان کی نفرت کا اظہار مختلف مو پر ہوتا رہتا تھا۔

ریشم خاموشی سے چائے لا کے میز پر رکھ گئی۔ یہ لیلیٰ بھابی کے لحاظ اور احترام کا نتیجہ تھا ورنہ یہاں شاید فار کو تذلیل کے سوا کچھ نہ ملتا۔ راجا نے فاروقی کو چائے بنا پیش کی جو اس نے ...لے لی۔ مجھے سخت دکھ تھا کہ ایک عزیز بے تکلف دوست کو جس پر مجھے سب سے زیادہ اعتماد تھا،

ں سب سے زیادہ نقصان پہنچانے والے دشمن کے طور پر کھ رہا ہوں۔

لیلیٰ بھابی نے آہستہ سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''کیا تم انہیں معاف نہیں کر سکتے دیور جی۔''

میں نے تڑپ کے انہیں دیکھا۔ ''یہ رشتہ پھر نہ جوڑیں لیٰ بھابی۔''

''بھابی تم نے ہمیشہ کہا ہے یا نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''وہ ٹھیک ہے لیکن ...... جو آپ چاہتی ہیں وہ ناممکن ہے میرے لیے۔ ہاں آپ کے لیے میرے جذبات ہمیشہ وہی رہیں گے۔''

''اس کا مطلب ہے ...... میرے جانے سے تم خوش نہیں ہو۔''

میں نے کہا۔ ''یہ ہماری نہیں آپ کی خوشی ہے۔ ہم کون ہوتے ہیں میاں بیوی کے رشتے کے بیچ میں آنے والے۔''

لیلیٰ بھابی دوپٹے کے کونے سے آنسو پونچھتی رہیں۔ ''اللہ نے چاہا تو...... ایک دن سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

فاروقی بولا۔ ''شاید خدا نے ایک موقع دیا ہے مجھے۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ لیلیٰ کے ساتھ اپنی ہر زیادتی کا ازالہ کر دوں۔ ہماری کوئی اولاد نہیں تھی۔ ہم ببلو کو قانونی طور پر بھی اپنا بیٹا بنا لیں گے۔''

راجا نے کہا۔ ''یہ معاملہ تمہارے اور ثریا کے بیچ میں ہے۔ اس میں ہم کہیں نہیں آتے۔''

لیلیٰ بھابی نے کہا۔ ''وہ آتا رہے گا یہاں۔''

میں نے کہا۔ ''اس کے حق میں بہتر یہی ہوگا کہ وہ نہ آئے۔ دونوں طرف کے جذباتی رشتے اس کی شخصیت کو تقسیم نہ کریں۔''

لیلیٰ بھابی نے آہستہ سے کہا۔ ''ثریا بھی ایسا ہی چاہتی ہے۔''

''میں اسے کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' میں نے کہا۔

فاروقی اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میرا خیال ہے کہ ہمیں چلنا چاہیے۔'' اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔ یہ ایک مشکل مرحلہ تھا۔ میرے دل میں غصے اور نفرت کا جو آتش فشاں بھڑک رہا تھا اس کے شعلوں کو میں نے باہر نہیں آنے دیا تھا۔ صرف لیلیٰ بھابی کی خاطر میں نے بہت ضبط کیا تھا۔ میری مشکل کو راجا نے ہاتھ ملا کے آسان کر دیا۔ راجا نے صرف ایک نظر میری طرف دیکھا اور میں نے فاروقی سے ملانے کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

فاروقی نے چند سیکنڈ میرا ہاتھ تھاما۔ ''میں واقعی اس کا مستحق نہیں۔ لیکن میں پھر معافی مانگتا ہوں۔''

میں نے کچھ نہیں کہا اور اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ لیلیٰ بھابی چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد شہناز، رابعہ اور ریشم میں رونے کا ایک اور مقابلہ ہوا۔ راجا اور میں خاموشی سے واپس اسپتال کی طرف لوٹ گئے۔ اچانک مجھے شدت سے احساس ہونے لگا تھا کہ حویلی اسی طرح سوگ میں ڈوب گئی ہے جیسے کوئی مر گیا ہو۔

راجا نے غصے سے کہا۔ ''اسے دیکھو۔ کمرے سے نہیں نکلی۔''

میں نے کہا۔ ''اس میں حوصلہ نہیں ہوگا۔''

''بیٹے کو ایسے دے دیا جیسے حرام کا تھا۔''

''راجا۔ یہ کسی عورت کے لیے آسان فیصلہ نہیں ہوتا لیکن اب میں محسوس کرتا ہوں کہ اس نے ٹھیک ہی فیصلہ کیا، کم سے کم بیٹے کا مستقبل محفوظ کر دیا۔ لیلیٰ بھابی اسے سگی ماں سے بہتر پالیں گی اور فاروقی بھی۔ انہیں خدا نے ایک بیٹا دے دیا جب وہ اولاد کی طرف سے مایوس ہو گئے تھے۔''

راجا میرے ساتھ چلتا رہا۔ ''کتنی مجبور ہوتی ہے یہ مخلوق بھی جسے ہم عورت کہتے ہیں۔ کوئی سوچ سکتا تھا کہ لوٹ کر وہ وہیں جائیں گی۔''

''عورت کے لیے محبت ایک کمزوری بن جاتی ہے۔ اسے وہ نفرت سے نہیں بدل پاتی۔ میں نے دیکھا ہے کیسے کیسے شیطان صفت شوہروں کے ساتھ فرشتہ سیرت بیویاں بڑے صبر و استقامت کے ساتھ زندگی گزار دیتی ہیں۔ ہم مرد ایسا نہیں کر سکتے۔ ہماری قوت برداشت صفر ہوتی ہے۔''

''دعوے بہت کیے لیلیٰ بھابی نے، زندگی بھر منہ نہیں دیکھوں گی۔ طلاق لینے کا ارادہ بھی ظاہر کیا۔ لیکن غصہ کم ہوتا گیا اور بیوی کا شوہر پرستی کا جذبہ غالب آتا گیا۔ نہ جانے رابطہ کس نے پہلے کیا۔ فاروقی نے یا لیلیٰ بھابی نے لیکن کسی کو پتا نہیں چلا۔ چپکے چپکے سب ہو گیا۔ سارے معاملات طے پا گئے اور آج دیکھو وہ چلی گئیں۔''

''سب کچھ چھوڑ گئیں۔ سب بھول گئیں کہ انہوں نے کیا کہا تھا۔ کیا ارادے ظاہر کیے تھے۔''

''شوہر کے گھر سے بڑھ کر عورت کسی گھر کو اپنا نہیں سمجھ سکتی۔ بیٹے کے گھر کو بھی نہیں۔ وہاں اسے جو مکمل تحفظ کا احساس ملتا ہے وہ اور کہیں نہیں ملتا۔ لیلیٰ بھابی ایک سیدھی سادی عام عورت تھیں۔''

راجا کو ڈاکٹر مہدی حسن نے کسی کام سے طلب کیا تو مجھے خیال آیا کہ ثریا کو دیکھوں۔ خواتین نے مخالف جذبات کے باعث اس کا مکمل بائیکاٹ کر رکھا تھا لیکن میں سمجھتا تھا کہ جذباتی طور پر وہ کس شدید بحران سے گزر رہی ہوگی۔ پہلے

شوہر نے اسے چھوڑا پھر ایک ردعمل کے طور پر اس نے بیٹے کو چھوڑنے کا فیصلہ کیا تا کہ وہ ایک نئی زندگی گزارنے کے لیے آزاد ہو اور پھر شادی کرے تو اس کا بیٹا محفوظ رہے۔ لیکن نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم۔ نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے۔ احمد حسن نے اسے بڑی بے رحمی سے ٹھکرا دیا۔ اب وہ اکیلی تھی اور تہی دست۔

میں نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور اس کے کمرے میں پہنچا تو اسے خبر ہی نہ ہوئی۔ وہ بستر پر اوندھی پڑی تکیے میں منہ گھسائے رو رہی تھی۔ اس پر جھک کے میں نے نرمی سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا تو اس نے چونک کے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔

میں بیڈ کی پٹی پر ٹک گیا۔ ''کیوں رو رہی ہو ثریا۔''

اس نے منہ چھپا کے کہا۔ ''میرے پاس کچھ نہیں رہا بھائی۔''

''ایسا کیوں سمجھتی ہو۔ تمہارے پاس اپنی یہ زندگی ہے۔ اسے تم اپنی مرضی سے جیسا چاہو بنا سکتی ہو۔''

''اپنی بدنصیبی کا میں کیا کروں۔ بہن بھائی تھے نہیں۔ ماں باپ رہے نہیں۔ اپنا ایک گھر تھا اب وہ بھی نہیں۔ جسے زندگی کا ساتھی چنا تھا وہ دغا باز نکلا۔ بیٹا اسی کی نشانی تھی۔''

میں نے اسے تسلی دی۔ ''ایسی باتیں سوچ کے آنسو بہاتے رہنے سے زندگی آسان نہیں ہو گی ثریا۔ ماں باپ کسی کے ہمیشہ نہیں رہتے۔ یہاں کون ہے جس کے سر پر ماں باپ کا سایہ سلامت ہو۔ رابعہ اور میں۔ راجا اور شہناز۔ سب اکیلے ہی تھے لیکن یہاں ایک خاندان بن گئے ہیں۔ یہی سب تمہارے لیے بھی بھائی بہن ہیں۔ کیا مجھے صرف زبان سے بھائی کہتی ہو؟ بھائی سمجھتی نہیں ہو۔''

اس نے اپنے آنسو پونچھے۔ ''یہ بات نہیں۔''

''پھر کیا بات ہے۔ اگر بھائی سمجھتی ہو تو پھر یہ گھر تمہارا ہی ہے۔ زندگی کے فیصلے ہم سب سے غلط بھی ہو جاتے ہیں۔ یہ تجربہ ہمیں صحیح فیصلے کرنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ ابھی تمہاری زندگی کا سفر آغاز ہوا ہے۔ اچھا ہوا بہت جلد ایک شخص کی اصلیت کھل گئی اور تمہاری جان چھوٹ گئی۔ دس بیس سال بعد یہ سانحہ پیش آتا تو تمہارے پاس کیا رہتا۔ کچھ نہیں۔ ابھی تو سب کچھ ہے۔ ساری عمر پڑی ہے۔ تم جوان ہو، خوبصورت اور حوصلہ مند ہو۔ اللہ نے چاہا تو آنے والے وقت میں تمہیں سب خوشیاں ملیں گی۔ میرے خیال میں تم نے ببلو کو لیلیٰ بھابی کے سپرد کر کے بڑی عقلمندی کا فیصلہ کیا اور بہت ہمت کا۔ اس کا مستقبل سنوارنے کے لیے اپنی ممتا کو قربان کر دیا۔ یہ کوئی آسان کام تھا؟''

میری باتوں نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔ اب تک وہ [illegible] طرف سے تنقید کا نشانہ بنتی آئی تھی۔ نہ احمد حسن کے لیے اس کی وارفتگی کسی کو اچھی لگی تھی اور نہ کسی نے ببلو سے لاتعلقی کے فیصلے کو اچھا سمجھا تھا۔ خود میں اس وقت جو کہہ رہا تھا نظر ضرورت کے مطابق کہہ رہا تھا کیونکہ ثریا کا حال خراب تھا اس کا مورال ڈاؤن تھا اور سب کے ساتھ وہ اپنی نظر میں گر چکی تھی۔ اس کی خود اعتمادی کو بحال کرنے کے لیے ضروری تھا کہ دوسرے بھی اسے سہارا دیں۔ میری باتوں کا اثر بہت اچھا ہوا۔ اس کی حالت سنبھل گئی اور آنے والے دنوں میں سب نے اس کے رویے میں ایک خوشگوار اور مثبت تبدیلی کو محسوس کیا۔

شام کو میں نے دیکھا کہ رابعہ باغ میں اکیلی بیٹھی ہے۔ چائے کے برتن اس کے سامنے رکھے تھے۔ میں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

''کیا بات ہے۔ تم اکیلی ہو کزن۔''

وہ مسکرائی۔ ''تم ساتھ ہو تو اکیلی کہاں ہوں۔''

''باقی لوگ کہاں ہیں۔ چائے ہے؟''

''ہاں۔ ابھی میں نے بھی کہاں پی ہے۔ باقی لوگ کون؟ ثریا نے خود کو کمرے میں بند کر لیا ہے، اپنی تقدیر پر آنسو بہانے کے لیے۔ بے وقوف لڑکی۔''

میں نے کہا۔ ''کزن وہ بے وقوف ہے تو کیا ہم اسے بے وقوف ہونے کی سزا دیں گے؟ کیونکہ ہم بے حد عقلمند ہیں یا ایسا سمجھتے ہیں۔''

''کزن۔ کوئی خود کو سزا دینے پر تل جائے تو دوسرے کیا کر سکتے ہیں۔'' رابعہ نے میرے لیے چائے بنا کے کپ آگے بڑھایا۔

''یہی وقت ہوتا ہے دوسروں کے لیے کچھ کرنے کا۔ اگر تم واقعی عقلمند ہو تو ایک بے وقوف کی مدد کرو۔ اس کو مطعون کرنے اور غلط ثابت کر کے برا بھلا کہنے سے کیا فائدہ۔ [illegible] اب ہماری ذمے داری ہے یا نہیں۔''

رابعہ نے سر ہلایا۔ ''ہاں، ذمے داری تو ہے۔''

''مجھے خوشی ہوئی کہ تم یہ تسلیم کرتی ہو۔ اس کا حوصلہ بحال کرنے اور زندگی کو بہتر طریقے پر شروع کرنے میں اس کی مدد کرو۔ تم مجھ سے چھوٹی ہو اور وہ تم سے بھی چھوٹی ہے۔ اب لیلیٰ بھابی کی جگہ اسکول میں وہ تمہارے ساتھ ہو گی۔''

''شہناز بھی ایسا ہی کہہ رہی تھی۔''

''وہ ہے کہاں۔ راجا بھی نظر نہیں آ رہا۔''

رابعہ ہنسنے لگی۔ ''وہ لاہور گئے ہیں۔ کل آئیں گے۔''

''خدا کا شکر ہے کہ شہناز بھی نکلی۔ وہ تو جب سے آئی حویلی کی مصروفیات میں قید ہو کے رہ گئی ہے۔''

''تمہیں راجا نے بتایا تو ہو گا۔ وہ شادی کرنے والے ہیں۔''

''ہاں۔ تمہیں شہناز سے یہ خبر ملی ہو گی۔ بڑی خوشی کی بات ہے۔''

''وہ اسی سلسلے میں کچھ شاپنگ وغیرہ کرنے نکلے ہیں۔ اس [illegible] آج ہم پر بھی آپ کی نظر کرم ہو گئی۔ ورنہ حضور نواب صاحب کب [illegible] تے ہیں کہ انہیں اپنی کزن یاد ہے جس کا نام رابعہ تھا۔''

میں نے ہنس کے کہا۔ ''تم سے طعنے سن کے اچھا لگا۔''

''یہ طعنے نہیں حقیقت ہے۔ اچھا اپنے ایمان سے کہو۔ [illegible] چڑیلوں کے لیے تو بار بار دوڑ لگاتے ہو لاہور کی طرف۔''

''جو کہنا ہے نام لے کے کہو۔ تم ایک نند کی پوسٹ پر [illegible]ز ہو۔''

''جب بھائی اپنی بہنوں کو یوں نظر انداز کریں تو [illegible]وں کو نند بن کے گنڈ ڈالنا پڑتا ہے۔ کبھی مجھ سے بھی کہا ہوتا [illegible] لاہور چلو۔ اسلام آباد چلو۔ تمہیں گھما لاؤں۔''

میں نے اعتراف کیا۔ ''مائی مسٹیک کزن۔ میں مانتا [illegible]ں۔ ابھی چلو۔''

اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ ''ابھی۔''

''ہاں۔ کل کا کیا بھروسا فرصت ملے نہ ملے۔ میرا [illegible]ل ہے بہت عرصہ ہوا تم نے اپنے لیے کچھ بھی نہیں خریدا۔ [illegible] کپڑے نہ جیولری۔ میری طرف سے اوپن آفر ہے سارا [illegible]ور لوٹ لاؤ۔''

وہ لہرا کے اٹھی۔ ''میں ابھی تیار ہو کے آتی ہوں۔''

رابعہ اور میرا رشتہ اپنائیت اور اعتماد کا تھا۔ میں نے [illegible]ب سے ہوش سنبھالا تھا اسے اپنے ساتھ دیکھا تھا۔ [illegible]رے درمیان بہن بھائی جیسی قربت تھی اور یہی دیکھتے [illegible]ئے ہمارے بزرگوں نے سوچا ہو گا کہ ہمارے درمیان دوامی رفاقت کا رشتہ کامیاب ہو گا لیکن ایسا میری وجہ [illegible]ے ممکن نہ ہوا۔ اس کا سارا الزام فریال کو نہیں دیا جا سکتا [illegible]۔ میں نے صاف بتا دیا تھا کہ رابعہ کے لیے میرے [illegible]بات ایک بھائی جیسے ہیں چنانچہ یہ ممکن ہی نہیں کہ میں [illegible]ے بیوی کے روپ میں دیکھ سکوں۔ کچھ ایسا ہی ردعمل [illegible] رابعہ نے ظاہر کیا جس سے اس کی ماں کو بہت صدمہ ہوا۔ وہ [illegible]تی تھیں کہ ست بدھائی کی ملکیت میں رابعہ یوں میرے [illegible]تھ برابر کی شریک بن جائے۔

رابعہ شروع سے میری بہت اچھی دوست بھی تھی مدد [illegible]ر بھی اور راز دار بھی۔ جب اس کے والدین نہ رہے تو رابعہ میری ذمے داری بن گئی مگر حالات نے اس کے اور میرے تعلقات میں تلخی پیدا کر دی۔ کبھی غلط فہمی کے باعث تو کبھی میری یا اس کی بدگمانی کے باعث۔ آج بہت عرصے بعد یہ موقع اتفاق سے آ گیا تھا کہ میں اس کے ساتھ اعتماد، قربت اور بے تکلف دوستی کا پرانا رشتہ پھر استوار کروں۔ شاید خود اس نے بھی محسوس ضرور کیا تھا کہ حالات نے ہمیں ایک دوسرے سے دور اور اجنبی کر دیا ہے لیکن ایسا ہونا نہیں چاہیے۔

رابعہ نے ثریا کو بھی ساتھ چلنے کے لیے کہا تھا۔ وہ میری بات مانتے ہوئے یہ چاہتی تھی کہ ثریا کا کچھ دل بہلے۔ وہ بھی گھومے پھرے اور شاپنگ کرے لیکن ثریا کا موڈ آف تھا۔ اس نے انکار کر دیا۔ ہم رات گئے لاہور پہنچے۔ ایک ہوٹل میں الگ الگ کمرے لیے اور پھر کھانے کے لیے نکل گئے۔ رابعہ بہت خوش تھی اور مسلسل بولتی رہی۔ ہنستی رہی اور ہنساتی رہی۔ اگلا پورا دن اس نے شاپنگ کی اور میں اسے بہترین شاپنگ سینٹرز میں لے گیا۔

یہ محض اتفاق تھا کہ رابعہ نے ایم ایم عالم روڈ کے ایک ریسٹورنٹ میں راجا کے ساتھ شہناز کو داخل ہوتے دیکھ لیا۔ اس نے فوراً مجھے متوجہ کیا۔

''وہ دیکھو۔ راجا اور شہناز۔ چلو انہیں سرپرائز دیں۔''

میں نے اسے روک دیا۔ ''نہیں۔ انہیں اپنی پرائیویسی انجوائے کرنے دو۔ ہم انہیں ڈسٹرب نہیں کریں گے ہم کہیں اور چلتے ہیں۔''

دوسری جگہ ڈنر کے دوران میں نے پوچھا۔ ''تمہاری شاپنگ ہو گئی؟''

''ابھی نہیں کزن، کچھ باقی ہے۔ ہم کل واپس جائیں گے۔''

''جیسی تمہاری مرضی۔ وہاں سب کہتے ہوں گے کہ سارے لوگ کہاں چلے گئے۔ اتنا کام پڑا ہے۔''

''کون سب۔''

''ڈاکٹر مہدی حسن اور ان کا بیٹا۔''

''انہیں ثریا نے بتا دیا ہو گا۔ ایک دن میں کچھ نہیں ہوتا۔''

میں نے کہا۔ ''یہ احمد حسن کیسا آدمی ہے؟''

اس نے مجھے غور سے دیکھا۔ ''جیسا آدمی کو ہونا چاہیے ایسا نہیں ہے۔''

''کیا مطلب۔''

وہ ہنسی۔ ''وہ پونے دو ٹانگ کا آدمی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''کیا اس سے کوئی فرق پڑتا ہے کزن؟''

''اسے پڑتا ہو گا۔ مجھے یا تمہیں کیا فرق پڑ سکتا ہے۔

ڈاکٹر اچھا ہے۔ باہمت اور نیک دل ہے۔ پتا نہیں اب تک اکیلا کیوں ہے۔"

میں نے کہا۔ "تم سمجھتی ہو وہ کسی بھی لڑکی کے لیے قابل قبول ہوسکتا ہے۔"

"کیوں نہیں۔ لیکن ثریا اس کے لائق نہیں تھی۔"

"تم ایسا سمجھتی ہو؟ اس کے لیے کیسی لڑکی ہونی چاہیے۔"

وہ سوچ کے بولی۔ "کچھ ذہین، تعلیم یافتہ اور سنجیدہ مزاج۔ جو اس کا خیال بھی رکھ سکے۔"

میں نے کہا۔ "گویا تمہارے جیسی۔"

اس نے مجھے گھورا۔ "کیا مطلب ہے تمہاری اس بات کا۔"

"کچھ نہیں۔ ایک معیار تم نے بتایا تھا۔ اس پر میں نے غور کیا تو اور کوئی لڑکی نظر نہ آئی۔ یقیناً بہت ہوں گی مگر میں نہیں جانتا۔ تم جیسی کوئی لڑکی، تم نہیں...... اس کے ساتھ خوش رہ سکتی ہے۔"

"ہاں۔ اگر وہ خواب پرست نہ ہو۔ شہزادہ گلفام وحید مراد جیسا یا عمران خان نہ مانگے۔ لیکن ہم یہ ڈسکس کیوں کر رہے ہیں آخر؟"

"مجھے ایسا لگا جیسے تم اسے ناپسند کرتی ہو۔"

"کیسی بات کرتے ہو کزن۔ اتنا اچھا آدمی ہے وہ۔"

"پھر اس سے کھنچی کھنچی کیوں رہتی ہو۔ اتنی بے رخی سے کیوں پیش آتی ہو اس کے ساتھ۔"

"یہ تمہاری نظر کا فتور ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں۔ ہی از اے پرفیکٹ جینٹلمین۔ اس کی شخصیت بڑی چارمنگ ہے۔ ایک پاؤں میں نقص کے باوجود۔ وہ سوبر ہے۔ خوش ذوق ہے۔ ثریا آخر کس پر کیوں فریفتہ ہوئی۔"

مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا تھا۔ رابعہ کو اندازہ بھی نہ ہوسکا کہ میں نے براہ راست پوچھے بغیر اس کی مرضی معلوم کرلی ہے۔ اگر کچھ عرصے بعد یہ سوال اس کے سامنے آیا کہ کیا وہ احمد حسن کے ساتھ اپنی باقی زندگی گزارنے کے لیے تیار ہے تو اس کا جواب نفی میں نہیں ہوگا۔ اب اس سے پہلے کہ وہ شک میں مبتلا ہو یہ ضروری تھا کہ موضوع بدل دیا جائے۔ مجھے یہ اطمینان حاصل ہوگیا تھا کہ اگر میرے اشارے پر احمد حسن نے پیش قدمی کی پہلے رابعہ میں دلچسپی کا اظہار کیا اور بالآخر اظہار محبت تو رابعہ کی طرف سے اس کی حوصلہ شکنی نہیں ہوگی۔

رابعہ نے اچانک میری طرف جھک کر کہا۔ "مڑ کر مت دیکھنا۔ پیچھے دو میزیں چھوڑ کے دو مشٹنڈے بیٹھے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "ذرا مشٹنڈے کی تعریف بیان کرو کزن۔ کیا پتا کسی اور کی نظر میں تمہارا یہ کزن مشٹنڈا ہو۔"

"پہلے میں نے اپنا شک سمجھا تھا لیکن یہ دونوں ہمارے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ میں نے ان کو لبرٹی میں دیکھا تھا۔ ہمیں گھور رہے تھے۔ پھر جب ہم ایم ایم عالم روڈ پر ایک ریسٹورنٹ میں جا رہے تھے اور پھر شہناز اور راجا کو دیکھ کر نہ گئے تھے۔ تو یہ وہاں بھی نظر آئے تھے۔ ہمارے پاس تو ایک وجہ تھی اندر نہ جانے کی۔ یہ وہاں سے یہاں کیوں آ گئے۔"

میں نے کہا۔ "تمہیں یقین ہے کہ یہ غلط فہمی نہیں۔"

"بالکل نہیں۔ دونوں ایک سے ہیں۔ اپنے حلیے کے اعتبار سے لمبے چوڑے۔ بھاری بھرکم۔ گھنی مونچھیں، چھوٹے چھوٹے بال۔ دونو سفید لٹھے کا شلوار قمیص اور اس پر واسکٹ پہنے ہوئے ہیں۔ صورت میں فرق نہ ہوتا تو لوگ جڑواں بھائی سمجھتے۔"

میں نے کہا۔ "میں اور تم ایک ساتھ اٹھیں گے دروازے تک جائیں گے۔ ظاہر ہے یہ بھی ہمارے پیچھے آئیں گے۔ ہم باہر جانے سے پہلے رک کر کچھ بات کریں گے۔ ان کو موقع دیں گے کہ یہ نزدیک آئیں۔"

"دیکھو۔ یہاں لڑائی جھگڑا نہیں کرنا ہے۔ میں جانتی ہوں تم جوڈو کراٹے کے ماہر ہو۔ ریوالور بھی ہے تمہارے پاس۔"

"میرے پاس اللہ کی دی ہوئی عقل بھی ہے کزن۔ دروازے سے پلٹ کے واش روم کی طرف جائیں گے۔ لیڈیز اور جینٹس کے واش روم پیچھے آخری حصے میں ہیں۔ دونوں کو باہر جانا پڑے گا۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ وہ واش روم میں ہمارے ساتھ جائیں۔ پانچ سات منٹ بعد ہم باہر نکل کر دیکھ لیں گے کہ وہ موجود ہیں یا چلے گئے۔ چلو اب اٹھو۔"

رابعہ کا شک بے بنیاد نہیں تھا۔ دس منٹ بعد میں نے انہیں کچھ فاصلے پر اپنی گاڑی کے قریب دیکھا۔ ان میں سے ایک سفید رنگ کی پجیرو میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ دوسرا باہر کھڑا تھا۔ ان کی پجیرو سامنے والی قطار میں ہم سے بیس قدم دور تھی۔ رابعہ کے بعد جیسے ہی میں نے ڈرائیونگ سنبھالی اور اپنی کار کو ریورس کیا، میں نے پجیرو کو بھی قطار سے نکلتا دیکھا۔ اب میرے لیے شک و شبے کی کوئی بات نہیں رہی تھی۔

میں نے کہا۔ "کزن۔ میری ایک بات مانو گی۔"

"میں کوئی وعدہ نہیں کرسکتی۔"

"دیکھو۔ مجھے ان دونوں کے ارادے اچھے نہیں لگتے۔"

"آخر یہ ہیں کون؟"

"میں نے بھی ان کو پہلے نہیں دیکھا۔"

"کیا یہ رانا کے بندے ہیں؟"

"ہو بھی سکتے ہیں۔ میرا شبہ ہے کہ یہی گجر برادران ہیں۔"

"کون گجر برادران۔"

میں نے عقبی شیشے میں دیکھا تو پجیرو ہمارے پیچھے آرہی تھی۔ "تفصیل بتانے کا وقت نہیں۔ انہوں نے چودھری سلطان کو اغوا کیا تھا۔ اس نے فلم بنانے کا چکر دے کر ان بھائیوں سے لاکھوں روپیا اینٹھ لیا تھا۔ یہ تقریباً پچاس لاکھ کے پھیرے میں آ گئے تھے۔ ان کی سیکڑوں بھینسوں کا باڑہ تھا۔"

"مگر یہ ہمارے پیچھے کیوں لگے ہیں۔" رابعہ اب خوفزدہ تھی۔

"میں اب گاڑی روک رہا ہوں۔ شاہدرہ سے گزر جانے کے بعد جو پہلا پیٹرول پمپ آئے گا تم وہاں اتر جاؤ گی۔"

"میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔"

"اپنی عقل مت لڑاؤ۔ میری بات نہ مانی تو پتا نہیں کیا ہوگا..... پیٹرول پمپ سے تم ماجد خان کو فون کرنا۔ اس کا نمبر لکھو۔"

رابعہ نے ڈیش بورڈ کے ایک خانے میں سے کاغذ اور بال پوائنٹ نکالا۔ وہ اب سخت ڈری ہوئی تھی۔ میں نے اسے نمبر لکھوایا۔ "ماجد خان یا اس کا کوئی ملازم تمہیں پک کر لے گا۔ ضرورت پڑی تو گھر بھی پہنچا دے گا۔ اسے سب بتا دینا۔ رائٹ؟"

رابعہ نے سر ہلایا۔ "میں پولیس کو نہ بتا دوں؟"

"جو کرنا ہے ماجد خان کرلے گا۔ جب میں پیٹرول پمپ پر رکوں گا تو یہ بھی کہیں رک کر انتظار کریں گے۔ اگر ان کے ارادے کچھ اور ہیں تو میں ان کو ڈاج دے سکتا ہوں۔ ان سے ریس لگا کے فرار نہیں ہوسکتا۔ ان کی بڑی گاڑی ہے۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، مجھے کچھ نہیں ہوگا۔"

پیٹرول پمپ تھوڑے تھوڑے ہی فاصلے پر تھے۔ پجیرو تقریباً دو سو گز کا فاصلہ رکھتے ہوئے میرے پیچھے تھی۔ میں نے کئی بار چیک کیا۔ میں اپنی رفتار بڑھاتا تھا تو پجیرو کی رفتار بھی بڑھ جاتی تھی۔ میں سلو ہوتا تھا تو میرا پیچھا کرنے والے بھی سلو ہو جاتے تھے۔

میں نے رابعہ کو ہوشیار کیا۔ "یہ اچھا بڑا پمپ ہے۔ آر یو ریڈی۔" اور گاڑی اندر موڑی۔

میں اپنی کار کو آخری پمپ پر لے گیا۔ کار کے رکتے ہی میں نے رابعہ سے کہا۔ "گو۔" اور وہ بڑی پھرتی سے دوسری طرف کا دروازہ کھول کے اتر گئی۔ پجیرو کے پیٹرول پمپ میں داخل ہونے سے پہلے ہی رابعہ اس چھوٹے سے اسٹور میں داخل ہوچکی تھی جہاں گاڑی والوں کے لیے کھانے پینے اور عام ضرورت کی تمام اشیا دستیاب تھیں۔ اس کے بڑے بڑے شفاف شیشوں کے پیچھے سے رابعہ نے بھی دیکھ لیا ہوگا کہ پجیرو اسٹیشن کے پہلے پمپ پر آ کھڑی ہوئی ہے۔ درمیان والے چار پمپ خالی ہوتے تب بھی وہ میرے اتنے نزدیک نہ آتے۔ میں نے ٹینک فل کرایا۔ یقیناً انہوں نے بھی ایسا ہی کیا ہوگا۔

اس وقت تک میں نے گیم پلان بنالیا تھا۔ میں پیٹرول پمپ سے نکلا اور گولی کی طرح پوری رفتار سے جی ٹی روڈ پر روانہ ہوگیا۔ ایک دو منٹ کے وقفے سے پجیرو نکلی اور میرے پیچھے آئی۔ اگلے آٹھ دس کلومیٹر میں مجھے ایک کچی پکی سی سڑک نظر آئی جو بائیں جانب کھیتوں اور درختوں کے بیچ میں سے نہ جانے کہاں جاتی تھی۔

معلوم نہیں کیوں آخری وقت میں میرا ارادہ بدل گیا اور میں نے کسی نامعلوم ویران راستے پر جانے سے بہتر سمجھا کہ سیدھے راستے پر چلتے ہوئے مقابلہ جاری رکھوں۔ سڑک پر دونوں طرف سے آمد ورفت جاری تھی۔ کسی حادثے کی صورت میں مجھے فوری امداد بھی حاصل ہوسکتی تھی۔ اس پتلی سی سڑک کا کیا پتا اچانک کسی جگہ ختم ہوجائے جہاں آگے کھیت ہوں یا کھائی ہو۔ نہ آگے جانے کا راستہ ہو نہ لوٹ کر واپس جانے کا۔

یہ خیال پختہ ہوتے ہی میں نے ایکسی لریٹر دبا دیا اور گاڑی جو پہلے ہی سو کلومیٹر کی رفتار پر دوڑ رہی تھی ایک دم بھاگی اور دیکھتے دیکھتے اس کی رفتار خطرناک حد پر ڈیڑھ سو کلومیٹر تک پہنچ گئی۔ اس رفتار پر اسٹیئرنگ سنبھالنا اتنا ہی مشکل ہوتا ہے جتنا بے لگام گھوڑے کو دوڑانا۔ ایک سیکنڈ تو بہت ہوتا ہے۔ اس کے دسویں یا سویں حصے میں توجہ ہٹ جائے اور گاڑی ایک سینٹی میٹر دائیں بائیں ہوجائے تو آپ کو پتا چلنے سے پہلے کچھ ہو جاتا ہے۔ گاڑی سڑک سے اتر جاتی ہے۔ کسی گاڑی سے گلے مل چکی ہوتی ہے۔ یہ آپ کی قسمت کہ وہ گدھا گاڑی ہے یا کوئی دیوہیکل ٹرک۔

میرے لیے اضافی آزمائش پیچھے دیکھنے کی تھی۔ میں بار بار بیک ویو مرر میں دیکھتا تھا تو پجیرو بڑی مستقل مزاجی سے تعاقب کرتی نظر آتی تھی۔ میں گاڑی کو سڑک پر نہیں کسی ریس ٹریک پر بھگا رہا تھا۔ دوسری گاڑیوں کے ڈرائیور سمجھتے ہوں گے کہ میں نشے میں ہوں۔ نشہ دولت کا ہو شراب کا یا طاقت کا۔ عقل و ہوش پر حاوی آجاتا ہے۔ کچھ دیر بعد پجیرو اسی طرح دائیں بائیں سے راستہ بناتی اتنی ہی طوفانی رفتار

سے گزرتی ہوگی تو لگتا ہوگا کہ شاید کسی فلم کی شوٹنگ ہے۔ تعاقب کا سین ہے۔

اصل صورت حال کون سمجھ سکتا تھا۔ خود میرے سامنے مقصد صرف ایک تھا کہ کسی طرح تعاقب کرنے والوں سے نجات ملے۔ اس کی ایک صورت یہ ہوسکتی تھی کہ مجھے سڑک کے کنارے کوئی پولیس اسٹیشن نظر آ جائے تو میں سیدھا اندر چلا جاؤں۔ اس رفتار پر یہ امکان ضرور تھا کہ گاڑی تھانیدار صاحب کے کمرے میں جا رکے یا اس کی دیواروں میں سے بھی گزر جائے۔ جب مجھے ایک پولیس اسٹیشن نظر آیا تو نظر آنے سے پہلے گزر گیا۔ دوسری صورت یہ بھی کہ پیچھے والی گاڑی کا پیٹرول ختم ہوجائے۔ اس کا ٹائر پنکچر ہوجائے۔ ایکسی لریٹر کا تار ٹوٹ جائے یا ایسی ہی کوئی خرابی پیدا ہوجائے۔ مگر یہ میرے ساتھ بھی تو ہوسکتا تھا۔ یہ میں نے نہیں سوچا۔

تاہم کچھ دیر بعد کچھ ہوا۔ خدا نے میری سن لی۔ ان کا ارادہ بدل گیا یا حوصلہ جواب دے گیا۔ تانگے سے منسلک گھوڑے اور ریس کے گھوڑے میں فرق تو ہوتا ہے۔ تانگے کا گھوڑا سارا دن دوڑ سکتا ہے لیکن وقفے وقفے سے اور کم رفتار پر۔ ریس کا گھوڑا گولی کی طرح نکلتا ہے لیکن ایک گھنٹا بھی اپنی رفتار برقرار نہیں رکھ سکتا۔ یہی میرے ساتھ ہو رہا تھا۔ اس برق رفتاری سے میں نے پہلے کبھی دینہ اور لاہور کا درمیانی فاصلہ طے نہیں کیا تھا۔ میں اب دینہ موڑ کے قریب تھا لیکن میرا جسمانی اور ذہنی حوصلہ جواب دے رہا تھا۔

اچانک میں نے محسوس کیا کہ میرا پیچھا کرنے والے غائب ہوگئے ہیں۔ کہیں بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ میں نے رفتار کم کی اور خود سے بیک ویو مرر میں دیکھا تو بہت سی گاڑیوں میں پجیرو دکھائی نہ دی۔ کہیں انہوں نے تعاقب چھوڑ دیا تھا۔ سوال یہ تھا کہ آخر کیوں؟ سیدھی سڑک پر ہار ماننے کی تو بات بھی نہ تھی۔ راہ گم کرنے کا امکان بھی نہ تھا۔

ابھی میں نے رفتار کم کرنے کا سوچا ہی تھا کہ مجھے اپنے سامنے بالکل ویسی ہی دوسری پجیرو دکھائی دی۔ جب میں نے اسے اوور ٹیک کرنے کی کوشش کی تو وہ گھوم کر میرے سامنے آگئی۔ میں نے بریک لگائے اور راستہ کاٹ کے نکلنا چاہا تو وہ پھر لہرا کے میرے سامنے آگئی۔ اسکیم ایک دم میری سمجھ میں آگئی۔ اس مشن پر جس کا مقصد ہنوز نامعلوم تھا دو گاڑیاں مامور تھیں۔ ایک مجھے دوڑاتی ہوئی یہاں تک لائی۔ دوسری نے آگے سے میرا راستہ روکا کہ میں نکل نہ جاؤں۔ چند سیکنڈ میں پیچھے والی گاڑی بھی پہنچ جائے گی جو نہ جانے کیسے مقابلے میں ہار گئی تھی۔

اور پھر ایسا ہی ہوا۔ میں اپنی گاڑی کو آگے والی گاڑی سے بچا کے آگے نکالنے کی جدوجہد میں مصروف تھا کہ ایک دھماکا ہوا۔ دوسری گاڑی نے پیچھے سے ٹکر مار کے میری کار ایک دم آگے اچھال دیا اور میں بریک لگانے کی دیوانہ وار کوشش کے باوجود آگے والی گاڑی سے تصادم کو نہ روک سکا۔ میرے آگے پیچھے دیوہیکل فور وہیل ڈرائیو پجیرو تھیں جن کے درمیان میری نازک سی خوبصورت کار ایسے ہی تھی جیسے فری اسٹائل ریسلنگ کے دو خوفناک دیوزادوں کے درمیان ایشوریا رائے جیسی نازک اندام ناز پروردہ حسینہ۔

میری گاڑی دونوں طرف سے پچک گئی لیکن اس کا مجھے بہت دیر بعد ہوا۔ فوری طور پر میں نے تصادم کے ساتھ ہی خود کو ایک جھٹکے سے بلند ہوتا اور ہوا میں اڑتا پایا۔ دوسرے لمحے میں کسی جھاڑی میں گرا۔ اس تصادم کی آواز نے میری سماعت کو مفلوج کردیا تھا۔ جب میں توپ سے نکلے ہوئے گولے کی طرح زمین پر گرا تو چند لمحے کے لیے میرے ہوش و حواس بھی مفلوج ہوگئے۔

یہ سب کیسے ہوا۔ میں نہیں جانتا اور اس کی وضاحت ناممکن ہے۔ اگر اس حادثے کی جو سو فیصد ایک قاتلانہ حملہ تھا۔ کوئی فلم ہوتی اور اسے فریم بائی فریم چلا کے دیکھنا ممکن ہوتا تو شاید کسی فریم میں میرا وجود کار کے فولادی پنجرے سے نکلتا نظر آجاتا۔ میرا قیاس ہے کہ سامنے والی گاڑی سے ٹکرانے کے بعد میری کار کی ونڈ اسکرین ذرہ ذرہ ہوگئی اور جھٹکے نے مجھے اس خلا سے نکال دیا جو شیشہ غائب ہونے سے بنا تھا۔

میرے چہرے پر خراشیں تھیں اور خونی لکیریں تھیں شیشے کے ذرے میرے کالر کے کھلے حصے میں سے اندر چلے گئے تھے اور میرے لباس پر چپک گئے تھے۔ تاہم میری آنکھیں محفوظ رہی تھیں۔ رہی سہی کسر میرے فٹ بال کی طرح اڑ کر دور جا گرنے کی چوٹ نے پوری کردی تھی۔ میری ایک سائیڈ کچھ دیر حرکت کے قابل نہ رہی۔ پھر حواس بحال ہوتے ہی میں نے اپنی ہمت کو مجتمع کیا اور خود کو اٹھایا۔ میرے دائیں بازو اور ٹانگ میں درد کی لہر سی اٹھی لیکن میں نے آہستہ آہستہ ہاتھ پاؤں ہلا کے اس بات کا یقین کیا کہ فریکچر کہیں نہیں ہے۔

میں سڑک پر اپنی کار کے پچکے ہوئے ڈھانچے سے تقریباً بیس فٹ کے فاصلے پر ایک گڑھے میں پڑا ہوا تھا جس کی گہرائی درمیان میں دو فٹ سے زائد نہیں تھی۔ یہ گڑھا

شاید بیس چالیس فٹ کے قطر میں پھیلا ہوا تھا۔ یہاں مٹی نرم تھی اور آس پاس کچے علاقے میں ایسے بہت سے نشیبی حصے تھے جہاں سے مٹی کھود کے اینٹوں کے بھٹے تک پہنچائی گئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اتنی دور آکر گرنے کے باوجود میرے اعضا سلامت رہے تھے۔ پتھریلی زمین پر میرے جسم کی ہڈیاں سلامت نہ رہتیں۔

میں نے سب سے پہلے خدا کا شکر ادا کیا جس نے مجھے اس قاتلانہ حملے میں ہلاک ہونے سے محفوظ رکھا اور پھر اس ہجوم کی طرف دیکھا جو میری تباہ ہوجانے والی کار کے گرد جمع ہونے لگا تھا۔ راہ چلتی کاریں اور دوسری گاڑیاں رک جانے سے سڑک پر ٹریفک جام ہوگیا تھا۔ کچھ لوگ مدد کے لیے بسوں اور پرائیویٹ گاڑیوں سے اتر کے آگئے تھے۔ تجسس اور ہمدردی کے جذبات سے مغلوب ہوکے جمع ہوگئے تھے۔ انہیں حیرانی ضرور ہوگی کہ اس تباہ شدہ کار میں نہ کوئی زخمی تھا نہ مردہ۔ اور آگے پیچھے سے گاڑی کا یہ حال ہوا تو کیسے۔ کیونکہ کار کے نہ آگے کوئی گاڑی تھی اور نہ پیچھے۔ سڑک پر حادثہ ہو تو ٹکرانے والی دونوں گاڑیاں رک جاتی ہیں۔

یہ بات صرف میں جانتا تھا کہ مجھے آگے پیچھے سے ٹکر مارنے والی دونوں گاڑیاں جائے حادثہ سے فرار ہوگئی تھیں۔ میری نازک کار کے مقابلے میں دو فولادی دیو پیکر گاڑیوں کا بہت معمولی نقصان ہوا ہوگا۔ ممکن ہے پیچھے ٹکرانے والی گاڑی کی ہیڈ لائٹس ٹوٹی ہوں یا بمپر اور بونٹ تباہ ہوئے ہوں اور جس گاڑی سے میری گاڑی پیچھے سے ٹکرائی تھی اس کا بمپر خراب ہوا ہوگا یا پیچھے والا دروازہ دب گیا ہو مگر میری گاڑی تو چرمر ہوکے لوہے کا ناقابل شناخت بدصورت ڈھانچہ بن گئی تھی جس کو لوہے کے بھاؤ کسی کباڑیے کو بھی فروخت کیا جاسکتا تھا۔

اگر معجزاتی طور پر میں ونڈ اسکرین کے خلا سے قلابازی نہ کر جاتا تو خود میرا ٹوٹا پھوٹا ڈھانچہ کار کے اندر ایسے پھنسا ہوا ہوتا کہ ٹکڑے نکالے جاتے۔ مجھے ''حادثے'' میں ختم کرنے پر مامور دونوں گاڑیاں نہ جانے کہاں پہنچ چکی تھیں۔ شاید موبائل فون پر اب تک یہ رپورٹ بھی دی جاچکی ہوگی کہ کام ہوگیا۔ اور میرے دشمن اس عظیم کامیابی پر خوشی بھی منا رہے ہوں گے۔ یہاں میں زندہ سلامت اور خیر و عافیت کے ساتھ ایک آفاقی سچائی کا ثبوت بنا کھڑا تھا کہ مارنے والے سے بچانے والا ہاتھ کتنا زبردست ہے۔

میں اپنی جائے پناہ سے نکل کر حیران پریشان ہجوم کی طرف جانے ہی والا تھا کہ میری جیب میں محفوظ موبائل فون کی گھنٹی بولنے لگی۔ میں نے دیکھا تو اس پر رابعہ کا نمبر تھا۔ میرے ہیلو کہتے ہی وہ چلانے لگی۔ ''رفیق کہاں ہو تم۔ یہ تمہاری گاڑی ہے نا جس کو حادثہ پیش آیا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''آف کورس یہ میری ہی گاڑی ہے کزن۔ خوب پہچانا۔''

وہ پھر بھی چلاتی رہی۔ ''اور تم۔ تم ٹھیک ہو۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ٹھیک نہ ہوتا تو تم سے یوں بات کرتا۔''

''لیکن گاڑی تو بالکل ختم ہوگئی ہے۔ مجھے بتاؤ تم کہاں ہو۔ کسی اسپتال میں۔ کون سے اسپتال میں۔'' وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

''پاگل لڑکی۔ میں کسی اسپتال میں نہیں ہوں۔'' میں نے اسے ڈانٹا۔

''تم زخمی ہو کزن۔ کتنے زخمی ہو۔ مجھے کچھ بتاؤ تو سہی۔''

میں نے کہا۔ ''بند کرو یہ رونا دھونا۔ خدا کے فضل سے میں بالکل ٹھیک ہوں۔ کوئی فریکچر تک نہیں ہے، جسم پر خراشیں ضرور آئی ہیں۔''

وہ روتی رہی۔ ''جھوٹ بول رہے ہو تم۔''

''رابعہ کیا تم انہی لوگوں میں شامل ہو۔ جو گاڑی کے آس پاس جمع ہیں۔ کیسے آئی ہو یہاں تک۔''

''ماجد خان نے اپنی گاڑی دی تھی۔ ان کا ڈرائیور بھی ہے۔ یہاں سے گزرتے ہوئے میں نے گاڑی دیکھی۔''

''اچھا سنو۔ میں بہت قریب ہی موجود ہوں۔''

''قریب کہاں۔ کیا حادثے کے وقت تم گاڑی سے اترے تھے کسی کام سے۔''

میں نے کہا۔ ''اگر کوئی مجبوری ایسی ہوتی تو میں گاڑی کو ایک سائیڈ پر لگا کے اترتا۔ حادثے کے وقت میں گاڑی میں تھا۔''

''آخر اتنا بھیانک حادثہ ہوا کیسے۔''

''دیکھو۔ جائے حادثہ پر پولیس پہنچ گئی ہے۔ تم اگر لوگوں کے بیچ میں ہو تو باہر نکل آؤ۔''

''میں باہر ہوں۔ وہاں تو اتنا شور تھا۔''

میں نے کہا۔ ''اچھا۔ اب اپنی گاڑی میں واپس چلو۔ اسی راستے پر جدھر سے آئی تھیں۔''

''گاڑی پھنسی ہوئی ہے۔ آگے پیچھے ساری ٹریفک رک گئی ہے۔ لیکن میں اس سے کہتی ہوں۔''

''تم پیدل پیچھے جاؤ۔ کیا تم نے کسی کو بتایا ہے کہ وہ گاڑی کس کی تھی یا میرے بارے میں۔''

''ہاں۔ میرے چیخنے چلانے پر کسی نے پوچھا تھا۔

معلوم نہیں کون تھا۔“

”چلو کوئی بات نہیں۔ اب خاموشی سے واپس چلو۔ اس ٹریفک جام سے باہر نکلو۔ میں تمہیں دیکھ لوں گا تو سامنے آ جاؤں گا۔ ایک کام یہ کرو کہ راجا کو بتا دو۔ لیکن چھوڑو کوئی فائدہ نہیں، تم آ جاؤ۔“

میں سڑک سے دور تاریکی میں رہتے ہوئے آہستہ آہستہ واپس چل پڑا۔ رفتہ رفتہ مجھے اندازہ ہونے لگا تھا کہ میرے جسم کے کتنے حصے چوٹوں سے متاثر ہوئے ہیں۔ جیسے جیسے وقت گزرے گا سوجن اور درد میں اضافہ ہوگا۔ اس وقت رابعہ کا آنا بھی تائیدِ غیبی سے کم نہ تھا۔ وہ ٹریفک جام کی وجہ سے رکی اور اس کی نظر نے گاڑی کو دیکھ کے پہچان لیا ورنہ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ وہ کار کی پچھلی سیٹ پر آنکھیں بند کیے نیم دراز رہتی اور جائے حادثہ سے کچھ دیکھے بغیر ہی گزر جاتی۔

پیچھے رکنے والی کاروں کی قطار طویل ہوتی جا رہی تھی۔ ان میں سے کچھ ٹریفک کے رکنے کی وجہ جاننے کے لیے گاڑیاں بند کر کے آگے چلے گئے تھے۔ باقی گاڑیوں میں بیٹھے ہارن بجا رہے تھے اور کسی صورت آگے نکلنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ اس سے مزید بدنظمی پیدا ہو رہی تھی۔ آگے کچھ لوگوں نے رضاکارانہ طور پر ٹریفک رواں رکھنے کی ذمے داری قبول کرلی تھی۔ اس سے کچھ بہتری کے آثار پیدا ہو رہے تھے اور گاڑیاں جو رکی ہوئی تھیں آگے رینگنے لگی تھیں۔

تقریباً سو قدم چلنے کے بعد میری نظر نے رابعہ کو دیکھ لیا۔ وہ رکی ہوئی گاڑیوں کے درمیان وحشت زدہ نظروں سے دونوں طرف دیکھتی آگے بڑھ رہی تھی۔ کاروں میں بیٹھے ہوئے لوگ ضرور حیران ہوں گے کہ کسی گاڑی سے اتر کے بدحواس لڑکی واپس کہاں جا رہی ہے۔

جب میں نے اسے آواز دی تو رابعہ ایسے چونکی جیسے اس نے فائر کی آواز سنی ہو۔ پھر وہ دیوانہ وار میری طرف لپکی۔ اس نے آگے پیچھے کچھ نہیں دیکھا اور ایک کار سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ پولیس نے اب صورتِ حال پر قابو پا لیا تھا اور تماشا دیکھنے کے لیے رکنے والوں کو جائے واردات سے روانہ کر دیا تھا۔

میں نہیں چاہتا تھا کہ رابعہ کو وحشت اور دیوانگی میں کوئی مجھ سے لپٹ کر روتا دیکھے۔ کچھ نہ جاننے والوں کے لیے یہ ایک نیا تماشا ہوتا۔ سڑک سے دور کچے راستے پر درخت بھی تھے۔ پھر مجھے کسی پنکچر لگانے والے کا کیبن نظر آ گیا جو بند پڑا تھا۔ میں اس کی اوٹ میں رک گیا۔

رابعہ کچھ دور نمودار ہوئی تو میں نے پھر اسے آواز دی اور وہ میری طرف لپکی۔ مجھ سے چمٹ کر اس نے رونا شروع کیا اور اپنے ہاتھوں سے دیوانہ وار میرے چہرے کو، ہاتھوں اور جسم کو ٹٹولتی رہی۔ میں نے محسوس کیا کہ خوف کے اثر میں اس کا پورا وجود ہی کسی طوفان کی زد میں آئے ہوئے ناتواں شجر کی طرح کانپ رہا تھا۔

چند منٹ بعد جب اسے یقین آ گیا کہ مجھے کچھ نہیں ہوا ہے اور اس کے آنسو بھی تھم گئے تو میں نے اسے بتایا کہ کس طرح لاہور سے میرے پیچھے لگ جانے والی گاڑی کے ساتھ یہاں دوسری ویسی ہی گاڑی مل گئی تھی اور انہوں نے میری کار کو آگے پیچھے سے سینڈوچ کر دیا تھا۔

وہ بار بار چہرہ اوپر اٹھا کے کہتی تھی۔ ”اللہ تیرا شکر ہے۔“ اور ایک گہری سانس لیتی تھی۔ جس گاڑی میں وہ لاہور سے یہاں تک آئی تھی وہ اس کی ہدایت پر واپس لاہور کی طرف روانہ ہو چکی تھی۔ اس نے خیال نہیں رکھا اور گاڑی کافی آگے نکل گئی۔ میرے کہنے پر رابعہ نے اسے فون کر کے واپس بلایا تو وہ چند منٹ بعد نمودار ہوا۔

رابعہ نے اسے بلاوجہ ڈانٹا۔ ”تم کہاں سیدھے نکل گئے تھے۔“

اس نے آہستہ سے کہا۔ ”میں دیکھتا جا رہا تھا جناب۔“

”اچھا دیکھو۔ آگے دینہ میں کوئی اسپتال ہوگا۔“

ڈرائیور نے مجھے غور سے دیکھا۔ وہ مجھے پہچانتا تھا۔ ”آپ کو کیا ہوا ہے سر؟“

میں نے کہا۔ ”کچھ نہیں۔ تم چلو سیدھے ست بدھائی۔“

پولیس کے علاوہ اب بھی جائے حادثہ پر گاڑیاں رک رہی تھیں جن کو پولیس کے اہلکار سیٹیاں بجا کے اور ہاتھ کے اشارے سے آگے روانہ کرنے میں مصروف تھے۔

”آپ نے دیکھا سر۔ کیسا خوفناک ایکسی ڈنٹ تھا۔“ ڈرائیور نے توبہ کے انداز میں اپنے دونوں کان چھوئے۔ ”نہیں کس کی گاڑی تھی۔ یہ سمجھ نہیں آتی کہ بندہ کدھر گیا۔ اندر ہوتا تو اس کا حال بھی گاڑی جیسا ہوتا۔ لاش کے ٹکڑے ملتے۔“

رابعہ نے بگڑ کے کہا۔ ”تم سے کسی نے کہا ہے تبصرہ کرنے کو۔ خاموشی سے گاڑی چلاؤ۔“

میں نے رابعہ کا ہاتھ دبایا۔ ”گاڑی میں کوئی لاش نہیں۔“

ڈرائیور نے کہا۔ ”نہیں سر۔“

”کیا مطلب۔ گاڑی سڑک کے بیچ میں ایسے ہی کھڑی تھی۔“

”کچھ سمجھ نہیں آتی سر، بندہ جو گاڑی چلا رہا تھا کدھر گیا۔ جو لاش ڈکی میں ملی ہے......“

میں اچھل پڑا۔ ”ڈکی میں؟ ڈکی میں کوئی لاش تھی۔“

”جی سر۔ میں نے خود دیکھی۔ پولیس بھی کہتی ہے کہ وہ ڈرائیور نہیں ہوسکتا۔“

”پھر کون۔ وہ کس کی لاش ہے۔ میرا مطلب ہے...... مرد یا عورت؟“

”مرد ہے سر۔ تیس سال کا ہوگا۔ شلوار قمیص میں۔ ...صحت ہے۔ میں نے ایک پولیس افسر کو سنا۔ وہ بعد میں ...تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ کوئی گاڑی میں لاش لایا۔ گاڑی ادھر ...کے اتر گیا۔ لیکن یہ بات سمجھ میں نہیں آتی سر، گاڑی کو ...نے آگے سے بھی ٹکر ماری ہے اور پیچھے سے بھی۔ کوئی ...ہوگا۔ پہلے پیچھے سے ٹکرایا۔ پھر آگے گیا اور ریورس میں ...آیا۔“

میں نے کہا۔ ”وہ پولیس معلوم کر لے گی۔ لیکن معاملہ ...رار ہے۔“

رابعہ کے لیے میں یہ انکشاف انتہائی باعثِ تشویش ...اس نے میری طرف دیکھ کے آنکھوں اور ہاتھوں کے ...ے سے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے تو میں نے ہونٹوں پر ...رکھ کے اسے اشارہ کیا کہ فی الحال اپنی زبان بند رکھے۔ خود ڈرائیور کی بات پر چکرا گیا تھا کہ یا خدا۔ تعاقب ...کے مجھے مارنے کی اس کوشش سے پہلے ہی مجھے پھنسانے ...یک سازش کی جا چکی تھی جس کا مجھے کوئی علم نہ تھا۔

بظاہر ایک سازش دوسرے کی نفی کرتی تھی۔ اگر مجھے ...ی میں ہی کچل کر ہلاک کر دینے کا پلان بنا لیا گیا تھا تو ...ا ڈکی میں ایک لاش ڈال کے مجھے قتل کے الزام میں ...ار کرانے کی سازش کا کیا مطلب؟ اس سے میرے ذہن ...مزید سوالات جنم لیتے تھے۔

پہلا یہ کہ وہ لاش کس کی تھی؟

دوسرا یہ کہ کیا اسے میری گاڑی کی ڈکی میں ڈالنے ...لے دشمن الگ تھے جو اس بات سے بے خبر تھے کہ دشمنوں ...دوسرے گروہ نے میرا کام تمام کرنے کی ساری تیاری ...ی مکمل کر لی ہے چنانچہ ان کی ساری محنت رائگاں جائے ...جو انہوں نے کوئی لاش میری گاڑی میں ڈالنے کے لیے ...۔ یہ بھی کوئی آسان کام نہ تھا۔ پہلا مرحلہ لاش حاصل ...نے کا ہوگا۔ دوسرا میرا پیچھا کرنے کا اور تیسرا وہ موقع ...پا کرنے کا جب یہ لاش کامیابی سے میری گاڑی کی ڈکی ...منتقل کی جا سکے۔ نہ وہ پکڑے جائیں اور نہ مجھے پتا چلے۔

تیسرا سوال ان دشمنوں کی شناخت کا تھا۔ میں فرض ...کرسکتا تھا کہ میری گاڑی کو کریش کر دینے کا فرمان رانا نے جاری کیا ہوگا۔ اگرچہ میں اسے اتنا بے وقوف نہیں سمجھتا تھا۔ گاڑی میں لاش ڈالنے کی سازش کرنے والا دوسرا دشمن کون تھا؟ رابعہ کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے میں نے ایک جیسا حلیہ رکھنے والے دو افراد کو رابعہ کے توجہ دلانے پر دیکھا تھا۔ وہ باہر تک ہمارے پیچھے آئے تھے اور میرا یہ قیاس تھا کہ وہ گجر برادران ہیں۔

گجر برادران کو میرے قدیم اور مستند رقیب چودھری سلطان نے لوٹا تھا۔ وہ ایک بے ضمیر اور بے شرم لٹیرا تھا۔ جو فلمسازی کے جال میں پھنسا کے بے وقوف اور ہوس پرست دولت مندوں کو اسی طرح لوٹتا تھا جیسے بے وقوف اور شوقین مزاج لڑکیوں کی عزت کو۔ فریال پہلے اس کے جال میں پھنسی اور قسمت کی یاوری سے نکل گئی۔ میری محبت لندن میں اس کی محافظ رہی لیکن میں کئی سال بعد ست بدھائی واپس آیا تو فریال ایک بار پھر شامتِ اعمال سے خود اس کے دام میں گرفتار ہونے چلی گئی۔ وہ اب میری زندگی سے بھی نکل چکی تھی اور ہر گزرتے دن کے ساتھ رسوائی کے غار میں گرتی چلی جا رہی تھی۔

سلطان بالآخر گجر برادران کے قبضے میں آ گیا۔ بکرے کی ماں کب تک خیر مناتی۔ اس نے ان دونوں بھائیوں کو دوالیا کر کے چھوڑا۔ جیسے کہ وہ پہلے بہت سے لوگوں کو کر چکا تھا۔ وہ سلطان کو اغوا کر کے لے گئے۔ سلطان کے پاس کچھ نہیں بچا تھا کہ وہ ان کا نقصان پورا کرسکتا۔ باپ نے اسے جائداد سے محروم کر دیا تھا اور اپنا سب کچھ وہ پہلے ہی لٹا چکا تھا۔ اس کے نہ جانے کتنے قرض خواہ تھے جو اس کی جان کے دشمن تھے۔ ابھی تک یہ واضح نہیں تھا کہ سلطان کو گجر برادران نے اغوا کر کے قتل کر دیا یا وہ خود ان کے ڈر سے روپوش ہوگیا۔ اس کے بارے میں ایک افواہ یہ تھی کہ وہ بھاگ کے لندن چلا گیا تو دوسری یہ تھی کہ گجر برادران نے اسے رانا رجب علی کے حوالے کر دیا ہے تاکہ وہ اسے مار کے کہیں میرے علاقے میں گاڑ دے اور مجھے اس قتل کے الزام میں تختۂ دار تک پہنچا دے۔ پہلے ایسی ایک کوشش ناکام ہو چکی تھی۔

یہ عین ممکن تھا کہ میری گاڑی کی ڈکی میں جو لاش ڈالی گئی وہ چودھری سلطان کی تھی اور یہ کارنامہ خود رانا رجب علی نے سرانجام دیا۔ یا پھر ان گجر برادران نے جن سے میری کوئی دشمنی نہ تھی۔ یہ بڑا کنفیوز کر دینے والا خیال تھا۔ گجر برادران میرے قتل کی سازش بھی نہیں کر سکتے تھے اور مجھے قتل کے الزام میں پھنسانے میں بھی انہیں کیا دلچسپی ہوسکتی تھی۔ یہ دونوں کام ایک ہی دشمن کے نہیں تھے تو دوسرا دشمن کون تھا؟

جب میرے ذہن میں صوبائی وزیرِ داخلہ عجب خان کریلہ کا خیال آیا تو گاڑی حویلی میں داخل ہو چکی تھی۔ میں نروس بریک ڈاؤن کے قریب تھا۔ کسی بھی روڈ ایکسی ڈنٹ میں بچ جانے والے کی ذہنی کیفیت اس شخص سے مختلف نہیں ہوتی جو تختۂ دار پر پہنچے اور وارثوں کے طرف سے معافی مل جانے کے بعد زندہ سلامت اتر آئے۔ وہ موت کو بہت قریب سے دیکھتا ہے۔ اتنے قریب سے کہ اسے محسوس کرسکتا ہے۔

مجھے اب تک یقین نہیں آتا تھا کہ اتنے خوفناک حادثے کے بعد میں خیر و عافیت کے ساتھ ست بدھائی پہنچ گیا ہوں۔ تمام راستہ میں نے اپنے حوصلے پر خوف کو حاوی نہیں آنے دیا لیکن حویلی کے محفوظ حصار میں داخل ہوتے ہی میری ہمت جواب دے گئی۔ میں نے راجا کو دیکھا اور رابعہ کی آواز سنی۔ وہ میری طرف دوڑ کے آیا لیکن تب تک میں زمین پر ڈھیر ہو گیا تھا۔ یہ میرے دل میں چھپی ہوئی دہشت تھی جس نے مجھے مغلوب کر دیا تھا۔

راجا مجھے نیم بے ہوشی کے عالم میں اٹھا کے اندر لے گیا۔ ''ٹیکے پتر یہ کیا ہوا۔ تو ٹھیک ہے نا، رابعہ...... تم بتاؤ۔''

رابعہ کے کچھ بولنے سے پہلے میں نے اسے روک دیا۔ ''ابھی بتاتا ہوں میں راجا۔ ہنگامہ کرنے کی ضرورت نہیں۔''

راجا مجھے اپنے کمرے میں لے گیا اور بستر پر لٹا دیا۔ ''شہناز کہاں ہے؟'' اس نے رابعہ سے پوچھا اور پھر خود دروازہ کھول کے اسے آوازیں دینے لگا۔

میں نے کہا۔ ''رابعہ، تم نے ماجد خان کے ڈرائیور کو رخصت کر دیا؟''

رابعہ نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''وہ پوچھ رہا تھا کہ نواب صاحب کو کیا ہوا مگر میں نے کچھ نہیں بتایا۔''

''بہت اچھا کیا۔ یہاں بھی ہر ایک کو بتانے کی ضرورت نہیں۔''

راجا نے کہا۔ ''پہلے تو کپڑے بدل لے۔ اٹھ ہمت کر۔''

میں نے اپنے کپڑوں کو دیکھا۔ ''ہاں۔ یہ تو سب مٹی میں بھر گئے ہیں اور پھٹ بھی گئے ہیں۔''

واش روم میں پہنچ کے میرا ارادہ بدل گیا۔ صرف ہاتھ منہ دھونے کے بجائے میں نے بہتر سمجھا کہ گرم پانی سے غسل کرلوں تاکہ پورا جسم صاف ہو جائے۔ میں باہر نکلا تو ڈاکٹر شہناز اور احمد حسن پر مشتمل میڈیکل ٹیم میرا چارج لینے کے لیے تیار تھی۔ انہوں نے اِدھر اُدھر سے مجھے دبا کے دیکھا اور مختلف سوالات کرتے رہے۔ بالآخر انہوں نے اعلان کیا کہ تشویش کی کوئی بات نہیں۔ چوٹیں اور خراشیں ہیں لیکن فر[illegible] کوئی نہیں ہے۔

مجھے کھانے کی قطعی خواہش نہیں تھی۔ فرمائش پر میرے لیے کافی اور سینڈوچ لے آئی۔ اتنی دیر میں شہناز مجھے تین انجکشن لگا دیے تھے۔ ایک کے بارے میں اس بتایا کہ یہ اے ٹی ایس ہے۔ دوسرا انجکشن درد کا اث[illegible] مٹانے کے لیے تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ فوری آرام اور [illegible] دینے کے لیے وہ مجھے خواب آور انجکشن لگا دے گی جب[illegible] میں ابھی سونا نہیں چاہتا تھا چنانچہ ہر انجکشن پر میں اس سوال کرتا تھا کہ یہ کیا ہے۔

تیسرے انجکشن کے بارے میں میرے سوال [illegible] چڑ گئی۔ ''ڈاکٹر تم ہو یا میں۔ تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

احمد حسن نے مسکرا کے کہا۔ ''یہ اینٹی بایوٹک ہے۔''

میں نے کہا۔ ''نیند کا انجکشن مت لگانا۔ مجھے با[illegible] کرنی ہیں۔''

''باتیں صبح کر لینا۔ نیند کا انجکشن تو پہلا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''تم نے تو کہا تھا......''

شہناز نے میری بات کاٹ دی۔ ''جھوٹ بولا تھا میں [illegible]''

میں نے کہا۔ ''راجا۔ پولیس کو معلوم ہو جائے گا [illegible] گاڑی میری تھی۔''

''اس میں وقت لگے گا۔ تفتیش کل شروع ہوگی۔ یہاں تک پہنچے بھی تو کل شام سے پہلے نہیں آئیں گے۔''

''راجا صاحب۔ ہماری پولیس کی کارکردگی ایکسی لریٹر سے بڑھتی ہے اسے کنٹرول کرنے والے ہمار[illegible] دوست نہیں ہیں۔ جو مجھے مارنے یا پھنسانے کے لیے پرفیکٹ پلاننگ کرتے ہیں۔ انہوں نے کوئی کام بھی اتا[illegible] پن سے نہیں کیا ہوگا۔ کوئی ذمے داری کسی اناڑی کے نہیں کی ہوگی۔''

''آج کی کارروائی ہمارے دو مشترکہ دشمنو[illegible] مشترکہ کوشش کا نتیجہ تھی۔''

''دشمن ضرور مشترک ہیں لیکن کارروائی با[illegible] اشتراک سے نہیں کی گئی۔ ورنہ ایک گرفتار کرائے اور د[illegible] عدم آباد روانہ کرنے کی سازش نہ کرتا۔ ایک نے کچھ دوسرے نے کچھ اور۔''

''آخر وہ کون ہیں۔ ایک رانا اور دوسرا......؟''

میں نے کہا۔ ''یہ بھی معلوم ہو جائے گا۔ ابھی ہمیں سوچنا چاہیے کہ ان کا اگلا قدم کیا ہوگا۔ شاید اب تک انہیں اطلاع پہنچا دی گئی ہوگی کہ کام تو ہم نے آپ کی ہدایات مطابق کیے تھے اور کسر کوئی نہیں چھوڑی تھی لیکن مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہوئے۔ معلوم نہیں کیسے وہ نواب کا نطفہ بچ کے نکل گیا۔ وہ گاڑی میں تھا لیکن حادثے کے بعد اس کی لاش گاڑی میں سے نہیں ملی۔ نہ وہ کہیں زخمی پڑا ہوا پایا گیا حالانکہ اس کے بچ جانے کا امکان ایک فیصد بھی نہیں۔ اندر ہی اس کا قیمہ بن جاتا مگر وہ بھوت کی طرح غائب ہو گیا۔ لگتا ہے گاڑی ریموٹ کنٹرول سے ڈرائیور کے بغیر چل رہی تھی۔ دوسرے دشمن کو اس حادثے کی خبر نہیں۔ اس نے یہ بندوبست کیا تھا کہ کوئی لاش میری ڈکی میں۔''

''ٹیکے پتر کوئی لاش نہیں۔ سلطان کی لاش۔''

''رائٹ۔ سلطان کی لاش۔ ست بدھائی کی حویلی میں پہنچ جائے۔ مجھے بالکل خبر ہی نہ ہو اور اچانک پولیس پہنچ کے لاش برآمد کر لے۔''

راجا نے سوچ کے سر ہلایا۔ ''تیرا مطلب ہے۔ پولیس ابھی آسکتی ہے کسی بھی وقت۔''

''شاید اب نہ آئے۔ اگر کسی کو میرے پیچھے لگایا گیا ہوگا تو اس نے بھی یہ خبر آگے.... پہنچا دی ہوگی کہ جس کی گاڑی میں لاش ڈالی تھی وہ تو خود لاش بن گیا۔ ایک حادثے میں اس کی گاڑی چکنا چور ہو گئی۔ یک نہ شد دو شد۔ ایک لاش ڈکی میں ہے، دوسری اندر۔ اور گاڑی پولیس کے قبضے میں ہے، ست بدھائی نہیں پہنچی۔ چنانچہ میرا خیال ہے کہ پولیس صبح اس حادثے کی اطلاع دینے اور یہ معلوم کرنے آئے گی کہ نواب رفیق نہ اس دنیا میں ہیں نہ دوسری دنیا میں تو پھر کہاں ہیں۔''

''اور آپ کہاں ہیں نواب صاحب قبلہ۔''

میں نے کہا۔ ''ہم لاپتا ہیں بقول مرزا غالب۔ ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی۔ یہ ایک صورت ہے۔''

راجا نے اس بات کی گہرائی پر غور کیا اور سر ہلایا۔ ''اور دوسری؟''

''دوسری یہ کہ ہم پولیس کے سامنے ہنستے کھیلتے چاق و چوبند صحت مند اور سو فیصد فٹ نمودار ہوں۔ ایسے کہ وہ دم بخود رہ جائیں۔ جب وہ حادثے کی بات کریں تو ہم کہیں کہ حادثہ؟ کیسا حادثہ۔ ہم کہیں گئے ہی نہیں تو حادثہ کیسا۔ ہم آپ کے سامنے ہیں۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ ہم سے ایک مکھی بھی نہیں ٹکرائی۔ اس کے بعد سوال اٹھے گا ہماری گاڑی کا۔ اسے حادثہ کیسے پیش آیا۔ حادثے کے وقت اسے کون چلا رہا تھا۔ تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک گاڑی کل چوری ہو گئی تھی۔ چور ہی چلا رہا ہوگا۔''

راجا نے شاباشی کے انداز میں میرے کندھے پر ہاتھ مارا۔ ''تجھے بڑا فائدہ ہوا اس حادثے سے۔ تیرا دماغ سیٹ ہو گیا۔''

میں نے چلا کے کہا۔ ''ہاں۔ مگر کندھا اتر گیا۔''

اب غنی کو طلب کیا گیا۔ سارا معاملہ سن کے اس نے دکھی لہجے میں کہا۔ ''سوری سر۔ میں اب مزید آپ کی کوئی خدمت نہیں کر سکتا۔''

''وہ کیوں۔ تم کہیں جا رہے ہو؟''

''میں استعفیٰ دے رہا ہوں۔ ابھی اسی وقت سے۔''

''میں اپنا سوال دہراتا ہوں۔''

''آپ مجھے کوئی اور ذمے داری سونپ دیں۔ مجھے مالی رکھ لیں۔ اسپتال میں جھاڑو دینے کے لیے یا کوے اڑانے پر۔'' وہ پھٹ پڑا۔ ''یہ کام میں نہیں کر سکتا جس کے لیے آپ نے مجھے رکھا ہے۔ میں خاک چیف سیکیورٹی افسر ہوں میں کوئی سیکیورٹی نہیں دے سکتا۔ آپ کا جو دل چاہتا ہے کرتے ہیں۔ جب کچھ ہو جاتا ہے تو مجھے بلا کے شرمندہ کرتے ہیں۔''

راجا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''آج تم واقعی غصے میں ہو مسٹر غنی لیکن تمہیں اس کا حق ہے۔''

''چلو ناراضی چھوڑو۔ آئندہ وہی ہوگا جیسا تم کہو گے۔ لیکن ابھی ایک ایمرجنسی ہے۔ پہلے یہ مسئلہ حل کرو۔ تمہیں معلوم ہے کہ ہمارے علاقے کی پولیس چوکی کے انچارج صاحب کہاں رہتے ہیں۔''

''سر۔ آپ نے اسے زمین دی تھی۔ اس نے اپنا مکان بنا لیا ہے اس سال کے آخر تک وہ ریٹائر ہو جائے گا۔ کہتا ہے اس کے بعد آپ کی خدمت کے لیے یہیں رہے گا۔''

ملازمت کے آخری دور میں کچا تھانیدار بن جانے والا اب بھی امید رکھتا تھا کہ نواب صاحب کی سفارش سے وہ پکا ہو جائے گا۔ یہ قطعہ زمین جس پر اس نے اپنا مکان کھڑا کر لیا تھا اسی کچے تھانیدار نے ایک موقعے پر مجھ سے رشوت بھی وصول کی تھی۔ لانچ میں وہ غنی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کے آگیا۔

مودبانہ مصافحے کے بعد اس نے کانپتے ہوئے کہا۔ ''سردی بڑی ہے جناب عالی۔ دو روز سے تپ بھی چڑھ رہا تھا۔ گھر والی نے بہت روکا کہ جان کی بازی مت لگاؤ لیکن میں نے کہا کہ نواب صاحب نے یاد کیا ہے تو میرا فرض ہے...... اگر چائے کی ایک گرم گرم پیالی مل جائے۔''

میں نے کہا۔ ''سب کچھ ملے گا اور تم جیسے فرض شناس

افسروں کو بچانے کے لیے ہم نے اتنا بڑا اسپتال قائم کیا ہے۔ دو ڈاکٹرز موجود ہیں اس وقت بھی۔"

"حکم کریں جناب عالی۔"

راجا نے ایک باکمال ایڈیٹر کی طرح واقعے کی سنگینی کو انتہائی کم کرکے اور خاطر مدارات میں خوب اضافہ کرکے اس کچے تھانیدار کو ہماری مرضی کے مطابق حادثے کی رپورٹ لکھنے کے لیے آمادہ کیا۔ چائے کے ساتھ دیگر لوازمات سے اپنے پیٹ کا تنور بھرتے ہوئے اس نے ساری بات سنی اور ایسی پُرتشویش نظروں سے دیکھتا رہا جیسے راجا کسی دہرے تہرے قتل کی لرزہ خیز واردات کا اعتراف کر رہا ہو۔

بالآخر اس نے کہا۔ "اگر جی ٹی روڈ پر حادثہ پیش آیا ہے تو پھر یہ ہائی وے پولیس کی ذمّے داری ہے۔"

راجا نے کہا۔ "ہم نے تمھیں حادثے کی رپورٹ لکھنے نہیں بلایا ہے۔ تمھیں چوری کی رپورٹ لکھنی ہے۔"

"چوری کی رپورٹ؟ کس کے خلاف؟"

"کسی کے خلاف نہیں۔ یہ بتاؤ کہ تمہارے ریکارڈ میں آخری واردات کی رپورٹ کب لکھی گئی تھی۔"

اس نے عیاری سے کام لیا۔ "جناب عالی۔ میری یادداشت کچھ کام نہیں کر رہی ہے۔"

"اوہو۔ یہ تو بڑا برا ہوا۔ ابھی سے یہ حال ہے تو ریٹائرمنٹ کے بعد کیا ہوگا۔ ہم تو سوچ رہے تھے کہ تمہاری خدمات سے فائدہ اٹھائیں۔" میں نے افسوس سے کہا۔

راجا نے موبائل فون اٹھاتے ہوئے غنی کی طرف دیکھا۔ "غنی۔ تھانیدار صاحب کو واپس چھوڑ آؤ۔ میں کسی اور سے بات کرتا ہوں، ایک چوری کی رپورٹ کا کیا ہے کہیں بھی لکھوائی جاسکتی ہے دس بیس ہزار میں۔"

تھانیدار نے جلدی سے کہا۔ "سر۔ میں نے انکار تو نہیں کیا میرا مطلب تھا روزنامچہ میں ساتھ ہی لایا تھا مگر گاڑی میں پڑا رہ گیا۔ ابھی دیکھ لیتا ہوں۔"

اس کے بعد معاملات آسان ہوگئے۔ روزنامچے میں آخری اندراج ایک بھینس کی چوری کا تھا جس کو چھتیس گھنٹے ہوگئے تھے۔ تھانیدار نے ہماری حسبِ منشا کار کی چوری کی رپورٹ پر ایک گھنٹے بعد کا وقت لکھا۔ گویا حادثہ کار کی چوری کی رپورٹ درج ہونے کے تقریباً چھتیس گھنٹے بعد پیش آیا۔ اس سے تاریخ میں دو دن کا فرق پڑ گیا۔ جیب میں نقد دس ہزار ڈال کے اور بعد از ریٹائرمنٹ ملازمت کے وعدے پر خوش ہوکے جانے والے تھانیدار کو کیسے اندازہ ہوسکتا تھا کہ معاملہ صرف ایک کار کے چوری ہونے کا نہیں۔ اس سے کہیں زیادہ سنگین ہے۔

احمد حسن تو میری حالت کی طرف سے مطمئن ہو سونے چلا گیا تھا لیکن رابعہ مصر تھی کہ وہ تمام رات میر سرہانے گزارے گی۔ جسے اندیشہ ہے کہ نہ جانے اچانک سورہ یٰسین کی تلاوت کا وقت آجائے۔ شہناز دلائل کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ خود شہناز اس موقعے انتظار میں تھی جب وہ بے خبری میں مجھے نیند کا انجکشن گھو دے اور بالآخر اس نے جھوٹ بول کے ایسا ہی کیا۔

صبح میں اٹھا تو بہت تازہ دم تھا۔ میرے جاگنے کی پاتے ہی ڈاکٹر اور تیمار دار سب آگئے۔ میرے جسم میں درد تھا اور ہاتھ پیر ہلانے سے بڑھ جاتا تھا۔ ناشتا میں سب کے ساتھ کیا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ راجا نے شہناز ساتھ مل کر کیا پلان بنایا ہے۔ ناشتے سے فراغت ہوئی خواتین نے مجھے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کرسی پر بٹھا کے میک اپ شروع کیا۔

میں نے احتجاج کیا۔ "جب میں پہلے ہی اتنا حسی وجمیل ہوں تو میرے ساتھ وہ سلوک کیوں ہو رہا ہے جو ا بدصورت دولہا کے ساتھ ہوتا ہے۔"

"وہ جو تجھے دیکھنے کے لیے آنے والے ہیں فیکے پتر اور کسی بھی وقت نازل ہوسکتے ہیں۔ وہ تیری صورت ہی دیکھیں گے۔ تیری صورت پر ایک داغ بھی نہیں ہونا چاہیے۔"

اس کی بات غور کرنے پر میری سمجھ میں آگئی۔ ثریا را اور شہناز پر مشتمل ماہرین کی ایک ٹیم نے بڑی محنت سے میرے چہرے کو بالکل صاف کردیا۔ خراشوں کے سارے نشان اور نیل ایسے مٹ گئے جیسے کبھی تھے ہی نہیں۔ میں نے بعد میں راجا کی دوراندیشی کی بڑی داد دی۔ عین وقت پر یہ بھی نہیں ہوسکتا تھا اور میرا چہرہ اصل حالت میں نظر آتا حادثے کی تمام علامات کی تصویر ہوتا۔

پولیس حسبِ توقع بڑے طمطراق سے آئی۔ اپنی دانست میں وہ بہت جلدی آئے تھے۔ خصوصی حالات پیدا کرنے والوں نے تفتیش کے لیے یہی خصوصی ٹیم کی تشکیل ضروری سمجھی تھی اور اس میں اپنے خاص بندے شامل کیے تھے۔ ان کے استقبال کی پوری تیاری تھی۔ ایک نیا ایس پی اس ٹیم کی قیادت کر رہا تھا جس نے ست بدھائی کا نام تک نہیں سنا تھا اور اسے یہ بھی بتایا گیا تھا کہ وہ کوئی نواب نہیں۔ اتفاق سے جاگیردار بن جانے والا مڈل کلاس کے ایک پروفیسر کا بیٹا ہے جس نے چند مصاحب اکٹھے کرلیے ہیں جو اسے نواب صاحب کہتے ہیں۔ ولایت سے پڑھ کے لوٹا ہے

...نا ہے اس کے دماغ میں یہ خناس سمایا ہے کہ اس علاقے کو ...نی دے کر لوگوں کی قسمت بدل دے۔

ایس پی کی رعونت کو پہلا صدمہ اس وقت پہنچا جب ...ں کی ہر دھمکی اور ہنگامہ آرائی کے باوجود گارڈ نے رعب ...ں آ کے دروازہ کھولنے سے انکار کردیا۔ وقت کے ساتھ وہ ...ی پکے ہوگئے تھے اور غنی نے بھی یہ سیکھ لیا تھا کہ ایسے فرعون ...فت افسروں سے ڈیل کرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے۔ پھر یہ ...سی غریب کے گھر کا وہ دروازہ نہیں تھا جسے پولیس والے ...نے بوٹ کی ٹھوکروں اور دھکوں سے گرا کے دندناتے ہوئے ...در گھس جاتے ہیں اور کسی کتاب میں درج چادر اور چار ...یواری کے تحفظ کا قانون بے اثر رہتا ہے۔ حویلی کے بلند ...بالا اور مضبوط گیٹ سے سر ٹکرا کے خود ایس پی صاحب کا ...رور پاش پاش ہوا۔

جب گیٹ کھولا گیا تو پہلے ایس پی صاحب کی جیپ ...در آئی جس میں وہ ڈرائیور کے ساتھ آگے بیٹھا ہوا تھا اور ...ں کے پیچھے دو گارڈ تھے جو پوری طرح مسلح تھے۔ اس کے ...یچھے دوسری جیپ میں بھی چار مسلح کانسٹیبل سوار تھے لیکن غنی ...نے اسے اندر نہیں آنے دیا۔ ایس پی صاحب کو اس کا علم اندر جانے کے بعد ہوا۔ پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق ...ں کا استقبال راجا نے کیا۔

"میں نواب صاحب کا پی آر او ہوں۔" راجا نے کہا۔

ایس پی نے چیں بہ چیں ہوکے اسے گھورا۔ "مجھے کسی ...آر او سے نہیں۔ رفیق احمد شیرازی سے ملنا ہے۔"

"آپ نواب صاحب سے کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں۔"

"نواب صاحب؟ کون نواب صاحب۔ میں نے سنا ...ہے کہ وہ شخص خود کو نواب کہتا ہے کس نے بنایا ہے اسے ...اب۔" ایس پی نے کہا۔

"وہ خاندانی نواب ہیں اور نہ ہوتے تب بھی یہ ...رے سوال کا جواب نہیں ہے ایس پی صاحب۔" راجا نے ...ت لہجے میں کہا۔ "کام بتائیے اپنا۔"

"مجھے ایک تفتیش پر مامور کیا گیا ہے۔ ایک حادثے ...ر ایک قتل کے کیس میں۔ میں انہیں گرفتار بھی کرسکتا ہوں۔"

"گرفتاری کا وارنٹ ضرور ہوگا آپ کے پاس۔"

"مجھے تفتیش کے لیے کسی وارنٹ کی ضرورت نہیں۔ ...تمھیں بھی گرفتار کرسکتا ہوں مسٹر پی آر او۔"

"کس جرم میں؟"

"سرکاری کام میں مداخلت۔ ادائے فرض سے روکنا۔ ...اپنے اور تمہارے سیکیورٹی گارڈ نے پولیس کا مقابلہ کیا ہے۔"

"ایس پی صاحب۔ کسی خوش فہمی میں نہ رہیں۔ یہاں آپ سے پہلے بھی کئی ایس پی آئے اور چلے گئے۔ اندر آنے کے لیے آپ کے پاس خانہ تلاشی کا وارنٹ نہ ہو تو ہمارے سیکیورٹی گارڈ آپ کو روکنے کا حق رکھتے ہیں۔ یہ گارڈ حویلی میں رہنے والوں کی حفاظت کے لیے رکھے ہیں۔"

"اپنی حفاظت کے لیے پرائیویٹ آدمی رکھنا بھی جرم ہے۔"

"آپ واپس جا کے اس کی رپورٹ کردیں۔ ویسے آپ دیکھ سکتے ہیں کہ ان میں سے کسی نے یونیفارم نہیں پہنی ہے۔ ان کے پاس جو اسلحہ ہے وہ لائسنس یافتہ ہے اور یہ نواب صاحب کے ملازم ہیں۔ حفاظت کے لیے یا ذاتی ضرورت کے لیے ملازموں کی تعداد پر کوئی پابندی ہے تو بتائیں۔"

ایس پی سخت طیش میں تھا مگر راجا نے اسے ایک ہی جگہ روک رکھا تھا اور بحث میں مصروف تھا۔ طے شدہ پروگرام کے مطابق ایس پی کو اندر آنے کی اجازت دینے سے پہلے اندر کا پورا سین بدل دیا گیا تھا۔ لان ایک کرکٹ گراؤنڈ نظر آتا تھا۔ میں اس طرف وکٹوں کے سامنے کھڑا بیٹنگ کر رہا تھا جہاں جیپ کو روکا گیا تھا چنانچہ میں راجا اور ایس پی کی ساری گفتگو سنتا رہا تھا۔ میرے سامنے بہت سے فیلڈر تھے۔ ان میں غنی کے علاوہ ڈاکٹر مہدی حسن اور ان کا بیٹا شامل تھے۔ چوتھا مرد راجا تھا۔ باقی خواتین تھیں یعنی ڈاکٹر شہناز، رابعہ، ثریا اور ریشم۔ غنی بالنگ کرا رہا تھا اور میں شاٹس لگا کے رن بنانے کے لیے دوڑ رہا تھا۔ گراؤنڈ میں ایک ہنگامہ بپا تھا۔

بالآخر ایس پی نے مفاہمانہ رویہ اختیار کرنا بہتر سمجھا۔ "پی آر او صاحب۔ آخر نواب رفیق ہیں کہاں آپ انہیں مطلع تو کریں۔"

راجا نے میری طرف اشارہ کیا۔ "یہ آپ کے سامنے اور کون ہے۔ لیکن ان سے ملنے کے لیے آپ کو کچھ انتظار کرنا پڑے گا۔ آپ کسی اپائنٹمنٹ کے بغیر آئے ہیں۔"

ایس پی نے بے یقینی سے کہا۔ "یہ۔ نواب رفیق ہیں؟"

"آپ کو شک ہے؟ ابھی آپ ان سے ملیں گے تو یقین آجائے گا۔ ابھی وہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ ہیں۔ آپ اندر مہمان خانے میں تشریف رکھیں۔ میں نواب صاحب کو مطلع کرتا ہوں۔"

ایس پی نے پہلے آنے والوں کی طرح خود کو سخت بے بس اور احمق محسوس کیا۔ اپنے ماتحتوں کے سامنے اس کی پوزیشن بھی خراب ہوجاتی اور اس صورتِ حال سے پھوں پھاں کے بجائے بردباری اور وقار سے نمٹنا ہی بہتر تھا۔

اسے کیسے اندازہ ہوسکتا تھا کہ یہاں ایک قلعہ نما حویلی کے اندر بھی ایوانِ صدر جیسا پروٹوکول ملے گا اور اس کی افسری نہیں چلے گی۔

میرا خیال ہے مجھے کرکٹ کھیلتا دیکھ کے اسے حیرانی کا سخت دھچکا لگا۔ وہ ایک خوفناک قسم کے حادثے کی تفتیش کرنے آیا تھا جس کے بارے میں اسے بتایا گیا ہوگا کہ کار کو نواب رفیق چلا رہا تھا لیکن نہ جانے کیسے وہ مرنے سے بچ گیا اور نکل کے بھاگ جانے میں کامیاب رہا کیونکہ وہ اپنی کار میں ایک لاش بھی کہیں ڈسپوزل کے لیے لے جارہا تھا۔ ایس پی کو یقین ہوگا کہ جائے واردات سے فرار ہو کے نواب حویلی پہنچ بھی گیا ہوگا تو رات بھر میں مرگیا ہوگا۔ نہیں مرا ہوگا تو قریب المرگ ہوگا یا ٹوٹی ہوئی ہڈیوں اور شکستہ جسم کے ساتھ خون آلود پٹیوں میں لپٹا پڑا ہوگا۔

یہاں نواب رفیق احمد شیرازی کرکٹ کھیل رہا تھا۔ وہ کرکٹ کیا تھی فیملی کا مشغل تھا لیکن وہ منہ زور گھوڑے کی طرح دوڑ رہا تھا اور ہنسا بھی رہا تھا۔ میرا ہنسنا اور شور مچانا اسے ایسا ہی لگا ہوگا اور چونکہ وہ مجھے پہچانتا نہیں تھا اس لیے ایس پی کے دماغ میں یہ شک آمیز خیال بھی پیدا ہوا ہوگا کہ کہیں اس کی آنکھوں میں دھول تو نہیں جھونکی جارہی ہے؟ کسی ایرے غیرے کے لیے تو نہیں کہا جارہا ہے کہ وہ نواب رفیق ہے؟

راجا نے اسے مہمان خانے میں بیٹھ کر انتظار کرنے پر مجبور کردیا۔ آدھے گھنٹے تک حویلی کی روایات کے مطابق خاطر داری کا ڈراما چلا کر حویلی کی شان وشوکت پہلے ہی اسے متاثر کرچکی تھی۔ خادموں اور کنیزوں سے وہ مزید مرعوب ہوا اور جب بالآخر نواب صاحب یعنی میں نے قدم رنجہ فرمایا تو ایس پی کے غبارے کی ہوا نکل چکی تھی اور اسے یقین آگیا تھا کہ اسے غلط بتایا گیا تھا۔ نواب رفیق سچ مچ ایک خاندانی قسم کا نواب تھا۔

جب راجا میرے استقبال کے لیے اٹھا تو ایس پی کو بھی اٹھنا پڑا۔ نیا وہ اس علاقے میں تھا ورنہ اس کی عمر پینتالیس سال سے زیادہ ہی تھی چنانچہ صحیح معنی میں وہ گرگ باراں دیدہ تھا۔ میں نے بڑے باوقار انداز میں اس سے مصافحہ کیا اور حاکمانہ شائستگی کے ساتھ اس کی خیروعافیت دریافت کی۔

''آپ.....آپ ہی نواب رفیق احمد شیرازی ہیں۔'' اس نے اپنے استعجاب پر قابو پاکے پوچھا۔

میں نے مسکرا کے راجا کی طرف دیکھا۔ ''بھئی راجا صاحب۔ یہ کیا ماجرا ہے؟ جو پہلی بار ملتا ہے مانتا ہی نہیں کہ ہم ہی نواب رفیق ہیں۔ کیا ہماری صورت ایسی نہیں یا ہم کوئی کمین نظر آتے ہیں۔''

ایس پی بوکھلایا۔ ''سوری سر۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا راجا صاحب نے مجھے بتادیا تھا کہ یہ آپ کے پی آر او ہیں۔''

''آپ یہاں نئے ہیں اس لیے راجا صاحب کو بھی نہیں جانتے ہوں گے۔ بھئی یہ بڑے توپ قسم کے صحافی ہیں۔ اگر کالم لکھ دیں کسی کے خلاف تو سمجھو اس کا خانہ خراب۔''

ایس پی نے فوراً گفتگو کو مختصر کردیا۔ ''نواب صاحب کچھ عجیب ہی معاملہ ہے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ گزشتہ شب آپ کہاں تھے؟''

میں نے پھر راجا کی طرف دیکھا۔ ''صرف یہ پوچھنے آئے ہیں ایس پی صاحب اتنی دور..... فون پر پوچھ لیتے۔''

''نواب صاحب حویلی میں ہی تھے اور کہاں۔'' راجا نے کہا۔

ایس پی نے سر جھٹکا۔ ''میرے پاس ایک رپورٹ ہے کہ آپ کل لاہور میں تھے، کسی خاتون کے ساتھ۔ اور سیاہ رنگ کی ہنڈا سوک تھی۔''

''سیاہ رنگ کی ہنڈا سوک؟'' راجا نے چونکنے کی اداکاری کی۔

''جی۔ اس کا جی ٹی روڈ پر انتہائی سنگین قسم کا ایکسیڈنٹ ہوا۔ غالباً کسی ٹرک نے اسے پیچھے سے ٹکر ماری۔ گاڑی آگے بھی ٹرک ہی ہوگا۔ وہ دونوں طرف سے چورا ہوگئی۔''

راجا نے پُرتمسخر انداز میں پوچھا۔ ''اور نواب صاحب بھی اس میں تھے، ایک خاتون کے ساتھ۔ پھر ان دونوں لاشوں کا کیا ہوا؟''

ایس پی نے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''یہی کمال ہے۔ لاش کوئی نہیں ملی۔''

''کیا لاشیں فرار ہوگئیں؟'' راجا بولا۔

ایس پی نے اسے گھورا۔ ''اس میں مذاق کی کوئی بات نہیں ہے۔''

''میرے خیال میں یہ انتہائی احمقانہ مذاق ہے کچھ نہیں کہ آپ نواب صاحب سے تفتیش کے لیے آئے ہیں۔ نواب صاحب آپ کے سامنے بیٹھے ہیں۔ کوئی خراش بھی ہے ان کے جسم پر کہیں؟ آپ نے انہیں کرکٹ کھیلتے بھی دیکھا۔''

''یہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔''

''جو کسی معمولی حادثے میں بھی زخمی ہو۔ کیا وہ تندرست نظر آتا ہے؟ اب رہی بات خاتون کی۔ ذرا اس کی وضاحت فرمایئے۔'' راجا بولا۔

''آئی ایم سوری۔ ان کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں۔ وہ لاہور سے ساتھ ہی روانہ ہوئی تھیں۔ ممکن ہے راستے میں کہیں اتر گئی ہوں مگر ایک سنگین مسئلہ اور بھی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''راجا صاحب کیا آپ نے انہیں بتایا کہ ہماری وہ سیاہ ہنڈا سوک پرسوں چوری ہوگئی تھی، بلکہ ایک دن پہلے...... اور ہم نے اس چوری کی رپورٹ لکھوانے کے لیے بھی کہا تھا۔''

غنی نے کہا۔ ''سر رپورٹ تو لکھوادی گئی تھی۔''

میں نے کہا۔ ''گویا کوئی چور تھا جو ہماری کار میں کسی خاتون یا اپنی زوجہ کے ساتھ تھا اور حادثے کے بعد وہ دونوں بھاگ گئے۔ ایس پی صاحب آپ کو یہاں آنے کی زحمت ہوئی۔ اب آپ اس چور کو تلاش کریں اور جو پوچھنا ہے اس سے پوچھیں۔''

ایس پی سخت پریشان ہوا۔ ''کار کے چوری ہونے کی وہ رپورٹ کہاں ہے؟ میں دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''اس کی نقل تو نہیں ہوگی ہمارے پاس۔ کوئی ضرورت نہیں تھی لیکن منگوائی جاسکتی ہے۔'' میں نے کہا۔

راجا نے کہا۔ ''آپ کے خصوصی اختیارات ہیں تھانیدار کو بلوالیں۔ وہ روزنامچہ ساتھ لے آئے۔''

''معلوم نہیں یہ کیا چکر ہے۔ مجھے یہاں تفتیش کے لیے کیوں بھیج دیا گیا۔'' ایس پی کی خفت اب غصے میں بدل رہی تھی۔ ''ساری رپورٹس غلط ہیں۔''

راجا نے کہا۔ ''یہ سب سیاسی چکر ہوتے ہیں ایس پی صاحب آپ کی کافی سروس ہے۔ کیا آپ کو اندازہ یا تجربہ نہیں۔''

''مجھے تو خاص طور پر صبح لاہور سے طلب کیا گیا تھا اور یہ خصوصی تفتیش میرے سپرد کردی گئی۔ مجھے زیادہ سمجھنے کے لیے وقت ہی نہیں ملا۔ مجھ سے کہا گیا کہ...... خیر چھوڑیں، واپس جاتے ہوئے میں وہ رپورٹ دیکھ لوں گا جو آپ نے کار کی چوری کے سلسلے میں درج کرائی تھی۔ ایک آخری بات۔''

میں نے کہا۔ ''اس کی آخری بات سے پہلے میں جاننا چاہتا ہوں کہ آپ کو میرے بارے میں کیا بتایا گیا تھا۔''

ایس پی کچھ دیر سوچتا رہا۔ ''ظاہر ہے وہ سب غلط تھا۔ اوپر والے ایسا کرتے ہیں۔ نیچے والے حکم کے پابند ہوتے ہیں۔ انہیں استعمال کیا جاتا ہے۔ بعد میں خرابی ہو تو اوپر والے بری الذمہ۔ پھنس جاتے ہیں نیچے والے۔ احکامات سب زبانی دیتے ہیں۔ ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ لکھ کر دیں۔''

''ایس پی صاحب۔ یہ ابھی تک واضح نہیں ہوا کہ میری گرفتاری کا حکم دینے والا کون تھا۔ اور میرا جرم کیا تھا اگر میری کار جائے حادثہ میں تباہ ہوئی۔ میں لاہور سے کسی خاتون کے ساتھ آرہا تھا اور حادثے کے بعد اس خاتون کے ساتھ کہیں غائب ہوگیا۔ تو اس میں خلافِ قانون کیا ہے کارروائی ہونی چاہیے ان کے خلاف جنہوں نے کار کو تباہ کیا۔ آپ کہتے ہیں ٹرک ہوں گے۔ اگر انہوں نے ٹکر مار کے دانستہ کار کو تباہ کیا تو کیا یہ قاتلانہ حملہ نہیں کہلائے گا۔ ان ٹرک والوں کا سراغ لگانے اور انہیں پکڑنے کے لیے کیا کوشش ہورہی ہے؟''

''آپ بلاوجہ مجھ پر خفا ہورہے ہیں سر۔ ایک بات اور مجھے بتائی گئی تھی۔ اس گاڑی کی ڈکی میں کوئی لاش تھی۔ جو آپ کا یہ بتایا گیا کہ آپ اس لاش کو کہیں لے جارہے تھے۔ غائب کرنے کے لیے۔''

''لیکن خود غائب ہوگئے اور لاش وہیں چھوڑ دی۔ واٹ نان سنس۔'' راجا نے خفگی سے کہا۔

میں نے کہا۔ ''بائی داوے۔ وہ لاش کس کی تھی اور اب کہاں ہے؟''

ایس پی نے اپنی فائل دیکھی۔ ''کوئی چودھری سلطان تھا۔''

''چودھری سلطان!'' میرے اور راجا کے لبوں سے ایک ساتھ نکلا۔

''اس کی دشمنی تھی آپ سے، کسی عورت کے معاملے میں۔ کوئی ماڈل اور فلم اسٹار ہے فریال۔ چودھری سلطان کی لاش پنڈی کے ڈسٹرکٹ اسپتال کے مردہ خانے میں ہے۔ میں نے دیکھی نہیں۔ آپ پر چودھری سلطان کے قتل کا کیس بھی تھا جس میں آپ ضمانت پر ہیں۔''

راجا نے افسوس سے سر ہلایا۔ ''اس کا مطلب ہے آپ کو کچھ بھی معلوم نہیں اور یہاں آنے سے پہلے آپ نے کچھ معلوم کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔ حکم کے ایسے غلام ہیں آپ کہ اپنی آنکھیں بند رکھتے ہیں۔ بس پکڑ لو۔ اٹھالو۔ بند کردو۔ تھانے میں تشدد سے ہلاک کردو یا پولیس مقابلے میں مار ڈالو۔ سب اختیار میں ہے آپ کے۔''

''راجا صاحب۔ آپ صحافی ہیں اپنا کالم بول رہے ہیں۔ آپ نے نوکری نہیں کی کبھی۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ مجرم ایک جعلی نواب ہے۔ قاتل ہے۔ اس نے ڈاکو پال رکھے ہیں۔ حویلی کو عیاشی کا اڈا بنا رکھا ہے۔ اردگرد کے شرفا کا جینا حرام کردیا ہے۔ فرض کریں یہ سب بتانے والا محکمے کے سربراہ سے بھی اوپر والا ہو۔''

راجا نے تلخی سے کہا۔ ''فرض کیا کرنا۔ تمہیں آئی جی

نہیں۔ اس نے سب کہا ہوگا جو خود کو سب سے اوپر سمجھتا ہے عجب خان کریلہ نے۔ اس نے تمہیں تھپکی دی ہوگی اور انعام کا وعدہ بھی کیا ہوگا کہ تمہاری پرموشن ہوجائے گی۔ بلکہ یہ اس کے اختیار میں نہیں یا جہاں چاہو گے پوسٹنگ دی جائے گی۔ اور تم بانس پر چڑھ گئے۔ یہ سوچے بغیر کہ اس نے کہا جھوٹ بھی ہوسکتا ہے۔ وہ تم کو استعمال کررہا ہے اور جو یوں استعمال ہوتے ہیں ان کو بعد میں اسی طرح طرح ڈسپوزل کیا جاتا ہے جیسے کُل میں استعمال ہونے والے آلے کا۔''

ایس پی کو پسینا آگیا۔ ''اب میں سچ جاننا چاہتا ہوں تاکہ میں اپنا دفاع کرسکوں۔''

راجا نے اسے بڑے اختصار کے ساتھ بنیادی حقائق سے آگاہ کیا۔ اس دوران میں کھانا بھی کھایا گیا۔ ایس پی جتنا حیران تھا اتنا ہی پشیمان بھی تھا۔ ظاہر ہے اسے ڈر ہوگا کہ لاہور لوٹنے پر اسے صوبائی وزیرِ داخلہ کے عتاب کا سامنا ہو۔ اگر وہ نااہل، کرپٹ اور بے وقوف افسر نہ ہوتا تو یوں بے حال کیوں ہوتا۔ یہاں آکے اسے احساس ہوا تھا کہ ہر صورت میں اس کو عتاب کا سامنا ہوگا خواہ وہ ناکام لوٹے یا کامیاب جائے۔ اس کی جگہ کوئی ہوشیار افسر ہوتا تو حقائق کی تصدیق کے بغیر کوئی قدم نہ اٹھاتا۔ مجھے بھی اس سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔

جب وہ معذرت کرکے چلا گیا تو ساری صورتِ حال سامنے آچکی تھی۔ میرے ساتھ جو کچھ ہوا تھا براہ راست رانا صاحب علی کی کارروائی نہیں تھی۔ اس کے ایما پر خواہ مخواہ میرے ساتھ دشمنی کا رشتہ استوار کرلینے والے عجب خان کریلہ کی بدمعاشی تھی۔ حالانکہ خود اس کے سیاسی مستقبل پر بے یقینی کے گہرے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے اور آئندہ انتخابات کے بعد یہ بھی کچھ طے نہیں تھا کہ اس کی پارٹی برسرِ اقتدار آئے گی۔ مخالفوں کے الیکشن جیتنے کی صورت میں شکست تو کیا اس کے لیے صوبائی اسمبلی میں اپنی سیٹ بچانا مشکل تھا۔ راجا کا خیال تھا کہ میرے الیکشن میں رانا رجب کے خلاف کھڑا ہونے کے ارادے سے نئے دشمنوں کی صفوں میں کھلبلی مچ گئی ہے۔

چودھری سلطان کی لاش مل جانے کی خبر نے ایک طرف تو بے یقینی کی صورتِ حال کو ختم کیا تھا مگر دوسری طرف خدشات کھڑے کردیے تھے۔ شک وشبہ کی اب گنجائش نہیں رہی تھی۔ رانا مجھے تباہ کرنے کے درپے تھا اور اپنی ہر کوشش کی ناکامی اس کی جھنجلاہٹ کو جنون میں بدل رہی تھی۔ وہ میرے بڑھتے ہوئے اثر رسوخ سے بھی خائف تھا اور مستقبل کے سیاسی نقشے میں اسے میرا وجود سب سے بڑا خطرہ محسوس ہورہا تھا۔ اس کی جدی پشتی حاکمیت کو پہلی بار کسی چیلنج کا سامنا تھا۔ اس سے بچنے کی ہر کوشش کی ناکامی اس کے اعتماد کو ختم کررہی تھی اور وہ پاگل ہونے لگا تھا۔

غنی اسی لیے خفا بھی تھا کہ میں حفاظتی معاملات کو سیریس نہیں لے رہا اور بہت زیادہ بے پروا ہوں۔ ''آپ طے کرلیں سر کہ آپ کو میری ضرورت ہے یا نہیں۔''

''یار کیسی باتیں کرتے ہو۔''

''نہیں سر۔ وہ براہِ راست آپ پر حملے کرنے لگا ہے اور اس کا مددگار بن گیا ہے وہ کڑوا کریلا۔''

''ابھی کوئی ثبوت نہیں کہ میری گاڑی کو ٹکر مارنے والوں کو انہی نے بھیجا تھا۔ یہ میرا شک ہے۔''

''شک؟ ابھی جو ایس پی آیا تھا۔ اس کے بعد بھی آپ کو شک ہے۔ اگلی مرتبہ اس کے بندے آپ کو گھیر کر......'' وہ رک گیا۔ ''ہر طرف سے فائرنگ کریں گے اور مجھے مار ڈالیں گے۔ یہی کہنا چاہتے تھے نا تم۔ میں بھی سمجھتا ہوں۔''

''صرف سمجھنے سے کیا ہوتا ہے سر۔ آپ کو کچھ کرنا بھی چاہیے۔ دوسروں کو بھی کچھ کرنے دینا چاہیے۔ آپ اب باہر جائیں گے تو آگے پیچھے دو گاڑیاں بھی ساتھ ہوں گی۔ کم سے کم دو گارڈ آگے دو پیچھے۔ اور آپ کی گاڑی خود میں چلاؤں گا۔''

میں نے کہا۔ ''یس سر۔ آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔''

وہ کھڑا ہوگیا۔ ''میں پتا کرتا ہوں وہ گاڑیاں کہاں گئیں جنہوں نے آپ کی گاڑی کو ٹکر ماری تھی۔ ان کا نقصان بھی تو ہوا ہوگا۔ کہیں نہ کہیں سے وہ اپنی گاڑیاں ٹھیک بھی کرائیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''اور اگر گاڑیاں حویلی کے احاطے میں ہی مرمت ہوگئیں پھر۔ اور اس سے ہوگا بھی کیا۔ ہمارے شک کی تصدیق ہوجائے گی۔ یہی نا۔''

وہ مجھے کوئی جواب دیے بغیر چلا گیا۔ راجا کسی گہری سوچ میں غرق تھا اور تشویش کے آثار اس کی صورت سے عیاں تھے۔ میں نے کہا۔ ''راجا۔ اتنا سیریس کیوں ہورہا ہے۔ یہ سب تو چلتا رہے گا۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں فیکے پتر۔ پانی سر سے گزرنے کی نوبت آگئی ہے۔ آخر کب تک ہم ان معاملات کو قانونی طور پر طے کریں گے۔ کب تک ڈپلومیسی سے مقابلہ کریں گے۔''

میں نے کہا۔ ''ہاں اس سے کچھ حاصل نہیں ہورہا ہے۔''

''ہم نے رانا کے خلاف کتنے قانونی مقدمات کھڑے کیے۔ ثبوت مہیا کیے۔ گواہ لائے۔ مقدمات کو ہائی کورٹ تک لے گئے لیکن ہوا کیا کچھ نہیں۔ معاملات جہاں تھے وہیں رہے۔ ہمارے اپنے وکیل دغا دے گئے۔''

''اور ماجد خان نے کون سا تیر مارا۔ رانا ابھی تک عبوری ضمانت پر پھر رہا ہے۔ عدالت میں توثیق کے لیے بھی حاضر نہیں ہوا۔ ہم نے ضمانت کو منسوخ کرانے کی جو کوشش کی رائگاں گئی۔ وہ آزاد پھر رہا ہے۔ الٹا پہلے سے زیادہ خطرناک ہو گیا ہے۔ ہم نے اس کے خلاف میڈیا کو متحرک کیا۔ پریس کانفرنس، کالم، سب بے اثر ثابت ہوئے۔''

''تیری باتوں سے مایوسی اور شکست کا احساس ہوتا ہے۔''

''اس کی ہمت بڑھتی جا رہی ہے۔ اس نے تجھے اغوا کرنے کی کوشش کی۔ تو جان ہتھیلی پر رکھ کر فرار نہ ہوتا تو ہمیں معلوم ہی نہ ہوتا۔ تو پہنچ جاتا اس کے نجی جیل خانے میں۔ مرکھپ جاتا کسی زمین دوز عقوبت خانے میں۔ اس نے چودھری سلطان کو بھی تیرے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالنے کے لیے استعمال کیا۔ اور اب دیکھ اس نے یہ ڈائریکٹ حملہ کیا ہے۔ تیرا بچ جانا معجزہ ہے مگر معجزے روز روز نہیں ہوتے ٹیکے پتر۔ اسے جب خبر ملے گی کہ تو بچ گیا تو سوچ اس پر کیا گزرے گی۔ وہ غصے سے پاگل ہو کے تجھے خود گولی مارنے کا فیصلہ بھی کر سکتا ہے۔ اسے قانون کا کوئی ڈر نہیں۔ اس نے اپنی بیٹی کو خود قتل کر دیا۔ شہناز کو اغوا کر کے حبس بے جا میں رکھا۔ کیا ہوا؟ کچھ نہیں۔''

''پھر کیا کریں راجا۔ مشین گن لے کر اسے بھون دیں۔ اس کی حویلی پر بم پھینک دیں۔''

راجا اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ ''تو بھاگ جا۔''

میں ہنس پڑا۔ ''کس کے ساتھ۔ اور کہاں؟''

''اپنی آج کی محبوبہ نمبر ون کے ساتھ۔ لندن۔'' راجا نے کہا۔

میں نے اپنا سر کھجایا۔ ''تو کتنا سیریس ہے اس مشورے میں راجا جو میرے دل کی آواز ہے۔''

''ون ہنڈرڈ پرسنٹ۔ تو نور جہاں کے ساتھ جا۔ میرا مطلب ہے کہ نور کے ساتھ۔ کچھ عرصہ وہ لندن میں رہے گی اور پھر لندن سے یہاں آئے گی تو اس کے اور تیرے مسائل حل ہوں گے۔ تجھے لندن میں وحید سے ملنا ہے اور کوشش کر کے اسے واپس پاکستان لانا ہے تاکہ تیری جان چھوٹے۔''

''ظاہر ہے میں کب تک وحید کا رول کروں گا۔''

''وہاں تیری خاصی جان پہچان ہے تو آسانی سے ماہ نور کو کہیں رکھوا سکتا ہے۔ میرا خیال ہے اسے دو چار مہینے [illegible] میں ضرور رہنا چاہیے۔''

''اس نے ایک بار یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ [illegible] سے کوئی ڈپلوما کورس کرے جو چار چھ ماہ میں مکمل ہو جا[ئے] اس کے ہاتھ میں ایک سند آ جائے۔ اس کا خیال تھا کہ [illegible] ڈیزائننگ یا بیوٹیشن بن جائے لیکن میں نے اسے مشور[ہ دیا] کہ وہ اسی انسٹی ٹیوٹ میں داخلہ لے جہاں فریال [نے] سال گزارے تھے۔ دو سال کے کورس میں اس نے چار [چاند] لگائے تھے۔''

''فریال نے انٹیریئر ڈیکوریشن میں ڈپلوما لیا تھا۔''

''ہاں۔ وہاں سے چھ ماہ میں سرٹیفکیٹ کورس مکمل [ہوتا] ہے نور ایک لندن کوالیفائیڈ انٹیریئر ڈیکوریٹر بن کے [واپس] آئے تو کسی کو شک نہیں ہو سکتا۔''

''شک بعد میں ہوگا۔ تیرے کرتوت دیکھ کے۔ سنیارٹی ماہ نور کا نمبر پانچواں ہوگا مگر تو اس کی فکر مت کر پتر۔ بندے کو ڈھیٹ ہونا چاہیے۔''

میں نے کہا۔ ''راجا صاحب۔ یہ سب بعد کے معا[ملات] ہیں۔ ابھی کیا ہوگا۔ میرے اچانک چلے جانے کے بعد۔''

راجا نے ہاتھ کے اشارے سے ایک خادمہ کو طلب [کیا] اور اسے کافی لانے کا حکم دیا۔ ''میں نے بہت غور فرمایا او[ر اس] نتیجے پر پہنچا کہ اس وقت تیرے لندن جانے سے فائدہ [ہے۔] دیکھ ابھی الیکشن دور ہیں۔''

''اتنی دور بھی نہیں راجا۔'' میں نے کہا۔

''او یار...... ! الیکشن کی فکر چھوڑ۔ تجھے کام[یاب] کرانے کے لیے مہم میں بھی چلا سکتا ہوں۔ ہر جلوس میں [تیری] شرکت اور ہر جلسے میں تیرا خطاب فی الحال ضر[وری] نہیں۔ تجھے ایک بریک ملے گا۔ جو میرے خیال میں ضروری ہے۔''

''اور یہاں کے معاملات......؟''

''یہاں کے کون سے معاملات؟ اسپتال بن ر[ہا ہے] اور اس میں نہ تیرا دخل ہے نہ میرا۔ وہ باپ بیٹا لگے [ہوئے] ہیں۔ اسکول اسی طرح چلتا رہے گا۔ یہ رابعہ اور ثریا کا [کام] ہے۔ قانونی مسائل سے میں نمٹ لوں گا۔ میری مدد کے [لیے] ماجد خان بھی ہے۔ ابھی تو اس سین سے غائب ہو جا جس [سے] تیری وجہ سے بڑی افراتفری ہے۔ مثال کے طور [پر] چودھری سلطان کا معاملہ۔ ابھی تصدیق نہیں ہوئی کہ وہ [لاش] واقعی چودھری سلطان کی تھی جو تیری گاڑی کی ڈکی میں [رکھی] گئی تھی یا کسی اور کی۔ قاتلانہ حملہ کس نے کرایا تھا۔''

''یہ معلوم ہو جائے گا۔''

''ہاں لیکن تیرا نام کہیں نہیں آئے گا۔ گاڑی چوری [ہوئی] تھی۔ لاش چودھری سلطان کی ہے یا کسی اور کی۔ اس [کی ڈک]ی میں کس نے ڈالی، کیوں ڈالی؟ گاڑی کو ٹکر مار کے کس [نے تب]اہ کیا۔ نواب صاحب کو کیا۔ وہ تو نہ گاڑی میں تھے اور نہ [اس م]لک میں ہیں۔ لندن میں بیٹھے ہیں اور کچھ پتا نہیں کب [تک ب]اہر رہیں گے۔ اس سے تیرے دشمنوں کو مایوسی بھی ہوگی [اور خو]شی بھی۔ کچھ عرصے میں یہاں کے معاملات ٹھنڈے [ہو جا]ئیں گے۔ دشمن سمجھیں گے بزدل نواب بھاگ گیا۔ خود [بھی] مشہور کریں گے کہ انہیں یہاں رہنے کی کیا ضرورت [ہے۔] بس آتے جاتے رہیں گے۔ میرا خیال ہے دو تین مہینے [گ]زر جائیں پھر تو آ سکتا ہے۔ چھ مہینے بعد بھی ماہ نور کے [لیے] تیرے جذبات یہی رہیں تو وہ آ سکتی ہے اور اس کی جگہ [تیرے] لیے کوئی اور آسمانی حور اتر آئے تو وہ لندن میں خوش [رہے]، کسی اور سے دل لگا لے۔''

میں نے دکھی لہجے میں کہا۔ ''تو میرا دوست ہونے کا [دعوید]ار ہے راجا مگر مجھے رسوا کر رہا ہے کہ میں ایک دل پھینک [نا]آشنا اور پیشہ ور قسم کا عاشق ہوں۔''

راجا نے آہ بھری۔ ''یہ رسوائی تو نہیں خوش نصیبی کی [علامت] ہے ٹیکے پتر۔''

میں نے احتجاج کیا۔ ''لیکن یہ میری کردار کشی ہے۔ میں [ایسا] نہیں ہوں۔ عائشہ سے میں نے کوئی عشق کیا نہ کوئی وعدہ۔ [فریا]ل نے خود مجھے چھوڑا۔ نور جہاں کے معاملے میں پہل میں [نے] نہیں کی۔ ہاں فریال کے جانے کے بعد میری مزاحمت ضرور [کمز]ور پڑ گئی تھی جس کا نور جہاں نے فائدہ اٹھا لیا۔''

''آہ کتنا مظلوم ہے، تو ایک لیلیٰ کے لیے مر بھی نہیں [سکت]ا۔ فوراً دوسری لیلیٰ آ کے تیرا چارج لے لیتی ہے۔ الو کے [پٹھے]۔ میرے سامنے کیوں صفائی دے رہا ہے۔ تیری رگ [رگ] سے واقف ہوں میں۔''

میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ ''وہ تو میں بھی ہوں۔ میرا خیال [ہے] کہ میں اب چلتا ہوں۔ ہم لندن کے لیے بوریا بستر باندھتے [ہیں]، میں اور ماہ نور۔ تیاری کے لیے کچھ وقت تو چاہیے۔''

راجا نے مسکرا کے مجھے آنکھ ماری۔ ''غنی سے آنکھ بچا [کے] نکل جا۔ وہ ابھی ہے نہیں۔ آ گیا تو تجھے ہرگز اکیلا نہیں [جا]نے دے گا۔''

''اور بعد میں اس نے استعفیٰ دے دیا پھر؟''

''اس سے میں نمٹ لوں گا ٹیکے پتر تو جا۔ عیش کر۔''

میں نام کا نواب رفیق احمد اپنی حویلی سے جس کا میں مالک تھا چوروں کی طرح نکلا۔ خود اپنے ملازم سے چھپ کے۔ اس وقت میں بالکل بھول گیا کہ گزشتہ روز ہی مجھ پر ایک قاتلانہ حملہ ہوا تھا اور میرے دشمن ہر وقت تاک میں رہتے ہیں۔ راجا نے صحیح دوست ہونے کا ثبوت دیا تھا۔ اس نے بالکل ٹھیک تشخیص کی تھی۔ میں یہاں کے قانونی اور غیر قانونی معاملات میں اتنا الجھ گیا تھا کہ نروس بریک ڈاؤن کے قریب تھا۔ تمام مشکلات اور مصائب، خطرات اور آفات کا ہدف براہِ راست میری ذات تھی۔

اچانک میں نے کولھو کے بیل کی طرح دن رات مشقت میں مصروف اس مزدور کی طرح محسوس کیا جو دن میں اور رات میں ڈبل شفٹ میں ڈیوٹی دیتے دیتے تھکن سے بے حال ہو۔ جس کے پاس اپنے بارے میں سوچنے کی فرصت نہ ہو۔ بیوی بچوں کے لیے وقت نہ ہو۔ لیکن مجبوری حالات کی زنجیر نے اسے جکڑ رکھا ہو۔ اور اچانک اسے چھٹی کے ساتھ بونس کی نوید ملے تو اس کی کیا کیفیت ہوگی۔

جب میں نے اس سرخوشی کی کیفیت میں ماہ نور کے بارے میں سوچا تو وہ مجھے ایک مکمل عورت لگی۔ اس لیے نہیں کہ وہ حسن میں لاثانی تھی اور اس کا شباب، اس کی ناز آفرینی اور اس کی ادائے محبوبی سب سے بڑھ کر تھی۔ بلکہ اس لیے کہ اپنی محبت میں بھی وہ عورت کی تخلیق کے مقصد اور اس کے وجود کی مکمل صورت کا بھرپور احساس دلاتی تھی۔ وہ محبوبہ بن کے ایک مرد کے دل کو جیتنا جانتی تھی اور مکمل خود سپردگی سے اس کی انا کو تسکین فراہم کرتی تھی تو ماں کا وہ جادو بھرا پیار بھی رکھتی تھی کہ زمانے بھر کا ستایا ہوا دکھی اور پریشان مرد اس کی آغوش میں گر کے سکون اور تحفظ کے احساس میں گم ہو جائے۔ وہ تنہائی کے لمحوں میں رفاقت کے بے غرض لمحات کی ساتھی بن جاتی تھی اور زندگی کے کمزور کرنے والے حالات میں خود اعتمادی اور حوصلہ دینے کے لیے یہ یقین بھی فراہم کر سکتی تھی کہ خدا کے بعد اپنے آپ پر اور پھر اس پر بھروسا کیا جا سکتا ہے۔

میں کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میرا تجزیہ عقل کی کسوٹی پر کس حد تک پورا اترتا ہے لیکن میں موازنہ کرتا تھا تو مجھے نور جہاں سب سے الگ نظر آتی تھی۔ ایلشا یا عائشہ کی محبت تو محض ٹین ایج کا بے بس کر دینے والا ایک منہ زور جذبہ تھا۔ وہ شعلہ جو آتش فشاں کی طرح بھڑکتا ہے تو عقل کو خاکستر کر دیتا ہے اور بجھتا ہے تو صرف پچھتاوے کی راکھ رہ جاتی ہے۔ ایک احساسِ زیاں اور واپسی کا سفر۔ فریال کے عشق نے مجھے ایک طویل عرصے تک دیوانہ کیے رکھا لیکن مجھے

احساس نہ ہوسکا وہ دو دنیاؤں میں رہنے والی عورت ہے جو محبت بھی چاہتی ہے لیکن دولت اور شہرت کی خواہش کو بھی دل سے نکال نہیں سکتی۔ اس کی محبت مکمل تھی اور ہر امتحان میں پوری اتری تھی۔ دولت مندی کی پُرآسائش زندگی بسر کرنے کی خواہش بھی اسے میری رفاقت میں پوری ہوتی نظر آتی تھی لیکن گمنامی اسے کسی صورت قبول نہ تھی۔ ست بدھائی میں میرے ساتھ تمام عمر صرف محبت کے ساتھ گزارنے کے معاملے میں فیصلے کا وقت آیا تو وہ ہار گئی۔ ایسا اس نے کبھی سوچا ہی نہ تھا کہ اپنی تمام دولت مندی کے ساتھ میں اس جنگل میں گزارنے آجاؤں گا۔ لندن اور نیو یارک چھوڑ دوں گا۔ وہ مجھے چھوڑ گئی۔

ان کے مقابلے میں نور جہاں کی میرے لیے وابستگی اور وارفتگی غیر مشروط تھی۔ اس کا اعتراف وہ برملا کرتی تھی کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ میں اس سے محبت کروں نہ کروں۔ وہ مجھے چاہتی رہے گی خواہ میں کسی اور کو چاہوں۔ شادی کسی اور سے کرلوں۔ ساری زندگی کسی دوسری عورت کے لیے وقف کردوں۔ اس کے جذبات وہی رہیں گے جو آج تھے۔ جو روزِ اول تھے جب مجھے دیکھتے ہی اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ بس اب اس کی تلاش کا سفر ختم ہوا۔ اسے اپنی منزل مل گئی۔ اس نے طے کرلیا تھا کہ خواہ کچھ بھی ہوجائے وہ مجھے حاصل کرے گی۔ اور اس نے مجھے حاصل کرلیا تھا۔

راجا کی بات مذاق تھی۔ جس حقیقت کا اعتراف کیے بنا میں نہیں رہ سکتا تھا اسے وہ بھی سمجھتا تھا۔ وہ میری زندگی کے ہر لمحے کا رفیق تھا اور مجھے مجھ سے بہتر سمجھتا تھا۔ اس نے دیکھا تھا، محسوس کیا تھا اور سمجھا تھا کہ نور جہاں جواب ماہ نور تھی۔ میرے لیے بنی ہی اور یہ اعتراف تو خود نور جہاں کرچکی تھی کہ جب اس نے پہلی بار مجھے دیکھا تو سمجھ لیا تھا اور جان لیا تھا کہ میں اس کے لیے بنا ہوں۔ اس کے سوا کسی کے لیے نہیں بنا ہوں۔

سارا راستہ میں نور جہاں کے بارے میں سوچتا رہا۔ یہ میرے اپنے خیالوں کی خودکلامی تھی۔ اپنے آپ سے گفتگو تھی۔ مجھے پتا بھی نہیں چلا کہ راستہ کیسے کٹا۔ میں بہت ہلکا پھلکا اور پرجوش محسوس کررہا تھا۔ کچھ عرصے کے لیے ہی سہی راجا نے مجھے تمام جھمیلوں، تمام تفکرات اور تمام اندیشوں سے یوں آزاد کردیا تھا جیسے کوئی پنجرے کا در کھول کے پنچھی کو آزاد فضا میں پرواز کرنے کے لیے چھوڑ دے۔ جب اس نے کہا تھا کہ جا لیکے پتر۔ عیش کر۔ یہاں کے سارے معاملات سے میں نمٹ لوں گا۔ تو میں نے نکلنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ اس پنچھی کی طرح جس پنجرے کا در کھلا نظر آئے۔

یہ بڑی اچھی دل خوش کرنے والی کیفیت تھی۔ میرا جی چاہتا تھا میں ہنسوں، قہقہے لگاؤں۔ نور جہاں کو ساتھ لے کر ابھی لندن کے لیے نکل جاؤں۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک بار میں اسے لانگ ڈرائیو پر لے گیا تھا اور ہم نے رات ایک ویران سنسان ٹیلے پر ایک دوسرے کی قربت کو محسوس کرتے ہوئے گزاری تھی۔ تو بھل دوست بدھائی۔ جہنم میں جائے ترقیاتی منصوبہ اور بھاڑ میں جائے رانا کی عداوت۔

جب میں نے نور کے دروازے پر لگی ہوئی گھنٹی بجائی تو گھنٹی کی سریلی بازگشت کا احساس ختم ہونے سے پہلے دروازہ آہستہ سے کھل گیا اور میں نے اپنے مقابل نور کو دیکھا۔ ایک مجسم پیکرِ رعنائی و دلآویزی۔ اس کی آنکھوں میں نشا تھا۔ ہونٹوں پر استقبال کرتی ہوئی مسکراہٹ۔ اس کے لبوں کی لالی سے جھلملاتے ستاروں والی سیاہ قمیص سے جھانکتی اور جھلکتے بدن کی خیرہ کن اجلی سفیدی تک۔ سب کو جیسے میرا ہی انتظار تھا۔ اس لمحے کا یقین تھا جب میں کال بیل پر ہاتھ رکھوں گا اور دروازہ خود بخود کھل جائے گا۔

اندر داخل ہو کے میں نے دروازے کو اپنے پیچھے بند کردیا۔ ”تم میرا انتظار کررہی تھیں۔ دروازے کے پیچھے۔“

اس نے کچھ نہیں کہا اور خود کو میرے حوالے کردیا۔ ”پھر پوچھو گے کہ مجھے کس نے بتایا۔ کہ تم آرہے ہو۔“

میں نے اس کی آنکھوں کو چوما۔ ”تمہارے دل نے بتایا ہوگا۔“

وہ ہنسی۔ ”اور کون بتائے گا۔“

میں نے کہا۔ ”کیا میرے دل نے پیغام بھیج دیا تھا؟“

وہ مسکرائی۔ ”ہاں۔ ایس ایم ایس۔ دل تم سے پوچھے بغیر بھیج دیتا ہے۔“

میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ”اگر میں یہ کہوں کہ پوری تیاری کے ساتھ تم کہیں جانے کے لیے نکل رہی تھیں کہ اچانک میں سامنے آگیا۔“

وہ دوسری کرسی پر میرے سامنے بیٹھ گئی۔ ”سچ تو یہی ہے۔ میرے جذبات پر جیسے اوس سی پڑ گئی۔“ ”اتنی تیاری کے ساتھ کس کے قتل کا ارادہ تھا۔ ہم جو اتنی دور سے جان نثار کرنے آئے ہیں۔“

”قتل ہونے کا بڑا شوق ہے جناب کو۔“

”ہاں۔ وہ جو منیر نیازی نے کہا ہے۔ کچھ شہر دے لوک وی ظالم سن۔ کچھ مینوں مرن دا شوق وی سی۔ آج جو

اپنے سامنے زندہ سلامت دیکھ رہی ہو۔ ایک ناقابلِ یقین اتفاق ہے ورنہ آج میرا سوئم ہوتا۔“

اس کا رنگ اڑ گیا۔ ”کیوں اب کیا ہوگیا؟“

میں نے کہا۔ ”بتاؤں گا بعد میں، ابھی تمہیں جانا ہے۔“

”اتنا ضروری نہیں میرا جانا۔“

میں نے کہا۔ ”اچھا پھر کافی لاؤ۔ میں بہت تھکا ہوا ہوں نور۔ سچ پوچھو تو میں بھاگ کے تمہارے پاس آیا ہوں۔ سکون کے لیے۔ خوف نے میرے اعصاب شکستہ کردیے ہیں۔ لگتا ہے کہ ہر جگہ موت میرے تعاقب میں ہے۔ یہی صورت رہی تو میں پاگل ہوجاؤں گا۔ میں پاگل پن میں نہ جانے کیا کر بیٹھوں گا۔“

نور گھبرا گئی۔ ”یہ تم کیسی باتیں کررہے ہو آج۔“

”میں سچ کہہ رہا ہوں۔ میں اب ست بدھائی نہیں جاؤں گا۔ میں تمہارے ساتھ رہوں گا پھر ہم لندن چلے جائیں گے۔“

عام حالات میں میری زبان سے ایسی باتیں سن کے اس کا چہرہ کھل اٹھتا۔ اس کی تو عین آرزو یہی ہوتی لیکن اس نے نہ جانے کیسے اندازہ کرلیا کہ میری ذہنی کیفیت اور میرے رویے میں کوئی بات ہے جو خلافِ معمول ہے...... شاید اس ذہنی اور اعصابی دباؤ کا اظہار میرے چہرے سے ہورہا تھا۔

”اچھا تم یہاں آرام سے لیٹ جاؤ۔“ اس نے مجھے پکڑ کے اٹھایا اور بیڈ تک لے گئی پھر اس نے اپنے ہاتھوں سے میرے جوتے اتارے۔ ”تم واقعی تھکے ہوئے لگ رہے ہو۔ میں ابھی کافی بنا کے لاتی ہوں۔ میں تو ایسے ہی جارہی تھی۔ ویزا کے لیے گئی تھی وہاں ایک خاتون سے دعا سلام ہوئی۔ ان کا فون آیا تھا کہ شام کو کچھ نہیں کررہی ہو تو آجاؤ۔ ان سے معذرت کرلوں گی کہ مہمان آگئے ہیں۔ جھوٹ ہوگا۔ تم کون سے مہمان ہو۔“

میں نے پوچھا۔ ”پھر کون ہوں؟“

”بلائے جان۔ پہلے دن سے بلائے جان۔ ہم باہر نہیں جائیں گے۔ آج میں خود تمہارے لیے کھانا پکاؤں گی جو تم کہو گے۔ کیا پسند ہے تمہیں؟“

مجھے نہیں معلوم کہ کب میری غنودگی گہری پُرسکون نیند میں بدل گئی۔ ایک بار مجھے احساس ضرور ہوا تھا کہ میں اس سحر آفریں وجود کی قربت میں اور ایک دلدار خوشبو کے احساس میں لیٹا ہوا ہوں۔ میں بادل کا سایہ بن کے کہساروں اور سبزہ زاروں اور گلپوش وادیوں پر سے گزرتا جارہا تھا۔ اور وہ بادل نیلگوں روشن آسمان کی وسعت میں تیر رہا تھا۔ اچانک ہر سمت سے گھیرے سیاہ بادلوں نے یلغار کی اور بارش میرے چہرے کو بھگونے لگی۔

میں نے چونک کے آنکھیں کھولیں تو خواب نے حقیقت کا روپ دھار لیا، وہ مجھ پر جھکی ہوئی تھی۔ اس کے بھیگے ہوئے بالوں سے پانی کے قطرے میرے چہرے پر ٹپک رہے تھے اور اس کے سفید ریشم میں بنے ہوئے جسم سے اس کے وجود کی مہک پھوٹ رہی تھی۔

”اٹھیے حضور والا نواب صاحب قبلہ، کافی حاضر ہے۔“

میں نے اٹھ کے اِدھر اُدھر دیکھا پھر میری نظر گھڑی پر گئی۔ ”کافی وہ تو میں نے کل شام طلب کی تھی۔“

”ناچیز بہت دیر سے کافی لیے کھڑی ہے۔“ وہ ہنسی۔

میں نے کافی لے لی۔ ”نور کیا واقعی رات گزر گئی۔“

”جب میں کافی لے کر آئی تو تم سو رہے تھے۔ میں نے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ تم واقعی بہت تھکے ہوئے اور ڈرے ہوئے تھے۔ نیند میں بولتے رہے حالانکہ تمہیں عادت نہیں۔ رات بھر بے چین رہے۔“

ناشتے کے بعد میں نے نور کو اس حادثے کے متعلق بتایا جس میں میری کار کا چورا ہوگیا تھا لیکن میں محفوظ رہا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ خوف اس کی آنکھوں سے جھانک رہا ہے اور فکرمندی سے اس کا چہرہ ویران ہے۔ ”بس ان حالات کے پیشِ نظر راجا نے مجھ سے کہا کہ تو کچھ دن کے لیے نور کے ساتھ لندن چلا جا۔ تو میں نے سوچا کہ یہ ہوسکتا ہے۔ کیا بات ہے۔ تم کو خوشی نہیں ہوئی۔“

وہ مجھے دیکھتی رہی۔ ”خوشی تب ہوتی جب تم لوٹ کے نہ آتے۔“

”یہ کیسے ہوسکتا ہے۔“

اس نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی۔ ”ہاں۔ یہ نہیں ہوسکتا لیکن اور بہت کچھ ہوسکتا ہے۔ تمہارا فیصلہ اپنی جگہ لیکن ایک فیصلہ میں نے بھی کرلیا ہے۔ جب تم واپس آؤ گے تو میں بھی تمہارے ساتھ ہی آؤں گی۔ اور تمہارے ساتھ ہی رہوں گی ست بدھائی میں۔ تم میری ایک نہیں سنتے۔ جو چاہتے ہو کرتے ہو تو پھر میں تمہاری کیوں سنوں۔ میں بھی وہی کروں گی جو میرا دل چاہے گا۔ کسی کی پروا نہیں مجھے۔ جس کا جو دل چاہے سمجھے او کے۔“ وہ پہلے افسردہ تھی پھر خفا ہوئی اور بالآخر رونے لگی۔

”یہ کیا پاگل پن ہے نور۔ میں نے کب روکا ہے تمہیں۔ تم میرے ساتھ ہی رہو گی۔ واپس میرے ساتھ آنا

چاہو تو ٹھیک ہے۔'' میں نے اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔'' خود مجھے تمہاری اشد ضرورت ہے ہر جگہ ہر وقت۔ یہ بتاؤ تمہارے ویزا کی کیا پوزیشن ہے۔''

اس نے اپنے آنسو پونچھے۔'' ہو گیا ہے، کل مل جائے گا۔''

میں نے کہا۔'' ٹھیک ہے۔ اگلے ہفتے ہم لندن میں ہوں گے دو تین دن میں نکل جائیں گے اگر جہاز پر بکنگ مل گئی۔''

'' کیوں؟ تمہیں اتنی جلدی ویزا مل جائے گا۔ سفارش ہے کوئی؟''

میں نے ہنس کے کہا۔'' کسی سفارش کی مجھے کیا ضرورت ہے۔ میں پہلے سے برٹش نیشنل بھی ہوں۔ تمہاری تیاری مکمل ہے نا۔''

وہ نہ جانے کس سوچ میں گم تھی کہ اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔'' تم نہا لو میں ناشتا بنا کے لاتی ہوں۔''

یہ محض اتفاق تھا یا پھر حسن ذوق کا دل موہ لینے والا انداز۔ یا پھر کچھ بھی نہیں محض میری نظر کا کرشمہ کہ بقول غالب۔ بلائے جان ہے غالب اس کی ہر بات۔ عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا۔ گزشتہ شام وہ سیاہ لباس میں رات کا حسین پیکر لگی تھی جس میں اس کے بدن کی چاندنی کا جادو سر چڑھ کے بولتا تھا اور اب اس نے اجلی روشن صبح جیسا بے داغ سفید ریشمی ملبوس زیب تن کیا تھا تو اس کا حسن سراپا کی اجلی دھوپ بن کے کھل رہا تھا۔

کیا حسن کچھ نہیں، صرف دیکھنے والے کی نظر ہے۔ لیلیٰ کو مجنوں کی آنکھ سے دیکھو تو عشق کی دیوانگی سمجھ میں آتی ہے۔ شاید اس میں کچھ مبالغہ ہے۔ عبارت آرائی ہے۔ دست قدرت کی صناعی کا نمونہ جھیل سیف الملوک ہو یا انسانی ہنرمندی کا کمال تاج محل۔ سب کا نظارہ دنیا بھر سے آنے والوں کو ایک سا مسحور کرتا ہے۔ بیتھوون کی پانچویں سمفنی ہو یا پھر مونا لیزا کی مسکراہٹ۔ سننے اور دیکھنے والے ہر جگہ ہر دور میں ہمیشہ مسحور ہوتے آئے ہیں۔ وہ نور جہاں تھی تب بھی اس کی ایک جھلک دیکھنے والے اسی طرح مسحور اور دم بخود رہ جاتے تھے جیسے آج جب وہ ماہ نور ہے اس کے حسن کی قوت تسخیر وہی ہے۔

میں بہت خوش تھا اور ایک رات میں جیسے میری کایا کلپ ہو گئی تھی کہ خوف تفکرات اور اندیشے جنہوں نے میرے ذہن کو اور اعصاب کو جکڑ رکھا تھا اور میری سوچ کو مفلوج کر دیا تھا ایسے صاف ہو گئے تھے جیسے ان کا وجود ہی نہ تھا۔ میں خود کو ایک نیا رفیق محسوس کر رہا تھا اور ست بدھائی کے نواب رفیق کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

جب نور نے مجھے پکارا۔'' کیا میں ناشتا وہیں لے آؤں؟'' تو میں نے چلا کے کہا۔'' اس سے اچھی کیا بات ہو سکتی ہے؟ لے آؤ۔''

اس نے دروازے کے قریب آ کے کہا۔'' راجا تم سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتا ہے۔''

میں نے مستی میں کہا۔'' اسے بھی اندر لے آؤ ابھی باہر نہیں آ سکتا۔ بڑا مزہ آ رہا ہے۔''

'' اچھا پھر میں ناشتا کر لیتی ہوں۔ میرا بھوک سے حال ہے۔''

اب مجھے بھی بھوک کا احساس ہوا۔ میں لباس بدل کر باہر نکلا تو نور کافی پھر گرم کر کے لائی۔ اسی وقت میرا فون بولا۔ میں نے کال ملا کے کہا'' یس راجا صاحب کیسے یاد کیا صبح دم۔ نہار منہ۔''

'' آنکھیں کھول لیکھے پتر۔ گیارہ بجے ہیں۔''

'' بجے ہوں گے تیرے لیے۔ مجھے وقت اور تاریخ دن اور مہینے سے کیا۔''

'' ایک اچھی خبر دینی ضروری تھی ورنہ میں مخل نہ ہوتا۔ تو نے اخبار دیکھا۔''

'' نہیں۔ اور دیکھوں گا بھی نہیں۔''

راجا بولا۔'' تیرا ایک دشمن کم ہو گیا ہے۔''

'' کوئی بات نہیں میں دوسرا بنا لوں گا۔''

'' الو کے پٹھے۔ بہت مستی چڑھی ہوئی ہے۔ اب وہ کا دست راست صوبائی وزیر داخلہ عجب خان کریلہ۔ وہ مر گیا''

'' کیسے مر گیا اور تو قسم لے سکتا ہے مجھ سے، میں نے اسے نہیں مارا۔''

'' اس کی موت کے اسباب پُراسرار ہیں۔ خبر میں کہا گیا ہے کہ اسے کل ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ اس کا بیٹا جس کی حال ہی میں شادی ہوئی تھی جس میں فریال نے بھی ڈانس کیا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے باپ کو کسی قسم کی ہارٹ پرابلم نہیں تھی۔ اسے قتل کیا گیا ہے۔''

'' تو نے صرف یہ بتانے کے لیے فون کیا تھا؟''

'' اصل بات کچھ اور تھی۔ میں اسلام آباد کے ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر اسپتال آیا تھا۔ بڑی مشکل سے یہ معلوم ہوا ہے کہ لاش اسی کی تھی۔''

'' کس کی؟'' میں نے چونک کے کہا۔

'' چودھری سلطان کی۔ ابھی میں نے خود مردہ خانے میں جا کے اسے دیکھا۔ ایکسی ڈنٹ میں لاش کو بھی نقصان پہنچا۔ مگر چہرہ متاثر نہیں ہوا۔ حیرت کی بات ہے کہ ابھی تک

کوئی وارث نہیں پہنچا۔ نہ پوسٹ مارٹم ہوا۔ لاش مردہ خانے میں پڑی ہے۔''

'' اس کی شناخت ہونی چاہیے راجا۔ کہیں اسے لاوارث قرار دے کے نہ دفن کر دیا جائے۔''

'' میں کچھ نہیں کر سکتا لیکن جس رپورٹر کے ساتھ میں گیا تھا۔ میں نے اسے بتا دیا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اب اس کا وارث کون ہوگا۔ بیوی کو خود اس نے قتل کرا دیا تھا بعد میں باپ مر گیا۔ بہن بہنوئی تھے۔ انہیں ڈاکوؤں نے ہلاک کر دیا تھا۔''

'' کیونکہ انہوں نے عدالت میں سچ بولا تھا لیکن اور بہت لوگ ہیں راجا۔ فلم انڈسٹری میں۔ چودھری سلطان کوئی گمنام شخصیت نہیں تھا۔''

'' وہ رپورٹر جانتا ہے گجرات میں بہت لوگ ہوں گے۔ اس کے باپ نے جو ٹرسٹ اسپتال قائم کر رکھا تھا اس کے ڈائریکٹرز میں چودھری سلطان بھی شامل تھا۔ شکر کر تو بچ گیا ورنہ دشمنوں نے کام بڑا پکا کیا تھا۔ اگر کسی طرح حادثے میں تو بچ جاتا تو یہ لاش تیرے گلے پڑ جاتی۔ اب تو دیر مت کر، فٹافٹ نکل جا لندن کے لیے تاکہ تیرا نام تفتیش میں بھی نہ آئے۔''

'' نور کا ویزا لگنا مسئلہ تھا۔ یہ کام ہو گیا ہے اگر فلائٹ مل گئی تو میں کل پرسوں نکل جاؤں گا۔''

'' پھر جب تک میں نہ کہوں ادھر کا رخ کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں اس وقت تک اسپتال میں رہوں گا جب تک سلطان کی لاش کی قانونی طور پر شناخت نہیں ہوتی اور اسے قانونی وارث لے کر نہیں جاتے۔''

میں راجا کی دور اندیشی کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ دشمن اس قتل کو میرے سر منڈھنے میں ناکام رہے تھے۔ ایسا دوبارہ ہو چکا تھا۔ ایک بار نہ جانے کس کی لاش ست بدھائی کے علاقے سے برآمد ہوئی تھی جو ناقابل شناخت تھی۔ اسے چودھری سلطان کی لاش ثابت کرنے کے لیے گواہ بھی فراہم کر دیے گئے تھے۔ لیکن خدا مغفرت کرے چودھری سلطان کے دین دار بہنوئی کا۔ اس نے عدالت میں حاضر ہو کے اپنے ضمیر کے مطابق گواہی دی تھی اور کسی گمنام شخص کی لاش کو چودھری سلطان کی لاش تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس کی سزا اسے یہ دی گئی تھی کہ رات کے وقت گھر میں گھسنے والے ڈاکوؤں نے اسے اور اس کی بیوی کو گولیوں سے بھون دیا تھا۔

اس بار چودھری سلطان کی ہلاکت میں کوئی شبہ نہیں رہا تھا۔ راجا نے اس کی لاش دیکھ لی تھی۔ لیکن یہ سوال ہنوز جواب طلب تھا کہ اب تک وہ کہاں روپوش تھا۔ وہ میرے دشمنوں کے ہاتھوں میں میرے خلاف استعمال ہونے والا سب سے کارآمد ہتھیار ثابت ہو سکتا تھا کیونکہ فریال کے معاملے میں اس کی اور میری رقابت اور دشمنی سے سارا زمانہ واقف تھا۔ اگر اس مرحلے پر چودھری سلطان کی لاش غائب ہوتی تو دشمن نہ جانے کب تک اس کی روپوشی کا ذمے دار مجھے بنائے رکھتے۔ یہی موقع ہے کہ چودھری سلطان کی موت کی تصدیق ہو جائے اور یہ ثابت کر دیا جائے کہ میری اس کی دشمنی کا اس کے قتل سے دور کا بھی تعلق ثابت نہیں ہوا۔

نور نے آہستہ سے میرے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھا۔'' کیا سوچ رہے ہو؟''

میں چونکا۔'' کچھ نہیں۔ بالآخر چودھری سلطان نہیں رہا۔''

'' تمہیں افسوس کیوں ہو رہا ہے؟''

'' افسوس انسان کی خام خیالی پر ہوتا ہے۔ کتنا غرور کرتا ہے وہ اپنی طاقت پر۔ یہی چودھری سلطان تھا جو اپنی دولت کے بل پر فلمی دنیا میں ایسے اکڑ کے چلتا تھا جیسے بادشاہت اسی کی ہے۔ فریال کی زندگی عذاب کیے رکھی۔ میرے لیے دہشت بنا رہا۔ پھر نہ وہ دولت رہی نہ وہ شان و شوکت۔ قرض خواہوں سے چھپتا پھرتا تھا۔ وہ جس فریال کو جان سے مار دینے کی دھمکی دیتا تھا اسی فریال نے اسے مروا دیا۔''

نور چونکی۔'' فریال نے مروا دیا؟''

'' یہ خود فریال نے بتایا تھا۔ مختلف ہاتھوں سے ہوتے ہوئے بالآخر پتا نہیں کس کے ہاتھوں مارا گیا۔''

'' اعمال کی سزا بھی تو ملتی ہے۔''

'' ہاں۔ اس کا باپ اچھا آدمی تھا۔ اس نے گجرات میں ٹرسٹ کا اسپتال قائم کیا۔ وہ ایک صدقہ جاریہ ہے۔ چودھری سلطان اس نیک کام کو آگے بڑھا سکتا تھا۔''

'' کیا بات ہے۔ تم فریال کے ذکر سے گریز کر رہے ہو۔ پہلے تم اس کے لیے اتنے فکرمند رہتے تھے۔''

'' میرا خیال ہے وہ میری غلطی تھی۔ اس نے اپنی زندگی کی راہ خود چن لی ہے۔''

'' کل اس کا فون آیا تھا۔''

میں چونک پڑا۔'' کیا کہہ رہی تھی؟''

'' وہ دبئی جا رہی ہے۔ کسی فلم کی شوٹنگ ہے۔ اس کے علاوہ انڈین چینل کے لیے کوئی ایگریمنٹ بھی ہونا ہے۔ اس نے کہا تھا بات بن گئی تو وہ لوٹ کر نہیں آئے گی۔ انڈیا چلی جائے گی۔''

'' اس نے یہ سب تمہیں بتانا کیوں ضروری سمجھا؟''

'' اس نے کہا کہ رفیق شاید مجھ سے بات بھی نہ کرے۔

میری طرف سے تم اس کا شکریہ ادا کر دینا۔ مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ تمھیں بھی اسی نے بھیجا تھا۔ شاید ہم اس راستے پر آگے نہیں جا سکتے تھے جس پر پہلے چلتے رہے۔ آخر میں اس نے کہا کہ چودھری سلطان کی طرف سے وہ بے فکر ہو جائے۔ یہ کانٹا میں نے اس کی زندگی سے نکال دیا ہے۔"

میں حیران بیٹھا رہا۔ "فریال نے ایسا کہا؟"

"میں اپنی طرف سے کچھ نہیں بتا رہی ہوں۔" نور نے خفگی سے کہا۔ "اس کی اسے کیا قیمت ادا کرنی پڑی۔ کبھی تمہیں اس کے ڈانس کی ایک وڈیو فلم دیکھنے کی اذیت اور شرمندگی برداشت کرنی پڑے۔"

"ڈانس کی وڈیو فلم میں کیا ہے۔ اس کے ساتھ فلمی دنیا کی دو اور ڈانسرز بھی شریک تھیں۔"

"میرے پوچھنے پر اس نے کہا کہ وہ الگ ہے۔ اس پرفارمنس کا سودا میں نے عجب خان کریلہ سے کیا تھا۔ بعد میں وہ ذلیل بے ضمیر انسان مجھے ہی بلیک میل کرنا چاہتا تھا۔ یہ کلہاڑی تو اپنے پیروں پر میں نے خود ہی ماری تھی۔ انسان غلطی سے ہی سبق سیکھتا ہے۔ پھر عزت کو کیا رونا۔ دولت اور شہرت تو مل ہی گئی اور......"

"اور کیا...... بولو۔"

"اس نے کہا تھا۔ یہ رفیق کو مت بتانا۔ میں نے کہا کہ اس سے میری ملاقات ہی کہاں ہوتی ہے۔"

مجھے فریال کی طرف سے تشویش لاحق ہونے لگی تھی۔ "تم نے اس سے پوچھا نہیں کہ عجب خان اسے کس طرح بلیک میل کر رہا تھا۔"

"پوچھا تھا۔ وہ کہنے لگی کہ ماہ نور مردوں کی دنیا میں کیا تمہیں اندازہ نہیں کہ عورت خواہ مجبوری کے تحت ہی گھر کی چار دیواری سے کیوں نہ نکلے۔ وہ کتنی غیر محفوظ ہو جاتی ہے۔ یہ غیرت مند مرد کس طرح اس کی عزت آبرو کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ جیسے وہ اسے اپنی مقرر کردہ حدود سے باہر نکلنے کے جرم کی سزا دینا چاہتے ہیں۔ کیا پڑھے لکھے کیا جاہل۔ یہ تمہارے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ فریال، میں اتنی کمزور نہیں ہوں۔ جس مرد نے کمزور سمجھا تھا میں نے اسے قتل کر دیا۔"

میں نے برہمی سے کہا۔ "بے وقوف۔ یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"بس۔ میری زبان سے نکل گیا غصے میں۔"

"اس نے پوچھا نہیں کہ وہ مرد کون تھا؟"

"نہیں۔ وہ جلدی میں تھی۔"

"پوچھتی تو تم بتا بھی دیتیں۔ کیا تمہیں احساس ہے کہ بالواسطہ طور پر تم نے اسے بھی قتل پر اکسایا۔ وہ پوچھتی تو تم اسے اکبر خان کے بارے میں بھی بتا دیتیں۔"

"اب اتنی بے وقوف بھی نہیں ہوں میں۔"

"یہ بے وقوفی نہیں، عورتوں کی کمزوری ہے۔ راز کو نہیں رکھ پاتیں۔"

"کیوں میرے پیچھے پڑ گئے ہو بلاوجہ۔ میں نے کچھ نہیں [illegible]"

"غصے کی بات نہیں۔ مجھے فکر ہو رہی ہے فریال کی۔ [illegible] خدانخواستہ اس نے وہ کیا ہو جو تم نے غصے میں کہہ دیا تھا۔"

"کیا مطلب......؟"

"نور۔ راجا نے مجھے بتایا کہ عجب خان مر گیا لیکن [illegible] موت کے اسباب سامنے نہیں آئے۔ اس کی فیملی یہ ماننے [illegible] تیار نہیں کہ موت حرکت قلب بند ہو جانے کا نتیجہ تھی۔"

"پھر؟ کیا اس نے خودکشی کی؟"

"خودکشی کیوں۔ پہلا شبہ قتل کا ظاہر کیا جاتا ہے۔ عجب خان جیسے لوگ قتل ہوں تو کسی کو حیرانی نہیں ہوتی۔"

"خدا کا خوف کرو۔ تم فریال پر شک کر رہے ہو۔"

"میرے شک سے کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن سوچو کیا یہ ناممکن ہے کہ فریال پر الزام آ جائے۔ اچانک وہ دبئی جا رہی تھی۔ اس کا ارادہ انڈیا جانے کا تھا۔ کہیں وہ فرار تو نہیں ہو رہی تھی۔"

"اتنا مت سوچو فریال کے بارے میں۔ اس وقت [illegible] بارے میں سوچو جو ہم لندن میں گزاریں گے۔ ایک [illegible] کامیاب مستقبل کے بارے میں سوچو جو تمہارا ہو سکتا ہے۔ جب تم صرف نواب رفیق نہیں۔ اسمبلی کے ممبر...... پھر وزیر [illegible] وزیر اعلیٰ بنو گے۔ چلو اٹھو ہمیں جانے سے پہلے بہت کام ہیں۔"

میں نے ایک لمبی سانس لی۔ "ٹھیک کہتی ہو تم۔ میں تو کچھ لے کر نہیں آیا مگر لندن میں سب کچھ مل جاتا ہے۔" میں نے کہا۔

"فلائٹ تو اسلام آباد سے ملے گی اور میرا ویزا بھی [illegible] میں راجا سے کہتا ہوں میری گاڑی واپس منگوا لے۔ [illegible] تمہاری گاڑی میں چلیں گے۔"

"تم چاہو تو اپنی گاڑی فریال کی کوٹھی میں کھڑی کر دو۔"

"اب تم اس کی سیکریٹری نہیں ہو۔"

"ہاں لیکن وہ چاہتی تھی کہ میں اس کی غیر حاضری میں [illegible] کے گھر کا خیال رکھوں۔ گاڑی مت چھوڑو لیکن ہم ایک نظر [illegible] لیں تو کیا حرج ہے۔"

میں نے انکار نہیں کیا۔ ایک خیال میرے ذہن میں بھی تھا۔ اگر بالفرض محال فریال گرفتاری کے ڈر سے فرار ہوئی ہو گی تو اس [illegible] چیزوں کو ایسے ہی چھوڑ دیا ہو گا۔ نور تالے وغیرہ چیک کر لے گی۔

میرا ماہ نور کی بات ماننا ایک غلطی ثابت ہوا۔ ہم ابھی اندر [illegible] تھے کہ پولیس کے اہلکار دندناتے ہوئے کوٹھی میں داخل ہو گئے۔

ہم سے دو بنیادی غلطیاں سرزد ہوئی تھیں۔ ایک تو ہم [illegible] اندر آنے کے بعد مین گیٹ کھلا چھوڑ دیا تھا۔ اندر میری [illegible] کھڑی تھی جو کسی قانونی جواز کے بغیر میرے اندر داخل [illegible] نے کا واضح اور ٹھوس ثبوت فراہم کرتی تھی۔ یہ میرے باپ [illegible] جاگیر نہیں تھی میرے دشمن کی پراپرٹی تھی۔ وہ دشمن بھی قتل [illegible] ہو چکا تھا اور ستم بالائے ستم یہ کہ اس قتل کے شک میں جو افراد [illegible] تھے ان میں سرفہرست میرا ہی نام تھا۔ دوسری غلطی اندر [illegible] لائٹس جلانا ثابت ہوا۔ اصل بات یہ تھی کہ پولیس کے [illegible] نے سے پہلے یہ خیال نہ میرے دماغ میں آیا تھا اور نہ نور [illegible] کہ ہم کوئی جرم کر رہے ہیں۔ نور کی خواہش محض خلوص یا [illegible] شناسی پر مبنی تھی کہ وہ لاوارث رہ جانے والی کوٹھی کو اور [illegible] کے ساز و سامان کو محفوظ دیکھنا چاہتی تھی اور ایک سابق [illegible] یٹری کی حیثیت سے یہاں صرف تالے چیک کرنے آئی [illegible] کوئی سابق سیکریٹری اس دلیل کو اپنی بے گناہی کے [illegible] ت کے طور پر پیش نہیں کر سکتی۔ ٹریس پاس کا جرم اس نے [illegible] مال کیا تھا۔

میری نظر اچانک باہر چلی گئی اور میں نے ایک شیشے [illegible] سے پولیس کی جیپ کو سیدھا اندر آتا دیکھ لیا۔ راہ میں [illegible] کار حائل تھی ورنہ وہ پورچ میں آ کے اترتے۔ ایک [illegible] ڈور جیپ میں بیٹھا رہا۔ ساتھ والی سیٹ پر براجمان کوئی [illegible] ر کے عہدے کا افسر اعلیٰ پتلون سنبھالتا کاہلی سے نیچے [illegible] ۔ اس کے دو حکم کے غلام پیچھے سے اترے۔

میں نے کہا۔ "نور، بس آج مارے گئے۔"

نور کا رنگ پہلے ہی فق تھا۔ "اب کیا ہو گا؟"

"ہم ارتکاب جرم کرتے ہوئے گرفتار ہوں گے۔ [illegible] ڑی ڈال کے تھانے لے جائے جائیں گے۔ صبح تک ہم [illegible] ری سلطان کے قتل کا اعتراف کر لیں گے۔"

وہ رونے کے قریب ہو گئی۔ "خدا کے لیے کچھ کرو۔ [illegible] بتاؤ کہ ہم کسی غلط ارادے سے نہیں آئے تھے۔"

میں نے کہا۔ "پاگل ہو تم۔ کوئی مان سکتا ہے یہ بات۔"

میرا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔ مقابلہ کرنا بھی ایسے [illegible] ممکن تھا جیسے بحث کرنا اور پولیس کو اپنی بے گناہی کا قائل [illegible] ۔ صرف ایک ہی صورت میں ہم محفوظ رہ سکتے تھے کہ کوئی [illegible] چلا کے فرار ہونے میں کامیاب ہو جائیں۔ وقت کم تھا [illegible] پہ میرے دماغ نے حل تلاش کرنے میں دیر نہیں لگائی۔

میں نے نور کو کچن میں بھیج دیا۔ "تم دروازہ کھلا رکھو۔ [illegible] اندر کی لائٹ آف رکھو۔ اندر ایک فریزر ہے۔ اس میں گھس کے بیٹھ جاؤ۔"

اس نے پوچھا۔ "اور تم؟"

میں نے اسے دھکیل دیا۔ "جاؤ میں ان سے نمٹ لوں گا۔"

میں نے تھانیدار کی آواز سنی۔ "کون ہے بھئی اندر؟"

انسپکٹر نے بیڈ روم میں آ کے لائٹ جلائی۔ اس وقت تک میں واش روم میں روپوش ہو چکا تھا۔ میں اس کے انتظار میں ہی رہا لیکن اس نے باتھ روم کا دروازہ کھول کے اندر نہیں جھانکا۔ "ادھر تو کوئی نہیں ہے۔" اس نے کسی سے کہا۔

"سر جی۔ ادھر بھی کوئی نہیں ہے، دوسرے کمرے میں۔" اس کے کسی ماتحت نے اطلاع دی۔

"اوئے اچھی طرح دیکھو۔ گاڑی کھڑی ہے باہر۔ ابھی لائٹ جل رہی تھی۔ کوئی تو ہو گا۔" انسپکٹر نے خفگی کا اظہار کیا۔ "باتھ روم میں دیکھو۔"

میں چوکنا ہو گیا۔ چند سیکنڈ کے بعد باتھ روم کا دروازہ کھلا۔ انسپکٹر کا ہاتھ کسی لائٹ سوئچ کی تلاش میں اندر آیا۔ میں نے اس کی کلائی تھام کے ایک جھٹکے سے اسے اندر کھینچ لیا۔ میرا دوسرا ہاتھ اس کے منہ پر جم گیا۔ اس نے خود کو چھڑانے کے لیے پورا زور لگایا اور میرا ہاتھ چبانے کی پوری کوشش کی۔ وہ میرے پیٹ میں کہنیاں مار رہا تھا اور لاتیں چلا رہا تھا۔ اس کے حلق سے کبوتروں کی غٹرغوں جیسی گھٹی ہوئی آواز بھی نکل رہی تھی۔ میں نے برسوں پہلے لندن میں شوقیہ سیکھے ہوئے مارشل آرٹ کو بروئے کار لاتے ہوئے ناپ تول کے انسپکٹر کی گردن پر کھڑی ہتھیلی کا وار کیا۔ وہ ایک دم بے جان سا ہو کے لٹک گیا۔ میں نے اسے فرش پر گرنے دیا اور باہر جھانکا۔

باہر کمرے میں لائٹ تھی۔ اسے بجھا کے میں نے باہر جھانکا۔ انسپکٹر کے دونوں معاونین میں سے ایک کچن میں لائٹ جلا کے دیکھ رہا تھا۔ ظاہر ہے وہاں اسے کوئی نظر نہیں آیا۔ فریزر کی طرف اس کا دھیان تب جاتا جب خانہ تلاشی مکمل ہونے کے باوجود کسی کو کچھ نہ ملتا۔ ابھی یہ کام شروع ہوا تھا اور ان سب کو یقین تھا کہ اندر جو بھی ہے سامنے آ جائے گا۔ اس نے لائٹ آف کی اور جب وہ میرے سامنے سے گزرا تو میں نے اسے کمرے میں کھینچ لیا۔ اس نے کہا۔ "اوئے کون ہے؟" اس کا جواب میں نے یہ دیا کہ تمہارا باپ اور پھر اسے وقتی طور پر ساری ذمے داریوں کے خیال سے سبکدوش کر کے لٹا دیا۔ اسی دوران ساتھی اہلکار اس مکالمے کو سن کر کمرے میں داخل ہوا اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ پاتا میں نے اسے تمام فکرات سے آزاد کرتے ہوئے اٹھا غفیل کر دیا۔

اب میں سیدھا کچن کی طرف دوڑا جہاں نور ایک فریزر کے اندر منجمد کردینے والے درجۂ حرارت میں چھپی بیٹھی تھی۔ نہ جانے اس نے گوشت مچھلی جیسی چیزوں کے درمیان اپنے لیے جگہ کیسے بنائی ہوگی۔ خدانخواستہ وہ بھی فریز ہوگئی تو کیا ہوگا؟ کیا اسے گرم کرکے اپنی اصل حالت میں لانا پڑے گا۔ ایسے فضول خیالات میرے دماغ میں صرف پریشانی کی وجہ سے آئے۔

نور صرف دس منٹ میں برف کی پُتلی نہیں بن سکتی تھی اور جب میں نے ڈھکن اٹھایا تو وہ خالی فریزر میں بڑے آرام سے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”کیا وہ چلے گئے؟“

میں نے کہا۔ ”تم باہر آؤ۔ مجھے تمہاری فکر ہو رہی تھی کہ کہیں جم نہ جاؤ۔“

وہ مسکرائی ”فریزر استعمال نہیں ہو رہا تھا۔“ اور میرا ہاتھ تھام کے باہر نکل آئی۔

”تین سے تو میں نے نمٹ لیا۔ ایک باہر جیپ میں ہے اور جیپ نے ہماری گاڑی کا راستہ روک رکھا ہے۔ خیر کچھ سوچتے ہیں۔“

”آخر یہ چھاپہ مارنے کی وجہ۔ انہیں کیسے شک ہوا کہ ہم یہاں ہیں اور پھر ہمارا جرم......“

میں نے جھلا کے کہا۔ ”بے وقوفی کے سارے سوالات ابھی ضروری ہیں؟ وہ ہمیں گرفتار کرنے نہیں آئے تھے۔ یہ معاملہ کچھ اور ہے۔“

”بے شک یہاں آنے کا مشورہ دینا میری غلطی تھی۔“

میں نے کہا۔ ”غلطی کو چھوڑو۔ تم یوں کرو یہ جو ڈرائیور جیپ میں بیٹھا ہے، اس سے کہو جائے۔“

”میرے کہنے سے وہ چلا جائے گا؟“

”اسے کہو، تھانیدار صاحب...... اس کا نام دیکھا تھا میں نے، انسپکٹر اشرف علی...... انہوں نے کہا ہے کہ تم واپس جاؤ۔ وہ کھانا ہمارے ساتھ کھائیں گے۔ پھر ہم انہیں اپنی گاڑی میں چھوڑ دیں گے۔“

نور تذبذب میں کھڑی رہی۔ ”مجھے ڈر لگتا ہے۔ اسے شک ہوگیا پھر۔“

”دیکھو۔ ذرا اعتماد کے ساتھ جاؤ، مسکراتی ہوئی۔“

نور نے سر ہلایا اور مردہ آواز میں بولی۔ ”جاتی ہوں لیکن......“

میرے اصرار سے مجبور ہوکے اس نے چہرے پر کچھ بشاشت پیدا کی، بال سنوارے اور مسکراتی ہوئی آگے بڑھی لیکن چند قدم کے بعد اس کا حوصلہ جواب دے گیا۔ ”میں...... نہیں کر سکتی۔“ اس نے مظلومیت سے کہا۔

”او کے، او کے۔ میں کچھ اور سوچتا ہوں۔“

سوچنے کے لیے زیادہ وقت نہیں تھا۔ میرے ذہن میں کئی قابلِ عمل خیال آئے۔ یا ہم کچھ بھی نہ کریں اور وقت ایسا آئے کہ صرف خاموشی اور انتظار سے شک میں مبتلا ہوکے وہ بقلم خود اندر جا کے حقیقت حال جاننے کی کوشش کرے اور میں اسے بھی لٹا دوں۔

مگر کسی خیال کو عمل کا جامہ پہنانے کی نوبت ہی نہ آئی۔ اچانک ڈرائیور جیپ سے اترا اور اندر کی طرف چل پڑا۔ میں اور نور ایک روشن کمرے میں پردے کے پیچھے موجود تھے اور ایک انچ کی درز سے سب دیکھ رہے تھے۔ مناسب وقت پر میں نے انگریزی محاورے کے مطابق ”کھلے بازوؤں کے ساتھ“ اس کا استقبال کیا اور وہ آواز نکالے بغیر لیٹ گیا۔

”یہ ہوگئے چار...... اب؟“ نور نے سوال کیا۔

”یہ آدھے پون گھنٹے بعد خوابِ غفلت سے بیداری شروع کردیں گے۔ کیا اتنی مہلت کافی نہیں ہے؟“

دس منٹ میں نور نے کچھ تالے لگائے۔ کچھ کھول کے اہم چیزیں نکالیں۔ ان میں زیورات کے علاوہ زیادہ تھے۔ باقی فائلیں تھیں جن کے بارے میں نور نے مجھے بتایا کہ پراپرٹی کے کاغذات تھے۔

چار افراد ایک جیپ میں بہ آسانی بیٹھ جاتے ہیں لیکن پانچواں میں تھا اور چار سواریاں بیٹھنے کے قابل نہ تھیں۔ لٹانے کی جگہ محدود تھی چنانچہ میں نے انہیں ایک دوسرے پر ڈھیر کیا۔ نور کو کچھ اہم ہدایات دیں اور جلدی کرنے کی تاکید کرکے جیپ سمیت باہر نکل گیا۔ کام مشکل اور خطرناک تھا۔ اگلے پندرہ منٹ میں ان چاروں کو میں نے الگ الگ مقامات پر ڈراپ کیا۔ دس منٹ بعد میں نے جیپ کے اسٹیئرنگ وہیل پر سے اپنے فنگر پرنٹس صاف کیے اور تھانیدار صاحب کو جیپ میں ایک گلی کے سامنے چھوڑ کے اتر گیا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کھسروں کی گلی تھی۔

نور میری گاڑی میں پہلے سے وہاں موجود تھی جہاں ہمیں ملنا تھا۔ ابھی تو ہم گرفتار ہوئے بغیر بہ حفاظت نکل جانے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ یہ سارا قصور اس نظام کا تھا جس میں بے گناہ پکڑا جائے تو خود کو بے گناہ ثابت کرنے تک اس کو قانون کی کتابوں میں لکھی ہوئی سزا سے کہیں زیادہ سزا مل چکی ہوتی ہے لہٰذا میرے لیے جھوٹ ہی سب سے محفوظ پناہ گاہ تھی۔ جھوٹ ہی میرا سچ تھا۔ جھوٹ ہی

تھی اور جھوٹ ہی میرا وکیل ہوسکتا تھا۔ کچھ دیر بعد نور نے مجھ سے سوال کیا۔ ”اب ہم کہاں جا رہے ہیں جان۔ بہت ڈر لگ رہا ہے۔“

تو میں نے ہنس کے کہا۔ ”اب کس بات کا ڈر؟“

”تم نے ان سب کو کہاں چھوڑا؟“

میں نے خوش دلی سے جواب دیا۔ ”یہاں وہاں۔ ایک دوسرے سے بہت دور۔ یہ سوچ کے مجھے ہنسی آتی ہے کہ کچھ دیر میں جب ہوش آنے پر ان کی آنکھ کھلے گی تو کیا کیفیت کی سچویشن ہوگی۔ جادونگری میں پہنچ جانے والے کی طرح وہ سوال کریں گے۔ ”میں کہاں ہوں؟“ آس پاس نظر ڈال کے سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ وہ خواب تھا یا اب وہ خواب دیکھ رہے ہیں۔ خصوصاً وہ تھانیدار، اس کے سوال پر کوئی کھسرا تالی بجا کے کہے گا کہ ہائے ہائے تھانیدار جی۔ اتنی کیوں پی لی تھی۔“ میں نے قہقہہ مارا۔

نور کو بالکل ہنسی نہیں آئی۔ ”اور اس کے بعد؟“

”اس کے بعد کیا۔ سب کپڑے جھاڑ کے اٹھیں گے پھر رخ کریں گے اپنے تھانے کا۔ ہماری بلا سے۔ سچ وہ ثابت ہو۔“

”انہوں نے گاڑی کا نمبر دیکھ لیا ہوگا۔“

”یار نمبر غلط بھی یاد رہ جاتے ہیں۔ ان کے کہنے سے کیا ہے۔ وہ نمبر بتا دیں عمران خان کی گاڑی کا تو کیا عمران خان مجرم ہو جائے گا؟ اول تو ہم سے پوچھے گا کون اور پوچھا تو ہمارا جواب ملے ہے۔ ہم اسلام آباد میں تھے۔ تم الگ اور میں الگ۔ تمہیں ویزا لینے کے بعد لندن کے لیے بکنگ حاصل کرنی تھی۔ اور مجھے بھی۔ ثبوت حاضر، گواہ حاضر۔ نتیجہ ہم سچے۔“

”ہم نے ایک چھوٹا جرم چھپانے کے لیے بڑا جرم کیا۔“

”یہ تو قاعدہ ہے۔ چھوٹا جھوٹ چھپانے کے لیے بڑا جھوٹ۔ اب تم اپنا موڈ ٹھیک کرو۔ مسکرا کے بجلی گرا کے دکھاؤ۔ ہم اسلام آباد جا رہے ہیں اور پھر لندن، ایک ساتھ۔“

اس نے مسکرا کے میرے کندھے پر سر رکھ دیا۔ ”مجھے بھوک لگی ہے۔“

”اچھا یاد دلایا۔ آخری طعام میں نے کب کیا تھا؟ کئی زمانہ ہوگئے غالباً۔ خیر آگے اپنے میاں جی کا شہرۂ آفاق ہوٹل ہے۔ کیا تم نے ان کا مشہورِ عالم دال پراٹھا کھایا ہے؟ نہیں تو پھر تم نے زندگی نہیں گزاری۔ جھک ماری......“

اندر سے میں بھی اپ سیٹ تھا لیکن مردانہ وار دوہری ذمے داری نبھا رہا تھا۔ صورتِ حال سے نمٹنے کی اور نور کو سنبھالنے کی۔ ”آخر پولیس وہاں کیوں آئی تھی۔“ نور نے کھانے کے بعد پوچھا۔

”ظاہر ہے ہمیں پکڑنے نہیں۔“

”پھر؟ کیا فریال کو پکڑنے؟“

”یہ بالکل ظاہر ہے۔ یہ مجھے بھی معلوم کرنا پڑے گا کہ اس گرفتاری کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ ایک کیس میں وہ بھی ضمانت پر تھی جیسے میں ہوں۔ چودھری سلطان کا کیس۔ اب اس کی لاش مل گئی ہے تو کسی نہ کسی کو قاتل بھی ثابت کرنا ضروری ہے۔ میری گاڑی میں اس کی لاش ڈال کے پھانسی کا پھندا میرے گلے میں ڈالا جا رہا تھا۔ مجھے اللہ میاں نے صاف بچا لیا۔ اس کے بعد یہ پھندا صرف فریال کی گردن میں فٹ بیٹھتا تھا۔ لیکن......“

”لیکن کیا۔ کچھ آگے بھی فرماؤ۔“

”تازہ ترین انتقال پر ملال ہوا ہے اپنے جب خان کوریلہ کا۔ لوگ اسے جائز طور پر کریلا کہتے تھے۔ ان کی موت کے اسباب ہنوز متنازعہ ہیں۔ ڈاکٹر کہتے ہیں اس کا سبب ہارٹ فیل ہونا تھا۔ ایسی زندگی اور ایسے اعمال ہوں تو دل کیا کرے، فیل ہی ہوگا۔ لیکن اس کے وارث کچھ سنسنی پھیلا رہے ہیں کہ اباجی کو دل کا عارضہ تو تھا ہی نہیں۔“

”یہ جھوٹ ہوسکتا ہے۔“

”ہاں۔ مرحوم کے پاس دل ہی کہاں تھا۔ سینے میں ایک پتھر کا ٹکڑا تھا۔ اسی لیے سنگدل تھے۔ لیکن میرا یہ بھی خیال ہے کہ ورثا کا بیان ایک سیاسی اسٹنٹ ہے اور کچھ نہیں۔ پبلسٹی کے لیے یا کسی کو پھنسانے کے لیے۔ رہی ڈاکٹروں کی رائے تو وہ بدل بھی سکتی ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے اگر اسے قتل کا کیس بنایا گیا تو الزام فریال پر آئے گا؟ لیکن کیوں؟ فریال سے اس کی کیا دشمنی ہے۔“

”اگر کبھی تم اس تھوڑی سی عقل میں سے جو خدا نے تمہیں دے دی ہے۔ تھوڑی سی استعمال کرلوگی تو تمہارا یہ خوبصورت سر خالی نہیں ہو جائے گا۔ ارے بابا دشمنی فریال سے نہیں مجھ سے تھی، رانا کی وجہ سے۔ اور خمیازہ بھگتنا پڑ رہا ہے فریال کو۔ یہ سیاست کی شطرنج ہے جانم۔ رانا کا اور اس کریلے کا گٹھ جوڑ تھا۔ دونوں کا تعلق ایک ہی پارٹی سے ہے۔ گزشتہ انتخابات میں انہیں اتنی سیٹوں پر کامیابی نہیں ملی کہ وہ پنجاب میں حکومت بنا سکتے۔ آزاد امیدوار اور چھوٹی پارٹیوں کے اکا دکا کامیاب ہونے والوں نے ان سے اتحاد کرلیا ہوتا تو شاید یہ ایک مخلوط حکومت بنا لیتے اور جو آج حکومت میں ہیں

وہ اپوزیشن میں بیٹھے ہوتے۔ اب پھر انتخابات آرہے ہیں اور مقابلے پر وہی پرانے حریف ہیں۔ میرے علاقے سے رانا رجب علی کی سیٹ پکی تھی۔ اچانک میرے مقابلے پر آنے سے نقشہ بدل گیا۔ رانا کی جدی پشتی سیٹ خطرے میں پڑگئی۔ نہ رانا مجھے قائل کرکے الیکشن سے دور رکھ سکتا ہے نہ خرید سکتا ہے۔ رہ جاتا ہے بدمعاشی کا طریقہ۔ یہ اس نے دیکھ لیا کہ میں ڈرنے والا نہیں۔ سیر کا جواب سوا سیر سے دے سکتا ہوں۔ پھر کون سا راستہ رہ جاتا ہے اس کے پاس۔''

نور نے سادگی سے کہا۔ ''صبر کرے۔ بیٹھ جائے آرام سے۔ اس بار کوئی اور سہی۔''

میں ہنس پڑا۔ ''میری بھولی حسینہ۔ طاقت اور اختیار، حکومت اور سلطنت، یہ کوئی رضا کارانہ طور پر کسی کو دیتا ہے؟ رانا کے پاس اس کے سوا راستہ نہیں کہ وہ مجھے اس دنیا سے چلتا کردے۔ کوشش وہ کررہا ہے لیکن ابھی تک اللہ بچاتا رہا ہے۔ یہ رانا جیسے لوگوں کا طریقہ ہے۔ میں نے کبھی نہیں سوچا کہ اسے اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے ختم کرادوں۔''

''کیوں نہیں سوچا؟'' نور نے سوال کیا۔

''شاید اس لیے کہ میں پڑھا لکھا اور مہذب آدمی ہوں۔ بزدل ہوں یا بے وقوف ہوں۔ میرے لیے ہار جیت کوئی زندگی یا موت کا مسئلہ نہیں جو رانا کے لیے ہے۔ اس کی یہ کوشش بھی ہے کہ کسی طرح میں الیکشن میں حصہ لینے کے لیے نااہل ہوجاؤں۔ چودھری سلطان کا قتل میرے سر منڈھنے کی کوشش کا مقصد اور کیا ہے۔ اگر سزائے موت نہیں ہوتی تو عمر قید ہی ہوجائے۔ سزا یافتہ ہوجانے کے بعد میں الیکشن کے لیے نااہل ہوجاؤں گا۔''

''ایسی ہی کوشش تم بھی کررہے ہو۔''

''یار وہ ایک مجرم کو قانون کے مطابق سزا دلانے کی کوشش تھی۔ اس نے اپنی ہی بیٹی کا قتل کیا تھا۔ شہناز کو اغوا کیا تھا اور حبس بے جا میں رکھا تھا۔ میں نے تو ایسا کوئی کام نہیں کیا۔''

''تم خفا ہوگئے۔''

''تم نے بات ہی ایسی کی۔ اب وہ فریال کے ذریعے مجھے بلیک میل کرنا چاہتا تھا۔ ابھی تک میں نے فریال کے ڈانس کا وہ کیسٹ نہیں دیکھا۔ میں دیکھنا بھی نہیں چاہتا۔ معلوم نہیں فریال نے جانتے بوجھتے ایسا کیا یا لاعلمی میں۔''

''وہ جانتے بوجھتے ایسا کیوں کرے گی۔''

''اب میں کیا بتاؤں تمہیں نور۔ خود کو عقل مند ثابت کرنے کے چکر میں اس عورت نے کیسی کیسی بے وقوفی کی ہے۔ مجھ پہ احسان جو نہ کرتے تو یہ احساں ہوتا۔ چودھری سلطان کو اسی نے مروایا۔ لیکن وہ قتل کس کے گلے پڑ... کے سامنے پرانے پاپی تھے۔ بے غیرت اور بے ضمیر... کہہ سکتا ہوں کہ عجب خان سے بھی اس نے کوئی سودا... ہو۔ وہ تو تھا ہی سب کچھ۔ بدمعاش، بلیک میلر، بدکردار۔ فریال کی اس کے سامنے کیا حیثیت۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ......''

''ہاں۔ مجھے شک ہے یا ڈر ہے۔ عجب خان... اسے دھوکا دیا۔ جھوٹ بولا اس سے۔ الٹا فریال کو میرے... استعمال کرنے کی کوشش کی اور فریال نے اسے قتل کردیا۔''

''فریال نے؟ تم بھی ایسا سمجھتے ہو۔''

''میں نے کہا نا مجھے شک ہے۔ اگر اس کے وار... مچا رہے ہیں تو یہ بات سچ بھی ہوسکتی ہے کہ عجب خان کو پہلے ہارٹ پرابلم نہ ہو۔ وہ کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ اگر یہ... ہوگیا کہ اس کی موت کے اسباب طبعی نہیں تھے تو اسپتال پھنس جائیں گے۔ پھر تفتیش ہوگی۔ اور یہ مرڈر ہوا تو جانے کس کس پر شک کیا جائے گا۔ ان میں فریال بھی ہے، میں بھی۔ آج فریال کے گھر پولیس کے چھاپے کا مقصد تھا؟ بہت جلد سامنے آجائے گا۔ تم کہتی ہو کہ وہ د... ہے۔ کسی شوٹنگ کے سلسلے میں۔ وہاں سے بمبئی جائے گی... یہ نہیں ہوسکتا کہ وہ خوف سے فرار ہوگئی ہو؟''

''لیکن وہ کوئی گمنام عورت نہیں اور ایسے کب روپوش رہ سکتی ہے۔''

''اور یوں فرار ہونے سے اس کے قانونی مسائل حل نہیں ہوتے۔ اس کی مشکلات اور بڑھ جائیں گی۔''

''ایسا تم اپنے بارے میں کیوں نہیں سوچتے۔''

''کیا مطلب؟''

''تم اگر اس طرح لندن چلے جاؤ گے تو کیا تم... مشکلات میں اضافہ نہیں ہوگا؟''

میں نفی میں سر ہلایا۔ ''میری بات اور ہے۔ میں... وقت پاکستانی اور برٹش نیشنلٹی ہولڈر ہوں۔ ان دونوں مما... کے میرے آنے جانے کو فرار نہیں سمجھا جاسکتا۔ میں کچھ... سکون سے رہنا چاہتا ہوں۔ میری عدم موجودگی... یہاں کچھ بھی ہوتا رہے کسی بھی معاملے میں میرا نام نہ آ... یہ ایک مقصد ہے۔ دوسرا وہی جو میں نے بتایا۔ مجھے د... تلاش اور قائل کرکے واپس لانا ہے۔ امید مجھے بھی بہ... ہے لیکن میں کہتا ہوں کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔ ا... میں یہ سوچ سوچ کے پریشان ہوتا رہتا ہوں کہ میرے نا... واپس آنے کے بعد نینا کا کیا ہوگا؟''

...ہلی۔ ''نینا کی نہیں نواب صاحب، اپنی فکر کریں۔ ...نے تو تمہیں ہی وحید مان لیا ہے۔ اب انکار کیسے ...م۔ زندگی ڈبل رول والی فلم ہوگی۔ اس کے لیے تم ...میرے لیے رفیق۔ جیسے تمہارے لیے میں وہی پرانی ...یہاں مگر دنیا کے لیے نور۔''

''تمہیں مذاق کی سوجھ رہی ہے۔''

''اوکے۔ سیریس ہوکے میں تمہیں ایک مشورہ دیتی ...لندن میں ہم کسی بھی وقت جاسکتے ہیں۔ نہ کوئی تمہیں ...نے والا نہ مجھے۔ ایسے فرار ہونے سے بہتر ہے کہ معاملات ...لیں، پھر جائیں۔''

''یہ اتنی جلدی نمٹنے والے معاملات ہیں؟''

''صورتِ حال واضح ہوجائے ورنہ لندن میں بھی ...نی رہے گی۔ ایسا نہ ہو وہاں کے سارے کام ادھورے ...کے واپس آنا پڑے۔ ایک معاملہ تو فریال ہے۔ وہ یقیناً ...میں ہے۔''

''لیکن میں اس کی کوئی مدد نہیں کرسکتا۔''

''مجھے شک ہوتا ہے۔ وہ دبئی بھی نہیں گئی۔ تمہاری ...اس کی کوشش بھی یہی ہے کہ کچھ عرصہ خود کو اس پورے ...سے الگ اور دور کرلے۔ یہاں جو ہوتا ہے ہو۔ جب یہ ...بیٹھ جائے تو اطمینان سے اپنے پلان کے مطابق تمام ...ات کو طے کرلے۔''

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ ''تمہارے نزدیک یہ ...وگا۔''

''تم صرف اپنے ذہن سے اپنے امکانات تک محدود ...تمہارے دشمن اس صورتِ حال کو کیسے اپنے فائدے کے استعمال کرسکتے ہیں؟ یہ بھی سوچو۔ پاکستان کی پولیس کو تم ...تے ہو۔ کسی ثبوت دلیل کے بغیر وہ کیس کا رخ بدل سکتے ...کہہ سکتے ہیں کہ اصل مجرم تو نکل گئے۔ مجرم نہ ہوتے تو ...کیوں ہوتے۔''

''یو آر ویری رائٹ۔ مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

''ایک تو راجا سے کہو کہ وہ اپنے شوبز کے تعلقات کو ...اری سے استعمال کرے اور فریال کا پتا چلائے۔ دبئی میں ...ا کے ساتھ ہے۔ اس کا شوٹنگ شیڈول کیا ہے۔ کوئی ڈراما ...اشتہار ہے یا فلم۔ مجھے لگتا ہے کہ جواب نفی میں آئے گا۔ وہ ...ابھی اور ہوسکتا ہے کہ تم سے یا مجھ سے رابطہ کرے۔''

''وہ کس لیے؟''

''دیکھو، بظاہر یہ سارے معاملات الگ الگ وقتوں ...الگ جگہ پیش آئے۔ چودھری سلطان مارا گیا۔ کسی نے اس کی لاش تمہاری ڈکی میں ڈال کے تمہیں مجرم بنانا چاہا۔ کسی اور نے یہ جانے بغیر تمہارا کام تمام کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ ادھر عجب خان کریلہ مرگیا۔ وارث اس کے ہارٹ اٹیک کو تسلیم نہیں کرتے۔ یہ قتل تھا تو کس نے کیا۔ بے شک ایسے لوگوں کے دوست بھی دشمن ہی ہوتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی فریال غائب ہوگئی۔ کیا تم آپس میں ان معاملات کو لنک نہیں کرسکتے؟ اور اگر ہمارے لندن جانے کو بھی واقعات کی اس کڑی میں جوڑ دیا گیا پھر؟''

''پھر کیا۔ جو ہوگا بھگتنا پڑے گا۔''

''تم معاملات کو سیٹل کرو۔ جانے سے پہلے۔ سامنے جاکے کہو کہ 'یس، آئی ایم ہیئر۔ یہ کیا سازش ہورہی ہے میرے خلاف۔ ہر معاملے میں میرا نام کیوں آرہا ہے۔ پولیس کیا کررہی ہے؟ پہلے میری گاڑی چوری ہوئی پولیس نے کیا کارروائی کی؟ کسی کو پکڑا؟ پھر اس میں چودھری سلطان کی لاش ڈالی گئی۔ کس نے ڈالی؟ پولیس نے کس کے خلاف کیس بنایا؟ کیا تفتیش کی؟ یہ معلوم کیا کہ وہ چور کون تھا جو میری گاڑی میں چودھری سلطان کی لاش لے کر جارہا تھا؟ اس پر قاتلانہ حملے کرنے والے کون تھے۔ وہ کس کی گاڑیاں تھیں جنہوں نے میری گاڑی کو تباہ کیا حالانکہ میں اس میں نہیں تھا۔ ابھی تک ان کا سراغ نہیں لگایا گیا؟ تم تو ایک ہنگامہ کرسکتے ہو۔ پولیس کے خلاف طوفان کھڑا کرسکتے ہو۔ اب اس کے راستے کا کانٹا نکل گیا ہے۔''

''کس کے راستے کا......''

''آئی جی صاحب کے راستے کا۔ عبداللہ جان تمہارا دوست ہے۔ وہ بھی بہت کچھ کرسکتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''انعام کے طور پر اچھی بات کہنے والے کا منہ چوم لیا جاتا ہے۔ یہ ہماری روایت ہے۔''

''اچھی روایات کو چھوڑنا نہیں چاہیے۔''

میں نے سر کھجا کے کہا۔ ''یعنی تمہاری طرف سے اجازت ہے یہاں بھی، تمہیں شرم نہیں آتی۔''

''انعام لینے میں کیسی شرم؟''

میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''تقریب ملتوی کی جاتی ہے۔''

نور نے میری حوصلہ افزائی کی تھی اور مجھے قائل کرلیا تھا۔ میں اب پہلے کے مقابلے میں زیادہ پرسکون تھا۔ میں نے راجا سے بات کی۔ وہ راولپنڈی کے ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹر اسپتال میں تھا۔ ''یہ بڑا اچھا ہوا کہ میں یہاں آگیا ورنہ چودھری سلطان کی لاش یا تو غائب ہوجاتی یا لاوارث قرار دے کر دفنا دی جاتی۔ اس کی پراسرار گمشدگی کا بھوت ہمارے

سر پر منڈلاتا رہتا۔"

"ہم قبر کھود کے لاش نکلوا لیتے۔"

"وہ بڑا لمبا چکر ہوتا۔ کرنے والے قبروں میں سے لاش غائب کروا دیتے ہیں۔ اب ٹھیک ہے۔ ڈیتھ سرٹیفکیٹ جاری ہو جائے گا۔ تو کہاں ہے؟"

میں نے کہا۔ "راستے میں۔ دو گھنٹے میں پہنچ جاؤں گا۔ فی الحال میں نے لندن جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا ہے، چند روز کے لیے۔"

"یہ ٹھیک فیصلہ کیا تو نے۔ تیرا یوں جانا شکوک پیدا کرتا اور کہا جاتا کہ تو فرار ہو گیا۔ مجھے بعد میں احساس ہوا کہ ایسی سچویشن میں خود اپنی طرف سے مزید خرابی کے اسباب پیدا کرنا کوئی عقلمندی نہیں۔"

"راجا صاحب۔ بعض اوقات میں خود کو ایک گدھا محسوس کرتا ہوں۔"

"گدھے کے لیے یہ بالکل فطری بات ہے۔"

"مجھے سب ایک طرف ہانکتے ہیں۔ کوئی اور دوسری طرف ہانک دیتا ہے۔ اور میں کہتا ہوں کہ یہ بھی ٹھیک تھا۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔ کیا تو نے وہاں اپنے قبیلے کے اور بھی شور مچانے والے بلائے ہیں۔ دوسرے اخبار نویس؟"

"ہاں اس کے بغیر گزارا کہاں تھا۔ میں اکیلا شور کرتا رہتا تو کس کے کان پر جوں رینگتی؟"

"ذرا خفیہ طور پر معلوم کر یہ فریال کہاں ہے؟"

"تیری وہ کیا لگتی ہے جو تو اس کے لیے پریشان ہے؟" راجا بگڑ گیا۔

"جو میں کہہ رہا ہوں وہ کر۔ بک بک نہ کر۔ خیال تو یہی ہے کہ وہ دبئی میں ہے اور کسی شوٹ کے لیے گئی ہے۔ لیکن ممکن ہے ایسا نہ ہو۔ یہ نور نے کہا ہے۔"

"اگر نور نے کہا ہے تو کچھ سوچ کے ہی کہا ہوگا۔ یہ خیال کیوں آیا اسے؟"

"جیسے میں فرار ہو رہا تھا، وہ روپوش ہو گئی۔"

"پتا چل جائے گا لیکن معلوم کرنے سے نہیں فیکے پتر۔ اس کے لیے سب سے زیادہ قابلِ اعتماد صرف تیری ذات ہے۔ وہ خود تجھے بتا دے گی۔ دبئی میں اس کے ہونے نہ ہونے والی خبر چھپی نہیں رہ سکتی۔" راجا نے کہا اور فون بند کر دیا۔

مناسب یہی تھا کہ میں نور کو کسی ہوٹل میں چھوڑ دوں۔ اسے اپنا ویزا اور ٹکٹ لینا تھا چنانچہ اسلام آباد کا ایک درمیانہ سا گمنام ہوٹل اس کی اور میری رہائش کے لیے موزوں ثابت ہوا۔ وہ میرے ساتھ رہنا چاہتی تھی لیکن میرے لیے یہ ممکن نہیں تھا۔ میں نے اسے کہا کہ دیر ہو تو وہ کھانا کھا کے سو جائے۔ میری واپسی کا کوئی وقت طے نہیں تھا۔

راولپنڈی کے ڈسٹرکٹ ہیڈ کوارٹرز اسپتال میں ... کے وقت بھی بہت لوگ تھے۔ مری روڈ پر پوری ٹریفک تھی اور اسپتال کے احاطے میں سیکڑوں لوگ پھیلے تھے۔ یہ مختلف وارڈز میں داخل مریضوں کے ساتھ گرد و نواح کے دیہات سے آنے والے لوگ تھے جو وہیں گزارنے پر مجبور تھے لیکن وارڈز میں نہیں رک سکتے تھے۔ پارکنگ ایریا میں بھی مجھے ایک گاڑی کے نکلنے سے جگہ مل گئی ورنہ شاید مجھے بھی اپنی گاڑی کو سڑک پر چھوڑنے کا رسک لینا پڑتا۔ نہ جانے کہاں سے غنی کی عقابی نظر نے تاڑ لیا۔ وہ سیدھا میری طرف آیا۔ میں گاڑی لاک کر رہا ہی تھا کہ وہ سلام کر کے میرے ساتھ چلنے لگا۔ اس وقت میں نے ایک اور شخص کو دیکھا جو بظاہر بے تعلق سا میرے پیچھے آ رہا تھا۔ یہ میری حفاظت پر مامور فرشتے تھے جو اپنے فرض سے غافل نہیں ہوئے تھے۔

غنی مجھے سیدھا راجا کے پاس لے گیا۔ وہاں مردہ خانے کی نحوست زدہ بیرک کے باہر تقریباً ساٹھ ستر افراد گروہ بنائے کھڑے تھے۔ ایک گروہ جو چند افراد پر مشتمل تھا ان صحافیوں کا تھا جو مدت میں راجا کے ساتھ رکے ہوئے تھے ورنہ ان کے لیے اب نہ کوئی خبر رہی تھی اور نہ خبر کی خیزی۔ باقی دو گروہ ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر جارحانہ موڈ میں کھڑے تھے۔ ان میں کچھ لوگ مسلح بھی تھے۔

"یہ دائیں بازو کے لوگ چودھری سلطان کی لاش لے جانے کے لیے گجرات سے آئے ہیں۔" راجا نے بتایا۔ "کچھ دور کے عزیز ہیں۔ کچھ واقف اور جاننے والے۔"

"اور یہ دوسرے۔"

"یہ مقامی لوگ ہیں۔ راولپنڈی کا ایک علاقہ ٹاہلی موڑی۔ یہ بھی لاش کے دعوے دار ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ پولیس نے ڈیڑھ مہینے پہلے ایک شخص بنارس خان کو شبے میں سمجھ کے گرفتار کیا تھا۔ مشتبہ کون ہوتا ہے؟ یہ صرف پولیس جانتی ہے۔ عام طور پر کسی کو پکڑ لینے کے بعد اسے ڈکلیئر کیا جاتا ہے کہ وہ کیا کرنے جا رہا تھا یا کیا کر چکا ہے۔ اصل کہانی کسی بااثر شخص سے دشمنی کی تھی۔ پولیس نے تھانے میں رکھا اور تشدد کر کے مار دیا۔ تھانے کے روزنامچے میں بھی اس کا کوئی ریکارڈ نہیں تھا۔ پولیس نے کہا کہ ہم نے اسے تھوڑی دیر بعد چھوڑ دیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ گھر والے روز تھانے جاتے رہے۔ اس کے بھائی نے اپنا اسکوٹر

... ہزار نقد دیے۔ ماں نے سونے کا ایک کڑا دیا اور باپ نے ... ان کی منت سماجت کی۔ جب معاملات طے پا گئے تو ... بندہ غائب ہے۔ پولیس کہتی رہی کہ ہم نے اسے ... دیا تھا۔ وہ گھر چلا گیا تھا۔ اب ان کا دعویٰ ہے کہ لاش ... خان کی ہے۔"

"کیوں؟ دونوں کی صورت ملتی ہے؟"

"صورت پہچانی کہاں جاتی ہے۔ چل تو دیکھ لے۔"

میں ہمت کر کے راجا کے ساتھ میڈیکل آفیسر کے ... میں پہنچا۔ وہاں پولیس سرجن کے ساتھ ایک بیزار ... ایس پی کھانا کھا رہا تھا۔ وہ سانولے رنگ کی ایک ... نرس کے ساتھ باقاعدہ فحش کلامی کر رہے تھے اور ... کی بات یہ تھی کہ نرس اس کا برا انہیں مان رہی تھی بلکہ اس ... رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی نرس باہر نکل گئی۔

"آپ بھی ہر ایک کو اندر لے آتے ہیں راجا صاحب۔" ... ناگواری سے بولا۔

راجا نے کہا۔ "میں صرف یہ بتانے آیا تھا کہ میں ... رفیق احمد شیرازی کو اندر لے جا رہا ہوں۔ چودھری ... کی شناخت کے لیے۔"

ایس پی نے مجھے غور سے دیکھا۔ "ان کا نام بھی ہے ... آئی آر میں......"

"ہاں۔ مگر میں ضمانت پر ہوں۔" میں نے کہا لیکن میں ... محسوس کیا کہ ایس پی سوچ میں پڑ گیا ہے اور اس کے اور ... سرجن کے درمیان معنی خیز نظروں کا تبادلہ بھی ہوا ہے۔

راجا کے ساتھ میں دوسرے دروازے سے نکلا اور ... طویل برآمدے کے آخری حصے تک پہنچا جہاں ایک ... دروازے کے سامنے اسٹول ڈالے اسپتال کا کوئی نچلے ... کا ملازم بیٹھا ہوا تھا۔ عام طور پر مردہ خانوں میں جو کچھ ... تے ہیں یہی بھنگی کرتے ہیں۔ وہ مُردوں کو ادھر سے ادھر ... لے پھینکتے یا گھسیٹتے ہیں۔ پوسٹ مارٹم کے لیے ٹیبل تک ... اتے ہیں۔ کاٹتے ہیں اور ان کے جسمانی اعضا نکالتے ... لیے میں اور معائنے کے بعد کہیں پھینک دیتے ہیں۔ وہ ... کام میں اتنے بے حس اور ایسے ماہر ہو جاتے ہیں کہ ... بھی عام آدمی کی پوسٹ مارٹم رپورٹ ان کے ... ہدے اور معائنے پر مرتب کر کے دستخط کر دیتے ہیں۔

شاعرانہ خیال ہے کہ موت اک زندگی کا وقفہ ہے۔ ... آگے چلیں گے دم لے کے۔ آخرِ کار سوم تک ہر مذہب ... عقیدے کے لوگ مرنے والے کو اتنا احترام دیتے ہیں جتنا ... ساری زندگی میں نہ ملا ہوگا۔ اس دنیا سے دوسری دنیا میں رخصتی کی تقریب اتنی ہی باوقار اور دل گداز ہوتی ہے جتنی ماں باپ کے گھر سے بیٹی کی رخصتی۔ لیکن انسان کے مردہ جسم کی بے توقیری اور بے حرمتی دیکھنی ہو تو کبھی سرکاری مردہ خانے جا کے دیکھیں۔

راجا نے سو روپے کا طے شدہ معاوضہ نگراں کے ہاتھ میں رکھا جسے اس نے کامل بے حسی کے ساتھ جیب میں ڈال لیا اور چرس بھرے سگریٹ کے کش لگانے میں مگن رہا۔ اس کی بو دھویں کے ساتھ محسوس کی جا سکتی تھی۔ دروازے سے اندر داخل ہوتے ہی میں نے وہ عبرت آموز اور دل دہلا دینے والا منظر دیکھا جو میرے لیے نیا نہیں تھا۔ اس کے باوجود مجھ پر دہشت سوار ہو گئی اور ہر گلی سڑی ٹوٹی پھوٹی لاوارث لاش کی صورت میں مجھے اپنا چہرہ نظر آنے لگا۔

چودھری سلطان ایک دیوار کے ساتھ الٹا پڑا تھا۔ نہ جانے کس نے اس پر دوسرا مردہ پھینک دیا تھا۔ راجا نہ ہوتا تو میں ہر مردے کی شکل دیکھتا اور ناکام لوٹ جاتا۔ راجا نے اوپر والے مردے کو ہٹا کے چودھری سلطان کو سیدھا کیا تو میں زیرِ لب توبہ استغفار پڑھ رہا تھا اور لاشعوری طور پر اللہ سے رحم مانگ رہا تھا کہ میرے معبود موت برحق ہے لیکن مجھے یہ سزا نہ دینا۔ اپنے سارے گناہوں کا مجھے خوب اندازہ ہے۔

چودھری سلطان کا چہرہ دیکھ کے میرے جسم پر کپکپی طاری ہونے لگی کیونکہ اس چہرے کو طاقت کی ساری رعونت کے ساتھ میں نے زندگی میں بارہا دیکھا تھا۔ کچھ لاش کے ڈی کمپوز ہونے سے چہرے کا گوشت ادھڑ گیا تھا۔ اس کی ایک آنکھ پھول کے حلقے سے باہر آ رہی تھی تو دوسری غائب ہو چکی تھی۔ اس کے ماتھے اور چہرے پر خون سیاہ کھرنڈ کی طرح جما ہوا تھا۔ بدبو ویسے تو مردہ خانے میں ایسے بھری ہوئی تھی جیسے ان مذبح خانوں میں جو کبھی صاف نہ کیے جاتے ہوں لیکن میرا دماغ اس بو سے پھٹ رہا تھا جو ناک پر رومال رکھنے کے باوجود چودھری سلطان کے وجود سے اٹھ رہی تھی۔ فضا ایک صدائے بازگشت سے گونج رہی تھی۔ دیکھنے والوں کے لیے اس میں بڑا عبرت کا سامان ہے۔

میں راجا کو باہر کھینچ لایا۔ اس سے زیادہ وہاں ٹھہرنا میری برداشت سے باہر تھا۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ آخر میں یہاں کیوں آیا؟ کیا صرف ایک دشمن کا عبرتناک انجام دیکھنے؟ اس کی شناخت تو میں بھی نہ کر سکا۔ لیکن ایک پر اذیت احساس کا نقش دائمی ہو گیا۔ دشمن بھی تو انسان ہوتا ہے۔ اسے ہر قیمت پر مردہ دیکھنے کا خواہش مند بھی اسے یوں نہیں دیکھ سکتا۔

باہر آ کے میں نے ایک ابکائی لی اور برآمدے میں

گر گیا۔ اسٹول پر بیٹھے ہوئے بھنگی نے بڑے پر تمسخر انداز میں راجا سے کہا۔ ”سر جی، ایسے بندے کو ادھر آنے کی کیا ضرورت تھی۔“ پھر اس نے مجھ پر پانی ڈالا اور بدصورت سلور کے ایک میلے گلاس میں پانی دیا جو مجھے راجا نے پلایا۔ چند منٹ میں میری حالت سنبھل گئی۔ میرے جسم پر پسینا بہہ رہا تھا اور مجھے نقاہت محسوس ہو رہی تھی لیکن میں راجا کے ساتھ چل پڑا۔

راجا مجھے دوسری طرف ایک عوامی کینٹین میں لے گیا جہاں میلی دیواروں، خستہ حال فرنیچر اور ٹوٹے کناروں والے گندے برتنوں کو نظر انداز کر کے میں نے چائے پی۔

”راجا آخر یہ فیصلہ کیسے ہوا کہ یہ چودھری سلطان ہے؟“

راجا نے کہا۔ ”ڈی این اے کا تو سوال ہی نہیں۔ فنگر پرنٹ تک کہیں موجود نہ تھے۔ دوسری پارٹی صرف کپڑوں کی شناخت پر لاش مانگ رہی تھی۔ دونوں کے قد و قامت میں فرق نہیں تھا۔ لیکن بالآخر چودھری سلطان کے اسپتال کی ایک نرس آگئی۔ اس نے کبھی چودھری سلطان کے پٹس پر کوئی انجکشن لگایا تھا۔ وہاں کوئی گولی کا زخم تھا جو مندمل ہو گیا تھا۔ اس کے کہنے پر یہاں کے ڈاکٹر نے دیکھا تو تصدیق ہو گئی۔ اب گجرات سے آنے والے لاش لے کر جا رہے ہیں۔ میرا خیال ہے فیکے پتر کہ تو بھی جا۔“

”میں گجرات جاؤں؟“

”تو واپس جا۔“

میں نے کہا۔ ”میں اب ٹھیک ہوں۔“

”لیکن مجھے ان کی نیت ٹھیک نہیں لگ رہی ہے۔ ایس پی صاحب کسی صورت فریال کی گرفتاری چاہتے تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ تھانیدار آیا تھا جس کے پاس یہ کیس تھا۔ چودھری سلطان کے لاپتا ہونے اور پھر مارے جانے کا۔ ساری اسٹوری سن کے اس نے تھانیدار کو بہت جھاڑا کہ اب کیا ہے۔ لاش مل گئی۔ قتل ثابت ہو گیا۔ قتل کے اسباب موجود ہیں۔ قاتل ایف آئی آر میں نامزد ہیں۔ کسی کو بھی پکڑو اور چالان مکمل کر کے سیشن کورٹ بھیجو تاکہ ہماری جان چھوٹے۔ وہ نواب بھی کھلا پھر رہا ہے اور وہ کنجری بھی۔ اس نے کہا کہ سر، وہ دبئی میں ہے ورنہ اب تک پکڑی جاتی۔ ایس پی مزید خفا ہوا کہ وہ دبئی کیا آسمان پر ہے کہ تم جا نہیں سکتے۔ اور نہیں جا سکتے تو باقی کارروائی کرو۔ دو چار دن میں وہ آجائے گی۔“

”مجھے تو شک ہے وہ دبئی نہیں گئی۔“

”میں نے بھی پوچھا تھا۔ ابھی تک تصدیق نہیں ہو سکی۔ اسی لیے تو نور کے ساتھ اس کے گھر گیا تھا۔ اس کا مشورہ کس نے دیا تھا۔“

”وہ یار، مجھے کیا معلوم تھا وہاں پولیس آجائے گی“

”ابھی اس کارنامے کی رپورٹ یہاں نہیں آئی ایس پی کو ... ہی معلوم ہوگا کہ تو وہاں سے کیسے فرار ہو تجھے یہاں پکڑ لے گا۔ دیکھ فیکے پتر پیسا ایک حد تک ہے۔ سفارش اور دباؤ بھی۔ یہاں جو مقابلے پر ہیں وہ سے کم نہیں۔ چودھری سلطان جیسے دس وہ خود مار دیں نہیں۔ یہ پھندا تیرے گلے میں ڈالنے کے لیے انہوں نے محنت کی ہے۔ جیسے تو نے گل کے قتل میں رانا کو مجرم قرار دلا کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ ہوا کیا، کچھ بھی نہیں۔ معلوم ہے تو محفوظ رہے گا لیکن فریال نہیں بچ سکتی۔“

میں نے بے بسی سے کہا۔ ”پھر کیا کرنا چاہیے مجھے“

”وہی جو تیرا خیال تھا۔ فریال کی فکر چھوڑ اور جا، نور کے ساتھ لندن۔ تیرے یہاں کے معاملات کو سنبھال لوں گا اور فریال کا نام تو دوسرے کیس میں بھی ہے۔ عجب خان کریلہ کی موت......“

”یار اس سے فریال کا کیا تعلق۔“

”فریال کے اور اس شخص کے تعلقات تھے۔“

میں نے خفگی سے کہا۔ ”اس کمینہ جانے کتنی عورتوں سے“

”عورت؟ فیکے پتر۔ ایک عورت عجب خان کی تھی، دوسری بیٹی۔ تیسری بہن۔ فریال خود تیرے لیے تھی۔ وہی عورت جو تجھ سے محبت کرتی تھی، جس سے ... کے لیے تو دیوانہ تھا۔ یہ سڑے گلے گوشت کا ڈھیر چودھری سلطان۔ یہ ہر قیمت پر اسے حاصل کرنا چاہتا تھا۔ الو پٹھے، پاگل خانے۔ مرگئی وہ فریال۔ یہ فریال وہ عورت ہے۔ اس نے جو بویا ہے وہ کاٹے گی۔ تو اپنی خیر منا۔ زندگی کو دیکھ۔“

ادھر ادھر کے سب لوگ ہماری طرف متوجہ ہو گئے کیونکہ غصے میں راجا چلانے لگا تھا۔ میں ایک دم اٹھا اور نکل آیا۔ راجا نے ایک نوٹ میز پر پھینکا اور میرے ... لپکا۔ ”دیکھ تماشا مت بنا، عقل سے کام لے فیکے پتر۔“ ... نے مجھے پکڑ لیا۔ ”تیری گاڑی کہاں ہے...... وہ گاڑی یہ چھوڑ دے۔ میں کہوں گا کہ وہ کل سے میرے پاس ہے۔ غنی کے ساتھ جا، ادھر سے نکل جا۔ فریال بھی بچ جائے گی۔“

میں نے گاڑی کی چابی اسے دے دی۔ کچھ دیر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ غلطی کا احساس ہوا تو میں راجا کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ”آئی ایم سوری راجا۔“

وہ ہنسنے لگا۔ ”غصہ تو مجھے اتنا آیا تھا کہ جی چاہتا تھا مار کے تجھے گنجا کر دوں۔ دماغ درست ہو جائے تیرا۔ لیکن چل!

...ی۔ ابھی تو جا عیش کر نور کے ساتھ۔ ایسی عورت تجھے ...یں ملے گی۔“

...س نے دروازہ کھولا اور مجھے اندر دھکیل دیا۔ غنی نے ... سنبھالی۔ اسی وقت میرے موبائل فون پر نور کا نمبر

”کہاں ہو تم؟“

میں نے کہا۔ ”تمہارے دل میں تمہارے خیالوں میں۔“

”کوئی تم سے ملنے آیا ہے۔ تمہارا انتظار کر رہا ہے۔“

میں نے حیرانی سے کہا۔ ”کون آگیا مجھ سے ملنے۔“

”کوئی بہت پرانا جاننے والا ہے۔ کہتا ہے لندن میں ...رے ساتھ تھا۔“

”سسپنس مت بڑھاؤ۔ میری بات کراؤ اس سے۔“

”سوری۔ بات کرنی ہے تو فوراً آجاؤ۔“ وہ بولی اور ...ر دیا۔

گاڑی ہوٹل کے سامنے پہنچ چکی تھی۔ غنی مجھے اتار کے ... پارکنگ ایریا کی طرف لے گیا۔ اس کے تیور بتاتے ...یرے کہنے سے وہ گاڑی چھوڑ کے جانے والا نہیں ...ں کے قیام کے لیے ہوٹل میں کوئی کمرا ابھی دستیاب نہ ...س نے کہا کہ آپ میری فکر نہ کریں، میں کچھ کر لوں ... وجوار میں اور ہوٹل بھی تھے چنانچہ میں مطمئن ہو گیا۔

...ن پر نور سے بات ہونے کے پانچ منٹ بعد میں ...ازے پر دستک دی۔ کمرا اندر سے لاک تھا۔ نور نے ...ولا تو میرے دماغ کو ایک دم کئی ہزار وولٹ کا جھٹکا ... کے پیچھے چند قدم کے فاصلے پر فریال کھڑی تھی۔ نور ... پکڑ کے اندر نہ کھینچتی تو میں وہیں منجمد کھڑا رہتا۔

...ں نے تلخ لہجے میں سوال کیا۔ ”تم یہاں کیوں آئی ...ہیں کس نے بتایا کہ میں یہاں ہوں؟“

...س نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ”اتنا تلخ ہونے کی ...ہیں۔“

...را غصہ اور بڑھ گیا۔ ”میری زندگی تلخ کر دی تم نے ...ے پوچھتی ہو کہ اتنا تلخ ہونے کی کیا ضرورت ہے؟“

...ور نے مجھے روکا۔ ”خدا کے لیے آہستہ بولو۔ آس ...ف لوگ ٹھہرے ہوئے ہیں۔ وہ کیا سمجھیں گے۔ بیٹھو ...ے۔“

...ں گہری سانس لے کر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ ”میں ...وہوں۔ اس سے مجھے فرق نہیں پڑ سکتا کہ لوگ مجھے ...ہیں۔“

...ریال کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ ”لو وہ بھی کہتے ہیں کہ ...نگ و نام ہوں۔“

”فریال۔ کیا ایسی کوئی صورت نہیں کہ تمہارے اور میرے درمیان جو بھی تعلق یا رشتہ تھا، اسے میری خطا سمجھ کے معاف کر دیا جائے۔“

نور نے خفگی سے کہا۔ ”تم کیوں اتنی بداخلاقی کا ثبوت دے رہے ہو۔ فریال تمہیں کچھ بتانے آئی ہے۔ ابھی چلی جائے گی۔“

”یہ کیا بتائے گی مجھے۔ میرے پاس بہت کچھ ہے اس کو بتانے کے لیے۔ میرا دماغ خراب ہو گیا ہے نور جب سے میں نے چودھری سلطان کی مسخ شدہ لاش دیکھی ہے۔ میرے دماغ سے یہ خیال نہیں نکلتا کہ اس کی جگہ میں بھی ہو سکتا تھا۔ خیر چھوڑو۔ مجھے بتاؤ تم کیا چاہتی ہو؟ ایک بات پہلے کلیئر کر دوں۔ تمہارے لیے میں کچھ نہیں کر سکتا، نہ کروں گا کیونکہ میں خود اپنے لیے کچھ کر سکتا تو جان بچا کے بھاگنے کی نہ سوچتا۔“

جواب نور نے دیا۔ ”فریال نے مجھے فون کیا تھا، ان کی دبئی کے لیے فلائٹ صبح سویرے ہے۔“

”مجھے ویزا ملنے میں دیر ہو گئی۔ میں نے سوچا نور کو بتا دوں۔“

”تمہاری واقعی شوٹنگ ہے؟“

”واقعی کا کیا مطلب؟ ایک انٹرنیشنل ایڈ ایجنسی نے مجھے دو مہینے پہلے بک کیا تھا۔ ان کے شیمپو کے کئی اشتہار ہیں۔ آدمی ادائیگی انہوں نے کر دی تھی۔ میں نے ان سے پوچھا تھا کہ ان کا شیڈول کیا ہے۔ اگر کوئی مسئلہ ہے تو ایگریمنٹ ختم کر دیں۔ خیر! مسئلہ حل ہو گیا لیکن اس دوران مجھے یہ فائدہ ہوا کہ بڑے شاہ جی سے رابطہ ہو گیا۔“

”یہ بڑے شاہ جی کون ذاتِ شریف ہیں؟“

”وہ انڈین فلم انڈسٹری کے ایک ستون ہیں۔ بہت بڑے فنانسر ہیں۔ بالی ووڈ کا ایک نامور ڈائریکٹر دبئی پہنچ گیا ہے ایگریمنٹ کے لیے۔“

”مبارک ہو۔ یہ اب بھی واضح نہیں ہوا کہ تم نے یہ سب مجھے بتانا کیوں ضروری سمجھا۔ تمہارے کارناموں کی دھوم تو پہلے ہی مچی ہوئی ہے۔ لیکن کل کو تم مادھوری ڈکشٹ یا رانی مکھرجی کے چراغ گل کر دو تو مجھے کیا۔“

”یہ سب بتانا میرا مقصد بھی نہیں تھا۔ اگر نور نہ بتاتی کہ تم یہاں ہو اور مجھے نہ بلاتی تو میں سات بجے کی فلائٹ سے نکل جاتی۔ اپنے ہوٹل سے بھی چار بجے نکل جاتی۔ میں نے فون کیا تھا نور کو کچھ بتانے کے لیے۔ اس نے کہا کہ میں تمہارے گھر گئی تھی اور تمہارا سارا زیور اور اہم کاغذات

سمیٹ لائی ہوں۔ وہ مجھ سے لے لو کیونکہ ہم بھی ایک آدھ دن میں لندن نکل جائیں گے۔"

نور نے کہا۔ "کھانے کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"تم جانتی ہو آج کا سارا دن ایسے ہی گزر گیا۔" میں نے کہا۔

"پھر باہر چلتے ہیں کہیں۔ دامن کوہ یا پیر سوہاوہ۔"

"چلو میں اس قدر بیزار اور ڈیپریس ہوں کہ بتا نہیں سکتا۔ شاید وہاں کچھ سکون ملے۔ فریال تمہیں خطرہ تو کوئی نہیں؟"

وہ اداسی سے مسکرائی۔ "کوئی نہیں اور اپنے خطروں سے میں نے اپنے طریقے سے نمٹنا بھی سیکھ لیا ہے۔ چلو......"

غنی کا چہرہ فریال کو ہمارے ساتھ دیکھ کر بھی سپاٹ ہی رہا۔ وہ ایک ماہر ڈرائیور تھا اور اسلام آباد کے سارے راستوں سے واقف تھا۔ تقریباً ایک گھنٹے میں اس نے ہمیں پہاڑوں کی انتہائی بلندی پر پیر سوہاوہ کے "منال" ریسٹورنٹ پہنچا دیا۔ آہستہ آہستہ نور اپنی باتوں سے فریال کے اور میرے موڈ کا بوجھل پن ختم کرنے میں کامیاب رہی۔ نہ صرف یہ کہ میں ایزی ہو گیا بلکہ اس کی باتوں سے فریال بھی مسکرانے لگی۔

ایک بار پھر میں نے نور کی اس خداداد صلاحیت کا اعتراف کیا جو خدا نے صرف اسے ودیعت کی تھی۔ وہ ایسی عورت تھی جو صرف مرد کے دل پر حکومت کرنا اور اس کے جسم کو مطیع رکھنا کافی نہیں سمجھتی تھی۔ وہ اس کے دماغ کو بھی بڑی خوبی اور مہارت سے کنٹرول کر لیتی تھی۔ نور نے بروقت فیصلہ کیا اور ہوٹل کے بند کمرے میں کھانا کھاتے ہوئے بھی لڑنے اور کشیدگی کا شکار رہنے کے بجائے ہم اس پہاڑ کی بلندی پر اس خوبصورت ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے آ گئے جہاں ہمارے چاروں طرف پھول تھے، موسیقی تھی، ہنستے قہقہے لگاتے خوش پوش وخوش باش لوگ تھے۔

"کھانے سے پہلے کوئی کسی کو بور نہیں کرے گا۔" نور نے اعلان کیا۔ "ہم یہاں انجوائے کرنے آئے ہیں۔"

فریال مسکرائی۔ "نور! تم نور جہاں ہو نا؟"

"ہاں۔ مجھے یقین تھا کہ اور کوئی جانے، نہ جانے تم پہچان لو گی مجھے۔"

فریال نے میری طرف دیکھا۔ "آپ بہت خوش قسمت ہیں نواب صاحب۔"

"لوگ تو ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ لاٹری میں ریاست کسی کو نہیں ملتی۔"

"ریاست عذاب ہو جاتی اگر تمہیں اچھے دوست نہ ملتے۔ تم اکیلے کیا کر سکتے تھے۔" فریال نے کہا۔

"اس میں تو شک کی کوئی بات ہی نہیں۔"

فریال نے کچھ دیر بعد کہا۔ "ایک بات کہوں...... اگر اعتراف نہ کیا تو پھر رہ جائے گی۔ کیا پتا پھر یہ موقع ملے نہ ملے۔"

"ایسی کیا بات ہے؟" نور نے کہا۔

"رفیق، یہ حقیقت کتنی بھی تلخ ہو لیکن میں تمہارے نہیں تھی۔ اچھا ہوا تمہارے میرے راستے الگ ہو گئے۔"

"ایسا کیوں سمجھتی ہو فریال۔ تمہی نے اس آدمی کا دیا۔ جو کسی کا ساتھ نہ دے سکا...... پٹڑی بدلتا رہا بار بار۔"

میں نے خفگی کا اظہار کیا۔ "کیا اپنی مرضی سے؟"

فریال نے کہا۔ "مرضی کسی کی نہیں چلتی۔ سارے تقدیر کے ہیں۔ کسی دستِ غیب نے کانٹا بدل دیا، منزل گئی۔ میری بات کا برا مت ماننا۔ میں تمہیں ماضی کے سے شرمندہ کرنا نہیں چاہتی۔ تمہارے کمال کا اعتراف مقصد ہے۔ جب میں سوچتی ہوں، دیکھتی ہوں کہ ہمارے رول کیسے بدل گئے آپس میں۔ یہ تقدیر کا ہاتھ ہی ہو گا نے مجھے تمہارے راستے پر ڈال دیا اور تمہیں میرے را ہمارے رول بدل دیے۔ جو تمہارا ماضی تھا وہ میرا ہو گیا۔ میرے ماضی کو تم نے اپنا مستقبل بنا لیا۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہتی ہے لیکن کھلے الفاظ نہیں کہہ سکتی۔ نور بھی اتنی بے وقوف نہیں تھی کہ اشا سمجھتی۔ فریال نے نور کے جس ماضی کا حوالہ دیا تھا وہ کبھی یہ بدنامی کا وہ راستہ تھا جو رسوائی کی منزل پر ختم ہوتا تھا جہاں نے میرے لیے وہ راستہ چھوڑ دیا تھا۔ اب اس پر فریال چل رہی تھی اور فریال نے اس کا اعتراف کر لیا۔

غنیمت یہ ہوا کہ اسی وقت کھانا آ گیا اور بات د ہو گئی۔ قسمت کا ہاتھ وقت کی بساط پر خوب چال چلتا ہے امکان میرے تصور سے بعید تھا کہ یہاں میرے اور نور ساتھ فریال بھی موجود ہو سکتی ہے۔ کھانا ختم کرنے کے میں نے خود کو بہت پرسکون اور پراعتماد محسوس کیا۔

میں نے کہا۔ "فریال تم اتنی مطمئن ہو، میرا ہے۔ تمہیں ذرا ڈر نہیں۔"

وہ بولی۔ "مجھ سے بڑے خطروں کے کھلاڑی تم تمہارے مقابلے میں تو اناڑی ہوں میں۔ بات یہ ہے رفتہ سب کو اپنے دریاؤں کی روانی اور طغیانی۔ راستوں نشیب وفراز چٹانوں اور کناروں میں بہنا آ جاتا ہے میرے لیے خطرات کی نوعیت بدل گئی ہے تو ان سے نمٹنے طریقے بھی آ گئے ہیں۔ تم میری فکر مت کرو۔"

"اگر تمہیں صبح گرفتار کر لیا گیا۔ فلائٹ سے پہلے ہی"

وہ ہنسی۔ "ایسا نہیں ہو گا۔ یہ لفظ بہت بدنام

میرے رابطے انڈر ورلڈ کے کچھ لوگوں سے ہیں۔ رابطوں کا مطلب تم جو چاہو نکالو۔ رابطے نہ ہوں تو کون Survive کر سکتا ہے۔ تمہارے کچھ اور ہیں مگر ہیں۔ یہاں جو اوپر ہیں وہ انہی رابطوں سے ہیں۔ ایک مافیا ہر جگہ ہے، کہیں چھوٹی کہیں بڑی۔ بڑے شاہ جی کا نام اس دنیا میں چلتا ہے جس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں۔ کچھ نام تم نے بھی سنے ہوں گے۔ چھوٹا شکیل، بڑا شکیل، حاجی ابراہیم، حاجی مستان، سیٹھ عابد، ایسے ان گنت نام ہیں۔ ہر ایک اپنی دنیا کا بادشاہ ہے اور وہ سب مل کے اس دنیا کی بادشاہت کو چلاتے ہیں۔"

میرے ساتھ نور بھی فریال کی شکل دیکھ رہی تھی۔ "تم تو بڑی اونچی باتیں کر رہی ہو۔"

فریال ہنسی۔ "تمہارا اطمینان ضروری ہے۔ رفیق میرے لیے فکرمند تھا۔ میں نے سوچا اسے مطمئن کر دوں۔ مجھے کچھ بھی نہیں ہو گا۔ اگر میرے بارے میں کوئی بری خبر سنو تو اسے افواہ سمجھنا۔ خبریں بعض اوقات اخباروں میں بھی شائع کرا دی جاتی ہیں۔ اپنا تو مسئلہ ہی نہیں۔ شوبزنس کی انڈر ورلڈ میں میرا داخلہ ہوا ملٹی نیشنل کمپنیوں کے ذریعے۔ انہی کی اصل حکومت ہے ہمارے ملک اسلامی جمہوریہ پاکستان میں بھی۔ یہ کولا ڈرنک کمپنیاں۔ برانڈڈ مصنوعات اور ٹیلی کام کے نام۔ فاسٹ فوڈ کنگز۔ یہ وہ ہیں کیا کہتے ہیں انہیں ...... ہزار پایہ۔ ان کے بازو ساری دنیا میں ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں اور اگر میں ان کی ایک ادنیٰ سی نامعلوم ورکر بھی ہوں تو محفوظ ہوں۔"

"میں واقعی امپریس ہوا۔ میں تمہیں بالکل اناڑی سمجھتا تھا۔ سب سے بڑا اناڑی میں خود......"

"دیکھو۔ تمہاری زندگی اور سوچ کا انداز کچھ اور ہے۔ تم اسے بدل نہیں سکو گے۔ اچھا ہے اپنے ہی دائرے میں کامیابیوں کے جھنڈے گاڑتے رہو۔ نور تمہارے ساتھ ہے۔ اسے ضرور ساتھ رکھنا۔"

"تائید کا شکریہ۔ کیا تم یہی بتانے آئی تھیں۔"

وہ کچھ دیر بعد بولی۔ "آج تم چودھری سلطان کے لیے دکھی ہو۔ بھول گئے اس نے میرے ساتھ اور تمہارے ساتھ کیا، کیا تھا۔ اسی انجام کا مستحق تھا وہ۔ تم جانتے ہو کہ اسے میں نے مروایا۔ لیکن اور بہت کچھ ہے جو تم نہیں جانتے۔ مثلاً یہ کہ اسے کس نے مارا۔"

میں نے کہا۔ "کیا اس سے فرق پڑتا ہے۔"

"اچھا ہے اگر ایک صورتِ حال کے بارے تمہارا ذہن کلیئر ہو، کوئی کنفیوژن نہ رہے۔ اس سے پیچھا چھڑانا میری مجبوری بن گئی تھی۔ میں نے اپنے کیریر کا پھر آغاز کیا تھا۔ میرے لیے یہ ایک مشکل چیلنج تھا۔ چودھری سلطان نے مجھے سپورٹ کرنے کی پیشکش کی تھی اور میرے لیے اسے قبول کرنے کے سوا چارہ نہ تھا لیکن اس سپورٹ کی جو قیمت چودھری سلطان طلب کر رہا تھا۔ وہ بہت زیادہ تھی۔ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ یہ ناممکن تھا۔ نئے سرے سے فلمی دنیا میں قدم جماتے ہی شادی کرنے کا مطلب ہوتا خودکشی۔ شادی شدہ عورت کو فلم بین اور فلم ساز ہیروئین کے روپ میں آسانی سے قبول نہیں کرتے۔ وہ ایک ایسی پوزیشن حاصل کر لے جیسی شبنم کی تھی، پھر اور بات ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ مجھے معلوم تھا کہ چودھری سلطان ذہنی طور پر فرسودہ خیالات اور تنگ نظری پر مبنی روایات کی حامل فیملی سے تعلق رکھنے والا عیاش جاگیردار ہے۔ اس کے پاس اپنا کچھ نہیں باپ کی طرف سے اسے جتنا ملا تھا وہ اس نے اڑا دیا ہے۔ اور اسے کچھ ملنے کی امید نہیں...... اپنی حرکتوں کی وجہ سے وہ قرض خواہوں میں گھرتا جا رہا ہے۔ میرے انکار پر اس کا اصل روپ سامنے آ گیا۔ ایسی نوبت آ گئی کہ میں اسے نہ مرواتی تو وہ مجھے قتل کر دیتا۔ میں نے کب کسی کو قتل کیا تھا۔ اس موقعے پر مجھے گجر برادران کی تائید مل گئی۔ خود میں نے بھی سنا۔ انہوں نے چودھری سلطان کو نوٹس دے دیا تھا کہ ہمارا پیسا جو تم نے ہمیں فلم کے نام پر بے وقوف بنا کے ہتھیا لیا تھا واپس کر دو ورنہ ہم تمہیں چھوڑیں گے نہیں۔ گجر برادران کو چودھری سلطان نے یہی کہا تھا کہ فلموں میں سرمایہ لگانے والوں کو گارنٹی کوئی نہیں دیتا۔ لیکن اندر سے وہ بھی بہت پریشان تھا۔ اس نے خود مجھ سے کہا کہ یہ گجر برادران بڑے خطرناک ہیں۔ کوئی صورت ہو کہ پورا نہ سہی ان کا نصف نقصان ہی پورا کر دوں تو جان بچ جائے گی ورنہ انہوں نے بدمعاش پال رکھے ہیں اور ان کے بھانجے بھتیجے بھی دس نمبری اور ہسٹری شیٹر ہیں۔ خیر میں نے کسی طرح گجر برادران سے رابطہ کیا اور ان سے یہ وعدہ کیا کہ اگر کسی طرح وہ چودھری سلطان سے میری جان چھڑا دیں تو ان کی اگلی فلم جب بھی بنی، میں اس میں بلامعاوضہ کام کروں گی، یہ میں لکھ کر دینے کے لیے تیار ہوں۔ انہوں نے مجھے ایک پلان دیا جس کے مطابق میں نے چودھری سلطان کو ان کے حوالے کرایا۔ اس طرح کہ الزام نہ مجھ پر آیا نہ گجر برادران پر۔ انہوں نے بعد میں رانا سے کیا معاملہ کیا، اس کا مجھے علم نہیں۔"

میں نے کہا۔ "یہ سب تم نے مجھے پہلے بھی بتایا تھا لیکن اب چودھری سلطان کی لاش کو میری گاڑی میں کس نے ڈالا؟"

"یہ میں نہیں بتا سکتی۔ تمہاری اور میری زندگی کا یہ کانٹا نکل گیا...... اتنا کافی ہے۔"

"لیکن اس کی تم نے کیا قیمت ادا کی اور مجھے کتنی پریشانی ہوئی۔ یہ سب تمہاری بے وقوفی کی وجہ سے ہوا۔"

"یہ سب رانا کی دخل اندازی کی وجہ سے ہوا۔ ہر صورت میں تمہارا ایک دشمن کم ہوگیا۔"

"کیا اس کے لیے میں تمہارا شکریہ ادا کروں؟" میں نے تلخی سے کہا۔

اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔ "اس عجب خان کوریلہ کو تم کیا سمجھتے تھے۔ کیا وہ تمہارا دشمن نہیں تھا؟"

"وہ رانا کی حمایت میں میرے ساتھ دشمنی کر رہا تھا۔ اس کا میرا کوئی جھگڑا نہیں تھا۔"

"میں نے اسے بھی مار دیا۔"

میں بھونچکا رہ گیا۔ "تم نے...... خود؟"

"ہاں...... خود میں نے۔" وہ چلا کے بولی۔

نور نے گھبرا کے ادھر ادھر دیکھا۔ "آہستہ، آہستہ۔ ہمارے آس پاس لوگ بیٹھے ہیں۔ بلکہ میرا خیال ہے کہ ہم چلتے ہیں۔ باقی بات ہوٹل جا کے اپنے کمرے میں بھی ہوسکتی ہے۔"

فریال خود بھی غنی کی موجودگی میں مزید تفصیل نہ بتاتی۔ نور نے گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے ہی مجھے بھی سختی سے منع کر دیا تھا اور فریال کو بھی کہ ہم راستے میں کوئی بات نہیں کریں گے۔ مجھے فریال کے اعترافِ جرم سے قبل بھی شک ضرور تھا کہ کہیں عجب خان کوریلہ کی پراسرار موت کے پیچھے بھی فریال کا ہاتھ نہ ہو لیکن یہ ایسا مفروضہ تھا جس پر ابھی تک پولیس اور مرنے والے کے اہلِ خانہ کا کوئی واضح الزام سامنے نہیں آیا تھا کہ عجب خان کوریلہ کا ہارٹ فیل نہیں ہوا تو کیا اسے قتل کیا گیا ہے؟

لیاقت علی خان پاکستان کے پہلے وزیراعظم کے قتل سے آج کے دن تک جتنے سیاسی قتل ہوئے ہیں وہ سب پراسراریت کی ایسی دھند میں لپٹے ہوئے ہیں کہ اصل اسباب کا علم کسی کو بھی نہیں۔ جتنے منہ اتنی باتیں۔ تاہم اتفاق ہے تو ایک بات پر کہ اربابِ بست وکشاد خود یہ چاہتے ہیں کہ اصل اسباب کا عوام کو علم نہ ہو۔ ورنہ یہ کیسے ممکن ہے کہ کسی کا قاتل بھی پکڑا نہ جائے۔ ہمارے پڑوسی ملک بھارت میں جو سیاسی قتل ہوئے، مہاتما گاندھی کا، اندرا گاندھی کا یا راجیو گاندھی کا۔ ان سب کی تفتیش کے نتیجے میں قاتل پکڑے گئے۔ ان پر عام قوانین کے تحت عام عدالتوں میں مقدمات چلے اور انہیں سزا بھی ہوئی۔

عجب خان کوریلہ کوئی قومی سطح کا سیاست داں تو نہیں تھا لیکن اس کی موت میں ابھی تک ذاتی دشمنی کا پہلو سامنے نہیں آیا تھا۔ اس کے وارث بھی کھل کے کچھ نہیں کہہ رہے تھے۔ ابھی تک انہوں نے یہ بھی نہیں کہا تھا کہ یہ پراسرار موت درحقیقت قتل تھی۔ نہ انہوں نے کسی پر قتل کی سازش کا الزام عائد کیا تھا اور نہ قتل کی تفتیش کے لیے ملکی روایات کے مطابق کسی تفتیشی کمیٹی یا تحقیقاتی کمیشن بنانے کا مطالبہ کیا تھا۔

یہاں فریال میرے سامنے برملا اعتراف کر رہی تھی کہ عجب خان کوریلہ کو خود اس نے قتل کیا تھا۔ اور وہ نہ پریشان تھی نہ خوفزدہ۔ میں سوچتا رہا کہ کیا وہ شیخی بگھار رہی تھی؟ مجھے مرعوب کر رہی تھی یا حقیقت کا اعتراف کر رہی تھی۔ ہوٹل کے کمرے میں پہنچ کے نور نے روم سروس کو چائے کے لیے کہا۔

"تم نے عجب خان کو قتل کیا؟ یہ میں بعد میں پوچھوں گا کہ کیسے؟ پہلے یہ وضاحت کرو کہ اس قتل کا مقصد کیا تھا؟"

فریال صوفے پر آرام سے بیٹھ گئی۔ "مقصد جو بھی ہو۔ تم پر کوئی احسان کرنا نہیں تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ میں نے تمہارا ایک اور دشمن کم کر دیا۔ میں تو رانا کو بھی ٹھکانے لگا دوں گی اگر مجھے موقع ملا۔"

میں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑے۔ "آپ کی بڑی مہربانی ہوگی میرے حال پر۔ مجھ پہ احسان جو نہ کرتے تو یہ احساں ہوتا۔"

"میں نے اسے اپنی وجہ سے قتل کیا۔ اخبارات نے اس معاملے کو بہت اچھالا تھا۔ جب میں نے اس کے بیٹے کی شادی کے جشن میں ڈانس سے انکار کر دیا تھا۔ ساری اسٹوری تم نے دیکھی ہوگی۔ کچھ فلمی صحافی اس کے زرخرید تھے۔ انہوں نے مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش کی۔ میں نے عجب خان کی مخالف لابی سے رابطہ کیا۔"

"قتل کی صرف یہی وجہ تھی؟"

"نہیں...... اس نے اپنی پوزیشن کا فائدہ اٹھایا۔ اسٹیج کی ایک بدنام ڈانسر ہے...... وہ میرے پاس آئی۔ کہنے لگی کہ بے وقوفی مت کرو۔ تم عمرے کر دیا حج۔ تو سوچ ہے کھانے کی بدنامی کا داغ میرے تمہارے ماتھے سے جا نہیں سکتا۔ نیک نامی پر لعنت بھیجو۔ فائدہ اٹھاؤ۔ ضد کرو گی تو نقصان میں رہو گی۔ میں نے اسے بے عزت کیا کہ تم کیا عجب خان کی وکیل بن کے مجھے سمجھانے آئی ہو۔ بعد میں وہی ہوا جو اس نے کہا تھا۔ میں نے اس کے گھر جا کے اس سے معافی مانگی۔ اس جشن کی تصاویر اور وڈیو کیسٹ تم نے بھی دیکھی ہوگی۔"

میں نے بھنا کے کہا۔ "میں نے کچھ نہیں دیکھا۔ اور دیکھوں گا بھی نہیں۔"

"وہاں تک میں نے برداشت کیا تھا اور تسلیم کر لیا تھا کہ اس پیشے میں فین بہت ہوں گے لیکن وہ عزت جو نچلے طبقے کی عورت کا سرمایہ غرور ہوتا ہے اس کا یہاں تصور بھی ناممکن ہے۔ یہ دو الگ دنیاؤں کے آئیڈیل ہیں جن میں بعد قطبین ہے۔ زمین آسمان کی دوری ہے۔ میری بدقسمتی کہ معاملہ وہیں ختم نہ ہوسکا۔ وہ ہوس پیشہ شخص میرے پیچھے پڑ گیا۔ یہ بھی ناممکن تھا کہ میں خود کو بلا مزاحمت اس کے حوالے کر دیتی۔ میں بڑی مصیبت میں پڑ گئی۔ صوبے کی ساری پولیس فورس اور انٹیلی جنس ایجنسیاں اس کی کمان میں تھیں۔ انہوں نے دن رات مجھے ہراساں کیا۔ آخری حربہ یہ تھا کہ اس نے مجھے شادی کی پیشکش کر دی۔ ایسے لوگوں کے لیے شادی کون سا اخلاقی بندھن ہوتی ہے۔ دل بھر جائے تو دو منٹ میں فارغ کر دیتے ہیں۔ خاندانی بیوی کی پوزیشن مستحکم رہتی ہے۔ وہ میری جیسی عورتوں کو آتا جاتا دیکھتی رہتی ہیں اور اپنی حیثیت پر غرور کرتی رہتی ہیں۔ میں اس کے پاس بھی گئی تھی۔ لیکن اس نے بڑی حقارت اور نفرت سے مجھے ڈسمس کر دیا کہ چل پھُٹ ادھر سے۔ کنجری۔ تیری جیسی خود مردوں کو پھنساتی ہیں پیسے کے لیے۔ تیری اوقات کیا ہے میرے بیٹے کی شادی میں ناچنے والی۔ یہ بات خود اس نے شوہر کو بتائی یا اسے ایسے ہی معلوم ہوگئی۔ اس نے بدمعاش بھیج کر مجھے اٹھوا لیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ مجھے کہاں لے گئے تھے۔ وہاں روایتی قسم کے بدمعاش جمع تھے۔ ان کے لیے مجھے...... ڈانس کرنا پڑا۔ میرے انکار کی کیا اہمیت تھی۔ انہوں نے زبردستی میرے کپڑے......"

خاموشی کا ایک مختصر سوگوار اور غصے میں بھرا ہوا وقفہ آیا جس میں ہم سب ایک دوسرے سے نظریں چراتے رہے اور فرش کو گھورتے رہے۔ فریال کی آنکھوں سے بہنے والے خاموش آنسو اس کے رخساروں پر چمکتے رہے۔ خود نور اپنے آنسو نہ روک سکی۔ ایک عورت کی حیثیت سے وہ فریال کی بے بسی اور مظلومیت کے درد کو محسوس کر سکتی تھی۔ ابھی رات کے دو بجے تھے۔ فریال کو دبئی کی فلائٹ پکڑنے کے لیے صبح چار بجے نکلنا تھا۔ یہاں سے ائرپورٹ دور نہیں تھا اور صبح کے اوقات میں سڑکوں پر ٹریفک نہ ہونے سے پندرہ بیس منٹ میں غنی اسے ائرپورٹ پہنچا سکتا تھا۔

"مجھے معلوم نہیں...... اس ڈانس کی وڈیو ریکارڈنگ ہوئی یا نہیں۔ سامنے کوئی کیمرا نہیں تھا۔ کہیں خفیہ طور پر لگا ہوا ہو تو مجھے علم نہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ ایسے دوسرے لوگوں کی موجودگی ثابت ہوتی۔ شاید یہ قرین مصلحت نہیں تھا۔ میں کسی کو بھی پہچانتی نہیں تھی لیکن وہ ہوں گے سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے۔ اسی کے ہم رتبہ اور ہم مزاج۔ انہوں نے اپنی عزت بچانے کے لیے ایسا ہونے نہیں دیا ہوگا کہ بعد میں کہیں وڈیو کیسٹ مخالف میڈیا کے ہاتھ لگ گئی تو پریشانی ہوگی۔ خیر...... مجھ پر جو بیتی، وہ میں کیا بتاؤں لیکن یہ حقیقت ہے کہ اسی رات میں نے طے کر لیا تھا کہ خواہ بعد میں مجھے پھانسی ہو جائے، میں اسے چھوڑوں گی نہیں۔ ابھی مجھے پتا چلا کہ وہ اسپتال میں داخل ہے۔ اس کے کچھ ٹیسٹ ہونے تھے۔ ڈاکٹرز نے کینسر کا اندیشہ ظاہر کیا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ مجھ سے پہلے قدرت اسے سزا دے رہی ہے۔ میں عیادت کے بہانے گئی۔ وہ بڑا خوش ہوا۔ اس کی رپورٹس بھی کلیئر آگئی تھیں۔ اندازہ یہ تھا کہ ایک دو دن میں اسے اسپتال سے فارغ کر دیا جائے گا۔"

ایک مختصر وقفے کے بعد فریال نے کہا۔ "میرے لیے اسے مارنا مشکل نہیں ہوا۔ میں نے اسے ایک انجکشن لگا دیا۔"

میں چونک پڑا۔ "کون سا انجکشن۔"

"اب تو مجھے نام یاد نہیں لیکن اس سے مریض سوتے میں مر جاتا ہے اور بعد میں علامات بالکل ایسی ہوتی ہیں جیسے ہارٹ فیل کی۔"

میں اور نور دم بخود بیٹھے رہے۔ "کیا یہ اتنا آسان تھا؟ اور تم کو اس انجکشن کے بارے میں کس نے بتایا؟"

وہ کچھ دیر چپ رہی۔ "کم سے کم دو ڈاکٹر ایسی ہیں جو میری دوست، مددگار یا ہمدرد ہوسکتی ہیں۔"

میں اس کی صورت دیکھتا رہا۔ "تم کس کی بات کر رہی ہو؟ شہناز کی یا ڈاکٹر شائستہ کی؟"

"میں کسی کا نام نہیں لوں گی۔"

"اور وہ انجکشن کیا اتنی آسانی سے مل جاتا ہے؟"

"ہاں...... غالباً وہ مرگی کا علاج ہے۔ مہنگا ہے لیکن مل جاتا ہے۔"

"تم نے کہاں سے لیا تھا؟"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اصل آسانی نرس کی یونیفارم سے ہوئی۔ وہ میں نے کسی سے نہیں لی، خود تیار کی۔ شلوار تو سفید ہوتی ہے۔ اوپر کا حصہ بنوانا پڑتا ہے۔ اس پر اسپتال کا بیج تھا۔ میرا نام کچھ اور لکھا ہوا تھا۔ گلے میں ایک شناختی کارڈ بھی تھا۔ کسی نے اس پر غور نہیں کیا۔ طبی آلات کی ایک دکان سے میں نے وہ ٹرے خریدی جو نرسوں کے ہاتھ

میں ہوتی ہے اور دوسرا سامان۔ اصل بات موقعے کی تھی۔ وہ مجھے قدرت نے فراہم کیا۔ ایک رات میں پرائیویٹ وارڈ کے برآمدے میں منڈلا رہی تھی کہ ایک نرس نے مجھ سے کہا کہ میں دو نمبر کا ٹمپریچر اور بلڈ پریشر ریکارڈ کروں۔ وہاں روشنی کم تھی۔ اس نے میرا چہرہ غور سے نہیں دیکھا۔ شناختی کارڈ کیا دیکھتی۔ وہ کسی دوست آشنا سے موبائل فون پر بات کرنے میں اتنی مصروف تھی کہ کال کاٹنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ مجھے کوئی جونیئر یا ٹرینی سمجھی ہوگی۔ میں نے سر ہلایا اور دو نمبر میں چلی گئی۔ دو نمبر میں عجب خان کوریلہ سو رہا تھا۔ یہ کوئی رات گیارہ بجے کا وقت تھا۔ میں نے اسے جگایا اور پہلے اس کا بلڈ پریشر اور ٹمپریچر لیا۔ پھر انجکشن نکالا تو اس نے اعتراض نہیں کیا۔ غالباً انجکشن اسے لگتے تھے۔ یہ دو منٹ کا کام تھا۔ میں باہر نکلی تو خوف سے میرا برا حال تھا۔ میں پسینا پسینا ہو رہی تھی۔ میں نے کمرے کی لائٹ آف کی اور وقت ضائع کیے بغیر اسپتال سے نکل آئی۔ صبح مجھے پتا چل گیا کہ وہ مر گیا ہے۔ اس کے وارث جائز طور پر شور کر رہے ہیں کہ اسے کوئی ہارٹ پرابلم نہیں تھی۔ دوسری طرف اسپتال والے ہیں۔ ان کی ساکھ کا مسئلہ بھی ہے۔ میں نے جس نرس کی جگہ ٹمپریچر اور بلڈ پریشر لیا تھا، وہ بیان دے چکی ہے کہ رات ساڑھے گیارہ بجے عجب خان زندہ تھا۔''

نور نے کچھ دیر بعد پوچھا۔ ''پھر پولیس تمہارے گھر کیوں گئی تھی؟''

''وہ کوئی ایرا غیرا نہیں تھا۔ صوبے کا وزیر داخلہ تھا۔ پولیس اور تفتیشی ادارے اپنی کارکردگی دکھانے کے لیے کچھ تو کریں گے۔''

''تمہاری پراپرٹی کے سارے ڈاکومنٹ میں نے نکال لیے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ کون سی چیز کہاں ہے۔''

''میں کیا کہوں نور۔ میرے پاس واقعی الفاظ نہیں ہیں تمہاری تعریف کے لیے۔ تم نے میری بہت مدد کی اور بڑے خلوص کے ساتھ۔ بڑی عجیب عورت ہو تم کہ تمہارے دل میں میرے خلاف نفرت عناد یا حسد کچھ نہیں۔''

''میری ساری ہمدردی تمہارے ساتھ ہے کیونکہ میں بھی ایک عورت ہوں اور ایسی ہی آزمائشوں سے گزر چکی ہوں۔''

''میری ایک بات مانو گی؟''

''کون سی بات......'' نور کچھ حیران ہوئی۔

''دیکھو۔ یہ سارے زیورات کے ڈبے جو تم اتنی محنت سے نکال کے لائی ہو۔ میں دبئی نہیں لے جا سکتی۔''

''ٹھیک ہے۔ ابھی میں رکھ لیتی ہوں امانتاً۔''

''امانتاً نہیں یہ تم میری طرف سے قبول کر لو۔''

''میں ایسا نہیں کر سکتی۔'' نور نے احتجاج کیا۔

''پلیز...... زیورات کی قیمت کی بات نہیں۔ بات میرے جذبات کی ہے۔ میری ایک خواہش ہے کہ جب تمہاری شادی ہو رفیق سے تو تم یہ پہنو اور دیکھو' دنیا کے کام چلتے رہتے ہیں۔ ایک وقت ہاتھ سے نکل جائے تو لوٹ کے نہیں آتا۔ یہ غلطی میں نے کی تم مت کرنا...... اچھا میں اب جاؤں گی۔ آج کل انٹرنیشنل فلائٹس پر تین گھنٹے پہلے پہنچنا پڑتا ہے۔''

''غنی تمہیں چھوڑ آئے گا۔ ایک الجھن ہے میرے دماغ میں فریال۔ گجر برادران سے میری تو کوئی دشمنی نہیں۔ پھر انہوں نے چودھری سلطان کی لاش میری گاڑی میں ڈال کے مجھے پھنسانے کی کوشش کیوں کی تھی؟''

''یہ وہی بتا سکتے ہیں تمہیں۔ اگر تم ان سے مل لو تو اچھا ہے۔ یہ بھی پتا چل جائے شاید کہ تمہاری گاڑی کو تباہ کر کے تمہیں قتل کرنے کی سازش کس کی تھی۔'' فریال کھڑی ہو گئی۔ ''ان کا پتا یا فون نمبر ملنے میں کوئی دشواری تو نہیں ہونی چاہیے۔''

میں نے کہا۔ ''وہ میں معلوم کر لوں گا۔ دیکھو فریال ہر ایک کی زندگی اس کی اپنی ہے جسے وہ اپنی عقل اور مرضی کے مطابق گزارنے کا حق رکھتا ہے۔ یہ حق تم نے بھی استعمال کیا۔ میری خواہش یہی ہوگی کہ تمہیں کامیابی ملے۔''

''ہم ایک دوسرے کے لیے نیک خواہشات بہرحال رکھ سکتے ہیں۔'' نور نے تائید کی۔

''ایک مشورہ تم نے دیا، نیک نیتی سے۔ ایک مشورہ میں بھی دوں گا۔ اپنے شوق اور اپنے پروفیشن کو سیاست سے الگ رکھنا۔''

وہ مسکرائی۔ ''اس کے لیے بھی بڑی سیاست سے کام لینا پڑتا ہے نواب صاحب۔ سیاست ہماری فطرت، مزاج اور عادات میں ایسے رچ بس گئی ہے جیسے ہوا جس میں ہم سانس لیتے ہیں۔ اس کا دوسرا نام منافقت ہے۔ تمہاری مراد غالباً سیاستدانوں سے تھی۔''

چار بجے فریال رخصت ہو گئی تو صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں تھی۔ اگر ہم چاہتے تو دس گیارہ بجے تک اپنی نیند پوری کر سکتے تھے لیکن اس کے لیے سکون کی ضرورت تھی۔ نور پر اس کے لیے جذباتی ہمدردی کا دورہ پڑا تھا اور میں ابھی تک دریائے حیرت میں غوطہ زن تھا۔ کتنی بے خوفی کے ساتھ فریال نے اعتراف کر لیا تھا کہ چودھری سلطان کے بعد عجب خان کریلہ کے قتل کی ذمے دار وہ ہے۔ ایک اس نے کرایا اور ایک کیا۔ لیکن فکر کی کوئی بات نہیں۔ وہ بالکل محفوظ ہے۔

دونوں کو اس نے ذاتی وجوہ کی بنا پر ٹھکانے لگایا تھا۔ اتفاق سے دونوں میرے خلاف بھی عداوت رکھتے تھے۔

نور کچھ دیر فریال کی باتیں کرتی رہی۔ پھر اس پر نیند غالب آ گئی تو میں بھی اپنے کمرے میں آ کے سو گیا۔ پھر میری آنکھ ٹیلی فون کی گھنٹی سے کھلی تو دس بج رہے تھے۔ یہ راجا کا فون تھا جو اس نے ست بدھائی سے صرف خیریت کی اطلاع دینے کے لیے کیا تھا۔

میں نے اسے گزشتہ شب فریال سے ملاقات کے بارے میں بتایا۔ پہلے تو وہ اسے مذاق سمجھا۔ ''فریال وہاں کیسے پہنچ گئی؟''

میں نے کہا۔ ''دل کو دل سے راہ ہوتی ہے راجا۔''

''تیرا دل تو ہے فیصل آباد کا گھنٹا گھر۔ ہر سڑک ادھر ہی جاتی ہے۔ اس وقت وہ کہاں ہے۔ دائیں پہلو میں کہ بائیں طرف۔''

''وہ دبئی میں ہے۔ صبح سات بجے کی فلائٹ پر غنی نے اسے ائر پورٹ چھوڑا۔ اگر تو چاہے تو اس سے رابطہ کر سکتا ہے۔ وہ نور کو سب بتا کے گئی ہے۔''

''سوکنوں میں پیار کا یہ رشتہ...... تیرے لیے خطرے کی گھنٹی ہونا چاہیے فیکے پتر۔''

میں نے اختصار سے کام لیا پھر بھی راجا کو فریال کے اعترافات اور انکشافات کے بارے میں بتانے میں ایک گھنٹا لگ گیا۔ نور خود ہی اٹھ کے میرے کمرے میں آ گئی۔ اس کی آنکھیں اب بھی نیند سے بوجھل تھیں۔ اس نے کچھ دیر انتظار کیا کہ میری گفتگو ختم ہو، پھر بولی۔ ''میں روم سروس کو ناشتے کا کہہ رہی ہوں۔ تم کو منہ دھونا ہے، نہانا ہے جو کرنا ہے کر لو۔''

میں نے سر ہلایا اور اپنی گفتگو جاری رکھی۔ اس کی آواز پر راجا نے کہا۔ ''یہ نور ڈانٹ رہی تھی تجھے۔''

میرے جواب دینے سے پہلے نور نے کہا۔ ''مجھے آج جانا تھا ویزا کے لیے۔ پہلے ہی اتنی دیر ہو گئی ہے۔ ٹکٹوں کا بھی معلوم کرنا تھا۔''

''نور بہت غصے میں گئی ہے۔''

''یار یہ عورتیں پہروں فضول گفتگو میں فون پکڑے بیٹھی رہتی ہیں۔ تب انہیں احساس نہیں ہوتا۔ میں پھر بات کروں گا...... دراصل مجھے بھی ویزے اور ٹکٹوں کے لیے جانا تھا۔ یہ بتا چودھری سلطان کی تدفین ہو گئی۔''

''آج ہو جائے گی۔ اسی ٹرسٹ اسپتال کے احاطے میں جو اس کے باپ نے قائم کیا تھا۔ پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔''

''لیکن ساری دنیا میں خوار ہو کے۔''

''تو ساری فکریں چھوڑ کے جا فیکے پتر۔ یہاں کے معاملات تو ایسے ہی چلتے رہیں گے۔ تو نہیں ہو گا تب بھی۔''

ناشتے کے ساتھ ویٹر ایک اخبار بھی لایا۔ اس کے پہلے صفحے پر ایک خبر عجب خان کوریلہ کے بارے میں تھی۔ ماہر ڈاکٹرز کی ایک ٹیم نے بھی یہ تصدیق کر دی تھی کہ اس کی موت ہارٹ فیل ہونے سے ہوئی۔ وہ عمر کے اس حصے میں تھا جب ایسا ہونا کوئی انوکھی بات نہیں۔ چند اور خبریں قیاس آرائی پر مبنی تھیں کہ ابھی تو وزارت داخلہ کا اضافی چارج خود وزیر اعلیٰ نے اپنے پاس رکھ لیا ہے لیکن اس کے لیے کس کس کے نام پر غور ہو رہا ہے۔

دائم آباد رہے گی دنیا۔ ہم نہ ہوں گے کوئی ہم سا ہو گا۔ یہاں ایک میں اس راز سے واقف تھا، دوسری نور تھی۔ تیسری فریال دبئی میں بیٹھی تھی جو یہ جانتی تھی کہ عجب خان کریلہ کے ساتھ دل نے دغا نہیں کی تھی۔ اس انتہائی طاقتور سمجھے جانے والے شخص کو جو بہت بڑا سیاسی وڈیرا تھا، بہت مضبوط سیاسی سپورٹ رکھتا تھا۔ جس کے ماتحت پولیس کا سارا محکمہ تھا اور دوسرے بہت سے طاقتور تفتیشی ادارے تھے۔ ایک ایسی نازک اندام عورت نے ٹھکانے لگا دیا تھا جسے وہ بہت کمزور اور بہت حقیر سمجھتا تھا۔ جیسے چیونٹی کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ہاتھی کو مار گراتی ہے۔ خدا نے کہا ہے۔ اس زمین پر ایسے غرور سے نہ چل جیسے تو اسے پھاڑ دے گا۔

خود نور بھی ایسے ہی خیالات میں گم تھی۔ وہ تمام زیورات کے ڈبے بیڈ سائڈ ٹیبل پر اوپر تلے رکھے تھے جو فریال اس کے لیے قبل از وقت شادی کا تحفہ دے گئی تھی۔ یہ معمولی قیمت کے زیورات نہیں تھے۔ میں عام مردوں کی طرح سونے کے زیورات کی مالیت کا اندازہ کرنے میں بالکل اناڑی ہوں۔ ان میں تو کچھ چمک دار پتھر بھی تھے جو شاید ہیرے ہوں گے۔ مجھے کوئی بلور کا تراشا ہوا ٹکڑا بھی ہیرا کہہ کر فروخت کرنے کی کوشش کرے تو کامیاب ہو گا۔ یہ میرے نزدیک لاکھوں کے زیورات تھے۔ نور کے لیے وہ انمول ہو گئے تھے کیونکہ اب ان کی جذباتی قیمت نے ان کی مارکیٹ ویلیو میں کئی گنا اضافہ کر دیا تھا۔

''یار تم نے فریال کی قدر نہیں کی۔'' نور نے کہا۔

''جو ہوا، اس کا الٹ تھا۔ قدر اس نے میری نہیں کی۔''

''وہ دل کی بہت اچھی ہے۔''

''یہ اس وقت تم نہیں ان زیورات کی آب و تاب بول رہی ہے۔ تم جذباتی ہو رہی ہو۔ خاتون! بات صرف دل کی نہیں، دماغ کبھی اچھا ہونا چاہیے۔ خیال کے ساتھ عمل کا تضاد

ہو تو بات نہیں بنتی۔ وہ حد سے زیادہ Ambitious ہے۔'' میں نے کہا۔

''اور اس نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ وہ کس انتہا تک جا سکتی ہے۔''

میں نے اسے دیکھ کے سر ہلایا۔ ''شاید ہر عورت اس انتہا تک جا سکتی ہے۔ یہ تم بھی ثابت کر چکی ہو کہ...... پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر۔''

''ہر عورت یہ کر سکتی تو پھر اپنی مظلومیت پر صرف فریاد کیوں کرتی۔ بھیڑ بکری کی طرح کیوں بکتی رہتی۔ بے آبرو کیوں ہوتی اور......''

''بس...... میں اس وقت خواتین کے ساتھ ہونے والی ناانصافی پر تمہاری تقریر سننے کے موڈ میں بالکل نہیں ہوں۔ میں یہ سوچ رہا ہوں کہ یہ کیسے ہوا؟ اتنی آسانی سے فریال نے عجب خان کوریلہ جیسے خونخوار درندے کو مار ڈالا۔ اور اتنی صفائی سے نکل گئی۔''

''تم کو شک ہے کوئی؟''

''اس نے کہا تھا کہ ایک ڈاکٹر نے یہ قتل کرنے میں اس کی مدد کی۔ جن دو ڈاکٹروں کا حوالہ اس نے دیا تھا۔''

''اس نے کسی کا نام نہیں لیا تھا۔''

''لیکن میں جانتا ہوں، ایک شہناز ہے۔ دوسری لندن میں ڈاکٹر شائستہ۔ شہناز کو اب فریال سے کوئی جذباتی ہمدردی نہیں۔ الٹا وہ اس کے خلاف ہی ہے لیکن شائستہ سے اس کے مراسم پرانے ہیں۔ اور میں نے لندن میں قیام کے دوران دیکھا تھا۔ یک جان دو قالب والا معاملہ تھا۔ بعض اوقات مجھے شک ہوتا تھا کہ ان کے بیچ میں کچھ اور چکر ہے۔ یہاں یہ بات عجیب لگتی ہے لیکن لندن میں نہیں ہے۔ شائستہ عجب آدم بیزار۔ خشک مزاج اور بد اخلاق عورت تھی۔ میرے ساتھ اس کا رویہ اتنا خراب ہوتا تھا کہ میں اسے ناشائستہ کہتا تھا۔ لیکن یہ دونوں سہیلیاں اکٹھی ہوں تو ان کی خوش مزاجی اور وارفتگی دیکھنے والی ہوتی تھی۔''

''کیا تم وہی کہہ رہے ہو جو میں سمجھ رہی ہوں؟''

''یس، مجھے یقین ہے ڈاکٹر شائستہ اپنے شوہر سے اور شوہر اس سے بالکل خوش نہیں ہوں گے۔ وہ فریال کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہے۔''

''چلو اب جو ہوا سو ہوا۔ لندن جا کے اس سے یہ تفتیش مت شروع کر دینا۔''

میں نے کہا۔ ''میرا دماغ خراب نہیں ہے۔ اچھا اب آپ تیار ہوں تا کہ ہم نکلیں۔ دوپہر تو ہونے والی ہے۔''

اس نے چٹکی بجائی۔ ''بس دو منٹ۔''

''جو برابر ہوں گے بیس منٹ کے۔'' میں نے ایک فائل اٹھائی جو فریال ہماری تحویل میں چھوڑ گئی تھی۔ اس میں چودھری سلطان کی گجرات والی کوٹھی کی ملکیت کے کاغذات تھے جو اس نے فریال کو تحفے میں دی تھی۔ دوسری فائل میں لاہور والی کوٹھی کی ملکیت کے کاغذات تھے جو فریال نے بعد میں خود لی تھی۔ فائلیں ہم وہیں سے لائے تھے۔ آئندہ کے لیے کچھ کہنا مشکل تھا کہ فریال ان کا کیا کرے گی۔

نور کا ویزا لگ گیا تھا۔ میں نے اپنا برٹش پاسپورٹ دکھا کے لندن کے لیے بکنگ حاصل کر لی۔ یہ اسلام آباد سے کراچی اور پھر دبئی کے راستے لندن جانے والی فلائٹ تھی جو دگنا وقت لیتی تھی۔ دبئی میں اس کا چار گھنٹے کا اسٹاپ اوور تھا۔ میں نے اور نور نے ایک پورا دن شاپنگ کی۔ مجھے اندازہ تھا کہ لندن میں یہی جوتے کپڑے بھی کتنے مہنگے ہوں گے۔ غنی ہمارے ساتھ رہا اور وہ دن نسبتاً پرسکون رہا۔ وہ معاملات جنہوں نے ایک ہفتے سے مجھے ذہنی انتشار اور اعصابی دباؤ میں مبتلا کر رکھا تھا۔ ٹھنڈے پڑتے دکھائی دیتے تھے۔ میں اس پرخوف اور اعصاب شکن ماحول سے نکل کے کچھ دن لندن میں گزارنے کے خیال سے ہی سکون محسوس کر رہا تھا۔

خرابی آخری وقت میں ہوئی جب میں نے امیگریشن والوں کو اپنا ٹکٹ اور پاسپورٹ پیش کیا۔ نور کو مجھ سے پہلے کلیئرنس مل گئی تھی اور وہ میرے کہنے پر بورڈنگ کارڈ لینے چلی گئی تھی۔ بغیر وردی والے خرانٹ قسم کے افسر نے کمپیوٹر میں میرا نام اور دیگر تفصیلات ڈالنے کے بعد غور سے دیکھا اور نفی میں سر ہلا دیا۔

''آپ ملک سے باہر نہیں جا سکتے سر!''

میں نے حیرانی سے کہا۔ ''وہ کیوں؟''

''آپ کا نام ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں ہے۔''

''لیکن میں برٹش نیشنل ہوں۔''

''آپ پاکستان میں پاکستانی ہیں سر۔''

میرا غصہ بڑھنے لگا۔ ''آخر اس کی وجہ بھی ہو گی کوئی؟''

''ہمارے پاس صرف نام آتے ہیں۔ جو لسٹ میں شامل ہوتے ہیں۔ یہ لسٹ وزارتِ داخلہ ارسال کرتی ہے۔'' اس نے پاسپورٹ مجھے واپس کر دیا۔

میں کچھ دیر بے وقوفوں کی طرح کھڑا رہا۔ ''بھائی میں کوئی سیاستداں نہیں ہوں......''

اسے شاید میری صورت پر ترس آ گیا۔ ''آپ کے خلاف کوئی کرمنل کیس تو نہیں ہے۔ نیب والوں کا یا اینٹی

کرپشن کا؟ آپ کرتے کیا ہیں؟''
میں نے کہا۔ ''کرتا تو بہت کچھ ہوں لیکن میرے خلاف ایسا کوئی کیس نہیں۔ ہاں ایک کیس میں ضمانت پر ہوں۔ ہائی کورٹ سے۔''
وہ مسکرایا۔ ''کچھ تو ہوتا ہے سرا۔''
مجھے احساس ہوا کہ اسے یہ بات بتانا غلطی تھا اب اس کا اگلا سوال بھی ہوگا کہ آخر میں نے کیا جرم کیا تھا۔ ''مجھے خیال ہی نہیں رہا کورٹ سے اجازت لینے کا۔''
''ہائی کورٹ سے ضمانت ہو تو آپ ملک سے کیا صوبے سے باہر نہیں جاسکتے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ ضمانت کس کیس میں تھی۔''
میں نے کہا۔ ''آپ نہیں پوچھ سکتے۔'' کہہ وہاں سے چل پڑا۔
یہ بڑی عجیب صورتِ حال ہوگئی تھی اور میں سخت ٹینشن میں مبتلا ہوگیا تھا۔ اسی وقت نور کی کال آگئی۔ ''اتنی دیر کیوں لگ رہی ہے تمہیں؟ مجھے تو مل گیا بورڈنگ کارڈ۔''
میں نے کہا۔ ''نور، میں تمہارے ساتھ نہیں جاسکتا۔''
''میرے ساتھ نہیں جاسکتے۔ پھر کس کے ساتھ جاؤ گے؟''
''یہ مذاق کی بات نہیں۔ میرا نام ای سی ایل میں ہے۔ میں کورٹ کی اجازت کے بغیر ملک نہیں چھوڑ سکتا۔''
''او مائی گاڈ! اب کیا ہوگا؟''
''کچھ نہیں تم جاؤ۔ میں چند روز بعد آجاؤں گا۔'' میں نے کہا۔
''نہیں۔ میں بھی چند روز انتظار کرسکتی ہوں۔''
''ڈونٹ بی اے فول۔ تم جاؤ، یہ کوئی مسئلہ نہیں مجھے خیال نہیں رہا ورنہ پہلے ہی کلیرنس لے لیتا۔''
''تمہیں کلیرنس نہ ملی...... پھر؟''
''کیسی باتیں کرتی ہوں میرا برٹش پاسپورٹ ہے اور اب تو وہ کیس بھی ختم ہوگئے سمجھو۔ میں ٹکٹ واپس نہیں کررہا ہوں۔ کیا پتا ماجد خان کل ہی اجازت دلوادیں۔ تمہارے لیے میں بندوبست کردوں گا۔ تمہیں کوئی پرابلم نہیں ہوگی۔ وہاں عائشہ ہے۔ اس کا باپ لارڈ ارنسٹ بہت اچھا آدمی ہے۔ میرے لندن میں بہت اچھے دوست ہیں اور وہ بھی ہے...... ڈاکٹر شائستہ۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔''
''دیکھو میں تمہارے کہنے سے جارہی ہوں لیکن یہ بھی بتادوں کہ تم اسی ہفتے میں لندن نہ آئے تو میں واپس آجاؤں گی۔''
''او کے۔ او کے۔ یہ صورتِ حال اچانک پیدا ہوگئی ہے۔ اور اس کا فوری حل کسی کے پاس نہیں۔''
''ایسا نہیں ہوسکتا۔ کتنے لوگ بوگس ویزا اور جعلی پاسپورٹ پر نکل جاتے ہیں۔''
''وہ اور بات ہے۔''
''امیگریشن والے ہی عیار کل ہوتے ہیں۔ ورنہ آنکھیں بند رکھیں تو نکالنے والے توپ نکال کے لے جائیں۔ ان کی جیب گرم نہ کی جائے تو پٹاخے کو بم قرار دے کر روک لیا جاتا ہے۔'' نور سخت برہم تھی۔
''جان اگر پیسا کھلانے کا معاملہ ہوتا تو میں ایک کی جگہ دس دے کر نکل آتا لیکن ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں نام ڈالنا اور اس میں سے نام نکالنا صرف محکمۂ داخلہ کا اختیار ہے۔ کوئی شخص نکل جائے جس کے باہر جانے پر پابندی ہو۔ تو یہاں بیٹھے ہیں ان کی نوکری جاتی ہے۔''
''ہاں۔ بشرطیکہ کسی کو پتا چلے۔ یہاں روز سیکڑوں آتے اور جاتے ہیں۔ اور تم کون سا رہنے کے لیے جارہے ہو۔ زیادہ سے زیادہ دو ہفتے میں واپس آجاؤ گے۔ تم بتا سکتے ہو۔''
''بے وقوف لڑکی۔ میں قتل کے الزام میں ضمانت پر ہوا تھا اور قتل بھی وہ جس کا حوالہ آج سارے اخبارات میں ہے ایسے تو ہر مجرم فرار ہوسکتا ہے۔''
''اگر کوئی تمہارا ضامن بن جائے؟''
''اتنی جلدی کچھ نہیں ہوسکتا۔ یہ قانونی معاملہ ہے۔ زبانی خود آئی جی صاحب بھی کہیں کہ جانے دو اور میں ضمانت دیتا ہوں کہ یہ واپس آجائے گا تو اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ میں واپس نہ آؤں تو میری جگہ کیا آئی جی صاحب کو پکڑ سکتا ہے کوئی۔ اور وہ کیا انکار نہیں کرسکتے کہ میں نے کبھی کوئی ایسے غیر قانونی احکامات نہیں دیے تھے۔ اور دیے تو تعمیل کیے ہوگی۔ میرے پاس ویسے ہی برٹش پاسپورٹ ہے۔''
کچھ دلیل کچھ غصے اور کچھ خوشامد سے میں نے نور کو بورڈنگ کارڈ واپس کرنے سے روکا اور اسے یقین دلایا کہ تین دن میں کلیرنس لے کر میں فوری طور پر لندن پہنچ جاؤں گا۔ میں نے بہت ضبط سے کام لیا ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مجھے سخت کوفت کا سامنا تھا اور میری ٹینشن دگنی ہوگئی تھی۔ میں نے نور کو سمجھایا کہ لندن کے ہیتھرو ائرپورٹ پر کوئی اسے لینے ضرور آئے گا اور وہ ''مس نور افشاں'' کا پلے کارڈ لیے کھڑا ہوگا۔ وہ پوچھ سکتی ہے کہ اسے کہاں جانا ہے۔ وہ بتادے گا کہ اسے کس نے بھیجا ہے۔ وہ ایلیشیا یا عائشہ کا نام لے گا یا ان کے باپ لارڈ ارنسٹ کا۔
''تم ان کو میرے بارے میں بتادو گے؟''
''آف کورس، میں سب بتادوں گا اور پھر تمہیں بھی تو پہلے بھی باہر آتی جاتی رہی ہو۔ پھر ایسے کیوں گھبرا رہی ہو۔''
''میں تمہارے ساتھ نہ آنے سے اپ سیٹ ہوں۔''

میں اکیلی بھی تین بار آچکی ہوں۔ کوئی بندوبست نہ ہوتا میں ائرپورٹ سے سیدھی ہوٹل چلی جاتی۔ اور اب بھی تو تمہیں بتادوں گی کہ میں نے کہاں قیام کیا ہے۔ فکر مت کرو۔ اپنے آنے کی فکر کرو۔ اب میں وہاں نہیں رہ سکتی۔''
اس کی بات نے مجھے خاصا اطمینان دیا۔ میرے سامان میں صرف ایک سوٹ کیس تھا۔ ایک بریف کیس میں نے ہاتھ میں اٹھا رکھا تھا۔ ائرپورٹ سے باہر آکے میں نے سوچا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میری طرف سے مطمئن غنی گاڑی میں واپس ست بدحالی جاچکا تھا اور اتنی دیر میں شاید آدھا راستہ طے کرچکا تھا۔ میں اسے بھی واپس بلا سکتا تھا اور دوسری کرائے کی گاڑی لے کر بھی واپس جاسکتا تھا۔ میں نے پہلی صورت کو ترجیح دی اور غنی کو فون کرکے واپس اسلام آباد ائرپورٹ پہنچنے کی تاکید کی۔ پھر میں کافی پینے اور وقت گزارنے کے لیے ریسٹورنٹ میں جا بیٹھا۔ وہاں سے فون پر میں نے راجا کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا۔
''کیا تیری ماجد خان سے بات ہوئی؟'' راجا بولا۔
''میں نے کہا۔'' ''ابھی تو نہیں۔''
''اجازت کے لیے درخواست لاہور ہائی کورٹ میں دی جائے گی لیکن یہ چٹکی بجاتے ہی حل ہونے والا مسئلہ نہیں ہے فیکے پتر۔ درخواست کسی جج کے سامنے جائے گی۔ رجسٹرار کے پاس ہوکے۔ وہ آنکھ بند کرکے نہیں لکھ دے گا کہ جاؤ نواب صاحب۔ وہ دوسرے فریق سے پوچھے گا کہ کوئی اعتراض تو نہیں ہے۔ ایڈووکیٹ جنرل یا اس کا کوئی معاون حاضر ہوکے کہے گا کہ استغاثہ کی طرف سے اعتراض نہیں تو کورٹ بھی اجازت دیدے گی۔ پھر یہ اجازت نامہ وزارتِ داخلہ کو ارسال ہوگا اور وہ تجھے این او سی جاری کردیں گے۔ اور مہربان ہوئے تو تیرا نام ای سی ایل سے نکال دیں گے لیکن تو جانتا ہے قانون اور ضابطے کی ساری کارروائی کیسے ہوتی ہے۔ پھر یہ معاملہ ہے لاہور سے اسلام آباد کا۔''
''کتنا وقت لگ جائے گا اس میں؟ فرض کرو ہم کسی بھی مرحلے میں پیش رفت کم نہ ہونے دیں۔ ایکسی لریٹر دبا کے رکھیں۔''
''ایکسی لریٹر تو پورا دبا کے رکھنا پڑے گا فیکے پتر۔ ورنہ گاڑی چلے گی بھی نہیں۔ لگاتے رہو دھکا۔ ایک انچ آگے نہیں بڑھے گی۔ ہاتھ کھلا رکھا تب بھی میرا خیال ہے تو ایک ہفتے بعد نکل جائے گا۔''
''مجھے بھی اُمید تھی۔'' میں نے مایوسی سے کہا۔ ''میں اب کیا کروں راجا، لاہور جاؤں یا واپس آجاؤں؟''
''تیرا ابھی لاہور میں کوئی کام نہیں۔ ماجد خان کو ساری صورتِ حال بتادے اور آجا لوٹ کے ست بدحالی۔ جدائی کا ایک ہفتہ درد ناک جائے گا۔ فراقیہ اشعار پڑھ۔ دن میں تارے گن۔ رات کو خواب میں اسے دیکھ۔''
''تجھے مذاق سوجھ رہا ہے الو کے پٹھے۔ مجھے رونا آرہا ہے۔''
''رونے سے کیا ہوگا فیکے پتر تیری لیلیٰ تو اڑ گئی سات سمندر پار۔ وہ لندن میں تو ست بدحالی میں۔''
غنی کے نمودار ہونے تک میں نے اپنے وکیل ماجد خان سے بات کرلی تھی اور انہوں نے بھی وہی کہا تھا جو راجا نے کہ بہت جلدی کرنے پر بھی ایک ہفتے سے پہلے میرا لندن جانا ممکن نہیں ہوگا۔ وہ بھی اس لیے کہ اس کیس میں استغاثہ کو دلچسپی نہیں ہے۔ مدعی تھے چودھری سلطان کے بہن بہنوئی تو وہ خود بھی دنیا میں نہیں رہے۔ مارا انہیں کسی نے ہو نام ڈاکوؤں کا لیا گیا۔ باپ پہلے ہی نا خلف بیٹے کی حرکت سے شرمسار ہوکے دنیا کو چھوڑ گیا تھا اور بیوی کو خود چودھری سلطان بہت پہلے ٹھکانے لگا چکا تھا۔ بیوی کا امریکن بھائی حقائق سے پوری طرح باخبر ہونے کے باوجود جتنا عرصہ یہاں رہا اس کا بال بیکا نہ کرسکا اور جھک مار کے تھک ہار کر امریکا چلا گیا۔ رہ گئے قرض خواہ تو وہ کس سے نقصان پورا کریں۔ آں دفتر را گاؤ خورد۔ گاؤ را قصاب برد و قصاب ہم مرد۔ یعنی فائل کو گائے کھا گئی گائے کو قصاب لے گیا اور قصاب مر گیا۔
صبر کے سوا چارہ نہ تھا۔ میں خود نور کے ساتھ جارہا تھا اس لیے ابھی تک میں نے لندن میں کسی کو بھی اپنی آمد کی اطلاع نہیں دی تھی۔ میں وہاں اچانک پہنچ کے پرانے دوستوں کو خصوصاً عائشہ کو سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ اور اندازہ مجھے نہ تھا کہ سب سے بڑا سرپرائز خود میرے لیے ائرپورٹ پر ہوگا۔ اب نور کو ریسیو کرنے اور میرے آنے تک میزبانی فراہم کرنے کے لیے عائشہ سے بات کرنا ضروری ہوگیا تھا۔ ابھی میرے پاس کافی وقت تھا لیکن اتنے عرصے بعد ایک ضرورت پڑنے پر عائشہ کو فون کرتے ہوئے مجھے جھجک محسوس ہورہی تھی۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ اب کس حال میں ہے اور میرے لیے کیا جذبات رکھتی ہے۔ وقت سب کچھ بدل دیتا ہے۔ جیسے اس نے فریال کو بدلا تھا۔ نور جہاں کو نور بنادیا تھا۔
میرے خیالات کا انہماک ٹیلی فون کی گھنٹی سے ختم ہوا۔ جو نمبر مجھے اسکرین پر نظر آرہا تھا میرے لیے اجنبی

تھا۔ ''ہیلو......'' میں نے محتاط لہجے میں کہا۔

''مجھے......نواب صاحب سے بات کرنی تھی۔ نواب رفیق احمد شیرازی سے۔'' کسی نے دبی ہوئی بیٹھی ہوئی پُرخوف آواز میں کہا۔

میں نے کہا۔ ''کون ہو تم؟''

''میں...... مجھے انہی سے کام تھا۔ وہ مجھے جانتے ہیں۔ ذرا جلدی کریں۔''

میں نے کہا۔ ''میں بول رہا ہوں۔ کہو کیا بات ہے۔''

''سر جی۔ میں یہاں میو اسپتال میں ہوں۔ کینسر وارڈ کے بیڈ نمبر چار پر۔ میرا نام زبیر ہے۔ ڈاکٹروں نے مجھے جواب دے دیا ہے۔''

''یہ سب تم مجھے کیوں بتا رہے ہو؟ میں تمہاری کیا مدد کرسکتا ہوں؟''

''مجھے مدد نہیں چاہیے جناب...... بس آپ اسے معاف کردیں...... میں نے بھی کردیا ہے، میرے بیٹے کو۔''

''کون ہے تمہارا بیٹا......''

''ہے ایک بدبخت۔ اس نے چار لاکھ روپے بچائے۔ مجھے بچانے کی بجائے گاڑی خریدی ہے اس نے۔ اس کے بچوں کے کام آئے گی۔ میں اس کے کسی کام کا نہیں تھا۔ ارے...... یہ موبائل فون ان کا ہے، ساتھ والے بھائی صاحب کا۔''

پھر ایک اور آواز آئی۔ ''ہیلو، کون ہو تم جس سے ابا بات کر رہے تھے۔''

میں نے محسوس کرلیا تھا کہ اب بات کرنے والا غصے میں ہے۔ آواز بدل کے میں نے کہا۔ ''میں جی کلیم سید غلام شبیر شاہ گجرات والا۔''

''ابا جی کیا بات کر رہے تھے......؟''

''اچھا وہ ابا تھے آپ کے۔ اللہ رحم کرے۔ آپ ان کو لے آئیں کل۔''

فون بند ہوگیا اور ایک منٹ بعد پھر بولا تو نمبر بدلا ہوا تھا۔ غالباً برخوردار اپنے طور پر مطمئن ہونا چاہتا تھا۔ میں نے اسی آواز میں دوبارہ اپنا نام دہرایا تو کسی نے جواب نہیں دیا۔ غنی نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ میں اپنی ہی سوچوں کے گرداب میں غوطہ زن تھا۔

آخر کینسر کے مرض کی آخری اسٹیج پر یہ شخص کون تھا جو اپنے لیے اور اپنے بیٹے کے لیے مجھ سے معافی کا خواستگار تھا۔ آخری وقت میں بندہ اپنے پروردگار سے عفو و درگزر کا طالب ہوتا ہے۔ وہ میرا نام جانتا تھا اور اس نے کسی طرح میرے موبائل فون کا نمبر بھی معلوم کرلیا تھا لیکن عجیب بات تھی کہ اس کے پاس اپنا موبائل فون نہیں تھا۔ مجھے فون کے لیے اس نے بیٹے سے چھپ کے کسی دوسرے مریض سے فون لیا تھا جو ساتھ والے بیڈ پر تھا اور پکڑا گیا تھا۔ کیا تھا؟ کون تھا اس کا بیٹا۔ زبیر نام کا کوئی شخص میرا شناسا نہ تھا، نہ زبیر الدین، نہ محمد زبیر۔

میں نے ذہن پر بہت زور ڈالا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ سوال یہی تھا کہ اس زبیر نام کے شخص کو اپنے بیٹے کے کر[توت] پر ندامت تھی؟ چار لاکھ لے کر اس ناخلف بیٹے نے کوئی ایسی حرکت کی تھی جس کی شرمندگی کا بوجھ قریب المرگ محسوس کرتا تھا۔ غلطی یا غلط فہمی کا امکان بالکل نہ تھا کیونکہ شخص کو میرا نام بالکل صحیح معلوم تھا اور فون نمبر بھی۔

میرے دل میں تجسس ایک خلش کو بڑھا رہا تھا۔ کے بیٹے نے کوئی ایسا کام کیا تھا کہ مرنے سے پہلے معافی مانگ کر اپنے ضمیر کا بوجھ اتارنا چاہتا تھا۔ یوں بار اولاد کی خیر خواہی کے جذبے کی انتہا تھی کہ اسے اپنے علا[ج پر] پیسا خرچ نہ کیے جانے کا دکھ ضرور تھا لیکن بیٹے کے لیے کے فعل قبیح پر مجھ سے معافی حاصل کرنے کی فکر کیا زیادہ تھ[ی]۔ وہ خود تو مر رہا تھا بیٹے کے گناہوں کی پریشانی اسے کیوں تھ[ی]۔ وہ کیوں اس کے لیے معافی کا طلبگار تھا؟

بالآخر میں نے طے کیا کہ اس معاملے کو زیادہ گہ[رائی] میں جا کے دیکھنے کی ضرورت ہے۔ خرابی یہ ہوئی تھی کہ معاملے کی تفصیل ملنے سے پہلے وہ بدبخت بیٹا آگیا تھا جو مجرم تھا لیکن اس کی معافی کے لیے باپ چھپ کر میرے سامنے دامن پھیلا رہا تھا اور بیٹے نے باپ کی اس نیکی کو جرم سمجھتے ہوئے اس سے موبائل فون چھین لیا تھا۔ آخر با[پ] کس سے بات کر رہا تھا اور کیوں؟ اس کے دل میں ای[ک] خوف تھا۔ ڈر تھا کہ اس کے جرم کا راز افشا نہ ہو جائے۔ خطرہ اسے باپ سے بھی تھا......

''غنی......'' میں نے کہا۔ ''ہم لاہور جا رہے ہیں۔''

غنی نے ایک لمحے کے توقف سے کہا۔ ''یس سر۔''

''تم کو ایک کام کرنا ہے۔ ہوشیاری اور رازداری سے......''

''آپ حکم کریں سر۔''

''میو اسپتال کینسر وارڈ دیکھا ہے تم نے۔''

''میں معلوم کرلوں گا سر۔''

''بیڈ نمبر چار پر ایک مریض ہے زبیر نام کا۔ خاموشی سے اس کے بارے میں معلوم کرو۔ کون ہے، کہاں رہتا ہے، کیا کر[تا] ہے۔ میرا مطلب ہے کیا کرتا تھا، اس کے کتنے بچے ہیں۔ ایک بیٹے نے حال ہی میں گاڑی لی ہے۔ وہ کون ہے؟''

''یس سر۔ اس بیٹے سے بھی ملنا ہے۔''

''ملنا کسی سے نہیں ہے۔ پہلے گھر دیکھو۔ کسی کو معلوم نہ ہو تم کیا انکوائری کرتے پھر رہے ہو۔ یہ ہم کل دیکھیں گے کہ بیٹے سے کہاں ملیں اور کیسے۔ مجھے ماجد خان کے گھر چھوڑ دو۔ لیکن ابھی تو وہ اپنے آفس میں ہوں گے۔''

ماجد خان کا لا چیمبر ہائی کورٹ کے پیچھے ٹمپل روڈ پر تھا۔ جب میں ان کے آفس میں پہنچا تو ان کے ساتھ صرف ایک کلائنٹ تھا۔ دوسرا اپنی باری کے انتظار میں تھا۔ ان کی مستعد سیکریٹری نے مجھے پہچان کے اندر اطلاع دی اور مجھے کافی سرو کی۔ ماجد خان کے فارغ ہونے تک میں نے راجا کو اپنے لاہور جانے کی وجہ بتادی۔ غنی مجھے چھوڑ کے سراغرسی کے اس مشن پر جاچکا تھا جو میں نے اسے سونپا تھا۔ میرے کہنے کے باوجود وہ گاڑی نہیں لے گیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے لیے رکشے میں جانا آسان اور بہتر رہے گا۔

ماجد خان نے میرا خوشدلی سے میرا استقبال کیا۔ ''بھئی آپ نے اچھا کیا خود آگئے۔ پتا نہیں آپ کی درخواست کس جج کے سامنے جائے۔ وہ اعتراض کرنا چاہے تو پوچھ سکتا ہے کہ درخواست گزار ضمانت پر ہے تو اسے خود حاضر ہونا لازم تھا۔''

ماجد خان عمر میں مجھ سے پچیس سال سے بھی بڑے اور تقریباً میرے والد کے ہم عمر تھے چنانچہ ان کے اور میرے درمیان ادب لحاظ کا رشتہ تھا۔ وہ بے تکلفی نہیں تھی جو سب سے پہلے فاروقی اور پھر شہزادے کے ساتھ رہی۔ وہ بہت سینئر ایڈووکیٹ شمار ہوتے تھے اور ایک طرح سے میں ان کا ممنون تھا کہ انہوں نے میرے معاملات کی قانونی وکالت قبول کرلی تھی۔

''میں صبح آپ کے ساتھ ہی چلوں گا۔ لیکن خانصاب، کیا اس بات کا امکان بھی ہے کہ کورٹ مجھے اجازت دینے سے انکار کردے۔''

وہ مسکرائے۔ ''بھئی یہ صوابدیدی اختیارات ہیں۔ جج کا مطمئن ہونا ضروری ہے۔''

''اسے مطمئن کرنے کے لیے آپ کا ہونا ہی کافی ہے۔''

''رفیق میاں...... بیشتر جج نہ کسی کے نام سے متاثر ہوتے ہیں نہ عہدے سے۔ وہ میرٹ پر جاتے ہیں اور قانونی پوزیشن دیکھتے ہیں۔ اب اتفاق کہو یا اپنی خوش قسمتی کہ اس کیس میں پیروی کرنے والوں کی دلچسپی تقریباً ختم ہوچکی ہے۔ اتفاق سے میری ایڈیشنل ایڈووکیٹ جنرل سے کچھ رشتے داری ہے۔ آج رات ایک شادی میں ملاقات ہوگی۔ یقین کہ وہ میری سفارش مان لے گا۔ وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ سفارش میں نہ کرتا ہوں نہ سنتا ہوں۔ اسے تھوڑا سا بریف کروں گا کہ یہ جینوئن کیس ہے اور میں خود گارنٹی دے سکتا ہوں کہ نواب رفیق کا فرار کا کوئی ارادہ نہیں۔ ایک تو وہ فرار ہو نہیں سکتے۔ دوسرے کیس میں کچھ نہیں رہا۔ پولیس جتنا جانتی ہے اس سے زیادہ میں جانتا ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''گویا انکار نہیں ہوگا۔ اب یہ فرمایئے کہ رانا کی ضمانت کے کیس کا کیا ہوگا۔ وہ تو پیش ہی نہیں ہو رہا۔''

''آئی ایم سوری ٹو سے نواب صاحب۔ اس کی ضمانت کی توثیق ہوگئی۔''

''وہ کیسے؟''

''اس بات کو چھوڑیے، پاکستان میں کیا نہیں ہوجاتا۔ سیاسی معاملات کیسے چل رہے ہیں اور ملک چلانے والوں نے ملک کو کہاں پہنچادیا ہے؟ آئین شکنی اوپر سے ہوئی۔ قانون شکنی نیچے والوں نے اپنا شعار بنالیا۔ میں تو بعض اوقات مایوسی میں ڈپریشن کا شکار ہوجاتا ہوں کہ کیا اپنی زندگی میں کبھی میں اس ملک کو صحیح افراد کے ہاتھوں میں صحیح راستے پر چلتا دیکھ سکوں گا۔ اور صحیح راستہ کون سا مشکل راستہ ہے۔ دنیا کے دو ممالک جو ہمارے ساتھ یا ہمارے بعد آزاد ہوئے، بہتری کی طرف گامزن ہیں......اور ہم؟''

فون کی گھنٹی بجی تو انہوں نے بات ادھوری چھوڑ کے پانی کے گلاس سے ایک گھونٹ لیا اور اپنی بیگم سے بات کرنے لگے۔ ''ہاں بھئی مجھے یاد ہے۔ نہیں دیر نہیں ہوگی مجھے۔ ایک مہمان بھی ہوں گے میرے ساتھ۔''

انہوں نے فون رکھا تو میں نے معذرت کی۔ ''میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گا ماجد صاحب۔''

''بھئی تکلف کوئی نہیں۔ میرے سالے کے بیٹے کی شادی ہے۔ آپ کو ان سے بھی ملوادیں گے۔ وہ جو ایڈیشنل ایڈووکیٹ جنرل ہیں۔''

''یہ کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا۔''

''بھئی وہ بڑے عالم فاضل آدمی ہیں۔ وکیل سے زیادہ فلسفی۔ آپ ان سے مل کے خوش ہوں گے۔''

اس کے باوجود میں نے معذرت کرلی۔ بن بلائے کسی شادی میں جانے سے زیادہ مجھے اپنی قانونی پوزیشن کی وجہ سے ماجد خان کے ساتھ جانا مناسب نہیں لگتا تھا۔ غنیمت یہ ہوا کہ دس منٹ بعد ہی غنی کا فون آگیا۔

''میں نے سب معلوم کرلیا ہے سر۔ میں نیچے گاڑی کے پاس کھڑا ہوں۔''

میں نیچے گیا تو غنی موجود تھا۔ اس جگہ سے میو اسپتال

بہت قریب تھا چنانچہ ایک گھنٹے میں وہ اپنا کام کر کے لوٹ آیا تھا۔ ''ہاں غنی کیا رپورٹ ہے؟''

اس نے کہا۔ ''اس کا بیٹا، زبیر الدین ریلوے پولیس میں تھا۔ اسپتال سے تو اس کے بارے میں زیادہ معلوم نہیں ہوسکا۔ رہائش اس کی سمن آباد کی طرف ہے۔ کسی کوٹھی کے سرونٹ کوارٹر میں جگہ ملی ہوئی ہے۔ وہ خود تو ایسا نہیں لگتا کہ کوٹھی کا مالک ہو۔ اس کا باپ واقعی مرنے کے قریب ہے۔ کچھ دن پہلے اگر اس کا آپریشن ہو جاتا تو وہ بچ جاتا۔ میں نے وارڈ کے ایک بندے سے کہا کہ مجھے ایک مریض کے بارے میں بتاؤ۔''

''اسے شک نہیں ہوا۔''

''ہوا تھا۔ میں نے کہا کہ اس کا بیٹا ہمارے سیٹھ کے پاس آیا تھا کہ باپ کے آپریشن کے لیے پیسا چاہیے۔ ہمارے سیٹھ ادھر جاپان سے ری کنڈیشنڈ گاڑیاں منگواتا ہے۔ یہ بھی سیٹھ کے پاس کام کرتا ہے۔ پانچ لاکھ کا خرچہ بتا رہا تھا۔ سیٹھ نے پوچھا کہ قرضہ واپس کیسے کرے گا۔ ابھی مجھ کو بھیجا ہے کہ دیکھ کر آؤ۔ یہ جھوٹ بول رہا تھا یا سچ۔ سیٹھ بڑا سخی ہے۔ آپریشن بھی کرا دے گا۔ لیکن میری تمہاری بات کا اس کے بیٹے کو پتا نہیں چلنا چاہیے۔ وہ لے گیا مجھے وارڈ کے ایک ڈاکٹر کے پاس۔ وہ چھٹی کر کے گھر جا رہا تھا۔ اس نے کہا کہ ابھی کوئی فائدہ نہیں۔ چار نمبر کا مریض آپریشن کے لیے راضی تھا۔ ہم نے بتایا کہ گارنٹی کوئی نہیں۔ برین ٹیومر دوبارہ بھی نمودار ہو جاتا ہے۔ ایک جگہ ختم ہو تو دوسری جگہ نکل آئے۔ یا اس کا باپ اندھا ہو جائے۔ زندگی بھر کے لیے مفلوج ہو جائے۔ بیٹے نے کہا کہ پھر چھوڑ دو۔ اس کی زندگی ہی کتنی رہ گئی ہے۔ چار لاکھ ضائع ہوں گے۔ تم اپنے سیٹھ کو بھی بتا دینا۔ ہم تو ڈاکٹر ہیں۔ اس کا پیسا کسی کے کام آئے تو اچھا ہے۔ کسی کو فائدہ ہو۔ اسے ثواب ملے۔ یہ کیس ہوپ لیس ہے۔ اس میں کوئی ڈاکٹر کچھ نہیں کر سکتا۔ نہ یہاں کا نہ باہر کا۔ ایسے کیس نہیں کہ آپریشن ہو تو انہیں نئی زندگی مل جائے۔''

''ویلڈن غنی۔ کیا تم نے اسے دیکھا؟ اس سے ملے؟''

''کس سے سر۔ زبیر الدین سے۔''

''نہیں، اس کے بیٹے سے۔ کیا نام ہے اس کا؟''

''عزیز الدین۔ اسے ایک ہفتے سے کسی نے نہیں دیکھا۔ پہلے چکر لگاتا تھا مگر اب باپ کو مرنے کے لیے چھوڑ گیا ہے۔''

''دیکھو غنی۔ ایسا ہے کہ مجھے یہ بندہ چاہیے۔ اس سے کچھ پوچھنا ہے۔''

''بندہ حاضر ہو جائے گا سر۔ یا کر دیا جائے گا۔ جہاں آپ کہیں۔''

میں نے کہا۔ ''ابھی تم مجھے میو اسپتال لے چلو۔ زبیر الدین سے ملوں گا۔ صبح مجھے حامد خان صاحب کے سا کورٹ جانا ہے اس لیے رات کو ہم ہوٹل میں ٹھہریں گے کورٹ سے پی سی قریب ہے۔ اب چلو۔''

میو اسپتال کے کینسر وارڈ تک جانے کے لیے مجھے ا ہی اندر شاید ایک کلومیٹر چلنا پڑا۔ غنی ساتھ نہ ہوتا تو وا معلوم کرنے کے لیے میں نہ جانے کتنا بھٹکتا۔ روز کی طر وہاں ایک اژدحام تھا۔ ان میں مریضوں سے زیا مریضوں کے لواحقین تھے جو اپنی اپنی فکروں میں مبتلا تھے کینسر وارڈ شاید سب سے پُرسکون جگہ تھی کیونکہ یہاں دکھ ا بیماری میں مبتلا انسانوں کے ساتھ اُمید کی روشنی نہیں تھی صرف مایوسی تھی جو موت کے پُرآسیب سایوں کی صورت میں اس وارڈ کے در و دیوار سے نحوست بن کے چمٹی ہوئی تھی۔ عجیب جگہ تھی جہاں ڈاکٹر بھی تھے اور علاج بھی تھا لیکن سب جانتے تھے اور مانتے تھے کہ وہ موت کے خلاف ایک لاحاصل جنگ کر رہے ہیں جس میں ہار ان کے لیے ہے بات صرف وقت کی ہے کہ کسے کتنا جینا ہے۔ وہ سب سزائے موت پانے والے ان قیدیوں کی طرح تھے جن کی رحم کی آخری اپیل مسترد ہو گئی تھی اور ان کے بلیک وارنٹ بھی جاری ہو چکے تھے چنانچہ وہ زندگی کی مہلت کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے تھے کہ صبح تک ہے یا دو دن، دو ہفتے، دو مہینے۔ انتظار ان کا اصل عذاب تھا۔

زبیر الدین ساٹھ ستر برس کا بظاہر صحت مند نظر آنے والا باریش بوڑھا تھا جو بستر پر بیٹھا تکیے پر قرآن رکھے تلاوت میں مصروف تھا۔ مجھے دیکھ کے اس نے سوالیہ نظر اٹھائی۔

میں اس کے سامنے بیڈ پر ٹک گیا۔ ''آج تم نے مجھے فون کیا تھا؟''

''میں نے'' آپ کون ہو جی؟''

میں نے کہا۔ ''نواب رفیق احمد شیرازی۔''

وہ مجھے نظر جما کے دیکھتا رہا۔ ''اچھا جی۔ میرا خیال تھا آپ...... ویسے ہوگے...... جیسے نواب ہوتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''تمہارا بیٹا اس پر ناراض ہوا تھا۔''

وہ اداس ہو گیا۔ ''بس جی۔ پتا نہیں کیسے اس وقت آ گیا۔ وہ اب کہاں آتا ہے۔ کوئی بھی نہیں آتا۔ آپ نے بڑی تکلیف کی جناب۔''

میں نے کہا۔ تکلیف کی بات چھوڑو۔ تم کیا کہنا چاہتے تھے''

وہ مجھے دیکھتا رہا۔ ''کیسے بتاؤں جنابِ عالی۔ کیا

ں، میں غریب آدمی ہوں۔ ساری عمر تنگی میں گزاری۔ محنت بیوی بچوں کو پالا لیکن بدنصیبی نے ساتھ نہیں چھوڑا ہے ابھی دیکھ لو کہاں پڑا ہوں۔ بیوی ہوتی تو شاید ساتھ دیتی۔''

میں نے اسے تسلی دینے کے لیے کہا۔ ''حوصلہ رکھو زبیر۔''

''کیا حوصلہ رکھوں جناب۔ اور کیا ہوگا اب حوصلہ ہے۔ پتا نہیں اللہ کون سے گناہوں کی سزا دے رہا ہے گنہگار تو بہت ہیں دنیا میں۔ ایک میں ہی کیوں۔ نہ حرام اپنا نہ اولاد کو کھلایا۔ سبزی پھل کی ریڑھی لے کے پھرتا رہا ہی گرمی۔'' آنسو اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔

میں نے کہا۔ ''آخر تم کیا بتانا چاہتے تھے مجھے؟''

اس نے اپنے آنسو پونچھے۔ ''چار بیٹے تھے میرے ب۔ تین بیٹیاں تھیں۔ وہ اپنے گھر کی ہو گئیں۔ چاروں ں کی شادی بھی میں نے ہی کی، اپنی کمائی سے۔ دو باہر گئے۔ عید بقر عید فون کر لیا کرتے تھے۔ اب کئی سال سے بھی نہیں۔ ایک ایسا بیوی کا ہوا کہ ماں باپ کو بھول گیا۔ مر گئی۔ کوئی نہیں آیا بیٹیوں کے سوا۔ اس لڑکے کو ریلوے نوکری دلا دی تھی، ریلوے پولیس میں۔ وہاں اس نے دھندے شروع کر دیے۔ چوری کے الزام میں برطرف مسافروں کا سامان اٹھا لیتا تھا رات کو۔ ٹرین میں ڈیوٹی لی تھی۔ مجھے جگہ ملی ہوئی تھی ایک سیٹھ کے پاس۔ اس نے ی کی انیکسی دے رکھی تھی۔ وہ خود باہر ہے اور میرے بیٹے اس پر قبضہ کر لیا ہے اب وہ کوٹھی بیچنا چاہتا ہے مگر بیچے تو بیچے۔ اس کے چار بچے ہیں۔ مگر میری چارپائی باہر ڈال ما ہے۔ میں نے کبھی شکوہ نہیں کیا۔ بہو دن رات کوستی ہے۔ مانے کو بھی ایسے دیتی ہے کہ آدمی کتے کو بھی زیادہ عزت ڈالتا ہے۔ لیکن اب کیا گلہ کرنا۔ زندگی ہی کتنی رہ گئی ہے ری۔ بتانا آپ کو یہ تھا کہ میری بیماری کا پتا چلا تو وہ مجھے ال لائے تھے۔ ڈاکٹروں نے بتایا دماغ میں پھوڑا ہے۔ پریشن ہوگا۔ پیسے نہیں ہیں تو گھر لے جاؤ۔ وہ واپس گھر لے گے اور اس چارپائی پر ڈال دیا۔ پھر ایک رات میں جاگ رہا ۔ وہ سمجھے سو رہا ہوں۔ میں نے ان کو کچھ باتیں کرتے سنا۔ رے بیٹے نے کسی سیٹھ سے بات کی تھی۔ وہ آپریشن کرانے راضی ہو گیا تھا۔ بہو کہہ رہی تھی کہ کچھ کرو۔ پیسے ہمیں مل گیں۔ تم کہو کہ آپریشن ہم کرا دیں گے۔ آپریشن کا کیا ندہ۔ بڈھا کتنا جیے گا۔ پیسے ہوں گے تو کام آئیں گے۔ ٹے نے بھی کہا کہ ہاں۔ ایک بہت اچھی کار خرید سکتے ہیں ا۔ مجھے بڑا دکھ ہوا۔ بعد میں پتا نہیں اس نے کیا چکر چلایا۔ رے بیٹے کے ساتھ ایک شخص آیا۔ اس نے مجھے دیکھا اور تسلی دی کہ فکر مت کرو تمہارا آپریشن ہوگا۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔ میں نے کہا کہ مجھے ٹھیک نہیں ہونا۔ وہ چلا گیا۔ بعد میں ایک دن پھر آیا۔ میں نے دیکھا وہ میرے بیٹے سے بات کر رہا تھا۔ وہ کمرے میں تھے۔ میں نے کھلی کھڑکی سے ان کی باتیں سنیں۔ اس شخص نے کہا کہ وہ چار لاکھ روپے دے سکتا ہے مگر نواب رفیق احمد شیرازی کا کام تمام ہونے کے بعد۔ میرا بیٹا رقم پہلے مانگ رہا تھا اور پوری ذمے داری قبول کر رہا تھا۔ بالآخر ان کے درمیان آدھی رقم پہلے اور آدھی کام کے بعد دینے پر اتفاق ہو گیا۔ وہ شخص چلا گیا۔ اس نے کہا کہ وہ بتائے گا کہ یہ کام کب اور کہاں کرنا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''تم نے اس کی صورت دیکھی تھی۔''

''نہیں جنابِ عالی۔ میری طرف اس کی پیٹھ تھی۔ میں سوچتا رہا کہ اب کیا کروں۔ بیٹے سے بات کرتا تو وہ مجھے بھی مار ڈالتا۔ چار لاکھ کے آگے میری حیثیت کیا تھی۔ میں اس کے لیے جن کا عذاب بنا ہوا تھا۔''

''یہ کب کی بات ہے؟''

''دو ہفتے پہلے کی جناب۔ میاں بیوی چار لاکھ ملنے کے خیال سے بہت خوش تھے اور ان کے بچے بھی۔ میرے بڑے پوتے نے کہا کہ دادا اب ہماری بالکل نئی کار آئے گی، چم چم کرتی۔ میں اسے کیا بتاتا کہ دادا کی جان۔ وہ کار میری جان کا صدقہ دے کر ہی تو آ رہی ہے۔ مجھے اپنی اولاد کا بڑا صدمہ تھا۔ میں نے کتنی محنت مشقت سے ان کو پالا تھا۔ اور آج وہ مجھ سے جان چھڑانا چاہتے تھے۔ جلد از جلد مجھے گاڑ کے اپنا عذاب ختم کرنا چاہتے تھے۔ چار لاکھ میرا بیٹا میرے علاج کے لیے لے رہا تھا لیکن اس سے اپنے لیے کار خرید رہا تھا۔ وہ ایک چھوڑ دو قتل کر رہا تھا۔ ایک میرا اور ایک کسی نواب رفیق احمد شیرازی کا۔ میں معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آخر یہ کون نواب رفیق احمد شیرازی ہے۔ اب میں اسے خبردار کرنا چاہتا تھا۔ میرے اندر غصہ تھا اور میں نے طے کر لیا تھا کہ خود چاہے مر جاؤں لیکن اپنے بیٹے کو یہ چار لاکھ کی کار نہیں لینے دوں گا۔ اسے اجرتی قاتل نہیں بننے دوں گا۔ یہی سوچ کے میں نے بیٹے سے کہا کہ مجھے اسپتال میں چھوڑ آئے۔ وہاں میری کوئی دیکھ بھال کرنے والا تو ہوگا۔ جب تک زندگی ہے دوا علاج بھی ہوگا اور مرنا ہے تو پھر یہاں برآمدے میں پڑے پڑے کیوں جان دوں۔ وہ کیوں نہ مانتا۔ اس کی تو جان چھوٹ رہی تھی۔ اس کی بیوی بھی بہت خوش تھی کہ بڈھا ایک بار گیا تو لوٹ کے نہیں آئے گا۔ نئی کار آ جائے گی۔ اس کے شوہر کا کہنا تھا کہ اب یہ گھر بھی اپنا ہی سمجھ۔ کوٹھی کا مالک دس بیس سال

عدالتوں میں خوار ہوگا یا اتنی رقم دے کر جان چھڑائے گا کہ ہم کہیں اور اس سے اچھا گھر لے لیں گے۔ وہ مجھے یہاں چھوڑ گئے۔ میں نے اِدھر اُدھر بہت لوگوں سے پوچھا کہ یہ نواب احمد شیرازی کون ہے لیکن کسی کو معلوم نہیں تھا۔ میرا خیال تھا کہ کوئی مشہور آدمی ہوگا۔"

میں نے کہا۔ "پھر کیسے پتا چلا، میرا فون نمبر کس نے دیا۔"

"بس جناب۔ اسے اتفاق کہو یا اللہ کی مدد۔ ایک دن اخبار دیکھ رہا تھا۔ پرانا اخبار تھا۔ اس میں کسی راجا نام کے صحافی کا لکھا ہوا کالم تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ ایک غیر معروف چھوٹے سے علاقے ست بدھائی میں کیا انقلاب آرہا ہے اور یہ سب نواب رفیق احمد شیرازی کی وجہ سے ہے۔ میری تو آنکھیں کھل گئیں جب میں نے پورا کالم پڑھا۔ مجھے پتا چلا کہ اس نواب کے کتنے دشمن ہیں جو نہیں چاہتے کہ وہ اپنے علاقے میں خوشحالی لائے اور تعلیم کو عام کرے۔ میں سمجھ گیا کہ میرے بیٹے کو چار لاکھ دے کر نواب رفیق کے قتل پر آمادہ کرنے والا انہی کا کوئی دشمن ہوگا۔ میری مشکل اس کالم نے آسان کردی۔ میں نے ایک وارڈ بوائے کو ساتھ ملایا۔ اس سے کہا کہ اخبار کے دفتر فون کرکے راجا کا نمبر لے۔ وہ لڑکا میرا بہت خیال رکھتا تھا۔ کہتا تھا کہ میری شکل اس کے دادا سے ملتی ہے۔ اس نے دوسرے ہی دن مجھے نمبر لا دیا۔ میں نے راجا صاحب کو ساری بات نہیں بتائی۔ آپ سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ موبائل فون میرے پاس نہیں ہے۔ ان بھائی صاحب نے اپنا موبائل فون دے دیا۔"

میں نے ساتھ والے بیڈ کی طرف دیکھا۔ اس پر ایک شخص سر تک چادر اوڑھے سو رہا تھا اور ظاہر ہے وہ بھی کینسر کے موذی مرض میں مبتلا تھا۔

"میری بدقسمتی کہ اسی وقت میرا بیٹا آگیا۔ آپ کی عقلمندی سے اسے پتا نہیں چلا۔ اس نے اپنے موبائل سے بھی تصدیق کی کوشش کی تھی مگر آپ نے گجرات کے کسی کلیم کا نام لیا۔" اس کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔

میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ "بابا میں کس طرح تمہارا شکریہ ادا کروں۔ تم نے میری جان بچالی۔"

"نہیں جناب۔ مارنے اور بچانے والا وہ ہے۔" اس نے اوپر انگلی اٹھائی۔

میں نے کہا۔ "کیا تمہارے بیٹے کو چار لاکھ دینے کا وعدہ کرنے والا خود اس کے پاس آیا تھا؟ میرا مطلب ہے۔ کیا تمہارے بیٹے کی ایسی شہرت تھی کہ وہ ایسے کام کرتا ہے؟"

"چھوٹے موٹے جرائم وہ کرتا رہا ہے۔ اب بھی وہ پولیس کا مخبر ہے اور اس کے دھندے اچھے نہیں ہیں۔ لیکن کسی کو پیسے لے کر قتل کرائے گا یہ کام اس کے بس کا نہیں۔ میں آپ کو بتانا بھول گیا۔ اس نے ایک چکر چلایا تھا۔ اخبار میں اشتہار دیا تھا کہ میرے باپ کو کینسر ہے اور اس کے علاج کے لیے پانچ لاکھ درکار ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ خیرات دینے والے آسانی سے پانچ لاکھ دے جائیں گے مگر ہوا یہ کہ پیسہ کسی نے نہیں دیا۔ لوگوں نے کہا کہ اپنے والد کو کسی خیراتی اسپتال لے جاؤ۔ ایسے اسپتالوں میں امیر غریب سب کا مفت علاج ہوتا ہے۔ ظاہر ہے اس کا یہ مقصد ہی نہیں تھا۔ وہ میری بیماری کے بہانے پیسا ہتھیانا چاہتا تھا۔"

میں نے کہا۔ "میں سمجھ گیا۔ انہی میں کوئی ایسا آگیا جس نے اس کی نیت اور مجبوری سمجھ لی۔ اسے چار لاکھ دینے پر راضی ہوگیا۔ خیر، میں اب چلتا ہوں۔ تمہارا شکریہ ادا کرنا میرا فرض تھا۔ اللہ تمہیں صحت اور زندگی دے۔"

اس نے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کے چوما۔ "اللہ ہم سب کی زندگی آپ کو دے۔ ہم تو اپنی پوری کرچکے۔ جو آپ کر رہے ہو وہ ہم نہیں کرسکتے تھے خواہ سو سال جیتے۔"

آس پاس کے بیڈز پر کچھ لوگ مجھے حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔ میں زبیر کے پاس سے اٹھا تو ڈیوٹی روم میں چلا گیا۔ وہاں ایک لیڈی ڈاکٹر اور ایک ڈاکٹر آمنے سامنے بیٹھے گپ لگا رہے تھے۔ لیڈی ڈاکٹر کے مقابلے میں ڈاکٹر بہت کم عمر اور اسمارٹ تھا۔ پہلے انہوں نے میرے سوالات کا جواب سرسری انداز میں دے کر مجھے ٹالنے کی کوشش کی۔ جب میں نے سخت رویہ اپنایا اور بتایا کہ میں کون ہوں تو وہ سراپا شرافت بن گئے۔ ڈاکٹر تو راؤنڈ کے بہانے نکل گیا۔ لیڈی ڈاکٹر نے زبیر کی فائل منگوائی۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس کا ٹرمینل کیس ہے۔"

اس نے فائل دیکھ کے نفی میں سر ہلایا۔ "غلط کہا ہے کسی نے آپ سے۔"

"کیا مطلب...... یہ قابلِ علاج ہے؟"

"بایوپسی کی رپورٹ سے پتا چلتا ہے کہ یہ کیس BENIGN ہے۔ دوسری قسم ہوتی ہے Malignant......"

میں نے کہا۔ "میں سمجھ گیا۔ آپ قابلِ علاج اور ناقابلِ علاج سمجھا رہی ہیں۔ اس کیس میں سرجری ممکن ہے؟"

"ابھی ممکن ہے۔ لیکن سو فیصد کامیابی کی گارنٹی نہیں۔ وہ بچ تو جائے گا مگر ہمیشہ کے لیے نابینا ہوجائے گا۔ اس کی آپٹک نروکٹ جائے گی۔"

اس وقت مجھے ایک مشکل فیصلہ کرنا پڑا۔ میں زبیر سے ...تا تو یہ ہوسکتا تھا کہ وہ بصارت سے محرومی کی معذور زندگی ...نہ کرتا۔ لیکن یہ بعد کی بات تھی۔ نابینا افراد کو بھی موقع ...و وہ نارمل زندگی گزار لیتے ہیں۔ بیماری سے نجات کے زبیر کو یہ موقع فراہم کیا جاسکتا تھا۔ میں نے وہیں طے ...ا۔ ڈاکٹر کو اپنا فون نمبر دیا اور اس سے کہا کہ وہ ذاتی ...زبیر کا ...ین ٹیومر نکالنے کے لیے کہیں بھی فوری سرجری ...ے۔ خواہ سرکاری اسپتال ہو یا پرائیویٹ۔ تمام ...جات میں برداشت کروں گا لیکن اس کے بارے میں کسی ...ی معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ اسپتال میں ایسے مخیر حضرات ...آتے تھے جو اپنا نام ظاہر نہیں کرتے تھے۔ ڈاکٹر میرے ...ے سے متاثر ہوئی۔ اس سے زیادہ وہ میرے حوالوں سے ...ہوئی۔ میں نے کہا کہ میرے سیکریٹری یا پی آر او کے ...و لاہور میں بیٹھے ہوئے آئی جی عبداللہ جان کے آفس ...بھی اس کیس میں ایم ایس کو ہدایات ملتی رہیں گی اور میں ...نا جا رہا ہوں مگر وہاں سے بھی میں پروگریس واچ کروں ...زبیر کا کیس اچانک وی آئی پی کیس ہوگیا تھا۔

رات کے نو بجے میں نے گاڑی میں ہوٹل کی طرف ...تے ہوئے لندن کال کی۔ لندن کے مقامی وقت کے مطابق ...کے چار بجے تھے اور ابھی نور کی فلائٹ کے پہنچنے میں تین ...ے زیادہ باقی تھے۔ میرے پاس تمام پرانے نمبر تھے۔ ...اسے میری فون پر بھی دعا سلام نہیں ہوئی تھی۔ عائشہ کا نمبر ...گیا تھا یا بدل دیا گیا تھا۔ کسی بدتمیز گورے نے دوبارہ نمبر مل ...نے پر مجھے ڈانٹ لگائی۔ "تمہیں کیا مسئلہ ہے؟ ایک بار میں ...نہیں سمجھتے یا اتنا پیے ہوئے ہو کہ ہر نمبر تمہیں عائشہ کا نمبر ...ل دے رہا ہے۔ آخر کون ہے یہ "بچ" عائشہ......"

میں نے کہا۔ "وہ تمہاری بیوی تھی یا بیٹی۔ یہ نمبر اسی ...دیا تھا۔ روز رات کو بات بھی ہوتی ہے۔" مزید گالیاں ...ے پہلے میں نے فون بند کردیا۔ اگلا نمبر عائشہ کے باپ ...ارنسٹ کا تھا۔ کسی سیکریٹری نے کہا کہ وہ میٹنگ میں ...یں چاہوں تو میسج چھوڑ دوں۔

میں نے کہا۔ "میں ان کی بیٹی مس عائشہ سے بات ...وں گا۔"

"عائشہ؟ تمہارا مطلب ہے ایلشیا۔ سوری۔ وہ بھی ...ں میں شریک ہے۔"

یہ صورتِ حال غیر متوقع تھی۔ اگر میں نور کے ساتھ ہوتا ...پرابلم کوئی نہ ہوتی۔ اسی لیے میں نے قبل از وقت کسی کو ...اطلاع دینا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ نور نے کہا ضرور تھا کہ کسی کے ریسیو نہ کرنے سے اسے پریشانی نہیں ہوگی۔ وہ اکیلی بھی ائرپورٹ سے ٹیکسی لے کر ہوٹل جاسکتی ہے لیکن میں چاہتا تھا کہ وہ لندن میں خود کو اجنبی محسوس نہ کرے اور میرے پہنچنے تک اسے کمپنی مل جائے۔ اب ایک نام ڈاکٹر غیر شائستہ کا تھا۔

حسبِ توقع اس نے رکھائی سے کہا۔ "یس رفیق، میں شائستہ ہوں۔"

"ڈاکٹر شائستہ۔ کیا آپ مجھ پر ایک عنایت کرسکتی ہیں؟"

"یہ تو عنایت کی نوعیت پر منحصر ہے۔"

میں نے اسے اپنی پرابلم بتائی۔ "اگر آپ نور کو ریسیو کرلیں۔"

اس نے میری بات سن کے کہا۔ "مسٹر رفیق۔ تم لندن میں رہے ہو۔ جانتے ہو کہ یہاں فاصلے کتنے ہیں اور فارغ کوئی نہیں ہوتا۔ وہ ٹیکسی لے سکتی ہے۔"

میں نے کہا۔ "مشورے کا شکریہ......"

"دوسری بات یہ کہ میرے گھر میں کوئی فالتو بیڈ روم نہیں۔ مہمانوں کے لیے۔"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ وہ ہوٹل چلی جائے گی۔"

"اور آخری بات بھی سن لو۔ وہ نور ہو یا حور۔ جو کچھ تم نے فریال کے ساتھ کیا۔ اس کے بعد تم مجھ سے کیسے توقع رکھ سکتے ہو کہ میں تمہارے لیے کوئی نیکی کروں گی خواہ اس کے لیے مجھے ایک انگلی ہلانی پڑے۔ میں تم پر لعنت بھیجتی ہوں نواب رفیق۔"

میں نے کہا۔ "یہی مجھے بھی کرنا چاہیے تھا۔" اور فون بند کردیا۔

غصے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ فریال کی سہیلی تھی اور اسی کی طرفداری کر رہی تھی۔ اس میں حالات و حقائق کو پیشِ نظر رکھنے کی بات ہی نہیں تھی۔ اچانک میرے ذہن میں ایک اور نام آیا۔ سوچی۔ وہ نیک دل جاپانی جو مجسم نیکی، خلوص اور شائستگی کا پیکر تھی لیکن اس سے پہلے کہ میں سوچی سے بات کرتا، میرے فون پر ایک عجیب و غریب نمبر آگیا۔

اس وقت میں پی سی کے لاؤنج میں تھا اور غنی میرے لیے مناسب کمرا بک کرا رہا تھا۔ میرے ہیلو کے جواب میں کسی زنانہ آواز نے کہا۔ "کیا میں کسی نواب کی آواز سن رہی ہوں۔ جو پہلے صرف رفیق تھا۔"

میں نے چلاّ کے کہا۔ "عائشہ......"

"اتنا چلاتا ہے تو فون کے بغیر ہی بات کرلو۔" وہ ہنسی۔ "ابھی مجھے پتا چلا کہ تم نے فون کیا تھا۔ کمینے، بے وفا مطلبی...... کب سے لندن میں ہو تم؟"

میں نے کہا۔ "ابھی میں لندن میں نہیں ہوں، لیکن

آ رہا ہوں دو چار دن میں۔‘‘

’’کوئی ضرورت نہیں۔ میں تمہاری شکل دیکھنا نہیں چاہتی۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’میں تو دیکھنا چاہتا ہوں۔‘‘

’’بکواس مت کرو۔ کوئی کام ہوگا مجھ سے۔ ٹھہرنے کی جگہ چاہیے۔‘‘

میں نے ہنس کے کہا۔ ’’یس۔ تمہارے بیڈروم میں، تمہارے ساتھ۔‘‘

وہ ہنسی۔ ’’میرا شوہر تمہیں قتل کرسکتا ہے۔ محض اس خواہش پر۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’پہلے اس رقیب سے کہو کہ جہنم رسید ہونے کے لیے تیار ہو جائے۔ وہ کیسے مرنا پسند کرے گا عائشہ۔‘‘

’’تمہاری اطلاع کے لیے۔ میں اب ایلشیا ہوں پھر۔‘‘

’’مجھے فرق نہیں پڑتا۔ اچھا اب سیریس ہو کے میری بات سنو۔ میری ایک فرینڈ تقریباً تین گھنٹے میں لندن پہنچ رہی ہے۔‘‘

’’وہی، کیا نام تھا اس کا...... فریال۔ ابھی تک گرل فرینڈ بنا کے کام چلا رہے ہو۔ شادی نہیں کی بدمعاش آدمی۔‘‘

’’تم جانتی ہو پھر بھی ایسی باتیں کرتی ہو۔ شادی کرنی ہوتی تو تم کیا بری تھیں؟ فریال کا نام بھی تم نے یاد دلایا۔ ایک سوا ایک آئیں اس کے بعد۔ اس کا نام ہے نور۔ اسے دیکھو گی تو خود کو چڑیل سمجھنے لگو گی۔‘‘

’’پھر میں کیوں دیکھوں گی اسے۔‘‘

’’اس لیے کہ ائرپورٹ سے اس کو ریسیو کر کے اپنے ساتھ لے جانے کا اعزاز میں نے تمہیں بخشا ہے، فلائٹ نمبر لکھو۔‘‘

’’بے وقوف۔ پہلے بتانے کی بات آخر میں بتا رہے ہو۔ چلو بولو ٹائم کم ہے۔ کیا نام بتایا تھا نور......‘‘

’’دیٹ از رائٹ۔ اس کا مطلب ہوتا ہے روشنی۔ جب تم اسے دیکھو گی تو پہچان لو گی۔‘‘

’’اس کی فکر مت کرو۔ تم بھی یاد رکھو کہ تمہارے آنے تک میں اسے تمہاری اصلیت بتا کے تمہارے خلاف کر دوں گی۔ اچھا باقی پھر...... مجھے جانا ہے۔‘‘

’’تم خود جاؤ گی۔ کسی شوفر کو بھیج دو۔‘‘

’’تمہارا کام ہے اور تمہیں نہ سہی مجھے پرانے تعلق کی شرم ہے۔‘‘ اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

مجھے صرف اطمینان ہی حاصل نہیں ہوا۔ ایک ایسی خوشی ملی جس کو میں گم کر چکا تھا اور میرا خیال تھا کہ مجھے پھر نہ ملے گی۔ ایلشیا بننا عائشہ کی مجبوری تھی۔ بالکل اس طرح جیسے ایلشیا سے عائشہ بننا اس کی محبت کا تقاضا بن گیا تھا۔ اس خبر سے مجھے کوئی صدمہ نہیں پہنچا کہ وہ شادی کر چکی ہے۔ میرے دل پر اب احساسِ جرم کا کوئی بار نہیں تھا۔

صبح میں ماجد خان کے ہمراہ عدالتِ عالیہ میں ...ہوا۔ خلاف توقع ماجد خان نے میری درخواست کو ...معاملات کی کاز لسٹ میں اوپر رکھوا دیا تھا۔ انہوں نے ...بتایا کہ جج ایماندار لیکن ذہین اور معاملہ فہم ہے۔ کورٹ کے باہر ہی میری ملاقات ایڈیشنل ایڈووکیٹ جنرل سے ہوئی۔ گھنے سفید بالوں کی وجہ سے اس کا سر بہت بڑا لگتا ...اسے دیکھ کر اور اس کی گھرج والی آواز سن کے مجھے ذوالفقار علی بخاری یاد آئے جو ایک زمانے میں ریڈیو ڈائریکٹر جنرل اور اپنے بھائی پطرس بخاری کی طرح عہد ...شخصیت تھے۔ اس نے مجھ سے کوئی خاص بات نہیں کی ...اپنے خیالات میں گم رہنے والا شخص تھا۔

جج نے میری درخواست دیکھی۔ پھر مجھے دیکھا۔ ملاحظہ کیا اور ماجد خان سے سوال کیا۔ ’’یہ ٹھیک ہے کہ ...کوئی نہیں اور بظاہر تفتیش کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا لیکن مقدمہ سیشن کورٹ میں ہے۔‘‘

’’یس یور آنر۔ لیکن ضمانت کی توثیق عدالتِ عالیہ ...کی تھی۔‘‘

’’مقدمے کی اگلی پیشی کب ہے؟‘‘

’’سماعت غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی کر دی گئی تھی۔‘‘

’’آپ پراسیکیوشن سے بات کریں۔ اگر انہیں ...احمد کے چودہ دن کے لیے ملک سے باہر جانے پر اعتراض نہیں تو کورٹ اجازت دے سکتی ہے۔‘‘

اب ایڈیشنل ایڈووکیٹ جنرل نے اٹھ کے کہا۔ ’’...آنر۔ سیشن کورٹ نے سماعت کی اگلی تاریخ آئندہ ما...چوبیس دی ہے۔‘‘

ماجد خان نے کہا۔ ’’یعنی ایک مہینا بیس دن ...میرے مؤکل نے صرف ایک ماہ کی اجازت مانگی ہے، ...سے زیادہ۔‘‘

جج نے سر ہلایا۔ ’’اجازت دی جاتی ہے۔‘‘

اس فیصلے کی نقل مجھے فوراً ہی مل گئی۔ اگلا مرحلہ جو زیادہ دشوار نظر آتا تھا اس اجازت سے سرکاری احکامات ...ترمیم کا تھا۔ مجھے تو صحیح طور پر یہ علم بھی نہیں تھا کہ وزارتِ داخلہ کا کون سا شعبہ ایگزٹ کنٹرول لسٹ جاری کرتا ہے ...اس میں ردوبدل کا اختیار رکھتا ہے۔ میں نے یہ کام راجا ...سپرد کرنے کا فیصلہ کیا جو دفتری ایوانوں کے پُرپیچ راستوں سے گزر کے منزلِ مراد تک پہنچنے میں اپنے پریس کارڈ ...مشکل کشا بناتا تھا۔

آپریشن کے بعد سے اب تک میں نے شامی بادشاہ کی خیر و عافیت فون پر بھی دریافت نہیں کی تھی۔ اسے نہ خلوص کی کمی سے منسوب کیا جا سکتا تھا اور نہ فرصت کی کمی سے۔ میں یہ بھی جانتا تھا کہ شامی شکایت کرنے والا آدمی نہیں ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ڈاکٹر مہدی حسن کے گھر سے میرے دور رہنے کی وجہ وہ بلا ہے جو مجھے دیکھتے ہی وحید سمجھ کے مجھ سے چمٹ جاتی ہے۔ پھر بھی میں فون پر بات تو کر سکتا تھا۔ اپنی کوتاہی کا ازالہ کرنے کے لیے میں نے غنی سے مدد لی۔

میں نے شامی کو فون کیا۔ ’’کیا حال ہے اب تمہاری طبیعت کا؟‘‘

اس نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی۔ ’’کیا پوچھتے ہو نواب دوست۔ ایسی قید پہلے نہیں کاٹی۔‘‘

’’کیا مطلب......؟‘‘

’’پہلے تو ایک گولی نے مفلوج کر رکھا تھا۔ وہ نکل گئی تو یہ دوسری گولی میرے اعصاب پر سوار ہے۔ یہ ہلنے نہیں دیتی۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’وہ تمہارے فائدے کے لیے احتیاط پر سختی کرتی ہے۔‘‘

’’وہ تیسری گولی سے مجبور ہے۔ وحید کی ٹینا۔‘‘

’’یار اتنے ناشکرے نہ بنو۔ ایک ڈاکٹر نے چوبیس گھنٹے خود کو تمہاری دیکھ بھال کے لیے وقف کر رکھا ہے۔‘‘

’’اب میں اس حد تک ٹھیک ہوں کہ وہیل چیئر پر اندر باہر آ جا سکتا ہوں۔ لیکن بیساکھی کے سہارے چلنے پر پابندی ہے۔ میں تنگ آ گیا ہوں اس مفلوج زندگی سے۔‘‘

’’شامی بادشاہ۔ اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ تم ہمیشہ کے لیے مفلوج نہیں ہوئے۔‘‘

’’کون قبول کرتا ایسی اپاہج زندگی نواب دوست۔‘‘

’’اچھا سنو۔ میں تمہاری طرف آ رہا ہوں۔ اندر تو آ نہیں سکتا۔ دو چار دن میں شاید لندن چلا جاؤں۔ تم باہر آ کے مجھ سے مل لو۔‘‘

’’اچھا میں گولی سے کہتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کو کہیں لے جائے۔ وہ کل بھی بازار جانے کی بات کر رہی تھی۔ میرے اور اپنے لیے کچھ کپڑے لانے تھے۔‘‘

مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ میں ڈاکٹر مہدی حسن کی کوٹھی کے گیٹ سے کچھ فاصلے پر گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا کہ ٹینا اپنی کار خود ڈرائیو کرتی ہوئی نکلی۔ گولی اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے اس کی ایک جھلک نظر آئی۔ بائیں ہاتھ سے اس نے میری طرف دیکھ کے اشارہ کیا کہ میں اندر جا سکتا ہوں۔ میں نے غنی کو گاڑی وہیں روکے رکھنے کے لیے کہا اور خود اندر چلا گیا۔

شامی وہیل چیئر پر مجھے ویلکم کرنے کے لیے موجود تھا۔ اس کی نئی وہیل چیئر سرسبز لان پر رکھی ہوئی سفید کرسیوں کے پاس رکھی ہوئی تھی۔ اس نے بڑے جذباتی انداز میں ہاتھ ملایا اور میں احتیاط کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس سے گلے ملا۔

’’تمہاری صحت تو بہت بہتر ہو رہی ہے۔‘‘ میں نے کہا۔

’’بہتر کیا۔ کھاتا ہوں اور پڑا رہتا ہوں۔ موٹا ہو رہا ہوں اور بے کار۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’ابھی گولی کو دیکھ کے مجھے حیرانی ہوئی۔ وہ کتنی بدل گئی ہے پندرہ دن میں۔‘‘

وہ ہنسا۔ ’’نواب دوست۔ یہ وہ تبدیلی ہے جسے عورت فوراً قبول کرتی ہے۔ ٹینا نے اسے بھی ٹھیک کرنے کا بیڑا اٹھا لیا ہے۔ اس کے لباس، اٹھنے بیٹھنے، بات کرنے کے طور طریقے سب بدل رہی ہے۔ اسے ماڈرن عورت بنا رہی ہے۔ وہ ٹینا کے کپڑے بھی استعمال کر رہی تھی، اب تک جو اسے تنگ ہو گئے تھے۔ اب دیکھنا آج اس کے ساتھ گئی ہے تو کیسے فیشن ایبل کپڑوں کا ڈھیر لے کر آئے گی۔ سب قسمت کے کھیل ہیں نواب دوست۔‘‘

’’تم اتنے ڈیپریس کیوں ہو۔‘‘

’’نہیں۔ اللہ سے گلہ نہیں بہتری کی امید ہی رکھنی چاہیے۔ ڈیڑھ انچ کی ایک گولی نے وہ کیا جو کوئی نیکی کا راستہ دکھانے والا۔ کسی کی نصیحت یا سزا کا خوف نہ کر سکا۔ ڈاکٹر نے مجھے بتا دیا ہے کہ مجھے تمام عمر احتیاط کرنا ہوگی۔ دوڑ بھاگ۔ اچھل پھاند بھاری وزن اٹھانا اور مشقت کے سارے کام میں نہیں کر سکتا۔ گھوڑے پر سواری کا تو سوال ہی نہیں۔‘‘

میں نے کہا۔ ’’کیا تم نے ساری عمر ڈاکو رہنے کی قسم کھائی تھی کہ افسوس ہو رہا ہے۔ تم پڑھے لکھے ہو۔ ذہین اور باہمت ہو۔ میرے جیسے عام لوگوں کی طرح سیکڑوں کام کر سکتے ہو۔‘‘

وہ خلا میں دیکھتا رہا۔ ’’لیکن وہ شامی بادشاہ تو نہیں رہا جس کی دہشت سے درخت بھی کانپتے تھے۔ اور جب میں ڈاکو نہیں رہا تو گولی بھی ڈاکو کی بیوی کیوں رہے۔ وہ بیگم صاحبہ بنتی جا رہی ہے۔‘‘

’’دیکھو۔ کل بھی تم میرے دوست تھے اور میری مدد کرتے تھے آج بھی ہو اور کل بھی رہو گے۔ مجھے تمہاری ضرورت ہوگی۔‘‘

’’ابھی تو میں حویلی میں نہیں آ سکتا۔‘‘

’’میرے لندن سے واپس آنے کے بعد سہی۔‘‘

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ موقع تھا جب میں خود اپنے ماضی کو چھوڑ رہا تھا۔ بدخواہوں نے مجھ سے چھین لیا۔''

''اس کی فکر مت کرو۔ تمہیں قانونی معافی میں دلواؤں گا اور تم ایک باعزت زندگی گزارو گے۔ مجھے الیکشن میں کامیاب کراؤ گے۔ پھر جب میں وزیر بنوں گا تو تم میرے مشیر ہو گے۔''

اسے بہت سی باتوں کا علم نہیں تھا۔ میں نے دو گھنٹے اس کے ساتھ گزارے اور دوپہر کا کھانا بھی وہیں کھایا۔ اسے بھی اندازہ تھا کہ شاپنگ کے لیے ایک ساتھ جانے والی خواتین اتنی جلدی واپس آنے والی نہیں ہیں۔ میں وہاں سے رخصت ہوا تو شامی کی ذہنی کیفیت میں بہت بہتری نظر آ رہی تھی۔ وہ خوش تھا۔

ایک جگہ غنی نے گاڑی میرے حوالے کر دی۔ ''میں نے شیر خان کو اپنی مدد کے لیے بلایا ہے۔ انشاء اللہ کل ہم آپ کے مجرم کے ساتھ ست بدھائی آئیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''غنی احتیاط سے کام لینا۔ وہ خطرناک آدمی ہے لیکن اس سے زیادہ خطرناک وہ ہے جو اسے استعمال کر رہا تھا۔''

''اس کا بھی پتا چل جائے گا سر۔''

میں آدھے راستے میں تھا کہ نور کی کال آ گئی۔ ''کیا کہوں۔ گڈ مارننگ یا گڈ ایوننگ؟''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اب تو وہاں بھی دوپہر ہو گی۔''

''لیکن میری صبح ہوئی ہے۔ ناشتا کر رہی ہوں اور افسوس کر رہی ہوں۔''

''افسوس کس بات پر......؟''

''تمہاری بےوقوفی پر۔ کیا لڑکی تھی جو تم نے اپنی بےوقوفی یا بدقسمتی سے چھوڑ دی۔ مجھے تو یقین نہیں آتا کہ تم ایسا کر سکتے ہو۔''

''میں اور کیا کر سکتا ہوں۔ یہ تمہیں وقت بتائے گا۔ عائشہ کہاں ہے؟''

''اب وہ ملیشیا پار کر ہے۔ کیا بتاؤں تمہارے مقابلے میں وہ کیا ہے۔ بالکل جہانواں۔ صدمے سے میرا برا حال ہے۔ ایسی چاند سورج کی جوڑی ہوتی تمہاری۔ اور پھر یہ ٹھاٹھ باٹھ۔ میں نے تو خواب میں بھی ایسے محل کا تصور نہیں کیا تھا جہاں آج میں مہمان بنی بیٹھی ہوں۔''

''ملیشیا اچھی لگی تمہیں؟''

''اچھی؟ اتنی اچھی کہ کیا بتاؤں۔ مجھ سے تمہاری باتیں کرتی رہی۔''

میں نے کہا۔ ''برا بھلا کہتی رہی ہو گی؟''

''نہیں۔ وہ کہتی ہے کہ ایسے کریکٹر کے انسان نہیں ہوتے۔''

''پھر کیا ہوتے ہیں؟ گدھے؟ جن بھوت؟''

''تمہاری اتنی عزت کرتی ہے وہ کہ میں کیا بتاؤں۔ کہتی ہے اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو مجھے ایکسپلائٹ کرتا۔ اس نے میری عزت کی اور مجھے عزت کا ایک نیا تصور دیا جو یہاں نہیں ہے۔ میں نے فریال کے بارے میں بتایا تو بہت افسوس کرتی رہی...... دراصل اس کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ دولت یا شہرت کی اتنی اہمیت بھی ہو سکتی ہے کہ اس کی خاطر کوئی اینجل کو چھوڑ دے۔''

''اینجل کون؟''

''وہ تمہیں اینجل کہتی ہے۔ فرشتہ...... اس کے نزدیک تم انسان نہیں ہو۔ خیر خیال میرا بھی یہی ہے مگر ذرا مختلف زاویے سے۔ اچھا چھوڑو۔ تم کب آ رہے ہو۔ میں نے بتا دیا تھا تمہیں، تم نہ آئے تو ایک ہفتے بعد میں ست بدھائی کے دروازے پر دستک دے رہی ہوں گی۔''

میں نے ہنس کے کہا۔ ''میں اس سے پہلے آ جاؤں گا۔ مجھے اجازت مل گئی ہے۔''

میں شام ہوتے حویلی کے گیٹ میں داخل ہوا۔ پھر رات تک کا وقت ایک سنسنی خیز گپ شپ کے سیشن میں گزرا۔ ظاہر ہے اس میں نور کے ذکر کے سوا وہ سب تھا جو خواتین ایک بار راجا سے سن چکی تھیں۔ دوسری بار انہوں نے مجھ سے سنا۔ فریال کے اعترافِ جرم نے جتنی سنسنی پھیلائی اس سے زیادہ پریشانی کے اسباب پیدا کیے۔ سب کا خیال یہی تھا کہ مجھے بلاتاخیر یہاں سے نکل جانا چاہیے۔

میں نے کہا۔ ''مجھے صرف ایک مہینے تک باہر رہنے کی اجازت ملی ہے اس کے بعد بھی میں نہ آیا تو مفرور مجرم قرار دے دیا جاؤں گا۔''

''کیس تو ختم ہو گیا۔'' رابعہ نے کہا۔

''کیس ایسے ختم نہیں ہوتے کزن۔ چودھری سلطان پہلے لاپتا تھا۔ اس کے بہن بہنوئی کی طرف سے رپورٹ یہ درج کرائی گئی تھی کہ اسے قتل نہ کر دیا گیا ہو۔ بے شک انہیں رپورٹ لکھوانے پر مجبور کیا گیا تھا۔ اب لاش مل گئی ہے اور قتل ثابت ہو گیا ہے لیکن وہ سوال اپنی جگہ ہے کہ قاتل کون ہے۔''

''لیکن مدعی خود نہیں رہے۔''

''فوجداری مقدمات میں مدعی خود ریاست رہتی ہے۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میں موت کے اسباب واضح ہیں۔ کسی تیز دھار آلے سے قتل۔ اور تشدد سے آنے والی چوٹیں۔

ہا گیا فریال پر۔ اور مجھ پر لیکن حالات کی شہادت سے الزام ثابت نہیں ہوتا تھا چنانچہ ہم ضمانت پر رہا ہیں نے کہا۔

راجا بولا۔ ''ہم اپنے اپنے اثر رسوخ کے باعث ہی رہے۔ کوئی عام آدمی ہوتا تو پولیس اب تک اعتراف اچکی ہوتی۔''

''یہ بھی ٹھیک ہے کہ کیس بالآخر دبا دیا جائے گا لیکن وہ ہمارے ذہن میں بھی ہے کہ چودھری سلطان کہاں تھا اور کیسے مارا گیا۔ اور یہ کہ اس کی لاش کو میری گاڑی نے ڈالا تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ کورٹ بالآخر مجھے بھی بالاتر قرار دیتے ہوئے میرا نام ہی ایف آئی آر سے کروے گی اور فریال کا بھی۔ لیکن اس میں وقت لگے گا۔''

''اور پیسا بھی، اثر رسوخ بھی۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ الی وارث کوئی نہیں۔ نہ بیوی بچے نہ بھائی بہن۔ آج میں اس کی تدفین کے وقت بھی تم لوگ تھے۔ جو تھے ور کے عزیز اور واقف کار تھے۔ اس کے باوجود کچھ سے میں نے سنا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ پتا نہیں یہ سلطان ہی ہے یا پولیس کیس ختم کرنے کے لیے کسی کو سلطان بنا کے گاڑ رہی ہے۔ صحیح شناخت کرنے والا انا تو تردید کرتا۔''

آدھی رات کے بعد نور نے پھر مجھے فون کیا۔ لندن وقت شام ہوئی تھی۔ ملیشیا اور وہ، دونوں گپ شپ میں تھیں۔ ''محبت کرنے والی اتنی حسین و جمیل خواتین ہ یہ بےرخی بدتہذیبی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے میں بدتہذیب ہوں۔ میں بت سے، اٹھا لو پاندان اپنا۔ مجھے نیند آ رہی ہے۔''

''ابھی سے سونے جا رہے ہو۔ سرشام۔''

''یہاں آدھی رات کا سماں ہے۔ اور آپ دونوں کو ہے تو میرے خواب میں تشریف لائیے، باری باری۔''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہمیں اپنی عزت عزیز ور بھی۔

''مانا کہ جاگتے میں تم بےضرر آدمی ہو...... بالکل اینجل۔''

میں نے فون بند کیا اور سو گیا۔ رات کو کسی وقت غنی آیا ے معلوم نہیں ہوا۔ جب میں اٹھا تو راجا میرے کام لام آباد کے لیے نکل گیا تھا۔ باقی لوگ اسپتال اور یں مصروف تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ ثریا اور احمد حسن کے بھی ویسی صلح ہو چکی ہے جو ورکنگ ریلیشن شپ کے لیے ضروری تھی۔ تاہم وہ اب رابعہ کے ساتھ اسکول کے پروجیکٹ میں شامل ہو گئی تھی۔ شہناز بھی ریشم کے بغیر کام چلا رہی تھی۔ ریشم کی ڈلیوری کسی بھی روز متوقع تھی چنانچہ وہ کام کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔

ناشتا مجھے ریشم کی ماں فاطمہ نے لا کے دیا اور پھر چپ چاپ میرے پاس کھڑی ہو گئی۔ ''صاحب جی۔ میں نے آپ سے ایک بات کی تھی۔''

میں نے بےخیالی میں پوچھا۔ ''کون سی بات؟''

''وہ سر۔ ریشم کے باپ کی موت کے بعد اس کی وارث تو اور کوئی نہیں ہے، ریشم کے سوا۔''

میں نے کہا۔ ''اوہ۔ میں واقعی بھول گیا تھا۔ تم مجھے تھوڑی سی مہلت دو، میں اپنے وکیل سے کہتا ہوں اور راجا سے بھی۔''

میں نے محسوس کیا کہ نور کو اس پراپرٹی اور ایک نام نہاد شوہر کے اثاثوں کی اتنی فکر نہیں ہے جتنی اب اس کی سابقہ بیوی کو لاحق ہو گئی ہے۔ شاید اس لیے کہ آج تک اس نے محرومی اور غریبی کے سوا کچھ دیکھا ہی نہیں تھا۔ اس نے پہلے نور جہاں کو مجبوراً قبول کیا تھا لیکن اب نور جہاں کہیں نہیں تھی تو فاطمہ کے دل میں مر جانے والے کی دولت پر قبضہ حاصل کرنے کی خواہش جاگ اٹھی تھی۔ یہ خواہش فاطمہ کی تھی؟ یا اس کی بیٹی کی؟ حویلی میں ہمارے ساتھ رہنے سے اس کی زندگی کا انداز ہی نہیں سوچ بھی بدل گئی تھی۔ وہ جاننا چاہتی ہو گی کہ اس کی ذاتی ملکیت کیا ہو سکتی ہے؟ کوئی کوٹھی، بینک بیلنس، کسی لاکر میں رکھے ہوئے زیورات۔ ایک باپ جو تمام عمر قابلِ نفرت رہا، اب اس کا ترکہ اہم ہونے لگا تھا۔

میرے خیالات کی رو کو غنی نے درہم برہم کیا۔ ''سر! اسے ہم رات اپنے ساتھ لے آئے تھے۔''

میں نے ہنس کے کہا۔ ''بڑی مستعدی دکھائی تم نے۔''

''یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا سر۔ ہم نے اسے گھر کے باہر ہی سے گاڑی میں ڈال لیا۔ شیر خان کو جانتے ہیں آپ، اس نے ایسا دبوچا کہ ہل نہیں سکا۔ وہ ڈبل کیبن پک اپ لے کر گیا تھا۔ باندھ کے پیچھے ڈال دیا۔''

''رات کو کہاں رکھا؟''

''تہ خانے میں سر۔ اسے نہیں معلوم کہ وہ کہاں ہے۔ ہم نے آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔ جو پوچھنا ہے آپ خود پوچھ لیں۔''

غنی مجھے حویلی سے باہر پیچھے والے خاندانی قبرستان سے بھی آگے لے گیا۔ وہاں اس نے قیدی کو ایک درخت

کے ساتھ کھڑا کر رکھا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ اوپر ایک تنے کے ساتھ بندھے ہوئے تھے۔ آنکھوں پر پٹی ہونے کی وجہ سے وہ کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔

میں نے اس کے قریب جا کے کہا۔ "تمہارا نام عزیز ہے۔"

وہ چپ رہا۔ چالیس پینتالیس سال کا وہ مکروہ صورت شخص دیکھنے سے بھی جرائم پیشہ اور بدمعاش لگتا تھا۔ اس میں کوئی شبہے کی بات نہیں کہ آدمی کے اعمال اور خیالات کا عکس اس کی شخصیت میں سب سے زیادہ صورت پر نظر آتا ہے۔

غنی نے کہا۔ "نواب صاحب نے کچھ پوچھا ہے تجھ سے۔"

میں نے کہا۔ "تم نے چار لاکھ میں میرے قتل کا ٹھیکا لیا تھا۔ اس میں سے دو لاکھ پیشگی وصول کیے تھے۔"

"میں کسی نواب صاحب کو نہیں جانتا۔"

"تو اپنی قبر پر کھڑا ہے۔ جھوٹ مت بول۔" غنی نے ایک پتلی سی چھڑی سے اس کے پیٹ پر مسلسل وار کیے۔ "تیری لاش سیدھی قبر میں گرے گی۔"

وہ تڑپا۔ "میں نے کچھ نہیں کیا۔"

میں نے کہا۔ "چار لاکھ میں مجھے قتل کرنے کا ٹھیکا کس نے دیا تھا؟ دیکھو سچ بتاؤ گے تو ہوسکتا ہے میں تمہیں معاف کر دوں۔ مجھے معلوم ہے اشد ضرورت سے مجبور ہو کے تم نے ایسا کیا تھا۔ تمہارے باپ کو کینسر ہے۔ تم اس کا آپریشن کرانا چاہتے تھے لیکن اس کے لیے تمہارے پاس پیسے نہیں تھے۔ بولو، کون تھا وہ جو تمہیں دو لاکھ دے گیا تھا۔"

"میں نے کسی سے دو لاکھ نہیں لیے۔"

"یہ ایسے نہیں بولے گا جناب عالی۔ میرا خیال ہے پہلے اس غدار کا فیصلہ کر دیں۔ اس سے فارغ ہو کے عزیز صاحب سے بات کریں گے۔"

میں نے حیرانی سے غنی کو دیکھا۔ وہاں مجھے شیر خان کے سوا کوئی اور نظر نہیں آ رہا تھا۔ معلوم نہیں وہ کس غدار کی بات کر رہا تھا مگر غنی نے مجھے اشارہ کیا کہ میں تماشا دیکھوں۔ اس نے کہا۔ "اوئے آخری موقع ہے تمہارے لیے۔ نمک حرام۔"

شیر خان چلایا۔ "رحم کریں نواب صاحب، رحم!"

"نمک حرام، غدار، تیرا جرم نا قابلِ معافی ہے۔" غنی دھاڑا۔

"حضور والا...... میرے بچے چھوٹے ہیں۔ وہ یتیم ہو جائیں گے۔"

غنی نے کہا۔ "انہیں تو نے خود یتیم کیا۔ لالچ میں یہ نہیں سوچا کے تیری بیوی کہاں جائے گی۔ چل کلمہ پڑھ۔"

شیر خان نے چیخ ماری۔ "خدا کے لیے، رسول کے لیے۔"

غنی نے گرج کے کہا۔ "کلمہ پڑھ۔"

شیر خان نے کانپتی لرزتی آواز میں کلمہ پڑھا۔ غنی نے ایک ہوائی فائر کیا۔ شیر خان نے یوں چیخ ماری جیسے گولی اس کے دل میں لگی ہو۔ غنی نے دوسرا فائر کیا۔ میں نے دیکھا عزیز کی پتلون کا ایک پائنچہ گیلا ہو چکا ہے اور وہ خوف سے [کانپ] رہا ہے۔

دو منٹ بعد غنی نے کہا۔ "مٹی برابر کر دو۔ آہستہ......"

یہ صرف ایک ریڈیو ڈراما تھا جس میں صرف صوتی اثرات سے ایک غدار کو سزائے موت دیے جانے کا خیالی منظر ایسے پیش کیا گیا تھا کہ عزیز کی جگہ میں بھی ہوتا تو میری آنکھیں پورا منظر حقیقی صورت میں دیکھتیں۔

میں نے کہا۔ "دیکھو۔ اس کی بیوہ وہیں رہے گی جہاں اب رہتی ہے۔ اسے سابق شوہر کی تنخواہ پوری ملتی رہے گی تا حیات۔ اور اس کے بچوں کی تعلیم کے اخراجات بھی پورے کریں گے۔ تا حیات۔"

اب غنی نے دوبارہ عزیز سے رجوع کیا۔ "بول آرام سے بتائے گا یا سو پیاز اور سو جوتے کھا کے بولے گا۔"

اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا۔ وہ دھاڑیں مار کے رونے لگا۔ "خدا کے لیے مجھے معاف کر دیں۔ میں لا[لچ] میں آ گیا تھا۔"

"کس نے دیے تھے تمہیں دو لاکھ؟"

"اس نے اپنا نام نہیں بتایا تھا۔ کہتا تھا کہ نام۔ تمہیں کیا۔"

"تم نے ایک اشتہار دیا تھا کہ تمہیں اپنے باپ کے علاج کے لیے رقم کی ضرورت ہے۔ وہ اس کے جواب میں آیا تھا۔"

"جی نواب صاحب۔ اس نے آپ کی تصویر دکھائی پھر آپ کی صورت بھی دکھائی اور کہا کہ ان کو روڈ ایکسی ڈنٹ میں ہلاک کرنا ہے۔"

"اس شخص کا حلیہ بتاؤ۔" میں نے کہا۔

"وہ جوان آدمی تھا۔ گورا چٹا، دراز قد، کسی اچھے خاندان کا لگتا تھا۔ میں نے پوچھا کہ آپ نواب صاحب کیوں مروانا چاہتے ہیں تو وہ بگڑ گیا کہ اپنے کام سے کام رکھو۔ فضول سوالات مت کرو۔ ظاہر ہے دشمنی ہے اس لیے نواب کو ختم کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ میں ایک دن پہلے تمہیں بتاؤں گا کہ نواب کو کہاں مارنا ہے۔ سارا انتظام تمہارا ہو گا میں تمہیں پھر نظر نہیں آؤں گا اس لیے حادثے کے بعد اپنی جان کیسے بچانی ہے یہ تم خود سوچو۔"

میں نے کہا۔ "تمہیں خیال نہیں آیا کہ حادثے کے بعد

اپنی دو لاکھ روپے دینے نہ آیا تو تم کیا کرو گے؟"

"آیا تھا حضور، اس نے کہا کہ فکر مت کرو باقی دو لاکھ تمہیں کام سے پہلے مل جائیں گے۔ لیکن یہ خیال رکھنا کہ [کام نہ] ہوا تو چوائس تمہارا ہو گا۔ چار لاکھ واپس کرو گے یا پھر [خودکشی] کرو گے۔ پکڑے گئے تو خود بھگتو گے۔ مارے گئے تو [تمہ]اری قسمت۔"

"یعنی تم پورے چار لاکھ وصول کر چکے ہو۔ باقی [دو لا]کھ اس نے کب دیے تھے؟"

"اسی روز صبح، جب ایکسی ڈنٹ ہوا۔"

"وہ گاڑیاں کس کی تھیں؟" میں نے کہا۔

"چوری کی۔"

"ایک کو تم چلا رہے تھے، دوسری میں کون تھا؟"

"دوسری کو وہ خود چلا رہا تھا۔ وہ لاہور سے پیچھے لگا تھا۔"

میں سوچ میں پڑ گیا کیونکہ لاہور سے میرے پیچھے [آ]نے والی گاڑی میں ایک جیسے حلیے کے دو آدمی تھے اور انہیں [میں] نے گجر برادران فرض کر لیا تھا۔

"گاڑیاں کہاں سے اٹھائی تھیں تم نے۔" میں نے کہا۔

"ایک لاہور کے گیراج سے، دوسری جہلم سے۔"

"ان کے نمبر یاد ہیں؟"

"نہیں جی۔ دونوں پر ڈینٹ پینٹ ہو رہا تھا۔ [نمبر] پلیٹ نہیں تھی۔"

میں نے کہا۔ "اس شخص کو دوبارہ دیکھو گے تو پہچان لو گے؟"

"جی سر۔"

میں نے کہا۔ "جس کام کے تمہیں چار لاکھ دیے گئے [تھ]ے۔ وہ نہیں ہوا تھا۔ کیا اس نے تمہاری مرضی پوچھی تھی؟"

"یس سر۔ میں نے کہا کہ مجھے ایک چانس اور دو۔ وہ [ما]ن گیا۔"

"گڈ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تم سے پھر رابطہ [ک]رے گا۔ کیا وہ تمہیں فون کرے گا؟"

"نہیں جناب عالی۔ وہ فون نہیں کرتا۔ اس کا کہنا تھا [ک]ہ فون کال کو ٹریس کیا جا سکتا ہے۔ وہ خود آتا تھا۔"

میں نے اس صورتِ حال پر غور کیا۔ "ٹھیک ہے۔ ہم تمہیں ایک چانس فراہم کریں گے۔ اس وقت تک دن [را]ت تم ہماری نظر میں رہو گے۔ ایک سیکنڈ کے لیے بھی ہماری [گ]ولی کے نشانے سے دور نہیں ہو گے۔ جب تک وہ شخص پھر تم [س]ے ملنے نہیں آتا۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ تمہاری زندگی کا [د]ارومدار اس کے پکڑے جانے پر ہے۔ وہ ہاتھ نہ آیا تو تم مارے جاؤ گے۔ تمہیں کبھی پتا نہیں چل سکتا کہ ہر وقت تمہارے آس پاس کتنے لوگ تمہیں نظر میں رکھے ہوئے ہیں۔ شاید تمہیں ان چار لاکھ کی فکر ہو گی۔ نہ وہ ہماری زندگی سے زیادہ ہیں اور نہ تمہاری زندگی اتنی کم قیمت ہے۔ وہ اپنے پاس رکھو۔ جب واپس لینے والا بھی نہیں رہے گا تو آگے تمہاری مرضی۔ جہاں چاہو جاؤ جہاں چاہو رہو۔ امید ہے کہ بات تمہاری سمجھ میں آ گئی ہو گی۔ لے جاؤ اسے۔"

"جی حضور والا۔ ہمارے لیے کیا حکم ہے؟"

"ساری بات تم نے سن لی ہے اور سمجھ لی ہے۔ مزید ہدایات تم کو بعد میں دی جائیں گی۔ اس معاملے میں کوتاہی برداشت نہیں ہو گی۔ اصل مجرم کو شک بھی نہیں ہونا چاہیے۔"

"آپ مطمئن رہیں سر۔ وہ پکڑا جائے گا۔"

اس تفتیش سے میں مطمئن بھی تھا اور غیر مطمئن بھی۔ اب مجھے امید تھی کہ مجھ پر قاتلانہ حملہ کرانے والے کا سراغ مل جائے گا لیکن ایک اندیشہ یہ بھی تھا کہ کہیں اسے عزیز کی گرفتاری کا پہلے ہی علم نہ ہو گیا ہو۔ مجھے اس کی گرفتاری کے لیے ایک جال پھیلانا تھا لیکن اس جال میں خود مجھے اپنے آپ کو چارے کے طور پر استعمال کرنا تھا۔ یہ ایک مشکل اور خطرناک کام تھا۔ اس میں کامیابی کے ساتھ ناکامی کے خطرات اپنی جگہ تھے۔ پلان ناکام بھی ہو سکتا تھا۔ لیک بھی ہو سکتا تھا۔

سب سے بڑی الجھن یہ تھی کہ میں لندن جا رہا تھا۔ کم سے کم بھی چودہ دن کے لیے اس پروگرام کو موخر کرنا ضروری تھا۔ قاتل کو پکڑنے کے لیے ہدف کا ہونا ضروری تھا اور ہدف میں خود تھا تو اگلے دو ہفتے تک دستیاب نہ تھا۔ کیا میرے اس پلان کو غنی محفوظ سمجھے گا۔ راجا اس کی اجازت دے گا۔ یہ سوالات اپنی جگہ تھے۔ غنی نے قیدی کو تہ خانے میں ڈال دیا تھا۔ وہ مجھ سے تفصیلی ہدایات چاہتا تھا۔ میں نے راجا کی واپسی تک معاملے کو التوا میں رکھنے کا فیصلہ کیا۔

راجا نے ہتھیلی پر سرسوں جمانے کا محاورہ عملی طور پر صحیح ثابت کر دیا۔ وہ رات کو واپس آیا تو بہت خوش تھا۔ "میں نے کوشش کی تھی کہ ان سالے کتوں کی ناک تک بو نہ جائے۔ عدالت کے اجازت نامے پر وزارتِ داخلہ خود ہی ای سی ایل میں ترمیم کر دے لیکن ایسا ہو نہیں سکا۔"

"یعنی میرا نام بدستور ای سی ایل میں ہے؟"

"نہیں فیکے پتر۔ پولیس اور سیشن کورٹ والے آ گئے اپنا حصہ وصول کرنے کہ یہ کیا، اوپر ہی اوپر معاملات طے کیسے ہو سکتے ہیں۔"

"پھر؟" میں نے بے چینی سے پوچھا۔

"پھر کیا، ان کا منہ بھی بند کر دیا ورنہ دیر ہوتی۔"

"گویا اب میں لندن کی فلائٹ پکڑ سکتا ہوں۔"

"ہاں۔ پندرہ فروری کو اصلی لسٹ پھر بحال ہو جائے گی۔ تجھے اس سے پہلے واپس آنا ہوگا۔"

اس رات راجا نے بھی تہ خانے میں جا کے قیدی سے سوالات کیے۔ اس نے پھر وہی باتیں دہرائیں جو مجھے بتا چکا تھا۔ راجا کو میرے پلان سے اختلاف نہیں تھا کہ عزیز کو آزاد چھوڑ دیا جائے لیکن اس کے گرد محافظ اور جاسوس ہر وقت موجود رہیں۔ وہ ہر جگہ اس کا سائے کی طرح تعاقب کریں۔ وہ کسی کو پہچانتا نہیں تو کارروائی کس کے خلاف کرے گا۔ لیکن پلان فول پروف اور ٹائٹ ہونا ضروری ہے۔ تاہم اس نے مجھے یقین دلایا کہ مجھے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ بیچ کی کڑی ہاتھ آ گئی ہے تو سازش کے ماسٹر مائنڈ تک پہنچنا مشکل نہیں ہوگا۔ اس کی یقین دہانی پر مجھے پورا اعتماد تھا۔

اسپتال کی تکمیل کے معاملات خاصی تیز رفتاری سے طے پا رہے تھے۔ اس کی بنیادی وجہ شہناز، مہدی حسن اور ان کے بیٹے احمد حسن کی دیوانگی آمیز دلچسپی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میرے واپس آنے تک اسپتال کے ان ڈور آؤٹ ڈور مریضوں کے علاج کی ساری سہولیات بلا معاوضہ سب کو دستیاب ہوں گی اور اس کے ساتھ ہی مردانہ زنانہ وارڈز کام کر رہے ہوں گے۔

شام کے وقت میں نے راجا کے ساتھ لان پر بیٹھنے کا سوچا لیکن وہاں احمد حسن اور زابعہ ٹہل رہے تھے اور نہ جانے کس موضوع پر کیا بات کر رہے تھے۔ ایک پیر کی جزوی خرابی احمد حسن کے لیے معذوری کبھی نہیں بنی تھی۔ وہ بائیں ہاتھ میں بیساکھی تھام کے آرام سے چلتا پھرتا تھا۔ یہ پرانی وضع کی بغلوں میں دبائی جانے والی بیساکھی نہیں تھی۔ المونیم کی چھڑی جیسی بیساکھی تھی جس کو وہ مٹھی میں دبا لیتا تھا۔ وہ ہر لحاظ سے ایک وجیہہ اور صحت مند آدمی تھا۔ مزاج کی نرمی اور شرافت دونوں باپ بیٹوں کی فطرت کی نمایاں اور متاثر کرنے والی خوبی تھی۔ میں نے انہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

رات کو رابعہ میرے کمرے میں آئی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن کہہ نہیں پا رہی۔ وہ میری طرف سے تشویش میں مبتلا تھی کیونکہ ابھی تک مجھ پر ہونے والے قاتلانہ حملے کے مجرم کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ میرے واپس آنے کے بعد جو ہونا ہے وہ تو ہوگا۔ اچانک اسے پریشانی یہ لاحق ہو گئی تھی کہ بدخواہ میرے پیچھے لندن پہنچ گئے تو کیا ہوگا۔

میں نے اسے تسلی دی کہ ایسا نہیں ہوگا کیونکہ ابھی تک روانگی کی خبر عام نہیں ہوئی۔

اگلے روز میں نے اپنی سیٹ کنفرم کرائی اور نور کی ... سے تیسرے دن میں لندن کی فلائٹ پر تھا۔ جب ا... کنٹرول لسٹ چیک ہو رہی تھی تو میں تھوڑا سا نروس ... پاکستان میں سرکاری نظام کی کارکردگی کا حال ایسا ... خود کمپیوٹر صاحب کی انفارمیشن غلط نہ ہو جائے مگر ایسا نہیں ...

فلائٹ کے ٹیک آف کرنے کے ساتھ ہی ... خیالات کی پرواز نے ماضی کے افق پر اڑان بھری۔ ... وقت یاد آیا جب ابا نے مجھے اس ملک کی سیاسی دلدل ... نکال کے میری جان بچانے کے لیے پڑھنے کے ... میری جلاوطنی قبول کی تھی۔ وہ یہاں اکیلے رہ گئے تھے او... چار سال بعد لندن آ گیا تھا۔

لندن ایک شہرِ طلسمات میرے لیے سچ مچ کی جادو... ثابت ہوا تھا۔ یہاں سے میں وطن گیا تو میری تقدیر بدل ... تھی۔ ایک معمولی کالج پروفیسر کا بیٹا نواب رفیق احمد ... بن گیا تھا۔ تمام راستہ میں انہی تصورات میں گم رہا ج... خواب کی طرح تھے۔

ہیتھرو کا ائرپورٹ وہی تھا۔ میں نے کسی کو اپنی آ... اطلاع نہیں دی تھی۔ نور یا ایلشیا کو یہ ضرور معلوم تھا کہ اگلے ... روز میں میری آمد کسی بھی وقت متوقع ہے لیکن انہیں فلا... علم نہ تھا۔ میں انہیں اچانک پہنچ کے حیران کرنا چاہتا تھا۔

سامان کی ٹرالی کے ساتھ میں باہر نکلا تو مسافر... ریسیو کرنے کے لیے آنے والوں کا ایک اژدہام چشم... تھا۔ درجنوں لوگ اپنے اجنبی مہمانوں کے نام لکھے کار... لکھے سامنے کھڑے تھے۔ میری نظر کو کسی کی تلاش نہیں تھی۔ ... اچانک میرے سامنے ایک چہرہ آ گیا۔ میرے دماغ ... زبردست شاک لگا اور میں چند سیکنڈ کے لیے منجمد ہو گیا۔ ... میرے پیچھے والے مسافر نے مجھے پش کیا تو میں آگے بڑھا ... میں نے ایک ایسے شخص کو زندہ دیکھ لیا تھا جس کے بار... میں مجھے سو فیصد یقین تھا کہ وہ مر چکا ہے۔ شک وشبے کی ذرا ... گنجائش نہ تھی۔ وہ میرے سامنے کھڑا تھا اور مجھے ہی دیکھ رہا تھ... کسی روبوٹ کی طرح چلتا ہوا میں اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہو مجھے۔" اس کے لبوں ... مسکراہٹ آ گئی۔

میں اسے دیکھتا رہا۔

اس کی آواز نے میری رہی سہی غلط فہمی بھی دور ... دی...... اس وقت تک میں نوٹ کر چکا تھا کہ رنگت صاف ...

ہونے کے باوجود اس کی جلد میں جنوبی ایشیا کی جھلک ہے۔ گولڈن براؤن جھلک اپنی پھٹے دودھ جیسی سفیدی میں پیدا کرنے کے لیے انگریز عورتیں دھوپ میں ساحلوں پر ننگ دھڑنگ پھرتی رہتی ہیں اور TAN کرنے والی کریموں کا سہارا لیتی ہیں۔

بلاشبہ اس کی صورت کے نقوش سو فیصد نہ سہی نوے فیصد چودھری سلطان جیسے تھے جسے مصدقہ شناخت کے بعد ہالا خر گجرات میں دفن کیا جا چکا تھا اور اس کا زندہ ہو کے لندن میں مجھے ریسیو کرنے کے لیے آنا ہی ناممکن تھا۔ اس کے لب ولہجے میں لندن کی چھاپ تھی اور دوسری شہری نسل کے انڈین ایسے ہی بولتے تھے۔

میں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا— "میں نواب رفیق ہوں۔"

"اور میں پی کے...... ہاؤ ڈو یو ڈو......؟" اس نے ہاتھ ملا کے سوٹ کیس مجھ سے لے لیا۔ "پلیز ادھر آیئے میرے ساتھ......"

میں نے کہا۔ "دراصل تمہاری صورت میں کسی اور کی حیرت انگیز مشابہت دیکھ کے میں سخت حیران ہوا تھا۔ وہ شخص مر چکا ہے۔"

وہ خوش دلی سے ہنسا— "تم سمجھے میں اس کا بھوت ہوں؟"

"بھوت کو دیکھ کر بھوت حیران نہیں ہوتے۔"

وہ قہقہہ مار کے ہنسا...... "پتا چل جائے گا بھوت کون ہے۔ ایش نے مجھ سے کہا کہ یار میرے دوست کو پکڑ لاؤ ورنہ وہ ادھر نکل جائے گا...... کسی بھی خوبصورت لڑکی کے پیچھے۔"

میں اس کے ساتھ چلتا گیا — ایلیشیا یا عائشہ کو ایش کہنے والے میں سمجھ گیا کہ وہ لارڈ ارسنٹ کا ملازم، شوفر نہیں ہو سکتا۔ "اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے...... تو تم مسٹر پارکر ہو......؟"

"تم نے ٹھیک کہا تھا...... بھوت کو بھوت پہچانتا ہے...... میں بھی مسافروں میں پہچان گیا تھا کہ تم ہی نواب رفیق ہو...... میں نے تمہاری کوئی تصویر نہیں دیکھی تھی...... ایش سے تمہارا اتنا ذکر سنا تھا کہ بعض اوقات میں جیلس ہو جاتا تھا...... لیکن وہ ٹھیک کہتی تھی اور میرا جیلس ہونا بھی ٹھیک تھا۔"

میں نے کہا...... "ہاؤ از شی مسٹر پارکر......"

"جسٹ پارکر...... وہ کیسی ہے...... یہ تم خود دیکھ سکتے ہو...... ابھی تک تو مجھے بہت اچھی لگتی ہے......" وہ آہستہ سے بولا۔

اور تب میں نے پارکر کے ہاتھ کے اشارے کی سمت دیکھا تو وہ مشکل سے پچاس گز کے فاصلے پر کھڑی تھی...... نور اس کے ساتھ تھی...... عائشہ کا حسن وہی تھا لیکن مجھے واضح طور پر محسوس ہوا کہ اس کی شگفتگی اور تابانی میں فرق آ گیا ہے...... یوں لگتا تھا جیسے اس نے عمر کا سفر چوگنی تیز رفتاری سے طے کیا ہے اور حسن کے خداداد خزانے کو بے دردی سے خرچ کیا ہے...... اس کی کوئی حفاظت نہیں کی۔ اس کا بدن پہلے سے زیادہ بھر گیا تھا مگر پرکشش ہو گیا تھا...... وہ لڑکی سے عورت بن گئی تھی لیکن اس کے چہرے کی مسحور کر دینے والی معصومیت کہیں کم ہو گئی تھی۔

وہ دیوانہ وار میری طرف لپکی اور مجھ سے لپٹ گئی......

ایسی وارفتگی کا مظاہرہ مغرب میں کہیں بھی کسی کو حیران یا متوجہ نہیں کرتا...... شاید وہ ایسا نہ کرتی تو خود اس کا شوہر حیران ہوتا کہ یہ کیسی پرانی دوستی ہے...... میرا ذکر سن سن کے اس کے تو کان پک گئے تھے اور ملاقات میں یہ سرد مہری......!

عائشہ ایک لارڈ کی بیٹی اور ایر اوپر والے طبقے سے تعلق رکھتی تھی جو فارمل ادب آداب یا ایٹی کیٹس کو اپنی شناخت سمجھتے ہیں مگر اس نے بڑی بے تکلفی سے مجھے چوما اور پھر میں نے اسے...... پارکر مسکراتا رہا اور نور شاید حیران ہوتی رہی......

"تم تو بہت بدل گئی ہو...... پہلے سے بہت زیادہ حسین ہو گئی ہو......" میں نے اخلاقاً اسے دور کر کے کہا۔

"اور تم بالکل نہیں بدلے ہو...... میں تو سمجھی تھی کہ میرے سامنے اونچی پگڑ اور گولڈن شیروانی میں کوئی نواب آئے گا۔" وہ خوش ہو کے ہنسی۔ "تم میرے شوہر سے ملے......؟"

"اس نے مجھے بھوت سمجھا......" پارکر بولا۔ "کیا میں ایسا ہوں؟"

"اس نے تمہیں صحیح سمجھا...... اچھا اب چلو...... ہم یہاں شام تک نہیں کھڑے رہ سکتے......" عائشہ نے میرا بازو پکڑ کے کھینچا۔

نور نے فریادی صورت بنا کے کہا...... "حضور والا...... ہم بھی تو پڑے ہیں راہوں میں...... ایک نظر ادھر بھی......"

میں نے بھی اردو میں جواب دیا...... "جو دل میں ہو نظر میں ہو...... خوابوں اور خیالوں میں ہو اسے دیکھنا کیا......"

اور ایک دم اسے پکڑ کے چوم لیا تاہم یہ چومنا اس سے مختلف تھا جیسے عائشہ نے مجھے چوما تھا...... چومنے کے ولایتی انداز فرینڈ...... گرل فرینڈ محبوبہ اور بیوی...... سب کے لیے الگ ہوتے ہیں۔ نور سرخ ہو گئی لیکن اور کسی نے میرے جذباتی ردعمل پر حیرانی کا اظہار نہیں کیا۔

میں پہلے ہی طے کر چکا تھا کہ خواہ عائشہ کتنا بھی اصرار کرے میں اس کے خاندانی محل نما گھر ارسنٹ مینشن میں قیام نہیں کروں گا۔ عام لوگوں کے گھر میں عام طور پر مہمانوں کے لیے نہ گھر میں جگہ ہوتی ہے اور نہ دل میں وہ جذبہ جو ہم دیسی لوگ رکھتے ہیں...... مہمان نوازی ایک قابل تعریف صفت سمجھی جاتی ہے مگر مغرب میں ایسے تکلفات کو سراسر تکلیف قرار دے کر زندگی کے معمولات سے خارج کر دیا گیا ہے...... ان کے معمولات میں مہمان نوازی کی نمائش ہی نہیں تھی...... عائشہ کے آبائی گھر ارسنٹ مینشن میں گیسٹ ہاؤس ایک الگ انیکسی کی صورت میں موجود تھا لیکن کاروباری یا خاندانی مراسم رکھنے والے وہاں دو چار دن کے لیے ٹھہرائے جاتے تھے...... ہمارا وہاں ٹھہرنا قطعی نامناسب ہوتا کیونکہ ہمیں غیر معینہ مدت کے لیے قیام کرنا تھا اور میں اپنے عائشہ سے تعلق کو نہ کاروباری کہہ سکتا تھا نہ خاندانی...... الٹا یہ ناپسندیدگی کے زمرے میں آتے تھے۔

گاڑی گیٹ سے داخل ہوئی تو پورچ میں ہمیں اتارنے کے لیے رکی اور آگے مہمان خانے کی طرف چلی گئی...... عائشہ مجھے اپنے ساتھ اندر لے گئی۔ حسبِ عادت میں نے پوچھا تھا کہ تمہارے والدین کی صحت کیسی ہے...... اس کے باپ سے میری بات ہوئی تھی تو اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا تھا...... انگریز ہمیشہ سے انتہائی ریزرو اور اپنے کام سے کام رکھنے والی قوم شمار ہوتے ہیں...... اس نے مجھے اپنی بیوی کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

عائشہ نے کہا...... ''ماں اسپتال میں ہیں...... ہوسکتا ہے، گھر نہ آئیں...... زندہ......''

میرا دل دھک سے رہ گیا...... ''کیوں...... کیا ہوا ہے انہیں؟''

عائشہ نے سرسری انداز میں کہا...... ''کینسر...... دو مہینے ہوگئے...... ڈیڈ بیڈ پر ہیں اور چند روز کی مہمان......''

مجھے معلوم تھا کہ مجھ سے تعلق ہی ماں بیٹی کے درمیان جذباتی دوری کا ایک سبب بنا تھا لیکن وہ پرانی بات تھی...... اصل وجہ یہ تھی کہ وہاں کے جذباتی رشتے ویسے ہی سرد اور رسمی ہوتے ہیں...... میں نے کہا ''آئی ایم سوری...... اور تمہارے والد......''

''ابھی وہ دورے پر جرمنی میں ہیں۔'' عائشہ نے کہا۔

اس کا شوہر نہ جانے کہاں گم ہوگیا تھا...... ہم ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے تو ایک ملازم چائے کی ٹرالی کے ساتھ آیا اور میری طرف دیکھے بغیر ٹرالی چھوڑ کے چلا گیا...... میں نے کہا...... ''مجھے تمہاری ماں کو دیکھنے کے لیے جانا چاہیے۔''

عائشہ نے چائے بناتے ہوئے سپاٹ لہجے میں پوچھا...... ''وہ کس لیے!''

میں نے کہا...... ''وہ بیمار ہیں......''

''تو کیا تم انہیں ٹھیک کر دو گے...... کوئی بھی ان سے وقت لیے بغیر نہیں مل سکتا...... ہم بھی...... ممکن ہے وہ تم سے ملنا ہی نہ چاہیں......''

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے...... پھر پیار سے نیک خواہشات کے ساتھ پھولوں کا گلدستہ ارسال کر دوں گا۔''

''بے کار ہے...... وہ نہیں لیں گی......! کوئی اور بات کرو...... ہم اتنا عرصہ بعد ملے ہیں......''

میں نے کہا...... ''تمہارا شوہر کہاں چلا گیا......''

''وہ یہاں بیٹھ کے کیا کرتا...... میرے کہنے سے مجھ ساتھ لے گیا تھا مگر وہ تمہیں کمپنی نہیں دے سکتا...... تمہارا دوست میں ہوں...... تمہارے لیے وہ اجنبی ہے......! لندن میں اتنا عرصہ رہے ہو...... یہاں کے ادب آداب جانتے ہو...... ہاں ڈنر پر وہ ضرور ہوگا......''

میں نے کہا...... ''وہ اچھا آدمی ہے......''

عائشہ ہنسنے لگی...... ''اتنی سی دیر میں تم نے یہ رائے کیسے قائم کرلی......''

میں نے شپٹا کے کہا...... ''وہ شوہر ہے تمہارا......! اچھا ہی ہوگا......''

''چھ مہینے پہلے میں نے شادی کی تو مجھے بھی یہی خوش فہمی ہوئی تھی...... مگر وہ دور ہو چکی ہے...... اب ہم علیحدگی کی طرف جا رہے ہیں......'' عائشہ نے کہا۔

''ایسی کیا بات ہوگئی......؟''

''بہت سی باتیں ہیں...... بس ہم ایک دوسرے کو مزید برداشت نہیں کر سکتے......'' عائشہ نے کسی ملال کے بغیر کہا۔

نور خلاف معمول چپ رہی حالانکہ میری فون پر بات ہوئی تھی تو وہ بہت چہک رہی تھی...... اب وہ بڑے محتاط انداز میں ہمارے پھر ملنے کے عمل کا مشاہدہ کر رہی تھی...... کافی پیتے ہوئے ہم بیشتر وقت پرانی باتیں کرتے رہے...... پھر اس نے کہا...... ''تمہارا سامان مہمان خانے میں پہنچا دیا گیا ہے...... سفر کی تکان سے ایزی ہو جاؤ...... ڈنر پر پھر ملاقات ہوگی...... اب مجھے ایک چکر آفس کا لگانا ہے......''

میں نے کہا۔ ''عائشہ...... ایک بات کی میں ابھی وضاحت کر دوں...... ہم کل ہوٹل میں شفٹ ہو جائیں گے۔''

''ناممکن...... مہمان خانہ کس لیے ہے......''

''میں عارضی مہمان نہیں ہوں...... اور مجھے نہیں معلوم کہ میں کتنا عرصہ رہوں گا...... نور یہاں اسٹڈی کورس کرنے آئی ہے...... ہوسٹل میں رہے گی......''

''اچھا بعد میں دیکھیں گے......'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

مہمان خانے کے ایک بیڈ روم میں میرا سامان رکھ دیا گیا تھا...... خلوت میسر آتے ہی نور نے کہا۔ ''مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آتی...... ان لوگوں کے رشتے کتنے مصنوعی ہیں......''

''دیکھ لو...... ہم اسی مغربی تہذیب کے پیچھے جا رہے ہیں......''

''خدا نے تمہیں بچا لیا...... اس گھر کا داماد بننے سے ورنہ تمہارا ابھی وہی حشر ہوتا جو پارکر کا ہو رہا ہے......''

''یہ کیا بدمعاشی ہے؟...... فون پر بات کرتے ہوئے تم نے عائشہ کی اتنی تعریف کی تھی......''

''ڈپلومیسی...... منافقت...... اخلاقی مجبوری...... تم کچھ بھی کہہ سکتے ہو...... وہ میرے سامنے تھی...... اور میں کیا کہتی......''

میں ایک صوفے پر بیٹھ گیا...... ''پتا نہیں اسے کیا ہو گیا ہے...... یقین کرو وہ ایسی نہیں تھی......''

وہ میرے گلے میں بانہیں ڈال کے میری گود میں بیٹھ گئی۔ ''ایک بات کہوں...... برا تو نہیں مانو گے؟''

''ضرور مانوں گا اگر سچ بولو گی......''

''یہ جو تمہاری خوبصورت جادوگر آنکھیں ہیں نا......'' اس نے باری باری میری آنکھوں کو چوما...... ''ان میں ایک خرابی ہے...... یہ صرف اچھائی دیکھتی ہیں...... تم بالکل یہی بات فریال کے بارے میں کہو گے...... بلکہ کہتے ہو......''

''اور تمہارے بارے میں بھی......''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں...... میرے بارے میں کسی شریف آدمی کی رائے اچھی نہیں تھی...... مجھے معلوم ہے......''

مگر میں شریف آدمی ایسا نہیں تھا...... احمق کہہ سکتی ہو......''

وہ ہنسی۔ ''ایک ہی بات ہے حضور والا...... جو لڑکی آپ کو اتنی اچھی لگتی تھی کہ آپ اس کے عشق میں مجنوں ہو جائیں...... اس میں آپ کو صرف اچھائی نظر آتی تھی۔''

میں نے اعتراف کیا۔ ''ایسا تو ہوتا ہے عشق میں۔''

وہ بولتی گئی۔ ''اس کی اصلیت کیا ہے...... یہ دیکھنے جاننے اور سننے کی تم میں صلاحیت ہی نہیں۔''

''پاگل ہو تم۔ کسی سے عشق کرنے اور کار کردگی...... آفٹر سیل سروس اور گارنٹی کے ساتھ بیوی مشنری خریدنے میں فرق تو ہوگا......''

''یہی فرق جب تمہارے سامنے آیا تو کتنا شاک لگا تمہیں...... یہ تمہاری عائشہ ایسی ہی تھی...... جیسی اب نظر آ رہی ہے...... فریال کو بھی تم کیا سمجھتے تھے...... بالآخر کیا ثابت ہوئی...... عائشہ تم سے شادی کر لیتی...... یا تم فریال سے کر لیتے...... ہر صورت میں...... خیر چھوڑو......'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

میں نے کہا۔ ''نہیں...... مجھے بتاؤ...... آج ان کی جگہ تم ہو...... تو میں کیسے دیکھوں کہ کل تمہارا اصل روپ کیا ہوگا۔''

وہ پلٹی۔ ''میں تو تم سے کچھ بھی نہیں مانگ رہی...... کوئی حق نہیں جتا رہی...... تم مجھ سے شادی کرو نہ کرو...... میری کوئی شرط نہیں کوئی مطالبہ نہیں...... محبت مجھے ہے تم سے...... وہ رہے گی خواہ تم مجھے چاہو یا نہ چاہو......''

''اگر میں چھوڑ دوں تمہیں؟''

''تو میں زندہ رہوں گی...... زندگی میں ہر خوشی نہ مانگے ملتی ہے...... نہ سدا ساتھ رہتی ہے...... بہت خوش ہوں کہ آج تمہارے ساتھ یہاں ہوں...... کل کا کیا پتا اور اس کے لیے خوشی کے اس لمحے کو کیوں خراب کر دوں۔''

''او مائی گاڈ...... آج تم کسی عظیم فلاسفر کی طرح بول رہی ہو......'' میں نے جھک کر اس کا ہاتھ پکڑ کر چوم لیا۔

اسی وقت عائشہ آ گئی۔ ''اوہ...... میں نے فلم رومیو جیولیٹ کے اس سین میں مداخلت کی......؟''

میں نے کہا۔ ''ایک اچھے تماشائی کی طرح تمہیں تالی بجا کے داد ضرور دینی چاہیے تھی۔''

''میں یہ بتانے آئی تھی کہ ڈنر نو بجے ہوگا...... تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو یہ کال بیل ہے...... تم بٹلر سے کہہ سکتے ہو۔''

''یعنی میں تم سے نہیں کہہ سکتا۔''

وہ ہنسی۔ ''مجھے معلوم ہے تم کتنے شرمیلے اور فارمل ہو...... تم بٹلر سے بھی کچھ نہیں کہو گے...... نور تمہارا سامان بھی کچھ دیر میں یہاں آ جائے گا۔''

نور نے کہا۔ ''اس کی ضرورت نہیں......''

وہ جاتے جاتے حیرانی سے ہنسی۔ ''کیوں ضرورت نہیں۔''

''اس لیے کہ میں وہاں ٹھیک ہوں......''

اس نے کچھ دیر بعد سر ہلایا۔ ''میں سمجھ گئی...... تمہاری دقیانوسی مشرقی روایات...... رفیق اور تم شادی ہونے تک ایک ساتھ نہیں سو سکتے...... اس نے ہمیشہ مجھے انکار کیا...... شرافت اور عزت و عصمت کے مضحکہ خیز تصورات تھے اس

کے...... سب اس پر ہنستے تھے...... خیر تمہاری مرضی۔"
ڈنر میں ابھی ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ وقت تھا...... غسل کے بعد کپڑے بدل کر میں اور نور باغ میں ٹہلتے رہے۔

میرے لندن میں قیام کے بہت سے واقعات میری زبانی سن چکی تھی وہ...... باقی عائشہ نے بتا دیے تھے...... نور جانتی تھی کہ انگریز دوسروں کی زندگی کے نجی معاملات پر بات کرنا بالکل پسند نہیں کرتے۔ اسے بھی عائشہ نے اتنا ہی بتایا تھا کہ اس کے اپنے شوہر کے اختلافات ایک ایسی سطح پر ہیں جہاں ان کا الگ ہونا ناگزیر ہے لیکن یہ اختلافات کیسے ہیں...... یہ نہ عائشہ نے بتایا تھا اور نہ میں نے پوچھا تھا۔

میرا بھی کوئی ارادہ نہ تھا کہ اس موضوع پر عائشہ سے بات کروں کہ اس نے کیا دیکھ کے پارکر کو پسند کیا تھا اور اب ایسی کیا بات ہو گئی تھی کہ نوبت طلاق تک پہنچ گئی تھی...... وہاں شادی اور طلاق ایک عورت، مرد کا ذاتی مسئلہ ہے جس میں کسی کو دخل اندازی کا حق نہیں...... الٹا یہ انتہائی معیوب سمجھا جاتا ہے کہ آپ میاں بیوی کے معاملات میں ٹانگ اڑائیں...... اپنے وطن میں اختلافات ہر گھر میں ہی ہوتے ہیں، بلکہ ازدواجی زندگی کا لازمی حصہ سمجھے جاتے ہیں...... لڑائی جھگڑے یہاں تک کہ مار پیٹ کی نوبت آ جاتی ہے مگر پھر صلح بھی ہو جاتی ہے کیونکہ وہاں گھر کے بڑے اپنا مصالحانہ کردار ادا کرتے ہیں...... دوست احباب چھوٹے بڑے سب پوری کوشش کرتے ہیں کہ گھر نہ ٹوٹے۔ چنانچہ طلاق کی شرح انتہائی کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے...... اس کے مقابلے میں طلاق یہاں روز کا معمول ہے...... ذرا ذرا سی بات پر ہو جاتی ہے...... صفِ اول کی اداکارہ الزبتھ ٹیلر نے آٹھ شادیاں کیں بلکہ ایک شوہر سے دو دفعہ کی...... سی این این کے مشہور اینکر اور انٹرویو لینے والے لیری کنگ نے بھی یہ ریکارڈ اسی طرح قائم کیا لیکن عام لوگ بھی پیچھے نہیں...... نہ کوئی اسے عیب سمجھتا ہے نہ معیوب...... ان کے یہاں زبردستی ساتھ نباہنے کو وفاداری نہیں بے وقوفی کہا جاتا ہے۔

یہ سب جاننے کے باوجود نہ جانے کیوں میرے دل میں ایک خلش سی تھی کہ کسی حد تک میں ہی عائشہ کی زندگی میں اس عدم توازن کا ذمے دار ہوں۔ نور نے تو کھل کر کہہ دیا تھا کہ میں احمق اور اناڑی تھا...... میں ان دونوں لڑکیوں عائشہ اور فریال کی محبت کو نہ سمجھ سکا لیکن میں اس کی رائے سے متفق نہیں تھا۔

عائشہ اس معاشرے کی عام لڑکیوں سے بالکل مختلف ایک سیدھی سادی اور شریف لڑکی تھی جس نے میرے لیے خود کو روایتی مشرقی لڑکی کے قالب میں بھی ڈھال لیا تھا بعد میں کیا ہوتا...... وہ پچھتاتی یا اپنے موجودہ روپ میں ڈھل جاتی...... یہ میں کیسے جان سکتا تھا۔ جب میں نے اسے مکمل طور پر انتہائی بے رخی بلکہ سنگدلی سے ٹھکرا دیا اور اسے چھوڑ کے چلا گیا تھا ایک ردعمل کے طور پر وہ جذباتی بحران سے دوچار ہوئی...... اس نے منشیات کا استعمال کیا اور گھر سے نکل کر آزاد دوستوں کے ساتھ رہنے لگی جو تمام اخلاقی و معاشرتی طور سے آزاد ہو کے مشترکہ خاندان کی صورت میں رہتے تھے۔

ماں باپ نے اس کا نفسیاتی علاج کرایا اور اسے دوبارہ نارمل زندگی گزارنے کے قابل بنانے میں کتنی محنت کی...... کتنا دکھ اٹھایا...... کتنا پیسا خرچ کیا اور کتنا وقت صرف کیا...... اس کا مجھے کوئی علم نہ تھا...... پیسا ان کے لیے غیر اہم تھا...... بیٹی اس لیے اہم تھی کہ اکلوتی تھی...... اس کا بھائی بھی کوئی نہ تھا...... ان کی تمام جائداد اور کاروبار کی مالک تھی...... وہ بے چارے یہ سب نہ کرتے تو کیا کرتے۔

میرے نقطہ نظر سے تو عائشہ اب بھی نارمل یا پہلے جیسی نہیں تھی...... غالباً اسی زمانے میں اس نے پارکر سے شادی کر لی اور اب اسے بھی چھوڑنے پر آمادہ تھی...... میں عائشہ سے پوچھ سکتا تھا اور نہ پارکر سے کہ ان کے درمیان اختلافات کی نوعیت کیا ہے...... وہ برامان کے دوٹوک لہجے میں کہتے کہ نواب صاحب اپنے کام سے کام رکھو۔

میں یہاں آرام اور تفریح کے لیے آیا تھا...... بے شک کچھ کام بھی اہم تھے لیکن عائشہ کے لیے فکر مند ہونا سرے سے کوئی کام ہی نہیں تھا...... زندگی ہر رنگ میں سامنے آتی ہے...... لارڈ ارسنٹ کے پاس عزت، شہرت، دولت سب کچھ تھا...... باہر سے دیکھنے والے لوگ ارسنٹ مینشن کے مکینوں کی زندگی پر رشک کرتے ہوں گے لیکن وہ ایک قید خانہ تھا جس میں تین افراد رہتے تھے جو ایک دوسرے کے ساتھ خاندانی رشتوں میں جکڑے ہوئے تھے...... وہ باہر خوش رہتے تھے...... آج ماں کینسر سے مر رہی تھی لیکن بیٹی کو یا شوہر کو پروا نہ تھی...... اسے ہر صورت میں مرنا ہے تو پھر فکر کیا کرنا...... باپ نہ جانے کہاں تھا...... بیٹی جو چاہے کرے...... جس کے ساتھ چاہے رہے۔

یہ سب سوچ کے میں نے عائشہ کے خیال کو ذہن سے جھٹک دیا اور نور سے اس کے لندن آ جانے کے بعد پیش آنے والے واقعات پر باتیں کرتا رہا...... وہ بہت خوش تھی کیونکہ بالآخر اس نے اپنے ماضی کی آسیب بن کر پیچھا کرنے والی

ائیوں سے نجات حاصل کر لی تھی...... وہ نور جہاں سے بنے میں کامیاب رہی تھی...... بالکل اسی طرح جیسے اس پلان کیا تھا...... اب وہ محفوظ تھی اور آزاد تھی...... اسے خواب اپنی دسترس میں محسوس ہوتے تھے۔

ٹھیک وقت پر ایک بٹلر ہمیں ڈنر کے لیے لے گیا...... اہتمام عائشہ نے ٹیرس پر کیا تھا...... تمام لائٹس بجھا دی تھیں اور ہر طرف خوشبودار موم بتیوں کا اجالا تھا...... ایک کافی فاصلے پر ٹیمز کا لینس ڈاؤن برج نظر آتا تھا جس اوپر پورا چاند روشن تھا...... لندن میں ایسی راتیں بہت کم ہیں جب آسمان صاف ہو...... ایسے دن کے لیے بھی ن کے باسی ترستے ہیں جب انہیں دھوپ میسر آئے۔

دوسری طرف آخری حصے میں ایک آرکسٹرا مدھم سُر میں کوئی دھن بجا رہا تھا جسے میں پہچاننے سے قاصر...... ظاہر ہے یہ سارا اہتمام عائشہ نے ہمارے لیے کیا...... جب وہ آئی تو میں اس کی جلوہ آرائی کو دیکھ کے دم بخود رہ گیا...... اس نے لباس اور میک اپ سے اپنے حسن کا جادو جگانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی...... گو اس کے بازو اور سینے کا بیشتر حصہ بے لباس تھا لیکن یہ اعلیٰ ترین سوسائٹی میں ڈنر کا پسندیدہ انداز تھا...... اس کا لباس پیچھے سے کھلا ہوا تھا اور اس نے لباس سے میچ کرتا ہوا فلاور ہیٹ بھی رکھا تھا۔

میں نے ایک مہذب آدمی کی طرح اٹھ کر اس کا استقبال کیا اور ادب آداب کے تقاضے نبھاتے ہوئے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھاما، چوما اور جھک کے کہا...... "تم قیامت کی حد تک طور پر حسین لگ رہی ہو......"

وہ مسکرائی اور شکریہ ادا کر کے بیٹھ گئی...... تیاری نور نے بھی کم نہیں کی تھی لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ گھر کے اندر ڈنر کا اسے دعوت ولیمہ جیسا اہتمام کر کے شریک ہونا چاہیے...... اس کے باوجود نور کو عائشہ پر ایک قدرتی فوقیت حاصل تھی...... عائشہ کے مقابلے میں وہ بہت زیادہ حسین تھی اور یہ ایسی حقیقت تھی جس کو عائشہ نے بڑے حسد کے ساتھ تسلیم کیا تھا۔

نور نے سوال کیا...... "کیا ڈنر میں ہم تین ہی ہیں...... میرا مطلب ہے تمہارے شوہر......"

عائشہ نے رکھائی سے کہا۔ "مجھے نہیں معلوم وہ کہاں ہوگا...... اور بہرحال تم میرے مہمان ہو...... رفیق...... کیا تم اب بھی نہیں پیتے؟"

"نہیں...... اور مرتے دم تک نہیں پیوں گا۔"

ساحر جمیل سید کے قلم سے ایک پُراسرار اور خوفناک ناول

راکھشس

ساحر جمیل سید

"خواہ میں کہوں......؟" وہ کچھ مایوس ہوئی۔ "اس گزرے ہوئے وقت کی قسم دوں جب مجھے تم سے محبت تھی۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا...... "خواہ یہ مجھے اپنی محبت کی قسم دے یا اس محبت کی جو مجھے اس سے ہے......" میں نے نور کی طرف اشارہ کیا۔

نور کا چہرہ فخر و مسرت سے دمکنے لگا اور واضح طور پر عائشہ نے سبکی محسوس کی مگر غلطی اس کی اپنی تھی۔ ایک طرف میں نے اس کی درخواست کو مسترد کر دیا تھا تو اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا تھا کہ میں نور سے کتنی محبت کرتا ہوں...... تاہم عائشہ نے فوراً ہی اپنے ردعمل کو ایک قہقہے میں چھپا لیا جو بالکل کھوکھلا اور مصنوعی محسوس ہوتا تھا۔

"تم ہمیشہ وہی رہو گے...... کیا کہتے تھے تمہارے دوست تمہیں، مالوی...... یا کچھ ایسا ہی...... ماولی......؟"

"مولوی......" میں نے ہنس کے کہا۔ "وہ مذاق کرتے تھے...... میں ایسا بہرحال نہیں ہوں۔"

عائشہ نے پینا شروع کر دیا...... یہ ان کے آداب طعام میں شامل تھا کہ پہلے کوئی سی شراب کتنی پی جائے...... سازندوں نے اپنی دھن بدلی...... اخلاقاً اس نے نور بھی آفر کی جسے اس نے شکریے کے ساتھ مسترد کر دیا...... کچھ دیر بعد کھانے کا پہلا کورس شروع ہوا...... میں نے اس کے معمولات اور کاروبار کے بارے میں پوچھا۔

"سب وہی ہے اور ویسا ہی جیسا کہ اس وقت تھا...... جب تم یہاں تھے......" اس نے کہا۔

"لارڈ ارسنٹ نے یہ مقام حاصل کرنے کے لیے بڑی محنت کی تھی۔"

"ہاں...... مقام تو اسے مل گیا...... لیکن اور کیا ملا؟...... آج تک وہ بھٹک رہا ہے...... اسے ایک عورت کی مثالی رفاقت نہیں ملی...... اس کے لیے بھی محبت ایک سراب ثابت ہوئی...... ساری زندگی وہ کبھی ایک عورت کے پیچھے پھرتا رہا

کبھی دوسری کے پیچھے۔"

"شادی اس نے اپنی مرضی سے کی تھی؟"

"ہاں...... اسی عورت سے جس سے وہ محبت کرتا تھا...... لیکن آج دیکھو کہ وہ خود کہاں ہے...... یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ عورت مر رہی ہے...... دراصل اس کی محبت تو بہت پہلے ہی مر چکی تھی...... انہوں نے نفرت اور جبر کے ساتھ تیس سال ایک ہی محبت کے پیچھے گزار دیے......"

"جبر کیا تھا...... کس کا تھا؟......" میں نے کہا۔

"حالات کا...... ظاہر داری کا...... اپنے سیاسی کیریئر کا...... اس کی بیوی کون سی وفادار رہی...... مجھ سے بہتر یہ کون جانتا ہے۔"

"کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم کوئی اور بات کریں......" نور نے کہا۔

وہ بولتی رہی۔ "مجھ پر کوئی جبر نہیں...... میں کیوں منافقت کروں...... ایک سو ایک آج بھی میرے پیچھے کتے کی طرح رال ٹپکاتے پھرتے ہیں...... جیسے یہ پھرتا تھا...... اب مجھے معلوم ہوا کہ وہ میری دولت کے پیچھے تھا...... وہ سمجھا کہ اس طرح ایک بڑا عہدہ مل جائے گا...... میری طرح وہ بھی ڈائریکٹر ہوگا۔"

میں دیکھ رہا تھا کہ وہ کھانے سے زیادہ پی رہی ہے اور شراب کا نشہ اس پر غالب آتا جا رہا ہے لیکن میں اسے روک نہیں سکتا تھا۔

"آج میں اسے چھوڑوں تو معاہدے کے مطابق مجھے اپنے نصف اثاثوں سے دستبردار ہونا پڑے گا...... لیکن ابھی میرے اثاثے ہی کیا بس...... میرے معاملہ فہم باپ نے ابھی تک یہ سب میرے نام نہیں کیا ہے...... بالآخر یہ سب میرا ہی ہوگا...... ابھی کس چیز کی کمی ہے مجھے...... اس نے اپنے داماد کو معمولی عہدہ دیا...... یہ سمجھایا کہ تم نیچے سے اوپر مختلف مدارج طے کرو گے تو اتنی بڑی فرم کے کاروباری معاملات کی سمجھ بوجھ پیدا ہوگی...... ابھی اس کی کوئی حیثیت ہی نہیں...... اگر چاہوں تو میں اسے نکال باہر کروں۔"

نور نے ایک احمقانہ سوال کیا۔ "کیا مصالحت کی کوئی صورت نہیں؟"

عائشہ نے جھک کے کہا۔ "مصالحت؟ میں کیوں کروں مصالحت......؟ کوئی مجبوری ہے تو اس کی...... وہ میرے ساتھ رہنا چاہتا ہے...... میں اس کے ساتھ رہنا ہی نہیں چاہتی...... اور زندگی نے بہت کچھ سکھا دیا ہے مجھے۔ یہ سب بکواس ہے...... محبت اور وفاداری۔"

"ایک مثال تاریخ میں ہے...... کنگ ایڈورڈ کی...... اس نے ایک عورت کی محبت کے لیے برطانیہ کا تاج وتخت چھوڑ دیا تھا...... حالانکہ وہ معمولی شکل وصورت کی بیوہ تھی...... مسز سمپسن......" نور نے کہا۔

وہ ہنستے ہنستے بے حال ہوگئی۔ "ہی واز اے فول...... تبصرہ کروں میں؟"

نور نے میرے اشاروں سے منع کرنے کے باوجود بحث جاری رکھی۔ "اور یہ پرنس چارلس ہے...... اس نے ڈایانا جیسی ہمہ صفت عورت کا شوہر ہونے کے باوجود پار کر کے ہی محبت کی...... اور بالآخر شادی......"

"وہ عقلمند آدمی تھا...... اس نے ڈایانا سے نجات حاصل کی...... برطانیہ کے تاج وتخت کو نہیں چھوڑا...... حالانکہ اب بادشاہ بنا بھی تو کیا...... بوڑھا ہوگیا۔"

ڈنر ختم ہونے تک عائشہ بالکل آؤٹ ہو چکی تھی۔ ا... طرف سے میں نے اسے سہارا دیا، دوسری طرف سے ... نے...... بیڈروم کے دروازے پر ہم نے اسے شب بخیر کہا۔ اس نے ہمارا شکریہ ادا کیا۔ پھر میں نور کو اس کے بیڈروم چھوڑنے چلا گیا۔

"بے وقوف لڑکی...... اس کے ساتھ بحث میں الجھنے کیا ضرورت تھی۔ اشارے سے منع بھی کر دیا تھا۔"

وہ ٹھنک کے بولی۔ "کیا میں نے کچھ غلط کہا؟"

"نہیں...... مگر غلط وقت پر غلط عورت سے کہا...... کو تلخی ہو جاتی پھر؟"

وہ میرے سینے سے لگ گئی۔ "جان...... میں یہاں نہیں رہ سکتی...... ہم کل ہی یہاں سے شفٹ ہو جائیں گے۔"

میں نے اسے چوما۔ "بالکل ایسا ہی ہوگا...... اگر مجھے ذرا بھی اندازہ ہوتا کہ...... عائشہ اتنی بدل گئی ہے......"

"میں خود حیران ہوں کہ تم کس کی تعریف کرتے تھے۔"

دروازے پر آہستہ سے ناک ہوئی تو میں نے کہا "یس......"

یونیفارم میں ہیڈ بٹلر نے اندر آ کر مودبانہ انداز میں عرض کیا۔ "سر میں میڈم کی طرف سے معذرت چاہتا ہوں......"

میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔ "کس بات پر؟"

"آپ کو زحمت ہوگی...... لیکن میڈم نے کہا ہے کہ میں ان کی طرف سے درخواست کروں...... دراصل اچانک لارڈ ارسنٹ ایک فیملی فرینڈ کے ساتھ پہنچ رہے ہیں اور انہیں آپ کی آمد کا قطعی علم نہیں تھا...... اس لیے انہوں نے اپنے فرینڈ اور فیملی کو گیسٹ ہاؤس میں قیام کے لیے مدعو کر لیا... کے لیے وہ بھی معذرت خواہ ہیں......"

میں نے کہا...... "مجھے کیا کرنا ہے...... یہ بتاؤ......"

"اگر آپ یہاں شفٹ ہو جائیں...... دوسرے ... میں...... تو آپ کی بڑی عنایت۔ وہاں آپ کو ... سہولیات حاصل ہوں گی۔"

مجھے اس لکھنوی پرتکلف انداز پر ہنسی آئی۔ "مجھے کوئی ... نہیں اور اس کے لیے کسی کو بھی معذرت کرنے کی ... نہیں۔"

اس نے پھر سر خم کیا۔ "آپ کا بہت بہت شکریہ......"

میں نے گھڑی دیکھی تو ابھی زیادہ رات نہیں ہوئی ... میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ "دیکھو......" بٹلر جاتے جاتے ... یس سر......"

میں نے کہا۔ "کافی لاؤ ہمارے لیے......"

اس نے پھر یس سر کہا اور دروازے کو آہستہ سے بند ... نکل گیا۔ پورے گھر کی شان وشوکت میں کسی قبرستان ... خاموشی کا راج تھا اور اپنی قدامت کے ساتھ یہ خاندانی ... محل آسیب زدہ محسوس ہوتا تھا۔ میرے خواب وخیال ... تھا کہ وقت کے ساتھ اس گھر کے ماحول اور مکینوں کے ... میں ایسی تبدیلی آ چکی ہوگی۔ ورنہ میں نور کو یہاں نہ ... اور خود بھی ادھر کا رخ نہ کرتا۔

میں نور کو بتاتا رہا کہ کس طرح میں یہاں ایک بزرگ ... خاتون کے ساتھ پے انگ گیسٹ کے طور پر رہتا تھا۔ ... علاوہ بھی تین اور تھے جن میں ایک بنگالی...... ایک ... ستانی مسلمان اور ایک سیلونی تھا لیکن ہم ایک فیملی کی ... تھے جس میں وہ عورت کسی ماں کا کردار کرتی تھی...... ... جانے پر وہ کتنی دکھی تھی اور اس نے کہا تھا کہ جب ... کرو تو اپنی بیوی کو میرے پاس ضرور لانا۔

"اسے معلوم تو ہوگا کہ تم فریال سے شادی کرو گے۔"

"نہیں...... اس کا مجھ سے تعلق دنیا سے پوشیدہ تھا ... کہ وہ چودھری سلطان کی سخت نگرانی میں تھی...... ہم ایسے ... کر ملتے تھے کہ وہ بیماری کے بہانے ڈاکٹر شائستہ کے گھر ... تھی...... میں وہاں پہلے سے موجود ہوتا تھا۔ کار باہر کھڑی ... تھی اور فریال گیراج میں کھڑی شائستہ کی کار کی ڈکی میں ... جاتی تھی...... پھر اس کار کو شائستہ کا ڈرائیور لے کر نکل ... تھا...... فریال کو وہاں لانے والی کار کا ڈرائیور یہ دیکھتا تھا ... مطمئن رہتا تھا کہ فریال اندر ہی اپنی سہیلی کے ساتھ ہے۔ ... وہاں پہنچ جاتی تھی جہاں میں اس کا منتظر ہوتا تھا......"

"او مائی گاڈ...... آج یہ کتنا ناقابل یقین لگتا ہے......

ایک انتہا سے دوسری انتہا تک کا سفر...... خیر...... اب تم چاہو تو مجھے اپنے ساتھ لے جا سکتے ہو...... اپنی اس لینڈ لیڈی سے ملوانے......"

"کیوں نہیں...... تم دیکھنا وہ کتنی خوش ہوگی......"

بٹلر پھر ناک کر کے اندر آیا اور کافی کی ٹرالی چھوڑ کے نکل گیا...... میں نور کو لندن کے قیام کے پرانے واقعات سناتا رہا۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ نور کی پلکیں نیند سے بوجھل ہو رہی ہیں اور اس کے لیے آنکھیں کھلی رکھنا مجبوری بنتا جا رہا ہے...... اس کے برعکس میں کافی کے سبب بے حد مستعد ہوگیا تھا جو ایک خلاف معمول بات تھی کیونکہ عادی ہونے کے باعث میری نیند کافی سے خراب نہیں ہوتی تھی...... اسے شب بخیر کہہ کر میں نے بٹلر کو طلب کیا اور اس بیڈروم میں چلا گیا جو اب میرے لیے کھولا گیا تھا۔

مجھے کوئی اندازہ نہ تھا کہ اس محل میں کتنی خواب گاہیں ہوں گی۔ بظاہر یہ بھی انتہائی شاندار طریقے سے آراستہ بیڈروم تھا اور بہت صاف ستھرا بھی لیکن کسی چیز سے بھی یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ یہ پہلے کس کے استعمال میں رہا تھا۔

آدھی رات کے بعد سردی بڑھ گئی تھی چنانچہ میں نے کمبل کو سر تک لیا اور لائٹ آف کر کے سو گیا...... میری آنکھ لگی ہی تھی کہ پھر کھل گئی...... اچانک میں نے خود کو کمبل کے اندر عائشہ کے بازوؤں کی گرفت میں محسوس کیا...... میں نے خود کو چھڑانے کی کوشش ضرور کی...... لیکن وہ مجھ سے چمٹ گئی تھی۔

میں نے کہا۔ "عائشہ...... واٹ از دس...... چھوڑو مجھے۔"

"نہیں...... اس وقت میں نادان اور ناتجربہ کار تھی جب میں نے تمہیں چھوڑ دیا تھا...... اب نہیں چھوڑوں گی۔"

"کیا مطلب...... تم زبردستی کرو گی؟"

"ہاں...... اگر تم پیار سے نہ مانے...... تم نے کتنی زیادتی کی تھی میرے ساتھ یاد ہے؟"

"اور میں پھر بھی نہ مانوں تو؟"

"تم اتنے بے وقوف نہیں ہو...... تم یہ گھاٹے کا سودا نہیں کر سکتے...... یہ میرا بیڈروم ہے جہاں تم خود چل کے آئے ہو......"

میرا ماتھا ٹھنک ہوگیا۔ "تم نے...... سازش کی ہے؟"

"سازش نہیں ڈارلنگ...... محبت۔" وہ مجھے چومنے لگی۔

"عائشہ...... سوچو تمہارا شوہر آ گیا...... پھر......"

وہ ہنسی "شوہر...... باہر میرے گارڈ ہیں...... ویسے بھی دو مہینے سے مجھے نہیں معلوم کہ وہ اپنی راتیں کہاں گزارتا ہے...... تم نے مجھے بہت ٹھکرایا...... بہت ذلیل کیا اپنی

شرافت کے نام پر...... اتنی بے عزتی کس لیے برداشت کی تھی میں نے آخر...... تم سے شادی کے لیے اور تم مجھے چھوڑ کر چلے گئے...... لیکن میں تم سے اپنی توہین کا بدلہ نہیں لے رہی ہوں...... وہ حق مانگ رہی ہوں محبت کے نام پر...... جو تم نے کبھی نہیں دیا میرے بار بار مانگنے کے باوجود۔"

میں نے کہا...... "او کے...... آئی ایم سوری۔"

"کیا سوری...... اس ایک لفظ بول دینے سے اس تمام دکھ اور تذلیل کی تلافی ہوجائے گی جو میں نے صرف تمہاری محبت میں برداشت کی......" اب وہ باقاعدہ رو رہی تھی۔

میں نے نرمی سے کہا۔ "دیکھو عائشہ......"

"عائشہ تھی میں...... تمہارے لیے کچھ بھی بن سکتی تھی...... لیکن تم نے میرے جذبات کی قدر نہیں کی...... الٹا مجھے بلیک میل کیا...... کیا اتنی قربانی کوئی عورت دے سکتی ہے...... میرے جیسی لڑکی...... جس کے ایک اشارے پر جان قربان کرنے والے ہزاروں ہیں...... ایک سے بڑھ کر ایک خوبرو...... عالی نسب۔"

میں نے اسے پیار کیا۔ "اچھا اب رونا چھوڑو...... میں مانتا ہوں کہ ساری غلطی میری تھی...... میں نے بہت زیادتی کی تمہارے ساتھ...... لیکن اب تم کسی اور کی بیوی ہو۔"

"بیوی...... مائی فٹ...... نفرت کرتی ہوں میں اس جانور سے...... اور میری زندگی میں اب نفرت کے سوا کیا ہے...... میں اپنے آپ سے بھی نفرت کرنے لگی تھی...... پھر تم کیوں آئے اس پرانی محبت کی آگ بھڑکانے جو راکھ ہوچکی تھی...... میں فقط ایک لاش تھی جس کے کوئی جذبات نہیں ہوتے۔"

وہ نہ جانے کیا بول رہی تھی۔ اس کی وارفتگی میں شدت آتی جارہی تھی...... میں نے محسوس کیا کہ جو آگ اس کے اندر جل رہی تھی وہ مجھے بھی جلانے لگی ہے۔ یہ شاید ناممکن تھا کہ میں اس کی قربت سے متاثر نہ ہوتا...... یہ معاملہ جذبات کا نہیں جسموں کے اتصال کا تھا...... یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس عورت کی سازش کتنی مکمل تھی جس کے نزدیک اب اخلاقی قیود کا حیوانی خواہشات سے کوئی تعلق نہ تھا اور جو ہر قسم کی بھوک مٹانے کے تمام ذرائع کو اسی طرح قبول اور اختیار کرتی تھی جیسے کوئی جانور کرتا ہے۔

لیکن اس کے پاس ایک چالاک عورت کا عیار ذہن بھی تھا جو تعلیم یافتہ تھی...... بااختیار تھی...... کاروباری مکروفریب کو جانتی تھی...... اس نے مجھے قابو کرنے کے پلان میں ناکامی کے تمام راستے مسدود کردیے اور مجھے یوں پکڑا جیسے ماہر شکاری جنگلی خون آشام اور آدم خور شیر کو زندہ پکڑتا ہے...... اس نے کافی میں کوئی دوا ملا دی تھی جو وہی کام کر[...] تھی جو آگ لگانے میں ماچس کی تیلی کرتی ہے...... شاید اسے یقین تھا کہ ڈنر کے بعد میں کافی طلب کروں گا...... میں ا[...] کرتا تب بھی کافی آجاتی...... خود اس نے شراب کی جو بو[تل] خالی کردی تھی اس میں شراب بہت کم تھی...... اسے معلوم [تھا] کہ میں شراب کو ہاتھ بھی نہ لگاؤں گا...... وہ نشے میں مدہو[ش] ہوجانے کی صرف اداکاری کررہی تھی اور ڈنر کے بعد جلد[ی] اٹھ کے سونے چلی گئی تھی۔

یہ سب مجھے بعد میں معلوم ہوا جب میں ہار چکا [تھا]...... اس کے جذبات کے سیلاب میں ایک تنکے کی طرح بہہ [گیا] تھا...... بالآخر وہ جیت گئی تھی...... میری اخلاقیات کے ہاتھو[ں] اپنی خواہشات کی "تذلیل" کا بدلہ لے لیا تھا۔ ظاہر ہے غلطی میری تھی کہ میں نے اسے یہ موقع فراہم کیا تھا...... میں تصورات کی پرانی دنیا میں اسی عائشہ کو دیکھتا رہا تھا جو واقعی معصوم اور شریف تھی...... اپنی دنیا میں وہ اتنا بدل چکی ہوگی...... یہ میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔

جب میں جاگا تو وہ جاچکی تھی...... ایک شدید غصے اور جھنجلاہٹ کے احساس نے مجھے مغلوب کرلیا لیکن اب اس کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ حادثات ایسے ہی ہوتے ہیں اور جس مصیبت سے کوئی بچ سکے وہ حادثہ نہیں ہوتی...... اب دانش مندی کا تقاضا یہی تھا کہ میں اپنی شکست پر ندامت اور احساس جرم میں مبتلا رہنے کے بجائے جلد از جلد اس حصار سے نکل جاؤں جہاں میں نے خود کو نادانستگی میں قید کرلیا تھا۔

میں نہا دھو کے اور لباس بدل کے نکلا تو صبح کے دس بج رہے تھے...... اب میرے دل میں یہ ڈر پیدا ہوا کہ کہیں پرانی تذلیل کا بدلہ لینے اور مجھے اپنے ساتھ نور کی نظر سے گرانے کے لیے عائشہ نے گزری ہوئی رات کا "پرلطف" قصہ نور کو نہ سنا دیا ہو۔ وہ نور کے جذبات کی پروا کیوں کرے گی۔ وہ تو چاہے گی کہ میری بدمعاشی کو سب کے سامنے لائے...... اسے نہ شرم تھی اور نہ حیا...... وہ ثابت کرنے پر تلی ہوئی تھی کہ ایک زخم خوردہ ناگن کے مقابلے میں ایک ٹھکرائی جانے والی عورت زیادہ خطرناک ہوجاتی ہے۔

نور اپنے کمرے میں نہیں تھی...... اس وقت میں نے غور ہی نہیں کیا کہ اس کا سامان بھی موجود نہیں ہے...... میں سمجھا کہ جاگنے کے بعد اس نے کچھ دیر میرا انتظار کیا ہوگا اور پھر باہر باغ میں چلی گئی ہوگی یا عائشہ کے ساتھ ہوگی...... میری پریشانی اور بڑھ گئی جب میں نے باہر جا کے دیکھا اور نور کہیں نظر نہ آئی...... میں نے ایک بٹلر سے معلوم کیا تو پتا چلا کہ میڈم

[ا]لیشیا پارکر ابھی اپنی خواب گاہ سے باہر نہیں آئیں اور نہ انہوں نے بیڈ ٹی طلب کی ہے...... مطلب یہ کہ وہ سو رہی ہیں۔

میں چکر میں پڑ گیا...... میرا اس سے موبائل فون پر [ر]ابطہ نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ یہاں سروس کا مسئلہ تھا...... یہ ضروری [تھ]ا کہ ہم یہاں کی فریکوئنسی پر کام کرنے والے یا پھر یونیورسل [مو]بائل فون حاصل کریں...... ایک بار پھر میں نے اس کے [بیڈ]روم میں جا کے دیکھا کہ وہ واش روم میں ہوگی تو باہر آچکی [ہوگ]ی...... اسے موجود نہ پا کر میں نے ہیڈ بٹلر کو طلب کیا۔

وہ سپاٹ چہرے والا روبوٹ کی طرح نمودار ہوا۔

"یس سر؟"

میں نے کہا "میڈم نور جو یہاں تھیں...... کہاں ہیں؟"

"مجھے معلوم نہیں سر۔"

"اچھا معلوم کرکے مجھے بتاؤ...... فوراً۔" میں نے [ت]لخ لہجے میں اس کی بیزاری سے کہا۔

وہ گیا اور تقریباً پانچ منٹ بعد آیا۔ "میڈم نور نے ٹیکسی [ط]لب کی تھی...... وہ آٹھ بج کر بیس منٹ پر باہر گئی ہیں...... [گی]ٹ کیپر نے بتایا ہے۔"

یہ اطلاع میرے لیے ناقابلِ فہم تھی۔ بے شک نور کے لیے لندن بھی اجنبی شہر نہیں تھا اور وہ اکبر خان کے ساتھ تین [با]ر یہاں بھی آچکی تھی لیکن وہ لندن کے بارے میں کچھ نہیں [جا]نتی تھی...... جیسے میں جانتا تھا یا فریال جانتی تھی...... پھر مجھے [بت]ائے بغیر وہ کیسے باہر جاسکتی ہے...... کہاں اور کیوں۔

بٹلر کی موجودگی کا خیال کیے بغیر میں اٹھا۔ میں نے اس کی وارڈروب میں دیکھا...... یہ منظر میری نظروں کے لیے [ن]اقابلِ یقین تھا کیونکہ اندر کچھ بھی نہیں تھا...... نور اپنا سب سامان اپنے ساتھ لے گئی تھی۔

بٹلر بت بنا کھڑا تھا...... میں نے اسے کافی لانے کے لیے کہا اور صوفے پر بیٹھ کے ایک گلاس پانی پیا...... مجھے ٹھنڈے دماغ سے سوچنے کی ضرورت تھی کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے...... کیا نور کو کچھ معلوم ہوگیا تھا...... رات کسی وقت وہ میرے بیڈروم میں آئی اور اس نے کچھ دیکھ لیا یا سن لیا...... لیکن بیڈروم اندر سے لاک تھا۔ شاید باہر گارڈ بھی موجود تھا جیسا کہ عائشہ نے مجھے بتایا تھا۔

ایک امکان یہ بھی تھا کہ اس نے عائشہ کو میرے بیڈروم سے نکلتا دیکھ لیا ہو...... وہ گئی ہوگی صبح سویرے لیکن کیا پتا...... نور جاگ رہی ہو...... یا عائشہ نے خود اسے اپنے ساتھ ہونے والی زیادتی اور میری بدمعاشی کے بارے میں بتایا ہو اور پھر اپنے کمرے میں جا کے سو گئی ہو...... یقیناً ایسا ہی ہوا ہوگا۔

نور کا غصے میں مجھے کچھ بتائے بغیر نکل جانا یہی ظاہر کرتا تھا۔

سوال یہ ہے کہ وہ کہاں گئی ہوگی؟ لندن میں اسے کون جانتا تھا...... وہ ایک خاص مقصد لے کر یہاں آئی تھی...... اس نے شائستہ کا نام سنا تھا۔ شاید دو چار دن وہ کسی ہوٹل میں بھی گزارے...... یا کچھ نہ کرے، غصے میں واپس پاکستان لوٹ جائے......

لیکن ایسی باتوں کو میرا دل اس لیے تسلیم نہیں کرتا تھا کہ نور سے اتنے شدید احتجاجی ردعمل کی توقع نہیں تھی...... وہ تو محبت کے معاملے میں بار بار مجھے احساس دلاتی رہتی تھی کہ اسے نہ میرے ماضی کے کردار سے سروکار ہے نہ آج کے معاملات سے...... نہ اس کا کوئی مطالبہ ہے نہ شرط...... میں جس سے چاہوں تعلق رکھوں اور جس سے چاہوں شادی کرلوں...... وہ مجھ سے محبت کرتی رہے گی۔

بالآخر میں نے عائشہ کو جگا کے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ بٹلر میری بات سن کے غائب ہوگیا تھا اور پھر آدھے گھنٹے بعد نمودار ہوا۔ "میڈم ایلیشیا پارکر ناشتے کی میز پر آپ کی منتظر ہیں سر......"

ایک وسیع وعریض شاہانہ طرز کے ڈائننگ ہال کی طویل میز پر چھ فانوس روشن تھے اور آخر میں عائشہ اکیلی بیٹھی تھی...... اس کی شخصیت بالکل بدلی ہوئی تھی...... وہ انفارمل ڈریس میں تھی لیکن بہت تروتازہ اور خوش وخرم دکھائی دے رہی تھی...... اس نے مسکراتے ہوئے اٹھ کر میرا استقبال کیا۔

میں اس کے دائیں جانب والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے کچھ بولنے سے پہلے میں نے کہا۔ "عائشہ...... نور کہاں ہے......؟"

اس نے بڑے سکون سے حیرانی کا اظہار کیا۔ "نور......"

میں نے برہمی سے کہا۔ "وہ ٹیکسی میں کہیں گئی ہے۔"

"ٹیکسی میں...... اتنی گاڑیاں ہیں؟"

"لعنت تمہاری گاڑیوں پر...... وہ اپنا سامان بھی لے گئی ہے۔"

وہ سیریس ہوگئی۔ "رفیق...... یہ میں کیسے بتا سکتی ہوں...... میں ابھی سو کے اٹھی ہوں...... ویسے یہ کب کی بات ہے......؟"

"میرے سامنے معصوم مت بنو...... مجھے یہ تمہارے سازشی دماغ کی حرکت لگتی ہے۔"

"تم غصے میں ہو اس لیے سوچے سمجھے بغیر بول رہے ہو......"

"دیکھو عائشہ...... مجھے پتا چل جائے گا...... کیا تم نے

اس کو مشتعل کیا تھا...... اسے کچھ بتایا تھا؟''

''واٹ نان سینس...... کل رات کے بعد میں نے اس کی صورت نہیں دیکھی اور میں ایسی گھٹیا حرکت کیوں کرنے لگی؟''

''تم کچھ بھی کر سکتی ہو...... میں جانتا ہوں......'' میں نے اسے برا بھلا کہنے اور چیخنے چلانے سے گریز کیا کیونکہ میں بہر حال اس کے گھر میں تھا۔

وہ بدستور پرسکون رہی۔ ''اچھا آرام سے بیٹھ کے ناشتا کرو...... اگر وہ کہیں گئی ہے تو پتا چل جائے گا......''

''اور پتا چلنے تک میں کیا کروں......؟''

''اسے تلاش کرو...... یا اس کی واپسی کا انتظار کرو...... اور کیا کر سکتے ہو تم۔''

''میں یہاں ایک منٹ اور ٹھہرنا نہیں چاہتا......''

''میں زبردستی کیسے روک سکتی ہوں تمہیں...... اسے کرنا ہوگا تو تم سے رابطہ کرلے گی۔''

''کیسے......! ہمارے درمیان رابطے کا کوئی ذریعہ نہیں...... فون نمبر کوئی نہیں...... وہ لندن سے ناواقف ہے...... یا اسے تمہارا نام معلوم ہے...... یا ڈاکٹر شائستہ کا......''

''یہ ڈاکٹر شائستہ کون ہے......؟ اس سے پوچھ کے دیکھو......''

یہ بات میرے ذہن میں بھی آئی تھی لیکن مجھے نور کے ناراض ہونے یا لاپتا ہو جانے کے بارے میں شائستہ سے پوچھنا ہی عجیب لگ رہا تھا...... مجھے اندازہ تھا کہ اس کا ردعمل کیا ہوگا اور میرے ساتھ کتنی بداخلاقی سے پیش آئے گی...... اس کے غیر شائستہ رویے کے بارے میں نور بھی جانتی تھی۔ اس لیے وہاں جانے کا بھی کوئی امکان نہیں تھا۔

ایک گھنٹے تک میں نور کے خالی بیڈروم میں اٹھتا بیٹھتا اور لیٹتا رہا...... میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ انتظار کروں تو کس امید پر...... یہاں سے چلا جاؤں تو کہاں جاؤں...... بالآخر میں نے شائستہ کو فون کیا۔

میرا نام سنتے ہی اس نے کہا...... ''کیا تم لندن میں ہو؟''

''ہاں...... میں کل آیا تھا۔ دیکھو ڈاکٹر شائستہ...... میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔''

اس نے رکھائی سے کہا۔ ''لیکن میں تم سے ملنا نہیں چاہتی۔''

میں نے کہا۔ ''جو بات کہنی ہے میں فون پر نہیں کہہ سکتا۔''

''تو نہ کہو...... میں جاننا ہی نہیں چاہتی۔''

''پلیز فون مت بند کرنا...... میں ایک مشکل میں ہوں۔''

''یہ کون سی نئی بات ہے۔ تم مشکلات اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کے لیے بھی پیدا کرتے ہو...... آئی ایم سوری...... میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتی۔'' اس نے فون بند کر دیا۔

ڈاکٹر شائستہ کا یہ رویہ غیر متوقع نہیں تھا اور مجھے امید بھی نہیں تھی کہ نور اس کے پاس جا سکتی ہے لیکن روشنی نہ ہو تو اندھیرے میں آدمی کے بھٹکنے کی کوئی سمت نہیں ہوتی۔ عائشہ کے سکون اور اس معاملے سے لاتعلقی کے اظہار میں کوئی بات شک پیدا کرنے والی نہیں تھی۔ بس اس کے چہرے کی بشاشت میں اور اس کی مسکراہٹ میں فتح مندی کی شان تھی۔ وہ خوش تھی کہ اس نے بالآخر میری پارسائی کے غرور کو خاک میں ملا دیا اور اپنی توہین کا بدلہ لے لیا تھا۔

ایسا سوچنا عائشہ کی حماقت تھی۔ اس نے میری نظر میں اپنی عزت کا بھرم بھی گنوا دیا تھا...... آہستہ آہستہ ایک شک میرے دماغ میں جڑ پکڑ رہا تھا کہ ہو نہ ہو نور کے یوں جانے میں عائشہ کا دخل ضرور ہوگا۔ براہ راست نہ سہی بالواسطہ طور پر اس نے ہی کچھ کہا ہوگا ورنہ نور مجھے چھوڑنے والی نہیں تھی۔

بے چینی سے ٹہلتے، اٹھتے، بیٹھتے میرا ذہن ایک دائرے میں قید تھا...... عائشہ اچانک نمودار ہوئی ''ہوں۔ کچھ پتا چلا نور کا؟''

اس کے چہرے پر تشویش کے مصنوعی جذبات دیکھ کر یہ خیال میرے خیالوں کے اندھیرے میں بجلی بن کے چمکا کہ نور اپنی مرضی سے کہیں نہیں گئی...... اس پاگل عورت نے اسے غائب کرا دیا ہے...... مروانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن یہ ہو سکتا تھا کہ وہ کہیں قید ہو...... اسی محل کے کسی نامعلوم کمرے یا تہ خانے میں...... اور اس کا مقصد مجھے بلیک میل کرنے کے سوا کچھ نہ ہو...... اسے اندازہ ہوگا کہ صبح ہوتے ہی میں نور کے ساتھ اس کے گھر سے ہمیشہ کے لیے چلا جاؤں گا۔

وہ مجھے زبردستی نہیں روک سکتی تھی...... نہ قید میں رکھنے سے اس کا مقصد پورا ہوتا تھا...... ہاں نور کی بخیر و عافیت واپسی کی گارنٹی پر وہ مجھ سے سودا کر سکتی تھی۔ ''نور مل جائے گی...... لیکن جب میں چاہوں گی...... اور جب تک میں چاہوں گی تمہیں میرے ساتھ رہنا ہوگا...... میری خواہشات کی تسکین کا سامان بن کے۔''

میں چلتے چلتے بیٹھ گیا۔ ''عائشہ...... آخر تم کیا چاہتی ہو؟''

وہ میرے مقابل ٹک گئی۔ ''میں تمہیں چاہتی ہوں۔''

''تم زبردستی مجھ سے محبت کا اعتراف کراؤ گی۔ اسی طرح جیسے گزری رات کرایا تھا۔'' میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

''جو چیز مانگے نہ ملے۔ وہ چھیننی پڑتی ہے، زبردستی حاصل

کرنی پڑتی ہے۔ یہ تلخ سبق میں نے زندگی سے سیکھا ہے۔''

''تمہارے نمک خوار جھوٹ بول رہے ہیں نا؟''

اس نے سپاٹ لہجے میں کہا ''مجھے کیا معلوم......''

''نور ٹیکسی میں کہیں نہیں گئی، وہ اندر ہی ہے۔ تم نے اسے کہیں قید کر رکھا ہے۔'' میرا غصہ کنٹرول کرنے کے باوجود بڑھ رہا تھا۔

''تم چاہو تو پولیس کو بلا لو...... میرے خلاف رپورٹ درج کرا دو لندن کی پولیس بہت ہوشیار ہے...... وہ اسے تلاش کر سکتی ہے۔''

میرا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ عائشہ نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے مجھے چیلنج کیا تھا۔ اس کا چیلنج کھلا اعتراف جرم تھا۔ میرا بدترین اندیشہ درست ثابت ہوا تھا۔ اب نور اس کے اختیار اور قبضے میں تھا۔ اگر میں غصے میں اس کی گردن دبوچ لیتا یا چیختا چلاتا تو اس کے گارڈ کتوں کی طرح آتے اور مجھے دبوچ لیتے۔ پولیس لندن کی ہو یا کہیں اور کی، محض الزام پر کارروائی نہیں کر سکتی۔ میرے پاس نہ ثبوت تھے اور نہ گواہ کہ نور ٹیکسی میں باہر نہیں گئی۔ اس کے ڈرائیور کی بات کو سچ ثابت کرنے والے چشم دید گواہ بہت تھے۔ پولیس یہ تو کر سکتی تھی کہ نور کو تلاش کرنے کا وعدہ کرے لیکن یہ ناممکن تھا کہ اسے وہ ارسٹ مینشن میں سے برآمد کرے اور عائشہ کو گرفتار کرلے۔

''تم بہت محبت کرتے ہو اس سے؟'' عائشہ کے سوال نے مجھے چونکایا۔

''تم کو کیا لگتا ہے؟''

اس نے میرے سوال کو نظر انداز کر دیا۔ ''اتنی ہی جتنی مجھ سے کرتے تھے؟'' یہ میرے منہ پر جوتا مارنے کی بات تھی۔ ''تم اس کی رہائی کی شرائط بتاؤ۔'' میں نے پوچھا۔

''شرائط بہت آسان اور سادہ سی ہیں...... میں چاہتی ہوں کہ تم کچھ دن میرے مہمان رہو...... میری خوشی کے لیے۔''

''چند دن...... کتنے دن...... میں یہاں زیادہ دن کے لیے نہیں آیا تھا۔ مجھے ملک سے باہر جانے کی محدود اجازت ملی تھی۔''

''جھوٹ مت بولو...... تمہیں کس کی اجازت درکار ہے۔ تم ایک نواب ہو...... وہ جبر کر کے تمہیں واپس بلانے والے ماں باپ بھی نہیں رہے۔''

میں نے کہا۔ ''تم معلوم کرا لو...... مجھے ہائی کورٹ سے مشروط اجازت ملی ہے...... پندرہ دن کے لیے...... اور کچھ ضروری کام نہ ہوتے تو میں نہ آتا۔''

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ ''پندرہ دن...... ٹھیک ہے...... پندرہ دن بعد تمہیں وہ مل جائے گی؟ اگر تم نے کوئی غلط قدم اٹھایا تو نقصان اپنا کرو گے۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''یہ نہیں ہو سکتا......''

''ہو سکتا ہے...... تم دن میں اپنا کام کرو...... گاڑی تمہارے ڈسپوزل پر ہوگی...... جہاں چاہو آؤ جاؤ...... لیکن تمہاری ہر رات صرف میری ہے۔''

''پلیز عائشہ۔ مجھے نور کو ایک انسٹی ٹیوٹ میں داخل کرانا تھا۔ اس کی رہائش کا بندوبست کرنا تھا۔''

اس کا چہرہ بے رحمی سے سپاٹ رہا۔ ''وہ ایک دن کا کام ہے جو میں کرا دوں گی...... بس ایک بات کا خیال رکھنا اور اپنی اس نور کو بھی سمجھا دینا، میرا نام کسی کی زبان پر نہ آئے۔ ظاہر ہے ہم پھر نہیں ملیں گے۔ ہم نہ دوست ہوں گے نہ دشمن۔ میرے بارے میں تمہاری رائے کتنی خراب ہے...... اس کی مجھے پروا نہیں۔''

وہ اٹھی اور دروازے سے باہر نکل گئی...... دروازے میں رک کر اس نے سر گھمایا اور مسکرائی۔ ''میں آفس جا رہی ہوں...... رات کو ملیں گے...... بائی۔''

میرے اندر غصے اور نفرت کا ایک آتش فشاں بھڑک رہا تھا اور میرا دل تو یہی چاہتا تھا کہ میں عائشہ کی گردن دبوچ کے اپنے ہاتھوں کے شکنجے میں اس وقت تک دبائے رکھوں جب تک اس کے لبوں سے نور کا پتا ٹھکانا یا اس کی اپنی جان نہ نکلے لیکن بے بس کر دینے والے جذباتی ردعمل کی لہر عقل و ہوش کا بند توڑے بغیر گزر گئی تھی اور اب میرا دماغ اس صورت حال سے باہر آنے کا عملی حل تلاش کرنے میں مصروف ہو گیا تھا۔

میرے خیال کے مطابق عائشہ نارمل نہیں تھی لہٰذا اسے نفسیاتی علاج گاہ میں ہونا چاہیے تھا۔ ممکن ہے کہ وہ ہو...... ابھی مجھے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس کی یہ ذہنی کیفیت بہت زیادہ منشیات کے استعمال کا نتیجہ تھی یا اس کے دیگر اسباب تھے۔ متعدد دوست، دولت کی فراوانی۔ والدین کی حد سے بڑھی ہوئی محبت اور نگرانی کے خلاف بغاوت...... عیاشی پر مبنی بے اعتدالی کی زندگی...... اس سے نمٹنے کے لیے جوش سے نہیں ہوش سے کام لینا ہوگا ورنہ اس کا نقصان نور کو ہو سکتا تھا۔ کسی نہ کسی صورت مجھے نور کے ساتھ یہاں سے نکلنا تھا اور اس کے لیے عائشہ کی ہر شرط کے آگے سر تسلیم خم کرنا ضروری تھا۔

اس فیصلے نے مجھے اعتماد دیا۔ میں اپنا رویہ ہی نہیں چہرہ بھی بدل کے عائشہ کے پاس گیا۔ ''عائشہ...... کیا اب بھی تمہیں مجھ سے محبت ہے؟''

وہ ٹیرس میں اکیلی بیٹھی کچھ پی رہی تھی...... میرے سوال نے اور لہجے نے اسے کچھ حیران کیا۔ ”شاید میں پاگل ہوں کہ اب تک تمہیں دل سے نکال نہیں سکی۔“

میں اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ ”میں کیسے یقین کرلوں...... مجھے تو فریال بھی چھوڑ گئی، پھر ایک لڑکی تھی نور جہاں...... ان دونوں کے اپنے عزائم تھے جسے انہوں نے محبت کا نام دے رکھا تھا...... جب وہ پورے نہیں ہوئے تو وہ خود سے چھوڑ گئیں...... اب یہ نور ہے اس کو آزما کے دیکھو......“

”میں کیسے آزماؤں اور کیوں؟“

”اس سے کہو کہ وہ لوٹ کے پاکستان جانا چاہے تو جاسکتی ہے...... رفیق نہیں جارہا......“

”تمہارا خیال ہے کہ وہ چلی جائے گی؟“

”پتا چل جائے گا...... تمہیں بھی اور مجھے بھی...... شادی تم نے بھی کسی اور سے کرلی تھی......“

”لیکن اس کی محبت بھی فریب تھی...... اور اس نے کبھی میری محبت کی قدر نہیں کی...... کبھی نہیں۔“ وہ چلائی۔

میں کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ ”سنو...... اگر نور مجھے چھوڑ کے واپس چلی گئی، تو میں یہاں رک جاؤں گا...... تمہارے پاس۔“

”تم مجھے بے وقوف بنا رہے ہو۔“

”یہ بھی آزما لو، تمہارے پارکر سے علیحدگی کے بعد میں تم سے شادی کرلوں گا۔“

اس نے شیشے کا گلاس دیوار پر دے مارا۔ ”بکواس کرتے ہو تم...... کیا تم نے کہا نہیں تھا کہ تمہیں دو ہفتے میں واپس ضرور جانا ہے۔“

”میں ایک کیس میں ضمانت پر رہا ہوا تھا۔ یہ کورٹ کا آرڈر ہے لیکن میں واپس نہ جاؤں تو کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا...... میں برٹش نیشنل ہوں۔“

”کیس کیا ہے......؟“

”ایک مرڈر کا...... جو میں نے نہیں کیا، لیکن پاکستان میں انصاف کا عمل مختلف ہے۔ وہاں انصاف خریدا بھی جاسکتا ہے...... اگر مجھ پر الزام عائد کرنے والے زیادہ طاقتور ہوں گے تو مجھے سزا بھی ہوسکتی ہے ثبوت، شہادت، وکیل اور جج...... سب پھر وہیں ہوں گے جہاں پیسا۔“

وہ مجھے گھورتی رہی...... ”تم ایک جال بچھا رہے ہو۔ نور کے جاتے ہی تم مجھ پر تھوک دو گے۔“

”میں اس کے جانے سے پہلے ہی تم سے شادی کرلوں گا۔ اگر لندن میں رہنا ہی پڑے تو اس سے بہتر کیا ہوگا کہ میں اپنے پرانے جاب پر لوٹ جاؤں اور تمہارے یہاں رہوں۔ تم اس امکان پر غور کرنا...... ابھی مجھے جا[نا ہے] ایک کام سے......“

وہ ایک دم کھڑی ہوگئی۔ ”میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن تم آفس جارہی تھیں ہم پہلے وہاں چلیں......؟“

میں نے محسوس کیا کہ عائشہ ٹریپ ہو رہی ہے۔ ایک آزمائش ہے کہ میں کتنا ذہین ہوں۔ معاملہ فہم ہو[ں] خطرات کے حصار کو توڑ کر نکلنے کی کتنی صلاحیت رکھتا ہوں میرے مقابل ایک عورت ہے جو نارمل نہیں۔ محبت اور [جنگ] میں سب جائز ہے، مجھے نور سے محبت ہے اور عائشہ سے جنگ ہے...... پھر میں جائز ناجائز کے چکر میں کیوں پڑو[ں]

لارڈ ارسنٹ گزشتہ رات نہیں آیا تھا۔ مجھے گ[یسٹ] ہاؤس سے اپنے بیڈروم میں لانے کے لیے اس نے یہ جھ[وٹ] بولا تھا۔ میں عائشہ کے ساتھ اپنے پرانے آفس پہنچا تو پرا[نے] لوگ مجھے دیکھ کر بڑی گرمجوشی سے ملے۔ بہت سے پرا[نے] لوگ اب نہیں تھے لیکن سوشی مجھے دیکھ کے اتنی خوش ہوئی میرے گلے لگ کے رونے لگی...... جیسے وہ اپنے گم شدہ [بیٹے] سے پھر ملی ہو۔ اس کا نیک دل جاپانی شوہر بھی اتنی ہی شا[ن] سے ملا تھا۔

میری جگہ ایک متوسط عمر کا انڈین کام کر رہا تھا مدراسی تھا۔ عائشہ نے چٹکی بجا کے کہا۔ ”مسٹر کمار...... تم[ہارا] دشمن تمہاری جگہ لینے واپس آگیا ہے۔ ایک پاکستانی...... جاسکتے ہو۔“

وہ ہنسا اور اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ”میں ایسے ڈ[من] کا بہت شکر گزار ہوں جس نے تم سے میری جان چھڑائی۔“

عائشہ نے کہا۔ ”اتنی جلدی بدل گئے۔“

”دنیا ایسی ہی ہے مسز پارکر۔ کیا کریں...... جا[نے] سے پہلے میں آخری بار پھر پوچھ لوں، میرے ساتھ بھا[گ] کے انڈیا چلو گی۔“

اس ادارے کا ماحول آج بھی بہترین تھا تو یہ [سب] عائشہ کے باپ لارڈ ارسنٹ کی کوشش کا نتیجہ تھا۔ عائشہ [کے] کمرے میں پہنچ کر میں نے اگلی چال چلی۔ ”یہ سب اچھے لوگ ہیں۔“ میں نے حسرت سے کہا۔ ”یہاں ا[یک] مثالی ماحول ہے۔ کاش میں پھر یہاں آسکتا۔“

وہ خوش ہوئی۔ ”آسکتے ہو لیکن وہ ریاست جس [کی] خاطر تم سب کچھ چھوڑ گئے تھے۔“

میں نے کہا۔ ”حالات بدل گئے ہیں عائشہ۔ میر[ے]

[و]ہاں نہیں رہے جنہوں نے مجھے واپسی کے لیے مجبور کیا [ف]ریال نہیں رہی۔ میں کچھ دشمنوں کی وجہ سے مقدمات میں [پھن]س گیا ہوں۔ ریاست کہیں نہیں جاتی، میں اس کا منتظم بنا [ہوا] ہوں کسی کو...... کسی کے ہاتھ فروخت بھی کرسکتا ہوں۔ [کرو]ڑوں کے مول جائے تب بھی مجھے کیا، کئی ملین مل جائیں [گے]...... پاؤنڈز۔“

وہ ششدر رہ گئی۔ ”کتنے ملین؟“

میں نے سوچ کے کہا۔ ”چھ سے دس...... کھڑے [کھ]ڑے چھ اور کاروباری صبر کا مظاہرہ کروں تو دس بھی ممکن [ہیں]۔“

”تم تو واقعی مہاراجا ہو...... روایتی قسم کے۔“

”نواب مسلم ہوتے ہیں۔ مہاراجا ہندو۔ رتبے میں [کو]ئی فرق نہیں ہے۔“

”وہ تو ساتھ رکھتے ہیں...... کئی بیویاں اور کنیزیں۔“

میں نے ہنس کے کہا۔ ”وہ سب قصے کہانیوں کی باتیں [ہیں]۔ میں اسی طرح رہتا ہوں جیسے تم یہاں رہتی ہو۔ اچھا [سن]و۔ مجھے تمہاری ماں کو پھول ارسال کرنے ہیں۔“

اس نے ایک فون نمبر ملایا۔ ”لیڈی ارسنٹ کو مسز [رف]یق کی طرف سے پھول بھجوا دو۔“

آدھے گھنٹے بعد مجھے ایک ٹیلی فون کال موصول [ہو]ئی۔ عائشہ نے ریسیور میرے طرف بڑھا دیا۔ اس نے ماں [کی] خیریت تک دریافت نہیں کی۔ ”مدر......“

میں نے کہا۔ ”ہیلو لیڈی ارسنٹ...... آپ کیسی ہیں؟“

”رفیق...... پھولوں کے لیے شکریہ۔ کیا میں تم سے مل [سک]تی ہوں؟“

”کیوں نہیں۔“

”لیکن دیکھو...... عائشہ ساتھ نہ ہو۔ بہتر ہے اسے پتا [نہ] چلے۔“

میں نے کہا۔ ”یس میڈم۔“ اور فون بند کر دیا۔

میں سوشی سے ملنے کا بہانہ کر کے نکلا اور کچھ دیر اس کے [پ]اس بیٹھ کے باتیں کرتا رہا۔ عائشہ کام میں مصروف ہوگئی [تھ]ی۔ پھر بھی اس نے دو مرتبہ اندر جھانک کے اپنی تسلی کی۔ [ا]س کے تیسری بار آنے سے پہلے میں فرار ہوگیا۔ یہ فرار ہی تھا کیونکہ باہر آکے میں نے ایک ٹیکسی لی اور اسے اسپتال کا ایڈریس دیا۔ یہ اسپتال نہیں لاعلاج کینسر کے مریضوں کی آرام گاہ تھی جہاں ان کے آخری ایام کو زیادہ سے زیادہ پرسکون بنانے کی پوری کوشش کی جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہاں ملاقات کے اوقات کی پابندی لازمی نہیں تھی۔

لیڈی ارسنٹ کو میں نے ایک انتہائی آرام دہ ماحول میں بستر پر نیم دراز پایا۔ اس جان لیوا بیماری نے اس کے وجود کو ہڈیوں کا ڈھانچا بنا دیا تھا۔ اسے دیکھ کر خوف آتا تھا کیونکہ میں نے اس کے غرور اور تکبر کا وہ زمانہ بھی دیکھا تھا جب میرے جیسے کالے اور کمتر حیثیت والوں کے ساتھ اس کا سلوک ہتک آمیز ہوتا تھا۔

کرسی کو اس کے قریب کھینچ کر میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ”مجھے بہت افسوس ہوا آپ کی بیماری کا سن کے۔“

”کیوں؟ تمہیں کیوں افسوس ہوا جب اور کسی کو نہیں...... نہ میرے شوہر کو نہ میری بیٹی کو...... تمہیں تو میں نے بہت ذلیل کیا تھا۔“

”بھول جایئے وہ سب۔“

”نہیں۔ میں وہ بھول نہیں سکتی تھی۔ اسی لیے میں نے تمہیں بلایا تھا کہ تم سے معافی مانگ لوں۔ مرنے سے پہلے۔“

”پلیز ایسی باتیں نہ کریں...... مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں۔ آپ کی جگہ کوئی بھی ماں ہوتی...... ایسا ہی کرتی۔“

”وہ میری بہت بڑی غلطی تھی۔ میں نے ایش کی لائف کو اپنے کنٹرول میں رکھنے کی کوشش کی۔ وہ میری اکلوتی اولاد تھی نا۔ حد سے زیادہ لاڈ پیار اور حد سے زیادہ سختی کے باعث اس نے بغاوت کی۔ اگر میں اسے تم سے شادی کرنے دیتی تو شاید یہ نہ ہوتا۔ آج وہ مجھے معاف کرنے پر تیار نہیں۔“ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

”میں اسے سمجھاؤں گا۔“

”کوئی فائدہ نہیں۔ اس نے گھر چھوڑ دیا تھا۔ وہ آوارہ گردوں اور بدمعاشوں کے ساتھ رہی۔ منشیات نے اس کو تباہ کردیا۔“

”اس کی صحت اب پہلے جیسی نہیں رہی...... کیا اس کے ذہن پر بھی برا اثر پڑا تھا؟“

”وہ کبھی نارمل نہیں ہوگی۔ سارے ڈاکٹر یہی کہتے ہیں۔ اس کے دماغ کے ایک حصے کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا ہے۔ اس کی شخصیت مسخ ہوگئی ہے اور کبھی کبھی اسے دورے پڑتے ہیں۔ میں کیا بتاؤں۔ وہ ایک کتیا بن جاتی ہے...... بالکل کتیا...... جو کتوں کے پیچھے پھر رہی ہو۔ گلی کے کتوں کے پیچھے۔ ادھر سے وہ شیطان...... پارکر...... اس کا شوہر جو چاہتا ہے کہ میرے بعد ایش کا باپ بھی مر جائے تاکہ ایش اسے

طلاق دے تو وہ نصف اثاثوں کا مالک ہو جائے۔"

"لیکن ایش اسے چھوڑ رہی ہے...... بلکہ چھوڑ چکی ہے۔"

"کاش میں نے اسے تم سے شادی کرنے دی ہوتی۔ میں سمجھتی ہوں پھر یہ سب نہ ہوتا...... تم اسے سنبھال لیتے۔"

"اگر اب میں اس سے شادی کروں۔"

وہ مجھے پلکیں جھپکائے بغیر دیکھتی رہی۔"تم ایسا کیوں کرو گے؟"

"اگر میں کرنا چاہوں...... وہ آج بھی مجھ سے محبت کرتی ہے۔"

اس نے آنکھیں بند کرلیں۔"دنیا میں بہت کچھ ہوتا رہے گا۔ میرے مرنے کے بعد...... کسی کو مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ اب تم جاؤ اور میرے لیے کوئی فضول دعا مت کرنا کہ آپ ٹھیک ہو جائیں گی۔"

میں بوجھل دل کے ساتھ باہر آگیا...... مجھے احساس تھا کہ ایک مرتی ہوئی عورت کو میں نے اپنے پرفریب مقصد کے لیے استعمال کیا تھا۔ میرا کھیلا ہوا دوسرا پتا بھی اپنا کام کر گیا۔

جب میں واپس عائشہ کے آفس پہنچا تو اس کا موڈ سخت خراب تھا۔"تم کہاں بھاگ گئے تھے...... بتائے بغیر۔"

"بھاگا ہوتا تو واپس کیوں آتا۔" میں نے مسکرا کے کہا۔"شکی مزاج لڑکی۔"

اس بات کا بھی اچھا اثر ہوا۔ اس نے تیزی سے کہا۔"میرا مطلب تھا میں تمہیں لے جاتی...... یا شوفر پہنچا دیتا...... اگر ماں کے پاس جانا تھا۔"

"بس یہی میں نے آسان سمجھا۔ تم مصروف تھیں۔"

"ابھی ماں نے مجھے فون پر کہا بلکہ اس نے تمہاری تعریف کی۔"

"اب کیا فائدہ۔ وہ تمہارے میرے درمیان دیوار بن گئی تھی۔"

وہ مجھے دیکھتی رہی۔"تم نے اس سے کہا کہ تم اب بھی شادی کرنا چاہتے ہو مجھ سے...... یہ جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"تم کچھ بھی سمجھ سکتی ہو۔ میرے نزدیک ایک مرتی ہوئی عورت سے جھوٹ بولنا سب سے بڑا گناہ ہے۔"

"اب ہم لنچ کے لیے جا رہے ہیں۔" وہ کھڑی ہوگئی۔

ایسا نظر آتا تھا کہ میرے جھوٹ کا جادو اس پر اثر کرنے لگا ہے۔ ایک نامعلوم اسٹار ریسٹورنٹ میں لنچ کے دوران اس نے خود ہی کہا۔"تم اس لڑکی نور کے لیے پریشان ہو۔"

"ہاں...... مگر میری پریشانی کا زیادہ تعلق اس کی سیفٹی سے ہے۔"

وہ ہنس پڑی۔"وہ بالکل محفوظ ہے اور بہت آرام سے ہے۔"

"مجھے تم پر اعتبار کرنا ہی پڑے گا۔"

"لندن میں تمہیں اور کیا ضروری کام تھے؟"

میں نے کہا۔"ایک مسٹر وحید ہیں۔ میں اس کا صرف نام جانتا ہوں مجھے اس کا سراغ لگانا ہے۔"

میں نے اسے ٹینا کے بارے میں تفصیل سے بتایا تو وہ بہت ہنسی۔"یہ وحید نہ ملا تو ٹینا بھی تمہاری ایک بیوی ہوگی۔ تمہیں تو چار کی اجازت ہے نا۔"

"وہ نہ ملا تو یہ ایک اور وجہ ہوگی...... میرے واپس نہ جانے کی...... کیا تم اسے قتل کرا سکتی ہو؟"

"کرادوں گی...... تم تلاش کرو۔"

میں نے کہا"اوکے...... کیا یہ ممکن ہے کہ یہاں سے ہم ڈاکٹر شائستہ کے پاس جائیں...... یا تمہیں کام ہے کوئی؟"

"کام جائے بھاڑ میں، لیکن یہ ڈاکٹر شائستہ آخر ہے کیا بلا۔"

"تم دیکھ لوگی۔ وہ واقعی بلا ہے لیکن وہی ہے جو وحید کے بارے میں کچھ بتا سکتی ہے اور کوئی نہیں۔"

"اگر یہ بات ہے تو میں چلتی ہوں تمہارے ساتھ۔"

میں نے اپنی عزت کو داؤ پر لگایا تھا۔ یہ عین ممکن تھا کہ عائشہ کے ساتھ ڈاکٹر شائستہ مجھے بے عزت کرے یا مجھ سے ملنے سے ہی انکار کردے لیکن سب کی عزت رکھنے والا اللہ ہے۔ معلوم نہیں کیوں ایسا نہیں ہوا۔ شائستہ نے دروازہ کھول کے ایک نظر مجھے دیکھا پھر عائشہ کو اور پیچھے ہٹ گئی۔

میں نے کہا۔"آئی ایم سوری اگر میں نے تمہیں ڈسٹرب کیا اور بغیر بتائے آگیا یہ لارڈ ارسنٹ کی بیٹی عائشہ ہیں اور یہ ڈاکٹر شائستہ۔"

"میں جانتی ہوں۔" شائستہ نے سپاٹ لہجے میں کہا۔"کیا یہ نام اب بھی تمہاری ہونے والی بیویوں کی فہرست میں شامل ہے۔"

عائشہ نے کہا۔"یہ کیا کہہ رہی ہے؟"

میں نے اسے انگریزی میں بتا دیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ ہم عادت کے مطابق وہی زبان بولنے لگیں تو وہ برا نہ مانے۔

شائستہ نے کہا۔"تم ڈرتے ہو اس سے۔"

میں نے کہا۔"جو میں کہنا چاہتا ہوں...... اسے معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ کسی کی زندگی کا سوال ہے۔"

"کس کی زندگی...... نور کی...... مجھے یقین نہیں آتا تم اتنے خود غرض ہو سکتے ہو۔ فریال کی زندگی تباہ کر کے تم کس منہ سے میرے پاس مدد کے لیے آئے ہو؟"

میں نے کہا۔"مجھے پتا ہے کہ تم مجھ سے نفرت کرتی ہو میں کیا کروں۔ میں سب ذلت برداشت کرنے پر مجبور ہوں۔ پلیز کسی دن مجھے صرف آدھا گھنٹا دو، تم ایک ڈاکٹر ہو، زندگیاں بچاتی ہو۔ نور کو بچالو۔"

"مجھے جذباتی مت کرو۔"

عائشہ نے تنگ کے کہا۔"خدا کے لیے انگریزی میں بات کرو۔ یہ کیا بدتمیزی ہے۔"

میں نے کہا۔"سوری...... ڈاکٹر عائشہ...... مسئلہ ہے وحید کا۔ مجھے اسے تلاش کرنا ہے۔"

اس نے تلخی سے کہا۔"چھوڑو...... کرلو اس ٹینا سے بھی شادی۔"

عائشہ ہنس پڑی۔"یہی مشورہ میں نے دیا تھا۔"

میں نے کہا۔"شائستہ...... میں نے ایک درخواست کی تھی۔" اس نے سر ہلایا۔"میں سوچوں گی۔" اب اس کا لہجہ بہتر ہو گیا تھا۔

ہم وحید کے بارے میں بات کرتے رہے۔ درمیان میں ایک آدھ جملہ اردو کا آیا تو اس نے میرے سوال پر کہا۔"ٹھیک ہے...... کل صبح آجاؤ یا رات کو۔"

"کیا تم فریال کے بارے میں نہیں پوچھو گی؟"

"مجھے سب معلوم ہے جو تم نے کیا۔"

میں نے کہا۔"میرا موقف......"

"اب کیا فائدہ تمہارا موقف جاننے کا میں کافی لاتی ہوں۔"

یہ ملاقات بیس منٹ جاری رہی۔ شائستہ میں تھوڑی بہت پاکستانیت باقی تھی ورنہ لندن کے باسی بھی بن بلائے سے نہیں ملتے۔ میں مطمئن تھا کہ میں نے شائستہ کو رام کرلیا ہے اور عائشہ بھی اب پہلے سے زیادہ مطمئن ہے۔ شام کو واپسی پر میں نے پہلا کام یہ کیا کہ پاکستان میں رابطے کے لیے ایک موبائل فون کی سروس حاصل کی جس سے میرا راجا سے رابطہ بحال ہو گیا۔ ظاہر ہے عائشہ اس پر اعتراض نہیں کر سکتی تھی۔ خود میں نے راجا سے انگریزی میں بات کی۔

اس نے کہا۔"یہ تجھے کیا ہو گیا ہے فیکے پتر...... اتنی انگریزی...... تیرا ہاضمہ خراب ہو جائے گا...... دماغ تو پہلے ہی خراب لگتا ہے...... کوئی مجبوری ہے؟"

"بالکل ٹھیک سمجھا تو نے۔" میں نے پھر انگریزی میں جواب دیا۔

راجا نے بڑی ذہانت کا ثبوت دیا تھا۔"اچھا...... کون ہے تیرے ساتھ؟"

"میرے ساتھ عائشہ ہے اور اس میں مبالغہ کوئی نہیں۔ وہ اب پہلے سے زیادہ پرکشش ہوگئی ہے۔ ہاں اب وہ ایک مکمل عورت بنی ہے۔"

"اور نور...... کیا وہ ٹاپ ٹین چارٹ میں نیچے چلی گئی ہے؟"

"نور بالکل ٹھیک ہے اور بہت خوش ہے۔ وہاں کیا ہو رہا ہے؟"

"ہر جگہ وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ میں رات آٹھ بجے فون کروں گا جب وہاں ایک بجا ہوگا کوئی ایسا ویسا خواب دیکھنا ہو تو بعد میں دیکھنا۔" اس نے فون بند کر دیا۔

مجھے اندازہ تھا کہ رات ایک بجے ایسا ویسا خواب کیسی حقیقت کا روپ دھار چکا ہوگا اور اس وقت راجا سے بات ممکن ہی نہ ہوگی۔ تاہم میری اس گفتگو نے عائشہ کے مجھ پر اعتماد میں مزید بہتری پیدا کر دی تھی۔ اس سے میرا اعتماد بھی بڑھا کہ میں نے کوشش جاری رکھی تو عائشہ مجھ پر یقین کرنے لگے گی کہ شاید وہ مجھے متاثر کرنے میں کامیاب ہوگئی ہے۔ میں تو ہوں بے وفائی کا عادی...... فریال کے بعد نور کو چاہنے لگا تھا لیکن اب پھر عائشہ کی طرف پلٹ رہا ہوں۔

عائشہ کے اتنی جلدی غلط فہمی میں گرفتار ہونے کے متعدد اسباب تھے۔ ایک یہ کہ دنیا کی ہر عورت خود کو سب سے حسین سمجھتی ہے اور کوئی سمجھائے تو فوراً مان لیتی ہے کہ ایسا ہی ہے۔ نور کو دیکھ لینے کے باوجود عائشہ یہ تسلیم کرنے پر راضی نہ تھی کہ وہ نور کے سامنے کچھ نہیں۔ وہ رئیس زادی ہونے کے ساتھ گوری چمڑی کے غرور میں بھی مبتلا تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ میں نے نور کے لیے وہ پریشانی ظاہر نہیں کی تھی جو کوئی اپنی محبوبہ کے لیے کرتا ہے یا جو میں فریال کے لیے کرتا تھا۔ اب تو میں اس کا ذکر بھی نہیں کر رہا تھا چنانچہ عائشہ سمجھنے لگی تھی کہ میری جذباتی وابستگی کی جڑیں زیادہ گہری نہیں۔

اس کے ساتھ میں نے عائشہ میں دلچسپی ظاہر کی تھی۔ پہلے مجبوری کے تحت...... پھر اپنے طور پر اس کی ماں کے سامنے اور شائستہ کے سامنے اور راجا سے بات کرتے ہوئے بھی...... اسے یقین آ رہا تھا کہ ایک رات میں مجھ پر اس کا جادو چل گیا ہے اور میں ولایتی بوائے فرینڈ کی طرح نور کو "ڈچ" کر کے اس کی طرف آ سکتا ہوں۔

آخری وجہ میرے حالات کا حوالہ تھی۔ میں نے کہا تھا کہ میرے لیے ریاست کو چھوڑ کے پھر لندن آنا اب ناممکن نہیں۔ اس رات کھانے سے پہلے اور کھانے کے بعد میں نے

ان تمام مشکلات اور مسائل کا ذکر کیا جو مجھے درپیش تھے۔ میں کیا کرنا چاہتا تھا۔ اس کی مخالفت کون کر رہا تھا اور کیوں...... اب تک مجھ پر کتنی بار قاتلانہ حملے ہوئے تھے...... کتنی بار مجھے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی تھی...... سیاسی دشمنی میں میرے حریف کس انتہا تک جا چکے تھے...... یہ سب اس نے بے حد حیرانی اور خوف کے ساتھ سنا۔

''کیا تم پاگل ہو...... کہ اس کے باوجود یہ سب کر رہے ہو؟''

''میں اور کیا کروں...... وہاں سیاست ایسی ہی ہے۔''

''لعنت بھیجو سب پر...... تم کو اپنی جان کی فکر نہیں؟ مارے جاؤ گے تو سب ختم ہو جائے گا۔''

''میرے آنے کا ایک مقصد ان امکانات کا جائزہ لینا بھی تھا۔''

''جائزہ کیسا...... تم کیا اجنبی ہو؟ پہلی بار آئے ہو...... تم برٹش نیشنل ہو سویٹ ہارٹ...... اور کوالیفائڈ ہو...... مزید یہ کہ دولت مند ہو...... تم اپنی دولت کو یہاں انویسٹ کر سکتے ہو۔ یہ ضروری نہیں لیکن تم میرے پارٹنر بھی بن سکتے ہو۔''

کچھ دیر بعد میں نے فریال کا ذکر چھیڑ دیا کہ اس پر وہاں کیا بیتی...... مجھ سے الگ ہو کے وہ شوبزنس میں گئی تو کیسے استحصال کا شکار ہوئی...... اس پر قتل کے کیس بن گئے اور بالآخر اسے دبئی فرار ہونا پڑا...... ایسا ملک ہے وہ جہاں تم میرے ساتھ جا کے رہنا چاہتی تھیں۔

''مگر تم رہ سکتے ہو میرے ساتھ...... پہلے بھی رہ سکتے تھے۔''

میں نے کہا۔ ''پچھلی باتیں چھوڑو...... قسمت اسی کا نام ہے۔ جب جب جو جو ہونا ہے تب تب وہ وہ ہو جاتا ہے۔'' میں نے اسے ایک اردو فلم کا مقبول ڈائیلاگ ترجمہ کر کے سنایا۔

''تم نور کو کتنا چاہتے ہو؟'' اس نے اچانک سوال کر دیا۔

''کتنا؟ میں ناپ تول کے کیسے بتاؤں؟''

''ایک میں...... ایک فریال...... ان کے مقابلے میں؟''

میں نے سوچ کے کہا۔ ''دراصل فریال کے بعد وہی تھی جس نے مجھے جذباتی سہارا فراہم کیا۔ میں اس سے اٹیچ ہو گیا۔ تم سے یا فریال سے اس کا کوئی مقابلہ نہیں...... آف کورس فریال نمبر ون تھی...... مگر نمبر ون نہ ہو تو نمبر دو کی طرف پسندیدگی کا رخ موڑنا ایک فطری بات ہے۔''

وہ خوش ہو گئی۔ اس رات بھی عائشہ نے پی اور مجھے بھی پلانے کی کوشش کی۔ مجبوری میں حرام بھی حلال ہے اس نظریے کو استعمال کرتے ہوئے میں نے تھوڑی سی پی لی لیکن میں مدہوش ہونا افورڈ ہی نہیں کر سکتا تھا۔ عائشہ نے اسے ایک اور کامیابی جانا۔ آج تھوڑی پی ہے...... کل زیادہ پیو گا...... ضد کی دیوار تو اس نے گرا دی۔

فائدہ مجھے یہ ہوا کہ صبح وہ خمار شب میں مدہوش پڑی تھی جب میں خاموشی سے اٹھا اور باہر نکل گیا۔ لباس بدل کے میں نے ناشتا کیا اور پھر موبائل فون دیکھا۔ اس میں گزشتہ رات راجا کے علاوہ رابعہ کی مس کال بھی تھی۔ ناشتے کے بعد میں نے گاڑی طلب کی جو فوراً حاضر ہو گئی۔ آٹھ بجے میں شائستہ کے گھر جانے کے لیے نکل گیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ ابھی دو گھنٹے تک عائشہ کے اٹھنے کا کوئی امکان نہیں۔ گاڑی میں بیٹھ کے میں نے راجا کا نمبر ملایا۔ اب میں آزادی کے ساتھ اردو میں بات کر سکتا تھا۔ میں نے اسے وہ سب کچھ بتا دیا جو نور کے اور میرے ساتھ ہوا تھا اور ہو رہا تھا۔

وہ سخت مشتعل ہوا لیکن میں نے اسے روک دیا۔ ''کچھ مت کر...... میرا خیال ہے کہ میں نے معاملات پر کنٹرول حاصل کر لیا ہے۔''

''یہ خاک کنٹرول ہے...... تجھے کیا پتا نور کہاں ہے...... زندہ ہے بھی یا نہیں؟''

''وہ میں پتا کر لوں گا۔ ایک دو روز کی بات ہے۔ اس معاملے میں ڈاکٹر شائستہ ہی میری مدد کر سکتی ہے...... اگر نور نے کوئی راستہ نکالا تو وہ شائستہ کو فون کرے گی۔''

''فریال کو یا مجھے کیوں نہیں کر سکتی؟''

''راجا...... میں لوکل فون کی بات کر رہا تھا۔ وہ پیغام دینا چاہے لندن میں کسی کو...... تو یہاں صرف ڈاکٹر شائستہ ہے...... اگر پاکستان والا موبائل اس کے پاس ہوا تو وہ بیکار بے کار ہے...... لیکن اس میں ڈاکٹر شائستہ کا نمبر ہو سکتا ہے...... وہ فریال کی سیکریٹری کی حیثیت سے کام کر چکی ہے...... ہاں ایک کام تو کر سکتا ہے۔''

''میں بہت غصے میں ہوں فیکے پتر...... عائشہ کو قتل بھی کر سکتا ہوں۔''

''تو فریال کو فون کر...... اس سے کہہ کہ اپنی سہیلی کو حقیقت بتائے...... یہ بتائے کہ میں نے اور نور نے اس کی کتنی مدد کی تھی۔ اب شائستہ میری مدد کرے۔''

''غالباً یہ کام وہ کر چکی ہے۔ اس نے فون پر مجھے بتایا تھا کہ اس کی شائستہ سے بات ہوئی تھی کہ وحید کی تلاش کے معاملے میں وہ تیری مدد کرے۔''

''نور کی تلاش کا معاملہ مختلف ہے۔ وہ نور کی دشمن ہو رہی ہے...... فریال کی وجہ سے۔''

''ٹھیک ہے...... میں اس سے بات کرتا ہوں۔''

گاڑی اس وقت تک ڈاکٹر شائستہ کے گھر کے سامنے رک گئی تھی۔ ''مجھے معلوم تھا تم صبح صبح پہنچ جاؤ گے...... [illegible]ی ہے ساتھ؟''

''نہیں...... میں جان چھڑا کے نکلا ہوں۔''

''ناشتا کیا ہے؟'' اس نے غیر متوقع شرافت کا مظاہرہ کیا۔

''کر لیا ہے...... لیکن کیا تم مجھے کچھ وقت دو گی؟ مجھے معلوم ہے تم مجھے سخت ناپسند کرتی ہو...... پہلے بھی کرتی تھیں لیکن اب تو [illegible] وجہ ہے میری شکل بھی دیکھنا تمہیں گوارا نہیں۔''

''پرانی بات مت کرو۔'' وہ میرے مقابل بیٹھ گئی۔

''پرانی نہیں...... یہ کل کی بات ہے۔ تم نے فون بند کر...... فریال کے مسئلے پر تم بے حد جذباتی ہو اور سو فیصد [illegible]روار سمجھتی ہو۔''

''اب تمہیں اپنی صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔''

''ضرورت کیسے نہیں۔''

''مجھے فریال نے فون پر بتا دیا ہے...... اس نے کہا کہ [illegible]ید کی تلاش میں تمہاری مدد کروں...... ظاہر ہے میں نے [illegible] ہا اڑا کہ تم اب بھی اس شخص کے لیے نیکی کے جذبات [illegible]...... وہ کسی وحید کے لیے نہیں نور کے لیے پریشان [illegible] پاگل ہو رہا تھا...... جس کے ساتھ وہ لندن پہنچا تھا۔''

''پھر اس نے کیا کہا؟''

''اس نے پوچھا کہ نور کو کیا ہوا ہے...... میں نے کہا کہ [illegible] معلوم...... وہ کہہ رہا تھا کہ اس کی زندگی اور موت کا [illegible]ہے...... وہ کچھ پریشان ہوئی کہ ایسا کیا مسئلہ بن گیا...... [illegible] اس سے بات کرو...... میں نے پوچھا کہ تمہیں اس سے ہمدردی ہے...... پھر اس نے مزید تفصیل سے بتایا...... [illegible]ی تھی کہ نور نے میری بہت مدد کی...... آخری وقت...... وہ میری پراپرٹی کی فائلیں اور زیورات نکال کرلانے [illegible] گئی تھی اور خود مشکل میں پھنستے پھنستے رہ گئی تھی۔''

''کیا اس نے بتایا کہ نور اس کی سیکریٹری بن کے رہی...... اور فریال دبئی جانے سے پہلے اپنے زیورات اسے [illegible] دے گئی تھی؟''

شائستہ نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''فریال نے کہا تو...... [illegible]ین کرنا پڑا۔''

''یہ کب کی بات ہے؟''

''کل تمہارے آنے سے کچھ دیر پہلے کی۔''

''اوہ...... یہی وجہ تھی تمہارے کل صبح کے اور شام کے [illegible] فرق کی۔''

اگلے دس منٹ تک میں نے اپنے نقطہ نظر سے فریال کے بارے میں بتایا کہ وہ مجھے چھوڑ کے کیوں گئی تھی اور بعد میں اس کے ساتھ جو ہوا اس کی اپنی بے وقوفی سے ہوا۔

''وہ سب مجھے معلوم ہے...... تم اپنی بات کرو...... یہ نور کون ہے؟ جو تمہارے ساتھ لندن آئی ہے...... کیا یہ ٹھیک ہے کہ اب تم اس سے شادی کر رہے ہو؟''

''تم بھی یہ تفصیل چھوڑو۔ جتنا تمہیں فریال نے بتایا ہے وہ کافی ہے۔''

''لیکن کل اس میم کے ساتھ تمہارا جو رویہ تھا؟''

''وہ مجبوری تھی میری...... میں یہی بتانے آیا ہوں۔ وہ ایک ذہنی مریض بن چکی ہے۔'' میں نے کہا۔

شائستہ نے بڑی توجہ سے میری ساری بات سنی۔ میں نے اس سے کچھ نہیں چھپایا۔ وہ بھی جو ہو چکا تھا یا جو ہو رہا تھا...... اور وہ بھی جو میں کرنا چاہتا تھا۔

اس نے میری بات ختم ہونے کے بعد کہا۔ ''جب تمہارے خیال میں پولیس کچھ نہیں کر سکتی...... تو میں کیا کر سکتی ہوں؟''

''ہاں...... یہی ہے اصل سوال...... میرے اندازے کے مطابق نور کو موقع ملا تو وہ فریال کو فون کرے گی...... اور تمہارا نمبر اس کے پاس ہوا تو تمہیں...... اگر وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوئی کہ کسی کو اپنے ساتھ ملا کے پیغام پہنچائے۔''

''میرے خیال میں اس کا امکان بہت کم ہے۔''

''میں کوشش کر رہا ہوں...... کہ اس پاگل عورت پر محبت کا جادو چل جائے۔ ایک دم میں ایسا نہیں کر سکتا۔ اسے شک ہو گا...... لیکن وہ اپنے شوہر کو طلاق دے رہی ہے...... آج کل میں قانونی طور پر ان کی علیحدگی ہو جائے گی...... تب تک میں اسے یقین دلا دوں گا کہ میں نے پٹڑی پھر بدل لی ہے۔''

''اس کا یقین وہ کر لے گی؟''

''ہاں...... کیونکہ تمہاری طرح وہ بھی سمجھتی ہے کہ میں ایسا ہی ہوں...... محبت کسی سے بھی کرتا...... ٹائم پاس کرتا ہوں...... آج اس کے ساتھ کل کسی اور کے ساتھ۔''

''یہ کیا غلط ہے...... پہلی کا نام تو فریال کو بھی یاد نہیں۔ تھی کوئی یونیورسٹی میں جس سے تم نے شادی بھی کر لی تھی۔ وہ مر گئی یا مار دی گئی تو فریال...... پھر نور جہاں اور اب نور۔''

''تم نے عائشہ کا نام مس کر دیا۔ نور پانچویں ہے۔ تمہاری مرضی ہے جو چاہو سمجھو...... عائشہ وہی ایلیشیا ہے اس کے لیے یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ وہ پھر عائشہ بھی بن سکتی ہے...... میرے لیے...... یہاں گرل فرینڈ اور بوائے فرینڈز بدلتے

رہتے ہیں...... میں اسے یقین دلا سکتا ہوں کہ نور کے لیے میرے جذبات بدل گئے ہیں...... میں پھر عائشہ کے عشق میں گرفتار ہو گیا ہوں...... ایسا کبھی نہیں تھا مگر وہ سمجھتی ہے کہ تھا...... نور کو چھڑانے کا یہی طریقہ کارگر ہوتا نظر آرہا ہے...... کہ میں عائشہ سے شادی کرلوں۔"

وہ تقریباً اچھل پڑی۔ "شادی......"

"شاید مجھے شادی کرنی پڑے...... اس کے بغیر وہ نہ مانے۔"

"اور بعد میں کیا ہوگا؟" وہ تلخی سے بولی۔

"وہ نور کو بتائے گی کہ رفیق نے مجھ سے شادی کرلی ہے۔ ظاہر ہے نور اتنی جلدی یقین کرنے والی نہیں ہے۔ وہ روئے گی پیٹے گی لیکن میری شرط ہے کہ نور کو جانے دو...... اب تمہیں اس سے کوئی خطرہ نہیں...... اگر نور کا فون تمہارے پاس آئے...... تمہیں کوئی پیغام ملے...... یا وہ فرار ہو کے تمہارے پاس پہنچنے میں کامیاب ہو جائے تو اسے سب سمجھا دینا...... اور کہنا کہ ابھی وہ پاکستان لوٹ جائے۔"

"اور وہ مان جائے گی؟"

"میرے کہنے سے عائشہ نے اسے رہا کیا تو وہ راجا کو فون کرے گی۔ فریال کو بتائے گی یا تمہارے پاس آئے گی...... نور کو وہی کرنا ہے جو میں کہہ رہا ہوں...... میں عائشہ سے اسلامی طریقے کے مطابق نکاح کروں گا...... اسے پھر مسلمان بنا کے۔"

"یہاں قانونی رجسٹریشن بھی ضروری ہوتی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔ ادھر نور واپس گئی...... ادھر میں اسے طلاق دے دوں گا۔ ہمارے فقہ کے مطابق تین بار طلاق کہنے سے طلاق ہو جائے گی۔ رہ جائے گا قانونی معاملہ کیونکہ میں برٹش نیشنل بھی ہوں۔ وہ جائے عدالت میں...... مجھ سے کیا لے گی...... میرے کون سے اثاثے ہیں یہاں...... اور موقع ملتے ہی میں بھی بھاگ جاؤں گا...... اس وقت تک میں وحید کو بھی تلاش کرلوں گا۔"

"لیکن تمہارے پاس مہلت نہیں ہے۔"

"عدالت نے مجھے ایک مہینے کی اجازت دی تھی۔ میں نہ گیا تو کیا ہوگا؟ میرے وارنٹ جاری ہو جائیں گے لیکن مجھے امید ہے کہ اس سے پہلے ہی میں نکل جاؤں گا...... وہ مجھے کیسے روک سکتی ہے۔"

"تم جانتے ہو یہ گناہ ہے...... اور جرم بھی۔"

"فضول باتیں مت کرو...... جو میرے ساتھ اور نور کے ساتھ ہو رہا ہے کیا وہ شرافت ہے...... نیکی ہے؟" میں بھڑک اٹھا۔ "کاش میں اسے قتل کرسکتا۔"

خاموشی کے ایک طویل وقفے کے بعد شائستہ [illegible]

"ٹھیک ہے اگر ماہ نور میرے پاس آئی یا مجھے پیغام [illegible] میں اسے سمجھا دوں گی کہ اسے کیا کرنا ہے۔"

یہ میرے لیے بڑے اطمینان کی بات تھی حالا[illegible] اس پلان کی کامیابی پر خود بھی یقین نہیں تھا۔ کوئی بات [illegible] میری توقعات کے خلاف ہوسکتی تھی۔ میں باہر آیا تو [illegible] مجھے اطلاع دی۔ "میڈم آپ کے بارے میں پوچھ رہی [illegible]"

"پھر...... کیا بتایا تم نے؟"

"میں نے کہا کہ آپ وہیں آئے ہیں جہاں [illegible] کے ساتھ آئے تھے۔"

"او کے...... اب ہم واپس جائیں گے۔"

خلاف توقع عائشہ میرے جانے کے ایک گھنٹے [illegible] گئی تھی اور وہ یقیناً اس فکر میں مبتلا ہوئی ہوگی کہ میں فر[illegible] ہوں جبکہ میرے لیے یہ ناممکن تھا۔ گزشتہ روز میں نے [illegible] آ کے اپنا اعتبار قائم کرلیا تھا۔ شوفر سے فون پر میرے [illegible] میں معلومات حاصل کر کے اسے کچھ اطمینان ضرور حا[illegible] ہوگا کہ فکر کی بات کوئی نہیں۔

جب میں واپس پہنچا تو وہ ناشتے سے فارغ [illegible] گارڈن میں بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی چلائی۔ "ایسے چلے جاتے ہو بنا بتائے؟"

میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ "کیا اپنی مرضی سے میں کہیں نہیں جا سکتا؟"

"نہیں...... میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ دراصل [illegible] پریشانی ہوتی ہے...... خیر میں ایک اچھی خبر سنانے کے تمہاری منتظر تھی۔"

"پھر انتظار کیسا...... سنا دو۔"

"اسی ہفتے میں مجھے پارکر سے چھٹکارا مل جائے [illegible] میں آزاد ہو جاؤں گی۔"

میں نے اسے مبارک باد پیش کی۔ "وہ مجھے پھر نظر [illegible] آیا...... کیا وہ پہلے ہی چلا گیا ہے؟"

"وہ اتنا شریف نہیں ہے۔ پوری قیمت وصول [illegible] کے نکلے گا یہاں سے...... اور جوتے کھا کے...... کیا تم خ[illegible] نہیں ہو؟"

میں نے کہا۔ "تمہاری خوشی ہی میری خوشی ہے۔"

"دیکھو...... اب فیصلہ کرلو...... تم واپس جا رہے [illegible] نہیں؟ میں نے ڈیڈ سے بات کرلی ہے۔"

"کس بارے میں؟" مجھے کچھ پریشانی ہوئی۔

"تمہاری پرانی پوزیشن سے بہتر پوسٹ تمہارے لیے [illegible]ے اور اگر تم بعد میں ایک بزنس پارٹنر کی حیثیت سے [illegible]کرتے ہو تو تمہیں برابر کا درجہ ملے گا۔"

[illegible]میں نے سوچ کے کہا۔ "مجھے کچھ ٹائم چاہیے...... یہ اتنا آسان نہیں ہے...... فرض کرو میں تمہارے سامنے [illegible]یک شرط رکھ دوں؟"

"کیسی شرط؟"

"یہی...... کہ اگر تم میرے ساتھ رہو گی تو میں لندن [illegible] سکتا ہوں؟"

اس کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا "اور کس کے ساتھ [illegible]گی۔"

"لیکن ایسے نہیں۔"

"پھر کیسے...... تم بتاؤ۔" وہ ہنسی

میں نے کہا۔ "تم جانتی ہو، میرے مذہب میں اور [illegible]رے اپنے ضابطۂ اخلاق میں یہ غلط ہے۔"

"تمہیں بھروسا نہیں ہے مجھ پر......؟" اس نے اٹھلا [illegible] اپنا ہینڈ بیگ مجھ پر دے مارا۔ "تم میرے ساتھ زندگی [illegible]ارنا چاہتے ہو؟"

"یہ فیصلہ تمہیں کرنا ہے۔"

"یعنی تم کر چکے ہو......؟ کیا تم مجھے پروپوز کر رہے [illegible]" وہ چلائی۔

"کرسکتا ہوں...... لیکن میں شرائط کا حوالہ دوں گا تو [illegible]یں ناگوار گزرے گا۔"

"مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔ مجھے معلوم ہے تمہاری [illegible]ظ کیا ہوں گی۔ اوہ رفیق...... تم نہیں جانتے میں کتنی خوش [illegible]۔ بالآخر میں نے تمہیں پالیا۔" وہ اٹھی اور مجھ سے چمٹ گئی۔

یہ عورت جذباتی طور پر ہی نہیں عقلی طور پر بھی مفلوج ہو چکی [illegible]۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ کامیابی اتنی جلدی میرے قدم چومے [illegible]۔ میں جو کچھ کر رہا تھا نور کی جان بچانے کے لیے کر رہا تھا۔

میں نے عائشہ کو اظہارِ الفت کے بعد بٹھا دیا۔ "جلدی [illegible]ت کرو۔ تم ہی سوچو۔ انہیں شرائط نہ کہو۔ خوشگوار ازدواجی [illegible]گی میں محبت تو آج کی طرح سنسنی خیز اور جوان رکھنے کا [illegible]سولا سمجھو۔"

میرے ڈائیلاگ نے اس کو بلڈوز کر دیا۔ وہ تو سب [illegible]ہ جلد از جلد چاہتی تھی لیکن میں نے خود سے کہا۔ دھیرج [illegible] پتر...... سلو اینڈ اسٹڈی ون دی ریس...... دوڑو گے تو [illegible]ر بھی لگ سکتی ہے۔ آہستہ قدم اٹھاؤ۔ میری اس پالیسی کا [illegible]مد عائشہ کے صبر کو آزمانا تھا۔

یہ حکمت عملی میں نے اس رات اختیار کی۔ میں اس کی پیاس بڑھاتا رہا لیکن اسے پانی نہیں دیا۔ وہ ایسا ظاہر کرتی رہی جیسے مر جائے گی لیکن مری نہیں...... وہ پیتی رہی، میں نے نہیں پی۔ میں نے اپنا پیار جتانے میں سارا زورِ بیان صرف کر دیا اور صبح ہوتے ہوتے اس سے اپنی ہر بات منوالی۔

اب میں نور کی طرف سے زیادہ بے فکر اور مطمئن ہو گیا تھا۔ وہ خود عائشہ کے لیے ایک نئی زندگی کی صبح تھی...... یا کم سے کم وہ ایسا سمجھنے لگی تھی۔ اس نے عہد کیا تھا کہ آج ہی وہ میرے ساتھ کسی مسجد میں جائے گی جو وہاں اسلامک سینٹر کہلاتی تھی اور دوبارہ اسلام قبول کرے گی...... پھر اس کا اعلان بھی اخباروں میں شائع کرائے گی۔ پارکر سے طلاق کا سرٹیفکیٹ ملتے ہی وہ پہلے مجھ سے نکاح پڑھوائے گی اور ہم قانونی رجسٹریشن کے لیے اپلائی کر دیں گے۔ نکاح کے فوراً بعد وہ نور کو ڈاکٹر شائستہ کے گھر پہنچا دے گی۔ میرے اندازے کے مطابق دو دن میں ایسا ممکن تھا۔ عائشہ کو یقین آ چکا تھا کہ میرے ارادے میں ایک فیصد بھی کھوٹ نہیں۔ اسی دن دوپہر کو وہ میرے ساتھ گئی اور اس نے ایک مولوی کے سامنے کلمہ پڑھ کے اسلام قبول کرلیا اور اس کا نام پھر عائشہ ہو گیا۔ وہیں سے اس نے میرے ساتھ جا کے یہ اعلان اخبار میں اشاعت کے لیے بھی دیا۔

ایک مایوس کن خرابی کی خبر نے بھی اس کی خوشیوں پر اوس ڈالی۔ اسے معلوم ہوا کہ پارکر کی غیر حاضری کے باعث طلاق کی کارروائی مکمل نہ ہوسکی۔ اس نے بیماری کے عذر پر تین دن کی تاخیر مانگی تھی اور اس کے دستخطوں کے بغیر فیصلہ ممکن نہیں تھا۔

عائشہ سخت خفا ہوئی۔ اس نے پارکر کو تلاش کرنا چاہا۔ میں نے اسے ٹھنڈا کیا۔ "تم کہاں دیکھو گی۔ اس کا کچھ پتا ہے۔"

"نہیں...... وہ آدھی رات تک ایک نیگرو ڈانسر کے ساتھ ہوتا ہے...... پھر اسے لے کر یہیں آتا ہے...... کہتا ہے میری سیکریٹری ہے...... لیکن مجھے سب معلوم ہو جاتا ہے۔ وہ بلیک پسی کہلاتی ہے۔"

میں نے سرسری دلچسپی سے کہا۔ "اس وقت بھی وہیں ہوگا وہ...... اسی ڈسکو میں۔"

"تم دیکھنا چاہتے ہو؟" اس نے پوچھا اور جواب سنے بغیر شوفر کو حکم دیا کہ گاڑی موڑ لے۔

میرا کسی ایسے ڈسکو میں جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ یہ نہیں کہ میں کوئی بہت پاکباز تھا...... اصل بات یہ تھی کہ عائشہ کے ساتھ میرا وہاں جانا قطعی مناسب نہیں تھا۔ میں نے صرف ڈسکو کا نام پتا دیکھا اور ڈرائیور کو آگے بڑھنے کے لیے کہا۔

''کیوں...... اس کتے کی اوقات نہیں دیکھو گے......''
میں نے کہا ''دیکھنا ضروری نہیں...... اور تم جیسی شریف خاندانی عورت کا اس قحبہ خانے میں کیا کام، میں پھر دیکھ لوں گا۔''
وہ مسکرائی۔ ''بدمعاش...... اکیلے آؤ گے یہاں۔ تم سب مرد ایک جیسے ہی ہوتے ہو۔ خیر مجھے کیا۔''
میں نے کہا۔ ''ڈارلنگ میں لندن میں چار سال گزار کے گیا تھا۔ یہ بلیک پسی یا ڈارک کیٹ جیسی لڑکیاں بہت دیکھی ہیں میں نے۔ میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ کیا وہ شخص پاگل ہے۔ جس نے جنت کی حور چھوڑ کے ایک بدشکل چڑیل اپنے لیے پسند کی۔ میں تو اس کا شکریہ ادا کروں گا۔''
وہ حیرانی سے ہنسی۔ ''شکریہ کس بات کا۔''
''اس نے چھوڑا تو تم مجھے ملیں۔''
عائشہ میرے بھرّے میں آ گئی۔ اس کا دماغ ایک طرف کا دل خوش کرنے والے منظر میں گم تھا۔ وہ مشکوک اور اندیشوں کے خوف سے ایسے ہی اندھی ہو رہی تھی۔ جیسے پہاڑی وادی کے منظر میں گم شخص جسے علم ہی نہ ہو کہ پیچھے سے سانپ سرکتا ہوا اس تک پہنچ گیا ہے۔ میں عائشہ کو چھوڑ کر لوٹ گیا تو اسے ذرا بھی شبہ نہیں ہوا کہ وہ کوئی خطرہ مول لے رہی ہے۔ میں ایک چانس لے رہا تھا اور اس اصول کو آزمانے کے چکر میں تھا کہ دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے۔ وہ جگہ کسی بھی بدنام نائٹ کلب جیسی ہی تھی۔ اندر کان پھاڑ دینے والا شور تھا۔ بڑے بڑے اسپیکرز پر فاسٹ ڈرم بیٹ والا کوئی گانا بج رہا تھا۔ فضا میں چرس اور دیگر گھٹیا منشیات والے سگریٹوں کا دھواں بھرا ہوا تھا۔ حسب توقع مجھے ایک شریفانہ حلیے کے باعث دربان نے ہی روک دیا تھا لیکن میں سابقہ تجربے کی بنا پر ایسی رکاوٹیں عبور کرنا جانتا تھا۔ میں نے کہا ''میں کسی ''کوپ'' (پولیس مین) کے ساتھ بھی آ کے اپنی نابالغ بہن کو لے جا سکتا ہوں مگر یہ بہتر ہے۔'' میں نے اس کے ہاتھ میں ایک پونڈ کا نوٹ پکڑا دیا۔
بلیک پسی اسٹیج پر تھی۔ اس کا ٹاپ لیس آئٹم چل رہا تھا۔ ایک رنگین مزاج عیاش گنجے بوڑھے شخص نے میرے ہاتھ مار کے کہا۔ ''اصل کچھ دیر بعد ہوگا۔'' میں سمجھ گیا کہ اصل میں وہ رہی سہی کسر پوری کرے گی۔ میری خوش قسمتی سے درمیان کا وقفہ فوراً ہی آ گیا۔ جس میں وہ اسٹیج کے پیچھے غائب ہو گئی۔ ایک شخص اس کے پیچھے لپکا۔
میں نے بار کاؤنٹر پر شراب سرو کرنے والی ویسی ہی دوسری لڑکی سے پوچھا۔ ''کیا یہ پارکر تھا۔''
اس نے مجھے آنکھ ماری۔ ''اور کون ہو سکتا تھا...... لیکن تمہارے لیے میں ہوں اگر تم چاہو...... آٹھ بجے کے بعد''
اس نے ایک کاغذ کے پرزے پر لکھا۔ ''مجھے ایش نے بھیجا ہے۔'' اور اس سے کہا۔ ''آٹھ بجے دیکھوں گا...... یہ لو۔'' میں نے اسے ایک پونڈ اور وہ کاغذ کا پرزہ تھما دیا۔ ''پارکر کو پہنچا دو۔''
وہ کچھ حیران ہوئی مگر سر ہلا کے اندر چلی گئی۔ جب پھر نظر آئی تو اس کے پیچھے پارکر تھا۔ لڑکی نے میری طرف اشارہ کیا تو وہ ٹکر مارنے والے بیل کی طرح میری طرف بڑھا۔ ''یہ تم نے بھیجا تھا۔'' اس نے غرا کے پرزہ لہرایا۔
''مسٹر پارکر...... مجھے تمہاری مدد درکار تھی۔ کیا تم مجھے صرف دس منٹ دے سکتے ہو کہیں باہر۔''
''جو کہنا ہے یہاں کہو۔''
''یہاں بات کرنا مشکل ہے۔ دیکھو مجھے غلط مت سمجھو۔ میں عائشہ کے نہیں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں بھی اس سے نفرت کرتا ہوں اور سخت مصیبت میں ہوں۔''
وہ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا۔ پھر میرے ساتھ چل ''میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔''
باہر نکلتے ہی وہ دیوار سے ٹیک لگا کے کھڑا ہو گیا۔ ''ائرپورٹ پر ملے تھے۔''
''ہاں...... لیکن اب معلوم ہوا ہے کہ تم اس پاگل سے شادی کر رہے ہو۔''
میں نے کہا۔ ''غلط...... میں پھنس گیا ہوں۔ اس نے مجھے یرغمال بنا لیا ہے۔ ایک لڑکی مجھ سے پہلے آئی تھی، نور، وہ میری گرل فرینڈ تھی۔ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اسے کہیں غائب کر دیا۔ معلوم نہیں کہاں...... اب کہتی ہے پہلے مجھ سے شادی کرو...... ورنہ اس لڑکی نور کی خیر نہیں۔ میں سخت پریشان ہوں کیونکہ وہ واقعی پاگل ہے۔ ایسا کر سکتی ہے اور میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔''
میں دیکھ رہا تھا کہ پارکر کو دلچسپی پیدا ہو رہی ہے۔ ''اگر ایسا ہے تو تم جا سکتے ہو۔''
''نہیں جا سکتا۔ وہ نور کو مار دے گی۔ مجھے یقین ہے۔''
''اپنے یقین کے بارے میں پولیس کو بتا دو۔''
میں نے اسے عملی مشکلات سے آگاہ کیا۔ ''پلیز مسٹر پارکر...... میری مدد کرو۔ اس کے بدلے تم جو کہو گے میں کروں گا۔''
''لیکن میں کیا کر سکتا ہوں مسٹر؟''
''رفیق......'' میں نے کہا ''تم اتنا عرصہ ایش کے قریب تھے۔ اس گھر کے اندر آج بھی ہو۔ میں بھی پہلے اس طرح نہیں رہا...... تم کچھ اندازہ لگا سکتے ہو کہ نور کو اس نے کہاں قید کیا ہوگا۔''

کہاں رکھا ہوگا......اسے وہ قتل تو نہیں کرسکتی۔"

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ "قتل کرنا ممکن ہوتا تو میں اس......کو نہ مار ڈالتا......لیکن تمہاری بات سچ ہے تو میرے لیے موقع ہے۔"

"میری بات کتنی سچ ہے، تم دیکھ لوگے۔"

"میں اس...... سے بدلہ لے سکتا ہوں اپنی ذلت کا۔ مجھ سے زیادہ اس گھر کے کتے کی عزت ہے۔"

"میں سمجھتا ہوں۔ میرا انجام بدتر ہوسکتا ہے لیکن نور مجھے مل جائے تو میں آزاد ہوجاؤں گا۔ پھر وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔"

"ایک جگہ آتی ہے میرے ذہن میں......تمہاری گرل فرینڈ وہاں ہوسکتی ہے۔ اس کی ایک فیری ہے۔ لگژری بوٹ ہاؤس......وہ ٹیمز میں بہتا رہتا ہے۔"

میں نے بے چینی سے کہا۔ "نام بتاؤ اس کا۔"

"نام جان کے تمہیں وہاں داخلے کا حق حاصل نہیں ہوسکتا۔" وہ بولا "اسے چلانے والا ایش کا خاص آدمی ہے اور وہ مسلح ہوتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "میں اس سے نمٹ لوں گا۔"

"وہ خالی ہاتھ بھی خطرناک ہے۔"

"اگر ابھی تک اس نے اپنے سے زیادہ خطرناک آدمی نہیں دیکھا تو تم مجھے دیکھ لو، وہ آدمی میں ہوں۔"

وہ مجھے دیکھتا رہا۔ "اس کا نام ہے سلور ڈولفن۔ تم جا کے دیکھ لو۔" وہ پلٹا "اب میں جاؤں گا ورنہ وہ بگڑ جائے گی......وائلڈ کیٹ بن جائے گی۔"

میں اس کے پیچھے دوڑا۔ "یہ سلور ڈولفن آخر ٹیمز میں کہاں ملے گی؟"

"تم کو ایک چھوٹی موٹر بوٹ کرائے پر لے کر تلاش کرنا پڑے گا۔" وہ پلٹ کر بولا اور اندر غائب ہوگیا۔

اس کی بات درست تھی۔ ٹیمز لندن کے بیچوں بیچ بہتا تھا۔ اس کے نہ جانے کتنے پل تھے۔ اگر میں کنارے کنارے پھرتا اور دوسری کشتیوں پر معلوم کرتا تب بھی یہ کام آسان نہ ہوتا...... مجھے کئی دن لگ جاتے۔ رات کے وقت ٹیمز کی سطح آب پر رواں چھوٹی بڑی کشتیوں، لانچوں، موٹر بوٹس اور اسٹیمرز کے نام پڑھنا اور بھی دشوار تھا۔

اچھی بات یہ ہوئی کہ میں خالی جیب نہیں تھا۔ میں نے ایک کرنسی ایکسچینج ڈیلر سے پانچ لاکھ روپے کے برٹش پاؤنڈز اور اتنی ہی رقم کے ڈالرز حاصل کرلیے تھے جو ایک ایک لاکھ کے ٹریولرز چیک کی صورت میں میرے پاس محفوظ تھے۔ ابھی تک میں نے ایک کو کیش کرایا تھا اور یہ رقم خرچ کے لیے میری جیب میں تھی۔ پاؤنڈز مالیت کے لحاظ سے ڈالر سے بھی بڑا تھا چنانچہ ایک لاکھ روپے کے بدلے ملنے والے ہزار کچھ اوپر پاؤنڈز کے نوٹ بہ آسانی ساتھ رکھے جاسکتے تھے۔

لندن میں کسی بھی اجنبی کا سب سے اچھا دو[ست و] مددگار ایک "بوبی" ہوتا ہے جسے ہم پولیس والا......ٹلا[...] جانے کیسے کیسے پُرتحقیر ناموں سے بلاتے ہیں......سارا[...] پولیس کے رویے کا ہے۔ عملاً لندن کی پولیس عوام کی [...] ہے اور ان کے ذاتی کام تک کرتی ہے۔ ان کی خد[مت] گزاری کے ان گنت واقعات کا میں خود شاہد تھا۔ ا[یک] خاتون نے جہاز میں سوار ہونے کے بعد پیغام دیا کہ میں استری آن چھوڑ آئی ہوں۔ کہیں آگ نہ لگ جائے پولیس نے بروقت کارروائی کی۔ اپارٹمنٹ میں جاکے اس[ے] آف کی اور پھر خاتون کو پیغام دیا کہ پریشان نہ ہوں۔ استری آف کردی گئی ہے۔ ایک خاتون نے ائرپورٹ [سے] کہا کہ میری بہن مجھے لینے نہیں آئی اور کال بھی کوئی ر[یس]پانس نہیں کررہا ہے۔ میں اجنبی ہوں کہاں جاؤں؟ مقامی پو[لیس] فون نمبر سے خاتون کی بہن کے گھر پہنچی۔ وہ بہن کی آمد [کی] تاریخ اگلے دن سمجھ رہی تھیں اور مزے سے سو رہی تھیں۔ آکے اسے لے گئیں۔ یہی نہیں، پولیس نے پھر کنفرم کیا [کہ] بہن گھر پہنچ گئی یا ابھی تک ائرپورٹ پر بیٹھی ہے۔

یہ صرف ایک دو مثالیں تھیں......اسی اعتماد کی بنا پر [میں] نے ایک پولیس مین سے رجوع کیا۔ اس نے میری پوری بات بڑے تحمل سے سنی اور پھر مجھے تفصیل سے سمجھایا کہ میں اس تک بہ آسانی کیسے پہنچ سکتا ہوں۔ چونکہ میں نے یہ [...] ضروری نہیں سمجھا تھا کہ میرے پاس بہت پیسے ہیں اس۔ آخر میں یہ ہوا کہ مجھے پولیس کی ایک لانچ ساتھ لے گئی... ان کے پاس سرچ لائٹس بھی تھیں......مشکل سے ایک گھ[نٹے] میں انہوں نے اشارہ کرکے بتادیا "یہ ہے وہ کشتی۔"

ٹیمز میں سینکڑوں کشتیاں تیر رہی تھیں اور کسی کی کوئی جگ[ہ] بھی مقرر نہ تھی۔ ایک خاص مقصد کے تحت سلور ڈولفن کو بہ[ت] آگے اور سب سے الگ کھڑا کیا گیا تھا۔ جب پولیس کی لا[نچ] قریب پہنچی تو کسی نے اوپر سے غرا کے کہا "کیا بات ہے؟"

پولیس مین نے کہا "کوئی تم سے ملنے آیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "مجھے ایش نے بھیجا ہے۔ ایک خاص پیغام کے ساتھ۔"

وہ کچھ دیر بعد بولا۔ "اوکے......آجاؤ اوپر......"

میں نے پولیس کا شکریہ ادا کیا اور اوپر جاکے کہا۔ "آپ لوگ اب جاسکتے ہیں۔ میں خود واپس چلا جاؤں گا۔" پولیس کی لانچ واپس ہوگئی مگر مختصر سے عرشے [...]

[ک]ھڑے ہوئے چھ فٹ قد کے سانڈ جیسے مضبوط نیگرو نے کہا۔ "مجھے پہلے ایش سے کنفرم کرلینا چاہیے تھا۔"

میں نے کہا "یہ تم نے واقعی غلطی کی۔" اور بڑی پھرتی سے ہاتھ مارا۔

اس نے جو موبائل نکالا تھا وہ سیدھا پانی میں گیا۔ اس نے غرا کے کہا۔ "یو باسٹرڈ......کون ہو تم۔" اور مجھے مکا مارنے کے لیے ہاتھ گھمایا۔ میں ایک دم غوطہ مار گیا اور پھر بیل کی طرح اس کے پیٹ میں گھس گیا۔ وہ پیچھے جا گرا۔ اس کا سر خاصی قوت سے تختے پر لگا تھا لیکن وہ پھرتی سے اٹھا۔ اس نے مجھے دبوچنے کے لیے حملہ کیا تو میں بیٹھ گیا اور وہ اوپر آیا تو میں نے دوسرا مکا بڑی نازک جگہ پر مارا۔ وہ بلبلا گیا اور درد سے دہرا ہوگیا......اس کے گرتے ہی میں نے اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ پھر اسے گھسیٹ کر نیچے لے گیا۔

نیچے جانے والا راستہ دو بار گھوما۔ یہ تین فٹ چوڑا زینہ تھا......اس کی سائڈ کی دیواروں پر میں نے صرف ایک بار اس کا سر بالوں سے پکڑ کے ٹکرایا تو وہ نیم بے ہوش ہوگیا۔ اس کے پاس اسلحہ ہوتا تو وہ ضرور نکالتا۔ ظاہر ہے اسے اپنے جسم کی طاقت اور مار پیٹ کی مہارت پر بڑا ناز تھا۔

یہ تقریباً ساٹھ فٹ لمبی فائبر گلاس کی بنی ہوئی کشتی تھی جس کی اوپر والی منزل پر صرف ایک کیبن تھا۔ وہاں سے شاید کشتی کو کنٹرول کیا جاتا ہوگا۔ باقی کھلا عرشہ تھا جس پر میں نے خوبصورت کرسیاں اور سوکے سن باتھ لینے والے بیڈ دیکھ لیے تھے...... نیچے میرے اندازے کے مطابق چار کیبن تھے۔ دو دائیں طرف......دو بائیں طرف۔

"تم......آخر تم کیا چاہتے ہو......کون ہو تم۔"

میں نے اسے پیروں پر کھڑا کردیا۔ "سوال میں کروں گا......تم صرف صحیح جواب دوگے ورنہ میں آسانی سے تمہاری گردن توڑ کے جان نکلنے سے پہلے تمہاری لاش پانی میں گرادوں گا...... بعد میں کیا ہوگا، اس کی فکر مت کرنا......کیا اس کشتی پر کوئی لڑکی ہے؟"

"میں......میں نہیں بتا سکتا......ایش مجھے نکال دے گی۔"

میں نے اس کے پے درپے پنچ رسید کیے یہاں تک کہ اس کے منہ سے خون نکلنے لگا۔ "میں تمہاری جان نکال دوں گا......اور خود دیکھ لوں گا۔"

اس نے اقرار کیا سر ہلایا "ایک لڑکی ہے......کوئی انڈین......ایش نے کہا تھا اسے چھپا کے رکھو۔ میرے سوا کسی کو پتا نہیں ہونا چاہیے۔"

چند منٹ بعد اس نے ایک کیبن کا لاک کھول دیا۔

دروازہ کھلتے ہی میں نے نور کو دیکھا۔ وہ ہاتھ منہ پر رکھے بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اس نے یہی سمجھا ہوگا کہ دروازہ کھولنے والا اس کا جیلر ہے۔ مجھے بھی اس سے کارروائی کا ڈر تھا جو وہ میری غفلت سے فائدہ اٹھا کے کرسکتا تھا۔

میں نے اسے پلٹ کے دیوار سے لگا دیا۔ "تم ہلے تو جان سے ماردوں گا۔"

میری آواز پر نور یوں اچھلی جیسے کیبن میں شیر کے دھاڑنے کی آواز سن لی ہو۔ پھر وہ چیخ مار کے دوڑی اور مجھ سے گولی کی طرح ٹکرائی۔ میرے کچھ کہنے یا سنبھالنے سے پہلے ہی وہ بیہوش ہوکے میری بانہوں میں جھول گئی۔ کالے سانڈ نے سر گھما کے یہ منظر دیکھا تو میں نے اسے گھورا۔ "میں ہڈیاں توڑنے کا ماہر ہوں......بھولنا مت۔"

وہ سیدھا ہوگیا تو میں نے نور کو پھر بیڈ پر لٹا دیا۔ بظاہر اس کی صحت ٹھیک ہی تھی۔ چند دن میں کوئی تبدیلی آئی تھی تو اس کے چہرے کی آب و تاب میں......اس کی آنکھوں کے گرد گہرے حلقے بے خوابی کے مظہر تھے۔ یقیناً اس نے کھانا پینا، سونا، منہ دھونا سب چھوڑ رکھا ہوگا اور اپنا زیادہ وقت رونے میں صرف کرتی ہوگی یا دہشت زدہ کرنے والے خیالات سے لڑنے میں۔ اس کا سارا سامان وہیں موجود تھا۔

کمرے میں پانی تھا۔ میں نے کوشش کی تو کچھ دیر میں نور کو ہوش آگیا۔ وہ اٹھی اور مجھ سے چمٹ کر پھر رونے لگی۔ اس کا جسم بری طرح کانپ رہا تھا۔ "رفیق...... مجھے لے چلو......یہ میں کہاں پھنس گئی۔"

میں نے اسے پیار کیا اور تسلی دی۔ "بس اب میں آگیا ہوں تو سب ٹھیک ہوجائے گا۔ خود کو سنبھالو جان...... پھر ہم چلتے ہیں۔"

"اس نے ایسا کیوں کیا آخر......تم تو بڑی تعریف کرتے تھے اس کی۔ بہت بھروسا تھا تمہیں۔"

میں نے کہا۔ "ابھی نہیں......بتاؤں گا یہ سب بھی پہلے اٹھو اپنی حالت کو ٹھیک کرو۔"

وہ ایک دم کھڑی ہوگئی۔ "چلو، میں تیار ہوں......لیکن ہم وہاں نہیں جائیں گے، اس ڈائن کے پاس۔"

محافظ سانڈ کو خاک سمجھ میں آتی......ہم اردو میں بات کررہے تھے تاہم وہ یقیناً حیران تھا اس سے زیادہ پریشان تھا۔ "ریوالور ہوتا تو میں تمہیں شوٹ کردیتا۔"

میں نے کہا۔ "بعد میں لے لینا......ایش کو شوٹ کردینا۔ میری طرف سے اجازت ہے۔ کشتی تم چلاتے ہو؟"

"لیکن میں تمہارے باپ کا ملازم نہیں ہوں۔"

میں نے کہا۔ ''یہ چوائس تمہارا ہے...... جیل جاؤ گے یا کشتی چلاؤ گے۔ تم نے ایک غیر ملکی اور ایک برٹش نیشنل کو حبس بے جا میں رکھا۔ ابھی پولیس تمہیں پکڑ کے لے جائے گی۔ ہم تو کنارے پر پہنچ ہی جائیں گے۔''

بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے پندرہ منٹ میں ہمیں ایک کنارے پر اتار دیا۔ ''میں ایلش سے کیا کہوں۔''

''وہی جو سچ ہے۔'' میں نے کہا ''یہ جھوٹ سے بہتر رہے گا۔''

شوفر مجھے بلیک پسی کے نائٹ کلب تک لایا تھا وہ ابھی تک میری واپسی کے انتظار میں اسی جگہ موجود تھا۔ میں اور نور ٹیکسی سے اترے اور اسی گاڑی میں جا بیٹھے۔ میرے جانے اور آنے میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹا لگ گیا تھا۔ اس کے سپاٹ چہرے سے بالکل اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ تشویش میں مبتلا ہے یا نہیں...... وہ سمجھ رہا ہے کہ میں اندر ہی ہوں یا اس نے مجھے کہیں آتے جاتے دیکھا ہے۔

میں نے اسے حکم دیا۔ ''ہم پہلے جائیں گے ڈاکٹر شائستہ کے یہاں، جہاں کل صبح بھی گئے تھے۔''

اس نے ''یس سر'' کہا اور گاڑی کو شائستہ کے گھر لے گیا۔ میں نے نور سے کہا۔ ''اب تم بالکل مت گھبراؤ...... شائستہ سب سنبھال لے گی۔''

نور نے صاف انکار کر دیا۔ ''میں کسی پر بھروسا نہیں کر سکتی۔''

میں نے کہا۔ ''اچھا یہاں اترو۔ یہاں سے ٹیکسی لے کر کسی ہوٹل میں چلی جاؤ...... میں اپنا نمبر دے رہا ہوں۔ فون کر کے مجھے بتا دینا۔''

''سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں تمہارے ساتھ رہوں گی۔ خواہ کچھ بھی ہو جائے۔''

''دیکھو۔ مجھے صرف اپنا سامان لانا تھا وہاں سے...... ہمارے کپڑے، پیسے۔''

''لعنت بھیجو ان پر۔'' نور چلائی۔

''وہی بھیج دیا۔ اب آؤ میرے ساتھ۔'' میں نے ہار مان کے کہا۔

نقصان زیادہ سے زیادہ پیسے کا ہو سکتا تھا لیکن وہ بھی میں بینک کو فون کر کے بتا سکتا تھا۔ مجھے نئے ٹریولر چیک مل جاتے...... راجا مجھے مزید رقم بھیج دیتا۔ مسئلہ پاسپورٹس کا بن جاتا لیکن نور کا پاسپورٹ اس کے سامان میں تھا اور میرا اپنی جیب میں...... اسے اتفاق ہی کہا جا سکتا تھا کہ جب نور کو ارسنٹ مینشن سے اٹھا کے کشتی میں قید کیا گیا تو اس کا مختصر سا اسباب بھی نکال دیا گیا۔ اس میں کم سے کم پچاس لاکھ کے زیورات تھے۔ ان میں فریال کے دیے ہوئے زیورات بھی تھے۔ یہ سب سوچ کے میں نے بھی نہ جانا بہتر سمجھا حالانکہ میری بڑی خواہش تھی کہ ایک بار نور کے ساتھ عائشہ کے سامنے ڈرامائی انداز میں فاتحانہ انٹری دیتا اور اس کی ذلت کا تماشا کرتا۔

میں نے ڈرائیور سے جانے کے لیے کہہ دیا اور خود ڈاکٹر شائستہ کی کال بیل دبا دی...... دروازہ اس نے خود ہی کھولا اور چند لمحے مجھے اور نور کو حیرانی سے دیکھتی رہی۔ ''تم کہاں مل گئی تمہیں۔''

میں نے کہا۔ ''ڈھونڈنے والوں کو نئی دنیا مل جاتی ہے۔ یہ تو پرانی چاہت ہے۔''

''اچھا اندر تو آؤ...... کیسی ہو تم نور؟''

نور نے سر ہلایا۔ ''بچ گئی اس لیے کہہ سکتی ہوں کہ اچھی ہوں۔''

ڈاکٹر شائستہ کے رویے میں حیرت انگیز تبدیلی آئی تھی اور میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ ایسا فریال کی وجہ سے ہوا تھا۔ یہ نہیں کہ مجھ سے برسوں کا بیر خود بخود ختم ہو گیا تھا۔

میں نے زبردستی نور کو ہاتھ منہ دھونے کے لیے بھیج دیا۔ اتنی دیر میں ڈاکٹر شائستہ نے ہمارے لیے کافی بنائی اور فریج میں سے کچھ کھانے کے لیے نکالا۔ اس کے دونوں بچے اندر ٹی وی دیکھ رہے تھے لیکن اس کا شوہر نہ مجھے پہلے نظر آیا تھا نہ اس وقت دکھائی دے رہا تھا۔ فی الحال مجھے اس مسئلے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

کافی پیتے ہوئے میں نے اسے ''محبوبہ کی بازیابی'' کے ایڈونچر کی تفصیل سنا دی جس سے وہ خاصی محظوظ ہوئی۔ مجھے ڈر تھا کہ عائشہ کا فون آنے والا ہو گا اور یہ ضروری تھا کہ اس کی زلزلے جیسی اشتعال کی کیفیت ہم پر اثر انداز نہ ہو۔ فریال کی سفارش کارگر ثابت ہوئی تھی اور وہی شائستہ جو مجھ سے بات کرنے کی روادار نہ تھی پہلی مرتبہ مجھ سے اس طرح ہنس ہنس کے باتیں کر رہی تھی، جیسے وہ صرف اپنی سہیلی فریال سے کرتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ فریال کے سوا دنیا میں اس کا کوئی دوست ہی نہیں۔ گزشتہ کئی برس میں، میں نے شائستہ کے دو ہی موڈ دیکھے تھے۔ وہ فریال کے ساتھ بے حد خوش مزاج، بے تکلف اور بات بات پر ہنسنے والی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی شکل بگڑ جاتی تھی اور وہ بدتمیزی کی حد تک غیر شائستہ ہو جاتی تھی۔

آج ایسا نہیں تھا۔ رفتہ رفتہ وہ مجھ سے بھی فری ہو گئی تھی، اس سے پتا چلتا تھا کہ یہی اس کا اصل روپ ہے۔ پہلے وہ نہ جانے کیوں جانتے بوجھتے میرے ساتھ بداخلاقی کا

اظہار کرتی تھی۔

رات کے دس بجے میں نے گھڑی دیکھ کے کہا۔ ''میرا خیال ہے اب ہم چلتے ہیں...... جو کچھ تم نے ہمارے لیے کیا......''

''میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا...... اور تم اس وقت کہاں جاؤ گے۔''

''یہ کیا سوال ہے...... لندن میں ٹھہرنے کی جگہ کی کیا کمی ہے......''

''میرا مطلب تھا...... آج یہیں رک جاتے۔''

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''فارمل ہونے کی ضرورت نہیں...... تمہارے پاس مہمانوں کا کوئی کمرا نہیں ہے۔''

''ہم پاکستانی ہیں نواب صاحب۔ دل میں جگہ رکھتے ہیں تو اپنے گھروں میں باراتیں ٹھہرا لیتے ہیں۔''

''تھینک یو شائستہ...... آج تم نے میرے سارے گلے شکوے دور کر دیے میرا خیال ہے عائشہ کا فون کسی بھی وقت آ سکتا ہے۔ وہ سخت غضبناک ہو گی...... تم بس اتنا کہہ دینا کہ وہ آئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد چلے گئے۔ کچھ پتا نہیں کہاں۔''

''اس سے میں نمٹ لوں گی۔''

سابقہ تجربے کو کام میں لاتے ہوئے میں نے اپنے لیے جو ہوٹل منتخب کیا وہ ایجنٹ پارک کے نزدیک تھا۔ میرے کچھ کہنے سے پہلے ہی نور نے ایک ڈبل روم منتخب کر لیا۔ مسز نور کے نام سے اپنے پاسپورٹ کی انٹری کی۔ اس کے بعد یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ مجھ سے اپنا رشتہ بھی بیان کرے۔ نہ انتظامیہ کو اس سے غرض تھی کہ میں شوہر ہوں، بوائے فرینڈ یا بھائی۔

''اب میں اکیلی نہیں رہوں گی۔'' اس نے مختصراً مجھے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ وہ اتنی خوفزدہ تھی کہ بار بار رو پڑتی تھی اور سونے میں بھی چونک کے اٹھتی رہی۔ عائشہ کے محل کے بیڈروم سے اٹھا کے ایک موٹر بوٹ کے کیبن میں قید کیے جانے کا تجربہ انتہائی اعصاب شکن تھا۔

اس نے روتے روتے مجھے بتایا۔ ''مجھے یقین ہے کہ اس کافی میں کچھ ملایا گیا تھا جو ہم دونوں نے پی۔''

میں نے جھوٹ بولا۔ ''اچھا...... مجھے پتا نہیں چلا۔''

''معلوم نہیں کب مجھے وہاں سے اٹھا کے موٹر بوٹ کے کیبن میں لے گئے۔ میں جب ہوش میں آئی تو اٹھنے کے قابل نہیں تھی۔ اٹھی تو گر گئی۔ موٹر بوٹ پانی پر چل رہی تھی۔ مجھے ابھی بھی مجھے چکر آ رہے ہیں...... بعد میں وہ کالا حبشی آ گیا اور کہنے لگا کہ بے بی...... مجھے پریشان مت کرنا، آرام سے بیٹھی رہو گی تو کچھ نہیں ہو گا ورنہ میں دونوں ٹانگیں توڑ کے بٹھا دوں گا۔ ابھی مجھے حکم ہے کہ تمہیں آرام سے رکھوں اور مرنے نہ دوں اس لیے کہا کہ کچھ چاہیے تو بتاؤ۔''

''تم نے باہر نکلنے یا کسی کو مدد کے لیے پکارنے کی کوشش بھی نہیں کی......؟'' میں نے پوچھا۔

''کیسے کرتی...... اوپر جانے والا راستہ مقفل تھا اور وہ خبیث وہیں بیٹھا مجھے گھورتا رہتا تھا۔ کہتا تھا کہ کیا کروں...... نوکری ایسی ہے ورنہ تم جیسی حسین تتلی میرے ہاتھ میں آئے اور میں اس کو صرف دیکھوں، ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا۔ اب میں کیا بتاؤں کبھی کبھی وہ کیسی فحش باتیں اور حرکتیں کرتا تھا۔''

''اور کوئی تکلیف تو نہیں تھی نا۔''

وہ ایک دم اٹھ بیٹھی۔ ''تم کتنے بے حس اور پاگل ہو۔ کیا میں بتا رہی ہوں کہ مجھے وہاں بڑا آرام ملا؟''

میں نے اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ ''میرا مطلب ہے...... جسمانی تشدد تو کوئی نہیں ہوا تم پر......؟''

''وہ کر نہیں سکتا تھا...... اور میری اذیت تو تمام ذہنی تھی، تمہاری محبت میں پاگل ہو جانے والی یہ شہزادی مجھے مار کے پہلے ہی دن گاڑ دیتی؟ اپنے محل کے پائیں باغ میں...... تو قصہ ہی ختم ہو جاتا۔''

''قصہ کیسے ختم ہو جاتا...... ہمیشہ ہیروئن کے بعد ہیرو اپنی جان دیتا ہے۔ تب ہی ان کی پریم کہانی امر ہوتی ہے۔''

اس نے پوری قوت سے میری پسلی میں کہنی ماری۔ ''بعد میں کیوں؟ پہلے نہیں مر سکتے تم......''

''آہ......'' میں نے چلا کے کہا۔ ''میرا دل توڑ دیا شیشے سے زیادہ نازک۔''

اس نے دوسری کہنی ماری۔ ''جھوٹ پر جھوٹ...... پتھر کے ٹکڑے کو دل کہتے ہو۔''

اگلے دن میں نے راجا کو فون کیا۔ اسے تفصیل سے بتایا کہ یہاں بھی آفات نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ ''ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے۔ اپنا کچھ ایسا ہی معاملہ ہے۔''

''سب اعمال کی سزا ہے نیکے پتر...... اس سے بچ کے تو کہاں جا سکتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''حیرانی یہ ہے کہ ابھی تک اس کا کوئی ردِ عمل سامنے نہیں آیا۔ کچھ ہوتا تو ڈاکٹر شائستہ ضرور بتاتی۔''

''ابھی کچھ دیر پہلے تیرے سسر نے فون کر کے تیرا نمبر مانگا تھا۔''

''پھر...... تو نے دے دیا، خیر...... میں اس سے ملوں گا۔''

''خیال رکھنا۔ وہ بہت اثر رسوخ والا آدمی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''وہ شریف آدمی ہے...... اور بہت سمجھدار۔'' ہوٹل سے نکل کے میں نے اپنے ٹریولرز چیک کم

ہونے کی اطلاع بینک کو دی اور مجھے تھوڑی سی رسمی کاغذی کارروائی کے بعد دوسرے چیک جاری کر دیے گئے۔ میں چاہتا تھا کہ نور ہوٹل میں کمرا بند کر کے سوئی رہے لیکن اس کے اعصاب پر ایک خوف طاری تھا کہ وہ محفوظ نہیں اور عائشہ پھر اسے اٹھوا لے گی۔ میرے اس دعوے کا کوئی فائدہ نہیں ہوا کہ یہ لندن ہے پاکستان نہیں مگر اس نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا۔ ہم نے کچھ شاپنگ کی اور پھر ایک مشہور اطالوی ریسٹورنٹ میں چلے گئے۔

لارڈ ارسنٹ کا فون وہیں موصول ہوا۔ ''رفیق۔ ہاؤ آر یو......؟''

میں نے کہا۔ ''فائن۔ آپ کا ٹور کب تک جاری رہے گا؟''

''میں واپس آ گیا ہوں...... اور تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ کیا تم میرے آفس میں آ سکتے ہو؟''

''شیور...... کون سا وقت مناسب رہے گا؟''

وہ کچھ اپ سیٹ تھا۔ ''ابھی آ جاؤ...... اگر کچھ نہیں کر رہے ہو۔ بعد میں میری مصروفیت بھی بڑھ جائے گی۔''

سمجھا بجھا کے میں نور کو اپنے ساتھ لے گیا۔ ''یہاں میرے چار سال بہت اچھے گزرے تھے۔''

''یہ بلا تم کو یہیں چمٹی تھی...... تم اسے اچھا کہتے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''اب تمہیں کیسے یقین دلاؤں۔ اس وقت وہ کیا تھی۔''

''بہت سن چکی ہوں میں...... مانتے کیوں نہیں کہ اس وقت تمہاری آنکھوں پر اور عقل پر جذبات کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ سب اچھی لگتی ہوں گی۔ یہ تھی شہزادی...... کیسے پسند نہ آتی۔''

''کبھی بلا اور چڑیل کہتی ہو کبھی...... شہزادی۔'' میں ہنس پڑا۔

''وہ ایسا ہی بہروپ بنا کے سامنے آتی ہیں۔''

''پھر تو تم بھی......''

''میں بھی کیا......؟ یہ گرم گرم سوپ الٹا دوں گی سر پر......''

لارڈ ارسنٹ اپنے آفس میں ہمارا منتظر تھا۔ اس کی سیکریٹری نے میرا نام لیا اور مجھے اندر جانے کا اشارہ کر دیا۔ اس نے اٹھ کے مجھ سے اور نور سے ہاتھ ملایا۔

''یہ نور ہے...... میرے ساتھ پاکستان سے آئی ہے۔ یہاں کسی انٹیریئر ڈیکوریٹر کا شارٹ کورس کرنے۔''

''آئی نو۔'' اس نے متانت سے کہا ''کیا یہ پاکستان کی سب سے حسین لڑکی ہے یا وہاں سب ایسی ہوتی ہیں۔''

میں نے ہنس کے کہا۔ ''آپ اسی سے پوچھ لیں۔''

خلافِ توقع نور نے کہا۔ ''یس...... میں سب سے حسین ہوں۔''

لارڈ ارسنٹ اسے مذاق سمجھ کے ہنسا مگر میں دیکھ [illegible] کہ اندر سے وہ کتنا اپ سیٹ ہے۔ دفتری یا کاروباری [illegible] کبھی اس پر اثر انداز نہیں ہوتی تھی۔ اس کا ایک ہو [illegible] ہو سکتی تھی۔ اس کی بیوی۔ رسمی تعلق کے باوجود وہ لارڈ [illegible] کی بیوی تھی اور اپنی زندگی کے آخری ایام پورے کر رہی [illegible]

میں نے اخلاقاً کہا۔ ''میں لیڈی سیلیا ارسنٹ [illegible] ملا تھا...... اور مجھے واقعی بہت افسوس ہوا۔''

اس نے ہاتھ ہلا کے جیسے میری بات ختم کر دی [illegible] کا اب کوئی فائدہ نہیں، شی از ڈیڈ۔''

نور نے چونک کے میری طرف دیکھا اور عاد [illegible] مطابق انا للہ پڑھا۔

''یہ کیا کہہ رہی ہے؟''

میں نے کہا۔ ''کچھ نہیں...... ہماری مذہبی دعا۔''

وہ خلا میں دیکھنے لگا۔ ''معلوم ہے اس نے اپنی [illegible] میں کیا لکھا ہے، علاوہ دیگر باتوں کے...... اس نے لکھا [illegible] اسے کسی کی دعا اور آخری رسوم کی ضرورت نہیں۔ زن [illegible] اسے کسی نے محبت نہیں دی۔ اب دعا کی منافقت نہ کر [illegible]

میں نے کہا۔ ''جب میں ان سے ملا تو ان کی [illegible] ایسی نہیں تھی۔''

''مسٹر رفیق...... یا میں نواب رفیق کہوں...... کینسر جیسے موذی مرض میں بھی جانبر ہوتے دیکھے [illegible] نے...... کیونکہ وہ زندگی سے پیار کرتے ہیں۔ جینا چا [illegible] تو بیماری سے لڑتے ہیں...... وہ کسی کے لیے جینا نہیں [illegible] تھی، اپنے لیے بھی نہیں۔ خیر چھوڑو اس کی بات جو [illegible] نہیں...... میری ایک بیٹی ہے...... جو ایلیشیا سے عائشہ [illegible] پھر ایلیشیا...... پھر عائشہ......''

میں نے دانت بجاتے ہوئے کہا۔ ''کیسی ہے وہ [illegible]

''تم دیکھ چکے ہو۔'' وہ تلخ لہجے میں بولا۔ ''تم بتا [illegible]

''وہ بہت بدل گئی ہے۔''

اس نے میز پر مکا مارا۔ ''بدل گئی ہے، وہ پاگل [illegible] ہے۔ کل رات سے وہ سیڈیشن میں ہے۔ انجکشنوں [illegible] کو سلا دیا گیا ہے۔ درحقیقت وہ بے ہوش ہے...... [illegible] نے پہلے کبھی نہیں کہا، نہ سمجھا...... کہ اس کے ذمے دار تم [illegible] اب میں ایسا کہنے پر مجبور ہوں۔'' اس نے میز کی دراز [illegible] ایک بوتل نکالی اور چند گھونٹ پی لیے۔

''لارڈ ارسنٹ...... میں سن رہا ہوں۔''

اس نے آگے جھک کے کہا۔ ''کیا ضرورت تھی [illegible]

پھر آنے کی؟ تم کہو گے کہ لندن میں آنے پر کوئی پابندی نہیں، رائٹ...... تم اس سے کیوں ملے...... اس کے ساتھ۔''

میں نے کہا۔ ''کیا آپ اپنی بیٹی کو حق بجانب ثابت کر رہے ہیں۔''

''وہ تو نارمل نہیں ہے۔''

میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''اگر یہ بات مجھے معلوم ہوتی تو میں ادھر کا رخ بھی نہیں کرتا۔ یہاں سے جانے کے بعد میری اس سے کبھی بات نہیں ہوئی۔ کبھی بات ہوتی تو آپ سے...... کیا آپ نے مجھے کچھ بتایا تھا؟''

اس نے ایک گہری سانس لی اور کرسی کی پشت پر نیم دراز ہو گیا۔ ''ابھی تک مجھے اس کی وجہ نہیں معلوم...... اس پر یہ جنونی دورہ کیوں پڑا؟ وہ تمہیں گالیاں دے رہی تھی۔ اس سے اندازہ کیا میں نے...... کہ تم نے پھر اسے دھوکا دیا۔''

''پھر کا کیا مطلب...... پہلے کب دھوکا دیا تھا میں نے اسے؟ میں نے تو صاف انکار کر دیا تھا۔''

''وہ پھر مسلمان ہو گئی تھی تمہارے لیے...... اور تم نے اس سے شادی بھی کر لی تھی اپنے طریقے کے مطابق...... کیا یہ صحیح ہے۔ تم جانتے ہو ابھی اس کی پارکر سے طلاق مکمل نہیں ہوئی۔''

میں نے کہا۔ ''اسی لیے یہ شادی کوئی معنی نہیں رکھتی۔''

''قانونی بات مت کرو۔'' اس نے سخت برہمی کا اظہار کیا۔ ''اسے یہ سب کیا معلوم...... وہ بزنس سمجھتی ہے، جذبات کے کھیل نہیں۔ کیا تم اس سے انکار کر سکتے ہو کہ تمہارا مقصد اسے بے وقوف بنانا تھا؟''

اب مجھے بھی غصہ آنے لگا۔ ''اور اس کا مقصد...... آپ جانبدار نہ ہوں تو ذرا غور کریں کہ آپ کی بیٹی نے کوئی راستہ نہیں چھوڑا تھا میرے لیے۔''

اس نے ایک گہری سانس لی۔ پھر شراب کے چند گھونٹ حلق سے اتارے ''چلو تم مجھے بتاؤ، جب میں یہاں نہیں تھا تو کیا ہوا۔''

میں نے نور کی طرف دیکھا۔ ''نور...... تم بتاؤ۔''

اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔ ''میں نہیں بتا سکتی اور میری فکر مت کرو۔ میرے جذبات مجروح نہیں ہوں گے۔''

میں نے زیادہ تفصیل میں جائے بغیر لارڈ ارسنٹ کو سب بتا دیا...... وہ بھی جو عائشہ نے میرے ساتھ کیا تھا اور وہ بھی جو نور کے ساتھ ہوا تھا۔ وہ دکھی چہرے کے ساتھ سنتا رہا۔

''مجھے نہیں معلوم کہ اس کا انجام کیا ہو گا۔ پہلے وہ نفسیاتی علاج بھگت چکی ہے...... وہ پوری طرح ٹھیک نہیں ہوئی تھی۔ اس بار مجھے عائشہ کو یقیناً کلینک میں داخل کرانا پڑے گا جانے وہ کبھی نارمل ہو گی یا نہیں...... معلوم نہیں وہ ایسی کیوں ہے۔ خیر، تم کو اس کا الزام دینا میری غلطی تھی۔ آئی ایم سوری میں جذبات میں ایسا کہہ گیا۔ آفٹر آل...... میں ایک باپ ہوں۔''

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں نے بالکل برا نہیں مانا لارڈ ارسنٹ۔''

لارڈ ارسنٹ نے کھڑے ہو کر شفقت سے نور کا ہاتھ تھاما۔ ''سوری سویٹ گرل...... تمہارے ساتھ جو ظلم ہوا۔ اس کی میں معافی مانگتا ہوں۔ اسے معاف کر......''

نور نے کہا۔ ''مجھے آپ سے ہمدردی ہے لیکن میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔''

''کوئی اور ہوتا تو ہم قانونی مشکلات میں پڑ جاتے۔ میری بدنامی ہوتی۔ تم کچھ نہیں کر رہی ہو۔ یہ بڑی مدد ہے ان حالات میں۔''

مجھے بھی افسوس ضرور ہوا تھا لیکن نیست۔ میں نے اپنے آپ کو ان تمام معاملات سے بالکل لاتعلق کر لیا اور نور سے ہی کہا کہ وہ اپنی نئی زندگی کو، نئی جگہ کو اور میرے ساتھ کو انجوائے کرے اور بس...... پہلے تین دن ہم نے صبح سے رات تک گھومتے پھرتے گزار دیے۔ ایک دن میں اسے اپنی پرانی لینڈ لیڈی سے ملوانے بھی لے گیا۔

اس کے گیسٹ ہوم میں رہنے والے بدل چکے تھے لیکن وہ ویسی ہی تھی اور اس نے مجھے دیکھتے ہی پہچان لیا۔ ''یو ناٹی بوائے...... میں سمجھی تھی تم سب بھول گئے، تم پھر کبھی نہیں آؤ گے۔''

''میں نے وعدہ کیا تھا۔''

اس نے سر ہلا کے نور کو دیکھا۔ ''ہاں...... مگر یہ دوسری لڑکی ہے۔''

''دوسری تیسری کو چھوڑو...... یہ بتاؤ کیسی ہے؟''

''میں بتا نہیں سکتی...... اتنی خوبصورت تو میں بھی اپنی جوانی میں نہیں تھی۔ کیا یہ ہے تمہاری بیوی؟''

''اسی لیے تو تم سے ملوانے لایا ہوں۔''

اس نے میرے ایک تھپڑ مارا۔ ''کیا کہا تھا میں نے؟ ایسے لانے کے لیے کہا تھا؟ میں نے کہا تھا عروسی لباس میں لانا...... وہ جو تمہارا ہوتا ہے، گولڈن سلور۔''

میں نے ہنس کے کہا۔ ''سوری...... اس لباس میں یہ جہاز میں کیسے سفر کرتی۔''

نور اس سے بے حد متاثر ہوئی۔ وہ چاہتی تھی کہ ہم جب تک لندن میں ہیں اس سے ملنے آتے رہیں، مجبوراً مجھے جھوٹ کا سہارا لینا پڑا کہ ہم دو دن بعد واپس اپنے ملک چلے جائیں گے۔

ایک آرٹس اسکول نے نور کو بنیادی ڈپلوما کورس میں داخلہ دے دیا۔ یہ تین مہینے کا کورس تھا جس کے لیے ویزے کی میعاد بڑھوانا بھی ضروری نہیں تھا۔ میری ایک ہفتے کی مہلت تمام ہو چکی تھی لیکن ابھی تک میں نے دوسرے کام کو توجہ ہی نہیں دی تھی۔ اب میں نے وحید کو تلاش کرنے کا فیصلہ کیا۔

اس رات ہمیں شائستہ نے کھانے پر مدعو کرلیا۔ باتوں باتوں میں وحید کا ذکر آگیا۔ ''مجھے بتاؤ کہ اس کی تلاش کا آغاز میں کہاں سے کروں۔''

''یہاں آرٹسٹوں کے کچھ ٹھکانے ہیں۔ کچھ واقعی کام کرتے ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو آرٹ کے نام پر عیاشی کرتے ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے معلوم ہے۔''

''معلوم ہے تو پھر انہی سے پوچھو۔ یہ وحید دوسری قسم کا آرٹسٹ تھا...... کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی کے ساتھ مل جائے گا۔''

میں نے پوچھا۔ ''فریال سے بات ہوئی؟''

''ہاں...... انڈیا کی فلمی ورلڈ کا کوئی ڈان ہے۔ اس نے ممبئی بلایا ہے۔'' شائستہ کا چہرہ تاریک ہوگیا۔

''کنٹریکٹ دلوانے کے لیے......؟''

''کنٹریکٹ سے زیادہ کنٹیکٹ کی ضرورت ہے اسے...... وہ کہتی ہے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ساری دنیا میں حکم ایک ہی انڈر ورلڈ کا چلتا ہے۔''

''کیا تمہیں افسوس نہیں ہے کہ اسے ایک انڈر ورلڈ سے رابطے کی ضرورت محسوس ہوئی؟''

''کیا تم ایک انتہائی اصولی...... سچی اور شرافت کی دنیا میں ہو؟ تم کو جھوٹ، مکر و فریب اور خود غرضانہ سفاکی نہیں چاہیے؟ اس کے بغیر تم اپنے ست بدھائی ترقیاتی پروگرام پر عمل کر سکتے ہو۔ اپنے سیاسی عزائم میں آگے بڑھ سکتے ہو؟ تمہارے دشمن تمہیں زندہ رہنے دیں گے۔'' وہ سخت اور تلخ ہوگئی۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میری بات اور ہے۔''

''کیونکہ تم مرد ہو...... تمہارے لیے نیک نامی بدنامی کے معیار مختلف ہیں۔ جو کام فریال کر رہی ہے اس میں بھی ہر قدم پر مرد اس کا راستہ روکتے ہیں۔ ان کی خواہشات کا لقمہ بنے بغیر وہ ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکتی...... پھر وہ کیا کرے؟ وہ ہالی ووڈ میں نہیں ہے۔ بالی ووڈ میں بھی عورت اپنے جسم کی رشوت دیے بغیر اپنے کیریئر میں کوئی جگہ نہیں بنا سکتی۔''

''یہ ٹھیک ہے...... لیکن کیا ضرورت تھی اسے یہی کیریئر اپنانے کی؟ اسی پیشے میں جانے کی۔''

''واہ...... مرد آپ بھی ہیں نواب صاحب...... آپ مجھ سے بھی سوال کریں گے کہ میں ڈاکٹر کیوں بنی؟ باپ بھائی یا شوہر، سب خاندانی اور معاشرتی عزت اور اخلا کے ٹھیکے دار ہیں۔ عورت کیا کر سکتی ہے کیا نہیں، آپ کرتے ہیں، ایسا ہی ایک مرد میرا شوہر تھا جس کے دو بچوں میں پال رہی ہوں۔ جانتے ہیں اس نے مجھے کیوں چھوڑ حالانکہ مجھ سے محبت کے بڑے دعوے تھے اسے...... جو شا غلط بھی نہیں تھے لیکن شادی کے بعد وہ چاہتا تھا کہ میں صرف ہاؤس وائف رہ جاؤں، وہی سب کروں جو پہلے الف جاہل آج میٹرک پاس عورت کرتی ہے۔ جھاڑو پوچا، کھانا پکا برتن دھونا اور بچے پیدا کر کے پالنا...... اس لیے ڈاکٹر بنتی کوئی لڑکی۔''

''آئی ایم سوری...... میں ایسا نہیں سوچتا۔''

''لیکن آپ مختلف نہیں ہیں۔ آپ گھر کی عورت صلاحیت دیکھ کر اسے کام کرنے کا لائسنس نہیں دیتے...... عزت اور نیک نامی پہلے دیکھتے ہیں ورنہ کہتے ہیں ضرورت ہے۔''

''ہم جس سوسائٹی میں رہتے ہیں...... اس کے اخلا معیار کے دائرے سے باہر نہیں جا سکتے، برا مت ماننا...... بڑی ہونے پر تم اپنی بیٹی کو کسی نائٹ کلب میں اسٹرپ ٹیز کر دو گی؟ پیشہ تو وہ بھی ہے۔ کال گرل بننے دو گی، بلیو فلموں میں کا کرنے کے بہت پیسے ملتے ہیں؟'' میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ''معاف کرنا میں تمہارے جذبات مجروح کرنے نہیں آیا تھا۔''

اسے چپ لگ گئی تھی۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ بحث میں اپنی جیت کے لیے میں نے اس کی بیٹی کا نام استعمال کیا میں اسے یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ نور کون ہے۔ وہ نور جہاں تھی جس راستے پر وہ چل رہی تھی اس میں پیسہ بہت تھا اور و کامیاب تھی لیکن محبت نے اس کا راستہ بدل دیا۔ اس نے بدنامی کی راہ چھوڑ دی اور میرے پیچھے چل پڑی۔ یہ آسان کا نہیں تھا۔ برائی کے راستے پر چلنے میں بڑی کشش محسوس ہوتی ہے۔ عزت، شہرت، دولت...... سب ملتا ہے...... لیکن اس چھوڑ کے واپس گمنامی کی طرف لوٹنا بڑی قربانی مانگتا ہے۔

باہر آ کے میں نے سب کچھ بھلا دیا۔ کورس میں داخلہ مل جانے کے بعد نور کے رہنے کا بندوبست بھی ہو گیا تھا میں نے اس کے اکاؤنٹ میں اگلے تین ماہ کے اخراجات سے دگنی رقم ڈال دی تھی۔ آج اس نے کلاس اٹینڈ کی تھی لندن آنے کے بعد پہلا دن تھا کہ وہ مجھ سے دور رہی تھی۔ شام کو وہ ہوسٹل کے باہر مجھے منتظر ملی تو کچھ اداس تھی۔

''کیسا رہا آج کا دن؟'' میں نے کہا۔

وہ چپ رہی اور دوسری طرف دیکھتی رہی۔ اس کا موڈ

نے کا تھا۔

''یہ کیا ہے نور۔''

اس نے میری طرف دیکھا تو میرے کندھے پر سر رکھ ''میں اکیلی یہاں نہیں رہ سکتی جان۔''

''تم چاہتی ہو کہ میں بھی داخلہ لے لوں۔''

''بھاڑ میں جائے یہ کورس...... مقصد تو پورا ہو گیا نا۔ میں نور جہاں نہیں ہوں۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گی بدھائی۔''

''میرے ساتھ...... یہ کیا پاگل پن ہے۔''

''مجھے پاگل پن کے سوا کچھ نہیں آتا۔ اور کچھ نہیں ہے۔ کون دیکھے گا وہاں میرا ڈپلوما یا...... یا میرا پاسپورٹ میں کب لندن گئی تھی اور کتنا عرصہ وہاں رہی۔''

اس کی بات میں دلیل سے زیادہ جذبات کا وزن تھا ن وہ میری ایک سننے پر راضی نہ تھی۔ رات کو میں نے بڑی قل سے اسے قائل کیا کہ وہ میرے جانے کے ایک ماہ بعد ائے۔ وہ ایک ہفتے پر بضد رہی۔ خود میرے پاس ایک بھی نہیں رہا تھا۔ اگلے دن میں اکیلا وحید کی تلاش میں جانا ہتا تھا لیکن نور کا اب پڑھنے کا کوئی موڈ نہیں رہا تھا۔

تھوڑی سی تلاش کے بعد مجھے ایک ''فنکار گلی'' کا پتا مل یا۔ اس میں دنیا بھر سے آنے والے آرٹسٹ رہتے تھے جو ی گمنام تھے لیکن اس شہر سے فن کی پرواز شروع کر کے رت کے افق کو چھونا چاہتے تھے۔ وہ سب غریب اور مفلوک ال تھے۔ رہی سہی کسر ان کی بگڑی ہوئی عادات پوری کر تی تھیں۔ ان میں سے کچھ فطری باغی تھے اور معاشرتی قیود کو ڑ کے جینا اپنا حق سمجھتے تھے۔ میں اسی لیے نور کو ساتھ نہیں نا چاہتا تھا کہ ان کا ماحول کسی طرح بھی شریفانہ نہیں تھا لیکن راز گئی کہ مجھے کسی کے ذاتی کردار سے کیا۔

ایک بلڈنگ کی دو منزلوں پر وہ ایک مشترکہ خاندان کی ورت میں رہتے تھے۔ ان میں کتنے مرد تھے اور کتنی عورتیں ر آپس میں میاں بیوی تھے۔ اس کا صحیح اندازہ ممکن نہیں تھا۔ کمرے سے ان کے ہنسنے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ کسی کمرے میں ایک مرد گا رہا تھا...... دوسری جگہ سے کسی عورت کی بے سری آواز سنائی دے رہی تھی۔ مجھے آتے جاتے دو ہا ئپ مرد نظر آئے۔ ان کی ڈاڑھیاں بے ترتیب انداز بڑھی ہوئی تھیں کپڑے گندے اور خستہ حال تھے...... ایک ورت جس کی جوانی ڈھل رہی تھی راہداری میں بے لباس نظر ئی اور زینے سے اوپر چلی گئی۔ اسی حلیے میں اوپر سے ترنے والا مرد ہمارے قریب سے ہمیں دیکھے بغیر گزر گیا۔

''یا میرے اللہ...... یہ کون لوگ ہیں۔'' نور نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

''یہ آرٹسٹ ہیں۔'' میں نے ہنس کے کہا ''ڈرو نہیں۔''

''مجھے تو پاگل لگتے ہیں۔''

''ان سے پوچھو گی تو وہ باقی دنیا کو پاگل قرار دیں گے جو قاعدوں، ضابطوں میں جکڑی ہوئی زندگی گزارتے ہیں جبکہ قدرت نے انہیں آزاد پیدا کیا تھا۔ یہ کسی قسم کی قیود پر یقین نہیں رکھتے۔ نہ معاشرتی، نہ خاندانی، نہ اخلاقی...... ان کے نزدیک انسان حیوانِ ناطق ہے اور کچھ نہیں...... اسے حیوانوں کی طرح رہنے کا حق حاصل ہے۔''

ایک کھلے دروازے میں مجھے دو افراد نظر آئے۔ ایک دیوار پر کوئی تصویر بنا رہا تھا جو میرے خیال میں سخت فحش تھی...... دوسرا گٹار بجا رہا تھا۔ جو چرس کا دھواں چھوڑ رہا تھا۔ موسیقار صرف نیکر پہنے ہوئے تھے۔ وہ نسبتاً زیادہ عمر کا تھا۔ اس کے بالوں پر سپیدی کب تھی۔

میں نے کسی تکلف کے بغیر چلّا کے کہا۔ ''ہیلو...... کیا میں بات کر سکتا ہوں۔''

موسیقی یا شور تھم گیا۔ ''ہم سب بات کر سکتے ہیں۔''

''ہم بات کرتے ہیں۔'' مصور پلٹا۔

میں نے کہا۔ ''مجھے ایک مصور وحید کا پتا چاہیے۔''

''میں مصور ہوں، مجھے وحید فرض کرلو۔ یہاں مجھ سے اچھی تصویر کون بنا سکتا ہے...... خصوصاً لباس قدرت میں شجر ممنوعہ کھاتے ہوئے۔''

میں نے کہا۔ ''اس میں کوئی شک نہیں...... لیکن مجھے تصویر نہیں بنوانی وحید سے ملنا ہے۔''

''معاوضہ بھی میں بہت مناسب لیتا ہوں...... صرف سو پونڈز''

میں نے جیب سے دس پونڈز نکالے۔ ''اگر تم مجھے صحیح انفارمیشن دو تو یہ تمہارے۔''

وہ مجھے گھورنے لگا۔ ''تم پولیس والے ہو؟''

موسیقار نے ایک دم آنکھ کھول کے نور کو دیکھا۔ ''وہ کوئی انڈین ہے؟''

''یہی سمجھو۔''

''ریڈ انڈین یا بلیک انڈین۔'' اس نے پوچھا۔ پھر وہ دونوں اس لطیفے پر ہنسنے لگے۔

میں نے ہمت نہیں ہاری حالانکہ نور ان کی بکواس اور حرکتوں سے سخت پریشان ہو رہی تھی۔ اکثر نشے میں تھے لیکن کچھ صرف ایسا ظاہر کر رہے تھے۔ میری قسمت اچھی تھی کہ بہت جلد مجھے ایک عورت نما مرد مل گیا۔ اس نے ساری باندھ رکھی تھی۔ اس کے لمبے لمبے بال تھے۔ آنکھوں میں کاجل

لگائے ہاتھوں یا گجرا باندھے وہ کیسٹ پر ایک گانا لگا کے ناچ رہا تھا۔ نادر دیم تانا دے رے تا نہ جانہ جابم تارے تا......" لتا کی آواز گونج رہی تھی۔

گانا ختم ہوا تو اس نے ہمیں دیکھا اور بولا۔ "یس......؟"

میں نے کہا۔ "کیا ایک شخص کی تلاش میں تم میری مدد کر سکتے ہو۔"

"کیا مضحکہ خیز بات ہے...... ایک میں ہی ملا تمہیں اتنے بڑے شہر میں...... مگر بتاؤ...... اگر وہ شخص میں نہیں ہوں۔"

میں نے کہا۔ "اس کا نام وحید ہے۔"

"وحید؟ وحید تو میں بھی ہوں...... میرا نام وحید...... میرا ایک دوست بی بی سی میں کام کرتا ہے...... وحید علی......"

وہ کم سے کم بات ڈھنگ سے کر رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا "مجھے غور سے دیکھو...... وہ میرا ڈپلی کیٹ ہے۔"

"پھر کیا مشکل ہے...... تم خود بھی اسے تلاش کر سکتے ہو۔"

میں نے کہا۔ "میری صورت میں بڑے بڑے بالوں کا اور ڈاڑھی کا اضافہ کر لو نہ میں نے اسے دیکھا ہے نہ کبھی اس سے ملا ہوں۔ مجھے یہ معلوم ہے کہ وہ ایک آرٹسٹ ہے...... کئی سال سے لندن میں مقیم ہے۔"

"آرٹسٹ ہم سب ہیں۔"

"میرا مطلب تھا تصویریں بناتا ہے، پینٹر ہے۔ پورٹریٹ......"

"پورٹریٹ پینٹر ہے؟ پھر اس کے بارے میں صحیح انفارمیشن کسی آرٹ گیلری سے ملے گی...... ایک یہاں قریب ہی ہے، اس کا مالک ایک یہودی ہے۔ ایسے ہی پتا نہیں بتائے گا...... کہو گے پورٹریٹ بنوانی ہے تو نصف رقم ایڈوانس لے گا۔ پھر کہے گا کہ کل آ جاؤ...... باقی نصف رقم آرٹسٹ کی ہوتی ہے۔ ڈائریکٹ کوئی نہیں ملواتا۔"

میں اس کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچا۔ آرٹ گیلری ایک لمبی سرنگ جیسی دکان تھی جس کا نصف حصہ برائے فروخت تصاویر سے بھرا ہوا تھا۔ تصاویر ہر دیوار پر ٹنگی ہوئی تھیں۔ ان پر قیمت بھی درج تھی۔ پیچھے والا آدھا حصہ اسٹوڈیو تھا جہاں مصور کرایہ ادا کر کے کام کر سکتے تھے۔ یہ کہنا لاحاصل ہے کہ وہاں کال گرل سے اعلیٰ طبقے کی خواتین تک سب کا رابطہ تھا۔ کچھ پروفیشنل ماڈل تھیں باقی اسی پیشے سے کماتی تھیں...... چہرے سے پورے جسم تک ان کی تصویر ہر انداز میں دستیاب تھی اور کچھ اپنی سیل پروموشن کے لیے اپنے نیوڈز......

ایسی بے نام اور بدنام گیلری میں یومیہ کرائے کی بنیاد پر کراتی تھیں۔ تصاویر کم بکتی تھیں وہ خود زیادہ......

بس میری قسمت اچھی تھی کہ پہلا تیر ہی نشانے پر لگ گیا۔ بوڑھے گنجے عقابی آنکھوں اور طوطے جیسی ناک والے یہودی نے گول شیشوں والی عینک کے پیچھے سے بغور میرے چہرے کا جائزہ لیا۔ پھر مجھے ایک وگ اور ڈاڑھی دی۔ "پہنو" میں نے تعمیل کی۔ نور منہ پر ہاتھ رکھ کے ہنسنے لگی۔ "بیلا لگ رہے ہو۔"

یہودی نے اس کے ہنسنے کی پروا نہیں کی۔ "میں سمجھ گیا...... تم کسے پوچھ رہے ہو...... لیکن وہ بہت پیسے لیتا ہے۔ تمہارا سستا کام ہو سکتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "مجھے پورٹریٹ نہیں بنوانی۔"

"پھر میرا وقت برباد مت کرو...... جاؤ کسی اور سے معلوم کرو۔"

میں نے کہا۔ "او کے...... اگر تصویر میری بیوی بنوائے؟"

وہ سنسنی خیز انداز میں مسکرایا۔ "اب آئے نا سیدھے راستے پر۔ تم ضرور اس کا پوز بنواؤ گے...... وہ ایک ہزار پاؤنڈ چارج کرتا ہے۔"

میں نے جیب میں سے پانچ سو پونڈز نکالے۔ "یہ ایڈوانس...... اب بتاؤ وہ کہاں ملے گا۔"

"یہاں ملے گا اور کہاں...... کل شام۔"

"مگر مجھے جلدی ہے۔"

"وہ زیادہ چارج کرے گا۔" یہودی نے عیاری سے کہا۔ میں نے اسے مزید پانچ سو پونڈ دیے۔ "اب بولو......"

یہودی نے فون اٹھا کے کسی سے بات کی۔ "ہیلو ڈارلنگ...... تمہارا ایک گاہک آیا ہے۔ تمہارے لور یوا۔ قرض چکانے...... کیا...... تم ایک ہزار پونڈز چھوڑ رہے ہو......؟ ٹانگ کس نے توڑی خود تم نے...... وہی میں سوچ رہا تھا کہ تم اپنا نقصان نہیں کرو گی...... لیکن وہ ٹانگ سے پورٹریٹ نہیں بناتا۔ فرض کرو کنواں خود پیاسے کے پاس آنے پر راضی ہو؟ خوبصورت لڑکی ہے...... اس کی تصویر بک جائے گی بہت اچھی قیمت پر...... میں تجربے کی بنا پر کہتا ہوں...... ورنہ وہ کہیں اور چلے جائیں گے۔" اس نے کچھ گفتگو کے بعد ریسیور رکھ دیا۔

"ایک حادثے میں اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔ لیکن اچھی بات یہ ہے کہ پورٹریٹ وہ ہاتھ سے بناتا تھا۔ میں تمہیں اس کا ایڈریس دیتا ہوں...... باقی رقم تم سے ایک عورت لے گی۔"

"اس کی بیوی......؟"

"بیوی......؟" یہودی یوں ہنسا جیسے اس سے بڑا لطیفہ ہو نہیں سکتا۔ "بہتر ہے خود جا کے دیکھ لو۔"

ایک کاغذ کے پرزے پر یہودی نے مجھے وحید کی رہائش گاہ کا پتا لکھ دیا۔ مجھے وہاں لے جانے کے ٹیکسی ڈرائیور نے جو پیسے بتائے وہ زیادہ ہونے کے باوجود کم تھے کیونکہ وہ جگہ لندن کے مضافات کا حصہ تھی۔ ایک عورت جس کی جوانی قبل از وقت ہی مال غنیمت کی طرح لٹا دی گئی تھی، مجھے اندر لے گئی...... مکان خاصا بڑا تھا اور اس کی آرائش میں قدامت کا رنگ تھا۔ پرانی عمارات اور قدیم اسباب لندن میں خاندانی ہونے کی ایک دلیل سمجھا جاتا ہے۔

اس نے نور کو بڑے غور سے دیکھا۔ "میں اسے راضی کر لوں گی۔"

میں نے اسے بقیہ ایک ہزار پونڈز نذر کیے۔ "...... تم ہمیں اس سے ملا دو۔"

وہ مجھے پچھلی طرف ایک ٹیرس پر لے گئی جہاں زندگی کا سب سے بڑا شاک میرا منتظر تھا۔ جیسے ہی اس نے ہمارے لیے دروازہ کھولا، میں نے وہیل چیئر پر خود کو دیکھا...... بے اختیار میرے قدم رک گئے۔ اتنی ہی حیرت کا جھٹکا نور نے برداشت کیا۔ چند سیکنڈ میں اور میرا ہم شکل ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ ہر شخص کے ایک ہمزاد ہونے کی روایت پر پہلے اعتبار نہیں تھا تو اب تھا۔ میں سمجھ گیا کہ دیوانگی اور مدہوشی میں بھی ٹینا نے کیسے مجھے وحید سمجھ لیا تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو یہی سمجھتا۔ یہ اتفاق تھا کہ وحید لندن میں تھا اور میں ست بدھائی میں...... ہم کبھی آمنے سامنے نہیں ہو سکتے تھے لیکن زندگی ایسے اتفاقات سے بھری پڑی ہے جو دوسروں کو قابل یقین ہی نہیں لگتے۔

اگر پہلے وحید کی ڈاڑھی مونچھیں تھیں تو اب نہیں تھیں۔ معلوم نہیں ڈاکٹر شائستہ نے اسے کب دیکھا تھا۔ وہ شاید اس کی جوانی کا وقت تھا جب ٹینا جا چکی تھی اور وحید نے اپنے چہرے کا جنگل صاف نہیں کیا تھا۔ اپنی موجودہ صورت میں وہ ایسا تھا کہ میرے مقابل کھڑا ہوتا تو لگتا کہ آئینہ درمیان میں ہے۔

میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ "میرا نام رفیق احمد ہے۔"

اس نے اردو میں جواب دیا۔ "تم کیسے جانتے ہو کہ...... تم یہاں رہتے ہو؟"

میں اس کے قریب دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔

"نہیں...... میں پاکستان سے آیا ہوں...... ابھی دس دن پہلے...... اور چار دن بعد چلا جاؤں گا۔"

اس کی محبوبہ، بیوی، نگراں یا ایجنٹ...... جو بھی وہ تھی، ہماری گفتگو سے بیزار ہو کے اندر چلی گئی۔ ویسے بھی اس کا سارا انٹرسٹ کمرشل تھا۔ اسے پورے پیسے مل چکے تھے۔ اب ہم اپنی مادری زبان میں اسے گالیاں بھی دیں تو اس کی بلا سے۔

"مجھے اپنی آنکھوں پر دھوکے کا گمان ہوا تھا، تمہیں دیکھ کر۔"

"وہ قدرتی بات ہے......"

"اور یہی بات مجھے تمہارے پاس لائی ہے۔ اگر تم نہ ملتے تو میرے لیے ناقابلِ بیان مشکلات پیدا ہو جاتیں۔"

"کیسی مشکلات؟......"

میں نے کہا۔ "تم کسی ٹینا کو جانتے ہو؟"

وہ چونکا۔ "ٹینا؟...... اس نے بھیجا ہے تمہیں......؟"

"نہیں...... میں خود تمہاری تلاش میں نکلا تھا۔ مجھے وضاحت کے لیے کچھ وقت درکار ہوگا۔"

"میرے پاس وقت ہی وقت ہے۔"

"یہ عورت اعتراض تو نہیں کرے گی۔"

"اسے صرف اس پیسے سے سروکار ہے جو میں کما کے دیتا ہوں...... اپنا قرض اتارنے کے لیے۔"

"کیسا قرض......؟"

"یہ میں بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے تم بتاؤ کہ ٹینا کو کیسے جانتے ہو...... چائے پیو گے یا کافی؟"

"لندن میں رہ کر میں بھی کافی کا عادی ہو گیا تھا۔"

میں نے کہا "پہلے میں چار سال یہاں رہ چکا ہوں...... اب لوگ مجھے ست بدھائی کا نواب کہتے ہیں۔"

اس نے میری داستانِ حیات کے مختصر اقتباسات خاصی دلچسپی سے سنے۔ نور چپ بیٹھی اسے دیکھتی رہی کہ یک نہ شد دو شد۔ اصل کے ساتھ اس کا ایک ڈپلی کیٹ بھی دستیاب ہے۔ بس میرے مقابلے میں اس کا حلیہ بہت افسوسناک تھا۔ اس کے کپڑے معمولی تھے اور غالباً خریدے اور پہنے جانے کے بعد انہیں دھونے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ نہانے کے معاملے میں برطانوی بھی فرانسیسی حریف ہمسایوں سے کم نہیں کہ مہینے میں ایک بار نہانے والے کو پانی کا کیڑا سمجھتے ہیں چنانچہ جسم کی بو کو چھپانے کے لیے پرفیوم استعمال کرتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی معاملہ میرے ہمزاد کا تھا۔ فنکار...... جن میں مصور، موسیقار، شاعر، مجسمہ ساز جیسے سب ہی آ جاتے ہیں، عام لوگوں کے مقابلے میں زیادہ لاابالی سمجھے جاتے

ہیں۔ وہ چہرے اور سر کے بال تک صاف نہیں کرتے۔ وحید خالص فنکار تھا۔ بس ڈاڑھی، مونچھ اور سر کی فصل کاٹے ابھی اسے ہفتہ بھر ہی ہوا ہوگا چنانچہ میری اور اس کی صورت کی ناقابل یقین مشابہت سامنے آگئی تھی۔

ٹینا کی کہانی نے وحید کو واضح طور پر ڈسٹرب کر دیا تھا۔ اس نے کافی نہیں پی تھی۔ وہ سگریٹ پیتا رہا تھا اور اس نے اخلاقاً نور سے معذرت کر لی تھی۔ سگریٹ چرس والے تھے لیکن ٹیرس ایک طرف سے کھلا تھا چنانچہ دھوئیں کے ساتھ بو باہر پھیل رہی تھی۔ اس کے ساتھ وہ گھونٹ گھونٹ شراب بھی حلق سے اتار رہا تھا۔ اس کی صحت جو پہلے یقیناً اچھی ہوگی ان دونوں نشوں سے تباہ ہو چکی تھی۔

”آج بھی میں ٹینا سے اتنا ہی پیار کرتا ہوں۔“ اس نے کچھ دیر بعد کہا۔

”یہ نظر آ رہا ہے...... اس کی حالت سے بھی اور تمہاری حالت سے بھی۔“

”طعنے مت دو...... تم نہیں جانتے حقائق کو...... ایک نہیں بہت سے تلخ حقائق تھے...... سب سے پہلے اس کا باپ تھا جو میرا دشمن تھا۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ مجھے قتل کر دیتا۔ وہ چاہتا تھا کہ ٹینا کسی ڈاکٹر سے شادی کرے۔ پاکستانی ڈاکٹر یہاں بہت تھے...... مجھ سمیت تمام فنکاروں سے وہ نفرت کرتا تھا۔“

”لندن میں والدین کسی لو اسٹوری میں نہیں آتے۔“

”رائٹ...... ہم شادی کر سکتے تھے...... لیکن میں اس وقت بھی قید میں تھا۔ جیسے آج ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عورتیں مجھ پر مرتی تھیں۔ میں بہت ہینڈسم تھا، ان کی نظر میں۔ بڑی سیکس اپیل رکھتا تھا اور پھر فنکار تھا۔ پورٹریٹ بنوانے سے ان کو میرے قریب آنے کا موقع مل جاتا تھا۔ ظاہر ہے ٹینا کے لیے یہ سب برداشت کرنا آسان نہیں تھا...... لیکن وہ میری عیاشی کے اخراجات پورے نہیں کر سکتی تھی۔ اس میں سب سے بڑا شوق شراب کا تھا۔ اعلیٰ سے اعلیٰ شراب مجھے دستیاب رہتی تھی۔ ہماری لڑائیاں بھی بہت ہوتی تھیں لیکن ہماری مجبوری بھی ایک جیسی تھی۔ ہم ایک دوسرے کو چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ جو عورتیں مجھ سے پورٹریٹ بنواتی تھیں...... نوے فیصد نیوڈ۔ وہ مجھے ایڈوانس پیسے دیتی تھیں ...... اور دیتی رہتی تھیں۔ میں کاہل تھا۔ ایک تصویر میں ہفتوں بلکہ مہینے لگا دیتا تھا۔ وہ بھی یہی چاہتی تھیں۔ مجھ پر قرض بڑھتا گیا۔ ادا کرنے کی ایک ہی صورت تھی کہ میں سب کی تصویر بنا کے دے دوں۔ کچھ سے تاخیر برداشت نہیں ہوتی تھی اور وہ جیلس ہو کے پیسے واپس مانگتی تھیں...... مجھے عدالت میں لے جانے کی دھمکیاں دیتی تھیں۔ میں ادھار لے کر ان کا واپس کرتا تھا۔ ایک وقت آیا کہ میرا قرض پچاس ہزار تک جا پہنچا۔ دو آرٹ گیلری والے تھے جو مجھے دس ہزار پونڈز دے چکے تھے۔ انہوں نے مجھ پر کیس کرا دیا اور جیل جانا پڑا۔ یہی وہ وقت تھا جب ٹینا میری طرف بالکل مایوس ہوگئی۔ ظاہر ہے اس کے لیے دونوں کام تھے۔ نہ وہ میری عادات کو سدھار سکتی تھی اور نہ میرا قرض کرنے کی پوزیشن میں تھی۔ اس صورت حال کا فائدہ شخص نے اٹھا لیا۔ یہ نہیں کہ اسے ٹینا سے محبت نہیں تھی لیکن ٹینا اس سے کبھی شادی نہ کرتی اگر وہ مجھ سے شا سکتی۔ اس شخص نے مجھے جیل سے نکالا...... میرا سارا قرض کر دیا۔ اس شرط پر کہ ٹینا اس سے شادی کرے گی پاکستان چلے جائیں گے۔ یہ ٹینا نے منظور کر لیا۔ میری یہ قربانی دی۔ وہ شخص ڈاکٹر بھی تھا چنانچہ اس کے با طرف سے مخالفت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں ہے کہ اسے نصف رقم ٹینا کے باپ نے فراہم کی تھی۔ اپنا وعدہ ایمانداری سے نبھایا۔ وہ پاکستان چلی گئی۔ مجھ میں معلوم ہوا کہ اس کے شوہر کا قتل ہو گیا تھا۔“

”وہ ایک حادثہ تھا جس میں ٹینا کا کوئی ہاتھ نہیں“

وحید کی معنی خیز مسکراہٹ برقرار رہی۔ ”اب تم کہ وہ پاگل ہو گئی ہے۔ پاگل تو وہ تھی ورنہ یہاں...... اکیسویں صدی میں...... ایسے کوئی کسی سے محبت کر سکتا“

”تمہیں اس سے محبت نہیں؟“ نور نے سوال کیا۔

وہ چونکا۔ ”تھی ...... حقیقت یہ ہے کہ اس کے سے محبت نہیں کی تھی میں نے۔“

”آج کل کس سے محبت کرتے ہو؟“ نور تلخ ہو گئی

”اسی سے جس سے پہلے کرتا تھا...... پیسے شراب سے...... اور یہ دونوں چیزیں مجھے اسی طرح فرا رہی ہیں...... بس اب میری قدر وہ نہیں رہی۔ نئے میدان میں آ گئے ہیں اور میں بدنام بھی بہت ہو گیا ہے اب میں اس زندگی سے خود بھی تنگ آ چکا ہوں۔ چاہتا اسے بدل دوں...... لیکن یہ میرے اختیار میں کہاں۔“

میں نے کہا۔ ”پھر کس کے اختیار میں ہے؟“

”شاید یہ کام ٹینا کر سکتی تھی۔“

میں نے کہا۔ ”وہ کرے گی...... لیکن اس کے تمہیں ٹینا کے پاس جانا ہوگا۔“

وہ تلخی سے ہنسا۔ ”میرے لیے جیل سے فرار ہونا ممکن نہیں“

”اب کس جیل کی بات کرتے ہو تم۔“ نور نے کہا۔

وہ حیرانی سے بولا۔ ”میڈم...... تمہیں میرے گرد جیل نظر نہیں آتی؟ اس لیے کہ یہ سلاخوں والی جیل نہیں ہے......؟ اس وقت بھی دس ہزار پونڈز سے زیادہ کا مقروض ہوں...... جس بڈھی گدھ نے تمہیں یہاں بھیجا ہے وہ میرا جیلر ہے۔ آج کل میں اس عورت کی تصویر بنا رہا ہوں جس کا یہ گھر ہے...... ایسی دس رہیں...... میں بھاگ کے کہاں جا سکتا ہوں؟“

خاموشی کا ایک طویل وقفہ آیا جس میں ہم سب کے لیے مایوسی کے سوا کچھ نہ تھا۔ بظاہر یہ مسئلہ حل ہونے والا نہیں تھا لیکن میں نے ناکامی کے تمام امکانات واضح ہونے کے باوجود کوشش کرنے کا فیصلہ کیا۔

”فرض کرو...... میں تمہارا سارا قرضہ اتار دوں؟“

”مجھے اندازہ تھا کہ تم یہی جذباتی حرکت کرو گے۔ واپس جانا، پیسا بہت ہوگا اور تمہیں اپنی جان چھڑانے کی فکر ہوگی۔“

”یہ دونوں باتیں درست ہیں دوسری فکر مجھے ٹینا کی ہے...... میں اس کی زندگی بھی بچانا چاہتا ہوں۔“

”اور اس کا وہ مفاد پرست بے حس باپ؟“

”اسی نے مجھے بھیجا ہے۔“

”ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا...... شاعری کو سمجھتے ہو تم؟“

”ہاں...... لیکن زندگی کے حقائق کو زیادہ سمجھتا ہوں۔“

وہ ہنسا ”اس کو کیا کہیں گے؟ تقدیر کی ستم ظریفی...... محبت کی جیت...... وقت کا انتقام؟ کل اس نے کسی اور کو دس ہزار پونڈز دیے تھے۔“

میں نے برہمی سے کہا۔ ”میں کسی کا محتاج نہیں ہوں، اس سے دگنی رقم بھی خود ادا کر سکتا تھا۔“

”آئی ایم سوری...... تم وہ ہو...... کیا کہتے ہیں اسے...... فرشتۂ غیب۔ تم کو خدا نے ایک نیک مشن پر بھیجا ہے...... دو زندگیاں بچانے کا مشن۔ اگر میں نے تمہیں انکار کر دیا...... تو مجھ پر اللہ کا عذاب نازل ہوگا۔“

”اب تم نشے میں ہو۔“ میں نے کہا۔

”لیکن نشہ میری قوتِ فیصلہ پر اثر انداز نہیں ہوتا... کیا تمہیں یقین ہے کہ مجھے یہاں سے لے جانے کے بعد تم دونوں کام کر سکتے ہو؟“

”کون سے دونوں کام؟“

”ایک میری یہ شراب کی لت چھڑانے کا...... دوسرا ٹینا سے ملوانے کا۔“

میں نے کہا۔ ”میں پوری کوشش کروں گا...... لیکن تمہارے تعاون کے بغیر تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔“

”میں تعاون کروں گا...... بس مجھے اس قید خانے سے...... جسے ولایت کہتے ہیں...... اپنے ساتھ لے جاؤ۔“ وہ ایک دم اٹھا اور میرے پیروں میں گر گیا۔

میں نے گھبرا کے اسے اٹھایا۔ ”یہ تم کیا کر رہے ہو؟“

صاف ظاہر تھا کہ اس پر نشہ غالب ہے اور ایسی حالت میں اس کی کسی بات کا اعتبار کرنا غلط ہوتا۔ دوسری طرف میرے پاس وقت کم تھا اور مجھے اس امر کو یقینی بنانا تھا کہ وحید مجھے دھوکا نہ دے۔ ضرورت مندی کی اس انتہا پر پہنچ کر آدمی نہ صرف بے شرم ہو جاتا ہے بلکہ بے ضمیر بھی بن جاتا ہے...... پیسا حاصل کرنے کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ وہ خود کو بیچ رہا تھا اور اس کی بے چارگی کو سمجھتے ہوئے ہی ٹینا نے فیصلہ کیا ہوگا کہ آخری بار اسے جیل سے نکال دے اور پھر اس کے حال پر چھوڑ دے...... اس کی خاطر اپنی زندگی تباہ نہیں کی جا سکتی۔

ایسا شخص مجھ سے بھی دس ہزار پونڈز اینٹھ سکتا تھا اور پھر جانے سے انکار کر سکتا تھا۔ میں اسے زبردستی کیسے لے جاتا...... دوسری جانب مجھے ٹینا کا خیال تھا اور اپنی فکر تھی چنانچہ میں یہ جوا کھیلنے پر مجبور تھا۔ تاہم اس سے کسی قسم کی یقین دہانی حاصل کرنا بھی ضروری تھا۔

میں نے وحید کو اٹھا کے بیڈ پر ڈال دیا۔ وہ کچھ دیر نشے میں بکواس کرتا رہا۔ ”ٹینا تم کتنی عظیم ہو...... تم نے پھر میرے جیسے گنہگار کی مدد کے لیے ایک فرشتہ بھیج دیا۔ فرشتے تمہاری مانتے ہیں کیونکہ تم خود فرشتہ ہو...... مجھے پہلے بھی تم سے محبت تھی...... آج بھی ہے اور مرنے کے بعد بھی رہے گی۔“

یہ صورت حال مایوس کن تھی۔ جب وہ بکتے بکتے سو گیا تو میں نور کے ساتھ باہر جانے کے لیے اٹھا۔ ”اب رکنے کا فائدہ کوئی نہیں۔“

”اب؟ فائدہ کل بھی نہیں ہوگا...... کبھی نہیں ہوگا۔“ وہ خفگی سے بولی۔

”ایک کوشش میں اور کروں گا۔ خواہش اس کے دل میں ہے۔“

”خواہش نہیں...... اس کا مردہ ڈھانچا اس کی یادوں کے قبرستان میں دفن ہے...... وہ زندہ نہیں ہو سکتا۔“

میں واپس جانے کے لیے کمرے سے گزرا تو وہ عورت صوفے پر بیٹھی تھی جس کا نام ایمی تھا۔ ”یہاں بیٹھو......“ اس نے مجھے حکم دیا۔

میں بیٹھ گیا۔ ”کیا تم سب سن رہی تھیں، تم اردو سمجھتی ہو؟“

”ہاں...... تم مجھے انگریز سمجھتے ہو۔ میرا نام امینہ

ہے...... جوایمی بن گیا ہے کیونکہ میں برطانیہ میں ہی پیدا ہوئی تھی۔ میں یہاں آباد تیسری نسل سے تعلق رکھتی ہوں۔ میرے باپ کا باپ یہاں آیا تھا۔ وہ کسی انگریز فوجی افسر کا بیٹ مین تھا۔ تم اسے لے جانا چاہتے ہو؟''

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''مگر میرے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔''

''دیکھو...... میرا صرف ایک ہزار پونڈز کا قرض ہے...... وہ میں چھوڑ سکتی ہوں...... باقی معاملات اس آرٹ ڈیلر سے طے کرلو۔''

''اور اس کے بعد؟ کیا ضمانت ہے اس بات کی کہ وہ پاکستان جائے گا۔ تین چار دن میں تو کچھ نہیں ہوگا...... اس سے زیادہ میں رک نہیں سکتا۔''

وہ بولی۔ ''تم جاؤ...... اسے میں روانہ کردوں گی۔''

''اتنا بھروسا ہے تمہیں خود پر؟''

''بھروسے کی وجہ ہے۔ وہ واقعی جانا چاہتا ہے۔ جب وہ سیریس ہو تو بہت ہوم سک محسوس کرتا ہے۔ وطن کو یاد کر کے روتا ہے۔''

''صرف وطن کو...... ٹینا کو نہیں؟''

''اسے ٹینا کی کوئی خبر ہی نہیں تھی...... لیکن اب میں محسوس کرتی ہوں کہ ایک اور وجہ بن گئی ہے...... جو زیادہ پاور فل ہے۔''

''یہ تم اتنے یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتی ہو؟''

''اس لیے کہ...... میں ایک عورت ہوں۔ اس وقت وہ میرے قبضے میں ہے، کل کا کچھ پتا نہیں۔''

''تم زبردستی کیسے کرو گی؟''

''تمہیں مجھ پر بھروسا کرنا ہی ہوگا اور کوئی تمہاری مدد نہیں کرسکتا...... نہ کرے گا۔'' امینہ نے کہا۔

مجھ سے پہلے نور نے کہا۔ ''ٹھیک ہے...... جوا ہم پہلے بھی کھیلنا چاہتے تھے، اب تمہاری ضمانت کے ساتھ کھیلیں گے...... حالانکہ جوئے میں کیا ضمانت؟''

میں نے کہا۔ ''کل میں اس آرٹ ڈیلر کو ادائیگی کر دوں گا...... اور اگر تم چاہو تو تمہیں بھی۔''

وہ مسکرائی۔ ''مجھے پیسوں کا کوئی مسئلہ نہیں۔''

''کیا تمہارا باپ بہت دولت چھوڑ گیا تھا؟''

''میرا دادا بیٹ مین تھا اس کا بیٹا دولت مند نہیں ہوسکتا تھا۔ یہ سب میں نے اپنے بل بوتے پر کیا۔ جب تم مجھے دیکھ رہے ہو...... تو پلوں کے نیچے سے بہت پانی بہہ چکا ہے...... دس سال پہلے میں قیامت تھی، اس وقت میں نے دنیا کو خوب لوٹا۔ اپنی پوری قیمت وصول کی، ایک بوڑھے تاجر نے مجھ سے شادی کرلی جب اس نے مجھے طلاق دی تو اس کی آدھی دولت جائداد مجھے مل گئی۔ وہ اس صدمے سے ہی مر گیا۔ اب میں عیش کررہی ہوں...... دن رات۔ میرے لیے یہ ایک ہزار پونڈز کیا ہیں...... اگر یہ دوسری عورتوں کا قرضہ نہ ہوتا۔ وحید نے یہ رقم شراب یا جوئے میں اڑائی ہوتی...... تو میں ادا کر دیتی۔''

میں نے کہا۔ ''تم نے میرا بوجھ ہلکا کر دیا۔''

''تم اس کے ڈپلی کیٹ ہو...... کہیں تم اسے اپنی جگہ استعمال تو نہیں کرو گے؟''

''PRISONER OF ZENDA کی کہانی۔'' نور مسکرائی۔

حقیقت اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ امینہ کی بات سننے سے پہلے میرے ذہن سے اس خیال کا گزر بھی نہیں ہوا تھا لیکن اچانک امکان کا ایک دریچہ یوں کھل گیا جیسے زلزلے سے کسی بند غار میں رخنہ نمودار ہو جائے۔ میں نے سوچا...... آف کورس، یہ ہوسکتا ہے۔ اگر وحید چاہے۔ وہ میرے ساتھ ہو ہوگا...... میرا ڈپلی کیٹ...... کہانی اچانک فلمی موڑ پر آگئی تھی۔

میں نے کہا۔ ''میں اسے صرف ٹینا کے لیے واپس لے جانے آیا تھا۔ اس سے میری جان بھی چھوٹ جانی تھی...... آگے ان دونوں کی مرضی۔ وہ واپس بھی آسکتے ہیں۔''

''اچھا...... پھر تمام معاملات مجھ پر چھوڑ دو...... جب تمہاری چیز تمہیں صحیح سالم مل جائے، تب مجھے قیمت ادا کر دینا۔''

''آخر آج اتنا بھروسا مجھ پر کیوں؟''

''تم دھوکا دینے والے لگتے نہیں...... لیکن میرا اندازہ غلط ہو گیا تب بھی میں تباہ نہیں ہو جاؤں گی۔''

''میں تمہارا احسان ساری عمر نہیں بھولوں گا۔''

وہ ہنسنے لگی۔ ''ایک خالص پاکستانی جذباتی ڈائیلاگ۔ بھائی تم پر کیا احسان...... بات کرتے ہو عمر کی، ہم پھر ملیں گے بھی نہیں۔''

''یہاں میرے ضامن ہیں۔'' میں نے اسے ڈاکٹر شائستہ کا پتا بتایا۔

''اسے چھوڑو، اپنا نام پتا دے جاؤ...... اور میرا لے جاؤ۔''

باہر آنے کے بعد نور نے کہا۔ ''آج مجھے یقین آگیا۔''

''کس بات کا؟''

''یہی کہ انسان ارادہ کرلے تو مدد خدا کرتا ہے...... دیکھو کیسے اچانک امینہ سامنے آگئی۔''

میں نے کہا۔ ''بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ میں مایوس ہو گیا تھا...... اب بھی ڈر ضرور ہے کہ کیا پتا امینہ بھی کچھ نہ کر سکے...... اس نے ہمیں ٹال دیا ہو۔''

''چلو شرط لگالو مجھ سے...... امینہ وہ ضرور کرے گی جو اس نے کہا ہے۔''

''تم سے میں ہر شرط ہارنے کے لیے تیار ہوں۔''

''سنو...... کیا تمہارا ٹھیک چودہ دن بعد جانا ضروری ہے؟ اجازت تو تمہیں ایک مہینے کی ملی تھی۔''

''میں نے چودہ دن کی مانگی تھی...... میں اپنا اعتبار کھونا نہیں چاہتا۔''

''ایک ماہ بعد جاؤ گے تب بھی یہ اعتبار قائم رہے گا...... اتنی جلدی کی ضرورت نہیں...... اب تک ہم کام کر رہے تھے۔''

''اب کیا کریں گے؟''

''آرام...... عیش...... تمہارے یہاں آنے کا ایک یہ بھی مقصد تھا۔''

اگلے روز اتوار تھا اور اخبار میں لیڈی سیلیا ارسٹ کی آخری رسوم کے بارے میں اعلان شائع ہوا تھا...... مجھے آنجہانی خاتون کے ساتھ کسی قسم کا جذباتی لگاؤ نہیں تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں ان کے خلاف جذبات رکھتا تھا کیونکہ انہوں نے محض نسلی تعصب اور نسبی غرور کی بنا پر میرے ساتھ ذلت آمیز سلوک کیا تھا۔ نہ مجھے عائشہ کی ماں ہونے کی وجہ سے کوئی قربت تھی لیکن میں لارڈ ارسٹ کا مداح تھا۔ انہوں نے میری کئی مواقع پر مدد کی تھی اور بڑی فراخدلی سے میری حوصلہ افزائی کی تھی۔ صرف اس کا دل رکھنے کے لیے میں قبرستان چلا گیا۔ وہاں مجھے کوئی نہیں جانتا تھا۔ میں نے لارڈ ارسٹ سے رسمی تعزیت کی اور واپس آگیا...... میرا خیال تھا کہ وہ عائشہ کی کوئی بات کرے گا مگر اس نے عمداً گریز کیا۔

دو دن بعد مجھے بڑی خوشگوار حیرت ہوئی جب امینہ نے مجھے فون کیا۔ ''تم کب واپس جارہے ہو؟''

''بس دو چار دن میں۔''

''میرا خیال تھا کہ...... خیر، میں تمہیں یہ بتانا چاہتی تھی کہ وحید کی طرف سے تمہارے لیے اچھی خبر ہے۔''

''یہ تمہاری کوشش کا نتیجہ ہے۔''

''اس کی مرضی نہ ہوتی تو میری تمہاری کوشش کیا کرتی...... میں اس ٹینا کو نہیں جانتی۔ کیا وہ وحید کو سنبھال لے گی؟''

''وہ دونوں ہی ایک دوسرے کو سنبھال سکتے ہیں......

اور کوئی نہیں۔'' میں نے کہا۔

اس رات یہ خبر سن کے نور نے اعلان کر دیا۔ ''میں اسے اپنے ساتھ لاؤں گی۔''

''گویا تم نے یہاں نہ رکنے کا فیصلہ کر لیا ہے؟''

''یس...... اور میرا وحید کے ساتھ آنا زیادہ اچھا ہو گا...... میں آؤں گی اس کے ساتھ۔ وہ جائے گا ٹینا کے پاس اور ٹینا پہنچے گی بالآخر ست بدھائی۔ پھر ہم سب وہاں ہنسی خوشی رہیں گے...... ھنو المطلوب۔''

وہ لندن میں میرا آخری دن تھا جب مجھے ڈاکٹر شائستہ کا پیغام ملا۔ ''کیا تم آ سکتے ہو؟''

میں نے گھڑی دیکھی۔ ''اس وقت؟...... خیریت تو ہے نا؟''

وہ کچھ نروس تھی۔ ''ہاں...... خیریت ہے۔'' فون بند ہو گیا۔

میں بہت تھکا ہوا تھا اور ابھی تک میں نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ نور کا موڈ اس فون نے خراب کیا۔ ''کہہ دیتے ابھی نہیں آ سکتا۔''

میں نے کہا۔ ''کوئی بہت ضروری بات ہو گی ورنہ وہ مجھے کیوں بلاتی...... دیکھو تم کھانا کھا لو، یہیں منگوا لو۔''

''آدھے گھنٹے میں کوئی قیامت نہیں آ جائے گی۔ تم بھی کھانا کھا لو لیکن مجھ میں ہمت نہیں ہے تمہارے ساتھ جانے کی۔''

''ٹھیک ہے تم آرام کرو۔ میں ویسے بھی تمہیں نہ لے جاتا۔''

رات ساڑھے گیارہ بجے میں نے ٹیکسی کو ڈاکٹر شائستہ کے گھر کے دروازے پر چھوڑ دیا۔ کال بیل کے جواب میں دروازہ کھلا اور ایک ہاتھ نے مجھے اندر کھینچ لیا۔ میں نے اپنے عین مقابل ایک ریوالور دیکھا۔

''بالآخر تم آ گئے اس جال میں۔''

میرے سامنے کھڑے ہوئے شخص نے مونچھوں پر تاؤ دیا۔ اس کے پیچھے ڈاکٹر شائستہ اپنے دونوں بچوں کو دائیں بائیں اپنے بازوؤں کی پناہ میں لیے وحشت زدہ بیٹھی تھی۔

ڈاکٹر شائستہ کے گھر میں استقبال کے اس انتہائی غیر متوقع انداز اور سامنے آ جانے والی صورتِ حال نے میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کے ساتھ ہی مجھے بھی مفلوج کر دیا تھا لیکن خطرے کا احساس ہوتے ہی ایک حیوانی جبلت ہے جو بلی کو بھی شیر سے مقابلے پر کھڑا کر دیتی ہے۔

خود کو سنبھال کے میں نے اپنے حریف کو دیکھا جو میرے ردِعمل کے انتظار میں ابھی تک توپ کا رخ میری طرف کیے کھڑا تھا۔ میں مسکراتا ہوا آگے بڑھا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ ''ہیلو چیف...... بڑا شاکنگ سرپرائز دیا تم نے مجھے...... لیکن اب بہت ہو گیا، اب تم یہ گولا بارود کی نمائش چھوڑ کے آرام سے بیٹھ جاؤ اور مجھے بتاؤ کہ اس خوفناک ڈرامے کا مقصد کیا ہے۔ دیکھو بچے بلاوجہ دہشت زدہ ہو رہے ہیں۔''

اس نے میری بات پر غور کیا اور سر ہلا کے اپنے قریب موجود ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ ریوالور کو اس نے اپنی گود میں رکھا۔ ''میں دیکھ رہا ہوں کہ اٹھارہ مہینے میں تم بہت بدل گئے ہو۔''

''یہ تو ایک فطری عمل ہے چیف...... اپنے آس پاس مجھے کوئی ایک چیز بتاؤ جو وقت کے ساتھ بدلی نہ ہو۔ ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں۔ لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے مجرمانہ اطوار نہیں بدلے۔''

''مجھ سے اس لہجے میں بات مت کرو، میرے لیے نواب رفیق احمد شیرازی نہیں ہو۔'' وہ برہمی سے بولا۔

''تم خود کو دھوکا دے رہے ہو۔ اگر مجھے تم وہی رفیق سمجھتے تو فون پر حکم دیتے اور مطمئن ہو جاتے کہ اب میں سر کے بل دوڑتا ہوا آؤں گا، لیکن تمہیں معلوم تھا کہ ایسا نہیں ہو گا۔ اسی لیے تم نے مجھے دھوکے سے بلایا۔''

شائستہ کا حوصلہ کچھ بحال ہوا۔ ''رفیق...... کون ہے یہ شخص، جس نے میرے گھر میں یہ بدمعاشی کا مظاہرہ کیا ہے؟''

چیف ریوالور اٹھا کر غرایا۔ ''اے لڑکی...... اپنی آواز نیچی رکھو اور آرام سے بیٹھی رہو۔''

شائستہ کی آواز بند ہو گئی۔ ''دیکھو...... غلطی سے گولی نہ چل جائے...... پلیز۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے بہت افسوس ہے شائستہ کہ اس شخص نے تمہیں اور تمہارے گھر کو استعمال کیا۔ میں تم سے معافی مانگتا ہوں لیکن تم کو خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس میں اتنی ہمت نہیں کہ میری موجودگی میں تمہیں یا بچوں کو کوئی نقصان پہنچا سکے...... کیونکہ ہاتھ میں گن رکھنے کے باوجود یہ شخص ڈرتا ہے کہ پھر اس کی لاش ہی جائے گی یہاں سے۔''

''واہ میرے ہیرو...... کیا ڈائیلاگ مارا ہے۔''

میں نے سکون سے کہا۔ ''چیف، آگے بات اس صورت میں ہو گی جب تم زبان سے بات کرو گے۔ یہ گن جیب میں رکھو اور ڈاکٹر شائستہ کو بچوں کے ساتھ دوسرے کمرے میں جانے دو، بچے سونا چاہتے ہیں۔''

''تاکہ وہ فوراً شور مچا کے پولیس کو بلا لے۔''

''ابھی میں ذمے داری لے سکتا ہوں کہ ایسا کچھ نہیں ہو گا...... بعد میں جو ہو گا اس میں تمہارے لیے رسک بہت زیادہ ہے، یہ بتاؤ مجھے کیوں بلایا ہے؟''

اس نے کچھ دیر سوچا اور پھر ریوالور کو جیب میں رکھ لیا۔ ''اوکے۔ خاتون کو بھی سمجھا دو کہ کوئی بے وقوفی نہ کرے۔''

''میں...... میں کچھ نہیں کروں گی۔'' شائستہ کانپتی آواز میں بولی۔

میں نے کہا۔ ''ہر ماں اپنے بچوں کی حفاظت کرنا جانتی ہے اور ڈاکٹر شائستہ کی عقل پر مجھے بھروسا ہے۔''

''ٹھیک ہے، تم یہاں سے جا سکتی ہو۔''

شائستہ بچوں کے ساتھ اٹھی اور ساتھ والے کمرے میں چلی گئی۔ اس نے دونوں بچوں کو تسلی دی۔ ''اب انکل آ گئے ہیں...... ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔''

چیف نے جگہ بدلی اور کرسی کو ایسی جگہ رکھ لیا جہاں سے وہ دوسرے کمرے میں شائستہ کی نقل و حرکت بھی دیکھ سکتا تھا۔ ''نواب بن کے تم پہلے سے بہت زیادہ پُراعتماد ہو گئے ہو۔''

''اور تم! پرانے ساتھیوں سے بھی اتنا ڈرنے لگے ہو۔ کہاں گئے وہ تمہارے سب جانثار جو تمہارے ایک اشارے پر جان دینے اور جان لینے کے لیے تیار رہتے تھے۔''

وہ کچھ اداس ہوا۔ ''تمہاری طرح بدل گئے ہیں۔''

''میری طرح...... یعنی قسمت نے سب کو نوابی عطا کر دی۔ بس ایک تم رہ گئے محتاج لاوارث۔''

''میرا مطلب تھا۔ سب موقع پرست لوگ تھے۔ ضرورت کے وقت گدھے کو باپ بنا دیا ضرورت نہ رہی تو باپ کو گدھا۔''

''اب پہچان ہوئی تمہیں...... جب اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ خیر...... یہ بتاؤ کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد میری کیا ضرورت پڑ گئی؟ ایک بات دماغ میں رکھنا، وقت بدل گیا ہے، تمہارے لیے بھی اور میرے لیے بھی۔'' اس نے اعتراف میں سر ہلایا۔

''پہلے تم حکم دیتے تھے اور میں بلاچوں چرا بجا لاتا تھا۔ مجھ سے اور میرے جیسے بہت سے احمق مجبور اور معزول لوگوں سے تم نے جانے کتنے غلط اور غیر قانونی کام کرائے اور پھر انہیں بلیک میل کیا...... صرف اپنی دہشت قائم رکھنے کے لیے تم نے انہیں استعمال کیا۔ مجرم اور دہشت گرد بنا دیا۔'' اس شخص کو اپنے سامنے دیکھ کر میرا دبا ہوا غصہ باہر آنے لگا تھا۔

وہ سنتا رہا۔ ''تم جو بھی کہو، جائز ہو گا...... لیکن یہ بھی سوچو کہ اس وقت تم میرے پاس کیوں آئے تھے؟ کیا میں نے تمہیں بلایا تھا؟ تم پاکستان سے فرار ہوئے تھے کیونکہ وہاں تمہاری زندگی خطرے میں تھی، تم اپنے ماں باپ کے اکلوتے تھے اور تمہارا پروفیسر باپ کالج میں پڑھا تو سکتا تھا تمہاری حفاظت نہیں کر سکتا تھا، یہ سمجھتا تھا کہ قانون بھی اس کی مدد کرنے سے قاصر ہے۔ کیا اس میں کوئی بات غلط ہے؟''

میں نے کہا۔ ''غلط تو میں تھا......''

اس نے میری بات کاٹ دی۔ ''ایک شخص نے جو مجھ سے زیادہ چالاک تھا۔ حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے طاقت حاصل کر لی تھی۔ اس نے مجھے بے دخل کیا اور مجھے جان کے خوف سے ملک چھوڑ کے یہاں پناہ لینی پڑی...... پھر تم جیسے بھاگ بھاگ کر آئے اور ان سب کو میں نے اکٹھا کیا۔ ایک مشترکہ دشمنی کے خلاف۔ تمام بڑے بڑے لیڈروں نے بھی جلاوطنی اختیار کی تھی...... جب حالات کا رخ یا سیاست کا دھارا بدلا اور وہ لوٹ کر گئے تو حکمراں بن گئے۔''

میں نے برہمی سے کہا۔ ''تم اپنا موازنہ ان بڑے لوگوں سے کرتے ہو؟''

''چلو انہیں چھوڑو...... اپنی مثال لو، اگر خوش قسمتی کی لاٹری میں تمہارا نام نہ نکلتا تو کیا ہوتا؟ تم بھی میری طرح خواری اور گمنامی میں مر جاتے۔''

''میرا وقت ضائع مت کرو، کم ٹو دی پوائنٹ۔ تم نے مجھے کیوں بلایا تھا؟''

''دوٹوک بات کروں؟...... احسان کا بدلہ چکانے۔''

''کون سا احسان؟''

''ایک وقت تھا جب میں نے تمہیں پناہ دی تھی...... بچایا تھا۔''

میں نے غصے اور نفرت سے کہا۔ ''تم نے مجھے استعمال کیا تھا۔''

''اوکے...... تم بھی ایسا ہی کرو، میری مدد کرو، مجھے پناہ دو...... بچاؤ، پھر جیسے چاہو استعمال کرو۔''

میں حیرانی سے اسے دیکھتا رہا۔ ''یعنی یہ نوبت آ گئی ہے؟''

''کبھی کے دن بڑے کبھی کی راتیں...... اسے قسمت

کے سوا کیا کہیں گے کہ میری تمہاری پوزیشن بدل گئی ہے۔ جہاں تم تھے اب وہاں میں ہوں۔ جب اورنگ زیب شہزادہ تھا تو اپنے باپ شاہ جہاں کے سامنے ہر درخواست اس کی منظوری کے لیے پیش کرتا تھا۔ پھر وقت بدل گیا، باپ قید میں تھا اور بیٹا تختِ شاہی پر...... باپ نے درخواست کی کہ قید میں وقت نہیں گزرتا، کچھ بچے ہوں جن کو میں قرآن ہی پڑھاؤں تو بیٹے نے کہا، کیا تو بھول گیا ہے کہ اب تو نہیں میں بادشاہ ہوں۔ درخواست نامنظور۔''

''درخواست نامنظور۔'' میں نے ہاتھ اٹھا کے مغلِ اعظم کی طرح کہا۔

اس نے ایک دم ریوالور نکالا اور میری گود میں ڈال دیا پھر اسی جگہ بیٹھ گیا۔ ''سوچ کیا رہے ہو، شوٹ کر دو مجھے۔''

میں نے ریوالور اٹھا کے دیکھا۔ ''یہ تو نقلی ہے۔''

''ہاں...... اور اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ میں اناڑی نہیں ہوں، ہر کھلاڑی کی طرح مجھ پر برا وقت آ گیا ہے، اس کھلونے سے میرا بیٹا کھیلتا ہے چنانچہ اس پر میرے فنگر پرنٹس ہی ہیں...... لیکن اس سے مجھ پر کوئی جرم ثابت نہیں ہو سکتا۔ یہ ضرور ثابت کیا جا سکتا ہے کہ کبھی ہم بھی تم بھی تھے آشنا اور میں صرف تم سے ملنے آیا تھا...... کیونکہ کل تم واپس جا رہے ہو، یہ تم نے ہی مجھے بتایا تھا۔''

میں نے پستول پھینک دیا اور دروازے کی طرف بڑھا پھر میں نے دروازہ کھولے رکھا۔ ''تم جا سکتے ہو چیف...... اس سے زیادہ میں تمہارے لیے نہ کچھ کر سکتا ہوں، نہ کروں گا۔''

وہ شکست خوردہ، شرمندہ اور احساسِ ذلت سے دوچار اپنی جگہ بیٹھا رہا۔

''میں تمہیں تیس سیکنڈ دوں گا۔'' میں نے کہا اور پھر اسے آہستہ سے اٹھ کر باہر جاتا ہوا دیکھتا رہا۔

''میری طرف سے ڈاکٹر شائستہ سے معافی مانگ لینا...... ورنہ کسی اور طرح بلائے سے شاید تم نہ آتے۔''

''دفع ہو جاؤ...... اسے تمہاری معافی کی ضرورت نہیں، اسے معافی ہی سمجھو کہ تم پولیس کی تحویل میں نہیں جا رہے ہو۔'' میں نے دھڑ سے دروازہ مارا اور کھلونا پستول کو اس کے پیچھے گلی میں پھینک دیا۔

میں پلٹا تو شائستہ میرے پیچھے موجود تھی۔ ''کون تھا یہ بدمعاش؟''

میں نے آہستہ سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''تھا کوئی...... بس بھول جاؤ اسے، یہ پریشانی تم کو میری وجہ سے اٹھانی پڑی، میں سخت شرمندہ ہوں۔''

وہ ڈری ہوئی تھی۔ ''مجھے پولیس کو رپورٹ نہیں کرنا چاہیے؟''

''کوئی فائدہ نہیں، تمہیں مزید پریشانی ہوگی۔ کیا ثابت کرو گی تم اس کے خلاف اور کیسے، میں بھی کل چلا جاؤں گا۔''

''اب تمہارے جانے کے بعد......''

''مجھ پر یقین کرو، وہ ادھر کا رخ نہیں کرے گا۔ اس کو تم سے کوئی پرخاش نہیں...... تم ایک بہادر اور باہمت عورت ہو، اتنے عرصے سے لندن میں ہو اور اکیلی دو بچوں کو پال رہی ہو۔''

''یہ بچے ہی ہیں جو عورت کو بزدل بنا دیتے ہیں۔ ایک مرد ہی ہوتا ہے جو طاقت دے سکتا ہے۔ خواہ وہ باپ اور بھائی ہو...... یا شوہر، کوئی انکل، میں جانتی ہوں، ابھی ایک لمبی زندگی کا سفر باقی ہے مگر مجھے ڈر لگتا ہے کہ میری زندگی میں آنے والا کوئی دوسرا مرد ان کو میرے پیار سے بھی محروم نہ کر دے، آدھا حق تو اس کا ہوگا۔''

یہ شائستہ کا ایک بدلا ہوا روپ تھا۔ ''دنیا ایسے لوگوں سے خالی نہیں ہوئی شائستہ۔''

''ہاں...... لیکن اس کی پہچان بھی بتاؤ مجھے، میں ایک بار دھوکا کھا چکی ہوں۔ میں سمجھتی تھی کہ ایسا میری ناتجربہ کاری کے باعث ہوا، شاید میں اسے پہچان نہیں سکی تھی کیونکہ میری آنکھوں پر جذبات کی پٹی بندھی ہوئی تھی، لیکن یہ بات نہیں تھی۔'' اس کی آنکھوں سے ایک آنسو ٹپکا۔

''پھر کیا بات تھی؟''

''برا مت ماننا۔ تم بھی ایک مرد ہو، میں نے اسے سمجھنے میں غلطی نہیں کی تھی۔ اس نے جانتے بوجھتے مجھے دھوکا دیا تھا۔ اس کا اصل روپ وہ نہیں تھا جو میرے سامنے آیا اور مجھ سے شادی کرنے تک قائم بھی رہا۔ مرد ایسے ہی ہوتے ہیں، وہ نہیں سمجھتے کہ عورت تو شادی کرتی ہے پناہ کے لیے اور تحفظ کے لیے...... صرف جسمانی تعلق کی بات ہو تو...... ہر رات وہ کسی بھی عاشق کو احسان مند کر سکتی ہے۔''

''تم ضرورت سے زیادہ تلخ ہو رہی ہو، صرف اس لیے کہ ایک مرد ایسا تھا، تم نے سب کو برا بنا دیا۔''

وہ جذبات سے عاری لہجے میں بولتی رہی۔ ''جب اس کی اصلیت کھلی، تو میرے لیے اس کے سوا چارہ نہ رہا کہ اس کو چھوڑ دوں، یہ بھی آسان نہ تھا، اس کی بہت بھاری قیمت

ادا کی میں نے، مجھے بتاتے ہوئے شرم آتی ہے، اس کے وکیل نے مجھے عدالتوں میں خوب گھسیٹا، بہت بدنام کیا، اتنا کہ میرے ماں باپ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے...... حالانکہ وہ بڑے عزت دار لوگ تھے۔''

''یہ تم کس زمانے کی بات کر رہی ہو؟''

''اب تو بات بہت پرانی ہو گئی، اس وقت میں لاہور میں تھی، ایک پرائیویٹ اسپتال میں جاب کرتی تھی، وہ بڑا اثر و رسوخ رکھنے والا شخص تھا۔ اس نے میرے بچے کا باپ ہونے سے بھی انکار کر دیا، حالانکہ اس وقت میں دوسرے بچے کو اپنے وجود میں پال رہی تھی، اس نے الزام ایک ڈاکٹر پر عائد کر دیا جو میرے ساتھ کام کرتا تھا۔ اس کا رشتہ خود میں نے اپنی چھوٹی بہن سے طے کروایا تھا، میرے شوہر نے کہا کہ ایسا میں نے اپنے انٹرسٹ میں کیا۔ میں اپنے عاشق سے مستقبل میں بھی رابطہ رکھنا چاہتی تھی۔''

''او مائی گاڈ...... کوئی شخص اتنا گر سکتا ہے؟''

''میری بہن کی نسبت ختم ہو گئی، وہ مفت میں بدنام ہوئی۔ بالآخر میرے والد کو کسی نے مشورہ دیا کہ اس لالچی کتے کا منہ ایسے بند نہیں ہوگا...... وہ بعد میں بھی بھونکتا رہے گا، اسے کچھ دے دلا کر جان چھڑائیں، میرے والد نے اس کے وکیل کے ذریعے بات کی۔ دس لاکھ میں سودا ہوا۔ ان کے پاس جو تھا میری تعلیم پر لگا دیا تھا۔ میری بہن نے صرف بی اے کیا تھا کیونکہ درمیان میں میرے بھائی کے باہر جانے کا سلسلہ ہو گیا لیکن وہ ایسا گیا کہ پھر لوٹ کر نہ آیا...... اوہ یہ میں نے کیا بات چھیڑ دی۔'' وہ آنسو پونچھ کے اٹھی۔ ''تم سے چائے کے لیے بھی نہیں پوچھا۔''

میں نے اسے بٹھا دیا۔ ''مجھے چائے کی طلب نہیں، آئی ایم سوری...... میں نے ہمیشہ تمہیں غلط سمجھا۔ فریال نے بھی کبھی ذکر نہیں کیا، تمہاری جگہ میں ہوتا تو اس خبیث کو قتل کر دیتا۔''

''سوچا میں نے بھی تھا لیکن ہمت نہیں ہوئی...... اور اس سے مسئلہ حل بھی نہ ہوتا۔ میرے ماں باپ زیادہ مشکل میں پڑ جاتے۔ انہوں نے اپنا گھر بیچ کے دس لاکھ ادا کیے۔ ہم نے خاموشی سے وہ شہر ہی چھوڑ دیا۔ کسی کو بتائے بغیر۔ ایک سال ہم کراچی میں رہے، وہاں میری چھوٹی بیٹی پیدا ہوئی۔ اس کے بعد میں نے انگلینڈ میں اعلیٰ تعلیم کے لیے اپلائی کیا۔ مجھے اسکالرشپ مل گیا۔ میں یہاں آ کے سیٹل ہو گئی۔ آج میں سوچتی ہوں کہ میرے والدین کے پاس وہ مکان بھی نہ ہوتا بیچنے کے لیے...... تو کیا ہوتا۔ وہ آخری وقت تک کرائے کے مکان میں رہے۔''

''اور تمہاری بہن۔''

''اس کی شادی بہت اچھی جگہ ہو گئی...... اب وہ دبئی میں ہے...... اب میں تمہارے دوسرے سوال کا جواب دوں، ایک چانس اور لیا تھا میں نے...... پہلی غلطی کے بعد میں بہت عقلمند ہو گئی ہوں، مجھے مردوں کی پہچان ہو گئی ہے، بس قسمت نے بچا لیا مجھے، اس کا جھوٹ بروقت کھل گیا۔ اس نے بتایا کہ وہ ایک پاکستانی فرم میں منیجر تھا، اس کی شادی بھی ناکام ہو چکی تھی، اس کے پاس یہاں کی شہریت نہیں تھی۔ اگر وہ چاہتا تو یہاں کی شہریت رکھنے والی پاکستانی لڑکیاں بہت تھیں لیکن برطانیہ میں پرورش پانے والی لڑکیاں حد سے زیادہ خودسر اور آزاد خیال ہوتی ہیں، پھر وہ میرا سہارا بھی بننا چاہتا تھا اور میں کیا بتاؤں رفیق کہ لوگ دھوکا بھی کیسے پلان کرتے ہیں...... اس کے ساتھ کام کرنے والوں نے اس کی ہر بات کی تصدیق کی، اس نے دو ساتھیوں سے مجھے ملوایا۔ جو بظاہر اتفاق سے ملے تھے لیکن وہ اتفاق بھی اس کے پلان میں شامل تھا۔''

''پھر حقیقت کیسے کھلی؟''

وہ اٹھی۔ ''کچن میں آ جاؤ...... چائے کی ضرورت اب مجھے بھی محسوس ہو رہی ہے، بچے تو سو گئے۔''

میں کچن میں ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔ ''یہ کافی پرانی بات...... ہے نا؟''

''تین، چار سال پہلے کی۔ بس مجھے قسمت نے بچا لیا۔ یہاں میرا اکاؤنٹ جس بینک میں تھا، وہاں ایک پاکستانی لڑکی تھی۔ فریال کی دوست...... ایک بار ہم تینوں کی ملاقات ایک لنچ پر ہوئی۔ فریال نے اس سے پوچھا کہ تمہارے معاملات کہاں تک آگے بڑھے ہیں تو اس نے بڑے دکھ سے بتایا کہ وہ شخص دھوکے باز ثابت ہوا۔ اس نے مجھے پروپوز کر دیا تھا۔ بینک منیجر سیانا اور شفیق آدمی ہے، اس نے کہا کہ بی بی جلدی نہ کرنا۔ یہ پاکستان نہیں ولایت ہے، شادی میں بھی بڑے چکر ہوتے ہیں...... پہلے اس کے بارے میں معلومات حاصل کر لو۔ جب میں نے معلوم کیا تو پتا چلا کہ اس کی ایک خاندانی بیوی پہلے سے پاکستان میں بیٹھی ہے، سندھ کے کسی گاؤں میں اور وہ ہر مہینے اسے اخراجات کی مد میں ایک لگی بندھی رقم بھی بھیجتا ہے...... اب اندازہ کرو رفیق کہ مجھے کتنا زبردست شاک لگا ہوگا جب اس گفتگو کے دوران مجھے پتا چلا ہوگا کہ مجھ سے محبت جتانے اور شادی کی خواہش کا اظہار کرنے والا بھی وہی شخص تھا۔ وہ ایک وقت میں دو کو پھانسا

دے رہا تھا۔''

''صرف برطانوی شہریت حاصل کرنے کے لیے؟''

''ظاہر ہے، میں اب کوئی نوجوان لڑکی نہیں رہی۔ میری عمر تیس سال ہو چکی ہے لیکن فریال کی وہ سہیلی مجھ سے بھی تین سال بڑی تھی اور بدقسمتی سے نظر بھی ایسی ہی آتی تھی جو شاید میں نہیں لگتی، لوگ کہتے ہیں۔''

''لوگ غلط نہیں کہتے، تم نہ بتاؤ تو پتا ہی نہیں چلے گا کہ تم دو بچوں کی ماں ہو۔ تم نے اچھا سنبھال کے رکھا ہے خود کو۔''

وہ مسکرائی۔ ''نہیں، میں کچھ نہیں کرتی، یہ قدرتی تحفہ ہے، وہ شخص اسی بات کا فائدہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ یہاں تو شادی کے لیے عمر کوئی نہیں دیکھتا، ہم ایشیائی سمجھتے ہیں کہ لڑکی کے لیے شادی کی مارکیٹ ویلیو پچیس کے بعد گر جاتی ہے اور ہر اضافی سال کے ساتھ گرتی ہے۔ یہاں عورت اکیلی رہ سکتی ہے، پاکستانی عورت محبت سے زیادہ تحفظ کے لیے مرد کا سہارا تلاش کرتی ہے۔ یہ ایک نفسیاتی خوف ہے جس سے عورت نکل نہیں سکتی کہ مرد نہ ہو تو وہ غیر محفوظ ہے۔''

اس نے کافی کا مگ کچن کے کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ ''ایک بار پھر سوری شائستہ...... مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ تمہاری زبان اس لیے تلخ ہے کہ تمہاری زندگی کے تجربات تلخ ہیں۔''

وہ میرے مقابل دوسرے اسٹول پر ٹک گئی۔

''تیسرے مرد تم سامنے آئے، میں نے فریال کو سمجھایا تھا کہ مرد سارے دھوکے باز ہوتے ہیں لیکن وہ خود کو اناڑی نہیں کھلاڑی سمجھتی تھی، دیکھ لو بعد میں اس کے ساتھ کیا ہوا۔''

''تم اب بھی سمجھتی ہو...... کہ قصوروار میں ہوں؟''

وہ سوچتی رہی۔ ''دراصل قصور ہماری مشرقی سوچ کا ہے، مرد بالادست ہے۔ وہ محبت کرتا ہے تو اپنی شرائط پر، شادی سے پہلے عورت کا رویہ کیسا ہونا چاہیے۔ شادی کے بعد اسے کیسے رہنا چاہیے، اس کی اہمیت نہیں ہوتی کہ عورت کیا چاہتی ہے۔''

''یہ عورت کو تو دیکھ لینا چاہیے...... محبت یا شادی کرنے سے پہلے...... کہ کیا مرد اس کی سب خواہشات پوری کر سکے گا یا وہ پوری کرا سکے گی۔ فریال کی بدقسمتی کہ اس کی اور میری محبت کے درمیان ریاست آگئی، بالکل اچانک اور غیر متوقع طور پر، یہ ریاست نہ ہوتی تو کیا وہی کرتے جو فریال چاہتی تھی۔ ہم لندن میں ہی رہتے، یہاں میرے لیے ایک روشن مستقبل کی ضمانت تھی...... جب میں نے ست بدھائی کی ذمے داری قبول کر لی تو صورت حال بدل گئی، میں فریال کے لیے ریاست کو چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ دیٹ واز اے ہارڈ فیکٹ...... جسے فریال ہضم نہ کر سکی۔''

''اور نور جہاں نے کر لیا۔'' شائستہ نے ٹھنڈی سانس لی۔

''اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔''

''پھر وہ تمہیں کیوں چھوڑ گئی؟''

میں نے اس کا جواب سوچ کے دیا۔ ''دراصل...... اس کے ماضی پر بدنامی کے سائے بہت گہرے تھے۔''

''اس نے اپنے شوہر کو قتل بھی کر دیا تھا...... ہمارے لیے۔''

''ابھی تک دونوں مفروضات ہیں، صرف الزام...... ایک یہ کہ اکبر خان اس کا شوہر تھا، دوسرے یہ کہ نور جہاں نے اسے قتل کیا تھا، لیکن الزام کا داغ کلنک کا ٹیکا ہوتا ہے، اگر مرد ہو اور عدالت اسے باعزت طور پر بری کر دے تب بھی یہی کہا جاتا ہے کہ وکیل نے بچا لیا ہوگا، سچا گواہ سامنے نہیں آیا ہوگا، الزام عورت پر ہو تو اس کا سوسائٹی میں کہیں ٹھکانا نہیں۔ اللہ بخشے ایک میرے والد ہی تھے جو اسے سپورٹ کرتے تھے، کہتے تھے کہ جو برائی اور بدنامی کی زندگی چھوڑ کے نیکی اختیار کرنا چاہے اس کی حوصلہ افزائی اور مدد کارِ ثواب ہے۔ باقی سب وہی تھے، الزام کے تیر چلانے والے، طعنے دینے والے، انگلیاں اٹھانے والے، جن کے نزدیک وہ اس قابل تھی کہ اسے سنگسار کر دیا جائے حالانکہ ان میں پہلا پتھر مارنے کی اہلیت رکھنے والا کوئی نہ تھا۔ بس وہ ان سب کے مقابلے میں ہار گئی۔ خاموشی سے میری زندگی سے نکل گئی، دنیا کی بھیڑ میں کہیں گم ہو گئیں۔''

''اور اس کے جاتے ہی نور آگئی۔'' وہ تلخی سے بولی۔ ''کتنے خوش قسمت ہو کہ تم سے محبت کرنے کے لیے لڑکیاں قطار باندھے کھڑی ہیں اور وہ بھی کوئی عام لڑکیاں نہیں، نور جیسی...... صورت ایسی کہ مس یونیورس کو شرمسار کر دے، سیرت ایسی کہ فریال بھی گن گائے۔''

''تم مجھے میرا قصور بتاؤ ڈاکٹر شائستہ، کیا میں اتنا ہی اور قابلِ نفرت ہوں جتنے وہ مرد تھے جن کا تم نے تذکرہ کیا؟''

وہ کچھ شرمندہ ہوئی۔ ''شاید نہیں، میں تمہارے ساتھ بداخلاقی سے پیش آتی رہی، آئی ایم سوری۔ آئی واز رانگ۔''

میں نے خالی مگ رکھ دیا۔ ''کوئی بات نہیں۔ رات بہت ہو گئی ہے میں اب چلتا ہوں لیکن جانے سے پہلے میں تمہیں دعوت دیتا ہوں، واپس پاکستان آنے کی...... اچھے برے لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں، ست بدھائی آ کے دیکھو

...وں کی اچھائی پر تمہارا اعتماد بحال ہو جائے گا۔''

میں ضرور آتی لیکن اب میں اپنے لیے نہیں ان بچوں کے مستقبل کو دیکھتی ہوں، میں نہیں آ سکتی...... تم کب تک ہو ...ں؟''

''میں کل واپس چلا جاؤں گا۔ نور بعد میں وحید کے ...ھ آئے گی، سچ پوچھو تو میرے یہاں آنے کا مقصد اور کچھ ...ں تھا۔''

اس نے کچھ تذبذب سے کہا۔ ''اچھا...... نور سے کہنا جب تک یہاں ہے، چاہے تو میرے ساتھ رہے، اسے کسی ...کی مدد کی ضرورت ہو، مجھے بتائے۔''

میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ ''تھینک یو، میں نور سے ...ہ دوں گا۔''

اس نے میرے لیے دروازہ کھولا۔ ''باہر تو بارش ہو ...ں ہے۔ تم کیسے جاؤ گے؟''

مجھے کچھ تشویش لاحق ہوئی۔ لندن کے رہنے والے ...بارش کے عادی ہیں جو وہاں تقریباً سارا سال جاری رہتی ہے۔ کبھی مسلسل پھوار کی صورت میں تو کبھی موسلا دھار۔ ...ہوں نے خود کو موسم کے مزاج کا عادی بنا لیا ہے اور وہ اپنے ...ن سہن کو یا معمولات کو موسم کی خرابی سے متاثر نہیں ہونے ...یتے۔ بارش کے ساتھ ہی چھتریاں کھل جاتی ہیں اور ہر وضع ...قع کے رین کوٹ نکل آتے ہیں۔ سردیوں کا موسم ہو تو یہی ...رش آسمان سے برف باری بن جاتی ہے۔ یہ صرف لندن کی ...ت نہیں، ہر شہر اور ملک کے رہنے والے خود کو موسم کی سختی کا ...ادی بنا لیتے ہیں۔

میں اس شہر میں اجنبی تھا اور بھول گیا تھا کہ یہاں کا ...موسم بھی محبوب کی نظر کی طرح پل بھر میں بدل جاتا ہے۔ مجھے ...صرف اپنے کپڑوں کی فکر تھی اور کچھ یہ اندیشہ کہ بھیگنے سے مجھ ...پر سردی کا اثر نہ ہو جائے۔ بارش کی رفتار اور آسمان پر بادلوں ...کو دیکھ کر یہ توقع رکھنا بھی عبث لگتا تھا کہ کچھ دیر انتظار کرنے ...سے فائدہ ہوگا۔

''اتنی رات گئے یہاں سے تمہیں ٹیکسی بھی نہیں ملے گی۔'' شائستہ نے کہا۔ ''تمہیں گلی کے آخر تک جانا پڑے گا۔''

میں نے کہا۔ ''اب جانا تو ہے۔''

''تم تھوڑی دیر انتظار کر لو۔ شاید بارش رک جائے۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں بھی لندن میں چار سال ...گزار چکا ہوں۔ آثار ایسے نہیں لگتے، تم مجھے کوئی رین کوٹ یا ...چھتری دے دو۔''

وہ یکدم شرمندہ نظر آنے لگی۔ ''میرے پاس مردانہ رین کوٹ نہیں ہے اور اتفاق ایسا ہوا کہ دو دن پہلے میری گاڑی خراب ہو گئی تھی، اسے گیراج میں چھوڑ کے میں ٹیکسی میں آئی تو چھتری ٹیکسی میں رہ گئی۔''

''یہاں ٹیکسی والے بھی عموماً وہ چیزیں دے جاتے ہیں جو مسافر بھول جائیں۔''

''ہاں...... لیکن وہ تھا ہمارا ہی بھائی بند...... خیر چلو، میں تمہیں ٹیکسی تک چھوڑ آتی ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''کیا اس سے بہتر اور آسان یہ نہیں ہوگا کہ تم فون کر کے مجھے ٹیکسی منگوا دو۔ تمہارے بچے بھی گھر میں اکیلے نہیں چھوڑے جا سکتے۔''

''دیکھو، چند گھنٹے میں صبح ہو جائے گی۔''

''شائستہ...... ہوٹل میں نور بہت پریشان ہوگی۔ میں تو حیران ہوں کہ ابھی تک اس نے مجھے فون نہیں کیا۔''

اس نے دروازے کو باہر سے لاک کیا۔ اس کی گاڑی دروازے کے ساتھ ہی موجود تھی، چند منٹ میں اس نے مجھے گلی کے آخری موڑ پر چھوڑا جہاں ایک ٹیکسی موجود تھی، عام پاکستانی عورت کی طرح نہ آدھی رات کے بعد اسے گھر سے اکیلے نکلنے کا خوف تھا نہ یہ ڈر تھا کہ پیچھے گھر میں اکیلے رہ جانے والے بچے غیر محفوظ ہیں۔

ہوٹل کی لابی میں اس وقت کوئی بھی نہیں تھا۔ استقبالیہ

کے کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی اکیلی عورت بھی کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کے سوگئی تھی، اتنی رات گئے اس بارش میں کسی مسافر کے آنے یا جانے کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ یہ کوئی بہت بڑا ہوٹل نہیں تھا۔ اس کی سہ منزلہ عمارت میں مجموعی طور پر پچاس کمرے بھی نہیں ہوں گے لیکن اس کا محلِ وقوع ایسا تھا کہ کمرے ہر وقت بھرے رہتے تھے اور سہولیات تھری اسٹار ہونے کے باوجود وہ فائیو اسٹار ہوٹل کے برابر کرایہ چارج کرتے تھے۔

ہوٹل میں بالکل خاموشی تھی۔ دیر سے آنے والے بھی سو چکے ہوں گے کہ تقریباً تمام کمروں کی کھڑکیوں کے پیچھے اندھیرا تھا۔ صرف باہر کھڑا ہوا دربان چوکس تھا لیکن اس نے میرے سیدھا اوپر جانے کو شک کی نظر سے نہیں دیکھا۔ ظاہر ہے اس کی نظر میں میری حیثیت وہاں قیام کرنے والے کسی مسافر کی تھی۔

فرسٹ فلور پر اپنے کمرے میں پہنچ کے میں نے آہستہ سے ناک کیا لیکن اندر خاموشی رہی۔ دروازے کے نیچے بھی مجھے روشنی نظر نہیں آئی۔ غالباً نور سو رہی تھی۔ میں نے دوسری بار زیادہ قوت سے دروازہ بجایا لیکن اندر کوئی آہٹ نہ ہوئی۔ دروازہ نہ کھلا تو میں نے دروازہ پیٹ کر دوسروں کی نیند حرام کرنے سے بہتر یہ سمجھا کہ نیچے جا کر ڈپلی کیٹ چابی سے دروازہ کھلوالوں۔

کاؤنٹر کے پیچھے کرسی پر خوابیدہ خاتون چالیس پینتالیس سالہ اور بے حد ضخیم لیکن شوقین مزاج خاتون تھیں۔ ان کے شوق کا اندازہ ان کے رنگے ہوئے بالوں اور جدید تراش خراش کے حسین لباس سے بھی ہوتا تھا۔ تاہم وہ اتنی خوش اخلاق بھی ثابت ہوئیں۔

''روم نمبر ایک سو ایک...... جو خاتون اندر ہیں وہ دروازہ نہیں کھول رہی ہیں......'' اس نے مسکرا کر کہا۔

''اس میں حیرانی یا پریشانی کی کیا بات ہے؟''

میں نے زبردستی مسکرا کر کہا۔ ''میڈم پریشانی کیسی، میرا خیال ہے وہ سو رہی ہوں گی۔''

''تمہارا یہ خیال غلط ہے۔ وہ اندر موجود ہی نہیں ہیں۔'' وہ بولی۔ اس نے اپنے پیچھے بورڈ کی طرف اشارہ کیا۔ ''کمرے کی چابی یہاں موجود ہے۔ وہ خود ہی دے کر گئی ہیں۔''

میں نے بے یقینی سے کہا۔ ''وہ کیسے گئی ہے۔ ایسے وقت؟''

''آخر تم بھی تو گئے ہوئے تھے۔ تم اس کے ساتھ رہتے ہونا؟''

''یس...... اس لیے میں اتنے یقین کے ساتھ ک[illegible] ہوں کہ وہ مجھے بتائے بغیر کہیں بھی نہیں جاسکتی۔'' پریشانی سخت تشویش میں بدل گئی۔

''ویل...... میں تمہاری کیا مدد کرسکتی ہوں...... اکیلے سونا نہیں چاہتے یا ڈرتے ہو۔''

''پلیز اسٹاپ دیٹ...... مجھے اس میں کوئی گڑ[illegible] آتی ہے۔''

اس نے بورڈ پر سے چابی اتار کر مجھے تھمادی۔ ''[illegible] چیک کرسکتے ہو۔''

میں نے دروازہ کھول کے اور لائٹ جلا کے د[illegible] سب کچھ ویسا ہی تھا جیسا میرے جانے سے پہلے تھا۔ نو[illegible] جانے سے پہلے کپڑے بدلے تھے اس کے اتارے [illegible] کپڑے بیڈ پر پھیلے ہوئے تھے۔ بیڈ کے نیچے اس کا [illegible] کیس بھی تھا جس میں کپڑوں کے علاوہ کم از کم پچا[illegible] روپے کے زیورات تھے۔ اس کے ساتھ بڑا سوٹ کیس بند رکھا ہوا تھا۔ صرف وہ ہینڈ بیگ نہیں تھا جو نور باہر [illegible] وقت اپنے ساتھ رکھتی تھی۔ میں نے اسے فون کیا۔ جوا[illegible] کہ اس نمبر سے کوئی جواب موصول نہیں ہو رہا۔ میں [illegible] بیٹھ گیا۔ چند منٹ میں میرا شک یقین میں بدل گیا کہ نو[illegible] ساتھ کوئی غیر معمولی بات ہوئی ہے۔ یہ دھوکا بھی ہوسک[illegible] حادثہ بھی...... یہ ناممکن تھا کہ مجھے بتائے بغیر وہ آدھی ر[illegible] نکل جائے اور وہ بھی لندن جیسے شہر میں جو اس کے لیے اجنبی تھا۔ اس نے مجھے کوئی فون نہیں کیا تھا، میرے [illegible] پیغام نہیں چھوڑا تھا۔

ایک خیال کے تحت میں نے فون ملایا کاؤنٹ[illegible] خاتون نے کہا۔ ''یس تمہاری پریشانی دور ہوگئی؟''

میں نے کہا۔ ''وہ کتنی دیر پہلے گئی تھی؟...... کوئی [illegible] چھوڑا تھا؟''

''پیغام کوئی نہیں...... اسے گئے ہوئے تقریباً [illegible] ہو چکا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''کیا وہ پریشان یا خوفزدہ تھی؟''

''میں سمجھتی ہوں، نہیں...... ورنہ میں نوٹ کرتی [illegible] نے پوچھا نہیں اور یہ میرا کام بھی نہیں۔''

''تھینکس......'' میں نے ریسیور رکھ دیا۔ میرا [illegible] ہی غلط ثابت ہو رہا تھا کہ طبیعت کی خرابی کی بنا پر وہ [illegible] لینے نکلی ہو، لیکن لندن میں کیمسٹ ڈاکٹر کے نسخے [illegible] سر درد کی گولی نہیں دیتے اور آدھی رات کے وقت ا[illegible]

[illegible] کی ضرورت پڑسکتی ہے۔ اسے معلوم تھا کہ میں ڈاکٹر شائستہ سے ملنے گیا ہوں، کیا وہ شائستہ کے گھر جاسکتی ہے؟ اگر وہ کوئی بے عقل شکی مزاج عورت ہوتی تب بھی ایسا نہ کرتی۔ نور تو شک کی صلاحیت ہی سے محروم ہے اور مجھ پر اس کا اعتماد سو فیصد رہتا ہے۔

اس کے باوجود میں نے شائستہ کو فون کیا۔ وہ سوتے سے اٹھی تھی۔ ''رفیق...... کیا ہوا، تم ٹھیک ہونا۔'' وہ گھبرا گئی۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ دراصل نور کا پتا نہیں چل رہا ہے۔ وہ ہوٹل میں نہیں ہے، فون پر بھی نہیں مل رہی ہے۔''

''کب سے......؟''

''ایک ڈیڑھ گھنٹے سے...... تمہاری طرف تو نہیں آئی؟''

''نہیں...... تم فوراً پولیس کو بتادو، دیر مت کرو۔''

''آئی ایم سوری...... تمہیں ڈسٹرب کیا تم سو جاؤ۔''

''ڈونٹ بی سو فارمل...... سوچو وہ کہاں جاسکتی ہے اور جب پتا چلے تو مجھے بتانا۔''

شائستہ کا مشورہ صائب تھا۔ اس کے باوجود پولیس کو رپورٹ کرنے سے پہلے میں نے امکانات پر غور کرلینا مناسب سمجھا۔ آخر پولیس بھی تو یہی سوال کرے گی کہ مجھے کس بات کا شک ہے یا کسی پر شک ہے...... کیوں شک ہے۔ یہاں تو خود پولیس اپنا کام شک سے شروع کرتی ہے کہ کہیں رپورٹ کرنے والا کوئی ڈراما تو نہیں کر رہا۔

شک کی کسوٹی پر صرف ایک نام پورا اترتا تھا۔ چیف ایک جرائم پیشہ اور کینہ پرور شخص تھا۔ میں نے اسے انکار کیا تھا اور بے عزت کیا تھا۔ کہیں وہ تو نور کو دھوکے سے نکال کے نہیں لے گیا۔ نور نہ بچی تھی اور نہ بے وقوف، کوئی زبردستی اسے نہیں لے جاسکتا تھا اور آخری بات یہی کہ ہر صورت میں وہ مجھے بتاتی۔

اچانک مجھے ایک نیا خیال آیا۔ میں نیچے لپکا اور گیٹ پر کھڑے ہوئے چوکیدار کے پاس گیا۔ ''سنو'' تم نے اس لیڈی کو دیکھا ہوگا جو میرے ساتھ تھی، ویری بیوٹی فل۔''

''اسے میں کیسے بھول سکتا ہوں، وہ تمہارے ساتھ ہی گئی تھی۔''

میں بھونچکا رہ گیا۔ ''میرے ساتھ گئی تھی...... کب؟''

''ابھی...... شاید دو گھنٹے پہلے...... میں نے وقت نہیں دیکھا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو، تم نشے میں تو نہیں ہو؟''

''چلاؤ مت۔ مجھے تو تم نشے میں لگتے ہو...... تم ٹیکسی میں آئے تھے تمہارے ساتھ کوئی عورت تھی جو ٹیکسی میں بیٹھی رہی۔ اسے میں نے نہیں دیکھا۔ تم نے کہا کہ روم ایک سو ایک سے اس عورت کو بلاؤ تم نے نام بھی لیا تھا۔ یس...... نور...... تم نے مجھے ایک پونڈ دیا تھا اور میں نے تمہارا پیغام دیا تھا، تم ٹیکسی میں بیٹھے رہے تھے کیونکہ بارش ہو رہی تھی لیکن وہ عورت اوپر سے آئی تھی تم نے باہر آ کے اسے ریسیو کیا تھا...... وہ تمہارے ساتھ پیچھے بیٹھی تھی۔''

میں نے نرمی سے کہا۔ ''دیکھو...... غور سے دیکھو، کیا میں نے یہی کپڑے پہن رکھے تھے؟''

''میں نے اتنا غور نہیں کیا تھا...... اور جب بارش کے ساتھ اندھیرا ہو تو دور سے کہاں نظر آتا ہے۔'' اس نے بے رخی سے کہا۔

اب ساری صورت حال مجھ پر واضح ہوچکی تھی۔ وہ میں نہیں وحید تھا جو ہوٹل پہنچا۔ اس نے نیچے سے ہی نور کو بلوایا اور گارڈ اسے دیکھ کر دھوکا کھا گیا کہ وہ میں ہوں...... اس نے اوپر سے نور کو بلا کے ایک پونڈ بھی وصول کرلیا۔ خود نور نے گیٹ سے نکلتے وقت ہی مجھے دیکھا ہوگا۔ یہ اسے ٹیکسی میں بیٹھنے کے بعد معلوم ہوا ہوگا کہ وہ میں نہیں تھا۔ کاؤنٹر پر بیٹھی ہوئی خاتون شاید اسی طرح کرسی پر سو رہی ہوگی چنانچہ نور نے کمرے کی چابی گارڈ کو دی ہوگی اور اس نے بورڈ پر لٹکا دی ہوگی۔ خاتون کو پتا نہیں چلا ہوگا کہ وہ کب گئی تھی۔ وہ مجھے کیا بتاتی۔

اب میری تشویش نے ایک نئی سمت اختیار کرلی تھی۔ آخر وحید کو کیا ضرورت تھی کہ وہ دھوکے سے نور کو لے جائے؟ کیا وہ خود کسی کے دباؤ میں تھا۔ کسی اور کے اشارے پر یا گن پوائنٹ پر اس نے یہ حرکت کی؟ نور کو یوں اغوا کرنے کا مقصد کیا ہوسکتا ہے؟ اس سے کسی کو کیا فائدہ ہوسکتا تھا؟ جب میں واپس اپنے کمرے میں آیا تو میرا ذہن مختلف امکانات میں الجھا ہوا تھا...... اگر نور کو اغوا کیا گیا تھا تو ابھی تک اپنا مقصد کیوں نہیں بتایا تھا یا کوئی مطالبہ کیوں نہیں کیا تھا؟ وحید بظاہر مجرمانہ ذہن نہیں رکھتا تھا لیکن مفلسی اور مجبوری انسان سے ہر کام کراسکتی ہے...... کیا مجھے اس کے خلاف رپورٹ لکھوا دینی چاہیے۔

یہ سوال ضرور پوچھا جائے گا کہ وحید نے خود ایسا نہیں کیا تو اسے مجبور کرنے والا کون ہوسکتا ہے۔ نور کے اغوا میں کس کا مفاد ہے...... کوئی ہے اس کا یا میرا دشمن جس کو اس حرکت سے انتقاماً...... تسکین مل سکتی ہے جو نور کا یا میرا برا چاہتا

ہو۔

ایک ساتھ میرے ذہن میں دو نام آئے۔ پہلا نام عائشہ کا تھا، وہ ایک زخم خوردہ ناگن تھی جسے احساس شکست نے دیوانہ کر دیا تھا۔ وہ تذلیل کے عذاب سے گزر رہی تھی اور مجھے سخت سزا دینا اس کی عین آرزو تھی، وہ بااثر تھی اور آج کل اسے اپنے سیاسی طاقت رکھنے والے باپ کی حمایت بھی حاصل تھی۔

دوسرا نام چیف کا تھا۔ عائشہ کے مقابلے میں وہ اغوا اور قتل جیسے جرائم میں ملوث ہونے کی بہت زیادہ اہلیت رکھتا تھا۔ اس کے ماضی کا مجرمانہ ریکارڈ میرے سامنے تھا اور کچھ دیر پہلے ڈاکٹر شائستہ کے گھر میں اسے میں نے سخت الفاظ میں بے عزت کیا تھا۔ وہ اپنی بات منوانے کے لیے کسی بھی انتہا تک جا سکتا تھا۔

مجھے معلوم تھا کہ لندن کی پولیس کتنی مستعد ہے اور میرے ایک فون پر نزدیک ترین پولیس کار چند منٹ میں ہوٹل پہنچ جائے گی لیکن عجلت میں کوئی قدم اٹھانے سے الٹا نقصان بھی ہو سکتا تھا۔ سب سے پہلا مسئلہ یہی ہوگا کہ نور کے نہ ملنے کو اغوا ثابت کرنا مشکل ہوگا۔ وہ اپنی تفتیش کا آغاز کاؤنٹر کلرک اور گارڈ کے بیان سے کریں گے۔ کاؤنٹر کلرک اپنے بیان پر قائم رہے گی کہ وہ اپنے پیروں پر چل کے گئی تھی۔ اس نے چابی میرے حوالے کی تو ذرا بھی نروس یا پریشان نہیں تھی۔

اصل مشکل میں ڈالے گا گارڈ کا بیان جو کہے گا کہ میں خود ہی اسے ٹیکسی میں اپنے ساتھ لے گیا تھا اور دو گھنٹے بعد خود ہی اس کے اغوا کیے جانے کا شور مچا رہا ہوں۔ یہ بات وہ اتنے وثوق سے حلف اٹھا کے کہے گا کہ پولیس خود مجھے شک کی نظر سے دیکھتے ہوئے مجھے شامل تفتیش کر لے گی۔ ظاہر ہے اس کے بعد مجھے اپنی پوری رام کہانی سنانی پڑے گی کہ میرے شک کی وجہ کیا ہے، وحید کون ہے۔ مجھے چیف پر کیوں شک ہے اور عائشہ سے کیوں خطرہ ہے، میرے اندیشوں کی بنیاد خود میرے خلاف تفتیش کا راستہ کھول دے گی اور چیف کے ساتھ میرے تعلق کا پس منظر سامنے آئے گا تو بہت سے سربستہ راز کھلیں گے جن پر ابھی تک پردہ پڑا ہوا تھا۔

صبح ہونے میں ابھی دیر تھی۔ دیوار پر لگی ہوئی گھڑی صبح کے ساڑھے تین بجا رہی تھی۔ آج پروگرام کے مطابق مجھے واپس جانا تھا لیکن ایسا لگتا تھا کہ شاید مجھے اپنا پروگرام موخر کرنا پڑے گا۔ پاکستان میں اس وقت رات کے ساڑھے دس بجے ہوں گے۔ کیا مجھے راجا سے مشورہ کرنا چاہیے۔ میرا ہاتھ فون کی طرف گیا اور رک گیا۔ ہزاروں میل کی دوری پر بدحالی میں بیٹھا ہوا راجا میری کیا مدد کرے گا۔ اس کے [illegible] میں یہاں خود کو بہت بے سہارا اور اکیلا محسوس کر رہا تھا۔

مجھے کافی کی طلب ہو رہی تھی۔ روم سروس کے اوقات کار صبح آٹھ بجے شروع ہوتے تھے لیکن مجھے معلوم تھا کہ [illegible] کھلا ہوگا اور سیلف سروس کے اصول پر مہمانوں کو اجازت [illegible] کہ وہ کافی مشین اور مائیکرو ویو وغیرہ استعمال کریں اور [illegible] میں دستیاب اشیائے خورونوش میں سے جو پسند کریں [illegible] لیں۔ جسمانی تھکان کے ساتھ ذہنی انتشار میری قوت فیصلہ [illegible] متاثر کر رہا تھا۔

میں ایک زینہ اتر کے بیسمنٹ میں گیا۔ کچن کی لائٹ [illegible] آف تھی اور لندن میں رہنے کا سابقہ تجربہ مجھے بھولا نہیں تھا [illegible] میں نے چند منٹ میں ضرورت کی ہر چیز نکال کے کافی بنا [illegible] اور مگ لے کر اوپر آیا تو فون کی گھنٹی بج رہی تھی مگ وہیں [illegible] کر میں نے ریسیور اٹھا لیا۔ ''ہیلو۔''

کسی نے بیٹھی ہوئی آواز میں کہا۔ ''کون......؟''

میں نے کہا۔ ''رفیق...... نواب رفیق احمد شیرازی [illegible] کون ہو؟''

''مجھے تم سے ہی بات کرنی تھی۔''

''نور کے بارے میں؟'' میں نے بے چینی سے کہا۔

''ہاں...... میں تمہارا ہم زاد ہوں......'' اس کی آواز نشے سے بوجھل ہو رہی تھی یا وہ دبے ہوئے لہجے میں بات [illegible] رہا تھا۔

''وحید......'' میں نے چلاتے ہوئے کہا۔ ''نور کو لے گئے تھے خبیث؟''

''گالیاں مت دو۔ میں ایسا آدمی نہیں ہوں، فنکار ہوں۔''

''فنکار کے بچے۔ تم نے خود اسے اغوا نہیں کیا تو [illegible] جرم میں کسی کے مددگار رہے ہو۔''

وہ نشے میں بولا ''دیکھو۔ اچھے لوگ بھی برائی پر مجبور ہو جاتے ہیں یا کر دیے جاتے ہیں، کیا...... میں نے [illegible] کہا؟''

''وحید...... وہ کہاں ہے؟''

''مجھے...... مجھے نہیں معلوم...... لیکن فکر مت کرنا۔''

پھر کسی نے چلا کے اسے گالی دی۔ ''یو سن آف [illegible] بچ!'' اور لائن کٹ گئی۔ آواز کسی عورت کی تھی جس نے [illegible] کے ہاتھ سے ریسیور چھینا تھا۔ میں کچھ دیر اپنے ہاتھ میں [illegible] جان ہو جانے والے ریسیور کو دیکھتا رہا۔ وحید کی کال [illegible]

[illegible] جانے کے باوجود میرے سر سے تفکرات کی بوجھل چٹان [illegible] تھی۔ اس نے رازداری سے اور اعتماد میں فون کیا تھا [illegible] سے ظاہر ہوتا تھا کہ مجبوری کا عذر رکھنے کے باوجود اس [illegible] جذباتی ہمدردی میرے ساتھ تھی اور موقع پاتے ہی اس [illegible] فون پر مجھے یہ اطلاع ضرور فراہم کر دی تھی کہ فکر کی کوئی [illegible] نہیں۔

ریسیور کو کریڈل پر رکھ کے میں نے کافی کا مگ اٹھا لیا۔ [illegible] بہت پرانی کہانی میں کسی شہزادی کو اغوا کیا گیا تو وہ اون [illegible] لیے بن رہی تھی۔ وہ اون کا گولا کھولتی گئی اور اس کے [illegible] میں نکلنے والا شہزادہ دھاگے کے ساتھ آگے بڑھتا گیا۔ [illegible] ہاتھ میں بھی ایک ڈور کا سرا آ گیا تھا۔ اب میں ایک [illegible] میں آگے بڑھ سکتا تھا۔ چند منٹ میں یہ پتا چل گیا کہ [illegible] ہوٹل کے نمبر پر کال کہاں سے کی گئی تھی۔ مایوسی کی بات [illegible] کہ نمبر کسی پبلک کال آفس کا تھا۔ اگر میں پولیس کو بتا دیتا [illegible] بہ آسانی اس پبلک کال آفس تک پہنچ جاتے لیکن میں [illegible] فوری قدم اٹھانے سے گریز کیا۔ ابھی میں پولیس کو بیچ [illegible] لانا نہیں چاہتا تھا۔ ایک امید تھی کہ یہ مسئلہ شاید خود ہی حل [illegible] جائے گا۔ لیکن دوسری طرف یہ اندیشہ بھی تھا کہ پولیس [illegible] تاخیر کا ذمے دار قرار دے گی۔

میں نے اس عورت کی آواز کو ذہن میں رکھا جس نے [illegible] وحید کو کتے کا بچہ کہا تھا۔ اس کا لب ولہجہ خالص مقامی تھا۔ کیا [illegible] اپنے گھر میں کوئی اسٹور چلاتی تھی جہاں پی سی او کی سہولت [illegible] تھی۔ ورنہ یہ کیسے ممکن ہوا کہ وحید نے اتنی رات گئے بارش [illegible] کسی پی سی او تک جانے کی ہمت کی اور وہ عورت بھی اس کے پیچھے پیچھے وہاں پہنچ گئی۔

تاخیر خود میرے لیے مسائل کھڑے کر سکتی تھی۔ اپنی عقل کے گھوڑے دوڑانے سے یہ کہیں بہتر تھا کہ میں پولیس کی مدد حاصل کر لوں۔ میں لندن کی پولیس کے طریقۂ کار سے واقف تھا۔ وہ پاکستانی پولیس کی طرح مسئلہ لے کر آنے والے کو مسائل میں گرفتار نہیں کرتے تھے۔ کوئی غلط بیانی نہ کرے تو وہ فوری ایکشن لیتے تھے اور ہمدردانہ رویے کے ساتھ مدد بھی کرتے تھے۔

میرے کال کرنے کے بعد مشکل سے دس منٹ میں ایک پولیس کار وہاں پہنچ گئی۔ اس وقت تک ہوٹل انتظامیہ کو بھی صورت حال کی سنگینی کا اندازہ ہو گیا تھا۔ ایک سارجنٹ نے لابی میں بیٹھ کے میری بات سنی اور نوٹ لیتا گیا۔

''مسٹر شیرازی، تم پاکستان سے آئے تھے۔ کیا میں تمہارا پاسپورٹ دیکھ سکتا ہوں؟''

میں نے اسے پاسپورٹ دے دیا۔ ''آج میرا واپسی کا ارادہ تھا۔''

''یہ عورت ماہ نور، یہ تمہارے ساتھ آئی تھی؟''

''یس...... لیکن اس نے یہاں انٹیریئر ڈیزائننگ کے ایک اسکول میں داخلہ لے لیا ہے۔ اس کا ارادہ میرے ساتھ واپس جانے کا نہیں تھا۔''

''ہوٹل میں اس کے پاسپورٹ کی انٹری ہے۔ تم اس کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے؟''

''یس۔ لیکن وہ میری بیوی نہیں ہے۔''

''اس سے مجھے کوئی سروکار نہیں کہ اس کا تم سے کیا رشتہ تھا۔ تم کہتے ہو کہ تمہارے یہاں آنے کا مقصد کچھ اور تھا۔''

''یس۔ میں برٹش نیشنل ہوں...... اور یہ نیشنلٹی مجھے تقریباً پانچ سال قبل ملی تھی جب میں لارڈ ارنسٹ کی فرم میں ایک اچھے عہدے پر تھا لیکن میرے آنے کا ایک مقصد اور بھی تھا۔''

سارجنٹ نے لکھتے ہوئے کہا ''کیا تم وہ مقصد بتاؤ گے؟''

میں نے کہا ''یہاں ایک پاکستانی آرٹسٹ ہے، وحید...... میں اسے واپس اپنے ساتھ پاکستان لے جانا چاہتا تھا۔''

''وہ کس لیے؟''

''اس کی وہاں ضرورت ہے۔ میں اسے قائل کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ وہ ناقابل یقین حد تک میرا ہم شکل ہے اور سیکیورٹی گارڈ کے بیان سے تصدیق ہو گئی ہے کہ وہی ماہ نور کو لے گیا ہے۔ گارڈ نے سمجھا وہ میں تھا۔ اس میں گارڈ کا کوئی قصور نہیں۔ خود ماہ نور اسی دھوکے میں چلی گئی لیکن وہ میں نہیں تھا۔ یہ میں جانتا ہوں۔ جب تم اسے دیکھو گے تو تمہیں بھی یقین آ جائے گا۔ مجھے اسی نے فون کال کر کے کہا تھا کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔''

سارجنٹ نے میرے بیان پر کسی شک یا حیرانی کا اظہار نہیں کیا۔ اس کے یقین کے مطابق میں جو بتا رہا تھا درست تھا۔ ایک اور جگہ اس نے مجھے غیر ضروری تفصیل میں جانے سے روکا اور پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

''ہم پہلے اس کال آفس کو دیکھتے ہیں۔ پھر وہاں جائیں گے جہاں تمہارا یہ ہم شکل وحید رہتا ہے۔ کوئی اور اہم بات تم راستے میں بتا سکتے ہو۔''

میں نے فی الحال عائشہ کے معاملے کو نہیں چھیڑا تھا اور نہ ہی چیف کا کوئی ذکر کیا تھا۔ ابتدا میں یہ تفصیلات غیر ضروری

تھیں۔ میں کسی کو ملوث کیے بغیر ماہ نور تک یا وحید تک رسائی چاہتا تھا۔ اس سے مجھ پر حقائق چھپانے کا الزام نہیں آ سکتا تھا۔

کسی دشواری کے بغیر پولیس نے اس پبلک کال آفس کا سراغ لگالیا جہاں سے وحید نے مجھے کال کی تھی۔ صبح کے سوا چار بجے ایک بوڑھے نے کال بیل کے جواب میں اوپر لائٹ آن کر کے کھڑکی سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے؟''

سارجنٹ نے کہا'' ہم کچھ معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ کیا تم نیچے آؤ گے؟''

''اس وقت...... تم کسی شریف اور بوڑھے آدمی کی نیند خراب کرنے آگئے ہو۔ ایسی کیا آفت آ گئی۔ کیا تم صبح نہیں آ سکتے تھے؟'' وہ بگڑ گیا۔

''یہ ضروری معاملہ تھا۔ تم ہی اس نیچے والے اسٹور کے مالک ہو؟''

''یس۔ میں کوئی غیر قانونی چیز نہیں بیچتا۔'' وہ نیچے آ گیا۔

''کیا ابھی یہاں کوئی فون کرنے آیا تھا؟ تم چوبیس گھنٹے سروس دیتے ہو۔''

''ہاں' جو لوگ جانتے ہیں وہ کال بیل بجا دیتے ہیں۔ لیکن عام طور پر آدھی رات کے بعد کوئی نہیں آتا۔''

''کچھ دیر پہلے کسی نے یہاں سے ایک کال کی تھی۔''

''فون باہر لگا ہوا ہے۔ جب میں صبح اسٹور کھولتا ہوں تو سکے نکال لیتا ہوں۔ سکے پر کسی کا نام نہیں ہوتا۔ مجھے نہیں معلوم تم کس کی بات کر رہے ہو۔ یہ تم خود بھی دیکھ سکتے تھے کہ فون بوتھ اندر نہیں ہے۔ اس کے لیے مجھے جگانا ضروری نہیں تھا۔ میں تمہاری رپورٹ کروں گا۔ تم شریف شہریوں کو تنگ کرتے ہو۔''

سارجنٹ نے اس سے معافی مانگی۔ ''آئی ایم سوری۔ اگر تم نہ بتاتے تو میں اس فون بوتھ کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ وہ ایسی جگہ لگا ہوا ہے' آس پاس کے رہنے والے شاید جانتے ہوں گے۔''

بڈھا دھڑ سے دروازہ بند کر کے اس وضاحت پر عدم اطمینان کا اظہار کرتا ہوا اندر چلا گیا۔ بظاہر سارجنٹ کے معافی مانگنے سے بات ختم ہو گئی تھی۔ مجھے اپنے ملک کی پولیس کا رویہ یاد آیا۔ وہ اتنی بات کہاں سنتے' گھسیٹ کر ٹھڈے مارتے ہوئے اس بڈھے کو تھانے لے جاتے اور صبح تک پولیس کے ساتھ تمیز سے بات کرنا سکھا دیتے۔

یہ صورتِ حال خاصی مایوس کن تھی۔ یہ تو پتا چل گیا تھا کہ وحید اسی علاقے میں رہتا تھا یا رہ چکا تھا اور جانتا فون بوتھ کہاں ہے۔ کوئی اجنبی یا سڑک پر سے گزرنے رات کے اندھیرے میں اسے نہیں دیکھ سکتا تھا انفارمیشن سے کوئی مدد نہیں مل سکتی تھی' محلے کے لوگوں کو پوچھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

''جہاں تمہاری وحید سے بات ہوئی تھی' کیا وہ اس علاقے میں ہے مسٹر شیرازی؟'' سارجنٹ نے پوچھا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''لیکن میں تمہیں وہاں لے جا سکتا ہوں۔''

وہاں میں صرف ایک بار گیا تھا۔ رات کے وقت دوبارہ پہنچنا آسان نہ تھا۔ میں یادداشت پر زور دے کر بتاتا گیا۔ کافی دیر ادھر ادھر کی گلیوں میں بھٹکنے کے بعد اس میں نے وہ گھر دیکھ لیا۔ اب بارش تھم چکی تھی لیکن اس علاقے میں گلیاں اور سڑکیں پوری طرح روشن نہیں تھیں۔ سارجنٹ نے کئی بار کال بیل بجائی لیکن گھر کے اندر سے کوئی جواب نہیں آیا۔ اندر بھی اندھیرا ہی رہا۔

''میرا خیال ہے کہ یہاں کوئی نہیں۔ یہ پتا تمہیں کس نے دیا تھا؟''

میں نے اس یہودی آرٹ ڈیلر کے بارے میں بتایا۔ ''اس کی گیلری میں پیچھے کچھ جگہ ہے۔ جہاں آرٹسٹ کام کرتے ہیں۔ ممکن ہے رات کو بھی کچھ کام کرنے والے آ جائیں۔ ان لوگوں کے لیے دن کے مقابلے میں رات کا ماحول اور موڈ فراہم کرتی ہے۔ خصوصاً ان کے لیے جو قابل اعتراض تصاویر بناتے ہیں۔''

سارجنٹ نے مجھے حیرانی سے دیکھا۔ ''ایک آرٹسٹ کی بنائی ہوئی تصویر میں قابل اعتراض کیا ہو سکتا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''ویل...... یہ میری رائے تھی۔ کچھ پیسوں کے لیے نیوڈ بناتے ہیں' کچھ خواتین شوقیہ آتی ہیں' کچھ مجبور اور میں نے صرف سنا ہے کہ کچھ آرٹسٹ اس کا ناجائز فائدہ بھی اٹھاتے ہیں' میں نہیں جانتا حقیقت کیا ہے؟''

سارجنٹ نے سر ہلایا۔ ''ہم چل کے دیکھ سکتے ہیں۔''

میرا اندازہ درست تھا۔ آرٹ گیلری کے شٹر ڈاؤن تھے لیکن اس کے نیچے سے روشنی کی لکیر دیکھی جا سکتی تھی۔ دروازہ بجانے پر ایک ڈاڑھی والا ہپی باہر آیا اور پولیس کو دیکھ کر حیران ہوا۔ ''کیا بات ہے؟''

''کیا اس آرٹ گیلری کا مالک اندر موجود ہے؟''

''نہیں۔ وہ اپنے گھر میں کسی عورت کے ساتھ سو رہا ہوگا۔ یہاں ہم چمگادڑ کی فیملی کے لوگ جاگ رہے ہیں۔''

...ہی جھوم رہا تھا اور سگریٹ کو مٹھی میں دبا کے کش لگا رہا تھا۔

''تم کسی وحید کو جانتے ہو؟ اس آدمی کو دیکھو۔'' ...ٹ نے میری طرف اشارہ کیا۔ ''ہمارے پاس اس کی تصویر نہیں لیکن وہ اس کی ڈپلی کیٹ کاپی ہے۔''

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ''یس۔ ایک شخص ہے ایسا۔ لیکن وہ ...یں ہے۔ اور یہ کون بتا سکتا ہے کہ وہ کہاں ہوگا؟''

میں نے کہا۔ ''گیلری کا یہودی مالک بتا سکتا ہے۔''

''تو پھر اس کے پاس جاؤ۔'' وہ پلٹ گیا۔ ''یا ایسے ...آنا جب وہ یہاں موجود ہو۔''

اب صبح کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔ میرے ہاتھ ...نے والی ڈور کسی ٹھکانے پر پہنچانے میں ناکام رہی تھی۔ ...نے مجھے واپس ہوٹل میں ڈراپ کیا۔ ''ہم اس کا سراغ ...ں گے۔ تمہارے پاس اس کی تصویر نہیں ہے اس لیے ہم ...ری تصویر استعمال کریں گے۔ تمہیں اعتراض تو نہیں ...؟''

میں نے کہا۔ ''مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔'' صبح مجھے پولیس اسٹیشن پر میری تصویر لانے کے لیے ...گیا۔

صبح کا اجالا نمودار ہونے تک میں سونے کی ناکام کوشش ...آنکھیں بند کیے پڑا رہا لیکن نیند کا تعلق دماغ سے ہوتا ہے ...دماغ کے اندر وحشت ناک سوچوں اور دہشت زدہ ...نے والے خیالوں کا کارخانہ پوری طرح چل رہا ہو تو نیند ...اں سے آئے۔ اب مجھے ایک نئی فکر نے بھی گھیر لیا تھا۔ ...نے اپنے طور پر فرض کر لیا تھا کہ وحید کے فون میں نور کی ...ت کا پیغام تھا کیونکہ اس نے کہا تھا کہ فکر نہ کرنا۔ مزید یہ ...میں نے صرف آواز سنی تھی۔ فون پر وحید کی صورت نظر ...نہ آ رہی تھی۔ خود پولیس میری ہم خیال تھی کہ فون بھی ...ب کی چال ہو۔ مجھے کوئی فوری قدم اٹھانے سے روکنے ...کے لیے۔ ابھی تک یہ تلاش بے سود رہی تھی لیکن وحید کا ملنا ...حد ضروری تھا۔

صبح آٹھ بجے میں نے آدھا ادھورا ناشتا کرتے ہوئے ...ستان میں راجا سے بات کی۔ وہاں صبح کے تین بجے تھے۔ ...بیس منٹ کی کال کا صرف اتنا فائدہ ہوا کہ میرا ذہن دوسرے ...شانت کی راہ پر چل پڑا۔

''وحید کو کسی نے استعمال کیا ہے فیکے پتر!''

میں نے کہا۔ ''یہ میں بھی سمجھتا ہوں' نہ وہ جرائم پیشہ ہے ...نہ اس کا ذہن ایسے جرم کی طرف مائل ہو سکتا ہے۔''

''وہ بہت مقروض تھا۔ کیا اس کا کوئی قرض خواہ اسے یہ راہ نہیں دکھا سکتا؟''

''یار' میں نے اس کا سارا قرض کا حساب برابر کرنے کی ذمے داری قبول کر لی تھی۔ اس کے قرض خواہ بھی عام لوگ ہیں۔ آرٹ گیلری والے۔ اس کو تصویر بنوانے کے لیے پیشگی رقم دینے والے۔ ان میں خواتین زیادہ ہیں۔ کچھ پروفیشنل جو اپنی تصاویر کو پبلسٹی میں استعمال کرتیں۔ کچھ نفسیاتی مریض قسم کی خواتین' خود پرست' مجھے کسی نے بتایا کہ وہ جنسی طور پر ناآسودہ ہوتی ہیں۔ ایسے لوگ جرائم پیشہ نہیں ہو سکتے۔''

''پھر میرا شک ایک ہی سمت میں جاتا ہے یار!''

''کس سمت میں' عائشہ کی طرف؟''

''رائٹ۔ عین ممکن ہے اس نے تجھ سے اپنی شکست کا انتقام لیا ہو۔ ایک ناکامی کے صدمے نے اسے پاگل کر دیا ہوگا اور مجھے خطرہ ہے کہ کہیں وہ نور کو ہی ختم نہ کرا دے۔ اسی کو وہ اپنا اصل حریف اور دشمن سمجھتی ہے۔''

''راجا' وہ اتنی پاگل بھی نہیں ہے۔ یہاں اغوا اور قتل انتہائی سیریس جرائم سمجھے جاتے ہیں اور عام طور پر پولیس چوبیس گھنٹے میں مجرم کا سراغ لگا لیتی ہے۔''

''اس کا باپ بہت بااثر ہے اور اپنے موجودہ حالات میں وہ بھی تیرا دشمن ہوگا۔ کیونکہ وہ تجھے ہی اپنی بیٹی کے دماغی عدم توازن کا ذمے دار سمجھتا ہے۔ تو نے اسے اس حال کو پہنچایا۔ تو نے اسے دھوکا دیا۔ اس سے جھوٹ بولا۔ اسے بے وقوف بنایا اور بالآخر نور کو لے کر نکل گیا۔''

''یہاں کی پولیس کسی کے اثر و رسوخ کو خاطر میں نہیں لاتی۔ یہ ٹھیک ہے کہ لارڈ ارنسٹ مجھے اپنی بیٹی کی موجودہ حالت کا ذمے دار سمجھتا ہوگا لیکن وہ نور کو قتل نہیں کرا سکتا۔''

''یار' میں کیا کہہ رہا ہوں۔ تو کیا سمجھ رہا ہے۔ قتل کرائے گی اس کی بیٹی اپنے پاگل پن میں۔ وہ بیٹی کو بچانے کے لیے اپنا اثر و رسوخ اور اپنی دولت سب استعمال کرے گا۔ عائشہ اس کی اکلوتی بیٹی ہے۔ ابھی بیوی مری ہے۔ اب وہ بیٹی کو بھی گنوا دے۔ وہ اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دے گا فیکے پتر اور اسے بچا لے گا۔ یہ مت کہو کہ وہاں سارے فرشتے ہوتے ہیں اور برطانیہ میں کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں ہوتی۔ وہاں رہنے والے لاکھوں انڈین' پاکستانی اور سیاہ فام اس نظام کو دن رات بھگت رہے ہیں۔ مسلمانوں کے ساتھ کیا ہو رہا ہے' تجھے نہیں معلوم۔''

میں نے کہا ''تو ٹھیک کہہ رہا ہے راجا لیکن میں یہاں زیادہ دن نہیں رک سکتا۔ میں نے لارڈ ارنسٹ کی بیٹی پر انگلی

اٹھائی تو ایک زبردست جنگ چھڑ جائے گی۔ وہ اپنی بیٹی کو بچانے کے لیے خود میرے خلاف اپنی پوری طاقت کے ساتھ میدان میں بھی اتر آئے گا اور واقعی' کوئی سسٹم پرفیکٹ نہیں ہوتا۔''

''ہاں' بڑے لوگ وہاں بھی پولیس میں ہوں گے۔ وہاں بھی وکیل ہوں گے جو انصاف کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے سو طریقے نکال لیں گے۔ تیرے مقابل کوئی عام آدمی نہیں' ایک بہت طاقت ور شخص ہوگا۔ جو دولت مند بھی ہے اور سیاسی اثر و رسوخ بھی رکھتا ہے۔ اور عائشہ اس کی اکلوتی بیٹی' اس کی وارث' یہ مت بھول۔''

''مگر تو میری جگہ ہوتا راجا!''

''سچ کہوں' میں جذبات کو ایک طرف رکھتا اور سودا کرلیتا۔ پکا سودا۔''

''سودا کس کا؟''

''اپنا...... اور کس کا فیکے پتر! میں اپنے جذبات اور ضمیر وغیرہ کا سودا کرلیتا۔ نور کی جان بچاتا' محبت پر لعنت بھیجتا' میں عائشہ کا ہوجاتا۔ نور کو واپس بھیج دیتا۔ اس سے کیا ہوتا؟ کیا نور مرجاتی' نہیں...... وہ روتی دھوتی کہرام مچاتی لیکن زندہ رہتی۔ جیسے فریال زندہ ہے۔ رابعہ زندہ ہے۔''

''وہ مرجاتی' سچ مچ مرجاتی راجا!''

''مرجاتی تو کیا ہوتا۔ رو دھو کے صبر کرلیتا۔ یہ چانس تجھے لینا ہی پڑے گا فیکے پتر۔ اگر نور کو بچانا ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ اس صدمے کو جھیل جائے۔ خودکشی نہ کرے لیکن دوسری صورت میں وہ ایک پاگل لڑکی کے ہاتھوں یقیناً ماری جائے گی۔ ایک اور طریقہ بتاؤں' کسی کو دوسری بار بے وقوف بنا کے دھوکا دینا آسان نہیں ہوتا۔ تجھے بہت مشکل پیش آئے گی لیکن ایک پاگل کو بے وقوف بنایا جاسکتا ہے۔ تو نے عائشہ سے جو شادی کی تھی۔''

''یار' وہ شادی تھی؟''

''اب نہیں تھی تو اب کرلے۔ پوری سنجیدگی سے اور سچائی کے ساتھ اور عائشہ کا شوہر بن کے وہیں رہ جا۔''

''یعنی ست بدھائی اور پاکستان چھوڑ دوں؟ دماغ خراب ہے تیرا؟''

''میرا دماغ تجھے بالکل صحیح راستہ دکھا رہا ہے فیکے پتر۔ تو برٹش نیشنل ہے۔ تجھے وہاں رہنے کے لیے کسی کی اجازت نہیں چاہیے تو پاکستانی بھی ہے۔ تجھے یہاں تمام حقوق حاصل رہیں گے۔ ست بدھائی پر تیرا ہی حق ملکیت رہے گا۔ جب دل چاہے عائشہ کے ساتھ آجا۔ کچھ عرصہ یہاں' کچھ عرصہ وہاں۔''

''اور نور!''

''پھر وہی نور۔ اب بھول جا نور کو۔ اس سے بھی دے کہ تجھے بھول جائے۔ وہ یہاں آئے گی تو میں ا سمجھا دوں گا' میری بات ٹھنڈے دماغ سے سن۔ یہی ا راستہ ہے تیرے لیے فیکے پتر۔ چند مہینے نہیں گزار پائے گی حال پارکر کا ہوا' تیرا بھی ہوگا۔ یہ اس کا عشق نہیں' اس کی ہے۔ جیسے بچہ ایک کھلونے کے لیے مچل جاتا ہے۔ خواہ وہ ہی بے وقعت کیوں نہ ہو' اس کے مقابلے میں وہ کچھ بھی نہیں کرتا۔''

''تیری بات میری سمجھ میں آرہی ہے راجا۔''

''شکر ہے خدا کا۔ تو ابھی جا اور عائشہ کے باپ کے پکڑ لے۔ لپٹ جا عائشہ کے سامنے۔ میں گدھا' بے وقو پاگل...... کہ تمہیں چھوڑ کے پہلے فریال کے پیچھے گیا۔ پھ کے پیچھے۔ مجھے معاف کردو اور پھر قبول کرلو۔ میں ساری کو چھوڑنے کے لیے تیار ہوں۔ حلف اٹھانے اور حلف سائن کرنے تک سب کچھ کروں گا۔ اپنی باقی زندگی تمہا غلامی میں گزاروں گا۔ اب یقین دلانے کا ڈراما کامیاب ہوگا۔ یہ تیری آزمائش ہے فیکے پتر!''

''اور اس کے بعد......؟''

''میں نے کہا نا...... چھ مہینے بھی بہت ہیں۔ تین میں تو عائشہ کے لیے اسی طرح ناقابل برداشت ہوجا جیسے آج کل پارکر ہے۔ اس سے بھی تو عائشہ نے لو میرج ہوگی۔ عشق کی دیوانگی میں مبتلا ہو کے۔ مگر عشق کی وفات پر ہوجاتی ہے اور شادی پر اس کی تدفین' پھر طلاق پر آ رسوم۔''

''بکواس کرتے ہیں آپ۔ گر یہ سمجھتے ہیں کہ محبت وفا کا وجود ہی نہیں۔''

''الو کے پٹھے۔ میں عائشہ کی بات کررہا تھا۔ اس کی پوری ہوجائے گی' عشق کا خبط ختم ہوجائے گا تو وہ خود تجھ جان چھڑائے گی۔''

''اور ایسا نہ ہوا پھر......؟''

''پھر اس کے اسباب پیدا کرنا کیا مشکل ہے۔ دو بعد کہہ دے کہ میں نور سے بھی شادی کررہا ہوں۔ ہم تو کرسکتے ہیں۔ اس کے ساتھ خالص دیسی شوہر والا رویہ اختیار کرلے۔ گھر والی کو پاؤں کی جوتی سمجھنے کا یا خالص والا شوہر بن جا۔ بیوی کی محبت ادھر ادھر سب میں فراخ دلی سے بانٹ۔ پکا مومن بن جا۔ ڈاڑھی رکھ لے' صبح فجر کی

پڑھ۔ رات دو بجے تہجد کی۔ اسے بھی مجبور کر' پردہ کرنے پر اصرار کر۔''

میں نے کہا ''بات تیری ٹھیک ہے لیکن میں یہ سب کر نہیں سکتا۔ مجھ سے ہوگا نہیں۔''

''آخری کوشش کرکے دیکھنے میں کیا حرج ہے فیکے پتر!''

فون بند کرنے کے بعد بھی میں سوچتا رہا۔ براہ راست میں عائشہ پر الزام لگاتا تو اس کی وجہ بتانا ضروری ہوجاتا۔ میں بتاتا کہ پہلے بھی نور کو اغوا کرکے ایک موٹر بوٹ پر قید میں رکھا گیا تھا۔ وہاں سے اسے میں نے خود ہی چھڑا لیا' پولیس کو کچھ بتائے بغیر۔ پھر مجھ پر الزام آسکتا تھا کہ میں نے قانون کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ اخفائے جرم بھی جرم ہے اور میں یہ کہتا تو ثابت کیسے کرتا۔

صبح پھر پولیس نے مجھ سے رابطہ کیا۔ ''مسٹر شیرازی' آپ کا پھر کوئی رابطہ ہوا کسی سے؟''

''نہیں' آپ کی کیا پروگریس ہے؟''

''ہم اسے پروگریس نہیں سمجھتے۔ ہماری اس آرٹ ڈیلر سے بات ہوئی تھی جس نے تمہیں وحید کا ایڈریس فراہم کیا تھا۔ اس نے پھر وہی کہا لیکن اس گھر میں کوئی نہیں ہے۔ تم اس شخص سے ایک ہی بار ملے تھے' کیا یہ صحیح ہے؟''

''یس۔ اسی گھر میں......''

''پھر تم اتنے یقین کے ساتھ کیسے کہہ سکتے ہو کہ جس شخص نے تمہیں نام وحید بتایا تھا' اور کہا تھا کہ فکر کی کوئی بات نہیں' وہ وحید ہی تھا؟''

''میں سو فیصد یقین کے ساتھ واقعی نہیں کہہ سکتا۔''

''خاتون اپنی مرضی سے کہیں چلی جائے' تمہیں بتانا ضروری نہ سمجھے' کیا ایسا نہیں ہوسکتا؟''

''ایسا نہیں ہوسکتا۔'' میں نے کہا۔

''یعنی تم یہ سمجھتے ہو کہ وہ تم سے اجازت لینے کی پابند ہے۔ حالانکہ وہ تمہاری بیوی بھی نہیں ہے۔''

''آخر تم کیا کہنا چاہتے ہو؟ وہ مجھے چھوڑ گئی۔''

''یہ ناممکن نہیں سمجھنا چاہیے۔ جب تم اس آرٹسٹ وحید سے ملنے گئے تھے تو وہ تمہارے ساتھ تھی؟''

''ہاں' وہ ساتھ گئی تھی۔''

''یہ آرٹسٹ وحید...... کچھ لیڈی کلر ٹائپ ہے۔ خواتین سے پسند کرتی ہیں۔ خواہ اس کے اسباب منفی سمجھے جائیں۔''

''تم مجھے یہ فرض کرنے پر مجبور کررہے ہو کہ اس نے وحید کو پسند کیا۔ خود بلایا اور اس کے ساتھ نکل گئی۔'' میں نے مشتعل ہو کے کہا۔

''اس میں غصے کی کون سی بات ہے مسٹر شیرازی' وہ ایک آزاد عاقل و بالغ عورت ہے۔ اگر کسی سے کوئی مفید انفارمیشن ملے تو ہمیں ضرور بتانا' ہم پوری کوشش کررہے ہیں۔''

ابھی میں نے ریسیور نیچے رکھا ہی تھا کہ میری نظر دروازے کی طرف گئی جہاں نیچے سے کسی نے ایک لفافہ اندر کھسکا دیا تھا۔ ایسا کب ہوا؟ یہ مجھے بالکل پتا نہیں چلا تھا۔ میں نے کاغذ کی خفیف سی سرسراہٹ بھی نہیں سنی تھی۔ میں نے اس لفافے کو دیکھا تو اوپر سے وہ بالکل سادہ تھا۔ اس کے اندر سے ایک کاغذ کا ٹکڑا برآمد ہوا جو کسی کتاب سے پھاڑا ہوا لگتا تھا۔ کسی نے انگریزی کے پیراگراف کی چند سطروں کو پنسل سے انڈر لائن کردیا تھا۔ ان سطروں کو ملا کر پڑھنے سے پورا پیغام واضح ہوجاتا تھا۔ پہلے تین الفاظ تھے ''شی از اوکے۔'' آگے کی سطر تھی ''کوئی تمہاری مدد نہیں کرسکتا۔'' تیسری جگہ پھر دو لفظ تھے ''میرے سوا۔'' اور آخر میں ایک جملہ تھا ''خطرہ مول لینا کوئی عقل مندی نہیں۔''

مختصر پیغام فوراً میری سمجھ میں آگیا تھا لیکن میں نے اسے کئی بار پڑھا پھر اس صفحے پر غور کیا۔ اس میں کوئی کہانی چل رہی تھی لیکن نہ پلاٹ کا اندازہ ہوتا تھا' نہ کتاب کے نام کا نہ مصنف کا۔ صفحہ پورا نہیں تھا۔ درمیان سے پھاڑا گیا تھا۔ ایک جگہ دو کرداروں کی گفتگو تھی۔ دوسری جگہ پھر دو کرداروں کے نام تھے لیکن مختلف۔

میں نے دروازہ کھول کے باہر دیکھا لیکن کاریڈور میں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نیچے گیا تو رات والی خاتون کی جگہ کاؤنٹر پر ایک دلربا اپنی تمام تر حشر سامانی کی بھرپور نمائش لگائے بیٹھی تھی۔

اس نے مجھے بھی ایک مسکراہٹ کا دعوت نامہ دیا۔ ''میں آپ کے لیے کیا کرسکتی ہوں؟'' خالص کاروباری جملہ مگر جواب دینے والا چاہے تو دوٹوک الفاظ میں کہہ دے کہ تم آج رات میرے ساتھ ڈنر کرسکتی ہو۔ پھر دیکھیں گے کہ ہم ایک دوسرے کے لیے کیا کرسکتے ہیں۔

میں نے بے رخی آمیز لہجے میں کہا۔ ''کیا ابھی تم نے کسی کو اوپر جاتے دیکھا' کوئی اجنبی؟''

''اجنبی سے تمہاری کیا مراد ہے؟ ویسے تو تم بھی میرے لیے اجنبی ہو۔''

میں نے مزید سوالات کے بغیر واپسی کو بہتر سمجھا کیونکہ وہ مجھ سے صرف ایک سوال کرلیتی کہ یہ سب تم مجھ سے کیوں

پوچھ رہے ہوتو مجھے کسی نامعلوم کتاب سے پھاڑا ہوا خط کشیدہ الفاظ والا آدھا ورق اس کے سامنے رکھنا پڑتا اور مزید وضاحت کے لیے پورا کیس بیان کرنا پڑتا۔ پھر ایک نیا کیس ہوجاتا جو پولیس کے نقطۂ نظر سے ان کے علم میں لانا میری ذمے داری تھی۔ جبکہ مجھے صاف سمجھا دیا گیا تھا کہ خطرہ مول لینا بے وقوفی ہوگی۔

سچ تو یہ ہے کہ جیسے گزشتہ رات کسی وحید کے فون کی ادھوری بات کے چند الفاظ 'فکر مت کرنا' وقتی طور پر میرے لیے وجہ تسلی بن گئے تھے' ایسے ہی یہ پیغام کہ ''شی از او کے'' وہ ٹھیک ہے' خیریت سے ہے۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا تھے۔ کون جانے وہ وحید تھا یا کوئی اور' کیسے یقین کیا جائے کہ ایک پھٹے ہوئے کتابی صفحے پر پنسل سے خط کشیدہ الفاظ کی کوئی حیثیت اور اہمیت ہے یا نہیں ہے۔ کوئی سیریس ہے یا مذاق کررہا ہے۔ کچھ کہنا چاہتا ہے یا شخص مجھے روک رہا ہے تاکہ اسے مہلت مل جائے۔

لیکن ایک نفسیاتی اثر یہ ہوا تھا کہ میری بے قراری کو قرار آگیا تھا۔ ایک امید پیدا ہوگئی تھی۔ پولیس سے کچھ نہیں ہوگا۔ مجھے واقعی خطرہ مول نہیں لینا چاہیے۔ انتظار کرنا چاہیے۔ دوبارہ کیسے رابطہ ہوتا ہے' ایک طرف راجا کا مشورہ تھا۔ دوسری طرف پولیس کا مطالبہ۔ تیسری طرف کسی نامعلوم شخص کا رابطہ تو چوتھی طرف میری اپنی عقل کا تقاضا۔

نہ جانے کیوں مجھے اس شخص کا خیال آیا جس سے میں اپنی دانست میں سب سے زیادہ نفرت کرتا تھا۔ یہاں ایک اجنبی دیس میں میرا نہ کوئی دوست تھا' نہ ہمدرد' نہ مددگار نہ مشیر۔ جو مہربان یا شناسا تھے وہ بھی نامہربان' ناآشنا ہوگئے تھے لیکن اس قسم کے معاملات ایک شخص سے ڈسکس کیے جاسکتے تھے۔ چیف کا مجرمانہ ذہن ایسے مسائل میں میری راہنمائی کرسکتا تھا۔ یہاں اس کے انڈر گراؤنڈ لنک بھی تھے۔

گزشتہ روز میں نے اس کی بہت بے عزتی کی تھی۔ جب وہ مجھ سے مدد کا طلب گار بن کے آیا تھا۔ اب صرف چوبیس گھنٹے بعد میں اسی سے مدد مانگوں؟ لیکن کوئی حرج نہیں' مجبوری میں سب جائز ہے۔ گدھے کو باپ بنالینے والی بات بھی غلط نہیں لگتی۔ وہ اب بھی ضرورت مند ہے۔ اسے بلانے کے لیے مجھے تھوڑا سا ڈھیٹ بننا پڑے گا مگر وہ آجائے گا اور ایسا ہی ہوا۔ میں نے اسے فون کیا اور چالیس منٹ بعد وہ میرے سامنے بیٹھا تھا۔ میں نے لگی لپٹی رکھے بغیر اس سے صاف بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ ''چیف! اس حقیقت کا اعتراف کرنے میں کوئی حرج نہیں کہ ایک ضرورت نے مجھے مجبور کردیا۔ ورنہ میں تمہاری شکل دیکھنا پسند نہیں کر...''

وہ مسکرایا ''ایسا ہوجاتا ہے نواب صاحب... مجھے بے عزت کرکے بھگا دیا تھا۔ آج بڑی عزت... بلالیا۔ اور دیکھو' ہم بھی آگئے برا مانے بغیر... ضرورت بتاؤ۔''

''حالات دو دشمنوں کو یکجا کردیتے ہیں۔''

''میرا خیال ہے کہ دشمن ہم کبھی نہیں تھے۔''

''ہم دوست بھی نہیں تھے۔ مگر خیر' کل رات... کو اغوا کرلیا ہے' اسی ہوٹل کے اسی کمرے سے۔''

''اور ہوٹل والے دیکھتے رہے۔ تم نے پو... بتایا؟''

میں نے کہا۔ ''میں بتاتا ہوں۔''

وہ دلچسپی سے سنتا رہا۔ مجھے صورت حالات کی... کے لیے بہت سی تفصیلات ظاہر کرنا پڑیں مثلاً نور... تعلقات کی نوعیت۔ پھر وہ سب جو میں نے نور... اغوا ہونے پر کہا تھا۔ عائشہ کے بارے میں' اس... ذہنی کیفیت کے متعلق۔ اور آخر میں اس گمنام... بارے میں۔

وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر بولا۔ ''کافی منگواؤ۔''

میں نے فون پر روم سروس کو کافی کے لیے کہا... کہتے ہو۔ مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

''وہی جو تمہیں مشورہ دیا گیا ہے۔'' اس نے... کتب کا ادھورا صفحہ اٹھا کے کہا۔ ''پولیس کا خیال دل... دو۔''

میں نے راجا کے دیے ہوئے پلان کی بات... مجھے ناقابل عمل محسوس ہوتا ہے۔ کچھ بتاؤ تم کیا کرسکتے...''

''تمہیں اتنا بھروسا ہے مجھ پر؟''

''کیا میرا بھروسا کرنا غلط ہے۔ ایسے کام تم... کیے ہیں اور ہم سے بھی کروائے تھے۔''

''ہم مل کے ایک لائن آف ایکشن لے... بشرطیکہ اس کے بعد تم بھی میرے لیے کچھ کرنے کا و... شریفانہ' سچا وعدہ۔''

''جب میں شریف آدمی نہیں سمجھا جاتا تھا تب... وعدہ نہیں کرتا تھا۔ تم جانتے ہو۔''

وہ ہنسا۔ ''ہاں...... لیکن اس وقت تم کسی ریا... نواب نہیں تھے اور نہ تمہارا سیاست سے تعلق تھا۔''

''تم کیا سمجھتے ہو' میرا عائشہ پر شک کرنا جائز...''

''اور کسی پر شک کیسے کیا جاسکتا ہے۔ تم ایسا...

...میں نے یہ حرکت کی ہوگی۔''

''میرا دھیان تمہاری طرف گیا تھا لیکن ایک تو آج... کے لیے وقت بدل گیا ہے۔ تم اپنے پیروں پر کلہاڑی... مارو گے پھر خود میرا ذہن عائشہ ہی کو مجرم قرار دے رہا... ایک ناکامی اس جیسی لڑکی کے لیے سرعام ایک تھپڑ جیسی... کے برابر تھی۔ اس شکست کو فتح میں بدلنے کے لیے وہ... کسی انتہا تک چلی جائے گی اگرچہ باپ ایسا نہیں لیکن وہ... بچائے گا۔ خواہ اس کا سب کچھ داؤ پر لگ جائے۔''

''او کے' فرض کرو۔ یہ حرکت اسی کی ہے۔ عائشہ نے... اغوا کرالیا ہے۔ حقائق بھی اسی سمت میں اشارہ... کرتے ہیں لیکن شکاری وہ خود نہیں۔ اس نے کسی اور کا کندھا... استعمال کیا ہے تاکہ شک بھی ادھر جائے۔''

''تم وحید کی طرف اشارہ کررہے ہو؟''

''یس۔ یہ میرا قیاس اور اندازہ ہے۔ وحید کو اس نے... استعمال کیا۔ یہ خود وحید بتادے گا۔''

''وحید جائے جہنم میں۔''

''وہ کہیں نہیں جاسکتا۔ پولیس اسے بالآخر ڈھونڈ نکالے... اس کو تو شاید علم بھی نہیں ہوگا کہ جو کام اس کے سپرد کیا گیا... جس کا اسے بھاری انعام بھی پیش کیا جارہا ہے' اس کی... مدد و عنایت کیا ہے۔''

''ہاں' اسے پتا بھی نہیں چلا ہوگا کہ بالواسطہ طور پر وہ... اغوا جیسے جرم میں شریک ہوگیا ہے۔''

چیف اٹھ کھڑا ہوا۔ ''اس سے کہا گیا ہوگا کہ فلاں ہوٹل... نور کو لے آؤ۔ رفیق صاحب نے بلوایا ہے۔ یہ کام آسانی... اس کے اندر جائے بغیر ہی ہوگیا۔ اسے بعد میں پتا چلا... کہ اس نے انجانے میں کیا کردیا اور ممکن ہے اس پر... بھی مچایا ہو۔''

''شاید اسی لیے کڑے پہرے میں ہونے کے باوجود... اس نے مجھے فون کردیا مگر ہم اسے کہاں تلاش کریں گے؟''

''تم نے کیا نام بتایا تھا اس موٹر بوٹ کا جہاں نور کو پہلے... لے جایا گیا تھا؟''

میں نے کہا ''سلور ڈولفن۔''

''اور وہاں کون تھا اس کا ناخدا' کوئی حبشی!''

''مجھے اس کا نام معلوم نہیں لیکن وہ دوبارہ نور کو وہاں... رکھنے کی بے وقوفی نہیں کرسکتی۔''

چیف نے کہا۔ ''ہم کہیں سے تو اسٹارٹ کریں گے اور... میرا ذہن کچھ اور سوچ رہا ہے۔''

میں نے خاموشی اختیار کرلی۔ چیف ایک مجرم کے ذہن سے سوچ رہا تھا جو میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ ہم سفر میں تھے۔ ایک ٹیکسی نے ہمیں اس جگہ اتار دیا جہاں سے میرے اندازے کے مطابق وہ موٹر بوٹ ''سلور ڈولفن'' زیادہ دور نہیں ہوسکتی تھی۔ پہلے میری رہنمائی پولیس نے کی تھی۔ اس بار چیف نے ایک چھوٹی سی تیز رفتار کشتی لی۔ میں خود بھی پولیس سے دور ہی رہنا چاہتا تھا۔

کشتی پر ایک دبلا پتلا حبشی لڑکا سیدھا لیٹا آسمان میں اڑتے رنگین غبارے کو دیکھ رہا تھا۔ غبارہ گیس والا اور اتنا بڑا تھا کہ اس کے نیچے چار سیٹوں والی باسکٹ لگادی گئی تھی۔ اس باسکٹ میں چار افراد بیٹھے اوپر سے دریائے ٹیمز کا نظارہ کررہے تھے اور اپنے کیمروں سے نیچے کے منظر کی فلم بنانے میں مصروف تھے۔

چیف نے کہا۔ ''ہے جوکر۔''

لڑکا تڑپ کر اٹھا۔ ''چیف۔ تم تو مجھے صحیح نام سے پکارو۔''

''باپ کہاں ہے تمہارا؟''

''اندر پڑا ہے۔ مردے کی طرح۔''

چیف نے کہا۔ ''کس کے ساتھ۔ ہوش میں ہے یا نہیں؟''

''لات مار کے دیکھو۔ ساتھ کون ہوگا سوائے اسی چڑیل کے۔ ابھی یہیں ڈبکیاں لگارہی تھی۔'' اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ ''وہ رہی۔''

میں نے ایک درمیانی عمر سے آگے نکل جانے والی سفید فام عورت کو دیکھا جو چند گز کے فاصلے پر ایسے نہارہی تھی جیسے وہ اپنے گھر کے باتھ روم میں ہو۔ اس کے جسم پر لباس نام کی کوئی چیز نہیں تھی مگر اسے پروا نہیں تھی۔ کوئی اسے دلچسپی سے دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔ اس میں دیکھنے کے لیے کچھ ہوتا تو کوئی متوجہ ہوتا۔

چیف میرے ساتھ ایک کیبن میں سر جھکا کے داخل ہوا۔ دھاری دار پتلون اور رنگین شرٹ والا ایک سیاہ فام آئل اسٹو میں ہوا بھر رہا تھا۔ اس نے غالباً چائے بنانے کے لیے کیتلی میں پانی ابلنے کے لیے رکھا تھا۔ وہ چیف کو دیکھ کے ایک دم اٹھا۔

''تم پھر آگئے۔ میں نے کہا تھا......''

''شٹ اپ جانی! کیا تمہیں دس پونڈز کی ضرورت ہے؟''

بڈھے کا چہرہ کھل اٹھا۔ ''میں پونڈز کے لیے بھی وہ کرسکتا ہوں جو تم نہیں کرسکتے۔''

''مثلاً...... اسے ایک رات کے لیے دے سکتے ہو جو باہر نہاکے باہر کی غلاظت ٹیمز میں ڈال رہی ہے۔ اندر کی غلاظت کا کیا کرے گی؟''

''اسے بیچ میں مت لاؤ۔'' وہ بگڑ گیا۔

''ایک موٹر بوٹ کو تلاش کرنا ہے۔ ''سلور ڈولفن'' اس پر تمہارے جیسا کوئی کالا سانڈ ہے۔ اس کے بارے میں معلوم کرنا ہے۔''

''کیا معلوم کرنا ہے۔'' اس نے ابلتے پانی کی مقدار بڑھا دی ''اس کی ولدیت میں نہیں معلوم کرسکتا۔''

''وہ کہاں رہتا ہے۔ آج کہاں ہے؟ اگر وہ موٹر بوٹ پر نہ ہو تو پھر کسی سے پوچھو۔ کیا اس کے بیوی بچے ہیں؟''

''یہ جوان رکھنے والی جڑی بوٹیوں کی چائے ہے' پیو گے؟''

''اس کی ضرورت یقیناً تمہیں ہے۔ مجھے معاف رکھو۔'' چیف نے کہا۔

''سلور ڈولفن'' کا صرف آدھے گھنٹے میں سراغ مل گیا تھا لیکن اب وہ ٹیمز کے پانی میں رواں نہیں تھی۔ اسے بڑی صفائی سے دو بڑی لانچوں کے درمیان ایسے کھڑا کیا گیا تھا کہ دریا سے گزرتے ہوئے اس پر کسی کی نظر نہیں پڑ سکتی تھی۔ شک پیدا کرنے کے لیے یہ کافی تھا۔

چیف نے مجھے اشارہ کیا۔ ہم کنارے کی طرف سے ایک لانچ پر گئے اور ''سلور ڈولفن'' پر اتر گئے۔ لانچ پر غسل آفتابی کا لطف لینے والی ایک فیملی نے محض واجبی سے تجسس کا اظہار کیا اور سمجھ لیا کہ ہمارا مقصد ان کی پرائیویسی میں مخل ہونا نہیں تھا۔ ہم کنارے سے براہ راست سلور ڈولفن پر اپنے کپڑے گیلے کیے بغیر نہیں جاسکتے تھے۔ اجلی دھوپ اور ویک اینڈ کی چھٹی نے لوگوں کو انجوائے کرنے کا اچھا موقع فراہم کیا تھا۔

میں سلور ڈولفن پر پہلے بھی آچکا تھا۔ اس وقت مجھے موٹر بوٹ پر زندگی کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ کنارے کے ایک ہک سے زنجیر کو جوڑ کے اسے کھڑا کر دیا گیا تھا۔ کسی رکاوٹ کے بغیر میں نے اوپر نیچے کے کیبن دیکھے مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں نے چیف کو وہ کمرا بھی دکھایا جس میں نور کو قید رکھا گیا تھا۔ چیف نے دھکے سے اس کے دروازے کا لاک نکال دیا۔ اندر بہت کم روشنی تھی جو ایک گول کھڑکی پر پڑے پردے کو ہٹانے سے بڑھ گئی۔ کھڑکی میں واٹر پروف دھندلا شیشہ تھا۔ صاف نظر آتا تھا کہ موٹر بوٹ پر کوئی نہیں اور اگر پولیس بھی یہاں آتی تو انہیں کوئی سراغ نہ ملتا۔

چیف نے کسی رکاوٹ کے بغیر ایک میز [illegible] چیزوں کو دیکھا، پھر درازوں کی تلاشی لی۔ درازوں میں سامان بھرا ہوا تھا لیکن چیف نے اس میں سے ایک تصویر [illegible] لی۔ تصویر کسی سیاہ فام عورت کی تھی جو ایک شیر خوار اٹھائے کھڑی تھی، نہ وہ بچے کی ماں ہوسکتی تھی اور نہ [illegible] کی بیوی جسے میں نے پہلے دیکھا تھا۔ عورت عمر رسیدہ [illegible] گود کے بچے کی نانی دادی ہوسکتی تھی۔ اس تصویر کے [illegible] گرافر کی مہر...... اور تاریخ تھی جس سے اندازہ [illegible] تصویر زیادہ پرانی نہیں۔

کسی ماہر سراغ رساں کی طرح چیف نے تصویر کو [illegible] سے جیب میں ڈال لیا۔ پھر اس نے ایک گیراج کی [illegible] تلاش کرلی۔ اس پر کسی گاڑی کا رجسٹریشن نمبر تھا اور اس میں کیے جانے والے کام کی واجبی سی تفصیل تھی۔ چیف [illegible] مسکرا کے مجھے دیکھا۔ ''شروع کرنے کے لیے یہ کافی۔''

پونے گھنٹے کی جستجو کے بعد ہم نے وہ گیراج [illegible] کرلیا...... لیکن اس کا مالک ایک بداخلاق بدزبان گورا [illegible]

''ہاں...... میں جانتا ہوں یہ گاڑی کس کی ہے، لیکن میں [illegible] کیوں بتاؤں۔''

چیف نے کہا۔ ''اس میں تمہارے لیے آسانی [illegible] بعد میں تم پولیس کو بتاؤ گے۔''

''پھر تم پولیس نہیں ہو۔ اس لیے گیٹ آؤٹ...... [illegible] کام کر رہا ہوں۔''

میں نے نرمی سے کہا۔ ''دیکھو، ہم کسی غلط مقصد [illegible] نہیں آئے ہیں۔''

اس نے میری بات کاٹ دی۔ ''غلط یا [illegible] چھوڑو...... اپنے کلائنٹ کے بارے میں کسی قسم کی [illegible] انفارمیشن دینا کون سا صحیح ہے؟ قانوناً یا اخلاقاً۔''

چیف نے مجھے آنکھ سے اشارہ کیا کہ بحث [illegible] حاصل نہیں ہوگا۔ ہمیں بات بڑھائے بغیر نکل جانا چا[illegible] باہر آکے اس نے بدتمیز گورے کی شان میں ایک قصیدہ [illegible] ''شرافت سے کام نہیں چلتا۔ ابھی تم دیکھتے جاؤ۔''

ہم اس ورکشاپ سے کچھ فاصلے پر کھڑے ہو[illegible] ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ کچھ دیر بعد ورکشاپ [illegible] ایک نوجوان نکلا جس نے نیلے رنگ کی اوور آل یعنی ڈا[illegible] پہن رکھی تھی۔ اس کی پشت پر ورکشاپ کا نام ایک دائر[illegible] میں لکھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کسی گاڑی کا کوئی پرزہ [illegible] وہ ہمارے قریب سے گزرا تو چیف نے اسے روک لیا۔

''ہے مین...... کیا تم پانچ پونڈ کمانا پسند کرو گے؟''

وہ رک گیا۔ ''کام جائز ہے کہ ناجائز۔''

''مجھے نہیں معلوم کہ تم اسے کیا سمجھتے ہو۔ میرے [illegible] ایک وہ آسان کام ہے، جس میں کسی کا نقصان بھی نہیں۔''

''ٹھیک ہے...... کام بتاؤ، پانچ پونڈ کے بدلے جان [illegible] بازی لگانے کے لیے کون بے وقوف تیار ہوگا یا جیل [illegible] نے کے لیے۔''

چیف ہنسا اور اسے رسید تھما دی۔ ''دیکھو، میں جاننا [illegible] چاہتا ہوں کہ یہ شخص کہاں رہتا ہے۔ بس اتنی سی بات ہے۔ تم [illegible] ادو گے تو کسی کو معلوم نہیں ہوگا، تمہارا مالک کتے کا بچہ خواہ مخواہ [illegible] م پر بھونکنے لگا کہ یہ میرے کاروباری ضابطۂ اخلاق کے [illegible] ملاف ہے۔''

نوجوان نے اسے بہتر خطاب سے نوازا۔ ''میں خوب جانتا ہوں اس کے کاروباری ضابطۂ اخلاق کو...... ہم سے وہ ہر ہفتے میں چار گھنٹے زیادہ کام کراتا ہے لیکن کوئی اضافی اجرت مانگے تو اس کی چھٹی کر دیتا ہے۔ اکڑفوں دکھائے تو اس پر چوری کا الزام لگا دیتا ہے۔ خیر...... تم مجھے کچھ وقت دو، ابھی تو میں یہ پرزہ لینے جا رہا ہوں۔''

''کتنا وقت۔''

''آدھا گھنٹا......'' اس نے سوچ کے کہا۔ ''زیادہ سے زیادہ ایک۔''

''اوکے...... ہم آدھا گھنٹا بھی یہاں کھڑے نہیں رہ سکتے۔ ہم کہیں قریب ہی بیٹھ جاتے ہیں۔ جب تم فون کرو گے تو ہم تمہیں پانچ پونڈ دینے یہاں آجائیں گے۔'' چیف نے اسی گیراج کی رسید کے پیچھے میرا فون نمبر لکھ دیا۔

ہم قریب ہی ایک روڈ سائیڈ کافی شاپ میں جا بیٹھے۔ یہ رش کے اوقات نہیں تھے اور شاپ کے مالک ایک سردار جی تھے جو حد درجہ بااخلاق تھے ورنہ ہم اتنی دیر بیٹھے نہ رہ سکتے۔ رش کے وقت کافی ختم ہوتے ہی جگہ خالی کرنی پڑ جاتی ہے۔

موقع ملا تو چیف نے اپنے مطلب کی بات کی۔ ''کیا اب تم بھی میرے لیے کچھ کرو گے۔ ماضی کی بات جانے دو...... حالات کے ساتھ انسان بھی بدل جاتے ہیں، یہ قسمت ہے جس نے آج مجھے تمہارے سامنے ضرورت مند بنا کے کھڑا کر دیا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''چیف...... میں تمہاری تھوڑی بہت ہی مدد کرسکتا ہوں۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''جیسے یہاں تمہیں میری مدد کی ضرورت محسوس ہوئی، ایسے ہی کیا وہاں میں تمہارے لیے کچھ نہیں کرسکتا...... جہاں تم نواب اور حاکم ہو۔''

''سوری چیف...... میں کوئی بدنامی مول نہیں لے سکتا۔''

اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''کیا شامی بادشاہ سے دوستی تم نے نیک نامی کمانے کے لیے کی تھی؟''

میں چونکا۔ ''تم شامی بادشاہ کو کیسے جانتے ہو؟''

وہ مسکرایا۔ ''میرے ساتھ ایک لڑکا تھا، بڑا فلاسفر اور پڑھا کو قسم کا۔ اس کا خاندان کسی سیاسی انتقام کے چکر میں تباہ ہوگیا تھا۔ باپ کوڑے کھا کے جیل گیا، وہاں مر گیا یا مار دیا گیا۔ تھوڑی سی زمین تھی۔ کوئی چھوٹا موٹا کاروبار تھا وہ ختم ہوگیا۔ ماں نے دوسری شادی کرلی...... شادی کیا...... وہ خوبصورت تھی، کسی نے گھر میں ڈال لیا، یہ ایک ہی لڑکا تھا، اسے ملک سے نکلوا دیا کہ یہاں رہا تو کیا کرے گا۔ الٹے سیدھے چکروں میں پڑ جائے گا۔ میں نے ترس کھا کے اسے رکھ لیا، وہ میرے کام کا بندہ نہیں تھا۔ میں نے اسے کہا کہ تو پڑھ اور ایک کام اس کے ذمے لگا دیا کہ مجھے پاکستان کی خبریں سنایا کرے۔ رہنے کو جگہ دی اور پانچ سو پونڈ مہینے کے اس کا وظیفہ مقرر کر دیا، وظیفہ اس لیے کہ جو کام وہ کرتا تھا میرے لیے بے مقصد تھا۔ جو کام میں دوسروں سے لیتا تھا اسے میں نے ان سے دور رکھا۔ وہ بھی مطمئن رہا۔''

میں نے کہا ''اب وہ کہاں ہے؟''

''یہاں بی بی سی اردو سروس میں کام کر رہا ہے۔ وہیں شادی کرلی ہے، پہلے مجھ سے ملنے آتا تھا۔ پھر میں نے منع کر دیا کہ ملنا ہوگا تو میں خود آجاؤں گا۔''

میں سخت حیران ہوا۔ ''وہ دنیا بھر کی خبریں تمہیں سناتا تھا اور اب ساری دنیا کو خبریں دے رہا ہے۔ اسے خبر نہیں ہوئی کہ عین اس کی ناک کے نیچے تم کیا کر رہے ہو۔''

''اسے ہی کہتے ہیں چراغ تلے اندھیرا۔ یوں سمجھو نواب صاحب کہ مجھے بڑی محنت کرنی پڑی، اس سے اپنا اصل چہرہ چھپانے کے لیے۔ وہ جب تک میرے ساتھ رہا مجھے ایک شریف بزنس مین سمجھتا رہا...... اور اب بھی سمجھتا ہے۔ تم اندازہ کرسکتے ہو کہ یہ کتنا مشکل کام تھا میرے لیے...... دہری شخصیت کا کھیل......''

میں اسے دیکھتا رہا۔ ''اور تم کو یقین ہے کہ تم اس کھیل میں کامیاب رہے، اسے تمہاری حیثیت کا علم نہیں ہوسکا۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ وہ بھی ایکٹنگ کرتا ہو، تمہارا بھرم رکھتا ہو۔''

''ہاں...... ہوسکتا ہے۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''وہ کیا شعر ہے، سچائی چھپ نہیں سکتی بناوٹ کے اصولوں

سے...... اور...... خوشبو آ نہیں سکتی کبھی کاغذ کے پھولوں سے...... لیکن میرا دل رکھنے کو وہ کہتا ہو کہ بڑی اچھی خوشبو آرہی ہے۔ اسے احساس تو ہوگا کہ میں اس کی مدد کررہا تھا۔ اس احسان کا بدلہ وہ اسی طرح چکا سکتا ہے، مجھے عزت دے کے۔''

میں نے کہا۔''چیف...... ایسا کیوں کیا تھا تم نے؟''

''پتا نہیں...... شاید اپنے دل سے احساس جرم کی خلش مٹانے کے لیے...... حالانکہ ایک نیکی میری زندگی کے سارے گناہوں کے مقابلے میں کچھ نہیں۔ آخر ایک صابن کی بٹی سے کتنے گندے کپڑے دھو کے صاف کیے جا سکتے ہیں۔ پانچ، دس، پندرہ، سینکڑوں ہزاروں پر کیا اثر ہوگا۔ وہ میلے ہی نظر آئیں گے۔''

''کچھ پتا نہیں چیف...... خدا تمہاری یہی ایک نیکی قبول کرلے۔''

وہ باہر دیکھتا رہا۔''ایک اور واقعہ سنو...... ایک بندہ دو سال میرے ساتھ رہا، بڑے کام کا بندہ تھا۔ نڈر اور ذہین...... ذہین ہونا ہی ساری خرابی کا سبب بنا۔ پتا نہیں اسے کون مل گیا، وہ ڈیپریس رہنے لگا، پھر نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہوگیا۔ میرے پاس سے بھاگ گیا۔ بعد میں پتا چلا کہ صوفی ہوگیا ہے۔ کسی مسجد میں درس بھی دیتا ہے۔ میں نے کہا کہ چلو جانے دو...... پہلے بھی بھٹک گیا تھا۔ اب پھر بھٹک گیا ہے تو مجھے کیا...... وہ جانے اس کا رب جانے، مگر وہ ایک دن آگیا مجھے نجات کی راہ دکھانے...... میں نے کہا کہ بھاگ جا سالے منافق کی اولاد ورنہ میں نے تیرا اصل چہرہ لوگوں کو دکھا دیا تو نہ دین کا رہے گا نہ دنیا کا...... وہ ایسے بات کررہا تھا جیسے میں (نعوذ باللہ)...... خدا سے سودا کرسکتا ہوں۔''

''چیف...... اپنے ایمان سے کہو، یہ کیا ہے؟ پچھتاوا کہ خوف۔''

''دونوں...... بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ جو لڑکا مجھے پاکستان کی خبریں سناتا تھا وہ پڑھا کو تو تھا، سارے زمانے کے اخبار رسالے پڑھتا تھا...... اس نے مجھے تمہارے بارے میں بتایا۔ پھر جب میں نے زیادہ دلچسپی دکھائی تو وہ ست بدھائی اور نواب رفیق احمد شیرازی کی خبریں ڈھونڈ کے سنانے لگا۔ مجھے سب معلوم ہے، تمہارے علاقے میں وزیراعلیٰ نے کسی اسپتال کا افتتاح کیا تھا۔ کوئی مقامی وڈیرا تمہارا دشمن ہورہا ہے کیونکہ تم اس کے خلاف الیکشن لڑنے کے موڈ میں ہو اور اس کی آبائی نشست خطرے میں ہے۔''

میں نے کہا۔''تمہیں سب معلوم ہے گویا۔''

''وہ جو تمہارا صحافی دوست ہے راجا۔ اس ک...... میں خود پڑھتا رہا...... وہ تمہارا اچھا ڈھول پیٹ رہا ہے تمہارے ترقیاتی منصوبوں کا اچھا پروپیگنڈا ہورہا ہے ہی میڈیا کا ہے۔''

''وہ صرف پروپیگنڈا نہیں ہے۔''

''مجھے کیا معلوم...... لیکن نواب صاحب کیا و... سیاست پاکستان میں شرافت کا کھیل ہے، صرف شرافت...'' وہ طنزیہ انداز میں ہنسا۔

''میں چاہتا ہوں کہ شرافت کی سیاست ہو۔''

''مگر اس کے لیے بھی تمہیں شاہی بادشاہ کی سپو... کی ضرورت پڑی اور جب تم نے اسے شرافت کی راہ دکھا... اس کا انجام کیا ہوا؟ اس کے پورے گروہ کو پولیس مقا... میں صاف کردیا گیا۔ وہ خود مفلوج پڑا ہے، میں تمہارے... بہت کچھ کرسکتا ہوں نواب رفیق...... سیاست کے کھیل میں اناڑی ہو، تم نے انحصار کیا ایک پیشہ ور ڈاکو پر...... لوگ سیاست والوں کو بھی ڈاکو سمجھتے ہیں مگر پولیس ان کی حفاظت مامور رہتی ہے۔ انہیں پولیس مقابلے میں ہلاک نہیں کیا جا... تم مجھے اپنی طاقت بنا کے فائدے میں رہو گے کیونکہ میں ا... سارے کام کرچکا ہوں...... میں اناڑی نہیں ہوں کھلاڑ... ہوں۔ یہ سارے کھیل بہت پہلے کھیل چکا ہوں، تم میر... تجربے سے فائدہ اٹھا سکتے ہو۔ طاقت صرف کلاشنکوف نہیں ہوتی، طاقت یہاں ہوتی ہے۔'' اس نے انگلی سے ا... سر کو بجایا۔

میں کچھ دیر سوچتا رہا۔''تم واپس کیسے جا سکتے ہو؟''

''وہ میرا کام ہے، ایک عام آدمی نام چہرہ ا... پاسپورٹ بدلتا رہتا ہے...... ہر سرحد عبور کرلیتا ہے، ا... ماضی کی سیاہی کو دھو ڈالتا ہے...... کوے سے بگلا بن... سامنے آجاتا ہے۔''

''سارا رسک تمہارا ہے۔''

''آف کورس...... اسی سے میری کمان تمہارے ہاتھ میں رہے گی۔ طاقت تمہاری ہوگی، تم مجھے استعمال کرسکتے ہو۔ ایکس پوز کرسکتے ہو، مروا سکتے ہو، اگر تم یہ محسوس کرو کہ تمہیں مجھ سے خطرہ لاحق ہے یا میری افادیت نہیں رہی، ال... میں تمہارے نقصان کا سبب بن سکتا ہوں۔''

''آل رائٹ چیف...... ویلکم ٹو ست بدھائی۔'' میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔''تم اس وقت تک محفوظ ہو جب تک میری حفاظت کی ساری ذمے داریاں نبھاتے رہو۔''

وہ مسکرایا۔''یہ ایک کاروباری معاہدہ ہونا چاہیے۔''

''جو غیر تحریری رہے گا۔ تم ایک باعزت پُرآسائش ...ی گزار سکو گے۔ جب تک میرے مفاد میں ہوگا۔ ہر گارنٹی ...ری طرف سے ہوگی، میری طرف سے کوئی گارنٹی نہیں۔''

''مجھے منظور ہے، میں بہت جلد رپورٹ کروں گا۔''

''تمہیں تمہاری ذمے داریاں بتادی جائیں گی۔''

''وہ میں جانتا ہوں، بلکہ سنبھال چکا ہوں...... کیا ہم ...ں۔ لگتا ہے وہ پانچ پونڈ کسی اور کو ملیں گے۔''

اسی وقت میرے فون کی گھنٹی بجی...... کسی نے کہا''پانچ ...ڑ دو اور اپنی چیز لے جاؤ۔''

اس نے رسید کے پیچھے نام کے ساتھ فون نمبر بھی لکھ دیا ...ا اور پتا بھی۔''سلور ڈولفن'' والے نیگرو کا نام البرٹ تھا اور ...ایک ایسی آبادی میں رہتا تھا جہاں انڈین اور ساؤتھ ...ریقن کے ساتھ دوسری قومیتوں کے لوگ بھی آباد تھے۔ یہ ...دن کے مضافات میں شمار ہونے والا علاقہ تھا جو کسی اجنبی ...ریف آدمی کے لیے غیر محفوظ بھی سمجھا جاتا تھا۔

''سمجھو آدھا کام تو ہوگیا۔ ابھی آدھا دن نہیں گزرا۔'' میں نے کہا۔''اتنے یقین کے ساتھ تم کچھ نہیں کہہ سکتے۔''

''تم جرم کی نفسیات کو نہیں سمجھتے، ورنہ میری طرح تمہاری چھٹی حس کبھی کہتی کہ ہم صحیح سمت میں جارہے ہیں۔''

وہ اچانک ایک فون بوتھ میں داخل ہوگیا۔ میں نے دروازہ کھلا رکھا تاکہ اس کی گفتگو سن سکوں۔ اس نے پانچ پونڈ دے کر حاصل ہونے والے ایڈریس پر فون نہیں کیا...... اس نے وہ فون نمبر ملایا جو ایک عمر رسیدہ نیگرو عورت کی تصویر کے پیچھے لکھا ہوا تھا۔

''کیا البرٹ گھر میں ہے؟ نہیں...... ہاں مجھے پتا ہے وہ بوٹ میں رہتا ہے لیکن وہ وہاں نہیں تھا۔ سلور ڈولفن پر...... تم کیا اس کی بیوی ہو؟ نہیں۔ اس کے ساتھ رہتی ہو......؟ اچھا، اس کی ماں ہو۔ آئی ایم سوری...... دراصل مجھے اس کو پانچ سو پونڈ دینا تھے۔ کیا یہ رقم میں تمہیں دے جاؤں، میں نے آج کا وعدہ کیا تھا اور آج مجھے کہیں جانا بھی ہے، اچھا تو پھر میں کہاں آؤں...... یس...... ہاں دیکھا ہے، کدھر...... اوکے۔''

جب وہ فون بوتھ سے نکلا تو مسکرا رہا تھا۔''اب ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے...... ایسا نہ ہو وہ خبیث البرٹ ہم سے پہلے گھر پہنچ جائے۔''

ایک ٹیکسی نے سوا گھنٹے بعد ہمیں ایک ایسی جگہ اتار دیا جہاں سے ہم پیدل چل کے البرٹ کے گھر تک جا سکتے تھے۔

ٹیکسی ڈرائیور اس سے آگے جانے پر راضی نہیں تھا۔''تمہارے ساتھ کوئی مجھے بھی لوٹ لے گا۔''

چیف نے جیب پر ہاتھ رکھا۔''میرے پاس گن ہے۔''

''پھر بھی میں کسی مشکل میں کیوں پڑوں۔ صرف ایک کوارٹر کے لیے...... تم اتنا پیدل چل سکتے ہو۔''

ہم ایک تنگ سڑک یا گلی سے گزرے جس میں نوجوان دو دو چار چار کی ٹولیاں بنائے کھڑے تھے یا فرش پر ایسے بیٹھے تھے جیسے قالین بچھا ہوا ہو۔ وہ چرس والے سگریٹ پی رہے تھے اور اپنی جیسی لڑکیوں کے ساتھ فحش حرکات کررہے تھے۔ انہوں نے ہمیں دلچسپی اور غور سے دیکھا مگر دو جگہ چیف نے کسی وجہ سے کے بغیر جیب سے ریوالور نکال کے دیکھا اور پھر جیب میں ڈال لیا۔ اس نے بدمعاشی کرنے والوں کو کچھ کرنے سے پہلے ہی روک دیا۔

البرٹ کی ماں ہمیں باہر ہی مل گئی۔ وہ بالکل اس تصویر کے پوز میں دروازے پر کھڑی تھی جو ہمیں سلور ڈولفن سے ملی تھی۔ شاید پانچ سو پونڈ کی امید نے اسے بے چین کردیا تھا۔

چیف نے انجان بن کے پوچھا۔''البرٹ یہاں رہتا ہے؟''

عورت کی باچھیں کھل گئیں۔''یس...... یہی البرٹ کا گھر ہے اور میں اس کی ماں ہوں۔ یہ میری گود میں اسی کا بیٹا ہے۔ ابھی تم نے فون کیا تھا؟''

''کیا ہم اندر چل کے بات کرسکتے ہیں۔'' چیف نے کہا۔

''ہاں آؤ...... اندر آجاؤ۔'' بڑی بی نے کہا اور اپنے پیچھے دروازہ بند کردیا۔''سب کے سامنے تم مجھے پانچ سو پونڈ دیتے۔''

چیف نے اس کی بات کاٹ دی۔''یہ میں اسی کو دوں گا۔''

''کیوں...... تمہیں مجھ پر اعتبار کرنا چاہیے۔ یہاں سب جانتے ہیں کہ میں اس کی ماں ہوں، تم کسی سے بھی پوچھ سکتے ہو۔ یہ البرٹ کا بیٹا ہے، میرا پوتا۔ اس کی ماں تو بھاگ گئی تھی جب یہ چھ مہینے کا تھا۔ ایک سال سے میں ہی اسے پال رہی ہوں...... تمہیں البرٹ ابھی نہیں مل سکتا۔''

چیف نے سوچ کے کہا۔''ابھی نہیں مل سکتا۔ اچھا...... یہ بچہ تو مل سکتا ہے۔''

بڑھیا گھبرائی۔''کیا مطلب ہے آخر تمہارا؟'' اور بچے کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

''کیا میں لاطینی بول رہا تھا؟'' اس نے ایک دم ریوالور نکال لیا۔
بڑھیا کے حلق سے گھٹی ہوئی چیخ نکلی جسے اس نے منہ پر ہاتھ رکھ کے خود ہی دبا لیا۔ ''یہ...... ایسا کیوں کر رہے ہو تم...... کون ہو تم۔''
چیف اٹھا اور اس نے ایک جھٹکے سے بچہ چھین لیا۔ ''اگر تیرے حلق سے آواز نکلی بڑھیا...... تو میں اس بچے کی گردن مروڑ دوں گا۔''
بڑھیا گرتے گرتے سنبھل گئی۔ ''خداوند یسوع مسیح کے لیے، میں چپ ہوں۔ تم اس بچے کو دے دو...... آخر کیا چاہتے ہو تم۔''
''وہ ہم البرٹ کو بتائیں گے لیکن اپنے ساتھ اس بچے کو چپ رکھنا تیری ذمے داری ہے۔ آئی بات سمجھ میں۔''
بڑھیا نے اوپر نیچے گردن ہلائی اور چیف نے روتے ہوئے بچے کو بڑھیا کی طرف واپس دھکیل دیا۔ اس کی دادی سخت دہشت زدہ تھی لیکن اس کی گود میں پہنچتے ہی بچہ چپ ہو گیا اور ہمیں پرخوف نظروں سے گھورنے لگا۔ بڑھیا نے دوبارہ پوچھا۔ ''آخر کچھ کہو تم کیا کرنا چاہتے ہو۔ تم البرٹ کو مارو گے تو نہیں...... اب وہی میرا سہارا ہے...... باقی سب تو گئے۔''
''بہتر ہے تم بھی جاؤ البرٹ کے آسرے پر مت جیو...... اس کی زندگی محدود ہے اور تم اچھی ماں ہو تو اسے سمجھانا کہ ہم سے تعاون کرے۔ ورنہ باری باری ہم سب کو مار دیں گے، پہلے اس بچے کو، پھر تمہیں...... اور آخر میں البرٹ کو بھی۔'' چیف نے سفاک لہجے میں کہا۔
وہ ہکلائی۔ ''میں...... میں اسے سمجھاؤں گی...... مگر میں نے تم سے غلط کہا تھا۔ پانچ سو پونڈ ہتھیانے کے لیے...... وہ نہیں آئے گا۔ اس نے کہا تھا۔''
''خواہ کوئی تمہیں مار جائے یا اس بچے کو...... بڑھیا...... وہ کہاں ہے، ابھی فون کروا سے اور بلاؤ۔''
''اس نے کہا تھا فون مت کرنا۔''
''اچھا...... پھر بتاؤ وہ کہاں ملے گا۔ ہم اس سے مل لیں گے۔''
''نہیں...... تم وہاں نہیں جا سکتے۔ وہاں محافظ ہیں، وہ کسی کو بھی اندر جانے نہیں دیتے اور وہ جگہ بہت دور ہے۔''
''وہیں تو جانا ہے ہمیں...... اس قلعے میں جہاں فیرل نے ایک پری کو قید کر رکھا ہے۔ تمہیں معلوم ہے وہ جگہ کہاں ہے؟ ضرور معلوم ہوگی ورنہ تمہیں کس نے بتایا کہ وہاں محافظ ہیں اور وہ جگہ بہت دور ہے۔ تم ایک مکار عورت ہو...... لیکن اس طرح تم کسی کے لیے اچھا نہیں کر رہی ہو، ہمیں دھوکا دینا ناممکن ہے۔ اپنے بیٹے کی اور اس کے بیٹے کی جان اس طرح نہیں بچ سکتی، اگر وہ ہماری ایک چھوٹی سی بات مان لے تو کچھ نہیں ہوگا، ہم واپس چلے جائیں گے۔ ہو سکتا ہے تمہیں پانچ سو پونڈ بھی دے جائیں۔''
''تم جھوٹ بول رہے ہو۔''
چیف نے میری طرف دیکھا۔ ''پانچ سو پونڈ اس بڑھیا کو دے دو۔''
میں نے تعمیل کی اور جیب سے رقم نکال کر اس کے سامنے رکھ دی۔ بڑھیا کی آنکھوں میں لالچ کی چمک پیدا ہوئی۔ اس نے نوٹوں کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ چیف نے کہا۔ ''ابھی نہیں...... اسے فون کر کے بلاؤ اور یہ تمہاری...... میں اپنی مردہ ماں کی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ اس میں کوئی دھوکا نہیں۔''
بڑھیا نے ایک لمحے کے لیے سوچا اور پھر اپنے ڈھیلے ڈھالے لباس میں ہاتھ ڈال کے ایک پرانا موبائل فون نکالا...... معلوم نہیں اسے خوف نے مجبور کیا تھا، لالچ نے چیف کی قسم نے...... چیف نے بچے کو پھر اس کی گود سے لیا۔ ''ایک غلط لفظ تمہارے منہ سے نکلا تو بچہ دوسری سانس نہیں لے گا۔ میں نے آج تک کسی بچے کو نہیں مارا لیکن تم مجھے مجبور کرو گی تو یہ گناہ بھی ہو جائے گا مجھ سے۔''
بڑھیا نے سر ہلایا۔ اب تک وہ پرسکون ہو گئی تھی...... ''البرٹ۔ جلدی کرو تمہارے بچے کو کچھ ہو گیا ہے۔ وہ بڑی مشکل سے سانس لے رہا ہے اور کانپ رہا ہے، الٹیاں کر رہا ہے اور اسے تیز بخار ہے۔ میں نہیں جانتی...... میری بچی رات سے ایسی ہی حالت ہے، میرے پاس پیسے بھی نہیں ہیں کہ میں کسی سے کہوں، مجھے ڈاکٹر کے پاس لے جائے۔ جلدی کرو ورنہ ہم دونوں مر جائیں گے۔''
غالباً البرٹ ایک اچھا بیٹا اور محبت کرنے والا باپ ضرور تھا کہ اس نے ماں کا اعتبار کر لیا۔ بڑھیا کے لبوں پر نمودار ہونے والی خفیف سی مسکراہٹ بتاتی تھی کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہی ہے۔ اس نے نوٹوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ''اب میں یہ لے سکتی ہوں۔'' اور چیف کی گردن کی خفیف سی حرکت کے ساتھ اس نے نوٹ جھپٹ کر اٹھا لیے۔
ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ پینتالیس منٹ بعد جو میرے لیے پینتالیس گھنٹوں جیسے تھے، دروازے پر دستک

ہوئی۔ بڑھیا نے اقرار میں سر ہلا کے تصدیق کی کہ یہ البرٹ تھا۔ چیف نے دروازہ کھولا اور اسے ایک دم اندر گھسیٹ لیا۔ وہ میرے سامنے منہ کے بل گرا۔ یہ سب اس کے لیے غیر متوقع تھا۔ پھر وہ تڑپ کے اٹھا اور خود بخود اس کے ہاتھ نے ریوالور نکال لیا۔ میں نے ایک لات رسید کی اور ایسی جگہ پڑی کہ وہ بلبلا کے ریوالور چھوڑنے پر مجبور ہوا۔ میں نے اس کے اٹھتے ہی پوری قوت سے اس کے سر پر مارا۔ وہ چکرا کے گر گیا۔
بڑھیا چلائی۔ ''البرٹ...... میں مجبور تھی، انہوں نے کہا تھا کہ مجھے بھی مار دیں گے اور بچے کو بھی۔''
چیف نے کہا۔ ''ایسا ضرور ہوگا اور تم بھی مارے جاؤ گی بالآخر......''
البرٹ بڑی مشکل سے اٹھا اور کچھ دیر فرش پر بیٹھا رہا، اس کی نظر مجھ پر جم گئی تھی۔ میں نے کہا۔ ''کیا کچھ یاد آیا؟...... ہم پہلے بھی مل چکے ہیں۔''
اس نے سر کو دائیں بائیں جھٹکا۔ ''میں سمجھ گیا کہ تم کیوں آئے ہو۔''
میں نے تعریفی انداز میں سر ہلایا۔ ''ایک لمحے میں ہوشیار ہو گئے تم۔''
چیف نے کہا۔ ''کچھ دماغ ایسے ہی سیٹ ہوتے ہیں۔''
بڑھیا نے کانپتی آواز میں کہا۔ ''البرٹ...... یہ خطرناک لوگ ہیں، ان کا تم سے کیا جھگڑا ہے؟''
''ماں...... تم اس جھگڑے میں مت پڑو۔ میں سب سیٹل کر لوں گا، میں جانتا ہوں یہ لوگ یہاں کیوں آئے ہیں۔''
میں نے کہا۔ ''ویری گڈ...... تم نے خود کو اور ہمیں بڑی زحمت اور پریشانی سے بچا لیا...... وہ لڑکی کہاں ہے؟''
''ابھی تک وہ محفوظ ہے، مجھ پر اعتبار کرو...... وہ پھر وہیں ہے، لارڈ کے گھر میں...... اگر اس پاگل لڑکی کا بس چلتا تو وہ یقیناً اسے قتل کر چکی ہوتی۔'' البرٹ کسی روبوٹ کی طرح بولنے لگا۔
''کیا تم کہنا چاہتے ہو کہ تم نے ایسا نہیں ہونے دیا؟''
اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میری کوئی اوقات نہیں۔ میں اس کے حکم کا غلام ہوں...... لیکن آج کے بعد شاید مجھے بھی روپوشی اختیار کرنی ہوگی، یہاں سے جانا پڑے گا...... میری مجبوری کا بہانہ نہیں چلے گا۔ قصوروار ہی سمجھا جائے گا۔ کوئی یہ تسلیم نہیں کرے گا کہ وفاداری اور فرض شناسی سب دھری رہ جاتی ہے جب موت سامنے ہو، مجھے لگتا ہے کہ تم سب کو مار ڈالو گے اگر میں نے تعاون نہ کیا۔''
چیف نے سر ہلایا۔ ''ایسا کرنا ہمیں اچھا نہیں لگتا، لیکن ایسا کرنا ہماری بھی مجبوری ہے۔ وہ لڑکی ہمیں زندہ سلامت چاہیے۔''
''کیا تم میری بات سنو گے...... یہ ٹھیک ہے کہ تم نے پہلی بار اسے میری قید میں دیکھا تھا۔ اغوا کر کے اسے کشتی پر لانے والا میں نہیں تھا۔ میں صرف اسے وہاں اپنی تحویل میں رکھنے کا ذمے دار تھا...... لیکن میں ناکام رہا اور قصوروار ٹھہرا۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنی جان بچائی تھی۔ میری سابقہ خدمات اور پرانی وفاداری کی وجہ سے مجھے معاف کر دیا گیا تھا...... لیکن میری ڈیوٹی تبدیل کر دی گئی تھی۔ مجھے لارڈ ارنسٹ کے شکاری کتوں کو نہلانے اور ان کی دیکھ بھال کے کام پر لگا دیا گیا تھا۔''
''مجھے اس تفصیل سے کوئی دلچسپی نہیں۔''
''دیکھو مسٹر رفیق...... تم مجھے اس جرم کی سزا نہ دو جو میں نے نہیں کیا، پہلے بھی میں اپنی ڈیوٹی کر رہا تھا۔ دوسری بار اس کو اغوا کر کے لانے والا میں نہیں تھا...... یہ کام کس نے کیا، مجھے کچھ نہیں معلوم لیکن میں جانتا ہوں کہ وہ لڑکی...... کیا نام ہے اس کا...... نور...... اس مرتبہ وہ وہیں ہے۔ اس گھر کے بیسمنٹ میں ایک اسٹور روم ہے لیکن سوچو، تم میری نشاندہی پر وہاں پہنچ جاؤ گے تو کیا یہ میرا قصور...... میری نمک حرامی کا نتیجہ نہیں سمجھا جائے گا۔''
''ہم یہ بات انہیں نہیں بتائیں گے۔''
وہ مایوسی سے سر ہلانے لگا۔ ''انہیں پتا چل جائے گا...... میرے حق میں یہی بہتر ہے کہ تمہارے جاتے ہی یہاں سے نکل جاؤں۔''
''تمہاری بات جھوٹ بھی ثابت ہو سکتی ہے۔''
''اب میری ہمدردی اس پاگل لڑکی کے ساتھ نہیں ہے۔ آخر وہ ایسا کیوں کر رہی ہے...... اس کا باپ بھی پریشان ہے، اس کا خیال تھا کہ محل میں کسی کو معلوم نہیں ہوگا لیکن سب جانتے ہیں وہ پاگل ہے اور وہ اس کے زرخرید نہیں، اس کے باپ کے ملازم ہیں۔ برسوں سے اس کے ساتھ ہیں۔ اسے پتا چل گیا ورنہ ایلیشا اسے مار ڈالتی۔ بھوکا پیاسا...... اذیت میں رکھ کے۔ میں نے اس کے باپ کو چلاتے سنا۔ وہ ایلیشا کو دھمکی دے رہا تھا کہ اسے پاگل خانے میں بند کرا دے گا۔ اس کا دماغ چل گیا ہے، کیا اس طرح وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ وہ سب کچھ

برباد کر دے گی، اس کی ساری عمر کی کمائی...... نیک نامی ......اور وہ چیخ رہی تھی کہ تمہیں حاصل نہ کر سکی تو اپنی جان لے لے گی۔ اس لڑکی کو قتل کرنے کے بعد خود کو گولی مار لے گی۔ بیچارا لارڈ بڑی مصیبت میں ہے۔ وہ ڈرتا ہے کہ یہ بات باہر نہ معلوم ہو جائے، اگر یہ ساری کہانی پریس میں آگئی یا پولیس تک بات پہنچ گئی تو وہ کیا کرے گا۔"

میں نے کہا۔ "اس نے مجھ سے رابطہ کیوں نہیں کیا؟"

"یہ میں کیا بتاؤں...... میں نے وہ بتا دیا جو اندر سنا، اب تم سیدھا راستہ اختیار کرو...... لارڈ ارنسٹ کے پاس جاؤ اس سے کہو کہ وہ نور کو واپس کر دے۔ تم اس کے ساتھ ہمدردی رکھتے ہو۔ ایلیشا کا معاملہ وہ خود سنبھالے، تم کسی کو کچھ نہیں بتاؤ گے۔ نہ نور کسی سے بات کرے گی۔ تم اس کے شکر گزار ہو۔ اس کی مداخلت سے نور زندہ ہے...... تمہیں پرانے مراسم کا بھی خیال ہے اور تم...... قانونی چکروں میں نہیں پڑ سکتے۔ تم فوراً نور کے ساتھ لندن چھوڑ دو گے۔ یہ تمہارے لیے سیدھا آسان راستہ ہے۔"

میں نے کہا۔ "تمہاری بات سمجھ میں آتی ہے۔"

چیف نے میری طرف دیکھا۔ "میں ابھی یہاں ہوں اور تمہاری طرف سے اچھی خبر سننے تک رہوں گا۔"

"میں تمہیں فون پر بتاؤں گا۔" میں اٹھ کھڑا ہوا۔

دوپہر گزر چکی تھی جب میں ٹیکسی میں ارنسٹ مینشن کے دروازے پر اترا۔ البرٹ سے حاصل ہونے والی انفارمیشن نے مجھے سکون کے ساتھ اعتماد بھی دیا تھا اور بلاشبہ یہ چیف کی مدد سے ہوا تھا جیسا کہ اس نے کہا۔ اس کی مجرمانہ چھٹی حس نے اس کی رہنمائی صحیح سمت میں کی تھی۔

مجھے معلوم تھا کہ ٹیکسی کو اندر نہیں جانے دیا جائے گا۔ خود مجھے سیکیورٹی گارڈ نے روک لیا۔ یہ نہیں کہ کوئی مجھے پہچانتا نہیں تھا۔ وہ صرف انہی کے احکامات کی تعمیل کرتے تھے جو ان کو خدمات کا معاوضہ دیتے تھے۔ قطعی اور غیر جذباتی انداز میں۔ اگر لارڈ ارنسٹ اپنے باپ کو بھی روکنے کو کہتا تو وہ نہ کوئی ندامت محسوس کرتے اور نہ معذرت کرتے۔

میں ابھی تک شک میں مبتلا تھا۔ البرٹ کوئی میرا آزمایا ہوا حق و صداقت کا چیمپین نہیں تھا۔ اس کی کہی ہوئی ہر بات جھوٹ بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ میں اس وقت تک سسپنس میں مبتلا رہا جب تک اندر سے مجھے بلاوا موصول نہیں ہوا اور یہ سوچتا رہا کہ البرٹ نے مجھے بلف کیا ہوگا تو میرے ساتھ کیا سلوک ہوگا۔ آگے کا پلان میرے ذہن میں واضح تھا۔

لارڈ ارنسٹ نے مجھے بڑے ظاہری سکون اور خندہ پیشانی کے ساتھ اپنی لائبریری میں ریسیو کیا لیکن اس کی کشمکش کا اظہار اس کے مصنوعی اطمینان کے پیچھے محسوس کیا جا سکتا تھا۔ اس کی پریشانی اس کی حرکات و سکنات میں تھی۔ اس نے پوچھا۔ "کیا پیو گے؟" اور پھر خود ہی "ظاہر ہے کافی لو گے۔" بیل بجا کے کسی کو طلب کرنے کے بجائے وہ دروازے تک گیا اور کسی سے چلا کے کافی کے لیے کہا۔ غصہ اس کی آواز اور لہجے میں بھرا ہوا تھا۔

میں نے کہا۔ "سر...... آپ آرام سے بیٹھ جائیے کیونکہ میں کوئی لپٹی رکھے بغیر اور ظاہری اخلاقیات کو بالائے طاق رکھ کے بات کروں گا۔ میں آپ کی ہمیشہ سے عزت کرتا رہا ہوں۔ اسی اعتماد کی وجہ سے اکیلا آگیا ہوں جو مجھے آپ کی قوت فیصلہ پر ہے...... میں نور کو واپس لے جانے آیا ہوں۔"

اس کا چہرہ کھنچ گیا اور ماتھے پر ایک نس پھڑکنے لگی۔ "یہ کس نے بتایا تمہیں کہ وہ یہاں ہوگی؟"

"اس سوال کے جواب کی کوئی اہمیت نہیں...... میں جانتا ہوں وہ یہاں ہے۔ میری ہمدردیاں آپ کے ساتھ نہ ہوتیں تو میں اکیلا نہ آتا۔ میں نہ آپ کے لیے پریشانی میں اضافہ چاہتا ہوں، نہ خود پریشانی میں پڑنا چاہتا ہوں۔ آپ قصوروار آپ نہیں لیکن آپ کا نتائج کے خوف میں مبتلا ہونا فطری بات ہے۔ اس خوف کو دل سے نکال دیں۔ یہ بات میرے آپ کے درمیان رہے گی اور یہیں ختم ہو جائے گی۔ کل مجھے واپس پاکستان جانا تھا مگر میں نہ جا سکا۔ اب میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ پہلی دستیاب پرواز سے میں پاکستان لوٹ جاؤں گا اور اپنے ساتھ نور کو بھی لے جاؤں گا۔"

وہ پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھتا رہا۔ "تم سچ کہہ رہے ہو؟"

"مجھے جھوٹ بولنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ کچھ خوفزدہ ضرور تھا کیونکہ آپ کے مقابلے میں...... آپ کے اثر رسوخ کے مقابلے میں میری پوزیشن بہت کمزور تھی۔"

اس نے ایک ہاتھ ہلایا۔ "یہ کیا فضول بات ہے۔"

"میں بہرحال اپنی حفاظت کے خیال سے غافل نہیں تھا۔ میں کسی کو بتا کے آیا تھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ میرے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

"کچھ بھی کا مطلب!...... کیا میں تمہیں قتل کرا دیتا یا غائب کرا دیتا۔ وہ لڑکی تو پاگل ہے، بالکل پاگل...... اسے نفسیاتی مریض کہنا میری مجبوری ہے کیونکہ میں اس کو کسی پاگل خانے کے حوالے نہیں کر سکتا۔ پھر یہاں کون رہ جائے

گا...... ایک اکیلا میں...... میں بھی پاگل ہو گیا پھر...... نہیں...... اس سے بہتر ہے کہ یہ گھر ہی ایک پاگل خانہ ہو، جہاں دو پاگل رہتے ہیں۔ ایک باپ اور ایک بیٹی......"

میں نے محسوس کیا کہ وہ شاید رو پڑے گا۔ "لارڈ ارنسٹ آپ مایوس نہ ہوں، میرے جانے سے بہتری آئے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے اس خرابی کا شک بھی ہوتا تو میں لندن نہ آتا۔"

"میں...... بہت احسان مند ہوں تمہارا۔ کوئی اور مجھے اتنی آسانی سے معاف نہ کرتا۔ میری عزت اور سیاسی ساکھ سب خاک میں مل جاتی۔"

"میں نے پولیس کو بالکل ہوا نہیں لگنے دی، آپ مطمئن رہیں پریس میں کچھ آنے کا سوال ہی نہیں۔ آپ عائشہ...... ایلیشا کو سنبھالیں اور خود کو بھی۔" میں نے اٹھ کے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "وہ ہے کہاں؟"

"کون...... تم نور کو پوچھ رہے ہو؟"

"نہیں...... ایلیشا کو......"

"اپنے کمرے میں بند ہے...... جنگلی بلی کی طرح غراتی ہے دیکھ کر۔ تم نور کو لے جاؤ...... اور میری درخواست ہے پھر کبھی ادھر مت آنا۔"

میں نے اسے تسلی دی۔ "ایلیشا علاج سے ٹھیک ہو جائے گی۔"

وہ مجھے اپنے ساتھ لے گیا اور ایک کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے نور نے کہا۔ "یس......"

لارڈ ارنسٹ کے اشارے پر میں نے دروازہ کھولا اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ نور بیڈ پر گھٹنے سمیٹے دہشت زدہ بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوف کی دیوانگی جھلک رہی تھی۔ وہ کچھ دیر پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھتی رہی۔ پھر ایک دم اٹھی...... "رفیق......" وہ چلائی۔ "تم بھی آگئے اس پاگل خانے میں......"

میں نے اسے سنبھالا نہ ہوتا تو وہ گر جاتی۔ "نور، ہوش میں آؤ...... میں تمہیں لے جا رہا ہوں واپس...... پاکستان......"

وہ دیوانہ وار رونے لگی۔ "مجھے ابھی جانا ہے...... میں یہاں نہیں رہوں گی...... وہ پاگل لڑکی مجھے مار ڈالے گی، وہ ڈائن ہے، چڑیل ہے۔"

میں نے اسے جھنجوڑا۔ "نور...... سنبھالو خود کو...... کیا کر رہی ہو میں نے کہا نا کہ ہم آج ہی پاکستان لوٹ جائیں گے۔"

لارڈ ارنسٹ نور کے رونے کی آواز سن کے اندر آگیا تھا اور سخت پریشان اور پشیمان ایک طرف کھڑا تھا۔ میں نے نور کو بیڈ پر بٹھا دیا اور پانی پلایا، کچھ دیر میں اس کی حالت سنبھل گئی تو وہ کھڑی ہو گئی۔ "چلو رفیق......"

ایک بار پھر خدا نے نور کو حیات نو عطا کی تھی اور عائشہ کو یہ ثبوت فراہم کر دیا تھا کہ مارنے والے سے بچانے والا ہاتھ زیادہ با اختیار اور زبردست ہے۔ لارڈ ارنسٹ کی حالت پر مجھے افسوس بھی ہوا، رحم بھی آیا۔ نہ جانے تقدیر نے اسے کون سے گناہوں کی پاداش میں زندگی کی ان خوشیوں سے محرومی کی سزا دی تھی جو کامیابی سے ملتی ہیں۔ دنیاوی طور پر وہ ایک انتہائی کامیاب آدمی تھا جس کے پاس دولت اور عزت کے سارے خزانے تھے لیکن گھر کے اندر اس کو نہ ازدواجی سکون حاصل ہوا نہ اولاد کی محبت ملی حالانکہ فطرت کے لحاظ سے بھی وہ کاروباری دنیا میں ایک پسندیدہ شخص تھا۔

اس نے بڑی شرمندگی سے کہا۔ "نور...... مجھے اپنی بیٹی کے رویے پر سخت ندامت ہے۔ کیا اس کے لیے تم مجھے معاف کر سکتی ہو۔"

اس کے قریب سے گزرتے ہوئے نور پل بھر کے لیے رکی۔ "میرے ساتھ جو ہوا اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں تھا۔ آپ کیوں معافی مانگتے ہیں۔"

"بس اپنے ذہنی سکون کے لیے...... جو مجھے کبھی نہیں ملا۔"

"آپ میری مدد نہ کرتے تو نہ جانے کیا ہوتا۔ میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں۔" نور نے کہا اور پھر تیزی سے باہر نکل گئی۔ "چلو رفیق دیر مت کرو۔ میں یہاں ایک منٹ رکنا نہیں چاہتی۔"

میں نے اخلاقاً لارڈ ارنسٹ سے ہاتھ ملایا۔ "آپ ہمیشہ سے ایک اچھے آدمی تھے، مجھ پر مہربان رہے۔ کاش میں آپ کے لیے کچھ کر سکتا۔"

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اس ڈرامے کا ڈراپ سین باقی ہے...... میں صدر دروازے سے نکلا تو نور مجھ سے آگے تھی۔ لارڈ ارنسٹ انتہائی دکھی اور شرمسار چہرے کے ساتھ ہمیں چھوڑنے آیا۔ تین گاڑیاں لان سے آگے ایک قطار میں ماربل ٹائلز والے راستے پر کھڑی تھیں۔ ان کے شوفر بھی مستعد ہو گئے تھے۔

"رفیق...... یہ گاڑی تمہیں چھوڑ آئے گی۔" لارڈ نے کہا۔

نور نے پلٹ کر ترش لہجے میں کہا۔ "کوئی ضرورت

نہیں۔ہم ٹیکسی میں چلے جائیں گے۔"

اسی وقت میں نے عائشہ کی آواز سنی۔"رفیق...... کمینے انسان، تم مجھے چھوڑ کے جا رہے ہو اس دو ٹکے کی کتیا کے ساتھ۔"

لارڈ ارنسٹ چلایا۔"ایش......"

اس کی آواز کے جواب میں ایک فائر ہوا اور مجھے یوں لگا جیسے گولی میرے کان کو چھوتی ہوئی گزری ہے۔ لارڈ ارنسٹ پھر چلایا۔"ایش...... یہ تم کیا کر رہی ہو...... رفیق ......بچاؤ خود کو......"

گولی اوپر سے چلائی گئی تھی۔ دیکھے بغیر میں سمجھ گیا کہ جنون کے بے بس کر دینے والے دورے میں عائشہ نے مجھے یا نور کو نشانہ بنایا ہوگا...... میں نے چلا کے نور کو خبردار کیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر بھاگا۔ پناہ کی واحد جگہ گاڑی کے پیچھے تھی۔

عائشہ نے چیخ کے کہا۔"میں ایسے نہیں جانے دوں گی تمہیں۔" دوسرا دھماکا ہوا تو نور گر گئی۔ اس کی چیخ نے میرے اوسان خطا کر دیے۔ پھر مجھے اس کے شانے پر خون کا سرخ دھبا پھیلتا نظر آیا، ہر طرف ایک افراتفری مچ گئی تھی۔ لارڈ ارنسٹ چلا رہا تھا۔"عائشہ، اسٹاپ اٹ...... ڈونٹ بی میڈ......" پھر اس نے ملازموں پر چیخنا شروع کیا۔

نور کو اٹھا کے میں نے ایک آخری دیوانہ وار کوشش کی۔ ایک جست نے مجھے دیوہیکل گاڑی کے پیچھے پہنچا دیا۔ وہاں میں نے تیسرا دھماکا سنا لیکن اب میں اور نور براہ راست نشانہ بننے سے محفوظ ہو گئے تھے۔ گولی شاید گاڑی پر لگی۔ میرے کانوں نے عائشہ کا ہذیانی قہقہہ سنا...... ایک شیشے کے فریم سے میں نے اس کو چھت پر بنے ہوئے ٹاور کے گول کمرے میں دیکھا۔ ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ پھر نشانہ لے رہی تھی۔ لارڈ ارنسٹ کے چلانے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہو رہا تھا۔

عائشہ اپنے باپ کو گالیاں دینے لگی۔"تم نے بھی مجھے دھوکا دیا۔ تم بھی میرے دشمن ہو۔"

ایک اور دھماکا ہوا۔ لارڈ ارنسٹ کی چیخ کے ساتھ میں نے اسے جھکتے اور پھر گرتے دیکھا۔ بیک وقت دو ملازم اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے اسے اٹھا کے پیچھے لے گئے...... وہاں سیمنٹ کے راستے پر بارش سے محفوظ رکھنے والا تین فٹ چوڑا چھجا تھا۔ ایک گاڑی پیچھے گئی اور ملازموں نے لارڈ ارنسٹ کو اس کے اندر ڈال دیا لیکن ابھی اس کے سامنے دو گاڑیاں راستہ روکے کھڑی تھیں...... گیٹ کے سیکیورٹی گارڈ نے پہلی گاڑی کے ڈرائیور سے چلا کے گاڑی ہٹانے کو کہا۔

میں نے دروازہ کھولا اور نور کو اس میں ڈال دیا۔ باہر سے ایک اور فائر کی آواز سنائی دی لیکن اس وقت تک گاڑی حرکت میں آ چکی تھی۔ میں نے ایک نسبتاً کم شدت کا دھماکا سنا اور پھر شیشوں میں آگ کے شعلوں کی چمک دیکھی۔ عائشہ کی گولی نے درمیانی گاڑی کو ہٹ کیا تھا اور اس کے ٹینک سے بہنے والے پیٹرول نے آگ پکڑ لی تھی۔ ہر طرف ایک چیخ پکار مچی ہوئی تھی لیکن ہماری گاڑی کے ڈرائیور نے گاڑی کو گیٹ سے نکال لیا۔

پھر میں نے حاضر دماغی، ہمت اور فرض شناسی کا حیرت انگیز مظاہرہ دیکھا۔ کسی ڈرائیور نے شعلہ بنی ہوئی گاڑی کو درمیان سے ہٹانے کے لیے جان کی بازی لگا دی تھی۔ دھڑ دھڑ جلتی گاڑی گیٹ سے نکل گئی تھی اور تیسری گاڑی کے لیے راستہ صاف ہو گیا تھا جس میں لارڈ ارنسٹ تھا۔ معلوم نہیں گولی اسے کہاں لگی تھی۔ ڈرائیور یقیناً اسے اسپتال لے جا رہا ہوگا۔

نور مجھ سے چمٹی ہوئی تھی۔ اسے اپنے شانے کے زخم کی تکلیف کا کوئی احساس نہ تھا۔ اس کی قمیص کو تر کرنے والا خون میرے کندھے پر بھی لگ گیا تھا۔ میں نے قمیص کی آستین کو پھاڑ کے الگ کیا تو زخم میرے سامنے آ گیا۔ گولی نے صرف شانے کے گوشت میں گہری خراش ڈالی تھی...... میں نے اسے تسلی دی......"سب ٹھیک ہے جان......اب ہم محفوظ ہیں، اللہ نے تمہیں بچا لیا، معمولی زخم ہے ٹھیک ہو جائے گا......" لیکن وہ ہوش میں کہاں تھی۔

فوری طور پر اس کو اسپتال لے جانا ضروری تھا......اگر پاکستان ہوتا تو ڈاکٹرز بھی علاج شروع کرنے سے پہلے مطالبہ کرتے کہ میں قانونی کارروائی پوری کروں...... پولیس سرجن پہلے معائنہ کرتا۔ پھر رپورٹ لکھتا اور شاید ایمرجنسی وارڈ کے ڈاکٹر ہی زخم صاف کرتے اور مرہم پٹی کر کے رخصت کر دیتے کہ زخم معمولی ہے لیکن لارڈ ارنسٹ کے تجربہ کار شوفر نے صرف ایک بار پوچھا کہ"کس اسپتال میں چلوں سر!" اور میں نے کہا کہ جو اچھا ہو۔ تو وہ خود ہی کہیں لے گیا۔ میں نے یہ بھی غور نہیں کیا کہ اسپتال کا نام کیا ہے۔

میں بھی سمجھ رہا تھا کہ زخم معمولی نوعیت کا ہے لیکن نور دہرے شاک میں تھی۔ ایک جسمانی اور اس سے شدید تر ذہنی۔ اس کی وجہ سے میں بھی تھوڑا سا نروس تھا لیکن اسپتال میں ملنے والی توجہ نے میری ساری پریشانی دور کر دی۔ نور کے زخم کی ڈریسنگ اور اسے پرسکون کرنے والی دوائیں دینے کے بعد ایک کمرے میں شفٹ کر دیا گیا۔ پولیس اس

بعد پہنچی۔

اب معاملات کی پردہ پوشی میرے اختیار کی بات نہیں تھی۔ میں نے اپنا پہلا بیان اختصار کے ساتھ دیا اور کوشش کہ اس میں حملے کے محرک تمام اسباب کا احاطہ کر لوں...... نے بتا دیا کہ میرے پاس برطانوی شہریت بھی ہے اور میں لارڈ ارنسٹ کی فرم میں ملازمت کرتا تھا تو اس کی ایلیشا کو مجھ سے محبت ہو گئی وہ مجھ سے شادی کی اتنی زومند تھی کہ اس نے مسلمان ہو کے اپنا نام عائشہ رکھ لیا تھا میرے ساتھ پاکستان جانے پر تیار تھی لیکن میں کسی اور کو ہتا تھا چنانچہ میں نے شادی سے انکار کر دیا۔ اب تقریباً دو ل بعد میں اپنے ذاتی کام سے لندن آیا تو اس عرصے میں ئشہ پھر ایلیشا ہو گئی تھی۔ اس نے شادی بھی کر لی تھی لیکن تی اختلافات کے باعث وہ شوہر سے علیحدگی لے رہی تھی۔ ے دیکھ کر اسے پھر عشق کا دورہ پڑ گیا۔ درمیان میں وہ قاعدہ نفسیاتی مریض رہی تھی۔ دوسری بار میرے انکار نے سے پاگل کر دیا پھر میں نے بتا دیا کہ کس طرح اس نے پہلی نور کو اغوا کیا تو اس کے شوہر کی مدد سے میں اسے رہا کرانے ں کامیاب ہوا تھا اور ایسا دوسری بار ہوا تو ایلیشا کے باپ رڈ ارنسٹ نے نور کو بچایا۔

اس کے بعد جو ہوا غیر متوقع نہیں تھا۔ گزشتہ روز نور کے اغوا کی تفتیش کرنے والوں نے اس کیس کو بھی تفتیش کا مہ بنا لیا۔ دو گھنٹے میں یہ خبر میڈیا سے نشر ہو گئی کہ لارڈ رنسٹ کی بیٹی نے ایک جنونی کیفیت میں فائرنگ کرتے وئے اپنے والد کے علاوہ پاکستان سے آئی ہوئی ایک ماتون کو زخمی کیا اور گولی لگنے سے ایک گاڑی جل کے خاک وگئی۔ ایلیشا پر ملازمین نے ریوالور کی گولیاں ختم ہو جانے کے بعد قابو پانے کی کوشش کی تو خودکشی کی نیت سے اس نے بیس فٹ اوپر ایک کھڑکی سے چھلانگ لگا دی لیکن اپنی جان لینے کی اس کوشش میں وہ ناکام رہی۔ اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی ور اسے بے ہوشی کی حالت میں اسپتال لے جایا گیا جہاں اکٹر اس کی جان بچانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ایلیشا کے مرنے کا کوئی چانس نہیں مگر یہ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی باقی عمر ڈھیل چیئر پر گزارے۔ ابھی اس کا آپریشن جاری ہے۔

لارڈ ارنسٹ کے بارے میں یہ خبر بھی میں نے اسپتال میں ہی سنی کہ گولی اس کی ٹانگ میں اوپر لگی تھی جسے نکال دیا گیا ہے اور زخم بھر جانے کے بعد وہ ٹھیک ہو جائے گا کیونکہ ہڈی محفوظ رہی ہے۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس خبر کے نشر ہونے

کے بعد میڈیا کی اسپتال پر یلغار ہوگی...... میں نے پولیس سے مدد کی درخواست کی کہ میں کسی سے ملنا نہیں چاہتا، نہ میڈیا کے کسی سوال کا جواب دوں گا۔ میں پولیس کو تمام تفصیلات دوں گا۔ آگے پولیس جو بتائے ان کی مرضی۔

میں پولیس کے تعاون، ہمدردی اور تحفظ کی جتنی بھی تعریف کروں کم ہے۔ خود اسپتال والوں نے کسی کو اندر نہیں آنے دیا۔ اپنے ضابطۂ اخلاق پر عمل کرتے ہوئے انہوں نے ہر سوال کے جواب کو میری رضامندی سے مشروط رکھا۔ ایک علیحدہ کمرے میں پولیس نے ساری کارروائی مکمل کی۔ یہ ایک ہی میٹنگ میں مکمل ہو جانے والی انکوائری نہیں تھی۔ انہوں نے کہا کہ ہم پھر آئیں گے۔ ایک آفیسر نے صرف اتنا کہا کہ انہیں بتائے بغیر میں کہیں نہ جاؤں۔

نور کے کمرے کو ایک طرح سے آؤٹ آف باؤنڈ قرار دے دیا گیا تھا یعنی علاج کرنے والے ڈاکٹر کی اجازت کے بغیر اس کمرے میں کوئی نہیں جا سکتا تھا۔ میں لوٹ کے ہوٹل نہیں گیا۔ مجھے یقین تھا کہ سراغرساں کتوں کی طرح پیچھے لگ جانے والے صحافی اور فوٹو گرافر جن کے لیے اب "پاپا رازی" کی اصطلاح عام استعمال ہونے لگی ہے۔ ہوٹل پہنچ کے میرے لیے عذاب بن جائیں گے۔ میں پولیس کی مدد سے اسپتال کے پیچھے والے کسی خفیہ راستے سے نکلا تو صحافی وہاں بھی کھڑے تھے مگر پولیس مجھے نکال کے لے گئی۔ انہوں نے رازداری کے ساتھ مجھے شائستہ کے گھر پہنچا دیا۔

یہ ایک سنسنی خیز واقعہ تھا......خصوصاً زرد صحافت کرنے والے اخباروں کے لیے۔ یہ ایک معروف سیاستداں لارڈ ارنسٹ کی بیٹی کے ایک رنگ دار نواب کے عشق میں پاگل ہو کے مرنے اور مار دینے کی کہانی تھی جو کسی فلمی کہانی سے زیادہ دلچسپ مسالہ رکھتی تھی۔ سب جاننا چاہتے تھے کہ یہ عشق کب ہوا، کیسے ہوا، نواب کون تھا۔ اس نے ایک شہزادی کو کیوں ٹھکرایا جو خوبصورت بھی تھی اور دولت مند بھی...... کس کے لیے ٹھکرایا۔ اس جدید داستانِ عشق میں رومیو جیولیٹ کی کہانی سے زیادہ سنسنی خیز مواد تھا۔ وہ پرانی اور فرضی کہانی تھی۔ یہ اکیسویں صدی کا حقیقی عشق تھا۔ اس پر کسی مصنف نے قلم بھی اٹھا لیا ہوگا اور کسی فلمساز نے اس کے ناول پر فلم بنانے کے بارے میں سوچنا بھی شروع کر دیا ہوگا۔

ڈاکٹر شائستہ بھی یہ روداد سن کے پریشان ہو گئی"رفیق، وہ تمہارا سراغ لگاتے ہوئے یہاں بھی پہنچ جائیں گے۔"

میں نے کہا"تم چاہتی ہو کہ میں یہاں سے چلا جاؤں؟"

"نہیں......لیکن مجھے بھی پولیس پروٹیکشن کی درخواست کرنی پڑے گی۔ آخر تم چوبیس گھنٹے یہاں کیسے چھپے رہ سکتے ہو۔ تم اسپتال بھی جاؤ گے اور پولیس تم سے پھر تفتیش کے لیے رابطہ کرے گی۔"

"پھر بتاؤ میں کیا کروں؟"

"تم بیٹھو آرام سے میں کچھ کرتی ہوں۔"

"دیکھو تم جو بھی کرو ایک کام مت کرنا۔ فریال کو کچھ مت بتانا ورنہ خبر پاکستان بھی پہنچ جائے گی۔"

"تم کیا سمجھتے ہو یہ خبر چھپی رہ سکتی ہے؟"

"شائستہ! یہ خبر مقامی اہمیت رکھتی ہے۔ سنجیدہ اور بڑے اخبارات کے لیے یہ شہر میں ہونے والے سیکڑوں جرائم کے واقعات کی طرح ہے۔ اس کی کچھ اہمیت ہے تو لارڈ ارنسٹ کی وجہ سے۔ ممکن ہے اسے مقامی ٹی وی چینل بھی ہائی لائٹ کریں لیکن پاکستان میں بی بی سی بھی بہت کم لوگ دیکھتے ہیں اور وہ اس خبر کو نشر نہیں کرے گا۔ یہاں کے چھوٹے موٹے جرائم کی رپورٹ پاکستان کے کسی اخبار میں نہیں جائے گی۔"

"اوکے۔ میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔ کیا تم بھی نہیں بتاؤ گے؟"

میں نے کہا "کیا ضرورت ہے۔ میں واپس جا کے بتا سکتا ہوں۔"

ڈاکٹر شائستہ نے صحیح قدم اٹھایا۔ سادہ کپڑوں والے دو سراغ رساں ہر آنے جانے والے پر نظر رکھنے کے لیے آ گئے اور گیٹ سے کچھ فاصلے پر اپنی گاڑی میں بیٹھے رہے۔ ایک پولیس مین دروازے کے سامنے ٹہلتا رہا۔ یہ پولیس اور اسپتال والوں کا تعاون اور حسن انتظام تھا کہ کسی صحافی کو میرے وہاں ہونے کی ہوا تک نہیں لگی۔

شام کو میں ڈاکٹر شائستہ کے ساتھ نور کو دیکھنے گیا تو وہ جاگ رہی تھی اور اس کی حالت اطمینان بخش تھی۔ وہیں سے میں نے لارڈ ارنسٹ سے بات کرنے کی کوشش کی اور ناکام رہا۔ وہ خود میری طرح نہ کسی کے سامنے آنا چاہتا تھا نہ کسی سے بات کرنا چاہتا تھا۔ ایلیشا سخت پہرے میں تھی اور ڈاکٹر بھی اس کے بارے میں کچھ بتانے پر تیار نہ ہوئے۔

اگلے ایک ہفتے تک میں اور نور عملی طور پر ڈاکٹر شائستہ کے گھر میں ہی نظر بند رہے۔ صاحب خانہ کے رویے میں تبدیلی خود ایک حیران کر دینے والا واقعہ تھا۔ اس کے لیے انکار کر دینا بہت آسان تھا۔ اس کا میں بھی برا نہ مانتا اور اگر مانتا تو اسے کیا فرق پڑتا۔ وہ بچوں کا بیڈ روم خالی کر کے ہمیں دینے پر آمادہ تھی۔ میں نے اسے منع کیا اور کہا کہ میرے، ڈرائنگ روم کے صوفے پر یا درمیانی جگہ میں قالین پر بچھا کے سونا کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ میں فوم کے گدے پر سونے کا عادی نہیں تھا چنانچہ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔ نور کو اس نے اپنے ساتھ رکھا۔ وہ ایک ہی بیڈ پر سوتی رہیں۔ ڈاکٹر شائستہ دن میں سخت مصروف رہتی تھی۔ بچوں کو اسکول سے لانا لے جانا اس کی ایک ذمے داری تھی۔ پھر وہ صبح شام اپنا کلینک بھی چلاتی تھی اور اس کے پاس آنے والے ایشیائی مریض بہت تھے۔ ان سب کے لیے جو وہاں غیر قانونی طور پر مقیم تھے یا بہت کم معاوضوں پر گھٹیا سمجھے جانے والے کام کرتے تھے، لندن کے اسپتالوں کا خرچ برداشت کرنا ان کی بساط سے باہر تھا۔ وہ شائستہ جیسے ڈاکٹر تلاش کرتے تھے جو ولایتی نرخ پر فیس نہ لیں۔ ان کے لیے لندن میں کام کرنا اور رہنا آسان نہ تھا کیونکہ وہ ہر مہینے بچت کر کے کچھ رقم اپنے گھر کو بھیجنے کے پابند تھے۔

میں اور نور سارا دن فارغ رہتے تھے۔ پہلے دو دن، سارے اخبارات دیکھتے رہے۔ خصوصاً شام کے۔ مقامی ریڈیو اور ٹی وی چینل سنتے رہے۔ ایلیشا کی خبر دو دن خوب مسالے لگا کے شائع کی گئی۔ صحافیوں نے عائشہ کی تصویر بھی حاصل کر لی تھی لیکن اس لو اسٹوری کے فریق ثانی یعنی میرا سراغ لگانے میں وہ ناکام رہے تھے۔ دو دن بعد یہ خبر پس منظر میں چلی گئی۔

یہاں میں عام آدمی کے رویے کو بھی سراہوں گا۔ عام برطانوی پرائے معاملات سے لاتعلق رہنا پسند کرتا ہے۔ سیاسی سطح پر بھی کسی نے لارڈ ارنسٹ کو ٹارگٹ نہیں کیا۔ قصور اس کی بیٹی کا تھا۔ وہاں برطانوی وزیراعظم کی بیٹی کا بھی نشے میں ڈرائیونگ پر عام شہری کی طرح چالان ہو جاتا ہے تو کسی کے لیے تو یہ حیرت کی بات ہوتی ہے نہ دلچسپی کی۔ دوستوں اور عزیزوں نے بھی لارڈ ارنسٹ سے صرف رسمی ہمدردی کا اور افسوس کا اظہار کیا۔ میری بھی اس سے فون پر تیسرے دن بات ہو گئی۔

"میں ٹھیک ہوں رفیق، شاید آج گھر چلا جاؤں گا۔ زخم بھرنے تک لیٹنا پڑے گا۔ نور کیسی ہے؟"

"شی از فائن......اور ایلیشا؟" میں نے ڈرتے ڈرتے سوال کیا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ "ابھی تک میں نے اسے دیکھا نہیں۔ وہ مجھ سے فون پر بھی بات نہیں کرتی لیکن ڈاکٹرز نے بتایا ہے کہ اس کی ذہنی کیفیت بہتر ہے۔ کچھ دواؤں کا اثر ہے

اصل فائدہ ہوا ہے دماغ میں بھرا ہوا غصہ نکل جانے سے۔ جیسے پھوڑے سے زہریلا مواد نکل جائے۔ ایک طرح سے یہ ذہنی Cathrsis کا عمل تھا۔"

"اور جسمانی طور پر؟"

"اس کی کمر کے دو مہرے متاثر ہوئے تھے۔ ممکن ہے مسلسل علاج سے افاقہ ہو۔ سرجری ہو چکی ہے لیکن ڈاکٹر ابھی کچھ بھی بتانے سے قاصر ہیں۔ میں اسے پھر اپنے پیروں پر دیکھنا چاہتا ہوں۔ اسے وہیل چیئر پر دیکھنا بڑا عذاب ہوگا میرے لیے۔ ورنہ کیا کروں گا میں اس بزنس ایمپائر کا؟"

ایک بار پھر بالواسطہ طور پر اس نے میری جانب انگلی اٹھا دی تھی کہ تم نے اسے قبول کر لیا ہوتا تو یہ سب نہ ہوتا۔ تم دونوں مل کے سب کچھ سنبھال لیتے اور خوش رہتے...... ہم سب۔ میں نے رسمی افسوس کے اظہار سے گریز کیا اور پوچھا "اس کے قانونی معاملات کیا ہوں گے؟"

"قانون اپنا راستہ اختیار کرے گا۔ بے شک میں بہت اچھے وکیل کی خدمات حاصل کروں گا اور عدالت اس کی ذہنی حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے زیادہ سے زیادہ رعایت دے سکتی ہے لیکن ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ تم اس کے خلاف چارجز کو کس حد تک پریس کرتے ہو۔"

"نہ میں ایسا کر سکتا ہوں نہ کروں گا۔"

"اقدام قتل کا معاملہ نور کا ہوگا۔"

"میں اس کی طرف سے بھی پوری ذمے داری لیتا ہوں۔"

وہ کچھ دیر بعد بولا "یہ تمہارا ایک اور احسان ہوگا مجھ پر۔ ممکن ہے اس کی سزا معطل ہو جائے۔"

میں نے کہا "اس میں احسان کی بات ہی نہیں۔ ہم خود جلد از جلد تمام قانونی معاملات سے جان چھڑا کے وطن واپس جانا چاہتے ہیں۔"

ہمدردی مجھے عائشہ سے بھی تھی لیکن نور کے سامنے میں یہ نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس کی زندگی تباہ ہو گئی تھی اور بلاوجہ الزام مجھ پر آ رہا تھا۔ میرا یہاں آنا ہی میرے لیے احساس جرم کا سبب بننے لگا تھا حالانکہ یہاں میں نور کے اور اپنے کام سے آیا تھا۔ مجھے ذرا بھی شک ہوتا کہ عائشہ کی ذہنی کیفیت پر ایسے تباہ کن اثرات مرتب ہوں گے تو میں ادھر کا رخ نہ کرتا مگر یہ الہام کیسے ہوتا؟

رات کو ہم تفریح کے لیے نکلنے کی ہمت کرتے تھے تو شائستہ کی گاڑی لے جاتے تھے۔ ایک ڈر یہ رہتا تھا کہ میرے پاس جو انٹرنیشنل ڈرائیونگ لائسنس تھا وہ ختم ہو چکا تھا۔ ٹریفک کی معمولی سی غلطی پر میں پکڑا جاتا، پھر یہ خوف تھا کہ کہیں کسی صحافی نے میری تصویر حاصل نہ کر لی ہو اور مجھے پہچان کے میرے پیچھے نہ پڑ جائے۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ ہم گھوم پھر کے آدھی رات سے پہلے ہی لوٹ آتے تھے۔

دن میں پولیس اپنی تفتیش کے لیے کسی بھی وقت نمودار ہو جاتی تھی۔ تاہم وہ اب بھی اتنا لحاظ کرتے تھے کہ سادہ کپڑوں والے عام کار میں آتے تھے۔ میرے پاس لاہور ہائی کورٹ سے ملنے والی مہلت ختم ہوتی نظر آ رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ بالآخر مجھے اس میں توسیع کے لیے درخواست ارسال کرنی ہوگی۔ جو بات ابھی تک پاکستان میں کسی کو معلوم نہیں تھی، سب کو پتا چل جائے گی۔ دوست اور مہربان تو محض تشویش میں مبتلا ہوں گے، مخالف اور بدخواہ اخبارات میں اسکینڈل کھڑا کر دیں گے۔ جس کا جو دل چاہے گا چھاپ دے گا، اکیلا راجا کس کس کو جھٹلائے گا۔

لارڈ ارنسٹ کا وکیل میری درخواست پر مجھے بھی قانونی راہنمائی فراہم کرنے پر آمادہ ہو گیا تھا جس سے معاملات کو کم سے کم وقت میں اور آسانی سے ختم کیا جا سکے۔ مجھے صرف ایک بات کا ڈر تھا۔ جانتے بوجھتے میں نے نہ البرٹ کا ذکر کیا تھا اور نہ چیف کا۔ دانستہ حقائق کو چھپانے کا نقصان چار دن بعد سامنے آیا جب تفتیش پر مامور سارجنٹ نے مجھے پولیس اسٹیشن آنے کے لیے کہا۔

اس نے میرا بیان سامنے رکھ دیا "اس میں تم کچھ اضافہ کرنا چاہتے ہو؟"

میں نے نفی میں سر ہلا دیا "میرے خیال میں اتنا کافی ہے۔"

"نہیں مسٹر شیرازی! اس میں تم نے نہیں بتایا کہ پہلی بار نور کو اس وقت اغوا کیا گیا تھا جب تم لارڈ ارنسٹ کے گھر میں تھے اور نور اس کے مہمان خانے سے غائب ہو گئی تھی، کیا ایسا ہوا تھا؟"

"یس۔ میں نے اس واقعے کو نظر انداز کر دیا تھا۔"

وہ طنز سے بولا "نظر انداز نہیں مسٹر شیرازی! تم پھر غلط بیانی سے کام لے رہے ہو۔ تم نے خود اسے بازیاب کیا، وہ لارڈ کی اس بوٹ پر قید تھی جس کا نام "سلور ڈولفن" ہے۔"

"میں یا نور اسے اغوا اور قید نہیں سمجھتے۔ وہ تفریح کے لیے گئی تھی اور اسے رات وہاں رکنا پڑا۔"

"ایسا مت کریں مسٹر شیرازی، آپ چاہیں تو اپنے وکیل کو بلا لیں کیونکہ آپ کا کہا ہوا ہر لفظ آپ کے خلاف عدالت میں بھی استعمال ہو سکتا ہے۔ کیا آپ البرٹ کو جانتے

ہیں؟''

''ہاں' وہ سلورڈولفن پر تھا۔''

''جب آپ وہاں گئے تو ایک پولیس بوٹ نے آپ کی رہنمائی کی تھی۔ آپ اس وقت تنہا تھے' آپ نے البرٹ کو مارا اور نور کو چھڑا لیا۔''

''یہ غلط ہے۔''

''مگر البرٹ ایسا کہتا ہے۔ دوسری بار آپ اس کے گھر گئے' آپ نے اس کی بوڑھی ماں کو ڈرا دھمکا کے البرٹ کو بلوایا۔ پھر آپ نے اس سے نور کے بارے میں پوچھا اور اسی نے آپ کو یہ معلومات فراہم کیں کہ وہ کہاں ہے۔ اس وقت آپ کے ساتھ ایک اور شخص بھی تھا جس کے پاس گن تھی۔''

مجبوراً میں نے کہا ''ہاں...... تھا۔''

''کون تھا وہ شخص...... اس کا نام پتا؟''

میں نے کہا ''وہ چیف کہلاتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اب وہ کہاں ملے گا۔ میرے پاس اس کا فون نمبر ہے۔ کیا البرٹ نے میرے خلاف کوئی رپورٹ لکھوائی ہے؟''

''ہاں۔ وہ تمہارے خلاف بھی جاتی ہے۔ کسی نے فون پر البرٹ کو دھمکی دی کہ اپنی ماں کی زبان بند رکھے ورنہ ٹھیک نہیں ہوگا۔ البرٹ نے ماں کو سمجھا دیا کہ کسی سے کوئی بات نہ کرے۔ بڑھیا کو بہت بولنے کی عادت ہے۔ اس نے پانچ سو پونڈز کا ذکر کیا جو تم نے اسے دیے تھے۔ لیکن کل یہ ہوا کہ کسی نے بڑھیا کو قتل کر دیا۔''

میں اچھل پڑا ''اسے قتل کر دیا؟''

''یس۔ شاید اس کی زبان بند رکھنے کے لیے۔ ایسا تم نے یقیناً نہیں کیا۔ البرٹ کہتا ہے کہ تم مدد پر اس کے شکرگزار تھے۔ لیکن وہ دوسرا شخص کوئی جرائم پیشہ تھا۔ وہ کون تھا؟ یہ ہم جاننا چاہتے ہیں۔ اس کی دھمکی والی فون کال کا ہم نے سراغ لگا لیا ہے لیکن وہ اپنا نمبر بدل چکا ہے۔''

اس کے بعد مجھے تفصیل سے بتانا پڑا کہ چیف کون تھا اور میرا اس کا تعلق کب اور کیوں ہوا تھا۔ ظاہر ہے اس بیان میں بھی میں نے ان تمام حقائق کا اعتراف نہیں کیا جن کا تعلق میرے ان جرائم سے تھا جو میں نے مجبوری میں کیے اور مجھ سے کرائے گئے لیکن قانون کہیں بھی جرم کے اس جواز کو تسلیم نہیں کرتا کہ کسی نے لاعلمی یا مجبوری میں جرم کیا۔

درمیان میں سارجنٹ مجھ سے سوالات کرتا رہا اور وہ سب ریکارڈ ہوا۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ بھڑوں کا چھتہ ہے اور یہ تفصیل مجھے بہت سے جرائم کے اعتراف کی طرف دھکیل دے گی جو تفتیش کے نتیجے میں منظرِ عام پر آئیں گے۔

یہ سب چیف سے تعلق کا شاخسانہ تھا۔ اس بوڑھی عورت کو کرنے کی قطعی ضرورت نہیں۔ اسے ایک دھمکی بھی خام رکھتی اور دھمکی نے اثر نہیں کیا تھا تو اس کی زبان ہمیشہ لیے بند کر دینا سراسر بے وقوفی تھی۔ ایک بہت معمولی جر چھپانے کا یہ طریقہ ایسا ہی تھا جیسے کتے سے بچنے کے لیے شیر کے پنجرے میں بند ہو جائے۔

کہتے ہیں نادان کی دوستی جی کا جنجال۔ اور نادا دوست سے دانا دشمن بہتر۔ میرے ساتھ یہی ہوا تھا۔ نے چیف کی باتوں میں آ کے اس کی مدد قبول کر لی تھی اسے ست بدھائی آنے کی دعوت بھی دے ڈالی تھی۔ اب لگتا تھا کہ چیف کا کرمنل ریکارڈ سامنے آئے گا تو میرا ما بھی بے نقاب ہوگا جو وقت کی گرد میں روپوش ہو چکا تھا لندن کی پولیس سے لندن میں کون چھپ کے رہ سکتا تھا چیف کا گرفتار ہونا یقینی تھا...... اور اس کے ساتھ ہی میرا۔

یہ تھا آسمان سے گرنا اور کھجور میں اٹکنا۔ پاکستان میں کچھ میں کر رہا تھا یا جو میرے ساتھ ہو رہا تھا صرف وہیں تک تھا۔ یہاں نہ میری دولت مجھے بچا سکتی تھی نہ میرا اثر و رسو کام آ سکتا تھا۔ بے شک البرٹ نے مجھے قتل کے الزام سے محفوظ رکھا تھا لیکن ایک مجرم کا ساتھی ہونا اپنی جگہ ایک الزا تھا۔ پھر میں نے یہ بھی تسلیم کر لیا تھا کہ نور کو میں نے چھڑایا۔ یعنی جرم کو چھپایا اور قانون کو اپنے ہاتھ میں لیا

پولیس حکام نے میری نقل و حرکت محدود کر دی ''جب تک یہ مبینہ قاتل گرفتار نہیں ہوتا' آپ ہر وقت دستیاب رہیں گے۔ آپ کو عدالت میں مقدمات کی پیروی کے لیے وکی بھی کر لینا چاہیے اور ضمانت پر رہائی کا بندوبست بھی۔''

میں نے ہمت سے کام لے کر کہا ''سارجنٹ۔ البرٹ کی ماں کی موت قتل ثابت ہو چکی ہے؟''

''ابھی نہیں۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آنا باقی ہے۔''

میرا حوصلہ بڑھ گیا ''البرٹ کا الزام غلط بھی ہو سکتا ہے۔ ضروری نہیں کہ اسے چیف نے ہی قتل کیا ہو۔''

''ہم نے ابھی قتل کا کیس رجسٹر نہیں کیا؟''

میں نے کہا ''وہ ہر ایک سے پانچ سو پونڈ کا ذکر کر رہی تھی۔ اس کے لیے وہ بہت بڑی رقم تھی اور جس قماش کے کنگلے اور چھوٹے موٹے جرم کرنے والے' اٹھائی گیرے اور لٹیرے وہاں رہتے ہیں۔ وہ پانچ سو پونڈ سے کم کے لیے بھی کسی کی جان لے سکتے ہیں۔''

''یہ امکان ہمارے پیش نظر ہے۔''

اس وقت مجھے پولیس اسٹیشن پر نہیں روکا گیا لیکن مجھ

سے کہا گیا کہ میں اپنا پاسپورٹ ان کے حوالے کر دوں۔ میرے پاس دونوں ہی پاسپورٹ تھے لیکن میں نے سفر پاکستانی پاسپورٹ پر کیا تھا۔ میرے برطانوی پاسپورٹ کی میعاد ختم ہونے کو تھی ور ایک کام یہ بھی تھا کہ میں اسے ری نیو کراؤں۔ میں نے وہ پاسپورٹ ان کے حوالے کر دیا۔

یکلخت میری پریشانی بہت بڑھ گئی تھی اور مجھے ایسا لگتا تھا کہ میرا برطانیہ آنا مجھے بہت مہنگا پڑے گا۔ شاید مجھ پر ایسے مقدمات کھل جائیں جو بالآخر مجھے جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دیں۔ میں یہی سوچتا ہوا ڈاکٹر شائستہ کے گھر پہنچا۔ راستے میں ان تمام مشکلات کا فوری اور آسان حل مجھے یہی لگا کہ میں سب سے پہلے شائستہ کے گھر سے نکلوں تاکہ میری وجہ سے وہ مشکل میں نہ پڑے۔ پھر جتنی جلدی ممکن ہو ہوائی جہاز میں بیٹھ کے پاکستان بھاگ جاؤں۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ میں ایک مفرور مجرم ہو جاؤں گا اور اپنی برطانوی شہریت سے محروم ہو جاؤں گا تو اس کی ضرورت کسے تھی۔

شائستہ اس وقت گھر پر نہیں تھی۔ میں نے نور کو بھی کچھ نہیں بتایا اور اس کے ساتھ دس منٹ میں وہ گھر چھوڑ دیا۔ فوری طور پر میں نے ایک ہوٹل میں رجسٹریشن کرالی۔ نور بہت ڈری ہوئی تھی اور بار بار کہتی تھی کہ یہ سب میری وجہ سے ہوا۔ میں نے تنگ آ کے اسے سختی سے جھڑک دیا کہ بار بار ایک ہی بات کرنے کا کیا فائدہ۔ جو ہوا اس کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں تھا۔

فون پر بات کرنے کے بجائے میں نے پی آئی اے کے مقامی آفس جا کے کسی سے بات کرنا بہتر سمجھا۔ یہ میری خوش قسمتی ہی کہی جا سکتی ہے کہ منیجر عین میری توقعات کے مطابق رشوت قبول کرتا تھا یعنی عین ہمارے قومی مزاج اور کردار کا نمونہ تھا۔ میں نے اسے صاف بتا دیا کہ میں جلد از جلد لندن سے فرار ہونا چاہتا ہوں۔ اگر پہلی فلائٹ سے مجھے سیٹ مل جائے تو میں اس کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہوں۔ یہاں یا پاکستان میں۔ وہ ایک بالشت کی ڈاڑھی والے مولانا صاحب تھے۔ اس نے کچھ دیر سوچا اور پھر سر ہلایا۔ ”آپ کا سامان کہاں ہے؟“

”ہوٹل میں۔ جہاں میری بیوی بھی ہے۔“

”ابھی تو کوئی نہیں...... مگر کل رات نو بجے فلائٹ ہے۔ میں اس میں آپ کو اکوموڈیٹ کر دیتا ہوں۔ آگے آپ کی قسمت‘ اگر جہاز اڑنے تک پولیس نے آپ کو گرفتار نہیں کیا تو پاکستان کے وقت کے مطابق صبح نو بجے آپ کراچی میں اتریں گے‘ انشاء اللہ۔“

اس نے مجھے ٹکٹ وہیں منگوا دیا۔ وہ میرے حوالوں سے کافی متاثر ہوا تھا اور میری مدد کرنے کے ساتھ اپنا بھلا بھی چاہتا تھا۔ ”جو آپ نے میرے لیے کیا......“

”میں نے کچھ نہیں کیا۔“ وہ ایسے بولا جیسے میں نے اس پر کوئی الزام عائد کر دیا ہو ”الحمدللہ جگہ تھی“ اس نے دو ٹکٹ لیے اور ہمیں تھما دیے۔

میں نے کہا ”او کے...... اب یہ بتایئے میں آپ کی کیا خدمت کروں۔“

”کچھ نہیں۔ میری فیملی یہاں نہیں ہے۔ میں آپ کو ان کا ایڈریس دے دیتا ہوں۔ اگر کوئی مسئلہ ہوگا تو وہ بتا دیں گے۔“ اس چالاک شخص نے بڑی عیاری سے کہا۔

میں نے کہا ”مسئلے کا علم آپ کو بھی ہوگا۔“

وہ کچھ سوچ کے بولا ”میرے بیٹے کا مسئلہ ہے۔ لاہور کے ایک کالج میں اس کے داخلے کا مسئلہ بنا ہوا ہے۔ کالج والے ڈونیشن مانگتے ہیں۔ آپ ماشاء اللہ صاحب استطاعت ہیں‘ ماشاء اللہ۔“

اس کے لیے اب صرف انا للہ پڑھنا باقی رہ گیا تھا۔ میں اس ظاہری حلیے سے پارسائی کے دعوے دار شخص کی ذہنیت پر افسوس کرتا ہوا نکلا جو یہاں وطن کو بھی بدنام کر رہا تھا۔ ملک کو بھی اور ہر جملے میں اللہ کا نام بھی لے رہا تھا۔ ابھی درمیان میں چوبیس گھنٹے سے زیادہ کا وقفہ تھا۔ اس دوران کیا ہوگا‘ یہ میرے لیے اصل تشویش کی بات تھی۔

میں ہوٹل پہنچا تو نور کسی سے فون پر بات کر رہی تھی۔ مجھے دیکھا تو اس نے کہا ”آپ انہی سے بات کر لیں۔“ اور میری طرف ریسیور بڑھا کے بولی ”شائستہ۔“

میں نے لہجے کو پرسکون رکھا ”ہیلو۔“

”رفیق صاحب! بڑے افسوس کی بات ہے۔ آپ ایسے بھاگ گئے سامان اٹھا کے‘ مجھے بتائے بغیر۔“ وہ سخت خفا تھی۔

”ڈاکٹر شائستہ! یہ واقعی انتہائی غیر اخلاقی حرکت تھی لیکن میرے پاس اس کے سوا چارہ نہ تھا۔“

”کیا چارہ نہ تھا۔ ایسی کون سی آفت نازل ہو رہی تھی۔“

”یہی خطرہ تھا...... اور میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ میری وجہ سے تم بھی کسی مشکل میں پڑو۔ تفصیل میں فون پر نہیں بتا سکتا لیکن تمہاری جو دل آزاری ہوئی اس کی معافی ضرور مانگ سکتا ہوں۔“

”تمہارے لیے ایک فون کال تھی۔“

”دیکھو شائستہ! اگر تم میری کچھ مدد کر سکتی ہو تو یہ کہ کسی کو میرے بارے میں نہ بتاؤ۔ صاف کہہ دو کہ مجھے نہیں معلوم وہ کہاں گئے؟“

”حد کرتے ہو تم بھی۔ میں ائرپورٹ جا رہی ہوں فریال کو لینے۔ اس سے کیسے کہتی کہ تم نے اور نور نے کیا عجیب بات کی ہے۔“

”فریال یہاں آ رہی ہے‘ کس لیے؟“

”اس نے مجھے بھی نہیں بتایا۔ اس کا کوئی شوٹنگ شیڈول ملتا ہے لیکن مجھے شک ہے کہ اسے سب معلوم ہو گیا ہے۔“

”کیسے معلوم ہو گیا ہے؟“

”یہ اسی سے پوچھنا۔ یار‘ دنیا بہت چھوٹی ہو گئی ہے۔ سات گھنٹے میں جہاز دوبئی سے لندن پہنچتا ہے۔ خبر چار سیکنڈ میں پہنچتی ہے۔ ابھی میں تم سے باتیں کرتی رہی تو لیٹ ہو جاؤں گی۔ تم شرافت سے واپس آ جاؤ۔“

”شائستہ! میں نہیں آ سکتا۔ اگر وہ اصرار کرے تو اسے ہوٹل لے آنا ورنہ تم بھی بتا سکتی ہو کہ......“

”تم اس سے ملنا نہیں چاہتے...... نور سے ڈرتے ہو؟“

”دونوں باتیں ہو سکتی ہیں۔“ میں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

میں یہ طے کرنے سے قاصر تھا کہ یوں فرار ہو کے میں اچھا کر رہا ہوں یا اپنے پیروں پر ایک اور کلہاڑی مار رہا ہوں۔ میرے لیے یہ جوا تھا۔ ہارنے کی صورت میں میرے مصائب کی نوعیت وہی رہتی تھی۔ جیت میرے تحفظ کی ضامن تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس طرح نکل جانے کے بعد میں دوبارہ برطانیہ نہیں آ پاؤں گا۔ لیکن اس بات کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے کہ مجھے پاکستان سے گرفتار کر کے لایا جائے۔ میرے یقین کے مطابق دونوں ممالک کے درمیان تحویل مجرمان کا معاہدہ تھا لیکن میرے خلاف کسی عدالت میں ابھی تک کوئی مقدمہ زیر سماعت نہیں تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ابھی تک مقدمہ درج بھی نہیں ہوا تھا۔ پھر میرے خلاف جرائم کی نوعیت اتنی سنگین نہیں تھی کہ اس میں انٹرپول ملوث ہوتی۔ ایک بار نکل جانے کے بعد میں محفوظ تھا۔

اچانک میں نے فیصلہ کر لیا کہ اپنے فرار کی کوشش کو کامیاب بنانے کے لیے ہر قدم اٹھانا میری مجبوری بن گیا ہے۔ میں یہاں عدالتوں میں مقدمات بھگتنا اور پھر جیل جانا افورڈ ہی نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے چوبیس گھنٹے روپوش رہنے کے لیے کیا کرنا ہوگا؟ یہ سوال بہت اہم تھا۔ لندن پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونکنا اتنا آسان نہ تھا۔ یہ میں جانتا تھا۔

میری دعا اس وقت یہی تھی کہ کاش پولیس کو اگلے دن میری ضرورت نہ پڑے۔ وہ میرے برٹش پاسپورٹ کو ضبط کر کے مطمئن بیٹھے رہیں کہ میں کہیں جا ہی نہیں سکتا۔ ایک چوک ان سے بھی ہو گئی تھی۔ انہوں نے پاسپورٹ پر میرے نام اور دیگر کوائف تصویر کے ساتھ ملا کے دیکھ لیے تھے لیکن یہ نہیں دیکھا تھا کہ اس پر برطانیہ میں داخلے کا ویزا نہیں ہے۔

نور میری پریشانی کو دیکھ کے زیادہ پریشان تھی۔ ساتھ آنے کا سارا خمیازہ اس کے ساتھ میں نے بھی بھگتا تھا۔ وہ اکیلی آ جاتی تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ یہ احساس الگ اس کے لیے باعث پشیمانی تھا۔ جب میں نے اس سے کہا کہ ہم یہاں بھی نہیں رہ سکتے تو اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔

ہمارے چند گھنٹے بعد چیک آؤٹ کرنے پر انتظامیہ کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ انہیں پورا کرایہ مل گیا تھا۔ رات گمنامی سے گزارنے کی اب ایک ہی صورت تھی کہ ہم اس علاقے کے کسی پاکستانی یا انڈین ہوٹل میں چلے جائیں جہاں ایشیائی باشندے اکثریت میں ہیں اور انہوں نے لندن میں اپنی دنیا الگ بسا رکھی ہے۔ وہاں کے ماحول سے یہی لگتا ہے کہ آپ دہلی یا کراچی میں ہیں۔ ان کے کچھ اڈے بدنام تھے جہاں لوگ عیاشی کے لیے رات گزارنے آتے تھے۔ وہ پاسپورٹ بھی طلب نہیں کرتے تھے اور شناخت پر بھی اصرار نہیں کرتے تھے۔ لندن میں چار سال گزار کے میں نے یہاں کی انڈر گراؤنڈ دنیا بھی دیکھی تھی لیکن وہ پرانی بات تھی۔

ہوٹل کے باہر تین ٹیکسی ڈرائیور مسافروں کے انتظار میں تھے لیکن ان میں سے ایک نیگرو تھا اور دو گورے۔ ان میں سے بھی ایک خاتون تھی۔ پھر ہوٹل کے عین دروازے پر ایک سردار جی نے ٹیکسی روکی۔ میں نے اسی کا انتخاب کر لیا۔ وہ نسبتاً جوان اور خوش مزاج بھی تھا۔

ٹیکسی میں بیٹھ جانے کے بعد میں نے اس سے پنجابی میں بات کی ”اپنے سردار جی‘ کب سے گاڑی چلا رہے ہو ادھر؟“

وہ خوش ہو کے بولا ”چار سال ہو گئے جی۔ خیر سے آپ کدھر سے آئے ہو‘ اپنے لہور سے؟“

میں نے کہا ”بالکل ٹھیک پہچانا تم نے۔ تم بھی لہور کے ہو؟“

”اب کدھر جی۔“ اس نے ٹھنڈی سانس لی ”اپنے پیو دادا ادھر سے آئے تھے۔ میں ایک بار گیا تھا پنجہ صاحب کے بہانے لہور۔ کہتے ہیں نا جیس نے لہور نئیں ویکھیا او جمیا ہی نئیں۔“

میں نے کہا "سردار جی' ہمیں ادھر لے چلو جدھر اپنے بندے ہیں سب اور ہوٹل بھی کوئی ایسا ہو' آپ میرا مطلب سمجھ گئے نا؟"

اس نے سر گھما کے مجھے آنکھ ماری اور ہنسا "آپ پروا ہی نہ کرو جناب! اپنے بھائی کا ہوٹل ہے۔ ادھر مزے سے رہو۔"

میں نے کہا "کوئی سوال جواب تو نہیں کرے گا؟"

"لو جی' آپ بھی کمال کرتے ہو۔ آپ بے شک اپنا نام سردار جسونت سنگھ لکھا دو۔ ویسے تو یہ میرا نام ہے۔" وہ قہقہہ مار کے ہنسا "ادھر اپنے بھائی بندوں نے نقشہ ہی بدل لیا ہے۔ بال کٹا دیے ہیں اور نہ پگ ہے نہ ڈاڑھی۔ جگہ بھی صاف ستھری اور کرایہ بھی کم۔"

ٹیکسی ڈرائیور عموماً ہوٹلوں کے ایجنٹ کا کام بھی کرتے ہیں اور مسافروں کو گھیر لاتے ہیں۔ مری جانے والوں کو اس کا خوب تجربہ ہوتا ہے۔ کوئی ٹیکسی ڈرائیور کے "مخلصانہ" مشورے کو مان لے تو ہزار کا کمرا اسے پندرہ سو میں پڑنا لازمی ہے۔ اضافی پانچ میں سے دو ڈھائی سو ٹیکسی والے کو مل جاتے ہیں۔ آپ براہ راست بات کریں تو شاید ہزار کا سودا ساڑھے سات سو میں ہو جائے۔ تاہم اس وقت میرا مسئلہ کچھ اور تھا۔

سکھ ڈرائیور ہمیں جس ہوٹل میں لے گیا یقیناً اس کا کمیشن پہلے سے طے ہو گا لیکن یہ فائدہ ضرور ہوا کہ سکھ ڈرائیور کے کسی خفیہ اشارے پر خرانٹ مالک نے رجسٹر میں اندراج کرتے وقت شناخت کا مسئلہ کھڑا نہیں کیا اور میں نے "مسٹر اور مسز چوہدری معراج دین" نام لکھوایا تو اس نے لکھ لیا۔ معیار کے اعتبار سے ہوٹل گوارا تھا لیکن اس نے ڈبل روم کا ڈبل کرایہ وصول کیا جو کسی فور اسٹار ہوٹل کے برابر تھا۔ ایسے ہوٹل بعض اوقات غیر محفوظ بھی ہوتے ہیں۔ وہاں رہنے والے لٹ جاتے ہیں مگر اس پوزیشن میں نہیں ہوتے کہ پولیس کے پاس شکایت لے کر بھی جائیں۔

اپنے تیوروں سے اور لہجے سے میں نے کچھ ایسا تاثر دیا تھا جیسے میں لاہور کا کوئی جانا مانا بدمعاش ہوں مگر یا لیے میری سن بھی کہاں رہا تھا۔ اس کی نظر تو نور پر جم کے رہ گئی تھی۔ یہ ایک خطرناک بات تھی۔ نور کو ایک نظر دیکھنے والا اس کے بے مثال حسن سے ایسا مسحور ہوتا تھا کہ بعد میں بھی اسے بھول نہیں سکتا تھا۔ شاید ہمیشہ یاد رکھتا تھا کہ کیا حسین چہرہ تھا اور کوئی میرے بارے میں پوچھے کہ اس کے ساتھ ایک بہت خوبصورت عورت تھی تو یہ حوالہ کافی تھا۔

کمرے میں اپنا سامان رکھنے کے بعد میں۔ اے کے لوکل نیجر مولانا سے بات کی اور انہیں صا کہ میں کس نام سے کہاں مقیم ہوں۔

"میں کل شام تک روپوش رہنا چاہتا تھا۔ یہاں آ گیا۔ اب آپ ایک مہربانی کریں' اگر کل کوئی میرے بارے میں پوچھنے آئے تو آپ مجھے ا کے روم نمبر ایک سو گیارہ میں بتا دیں۔"

"میرے لیے کوئی مصیبت تو نہیں کھڑ خدانخواستہ۔"

"میں نے یہ نہیں کہا کہ آپ جھوٹ بولیں۔ ب مجھے مطلع کر دیں تا کہ میں ادھر کا رخ بھی نہ کروں۔"

"یہ میں کر سکتا ہوں' انشاء اللہ۔ لیکن نواب ہ ایک عرض میں نے بھی کی تھی۔"

"اس کی آپ قطعی فکر نہ کریں سمجھیں آ ہو گیا۔"

اس کے بعد میں نے اپنے اور نور کے موبائل فو کر دیے۔ اب اگلے چوبیس گھنٹوں تک میں لندن سے بھی رابطہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں بالکل گم رہنا چا اس کے بعد جو ہو سو ہو۔ ابھی تک صرف دو ہی افراد خفیہ ٹھکانے سے واقف تھے۔ سکھ ڈرائیور کو اس سے کوئ نہیں تھی کہ میں کون ہوں اور جو میرے ساتھ ہے وہ مے لگتی ہے۔ وہ اپنا کمیشن لے کر چلتا بنا ہو گا۔ دوسرے کرم فرما پی آئی اے کے مولانا صاحب تھے۔ انہوں راز داری کا معاوضہ بتا دیا تھا جو میرے لیے بہت زیاد تھا۔ مجھ سے پہلے وہ نہ جانے کس کس کے سامنے اپنے مسئلہ رکھ چکے ہوں گے لیکن مسئلہ ابھی تک حل نہیں ہوا مجھے قوی امید تھی کہ اپنے مفاد میں وہ میرے راز کو راز گے۔

مجھے معلوم تھا کہ فریال کو ریسیو کرنے کے بعد روپوشی سے فریال اور ڈاکٹر شائستہ کتنی پریشان ہوں گی کتنی ناراض لیکن میں نے جو خطرناک بازی لگائی تھی اس بار میری تباہی کے مترادف تھی۔ اگر میں کسی وجہ سے پاک فرار نہ ہو پاتا تو پولیس کے سامنے ایک جھوٹ کو چھپانے لیے دس جھوٹ بول سکتا تھا۔ لیکن سال چھ مہینے بھی یہاں جیل میں گزارنے کا تصور ہی میری نیند اڑانے کے لیے تھا۔ میں نے ایسے بہت سے چھوٹے چھوٹے اور بظاہر ضرر جرائم کیے تھے جو پاکستان میں جرم شمار ہی نہیں ہوتے وہاں کا نظام تو ایسا تھا کہ قتل کر کے بھی اثر رسوخ رکھنے ا

صاحب ثروت صاف بچ جاتا تھا۔ بے گناہی کے گواہ اوپن مارکیٹ میں دستیاب تھے اور خود پولیس کے اسٹاک میں دستیاب ہوتے تھے۔ باقی معاملات پولیس' وکیل اور منصف کے ایجنٹ ختم کرا سکتے تھے بلکہ یہ بھی ناممکن نہ تھا کہ پھانسی کے پھندے کے لیے کوئی گردن فراہم کر دی جائے۔

یہاں کا نظام اس کے برعکس تھا۔ چرچل کے بارے میں یہ بات اکثر کہی جاتی ہے کہ دوسری جنگ عظیم کی تباہی کے بعد کسی نے اس سے سوال کیا کہ کیا برطانیہ تباہ ہونے سے بچ جائے گا؟ اس نے جواب میں پوچھا کہ کیا ہماری عدالتوں میں انصاف ہو رہا ہے اور اثبات میں جواب ملنے پر اس نے کہا کہ پھر برطانیہ کو کوئی خطرہ نہیں۔ پولیس آج بھی اس مقولے پر عمل کرتی ہے کہ جب قانون لچک دکھاتا ہے تو ٹوٹ جاتا ہے۔

"When the Law bonds...it breaks"

اور میری ساری پریشانی اسی لیے تھی کہ ایک بار بھی گرفت میں آ گیا تو پھر یا مجھے اپنی بے گناہی ثابت کرنی ہو گی ورنہ سزا کاٹنی ہو گی۔ کیا ہو گا...... کیا نہیں ہو گا' انہی تفکرات نے رات بھر مجھے سونے نہ دیا۔ خود نور کا اضطراب کم نہ تھا۔ ہم دونوں کے دل ایک ہی خواہش سے مغلوب تھے کہ جیسے بھی ہو بخیر و عافیت واپس اپنے گھر پاکستان پہنچ جائیں۔

صبح میں نے غسل کیا اور ناشتے سے فراغت کے بعد باہر جانے کا ارادہ کیا تو نور اڑ گئی "تم مجھے اکیلا چھوڑ کے نہیں جا سکتے۔"

میں نے بگڑ کے کہا "تم کو ڈر ہے کہ میں تمہیں بھی چھوڑ کے بھاگ جاؤں گا۔"

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "رفیق' میں ایک کمزور عورت ہوں جس کا یہاں کوئی نہیں۔ خدانخواستہ تمہیں کچھ ہو گیا......"

میں نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا کے اسے پیار کیا "آئی ایم سوری۔ میں کہیں دور نہیں جا رہا ہوں۔ نیچے سے اخبارات خرید کے لاؤں گا۔ کوئی ایسی ویسی خبر ہو تو دیکھ لوں۔"

"میں بھی چلوں گی تمہارے ساتھ۔"

"نور۔ تمہارا یہ حسن ایک جادو ہے۔ اندھیری رات میں روشن نیون سائن کی طرح نظر آتا ہے اور دل پر اثر کرتا ہے۔ جو ایک بار دیکھ لے بھول نہیں سکتا۔"

وہ اس تعریف سے خوش نہیں ہوئی "میں برقع پہن لوں؟"

"برقع کہاں سے لاؤں میں؟"

"چلو' چادر اوڑھ کے منہ چھپا لیتی ہوں۔ اکیلی میں ہرگز نہیں رہوں گی۔" وہ اپنی بات پر اڑ گئی۔

میں اسے ساتھ لے جانے پر مجبور ہو گیا۔ ہوٹل کے آس پاس کا سارا علاقہ کسی پاکستانی بازار کا منظر پیش کر رہا تھا۔ انڈین پاکستانی سب اردو ہندی پنجابی بولتے نظر آتے تھے۔ دیسی کھانوں کے ریسٹورنٹ بھرے ہوئے تھے اور ان کے سائن بورڈز پر قورمے' بریانی کے اشتہار تھے۔ پان کی دکانیں روایتی انداز میں آباد تھیں۔ شلوار قمیص اور ساڑیوں والی خواتین ہر طرف شاپنگ میں مصروف تھیں۔

اخبارات مجھے ایک ہی نیوز شاپ سے مل گئے۔ وہیں ایک دکان پر مجھے دوپٹے' عبائے اور برقعے نظر آئے۔ نور نے مجھے کہنی مار کے متوجہ کیا تو میں دکان کے اندر داخل ہو گیا۔ ایک سیلز مین اسے برقعے دکھانے لگا۔ اسی دوران کاؤنٹر جیسی جگہ پر بیٹھا ہوا ایک شخص اٹھ کر میرے قریب آیا۔

"تم...... رفیق ہو نا...... رفیق احمد!"

میں چونک پڑا "ہاں...... مگر تم کون ہو؟"

اس نے مسکرا کے کہا "ذرا پہچاننے کی کوشش کرو۔"

میں نے اپنی ناکامی کا اعتراف کرنا بہتر سمجھا "مجھے تو یاد نہیں۔"

"میں اور تم چیف کے لیے کام کرتے تھے۔ میں یونس ہوں۔"

مجھے پھر بھی یاد نہ آیا لیکن اس کے انکشاف سے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا "یہ تو بہت پرانی بات ہے۔"

"ہاں' میں بھاگ گیا تھا۔ بعد میں سنا تم پاکستان چلے گئے۔ تمہاری کوئی لاٹری نکل آئی تھی۔"

میں نے سر ہلایا "کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ چیف اب کہاں ہے؟"

"اسی علاقے میں دو چار بار نظر آیا تھا۔ حال ہی میں۔ اس کا حال خراب ہے۔ سارے ساتھی مارے گئے یا بھاگ گئے۔"

پتا نہیں وہ کیا کچھ کہتا رہا۔ نور نے برقع پسند کر کے پہن لیا تھا۔ میں ایک دم دکان سے نکل گیا۔ یونس مجھے روکتا ہی رہ گیا کہ چائے تو پیتے جاؤ۔ لیکن مجھ پر اس خبر سے وحشت سوار ہو گئی تھی کہ چیف اسی علاقے میں موجود ہے۔ میں اس کا سامنا بالکل نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میں واپس ہوٹل میں داخل ہو رہا تھا کہ مجھے رات والے سردار جی نظر آ گئے۔ وہ بڑے جوش میں میری طرف لپکا ''او جناب عالی! دیکھا آپ کو کیسی جگہ لایا میں۔ کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی نا۔ پہچانا نہیں آپ نے' میں سردار جسونت سنگھ!''

میں نے نور کا ہاتھ تھاما اور ٹیکسی میں بیٹھ گیا ''آپ خوب ملے۔ مجھے کسی بھروسے کے آدمی کی تلاش تھی۔ مجھے ایک کام تھا۔''

وہ فوراً ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا ''آپ حکم کرو سر جی!''

میں نے کہا ''ذرا پکاڈلی سرکس چلو۔''

''کبوتروں کو دانہ ڈالنا ہے۔'' وہ ہنسا ''سنا ہے جی ادھر دنیا بھر کے کبوتر آتے ہیں' سیاح کبوتر۔ بھابی جی نے برقع کرلیا۔''

وہ حد درجہ باتونی آدمی تھا لیکن دل کا کھرا تھا اور بھروسے کے قابل لگتا تھا۔ راستے میں ایک جگہ میں نے ٹیکسی رکوا کے پبلک کال آفس سے فریال کو فون کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس وقت شائستہ کلینک میں اپنے مریضوں کے درمیان مصروف ہوگی۔

''رفیق۔ یہ تم کیا کر رہے ہو۔ میں تم سے ملنے آئی تھی۔ میں نے دوبئی میں لندن کے اخبارات دیکھ لیے تھے۔''

''دیکھو۔ میری بات دھیان سے سنو۔ مجھے تمہاری مدد چاہیے۔ یہ سمجھو پہلے میں نے تمہاری مدد کی تھی' تمہیں اس کا بدلہ چکانا ہے۔''

''فضول باتیں مت کرو۔ میں آئی کس لیے تھی۔ لیکن پہلے یہ تو بتاؤ کہ تم ہو کہاں؟''

''یہ میں نہیں بتا سکتا۔ میں روپوش ہوں اور فرار ہونے کے سوا میرے پاس کوئی راستہ نہیں۔''

''مجھے شائستہ نے سب بتایا۔''

''لیکن تم اسے کچھ نہیں بتاؤ گی۔ سنو' میں لندن آیا تھا وحید کو اپنے ساتھ پاکستان لے جانے کے لیے اور اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو جاتا اگر یہ چکر نہ پڑ جاتے۔''

''تم بتاؤ' مجھے کیا کرنا ہے؟ میرے پاس دو دن ہیں۔''

میں نے کہا ''تم شائستہ سے کہنا کہ وحید کو پاکستان بھجوا دے، جلد از جلد...... اور جیسے بھی ہو۔''

''مگر وحید ہے کہاں، کیا شائستہ کو پتا ہے؟''

میں نے اسے آرٹ گیلری کا ایڈریس سمجھایا۔ ''یہاں جاؤ گی تو اس کا یہودی مالک تمہیں وحید کے بارے میں پوری انفارمیشن دے گا۔ وہ پاکستان آنے کے لیے تیار ہے لیکن اس قرض خواہوں نے پکڑ رکھا ہے۔ میں نے اس کا قرض ادا کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ یہ رقم میں شائستہ کو بھجوا دوں گا۔''

''رقم کی بات نہیں، میں دے دوں گی لیکن مجھے پتا تھا کہ وہ نور کے اغوا میں ملوث تھا۔''

''میرا خیال ہے ایسا نہیں ہو سکتا۔ کسی نے دھوکے سے اس کو استعمال کیا ہوگا۔ وہ آرٹسٹ آدمی ہے۔''

''اچھا میں کوشش کروں گی...... بلکہ میں یہ کروں گی' اسے دوبئی بلا لوں گی، وہاں سے پاکستان روانہ کر دوں گی۔''

''میرے حق میں دعا کرنا، اب میں پاکستان سے فون کروں گا۔'' میں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

ہم نے وہ سارا دن سردار جی کی ٹیکسی میں ادھر ادھر گھومتے پھرتے گزارا۔ میرے لیے دن کا ایک ایک منٹ گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔ ہر لحظہ مجھے دھڑکا لگا ہوا تھا کہ جب میں ہوٹل پہنچوں گا تو پی آئی اے کے لوکل منیجر مولانا صاحب کا پیغام پہلے سے موجود ہوگا کہ پولیس آپ کو پوچھتی ہوئی آئی تھی، آپ ادھر نہ آئیں، فلائٹ پکڑنے سے پہلے ہی پولیس آپ کو پکڑ لے گی۔

لیکن شام کو واپس پہنچنے کے بعد ہوٹل کے مالک نے کہا کہ آج سارا دن میں میرے لیے کوئی پیغام یا فون موصول نہیں ہوا۔ اس سے مجھے کچھ تسلی ہوئی لیکن ایک خلش باقی رہی کہ کہیں مولانا بھول نہ گئے ہوں یا انہیں موقع ہی نہ ملا ہو، میں جاؤں اور گرفتار ہو جاؤں...... نور مجھ سے زیادہ نروس تھی۔ رات کا اندھیرا نمودار ہوتے ہی ہم ہوٹل سے نکل گئے۔ سردار جی کی ٹیکسی نے ہمیں ائرپورٹ پہنچا دیا۔ وہ مجھ سے گلے مل کے رخصت ہو گیا۔

اب اصل آزمائش کا آخری مرحلہ شروع ہوا...... کسی پاکستانی کے لیے واپس پاکستان جانا کوئی مرحلہ نہیں ہوتا لیکن میرے لیے یہی اصل مرحلہ تھا۔ ایگزٹ ویزا لگوانے سے پہلے میں نے بہتر سمجھا کہ مولانا صاحب سے تصدیق کر لوں خطرہ ہو تو یہیں سے واپس لوٹ جاؤں۔

اسٹیشن منیجر کے آفس میں مولانا صاحب کی جگہ ایک اور اول جلول قسم کا شخص بیٹھا تھا۔ اس نے میرے سوال پر خفگی سے کہا۔ ''کون مولانا...... میں ہی لوکل منیجر ہوں۔''

ایک لمحے کے لیے میرا دماغ چکرا گیا۔ کیا میرے ساتھ دھوکا ہو گیا تھا لیکن ٹکٹ میرے پاس تھا۔ اچانک میری نظر شیشے کے کیبن سے باہر گئی۔ مولانا صاحب دو پولیس والوں کے ساتھ ادھر ہی آ رہے تھے۔

میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا۔

بظاہر تو میرے ساتھ دھوکا ہوا تھا۔ دھوکا مجھے قسمت نے بھی دیا تھا اور اس دھوکے باز نے بھی جس کی ظاہری وضع قطع میں بڑی پارسائی تھی اور جو میرے سامنے اسٹیشن منیجر کے روپ میں آیا تھا جبکہ حقیقت میں وہ کچھ اور تھا......

میرے لیے فرار کے تمام راستے مسدود ہو چکے تھے، صوفی دو قانون کے محافظوں کو ساتھ لیے آگے بڑھتا آ رہا تھا اور ان کے جارحانہ تیور واضح طور پر ان کے عزائم کی عکاسی کر رہے تھے۔ صرف اسٹیشن منیجر کی کرسی پر بیٹھا ہوا شخص بڑے عجیب انداز میں میری حالت پر خندہ زن تھا۔

فیصلے کے لیے بہت کم وقت تھا...... ''اب میں پاکستان نہیں جا سکتا نور...... اس کے سوا چارہ نہیں کہ میں اب اپنے خلاف الزامات کا سامنا کروں، لیکن تم نکل جاؤ۔''

''میں اکیلے نہیں جاؤں گی، میں نے کہہ دیا۔''

''بے وقوفی کی ضدمت کرو...... جاؤ۔'' میں نے برہمی سے کہا۔

کرسی پر بیٹھا ہوا شخص بے سری آواز میں گانے لگا۔

''اکیلے نہ جانا...... ہمیں چھوڑ کے تم۔''

مجھے اس کی حرکت عجیب سی لگی۔ پولیس والے اب بہت قریب آ چکے تھے، میں نے ایک آخری کوشش کی۔ ''نور، پلیز جاؤ، تمہیں میری قسم ہے نور...... باہر رہ کر تم میری زیادہ مدد کر سکو گی۔ میں اپنے معاملات سے نمٹ کے آ جاؤں گا۔''

میں نے اسے باہر دھکیل دیا۔

''اچھا...... اچھا...... میں جاتی ہوں۔'' وہ جیسے قسم سے مجبور ہو گئی۔

میں دوسری طرف سے نکلنا چاہتا تھا کہ پولیس نے مجھے دونوں طرف سے گرفت میں لے لیا، میں نے کوئی مزاحمت نہیں کی۔ میرے لیے اطمینان کی بات یہ تھی کہ نور کسی مشکل میں نہیں پڑی۔ وہ خاموشی سے آنسو بہاتی ڈیپارچر لاؤنج کی طرف جا رہی تھی تمام اسباب جو ایک ٹرالی پر لوڈ کیا گیا تھا اس کے ساتھ تھا اور ٹرالی کو ایک لوڈر دھکیل کر لے جا رہا تھا۔

اچانک صوفی صاحب نے کہا۔ ''آپ نے غلط آدمی کو پکڑ رکھا ہے سر۔''

پولیس کیپٹن کی صورت پر الجھن کے آثار نمودار ہوئے۔ ''کیا مطلب؟''

''جس شخص نے مجھے پریشان کر رکھا ہے...... یہ بدمعاش ہے...... پتا نہیں یہ کسی پاگل خانے سے نکل آیا ہے۔ آ کے میری کرسی پر جم گیا ہے اور اٹھنے کا نام نہیں لیتا، کہتا ہے میں اسٹیشن منیجر ہوں۔''

دونوں پولیس والوں نے مجھے چھوڑ دیا اور اس شخص کی طرف بڑھے جو مجھے بھی دیوانہ ہی لگا تھا، وہ شور کرنے لگا۔ ''میں بتا رہا ہوں، اس کا نتیجہ بہت برا ہوگا، میں ہی اسٹیشن منیجر ہوں، یہ ڈاڑھی والا بکواس کرتا ہے۔''

پولیس نے اس کی ایک نہیں سنی اور اسے دھکے دیتے ہوئے لے گئے۔ صوفی صاحب اپنی کرسی پر دوبارہ براجمان ہو گئے۔ ''لاحول ولاقوۃ......'' انہوں نے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کے کہا۔ ''کہاں کہاں سے بلاوجہ مصیبت نازل ہو جاتی ہے۔ خیر...... آپ فرمایے۔''

میں نے سکون کی سانس لی۔ ''میں خود حیران تھا کہ یہ کون آ گیا آپ کی جگہ راتوں رات...... اس کی تو حرکات ہی عجیب تھیں۔''

وہ بولے۔ ''غنیمت ہے کہ خطرناک پاگل نہیں تھا۔''

لیکن اس سے پہلے کہ میں کوئی سوال کرتا ان کے فون پر کوئی کال آ گئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو نور لوگوں کے ہجوم میں گم ہو چکی تھی۔ اس وقت مجھے اچانک خیال آیا کہ میرا تو سب کچھ نور لے گئی...... سوائے اپنے پاسپورٹ کے اور والٹ میں موجود رقم کے میرے پاس کچھ بھی نہیں رہا تھا۔

میں اس کے پیچھے لپکا تا کہ ٹرالی پر سے اپنا سوٹ کیس اتروا لوں لیکن ہیتھرو جیسے انٹرنیشنل ایئرپورٹ کے اژدحام میں نور کو تلاش کرنا عملاً ایسا ہی تھا جیسے بھوسے کے ڈھیر میں سوئی کو تلاش کرنا...... اگر وہ کوئی پہلی بار آنے والی...... ناتجربہ کار مسافر ہوتی تو راستہ پوچھنے اور راہنمائی حاصل کرنے میں اسے کچھ وقت لگتا لیکن وہ پہلے بھی لندن آتی رہی تھی...... وہ سیدھی چلتی گئی اور بڑے بڑے شیشوں والے ممنوعہ علاقے میں داخل ہو گئی جہاں میں اپنا ٹکٹ اور پاسپورٹ دکھا کے ایگزٹ ویزا سے جا سکتا تھا۔ اس سے آگے بورڈنگ کارڈ لے کر جہاز پر سوار ہونے والے جاتے تھے...... اندر سیکڑوں کاؤنٹر تھے اور ہزاروں مسافر، میری نظر اسے کہاں دیکھتی۔

میں سخت مایوس ہوا کیونکہ میرا تو ٹکٹ بھی اسی کے پاس تھا، پھر میں نے سوچا کہ شاید ابھی وقت ہو اور میں بھی نور کے ساتھ جا سکوں لیکن چند منٹ کی تاخیر نے میرے لیے فلائٹ کے دروازے بند کر دیے تھے...... بین الاقوامی فلائٹس پر مسافروں کو دو گھنٹے پہلے رپورٹ کرنا لازمی ہے اور یہ پاکستان نہیں تھا کہ سوا دو یا ڈھائی گھنٹے بعد بھی مسافر منت سماجت کر کے یا کچھ دے دلا کے نکل جائے...... خود کار دروازے سیکنڈ کی سوئی کے حساب سے کھلتے اور بند ہوتے تھے، خود نور چند منٹ پہلے ہی نکلی ہوگی۔

اب میں متضاد کیفیات اور جذبات کا شکار تھا، ایک ملال سا تھا کہ بلاوجہ ایک غلط فہمی کے باعث وقت ضائع ہوا، میں بھی نور کے ساتھ ہی نکل جاتا تو اچھا تھا۔ دوسری طرف یہ اندیشہ تھا کہ بورڈنگ کارڈ ملنے سے پہلے مجھے روک لیا جاتا تب بھی یہی ہوتا۔ میرے لیے فرار ہونے کی کوشش میں پکڑے جانے کا رسک تھا۔ میں گرفتار ہو جاتا تو نور کتنی پریشان ہوتی۔ اب مجھے یہ اطمینان تو ہے کہ میں کسی سنگین جرم کا مرتکب نہیں ہوا۔ میرے خلاف دیگر الزامات اتنے سنگین نوعیت کے نہیں...... وکیل مجھے بچالیں گے ورنہ میں بچنے کی کوئی صورت نکال لوں گا۔ یہاں اس کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا اس سے نور بہت ڈر گئی تھی اور جب میں نے اپنی قسم دی تو اس نے نکل جانا ہی بہتر سمجھا۔

میں ست قدموں سے واپس ہوا، نور کے چلے جانے سے دل پر خوامخواہ اداسی کا غلبہ تھا۔ یہ خیال بھی تھا کہ قدرت کے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے تو میرے نہ جانے میں بھی بہتری ہوگی...... کم سے کم یہ تو ہوا کہ مجھ پر مفرور مجرم کا لیبل نہیں لگا اور میری برطانوی شہریت ختم نہیں ہوئی، مجھے حوصلہ نہیں ہارنا چاہیے اور امید رکھنی چاہیے کہ میں اپنی بے گناہی ثابت کرسکوں گا اور سزا ہوگی تو بہت معمولی جرمانہ ہوگا، سزا معطل رکھی جائے گی کیونکہ میرا سابقہ ریکارڈ کوئی نہیں، میں دو ملکوں کا معزز شہری شمار ہوتا ہوں اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں...... ایسے تمام حوالے یہاں بالکل ہی نظر انداز نہیں کیے جاتے۔ باہر آتے آتے میں خاصا مطمئن تھا کہ جو ہوا اچھا ہی ہوا...... ورنہ میں جس فیصلے پر عمل کرنے والا تھا وہ میرے حق میں انتہائی نقصان دہ ثابت ہوتا...... میں نے جرم کی نیت سے کوئی جرم نہیں کیا، جو کیا نادانستگی میں کیا یا پھر اپنے دفاع کے لیے۔

آگے سوال یہ تھا کہ اب میں کیا کروں...... کہاں جاؤں۔ میری جیب میں رقم بہت محدود ہو گئی تھی، میرے پاس ذاتی استعمال کے کپڑے تک نہیں رہے تھے، تاہم یہ ایسے مسائل تھے جن پر قابو پانا میرے لیے مشکل نہیں تھا، نہ میں مفلس تھا نہ بے نوا اور نہ لاوارث...... وقتی ضرورت کے لیے میں کسی سے بھی رقم لے سکتا تھا اور پھر اپنے بینک سے منگوا سکتا تھا...... ضرورت کی ہر چیز خریدی جاسکتی تھی۔

بظاہر ایسا لگتا تھا کہ پولیس نے مجھے یاد نہیں کیا۔ ظاہر ہے وہ اپنی ساری توجہ کسی ایک ہی کیس پر مرتکز نہیں رکھتے۔ وہ کسی زیادہ سنگین اور اہم معاملے میں بھی مصروف ہو جاتے ہیں۔ شاید ابھی تک انہیں علم ہی نہ ہو کہ میں فرار ہو گیا ہوں۔ اگر ایسا ہوا تو یہ بات میرے حق میں جائے گی، مغرب کے ترقی یافتہ معاشرے میں سب سے اچھی بات یہ ہے کہ وہاں اعتماد قائم ہے۔ جھوٹ کی حیثیت انسانی کردار کی سب سے بڑی خرابی، ایک گناہ بلکہ جرم جیسی ہے اور عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کسی کو بھی جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے چنانچہ ایک دوسرے پر اعتبار بھی کرتے ہیں۔

پولیس نے میرا برطانوی پاسپورٹ یہ دیکھے بغیر رکھ لیا تھا کہ اس کی میعاد ختم ہونے کے قریب ہے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ برطانیہ میں داخلے کا ویزا مجھے اس پاسپورٹ کی بنیاد پر نہیں ملا ہے۔ پولیس کے نزدیک میں کوئی عادی یا پیشہ ور مجرم نہیں بلکہ ایک معزز شہری تھا جو بالکل نادانستگی میں کچھ ایسے کام کر چکا تھا جو خلافِ قانون تھے۔

شاید ابھی وقت ہے اور میں اس مہلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ ثابت کرسکتا ہوں کہ نہ میری نیت قانون شکنی کی تھی اور نہ میں حقائق سے اپنی بے گناہی ثابت کرنے میں کوئی ڈر محسوس کرتا ہوں۔ میں نے گھڑی دیکھ کے اندازہ کیا کہ اب تک نور کو پاکستان لے جانے والا جہاز بہت بلندی پر اور بہت دور محو پرواز ہوگا۔

میں نے اپنے ساتھ نور کا فون بھی بند کر دیا تھا کیونکہ فرار کا فیصلہ کرتے ہی میں نے سب سے رابطہ منقطع کر دیا تھا۔ نور کو اب اس کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے اپنا فون دوبارہ کھولا، وہ سب جو مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش کرتے رہے ہوں گے اب تھک ہار کے اور مایوس ہو کے بیٹھ گئے ہوں گے۔

اس میں بہت سی مس ہونے والی کالز تھیں اور خیر خواہی کے کچھ پیغامات بھی تھے جن میں مجھے سمجھانے کی کوشش کی گئی تھی کہ میں لندن سے فرار ہو کے نہ جاؤں بلکہ اپنے خلاف عائد الزامات میں اپنی بے گناہی ثابت کروں...... کیا اب یہ ممکن ہوگا؟

ابھی زیادہ رات نہیں گزری تھی، میں نے صورت حال کا اندازہ کرنے کے لیے خود ہی پولیس اسٹیشن فون کیا۔ کسی خاتون نے کہا۔ ''یس؟''

میں نے پراعتماد لہجے میں سوال کیا۔ ''کیا میں کیپٹن ایڈم سے بات کرسکتا ہوں؟''

''ویل...... وہ ابھی نہیں ہے...... اگر آپ دس منٹ بعد کوشش کریں تو وہ یہاں ہوگا...... وہ راستے میں ہے، آپ کون ہیں؟''

میں نے کہا۔ ''میں رفیق احمد شیرازی۔''

''شیرازی؟ ...... فرام پاکستان؟...... آپ غالباً کوئی لارڈ یا کاؤنٹ ہیں...... ایم آئی رائٹ سر؟''

میں نے کہا۔ ''یس، اسے ہم پاکستان میں نواب کہتے ہیں۔''

''ویل سر...... کیپٹن ایڈم خود آپ سے رابطہ کرنے کی [کوشش] کرتا رہا ہے، وہ آپ سے ملنا چاہتا تھا۔''

[غ]الباً وہ کال ملانے اور ریسیو کرنے پر مامور ٹیلی فون [آپری]ٹر تھی۔ چنانچہ میں نے کہا۔ ''ایسی صورت میں میرا وہاں [ضر]وری ہے، میں آدھے گھنٹے میں پہنچ سکتا ہوں۔''

میرا سامان چلا گیا تھا لیکن پاسپورٹ کے علاوہ تقریباً [ہز]ار پاؤنڈز اب بھی میری جیب میں تھے جو خاصی بڑی رقم [تھی]...... پھر بھی میں نے ٹیکسی میں پولیس اسٹیشن جاتے ہوئے [راجا] سے فون پر کہا۔ ''یار مجھے کچھ پیسے چاہئیں۔''

راجا نے کہا۔ ''ابھی تو نہیں بھیج سکتا، بینک بند ہو چکے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''ایسی جلدی نہیں، دراصل میرا سارا سامان [چل]ا گیا نور کے ساتھ۔ اس میں ٹریولر چیک بھی تھے، میں رہ گیا [خالی] ہاتھ۔ غنیمت ہے کہ میرا پاسپورٹ میرے پاس تھا۔''

''سامان نور کے ساتھ چلا گیا۔ وہ کہاں گئی ہے؟''

''وہ صبح نو بجے پاکستان پہنچ جائے گی۔''

''اور تو لندن میں ہے، یہ کیا چکر ہے نیکے پتر!''

''یہ سب وہی تقدیر کے چکر ہیں مہاراج...... تفصیل [پھر] بتائے گی۔''

''یہ کیا الٹا معاملہ ہے، وہ گئی تھی انٹریئر ڈیزائنر کا [کو]رس کرنے اور تو اسے چھوڑنے گیا، اب وہ آرہی ہے تجھے [چھو]ڑ کے۔''

میں نے آہ بھر کے کہا۔ ''ہاں، وہ بے وفا مجھے چھوڑ کے [چلی] گئی ہے واپس اور میں بدبخت جا رہا ہوں تھانے، انشاء اللہ [آج را]ت حوالات کی سیر ہوگی مگر یہاں کی حوالات بھی اتنی بری نہیں ہوتی، ویسے بھی کسی ہوٹل میں رہتا، کچھ پیسے ہی بچ [جائ]یں گے۔ فی امان اللہ۔'' میں نے فون بند کر دیا اور چونکہ [ٹیکس]ی بھی پولیس اسٹیشن پہنچ چکی تھی اس لیے راجا کی دخل [اند]ازی سے بچنے کے لیے میں نے اسے پھر آف کر دیا۔

[نو]جوان نظر آنے والے کیپٹن ایڈم کو میں نے کسی سے فون پر [گف]تگو میں مصروف پایا۔ اس نے مجھے ہاتھ سے بیٹھنے کا اشارہ [ک]یا۔ تھانے کا ماحول انتہائی صاف ستھرا اور پرسکون تھا، نہ کوئی [اف]راتفری نہ چیخ پکار، مختلف میزوں پر پولیس کے ملازم مرد، [اور خوات]ین بڑے انہماک سے اپنے اپنے کام میں مصروف تھے، [تھ]وڑی دیر پہلے میری جس سے بات ہوئی تھی وہ لڑکی ایک کونے [میں] چھوٹے سے ڈیجیٹل ٹیلی فون ایکس چینج پر کالز ریسیو کر [رہی] تھی اور بہت کم عمر تھی۔

کیپٹن ایڈم کے بارے میں پہلے سے میری یہ رائے [تھی] کہ وہ نجی زندگی میں جیسا بھی ہو ادائے فرض کے معاملے میں قطعی غیر متعصب اور نرم خو تھا۔ ہمارے تھانے کے اہلکاروں کی طرح وہ ہر فریاد لے کر آنے والے کو ملزم اور ملزم کو مجرم سمجھنے کا رویہ نہیں رکھتا تھا۔ دو منٹ میں اس نے فون رکھ دیا۔ ''تم کہاں تھے مسٹر شیرازی...... جب میں نے تم سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تو مجھے بتایا گیا کہ تم باہر ہو اور تمہارا فون بھی کام نہیں کر رہا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''آئی ایم سوری، ایک اشد ضرورت سے مجھے جانا پڑا۔''

''حالانکہ میں نے تم سے کہا تھا کہ تم بتائے بغیر کہیں نہیں جاؤ گے، خیر...... اب تم پر وہ پابندی نہیں رہی، گھر سے نہ نکلنے کی...... لیکن شہر میں تم سے رابطہ ضرور رہنا چاہیے۔''

''یہ میرے لیے یقیناً اچھی خبر ہے، کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ حالات میں یہ امید افزا بہتری کیسے آئی؟''

اس نے ایک فائل کھولی۔ ''ہمیں اس خاتون کی پوسٹ مارٹم رپورٹ موصول ہو گئی ہے۔ مسز ایستھر کی۔''

میں نے کہا۔ ''یہ غالباً البرٹ کی ماں کا نام تھا۔''

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''اسے گلا گھونٹ کے ہلاک کیا گیا تھا۔''

میرا گلا خشک ہونے لگا۔ ''یہ قتل تھا؟''

''آف کورس...... لیکن ہم نے قاتل کو کسی دشواری کے بغیر پکڑ لیا۔''

''کس نے قتل کیا تھا اس بوڑھی عورت کو؟''

کیپٹن نے سپاٹ لہجے میں بتایا۔ ''خود اس کے بیٹے نے...... جیسا کہ مجھے بھی شک تھا، بڑھیا کے گلے پر اس کی انگلیوں کے نشانات بہت واضح تھے۔''

''کیا وہ اتنا بے وقوف ہے؟''

''عقلمند ہوتا تو اپنے حالات بدل سکتا۔'' وہ کرسی کی پشت کا سہارا لے کر بولا۔ ''اور جب اس نے یہ غیر انسانی کارنامہ سرانجام دیا...... اس وقت البرٹ کے پاس جتنی بھی عقل ہے، وہ بھی شراب نے مفلوج کر رکھی تھی، اس ناقص عقل کے ساتھ اس نے سوچا کہ وہ فائدہ اٹھا سکتا ہے...... تین طرح، نمبر ون...... شک کا پہلا ہدف تم ہو، تم اور وہ شخص، کیا نام ہے اس کا...... چیف، جنہوں نے اس کے گھر جاکے گن پوائنٹ پر دھمکی دی تھی۔ نمبر دو...... پانچ سو پاؤنڈز کے لیے وہاں کوئی بھی قتل کرسکتا ہے...... یا ہو جاتا ہے، اور بڑھیا نے اپنی دولت مندی کے قصے سب کو بڑھا چڑھا کے سنائے تھے۔''

''اور تیسرا فائدہ......؟''

''اسے پانچ سو پاؤنڈز بھی تو مل گئے۔'' کیپٹن ایڈم

نے دراز میں سے کچھ نکالا۔ ''یہ تمہارا پاسپورٹ، تمہارے خلاف قتل کا الزام ڈراپ کر دیا گیا ہے اور باقی معاملات میں بھی خود لارڈ ارنسٹ نے ذمے داری قبول کی ہے کہ تم کہیں نہیں جاؤ گے۔''

''لارڈ ارنسٹ نے ......خود؟''

''ہاں، اس کے وکیل نے کہا کہ ہم آؤٹ آف کورٹ کوئی تصفیہ کر سکے تو کورٹ کی اجازت سے چارجز واپس لے سکتے ہیں۔''

''کیا یہ ممکن ہے......؟''

''میں یہاں تمہیں قانونی مشورے دینے پر مامور نہیں ہوں۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا اور اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

لارڈ ارنسٹ نے ذاتی ضمانت پر میری رہائی کو ممکن بنایا تھا......ظاہر ہے یہ باہمی مفاد کا سودا تھا لیکن اس کے پیچھے برسوں پرانا اعتماد کا رشتہ بھی تھا جو حالات نے یوں تباہ کر دیا تھا جیسے وقت تاریخی عمارات کے حسن کو کھنڈر بنا کے برباد کر دیتا ہے۔

ایک نئے حوصلے کے ساتھ میں باہر آیا تو یہ سوچ رہا تھا کہ میں نور کے ساتھ نکل جانے میں کامیاب ہو جاتا تو کتنی بڑی بے وقوفی اور خرابی ہوتی، کسی وجہ کے بغیر میری برطانوی شہریت باقی نہ رہتی اور میں اس قابل نہ رہتا کہ پھر لندن آسکوں...... لارڈ ارنسٹ کی پوزیشن میرے فرار سے کتنی خراب ہو جاتی اور وہ معاملات جو اب آسانی سے سلجھتے نظر آرہے ہیں کتنے الجھ جاتے......نور کا جہاز عافیت کی منزل کی جانب محو پرواز تھا اور میں وقت گزارنے کے لیے کسی گوشۂ عافیت کی تلاش میں تھا۔

میں کہیں بھی جاسکتا تھا۔ ڈاکٹر شائستہ کے گھر جو مجھے فون کر کر کے مایوس ہو چکی تھی اور شاید فریال سے لڑ رہی ہو گی کہ تم بھی کس آدمی کے لیے آئی تھیں۔ وہ تو چوروں کی طرح جوتے بغل میں دبائے نکل گیا۔ میں کسی ہوٹل میں بھی جاسکتا تھا اور میں لارڈ ارنسٹ کے پاس شکریہ ادا کرنے اور تصفیہ طلب امور پر بات کرنے کے بہانے بھی جاسکتا تھا۔

ہوٹل کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میں لارڈ ارنسٹ کی طرف جاتا تو وہ مجھے یقیناً ویلکم کرتا۔ اس کی طرف سے خیر سگالی کے جذبے کا یہ مظاہرہ واضح کرتا تھا کہ وہ معاملات کو صلح صفائی کے ساتھ ختم کرنے کے موڈ میں ہے اور ظاہر ہے اسی میں فریقین کی بہتری تھی تاہم میں نے شائستہ اور فریال کو حیرت اور مسرت کا بھرپور سرپرائز دینے کا فیصلہ کیا۔

کال بیل کے جواب میں خود ڈاکٹر شائستہ ہی دروازہ کھولنے کے لیے آئی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے اپنے مقابل دیکھ کر اسے یقین ہی نہ آیا، پھر اس نے بے حد مسرت سے کہا۔ ''رفیق...... کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہی ہوں.... واپس آگئے......لیکن خالی ہاتھ؟ اور نور کہاں ہے؟''

میں نے ہنس کے کہا۔ ''کیا سارے سوال یہیں ادا کے کرو گی۔ جواب کے لیے اندر آنے کی مہلت بھی نہیں دو گی۔''

وہ سامنے سے ہٹ گئی، اندر داخل ہوتے ہی میں نے فریال کو دیکھا۔ میری آواز نے اسے بھی متوجہ کر لیا تھا۔ اس کا حلیہ بالکل بدلا ہوا تھا۔ وہ مختصر ترین ٹی شرٹ اور جینز میں تھی۔ اس نے اپنا ہیئر اسٹائل بھی بدلا ہوا تھا اور کلر بھی، اس کے بال اب ہلکے گولڈن براؤن، بالکل سیدھے اور شولڈر تک کٹے ہوئے تھے، وہ ایک مکمل ماڈل اور اسٹار کے روپ میں میرے سامنے تھی۔

اس نے مسکرا کر کہا۔ ''تم کیسے لوٹ آئے؟ لگتا ہے تمہاری دعائیں قبول ہو گئیں شائستہ۔''

شائستہ نے پلٹ کے کہا۔ ''میری کیوں؟ تم جو وہاں سے بھاگی چلی آئی ہو۔''

''مجھے تو آنا ہی تھا اپنے شوٹنگ شیڈول کے مطابق۔ تم ہی زیادہ پریشان تھیں۔''

شائستہ نے مان لیا۔ ''واقعی میں پریشان تھی، یہی سوچ کے...... کہ میرا اب کیا ہو گا، میں کیا جواب دوں گی پوچھنے والوں کو، خیر چھوڑو، یہ بتاؤ کہ آخر یہ تمہیں کیا سوجھی؟''

میں بیٹھ گیا۔ ''کیا سوجھی؟ یعنی واپس کیسے آگیا؟''

''یہ بھی اور جانے کی بھی، کچھ نہیں سوچا، کسی سے نہیں پوچھا اور بھاگ گئے۔'' میں نے محسوس کیا کہ شائستہ بہت چہک رہی ہے اور خوش ہے۔

''نور کو کہاں چھوڑ کے آئے ہو؟'' فریال نے کہا۔

''دیکھو، میں ایک منٹ میں سب وضاحت کر دوں گا لیکن ابھی میں سیدھا تھانے سے آرہا ہوں۔''

''تمہیں پولیس نے گرفتار کر لیا تھا؟ بھاگنے سے پہلے ہی، مجھے پتا تھا۔'' شائستہ نے کہا۔

''تمہیں کچھ نہیں پتا، پہلے کھانا لگاؤ۔''

''اتفاق ہے کہ آج ہم نے بھی ابھی تک نہیں کھایا، باتیں کرتے رہے، وہ بھی تمہاری۔''

میں نے کہا۔ ''میری قسمت، ایک ساتھ دو حسین خواتین میرے لیے متفکر تھیں۔''

''متفکر ہونے سے کیا ہو گا، نواب صاحب پر فوراً قبضہ ہے فی الحال۔''

شائستہ کھانا لگاتی رہی۔ ''مالدار اسامی ہے پھنسی اور نہ جانے

ہیں کس کس کی نظریں ہوں گی، ہم تو کسی شمار قطار میں نہیں۔''

میں حیران تھا کہ شائستہ کی کیا کایا پلٹ ہو گئی ہے، یہ اس کی شخصیت کا بالکل مختلف روپ تھا جو میں دیکھ رہا تھا، کہاں وہ تند مزاج بدخو اور آدم بیزار شائستہ اور کہاں یہ خوش مزاج، شگفتگی کا پیکر اور مجسم خلوص عورت جس کی بے تکلفی میں بھی اپنائیت تھی۔

شائستہ عمر میں مجھ سے تھوڑی ہی بڑی ہو گی لیکن کچھ فطری ساخت اور کچھ ایک ڈاکٹر جیسی اپنی دیکھ بھال سے اس نے خود کو فٹ اور اسمارٹ رکھا تھا۔ صبح سے شام تک اس کی مصروفیت کا معمول بھی سخت تھا چنانچہ وہ میرے ساتھ کھڑی ہوتی تو شاید مجھ سے پانچ سال چھوٹی نظر آتی۔ صورت شکل کے اعتبار سے بھی اگر وہ انتہائی حسین نہیں تھی تو قبول صورت ضرور تھی۔ بس وہ اپنے دو بچوں کی ذمے داری سنبھالنے کے چکر میں پھنس گئی تھی اور جوانی میں اکیلے پن کا عذاب سہ رہی تھی ورنہ اس سے شادی کے خواہش مند بہت ہوتے......اس کی اضافی خوبی اس کا ڈاکٹر ہونا تھا اور وہ لندن میں سیٹل تھی۔

کھانے کے دوران میں، میں نے نور کے اکیلے جانے اور میرے رک جانے کے اسباب یوں بتائے کہ وہ دونوں ہنستی رہیں۔ خود میرا موڈ بہت اچھا تھا۔ معمول کے مطابق شائستہ نے دونوں بچوں کو بہت پہلے کھانا کھلایا اور پھر وہ شب بخیر کہہ کر سونے چلے گئے۔ یہاں آ کے رفتہ رفتہ پاکستانی بھی تربیت کے انہی اصولوں پر عمل کرنے لگے تھے جو برطانوی تھے۔ یہاں اسکول جانے والے بچوں کا والدین کی لیٹ نائٹ ایکٹیوٹی سے کوئی تعلق نہیں......انہیں آٹھ نو بجے سلا دیا جاتا ہے کچھ ایسی ہی صورتِ حال ان کے ٹی وی دیکھنے کی ہے، جہاں سے سارے زمانے کے کارٹون نشر ہوتے ہیں وہاں بچے ہر وقت کارٹون چینل لگا کے نہیں بیٹھ سکتے۔

کھانے کے بعد شائستہ کافی لے آئی۔ ''میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ کس کو کیا جواب دوں؟ پہلے تمہارے سسر فون کرتے رہے۔''

''میرے سسر......؟''

''ہاں...... جس سے تمہارا نکاح ہوا ہے اس کا باپ تمہارا کیا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''لاحول ولاقوۃ شائستہ......وہ اس وقت کسی اور کی بیوی تھی، اس کو طلاق تک نہیں ہوئی تھی، اس کے ساتھ نکاح ڈراما تھا۔''

''چلو پھر......تمہارا ڈرامے والا سسر مجھ سے پوچھتا رہا کہ رفیق کہاں ہے؟ میں کیا بتاتی اسے، شکر کرو یہ نہیں کہا میں نے کہ وہ پاکستان بھاگ گیا۔'' وہ ہنس پڑی۔

فریال نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی۔ ''چلو جو ہوا سو اچھا ہی ہوا۔ تم نے سوچے سمجھے بغیر قدم اٹھایا تھا۔''

''ایک فون پولیس کے کسی کیپٹن کا بھی آگیا تھا۔''

میں نے کہا۔ ''شائستہ، ان لوگوں کو تمہارا نمبر کس نے دیا؟ لارڈ ارنسٹ کو اور پولیس کیپٹن ایڈم کو؟''

''یہ تو میں نے ان سے نہیں پوچھا۔''

فریال نے کچھ بے چینی سے پہلو بدلا۔ ''گاڑی ابھی تک مجھے لینے نہیں آئی۔''

''تم کو جانا ہے کہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، بہت صبح صبح شوٹ ہے، میں اپنے یونٹ کے ساتھ ہی ٹھہری ہوں، دو دن کا لندن میں قیام ہے۔ دو دن کا پیرس میں، پھر روم۔''

میں نے پوچھا۔ ''کوئی اشتہار ہے؟''

''شیمپو کا......لیکن میں دبئی میں مشترکہ پروڈکشن کے کئی اسائنمنٹ دیکھ رہی ہوں، ایک فائنل کر لیا ہے، ایک کا اسکرپٹ دیکھ رہی ہوں، تیسرے کا اسکرپٹ مجھے قبول نہیں تھا چند شرائط، وہ ترمیم ہو کے آجائے گا۔''

''یہ فلموں کے پروجیکٹس ہیں؟''

''نہیں، ٹی وی سوپ۔''

میں نے کہا۔ ''گویا تمہارا دبئی جانے کا فیصلہ تمہیں راس آگیا۔ سب کچھ ٹھیک ہو گیا، پاکستان میں جو معاملات تمہیں پریشان کر رہے تھے وہ بھی ختم ہو گئے ہوں گے، آئی وش یو مور سکسز......''

''طنز کر رہے ہو؟......'' وہ ہارن کی آواز پر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''نہیں، یہی کہہ سکتا ہوں میں......میرے بارے میں تمہیں کس نے بتایا؟''

''پتا چل جاتا ہے، میں نے بس ایک خبر دیکھی تھی، لندن کے سارے اخبارات وہاں دستیاب ہیں۔'' وہ دروازے کی طرف مڑی۔

''تھینک یو...... مجھے مدد کی ضرورت نہیں، میں اپنے معاملات طے کر لوں گا۔''

اس نے دکھی اور مجروح نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''دیکھو، تم تلخ ہو رہے ہو، میں محض کوشش کر رہی ہوں کہ ذاتی سطح پر تم سے تعلق نبھاتی رہوں، کیونکہ تم نے بھی ہمارے راستے جدا ہونے کے باوجود میرے لیے کم نہیں کیا تھا...... لیکن تم سمجھتے ہو کہ مجھ سے ملنے میں تمہاری نیک نامی پر حرف آتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''آئی ایم سوری فریال، میرا ہرگز یہ

مطلب نہیں تھا۔"

اس نے باہر نکلنے کے بعد شائستہ سے ہاتھ ملایا۔

"دیکھو، موقع ملا تو میں پھر چکر لگاؤں گی، فرصت ملنے کی بات ہے......؟" پھر وہ میری طرف پلٹی۔ "میں کیا کروں، ابھی تک میں جذباتی طور پر تم سے اتنی دور نہیں جا سکی کہ تم سے نفرت کرنے لگوں، تم اپنے معاملات نمٹا کے خیریت سے واپس جاؤ گے تو مجھے چین آ جائے گا۔"

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ "تھینک یو فریال، ہم ہمیشہ اچھے دوست ضرور رہیں گے۔"

"تمہیں پیسوں کی ضرورت تھی۔" اس نے اپنا بیگ کھولا۔

شائستہ نے اسے روک دیا۔ "ضرورت کے لیے میں بھی دے سکتی ہوں۔"

جب اس کی گاڑی فریال کو لے کر چلی گئی تو میرے دل پر تھوڑا سا ملال کا اثر تھا "میرے الفاظ سے اس کے دل کو دکھ پہنچا۔"

"اس کا تمہارا جو رشتہ تھا، اتنی آسانی سے بھلایا ہی نہیں جا سکتا لیکن رفتہ رفتہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

میں نے کہا۔ "میں بھی اب چلتا ہوں۔"

"اس وقت کہاں جانے کا سوچ رہے ہو؟"

میں نے کہا۔ "اس وقت کا کیا مطلب؟ رات کے بارہ بجے ہیں اور لندن کیا کوئی جنگل ہے، یا باہر برفباری ہے، آندھی طوفان ہے؟"

"آج یہاں سو جاؤ گے میرے ساتھ تو کیا تمہاری پاک دامنی پر حرف آ جائے گا۔" اس نے مجھے اندر کھینچ کے بیڈ روم کا دروازہ بند کر دیا اور پلٹ کر دروازے کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔

میرے ذہن کو سخت شاک لگا۔ "شائستہ......"

"بہت بے شرم ہوں نا میں...... اور تم مجھے ایسا نہیں سمجھتے تھے، دو بچوں کی ماں ہوں میں اور ڈاکٹر ہوں۔" وہ تلخی سے بولی۔ "لیکن ایک عورت پہلے ہوں میں...... ایک جوان خواہشات رکھنے والی عورت۔"

میں نے نرمی سے کہا۔ "میں تمہاری پرابلم سمجھتا ہوں لیکن......"

بڑے سکون اور اطمینان کے ساتھ اس نے خود ہی اپنے آپ کو سنبھالا دیا۔ "کوئی نہیں سمجھتا یہ بات، میں ایک شادی شدہ زندگی گزار چکی ہوں، اب یہ زندگی ... کا سونا پن اور راتوں کی تنہائی میرا عذاب ہے، میں شادی بھی نہیں کر سکتی کیونکہ مجھ پر دو بچوں کی ذمے داری ہے، ان کی وجہ سے میں کوئی بدنامی بھی مول نہیں لے سکتی ورنہ لندن میں کون ہے مجھ پر روک ٹوک کرنے والا۔ میں یہ بھی چاہتی ہوں کہ ان کی نظر میں ماں کی عزت ہو، میرے لیے دو طرفہ عذاب ہے۔" وہ سسکیاں لینے لگی۔

میں نے اسے اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا۔ "دیکھو، اتنا دلبرداشتہ ہونے کی ضرورت نہیں...... دنیا میں اچھے لوگ بھی ہیں۔ تم شادی کر سکتی ہو۔"

"کوئی اچھا آدمی ابھی تک تو ملا نہیں مجھے۔" اس نے میرے سینے پر سر رکھ دیا۔

مجھے اس عورت پر واقعی ترس آیا جو اکیلے پن کا دباؤ برداشت نہیں کر پائی تھی اور بھوک سے قریب المرگ شخص کی طرح جو روٹی بھیک میں مانگتے ہوئے نہیں شرماتا اس نے خود کو میرے سامنے ڈال دیا تھا، شاید ایسا وہ پہلے بھی کر چکی ہو گی، مرد کوٹھے پر چلا جاتا ہے، کال گرل کو بلا لیتا ہے، عورت اخلاقی پابندیوں کے جال میں جکڑی اپنا عذاب خود جھیلتی ہے، شائستہ آزاد تھی، پڑھی لکھی عورت تھی جو بغاوت کر سکتی تھی اور لندن میں تھی جہاں اس کی زندگی پر کسی کا کنٹرول نہیں تھا۔ میں کسی طرح بھی اس کے رویے کی حمایت نہیں کر رہا ہوں، شیطان ہمیشہ سے اتنا قوی ہے کہ وہ آدم اور حوا دونوں کو شجرِ ممنوعہ چکھنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

شائستہ کا شائستہ رویہ اور اس کا بدلا ہوا انداز، اس کی مہربانی اور شگفتہ مزاجی، سب کا مطلب میری سمجھ میں آ چکا تھا۔ زندگی کا ایک ان دیکھا پہلو یہ بھی تھا جو اچانک میرے سامنے آیا تو مجھے حیران کر گیا۔ وہ رات بھر بولتی رہی، مجھے اپنی گزری ہوئی زندگی کے بارے میں بتاتی رہی جس کے پیچ و خم اسے یہاں تک لے آئے تھے۔

"اپنے بارے میں نہ تم نے کبھی بتایا، نہ فریال نے تمہاری بات کی۔"

"اس کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔"

"الٹا تم میرے ساتھ انتہائی غیر شائستہ رویہ رکھتی تھیں، میں تمہیں ڈاکٹر غیر شائستہ کہتا تھا۔"

"دراصل اس سے کچھ پوشیدہ نہیں۔ میں تم سے نرمی یا التفات سے بات کرتی تو وہ شک کرتی...... حالانکہ اسے معلوم ہے کہ میں ایسے راہ چلتے مردوں کو پھانسنے والی عورت نہیں ہوں، اپنی نیک نامی کا بھرم رکھتی ہوں اور بہت محتاط رہتی ہوں لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ تم مجھے اچھے لگتے تھے۔"

"کیوں اچھا لگتا تھا؟"

"یہ سوال کبھی فریال سے یا نور جہاں سے...... یا نور

آج نور کیوں اچھی لگتی ہے تمہیں، کبھی فریال کیوں ی، نام کچھ بھی دو تم اپنے جذبات کو...... مگر عورت کے نشش میں مردوں کے لیے بھی جنس کے سوا کیا ہے؟"

یہ بڑا منفی رویہ ہے۔"

یہ ایک میڈیکل فیکٹ ہے، سیکس صرف حیوانی ہے، دیگر ضروریات کی طرح ایک جسمانی ضرورت کیا ہے؟ حیوان ناطق۔"

ج ویک اینڈ تھا چنانچہ بچوں کو اسکول جانے کے لیے جلدی نہیں لیکن نہ جانے کیوں مجھ میں ہمت نہیں تھی کہ ان سے وں، اسی اعتماد کے ساتھ جیسے پہلے ان سے بات کر کھ میں اپنے احساسِ جرم کے ساتھ ان کے سامنے حوصلہ نہیں تھا۔ میں سوچتا رہا کہ کیا انہیں اپنی ماما پر ہو گا یا نہیں۔ بچے بہرحال ہمیشہ بچے نہیں رہتے اور ات اتنے ناسمجھ نہیں ہوتے جتنے ہم سمجھتے ہیں۔

ں اسے سوتا چھوڑ کے نکل گیا، اس عورت سے میری بہت پرانی تھی لیکن میں اس کے بارے میں بڑے یالات رکھتا تھا۔ وہ دہری زندگی جی رہی تھی تو یہ اس ی بن گئی تھی، نہ میں اسے آبرو باختہ بدکردار عورت تھا اور نہ شریف زادی، میرا دماغ شدید الجھن اور ن کا شکار تھا۔

ہر دن چڑھ گیا تھا اور کاروبار زندگی شروع ہو چکا ں نے اپنے موبائل فون کو چیک کیا، اس میں نہ نور س کال تھی اور نہ میسج تھا، پاکستان میں دوپہر گزر چکی یرے حساب سے نور کے جہاز کو لینڈ کیے چار گھنٹے تھے۔

ابھی میں راجا کو فون کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ ڈ ارنسٹ کی کال موصول ہو گئی۔ "کل سے مجھے تمہاری ہے اور تم لاپتا ہو۔"

یں نے کہا۔ "بس میں ابھی تمہیں کال کرنا چاہتا تھا۔"

"تم اس وقت کہاں ہو؟"

یں نے کہا۔ "سڑک پر، کہیں ناشتا کروں گا پھر ٹیکسی ہاری طرف آ جاؤں گا، تمہارے آفس۔"

"آفس آج بند ہے، دیکھو تم ناشتا میرے ساتھ کیوں یتے، میں ابھی سو کے اٹھا ہوں۔"

یں نے کہا۔ "مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

لارڈ ارنسٹ کا لہجہ اور رویہ بہت بدلا ہوا تھا۔ میں خود یہ اس بات کا آرزومند تھا کہ معاملات رفت گزشت ورنہ مسائل دونوں طرف کھڑے ہوتے تھے، خواہ ان کی نوعیت مختلف رہے۔ الزامات کی فہرست دونوں طرف ایک جیسی تھی اور ان کی سنگینی میں بھی کوئی فرق نہیں تھا، فرق تھا تو صرف یہ کہ میرے مقابلے میں ملزم لارڈ ارنسٹ کی پاگل بیٹی تھی، وہ مجبور تھا کہ مصالحت کرانے والے کا کردار ادا کرے اور اس کے لیے اپنا اثر رسوخ بھی استعمال کرے۔

ایک بار پھر میں ارنسٹ مینشن میں داخل ہوا۔ اندر پرانی معرکہ آرائی کے آثار تک نہ تھے، جل کے خاکستر ہو جانے والی گاڑی نہ جانے کہاں پھینک دی گئی تھی، کسی دیوار پر آگ یا دھوئیں کا داغ بھی رہنے نہیں دیا گیا تھا۔ جو پودے جلے تھے انہیں بھی ہٹا کے نئے پودے لگا دیے گئے تھے۔

لارڈ ارنسٹ نے مصالحانہ متانت کے ساتھ مجھے اسی ٹیرس پر ریسیو کیا جہاں ایک بار میں عائشہ کے ساتھ ڈنر کر چکا تھا اور پھر اس کا خمیازہ بھی بھگت چکا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "ایلیشا کیسی ہے؟"

اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "جیسا اسے ہونا چاہیے، ابھی وہ بیڈ سے اٹھ بھی نہیں سکتی۔"

"اور ڈاکٹرز کیا کہتے ہیں؟"

"ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا، یہ مہینوں کی بات ہے۔ پھر پتا چلے گا کہ وہ وہیل چیئر کی جگہ اپنے پیر استعمال کرنے کے قابل ہو گی یا نہیں۔"

"آئی ایم رئیلی سوری۔"

"اس بات کو چھوڑو، میں چاہتا ہوں کہ یہ سارے معاملات سیٹل ہو جائیں، جو قانونی ہیں۔"

"میں ہر قسم کے تعاون کے لیے تیار ہوں۔"

"میرے وکیل نے کچھ کاغذات تیار کیے ہیں۔ ایک ایسی صورتِ حال پیدا کرنے کے لیے جس میں تصفیہ ممکن ہو...... یہ اتنا آسان تو نہیں، لیکن کچھ ہو جائے گا۔"

میں نے کہا۔ "میں بھی یہی چاہتا ہوں، لیکن قانون......"

"قانون کو اندھا کہا جاتا ہے، وہ ناانصافی نہیں کرتا لیکن قانون نہ بے رحم ہے اور نہ منتقم مزاج...... وہ معاف کرنا بھی جانتا ہے، ایلیشا کے لیے ماہرینِ نفسیات نے بہت اسٹرانگ کیس بنایا ہے کہ وہ شاک کی کنڈیشن میں اور ذہنی طور پر نارمل نہیں تھی، اسے زیادہ سے زیادہ رعایت ملے گی، اس کے خلاف الزام ہے نور پر قاتلانہ حملے کا، صرف وہی زخمی ہوئی تھی، اگر وہ کہہ سکے کہ اس کے شانے کا زخم گولی کا نہیں تھا۔"

میں نے کہا۔ "میڈیکل رپورٹ کیا کہتی ہے؟"

"اس میں حتمی کچھ نہیں ہے۔ یہ لکھا ہے کہ زخم بائیں

بور کے ریوالور سے فائر کی جانے والی گولی کا ہوسکتا ہے، ہوسکتا ہے...... ہے نہیں۔"

"عائشہ کے ہاتھ میں وہی ریوالور تھا اور اس نے ایک سے زیادہ گولیاں چلائی تھیں۔"

"گن اس کی ماں کی تھی، شی از ڈیڈ۔ ہم نے وہ گن پھر نہیں دیکھی۔" وہ دیدار کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"اور جو گولی تمہاری گاڑی میں لگی تھی۔"

"گاڑی میں شارٹ سرکٹ سے آگ لگی تھی، یہ کسی نے نہیں کہا کہ اس میں گولی لگی تھی، اب بحث مت کرو...... میری بات سن لو اگر نور عدالت میں اپنا بیان واپس لے سکتی ہے۔"

"نہیں لے سکتی۔"

اس کا رنگ اڑ گیا۔ "کیوں...... کیوں نہیں لے سکتی؟"

"اس لیے کہ وہ یہاں نہیں ہے۔"

"پھر کہاں ہے؟"

"پاکستان میں، وہ چلی گئی...... کل رات کی فلائٹ سے۔"

لارڈ نے حیرانی سے کہا۔ "ایسے کیسے چلی گئی، سارے کیس چھوڑ کے۔"

"وہ فرار ہوگئی، وہ قانونی چکروں میں نہیں پڑنا چاہتی تھی، وہ سخت دہشت زدہ تھی، اسے اور کچھ نہیں سوجھا۔"

"او مائی گاڈ...... اسے تو آنا چاہیے۔"

"وہ یہاں قیام کے لیے آئی تھی۔ عائشہ کے بارے میں بڑے اچھے خیالات رکھتی تھی۔ ظاہر ہے اسے میں نے بتایا تھا لیکن یہاں جو ہوا...... ناقابل تصور تھا، اس نے سمجھا کہ وہ جب تک، یہاں رہے گی غیر محفوظ ہوگی۔"

"پلیز! اسے بلاؤ، ممکن ہے تمہارے کہنے سے وہ آجائے۔"

"میں صرف کوشش کرسکتا ہوں۔"

لارڈ نے کہا۔ "اسے میرے سامنے فون کرو، ابھی بات کرو، یہ رکھا ہے فون تمہارے دائیں ہاتھ پر......"

میں نے ریسیور اٹھا کے نور کا موبائل فون نمبر ملایا۔ مجھے بڑی خوشگوار حیرت ہوئی جب پہلی گھنٹی پر نور نے کہا۔ "ہیلو۔"

میں نے کہا۔ "نور...... آواز تو تمہاری ایسے آرہی ہے جیسے یہ لوکل کال ہو۔"

وہ کچھ دیر خاموش رہی، پھر ہنس پڑی۔ "کیا ایسا ہونا ناممکن ہے؟ یہ لوکل کال ہو بھی سکتی ہے۔"

میں نے کنفیوز ہو کے کہا۔ "کیا مطلب؟"

"میں پاکستان میں نہیں، لندن میں ہوں۔"

"کیوں مذاق کر رہی ہو۔"

"میں جا نہیں سکی، کوشش کے باوجود...... تمہارے قسم دینے کے باوجود، آئی ایم سوری، میں گیٹ سے گئی اور...... دونوں ٹکٹ واپس کردیے۔"

"میں نے تمہیں بہت تلاش کیا تھا۔" میر بعد کہا۔

"کیوں، مجھے روکنا چاہتے تھے؟ یا اپنا فیصلہ

"میں نے سوچا تھا تمہارے ساتھ ہی نکل میں تمہیں تلاش کرنے میں ناکام رہا۔"

"اس وقت تم کہاں ہو؟ یہ نمبر کس کا ہے۔

"اسی کا...... عائشہ کے گھر کا، ائرپورٹ۔ آگیا، اب تم پوچھو گی کیوں...... تو سچی بات یہ وہاں جانا نہیں چاہتا تھا' اس ڈاکٹر شائستہ کے گھ فریال بھی پہنچ گئی تھی۔"

"ماشاءاللہ راجا اندر سے گھوم رہے ہو. نمبرون، ٹو...... تھری...... آج بھی سب کے دل ہے، ہوٹل میں نہیں تو کیا ہوا۔"

"تم جیلس ہو رہی ہو؟"

"ہاں...... چوتھے نمبر پر جو ہوں۔"

"رات کو یہ بات نہیں بتائی تم نے...... فون کرتا رہا۔"

"میں...... ڈر رہی تھی تمہارے غصے سے.. قسم کی پروا نہیں کی میں نے۔"

اور تم کہاں چھپی ہوئی ہو؟"

"اپنے ہاسٹل میں...... نہ ابھی میرا داخلہ کی نہ کمرا۔ سوچ رہی تھی تم سے کہاں رابطہ کروں۔"

میں نے کہا۔ "نور...... واقعی اللہ جو کرتا ہے، تم یہاں آجاؤ...... لارڈ ارنسٹ کے گھر۔"

"وہاں تو میرا جنازہ ہی جاسکتا ہے۔"

"پاگل...... میں ہوں نا یہاں۔" میں نے

"تم پہلے بھی تو تھے...... کون سا تیر چلالیا اپنے کمرے میں بیٹھی ہوں، آنا ہے تو آجاؤ۔" ا رکھ دیا۔

لارڈ ارنسٹ نے بےچینی سے پوچھا۔ "کی تم نے مگر مجھے بھی سمجھاؤ، کیا طے پایا۔"

میں نے کہا۔ "وہ پھر آنے کے لیے تیار ہے یہ آسان نہیں ہوگا لیکن میرے کہنے سے وہ مان

"اس کی واپسی کب تک متوقع ہے؟"

"ایک دو روز...... تب تک تم اپنے قانو سے کہو کہ معاملات کو ختم کرنے کے لیے جو کرنا

دامن بھی صاف رہے۔"

"مجھے امید ہے کہ سب کے لیے اچھا ہوگا۔"

"البرٹ کی ماں کے قتل کا معاملہ تو ختم ہوا۔"

وہ افسوس سے سر ہلانے لگا۔ "ایڈیٹ، یہ گناہ خود اس اب بتاؤ میں اس کی کیا مدد کروں؟"

"میرے خلاف باقی چارجز اتنے سیریس نہیں ہیں۔"

"وہ ختم ہوجائیں گے اگر نور نے اپنا کیس واپس لے جرمانہ شاید دینا پڑے۔ وہ میں ادا کردوں گا یا پہلی بار کی وجہ سے جیوری تمہیں مختصر ترین سزا سنائے، وہ بھی SUSPEN پندرہ دن کی۔ وہ بھی تمہیں جیل نہیں جانا ، کوئی تمہاری ذمے داری قبول کرلے گا اور تم اچھے ن کی ضمانت دوگے، یہ سب کاغذی معاملات ہیں۔"

"میرا خیال ہے لارڈ کہ ایک وکیل کی ضرورت مجھے ہے، جو میرے معاملات کو میری نظر سے دیکھے۔ مجھے سمجھا میرے لیے رسک فیکٹر کیا ہیں اور کورٹ میں بھی میری ل کرے۔" میں نے کہا۔

لارڈ ارنسٹ نے جیسے بادل ناخواستہ میری تجویز کو یا۔ "اگر تم ضروری سمجھتے ہو، تو ٹھیک ہے۔"

جس آرٹس اسکول میں نور نے انٹیریئر ڈیزائنر کا کورس نے کے لیے داخلہ لیا تھا وہ لندن کے دوسرے کنارے پر ہاں پہنچنے کے لیے میں نے انڈر گراؤنڈ ٹرین کا سہارا لیا ہی اسٹیشن پہنچ کے باقی فاصلہ ٹیکسی سے طے کیا۔ میری یفیت بہت تبدیل ہوچکی تھی، ایک دن پہلے میں سخت اور خوفزدہ تھا لیکن ایک غلطی یا غلط فہمی نے مجھے اور نور کو ہونے سے بچالیا تھا اور اب حالات میں آنے والی نے مجھے پراعتماد کردیا تھا۔

نور بھی مجھ سے ملتے ہوئے کچھ خائف تھی لیکن میرا موڈ کے اس کے انداز بھی بدل گئے۔ میں لوٹ کے ڈاکٹر تہ کے گھر جانا نہیں چاہتا تھا لیکن راجا نے مجھے پاکستان جو رقم ارسال کی تھی وہ شائستہ کے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر ہوئی یہ وصول کرنے کے لیے مجھے اسی سے رجوع کرنا پڑا۔

اس نے مجھ سے سوال کیا۔ "اس وقت تم کہاں ہو؟"

میں نے کہا۔ "ظاہر ہے نور کے ساتھ۔"

وہ چونکی۔ "نور کے ساتھ، وہ تو پاکستان چلی گئی تھی۔"

"واپس آگئی۔" میں نے کہا۔ "میں نے بلالیا تھا، وہ گئی ہی نہیں تھی، تفصیل بعد میں بتاؤں گا۔"

"اچھا پھر میرے گھر آنے کی ضرورت نہیں۔ میرا ؤنٹ وہیں ہے جہاں میرے بچوں کا اسکول ہے، انہیں لانے کے لیے میں دیر سے جاتی ہوں، آج کچھ پہلے نکل جاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے، میں بینک پہنچ جاؤں گا۔"

"بینک سے تو میں رقم نکال لاؤں گی، ہم کہیں لنچ کرتے ہیں ایک ساتھ، سامنے ہی ایک انڈین ریسٹورنٹ ہے۔" "پاروتی......"

مجھے جانا پڑا...... نور کو حیرانی تھی کہ آج میں شائستہ سے اتنا الرجک کیوں ہو رہا ہوں...... اسے میں کیا بتاتا، چور میرے دل میں تھا کہ غیروں پر کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا، میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا۔ قصوروار مجھے نہیں سمجھا جاسکتا تھا لیکن میں خود اپنی نظر میں بن گیا تھا اور اس لاشعوری خوف میں گرفتار تھا کہ چہرہ بھی دل کی زبان ہوتا ہے۔

تاہم جب شائستہ ملی تو وہ سو فیصد نارمل، اتنی ہی پُراعتماد اور بےتکلف تھی جیسی ہمیشہ نظر آتی تھی، مجھ سے بات کرنے میں نظر ملاتے وقت بھی نہ پشیمانی کا کوئی احساس اس کی صورت سے عیاں تھا نہ پریشانی کا اس کے اطوار سے...... یوں لگتا تھا جیسے گزری ہوئی رات کسی خواب کا حصہ تھی یا برسوں پہلے کی بھولی بسری کہانی۔

آہستہ آہستہ میرا رویہ بھی اس جیسا ہی ہوگیا۔ میں نے اور نور نے اسے ہنس ہنس کے بتایا کہ ہمارا بھاگ جانے کا فیصلہ اور نہ جانا کیسے کیسے۔ حادثات و اتفاقات کا نتیجہ تھا، وہ رہ رہ کے ہنستی تھی اور ایک ہی بات دہراتی تھی کہ خدائی فیصلوں کی مصلحت خدا ہی جانتا ہے، پھر میں نے اسے لارڈ ارنسٹ سے ہونے والی صلح بندی کے مذاکرات کی ساری تفصیل سنائی تو وہ واقعی خوش ہوگئی، مجھے افسوس ہوا کہ اتنی اچھی عورت کے ساتھ زندگی نے کیا کیا اور اب وہ اسے کیسے جی رہی ہے۔

"یہ تم اپنے پیسے تو پکڑو نا۔" اس نے بیگ کھول کے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور میری طرف بڑھادی۔ "گن لو۔"

"یہ میں نے آج تک نہیں کیا۔ گنے بغیر رقم جیب میں ڈال لیتا ہوں۔ فریال میری اس عادت سے بہت چڑتی تھی۔"

"میری تو اس سے ملاقات ہی نہیں ہوگی شاید۔" نور نے سادگی سے کہا۔

"ہاں، پتا نہیں مجھ سے ہوتی ہے یا نہیں۔ اب مجھے تو بچوں کو اسکول سے اٹھانا ہے، تم لوگ کہاں جاؤ گے۔"

"کچھ شاپنگ کریں گے۔ میں سوچ رہا ہوں کسی وکیل سے خود بھی بات کردوں۔"

"کبھی گورے وکیل سے مت بات کرنا، پھنس جاؤ گے۔ ایک تو وہ فیس بہت لے گا دوسرے تم سے توقع رکھے گا

کہ اسے بھی سچ بتاؤ اور عدالت میں بھی سچ بولو۔ میں ایک پاکستانی وکیل کو جانتی ہوں۔"

"کس حوالے سے......" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

اس کا ہینڈ بیگ میں کارڈ تلاش کرتا ہوا ہاتھ رک گیا اور اس نے نظر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ اس ایک نظر میں میرے سوال کا جواب تھا کہ جو تم سمجھ رہے ہو وہ بات نہیں ہے لیکن ہے بھی تو تم کون ہوتے ہو مجھ سے پوچھنے والے...... یہ میری زندگی ہے اور اسے اپنی مرضی سے گزارنے کا اختیار بھی میرا ہے، تاہم اس نے کارڈ نکال کے سرد اور سپاٹ لہجے میں کہا۔ "یہ میرا وکیل تھا......طلاق کے کیس میں۔"

"پھر تو اچھا ہی ہوگا میری طرح......"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "تم ملو گے تو معلوم ہو جائے گا۔ اب ویسے تو تم دونوں لوبرڈز جہاں چاہو بسیرا کرو، لیکن دعوت دینا میرا اخلاقی فرض ہے، رات کو فریال بھی ادھر ہی ہوگی، چاہو تو آجانا، ہم کھانا ساتھ کھا سکتے ہیں۔"

نور نے فوراً ہامی بھرلی۔ "آجائیں گے، گپ شپ رہے گی۔"

شائستہ کے جانے کے بعد میں نے بل طلب کیا۔

"اتنی جلدی کیا پڑی تھی اقرار کرنے کی، شائستہ نے گھر میں کوئی مہمان خانہ کھول رکھا ہے، ایک فریال ہی کافی ہے، ہم کہاں رہیں گے؟"

"افوہ......اتنے غصے میں آنے کی کیا ضرورت ہے، نہیں جانا تو کردیں گے کوئی بہانہ۔"

میں نے کہا۔ "دراصل، فریال سے دور ہی رہنا چاہتا ہوں، جب تعلق ہی ختم ہوگیا تو پھر ملنا کیسا اور وہ کون سا مجھ سے ملنے آئی تھی، اس کو اپنا کام نمٹانا تھا۔"

نور نے مجھے بڑی عجیب سی نظروں سے دیکھا لیکن بولی کچھ نہیں۔ شائستہ کا دیا ہوا کارڈ میرے پاس تھا، میں نے بہتر سمجھا کہ اس سے مل لوں۔ یہاں قانونی معاملات میں پولیس اور عدالتوں کی کارکردگی قابل رشک ہے، کسی بھی کیس میں تاخیر ممکن ہی نہیں۔ لارڈ ارنسٹ جس طرح سے مصالحت کے لیے کوشش کر رہا تھا اور سوچنے سمجھنے کا موقع دیے بغیر مقدمات ختم کرنے کے لیے دباؤ ڈال رہا تھا اس میں ذاتی مفاد کا پہلو بہت نمایاں محسوس ہوتا تھا۔ خواہ اس سے میری پوزیشن غیر محفوظ ہوجائے، میں کسی وکیل سے رہنمائی چاہتا تھا تاکہ میری قانونی اور اخلاقی پوزیشن پر حرف نہ آئے۔

قدرتی طور پر وکیل نے اپنا آفس وہیں بنایا تھا جہاں

پاکستانی بڑی تعداد میں آباد تھے، طرز زندگی دیکھتے ہو یورپی اور امریکی عوام ان کے درمیان فرق کو سمجھنے سے رہتے تھے اور سمجھایا جائے تو سیاسی اختلاف کی بنا پر انھیں مان لیتے تھے۔ جب وہ دیکھتے تھے کہ مغربی معاشرے میں اپنے لباس، زبان، کھانوں اور موسیقی رقص کے ذوق جیسے رکھتے ہیں تو سری لنکا اور بنگلا دیشی بھی ان کے "ایشیائی" ہوجاتے تھے۔ میں نے یہ بھی نوٹ کیا تھا کہ وہ اپنے معاشرتی اور سیاسی اختلافات فراموش کر کے قاموں کے مقابلے پر ڈٹ جاتے تھے اور مل کر اپنے مفاد کا تحفظ کرتے تھے۔ لیکن ایک شادی بیاہ کے معاملات دوسرے وراثت کے معاملات میں مسلمان اپنے مذہبی قوا پر کاربند تھے چنانچہ عام گھریلو جھگڑوں یا جائداد کے معاملا خواہ پاکستان میں ہوں انہیں کسی پاکستانی وکیل کی ضرور پڑتی تھی اور وہ وکیل بہت کامیاب تھے جو دونوں جگہ دفاتر رکھتے تھے اور دونوں ملکوں کے قانون سے واقف تھے

ملک ارشد کا آفس متاثر کن تھا۔ ظاہر ہے اس ٹاپ کے باعث جو بڑے وکیل شمار ہوتے ہیں وہ بڑی بھی وصول کرتے ہیں کچھ ایسا ہی معاملہ ڈاکٹروں کا بھی ہے ملک ارشد کا دفتر تین حصوں پر مشتمل تھا۔ ایک ویٹنگ روم جہاں اس نے ایک طرحدار ماڈل ٹائپ دیسی لڑکی کو دیا تھا کہ آنے والوں کا اپنی کاروباری مسکراہٹ سے استقبا کرے۔ ان کو اپائنمنٹ دے، ان سے فیسیں وغیرہ وصو کرے اور انہیں ترتیب وار اندر بھیجے، جہاں مہمانوں کے لیے پرتکلف صوفے تھے اور انتظار کے دوران میں ان کی تواضع کافی سے بھی کی جاتی تھی۔ ظاہر ہے اس وقت نہ لیکن بعد میں کلائنٹ اس سب کی پیمنٹ اپنی جیب سے ادا کرتے تھے۔ دوسرے حصے میں وکیل صاحب کا دفتر عملہ بیٹھتا تھا اور مقدمات کا ریکارڈ تھا چنانچہ عملے کے سوا کسی ادھر جانے کی اجازت نہ تھی۔ تیسرے حصے کے بھی دو حصے تھے، نصف میں ملک صاحب بیٹھتے تھے...... باقی نصف کو ان کے دو ماتحتوں نے آپس میں بانٹ رکھا تھا۔ وہ فراغت کا وقت تھا۔ رش کے اوقات شام کے بعد رات تک ہوتے تھے میں نے کارڈ دیا تو کاؤنٹر والی حسینہ نے مجھے دلچسپی اور تجسس سے دیکھا "ست بدھائی؟...... یہ ریاست کہاں ہے سر؟"

میں نے کہا۔ "کیا یہ معلومات حاصل کرنا بھی آپ کے فرائض میں شامل ہے؟ کیا اس کے بعد آپ رقبہ، آبادی اور تاریخ جغرافیے کے سوالات بھی کریں گی؟"

وہ کچھ نروس ہوئی۔ "نو سر...... میں ملک صاحب کو بتا

تی ہوں۔"

وہ میرا نام تو انٹرکام پر بھی بتا سکتی تھی لیکن اس نے خود ر جا کے یہ بتانا ضروری سمجھا کہ ایک نواب صاحب آئے ں پاکستان سے جو شکل اور حلیے سے ایکٹر لگتے ہیں اور ان ے ساتھ جو لڑکی ہے وہ ماڈل نظر آتی ہے، اب پتا نہیں ان کی ں ہے کہ سیکریٹری یا کچھ اور...... جب وہ چند منٹ بعد باہر ئی تو اس کی مسکراہٹ مفقود تھی۔ "جائیں سر......" اس نے ضرا کہا اور اپنی جگہ بیٹھ گئی۔

ملک ارشد کو دیکھ کر مجھے اپنے الفاظ پر ندامت ہوئی جو ں نے طنزیہ انداز میں ڈاکٹر شائستہ سے کہے تھے۔ وہ سفید وں والا عمر رسیدہ شخص تھا اور جیسا کہ اس نے بعد میں خود کو بت کیا، ایک مہذب باخبر اور ذہین آدمی......اس نے بہت لیقے سے کپڑے پہن رکھے تھے، معلوم نہیں وہ دوسرے لوں سے بھی ایسے ہی اٹھ کے ملتا تھا یا اس نے میرا استقبال یادہ پرجوش انداز میں کیا۔

"آپ کے کارڈ نے مجھے حیران کیا۔" وہ ہاتھ ملا کے لا۔ "اور اس کے بعد آپ کی شخصیت نے، تشریف رکھیے۔"

میں نے کہا۔ "اب مجھے حیرت کی وجہ بھی بتا دیں۔"

"یہ اتفاق ایسا ہے...... کہ آپ سے میرا پہلے سے غائبانہ ارف تھا، پہلے ایک لیگل ایڈوائزر تھا آپ کا شہزاد، وہ میرا انجا ہے۔"

"آپ نے اچھا کیا کہ نام لیا تو رشتہ بھی بتا دیا، کیا اس نے کچھ بتایا تھا میرے بارے میں؟"

"اس کو تو میں نے ایک طرح سے عاق کر رکھا ہے، ں کی میری بات چیت بند ہے لیکن کیا کروں اس کی ماں ری بہن ہے اور آنکھوں سے معذور بھی ہے، کافی عرصہ لے اس نے آپ کا ذکر کیا تھا، خاصی تفصیل سے......اور وہ پ کی بہت تعریف کرتی تھی، بیٹے کی وجہ سے وہ بے حد دکھی ہے، خیر......"

"گویا آپ ست بدھائی کے نام سے واقف تھے۔"

"بالکل، اس لیے آپ کو اپنے آفس میں دیکھ کر مجھے رانی ہوئی، پھر آپ دیکھنے میں تو ذرا بھی نواب نہیں لگتے، راصل ہمارے ذہنوں میں راجوں مہاراجوں اور نوابوں کا لکل مختلف تصور ہے۔"

"یہاں میں شہزاد کے کسی حوالے سے آنا بالکل پسند نہ رتا، مجھے بھیجا ہے ڈاکٹر شائستہ نے۔"

اس نے سر ہلایا۔ "شہزاد کی وجہ سے آپ کی رائے رے بارے میں خراب نہیں ہونی چاہیے۔"

"شائستہ نے آپ کی تعریف کی تھی، اپنے معاملات کی وضاحت کے لیے مجھے کچھ وقت چاہیے۔"

"یہ وقت فراغت کا ہوتا ہے، آپ بولیں، کوئی آئے گا تو کچھ دیر انتظار کرلے گا۔" اس نے کہا۔

میں نے اختصار سے کام لیا، قانونی معاملات کو الگ رکھا اور اپنی مشکلات کے بارے میں الگ بتایا۔ وہ سر ہلاتا رہا اور ایک پیڈ پر نوٹ بھی لیتا گیا، میں نے بڑی کامیابی سے اپنا مسئلہ آدھے گھنٹے میں پوری طرح سمجھا دیا، درمیان میں نور کا حوالہ آیا تو اس کا تعارف بھی ہوا، آخر میں کسی ایسے پریزنٹر کی طرح میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ میں نے سب بتا دیا، اب آپ سمجھ لیں کہ میرے پاس وقت کم ہے، آپ ڈاکٹروں کی طرح ایمرجنسی کیس کی دگنی فیس لے سکتے ہیں۔ فیئر اور فاؤل...... مجھے خیر و عافیت کے ساتھ وطن واپس بھیجنا ایک چیلنج ہے، کیا آپ نے قبول کیا؟"

وہ ہنس پڑا کیونکہ میرا سوال کرنے کا انداز نکاح خواں جیسا تھا۔ "میں نے بالکل قبول کیا۔ میں جانتا ہوں ارجنٹ کیس کی فیس دینا آپ کے لیے مشکل نہیں لیکن میں ہتھیلی پر سرسوں جمانے کا کوئی دعویٰ نہیں کروں گا، میں لارڈ ارنسٹ اور اس کے قانونی مشیر سے بات کرلوں، اس کے بعد ہی کچھ بتا سکوں گا۔"

"میں آپ سے پھر کب بات کروں؟"

"کل میں خود آپ کو بتا دوں گا۔"

"آپ کا طویل تجربہ ہے ملک صاحب، آپ کو میرے کیس میں جان نظر آتی ہے؟......یعنی حس کیا کہتی ہے آپ کی؟"

"ہم غلط امیدوں پر کلائنٹ کو اپنے جال میں گرفتار رکھنے والے بدنام لوگ ہیں، لیکن آپ کو میں ایمانداری سے بتا رہا ہوں اگر میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی اور کیوں پڑے گا جھنجٹ میں...... فریقِ ثانی صلح چاہتا ہے تو صلح ہوجائے گی...... ایز سمپل ایز دیٹ...... پانی اپنا راستہ خود بنا لیتا ہے، قانون کے ان گلی کوچوں سے ہم آپ کو نکال لیں گے جو چور راستے کہلاتے ہیں، جہاں قانون کی نظر نہیں جاتی۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا...... "بس آپ نے کیس سمجھ لیا...... میں اب مطمئن ہوں، یہ اندر کی بات ہے، جو ایک ہم زبان اور ہم وطن ہی سمجھ سکتا تھا۔"

ملک ارشد سے مل کر میرے اطمینان میں کئی گنا اضافہ ہوگیا تھا، مجھے شائستہ نے صحیح جگہ بھیجا تھا۔ نور نے کہا۔ "اب تو رات کو اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے جانا مزید ضروری ہوگیا ہے۔"

میں نے ملک ارشد کے آفس سے نکل کر اپنا موبائل فون چیک کیا تو اس میں میرے لیے تین ایس ایم ایس تھے، پہلا لارڈ ارنسٹ کا تھا وہ مجھ سے ملنا چاہتا تھا۔ اسے میں دونوں طرف کے وکیلوں کی ملاقات تک آسانی سے موخر کرسکتا تھا۔ دوسرا چیف کا تھا جو کہیں روپوش تھا اور وہ بھی مجھ سے ملنا چاہتا تھا، اسے میں نے نظر انداز کردیا۔ تیسرا وحید نے بھیجا تھا۔ اس نے پوچھا تھا کہ کیا میں اس کے ساتھ کیے ہوئے وعدے کو بھول گیا ہوں؟

یہ مسئلہ غور طلب تھا۔ مجھے اپنی کوتاہی کا احساس ہونے لگا، میں نے موبائل فون میں موجود نمبر پر رابطہ کیا تو ایک اجنبی آواز نے کہا۔ ''ہیلو۔''

میں نے کہا۔ ''کیا میری وحید سے بات ہوسکتی ہے؟''

''یہ آرٹ گیلری ہے، کسی چڑیا گھر سے معلوم کرو یا میوزیم سے۔'' فون بند ہوگیا۔

میں نے پھر نمبر ملایا۔ ''یہ کیا بدتمیزی ہے، ابھی اسی نمبر سے وحید نے مجھے ایس ایم ایس کیا تھا۔ وہ آرٹسٹ ہے اور تمہارے لیے کام کرتا ہے۔''

''موقع پا کے کسی نے فائدہ اٹھالیا ہوگا...... یہ سب کنگلے ایسی ہی حرکت کرتے ہیں، وحید اس وقت یہاں نہیں ہے، پھر فون مت کرنا۔'' فون پھر بند ہوگیا۔

مجھے سخت طیش آیا۔ میں نے کہا۔ ''نور...... میں اس یہودی کے خلاف جہاد کا اعلان کرتا ہوں۔''

''تم فلسطینی نہیں ہو۔''

''لیکن میں مسلمان ہوں اور اس وقت غصے میں بھی ہوں، چلتے ہیں اس کی طرف......''

''راستے میں کہیں سے تلوار بھی لے لینا۔''

''وہ کیا گانا تھا، میری نظریں ہیں تلوار۔ تو تم ساتھ ہو تو گویا اسلحہ خانہ ساتھ ہے۔ نگاہوں کے تیر، خنجر مژگاں، حسن کی توپ، شباب کا ایٹم بم۔''

یہودی مجھے دیکھتے ہی بدل گیا اور دانت نکالنے لگا۔ ''اچھا تم ہو، وہی جو اس کنگلے کو جھوٹی آس دلا کے بھاگ گئے تھے۔ اس کے جڑواں بھائی۔''

''تمہارے تمام الزامات بدنیتی پر مبنی ہیں اور بے بنیاد ہیں، اگر وہ میرا جڑواں بھائی ہے تو اسے کنگلا مت سمجھو کیونکہ ہم نواب ہیں اور کھڑے کھڑے تمہارا یہ سارا کاروبار خرید سکتے ہیں، بس اس وقت ہم غصے میں نہیں ہیں، یہ بتاؤ وہ کہاں ملے گا؟''

اس نے اوپر انگلی اٹھائی۔ ''یہ سوال اس عالم غیب سے کرو، خدا جانتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''گزشتہ روز جہاں وہ مجھے ملا تھا، دوسری بار وہ وہاں نہیں تھا، وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔''

''اس کی منہ بولی داشتہ اسے نکال کے لے گئی تھی، پولیس سے بچانے کے لیے، لیکن وہ کہاں جاسکتی ہے، پھر وہیں ہوگی، وہ ایک جادوگرنی ہے، وحید کو اس نے کہیں اور منتقل کردیا ہوگا، الو بنا کے۔ ایک بہت عقلمند مرد کو بھی عورت جو چاہے بنادے، مجنوں، پالتو کتا، زن مرید شوہر، فقیر یا بادشاہ۔''

میں نے چلتے چلتے آہ بھر کے کہا۔ ''بدقسمتی سے میں تمہارا دشمن ہونے کے باوجود تم سے متفق ہوں...... ایسا ہی ہوتا ہے۔''

''میں بھی ذاتی تجربے سے اخذ کردہ نتائج پیش کررہا تھا۔''

آگے جا کے نور نے بہت خفگی کا اظہار کیا۔ ''اس بڈھے یہودی سے اتنا اتفاق...... وہ تو خبطی ہے، بلکہ پاگل ہے۔''

میں نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔ ''وہ میں بھی ہوں۔''

ایک بار پھر میں نے خود کو اس قدیم گھر کے سامنے پایا جہاں یہودی کے مطابق ایک چڑیل یا جادوگرنی نے میرے ہمزاد کو الو بنا کر قید کر رکھا تھا، اندر جانے کا راستہ ایک مختصر ویران باغیچے سے گزرتا تھا۔ برآمدے کے کھلے دروازے کے سامنے رک کر میں نے کہا۔ ''ہیلو، کوئی ہے؟''

ایمی یا امینہ ایک دم نمودار ہوگئی۔ ''میں ہوں نا......''

ایمی کو ہرگز بڑھیا قرار نہیں دیا جاسکتا تھا۔ ابھی وہ زیادہ سے زیادہ ادھیڑ عمر کی تھی چالیس یا پینتالیس سال کی۔ بوڑھا تو خود کو ساٹھ سال کی عورت بھی نہیں سمجھتی اور کوشش کرے تو جذبات کے ساتھ جسم کو مصنوعی سہاروں پر جوان بھی رکھ سکتی ہے، ایمی نے شاید آدھی ادھوری کوشش کی تھی چنانچہ چہرے پر عمر کے اثرات غالب تھے، اس کا جسم اپنی قدرتی ساخت کے باعث اب بھی پرکشش تھا۔

میں نے کہا۔ ''وحید بھی ہے اندر؟''

''تمہارے ساتھ پولیس تو نہیں ہے نا، جو اسے قید کردے۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''قید اس نے مجھے کر رکھا ہے لیکن یہ پولیس نہیں، نور ہے۔''

اس نے برآمدے میں پڑی کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''بیٹھو وہ اپنی بے وقوفی کے باعث ایک مشکل میں پڑ گیا تھا۔''

''میں اکثر اپنی عقل مندی کے باعث پڑتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''پولیس اسے گرفتار کرنے بھی آئی تھی لیکن ایک دوست نے بروقت اسے بچالیا، وہ تمہیں بھی جانتا ہے۔''

میں نے حیرانی سے کہا۔ ''اس کا اور میرا ایسا کون سا

...کہ دوست نکل آیا؟''

''وہ بہت سے پاکستانیوں کو جانتا ہے اور لوگ اسے بڑے ...نام سے یاد کرتے ہیں کیونکہ وہ سب کی مدد کرتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''فرشتے لندن میں بھی رہتے ہیں۔ یہ ...علم نہیں تھا، مجھے آج بلکہ ابھی کچھ دیر پہلے وحید کا ایس ایم ...موصول ہوا تھا۔ وہ مجھ سے ملنا چاہتا تھا لیکن مجھے معلوم ...تھا کہ وہ کہاں ہوگا۔ میں اس آرٹ ڈیلر کی شاپ پر گیا ...کیونکہ ایس ایم ایس اسی کے نمبر سے کیا گیا تھا۔''

امینہ کے ماتھے پر سوچ کی ایک شکن نمودار ہوئی۔ ابھی ...دیر پہلے اور موبائل فون تو وحید کے پاس بھی ہے اور اس ...دوست کے پاس بھی۔''

میں نے کہا۔ ''اگر دونوں نمبر مجھے دے دو۔''

''سوری...... اس نے رازداری کے لیے مجھے منع کر ...ا ہے کہ نمبر کسی کو نہیں بتانا، اگر تم خود آئے ہو تو میں یہ کرسکتی ...ں کہ تمہیں وہاں لے جاؤں۔''

''کیا مطلب؟ وہ کہیں اور ہے؟''

...اس کی حفاظت کرنا ضروری تھا، وحید خود بھی بہت ڈرتا ہے۔''

''پھر ہمیں یہاں وقت ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے۔''

امینہ برآمدے کے سامنے کھڑی ہوئی پرانی لیکن بیش ...ت مرسیڈیز میں بیٹھ گئی۔ لندن کے حساب سے دس سال ...رانے ماڈل کی مرسیڈیز پرانی تھی، پاکستان کے حساب سے ...نہیں جہاں چالیس سال پرانے ماڈل کی ہر گاڑی سڑک پر ...ی طمطراق سے رواں دواں نظر آتی ہے جیسے لندن کی سڑک ...پر سرخی پوڈر تھوپے اور جدید ترین لباس پہنے ستر سالہ حسینہ۔''

میں نے کہا۔ ''گھر ایسے ہی لاوارث اور کھلا پڑا رہے گا؟''

امینہ مسکرائی۔ ''اندر میرا وفادار ڈیوڈ ہے۔'' اس نے ...ہارن بجا کر اپنی روانگی کی اطلاع دی تو چھ فٹ قد کا لمبا تڑنگا ہٹا ...کٹا حبشی اندر سے نمودار ہوا۔ اس نے گیلس والی پتلون بغیر ...آستینوں والی ٹی شرٹ اور چارخانے والی کیپ لگا رکھی تھی۔

وفاداری کا تصور لندن میں ایک نہیں...... اس کی ...نوعیت بھی ضرورت اور تعلق کے ساتھ بدلتی رہتی ہے لیکن ...زیادہ اہم وہ معاوضہ ہے جو کسی کی خدمت کے عوض ادا کیا ...جاتا ہے، یہ ایک خالص کاروباری رشتہ ہوتا ہے جس کا ...جذبات سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ یہ میرے خیالات کی ...پراگندگی نہیں تھی، کچھ سابقہ اور کچھ حالیہ تجربات کا سبق تھا، ...دس ہزار پاؤنڈز میں یہ حبشی اس عورت کے ساتھ سونے کے ...لیے ہر رات حاضر ہوسکتا تھا، یا جب ضرورت ہو اور عارضی ...محافظ شوہر بن کے ساتھ بھی رہ سکتا تھا۔

چند گلیاں گھوم کے گاڑی ایک گھر کے سامنے رک گئی۔ یہ نسبتاً چھوٹے گھر اور کم آمدنی والے لوگوں کا علاقہ تھا۔ امینہ نے کال بیل بجائی تو کسی نے اوپر ہی سے گیٹ کو ان لاک کر دیا، ہم آگے پیچھے زینہ چڑھتے اوپر پہنچے تو میں نے اپنے سامنے چیف کو دیکھا اور رک گیا۔

''تم......؟'' میں نے حیرانی اور برہمی سے کہا۔

''اندر آجاؤ، میں جانتا تھا کہ تم آؤ گے۔'' وہ بڑے اسٹائل سے ایک سگار پی رہا تھا۔

امینہ کے پیچھے میں ایک کمرے میں رک گیا جو بیک وقت بیڈروم بھی تھا اور سٹنگ روم بھی...... ایسے ایک بیڈ کے اپارٹمنٹ کو اسٹوڈیو اپارٹمنٹ کہا جاتا ہے، اس سے ملحق مختصر ترین جگہ میں ٹائلٹ کے لیے ایک گوشہ تھا، دوسرے گوشے میں کیبنٹ جو کچن کا خلاصہ ہوتا ہے، بے ترتیبی کمرے کے اسباب سے عیاں تھی۔

''اپنے لیے جگہ بناؤ اور بیٹھو۔'' چیف نے ایک ہاتھ سے اشارہ کیا۔

''میں تم سے ملاقات کے شوق میں نہیں آیا تھا۔'' میں نے کہا۔

''مجھے معلوم ہے کہ تم کیوں آئے ہو۔'' چیف نے سکون سے کہا۔

''تم لوگ بھی ایک دوسرے سے واقف ہو۔'' امینہ ایک صوفے پر بیٹھ گئی۔

''شیطان سے کون واقف نہیں ہوتا۔'' میں نے کہا۔

''یہ نواب صاحب نے اپنے بارے میں نہیں کہا۔'' چیف نے گویا امینہ سے مذاق کیا اور اس پر خود ہی ہنسا۔

نروس ہونے کے باوجود نور بھی امینہ کے ساتھ ہی بیٹھ گئی اور اس سے جڑ کر میں نے اپنے لیے جگہ بنائی۔ ''چیف یہ کیا گیم ہے؟''

چیف ہم سب کے مقابل بیڈ پر آلتی پالتی مار کے بیٹھ گیا۔ ''وہی جو ہم تم سب مل کر کھیلتے رہے، برسوں...... اس کی تفصیلات میں جانے سے کیا حاصل۔''

''وحید کہاں ہے؟''

''میری حفاظتی تحویل میں...... فکر کی بالکل کوئی بات نہیں، جب میں پاکستان آؤں گا تو اسے بھی اپنے ساتھ لے آؤں گا...... ست بدھائی۔''

''میں ست بدھائی میں تمہاری شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتا۔''

''اس پر تو ہمارے درمیان مفاہمت ہوگئی تھی۔'' وہ عیاری سے بولا۔

''وہ میری غلطی تھی۔''

چیف نے افسوس سے سر ہلایا۔ ''آدمی کو اتنی جلدی کرنا نہیں چاہیے اور جو اتنی جلدی معاہدے سے پھر جائے، وہ کس طرح اعتماد کے قابل ہو سکتا ہے، یہ بات وحید کو بھی سوچنی چاہیے۔ تمہارا کیا خیال ہے امینہ؟''

''مجھے نواب رفیق کی زبان پر اعتبار تھا۔''

''دیکھو، امینہ کو بیچ میں مت لاؤ، اسے کچھ معلوم نہیں۔''

چیف نے سگار بجھا دیا۔ ''اوکے، ڈیل یا نو ڈیل؟ ہمارے درمیان جو ایگریمنٹ ہوا تھا، ہم اس پر قائم رہیں گے، ایمانداری سے، اور نہیں رہیں گے تو پھر مجھے وحید کو سمجھانا پڑے گا کہ وہ تم پر اعتبار نہ کرے، ایک مخلص دوست کی حیثیت سے وہ میری رائے پر بہت بھروسا کرتا ہے، میں نے اس کے قرض بھی بے باق کر دیے ہیں، چنانچہ وہ میری رائے پر بھروسا کرتا ہے اسے یوں سمجھو کہ وحید اب اس پیکیج ڈیل کا حصہ ہے۔''

میں نے غصے کو ضبط کیا۔ ''یہ بلیک میلنگ ہے چیف۔''

''نہیں۔ ہم دونوں شریف اور عزت دار ہیں، ایسے کام نہیں کرتے، ہمیں ایک دوسرے کے مفاد کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔''

''تم نے وحید کو خرید کے استعمال کیا اور اب اسے ایک لیور بنا رہے ہو مجھے استعمال کرنے کے لیے، میں سمجھ گیا ہوں چیف...... تم وحید کو اپنے ساتھ لے گئے، اس کے سب سے بڑے قرض خواہ، اس یہودی سے اس کی جان چھڑائی، پھر اس کو یقین دلایا کہ تم اسے بحفاظت پاکستان پہنچا دو گے، شاید میرے بارے میں بتایا ہوگا کہ میں تو اب جیل جاؤں گا، کیونکہ مجھے بہت سے الزامات کا سامنا ہے، اس کو تم اپنے ساتھ لے گئے تھے کہ ہوٹل میں نور اکیلی ہے اور ڈر رہی ہے، اسے ساتھ لے چلتے ہیں۔''

''یہ کیا اسٹوری ہے!......'' وہ مسکرانے لگا۔

''اس نے ہوٹل کے باہر ہی سے گیٹ کیپر سے کہا کہ روم نمبر ایک سو ایک سے نور کو بلا دو...... وہ سمجھا کہ نور کو میں بلا رہا ہوں، وہ دس پاؤنڈ لے کر گیا اور نور کو پیغام دے دیا کہ نیچے نواب رفیق آپ کے منتظر ہیں۔ وہ فوراً آ گئی اور اس نے بھی اندر سے دیکھا تو وحید کو رفیق سمجھا فرق تو اسے ٹیکسی میں بیٹھنے کے بعد پتا چلا ہوگا اور تب وحید کو بھی احساس ہوا ہوگا کہ اس سے ایک جرم کرا لیا گیا ہے لیکن اس وقت وہ کیا کر سکتا تھا، تم نور کو اپنے ساتھ لے گئے اور البرٹ کے حوالے کر دیا جو اس پاگل نواب زادی ایلیشا کا معاون خصوصی ہے اس نے کتنی رقم دی تھی تمہیں چیف؟''

''تمہیں اس سے کیا۔'' چیف اطمینان سے بیٹھا ر[ہا۔]

''نور کے اغوا کا الزام کسی پر نہیں آیا۔ گیٹ کیپر [یہی کہے گا] کہ اسے تو خود نواب رفیق اپنے ساتھ لے گئے تھے، میں [نے] خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا مگر وحید کو تم نے ڈرایا کہ [اگر] اب رفیق تمہارا نام لے گا، تم پکڑے جاؤ گے، خیریت چا[ہتے] ہو تو چپ کر کے بیٹھے رہو اور وہ تمہاری حفاظتی تحویل [میں] خاموش بیٹھا ہے کیونکہ اب وہ صرف تمہارے ساتھ پاک[ستان] جا سکتا ہے۔''

''ہاں، ایسا ہی سمجھتا ہے وہ......''

امینہ گھبرا کر کھڑی ہو گئی۔ ''یہ سب کیا چکر ہے؟''

''امینہ تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ خود کو اس معا[ملے] سے دور اور الگ رکھو۔''

''میرا بھی یہی خیال ہے، میں چلتی ہوں۔'' وہ [ا]دم پلٹی اور زینے سے نیچے اتر گئی۔

''یس، اب بتاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''کیا خیال ہے؟''

''کچھ نہیں، نہ امینہ کے آنے سے صورتِ حال بدلی نہ جانے سے بدلی ہے، جب میں آؤں گا تو وحید بھی آ جا[ئے] گا۔'' چیف نے سگار پھر سلگایا۔

نور میرا ہاتھ بار بار دبا رہی تھی کہ میں غصے میں کوئی [ا]قدم نہ اٹھاؤں لیکن میں خود بھی دیکھ رہا تھا کہ چیف کا ا[یک] ہاتھ جیب سے ریوالور نکالنے کے لیے تیار ہے، یہ ڈر نہ [ہوتا] تب بھی شاید مار پیٹ سے میں اپنی بات نہیں منوا سکتا، شا[ید] اپنی مشکلات بڑھا لیتا، غصے کی ابتدائی لہر گزر گئی تھی اور م[یں] اس پوزیشن میں آ گیا تھا کہ عقل استعمال کر سکوں۔

میں نے سوچ کر کہا۔ ''پاکستان میں صورتِ حا[ل] بہت مختلف ہو گی چیف۔''

''میں جانتا ہوں، میں تمہیں شکایت کا کوئی موقع نہیں دوں گا اور اپنی ذمے داری نبھاؤں گا۔''

میں نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ ''ایسی صورت میں، ڈ[یل] اپنی جگہ ہے، اب یہ بتا دو کہ تم وحید کے ساتھ کب آؤ گے؟''

اس نے فاتحانہ انداز میں مصافحہ کیا۔ ''مجھے پورا یقین [تھا] تھا کہ تم سمجھدار آدمی ہو، کسی بات پر اڑ کر اپنا نقصان نہیں کرو گے۔ زندگی کے تجربے سے سیکھ چکے ہو کہ کامیابی کی را[ہ] پر سمجھوتا ہر قدم پر ضروری ہوتا ہے۔''

''تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔''

''ہم پہلی فرصت میں جائیں گے، پہلے تم تو پہنچو، یہ نہ ہو کہ دلہن حاضر، برات غائب۔''

میں کھڑا ہو گیا۔ ''تم اگر یہ سمجھ رہے ہو کہ میرا کچھ وقت

[ی]ہاں کی کسی جیل یاترا میں گزرے گا تو غلط سمجھ رہے ہو۔''

''یعنی لارڈ ارنسٹ نے مصالحت کی درخواست کی [ہ]ے، اگر وہ قانونی جنگ لڑتا تو تمہارا کیا جاتا، اس کی سیاسی [سا]کھ لگی ہوئی تھی داؤ پر...... اس کی بیٹی کی عشق میں دیوانگی کی [ک]ہانی میڈیا میں چلتی، مسالے کے ساتھ...... اس میں سنسنی [خی]زی کا تڑکا لگایا جاتا، چلو اچھا ہوا، ویسے یہاں کے جیل [خ]انے اتنے برے نہیں ہوتے، میں دیکھ چکا ہوں۔'' وہ ہنسا۔

میں نور کے ساتھ نیچے اتر گیا۔ امینہ عرف ایمی جس نے [ش]وقیہ ایک آرٹسٹ بھی پال رکھا تھا تا کہ سماجی تقریبات میں [اپن]ے ساتھ لے جا سکے، وحید کے ساتھ چیف کے مجرمانہ تعلق کا علم ہوتے ہی بھاگ گئی تھی، شاید آئندہ وہ کسی وحید نام کے شخص سے آشنائی کا الزام ہی قبول نہ کرے۔

ایک ٹیکسی مجھے دروازے پر ہی مل گئی، میرے فیصلہ کرنے سے پہلے ہی نور نے اسے ڈاکٹر شائستہ کے گھر کا پتا بتا دیا، لندن میں گھروں کے نمبر، گلیاں اور سڑکیں اس ترتیب سے ہیں کہ ٹیکسی ڈرائیور نیا نہ ہو تو اسے رہنمائی کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ وہ مسافر کو صحیح جگہ لے جا کے اتار دیتا ہے۔

''یہ شخص تو بڑا ہی حرامی ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہیں جی؟ گالاں کیوں کڈ رہے ہو بادشاہو۔'' سکھ ٹیکسی ڈرائیور نے پلٹ کے پوچھا۔ ''ساڈا قصور تے دسو۔''

ہنسی آنے سے میرا غصہ کافور ہو گیا۔ ''سردار جی آپ سے نہیں کہا۔ یہ ہماری آپس کی بات ہے۔''

نور نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ''میرے ساتھ لندن کیا آئے ایک دلدل میں اتر گئے۔''

''پاگل ہو تم جو ایسا سوچتی ہو، تم عائشہ کے پاگل پن کی ذمے دار نہیں ہو۔''

''ذمے دار تو تم بھی نہیں سمجھے جا سکتے۔''

''شاید میں کسی حد تک ہوں اور نہیں بھی، دکھ اس بات کا ہے کہ وہ میری زندگی کا ایک خوبصورت یادیں رکھنے والا باب تھا جو اس افسوسناک طریقے پر ختم ہوا۔ میں تمہارے ساتھ نہ آتا، اکیلا وحید کو لے جانے کے لیے آتا، تب بھی یہی ہوتا، آنے سے پہلے میں کیسے اندازہ کر سکتا تھا کہ عائشہ اب کیا کرے گی۔''

''میں تو منت مان چکی ہوں، چالیس دیگوں کی نیاز دوں گی اور چادر چڑھاؤں گی داتا صاحبؒ کے مزار پر...... خیر و عافیت کے ساتھ واپس پاکستان پہنچ جائیں۔''

میں نے ہنس کے کہا۔ ''شکرانے کے دو نفل میں بھی ادا کروں گا...... زندگی انہی تجربات کا نام ہے، کچھ تمہارے، کچھ میرے، کچھ ہمارے مشترکہ، وقت رک جائے تو سب ختم۔''

خلاف توقع ڈاکٹر شائستہ گھر میں اکیلی تھی۔ فریال کے نہ آنے سے وہ مایوس تھی۔ ''دن میں تو وہ شوٹنگ میں مصروف رہی ہو گی۔ میں نے فون نہیں کیا۔ ابھی کچھ دیر پہلے بات ہوئی تو کہہ رہی تھی کہ شاید میں آ نہ سکوں، پھر صبح صبح اتنی دور آنے کا مسئلہ ہو گا، جس ہوٹل میں پورا یونٹ مقیم ہے وہاں کمرا اس کے لیے بھی بک ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اب وہ صرف تمہاری سہیلی نہیں رہی۔ اسٹار بن گئی ہے، کام اس کے لیے اولیت رکھتا ہے۔''

''ایسا ہونا بھی چاہیے۔'' نور نے کہا۔

''خوش فہمی مجھے بھی کوئی نہیں...... میرے بارے میں خبر بھی اس نے ضرور دیکھ لی ہو گی لیکن یہاں وہ میرے لیے پریشان ہو کے نہیں، اپنے کام سے آئی ہے اور اب اس نے کنٹیکٹ ایسے بنا لیے ہیں کہ اس کی مصروفیت بڑھتی جائے گی۔''

''تم لوگوں نے کھانا تو نہیں کھایا ہے نا۔ میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی، چلو کہیں چلتے ہیں۔''

''پلیز شائستہ، میں بہت تھکی ہوئی ہوں۔'' نور لیٹ گئی۔

''اچھا، تو کھانا منگوا لیتے ہیں۔'' شائستہ نے فون اٹھا لیا۔

اس رات ہم پھر اسی ترتیب سے سوئے، میں سٹنگ روم میں رہا، شائستہ نے نور کو اپنے بیڈ پر جگہ دی۔ میں نے نوٹ کیا کہ صبح ناشتے پر نور کا موڈ کچھ آف تھا، وہ شائستہ سے کچھ کھنچی ہوئی تھی۔ ناشتے کے فوراً بعد مجھے ملک ارشد کا فون موصول ہوا۔ ''نواب صاحب، ہم نے آپ کے قانونی مسئلے تو نمٹا دیے۔''

''اتنی جلدی ملک صاحب، راتوں رات۔''

وہ ہنسا۔ ''میری لارڈ صاحب سے ہی بات ہو گئی اور اس کے قانونی مشیر سے بھی۔''

''پھر کیا میں جاؤں پاکستان؟''

''ایسے نہیں سر...... رسمی طور پر عدالت میں حاضر تو ہونا پڑے گا۔ پیپرز ہم تیار کر لیں گے، آپ شام کے وقت آ کے سائن کر دیں بلکہ کل والے ٹائم پر آ جائیں تو اچھا ہے، کچھ فرصت ہوتی ہے۔''

''میں آ جاؤں گا، عدالت میں پیشی کب متوقع ہے؟''

''کل نہیں تو پرسوں، اس کی اطلاع آپ کو پولیس دے گی، تمام فریق وہاں موجود ہوں گے۔''

''عائشہ بھی؟''

''اس کا بیان حلفی پیش کیا جا سکتا تھا لیکن اس کے باپ نے کہا ہے کہ وہ خود حاضر ہو گی تو اس کی مرضی۔''

''وہ کوئی نیا تماشا نہ کردے، اس کے دماغ کا کیا بھروسا۔''

''ہم اسے روک تو نہیں سکتے۔''

ابھی میں ملک ارشد سے بات کر رہا تھا کہ موبائل پر دوسری کال موصول ہونے کا اشارہ مل گیا۔ یہ دوسری کال لارڈ ارنسٹ کی تھی۔

''میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں بلکہ میرے ساتھ عائشہ بھی تم سے ملاقات کی خواہش مند ہے۔''

''میرے دل میں ایسی کوئی خواہش نہیں ہے۔ سوری لارڈ، وہاں آ کے مجھے تمہارے قانونی مشیر کے ساتھ ملنا ہے، جو پیپر سائن کرنے ہیں کورٹ میں جانے سے پہلے، وہ میں سائن کر دوں گا۔''

''عائشہ ابھی تک اسپتال میں ہے۔''

''یہ تم مجھے کیوں بتا رہے ہو کہ وہ کہاں ہے، اسے مینٹل ہاسپٹل میں ہی ہونا چاہیے، میرا اس پاگل سے کوئی تعلق نہیں۔''

''ول یو پلیز شٹ اپ...... یہ مت بھولو کہ وہ میری بیٹی ہے اور اس حال میں وہ تمہاری وجہ سے پہنچی ہے، یو باسٹرڈ......'' وہ چلانے لگا۔

پیچھے سے عائشہ نے چیخ ماری۔ ''ڈیڈ، اسٹاپ دس، مجھے بات کرنے دو۔''

''تم ٹھہر دایلیشا، آخر وہ خود کو سمجھتا کیا ہے، یہاں بھی وہ نواب ہے، میں اس کی ساری اکڑفوں نکال دوں گا، ہاں اب بات کرد مجھ سے، تم آرہے ہو یا نہیں، میں اس کے کمرے سے باہر آ گیا ہوں۔''

''نہیں، میں بتا چکا ہوں۔''

''یہ تم بھی سن لو، میں اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دوں گا، میں جو بھی کر رہا تھا اسی بیٹی کی خاطر کر رہا تھا، اگر ایسے جذبات رکھتے ہو تم اس کے لیے، تو پھر یقیناً میں نے تمہیں سمجھنے میں غلطی کی، تم نے ایلیشا کے بارے میں ایسے الفاظ استعمال کر کے میرے جذبات کو سخت ٹھیس پہنچائی ہے، تذلیل کی ہے میری، میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں یو سن آف اے بچ، میں تمہیں جیل میں سڑا دوں گا۔''

''لارڈ ارنسٹ، تم ہوش میں نہیں ہو۔''

''یہ پتا چل جائے گا تمہیں، تم ایلیشا کو پاگل خانے میں دیکھنا چاہتے ہو؟ میں تمہیں جیل خانے میں پہنچا کے دم لوں گا، میرا جو ہو سو ہو، اب کوئی مصالحت نہیں، ہم کورٹ میں ملیں گے۔''

مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ بات یوں اچانک بگڑ جائے گی، لارڈ ارنسٹ کا میری ایک بات سے نروس بریک ڈاؤن ہو جائے گا، غلطی میری ہی تھی کہ میں نے اپنی پوزیشن کا غلط اندازہ کیا، شاید قانونی طور پر میں بہتر پوزیشن میں تھا اس گمان میں تھا کہ چونکہ میرے مقابلے میں لارڈ ارنسٹ سیاسی اور سماجی پوزیشن کو اس کیس کی پبلسٹی سے بہت زیادہ نقصان ہوگا جو وہ افورڈ نہیں کر سکتا۔ میں نے یہ نہیں سوچا تھا اس کی عمر کا آدمی جب مایوسی اور ڈپریشن کی انتہا کو پہنچ جاتا ہے تو خودکشی بھی کر لیتا ہے اور قتل بھی کر دیتا ہے، اگر وہ خود کو تباہ کرنے پر تل گیا تو یہ، ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے، والی پوزیشن ہو جائے گی۔

نور نے کہا۔ ''کیا ہو گیا، کیا کہہ دیا اس نے تمہیں؟''

میں چونکا۔ ''ارے یار، بس میرے ہی منہ سے ایک غلط بات نکل گئی اور بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔''

ابھی میں نور کو بتا ہی رہا تھا کہ میرے موبائل فون کی گھنٹی بجنے لگی، یہ وہی نمبر تھا، میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر نور کو خاموش کیا۔ ''وہی ہے پھر۔''

لیکن ایسا نہیں تھا، دوسری طرف اب عائشہ تھی اور رو زار و قطار رو رہی تھی۔ ''رفیق ایسا کیا کہہ دیا تم نے ڈیڈ سے سوچے سمجھے بغیر۔''

''کیوں، کیا ہوا......؟ تم رو کیوں رہی ہو؟''

''دیکھو، اگر ڈیڈ کو کچھ ہوا، تو میں تمہیں چھوڑوں گی نہیں میں پاگل تھی تمہارے لیے لیکن اب نہیں ہوں، وہ جیسا بھی ہے میرا باپ ہے۔''

''مجھے بتاؤ آخر ہوا کیا ہے؟''

''وہ کمرے سے باہر تھے اور اسپتال والے انہیں اٹھا کے لے گئے ہیں اور انہیں اسٹروک ہوا ہے تمہاری وجہ سے...... ہارٹ اٹیک۔''

''ہارٹ اٹیک؟'' میں سنبھل گیا۔ ''مگر میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔''

''جھوٹ بولتے ہو تم، میں ان کے چلانے کی آواز سن رہی تھی۔''

''اچھا میں آتا ہوں عائشہ۔'' میں نے پریشانی سے کہا اور فون بند کر دیا۔

شائستہ نے چابی میری طرف اچھالی۔ ''میری گاڑی لے جاؤ۔''

نور نے کہا۔ ''ہمیں ٹیکسی مل جائے گی۔''

لیکن میں نے نور کو کھینچ لیا۔ ''ہم دیر نہیں کر سکتے۔''

''لیکن رفیق...... تمہیں لندن کے راستوں کا......''

میں نے برہمی سے کہا۔ ''سب راستے معلوم ہیں مجھے، تم چلو۔''

''جان، اس کیفیت میں تمہارا ڈرائیو کرنا مناسب نہیں۔''

''میں ٹھیک ہوں، تم آرہی ہو یا میں جاؤں؟''

وہ میرے پیچھے لپکی۔ ''میں تمہیں اکیلا نہیں جانے دوں گی۔''

اس کے گاڑی میں بیٹھتے ہی میں نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ ''میں چار سال لندن میں دن رات گاڑی بھگاتا رہا ہوں۔''

وہ منہ پھلا کر بولی۔ ''میں واپس یہاں نہیں آنا چاہتی تھی، اب آنا پڑے گا یہ گاڑی واپس کرنے کے لیے۔''

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ ''شائستہ سے خفا ہو تم، میں صبح نے نوٹ کر رہا ہوں۔''

''تم نے ٹھیک اندازہ کیا تھا، وہ جیسی نظر آتی ہے، ویسی ہے نہیں۔ کہنے کو ڈاکٹر ہے، باعزت اور ذمے دار ہے۔''

میرا دل ڈوبنے لگا۔ میرے دل کا چور چلانے لگا، ضرور شائستہ نے اسے بتا دیا ہے، ایک رات پہلے کی کوئی بات یا نور کو شک ہو گیا ہے۔

میں نے کہا۔ ''ایسی کیا بات ہو گئی آخر...... کہ تمہاری رائے اتنی خراب ہو گئی اس کے بارے میں۔''

''رفیق...... میں کیا بتاؤں، کل رات وہ مجھ سے کیسی باتیں کرتی رہی۔''

''کیسی باتیں؟''

''وہ مجھ سے سوال کرتی رہی، میرے...... زندگی کے تجربات کے بارے میں، جنسی تجربات۔ میرے اور تمہارے تعلق کے بارے میں پوچھتی رہی، انتہائی بے شرمی کے سوال......''

''یار لڑکیاں کیا ایسی باتیں نہیں کرتیں؟ لڑکے تو کرتے ہیں؟''

''وہ آپس میں بے تکلف دوست ہوتے ہیں...... سہیلیاں ہوتی ہیں اور...... اب میں کیا کہوں، وہ تو عجیب ہی باتیں کر رہی تھی، اس کا کہنا تو یہ تھا کہ انسان بھی جانور ہے، جنس ایک حیوانی جذبہ ہے جس کا شرم اور اخلاقیات سے کوئی تعلق نہیں، جو چاہو کرو، یہ سب رشتے انسان کے ذہن نے تخلیق کیے ہیں ورنہ گائے، بھینس، بھیڑ، بکریاں ہمارے سامنے ہیں، ان کے لیے کیا محرم اور کیا نامحرم...... رومن اور مصری تہذیب میں نسل کو خالص رکھنے کے لیے بہن سے شادی ہوتی تھی۔''

میں نے کہا۔ ''دیکھو، وہ ایک بیمار ذہن کے ساتھ صحت مند نظر آنے والی عورت ہے۔ تم اسے روک دیتیں۔''

''روکا تھا۔ وہ بحث کرنے لگی، لیکن پھر حد ہو گئی، میں نے سخت تذلیل محسوس کی جب اس نے پوچھا کہ تمہارا تو وسیع تجربہ ہے، مردوں کے بارے میں...... پھر میں نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب، رہنے دو، مجھے تو لگتا ہے کہ مجھ سے زیادہ تجربہ تم رکھتی ہو اور تم تو اخلاقی قدروں پر بھی یقین نہیں رکھتی ہو، کہلاتی ہو ڈاکٹر۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے جو اس نے ایک انگلی سے صاف کر کے جھٹک دیے۔

''چھوڑو جان...... یہاں دہری شخصیت اور کئی چہرے رکھنے والے بہت لوگ ہیں، وہ نفسیاتی اور جنسی مریض ہے۔''

''کیا یہ بات فریال نہیں جانتی، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آج تک تمہیں معلوم نہ ہوئی ہو۔''

میں نے فوراً اپنا دفاع کیا۔ ''اس کی اور میری کبھی نہیں بنی، یہ پہلی اور آخری بار تھا کہ وہ شرافت دکھا رہی تھی۔''

''معلوم نہیں اس کے پیچھے بھی کیا گھناؤنا مقصد ہوگا، تم دیکھو کہ بدنام میں تھی اور یہ سب بڑی پاکباز شریف زادیاں اپنی شرافت کا ڈھنڈورا پیٹتی تھیں، تمہاری یہ فریال بھی، آ گئی نا اپنی اصلیت پر۔ بری میں تھی......'' وہ اب باقاعدہ آنسو بہا رہی تھی۔

ڈرائیونگ کرتے ہوئے میں اسے صرف زبانی تسلی دے سکتا تھا، میرا ذہن کئی طرف بٹا ہوا تھا۔ میرا دھیان سڑک کی ٹریفک پر تھا، مجھے یہ فکر بھی تھی کہ نہ جانے اسپتال پہنچنے پر مجھے لارڈ ارنسٹ زندہ بھی ملے گا یا نہیں اور وہ مر گیا تو عائشہ کا میرے خلاف کیا ردعمل ہوگا۔ اس کے بعد میرے قانونی معاملات کیا شکل اختیار کریں گے۔

نور نے نئی کہانی چھیڑ دی تھی، مجھے سخت جھنجلاہٹ ہو رہی تھی کہ بے وقوف عورت سمجھتی کیوں نہیں کہ اس وقت میرے لیے دیگر مسائل زیادہ توجہ طلب ہیں یا وہ فضول باتیں جو شائستہ نے کی تھیں، میرے نزدیک ان باتوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی، ان پر فرصت کے وقت بات ہو سکتی تھی۔

تاہم میں نے غصے پر قابو رکھا اور میری خاموشی یا میری صورت کے تاثرات سے نور نے خود ہی اندازہ کر لیا کہ وہ میری پریشانی میں اضافے کا سبب بن رہی ہے۔ وہ خاموش ہو گئی اور جب میں نے گاڑی اسپتال میں پارک کی تو اس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ ''آئی ایم سوری جان، اس وقت یہ باتیں کر کے میں نے بے تونی کی، تمہیں اور پریشان کیا۔''

میں نے کہا۔ ''اٹ از او کے۔ یہ بھی تو میری ذمے داری ہے کہ تمہاری بھی سنوں، خدا نے مجھے بڑی برداشت کی قوت دی ہے۔''

وہ پاکستان کا اسپتال نہیں تھا، انتہائی نگہداشت کے شعبے کی طرف تو کسی غیر متعلقہ شخص کے پھٹکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ لارڈ ارنسٹ کی حالت کے بارے میں بھی مجھے ڈاکٹرز نے کچھ بتانے سے انکار کر دیا۔ ''ابھی ہم کچھ نہیں بتا سکتے، خصوصاً غیر متعلقہ افراد کو۔''

میں نے کہا۔ ''میں ایک دوست ہوں۔''

''تم دشمن بھی ہو سکتے ہو۔'' جواب ملا۔ ''وہ کوئی عام آدمی نہیں ہے۔''

تاہم اس سے یہ تصدیق ضرور ہو گئی کہ ابھی تک وہ زندہ ہے۔ برطانیہ میں ڈاکٹر اپنے مریض کے بارے میں جو کچھ جانتا ہے اسے راز رکھنے کا پابند ہوتا ہے اور جب تک مریض اجازت نہ دے لواحقین کے سوا کسی کو کچھ نہیں بتاتا، بعض اوقات لواحقین کو بھی نہیں، دوسرا مسئلہ قانونی الجھنوں سے بچنے کا ہوتا ہے، تمام ذمے داری پہلے ڈاکٹر اور پھر اسپتال پر آ جاتی ہے۔ اگر انہیں یہ معلوم ہو جاتا کہ میں وہی شخص ہوں جس کی بات کے ردعمل نے لارڈ ارنسٹ کو آئی سی یو میں پہنچایا تو میری پوزیشن مزید خراب ہو جاتی، اب ایک صورت تو یہ ہو سکتی تھی کہ میں عائشہ سے ملوں لیکن یہ بھی عائشہ کی اجازت کے بغیر ممکن نہیں تھا، عائشہ سے اجازت مانگنا ایک الگ طوفان کو جنم دے سکتا تھا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ میں بیک ڈور سے ضروری معلومات حاصل کروں، اس معاملے میں میرا سابقہ تجربہ میرے کام آیا۔

میں نے نور کو ویٹنگ لاؤنج میں بٹھا دیا اور کیفے ٹیریا کی طرف چلا گیا، وہ جگہ صرف اسٹاف کے لیے مخصوص تھی، میں نے اپنے لیے مشین سے کافی لی اور خالی جگہ تلاش کی، ایک گوشے میں مجھے اسٹول نما کرسی مل گئی، ادھر ادھر گوری کالی نرسیں اور ڈاکٹر...... اور اسپتال کے دیگر شعبوں میں کام کرنے والے بیٹھے تھے، کوئی وہاں حرام خوری کرنے اور گپ لگانے نہیں آیا تھا، سب خود کو تازہ دم کرنے کے لیے مختصر کافی بریک دے رہے تھے۔

دو منٹ بعد میرے ساتھ والی کرسی خالی ہوئی اور اس پر ایک نوعمر سیاہ فام لڑکی آ بیٹھی جس کے لباس اور اطوار گواہی دیتے تھے کہ وہ نرسنگ جیسے مقدس پیشے کو بدنام کر رہی ہے اور تنخواہ سے زیادہ فارغ اوقات میں دوسرے دھندوں سے کماتی ہو گی، یہاں کوئی کسی کے ذاتی معاملات میں بالکل دخل نہیں دیتا چنانچہ کام ختم کرنے کے بعد فرصت میں جس کا جو دل چاہے کرے۔ ایسی لڑکیوں کا انداز تخاطب براہ راست ہوتا ہے، اس لڑکی نے بھی لگی لپٹی رکھے بغیر مسکرا کے مجھ سے سوال کیا۔ ''ہائے ہینڈسم، کیا تم اکیلے ہو؟''

میں نے بھی محاورے کے مطابق، روم میں وہی کیا جو رومن کرتے ہیں، میں نے کہا۔ ''کیا تم دس منٹ میں دس پاؤنڈ کمانا چاہو گی۔''

وہ کھل اٹھی۔ ''کیوں نہیں، میں فارغ ہوں، اور دس منٹ کی بھی کوئی قید نہیں، چلو۔''

میں نے پرس میں سے دس پاؤنڈ نکالے۔ ''میں یہیں بیٹھا ہوں، مجھے یہ معلوم کر کے بتاؤ کہ آئی سی یو میں لارڈ ارنسٹ کی کیا کنڈیشن ہے۔''

اس کی مسکراہٹ حیرانی میں بدل گئی۔ ''بس۔'' اس نے دس پاؤنڈز لینے کے بعد بچی ہوئی کافی کو حلق میں انڈیل لیا۔ ''میں ابھی آتی ہوں۔''

اس وقت ایک لمحے کے لیے بھی مجھے یہ خیال نہیں آیا کہ وہ دس پاؤنڈ لے کر غائب ہو جائے گی اور میں یہاں بیٹھا اس کی راہ تکتا رہ جاؤں گا۔ ہمارے ملک میں بھی بے ایمانی کے ہر کام میں ایمانداری نظر آتی ہے، یہاں لوگ زیادہ قول پرست ہیں، مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ وہ ٹھیک بارہ منٹ بعد نمودار ہوئی اور میرے سامنے بیٹھ گئی۔

''اس کی کنڈیشن STABLE ہو گئی ہے۔ اسٹروک معمولی تھا لیکن وہ پہلے سے دل کا مریض ہے، بوڑھا ہے اور شراب زیادہ پیتا ہے اس لیے ڈاکٹر دوسرے اٹیک کا امکان دیکھ رہے ہیں...... اور کچھ۔''

میں نے کہا۔ ''کون ہے تمہاری معلومات کا ذریعہ؟''

''اسے چھوڑو۔ آئندہ کبھی پیسے فالتو ہوں تو جین کو یاد رکھنا۔ اس نے مجھے ایک کاغذ کا پرزہ دیا جس پر اس کا فون نمبر لکھا ہوا تھا۔ ''میں بہت اچھی کمپنی بھی فراہم کرتی ہوں۔''

''میں یاد رکھوں گا۔ لارڈ ارنسٹ کی بیٹی ایلیشا بھی وارڈ میں ہے، اسے نفسیاتی کیس ہونے کے باوجود جنرل وارڈ میں رکھا گیا ہے، اگر تم اس سے ایک سوال کا جواب لا دو...... کہ رفیق تم سے ملنا چاہتا ہے، کیا وہ آ سکتا ہے؟ تو مزید دس پاؤنڈ تمہارے۔''

دس پاؤنڈ بہت بڑی رقم تھی، یہی کام شاید ایک پاؤنڈ میں بھی ہو جاتا لیکن میں رسک سے بچ رہا تھا، حسب توقع اس نے بڑے لالچ کے ساتھ دس پاؤنڈ جھپٹ لیے لیکن وہ کچھ دیر بعد نمودار ہوئی تو اس کا چہرہ اترا ہوا تھا۔

''وہ دواؤں کے زیر اثر ہے، تم اپنے پیسے واپس لے سکتے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''چلو نقصان آدھا آدھا تم نے کوشش تو کی۔''

میں نور کے ساتھ واپس جا رہا تھا کہ مجھے پولیس کے

ایڈم کی کال موصول ہوئی۔ ''مسٹر شیرازی ویسے تو کل و مقامی عدالت میں جج کے سامنے پیش ہونا تھا لیکن ی ابھی اطلاع ملی ہے کہ لارڈ ارنسٹ اور اس کی بیٹی ں میں ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے معلوم ہے۔''

''یہ ہو سکتا ہے کہ اس کیس کی سماعت غیر معینہ مدت یے ملتوی کر دی جائے، اس وقت تک تم کہیں نہ جانے بند رہو گے۔''

میں نے کہا۔ ''آئندہ تمام قانونی معاملات میں تم ے اٹارنی ملک ارشد کو بھی مطلع کرو گے۔''

''یہ میرا کام نہیں ہے۔''

میں نے کہا۔ ''میں یہاں کے قانون سے بالکل ف ہوں۔''

''یہ بھی میرا قصور نہیں ہے۔'' اس نے درشتی سے کہا ن بند کر دیا۔

اب میں ایک نئی صورت حال سے دوچار تھا جس میں ے لیے کچھ بھی یقینی نہیں تھا، یہ ہو سکتا تھا کہ لارڈ ارنسٹ کی ، چند دن میں سنبھل جائے اور وہ اپنے قانونی معاملات ٹنے کے قابل ہو جائے یا اس کا دل بیمار کسی دوسرے حملے ب نہ لا سکے اور تھم جائے۔ میری گلوخلاصی کا انحصار اس پر تھا کہ حالت میں بہتری آنے کے بعد بھی وہ مجھے سزا ، کے فیصلے پر قائم رہتا ہے یا میرے معافی مانگنے سے لمانہ روش پر لوٹ آتا ہے۔

اپنی عاقبت نااندیشی اب مجھ پر ظاہر ہو رہی تھی۔ اگر ڈپلومیسی سے کام لیتا اور بلاوجہ اس کے جذبات کو مجروح رتا تو معاملات جو صحیح سمت میں بڑھ رہے تھے طے اتے۔ اب اس کی تلافی اسی صورت میں ممکن ہے کہ مجھے کے سامنے دست بستہ حاضر ہو کے اپنی کم عقلی اور بداخلاقی رمندگی کے اظہار کا موقع ملے اور میں کسی طرح اسے پھر لات کو باعزت طریقے پر ختم کرنے کے لیے راضی سکوں، اس میں اتنا ہی اہم رول عائشہ کا بھی تھا، وہ انتقامی ان میں باپ کو مجبور کر سکتی تھی کہ میرا حشر نشر کر دے۔

ہم نے گاڑی کو واپس ڈاکٹر شائستہ کے گھر چھوڑا۔ ، وقت تک فریال کی کہیں سے کوئی خیر خبر نہیں ملی تھی، جس کی باتیں شائستہ نے نور سے کی تھیں ان سے میرے دماغ ، یہ اور شک کا کیڑا رینگنے لگا تھا کہ کہیں فریال بھی بدظن سے تو نہیں گئی۔ شائستہ کے ساتھ اس کی بے تکلف دوستی ، تھی۔ اس نے اپنی سہیلی کو بتا دیا ہو کہ تمہارا عاشق صادق بھی میری توقعات کے مطابق ایک جانور ہی ثابت ہوا۔

نور کے پاس فی الحال ایک رہائش تھی جہاں وہ اپنی مرضی سے آ جا سکتی تھی اور وہ تھا آرٹس اسکول کا ہاسٹل۔ ہم کسی ہوٹل میں بھی رہائش اختیار کر سکتے تھے لیکن موجودہ صورت حال میں مجھے نور کا یہاں مزید قیام بے مقصد لگتا تھا۔ وہ تھی کہ اکیلے واپس جانے پر راضی نہ تھی۔

آگے دو دنوں میں میری بات ملک ارشد سے بھی ہوئی اور اس نے لارڈ ارنسٹ کے قانونی مشیر سے بھی بات کی لیکن وہ خود بے یقینی کا شکار تھے۔ مجھے اب فکر تھی تو یہ کہ کہیں مجھے پاکستان کی عدالت سے ملنے والی مہلت تمام نہ ہو جائے اور میں یہاں کے معاملات میں الجھا رہوں، دو دن ہم نے گھومتے پھرتے گزارے لیکن اس دوران میں، میں نے مسلسل اسپتال سے رابطہ رکھا اور مجھے یہ معلوم ہو گیا کہ لارڈ ارنسٹ کی حالت بہت تیزی سے بہتر ہو رہی ہے اور اسے جنرل وارڈ میں منتقل کر دیا گیا ہے اور عائشہ دن کا زیادہ وقت باپ کے پاس گزارتی ہے تاہم ان دونوں میں سے کسی نے بھی مجھ سے رابطہ نہیں کیا تھا۔

تیسری صبح میں ایک ہوٹل کی ساتویں منزل کے شیشوں سے لندن کا نظارہ کر رہا تھا، باہر ایک نیم روشن آسمان والی دھندلی صبح تھی جس میں بہت دور سے بگ بین اور لندن آئی کا خاکہ سا دکھائی دے رہا تھا، میں سوچ رہا تھا کہ آخر یہ سسپنس کب ختم ہو گا۔ بالآخر مجھے کہاں جانا ہے؟ واپس اپنے دیس، اپنے ست بدھائی، اپنی حویلی میں اپنوں کے پاس...... یا دیارِ غیر کی کسی جیل میں، غیر معینہ مدت کے لیے۔

نور نے پیچھے سے میرے کندھے پر سر رکھا۔ ''کیا سوچ رہے ہو؟''

میں نے کہا۔ ''کچھ نہیں، میرے سوچنے سے ہو گا کیا۔''

''تم خوامخواہ اتنا پریشان ہو رہے ہو، اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

میں نے کہا۔ ''ایک شعر میرے حسب حال ہے۔

تہمتیں چند اپنے ذمے دھر چلے
کس لیے آئے تھے اور کیا کر چلے

نور نے کہا۔ ''تم میرے ساتھ آئے تھے، آرام کرنے، سیر کرنے، سو ہم گھوم پھر رہے ہیں، میں واپس تمہارے ساتھ جا رہی ہوں کیونکہ میرے آنے کا مقصد تو پورا ہو گیا، تم وحید کو لینے آئے تھے، وہ مل گیا۔''

''نور میری جان اور بھی بہت کچھ ہوا...... اور ہونے والا ہے۔''

"بھول جاؤ سب، جو ہونا تھا ہو گیا۔ آگے کچھ نہیں ہوگا۔ جو ہوگا اچھا ہوگا۔"

میں نے ہنس کے کہا۔ "تم پر کیا وحی نازل ہوئی ہے۔ ایسی طفل تسلیاں کیوں دے رہی ہو؟"

"آج صبح میں نے ایک خواب دیکھا اور میری ایک رشتے کی نانی یا دادی تھیں جو خوابوں کی تعبیر بتاتی تھیں، وہ کہتی تھیں کہ صبح فجر کی اذان سے پہلے کے خواب بشارت ہوتے ہیں، معلوم ہے میں نے کیا دیکھا؟ تم ہنسو گے، میں نے دیکھا...... اپنی ست بدھائی کی حویلی کے سامنے ایک اور عالی شان محل کھڑا ہے اور میں نے جو غور کیا تو وہ...... وہ تھا ارنسٹ مینشن۔"

مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ "ارنسٹ مینشن ست بدھائی میں۔"

"ہاں...... وہ ارنسٹ مینشن ہی تھا، عائشہ کے باپ کا محل، لیکن اس کے بند دروازے کے باہر جو گارڈ کھڑے تھے۔ وہ بالکل انہی کے جیسے تھے۔ جیسے ست بدھائی کی حویلی کے پھاٹک پر کھڑے ہوتے ہیں اور غنی تم سے کہہ رہا تھا کہ سر...... میں نے سوچا آپ کی واپسی سے پہلے یہ مکمل ہو جائے۔"

"تم پاگل ہو۔ بے تکے خواب دیکھتی ہو اور......"

اس نے احتجاج کیا۔ "خواب میں تو اشارے ہوتے ہیں۔"

اسی وقت میرے فون کی گھنٹی بجنے لگی اور میں نے نور کو الگ کر کے کال ریسیو کی۔ "ہیلو۔"

"نواب رفیق...... میں ملک ارشد۔"

"جی ملک صاحب، کیسے یاد کیا۔ کوئی پروگریس......"

"مجھے ابھی لارڈ ارنسٹ کے قانونی مشیر نے کنٹیکٹ کیا اور آپ کے بارے میں پوچھا۔ لارڈ ارنسٹ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"

"مجھ سے ملنا چاہتا ہے؟ کہاں......"

"اسپتال میں، اس نے مجھے بھی بلایا ہے۔ میرا اتفاق سے آج کوئی کیس نہیں ہے، میں پہنچ جاؤں گا۔ آپ کتنی دیر میں آسکتے ہیں؟"

میں نے گھڑی دیکھی۔ "ایک گھنٹا رکھ لیں، فاصلہ تو اتنا نہیں لیکن ٹریفک کے رش کا وقت ہے۔"

"نواب صاحب، مجھے امید ہے آپ اس موقعے سے فائدہ اٹھائیں گے، وہ ایک بیمار آدمی ہے...... اس کی دلآزاری ہوئی تھی۔"

میں نے کہا۔ "میں اس سے معافی مانگ لوں گا، مجھے واقعی اپنے رویے پر شرمندگی ہے۔"

ایک گھنٹے سے پہلے ہی میں اسپتال میں تھا، میں نے جینی کو فون کیا مگر وہ وہاں نہیں تھی، اس کا ڈے آف تھا۔ ہمت کر کے میں انفارمیشن کاؤنٹر تک گیا۔ "مس ایلیشا ارنسٹ، یہاں داخل ہیں۔"

ڈیوٹی پر موجود کلرک نے یہ نام کمپیوٹر پر ٹائپ کیا۔ "یہاں داخل تھی، دو دن ہوئے اسے ڈسچارج کر دیا گیا۔"

"اور اس کا باپ، لارڈ ارنسٹ......"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "ان کے بارے میں کسی کو بھی انفارمیشن پاس کرنے کی ممانعت ہے۔"

میں واپس ہوا اور ویٹنگ ہال میں ملک ارشد کا انتظار کرنے لگا۔ پانچ منٹ بعد میں نے اسے ایک ادھیڑ عمر کے بھاری بھرکم اور پستہ قد شخص کے ساتھ اندر آتے دیکھا۔ اس کے پیچھے ایک دراز قد خاتون فائلوں کا بیگ اٹھائے چل رہی تھی۔ میں نے ہاتھ اٹھا کے ملک ارشد کو اپنی طرف متوجہ کیا، ورنہ وہ سیدھا نکل جاتا۔

ملک ارشد نے مجھ سے ہاتھ ملانے کے بعد کہا۔ "نواب صاحب یہ ہیں لارڈ ارنسٹ کے قانونی مشیر، مسٹر جان آرنلڈ سولی سیٹر...... اور مسٹر آرنلڈ، نواب رفیق احمد شیرازی فرام پاکستان، یہ نواب وہاں ایسا ہی ہوتا ہے جیسے یہاں لارڈ۔"

آرنلڈ نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ "جو کچھ مجھے معلوم ہوا ہے، میں صرف اس کے قانونی پہلو پر بات کروں گا۔"

ملک ارشد نے کہا۔ "ہم یہاں بیٹھ سکتے ہیں۔"

ہم ایک ہی بنچ نما صوفے پر ساتھ ساتھ بیٹھ گئے۔ میرے دائیں جانب ولایتی وکیل تھا اور بائیں ہاتھ پاکستانی۔ ملک ارشد نے عمداً مجھے درمیان میں رکھا تھا، آرنلڈ کے اشارے پر اس کی دراز قد اسسٹنٹ نے ایک فائل نکالی اور پھر اسے پڑھنے کے لیے استعمال ہونے والا چشمہ دیا۔

"مسٹر شیرازی...... میں تقریباً بیس سال سے تمام قانونی معاملات میں لارڈ ارنسٹ کی معاونت کر رہا ہوں۔" اس نے چشمہ اتار کے براہ راست مجھ سے بات کا آغاز کیا۔ "خواہ ان کا تعلق کاروبار سے ہو یا اس کی نجی زندگی سے۔ میں اسے اپنی طرف سے بہتر ہی مشورہ دیتا ہوں جو اس کے مفاد میں ہو...... لیکن ظاہر ہے آخری فیصلہ اسی کا ہوتا ہے، اس نے زندگی میں بہت کچھ حاصل کیا اور اپنی صلاحیت سے حاصل کیا لیکن ایک اہم عنصر قسمت کا بھی ہے۔ جس پر انسان کا کوئی کنٹرول نہیں، خواہ وہ کتنا ہی باصلاحیت ہو۔"

"میں اس تمہید کی ضرورت ابھی تک نہیں سمجھا۔" میں نے کہا۔

"لارڈ ارنسٹ مر رہا ہے، ایسا تو میں نہیں کہوں گا کہ کم عمری میں یا قبل از وقت...... لیکن وہ ساٹھ سال کا ہے اور اسی

...ی سال بھی جی سکتا تھا۔ گویا مزید پچیس برس اسے مل ...تے، لیکن حالات نے اور حالات سے دل برداشتہ ہو کے ...ں نے خود اپنی زندگی کو مختصر کیا۔ ہم حالات کی تفصیل میں ...یں جائیں گے۔"

میں نے کہا۔ "کیا ڈاکٹروں نے بالکل جواب دے ...یا ہے؟"

"وہ وینٹی لیٹر پر ہے۔ یہ سانس لینے کی مشین دونوں کام کرتی ہے، یہ زندہ رہنے کے لیے جسم کو، یعنی دل کو، آرام کا وقفہ فراہم کر سکتی ہے جس سے وہ کچھ توانائی حاصل کر لیتا ہے یا یہ دل سے رہی سہی توانائی پر چلنے والی صلاحیت بھی ختم کر دیتی ہے۔ اب اس کا جسم ایک مصنوعی سہارے پر زندہ ہے۔ یہ سہارا ہٹاتے ہی زندگی ختم ہو جائے گی۔"

"مجھے واقعی بہت افسوس ہوا، وہ بڑا اچھا آدمی تھا۔"

"رسمی باتوں کے لیے بعد میں بہت وقت ہوگا۔" اس نے پھر عینک کو اپنی ناک پر جما لیا۔ "دو دن پہلے اس نے میرے سامنے اس خواہش کا اظہار کیا، بلکہ اپنا فیصلہ بتایا اور مجھے حکم دیا کہ میں اس کی تمام منقولہ اور غیر منقولہ جائداد اور اثاثے تمہارے نام منتقل کرا دوں۔"

میں اچھل پڑا۔ "میرے نام......"

"یس۔ اس وقت ڈاکٹر کی ماہرانہ طبی رائے کے مطابق وہ اپنے پورے ہوش و حواس میں تھا اس میں کاروبار، بینکوں میں موجود رقم، تمام سرمایہ کاری، ایک فارم ہاؤس اور اصطبل...... اور تمام گاڑیوں اور دیگر ساز و سامان کے ساتھ اس کا محل شامل ہے۔"

میں نے کہا۔ "مسٹر آرنلڈ یہ سب کیا ہے؟"

وہ پڑھتا رہا۔ "اس کی مجموعی مالیت ایک سو بیس ملین پاؤنڈ سے اوپر ہے۔"

"لیکن یہ مجھے کیوں دیا جا رہا ہے جبکہ اس کی حق دار اور وارث اس کی بیٹی ایلیشا موجود ہے۔" اثاثوں کی مالیت سن کے میرا دماغ گھوم گیا۔

اس نے پھر چشمہ اتار کے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ "پہلی بات تو یہ کہ وہ ابھی زندہ ہے اور قانونی طور پر اپنی زندگی میں کوئی شخص اپنی ساری پراپرٹی اور اثاثے کسی کو بھی دے سکتا ہے، حق وراثت کا مسئلہ ایک آدمی کے مر جانے کے بعد کھڑا ہوتا ہے، کوئی شخص اپنی زندگی میں یہ وصیت کر سکتا ہے کہ اس کے وارثوں کو ایک پھوٹی کوڑی نہ دی جائے۔ سب فلاں کو دے دیا جائے خواہ یہ فلاں اس کا دشمن ہی کیوں نہ ہو۔"

"لارڈ ارنسٹ ایسا نہیں کر سکتا۔ یہ ایلیشا کے ساتھ زیادتی ہوگی، یہ ظلم اور ناانصافی ہے۔"

"مسٹر شیرازی، نہ یہ ظلم ہے نہ ناانصافی...... ایسا وہ ایلیشا کی مرضی اور منشا سے اور اس کی خوشی کے لیے مجبوراً کر رہا ہے۔"

"وہ تو پاگل ہے۔"

"تو...... اس کے بارے میں بھی میڈیکل ایکسپرٹ یہی کہتے ہیں کہ وہ بالکل نارمل ہے۔ طیش میں یا صدمے کی انتہائی کیفیت میں کسی بھی شخص کا پاگل ہونا یا دیوانگی کا مظاہرہ ایک نارمل بات ہے اور جب لارڈ ارنسٹ اپنی زندگی میں سب کچھ تمہیں دے رہا ہے تو ایلیشا کا حقِ وراثت.... یا اس کے نارمل ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"اور اگر میں یہ سب لینے سے انکار کر دوں پھر......"

"تم ایسا کر سکتے ہو، پھر قانون کے مطابق یہ سب سرکاری تحویل میں چلا جائے گا، یعنی اس صورت میں کہ تم بھی انکار کر دو اور ایلیشا بھی اس کی حقدار نہ رہے۔"

"آخر وہ ایسا کیوں کر رہی ہے......؟"

"ایلیشا اپنے تمام فیصلے کرنے میں خود مختار ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ اپنی خوشی کے لیے ایسا کر رہی ہے۔"

"کیسی خوشی...... کیا کرے گی وہ زندگی گزارنے کے لیے۔"

"اس نے اپنی زندگی چرچ کی خدمت کے لیے وقف کر دی ہے مسٹر شیرازی۔ وہ نن بن گئی ہے جو دنیاوی خواہشات اور ضروریات کو قربان کر کے زندگی گزارتی ہیں۔"

"کیا یہ پاگل پن نہیں ہے؟"

"میں ایسا نہیں کہہ سکتا اور نہ یہ فعل پاگل پن کی قانونی تعریف میں آتا ہے۔"

میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ "او مائی گاڈ، وہ بے وقوف لڑکی بعد میں پچھتائے گی۔ وہ ایسے ہی جذباتی فیصلے کرتی ہے۔"

"مسٹر شیرازی...... اگر بعد میں ایسا ہوتا ہے، تو تم یہ سب اسے لوٹا سکتے ہو، اسی طرح دے سکتے ہو جیسے لارڈ ارنسٹ تمہیں دے رہا ہے۔" آرنلڈ نے مجھے چشمے کے پیچھے سے گھورا۔

"کیا میں اسے سمجھا نہیں سکتا، اگر مجھے موقع دیا جائے۔"

"نہیں...... اس کے لیے وقت نہیں ہے۔ وہ یہاں سے بہت دور ایک چرچ میں ہے، جہاں تم نہیں جا سکتے اور جاؤ گے تو ناکام واپس آؤ گے کیونکہ وہ تم سے ملنے سے انکار کر دے گی، میں کوشش کر کے دیکھ چکا ہوں۔"

یہ صورت حال اتنی غیر متوقع تھی کہ اس نے مجھے چکرا کے رکھ دیا تھا۔ وکیل نے تمام قانونی پوزیشن مجھ پر واضح کر دی تھی، اس میں انکار کا کوئی فائدہ کسی صورت ایلیشا کو نہیں پہنچتا

تھا۔ اقرار کی صورت میں سب کا مالک میں ہوجاتا تھا اور یہ اختیار مجھے ہمیشہ حاصل رہتا کہ بعد میں کسی مرحلے پر ایلیشا ایک فوری جذباتی فیصلے پر پچھتاوا محسوس کرے اور جو گنوایا تھا یا ٹھکرایا تھا وہ واپس حاصل کرنا چاہے تو میں اس کا حق اسے لوٹا بھی سکتا ہوں، اگرچہ میں قانونی طور پر اس کا بالکل پابند نہیں اور ایلیشا کے لیے بعد میں مجھ سے یہ سب واپس حاصل کرنا میری مرضی کے بغیر ناممکن ہوگا لیکن میرے لیے اخلاقی طور پر اپنا قبضہ برقرار رکھنا اتنا ہی ناممکن ہوگا جتنا کسی کے حق پر ڈاکا ڈالنا۔

ارشد ملک کے لبوں پر ایک پرہوس اور پرمسرت مسکراہٹ تھی، ظاہر ہے اس کا نہ لارڈ ارنسٹ سے کوئی تعلق تھا نہ ایلیشا سے۔ اس کا موکل میں تھا جو کسی حوالے سے اس کے پاس پہنچ گیا تھا۔ میں پہلے ہی نواب تھا اور کم دولت مند نہیں تھا۔ مجھے مزید ایک سو بیس ملین پاؤنڈز مل رہے تھے، اس کے نزدیک تو یہ خوش نصیبی کا انوکھا واقعہ، ایک عالمی ریکارڈ یا معجزہ ہی تھا کہ کسی کے نام ایک زندگی میں کروڑوں کی لاٹری دوبار نکل آئے۔ اب وہ مجھ سے منہ مانگی فیس کی توقع رکھ سکتا تھا۔

''کس سوچ میں پڑ گئے نواب صاحب......'' ملک ارشد نے کہا۔

میں چونکا۔ ''میں اس کے لیے بالکل تیار نہیں تھا ملک صاحب۔''

''جناب عالی آپ کو فکر مند ہونے کی کیا ضرورت ہے؟''

میں نے کہا۔ ''فکر کی نہیں یہ پریشانی اور تشویش کی بات ہے میرے لیے، کیونکہ میں یہاں نہیں ست بدھائی میں ہوں......''

''ہم جو بیٹھے ہیں یہاں آپ کی خدمت کے لیے......'' ملک ارشد نے شعر پڑھنے کے انداز میں کہا۔ ''آپ اللہ کا نام لے کر ہاں کریں۔''

آرنلڈ باری باری ملک ارشد کی اور میری صورت دیکھ رہا تھا اور یہ سمجھ رہا تھا کہ شاید ہم قانونی مشاورت کر رہے ہیں اور کوئی ایسی بات ہے جو راز داری سے کرنا چاہتے ہیں۔ اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ''ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے اور پھر اس میں ایسی کون سی بات ہے جس پر طویل مشورہ ضروری ہو، جو مل رہا ہے لے لو یا انکار کردو...... نہ کوئی زبردستی ہے نہ کوئی بات خلاف قانون۔''

''میں یہ ڈسکس کر رہا تھا کہ یہاں کے سارے معاملات کو ہزاروں میل دور بیٹھ کر کیسے سنبھالوں گا۔''

''لوگ ساری دنیا میں بزنس پھیلاتے ہیں اور سنبھالتے ہیں۔ صبح ایک ملک میں ہوتے ہیں تو شام کو دوسرے ملک میں، پاکستان کی تو صرف سات آٹھ گھنٹے کی فلائٹ ہے، تم اپنی سہولت کے مطابق آجا سکتے ہو، ادھر لارڈ ارنسٹ کی فرم میں ایک اچھی پوزیشن پر کام کر چکے ہو، تمہیں تمام معاملات کا علم ہے، تمہارے پاس تجربے کے ساتھ ہے، بس تمہاری ذمے داریاں دگنی ہوجاتی ہیں۔''

''جبکہ میرا دن وہی چوبیس گھنٹے کا رہے گا۔'' میں نے ...

''میں تمہارا قانونی مشیر نہیں ہوں لیکن یہ مشورہ دے سکتا ہوں کہ تمہارے پاس بعد میں سارے آپشن ہوں گے، تم یہ سب کچھ بیچ کے سارا سرمایہ پاکستان منتقل کر سکتے ہو، تمہیں گڈ ول پرائس ملے گی۔''

''میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا کیونکہ یہ سب میرے نزدیک ایلیشا کا ہے، وہ جب چاہے گی میں اسے واپس کردوں گا، میں اس کی طرف سے ایک منتظم یا نگراں کے سوا کچھ بھی نہیں سمجھتا خود کو۔'' میں اٹھ کھڑا ہوا۔

اسپتال کے اس خصوصی کمرے میں جسے دنیا کا بہترین انتہائی نگہداشت یونٹ سمجھا جاسکتا تھا۔ مجھے صرف جان آرنلڈ کے ساتھ جانے کی خصوصی اجازت حاصل تھی۔ اندر کا نقشہ میرے لیے پرہیبت اور عبرت آموز تھا۔ وسیع جراثیم سے پاک خاموش کمرے میں صرف ان مشینوں کی سرسراہٹ یا گونج تھی جو ایک سو بیس ملین یعنی بارہ کروڑ پاؤنڈ کے مالک لارڈ ارنسٹ کو اس کی زندگی کی آخری سانسوں کی فراہمی کے لیے لگی ہوئی تھیں۔

اس کے سرہانے درجن بھر مانیٹرز اس کے تمام اندرونی اعضا کی کارکردگی کو برقی لکیروں، اعداد و شمار یا گراف کی صورت میں پیش کر رہے تھے، نہ جانے کتنے تار اور کتنی ٹیوبز لارڈ ارنسٹ کے جسم کے مختلف حصوں سے منسلک تھے۔ وینٹی لیٹر یعنی آئرن لنگ، ایک مشینی پھیپھڑا اسے مصنوعی تنفس فراہم کر رہا تھا جس سے دل و دماغ اور جسم کو آکسیجن مل رہی تھی چنانچہ وہ زندہ تھا۔

لارڈ ارنسٹ کی آنکھیں جھپک رہی تھیں اور وہ مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے بڑے بوجھل دل سے کہا۔ ''لارڈ ارنسٹ، پلیز مجھے معاف کردیں، میں نے اس دن جس طرح بی ہیو کیا۔ وہ انتہائی غلط تھا، میری بے وقوفی تھی۔''

لارڈ ارنسٹ کے ایک ہاتھ میں چھوٹا سا موبائل فون جیسا کمپیوٹر تھا۔ اس کی انگلیوں نے ٹائپ کیا۔ ''بے شک میں نے تمہیں معاف کردیا ہے کیونکہ میری بیٹی ایلیشا بھی ایسا ہی چاہتی تھی۔''

''میں ایلیشا کا مجرم ہوں۔''

وہ ایسا نہیں سمجھتی۔ وہ سمجھتی ہے کہ تم کو بھی اس کے ...ی سزا مل رہی ہے، سب گناہوں کا کفارہ ادا کرنے ...ہ خداوند یسوع مسیح کی پناہ میں چلی گئی ہے اور تمام ...ہ ادا کرے گی۔''

...ں نے کہا۔ ''یہ ظلم کیوں کیا اس نے اپنے ساتھ۔''

...اسے یقین تھا کہ اس کے لیے یہی راہِ نجات ہے اور ...راستہ ہے۔ میری تم سے درخواست ہے کہ اس کا ...نا، اس کی طرف سے غافل مت ہونا، یہ ہوسکتا ہے ...پچھتائے۔''

...ں نے کہا۔ ''آپ بالکل فکر مند نہ ہوں، اگر کل اس ...تو میں ایک ایک پائی اسے لوٹا دوں گا، یہ سب اس کا ...ا کا حق تھا، میں اس کی حفاظت کروں گا اور میری ...رف ایک منتظم کی ہوگی۔''

''مجھے تم سے یہی امید تھی، صرف تم ہی ایسے ہو جو میری ...ں پر پورے اتر سکتے تھے، تم نے یقیناً میرے لیے مرنا اور موت کو پرسکون کردیا ہے۔''

اس کے بعد جو ہوا میرے لیے انتہائی تکلیف دہ مگر ...ل کا حصہ تھا، ساری کارروائی جان آرنلڈ نے پوری ...ں نے جہاں کہا میں نے دستخط کردیے، وہ تمام ...ے جن کے بارے میں مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ ان میں ...ا ہوا ہے، ملک ارشد نے میرے قانونی مشیر کی حیثیت ...تخط کیے اور گویا میری شناخت کا گواہ بھی بنا۔ جان نے دو ڈاکٹرز کے سائن بھی لیے جو اس بات کے گواہ ... لارڈ ارنسٹ نے ان کے سامنے خود دستخط کردیے تھے، ...ل وقت...... وہ اٹھ بیٹھ سکتا تھا اور ان بے حس مشینوں ...ڑا ہوا نہیں تھا جو ہر لمحہ یہ مطالبہ کرتی محسوس ہوتی تھیں ...و اب بس کرو، بہت جی لیے یہ مصنوعی سانسوں والی ...ہمیں فارغ کرو اور وجود سے عدم کا سفر اختیار کرو۔

میرے اور باقی سب لوگوں کے باہر نکل آنے کے کچھ ...د لارڈ ارنسٹ کی خواہش کے مطابق لائف سپورٹ ...ں کو ہٹالیا گیا اور لارڈ کی موت کا سرکاری اعلان اسپتال ...رف سے ایک ڈیتھ سرٹیفکیٹ کی صورت میں جاری کردیا ...اس کے قانونی مشیر جان آرنلڈ نے سرٹیفکیٹ وصول کیا۔

میرے دماغ میں جیسے خلا تھا۔ میں ایک عجیب صورت سے گزر رہا تھا جو حقیقی ہونے کے باوجود کسی ہارر فلم ...ری جیسی لگتی تھی، دیکھا جائے تو میں لارڈ ارنسٹ کی ...ی جائیداد، جاگیر، محل اور کاروبار کا مالک ہوگیا تھا لیکن ...ت یہ ہے کہ مجھے اس کی کوئی خوشی نہیں تھی، الٹا ایک بارِ غم تھا، ایک احساسِ جرم تھا جو میرے دل کو جکڑے ہوئے تھا۔

میں نے آرنلڈ سے پوچھا۔ ''اب کیا ہوگا؟ لارڈ ارنسٹ کی آخری رسوم کب ادا ہوں گی؟''

اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''ابھی کچھ دیر میں۔''

میں نے کہا۔ ''اس کی تیاری مکمل ہے؟ سب کو اطلاع ہے۔''

''سب کو کل ایک اخباری اعلان سے معلوم ہوگا۔ جو تمام اخباروں میں فرنٹ پیج پر آئے گا۔''

''تو وہ سب کیسے شریک ہوں گے؟''

وہ اپنے سامنے دیکھتا رہا۔ ''اس نے ایک اور وصیت پہلے سے کردی تھی کہ اس کی آخری رسوم کہیں ادا نہ کی جائیں، ابھی کچھ دیر میں اس کی ڈیڈ باڈی میرے حوالے کردی جائے گی۔ میں اسے جلانے کے لیے لے جاؤں گا۔ الیکٹرک فرنیس میں...... CREMATORIUM...... جہاں مردے جلائے جاتے ہیں، پھر اس کی راکھ اس کے گھر کے پائیں باغ میں بکھیر دی جائے گی، پانی کے ساتھ لان کی مٹی میں جذب ہوجائے گی، اینڈ دیٹ از آل۔''

میں نے چند سیکنڈ کے بعد کہا۔ ''ایلیشا...... یا اس کا کوئی قریبی عزیز، بھائی بہن......نہیں ہوگا؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اس کے بہن بھائی تھے لیکن اس کا کسی سے رابطہ نہیں تھا۔''

''کیا...... میں ساتھ چل سکتا ہوں؟'' میں نے بوجھل دل سے پوچھا۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں، ویسے بھی مجھے تمہارے ساتھ جاکے اس گھر کی چابیاں تمہارے حوالے کرنا تھیں...... پھر تمہارے ساتھ اس کے آفس جاکے اعلان کرنا تھا کہ اب قانونی طور پر تم فرم کے مالک ہو۔''

میں بت بنا کھڑا رہا۔ جو ہونا تھا ہوچکا تھا اور باقی ان سب مرحلوں سے مجھے بہرحال گزرنا تھا۔ ملک ارشد بار بار مجھے رسمی انداز میں حوصلہ رکھنے کی تلقین کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ ''سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' بالآخر مجھے اس کو سختی سے کہنا پڑا کہ یہ کیا ایک ہی فضول رٹ لگا رکھی ہے، میں بھی دیکھ رہا ہوں اور سمجھ رہا ہوں کہ کیا ہو رہا ہے۔ ملک ارشد چپ ہوگیا۔

آدھے گھنٹے بعد جان آرنلڈ کی اسسٹنٹ نے ہمیں مطلع کیا کہ ڈیڈ باڈی کو ایک ایمبولینس میں رکھ دیا گیا ہے، ہم سب ایک ہی گاڑی میں روانہ ہوئے۔ آرنلڈ خود ایمبولینس میں گیا۔ اس کی اسسٹنٹ نے آرنلڈ کی گاڑی منگوائی اور وہ شوفر کے ساتھ بیٹھی، میں پیچھے رہا، ملک ارشد نے اپنی گاڑی کو سب سے پیچھے رکھا۔

تقریباً سوا گھنٹے کے خاموش سوگوار سفر کے بعد ہم ایک اونچی چار دیواری میں داخل ہوئے۔ بائیں جانب ایک نیم دائرے میں بہت سی گاڑیاں کھڑی تھیں، جن میں چار سیاہ رنگ کی میت گاڑیاں HEARSE تھیں، دو ایمبولینس اور باقی عام کاریں، سامنے ایک ہال تھا جس کی دیواروں پر باہر بھی سیاہ رنگ تھا، اندر موت کا سکوت۔

ایک مشینی انداز میں اوور آل پہنے ہوئے دو جوان نمودار ہوئے اور ایمبولینس میں سے اسٹریچر نکال کے اندر لے گئے۔ ہم ان کے پیچھے پیچھے گئے، اندر ایک ہال تھا جس میں سوگواروں کے مختلف گروپ خاموش بیٹھے تھے، آرنلڈ کی اسسٹنٹ تمام پروسیجر سے واقف تھی۔ وہ ڈیڈ باڈی کے ساتھ ایک کاؤنٹر کی طرف گئی، کچھ دیر بعد وہ ایک رسید کے ساتھ آئی۔ ڈیڈ باڈی ایک دروازے سے اندر غائب ہوگئی۔

سیاہ کپڑوں والا ایک گروپ اٹھا اور باہر نکل گیا، وہاں کچھ خواتین خاموشی سے آنسو بھی بہا رہی تھیں لیکن بیشتر لوگ سپاٹ چہرے لیے بیٹھے تھے، ظاہر ہے آنسو ہی بہا رہے تھے جو کسی بچھڑنے والے سے قریبی جذبات کا رشتہ رکھتے تھے۔ باقی رسم دنیا نبھانے کے لیے آئے تھے۔ کیا لارڈ کی پندرہ دن قبل، دنیا سے رخصت ہونے والی شریک حیات یہاں ہوتی یا اس کی ترک دنیا کرنے والی بیٹی موجود ہوتی تو ان کی آنکھیں بھی ایسے ہی خشک ہوتیں جیسے ہم سب کی تھیں جو لارڈ کی ان ''آخری رسوم'' میں شریک تھے؟ خود میرے لیے اپنے سوال کا جواب ہاں یا نہیں میں دینا دشوار تھا کیونکہ میں نے دیکھا تھا کہ ان میں سے کسی کا بھی کسی سے جذباتی رشتہ نہیں تھا۔

رشتوں کی نوعیت بھی کیا عجیب ہوتی ہے۔ جب لارڈ نے شادی کی ہوگی تو وہ کتنا خوش پرجوش اور پرامید ہوگا کہ آنے والے دنوں اور سالوں میں اس کی ایک فیملی تشکیل پائے گی، ان کے بچے انہیں کتنی خوشیاں دیں گے، کتنی مسکراہٹیں اور کتنی ہنسی ...... اور وہ انہیں دنیاوی تعلیم، عزت اور پرسہولت زندگی کے کتنے مواقع فراہم کریں گے اور ان کی زندگیوں کو کس طرح خوشیوں سے بھر دیں گے۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ...... آج صرف ایک سو بیس ملین پاؤنڈ تھے، لارڈ کا خطاب تھا اور شہرت تھی، وہ خوشی کہیں نہ تھی۔ کبھی قریب سے بھی نہ گزری تھی جس کے خواب ہم سب دیکھتے ہیں لیکن وہ دولت سے کہاں ملتی ہے، وہ تو کہیں دل کے اندر سے پھوٹتی ہے اور خدا کا انعام ہوتی ہے، ورنہ حسرت بن جاتی ہے...... شہر آرزو ویران قبرستان ہو جاتا ہے مکین نہیں رہتے، خالی مکان کھڑے رہتے ہیں۔

میرے خیالات کا مایوسی اور ڈیپریشن کی جانب دھارا رک گیا۔ آرنلڈ کی اسسٹنٹ اٹھ کے ایک کاؤنٹر کی طرف جا رہی تھی جس کے اوپر بیس نمبر روشن ہوگیا تھا۔ لارڈ کی لاش کا نمبر بیسواں تھا، اس سے پہلے آج انیس ا... کے جسم...... جو کبھی زندگی کی حرارت سے متحرک تھے، ... کیے جا چکے تھے، خاک کرنے کا طریقہ مغربی دنیا میں م... ہوتا جا رہا ہے، زمانہ تیز رفتاری کا ہے، خاک ہونے ... وقت لگتا ہے۔ کئی ہزار سینٹی گریڈ کی برقی بھٹی یہی کام ... منٹ میں کر دیتی ہے۔

جب ہم لارڈ کی باقیات، ایک سیل کیے ہوئے لفافے میں راکھ...... لے کر واپس جا رہے تھے تو اس وقت تک و... اتنے ہی جنازے اور آ چکے تھے، مجھے یہ سب بہت بھیانک ڈرانے والا ماحول لگ رہا تھا اور میں جس ذہنی و روحانی تجربے سے گزر رہا تھا وہ میری روح پر بھی لرزہ طاری کر رہا تھا۔ میری نظر بار بار اس غیر شفاف پلاسٹک بیگ پر جاتی تھی جو ... آرنلڈ نے اٹھا رکھا تھا۔ جس میں اس کا زندگی بھر کا دو... راکھ بن کے سما گیا تھا، اس کا چہرہ سپاٹ تھا اور شاید وہ کچھ محسوس نہیں کر رہا تھا۔ وہ صرف اپنی ذمے داری پوری کر رہا تھا۔ چونکہ میں ایسی ''آخری رسوم'' کا عادی نہیں تھا ... لیے ذہنی طور پر بہت اپ سیٹ تھا۔ مجھے یقین کرنا مشکل ہو... تھا کہ جو شخص راکھ بن کے ایک لفافے میں بند ہے وہی ... جس سے میں نے ڈھائی تین گھنٹے قبل بات کی تھی، جس ... ساتھ میں نے چار سال کام کیا تھا اور بہت کچھ سیکھا تھا۔ عائشہ کا باپ تھا، لارڈ ارنسٹ تھا۔

باہر آنے کے بعد جان آرنلڈ نے کہا۔ ''مسٹر شیرازی...... تم کو میرے ساتھ جانا ہے۔''

میں نے سر ہلایا۔ ''مجھے آپ کی مدد اور راہنمائی چاہیے مسٹر آرنلڈ'' اور اس کے ساتھ گاڑی میں پیچھے بیٹھ گیا۔ شوفر نے دروازہ بند کیا۔ اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ آرنلڈ کی اسسٹنٹ بیٹھ گئی۔ ملک ارشد نے اپنی گاڑی ہمارے پیچھے رکھی۔

''ابھی میں رسمی طور پر ارنسٹ مینشن کی چابیاں تمہارے حوالے کر دوں گا۔ قانونی طور پر اس کی ملکیت تمہارے نام ٹرانسفر ہونے میں کچھ وقت لگے گا، اس وقت تک تم یہاں رہائش اختیار کر سکتے ہو، اگر کسی قسم کی انتظامی تبدیلی کرنا چاہو تو تمہیں کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں۔ عملی طور پر تم اس ہاؤس ہولڈ کے مالک ہو، یہاں کی ہر چیز تمہاری ہے۔ کاغذات میں گاڑیوں کی ملکیت تبدیل ہو جائے گی تمہیں ان کے استعمال کی اجازت ہے مگر فی الحال تم کسی بھی ...

...فروخت نہیں کر سکتے۔''

''میرا ایسا کوئی ارادہ بھی نہیں؟''

''قانونی پوزیشن کی وضاحت میرا فرض ہے۔'' وہ بولا۔

میں نے کہا۔ ''کیا میں ایک درخواست کر سکتا ہوں، ...پ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میرے لارڈ سے کیسے مراسم ...، وہ میری بہت قدر کرتا تھا اور میں اس کی دل سے عزت کرتا ... کیونکہ وہ ایک فراخدل باس تھا، ایک غیر متعصب انسان اور ... راہنمائی کرنے والا شخص، اب وہ نہیں ہے تو مجھے آپ کی ...کی ضرورت ہے، کیا یہ ہو سکتا ہے کہ آپ اسی طرح میری ...ونی مشاورت جاری رکھیں جیسے لارڈ کی کرتے تھے۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہا۔ ''آئی ایم سوری مسٹر شیرازی۔ ... ایسا نہیں کر سکوں گا۔ میرے لارڈ کے ساتھ ذاتی مراسم ...، یہ معاملہ ہرگز مالی منافع کا نہیں تھا، اختلافات کے ... جود نہ کبھی اس نے مجھے چھوڑا، نہ میں نے اسے۔ اگر وہ ...ی مانتا، تو شاید، میں پھر کہتا ہوں شاید...... اس کی نجی ...رگی میں بھی بہت سے مسائل پیدا نہ ہوتے، اب میں اسی ...رح کسی اور کے ساتھ نہیں رہ سکتا...... یہاں بہت اچھے ...نونی مشیر ہیں میرے علاوہ بھی۔''

میں نے کہا۔ ''اگر کبھی مجھے گائیڈنس کی ضرورت ...ے تو میں آپ سے مشورہ کر سکتا ہوں؟''

''آف کورس...... اینی ٹائم، اچھا اب آگے سنو، اس ...ام سے فارغ ہونے کے بعد ہم لارڈ کے آفس جائیں گے، ...واب تمہارا آفس ہے۔''

''کیا یہ بھی آج ہی ضروری ہے؟''

''ہاں...... یہ میری ذمے داری ہے جو میں آج ہی ...ری کرنا چاہتا ہوں، صرف ویلج اور فارم ہاؤس کا معاملہ کل ...ر رکھا جا سکتا ہے، آفس میں تمہیں کوئی پرابلم نہیں ہو سکتی۔ ...ہاں سب تمہیں جانتے ہیں اور تم سب سے واقف ہو، ...مطبل اور فارم ہاؤس کے نگراں پرانے ملازم ہیں اور ...بھروسے کے قابل ہیں، اچھے رویے سے تم ان کا تعاون ...حاصل کر لو گے تو کوئی پرابلم نہیں ہوگی، وہ تمہارے معاون ...مددگار ثابت ہوں گے، اسی طرح گھر میں جتنے ملازم ہیں ان ...کی نگراں ایک عورت مسز لوسیل جانسن ہے جسے لوسی بھی کہتے ...ہیں، ممکن ہے میری طرح وہ بھی تمہارے ساتھ نہ رہے۔ اس ...کی فیملی کے ساتھ بہت پرانی وابستگی تھی، تم اس کی جگہ سب ...سے سینئر ہاؤس میڈ کو دے سکتے ہو۔''

میں نے پوچھا۔ ''اندر کل کتنے ملازم ہیں؟''

''کچن میں دو میاں بیوی، صفائی میری مورنین میڈز، ایک بٹلر، دو ویٹر، تین شوفر اور دو گارڈ اور دو مالی۔''

''لیکن مجھے تو اتنے ملازموں کی ضرورت ہی نہیں ہوگی۔ میں یہاں نہیں رہ سکتا۔ یہ بعد میں طے کروں گا کہ اس جگہ کو محفوظ رکھوں ایلیشا کے لیے، یا اس کا کچھ اور بندوبست کروں۔''

''تم انہیں فارغ کر سکتے ہو۔''

''مجھے زیادہ سے زیادہ دیکھ بھال حفاظت اور صفائی کے لیے ملازم درکار ہوں گے مثلاً گارڈ یا مالی۔ شوفر اور بٹلر وغیرہ کی مجھے کوئی ضرورت نہیں۔''

''یہ تمہارا انتظامی مسئلہ ہے، میں کیا کہوں، تم جو چاہو کرو مگر ایک مشورہ ہے، جو کرو جلدی مت کرو، انتظامی تبدیلی بھی رفتہ رفتہ کرو، ظاہر ہے تمہیں کوئی مالی مسئلہ درپیش نہیں، پھر کیا حرج ہے اگر یہ سب لوگ فوری طور پر بے روزگار اور بے گھر نہ ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''آپ فکر نہ کریں، میں سب کا خیال رکھوں گا، شکایت کا موقع کسی کو نہیں دوں گا، کوئی ایسا نہیں کہے گا کہ لارڈ ہوتا تو یہ نہ ہوتا۔''

میں نے محسوس کیا کہ اس گفتگو کے نتیجے میں یا کسی اور وجہ سے میرے موڈ اور میرے جذبات میں ایک تبدیلی آ رہی ہے...... اداسی، مایوسی اور بددلی کی جگہ آہستہ آہستہ میں عملی دلچسپی کی طرف بڑھ رہا ہوں، میرا رویہ مثبت اور پریکٹیکل ہونے لگا ہے کہ جو ہونا تھا ہو چکا، اب مجھے اس چیلنج کے بارے میں سوچنا ہے جو مجھے درپیش ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے اور کیسے کرنا ہے۔

یہ شاید اسی بدلی ہوئی ذہنی کیفیت کا ردعمل تھا کہ آدھے راستے میں اچانک مجھے نور کا خیال آ گیا جو اب تک دیگر تفکرات کے انبار میں گم تھا، میں نے یہ بھی نوٹ کیا کہ ہماری منزل کا راستہ اگر نور کے لیے تھوڑا سا بدل دیا جائے تو اس سے مسافت میں زیادہ فرق نہیں پڑے گا، یہ بات میں نے آرنلڈ سے کہی تو وہ ''جیسی تمہاری مرضی'' کہہ کر خاموش ہوگیا۔ شوفر کو راستے کی تبدیلی کے بارے میں سمجھا کے میں نے نور کو فون کیا۔

وہ حسب توقع شور کرنے لگی۔ ''کہاں غائب ہوگئے مجھے اکیلا چھوڑ کے، چار گھنٹے ہوگئے، تمہارا فون ہی بند تھا۔''

میں نے کہا۔ ''نور، میں تمہیں لینے آ رہا ہوں، تیار ہو جاؤ فوراً۔''

''کہاں جانا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''دیکھو، تمہارے پاس صرف دس منٹ ہیں، جو اچھے سے اچھا لباس ہے وہ پہن لو، میں باہر آ کے کال کروں تو تمہیں گیٹ پر ہونا چاہیے۔ آئی بات سمجھ میں، دس

منٹ، باقی سب میں راستے میں بتاؤں گا، تمہاری تیاری کا وقت شروع ہوتا ہے......اب۔"

اب مجھے یہ طے کرنا تھا کہ نور کو اپنے ساتھ کیسے رکھوں، آرنلڈ کی گاڑی بڑی تھی، اس میں پیچھے تین افراد بھی بیٹھ سکتے تھے لیکن وہ نامناسب ہوتا۔ مجھے آرنلڈ کے ساتھ لگ کے بیٹھنا پڑتا۔ یہ اس سے بھی زیادہ نامناسب ہوتا کہ میں آرنلڈ کی اسسٹنٹ کو ملک ارشد کی گاڑی میں بھیجتا اور نور کے لیے جگہ نکالتا، اگر میں نور کے ساتھ ملک ارشد کی گاڑی میں پیچھے بیٹھتا تو ہماری ساری گفتگو ملک صاحب بھی سنتے اور مجھے خوب اندازہ تھا کہ وہ گفتگو کیا ہوگی، مسئلے کا حل اس وقت میرے دماغ میں آیا جب دونوں گاڑیاں ہوٹل کے سامنے ٹھہر گئیں۔

میں نے آرنلڈ سے کہا۔ "اگر آپ برا نہ مانیں تو جو مجھے سمجھایا ہے وہ میرے قانونی مشیر کو بھی بتا دیں۔"

اس نے کہا۔ "مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

میں فوراً اتر کے نیچے گیا۔ "ملک صاحب، اگر آپ برا نہ مانیں تو آگے میری جگہ جان آرنلڈ کی گاڑی میں بیٹھ جائیں، وہ آپ کو کچھ بتانا چاہتا ہے، ارنسٹ مینشن پہنچنے سے پہلے۔"

"لیکن میری گاڑی۔"

میں نے کہا۔ "وہ میں لے کر آتا ہوں پیچھے پیچھے...... دراصل یہاں سے میری وائف بھی ساتھ ہوں گی۔"

وہ فوراً چابی میرے حوالے کر کے اتر گیا تو میں نے نور کو کال دی، وہ شیشے کے دروازے کے پیچھے سے یوں نمودار ہوئی جیسے اس سے لگی کھڑی تھی، اس نے قطار میں کھڑی گاڑیوں کو دیکھا، پھر میں نے اسے متوجہ کرلیا۔ وہ سیدھی آئی اور میرے ساتھ بیٹھ گئی۔ "یہ کس کی گاڑی ہے؟"

"جو ہمارے پاس ہے وہ ہماری گاڑی......" میں نے گاڑی نکالی اور آگے نکلنے والی آرنلڈ کی گاڑی کے پیچھے لگا دی۔ "نور، میری بات دھیان سے سنو۔"

"تم اتنے سیریس کیوں ہو رہے ہو؟"

"اس لیے کہ یہ انتہائی سیریس بات ہے۔ لارڈ ارنسٹ کا انتقال ہوگیا، میں اسے جلا کے آرہا ہوں۔"

نور نے چیخ ماری۔ "جلا کے، کیا وہ ہندو تھا؟"

میں نے برہمی سے کہا۔ "سنو، یہاں مردے برقی بھٹی میں جلائے بھی جاتے ہیں، اب ہم اس کی راکھ ارنسٹ مینشن کے باغ میں پھیلائیں گے۔"

وہ حیران ہوگئی۔ "اس کے لیے مجھے لے جا رہے ہو۔"

میں نے دھاڑ کے کہا۔ "شٹ اپ، میں نے کہا تھا کہ سنو، صرف سنو۔ تم کو وہی کرنا ہے جو میں کہہ رہا ہوں اور میرے پاس وقت کم ہے، مرنے سے پہلے لارڈ ارن اپنا سب کچھ میرے نام کر دیا ہے۔"

نور کے حلق سے پھر غیر ارادی چیخ نکلی۔ "تمہارے میں نے اسے گھورا۔ "ہاں، کیونکہ اس کی بی عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق ترک دنیا کر کے چلی گئی ہے، وہ نن بن گئی ہے اور یہ اسی کی خواہش تھی اپنی زندگی میں سب مجھے دے جائے، باپ مجبور ہو گ کچھ میں ایک تو اس کی کمپنی ہے جس میں چار سال بھی کام کیا تھا۔ دوسرا یہ محل ہے جو تم دیکھ چکی گاڑیاں، سازوسامان کے ساتھ......اس کے علاوہ ایک ہاؤس یا ولیج ہے، جہاں گھوڑے بھی ہیں یہ سب ایک ملین پاؤنڈ سے زیادہ کے اثاثے ہیں، بارہ کروڑ پاؤ زیادہ۔ اس میں نقد کتنا ہے مجھے نہیں معلوم، لیکن یہ سب وصیت کی رو سے میرا ہے، قانونی طور پر۔"

نور کی آنکھیں پھٹ گئی تھیں اور اس کا منہ کھلا رہ اس کے لیے یہ سب ناقابل یقین تھا اور میں اتنا سیر ہوتا تو وہ اسے مذاق ہی سمجھتی لیکن اب اس کے حلق ہی نہیں نکل رہی تھی۔

میں نے نظر سڑک پر رکھی۔ "اس سب کے قانو پر یعنی سرکاری ریکارڈ بھی میرے نام منتقل ہونے میں وقت لگے گا لیکن نہ اس میں کسی قسم کی رکاوٹ ہے نہ پر اگر میں برطانوی شہری نہ ہوتا تو شاید یہ مسئلہ ہوتا...... سب بالکل قبول نہیں ہوتا، اگر پہلے مجھ سے پوچھا جاتا اب میں کچھ نہیں کرسکتا۔ میں عائشہ، ایلیشا کو سمجھانے کی ضرور کروں گا لیکن یہ ابھی تقریباً ناممکن ہے، بعد میں و نہیں کرسکتی، وہ کچھ بھی واپس نہیں مانگ سکتی، اس کا قانو ختم........ لیکن میں طے کر چکا ہوں کہ کبھی ایسا ہوا تو ایک ایک چیز اسے دے دوں گا، ابھی میں قبضہ لے رہا پہلے ہم ارنسٹ مینشن جا رہے ہیں اور میں اسی لیے تم کو لے جا رہا ہوں کہ تمہارا اعتماد بحال ہو، اب نہ تم مہمان حیثیت سے جا رہی ہو نہ قیدی بن کے۔ تم مالک ہو۔"

"میں......میں مالک کیسے ہوگئی؟" وہ ہکلائی۔

"اس لیے کہ جو میرا ہے وہ تمہارا ہے، یہ سمجھو اور لو، اسی لیے میں نے کہا تھا کہ پوری تیاری سے آنا......آ کو ایسے ہی بی ہیو کرنا ہے جیسے تم مالکن ہو۔"

"میں یہ نہیں کرسکتی۔"

"تم کو یہ کرنا ہوگا، ہم محل پہنچنے والے ہیں۔ خو سنبھالو اور تیار ہو جاؤ۔ میں جانتا ہوں کہ یہ بہت بڑا چیلنج

تمہارے لیے اور تمہیں جو وقت ملا ہے وہ بہت کم ہے، لیکن کیا کروں، خود میری پوزیشن تم سے مختلف نہیں ہے، میں اس صورتِ حال کا سامنا کر رہا ہوں اور تم کو میرا ساتھ دینا ہے۔ سنا تم نے جان، تم کو میرا ساتھ دینا ہے، رائٹ۔"

اس نے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا۔ اس وقت آگے والی گاڑی ارنسٹ مینشن میں داخل ہوچکی تھی، میں نے نور کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا تو وہ بالکل سرد ہو رہا تھا، لیکن وہ میرے ساتھ گاڑی سے اتری تو سنبھل چکی تھی۔ ان نے میرا دکھ کے احساس سے بوجھل چہرہ دیکھا۔ پھر جان آرنلڈ کو، میں نے رسمی انداز میں نور کو ان سب سے متعارف کرایا۔ انہوں نے ہاتھ ملائے، پھر ایک عجیب بات ہوئی، آرنلڈ نے مجھے سرخ رنگ کا ایک باکس دیا، آٹھ انچ لمبا اور چوڑا اس پر مخمل چڑھا ہوا تھا۔ یہ ویسا ہی ڈبا تھا جیسا زیورات رکھنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

میں نے کہا۔ "یہ کیا ہے؟" اور اسے کھولا۔

"یہ اس گھر کی چابی ہے، جو ایک ٹوکن کے طور پر یا ملکیت کی علامت سمجھی جاتی ہے، جب ملکیت بدلتی ہے تو اس سے باہر والا گیٹ لاک ہوتا ہے اور پھر اسے نیا مالک ہی کھولتا ہے، اب یہ تمہارے پاس رہے گی۔"

میں نے اسے بڑی عقیدت سے چوما اور نور کی طرف بڑھا دیا، نور کے لیے یہ غیر متوقع تھا مگر اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "تھینک یو۔"

ہم سب آگے پیچھے چلتے ہوئے عقبی حصے کے مختصر سے باغ میں پہنچے جہاں ایک اور حیران کن نظارہ سامنے تھا، گو کے سارے ملازمین ایک جیسے سیاہ لباس میں نیم دائرہ بنائے اور سر جھکائے سوگوار کھڑے تھے، ان کے عین مقابل نصف دائرے کے مرکز میں سیاہ عبا والا پادری استادہ تھا، یہ جان آرنلڈ ہی کا انتظام تھا کہ ارنسٹ مینشن میں مالک کے انتقال کی خبر پہلے سے پہنچ چکی تھی اور اس کی آخری رسوم کیسے ادا ہوں گی، یہ بھی سب جانتے تھے۔

جان آرنلڈ پادری کے پیچھے کھڑا ہوگیا۔ اس کے ساتھ میں اور میرے ساتھ نور ہاتھ عقیدت سے سامنے باندھ کے اور سر جھکا کے کھڑی ہوگئی۔ ملک ارشد دوسری طرف رہا۔ اس کے ساتھ آرنلڈ کی ماتحت۔ پادری نے کوئی دعا شروع کی اور اس وقت میں نے دیکھا کہ محل کے ملازمین میں سے چار عورتیں رو رہی تھیں، مردوں میں صرف ایک کی آنکھوں میں آنسو تھے، باقی دل سے سوگوار تھے۔

دعا ختم ہوئی تو اس نے وہ پلاسٹک بیگ اٹھا لیا جس میں لارڈ ارنسٹ کی راکھ تھی اور اس نے کچھ پڑھتے ہوئے راکھ کو لان میں ہر طرف بکھیرنا شروع کیا۔ ہم سب پیچھے ہٹ گئے، لفافہ خالی ہوگیا، ایک سفید سر والے شخص نے پانی کا فوارہ اٹھایا اور پانی کی دھاروں کو گھاس پر پھیلانے لگا، وہی ایک مرد تھا جو پہلے ہی رو رہا تھا۔ لارڈ ارنسٹ اپنے باغ کی مٹی میں مل گیا، ارتھ ٹو ارتھ، ڈسٹ ٹو ڈسٹ...... پادری نے کہا۔ جو تقریباً وہی بات تھی کہ آدمی ایک مشت خاک ہے اور خاک سے وجود پانے والا خاک میں ہی مل جاتا ہے۔

آرنلڈ نے تمام ملازمین کو ہال میں جمع ہونے کے لیے کہا۔ آہستہ آہستہ وہ سب ہمارے سامنے کھڑے ہوگئے۔ جان آرنلڈ نے ان سب کے سامنے لارڈ ارنسٹ کی وصیت پڑھ کے سنائی اور پھر کہا۔ "میں اپنے دوست کے قانونی مشیر کی حیثیت سے تم سب کو بتا رہا ہوں کہ آج کے بعد سے اس گھر کے اور لارڈ کی تمام چیزوں کے نئے مالک نواب رفیق احمد شیرازی ہیں چنانچہ تم میں سے جو یہاں نوکری جاری رکھنا چاہیں وہ ان کے حکم کی تعمیل کریں۔"

خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد لوسی نے ایک قدم آگے آ کے کہا۔ "آئی ایم سوری، میں یہاں نہیں رہنا چاہتی، مجھے فارغ کر دیا جائے۔"

آرنلڈ نے صرف لوسی کے بارے میں یہ خدشہ ظاہر کیا تھا لیکن اس کے بعد دوسری میڈ آگے آئی، پھر ایک بٹلر، میں نے غور سے دیکھا تو مجھے ان سب کے چہروں پر ناگوار جذبات کی ایک سی تحریر نظر آئی۔ ان میں سے غالباً کوئی بھی ایک انگریز لارڈ کے بعد کسی انڈین نواب کی ملازمت کا طعنہ سننا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ایک نسل پرست اور متعصب قوم تھے اور جو کسی عالی نسب خاندان سے تعلق رکھ چکے تھے ان پر کڑوا کریلا نیم چڑھا کی مثال صادق آتی تھی۔

مجھے ایک خوشگوار حیرت ہوئی جب مجھ سے پہلے نور نے ہاتھ اٹھا کے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اس کا فیصلہ ہم بعد میں اطمینان سے کریں گے، کسی کو یہاں اس کی مرضی کے خلاف روکا نہیں جائے گا۔ سب کو ان کی شرائط ملازمت کے مطابق واجبات ادا ہوں گے اور آپ سب ہی انہی کے مطابق ہمیں ملازمت چھوڑنے کا نوٹس دیں گے۔ تھینک یو آل۔ اب آپ لوگ اپنی اپنی جگہ جا کے معمول کے مطابق کام کریں۔"

نور کے پراعتماد انداز نے میرا حوصلہ دوچند کر دیا۔ یکلخت مجھے احساس ہوا کہ میں اکیلا نہیں ہوں اور وہ سب، جو مجھے اپنے لیے ناممکن لگ رہا تھا بہت آسان ہے۔ یہ نور کی خاص ادا تھی، خوبی تھی یا کمال تھا کہ وہ اس وقت میرا سہارا بن

جاتی تھی جب میں خود کو کمزور یا تنہا محسوس کرنے لگتا تھا۔ عام حالات میں نادان، کم ہمت اور کمزور نظر آنے والی نور میری طاقت، میری ہمت اور توانائی کے لیے بوسٹر کا کام کرتی تھی۔

میرے کہے بغیر اس نے لیڈی آف دی ہاؤس کا رول بڑی خوش اسلوبی سے اور پروقار انداز میں سنبھال لیا تھا جبکہ میرا خیال تھا وہ اندر جا کر مزید نروس اور خوفزدہ ہوگی۔ تمام ملازمین سر جھکا کے محل کے اندر غائب ہو گئے تھے۔ پہلا انتہائی مشکل مرحلہ میں نے تقریباً سر کر لیا تھا لیکن ابھی عشق کے امتحان اور بھی تھے۔ اگلا مرحلہ جان آرنلڈ کے ساتھ آفس جا کے کمپنی کا انتظام سنبھالنے کا تھا۔ دیگر مراحل اس کے بعد آتے تھے اور مجھے بخوبی اندازہ ہو چکا تھا کہ جب لارڈ ارنسٹ کے مرنے کی خبر عام ہوگی تو اس کا کیا ردعمل سامنے آئے گا۔

جب یہ معلوم ہوگا کہ اس کی واحد وارث ایلیشا نے ترکِ دنیا کے بعد چرچ میں نن کی زندگی اختیار کر لی ہے اور ایک انڈین (وہ پاکستانی کو بھی یہی کہتے ہیں) کسی غیر معروف چھوٹی سی ریاست کے نواب کے حق میں ایک سو بیس ملین پاؤنڈ کے اثاثوں سے دستبرداری قبول کر لی ہے۔ یہ شخص کسی زمانے میں لارڈ ارنسٹ کا ملازم تھا اور اس کی بیٹی ایلیشا اس کے عشق کی دیوانگی میں پہلے بھی اپنا گھر، مذہب اور ملک چھوڑنے پر کمربستہ تھی تو اس پر کیا ہنگامہ برپا ہوگا۔ سوسائٹی، کاروباری اور سیاسی حلقے...... پریس اور پبلک کس بری طرح اس فیصلے کے خلاف اپنا غصہ ظاہر کریں گے۔

اب میں مخالفت کے ہر طوفان کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھا۔ میں یہ نہیں سمجھتا کہ تمام سفید فام نسلی تعصب رکھتے ہیں لیکن برطانیہ کے اشراف میں رنگ دار افراد کے خلاف نفرت کے جذبات رکھنے والوں کا تناسب یقیناً بہت زیادہ ہے تاہم وہ اپنے مہذب ہونے کا ثبوت دینے کے لیے اس کا اظہار عام زندگی کے رویے میں نہیں کرتے، مثلاً یہ کہنا مشکل تھا کہ کاروباری شائستگی کے باوجود لارڈ ارنسٹ کا قانونی مشیر جان آرنلڈ دل میں میرے خلاف ناپسندیدگی کے جذبات رکھتا ہے۔ اس نے بڑی شرافت سے معذرت کر لی تھی کہ وہ میری خدمت نہیں کر سکے گا۔ اس کی وجہ ہرگز وہ نہیں ہوگی جو اس نے مجھے بتائی تھی، اگر ابھی کوئی دوسرا سفید فام صنعت کار یا بزنس مین اس کی خدمات اسی معاوضے پر حاصل کرنا چاہے جو اسے لارڈ ارنسٹ ادا کرتا تھا تو وہ انکار نہیں کرے گا۔

''سر...... کیا ہم اب آفس کی طرف چلیں؟'' جان آرنلڈ نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''آپ مجھے دس منٹ کی مہلت دیں گے؟ میں کچھ ریفریش ہو جاؤں اور میڈم سے کچھ مشورہ بھی کر لوں۔''

''شیور سر......'' جان آرنلڈ نے اب میرے ساتھ فارمل انداز اختیار کر لیا تھا اور وہ مجھے باقاعدگی سے سر کہہ رہا تھا، میں نے اسے ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کے لیے کہا اور خود ہاتھ منہ دھونے چلا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ میں جسمانی طور پر اتنا ہی تھکا ہوا تھا جتنا ذہنی طور پر سکون کے ایک وقفے کا متلاشی تھا۔

نور نے بٹلر کو طلب کر کے سب کے لیے کافی اور ریفریشمنٹ کا آرڈر دے دیا تھا، میں نے صبح سے کچھ کھانا تو درکنار کافی کا ایک کپ بھی نہیں پیا تھا، مجھے نور لاؤنج میں ملی...... یہ ایک وسیع گول ہال تھا جس کے چاروں طرف بلند محرابی دروازے تھے اور اونچی رنگین شیشوں والی کھڑکیاں تھیں، اوپر کی منزل کی چھت تک جانے والے گول ستون تھے جن پر...... سنگ مرمر تھا۔ پیچھے کی دیواروں پر اوپر سے نیچے تک سرخ ریشمی پردے تھے جو ڈوری کھینچنے سے سمٹ جاتے تھے یا پھیل کر تمام کھڑکیوں، دروازوں کو چھپا لیتے تھے۔ اوپر ایک بہت بڑا فانوس عین درمیان میں معلق تھا جس کے پھیلے ہوئے بازوؤں سے سیکڑوں روشنیاں پھوٹتی تھیں، اس کو سہارا دینے والی چمکتے پیتل کی راڈ اٹھائیس تیس فٹ اوپر چھت کے گنبد سے منسلک تھی۔ یہ گنبد اسٹیل اور فائبر گلاس سے بنا ہوا تھا چنانچہ دن میں آسمان کا اجالا اندر آتا تھا، اس لاؤنج کے چاروں طرف چودہ فٹ کی بلندی پر ایک دائرے میں وہ گیلری تھی جس میں اوپر کی منزل کے سارے کمروں کے دروازے کھلتے تھے اور پرسب ملا کے سات کمرے اور ٹیرس وغیرہ تھے اور فیملی کی خواب گاہیں تھیں جن کی تعداد پانچ تھی اور ایک کچن تھا۔ نچلی منزل پر طعام گاہ، دفاتر اور مہمانوں کے لیے قیام گاہ، سٹنگ روم اور لائبریری وغیرہ تھے۔

میں نور کے ساتھ ہی صوفے پر گر گیا۔ ''تم نے دیکھا نور۔''

''مجھے ابھی تک یقین کرنا مشکل ہو رہا ہے کہ یہ کسی خواب کا منظر نہیں ہے، اب ہم کیا کریں گے جان......؟''

میں نے کہا۔ ''وہی جو ہم کر رہے ہیں، تم کو میرا ساتھ دینا ہے نور۔''

اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''کیا میں دے نہیں رہی ہوں، یہ پتا نہیں کیسے۔''

''بس چند دن کی بات ہے، ہمیں ایک بہت بڑے طوفان کا سامنا کرنا ہوگا، لیکن ہم اس پر قابو پا لیں گے، بس ہمت نہ ہارنا، ڈٹ کر ہمت اور خدا پر بھروسا رکھنا۔''

''تم مجھے بتاتے رہنا کہ مجھے کب کیا کرنا ہے؟''

''تم سب کچھ کرسکتی ہو نور، یہاں خدا کے بعد میرے ساتھ صرف تم ہو، اتنا وقت ہی نہیں ہے کہ میں پاکستان سے راجا کو بلاسکوں۔ اچھا سنو اب میں لارڈ کے کاروبار کا انتظام سنبھالنے جارہا ہوں، یہ گھر تم سنبھالوگی۔''

''کیا اب ہم واپس نہیں جائیں گے؟''

''ضرور واپس جائیں گے، یہاں کے معاملات کنٹرول میں آجائیں۔''

''ہم......اس محل میں رہیں گے، مجھے ڈر لگتا ہے رفیق۔''

''ڈرنے کی کوئی بات نہیں، میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔ مشکل ہوگا کاروبار کو سنبھالنا لیکن میری خوش قسمتی ہے کہ اس کمپنی میں بھی چار سال ایک انتظامی عہدے پر صرف کر چکا ہوں، مجھے سب معلوم ہے۔ اس کے علاوہ میری گڈول اچھی ہے، دوسرے لوگ میرے ساتھ بڑا دوستانہ رویہ رکھتے تھے، میں نہیں کہہ سکتا کہ اب ان کا ردعمل کیسا ہوگا، کتنے لوگ حاسدانہ جذبات کے باعث میرے خلاف ہوجائیں گے، لیکن میں ذاتی طور پر کچھ لوگوں کو جانتا ہوں جو میری جگہ تمام انتظامی امور کو کنٹرول کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور میرے ساتھ مخلص ہیں، ان میں ایک جاپانی خاتون سوشی اور اس کا شوہر سرفہرست ہیں۔''

''تمہارے آنے تک میں یہاں اکیلی رہوں گی......؟'' اس نے بٹلر کی لائی ہوئی ٹرالی اپنی طرف کھینچ کے میرے لیے کافی بنائی۔

میں نے کھانے کی چیزوں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کیا۔ ''تم یہاں کسی کونے میں چھپ کر نہیں بیٹھوگی، لیک کمانڈ آف دس پیلس، لوسی کو بلاؤ اور ایک ایک کمرے میں جاؤ، اسے اپنی نگرانی میں مقفل کراؤ، چابیاں اپنی تحویل میں لو، کوئی چیز ادھر سے ادھر نہ ہو، یہ بات یقینی بناؤ، احکامات جاری کردو کہ تم سے اجازت لیے بغیر کچھ نہیں ہوگا پتّا بھی نہیں ہلے گا۔''

''جان یہ......بہت مشکل ہے۔''

''میں جانتا ہوں تم میں اس سے زیادہ ہمت اور صلاحیت ہے، تم بہت بڑے بڑے اور خطرناک کام کرتی رہی ہو، بین الاقوامی سطح پر۔ تم اکبر خان کے ساتھ۔''

''اب اس کا حوالہ مت دو۔'' وہ خفگی سے بولی۔

''وہ تجربہ ہے تمہارا جو اب کام آسکتا ہے، جیسے میرا تجربہ میرے کام آئے گا۔ یہ ٹھیک ہے کہ تم نے اپنی زندگی کو محدود کرلیا تھا، گھر کے اندر تک اور عام عورت کی مصروفیات تک لیکن تم وہی نور ہو۔ بہادر بنو اور سامنے آؤ، تم اس چیلنج کو قبول کرنے کی اہل ہو، صرف تم نور۔ اب میں چلتا ہوں۔''

نور نے کچھ نہیں کہا۔ وہ بس مجھے دیکھتی رہی لیکن [illegible] نے محسوس کرلیا تھا کہ میرے الفاظ کا اثر ہوا ہے، اس کے [illegible] کی وہ عورت جو فراغت اور عافیت کے لیے ایک پرخطر [illegible] چھوڑ کے پیچھے ہٹ گئی تھی۔ جس نے دولت اور شہرت کی [illegible] سکون کر دینے والی چکاچوند اور بدنامی سے بھاگ کر [illegible] محبت کے سائبان میں پناہ لی تھی، ایک گھر کی [illegible] چاردیواری میں چھپ گئی تھی اور سکون کے لیے گمنامی [illegible] کرچکی تھی۔ وہ عورت جیسے انگڑائی لے کر جاگ اٹھی تھی [illegible] اپنے عافیت کے خول سے باہر نکل آئی تھی اور ایک بار پھر [illegible] کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھی، اس کا خوف اور ڈر، [illegible] اور شرم سب ختم ہوگئے تھے۔

اب خود میرے لیے دنیا ایک حریف بن گئی تھی اور [illegible] اس کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھا کیونکہ نہ میں کوئی غیر قانونی کام کررہا تھا نہ غیراخلاقی......نہ میں نے سازش کی تھی اور فریب کاری، میری نیت صاف تھی، میرا دل صاف تھا اور [illegible] احساس میرے اعتماد کو دوچند کررہا تھا، میں نے اپنے لیے [illegible] گاڑی طلب کی جو لارڈ ارنسٹ آفس اور سرکاری تقریبات میں آنے جانے کے لیے استعمال کرتا تھا، جس میں میرے کہنے پر میرے ساتھ صرف جان آرنلڈ نے سفر کیا۔

میں نے راستے میں اس پر واضح کردیا کہ میں کیا [illegible] کرچکا ہوں اور آنے والے دنوں میں میرا لائحہ عمل کیا ہوگا۔ ''قدرتی بات ہے کہ کل لارڈ کی موت کے اعلان کا ردعمل سامنے آئے گا اور اس کے حلقہ شناسائی میں جتنے لوگ شامل ہیں، خواہ ان کی حیثیت سیاسی ہو کاروباری یا ذاتی، وہ مجھ سے ان گنت وضاحتوں کے طالب ہوں گے کیونکہ کسی کو جواب دینے کے لیے ایلیشا موجود ہی نہیں، میں فرداً فرداً ہر ایک سے نہیں نمٹ سکتا چنانچہ میرے ذہن میں ایک پریس بریفنگ ہے جس میں ساری صورت حال کی وضاحت کردی جائے بعد میں پی آر والے سب سے نمٹتے رہیں گے۔''

جان آرنلڈ نے سپاٹ چہرے کے ساتھ کہا۔ ''جیسی آپ کی مرضی سر، میں صرف قانونی مشیر ہوں۔''

کمپنی کا آفس ایک کاروباری علاقے میں لیکن الگ جگہ پر تھا، یہ دومنزلہ عمارت زیادہ بڑی نہیں تھی، اوپر کی منزل پر ماتحت عملہ بیٹھتا تھا اور تمام ریکارڈ رکھا جاتا تھا۔ نچلی منزل پر ایگزیکٹو دفاتر تھے، کانفرنس روم تھا اور ایک کھانے کا کمرا سامنے چاردیواری کے اندر عمارت سے دگنی جگہ پارکنگ کے لیے مخصوص تھی اور یہاں بھی ایگزیکٹوز کی ہر گاڑی کے لیے

الگ جگہ تھی جہاں اور کوئی گاڑی نہیں کھڑی کرسکتا تھا۔

میری گاڑی عمارت کے گیٹ پر پہنچی تو سیکیورٹی اسٹاف نے سیلوٹ کرکے گاڑی کو گزر جانے دیا۔ یہ گاڑی بائیں طرف مڑگئی اور عمارت کے مرکزی دروازے پر جارکی، جان آرنلڈ کی گاڑی دائیں طرف گئی اور ملک ارشد کی گاڑی باہر ہی روک لی گئی۔ بعد میں میرے کہنے سے اسے بھی اندر آنے دیا گیا۔

گھر کی طرح دفتر میں بھی لارڈ ارنسٹ کی وفات کی خبر پہنچ گئی تھی۔ چنانچہ کام بند تھا اور ماحول سوگوار، ہم سیدھے کانفرنس روم میں گئے جہاں ایک طویل میز کے گرد بیس بائیس کرسیاں لگی ہوئی تھیں، چند منٹ کے اندر آفس کے عملے نے مرحلہ وار آنا شروع کیا، وہ روزمرہ کے معمول کے مطابق اپنی اپنی مخصوص سیٹوں پر بیٹھتے گئے۔ ماتحت عملہ کرسیوں کے پیچھے کھڑا رہا، ان سب کے چہرے منجمد اور سوگوار تھے اور سب کی نگاہیں مجھ پر مرتکز تھیں۔ پتا نہیں یہ میرا وہم تھا یا حقیقت تھی کہ بیشتر لوگوں کی نظر میں حقارت اور نفرت کے جذبات تھے۔ ان کی نگاہیں صاف کہتی محسوس ہوتی تھیں کہ یو بلڈی انڈین، کیا ہم تمہیں جانتے نہیں کہ تمہاری اوقات کیا تھی۔ کیسے تم نے اپنے ملک میں ایک ریاست ہتھیائی اور کیسے تم لارڈ ارنسٹ کی اس ایک سو بیس ملین پاؤنڈ کی دولت پر قابض ہوئے ہو، تم تاریخ کے سب سے بڑے بلیک میلر اور دھوکے باز SWINDLER ہو جس نے ایک عورت پر اپنے شیطانی قبضے سے یہ سب حاصل کیا۔

جان آرنلڈ نے جذبات سے عاری لہجے اور سپاٹ چہرے کے ساتھ کسی روبوٹ کی طرح صورتِ حال کی وضاحت شروع کی۔ اس نے ایک کاغذ پر تمام وضاحت طلب نکات کو ترتیب سے لکھ لیا تھا، کانفرنس ہال میں اتنی خاموشی تھی کہ ایک لڑکی نے سسکی بھری تو سارے سر گھوم گئے۔ وہ لڑکی روتی ہوئی باہر نکل گئی، میں نے چند اور لوگوں کی آنکھوں کو بھی اشکبار دیکھا، ان میں میرے دائیں ہاتھ پر بیٹھی ہوئی سوشی بھی شامل تھی۔ وہ اس وقت سب سے سینئر ایگزیکٹو تھی، اس کا ہم مرتبہ دوسرا شخص ایک بھارتی ہندو تھا جو میرے سامنے بیٹھا زیرِلب مسکراتا محسوس ہوتا تھا۔

لارڈ ارنسٹ کی فرم مختلف ممالک سے کچھ چیزیں منگواتی تھی اور کچھ چیزیں بھیجتی تھی، سادہ الفاظ میں یہ امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس تھا جو کسی دشواری کے بغیر طے شدہ اصولوں کے مطابق چل رہا تھا چنانچہ کاروبار کرنے والوں کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ کمپنی کا سربراہ اب کون ہے۔ عورت ہے یا مرد، برطانوی ہے یا ایشیائی، یہ کوئی لمیٹڈ کمپنی نہیں تھی جس کے اسٹاک ایکس چینج میں شیئرز کی ویلیو پر لارڈ ارنسٹ کی موت کی خبر منفی اثر ڈالتی۔

دس منٹ میں جان آرنلڈ نے قانونی پوزیشن کی مکمل وضاحت کردی اس کی گنجائش بھی نہ تھی کہ کوئی ملازم یا ماتحت اس اعلان پر مخالف ردعمل ظاہر کرتا یا کوئی قانونی اعتراض کرتا، سب لوگ اسی طرح ہاتھ باندھے خاموش کھڑے رہے یا کرسیوں پر ساکت بیٹھے مجھے گھورتے رہے، ظاہر ہے اب میرے کچھ کہنے کی باری تھی۔

میں نے کھل کے صاف بات کی۔ لارڈ ارنسٹ کی وفات پر اظہار افسوس کے بعد میں نے اس کے ساتھ چار سال کی رفاقت کا ذکر کیا اور اس کی تعریف کی کہ اس نے مالک، ساتھی اور سینئر کی حیثیت سے مجھے اہمیت دی، میری عزت اور راہنمائی کی اور یہ کوئی رسمی بات نہیں، آپ سب لوگ بھی جانتے ہیں کہ یہ حقیقت ہے۔

پھر میں نے ایلیشا کے فیصلے پر افسوس کا اظہار کیا اور کہا کہ اچھا ہوتا اگر آج میری جگہ وہ آپ سے مخاطب ہوتی لیکن اس کا فیصلہ ایک ذاتی فیصلہ ہے جس پر میں کوئی تبصرہ نہیں کرسکتا۔ تاہم یہ اعلان ضرور کرسکتا ہوں کہ اگر بعد میں کسی بھی مرحلے پر وہ اپنا فیصلہ بدلتی ہے اور واپس آکے وہ سب طلب کرتی ہے جس کی وہ وارث تھی، تو میں آپ سب کے سامنے عہد کرتا ہوں کہ یہ سب کسی عذر اور تاخیر کے بغیر اسے واپس دے دوں گا، جو قانونی طور پر تو میرا ہوگیا ہے لیکن میں اخلاقی طور پر ایلیشا ہی کو اس کا مالک سمجھتا ہوں۔

میرے اس اعلان نے جیسے دھماکا کردیا، یہ ان سب کے لیے انتہائی غیرمتوقع تھا جو میرے خلاف جذبات رکھتے تھے اور یہ سمجھے بیٹھے تھے کہ میں نے ایلیشا کا جذباتی استحصال یعنی اسے ایموشنل بلیک میل کرکے یہ سب ہتھیایا تھا۔ پندرہ دن میں لارڈ ارنسٹ اور اس کی بیوی کا دنیا سے رخصت ہوجانا ایک سانحہ تھا لیکن اس کا ذمے دار مجھے نہیں سمجھا جاسکتا تھا۔ ایک موت کینسر سے ہوئی تھی اور دوسری ہارٹ فیل ہونے سے لیکن اس کے اسباب پہلے سے موجود تھے، اس کے باوجود تمام پرانے ساتھیوں اور نمک خواروں کی ساری ہمدردیاں لارڈ کی فیملی کے ساتھ تھیں، وہ ایلیشا کے مالک نہ ہونے کا ذمے دار مجھے گردانتے تھے۔

میں سب کے دل صاف نہیں کرسکتا تھا۔ عین ممکن ہے میرے اعلان کو بھی انہوں نے بلف قرار دیا ہو، ایک سیاسی چال، ایک کاروباری چالاکی، مگر میں سمجھتا ہوں کہ میں نے ففٹی پرسنٹ سے زیادہ اسکور کرکے عمومی حمایت ضرور حاصل کرلی تھی۔ آخری بات میں نے وہی کہی جو گھر کے ملازموں

سے کہی تھی لیکن تھوڑے سے فرق کے ساتھ۔

میں نے کہا۔ ''آپ میں سے اکثر مجھے جانتے ہیں، چار سال میرے ساتھ کام کر چکے ہیں، جیسا میں پہلے تھا ویسا ہی آج بھی ہوں چنانچہ میری خواہش ہے کہ آپ بھی میرے ساتھ ویسے ہی رہیں، مجھے سب کے تعاون اور سب کی دوستی کی آج بہت زیادہ ضرورت ہے، جو میری مدد کریں گے ان کا مجھ پر احسان ہوگا اور میں وقت آنے پر اس کا بدلہ بھی چکاؤں گا، لیکن جو جانا چاہیں ان کو بھی میں ناخوش نہیں جانے دوں گا۔''

میری تقریر ختم ہوتے ہی سب سے پہلے سوشی نے کھڑے ہو کے مجھ سے ہاتھ ملایا اور مجھے مبارکباد کے ساتھ اپنے تعاون کا یقین دلایا۔ وہ لارڈ ارنسٹ کی موت پر دکھی ضرور تھی مگر میرے آنے پر خوش بھی ہوئی، اس کی تقلید میں دوسرے لوگوں نے مجھ سے مصافحے کا سلسلہ شروع کیا۔

میرے سامنے بیٹھا ہوا مکیش کمار ہاتھ ملانے آیا تو اس نے اردو میں کہا۔ ''نواب صاحب ہماری جو لڑائی ہے وہ دفتر کے باہر جاری رہے گی۔''

میں نے کہا۔ ''کیوں نہیں، آخر ہم پرانے دشمن ہیں۔''

''لیکن اندر آپ کا سب سے بڑا خیر خواہی کا ٹھیکے دار میں ہوں کیونکہ ایک تو میں ایشیائی ہوں، دوسرے میرے ماں باپ لاہور کے تھے۔ میں ولدیت کے اعتبار سے پاکستانی بھی ہوں۔''

اس وقت مجھے کوئی اندازہ نہ ہو سکا کہ ماتحت عملے میں سے کس کس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور کیا کہا۔ اب شام ہو رہی تھی اور آفس بند ہونے کا وقت بھی آ گیا تھا لیکن میں نے تین شعبوں کے ڈائریکٹرز سے رکنے کی درخواست کی، چوتھی سوشی تھی جو کمپنی میں لارڈ کے بعد دوسری پوزیشن رکھتی تھی، ہم نے محاورے کے مطابق چائے کے ایک کپ پر...... اور عملاً کافی پیتے ہوئے کمپنی کی ایک پالیسی بنائی جو سو فیصد وہی تھی جو چل رہی تھی، میں نے واضح کر دیا کہ میں پاکستان میں اپنی مصروفیات کے باعث ہر وقت یہاں موجود نہیں رہ سکتا چنانچہ میری عدم موجودگی میں سوشی ہی چیف ایگزیکٹو ہوگی۔

آنجہانی لارڈ ارنسٹ کے سوگ میں اگلے دن کمپنی میں عام تعطیل کا اعلان کر دیا گیا تھا، میٹنگ ختم ہوئی تو مشیر اور معاون بھی ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے، آخر میں صرف سوشی رہ گئی۔

اس نے بڑی محبت سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا رفیق، میں تمہیں رفیق کہہ سکتی ہوں نا؟''

''سوشی'' میں نے احتجاج کیا۔ ''اب ہم آفس میں ہیں لیکن یہاں اور کوئی نہیں ہے تو صرف پرانے دوست ہیں، جیسے پہلے تھے، ایک تم ہی تو تھیں جس کو میں پاکستان سے بھی ہر کام کے لیے فون کرتا تھا، اس اعتماد کی وجہ سے جو مجھے تم پر تھا اور ہے۔''

''تھینک یو رفیق، تم نے مجھے اس قابل سمجھا، مجھے سمجھ نہیں آتا کہ میں اس موقعے پر اپنے دلی رنج و غم کو ظاہر کروں یا اپنی خوشی کو، میری آنکھوں میں آنسو ہیں اور ہونٹوں پر ہنسی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایک دن تم واپس آؤ گے، حالانکہ میں ہمیشہ چاہتی تھی کہ تم نہ جاؤ اور تم کس حیثیت میں آئے ہو، یہ سب مجھے ابھی تک خواب جیسا لگتا ہے۔''

''سوشی...... میں سب معاملات تم پر چھوڑ رہا ہوں، سمجھو میں صرف نام کا سربراہ ہوں، سارے فیصلے تم کرو گی، کیا اچھا ہے کیا برا ہے، کسے رکھنا ہے کسے فارغ کرنا ہے، سارے اختیارات میں قانونی طور پر تمہیں دے کر جاؤں گا، پلیز مجھے چھوڑ کر جانے کا کبھی مت سوچنا۔''

وہ ہنسی۔ ''میں پہلے ہی کہاں جانے والی تھی، اب تو تمہارے اعتماد اور ذمے داری کے بوجھ تلے دب گئی ہوں۔''

''میں ایلیشا کے لیے بہت دکھی ہوں سوشی...... دل سے۔''

''وہ میں بھی ہوں، ہم جاپانی بھی تقدیر پر بہت یقین رکھتے ہیں، کسی کے چاہنے سے کچھ ہوتا تو میں اس خواہش کے بدلے اپنی زندگی دے سکتی تھی کہ تمہاری اور ایلیشا کی دائمی رفاقت ہو۔''

''ہم پاکستانی کہتے ہیں کہ رشتے آسمانوں پر بنتے ہیں۔'' میں نے اوپر انگلی اٹھا کے کہا۔ ''زمین پر انسان کی کوشش سے کچھ نہیں ہوتا۔''

''تمہیں اندازہ نہیں کہ میرے دل میں اور یہاں بہت سے لوگوں کے دل میں تمہاری عزت کتنی بڑھ گئی ہے، جب تم نے اعلان کیا کہ ایلیشا نے مانگا تو تم سب اسے لوٹا دو گے۔''

میں نے کہا۔ ''وہ بے وقوفی کی حد تک جذباتی لڑکی ہے، زندگی بھر ایسے ہی فیصلے کرتی اور پچھتاتی رہی ہے، میں اس سے مل کر اسے قائل کرنے کی پوری کوشش کروں گا کہ وہ واپس آ جائے۔''

''چاہوں گی میں بھی...... لیکن رفیق، وہ اس کمپنی کو نہیں چلا سکتی، جو اپنی زندگی کو نہیں چلا سکتی، کیا تم نے شادی کر لی ہے؟...... میں نے سنا ہے کہ ایک انتہائی خوبصورت لڑکی تمہارے ساتھ ہے۔''

''وہ اس وقت ارنسٹ مینشن میں ہے اور وہ کمال کی لڑکی ہے، صورت کی نہیں میں اس کی سیرت کی بات کر رہا ہوں۔ ایک دو دن میں تم اس سے بھی ملو گی، میں تمہیں خاص طور پر مدعو کروں گا، لیکن ابھی نہیں۔ پہلے مجھے اس طوفان سے

نمٹنا ہے جو اس تبدیلی کی خبر کے نتیجے میں آئے گا۔''

''تمہیں بہت محتاط ہو کے چلنا پڑے گا رفیق، یہاں بہت لوگ تمہیں نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے، اپنے ذاتی محافظ اور ذاتی عملہ بدل دو۔ لارڈ کی سیکریٹری بدلتی رہتی تھی۔ گزشتہ تین سال سے ایک لڑکی الزبتھ نے اس کو پوری طرح قابو کر رکھا تھا۔''

''ابھی تک میں نے اسے نہیں دیکھا...... کہاں ہے وہ؟''

''میں نے سنا ہے کہ لارڈ نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ کیا کرنے والا ہے اور خاصی بڑی رقم اس کے نام کی ہے لیکن وہ سخت مشتعل ہے، اس کے پلان کچھ اور تھے۔''

''وہ سارے کی مالک بننا چاہتی تھی۔''

سوشی نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''وہ لیڈی سیلیا ارنسٹ کی موت سے بڑی امیدیں وابستہ کیے بیٹھی تھی، اس کے بس میں ہوتا تو وہ اسے بہت پہلے مروا دیتی۔ لارڈ نے اسے صبر سے کام لینے کا کہا تھا لیکن صبر کا پھل اسے کیا ملا۔ اس نے سب کچھ گنوا دیا، وہ سیلیا کی جگہ نہ لے سکی۔ کیا دیا ہوگا اسے لارڈ نے، چند لاکھ پاؤنڈ...... وہ کاروباری طور پر بہت ہوشیار آدمی تھا، تم دیکھنا وہ تمہارے پاس آئے گی، اپنی خدمات تمہیں پیش کرے گی۔ وہ خطرناک عورت ہے، سیکس بم کہلاتی ہے اور دعویٰ رکھتی ہے کہ ہر مرد کو چت کر سکتی ہے۔''

''چلو زندگی میں ایک ناکامی کا مزہ بھی چکھنے دو اسے۔''

''اسے اپنے نزدیک مت پھٹکنے دینا۔ آفس میں کچھ نہیں ہوگا کیونکہ میں ہوں، گھر میں محتاط رہنا اور اپنی حفاظت کرنا۔''

''تمہاری نیک خواہشات میرے ساتھ ہیں تو پھر فکر کیسی، تمہارا وہ نیک دل سیدھا سادا شوہر کہاں ہے۔''

''وہ بھی اپنا کام کر رہا ہے۔'' وہ جانے کے لیے اٹھی۔

''میں اسے کسی ذمے دار پوزیشن میں لانا چاہتا ہوں سوشی۔''

وہ پھر بیٹھ گئی۔ ''ڈیئر رفیق، ایسا مت کرنا، اس سے میرے تمہارے تعلقات متاثر ہوں گے، دفتر کے معاملات میرٹ پر چلنے دو، جب اس کی ترقی کا وقت آئے گا تو میں خود کروں گی۔''

''اوکے...... اوکے آئی ایم سوری، جیسی تمہاری مرضی، مالک تم ہو، میں نہیں۔'' میں اسے باہر تک چھوڑنے آیا۔ ''کل میں ایک پریس بریفنگ کا ارادہ رکھتا ہوں، یہاں آفس میں، کیا تم میری مدد کرنے آ سکتی ہو، صبح اخبارات میں بہت کچھ آئے گا میں سب کے سوالات کا کیسے جواب دوں گا۔''

''میں بالکل آؤں گی۔'' سوشی نے کہا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو گئی۔

ایک شخص میری گاڑی کے پاس مجھ سے ملنے آیا۔

''سر، میں آفس میں آپ کا پرسنل اسسٹنٹ ہوں، میرے لیے کیا ہدایات ہیں؟''

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ ''کتنے عرصے سے تم لارڈ کے ساتھ تھے؟''

''تقریباً ایک سال ہو گیا، میرا نام سائمن ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ویل سائمن، ہم اپنا کام پرسوں شروع کریں گے، ابھی صرف یہ ہدایات ہیں کہ میرا آفس بند رہے گا، تمام فون بند رہیں گے، کسی کو بھی اندر جانے کی اجازت نہیں ہوگی۔ جب تک میں یا سوشی نہیں آتے، یہاں کی سیکورٹی کا انچارج کون ہے؟''

ایک باوردی اور مسلح ساڑھے چھ فٹ قد کا نیگرو میرے سامنے آ کے کھڑا ہو گیا۔ ''یس باس میں چیف سیکیورٹی آفیسر براؤن۔''

میں نے کہا۔ ''براؤن...... تمہیں اس بات کو یقینی بنانا ہے کہ یہاں سے باہر کچھ نہیں جائے گا، ایک کاغذ کا پرزہ بھی نہیں، کوئی انفارمیشن نہیں۔''

''یہ میری ذمے داری ہے باس۔''

جب میں واپس ارنسٹ مینشن جانے کے لیے لارڈ ارنسٹ کی شاہانہ مرسڈیز میں بیٹھا تو میں ایک بدلا ہوا انسان تھا، میں وہ نہیں تھا جو صبح اسپتال میں اکیلا بیٹھا لارڈ ارنسٹ کے قانونی مشیر کا انتظار کر رہا تھا۔ اس وقت سے اب تک تقریباً دس گھنٹے ہو چکے تھے لیکن جو واقعات پیش آئے تھے اور جس کیفیت سے میں گزرا تھا وہ دس دن کا تجربہ لگتا تھا، بے یقینی کی پراسرار فضا ہنوز میرے خیالوں پر اس طرح چھائی ہوئی تھی جیسے سردیوں کی شدید دھند میں سورج نکل آنے کے باوجود ساری دنیا اندھیرے میں متحرک سایوں جیسی لگتی ہے۔

ارنسٹ مینشن کا گیٹ کھلا اور بند ہو گیا۔ گارڈ نے مجھے سیلوٹ کیا اور کار پورچ میں ٹھہر گئی۔ شوفر نے بڑی مستعدی سے اتر کے کار کا دروازہ کھولا تو نور باہر آ گئی۔ وہ کچھ تھکی ہوئی اور پریشان تھی لیکن میری خاطر مسکرا رہی تھی۔ میں اس کے ساتھ سکون اور تنہائی میں کچھ وقت گزارنا چاہتا تھا۔ میری غیر حاضری میں اس نے لوسی کے ساتھ محل کا تفصیلی جائزہ لیا تھا اور کسی حد تک گھر کی مالکن جیسی اتھارٹی قائم کر لی تھی۔

وہ مجھے عقبی حصے میں ایک ٹیرس پر لے گئی جہاں بہت خاموشی تھی اور انتہائی آرام دہ لاؤنج چیئرز رکھی ہوئی تھیں۔

''میں نے تمہارے لیے کافی کا کہا ہے، تم بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہو۔''

میں ایک کرسی پر نیم دراز ہوگیا۔ ''آج کے لیے میں مزید کچھ کرنے کے قابل نہیں ہوں نور...... جسمانی طور پر نہ ذہنی طور پر۔''

وہ میرے سامنے بیٹھ گئی۔ ''آفس میں سب ٹھیک رہا؟''

''چھوڑو نور...... نہ آفس کی بات کرو نہ اس گھر کی، بس میرے سامنے بیٹھی رہو، میں صرف تمہارے ساتھ رہنا چاہتا ہوں، باہر کی دنیا سے بالکل الگ، کوئی فون نہیں، کوئی پیغام نہیں، کوئی دخل اندازی نہیں۔''

''میں نے اس کے لیے پہلے ہی سخت ہدایات جاری کردی ہیں۔ سارے کمرے بند ہیں، صرف ایک بیڈروم کھلا ہے ہمارے لیے، نیچے۔ اگر تم نہا کے کپڑے بدل لو تو فریش ہوجاؤ گے، دس منٹ لگیں گے۔''

''مجھ میں ہمت نہیں ہے نور۔''

''چلو اٹھو۔'' اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے کھینچا اور مجھے زبردستی اندر باتھ روم میں دھکیل دیا۔ دس منٹ کے بجائے میں آدھے گھنٹے میں نکلا تو واقعی لگتا تھا کہ ساری تھکن اور بیزاری گرم پانی کے ساتھ بہہ گئی ہے۔ ٹیرس پر کافی میری منتظر تھی، نور نے مجھے بتایا کہ اس نے رات کے کھانے کے لیے بھی ہدایات دے دی ہیں۔

''اسٹاف بہت اپ سیٹ ہے، یہاں کا سارا شیڈول ایک دم مغربی سے مشرقی ہوگیا ہے، میں نے ہاؤس کیپر کو سمجھا دیا ہے کہ ہم کسی قسم کی ڈرنکس نہیں لیتے، شراب کا جتنا اسٹاک گھر میں موجود ہے عملے میں تقسیم کردیا جائے۔ وہ سخت پریشان تھی کہ اتنی مہنگی شراب جو خاص مہمانوں کے لیے وقف تھی کیسے ملازمین کو فری دے دی جائے۔ میں نے کہا کہ کل سے کہیں بھی شراب نظر آئی تو اسے فلش میں بہا دیا جائے گا۔ بات اس کی سمجھ میں آنے لگی ہے، لیکن جان، ہمیں کچن کا سارا اسٹاف بدلنا پڑے گا۔''

میں نے کہا۔ ''سب ہوجائے گا، ٹیک اٹ ایزی۔''

''ہم ابھی واپس نہیں جاسکتے نا۔''

''کیسے جائیں گے، جب تک یہاں کے سارے معاملات پوری طرح کنٹرول میں نہ آجائیں، قانونی طور پر ایسا ہونے میں وقت لگتا ہے، میں ابھی راجا سے بات کروں گا تو اسے کہوں گا کہ میری طرف سے عدالت میں درخواست دائر کردی جائے، جس میں تمام حالات کی وضاحت ہو۔''

''کیا تہلکہ خیز خبر ہوگی یہ......''

''میں اسے بتادوں گا کہ تفصیل دیکھنی ہے تو کل کی تاریخ کے لندن سے شائع ہونے والے اخبارات دیکھے اور اس کے بعد کی تاریخوں کے بھی۔''

''جان...... راجا جانتا ہے، باقی سب کو کیا بتاؤ گے میرے بارے میں؟''

میں نے سوچ کے کہا۔ ''یہی کہ تم لندن میں تھیں، انٹریئر ڈیزائن کا کورس کررہی تھیں، فریال نے تمہاری سفارش کی اور میں نے تمہیں اس ذمے داری کے لیے منتخب کرلیا۔''

''یہ جھوٹ نہیں چلے گا۔ فریال کے علاوہ شائستہ بھی تو ہے۔''

میں نے کہا۔ ''دیکھو، ان دونوں سے میں تعاون کے لیے کہہ سکتا ہوں اور میں سمجھتا ہوں ان سے ایسا کوئی اندیشہ نہیں کہ وہ مجھے بلیک میل کریں۔ جو ہونا ہے اس سے کیا ڈرنا، بالآخر سب ٹھیک ہوجائے گا۔ ابھی ہمیں اتنی دور کی سوچنے کی ضرورت بھی نہیں۔ میرا یہ ارادہ ہے کہ کل شام پریس بریفنگ دوں، صبح ہم ایلیشا سے ملیں۔''

محل پر ایک عجیب پراسرار ہیبت ناک خاموشی مسلط تھی۔ راتوں رات اس گھر کے مالک بدل گئے تھے۔ درودیوار وہی تھے، سارا سامان وہی تھا اور کہیں کچھ بھی بدلا ہوا نظر نہیں آتا تھا۔ یہی محسوس ہوتا تھا کہ یہاں صرف ہمارا وجود اجنبی ہے۔ نیچے کی منزل پر ملازمین بھی اداس اور سراسیمہ تھے، بے چینی کا شکار تھے کہ نئے مالک کیسے ہوں گے، کیا کریں گے، تبدیلی کے آثار تو انہیں بھی محسوس ہونے لگے تھے مگر یہ صرف ابتدا تھی۔

رات کا کھانا بھی نور کی براہ راست نگرانی میں بنا کیونکہ ہمارے لیے ایک مسئلہ حرام حلال کا بھی تھا جو ملازمین کے لیے ناقابل فہم تھا۔ شراب کی حد تک بات ان کی سمجھ میں آتی تھی لیکن گوشت میں حرام حلال اور ذبح ہونے کا تصور ان کے لیے اجنبی تھا۔ نور یہ واضح کرچکی تھی کہ ملازمین کی اتنی بڑی فوج قطعی غیرضروری ہوگی۔ ہم یہاں رہیں تب بھی اور نہ رہیں تب بھی۔

رات کے بارہ بجے بھی نیند مجھ سے دور تھی، ایک عجیب طرح کی بے چینی تھی جس نے میرے ذہن اور اعصاب پر تسلط حاصل کرلیا تھا۔ یہ احساس تھا کہ یہ سب میرا نہیں تھا جو مجھے مل گیا ہے یا دے دیا گیا ہے، میں اس گھر کا اور اس ماحول کا حصہ نہیں ہوں، اگر ایلیشا نے اسے کبھی واپس نہ لیا تو بھی شاید میں یہاں نہیں رہ سکوں گا، نہ اس گھر میں نہ شہر میں اور نہ ملک میں، پھر مجھے اس کو فروخت کرنا پڑے گا لیکن یہ ابھی بہت دور کی بات تھی۔

آدھی رات کے وقت جب پاکستان میں شام کے سات بجے تھے میں نے راجا سے فون پر بات کی، اسے اول

ایک دن کی روداد سنانے میں ہی مجھے ایک گھنٹا لگ گیا۔

ساری بات سن کے اس نے کہا۔ ''میرے پیارے [...]ز، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں پریشانی کی کون سی ہے تیرے لیے۔ یار ایسی قسمت ہم نے کسی کی نہ دیکھی [...]۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اب ایسی ہی کوئی اور لاٹری والی [...]تیرے نام کسی اور ملک میں بھی نکلے گی۔''

''راجا میں ابھی تک کنفیوژن کا شکار ہوں، شاید اس [...]ی کہ میں اس کے لیے بالکل تیار نہیں تھا، میں تو تیاری کر [...]ا جیل جانے کی۔ لارڈ نے مجھے یہی دھمکی دی تھی، [...]ک سب الٹا ہوگیا جیسے زمین اوپر آسمان نیچے۔''

''یہ فکرمت کر یار، ایک دو روز میں حالات تیرے قابو [...]آجائیں گے اور تجھے کرنا کیا ہے، کمپنی چلائے گی سوشی، تو [...]بھی چلا سکتا تھا، قانونی معاملات سے نمٹے گا ملک ارشد اور [...]کورا جان آرنلڈ، سب تیرے نام ہوجائے تو پھر تیری [...]ی، سب کو ٹھکانے لگا اور بات ختم، لیکن میری مانے تو ابھی [...]ی چیز کو مت چھیڑ، مہینا دو مہینا ٹھہر۔ جیسے انگریزی میں [...]تے ہیں کہ گرد کو بیٹھ جانے دے، یہاں کی فکرمت کرو، [...]الت سارے حالات جان کے مہلت ضرور دے گی۔''

میں نے کہا۔ ''اتنا عرصہ میں نہیں رک سکتا۔''

''واپس آنا کیا مشکل ہے، تو دو ملکوں کا شہری ہے [...]ہاں رہ یا وہاں۔ کاروبار کا چلتے رہنا فائدے کی بات ہے، [...]ل کی فوری فروخت کا بھی کوئی فائدہ نہیں، ایک شاندار [...]ہائش گاہ لندن میں ہو تو اچھا ہے، اگر وہ مان جائے تو نور کو [...]وہیں چھوڑ دے۔''

''وہ کبھی نہیں مانے گی، ایک دن نہیں رکے گی یہاں، [...]ی الحال تو یہ کر کہ مجھے ایک پی آر او فراہم کر۔''

''میں کیا کروں، کسی دکان کا پتا بتاؤں جہاں پی آر او ملتے ہوں۔''

''یار پاکستانی اخباروں کے نمائندے ہیں، بی بی سی اردو سروس میں لوگ ہیں، کسی سے میرا رابطہ کرادے، ایک اعزازی عہدہ ہوگا، کام کچھ نہیں، تنخواہ اضافی ملے گی، باقی پاکستانی اسٹاف مل جائے گا۔''

''اچھا میں دیکھتا ہوں۔''

''کل کے لندن کے اخبارات دیکھ لینا۔ کسی سے منگوا لینا۔ یہ بی بی سی سے نشر ہونے والی خبر تو ہے نہیں۔ بڑے اخباروں میں بھی نمایاں جگہ پر شائع نہیں ہوگی، ویسے میں بھی بھجوادوں گا، سب کو معلوم ہوجائے گا۔''

جیسا کہ مجھے یقین تھا نور نے اس محل میں رہنے سے صاف انکار کردیا۔ ''تمہارے بغیر میں ایک دن نہیں رہ سکتی یہاں۔''

''بہادر بنو لڑکی۔''

''میں بزدل ہی اچھی، نہیں چاہیے مجھے تمہارا ستارۂ جرأت، تم رہو تو ٹھیک ہے۔'' اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔

''اگر میں آتا جاتا رہوں، ہر ہفتے یا پندرہ دن میں اور تمہارے ساتھ اپنے لوگ ہوں، سارا عملہ تم اپنی مرضی سے رکھو یا ست بدھائی سے آجائے۔''

''میں نے کہہ دیا نا کہ یہ ناممکن ہے، بس تم اپنے قانونی معاملات نمٹاؤ، اس کے بعد محل رکھو یا کسی کے حوالے کرو۔''

''تم نے سب کمرے بند کرادیے؟''

''کمرے بند کرادیے لیکن میرا خیال ہے کہ تمہیں ہر کمرے کے تمام ساز و سامان کی تفصیل بنوانی چاہیے، ہمیں نہیں معلوم کیا تھا کیا نہیں ہے۔ یہ جو ہاؤس کیپر ہے لوسی، یہ تو شاید کل ہی چھوڑ جائے۔ اسے سخت ناگوار گزر رہا تھا میرے احکامات کی تکمیل کرنا، میں سمجھتی ہوں باقی بھی ایسا ہی سوچ رہے ہوں گے، یہاں تین فون ہیں، چار گاڑیاں اور سترہ ملازم...... حد ہے۔''

میں نے کہا۔ ''تم کو ان فکروں میں ہلکان ہونے کی ضرورت نہیں، کرلیں گے آہستہ آہستہ سب کچھ یہ حالات کے مطابق اور اپنی ضروریات کے مطابق، ابھی دیکھتے ہیں ایلیشا کا موڈ کیا ہے۔''

تھکن سے بے حال ہونے کے باوجود میری رات بے چینی میں گزری، نور کا تو ایسا حال رہا جیسے وہ کسی آسیب زدہ محل میں ہے، اسے رات بھر آوازیں سنائی دیتی رہیں، کوئی آہٹ بھی ہوتی تو وہ چونک پڑتی تھی، گھر میں جو تین ٹیلی فون تھے وہ آدھی رات کے بعد بجنے شروع ہوگئے تھے، وہ یقیناً خبروں کے متلاشی صحافی ہوں گے جن کے لیے یہ ایک سنسنی خیز اسٹوری تھی، میں نے سب کے ریسیور نیچے رکھ دیے۔

مجھے اندیشہ یہ تھا کہ صبح جب لارڈ ارنسٹ کے انتقال کی خبر عام ہوگی اور اس تبدیلی کا پتا چلے گا تو اخبار والوں کے علاوہ ان سے کاروباری یا ذاتی تعلق رکھنے والے بھی ارنسٹ مینشن کا رخ کریں گے کیونکہ کمپنی کا آفس انہیں بند ملے گا اور ان کے کسی سوال کا جواب دینے والا کوئی نہیں ہوگا، کسی سے نہ ملنا اور سب کو باہر ہی سے رخصت کرنا بھی ایک مشکل کام ہوگا...... اس سے کہیں بہتر ہوگا کہ میں خود لاپتا ہوجاؤں...... میرے اپنے جاننے والے بہرحال میرے فون نمبر پر رابطہ کرلیں گے۔

صبح میں نے ناشتے سے فارغ ہوتے ہی گاڑی

نکلوائی...... گیٹ پر سیکورٹی کے ذمے داروں کو ہدایات دیں کہ وہ تمام ملاقات کے لیے آنے والوں سے معذرت کر لیں...... لوسی کو سمجھا دیا کہ وہ تمام فون کالز کا ایک ہی جواب دے کہ مالک گھر پر نہیں ہیں اور کچھ بتا کے نہیں گئے۔

باہر آنے کے بعد میں نے شوفر سے پوچھا۔ ''تمہیں اس چرچ کا پتا معلوم ہے جہاں ایلیشا ہے۔''

''نو سر...... لارڈ ارنسٹ کو معلوم تھا...... وہاں وہ اکیلے جاتے تھے۔''

میں نے سوچ کے کہا۔ ''اچھا...... کہاں سے معلوم ہو سکتا ہے؟''

شوفر نے کہا۔ ''میرا خیال ہے...... کسی بھی چرچ سے مدد مل سکتی ہے......''

یکے بعد دیگرے ہم نے لندن کے کئی چرچ دیکھے لیکن انہوں نے مطلوبہ معلومات کی فراہمی سے معذرت کر لی...... ان کے نزدیک یہ ایک نجی معاملہ تھا جس میں کسی کو مداخلت نہیں کرنا چاہیے...... ہم مایوس ہو چکے تھے۔ اب ایک مرکزی چرچ کے آفس سے کچھ حوصلہ افزا جواب ملا...... کچھ دیر انتظار کے بعد ہمیں ایک ٹیلی فون نمبر دیا گیا...... ''آپ یہاں سے معلوم کر لیں۔''

اس نمبر سے بھی کسی نے انتہائی شرافت کے ساتھ لیکن بڑے غیر جذباتی انداز میں مجھ سے بہت سے سوالات کیے۔ میرا نام...... ایلیشا سے تعلق...... مقصد ملاقات...... پھر مجھے انتظار کرنے کے لیے کہا گیا...... چند منٹ بعد مجھے یہ کورا جواب ملا کہ ''سوری...... آپ کی ملاقات ممکن نہیں۔'' اور فون بند ہو گیا۔ کوئی وجہ نہیں...... کوئی وضاحت نہیں۔

مجھے سخت مایوسی ہوئی...... اسی جستجو میں دوپہر ہو گئی تھی۔ اس دوران مجھے متعدد فون موصول ہوئے۔ ان میں زیادہ تر ست بدھائی سے تھے۔ ایک کال ڈاکٹر شائستہ کی تھی۔ اسے میں نے شرافت سے سمجھا دیا کہ حقیقت وہی ہے جو اس نے اخبار میں دیکھی...... تفصیل میں ملاقات پر بتاؤں گا...... ابھی میں مصروف ہوں...... یہی جواب میں نے فریال کو بھی دیا۔

پھر ایک کال چیف کی موصول ہوئی...... ''نواب صاحب! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں اخبارات میں...... کیا یہ سچ ہے؟''

میں نے کہا۔ ''نہیں...... سب جھوٹ ہے...... میں نے پیسا خرچ کر کے شائع کرایا ہے۔''

''آپ تو ناراض ہو گئے...... آخر ہم پارٹنر ہیں۔''

''میں ابھی بے حد مصروف ہوں...... پھر بات کروں گا۔''

اب مجھے کوفت ہونے لگی تھی۔ نہ میں نے جرم کیا تھا اور نہ کوئی غلط کام...... پھر بھی میں لوگوں سے بھاگ رہا تھا۔

گھر سے نکلا ہوا تھا اور سڑکوں پر اس لیے پھر رہا تھا کہ سوالات سے بچنا چاہتا تھا۔ مجھے اپنی اس بزدلی پر شرم آئی آخر ایسے کب تک چلے گا...... یہ لوگ کل پھر مجھے گھیر لیں گے۔

ہم نے دوپہر کا کھانا بھی باہر ہی کھایا۔ وہاں مجھے کا فون موصول ہوا۔ اس نے ایک نام بتایا۔ ''ابراہیم بہت سینئر صحافی ہے...... کسی اصولی اختلاف کی وجہ سے سی کو چھوڑا...... ایسے ہی اختلافات کی وجہ سے یہاں سب سے بڑے اخبار کو چھوڑا...... اور پھر ملک بدر ہوا۔ میں سمجھتا ہوں وہ تیرے کام کا بندہ ہے...... اس سے پیسوں بات مت کرنا...... چڑ جائے گا...... میں بعد میں بتا دوں گا اسے کیا مل رہا تھا۔''

یہ میرے لیے بڑے اطمینان کی بات تھی۔ پریس بریفنگ کے لیے شام ساڑھے چار بجے کا وقت رکھا گیا تھا یہ اطلاع مجھے سوشی سے ملی۔ میں تین بجے آفس پہنچ گیا کیونکہ ابراہیم یوسفی کو راجانے یہی وقت دیا تھا۔ اسے میں اخبار والوں کے آنے سے پہلے اپنے تمام معاملات تفصیل سے سمجھانا چاہتا تھا۔

ابراہیم یوسفی درمیانی عمر کا بظاہر غیر سنجیدہ اور لاابالی نظر آنے والا شخص تھا۔ راجانے اسے میرے بارے میں مطمئن کر دیا ہوگا۔ اس سے کچھ دیر کی ملاقات کے بعد مجھے بھی اندازہ ہو گیا کہ وہ میرے لیے کس حد تک کارآمد ثابت ہو سکتا ہے......

چار بجے سوشی پہنچ گئی...... کچھ دیر بعد ہی مقامی اخبارات کے رپورٹر پہنچنے لگے...... ان میں کچھ پاکستانی بھی تھے۔

کانفرنس روم میں ان کی تعداد دیکھ کر مجھے مایوسی ہوئی۔ پاکستان میں شاید ہال بھر جاتا اور جگہ کم پڑ جاتی...... یہاں مشکل سے درجن بھر لوگ آئے تھے۔ میرے ساتھ ایک طرف جان آرنلڈ تھا...... دوسری طرف سوشی تھی...... نور دانستہ پریس کانفرنس سے دور ہی تھی اور میرے آفس والے کمرے میں سب دیکھ اور سن رہی تھی۔

ابھی میں نے پہلا تعارفی جملہ ہی بولا تھا کہ ''حضرات و خواتین...... میں نواب رفیق احمد شیرازی، اس کمپنی کا نیا مالک ہوں......'' کہ ایک عورت کھڑی ہو گئی، وہ میز کے آخری کنارے پر صحافیوں سے الگ بیٹھی ہوئی تھی۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم ایسا لغو اور بے بنیاد دعویٰ کرنے کی ہمت بھی کیسے کر سکتے ہو، میرے ہوتے ہوئے۔''

یہ سنتے ہی سارے سر اس کی طرف گھوم گئے۔

چند لمحوں کی خاموشی کے بعد میں نے جان آرنلڈ کی طرف دیکھا تو اس نے سوال کیا...... ''آپ کون ہیں خاتون؟ کس حیثیت میں یہ سوال کر رہی ہیں۔''

''میرا نام الزبتھ ہے۔''

اس کے مزید کچھ کہنے سے پہلے ہی کسی ستم ظریف نے بے لہجے میں پوچھ لیا۔ ''کون الزبتھ یا الزبتھ ٹیلر......''

صورتِ حال کی سنجیدگی کے باوجود لوگوں کے چہرے پر تبسم آ گیا اور ایک شخص تو زور سے ہنس پڑا مگر سوال کرنے والا سکون سے بیٹھا رہا۔

''لیڈی سیلیا ارنسٹ کی موت کے وقت میں الزبتھ براؤن تھی۔'' اس عورت نے صرف ایک نظر سوال کرنے والے کو گھورا اور پھر اپنی بات جاری رکھی۔ ''ایک ہفتے بعد میں الزبتھ ارنسٹ بن گئی۔ اس کی بیوی جس کے اثاثوں پر آج یہ ... لا انڈین غاصبانہ طور پر قابض ہو گیا ہے جو کل تک اس کا ... ملازم تھا۔''

وہ عورت شاید چالیس سال کی ہو گی لیکن صحت مندی کے اصولوں پر عمل کرنے سے وہ اپنی عمر کی پیش رفت کو بریک لگانے میں کامیاب تھی۔ وہ تیس کی دکھائی دیتی تھی اور اپنے ... اسٹائل لباس اور اطوار سے پانچ سال مزید کم کی نظر آنے میں کامیاب تھی۔ اس کی بات نے ایک زیرِ لب اظہارِ حیرت کا خفیف سا شور پیدا کیا۔ پھر جان آرنلڈ نے کہا۔ ''پلیز آپ بیٹھیے اور مجھے یہ بتائیے کہ اپنے نام کے ساتھ ارنسٹ جوڑنے کا کیا مطلب لیں؟ یہ کہ آپ آنجہانی لارڈ کی بیوہ ہیں؟''

''اس کا مطلب کچھ اور نہیں ہو سکتا مسٹر آرنلڈ۔''

''میں قانون کی زبان میں بات کرتا ہوں...... کیا آپ کے پاس لارڈ کی قانونی بیوی ہونے کا کوئی ثبوت ہے؟'' آرنلڈ نے کہا۔

سوشی میری طرف دیکھ کر زیرِ لب مسکرائی۔ اس نے مجھے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ آج کل جو خاتون آنجہانی لارڈ کی ... سیکریٹری کے علاوہ گرل فرینڈ کے عہدے پر فائز تھیں وہ کس حد تک خطرناک ثابت ہو سکتی ہیں۔

الزبتھ نے کہا۔ ''ثبوت کیوں نہیں...... اپنی موت سے بہت پہلے...... بلکہ لیڈی سیلیا کی زندگی میں ہی...... اس نے مجھے پروپوز کیا تھا اور صاف کہا تھا کہ وہ صرف اپنی بیوی کے مرنے کا انتظار کر رہا ہے، تاہم اس نے مجھے یہ منگنی کی انگوٹھی پہنا دی تھی۔''

اب مسکراہٹ سب کے لبوں پر نمایاں ہو چکی تھی لیکن ماحول ایسا تھا کہ کوئی شرارت آمیز سوال نہیں کرنا چاہتا تھا چنانچہ آرنلڈ نے ہی کہا۔ ''میڈم، میں شادی کے ثبوت پر اصرار کروں گا۔''

الزبتھ نے برہمی سے کہا۔ ''اس نے مجھے دس ملین پاؤنڈز دیے اور مجھ سے شادی کے سارے انتظامات پر بات کی۔ میں چوبیس گھنٹے اس کے ساتھ رہتی تھی اور وہ ہر جگہ...... میرا مطلب ہے باہر...... مجھے اپنی وائف کے طور پر ملواتا تھا۔''

''لیکن شادی نہ کسی پادری کے سامنے ہوئی تھی اور نہ رجسٹر کی گئی تھی، کیا یہ صحیح ہے، یس آر نو......؟''

''تم حالات اور واقعات کی شہادت دیکھو۔''

''یس آر نو؟'' آرنلڈ نے سخت لہجے میں دہرایا۔ ''اگر تم اپنا دعویٰ عدالت میں ثابت کر سکتی ہو تو ضرور کرو...... یہاں خاموش بیٹھو۔''

وہ چلانے لگی۔ ''میں خاموش نہیں رہ سکتی۔''

اب میں نے کہا۔ ''ایسی صورت میں مجھے سیکیورٹی کے ذمے داروں کو کہنا پڑے گا کہ تمہیں باہر نکال دیں کیونکہ ویسے ہی یہاں صرف صحافی بلائے گئے تھے۔''

وہ شور مچاتی اٹھی۔ ''میں تم سے بھی نمٹ لوں گی، تم غاصب نہیں ڈاکو ہو، قاتل ہو...... اس کی موت کے تم ذمے دار ہو، اس کی بیٹی کو تم نے ہی پاگل کیا ہے۔'' باہر جانے تک اس کی آواز آتی رہی۔

امن اور سکون ہونے کے بعد جان آرنلڈ نے پھر اپنی بات کا آغاز کیا۔ اس نے تمام قانونی صورتِ حال واضح کی اور اخبار والوں کو بتایا کہ اب صرف ضابطے کے مطابق قانونی کارروائی باقی ہے جس میں اتنا ہی وقت لگے گا جتنا کسی بھی عام کیس میں لگتا ہے۔ اس کے بعد سوالات کا سلسلہ شروع ہوا۔

ہمارے ایک پاکستانی کی طرف سے ہی پہلا سوال آیا۔ ''لارڈ ارنسٹ کا پوسٹ مارٹم کیوں ضروری نہیں سمجھا گیا، اس کی موت کے اسباب جاننے کے لیے۔''

آرنلڈ نے کہا۔ ''وہ اسپتال میں تھا جب اس پر اٹیک ہوا اور اس کی کیس ہسٹری، ڈاکٹرز جانتے تھے کہ وہ رسک پر تھا۔ ان کے نزدیک یہ طبعی موت تھی اور ڈیتھ سرٹیفکیٹ بناتے وقت اس کی فائل میں سب لکھ دیا گیا ہے۔''

ایک اور انڈین جرنلسٹ نے پوچھا۔ ''آخر اس نے نواب رفیق احمد شیرازی کا انتخاب ہی کیوں کیا اپنے جانشین کے طور پر......؟''

جان آرنلڈ کے لبوں سے پہلی غیر سنجیدہ بات نکلی۔ ''یہ سوال آپ آنجہانی لارڈ کی خدمت میں حاضر ہو کے انہی سے پوچھ لیں تو آپ کو بالکل صحیح جواب مل جائے گا۔''

مجھے بڑی خوشگوار حیرت ہوئی جب ایک معتبر اخبار کے رپورٹر نے مجھ سے سوال کیا۔ ''نواب شیرازی، آپ کی پاکستان میں ایک ریاست ہے جہاں آپ نے عوامی فلاح و بہبود کا ایک ترقیاتی پروگرام شروع کیا ہے، کیا آپ اس کو جاری رکھ سکیں گے؟''

''کوئی وجہ نہیں کہ وہ جاری نہ رہے۔''

''کیا ایسی صورت میں لارڈ ارنسٹ کا بزنس متاثر نہیں ہوگا؟''

میں نے کہا۔ ''آپ بھی دو کام ضرور کر رہے ہوں گے جو یکساں مشکل اور اہم ہوں گے، ایک صحافت کی ذمے داری اور ایک گھر کی ذمے داری۔ میں بھی دو کام کر ہی لوں گا۔''

ایک رپورٹر نے کہا۔ ''آپ کے پاس دہری شہریت ہے، اب آپ کی ترجیح کہاں رہنا ہوگی؟''

''اس کا انحصار ضرورت پر ہے۔ کب کہاں زیادہ ہوگی، یہ ابھی میں نہیں جانتا۔''

''کیا اس کا امکان بھی ہے کہ آپ یہاں کے سارے اثاثے فروخت کر کے رقم پاکستان منتقل کر دیں؟'' ایک خاتون رپورٹر نے پوچھا۔

دوسری نے اس میں اضافہ کیا۔ ''یا پھر اس کے برعکس۔''

میں نے کہا۔ ''نہ اس کی ضرورت ہے، نہ میں نے ایسا سوچا ہے۔''

کسی نے میرے حق ملکیت، اس کے اخلاقی جواز یا قانونی پہلو پر نکتہ چینی یا اعتراض اٹھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی،... در صل یہ اتنا بڑا معاملہ نہیں تھا جتنا میں سمجھ رہا تھا۔ ہمارے نظام وراثت میں حق صرف قانونی وارثوں کو ملتا ہے، وصیت کی رو سے صرف ایک تہائی غیر متعلقہ فرد کو یا ادارے کو جا سکتی ہے ورنہ عاق نامے کی شرعی حیثیت بھی کچھ نہیں... یہاں جو مالک ہے اس کی مرضی۔ چنانچہ یہ کوئی انوکھا واقعہ نہیں تھا کہ ایلیشا کے ہوتے لارڈ نے سب مجھے کیوں دے دیا؟

دوسری بات یہ کہ لندن میں سیکڑوں بڑے بڑے کاروباری ادارے ہیں یہاں نہ جانے کتنے ہی کروڑ پتی ارب پتی جائدادیں اور اثاثے لیے بیٹھے ہیں، کون مر گیا اور کس کے لیے کیا چھوڑ گیا، نہ بینک کو سروکار ہے اور نہ ریاست کو۔

یہی وجہ ہے کہ لندن سے شائع ہونے والے بیشتر اخبارات میں یہ اندر کے صفحات پر چھوٹی سی خبر تھی کہ لارڈ ارنسٹ نے اپنے اثاثے ایک انڈین اسٹیٹ کے ترقیاتی فنڈ میں دے دیے۔ دو نے اس کا صرف یہ پس منظر بیان کیا تھا کہ لارڈ کی بیٹی نے نروس بریک ڈاؤن کے بعد چرچ میں شمولیت اختیار کر لی تھی اور نن بننے کے بعد اس نے لارڈ ارنسٹ کے اثاثوں سے دستبرداری قبول کر لی تھی۔ کسی خبر میں کوئی ذاتی حوالہ نہیں تھا کہ ایلیشا کب عائشہ رہی، کب میرے عشق میں اپنا سب کچھ چھوڑنے پر تیار تھی۔

تاہم کچھ زرد صحافت کے علمبردار اخبارات نے جن کو انڈین یا پاکستانی کمیونٹی میں ریڈر شپ حاصل تھی اس کہانی کو خوب نمک مرچ لگا کے چھاپا...... ایسے کچھ اخبارات کے نمائندے وہاں موجود تھے۔

ان میں سے ایک نے پوچھا۔ ''کیا لارڈ ارنسٹ کی واحد وارث کے نروس بریک ڈاؤن اور سب کچھ آپ کو دے کر نن بن جانے کی وجہ یہ تو نہیں تھی کہ آپ نے اس کی محبت کو ٹھکرا دیا تھا؟''

میں نے کہا۔ ''میں پرسنل لائف سے متعلق کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔''

دوسرے نے پھر بھی پوچھا۔ ''آپ نے ابھی تک شادی نہیں کی۔ کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ آپ اسی لڑکی سے شادی کر لیتے جو آپ کی خاطر اپنا گھر، ملک اور مذہب تک چھوڑنے پر تیار تھی۔''

''میرے لیے کیا بہتر ہے اور کیا نہیں، میں جانتا ہوں، اس بارے میں آپ کو متفکر ہونے کی ضرورت نہیں۔''

پاکستانی معیار سے یہ پریس کانفرنس پھس پھسی رہی شاید اس کی اتنی ضرورت نہیں تھی، یہ احساس مجھے بعد میں ہوا۔ ایک گھنٹے سے کم وقت میں صحافی رخصت ہو گئے تو ابراہیم یوسفی نے بھی کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ آپ کو میری خدمات کی چنداں ضرورت نہیں۔ آپ پریشان نہ ہوں یہاں کسی کے معاملات سے کوئی سروکار نہیں رکھتا۔ بس آپ قانونی معاملات پر دھیان دیں۔''

میں نے کہا۔ ''یہ گورا تو بطور مشیر میرے ساتھ رہنا نہیں چاہتا۔''

''اسے نہ رکھنا ہی بہتر ہوگا۔ ملک ارشد کی یہاں اچھی گڈول ہے...... ورنہ ہمارے پاکستانی وکیل تو یہاں بھی ایسے ہیں کہ خدا بچائے۔''

جان آرنلڈ نے کہا کہ معاہدے کی رو سے وہ ایک مہینے کا نوٹس دے رہا ہے۔ اس ایک مہینے میں وہ میری پوری معاونت کرے گا۔ بالکل اسی طرح جیسے لارڈ ارنسٹ کی کرتا تھا...... اگر اس سے پہلے ہی میں اپنا قانونی مشیر لے آؤں اور اسے

ادا کر کے فارغ کر دوں تو اسے کوئی اعتراض نہیں۔''

میں نے کہا۔ ''میں نے ملک ارشد کا تقرر کرنے کا ہے لیکن آپ فی الحال اس کی راہنمائی کریں، یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ اسے مزید رہنمائی کی ضرورت نہیں۔''

ملک ارشد نے اخلاقاً کہا۔ ''آپ کا تجربہ یقیناً کام آئے گا۔''

شام کے وقت میں نور کے ساتھ ارنسٹ مینشن پہنچا تو سرپرائز میرے منتظر تھے۔ لوسی اپنی سنیارٹی کے ہاؤس کیپر اور اندر کے سارے نظم و نسق کی ذمے دار تھی اس کی ایمانداری، فرض شناسی اور وفاداری کا جذبہ ہوگا رڈ ارنسٹ نے سب کچھ اس کے سپرد کر رکھا تھا۔ وہ ایک مزاج اور ضرورت سے زیادہ سخت گیر عورت تھی چنانچہ ازمین اسے میجر لوسی کہتے تھے۔ پہلے میں سمجھا تھا کہ یہ رنسٹ اور اس کی بیوی کے صدمے کا اثر ہے کہ وہ اتنی رہتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی نے اسے کبھی مسکراتے دیکھا تھا اور کسی کو اس کی وجہ بھی معلوم نہیں تھی کہ وہ ایسی ہے، میجر لوسی کسی کو ذاتی نوعیت کا سوال کرنے کی ت ہی نہیں دیتی تھی۔

ہمارے واپس پہنچنے کے کچھ دیر بعد لوسی نے ہمیں مطلع کہ آج دن بھر میں کس کس نے کال کیا تھا۔ کافی پیتے ے میں نے اس فہرست پر نظر ڈالی تو مجھے ایک نام چیف کا آیا، اس کے سامنے لکھا تھا کہ وہ صرف نواب شیرازی سے ملنے کا متمنی تھا اور دوبارہ فون کرے گا۔ دوسری حیرت مجھے نا کی طرف سے موصول ہونے والے پیغام پر ہوئی، اس کہا تھا کہ میں اگر اس سے ملاقات کرنا چاہوں تو سینٹ ی کی خانقاہ میں صبح دس بجے کے بعد آ سکتا ہوں۔

''اس نے اور کچھ نہیں کہا۔ وہ کیسی تھی، تمہاری بات تھی؟''

لوسی نے وضاحت کی۔ ''میری اس سے کوئی بات نہیں ی، پیغام دینے والی خانقاہ کی کوئی سسٹر جون تھی۔''

''کیا وہاں میرا اکیلا جانا ضروری ہوگا؟''

''یہ میں نہیں بتا سکتی...... کیونکہ پیغام میں اس کی کوئی صراحت نہیں تھی۔''

''کوئی مجھ سے ملاقات کے لیے آیا تھا؟''

''یس...... کچھ لوگ آئے تھے، ان کے نام گیٹ پر یکورٹی اسٹاف نے لکھے ہوں گے، وہ سب تعزیت کرنے لے تھے۔ اس کے علاوہ پولیس کیپٹن ایڈم بھی تھا، وہ دوبارہ ئے گا۔''

اور وہ اسی وقت آ گیا، میں نے اسے مہمانوں کے کمرے میں طلب کر لیا۔ ''آئی ایم سوری میں گھر پر نہیں تھا۔'' وہ مجھے دیکھ کے اٹھا۔ ''مجھے لارڈ کی مرگ ناگہاں کا افسوس ہے، وہ طبعاً نیک اور فراخدل آدمی تھا۔''

میں نے پوچھا۔ ''تم کچھ لو گے...... کافی یا......''

''نو سر...... میں ڈیوٹی پر ہوں اور یہ بتانے آیا ہوں کہ اب اگرچہ عدالتی اور قانونی کارروائی بے مقصد ہو چکی ہے، اس کیس میں مدعی کوئی نہیں رہا، تاہم آپ کے ساتھ مس نور کے بیان کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر یہ کیس ختم نہیں ہو سکتا۔ عدالت نے آپ کو کل صبح نو بجے طلب کیا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ہم حاضر ہو جائیں گے۔''

رات کے کھانے سے ایک گھنٹا پہلے لوسی دوبارہ حاضر ہوئی۔ ''گھر کے تمام ملازم کچھ کہنا چاہتے ہیں سر......''

''ایک ساتھ...... یا الگ الگ؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ ایک ایک کر کے آئیں گے، آپ کا زیادہ وقت نہیں لیں گے۔''

''اچھا آنے دو۔'' میں نے کہا۔

نور اس وقت کچن میں ہدایات جاری کر رہی تھی۔ لارڈ کے ذاتی ملازمین ایک ہی درخواست پیش کی۔ وہ میری ملازمت کرنا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے یقیناً یہ فیصلہ آپس میں اتفاق رائے سے کیا ہوگا درخواست کے آخر میں دستخط اور نام الگ الگ تھے۔ ان سب نے کہا تھا کہ انہیں لارڈ کے گھر میں ملازمت سے فارغ کر دیا جائے۔ شرائط ملازمت کے مطابق وہ ایک ماہ کا نوٹس دے رہے ہیں۔

میں نے ان سب کا شکریہ ادا کیا اور انہیں یقین دلایا کہ انہیں ان کی مرضی کے خلاف ایک دن بھی روکا نہیں جائے گا اور اگر وہ چاہیں تو کل ہی اپنے واجبات وصول کر لیں۔ شکرگزاری کے طور پر سب کو میری طرف سے ایک ایک ہزار پاؤنڈ کا بونس دیا جائے گا۔

''چلو یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ نوٹس ہمیں نہیں دینا پڑا۔'' نور نے آخری ملازمہ کے جانے کے بعد کہا۔

''لیکن ہمیں کچھ عملہ تو چاہیے۔''

''ابھی ایک مہینا کچھ لوگوں کو روکا جا سکتا ہے۔ ڈرائیور صرف ایک چاہیے۔ مالی نہ رکھیں تو باغ تباہ ہو جائے گا۔ وہ بھی ایک ہی کافی ہے، صبح آئے اور شام کو چلا جائے۔ کچن میں کام کے لیے ایک تو میں ہوں۔''

''تم کچن میں کیا کرو گی؟''

''کھانا پکانا اور کیا...... مجھے اطمینان نہیں، یہ پتا نہیں کیا

کھلا رہے ہیں، میری مدد اور صفائی کے لیے ایک ملازمہ چاہیے۔ ایک سیکیورٹی گارڈ دن کے لیے، ایک رات کے لیے، محل کی صفائی کے لیے دو ملازم۔ یہ ہوئے سات آدمی، ابھی سترہ کام کررہے ہیں، سات افراد بھی ہم خود اپنی مرضی سے ملازم رکھیں گے، ان کے آنے کے بعد باقی کو فارغ کیا جاسکتا ہے۔ دس کی تو کل ہی چھٹی کردی جائے گی۔"

"یو آر دی باس میڈم...... آپ چاہیں تو میری بھی چھٹی کردیں۔"

وہ ہنسی۔ "تم کس حیثیت میں کام کررہے تھے؟"

"آپ کا مخلص عاشق صادق...... دوست، محافظ، دائمی رفاقت کا امیدوار، خدمت گزار۔"

"یہ سب اعزازی عہدے ہیں اور کام کی چھٹی کوئی نہیں۔"

میرے موبائل فون پر آج بھی سارا دن مختلف فون آتے رہے تھے۔ ایک ایک کال تو ست بدھائی سے سب نے کی تھی۔ راجا کے کئی فون آئے تھے لیکن ایک نمبر کو دیکھ کے میں شش و پنج میں پڑ گیا کہ بات کروں یا نہ کروں۔ یہ فریال کا فون تھا۔ میں نے اس سے بات نہ کرنا ہی بہتر سمجھا۔ اسی طرح کی مس کالوں میں ڈاکٹر شائستہ کا نمبر بھی تھا اور کچھ اجنبی نمبرز تھے...... مجھے بخوبی اندازہ تھا کہ میرے دوست احباب رشتے داروں اور شناسائی کے حلقے میں شامل افراد کا عمومی ردعمل کیا ہوگا۔ چنانچہ میں نے راجا کے سوا کسی سے بھی بات نہیں کی تھی اور یہ کہہ کے ٹال دیا کہ ابھی میں مصروف اور میٹنگ میں ہوں، پھر بات کروں گا۔

کافی رات گئے انہی مہربان، قدردان کرم فرماؤں نے حساب لگا کے فون کالز کا دوسرا راؤنڈ شروع کیا کہ اب مجھے فراغت ہوگی اور میری کوئی میٹنگ نہیں چل رہی ہو گی...... پہلا فون لوکل تھا جو شائستہ نے کیا تھا۔

"رفیق...... آج میں نے ایک اخبار میں دیکھا، لارڈ ارنسٹ نے اپنا سب کچھ تمہارے نام کردیا، کیا یہ ٹھیک ہے؟"

"اخبار میں دیکھا ہے تو شک کیوں ہے؟ اتنی بڑی خبر جھوٹ پر مبنی نہیں ہوسکتی۔"

"یار تم تو بڑے قسمت کے دھنی ہو، کیا کہتے ہیں اسے۔ چپڑی اور دو دو...... سخت حسد محسوس ہو رہا ہے تم سے، سمجھ میں نہیں آتا مبارکباد کیسے دوں۔"

میں نے کہا۔ "اس کا موقع بھی نہیں، تمہیں تعزیت کرنا چاہیے۔"

"کیوں وہ کون سا تمہارا سگا سسر تھا۔"

میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "بہرحال مجھے افسوس ہے جو بھی ہوا، میں کسی صورت اس کا حقدار نہیں تھا۔"

"جب حقدار کا دماغی توازن ہی درست نہیں مرنے والا کیا کرتا۔ کیا وہ لڑکی واقعی نن ہوگئی ہے، یا یہ ڈراما ہے اس کا؟"

میں نے کہا۔ "خدا کرے کہ یہ ڈراما ہو، جس دن اس نے محسوس کیا کہ اس کا فیصلہ غلط تھا اور اپنا حق مانگا، میں سب اسے واپس کردوں گا۔"

"تم پاگل تو نہیں ہو؟"

"ایسا ہوتا ڈاکٹر شائستہ تو لارڈ مجھے یہ سب دے کر جاتا۔ اسے میرے اسی پاگل پن پر اعتماد تھا، میں ہی اس کی نظر میں وہ شخص تھا جو لالچی نہیں اور حق دار کے اخلاقی دعوے کو تسلیم کرسکتا ہے۔ خواہ قانونی طور پر اس دعوے کی کوئی حیثیت نہ ہو۔"

"یعنی تم خوش نہیں ہو، یہی کہنا چاہتے ہو نا......"

"کہنے کا کیا فائدہ جب تم یقین ہی نہیں کرو گی۔" میں نے کہا۔ "گڈ نائٹ......"

"سنو...... فریال بھی بات کرنا چاہتی ہے، وہ سارا دن کوشش کرتی رہی لیکن تم پتا نہیں کہاں مصروف تھے۔"

"پہلے وہ کیا کم مصروف تھی اور وہ مجھ سے کیا نئی بات کرے گی۔ یہی کہے گی جو تم نے کہا۔ میں پھر بات کرلوں گا۔"

"صبح وہ دبئی لوٹ جائے گی۔"

"بات تو ساری دنیا میں کہیں سے بھی کی جاسکتی ہے......" میں نے فون بند کردیا۔

ابھی چند منٹ ہی گزرے تھے کہ پاکستان سے رابعہ کی کال موصول ہوگئی۔ اس نے میرے ہیلو کہتے ہی شور مچایا۔

"کیا بات ہے کزن...... دماغ کچھ زیادہ خراب ہوگیا ہے ولایتی نواب بننے کے بعد...... کڑوا کریلا نیم چڑھ گیا۔"

میں نے کہا۔ "کیسی باتیں کرتی ہو۔"

"یہ تم بتاؤ، سارا دن بیوروکریٹس والا جواب ملتا رہا کہ میٹنگ میں مصروف ہیں لارڈ صاحب......"

"میں نے جھوٹ نہیں بولا تھا کزن، واقعی آج بے حد مصروف دن تھا۔ سارے معاملات طے کرنے تھے، پھر ایک پریس کانفرنس تھی۔"

"قسم خدا کی، یہ پاسپورٹ ویزا کا چکر نہ ہوتا تو میں اب تک پہنچ چکی ہوتی وہاں......"

"اللہ ہر بلا سے بچانے والا ہے۔"

"میں تو مرجاؤں گی حسد سے کزن، یار کیا قسمت پائی ہے، یہاں بھی نوابی وہاں بھی نوابی...... تم بھی چکر چلانے

...۔"

...ں نے کہا۔ "ابھی کچھ دیر پہلے بھی ایک خاتون یہی ...یں۔"

...کون خاتون، ویسے تو اب لائن میں بہت آگئی ہوں ...یہ کون خوش قسمت ہیں جن کو آپ نے مجھ سے پہلے ...شرف عطا کیا۔ کہیں وہی تو لندن نہیں پہنچ گئیں دبئی ...بزنس کے افق کا سب سے روشن ستارہ بننے کا خواب ...مس فریال......"

...تم واقعی جل ککڑی ہو کزن...... مرجاؤ گی حسد کرتے ...تم ایسا کرو، یہاں آکے مجھ سے یہ سب لے لو۔"

...ہنسی۔ "ایک سو بیس ملین پاؤنڈز...... کتنے ہوتے ...ہ کروڑ پاؤنڈ، میں نے حساب لگایا پاکستانی روپے ...یک ارب سے اوپر بنتے ہیں، اتنا بڑا دل کہاں سے ...ن، یہاں تو کچھ دے نہیں سکے۔"

...ں نے اس کے لہجے میں چھپے ہوئے طنز کو محسوس ...ہ مجھے احساس دلا رہی تھی کہ یہاں مجھے میرا حق نہیں ...، تو وہاں کیا دو گے۔ میں نے کہا۔ "یہ بھی سچ کہا تم ...ں خود محسوس کرتا ہوں کہ ہر گزرتے دن کے ساتھ میں ...ر تنگ دل ہوتا جارہا ہوں، کسی فقیر کو خیرات دیتے ...ج میں پڑ جاتا ہوں کہ فضول خرچی تو نہیں۔"

"سچ بتاؤں کزن، مجھے واقعی دکھ ہوا اس لڑکی عائشہ ...۔"

"دکھ مجھے بھی ہے...... کل صبح میں اس سے ملوں گا اور ...ں کرنے کی کوشش کروں گا کہ وہ مجھ سے سب کچھ ...۔"

"اور وہ مان گئی...... پھر......"

"میں کیا ڈراما کرنے جاؤں گا؟ مان گئی تو دے دوں ...ی کا ہے، اس نے انکار کیا تو مجھے ملا ہے ورنہ میں کون، ...یا کا مستحق......"

"مستحق کی بات مت کرو، اللہ بھی بڑی ناانصافی کرتا ہے۔"

"کیوں کفر کا کلمہ منہ سے نکال کے گناہ گار ہوتی ہو ...یہ میرا فیصلہ ہے۔ جس کا اعلان میں ہر ایک کے ...رہا ہوں کہ آئندہ جب بھی ایلیشا......"

"جو تمہارے لیے عائشہ ہے اب بھی......"

"نہیں...... وہ اب صرف ایک نن ہے جو ترک دنیا کر ...لیکن کسی بھی وقت، چند ماہ یا چند سال بعد زندگی میں ...وہ اپنا فیصلہ بدلتی ہے، پچھتاتی ہے کہ اس نے یہ سب ...چھوڑا اور چرچ سے واپس دنیا کی طرف لوٹتی ہے تو میں اس کی امانت اسے لوٹا دوں گا...... میں یہ تہیہ کرچکا ہوں کہ اس تمام جاگیر جائداد کا منتظم بن کے رہوں گا۔"

وہ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد بولی۔ "کیا یہی ڈائیلاگ تم نے مرنے والے کے سامنے بھی بولے تھے اور وہ آگیا تمہارے چکر میں۔"

"تم مجھے ذلیل کررہی ہو کزن...... اس نے آخری وقت میں اپنی بیٹی کے اصرار پر یہ فیصلہ کیا تھا۔ ورنہ وہ تو میری جان کا دشمن ہو رہا تھا۔ مجھے جیل میں سڑا دینا چاہتا تھا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ اس کی بیٹی کی زندگی کو تباہ کرنے کا ذمے دار میں ہوں، میں اس سے شادی کرلیتا تو سب ٹھیک رہتا۔"

"عائشہ کے باپ کا دکھ جینوین تھا، کیا اب تمہیں پچھتاوا محسوس نہیں ہوتا؟"

"چھوڑو اس قصے کو، جو ہوتا یوں تو کیا ہوتا...... نہ ہوتا یوں تو کیا ہوتا۔"

"ابھی ایک بات اور...... اب تمہاری راہ میں کیا رکاوٹ تھی؟"

"وہی جو پہلے تھی...... میرے جذبات۔"

"تم نے بتایا تھا کہ وہ خوبصورت ہے، ذہین ہے، اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تم سے اتنی محبت کرتی ہے جو کوئی نہ کرسکا۔ اب تو نور جہاں بھی نہیں تھی۔"

"آخر کیا کہنا چاہتی ہو تم......"

"یہی کہ اب تم اسے اپنا لیتے، دیر آید درست آید۔"

"رابعہ، تم نہیں سمجھو گی۔" میں نے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔ "اگر پہلے میں نے اس کو ذہنی اور جذباتی طور پر قبول نہیں کیا تھا، تو آج کیسے کرلوں؟ مجھے اس کی اور اپنی زندگی کا غلط سودا کرنا منظور نہیں تھا اور پھر اس نے بھی شادی کرلی تھی۔"

"راجا نے مجھے بتایا کہ ان میں علیحدگی ہوگئی تھی، تمہارے جانے کے بعد؟"

"میرے آنے سے اس کا کوئی تعلق نہیں، وہ پہلے ہی طلاق لینے کا فیصلہ کرچکی تھی۔"

"دیکھو، ایمانداری سے بتاؤ، کیا وہ اب بھی چاہتی تھی تمہیں؟"

میں نے کہا۔ "یس...... وہ اب بھی چاہتی تھی لیکن میں نے اسے بتا دیا کہ میں کل ایسا نہیں کرسکا تو آج بھی نہیں کرسکتا تھا، حالانکہ میری جگہ کوئی بھی ہوتا یہ گھاٹے کا سودا نہ کرتا۔ لوگ اندھی، لنگڑی لولی، ذہنی طور پر معذور سب قبول کرلیتے ہیں دولت کے لیے۔"

''گویا یہ ٹھیک ہے کہ اس کی جو حالت ہے تمہاری وجہ سے ہے، تم نے پاگل کیا ہے اسے اور پاگل پن میں اس نے یہ فیصلہ کیا۔''

''میں کسی کو ایسا کرنے سے روک نہیں سکتا لیکن میرا خدا جانتا ہے کہ میں نے کبھی کسی کا برا نہیں چاہا اور نہ لالچ میں اپنا یا ضمیر کا سودا کیا...... میں نے تم سے جو کہا وہی سچ ہے، یہ سب اس کی امانت ہے۔''

''میری مانو تو کزن، صبح اس سے ملنے جاؤ تو اسے پروپوز کردو، یہ بڑی نیکی ہوگی اور تمہارے لیے کون سا گھاٹے کا سودا ہے۔''

اس کی بات سن کر میں نے فون بند کیا اور سو گیا۔ مجھے ایک عام ردعمل کا اندازہ ضرور تھا لیکن رابعہ کا معاملہ مختلف تھا۔ پہلے بھی متعدد مواقع پر وہ مجھے احساس دلا چکی تھی کہ ست بدھائی کے معاملے میں اس کے حق وراثت کو تسلیم نہ کرکے میں نے زیادتی کی تھی، یہ بالکل غلط تھا، یہ ریاست میرے اور اس کے مشترکہ دادا پردادا کی ملکیت تھی لیکن کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اس کا آخری وارث اور مالک لندن میں زندہ ہے۔

نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ گزرا یعنی تقسیم ہند اور پاکستان بننے سے بھی پہلے اسے لندن بھیجا گیا تھا تاکہ وہ خاندان پر ایک بددعا کے نحس اثرات سے بچ جائے کیونکہ اس کے چھ بھائی اس سے پہلے عجیب وغریب غیر متوقع حادثات میں ہلاک ہو چکے تھے، اس کا جہاز لندن جاتے ہوئے بحرالکاہل میں گر گیا اور سرکاری طور پر تصدیق کردی گئی کہ اس کا کوئی مسافر زندہ نہیں بچا لیکن ایک شخص کو قدرت نے محفوظ رکھا اور وہ کسی تختے پر بہتا ہوا ایک لانچ تک پہنچا، لانچ نے اسے لندن پہنچا دیا۔ وہ شدید زخمی تھا، اسپتال میں اس کی جان تو بچالی گئی لیکن وہ تمام عمر کے لیے مفلوج ہو گیا، اس کی باقی زندگی اسپتال میں گزری۔

جب میں لندن میں تھا اور لارڈ ارنسٹ کی فرم میں ملازمت کرتا تھا تو اس مفلوج شخص نے جو تقسیم سے پہلے ست بدھائی کا آخری مالک تھا کسی وکیل کو وارثوں کی تلاش پر مامور کیا اور وکیل نے بڑی جستجو کے بعد میرا سراغ لگالیا۔ میں اپنے اس پردادا کی خدمت میں حاضر ہوا تو پتا چلا کہ ست بدھائی کی ساری جائیداد اور جاگیر میرے نام کردی گئی ہے اور اب میں اس کا مالک ہوں...... کچھ دن بعد اس عمر رسیدہ مفلوج شخص کا انتقال ہو گیا جو میرے والد اور چچا کا دادا تھا۔

اگر وہ اپنی زندگی میں جائیداد کو میرے نام نہ کرتا تو پاکستان کے اور شرعی قانون وراثت کے مطابق دونوں بھائی یعنی میرے والد اور چچا اس کے مالک ہوتے اور ان کے [illegible] رابعہ اور میں...... لیکن یہ تب ہوتا جب وہ ساری جائیداد [illegible] کسی کے نام کیے بغیر مرجاتے...... اپنی زندگی میں ہر [illegible] مالک اور مختار ہے کہ اپنا سب کچھ کسی کو بھی دیدے۔ خیرا[illegible] کردے یا لٹادے، اگر ست بدھائی کا مالک مجھے بنادیا گیا اس میں نہ کوئی غیر قانونی بات تھی نہ غیر شرعی اور غیر اخلاقی۔

میرے والد کو بھی میری نامزدگی پر اعتراض کیوں [illegible] لیکن چچا نے اسے اپنی حق تلفی سمجھا۔ وہ زندگی بھر ایسے [illegible] کام کرتے رہے تھے جو میرے پروفیسر والد کے نزد[illegible] غیر شریفانہ، دھوکے بازی اور جعلسازی کے مترادف [illegible] جب میں لندن سے ست بدھائی کا قبضہ لینے لوٹا تو چچا [illegible] مریدی کا دھندا چلا رہے تھے اور ان کے آستانہ عالیہ [illegible] بازی کے ساتھ منشیات کا اڈا بھی تھا۔ چچی چاہتی تھیں کہ را[illegible] کی شادی مجھ سے ہو جائے تو گویا حق تلفی کی شکایت [illegible] ہو جائے...... بالآخر ہم دونوں ہی مالک ہوتے جو حقدار [illegible] لیکن میرے انکار نے بڑے سنگین مسائل پیدا کیے، چچی پا[illegible] ہو کے مریں اور چچا نے پولیس کی تحویل میں خودکشی کی۔

ابا چاہتے تھے کہ میں رابعہ کو کچھ دے دوں تاکہ ا[illegible] زیادتی کا احساس نہ رہے لیکن اس کو خیرات یا ترس کھا[illegible] کچھ لینا منظور نہ تھا۔ وہ اپنے حق کی بات کرتی تھی اور م[illegible] جائز طور پر یہ سمجھتا تھا کہ قانونی طور پر اس کا کوئی حق نہیں بنتا [illegible] اس کا خیال تھا کہ میں نے کوئی چکر چلا کر یہ جائیداد ہتھیا[illegible] ہے۔ حقیقت سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہ تھا چنانچہ میں را[illegible] کے لیے اخلاقی طور پر سب کچھ کرنے کے لیے تیار تھا۔ [illegible] اپنی بہن اور اپنی ذمے داری مانتا تھا لیکن اس کے قانونی دعو[illegible] کو تسلیم کرنے سے بڑی خرابی پیدا ہوتی تھی چنانچہ وہ ا[illegible] موقف پر قائم تھی اور میں اپنے موقف پر...... وہ مجھے سچ [illegible] بھائی بھی مانتی تھی اور میں اس سے بہنوں جیسی محبت کرتا تھا لیکن ہمارے بیچ کہیں ایک دراڑ بھی تھی جو ختم نہیں ہوئی تھی۔

اب لارڈ ارنسٹ کی جاگیر جائیداد، کاروبار اور ا[illegible] مجھے ملے تو رابعہ کے دل میں پرانی خلش نئے سرے [illegible] بیدار ہوگئی...... اس کا تقدیر سے گلہ جائز تھا کہ ایسا کیوں ہ[illegible] مجھے ایک بار نہیں دو بار نواز دیا۔ اسے ایک بار بھی اپنا حق نہیں ملا، مزید بدنصیبی یہ کہ اس نے ایک شادی کی جو محبت کا نتیجہ [illegible] لیکن وہ شخص دھوکے باز ثابت ہوا۔ رابعہ نے خودکشی کی کوشش کی، وہ خود بچ گئی لیکن وہ بچہ ضائع ہو گیا جس کی وہ ماں [illegible] سکتی تھی، بہت عرصے بعد جب اس کا یہ زخم مندمل ہوا تو ا[illegible]

[illegible]ت کے نام پر دوسرے شخص نے دھوکا دیا۔ بدقسمتی سے [illegible]ں افراد میرے ذریعے سے اس تک پہنچے تھے۔

دیکھا جائے تو خود میرے ساتھ تقدیر نے ایسا ہی تماشا [illegible] تھا میں یونیورسٹی میں تھا جب مجھے ایک لڑکی سے محبت ہوئی [illegible]ہم نے چھپ کر شادی بھی کرلی لیکن اس کا اعلان نہیں کیا۔ [illegible]کی قتل ہوگئی، فریال اس کے بعد میری زندگی میں آئی لیکن [illegible]یال نے آٹھ سال کے عہد رفاقت کو توڑا تو مجھے پتا چلا کہ وہ [illegible]ت میں کیا چاہتی تھی، وہ مجھ سے دولت مندی کی چکاچوند [illegible] زندگی کی طالب تھی۔ وہ واپس شوبز کی دنیا میں چلی گئی۔ [illegible]نہ اس نے نور جہاں کو بنایا جس نے میری محبت میں اس [illegible]ے بالکل برعکس کیا تھا، یعنی اس نے شہرت اور دولت کی [illegible] چکاچوند والی دنیا کو میرے لیے چھوڑ دیا تھا۔ ایک نام نہاد [illegible] شوہر کو بھی قتل کردیا تھا جو اس کی راہ میں حائل تھا اور اب [illegible] بالکل نئی شخصیت کے روپ میں پوری طرح میری ہوگئی [illegible]ی۔ اب وہ ماہ نور تھی، ایک عورت کسی مرد کو جتنی محبت کسی [illegible]رض کے بغیر دے سکتی ہے وہ نور نے مجھے دی تھی۔

رابعہ کی وجہ سے میں ذہنی طور پر سخت مضطرب رہا اور [illegible]ات کا بیشتر حصہ سونے کی کوشش میں کروٹیں بدلتا رہا، رابعہ کو [illegible]ب یہ احساس تھا کہ میں نے ایک اور چکر چلا کے لندن میں [illegible]یک نواب کا سب کچھ ہتھیا لیا...... ست بدھائی کے بعد لندن [illegible]یں بھی مجھے نوابی مل گئی میں نے کوئی ایسی حرکت دانستہ نہیں کی جو [illegible]یرے ضمیر پر کوئی بوجھ بن جاتی مگر رابعہ مجھ پر یہ بوجھ ڈال رہی تھی۔

صبح نور نے میری صورت دیکھی۔ ''کیا ہے جان، تم رات سوئے نہیں کیا؟''

میں نے جھوٹ کا سہارا لیا۔ ''ایسی تو کوئی بات نہیں۔''

''مجھ سے جھوٹ...... تمہارا چہرہ بتا رہا ہے، تمہاری آنکھیں کہہ رہی ہیں۔''

میں نے فوراً ہتھیار ڈال دیے۔ ''اوکے...... میں رات بھر واقعی ایک ذہنی اذیت میں مبتلا رہا۔''

وہ اداس ہو کے بولی۔ ''مجھے بتاؤ گے نہیں؟ نہ بتاؤ...... مجھے معلوم ہے تم اپنے ضمیر کی خلش کے عذاب میں رہے، خوامخواہ......''

میں نے سنبھل کے کہا۔ ''اگر فرض کرلیا جائے کہ ایسا ہوا تو پھر خوامخواہ کیوں......؟''

''خوامخواہ اس لیے کہ وہ لڑکی خود اس کی ذمے دار ہے۔''

میں نے کہا۔ ''کون لڑکی؟''

''جو کبھی ایلیشا ہوتی ہے کبھی عائشہ، جس نے اپنی زندگی خود تباہ کی اور ذمے دار تمہیں بنا دیا، نہ تم نے اسے نشے کا عادی بنایا، نہ تم نے اسے پاگل کیا، آج وہ ترک دنیا کرکے نن بنی ہے تو اپنی مرضی سے۔''

''یار ایک پاگل کی کیا مرضی۔''

''جان کون کہتا ہے اسے پاگل، کیا ڈاکٹرز ایسا کہتے ہیں؟ یا سائیکاٹرسٹ کی رائے ہے کہ اس کا دماغی توازن درست نہیں۔'' نور نے خفگی سے کہا۔

''نہیں...... ایسی بات بھی نہیں۔''

''دیکھو برا مت ماننا، اس کے باپ نے مرنے سے پہلے یہ آخری چال چلی تھی۔''

میں نے حیرانی سے کہا۔ ''کیسی چال!''

''یہی کہ شاید اس کے بعد تم اسے اپنا لوگے...... کبھی نہ کبھی، وہ جانتا تھا کہ تم کس قماش کے آدمی ہو، یہ ایک سو بیس ملین پاؤنڈز تمہارے ضمیر کا بوجھ بن جائیں گے اور بن گئے ہیں بلاوجہ......''

''بلاوجہ تو نہیں نور۔''

''بالکل بلاوجہ...... تم دباؤ میں ہو، جذباتی طور پر...... ہو یا نہیں؟''

میں نے اعتراف کیا۔ ''ہاں میں دباؤ میں ہوں، تو ایلیشا کی وجہ سے کم، رابعہ کی وجہ سے زیادہ۔''

وہ کچھ حیران ہوئی۔ ''رابعہ نے کچھ کہا ہے تم سے؟''

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''ایسی ایسی باتیں کہی ہیں اس نے جو میرے لیے گالی کے برابر ہیں، اس نے کہا کہ میں چکر باز ہوں، پہلے ایک چکر چلا کے ست بدھائی کی ریاست ہتھیالی، میں اسے کیسے یقین دلاؤں کہ مجھے کیا میرے باپ کو بھی معلوم نہیں تھا کہ ست بدھائی کا آخری مالک کون تھا اور اب کہاں ہے، سب سمجھتے تھے کہ وہ جہاز گرنے کے بعد مر چکا...... ریاست سرکاری تحویل میں چلی گئی لیکن وہ زندہ تھا اور خود اس نے میرا سراغ لگایا، میں یہاں تھا اس لیے پہنچ گیا۔ رابعہ اس کا الٹ سمجھتی ہے کہ میں نے یہاں ہونے کا فائدہ اٹھایا، جھوٹ بولا اس سے۔ وہ سمجھتی ہے کہ جانتے بوجھتے میں نے اپنے باپ اور چچا کا نام نہیں بتایا۔ ورنہ میں نہیں وہ وارث بنا دیے جاتے۔''

نور نے افسوس سے سر ہلایا۔ ''تم اسے کچھ دے دلا کہ چپ کیوں نہیں کردیتے۔''

''وہ ایسے چپ ہونے والی نہیں ہے نور...... وہ تو شراکت مانگتی ہے، اختیار اور اقتدار میں، وہ صرف نواب کی بہن کہلانے سے مطمئن نہیں۔ سچ بتاؤں، جب میں نے اسے

شریک حیات بنانے سے انکار کیا اور یہ کہا کہ میں نے اسے کبھی اس نظر سے نہیں دیکھا تو میرے اور اس کے ماں باپ کو جو دکھ ہوا اپنی جگہ، رابعہ نے سخت بے عزتی محسوس کی تھی۔ فریال کو وہ کوئی شریف لڑکی نہیں سمجھتی تھی، وہ شوبزنس میں خوار ہو چکی تھی۔ اسے اپنی سبکی محسوس ہوئی تھی کہ میں نے فریال کو ترجیح دی۔ وہ شاید بچپن سے یہ سمجھ رہی تھی کہ اس کے نصیب میں میرا ساتھ تو گویا پیدائشی طور پر لکھا گیا تھا، اس کی ماں...... اللہ اسے معاف کرے، وہ تو اس حد تک گر گئی تھی...... کہتی تھی کہ اسلام نے تو چار کی اجازت دے رکھی ہے، انصاف تم کر سکتے ہو کیونکہ نہ مال مسئلہ ہے اور نہ اخلاقی...... فریال کے ساتھ رابعہ سے بھی شادی کر لو لیکن رابعہ نے اپنی انا کو بچایا، اپنی ذلت کے زخموں کو یوں چھپایا اس نے بھی کہا کہ وہ مجھے اس نظر سے نہیں دیکھتی، ہم تو بہن بھائی کی طرح تھے۔"

"حقیقت یہ نہیں تھی؟"

"نہیں...... حقیقت آج بھی یہ ہے کہ میں کہوں تو وہ میری دوسری بیوی بن جائے۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں، وہ مالکن بننا چاہتی ہے ست بدھائی کی۔ یہ احساس یہ غرور مانگتی ہے کہ اسے میں نے کچھ نہیں دیا۔ اس نے اپنا حق لیا، چونکہ یہ ناممکن ہے اس لیے میرے خلاف جذبات اس کے دل میں زہر کی طرح پھیل رہے ہیں اور اب یہ زہر وہ اگلنے لگی ہے اپنی باتوں میں...... معلوم ہے وہ کیا الزام لگا رہی ہے مجھ پر......؟"

"چلو چھوڑو جان، کیوں جان جلاتے ہو اپنی۔"

"وہ کہتی ہے کہ میں عائشہ کے ذہنی عدم توازن کا ذمے دار تھا، میں نے اس کو ٹھکرایا تو وہ منشیات کی عادی بنی...... اور اب جو کچھ ہوا میرے لندن آنے کے بعد ہوا، اس کی شوہر سے علیحدگی، اس کا پاگل پن، جائداد اور کاروبار میرے سپرد کر کے خودنن بن جانے کا فیصلہ، سب کا ذمے دار میں ہوں۔"

"تم ایک ہی دفعہ اس کا دماغ درست کیوں نہیں کر دیتے؟ کیوں سنتے ہو اس کی بات۔ اسی سے رابعہ کا حوصلہ بڑھتا جا رہا ہے۔"

"نور...... میرے والدین نے اسے میری ذمے داری بنا دیا تھا کہ یہ تمہاری چھوٹی بہن ہے، اس کا دنیا میں اور کوئی نہیں، اس کا خیال رکھنا، اسے کوئی تکلیف نہ ہونے دینا۔ میں یہی کر رہا ہوں اور کرنے پر مجبور ہوں، سب سنتا ہوں لیکن بولتا نہیں...... میرا دل صاف ہے، نیت صاف ہے...... کوئی جو چاہے سمجھے اور کہے، میرا خدا سب جانتا ہے۔"

"لیکن جان...... یہ ایسے ہی نہیں چلنا چاہیے، کوئی حل ہونا چاہیے اس مسئلے کا...... یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ وہ کہتی رہے گی اور تم سنتے رہو گے۔"

"ہاں...... واپس جا کے کچھ کروں گا۔"

"اب مجھے خوب اندازہ ہو رہا ہے کہ وہ تم سے کیا مطالبہ کرے گی۔"

میں نے ہنس کے کہا۔ "اچھا؟ مجھے بھی بتاؤ۔"

"وہ کہے گی، ست بدھائی مجھے دے دو، تم لندن میں عیش کرو...... ایک خزانہ ملا تھا تمہیں تو آدھا دیتے ہوئے دکھ ہو رہا تھا، اب دو ہیں تو ایک تمہارا ایک میرا......"

"وہ اتنی پاگل نہیں ہے۔"

"مگر تم پاگل ہو اس کے نزدیک، تمہارے ضمیر صاحب کو طعنوں کے اور تلخ باتوں کے کوڑے مار مار کے تم سے کچھ بھی فیصلہ کرایا جا سکتا ہے، جیسے پولیس شریف آدمی کو مار مار کے اس سے کچھ بھی منوا لیتی ہے۔"

میں نے اس کے گال پر چٹکی دی۔ "تم دیکھو گی سویٹ ہارٹ کہ میں اتنا کمزور بھی نہیں ہوں، سخت فیصلے بھی کر سکتا ہوں اور سختی بھی۔"

"رہنے دو جان...... اکبر خان جیسا بندہ ہوتا تمہاری جگہ تو کب کا اس کی زبان ہمیشہ کے لیے بند کر چکا ہوتا۔"

"تم چاہتی ہو میں اکبر خان بن جاؤں؟ وہی تھا تمہارا آئیڈیل تو اسے چھوڑنے کی کیا ضرورت تھی۔" میں نے برہمی سے کہا۔

وہ میرے گلے میں جھول گئی...... "تم برا مان گئے؟ ناراض ہو گئے، چلو معاف کر دو مجھے، غلطی سے یہ نام میری زبان پر آ گیا۔ میرا مطلب تھا کہ اس جیسے ہی ہوتے ہیں سب......"

میں نے ایک گہری سانس لی۔ "میں سب جیسا کیسے بنوں نور؟"

"تمہیں سخت ہونا پڑے گا جان، ورنہ دنیا جینے نہیں دے گی، لحاظ اور مروت کی بھی حد ہوتی ہے...... وہ جو تم نے ایک بار کہا تھا نا کہ اورنگ زیب نے کوئی نماز نہیں چھوڑی اور کوئی بھائی نہیں چھوڑا۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں اورنگ زیب بھی نہیں بن سکتا، میں وہی ہوں جو میں ہوں...... رفیق احمد شیرازی، نواب ہونے سے فرق پڑتا ہے نہ فقیر ہونے سے۔"

گیٹ سے موصول ہونے والی ایک کال نے مجھے ڈسٹرب کیا۔ "سر ایک ملاقاتی آپ سے ملنے پر بضد ہے۔"

"کون...... کیا نام ہے اس کا...... کیا کام ہے؟"

"اس کا کہنا ہے کہ کام آپ جانتے ہیں، نام اس نے بتایا تھا، میں نے کہا کہ پورا نام بتاؤ تو......"

میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے...... اس کی تلاشی لو اچھی ، اور اسے باہر ملاقاتیوں کے کمرے میں بٹھا دو۔"

میں نے کوئی جلدی نہیں دکھائی بلکہ جانتے بوجھتے کچھ ۔ میں نے ناشتا اطمینان سے کیا۔ پھر خانقاہ میں فون کے سسٹر ایلیشا سے ملاقات کے وقت کی تصدیق کی، اس ریا ایک گھنٹا گزر گیا۔ اس عرصے میں چیف اکیلا فارغ رہا۔ کسی نے اس سے چائے پانی کا بھی نہیں پوچھا لیکن ت ڈھیٹ چیز تھا۔

جب میں گیا تو وہ اٹھ کر خندہ پیشانی کے ساتھ مجھ سے آپ کیسے ہیں سر...... دراصل فون پر آپ سے بات نہیں ی تھی، اس لیے میں خود حاضر ہو گیا اور میں آپ کا لزار ہوں کہ آپ نے مجھے شرف ملاقات بخشا۔"

بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے۔ چیف کے انتہائی زانہ انداز نے مجھے حیران کر دیا۔ اب سے چند سال پہلے وہ تان میں دہشت کی علامت تھا۔ وہ ایک سیاسی جماعت کی ع طلبا تنظیم کی سربراہی کرتا تھا۔ اس نے بے وقوف طلبا کو میل کیا اور اپنے مذموم مقاصد کے لیے ذاتی غلاموں کی رح استعمال کیا۔ پولیس اس کی معاون اور شریک جرم رہی دہ ان کو بھی اپنی مرضی سے استعمال کرتا تھا۔

یہ وہی شخص تھا جو کبھی مجھے کمان کرتا تھا، اپنا ہر حکم بجا نے پر مجبور کرتا تھا۔ اب وہ مجھے اپنا آقا و مالک بنانے کے یے میرے قدموں میں سر رکھنے کے لیے بھی تیار تھا۔ مجھے ین دلا رہا تھا کہ وہ میرا بہترین جانثار ثابت ہوگا اور اپنی ماری توانائی، شیطانی ذہانت، سیاسی دانائی اور تجربہ میری فاظت کے لیے وقف رکھے گا، بس میں اسے پاکستان لے جاؤں اور خدمت کا موقع دوں۔

ظاہر ہے میں آنکھ بند کر کے اس پر اعتبار نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے منہ کو خون لگ چکا تھا۔ دوبارہ اختیار ملا تو وہ ست بدھائی میں جو چکر چلائے گا۔ ان سے میری بدنامی ہوگی، اسے خدمات کا بھاری معاوضہ دینے کے بعد میرے لیے یہ اضافی دردسر ہوگا کہ میں اس کی ہر ایکٹویٹی پر نظر بھی رکھوں، ظاہر ہے مجھے اس مشکل میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی لیکن میرا ذہن دوسرے پہلو سے بھی سوچتا تھا...... اگر اس نے میرے ماضی کی بنیاد پر مجھے بلیک میل کیا، میری بدنامی اس سے بھی ہوگی، یہ امکان بھی تھا کہ مجھ سے مایوس ہو کے وہ میرے دشمنوں سے مل جائے، ایسی صورت میں وہ میرے خلاف استعمال ہونے والا ایک موثر ہتھیار بھی بن سکتا تھا۔

شاید اس سے بہتر یہی تھا کہ میں اسے خرید لوں، جس کتے سے ڈر ہو کہ کاٹے گا نہیں تو بھونکے گا، اسے سونے کی زنجیر سے باندھ کر رکھا جائے، میں اسے غنی کی کمان میں دے سکتا تھا جو اس کے گرد چوکسی کا ایسا جال پھیلاتا کہ وہ اپنی مرضی سے دائیں بائیں نہ ہو سکے۔

میں نے واجبی شائستگی سے کہا۔ "چیف، بہت سوچ بچار کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تم کو آزماؤں، یہ فیصلہ میں بعد میں کروں گا کہ تم سے مجھے کیا کام لینا ہے، اپنی مرضی سے تم کچھ نہیں کرو گے۔"

"میں آپ کے حکم کا غلام ہوں سر......"

"بس یہی ہونا بھی چاہیے، پرانے وقت کو بھول جاؤ۔ اب تم میرے ملازم ہو، تمہارا رویہ ایسا ہی تابعداری کا اور عاجزانہ رہنا چاہیے، جیسا اس وقت ہے۔"

"آپ مطمئن رہیں جناب۔" اس نے پہلے ہی یہ ثابت کرنا شروع کر دیا تھا کہ وہ کتنا موقع پرست اور زمانہ ساز ہے۔

"یہ بھی سمجھ لو کہ نہ میں وہ پرانا رفیق ہوں، نہ تم وہ ہو چونکہ میں تمہیں بھگت چکا ہوں اس لیے کسی صورت تم پر اعتبار نہیں کر سکتا۔ مجھے کوئی مجبوری نہیں لیکن تم کو اپنا اعتبار قائم کرنے کی مجبوری ہے، جس دن مجھے شک ہوا یا اطلاع ملی کہ تم نے میرے اعتماد کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش بھی کی ہے، تمہارے لیے اچھا نہیں ہوگا...... یہ دھمکی نہیں، وارننگ ہے۔"

"میں اپنی پوزیشن کو سمجھتا ہوں سر......"

"اب آخری بات...... تم نے اپنے نام نہ جانے کتنی بار بدلے ہوں گے۔ اب تک میں تمہیں پرانے حوالے سے چیف کہتا رہا...... اب چیف میں ہوں، تم پاکستان جاؤ گے تو پاسپورٹ پر تمہارا کیا نام ہوگا؟"

"آخری پاسپورٹ پر میرا نام غلام علی تھا۔ جو میں نے ابھی سال بھر پہلے حاصل کیا تھا، اس پر پاکستان سے دبئی اور پھر لندن تک سفر کر چکا ہوں۔"

"بس تو یہی نام آئندہ بھی چلے گا۔" میں نے طے کیا۔

اس نے مردہ دلی سے کہا۔ "میرا یہ خیال تھا...... کہ پاکستان جا کے پرانی شناخت بدل دوں...... تاکہ خطرہ کوئی نہ رہے۔"

میں نے کہا۔ "اگر تم میرے ساتھ ہو تو خطرے کو بھول جاؤ، اس کا یقین تمہیں ست بدھائی پہنچ کے آنے گا جب تم دیکھو گے کہ نواب رفیق احمد شیرازی کی ریاست تو اتنی بڑی

نہیں لیکن اس کے اختیار اور اقتدار کا دائرہ بہت بڑا ہے۔ اس کی تصدیق کرنا چاہتے ہو تو آئی جی پنجاب عبداللہ جان سے میرے بارے میں پوچھو...... نمبر میں دیتا ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے سر کہ وہ آپ کے دوست ہیں۔"

"گویا میرے پاس آنے سے پہلے تم نے سارا ہوم ورک کرلیا تھا۔ گڈ...... مجھے تم سے اور کچھ کہنے کی ضرورت نہیں...... سمجھو تمہاری ڈیوٹی شروع ہوچکی۔ تم میری گاڑی ڈرائیو کرو گے لیکن درحقیقت باڈی گارڈ کی حیثیت سے میرے ساتھ چلو گے۔"

"رائٹ سر......"

"لارڈ ارنسٹ کے شوفر سے چارج لے لو...... میرا خیال ہے اس کا اور تمہارا سائز برابر ہوگا۔ تم اس کی یونیفارم پہن سکتے ہو، میں پرانے اسٹاف کو فارغ کررہا ہوں...... لیکن ایک ساتھ نہیں۔ باری باری، تم اتنا عرصہ لندن میں گزار چکے ہو...... کسی اچھی اور قابل اعتبار ایجنسی سے بات کرو کہ مجھے اپنا پاکستانی اسٹاف چاہیے۔ اس کے بارے میں ماہ نور تمہیں بتائیں گی۔ جب میں پاکستان جاؤں گا تو بعد میں تم وحید کے ساتھ آؤ گے، تم اسے لانے کی ذمے داری پہلے ہی قبول کرچکے ہو۔"

مجھے خوب اندازہ تھا کہ میرا لہجہ اور میرا رویہ اسے کتنا گراں گزر رہا ہوگا لیکن اس سے کہیں زیادہ میں نے برداشت کیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ اپنی موجودہ پوزیشن کو اچھی طرح سمجھ لے اور ناک کا سوال ہو تو یہ نوکری ہی نہ کرے لیکن مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ عزت و غیرت کے معاملے میں فقیر ہے...... سر اٹھا کے جینے والے ذلت نہیں اٹھاتے۔

نور کو میرے فیصلے سے جائز اختلاف تھا۔ "تم ایک انتہائی خطرناک سانپ کو پالنے کا خطرہ مول لے رہے ہو جس کی فطرت میں ڈسنا ہے۔"

"اس لیے کہ میں اس سانپ کا سر کچلنا بھی جانتا ہوں...... میں اسے ایک چانس دے رہا ہوں، کیا پتا وہ بھی اپنی پرانی زندگی سے تائب ہوکے ایک محفوظ اور باعزت مستقبل کی طرف جانا چاہتا ہو۔ اب اس کی ایک فیملی بھی ہے۔"

وہ مجھے دیکھتی رہی۔ "تم بالکل اپنے مرحوم ابا کی طرح سوچتے ہو۔"

"آخر میں ان کا بیٹا ہوں۔"

"انہوں نے بھی مجھے چانس دیا تھا...... سب کی مخالفت کے باوجود میری حمایت کی تھی کہ جو نیکی کے راستے پر چلنا چاہے اس کی مدد کرنا چاہیے۔" وہ اداس ہوگئی۔ "اللہ ان کی اسی ایک نیکی کو ساری عمر کی عبادت سے افضل سمجھ کے انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام دے سکتا ہے۔"

میں نے بہتر سمجھا کہ موضوع بدل دوں۔ "اچھا اب پلان کرو، جتنے بھی ملازم تمہارے نزدیک فالتو ہیں۔ سب کو رخصت کرو، ان سے کہہ دو کہ کل سے آنے کی ضرورت نہیں۔ میں آفس میں اکاؤنٹس والوں سے کہہ دوں گا کہ ان کے واجبات کی ادائیگی کردیں...... اور ایک ایک ہزار اس کے علاوہ۔"

نور نے لوسی کی معرفت دس ملازمین کو طلب کیا اور بڑے سلیقے سے ان کو رخصت کردیا۔ "آپ سب نے یقیناً لارڈ ارنسٹ کی بہترین خدمت کی۔ افسوس کہ ہم آپ کی خدمت سے استفادہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں لیکن ہم آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ سب کو بہترین خدمت کی اسناد بھی ملیں گی اور واجبات کے علاوہ انعام بھی...... تھینک یو آل۔"

میں نے محسوس کیا کہ ان میں سے کچھ جو پہلے مخالف جذبات رکھتے تھے اب قدرے افسردہ تھے۔ لیکن نور نے معذرت کرلی کہ اسے زیادہ اسٹاف کی ضرورت ہی نہیں ہوگی۔

نور نے یہاں آنے سے پہلے کافی شاپنگ کی تھی اور عام عورتوں کی طرح اس کی خریداری بھی زیادہ جوتوں اور کپڑوں کی ہی تھی۔ جب میں نے اس سے کہا کہ وہ ایلیشا سے ملنے میرے ساتھ چلے تو اس نے صاف انکار کردیا۔ "ایک تو مجھے یہاں کے بہت سے معاملات سنبھالنے ہیں......"

"ابھی ہاؤس کیپر لوسی ہے۔"

"نہیں...... میں جانتی ہوں اس کے جذبات ہمارے لیے کیا ہیں۔ میں کسی پر بھروسا نہیں کرسکتی۔ اس کے علاوہ جان...... سچی بات یہ ہے کہ مجھ میں ایلیشا کے سامنے جانے کی ہمت نہیں ہے۔ بس خوامخواہ ایک احساس جرم ہے۔"

میں نے ہنس کے کہا۔ "اور تم مجھے سمجھا رہی تھیں کہ میں خوامخواہ خود کو مجرم نہ سمجھوں۔"

اپنے شوفر اور باڈی گارڈ کی حیثیت سے چیف کو ملازم رکھنے کا میرا فیصلہ صحیح تھا یا غلط...... اس کا فیصلہ وقت ہی کرسکتا تھا لیکن ابھی ایلیشا سے ملاقات کے لیے میں نے لارڈ ارنسٹ کے شوفر ہی کو ساتھ لے جانا مناسب جانا۔ وہ یقیناً لندن کے راستوں سے بہتر طور پر واقف تھا اور اس کی طویل رفاقت کے باعث لارڈ کی بیٹی سے بھی جذباتی وابستگی ہوگی، یہی سوچ کے میں نے اسے ساتھ رکھا تاکہ وہ ایلیشا سے ملنا چاہے تو مل لے۔ خانقاہ کا جو پتا مجھے بتایا گیا تھا وہ کہیں مضافات کا تھا۔ جب میں لندن میں تھا تو میں نے تمام قابل دید مقامات دیکھے تھے لیکن مضافات سے میں زیادہ واقف

تھا۔ میری طویل غیر حاضری میں بہت کچھ بدل گیا تھا۔ ان راستے بھی تھے جو ہر جگہ وقت کے ساتھ بدلتے مجھے ڈیڑھ گھنٹے کی ڈرائیو میں صرف سمت کا اندازہ رہا۔ کے جنوبی حصے کی آبادی تک میری شناسائی محدود تھی۔ آبادی برائے نام رہ گئی تو میں نے شوفر سے پوچھا۔ "اور دور ہے وہ خانقاہ؟"

اس نے پلٹ کے جواب دیا۔ "بس تھوڑی دیر......"

پیچھے کچھ فائلیں تھیں جو میرے لیے آفس سے ارسال تھیں۔ میرا زیادہ وقت انہی کو دیکھتے ہوئے گزرا تھا۔ اس کام میں اتنا محو تھا کہ گاڑی اچانک ایک بلند دیواروں احاطے میں داخل ہوئی اور مجھے اس وقت پتا چلا جب بریک لگا کے شوفر نے گاڑی روک دی۔

"یہ تو خانقاہ نہیں ہے۔" میں نے حیرانی سے کہا۔ پھر ساری حیرانی خود بخود دور ہوگئی جب میں نے شوفر کو سے کود کے نیچے اترتے دیکھا۔

اس نے بڑے اشتعال انگیز طریقے پر گالی دے کر ازہ کھولا۔ "نیچے اتر لارڈ کی ناجائز اولاد۔"

میں نے اس کے ہاتھ میں ریوالور اور اس کی آنکھوں نفرت اور وحشت دیکھی۔ "واٹ از آل دس......"

اس نے مجھے کالر سے پکڑ کر کھینچ لیا۔ "یو بلیک سن آف اے...... ابھی دیتا ہوں میں تجھے سارے سوالوں کے جواب۔"

وہ ہٹا کٹا چھ فٹ قد کا گورا تھا جس کو اپنی جسمانی قوت بھروسا ہوگا۔ میں بھی اس اچانک حملے کے لیے تیار نہیں تھا۔ نیچے گرا۔ وہاں کچا فرش تھا، پھر بھی میرے شانے اور نچلے ڑ پر چوٹ آئی جس نے چند سیکنڈ کے لیے مجھے مفلوج کر یا۔ میرے سنبھلنے سے پہلے ہی مجھ پر بیک وقت چھ پیروں کے بھاری بوٹس کی ٹھوکریں پڑیں...... مجھے یوں لگا جیسے میری پسلیاں ٹوٹ جائیں گی۔

وہ سب غلیظ گالیاں بک رہے تھے اور مجھے سبق سکھانے کا اعلان کررہے تھے...... ان کی ناراضی اور جنونی کیفیت کا سبب بھی مجھ پر واضح ہوگیا تھا...... وہ میرے لارڈ ارنسٹ کا جانشین بننے پر چراغ پا تھے اور مجھے وہیں پہنچانے پر کمربستہ تھے جہاں لارڈ تھا۔

میں نے سوٹ پہن رکھا تھا چنانچہ مجھے آزادانہ حرکت میں کچھ دشواری تھی، اس پر میں نے یوں قابو پایا کہ زمین پر کروٹ لے کر لارڈ کی دیوہیکل گاڑی کے نیچے گھس گیا۔ مجھے چند سیکنڈ کی مہلت مل گئی۔ میں نے ایک لمبی گہری سانس لی اور کوٹ کو اپنے جسم سے الگ کردیا۔

ایک گورے نے جھک کے چیخ کے کہا۔ "نکل نیچے سے......"

"رہنے دو...... گاڑی گزار دو اس کے اوپر سے۔" دوسرا غرایا۔

لارڈ کے شوفر نے زہرخند لہجے میں کہا۔ "اپنی موت کو خود آسان کرلیا اس نے۔"

گاڑی کا انجن غرایا اور میں ایک کروٹ میں دوسری طرف نکل گیا۔ گاڑی کسی وحشی درندے کی طرح آگے بڑھی، اگر میں ایک سیکنڈ کی دیر کرتا تو اس کے دیوہیکل پہیے مجھے کچلتے ہوئے گزرتے۔ میں نے اپنے مقابل دو کو دیکھا، وہ بھی پلے ہوئے مشٹنڈے تھے۔ ایک نے اپنا سر منڈوا رکھا تھا اور نیکر پر صرف واسکٹ پہنے ہوئے تھا۔ دوسرے کے لمبے لمبے بال تھے جن پر اس نے ربر بینڈ چڑھا رکھا تھا۔

وہ ایک ساتھ مجھ پر حملہ آور ہوئے۔ انہیں کیسے اندازہ ہوسکتا تھا کہ میرے جیسا انڈین نواب اور نازپروردہ ایک سخت حریف ثابت ہوگا، میں نے ایک پیر پر گھوم کے اسے لات ماری جو اس کے پیٹ میں لگی۔ وہ بلبلایا اور پیٹ سنبھال کے جھکا۔ اتنی دیر میں دوسرا میرے قریب آگیا تھا۔ میں نے سر جھکا کر اسے ٹکر ماری اور اپنے ساتھ گاڑی تک لے گیا، ایک دھماکے سے اس کا سر گاڑی پر لگا، وہ چکرا گیا۔

اتنی دیر میں پہلا حملہ آور سنبھل گیا تھا۔ اس نے پیچھے سے مجھے جکڑ لیا۔ میں نے پوری قوت سے دائیں اور بائیں کہنی کو پیچھے مارا۔ وہ چکرا کے مجھے چھوڑنے پر مجبور ہوا لیکن عین اس وقت جب مجھ پر جنون کا غلبہ تھا اور میں ان دونوں کی گردن توڑ دیتا ایک فائر ہوا۔

مجھے یوں لگا جیسے گولی نے میرے کان کو چھوا ہو......

"اسٹاپ اٹ ورنہ میں تیرا سر اڑا دوں گا۔" یہ آواز شوفر کی تھی۔

نہ جانے کیوں میں نے محسوس کیا کہ اس نے جو کہا ہے وہی ہوگا۔ دوسری گولی شاید میرا بھیجا نکال دیتی اگر میں نے بروقت غوطہ لگا کے ڈاج نہ کیا ہوتا...... اب میرے لیے شوفر کے ہاتھ سے وہ مہلک ہتھیار پہلے لینا ضروری ہوگیا جس کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس کشمکش میں ایک جوتا میرے پیروں سے نکل گیا تھا...... فائر ہوا تو میں زمین پر تھا اور وہ جوتا میرے ہاتھ میں آگیا تھا۔ اسے میں نے اندازے سے کھینچ کے مارا تھا مگر وہ نشانے پر جالگا۔ ریوالور اس نمک حرام کے ہاتھ سے نکل گیا اور مجھے اتنی مہلت مل گئی کہ اٹھے بغیر مینڈک کی طرح پنجوں کے زور پر جست لگا کے اس کے پیر پکڑ لوں۔

وہ اس وقت پلٹا ہی تھا کہ ہاتھ سے نکل جانے والے ریوالور کو اٹھالے۔ میرے ہاتھ میں اس کا ایک پیر آیا۔ وہ منہ کے بل زمین پر گرا تو میں اس کے اوپر تھا۔ ایک ہاتھ سے میں نے اس کی گردن کو کہنی سے جکڑ لیا۔ وہ بیل کی طرح ڈکرا رہا تھا اور گالیاں بک رہا تھا۔

''تم نے ذرا حرکت کی تو تمہاری گردن ٹوٹ جائے گی۔'' میں نے کہا۔

وہ ساکت ہوگیا۔ ''مگر تم یہاں سے بچ کر نہیں جاؤ گے۔''

اب ریوالور اس کے نیچے آگیا تھا۔ میں نے دوسرا ہاتھ نیچے ڈال کے ریوالور نکالا اور نیچے دبے ہوئے دشمن کو چھوڑ دیا لیکن میرے اٹھنے سے پہلے اس کے دو ساتھیوں میں سے ایک نے کسی لوہے کی سلاخ کے ساتھ مجھ پر وار کیا۔ اگر میں ساکت ہوتا تو سلاخ میری گردن پر لگتی، میرے حرکت میں ہونے کی وجہ سے سلاخ میرے ہاتھ پر لگی، ریوالور خود بخود میری گرفت سے نکل کے گاڑی کے نیچے جا گرا۔

درد کی شدت سے میرا ایک ہاتھ تقریباً ناکارہ ہوگیا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے سلاخ کو تھام کے ایک جھٹکا دیا تو حملہ آور کا توازن بگڑ گیا اور وہ شوفر سے ٹکرا گیا جو زمین پر سے اٹھنے کی کوشش میں تقریباً کامیاب ہوگیا تھا۔ وہ دونوں گر گئے۔ مجھے اتنی مہلت کافی تھی۔ ایک ابھی اٹھ رہا تھا کہ میری کک اس کے منہ پر لگی...... وہ پلٹ کے گرا، میری دوسری کک نے شوفر کو تارے دکھا دیے، میرے دائیں پیر کے بوٹ کی بھرپور ضرب اس کے سر پر لگی اور وہ کھڑا ہونے کی کوشش میں گھٹنوں کے بل جھومتا ہوا الٹا ہوگیا۔

''ویل...... اب کون آرہا ہے مقابلے پر......'' میں نے اپنے حریفوں کو انوائٹ کیا۔ ''کم آن...... آؤ ایک ساتھ آؤ، اگر آسکتے ہو۔''

ایک تو کچھ فاصلے پر بے حس وحرکت اوندھا پڑا تھا۔ غالباً اس کے سر کی چوٹ ایسی تھی کہ اس کا مغز اندر سے ہل گیا تھا اور وہ بے ہوش ہوگیا تھا۔ باقی دو اپنے پیروں پر سیدھے کھڑے نہیں ہوسکتے تھے۔ وہ دائیں بائیں ڈول رہے تھے۔ ایک کے ہونٹ پھٹ گئے تھے۔ دوسرا اپنی ناک سے بہنے والے خون کو کہنی رگڑ کے صاف کر رہا تھا۔

''یو ڈرٹی سن آف اے بچ......'' میں نے اپنے شوفر کو مخاطب کیا۔ ''اب دیکھنا میں تمہارا کیا حال کرتا ہوں، تم نے کیا سمجھا تھا کہ میں بہت آسان شکار ہوں کیونکہ میں بدمعاش نہیں ہوں، پرنس اور نواب ہوں، اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں، نمک حرام کتے، میں بلیک بیلٹ بھی ہوں۔''

''تم ہمیں پولیس کے حوالے کرسکتے ہو۔'' وہ غرایا۔

''پولیس......!'' میں نے پاکستانی فلموں کے ولن کی طرح مصنوعی قہقہہ لگا کے کہا۔ ''واقعی...... بے حد مستعد ہے لندن پولیس اور بڑی شہرت ہے ان کی کارکردگی کی...... اب یہ دیکھنا باقی ہے کہ وہ تمہاری لاشوں کا سراغ لگانے میں کتنا وقت لیتے ہیں۔ یہ ایک چیلنج ہوگا ان کے لیے۔''

''آخر تم کیا کرنا چاہتے ہو۔ دیکھو میرا کوئی قصور نہیں اس نے مجھے مجبور کیا تھا۔'' شوفر کا ساتھی منت سماجت پر آگیا۔

شوفر غرایا۔ ''شٹ اپ یو ایڈیٹ...... یہ خالی خولی دھمکی ہے، ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ کچھ نہیں کرسکتا۔ زیادہ سے زیادہ پولیس کو رپورٹ کرے گا۔ کیسے ثابت کرے گا عدالت میں کہ ہم نے اس پر حملہ کیا تھا۔''

''جو میں کروں گا، وہ تم دیکھو گے اور بھگتو گے، تم شاید لندن کے بڑے بدمعاشوں میں شمار کرتے ہو خود کو...... ابھی تم نے پاکستانی بدمعاش نہیں دیکھے۔'' میں نے جیب سے موبائل فون نکالا اور چیف کا نمبر ملایا۔

لارڈ کے شوفر نے اپنے تیسرے ساتھی کو تشویش سے دیکھا۔ ''کیا وہ مرگیا ہے؟ جا کے دیکھو...... بہت دیر سے اوندھا پڑا ہے۔''

میں نے اسے وارننگ دی۔ ''جہاں ہو وہیں کھڑے رہو۔ وہ مرگیا ہے، کچھ دیر میں تم بھی مر جاؤ گے۔ پھر اس کی فکر کیوں۔''

''اگر وہ گن میرے ہاتھ میں آجائے۔'' شوفر نے گاڑی کے نیچے دیکھا۔

''تب بھی کچھ نہیں ہوگا، کیونکہ مرنا تمہارا مقدر ہوگیا ہے۔ ورنہ نشانہ خطا کیوں ہوتا تمہارا، ہاں غلام علی...... کہاں ہو تم......''

''آپ حکم کریں سر......''

''گاڑی لے کر نکلو، خاموشی اور بالکل رازداری سے...... جنوبی لندن کی طرف آؤ، راستہ میں بتاتا ہوں۔ ہاں...... نکلا تو میں کہیں اور جانے کے لیے تھا، یہاں کیسے پہنچ گیا؟ جب تم آؤ گے تو بتاؤں گا۔ اب راستے کی ڈائریکشن لو، میں سمجھتا ہوں تم بھی یہاں پہنچ جاؤ گے، لندن تمہارا اچھی طرح دیکھا بھالا ہے۔ میرے سامنے ایک کائی ہاؤس ہے، سڑک کے پار اور گرین بیکری ہے......'' جتنی تفصیل میرے ذہن میں تھی وہ میں نے غلام علی کو بتا دی۔ اس کے باوجود مجھے شک تھا کہ میں نے کچھ مس کردیا ہوگا۔ میں فائل دیکھ رہا تھا۔ شاید کچھ موڑ میری نظر نے نہ دیکھے ہوں، ملزموں کے

...کی طنزیہ مسکراہٹ سے ظاہر ہوتا تھا کہ میں پتا سمجھانے ...ام ہوں مگر مجھے فرق نہیں پڑتا تھا۔ غلام علی اس علاقے ... جائے یہی کافی ہے۔ اس نے کہا تھا کہ ضرورت محسوس ... وہ فون کرلے گا۔

شوفر کا ساتھ دینے والا زیادہ خوفزدہ اور پریشان تھا۔ ...کھیل الٹا ہوگیا تھا۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ آسانی سے مجھے ...نے لگا دیں گے۔ ان کا بھی کوئی پلان ہوگا جس کی ...بی کا انہیں پورا یقین ہوگا۔ وہ اس صورت حال کے ...ہنی طور پر بالکل تیار نہیں تھے مگر انہیں کیسے معلوم ہوسکتا ... جب میں نے چار سال لندن میں ملازمت کی تو عیاشی ...ساتھ یہ کام بھی کیا کہ شوقیہ اپنے ہاتھوں پیروں کا ...ل بھی سیکھ لیا تھا۔ لندن کے لوفر تلنگے ایشیائی باشندوں ...بالعموم اور پاکستانیوں کے خاص دشمن تھے۔ وہ ان کو ...نے جاتے اکیلے ہی گھیر لیتے تھے...... صرف اپنا دفاع ...نے کے لیے میں نے ایک مارشل آرٹ سکھانے والے ...ے میں داخلہ لے لیا تھا...... کلاسز میں نے باقاعدگی ...اٹینڈ نہیں کی تھیں مگر میرے انسٹرکٹرز مطمئن تھے کہ میں ...بیلٹ لینے کی قدرتی صلاحیت رکھتا ہوں چنانچہ آخری ...حلے میں جب مجھے ٹریننگ ملتوی کرکے واپس پاکستان ...آپڑا تو وہ خاصے مایوس ہوگئے تھے۔

اب میں نے جائے واردات کا جائزہ لیا۔ یہ آٹھ فٹ ...چی دیوار اور فولادی گیٹ والا احاطہ شاید ایک ہزار مربع گز ہوگا۔ اس کے آخری حصے میں صرف ایک کمرا بنا ہوا تھا جو ...پڑا تھا۔ باقی رقبے میں تعمیراتی سامان ڈھیر تھا...... زمین ...ہونے والا ایکس کوریٹر جس کا آگے کو جھکا ہوا طویل ...لادی بازو تارکول کی پکی سڑک کو بھی روئی کی طرح ادھیڑ سکتا ...۔ اس کے آگے والے ایک چھوٹے ٹائر کی ہوا نکل چکی ...تھی۔ وہیں ایک کنکریٹ مکسر کھڑا تھا۔ بہت سی لوہے اور ...لکڑی کی سیڑھیاں اور شٹرنگ میں استعمال ہونے والے تختے ...پڑے تھے۔ ایک طرف اسٹون کرش کا ڈھیر تھا۔ دوسری ...طرف ریت کا۔ بارش پڑنے سے ریت جم گئی تھی اور اس میں کہیں کہیں سے خودرو گھاس سر نکال رہی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ عرصہ دراز سے تعمیراتی کمپنی نے اس سازوسامان کا استعمال نہیں کیا...... کمپنی یا تو بند ہوچکی تھی لیکن یہ جگہ انہی کے قبضے میں تھی یا اس جگہ کا بہتر استعمال زیر غور تھا۔

گاڑی اندر لانے کے بعد گیٹ کس نے بند کیا۔ یہ میں نے نہیں دیکھا تھا۔ دیوار کے پیچھے سڑک پر سے ٹریفک کے گزرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی اور مجھے دو ہی سائن بورڈ دکھائی دے رہے تھے جن کا حوالہ میں نے غلام علی کو دیا تھا۔

شوفر کے ساتھی نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ''آخر تم نے کیا سوچا ہے۔ دیکھو، تم زیادہ سے زیادہ ہمیں جیل بھجوا سکتے ہو۔ میں دو بار جیل کاٹ آیا ہوں، وہ گھر سے زیادہ بری جگہ نہیں ہے۔''

میں نے کہا۔ ''جگہ یہ بھی بری نہیں۔ تھوڑی سی کوشش سے ہم یہ مشنری استعمال کرسکتے ہیں۔ اگر یہ فولادی ہاتھ کام کرے تو دو تین بار میں تمہارے لیے خاصی گہری قبر کھود سکتا ہے۔ مشکل سے دو تین منٹ، وہی مٹی تم پر ڈال کے یہ کنکریوں کا ڈھیر تمہارے مدفن پر منتقل کرنے میں کتنی دیر لگے گی۔ آدھا گھنٹا...... بس اس کے بعد ہم چلے جائیں گے۔ یہ جگہ ایسی ہی رہے گی نہ جانے کب تک...... اول تو یہاں کوئی آنے سے رہا...... آیا تو اسے یہ کاٹھ کباڑ اور فالتو سامان اسی حالت میں پڑا دکھائی دے گا۔''

شوفر کا ساتھی دہشت سے چلایا۔ ''دیکھو ایسا مت کرو، میری بیوی ہے اور ایک بچہ ہے۔''

''بچہ ایک ہی ہے؟ اس کا مطلب ہے بیوی جوان ہوگی، مل جائے گا اسے کوئی...... بچے بن ماں باپ کے بھی پل جاتے ہیں، تم ان کی فکر مت کرو۔''

وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگا۔ ''مجھ سے غلطی ہوگئی...... خدا کے لیے مجھے معاف کردو، میں پھر لالچ میں آگیا تھا۔ اس حرامی نے مجھے پانچ سو پونڈ دینے کا وعدہ کیا تھا۔''

''اسے میں نے بھی ایک ہزار پاؤنڈ دینے کا وعدہ کیا تھا، مگر میرے پیسے تو بچ گئے، تمہیں پانچ سو پونڈ مل سکتے ہیں اگر تم اپنی سائڈ بدل لو، جیسے ہاف ٹائم کے بعد فٹ بال میں ہر ٹیم سائڈ بدلتی ہے۔''

''کیا مطلب......'' وہ ہکلایا۔

''تم میرے ساتھ آجاؤ، جو کام اس کے لیے کر رہے تھے میرے لیے کرو، مار ڈالو اس کو جس نے تمہیں مشکل میں ڈالا۔ کم آن...... سوچنا نہیں۔ کام وہی ہے، معاوضہ بھی وہی مل رہا ہے اور میری طرف سے یہ ضمانت بھی کہ پھر تم ہاتھ جھاڑ کے یہاں سے ایسے جاسکو گے جیسے تم نے کچھ کیا ہی نہیں۔ تم ضرور دوستی کے بارے میں سوچ رہے ہو، اسی لیے تذبذب کا شکار ہو، مگر یہ تمہارا دوست کیسے ہوسکتا ہے جس نے تمہیں اس مشکل میں ڈالا اور پانچ سو پونڈ دینے والا دوست ہوتا ہے تو پھر مجھے اپنا دوست مانو۔''

اس نے اپنے آنسو آستین سے صاف کیے اور بولا۔

''او کے......''

شوفر دہاڑا۔ ”کیا؟...... تم مجھے قتل کرو گے اس کے لیے......“

”سوری پال، میں مجبور ہوں کہ اپنے لیے سوچوں، بے شک یہ کمینگی اور خود غرضی ہے۔“

اسی وقت گیٹ آہستہ سے کھلا اور پھر بند ہو گیا۔ اندر آنے والا غلام علی تھا۔ وہ اطمینان سے چلتا ہوا آیا اور ایک نظر میں اس نے ساری صورت حال کو سمجھ لیا۔

میں نے کہا۔ ”تم کیسے آئے ہو؟ گاڑی کہاں ہے تمہاری؟“

”وہ باہر کھڑی ہے سر...... کچھ فاصلے پر......“ اس نے چابی میری طرف بڑھائی۔

”تمہیں کیسے پتا چلا؟“

”میں نے گیٹ کے اوپر سے جھانک کر دیکھا تھا۔“

میں نے کہا۔ ”ان تینوں کو لے جاؤ، اور دو چار دن مہمان رکھو، ان کی اچھی خاطر مدارات کرو، یہ لوگ مجھے یہاں گاڑنے کے لیے لائے تھے۔“

”آپ جائیں سر، جو گاڑی میں لایا ہوں وہ لے جائیں۔“

میں نے کہا۔ ”یہ ہمارے وفادار، شوفر کا دوست ہے اور تعاون پر آمادہ ہے، کہتا ہے لالچ میں غلط کام پر راضی ہو گیا تھا۔“

غلام علی نے اسے اشارہ کیا۔ ”ادھر آؤ۔“

وہ ڈرتے ڈرتے آگے آیا۔ ”آئی ایم سوری۔“

غلام علی نے ہاتھ گھما کر اس کے سر پر ریوالور مارا، وہ وہیں گر گیا۔ اس نے ایک بار پھر کہا۔ ”آپ جائیں سر...... آپ کی گاڑی میں لے آؤں گا۔“

میں نے باہر جاتے ہوئے گیٹ برابر کر دیا۔ دوسری گاڑی تقریباً سو گز دور موجود تھی۔ مجھے کوئی اندازہ نہ تھا کہ میں کہاں ہوں اور جہاں جانے کے لیے روانہ ہوا تھا وہ جگہ کس طرف ہوگی...... تاہم یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں تھی، لندن میں راہنمائی کے لیے نشانات اور نقشے قدم قدم پر موجود ہیں۔ یہ بات عموماً کہی جاتی ہے کہ لندن میں اگر کوئی کسی سے پتا یا راستہ پوچھتا ہے تو اس کے دو ہی سبب ہو سکتے ہیں یا وہ شخص انگریزی نہیں پڑھ سکتا یا یہ شہری انتظامیہ کی نااہلی ہے۔ اجنبی کی عملی راہنمائی کے لیے ایک مستعد اور دوستانہ رویہ والی پولیس تو ہر جگہ ہی ہے۔

جو کچھ میرے ساتھ اچانک اور انتہائی غیر متوقع انداز میں ہوا اس میں بے عزتی کے احساس اور اشتعال انگیزی کے علاوہ ایک پہلو قانونی پریشانی کا بھی تھا، اس نمک حرام شوفر کی یہ بات غلط نہیں تھی کہ اس کیس کی رپورٹ کرنے میں ثبوت اور شہادت فراہم کرنے کے بعد ملزم کو مجرم ثابت کرنے کی پریشانی اضافی تھی۔ جرم سے انکار تو سب ہی کرتے ہیں لیکن پولیس سب معلوم کر لیتی ہے۔ مجرموں کو یقینی سزا ہوتی مگر اس وقت تک ہر پیشی پر میری عدالت میں حاضری ضروری تھی پھر وکیل دفاع کی جرح اور میرے وکیل کی فیس...... کیس کرنے میں بھی جھنجٹ ہے، اگرچہ ہمارے ملک کے مقابلے میں نہ ہونے کے برابر۔

قانون کو اپنے ہاتھ میں لینا پاکستان میں طاقتور ہونے کی دلیل سمجھا جاتا ہے۔ سب سے بڑی طاقت رشوت کی ہے، پھر تعلقات کی، جو خود وزیر سفیر یا پولیس اور فوج میں عہدے کے ساتھ جنرل لگاتا ہو اس کی تو شان ہی اور ہے۔

میں قانونی چکر میں پڑ جاتا تو پھر دستور کے مطابق چلنا لازمی ہوتا۔ میں پہلے ہی مقدمات سے گلو خلاصی پر خدا کا شکر بجا لا رہا تھا۔ نیا مقدمہ کھڑا کرنا خود میرے پاؤں کی زنجیر بن سکتا تھا۔ خیر ابھی تو پاکستانی اسٹائل سے چیف خود ہی تفتیش کرے، خود ہی مدعی بنے، خود عدالت لگا کے خود ہی سزا دے اور پھر فیصلے پر عمل درآمد کرائے۔ اس کے بعد دیکھا جائے گا، ملزم کا دماغ کس حد تک درست ہوا ہے۔

صراط مستقیم سے بھٹکنے کا نتیجہ ایک گھنٹے چالیس منٹ کے زیاں کی صورت میں نکل چکا تھا۔ اب ضروری تھا کہ خانقاہ پہنچ کے ایلیشا سے ملنے سے پہلے دوبارہ اپائنٹمنٹ لے لی جائے۔ ورنہ وہاں پہنچ کر پتا چلے گا کہ ملاقات کا وقت ختم ہو چکا۔ پھر بھی تشریف لائیں وقت پر۔ میں نے نمبر ملایا، رابطہ ہونے پر کہا۔ ”آئی ایم سوری مجھے ڈیڑھ گھنٹا قبل سسٹر ایلیشا سے ملاقات کی اجازت دی گئی تھی لیکن میں وقت پر نہ پہنچ سکا۔ میں ایک معمولی حادثے کا شکار ہو گیا تھا۔ کیا میں اب آ سکتا ہوں؟“

”اللہ تم پر رحم کرے، میں ابھی پوچھ کے بتاتی ہوں۔“

مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ پانچ منٹ بعد اس نے کہا کہ میں آ سکتا ہوں، سسٹر ایلیشا میری منتظر ہیں۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور گاڑی ایک پولیس مین کے پاس روک لی۔ اس نے تحمل سے میری بات سنی اور پھر جیب سے ایک نقشہ نکالا۔ ”اس وقت آپ یہاں ہیں۔“ اس نے گلیوں، سڑکوں کے جال پر ایک جگہ انگلی رکھی۔ پھر اس نے آگے کے راستے کی وضاحت کی۔ اس کا خیال تھا کہ میں نو وارد ہوں، جب میں نے بتایا کہ میں پہلے بھی چار سال لندن میں گزار چکا ہوں تو اسے کچھ اطمینان ہوا، ورنہ لگتا یہ تھا کہ مجھ سے زیادہ وہ پریشان ہے۔

ایک گھنٹے بعد میں شہر کے مشرقی حصے میں تھا جو زیادہ سبز اور پرسکون تھا۔ پولیس مین کی ہدایات کو میں نے ذہن نشین کر لیا تھا اور واضح نشانیاں دیکھتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ دو فرلانگ دور ہی سے مجھے کلیسا کا مینار نظر آ گیا، ارد گرد دوسرا کوئی چرچ نہیں تھا۔ دو منٹ بعد میں نے ایک سر سبز ہموار کاشت ہوئی باڑھ دیکھی۔ ایک جگہ خالی تھی اور کنکر بچھی پتلی سی سڑک اندر جا رہی تھی۔ سڑک کے دونوں جانب سبز قالین کے خوشنما لان تھے۔ ان پر سیاہ و سفید لبادوں والی راہبات ٹہل رہی تھیں یا باتوں میں مصروف تھیں۔

میں نے گاڑی کو ایک دیوار کے ساتھ روکا جہاں پہلے سے چند کاریں، ایک ایمبولینس اور ایک ٹرک موجود تھے۔ سیڑھیاں چڑھ کے میں برآمدے تک پہنچا اور ہال کے مرکزی دروازے کے سامنے سے گزرا تو مجھے اندر کسی کی آخری رسوم ادا کیے جانے کا منظر دکھائی دیا۔ سامنے ایک دروازے پر آفس کی تختی لگی ہوئی تھی۔ میں نے اندر جا کے اپنی آمد کا مقصد بتایا۔

پاکیزہ صورت والی جواں سال راہبہ نے مجھے دیوار کے ساتھ لگی کرسیوں پر بیٹھنے کے لیے کہا اور ایلیشا کو مطلع کرنے اندر چلی گئی۔ وہ خود بھی میرے اندازے کے مطابق پچیس اٹھائیس سال کی ہوگی۔ نہ جانے اس نے کیوں یہ فیصلہ کیا ہوگا کہ اسے تمام عمر شادی نہیں کرنی، گھر نہیں بسانا اور خود کو ایک عام عورت کو ملنے والی تمام خوشیوں اور لذتوں سے دور رکھنا ہے۔ وہ اور اس جیسی سیکڑوں ہزاروں ایلیشا جب راہبہ بنتی ہیں تو دنیاوی زندگی سے منہ موڑ لیتی ہیں، یقیناً اس کے پیچھے نفسیاتی اور معاشرتی عوامل ہوتے ہوں گے لیکن ان کا مذہب اس کی اجازت دیتا ہے، اسلام میں دنیاوی زندگی کو ترک کرنے کا کوئی تصور نہیں مگر ہم کون کہ کسی عقیدے پر اپنی عقل کے مطابق اچھا برا ہونے کا لیبل چسپاں کریں۔

دس منٹ بعد ایلیشا آئی تو مجھے ایک ذہنی صدمہ ہوا کیونکہ میرے تصور کے برخلاف میرے سامنے ایک معذور راہبہ تھی جو وہیل چیئر پر بیٹھی تھی، اسے دوسری راہبہ چلاتے ہوئے اندر لائی۔

میں اٹھ کھڑا ہوا اور چند لمحے خاموشی میں گزر گئے۔

”مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم وہیل چیئر پر ہو، مجھے بہت دکھ ہوا۔“

اس نے سوگوار متانت سے کہا۔ ”خدا کی یہی مرضی تھی۔“

میں نے کہا۔ ”کیا ہم باہر چل کے بات کر سکتے ہیں؟“

”کیوں نہیں۔“ وہ بولی اور پلٹ کے اپنی معاون سے کہا۔ ”تھینک یو۔“

وہیل چیئر کو میں نے سنبھال لیا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھاتا ہوا دروازے تک لے گیا۔ برآمدے میں ایک جگہ ریمپ اسی مقصد کے لیے بنایا گیا تھا، وہیل چیئر کو میں نے احتیاط سے نیچے اتارا اور لان پر لے گیا۔ ایلیشا کا چہرہ سپاٹ تھا لیکن دکھ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں کاجل کی طرح بس گیا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ دکھ اور غم کے جذبات نے اس کے سینے میں بھی کیسی گھٹن پیدا کر دی ہوگی، ایسی ہی گھٹن نے میرے لیے بھی سانس تک لینا دشوار کر دیا تھا۔

وہاں کرسی کوئی نہیں تھی، میں سیمنٹ کی بنی ہوئی بنچ پر بیٹھ گیا۔ وہ میرے سامنے دونوں ہاتھ گود میں رکھے اپنے پیروں کو دیکھتی رہی۔

بالآخر میں نے کہا۔ ”ایلیشا، ایسا کیوں کیا تم نے؟“

”اب میں مطمئن ہوں کہ یہ تقدیر کے خدائی فیصلے ہیں جن کو قبول کر لینے میں عافیت ہے، اس پر ہم بات نہیں کریں گے۔“

”میں تم سے کلیسا کی تعلیمات ڈسکس کرنے نہیں آیا ہوں۔“

”اور میں نے تمہیں ملاقات کی اجازت اس لیے نہیں دی تھی کہ تم مجھ سے ان دنیاوی معاملات پر بات کرو جن سے اب میرا کوئی تعلق نہیں رہا۔“

”لیکن تم نے زیادتی میرے ساتھ کی ہے، وہ معاملات میرے سپرد کر دیے ہیں...... مجھ سے پوچھے بغیر، میری مرضی جانے بغیر، کیوں ایلیشا؟“

وہ کچھ دیر بعد بولی۔ ”اس لیے کہ...... اور کوئی مجھے اپنی جگہ لینے کے لائق نظر نہیں آیا، ایک احساس اطمینان کا تھا کہ میں نہ سہی تم سہی...... ایک ہی بات ہے۔“

”کیسے ایک بات ہے؟“

”ایسا مجھے لگا...... میں کیا بتاؤں کہ کیوں لگا......؟“

میں نے کہا۔ ”یہ تم نے سزا دی ہے مجھے عائشہ......“

”مسٹر رفیق، میں سسٹر ایلیشا ارنسٹ ہوں۔“

”میرے لیے نہیں۔“ میں نے برہمی سے کہا۔

”پھر میں چلتی ہوں۔“ اس کے ہاتھ وہیل چیئر کی طرف بڑھے۔

”او کے...... او کے...... آئی ایم سوری۔ دیکھو میں سمجھتا ہوں یہ سب میری وجہ سے ہوا۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”پہلے میں بھی سمجھتی تھی کہ سب میری وجہ سے ہوا لیکن یہاں مدر ایملی نے مجھے سمجھایا کہ ہم انسان بلاوجہ تاویلوں میں الجھے رہتے ہیں اور اپنے لیے

پریشانیوں کے اسباب پیدا کرتے ہیں، اگر ہم سمجھ لیں کہ سب خدائی فیصلے ہیں، نہ اچھے ہوتے نہ برے...... مگر اپنی مصلحت رکھتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "یہ تو ہمارا بھی عقیدہ ہے مگر ایلیشا۔ کیا تم میری تسلی کے لیے کہہ سکتی ہو کہ تم نے مجھے معاف کر دیا ہے، دل سے۔"

"پھر وہی بات۔ ہم انسانوں کو یہ اختیار کہاں حاصل ہے۔"

یہ ایک الگ مشکل تھی کہ وہ ہر بات کا جواب ایک مخصوص حوالے سے دینے لگی تھی۔ اس نے چرچ کی تعلیمات کو ایک ڈھال بنالیا تھا کیونکہ خود کچھ نہ سوچنے اور کچھ نہ کہنے سے وہ پریشانی سے دور اور محفوظ ہو جاتی تھی۔ وہ مجھ سے دنیا اور اس کے معاملات پر بات ہی نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"دیکھو ایلیشا...... پلیز میری پوزیشن کو سمجھنے کی کوشش کرو، میں ہرگز تمہارے پاس نہ آتا اگر میرے ذہن میں پیدا ہونے والے سوالات کا جواب کہیں اور سے مل سکتا۔ تمہاری ماں ہوتی یا باپ کچھ دن اور زندہ رہ جاتا...... بالکل آخری وقت میں جب کہنے سننے کی گنجائش ہی نہ تھی اس نے اپنا سب کچھ میرے حوالے کیا اور چلا گیا۔ ابھی تک کسی نے بھی مجھے یہ بتانا ضروری نہیں سمجھا تھا کہ تم اپنے پیروں پر چلنے سے قاصر ہو...... اور اس حالت میں کتنا عرصہ گزار دو گی، یہ جواب نہیں چاہیے مجھے کہ جب تک خدا کو منظور ہوگا، میں میڈیکل ایکسپرٹ کی رائے جاننا چاہتا ہوں، آرتھوپیڈک اور نیوروسرجن کیا کہتے ہیں، کیا توقع رکھتے ہیں کہ کوئی علاج کارگر ہوگا؟ کتنا عرصہ لگے گا؟"

"اس بارے میں زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، ڈاکٹر بہت پرامید ہیں، میری ریڑھ کی ہڈی کے مہروں کو نقصان نہیں ہوا تھا، تھوڑا سا ٹشوز متاثر ہوئے، جو دونوں طرف سے سہارا اور طاقت فراہم کرتے ہیں، کچھ دواؤں سے اور کچھ فزیوتھراپی سے فائدہ ہوگا۔ چھ مہینے یا زیادہ سے زیادہ ایک سال بعد میں اپنے پیروں پر نارمل لوگوں کی طرح چل پھر سکوں گی، احتیاط اور علاج دونوں جاری رہنا ضروری ہے، وہ میں کر رہی ہوں، باقی ظاہر ہے اللہ کی مرضی۔"

میں نے کہا۔ "یہ میرے لیے اطمینان کی بات ہے، ایلیشا...... کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ چھ مہینے سال بعد تم وہ سب مجھ سے واپس لے لو، جو تمہارا ہے۔"

"اب یہ کیسے ہوسکتا ہے؟"

"تم اپنا فیصلہ بدل بھی سکتی ہو...... میں ایک سال تک تمہارے لیے سارے معاملات سنبھال لوں گا...... جب تک تم بالکل صحت مند نہیں ہو جاتیں۔"

"رفیق یہ دنیاوی فیصلہ نہیں ہے، جو میں اپنی مرضی سے روز بدل سکتی تھی...... اب تم جو چاہو کرو میں آئندہ تم سے اس مسئلے پر بات بھی کرنا نہیں چاہتی، اور لگی لپٹی رکھنے سے کیا فائدہ، میں پھر تم سے نہیں ملوں گی، مجھے فون بھی مت کرنا۔ جو دنیا میں نے چھوڑ دی...... وہ چھوڑ دی، اسی میں تم خوش رہو۔"

میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "میری جگہ خود کو رکھ کر جواب دو، کیا تم خوش رہ سکتی تھیں؟...... فرض کرو......؟"

"یہ مفروضات کی نہیں حقیقت کی دنیا ہے، اچھا اب تم جاؤ۔"

میں نے کہا۔ "ایلیشا...... ایک بات یاد رکھنا، یہ ٹھیک ہے کہ میں نے تم سے شادی نہیں کی اور یہ احساس جرم اپنی جگہ ہے لیکن آئندہ جب بھی تمہیں ضرورت محسوس ہو، تو سمجھنا میں تمہاری ہر آزمائش میں پورا اترنے والا مخلص دوست ہوں، میں تمہارے ساتھ ہوں۔"

"یہاں میں خدا پر بھروسا کرنا سیکھ جاؤں گی۔ انسان کا سہارا کمزور ہوتا ہے کیونکہ انسان کمزور ہے۔" اس نے ہاتھوں سے وہیل چیئر کے پہیوں کو گھمایا۔

میں اس کے ساتھ چلنے لگا۔ "وہ سب جو تمہارا تھا...... تمہارا ہی رہے گا، ہمیشہ...... قانون کی بات چھوڑو، اخلاقی حق افضل ہے۔"

"نہیں یہاں رہتے ہوئے مجھے کبھی کسی چیز کی ضرورت نہیں پڑ سکتی، تم خود کو بلاوجہ عذاب میں نہ ڈالو، بھول جاؤ گزرے ہوئے وقت کو...... اور مجھے۔"

"یہ ناممکن ہے میرے لیے۔" میں نے کہا۔

"گاڈ بلیس یو رفیق۔" اس نے پلٹ کر دیکھے بغیر کہا اور آہستہ آہستہ وہیل چیئر کو بڑھا کے آگے لے گئی۔

انتہائی دکھ، اذیت اور ندامت کے احساس سے بوجھل دل لیے میں آفس سے نکلا تو ایک میٹرن میرے ساتھ چلنے لگی...... "مسٹر رفیق، مجھے کچھ کہنا تھا تم سے...... یوں ابھی سسٹر ایلیشا کے دنیاوی اثاثوں کی منتقلی کے قانونی معاملات طے ہونا باقی ہیں، مجھے بتایا گیا ہے کہ اس کے بعد تم ان کے مالک ہو جاؤ گے۔ اسی لیے آج تم کو ملاقات کی اجازت دی گئی کہ تم اہم امور میں مشورہ کرلو، ورنہ اس رومن کیتھولک مونیسٹری میں کسی دنیاوی رشتے کی بنیاد پر کسی راہبہ سے ملاقات کی گنجائش نہیں ہوتی، چرچ کے قواعد وضوابط بہت سخت ہیں۔"

میں نے کہا۔ "گستاخی معاف ہولی مدر...... کہیں آپ

زان کا سختی سے استعمال نہیں کرتیں؟"

اس کے چہرے پر ناگواری کا خفیف سا احساس نظر آیا۔ "ایک راہبہ اگر اپنی زندگی کو خداوند یسوع مسیح کے لیے وقف کر دے تو اس دنیا کو بالکل چھوڑ دینا چاہیے۔ تھوڑا بہت تعلق بھی ارادوں کو غیر مستحکم کرتا ہے۔"

"لیکن تمام قانونی معاملات ایک ملاقات میں تو طے نہیں کیے جاسکتے۔"

اس نے سر ہلایا۔ "میں سمجھتی ہوں، لیکن قانونی مسائل پر بات کرنے کے لیے قانونی مشیر ہی کو آنا چاہیے، تم کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔"

میں نے کہا۔ "کیا ایلیشا اب تمام عمر باہر کی دنیا سے کوئی رابطہ نہیں رکھے گی۔ ایسا تو جیل میں ہوتا ہے، آخر طبی معائنے، مشورے اور فزیوتھراپی کے لیے اسے اسپتال جانا ہوگا۔"

میٹرن کی آنکھوں میں ناپسندیدگی نمایاں ہوگئی۔ "نو مائی سن۔ ڈاکٹر اور فزیوتھراپسٹ خود یہاں آجاتے ہیں۔" پھر اس سے پہلے کہ میں مزید کوئی سوال کرتا وہ پلٹی اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی اندر غائب ہوگئی۔

جب میں واپس آرہا تھا تو ذہنی طور پر لارڈ ارنسٹ کے شوفر کی بدمعاشی کو بھولا ہوا تھا، اب ایک افسردگی تھی اور ندامت تھی، جھنجلاہٹ اور بے بسی کا احساس تھا جس نے مجھے مغلوب کرلیا تھا۔ وقت جب گزر جاتا ہے تو پھر دکھ اور ناکامی ایک خلش بن جاتی ہے اور یہ احساس پیچھا نہیں چھوڑتا کہ ہم نے یوں کیا ہوتا یا ایسے نہ کیا ہوتا تو اس ساری خرابی سے بچنا ممکن تھا۔

لیکن غیب کا علم کوئی نہیں رکھتا۔ میں کیسے جان سکتا تھا کہ فریال کے عشق کی دیوانگی اور عہد وفا پر قائم رہنے کے چکر میں آج عائشہ کو ٹھکرا کے میں کیسی بھیانک نتائج رکھنے والی غلطی کر رہا ہوں، ایک دن ایسا آئے گا جب فریال مجھے چھوڑ کے شوبزنس کی مارکیٹ میں اپنے حسن وشباب کی دکان سجائے گی اور یہ عائشہ جو میرے لیے اپنا گھر مذہب اور ملک سب کچھ چھوڑنے پر تیار تھی۔ اس دنیا کو اور سارے دنیاوی اثاثوں کو چھوڑ کر راہبہ بن جائے گی، ایک سو بیس ملین پاؤنڈ بھی مجھے دیدے گی اور خود ایک وہیل چیئر پر خانقاہ کی بے رنگ دیواروں میں قید تنہائی کا عذاب قبول کرلے گی...... اور تب میرے ساتھ اس پشیمانی کا ہر لحظہ ڈسنے والا آزار ہوگا کہ اس تمام خرابی کا ذمے دار میں ہوں، میں نے فریال کو سمجھنے میں غلطی کی تھی لیکن اس کی سزا عائشہ کو ملی۔

پھر آہستہ آہستہ میں پرسکون ہوتا گیا اور میرے خیالات کا ایک ہی سمت میں بہنے والا طوفانی دھارا تھم گیا۔

جب میں نے گاڑی کو ارنسٹ مینشن کے اندر کھڑا کیا تو میری جسمانی توانائی بھی میرا ساتھ چھوڑ رہی تھی۔ ذہنی طور پر میری قوت برداشت کا گراف زیرو پر آگیا تھا۔ میں سیدھا اندر گیا اور جوتوں سمیت بیڈ پر گر گیا۔

نور کو میرے آنے کی خبر کچھ دیر بعد ہوئی، جب اس نے میرے قریب آکے پریشانی میں میرا نام لیا تو میں نے آنکھیں کھولیں، وہ میرے پاس گھٹنوں کے بل فرش پر بیٹھ گئی۔ "رفیق...... کیا ہوا ہے تمہیں......؟" اس نے میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔

میں نے سر ہلایا۔ "کچھ نہیں جان، میں ٹھیک ہوں، بس مجھے تھوڑے سے آرام کی اور سکون کی ضرورت ہے۔"

"اچھا تو سو جاؤ، میں سر دبا دیتی ہوں۔"

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔ "پریشانی کی کوئی بات نہیں، میرا خیال ہے کہ میں منہ دھو لوں، تھکن دور ہو جائے گی۔"

"نہیں، تم نہا لو، میں کھانا لگواتی ہوں، چلو اٹھو۔"

"ایسا کرو، کھانا یہیں منگوا لو، ہم دونوں ہی تو ہیں۔"

میں ہمت کر کے اٹھا اور واش روم میں گھس گیا۔

گرم پانی کے ٹب میں دس منٹ بیٹھنے سے مجھے بڑی فرحت حاصل ہوئی، پھر ٹھنڈے پانی کے شاور نے میری سستی دور کر دی۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ میں کتنا بھوکا ہوں، صبح سے ناشتے کے بعد میں نے کچھ بھی تو نہیں کھایا تھا۔ ڈٹ کر کھانے کے بعد میں نے بلیک کافی کا ایک مگ بھی چڑھا لیا تو میں ایک بار پھر اتنا ہی فٹ ہوگیا جتنا صبح گھر سے نکلتے وقت تھا۔

میں نے مختصر الفاظ میں نور کو اپنی پریشانی کے دونوں اسباب بتا دیے۔ "میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک معمولی ملازم جانثاری میں اس حد تک بڑھ سکتا ہے، اس کے جذبات اس حد تک مجروح ہوسکتے ہیں۔"

"یہ جانثاری نہیں دیوانگی ہے، ہوسکتا ہے اس کی وجہ کچھ اور ہو۔"

"اور کیا وجہ ہوسکتی ہے، بس اس کے دماغ میں یہ بات سما گئی کہ وہ جس خاندان کا نمک خوار تھا۔ اس کو ارنسٹ ہاؤس سے نکالنے والا میں ہوں اور یہ اس سے برداشت نہیں ہوا کہ اس پر میرا قبضہ ہو۔ جسے قانون بھی مانے۔ اس محل میں جہاں ایک عالی نسب خاندانی اور سفید فام لارڈ کا خاندان آباد تھا اس میں میرے جیسا رنگ دار نو دولتیا دندناتا پھرے،

جوکل تک اس کی طرح محض ایک تنخواہ دار ملازم تھا۔"

"لیکن تمہیں جان سے مار دینے کا فیصلہ اس نے کیسے کرلیا۔ آخر وہ ایک ڈرائیور ہی تھا۔"

"اندازہ کرلو کہ اس کی نفرت کے جذبات میں کتنی شدت ہوگی، جو ابتدا میں ایک چنگاری تھی پھر رفتہ رفتہ آتش فشاں بن گئی، سب کچھ اس کی نظروں کے سامنے تھا، وہ سب جانتا تھا لیکن اس کی کیا مجال کہ مالکوں کے نجی معاملات میں بولتا، مگر اس ساری خرابی کے بعد مالک میں بنا تو اس کے دماغ نے فیصلہ کیا کہ جب اصل مالک نہ رہے تو پھر مجھے بھی نہیں رہنا چاہیے۔"

"قتل کتنا سنگین جرم ہے۔ یہ نہیں سوچا اس نے، یہ خیال نہیں آیا کہ میں پکڑا جاؤں گا، تو کیا ہوگا؟"

"ایسا ہی ہوتا ہے نور...... جذبات انسان کو اندھا اور اس کی عقل کو مفلوج کر دیتے ہیں، وہ دیکھتا رہا کہ میں کس طرح چارج لے رہا ہوں، گھر کا، بزنس کا، کس طرح حکم چلا رہا ہوں، تم کیسے مالکن بن کے نوکروں کو کمانڈ کر رہی ہو۔ انہیں نوٹس دے کر فارغ کر رہی ہو، جان آرنلڈ جو اس کا قانونی مشیر تھا...... لارڈ ارنسٹ کا، سب سے پہلے اس نے میری خدمت سے معذرت کرلی، یہ بھی محض تعصب کی وجہ تھی اور اس نے کہا تھا کہ شاید ہاؤس کیپر بھی میری ملازمت جاری نہ رکھے۔ اسے لوسی کے جذبات کا اندازہ ہوگا لیکن یہاں تو ایک ساتھ سب نے انکار کر دیا۔ میرا ملازم کہلانا ان کے لیے باعث توہین ہوگیا۔ وجہ وہی، میں کوئی نجیب الطرفین رئیس زادہ نہیں اور گوری چمڑی والا بھی نہیں...... میرا نوکر کہلانا ان کی بےعزتی ہوتی۔"

"اس حد تک نفرت کے اظہار کی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔"

"شوفر صاحب کا مزاج الگ ہوگا۔ اس کے دل میں نفرت کی آگ میرے ایک ایک فعل سے بھڑکتی جارہی ہوگی...... کہ اب اس محل میں دیسی طور طریقے سے رہیں گے ان کے گھٹیا ملازم ہوں گے۔"

"پھر تو میرا ہر کمرے کو لاک کرانا اور چابی اپنی تحویل میں لینا بھی اسے گراں گزرا ہوگا۔"

"تم نے اور بھی بہت کچھ کیا تھا۔ حرام حلال کا چکر چلا دیا تھا، شراب سے محل کو پاک کر دیا تھا، کتنی قیمتی شراب ہوگی جو تم نے ضائع کی۔ نوکروں سے کہا کہ لے جاؤ ورنہ فلش میں بہا دی جائے گی، لارڈ کے اعلیٰ ترین مہمانوں کو وہ شراب خصوصی مواقع پر پیش کی جاتی ہوگی۔"

"گویا وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا خدانخواستہ...... تو اس کے بعد میرا نمبر تھا۔" نور سخت متوحش نظر آرہی تھی۔

"دریں چہ شک...... میں تو حیران ہوں کہ تم اب تک زندہ کیسے ہو، کسی نے تمہیں کھانے میں زہر کیوں نہیں دیا۔ زینے سے دھکا دے کر کیوں نہیں مارا، خیر...... بچانے والا یہاں بھی وہی اللہ ہے۔" میں نے کلائی کی گھڑی دیکھی۔

"میں پوچھتا ہوں غلام علی سے کہ آخر وہ ہے کہاں۔"

"مجھے تمہارے اس فیصلے سے بھی سخت اختلاف ہے۔ یہ جو تم نے غلام علی کو اپنا باڈی گارڈ بنالیا ہے۔"

"وہ مجبوری ہے جان...... میں بتا چکا ہوں۔"

"وہ بھی خطرناک ثابت ہوسکتا ہے تمہارے لیے۔"

میں نے کہا۔ "میں جانتا ہوں، اور اسی لیے میں اس کی طرف سے بہت محتاط بھی ہوں۔ آخر یہ جواب کیوں نہیں دے رہا ہے۔"

"مجھے یہاں کے معاملات اتنی جلدی طے ہونے والے نہیں لگتے، کل جج کے سامنے پیشی ہے۔"

"وہ معاملہ کل ہی ختم ہوجائے گا۔ اس میں مدعی کوئی نہیں۔"

"لیکن اس کے بعد پراپرٹی اور بزنس تمہارے نام ہونے میں وقت لگے گا، کوئی ایک چیز تو نہیں ہے، اتنی گاڑیاں ہیں، ایک کمرے میں وہ اسلحہ ہے جو لارڈ کے نام پر ہوگا۔ شکاری بندوقیں ہیں، نئی پرانی...... پتا نہیں کتنی اصلی ہیں کتنی صرف نمائشی، میں نے تو ہاتھ نہیں لگایا۔"

"اسلحہ سارا میں حکومت کے حوالے کر دوں گا۔"

"ابھی تم نے فارم ہاؤس اور اصطبل نہیں دیکھا۔ گھوڑوں کا کیا کرو گے، بحر ظلمات میں دوڑاؤ گے......"

میں ہنس پڑا۔ "ہاں، یہی کیا ہے ہمارے آباواجداد نے، یہ گھوڑے یہاں ریس میں حصہ لیتے ہوں گے، ڈربی میں...... یہ نہ میرا شوق ہے اور نہ میرے بس کی بات، انہیں میں کسی کو بیچ دوں گا، لیکن تمہارا خیال درست ہے، ان تمام مسائل کو سیٹل کرنے میں وقت لگے گا، خیر...... درمیان میں ست بدھائی کا چکر لگایا جاسکتا ہے، کبھی یہاں کبھی وہاں، آٹھ گھنٹے میں ادھر سے ادھر۔"

"تم یہ نہیں کر سکتے، شرط لگالو مجھ سے۔"

"کیا نہیں کرسکتا......"

"دو کشتیوں کی سواری، دہری شہریت چل جاتی ہے، دو ملکوں کے کاروباری معاملات کیسے سنبھالو گے، پھر وہاں تمہارا سیاسی مستقبل ہے۔"

"جان تم ساتھ ہو تو پھر کچھ بھی مشکل نہیں...... اور یہ مشکل ضرور لگتا ہے مجھے...... ناممکن نہیں کہ ایلیشا لوٹ آئے

یہ سب واپس لے لے۔"

"تم واقعی سیریس ہو اس میں۔"

میں نے ناراضی سے کہا۔ "اس میں مذاق کی کون سی ت ہے نور...... یہ اسی کا ہے، اس کو ملنا چاہیے۔"

"دیکھو، میری جو چھٹی حس ہے نا...... وہ کچھ اور کہتی ، میرے نقطہ نظر سے خطرے کی گھنٹی بجنے لگی ہے۔"

"تمہارے لیے اس میں خطرے کی کون سی بات ہے پاگل۔"

"میرے سوا خطرہ کسے ہوسکتا ہے۔ یہ گھنٹی تم خود بجا ہے ہو بار بار...... وہ جو وارث اور مالک ہے لارڈ ارنسٹ ، تمہیں اتنی فکر ہے اس کی...... آخر کیوں، صرف اس لیے یہ تم نے سارا بوجھ اپنے ضمیر پر لے لیا ہے، تم خود کو مجرم اور سوروار سمجھنے پر تلے ہوئے ہو اور تمہارے ضمیر صاحب ہیں ہ چلا رہے ہیں......"

"اس میں تو کوئی شک نہیں۔" میں نے افسردگی سے رار کیا۔

"تو خطرہ مجھے کیوں محسوس نہ ہو، تم کہیں ماضی کے لناہوں کا کفارہ ادا کرنے کی نہ سوچ لو، یہ خیال آگیا ہمارے دل میں کہ تلافی ممکن ہے۔"

"کیا تمہارا وہی مطلب ہے جو میں سمجھ رہا ہوں؟"

"ہاں...... ایسا ہونا عین ممکن ہے، تم یہ فیصلہ کر سکتے ہو کہ جو کل نہیں ہوا اب ہوسکتا ہے اور تم ایسا نہ سوچو، فرض کرو وہ تمہارے سامنے یہ شرط رکھ دے کہ اچھا ٹھیک ہے میں یہ رہبانیت ترک کرکے واپس اپنی دنیا میں آنے کے لیے تیار ہوں، بشرطیکہ تم میرے ساتھ رہو۔"

"تم پاگل ہوگئی ہو نور......" میں نے برہمی سے کہا۔

"ابھی؟ آج؟......" وہ ہنسی۔ "میں تو شروع سے پاگل ہوں تمہارے لیے...... اور تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں کبھی تمہاری راہ میں حائل نہیں ہوسکتی، تم فریال کے تھے تب بھی مجھے فرق نہیں پڑتا تھا۔ ایلیشا دوبارہ سہ بارہ عائشہ بن کے تمہاری زندگی میں آجائے، مجھے کیا فرق پڑتا ہے، یہی تو میری مجبوری ہے۔"

"بند کرو اپنی فضول بکواس۔"

"تم دیکھنا یہ ہوگا، تم اسے مجبور کرو گے۔ وہ تمہاری مجبوری سے فائدہ ضرور اٹھائے گی، پھر تمہارے سامنے کوئی راستہ نہیں ہوگا، تمہیں اس کی شرط ماننا پڑے گی...... تم وہ جرم دوسری بار نہیں کرو گے جو ایک بار پہلے کیا تھا تو آج تک پچھتا رہے ہو...... کہ یہ سب خرابی اسی وجہ سے ہوئی......" وہ اب رو رہی تھی۔

میں نے اس کے آنسو پونچھے۔ "خدا کے لیے نور، مجھے غلط مت سمجھو، اب یہ ممکن نہیں کہ تمہاری جگہ کوئی اور لے سکے۔ میرا یقین کرو۔"

"یقین کر سکتی ہوں۔" اس نے میرے کندھے سے سر اٹھایا۔ "اگر تم ایک وعدہ کرلو۔"

"کیسا وعدہ...... !بتاؤ مجھے کیا کرنا ہوگا۔"

"تم ایلیشا کو یہ سب واپس کرنے کے خبط سے باز آجاؤ۔ دیکھو مجھے لالچ کوئی نہیں، اگر وہ خود آجاتی ہے اپنا حق مانگنے تو اسے ضرور دے دینا...... مگر اس کو مجبور کرنے کی ضرورت نہیں، وہ نہیں مانتی تو نہ مانے۔"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ "یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔"

"وہی جو تمہارے حق میں بہتر ہے۔ دیکھو، میں تم کو بےوقوف یا کوتاہ اندیش نہیں سمجھ رہی ہوں اور نہ خود کو دور اندیش...... یہی تمہارا مسئلہ ہے۔ تم سب پر اعتبار کر لیتے ہو، انسانوں پر بھی اور ان کی زبان پر بھی...... کسی پر شک نہیں کرتے۔"

"کیا؟ تمہارے خیال میں مجھے کیا کرنا چاہیے۔"

"بس جلد بازی مت کرو، اور اپنے معاملات کو دیکھو۔ سمجھو، ہر پہلو سے، فیس ویلیو پر جو چیز جیسی نظر آتی ہے...... ہوسکتا ہے ویسی نہ ہو۔"

"مرزا غالب نے اس کو یوں کہا تھا۔ ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ...... دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا۔"

"تم نے میرا مسئلہ بھی حل کر دیا۔ تمہارے ساتھ یہی ہوتا آیا ہے...... سب سے پہلے تمہارا اعتماد حاصل کر کے دھوکا دینے والا کون تھا......؟ تمہارا سب سے عزیز دوست اور وکیل فاروقی، تم اسے کیا سمجھتے تھے وہ کیا نکلا، فریال کے عزائم کیا تھے؟ تم غور کرتے تو سمجھ میں آتے نا...... پھر شہزاد نے کیا کیا؟ اب رابعہ کیا کر رہی ہے...... کتنا اعتبار اور اعتماد تھا تمہیں اس پر...... دیکھو ناراض مت ہونا میری بات پر...... میں کوئی عالم غیب یا افلاطون ہونے کا دعویٰ نہیں کر رہی ہوں لیکن کل تمہاری اسی جذباتیت سے ایلیشا فائدہ اٹھائے گی، یہ دانہ ڈالا ہے اس نے تمہیں، تم پھنس جاؤ گے۔"

میں نے کمزور سا احتجاج کیا۔ "میں اتنا اناڑی نہیں ہوں۔"

"تم اناڑی ہو۔" اس نے چلا کے کہا۔ "تم کو ماننا پڑے گا۔"

"ورنہ......؟" میں ہنس پڑا۔ "ورنہ تم کیا کرو گی؟"

وہ میری آغوش میں گر گئی۔ "میں...... میں ان سب کو قتل کردوں گی جو تمہاری زندگی کو مشکل بناتے ہیں، تمہیں

اناڑی سمجھ کے۔"

"میری طرف سے اجازت ہے، پہلا نمبر کس کا ہوگا؟"

انٹرکام کا بزر بجا۔ "سر...... کام ہوگیا ہے۔"

"غلام علی......" میں نے کہا اور ریسیور رکھ کے اٹھ کھڑا ہوا۔

"پہلا نمبر اسی خبیث کا ہوگا، بتا دینا اسے بھی۔" نور نے برہمی سے کہا۔

غلام علی ویٹنگ روم میں بڑی بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ "سر میں نے وہ گاڑی ایک سروس گیراج میں دے دی ہے۔"

میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ "کیوں؟ کوئی خرابی ہوگئی تھی؟"

"خرابی تو کوئی نہیں تھی سر......" اس نے ایک رسید میری طرف بڑھائی۔ "یہ میرے پرانے شناسا ہیں، ان کا رجسٹرڈ گیراج ہے، میں نے گاڑی گیراج میں جانے کا وقت صبح دس بجے لکھوایا ہے۔"

"دس بجے تو میں اس کے ساتھ نکلا تھا۔"

"یس سر...... لیکن اب صورت حال بدل گئی ہے، شوفر اکیلا گاڑی لے کر گیا تھا۔ آپ دوسری گاڑی میں مس ایلیشا سے ملنے کے لیے گئے تھے۔ شوفر اس گاڑی کو گیراج میں چھوڑ کے کہاں گیا؟ یہ آپ کیسے بتا سکتے ہیں، اسے شام کے وقت گاڑی واپس لانی ہے، دیکھیے وہ لاتا ہے یا نہیں......" وہ معنی خیز طریقے سے مسکرایا۔

"تم مجھے بتا رہے ہو کہ وہ نہیں لائے گا۔"

"آپ اس گیراج سے معلوم کریں گے جہاں تمام گاڑیاں سروس اور مینٹی نینس کے لیے جاتی ہیں۔ وہاں سے آپ کو بتایا جائے گا کہ آپ کی گاڑی وہاں نہیں لائی گئی۔ ظاہر ہے اس کے بعد آپ کو تشویش لاحق ہوگی اور آپ اس کے گھر سے معلوم کریں گے کہ وہ خود کہاں ہے...... جب وہ گھر پر بھی نہیں ملے گا تو آپ ہاؤس کیپر سے ذکر کریں گے اور وہ پولیس کو بتائے گی کہ ہمارا شوفر گاڑی کے ساتھ لاپتا ہے۔ پولیس رات تک گاڑی کا سراغ لگا لے گی، تاہم شوفر نہیں ملے گا۔"

میں نے معنی خیز لہجے میں مسکرا کے پوچھا۔ "کیوں نہیں ملے گا؟"

"ملے گا...... لیکن میدان حشر میں......"

میں چونکا۔ "کیا تم نے اسے مار دیا ہے؟"

"اس کی قضا آگئی تھی کہ اس نے مجھ پر حملہ کیا...... یہ دیکھتے ہوئے بھی کہ ریوالور میرے ہاتھ میں ہے۔"

میں کچھ دیر خاموش رہا۔ "پھر...... تم نے اس کی لاش کو کیسے ٹھکانے لگایا؟"

"میرے دماغ کی داد دیں سر...... آپ نے دیکھا ہوگا، وہاں ایک ایکس کوریٹر کھڑا تھا۔ وہ بالکل ٹھیک تھا۔ بس اس کی بیٹری ڈیڈ تھی، میں نے اس میں گاڑی کی بیٹری لگائی تو وہ اسٹارٹ ہوگیا، میں نے اس کو چلایا تو کبھی نہیں لیکن میرے ساتھ جو سلطانی گواہ تھے، ان میں سے ایک آپریٹر رہا تھا۔ اس نے یہ کام آسان کر دیا۔ اس کی مدد سے میں نے ایکس کوریٹر کے بازو کو گھمایا۔ وہاں کنکریوں کا ایک ڈھیر پڑا ہے۔"

میں نے سر ہلایا۔ "ہاں...... جو کنکریٹ مکسر بنانے کے لیے سیمنٹ کے ساتھ ملایا جاتا ہے۔"

"میں نے اس ڈھیر کو ایک طرف سے ہٹایا۔ پھر وہاں زمین کھودی، ایکس کوریٹر کے فولادی بازو نے دوبار مٹی نکالی تو اچھا خاصا بڑا گڑھا بن گیا۔ میں نے شوفر کی لاش اس میں ڈالی اور مٹی برابر کر کے اوپر کنکریوں کا ڈھیر اسی طرح ڈال دیا کہ سامنے سے کوئی اندازہ بھی نہیں کر سکتا۔"

"میں تمہاری ذہانت کی داد دیتا ہوں۔"

وہ خوشی سے پھول گیا۔ "سامنے سے دیکھا جائے تو ہر چیز اپنی جگہ پر ہے۔ نہ ایکس کوریٹر ہلا ہے...... نہ وہ کنکریوں کا ڈھیر ادھر سے ادھر ہوا ہے، اس پر جو گھاس اگی ہوئی ہے وہ بھی موجود ہے۔ کون سوچ سکتا ہے کہ شوفر اس کے نیچے گھس گیا ہوگا۔ استعمال کے بعد ہم نے گاڑی کی بیٹری واپس نکالی اور گاڑی میں لگا دی، ایکس کوریٹر کی ڈیڈ بیٹری پھر اپنی جگہ فٹ کر دی۔"

"اور اس کام میں ان دونوں نے تمہاری مدد کی......؟"

"وہ کیسے مدد نہ کرتے، اپنی جان بچانے کے لیے انہوں نے نے تعاون کیا۔"

میں نے کہا۔ "اور تمہیں یقین ہے۔ وہ آئندہ بھی اپنی خاموشی برقرار رکھیں گے...... وہ تینوں دوست تھے۔"

"ان کی وہ دوستی نہیں تھی سر جس کی مثال دی جائے۔ سب غرض مندی کے ساتھی تھے۔"

میں نے کہا۔ "یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ...... وہ خود سامنے آئے بغیر پولیس کو سب بتا دیں۔"

"پھر وہ خود کیسے بچیں گے سر؟"

"تمہارے پاس کیا ثبوت ہوگا کہ وہ شریک جرم تھے، اس معاملے کو کسی وکیل صفائی کی نظر سے دیکھو، الزام براہ راست تم پر...... بلکہ مجھ پر آئے گا کیونکہ وہ میرا شوفر تھا اور میں ہی اسے ساتھ لے کر گیا تھا۔"

اس نے مجھے ایک کیمرا پیش کیا۔ "آپ کی پوزیشن بالکل محفوظ ہے، وہ آپ کے ساتھ گیا ہی نہیں تھا۔ آپ یہاں سے دوسری گاڑی خود ڈرائیو کر کے لے گئے تھے اور سیدھے کلیسا پہنچے تھے۔"

میں نے ایک ایک تصویر کو دیکھا۔ یہ ڈیجیٹل کیمرا تھا۔ میں بٹن دباتا گیا اور اگلی تصویر اسکرین پر نمودار ہوتی گئی لیکن ساتھ ساتھ میں نے یہ بھی کیا کہ ہر عکس کو مٹا دیا یعنی Delete کر دیا جس کا غلام علی کو اس وقت علم نہیں ہوا۔

"ویری گڈ۔ تم نے یہ تصاویر ان کو دکھا دی تھیں؟"

وہ فخر سے مسکرایا اور کیمرا واپس کیس میں رکھ لیا۔ "وہ ضروری تھا اب وہ پوری طرح میرے قبضے میں ہیں، وہی کہیں گے جو میں چاہوں گا۔"

"ان کے بارے میں تم کیا جانتے ہو؟ وہ کون ہیں، کہاں رہتے ہیں، کیا کرتے ہیں۔"

"ان میں سے ایک براؤن کچھ عرصہ یہاں شوفر تھا۔ پھر کاہلی، غیر ذمے داری اور بدتمیزی کے باعث رخصت کیا گیا۔ لارڈ ارنسٹ نے اس کی خوب ٹھکائی بھی کی تھی، اس کی بیوی بہت خوبصورت ہے۔ کسی کلب میں ویٹرس تھی آپ کا یہ شوفر اس پر فریفتہ تھا اور براؤن کو شک تھا کہ وہ بھی اس کی طرف ملتفت ہے، دونوں مل کے اسے ٹھکانے لگا دیں گے۔"

"چنانچہ پہل اس نے کی۔ سانپ کو پھن اٹھانے سے پہلے ہی مار دیا۔ دور اندیش آدمی تھا۔"

"دوسرا گورڈن صرف اپنے دوست براؤن کا ساتھ دے رہا تھا۔ اس کا شوفر سے کوئی براہ راست تعلق نہیں تھا۔ اس جگہ کی نشاندہی بھی کرنے والا وہ تھا۔ اس تعمیراتی کمپنی کے دیوالیا ہونے سے پہلے وہ یہاں کرین آپریٹر تھا۔ یہ بڑا دلچسپ اتحاد تھا، گورڈن کے شوفر کی بیوی کے ساتھ جو اب بیوہ ہوگئی ہے، مراسم تھے، حالانکہ وہ عمر میں اس سے دس سال زیادہ ہوگی لیکن عشق کا عمر سے کیا تعلق......"

"چنانچہ اب خیر سے سب کے جذباتی مسائل ختم ہوگئے، اب تم گھر جاؤ اور کچھ ایسا کرو کہ آج کے دن تمہاری موجودگی کہیں اور ثابت ہو۔ میں بھی کہہ سکوں کہ غلام علی کو میں نے کل شام کے بعد سے نہیں دیکھا۔ آج وہ ڈیوٹی پر ہی نہیں آیا۔"

"وہ سب میں کر لوں گا سر......"

میں نے کہا۔ "مجھے پتا ہے تم اناڑی نہیں ہو، بلکہ تمہارے مقابلے میں یقیناً میں خود کو اناڑی کہہ سکتا ہوں۔"

وہ ایک غرور آمیز مسکراہٹ چہرے پر سجائے چلا گیا تو اچانک نور وہاں نمودار ہوئی۔ "یہ تم اس شیطان سے کس قسم کی باتیں کر رہے تھے۔"

میں نے کہا۔ "تم چھپ کر سن رہی تھیں۔"

"دیکھو، میں پھر بتا رہی ہوں، تم نے کوبرا پال لیا ہے، اس پر بھروسا کر کے تم دنیاوی معاملات میں اپنے اناڑی ہونے کا ثبوت دے چکے ہو، پھر اس دو ٹکے کے ملازم کے سامنے اس کا اعتراف کرتا۔"

میں نے ہنس کے کہا۔ "میں تو تمہارے سامنے بھی مان لیتا ہوں کہ میں اناڑی ہوں...... لیکن دو چار دن دیکھو، ثابت کیا ہوتا ہے، شاید اس سے پہلے ہی تمہیں اپنی رائے بدلنی پڑ جائے۔"

تیسرے پہر کے بعد میں نے آفس میں اپنی حاضری لگائی، یہ ایک طرح سے اپنے آفس میں ذمے داریاں سنبھالنے کی شروعات تھیں۔ سوشی نے مجھے ویلکم کہا اور ایک گھنٹا کاروباری معاملات پر بریفنگ دیتی رہی۔ اس سے کاروبار کی مجموعی صورت حال میرے سامنے آگئی۔ اس کے ساتھ دوسرے شعبوں کے وہ سربراہ بھی پیچھے جو اب انتظامی طور پر سوشی کے ماتحت ہوگئے تھے۔ اس تفصیلی رپورٹ یا پریزنٹیشن کی تیاری میں انہوں نے بھی تعاون کیا تھا۔"

میں نے ان سب کا شکریہ ادا کیا اور امید ظاہر کی کہ تمام دفتری کاروباری اور انتظامی معاملات اسی خوش اسلوبی کے ساتھ چلتے رہیں گے جیسے کہ آنجہانی لارڈ ارنسٹ کے زمانے میں چلتے تھے۔ سب کچھ وہی رہے گا ویسا ہی ہوگا اور ہم سب مل کے اس ادارے کی ترقی میں اسی طرح کوشاں رہیں گے جیسے پہلے رہتے تھے۔

اگلا ایک گھنٹا سوشی کے ساتھ بیٹھ کر میں نے ان امور پر مذاکرات میں گزارا جو ان آفیشل تھے۔ اندر باہر کے وہ معاملات جو اعتماد اور مکمل رازداری کے بغیر ڈسکس ہی نہیں ہو سکتے تھے۔ کون کیا ہے، کیا کرتا ہے، کیا کر سکتا ہے، کس سے محتاط رہنے کی ضرورت ہے، کس کو زیادہ بااعتماد بنایا جا سکتا ہے۔

"یہ سب تمہیں کرنا ہے سوشی، فرض کر لو کہ میں یہاں نہیں ہوں اور فرض کیا کرنا...... میں دو چار دن میں چلا جاؤں گا تو تم ہی باس رہو گی، میں تم پر آنکھ بند کر کے ایک سو ایک فیصد بھروسا کرتا ہوں سوشی، تم میرا سب سے بڑا سہارا اور

اثاثہ ہو۔''

وہ ہنس پڑی۔ ''رفیق ...... اگر ایسا ہے تب بھی کہنا نہیں چاہیے۔''

''یعنی سچ بولنا بری بات ہے۔''

''یہ ریاضی کا دو اور دو چار والا سچ نہیں ہے...... اور نہ سائنسی فارمولے کا سچ ...... یہ تمہارے اندازوں اور امیدوں کا سچ ہے۔ اسے اپنی ذات تک محدود کرنا چاہیے تاکہ کوئی تمہارے حد سے بڑھے ہوئے اعتماد سے ناجائز فائدہ نہ اٹھائے۔''

''تمہارے لیے میں ایسا سوچوں تو مجھے اپنی کمینگی پر شرم آئے گی، اچھا اب انتہائی دوستانہ رازداری کے ساتھ میں تمہارے سامنے کچھ اعترافات کرنا چاہتا ہوں۔''

وہ حیران ہوئی۔ ''اعترافات اگر ذاتی ہیں تو پلیز ایسا مت کرو۔''

''جب میں کمپنی کا صدر اور تم نائب صدر ہو، تو کوئی معاملہ جس کا تعلق کسی ملازم سے ہو۔ ذاتی نہیں ہوسکتا۔'' میں نے سوچ کے کہا۔

''ملازموں پر یاد آیا، تمہارے گھر کے سارے ملازمین کے بقایا جات کے اور واجبات کے چیک تیار ہیں۔''

''وہ نور کو بھجوا دو۔ یہ اس کا کام ہے، میں ایک شوفر کی بات کرتا ہوں جو لارڈ ارنسٹ کی گاڑی چلاتا تھا اور اس کا باڈی گارڈ بھی تھا۔''

''چارلی ...... وہ لارڈ کا بہت منہ چڑھا تھا۔''

''بس ...... اسی لیے مجھ سے نفرت اور ناراضی کا اظہار بھی سب سے زیادہ اسی کی طرف سے ہوا۔''

''کیا اس نے کوئی بدتمیزی کی ...... یا دھمکی دی۔''

میں کچھ دیر میز پر اپنے بال پوائنٹ کو بجاتا رہا۔ سسپنس کے چند سیکنڈ سوشی کو دیکھنے میں گزار کے میں نے کہا۔ ''سوشی ...... آج اس نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی۔ دو بدمعاشوں کی مدد سے، ایک کا نام ہے براؤن ...... دوسرے کا گورڈن، مجھے نہیں معلوم وہ کون تھے۔ چارلی نے ان کے یہی نام لیے تھے۔''

سوشی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔''

میں نے اسے اول تا آخر تمام واقعہ تمام تفصیلات کے ساتھ بتا دیا، وہ سخت خوفزدہ اور پریشان اس قتل کی ساری لرزہ خیز کہانی سنتی رہی۔ پھر خاموشی کا ایک وقفہ آیا جو مجھے بہت طویل لگا، اس میں سوشی مجھ پر نظر جمائے بے حس وحرکت بیٹھی رہی۔ بالآخر اس نے ایک گہری سانس لی۔

''یہ سب مجھے بتا کے ...... تم نے بہت برا کیا رفیق۔''

''میں تم پر پورا اعتماد کرتا ہوں۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''بات اعتماد کی نہیں ...... ابھی تک تم نے پولیس کو رپورٹ نہیں کیا ہے۔''

''میں کرنا ہی نہیں چاہتا۔''

وہ اسی طرح سر ہلاتی رہی۔ ''لیکن یہ نہیں ہوسکتا، اب اگر میں خاموش رہوں تو گویا میں بھی شریک جرم۔''

''مجھے تم سے یہ امید نہیں سوشی ......''

''یہی تو غلط ہے کہ تم مجھ سے ایسی امید رکھتے ہو، یہ ناممکن ہے تم چاہے نہ بتاؤ ...... اپنی اولین فرصت میں ایسا کرنا میرا قانونی اور اخلاقی فرض ہے رفیق ......'' وہ ایک دم اٹھی اور باہر نکل گئی، یہ عین میری توقعات کے مطابق تھا، مجھے معلوم تھا کہ ایسا ہی ہوگا۔ میں نے یہ قدم سوچ سمجھ کے اٹھایا تھا۔

ابھی میں گھر پہنچا ہی تھا کہ شعبہ قتل سے تعلق رکھنے والے دو پولیس افسران آگئے۔ ''مسٹر شیرازی، ہم آپ کے شوفر چارلس کیمرون کے قتل کیے جانے کی رپورٹ پر تفتیش کے لیے آئے ہیں۔ یہ رپورٹ آپ کی وائس چیئرمین مسز سوشی نے لکھوائی ہے، ہم نے غلام علی کو گرفتار کرلیا ہے۔''

میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''آپ لوگوں نے بڑی تیز رفتاری دکھائی۔''

''اب اس سے پہلے کہ آپ کچھ کہیں، ہم آپ کو بتا دیں کہ آپ کا بیان خود آپ کے خلاف بھی قانونی طور پر استعمال ہوسکتا ہے۔ اس لیے آپ چاہیں تو اپنے وکیل کو طلب کرسکتے ہیں۔''

میں نے سوچ کے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ ایسا ہی کروں گا کیونکہ مجھے برطانوی قوانین کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔ آپ لوگوں کو کچھ انتظار کرنا پڑے گا۔''

''ہم ڈیوٹی کو انتظار کی زحمت شمار نہیں کرتے۔'' ان میں سے سینئر نے کہا۔

''اتنی دیر میں ہم بہرحال کافی پی سکتے ہیں۔''

دوسرے نے نفی میں سر ہلایا۔ ''مسٹر رفیق ...... آن ڈیوٹی کسی آفیسر کو کچھ بھی پیش کرنا رشوت کے زمرے میں آتا ہے۔''

''اوہ نو ...... یہ صرف ہماری روایتی مہمان نوازی اور خوش اخلاقی ہے مگر کوئی بات نہیں ...... میں سمجھتا ہوں ملک ارشد کو آنے میں ایک گھنٹا لگ جائے گا۔''

''ہمارے پاس بہت وقت ہے۔''

نور سخت پریشان تھی مگر میں نے اسے تسلی دی۔ ''فکر

مت کرو، سب کچھ بالکل ویسا ہی ہو رہا ہے، جیسا میں نے سوچا تھا...... ٹھیک میرے پلان کے مطابق۔

''کیا یہ تمہیں گرفتار کر کے لے جائیں گے؟''

میں ہنس پڑا۔ ''وہ کس لیے...... کیا میں نے کوئی جرم کیا ہے۔ مجرم غلام علی تھا وہ گرفتار ہو چکا ہے۔''

''وہ تمہارا نام لے گا، سب تم پر رکھے گا۔''

''اس کے کہنے سے کیا ہوتا ہے سویٹ ہارٹ...... میں نے تم سے کیا کہا تھا؟ میں اناڑی نظر آتا ہوں، مگر ہوں نہیں...... اور یہ مجھے ثابت بھی کرنا ہے تاکہ تم آئندہ ایسا نہ کہو۔'' میں نے اس کے سوچ ہوئے گالوں پر چٹکی لی۔ وہ پھر بھی نہیں مسکرائی۔

ملک ارشد مصروف تھا مگر وہ میرے طلب کرنے پر ساری مصروفیات منسوخ کر کے ایک گھنٹے سے بھی پہلے پہنچ گیا۔ اس نے دوسرے موکلوں کو کوئی بہانہ بنا کے رخصت کر دیا تھا۔ اب میرے مقابلے میں وہ اس کے لیے اہم نہیں رہے تھے۔

میں نے تفصیلی بیان دیا۔ پہلا سوال مجھ سے یہی کیا گیا کہ میں نے اس واردات کی رپورٹ کرنے میں تاخیر کیوں کی۔

میں نے کہا۔ ''اتنی زیادہ دیر بھی نہیں کی۔ غلام علی کے جانے کے بعد ہی میں آفس گیا تھا۔''

''پہلے آپ پولیس اسٹیشن کیوں نہیں گئے؟''

میں نے کہا۔ ''میں بہت سے قانونی معاملات میں الجھا ہوا تھا اور اس معاملے میں کسی سے مشورہ کرنا چاہتا تھا۔ جو میری صحیح رہنمائی کر سکے۔ میں سوشی پر بھروسا کرتا ہوں...... میں نے اسے سب کچھ بتایا تو اس نے بھی یہی کہا کہ مجھے بلا تاخیر یہ معاملہ پولیس کو رپورٹ کرنا چاہیے ورنہ وہ ایسا کرے گی اور مجھے خوشی ہے کہ اس نے ایسا کرنے میں دیر نہیں لگائی......''

''میرا کلائنٹ برطانوی قانون سے ناواقفیت کی بنا پر کچھ کنفیوژن کا شکار تھا۔ ایک گھنٹے کی تاخیر کا یہی سبب تھا۔'' ملک ارشد نے کہا۔

''آپ نے اپنے قانونی مشیر سے کیوں مشورہ نہیں لیا؟''

میں نے کہا۔ ''مجھے ملک ارشد کا فون بزی ملا تھا۔''

''یس...... میں اپنے کلائنٹس سے بات کر رہا تھا۔'' ملک ارشد بولا۔

''اچھا مسٹر شیرازی...... اب آپ اپنا بیان وہاں سے شروع کریں گے جب آپ مسز ایلیشا ارنسٹ سے ملاقات کے لیے اپنے پرانے شوفر چارلس کے ساتھ گھر سے روانہ ہوئے تھے۔''

میں نے کہا۔ ''سب سے پہلے تو یہ وضاحت ضروری ہے کہ چارلس کیمرون کو میں نے نہیں، لارڈ ارنسٹ نے ملازم رکھا تھا۔ میں نے اسے دیگر تمام ملازمین کی طرح آفر کی تھی کہ وہ اپنی سابقہ شرائط پر ملازمت جاری رکھ سکتا ہے لیکن اس نے انکار کر دیا۔''

''اس کی کوئی وجہ، جو اس نے بتائی۔''

''نہیں...... وجہ جاننا میرے لیے ضروری نہیں تھا میں نے یہی آفر دیگر تمام ملازمین کو بھی کی تھی لیکن کسی نے قبول نہیں کی۔ یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ ان کی وفاداریاں اپنے سابق مالک کے ساتھ تھیں، ان پر اس فیملی کے ساتھ پیش آنے والے افسوسناک حالات کا اثر تھا۔ یہ ان سب کے واجبات کے چیک ہیں جو انہیں ابھی دیے جائیں گے، وہ کل سے ڈیوٹی پر نہیں آئیں گے۔''

ان میں سے سینئر لیفٹیننٹ نے چیکس پر ایک سرسری نظر ڈالنا کافی سمجھا۔ ''میں ان کے جذبات سمجھ سکتا ہوں۔''

''میری طرف سے ان کو ایک ایک ہزار اضافی دیے گئے ہیں، ان کی سابقہ خدمات کے اعتراف میں...... لارڈ کے قانونی مشیر جان آرنلڈ کا ردعمل بھی ایسا ہی تھا...... انہوں نے معذرت کر لی تھی کہ وہ اپنی خدمات مجھے فراہم نہیں کر سکیں گے، اس کے بعد ہی میں نے مسٹر ارشد ملک کو اپنا قانونی مشیر مقرر کیا۔''

''پلیز اپنے بیان کو اس واقعے تک محدود رکھیں جس کی تفتیش ہمارے سپرد کی گئی ہے۔'' لیفٹیننٹ نے کہا۔

''یہ بیک گراؤنڈ بھی آپ کے علم میں ہونا چاہیے اور کسی نے کھل کے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کیا، لیکن چارلس کے رویے سے بھی ظاہر ہوتا تھا کہ اسے میری ملازمت میں اپنی تحقیر محسوس ہوتی تھی۔ اس کا اظہار بعد میں چارلس نے کھل کر کیا...... میں گاڑی کی پچھلی سیٹ پر فائلوں کا مطالعہ کر رہا تھا...... یو سی...... ابھی بہت سے معاملات تصفیہ طلب ہیں، قانونی بھی اور مالی بھی، مجھے اس چرچ کی صحیح لوکیشن کا علم بھی نہیں تھا جہاں مجھے جانا تھا، چنانچہ میں نے چارلس پر سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔ مجھے اس وقت خطرے کا احساس ہوا جب اچانک میں نے خود کو ایک چار دیواری کے اندر پایا۔''

وہ میرا ابتدائی بیان ریکارڈ کر رہے تھے۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس بیان کی حیثیت ایف آئی آر جیسی ہے، بنیاد یہی بنے گا لیکن مجھے مجسٹریٹ کی عدالت میں سب کچھ پھر بتانا ہوگا اور

ں چارلس کی طرف سے پیش ہونے والا وکیل صفائی
رے بیان میں تضاد یا اختلاف ہی کو بنیاد بنائے گا چنانچہ
ں نے بعد میں پیش آنے والے تمام واقعات کو اصل حقائق
ں محدود رکھا۔ اگرچہ اس سے بیان بہت طویل ہو گیا لیکن
ں نے اصرار کیا کہ وہاں جو کچھ چارلس نے کیا اس کے
اتھ وہ بھی لکھا جائے جو اس نے کہا تھا اس کے دونوں
رکار ساتھیوں براڈن اور گورڈن نے کیا تھا۔

لیفٹیننٹ نے درمیان میں سوال کیا۔ ''آپ کے پاس
پنی حفاظت کے لیے کوئی اسلحہ نہیں تھا؟''

''میں نے اسلحہ رکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی، کیونکہ چارلس صرف شوفر ہی نہیں لارڈ ارنسٹ کے باڈی گارڈ کے فرائض بھی سر انجام دیتا تھا۔ اس کے پاس ایک ریوالور تھا جو بالآخر میں نے اس سے چھین لیا تھا۔''

''کیا اس نے آپ پر فائر بھی کیا تھا؟'' لیفٹیننٹ نے پوچھا۔

''یس...... اس نے خود کو جسمانی مقابلے میں کمزور پڑتا دیکھا تو مجھے شوٹ کرنے کی کوشش کی لیکن میں مارشل آرٹ سے واقف ہوں، اس کی ریگولر ٹریننگ میں نے لندن میں لی تھی۔ جب میں لارڈ ارنسٹ کی فرم میں ملازم تھا، چار سال تک...... میں اس ادارے کا نام بھی بتا سکتا ہوں اور آپ اس کی تصدیق بھی کر سکتے ہیں کہ اگر میں چاہتا تو ٹریننگ پوری ہونے کے بعد بلیک بیلٹ کا اعزاز حاصل کر سکتا تھا لیکن مجھے اچانک نوکری چھوڑ کے واپس پاکستان جانا پڑا اور میرے لیے بہرحال اس پروفیشنل ٹائٹل کی کوئی اہمیت بھی نہیں تھی۔''

''آپ نے خالی ہاتھ ہونے کے باوجود ان تینوں کو ناک آؤٹ کر دیا؟''

''یس...... ایسا ہی ہوا تھا۔ اس کے بعد میں نے غلام علی سے رابطہ کیا اور وہ دوسری گاڑی لے کر وہاں پہنچا۔''

''آپ اس وقت بھی پولیس سے رابطہ کرتے تو وہ آپ کی مدد کے لیے پہلے پہنچ سکتے تھے۔''

''آپ اسے میری کوتاہی شمار کر سکتے ہیں تاہم نہ یہ کوئی مجرمانہ فعل تھا اور نہ میں نے عمداً جرم کو چھپانے کے لیے ایسا کیا تھا۔''

''یہ ایک مجرمانہ غفلت شمار ہوگی مسٹر شیرازی۔ سب سے پہلے پولیس کا جائے واردات پر پہنچنا ضروری ہوتا ہے تاکہ واقعاتی شہادت ضائع نہ ہوں۔'' ماتحت نے اعتراض کیا۔

لیفٹیننٹ بولا۔ ''اس کے علاوہ پولیس کے پہنچ جانے کے بعد اس کا کوئی امکان نہ رہتا کہ چارلس کا قتل ہو...... اسے زندہ گرفتار کیا جا سکتا تھا۔''

''اس وقت میں یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ایسا ہوگا، میں نے غلام علی کو بھی تائید کی تھی کہ وہ پولیس کو طلب کرے اور تینوں ملزموں کو قانون کے حوالے کرے۔ مجھے چرچ پہنچنے میں پہلے ہی دیر ہو چکی تھی اور مجھے ڈر تھا کہ میں ایلیشا سے ملاقات نہ کر پاؤں گا تاہم میری وضاحت کے بعد اس نے مجھے بلا لیا۔ میں یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ میں نے کہاں سے راہنمائی حاصل کی تھی۔ جو پولیس مین وہاں ڈیوٹی پر تھا وہ تصدیق کر سکتا ہے کہ اس نے مجھے چرچ کا راستہ ایک نقشے کی مدد سے سمجھایا تھا۔ میں نے تینوں ملزمان زندہ اور ہوش وحواس میں غلام علی کے سپرد کیے تھے اور وہ گاڑی بھی وہیں چھوڑی تھی۔ دوسری گاڑی وہاں پر موجود تھی، وہ میں لے گیا تھا اب اگر میرے جانے کے بعد غلام علی نے قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تو اس کا ذمے دار وہ خود ہے۔''

''وہ گاڑی اب کہاں ہے؟''

''جب وہ یہاں آیا تو اسی نے مجھے ایک رسید دکھائی، کسی خرابی کو بنیاد بنا کر اس نے وہ گاڑی ایک گیراج میں پہنچا دی تھی، اس نے کہا کہ گیراج والے اس کے واقف ہیں۔ انہوں نے تاریخ تو وہی رکھی تھی لیکن وقت بہت پہلے کا لکھ دیا تھا یہ رسید آپ دیکھ سکتے ہیں۔'' میں نے رسید پیش کر دی۔

لیفٹیننٹ نے رسید غور سے دیکھی۔ ''گاڑی میں کوئی خرابی نہیں تھی؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''تو...... گاڑی کو گیراج میں دکھانے کا ایک مقصد یہ تھا کہ میرا اس گاڑی کو استعمال کرنا ثابت ہی نہ ہو۔ میں یہ کہہ سکوں کہ جب میں مسز ایلیشا سے ملنے گیا تھا تو گھر سے دوسری گاڑی لے کر گیا تھا اور اکیلا گیا تھا۔''

''اور دوسرا مقصد......؟''

''دوسرا مقصد مقتول چارلس کو لاپتا ظاہر کرنا تھا۔ یو سی...... لارڈ ارنسٹ کی گاڑیوں کی دیکھ بھال کے ذمے دار دوسرے گیراج والے تھے۔ کوئی بھی خرابی ہو گاڑی وہیں جاتی تھی۔ چارلس نہ جانے کیوں گاڑی کسی اور کے پاس لے گیا اور اس کے بعد غائب ہو گیا۔ کسی کو معلوم نہیں ہو سکتا کہ وہ کہاں گیا اور کس کے ساتھ۔ جب وہ گاڑی واپس لینے نہیں پہنچے گا تو بالآخر گیراج والے یہاں فون کریں گے۔ گاڑی منگوائی جائے گی اس کی پوری طرح سروس کی جا چکی ہوگی، اندر باہر سے دھونے اور صاف کرنے کے بعد کوئی سراغ باقی رہنے کا سوال ہی نہیں۔ اب پولیس تلاش کرتی پھرے چارلس کو، زمین کے اوپر تو وہ کہیں ملے گا نہیں اور زمین کے نیچے

جہاں وہ ہے وہاں کسی کا خیال بھی نہیں جا سکتا۔"

"گویا اس نے آپ کے سامنے سب اعتراف کر لیا۔"

"یس...... اس نے یہ بھی بتا دیا کہ ایکس کوریٹر کو کیسے اسٹارٹ کیا گیا، اس کی ڈیڈ بیٹری کی جگہ میری گاڑی کی نئی بیٹری لگائی گئی اور بعد میں نکال لی گئی، دونوں بیٹریوں پر اس کے فنگر پرنٹس ہوں گے، کیا پولیس نے چارلس کے قتل میں معاون براؤن اور گورڈن کو بھی گرفتار کر لیا ہے؟"

"ابھی نہیں، لیکن وہ گرفتار ہو جائیں گے۔ مسٹر شیرازی! غلام علی نے یہ سب کیوں کیا؟"

"اپنا جرم چھپانے کے لیے، اور مجھے بچانے کے لیے؟"

"لیکن آپ نے تو کچھ بھی نہیں کیا تھا، کوئی جرم نہیں کیا تھا۔"

میں نے کہا۔ "مجھے قانونی الجھنوں سے بچانے کے لیے، اس سے میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ چارلس کو اس بدمعاشی کی سزا دو، ایسا خود اس نے اپنی مرضی سے کیا۔ میں تو یہ کہہ کر گیا تھا کہ پولیس کو اطلاع دو تا کہ وہ انہیں گرفتار کر کے مقدمہ درج کرے، میں پہلے بتا چکا ہوں کہ مجھے دیر نہ ہوتی تو میں یہ کام خود کرتا۔"

لیفٹیننٹ بے یقینی سے مجھے دیکھتا رہا۔ "سر...... اس نے آپ کے سامنے قتل کے جرم کا اعتراف کیوں کیا؟"

"اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا اس کے پاس۔ وہ کیا کہتا کہ مجرم بھاگ گئے؟ کیسے بھاگ گئے، بھاگ کے کہاں گئے، نو سر...... اس کے لیے میرے سامنے سچ بولے بنا چارہ نہ تھا۔"

"اس نے قتل کرنے سے لے کر چارلس کو گریول کے نیچے گڑھا کھود کے دبانے تک کی ساری تفصیل خود بتا دی...... کہ اس نے یہ کیسے کیا؟"

"ہاں، کچھ خود بتایا، کچھ میں نے پوچھا۔ میں نے اسے بہت برا بھلا کہا کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟ وہ منت سماجت کرنے لگا اور ہاتھ جوڑنے لگا کہ اسے بچا لوں، چارلس نے اسے مشتعل نہ کیا ہوتا تو وہ بھی اسے قتل نہ کرتا۔"

"پھر آپ نے اسے یقین دہانی کرا دی کہ جیسا وہ چاہتا ہے ویسا ہی ہوگا۔ آپ پولیس کو رپورٹ نہیں کریں گے اور وہی کہیں گے جو وہ چاہتا تھا......؟" لیفٹیننٹ نے پوچھا۔

"میں نے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا تھا۔" میں نے برہمی سے کہا۔ "خواہ مخواہ کے مفروضات مت قائم کرو، آخر یہ سب تمہیں کون بتا رہا ہے؟"

"قتل کی اطلاع ہمیں آپ کی معاون سوشی نے دی تھی۔"

"اگر میں نہ چاہتا تو اس سے بھی بات نہ کرتا۔ کیا میں جانتا نہیں تھا کہ یہ جرم ہے؟ میں کوئی نادان بچہ نہیں ہوں، عقل سے پیدل نہیں ہوں، پڑھا لکھا ذمے دار شہری ہوں، معزز برطانوی شہری ہوں۔" میں بگڑ گیا۔

ملک ارشد نے بھی کہا۔ "لیفٹیننٹ، تمہیں معذرت کرنی چاہیے۔"

لیفٹیننٹ نے کہا۔ "میں نے صرف ایک سوال کیا تھا اس کے باوجود...... آئی ایم سوری اگر آپ چاہتے ہیں، اب میں اس مبینہ قاتل کی طرف آتا ہوں، آپ اسے کب سے جانتے تھے؟"

میں نے پانی کا ایک گھونٹ لے کر خود کو پرسکون کیا۔ "جہاں تک جاننے کا تعلق ہے، تو بہت عرصے...... تقریباً آٹھ سال سے۔"

"کیا وہ پہلے بھی آپ کا ملازم رہا تھا؟"

میں نے کہا۔ "نو...... وہ پاکستان میں ایک غیر معروف سیاسی تنظیم کا سربراہ تھا۔ ایک غیر معروف سیاسی جماعت کی ذیلی تنظیم کے اسٹوڈنٹ ونگ کا۔ پاکستان میں ہر سیاسی جماعت کی ایک طلبا تنظیم ہوتی ہے جس میں جوشیلے نوجوان ہوتے ہیں، پھر وہاں سیاسی صورت حال بدل گئی۔ ان کے دشمن برسر اقتدار آگئے تو یہ فرار ہو کے برطانیہ آگیا۔ اپنے بہت سے ساتھیوں کے ہمراہ...... ان سب نے یہاں سیاسی پناہ حاصل کر لی۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ یہ مجرمانہ ماضی رکھنے والے لوگ تھے؟"

"آپ کہہ سکتے ہیں، یہ لوگ غیر قانونی کام کرتے اور کراتے تھے۔ پاکستان میں نعروں کی سیاست چلتی ہے، نوجوان لوگ جذباتی نعروں سے جلد متاثر ہو جاتے ہیں، میں بھی ہو گیا تھا اور مجھ سے بھی بہت سے غلط کام کرائے گئے۔"

"وہ غیر قانونی کام تھے؟"

"کسی حد تک...... مثال کے طور پر کسی ہنگامہ آرائی میں شریک ہو کے توڑ پھوڑ کرنا۔ پولیس کے آنے سے پہلے اصل لوگ فرار ہو جاتے ہیں۔ تماشا دیکھنے والے پکڑے جاتے ہیں۔ جب میرے والد نے محسوس کیا کہ میں تعلیم سے زیادہ سیاست میں دلچسپی لے رہا ہوں اور میرا مستقبل خراب ہو سکتا ہے۔ تو انہوں نے مجھے اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکا بھیج دیا۔ وہ ایسا نہ کرتے تو کچھ بھی ہو سکتا تھا...... میں پکڑا جاتا یا مارا جاتا۔ تعلیم مکمل کر کے میں لندن آیا اور لارڈ ارنسٹ کے ساتھ وابستہ رہا۔ اس زمانے میں یہ شخص یہاں تھا، اس نے مجھے بلیک میل کرنے کی کوشش ضرور کی تھی لیکن میری جوابی

دھمکی سے ڈر گیا، یہ اور اس کے ساتھی پھر کسی انقلاب کے منتظر تھے تا کہ یہ پاکستان واپس جا کے سیاسی عہدے اور اقتدار حاصل کریں مگر ایسا نہیں ہوا۔ غلام علی پہلے چیف کہلاتا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں بھی اسے چیف کہہ کے بلاتا تھا۔ آج کل وہ معاشی مسائل سے دوچار تھا۔ اس نے مجھ سے مدد کی درخواست کی اور میں نے صرف اس کی تذلیل اور تحقیر کی نیت سے اس کو شوفر کی ملازمت پیش کی۔ جو اس نے قبول کر لی تو مجھے سخت حیرانی ہوئی۔ تاہم میں اس کی طرف سے محتاط تھا اور اگر موقع ملتا تو اسے رخصت کر دیتا۔ وہ بھروسے کے قابل نہیں تھا۔"

"اس کے مجرمانہ ماضی کی وجہ سے؟"

"آف کورس...... میں اسے پاکستان بھجوا دیتا۔ وہاں بھی وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔"

"تھینک یو سر...... اب اس کیس میں آپ کی گواہی کی حیثیت بنیادی ہے اور جب کیس عدالت میں جائے گا تو آپ سے وکیل صفائی جرح میں بہت کچھ پوچھے گا۔ کیس کا فیصلہ ہونے تک آپ برطانیہ سے نہیں جائیں گے، یا جائیں گے تو عدالت کی اجازت سے۔" لیفٹیننٹ اٹھ کھڑا ہوا۔ "یہ ہو سکتا ہے کہ آپ کو پولیس اسٹیشن آنا پڑے۔"

"ہم پولیس سے پورا تعاون کریں گے اور مجرموں کو سزا دلوانے میں انصاف کی پوری مدد کریں گے۔" ملک ارشد نے ایک رسمی قسم کا ڈائیلاگ مارا۔

پولیس کے جانے کے کچھ دیر بعد ملک ارشد بھی مجھے مطمئن کرنے کے لیے اپنی مہارت بگھارتا رہا اور مجھے تسلی دیتا رہا کہ میں اس معاملے میں قانونی طور پر بالکل محفوظ ہوں۔ غلام علی کچھ بھی کہے آپ کے خلاف کچھ ثابت نہیں ہوگا۔ اس کو عمر بھر کے لیے جیل میں بند کرانے کے لیے انہی دو گوروں کی گواہی کافی ہوگی جو پہلے چارلس کے شریک جرم تھے اور بعد میں غلام علی سے مل گئے تھے۔"

"وہ خود یا اپنے وکیل کے مشورے سے مجھے بھی اس قتل میں ملوث ضرور کرے گا۔" میں نے کہا۔

"اس کے کہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ تو کہے گا کہ اس کے پہنچنے سے پہلے ہی آپ چارلس کو قتل کر چکے تھے۔ آپ نے اسے حکم دیا کہ لاش کو کنکریوں کے ڈھیر کے نیچے دبا دو۔ اس نے تعمیل کی...... وہ ملازم تھا اور آپ مالک لیکن ثبوت اور شہادت کے بغیر کسی کا نام لینے سے کچھ نہیں ہوتا۔"

اس کے جانے کے بعد میں نے بہت بہتر محسوس کیا۔ صورت حال اب پوری طرح میرے کنٹرول میں تھی۔

سب کچھ ویسے ہی ہوا تھا جیسے میں نے پلان کیا تھا۔ غلام علی عرف چیف اعتماد کے دھوکے میں مارا گیا تھا۔ اسے پورا یقین ہوگا کہ میں اخفائے جرم میں اس کی پوری طرح مدد کروں گا۔ اسے میں بچانے پر اس لیے بھی مجبور ہوں کہ وہ خود مجرم سہی...... مجھ سے بھی مجرمانہ کام لے چکا ہے اور میرے ماضی کے بہت سے راز جانتا ہے لیکن میرے ماضی کا ریکارڈ اس کیس میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا اور اگر میں نے بے وقوفی یا مجبوری میں کچھ سیاسی جرائم کیے تھے تو اس کا نہ آج کوئی ثبوت تھا نہ گواہ...... میرا امریکا میں تعلیمی کیریئر بے داغ اور شاندار تھا...... غلام علی میرا کیا بگاڑ سکتا تھا، وہ ایک کانٹا تھا جسے میں نے اپنی زندگی سے نکال دیا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اب اس کی بقیہ زندگی جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہی گزرے گی۔

اس رات میں نے نور سے کہا۔ "اب کیا کہتی ہو تم سویٹ ہارٹ...... کیا میں اناڑی ہوں؟"

ہم ایک ٹیرس پر بیٹھے کھانے سے فارغ ہو کے کافی پی رہے تھے۔ میں نور کو کچھ نہ بتاتا لیکن یہاں آنے کے بعد اس کے کان، اس کی آنکھیں، دماغ اور چھٹی حس...... اس کا اعتماد اس کی ذہانت اور مستعدی اور اس کی باخبری کی صلاحیت سب کی کارکردگی میں حیرت انگیز اضافہ ہوا تھا...... وہ ہر طرف دیکھتی تھی...... ہر معاملے پر نظر رکھتی تھی۔ اس سے کچھ چھپانا یا اسے بے خبر رکھنا ناممکن تھا۔

وہ بڑے دلنشین انداز میں مسکرائی۔ "میں اپنی رائے بدل دوں گی کسی دن...... ابھی بہت سے معاملات میں تم اناڑی ہو......"

"بڑی کمینی ہو تم نور......" میں نے اسے لالچی نظروں سے دیکھا۔ اس نے بالکل سفید ریشمی گاؤن پہن رکھا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس نے ریشم کی ایک چادر اپنے کندھوں پر ڈال لی ہے جو کسی بھی لمحہ پھسل کے فرش پر گر جائے گی، اس کے لمبے سیاہ ریشمی بال اس چادر کے اوپر بکھرے ہوئے تھے اور تیز ہوا سے اڑ کے اس کے چہرے پر آ رہے تھے۔

"کیوں......" وہ بل کھا کے ہنسی۔ "اس لیے کہ میں سچ جانتی ہوں اور تم سے چھپاتی نہیں؟ عورت کے معاملے میں تم اناڑی ہو...... کوئی بھی عورت تمہاری شکست بن جاتی ہے، تم جانتے ہو؟ یا میں نام گنواؤں...... آخری نام ہے ڈاکٹر شائستہ کا......"

میں نے کہا۔ "اس نے...... تمہیں بتا دیا؟"

"ہاں، مجھے اور فریال کو...... مگر معلوم ہے میں نے

اس سے کیا کہا؟ میں نے کہا۔ اسے تم اپنی فتح کہتی ہونا...... اسی لیے بڑے غرور سے بتا رہی ہو، اسے میں تمہاری شکست سمجھتی ہوں، ہاں اگر تم کہتیں کہ میں ہار گئی اس کے سامنے تو یہ تمہاری فتح ہوتی، پھر اس نے مجھے بہت گالیاں دیں...... میرے ماضی کے حوالے سے مجھے فاحشہ...... ایک بکنے والی عورت، طوائف کہا...... میں نے سب تسلیم کیا، اس نے پوچھا کہ کچھ یاد ہے تم کتنے مردوں کے ساتھ سوچکی ہو اور میں نے کہا کہ بے حساب...... مگر یہ بھی کہا کہ تم بھی ماضی کے حوالے سے بات کرتی ہو اور فریال بھی...... میں مستقبل کے بارے میں پوچھوں تو تم کیا بتاؤ گی، میں بتا سکتی ہوں کہ میں نے اپنی شکست کو اپنا مقدر بنالیا ہے۔ مجھے اور کسی کو فتح ہی نہیں کرنا لیکن تم اور فریال مزید فتوحات کرو گی، مجھے اپنی یہ شکست عزیز ہے کیونکہ رفیق نے مجھ پر آخری فتح حاصل کرلی ہے۔"

باتوں سے زیادہ اس کے لہجے نے مجھے چونکنے پر مجبور کردیا۔ "نور...... تم ٹھیک تو ہو۔"

اس کی آواز میں لکنت زیادہ ہونے لگی تھی اور اس کی ہنسی واضح طور پر نشے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ "میں...... مجھے کیا ہوسکتا ہے بھلا......" وہ لہرا کے اٹھی لیکن خود کو سنبھال نہ سکی اور پھر کرسی پر گر گئی۔

میں نے اس کو سہارا دے کر اٹھایا تو وہ ہنس رہی تھی۔

"پریشان کیوں ہوتے ہو جان......"

میں نے کہا۔ "نور تم نے پی ہے، تم نشے میں ہو، اندر چلو۔"

"ہاں...... ابھی کافی پی ہے نا تمہارے ساتھ۔" وہ میرے سہارے پر اپنا سر میرے کندھے پر ٹکا کے چلنے لگی۔ "ہاں، کچھ دیر پہلے...... ایک شربت پیا تھا، بہت اچھا ذائقہ تھا اس کا...... تم بھی پیو گے؟"

میں کمر میں ہاتھ ڈال کے اسے کچن کی طرف لے گیا۔ "ہاں، مجھے بتاؤ کہاں ہے وہ شربت...... اور تم سے کس نے کہا تھا وہ شربت پینے کو...... اچھا چلو چھوڑو، صبح بتا دینا، ابھی تم سو جاؤ۔"

سارے ملازم چھٹی کرکے جاچکے تھے، کچن میں دو میاں بیوی رہ گئے تھے جنہیں گھر کے اندر ہی رہائش کے لیے ایک کمرا ملا ہوا تھا۔ باقی گھر پر ہو کا عالم تھا، یہ خاموشی بھی ایک پرآسیب تاثر رکھتی تھی۔ باہر گیٹ پر صرف ایک گارڈ رات بھر ڈیوٹی دینے کے لیے موجود تھا۔ مجھے اس گھر میں اپنی اور نور کی موجودگی بہت عجیب لگی۔ وہ جو اس گھر کے اصل مالک و مکین تھے سب کچھ میرے لیے چھوڑ گئے تھے اور اس گھر کی ساری رونق اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ جب ان کی شان و شوکت تھی تو گھر میں دعوتیں اور پارٹیاں ہوتی ہوں گی، قہقہے گونجتے ہوں گے۔ موسیقی کی تانیں سنائی دیتی ہوں گی، خود میں نے ایک رات ایلیشا کے ساتھ کینڈل لائٹ ڈنر کیا تھا تو ٹیرس میں آرکسٹرا نے سازوں پر نغمے چھیڑ رکھے تھے۔

اب یہاں سناٹا تھا، صرف میں اور نور تھے، سارے کمرے بند پڑے تھے اور ہم میں یہاں مالک ہونے کے باوجود عارضی مہمان کی طرح مقیم تھے...... محل کے پرانے ملازم تک ہمارا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ میں نے ان کی جگہ کسی کی خدمات حاصل کرنا ضروری نہیں سمجھا کیونکہ مجھے یہاں رہنا بھی نہیں تھا...... مجھے اس گھر کو مقفل کرکے ست بدھائی لوٹ جانا تھا۔ میں پھر آیا تو میری رہائش کے لیے صرف ایک بیڈروم کافی ہوگا، اس وقت یہ خیال میرے ذہن میں آیا کہ آخر مجھے ارنسٹ مینشن کو اپنی ملکیت میں رکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ شاید میں کبھی یہاں مستقل رہائش اختیار نہ کرسکوں۔ اس کا تمام شاہانہ اسباب اور ساز و سامان کے ساتھ دیکھ بھال میرے بس کی بات نہ تھی، پھر یہ سب ایسے نہیں رہے گا، قیمتی آرائش ظروف، تصاویر، پردے، فرنیچر، لائٹس، قالین...... یہ خراب اور تباہ ہوجائیں گے یا چوری ہوجائیں گے۔

کچن میں موجود میاں بیوی مجھے دیکھ کر کھڑے ہوگئے۔ "کیا آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہے سر......؟"

میں نے کہا۔ "میڈم نے حکم دیا تھا کہ اس گھر میں شراب کا گزر بھی نہیں ہوگا۔"

"یس سر...... تمام شراب تقسیم کردی گئی تھی، اس میں اتنی بیش قیمت شراب بھی تھی جس کو پینے کا ہم خواب بھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔"

"پھر میڈم نے کہاں سے پی...... کوئی ایسی چیز جو شربت جیسی تھی مگر شراب کا اثر رکھتی تھی۔"

"میں نہیں بتا سکتا سر...... ممکن ہے لیڈی ارنسٹ کے پرائیویٹ کپ بورڈ یا میڈم ایلیشا کے کمرے میں کچھ ہو۔"

میں نے کہا۔ "کیا سارے ملازمین کو ان کے واجبات کے چیک مل گئے تھے؟"

"یس سر......" سیاہ فام کرسٹین نے کہا۔ "سب چلے گئے ہیں اور صبح کوئی نہیں آئے گا۔"

اس کے شوہر نے کہا۔ "لیکن ہم دونوں جانا نہیں چاہتے، کیا آپ میڈم سے سفارش کریں گے کہ وہ ہمیں یہاں رہنے دیں۔ جیسے ہم پہلے رہتے تھے ایک کمرے میں...... میری بیوی ہر قسم کا کھانا پکا لیتی ہے، انڈین بھی کیونکہ

کا باپ انڈیا کی ایک ریاست شانتی پور کے راجا کا بٹلر تھا اس کی ماں ان کا کچن چلاتی تھی، راجا اس کے ہاتھ کا کھانا ت پسند کرتا تھا۔"

میں نے حیرانی سے اردو میں پوچھا۔ "تم انڈین ہو......"

اس نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔ "جی سرکار، میری ماں شانتی ، باپ سکھ پرمود سنگھ، تقسیم کے بعد وہ یہاں آگئے تھے۔"

"لیکن تم کرسچین ہو۔"

"مہاراج...... جب میں نے کرسٹوفر سے شادی کی، اس سے محبت ہوگئی تھی۔" وہ کچھ شرمائی۔ "تو میں نے اپنا ب بدل لیا تھا، میرا اصل نام نرملا تھا۔"

"کب سے ملازم ہو تم دونوں یہاں؟"

"ہماری شادی کو ہوگئے چھبیس برس، یہ ایلیشا نے ہمیں در جوبلی پر گفٹ کیا تھا۔" اس نے گلے میں پڑے سونے نیکلس کو چھوا۔ "بے بی ایلیشا ہمارے سامنے پیدا ہوئی۔"

"اور تمہارے اپنے بچے؟" میں نے کہا۔

"دو مر گئے، بڑے ہونے سے پہلے...... ایک گم ہوگیا یا میں......"

"انڈیا میں......؟"

"جی حضور، مجھے ہی شوق چڑھا تھا، کاشی جا کے کمبھ بلا دیکھنے کا، میرا باپ میری ماں کو لے جاتا تھا۔ وہاں اتنی بیڑ تھی......" وہ چپ ہوگئی۔

"دیکھو، تم دونوں یہاں رہنا چاہو تو رہ سکتے ہو، لیکن ی خود مجھے نہیں معلوم...... کہ میں یہ گھر اپنے پاس رکھوں گا یا یں، میرا یہاں رہنا مشکل ہے، لندن آتا جاتا رہوں گا لیکن تنے بڑے گھر اور اس سارے ساز و سامان کی مجھے ضرورت یں ہوگی، اس کی دیکھ بھال کون کرے گا؟"

"جب تک ہم ہیں سرکار...... ہم کرلیں گے، میرا شوہر لی بھی ہے، چوکیداری بھی کرلے گا۔ میں صفائی رکھوں گی، اگر نئے مالک آئیں گے تو ان سے بھی کہیں گے کہ ہمیں نہ نکالیں، م کہاں جائیں گے، ایک کمرا رہنے دیں ہمارے پاس۔"

میں نے سر ہلایا۔ "ابھی کوئی تمہیں نہیں نکال رہا ہے، یکن تم نے یہ سب بیگم صاحبہ کو کیوں نہیں بتایا؟"

"اس ڈر سے سرکار...... کہ وہ ہمیں نکال نہ دیں، وہ بہت سخت ہیں ان کو پتا چلتا کہ میں کسی ہندو کی بیٹی تھی......"

میں نے ہنس کے کہا۔ "نہیں، ایسی کوئی بات نہیں...... کیا تمہارا گھر والا ہندی اردو سمجھتا ہے۔"

"نہیں سرکار، میں تو یہاں بڑی ہوئی، انگریزی سیکھی نہیں، خود آگئی، یہ کچھ کہنا چاہتا تھا آپ سے، موقع نہیں مل رہا تھا اور ڈرتا تھا آپ ناراض نہ ہوجائیں۔"

میں نے کہا۔ "کرسٹوفر...... کیا کہنا چاہتے ہو تم...... کہو۔"

اس کی بیوی نے کہا۔ "نواب صاحب نے ہمیں رہنے کی اجازت دے دی ہے۔"

"تھینک یو سر...... یہ چیک آپ واپس لے لیں؟" اس نے جیب سے کاغذ کا پرزہ نکال کے میری طرف بڑھایا۔ "ہم اپنے واجبات لینا نہیں چاہتے۔"

میں نے کہا۔ "ایسی صورت میں، سمجھو یہ تمہاری خدمت اور وفاداری کا انعام ہے۔"

"آپ کا بہت شکریہ، میں چاہتا تھا آپ کو خبردار کردوں کہ یہاں ملازمین میں کس طرح آپ کے خلاف ناراضی اور نفرت کے جذبات پیدا ہورہے ہیں۔"

"مجھے اس کا اندازہ تھا اور میں کسی حد تک ان کو قابل معافی سمجھتا ہوں، وہ پرانے ملازم تھے اور جیسے حالات میں پرانے مالک گئے اور میں آیا، اس میں ان کے لیے دکھ اور صدمہ تھا۔ وہ راتوں رات وفاداریاں بدل نہیں سکتے تھے، کچھ نسلی تعصب کے جذبات تھے۔"

"انہوں نے ہمیں بھی اپنی برادری سے خارج کردیا تھا، کیونکہ ہم نے ان کا ساتھ دینے سے معذرت کرلی تھی، اس میں ہماری مجبوری کو دخل تھا لیکن انہوں نے اسے ہمارا تعصب کہا۔ یہ کہا کہ نیا مالک انڈین ہے اور ہم بھی......" کرسٹین نے کہا۔

"چارلس کے قتل سے ایک دم صورت حال میں بہت تبدیلی آئی، جو چند ہمارے ہم خیال ہو کے سوچ رہے تھے کہ نوکری جاری رکھیں، انہیں اس سے کیا کہ مالک کا تعلق کس ملک سے ہے، لیکن آپ نے چارلس کی جگہ دیدی ایک انڈین کو......"

میں نے کہا۔ "دیکھو، میں سمجھتا ہوں کہ یہاں انڈین ایک اصطلاح ہے جو سب کے لیے استعمال ہوتی ہے خواہ وہ پاکستانی ہو سیلونی یا بنگلا دیشی...... مگر میں چاہتا ہوں ہمیں انڈین نہیں پاکستانی کہا جائے۔"

"میں اس کا خیال رکھوں گا سر۔ یہ لوگ بالکل غلط مطلب نکال رہے ہیں، آپ نے ایک پاکستانی کو چارلس کی جگہ دی، غلام علی کو، کچھ اس کا بھی قصور ہے، وہ معلوم نہیں کیوں اپنے آپ کو سب سے برتر سمجھتا تھا اور خود کو سب سے الگ رکھتا تھا۔ دوسروں پر حکم چلانے کی کوشش کرتا تھا۔"

میں نے سمجھتے ہوئے کہا۔ "وہ اپنی فطرت اور عادت سے مجبور تھا۔"

"میجر لوسی سب کو بھڑکانے میں پیش پیش تھی، کیا آپ

کو معلوم ہے کہ وہ اس تبدیلی کو ایک سازش قرار دیتی تھی، یہ کہتی تھی کہ آپ نے منصوبہ بندی کر کے لارڈ ارنسٹ کی بیٹی کا استحصال کیا اور اس جگہ پر قابض ہو گئے۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

"جب یہ بات پتا چلی کہ غلام علی کے ہاتھوں چارلس کا قتل ہو گیا ہے۔"

میں چونکا۔ "یہ بات انہیں کس نے بتائی؟"

"مجھے نہیں معلوم سر...... میجر لوسی سخت آگ بگولا ہوئی اور اس نے سب کو جمع کر کے شور مچا دیا کہ دیکھو یہاں کیا ہو رہا ہے، تمہارے نئے مالک نے چارلس کو قتل کرا دیا ہے، اپنے انڈین شوفر سے، وہ کتنا پرانا اور وفادار ملازم تھا۔ لارڈ ارنسٹ اس پر کتنا بھروسا کرتے تھے۔"

"کرسٹوفر...... یہ کس وقت ہوا؟"

"ابھی شام چار پانچ بجے، جب میڈم نور نے ان میں چیک تقسیم کیے اور کہا کہ اب وہ فارغ ہیں، اس کے بعد......"

میں سوچ میں پڑ گیا۔ "لیفٹیننٹ میرے پاس چھ بجے آیا تھا۔ اس سے پہلے یہ بات میرے ملازمین کو کیسے معلوم ہو گئی؟"

"میں نے ایسا سنا تھا کہ کسی نے میجر لوسی کو فون کر کے اطلاع دی، یہاں سب میں بہت اشتعال پھیلا، چارلس سب کا پرانا ساتھی تھا۔ انہیں یقین آ گیا تھا کہ آپ نے غلام علی کو اس قتل پر مامور کیا تھا۔ وہ آپ کا خاص آدمی تھا، اسی لیے خود کو عام ملازموں سے برتر سمجھتا تھا۔ سب لوگ اسی وقت چلے گئے تھے۔ انہوں نے طے کر لیا تھا کہ وہ عدالت میں آپ کے خلاف گواہی کے لیے پیش ہوں گے۔"

"یہ افسوس کی بات ضرور ہے، لیکن عدالت میں وہ کیا کہیں گے؟ وہاں صرف جذبات کی بات تو نہیں ہوتی، کیا ثبوت پیش کر سکتے ہیں؟ کچھ نہیں۔"

"سر...... گستاخی معاف، یہ چھوٹا منہ اور بڑی بات ہے لیکن میرا باپ کہتا تھا کہ لڑائی چھوٹی ہو یا بڑی، دشمن کمزور ہو یا طاقتور...... مارا وہی جاتا ہے جو خوش فہمی کا شکار رہے۔" کرسٹین نے کہا۔ "اگر وہ آپ کو نقصان پہنچانے کے لیے جھوٹ بولنے پر اتفاق کر لیں، یہ کہہ دیں کہ انہوں نے غلام علی کے منہ سے یہ بات سنی تھی کہ نواب صاحب نے اسے چارلس کا قصہ تمام کرنے کی ذمے داری سونپی ہے۔ آپ اس حرافہ میجر لوسی کو نہیں جانتے، اس نے لیڈی ارنسٹ کو اپنی مٹھی میں کر لیا تھا اور اس گھر پر راج کرتی تھی، خوب لوٹا اس نے سب کو لیکن لیڈی ارنسٹ کے سامنے یہ بھرم رکھا کہ اس نے ملازموں کو نکیل ڈال کے رکھا ہے ورنہ سب لٹیرے ہیں......

کوئی اس کے خلاف دم نہیں مار سکتا تھا۔ وہ مالکوں کی معتمد تھی، سب سے زیادہ وہی آپ کی دشمن ہے کیونکہ اس کا راج ختم ہو گیا۔ میڈم نور نے اس کو اپنی اوقات یاد دلا دی اور ایسا ٹائٹ کیا کہ میرا تو دل خوش ہو گیا، اس کی لوٹ مار ختم ہو گئی، اس نے سوچا تھا کہ وہ نوکری چھوڑنے کی دھمکی دے گی تو اسے روکا جائے گا کیونکہ وہ سارے ملازموں کو کنٹرول کرتی ہے۔ ایسا نہیں ہوا تو اس کو زیادہ صدمہ ہوا، اسے عام ملازموں کے برابر واجبات ملے اور عام ملازموں کی طرح رخصت کر دیا گیا۔ وہ عدالت میں زہر افشانی کر سکتی ہے کہ اس نے خود آپ کے اور غلام علی کے درمیان ہونے والی گفتگو سنی تھی۔"

میں نے کہا۔ "جب وقت آئے گا دیکھا جائے گا۔ نمٹ لیں گے اس سے بھی، بیان تو وہ دے سکتی ہے کہ میں برطانوی وزیراعظم کے قتل کی سازش کر رہا تھا۔"

میں لوٹ کے بیڈروم میں آیا۔ نور بڑے سکون سے سو رہی تھی۔ یہ وہی بیڈروم تھا جس میں ایلیشا نے مجھے اغوا کرا کے اور یرغمال بنا کے رکھا تھا۔ اس کا ایک دروازہ ٹیرس کی طرف کے ساتھ والے بیڈروم میں کھلتا تھا۔ یہ دو کمرے ایک ہی رخ پر تھے اور اس کے سامنے وہی ٹیرس تھا جہاں سے دریائے ٹیمز کا ایک ویو دیکھا جا سکتا تھا اور بہت دور پس منظر میں بگ بین کے علاوہ "لندن آئی" نظر آتے...... "لندن آئی" اس دیوہیکل گھومنے والے فولادی چکر کو کہتے ہیں جو ایک ستون پر نصب ہے اور انجینئرنگ کا شاہکار تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس کو ایک بہت بڑا گھومنے والا جھولا بھی کہا جا سکتا ہے جس میں لاتعداد تفریح کرنے والوں کے لیے ہنڈولے نصب ہیں، ٹکٹ بہت زیادہ ہونے کے باوجود یہاں سیاح ہمہ وقت قطار باندھے نظر آتے ہیں۔ یہ دو بیڈروم لیڈی اور لارڈ ارنسٹ کے زیر استعمال تھے پہلے وہ ضرور ایک ہی میں سوتے ہوں گے لیکن اب کچھ عرصے سے انہوں نے اپنے بیڈروم الگ کر لیے تھے، تعلقات میں مزید کشیدگی تب آئی جب ایک بیٹی کے بعد خاتون خانہ کے لیے لارڈ کو بیٹا دینا ممکن نہ رہا اور لارڈ عیاشی میں بہت زیادہ مصروف ہو گیا۔ رہی سہی کسر بیوی کی بیماری نے پوری کر دی، عارضی جدائی بالآخر دائمی بن گئی۔

اب لیڈی سیلیا ارنسٹ کے بیڈروم کو نور استعمال کر رہی تھی اور لارڈ کے کمرے میں، میں مقیم تھا۔ ٹیرس کی طرف سے کوئی اور آ جا نہیں سکتا تھا، یہ ایک خوبصورت ماحول والی پرسکون جگہ تھی۔ نیچے مختصر سے پائیں باغ کا نظارہ تھا جس

میں سبز مخملی گھاس کا فرش تھا اور رنگین موسمی پھول اس کا حاشیہ بناتے تھے۔ ٹیرس کی سنہرے رنگ والی گرل میں دس دس فٹ کے فاصلے سے لائٹس نصب تھیں، ان کے الیکٹرک بلب دیکھنے میں موم بتی کے شعلے جیسے تھے، نیچے چاروں طرف خوبصورت پتوں والے سدابہار پودوں کے گملے تھے۔ درمیان میں تھوڑے فاصلے سے دو میزیں پڑی تھیں۔ ایک کے گرد آٹھ کرسیاں تھیں، دوسری کے گرد چار......

کرسٹین اور کرسٹوفر کی باتوں پر غور کرتے ہوئے میں کچھ دیر ٹیرس سے لندن کا نائٹ ویو دیکھتا رہا۔ پھر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اسی وقت میں نے درمیان میں رکھی ہوئی شراب کی بوتل کو دیکھا۔ اسے میں نے ایک نظر میں پہچان لیا۔ یہ ہمارے مشہور عالم مشروب مشرق روح افزا کی بوتل تھی جس کا ایک مخصوص ڈیزائن ہے، میں کچھ حیران ہوا، اس پر لیبل کوئی نہیں تھا۔ جب میں نے اسے کھول کے سونگھا تو روح افزا کے ساتھ مجھے ایک الگ خوشبو محسوس ہوئی۔

چار سال لندن میں گزارنے سے پہلے میں دو سال امریکا میں رہا تھا چنانچہ عادی مے نوش نہ ہونے کے باوجود میں سو فیصد پاک بھی نہ تھا۔ میں ایسا ماہر شراب شناس بھی نہ تھا مگر کچھ شرابوں کی مہک ہی الگ ہوتی ہے جو ملاوٹ کے باوجود محسوس کی جا سکتی ہے۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے روح افزا میں ایک شراب ملائی ہے جس کو فرنچ بون بون کہتے ہیں، یعنی میٹھی چیز...... وہیں ایک گلاس بھی موجود تھا جس میں تھوڑی سی "دردتہ جام" موجود تھی۔

غالباً یہی وہ مزے دار مشروب تھا جس کے نور نے دو گلاس چڑھا لیے تھے اور اسے نشہ ہو گیا تھا۔ اس خیال نے مجھے چونکا دیا کہ آخر یہ ملاوٹ والا مشروب کس نے بنایا اور کیوں...... کسی نے دانستہ ایسا کیا تھا تو کیا اس کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ شراب کے بجائے روح افزا میں کوئی زہر ملا دے؟ یہ ہوا نہیں تھا مگر ہو سکتا تھا۔

میں نے گلاس میز پر رکھ دیا اور اس فکر میں مبتلا ہو گیا کہ ضرور کسی نے یہ سازش کی تھی۔ ابھی ابھی مجھے پتا چلا تھا کہ میجر لوسی نے تمام ملازمین کو اپنی سازش والی تھیوری سے میرے خلاف کر دیا تھا۔ اس نے تو چارلس کے قتل کو بھی میری سازش کا نتیجہ قرار دے دیا تھا۔ کیا یہ لوسی کی سازش تھی؟ نور نے اس کی مرضی کے خلاف ارنسٹ ہاؤس میں موجود نایاب اور بیش قیمت شراب کے ذخیرے کو ناپاک اور حرام قرار دے کر ضائع کرا دیا تھا۔ لوسی نے جوابی انتقامی کارروائی کی کہ تو دیکھتی جا دخترِ اسلام...... کیسے میں یہی حرام اور نجس چیز تیرے

حلق سے اتارتی ہوں۔

خیر یہاں تک تو خطرے کی بات نہیں تھی لیکن اس کے بعد؟ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ جاتے جاتے لوسی نے کچھ چیزوں میں زہر ملا دیا ہو جو ہم ناشتے کھانے میں استعمال کرتے تھے؟ یہ مشکل تھا، ناممکن نہیں اور امکان ایک فیصد بھی ہو تو خطرے کی حالت میں اس سے بچنا چاہیے، کیا حرج ہے اگر گھر کے اسٹور اور کچن میں موجود تمام کھانے پینے کی چیزوں کو تلف کر کے نیا سامان ڈال دیا جائے، واٹر ٹینک بھی صاف کرائے جائیں۔

ان احکامات نے جو میں نے میاں بیوی کو جگا کے جاری کیے انہیں جتنا حیران کیا ان سے زیادہ پریشان کیا۔ انہوں نے دل میں سوچا ہو گا کہ نیا مالک تو سخت بزدل ہے۔ ہم نے تو خبردار کیا تھا۔ اس کو ڈر کے مارے نیند نہیں آ رہی ہے۔ بستر پر پڑا میں یہی سوچ رہا تھا تاہم مجھے اطمینان ہو گیا کہ میں نے بروقت حفاظتی قدم اٹھایا تو کوئی بے وقوفی نہیں کی۔

ہر روز کی طرح میں نے آدھی رات سے پہلے راجا کو فون کیا۔ اس روزانہ کی ٹیلی فونک میٹنگ میں ہم تمام انتظامی امور سے لے کر جذباتی مسائل تک تمام معاملات پر بات کرتے تھے۔ روز کی طرح راجا نے مجھے اطمینان دلایا کہ وہاں سب ٹھیک اور معمول کے مطابق چل رہا ہے چنانچہ میں اپنی فکر ولایتی معاملات کو سدھارنے پر مرتکز کروں۔ چارلس کے قتل کے الزام میں چیف صاحب کی گرفتاری کے معاملے نے اسے تشویش میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ اس میں تشویش کی بات ہی نہیں اور اچھا ہوا اس طرح ایک ساتھ دو کانٹے نکل گئے۔ چارلس گیا جہنم میں...... چیف جائے گا عمر قید کاٹنے۔

"ڈٹ ان لحم خنزیر کھانے والے کفار کے مقابلے میں لیکے پتر...... ہم یہاں سے سات سمندر پار تجھے صرف دعائیں ہی ارسال کر سکتے ہیں، واپسی کی کوئی جلدی نہیں...... اپنے ماجد خان فرماتے ہیں کہ ان حالات میں عدالت تیرے ولایت میں قیام کی مدت بڑھا دے گی، بے شک تو سات سال کے لیے جیل چلا جا اور خیر سے تو بھی سیانا ہے، کوئی اناڑی نہیں...... یہاں کے معاملات ایسے ہی چلتے رہیں گے۔ کیس پرانا ہو کے خود ہی دب جاتا ہے، ورنہ دبا دیا جاتا ہے۔"

"اور سب تو ٹھیک ہے مہاراجا...... ایک معاملہ میں نے بالکل نظرانداز کر رکھا تھا اور وہ ہے مالی صورت حال، تو

نے کبھی دیکھا یا معلوم کیا کہ نواب صاحب کے شاہی خزانے میں مال کتنا ہے؟''

''اچھے وقت پر یہ سوال اٹھایا تو نے، تیرے جانے کے بعد جون میں ختم ہونے والے مالی سال کی بینک اسٹیٹ منٹ ملی تھی، وہ میں تجھے پڑھ کے سناتا ہوں مگر ایک کمرشل بریک کے بعد، دیکھوں وہ ہے کہاں۔''

ایک منٹ گزرنے سے پہلے وہ پھر لائن پر آگیا۔ ''ہاں...... تو پکڑے بیٹھا ہے ناٹیکے پتر...... ٹیلی فون، تو سن دھیان سے عرض کیا ہے، سال کے آغاز میں ہمارے اثاثے ہوگئے تھے دوسو ستر کروڑ......''

میں نے کہا۔''ایک بار پھر بتا، دوسو ستر پونڈ......''

''کروڑ روپے...... پیسا یہاں پونڈ میں تول کے نہیں بتایا جاتا، خواتین اپنا وزن بتاتی ہیں۔''

''یار مجھے اندازہ نہیں تھا کہ لندن کے لارڈ ارنسٹ سے دگنا دولت مند تو ست بدھائی کا نواب ہے۔ آخر اتنا پیسا آیا کہاں سے، بینک والوں سے حساب کتاب میں تو غلطی نہیں ہوئی۔''

''ہم نے شروع شروع میں دیکھا تھا۔ پھر کبھی پوچھا نہیں، سب سے بڑا حصہ تو انہی سونے چاندی کے برتنوں کا اور زیورات کا ہے اور ان ہیرے جواہرات کا جو تجوری سے نکلے تھے۔ پھر ہم نے وہ قدیم کاریں فروخت کی تھیں جو ساٹھ ستر سال سے کھڑی تھیں، دیگر نوادرات الگ تھے، اس کے علاوہ تاریخی تصاویر تھیں، الگ الگ تو حساب ہوگا بینک والوں کے پاس، دوسو کروڑ ہیں فکس ڈیپازٹ کی صورت میں۔ بونڈ، شیئرز، سرٹیفکیٹ، ستر کروڑ کرنٹ اکاؤنٹ میں ہیں، اس سال کا منافع ملا ہے۔ دو کروڑ اسی لاکھ بینک سے، چھ کروڑ انویسٹمنٹ سے، چھ کروڑ چالیس لاکھ، شیئرز ویلیو الگ بڑھی ہوگی۔''

''اور ہمارا خرچ، تجھے کچھ اندازہ ہے۔''

''بس اندازہ ہے، تقریباً اکیس لاکھ ماہانہ، اس میں حویلی کا خرچ، اسکول اور اسپتال کا خرچ اور اسٹاف کی تنخواہ وغیرہ شامل ہیں، یہ ہوتے ہیں سالانہ ڈھائی کروڑ، گویا ہم نقصان میں نہیں جارہے ہیں۔''

''ابھی ترقیاتی پروگرام تو صحیح معنوں میں شروع بھی نہیں ہوا، مگر یار بڑا اطمینان ہوا یہ حساب جان کے...... اب اس میں ایک سو بیس ملین پاؤنڈز اور جوڑ لے، جو یہاں مجھے ملے ہیں۔''

''تقریباً سو کروڑ روپے، لیکن اس کا حساب وہیں رکھ ٹیکے پتر، مشرق اور مغرب کو مت ملا۔''

''یہ مجھے بہت مشکل نظر آتا ہے، ایک ٹانگ یہاں ایک وہاں...... میں تو آج ہی سوچ رہا تھا کہ اس محل نما گھر کو ٹھکانے لگاؤں، میں یہاں رہ نہیں سکتا اس کی دیکھ بھال کون کرے گا؟''

''میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ نور اس کی اہل ہے۔''

''یہ اس نے یہاں آنے کے بعد ثابت کیا ہے ورنہ اس سے پہلے تو وہی بنی ہوئی تھی، اللہ رکھی عرف چھوٹی موئی، کوئی اپارٹمنٹ ہمیں زیادہ سوٹ کرے گا۔''

''ہمیں؟ یعنی مسٹر اینڈ مسز رفیق کو...... دیکھ اللہ نے تیری مشکل تو پہلے ہی آسان کردی تھی، تو چار کرسکتا تھا، اب ایک وہاں ایک یہاں، اس میں تو کوئی مسئلہ نہیں، ہر ملک میں ایک ہوگی کسی دن انشاء اللہ۔''

اتنی لمبی گفتگو کے بعد موبائل فون کی بیٹری کا جواب دے جانا کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی، مجھے یوں لگا جیسے حالات پر کچھ میری گرفت مضبوط ہوئی ہے، ذہنی طور پر اب میں پہلے جیسی افراتفری کا شکار نہیں تھا۔ میں نے حالات کو فیس ویلیو پر قبول کرلیا تھا۔ جو جیسا ہے جہاں ہے۔ ایلیشا نہیں آتی، نہ آئے، ملازم جاتے ہیں بھاڑ میں جائیں، قانونی مشیر دوسرا مل گیا، آفس کو سوشی نے سنبھال لیا۔ جیسے بھی ہوا چیف صاحب کا پتا صاف ہوگیا، قانونی معاملات بھی طے ہوجائیں گے۔ پرانے کیس صبح پہلی پیشی پر نمٹا دیے جائیں گے جن میں کوئی مدعی ہی نہیں رہا۔ چارلی کے قتل کی رپورٹ دیر سے دینا میری بے وقوفی سمجھی جاسکتی ہے یا زیادہ سے زیادہ کوتاہی، بدنیتی نہیں قرار دی جاسکتی۔ کورٹ مجھے وارننگ دے گی یا ممکن ہے جرمانہ کردے۔

میں سکون سے سوگیا لیکن ابھی سویا ہی تھا کہ اٹھا دیا گیا...... یا مجھے ایسا محسوس ہوا، نور نے کسی چڑیا کا پر میرے کان میں گھمایا پھر میری ناک میں۔ میں چھینک مار کے اٹھ بیٹھا۔''یہ کیا ہورہا ہے آنرایبل لیڈی۔''

''لارڈ رفیق۔ کیا آپ دیکھ نہیں سکتے کہ ہم آپ کی ناک میں مرغی کا پر گھمار ہے تھے۔'' وہ متانت سے بولی۔''یہ خلاف قانون تو نہیں۔''

میں نے اسے دبوچ کے نیچے گرالیا۔''یہ بھی خلاف قانون نہیں۔'' میں نے اسے چوما۔ اس کے گالوں پر کاٹا اور اسے گدگدی کرکے بے حال کردیا۔ وہ ہنس ہنس کے مجھے مکے مارتی رہی۔''ارے بدتمیز، کچھ خیال کرو، ایسے ہوتے ہیں کوئی لارڈ...... نواب رفیق...... تم تو بڑے چھچھورے ہو، چھوڑو مجھے۔''

وہ ہانپتی ہوئی اٹھی تو میں نے اسے کھینچ کے گود میں بٹھالیا۔''نور...... ہمیں اب فوراً شادی کرلینی چاہیے۔''

''یہاں کے طریقے کے مطابق انگوٹھی لے کر آؤ، گھٹنوں کے بل میرے سامنے بیٹھ کے پروپوز کرو، پھر میں انکار کروں گی۔''

''تم انکار کروگی...... کیوں؟''

''میں کہوں گی، مجھے کچھ سوچنے دو، اور میں سال بھر سوچوں گی...... کم سے کم......''

''سال بھر...... وہ کیوں؟''

ہم ایک سال شادی نہیں کرسکتے۔ ہم یعنی تم...... تمہارے سامنے اس سے زیادہ اہم کام ہیں، زیادہ بڑے چیلنج ہیں، شادی کا کیا ہے، ہوجائے گی اور نہ ہوئی تو کیا فرق پڑتا ہے۔''

''فرق مجھے پڑتا ہے۔'' میں نے احتجاج کیا۔

''فرق پڑے گا اگر تم وقت پر عدالت میں حاضر نہ ہوئے۔ ملزم رفیق احمد شیرازی حاضر ہو۔'' اس نے پیش کار کی طرح آواز لگائی۔''چلو اٹھو......''

اب شوفر کوئی نہیں تھا چنانچہ میں خود ہی اپنی گاڑی چلا کے مقامی عدالت تک گیا۔ وہاں جان آرنلڈ پہلے سے موجود تھا۔ وہ آنجہانی لارڈ ارنسٹ کی اور ایلیشا ارنسٹ کی وکالت کر رہا تھا۔ میں وہاں مدعی بھی تھا اور ملزم بھی، میری طرف سے ملک ارشد کچھ دیر بعد آیا۔ وہ ماہ نور کا وکیل بھی تھا۔

جج ایک خاتون تھی اس کی عمر تو زیادہ نہیں تھی لیکن وہ ررورت سے زیادہ سخت مزاج ثابت ہوئی۔ اس نے کیس لے بارے میں بہت سے سوالات کیے جو میرے خیال میں کل غیر ضروری تھے۔ کیونکہ دونوں وکیلوں نے الگ الگ لف نامے داخل کردیے تھے کہ فریقین نے ایک دوسرے کے خلاف اپنی اپنی شکایات واپس لے لی ہیں اور یہ بھی بتا دیا ا کہ ایک فریق لارڈ ارنسٹ کا انتقال ہوچکا ہے اور دوسری ں کی بیٹی ایلیشا ارنسٹ ترک دنیا کرکے نن بن گئی ہے۔

دوپہر سے کچھ پہلے مجھے فراغت ہوئی تو مجھے پولیس ٹیشن سے کال آچکی تھی۔ غلام علی کے خلاف قتل کا مقدمہ اس لاقے کی پولیس کے پاس تھا جہاں سے چارلس کی لاش آمد کی گئی تھی۔ قتل کی تحقیقات کرنے والا لیفٹیننٹ وہی تھا س نے گزشتہ شام میرا بیان ریکارڈ کیا تھا۔

''چارلس کیمرون کی لاش ہم نے گزشتہ شام ہی برآمد رلی تھی۔'' اس نے مجھے بتایا۔

''اور وہ دونوں جو شریک جرم تھے؟''

''وہ بھی پولیس کی تحویل میں ہیں...... ایک اپنی ماں کے گھر میں چھپا ہوا تھا، وہ کل رات گرفتار ہوا۔ دوسرے کے بارے میں ایک عورت نے اطلاع دی۔ وہ اسی کے گھر میں تھا اور آج صبح پکڑا گیا۔''

''کیا انہوں نے اپنے جرم کا اعتراف کرلیا ہے؟''

''آج ہم انہیں مجسٹریٹ کے سامنے پیش کریں گے، اہمیت اس بیان کی ہے جو وہاں دیا جائے گا۔''

میں نے پوچھا۔''پھر انتظار کس بات کا ہے؟''

''کورونر کی رپورٹ ابھی موصول نہیں ہوئی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ وہاں پوسٹ مارٹم رپورٹ کا یہی نام ہے۔

''وہ کب تک آجائے گی؟'' میں نے گھڑی دیکھی۔

''دراصل بلیسٹک ایکسپرٹ کی رپورٹ بھی ساتھ ہی پیش کرنا ضروری ہے۔ میرا خیال ہے ایک گھنٹے میں دونوں رپورٹیں مل جائیں گی۔''

''کیا آلہ قتل بھی مل گیا ہے؟''

''یس...... فنگر پرنٹس وغیرہ کی رپورٹ بھی ساتھ ہے، میں سمجھتا ہوں عدالت میں ملزم نے اپنا بیان نہ بدلا تو مقدمہ قتل کی سماعت اسی ہفتے میں شروع ہوجائے گی۔''

میں نے کہا۔''اگر اس نے عدالت میں اعتراف جرم سے انکار کردیا تو؟''

''پراسیکیوشن کے پاس کافی مواد موجود ہے۔ وہ دونوں جو پہلے چارلی کے ساتھ تھے اور بعد میں غلام علی سے مل گئے اس عذر پر کچھ رعایت حاصل کرسکتے ہیں کہ انہوں نے جو کیا مجبوری میں کیا۔ ان کی براہ راست نہ چارلس سے دشمنی تھی اور نہ مسٹر شیرازی سے جن کو وہ قتل کرنا چاہتا تھا۔ اس طرح ان کی سزا میں کمی کی درخواست قابل غور سمجھی جائے گی۔''

میں نے کہا۔''لیفٹیننٹ...... کیا ملزم غلام علی نے سارا الزام اپنے سر لے لیا ہے، میرے خلاف کچھ نہیں کہا؟''

''یہ کیسے ہوسکتا تھا، اس نے جرم کی ذمے داری آپ پر بھی ڈالی ہے۔ یہ کہا ہے کہ آپ نے اسے حکم دیا تھا اور اس نے ملازم کی حیثیت سے تعمیل کی، حالانکہ یہ عذر نہیں بنتا۔ ہر ملازم قانونی احکامات کی تعمیل کا پابند ہوتا ہے۔ اس نے آپ کے بارے میں اور بھی بہت کچھ کہا ہے مثلاً یہ کہ آپ کا ماضی کا ریکارڈ صاف نہیں ہے، پاکستان میں آپ کے خلاف بہت سے قانونی مقدمات تھے جن کی وجہ سے آپ کو ملک چھوڑ کے فرار ہونا پڑا۔ اعلیٰ تعلیم کا تو محض بہانہ تھا۔''

''کیا اس سے مقدمے پر اثر پڑتا ہے؟''

''میرے خیال میں نہیں...... ایک تو اس نے جن

باتوں کا ذکر کیا ہے وہ آٹھ سال پہلے کی ہیں، دوسرے ان کا ارتکاب برطانیہ کی حدود میں نہیں ہوا۔ جبکہ آپ خود ایک برطانوی شہری ہیں، ہم پاکستان سے موصول ہونے والے کسی قانونی معاملے میں کوئی ایکشن نہیں لے سکتے۔"

میں نے کہا۔ "کیا میں اس سے مل سکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں۔" لیفٹیننٹ نے کہا اور مجھے ایک ماتحت کے ہمراہ دوسرے کمرے میں بھیج دیا گیا۔ وہاں صرف ایک میز تھی جس کے گرد چند کرسیاں پڑی ہوئی تھیں، کچھ دیر بعد غلام علی نمودار ہوا۔ اسے ہتھکڑی کے ساتھ لایا گیا تھا چنانچہ ایک پولیس مین اس سے چند فٹ کے فاصلے پر مستعد کھڑا تھا۔

وہ مجھے دیکھتے ہی بپھر گیا لیکن اس نے اپنی آواز سے اشتعال کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ میں نے کہا۔ "کیسا لگ رہا ہے چیف اس زیور کو پہن کے؟"

وہ مجھے گالیاں دینے لگا۔ ایک سے ایک غلیظ اور اشتعال انگیز لیکن اس نے اپنی آواز نیچی رکھی۔ "مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی نواب زادے۔"

میں نے کہا۔ "کیوں امید نہیں تھی؟"

"اس لیے کہ جب تم پر برا وقت آیا ہوا تھا تو میں نے ہی تمہاری مدد کی تھی احسان فراموش کتے......"

میں نے کہا۔ "مجھ پر وہ برا وقت کس کی وجہ سے آیا تھا۔ تمہیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیے۔ میری مجبوری مجھے تمہارے پاس لائی تھی، جیسے اب تم مجبور ہو کے میرے پاس آئے تھے۔ سوچو ذرا، تمہارے پاس آج بھی طاقت ہوتی اور اختیار ہوتا، تو کیا تم مجھے بلیک میل نہ کرتے۔"

"تم نے میرے اعتماد کو دھوکا دیا۔"

"ذرا اپنی زندگی کے اس وقت کا حساب کرو جب تم طاقتور تھے۔ کتنے لوگوں کے اعتماد کو دھوکا دیا تھا تم نے؟ ان میں میرا نام بھی شامل ہے، اپنے جرائم کو دیکھو جو تمہارے نامہ اعمال میں لکھے گئے، لیکن ان کی سزا تمہیں کوئی نہ دے سکا لیکن چیف...... عاقبت سے پہلے اسی دنیا میں جو سزا ملتی ہے اس سے کوئی بچ نہیں سکتا......اور جب برا وقت آتا ہے تو یہی ہوتا ہے، یہ تم نے بھی سنا ہوگا کہ گیدڑ کی موت آئے تو وہ شہر کا رخ کرتا ہے۔"

"جیسے میں نے تم پر اعتماد کی غلطی کی۔"

"یہ غلطی میں نے نہیں کی چیف......بس میں نے یہ ظاہر کیا کہ میں تم پر اعتماد کر رہا ہوں، اس وقت بھی میں فیصلہ کر چکا تھا کہ میں کوبرا سانپ کو اپنا محافظ بنا سکتا ہوں، تمہیں نہیں...... تمہیں تو پھن اٹھانے سے پہلے ہی کچلنا ضروری تھا۔"

"تم کیا سمجھتے ہو......اس طرح تم بچ جاؤ گے؟ تم لا[کھ] کوشش کر لو...... مجھے سزائے موت نہیں دلوا سکتے، میں جس د[ن] بھی باہر آؤں گا اپنا حساب برابر کروں گا نواب زادے......"

میں نے ہنس کے کہا۔ "کب آئے گا وہ دن...... لیکن اس کی ابھی سے کیا فکر کرنا، زیادہ با اختیار میں ہوں، جو باہر کے تمہارے استقبال کے لیے ہار لے کر آؤں گا، یہ بھی ہو سکتا ہے چیف کہ تم باہر آؤ تو جسم سے تمہاری روح پ[رواز] ہو چکی ہو۔"

"تم مجھے جیل میں قتل کراؤ گے؟ یہ پاکستان نہیں ہے۔"

"ہاں...... یہ میرے لیے بہت آسان تھا کہ تمہیں پاکستان لے جاؤں، اپنا باڈی گارڈ بنا کے...... یہ تم خود بھی جانتے ہو کہ وہاں کسی ایک آدمی کو مروانا یا غائب کرانا کو[ئی] مشکل کام نہیں، خصوصاً میرے لیے، چلو اس مہلت کو غنیمت شمار کرو۔"

اس کیس کو عدالت میں پیش کرتے کرتے سہ پ[ہر] ہو گئی۔ غلام علی نے جج کے سامنے اعتراف جرم سے صاف انکار کر دیا۔ ظاہر ہے ایسا اس نے بھی اپنے قانونی مشیر کے کہنے پر کیا تھا۔ اس نے چارلس کے قتل کی ساری ذمے دار[ی] مجھ پر ڈال دی۔ اس کے بیان سے یوں لگتا تھا جیسے میں نے گن پوائنٹ پر اس سے یہ قتل کرایا تھا۔

اس کے لیے پریشانی کے اسباب اس وقت پی[دا] ہوئے جب چارلس کے ساتھ آنے والوں نے اپنی جا[ن] بچانے کے لیے اس کے خلاف بیان دیا۔ وہ ایک طرح سے وعدہ معاف گواہ بن کے اپنا تحفظ کر رہے تھے، پولیس نے عدالت کے سامنے میرا بیان پیش کر دیا تھا۔ جو بیان میں نے وہاں ریکارڈ کرایا وہ اس سے مختلف نہیں تھا۔

میرا بیان ابھی ختم ہوا ہی تھا کہ ایک عورت کھڑی ہو کے چلانے لگی۔ "جج صاحب...... قاتل یہی ہے، مجھے اس کے خلاف بیان دینے کی اجازت ہونی چاہیے۔ میرے پاس ثبوت ہیں، میں گواہوں کے نام بتا سکتی ہوں جو جانتے ہیں قتل اس شخص نے کیا تھا، لارڈ ارنسٹ کی موت طبعی نہیں تھی۔"

جج نے پوچھا۔ "تم کون ہو، اس کیس سے تمہارا تعلق ہے؟"

"یہ آپ کو معلوم ہو جائے گا جناب۔" وہ گواہوں کے کٹہرے کی طرف بڑھی۔

"یہ شخص میرا شوہر ہے۔"

اس عورت کو میں صورت سے پہچانتا تھا اور آنجہانی [لا]رڈ ارنسٹ کی زندگی میں اس کی سیرت کے چرچے بھی عام [تھ]ے۔ بات وہی تھی کہ بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا......وہ [پہ]لے ایک ناکام ماڈل تھی لیکن ادا فروشی اور حسن و شباب کی نمائش [کا] ہنر جانتی تھی...... ماڈلنگ ایک مشکل پیشہ تھا...... ہر روز کسی [نئی] وارد کی صورت میں قیامت برپا ہوتی تھی تو اپنا مستقبل [ز]لزلے کی زد میں محسوس ہوتا تھا...... یہ خوف غالب رہتا تھا کہ [ک]ہیں کوئی نئی نویلی ماڈل اس کا پتانہ کاٹ دے......پھر اس پیشے [میں] اس وقت بہت کم ملتا تھا......زیادہ سے زیادہ پانچ سال میں جتنا [کم]الو وہی کسی کاروبار میں لگا دو تو زندگی فراغت سے گزر جائے [گ]ی ورنہ وقت کے ساتھ ساتھ طلب کم ہوتی جاتی ہے اور اشتہار [دین]ے والوں کے پاس صاف جواب ہوتا ہے کہ ایک ہی چہرے [کو] کتنے اشتہاروں میں دیکھیں اور کب تک......؟

زیادہ سمجھدار وہ ہوتی ہیں جو عروج کے زمانے میں اپنی [شر]ائط پر کسی دولت مند دیوانے کو پھانس لیتی ہیں...... جب تک [اس] کی دیوانگی برقرار رہتی ہے قیمت وصول ہوتی رہتی ہے...... [ج]ب وہ بھی اکتاہٹ کا شکار ہوتا ہے تو جان چھڑانے کی اتنی [ب]ڑی قیمت دینے پر مجبور ہوتا ہے کہ باقی عمر اچھی گزر سکے۔

اس عورت نے بھی لارڈ ارنسٹ کو پھانس لیا تھا اور دنیا [ک]ی زبان بند کرنے کے لیے اس کی سیکریٹری کے عہدے پر [فائ]ز ہو گئی تھی......اب یہ سب ہی جاننے والے جانتے تھے کہ [سیک]ریٹری کون سے سیکریٹ معاملات کو سنبھالتی ہے اور تنخواہ تو [ٹی]کس والوں کو دکھانے کے لیے مقرر ہے آف دی ریکارڈ وہ [ان] خدمات کا معاوضہ کتنا وصول کرتی ہے۔

"تم کون ہو؟" جج نے ہتھوڑا مار کے عدالت میں پھر [خام]وشی پیدا کی۔

"یور آنر...... میرا نام جینی ہے...... جینی اسمتھ...... [میں] گزشتہ تین برس سے لارڈ ارنسٹ کی پرنسپل سیکریٹری تھی۔"

"پرنسپل سے تمہاری کیا مراد ہے؟" جج نے کہا۔

"میرے علاوہ لارڈ کی تین اور سیکریٹری تھیں جو محدود [ذمے] داری کے ساتھ لارڈ کے کاروباری معاملات میں مدد [کرت]ی تھیں۔ میں ان کی ذمے دار تھی...... لارڈ کے وہ [معام]لات بھی میرے علم میں رہتے تھے جو کانفیڈینشل تھے [اور] میں وہ بھی جانتی ہوں جو دوسرے نہیں جانتے۔"

"او کے مس جینی...... آپ گواہوں کے کٹہرے میں [آ کر] اپنا بیان ریکارڈ کرائیں۔" جج نے حکم دیا۔

جینی کٹہرے میں آ گئی...... یہاں بھی اس کا لباس [اس کے و]قار کے مطابق نہیں تھا۔ دراصل وہ ایسے ہی ملبوس کی عادی تھی جو اس کی مارکیٹ ویلیو برقرار رکھے......عدالت کے کمرے میں موجود حضرات کا متاثر ہونا تو فطری بات تھی خود جج صاحبہ اسے دلچسپی (یا حسد) سے دیکھ رہی تھیں۔

لیکن اس سے پہلے کہ جینی کے آتش غضب سے سرخ چہرے اور لپ اسٹک سے لال ہونٹوں سے پھول کے بجائے انگارے جھڑتے میرا وکیل ملک ارشد اٹھ کھڑا ہوا۔ "یور آنر یہ کیا ہو رہا ہے؟"

خاتون جج نے شکن آلود ماتھے کے ساتھ اسے گھورا۔ "آپ کے خیال میں یہاں بندر کا تماشا ہو رہا ہے؟"

ملک ارشد کی متانت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ "اگر میرے موکل کو بندر مان لیا جائے...... ڈارون تو کہتا ہے کہ سب انسان بندر کی اولاد ہیں......تو عدالت میں وہی ہو رہا ہے جو آپ نے کہا۔"

"اس قسم کی زبان استعمال کر کے آپ غلطی کر رہے ہیں مسٹر ارشد۔"

"اور عدالت کیا کر رہی ہے؟ کس کی بات سن رہی ہے اور کس معاملے میں؟ میرا خیال تھا کہ یہاں لارڈ ارنسٹ کے قتل کا کوئی کیس زیر سماعت نہیں تھا...... عدالت ان کے شوفر اور وکیل کے قتل کا مقدمہ سن رہی تھی......ملزم میرا موکل نہیں غلام علی تھا۔"

یہ نکتہ میں بھی اٹھانا چاہتا تھا چنانچہ میں نے نظروں ہی نظروں میں ملک ارشد کو دادِ شجاعت دی۔ وہ بولتا رہا۔ "مجھے بتایا جائے کہ کیا میرے موکل کے خلاف کہیں بھی لارڈ ارنسٹ کے قتل یا قتل کے شبہے...... یا قتل کی سازش میں معاونت کا کوئی بھی مقدمہ درج ہے؟"

اب جج کی خفت اور پریشانی قابلِ دید تھی۔ "آپ کا اعتراض درست ہے...... مس جینی اسمتھ...... اگر آپ کو یقین یا شک ہے کہ لارڈ ارنسٹ کا قتل ہوا تھا اور قاتل مسٹر رفیق احمد ہیں تو آپ پہلے پولیس کے پاس جائیں۔ تفتیش کے بعد مقدمہ سماعت کے لیے آیا تو آپ کی گواہی بھی سنی جائے گی۔"

"یور آنر...... یہ زیادتی ہے...... یہ انصاف نہیں ہے۔" جینی چلائی۔

"اگر اس کے بعد تم نے ایک لفظ بھی کہا تو میں توہینِ عدالت کے جرم میں تم کو چھ مہینے کے لیے جیل بھیج دوں گی......کورٹ ڈسمس......" اس نے غصے میں ہتھوڑا اتنی زور سے میز پر مارا کہ شاید اس کی ہموار سطح پر ڈینٹ پڑ گیا ہو۔

میں عدالت کے کمرے سے باہر آیا تو شام ہو گئی تھی۔ آج کا سارا دن عدالتی کارروائی کی نذر ہو گیا تھا...... پہلے

ایک کورٹ میں پھر دوسری عدالت میں...... ذہنی طور پر جس دباؤ اور الجھاؤ کا شکار تھا وہ اب تقریباً ختم ہوگیا تھا...... میں نے ملک ارشد کی کارکردگی کو سراہا۔

''آپ اس عورت کی بکواس کو ذرا بھی اہمیت نہ دیں...... برطانوی عدالتوں کے انصاف کی روایات قابلِ رشک ہیں۔''

میں نے آہ بھری۔ ''اس میں کوئی شک نہیں...... لیکن مجھے بہت افسوس ہوتا ہے۔''

وہ چلتے چلتے رک گیا۔ ''یہ آپ کے لیے افسوس کی بات ہے؟''

''ہاں...... کیونکہ خیال جاتا ہے اپنے پیارے پاکستان کے نظام انصاف کی طرف...... کاش میں وہ وقت دیکھتا جب ایسا ہی میرے وطن کے عدالتی نظام کے بارے میں کہا جاتا۔''

وہ مسکرا کے پھر ساتھ چلنے لگا۔ ''آپ بھی کہاں کی بات کرتے ہیں جناب! یہ دکھ اور شرم کی بات ہے۔''

''صحیح فرمایا آپ نے...... لیکن وہاں تو حالات ہر گزرتے دن کے ساتھ خراب سے خراب تر ہوتے جارہے ہیں...... ہم اُمید بھی رکھیں تو کیسے......؟''

میں خاموش ہوگیا کیونکہ میں ملک ارشد کی سوچ کو غلط نہیں قرار دے سکتا تھا...... پاکستان کا خواب دیکھنے والے شاعرِ مشرق نے کہا تھا...... پیوستہ رہ شجر سے اُمید بہار رکھ...... پھر فیض نے بڑے یقین سے کہا کہ لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے...... لیکن جو ہم دیکھ رہے ہیں اس سے ہر محب وطن پاکستان اُمید سے دور ہوتا جارہا ہے...... آباؤاجداد کی سرزمین...... تہذیب اور روایات سے سارے ناتے توڑ کے جارہے ہیں...... ناروے اور جاپان سے کینیڈا اور آسٹریلیا تک...... جہاں بھی مستقبل کا تحفظ ہے...... جو پاکستان میں ہیں وہ دن رات ملک ٹوٹنے کی باتیں کرتے ہیں اور خوف کی بے عملی کا شکار ہیں۔''

لارڈ ارنسٹ کا قانونی مشیر جان آرنلڈ اچانک سامنے سے نمودار ہوا۔ ''آئی ایم سوری نواب رفیق......''

''کس بات کے لیے؟''

''اس بے وقوف عورت جینی اسمتھ کے رویے پر۔''

میں نے کہا۔ ''اس کے لیے آپ کیوں شرمندہ ہیں؟''

''میں نے اسے سمجھا دیا ہے...... معلوم نہیں کس نے اسے پٹی پڑھائی تھی کہ آپ کے خلاف لارڈ ارنسٹ کے قتل کا مقدمہ درج کرے۔''

''جو ایسا چاہتا ہے اپنا شوق پورا کرے۔''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کرنا بھی جرم ہے...... میں نے اسے کہا کہ سب سے اہم ہوتی ہے اسپتال کی اور پھر پوسٹ مارٹم کی رپورٹ...... لارڈ کی موت اسپتال میں ہی ہوئی اور اسپتال والے ذمے دار لوگ ہیں...... کوئی بھی تمہارے شک کی حمایت نہیں کرسکتا...... خود لارڈ کی بیٹی نے نواب رفیق پر مکمل اعتماد کا اظہار کیا ہے...... لارڈ نے بھی اسی اعتماد کی وجہ سے اپنا کاروبار اور سارے اثاثے نواب رفیق کے حوالے کیے تھے...... خیر...... وہ سمجھ گئی۔''

''یعنی آپ نے میری یہ خواہش پوری نہیں ہونے دی کہ میں خود اسے سمجھاتا...... تنہائی میں۔'' میں نے ہنس کے کہا۔

''اس سے محتاط رہنا...... وہ تمہارے پاس خود آسکتی ہے اپنی بے وقوفی پر شرمندگی کا اظہار کرنے...... لیکن درحقیقت اس کا مقصد کچھ اور ہوگا...... جو کاروبار کا مالک ہے وہ اس کے جسم کا مالک ہے...... وہ اسی اصول پر چلتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''پھر یہ عدالت میں اس نے کیا ڈراما کیا تھا؟''

وہ مسکرایا۔ ''ابھی تجربے سے تم بہت کچھ سیکھو گے...... جب آپ کا دشمن آپ کے سامنے قدموں میں گر کے معافی مانگے تو آپ زیادہ فراخدل ہوجاتے ہو...... ایک فاتح کی طرح......''

میں اس کی معاملہ فہمی سے متاثر ہوا۔ ''رائٹ...... سکندر نے پورس کو اس کی سلطنت واپس کردی تھی۔''

''میں کچھ اور کہنے کے لیے آیا تھا...... میرا خیال ہے کہ اب میرے اور آپ کے درمیان کسی کاروباری معاملے میں رابطے کی ضرورت بھی نہیں رہی...... مجھے ان ذمے داریوں سے سبکدوش سمجھا جائے جو لارڈ نے مجھے سونپ رکھی تھیں۔''

میں نے ہاتھ ہلا کے کہا۔ ''تھینک یو جان...... تم میرے بہترین راہنما تھے اور میری خواہش تھی کہ رہتے...... لیکن ہم اچھے دوست ضرور رہیں گے۔''

اس کے جاتے ہی میں نے ملک ارشد کو اپنا قانونی مشیر مقرر کردیا۔

''تمہیں کل ہی آفس سے ایگریمنٹ لیٹر مل جائے گا۔'' میں نے کہا۔

''یہ میرے لیے بڑے اعزاز کی بات ہوگی...... مگر......''

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ ''تم کچھ زیادہ خوش نظر نہیں آتے...... اگر بات معاوضے کی ہے تو اس کی جگہ خالی

چھوڑ دی جائے گی...... تم اپنی مرضی سے رقم بھر سکتے ہو۔''

''یہ بات نہیں سر۔''

''پھر کیا بات ہے؟...... تم یہ کام کرنا نہیں چاہتے؟''

''بات یہ ہے سر...... کہ معاہدے میں یقیناً ایک شق بندی کی ہوگی...... میں کسی اور کے مقدمات کی پیروی نہیں کرسکوں گا۔''

''ایسا تو ہوتا ہے...... ایک ضابطہ اخلاق کی اہمیت ہے رنہ کل کو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسی کاروباری معاملے میں تمہیں برا حریف دگنے معاوضے پر تمہیں میرے سامنے کھڑا کر ے...... میری کمپنی میں رہ کر تمہیں اندر کی بہت سی باتیں علوم ہوں گی۔''

''آپ نے غلط سمجھا...... معاوضہ میرا مسئلہ نہیں ہے...... مجھے آپ کے ساتھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا لیکن میں نے آپ کی فراخدلانہ فطرت کو سمجھ لیا ہے...... آپ مجھے میری توقع سے زیادہ دیں گے...... لیکن میں یہاں صرف پیسا نہیں کمارہا ہوں...... تھوڑی بہت مدد اپنے ہم وطنوں کی بھی کررہا وں جو یہاں آکے قانونی مشکلات میں پھنس جاتے ہیں اور جھے دکیل افورڈ نہیں کرسکتے...... آپ اسے سوشل ورک سمجھ ہیں...... یہ کام میں نہیں چھوڑ سکتا۔''

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''اگر میں ایسا کروں تو یہ سوشل ورک سے نہیں کارِخیر سے روکنے کے مترادف ہوگا...... میں کسی کو نیکی سے روکوں تو گنہگار کہلاؤں گا...... میں اس کام میں تمہاری ہر ممکن مدد کروں گا ملک صاحب۔''

اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ ''پھر مجھے آپ کی خدمت کر کے خوشی ہوگی۔''

''لیکن......'' میں نے ہاتھ اٹھا کے کہا۔ ''بالفرض محال...... کوئی ایسی صورت حال پیدا ہوگی...... جب تمہیں اپنے کارِخیر پر اپنے فرائض منصبی کو ترجیح دینا پڑے۔''

''فرض اوّلیت رکھتا ہے...... فرض فرض ہے...... نماز میں بھی سنت اور نوافل چھوڑے جاسکتے ہیں...... فرض نہیں۔''

اس نے ہاتھ ملایا اور رخصت ہوگیا۔

آنے والے دنوں میں مجھے نوعیت کے اعتبار سے دو طرح کے مسائل کا سامنا تھا۔ ایک مسائل دفتری اور کاروباری تھے۔ بے شک میں نے سوشی کو اس کے خلوص، وفاداری اور فرض شناسی کی بنا پر تمام معاملات میں خودمختار بنا دیا تھا اور ان فیصلوں کا اختیار بھی دے دیا تھا جو مالک کی حیثیت سے میرے کرنے کے تھے لیکن خودسوشی اس ذمّے

داری کا بوجھ اٹھانے سے گھبرا رہی تھی۔

دوسرے مسائل کی نوعیت کو ذاتی یا گھریلو کا نام دیا جا سکتا ہے۔ہم نے کرسٹوفر اور اس کی بیوی کرسٹین کے سوا تمام ملازم برطرف کردیے تھے۔کرسٹین پہلے ہندو تھی اور اس کا نام نرملا تھا...... کرسٹوفر کے عشق میں اس نے اپنا دھرم چھوڑا اور کرسٹین بن کے ولایت آ گئی...... یہ ایک بہت بڑا انقلاب تھا کہ ارنسٹ مینشن سے اس کے اصل اور پرانے مکین رخصت ہو گئے تھے...... مالک اس دنیا سے چلے گئے تھے اور جو مالک تھی اس نے دستبرداری اختیار کرلی تھی۔

یہ محض ملکیت کی تبدیلی نہیں تھی...... ایک سوشل ٹریجڈی بن گئی تھی...... وہ اس سے زیادہ ناخوشگوار تبدیلی تھی جو مغل انڈیا میں آئی تھی جب تجارت کے لیے مراعات حاصل کرنے والوں نے حکمرانوں کو بے دخل کر کے ان سے حکومت چھین لی تھی۔اگرچہ اس غاصبانہ قبضے کا عمل پورا ہونے میں بھی ایک صدی گزر گئی تھی اور لوگ یہ بھی سمجھتے تھے کہ ایسا حکمرانوں کی عیاشی اور نااہلی کے باعث ہوا تھا...... اس کے باوجود نئے حکمرانوں کے خلاف نفرت کا ردِعمل بہت شدید تھا۔

یہاں صورتِ حالات اس سے بھی بڑی تھی...... سب کچھ اچانک اور بغیر کسی وجہ کے ہوا...... کاروبار اور جائداد کے اصل مالک عالی نسبت خاندانی اور خالص سفید فام نسل سے تعلق رکھنے والے تھے...... ان کا سب کچھ ایک ایسے شخص کا ہو گیا تھا جو لارڈ ارنسٹ سے تعلق رکھنے والوں کے نزدیک ''انڈین'' تھا۔

میرے اندازے کے مطابق لارڈ کے خاندان سے رسم و راہ رکھنے والے بھی ایک شاک کی کیفیت میں تھے...... ان کی نظر میں میری حیثیت ایک سازشی کی تھی جس نے ایک پلان کے تحت ایلیشا پر ڈورے ڈالے...... اور ایلیشا کو ایسا پاگل کیا کہ اس نے اپنا مذہب بھی چھوڑ دیا...... پہلے دین سے گئی اب دنیا سے...... ماں باپ کو صدمے دے کر مار دیا اور خود چرچ میں جا بیٹھی۔

نوکر پیشہ لوگ کم تعلیم یافتہ ہوتے ہیں چنانچہ نفرت کا سب سے پہلا ردِعمل ارنسٹ مینشن کے اندر کام کرنے والوں کی بغاوت اور برطرفی کی صورت میں سامنے آیا...... دو نوکر صرف اس لیے رہ گئے کہ ایک اپنے ORIGIN میں انڈین تھی...... مجھے اندیشہ تھا کہ ایک مہذب کہلانے والے سفید فام معاشرے کا ردِعمل بھی کسی نہ کسی صورت میں سامنے آئے گا خواہ وہ ہمارا سوشل بائیکاٹ ہو یا اعلانِ جنگ۔

ابھی تک ظاہری اور مجلسی اخلاق کے مظاہرے میں سب مہذب ہونے کا ثبوت دے رہے تھے لیکن سب کے دلوں میں تعصب حسد اور کینہ تھا...... ان کے خیال میں میں نے ایلیشا کو عائشہ بنایا تھا...... یہ جنسی ہی نہیں مذہبی بدکاری تھی...... میں نے لارڈ ارنسٹ کی فیملی ختم کردی تھی اور اس کی تمام عمر کی کمائی اس کے کاروبار اور گڈول سب پر قابض تھا...... میں ان سب کا قاتل تھا لیکن عدالت میں میرا جرم ثابت نہیں ہوتا تھا۔مگر مجھے سزا تو ملنی ہی چاہیے...... عدالت اگر ثبوت شہادت کے بغیر خود کو بے بس محسوس کرتی ہے تو انگریز قوم انصاف کرے گی۔دشمنی اور نفرت کے زہر کی بو میں گردوپیش کی ہوا اور فضا میں محسوس کر رہا تھا...... آج بھری عدالت میں ایک بدکردار خودفروش عورت نے سوچے سمجھے بغیر مجھ پر براہِ راست قاتل ہونے کا الزام لگا دیا تھا...... بہت سے لوگ اس الزام سے سو فیصد اتفاق کریں گے۔

میں جسمانی طور پر کم اور اعصابی تھکن کا زیادہ شکار تھا۔ میرا سارا دن عدالت میں گزرا تھا اور جینی اسمتھ کی شرانگیزی سے یہ خطرہ کھل کر سامنے آ گیا تھا کہ نقصان پہنچانے والے سازشی عناصر چین سے جینے نہیں دیں گے...... میں نور کے ساتھ تفریح کی غرض سے نکل گیا اور ہم نے رات کے کھانے کے لیے ٹیمز کے ایک فلوٹنگ ریسٹورنٹ کا انتخاب کیا۔

چودھویں رات کے چاند کو دیکھ کر یہ خیال میرے ذہن میں آیا تھا کہ دریا کے خاموش پانی پر بہتے ریسٹورنٹ اور ایک سازینے کی سحر آفریں موسیقی میں نور کے ساتھ مجھے لطف اور سکون کے چند لمحے میسر آئیں گے...... نور کو کچھ معلوم نہیں تھا...... لندن میں تین سال رہ کے مجھے ہر جگہ جانے کا موقع ملا تھا...... یہاں بھی ایک بار میں عائشہ کے ساتھ آیا تھا اور بلاشبہ یہ ایک خوب صورت وقت کی یاد تھی جس نے مجھے نور کو یہاں لانے پر مجبور کیا۔

لیکن اس خواہش کے پورا ہونے سے پہلے ہی مجھے ایک شرمسار کرنے والی صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑا...... ہیڈ بٹلر انتہائی مؤدبانہ انداز میں مجھے اپنے ساتھ لے گیا...... میرا خیال تھا کہ وہ ٹیبل تک میری راہنمائی کرے گا یا کوئی ٹیبل فوری طور پر دستیاب نہ ہونے کی صورت میں مجھے بڑی معذرت کے ساتھ کچھ دیر انتظارگاہ میں ''مشروبات'' سے شغل کرنے کی درخواست کرے گا۔

لیکن جو ہوا اس کے برعکس تھا۔''کیا آپ اپنا تعارف کرانا پسند کریں گے جناب!'' ہیڈ بٹلر نے دست بستہ عرض کی۔

''میں لارڈ ارنسٹ کی فرم کا مالک اور چیئرمین ہوں...... رفیق احمد شیرازی۔''

''تھینک یو سر...... اور آپ کا ٹائٹل؟''

''ٹائٹل...... میں کچھ سمجھا نہیں۔'' میں نے خفگی سے کہا۔

''جناب والا یہاں صرف خطاب یافتہ اور عالی نسب شرفا ہی آ سکتے ہیں...... آپ ملاحظہ فرما سکتے ہیں...... حقوق داخلہ محفوظ ہیں۔'' اس نے ایک سائن بورڈ کی طرف اشارہ کیا۔

''غصے اور خفت سے میرا چہرہ گرم ہو گیا۔''میں پہلے بھی یہاں آ چکا ہوں...... ایلیشا ارنسٹ کے ساتھ۔''

''آف کورس لیڈی ایلیشا ارنسٹ ایک خطاب یافتہ لارڈ کی صاحب زادی ہیں...... آپ ان کے مہمان تھے۔''

میں خود بھی ایک اسٹیٹ کا نواب ہوں...... نواب سمجھتے ہو؟ حاکم...... اسٹیٹ آف ست بدھائی کا حکمراں...... یہ پاکستان کی ایک خودمختار ریاست ہے۔'' میں نے اپنے غصے کا اظہار بھی بڑی بردباری کے ساتھ کیا۔

ہیڈ بٹلر کے تیور بدل گئے۔تاہم اس نے اپنی غلطی پر خفت کا اظہار نہیں کیا...... اس نے اپنے انکار پر قائم رہنے کے لیے دوسرا اعتراض پیش کر دیا۔''نواب صاحب کو یہ علم تو ہوگا کہ ڈنر جیکٹ یہاں حقوق داخلہ کی ایک شرط ہے۔''

مجھ پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا...... میری ساری اکڑفوں دھری رہ گئی...... میں ست بدھائی کا نواب تھا یا لارڈ ارنسٹ کی دولت، جاگیر کا وارث...... کروڑپتی ارب پتی تھا یا اعلیٰ تعلیم یافتہ برطانوی شہری...... میرا لباس عامیانہ تھا...... مجھے ہائی سوسائٹی میں داخلے کا حق پیدائشی طور پر حاصل ہو سکتا تھا، اگر میں کسی لارڈ یا کاؤنٹ اور ڈیوک کی نسل سے ہوتا...... مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اشرافیہ کا رات کے کھانے کا لباس کیسا ہوتا ہے۔

نور مجھ سے زیادہ برافروختہ تھی۔''جان چھوڑو...... ہم کہیں اور چلتے ہیں...... لعنت بھیجو اس متعصب نسل پرست جگہ پر......''

لیکن اب میں نے جوابی کارروائی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔''ڈنر جیکٹ از نو پرابلم...... یہاں سے ہیرڈز کتنی دور ہے؟''

ہیرڈز لندن کا سب سے بڑا پرتعیش اور گراں سمجھا جانے والا ڈیپارٹمنٹل اسٹور ہے جہاں عام لوگ خریداری نہیں کرتے...... شہزادی ڈایانا جب حادثے میں ہلاک ہوئی تو وہ ہیرڈز کے مصری مالک دودی الفائد کے ساتھ تھی...... ہیڈ بٹلر نے کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا...... وہ تجربہ کار اور تربیت یافتہ شخص طبقۂ امرا سے ڈیل کرتا تھا اور ان کے ہر طرح کے رویے اور جذباتی مسائل سے نمٹنا جانتا تھا۔

اس دلچسپ ترین کہانی کے بقیہ واقعات آٹھویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں۔

قسمت کے پھیر میں اُلجھے ایک نوجوان کی داستان

اناڑی

احمد اقبال

8

قسمت کے پھیر میں اُلجھے ایک نوجوان کی کتھا، حالات اور واقعات کا بہاؤ اُسے دیارِ غیر لے گیا جہاں وہ اناڑی تھا مگر خود کو کسی کھلاڑی سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ ایسا کھلاڑی جسے کسی بساط پر شکست نہیں دی جاسکتی تھی۔ اس کا اناڑی پن اُسے کھلاڑیوں کے مقابل کامیابیاں دلاتا رہا۔ اُسے پردیس راس آ گیا تھا جہاں کی ہنگاماں خیزیاں اُس کا دل لبھاتی تھیں مگر دوسری طرف دیس میں اس کی لاٹری کھل گئی، ایسی لاٹری کہ جس کے بعد اُسے لوٹنا تھا۔ اناڑی سے کھلاڑی بننے کے بعد...... وہ لوٹا...... تو ہنگامے اور شرارتیں اُس کے ساتھ تھیں۔ قدم قدم پر آنسو اور لمحہ قہقہوں سے لبریز اُس اناڑی کی کہانی جس کا دل دو حصوں میں منقسم تھا۔

اناڑی

خوب صورت و گل رنگ جذبوں سے گندھی ایک تیز رفتار کہانی

میں نے احتجاج کرتی نور کو اپنے ساتھ گھسیٹا اور طوفانی رفتار سے گاڑی دوڑاتا ہوا ''ہیرڈز'' پہنچا...... متعلقہ شعبے میں جا کے اپنی مرضی کا ڈنر جیکٹ سوٹ منتخب کیا لیکن اسے پہنا نہیں حالانکہ وہاں ڈریسنگ روم تھا...... میں نے اسے پیک کرا لیا اور لوٹ کے اسی فلوٹنگ رائل ریسٹورنٹ پر گیا...... ایک بار پھر مجھے ہیڈ بٹلر نے ریسیو کیا۔

سوال اس نے زبان سے نہیں کیا...... سوال از خود اس کی آنکھوں میں اتر آیا کہ تم پھر آ گئے؟ اسی عامیانہ حلیے میں......؟

میں نے ڈنر جیکٹ والا ''ہیرڈز'' کا شاپنگ بیگ میز پر رکھ دیا۔ ''مجھے اُمید ہے اگر میں یہ ڈنر جیکٹ زیب تن کر لوں تو تم کوئی نیا اعتراض نہیں کرو گے؟''

اس نے اشارے سے بتایا۔ ''ڈریسنگ روم اس طرف ہے سر۔''

''تھینک یو...... لیکن اب میں احتجاجاً یہ ڈنر جیکٹ سوٹ تمہارے لیے چھوڑ کے جا رہا ہوں...... میں اس نسلی اور طبقاتی امتیاز کے خلاف آواز بھی اٹھاؤں گا...... تو ہیل دو یور فلوٹنگ ریسٹورنٹ۔''

ہیڈ بٹلر کا چہرہ سپاٹ رہا...... میں نے نور کا ہاتھ تھاما اور پھر اس پُرتعصب جگہ سے واک آؤٹ کر گیا...... نور میرے غصے کے باعث خاموش تھی کہ کہیں اس کے کچھ کہنے سے میں مزید نہ بھڑک اٹھوں...... میں اسے دوسری جگہ لے گیا...... یہ ایک انتہائی خوب صورت منظر رکھنے والا فائیو اسٹار انڈین ہوٹل تھا جس کی شان و شوکت کے سامنے وہ رائل فلوٹنگ ریسٹورنٹ بھی کچھ نہیں تھا۔ یہاں دولت مند اور عالی نسب انگریز بھی دیسی کھانوں کا مزہ لینے آتے تھے...... گزشتہ سال چکن تکا کو برطانیہ کا مقبول ترین قومی کھانا ہونے کا اعزاز بھی مل چکا تھا۔

ہم ایک کارنر ٹیبل پر بیٹھ گئے جہاں شفاف شیشوں سے ایک طرف ٹیمز کی جلوہ گری نظر آتی تھی تو دوسری طرف لندن کی جگمگاتی رات کا حسن...... یہاں بھی ایک آرکسٹرا تھا لیکن وہ سازوں پر مشہور رومانی گانوں کی دھن بجا رہا تھا۔

میں نے نور کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ ''تمہارا موڈ خراب کیا نا میں نے...... آئی ایم سوری سویٹ ہارٹ۔''

وہ مسکرائی۔ ''جب تم جانتے ہو کہ انگریز ایسی ہی متعصب قوم ہے تو ری ایکٹ کرنے سے کیا ہوگا...... کیا تم ان کا مزاج بدل دو گے؟''

''مجھ سے بے عزتی برداشت نہیں ہوتی...... مجھے ایسا لگتا ہے نور کہ یہ نسل پرست معاشرہ مجھے معاف کرنے والا

نہیں ہے...... لارڈ کے ذاتی ملازموں کا احتجاج تم نے دیکھا؟ یہ لوگ مجھے اس کا قانونی وارث ماننے کو تیار نہیں...... اس کا ردِعمل ہر جگہ سامنے آئے گا۔"

"اچھا چھوڑو...... ہم یہاں کھانا کھانے آئے ہیں یا اپنی جان جلانے...... جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"

ہمارے قریب ایک ٹیبل گری...... اس پر پھیلا ہوا تمام اسباب خورد و نوش فرش پر بکھر گیا...... شیشے اور چینی کے ظروف ٹوٹ گئے...... ایک لڑکی چلّانے لگی...... "تم گلی کے آوارہ کتے...... کیا مجھے معلوم نہیں کہ تم ہر کتیا کے پیچھے رال ٹپکاتے پھر رہے ہو...... آخر کیا ہے ان میں جو میرے پاس نہیں...... لو دیکھو......"

لڑکی جوانی کی حدود سے گزر چکی تھی مگر مصنوعی سہاروں نے اس کو حسن و شباب کی سیکسی توپ بنا رکھا تھا یا وہ خود فریبی میں ایسا سمجھتی تھی۔ وہ نشے میں مدہوش تھی...... ایک جھٹکے میں اس نے اپنا لباس تار تار کر دیا اور اپنے عریاں جسم کے ساتھ ہر طرف گھوم گئی...... "دیکھو...... تم سب دیکھ سکتے ہو کہ میں کسی سے کم نہیں...... بلکہ یہاں کون ہے جو میرے مقابلے پر آئے۔"

اس کا شرم سے پانی پانی ہونے کے بجائے ڈھٹائی سے مسکرانے والا پارٹنر اسے گود میں اٹھا کے باہر لے گیا۔ وہ مچلتی تڑپتی اور شور کرتی رہی...... ویٹر جگہ کو صاف کرنے لگے...... دوسری میزوں پر لوگ جن میں فیملیز بھی تھیں پھر اپنے کھانے اور باتوں میں لگ گئے۔

نور ہکا بکا اور شرم سے لال ہوئی بیٹھی تھی۔ "یہ تم کیسی بے ہودہ جگہ لے آئے ہو مجھے؟"

میں نے ہنس کر کہا۔ "ایسے تماشے یہاں ہوتے ہیں...... اور انہیں کوئی بھی اہمیت نہیں دیتا...... تم بھی عادی ہو جاؤ گی۔"

لیکن وہ دن ہی اچھا نہیں تھا۔ اپنی خلوت کو جلوت میں بھی برقرار رکھنے کے لیے میں نے موبائل فون تک آف کر دیے تھے تاکہ کوئی فون بھی موصول نہ ہو...... راجا یا رابعہ عام طور پر رات کو دیر سے فون پر بات کرتے تھے اور یہ گفتگو طویل ہوتی تھی۔ وہ مجھے ست بدھائی کے حالات کی رپورٹ دیتے تھے اور مجھ سے یہاں کے حالات کا خبرنامہ سنتے تھے۔

نور بڑے اچھے موڈ میں تھی اور بہت اچھی لگ رہی تھی۔ میری فرمائش پر اس نے لباس اور میک اپ کا خصوصی اہتمام کیا تھا چنانچہ میں دیکھ رہا تھا کہ وہاں آنے والے...... جن میں ہمارے پاکستانی بھائی بھی اور انڈین بھی...... نور کو دیکھتے تھے تو ایک لمحے کے لیے ٹھٹک کر ٹھہر جاتے تھے...... یہ

بجلی کے کرنٹ جیسا حسن کا شاک ہوتا تھا۔ پھر ان کے ساتھ آنے والی کوئی بیوی یا گرل فرینڈ ان کی ٹھہری ہوئی نگاہوں کے مرکز یعنی نور پر حاسدانہ نظر ڈال کر اپنے شوہروں اور بوائے فرینڈز کو کھینچ لیتی تھیں۔

ہم اپنی باتیں کر رہے تھے لیکن اپنی باتوں کو اپنے حالات سے دور نہیں رکھا جا سکتا تھا...... میرے لیے یک نہ شد دو شد والا مرحلہ تھا...... ایک ست بدھائی کے مسائل ہی کیا کم تھے کہ لندن کے کاروبار اور اس سے جڑے ہوئے سارے چیلنج سامنے آ گئے۔

"تم بلاوجہ پریشان ہو۔"

"بلاوجہ؟ میری حالت تو اس عورت سے بری ہے جس کے دو خصم ہوں...... یہ سب کیسے ہوگا...... میرا ایک پیر مشرق میں اور دوسرا مغرب میں...... یہاں کے مسائل کچھ اور ہیں...... وہاں کے کچھ اور......"

"سب ہو جائے گا...... میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔"

"کیا ساتھ ہو؟ محض جذباتی طور پر......" میں نے مایوسی سے کہا۔

"اور کیا چاہتے ہو تم؟"

"میں چاہتا ہوں تم عملی طور پر بھی میرا ساتھ دو...... تم میں اس کی صلاحیت ہے...... لیکن تم ہمت نہیں کر رہی ہو۔"

وہ کچھ دیر سوچتی رہی۔ "میں کیا ہمت کروں؟"

"تم یہاں رہو...... اس محل کے سارے معاملات تم نے نمٹائے یا نہیں، یہاں چارلی جیسے بدمعاش بھی تھے...... اور میجر لوسی جیسے خود کو سارے معاملات کا کرتا دھرتا سمجھنے والے بھی۔"

"وہ تو خدائی فوجدار بنی ہوئی تھی۔"

"اس کو کیسے رخصت کیا تم نے...... اب تمہارا پورا کنٹرول ہے...... تمہیں ایک ایک چیز کا علم ہے......"

"صرف اس محل کو سنبھالنے کے لیے میں یہاں اکیلی رہوں؟ آخر کیا مصرف ہے اتنے بڑے محل کا ہمارے لیے...... لارڈ ارنسٹ کا...... اس کی بیوی سیلیا کا اور خود ایلیشا کا ایک وسیع حلقہ شناسائی تھا...... آنے جانے والے بہت تھے...... وہ یہاں پارٹیاں دیتے تھے...... مہمانوں کو ٹھہراتے تھے...... اسی مناسبت سے محل کا ساز و سامان تھا۔"

میں نے کہا۔ "کیا ہم ان کی طرح نہیں رہ سکتے؟"

"بالکل نہیں رہ سکتے...... پھر کیا ضرورت ہے ارنسٹ مینشن کا بکھیڑا پالنے کی......؟"

"ہمیں رہنے کے لیے کوئی جگہ تو چاہیے۔"

"لیکن کیا ضروری ہے کہ وہ کوئی قیصرِ عالی شان

ہو...... ہم لندن میں کہیں ایک شاندار اپارٹمنٹ بھی تو لے سکتے ہیں...... کسی اچھے علاقے میں...... جو اتنا بڑا ہو کہ ہمارے مستقبل کی ضروریات بھی پوری کرے۔"

"یعنی ہمارے بچوں اور بچوں کے بچوں کو بھی کافی ہو۔"

وہ ہنس پڑی۔ "زمانۂ حال میں لوٹ آئیں نواب صاحب...... دنیا بچے دو ہی اچھے کے اصول پر کاربند ہے...... اور یہ دو بچے بھی بالغ ہوتے ہی اپنی دنیا آپ بسانے نکل جاتے ہیں...... آج میرے سامنے تم ہو اور تمہارے سامنے میں ہوں۔"

"اور ہم دونوں کے سامنے ہے مستقبل کا ایک سوال...... اچھا فرض کرو...... بلکہ فرض کیا کرنا تم کہتی ہو تو ایسا ہی ہوگا...... ہم یہاں ایک لگژری اپارٹمنٹ خرید لیتے ہیں...... اس کا کیا کریں...... ارنسٹ مینشن کا؟"

"یار اسے بیچ دو...... اس کی ایک گڈول ہے...... یہ ایک عالی نسبت لارڈ کی رہائش گاہ تھی...... کسی عام آدمی کا گھر نہیں تھا...... اسے کوئی بھی لارڈ یا ڈیوک منہ مانگی قیمت پر خریدے گا۔"

"اس بات پر جی چاہتا ہے تمہارا منہ چوم لوں۔" میں نے کہا اور اس سے پہلے کہ نور سمجھتی یا سنبھلتی میں نے اسے چوم لیا۔

وہ اس کے لیے تیار نہیں تھی لیکن اپنے آس پاس بوس و کنار کے مناظر اس کے لیے اجنبی نہیں رہے تھے۔ اس نے واجبی سی مزاحمت کی اور پھر ہتھیار ڈال دیے...... کسی نے بھی اس رومانی منظر میں غیر معمولی دلچسپی نہیں لی...... میں پھر اپنی جگہ بیٹھ گیا۔

نور کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا...... "دیکھو...... یہ بدتمیزی نہیں چلے گی ہمیشہ۔"

"روم میں وہی کرو جو رومن کرتے ہیں...... اور اس میں مرضی کی کیا بات ہے...... یہ تو زبردستی ہے میرے جذبات کی...... جو مجھے مجبور کر دیتے ہیں اور جذبات کو بھڑکاتی ہو تم...... تمہارا یہ خانہ خراب حسن ہے۔"

اس نے بڑی ادا سے بگڑ کے کہا۔ "اچھا!...... یعنی قصوروار میں۔"

میں نے کہا۔ "ہم بات کر رہے تھے محل کو ٹھکانے لگانے کی۔"

"مگر تمہارا دماغ ٹھکانے پر نہیں رہتا۔ مجھے یہ بالکل پسند نہیں کہ ہم لندن میں اپنے طور طریقے بھول کے انگریز بن جائیں...... ایسے تو تم مجھ سے کہو گے کہ منی اسکرٹ پہنو اور خود جام کو حلال سمجھ کے منہ لگا لو گے...... پی کے مجھ سے کہو گے کہ میرے ساتھ ڈانس بھی کرو۔"

میں نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔ "اچھا غلطی ہو گئی مجھ سے آئندہ ضرورت محسوس ہوئی تو ہم پردہ کر لیں گے......"

وہ ہنسنے پر مجبور ہو گئی۔ "ہو بڑے ہی ڈھیٹ۔ اچھا بتاؤ ارنسٹ مینشن کو بیچ کے ہم نے کوئی اپارٹمنٹ لے لیا۔"

"پھر...... تم یہاں رہو گی...... اکیلی...... جیسے ہزاروں خواتین رہتی ہیں...... تم روز میرے آفس جاؤ گی اور سوشی تمہیں کاروبار کی اونچ نیچ سمجھائے گی۔ اس میں کوئی ٹیکنیکل مسئلہ نہیں آ سکتا کیونکہ کمپنی جنرل آرڈر سپلائر ہے...... ایک جگہ سے کوئی چیز اٹھاتی ہے اور دوسری جگہ سپلائی کر دیتی ہے، زیادہ سے زیادہ یہ کرتی ہے کہ تین مختلف ممالک یا سورس آف سپلائی سے کوٹیشن لے کر......"

"خدا کے لیے رفیق، تم مجھے یہاں بزنس ایڈمنسٹریشن پر لیکچر دینے کے لیے لائے تھے۔"

میں نے کہا۔ "سوری جانم...... بات سے بات نکلی ہے، ہم اپنے مستقبل کا لائحہ عمل بنا رہے ہیں، آج نہیں تو کل تمہیں وہ سب کرنا ہے، جو میں بتا رہا ہوں، تم کو میرے ساتھ اس کاروبار کو چلانا ہے، صرف چلانا ہی نہیں ہے، بڑھانا بھی ہے۔"

"یہ سب میں کیسے کر پاؤں گی؟"

"ارادہ کر لو...... سب ہو جائے گا۔"

ایک لمبے تڑنگے گورے نے ہماری خلوت میں دخل اندازی کی، وہ قریب آ کے ہاتھوں کے بل میز پر جھک گیا اور اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔ "تم وہی انڈین ہو نا۔"

میں کھڑا ہو گیا...... "پاکستانی، ناٹ انڈین......"

"اے ڈاگ از اے ڈاگ......"

میں نے دھاڑ کے کہا۔ "تم مدہوش ہو، اپنی ٹیبل پر واپس جاؤ ورنہ میں تمہارے ہوش ٹھکانے لگا دوں گا۔"

میری آواز بلند ہوتے ہی اِدھر اُدھر بیٹھے ہوئے بہت سے لوگوں کے سر گھوم گئے، ان میں اکثریت ایشیائی لوگوں کی تھی لیکن کافی تعداد میں گورے بھی تھے۔

وہ سنبھل گیا۔ "میں صرف یہ بتانے آیا تھا کہ لارڈ کے خاندان کو مٹا کے تم نے جس طرح اس کی دولت ہتھیالی ہے......"

جملہ ختم ہونے سے پہلے ہی میں نے اس کے منہ پر ایک نپا تلا پنچ مارا، میں اسے ناک آؤٹ بھی کر سکتا تھا لیکن اس سے معاملہ بڑھ جاتا...... گورے کے ریمارکس قریب کی میز پر بیٹھے ہوئے لوگوں نے بھی سنے تھے اور ویٹرز نے بھی...... ان میں ہیڈ ویٹر بھی شامل تھے جو اسی قسم کی ناخوشگوار

صورتِ حال کوسنبھالنا جانتے تھے۔

ہیڈ ویٹر نے گورے کو اٹھایا اور اس کی آنکھ کے اشارے پر دو تنومند ویٹر اسے کھینچ کر لے گئے۔ ''چھوڑو مجھے، میں ٹھیک ہوں۔''

''نو سر...... آپ نے بہت زیادہ پی لی ہے۔'' ہیڈ ویٹر نے کہا اور پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''آئی ایم سوری سر لیکن اب آپ اور محترم خاتون کہیں مزید پریشانی، میرا مطلب ہے بدمزگی سے دوچار نہ ہوں۔''

میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔ وہ جو بھی تھا کوئی شریف اور مہذب آدمی نہیں تھا، ایک کِکے سے اس کا نشہ ضرور اترا ہوگا لیکن وہ سرِعام اپنی بے عزتی کو ایشو بنا کے کچھ بھی کرسکتا تھا۔ یقیناً وہاں وہ اکیلا نہیں آیا ہوگا، میں نے کہا۔ ''ہم ویسے بھی جا رہے ہیں۔''

جب میں باہر جانے والے دروازے کی طرف نور کے ساتھ جا رہا تھا تو میں نے اس شخص کو ایک میز پر غصے میں منہ سے جھاگ اڑاتا دیکھا۔ اس کے ساتھ کوئی عورت بھی تھی جو اسے منت سماجت کے انداز میں روک رہی تھی لیکن وہ اس کی ایک نہیں سن رہا تھا اور نہ جانے فون پر کس سے بات کر رہا تھا...... یہ ہوسکتا تھا کہ وہ جوابی کارروائی کے لیے اپنے مددگاروں کی فورس طلب کر رہا ہو۔

ابھی بارہ بجنے میں چند منٹ باقی تھے۔ ''آج کا دن ہی منحوس تھا۔'' میں نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

نور متانت سے بولی۔ ''خدا نے سب دن ایک سے بنائے ہیں، کوئی اچھا برا نہیں ہوتا۔''

میں نے خفت سے کہا۔ ''یہ تو ٹھیک کہا تم نے...... لیکن......''

''لیکن کچھ نہیں، ہم گھر جا کے بات کریں گے...... تم پُرسکون ہو کے گاڑی چلاؤ......''

اس رات فوراً سونا میرے بس میں نہ تھا، آنے والے دنوں کے بہت سے اندیشوں نے میرے دماغ پر یلغار کر دی تھی، نور نے بھی کوشش ترک کر دی اور میرے لیے کافی بنا کر ٹیرس پر لے آئی۔ لندن کا آسمان جو کچھ دیر پہلے چاندنی سے روشن تھا اب ہر سمت سے بادلوں کی بڑھتی ہوئی یلغار میں تھا۔

''یہ گورے ہمیں تنگ کریں گے نور...... تم دیکھ لینا۔''

''کیا تنگ کریں گے...... آخر قانون بھی تو ہے ہماری حفاظت کے لیے......''

''ہاں...... یہ ہوسکتا ہے کہ میں قانونی تحفظ مانگ لوں اور عدالت مجھے سیکیورٹی فراہم کر دے...... لیکن اس سے پہلے مجھے ثابت کرنا ہوگا کہ مجھے سیکیورٹی کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی...... کیا مجھ پر کوئی قاتلانہ حملہ ہوا؟ کیا مجھے کوئی دھمکی موصول ہوئی؟ محض ایک شراب کے نشے میں دھت شخص کی بکواس پر لندن پولیس کو میری حفاظت پر مامور نہیں کیا جاسکتا۔''

''تم خود اپنی سیکیورٹی فورس لے لو......''

میں نے ہنس کے کہا۔ ''جانم...... یہاں وزیراعظم کی کوئی سیکیورٹی نہیں...... وہ عام لوگوں کی طرح رہتا ہے اور جب نکلتا ہے تو ہمارے غریب مقروض اور چھوٹے سے ملک کے صدر اور وزیراعظم کی طرح اس کے آگے پیچھے سائرن بجانے والا لمبا جلوس نہیں ہوتا...... سڑک ایسے بند نہیں کی جاتی کہ پرندہ پر نہ مار سکے...... ایمبولینس تک روک دی جاتی ہے...... کوئی مرتا ہے تو مر جائے، میں یہاں اپنے ملک کے وی آئی پی کلچر کا مظاہرہ کروں گا تو تماشا بن جاؤں گا۔''

''پھر کیا کرو گے...... ہر جگہ خود اپنے مارشل آرٹ میں بلیک بیلٹ ہونے کا مظاہرہ کرو گے......'' نور ٹھہر کے بولی۔

''جسٹ ویٹ اینڈ سی...... دیکھو مجھے اس سوسائٹی سے ایک پُراعتماد سلوک کی توقع ہے...... گھریلو ملازمین اپنی نفرت کا اظہار کر چکے ہیں۔ اس کا اگلا مظاہرہ کمپنی میں ہوگا...... وہاں کے گورے ملازم اس تبدیلی کو ذہنی طور پر قبول نہیں کریں گے۔''

''یہ تو بڑی خطرناک بات ہے۔''

''ہاں...... سوشی بھی ایشیائی ہے، لارڈ ارنسٹ کے سائے میں باہمی اشتراک سے چلنے والے کاروبار میں اسے کوئی پرابلم نہیں تھی...... اب اگر کینہ پرور لوگوں نے مجھے نقصان پہنچانے کے لیے ریکارڈ میں ردّوبدل کیا، کاغذات اور فائلیں غائب ہونے لگیں، اعداد و شمار میں گڑبڑ کی گئی تو مالی نقصان اپنی جگہ، ہم قانونی چکر میں پھنس جائیں گے۔''

نور پریشان ہوگئی۔ ''پھر کیا سوچا ہے تم نے؟''

میں نے کہا۔ ''جارحیت ہی بہترین دفاع ہے۔''

''آپ وضاحت فرمائیں گے؟''

میں نے کہا۔ ''اگر میں نے حفاظتی پیش بندی کی۔ سوشی سے کہا کہ وہ سب پر نظر رکھے، لوگوں کے ردِّعمل اور ان کی نیت سے محتاط ہو...... شرپسندی کے امکانات کا جائزہ لے، تو یہ مشکل ہوگا، شاید ناممکن...... خدا سب دیکھتا ہے، انسان نہیں دیکھ سکتا۔ آسان طریقہ یہ ہے کہ خرابی ہونے سے پہلے میں اس کا تدارک کر لوں، میں فرم کو نیشنلائز کر لوں۔''

''کیا مطلب......؟''

''میں جانچنے پرکھنے کے چکر میں نہ پڑوں، قانونی طور سب کی چھٹی کر دوں لیکن اس سے پہلے اپنی ٹیم منتخب کر لوں۔ جو ایک دن نیا انتظام سنبھال لے، کسی کو گڑبڑ کرنے کی مہلت ہی نہ ملے۔''

''یہ تم کیسے کرو گے...... اور نئی ٹیم کا کیا بھروسا۔''

''میں نے سب سوچ لیا ہے ڈارلنگ...... سوشی بہت عرصے سے یہاں ہے...... اسے معلوم ہوگا کہ اوپر کی سطح کے اچھے منتظم اور باصلاحیت لوگ کہاں ہیں...... وہ دوسرے کاروباری اداروں میں کیا تنخواہ لے رہے ہیں...... پاکستان کے بعد بنگلا دیشی بھی اپنے ہی ہیں اب کسی گورے کے مقابلے میں انڈین پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے۔''

''شاید تم ٹھیک سوچ رہے ہو۔''

''میرے ذہن میں اب کوئی شک و شبہ نہیں...... مالک میں ہوں تو یہ ایک پاکستانی فرم ہوگی، اس کی افرادی قوت کا ڈھانچا ہی نہیں، نام بھی بدلا جائے گا۔ اب یہ شیرازی انٹر پرائز ہوگی اور ایک سو فیصد پاکستانی فرم...... کام یہی ہوگا لیکن کام کرنے والے سب پاکستانی ہوں گے، اچھے لوگ مل جاتے ہیں۔''

نور نے میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ ''ایک بات کہوں۔''

میں نے اسے آغوش میں لے لیا۔ ''پوچھ کیوں رہی ہو؟''

''خدا نے تمہیں انسانوں کا دل جیتنے کی بے پناہ صلاحیت الگ دی ہے، ذہنی صلاحیت کے علاوہ...... آخر کیوں؟''

میں چکرا گیا۔ ''اس کیوں کا بھلا میں کیا جواب دوں؟''

''وہ تم سے کوئی خاص کام لینا چاہتا ہے۔''

میں ہنس پڑا۔ ''یہ تمہیں کیسے معلوم ہوگیا۔''

''یہ میرا یقین ہے۔''

میں نے کہا۔ ''اور میرا یقین کہتا ہے کہ اس خاص کام میں جو لوگ میری مدد کر رہے ہیں، انہیں خدا ہر جگہ سے انتخاب کر کے میری طرف بھیج رہا ہے، ان میں تم بھی ہو، دیکھو کیسے حالات کے دھارے میں بہتی ہوئی مجھ تک آئیں۔ اب تم انکار کیسے کر سکتی ہو۔''

''انکار......'' وہ مجھ سے الگ ہو کے بولی۔ ''میں نے کب انکار کیا ہے اور میں تمہیں کیسے انکار کر سکتی ہوں جان۔''

''تو پھر طے ہے...... شیرازی انٹر پرائز میں تم میرے ساتھ ہو...... نام کے ساتھ کوئی بھی عہدہ چلتا ہے...... تم چیئرمین اور میں ایم ڈی......؟ اس کے برعکس میں چیئرمین اور تم ایم ڈی...... باقی سب سوشی کی طرح اس کے بعد...... ڈائریکٹرز...... یہ ہوگا ہماری فرم کا سیٹ اپ، تمہیں منظور ہے؟''

یہ میں نے نکاح پڑھانے والے قاضی کی طرح پوچھا تھا، نور ہنستے ہوئے میری آغوش میں سما گئی۔ ''منظور ہے...... سو بار منظور ہے......''

اس موضوع پر میں نے راجا سے ایک گھنٹا ٹیلی فون پر ڈسکشن کیا...... وہ سخت خفا تھا کہ میں نے گزشتہ آٹھ گھنٹے اپنا کنکشن آف کر رکھا ہے اور میرے ساتھ ایئر مارشل نور خان نے بھی......

''نور جیسی حسینہ کے لیے یہ خطاب......''

اس نے مارشل لا لگا رکھا ہے تجھ پر اور تیری ناقص عقل پر...... وہ مہ نور نہیں ایئر مارشل نور خان ہے...... فیکے پتر......''

''یہ اس کا قصور نہیں میرے پیارے بھائی، یہ ٹھیک ہے کہ میرا دل اس کے عشق کے جال میں یوں پھنسا ہوا ہے جیسے مکڑی کے جالے میں مکھی...... لیکن میرا دماغ خاصی بلندی پر اس کے مضر اثرات سے بالکل محفوظ اطمینان بخش طریقے پر کام کر رہا ہے۔''

''پھر یہ مواصلاتی رابطہ کیوں منقطع تھا......''

میں نے کہا۔ ''اس کی وجہ ہرگز وہ نہیں جو تو سمجھ رہا ہے کہ میں اور نور کسی گوشۂ خلوت میں نشۂ عشق سے مدہوش پڑے تھے...... آج کا دن ہی ایسا پُرنحوست تھا کہ تجھے بتاؤں گا تو تیرا کلیجا بھی شق ہو جائے گا...... تیرا دل......''

راجا نے مجھے تسلی دی۔ ''میرے اعضائے رئیسہ کی فکر نہ کر فیکے پتر، حوصلہ رکھ...... بتا دے تیرے ساتھ ان فرنگیوں نے 'کیا' کیا؟''

میں نے اسے ہر روز کی طرح دن بھر کی روداد بڑے اختصار کے ساتھ سنائی...... وہ توجہ سے سنتا رہا، ٹیلی فون نے فاصلوں کا وجود مٹا دیا ہے، پہلے وہ بھی دور تھا جب لندن میں کسی سے بات کرنے کے لیے کال بک کرانا پڑتی تھی اور کال ہو تین منٹ کی تو آپریٹر صاحب ایک سیکنڈ اوپر نہیں ہونے دیتے تھے۔ اب یہ وقت تھا کہ فون کو سب جیب میں ڈالے پھرتے تھے اور کال بیڈروم میں لیٹ کر بھی کی جاسکتی تھی اور باتھ روم میں بیٹھ کر بھی۔ راجا اتنی دور سے عملاً کچھ بھی کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا...... یہی کیا کم تھا کہ میری عدم موجودگی میں وہ ست بدھائی کے انتظامی امور میں کسی قسم کی خلل اندازی نہیں ہونے دے رہا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ لندن

کے مسائل لندن میں بیٹھ کے ہی حل کیے جا سکتے ہیں......اور خوش قسمتی سے لندن میرے لیے اور میں لندن کے لیے اجنبی نہیں چنانچہ اس نے معمول کے مطابق سب ٹھیک ہے کی رپورٹ دی اور میری حوصلہ افزائی کے لیے میرے ہر فیصلے کی تائید بھی کرتا رہا۔

حالات کو دیکھتے ہوئے مجھے مستقبل قریب میں اپنا لوٹ کے پاکستان جانا ممکن نظر نہیں آتا تھا لیکن میری خواہش تھی کہ مہلت ملے تو کچھ دن کے لیے ست بدھائی والوں کو بھی اپنا چہرہ دکھا آؤں۔

میں یہاں جس کے خلوص پر سب سے زیادہ بھروسا کرسکتا تھا وہ سوشی کی ذات تھی...... وہ جاپانی نژاد لڑکی ہیروشیما یا شاید ناگاساکی کی رہنے والی تھی، اس نے ایک بار مجھے بتایا تھا کہ اس کی نانی ایٹمی بم کی تباہ کاری میں زندہ بچ جانے والی اکیلی عورت تھی۔ اس کا کسی امریکی فوجی سے معاشقہ چل رہا تھا اور جب ایٹم بم گرا تو وہ اپنے گھر سے سیکڑوں میل دور اس امریکی فوجی کے ساتھ تھی......اس کے خاندان کے تمام افراد جل کر کوئلہ ہوگئے اور جب بالآخر اسے اپنے گھر جانے کا موقع ملا تو وہاں ملبے کے سوا کچھ بھی نہیں تھا......اس امریکی فوجی کا بھی ایک جاپانی لڑکی سے مراسم پر کورٹ مارشل ہوا اور برطرفی کے بعد اس کو واپس بھیجنے کے احکامات صادر کیے گئے......اس نے جھوٹ بول دیا کہ میں شادی کر چکا ہوں چنانچہ واپس جاؤں گا تو اپنی بیوی کے ساتھ ورنہ یہیں رہوں گا۔ ایک مہربان افسر نے اسے بیوی کے ہمراہ جانے کی اجازت دی، یہاں اس نے تین مہینے کی جیل کاٹی، اسی زمانۂ اسیری میں سوشی کی ماں پیدا ہوئی لیکن زچگی میں کسی پیچیدگی کے باعث بچی زندہ رہی اور ماں مرگئی، باپ کے جیل سے رہا ہونے تک بچی کو اسپتال کی ایک نرس نے پالا، بعد میں یہی نرس اس امریکی فوجی کی دوسری بیوی بنی جس نے سوشی کی نانی سے قانونی طور پر شادی بھی نہیں کی تھی، وہ فوجی ویت نام کی جنگ میں مارا گیا اور سوشی کی ماں کو ایک امریکن فیملی نے گود لے لیا......انہی کے ساتھ وہ لندن آئی۔

سوشی کی ماں اب بھی زندہ تھی اور اس کی عمر ستر سال کے قریب تھی۔ اس کا باپ اسپین سے آیا تھا چنانچہ سوشی کے خدوخال میں اور رنگ روپ میں جاپان کے سنہری رنگ والی جلد میں ہلکی سی زیتونی رنگت نے بڑی دلکشی پیدا کردی تھی۔ اس کا باپ شادی کے کئی سال بعد ایک دن ایسا غائب ہوا کہ پھر اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔

سوشی نے لندن میں ہی پرورش اور تعلیم پائی اور اپنے آبائی وطن جاپان سے تین نسل دور ہونے کے باوجود اپنے جاپانی آداب و اطوار ترک نہیں کیے......اس نے اپنے ایک ہم وطن سے شادی کی تھی اور مزے کی بات یہ تھی کہ اس کا شوہر آفس میں بہت نچلے درجے کا ماتحت تھا لیکن ان کے درمیان ایسی پُرخلوص مفاہمت تھی کہ نہ گھریلو تعلقات پر آفس اثر انداز ہوتا تھا، نہ آفس پر ان کا میاں بیوی کا رشتہ، دونوں انتہائی مہذب اور مخلص تھے اور جاپان کی تہذیبی وضعداری کا جیتا جاگتا نمونہ......ایسا ہی ان کا گھر بھی تھا۔

اگلے دو دن میں نے سوشی کے ساتھ مشاہدات میں گزارے، یہ انتہائی رازدارانہ نوعیت کی اور بہت اہم مشاورت تھی......فرم میں ایک انقلاب آنے والا تھا۔ اس کا نام ہی نہیں انتظامی ڈھانچا بھی تبدیل ہونے والا تھا۔ سوشی نے میری کسی بات سے اختلاف نہیں کیا، اس لیے نہیں کہ وہ ماتحت تھی، وہ بھی سمجھتی تھی کہ میں نے یہ تبدیلی نہ کی تو مجھے مزاحمت کا سامنا ہوگا اور سازشی عناصر کو مخالفت کے لیے متحد ہونے کا موقع ملا تو وہ مجھے نقصان بھی پہنچائیں گے۔ حالانکہ یہ ان کا معاملہ ہی نہیں تھا......فرم کا مالک ٹام ڈک آر ہیری ہو یا زید بکر عمر......ان کو اپنا وہی روزمرہ کا کام کرنا تھا۔

نوران مذاکرات میں ہمہ وقت موجود رہی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ تمام امور کو سمجھ لے اور کاروبار کی نوعیت کے ساتھ انتظامی مسائل کی اونچ نیچ سے بھی واقف ہوجائے۔ مجھے خوشی ہوئی جب رفتہ رفتہ اس نے ڈسکشن میں حصہ لینا شروع کیا اور کچھ کارآمد مشورے بھی دیے۔ وہ بہت سنجیدگی سے فرم میں ذمے داریاں سنبھالنے کے لیے خود کو تیار کر رہی تھی۔

سوشی نے میری اس بات سے اختلاف کیا کہ کمپنی کا سارا انتظامی ڈھانچا بیک جنبش قلم بدل دیا جائے۔ ''تبدیلی ایسے آنی چاہیے کہ کسی کو احساس تک نہ ہو۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

''ہوسکتا ہے...... اس کا آغاز ہم کل سے کریں گے......کمپنی میں کل ملا کے ایک سو چالیس ایمپلائز ہیں......چار اور مجھ سمیت پانچ افراد اپنے اپنے شعبوں کے سربراہ ہیں۔ کہنے کو میں چاروں پر نگراں ہوں لیکن انہیں نگرانی کی کوئی ضرورت نہیں...... وہ اپنا کام اور اپنی ذمے داریاں جانتے ہیں، ان میں سے دو اپنے موجودہ کنٹریکٹ کی مدت پوری ہونے کے انتظار میں ہیں......ایک انڈین سے تم مل چکے ہو، وہ واپس جانا چاہتا ہے تاکہ انڈیا میں اپنا بزنس سیٹ کرے، دوسرا مقامی ہے اور اسے اپنے سسر کی طرف سے اچھی آفر ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ ہم انہیں کنٹریکٹ کی شرائط سے آزاد کردیں تو وہ ابھی چلے جائیں گے۔''

''رائٹ...... اور ہمارے شکر گزار بھی ہوں گے۔ تیسرے کے خلاف کچھ شکایات موصول ہوئی تھیں کہ اس نے کک بیکس وصول کی ہیں۔''

نور نے سادگی سے سوال کیا۔ ''یہ کک بیک کیا ہوتا ہے۔''

سوشی نے وضاحت کی۔ ''کسی سودے سے حاصل ہونے والا کمیشن......جس کو قیمت میں شامل کر کے ادائیگی کی جائے۔ یہ پریکٹس ملٹی نیشنل کمپنیوں میں بھی ہے مثلاً جہاز بنانے والے......ایک طرف بوئنگ ہے دوسری طرف ایئربس بنانے والے...... اب کوئی ایئرلائن ایسے فلیٹ کے لیے جہازوں کی خریداری کا آرڈر دیتی ہے تو کہیں نہ کہیں کوئی شخص ڈیل کو اوکے کرتا ہے......یا ماہرین پر مشتمل کمپنی ہوتی ہے جو ایک کو دوسرے پر ترجیح دیتی ہے، اس کام کا معاوضہ انہیں جہاز بنانے والی وہ کمپنی پہلے سے ادا کردیتی ہے جس کے جہاز خریدے جاتے ہیں، ظاہر ہے یہ رقم لاگت کا حصہ بنتی ہے اور عموماً باہر کے کسی خفیہ اکاؤنٹ میں جمع کرادی جاتی ہے، جس شخص کا میں ذکر کر رہی ہوں اس نے پاکستان میں بننے والے ایک فلاحی اسپتال کی آٹھ ایکسرے مشینوں کے تقریباً اسی ہزار پاؤنڈز وصول کیے اور ان کو مطلوبہ اسٹینڈرڈ کا قرار دیا۔ جو پہلی مشین ڈلیور کی گئی وہ معیار کے عین مطابق تھی، اس کے بعد وقفے وقفے سے دو مہینے میں جانے والی سات مشینوں میں بنانے والوں نے ڈنڈی ماردی، جاپانی پرزوں کی جگہ چینی ساخت کے ہلکے اور سستے پرزے لگائے، نہ وہاں کسی نے دیکھا اور نہ یہاں پروا کی......ایک سال کا وارنٹی پیریڈ بھی گزر گیا، اس کے بعد ہلکے پرزوں والی مشینوں میں خرابی آنے لگی۔''

میں نے کہا۔ ''یہ تم پاکستان کے کس اسپتال کی بات کر رہی ہو۔''

''نام تو مجھے اس وقت یاد نہیں، کراچی میں ہے، وہاں کا کوئی علاقہ ہے کورنگی...... یو سی رفیق......لوگ کار خیر کرنے والوں کے ساتھ بھی فراڈ کرتے ہوئے نہیں شرماتے، وہ اسپتال خیراتی ہے اور اسے ایک بہت نیک مذہبی آدمی بنا رہا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''میں سمجھ گیا، میں ان مولانا صاحب کو جانتا ہوں۔''

''ایسے ہی دوسری شکایت بنگلا دیش سے ملی تھی، ہم خود کچھ بھی نہیں کرتے، مختلف ممالک کے مینوفیکچرنگ اداروں

سے رابطہ کرتے ہیں، جہاں سے کوئی پروڈکٹ معیار اور قیمت کے اعتبار سے اچھی ملے منگوا لیتے ہیں، میرا مطلب ہے آرڈر کر دیتے ہیں۔''

''اس شخص کے خلاف بدعنوانی کا کوئی ثبوت ملا؟''

''مشکل یہی ہے کہ کہ ایسی رشوت یا انڈر ہینڈ ڈیل کا دستاویزی ثبوت کوئی نہیں ملتا، نہ کوئی گواہ، یہ وائٹ کالر کرائم کرنے والے محفوظ رہتے ہیں، کک بیک دینے والے خود انہیں تحفظ فراہم کرتے ہیں، یہ شخص اپنے لائف اسٹائل میں غیر معمولی بہتری کے باعث نظر میں آیا، اس کے اخراجات اس کی آمدنی کے مقابلے میں زیادہ بتائے گئے، ہم نے تفتیش کی تو اس نے ادھر ادھر کے بہانے کر دیے کہ مجھے میرے فادر نے پھر فادر ان لا نے سپورٹ کیا، نئی کار میرے بھائی نے گفٹ کی، اور یہ سب ثابت بھی کر دیا لیکن اب اس کے خلاف بیشتر الزام زیر تفتیش ہیں، اسے ہم کسی عذر کے بغیر فارغ کر سکتے ہیں کہ ہمیں اس پر اعتماد نہیں رہا۔ ایک ہفتے کے وقفے سے ہم ٹاپ کے تین افراد کو فارغ کر دیں تو چوتھے کے جانے سے فرق نہیں پڑے گا لیکن سوال یہ ہے رفیق کہ ان کا متبادل تم کہاں سے لاؤ گے؟''

''اس کام میں تم میری مدد کرو گی، ہم دگنی تنخواہ بھی دے سکتے ہیں۔''

سوشی ہنسنے لگی۔ ''اتنے شاہ خرچ ہو گئے تو کمپنی دوالیا ہو جائے گی۔ ٹھیک ہے، ہم بہتر مراعات دیں گے، برائٹ فیوچر کا وعدہ کریں گے اور وہ بہت کچھ جو دوسرے ادارے نہیں دیتے۔''

''تم جانتی ہو ایسے اداروں کو، ایسے لوگوں کو؟''

''ہاں...... اچھے لوگ بھی ہیں، جو ہمارے لیے زیادہ فائدہ مند ثابت ہوں گے اور وہ تمہاری یہ شرط بھی پوری کرتے ہیں کہ برٹش نہ ہوں، میں کوشش کروں گی کہ سب تمہارے ہم وطن ہوں لیکن میری ایک بات تمہیں بری نہ لگے تو کہوں، اچھے لوگ ہر قوم میں ہوتے ہیں اور اپنوں پر حد سے زیادہ بھروسا کرنا نقصان کا باعث بھی ہو سکتا ہے۔''

''تم نے بالکل ٹھیک کہا۔'' میری جگہ نور بولی۔ ''کوئی وجہ نہیں اگر وہ ایشیائی ہوں، انڈین، بنگلا دیش اور سری لنکا کے لوگ بھی گوروں کے مقابلے میں ہمارے بہتر اتحادی ثابت ہوں گے۔''

''دراصل ایشیائی یہاں استحصال کا شکار بھی ہو رہے ہیں۔ گوروں کے مقابلے میں انہیں کمتر سمجھا جاتا ہے، کم معاوضہ ملتا ہے اور ان کی صلاحیت کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔''

میں نے کہا۔ ''سوشی تم سب جانتی ہو، یہ سب ذمے داری میں تم پر چھوڑتا ہوں، کیا نچلے درجے کے ملازمین کے لیے بھی تم یہی کرو گی؟''

''پالیسی ایک ہی رہے گی...... بہت سے لوگوں کے کنٹریکٹ میں یہ بات شامل ہے کہ انہیں کسی بھی وقت فارغ کیا جا سکتا ہے۔ کسی اضافی ذمے داری کے بغیر...... کچھ لوگوں کے کنٹریکٹ میں توسیع نہیں کی جائے گی کہ کسی کو احساس ہی نہ ہو اور سب بدل جائے۔''

میں نے کہا۔ ''یہ ہو سکتا ہے کہ میں کچھ عرصے بعد پاکستان چلا جاؤں، مختصر مدت کے لیے اور آتا جاتا رہوں، نور یہاں ہوگی، تم اسے ہر جگہ اپنے ساتھ رکھو گی۔''

وہ مسکرائی۔ ''پھر اب اسے تم میری جگہ لے آؤ گے۔''

''تمہاری جگہ تو میں کبھی نہیں لے سکتا سوشی...... لیکن ہر نظام کو سنبھالنے والے ایک سے زیادہ لوگ ہوتے ہیں یا نہیں...... کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ کل کو تمہیں اپنا مستقبل سنوارنے کا کوئی اور موقع ملے۔ کیا اس وقت تم اس کمپنی سے رفاقت اور وفاداری کو دیکھو گی یا موقعے سے فائدہ اٹھاؤ گی۔''

''میں موقعے سے فائدہ اٹھاؤں گی، اس میں شک کی کوئی بات ہی نہیں کہ ہم سب اپنا فائدہ دیکھتے ہیں اور اپنے خاندان کا مستقبل بہتر بنانے کے لیے سب کچھ کرتے ہیں، ہم بے فکر ہو جاؤ...... اگر نور تین مہینے میرے ساتھ رہے گی تو سب جان لے گی، اس میں صلاحیت ہے۔''

نور خوش ہو گئی۔ ''میں تمہیں اپنا استاد تسلیم کرتی ہوں مجھے جو سیکھنا ہے تم سے سیکھنا ہے۔''

جب میں نے ارنسٹ مینشن کی فروخت اور لارڈ کے اصطبل کا خریدار تلاش کرنے کی بات کی تو سوشی نے معذرت کر لی۔ ''یہ تمہارے نجی معاملات ہیں، ان کا دفتر سے کوئی تعلق نہیں۔''

''سوشی تم میری سب سے مخلص دوست بھی ہو...... پہلے سے۔''

''تھینک یو، لیکن یہاں پہلے ہی لوگ تمہارے مجھ پر حد سے زیادہ اعتماد کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔''

''ایسے لوگوں کی پروا نہ تمہیں کرنی چاہیے نہ مجھے...... اور سچ بتاؤں سوشی، ایسا میں نے سوچا اکثر تھا لیکن ابھی اپنے ارادے کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا...... اب تم نے ایک بات کی ہے تو میں بتا رہا ہوں کہ مستقبل کے لیے میں کیا عزائم رکھتا ہوں۔ میں لارڈ ارنسٹ کی فرم کا صرف نام ہی بدل کے شیرازی اینڈ کمپنی کرنا نہیں چاہتا، میں چاہتا ہوں کہ یہ ایک ملٹی

نیشنل کمپنی ہو، اس کا تعاون جاپان اور پاکستان سے ہو اور ہمارے درمیان پارٹنر شپ ہو، میں بڑے خواب دیکھتا ہوں اور جب تم جیسے ساتھی مل جاتے ہیں تو ان خوابوں کی تعبیر بھی مل جاتی ہے۔''

مجھے ایسا لگا کہ سوشی رو پڑے گی۔ وہ جاپانی تھی اور اگرچہ اپنے آبا و اجداد کی سرزمین سے اس کا کوئی پیدائشی رشتہ نہیں تھا لیکن وہ دل کی گہرائی سے جاپانی تھی۔ برطانوی شہریت رکھنے کے باوجود وہ برطانیہ سے نفرت کرتی تھی کیونکہ وہ دوسری جنگ عظیم میں امریکا کا اتحادی تھا اور اس امریکا نے ایٹم بم گرا کے اس کو بے وطن کر دیا تھا۔ جاپانی انتہائی وضعدار اور قوم پرست لوگ ہوتے ہیں، سوشی کا نانا امریکن تھا اور باپ اسپینش مگر وہ آج بھی خود کو جاپانی کہتی تھی اور جاپان اس کے خوابوں کی سرزمین تھا جس کے ساتھ اس کی عقیدت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔

''کیا واقعی تم ایسا کرو گے رفیق......'' اس نے بڑی مشکل سے کہا۔

''ایسا ہوگا سوشی...... یقین رکھو۔''

''اچھا، تو پھر آج رات تم نور کے ساتھ میرے گھر آؤ، کھانا میں خود پکاؤں گی، باقی باتیں ہم وہاں کریں گے، وہ باتیں جو دوست کرتے ہیں۔ یہاں ہم دفتر میں ہیں اور کام کے ساتھی ہیں۔''

''ہم ضرور آئیں گے۔'' نور نے کہا۔

جب میں نور کے ساتھ واپس جا رہا تھا تو میں نے سوشی کے شوہر کو دیکھا۔ وہ میلے رنگ کی ڈانگری پہنے آفس کے پرانے ساز و سامان کو باہر نکال رہا تھا۔ اس نے ایک عام ملازم کی طرح مجھے سلام کیا اور پھر اپنے کام میں لگ گیا۔ یہ ایک باوقار محنت کش خود پر اعتماد رکھنے والی قوم تھی جو محنت کی عظمت کی قائل تھی۔

اس رات ہم نے ایک خوش و خرم خاندان کا مثالی گھر بھی دیکھا۔ میں اور نور جب سوشی کے گھر پہنچے تو وہ جیسے دروازے پر ہی ہمارے منتظر تھے، دفتر میں کوٹ پتلون میں نظر آنے والی سوشی کو جاپان کے روایتی لباس کیمونو میں دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ اس خوبصورت رنگین ریشمی لباس کا کسی حد تک ساری سے موازنہ کیا جا سکتا ہے جس کو پہننے' باندھنے اور برتنے کے مختلف انداز خوبصورتی کے ہزاروں رنگ پیدا کرتے ہیں، پھر سلیقے کے ساتھ جسمانی ساخت اور لباس استعمال کرنے کا سلیقہ اور قرینہ اس کی دلکشی میں اضافہ کرتا ہے۔

میاں بیوی نے خالص جاپانی روایات کے مطابق ہمارا استقبال کیا اور ہمیں بڑے عزت و احترام کے ساتھ اندر لے گئے۔ مہمانوں کے کمرے میں سوشی کی ماں ہماری منتظر تھی۔ اس نے بھی رکوع میں جا کے ہمیں خوش آمدید کہا۔ پھر بچے آئے ایک لڑکا بارہ چودہ سال کا تھا، اس سے چھوٹی لڑکی تھی، سوشی نے ان کے نام بتائے اور تعارف کی رسم ادا کی۔ جاپان کے آداب میزبانی کے مطابق ہمیں ہر چیز پیش کی گئی، مشروبات...... پھر مختلف مراحل میں رات کا کھانا، اس کے بعد پھل پھر کافی۔

گھر کی آرائش بھی بالکل جاپانی اسٹائل میں کی گئی تھی، دیواروں پر آویزاں مصوری کے نمونے، مدھم روشنی والی فانوس جیسی آرائشی لائٹس جن پر نقاشی تھی، جاپان کی تہذیب کی عکاسی کرنے والے ڈیکوریشن پیس، بدھ کے مجسمے، میں کبھی جاپان نہیں گیا تھا لیکن میں نے بہت سی فلموں میں جاپان کی تہذیبی عکاسی دیکھی تھی اور ان کی روایتی وضعداری، تہذیب اور اخلاق کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا، یقین نہیں آتا تھا کہ یہ اکیسویں صدی کے لندن کا ایک گھر ہے، میں نے محسوس کیا کہ میں جاپان میں ہوں، مجھے اندازہ ہوا کہ سوشی اور اس کے شوہر کو اپنی روایات سے کتنی محبت ہے۔

مجھے تھوڑا سا دکھ ہوا کہ ہم پاکستانی اپنی روایات اور اپنی ثقافت سے الرجک کیوں ہیں...... اپنی تہذیب لباس اور مجلس آداب، خاندانی اقدار اور معاشرتی رواجوں سے محبت تو الگ بات' ہم تو ان سے بہت دور بھاگتے ہیں اور خود کو مغربی تہذیب میں ڈھال کر اس پر فخر کرتے ہیں۔ گفتگو کے دوران میں نے وہ بات بھی چھیڑ دی جس کے لیے میں نے یہ دعوت قبول کی تھی، سوشی نے دفتر میں گھر کی بات کرنے سے انکار کر دیا تھا، میں سوشی کا گھر بھی دیکھنا چاہتا تھا، اس گھر کے طور طریقے اور سوشی کا رہن سہن دیکھ کر میرے دل میں اس کی عزت اور بڑھ گئی۔

پہلا مسئلہ نور نے ڈسکس کیا۔ یہ ارنسٹ مینشن چھوڑ کے کسی اپارٹمنٹ میں رہائش اختیار کرنے کا تھا۔ ''ہم اس محل میں نہیں رہ سکتے۔ اس کی دیکھ بھال کے لیے ملازموں کی پوری فوج چاہیے۔ خرچ اپنی جگہ، ان ملازموں پر نظر رکھنا اور ان سے کام لینا ایک بلاوجہ کا دردسر ہے۔''

''تم ٹھیک کہتی ہو، اب یہ گھر ہے...... اس کو ہم سب مل کر سجاتے سنوارتے ہیں اور صاف ستھرا رکھتے ہیں، یہ ہمارا شوق ہے، دردسر نہیں۔ بلاوجہ کی شان و شوکت کا مظاہرہ مسائل پیدا کرتا ہے، یہاں ہم بہت سکون سے ہیں۔''

''میں سو فیصد تم سے متفق ہوں، اب یہ بتاؤ اپنے

چیئر مین صاحب کو کہ اس محل سے نکلیں۔"

میں نے کہا۔ "نور...... یہاں میں صرف رفیق ہوں، سوشی کا ایک عام مہمان اور پھر میں نے کب تم سے اختلاف کیا ہے۔"

نور نے فوراً معذرت کر لی۔ "آئی ایم سوری، میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا، میں سوشی سے کہنا چاہتی تھی کہ ہمیں اس محل سے جان چھڑا کر کسی پرسکون اپارٹمنٹ میں شفٹ ہونے میں مدد کرے۔"

سوشی نے کہا۔ "یہ کیا مشکل ہے، میرا اپنا خیال ہے کہ یہاں بہت سے ایسے لارڈ اور خطاب یافتہ لوگ ہوں گے جو اپنی شان بڑھانے کے لیے ارنسٹ مینشن خریدنا چاہیں گے۔ وہ تمہیں منہ مانگی قیمت دیں گے، ان کے مقابلے پر آئیں گے نودولتیے جو خاندانی امرا اور شرفا میں شامل ہونے کے لیے ان کا طرز زندگی اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ پرانی حویلیاں اور محلات ملتے کہاں ہیں، وہ الگ تیار کریں گے، خاندانی امرا کے مقابلے میں وہ دگنی تگنی قیمت دے کر یہ جگہ حاصل کرنا چاہیں گے تاکہ ان کے لائف اسٹائل کو خاندانی رئیس ہونے کی سند حاصل ہو جائے۔"

میں نے کہا۔ "یہ تو بڑی کاروباری بات بتائی تم نے۔"

نور نے کہا۔ "ہاں...... ہم کوئی قیمت مانگنے کے بجائے اوپن بڈ مانگ لیں، خریدار سے پوچھیں کہ آپ بتائیں آپ کیا دے سکتے ہیں۔"

سوشی ہنسنے لگی "تمہاری فرینڈ میں کاروباری ذہانت ہے۔ زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کرنے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ تم کسی کو ڈائریکٹ ایڈریس نہ دو۔ جو دلچسپی رکھتے ہوں وہ ملاقات کریں۔ اندازہ ہو کہ وہ کس حد تک سیریس ہیں اور کتنی مالی سکت رکھتے ہیں۔"

"تمہارے خیال میں ارنسٹ مینشن کی زیادہ سے زیادہ قیمت کیا ملے گی؟"

جواب سوشی کے شوہر نے دیا "میرا خیال ہے...... دس ملین!"

سوشی نے اس سے اتفاق کیا۔ "میرا اندازہ آٹھ کا تھا لیکن دس ہو سکتے ہیں۔ خریدار کے شوق کو ہوا دی جائے اور اس میں حاسدانہ مقابلے کے جذبات ابھارے جائیں۔"

نور نے پوچھا۔ "یہ کیسے ہوگا؟"

سوشی نے کہا۔ "کم قیمت لگانے والے کو تو سیدھا باہر کا راستہ دکھا دیا جائے۔ مثلاً پانچ سے کم یا پانچ چھ لگانے والوں کو مہذب طریقے سے بتا دیا جائے کہ یہ محل آپ نہیں خرید سکتے۔ کوئی اور چھوٹا موٹا مکان دیکھ لیں۔ سات آٹھ لگانے والوں سے کہا جائے کہ دیکھیے آپ خاندانی آدمی ہیں لیکن بدقسمتی سے ایک نودولتیا کاروباری جس نے کالے دھندوں سے سب دولت اکٹھی کی ہے ہمارے پیچھے پڑ گیا ہے اور دس لگا کے گیا ہے مگر سچی بات یہ ہے کہ ہم خود نہیں چاہتے کہ اچھے خاندانی محل میں اس قماش کے لوگ آئیں۔ دولت ہی تو سب کچھ نہیں ہوتی لیکن دوسری طرف ہم مالی نقصان کو کیسے نہ دیکھیں۔"

"اچھا۔ تم نے کہا کہ ایک طریقہ یہ ہے۔ دوسرا کیا ہے؟"

"دوسرا قدرے محفوظ اور تمہارے لیے آسان ہے۔ تم کسی سودے بازی کے جھنجٹ میں نہ پڑو میں تمہیں ایک بروکر کا ایڈریس بتاتی ہوں۔ وہ نوادرات، مصوری کے شہکار، خاندانی محلات اور زیورات، ریس کے گھوڑے اور بین الاقوامی قسم کی پراپرٹی کے سودے کراتا ہے۔ اس کا رابطہ سب سے ہے۔ منشیات کی دنیا کے بادشاہوں سے انڈرورلڈ کے کنگ اور شیوخ...... سب اس کے خریدار ہیں۔"

"میرا خیال ہے وہی سب سے بہتر ہے۔ مجھے اپنا اصطبل بھی تو فروخت کرنا ہے حالانکہ ابھی تک نہ میں نے گھوڑے دیکھے ہیں نہ مجھے ان کے بارے میں کوئی معلومات ہیں۔ میں ایک ہارس پاور کے تانگے میں ضرور بیٹھا ہوں پہلے لوگ شادی کے لیے بھی زندگی میں کم سے کم ایک بار سہرا باندھ کے گھوڑے پر سوار ہو جاتے تھے۔"

سوشی بھی نور کے ساتھ ہنسنے لگی۔ "تم واقعی خاندانی رئیس نہیں ہو۔"

نور نے آہستہ سے کہا۔ "یہ صرف خاندانی عاشق ہیں۔"

"کیوں مجھے خوامخواہ بدنام کرتی ہو۔ ابا نے صرف ایک عورت کے ساتھ عمر گزار دی اور اسی کے ساتھ دوسری دنیا میں بھی خوش ہوں گے۔"

سوشی نے کہا۔ "یہ بروکر تمہیں دس کیا بارہ پندرہ بھی دلا سکتا ہے۔"

"کاروباری آدمی تو یہی سوچتا ہے اور ایسا ہی کرتا ہے لیکن یہاں کے انگریزوں میں قدامت پرستی کا مرض ہے۔ ملکہ کو پوجتے ہیں خاندانی حسب نسب کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ ایٹی کیٹس پر جان دیتے ہیں۔ حد سے زیادہ روایت پرست ہیں۔ تمہاری جگہ لارڈ ارنسٹ ہوتا تو کسی عام آدمی کو ہرگز بھی محل نہ دیتا خواہ وہ کتنا ہی دولت مند کیوں نہ ہو۔"

"میرے لیے صرف اچھی قیمت کی اہمیت ہے۔"

"پھر تم اس بروکر کے سپرد کر دو سب کچھ اور خود بے فکر

ہو کے آرام سے بیٹھ جاؤ۔ ہاں وہ بروکر اپنا کمیشن تگڑا لے گا۔"

"وہ اس کا حق ہے۔ محنت اسی کی ہوگی...... اور مجھے قیمت زیادہ ملے گی میں اپنا اصطبل بھی اسی کے حوالے کر دوں گا۔"

"جو ابھی تک تم نے دیکھا بھی نہیں ہے؟"

"صبح ہم پہلا کام یہ کریں گے کسی اور کی ملکیت میں جانے سے پہلے گھوڑے ہمیں ایک نظر دیکھ تو لیں کہ ایسے بدذوق بھی کچھ عرصہ ہمارے مالک رہے تھے۔"

نصف شب کے بعد ہم نے اجازت طلب کی تو انہوں نے ہمیں پھولوں کے گلدستے پیش کیے اور ہمیں چھوڑنے باہر تک آئے۔ پھر جب تک گاڑی روانہ نہیں ہوگئی وہ سب ہاتھ باندھے کھڑے رہے۔

وہ لندن کے مضافات کا ایک خوبصورت رہائشی علاقہ تھا جہاں سڑکوں پر نہ ٹریفک کا رش اور شور تھا اور نہ بازاروں کی چہل پہل، چھوٹی بڑی تمام سڑکیں سنسان تھیں۔ گھروں کے گیٹ بند تھے لیکن روشنی کھڑکیوں کے پیچھے دکھائی دیتی تھی۔ میں بہت خوش اور مطمئن تھا۔ بہت عرصے بعد میں نے ایک انتہائی پرمسرت شام گزاری تھی جس میں اپنایت کے احساس سے ملنے والی ساری آسودگی تھی۔

نور مجھ سے زیادہ خوش تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر کے میرے کندھے پر سر رکھا۔ "مجھے معلوم ہے یہ ہو نہیں سکتا لیکن جان! کتنا اچھا ہوتا اگر ہم اپنی زندگی یہاں اسی طرح گزار سکتے۔"

میں جواب دینا چاہتا تھا کہ شاید ایسا ہی فریال سوچتی تھی لیکن اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔ مگر میں نے کچھ نہیں کہا۔ آخر خواب دیکھنے میں حرج ہی کیا ہے؟ پھر اچانک میرے پیچھے سے ایک گاڑی نے اوورٹیک کیا۔ وہ اندھیرے میں آئی تھی۔ اس کی ہیڈ لائٹس روشن ہوتیں تو میں بیک ویو مرر میں ضرور دیکھتا۔ اس پرانی لمبی سی کار نے سامنے آ کے مجھے سائڈ دی اور اپنی پوری کوشش کے باوجود میں تصادم سے بچا نہ سکا۔ میری اونچی بمپر و نے اس لمبی نیچی ڈکی والی گاڑی کو پیچھے سے ہٹ کیا۔

جس طرح وہ گاڑی میرے سامنے آئی تھی اس سے مجھے یہ اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ ایسا اتفاقیہ نہیں ہوا۔ گاڑی جانتے بوجھتے ٹکرائی گئی ہے اور میرا خیال غلط نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ میں بریک لگا کے گاڑی سے اترتا اگلی گاڑی بالکل سامنے ٹھہر گئی اور بیک وقت اس کے چاروں دروازے کھول کے چار گورے باہر نکلے۔ وہ سب نیکروں اور بغیر آستین کی رنگین ٹی شرٹس میں ملبوس تھے۔ غنڈا گردی کی سب سے بڑی علامت ان کے منڈھے ہوئے سر تھے۔ ان کو عرف عام میں "اسکن ہیڈز" کہا جاتا تھا اور یہ پہلے تمام رنگدار ایشیائی باشندوں کے دشمن تھے لیکن کچھ عرصے سے ان کی جارحیت کا نشانہ صرف پاکستانی ہو گئے تھے جن کو وہ بڑی حقارت سے گالی کے انداز میں پاکی کہتے تھے۔

نور ایک دم سہم کے مجھ سے چمٹ گئی۔ میں نے اسے ایک جھٹکے سے الگ کیا۔ "نور! دوسری طرف سے اتر کے بھاگ جاؤ واپس سوشی کے گھر۔ ابھی ہم زیادہ دور نہیں آئے ہیں۔"

دو نوجوانوں کے ہاتھ میں بیس بال کے بیٹ تھے۔ دو نے ہاکی اٹھا رکھی تھی پھر پانچواں ڈرائیونگ سیٹ سے کرکٹ کا بیٹ اٹھائے نکلا۔ کوئی سوال کیے بغیر انہوں نے میری گاڑی پر وار کرنے شروع کیے۔ ایک چھناکے سے ہیڈ لائٹس کا چورا ہو گیا اور اندھیرا پھیل گیا۔ بیس بال کے بیٹ والوں نے ونڈ اسکرین کو نشانہ بنایا۔

میں نے چلا کے کہا۔ "واٹ از دس۔ یہ سب کیوں کر رہے ہو تم؟"

ان میں سے ایک نے زمین پر تھوکا۔ "کیونکہ تم اس کے مستحق ہو پاکی ڈاگ۔"

دوسرے نے کہا۔ "پہلے تم نے ہماری گاڑی کا نقصان کیا ہے۔"

میں نے دیکھ لیا تھا کہ نور میری بات مانتے ہوئے دوسری طرف سے کود گئی تھی اور گلی میں واپس دوڑتی جا رہی تھی۔ ابھی تک اسکن ہیڈز میری گاڑی توڑ رہے تھے اور ان کا مجھ سے الجھنے کا ارادہ نہیں تھا۔ غالباً وہ چاہتے تھے کہ میں بھی خوف زدہ ہو کے بھاگ جاؤں۔ چند منٹ میں وہ گاڑی کو تباہ کر کے خود بھی فرار ہو جاتے۔ میں نے محسوس کیا کہ میں یوں تماشائی بن کے کھڑا رہا تو اس کا مطلب وہ بزدلی نکالیں گے۔

میں جوابی کارروائی سے اس لیے گریز کر رہا تھا کہ مالی نقصان میرے لیے غیر اہم تھا۔ انشورنس کمپنی سب کی تلافی کر دیتی۔ لیکن میری وقتی لاتعلقی سے ان کا حوصلہ بڑھ گیا۔ انہوں نے گاڑی کو چھوڑ کے میری طرف رخ کیا۔ اتفاق ہے کہ چند منٹ کے اس تباہ کن وقفے میں نہ پولیس آئی نہ کوئی اور گاڑی گزری۔ اب میں بھی اپنے اشتعال پر قابو نہ رکھ سکا اور میں نے پوزیشن سنبھال لی۔

ایک گنجے نے گالی دے کر کہا۔ "لیو دس کنٹری۔ یو بلیک ڈاگ۔ ورنہ تمہارا حشر اس گاڑی سے برا ہوگا۔"

"ہم تمہیں تابوت میں ڈال کے بھیج دیں گے۔"

"مگر سالم نہیں۔"

ان میں سے زیادہ جسامت کا مالک اب میرے قریب آ گیا تھا۔ ان کو یہ اندازہ ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ اب تک ضبط کا مظاہرہ کرنے والا کوئی بلیک بیلٹ ہو سکتا ہے' میں ایک دم ایڑی پر گھوم گیا اور اپنی دوسری ٹانگ کو پورا اوپر اٹھالیا۔ یہ ٹانگ کسی بجلی سے چلنے والی راڈ کی طرح اس کے پیٹ پر لگی تو بیس بال کا بیٹ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس نے حلق سے "ہا" قسم کی آواز نکالی۔ پھر اس کا منہ کھلا رہ گیا کیونکہ اس کا سانس بھی رک گیا تھا۔ وہ الٹ کے پیچھے گر گیا۔

اتنی دیر میں دوسرا میری دسترس میں آ گیا تھا۔ اس نے ہاکی گھمائی تو میں غوطہ مار گیا اور سیدھا بیل کی طرح اس کے پیٹ میں گھس گیا۔ میں اسے بلڈوزر کی طرح ساتھ لیتا ہوا اپنی گاڑی تک گیا اور جب اس کا جسم گاڑی کے فولادی ڈھانچے سے لگا تو میں نے وقفہ دیے بغیر اسے اٹھا کے سڑک پر دے مارا۔

باقی دو نے میری جوابی کارروائی سے اندازہ کر لیا تھا کہ آگے کیا ہوگا۔ وہ پلٹ کے اپنی گاڑی کی طرف بھاگے۔ انہوں نے زمین پر گرے ہوئے سورماؤں کو بھی کھینچ کے اٹھایا۔ میں نے خود انہیں بھاگنے دیا حالانکہ میرے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا کہ باقی دو کو بھی توڑ پھوڑ دیتا لیکن مجھے معلوم تھا کہ اب پولیس کو آنے میں دیر نہیں لگے گی۔

میرا اندازہ تھا کہ نور اب تک سوشی کے گھر سے پولیس کو فون کر چکی ہوگی اور واپس آ رہی ہوگی۔ وہ پانچوں اپنی دیوہیکل ٹوٹی پھوٹی کھٹارا گاڑی کو اسٹارٹ کر کے فرار ہو گئے۔ یہ میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا کہ اس کے پیچھے کوئی نمبر نہیں ہے۔

نہ جانے کہاں جانے والا ایک بوڑھا جوڑا اپنی پرانی موریس کار میں نمودار ہوا اور میرے قریب پہنچ کر انہوں نے گاڑی روک لی۔ بوڑھا پہلے اترا اور میری شاندار گاڑی کو ایسے دکھی انداز سے دیکھتا رہا جیسے کوئی رومان پسند تاج محل کی جگہ اس کا دھماکے سے تباہ ہونے والا کھنڈر دیکھے۔

"یہ سب کیسے ہوا؟ کس نے کیا...... اور کیوں؟"

میں نے کہا۔ "آپ کے تینوں سوالوں کا ایک ہی جواب ہے سر' میں نہیں جانتا۔"

دوسری طرف سے بڑی بی سینے پر صلیب بناتی اتریں۔

"آخر کون تھے وہ بدمعاش' تمہارے دشمن!"

میں نے کہا "محترم خاتون! وہ آپ کے ہم قوم تھے۔ آپ کی قابل فخر گوری نسل کے سپوت جو ہم کالی چمڑی والوں سے فی سبیل اللہ بغض رکھتے ہیں۔ آپ کے جمہوریت پسند اور قانون پرست ملک کا نام روشن کرنے والے اسکن ہیڈز۔"

"ابھی پولیس آ جائے گی۔"

میں نے کہا "یس۔ بہتر ہے کہ آپ لوگ اس سے پہلے چلے جائیں ورنہ خواہ مخواہ گواہی میں نام آئے گا۔ مجھے معلوم ہے پولیس کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ کوئی پکڑا نہیں جائے گا۔ میرا نقصان انشورنس کمپنی پورا کر دے گی' تھینک یو ویری مچ۔"

وہ سر ہلا کے گاڑی میں بیٹھے اور چلے گئے کیونکہ دور سے میں نے بھی پولیس کے سائرن سن لیے تھے۔ پولیس کے ساتھ ساتھ ہی سوشی اور اس کا شوہر اپنی گاڑی میں پہنچے۔ نور اتنی بدحواس تھی کہ گاڑی رکنے سے پہلے ہی اترنے کی کوشش میں توازن برقرار نہ رکھ سکی اور گر پڑی۔ پھر اٹھ کر دوڑی اور روتی ہوئی مجھ سے چمٹ گئی۔ "تم...... تم ٹھیک تو ہو۔" اس نے اوپر سے نیچے تک مجھے یوں ٹٹولنا شروع کیا جیسے میں ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کے ساتھ کھڑا ہوں۔

"نور۔ ہولڈ یور سیلف' میں ٹھیک ہوں۔"

سوشی نے کہا۔ "تھینک گاڈ' تم ٹھیک ہو' نور میرے پاس آئی تو اس کی حالت دیکھ کے میں پریشان ہو گئی تھی۔"

پولیس سارجنٹ نے اس جذباتی مظاہرے کو انسانی ضرورت سمجھتے ہوئے قانونی کارروائی کو چند منٹ کے لیے روکے رکھا تھا۔ اب اس نے خالص پیشہ ورانہ لہجے میں کہا۔ "کیا اب آپ ہمیں اس واردات کے بارے میں بتائیں گے؟"

وہ ایک گاڑی میں آنے والے چار پروفیشنل افراد کی ٹیم تھی۔ ان میں سے ایک مختلف زاویوں سے کھٹا کھٹ تصویریں بنا رہا تھا۔ دوسرا غالباً گاڑی کے ڈھانچے پر فنگر پرنٹس تلاش کر رہا تھا۔ تیسرا گاڑی میں بیٹھا وائرلیس پر رابطے میں تھا۔ چوتھا وہ تھا جو اس ٹیم کا سربراہ تھا اور ایک نوٹ بک میں میرا بیان ریکارڈ کرنے کے لیے تیار کھڑا تھا۔

"جو ہوا آپ کے سامنے ہے۔ یہ اندازہ بھی آپ نے کر لیا ہوگا کہ کیسے ہوا؟ رہا یہ سوال کہ کس نے کیا تو وہ پانچ تھے۔ ایک لمبی سی پرانی گرے کلر کی فورڈ سیڈان میں۔ سب نوجوان' اسکن ہیڈز۔ دو کے پاس بیس بال کے بیٹ تھے' دو کے پاس ہاکیاں' ایک کرکٹر تھا۔ آپ کے قومی کھلاڑیوں پر مشتمل ٹیم تھی۔"

پولیس افسر کے چہرے پر مسکراہٹ تک نہیں آئی "اور یہ سب انہوں نے کیوں کیا؟"

"ویری گڈ کوئسچن' بات یہ ہے کہ میں ایک پاکستانی ہوں۔ ان حملہ آوروں کی زبان میں بلیک پاکی ڈاگ۔ یہ

سب یہاں ہوتا رہتا ہے ہم جیسوں کے ساتھ۔"

"یعنی آپ کی کوئی ذاتی دشمنی کسی کے ساتھ نہیں تھی۔"

میں کہنا چاہتا تھا کہ ویسے تو میں بھی دو طرح سے ہر انگریز کا دشمن ہوں۔ ایک رنگ کے فرق کی وجہ سے اور دوسرا صدیوں پرانی سیاسی وجہ سے' جب وہ آقا تھے اور ہم غلام لیکن مصلحت کے تحت میں نے صرف نفی میں سر ہلا دیا تھا کہ وہ ٹل جائیں اور بات ختم ہو جائے مگر وہ اتنی آسانی سے جان چھوڑنے والے کہاں تھے؟

"انہوں نے آپ کو اغوا کرنے کی کوشش نہیں کی یا اس لیڈی کو؟" اس نے نور کی طرف اشارہ کیا۔

میرے انکار پر اس نے دوسرا سوال داغ دیا۔ "انہوں نے آپ کو لوٹا بھی نہیں۔ عموماً یہ لوگ پرس' گھڑی وغیرہ چھین لیتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "یا تو انہیں پیسے کی ضرورت نہیں تھی' یا وہ محض شریف اسکن ہیڈز تھے۔ وہ چور ڈاکو کا خطاب پسند نہیں کرتے ہوں گے۔ میں نے سنا ہے' یہ عموماً کھاتے پیتے گھروں کے چشم و چراغ ہوتے ہیں؟"

"آپ انہیں پھر دیکھیں گے تو پہچان لیں گے؟"

میں نے نفی میں سر ہلا دیا "ایک تو اندھیرا ہے۔ دوسرے میں جان بچانے کے لیے بھاگ کے دور کھڑا ہو گیا تھا۔"

"آپ نے مدد کے لیے اس خاتون کو دوڑایا۔ خود یہاں کھڑے گاڑی کو تباہ ہوتے دیکھتے رہے؟"

"کیا میں نے کچھ غلط کیا؟"

"آپ کی جگہ کوئی اور ہوتا تو مقابلہ کرتا' کسی کو پکڑتا۔"

میں نے کہا۔ "میں برطانیہ میں قیام کے باقی دن کسی ہڈیوں کے وارڈ میں لیٹ کر گزارنا نہیں چاہتا تھا۔ اب ایک سوال میں کروں؟"

"یس!"

"کیا ساری تفتیش اسی جگہ کھڑے کھڑے ہوگی؟ ساری رات جاری رہے گی؟ میں نے تمہیں بتا دیا کہ میں کون ہوں اور کہاں رہتا ہوں' کیا کرتا ہوں۔ تم دیکھ سکتے ہو کہ یہ خاتون شاک کی پوزیشن میں ہے اور میں بھی۔ یہ کس قسم کا رویہ ہے؟" میں ایک دم پھٹ پڑا۔

پولیس افسر نے فوراً معافی مانگ لی۔ "آئی ایم سوری سر! آپ یہ گاڑی چھوڑ جائیں' اسے ہم آپ کی ہدایات کے مطابق جہاں آپ کہیں گے پہنچا دیں گے' خود آپ......"

"ان کو میں پہنچا دوں گی آفیسر!" سوشی نے کہا۔

"کل ہم آپ کو زحمت دیں گے۔ آپ کا بیان ہوگا اور ہم آپ کو کچھ تصاویر دکھائیں گے۔"

"میں کسی کے خلاف کوئی قانونی کارروائی کرنا نہیں چاہتا۔"

"اس کے بغیر انشورنس کمپنی بھی آپ کے نقصانات پورے نہیں کرے گی سر!"

"نہ کرے' میں یہ نقصان برداشت کر سکتا ہوں۔" میں نے برہمی سے کہا۔

"لیکن ایسے عناصر کے خلاف کوئی کارروائی نہ کرنا ان کی حوصلہ افزائی کے مترادف ہوگا۔ آپ کو قانون سے تعاون کرنا چاہیے۔"

"آپ پہلے گارنٹی دیں کہ مجرم پکڑے جائیں گے اور مجھے آیندہ کے لیے تحفظ حاصل ہوگا۔ ورنہ میں اپنا اور تمہارا وقت کیوں برباد کروں؟ کیوں بلاوجہ ان کی دشمنی بڑھاؤں۔ تھینک یو آفیسر! میں تو کچھ دن بعد واپس پاکستان چلا جاؤں گا۔ تمہیں کچھ کرنا ہے تو دوسرے پاکستانیوں کو تحفظ دو' اسکن ہیڈز کو ختم کرو۔" میں اب واقعی غصے میں تھا۔

سوشی ہمیں گھر پہنچانے کے بعد بھی دو گھنٹے ٹھہری۔ اس نے فون کر کے اپنے فیملی ڈاکٹر کو وہاں بلایا۔ مجھے نہ کوئی چوٹ آئی تھی نہ زخم لگا تھا۔ اس نے مجھے اور نور کو سکون آور گولیاں دیں اور چلا گیا۔ سوشی زیادہ پریشان تھی کیونکہ ارنسٹ مینشن میں اب کوئی سیکیورٹی نہیں تھی اور نہ باہر میں اور نور اپنے ساتھ باڈی گارڈز رکھتے تھے۔ پریشانی سے زیادہ اسے پشیمانی تھی کہ یہ سب اس کے گھر سے واپس جاتے ہوئے ہوا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے واپس بھیجا۔

صبح میں دیر تک سوتا رہا۔ یہ خواب آور گولیوں کا اثر تھا۔ نور غائب تھی۔ تلاش کرنے پر وہ مجھے کچن میں ملی۔ "کل رات گھوڑے بیچنے کی بات کر رہے تھے' سب بیچ کے سوتے رہے۔"

"اور آپ کیا کر رہی ہیں کچن میں صبح صبح؟"

"صبح صبح...... ذرا گھڑی دیکھو' میں نے ناشتا بنا لیا ہے۔ دس منٹ میں مکھڑا دھلوا اشنان کر لو' جو کرنا ہے کر لو۔"

"ناشتا اس کے بغیر بھی ہو سکتا ہے۔ مگر وہ کہاں ہیں کرسٹوفر اور کرسٹین۔ کیا ان کی بھی چھٹی کر دی' ناشتا تم کیوں بنا رہی ہو؟"

"یار' ایک تو نیند نہیں آ رہی تھی مجھے' پتا نہیں یہاں بھی جعلی گولیاں ہوتی ہیں یا مجھے ایک گولی کافی نہیں تھی۔ میں نے سوچا کچھ کروں...... ادھر آ گئی ناشتا بنانے۔"

ہم ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ پولیس پھر آ گئی۔ انہوں نے میری ہدایات کے مطابق گاڑی کو گیراج میں

مرمت کے لیے بھیجا اور مجھے ایک البم دیکھنے پر مجبور کیا جس میں کچھ نامی گرامی اسکن ہیڈز کی تصویریں تھیں۔ وہ سب ایک جیسے لگ رہے تھے۔ میں نے اور نور نے کہہ دیا کہ ان میں سے کوئی نہیں تھا اور سوچتا رہا کہ رات کو میرے ہاتھوں پٹنے والوں کا حال کیا ہوگا۔ انہوں نے اپنے زخموں اور چوٹوں کی خود ہی لیپا پوتی کر لی ہوگی۔ کسی ڈاکٹر سے رجوع کرتے یا اسپتال جاتے تو پہلا سوال یہی ہوتا کہ آخر ہوا کیا تھا؟

میں نے پولیس کو تاکید کر دی کہ اس کیس میں مزید تفتیش کا فرض وہ ضرور پورا کریں لیکن آئندہ براہ راست مجھ سے رجوع کرنے کے بجائے میرے قانونی مشیر ملک ارشد سے بات کریں۔ وہ ضروری سمجھے گا تو مجھ سے بات کر لے گا ورنہ میری طرف سے کوئی مطالبہ نہیں کہ مجرمان کو گرفتار کر کے قرار واقعی سزا دلوائی جائے۔

اس معاملے کے دوسرے پہلو پر میں نے نور کے ساتھ اپنے فارم ہاؤس جاتے وقت غور کیا۔ دو گاڑیاں جو ظاہری و باطنی اعتبار سے گیراج میں داخل شکستہ و زخم خوردہ گاڑی سے کسی طرح کم نہ تھیں اب بھی میرے پاس تھیں۔ پہلی گاڑی کے بارے میں گیراج کے ماہرین ابھی یہ اندازہ لگانے میں مصروف تھے کہ اس کے علاج معالجے پر کتنا خرچ ہوگا کہ یہ پھر پہلے جیسی ہو جائے۔

گاڑی باہر نکالتے ہوئے میں نے احتیاط سے آگے پیچھے دیکھا اور پھر سارا راستہ دیکھتا گیا کہ گزشتہ رات جو مار دھاڑ سے بھرپور سین پیش ہوا تھا' اس کے دوبارہ فلمائے جانے کے امکانات پائے جاتے ہیں یا نہیں۔ نور نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہارے شکایت درج نہ کرانے اور مجرمان کے خلاف قانونی کارروائی نہ کرنے کا ایک منفی اثر یہ ہو سکتا ہے کہ مجرم واقعی شیر ہو جائیں کہ یہ بندہ خود کو بڑا تیس مار خان سمجھتا ہے۔ یہ تو سارے معاملے کو پی گیا۔ بولا ہی کچھ نہیں۔ چلو دوسری دفعہ اسے کوئی رعایت دیے بغیر ایسا سبق پڑھاتے ہیں کہ یاد رکھے۔

ایسا اپنی پاکستانی فلموں میں ہوتا تھا بلکہ ہوتا ہے۔ اکیلا ہیرو دس بیس کو لٹا دیتا ہے۔ آخر میں دس پندرہ منٹ کی جنگ عظیم کے بعد فاتح ہمارا ہیرو ہوتا ہے اور مخالفین کے لشکر جرار کو ایسی شکست فاش ہوتی ہے کہ تماشائی تالیاں پیٹتے ہیں' سیٹیاں بجاتے ہیں اور ہیروئن جو ایک طرف ریشمی لاچا اور تنگ ترین کرتی پہن کے ریفری کی طرح کھڑی تماشا دیکھ رہی ہوتی ہے' فوراً سب کچھ بھول کے ہیرو کے ساتھ کوئی تباہ کن رقص اور گانا شروع کر دیتی ہے۔

مجھے ذرا بھی خوش فہمی نہیں تھی کہ میں سلطان راہی مرحوم ہوں یا ناقابل شکست ہوں۔ گزشتہ رات والے اسکن ہیڈ عام نوجوان بلکہ لڑکے تھے جو پٹنے سے پہلے ہی فرار ہو گئے۔ اور میں نے بھی معاملے کو بڑھایا نہیں ورنہ پانچوں کو اسپتال اور پھر تھانے پہنچاتا۔ ان سے دوبارہ ٹکرا ہونے کا احتمال کم تھا لیکن اس واقعے نے میرے اندیشے درست ثابت کر دیے تھے۔ مخالفین اب کھل کر سامنے آ رہے تھے۔ یہ ہو سکتا تھا کہ وہ عام شہدے ہوں جو ایشین کمیونٹی کو اسی طرح نسلی تعصب کی بنا پر پریشان کرتے رہتے ہیں لیکن اس امکان کو مسترد نہیں کیا جا سکتا تھا کہ انہیں میرے مخالفین نے ہائر کیا ہو۔

آج میں ریوالور لے کر نکلا تھا۔ کسی باڈی گارڈ کی ضرورت میں اس لیے محسوس نہیں کرتا تھا کہ میرا بھروسا خود پر تھا یا اپنے خدا پر۔ زندگی نے مجھے یہی دکھایا اور سکھایا تھا کہ دنیا میں سب سے زیادہ سیکیورٹی میں رہنے والے امریکن صدر جان ایف کینیڈی کو مارنے والوں نے دن دہاڑے' بھرے بازار میں ایک جلوس میں کار کے اندر گولی مار دی۔ صرف ایک گولی چلائی گئی مگر اس پر کینیڈی کا نام لکھا ہوا تھا تو وہ کسی اور کو کیسے لگ سکتی تھی۔ پھر میں نے اپنے ملک کے سربراہوں کی سیکیورٹی دیکھی تھی کہ کتنی آسانی سے انہیں نشانہ بنایا تھا۔

احتیاط البتہ ضروری تھی۔ میں یہ سمجھنے پر مجبور تھا کہ مخالفین باز نہیں آئیں گے اور عناد و عداوت کا سلسلہ مزید چلے گا۔ تاہم میں نہ تصادم چاہتا تھا اور نہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لینا ضروری سمجھتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ مخالفین جو وقتی طور پر برہم ہیں اور لارڈ ارنسٹ کے کاروبار سے محل تک سب پر میرے قبضے کو ایلیشا کی حق تلفی اور میرے ذہن کی مجرمانہ سازش کا نتیجہ سمجھتے ہیں' رفتہ رفتہ سب بھول جائیں گے۔ بالکل اسی طرح جیسے ایرانی عوام شاہِ ایران کو بھول گئے۔ میرے کیس میں تبدیلی بہت چھوٹی اور معمولی تھی، تاہم حاکمیت کی تبدیلی کے اصولوں پر عمل کرتے ہوئے میں نے پرانے وفاداروں کی جگہ اپنے اعتماد کے لوگ لانے کا فیصلہ پہلے ہی کر لیا تھا۔

نور بھی اب نارمل تھی۔ میں نے اسے سمجھا دیا تھا کہ یہ سب وقتی باتیں ہیں اور مخالف بھی کب تک مخالفت کریں گے۔ اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔

تقریباً پچاس میل کا راستہ بہت خوبصورت تھا۔ ہم نے نصف راستے کے بعد ایک کاٹیج ٹائپ کافی ہاؤس کے باغ میں بیٹھ کے کافی پی۔ اس کیفے سر راہ کو دو معمر اور زندہ دل میاں بیوی چلاتے تھے۔

وہاں مجھے پہلی دھمکی والی کال موصول ہوئی۔ میرے موبائل فون نے رنگ دی تو میں نے ایک اجنبی نمبر دیکھا اور اس خیال سے کال لے لی کہ کہیں بات گزشتہ رات کے واقعے کی نہ ہو۔ بات وہی تھی لیکن بات کرنے والے وہ نہیں تھے جن سے بات کر کے مجھے ہمدردی یا مدد ملتی۔ وہ نہ پولیس تھی اور نہ میرے خیر خواہوں میں سے کوئی۔

میری ہیلو کے جواب میں کسی نے کہا۔ ''تم وہی انڈین نواب ہو نا جو اب برطانیہ پر حکومت کا خواب دیکھتا ہے؟''

''فرض کرو میں وہی ہوں؟'' میں محتاط ہو گیا۔

''کل رات تمہیں ایک مشورہ دیا گیا تھا' لگتا ہے تم نے مان لیا۔''

''مجھے میرے دوستوں نے کل ایک سو ایک مشورے دیے تھے' تم ان میں شامل ہو تو اپنا نام بتا دو۔''

''دیکھو' ہم تمہیں دو ہفتے کی مہلت دے رہے ہیں۔ تم نے عقلمندی سے کام لیا اور بات پھیلائی نہیں۔''

''یہ مہلت مجھے کس سلسلے میں دی جا رہی ہے؟''

''حق داروں کو ان کا حق لوٹا دو۔ عقلمند کو اشارہ کافی ہونا چاہیے۔ اور خود بھی صحیح سلامت لوٹ جاؤ۔ جتنا ہے اسی پر اکتفا کرو ورنہ حصے میں آئے گی وہی دو گز زمین۔''

''یہ تم لے لو۔ میں تو اب طے کر چکا کہ اسی طرح پورے برطانیہ پر قبضہ کروں گا۔ آخر تم لوگوں نے بھی تو یہی کیا تھا۔''

''یو بلڈی جوکر! یہ تمہارے لیے ایک وارننگ تھی۔ اصل کھیل اب شروع ہوگا۔''

لائن بند ہو گئی اور میں نے اپنے مقابل نور کا متفکر چہرہ دیکھا تو میں نے کہا۔ ''دنیا میں ایک سے ایک احمق پڑا ہے۔ فارغ لوگ فون پر بھی مذاق کرتے ہیں حالانکہ فون کال ریکارڈ ہوتی ہے۔''

نور نے سپاٹ لہجے میں کہا ''جھوٹ مت بولو۔ یہ کسی نے مذاق نہیں کیا تھا۔ دھمکی دی ہے تمہیں۔''

''ایسی دھمکیاں بھی مذاق ہی تو ہوتی ہیں جانِ من!''

''لیکن اب میں ان کو مذاق نہیں سمجھ سکتی۔ تم چاہو نہ چاہو' میں اپنی اور تمہاری سیکیورٹی کی ضرورت کو نظر انداز نہیں کر سکتی۔''

میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''اب میں بھی سوچنے پر مجبور ہوں کہ کل رات کا واقعہ اتفاق نہیں تھا۔ یہ مجھے پولیس کو بھی بتانا پڑے گا۔ ڈونٹ بی سو سیریس' سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''کیسے ہو جائے گا؟ جب تک ہم خود کچھ نہیں کریں گے۔ ابھی تم ہو یہاں' تم چاہتے ہو میں یہاں کے معاملات کو دیکھوں' یہاں اکیلی رہوں۔''

''اچھا اٹھو' کل میں کسی پرائیویٹ سیکیورٹی ایجنسی کی خدمات حاصل کر لوں گا۔ کیا میں تمہیں ایسے ہی غیر محفوظ چھوڑ کے جا سکتا ہوں لیکن میں پھر بتا رہا ہوں کہ یہ لارڈ کے جاں نثار یا نمک خوار ہیں جو زیادہ مشتعل ہیں۔ لارڈ کی ذات سے ان کو صرف نسلی عقیدت نہیں تھی، ان کے مفادات بھی تھے جن پر ضرب پڑی ہے۔ وہی زیادہ تلملا رہے ہوں گے۔ کچھ دن بعد ٹھنڈے ہو کے بیٹھ جائیں گے جب اندازہ ہوگا کہ ان کے ڈرانے دھمکانے سے کچھ ہوگا نہیں۔''

برطانیہ میں رہنے والوں کی اکثریت اب بدل گئی ہے۔ نوجوان نسل پہلے سے زیادہ فراخ دل ہے۔ وہ انیسوی صدی کے مزاج سے ہم آہنگ ہیں اور مانتے ہیں کہ دنیا ایک گلوبل ولیج بن گئی ہے۔ وہ یورپین یونین میں ہیں اور یونیورسل تہذیبی اثرات کے خلاف نہیں لیکن ایک خاصی بڑی اقلیت اب بھی نسلی امتیاز کے غرور میں مبتلا' روایت پرست اور نسلی تعصب میں مبتلا ہے۔

ایسا ہی ایک پرانے وقتوں کا نمونہ وہ شخص تھا جو لارڈ کے فارم ہاؤس اور اصطبل میں ہمارا استقبال کرنے پر مامور یا مجبور تھا۔ وہ ستر سال سے زائد عمر کا تندرست بوڑھا تھا جس نے روایتی جوکی کے لباس میں ہمیں خوش آمدید کہا۔ صاف نظر آتا تھا کہ ایک خاندانی آقا کی جگہ وہ ہم جیسے ''نیٹو'' (Native) کو بطور مالک قبول کرنے پر تیار نہیں۔ اگر وہ با دل ناخواستہ ادب آداب اور خوش دلی کا مظاہرہ کرتا تو کام چل جاتا مگر وہ تو جارحانہ طور پر یہ واضح کرنا چاہتا تھا کہ جو کچھ ہمیں اتفاق سے یا تقدیر سے مل گیا ہے ہم اس کے ذرا بھی مستحق نہیں۔

ہاتھ ملانے کے بعد اس نے متانت سے کہا۔ ''آپ کو معلوم ہوگا کہ میرا نام اور کام کیا ہے؟''

''نہیں' یہ تم مجھے بتاؤ گے۔ اور مجھے سر کہنا بھی نہیں بھولو گے۔''

اس نے برا مانتے ہوئے کہا۔ ''یس سر! میرا نام فلپ ہے' سائمن فلپ۔ میں ابتدا سے اس اصطبل میں ہوں کیونکہ مجھ سے پہلے میرا باپ بھی یہاں تھا۔ میں یہاں کے ہر گھوڑے کے بارے میں اتنا ہی جانتا ہوں جتنا ایک باپ اپنی اولاد کے بارے میں ان کا شجرۂ نسب' صفات' عادات و اطوار' پسند ناپسند' ان کے موڈ' ان کے نفسیاتی ردِعمل......''

میں نے کہا۔ ''میرے نزدیک گھوڑا صرف گھوڑا ہوتا ہے۔ گدھے اور خچر کی طرح۔ ان کو ایک لاٹھی سے بھی ہانکا جا سکتا ہے۔''

اس کا چہرہ صدمے کی تصویر بن گیا۔ ''معلوم ہوتا ہے' آپ کو گھوڑوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔''

''اب نہیں رہی۔ جب میں چھوٹا تھا تو تانگے پر آگے بیٹھ کے اس کی دُم کو چھونا چاہتا تھا۔ لیکن ایک بار میں نے ایسا کیا تو عین اسی وقت گھوڑے نے بھی کچھ کیا اور بس۔ میرا ہاتھ گندا ہوگیا۔ غالباً گھوڑے کا ہاضمہ خراب تھا۔''

سائمن میرے ساتھ چلتے ہوئے سنتا رہا لیکن مجھے اندیشہ تھا کہ اس قسم کی گفتگو سے اس کا دل خون کے آنسو رو رہا ہے اور ڈر ہے کہ کہیں وہ ہٹ سے گر کے بے ہوش نہ ہوجائے۔ وہ گھوڑیات میں پی ایچ ڈی تھا اور میں اس سے انتہائی جاہلانہ گفتگو کر رہا تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ میں مالک تھا اور وہ ملازم۔

میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''ہمارے ملک میں آج بھی کچھ لوگ گھوڑے پر بیٹھ کے اور سر پر پھول باندھ کے شادی کے لیے جاتے ہیں۔''

اب ہم وسیع سبزہ زار کے آخر میں بنے ہوئے اصطبل تک پہنچ گئے تھے۔ سائمن نے ایک سفید گھوڑے کے بارے میں اپنے علم و عمل پر مبنی لیکچر شروع کیا تو میں نے اسے ٹوک دیا ''کیا نام ہے اس بے وقوف نظر آنے والے جانور کا؟''

سائمن کے چہرے پر ہارٹ اٹیک کی علامات نمودار ہوئیں۔ ''اگر آپ اس کے ٹریک ریکارڈ کی رپورٹ سن لیں سر' تو آپ کی رائے بدل جائے۔''

''میں نے تم سے اس کا نام پوچھا تھا......اور بس!''

''گفٹ آف گاڈ سر!......اور یہ واقعی ہے۔''

میں نے مختصراً کہا۔ ''کل سے اس کا نام اللہ رکھا ہوگا۔'' اور آگے بڑھ گیا۔ نور کو ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس نے دوبار مجھے کہا کہ کچھ تو خیال کرو' یہ صدمے سے مرجائے گا۔

میں نے کہا ''وقت تو پورا ہوگیا ہے اس کا۔ اب موت اس بہانے آنی ہے تو بھلا ہم کیا کرسکتے ہیں۔''

جانتے بوجھتے میں نے سخت جہالت اور ان عالی نسب باکمال گھوڑوں کے بارے میں کسی تانگے والے سے بھی بدتر رویے کا مظاہرہ کیا۔ میں نے ''دی پرل'' نامی گھوڑے کو ''دُرِ شہوار'' کردیا جو سائمن کے خاک پلے نہیں پڑا۔ مزید یہ کہ میں نے کسی جانوروں کے سوداگر کی طرح ہر گھوڑے کے بارے میں پوچھا کہ اسے بازار میں بیچا جائے تو کیا قیمت مل جائے گی؟ ورنہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میں چنیوٹ سے بگھی بنواؤں جس میں آٹھ گھوڑے لگا کے سیر کے لیے نکلوں تو لوگوں پر کتنا رعب پڑے گا۔

سائمن کا دکھی ہونا ایک فطری بات تھی۔ بطور باس کے میں اس کی پسند کے معیار کی سب سے نچلی سیڑھی پر تھا اور اس کے نزدیک میرے جیسے بدذوق اور پست آدمی کی نوکری قطعی باعثِ عزت نہیں ہوسکتی تھی۔ بقول اپنے علامہ اقبال کے' اس رزق سے موت اچھی۔

اصطبل کے دورے کا اختتام ہوا تو میری توقع کے مطابق سائمن نے صاف کہہ دیا۔ ''مجھے فارغ کردیا جائے۔''

میں نے انجان بن کے پوچھا۔ ''کیا یہ استدعا کبھی آنجہانی لارڈ ارنسٹ کی خدمت میں بھی پیش کی تھی؟''

اس نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی۔ ''ان کی خدمت کرنا تو میرے لیے ایک اعزاز تھا۔''

''مگر اب تم بڈھے ہوگئے ہو اور گھوڑوں کو سنبھالنا کوئی آسان کام نہیں ہے' کام مشکل ہے۔''

وہ جھلایا۔ ''یہ بات نہیں سر۔ کام سب دوسرے ملازم کرتے ہیں جو میرے ملازم ہیں۔ میں صرف انہیں ریس کے لیے سدھاتا ہوں اور منتخب کرتا ہوں۔ آج میں فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ میرے برابر نصف صدی کا تجربہ رکھنے والا کوئی نہیں۔''

نور کو اس پر ترس آگیا۔ ''مت تنگ کرو اسے۔ کہہ دو کہ ہم گھڑ دوڑ کے چکر میں نہیں ہیں اور لارڈ ارنسٹ جیسا کوئی خاندانی رئیس ہمارے گھوڑے خرید لے گا۔''

''میں ذرا لطف لے رہا تھا۔ پتا ہے انہوں نے مغل شہزادوں اور شہزادیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔ معمولی انگریز حاکم انہیں جوتے اور فرش صاف کرنے پر ملازم رکھتے تھے اور شہزادیوں کو مہترانی رکھتے تھے، واش روم صاف کرنے والی۔''

''بدلہ تم اس سے لوگے؟'' نور نے ناراضی سے کہا۔ ''میں خود اسے بتادیتی ہوں۔''

نور کی بات سن کے سائمن کے چہرے پر سکون لوٹ آیا کہ اسے ہم جیسے بے ذوق نودولتیوں کی ملازمت نہیں کرنی جو اچھی نسل کے گھوڑوں اور ماہرِ فن انسانوں کی قدر نہیں جانتے۔ اس نے کہا۔ ''سر' اگر ایسی ہی بات ہے تو آپ کی مرضی ہے میں ایک خریدار لاسکتا ہوں۔''

''وہ کون ہے سائمن؟''

''لارڈ ارنسٹ کا حریف نمبر ون۔ ان کا ہر ریس میں مقابلہ ہوتا تھا لیکن دونوں خاندانی لوگ تھے۔ ریس کورس کے باہر ایک دوسرے کی عزت کرتے تھے اور جیتنے والا فراخ دلی سے گھوڑے کی تعریف کرتا تھا۔ ان سے بڑا قدردان آپ کو پورے برطانیہ میں ڈھونڈے سے نہیں ملے گا۔ ہاں زیادہ معاوضہ دینے والے

یورپی' امریکی بروکر ملیں گے یا نودولیتے۔ ڈرگ مافیا کے ڈان اور کاٹن کنگ' بے قدرے لوگ' بدذوق' جو گھوڑے کو دولت میں اضافے کی مشین کے سوا کچھ نہیں سمجھتے۔''

میں نے تقریباً اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ ''دیکھو سائمن! میں ان گھوڑوں کے مقابلے میں گدھا ہوں۔ نہ ذوق رکھتا ہوں اور نہ شوق۔ چلو تم یہ سودا کرادو' لیکن دیکھو...... مالِ مفت دلِ بے رحم والی بات نہ ہو' لاکھ کی چیز کے سوا لاکھ نہ ملیں مگر میرا مالی نقصان نہیں ہونا چاہیے۔''

''آپ مطمئن رہیں سر! ڈیوک آف کنٹر شائر کی پیشکش پر آپ خود بھی معلوم کرسکتے ہیں کہ کس حد تک مناسب ہے اور اس کے بعد آپ کی مرضی۔''

ہم واپس ہوئے اور لوٹ کے اپنے گھر جانے سے پہلے کچھ دیر پکا ڈلی سرکس کی رونق دیکھتے رہے۔ نور نے کچھ شاپنگ کی اور ہم نے رات کا کھانا ایک پاکستانی کے ہوٹل میں کھایا اور جب گھر پہنچے تو ایک شخص دروازے پر بیٹھا ہوا تھا۔ اسے پارٹ ٹائم گیٹ کیپر کی ڈیوٹی دینے والے کرسٹوفر نے باہر ہی روک رکھا تھا۔ یہ وحید تھا۔

میں اسے اندر لے گیا۔ کرسٹوفر کے رویے سے وہ بہت دکھی اور آزردہ تھا۔ ''اس شخص نے پہلے تو مجھے سلیوٹ کیا اور اندر لے گیا' سیدھا آپ کے بیڈ روم میں۔ پھر پوچھنے لگا کہ سر' آپ گاڑی میں میڈم کے ساتھ گئے تھے تو آپ نے یہ کپڑے نہیں پہن رکھے تھے۔ اور اب گاڑی ہے نہ میڈم آپ کے ساتھ ہیں۔''

میں ہنس پڑا۔ ''وہ تمہیں دیکھ کے دھوکا کھا گیا۔''

''لیکن میں نے اسے کوئی دھوکا نہیں دیا۔ میں نے اسے حقیقت بتادی کہ میں وحید ہوں، تمہارے نواب صاحب کا ہم شکل...... میں انہی سے ملنے آیا ہوں۔ تم بس مجھے ایک پیالی چائے پلادو۔ اور سچ بولنے کی سزا مجھے یہ ملی کہ اس نے فوراً مجھے کمرے سے ہی نہیں اس محل سے بھی نکال دیا۔''

''آئی ایم سوری وحید!''

اس کی خفگی میں کوئی کمی نہیں آئی کیونکہ نور کا ہنس ہنس کے برا حال ہو رہا تھا۔ ''تم ڈبل رول کرسکتے ہو۔''

''خاک کرسکتا ہوں۔ اچھا ہوتا اگر میں نواب رفیق بن کے اسے حکم دیتا کہ جاؤ چائے کافی سب لے آؤ اور بک بک بند کرو۔ بجائے اس کے کہ وہ مجھے نکالتا' میں اسے نکال باہر کرتا۔''

''تم فون ہی کردیتے مجھے۔ کب سے بیٹھے ہو باہر؟''

وہ بولا۔ ''ڈیڑھ گھنٹا ہوگیا۔ میں مرجاتا تمہارے دروازے پر بھوک سے تو بدنامی اس کی ہوتی یا تمہاری؟''

''اچھا چلو اب غصہ تھوک دو۔ یہ غلط فہمی میں ہوگیا۔ وہ بھی کیا کرے۔ میں نے اسے تمہارے بارے میں کچھ بتایا ہی نہیں تھا ورنہ ایسا نہ ہوتا۔''

''میں......اب واپس نہیں جاؤں گا۔''

''کیوں' خیریت تو ہے نا' تم بہت اپ سیٹ ہو؟''

وہ بولا۔ ''تم لوٹ کے ہی نہیں آئے' سب میں مشہور ہوگیا کہ میں واپس پاکستان جارہا ہوں۔ بس' کچھ لوگ میری جان کے دشمن ہوگئے۔''

میں نے نور سے کہا۔ ''تم جاؤ دیکھو کچن میں کیا ہے؟ یہ ہمارے مہمان ہیں بلکہ ڈبل رول میں میزبان بھی ہیں۔'' پھر میں وحید سے مخاطب ہوا۔ ''تم بھاگ کر آئے ہو' خالی ہاتھ؟''

''اور میں کیا کرتا' میں قید میں تھا۔''

میں نے کہا۔ ''جہاں تک مجھے یقین ہے' میں نے تمہارے تمام قرض بے باق کردیے تھے۔ پھر کون ہے جو تمہیں غیر قانونی طور پر روکنا چاہتا ہے اور کیوں؟''

وہ اضطراب میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔ ''کچھ لوگ مجھے سونے کا انڈا دینے والی مرغی سمجھتے ہیں۔''

''ظاہر ہے کوئی مرغا انڈا نہیں دے سکتا۔''

''آپ کے لیے مذاق کی بات ہوگی' میری جان خطرے میں ہے۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے نام بتاؤ ان کے' کل وہ سب اندر ہوں گے۔ کسی کو حبسِ بے جا میں رکھنا سنگین جرم ہے۔''

''وہ ایک ہو تو نام بتاؤں۔''

''جب میں تم سے ملا تھا' تو تم کچھ حسین اور جوان' پارسا اور باحیا خواتین کے چنگل میں تھے۔ وہ تم سے خلوت میں ایسی تصویریں بنواتی تھیں جو صرف خلوت میں ہی دیکھی جاسکتی ہیں...اور تم آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام وصول کر رہے تھے۔ آم سمجھ لو اپنی تصویر بنانے کی صلاحیت کو اور گٹھلی سمجھ لو تصویر بنوانے والی کو۔ تمہیں پیسا الگ مل رہا تھا اور حسن کے خزانے سے شراب و شباب بن مانگے بلا معاوضہ حاصل تھا۔''

نور ایک ٹرے میں کھانے پینے کے سامان کا ڈھیر لیے نمودار ہوئی۔ ''کافی آرہی ہے' تب تک یہ کھاؤ۔''

وحید کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ وہ دن بھر کا بھوکا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے ہاتھ روک کے خفت سے مجھے دیکھا۔ ''آپ لوگ صرف مجھے کھاتا دیکھیں گے؟''

میں نے کہا۔ ''ہم پیٹ بھرے لوگ ہیں۔ باہر سے

کھا کے آئے ہیں۔''

اس نے کھانا ختم کیا تو اس کے ہاتھ اور منہ کھانے سے بھر گئے تھے۔ کھانے سے پہلے بھی اس نے ہاتھ نہیں دھوئے تھے۔ اب بھی واش روم جانے کے بجائے اس نے ہاتھ اپنی پرانی میلی جینز کی پتلون سے رگڑ کے صاف کیے اور منہ آستین سے پونچھ لیا۔ ایسا وہ نہ جانے کتنے دنوں یا کتنے ہفتوں سے کر رہا تھا۔ کچھ اس کے اندر کا بے لگام فنکار تھا جو ادب آداب کی قیود سے سرکشی کی فطری جبلت رکھتا تھا۔ کچھ یہاں کے ماحول اور اس کی مے نوشی نے اسے مہذب انسانوں والی عادات سے بیگانہ کر دیا تھا۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ اس کے جنگلی پن کو کسی عورت نے کنٹرول کیوں نہیں کیا؟ ان میں جو وحید پر مہربان تھیں' اعلیٰ طبقے کی ایسی خواتین بھی شامل تھیں جن کے طور طریقے اور سوشل ایٹی کیٹس مثالی ہوں گے۔ کیا وہ اسے ایک جنگلی جانور کے روپ میں دیکھنا پسند کرتی تھیں؟ اس کی وحشیانہ عادات پر فریفتہ تھیں۔ کیونکہ وہ اپنے شوہروں کے مصنوعی، پُرتکلف نفیس اور مہذب اظہارِ عشق کے سرد بے جان رویوں سے اکتا چکی تھیں۔ وہ اظہارِ عشق میں جنون اور دیوانگی کی طلبگار تھیں۔ جنس کے حیوانی جذبے میں مرد کو صرف ایک حیوان دیکھنا چاہتی تھیں۔

''کافی!'' نور نے مگ میری طرف بڑھایا تو میں چونکا۔

میں نے کہا۔ ''تم نے بتایا نہیں' یہ کون دشمن تھے؟''

''وہی جو مجھ سے مالی فائدہ اٹھا رہے تھے۔ میرے بنائے ہوئے نیوڈز کو مشہور مصوروں کے نام سے آرٹ گیلریز میں لگا کے ہزاروں پاؤنڈز وصول کر رہے تھے۔ دس ہزار پاؤنڈز کی ایک شاہکار تصویر گزشتہ ہفتے نیلامی کے لیے پیش ہوئی۔ وہ ایک ڈچس نے مجھے پانچ سو پاؤنڈز دے کر بنوائی تھی' اپنے شوہر کے لیے۔''

میں چونکا ''شوہر کے لیے؟''

''یس۔ وہ دیوانہ تھا اپنی بیوی کے حسن و شباب کا۔ تصویر ان کے بیڈ روم سے چوری ہوگئی۔ وہ رپورٹ کیا کرتے' اپنے طور پر تفتیش کی تو کچھ پتا نہیں چلا۔ وہ تھی کوئی آٹھ فٹ لمبی اور دو فٹ چوڑی پینٹنگ۔ تم نے ٹائی ٹینک (Titanic) فلم دیکھی؟''

''دیکھی ہے۔''

''اس میں...... ہیروئن نے ہیرو سے ایک پینٹنگ بنوائی تھی' صرف ایک قیمتی لاکٹ پہن کے' وہ صوفے پر لیٹ گئی تھی۔''

''مجھے وہ سین یاد ہے۔''

''یہ اسی کی کاپی تھی، ڈپلی کیٹ۔ وہی لاکٹ' میرا مطلب ہے ویسا ہی لاکٹ تھا...... اور تم یقین نہیں کرو گے' وہ خاتون بھی اسی کی کاپی تھی' وہی صورت' وہی جسم۔ چنانچہ اس کے خاوند کو خیال آیا کہ اپنی بیوی کے حسن کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کرے اور نظر کے سامنے رکھے۔ لوگوں کے اپنے اپنے شوق ہیں...... یا کمپلیکس۔''

''تم تصویر چوری ہونے کی بات کر رہے تھے۔''

''یس۔ تصویر نہ ملنی تھی نہ ملی۔ پھر کچھ ایسے حالات ہوئے کہ میاں بیوی میں علیحدگی ہوگئی۔ کچھ عرصے بعد شوہر نے خودکشی کر لی۔ وہ واقعی بیوی کا ایسا عاشق تھا کہ اس کی خاطر جان دے سکتا تھا اور اس کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کی موت کے تین ہفتے بعد یہ پینٹنگ ایک مشہور آرٹ گیلری میں منظر عام پر آگئی...... اور جانتے ہو اسے کس نے خریدا......؟''

''میں نے یقیناً نہیں خریدا تھا۔ حالانکہ میں بھی ٹائی ٹینک کی ہیروئن پر دل سے فریفتہ ہوں۔''

''اس کے ایک پرستار نے...... لیکن اس کے ساتھ ہی ایک رات کچھ لوگ مجھے اٹھا کے لے گئے اور اس خاتون کی خدمت میں پیش کر دیا۔ وہ بڑی فیملی کی اور خاصی دولت مند خاتون ہے' جس کے اوپر کی سطح پر خاصے مراسم ہیں۔ مجھے اغوا کرنے والے اسی نے ہائر کیے تھے۔''

''ویری دلچسپ۔'' میں نے کہا۔ ''وہ ایک مصور کو شرافت سے بھی تو مدعو کر سکتی تھی۔''

وحید تھوڑی دیر کے لیے نروس ہوا۔ ''دراصل...... تصویر جب نمائش کے لیے پیش کی گئی تو کہا یہی گیا کہ یہ ایک گمنام ماڈل ہے۔ سمجھنے والوں نے اسے ٹائی ٹینک کی ہیروئن کی وہی تصویر مان لیا جو وہ فلم میں دیکھ چکے تھے مگر اس خاتون کی سمجھ میں آگیا کہ یہ تصویر وہی ہے جو اس کے بیڈ روم سے چوری ہوئی تھی۔ اس نے مجھے فون کر کے پوچھا۔ میں نے کہا کہ میں مصور ہوں' چور نہیں۔ پولیس سے کہو کہ چور کا سراغ لگائے۔ اس پر وہ بگڑ گئی۔ کہنے لگی کہ اگر تم نے چوری نہیں کی تو پھر یہ نقشِ ثانی بھی تمہارا کمال ہے۔ تم نے کوئی کیمرا فوٹو رکھی ہوگی جس سے ایک اور نیوڈ بنا لیا، میری بدنامی کا خیال کیے بغیر۔ اس نے میرے انکار کو تسلیم ہی نہیں کیا اور مجھے اٹھوا لیا۔ دو ہفتے میں نے اس کی قید میں گزارے۔''

''اور کیسے گزرے یہ دو ہفتے؟'' میں نے ہنس کے کہا۔

''مت پوچھو' اصل تصویر دو ہفتے میں مکمل ہوئی تھی اور وہ بڑے یادگار لمحے تھے۔ تصویریں تو بہت بنائی ہیں میں نے اور مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی عار بھی نہیں کہ پیسے کے علاوہ مجھے وہ سب ملا جو میں نے مانگا۔ صرف یہ ایک عورت تھی جس کی طلب نے مجھے واقعی دیوانہ کر دیا تھا مگر وہ ہاتھ آنے والی چیز نہیں تھی۔ اس کا شوہر ہمہ وقت موجود رہتا تھا۔ صرف ایک بار ایسا ہوا کہ سیشن کے دوران وہ سو گیا۔ اسے بخار تھا، میں نے دوا کے نام پر اسے خواب آور گولی کھلا دی۔ پھر میں نے اس عورت سے عرضِ مدعا کی۔ رو رو کے، ہاتھ جوڑ کے اور پاؤں پکڑ کے صرف ایک بار کی قربت مانگی...... اور اس وقت میں رو رہا تھا۔ یہ ایکٹنگ نہیں تھی' میرے حقیقی جذبات تھے۔''

میں دم بخود یہ اعتراف سن رہا تھا۔ ''پھر...... اس نے جاگنے پر شوہر کو بتا دیا؟''

وہ مسکرایا۔ ''نہیں۔ انگریزی میں کہتے ہیں کہ چوری کے پھلوں کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ اس عورت نے اپنے شوہر کی دیوانگی والے عشق سے بغاوت کی۔ وہ اس کی پہرے دار نظروں سے عاجز تھی۔ اس نے میری استدعا قبول کر لی' یہی نہیں' اس نے ایک بار میری مانی' ایک بار مجھ سے اپنی منوائی۔ خواب آور گولیاں وہ خود اپنے ساتھ لائی تھی۔ وہ سیشن کا آخری دن تھا۔ کھامڑ عاشق شوہر مجھے ایک ہزار پاؤنڈز معاوضے کے علاوہ دے گیا۔ وہ بہت خوش تھا کہ میں نے اس کی محبوبہ بیوی کے حسن کو امر کر دیا ہے۔ خیر' دوسری بار مجھے اس بے وفا حسینہ کے سامنے قیدی کی حیثیت سے پیش کیا گیا تو اس نے میرے ساتھ وہ سلوک کیا جو پولیس کسی چور کے ساتھ کرتی ہے۔ اس کے حکم کے غلاموں نے مجھے مارا پیٹا' ننگا بھوکا رکھا اور کہتے رہے کہ تمہارا قیمہ بنا کے ان سب کو کھلائیں گے جن کی تصویریں تم پہلے بناتے رہے ہو۔''

''پھر تمہاری رہائی کیسے ہوئی؟''

''میں نے اس کی ایک خادمہ پر ڈورے ڈالے۔ میں کیا کرتا' ایک ہی ہتھیار ہے میرے پاس جو کام کرتا ہے۔ مجھے تجربہ ہے۔ میں اس کی مدد سے فرار ہوا۔ وہ میرے ساتھ تھی۔ میں اسے اپنے گھر لے گیا۔ وہاں میرے پاسپورٹ اور دیگر دستاویزات تھیں۔ میں نے وہ نکالیں اور اپنی محسنہ کو وہیں چھوڑ کے پھر فرار ہوا اور سیدھا یہاں آ گیا۔''

''بڑے خبیث ہو تم۔ اس بے چاری کو ساتھ نہیں لا سکتے تھے؟ معلوم نہیں اس پر کیا گزری ہوگی بعد میں؟''

''وہ چلی گئی ہوگی واپس۔ اس بلا کو میں کیسے اپنے پیچھے لگا کر لاتا۔ آپ نے ابھی اسے دیکھا نہیں خاتون۔ میں لفظوں میں کیا بیان کروں۔ مجھے ایک پنسل کاغذ دیں تو دکھا دوں۔''

نور نے اسے سادہ کاغذ اور پنسل فراہم کر دی۔ وہ بڑا عجیب کیریکٹر تھا۔ مزاج کے اعتبار سے بالکل مجذوب قسم کا فنکار۔ اپنے فن میں یکتا مگر دنیا داری میں صفر۔ فنکار ایسے ہی ہوتے ہیں جیسے صادقین تھا یا اقبال مہدی۔ وہ سر جھکائے بڑے انہماک سے کام کر رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ کافی وقت لے گا لیکن اس نے دس منٹ میں ایک پنسل اسکیچ میرے اور نور کے سامنے کر دیا جو اس کے دعوے کو سچ ثابت کرتا تھا۔ تصویر میں ادھیڑ عمر کی ایک ٹن وزنی گوشت کا پہاڑ قسم کی عورت تھی۔ اگر اسے عورت مانا جائے۔ سیاہ رو اور بھیانک شکل والی۔ میں اور نور اسے دیکھتے رہے۔

''کیا وہ واقعی ایسی تھی؟'' نور نے کہا۔

''ہاں' لیکن میں نے اپنے جھوٹ سے اس کو یقین دلایا کہ وہ چڑیل نہیں پری ہے تو وہ مان گئی' قائل ہوگئی۔'' وہ حیرانی سے سر ہلانے لگا۔ ''گستاخی معاف خاتون! مجھے یقین آ گیا ہے کہ عورت خواہ کتنی بھی عقل مند ہو' مرد کا ایک جھوٹ نہ چلنے دے بلکہ اس کے سچ کو بھی جھوٹ سمجھے مگر ایک جھوٹ کے چکر میں ضرور آ جاتی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''سچ فرمایا آپ نے بڑے بھائی!'' اور [illegible]ر کی طرف دیکھا۔

''بکواس فرماتے ہیں آپ۔ میں نے بھی دیکھا ہے کہ بڑے بڑے افلاطون مردوں کی عقل کیسے ماری جاتی ہے' عورت کی ایک ادا پر۔''

''ہم اس موضوع پر فرصت میں بحث کریں گے۔ فی الحال تم یوں کرو مسٹر حید کہ سو جاؤ۔ نور تمہیں بیڈ روم دکھا دے گی لیکن صبح تم میری وارڈ روب سے کوئی بھی لباس منتخب کرو او[ر] ہمارے سامنے آؤ تو نہا دھو کے۔ آخری بار تم کب نہائے تھے' کچھ یاد ہے۔''

وہ سوچتا رہا۔ ''منہ دھویا تھا دو ہفتے پہلے۔''

''اور یہ کپڑے کب بدلے تھے؟'' نور نے پوچھا۔

وہ کچھ نہیں بولا۔ شاید اسے یاد ہی نہیں تھا۔ وہ نور کے پیچھے چل پڑا۔ صورت شکل میں میرا یہ ڈپلی کیٹ عادات و اطوار میں میرا الٹ تھا۔ عام طور پر ایسی غیر معمولی صلاحیت رکھنے والے افراد کا المیہ یہی ہوتا ہے کہ ان کا دماغ ایک سمت میں یا ایک رُخ پر غیر معمولی کارکردگی کا مظاہرہ کرتا ہے لیکن دنیا داری میں وہ عام افراد کے برابر بھی نہیں ہوتے۔ مفکر' سائنس داں' شاعر' ادیب اور مصور اپنے فن میں بڑا نام پیدا کرتے ہیں اور ان کی تخلیقی صلاحیت انہیں ساری دنیا میں شہرت دوام عطا کرتی ہے لیکن وہ اس سے دولت مند نہیں ہو پاتے۔

اپنے خیالوں کی دنیا میں رہنے والے یہ جینئس گرد و پیش کی دنیا کے معاملات سے لاتعلق رہتے ہیں۔ غالب سے فیض تک کس کو دولت مندی ملی؟ آئن اسٹائن جیسا سائنس داں

کسی بین الاقوامی کانفرنس سے خطاب کرنے جاتا تھا تو بیوی اسے سمجھاتی کہ دیکھو اس سوٹ کے ساتھ یہ موزے پہننا اور دوسرے کے ساتھ یہ۔ لیکن وہ واپس آتا تھا تو دو پیروں میں دو رنگ کی جرابیں پہنے ہوتا تھا۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ ان لوگوں کی تخلیقی صلاحیت کو تاڑ کر موقع شناس اور مفاد پرست لوگوں نے انہیں استعمال کیا ہے اور خوب مال کمایا ہے لیکن نہ انہیں خبر ہوئی اور نہ انہوں نے پروا کی۔

وحید لندن میں رہ کے کچھ دنیا دار ضرور ہو گیا تھا لیکن عیار لوگ یہاں بھی تھے اور انہوں نے واقعی اسے سونے کا انڈا دینے والی مرغی جان کے خوب استعمال کیا۔ پھر غالب کی طرح 'سیکھے ہیں مہ رخوں کے لیے ہم مصوری۔ حسن پرستی اس کی فطرت میں تھی۔ وہ حسن شناس تھا اور حسن کو رنگوں میں قید کر کے شہرت دوام عطا کر سکتا تھا۔ حالات ایسے تھے کہ اس کی حسن پرستی ہی اس کی کمزوری بن گئی یا بنادی گئی اور اس پر یہ مصرع صادق آنے لگا کہ ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی۔ بدکردار اور جسم فروش عورتوں سے لے کر یہودی تاجروں تک سب نے اس کو جیسے چاہا استعمال کیا۔

صبح میں نے اسے قدرے بدلا ہوا پایا۔ میری ہدایات اور نور کی سختی کے باعث وہ نہا دھو کے اور کپڑے بدل کے انسان کا بچہ نظر آنے لگا تھا۔ میں نے ایک باربر کو طلب کیا اور اس کے بے ترتیب بڑھے ہوئے بالوں کو اپنی نگرانی میں کاٹ چھانٹ کے اپنے جیسا بنادیا۔ ابھی اس کی جسمانی صحت خراب تھی ورنہ وہ ہو بہو میرا نقشِ ثانی نظر آتا۔ وہ باہر جانے سے ڈرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس قاتل حسینہ کے آدمی اسے ہر جگہ تلاش کرتے پھر رہے ہوں گے۔

ایک ہفتے تک میری شدید مصروفیت رہی۔ میں آفس بھی جاتا تھا جہاں سوشی میرے پلان پر عمل کر رہی تھی۔ اوپر والوں میں سے دو نے انتظامی تبدیلی کو ہنسی خوشی قبول کیا تھا کیونکہ وہ خود بھی جانا چاہتے تھے لیکن اپنے کنٹریکٹ کی وجہ سے مجبور تھے۔ ایک کے خلاف انکوائری کو تیزی سے آگے بڑھایا گیا اور ایک دن سوشی نے رپورٹ اس کے سامنے رکھ دی۔ ''انتخاب تمہارے ہاتھ میں ہے۔ خاموشی سے استعفیٰ دے کر چلے جاؤ یا رپورٹ کو چیلنج کرو۔ کورٹ میں جاؤ گے اور برطرفی کو چیلنج کرو گے تو اپنے پیروں پر کلہاڑی خود مارو گے۔ ہم تمام ثبوت عدالت کے سامنے رکھ دیں گے۔ تم جیل جاؤ گے اور باہر آؤ گے تو باعزت ملازمت کے دروازے تم پر بند ہو چکے ہوں گے۔''

اس نے عقلمندی سے کام لیتے ہوئے ''ذاتی وجوہ'' کی بنیاد پر اپنا استعفیٰ پیش کر دیا اور کمپنی نے اسے تمام واجبات ادا کر کے رخصت کر دیا۔ اس نے کمپنی کا بہت مال کھایا تھا لیکن قانونی چارہ جوئی کے ذریعے اب اس سے مال نکلوایا نہیں جا سکتا تھا اور اسے جیل پہنچانے کے عدالتی عمل کے اخراجات زیادہ ہوتے۔

سوشی نے مجھے دو افراد سے ملوایا۔ ایک نصر اللہ جو پاکستان کے سیاسی حالات سے پریشان ہو کے لندن میں سیاسی پناہ لے چکا تھا۔ وہ مالی امور کا ماہر تھا۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا لیکن پاکستان میں اس پر نالائق اور کرپٹ لوگ مسلط کر دیے گئے جو چاہتے تھے کہ وہ ہر ترقیاتی منصوبے میں خود بھی کھائے اور ان کے لیے بھی نکالے۔ ایک زمانے میں یہ شعر بہت مشہور تھا کہ نام منظور ہے تو فیض کے اسباب بنا۔ پُل بنا چاہ بنا مسجد و تالاب بنا۔ اب یہ کام سرکاری ٹھیکوں کے ذریعے ہوتے تھے۔ سڑکیں اور پل' واٹر سپلائی کے منصوبے' اسکول اور اسپتال کی عمارات میں سیمنٹ کی جگہ ریت استعمال کر کے ٹھیکے دار کروڑپتی بنتے تھے تو وزارت کے حکام مع وزیر موصوف ارب پتی ہو جاتے تھے۔ پروجیکٹ کا بعد میں پہلی بارش کے بعد کیا حشر ہوتا ہے' اس کا کسی کو ڈر نہیں تھا کیونکہ انکوائری کی رسمی کارروائی ہوگی تو انہی کے من پسند افراد کریں گے۔ ہوئے ہیں اہلِ ہوس مدعی بھی منصف بھی۔ اور عام پبلک کا حال یہ تھا کہ پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں۔

نصر اللہ کے لیے اس کی ایمانداری اور وطن پرستی جرم بن گئی تو وہ پاکستان سے فرار ہوا۔ کسی خیر خواہ نے اسے سمجھایا کہ میاں ایماندار' کیوں اپنی جان کے دشمن ہوئے ہو۔ یہ چمن یونہی رہے گا اور ہزاروں جانور۔ تم جان بچا کے نکل جاؤ ورنہ احمد کی پگڑی محمود کے سر باندھنے والے دوسروں کی بداعمالی تمہارے کھاتے میں ڈال دیں گے اور تم اپنی ناکردہ گناہی پر شور مچاتے جیل پہنچ جاؤ گے یا کسی ''نامعلوم قاتل'' کے ہاتھوں تمہیں شہید کرا کے جنت کے مزے لوٹنے بھیج دیا جائے گا۔ اس کی عقل میں یہ بات آگئی اور وہ جلاوطن ہو کے لندن آگیا۔ بلاشبہ وہ مالیاتی امور میں غیر معمولی خداداد صلاحیت کا حامل تھا اور بعد میں اس نے ایسا مالی ڈسپلن قائم کیا کہ بدعنوانی کا نام تک نہ رہا اور کمپنی کو کروڑوں کا فائدہ ہوا، میں نے بھی اسے ترقی اور انعام دے کر اس منافع میں شریک کیا۔

دوسرا پاکستانی نہیں تھا، اکرام علی خان بھارت سے آیا تھا اور اس کی کہانی بھی نصر اللہ سے زیادہ مختلف نہیں تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ بھارت میں مسلمان ہونا بھی اس کا جرم بن گیا تھا اور جب گجرات کا قتل عام ہوا تو اس کے مخالفین نے سازش کر کے اسے پھنسا دیا تھا مگر کورٹ انکوائری میں وہ بے

قصور ثابت ہوا، بے قصور ثابت ہونے تک اس نے جو کچھ جھیلا اس کے بعد اکرام علی خان نے بھی وہ ملک چھوڑ دیا۔

رخصت ہونے والا تیسرا شخص اپنی خوشی سے نہیں گیا تھا، نکالا گیا تھا۔ کبھی اگر وہ اپنے خلاف الزامات کا سامنا کر سکتا تو ابھی نہ جاتا لیکن غبن اور کرپشن کے الزامات دو جمع دو چار نہیں پانچ چھ سے بھی زیادہ ثابت کرتے تھے اور وہ الزامات کا سامنا کرتا تو اور بہت سے چکروں میں آجاتا جن میں ٹیکس کا مسئلہ سب سے بڑا تھا۔ اس کا طرز زندگی اس کی آمدنی سے کہیں بڑھ کر تھا، وہ آمدنی کے ذرائع بتا بھی دیتا مگر پھر انکم ٹیکس والے اس کے پیچھے پڑ جاتے اور وہ بال کی کھال نکالنے میں تو کسی کو بخشتے نہیں۔

یہ ''باعزت رخصتی'' بھی اس کے لیے بے عزتی تھی۔ اس کے منہ پر کوئی کچھ نہ کہے لیکن پیٹھ پیچھے سب اس کے بے ایمان ہونے پر یقین رکھتے تھے۔ اس شخص کو بھی اتنی منافع بخش پوسٹ کو چھوڑنے کا صدمہ تھا اور جائز طور پر اس کا ذمے دار وہ مجھے سمجھتا تھا۔ وہ لارڈ ارنسٹ کے زمانے میں ہی اپنی بدعنوانی کے باعث نظر میں آگیا تھا لیکن نہ جانے کس مصلحت کی بنا پر اس کے خلاف فوری کارروائی نہیں ہوئی تھی، شاید لارڈ ارنسٹ کمپنی کی مجموعی کارکردگی سے مطمئن تھا اور تھوڑی بہت ہیرا پھیری کو انسانی ضرورت عادت یا مجبوری سمجھ کے برداشت کر لیتا تھا۔

سوشی نے مجھے بتایا تھا کہ پہلی بار اس کی شکایت کو لارڈ نے نظرانداز کر دیا تھا کہ چھوڑو...... تھوڑا بہت گھپلا تو ہر جگہ ہوتا ہے۔ ہم اداروں کو سو فیصد پاک صاف نہیں بنا سکتے۔ دوسری بار اس نے کہا کہ اچھا میں دیکھوں گا، یہ شخص دس فیصد بے ایمان ہے تو اس کی جگہ آنے والا بیس فیصد نہیں ہوگا، اس کی کیا ضمانت ہے؟ تم اپنی ضمانت پر کوئی ایماندار آدمی لا سکتی ہو جو اتنا ہی اچھا کام بھی کرے۔ تیسری بار اس کی بے ایمانی کے اعداد و شمار نے لارڈ کو پریشان کیا تو اس نے سوشی سے انکوائری کرانے کے لیے کہا لیکن اس نے انکار کر دیا، اگر خود مالک فیصلہ کن قدم اٹھانے سے گریزاں ہے تو وہ برائی کیوں مول لے۔

یہ کام میں نے کیا تھا۔ قدرتی طور پر اس کے دل میں عناد کا زہر تھا جو اس نے میرے خلاف استعمال کیا۔ جانے سے پہلے اس نے عملے میں میرے خلاف پروپیگنڈا کیا کہ اب یہ پاکی آگیا ہے تو دیکھنا سب کو نکال باہر کرے گا اور اپنے ہم وطنوں کو ہماری جگہ لا بٹھائے گا۔ جب تین ڈائریکٹرز رخصت ہو گئے تو نچلے عملے میں بے چینی پھیلی اور یہ تاثر گہرا ہو گیا کہ ملکیت تبدیل ہونے کے ساتھ ہی کمپنی کا ڈھانچا بھی بدل جائے گا اور متعصب نیا مالک سب گوروں کو فارغ کر کے کالوں کو لانے کا فیصلہ کر چکا ہے۔

جو دور اندیش اور اپنا فائدہ دیکھنے والے تھے انہوں نے دوسرے اداروں میں قسمت آزمائی شروع کر دی۔ دس بارہ افراد نے مجھ سے ملاقات کی اور کہا کہ وہ ملازمت چھوڑنا چاہتے ہیں اور انہیں اعلیٰ کارکردگی کا سرٹیفکیٹ مل جائے تو دوسری جگہ ان کے کام آئے گا۔ یہ انہیں دے دیا گیا اور چند روز میں وہ نئی ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب رہے تو ان کی تقلید کرتے ہوئے مزید دس بارہ افراد نکل گئے۔ اب کسی کو شک نہیں تھا کہ پرانے جائیں گے کیونکہ نیا مالک اپنے وفاداروں کو لائے گا، دوسرے ہفتے میں سوشی نے مجھے بتایا کہ کچھ لوگ سودا کرنا چاہتے ہیں یعنی انہیں کچھ دے دلا کے رخصت کرنا ہے تو وہ کسی قسم کی قانونی پریشانی پیدا نہیں کریں گے۔

میں نے سوشی کو مکمل اختیارات دے دیے کہ وہ پُرامن تبدیلی کی جو قیمت مناسب سمجھے ادا کر دے۔ اس طرح تین چوتھائی عملہ رخصت ہو گیا۔ سوشی نے پیچھے رہتے ہوئے بھی بہت دوڑ دھوپ کی۔ اس کے شوہر نے ایک سراغرساں کا کردار ادا کیا اور دوسرے اداروں سے ایسے پاکستانی کارکن ڈھونڈ لایا جن کی کارکردگی مثالی تھی۔ ایک ہفتے میں خفیہ طور پر مجھ سے بیس بائیس افراد نے دفتر کے باہر رابطہ کیا۔ انہوں نے اپنے بارے میں بتایا کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور میرے لیے کیا کر سکتے ہیں۔ یہ لوگ اچھے روزگار کی تلاش میں بے وطن ہوئے تھے۔ اچھی آمدنی ان کا واحد مقصدِ حیات بن گئی تھی۔ میں نے انہیں دگنا معاوضہ دینے کی پیشکش کی تو بلاتامل انہوں نے اپنی وفاداریاں میرے نام کر دیں۔ ان میں کچھ میرے ہم وطن تھے، کچھ انڈین اور بنگلادیشی مسلم تھے۔ مذہبی یگانگت عام طور پر اس معاشرے میں اتنا اہم کردار ادا نہیں کرتی جتنا معاشی خوشحالی، اچھا کیریئر اور روشن مستقبل۔ جب انہیں سب کچھ میرا ساتھ دینے میں نظر آیا تو وہ متحد ہو گئے۔ وہ بھی جنہیں گوروں سے کوئی شکایت نہ تھی انہوں نے مسلمان یا پاکستانی ہونے کے ناتے میری ٹیم کو جوائن کر لیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کچھ عرصے کے لیے کمپنی کی مجموعی کارکردگی متاثر ہوئی۔ نئے لوگوں کو آنے کے بعد کام سمجھنے میں وقت لگا لیکن میں اس عارضی نقصان کے لیے تیار تھا۔ تبدیلی کا سارا عمل دو ہفتے میں مکمل ہوا۔ نور بلاناغہ اور باقاعدگی سے سوشی کے ساتھ بیٹھ کے کام کو سمجھتی رہی اور مشورے دینے کے ساتھ فیصلے بھی کرتی رہی۔ خود سوشی نے میرے سامنے اعتراف کیا کہ نور نے تمام معاملات پر اپنی گرفت مضبوط کرنے میں حیرت انگیز ذہانت کا مظاہرہ کیا ہے اور اس کے بیشتر

مشورے صحیح فیصلے کا سبب بنے ہیں۔ ظاہر ہے میں اس صورتِ حال سے بہت خوش تھا کیونکہ اس سے میرے تفکرات کم ہوتے جا رہے تھے۔ میں بہت پُرامید تھا کہ مستقبل میں میرے لیے زیادہ وقت ست بدھائی میں گزارنا ممکن ہوگا، لندن کے معاملات سوشی کے ساتھ نور سنبھال لے گی۔

میں نے ایک سیکیورٹی ایجنسی سے بھی معاہدہ کرلیا تھا جس نے ارنسٹ مینشن کے علاوہ آفس کی اور میرے یا نور کے آنے جانے کی تمام حفاظتی ذمے داری قبول کرلی تھی۔ میں نے صرف ایک کنٹریکٹ سائن کیا تھا، اس کی رو سے مجھے ایک لگی بندھی رقم ہر ماہ ادا کرنی تھی، باری باری تین گارڈ میرے گھر کے دروازے پر ڈیوٹی دیتے تھے، تین دفتر میں رہتے تھے اور دو ہر وقت آتے جاتے اسلحہ لے کر ہمارے ساتھ رہتے تھے۔ انہوں نے انٹرکام، وائرلیس اور کلوز سرکٹ ٹی وی کا فول پروف نظام نئے سرے سے قائم کیا تھا۔

وحید کا مسئلہ بھی دو ہفتے میرے ذہن پر سوار رہا۔ وہ اتنا ڈرا ہوا تھا کہ باہر نکلنے پر تیار نہیں تھا۔ اس کی ایک اور وجہ یہ تھی کہ لندن میں پہلی بار اسے تحفظ کے ساتھ آسودگی میسر آئی تھی۔ میں نے اس کی فرمائش کے مطابق مصوری کا تمام سازوسامان اسے فراہم کر دیا تھا۔ وہ ایک کمرے کو اپنا اسٹوڈیو بنا کے تخلیقی عمل میں مصروف ہوگیا تھا اور ایسا بھی پہلی بار ہوا تھا کہ وہ پیسا کمانے کے لیے کسی جسم فروش عورت کی عریاں تصویر بنانے کی معاشی مجبوری کا شکار نہیں تھا۔ نیوڈز پر دنیا کے ہر مصور نے تخلیقی کام کیا ہے مگر وحید کو ان عورتوں کی ایک ہیجان انگیز تصویر بنانی پڑتی تھی جو سستے جنسی جذبات کو ابھار سکے۔ یہ تصویر ایک یہودی تاجر اپنی آرٹ گیلری میں آویزاں کرکے دہرا استحصال کرتا تھا۔ وہ مصور سے الگ پیسے لیتا تھا اور تصویر دیکھ کے کوئی جسم کا خریدار آئے تو ماڈل سے الگ۔ یہ تصویر نہیں ''مجھے خریدلو'' کا اشتہار ہوتی تھی۔

یہاں وحید کا ذہن آزاد تھا اور وہ صرف ایک مصور کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ میرے کہنے پر اس نے ٹینا سے بھی بات کی اور پھر دیکھتے دیکھتے تجدید وفا کا سلسلہ بھی ایسا بڑھا کہ وہ دن رات فون پر باتیں کرنے لگے اور یہ سویا ہوا عشق جاگا تو دو ہفتے بعد وحید نے مجھ سے درخواست کی کہ اسے پاکستان بھجوا دیا جائے۔ میں نے اسے پاکستان بھیج دیا۔ وہاں سے مجھے رپورٹ یہ ملی کہ بچھڑے ہوئے پھر مل گئے ہیں۔ انہوں نے شادی بھی خود ہی کرلی ہے اور اب اسی گھر میں ہی اپنا ہنی مون منا رہے ہیں۔

یہ اطلاع مجھے راجا نے دی تو میں نے کہا۔ ''کیا مطلب، انہوں نے اپنی شادی میں کسی کو نہیں بلایا۔''

''بلایا تھا، ایک مولوی کو...... اس نے نکاح پڑھانے کی رسمی کارروائی پوری کی، دو گواہ بھی وہی لے آیا تھا اور پیسے وصول کرکے چلا گیا۔''

''ٹینا نے اپنے باپ کو اور بھائی کو بھی نہیں کہا۔''

''نہیں نیکے پتر...... مجھے تو نے بتایا تھا کہ تو نے اسے لندن سے جہاز میں سوار کرا دیا ہے، یہ تو مجھے امید نہیں تھی کہ وہ لاہور میں اترے گا تو سیدھا ست بدھائی کا رخ کرے گا۔ وہ سیدھا ٹینا کے پاس گیا اور بس...... دوسرے دن انہوں نے نکاح کرلیا اور باہر کی دنیا سے سارے رابطے ختم کرکے اپنے حجلۂ عروسی میں بند ہوگئے۔''

''پھر پتا کیسے چلا ان کی شادی کا......؟''

''نہ یہ بات چھپائی جا سکتی تھی، نہ وہ چھپانا چاہتے تھے۔ جو لوگ یہاں فون کرتے رہے انہیں فون مستقل بزی ملا، دولہا دلہن نے چونگا اٹھا کے نیچے رکھ دیا ہوگا۔''

میں نے کہا۔ ''یہ چونگا کیا ہوتا ہے، کس کے نیچے رکھا جاتا ہے؟''

''ابے فون کے ریسیور کو کہتے ہیں، تو چار دن ولایت میں کیا رہا ساری اردو بھول گیا نیکے پتر...... ویری بیڈ...... ہم لوگ تو اتنے فکرمند نہیں تھے، ٹینا کا باپ روز بیٹی کی خیر خبر معلوم کرتا رہتا تھا، اب وہ اسپتال میں اتنا مصروف ہوگیا ہے کہ اسے لاہور جانے کی فرصت نہیں تو فون سے کام چلاتا ہے، میں نے کہا کہ فون خراب ہوں تو اتنی جلدی ٹھیک ہوتے ہیں پاکستان میں...... لیکن ایک چیز ہے موبائل فون۔ ٹینا کا موبائل فون بھی ایک ہی جواب دے رہا تھا، رابطہ نہیں ہوسکتا، تین دن بعد مجھے لاہور جانے کا اتفاق ہوا تو ڈاکٹر مہدی حسن نے کہا کہ ادھر بھی ہوتے آنا، دیکھ لینا ٹینا ٹھیک ہے...... اب جو میں وہاں گیا، تو میرے سامنے پہلے آیا تیرا وہ ڈپلی کیٹ، قسم خدا کی، ایسی کاربن کاپی تو فلم والے بھی نہیں بناتے، آنکھیں ہی نہیں میرا دماغ بھی دھوکا کھا گیا۔ میں نے اسے پکڑ لیا اور گلے لگا کے خوب نچوڑا، مکے مارے اور گالیاں دیں کہ نیکے پتر، تو کب آیا۔ وہ بڑا چیخا چلایا کہ پاگل کے بچے میں وہ نہیں ہوں جو تم سمجھ رہے ہو، میں وحید ہوں...... لیکن یہ سمجھنے تک میں نے اس کا اچھا خاصا آم سے امچور بنا دیا تھا۔ اس کی فریاد و فغاں پر اس کی منکوحہ اندر سے دوڑی آئی اور اسے چھڑایا، میں نے بعد میں بہت معافی مانگی۔''

''تو نے جانتے بوجھتے ایسا کیا ہوگا راجا...... تو دھوکا کھانے والی چیز نہیں ہے۔''

وہ ہنسنے لگا۔ ''ہاں نیکے پتر، تھوڑی سی تفریح کے لیے میں نے ہی ڈراما کیا تھا۔ مجھے تو پتا تھا کہ تو لندن میں ہے، میں نے دل لگی کی تھوڑی سی، جانتے بوجھتے۔''

''اچھا فریق ثانی کی رپورٹ کیا ہے؟''

''وہی جو متوقع تھی، جیسے وہ تجھے دیکھ کے نارمل ہوگئی تھی۔ اب بالکل ٹھیک ہے اور بہت خوش...... جو نقل سے بہل جائے اس کی حالت اصل کو پا کے کیا ہوسکتی ہے...... لیکن اس کا باپ خوش نہیں ہے۔''

''کیوں؟ وہ کیوں خوش نہیں ہے۔ اس کی بیٹی ٹھیک ہوگئی۔''

''ہاں...... مگر اور جو کچھ ہوا، وہ اس کے خیال میں ٹھیک نہیں تھا...... یہ میں کہتا ہوں، اس نے یوں اکیلے بیٹھ کے نکاح پڑھوا لیا۔ باپ کو بلا لیتی یا بھائی کو تو کیا شان گھٹ جاتی، یہ خودغرضی ہے کہ آدمی اکیلا خوش ہولے۔ اپنی خوشی میں انہیں بھی شریک نہ کرے جو اپنے ہیں۔''

''بات تیری غلط نہیں ہے راجا...... لیکن وقت وقت کی بات ہے، ایک وقت تھا جب ٹینا کے باپ نے اپنی خوشی دیکھی، وحید اور ٹینا کو ملنے نہیں دیا۔ آج ٹینا کو موقع ملا تو لاشعوری طور پر اس نے باپ سے انتقام لیا، یا اس کو سزا دی یا خوف تھا اس کے دل میں کہ باپ پھر آڑے نہ آئے...... سب ٹھیک ہو جائے گا بعد میں......''

''ہاں...... باپ کو دوسرا صدمہ یہ ہے کہ وہ شرابی ہے، دن رات پیتا ہے اور ٹینا خود لا کے دیتی ہے۔''

''اس کی فکر اسے نہیں کرنی چاہیے، بیوی اگر سمجھے گی تو خود شوہر کو سدھار لے گی، وہ کوئی بے وقوف لڑکی نہیں' ڈاکٹر ہے۔ تیری باتوں سے ایسا لگتا ہے کہ ان کا ست بدھائی آنا مشکل ہے۔''

''ابھی کوئی چانس نہیں، بس تو خدا کا شکر ادا کر کہ تیری جان چھوٹ گئی، تیرا ارادہ ہے واپس آنے کا یا لندن نے ست بدھائی کو اسی طرح بھلا دیا ہے جیسے نور نے فریال کو۔''

''عورتوں کی طرح طعنے مت دے...... میں روز تجھے بتا رہا ہوں یہاں کے حالات کے بارے میں...... نور نے بہت کچھ سنبھال لیا ہے لیکن اب بھی بہت سے معاملات طے ہونا باقی ہیں۔''

''یار، میں مذاق کر رہا تھا، تو وہاں رہ مزے سے...... یہاں کے معاملات ٹھیک چل رہے ہیں، ابھی ہم نے کورٹ کے کیس بھی دبا دیے ہیں۔ ہمارے قانونی مشیر ساجد خان صاحب نے بھی کہا کہ اس میں دونوں فریقوں کا محض وقت اور پیسا ضائع ہوتا ہے، ایک چیز بچا لو...... یعنی پیسا خرچ کرو کیس دبانے میں تو وقت بچ جائے گا۔ وہ کہیں اور لگاؤ...... خود رانا کے کیمپ میں آج کل بڑی خاموشی ہے، ایک تو وہ بیمار ہے، پھر میں نے سنا ہے اسے کینسر قسم کی کوئی بیماری لگ گئی ہے جسے چھپایا جا رہا ہے۔''

''یہ تو بڑے افسوس کی بات ہے......''

''ہاں نیکے پتر...... دوستوں کے ساتھ دشمنوں کو بھی سلامت رہنا ہی چاہیے ورنہ دکھ نہ ہوں تو سکھ کا کیا مزہ۔''

''تجھے کس نے بتایا؟''

''غنی کی سیکریٹ سروس بہت ایکٹو ہے۔ ہوا یوں کہ بالواسطہ طور پر ایک رات ہمیں پیغام یہ ملا کہ رانا صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اگر کوئی قابل ڈاکٹر انہیں دیکھنے آ جائے تو مہربانی ہوگی اور جو فیس ہے وہ بھی دی جائے گی۔ ڈاکٹر احمد حسن نے کال وصول کی تھی، اس نے کہا کہ بات نہ فیس کی ہے اور نہ مہربانی کی۔ اسپتال ہم نے بنایا ہی بیماروں کے لیے ہے مگر بیمار یہاں آتے ہیں، اسپتال ان کے پاس نہیں جاتا۔''

''بالکل صحیح جواب دیا اس نے۔''

''میں نے بھی یہی کہا تھا، تھوڑی دیر بعد کسی نے کہا کہ نواب رفیق سے بات کرنی ہے، میں زوہیب بول رہا ہوں۔ میں نے کہا کہ نواب رفیق لندن میں ہیں۔ میں راجا بول رہا ہوں، فرمایئے آپ کی کیا خدمت کی جائے۔ وہ کہنے لگا کہ ابا جی بیمار ہیں، کیا میں انہیں آپ کے اسپتال میں لے آؤں اور داخل کرا دوں، میں چکر میں پڑ گیا کہ یہ کیا چکر ہے، میں نے کہا کہ یہ تو چھوٹا سا اسپتال ہے، رانا صاحب بہت بڑے آدمی ہیں پھر بھی ہم سے جو ہوگا کریں گے۔ یہ بتاؤ بیماری کیا ہے۔ داخل کرنے کا مسئلہ ہے تو پھر لاہور یا اسلام آباد جانے میں کیا قباحت ہے؟ اس نے خفگی سے کہا کہ تمہیں کیا بتاؤں، تم کوئی ڈاکٹر ہو۔ میں نے کہا کہ چلو ڈاکٹر مہدی حسن کو بتا دو، وہ سب سے سینئر ڈاکٹر ہیں۔''

''پھر......؟ بات کی اس نے......''

''نہیں...... لیکن وہ خاصا اپ سیٹ تھا اور میں نے سوچا کہ خدانخواستہ ایمرجنسی ہے۔ رانا صاحب کو ہارٹ اٹیک ہوا اور وہ یہاں آ کے مر گیا تو اس کا سارا الزام ہم پر آ جائے گا، ولی عہد ایشو بنا دے گا کہ میرے باپ کو مار ڈالا...... لیکن اس معاملے نے مجھے اتنا تجسس میں مبتلا کیا کہ میں نے غنی کی ڈیوٹی لگا دی اور اس نے جو پتا چلایا وہ یہی تھا کہ بیماری سنگین ہے مگر کسی کو کچھ پتا نہیں، سب چھپا رہے ہیں۔ رانا کو کمرے سے باہر آئے پندرہ دن ہوگئے...... یہ ہارٹ اٹیک نہیں

ہو سکتا۔ مخبر نے یہ ضرور کہا کہ شاید ان کو وہ بیماری ہے...... اس کا نام نہیں لینا چاہیے، یہ جاہل اور دیہاتی لوگ کینسر کا نام بھی لینے سے گریز کرتے ہیں۔''

راجا کی منطق میری سمجھ میں آ گئی۔ بہت پہلے ایسے ہی چیچک کا نام نہیں لیا جاتا تھا، اس سے پہلے لوگ پلیگ کے نام ڈرتے تھے۔ رانا کی عمر کافی تھی، دیگر امراض اپنی جگہ، عمر کے ساتھ جسم کی قوتِ مزاحمت کم ہوتی ہے تو کینسر بھی ہو سکتا ہے خصوصاً پراسٹیٹ کا...... ورنہ عموماً یہ موروثی مسئلہ سمجھا جاتا ہے۔

میں تمام معاملات کی طرف سے خاصا مطمئن تھا اور اب آخری کام میں ہاتھ ڈالنے کی سوچ رہا تھا یعنی کاروبار کا نام بدلنے کی...... مجھے معلوم تھا کہ اس سے کچھ نقصان بھی ہوگا، ہر پرانے نام کی ایک گڈول ہوتی ہے۔ یہاں ایک مسئلہ نسلی تعصب کا بھی تھا۔ ابھی تک ہمارے کلائنٹ وہی تھے اور کاروبار میں لارڈ ارنسٹ کے نہ ہونے سے کوئی رکاوٹ نہیں آئی تھی لیکن مجھے اندازہ تھا کہ پرانی فرم کو نیا نام دینے سے فرق پڑے گا، یہ شیرازی اینڈ کمپنی کیا ہے۔ اس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے یا نہیں...... یہ ہماری توقعات پر کس حد تک پورے اتریں گے؟ یہ لوگ کون ہیں۔ باصلاحیت ہیں یا نہیں...... ایسے بہت سے سوالات کے ساتھ نسلی تعصب بھی سامنے آئے گا۔ کچھ لوگ کہہ سکتے ہیں کہ ہم صرف لارڈ ارنسٹ سے تعلق بنا رہے تھے...... ہم کسی رفیق شیرازی کے ساتھ ہیں یا نہیں، اس کا فیصلہ وقت کرے گا۔ ایک برٹش مالک اور پاکستانی مالک کو ہم ایک جیسا کیسے سمجھ سکتے ہیں۔

لیکن اس سے پہلے کہ نام بدلنے کی یہ کارروائی شروع ہوتی ایک رات اچانک مجھے کسی خاتون نے کال کیا۔ ''یہ نمبر میرے لیے نیا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''ہیلو، آپ کو کس سے بات کرنا ہے؟''

جواب میں کہا گیا۔ رفیق...... میں سسٹر ایلیشا ہوں۔''

میں نے حیرانی سے کہا۔ ''ایلیشا...... سب خیریت ہے نا۔''

''یہ تم بتاؤ مجھے، جو اطلاعات مجھے مل رہی ہیں ان سے تو ایسا نہیں لگتا کہ خیریت ہے۔''

میں سنبھل گیا۔ ''میں سمجھا نہیں کیسی اطلاعات اور کون پہنچا رہا ہے تم تک یہ اطلاعات۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ اطلاع دینے والا کون ہے۔''

''دنیاداری ترک کر دینے کے بعد تمہیں یقیناً فرق نہیں پڑنا چاہیے کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے اور کیوں......''

''لیکن جب لوگ میرے پاس آ کے فریاد کریں گے کہ تم ایک ایک کر کے پرانے وفاداروں کو نکال رہے ہو تو کیا مجھے دکھ نہیں ہوگا؟''

''میرے خیال میں تمہیں بالکل دکھی نہیں ہونا چاہیے کیونکہ میں محسوس کر رہا ہوں اس سے تمہارا اب کوئی تعلق نہیں، اگر میں اپنے اختیارات کا استعمال کروں تو کسی کو بھی پریشانی کیوں ہو۔''

وہ برہمی سے بولی۔ ''رفیق، مت بھولو کہ یہ سب اختیارات تمہیں میری وجہ سے حاصل ہیں۔''

میں نے غصے کو قابو میں رکھا۔ ''نہیں سسٹر ایلیشا، یہ آپ کی غلط فہمی ہے۔ یہ اختیارات مجھے آپ کے والد لارڈ ارنسٹ نے قانونی طور پر منتقل کیے تھے...... انتقال سے پہلے......''

''اس لیے کہ میں نے ان کو مجبور کیا تھا۔''

''پھر اب پریشانی کیسی...... جو ہونا تھا ہو گیا، تم انہیں باغِ جنت سے واپس بلوا کے نیا وصیت نامہ نہیں لکھوا سکتیں۔''

''مجھے بہت دکھ ہو رہا ہے تمہارے اس خود غرض رویے پر۔''

''سسٹر ایلیشا...... خدا سے لو لگاؤ، میں تو خود چل کے تمہارے پاس آیا تھا کہ اپنا حق مجھ سے لے لو۔''

''اور اگر میں آج تمہاری بات مان لوں۔''

''تمہیں پتا ہے تم کیا کہہ رہی ہو؟ کیا تم چرچ سے اتنی جلدی اکتا گئی ہو......؟ واپس اسی دنیا میں آنے کا سوچ رہی ہو۔ یہ بڑے گناہ کی بات ہوگی اور اس کے علاوہ...... کل کی بات کل کے ساتھ تھی، آج کے حقائق بہت مختلف ہیں۔''

''یعنی تم انکار کر رہے ہو۔''

''جو چاہو سمجھ لو، کل تم نے خود انکار کیا تھا۔''

''تم وہ محل بھی فروخت کرنے کا ارادہ رکھتے ہو جو میرے والد کے خاندانی وقار کی نشانی تھا۔''

''آدمی مٹی میں مل جاتا ہے تو دنیاوی وقار کا کیا ہے، یہ سب پتھر کی عمارتیں ہیں جن کے مالک بدلتے رہتے ہیں۔''

''خدا کے لیے ایسا مت کرو، مجھے سائمن نے اطلاع دی ہے کہ تم اصطبل کو بھی بیچ رہے ہو، تمہیں پیسے کی کوئی ضرورت تو نہیں ہے۔''

''پیسا انسان کی سب سے بڑی ضرورت ہے سسٹر ایلیشا۔''

''تم ہو نا وہی پست سوچ رکھنے والے انڈین...... میرے والد نے بہت بڑی غلطی کی یہ سب کچھ تمہیں سونپ کر۔''

''دعا کرو اللہ ان کی ہر غلطی معاف کرے۔'' میں نے کہا اور فون بند کر دیا، مجھے دکھ بھی تھا افسوس بھی اور غصہ بھی...... اور میں ایک خطرہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ جلد یا بدیر ایلیشا چرچ چھوڑ کر واپس آئے گی۔

فون کی گھنٹی پھر گنگنانے لگی...... نمبر وہی تھا...... میرا جی

چاہا کہ کال ریسیو کر کے ساری گفتگو ریکارڈ کرلوں اور اس سے وہ سوالات کروں جن کا جواب بعد میں خود اس کے لیے باعث شرمندگی ہو...... قانونی مسائل پیدا کرے لیکن پھر خود مجھے اپنے اس خیال پر ندامت محسوس ہوئی...... ایلیشا ذہنی طور پر الجھی ہوئی اور ڈیپریشن کا شکار تھی۔ اگر وہ نارمل ہوتی تو نہ باپ اسے حق وراثت سے محروم کرتا اور نہ وہ ترک دنیا کا مشکل فیصلہ کرتی...... باپ کو یقین ہوگا کہ اتنی بڑی بزنس ایمپائر کو ایلیشا سنبھال نہ پائے گی...... جو خود کو نہ سنبھال سکے اس سے کیا امید رکھی جا سکتی ہے...... ایلیشا میں اس کی صلاحیت تھی لیکن مسلسل جذباتی حادثات و صدمات...... ماں باپ کی عدم توجہی' دولت کی فراوانی کے ساتھ بے لگام آزادی جس نے اسے ضدی اور خودسر بنا دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ گھر میں اس کی ہر جائز ناجائز بات بلا تامل مان لی جاتی تھی۔

لیکن اصل خرابی آدمی کے اندر ہوتی ہے...... تمام دولت مندوں کی اکلوتی اولادیں ایسی بگڑی ہوئی نہیں ہوتیں...... نہ مفلسی میں پروان چڑھنے والے تمام بچوں کو احساس محرومی یا انتقامی جذبہ چور ڈاکو بناتا ہے...... مثالیں اس کے برعکس زیادہ ملتی ہیں...... ایلیشا ماں کی طرح جذباتی طور پر کمزور تھی...... باپ کے جیسی ہوتی تو کوئی حادثہ اس کی شخصیت کو توڑ پھوڑ نہیں سکتا تھا۔

صبح تک میرا یہ یقین راسخ ہو چکا تھا کہ ایلیشا بہت جلد واپس دنیاداری کی طرف لوٹ کے میرے خلاف کھڑی ہوگی اور مجھ سے قانونی طور پر اپنا سب کچھ واپس مانگ لے گی...... قانون میں اس کی کوئی گنجائش نہ تھی لیکن وہ عام لوگوں کی حمایت اور جذباتی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے میرے خلاف مہم چلا سکتی تھی...... مجھے غاصب...... دھوکے باز...... ایکٹر...... سب کچھ ثابت کر سکتی تھی...... نسلی طور پر تو میں قابل نفرت تھا ہی...... وہ بطور انسان بھی مجھے شیطان سے زیادہ نفرت کے قابل بنا سکتی تھی۔

میں نے نور سے اور پھر راجا سے مشورہ کیا اور آخر میں سوشی سے...... وہ سب میرے ساتھ تھے اور اس بات پر متفق تھے کہ اب رول بیک کرنا بالکل ناممکن ہے...... لارڈ ارنسٹ کی فرم کا نام اور انتظامی ڈھانچا تک بدلا جا چکا تھا اور مستقبل کے کاروباری تعلقات نئے سرے سے استوار ہو چکے تھے...... اس سے بھی بڑی بات یہ تھی کہ ایلیشا طبی اور ذہنی طور پر اس قابل بھی نہ تھی کہ ایک شعبہ تک کی نگرانی کر سکے۔

جب مجھے اطلاع ملی کہ کمپنی کا سابق مشیر آرنلڈ مجھ سے ملنے آیا ہے تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ اب کیا بات کر سکتا ہے...... اور ایسا ہی ہوا...... مہمانوں کے کمرے میں بیٹھنے کے بعد اس نے تحمل اور بردباری سے کہا۔ ''مسٹر رفیق! میں ایلیشا کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔''

''مجھے معلوم ہے آپ کیا کہیں گے...... اس نے کل رات مجھ سے فون پر کافی دیر بات کی تھی......'' میں نے کہا۔

''ہو سکتا ہے کہ آپ کا اندازہ غلط ثابت ہو جائے...... یو سی...... میں ارنسٹ کا مشیر ہی نہیں دوست بھی تھا بلکہ دوست پہلے تھا...... مشیر بعد میں...... وہ مجھ پر جتنا اعتماد کرتا تھا...... کسی اور پر نہیں کرتا تھا...... اپنی بیوی پر بھی نہیں...... یہ بات میں دعوے کے ساتھ کہتا ہوں...... اس نے تمہیں وارث بنانے سے پہلے مجھ سے پوچھا تھا اور ہماری گفتگو صرف ایک سیشن تک محدود نہیں تھی...... پہلے میں نے اس خیال کی سخت مخالفت کی...... پھر اس نے ایلیشا کی موجودگی میں ثابت کیا کہ میں غلط تھا...... میں نے ڈاکٹرز سے اور ماہرین نفسیات سے بھی بات کی...... اور بالآخر قائل ہو گیا کہ ارنسٹ بہت پریکٹیکل تھا...... اس کے سامنے امید کا واحد راستہ تم تھے۔''

''کس بنیاد پر آرنلڈ؟''

''ایلیشا کو دنیا کا کوئی ماہر نفسیات ڈاکٹر یا روحانی علاج کرنے والا ٹھیک نہیں کر سکتا...... ارنسٹ کو صرف تم سے امید تھی...... تم دونوں کام کر سکتے تھے...... اس کے بزنس کو بہتر طور پر سنبھال سکتے تھے...... اور اگر چاہو تو ایلیشا کو بھی...... شاید وہ خود تم سے کہتا کہ مجھ پر ایک احسان کرو...... ایلیشا کو اپنا لو اور وہ ٹھیک ہو جائے...... خود تمہیں بھروسا ہو کہ اب وہ کاروبار کو چلا لے گی...... تو تمہاری مرضی...... دونوں کو چھوڑ کے جاؤ...... میں نے کہا کہ لارڈ یہ اب ناممکن ہے...... رفیق کے پاس انڈیا...... سوری...... پاکستان میں اس سے بڑی ذمے داری ہے...... وہ یہاں رک نہیں سکتا...... اور ایلیشا سے شادی کا تو سوال ہی نہیں...... ایک تو اس کے نارمل ہونے میں بہت وقت لگے گا...... ایلیشا کی موجودہ ذہنی کیفیت کے ساتھ کوئی بھی رفیق جیسا شخص اپنی زندگی کو داؤ پر نہیں لگا سکتا...... وہ کسی اور کو چاہتا ہے...... ایلیشا اسے برداشت نہیں کرے گی...... مختصر یہ کہ ناممکن...... اس کے باوجود لارڈ نے کہا کہ میں چانس لوں گا...... کوشش ضرور کروں گا...... کیا پتا جو ناممکن ہے وہ ممکن ہو جائے...... کاروبار کو میں نے اپنی اولاد کی طرح پالا ہے...... بڑھتے دیکھا ہے...... اب اسے بیچنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں...... ایلیشا کے ہاتھ میں دولت آئے گی تو لٹیرے ہر طرف سے یلغار کریں گے اور وہ خود کو بچانے سے زیادہ تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہے...... لارڈ تم سے کچھ نہ کہہ سکا۔

''وہ کہتا تو میں معذرت کے ساتھ انکار کر دیتا۔''

''وہ جانتا تھا، چنانچہ اس نے تمہیں سوچنے کی مہلت بھی نہیں دی...... بس فیصلہ کیا اور دنیا سے چلا گیا...... رات ایلیشا نے مجھ سے کہا کہ وہ چرچ چھوڑنا چاہتی ہے اور اپنے حق وراثت کے لیے کیس کرنا چاہتی ہے...... میں نے اسے سمجھایا کہ اب یہ ناممکن ہے...... جب تک کہ رفیق خود تمہیں سب کچھ نہ لوٹا دے۔''

''اور آپ یہ درخواست لے کر آئے ہیں کہ میں ایسا کروں؟''

وہ مسکرایا۔ ''اس کے برخلاف...... میں یہ سمجھانے آیا ہوں کہ ایسا سوچنا بھی نہیں...... تم بالکل ٹھیک جا رہے ہو...... اور ایلیشا جو کر رہی ہے غلط ہے...... جذباتی ہونے کی بالکل ضرورت نہیں...... اپنا کام اپنے پروگرام کے مطابق کرتے رہو، ایلیشا کو اب شاک ٹریٹمنٹ کی ضرورت ہے، ذہنی امراض میں الیکٹرک شاک آخری تکلیف دہ علاج ہوتا ہے جب دوائیں اور مشورے کام نہ کریں۔ ایک بے وقوفی وہ کر چکی...... اب چرچ چھوڑ کے مزید رسوا ہوگی، ہونے دو...... قانونی جنگ لڑے گی، لڑنے دو، ہر جگہ شکست اور مایوسی اس کا مقدر ہے اور اس کا علاج بھی...... جو اس کے دوست بنتے تھے اب اسے ٹھکرائیں گے، وہ خوار ہوگی اور آخر میں تمہارے پاس آئے گی، روئے گی اور تمہارے قدموں میں سر رکھ دے گی، اسے ٹھکرا دینا۔''

میں نے کہا۔ ''آرنلڈ...... وہ خودکشی بھی کر سکتی ہے۔''

''یس...... یہ رسک ہے، ففٹی ففٹی چانس ہے کہ شاک ٹریٹمنٹ اسے ٹھیک کر دے، اسے حقائق کی دنیا میں واپس لے آئے، ٹھوکریں کھا کے زندہ رہنے کا طریقہ سیکھ لے، اسے ایسا آتا ہے، وہ سب کچھ کر سکتی ہے، اچھا اب میں چلتا ہوں، مجھے ایلیشا نے تمہارے پاس بھیجا تھا، اس لیے میں آ گیا، لیکن میں نے وہ نہیں کہا جو وہ چاہتی تھی، وہ کیا جو اس کے حق میں بہتر ہے۔''

میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ ''ہم دونوں اس کے خیرخواہ ہیں اور آپ کی ہر کوشش میں، میں بھی آپ کے ساتھ ہوں، میری بھی خواہش ہے کہ میں اس کی امانت اسے لوٹا دوں، وہ اس قابل ہو جائے اور تب تک اس کی حفاظت کروں، بہتری کے لیے......''

آرنلڈ کے رخصت ہونے کے کچھ دیر بعد مجھے گھوڑوں کے اصطبل کے نگراں سائمن نے فون کیا۔ ''سر، ڈیوک آف انٹرشائر آپ سے ملاقات کے خواہاں ہیں۔''

''کس سلسلے میں...... اور یہ صاحب ہیں کون......؟''

''میں نے عرض کی تھی، وہ لارڈ ارنسٹ کے مقابلے میں اپنے گھوڑے دوڑاتے تھے، ایک مکمل جنٹلمین...... خاندانی آدمی...... جو لارڈ کے بہترین دوست ہیں۔''

''مجھے یاد آ گیا، وہ گھوڑے لینا چاہتے ہیں؟''

''یس سر...... اگر آپ فارغ ہیں تو ابھی چلے آئیں، ڈیوک نے کہا ہے کہ وہ آپ کی خدمت میں بلینک چیک پیش کریں گے، رقم آپ اپنی مرضی سے بھر لیں...... اور اصطبل ان کے نام کر دیں۔''

''یہ بات ہے تو میں آتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

نور آفس جا چکی تھی اب میرے لیے یہی بہتر تھا کہ میں باہر کے قضیے نمٹا دوں۔ میں اس گاڑی کے واپس آنے کا انتظار بھی کر سکتا تھا جس میں ایک مسلح سیکیورٹی گارڈ ہمیشہ موجود رہتا تھا لیکن میں خود ہی دوسری گاڑی لے کر نکل پڑا۔ آدھے راستے میں سوشی نے مجھے فون کر کے بتایا کہ وہ بروکر جو ارنسٹ مینشن کے لیے کسٹمر تلاش کر سکتا ہے ملاقات کے لیے وقت چاہتا ہے، میں نے اسے شام کا وقت دے دیا۔

راستہ میرا دیکھا بھالا تھا۔ پینتالیس منٹ کی ڈرائیو کے بعد میں فارم ہاؤس پہنچ گیا۔ اس کا گیٹ بند تھا۔ میں نے کئی بار ہارن دیا مگر کوئی گیٹ کھولنے نہ آیا تو میں خود نیچے اتر آیا۔ اسی وقت چاروں طرف چھپے ہوئے بہت سے لوگ نکل آئے، ایک نظر میں مجھے ان کی تعداد کا اندازہ نہ ہو سکا۔

وہ ایک دم مجھ پر جھپٹ پڑے۔ انہیں اندازہ تھا کہ مجھے مہلت دی تو میں مقابلے پر ڈٹ جاؤں گا۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں ریوالور بھی تھا۔ چار نے میرے بازو جکڑ لیے، پھر پیچھے سے کسی نے میرے سر پر ڈنڈا یا بیٹ مارا، ضرب اتنی شدید تھی کہ میری نظروں سے دنیا اوجھل ہو گئی۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں ایک کمرے کے فرش پر پڑا تھا...... میرے جسم پر کپڑے کے نام پر ایک دھاگا بھی نہیں تھا، چھت سے لٹکے ہوئے بلب کی روشنی میں مجھے ایک دروازے پر کھڑا ہوا مسلح شخص نظر آیا، دوسرا میرے قریب کرسی ڈالے بیٹھا تھا۔

میں آہستہ آہستہ اٹھا کیونکہ میرا سر میرے کندھوں پر ایک چٹان سے زیادہ وزنی ہو رہا تھا۔ ''میں...... میں کہاں ہوں؟'' میں نے پوچھا۔

کرسی پر بیٹھا ہوا شخص آگے جھکا۔ ''پہلے یہ بتاؤ کہ تم کون ہو؟ کیا نام ہے تمہارا......؟''

میں نے بہت سوچا۔ کون ہوں میں، لیکن مجھے اپنا نام بالکل یاد نہیں آیا۔

گیٹ کے پاس جو شخص کلاشنکوف نما کوئی آتشیں اسلحہ تھامے بے نیازی سے کھڑا تھا، وہ ایک بے مصرف کھیل میں مصروف تھا۔ وہ اپنی گن کو ایک ہاتھ سے اوپر اچھالتا تھا۔ پھر دوسرے ہاتھ سے اس کو اسی گرفت میں لینے کی مہارت پر خوش ہوتا تھا۔ سر کا سامنے والا نصف حصہ اس نے استرا پھیر کے یا پھروا کے صاف کر رکھا تھا۔ پچھلے نصف حصے میں لمبے لمبے بال تھے جو پیچھے کی طرف اس کی گردن سے نیچے تک جاتے تھے۔ انہیں اس نے سر کے درمیان ایک سلور بینڈ سے باندھ رکھا تھا۔ وہ دبلا پتلا اور مختصر قد کا جوکر ٹائپ شخص تھا اور طوطے کی چونچ جیسی ناک کے ساتھ مزید مضحکہ خیز لگتا تھا...... اس نے دھاری دار ٹی شرٹ اور پیلے رنگ کی پتلون پہن رکھی تھی۔

کلاشنکوف کو ہوا میں پکڑنے کا مظاہرہ پانچویں چھٹی کوشش میں ناکامی سے دوچار ہوا۔ کلاشنکوف بڑی آواز کے ساتھ فرش پر گری اور جوکر نے اسے لپک کے یوں اٹھایا جیسے وہ اس کا شیر خوار بیٹا تھا جسے وہ ہوا میں اچھال کے کھیل رہا تھا اور اتنی ہی تشویش کے ساتھ اس کا معائنہ کرنے لگا۔

میرے قریب بیٹھے ہوئے شخص نے قہقہہ لگا کے کہا۔ ''یہ تو اپنا نام بھی بھول گیا...... ابے سوچ بھوتنی کے...... کون ہے تو......؟''

اس وقت تک میرا دماغ کام کرنے لگا تھا اور مجھے سب کچھ یاد آ گیا تھا لیکن اچانک ذہن میں آنے والے ایک خیال کے تحت میں سوال کرنے والے کو خالی خالی نظروں سے دیکھتا رہا...... ''نام...... کیا ہے میرا...... نام؟''

کلاشنکوف اچھالنے والا اب مطمئن ہو گیا تھا کہ اس کے لاڈلے ہتھیار کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچا...... تاہم اس نے اپنا کھیل بند کر دیا تھا اور دلچسپی سے میری طرف دیکھ رہا تھا...... اس نے قہقہہ لگا کے کہا۔ ''ابے تیرا نام ہے شاہ رخ خان...... ٹھیک کہہ رہا ہوں نا میں...... سالے ایکٹر......''

میرے قریب بیٹھا ہوا شخص زیادہ عمر کا بھاری بھر کم آدمی تھا۔ وہ چہرے سے بھی زیادہ سفاک لگتا تھا...... اس کا چہرہ چوڑا اور پُرشکن تھا، بالکل کسی بوڑھے بل ڈاگ کی طرح...... وہ سانس لیتے ہوئے غراتا بھی تھا...... اس کی آنکھوں میں لالی تھی اور آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے تھے۔ اس نے ڈھیلی ڈھالی سیاہ ٹی شرٹ کے ساتھ جینز کی پتلون پہن رکھی تھی۔ ٹی شرٹ پر ایک ننگی عورت کی تصویر تھی جو بڑے فخر کے ساتھ اپنے جسم کے قابل دید حصوں کو نمایاں کر کے پیش کر رہی تھی...... ظاہر ہے حسن میں اس کے لیے شرم کی کوئی بات ہی نہیں تھی۔

بل ڈاگ نے مجھے ایک لات رسید کی...... ''تو بڑا تیس مار خان ہے نا...... آ جا مقابلے پر تیری تو......''

میں نیچے گرا۔ اس کی لات میرے کندھے پر لگی تھی۔ یہ کسی پروفیشنل کی کک ہوتی تو میرے شانے کی ہڈی ٹوٹ جاتی لیکن بقول علامہ اقبال...... کافر ہو تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسا...... ان کی ساری طاقت اس آتشیں اسلحے میں تھی جس کا رخ وہ میری طرف کر چکا تھا...... میرے شانے میں چوٹ سے درد ضرور ہو رہا تھا لیکن وہ قابل برداشت تھا مگر میں نے چہرے کے تاثرات اور آہ و بکا سے یہ ظاہر کیا جیسے واقعی میرے بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی ہو۔

مجھے گرفتار کر کے اپنی قید میں رکھنے والے گورے بدمعاش نہیں تھے۔ اپنے ہی ہم زبان تھے...... پاکستانی یا انڈین...... لہجہ گواہی دیتا تھا کہ وہ انڈین ہوں گے، یہ خاصی حیرانی کی بات تھی کہ فارم ہاؤس کے گیٹ پر وہ میرا انتظار کر رہے تھے۔ مجھے وہاں بلانے والا اصطبل کا نگران سائمن تھا جس نے کہا تھا کہ ڈیوک آف کنٹر شائر مجھے ریس کے گھوڑوں کی منہ مانگی قیمت دینے کے لیے تیار ہیں اور ادائیگی ایک سادہ چیک سے کریں گے اور اس میں رقم میں اپنی مرضی سے بھروں گا۔

ظاہر ہے یہ سب بکواس تھی...... سائمن خود مجھ سے سخت ناخوش تھا لیکن یہ ہو سکتا تھا کہ کسی نے سائمن کی آواز بنا کر مجھے بلایا ہو۔ میں صرف ایک بار سائمن سے ملا تھا مجھے آواز کی شناخت میں دھوکا ہو سکتا تھا تاہم زیادہ امکان یہی تھا کہ اس نے سازش کی یا وہ کسی سازشی ٹولے کے ساتھ مل گیا، بعد میں وہ بیان حلفی بھی دے سکتا تھا کہ اس نے مجھے کوئی فون نہیں کیا تھا، اس کے اور میرے درمیان ہونے والی گفتگو کسی نے بھی نہیں سنی تھی لیکن کسی بھی فون کال کو ٹیپ کر لینا مشکل نہیں ہوتا۔

اگر کچھ لوگ میری نقل و حرکت اور معمولات کی نگرانی کر رہے تھے تو انہوں نے فوراً سب کو بتا دیا ہو گا کہ موقع اچھا ہے...... شکار اکیلا ہے۔ کوئی مسلح محافظ ساتھ نہیں اور جہاں اسے پکڑا جا سکتا ہے وہاں دیکھنے والا بھی کوئی نہیں ہو گا۔

بل ڈاگ نے آگے جھک کر میرا شانہ ہلایا۔ ''کیا بہت درد ہو رہا ہے......''

میں نے کراہ کے کہا۔ ''ہاں...... کہیں ہڈی نہ ٹوٹ گئی ہو......''

رابن نے کہا۔ ''بڑی ڈھیٹ ہڈیاں ہیں تیری...... ایسے ٹوٹنے والی نہیں ہیں۔''

استاد نے کہا۔ ''ابھی تو کچھ ہوا ہی نہیں بیٹے۔''

میں نے کہا۔ ''آخر کیا چاہتے ہو تم لوگ...... کیوں لائے ہو مجھے یہاں؟''

رابن نے ہنس کے کہا۔ ''ابے ہم کہاں سے لائے ہیں، تو پیدا ہی یہاں ہوا تھا......''

استاد نے اپنے سخت بڑے سائز کے شکنجے جیسے ہاتھ سے میرا چہرہ یوں پکڑ لیا کہ ایک طرف سے چار انگلیاں اور دوسری طرف سے اس کا انگوٹھا میرے گالوں میں گڑ گیا۔ ''ہاں بول...... شاباش...... نام کیا ہے تیرا۔''

میں اسے خالی خالی خوفزدہ نظروں سے دیکھتا رہا۔ میرے خالی الذہن ہونے کی اداکاری سے وہ کچھ کنفیوز اور پریشان نظر آنے لگا تھا۔ میں نے اس کھیل کو جاری رکھنے کا فیصلہ کیا اور یہ ظاہر کیا کہ میں سوچ رہا ہوں۔ ''نام...... کیا نام ہے میرا......'' میں نے جیسے خود سے کہا۔

''ہاں...... سوچ، تجھے یاد آ جائے گا۔''

میں نے بے وقوفوں کی طرح کہا۔ ''شاہ رخ خان...... یہی نام ہے میرا...... ہاں۔''

استاد کا ہاتھ بڑی تیزی سے حرکت میں آیا اور منہ پر لگنے والے تھپڑ نے مجھے گرا دیا۔ ''تو شاہ رخ خان ہے......'' اس نے مجھے ایک گالی دی۔

رابن کو بلا وجہ ہنسنے کی عادت تھی۔ ''دیکھا استاد...... کتنی جلدی مان گیا۔''

استاد کی نظر مجھ پر جم گئی۔ ''یار کیوں مذاق کرتا ہے۔ چل نام بتا اپنا۔''

میں نے دائیں ہاتھ سے پیشانی کو رگڑا۔ ''اگر شاہ رخ خان نہیں...... تو پھر وہ ہو گا، جو تم نے کہا تھا...... تیس مار خان۔'' ایسا لگتا تھا کہ میری اداکاری کامیاب جا رہی ہے۔ رابن کی ہنسی تھم گئی تھی اور استاد بھی کچھ متفکر نظر آنے لگا تھا۔ ''نہیں...... یہ تیرا نام نہیں ہے، دماغ پر زور دے یاد آ جائے گا۔''

رابن نے تجویز پیش کی۔ ''استاد ایسے یہ کچھ نہیں بتائے گا، ترکیب نمبر گیارہ آزما کے دیکھو، مرچوں کی دھونی دو الٹا لٹکا کے۔''

استاد نے بے خیالی میں کہا۔ ''اس سے کیا ہو گا؟''

''اللہ قسم بڑے بڑے جن اس سے اتر جاتے ہیں، دس سال نوکری کی ہے پولیس کی...... پتھر کے بت سے اعتراف جرم کرا تا آتا ہے۔''

''بکواس مت کر...... مجھے لگتا ہے کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے۔'' رابن قریب آ گیا۔ ''ایسے ڈرامے بہت دیکھے ہیں میں نے، سالے قتل کر کے آتے تھے اور پاگل بن جاتے تھے، ایک رات میں ان کی عقل واپس آ جاتی تھی...... تم مجھے ایک موقع دو۔''

استاد کچھ تذبذب کا شکار تھا کہ اپنی عقل پر بھروسا کرے یا رابن کی مانے...... بالآخر اس نے رابن کو ترکیب نمبر گیارہ استعمال کرنے کی اجازت دے دی۔ ''دیکھ...... اگر یہ مر گیا تو تیرے بیوی بچوں کا قیمہ کر کے سیخ کباب بنا دوں گا اور تجھے کھلاؤں گا۔''

ترکیب نمبر گیارہ محض ایک اصطلاح تھی...... اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ کوئی ترکیب نمبر دس بھی ہو گی، جب رابن نے میرا چارج لیا تو میرے لیے صورت حال کو الٹ دینا مشکل نہ تھا، استاد کا ریوالور پہلے ہی اس کی جیب میں چلا گیا تھا اور وہ رابن کی کلاشنکوف پر بھروسا کر رہا تھا۔ اب وہ پھر اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔ اس وقت میں ایک جست میں رابن سے اس کی کلاشنکوف چھین لیتا تو دس سیکنڈ میں ان دونوں کے پھڑکتے جسم فرش پر اپنے ہی خون میں غلطاں نظر آتے لیکن میں نے جوش کو ہوش پر غالب نہیں آنے دیا، میرا یہ بات یقینی تھی کہ مجھے اس زنداں میں لا کے قید میں رکھنے والے دو ہی افراد نہیں ہوں گے، اس دیوار کے بعد اور کتنی دیواریں ہوں گی اور کتنے دشمن ہوں گے' اس کا مجھے کوئی اندازہ نہ تھا، میں تو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ یہ کمرا زمین کی کتنی گہرائی میں ہے یا کتنی بلندی پر۔

جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا، رابن کا اصل نام رابندر ناتھ تھا، وہ بھگوان کی سوگند کے بجائے قسم اللہ کی کہتا تھا تو یہ محض ایک عادت تھی جیسے اکثر ہندو انشاءاللہ یا خدا خیر کرے جیسے جملے استعمال کرتے ہیں۔ مجھے اس کمرے میں دن رات کا اندازہ کرنا مشکل تھا کیونکہ وہاں بجلی کی مصنوعی روشنی تھی، وقت کا یا تاریخ کا اب کیا پتا چلتا، قید میں ذہنی اذیت دینے کا یہ مروجہ طریقہ ہے۔ میرے ہاتھ پر سے گھڑی بھی اتار لی گئی تھی اور میں یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ مجھے وہاں ایک دن پہلے لایا گیا تھا یا ایک ہفتے پہلے...... بے ہوشی اتنی طویل نہیں ہوتی لیکن دواؤں اور انجکشنوں سے کسی کو مسلسل سلائے رکھنا کوئی مشکل نہیں ہوتا۔

ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میری یادداشت کھو دینے والی ٹرک کس حد تک معاون ثابت ہو گی، جاننے والے

صرف ایک انجکشن لگا کے معلوم کر لیتے ہیں کہ یہ ڈراما ہے یا حقیقت...... بظاہر سو جانے والے سے کہا جاتا ہے کہ وہ الٹی گنتی کرے اور وہ سوتے میں بولنے والے کی طرح گنتی سنا دیتا ہے۔

رابن نے دروازہ کھول کے نہ جانے کس کو پکارا، دو اور ایشیائی اندر آ گئے، وہ باہر گئے اور دوبارہ آئے تو ان کے ہاتھ میں نائلون کی مضبوط رسی تھی، انہوں نے میرے دونوں پیروں کو جوڑ کر باندھ دیا۔ رسی میرے ٹخنوں سے اوپر پنڈلی میں گڑسی گئی تھی۔ انہوں نے مجھے فرش پر یوں گھسیٹا جیسے میں بے جان چیز ہوں یا کسی جانور کی لاش۔ پتھریلے فرش پر میری کمر اور کہنیاں چھل کے زخمی ہو گئیں لیکن سر کو میں نے تھوڑا سا اٹھا کے ضربات سے بچائے رکھا۔ عین وسط میں پہنچ کے ان میں سے ایک نے بڑی مہارت کے ساتھ رسی کو اوپر پھینکا اور ایک پنکھے میں پھندا ڈال دیا۔ پھر ان دونوں نے زور لگا کر کھینچا تو میں یوں فضا میں بلند ہو گیا کہ میرا سر نیچے کی طرف تھا، بکرا ذبح کرنے کے بعد قسائی اسے کھال اتارنے کے لیے ایسی ہی مہارت سے لٹکاتے ہیں۔

استاد محترم نے رحم دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے ایک اور موقع دینے کا فیصلہ کیا۔ اس نے میرے قریب آ کے یہ کہا۔ ''رفیق احمد کو جانتا ہے تو......؟''

میں نے طے کر لیا تھا کہ اب جو ہو سو ہو...... ڈراما شروع کیا ہے تو اتنی جلدی ہمت نہیں ہارنی چاہیے۔ ''رفیق احمد......کون ہے......؟''

''ایک نواب ہے سالا......''

کہاں کا نواب ہے۔'' میں نے کراہ کے کہا۔

''ست بدھائی کا، یہ نام پہلے کبھی سنا ہے؟''

میں نے فریاد کی۔ ''میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں، مجھے کچھ یاد نہیں۔''

اب بلاوجہ ہنسنے والا رابن بھی سیریس ہو رہا تھا۔ ''استاد اسے تو واقعی کچھ یاد نہیں، کیوں بے بھوت کے بچے، کیا ہوا تھا تیرے ساتھ......''

''کیا ہوا تھا......؟'' میں نے کہا۔

''ابے تو یہاں کیسے آ گیا۔''

''خدا کے لیے، آخر تم مجھے بتاتے کیوں نہیں، کون ہو تم لوگ...... کیا چاہتے ہو؟ یہ ظلم کیوں کر رہے مجھ پر، بتا کیوں نہیں دیتے کہ میں کون ہوں، یہاں کیسے آیا۔''

رابن سر ہلانے لگا۔ ''اس کی یادداشت تو سچ مچ چلی گئی ہے۔ جیسے کہ فلموں میں ہوتا ہے۔''

''اس کے سر پر ڈنڈا کس ...... نے مارا تھا۔'' استاد نے درمیان میں ایک گالی فٹ کر دی۔

رابن پیچھے ہٹا۔ ''میں...... میں نے...... مگر مجھے کیا پتا تھا استاد اور تم نے ہی کہا تھا کہ گولی مت چلانا۔ اسے ناک آؤٹ کر کے اٹھانا ہے۔''

''چوٹ غلط پڑ گئی۔'' استاد فکرمند ہو گیا۔

''استاد...... ایک ڈنڈا اور مار دوں اس کے سر میں۔ کئی فلموں میں دیکھا ہے میں نے...... ایسے یادداشت واپس آ جاتی ہے۔''

استاد نے اسے درجن بھر گالیوں کے ساتھ دھکے دیے۔ ''فلموں نے دماغ خراب کر دیا ہے تیرا۔ ابے ہم جواب کیا دیں گے؟''

الٹا لٹکے لٹکے میری حالت غیر ہونے لگی تھی۔ میں ہاتھ سے رسی پکڑ کے اپنا سر اٹھانے کی کوشش میں مصروف تھا لیکن اس سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہو رہا تھا۔ میرا سارا خون کھنچ کر میرے سر میں جمع ہو رہا تھا اور میری آنکھوں میں دباؤ اتنا بڑھ گیا تھا کہ لگتا تھا وہ اپنے حلقے سے نکل جائیں گی۔

میں نے شور مچانا شروع کیا۔ ''خدا کے لیے رحم کرو مجھ پر۔ میں مر جاؤں گا۔ میں نے کیا بگاڑا ہے تمہارا۔''

استاد نے کہا۔ ''رابندر ناتھ...... اپنا کام کر' پہلے ہی بہت ٹائم ضائع ہو چکا ہے۔ ابھی کوئی آ جائے گا۔''

رابن نے میرے سر کے نیچے ایک ہانڈی لا کر رکھی۔ اس میں سے دھواں اٹھ رہا تھا اور میں اس کے اندر دہکتے انگارے دیکھ سکتا تھا۔ اس نے ہانڈی عین میرے سر کے نیچے رکھ دی اور جیب میں سے کچھ نکال کر انگاروں پر پھینک دیا۔ دھوئیں کے ساتھ سخت بدبو اٹھی اور مرچوں جیسی دھانس۔ میں دھوئیں کو کب تک سانس روک کے پھیپھڑوں میں نہ جانے دیتا۔

سانس لیتے ہی میرے دماغ کو زبردست جھٹکا لگا اور مجھے حلق میں شدید جلن اور خراش کے ساتھ کھانسی آئی۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے نتھنوں میں مرچوں کا پیسٹ بھر دیا ہو۔ میری آنکھوں میں چٹنی ڈال دی ہو اور میرے سینے میں انگارے بھر دیے ہوں، میں بری طرح تڑپا۔ یہ شاید چند سیکنڈ کی اذیت ہوگی جو اسی طرح پھانسی پانے والا بھی موت کا تختہ کھلتے ہی جھیلتا ہوگا۔ پھر جیسے مہربان موت اسے دائمی سکون عطا کرتی ہے ایسے ہی بے ہوشی نے مجھے اذیت سے نجات دی۔

جب مجھے ہوش آیا تو وہاں کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔ سوائے

اس کے کہ وہ اذیت ناک ہانڈی نیچے سے ہٹا لی گئی تھی۔ میرا جسم اپنی ساری توانائی اور سکت کھو چکا تھا۔ میں کسی لاش کی طرح الٹا لٹکا ہوا تھا اور میرے ہاتھ فرش سے دو فٹ اوپر جھول رہے تھے۔

''اب کچھ یاد آیا......'' میرے کانوں نے استاد کی آواز سنی اور اس کا چہرہ پل بھر کے لیے کسی اسکرین پر روشن ہوا۔ ''نام کیا ہے تیرا؟''

میں نے کہا۔ ''رفیق احمد...... شیرازی......''

میں نے رابن کا قہقہہ سنا۔ ''دیکھا استاد...... گیارہ نمبر ترکیب کا کمال۔''

استاد نے کہا۔ ''نواب صاحب...... آپ کی ریاست کا نام کیا ہے؟''

''ست...... ست بدھائی۔'' میں نے نیم بے ہوشی میں کہا۔ ایک دم میرے چہرے پر ٹھنڈے پانی کی بوچھاڑ آئی۔ اس سے پہلے بھی میرا بدن بھیگا ہوا تھا۔ یہ میں بعد میں سمجھا کہ وہ میرا اپنا پیشاب تھا جو از خود خطا ہو کے میرے الٹے لٹکے ہوئے جسم پر بہا تھا۔ میرے پیٹ اور سینے پر سے گزر کے یہ غلاظت میرے منہ پر پہنچی تھی اور کچھ بعید نہیں کہ میرے کھلے منہ سے میرے حلق میں بھی اتری ہو۔

ایک بار پھر مجھے ہوش آیا تو منظر بدل چکا تھا۔ اب میرے جسم پر کپڑے بھی تھے اور میں کسی بیڈ پر سیدھا پڑا تھا لیکن مجھ میں اتنی سکت اور توانائی نہ تھی کہ کروٹ بھی لے سکتا...... میرے ہاتھ پیر سن تھے اور کھلی آنکھوں سے اردگرد کا منظر دیکھنے کے ساتھ میرا دماغ بھی کام کرنے لگا تھا...... چند منٹ میں مجھے وہ سب یاد آ گیا جو میرے ساتھ ہوا تھا۔

پہلے والا کمرا خالی کیا گیا تھا، اس کا کچھ سامان ادھر ادھر کی دیواروں کے ساتھ ڈھیر تھا۔ یہ دوسرا کمرا...... شاید اسی گھر کا بیڈروم تھا، صاف ستھرے بیڈ سے کچھ فاصلے پر ڈریسنگ ٹیبل تھی، ایک وارڈروب مخالف دیوار میں بنی ہوئی تھی۔ پندرہ فٹ لمبے چوڑے اس بیڈروم میں کوئی غیر معمولی لگژری نہیں تھی، ایک کھڑکی پر معمولی پرانے پردے پڑے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی باہر یا دوسرے کمرے میں جانے کے لیے دروازہ تھا۔ دوسرے کمرے کے دروازے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ باتھ روم ہوگا۔

گھڑی اس کمرے میں بھی نہیں تھی اور میرے ہاتھ پر بھی نہیں تھی چنانچہ وقت اور تاریخ کا تعین ممکن نہیں تھا۔ سرہانے کی طرف ایک ٹیبل لیمپ روشن تھا اور میز پر پانی کی بوتل کے ساتھ ایک تھرماس فلاسک مگ اور بسکٹوں کا ایک پیکٹ رکھا تھا۔ میں نے سخت جدوجہد کے بعد اپنے درد سے سلگتے جسم کو حرکت دی اور ہاتھوں کے بل خود کو اوپر اٹھایا۔

میری بھوک اور پیاس یکلخت لوٹ آئی۔ میں نے جھپٹ کر پانی کی بوتل اٹھائی اور کئی گھونٹ لیے۔ اس سے میرا سانس پھول گیا اور مجھے متلی محسوس ہوئی، تھوڑا سا پانی واپس نکل گیا...... احتیاط...... احتیاط...... میرے دماغ نے مجھے ٹوکا، میں رک گیا۔ چند منٹ بعد میں نے تھرماس فلاسک کو تھوڑا سا ٹیڑھا کیا۔ اس میں سے بھاپ دیتی کافی میز پر گری...... ایک بار پھر صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا اور میں نے بسکٹ کے پیکٹ کو پھاڑ دیا، کچھ بسکٹ نیچے گرے، کسی وحشی کی طرح میں نے چار بسکٹ چبائے بغیر نگل لیے، میرے حلق میں پھندا سا لگا، میں نے کافی کے تھرماس کو مگ میں الٹا اور گرم گرم کافی کا ایک گھونٹ لیا تو ہونٹوں کے ساتھ میری زبان بھی جل گئی...... میں نے پروا نہیں کی۔

دس منٹ بعد نہ وہاں بسکٹ کا کوئی ریزہ بچا تھا اور نہ تھرماس میں کافی لیکن میری حالت میں نمایاں تبدیلی آئی تھی۔ اب میں کھڑا ہو سکتا تھا، میں چل کے دروازے تک گیا اور اسے کھولنا چاہا مگر وہ باہر سے بند تھا۔ میں نے اس پر زور زور سے ہاتھ مارے، پھر کھڑکی کا پردہ ہٹا کے دیکھا۔ مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ باہر اندھیرا تھا یا کھڑکی کے شیشوں کے سامنے سیاہ پردہ۔

میں نے دوسرے دروازے کو دیکھا۔ وہ باتھ روم ہی تھا، میں پھر بیڈ پر آ بیٹھا، یا میرے خدا، یہ میں کہاں پھنس گیا۔ میں کب سے یہاں ہوں اور مجھے اسیر رکھنے والے کون ہیں؟...... رفتہ رفتہ مجھے سب یاد آ رہا تھا۔ میں سائمن کے بلانے پر اصطبل اور گھوڑوں کا سودا کرنے گیا تھا، اس نے کہا تھا کہ لارڈ ارنسٹ کے دوست ڈیوک آف کنٹر شائر ہیں۔ ریس کے میدان میں ان کے سب سے بڑے حریف تھے اور وہ مجھ سے منہ مانگی قیمت پر تمام گھوڑے خریدنا چاہتے تھے...... اس کے لیے وہ مجھے بلینک چیک دے رہے تھے۔

پھر وہاں سے مجھے اغوا کیا گیا۔ یہ اغوا کار کون تھے؟ وہ مقامی اسکن ہیڈ غنڈے نہیں تھے۔ میری اپنی زبان بولنے والے ایشیائی تھے۔ میری جان کے دشمن تو گورے ہو گئے تھے۔ لارڈ ارنسٹ کے پرانے نمک خوار...... ایلیشا کے ہمدرد...... اس کی فرم کے ملازم...... عام انگریز جو ایک عالی نسب لارڈ کی جگہ میرے جیسے کالے ایشیائی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے، لیکن مجھے اغوا کر کے قید میں رکھنے اور اذیت دینے والے تو گورے نہیں تھے۔

پھر کیا وہ کرائے کے بدمعاش تھے؟ گوروں نے خود کو شک سے محفوظ رکھنے کے لیے انہیں استعمال کیا تھا؟ آج کل ہر چیز کرائے پر ملتی ہے۔ کرائے کے قاتل، کرائے کے گواہ...... میں جب چھوٹا تھا تو سب سے چھپ کر کرائے کی سائیکل لیتا تھا اور ہاکی گراؤنڈ میں چلاتا تھا، ایک بار کسی مفرور اور مشتعل گائے نے ٹکر ماری تو سائیکل سے گر کے میری ٹانگ ٹوٹ گئی تھی اور ابا کو پتا چل گیا کہ مسجد میں سیپارہ پڑھنے کے بہانے میں کہاں گیا تھا۔

نور کا خیال بجلی کے کوندے کی طرح میرے دماغ میں آیا۔ جیسے خاموش تاریک رات میں پتا نہیں چلتا کہ گھٹا کب اٹھی اور اچانک بجلی چمکتی ہے...... کیا اس کے ساتھ بھی، نہیں...... اس کا کوئی قصور نہ تھا...... میاں نواب صاحب قبلہ...... اس کا یہ قصور کیا کم ہے کہ وہ تمہاری ہے، جیسے یہ جان تمہاری ہے، یہ زندگی تمہاری ہے، عذاب جسم پر آئے گا تو جان بھی جائے گی۔

میں نے اپنا سر تھام لیا، معلوم نہیں وہ کہاں اور کس حال میں ہوگی...... اسے کچھ پتا ہے یا نہیں...... کب سے میں اس جہنم میں ہوں۔ ایک دن...... ایک ہفتہ...... ایک مہینا...... کچھ معلوم نہیں...... کیا راجا کو کچھ معلوم ہوگا؟ میری اچانک گمشدگی کے بعد کیا ہوا ہوگا۔ لندن کی پولیس تو واردات سے پہلے اس کا سراغ لگانے کی شہرت رکھتی ہے۔ ابھی تک کسی نے میرا سراغ کیوں نہیں لگایا۔ آخر اس وحشیانہ کھیل کا انجام کیا ہوگا۔ میری موت؟ مگر کیا میری موت سے سارے مقاصد حاصل ہو جائیں گے۔ وہ سب کچھ میرا ہی رہے گا جو از روئے قانون مجھے ملا ہے...... اور جو میرا ہے وہ میرے بعد ان کی ملکیت ہوگا جو میرے وارث ہوں گے، لیکن ابھی کون ہے میرا وارث؟ نہ میری بیوی ہے نہ بچے، نہ بھائی نہ بہن...... جو ہے صرف ایک رابعہ ہے جو خون کا رشتہ ہونے کی بنیاد پر حقِ وراثت رکھتی ہے اور قانون سے یہ حق تسلیم بھی کرا سکتی ہے۔

یہ کوئی اطمینان بخش یا مثالی صورتِ حال نہیں تھی رابعہ کے پاس ابھی اپنا کچھ بھی نہیں تھا۔ جو تھا میرا ہونے کے ناتے اس کا بھی تھا...... کم سے کم میں ایسا ضرور سمجھتا تھا لیکن خود رابعہ اس سے مطمئن نہیں تھی۔ وہ کہہ ہی چکی تھی کہ ابھی میں کیا ہوں؟ میرا کیا ہے، کچھ بھی نہیں۔ جو ہے تم سے ایک رشتے کی بدولت ہے۔ شاہ تم ہو، میں صرف تمہاری وجہ سے شہزادی ہوں ورنہ کچھ نہیں۔

میرے خیالات کی رو ایک دھماکے سے بکھر گئی، اچانک دروازہ کھلا اور چیف اندر آ گیا۔ ایک لمحے کے لیے میں پلک جھپکانا تک بھول گیا۔ یہ ایسا نظارہ تھا جو میری آنکھوں کے لیے اور آنکھوں کے وسیلے سے دماغ تک پہنچنے والے مرکزِ اطلاعات کے لیے ناقابلِ یقین تھا۔

بے اختیار میں نے کہا۔ ''تم......''

چیف اپنی مخصوص وضع قطع، پرتکبر انداز اور پر رعونت چال کے ساتھ لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ سجائے آگے بڑھا اور صوفے پر براجمان ہو گیا۔ اس نے سگریٹ کا کش لے کر دھواں اوپر چھوڑا اور بولا۔ ''ہاں...... میں......''

''لیکن...... تم تو......'' میں سوال کرتے کرتے رک گیا۔

''لیس...... مجھے معلوم ہے کہ تمہارا سوال ادھورا کیوں رہ گیا۔ خود تمہیں بھی اندازہ ہوا ہوگا کہ ایک شخص دو جگہ نہیں ہو سکتا۔ بالکل نہیں ہو سکتا نواب رفیق احمد شیرازی، تم یہاں ہو تو ست بدھائی میں نہیں ہو سکتے، لیکن تمہیں کیا معلوم کہ تم کہاں ہو...... لندن میں یا ست بدھائی میں...... ہاں میں تمہارے سامنے ہوں، ون ہنڈرڈ پرسنٹ...... کیونکہ چیف کسی قید خانے کے لیے نہیں بنا اور کوئی قید خانہ ابھی تک چیف کے لیے نہیں بنا۔''

''کیا تم کو ضمانت پر رہائی مل گئی ہے؟''

اس نے قہقہہ مارا۔ ''فیکے پتر...... تم پیدائشی انگریز نہ سہی۔ لندن کے باسی اور برطانوی شہریت رکھتے ہو۔ کیا تمہارے خیال میں یہاں بھی وہی جھرلو چلتا ہے جو اپنے وطن میں ناممکن کو ممکن کر دکھاتا ہے؟ کیا اس نظامِ انصاف میں یہ ممکن ہے کہ ایک شخص جس پر قتلِ عمد کا الزام ہو، واقعاتی شہادت اس کے خلاف ہو اور ایک نہیں تین تین چشم دید گواہ اسے بجلی کی کرسی پر بٹھانے کے لیے بے چین ہوں۔ کوئی جیل توڑ کے نکل آئے۔''

''اسی لیے میں ابھی تک یقین کرنے سے قاصر ہوں کہ یہ تم ہو۔''

''کم آن...... مجھے چھو کے سونگھ کے دیکھو...... ہم تو بہت قریب رہے ہیں، آنکھوں سے نہ دیکھو، تم پھر بھی میرے وجود کو محسوس کر سکتے ہو۔''

''او کے...... واٹ ناؤ...... جو ناممکن تھا، تم نے ممکن کر دکھایا مسٹر سپر مین۔''

''واٹ ناؤ...... تم ہی بتاؤ...... کیا کرنا چاہتے ہو۔''

''تمہیں اپنا اور میرا وقت ڈرامائی ڈائیلاگ بازی میں ضائع نہیں کرنا چاہیے، اگر تم نے مجھے زندہ چھوڑ دیا تو میں پھر

وہی کروں گا، جو میں نے کیا تھا۔ تم کو اتنا بے وقوف سمجھنے کی غلطی میں کیسے کر سکتا ہوں۔ جسٹ کل می یو باسٹرڈ فائنڈ گو۔'' میں نے چلا کے کہا۔

اس نے سگریٹ کے نصف حصے کو قالین پر ڈالا اور جوتے سے رگڑ کے بجھا دیا۔ ''تم نے یہ کیسے سمجھ لیا تھا کہ چیف ایک آدمی ہے، میں واقعی تم سے تعاون کا جذبہ رکھتا تھا اور تم ابھی تک انتقام کی آگ میں جل رہے تھے۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی...... کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی تم نے مجھے سزائے موت دلوانے میں۔ ارے ہمت تھی تو خود قتل کرتے مجھے......''

اچانک ایک ایسی بات ہوئی جس کی بظاہر کوئی اہمیت نہ تھی لیکن اس نے پوری سچویشن بدل دی...... چیف کے پیچھے وہ دروازہ تھا جس سے اس نے ڈرامائی انٹری دی تھی، اندر آنے کے بعد اس نے دروازے کو مقفل نہیں کیا تھا...... ایسی غلطی وہ کر بھی نہیں سکتا تھا۔ دروازے کے باہر مسلح محافظ ہوں گے۔ چیف بھی یہ رسک نہیں لے سکتا تھا کہ ان کے اندر آنے کا راستہ بند کرے اور میرے رحم و کرم پر رہ جائے۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس کے مسلح ہونے اور میرے خالی ہاتھ ہونے سے فرق نہیں پڑتا۔ میں وہ موقع خود بھی حاصل کر لیتا ہوں جب اس کے ریوالور کی چھ گولیاں بے مصرف ثابت ہوں اور میں ایک وار سے اس کی تھمبنے جیسی گردن توڑ دوں۔

دروازہ جیسے ہوا سے ہلا اور کوئی آہٹ پیدا کیے بغیر ایک بلی اندر آ گئی۔ وہ سیاہ رنگ کی سیامی بلی جوان اور خوبصورت تھی۔ دبے پاؤں چلتی ہوئی وہ آہستہ آہستہ چیف کے قریب پہنچ گئی۔ مجھ سے بات کرتے کرتے چیف نیچے جھکا اور اس نے بڑی نرمی سے بلی کو اٹھا کے اپنی گود میں بٹھا لیا اور پیار سے اس کے ریشمی بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

میرے لیے یہ نظارہ ناقابلِ یقین تھا۔ میں جانتا تھا کہ چیف کو بلیوں سے الرجی ہے۔ وہ بلیوں کے خوف کی نفسیاتی بیماری میں مبتلا تھا۔ دنیا کو فتح کرنے کے خواب دیکھنے والا عظیم ہٹلر جس نے آدھی دنیا کو تباہ کر دیا تھا۔ لاکھوں انسانوں کو مروا دیا تھا اور جس کے یہودیوں پر مظالم کی انسانیت سوز داستانیں تاریخ کا حصہ ہیں۔ وہ بھی بلی سے ڈرتا تھا، شاید زندگی میں اس کی دو ہی کمزوریاں تھیں، ایوا براؤن کی محبت اور بلی سے ڈر کا نفسیاتی مرض...... دونوں سے وہ مرتے دم تک نجات حاصل نہ کر سکا تھا۔ دوسری جنگ عظیم میں شکست کے بعد جب اس نے ایک تہ خانے میں خودکشی کی تو اس کے ساتھ مرنے والی صرف ایوا براؤن تھی۔

چیف کی اس ذہنی اور جسمانی کمزوری کا علم مجھے پہلے سے تھا۔ بلی اگر اتفاق سے بھی اس کے سامنے آ جاتی تو چہرے پر خوف کے آثار پسینے کے قطرے بن کے نمودار ہو جاتے تھے۔ اس کے ساتھ وہ چھینکنے لگتا تھا اور بلی کو فوراً دور کیا جاتا تو اسے دمے کا سا دورہ پڑ جاتا تھا۔ خواتین کا چھپکلی یا کاکروچ سے دہشت زدہ ہونا ایک عام سی بات ہے حالانکہ دونوں ہی بے ضرر گھریلو حشرات ہیں۔

یہ ناممکن تھا کہ چیف بلی کو چھو بھی سکے۔ یہاں اس نے میرے سامنے بلی کو گود میں بٹھا رکھا تھا اور بڑی محبت سے اس کو سہلا رہا تھا۔ اس کا ہرگز مطلب یہ نہیں تھا کہ اس نے اپنے نفسیاتی خوف پر قابو پا لیا ہے یا اس نے اپنی الرجی کا علاج کرا لیا ہے۔ یہ دونوں کام ممکن نہیں ہوتے چنانچہ اس کا ایک اور صرف ایک مطلب نکالا جا سکتا تھا۔

وہ چیف نہیں تھا...... اس جیسا تھا۔

اس نتیجے پر پہنچنے میں مجھے دیر نہیں لگی لیکن میں نے پوری کوشش کی کہ میری صورت کے تاثرات میں تبدیلی نہ آئے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنے سامنے بیٹھے چیف کے نقشِ ثانی کو زیادہ غور سے دیکھنا شروع کیا اور چند منٹ میں ایسی بہت سی علاماتِ تلاش کرنے میں کامیاب رہا جو میرے یقین کی تائید کرتی تھیں۔

چیف سے چند بار ملنے والا یا اسے سرسری نظر سے دیکھنے والا اصلی نقلی کے فرق کو محسوس نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی صورت کے نقوش وہی تھے۔ بالوں کا انداز اور آنکھوں کا رنگ بدلا جا سکتا تھا۔ قد کاٹھ اور وزن کے فرق میں انیس بیس کے فرق کو نوٹ کرنا مشکل تھا۔ کپڑے اس نے بالکل چیف جیسے پہنے تھے لیکن اصل کمال اس کی آواز کا اور اس کے انداز و اطوار کا تھا۔ یہ کمال اس نے یقیناً مشق اور مہارت سے حاصل کیا ہوگا۔ اس کا Mannerism کی نقل کرنا قابلِ تعریف تھا۔ وہ اسی طرح سے ہاتھ ہلاتا، ویسے ہی آنکھیں گھماتا تھا۔ ہونٹ سکیڑتا تھا۔ وہی الفاظ محاورے یہاں تک کہ گالیاں بھی وہی استعمال کرتا جو چیف کرتا تھا اور آواز کا لہجہ بھی اس نے نقل مطابق اصل کر لیا تھا۔

اپنا ڈپلی کیٹ رکھنا بہت سے مشہور لوگوں کے لیے سیکیورٹی کی ضرورت بن جاتا ہے۔ حقیقت کوئی نہیں جانتا کیونکہ یہ بات ہمیشہ ٹاپ سیکریٹ رکھی جاتی ہے۔ مشہور ہے کہ جنرل رومیل کا ایک ڈپلی کیٹ تھا۔ بعض اوقات وہ ہٹلر سے خفیہ جنگی حکمتِ عملی پر مذاکرات کرنے میں مصروف ہوتا

تھا اور اس کا ڈپلی کیٹ فوجوں کی کمان کرتا رہتا تھا۔ اپنے ملک میں مرحوم امیر محمد خان نواب آف کالا باغ کے بارے میں بھی ایسا ہی کہا جاتا ہے کہ کہیں وہ خود نہیں جانا چاہتے تھے تو اپنے ڈپلی کیٹ کو بھیج دیتے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ اس کی افادیت یقیناً سمجھ میں آتی ہے۔ آج جب ہمارے حاکم درجنوں حفاظتی گاڑیوں اور سیکڑوں محافظوں کی معیت میں کسی سڑک سے گزرتے ہیں تو ایک جیسی بہت سی گاڑیوں میں سے کسی ایک میں ہوتے ہیں۔ دیکھنے والے کو کچھ پتا نہیں چلتا کہ وہ کس میں تھے...... خدانخواستہ کوئی انہیں مارنا بھی چاہے تو کسے مارے...... یہ تو بہت ہی آسان ہے کہ اپنے ڈپلی کیٹ کو سرکاری گاڑی میں روانہ کردیں اور خود نکل جائیں ٹیکسی میں یا موٹر سائیکل پر تو ان کی طرف کسی کا گمان بھی نہیں جاسکتا۔

چیف نے ایک زمانے میں بڑی دہشت گردی پھیلائی تھی اور اس کی جان کے دشمن بہت تھے۔ ظاہر ہے مارے جانے کا خوف اسی کو ہوگا جس کا کوئی جانی دشمن ہوگا۔ جس کو یہ ڈر نہ ہو، وہ حفاظتی انتظامات کے بارے میں سوچے گا بھی نہیں۔ اس زمانے میں چیف نے بڑی تلاش کے بعد اپنا ایک ہم شکل رکھ لیا تھا۔

یہاں ایک دلچسپ واقعے کا ذکر بھی بے محل نہ ہوگا۔ فلموں میں ڈپلی کیٹ عام ہوتے ہیں۔ نامی گرامی ہیرو جو مشکل اور جان جوکھوں کا کام نہ کر پائیں یہ ڈپلی کیٹ کرتے ہیں کیونکہ ان کی جان اتنی قیمتی نہیں ہوتی۔ فلم ''شبستان'' کی شوٹنگ کے دوران فلم اسٹار شیام کی حادثاتی موت ہوگئی تھی، باقی آدھی فلم اس کے ڈپلی کیٹ کے ساتھ پوری کی گئی اور دیکھنے والوں کو کہیں بھی فرق کا پتا نہیں چلا۔

میں نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے نقلی چیف میں باریک بینی سے چند فرق تلاش کیے۔ اخبار رسالوں میں اکثر دو ایک جیسی تصویریں شائع ہوتی ہیں کہ فرق بتائیں۔ یہ بھی ایسا ہی کیس تھا۔ ایک تو مجھے اس شخص کی گردن کے نچلے حصے میں دائیں جانب تل نظر نہیں آیا۔ تل اس کے اوپر والے ہونٹ پر تھا جو چیف کے ہونٹ پر نہیں تھا۔ نقلی چیف کے بائیں ہاتھ کی انگلی میں منگنی کی انگوٹھی تھی۔ اصل چیف کے دائیں ہاتھ میں تھی اور برسوں بعد یہ انگوٹھی ایسے پھنس چکی تھی کہ اسے اتارنا ہی ناممکن تھا۔ مزید یہ کہ اصل چیف کی انگوٹھی میں نگینے پر انگریزی حرف ایس کندہ تھا۔ ہوسکتا ہے اس کی کسی منگیتر کا نام ایس سے شروع ہوتا ہو۔ منگنی وہ کرتا رہتا تھا اور شادی اس نے فرزانہ نام کی ایک ماڈل سے کی تھی جو صرف چھ ماہ اس کے ساتھ رہی اور پھر غائب ہوگئی۔ چیف نے کہا کہ وہ طلاق لے کر امریکا چلی گئی مگر اس کی تصدیق کبھی نہ ہوئی۔ نقلی چیف کی انگوٹھی پر کوئی نگینہ نہیں تھا۔

جب مجھے سارے ثبوت مل گئے تو پورا یقین ہوگیا کہ میرے سامنے بیٹھا ہوا بہروپیا ہے۔ اصل چیف تو اس وقت بھی پولیس کی تحویل میں اور کسی جیل میں بند ہوگا۔ یہ ایک اچھی چال تھی، جو ناکام ہوگئی۔ یہ ٹھیک ہے کہ میری قوت مشاہدہ نے بعد میں بڑا کام کیا لیکن چیف کے پلان کا بیڑا غرق کرنے والی تو درحقیقت وہی معصوم سی کالی بلی تھی جو کسی پلان کے بغیر گھومتی پھرتی وہاں آگئی...... چنانچہ میں نے اسے تائیدِ ایزدی سے موسوم کیا اور ایک دم مستعد ہوگیا۔ اب یہ ضروری تھا کہ اپنی ہوشیاری ظاہر نہ کروں...... یہ تاثر دیتا رہوں کہ میں چیف کو اصل ہی سمجھ رہا ہوں۔

خاموشی کے ایک مختصر وقفے کے بعد چیف مسکرایا۔

''یار تم اچھے ایکٹر کبھی نہیں بن سکتے۔''

میں نے محتاط ہوکے پوچھا۔ ''میں نے کبھی کوشش بھی نہیں کی۔''

اس نے بلی کو مجھ پر کھینچ مارا۔ بلی نے دہشت زدہ آوازیں... نکالیں اور نیچے گرتے ہی فرار ہوگئی۔ ''کوشش پوری کی تھی تم نے...... یادداشت کے ضائع ہونے کا ڈراما کیا تھا۔''

میں نے خفت سے کہا۔ ''مجھے ترکیب نمبر گیارہ کا علم نہیں تھا۔ اور میری جگہ تم ہوتے تو جان بچانے کے لیے کیا کرتے؟''

''یہ سوال کررہے ہو تم مجھ سے؟''

''ہاں...... اور کس سے کروں۔''

اس نے قہقہہ مارا — ''مرنے سے اتنا ڈرتے ہو؟ کیا ہوگا اگر تم مرجاؤ گے؟ کچھ نہیں...... یہ دنیا ایسے ہی چلتی رہے گی۔ ست بدھائی کی ریاست بھی...... اور یہ شیرازی اینڈ کمپنی بھی......''

''اس کے باوجود میں جینا چاہتا ہوں۔ جیسے تم جینا چاہتے ہو۔''

''یہ کی نا تم نے پہلی کام کی بات۔ اسے کہتے ہیں بقائے باہمی کا سمجھوتا، جیو اور جینے دو۔''

''مجھ سے تم کیا چاہتے ہو؟'' میں نے کہا۔

''ویری سمپل...... تم میرے خلاف اپنے شوفر چارلی کے قتل کا الزام واپس لے لو۔''

میں نے کہا۔ ''چارلی کی طبعی موت نہیں تھی۔''

''یس...... وہ قتل تھا، اس کی لاش کو کنکریوں کے ایک ڈھیر کے نیچے دبا دیا گیا تھا۔ مکمل شاول چلا کے۔ یہ پولیس رپورٹ میں بھی ہے اور دونوں وعدہ معاف گواہوں نے بھی کہا ہے۔ اس کی پوسٹ مارٹم رپورٹ بہت واضح ہے۔''

''پھر وہ کیسے ہوسکتا ہے جو تم کہہ رہے ہو...... صرف میرے کہنے سے کیس ختم کیسے ہوسکتا ہے۔''

''میرے خلاف کیس ختم ہوسکتا ہے۔ الزام تم اپنے سر لے لو۔''

''واہ...... کیا آئیڈیا ہے، تمہاری جگہ میں بجلی کی کرسی پر جا بیٹھوں، ابھی میں نے تم سے کہا کہ میں مرنا نہیں چاہتا، اب تم کہہ رہے ہو کہ میری جگہ مرجاؤ۔''

''دیکھو...... تمہیں سزا ہوگی لیکن موت کی نہیں، یہ میری گارنٹی ہے۔''

''تم کیا اور تمہاری گارنٹی کیا، اس کے علاوہ میں کیا کروں؟ عدالت میں حاضر ہوکے کہوں کہ سوری مائی لارڈ...... قاتل یہ نہیں میں ہوں...... جب میں نے اس پر الزام لگایا تھا اس وقت میں نے پی رکھی تھی اور جج کہے گا کہ یہ بات ہے؟ چلو پھر تم کو پکڑ لیتے ہیں۔ چیف صاحب سوری...... آپ جاسکتے ہیں؟''

شاید ضرورت سے زیادہ چالاک ہونے کا ثبوت دینا میری غلطی تھی، مجھے چیف کی مرضی کے مطابق چلنا چاہیے۔ خود اسی سے پوچھنا چاہیے کہ آخر یہ سب کیسے ہوگا، کوئی پلان اس کے پاس بھی ضرور ہوگا۔

نقلی چیف صاحب نے غصے میں وہ گلاس دیوار پر دے مارا جس سے وہ پی رہا تھا، شراب کی یہ بوتل ایک الماری سے اس نے خود ہی نکالی تھی۔

''بند کرو اپنی بکواس...... فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں ہم ہیں، ضمانت پر مجھے رہائی مل گئی ہے، زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ میں روپوش ہوجاؤں گا اور پھر کسی خفیہ راستے سے نکل بھی جاؤں گا، مگر جانے سے پہلے تم کو زندہ گاڑ جاؤں گا فیکے پتر......'' اس نے بوتل سے منہ لگا کے ایک گھونٹ لیا۔

میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''او کے، تم بتاؤ یہ سب کیسے ہوگا۔''

''دیکھو...... تم عدالت میں حاضر ہوکے اپنے وکیل کی مدد سے دوسرا بیان داخل کرو گے، تم کہو گے میں نے ذاتی دشمنی کی بنا پر ایک بے گناہ شخص کو اس قتل کے الزام میں ملوث کردیا تھا۔ اب میرے ضمیر کی خلش نے مجھے مجبور کردیا ہے کہ میں عدالت کے سامنے آکے سچ بولوں۔ ذاتی دشمنی کی وجہ تم کچھ بھی بتا سکتے ہو۔ مثلاً یہ کہ چیف نے موقع پا کے ایک دن زبردستی نور کے ساتھ زیادتی کی تھی۔''

ایک دم سارا خون کھنچ کے میرے سر میں آگیا۔ ''نور کے ساتھ...... تمہارا دماغ خراب ہے، تم نے ایسا سوچا بھی کیسے۔''

''سنو...... سارا مسئلہ سوچنے ہی سے حل ہوگا۔ ظاہر ہے نور کے ساتھ کچھ بھی نہیں ہوا تھا، یہ جھوٹ ہوگا لیکن نور تردید نہ کرے تو کیا اس سے نور جیسی پاک دامن عفت مآب حسینہ کے دامن پاکیزگی پر داغ آجائے گا؟''

نور کے بارے میں اس کے الفاظ میرے منہ پر تھپڑ بن کے لگ رہے تھے مگر میں برداشت کرنے پر مجبور تھا۔

''جھوٹ تو جھوٹ ہی رہے گا۔'' چیف نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''نور وہی رہے گی جو ہے لیکن تم کہہ سکتے ہو کہ تمہارے دل میں چیف سے بدلہ لینے کی ایک پرانی خواہش تھی، اب موقع ملتے ہی تم نے اسے پھنسا دیا۔''

میں نے کہا۔ ''پھر یہ کہوں کہ چارلی کو قتل میں نے کیا تھا، رائٹ۔''

''بالکل نہیں...... یہ تم سے کس نے کہا ہے کہ تم قتل کا الزام اپنے سر لے لو۔''

میں نے سر پر ہاتھ مارا۔ ''یار چارلی کا قتل تو ہوا تھا، میں کہوں کہ چیف نے نہیں کیا تھا، پھر کس نے کیا تھا؟''

''یہ پولیس معلوم کرے۔''

''تم عدالت کو اور پولیس کی تفتیش کو مذاق سمجھتے ہو شاید۔ یہ میں نے ہی بتایا تھا کہ چارلی کو فلاں جگہ قتل کے بعد دفن کیا گیا ہے، دو چشم دید گواہ ہیں۔''

''وہ دونوں کہیں گے کہ ہمیں مسٹر رفیق نے اس گواہی کے لیے تیار کیا گیا تھا، پیسا دیا تھا۔''

''کیوں میرا دماغ خراب کررہے ہو، مجھے کیا فرشتوں نے آکے بتایا تھا کہ چارلی کو مار کے فلاں جگہ گاڑا گیا ہے۔''

''سنو، پہلا مرحلہ ہے عدالت کو یہ بتانے کا کہ میں نے کچھ نہیں کیا، میں صرف تمہارے انتقامی جذبات کا نشانہ بنا ہوں، تمہارا بیان بھی جھوٹا تھا اور وہ چشم دید گواہ بھی جھوٹے تھے۔ یہاں تک بات تمہاری سمجھ میں آگئی ہو تو میں آگے چلوں۔''

''بولو...... میں سن رہا ہوں۔''

''اب تم پر الزام یہ ہوگا کہ تم نے عدالت میں جھوٹ بولا اور دو جھوٹے گواہ خریدے...... تمہیں الگ سزا ہوگی اور ان گواہوں کو الگ، لیکن قتل کا الزام مجھ پر نہیں ہوگا اور تم پر بھی نہیں، تم صرف یہ کہو گے کہ چارلی کے بارے میں کسی نے

تمہیں گمنام فون کر کے اطلاع دی تھی کہ ہم نے اسے قتل کر کے فلاں جگہ گاڑ دیا ہے۔ تم خود چارلی کو ناپسند کرتے تھے کیونکہ وہ تم سے خوش نہیں تھا، لارڈ ارنسٹ کے سارے ملازمین نے تمہاری خدمت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس وقت تمہیں ایک تیر سے دوشکار کرنے کا خیال آیا۔ تم نے سوچا کہ کیوں نہ چیف کی گردن اس قتل کے جرم میں پھنسا دی جائے اور تم نے یہی کیا۔ تم نے چیف کو گاڑی دے کر وہاں بھیجا جہاں کے بارے میں اطلاع ملی تھی کہ چارلی کو وہاں مار کے کنکریوں کے ایک ڈھیر میں دبا دیا گیا ہے اور چیف وہاں پہنچا تو ایک پلان کے مطابق تم نے اسے مجرم بنا دیا، تم ادھر گئے ہی نہیں تھے۔ اس دن ایلیشا کے ساتھ تھے۔"

یہ ساری کہانی انتہائی بے سروپا تھی اور پوری دنیا کی کوئی عدالت اس پر یقین نہ کرتی اور پھر لندن کی پولیس! وہ مجھ سے یہ بھی معلوم کر لیتے کہ آخر میں اب جھوٹ کیوں بول رہا ہوں۔ مجھے کیا مجبوری ہے...... بس...... مجبوری...... یہ خیال اچانک میرے ذہن میں آیا۔ مجھے کیا ضرورت ہے بحث کرنے کی، مجھے تو یہاں سے نکلنا ہے، مجھے وقت چاہیے اور کچھ کرنے کی مہلت۔

نقلی چیف نے اچانک کہا۔ "ایک اور صورت ہے جس میں تمہاری جان صاف بچ سکتی ہے۔"

میں چونکا۔ "وہ کیا؟"

"تم اپنی جگہ وحید کو پیش کر دو۔ وہ جو تمہارا ہم شکل ہے۔"

میں نے کہا۔ "وہ تو پاکستان چلا گیا۔"

"کیا تم اسے واپس نہیں بلا سکتے۔ کسی بھی بہانے...... کوئی ایسا چکر چلاؤ کہ خود پہنچ جاؤ ست بدھائی، وہ پکڑا جائے۔ یہ ناممکن نہیں۔"

جو وہ کہہ رہا تھا سب ناممکن تھا۔ معلوم نہیں کیسے اس نے فرض کر لیا تھا کہ میں ہر بات مان سکتا ہوں...... ساری دنیا پاگل ہے کہ میں پہاڑ سے بڑا جھوٹ بولوں اور سچ مان لیا جائے لیکن اب تاثر مجھے یہ دینا تھا کہ میں ان کے چکر میں آ گیا ہوں، وہ مجھے بے وقوف بنانے میں کامیاب ہو گئے ہیں...... اس کے بعد وہ کیا کرتے ہیں، یہ اندازہ بعد میں ہوا۔

میں نے کہا۔ "چیف...... یہ تمہارا گیم ہے، اگر تم نے سمجھ لیا ہے تو میں کھیلنے کے لیے تیار ہوں، تم بتاؤ مجھے عدالت کے سامنے کیا بیان دینا ہوگا، میں دوں گا مقصد تمہیں بچانا ہے...... اگر تم بچ جاؤ گے تو میں پھنس جاؤں گا، مجھے معلوم ہے اس کے بعد تم مجھے بچانے کی بالکل کوشش نہیں کرو گے...... تم بھاگ جاؤ گے، روپوش ہو جاؤ گے لیکن کوئی بات نہیں...... میں یہ چانس لوں گا۔"

"تم یہاں سے نکلنے کے لیے بہت بے چین ہو۔"

"قدرتی بات ہے......"

وہ عیاری سے ہنسا۔ "یہ سمجھتے ہو کہ بس ایک بار باہر نکل گئے تو پھر تمہارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا...... کیا ہم اتنے بے وقوف لگتے ہیں تمہیں فیکے پتر......" وہ آگے جھک کے بولا۔

"نہیں...... تم نے اس کا انتظام بھی کیا ہوگا۔"

"یس...... تمہیں معلوم ہے اس وقت باہر کیا ہو رہا ہے؟...... مگر تمہیں کیسے معلوم ہو سکتا ہے۔ لارڈ ارنسٹ کے اصطبل کا نگراں پولیس کی تحویل میں ہے...... اس نے فون کر کے تمہیں بلایا تھا، اس کا کہنا ہے کہ تم وہاں نہیں پہنچے جبکہ پولیس فارم ہاؤس کے گیٹ تک تمہارا سراغ لگا چکی ہے۔ تمہاری گاڑی وہیں سے ملی ہے۔"

"یہ کب کی بات ہے؟"

"دو دن پہلے کی...... تمہارے لاپتا ہونے کی رپورٹ نور نے کی۔ اس نے ایلیشا پر بھی شک ظاہر کیا ہے۔ کہا ہے کہ وہ پاگل عورت اب چرچ چھوڑ کے واپس دنیا میں آنا چاہتی تھی اور سب کچھ واپس مانگ رہی تھی۔"

"یہ ایلیشا کیسے مان سکتی ہے۔"

"اس نے تسلیم کیا ہے کہ فون پر اس نے رفیق سے بات کی تھی تو اس بات پر افسوس کا اظہار کیا تھا کہ وہ لارڈ ارنسٹ کے خاندانی محل کو بھی بیچ رہا ہے اور ان کے انتہائی شوق سے پالے ہوئے گھوڑوں کو بھی...... مزید یہ کہ وہ فرم کا نام بدل کے اپنے نام پر رکھ رہا ہے، لیکن وہ صرف درخواست کر سکتی تھی کہ رفیق ایسا نہ کرے...... اسے روک نہیں سکتی تھی۔ مالک وہ ہے۔ اس نے کہا کہ ایک نن کے لیے جھوٹ بولنا گناہِ عظیم ہوگا۔ اس لیے میں سچ کہوں گی۔ مجھے رفیق پر سخت غصہ تھا اور میں انتہائی رنجیدہ تھی، لیکن اس سے میں نے ایسی کوئی بات نہیں کی کہ میں اپنا حقِ ملکیت واپس چاہتی ہوں۔"

"تمہاری مرضی کا بیان دینے کے لیے میرا عدالت میں حاضر ہونا ضروری ہے...... اگر یہاں سے تم میرا حلف نامہ دستخط کروا کے لے جاؤ تو وہ قبول نہیں ہوگا۔"

"یہ مجھے بھی معلوم ہے فیکے پتر......"

"الو کے پٹھے...... تمہیں کس نے حق دیا ہے کہ مجھے اس نام سے پکارو...... راجا کے علاوہ کوئی مجھے یہ نہیں کہہ سکتا۔"

اس نے اصل چیف کے انداز میں بے وجہ قہقہہ لگایا۔

"یہ پیار کا نام ہے۔ برا کیوں مانتے ہو نواب صاحب۔ عدالت میں آپ خود ہی پیش ہو گے اپنے وکیل ملک ارشد کے ساتھ۔"

"اس میں تمہیں کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوتا۔"

وہ کچھ دیر مختصر سے کمرے میں ادھر ادھر ٹہلتا رہا۔ "تم نور کو کتنا چاہتے ہو، اتنا ہی جتنا فریال کو چاہتے تھے یا اس سے پہلے......"

میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ "اس فضول سوال کا مقصد! یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔"

وہ ایک دم پلٹا۔ "چوائس تمہاری ہوگی نواب رفیق...... اور یہی ایک خطرے کی بات ہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ تم اپنے انتقامی جذبات پر اپنی محبت کو قربان کر دو، تمہارا ماضی کا ریکارڈ کوئی بہت قابلِ رشک نہیں ہے۔"

"کیا مطلب......"

"مطلب یہ کہ عدالت میں جا کے تم یوٹرن لے لو...... اپنی بات سے پھر جاؤ اور عدالت کو وہ سب بتا دو جو تمہارے ساتھ ہوا۔ تمہارا کچھ بھی نہیں جائے گا۔ میری فردِ جرم میں اغوا اور حبس بے جا میں رکھنے کے جرائم بھی شامل ہو جائیں گے تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ جہاں سیر وہاں سوا سیر...... لیکن نور تمہاری محبت میں اپنی جان سے جائے گی۔"

میں چونکا۔ "تم اسے قتل کرنے کی دھمکی دے رہے ہو۔"

"یہ دھمکی نہیں...... ہم اسے واقعی قتل کر دیں گے۔ فوراً...... اور تمہیں اس کی لاش مل جائے گی، سالم نہیں...... ٹکڑوں کی صورت میں...... کیونکہ وہ پہلے سے ہمارے قبضے میں ہوگی۔"

"کیا تم نے اسے بھی اٹھا لیا ہے؟"

"نہیں...... اس کے قریب کوئی نہیں پھٹک سکتا۔ اس کی اپنی سیکیورٹی سخت ہے، پھر لندن پولیس اس کی حفاظت کر رہی ہے۔ اس نے دو دن میں کہرام مچا دیا ہے۔"

"پھر تم اتنے وثوق سے کیوں کہہ رہے ہو کہ......"

"رفیق صاحب...... اگر سودا منظور ہے تو سنو...... ابھی میں تم کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا لیکن جانے سے پہلے تم نور کو فون کر کے بلاؤ گے۔ راز داری اور اعتماد کے ساتھ، تم اس سے کہو گے کہ وہ تمہاری رہائی کے لیے اپنے ساتھ پچاس ہزار پاؤنڈ لائے۔"

"پچاس ہزار پاؤنڈ......"

"ہاں...... اب تک اسے مختلف لوگ پبلک کال آفس سے کال کر چکے ہیں، پہلی کال پرسوں رات ڈھائی بجے کی گئی تھی اور اس سے یہی کہا گیا تھا کہ وہ رفیق کو زندہ سلامت واپس چاہتی ہے تو کسی کو بھی اس کال کے بارے میں نہ بتائے۔ خصوصاً پولیس کو...... اور پچاس ہزار پاؤنڈ تیار رکھے۔ اغوا برائے تاوان کرنے والوں کے اسٹائل میں اس سے کہا گیا کہ نوٹ پرانے ہوں اور چھوٹے ہوں...... ان کو سرخ رنگ کے بریف کیس میں ڈالا جائے۔ اس پر دونوں جانب تین انچ قطر کا سفید دائرہ ہو۔"

"اس کا مقصد......؟"

"کچھ نہیں، بس کنفیوژن پھیلانا۔ پولیس نے یہ کال ٹریس کر لی مگر کال کرنے والا دو منٹ بعد جا چکا تھا۔ دوسری کال ہوئی کل دوپہر اور تیسری گزشتہ رات پھر ڈھائی بجے...... وہ تیار ہے۔"

"اب میں اسے کہاں بلاؤں؟"

"کوریئر سروس کے ذریعے ابھی کچھ دیر پہلے اسے ایک موبائل فون ملا ہوگا...... اس میں یہ بھی تحریر ہوگا کہ اس نئے نمبر پر موصول ہونے والی کال کا ذکر اس نے کسی سے کیا تو شام تک رفیق کی لاش اسے پہنچا دی جائے گی۔ ابھی ہم تمہیں ایک نیا نمبر دیں گے۔ اس سے تم پاکستان میں راجا کو کال کرو گے...... راجا سے کہو گے کہ وہ ایک نیا فون اور نئی سم لے کر نور کو کال کرے۔ جو تم راجا سے کہو گے، وہ نور کو بتائے گا۔ یہ تم تینوں کے اعتماد کا کھیل ہے جس میں داؤ پر صرف نور کی جان ہوگی یا تمہاری...... نور کو تم قائل کرو گے کہ وہ پچاس ہزار پاؤنڈ لے کر تمہاری بتائی ہوئی جگہ پر اکیلی آئے اور کسی کو بتائے بغیر۔ وہ کس حد تک تمہاری ہدایات مانتی ہے، یہ ہم دیکھ لیں گے۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ میرے اغوا کو عام اغوا برائے تاوان کا رنگ دے کر پولیس کو گمراہ کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے کھیل میں شامل ہونا ایک خطرناک کام تھا لیکن میرے پاس اور کوئی راستہ بھی نہ تھا۔ یہ نو رسک نو گیم والی پوزیشن تھی...... وہ کہاں غلطی کرتے ہیں، کہاں تقدیر انہیں دھوکا دیتی ہے۔ نور کیا کرتی ہے اور کیا نہیں کرتی۔ جھوٹ کیا ہے سچ کیا، ایسے ان گنت سوالوں کا جواب پانے کے لیے مجھے وقت درکار تھا اور یہاں سے نکلے بغیر وقت کا بھی کوئی مصرف نہ تھا۔

میں نے ان کی بات مان لی۔ جو ہو سو ہو...... یہ ایک مجرمانہ منصوبہ تھا جس کو سمجھنا محال تھا۔ آدمی کی عقل سازشوں کے بہت الجھے ہوئے جال بنتی ہے اور اس کا تانا بانا بننے

والے کو اپنے دماغ پر بڑا ناز اور اعتماد ہوتا ہے کہ اس کی نظر سے کچھ پوشیدہ نہیں۔ وہ دیکھ سکتا ہے کہ آنے والے وقت میں کیا ہوگا اور کیا نہیں ہوگا...... مگر آگے تقدیر اپنا پارٹ پلے کرتی ہے، تدبیر کے بعد۔

اس نقلی چیف نے مجھے ایک نیا فون لا کے دیا۔ ظاہر ہے اس کی رجسٹریشن کو ٹریس کرنا پولیس کے لیے بھی کارِ زیاں ہوگا۔ وہ کہیں اور پہنچ جائیں گے۔ مجرموں کے اور ان کے پکڑنے والوں کے درمیان ذہانت سے ایک دوسرے کو دھوکا دینے کی آنکھ مچولی ہر جگہ ہر وقت جاری رہتی ہے۔ میں ابھی اپنی عقل کرڑا کے یہ موقع گنوانے کے موڈ میں نہیں تھا جو مجھے ایک پیاری سی کالی بلی کے طفیل حاصل ہوا تھا۔ جسے عام طور پر ہمارے ملک میں منحوس سمجھا جاتا ہے۔

میں نے راجا کا نمبر ملایا۔ اس وقت کمرے میں دو منحوس صورت بدمعاش اور آ گئے تھے اور کسی وجہ کے بغیر مجھے ریوالور دکھا کے ڈرانا چاہتے تھے۔ میں نے انہیں نظر انداز کر دیا۔

دوسری طرف سے راجا نے کسی سے کہا۔ ''یار یہ کیا ہو رہا ہے؟'' اور پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''ہیلو......''

میں نے کہا۔ ''راجا......''

میں دیکھ نہیں سکتا تھا اور پھر بھی تصور میں راجا کا ردِعمل میرے سامنے تھا، جب وہ چلایا نہیں۔ اس نے مجھے گالیاں نہیں دیں اور مجھ پر سوالات کی بوچھاڑ نہیں کی تو میں سمجھ گیا کہ وہ تمام صورتِ حال سے پوری طرح باخبر ہے اور نور نے اسے میرے اغوا کیے جانے کی رپورٹ پہنچا دی ہے۔

''کیا حال ہے تیرا فیکے پتر...... کہاں سے بول رہا ہے تو؟''

میں نے ہنس کے کہا۔ ''اپنے منہ سے راجا اور کہاں سے......؟''

راجا کی متانت برقرار رہی۔ ''تو ٹھیک ہے نا۔''

''میں بالکل ٹھیک ہوں......''

''نور نے سب بتا دیا ہے، تو فکر مت کر ان سے سودا پکا کر لے...... اور دماغ ٹھنڈا رکھ...... تو ہے کہاں۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے نہیں معلوم...... اب تو میری بات دھیان سے سن...... نور کو فون کر...... نمبر میں بتاتا ہوں۔''

''یہ نیا نمبر ہے؟''

''ہاں...... اس سے کہہ کہ پچاس ہزار پاؤنڈز ہدایات کے مطابق لے آئے، میں دوسری کال نہیں کروں گا۔ اسے وہی کرنا ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔ اگر اس گفتگو کا ایک لفظ بھی کسی اور تک پہنچا تو پھر کچھ نہیں ہوگا، یہ لوگ دوسرا چانس دینے والے نہیں ہیں۔''

''ٹھیک ہے...... میں اسے سمجھا دوں گا۔ تو مجھے بتا۔''

میں نے نقلی چیف صاحب کی ہدایت کے مطابق راستہ سمجھانا شروع کیا۔ ''اس کو اکیلے آنا ہوگا، اپنی سیکیورٹی کو وہ منع کر سکتی ہے لیکن اسے کیا معلوم کہ باہر سے سادہ کپڑوں میں کون اس کے پیچھے لگ گیا۔ پولیس کی اس پر نظر ہوگی، وہ عقبی راستے سے نکلے، پیدل اور پھر ٹیکسی پکڑ لے، جو نیا فون اس کے پاس ہے اس پر میں نور کو ہدایات دوں گا کہ اسے کہاں آنا ہے۔''

چیف نے ایک کاغذ کا پرزہ میرے حوالے کیا، میں نے اس پر لکھی ہوئی عبارت ایسے پڑھی جیسے یہ بات میں خود راجا سے کہہ رہا ہوں۔ ''نور کو رقم پہنچا کے ہدایات کے مطابق واپس جانا ہوگا۔ اس کے پہنچنے سے پہلے ہی میں گھر پہنچ جاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے...... میں اسے سمجھا دوں گا۔''

فون میرے ہاتھ سے لے لیا گیا۔ اب ایک نیا کھیل شروع ہوا۔ میرے ہاتھ کر کے پیچھے باندھ دیے گئے۔ ایک ربر بینڈ میری آنکھوں پر آ گیا۔ مجھے باہر لے جا کر ایک گاڑی میں بٹھا دیا گیا اور گاڑی روانہ ہوگئی۔ دو محافظ میرے دائیں بائیں بیٹھے تھے۔ شاید وہ شخص جو چیف کا کردار ادا کر رہا تھا آگے تھا۔ ان کا چوتھا ساتھی گاڑی چلا رہا ہوگا۔ گاڑی کے شیشے بند تھے۔ باہر کی آوازیں میرے کانوں میں بہت کم آ رہی تھیں۔ ان سے یہ اندازہ کرنا ناممکن تھا کہ ہم کہاں سے گزر رہے ہیں۔

گاڑی آرام دہ اور نئی تھی۔ ہم ایک گھنٹا خاموشی سے سفر کرتے رہے۔ پھر مجھے فون دیا گیا۔ ''راجا کے ذریعے نور سے کہو کہ وہ اسی جگہ آ جائے جہاں چارلی کو دفن کیا گیا تھا۔''

میں نے تعمیل کی۔ آدھا گھنٹا اور گزر گیا۔ اس کے بعد میں نے راجا کے ذریعے نئی ہدایات ارسال کر دیں۔ اب نور کو نئی سمت میں سفر کرنا تھا۔ اس بات کی تصدیق ہوگئی تھی کہ نور اکیلی آئی ہے اور اس کا تعاقب کوئی نہیں کر رہا ہے۔ اس نقلی چیف کو نہ جانے کون مسلسل یہ اطلاع دے رہا تھا کہ سب کچھ ہماری مرضی کے مطابق ہو رہا ہے اور خطرے کی کوئی بات نہیں۔ وہ اسے اپنی کامیابی سمجھ کر فخر سے مسکراتا تھا اور پھر میری طرف دیکھ کے کہتا تھا۔ ''لڑکی سیانی ہے۔''

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا میرا دل ڈوبتا جا رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ میں اس جوئے میں ہار گیا ہوں۔ میں نے اس امید

میں چیف کی ہر بات مانی تھی کہ جب مجھے یہاں سے نکلنے کا موقع ملے گا تو میں فائدہ اٹھاؤں گا۔ میں لندن پولیس سے بھی توقع لگائے بیٹھا تھا کہ وہ اپنی شہرت کے مطابق کوئی کارنامہ سرانجام دیں گے اور مجرم عین اس وقت پکڑ لیے جائیں گے جب وہ پچاس ہزار پاؤنڈز کے ساتھ نور کو بھی لے جائیں گے، ضمانت کے طور پر...... اگر میں ان کی مرضی کے مطابق عدالت میں اپنا بیان بدل کے چیف کو بے گناہ قرار دلوانے میں کامیاب رہتا ہوں تو وہ نور کو چھوڑ دیں گے۔

لیکن ایسا نہ ہوا، پھر...... ان کی مرضی کا بیان دینے کے باوجود ثبوت اور شہادتوں کی بنیاد پر عدالت نے میرے بیان کو تسلیم نہ کیا۔ پولیس نے ثابت کر دیا کہ میں اپنی مرضی سے کچھ نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں نور کی جان بچانے کے لیے ایسا کہنے پر مجبور ہوں، یہ تو انہیں معلوم ہو ہی جائے گا کہ مجھے رہائی مل گئی ہے تو نور غائب ہے...... میں یہ جھوٹ بھی نہیں بول سکتا کہ نور واپس پاکستان چلی گئی ہے۔

ان بے ضمیر بے کردار کی قید میں نور پر کیا بیتے گی؟ وہ مجھے کیا سمجھے گی؟ اپنی رہائی کے لیے میں نے اسے پکڑوا دیا۔ بے شک پولیس اور سراغرساں میری بھرپور مدد کریں گے لیکن وہ نور کے بخیر و عافیت واپس آنے کی کوئی ضمانت نہیں دے سکتے۔ یہ نقلی چیف تو غائب ہو جائے گا اصلی چیف جو ابھی تک جیل میں ہے اور اپنے جرم کی سزا سنائے جانے کا انتظار کر رہا ہے اپنے موقف پر قائم رہے گا کہ قتل میں نے نہیں کیا تھا، مجھے پھنسایا گیا ہے۔

گاڑی اچانک رکی تو میرے پریشان خیالات کی رو بکھر گئی۔ میرے لیے طے کرنا محال تھا کہ میں نے عقلمندی کی تھی یا بے وقوفی۔ ان جرائم پیشہ لوگوں کے سامنے میری کیا چلتی۔ میں نے نور امارے جانے پر کچھ وقت حاصل کرنے کو ترجیح دی تھی کہ شاید یہ مہلت فائدہ مند ثابت ہو۔ کچھ ایسا ہو جائے کہ بگڑی بات بن جائے۔ غیب سے کچھ ظہور میں آئے یا تقدیر مجھے کوئی موقع فراہم کر دے...... دس منٹ تک ہم پیدل چلتے رہے۔ پھر مجھے ایک زینہ اترنے کو کہا گیا۔ میری آنکھوں پر پٹی تھی۔ میں کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا کہ میں کہاں ہوں، ہر طرف کی خاموشی یہ احساس دلاتی تھی کہ مجھے شہر سے باہر لایا گیا ہے۔ یہ ڈیل کسی ویرانے میں ہو رہی ہے۔

میں نے کہا۔ ''کیا نور آ گئی......''

''ہاں...... اور وہ بریف کیس بھی لے آئی ہے۔''

میں نے عاجزی سے کہا۔ ''میری آنکھوں پر سے یہ پٹی ہٹا دو، تھوڑی دیر کے لیے......''

"یہ نہیں ہوسکتا۔"

میں نے کہا۔ "پلیز، میں اسے ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"تم اسے دیکھ نہیں سکتے۔ اس کے اور ہمارے درمیان ایک خستہ عمارت حائل ہے۔ اس کے بعد نیچے کی طرف ایک سڑک ہے، یہی سڑک آگے سے گھوم کے آئی ہے۔ نور اس پر کھڑی ہے۔"

میں نے کہا۔ "ڈرنے کی کیا بات ہے اس میں۔"

ایک زبردست تھپڑ میرے منہ پر پڑا جو اتنا غیر متوقع تھا کہ میں گر پڑا۔ میں نے چلا کے کہا۔ "نور...... تم کہاں ہو۔"

نور کا کوئی جواب نہیں آیا۔ پے در پے پڑنے والی ٹھوکروں نے مجھے بے حال کر دیا۔ "تم کچھ نہیں کر سکتے نواب زادے۔ ہم نور کو لے جارہے ہیں اور وہ تم کو اسی وقت ملے گی جب تم اور تمہارا وکیل چارلی کے قتل کے الزام سے چیف کو رہائی دلوا دو گے۔"

میں نے فریاد کی۔ "دیکھو، یہ پاکستان نہیں ہے۔ وہاں سب کچھ ہوسکتا تھا۔ زور زبردستی سے یا رشوت سے، لیکن یہاں۔"

"کوئی پہاڑ نہیں کھودنا ہے تم کو...... صرف یہ کہنا ہے کہ تمہارا الزام لگانا غلط تھا۔ چیف نے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ تم نے اپنا پرانا حساب برابر کرنے کے لیے اسے پھنسایا۔ چاہو تو الزام اپنے سر لے لو، کسی اور کو مجرم بنا دو...... یا وہی کہو جو تمہیں سمجھایا گیا ہے، جب تک چیف واپس نہیں آئے گا نور بھی واپس تمہیں آئے گی، آگے تمہاری مرضی...... تمہیں یہ کام کیسے کرنا ہے۔"

"اور...... تم...... نور سے میرا رابطہ کراؤ گے۔"

"یہ ہوسکتا ہے...... یہ تمہاری نیت پر منحصر ہے...... تم پلان کے مطابق چلو گے تو اسے کوئی تکلیف نہیں ہوگی...... ورنہ......"

"ورنہ کیا......؟"

"وہ ہمارے بس میں ہوگی، اس کے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔"

خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا۔ کسی نے میری جیب میں سے نیا موبائل فون بھی نکال لیا جس پر میں راجا کے ذریعے نور تک اپنی بات پہنچاتا رہا تھا۔ آس پاس بدستور سناٹا تھا۔ کہیں کسی قسم کی کوئی آواز نہ تھی۔ نہ سڑک پر سے کوئی گاڑی گزرنے کی...... نہ انسانوں کے بات کرنے کی...... زندگی میں اتنا بے بس میں نے خود کو کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔

میں اپنے پر وحشت خیالوں میں اتنا سرگرداں تھا کہ میرے لیے وقت کا احساس بے معنی ہوگیا تھا۔ اچانک مجھے اپنے چاروں طرف خاموشی محسوس ہوئی، ایسی خاموشی جس میں میرے ساتھ صرف میری تنہائی تھی۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ "چیف......"

کسی نے بھی جواب میں کچھ نہیں کہا۔ میں نے کہا۔ "چیف...... تم کہاں ہو...... چیف......!" میں چلایا لیکن میرے کانوں میں صرف اپنی آواز آئی یا اپنی بے چارگی اور بے بسی کی خاموش ہنسی۔ وہ لوگ جاچکے تھے۔ وہ نور کو بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے اور مجھے نہ جانے کہاں چھوڑ گئے تھے۔

میں نے اپنے ہاتھ آزاد کرانے کی اور اپنی آنکھوں پر چڑھی ہوئی پٹی اتارنے کی دیوانہ وار لاحاصل کوشش کی۔ ایک عجیب طرح کے خوف نے مجھے گھیر لیا۔ شاید وہ مجھے کسی ویران گھر میں بند کر گئے ہوں گے جہاں کوئی میری آواز پر نہیں آئے گا۔ میں چلاتے چلاتے اسی مدفن بے نشاں میں مر جاؤں گا۔ بے وقوف...... احمق...... بے عقل نواب رفیق احمد شیرازی، یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ چیف نہیں، تم نے اس سے تعاون کیا؟ نور کو اس کے حوالے کر دیا؟ انہیں پچاس ہزار پاؤنڈز بھی دلوا دیے۔ تمہاری یہی سزا تھی جو تمہارے دشمنوں نے مل کر دی۔ اب نہ ست بدھائی کی ریاست ہوگی نہ شیرازی اینڈ کمپنی، نہ وہ محل نہ وہ اصطبل...... نور پھر خوار ہوگی۔

میں نے اپنا سر جھٹکا۔ یہ میرے دماغ میں کس قسم کے فضول خیالات کی یلغار ہے، ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ اگر میں یہاں سے نکل گیا تو سب ٹھیک کرلوں گا۔ یہاں سے نکلنا کیا مشکل ہے، جب وہ مجھے لائے تھے تو میں چند زینے اتر کے نیچے آیا تھا، نہ اس وقت کسی نے کوئی دروازہ کھولا تھا اور نہ بعد میں اس کے بند ہونے کی آواز آئی تھی، وہ زینہ کہیں قریب ہی ہوگا، میں اسے تلاش کرسکتا ہوں۔

کئی بار گرنے اور دیوار سے ٹکرانے کے بعد بالآخر میرے قدموں نے زینہ تلاش کرلیا۔ ایک دم میرا حوصلہ دوچند ہوگیا، آہستہ آہستہ ایک ایک کر کے میں اوپر کی جانب بڑھتا گیا۔ پھر میرا اگلا قدم ہموار سطح پر پڑا۔ زینہ ختم ہوگیا تھا، میں نے چلا کے کہا۔ "ہیلو...... کوئی ہے؟"

مجھے یہاں چھوڑ کے جانے والوں نے کہا تھا کہ سڑک اسی کھنڈر کے نیچے سے گزرتی ہے، کھنڈر سے شاید میں باہر آگیا تھا۔ اب کیا مجھے نیچے کود جانا چاہیے؟ معلوم نہیں سڑک

کتنی گہرائی پر ہے اور یقیناً یہ کوئی متروک سڑک ہوگی...... یا وہ سب جھوٹ ہوگا جو انہوں نے کہا۔ پیاس سے میرے حلق میں کانٹے سے پڑ رہے تھے، میرے اندازے کے مطابق یہ سہ پہر کا وقت تھا...... سورج میرے دائیں ہاتھ پر مغرب کی جانب تھا۔

میں جہاں کھڑا تھا وہیں بیٹھ گیا۔ ایک شکست خوردہ انسان...... ایک ہارا ہوا جواری، ایک بے عقل انسان جس نے اپنے غلط فیصلوں سے نور کو بھی گنوا دیا تھا۔ اب میں کیا کرسکتا ہوں، کیا مجھے یہاں بیٹھے رہنا چاہیے؟ جب تک کہ رات کی تاریکی میرے گرد محیط نہ ہوجائے، یا کسی بھی سمت میں چل دینا چاہیے، چلتے رہنا چاہیے۔ میں کہیں نہ کہیں ضرور پہنچ جاؤں گا۔ اندھا ہونے کے باوجود میرے پیر سلامت ہیں اور آزاد ہیں۔

میں نے آہستہ آہستہ چلنا شروع کیا اور سوچنے لگا کہ آخر لندن کے مضافات میں یہ جگہ کون سی ہوسکتی ہے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ مجھے لندن کے چپے چپے سے واقفیت تھی لیکن میں انگلینڈ کو جانتا تھا۔ یہ کوئی بہت بڑا ملک نہیں تھا۔ اس میں ہمارے ملک کی طرح سیکڑوں میل رقبے میں پھیلے ہوئے جنگل یا صحرا نہیں تھے۔ ہم نے شاید ڈیڑھ گھنٹا ڈرائیو کی تھی لیکن کس سمت میں...... لندن کے مشرق میں کیا ہے اور مغرب میں کیا۔

میں آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا جارہا تھا اور محتاط تھا کہ اچانک کسی چٹان سے نہ ٹکرا جاؤں یا کسی نشیب میں نہ جا گروں، میرے بندھے ہوئے ہاتھ بالکل سن ہوچکے تھے اور کندھے تک جیسے میرے جسم کا حصہ ہی نہیں رہے تھے۔ اچانک میں نے ایک آواز سنی، یہ کسی گھوڑے کی آواز تھی۔

میں نے اپنا رخ بدلا اور آواز کی سمت چل پڑا۔ کئی بار میں نے چلا کے بھی پوچھا۔ "کوئی ہے، ڈو یو ہیئر می......" پھر اچانک کسی نے میرے قریب سے کہا۔ "رک جاؤ...... کون ہو تم......؟"

میں اچھل پڑا۔ "تھینکس گاڈ...... پہلے میرے ہاتھ کھولو، نہیں پہلے میری آنکھوں پر سے یہ پٹی ہٹاؤ، پھر میں سب بتاتا ہوں۔ مجھے تمہاری مدد چاہیے۔"

ایک ہاتھ نے سختی سے چڑھے ہوئے ربر بینڈ کو ایک جھٹکے سے کھینچ کر اتار دیا۔ روشنی میں دنیا ایک دم میرے سامنے آئی۔ زمین، آسمان...... بادل...... کھیت اور میرے سامنے بندوق کے سہارے کھڑا ہوا بوڑھا فارمر۔

"تھینک یو...... تھینک یو ویری مچ...... تم میرے محسن ہو، تم نے میری زندگی بچالی۔ اب پھر میرے ہاتھ بھی کھول دو۔"

اس شخص کی چھوٹی سی سفید ڈاڑھی تھی، سر پر بوسیدہ ہیٹ تھا۔ اس نے زین کی پرانی میلی پتلون اور سلیٹی قمیص پہن رکھی تھی۔ اس کے جوتے برسوں پرانے تھے۔ میں اور وہ ایک چھوٹے سے فارم میں کھڑے ہوئے تھے۔ مجھے اپنی موجودگی کا احساس دلا کر ادھر بلانے والا گھوڑا ایک احاطے کے بانس سے بندھا ہوا تھا۔ اس کے آگے صاف ستھرے کاٹیج جیسے گھر کے باہر ایک بوڑھی عورت سر پر رومال باندھے اور ہاتھ میں ٹوکری اٹھائے کھڑی بار بار پوچھ رہی تھی۔ "یہ کون ہے جارج...... صورت سے تو شریف آدمی لگتا ہے، کیا ہوا ہے اسے......؟"

بڈھے نے کہا۔ "اگر تم ایک منٹ کے لیے اپنی چونچ بند کرو تو سب معلوم ہوجائے گا۔ ابھی تو میں خود بھی کچھ نہیں جانتا۔"

رسی الگ ہوجانے کے بعد بھی میں اپنے ہاتھوں کو حرکت دینے سے قاصر رہا۔ میرے بازو سائیڈ میں لٹک گئے۔ میرے شانوں میں اس حرکت سے شدید ٹیس اٹھی۔ میری انگلیوں میں سرسراہٹ کی وجہ دوران خون کا بحال ہونا تھا۔

تھوڑی دیر بعد میں اپنے بازو ہلانے اور گھمانے کے قابل ہوگیا، بڈھا بڑھیا مجھے دکھ اور حیرانی سے دیکھتے رہے۔ "یہ کس نے کیا تمہارے ساتھ......؟"

میں نے کہا۔ "میرے کچھ دشمن ہیں۔"

"کیا انہوں نے تمہیں مارا......؟" بڑی بی نے سوال کیا۔

"اب کیا اسی جگہ کھڑے کھڑے سارے سوال جواب کرو گی، کم آن سن......" اس نے میرا ہاتھ تھاما۔ "آر یو او کے؟"

میں نے کہا۔ "اگر مجھے پینے کے لیے کچھ مل جائے۔"

اندر دو مختصر کمرے تھے...... اس دیہاتی گھر کی دیواریں اور فرش سب لکڑی کے بنے ہوئے تھے۔ فرنیچر بھی پرانا اور دیہاتی فیشن کا تھا لیکن آرام دہ تھا۔ مجھے ایک آرام کرسی پر لٹا دیا گیا اور بڑی بی نے بڑی پھرتی سے کافی بنانی شروع کی۔ ان کی زبان ان کے ہاتھوں سے زیادہ تیز چلتی رہی۔ "ایسی کافی بناتی ہوں میں، ایک مگ پیو گے تو گھوڑے کی طرح دوڑنے لگو گے اور میرے پاس کچھ پنیر کیک پڑے ہیں، میرے پوتے اور نواسے کبھی آجاتے ہیں تو......"

''تو کیا...... وہ کچھ نہیں کھاتے اور وہ آتے ہی کب ہیں۔ بس تم انتظار کرتے کرتے مر جاؤ گی...... اب پلیز خاموشی سے کام کرو، مجھے اس نوجوان سے کچھ پوچھنا ہے، تم کون ہو مسٹر...... انڈین لگتے ہو مجھے......''

میں نے کہا۔ ''سر...... آپ کو سب معلوم ہو جائے گا۔ پہلے آپ ایک مہربانی کریں۔ کیا فون ہے آپ کے پاس۔''

''کیوں نہیں......'' اس نے سیٹ میرے سامنے رکھ دیا۔ ''بیوی بچوں سے بات کرنا چاہتے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''دیکھو مجھے نہیں معلوم کہ میں کہاں ہوں۔ کچھ لوگ مجھے اغوا کر کے لائے تھے، وہ بعد میں میری بیوی کو لے گئے، کیا آپ پولیس کو بلا سکتے ہیں؟ انہیں بتائیں میں یہاں ہوں، مجھے آ کے لے جائیں، میرا نام رفیق ہے، نواب رفیق احمد شیرازی۔''

''کیا......؟ ذرا مجھے لکھ کے دو۔''

میں نے کہا۔ ''اچھا چھوڑو۔ ان سے کہو ارنسٹ مینشن کیس والا رفیق یہاں ہے۔''

وہ مجھے حیرانی سے دیکھتا رہا۔ ''یہ ارنسٹ مینشن کہاں ہے؟''

''سینٹرل لندن میں...... اور وہ میرا ہے، میں تمہیں وہاں انوائٹ کرتا ہوں، تم دونوں نے میری جان بچالی۔''

بڈھے نے سینے پر صلیب بنا کے ہاتھ اوپر اٹھایا۔ ''میں نے کچھ بھی نہیں کیا...... لیکن میں پولیس کو بتا دیتا ہوں، کیا نام بتایا تم نے۔ ارنسٹ مینشن والا رفیق۔'' اس نے فون گھمانا شروع کیا۔

اس کے بعد معاملات کا رخ یوں بدل گیا جیسے طوفان میں گھری ہوئی کشتی کو کوئی دستِ غیب سلامتی کے ساحل کی طرف موڑ دے۔ میں ابھی بڑی بی کے پوتوں نواسوں کے چھوڑے ہوئے پنیر کیک کھا کے کافی کا دوسرا مگ پی رہا تھا کہ پولیس کی گاڑی سائرن بجاتی آئی اور دروازے پر ٹھہر گئی۔ بلاشبہ وہ سب پوتے نواسے بدقسمت ہیں جو نانی دادی کی بنائی پرشفقت ذائقہ دار چیزیں چھوڑ کے فاسٹ فوڈ آئس کریم اور چاکلیٹ کی طرف لپکتے ہیں۔

میں نے ان دونوں نیک دل بوڑھوں کا شکریہ ادا کیا جن کے بچے اب ان سے ملنا بھی بھول گئے تھے لیکن وہ تنہا نہیں تھے۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ تھے، پہلے کی طرح...... اور اپنی دلچسپیوں کی الگ دنیا بسائے بیٹھے تھے۔ ایک بار پھر میں نے انہیں ارنسٹ مینشن میں مدعو کیا لیکن وہ یہی کہتے رہے کہ ہم کہیں بھی آتے جاتے نہیں۔ پھر بھی کوشش کریں گے۔

مجھے لینے کے لیے آنے والے میرے معاملات کے پس منظر سے بے خبر تھے۔ ان کے ذمے یہ ڈیوٹی لگائی گئی تھی کہ جہاں سے میں نے کال کیا ہے وہاں جا کے دیکھیں اور مجھے اپنے علاقے کے پولیس اسٹیشن پہنچا دیں۔ ان کا مرکز سے مسلسل رابطہ تھا چنانچہ مجھے دریافت کرنے کے بعد انہوں نے کنفرم کیا کہ اطلاع درست تھی اور اب وہ مسٹر رفیق کو ساتھ لا رہے ہیں۔ میں اتنا اپ سیٹ تھا کہ میں نے راستے میں ان سے نور کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے معذرت کر لی کہ وہ کچھ نہیں جانتے۔

غصے کا آتش فشاں اب میرے اندر لاوا اگل رہا تھا۔ کچھ اپنی بے وقوفی پر غصہ تھا کہ میں نے اس جعلساز دھوکے باز کو پہچان لیا تھا کہ وہ چیف نہیں اور پھر بھی اس کے ساتھ مذاکرات کرتا رہا...... لیکن میرے سامنے راستہ بھی کیا تھا۔ نور کا خیال اور اس کا تصور میرے دل میں انگارے بھر رہا تھا۔ وہ جرائم پیشہ اور وحشی لوگ اس کا کیا حال کریں گے۔ لندن کی پولیس لاکھ مستعد سہی۔ کیا وہ اسے زندہ سلامت اور خیر و عافیت کے ساتھ مجھے لوٹا سکے گی۔ وہ اس اجنبی شہر میں میری وجہ سے آئی تھی۔ اگر اسے کچھ ہوا تو ذمے دار میرے سوا کون ہوگا۔

پولیس اسٹیشن پہنچ کے مجھے حیرانی کا جو شاک لگا وہ میری زندگی کا ناقابل فراموش تجربہ بن گیا۔ کیپٹن راجر کے کمرے میں داخل ہوتے ہی میں نے نور کو دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے میں اپنی جگہ پر منجمد ہو گیا۔ نور کی بات اس کے لبوں پر ادھوری رہ گئی۔ وہ ایک دم اٹھی اور مجھ سے لپٹ گئی۔ ایسا جذباتی منظر پاکستان میں کہیں بھی سرعام بالکل ناقابلِ تصور ہے مگر لندن میں نہ معیوب سمجھا جاتا ہے اور نہ غیر فطری۔

میرے نمودار ہونے سے پہلے بھی نور جذباتی ہیجان میں مبتلا ہوگی لیکن وہ امید اور انتظار کے وقفے میں خود پر کنٹرول کیے بیٹھی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کا بے قابو ہو جانا فطری بات تھی۔ چیخ مار کے مجھ سے چمٹتے ہی وہ بے ہوش ہو گئی اور میں اسے نہ سنبھالتا تو وہ فرش پر ڈھیر ہو جاتی۔ بچھڑے ہوئے چاہنے والوں کا ملنا ایک جذباتی سین ضرور ہوتا ہے لیکن کیپٹن راجر ایسے شدید جذباتی مظاہرے کے لیے تیار نہ تھا جس میں میڈیکل ایمرجنسی پیدا ہو جائے۔

وہاں صرف کیپٹن راجر کی میز تھی۔ میں نے اس پر نور کو لٹا دیا۔ اسے بے حس پڑا دیکھ کے وہ گھبرا گیا۔ ''میں ایمبولینس بلاتا ہوں۔''

میں نے اسے روکا۔ ''اٹ از آل رائٹ...... مجھے تھوڑا سا پانی منگوا دو، یہ ابھی ہوش میں آ جائے گی۔''

اس نے مجھے پانی منگوا دیا۔ ''مجھے سخت حیرت ہے کہ اچانک اسے کیا ہوا، ابھی تمہارے آنے سے پہلے نور بالکل نارمل طریقے پر مجھ سے بات کر رہی تھی۔''

میں نے کہا۔ ''ہاں، یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آ سکتی۔ کسی کی نظر اندر اٹھنے والے جذبات کے طوفانوں کی شدت کا کیسے اندازہ کر سکتی ہے۔''

وہ میری بات کچھ سمجھا کچھ نہیں لیکن اس نے خدا کا شکر ادا کیا جب پانی کے چند چھینٹے پڑنے کے بعد نور نے آنکھیں کھول دیں اور کچھ دیر میں خفت زدہ سی اٹھ بیٹھی۔ راجر کے علاوہ بھی کچھ لوگ اس کے ہسٹریائی ردعمل کا مشاہدہ کر کے جا چکے تھے۔

میں نے کہا۔ ''تم واقعی پاگل ہو...... خود کو تماشا بنا لیا سب کے سامنے۔''

وہ مجھے دیکھتی رہی۔ ''جو کچھ ہوا اس پر میرا اختیار نہیں تھا۔ میں کوئی ایکٹنگ نہیں کر رہی تھی۔''

میں نے کہا۔ ''آئی ایم سوری، میرا یہ مطلب نہیں تھا جان لیکن موقع محل بھی تو دیکھنا چاہیے۔ کچھ کنٹرول رکھنا چاہیے اپنے جذبات پر۔ خیر...... یہ بتاؤ، اب طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟''

''میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''تم کیسے ہو، مجھے بہت کمزور لگ رہے ہو۔''

میں نے کہا۔ ''جہاں مجھے رکھا گیا تھا۔ وہ کوئی صحت افزا مقام نہیں تھا۔ تم بتاؤ کہ یہاں کیسے آئیں۔ تمہیں تو وہ بدمعاش لے گئے تھے؟''

کیپٹن راجر ہماری گفتگو کیا سمجھتا۔ ہم دونوں ہی ایک بحرانی کیفیت سے گزر کے آئے تھے۔ وہ ہم سے یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ دیکھو تمہاری باتوں میں میرا وقت ضائع ہو رہا ہے اور فوراً قانونی کارروائی شروع کر دیتا۔ یہ وہاں کی پولیس کا خالص انسانی وصف ہے، وہ غیر انسانی رویہ کبھی اختیار نہیں کرتے خصوصاً عام شریف لوگوں کے ساتھ۔

کیپٹن راجر نے گھڑی دیکھی۔ ''میرا خیال ہے کہ قانونی کارروائی کو کچھ دیر کے لیے ملتوی کر دینا چاہیے۔''

میں نے کہا۔ ''اٹ از آل رائٹ کیپٹن...... ہم اپنا بیان دینے کے لیے تیار ہیں۔''

''دراصل مجھے ایک کام سے جانا تھا اور وہاں میرا وقت پر پہنچنا از حد ضروری ہے، باقی کارروائی ہم کل صبح پر رکھ لیتے ہیں۔''

باقی کیا...... کارروائی ابھی شروع ہی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے زبانی نور سے چند سوالات پوچھے ہی تھے کہ میں پہنچ گیا اور کارروائی رک گئی۔ میں نے اس کی پیشکش کو قبول کر لیا۔ ہماری گاڑی باہر موجود تھی۔ یہ وہی گاڑی تھی جو پولیس کو میرے اغوا کے بعد فارم ہاؤس کے باہر لاوارث کھڑی ملی تھی۔ اب اس میں ایک ڈرائیور موجود تھا جس کی صورت میرے لیے اجنبی تھی۔ دوسرا اس کے ساتھ سر سیٹ پر رکھے سو رہا تھا۔

ہمیں دیکھتے ہی ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کی تو اس کا ساتھی بھی مستعد ہو کے بیٹھ گیا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ دونوں حفاظتی عملے کا حصہ ہوں گے اور ہر جگہ آتے جاتے ہمارے ساتھ رہیں گے۔ تمام راستہ نور میرے کندھے پر سر رکھے آنکھیں بند کیے خاموش بیٹھی رہی۔ میں واپس ارنسٹ ہاؤس پہنچا تو مجھے سب کچھ بہت بدلا ہوا لگا۔ جس سیکیورٹی کو میں نے غیر ضروری سمجھتے ہوئے ختم کر دیا تھا وہ پہلے سے زیادہ نظر آ رہی تھی۔ سوشی نے اور پولیس نے حفاظتی انتظامات کو ناگزیر قرار دیتے ہوئے ایک فول پروف سسٹم نافذ کرا دیا تھا جس میں باڈی گارڈز کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔ کلوز سرکٹ کیمرے، خودکار الارم، مخصوص فریکوئنسی پر سگنل دینے والے آلات۔

اپنے کمرے کی خلوت میں پہنچتے ہی نور کو پھر جذباتی کمزوری نے مغلوب کیا اور اس نے روتے روتے مجھ سے مطالبہ کیا کہ بس اب یہ سب چھوڑو اور چلو واپس...... لعنت لندن پر، ارنسٹ مینشن پر اور شیرازی اینڈ کمپنی پر...... میں صرف سنتا رہا اور اسے تسلی دیتے ہوئے اچھا اچھا کہتا رہا۔ بالآخر وہ پرسکون ہو گئی۔ میں خود شدید ٹینشن میں تھا لیکن نور کو سنبھالنے کی ذمے داری بھی میری تھی چنانچہ میں نرمی سے اور محبت سے اسے سمجھاتا بھی رہا اور اپنی ہلکی پھلکی باتوں سے اس کو ہنسانے کی کوشش بھی کرتا رہا۔

کچھ دیر میں وہ ہاتھ منہ دھو کے اور لباس بدل کے آ گئی تو میں بھی غسل کرنے چلا گیا۔ پھر ہم نے ٹیرس پر بیٹھ کے رات کا کھانا کھایا۔ اب نور سے پوچھا جا سکتا تھا کہ اس پر کیا بیتی اور میں بھی بتا سکتا تھا کہ میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔ اس سے پہلے جب نور نے بات کرنی چاہی، میں نے اسے روک دیا تھا کہ ابھی نہیں...... کریں گے بات، جلدی کیا ہے۔

پہلا سوال میں نے کیا۔ ''میرے ساتھ جو ڈراما ہوا سو ہوا، کیا وہ تمہیں اغوا کر کے نہیں لے گئے تھے......؟ پچاس

ہزار پاؤنڈز کے ساتھ۔"

"لے گئے تھے......ان کے پیچھے پیچھے پولیس پہنچ گئی۔ وہ سب پکڑے گئے......" نور نے کہا۔ "پوچھو کیسے؟"

میں نے کہا۔ "لندن کی پولیس ایسے کارنامے سرانجام دینے کے لیے مشہور ہے۔ کیسے کا جواب میں کیسے دوں؟"

وہ بولی۔ "پولیس کو میں نے بلایا تھا، اپنے پیچھے۔"

"تم نے بلایا تھا؟"

اس نے ایک گہری سانس لی۔ "تمہارے اصطبل جانے کے کوئی ایک گھنٹے بعد وہاں سے سائمن نے فون کیا تھا۔ بے چارا سائمن...... پولیس نے میرے بیان پر اسے تفتیش کے لیے پکڑ لیا تھا۔ وہ کیا بتاتا......"

"اس نے کہاں فون کیا تھا......؟"

"اس نے آفس میں فون کیا تھا، تم سے بات کرنے کے لیے۔ مگر اسے بتایا گیا تھا کہ نواب رفیق ایک گھنٹا پہلے گاڑی لے کر کہیں گئے ہیں۔ اس نے معلوم کرنے کی کوشش کی کہ تم آفس میں ہو یا نہیں، وہاں اس کی بات مجھ سے ہوئی۔ اس نے کہا کہ میں یہاں ان کا انتظار کر رہا ہوں۔ اس نے بتایا کہ میں نے انہیں ایک گاہک سے ملوانے کے لیے بلایا تھا۔"

میں نے کہا۔ "یعنی فون کال جنیوئن تھی۔"

"سائمن نے کہا کہ لارڈ رفیق کے آنے کے بعد میں ڈیوک آف کنٹرشائر کو اطلاع دیتا...... لیکن وہ ابھی تک پہنچے نہیں حالانکہ انہوں نے کہا تھا کہ میں آ رہا ہوں۔ پہلے تو میں نے کہہ دیا کہ ہو سکتا ہے کوئی اور ضروری کام نکل آیا ہو، پھر میں نے تم سے بات کرنے کی کوشش کی تو آدھے گھنٹے تک تمہارا فون بند ملا۔ مجھے تشویش ہوئی۔ میں نے پھر سائمن سے پوچھا تو اس نے کہا کہ لارڈ رفیق ابھی تک نہیں آئے۔"

"یہ نواب سے میں لارڈ کب بنا۔"

"صرف سائمن ہی نہیں...... یہاں اور لوگ بھی تمہیں لارڈ رفیق کہنے لگے ہیں...... عادت کے مطابق، نواب ان کی زبان پر نہیں چڑھتا۔ پہلے لارڈ ارنسٹ کہتے تھے، ان کی جگہ تم آئے ہو تو لارڈ رفیق ہو گئے۔ خیر...... سائمن کی بات پر مجھے تشویش لاحق ہوئی، میں نے سوشی سے کہا کہ آخر رفیق گیا کہاں اور اس سے رابطہ کیوں نہیں ہو رہا ہے، اس نے کہا کہ تھوڑی دیر اور دیکھ لیتے ہیں، کیا پتا فون خراب ہو گیا ہو۔"

"سائمن نے گیٹ پر میری گاڑی نہیں دیکھی تھی؟"

"وہ باہر گیا بھی نہیں...... ڈھائی گھنٹے بعد اس نے پھر یہی کہا کہ میں لارڈ رفیق کا انتظار کر رہا ہوں اور مجھے تشویش ہو رہی ہے۔ پھر میں نے پولیس سے اپنے اندیشوں کا اظہار کیا۔ پولیس پہلے میرے اندیشوں کو سیریس نہیں لے رہی تھی لیکن جب میں نے گزشتہ رات کے پرعداوت واقعے کا ذکر کیا جس میں نسل پرست متعصب گورے اسکن ہیڈز نے سوشی کے گھر سے واپس آتے ہوئے ہم پر حملہ کیا تھا اور سوشی نے بھی تائید کی تو پولیس نے رینچ یعنی اصطبل میں سائمن کو فون کیا اور اس سے کہا کہ وہ اصطبل سے ارنسٹ مینشن کے راستے پر دیکھے۔ وہ گیٹ سے نکلا ہی تھا کہ اسے تمہاری لاوارث کھڑی ہوئی گاڑی نظر آ گئی۔ اس نے فوراً پولیس کو بتا دیا اور دس منٹ میں ایک پولیس کار وہاں پہنچ گئی۔ پھر سراغرساں اور جاسوس آ گئے۔ انہوں نے مجھے مطلع کیا اور میں سوشی کے ساتھ ایک پولیس کار میں گئی۔ پولیس نے وہاں معمول کے مطابق اپنی کارروائی کی۔ انہوں نے فنگر پرنٹس لیے اور فوٹو گراف...... وہاں دوسری گاڑی کی موجودگی ثابت ہو گئی تھی جس میں تمہیں اغوا کر کے لے جایا گیا تھا۔ انہوں نے ٹائروں کے پرنٹس دیکھے۔ جھاڑیاں دیکھیں جہاں اغوا کار چھپ کر بیٹھے تھے۔ بعد میں سراغ لگانے والے کتے طلب کیے گئے اور واردات کی خبر پولیس کے نیٹ ورک پر پھیلا دی گئی۔

پولیس نے مجھ سے بہت کچھ پوچھا۔ میں نے سائمن کے رویے کا ذکر کیا جو مجھے بھی مخالف لگا تھا اور تمہیں بھی...... وہ ہمیں اپنا نیا مالک سمجھ کے ناخوش تھا۔ وجہ وہی...... ہم نو دولتیے اور گھٹیا لوگ تھے۔ غیر خاندانی، سونے پر سہاگہ یہ کہ انڈین...... کالے لوگ، میں نے اسی پر شک ظاہر کیا۔ اس سے پہلے چارلی اپنی خباثت دکھا چکا تھا اور محل کے سارے ملازمین احتجاجاً مستعفی ہو گئے تھے۔ انہیں یہ ملکیت کی تبدیلی ناپسند اور نامنظور تھی۔ میرے بیان پر...... میرا خیال ہے کہ میں غم و غصے میں اس حد تک آگے چلی گئی کہ میں نے سائمن کو ہی مجرم بنا دیا تھا کہ اس نے دھوکے سے فون کر کے تمہیں بلایا ہوگا، خیر بعد میں خود ڈیوک آف کنٹرشائر نے تصدیق کر دی کہ وہ گھوڑے خریدنا چاہتے تھے۔ سائمن نے ان سے بات کی تھی اور انہوں نے کہا تھا کہ وہ لارڈ رفیق کو منہ مانگی قیمت دینے کے لیے تیار ہیں یہاں تک کہ بلینک چیک بھی دے دیں گے۔ دراصل گھوڑوں کی محبت سے زیادہ ان کو اپنے حریف دوست لارڈ ارنسٹ کی موت کا صدمہ تھا اور ان کی فیملی سے جذباتی ہمدردی تھی۔ ان کے بیان سے سائمن کی جاں بخشی ضرور ہو گئی لیکن اس پر شک برقرار رہا۔

میری جو حالت ہوئی سو ہوئی۔ سوشی کا صدمے سے برا

حال تھا۔ اس نے پولیس پر دباؤ ڈالنے کے لیے ایک پریس اسٹیٹمنٹ جاری کر دیا۔ پولیس کا سارا محکمہ ایک دم جیسے سارے کام چھوڑ کے اس کیس میں لگ گیا۔ ہر وقت صبح شام نئے احکامات ملتے تھے، نئے انتظامات کیے جاتے تھے۔ انہوں نے ہر طرف خفیہ پولیس کے لوگ سادے کپڑوں میں متعین کر دیے تھے اور امکانات کے ہر پہلو کو سامنے رکھا تھا۔ بہت سے لوگ گرفتار ہوئے اور تفتیش کے بعد چھوڑ دیے گئے۔ دو بار مجھے شناخت کے لیے بلایا گیا۔ محل کے پرانے خادم طلب ہوئے جن میں میجر لوسی بھی شامل تھی۔ وہ سخت برافروختہ تھی اور الٹا پولیس کو دھمکی دیتی رہی کہ وہ ان کے خلاف ہتک عزت کے ہرجانے کا کیس کرے گی۔ میں نے کسی پرائیوٹ سیکیورٹی ایجنسی کی خدمات حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کی تو پولیس نے مجھے تین نام دیے کہ یہ قابل اعتبار ہیں۔ ایک سے میں نے کنٹریکٹ بھی کر لیا لیکن ایک بہت بڑا کمال پولیس نے یہ کیا...... بتاؤ یہ کیا ہے؟"

میں نے نور کی ایک پنڈلی پر زخم کا نشان دیکھا۔ اس پر میڈیکل ٹیپ سے کراس بنا ہوا تھا اور اردگرد کی جگہ پر گہری سرخی تھی۔ ایک خفیف سا نشان خون کا بھی تھا۔ میں نے اسے انگلی سے چھو کر کہا۔ "یہ کوئی چوٹ لگی ہے؟"

اس نے مسکرا کے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں۔"

میں نے کہا۔ "کوئی چیز چبھی ہوگی۔ درد ہوتا ہے۔"

وہ قہقہہ مار کے ہنسی...... "تم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ اسی زخم کی وجہ سے اس وقت میں تمہارے سامنے بیٹھی ہوں۔"

میں نے بے وقوفوں کی طرح پوچھا۔ "وہ کیسے......؟"

اس نے کہا۔ "اس بینڈ ایج کے پیچھے ایک الیکٹرونک چپ ہے۔ ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے جان لیکن یہاں کی پولیس سراغرسانی کے لیے سائنسی آلات اور ایجادات سے کیا کچھ کرتی ہے، ایک رات میرے پاس کیپٹن راجر آیا میں سمجھی معمول کی تفتیش کے لیے آیا ہوگا۔ ہاں...... یہ پہلی رات کی بات ہے، اس کے ساتھ ایک دبلا پتلا بے وقوف نظر آنے والا ڈرائیور تھا۔ اس نے اندر آ کے مجھے خبردار کیا کہ لارڈ رفیق کا سراغ تو ہم لگا لیں گے لیکن میڈم...... آپ خود بہت خطرے میں ہیں، وہی لوگ آپ کو بھی لے جا سکتے ہیں جن کی تحویل میں آپ کا دوست ہے، وہ آپ کو بلانے کے لیے انہی کو استعمال کریں گے اور وہ مجبور ہوں گے...... کسی نہ کسی وجہ سے انکار نہیں کر پائیں گے۔"

میں دم بخود بیٹھا تھا۔ "کتنا صحیح اندازہ تھا ان کا......"

"ہاں...... اس نے کہا کہ ہم آپ کو ایک چھوٹی سی تکلیف دیں گے، اس سے آپ کا تحفظ سو فیصد یقینی ہو جائے گا۔ یہ ہمارے پولیس سرجن ہیں، یہ آپ کے جسم میں ایک ٹرانسمیٹر لگائیں گے۔ ٹرانسمیٹر کے نام پر میں ڈر گئی کہ شاید پیٹ میں کوئی آلہ ڈالیں گے۔ اس نے مجھے سمجھایا کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں، یہ آپ کے ناخن کے برابر ایک چپ ہوگی، جو سگنل نشر کرتی ہے، اس نے مجھے نیشنل جیوگرافک والوں کی ایک وڈیو فلم دکھائی جس میں سائنسدانوں نے کچھ پرندوں کے گلے میں تعویذ نما لاکٹ ڈالے تھے اور اس سے ان کی نقل و حرکت پر نظر رکھی جاتی تھی۔ یہ لاکٹ جو سگنل دیتے تھے اس سے معلوم ہوتا رہتا تھا کہ پرندہ کہاں ہے اور کیا کر رہا ہے۔ بعض لاکٹ کیمرے والے بھی تھے، جانوروں کو تحفظ فراہم کرنے والے ادارے اور ریسرچ کرنے والے یہ تکنیک ہر جگہ استعمال کر رہے ہیں۔ پھر اس نے مجھے وہ چپ دکھائی۔ وہ ناخن کے برابر تو خیر نہیں تھی، ایک انچ سے کچھ کم لمبائی اور چوڑائی تھی اور تقریباً تین ملی میٹر موٹائی۔ کیپٹن راجر نے کہا کہ یہ میری جلد کے نیچے ٹرانس پلانٹ ہوگی۔ اس میں ایک بیٹری ہے جو میرے جسم کی حرارت سے چارج لیتی رہے گی اور اس کا ٹرانسمیٹر ایک مخصوص فریکوئنسی پر مسلسل سگنل نشر کرے گا۔ پولیس کے ریسیور سینٹر پر اسے مانیٹر کیا جائے گا۔ اوپر سے دیکھنے میں یہ کسی زخم کی بینڈ ایج نظر آئے گا۔ ہم اس کے آس پاس کی جلد کو ایسا ہی بنا دیں گے۔ آپ کو چلتے ہوئے احساس تک نہیں ہوگا لیکن دن رات آپ جہاں جائیں گی ہمیں سگنل ملے گا اور پتا چلتا رہے گا کہ آپ کہاں ہیں۔ میں حیران تو خیر تھی، پھر بھی میں نے پوچھا کہ یہ جلد کے نیچے ہی کیوں ضروری ہے۔ اس نے کہا کہ میڈم...... خدانخواستہ کہ آپ اغوا ہوں لیکن اغوا کرنے والے جسم پر کچھ چھوڑتے نہیں، نہ کپڑے نہ زیور۔ وہ آپ کے بالوں میں بھی دیکھیں گے اور ٹاپس بھی اتروا لیں گے۔ گھڑی یا موبائل فون کا تو سوال ہی نہیں۔ ہر صورت میں یہ زخم اپنی جگہ رہے گا۔ وہ پٹی کو نہیں اتاریں گے۔ پٹی بھی کہاں یہ میڈیکل ٹیپ کا معمولی کراس ہے۔ اس کے آس پاس جو سرخی تم نے دیکھی یا جو خون کا معمولی سا داغ تمہیں نظر آیا۔ وہ کچھ بھی نہیں...... میک اپ کا رنگ ہے لیکن اس سے چوٹ کا پتا چلتا ہے کہ زخم کے آس پاس کی جگہ بھی متاثر ہوئی ہے۔"

"یہ تو واقعی کمال کیا پولیس نے......"

"جب مجھے بلایا گیا تو مجھے کیپٹن راجر کی بات یاد آئی۔ ابھی تک اغوا کرنے والوں کا کچھ پتا نہیں تھا کہ کون

ہیں۔اب مجھے معلوم ہوگیا کہ تمہیں تاوان کے لیے اغوا کیا گیا ہے۔راجر نے کہا تھا کہ جب لارڈ رفیق آپ کو بلائیں گے تو ان کے پاس اس کے سوا چارہ نہیں ہوگا۔وہ کسی بھی وجہ سے مجبور ہوں گے۔بالکل ٹھیک کہا تھا اس نے......اب پولیس کو کچھ بتانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔میں نے وہی کیا جو مجھ سے کہا گیا۔میں ذرا بھی خوف زدہ نہیں تھی کہ میرے ساتھ کیا ہوگا۔الٹا مجھے امید ہوگئی تھی کہ اب مجرم بچ نہیں سکتے۔میں پچاس ہزار پاؤنڈز لے کر خفیہ طریقے سے نکلی لیکن میری نقل وحرکت خفیہ کہاں تھی۔پولیس کو فوراً معلوم ہوگیا کہ میں کہاں جارہی ہوں۔وہ سائے کی طرح میرے پیچھے آئے مگر شہر سے باہر آکے غائب ہوگئے۔مجھے اپنی گاڑی میں لے جانے والے اپنی طرف سے انتہائی محتاط تھے اوران کی گاڑی سے ایک کلومیٹر پیچھے دوسری گاڑی صرف یہ دیکھنے کے لیے چل رہی تھی کہ پولیس یا کوئی اوران کے تعاقب میں تو نہیں ہے لیکن پولیس نے مخالف سمت سے بلکہ تین طرف سے سگنل ریسیو کیا۔ظاہر ہے سگنل تو ایک دائرے میں نشر ہورہا تھا اور اس کی رینج بہت تھی۔پولیس نے اپنے طور پر نتیجہ اخذ کرلیا تھا کہ میرے ساتھ وہی ہورہا ہے جس کا انہیں اندیشہ تھا یعنی تم نے مجھے بلایا ہے اور میں رازداری سے پولیس کو یا کسی اور کو بتائے بغیر جارہی ہوں۔انہوں نے تین گاڑیوں کو روانہ کیا جو الگ الگ سمتوں سے آئیں لیکن ان کے پیچھے کوئی نہیں لگا۔پولیس کا خیال تھا کہ یہ لوگ مسلح ہوں تو پولیس کا بھی مقابلہ کرسکتے ہیں۔ان کے فرشتوں کو خبر نہیں ہوئی اور پولیس سر پر آکھڑی ہوئی۔''

''تمہارے ساتھ انہوں نے کوئی بدسلوکی تو نہیں کی تھی؟''میں نے پوچھا۔

''سوال یہ ہے کہ تم بدتمیزی کسے سمجھتے ہو۔اگر تمہاری مراد دست درازی سے ہے تو جواب ہے نہیں۔ممکن ہے موقع ملتا تو وہ کرتے......ایک مرد کے مقابلے میں عورت کو صرف جسمانی تشدد کا خطرہ ہی نہیں ہوتا۔بے آبروئی کا ڈر زیادہ ہوتا ہے۔تمیز سے بات کرنے والا ان میں کوئی بھی نہیں تھا۔وہ سب انتہائی گھٹیا اور بازاری زبان استعمال کررہے تھے اور یہ ثبوت فراہم کررہے تھے کہ وہ کتنے گھٹیا مجرم ہیں۔''

''یعنی اعلیٰ مجرم بھی ہوتے ہیں۔''

''کیا تم نے دیکھے نہیں؟......اکبر خان کے ساتھ میں ایسے لوگوں سے ملی ہوں جو ڈان تھے، مافیا کو کنٹرول کرتے تھے لیکن کیا مہذب اور شائستہ......خوش لباس، خوش ذوق، آداب مجلس کے واقف......دیکھ کے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ وہ جرائم پیشہ گروہ کے سربراہ ہیں......پروفیسر، دانشور......''

''وہ سب پکڑے گئے؟''

''بھاگ کے کہاں جاتے......پولیس نے ہر طرف سے محصور کرلیا تھا۔''

''انہوں نے مقابلہ کرنے کی کوشش بھی نہیں کی۔''

''اس کی مہلت ہی نہیں ملی......وہ جو چیف پارٹ ٹوبنا ہوا ہے، وہ صوفے پر نیم دراز ایک جام چڑھا چکا تھا اور دوسرا بھر رہا تھا۔اس کا نائب تلاشی کے بہانے میری بوٹیاں نوچ کے رپورٹ دے چکا تھا کہ باس کچھ نہیں......تیسرا بریف کیس کا معائنہ کرنے کے بعد اسے کھول کے رقم گن رہا تھا۔باس نے فرمایا تھا کہ ذرا احتیاط سے......اس میں کوئی بم نہ ہو، اس اچانک تین مسلح پولیس والے ایک دھماکے سے اندر آئے اور انہوں نے کسی کو سنبھلنے کا موقع نہیں دیا......ان کے ریوالوروں کا رخ مجرموں کی طرف تھا اور انہوں نے بتا دیا تھا کہ وہ ہر طرف سے گھر گئے ہیں مقابلہ کیا تو مارے جائیں گے......ایک منٹ میں کھیل ختم ہوگیا، ان کی سمجھ میں نہیں آیا ہوگا کہ پیچھے کوئی نہیں لگا ہوا تھا تو یہ موت کے فرشتے کہاں سے ٹپک پڑے۔انہوں نے گھر سے میرا تعاقب کیا ہوگا، وہ سارا راستہ مجھے ہدایات پہنچاتے رہے اور میں نے بال برابر انحراف نہیں کیا......پولیس انہیں نہ جانے کہاں لے گئی، مجھے وہ ایک کار میں کیپٹن راجر کے پاس لے گئے، اس نے کہا کہ میڈم ہم نہ کہتے تھے کہ آپ ڈائریکٹ ٹارگٹ ہیں......اس نے مجھ سے زبانی پوچھا اور میں نے بتایا کہ اغوا کرنے والوں نے پچاس ہزار پاؤنڈز تاوان طلب کیا تھا جو میں نے پہنچا دیا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ رفیق کو چھوڑ دیا گیا ہے۔''

''یہ پولیس کو گمراہ کرنے کی کوشش تھی......''

''بالکل......کیپٹن راجر نے بھی کہا کہ پچاس ہزار پاؤنڈز مانگنا ہماری تحقیقات کا رخ موڑنے کی سازش ہے کہ ہم ان سے تفتیش کرنے لگیں جو پہلے اس قسم کے جرائم میں ملوث رہے ہیں۔خیر اب آپ مطمئن ہوجائیں، میرے اندازے کے مطابق لارڈ رفیق کو اب تک پولیس سے رابطہ کرلینا چاہیے تھا۔ایسا لگتا ہے کہ ان کو مجرموں نے ایسی جگہ چھوڑا ہے جہاں سے مواصلاتی رابطے میں دشواری ہوگی......مجرم اپنے لیے مہلت چاہتے ہوں گے......اور ایسا ہی ہوا۔آدھے گھنٹے بعد تمہارا سراغ مل گیا۔''

''ان بدمعاشوں نے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے۔اتنا آسان سمجھ رکھا تھا انہوں نے قانون کی آنکھوں میں دھول جھونکنا۔''

''آئندہ کے لیے کیا سوچا ہے تم نے؟''

''جان من......یہ ست بدھائی نہیں لندن ہے......بہت تھوڑے سے لوگ ہیں جو حالات کی اس تبدیلی سے متاثر ہوئے ہیں اور وہ بھی براہ راست نہیں......ان کو صدمہ ہوا ہے، یہ لارڈ کے حامی اور پاکستانیوں کے دشمن اسکن ہیڈ......سابق ملازم اور نکالے جانے والے خدمت گار ان کی دشمنی وقتی ہے، یہ چند دن میں سب بھول جائیں گے جب دیکھیں گے کہ حالات بدل گئے ہیں اب وہ کچھ بھی نہیں کرسکتے......لارڈ اماننٹ، اس کی فیملی اور وہ گزرا ہوا وقت......سب کل کی باتیں ہیں اور وقت بہت آگے بڑھ گیا ہے، خطرناک تھے ہمارے یہ ہم وطن۔کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ ایسے لوگوں کو زندگی نے کیا دیا؟انہوں نے سیاسی سبز باغ دکھانے والوں سے پیسا لیا اور ان کے جاں نثار کارکن بنے......کتنا پیسا؟......بالکل برائے نام......ان کے ہاتھوں میں گن تھما دی گئی اور یہ خود کو بھی طاقتور سمجھنے لگے......انہیں بھی احساس نہیں ہوا کہ یہ خود بھی چلے ہوئے کارتوس سے زیادہ اہم نہیں ہوتے، انہیں استعمال کرنے والے ان کو جرائم کی دلدل کی جانب دھکیلتے جاتے ہیں اور پھر انہیں بلیک میل کرکے استعمال کرتے ہیں، انکار کریں تو مروا دیتے ہیں، اسمبلیوں میں پہنچنے والے سیاسی وڈیرے......وزیر اور مشیر بننے والے......ایسے ہی بدقسمت بے وقوف لوگوں کو ڈھال بنا کے آگے بڑھتے جاتے ہیں۔چیف اس کی ایک عبرتناک مثال ہے۔نہ اس کا کوئی گھر ہے نہ وطن......نہ دوست نہ پناہ دینے والا......ان کے پاس آج کچھ بھی نہیں......سوائے پچھتاووں کے......موت کے خوف کے اور ایک مجرمانہ ماضی کے۔چیف میرے پاس پناہ کی امید میں آیا تھا، سچی بات یہ ہے کہ آج بھی میں اس سے ڈرتا ہوں، میں اسے انکار نہ کرسکا لیکن موقع ملتے ہی میں نے اسے وہاں پہنچا دیا جہاں اسے بہت پہلے پہنچ جانا چاہیے تھا۔اگر آئندہ چند ماہ میں وہ بجلی کی کرسی پر نہ بٹھایا گیا جس کا امکان بہت ہی کم ہے، تو وہ اور اس کے ساتھی اپنی زندگی کے باقی دن یہاں کی جیل میں گزاریں گے جہاں سے فرار بھی ممکن نہیں۔''

''چلو چھوڑو......بتاؤ تم نے میرے لیے کیا سوچا ہے؟''

میں اس سوال سے حیران ہوا......''اب تمہارے سوا بھلا کون ہوسکتا ہے میرے خیالوں کا محور ومرکز......''

''ڈائیلاگ مت مارو......تمہاری باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ تم نے یہاں بھی اپنی ریاست قائم کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔''

''کاروباری حد تک......نہ میں یہاں لارڈ بن سکتا ہوں اور نہ نواب......حالانکہ کچھ لوگ مجھے نواب کے بجائے لارڈ کہنے لگے ہیں۔''

''تم دونوں جگہ رہو گے......؟''

''یہ آج کے دور میں کیا مشکل ہے، چھ سات گھنٹے میں لاہور سے لندن۔''

''میں کہاں رہوں گی؟''

''یہ تو طے ہوچکا، تم یہاں رہوگی۔''

''نہیں' یہ طے نہیں ہوا، میں تمہارے ساتھ رہوں گی یہاں بھی اور وہاں بھی، دن رات کے چوبیس گھنٹے......جو زندگی تم نے میرے لیے رکھی ہے وہ بٹی ہوئی ہے، تم پندرہ دن وہاں اور پندرہ دن یہاں رہو یا چھ مہینے یہاں اور چھ مہینے وہاں، میرے لیے ایک ہی بات ہے میں تمہاری لندن مسٹریس کا رول نہیں نبھا سکتی۔''

''یہ کیا فضول بات ہے۔''

''کیوں؟......تم رہ سکتے ہو میرے بغیر اکیلے......میں نہیں اور جو لوگ رہتے ہیں اس طرح ان کو میں جانتی ہوں، ان کی ایک خاندانی قسم کی بیوی پاکستان میں رہتی ہے، دوسری باہر۔''

میں نے کہا۔''پاگل لڑکی......پاکستان میں میری کون سی بیوی ہے' کون سا خاندان ہے......''

''یہ سیٹ اپ نہیں چل سکتا رفیق......تم سمجھتے کیوں نہیں......ابھی نہ سہی......تم یہ کرسکتے ہو، دو گھر......دو ملک......دو کاروبار......دو بیویاں......میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گی۔''

''نور......میں تم پر بھروسا کررہا تھا کہ تم میری مدد کرو گی، یہاں کے معاملات صرف تم سنبھال سکتی ہو۔''

''مگر میں سنبھالنا نہیں چاہتی......میں صرف تمہیں سنبھالنا چاہتی ہوں، اپنے بچوں کو سنبھالنا چاہتی ہوں۔ایک عام عورت کی طرح صرف تمہارے لیے جینا چاہتی ہوں، نہ ست بدھائی کے لیے اور نہ شیرازی اینڈ کمپنی کے لیے......اور آخر ضرورت کیا ہے میری یہاں......سوشی ہے۔''

''سوشی مالک نہیں۔''

''مالک میں بھی نہیں......اور میں بننا بھی نہیں چاہتی۔''

میں نے کہا۔''نور......یہ تم نے کیا نیا مسئلہ کھڑا کردیا،

میں تو تم پر انحصار کر رہا تھا۔"

"اسی لیے میں نے بتا دیا کہ تمہارے ساتھ میں سب کچھ کر سکتی ہوں...... اکیلی نہیں کروں گی۔"

"مسائل میرے لیے پیدا ہوں گے۔"

"نہیں ہوں گے، ایک بات کہوں، یہ ذمّے داری رابعہ کو سونپ دو۔"

میں چونک پڑا۔ "رابعہ کو...... تمہیں یہ خیال بھی کیسے آیا۔"

"کیوں...... کیا حرج ہے اس میں...... وہ بھی باصلاحیت ہے اور سوشی اسے بھی ساری ذمّے داریاں سمجھا دے گی، وہ بہت خوش ہو کے یہ کام کرے گی، اسے اپنی اہمیت نہ ہونے کا گلہ ہے، وہ بھی دور ہو جائے گا۔ وہ بڑے شوق سے لندن میں رہے گی۔ شاید واپس آنا بھی نہ چاہے اور اگر اس کی شادی ڈاکٹر احمد سے ہو گئی، جیسا کہ سوچا جا رہا ہے اور سنا جا رہا ہے، تو پھر کیا مسئلہ...... ڈاکٹر احمد لندن میں رہ چکا ہے وہ دونوں مل کے یہ کاروبار سنبھال سکتے ہیں، یہ میں نہیں کہوں گی کہ یہ سب کچھ رابعہ کو دے دو۔ دے دو گے تو بہت فائدے میں رہو گے...... تمہارے ضمیر پر سے بوجھ ہٹ جائے گا اور تمہارا ایک مسئلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔"

اس وقت نور کی بات کو میں نے ٹال دینا ہی بہتر سمجھا۔ وہ جذباتی ہو رہی تھی اور میں دو پُر اذیت دن ایک پرانے دشمن کی قید میں گزار کے آیا تھا۔ یہ ذہنی اور اعصابی ٹینشن مجھے غصے اور جھنجلاہٹ میں مبتلا کر رہی تھی۔ یہ ایک قدرتی ردعمل تھا، میرا دل چاہتا تھا کہ میں چیف کو اور اس کے حواریوں کو ایک لائن میں کھڑا کر کے اپنے ہاتھوں سے شوٹ کر دوں، اگر وہ سر منڈے گورے بدمعاش مل جائیں تو میں انہی کے ڈنڈوں سے اور بیٹ سے ان کو اتنا ماروں کہ ان کی ہڈیوں کا سرمہ بن جائے اور ان کے جسم پلپلے ہو جائیں۔

ست بدھائی میں ڈاکٹر شہناز ضرورت پڑنے پر سکون آور گولیاں دے کر سلا دیتی تھی اور اٹھنے کے بعد میں نارمل ہوتا تھا۔ یہاں یہ ممکن نہیں تھا۔ کسی کیمسٹ سے آپ کو اسپرین کی گولی تک ڈاکٹری نسخے کے بغیر نہیں دی جاتی تھی، میرے ساتھ صرف نور تھی جو ایک عورت تھی' جسمانی اور جذباتی طور پر مجھ سے کہیں زیادہ کمزور...... اس نے بھی دو دن بڑے عذاب میں گزارے تھے اور میں تھا کہ اس سے دنیا داری کے معاملات پر بحث میں الجھا ہوا تھا۔

اب میں نے اسے غور سے دیکھا۔ نور جہاں ایک بہادر عورت تھی جس نے زندگی میں بڑے نشیب و فراز دیکھے تھے لیکن میرے سامنے بیٹھی ہوئی ماہ نور اس زندگی سے بھاگ کے آئی تھی اور اس نے میری محبت کے سائبان میں پناہ لی تھی۔ رفتہ رفتہ اس نے اپنے گرد ایک جذباتی حصار قائم کر لیا تھا جس میں وہ خود کو صرف میرے ساتھ محفوظ دیکھتی تھی...... یہ سمجھتی تھی کہ باہر کی دنیا اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔

اور میں تھا کہ اسے پھر اسی کاروباری دنیا میں کھینچ لا رہا تھا۔ اس کو مجبور کر رہا تھا کہ وہ جذبات کو ایک طرف رکھے، اپنے عملی ہونے کا ثبوت دے، دنیا دار بنے۔ میرے ساتھ مل کے بزنس چلائے اور مزید دولت کمانے کی جدوجہد میں میرا ساتھ دے۔ یہ سب کچھ بھی وہ اکبر خان کے لیے بھی کر رہی تھی۔ صرف پیسا کمانا اور کاروبار چلانا اس کا مقصدِ حیات ہوتا تو وہ اکبر خان کو چھوڑتی ہی کیوں اور اس کے قتل کا الزام اپنے سر کیوں لیتی، یہ صرف محبت تھی جو اسے میری طرف کھینچ لائی تھی، یہ ایسی محبت تھی جس میں وہ مجھ سے کچھ طلب کرنے کی روادار نہ تھی۔ یہ بالکل غیر مشروط محبت تھی' بالکل یکطرفہ......

اس نے مجھے بتا دیا تھا کہ میں فریال سے شادی کر لوں تو اسے کوئی فرق نہیں پڑتا اور اس سے شادی نہ کروں تب بھی اس کی محبت وہی رہے گی، بس میں اسے خود سے دور نہ کروں۔

وہ جو کچھ کر رہی تھی محبت میں میرے لیے کر رہی تھی، نہ دنیا پر کچھ ثابت کرنے کے لیے اور نہ مجھے امپریس کرنے کے لیے۔ وہ میری خوشی کے لیے کچھ بھی کر سکتی تھی...... اور کرتی رہی تھی لیکن اب شاید یہ نروس بریک ڈاؤن کا نتیجہ تھا کہ اس کے دل کی بات زبان پر آ گئی اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ کیا چاہتی ہے اور میں نے اس کے دل کی بات سمجھ لی۔

لندن کے سنجیدہ اخبارات میں جرائم کی خبروں کو نمایاں جگہ نہیں دی جاتی لیکن وہاں بھی ایسے اخبارات کی کمی نہیں جیسے ہمارے ملک میں عام طور پر شام کو شائع ہونے والے کہلاتے ہیں لیکن دوپہر سے بھی پہلے مارکیٹ میں آ جاتے ہیں۔ خود ہماری پاکستانی برادری اردو زبان میں ایسے اخبارات شائع کرتی ہے جن کے پڑھنے والوں کی تعداد ہزاروں تو کیا سیکڑوں میں ہی رہتی ہے اور یہ اخبارات بھی مفت تقسیم کیے جاتے ہیں اور اسٹالوں پر ایسے ہی دوسرے اخبارات کے ساتھ پڑے نظر آتے ہیں۔

انہی اخبارات نے میرے کیس میں بڑی دلچسپی لی اور اغوا برائے تاوان کی واردات کو خوب بڑھا چڑھا کے پیش کیا۔ کچھ رپورٹر نور کا اور میرا انٹرویو بھی کرنا چاہتے تھے۔ انہیں میں نے قریب نہیں پھٹکنے دیا۔ پھر بھی کچھ کیمروں سے مسلح ارنسٹ مینشن کے باہر منڈلاتے رہے اور میرے

تعاقب میں بھی آئے۔ انہوں نے ہماری تصویریں بھی اتار لیں اور ہمیں پتا نہیں چلا۔ اطالوی زبان میں ایسے جان کا روگ بن کر تعاقب کرنے والے صحافیوں کو پاپارازی کہا جاتا ہے۔

ان اخبارات نے ہمیں بہت کچھ بنا دیا۔ میں پاکستان کی ایک بہت بڑی ریاست کا بادشاہ قرار پایا۔ ایک نے مجھے حکمران لکھا۔ نور ملکہ ہو گئی اور اس کا مقابلہ ملکہ نور جہاں سے کیا گیا تو مجھے جہانگیر کہا گیا۔ اس کے بعد انگریزوں کے لتے لیے گئے کہ وہ یہاں بھی اپنی نسلی برتری اور کمیت کے خناس میں مبتلا ہیں۔

افسوس کی بات یہ تھی کہ کچھ اخبارات نے ایلیشا کے ساتھ میرے معاشقے کی بنیاد پر وہ کہانیاں شائع کر دیں جو غلط تو خیر نہیں تھیں مگر مکمل درست بھی نہ تھیں۔ ان میں ہمارے عشق کو ساری خرابی کا ذمے دار ٹھہرایا گیا۔ مجھے بے وفا اور چالباز کہا گیا کہ ایک اور لڑکی کے ساتھ گلچھرے اڑا رہا ہوں اور دل شکستہ ہیروئن دنیا چھوڑ کے سنیاس لے چکی ہے' کسی دن خودکشی بھی کرے گی...... جتنے منہ تھے اتنی باتیں۔

ایسے صحافیوں سے محفوظ رہنے کا ایک طریقہ تو قانونی تھا کہ میں ہر بے بنیاد خبر یا غلط رپورٹ پر ہر اخبار کو نوٹس جاری کر دوں...... ظاہر ہے یہ ناممکن تھا...... نور ان خبروں کو بہت انجوائے کرتی تھی لیکن مجھے ایک کاروباری ادارے کے سربراہ کی حیثیت سے اپنی گڈ وِل کی فکر تھی...... میرے قانونی مشیر ملک ارشد نے مجھے مشورہ دیا کہ میں دو چار دن کے لیے غائب ہو جاؤں...... بہتر ہو گا کہ کسی کو بتائے بغیر پیرس چلا جاؤں...... اس سے معاملات خود ہی ختم ہو جائیں گے۔

یہ تجویز مجھے پسند آئی۔ میں خود بھی تبدیلی کے لیے ایک بریک چاہتا تھا۔ میرے ڈاکٹر نے اس کی تائید کی۔ لندن کے اعصاب شکن معاملات نور کو اور مجھے ڈپریشن میں مبتلا کر رہے تھے اور اس کا سب سے مؤثر علاج یہی تھا کہ ہم کچھ دن کے لیے سب کچھ بھول کے صرف تفریح کریں۔

مجھے اس تجویز پر ہنسی بھی آئی کیونکہ بالکل ایسا ہی مشورہ مجھے ست بدھائی میں دیا گیا تھا۔ راجا سمیت میرے تمام خیر خواہ اس حق میں تھے کہ کچھ دن کے لیے میں لندن چلا جاؤں کیونکہ ست بدھائی کے حالات میری ذہنی اور اعصابی صحت کو متاثر کر رہے تھے...... چنانچہ میں نور کے ساتھ لندن آ گیا تھا۔ اب لندن کا ڈاکٹر بھی یہی کہہ رہا تھا کہ چند دن کے لیے سارے مسائل کو بھول کر لندن سے دور چلے جاؤ۔ بے اختیار مجھے مرزا غالب یاد آئے۔ اب تو گھبرا کے یہی کہتے ہیں مرجائیں گے...... مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے۔

ست بدھائی سے لندن...... لندن سے پیرس...... اور آگے؟ اپنی مرضی سے کم اور نور کے اصرار سے زیادہ مجبور ہو کے میں نے سپر ڈال دی اور ہم پیرس پہنچ گئے...... یہ میڈیکل ایڈوائس تھی چنانچہ پولیس نے اپنی ساری کارروائی مؤخر کر دی۔

اس قسم کی تبدیلی کے اثرات ہمیشہ خوش گوار ہوتے ہیں اور پیرس تو شہر ہی ایسا ہے کہ کرشمہ دامن دل کا کشد کہ جا ایں جاست...... ہر طرف حسن...... خوب صورتی...... فیشن اور خوشبو۔ پھولوں کے رنگ اور فوارے' مصوری اور سنگتراشی کے مجسمے۔ دنیا میں سب سے زیادہ سیاحوں کے پیرس آنے کی یہی وجہ ہے۔

میں اور نور بھی لوٹ کر آئے تو بہت تازہ دم اور خوش تھے۔ ہمارے واپس آتے ہی مصروفیات کا سلسلہ پھر شروع ہوا۔ چیف کا معاملہ زیادہ سنگین ہو گیا تھا۔ اس کے احمق ساتھیوں نے ایک احمقانہ منصوبے کے ذریعے اسے چھڑانے کی جو کوشش کی تھی اس سے جرم کی سنگینی اور بڑھ گئی تھی۔

اغوا برائے تاوان میں استعمال ہونے والی ساری رقم ہمیں لوٹا دی گئی تھی۔ ایک صبح مجھے اور نور کو شناخت پریڈ قسم کی کارروائی کے لیے کاؤنٹی جیل لے جایا گیا۔ وہاں ایک ایک کر کے تمام ملزمان کو ہمارے سامنے پیش کیا گیا۔ نقلی چیف کو دیکھ کر میں حیران بھی ہوا اور مجھے ہنسی بھی آئی...... وہ اصل چیف سے بالکل مختلف تھا۔ اس کی صورت کے نقوش میں تھوڑی بہت مماثلت ضرور تھی لیکن اس کا ہیئر اسٹائل وگ کا مرہون منت تھا۔ وہ گنجا تھا اور وگ کے بغیر ذرا بھی چیف نہیں لگتا تھا۔

میں نے اس شخص سے کہا۔ "مجھے تمہاری بے وقوفی پر افسوس ہوتا ہے۔ آخر کیا ضرورت تھی تمہیں اس شخص کی خاطر یہ سوانگ بھرنے کی جو تمہارے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا؟"

"تم دیکھنا...... وہ خود بھی نکل جائے گا اور پھر مجھے بھی نکال لے گا۔" اس نے ہٹ دھرمی یا بے شرمی سے کہا۔

میں نے افسوس سے سر ہلایا۔ "مجھے تو وہ وقت بہت دور نظر نہیں آتا جب وہ اور تم ایک ساتھ بجلی کی کرسی پر بٹھائے جاؤ گے...... یہ پاکستان نہیں' لندن ہے...... یہاں اغوا برائے تاوان کی سزا بھی موت ہے...... اور یہاں رشوت یا سفارش کام نہیں آتی۔"

اس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ "مرنا تو ایک دن سب کو ہے۔"

''اور جس کاروبار میں تم چیف کا ساتھ دے رہے تھے۔اس میں یہی ہوتا تھا...... افسوس یہ ہے کہ ایسا بہت دیر سے ہوا...... جتنے لوگوں کی جان تم نے لی...... جتنی زندگیوں کو تم نے برباد کیا اس کے بعد یہ سزا کوئی سزا نہیں۔''

''تم بھی تو چیف کے ساتھیوں میں تھے۔''

''غلط...... میں اس کا شکار تھا...... لیکن میں بچ گیا تھا...... شاید خدا نے مجھے اسی لیے بچایا...... زندہ رکھا اور پھر یہاں پہنچایا...... کہ یہ نیک کام میرے ہاتھوں سرانجام پائے...... ہر فرعونے راموسئے...... افسوس پھر بھی ہوتا ہے کہ تمہارے بیوی بچے تاعمر تمہارے اعمال کی سزا بھگتیں گے۔''

اس نے کہا۔''ان کے پاس پیسا بہت ہے۔''

''ویری گڈ...... آج پتا چلا کہ پیسا شوہر کا اور باپ کا متبادل ہوسکتا ہے...... چلو پھر جاؤ تم بھی......''

تقریباً آٹھ ماہ بعد چیف کی سزائے موت پر عمل درآمد ہوا۔ اس کے ساتھی کو مجموعی طور پر ساٹھ سال قید کی سزا ملی...... باقی افراد کی میعاد دس سے چالیس سال تھی...... ان کا ذکر آگے نہیں آئے گا۔

ست بدھائی میں میرا سب سے ہی رابطہ تھا۔ راجا اصل حقائق سے پوری طرح باخبر تھا اور اس نے ہزاروں میل دور سے بھی ہر معاملے میں مجھے صائب مشورہ دیا اور اپنی حاضر دماغی، ذہانت اور معاملہ فہمی سے مجھے احساس نہیں ہونے دیا کہ میں اکیلا ہوں۔ بے شک نور وہاں میرا حوصلہ بڑھانے کے لیے موجود تھی لیکن اس کا سہارا محض جذباتی تھا۔ میں نے اس سے بہت زیادہ توقعات وابستہ کرلی تھیں اور اسے بہت سی ایسی ذمے داریوں میں شریک کرلیا تھا جن کا بوجھ اٹھانا اس کے بس کی بات نہیں تھی لیکن میری خوشی کے لیے اس نے انکار نہیں کیا حالانکہ وہ ایک عام عورت تھی جسے جسمانی طور پر صنف نازک شمار کیا جاتا ہے...... اعصابی اور جسمانی طور پر بھی وہ عموماً مرد کے مقابلے میں کمزور ثابت ہوتی ہیں۔ بالآخر ایک ایسی نوبت آگئی تھی جب نور نے صاف انکار کردیا تھا کہ میرے بغیر وہ یہاں نہیں رہے گی۔

پیرس میں قیام کے دوران میں ہم نے کوئی کاروباری یا قانونی مسائل کی بات نہیں کی...... یہ ہم نے روانگی سے پہلے ہی طے کرلیا تھا' اس کے باوجود ہم میں سے کوئی ایسی بات چھیڑ دیتا تھا تو دوسرا فوراً اسے روک دیتا تھا...... یہ ایک مصنوعی اور شعوری کوشش تھی' حقائق سے روگردانی تھی' فرار کی کوشش تھی۔ شتر مرغ کی طرح خطرے کے ڈر سے ریت میں منہ چھپانے والی بات تھی لیکن اس کا فائدہ ہوا۔

اس تمام عرصے میں سوشی نے جس خلوص اور مہارت سے کمپنی کے معاملات چلائے اس کی تعریف الفاظ میں نہیں کی جاسکتی۔ اس کی مدد کے بغیر میں نے کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس نے میری خواہش کے مطابق عملے میں تبدیلی کی تھی۔ نئے اسٹاف میں زیادہ تر پاکستانی تھے۔ یہ وہ ہونہار نوجوان تھے جن کی اپنے وطن میں قدر نہ ہوئی یا جنہیں ان کی صلاحیت کے مطابق نہ کام ملا اور نہ معاوضہ تو وہ بددل ہو کے باہر نکل گئے...... ایسی مثالیں سیکڑوں نہیں ہزاروں ہیں۔

یہاں کے سارے معاملات رابعہ کے سپرد کردینے کا آئیڈیا رفتہ رفتہ مجھے قائل کر رہا تھا کہ یہ میرے مسائل کا سب سے بہتر حل ہے اور خود رابعہ کو مطمئن کرنے کا بھی۔ میں نے جتنا اس پر غور کیا اتنا ہی اس تجویز کی افادیت کا قائل ہوتا چلا گیا...... لیکن میں نے کوئی فوری فیصلہ نہیں کیا۔ میں اس معاملے میں واپس ست بدھائی پہنچ کے راجا سے اور دوسرے لوگوں کے علاوہ رابعہ سے بھی مشورہ کرنا چاہتا تھا۔

اب میں واپسی کے متعلق سوچنے لگا تھا کہ ایک رات سیکیورٹی گارڈ نے مجھے کسی ہربرٹ اسپنسر کے آنے کی اطلاع دی۔ انگریز پیشگی اطلاع دیے بغیر اور وقت ملاقات لیے بغیر اپنے سگے بہن بھائی سے بھی ملنے نہیں جاتے۔

میں نے کہا۔''میں کسی ہربرٹ اسپنسر کو نہیں جانتا...... وہ کیا چاہتا ہے؟''

''اس نے کہا ہے کہ مقصد ملاقات وہ صرف آپ کو بتائے گا؟''

میں نے کہا۔''اچھا فون اسے دو۔''

فون پر آواز آئی۔''لارڈ رفیق...... مجھے سوشی نے آپ سے ملنے کو کہا تھا۔''

میں نے کہا۔''لیکن سوشی نے یہ بات مجھے نہیں بتائی۔''

وہ برا مانے بغیر بولا۔''کیا اس میں میرا قصور ہے؟''

''مسٹر ہربرٹ اسپنسر...... آپ ایک منٹ انتظار کریں میں سوشی سے کنفرم کرلوں۔''

میں نے سوشی سے پوچھا۔''یہ ہربرٹ اسپنسر کون ہے؟ کہتا ہے اسے تم نے بھیجا ہے؟''

''اوہ رفیق...... آئی ایم سوری...... میں مصروفیت میں تمہیں بتانا بھول گئی...... یہ وہی بروکر ہے جو محلات' قدیم کوٹھیوں' نوادرات اور جواہرات وغیرہ کے سودے کراتا ہے۔''

میں نے ہربرٹ اسپنسر کو اندر بلالیا۔ خلافِ توقع وہ

ایک عمر رسیدہ شخص تھا جس کے سر کے بال بہت گھنے اور لمبے ہونے کے ساتھ بالکل سفید تھے...... جیسا کہ اس نے بعد میں بتایا کہ اس کی عمر ستر سال ایک سو ستر دن اور چودہ گھنٹے تھی...... لیکن اس کی صحت بہت سے جوانوں سے اچھی تھی اور وہ حد درجہ خوش مزاج اور خوش لباس شخص تھا۔

''آئی ایم سوری مسٹر اسپنسر...... آپ کو انتظار کرنا پڑا۔''

وہ مسکرا کے صوفے پر بیٹھ گیا۔''معذرت سوشی کو کرنی چاہیے...... لیکن میں انتظار کا عادی ہوں۔ پیدا ہونے کے لیے مجھے نو مہینے ماں کے پیٹ میں انتظار کرنا پڑا...... جوان ہونے کے لیے اٹھارہ سال انتظار کرنا پڑا تاکہ میں کسی خوب صورت لڑکی پر ڈورے ڈال سکوں...... انتظار میں اب بھی کر رہا ہوں۔''

میں نے ہنس کے کہا۔''کس بات کا؟''

''مرنے کا اور کس کا...... اور میں اپنے وارثوں کو مسلسل مایوس کر رہا ہوں...... ہر سال کہتا ہوں کہ بس یہ آخری سالگرہ ہے...... میری آٹھویں بیوی سب سے زیادہ دکھی ہے کیونکہ اس کی عمر ایک ایک سال کر کے بڑھتی جارہی ہے' اس نے آٹھ سال قبل مجھ سے شادی کی تھی تو وہ تیس سال کی تھی۔''

میں نے حیرانی سے کہا۔''یعنی تم سے نصف عمر کی؟''

''مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا تھا...... وہ بیس کی ہوتی تب بھی کیا تھا...... دراصل ایک نجومی نے اسے مطلع کیا تھا کہ دو سال میں تم مالدار ہو جاؤ گی...... اس وقت ہم منگنی کر چکے تھے...... جو تین سال رہی...... پھر وہ شادی کے لیے بضد ہو گئی۔''

میں نے کہا۔''دولت مند بننے کے اور بھی طریقے تھے۔''

''ہاں...... مگر اس نے یہی طریقہ پسند کیا تو اس کی مرضی...... دراصل اسے یقین ہوگا کہ میں اپنا وعدہ نبھاؤں گا اور آئندہ میری سالگرہ نہیں بری ہوگی۔ اب وہ مجھے چھوڑ بھی نہیں سکتی...... کیا پتا میں اسی سال روانہ ہو جاؤں...... اور کچھ پتا نہیں سنچری مار دوں...... تیس سال بعد وہ ہو جائے گی اڑسٹھ کی...... اور مجھے یقین ہے جلتے کڑھتے پہلے ہی مر جائے گی...... ورنہ خودکشی کرلے گی۔''

میں نے کہا۔''کیا اب ہم بزنس کی بات کریں؟''

''شیور...... دراصل میں تم سے ملنے آگیا ورنہ یہ بات فون پر دو منٹ میں ختم ہو جاتی...... میں پوچھتا کہ بے دخل ہونے کا کیا لو گے...... تم ایک رقم بتاتے...... میں کہتا او کے...... اور بس۔''

''یعنی میں کچھ بھی مانگ لیتا؟''

''اب مانگ کے دیکھو...... کیا چاہیے تمہیں اس محل کا؟''

میں نے کہا۔''اگر میں سو ملین کہوں...... پھر؟''

''میرا جواب وہی ہوگا...... انتظار تمہیں زیادہ کرنا پڑے گا۔''

میں نے کہا۔''کتنا زیادہ؟''

''میرے خیال میں پچاس سال سے کافی کم۔'' وہ سوچ کے بولا۔

میں نے پوچھا۔''کتنا کم؟''

''چھ سات ہفتے کم۔'' اس نے کہا اور پھر اپنے مذاق پر خود ہی ہنسا۔''اتنا جی لوگے؟''

میں نے کہا۔''مسٹر اسپنسر...... مجھے یہاں کی جائدادوں کی مالیت کا کچھ پتا نہیں...... تم میری راہنمائی کرو۔''

نور کافی لے آئی اور وہیں بیٹھ گئی۔ ہربرٹ اسپنسر نے اسے غور سے دیکھا۔''تمہاری سیکریٹری...... گرل فرینڈ...... یا وائف؟''

''سب کچھ۔'' میں نے کہا۔''تھری ان ون۔''

اس نے کہا۔''میں اپنی زندگی کے تجربات کی قسم کھا کے کہتا ہوں کہ تم خوش قسمت ہو۔ ایسی حسین لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ دیکھی ہوتی تو تمہاری طرح قناعت کر کے بیٹھ جاتا...... یوں نہ بھٹکتا پھرتا...... خوب سے خوب تر کی تلاش میں۔''

نور کا چہرہ سرخ ہو کے خوشی سے دمکنے لگا۔

اسپنسر نے کہا۔''یہ محل کوئی ڈھائی سو سال پہلے تعمیر ہوا تھا' لارڈ ارنسٹ کے دادا کے دادا نے اسے کوئن الزبتھ کے زمانے میں خریدا تھا۔''

''لیکن یہ اتنا پرانا تو نہیں لگتا؟''

''عورت...... گھر اور مشینری کی دیکھ بھال کی ضرورت ہوتی ہے۔'' اس نے کسی فلسفی کی طرح ارشاد فرمایا۔''ان کو خطاب بھی ملکہ الزبتھ اوّل نے دیا تھا...... اس وقت بھی یہ اتنا ہی بڑا تھا اور میرا خیال ہے کہ اس کے باغ اور نقشے میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا...... بعد میں آنے والے یعنی لارڈ ارنسٹ کے باپ نے اور سب سے زیادہ لارڈ ارنسٹ نے اس کی مرمت اور رنگ و روغن اور اندرونی آرائش پر سب سے زیادہ وقت اور پیسا خرچ کیا...... اب یہ ایک تاریخی ورثہ ہے......

اس کی ظاہری شکل وصورت بدلی نہیں جاسکتی...... اسے گرا کے کوئی تجارتی عمارت کھڑی کرنے کا تو سوال ہی نہیں...... چنانچہ اب اس کے خریدار بہت کم ہیں...... اور ایسے لوگ جو نوادرات کی قدر کریں کم ہوتے جارہے ہیں۔ تمہیں دوستوں اور مشیروں نے کیا قیمت لگانے کو کہا...... اور خود تم کیا توقع رکھتے ہو؟ اب تو میں نے کسی لگی لپٹی رکھے بغیر تمہیں اس کی تاریخی حیثیت بھی بتادی۔''

میں نے کہا۔''جو قیمت میں نے پہلے بتائی تھی...... اگر میں اسے نصف کردوں؟''

وہ عیاری سے مسکرایا۔''تو وقت بھی نصف ہو جائے گا۔''

''اس حساب سے تو دس ملین کے لیے مجھے دس سال چاہئیں؟''

''نو سر...... صرف دس منٹ...... شاید اس سے بھی کم...... ایک چیک لکھنے میں جتنا وقت لگتا ہے۔''

''مسٹر اسپنسر میری کم آگاہی کا مذاق نہ اڑاؤ۔ میں نے کہا تھا کہ میری راہنمائی کرو۔'' میں نے خفگی سے کہا۔

''لارڈ رفیق...... میں نہ کسی کی کم علمی سے فائدہ اٹھاتا ہوں اور نہ کسی سے غلط بیانی کرتا ہوں...... آپ کا دوست بن کر میں دوسرے شخص کو لوٹوں گا نہیں...... ممکن ہے وہ آپ سے بھی زیادہ سادہ لوح ہو...... شوق میں دگنی تگنی قیمت دے جائے...... بعد میں پچھتائے اور مجھے کوسے...... میں اس کی بھی راہنمائی کروں گا...... مجھے ہر حال میں دونوں سے حقِ محنت وصول ہوگا...... کمیشن اس کے لیے ذرا گھٹیا لفظ ہے۔ اس کی قیمت آپ بیس اور پچیس کے درمیان وصول کر سکتے ہیں۔ بیس ملین پاؤنڈز آپ کو فوراً بھی مل سکتے ہیں...... ایک ہفتے میں...... پچیس کے لیے شاید پچیس ہفتے لگ جائیں...... یہ آپ کی قسمت ہے کہ گاہک پہلے آجائے۔''

''میں پچیس ہفتے انتظار کرسکتا ہوں...... گویا چھ مہینے۔''

''ویری گڈ۔'' اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔''مجھے وہ نوجوان پسند ہیں جو تذبذب میں اپنا اور دوسروں کا دماغ خراب نہ کریں۔''

''یہ ہوسکتا ہے کہ میں واپس پاکستان چلا جاؤں...... اور پھر آجاؤں...... اس سے کوئی فرق تو نہیں پڑے گا؟''

اس نے نفی میں سر ہلایا۔''آپ کون سا محل اپنے ساتھ لے جائیں گے۔''

''خریدار اسے دیکھنا چاہیں گے؟''

وہ ہنسا۔''خریدار انہی میں سے کوئی ہوگا جو اسے بار ہا دیکھ چکے ہوں گے اور حسرت رکھتے ہوئے گئے کہ اس میں رہائش اختیار کریں...... اس حسرت کے بغیر اتنی بڑی رقم کون نکال سکتا ہے۔ اس سے کہیں کم میں جدید وضع کی اس سے دگنی بڑی عمارت کہیں بھی لی جاسکتی ہے...... ساری بات ہے جذبے کی قدر شناسی کی...... اب یہ سودا تو ہوگیا۔'' اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔

''اگر ہوگیا تو بڑی خوشی کی بات ہے۔''

''اگر مگر کیسی...... آپ نے پچیس ملین پاؤنڈز میں رضامندی ظاہر کی ہے اور میں نے چھ ماہ کی مہلت لی ہے...... ہم دونوں شریف اور اپنی اپنی بات پر قائم رہنے والے لوگ ہیں...... اب ہم آتے ہیں ایک اور اہم سوال کی طرف...... کیا آپ خریدار کا انتخاب بھی کریں گے؟''

میں نے کہا۔''میں سمجھا نہیں۔''

''آپ نے آنجہانی لارڈ کے گھوڑوں والے اصطبل کا سودا ڈیوک آف کنٹر شائر سے کیا ہے...... یہ ایک جنٹلمین ڈیل تھی...... میرے خیال میں اس سے بہتر قدر شناس گاہک اور کوئی نہیں تھا...... کیا ایسا ہی آپ محل کے بارے میں کریں گے؟''

''دیکھیے...... مجھے کیا پتا کون گاہک آئے گا...... اصطبل کا تو ایک ہی خریدار تھا اور اس نے مجھے بلینک چیک دینے پر رضامندی ظاہر کردی ہے...... پھر میں دوسرے سے بات کیوں کروں؟''

''فرض کریں آپ کے پاس تین گاہک ہوں...... ایک آپ کو پانچ ملین زیادہ دینے پر راضی ہو لیکن وہ کسی انڈرورلڈ مافیا کا سربراہ ہو۔''

''پھر انکار کی ہمت ہی کہاں ہوگی مجھ میں۔''

''ایسی بات نہیں...... وہ آپ کے سامنے پرفیکٹ جنٹلمین کا نمونہ بن کے آئے گا اور آپ کو پتا بھی نہیں چلے گا کہ وہ کون ہے...... دوسرا خریدار لارڈ کا کوئی پرانا حاسد اور دشمن ہو...... وہ بھی پانچ ملین زیادہ دے...... اور تیسرا ایک حقیقی قدرداں...... نہ دوست نہ دشمن۔''

میں نے کہا۔''آپ کو یقیناً مایوسی ہوگی مسٹر ہربرٹ اسپنسر...... میں آج کے زمانے کا کاروباری ذہن رکھنے والا عام آدمی ہوں...... خاصا بزدل بھی ہوں...... میں اس مافیا کے ڈان کے سامنے سر جھکادوں گا۔''

''مجھے اسی جواب کی اُمید تھی۔ اب دیکھا جائے تو آپ کی توقع پچیس سے بڑھ کر تیس کی ہوگی لیکن میں ایسا نہیں کروں گا...... حالانکہ تیس ملین میں میرا کمیشن بھی بڑھ جاتا

لیکن لارڈ نہیں' میں پرانے وقتوں کا ایک احمق بوڑھا ہوں جو پرانی قدروں کو آج بھی اہم سمجھتا ہے...... نہ میں لارڈ کے دشمن سے رابطہ کروں گا اور نہ اس ڈان سے...... میری بات صرف مستحق لوگوں سے ہوگی...... مستحق کا لفظ شاید آپ کو عجیب لگے...... دنیا کے بازار میں ہر وہ شخص مستحق ہے جو قوتِ خرید رکھتا ہے مگر میرے لیے ایسا نہیں ہے۔''

حقیقت یہ ہے کہ اس بوڑھے شخص کی بات نے مجھے شرمندہ کردیا۔ انگریز ایک وضعدار اور روایت پسند قوم ہے اور پرانے لوگ حد درجہ قدامت پرست...... میرا صاف پانچ ملین کا نقصان ہورہا تھا مگر اسے پرواہ نہیں تھی اور میں مجبور تھا۔ اس کی مدد کے بغیر میں یہ محل اور جائداد برائے فروخت کا اشتہار لگا کے نہیں بیچ سکتا تھا...... پھر یہ نوادرات اور آثارِ قدیمہ نہ رہتی...... عام پراپرٹی ہو جاتی جس کو خواص منہ نہ لگاتے۔ عام آدمی صرف زمین کی قیمت لگاتا یا اینٹ پتھروں کی...... یہ شاید نصف بھی نہ ہوتی۔

نور اب تک خاموش تھی۔ اس نے اچانک ایک بہت اہم سوال کیا جو میرے ذہن سے اوجھل تھا۔''مسٹر ہربرٹ اسپنسر...... ایک بہت اہم پہلو پر آپ نے بات نہیں کی۔ اس محل کی یہ قیمت آپ نے تمام ساز وسامان کے ساتھ لگائی ہے یا اس کے بغیر؟''

وہ کچھ دیر نور کو دیکھتا رہا۔''تمہاری ناقابلِ یقین خوب صورتی کی وجہ سے میں اس احمقانہ سوال کو معاف کرتا ہوں۔''

نور نے خفگی سے کہا۔''آپ میری بے عزتی کررہے ہیں۔''

''نہیں...... ایسا ہوتا ہے...... خدا ایک وقت میں دو چیزیں نہیں دیتا...... کہ سارے زمانے کا حسن بھی تمہارے حوالے کردے اور ذہانت بھی۔ ڈیئر گرل یہ پوری حویلی ایک تاریخی ورثہ ہے' کسی میوزیم کی طرح...... اور جب میوزیم کا سودا ہوتا ہے تو صرف تعمیر کا نہیں ہوتا۔''

''آپ کا مطلب ہے...... سارا سامان قیمت میں شامل ہے؟''

''آف کورس...... اب آپ اس کی امین ہیں...... آپ کا اخلاقی فرض بنتا ہے کہ اس کی ایک ایک چیز کی اسی طرح حفاظت کریں جیسے کسی میوزیم کا ڈائریکٹر کرتا ہے...... ہاں یہ بعد میں خریدار کی مرضی! اور فیاضی پر منحصر ہے کہ اس میں سے بہت کچھ وہ آپ کو لے جانے دے۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

میں نے اور نور نے اسے ملے جلے جذبات کے ساتھ الوداع کہا۔ ایک طرف وہ ہمیں ارنسٹ نیشن کی خصوصی قیمت دلوا رہا تھا کیونکہ اس کے مراسم خصوصی لوگوں سے تھے' دوسری طرف وہ اچھی خاصی قیمت کے نوادرات بھی ساتھ ہی خرید رہا تھا جن کی قیمت کا ہمیں کوئی اندازہ نہ تھا...... پھر بھی میرا خیال تھا کہ وہ مالیت میں محل کے برابر کسی صورت نہیں ہو سکتے۔

یہ اگلے روز شام کی بات ہے جب مجھے ایلیشا کا فون موصول ہوا۔''رفیق میں تم سے ملنا چاہتی ہوں۔''

میں نے کہا۔''کس سلسلے میں......؟''

''سلسلہ تو بہت پرانا ہے اور لوگ ایسے بھی ملتے رہتے ہیں۔''

میں نے صاف کہا۔''آئی ایم سوری' پرانے وقت کی اب کوئی بات نہیں رہی اور ویسے بھی میں بہت مصروف ہوں اپنے کام میں۔''

''مجھے سب معلوم ہے تمہاری مصروفیت کا......'' اس نے تلخ ہو کے کہا۔''تم پیرس میں سیر وتفریح کو تم کام کہتے ہو؟''

''سیر وتفریح کو اگر میں کام سمجھتا ہوں تو تمہیں کیا...... تفریح تم پر حرام ہے' مجھ پر نہیں۔''

''اس سے پہلے دو دن اچھی تفریح کرا چکے تھے پرانے دوست۔''

مجھے سخت طیش آیا۔''واہ...... یہ خوب ترک دنیا ہے کہ چرچ میں ہی باہر سے منٹ منٹ کی خبر مل رہی ہے' کیوں کر رہی ہو یہ ڈراما تم؟''

وہ روہانسی ہوگئی۔''پلیز رفیق' اتنے بے مروت نہ بنو۔''

''یہ بے مروتی نہیں۔ تمہاری بھلائی کے لیے ہے۔ یکسوئی سے عبادت میں مصروف ہوجاؤ گی تو تمہارے دل کو وہ سکون ملے گا جو ابھی حاصل نہیں کیونکہ تم دو دنیاؤں کے بیچ میں پنڈولم کی طرح اِدھر سے اُدھر ہورہی ہو۔ میری پریشانی کو چھوڑو۔ اپنے لیے پریشانی کم کرو۔''

اچانک مجھے احساس ہوا کہ دوسری طرف سے ایلیشا نے فون بند کردیا ہے اور میں اکیلا خود سے باتیں کررہا ہوں۔ نور نے سب سنا تھا لیکن دخل نہیں دیا تھا۔ اس نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔''غصہ کیوں کرتے ہو' وہ نارمل نہیں ہے' رحم کے قابل ہے۔''

''ایسا نہ ہو کہ میں نارمل نہ رہوں۔ رحم کے قابل

ہو جاؤں، یہی چاہتی ہے وہ......"

"چلو چھوڑو، تم نے سمجھا دیا ہے، وہ سمجھ جائے گی۔ آؤ آج ہم ڈاکٹر شائستہ سے مل آئیں، بہت دن ہو گئے، اس سے فریال کی بھی شاید خبر ملے گی۔" اس نے مجھے اٹھنے پر مجبور کر دیا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی میں نور کے ساتھ ڈاکٹر شائستہ کی طرف چلا گیا۔ مجھے ایک ڈر سا لگا رہتا تھا کہ وہ حد درجہ ذاتی سوچ رکھنے والی عورت کہیں نور کے سامنے کوئی غلط بات نہ کر دے۔ اسے بھی میں ابنارمل سوچ ہی کہوں گا کہ وہ مرد عورت کے رشتے کو محض حیوانی تعلق سمجھتی تھی جس میں اخلاقیات کا کوئی دخل نہیں۔ جنس ایک جسمانی ضرورت ہے جو کہیں سے بھی پوری کی جا سکتی ہے جیسے پیٹ کی بھوک کہیں سے بھی کچھ کھا کے مٹائی جا سکتی ہے۔ مغرب میں یہ طرزِ فکر تیزی سے پروان چڑھ رہی ہے اور ایک طبقہ ایسا بھی پیدا ہو گیا ہے جو خونی رشتوں کی حرمت کا قائل نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ کتے، بلی، بکرے اور بکری یا دیگر جانور کون سے خونی رشتے کا احترام ملحوظ رکھتے ہیں۔ گائے کا کون سا بھائی ہوتا ہے، وہ صرف بیل ہوتا ہے۔

شائستہ کی اس سوچ کے پیچھے بھی ایک حادثہ تھا لیکن مجھے اس کا علم نہیں تھا۔ وہ فریال کی سب سے عزیز سہیلی تھی جس نے لندن کے قیام کے دوران میں سے اور مجھے ملائے رکھا تھا۔ میں تو اچانک ایک دن اس کے چنگل میں پھنس گیا تھا۔ تب مجھے اس کے کمپلیکس کا علم ہوا تھا۔ اس سے پہلے وہ میرے ساتھ اتنی رکھائی اور بے رخی سے پیش آتی تھی۔ خصوصاً فریال کے سامنے کہ میں نے اسے ڈاکٹر غیر شائستہ کا خطاب دے رکھا تھا۔

ڈاکٹر شائستہ نے بڑے تپاک سے ہمارا خیر مقدم کیا۔ اب میرے ساتھ اس کا رویہ بالکل بدل چکا تھا۔ وہ نور کے ساتھ بھی بہت فرینڈلی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے فریال کے ساتھ تھی۔ یہاں آنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ نور کو اپنے ساتھ لا کے میں نے غلطی کی ہے۔ شاید خود مجھے بھی اس تعلق کو بحال کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ دونوں اندر والے کمرے میں نہ جانے کیا کھسر پھسر کرتی رہیں۔ میں نے باہر بیٹھ کے کافی ختم کر لی، پھر احتجاج کیا کہ آخر مجھے اکیلا کیوں بٹھا دیا گیا ہے تو وہ باہر آ گئیں۔ میں نے نوٹ کیا کہ نور کا رنگ کچھ اڑا ہوا ہے۔

نور فوراً رخصت چاہتی تھی لیکن شائستہ نے کہا کہ باہر کہیں کھانے پر چلتے ہیں۔ "میں تو بالکل اکیلی ہی رہتی ہوں، جہاں جاتی ہوں بچے ساتھ ہوتے ہیں، تم لوگوں کے آنے سے کچھ رونق ہو گئی۔"

اس کے اصرار کے آگے ہماری ایک نہ چلی۔ وہ ہمیں لندن کے ایک عربی ریسٹورنٹ میں لے گئی جہاں کھانا واقعی اچھا اور نیا تھا۔ جب ہم واپس آ رہے تھے تو نور نے خود ہی بولنا شروع کر دیا۔ "یہ شائستہ کیا چیز ہے آخر، مجھے تو آج پتا چلا۔"

"کیا پتا چلا......؟" میں نے اپنی نظر سڑک پر رکھی۔

"وہ تو پاگل ہے۔"

میں نے ہنس کے کہا۔ "ہر پاگل کی نظر میں دوسرا شخص پاگل ہے، وہ کیا کہتی ہے تمہارے بارے میں؟"

"مجھے جاننے کی کوئی ضرورت نہیں، اگر مجھے پتا ہوتا تو میں ہرگز تمہیں وہاں نہ لے جاتی......"

"مطلب یہ کہ اکیلی جاتیں۔"

"آج جو باتیں اس نے مجھ سے کی ہیں، میں کیا بتاؤں تمہیں۔"

میں نے کہا۔ "مت بتاؤ، مجھے معلوم ہے سب۔"

"تمہیں معلوم ہے؟......فریال نے بتایا ہو گا۔"

میں نے سر ہلا دیا۔ "ظاہر ہے لیکن دیکھو، ہر مسخ شدہ شخصیت کسی حادثے کا نتیجہ ہوتی ہے، جیسے گاڑی، زیادہ تر ٹھیک ہوتی ہیں لیکن ایکسیڈنٹ ہو جائے تو......"

"چلو اب اپنا یہ فلسفہ مت بگھارو، میں آئندہ اس عورت سے نہیں ملوں گی اور تم بھی نہیں۔"

"میں بھی نہیں؟......" میں نے شرارت سے ٹھنڈی سانس لی۔

"اگر تمہیں ایک بات معلوم تھی تو مجھے کیوں نہیں بتائی تھی؟"

"وہ کوئی اچھی بات تھی کہ تمہیں ضرور بتاتا......؟" میں نے کہا۔ "یہ بتاؤ، فریال کے بارے میں بھی کچھ معلوم ہوا۔"

"اس کے بارے میں خبر اچھی نہیں ہے، وہ کسی فنانسر چھوٹے حاجی مستانہ کے ساتھ رہتی ہے، کسی فلم کا آئٹم سونگ کر رہی تھی۔"

"وہ آئٹم گرل ہو گئی ہے۔"

"اس کے پروفیشن میں سب کام ہیں اور مقصد صرف ایک ہے، ناموری اور پیسا......وہاں امارات کا کوئی شہزادہ بھی موجود تھا، اس نے بعد میں فریال کو ساتھ چلنے کی پیشکش کی، فریال نے انکار کر دیا۔ شہزادے کی سخت بے عزتی ہوئی

کسی کی مجال نہیں کہ اسے انکار کر سکے۔ اس وقت وہ تو لال پیلا ہوتا چلا گیا کیونکہ حاجی مستانہ پہنچ گیا تھا اور اس نے کہا کہ ابھی تو یہ میری بیوی ہے لیکن آپ کو پسند ہے تو میں طلاق دے کر آپ کے پاس پہنچا دوں گا، اس کے بعد سے وہ غائب ہے۔"

"غائب ہے؟"

"دبئی میں نہیں ہے......شہزادہ سمجھ رہا ہے کہ اسے حاجی مستانہ نے فرار کرا دیا، حاجی مستانہ کا خیال ہے کہ شہزادے نے اغوا کرا لیا۔ ان کے کاروباری تعلقات ختم ہو گئے اور ایک طرح کی دشمنی ہو گئی ہے۔ وہ تو حاجی مستانہ بھی کوئی معمولی چیز نہیں، اس کے مراسم شہزادے کے والد ماجد شیخ سے ہیں، فریال کا پتا نہیں کہاں ہے۔"

میں نے کہا۔ "اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔ چھوڑو......کوئی اور بات کرو۔"

"فرض کرو، ابھی ہم گھر جائیں اور وہ پہلے سے وہاں موجود ہو۔"

میں نے برہمی سے کہا۔ "یار کیوں میرا دماغ خراب کر رہی ہو......کرنا ہے تو اچھی بات کرو ورنہ خاموش رہو۔"

نور نے سخت برا مانا اور گھر پہنچنے کے بعد بھی اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی۔ میں خود بہت دیر جاگتا رہا اور اس وقت کے بارے میں سوچتا رہا جو فریال کے ساتھ گزرا تھا۔ زندگی نے اس کے ساتھ اچھا نہیں کیا تھا۔ پھر فریال نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا تھا، آخر میرا قصور کیا تھا؟

اچانک انٹر کام کا بزر بولا۔ میں نے گھڑی دیکھی تو رات کے سوا بارہ بجے تھے، سیکیورٹی گارڈ کو اس وقت مجھ سے بات کرنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی، اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ وقت سونے کا ہے۔ شاید اسے کوئی ایمرجنسی ہو، یہ سوچ کے میں نے ریسیور اٹھا لیا۔

"سر......آپ سے کوئی ملنے آیا ہے، ایک خاتون ہیں برقعے میں۔"

میں ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ ایک دم میرا ذہن نور کی بات کی طرف چلا گیا تھا۔ فرض کرو ابھی ہم گھر جائیں اور وہ وہاں پہلے سے موجود ہو۔ کیا فریال سچ مچ آ گئی تھی۔ برقعہ پہن کے یہاں آنے والا اور کون ہو سکتا تھا۔ میں کچھ دیر تذبذب میں ریسیور لیے بیٹھا رہا۔ سیکیورٹی گارڈ دوسری طرف میرے جواب کے انتظار میں تھا۔

نور کو درمیانی دروازے میں دیکھ کے میں نے سکون کا سانس لیا۔ اس نے میری صورت دیکھ کے پوچھا۔

"کیوں......کیا ہوا......؟"

میں نے ریسیور اسے تھما دیا۔ "تمہاری بات سچ ہو گئی نا۔ وہ پہنچ گئی یہاں......مصیبت۔"

اس نے ریسیور لے کر کہا۔ "کون فریال......" اور پھر گارڈ سے بات کرنے لگی۔ "فریال نہیں ہے تو پھر کون ہے، نام کیوں نہیں بتاتی، اچھا اسے آنے دو۔"

میں نے پریشانی سے کہا۔ "کون ہے آخر؟"

"میں دیکھتی ہوں باہر جا کے۔"

"میں بھی چلتا ہوں تمہارے ساتھ......کوئی چکر نہ ہو۔" میں نے اپنا ریوالور ساتھ لے لیا۔

وہ عورت گیٹ سے اندر آ چکی تھی اور میں نے ایک نظر میں پہچان لیا کہ اسے برقعہ پہننے کی عادت نہیں ہے۔ روشنی میں آ کے اس نے نقاب الٹا تو میرے دماغ کو زبردست جھٹکا لگا، نور کے قدم بھی رک گئے۔

میں نے بڑی مشکل سے کہا۔ "ایلیشا......تم...... مجھے یقین نہیں آ رہا۔"

وہ سیدھی اندر چلی گئی۔ "مجھے اس طرح آنا پڑا۔"

میں اور نور اس کے پیچھے اندر گئے۔ اس وقت تک وہ برقعہ ایک طرف ڈال کے صوفے پر بیٹھ چکی تھی۔ "اگر میں چھپ کے نہ آتی تو اور کیا کرتی 'تم نے ملنے سے انکار جو کر دیا تھا۔"

"ایلیشا......تم چرچ سے کیسے نکل آئیں؟"

"بس نکل آئی۔ میرا تم سے ملنا بے حد ضروری تھا۔ میں تم سے پوچھنا چاہتی تھی کہ کیا یہ صحیح ہے؟......تم ارنسٹ مینشن کے ساتھ ہمارا تمام ساز و سامان بھی بیچ رہے ہو؟"

میں نے رکھائی سے کہا۔ "تم بھول رہی ہو کہ اب وہ میرا ہے۔"

اس نے غصے سے پیر پٹخا۔ "مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنے کمینے اور ذلیل ہو، تمہیں ذرا احساس نہیں کہ اس محل کے علاوہ اس کے اسباب کی میرے نزدیک کیا جذباتی قیمت ہے۔ وہ سب نوادرات ہیں، ان کے ساتھ میری زندگی کی کہانی جڑی ہوئی ہے، میرا بچپن...... میری جوانی۔" وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی اور منہ چھپا کے ہچکیاں لینے لگی۔

نور نے مجھے اشارہ کیا کہ فی الحال میں خاموش ہو جاؤں اور اسے پانی کا گلاس پیش کیا۔ "ٹیک اٹ ایزی ایلیشا......"

اس نے ایک ہاتھ مار کے گلاس گرا دیا۔ "یہ کیا پلا رہی ہو مجھے، اس سے بہتر چیز کوئی نہیں رہی اس محل میں......دنیا

کی بہترین شراب کا قابل فخر ذخیرہ تھا یہاں۔"

میں نے برہمی سے کہا۔ "وہ سب ہم نے نالی میں بہا دیا اور اب تم چرچ میں کیا پتی ہو، نن بننے کے بعد؟"

"اس وقت تو میں اپنے گھر میں ہوں۔"

"مت بھولو کہ اب یہ میرا گھر ہے اور تمہاری حیثیت ایک بن بلائے مہمان سے زیادہ نہیں ہے۔" میں نے ترش روئی سے کہا۔ "یہاں جو کچھ ہے میرا ہے...... اس لیے کہ تم نے خود یہ سب قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔"

وہ روتی رہی۔ "بہت بڑی غلطی ہوئی مجھ سے...... میرا دماغ چل گیا تھا، مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"آئی ایم سوری...... جو ہونا تھا ہو گیا، گزرا ہوا وقت اب تمہارے یا میرے چاہنے سے واپس نہیں آ سکتا۔"

اس نے اپنے آنسو پونچھے۔ "دیکھو، ابھی تم نے سودے کی بات کی ہے۔ سودا نہیں کیا ہے۔"

میں نے کہا۔ "دنیا کا سارا کاروبار زبان پر چلتا ہے۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ محل مع ساز و سامان ملے گا اور خود بروکر کی شرط یہی تھی کہ......"

"جہنم میں جائے بروکر...... کینسل کر دو یہ ڈیل۔" وہ چلائی۔

"کیوں سسٹر ایلیشا......؟" میں نے پہلی مرتبہ اسے اس نام سے پکارا۔

"نہیں ہوں میں سسٹر ایلیشا...... میں صرف ایلیشا ارنسٹ ہوں، لارڈ ارنسٹ کی واحد وارث...... یہ سب میرا ہے۔" وہ ہسٹریا میں چلانے لگی۔ "اسے تم مجھ سے چھین نہیں سکتے۔"

میں نے کہا۔ "ایلیشا...... ہوش میں آؤ...... اگر دوسرے یہ سب سنیں گے تو نقصان میرا نہیں تمہارا ہوگا، بے عزتی تمہاری ہوگی۔"

"رفیق...... کیا تم نے کہا نہیں تھا کہ جب میں چاہوں گی تم میرا حق مجھے واپس کر دو گے؟"

"یس...... لیکن اس وقت تم نے انکار کر دیا تھا اور قانونی طور پر اب یہ میرا ہے، یہ کوئی میری جیب میں پڑا ہوا سکہ نہیں جو میں نکال کر تمہارے ہاتھ پر رکھ دوں۔ اگر یہ سب واپس چاہیے تو عدالت سے طلب کرو، مجھے یقین ہے کہ اس معاملے میں قانون بھی تمہاری کوئی مدد نہیں کرے گا۔ اس محل میں سے اب تم ایک چیز بھی اٹھا کے نہیں لے جا سکتیں۔"

وہ روتی رہی۔ "دیکھو...... میری ذاتی چیزیں ہیں یہاں...... میرے کپڑے، جیولری، میری تصویریں، خطوط اور ڈائریاں...... میرے بچپن کی یادگار گڑیاں اور کھلونے......"

میں نے کہا۔ "سب ہوگا...... بالکل اسی طرح جیسے تم چھوڑ کے گئی تھیں، اگر کل تم مجھ سے کہتیں تو میں تمہیں اجازت دیتا کہ جو چاہیے لے جاؤ...... کیونکہ اس وقت سب میرا تھا۔ مالک میں تھا لیکن اب میں زبان دے چکا ہوں کہ محل میں جو کچھ ہے وہ خریدار کو ملے گا۔"

"اسے کیا معلوم......"

"مگر مجھے تو معلوم ہے...... اور سسٹر ایلیشا...... خدا دیکھ رہا ہے۔"

وہ خوں آشام نظروں سے مجھے گھورتی رہی۔ پھر اچانک اس نے اپنے گریبان میں ہاتھ ڈالا اور ایک ریوالور نکال لیا۔ "میں فیصلہ کر کے آئی تھی......"

میں نے کہا۔ "ایلیشا...... یہ کیا پاگل پن ہے؟"

"بولو...... تمہاری جان لوں کہ اپنی......؟" اس نے ریوالور میری اور اپنی طرف کر کے کہا۔

نور کا رنگ زرد پڑ گیا۔ "ایلیشا...... اسے رکھ لو، تم جو چاہتی ہو وہی ہوگا۔"

وہ دیوانگی میں پلٹی۔ "بے وقوف لڑکی...... یہ تیرا چاہنے والا کہہ چکا ہے کہ جو میں چاہتی ہوں وہ نہیں ہو سکتا...... اور میں' ایلیشا ارنسٹ...... طے کر کے آئی تھی کہ ہوگا وہی جو میں چاہوں گی۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ جو میں نے چاہا ہو وہ نہ ہوا ہو، میری بات کوئی ٹال نہیں سکتا۔"

میں نے کہا۔ "ایلیشا...... ایک طریقہ ہے جس سے تم اپنی بات منوا سکتی ہو...... میرا مطلب ہے، جو تمہیں چاہیے وہ مل سکتا ہے۔ تم مجھ سے نہیں اس سے بات کرنا جو میرے بعد یہاں آئے گا۔ اتنے چھوٹے دل کا میں بھی نہیں ہوں کہ تم جو بے حیثیت چیزیں مانگ رہی ہو، وہ تمہیں نہ دے سکوں، وہ بھی تمہیں انکار نہیں کرے گا۔ تمہاری ذاتی چیزیں رکھ کے وہ کیا کرے گا لیکن میں مجبور ہوں۔"

میرا مقصد اس کی توجہ حاصل کرنا تھا۔ میں نے درمیان میں نور سے اردو میں کہا۔ "اس کو گرا دو......" اور پھر اپنی بات شروع کر دی۔ "اگر تم واپس دنیا میں آنا چاہتی ہو ایلیشا تو یہ تمہارا فیصلہ ہوگا' صرف تمہارا...... اور پھر میں دیکھوں گا کہ تمہیں کیا واپس کیا جائے۔ مجھے نئے سرے سے تمام معاملات کو دیکھنا ہوگا، یہ بھی دیکھنا پڑے گا کہ تم ذہنی طور پر اس قابل ہو یا نہیں...... لیکن پہلے تم اعلان تو کرو کہ میں چرچ کو چھوڑ کے واپس آ گئی ہوں۔ میں یہ سودا بھی کینسل کر دوں گا۔"

نور نے بروقت اور صحیح کارروائی کی...... ایلیشا کی توجہ ہٹی ہی تھی۔ اس کی آنکھیں میرے دکھائے ہوئے خواب میں گم تھیں جب نور نے ایک دم سے اسے دھکا دیا۔ یہی نہیں، جب وہ گری تو نور نے اس کے ہاتھ پر اپنے پاؤں کی ٹھوکر ماری اور اس کے ہاتھ سے ریوالور نکل کے پھسلتا ہوا صوفے کے نیچے چلا گیا۔ پھر میں نے بڑی آسانی سے اسے قابو کر لیا حالانکہ وہ مچل رہی تھی اور چلا چلا کے نور کو گالیاں دے رہی تھی۔

میں نے اسے ایک صوفے پر پھینک دیا مگر وہ زخم خوردہ شیرنی کی طرح پھر اٹھ کھڑی ہوئی۔ "میں تم کو چھوڑوں گی نہیں، دغا باز...... لالچی...... غاصب......" وہ مجھ پر کسی وحشی جانور کی طرح حملہ آور ہوئی۔

میں نے اس کو قریب آنے پر ایک ایسا تھپڑ رسید کیا کہ وہ پھر صوفے پر جا گری۔

نور چلائی۔ "یہ کیا کر رہے ہو؟"

"اسے ہوش میں لانے کا اور کوئی طریقہ نہیں۔" میں نے کہا۔

اس کا ریوالور صوفے کے نیچے نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ ایلیشا الٹی پڑی ہچکیوں سے رو رہی تھی اور مجھے دغا باز، قاتل اور نہ جانے کیا کچھ کہہ رہی تھی۔ نور کا رنگ فق ہو رہا تھا' آدھی رات کے وقت گھر میں اس ہنگامے کا تصور نہ وہ کر سکتی تھی اور نہ میں سوچ سکتا تھا کہ ایلیشا چرچ سے اس وقت فرار ہو کے یہاں نازل ہو سکتی ہے۔

نور نے کہا۔ "کیا میں...... پولیس کو بلاؤں یا ڈاکٹر کو......؟"

میں نے اسے حوصلے اور صبر سے کام لینے کا اشارہ کیا۔ "ابھی سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

لیکن ایسا نہیں ہوا، ایلیشا صوفے پر لیٹی سسکیاں بھرتی رہی آہستہ آہستہ اس کی سسکیاں مدھم پڑتی گئیں اور کچھ دیر بعد وہ بے حس و حرکت اور ساکت ہو گئی۔ اس کی ذہنی' اعصابی اور جسمانی توانائی کا لیول زیرو پر آ گیا تھا۔ وہ سو گئی تھی یا بے ہوش ہو گئی تھی۔ میں نے اسے سیدھا کیا اور صوفے پر لٹا دیا۔ نور نے اس کے پیروں سے جوتے الگ کر دیے۔

"یہ بیٹھے بٹھائے کیا مصیبت نازل ہو گئی۔" نور بولی۔

میں نے کہا۔ "مجھے آگے کی فکر ہے۔ اس ذہنی عدم توازن کے ساتھ یہ کیا کرے گی۔"

"تم کیا اسے پاگل خانے بھیجنے کا سوچ رہے ہو؟"

میں نے کہا۔ "اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں یہی کرتا لیکن اب اس کا ذمے دار چرچ ہے جہاں سے یہ نکل کر بھاگی ہے۔"

"کیا وہ ان کا خیال نہیں رکھتے؟"

میں نے کہا۔ "رکھتے ہیں لیکن چرچ کوئی جیل خانہ نہیں ہوتا، وہاں سب اپنی مرضی سے آتی ہیں۔ شاید وہاں کسی کو علم ہی نہیں ہوگا کہ سسٹر ایلیشا اپنے کمرے میں نہیں ہے۔"

"یہ برقعہ اس نے کہاں سے لیا؟"

"برقعہ نہیں...... یہ راہباؤں کا سیاہ لباس ہے، اس نے خود ہی اسے نقاب لگا کے برقعے کی صورت دے دی ہے۔ اصل مقصد تو چہرہ چھپانا تھا۔ میرا خیال ہے پہلے میں انہیں بتا دوں۔"

"ہاں...... آگے وہ جانیں اور ان کا کام۔"

"اس کے باوجود یہ خطرہ باقی رہے گا کہ ایلیشا اپنے جلد بازی کے فیصلے کو بدل کے چرچ چھوڑ دے اور پھر دنیا دار بن جائے، حالانکہ ایسا کرنا انتہائی معیوب اور گناہ کی بات سمجھا جاتا ہے۔"

"اسے کون روک سکتا ہے۔"

"ہاں...... اگر وہ چرچ سے نکل آئے تو پھر اپنے قول و فعل کی ذمے دار خود ہوگی، اس کے حامی بہت ہیں' وہ اسے میرے خلاف قانونی کارروائی پر اکسائیں گے کہ اپنا حق واپس لو، لیکن اب یہ ناممکن ہے۔"

"پہلے تم خود سب کچھ اسے دینا چاہتے تھے۔"

"اگر یہ نارمل ہوتی تو میرے لیے آج بھی سب سے آسان یہی ہوتا کہ میں اس کا حق اس کے حوالے کر دوں اور ہاتھ جھاڑ کے واپس چلا جاؤں لیکن اس کی ذہنی حالت پاگل پن کے قریب ہے۔ وہ اتنی بڑی بزنس آرگنائزیشن کو نہیں چلا سکتی۔ اس کے ساتھ اور بہت سے لوگوں کا روزگار اور مستقبل وابستہ ہے۔ لارڈ ارنسٹ کی اتنی محنت سے کھڑی کی گئی ایمپائر کو گدھ کھا جائیں گے۔"

ایلیشا آہستہ سے اٹھ بیٹھی۔ اب وہ پُرسکون تھی۔ اس نے اپنے بال ایک ہاتھ سے پیچھے کیے۔ "تم ٹھیک کہتے ہو، میں اس قابل ہوتی تو ڈیڈی کسی اور کو یہ سب کیوں سونپتے...... میں نے انہیں مایوس کیا۔ میں نے سب کو مایوس کیا، میں اپنے والدین کی بدنامی کا سبب بنی اور اب میں چرچ سے بھاگ آئی ہوں تو میری مزید رسوائی ہوگی، مجھے پاگل خانے بھیج دیا جائے گا۔ پلیز رفیق...... مجھے بچا لو۔"

میں نے کہا۔ "میں کیا کر سکتا ہوں۔"

''تم سب کچھ کر سکتے ہو، تم مجھے پاگل خانے میں مرنے سے بچا سکتے ہو، میں بتا رہی ہوں تمہیں...... میں مر جاؤں گی۔''

''وہاں تمہارا علاج ہوگا تو تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔''

''اتنے سنگدل اور بے رحم نہ بنو...... تم چاہو تو سب کچھ کر سکتے ہو، یہ تمہارے لیے کوئی مشکل نہیں، تم میری ذمے داری لے لو۔''

میں نے گھبرا کے کہا۔ ''ایلیشا میں خود کو اس قابل نہیں سمجھتا، میں یہ ذمے داری کیسے لے سکتا ہوں۔''

''بہت آسان ہے۔ تم مجھ سے شادی کر لو تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''میں تم سے شادی کر لوں......؟''

''ہاں...... دیکھو نا...... ڈیڈ یہی چاہتے تھے اور تم کو وارث بنانے کا مقصد کیا تھا۔ تمہارے لیے تو یہ کوئی مشکل کام نہیں، تم مجھ سے بھی شادی کر سکتے ہو اور نور سے بھی۔ تمہارے مذہب میں تو چار کی اجازت ہے، ایک جیسا منصفانہ سلوک کرنے کی شرط ہے، وہ تم پوری کر سکتے ہو۔ اس طرح سارے مسئلے حل ہو جاتے ہیں۔ یہاں میں اور تم ہوں گے۔ مجھے میرا حق بھی مل جائے گا اور تمہیں اپنے حق سے دستبردار بھی نہیں ہونا پڑے گا۔''

''ایلیشا...... یہ ناممکن ہے۔'' میں نے بڑی مشکل سے کہا۔

''کیوں ناممکن ہے...... کیا نور کو اعتراض ہوگا؟...... نہیں ہوگا، مجھے معلوم ہے...... وہ تو تمہارے ساتھ شادی کے بغیر بھی رہنے پر تیار ہے۔ پہلے تم فریال سے شادی کرنا چاہتے تھے تو اسے اعتراض نہیں تھا، اب مجھ سے کر لو گے ایک نیک مقصد کی خاطر...... تو وہ تمہیں کیوں روکے گی، کیوں نور...... کیا میں نے غلط کہا......؟''

نور ساکت و صامت بیٹھی تھی اور پلکیں جھپکائے بغیر اس لڑکی کو دیکھ رہی تھی جو دیوانہ بکار خویش ہشیار کی جیتی جاگتی مثال تھی۔ وہ پاگل تھی لیکن اپنا برا بھلا سمجھتی تھی...... اپنے مفاد کو نہیں بھولتی تھی۔

''تم نے دیکھا رفیق...... نور نے میری تائید کر دی، کیونکہ یہ بہت آسان...... بہت پریکٹیکل ہے یہاں میں اور تم...... ست بدھائی میں تم اور نور...... تم یہاں بھی مالک وہاں بھی۔ اس میں سب کی بھلائی ہی ہے اور پھر اعتراض کرنے والا کون ہے تم دیکھنا میں ٹھیک ہو جاؤں گی، مجھے معلوم ہے میرے مسیحا تم ہی ہو سکتے ہو۔''

ایک دم مجھے ہوش آ گیا۔ ''اسٹاپ دس نان سـ...... ایلیشا...... جو تم سوچ رہی ہو وہ قیامت تک نہیں ہو سکتا۔ ا... ساتھ مجھے پاگل مت کرو، اب تمہاری واحد پناہ گاہ وہی پاگل خانہ......''

''میں مر جاؤں گی لیکن واپس نہیں جاؤں گی۔ ر... میں واپس جانے کے لیے نہیں آئی تھی، یہ گھر میرا ہے، ... اس میں تمہارے ساتھ رہوں گی...... یہاں سے کوئی مجھے نہ... نکال سکتا۔'' وہ پھر چلانے لگی۔

میں نے کہا۔ ''نور...... پولیس کو بلا لو۔''

نور ابھی اٹھی ہی تھی کہ ایلیشا صوفے کے نیچے گھس گ... بے وقوفی سراسر میری تھی، ابھی تک میں نے نیچے سے ریوا... نکال کر اپنے قبضے میں نہیں لیا تھا، میں اس کی طرف سے بے... فکر ہو گیا تھا کہ وہ ایلیشا کی دسترس میں نہیں رہا۔

کچھ دیر پہلے نور نے اسی اندیشے کا اظہار کیا تھا۔ ا... میں تمہارے ساتھ نہ رہی تو تم ایک بیوی کے ساتھ یہاں ر... گے دوسری کے ساتھ وہاں...... اور ایلیشا اس کے اندیشوں... حقیقت کا روپ دینے کتنی جلدی آ گئی تھی...... لیکن میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اب ایلیشا کو پولیس کے حوالے ہی کرنا ہو... ہوگا۔ پولیس اسے واپس چرچ لے جائے یا کہیں اور......!

اس نے گھٹنوں کے بل ہو کے نیچے جھانکا۔ ''ایلیشا با... آ جاؤ۔''

''نہیں...... اب میری لاش ہی باہر آئے گی۔''

''دیکھو ہم بات کر سکتے ہیں۔''

''نہیں نہیں نہیں......'' وہ دیوانگی میں چلائی۔ ''... انکار کر چکے ہو...... تم نے پولیس کو طلب کر لیا ہے۔''

مجھے نور کی لرزتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''پولیس...... پلیز فوراً ارنسٹ مینشن آ جائیں، ایمرجنسی ہے...... کسی کی جان جا سکتی ہے۔''

میں صوفے کے نیچے گھس گیا۔ ''ایلیشا......!''

مجھے اندھیرے میں اس کا وجود سائے کی طرح دکھائی دیا۔ وہ سیدھی لیٹی ہوئی تھی اور اس کے دائیں ہاتھ میں ریوالور تھا۔ میں نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ ''یہ مجھے دے دو...... پلیز......''

وہ ہنسی۔ پھر ایک دھماکا ہوا...... میری نظروں کے سامنے گہری تاریکی پھیل گئی۔ میرے کانوں میں پولیس کے سائرن کی آواز گونجی...... نور چیخ رہی تھی، میرا نام دہرا رہی تھی ''رفیق...... رفیق...... رفیق!''

مجھے کوئی اندازہ نہیں کہ بے حسی کا دورانیہ کیا تھا...... چند سیکنڈ یا چند منٹ۔ میرے کانوں میں اتنے قریب دھماکا ہونے سے سیٹیاں سی بج رہی تھیں۔ میں بارود کی بو سونگھ رہا تھا اور میرے ذہن میں آنے والا پہلا خیال یہ سوال تھا کہ کیا میں مر رہا ہوں؟ کیا ایلیشا کے ریوالور سے نکلنے والی گولی مجھے لگ گئی ہے؟ اتنے قریب سے نشانہ خطا کیسے ہو سکتا تھا...... لیکن گولی مجھے لگی ہے تو کہاں؟

پھر زندگی کا یقین اور احساس میرے جسم میں برقی رو کی طرح بھر گیا اور فون کے ریسیور میں پولیس کے لیے دیوانہ وار چیخنے والی نور ایک دم متحرک ہوئی تو اس نے صوفے کو پیچھے کی طرف الٹ دیا۔ میں نے خود کو قالین پر سیدھا پڑا دیکھا...... ایلیشا مجھ سے چند انچ کے فاصلے پر لیٹی ہوئی تھی، وہ بے حس و حرکت تھی اور اس کی آنکھیں ساکت ہو گئی تھیں لیکن وہ زندہ تھی۔

اس کا اندازہ مجھے سانس کے زیر و بم سے ہوا۔ اس کا سینہ اوپر نیچے ہو رہا تھا، میرے بہت نزدیک ہونے کی وجہ سے وہ ریوالور سے نہ اپنی جان لے سکی تھی اور نہ میری...... میں نے اس سے آتشیں ہتھیار چھیننے کی کوشش کی تھی اور اس نے اپنی وحشیانہ جسمانی قوت کے ساتھ پوری مزاحمت کی تھی، اس جد و جہد میں غیر ارادی طور پر اس کی انگلی نے ٹریگر کو دبا دیا تھا۔ پھر جو دھماکا ہوا اور اس کے ہاتھ کو فائر کے ردعمل سے جو شدید جھٹکا لگا اس کے شاک نے نہ صرف ایلیشا کو بھی مفلوج کر دیا تھا بلکہ اس کے ہسٹریا کی دیوانگی بھی ختم ہو گئی تھی۔

اب ریوالور اس کے پیروں کی طرف پڑا تھا، میں نے اسے جھپٹ کر اٹھا لیا اور کھڑا ہو گیا۔ ریوالور سے نکلنے والی گولی صوفے میں سوراخ کرتی ہوئی اوپر چھت کی طرف نکل گئی تھی۔ چھت کی بے داغ سفیدی میں جھڑنے والے پلاسٹر سے ایک زخم جیسا نشان بن گیا تھا۔

نور ایسے مجھ سے چمٹ گئی تھی کہ مجھے اس کو الگ کرنا مشکل ہو گیا تھا...... وہ ہچکیوں کے درمیان ایک ہی سوال دہرائے جا رہی تھی۔ تم ٹھیک ہو؟ تمہیں کچھ ہوا تو نہیں؟ وہ میرا جواب سن ہی نہیں رہی تھی اور اپنے ہاتھوں سے میرے جسم کے ہر حصے کو ٹٹول کر دیکھ رہی تھی۔

ایلیشا خود ہی آہستہ آہستہ اٹھی۔ اس کی آنکھوں میں ویرانی تھی اور چہرے پر بھی کوئی تاثر نہ تھا، میں نے سختی سے خود کو نور کی گرفت سے چھڑایا اور اسے دور دھکیل دیا۔ ''نور ہوش میں آؤ، دیکھو پولیس آ گئی ہے۔'' میں نے فریج کھول کر پانی کی بوتل نکالی اور اس میں سے ایک گلاس بھر کے نور کو دیا۔ اس نے دو گھونٹ لے کر گلاس مجھے واپس کر دیا۔ میں نے باقی پانی ختم کر کے ایلیشا کی طرف دیکھا۔

وہ صوفے پر بیٹھ گئی تھی۔ ''مجھے کہیں سے تھوڑی سی وہسکی لا دو...... پلیز...... اور پولیس سے کہو، بعد میں آئیں۔''

میں نے کہا۔ ''وہ میرے حکم کے تابع نہیں ہیں سسٹر ایلیشا...... اور میں پہلے بتا چکا ہوں کہ اب یہاں شراب نہیں مل سکتی۔''

نور نے کہا۔ ''سنو...... شاید کرسٹوفر نے اپنے لیے کہیں چھپا کے رکھی ہو، میں دیکھتی ہوں۔''

دروازے پر دستک سن کے میں نے باہر جھانکا۔ سیکیورٹی گارڈ نے کہا۔ ''سر...... آپ ٹھیک ہیں نا؟...... میں نے ایک دھماکا سنا تھا، گن کس نے فائر کی تھی۔''

''وہ اتفاقیہ فائر تھا۔''

''باہر پولیس آئی ہے...... وہ کہتے ہیں انہیں کال کیا گیا تھا۔''

''ان سے میں بات کر لیتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

پولیس کار سے اترنے والے سارجنٹ نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ''پولیس کو کس نے کال کیا تھا؟''

''وہ...... میری فرینڈ کچھ گھبرا گئی تھی۔ غلطی سے ایک فائر ہو گیا تھا۔''

''فائر کس کی غلطی تھی، آپ کی یا آپ کی فرینڈ کی؟'' اس نے ایک نوٹ بک میں لکھنا شروع کیا۔

مجھے محسوس ہوا کہ معاملہ اب اتنی آسانی سے ختم ہونے والا نہیں ہے...... یہ پاکستان نہیں ہے کہ اول تو پولیس آتی ہی نہیں اور آ جائے تو کمک مکا بھی مشکل نہیں ہوتا۔ آخر مجھے کیا ضرورت ہے حقائق کی پردہ پوشی کرنے کی۔

میں نے کہا۔ ''فائر نہ مجھ سے ہوا تھا اور نہ میری فرینڈ کی غلطی سے...... اصل بات جاننے کے لیے تمہیں اندر آ کے دیکھنا ہوگا۔ یہاں صرف میرا بیان لینے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ میں رفیق احمد ہوں جو اب اس جگہ کا مالک ہوں...... لارڈ ارنسٹ کی موت کے بعد۔''

وہ میرے پیچھے پیچھے اندر آ گیا۔ اس کی نظر نے نور اور ایلیشا کے بعد الٹے پڑے ہوئے صوفے کو دیکھا اور میرے اشارے پر وہ خالی صوفے پر بیٹھ گیا۔

''یہ تم نے پولیس کو بلا کے اچھا نہیں کیا رفیق......'' ایلیشا نے احتجاجی اور فریادی لہجے میں کہا۔

''یہ ضروری تھا مسز ایلیشا۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

سارجنٹ نے اسے غور سے دیکھا۔ ''یو آر اے نن......؟ تم یہاں کیا کر رہی ہو اس وقت؟''

''اپنے کام سے کام رکھو ایڈیٹ...... آئی واز اے نن...... لیکن میں اب اس ارنسٹ مینشن کی مالک ہوں کیونکہ میں ہی لارڈ ارنسٹ کی واحد اولاد ہوں اور یہ شخص۔'' اس نے میری طرف حقارت اور نفرت سے انگلی اٹھائی...... ''یہ ایک دھوکے باز غاصب ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ مجھے یہ معاملہ لوکل پولیس اسٹیشن کے سپرد کر دینا چاہیے۔'' سارجنٹ نے سوچ کے کہا۔

میں نے اس کی تائید کی۔ ''دیکھو اگر کیپٹن راجر ڈیوٹی پر ہو گا تو وہ سب جانتا ہے۔ مسز ایلیشا کسی کو بتائے بغیر چرچ سے نکل آئی ہے۔ کیپٹن راجر ان کو بھی بتا سکتا ہے۔''

''ابھی تک مجھے یہ نہیں معلوم ہوا کہ گن کس کی تھی...... اور فائر غلطی سے ہوا تو کس کے ہاتھ میں تھی......؟''

''گن مسز ایلیشا کی تھی اور یہ اپنے ساتھ لائی تھی، فائر کے وقت اسی کے ہاتھ میں تھی۔ میں نے گن اس سے چھیننے کی کوشش کی تو گولی چل گئی۔''

''یہ بکواس کرتا ہے۔'' ایلیشا چلائی۔

''کون بکواس کرتا ہے اور کون نہیں...... یہ معلوم کرنا میرا کام نہیں۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''جب تک پولیس اسٹیشن سے کوئی ذمے دار آفیسر نہیں آ جاتا۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی اس کمرے سے باہر جائے، یا قانون کے کام میں دخل دے۔'' اس نے ایک دم ریوالور نکال لیا۔

ایلیشا کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ جذبات کے منہ زور دھارے میں وہ تنکے کی طرح بہہ گئی تھی اور چرچ سے نکل بھاگی تھی۔ معلوم نہیں کہاں سے اس نے ریوالور حاصل کیا اور کیسے مجھ تک پہنچ گئی۔ وہ شدید جذباتی شاک میں پاگل ہو گئی تھی کہ کل تک جو اس کا تھا وہ اب کسی اور کا ہو گیا ہے۔ اس کے ایک انتہائی غیر متوازن دماغ میں اتنی صلاحیت نہیں تھی کہ وہ کسی خواہش سے ہونے والے نفع نقصان کا اندازہ کر سکے۔

شاید یہ ایک فطری کمزوری تھی۔ حالات نے اس کو ضدی بنا دیا۔ وہ اکلوتی بیٹی اور شہزادی، اپنا حق سمجھنے لگی کہ جو وہ چاہے گی ہو جائے گا۔ پہلے اس نے چاہا کہ میں اس کا ہو جاؤں...... اس نے نفع نقصان کو میرے سمجھانے کے باوجود نہیں سمجھا۔ اس کی ضد پوری نہیں ہوئی تو وہ بچوں کی طرح مچل گئی۔ نشے کی لت میں مبتلا ہو گئی اور خود کو عام کر دیا کہ میں خود کو جس کے لیے سمجھتی تھی وہ نہیں تو پھر جس کا جی چاہے آئے اور مجھے استعمال کرے۔

وہ اسی پاگل پن میں اپنے حق ملکیت سے دستبر[دار] ہوئی تھی، اس نے باپ سے کہا تھا کہ یہ دولت جائداد کار[وبار] سب رقیق کا ہو جائے گا تو وہ بھی میرا ہو جائے گا۔ اس کی [اس] سوچ کو پھر شکست ہوئی تھی۔ اس نے دنیا ہی چھوڑ دی [اور] چرچ میں پناہ لے لی۔ صرف چند ہفتوں میں اسے پھر احسا[س] ہوا کہ اس نے غلطی کی ہے کیونکہ جو وہ چاہتی تھی وہ [نہیں] ہوا...... ایک انتقامی جذبے کے ساتھ وہ چرچ سے بھی نکل آئی، یہ طے کر کے کہ آج میں نہیں یا تم نہیں، یا ہم دونو[ں] نہیں۔ اس پاگل عورت کی یہ خواہش بھی پوری نہ ہو سکی۔

اب آگے مزید ذلت و رسوائی کی گہرائیاں تھیں [جن] میں گرنے سے وہ خود کو نہیں بچا سکتی تھی اور وہ وقتی اشتعال [میں] قتل کر دینے والے مجرم کی طرح پھانسی کے خیال سے دہش[ت] زدہ تھی۔ مجھے اس پر ترس آیا لیکن صرف میرے چاہنے [سے] کچھ ہو سکتا تو نوبت یہاں تک نہ آتی۔ آج وہ اپنے باپ [کی] کرسی پر بیٹھی ایک بزنس فرم کی سربراہی کر رہی ہوتی، اس [نے] سوچ سمجھ کے کسی شریک حیات کا انتخاب کر لیا ہوتا اور اس [کی] زندگی ایک سنہرے خواب کے مانند خوبصورت ہوتی......

اس نے صرف خود کو ہی نہیں بلکہ ماں باپ کو زندگی بھر کسی نہ [کسی] عذاب میں مبتلا کیے رکھا۔ یہاں تک کہ وہ اس کی ماتم [کرتے] مر گئے، اس نے میرے لیے پریشانیاں پیدا کرنا جاری رکھ[ا] کبھی یہ نہیں سمجھا کہ جب میں اس کے لیے بنا ہی نہیں تو [اس کی] مجھے حاصل کرنے کی خواہش، جدوجہد اتنی ہی بے معنی [تھی] جتنی کسی بچے کی چاند مانگنے کی ضد، اس کی خواہش نے فر[یال] کو ڈسٹرب کیا۔ اب نور اسی گرداب میں غوطہ زن تھی اور آ[گے] میرے لیے خوامخواہ کی دشواریاں تھیں۔

اگر وہ ذرا بھی نارمل ہوتی تو میں یہاں سب کچھ ا[س] کے حوالے کر کے واپس بھاگ جاتا۔ مگر اب ایسا کر[نا] انگریزی محاورے کے مطابق سب کچھ کتوں کے آگے ڈال[نے] والی بات تھی، بدنیت لٹیرے اور ڈاکو سب کچھ ختم کر دیتے۔ ان میں عام کاروباری حریف بھی ہوتے جو لارڈ ارنسٹ [کی] زندگی میں بھی ایسا ہی چاہتے ہوں گے، کوئی ذاتی دشمنی [نہ] ہونے کے باوجود...... اور لارڈ کے مخالف۔ حاسد اور دشمن [کی] یہ خواہش سب کی ہو گی۔ پھر خود ایلیشا کے دشمن کم نہ تھے جو سب مل کے نہ کر سکے تھے وہ ایلیشا کر چکی تھی۔

اب یہ ناگزیر تھا کہ میں اس اعتماد پر پورا اتر[وں جو] لارڈ ارنسٹ کو مجھ پر تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کے انت[قال] کے پیچھے اس کا جواری... ذہن تھا...... کہ شاید اس طرح وہ دماغ کے ساتھ میرا دل بھی خرید لے اور اپنی بیٹی کی ضد پوری کر دے کہ یہ لو...... جیسا تم چاہتی تھیں میں نے کر دیا، پھر وہ مر گیا...... مگر وہ نہ ہوا جو وہ چاہتا تھا، آدمی کے گرنے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ ایلیشا نے بڑی بے شرمی سے کہہ دیا تھا کہ نور کے ساتھ مجھ سے بھی شادی کر لو...... اسے وہ ناممکن نہیں سمجھتی تھی۔

پولیس آدھے گھنٹے بعد آئی اور انہوں نے مجھے پابند کر دیا کہ میں صبح قانونی کارروائی کے لیے خود کو نور کے ساتھ پیش کروں۔ وہ احتجاج کرتی مسز ایلیشا کو اپنے ہمراہ لے گئے۔ انہوں نے اس کی یہ درخواست قبول نہیں کی کہ اسے واپس چرچ پہنچا دیا جائے۔ اسے ایک علیحدہ کمرے میں سونے کے لیے بیڈ بھی فراہم کیا گیا مگر عملاً وہ پولیس کی قید میں رہی۔ ایک مسلح محافظ اس کمرے کے باہر کھڑا رہا۔ ایلیشا کو یہ اجازت نہیں تھی کہ کمرے کا دروازہ بند کرے...... یہ سب مجھے بعد میں پولیس اسٹیشن جا کے معلوم ہوا۔

نصف شب گزر جانے کے بعد جب یہ ممکن ہوا کہ میں سو سکوں تو نیند کا وقت بھی گزر چکا تھا اور میرے دماغ کے اندر پریشانی کی مشین پوری رفتار سے چل رہی تھی۔ یہی حال نور کا تھا۔ وہ جذباتی طور پر COLLAPSE کرنے کے قریب تھی۔ اسے بھی سکون آور گولیوں کا سہارا درکار تھا لیکن یہ پاکستان نہیں تھا جہاں ڈاکٹر شہناز ضرورت پڑنے پر بیٹھی تھی کہ خواب آور گولیاں کسی کو سلانے کے لیے ضروری ہیں تو اپنے دواؤں کے بکس میں سے نکال کے دے دیتی تھی۔ بازار میں بھی ایسی تمام ممنوعہ ادویات مل جاتی تھیں۔ یہاں اسپرین جیسی بے ضرر سمجھی جانے والی دوا بھی کسی مستند ڈاکٹری نسخے کے بغیر نہیں ملتی تھی۔

پہلے میں نے سونے کی کوشش کی تو نور نے بولنا بند نہیں کیا۔ وہ نروس تھی اور اسے چپ کر کے آنکھیں بند کرنے اور سو جانے کی نرم التجا اور سخت حکم کا مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ خود میں لائٹ آف کر کے آنکھیں بند کر کے پڑا رہتا تو سو نہیں سکتا تھا۔

اپنی کوشش یا خواہش ترک کر کے میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ''چلو......''

نور اٹھ بیٹھی۔ ''کہاں......؟''

''باہر باغ میں...... نہ تم سو رہی ہو اور نہ مجھے سونے دے رہی ہو۔''

''میں کیا کروں......'' وہ روہانسی ہو گئی۔ ''اچھا تم سو جاؤ، اب میں نہیں بولوں گی۔ صبح تک منہ بند کیے پڑی رہوں گی۔''

میں نے اس کے شانوں کے گرد ایک بازو حائل کر کے اس کے ماتھے پر چوما۔ ''کوئی ضرورت نہیں، تم باتیں کرو مجھ سے۔ مجھے سکون ملتا ہے۔''

آسمان پر بادل تھے اور باہر سردی تھی۔ نور نے ایک شال اپنے کندھوں پر ڈال لی۔ ''تم بھی کچھ پہن لو، ٹھنڈ نہ لگ جائے۔''

''میرا دماغ بھٹی بنا ہوا ہے۔ جذبات کی حدت میرے دل کو جلا رہی ہے۔ غصے کی آگ میرے وجود میں بھڑک رہی ہے اور تم کہتی ہو ٹھنڈ نہ لگ جائے۔''

''اور یہ آتش فشاں سونے کی بات کر رہا تھا۔ کیا تم سو سکتے تھے؟ میں نہ بولتی تب بھی......''

''میرا خیال تھا کہ تمہارے اعصاب کافی مضبوط ہیں۔ تم ٹینشن لے سکتی ہو۔'' میں اس کے ساتھ لان کے کنارے کنارے چلتا رہا۔

''کیا میں لے نہیں رہی ہوں؟...... ہاں اس سے زیادہ نہیں لے سکتی، میرا خیال ہے تمہارے ساتھ رہ کے ایک تبدیلی یہ آئی ہے مجھ میں...... پہلے بڑے خطرناک کام کیے میں نے، ڈر بھی لگتا تھا...... لیکن میں انکار نہیں کر سکتی تھی...... اب انکار کر سکتی ہوں۔''

''تم کو جذباتی کمزوری کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے۔ تم رہ سکتی ہو یہاں، میرے بغیر بھی...... سیکیورٹی کا کوئی مسئلہ نہیں اور سوشی کے ساتھ مل کر کمپنی بھی چلا سکتی ہو...... مگر تم عورتوں والی بات کرتی ہو۔''

''مردوں والی بات کیسے کروں؟ تم کر سکتے ہو عورتوں والی بات۔''

''میرا مطلب تھا، بے بنیاد خوف، شک، عدم تحفظ کا احساس...... کہ میں بالکل قابل اعتبار نہیں، ایک شادی یہاں کی تو دوسری پاکستان میں کر لوں گا۔ یہ ہو سکتا ہے؟''

''مرد ایسا کر سکتے ہیں۔''

''بکواس مت کرو...... ایسا مرد ہوتا تو بہت پہلے عائشہ سے شادی کر چکا ہوتا اور پاکستان میں فریال سے یا تم سے...... تم نے دیکھا نہیں ابھی میں نے جو کچھ کیا۔''

''اچھا بابا معاف کر دو، لڑو مت......'' وہ میرے کندھے کا سہارا لے کر چلتی رہی۔ ''تم جیسا چاہتے ہو وہی ہو گا۔'' ''گڈ گرل۔ یعنی اب تم یہاں اکیلے رہ کے معاملات سنبھالنے کے لیے تیار ہو۔''

''کیا کروں...... تمہیں ناراض تو نہیں کرسکتی نا......''

''نہ میری ناراضی ہے نہ زبردستی...... اگر تم کو شریک حیات بنانے کا فیصلہ کیا ہے تو صرف بچے پیدا کرنے کے۔لیے نہیں۔ نہ امورِ خانہ داری کے لیے اور نہ اپنی خدمت کے لیے، تم زندگی کے تمام معاملات میں شانہ بشانہ میرے ساتھ رہو۔ میرے ہر فیصلے میں شامل رہو، ہر جگہ میرے ساتھ جاؤ، برابر کی سطح پر فیصلے کرو، ہے اتنی ہمت......؟''

''ہمت تو بہت ہے لیکن ڈر لگتا ہے۔''

میں نے ہنس کے کہا۔ ''ڈر لگتا ہے؟ کس بات سے۔''

''یہی ایک بار پہلے بھی کہا گیا تھا کہ ہمت کرو، خدا نے تمہیں عقل اور ذہانت بھی دی ہے، تم سب کچھ کرسکتی ہو۔''

میں نے آزردگی سے کہا۔ ''تم اکبر خان کی اور میری کہی ہوئی بات کو برابر سمجھتی ہو۔ یہ بڑی زیادتی ہے۔''

وہ میرے سامنے آکے مجھ سے چمٹ گئی۔ ''ایسا مت کہو۔ سانپ کا کاٹا رسی سے ڈرتا ہے۔ آخر وہ میری ہی ہمت تھی نا کہ میں نے اکبر خان کو قتل کردیا، یہ میں نہیں کہوں گی کہ تمہارے عشق کی دیوانگی میں...... میں اس زندگی سے موت کو بہتر سمجھنے لگی تھی جس میں میرا ہر طرح کا استحصال ہو رہا تھا۔ میں ایک نئی زندگی کی شروعات چاہتی تھی، باعزت، شریفانہ اور خود مختار زندگی، ایسے میں تم مل گئے، تم نے مجھے سہارا دیا...... محبت کی صورت میں اور مجھے بچالیا۔''

میں نے اسے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ ''جان...... مجھے پورا بھروسا ہے تم پر...... اور تمہاری صلاحیت پر، مجھے یقین ہے کہ میرے یہاں نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا، سوشی بڑی تجربہ کار منتظم ہے۔ تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی اور آہستہ آہستہ تم تمام کاروباری معاملات کو سمجھ لوگی، میں یہ چاہتا ہوں کہ بعد میں تمہیں مکمل ذمے داریاں سونپ دوں۔''

اس نے میری بات کاٹ دی۔ ''آخر تم وہ بات کیوں نہیں کرتے؟''

میں نے حیرانی سے کہا۔ ''کون سی بات......؟''

''جو دنیا کی ہر عورت سننا چاہتی ہے۔ میں کوئی آسمانی مخلوق نہیں ہو جان...... گوشت پوست کی بنی ہوئی عام عورت ہوں اور میرے جذبات کی دنیا بھی وہی ہے۔'' وہ ایک بنچ پر بیٹھ گئی۔

''اوہ...... تم شادی کی بات کررہی ہو؟''

''ہاں...... ایک لڑکی جب سے ہوش سنبھالتی ہے یہی خواب دیکھتی رہتی ہے...... اس کا گھر ہو، محبت کرنے والا شوہر ہو، بچے ہوں، وہ نہ دنیا فتح کرنے کا سوچتی ہے اور نہ کسی ملٹی نیشنل کمپنی کی سربراہی کا...... یہ سب ثانوی اہمیت رکھنے والی باتیں ہیں، کم سے کم میرے لیے۔ یہ بھی میں کرلوں گی جو تم چاہتے ہو، مگر وہ کب ہوگا جو میں چاہتی ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''وہ بھی ہوگا۔ بہت جلد ہوگا، بس مجھے تھوڑی سی مہلت دے دو...... یہاں کے معاملات ڈھب پر آگئے ہیں، انشاء اللہ ست بدھائی کے حالات بھی ٹھیک ہو جائیں گے۔ پھر ساری زندگی ہماری ہے، محبت کے لیے ایک عمر پڑی ہے۔''

''یہی تو گڑبڑ ہے ساری...... تم مرد بڑے حرفوں کے بنے ہوئے ہوتے ہو...... خوابوں میں الجھا دیتے ہو۔''

''لیکن ہمارے خواب کی تعبیر تو ہمارے ہاتھ میں ہے، تم میرے ساتھ ہو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں، محبت اور کیسی ہوتی ہے، ہاں ایک فرق اور ہے۔''

''کیسا فرق......؟''

''عام لوگ لو میرج کرتے ہیں، شادی سے پہلے فلمی محبت کا ایک بڑا زبردست راؤنڈ ہوتا ہے، میاں بیوی بنتے ہی وہ محبت گزری ہوئی رات کے خواب کی طرح رہ جاتی ہے لیکن ہمارے ساتھ ایسا نہیں ہوگا، وہ بھی محبت ہوگی، محبت کا ایک نیا دور ہوگا۔ نیا روپ ہوگا...... زیادہ خوبصورت...... زیادہ پائیدار......''

کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ شاید وہ کچھ نہیں سن رہی ہے۔ میرے کندھے پر سر رکھے وہ سوگئی تھی۔ میں اسے اٹھا کے اندر لے گیا اور بیڈ پر لٹا دیا۔ وہ آنکھیں کھول کے مسکرائی اور پھر سوگئی، آغازِ شب کے حادثے کا اثر میرے ذہن پر بھی کم ہوگیا تھا۔ ایلیشا اپنا کیا خود بھگتے گی۔ میں نے سوچا، مجھے پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے اور خود بھی سو گیا۔

ایک بار پھر لارڈ ارنسٹ کے جانشین اور اس کی اکلوتی بیٹی کا نام خبروں کی زینت بنا لیکن اس بار عوامی ردعمل پہلے جیسا نہیں تھا، غالباً اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ حق ملکیت کا مسئلہ قانونی طور پر طے ہوچکا تھا اور یہ بات بھی پرانی ہوچکی تھی، کم سے کم اخبار والوں کے لیے...... ایلیشا کی بے راہ روی اور نفسیاتی مسائل سے اخبار والوں کو کیا دلچسپی ہوسکتی تھی، ایسے نوجوان لڑکے لڑکیوں کی تعداد اس معاشرے میں بڑھتی جارہی تھی جو کسی قسم کی خاندانی اور اخلاقی اقدار کو تسلیم نہیں کرتے تھے...... ان کا سارا فلسفۂ حیات یہ تھا کہ زندگی میری ہے، اسے میں جیسے چاہوں گزاروں......

جب یہ کیس عدالت کے سامنے آیا تو پرانے نمک خوار

جان آرنلڈ کو پھر پرانی دوستی اور تعلق کے ناتے ایلیشا کی طرف سے عدالت میں پیش ہونا پڑا، اس سے پہلے عدالت میں مجھے صرف ایک فریق کی ملامت بھری نظروں کا ہدف بنا پڑا تھا اور یہ سب لارڈ ارنسٹ کے خاندانی دوست اور عزیز ہوتے تھے جن کے لیے میرا وجود ایک ایسے ناپسندیدہ، چالاک، غاصب اور مکار شخص کا تھا جس نے پہلے ایلیشا کو اپنے دام الفت میں گرفتار کرکے نہ دین کا چھوڑا نہ دنیا کا اور پھر اس کے باپ کو مار کے ساری دولت جائداد ہتھیالی، مارنے کا ثبوت ہو نہ ہو، وجہ میں ہی تھا...... پرانے انگریزوں نے جو کچھ وقت انڈیا میں گزار آئے تھے یہ بات پھیلا دی تھی کہ کوئی مانے یا نہ مانے، یہ انڈین جادو ٹونے، تعویذ اور سفلی عمل وغیرہ سے دشمن کو تباہ بھی کرسکتے ہیں اور نیست و نابود بھی......

اس مرتبہ ایک اور باوقار، خاموش اور غم کا مارا فریق پرانے مذہب پرستوں کا ٹولہ تھا جو کیتھولک چرچ کی نمائندگی کررہا تھا۔ یہ ان کے لیے انتہائی صدمے اور شرم کی بات تھی کہ مقدس چرچ کی روحانی دنیا سے بھاگ کر ایک راہبہ پھر اس گناہ گار دنیا میں آگئی تھی اور شیطان نے جو اسے گمراہ کرنے والا تھا اس سے ایسے کام کرائے تھے جو گناہ بھی شمار ہوتے ہیں اور جرم بھی......

ایک رنگ اور نسل پرست معاشرے کا غصہ اور نفرت اپنی جگہ...... یہ اس ملک کا مضبوط ترین اور ناقابل شکست عدالتی نظامِ انصاف تھا جس پر جانب داری کے شک کا ایک فیصد امکان بھی نہ تھا۔ سب سے پہلے میرا بیان ہوا تو میں نے تمام واقعہ بلاکم و کاست بیان کردیا، نہ مجھے جھوٹ بولنے یا سچ کو چھپانے سے کوئی فائدہ ہوسکتا تھا نہ ایلیشا کو...... میں نے نور کو بھی تاکید کی تھی کہ وہ کسی معاملے میں اپنی رائے تک نہ دے۔ بس وہی بیان کردے جو ہوا تھا اور اس نے دیکھا تھا۔ ایلیشا کے یا میرے بارے میں جذباتی ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔

ایلیشا کو دوسرے دن پیش کیا گیا۔ پہلی تبدیلی جو میں نے افسوس کے ساتھ نوٹ کی یہ تھی کہ اس نے عام لباس پہن رکھا تھا، نور نے تو اسے عامیانہ کہا۔ وہ نن کے لبادے میں نہیں تھی۔ جب میں نے اسے پیشی سے پہلے عدالت کے باہر آرنلڈ سے بات کرتے دیکھا تو وہ سگریٹ بھی پی رہی تھی اور اس نے مجھے گزرتے دیکھا تو دانت پیس کر مجھ پر ایک قہر آلود نظر بھی ڈالی تھی...... ''میں تمہیں چھوڑوں گی نہیں یو سن آف اے بچ......'' یہ الفاظ میں نے سنے مگر یوں گزر گیا جیسے میں نے کچھ نہیں سنا۔

چرچ کی طرف سے ان کے نمائندے نے بے حد مختصر بیان دیا کہ ایلیشا خود اپنی مرضی سے خداوند یسوع مسیح کی پناہ میں آئی تھی اور اس کے لیے اسی میں سکون قلب اور روح کی نجات تھی لیکن اب اس نے خود ہی صراطِ مستقیم کو چھوڑ کر دنیا کی طرف رجوع کیا ہے تو ہم صرف اس کے لیے دعا کرسکتے ہیں۔ اپنے قول و فعل کی ذمے دار وہ خود ہے۔

پھر ایلیشا کا بیان ہوا۔ اس نے مجھ پر ایک ہوس پرست سے قاتل ہونے تک تمام الزامات لگائے۔ ''یہ شخص جتنا شریف اور مہذب نظر آتا ہے درحقیقت ایک پرفریب اور ہوس پرست شخص ہے۔ اس کا ماضی ہی وہ آئینہ ہے جس میں آپ اس کا اصل مکروہ چہرہ دیکھ سکتے ہیں۔ میں کسی غلط بیان پر اپنے دعوے کی بنیاد نہیں رکھتی، آپ اسی سے پوچھیں کہ یہ اپنا ملک چھوڑ کے اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکا کیوں گیا تھا...... اپنے مجرمانہ ماضی سے فرار ہوکے......''

''آبجکشن سر......'' ملک ارشد اٹھ کھڑا ہوا۔ ''کیا اعلیٰ تعلیم کے لیے دنیا بھر سے امریکا جانے والے مجرم ہوتے ہیں۔''

جج نے اعتراض مسترد کردیا اور ایلیشا کو بیان جاری رکھنے کی ہدایت کی۔ ''اپنے ملک میں اس کا تعلق ایک جرائم پیشہ اور دہشت گرد تنظیم سے ہوگیا تھا...... اگر اس کا باپ تعلیم کے بہانے اسے ملک سے فرار نہ کراتا تو یہ آج یہاں نہ کھڑا ہوتا...... یہ مار دیا جاتا یا جیل میں اسے پھانسی ہوجاتی کیونکہ اس کے دامن پر بہت سے بے گناہوں کے خون کے چھینٹے تھے۔''

ملک ارشد پھر کھڑا ہوگیا۔ ''میرے موکل کے خلاف پاکستان کی کسی عدالت میں کوئی مقدمہ بھی زیرِ سماعت نہیں رہا۔''

''یہ میں جانتی ہوں...... اور اس تنظیم کا سربراہ جو چیف کہلاتا تھا خود بھی ملک سے فرار ہونے کے بعد مختلف ممالک میں رہا اور بالآخر اس نے لندن میں سیاسی پناہ لی۔ آج کل وہ یہاں جیل میں ہے اور اسے جیل بھجوانے والا خود رنتی ہے......'' اس نے میری طرف انگلی اٹھا کے نفرت سے کہا۔

ملک ارشد نے پھر دخل دیا۔ ''کیا برطانیہ میں کوئی کسی کو بھی جیل بھجوا سکتا ہے یور آنر......؟ اسے کسی عدالت کے حکم پر جیل بھیجا گیا ہوگا اور عدالت نے اس کے جرم کو دیکھا ہوگا، ثبوت اور شہادت کی بنیاد پر یہ فیصلہ کیا ہوگا، خاتون کے یہ

الفاظ توہینِ عدالت کے زمرے میں آتے ہیں۔"

اب جان آرنلڈ اٹھا۔ "مسٹر ارشد، کیا آپ وضاحت کریں گے کہ میری موکلہ کے ان الفاظ سے توہینِ عدالت کیسے ہوئی؟"

ملک ارشد نے کہا۔ "ان کے الفاظ تھے، اسے جیل بھجوانے والا خود رفیق تھا...... کیسے؟...... کیا رفیق یہ اختیار رکھتا ہے؟ نہیں یور آنر...... یہ اختیار صرف اس جج کو حاصل تھا جس نے چیف کو سزا سنائی......تو کیا رفیق نے اس جج پر دباؤ ڈالا تھا؟ اسے رشوت دی تھی یا دھمکی دی تھی؟......اور وہ جج دباؤ میں آ گیا تھا، اس نے جو فیصلہ سنایا خلاف حقائق تھا......؟"

اب جج نے ایلیشا کی طرف دیکھا۔ "کیا تم اپنے بیان پر قائم رہو گی؟...... یا چاہو گی کہ یہ الفاظ حذف کر دیے جائیں۔"

آرنلڈ نے کہا۔ "یور آنر...... یہ الفاظ میری موکلہ کے بیان سے حذف سمجھے جائیں، تاہم چیف کو گواہی کے لیے ضرور طلب کیا جائے۔"

ایلیشا نے پھر بات شروع کی۔ "امریکا میں تعلیم سے فارغ ہو کے بھی یہ واپس نہیں گیا، آخر کیوں......اسے خطرہ تھا کہ وہاں اس کا مستقبل محفوظ نہیں ہوگا، اس نے میرے والد آنجہانی لارڈ ارنسٹ کی فرم میں ملازمت کر لی......اور اپنی چرب زبانی، خوشامد اور جی حضوری کے حربے استعمال کر کے بہت اچھے عہدے پر فائز ہو گیا۔"

ملک ارشد پھر اٹھا۔ "کیا خاتون اپنے باپ کو بے وقوف ثابت کر رہی ہیں؟ یہ کہہ رہی ہیں کہ انہیں انسانوں کی اور ان کی صلاحیت کی پہچان نہیں تھی...... پھر وہ ایک کامیاب بزنس مین اور سیاستدان کیسے بنے...... اور میرے موکل کا تعلیمی ریکارڈ دیکھا جائے، ایسی ملازمت وہ کہیں بھی حاصل کر سکتا تھا۔"

جج نے ایلیشا کو تنبیہہ کی۔ "اپنے بیان کو محدود رکھیں۔"

"عدالت کو یہ سب بتانا ضروری ہے یور آنر...... پھر اس نے مجھ پر ڈورے ڈالے، اس کے وجود سے حیوانی کشش کی ایسی مقناطیسی شعاعیں نکلتی ہیں کہ لڑکیاں مسحور ہو جاتی ہیں۔"

جج کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ عدالت میں موجود کچھ لوگ بھی ہنسنے لگے۔ ایلیشا بولتی رہی۔ "جب اس نے مجھے شادی کی پیشکش کی۔"

ملک ارشد نے پھر اعتراض کیا۔ "میرے موکل نے ایسی کوئی پیشکش نہیں کی۔ ایلیشا ارنسٹ خود میرے موکل سے شادی کے لیے اپنا مذہب، ملک اور گھر سب چھوڑنے پر تیار تھی۔"

"یہ غلط ہے۔" ایلیشا چلائی۔

ارشد نے کہا۔ "ملزمہ نے پاکستان کا ویزا حاصل کر لیا تھا۔ یہاں تک کہ اسی فلائٹ پر جہاز کی سیٹ تک بک کرا لی تھی جس پر نواب رفیق واپس جا رہے تھے۔"

"مسٹر ارشد آپ کچھ نہیں جانتے۔" ایلیشا پھر چلائی۔ عدالت نے اسے خبردار کیا کہ وہ براہ راست کسی سے مخاطب نہ ہو۔

"یور آنر...... اس زمانے میں بھی جب رفیق مجھ سے شادی کا خواستگار تھا۔ یہ ایک اور پاکستانی لڑکی فریال سے منسوب تھا۔ اس کی خاطر وہ لڑکی بھی چار سال اس سے وابستہ رہی۔ یہ چھپ کر ملتے تھے، وہ ایک ماڈل اور ایکٹریس تھی اور اب اسے چھوڑ کے جا چکی ہے۔ وہ پھر ایک شوگرل ہے اور جس لڑکی نے چار سال تک اس کا مستقل مزاجی سے ساتھ دیا، آخر وہ اسے کیوں چھوڑ گئی؟ یہ سوال آپ اسی سے پوچھیں...... یہ ایک شادی شدہ عورت نور جہاں کے عشق میں گرفتار ہو گیا تھا۔ اسی عورت نے رفیق کے لیے اپنے شوہر کو قتل کر دیا اور تب سے روپوش ہے۔ وہ ایک کیریئر گرل تھی منشیات فروش اور انڈر ورلڈ سے روابط رکھنے میں کام آتی تھی۔ میں ایک خاندانی، تعلیم یافتہ اور دولت مند لڑکی تھی اپنے والدین کی اکلوتی تھی چنانچہ اس نے مجھ پر ڈورے ڈالے۔ صرف میری دولت اور جائیداد پر قبضہ حاصل کرنے کے لیے......اور اگر میں اس کے جھانسے میں آ جاتی تو معلوم نہیں کیا ہوتا، یہ مجھے قتل کر کے اسی طرح تمام کاروبار جائیداد اپنے نام کرا چکا ہوتا جیسے اس نے میرے باپ کو قتل کر کے کیا۔" وہ زار و قطار رونے لگی۔

ملک ارشد کا کھڑا ہونا لازم...... "جناب والا، ملزمہ مسلسل غلط بیانی اور الزام تراشی کی مرتکب ہو رہی ہے اور اب اپنے آنسوؤں سے جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کا ڈرامہ کر رہی ہے۔"

جان آرنلڈ نے درخواست کی کہ سماعت صرف آدھے گھنٹے کے لیے روک دی جائے تاکہ ایلیشا کی طبیعت بحال ہو۔ وہ اس وقت ذہنی اور جذباتی طور پر ڈسٹرب ہے۔ جج نے پندرہ منٹ کا وقفہ دیا۔ برطانوی عدالتوں میں بات بے بات سماعت کی تاریخ ملتوی کرنے کا دستور نہیں ہے۔

جیسے کہ ہماری نچلی عدالتوں میں ممکن ہے کہ آپ رشوت دیتے جائیں اور تاریخ لیتے جائیں، مہینوں کیا برسوں تک سماعت کی نوبت نہیں آتی اور بے گناہ بھی جیلوں میں سڑتے رہتے ہیں۔

پندرہ منٹ میں ایلیشا کی ذہنی حالت کیا بدلتی۔ وہ کچھ فریش ہو کے اور جان آرنلڈ سے ہدایات لے کر آ گئی۔ اب میری ''ہوس پرستی'' اور ''مجرمانہ ماضی'' کو چھوڑ کے اس نے میری ''دولت کی بھوک'' کا ذکر کیا۔

''یور آنر...... رفیق انڈیا...... سوری...... پاکستان کے ایک غریب گھر سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کا باپ ایک معمولی ٹیچر تھا۔ اس کا ماضی بس مفلسی اور تنگ دستی میں گزرا۔''

ملک ارشد نے اعتراض کیا۔ ''ملزمہ پھر غلط بیانی کر رہی ہے، میرا موکل ٹیچر کا نہیں ایک کالج کے پروفیسر کا بیٹا ہے۔''

جج نے کہا۔ ''ٹیچر تو وہ بھی ہوتا ہے۔''

''یس سر...... لیکن برطانیہ کی طرح وہاں بھی اسکول ٹیچر کے مقابلے میں کالج اور یونیورسٹی کا لیکچرر زیادہ کوالیفائیڈ اور بہت بہتر تنخواہ لیتا ہے چنانچہ میرے موکل کا تعلق متوسط طبقے سے تھا۔ وہ کبھی مفلس یا تنگ دست نہیں رہا۔ آخر اس کے باپ نے اسے اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکا بھیجا تھا جس کے اخراجات کم نہیں ہوتے۔''

جج نے ایلیشا کو اپنا بیان جاری رکھنے کے لیے کہا۔ اس نے پہلے یہ بتایا کہ مجھے ست بدھائی کی ریاست کیسے ملی۔ میرے اس جدِ امجد کا ذکر کیا جنہوں نے خود مجھے تلاش کیا اور اپنا وارث بنایا تھا۔ اس وقت وہ انتہائی بیمار، عمر کے آخری حصے میں اور مفلوج تھے۔ میں ایک اولڈ ہوم میں ان سے ملا تھا اور مرنے سے پہلے انہوں نے اپنا سب کچھ میرے نام کر دیا تھا۔ زندگی میں وہ ایسا کر سکتے تھے۔ وہ کسی کو وارث بنائے بغیر مر جاتے تو بھی پاکستان میں رائج قانونِ وراثت کے مطابق اس کے مالک میرے چچا اور والد ہوتے۔

ایلیشا نے ان کی موت کو بھی پراسرار قرار دیا اور اس شک کا اظہار کیا کہ میں نے اپنے شیطانی دماغ سے اس بیمار اور ذہنی طور پر مفلوج شخص کو اپنے قابو میں کیا اور ممکن ہے اسے مار ڈالا ہو، بالکل اسی طرح میں نے لارڈ ارنسٹ کو قابو میں کیا اور آج میں ان کی ساری دولت جائداد کا مالک بنا بیٹھا ہوں۔

ایلیشا نفسیاتی مریض تھی اور اس کے اعصاب جواب دے چکے تھے۔ وہ بیان کے دوران بار بار رو پڑتی اور بیٹھ جاتی تھی۔ اس نے دو بار ڈرنک کیا۔ وہ بیمار اور کمزور نظر آتی تھی چنانچہ اس کے بیان نے عدالت میں موجود لوگوں کی ہمدردی حاصل کر لی اور ایلیشا کے تینوں الزامات انہیں جائز نظر آنے لگے کہ عورت کے معاملے میں یقیناً میں ہوس پرست ہوں۔ دولت کے معاملے میں لالچی ہوں اور شاید ایک ہوشیار قاتل بھی ہوں۔

عدالت کا وقت ختم ہونے تک ایلیشا کا بیان ہی ختم ہوا تھا۔ سماعت اگلے دن پر ملتوی ہو گئی۔ رات کو ملک ارشد کے ساتھ مل کر میں نے اپنا دفاعی بیان تیار کیا اور اگلے دن ملک ارشد نے جرح میں ایلیشا کے بیان کے پرخچے اڑا دیے۔ اس کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا کیونکہ ملک ارشد نے میرے کہنے پر کسی رعایت کے بغیر ایلیشا کو ایک ذہنی مریض ثابت کر دیا تھا جو ضدی، سرکش اور بگڑی ہوئی لڑکی تھی۔ منشیات کی عادت میں مبتلا ہو کے علاج گاہ میں رہ چکی تھی اور گھر سے فرار ہو کے کئی مہینے ایک ''مشترکہ خاندان'' میں بھی گزار آئی تھی جہاں اخلاقی اور معاشرتی قدروں کا کوئی تصور نہیں تھا۔ ماں باپ دونوں اس سے سخت عاجز اور دکھی تھے۔

ایلیشا کے بیان کے دوسرے حصے کا بھی یہی حشر ہوا۔ ملک ارشد نے مطالبہ کیا کہ عدالت میں اس اولڈ ہوم کے منتظم کو بلایا جائے جہاں میرے جدِ امجد بیس سال مفلوج رہے تھے اور وہیں انتقال کر گئے تھے...... اس سے معلوم کیا جائے کہ کیا ان کی موت غیر طبعی تھی یا مشکوک حالات میں ہوئی تھی......؟ یہی سوال اس اسپتال کی انتظامیہ کو بلا کے بھی کیا جائے جہاں لارڈ ارنسٹ کی موت واقع ہوئی تھی کیونکہ ہم ایلیشا کے خلاف جھوٹے الزامات کو بنیاد بنا کے دوسری عدالت میں ہرجانے کا کیس کرنا چاہتے ہیں۔ اس نے یہ بھی مطالبہ کیا کہ ایلیشا کا ذہنی معائنہ کرایا جائے، ہمارے خیال میں پہلے وہ ابنارمل تھی۔ ڈیپریشن کے بڑھنے سے وہ پاگل ہو گئی ہے اور اس حد تک خطرناک بھی کہ اسے کھلا نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اس نے ریوالور حاصل کر کے ایک قتل کرنے کی کوشش کی تھی اور اس کا چرچ میں داخل ہو کے فرار ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنے قول و فعل پر اختیار سے محروم ہو چکی ہے۔

تیسرے دن جان آرنلڈ نے عدالت میں دو طبی ماہرین کو پیش کیا۔ ایک پہلے سے ایلیشا کا معالج رہا تھا اور اس کے نفسیاتی مسائل سے آگاہ تھا۔ دوسرے نے اس کی موجودہ ذہنی کیفیت کو قطعی پاگل پن قرار دیتے ہوئے اس کے لیے کم سے کم چھ ماہ تک دماغی علاج ضروری بتایا۔ اگر اسے

سخت نگرانی میں انڈر آبزرویشن نہ رکھا گیا اور نفسیاتی طریقہ علاج کے ساتھ دواؤں کا باقاعدہ استعمال نہ کرایا گیا تو یہ بھی ممکن ہے کہ وہ خودکشی کر لے۔

معلوم نہیں یہ جان آرنلڈ کا احساس کمتری تھا یا وہ بھی میرے خلاف جذبات رکھتا تھا۔ کیونکہ اس نے مجھ سے بالکل بات نہیں کی۔ ایک پرانے تعلق کی بنا پر میں بھی ہرگز یہ نہیں چاہتا تھا کہ ایلیشا کو قاتلانہ حملہ کرنے کے جرم میں جیل ہو۔ وہ واقعی خطرناک ذہنی مریض ہو گئی تھی۔ مجھے قاتل ثابت کرنے میں ناکامی کے بعد مجھے قتل کرنے کی کوشش میں ناکام ہونے کا یہی نتیجہ نکل سکتا تھا کہ اب وہ خود کو قتل کر دے۔ اس آخری حد کو عبور کر جائے جہاں آدمی سب کچھ ہار کے حوصلہ بھی ہار بیٹھتا ہے۔

ظاہر ہے عدالت ایک ذہنی مریض کو جسمانی سزا نہیں دے سکتی تھی۔ میں نے آرنلڈ کی نظروں سے اندازہ کیا کہ وہ اپنے موقف میں میری تائید چاہتا ہے۔ عدالت نے ایک سال کے لیے ایلیشا کو...... ذہنی امراض کے اسپتال بھیجنے کا حکم دیا لیکن ساتھ ہی یہ حکم بھی دیا کہ ہر تین ماہ بعد اس کی پروگریس رپورٹ پیش کی جائے۔

میں فیصلے سے قبل ہی باہر آ گیا تھا۔ جب جان آرنلڈ باہر آیا تو میں نے اس کا راستہ روک لیا۔ ''سر جان...... مجھے بہت افسوس ہے۔''

''افسوس مجھے بھی ہے...... لیکن تقدیر کا اپنا راستہ ہے۔''

میں نے کہا۔ ''میں خود بھی ایلیشا کو صحت مند دیکھنا چاہتا ہوں اور ایک نارمل زندگی گزارتے ہوئے۔''

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''کیا سب کچھ صرف چاہنے سے ہو جاتا ہے لارڈ رفیق......''

''میرا خیال...... یا میری توقع تھی کہ آپ مجھ سے تعاون کے لیے کہیں گے، ہم مل کے وہ سب کریں گے جو ایلیشا کی بہتری کے لیے ہوگا...... لیکن آپ نے مجھ سے بات کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔''

وہ مسکرایا۔ ''اس کے لیے مجھے بات کرنے کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی۔ مجھے معلوم تھا کہ تم تعاون کرو گے۔ خدا کرے سب اچھا ہو...... لیکن مجھے ایک بات سمجھاؤ، میرے پاس اس کا جواب کوئی نہیں، بالکل صحت مند اور نارمل ہو جانے کے بعد ایلیشا کیا کرے گی؟ میرا مطلب ہے زندہ رہنے کے لیے وہ کسی اسپتال میں نرس بھی نہیں ہو سکتی، وہ کسی آفس میں سیکریٹری یا کسی ہوٹل کے ریسپشن پر کام نہیں کر سکتی۔ یو سی...... اس نے شہزادیوں والی زندگی گزاری ہے، وہ منہ میں سونے کا چمچہ لے کر پیدا ہوئی تھی، لیکن اب اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔''

میں نے کہا۔ ''سر جان...... میں نے پہلے ہی کہا تھا، آپ سے بھی اور ایلیشا سے بھی، مرنے سے پہلے لارڈ ارنسٹ سے بھی...... کہ یہ سب میں اسے دے دوں گا جس کا یہ حق ہے، نہ میں نے یہ مانگا تھا، نہ ہی اس پر غاصبانہ قبضہ رکھنا چاہتا ہوں۔''

''شاید یہ ممکن نہ ہو تمہارے لیے......''

''میں آپ کو لکھ کر دینے کے لیے تیار ہوں...... لیکن شرط میری یہی ہے کہ وہ اس قابل ہو...... کہ اسے سنبھال سکے۔ میں ابھی جو کر رہا ہوں بہتری کے لیے کر رہا ہوں۔''

''کس کی بہتری کے لیے......؟ تم اس پر اپنا قبضہ مضبوط کر رہے ہو...... اور واپس کیا دو گے تم...... جہاں تک مجھے معلوم ہے، تم سب کچھ بیچ رہے ہو، تم نے اعلیٰ نسل کے گھوڑوں والا اصطبل بیچ دیا ہے۔''

''یس...... میں گھوڑوں کے بارے میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ چار ٹانگوں والا ایک جانور ہے جو ہمارے ملک میں تانگے میں جوتا جاتا ہے...... مگر رقم بالکل محفوظ ہے۔''

اس نے تلخی سے کہا۔ ''رقم! کیا پیسا ہر چیز کا متبادل ہوتا ہے؟...... تم اس کا خاندانی گھر بھی بیچ رہے ہو، جس کے ساتھ اس کی یادیں جڑی ہوئی تھیں۔ جس پر وہ فخر محسوس کرتی تھی۔''

میں نے کہا۔ ''سوری سر جان...... میں اس کی دیکھ بھال اور حفاظت نہیں کر سکتا۔ اس کے علاوہ...... میں پریکٹیکل آدمی ہوں، میں اس کے جذبات کو دیکھوں یا اپنی مشکل کو......؟''

''اس مشکل کا ایک بہت آسان اور پریکٹیکل حل تھا۔''

''پھر وہ مجھے ضرور بتائیں اور اتنے اداس نہ ہوں، سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک......

غالب کا یہ شعر جان آرنلڈ نہیں پڑھ سکتا تھا لیکن جو اس نے کہا یہی مفہوم رکھتا تھا۔ ''یو سی...... میری عمر بہت ناقابلِ اعتبار ہے، اگلے سال کیا اگلے دن کا بھروسا نہیں، میرا خیال تھا کہ ایلیشا کی زندگی تمہارے ہاتھ میں تھی...... ارے...... وہ ایسے تمہارا ساتھ دے سکتی تھی جیسے تمہارا یہ دایاں ہاتھ تمہارے بائیں ہاتھ کا ساتھ دیتا ہے، بس تم اس سے شادی کر لیتے۔''

''اومائی گاڈ...... میں آپ کو کیسے سمجھاؤں سر جان، یہ ممکن ہوتا تو میں بہت پہلے ایسا کر چکا ہوتا۔''

''مجھے بتاؤ تو سہی، یہ کیوں ناممکن ہے......؟''

''ویری سمپل ...... میں کسی اور کو قبول کر چکا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''یہ غالباً چوتھی ہے...... یا تیسری......؟''

میں نے غصے کو کنٹرول کر لیا۔ ''پانچویں چھٹی یا ساتویں ہو تب بھی کیا فرق پڑتا ہے۔ اب خدا کے لیے یہ مت دہرانا کہ تم دونوں کو رکھ سکتے ہو کیونکہ تمہارا مذہب اس کی اجازت دیتا ہے۔''

''یہ تم نے خود دعویٰ کیا تھا کہ تم ایک پریکٹکل آدمی ہو۔ اس طرح تم ایک زندگی بچا سکتے ہو۔''

''سوری سر...... میں صرف ایک بات کمٹ کر رہا ہوں، اگر وہ ٹھیک ہو گئی، تو یہ سب اسے واپس کر دوں گا۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہ آپ بھی سمجھ لیں اور اسے بھی سمجھا دیں تو آپ کی بڑی مہربانی۔'' اپنی بات مکمل کر کے میں چل پڑا۔

مجھے اس بات پر سخت افسوس بھی تھا اور غصہ بھی کہ ایک سے زائد شادیوں کی جو اجازت اسلام نے مخصوص حالات میں دی تھی اس کا کس طرح کچھ لوگ غلط استعمال کرتے ہیں۔ اگر وہ آ کے دیکھیں تو انہیں اندازہ ہوگا کہ شاید بیک وقت دو بیویوں کا شوہر بننے والوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں...... ہزار میں ایک یا شاید اس سے بھی کم ہوں گے جو یہ غلطی کرتے ہیں تو خود اپنی گھریلو زندگی کو جہنم کا نمونہ بنا لیتے ہیں۔ دولت مند یا عیاش باہر کتنی ہی عورتوں سے مراسم رکھتے ہوں گھر کی مالکن ایک ہی عورت ہوتی ہے جو بچوں کی ماں ہوتی ہے۔

یہاں اسی دلیل سے خود ایلیشا نے مجھے قائل کرنے کی کوشش کی تھی اور اب اپنی دانست میں یہی راستہ جان آرنلڈ نے مسئلے کا حل سمجھ کے دکھایا تھا۔ انہیں اندازہ ہی نہیں تھا کہ اس کے نتائج کتنے خراب نکل سکتے ہیں۔ محبت کو زمین کی طرح تقسیم نہیں کیا جا سکتا کہ سب کے حصے میں برابر خوشی آ جائے۔

ایک بار پھر لارڈ کے قریبی شناساؤں کے حلقے میں ساری ہمدردی ایلیشا کے حصے میں آئی۔ مردود خلائق میں ہی ٹھہرا۔ میرا وجود سب کی نظر میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا کہ میں ارنسٹ مینشن پر قابض ہوں اور اس کی جائز اخلاقی اور قانونی وارث ایلیشا پاگل خانے میں ہے۔ حقیقت کوئی نہ دیکھتا نہ سمجھتا تھا۔ سب یہی کہتے تھے کہ لارڈ ارنسٹ نے یہ زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی تھی جو گناہ کے برابر تھی اور میں نے اسے ڈھال بنا لیا تھا۔ کل کس نے دیکھی ہے۔ نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی...... نہ ایلیشا کا دماغی توازن اس صدمے کے بعد درست ہوگا اور نہ میں اپنے وعدے کے مطابق سب کچھ اسے واپس کروں گا۔

کچھ لوگ گاڑی کو گھوڑے کے آگے باندھتے تھے کہ اگر آج میں ایلیشا کو اس کا حق لوٹا دوں تو وہ ٹھیک ہو سکتی ہے... جو سراسر خلاف واقعہ تھا۔ اپنے والدین کی زندگی میں جب وہ مالک و مختار کل تھی تب بھی اس کا حال یہی تھا۔

اقدام قتل کی تفتیش کے نتیجے میں یہ بات بھی سامنے آئی تھی کہ ریوالور بھی اس کے باپ کا تھا۔ اس کا لائسنس بھی اسی کے نام پر تھا اور اس کی موت کے بعد دیگر اسباب کی طرح جو ارنسٹ مینشن میں جمع تھا یہ خود بخود ایلیشا کے نام نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ ضروری تھا کہ اسے فوراً منسوخ کرایا جائے، ایلیشا ذاتی وجوہ پر اس کا لائسنس اپنے نام سے لے۔ معلوم نہیں کب اور کیسے یہ ارنسٹ مینشن سے نکلا اور ایلیشا کے پاس پہنچ گیا۔ وہ چرچ میں مقیم تھی جہاں اس قسم کی چیز کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ شاید یہ کسی اور کے گھر میں تھا جہاں سے ایلیشا نے پھر حاصل کر لیا تھا۔

ایسا کون تھا؟ یہ اندازہ کرنا مشکل تھا لیکن اتنا میں ضرور سمجھتا تھا کہ ایلیشا کا یہ مددگار غائبانہ طور پر مجھ سے دشمنی رکھتا تھا۔ عدالت میں اور تفتیش کرنے والوں کے سامنے ایلیشا کا جواب ایک ہی رہا کہ یہ میرے پاس تھا۔ پاگل پن کے عذر پر وہ بچ گئی تھی، عدالت میڈیکل رپورٹس اور ایڈوائس کو نظر انداز نہیں کر سکتی تھی اور خود ہم نے سزا پر زور نہیں دیا تھا۔

وقتی طور پر میرے معاملات میں ٹھہراؤ سا آ گیا تھا۔ ایلیشا نفسیاتی علاج گاہ میں پہنچ گئی تھی اور محفوظ تھی۔ اس بات کا یقین بہت کم لوگوں کو تھا کہ وہ کبھی ٹھیک ہو سکے گی...... لارڈ کے اعلیٰ نسل کے ریس کے گھوڑے اسی شخص نے خرید لیے تھے جو زندگی میں لارڈ کا سب سے بڑا حریف تھا اور مقابلے پر اپنے گھوڑے دوڑاتا تھا، اب وہ ہارس ریس کا بے تاج بادشاہ تھا۔ رقم میرے اکاؤنٹ میں آ گئی تھی۔ ارنسٹ مینشن زیر فروخت تھا۔ کسی مناسب گاہک کے ملنے تک میں اخلاقی طور پر پابند تھا کہ خود کسی سے سودا نہ کروں خواہ مجھے اس سے دگنی رقم ملتی ہو۔ یہی پابندی محل کی ان اشیا کے بارے میں تھی جو نوادرات کی حیثیت رکھتی تھیں۔ ان کی کوئی فہرست یا INVENTORY نہیں بنی تھی کہ کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ سب کچھ میرے اخلاقی معاہدے میں شامل تھا کہ خریدار کو وہ سب

ملے گا جو ہے۔

میں نے ایک پورا دن ارنسٹ مینشن میں تاریخی حیثیت رکھنے والی اشیا کا معائنہ اور اندازہ کرنے میں صرف کیا۔ آرائشی ظروف تحائف، ڈیکوریشن پیس، مجسمے، تصاویر اور ایسی ہی دیگر اشیا کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ نہ میں ان کا شوق رکھتا تھا اور نہ یہ ذوق...... میری زیادہ دلچسپی اس خاندان کی نجی زندگی سے تعلق رکھنے والے اسباب سے تھی۔ ان میں بھی کپڑے جوتے یا زیورات کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

ایک بیڈروم جو پہلے لارڈ ارنسٹ اور سیلیا کی مشترکہ خواب گاہ تھا۔ شادی کے برسوں بعد نہ جانے زندگی کے کس موڑ پر اور کس مسئلے پر ان کے درمیان اختلافات نے جنم لیا جو اس حد تک بڑھ گئے کہ انہوں نے الگ الگ سونا شروع کر دیا۔ یہ ایک اوپن سیکریٹ تھا کہ میاں بیوی محض رسم دنیا نبھانے کے لیے...... بیٹی کی خاطر یا مذہبی پابندی کے باعث ایک چھت کے نیچے رہتے ہیں اور طلاق لے کر الگ نہیں ہوئے ورنہ ان کے ازدواجی تعلقات کب کے ختم ہو گئے ہوتے۔ وہ سوشل تقریبات میں ساتھ بھی جاتے تھے مگر کبھی کسی نے انہیں آپس میں بات کرتے نہیں دیکھا تھا اور جس طبقۂ اشراف سے ان کا تعلق تھا وہاں کسی کی نجی زندگی کے بارے میں سوال یا اعتراض کو معیوب سمجھا جاتا تھا۔

اب وہ صرف شوہر کا کمرا تھا۔ میں نے جب اس کی تلاشی لی تو مجھے بہت سی مقفل درازوں کو کھولنا پڑا۔ ان میں، چند تصویر بتاں، چند حسینوں کے خطوط...... بنڈل کی صورت میں موجود تھے۔ محض تفریح طبع کے لیے میں نے تصویروں کو دیکھا۔ ان میں ایک مشہور اداکارہ بھی تھی اور اتفاق سے میں بھی اس کے پرستاروں میں شامل تھا۔ لندن اور امریکا میں قیام کے دوران میں نے اس کی کوئی فلم نہیں چھوڑی تھی۔ لارڈ خوش قسمت تھا کہ اسے لاکھوں پرستاروں میں سے منتخب کیا گیا تھا...... باقی بھی خوبصورت عورتیں تھیں، ظاہر ہے شوق آوارگی یا حسن پرستی کا جذبہ کسی بھی مرد کو انہی کی بارگاہ ناز میں لے جاتا۔ میں نے ان کے خطوط بھی پڑھے...... خصوصاً اس اداکارہ کے، وہ لارڈ سے شادی کے معاملے میں سیریس تھی، شاید خود لارڈ سیریس نہیں ہوا۔ بیٹی کی وجہ سے، بدنامی کے ڈر سے یا یہ سمجھتے ہوئے کہ ان رنگین تتلیوں کا عشق بھی اداکاری ہی ہوتا ہے۔ میں اگر چاہتا تو ان خطوط کو کسی پبلشر کے حوالے کر کے اچھی خاصی رقم وصول کر سکتا تھا مگر میں امانت میں خیانت نہیں کر سکتا تھا۔

لارڈ کے کمرے سے مجھے خفیہ اکاؤنٹس کی دستاویزات ملیں اور بہت سی ایسی فائلیں جو انکم ٹیکس یا اخبار والوں کے ہتھے چڑھ جاتیں تو شاید لارڈ کے سیاسی کیریئر کا خاتمہ کسی قید خانے میں ہوتا۔ اب بعد از مرگ کسی کی رسوائی لاحاصل تھی۔ حیرانی مجھے دوسری خواب گاہ میں زیادہ ہوئی جہاں سیلیا نے اپنی زندگی کو لارڈ سے اتنا ہی الگ کر لیا تھا جتنی وہ شادی سے پہلے تھی، مجھے اس کی درازوں سے بھی محبت بھرے خطوط ملے جو اس کو چاہنے والوں نے یا الو بنانے والوں نے لکھے ہوں گے۔ وہ کوئی اتنی حسین عورت نہیں تھی لیکن وہ دولت مند اور بااثر تھی۔

شادی سے پہلے کا ایک آدھ رومانس کوئی انوکھی بات نہیں اور مغرب کے آزاد معاشرے میں وہ لڑکی نارمل نہیں سمجھی جاتی جس کے بوائے فرینڈز نہ ہوں۔ افیئرز نہ ہوں اور حد یہ ہے کہ کوئی شادی تک کنواری رہ جائے تو یہ ناقابل یقین واقعہ بھی نفسیاتی مسئلے کی طرح اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ سوال کیا جاتا ہے کہ آخر ایسا کیوں ہوا؟ مخالف جنس کی طرف میلان کم ہے؟ جنسی جذبات کی کمی ہے؟ خوف ہے یا کوئی اور وجہ...؟

البتہ شادی کے بعد وفاداری کامیاب ازدواجی زندگی کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہے۔ چوری چھپے مرد گھر سے باہر آفس میں یا اپنی کاروباری مصروفیات میں چار عشق لڑاتے ہیں تو عورت کو بھی ایک موقع مل ہی جاتا ہے۔ کبھی اپنی خواہش پر کبھی ترغیب پر، لیکن بنیادی بات یہ ہے کہ اس قسم کے نقص کا ثبوت کوئی نہیں رکھتا کیونکہ طلاق کی بنیاد ہی بے وفائی بنتی ہے اور یہ ثابت ہو جائے تو میاں کی آدھی کمائی اور جائداد بیوی لے جاتی ہے۔ یہاں میاں بیوی دونوں اپنے جرائم کا سارا ریکارڈ لیے بیٹھے تھے۔ جو بالکل کسی ٹائم بم کی طرح تھا۔ نوجوانی میں ایسی جذباتیت کا مظاہرہ نظر آتا ہے لیکن اب وہ دونوں عمر رسیدہ تھے۔ دونوں اپنی یادوں کے خزانے سنبھالے بیٹھے تھے۔

قدرتی طور پر مجھے ایلیشا کے کمرے سے کہیں زیادہ گولہ بارود ملنے کی توقع تھی۔ ایک رات میں نے نور کے ساتھ اس کی الماری کو دیکھا۔ ان تمام درازوں کے تالے توڑے جو مقفل تھیں۔ الماریاں ملبوسات سے بھری پڑی تھیں۔ یہ اس دور کی یادگار تھے جب وہ رئیس زادیوں کی طرح شریفانہ لباس میں نظر آتی تھی اور ہیرڈز اور اسپنسر جیسے اسٹور تھے یا لندن کے نامور ڈیزائنرز کے بنائے ہوئے تھے۔

بعد میں اس نے لندن کے لاابالی ٹین ایجرز کی طرح

لباس کے نام پر بے لباسی کا فیشن اپنالیا تھا۔ میرے نزدیک وہ بے ہنگم بدنما چیتھڑے تھے جن سے جسم کی ہیجان خیزی ضرور بڑھتی تھی لیکن حسن کا احساس مجروح ہوتا تھا۔ مزید خرابی کے نتیجے میں یہ نام کا لباس بھی نہیں رہا اور میں نے ان گنت تصاویر دیکھیں جن میں اس نے اپنے عریاں جسم کی ہر پوز میں بھرپور نمائش کی تھی۔ معلوم نہیں کس کے لیے...... اس نے نیوڈز بنانے والوں کے لیے ماڈلنگ کی تھی، کسی پرستار کی فرمائش میں اپنے حسن وشباب کی نمائش لگائی تھی یا وہ خود اپنی حشر سامانی دیکھ کے خوشی اور تسکین حاصل کرتی تھی۔

نور کو اپنی جانب غور سے دیکھتے ہوئے پا کے میں نے کہا۔ ''یہ میری صورت کیوں دیکھی جارہی ہے؟''

وہ ہنس پڑی۔ ''دیکھ رہی ہوں کہ حسنِ جاناں کا نظارہ تمہارے دل پر کیا اثر کرتا ہے۔''

''میں نے آج تک اسے ایسے نہیں دیکھا تھا۔ کیا تم مانوگی؟''

''بالکل نہیں......''

''کیا میں نے کبھی تم سے جھوٹ بولا ہے؟''

''مزید پوچھو کہ کبھی سچ بولا ہے۔ تو میں سوچ کے جواب دوں۔''

میں سمجھ گیا کہ اس کا مقصد مجھے تنگ کرنا ہے۔ ''عبرت خانۂ دہر میں کیا نہیں ہوتا، یہ دیکھو کہ ایک خاندان تھا جو مکمل تھا، ماں باپ اور ان کی بیٹی...... ان کے پاس کیا نہیں تھا، دولت...... عزت، شہرت...... اور آج ان کا نام ونشان بھی نہیں۔ بیٹی پاگل خانے میں ہے اور ہم کم ذات' قابل نفرت' رنگ دار نسل کے لوگ یہاں مالک بنے کھڑے ہیں اور ان کی نجی زندگی کے شرمناک پہلوؤں کو بے نقاب دیکھ رہے ہیں۔''

''میرا خیال ہے یہ سب ہمیں جلا دینی چاہئیں۔ یہ تصویریں اور خطوط...... تاکہ شرافت اور عزت کا بھرم رہے۔''

''ہم ایسا ہی کریں گے۔'' میں نے کہا۔ ''تم کمرے سے ملنے والی تمام تصویروں اور خطوط کو ایک بیگ میں ڈالتی جاؤ۔''

''یہ ایک ڈائری ہے۔'' نور نے ایک دراز میں سرخ جلد والی ڈائری نکالی۔ پھر دوسری......

''یہ ایلیشا کی تحریر ہے۔'' میں نے ایک ڈائری دیکھ کے کہا۔

''ایسی چار اور بھی ہیں......''

''کیا یہ ہمیں پڑھنی چاہئیں......'' میں نے کہا۔

''اب پردہ داری کے لیے کیا ہے...... اور ہم نہ انھیں شائع کرائیں گے نہ عام کریں گے۔''

''او کے...... لیکن ان سب کو پڑھے گا کون؟''

''میں پڑھوں گی، فرصت سے...... کیا تمھیں اس لڑکی کے خیالات کی دنیا کو دیکھنے اور سمجھنے کا شوق نہیں۔''

''میں نے سب دیکھا ہے اور سمجھنے کو کیا ہے جو سب کے سامنے نہیں...... بس ایک دلچسپی ہوتی ہے فکشن والی...... ہر زندگی ایک کہانی ہے۔''

''بہت کم لوگوں میں یہ عادت ہوتی ہے۔ ایلیشا میں بھی تھی۔ یہ پہلی ڈائری پندرہ سال پہلے کی ہے...... یعنی ہوش سنبھالتے ہی وہ لکھنے لگی تھی۔'' نور نے کہا۔

''وہ غیر معمولی حساس لڑکی تھی، گھر کے ماحول نے اسے مزید حساس بنا دیا۔ بیک وقت بہت زیادہ لاڈ پیار...... اور ماں باپ کے تعلقات میں کشیدگی کا منفی پہلو، جو گھر میں گھر کا ماحول نہ ہونے کا نتیجہ تھا۔ وہ اسکول میں اچھی ڈیبیٹر تھی۔ اسے لکھنا آتا تھا اور میں نے ایک بار اسے کہا تھا کہ وہ کوشش کرے تو رائٹر بن سکتی ہے۔ مگر وہ کبھی سیریس نہیں ہوئی۔ شاید اس لیے کہ اسے ضرورت نہیں تھی، یہ پہلی ڈائری میں دیکھوں گا...... آخری تم دیکھو، مجھے معلوم ہے اس میں کیا ہوگا؟''

اس رات ہم نے چن چن کے تمام خطوط اور تصاویر آتش دان میں جلا دیں جو کسی اور کے ہاتھ لگ جاتیں تو شاید ارنسٹ فیملی کے لیے رسوائی کا باعث ہوتیں۔ اگلا پورا دن مصروفیات میں گزر گیا۔ نور میں ایک بڑی خوشگوار حوصلہ افزا تبدیلی آئی تھی۔ اس نے لندن کی ورکنگ وومن والا لباس پہننا شروع کر دیا تھا اور وہ سارا دن آفس میں سوشی سے کاروباری امور سیکھ رہی تھی اور سوشی نے یہ امید ظاہر کی تھی کہ ایک دو ماہ میں وہ کمپنی کی سربراہی کے قابل ہو جائے گی۔

یہ میرے لیے بڑے اطمینان کی بات تھی۔ عمداً میں نے خود کو پیچھے رکھا اور نور کی آگے بڑھنے میں حوصلہ افزائی جاری رکھی۔ مجھے لندن آئے دو ماہ ہو چکے تھے۔ ان دو مہینوں میں بہت کچھ ہوا تھا لیکن اچھی بات یہ تھی کہ میری عدم موجودگی میں ست بدھائی کے معاملات میں کوئی خرابی نہیں آئی تھی۔ اب مجھے واپسی کا خیال آنے لگا تھا۔

میری راجا سے بات ہوئی تو اس نے بھی کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ اب تجھے یہاں ہونا چاہیے...... اگر الیکشن میں حصہ لینا ہے۔''

میں سوچ میں پڑ گیا۔ ''الیکشن......''

''ہاں...... کیا ارادہ بدل گیا لندن میں رہ کے......؟''

میں نے کہا۔ ''نہیں......''

''پھر کیا ہارنے کا ڈر ہے فیکے پتر...... تیری آواز حلق سے نہیں کسی اور جگہ سے کیوں نکلتی ہوئی لگتی ہے۔''

''ہار، جیت، عزت، ذلت اللہ کے ہاتھ میں ہے مہاراجا۔ کب متوقع ہیں انتخابات......؟''

''کیا تو نے وہاں رہ کے اخبار پڑھنا، خبریں سننا سب چھوڑ دیا...... ابے کاغذات حرامزدگی...... معاف کرنا، نامزدگی داخل کرنے کی تاریخ کا اعلان ہوگیا...... اور کیا چاہیے، ڈیڑھ مہینے بعد الیکشن، ایک سنسنی خیز خبر یہ ہے کہ اپنے راناصاحب اس بار کھڑے نہیں ہورہے۔''

''وہ کیوں...... مجھے بلا مقابلہ منتخب کرانے کے لیے......؟''

''اس لیے کہ وہ لیٹے ہوئے ہیں، کھڑے ہی نہیں ہوسکتے، کئی بار خوش خبری سنی کہ اللہ کو پیارے ہوگئے، مگر وہ افواہ ثابت ہوئی۔''

''دشمن مرے تے خوشی نہ کریے...... شاعر نے کہا تھا۔''

''شاعر کے دشمن اور قسم کے ہوں گے...... رقیب روسیاہ ٹائپ، اس بار وہ تیرا مدمقابل ہوگا جسے والد ماجد پیار سے کھوتے دا پتر، حرامی وغیرہ جیسے نام سے اکثر پکارتے تھے...... سرعام......''

''تیرا مطلب ہے، زوہیب...... اچھا پھر سمجھو آیا کے میں آیا۔'' میں نے ہتھیلی بجائی۔ ''دوچار دن میں......''

''میں آج ہی بقلم خود ہر دیوار پر لکھ دیتا ہوں۔ فیکا پتر آوے ای آوے...... کھوتے دا پتر خصماں نوں کھاوے......''

''بہت خوب راجا صاحب...... کبھی میں اس ملک کا صدر بنا تو آپ ہی وزیراعظم ہوں گے۔''

''تاکنے کے لیے یا جلاوطن کرنے کے لیے، مجھے آپ معاف ہی فرمائیں، ہوئے تم دوست جس کے...... یہ غالب صاحب نے تیرے لیے فرمادیا تھا۔''

اس رات میں نے نور سے واپسی کی بات کی تو وہ اداس ہوگئی۔ ''جانے کو جاؤ، یہ بھی بتا جاؤ پردیسی بابو کہ لوٹ کے کب آؤ گے؟'' اس نے غمگین آواز بنا کے کہا۔

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کے کہا۔ ''تم میرے سپنوں میں تو آؤ گی نا؟''

اس نے ہاتھ چھڑا لیا۔ ''تو...... سنسر شپ کے قوانین سخت ہیں اور تمہارا کیا ہے، خوابوں پر ہی گزارا کرلو گے۔''

میں نے آہ بھری۔ ''پھر تو آنا پڑے گا جلد ہی......''

اس نے میرا کان پکڑ لیا۔ ''کان کھول کے سن لو میری بات......''

''بولو۔ دوسرے کان میں آواز آرہی ہے، ایک تو گیا۔''

''میں یہاں بیٹھ کے تمہاری یاد میں آنسو بہاتے آہیں بھرتے، دردناک گانے نہیں گاؤں گی۔''

''ہاں...... آج کل فرصت کہاں ہے تمہارے پاس، بگ باس جو بنی ہوئی ہو۔''

''میں آجاؤں گی شوں سے......'' اس نے ہاتھ کو جہاز کی طرح میرے اوپر اڑایا۔ ''نہ میں ڈرتی ہوں کسی سے...... نہ کسی کی پروا کرتی ہوں، کیونکہ میں نور جہاں نہیں...... ماہ نور ہوں۔''

''دیکھو یہ کان میں نے گوند سے جوڑ رکھا تھا۔ نکل جائے گا تو۔''

''تو کیا...... ایک کان سے سنو گے دوسرے سے اڑا نہیں سکو گے۔''

میں نے کہا۔ ''سننے والا تو یہی کان ہے۔''

وہ میرے سینے سے لگ گئی۔ ''تم تو جارہے ہو الیکشن میں حصہ لینے، جو ہوں گے ڈیڑھ مہینے بعد...... ہار گئے تو منہ چھپانے آجاؤ گے، جیت گئے تو؟''

''تو کیا...... وزیر بن جاؤں گا اور ظاہر ہے تمہیں بھول جاؤں گا۔''

''میں ابھی سے بتادوں، پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی۔ تم وہاں مجھے جیسے چاہو انٹروڈیوس کراؤ، ہر ہفتے کی فلائٹ سے میری سیٹ جانے کے لیے بک ہوگی، سوموار کی واپسی کے لیے......''

''اب تم خود شیرازی کارپوریشن کی کیا ہو......''

''کیا کمپنی اس نئے نام سے رجسٹر ہوگئی ہے......''

''ہوجائے گی اس ہفتے، چیئرمین میں ہوں، سوشی ہے ایگزیکٹو ڈائریکٹر، تمہارا عہدہ ایم ڈی کا کر دیا جائے؟''

''باہر جو چاہو کہو یا لکھو...... تمہاری مرضی......''

''اور اندر تمہاری مرضی...... ملاؤ ہاتھ......'' اس نے ہاتھ بڑھایا۔

وہ میری آنکھوں میں دیکھتی رہی...... ''تم ہاتھ پکڑ کے چھوڑنے کے عادی ہو۔''

''کم سے کم تمہیں یہ الزام نہیں دینا چاہیے۔'' میں نے احتجاج کیا۔

باہمی مشورے سے میں نے تین دن بعد کی فلائٹ پر پاکستان کے لیے سیٹ حاصل کر لی۔ کہنے کو نور نے بڑے اعتماد کے ساتھ یہ کہہ دیا تھا کہ وہ لندن میں میرے بغیر بھی رہ کر دکھا سکتی ہے اور کمپنی کے معاملات پر کمانڈ حاصل کرنے کے بعد سوشی کے ساتھ مل کر کمپنی کے تمام امور کو چلا سکتی ہے لیکن واضح طور پر وہ نروس تھی۔

دوسرے دن اس نے رہائش کا مسئلہ کھڑا کر دیا۔ ''میں اتنے بڑے محل میں نہیں رہوں گی۔''

''پھر کہاں رہو گی......؟ اور یہاں رہنے میں کیا ہے، کوئی خطرے کی بات نہیں، سیکیورٹی بہت ٹائٹ ہے۔ تمہاری اجازت کے بغیر پرندہ پر نہیں مار سکتا۔''

''پرندے کے پر مارنے سے کچھ نہیں ہوتا۔''

''پھر...... یہاں بھوت بھی نہیں ہیں۔''

''جب میں اکیلی رہوں گی اتنے بڑے گھر میں۔ تو آ جائیں گے، نہ آئیں تو مجھے لگے گا کہ بھوت میں ہوں جو اس ویرانے میں سرگرداں ہے۔''

''تم ڈرتی ہو بھوتوں سے...... یقین رکھتی ہو بھوتوں پر؟''

''یقین نہیں رکھتی، مگر ڈرتی ہوں۔'' نور نے ایک زنانہ منطق والا جواب دیا۔

''او کے...... پھر کہاں بندوبست کیا جائے تمہارے لیے چاہو تو ڈاکٹر شائستہ کے پاس چلی جاؤ۔''

''اس جنسی مریض کے پاس...... نو سر...... دو ہفتے میں وہ مجھے بھی مریض بنا دے گی۔''

میں ہنس پڑا۔ ''ایک صورت یہ ہے کہ ہوٹل میں تمہارے لیے مستقل بنیادوں پر ایک کمرا بک کرا دیا جائے۔ کسی بھی اچھے سے ہوٹل میں جو آفس سے نزدیک ہو۔''

''یہ ہو سکتا ہے مگر پہلے مجھے سوشی سے بات کرنے دو۔ شاید وہ کوئی بہتر مشورہ دے۔''

اور ایسا ہی ہوا۔ سوشی نے کہا کہ اس کے پڑوس میں ایک بڈھا بڑھیا رہتے ہیں۔ ان کے گھر کے اوپر والی منزل خالی ہوئی تھی۔ اس سے بہتر کوئی جگہ نہیں ہو سکتی تھی۔ اسی روز ہم رات کے وقت گئے۔ مسٹر اور مسز رابرٹ دونوں ستر کے پیٹے میں تھے۔ معاشرتی دستور کے مطابق ان کے سارے بچے بالغ ہونے کے بعد اپنی دنیا آباد کرنے کے لیے رخصت ہوتے گئے۔ اب ان کے صرف فون آتے تھے۔ ماؤں کے عالمی دن پر، باپوں کے دن پر، کرسمس پر وہ کارڈ بھیج دیتے تھے یا بڑا تیر مارتے تو کارڈ کے ساتھ گفٹ بھی آ جاتا تھا۔ وہ انہی کارڈز اور تحائف کو سجا کے اپنی یادوں کی دنیا آباد کیے بیٹھے تھے۔

''تم سے پہلے یہاں ایک انڈین جوڑا تھا۔ راجندر سات سال ہمارے ساتھ رہا۔ وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے آیا تھا۔ پھر اسے یہاں ایک جاب مل گیا اور ایک انڈین لڑکی موہنی، ویری سویٹ گرل، اس نے شادی کر لی۔ ان کا ایک بچہ تھا جو اب چھ سال کا ہو گیا تھا۔ مجھ سے بہت مانوس تھا۔''

''وہ کہاں چلے گئے، واپس......؟''

''نہیں...... ان کو یہ جگہ کم پڑ رہی تھی، چار سال میں ان کے تین بچے تو ہو گئے تھے۔ میں نے انہیں مشورہ دیا کہ آبادی میں اضافے کی رفتار کے مطابق کوئی مکان لیں جہاں وہ چھ سات سال رہیں یا آٹھ دس سال تو انہیں جگہ کی پریشانی نہ ہو۔''

مجھے ہنسی آئی۔ ''محلے والوں کو ہوتی ہے تو ہو۔''

''دراصل...... رابرٹ اور میں، ہم دونوں سکون کے عادی ہو گئے ہیں...... شور ہم سے برداشت نہیں ہوتا۔ خصوصاً رات کے وقت...... ابھی تم کہاں رہتے ہو۔''

میں نے پہلے جھوٹ سے کام چلانے کا سوچا۔ پھر یہ خیال آیا کہ کبھی سچ سامنے آیا تو انہیں دکھ ہوگا۔ میں نے مختصراً اسے یہ بتا دیا کہ ہم ارنسٹ مینشن میں تھے جو ہماری ضروریات سے بہت زیادہ تھا۔ وہ ارنسٹ مینشن سے ناواقف تھے لہٰذا زیادہ تفصیل میں جانا بھی لاحاصل تھا۔ یہ بات ان کی سمجھ میں آ گئی کہ اکیلی نور کے لیے ان کا گھر موزوں ترین جگہ ہے کیونکہ وہ سوشی کے ساتھ ہی کام کرتی ہے۔

ہمارے اقرار کیے بغیر ہی انہوں نے فرض کر لیا تھا کہ ہم میاں بیوی ہیں اور میں نے اس تاثر کی تردید بھی نہیں کی۔ ''کبھی کبھی میں پاکستان سے آؤں گا۔ وہاں بھی میرا بزنس ہے۔ یہاں نور ہو گی، اور یہ کچھ ڈرتی ہے۔ اس کے آنے جانے کے لیے گاڑی ہو گی اور ایک شوفر ہو گا۔ پرانے ملازم جو میاں بیوی ہیں اس کے ساتھ رہیں گے، بچے کوئی نہیں۔''

''گھر میں دوستوں کا اژدہام تو نہیں رہے گا پارٹیاں، لاؤڈ میوزک...... چیخ پکار، یہ سب نہیں چلے گا۔''

''یہ کچھ نہیں ہو گا۔ ایک سیکیورٹی گارڈ باہر متعین ہو گا جیسے سوشی کے گھر کے باہر کھڑا رہتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے۔ لندن اب پہلے جیسا نہیں رہا۔ وارداتیں بہت ہونے لگی ہیں اور ہم جیسے بوڑھے زیادہ

غیر محفوظ ہیں۔ اگرچہ میں گن رکھتا ہوں اپنے پاس، اس کا لائسنس بھی ہے۔'' رابرٹ نے کہا۔

''بس اسے چلانے کی ہمت نہیں ہے۔'' بڑی بی نے کہا۔

معاملات طے ہو گئے تو اگلے دن نور نے ضرورت کا سامان اٹھایا اور شفٹ ہو گئی۔ کرسٹین اور کرسٹوفر اس کے ساتھ آ گئے۔ انہیں رہنے کے لیے ایک کمرا مل گیا۔ اس سے زیادہ کی انہیں ضرورت بھی نہیں تھی۔ خود نور یہاں بہت مطمئن تھی۔ یہ مکان اتنا چھوٹا بھی نہیں تھا۔ اوپر کی منزل پر تین بیڈ روم تھے۔ وہ بہ آسانی ایک کو مہمانوں کے لیے مخصوص کر سکتی تھی۔ لاؤنج چھوٹا تھا مگر ڈرائنگ روم بڑا تھا۔ اس کا سارا فرنیچر خاصا پرانا اور بے دردی سے استعمال شدہ تھا۔ انہوں نے اجازت دے دی کہ ہم اسے اپنی مرضی کے مطابق فرنش کر سکتے ہیں۔ اگر وہ قدامت پسند انگریز ہوتے جو ہر پرانی چیز کو تاریخی ورثہ بنا کے رکھتے ہیں تو مشکل ہو جاتی۔ اس سے بھی اچھی بات یہ تھی کہ سابقہ کرائے داروں نے ان سے اچھا سلوک کیا تھا۔ ان کی خدمت اور عزت کی تھی چنانچہ وہ کسی انڈین یا پاکستانی سے تعصب نہیں رکھتے تھے بلکہ انہیں ترجیح دینے لگے تھے۔

ارنسٹ مینشن بند کر دیا گیا۔ اس کی حفاظت پر مامور گارڈز موجود رہے۔ گھر مکینوں سے خالی ہو گیا۔ میں نے کرسٹوفر کو مطلع کر دیا کہ اسے کوئی گاہک ملے تو وہ نور سے رابطہ کر سکتا ہے جو تمام معاملات میں میری اتارنی ہو گی۔ جیسے جیسے میرے جانے کی ساعت قریب آ رہی تھی نور کی اداسی بڑھتی جا رہی تھی۔

پاکستان روانگی سے ایک رات پہلے اسے ڈنر کے لیے لے گیا اور اس کا حوصلہ بڑھاتا رہا۔ کینڈل لائٹس میں ٹیمز پر آہستگی سے رواں اسٹیمر کے ڈیک پر ماحول انتہائی خوبصورت تھا لیکن نور میری تمام تر کوشش کے باوجود اداس رہی۔

جب آرکسٹرا نے ایک دلگداز رومانی دھن چھیڑی تو وہ رو پڑی...... ''جان میں اکیلی نہیں رہ سکتی۔''

''نور...... ڈونٹ بی سلی...... تم نے سب کر لیا ہے، دیکھو جب ہم آئے تھے، اس وقت سے آج تک تم نے خود کو کتنا بدلا ہے، کتنا اعتماد حاصل کیا ہے۔ تم کو بھروسا رکھنا چاہیے۔ خود پر اور مجھ پر......''

''ہاں، خود کو اس صورتِ حال میں ڈالنے کی ذمے دار میں خود ہوں۔'' اس نے میرے رومال سے آنسو صاف کیے۔ ''مجھے کوئی وعدہ یا دعویٰ نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

''پھر میں دور کہاں ہوں، ایک تو یہ فاصلہ کچھ نہیں۔ سات گھنٹے ہیں یہاں سے وہاں، اور پھر فون ہے...... ہر وقت رابطے کے لیے۔''

''میں ہر ہفتے آ سکتی تھی، تم نے پندرہ دن کی شرط عائد کر دی۔''

میں نے کہا۔ ''یہ سب عارضی انتظام ہے نور...... تھوڑے دن کی بات ہے۔''

''اس کے بعد کیا ہو گا؟''

''ہم ایک ہو جائیں گے۔''

''جھوٹ بولتے ہو تم...... وہاں تمہاری سیاست کی دکان تمہارے بغیر نہیں چل سکتی۔ یہاں کا بزنس میری مستقل ذمے داری بن جائے گا۔ مجھے معلوم ہے، تم نے میری بات کو اہمیت نہیں دی تھی۔''

''کون سی بات......''

''یہی کہ رابعہ کو یہ سب سونپ دو، وہ بھی خوش...... تمہارے ضمیر صاحب کی خلش بھی دور......''

''میں نے اس تجویز کو مسترد نہیں کیا تھا۔ حالات کا جائزہ لیے بغیر میں اس پر عمل نہیں کر سکتا۔ رابعہ بے وقوف نہیں ہے لیکن اس کی کاروباری سمجھ بوجھ پر مجھے شک ہے، اگر وہ ڈاکٹر احمد سے شادی کر لے...... اور وہ دونوں یہاں آ جائیں تو ایسا ہو سکتا ہے۔ احمد ذہین ہے اور میچور بھی۔ ڈر یہ لگتا ہے کہ جما جمایا کاروبار تباہ نہ ہو جائے...... میں اسے توسیع دے کر ملٹی نیشنل کمپنی بنانے کے خواب دیکھتا ہوں اور خواب دیکھے بغیر کامیابی کی تعبیر نہیں ملتی۔''

''یعنی تم وہ اسے نہیں دینا چاہتے۔''

''چاہتا ہوں...... لیکن پہلے آزمائشی بنیاد پر ان کو موقع دوں گا۔''

''دیکھو...... تمہارا یہ کاروبار جائے بھاڑ میں۔ یہ ملٹی نیشنل ادارہ بنے نہ بنے...... میں زیادہ سے زیادہ چھ مہینے اکیلی رہوں گی۔''

''ایک سال......'' میں نے کہا۔ ''میری خاطر...... تم رابعہ کو وہ سب بتاؤ گی جو سوشی نے تمہیں بتایا۔''

''جب سوشی ہے تو میرے کچھ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ چھ مہینے...... اس کے بعد میں ہاتھ جھاڑ کے ست بدھائی آ جاؤں گی...... ہمیشہ کے لیے۔''

او کے...... او کے...... ابھی چھ مہینے موج کرو۔'' نور نے کہا۔ ''میں تمہیں سی آف کرنے بھی نہیں جاؤں گی۔''

تیں ہے، اس نے کہا۔ "ہاں...... آفس ٹائم ہوگا۔"

"یہ بات نہیں۔ الوداعی سین میں میرا حوصلہ جواب دے گیا تو میں ایئرپورٹ پر روتے روتے بے ہوش ہو جاؤں گی۔"

"ہم نخلخہ ساتھ لے جائیں گے۔"

"نخلخہ؟ وہ کیا ہوتا ہے؟"

میں نے کہا۔ "پتا نہیں، ہوتی تھی کوئی...... خیر سے سنگھاتے ہی ہوش آجاتا تھا۔ خیر لیڈی...... سب جانے والوں کی طرح میں بھی تمہیں وصیت کر کے جاؤں گا۔"

"ابھی میں رونا شروع کر دوں گی۔" اس نے مجھے دھمکی دی۔

"خدا کے لیے یہ تماشامت کرنا...... بقول شاعر...... تیرے لیے رونے کو بہت عمر پڑی ہے۔"

"یعنی پہلے سے طے ہے کہ تم مجھے رلاؤ گے۔"

"رونا خواتین کی صحت کے لیے ضروری ہے۔ یہ میں نہیں ڈاکٹر کہتے ہیں۔ مجھے تو طے کرنا مشکل ہے کہ تمہاری آنکھیں روتے ہوئے زیادہ حسین لگتی ہیں یا جب تمہاری آنکھوں میں خوشی کے ستارے جگمگاتے ہیں...... اچھا اب جو میں کہہ رہا ہوں بحیثیت چیئر مین...... اس پر دھیان دو......"

"کیا؟...... تم دفتر اور کاروبار کی باتیں کرنے لائے ہو مجھے یہاں۔"

میں نے کہا۔ "رومانٹک ڈائیلاگ بھی بولوں گا بعد میں...... بڑی پریکٹس ہے مجھے، تم سن سن کے بور ہو جاؤ گی۔"

"اچھا بولو...... بدمعاش......"

میں نے کہا۔ "یہاں کے تمام معاملات تقریباً طے ہو چکے ہیں جو تمہارے لیے پریشانی کا سبب ہو سکتے تھے۔ گھر میں اور آفس کا سارا عملہ بدلا جا چکا ہے۔ لارڈ کی جاں نثاری میں اپنی اوقات بھول جانے والے سب نکالے جا چکے ہیں۔ اب تمہارے حکم کے غلام ہیں سب اور تمہیں مکمل اختیارات حاصل ہیں کہ کسی کو بھی جب چاہو کان پکڑ کے نکال دو......"

"مجھے خوامخواہ رعب جھاڑنا نہیں آتا۔"

"میں بصد ادب اس سے اختلاف کرتا ہوں، مجھے کان پکڑ کے مت نکال دینا۔" میں نے معصوم صورت بنا کے کہا۔

"تمہیں کان پکڑ کے واپس ضرور لاسکتی ہوں۔"

"اچھا، پھر سیریس...... چیف کا پتا ہمیشہ کے لیے صاف...... اس کے حواری بھی اندر...... ویسے بھی ان کی تم سے کوئی دشمنی نہیں، لارڈ کے ہمدرد بھی صبر کر کے بیٹھ گئے ہیں۔ ایلیشا ابھی سال بھر تو باہر نہیں آسکتی۔"

"تم میرے باڈی گارڈ نہیں ہو، میں اپنی حفاظت خود بھی کر سکتی ہوں۔ بات کرو میری جذباتی تنہائی کی۔"

"تم تنہا کہاں ہو جان...... ہر وقت ہر جگہ تم خیالوں میں میرے ساتھ ہو اور میں تمہارے ساتھ...... یہ دوری کوئی دوری نہیں......"

"میرے لیے ہے...... تم سمجھتے کیوں نہیں۔"

"میں سب سمجھتا ہوں، یہ بھی کہ صرف تم ہی میرا ساتھ دے سکتی ہو، خدا نے تمہیں میرے لیے ہی بنایا تھا اور میرے پاس بھیج دیا۔ یہ پیٹھ پیچھے یا وقت گزر جانے کے بعد اعتراف نہیں، اس وقت تم ملی ہی نہیں تھیں کہ میں فرق کو محسوس کر سکتا، لیکن یہ حقیقت ہے کہ نہ فریال میں یہ صلاحیت تھی، نہ کسی اور میں ہے۔ رابعہ کا بھی مجھے شک ہے کہ یہ سب کر سکے۔ یہ تم نے میرے کہنے سے کر دکھایا۔"

"تمہارے لیے میں کچھ بھی کر سکتی تھی۔"

"ایک آخری بات...... سوشی کو تم نے دیکھا، اس کی فرض شناسی اپنی جگہ...... لیکن وہ زندگی کے ہر لمحے میں جاپانی ہے۔ اس کے وجود کا ایک ایک خلیہ حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہے۔ تم کو ایسا ہی پاکستانی بن کے رہنا ہے۔"

اس نے کہا۔ "میں سمجھی نہیں تم کیا چاہتے ہو۔"

"دیکھو...... وہ کاروباری معاملات میں جاپان کو باقی ساری دنیا پر ترجیح دیتی ہے۔ ہم جاپان کے برابر صنعتی طور پر ترقی یافتہ نہ سہی۔ بہت کچھ وہاں بھی بنتا ہے جو عالمی معیار کا ہوتا ہے۔ کیا ہمیں پاکستانی پروڈکٹ کو پروموٹ نہیں کرنا چاہیے؟"

اس نے سر ہلایا۔ "ایسا ہی ہوگا لیکن اس کی اور میری رائے میں اختلاف ہوا...... پھر؟"

"یو آر دی باس......" میں نے مٹھی بند کر کے انگوٹھا بلند کیا۔

صبح وہ آفس میں تھی جب میں نے واپسی کے لیے رخت سفر باندھا یعنی سوٹ کیس لیا اور ہیتھرو ایئرپورٹ کے لیے روانہ ہو گیا۔ ٹریفک جام لندن کا معمول ہے۔ یہ بات میں نے ملحوظ رکھی تھی۔ پی آئی اے کی فلائٹ کے مقررہ وقت سے بھی نصف گھنٹا پہلے ہی بورڈنگ کارڈ لینے پہنچ گیا۔ میری ہم وطن خاتون نے روایتی بے رخی سے کاغذات دیکھے اور تھینک یو کہے بغیر مجھے آگے بھیج دیا۔

ڈیپارچر لاؤنج میں پہنچنے کے بعد بھی اتنا وقت تھا کہ میں اطمینان سے ایک کپ کافی کا پی سکوں۔ لاؤنج بھانت بھانت کے مسافروں سے بھرا پڑا تھا۔ میں نے ایک سیٹ کا انتخاب کیا اور کافی کے کپ کے ساتھ درمیان میں جا بیٹھا۔ اپنا بریف کیس میں نے دائیں جانب رکھا۔ اس سے آگے ایک سیاہ فام خاتون کسی رسالے کے مطالعے میں مگن تھی بائیں جانب کی سیٹ خالی تھی۔

میں کسی بھی وقت روانگی کے اعلان کا انتظار کر رہا تھا کہ ایک اعلان میں پی آئی اے کا ذکر سن کے چونکا۔ اعلان دہرایا گیا تو وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ ناگزیر وجوہ کی بنا پر پاکستان جانے والی فلائٹ تاخیر سے روانہ ہوگی۔ کاؤنٹر پر جانا لاحاصل تھا۔ تجربے کی بنا پر مجھے اندازہ تھا کہ کوئی بھی مجھے اطمینان بخش جواب نہیں دے گا۔ ناگزیر وجوہ بڑی وسعت رکھنے والی اصطلاح ہے جس میں فنی خرابی سے موسم کی خرابی تک سب کچھ آجاتا ہے۔ فنی خرابی کہاں ہے، یہ کون بتائے...... اور بتائے تو میں خاک سمجھوں گا۔ انگلستان سے پاکستان تک موسم کا مزاج کہیں بھی بگڑ جائے تو باکمال لوگ کیسے لاجواب پرواز کا مظاہرہ کریں۔

ایک شخص توپ سے نکلے گولے کی طرح میرے ساتھ والی کرسی پر آگرا۔ وہ بھاری بھرکم اور گھنی مونچھوں والا شخص سوٹ میں تھا لیکن اس نے قومی ایئرلائن کی شان میں نازیبا کلمات کہے تو مادری زبان میری سمجھ میں آگئی۔ "ٹیک اٹ ایزی...... یہ ہوتا رہتا ہے۔"

اس نے میری طرف دیکھا۔ "آپ بھی ہیں متاثرین میں، لیکن میرا تو جانا ہی بے مقصد ہوگا اگر میں وقت پر نہ پہنچا۔"

میں نے سوچ کے کہا۔ "کوئی بیمار ہے یا خدانخواستہ......"

"لاحول ولاقوۃ...... میری بیوی کی منگنی تھی۔"

میں چونکا۔ "بیوی کی......"

"میری......" اس نے جھلا کے کہا۔ "بیوی سے ہی ہو رہی تھی نا اب آپ اعتراض کریں گے کہ ابھی سے بیوی کہاں......"

"منگنی کل بھی تو ہو سکتی ہے۔"

اس نے افسوس سے سر ہلایا۔ "اس سسرے کی عقل میں آئے تب نا...... اس نے نجومیوں، ستارہ شناس اور علم الاعداد کے ماہرین کے مشورے سے تاریخ اور وقت مقرر کیا تھا۔"

مجھے بڑی ہنسی آئی۔ "آپ دلچسپ آدمی ہیں۔ میں رنگیلا شیرازی ہوں، نواب رنگیلا شیرازی آف ست بدھائی۔ یہ نام سنا ہے آپ نے؟"

خلاف توقع اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ "کافی سنا ہے یہاں بھی اور وہاں بھی۔ میں ڈاکٹر امجد پرویز ہوں، عبداللہ جان کا ہم زلف۔ ان کی اور میری بیوی سگی بہنیں ہیں، پیر پنجال بھی تو ادھر کا ہے۔"

"آف کورس...... یہ پہاڑی سلسلہ ہے۔"

لاؤڈ اسپیکر نے پکارنا شروع کیا۔ "ڈاکٹر امجد پرویز...... ڈاکٹر امجد پرویز...... پلیز پی آئی اے کے کاؤنٹر پر رپورٹ کریں۔"

"اللہ خیر......" وہ بولا اور اپنا چھوٹا سا سوٹ کیس ہاتھ سے پیچھے کھینچتا ہوا لے گیا۔ دوسری طرف خاتون بدستور میگزین کے مطالعے میں مستغرق تھی۔ ابھی کچھ پتا نہیں تھا کہ روانگی میں تاخیر کا وقفہ کتنا طویل ہوگا۔ مجھے خیال آیا کہ ایلیشا کے بچپن کی ڈائری میرے بریف کیس میں ہے۔

وقت گزاری کے لیے میں نے اسے نکال لیا۔ پندرہ برس پرانی ہونے کے باوجود اس کی جلد سلامت تھی اور صفحات بھی الگ نہیں ہوئے تھے۔ میں نے پہلا اندراج دیکھا۔ اس کی ہینڈ رائٹنگ...... میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ خاصی خوشخط تھی، اس نے لکھا تھا۔

"آج کرسمس ہے لیکن میں اپنے کمرے میں قید ہوں، میں نے ہی خود کو قید کیا ہے اور دکھ مجھے اس بات کا ہے کہ کسی کو پروا نہیں، کوئی مجھ سے پوچھنے نہیں آیا۔ سوائے نوکروں کے...... میں نے سارا دن کچھ نہیں کھایا۔ صرف کافی منگواتی رہی۔ پرسوں ماما کی ڈیڈ سے لڑائی ہو گئی تھی...... ڈیڈی ان کی برتھ ڈے بھول گئے تھے، ہمیشہ کی طرح۔ وہ یہاں تھے بھی نہیں...... نہ جانے کس نے ماما کو فون کر کے بتا دیا کہ وہ پیرس میں ایک ماڈل کے ساتھ ہیں۔ ماما نے فون پر تصدیق کی اور بدقسمتی سے کال اسی عورت نے ریسیو کی۔ ماما نے پوچھا کہ تم فلاں بول رہی ہو۔ اس نے ماما سے پوچھا کہ آپ کون ہیں تو ماما نے کہا کہ مجھے ایک اشتہار کے سلسلے میں تم سے ملنا تھا۔ ماما نے ایک بہت بڑی مشروبات کی کمپنی کا حوالہ دیا تو اس نے کہا کہ وہ شام کے وقت مل سکتی ہے۔ اس کے بعد فساد تو ہونا ہی تھا...... ماما نے ڈیڈی کو دغا باز کہا اور انہوں نے ماما کو جھوٹا قرار دیا۔

نتیجہ یہ کہ اب معلوم ہوتا ہے گھر میں گھر والے نہیں ہیں...... اس مکان میں دیواریں، کھڑکیاں اور فرنیچر ہے لیکن یہاں کوئی فیملی نہیں ہے۔ جو ہیں وہ اجنبی بلکہ ایک دوسرے کے بدخواہ اور دشمن ہیں۔ جھوٹے، دغا باز اور اخلاقیات سے لاتعلق لوگ...... یہاں خوشی کا کیا کام...... باہر ساری دنیا

کرسمس منا رہی ہے۔ لوگ ایک دوسرے کو تحائف دے رہے ہیں اور دعوتیں کر رہے ہیں، پارٹیوں میں ڈانس اور میوزک ہے، گھروں میں کرسمس کے ٹری سجائے گئے ہیں...... سانتا کلاز بچوں کو تحائف تقسیم کرتے پھر رہے ہیں۔ یہاں صرف اندھیرا ہے۔ مایوسی اور نفرت...... سب سے زیادہ ذلت میں نے اس وقت محسوس کی جب بابا نے شک ظاہر کیا کہ میں ان کی بیٹی ہی نہیں اور ماما نے کہا کہ تمہیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ تمہاری بیوی کب تمہاری ہے......

اچانک مجھ پر دو انکشافات ہوئے۔ میں ڈائری پڑھنے میں کچھ زیادہ ہی منہمک ہو گیا چنانچہ میرے ساتھ والی سیٹ کی طرف سے خوشبو کا دلنواز جھونکا آیا تو میں نے نظر اٹھا کے دیکھا اور اس قیامت کو دیکھ کر مسحور ہو گیا جو اپنے لباس کی تمام بے لباسی کے ساتھ وہاں موجود تھی...... ڈاکٹر امجد پرویز وہیں سے اٹھ کر گیا تھا اور نہ جانے کس چکر میں پڑ گیا تھا کہ واپس نہیں آسکا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ کہیں اور بیٹھ گیا ہو۔

میں پھر چونکا جب دوسری طرف بھی کوئی آکے بیٹھا اور اس کی کہنی میری کہنی سے ٹکرائی۔ وہ بڑی ہوئی شیو والا ایک بدتمیز قسم کا نیگرو تھا۔ اسے دیکھ کر میرے حواس گم ہو گئے کیونکہ جہاں وہ بیٹھا تھا وہیں میں نے اپنا بریف کیس رکھا تھا۔

سیاہ فام نے تقریباً غرا کے کہا۔ ''مجھے ایسے کیوں گھور رہے ہو...... ادھر دیکھو جدھر پہلے دیکھ رہے تھے۔''

میں نے گھبرا کر اٹھتے ہوئے کہا۔ ''میرا بریف کیس کہاں ہے؟''

وہ پرتمسخر انداز میں ہنسا۔ ''اچھی طرح سوچ لو کہ تم اپنی بیوی کے بارے میں نہیں پوچھ رہے ہو۔''

''شٹ اپ۔'' میں نے سیٹ کے پیچھے جھانک کے کہا۔ ''وہ میں نے اسی سیٹ پر رکھا تھا جس پر اب تم بیٹھے ہو۔''

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''دیکھ لو...... اس کا چورا بھی میرے پیچھے نہیں ہے۔ ویسے یہ سیٹس انسانوں کے بیٹھنے کے لیے ہیں...... بریف کیس کے لیے نہیں۔''

میں اتنا حواس باختہ ہو گیا تھا کہ اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے میں اپنی اور دوسری طرف والی سیٹ کے پیچھے جھانکتا رہا۔ اس نے ایک قاتل مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔ ''بریف کیس کہاں جا سکتا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''خود تو کہیں نہیں جا سکتا۔ مگر کوئی لے جا سکتا ہے۔''

''وہ کیسے...... اگر تم اس کا خیال رکھتے......''

''میں ذرا پڑھنے میں مصروف ہو گیا تھا۔''

وہ مسکرائی...... ''مجھے پڑھنے میں؟...... اندر تک......''

مجھے جھینپنے کی فرصت ہی کہاں تھی، اس خیال سے میرا ذہن ماؤف ہو رہا تھا کہ بریف کیس نہ ملا تو میں سفر کیسے کروں گا۔ اس میں میری تمام سفری دستاویزات تھیں جن کے بغیر یہاں میرا ہونا بھی مشکوک ہو جاتا۔ اچانک میں نے اس سیٹ کو دیکھا جس پر ایک سیاہ فام حسینہ کسی رسالے کے مطالعے میں مستغرق تھی۔ وہاں اب ایک سکھ بیٹھا اپنی داڑھی میں کنگھی کر رہا تھا۔

میں نے بدحواسی میں پوچھا۔ ''سردار جی...... یہاں جو نیگرو لڑکی بیٹھی تھی...... زرد ٹی شرٹ اور جینز میں......''

سردار جی نے قہقہہ لگایا۔ ''وہ میں ہی ہوں، غور سے دیکھو۔''

میں نے کہا۔ ''دیکھو...... مذاق کا وقت نہیں، مجھے شک ہے کہ وہی میرا بریف کیس لے کر چمپت ہو گئی، اس میں میرا سب کچھ تھا۔''

سردار جی نے بے نیازی سے کہا۔ ''اوئے تم بدنام ہمیں کرتے ہو، خود تمہارے بارہ بجے ہوئے ہیں کہ یہاں کھڑے شور کر رہے ہو، جاؤ پولیس کو رپورٹ کرو، اسے تلاش کرو۔''

سردار جی کی حسِ مزاح نے مجھے مزید مشتعل کیا کیونکہ کلاک میں اس وقت واقعی پورے بارہ بجے ہوئے تھے۔ سخت پریشانی میں اپنی بات میں نے ایک پولیس مین کو بتائی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔ اس کے لیے یہ روزمرہ کی معمولی واردات تھی چنانچہ وہ پرسکون تھا اور مجھے بھی کہہ رہا تھا کہ ''ٹیک اٹ ایزی......''

''یہ تمہارے ساتھ ہوتا تو......''

''تو میں یہ بات سمجھ لیتا کہ سفری دستاویزات وغیرہ چور کے لیے بالکل بے مصرف ہیں۔ وہ کیش رکھے گا اپنے پاس...... بریف کیس کہیں چھوڑ دے گا، فکر مت کرو، ہم ابھی اسے تلاش کر لیتے ہیں۔''

اس کی بات میرے دل کو لگی مگر میری بے چینی کم نہ ہوئی۔ ''میں شرط لگاتا ہوں کہ میری بے خبری کا فائدہ اسی سیاہ فام حسینہ نے اٹھایا ہے۔''

''ہار جانے والی شرط لگانے سے نقصان ہو سکتا ہے۔''

اس نے مجھے ایک پولیس پوسٹ میں کرسی پر بٹھا دیا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ کسی فنی خرابی کی وجہ سے جہاز ابھی تک رکا

ہوا تھا۔ پولیس کی مستعدی قابلِ تعریف تھی۔ انہوں نے دو منٹ میں اس خاتون کا حلیہ اور میرے بریف کیس کی تفصیلات کو ایئرپورٹ پر ایسے نشر کر دیا کہ شاید ہی کوئی ہو جس نے اعلان نہ سنا ہو اور جگہ جگہ لگے ہوئے ٹی وی اسکرین پر یہ تفصیل نہ دیکھی ہو۔

میرا دماغ امکانات کے مختلف راستوں پر کسی پاگل کتے کی طرح دوڑ رہا تھا۔ کبھی خیال آتا تھا کہ یہ سازش ہو گی جس کا ایک کردار ڈاکٹر امجد پرویز تھا۔ وہ بیٹھا دوسری طرف تھا مگر اس نے میری توجہ اپنی طرف کرالی تھی اور وہ سیاہ فام لڑکی...... اس کا سارا انہماک پرفریب تھا۔ وہ وہاں اسی لیے بیٹھی تھی۔ کیا اس کا پیشہ یہی تھا یا وہ بطورِ خاص میرا بریف کیس اڑانے پر مامور تھی...... لاحول ولاقوۃ...... بھلا کون چاہتا ہوگا کہ میں لندن سے نہ جاؤں، سوائے ایک نور کے......

میرا ہارٹ فیل اس وقت ہوتے ہوتے رہ گیا جب ہماری قومی ایئرلائن کی طرف سے مسافروں کو جہاز پر تشریف لانے کی دعوت دی گئی، پہلے انگریزی میں...... پھر اردو میں، اس کے بعد فرنچ اور عربی میں...... ابھی تک نہ وہ سیاہ فام حسینہ ملی تھی اور نہ کہیں میرا خالی بریف کیس نظر آیا تھا۔ اس میں شک کا امکان نہیں رہا تھا کہ نواب رفیق احمد شیرازی آف ست بدھائی اس فلائٹ سے وطنِ مالوف کی جانب پرواز نہ فرما سکیں گے۔ خود پولیس نے ایئرلائن انتظامیہ کو یہ اطلاع دی کہ ایک بورڈنگ کارڈ رکھنے والا مسافر جہاز پر نہیں ہوگا۔

میری نظر سے دیکھا جاتا تو وہ سیاہ فام حسینہ ہزاروں مسافروں کے ہجوم میں بھی ایسے نظر آجاتی جیسے آسمان کے ستاروں میں قطبی ستارہ نظر آجاتا ہے۔ اس کی زرد ٹی شرٹ کا رنگ شوخ اور چمکیلا تھا اور جینز کی پتلون کا گہرا نیلا...... یہ بات میں نے پولیس سے کہی تو انہوں نے مجھے ایک مشورہ دیا۔ ''تم خود ایک راؤنڈ لگا کے دیکھو۔''

میں ادھر ادھر بھاگا، لیکن ہیتھرو ایئرپورٹ ایک پورا شہر ہے۔ ہر ایک گھنٹے میں وہاں سے ہزاروں مسافر گزرتے ہیں۔ آنے والے بھی اور جانے والے بھی...... وہ لڑکی نہ جانے کس جہاز پر کہاں پرواز کر رہی ہو گی...... یا لندن میں نہ جانے کہاں میرے بریف کیس کو کھولنے کے بعد مالِ غنیمت شمار کر رہی ہو گی۔

میں مایوس لوٹا۔ ابھی میں پولیس پوسٹ کے باہر ہی تھا کہ پہلے ایک پورٹر مجھ سے ٹکرایا۔ میں سنبھلا تو دوسری طرف سے ٹکر مار کے کسی نے کہا۔ ''سوری نواب صاحب......'' اس کے ساتھ ہی مجھے پیچھے کی طرف شدید چبھن محسوس ہوئی اور ایک دم جیسے میرا پورا جسم مفلوج اور بے جان ہو گیا۔ میں وہیں کٹے ہوئے درخت کی طرح منہ کے بل گر گیا اور اپنی انتہائی خواہش اور کوشش کے باوجود اٹھنے سے قاصر رہا۔ اٹھنا تو دور کی بات ہے، میں اپنا ہاتھ تک نہیں ہلا سکتا تھا، سر نہیں اٹھا سکتا تھا۔

حیرانی کی بات یہ تھی کہ جسمانی طور پر بے حس و حرکت ہونے کے باوجود میرا ذہن مستعد تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ جو چیز مجھے پیچھے سے چبھوئی گئی تھی وہ کوئی فوری اثر کرنے والا انجکشن تھا۔ اس نے میرے اعصابی نظام کو یا زیادہ ٹیکنیکل الفاظ میں...... میرے دماغ کے موٹر نروز کو کنٹرول کرنے والے حصے کو ناکارہ کر دیا تھا...... الیکٹرک شاک کی طرح...... اب میں اپنی مرضی سے لب نہیں ہلا سکتا تھا...... کسی کو یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ میرے ساتھ کیا ہوا تھا، وہ بات نہ کہہ سکتا تھا نہ لکھ سکتا تھا جو میرا دماغ سوچ رہا تھا، میں ایک سازش کا شکار ہوا تھا جو بڑی سائنٹیفک، پرفیکٹ اور کامیاب تھی۔ وہ زرد بلاؤز والی سیاہ فام حسینہ...... ڈاکٹر امجد پرویز...... اور نہ جانے کون اس سازش کے کردار تھے۔

سازش کا نظریہ میرے دماغ کی اختراع یا احمقانہ سوچ کا نتیجہ نہیں تھا۔ کسی نے کہا تھا۔ ''سوری نواب صاحب......'' آخر اس انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر جہاں ساری دنیا سے آنے جانے والے لاکھوں مسافر ہوتے ہیں، کون تھا جو رفیق احمد کو نواب صاحب کہے؟ کون تھا جو مجھے پہچانتا تھا؟ یہ جانتا تھا کہ ست بدھائی کا نواب یہی ہے۔

یہ اور ایسے ہی دیوانہ کرنے والے خیالات کا اژدہام اس وقت بھی تھا جب مجھے پولیس نے ایمبولینس میں منتقل کیا۔ میں بتانا چاہتا تھا کہ میرے ساتھ کیا ہوا مگر میں بے بس تھا۔ وہ پوچھ رہے تھے کہ یہ کون ہے؟...... اس کا نام کیا ہے؟ میرے تمام شناختی کاغذات میرے بریف کیس میں تھے لیکن انہیں میری جیب میں سے موبائل فون بھی نہیں ملا تھا۔ یہ ناقابلِ یقین بات تھی کیونکہ گرنے تک وہ میرے پاس تھا۔ اس میں سارے نمبرز تھے، دوستوں کے...... کاروباری...... پاکستان اور لندن کے...... وہ کس نے نکالا؟ کب اور کیسے؟

''خیر ہم معلوم کر لیں گے۔'' ایک پولیس مین نے کہا۔ ''ایئرلائن ہمیں بورڈنگ کارڈ لینے والے کے بارے میں بتا سکتی ہے۔'' ان کا خیال تھا کہ بریف کیس گم ہو جانے کے صدمے سے مجھ پر دل کا دورہ پڑا ہے، ابھی وہ اسے چوری تسلیم کرنے پر آمادہ نہ تھے۔ پہلے یہ ضروری تھا کہ میری جان

بجائی جائے۔

ایمبولینس کے اندر میں نے سفید کپڑوں میں ایک نرس کو اپنے اوپر جھکا ہوا دیکھا۔ وہاں ایک ڈاکٹر بھی موجود تھا۔ نرس نے آکسیجن لگائی۔ میری بے حسی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ ایک عمر رسیدہ ڈاکٹر نے مجھ سے میرا نام پتا پوچھا۔ وہ میرے گھٹنوں اور ٹخنوں پر ضرب لگاتا رہا۔ ایک چھوٹی سی ہتھوڑی مارتا رہا، نرس کو ہدایات دیتا رہا۔ نرس نے مجھے آکسیجن سلنڈر کے ساتھ کھڑے اسٹینڈ سے پلاسٹک کی ٹیوب اتاری اور میرے بازو میں انجکشن کی سوئی ڈال دی۔ گلوکوز کا شفاف محلول میری رگوں میں اترنے لگا۔ اس میں نہ جانے کیا کیا دوائیں ڈالی گئی تھیں، مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی، میرا دماغ بھی سوگیا۔ میں کسی کو بھی نہ بتاسکا کہ میں کون ہوں اور میرے ساتھ اصل میں کیا ہوا تھا۔ غنودگی میں مجھے یہ احساس ضرور تھا کہ ڈاکٹر بھی اسے ہارٹ اٹیک سمجھ رہے ہیں تو ان کا کیا قصور...... وہاں وہ ظاہری علامات پر ہی علاج کر سکتے تھے۔ باقی ٹیسٹ جن سے ثابت ہو کہ یہ دل کا دورہ نہیں تھا جس نے مجھے مفلوج کیا، اسپتال ہی میں ہوسکتے تھے۔

نیند، بے ہوشی یا موت...... ان میں فرق صرف دورانیے کا ہے ورنہ خود کون جان سکتا ہے کہ پوری طرح ہوش میں آنے تک کتنا وقت گزر گیا۔ جب مجھے تھوڑا بہت ہوش آیا تو میں مفلوج نہیں تھا۔ اس کا یقین میں نے ہاتھ پاؤں ہلا کے کیا۔ میری یادداشت بھی فوراً بحال ہوگئی اور مجھے لندن کے ہیتھرو ائرپورٹ پر پیش آنے والا پورا واقعہ یاد آگیا۔ معلوم نہیں یہ کب کی بات تھی......؟ میں نے سوچا اور کلائی اٹھا کے گھڑی دیکھنے کی کوشش کی جس میں وقت کے علاوہ تاریخ اور دن بھی چلتے تھے، لیکن گھڑی نہیں تھی۔

میں نے روشنیوں سے اندازہ کیا کہ میں کسی اسپتال کے بیڈ پر ہوں، روشنی بہت مدھم تھی...... بیڈ پر بے داغ سفید چادر، سفید تکیہ اور سرخ کمبل اسپتال کی مخصوص نشانی تھے۔ کھڑکیوں پر سفید پردے تھے لیکن پیچھے سے کوئی روشنی نہ آنے کا مطلب تھا کہ رات ہے۔ سامنے والا دروازہ بند ہو کے سفید دیوار کا حصہ بن گیا تھا۔ حیرانی مجھے یہ تھی کہ کمرا بہت چھوٹا تھا۔ مشکل سے دس فٹ لمبا اور چوڑا...... اس کی چھت آٹھ فٹ اوپر ہوگی۔ ایک دیوار کے ساتھ دو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ دوسری کے ساتھ صوفہ تھا، عجیب بات یہ بھی تھی کہ کمرے میں اسپتال کے کمرے والی کوئی چیز نہیں تھی۔ مثلاً آکسیجن پوائنٹ، ڈرپ کے اسٹینڈ، الیکٹرانک مانیٹرز...... اور وہ بو جو اسپتال کا لازمی جزو ہوتی ہے۔

جب میرے سوچنے سمجھنے کی قوت پوری طرح بحال ہوگئی تو میں نے سر گھما کے اوپر نیچے دیکھا۔ وہاں کوئی کال پوائنٹ یا بٹن نہیں تھا جسے دبانے سے کوئی آجائے۔ آخر مجھے ایسا کیوں محسوس ہو رہا ہے کہ میرا بیڈ مرتعش ہے۔ یوں جیسے میں کسی جہاز کے کیبن میں ہوں اور جہاز اڑ رہا ہے۔

میں نے اٹھنا چاہا تو مجھے شدید کمزوری محسوس ہوئی۔ اٹھنے کے ساتھ ہی میں پھر بستر پر گر گیا۔ میری سانس پھول گئی تھی اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا پھیل رہا تھا۔ میں پورا زور لگا کے چلایا۔ ''کوئی ہے......؟''

نرسنگ اردلی کے لباس میں دو سفید پوش نمودار ہوئے جو بے حد مضبوط اور توانا تھے۔ ''یس سر......'' وہ دونوں انگریز تھے۔

''میں کسی ڈاکٹر سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''میں ڈاکٹر ہوں...... بولو کیا بات ہے؟''

''کیا تم بتاسکتے ہو کہ مجھے کیا ہوا تھا؟''

''یہ جان کے تم کیا کرو گے...... تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔'' دوسرے نے گاؤن کی جیب سے ایک انجکشن نکالا۔

''دیکھو...... ٹھہرو...... پہلے مجھے بتاؤ، کیا یہ خواب آور دوا ہے؟...... میں سونا نہیں چاہتا۔''

''تمہیں صحت یاب ہونے کے لیے......''

''میں ٹھیک ہوں......'' میں نے چلا کے کہا۔ ''یہ کون سا اسپتال ہے آخر...... کیا تم نے میرے عزیز و اقارب اور دوستوں کو بتایا ہے؟''

اس نے میرا بازو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ''انہیں مطلع کیا جاچکا ہے۔''

''پھر وہ کہاں ہیں......'' میں نے اپنا بازو چھڑا لیا۔ ''مجھے کوئی فون لا کے دو، زبردستی مت کرو میرے ساتھ...... میں ٹھیک ہوں۔''

''تم ٹھیک نہیں ہو، یہ ہم جانتے ہیں۔''

''نہیں...... تم نہیں جانتے کہ ایئرپورٹ پر کیا سازش ہوئی تھی میرے خلاف...... آخر میں کہاں ہوں؟'' میں نے اپنا بازو چھڑانے کی بے سود کوشش کی مگر انجکشن میری نس میں اتر گیا۔

''تم ایک ہوائی جہاز میں ہو......''

''ہوائی جہاز...... تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟''

''جہاں تم جا رہے تھے...... پاکستان......''

''لیکن...... میری دستاویزات گم ہوگئی تھیں، کیا وہ بریف کیس مل گیا تھا۔''

''یس...... اب تم ایک چارٹرڈ فلائٹ پر ہو، نواب ریٹی۔'' یہ آخری الفاظ میں نے نیم غنودگی میں سنے، پھر کسی نے غصے سے کہا۔ ''ایڈیٹ...... اب اسے ہوش نہیں آنا چاہیے، انجکشن چھ گھنٹے بعد لگا دو۔ مگر اب کیا ضرورت ہے...... ہم اس سے پہلے ہی پہنچ جائیں گے...... کوئی ہنسا...... کسی نے گالی دی۔ کیا انگریز ایسی روانی سے پنجابی کی گالی دے سکتے ہیں؟

میں پھر سوگیا تھا۔ بے ہوش ہوگیا تھا...... یا مرگیا تھا۔ ایک نئی زندگی کا احساس مجھے نئی جگہ ہوا۔ یہ میں نے پہلے نہیں دیکھی تھی...... روشنی اور ہوش ٹکڑوں میں واپس آئے...... اندھیرا...... روشنی...... پھر اندھیرا...... پھر روشنی...... جہاز؟ جہاز گول گول کیوں گھوم رہا ہے......؟ ہاں، میں جہاز میں تھا، چارٹرڈ فلائٹ...... لیکن یہ وہ کمرا ہی نہیں، وہاں تو سب کچھ سفید تھا، یہ بیڈروم ہے، کس کا بیڈروم؟...... میں نے ذہن پر زور دیا لیکن مجھے کچھ یاد نہ آیا۔ میں نے اس کے اسباب اور سامانِ آرائش کی اس ترتیب کو پہلے نہیں دیکھا تھا۔

آخر میں کہاں ہوں...... میں نے سوچنا شروع کیا۔ واقعات ابتدا سے میرے ذہن کے پردے کی فلم پر چلنے لگے۔ ہیتھرو ایئرپورٹ۔ وہ سیاہ فام لڑکی جس نے زرد بلاؤز پہن رکھا تھا۔ ڈاکٹر امجد پرویز، بریف کیس کی گم شدگی...... پھر پولیس پوسٹ کے سامنے کسی کا مجھ سے ٹکرانا، وہ چبھن اور بے حسی، پھر وہ چہرے جو مجھے یقین دلانے پر مصر تھے کہ میں ایک چارٹرڈ جہاز کی اسپیشل فلائٹ سے واپس جا رہا ہوں، جھوٹ...... سب جھوٹ...... ایئرپورٹ پر کس نے مجھے کہا تھا نواب صاحب...... اور پنجابی میں گالی دینے والا بھی انگریز ہرگز نہیں ہوسکتا۔

اب میرے لیے شک و شبے کی کوئی بات نہیں رہی تھی کہ مجھے ایئرپورٹ پر پاکستان جانے سے روکنے کے لیے وہ بریف کیس چرالیا گیا تھا جس میں میری تمام سفری دستاویزات تھیں۔ مجھے ایئرپورٹ سے اغوا کر کے واپس لے جایا گیا تھا اور میں کہیں لندن کے مضافات میں قید تھا...... لیکن کیسے؟ میں تو پولیس کی تحویل میں تھا۔ پولیس نے مجھے ایمبولینس میں اسپتال بھیجا تھا۔ وہ بہ آسانی پی آئی اے کے کاؤنٹر سے معلوم کرسکتے تھے کہ نہ پہنچنے والا وہ مسافر کون تھا جس نے بورڈنگ کارڈ لے لیا تھا۔ سیٹ بک کراتے وقت میں نے ساری تفصیل دی تھی۔ اپنا نام...... پاسپورٹ نمبر...... سیل فون نمبر، ہو نہ ہو وہ ایمبولینس انہی کی ہوگی جو ایئرپورٹ پر اپنا جال بچھائے بیٹھے تھے۔

میں آہستہ آہستہ اٹھ بیٹھا۔ یہ تکان تھی یا کمزوری، میرے جسم میں جیسے جان ہی نہیں تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ میں نے کھڑا ہونے کی کوشش کی تو گر جاؤں گا۔ پھر بھی میں دیوار کا سہارا لے کر اٹھا۔ زمین میرے پیروں کے نیچے ہلنے لگی۔ روشنی غائب ہوگئی۔ میں نے دیوار کو پکڑے رکھا۔ میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں مگر میں گرا نہیں۔ آہستہ آہستہ اندھیرا دور ہوگیا۔ یہ ضرور دواؤں کا اثر تھا، ایسی کمزوری تو طویل بیماری کے بعد بھی محسوس نہیں ہوتی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ نہ میں ہوش میں آؤں یا ہوش آجائے تو فرار یا مقابلے کے قابل نہ رہوں۔

میں پھر بیڈ کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ اگر میں لندن ہی میں ہوں تو کیا یہ بات نور کو معلوم ہے؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اسے پتا نہ چلے۔ میرا سیل فون جس میں نور کا، رابعہ کا، سوٹی کا اور درجنوں دوسرے نمبر تھے نکال لیا گیا تھا اور میرا والٹ جس میں کارڈز تھے، پاسپورٹ اور انٹرنیشنل ڈرائیونگ لائسنس تھا، ان سب نے کچھ تو کیا ہوگا جب یہ معلوم ہوا ہوگا کہ میں لندن سے روانہ ہی نہیں ہوا اور کراچی بھی نہیں پہنچا۔ اسلام آباد یا لاہور بھی نہیں پہنچا، میں نے اس فلائٹ کو مس کر دیا۔

اب یہ کارروائی کس نے کی؟...... اور یہ بات کتنی پرانی ہوگئی، سب اغوا کاروں کی طرح مجھے یہاں لانے والوں نے بھی مجھے دنیا کے علاوہ ٹائم سے کاٹ دیا تھا۔ نہ مجھے دن کا پتا تھا نہ رات کا۔ نہ وقت کا اور نہ دن کا۔ اب مجھے پیاس لگ رہی تھی۔ میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ شاید یہ بھوک تھی کہ میرے پیٹ میں گرہیں سی پڑ رہی تھیں۔

آہستہ آہستہ دیوار کے سہارے چل کر میں ایک کھڑکی تک گیا۔ اس کے شیشوں سے باہر کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ باہر کی طرف سیاہ پینٹ تھا یا کالے رنگ کا کاغذ چسپاں کر دیا گیا تھا۔ ذرا آگے پردے کے پیچھے ایک دروازہ تھا۔ وہ بند اور مقفل تھا۔ میں نے اس پر دستک دی۔ کوئی ہے، کوئی ہے چلایا...... نہ کسی نے جواب دیا نہ کوئی آیا۔

دوسری طرف مخالف دیوار کے ساتھ مجھے ایک اور دروازہ ملا، یہ باتھ روم تھا، اندر جا کے میں نے واش بیسن پر جھک کے دونوں ہاتھوں میں پانی لے کر منہ دھویا۔ پھر اس پانی کے چند گھونٹ پیے جو صاف ہی نظر آرہا تھا۔ اس سے میری سانس میں بہتری آئی، میں نے اپنے چہرے کو دیکھا۔ میں برسوں کا بیمار نظر آتا تھا۔ میری آنکھوں کے گرد حلقے تھے اور میرے بال پریشان تھے، میری شیو اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ خشخشی ڈاڑھی جیسی نظر آتی تھی۔ یہ دو چار دن میں بڑھنے والی

شیو نہیں تھی۔ شاید میرے اغوا کاروں سے یہی ایک غلطی ہوئی تھی ورنہ وہ میری شیو بھی بنوا دیتے۔ اب مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ میں نے کم سے کم ایک ہفتے سے شیو نہیں کی۔ میرے کپڑے بھی وہی تھے۔

باہر سے میں نے ایک خفیف سی آہٹ سنی۔ جیسے کوئی دروازہ بند کر کے باہر گیا ہو، میں باتھ روم سے نکلا تو مجھے بیڈ کے قریب میز پر کھانے پینے کی چیزیں رکھی ہوئی دکھائی دیں جو پہلے وہاں نہیں تھیں۔ ایک مگ میں گرم کافی تھی، ایک پلیٹ میں سینڈوچ تھے۔ مگ سے اٹھنے والی مہک نے میری اشتہا کو بڑھا دیا۔ میں نے سینڈوچ کی پلیٹ صاف کر دی اور کافی کا مگ خالی کر دیا۔

میری نظریں چھت اور دیواروں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ ضرور وہاں کہیں کلوز سرکٹ کیمرا نصب تھا جس پر میری نقل و حرکت کی نگرانی کی جا رہی تھی۔ مجھے واش روم جاتا دیکھ کے کوئی بڑی خاموشی سے آیا اور یہ سب چیزیں رکھ کے پھر نکل گیا۔ میرا خیال تھا کہ کھانے سے توانائی ملے گی لیکن کچھ دیر بعد مجھ پر غنودگی کا غلبہ ہونے لگا۔ یقیناً کافی میں کوئی خواب آور دوا شامل تھی۔

وقت اور مقام کا میرے ذہن میں کوئی تصور نہ رہا۔ نہ جانے کتنی بار میں جاگا اور سویا۔ میری عدم موجودگی میں یعنی اس وقت جب میں عالم خواب میں ہوتا تھا کوئی آ کے میرے لیے پانی اور خوراک رکھ جاتا تھا۔ حوائج ضروریہ کے لیے میں باتھ روم تک بڑی مشکل سے جاتا تھا۔ بھوک مجھے لگتی ہی نہ تھی مگر میں زندہ رہنے کے لیے کھا لیتا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کھانے میں بے ہوشی کی دوا ملی ہو گی۔ کھانا ہر روز ایک جیسا ہوتا تھا۔ ایک روٹی اور پیالی میں پتلی بدذائقہ دال، میرے ساتھ عملاً وہی سلوک کیا جا رہا تھا جو سرکاری جیل میں اخلاقی مجرموں کے ساتھ ہوتا ہے۔ مقصد اعصابی طور پر میری مزاحمت کی قوت کو شکست دینا تھا۔

میں یہی سمجھتا تھا کہ امید کے لیے زندگی کی شرط ہے، لیکن میں اپنی شخصیت میں رونما ہونے والی تبدیلیوں سے بے خبر نہ تھا۔ میری صحت جواب دے رہی تھی۔ میں جسمانی طور پر کمزور ہوتا جا رہا تھا اور اسے اپنے حق میں اچھا سمجھتا تھا کہ نشہ آور دوا ملا ہوا کھانا کھاؤں اور سو جاؤں، وقت کا زیادہ حصہ سو کے گزارا جا سکتا تھا۔ جاگنا پڑتا تو میں ایک ایک سیکنڈ گنتا اور سوچتا رہتا۔ اس کے باوجود میری قوتِ برداشت اب ختم ہونے لگی تھی۔

میں جاننا چاہتا تھا کہ آخر کون ہے جو مجھے قید میں ڈال کے بھول گیا ہے۔ مجھے قید کرنے والا کون ہے اور مجھ[...] چاہتا ہے، صرف ایک بات واضح تھی کہ وہ میری موت[...] چاہتا تھا ورنہ خواب آور دوا کی جگہ کوئی زہر بھی کھانے [...] جا سکتا تھا جو مجھے ہمیشہ کی نیند سلا دے۔ مایوسی کی بات [...] کہ ابھی تک کسی کو بھی میرے بارے میں علم نہ تھا کہ میں [...] ہوں ورنہ کوئی آ جاتا۔

بارہا مجھ پر شدید ڈپریشن میں دیوانگی کے دورے پڑے، میں چلاتا رہا۔ گالیاں بکتا رہا۔ انہیں آواز دیتا [...] شاید وہاں تھے ہی نہیں یا میری آواز سن کے طمانیت [...] کرتے تھے کہ انہیں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو [...] ہے، میری جسمانی قوت بھی زائل ہو رہی تھی اور میں دیکھ [...] تھا کہ میرا جسم گھل رہا ہے۔

ایک دن میں باتھ روم جانے کے لیے اٹھا تو دیوار [...] پکڑنے کے باوجود فرش پر گر گیا۔ میری ٹانگوں میں اتنا دم [...] نہیں رہا تھا کہ میرے وجود کا بوجھ سنبھال سکیں۔ میں دیر [...] رہا اور پھر رونے لگا کیونکہ میرا پیشاب خطا ہو گیا تھا اور [...] قابل نہ تھا کہ اٹھ سکوں۔ مجھ پر غشی سی طاری ہو گئی، پھر ہوش [...] آیا تو میرے کپڑے غلاظت میں بھرے ہوئے تھے۔ خدا...... آخر یہ میرے کس جرم کی سزا ہے کہ میں باعزت [...] شریفانہ طریقے پر مر بھی نہیں سکتا۔ کون ہے جو مجھے اس ذلت [...] کے ساتھ مرتا دیکھ کے خوشی اور تسکین حاصل کر رہا ہے اور [...] نے واقعی چاہا کہ اب آنکھ بند ہو تو پھر صورِ اسرافیل سے کھلے [...] دنیا میرے لیے اور میں دنیا کے لیے ختم ہو چکا تھا۔

بس وہی وقت تھا جب خدا نے میری سن لی۔ میری [...] جو یقیناً کسی گناہ کی پاداش میں تھی، تمام ہونے کا حکم جاری [...] ہوا۔ میری آنکھ کھلی تو گرد و پیش میں کوئی تبدیلی نہیں آئی [...] لیکن میں صاف ستھرے کپڑوں میں تھا اور کمرے میں [...] بھی نہیں تھی۔ میرا بیڈ بھی بدلا ہوا تھا۔ کمرا پہلے سے زیادہ [...] روشن تھا۔

مگر اس وقت میری آنکھوں نے جو دیکھا وہ سراب جیسا تھا۔ ایک ایسا منظر جو درحقیقت کوئی وجود نہیں رکھتا تھا [...] صحرا کے مسافر کو جان لیوا پیاس میں پانی نظر آتا ہے۔ ٹھنڈا [...] میٹھا زندگی بخش امرت...... مجھے رابعہ دکھائی دی، یہ کچھ عجیب [...] تھا، خواہش کو مددگار کا روپ دھارنا ہی تھا تو رابعہ کیوں؟ میں [...] نے تصور میں راجا کو یا نور کو کیوں نہیں دیکھا؟

ایک بار پھر میں نے آنکھیں کھولیں تو رابعہ دکھائی دی [...] اب وہ کرسی پر نہیں بیٹھی ہوئی تھی، دونوں ہاتھ سامنے باندھے [...] کمرے میں ٹہل رہی تھی اور اس کے تر و تازہ چہرے [...]

مسکراہٹ تھی۔ اس نے زرد قمیص کے ساتھ نیلی شلوار پہن رکھی تھی اور اس کے شانے پر شلوار کے رنگ کا دوپٹا پڑا ہوا تھا۔

میں نے نظر جما کے دیکھا۔ ”رابعہ...... یہ تم ہو...... یا میرا خیال......“

وہ ایک دم پلٹی اور میرے قریب آ کے مجھ پر جھک گئی۔ ”چھو کے دیکھو مجھے کزن...... میں خیال ہوں یا حقیقت۔“

میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”مجھے پتا تھا کہ کوئی آئے گا۔“

اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا اور تلخی سے ہنسی۔ ”لیکن یہ نہیں پتا ہو گا کہ میں آؤں گی۔“

”ہاں...... مجھے راجا کا خیال آتا تھا۔“

”یا نور کا؟...... تمہارے سب سے بڑے خیر خواہ تو وہی ہیں نا...... لیکن وہ یہاں نہیں آ سکتے نواب صاحب......“

”چلو اچھا ہے تم آ گئیں، خدا نے میری سن لی۔“

”نہیں کزن...... خدا نے اب میری سنی، اس سے پہلے وہ صرف تمہاری سنتا رہا۔ تم کہو گے یہ کفر کا کلمہ ہے۔ میں خدا پر ناانصافی کا الزام نہیں عائد کر رہی ہوں۔ نعوذ باللہ، مجھے معلوم ہے کہ اس کے ہاں دیر ہے اندھیر نہیں ہے، اس نے مجھے آزمایا، میرا صبر دیکھا...... وہ ظلم دیکھا جو میرے ساتھ ہوا اور آج یہ دن آ گیا کہ میں تم سے جواب مانگوں۔“ بولتے بولتے اس کی آواز بلند ہو گئی۔

میں اسے دیکھتا رہا۔ ”تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔“

”آ جائے گی، لو کافی پیو۔“ اس نے ایک تھرمس میں سے میرے لیے مگ بھرا۔ ”ڈرو نہیں، میں بھی پیوں گی تمہارے سامنے۔ اس میں کوئی بے ہوشی کی دوا نہیں ہے۔“

میں بڑی مشکل سے اٹھ کر بیٹھا۔ کافی کا مگ میرے ہاتھوں میں لرز رہا تھا لیکن اس کی مہک مجھے دیوانہ کر رہی تھی۔ دن رات کافی پینے والا، اچھی سے اچھی کافی کا شوقین، نہ جانے کتنا عرصہ اس سے محروم رکھا گیا۔ کئی ہفتے یا کئی مہینے۔ میں نے بڑے ندیدے پن سے تیز گرم کافی کا پہلا مگ ختم کیا اور آگے بڑھا دیا۔ ”اور ہے......؟“

رابعہ نے پھر میرا مگ بھر دیا۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی...... اس کی آنکھیں مجھے دیکھ رہی تھیں لیکن رفتہ رفتہ مجھ پر عیاں ہو رہا تھا کہ ان آنکھوں میں میرے لیے رحم یا دوستی اور محبت کے جذبات نہیں ہیں۔ غصہ ہے نفرت ہے اور کینہ ہے...... کافی مجھے جسمانی طور پر ہی نہیں ذہنی طور پر بھی میری صلاحیت کو بہتر بنا رہی تھی۔

”کیا اب تمہیں اندازہ ہوا...... کہ تم کہاں ہو؟“ رابعہ نے زہر آلود لہجے میں سوال کیا۔

”نہیں......“

”تم میری قید میں ہو کزن......“ رابعہ پھنکاری۔ ”اور میں مذاق نہیں کر رہی ہوں۔“

میرا دماغ اس خوفناک حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے اصرار کرنے لگا تو میں نے پوچھا۔ ”میں کیسے مان لوں؟“

”میں کب آپ سے التجا کر رہی ہوں کہ آپ مانیں...... نہ مانو تم...... مگر حقیقت تمہارے سامنے آ چکی ہے۔“

”کیا تم مجھے بتاؤ گی۔ میں کہاں ہوں، پاکستان میں یا لندن میں......؟“ میں نے کہا۔

وہ بولی۔ ”اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ تمہارا یہ قید خانہ کس شہر یا ملک میں ہے۔ اگلا سوال تم یہ کرو گے کہ تم کب سے قید میں ہو، میں کہوں ایک مہینا تو کیا اور ایک سال بتاؤں تو کیا...... تم یقین کرو تو فرق نہیں پڑتا اور نہ کرو تب بھی...... یہ ضرور سمجھ لو کہ یہاں تمہارے کسی خیر خواہ کے خیال کا بھی گزر نہیں ہو سکتا، کوئی تمہیں بچا نہیں سکتا...... اہم یہ ہے...... کہ میں نے ایسا کیوں کیا...... یا کیسے کیا......“

”کیوں کیا...... اس کا اندازہ ہو رہا ہے مجھے...... کیسے کیا...... یہ واقعی سمجھ میں نہیں آتا۔“

وہ ہنسی...... ”دنیا میں ناممکن کچھ بھی نہیں کزن...... اور مارے وہی لوگ جاتے ہیں جو حد سے زیادہ خود اعتمادی میں مبتلا ہو جائیں، تم سے دو غلطیاں سرزد ہوئیں، ایک یہ کہ تم نے میرا حق مارا، مجھ پر ظلم کیا اور اسے اپنی کامیابی سمجھا۔ دوسری غلطی تم نے مجھے سمجھنے میں کی، تم نے تسلیم کر لیا کہ میں ایک ناقص العقل ناتجربہ کار لڑکی ہوں، سب کچھ نوشتۂ تقدیر سمجھ کے قبول کر چکی ہوں، صبر اختیار کرتے ہوئے میں نے تمہارے سہارے پر زندگی گزارنا منظور کر لیا ہے۔“

”جسے تم نے میری پہلی غلطی قرار دیا ہے، اسے میں تمہاری غلط فہمی قرار دیتا ہوں کزن......“

وہ ایک دم مجھ پر خونخوار انداز میں حملہ آور ہوئی۔ ”اب بھی یہ میری ہی غلط فہمی ہے، کمینے خود غرض شیطان......“ اس نے اپنے ناخن والے پنجوں سے میرا چہرہ نوچنے کی کوشش کی۔

میں نے کہنی سامنے کر کے خود کو بچایا۔ ”رابعہ...... اسٹاپ دس......“

اس کے ہاتھوں نے میری گردن دبوچ لی۔ ”جان سے مار دوں گی میں تمہیں یہیں اور کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔“

میں نے اسے اپنے کمزور ہاتھوں سے دور دھکیلا لیکن میرے جسم میں اس کی وحشیانہ قوت کا مقابلہ کرنے کی سکت

ہی نہ تھی۔

اس نے خود ہی مجھے چھوڑ دیا۔ ''پھر ایسا مت کہنا۔'' وہ پھولی ہوئی سانس کے ساتھ بولی۔ ''میں یوم حشر تک انتظار کرتی؟ سمجھو تمہارے لیے وہ دن آگیا۔''

میں نے آستین سے چہرے کی خراشوں کو صاف کیا۔

''اور آج کوئی نہیں ہے جو تمہیں بچائے۔ تم تو بڑے تمیں مار خان بنتے تھے۔ بلیک بیلٹ...... خالی ہاتھوں سے ایک دو نہیں چار چھ کو گراتے تھے۔ آج اتنا دم ہے تمہارے ہاتھوں میں کہ ایک لڑکی کا مقابلہ کرسکو......؟''

میں نے لمبے لمبے سانس لیے۔ ''اسی لیے تم نے مجھے اس قابل نہیں چھوڑا۔''

''ہاں...... آزمانا ہو تو اٹھو اور آؤ میرے مقابلے پر...... ایک ہاتھ ماروں گی تو جا کے دیوار سے لگو گے...... کسی غلط فہمی میں مت رہنا، اتنا ماروں گی ہنٹر سے کہ چمڑی اتار دوں گی...... اور اسے شیخی بھی مت سمجھنا، دیکھو تمہیں کہاں سے اٹھایا میں نے...... اٹھوایا...... لندن کے ایئرپورٹ پر ہزاروں افراد کے بیچ میں سے، کوئی کچھ نہیں کرسکا اور تمہیں کہاں لے آئی...... کتنی پرفیکٹ پلاننگ تھی میری، کتنی اچھی ٹیم تھی جس نے یہ کام کیا، بے شک پیسا لے کر، مگر دنیا میں پیسے کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوتا۔''

رابعہ کی زبان سے نکلنے والا ہر لفظ ایک نشتر تھا۔ یہ یقیناً اذیت کا باعث تھا، اس سے زیادہ حیرانی کا سبب تھا، ایسا ہوگیا تھا مگر ابھی تک میں یہ ماننے کے لیے تیار نہ تھا کہ رابعہ جیسی لڑکی نے اس کو پلان کیا ہوگا، ست بدھائی میں بیٹھ کے اس نے لندن میں میرے معمولات کی خبر رکھی، ایسے افراد سے رابطہ کیا جو مجھے ہیتھرو کے ایئرپورٹ سے اٹھا کے لا سکتے تھے اور اس کی خدمت میں پیش کرسکتے تھے...... کون تھے وہ لوگ؟...... کیا معاوضہ لیا ہوگا انہوں نے...... وہ زرد بلاؤز والی سیاہ فام حسینہ، ڈاکٹر امجد پرویز...... مجھے ایمبولینس میں لے جانے والے...... ان سب نے مل کر اغوا کا ایسا کامیاب ڈراما کیا، اس کا اسکرپٹ کس کے ذہن کی پیداوار تھا، رابعہ اتنی صلاحیت نہیں رکھتی تھی۔ یہ میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا تھا کیونکہ میں اسے پیدائش کے روز اول سے جانتا تھا، یقیناً اس کے خیال کو عملی جامہ پہنانے میں کسی اور کی مدد شامل تھی۔ وہ جو اس سازش کا ماسٹر مائنڈ تھا...... وہ کون تھا؟

رابعہ ایک دم اٹھی۔ ''مجھے جانا چاہیے، کافی دیر ہوگئی۔''

میں نے کہا۔ ''تھوڑی دیر ٹھہرو۔''

وہ پلٹ کے مسکرائی۔ ''میں پھر آؤں گی، تمہیں اپنے ہر سوال کا جواب دوں گی، ابھی میں کسی کو شک میں مبتلا نہیں کرسکتی۔''

''رابعہ...... نور کیسی ہے؟''

''نور......؟ ٹھیک ہی ہوگی، اچھی خاصی کوشش کر رہی ہے وہ بھی لیکن کب تک...... رو دھو کے صبر کرلے گی...... اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے، اس کے ساتھ بھی ہوگا، اس کی فکر کیوں کرتے ہو، اسے تو بہت مل گیا، بن مانگے مل گیا۔ لندن میں رہے گی تو عیش سے زندگی گزارے گی۔ سارے کاروبار کی مالک ہوگی۔ تم سے لاکھ درجہ بہتر چاہنے والا مل جائے گا اسے، تم میرے بارے میں سوچو یا اپنے بارے میں۔''

''کیا سوچوں یہ بھی بتا دو......''

''تم جانتے ہو، پھر بھی مجھ سے سننا چاہتے ہو تو انتظار کرو۔ میں نے بھی یہ طے نہیں کیا ابھی تک کہ تمہارا کیا کروں، اب رحم یا لحاظ نام کی کوئی چیز تو میرے دل میں رہی نہیں...... کہ میں تمہیں زندہ چھوڑوں...... لیکن تمہیں زندہ رکھنا بھی ضروری ہے۔'' اس نے دروازہ کھولا اور باہر نکل گئی۔

میں بہت دیر تک خالی الذہن ساکت پڑا رہا۔ جو کچھ میں نے دیکھا اور سنا تھا ناممکن اور ناقابل یقین لگتا تھا...... ایک بھیانک خواب کی طرح تھا لیکن حقیقت یہی تھی کہ رابعہ نے مجھے اغوا کرالیا تھا اور اب میں اس کا قیدی تھا، یہ بات ابھی تک کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔

اس نے جانے کی بات کر کے خود ہی مجھے بتا دیا تھا کہ اب میں لندن میں نہیں ہوں۔ کہیں ست بدھائی کے نزدیک ہوں...... یا شاید ست بدھائی میں ہوں، کسی قید خانے میں...... حویلی میں یا اس کے بہت نزدیک۔ یہ جگہ نئے اسپتال کا حصہ بھی ہوسکتی تھی۔ جب میں گیا تھا تو اس کی توسیع و تعمیر کا کام جاری تھا۔ اس میں تہ خانے بھی ہوں گے، اسٹور بھی گراؤنڈ فلور کے نیچے بنائے جاسکتے ہیں، کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ اوپر میری اپنی دنیا کے لوگ ہیں، راجا اور شہناز...... ڈاکٹر مہدی حسن اور احمد حسن اور انہیں معلوم ہی نہیں کہ میں واپس آگیا ہوں۔

مگر میں واپس کیسے آگیا؟ جس فلائٹ سے مجھے آنا تھا وہ تو میں نے مس کردی تھی۔ میری تمام سفری دستاویزات چھن لی گئی تھیں۔ کیا مجھے انہی دستاویزات کو استعمال کر کے لایا گیا؟ میرے دماغ میں جو خیال ہے کہ میں کسی جہاز پر تھا اور وہ چارٹرڈ فلائٹ تھی، وہ غلط نہیں تھا لیکن لندن سے یہاں تک

چارٹرڈ فلائٹ لانا ممکن نہیں، پچاس لاکھ یا ایک کروڑ دے کے بھی۔

خیر...... ابھی مجھے اس میں سر کھپانے کی کیا ضرورت ہے کہ میں یہاں کیسے پہنچا، کب پہنچا۔ یہ بھی معلوم ہو ہی جائے گا کہ رابعہ نے اتنا بڑا قدم کیسے اٹھایا، کس کی مدد سے اٹھایا۔ غور طلب یہ ہے کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟ ظاہر ہے وہ اپنا حق مانگے گی، جو خیال ابتدا سے اس کے دماغ میں کیڑے کی طرح رینگ رہا تھا کہ میں نے اس کی حق تلفی کی، وہ کیڑا ایک اژدھا بن چکا ہے۔ وہ پاگل ہوگئی ہے، کیا اس طرح زبردستی وہ مجھ سے کچھ لے سکتی ہے؟

اس کا جواب نفی میں ہونے کے باوجود نفی میں نہیں تھا کیونکہ کچھ نہیں...... وہ مجھ سے سب کچھ بھی لے سکتی تھی، میرے نہ ہونے کی صورت میں ست بدھائی کی قانونی وارث وہی بنتی تھی مگر میرا نہ ہونا اس کے لیے کافی نہیں تھا۔ یہ ضروری ہوگا کہ وہ میرا ڈیتھ سرٹیفکیٹ پیش کرے، میری ڈیڈ باڈی کے بغیر یہ سرٹیفکیٹ کہاں سے ملے گا...... اور میری یہ جیتی جاگتی باڈی اگر ڈیڈ باڈی بنے گی تو اس کے اسباب ہوں گے، جو طبعی نہیں ہوں گے تو پھر تفتیش کا سلسلہ ہوگا، نہ راجا کسی کو بخشے گا اور نہ نور چپ بیٹھے گی۔ لندن سے پاکستان تک اور پاکستان سے لندن تک قانون کی مشنری حرکت میں آجائے گی۔

دوسرا طریقہ ہے میرے لاپتا ہونے کا، میری پراسرار گمشدگی کا...... بفرض محال ایسا ہو تو رابعہ کو سات سال انتظار میں گزارنے ہوں گے۔ جہاں تک مجھے علم تھا لاپتا ہوجانے والوں کے کیس میں سات سال بعد عدالت میں یہ درخواست دائر کی جاسکتی تھی کہ اب انہیں مردہ قرار دے دیا جائے، اس کے بعد ہی حق وراثت کا معاملہ اٹھانے کی نوبت آتی ہے۔ رابعہ اتنا طویل عرصہ کیسے گزارے گی...... اور ایک اس کے چاہنے سے کیا ہوگا جب تک راجا جیسے دوست ہیں اور نور جیسی لڑکی...... وہ اس کا جینا محال کردیں گے۔

اب میرا دماغ کام کر رہا تھا تو میں اس نتیجے پر پہنچا کہ رابعہ نے مجرمانہ حماقت کے سوا کچھ بھی نہیں کیا۔ زبردستی وہ مجھ سے جس کاغذ پر چاہے دستخط کرائے، زمین جائداد کسی عدالت میں محض دستخطوں پر ایسے نہیں مل جاتے جیسے بیرر چیک سے کیش مل جاتا ہے۔ اصل مالک اپنی پراپرٹی کسی کو بیچنا چاہے یا تحفے میں دے...... ٹرانسفر کے لیے اس کا خود عدالت میں پیش ہونا ضروری ہے۔

پتا نہیں ایسا خطرناک جرم کرنے کا مشورہ اور پلان دینے والا کون تھا۔ رابعہ کے دماغ پر کوئی پابندی نہیں، وہ کچھ بھی سوچے لیکن کسی خیال پر عمل کی راہ میں عملی مسائل کے پہاڑ آجاتے ہیں۔ انہیں عبور کرنا فقط آرزو کی بات نہیں ہوتی۔

میں نے اپنے خیالوں کو منظم کیا۔ مانا کہ رابعہ نے ایک انتہائی خطرناک مجرمانہ قدم اٹھالیا۔ کیسے اٹھایا، یہ بعد میں سامنے آجاتا۔ اس کا اگلا قدم کیا ہوگا؟ وہ کہے گی آدھی جائداد جاگیر میرے نام کرو...... یا اس کا مطالبہ ہوگا کہ یہ سب مجھے دو اور خود لندن دفع ہوجاؤ۔ اس کے مطالبے سے تو کچھ نہیں ہوتا مگر میرے انکار سے خرابی ہوسکتی ہے۔ وہ بے عقل عورت کوئی انتہائی قدم اٹھا سکتی ہے۔

چنانچہ مجھے اس کی بات سنجیدگی سے سنتے ہوئے اس کی مان لینے کا ڈراما کرنا چاہیے۔ مجھے پہلے خود کو بچانے کا سوچنا چاہیے، جاگیر اور حویلی، روپیا پیسا کاروبار، یہ کہیں نہیں جاتے...... جو میرا ہے میرا ہی رہے گا، مجھے اس کو سمجھانا چاہیے، نور بھی اسے یقین دلا سکتی ہے کہ ہم نے تو پہلے ہی یہ طے کرلیا تھا کہ رابعہ لندن کا سارا بزنس لے لے۔ اگر وہ ڈاکٹر احمد سے شادی کرلے تو اس کے حق میں مزید بہتر کیونکہ وہ کافی عرصہ لندن میں گزار چکا ہے۔

آہستہ آہستہ میرا دماغ پرسکون ہونے لگا۔ اپنا ردعمل مجھ پر واضح ہوچکا تھا۔ مجھے خود کو بچانا تھا، رابعہ کچھ بھی کہے اس سے اتفاق کرنا تھا...... اس کی ہر بات کے سامنے سر تسلیم خم کرنا تھا لیکن ایسے کہ اسے شک نہ ہو...... بلاشبہ احساس محرومی نے اسے پاگل پن کی اس انتہا تک پہنچا دیا تھا جہاں وہ ناممکن کو ممکن سمجھ رہی تھی۔

جو سوال مسلسل میرے ذہن میں گردش کر رہا تھا، یہ تھا کہ آخر لندن میں رابعہ کی مدد کرنے والا کون تھا۔ میرا اغوا کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا۔ ایک آدمی یہ کام نہیں کرسکتا۔ یہ پروفیشنل کام تھا جو کوئی گروہ کرسکتا تھا...... ایسے کسی گروہ سے رابطہ کس نے کیا اور کیسے، یہ تو ہو نہیں سکتا تھا کہ رابعہ نے یہاں سے فون کر کے معاملات طے کرلیے ہوں کہ نواب رفیق فلاں دن فلاں فلائٹ سے روانہ ہو رہے ہیں۔ ان کو ایئرپورٹ سے اٹھا کے میرے پاس پہنچا دو۔ کتنے پیسے لوگے اس کام کے؟

میری توانائی خاصی بحال ہوگئی تھی کیونکہ ڈرگ کافی ہنسے سے نشہ آور دواؤں کا اثر زائل ہوگیا تھا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی اور میں کسی سہارے کے بغیر کھڑا ہونے میں کامیاب رہا۔ پھر میں اپنے قدموں سے دیوار پکڑے بغیر

باتھ روم گیا۔ میں نے ہاتھ منہ دھو کے اپنا چہرہ دیکھا۔ میری شیو بھی بنادی گئی تھی چنانچہ اپنا عکس مجھے اجنبی نہیں لگا۔

جب میں باہر آیا تو کھانا موجود تھا۔ مجھے کچھ حیرانی ہوئی۔ کوئی اتنی خاموشی سے آیا اور چلا گیا۔ اسے کیسے معلوم ہوا کہ میں باتھ روم میں ہوں؟ ظاہر ہے اس نے مجھے جاتا دیکھا، وہ کسی دروازے کی جھری سے آنکھ لگائے نہیں کھڑا تھا۔ کہیں سے ایک کلوز سرکٹ ٹی وی نے اسے سب دکھایا۔ میں نے اوپر چھت اور دیواروں کی طرف دیکھا مگر خفیہ کیمرا نظر نہ آیا۔ وہ کسی لائٹ کے شیڈ میں بھی ہوسکتا تھا۔ ٹیبل لیمپ میں بھی، چھت کے پنکھے میں بھی۔

کھانا بھی اب مختلف تھا اور بہتر تھا، میں نے سب صاف کر دیا اور پھر بھی بھوکا رہا۔ اس کے اثرات تقریباً آدھے گھنٹے میں ظاہر ہونے لگے۔ میں نے خواہ مخواہ یہ فرض کرلیا تھا کہ اب مجھے نشہ آور دوا نہیں دی جائے گی...... میں پھر سو گیا۔

جب میں دوبارہ جاگا تو نہ جانے کتنا وقت گزر چکا تھا، ایک بار پھر نقاہت مجھ پر غالب تھی۔ رابعہ غالباً یہی چاہتی تھی کہ میری جسمانی قوت اتنی بھی نہ رکھی جائے کہ میں اس کا گلا دبوچ لوں، اسی یقین کے ساتھ وہ مجھ پر حملہ آور ہوئی تھی کہ میں اپنا دفاع بھی نہیں کرسکتا۔ اسے کیا نقصان پہنچاؤں گا۔

کلوز سرکٹ کیمرے میں خود کو بیدار دکھانے کے لیے میں اٹھ بیٹھا۔ اس کا نتیجہ فوراً رابعہ کی صورت میں سامنے آیا۔ وہ دروازہ کھول کے اندر آگئی اور میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کا لباس اب بدلا ہوا تھا لیکن عزائم وہی تھے۔ ان کا اظہار اس کی آنکھوں سے ہوتا تھا۔ اس کے وجود میں غصہ بھر گیا تھا۔ مسلسل اپنے احساس محرومی کو برداشت کرتے کرتے اور اپنی دانست میں ناانصافی کو سہتے سہتے اس کے رویے سے کبھی میں اندازہ نہ کرسکا کہ وہ میرے خلاف دل میں کتنے شدید جذبات رکھتی ہے لیکن رفتہ رفتہ اس کی قوت برداشت کا پیمانہ چھلکنے لگا تھا۔ کبھی کبھی اس کی زبان سے ان جذبات کا اظہار ہونے لگا تھا بلکہ ایک موقعے پر تو اس نے کھل کے کہہ دیا تھا کہ مجھے میرا حق ملنا چاہیے، اس سے پہلے وہ کہہ چکی تھی کہ میری حیثیت کچھ نہیں، تم بادشاہ ہو تمہاری بہن ہونے سے مجھے شہزادی سمجھا جاتا ہے مگر ہوں تو میں تمہاری ہی محتاج۔ میرے پاس اپنا کیا ہے۔

رابعہ کے بدلتے اور غیر متوازن رویے کے باعث میں نے کئی بار اس کو حق ملکیت دینے کا معاملہ ملتوی کردیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس کے احساس محرومی و ناانصافی کو دوسرے لوگوں نے بھی ہوا دی۔ اس کے جذبات کو میرے خلاف بھڑکایا...... وہ سمجھتے ہوں گے کہ رابعہ جیسی عورت سے فائدہ اٹھانا زیادہ آسان ہوگا جو دنیاوی معاملات میں زیادہ ہوشیار نہیں تھی۔

اور نوبت یہاں تک آگئی تھی کہ رابعہ نے انتہائی قدم اٹھاتے ہوئے ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی تھی۔ ہم جو پیدائش سے خون کا رشتہ رکھتے تھے۔ کزن سے زیادہ دوست تھے اور ایک زمانے میں جو بلوغت سے پہلے کا زمانہ تھا یہ بھی طے تھا کہ ہم شریک حیات رہیں گے۔ آج ایک دوسرے کے جانی دشمن بنے آمنے سامنے تھے۔

ابتدا رابعہ نے کی۔ ''کیا دیکھ رہے ہو کزن...... اور کب تک دیکھتے رہو گے مجھے...... کیا میرے سینگ نکل آئے ہیں؟ میں وہی رابعہ ہوں۔''

''وہی رابعہ؟'' میں نے حیرانی سے دہرایا۔

''ہاں...... تمہاری چچا زاد جو ہوش سنبھالنے سے یہی سنتی آئی تھی کہ تم ہی اس کے مجازی خدا ہو، جو مرتے دم تک تمہارے ساتھ رہے گی، مگر تم نے اسے بڑی حقارت سے ٹھکرا دیا تھا۔''

''جو تمہارے یا میرے بڑوں نے سوچا۔ اس کی ذمے داری مجھ پر نہیں ڈالی جاسکتی، کیا تم اس کا بدلہ لے رہی ہو؟''

''نہیں، بدلہ لینا ہوتا تو میں بہت پہلے تمہیں قتل کر دیتی، مجھے ٹھکرا کے تم نے میری ماں کا دل توڑا۔ اسے خود اپنی نظر میں اتنا گرا دیا کہ وہ پاگل ہوگئی اور مر گئی۔''

''اس کا دماغ پہلے سے خراب تھا۔ ورنہ وہ زبردستی یہ رشتہ جوڑنے کی دیوانہ وار کوشش نہ کرتی۔''

''ہر ماں کے کچھ ارمان ہوتے ہیں۔ میں اس کی اکلوتی بیٹی تھی، وہ مجھے خوش دیکھنا چاہتی تھی۔ یہ چاہتی تھی کہ بیٹی راج کرے۔ اسے دنیا کا سارا عیش و آرام میسر ہو۔ تو کیا ایسا سوچنا اس کا گناہ تھا...... جرم تھا...... اپنی عزت نفس کو بھول کر اس نے تم سے التجا کی، اپنی بیٹی تمہارے قدموں میں ڈال دی اور تم نے کیا کیا؟''

''میں نے یہ اختیار کسی کو نہیں دیا تھا کہ وہ میری زندگی کے فیصلے کرے۔ ایسے تو ہر ماں اپنی لڑکی میرے قدموں میں ڈال دے گی اور جب میں نے کبھی تمہیں اس نظر سے دیکھا ہی نہیں تھا۔''

وہ تلخی سے بولی۔ ''ہاں...... تمہاری نظر دیکھ رہی تھی فریال جیسی لڑکیوں کو...... چمکتی دمکتی، ماڈل ٹائپ، شوخ ادا،

فیشن ایبل...... میں کیا تھی ان کے مقابلے میں...... فریال کا مقابلہ عائشہ نہیں کرسکی تھی مگر وہ کوالیفائی ضرور کرلی تھی۔ تمہاری نظر خوب سے خوب تر کی تلاش میں ٹھہری نور جہاں پر جاکے...... اور اب سنا ہے کوئی ماہ نور ہے اس سے بھی بڑھ کر......''

''اب ان باتوں سے کیا حاصل......''

''کیا حاصل؟......'' وہ بھڑک اٹھی۔ ''یہ لاوا ہے، میرے دل کے ہر گھاؤ سے بہنے والا گندا مواد ہے، فاسد خون ہے۔ تم نے مجھے ذلیل کیا، میری ماں کو پاگل کر دیا۔ میرے باپ کی جان لی۔ میرے سارے خاندان کو ختم کرنے والے تم ہو۔ اگر تم انہیں ان کا حق دے دیتے تو آج یہ نہ ہوتا جو ہو رہا ہے۔''

''ٹھیک ہے، تم مجھ سے اپنا انتقام لو، مار دو مجھے لیکن اس سے ایک لاش کے سوا کیا ملے گا تمہیں اور یہ لاش بھی تمہارے گلے پڑ جائے گی۔ اس لاش سے تم نہ وہ جائیداد اور جاگیر حاصل کرسکتی ہو نہ کچھ اور...... تم یہ سب کچھ کس کے کہنے سے کررہی ہو؟ کس کے ہاتھوں میں کھیل رہی ہو؟...... یہ بے وقوفی نہیں پاگل پن ہے رابعہ...... یہ قانونی اور عدالتی معاملات ہیں رابعہ......''

''بند کرو یہ بکواس......'' وہ چلائی۔ ''تم اب بھی سمجھتے ہو میں بے وقوف اور پاگل ہوں، عقل سے پیدل ہوں، ذرا خود کو دیکھو مسٹر عقلمند...... اپنی عقل پر غرور نے تمہیں کس حال میں پہنچا دیا ہے، تم مجبور، بے بس اور محتاج ہو، اختیار میرے ہاتھ میں ہے۔''

میں خاموش ہوگیا۔ جنون میں مبتلا اس لڑکی کو عقل کی بات نہیں سمجھائی جاسکتی تھی۔ ''مجھے یہ بتاؤ، تم کیا چاہتی ہو، میں تمہاری ہر بات مان لوں گا جو تم کہو گی وہی کروں گا۔''

وہ مسکرائی۔ ''اب آئے نا تم سیدھے راستے پر۔ دیکھو میں نے اتنا کرلیا ہے تو باقی کیوں نہیں کرسکتی، آج تم جس طرح میرے سامنے ہو......''

میں نے کہا۔ ''رابعہ...... اگر تم مجھے ذلت اور اذیت ہی دینا چاہتی ہو تو میں واقعی سب کچھ جھیلوں گا، لیکن تمہارا مقصد مجھ سے کچھ حاصل کرنا ہے تو اس کے لیے تمہیں بات کرنا ہوگی، سودا کرنا پڑے گا۔ تم میری جان ضرور لے سکتی ہو لیکن وہ تمہارے کس کام کی، مجھے بتاؤ تم نے کیا سوچا ہے، تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟''

''تمہیں سب معلوم ہے۔'' وہ چلائی۔

''یہاں میرے پاس کیا ہے رابعہ...... اگر میں ست بدھائی کی آدھی یا ساری جاگیر جائیداد یا حویلی تمہارے حوالے کرنا چاہوں، تو کیا اس جگہ سے یہ ممکن ہے؟ تم سمجھتی ہو میں ایک دفعہ اس مضمون کا لکھ کے اپنے دستخط کردوں اور تمہیں دے دوں تو سب ہوجائے گا۔''

''تم اس خیال کو سر سے نکال نہیں سکتے کہ میں ایک پاگل بے وقوف لڑکی ہوں، ناقص العقل عورت...... جسے کچھ معلوم نہیں، حقیقت اس کے برعکس ہے، تمہارا دماغ محدود اور ناکارہ ہے، تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ میں نے کیا سوچ کے اتنا کرلیا۔''

''او کے...... تم مجھے بتاؤ لیکن کیا یہ ہوسکتا ہے کہ مجھے ویسی ہی کافی مل جائے، جیسی تم نے پہلے پلائی تھی پھر شاید میرا دماغ کام کرنے لگے۔''

اس نے ایک موبائل فون پر کافی لانے کے لیے کہا۔ ''دماغ سے کام لینے کی تمہیں کوئی ضرورت نہیں۔ تم بس وہی کرو جو میں کہوں۔''

''میں جاننا ضرور چاہتا ہوں، تم نے یہ کارنامہ کیسے سرانجام دیا۔ یہ بتانے میں تو حرج کوئی نہیں کہ میں لندن میں ہوں یا پاکستان میں، اس میں کوئی خطرہ بھی نہیں......''

''تم پاکستان میں ہو......''

''لیکن میں یہاں کیسے آیا...... میری فلائٹ مس ہوگئی تھی۔''

''نہیں...... اگر تم ایئرلائن سے معلوم کرو گے تو وہ بھی بتائیں گے کہ تمہاری سیٹ خالی نہیں تھی۔''

''کون بیٹھا اس پر......؟''

''تم اور کون...... اپنے بورڈنگ کارڈ پر......''

''ایئرلائن والوں نے، آگے کسٹم والوں نے، کسی نے کچھ نہیں دیکھا۔ نہ شناختی کارڈ، نہ پاسپورٹ، نہ میری صورت......؟''

''تم جانتے ہو، کوئی کچھ نہیں دیکھتا، ہم غیر ملکیوں کو اپنا قومی شناختی کارڈ جاری کر دیتے ہیں، ہمارے سفارت خانوں سے ڈپلی کیٹ پاسپورٹ جاری ہوجاتے ہیں، چوری ہوجاتے ہیں اور پھر غیر قانونی طور پر استعمال ہوتے ہیں، اگر اس کا پتا چل جائے تو کچھ نہیں ہوتا، کوئی پکڑا نہیں جاتا۔ پکڑنے والے آنکھیں بند کر لیتے ہیں...... میں نے ایک کارٹون دیکھا تھا، کار کے اوپر توپ رکھی ہوئی تھی اور پولیس ڈرائیور کی جیبوں کی تلاشی لے رہی تھی کہ کوئی ناجائز اسلحہ چھپا کے نہ لے جائے۔''

''یعنی میں لندن کے ہیتھرو ایئرپورٹ سے اغوا ہی

نہیں ہوا تھا...... میں اسی فلائٹ سے پاکستان پہنچ گیا تھا جس سے آنا تھا۔“

اس۔نے اقرار میں سرہلایا۔”پاکستان پہنچنے کے بعد تم غائب ہوگئے تھے۔“

”اچھا...... پھر کیا مجھے واقعی چارٹرڈ فلائٹ سے لایا گیا تھا؟“

”نہیں...... وہ عام فلائٹ تھی لیکن تم خاص مسافر تھے، تمہارے لیے خصوصی جگہ کا انتظام کیا گیا تھا کیونکہ ڈاکٹرز نے کہا تھا کہ تم کینسر کے مریض ہو، آخری اسٹیج پر...... اور اپنے وطن کی مٹی میں دفن ہونے کے لیے تمہیں پاکستان پہنچانا ضروری ہے۔“

”مجھے ریسیو کرنے کوئی نہیں آیا تھا؟“

”سب تھے...... لیکن وہ ادھر کھڑے رہ گئے۔ جہاں سے سب مسافر باہر آتے ہیں، جو تمہاری سیٹ پر بیٹھا تھا وہ ان کا اپنا بندہ تھا، وہ ادھر نکل گیا، ہینگرز کی طرف...... اور انجینئرنگ اسٹاف کے گیٹ سے باہر گیا، اب یہ مت پوچھنا کہ یہ واقعہ کب پیش آیا تھا اور تم اس وقت کہاں ہو...... کافی پیو......“

کافی لانے والا ایک سولہ سترہ سال کا لڑکا تھا، مجھے وہ انگریز لگا لیکن وہ کافی میز پر رکھ کے فوراً لوٹ گیا۔

میں نے ایک مگ اٹھالیا۔”میں نے کچھ اور سوچا تھا۔“

”کس بارے میں......“

”تمہارے بارے میں...... کہ تم اگر ڈاکٹر احمد حسن سے شادی کر کے لندن چلی جاؤ، تو وہاں کا سارا بزنس تمہیں سونپ دوں، تمہاری ملکیت میں دے دوں، وہ لندن میں رہا ہے...... بزنس کی مالیت کروڑوں میں ہے، تم اسے اربوں تک لے جاؤ، میں واپس ست بدھائی چلا جاؤں...... اور نور کے ساتھ......“

”میں ان چکروں میں نہیں آسکتی......“ وہ رکھائی سے بولی۔”تم بس یہی کرو گے اور اتنا ہی کرو گے جتنا میں بتاؤں گی۔“

”آل رائٹ...... آپ ہی فرمائیے ابتدا کہاں سے ہوگی۔“

”میرا پلان بہت سمپل ہے، ست بدھائی کی دولت جائداد اور حویلی کے مالک تم ہو، یہ تم مجھے دے سکتے ہو، بالکل اسی طرح جیسے یہ تمہیں ملی تھی، ایک صورت ہے گفٹ کرنے کی......“

”اس کے لیے عدالت میں پیش ہونا لازمی ہے۔“

”لازمی کچھ نہیں...... تم نہیں ہو گے تب بھی یہ دنیا اس کے کاروبار اور ست بدھائی کے معاملات حسب سابق چلتے رہیں گے۔“

”یا لک میری جگہ تم ہو جاؤ گی......؟“

”نہیں...... یہی ایک مشکل ہے، یا تو کسی طرح تمہاری طبعی یا حادثاتی موت کا ثبوت ملے۔“

”یہ تو سب سے آسان کام ہے۔“

”ہاں...... لیکن وہ جو تمہارے نگراں فرشتے بنے ہوئے ہیں۔ یہاں اور وہاں...... وہ اتنی آسانی سے ماننے والے نہیں ہیں۔ان سے ڈر لگتا ہے کہ میری ساری اسکیم کو چوپٹ نہ کر دیں۔“

”وہ چپ بیٹھنے والے نہیں ہیں۔ان سے تم کیسے نمٹو گی؟“

”ابھی تم صرف لاپتا ہو، میں سات سال تمہارے لاپتا رہنے کا انتظار نہیں کرسکتی...... اور یہ ممکن ہی نہیں۔“

”پھر کیا سوچا ہے تم نے......؟“

”تم مجھے پاور آف اٹارنی دو گے، قانونی طور پر تمہارے بعد وارث میں ہوں اور تمہارے ساتھ بلڈ ریلیشن بھی میرے سوا کسی کا نہیں...... تم یہ پاور آف اٹارنی لندن سے بھیجو گے۔“

”لندن سے؟...... مگر میں تو پاکستان میں ہوں......“

”جب تم دیکھو گے تو تمہیں معلوم ہو جائے گا، قانونی دستاویزات تمہارے لندن میں غائب ہونے سے پہلے......“

”یہ کیا ہے؟...... میں وہاں غائب ہوا تھا کہ یہاں ایک آدمی دو جگہ کیسے غائب ہوسکتا ہے۔“

رابعہ کا رنگ تیزی سے بدلا اور پھر معمول پر آگیا۔”پاور آف اٹارنی تم نے لندن میں بنوائی تھیں، کیونکہ تمہارا ارادہ لندن میں ہی رہنے کا اور وہاں کے کاروبار کو سنبھالنے کا تھا۔ اس لیے تم نے پاکستان میں مجھے قانونی اختیارات دیدیے...... کہ میں تمہاری جگہ ہر قسم کے فیصلے کرسکتی ہوں، جنرل پاورز آف اٹارنی...... جس کے پاس ہوں وہ اصل مالک ہو جاتا ہے۔خرید و فروخت بھی کرسکتا ہے۔“

”کیا تمہارا یہ ارادہ ہے؟ ست بدھائی کی جاگیر اور حویلی کو فروخت کرنے کا......؟“

”میں ایسا کروں تو مجھے کون روک سکتا ہے، ان راجوں مہاراجوں کو میں یوں نکال باہر کروں گی......“ اس نے چٹکی بجائی۔

”ٹھیک...... اب یہ بتاؤ کہ میں نے لندن سے تمہیں

پاور آف اٹارنی کب ارسال کی تھی......؟“

”کوئی دو ہفتے قبل......“

”اس پر میرے دستخط بھی ہوں گے؟......“

”ہاں...... اور قانونی ضرورت کے مطابق سفارت خانے سے ان کی تصدیق ہوئی تھی۔ ATTEST کرنے والے کے دستخط اصلی ہیں اور مہر بھی اصلی ہے، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ تم نے اس کے سامنے جا کے بقلم خود دستخط کیے تھے،ان کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔“

”کیا تمہیں معلوم ہے کہ اگر کوئی شخص مر جائے تو اس کی دی ہوئی پاور آف اٹارنی ختم ہو جاتی ہے۔“

”ہاں...... لیکن تم مرے تو نہیں۔“

”اگر میں غائب رہا تو ممکن ہے راجا یا ماہ نور کورٹ سے احکامات حاصل کرلیں کہ نواب رفیق کی زندہ یا مردہ بازیابی تک ان کو معطل رکھا جائے۔“

”ہاں، کچھ مسئلے کھڑے ہوں گے۔“

”ہوں گے یا ہو چکے ہیں؟...... میں نہیں مان سکتا کہ راجا یا ماہ نور خاموش اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہوں۔“

وہ چلائی۔”میں ان سب سے نمٹ لوں گی، وہ ہوتے کون ہیں میرے معاملات میں ٹانگ اڑانے والے...... اس جاگیر اور جائداد کے مالک تم ہو اور تمہارے بعد میں ہوں۔“

میں کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔”آخر تم کس کے ہاتھوں میں کھیل رہی ہو رابعہ...... کون استعمال کر رہا ہے تمہیں...... جو تم کہہ رہی ہو، یہ نہیں ہوسکتا۔نہ میری زندگی میں...... نہ مجھے مار کے، ابھی وقت ہے اور آگے مت جاؤ، یہیں رک جاؤ، مجھے سچ سچ بتادو کہ میرا اور تمہارا وہ کون دشمن ہے جو تمہارے ہاتھوں سے مجھے مروانا چاہتا ہے؟“

اس کی آنکھوں میں وحشت کے ساتھ دہشت نمودار ہونے لگی۔”بکواس کرتے ہو تم......“

میں نے اپنی بات جاری رکھی۔”دیکھو، میں تمہیں معاف کردوں گا کیونکہ قصور تمہارا نہیں...... اور تم دنیا میں میری واحد رشتے دار ہو جسے میں نے اپنی بہن سمجھا ہے، میرے مرحوم والد نے تمہیں مرتے وقت میری ذمے داری بنا دیا تھا، وہ ذمے داری آج بھی میری ہے۔“

وہ ایک دم مجھ پر حملہ آور ہوئی۔”میں تمہاری باتوں میں نہیں آنے والی......“

میں نے اسے دونوں ہاتھوں سے دھکا دیا۔”ہوش میں آؤ رابعہ ابھی کچھ بھی نہیں بگڑا...... میں تمہیں وعدے کے مطابق لندن کا بزنس دے دوں گا، تم وہاں رہنا، ڈاکٹر احمد حسن کے ساتھ......“

وہ فرش پر گری اور ایک دم اٹھی تو اس نے گریبان میں ہاتھ ڈال کے ایک ریوالور نکال لیا۔”مجھے کمزور مت سمجھنا اور اکیلا بھی نہیں، میں تمہیں شوٹ کر دوں گی۔“

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے کہا۔”کردو...... چلاؤ گولی رابعہ...... اتنے قریب سے تمہارا نشانہ خطا نہیں ہوسکتا مگر پہلے یہ بتا دو کہ اس کے بعد کیا ہوگا، میری لاش کون اٹھائے گا تم کو قتل کے الزام سے کون بچائے گا۔“

”زوہیب نے کہا ہے...... وہ میرا بال بیکا نہیں ہونے دے گا۔“

زوہیب؟ میرے کانوں میں یہ نام بم کا دھماکا بن کے گونجا، تو یہ نام ہے اس بے وقوف لڑکی کو استعمال کرنے والے کا...... وہ پھر اس کے جال میں پھنس گئی ہے۔

”وہ اب صوبائی الیکشن لڑے گا۔ وہ حکومت میں ہوگا، کسی محکمے کا وزیر......“

”جب تم مجھے اس کے راستے سے ہٹا دو گی؟ کیا واقعی رابعہ...... تم میری جان لو گی۔“ میں نے نرمی سے اور محبت سے کہا۔”کیا تم نے سوچا کہ بعد میں وہ کیا کرے گا...... ایک بار وہ تمہیں دھوکا دے چکا ہے۔“

”اس نے کبھی مجھے دھوکا نہیں دیا۔“ رابعہ نے کانپتی آواز میں کہا۔”وہ میری غلط فہمی تھی، وہ ہمیشہ میرا تھا، جب وہ مجھ سے شادی کرے گا تو وہ سب میرا ہوگا، جو اس کا ہے، میں پاگل نہیں ہوں جو اتنی دور لندن آئی ہوں۔“

میرے کانوں میں ایک اور دھماکا ہوا۔”تم...... تم لندن آئی ہو......؟ یعنی کہ میں لندن میں ہوں...... اور وہ سب جھوٹ تھا، ڈراما تھا، وہ تمہاری بکواس تھی۔“

میرا سر گھوم رہا تھا یا شاید میرے گردز مین آسمان اور اس کمرے کے در و دیوار سب گھوم رہے تھے۔ اتنا بڑا دھوکا، اتنا بڑا جھوٹ...... ایسی سازش...... رانا کا بیٹا اب مجھے رابعہ کے ہاتھوں قتل کرانے کے لیے اسے لندن لے آیا ہے، کسی دن میری لاش لندن پولیس کو کسی ویرانے میں مل جائے گی...... پھر سب کچھ رابعہ کا ہوگا، مگر اس کے بعد......!

ایک اور دھماکے نے میرے خیالات کو منتشر کر دیا مگر یہ دھماکا خیالی نہیں تھا، اس سے پہلے...... سیکنڈ کے سویں یا ہزارویں حصے کے فرق سے...... میں رابعہ پر جست لگا چکا تھا۔ معلوم نہیں کس نے مجھے خبردار کیا، کس نے میرے جسم کو اتنی توانائی دی۔

رابعہ نے شاید کبھی غلیل سے چڑیا تک نہیں ماری تھی۔ ایک غریب گھر کی عام سی لڑکی پستول بندوق سے توپ تک ہر قسم کے آتشیں اسلحے کا صرف نام سنتی ہے یا زیادہ سے زیادہ خبر سن لیتی ہے اور فلم میں دیکھ سکتی ہے کہ گولی چلا کے کسی کی جان کیسے لی جاتی ہے۔

آج اس کے ہاتھ میں ریوالور آ گیا تھا اور کسی نے اسے یہ بھی بتا دیا تھا کہ سیفٹی کیچ ہٹا کے ٹریگر دبانا کوئی مشکل کام نہیں ہوتا۔ سامنے والے کی قضا آئی ہو تو گولی اس کے سر یا سینے میں دل کے مقام پر جا لگتی ہے ورنہ اناڑی کا بھروسا نہیں کہ نشانہ سرکا لے اور گولی پیر میں لگے یا مارا جائے دائیں بائیں کوئی بے گناہ۔

بات لطیفے کی ہے مگر غلط نہیں کہ کوئی شہزادہ تیر اندازی سیکھ رہا تھا تو ایک درباری مسخرہ عین ہدف پر جا بیٹھا۔ کسی نے کہ کیوں مرنے کی ٹھانی ہے تو اس نے کہا کہ مجھے یہی جگہ سب سے محفوظ نظر آ رہی ہے۔

رابعہ کے ساتھ بھی جو کچھ ہوا اس کے لیے وہ تیار نہ تھی، اس کا نشانہ خطا گیا اس میں کمال میری ہوشیاری یا پھرتی کا نہیں تھا، بس میری زندگی تھی ورنہ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ اپنی جگہ سے حرکت کر کے میں ادھر اُدھر نکل جانے والی گولی کی راہ میں حائل ہو جاتا اور خود اپنی کوشش سے قتل ہو جاتا۔

گولی تو خدا ہی جانے کدھر گئی، میں نے صرف دھما کا سنا تھا، اس کے ری کوائل کا جھٹکا کتنا شدید ہوگا، یہ رابعہ کو اندازہ نہ تھا۔ نزاکت رکھنے والوں کی کلائی میں موچ آ جاتی ہے؟ کندھا بھی اتر سکتا ہے۔

بہادری دکھاتے ہوئے رابعہ نے چیخ تو نہیں ماری لیکن وہ خود کو جھٹکا کھانے کے بعد سنبھال نہیں سکی۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتی میں توپ سے نکلے گولے کی طرح اس سے ٹکرا گیا۔ میں اور وہ ایک ساتھ فرش پر گرے۔ میں اوپر وہ نیچے۔ ریوالور پہلے ہی یوں نکل گیا تھا جیسے ہاتھوں کے طوطے اڑ جاتے ہیں۔ عادتاً اس نے چیخ پہلے ماردی تھی۔ اس کا سر بعد میں فرش سے ٹکرایا۔ اوپر سے اس کا نازک جسم میرے وزن سے کچلا گیا۔

مجھے کچھ احساس نہ تھا کہ غیظ و غضب کی اس دیوانگی میں رابعہ کے لیے میرے منہ سے کس قسم کی اور کیا گالیاں نکل گئیں...... اشتعال میں عقل اور تمیز تہذیب کس کا ساتھ دیتی ہے۔ نہ مجھے یہ احساس رہا کہ وہ عورت ہے، میری کزن ہے جسے میں بہن سمجھتا ہوں۔ اس وقت وہ صرف دشمن تھی۔

میں اس کا گلا گھونٹ دیتا یا اس کے سر کو فرش پر مار مار کر قتل کر دیتا تو یہ ایک فطری ردِّعمل ہوتا اور دنیا کا قانون بھی اسے جائز قرار دیتا کہ میں نے اپنا دفاع کیا۔ لیکن اس سے پہلے ہی رابعہ بے جان اور بے حس و حرکت ہو گئی تو میرے جنون کو جیسے ایمرجنسی بریک لگ گئے۔

میں اسے چھوڑ کے ریوالور کی طرف لپکا اور اسے اٹھانے میں کامیاب رہا۔ یہ سب چند سیکنڈ میں ہو گیا۔ پھر وہ دیوہیکل گوریلے اندر آ گئے جو مجھے قید میں رکھنے اور رابعہ کی حفاظت پر مامور تھے۔ ان کے سات بے رحم چہروں پر یا ان کی غراہٹ میں کوئی خوش فہمی کا امکان نہ تھا کہ میں نے ان کا کہا نہ مانا تو وہ کیا کریں گے...... انہوں نے ایک ساتھ کہا کہ ”ریوالور نیچے پھینک کر سیدھے کھڑے ہو جاؤ۔“ میں نے بالکل ایسا ہی کیا۔ اس وقت تک میری عقل ٹھکانے آ چکی تھی۔ کم از کم اس حد تک کہ اپنی جان بچانے کے لیے میں نے بہادری پر بزدلی کو ترجیح دی۔

غصہ یا رنج تھا جو میرے اندر ایسے بھرا ہوا تھا جیسے بم کے اندر بارود یا آتش فشاں میں لاوا...... بس میں دھواں دے رہا تھا، پھٹ نہیں سکتا تھا...... میری سانس پھولی ہوئی تھی اور چہرہ گرم ہو رہا تھا ...... میں ہار گیا تھا اور میرے ساتھ رابعہ بھی لیکن آخر جیت اسی کی تھی۔ اب مجھے کچھ اندازہ نہ تھا کہ میرے ساتھ کیا سلوک ہوگا، ہوا کچھ بھی نہیں...... بس وہ دونوں حکم کے غلام جو دھماکا سن کے میری لاش اٹھانے آئے ہوں گے، بے ہوش رابعہ کو اٹھا کے لے گئے اور وہ ریوالور بھی جو مجھ سے کچھ فاصلے پر پڑا تھا۔ انہوں نے مجھ سے نہ کچھ پوچھا نہ کہا۔ یہ ان کے فرائضِ منصبی میں شامل نہیں ہوگا۔ ان کی ذمے داری محدود تھی۔ مجھے اندر رکھنا اور مس رابعہ شیرازی کی حفاظت اور سلامتی کو یقینی بنانا۔

دروازہ ایک بار پھر بند ہو گیا۔ میں دونوں ہاتھوں میں اپنا سر تھام کے بیڈ پر بیٹھا رہ گیا۔ ذرا سی دیر میں کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ رشتوں پر اعتماد کا بھرم پہلے ہی ٹوٹ چکا تھا، اب یہ خام خیالی بھی نہ رہی کہ رابعہ مجھے قتل نہیں کر سکتی یا کرا نہیں سکتی۔ مجھ سے بہت بڑی بھول ہوئی تھی، ازل سے فتنہ، فساد اور قتل و غارت گری کو زر، زمین اور زن سے منسوب کیا جاتا رہا ہے۔ انسانوں کی، قبیلوں کی یا ملکوں کی ہر جنگ میں کہیں نہ کہیں یہی عوامل واضح طور پر کارفرما نظر آتے ہیں۔

پھر میں نے اتنی بڑی حقیقت کو کیسے نظر انداز کر دیا؟ میں سنتا تھا، دیکھتا تھا اور اخباروں میں پڑھتا رہتا تھا کہ زمین کے چھوٹے سے ٹکڑے کے لیے بھائی نے بھائی کو یا باپ کو مار دیا۔ چھوٹی چھوٹی رقموں کے تنازعے پر قتل کی وارداتیں

ہو جاتی ہیں، چوری ڈکیتی بھی آخر کیا ہیں...... ہوسِ زر...... اغوا کیوں ہوتے ہیں؟ یہ جانتے ہوئے بھی کہ پسند کی شادی کا انجام جلد یا بدیر قتل کے سوا کچھ نہیں ہوتا، لڑکیاں کیوں گھر چھوڑ کے نکلتی ہیں...... لوگ انتقام میں شیطان کیسے بن جاتے ہیں۔

میں نے رابعہ کے معاملے میں کیوں فرض کر لیا تھا کہ جو میں سوچ رہا ہوں یا کر رہا ہوں وہی درست ہے......؟ رابعہ کو بھی مجھ سے اتفاق ہے۔ وہ میرے ہر فیصلے کے سامنے سرِ تسلیم خم کر رہی ہے تو وہ خوش ہے۔ وہ خوش نہیں مجبور تھی، اس نے کئی بار اپنے اندر کی ناراضی کا اظہار بھی کیا۔ رفتہ رفتہ اس کی قوتِ برداشت جواب دینے لگی تو اس نے کھل کے کہنا شروع کر دیا تھا کہ میں نے اس کی حق تلفی کی تھی، تذلیل کی تھی اور اس پر بہت ظلم ڈھائے تھے۔

وہ سمجھتی تھی کہ ست بدھائی کی جائداد اور جاگیر میں وہ نصف کی حقدار تھی۔ اس کے باپ کا حصہ میں نے ہتھیا لیا تھا اور وہ مجھے اپنے ماں باپ کی موت کا ذمے دار بھی قرار دینے لگی تھی۔ تب بھی مجھے ہوش نہ آیا۔ میرے والد نے مرنے سے پہلے مجھے سمجھایا تھا کہ رابعہ کو اپنی بہن نہیں سمجھوں اور اسے اتنا ضرور دے دوں کہ اس کی محرومی کا ازالہ ہو جائے۔

لیکن رابعہ کے نزدیک میری بہن بننا حالات کا جبر تھا۔ وہ ایسا نہ کرتی تو کیا کرتی، وہ تو میری شریکِ حیات اور اس سب کی مالک بننا چاہتی تھی جو آج میرا تھا، ٹھکرائے جانے سے زیادہ کسی عورت کی تذلیل کیا ہو سکتی ہے۔ میں نے اسے فریال کے لیے چھوڑا تھا لیکن جب فریال مجھے چھوڑ گئی تب بھی میں نے رابعہ کو اس کی جگہ نہیں دی۔ میں نے پھر نور جہاں کو اپنا لیا۔ رابعہ کے دل میں بغض اور دشمنی کا لاوا پکتا رہا، وہ موقعے کی منتظر رہی...... بظاہر مطمئن اور میرے ساتھ نظر آتی مگر اندر سے میرے خون کی پیاسی تھی۔

ایک بار پہلے بھی اس نے طاقت حاصل کر کے مجھ سے اپنا حق چھیننے اور مجھے اس ظلم کی سزا دینے کے لیے میرے دشمنوں سے ہاتھ ملا لیا تھا۔ رانا کے بیٹے زوہیب کے بارے میں مجھے کوئی شک نہ تھا کہ سانپ کا بچہ سانپ ہی ہوگا لیکن رابعہ نے خاموشی سے کچھ ایسا کھیل کھیلا کہ... وہی سانپ مجھے میرے گھر میں آ کے ڈس لے...... اس نے زوہیب کو پھانسا تھا یا زوہیب نے اسے...... بات ایک ہی تھی کیونکہ دونوں کا مقصد و مدعا ایک ہی تھا۔ رفیق احمد شیرازی کو ست بدھائی کے اس خاندانی قبرستان میں دو گز زمین دے دی جائے جہاں پہلے کی سات نسلیں محوِ خواب ہیں۔ زوہیب اور رابعہ اس طرح ایک ہو جائیں پھر رانا نگر اور ست بدھائی ایک ہو جائیں۔ دشمن کے دشمن سیاست میں دوست ہو جاتے ہیں۔

اب کس کے دل میں کیا تھا۔ کس کی نیت میں خلوص تھا اور کس کی نیت میں فریب...... یہ محبت تھی یا سیاست...... اس کا انجام کس کے حق میں کیا ہوتا...... کیا سچ مچ رابعہ زندگی بھر اس عظیم تر وسیع تر مملکت پر زوہیب کے ساتھ راج کرتی اور ملکہ عالیہ کہلاتی یا مار کے اسی خاندانی قبرستان میں میرے ساتھ لٹا دی جاتی...... یہ کون جان سکتا تھا۔

پہلے یہ سازشی ڈراما فلاپ ہو گیا تھا۔ ایسا حادثاتی طور پر ہوا تھا چنانچہ ذہنی طور پر رابعہ نے بھی چپ سادھ لی تھی اور اپنی بے وقوفی کو تسلیم بھی کر لیا تھا کہ زوہیب نے دھوکے اور ترغیب سے اسے پھانس لیا تھا...... لیکن درحقیقت ایسا نہیں تھا...... اس پہلی ناکامی نے اسے بددل یا مایوس نہیں کیا تھا...... پہلے سے زیادہ محتاط کر دیا تھا۔ وہ خاموشی سے اپنے منصوبے پر عمل پیرا رہی اور زوہیب کے ساتھ رابطہ برقرار رکھا۔ زوہیب مرد تھا اور ایک جاگیردار معاشرے کا مطلق العنان مرد جس کے نزدیک کوئی بھی عورت پاؤں کی جوتی سے زیادہ اہم نہ تھی...... وہ شاید رابعہ کو سر پر بٹھانے کے خواب...... دکھاتا رہا، وہ اچھی طرح جانتا ہوگا کہ خربوزہ چھری پر گرے یا چھری خربوزے پر...... انجام ایک ہی ہوتا ہے لیکن رابعہ کو اس فریب میں مبتلا رہنا اچھا لگا کہ ایک دن وہ زوہیب کے دل کے ساتھ ست بدھائی اور رانا نگر پر بھی راج کرے گی۔

میں سمجھ سکتا تھا کہ رانا کی یہ سازش میرے تین مہینے وطن سے دور لندن میں گزارنے سے ہوئی...... اس کے لیے حالات پہلے سے موجود تھے، میری غیر حاضری کے ساتھ رانا رجب علی کی بیماری نے سازگار ماحول فراہم کیا۔ رابعہ کی طرف سے پہلے بھی حوصلہ افزائی ملی تھی، اب زوہیب حسن کو یہ ممکن نظر آنے لگا کہ وہ اپنے باپ سے بڑا اور زیادہ طاقتور حکمران بن کے دکھا سکتا ہے۔ رانا نگر کے ساتھ ست بدھائی کا الحاق اسے ایک بہت بڑی سچ مچ کی ریاست کا نواب بنا دے گا۔ صوبائی اسمبلی کا رکن تو اس کا باپ بھی رہا لیکن بیٹے نے میری طرح باہر سے تعلیم بھی حاصل کی تھی...... باہر جا کے اس نے کیا پڑھا تھا یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ ممکن ہے اس نے محض تفریح کی ہو اور اچھا وقت گزارا ہو، پہلے بھی راجوں، نوابوں اور رئیسوں کے بیٹے تعلیم حاصل کرنے باہر جاتے تھے تو واپسی میں ان سے کون پوچھتا تھا یا پوچھ سکتا تھا کہ انہوں

نے کوئی ڈگری حاصل کی ہے یا نہیں اور ڈگری اصلی ہے یا جعلی؟

غصہ مجھے راجا پر بھی آتا تھا۔ شہناز پر بھی اور ان سب پر بھی جو میری عدم موجودگی میں حالات پر نظر رکھنے اور معاملات کو چلانے کے ذمے دار تھے۔ ان میں غنی بھی تھا جس کی عقابی نظر تھی اور جو اندر باہر ہونے والی ہر سازش سے باخبر رہتا تھا۔ دیکھنے والے تو اور بھی تھے، غنی کی بیوی ریشم، ڈاکٹر مہدی حسن اور ان کا بیٹا...... اتنی بڑی خرابی ہوگئی اور کسی کو احساس نہ ہوا؟ سب اپنے اپنے معاملات میں ایسے مگن رہے کہ کسی کی نظر رابعہ کی طرف نہ گئی کہ وہ کیا کر رہی ہے اور میرا تختہ الٹنے کے ساتھ سب...... کیے کرائے پر پانی پھیرنے والی ہے۔

مجھے ہر صورت میں رابعہ اور زوہیب کے گٹھ جوڑ کو ناکام بنانا تھا لیکن یہ ہوگا کیسے؟ اس سوال کا میرے پاس ابھی کوئی جواب نہ تھا...... میں ایسا پھنسا تھا کہ کوئی تدبیر کارگر ہوتی نظر نہیں آتی تھی۔ میں کہاں قید ہوں...... کب سے قید ہوں، لندن میں نور کو بھی معلوم تو ہوگا کہ میں لندن کی زمین سے تو اڑا تھا پاکستان جانے کے لیے مگر اس کے بعد درمیان ہی میں کہیں ایسے غائب ہوگیا تھا جیسے دھواں اٹھتا نظر آتا ہے مگر پھر فضا میں تحلیل ہو جاتا ہے، نہ میں لندن میں تھا نہ ست بدھائی میں، نہ زمین پر نہ آسمان میں...... نہ زندوں میں نہ مردوں میں...... پھر میں کہاں تھا؟ تھا یا نہیں تھا؟...... راجا نے بھی معلوم کرنے کے لیے بہت دوڑ دھوپ کی ہوگی، اپنے سارے وسائل استعمال کیے ہوں گے، ان میں سے کوئی بھی صبر کر کے خاموش بیٹھنے والا نہیں تھا۔

ہاں یہ ہو سکتا تھا کہ ان کو روک دیا ہوگا۔ بالکل اسی طرح جیسے تاوان کے لیے اغوا کرنے والے پولیس کے پاس جانے سے روک دیتے ہیں اور عزیز و اقارب مجبور ہو جاتے ہیں کیونکہ انہیں اغوا ہو جانے والے کی زندگی زیادہ عزیز ہوتی ہے۔ دیکھا جائے تو یہ کسی طرح بھی اغوا برائے تاوان کے کسی معاملے سے مختلف معاملہ نہ تھا، راجا کو یہاں اور نور کو لندن میں دھمکی دی گئی ہوگی کہ رفیق کی بازیابی کے لیے پولیس اور اسکاٹ لینڈ یارڈ سے مدد لی تو نتیجہ رفیق کی موت کے سوا کچھ نہیں نکلے گا۔ اس کی لاش کہیں مل جائے گی...... اور وہ مجبوراً کچھ نہیں کریں گے۔ سوائے دعا کے۔

اپنی رہائی یا رابعہ کی مجرمانہ سازش کو ناکام بنانے سے زیادہ مجھے جو چیز پریشان رکھتی تھی وہ خود اپنے احساس کی دنیا سے بے خبری تھی۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ میں کہاں ہوں، لندن میں یا پاکستان کے کسی نجی عقوبت خانے میں...... اوقات مجھے یہ خیال بھی آتا تھا کہ عین ممکن ہے میں ست بدھائی کی حویلی کے کسی تہ خانے میں پڑا ہوں اور اور کسی کو وہم و گمان تک نہ ہو...... یا مجھے زوہیب کی قید میں رکھا گیا ہو، اس کے پاس خفیہ ٹھکانوں کی کوئی کمی نہ تھی...... پھر میں جاننا چاہتا تھا کہ مجھے قید میں کتنا وقت گزرا ہے، آج کون سا دن ہے...... یہ مہینا کون سا ہے...... باہر کی دنیا میں دن ہے یا رات، ٹائم کیا ہوا ہے...... یہ خیال میرے لیے سب سے زیادہ اذیت کا سبب بن گیا تھا اور میں محسوس کرتا تھا کہ میں ذہنی مریض ہو چکا ہوں، جب آدمی دن رات کا شعور کھو دے...... اسے معلوم نہ ہو کہ دن، تاریخ اور وقت کیا ہے تو اسے پاگل ہو جائے گا۔ یہ احساس قبر میں مردے کو بھی نہیں ہوتا لیکن میں زندہ تھا۔

مجھے زندہ رکھنے والے بھی مجبور تھے۔ وہ مجھے کھانا دے رہے تھے اور مجھ پر کوئی تشدد نہیں کر رہے تھے۔ جسمانی سے زیادہ ذہنی اذیت میرے لیے ناقابل برداشت ہونے لگی تھی۔ بھوک سے مجبور ہو کے میں وہ کھانا بھی کھا لیتا تھا جو شاید عام حالات میں اور اپنی نوابی کے زمانے میں اٹھا کے پھینک دیتا۔ اللہ مجھے معاف کرے۔ رزق کی ناقدری بھی گناہ کبیرہ ہے، جو اس کے مرتکب ہوتے ہیں انہیں بعد میں ہی سوکھی روٹی کے لالے پڑ جاتے ہیں۔

کھانا خراب ہونے کے ساتھ نشہ آور بھی ہوتا تھا۔ ہیروئین کے عادی نشے باز کی طرح میں بے سدھ پڑا رہتا تھا...... سونے کی بھی ایک حد ہوتی ہے، میرا وقت کچھ سو کے اور کچھ نیم بے ہوشی میں غافل رہ کے گزرتا تھا۔ جب آنکھ کھلتی تب بھی بے حس و حرکت پڑا رہتا تھا۔ میرے اعصاب پر وہ منظر سوار ہوگیا تھا جو کبھی بدلتا نہیں تھا۔ وہی بوسیدہ اور اکھڑتے چونے اور گرتے پلستر والی دیواریں۔ وہی چھت، وہی ٹمٹماتا ہوا زرد روشنی دینے والا پچیس واٹ کا بلب۔

میری صحت خراب ہوتی جا رہی تھی اور میں سمجھتا ہوں مزاحمت کو ختم کرنے کی یہ تکنیک جسمانی تشدد سے زیادہ کارگر ثابت ہوتی ہے۔ کسی جاسوس یا مضبوط قوت ارادی والے سیکرٹ ایجنٹ پر یہی حربے آزمائے جاتے تھے۔ جسمانی تشدد سے آدمی مر جاتا ہے۔ اس طرح وہ ہمت ہار جاتا ہے اور ٹوٹ جاتا ہے اور اسے بریک کرنا بھی کہتے ہیں، میری شخصیت میں بھی ٹوٹ پھوٹ جاری تھی۔ میرا عزم اور میری ہمت میرا ساتھ چھوڑ رہے تھے۔ اب میں ہر بات ماننے کے لیے تیار

تھا۔ رابعہ ہو یا زوہیب حسن، میں ان کی ہر شرط سے اتفاق کرنے پر مجبور تھا۔ ہر قیمت پر میں اس مدفن سے نکلنا چاہتا تھا جہاں میں زندہ درگور کر دیا گیا تھا۔

میں نے خود کو قائل کر لیا تھا کہ ست بدھائی کو چھوڑا جا سکتا ہے کیونکہ لندن میں میرے پاس بہت ہے...... علاقے کے لوگوں کی حالت بدلنے کا خواب جائے جہنم میں، زیادہ اہم میری زندگی ہے...... زندگی کا بدل یہ نوابی نہیں ہو سکتی۔ زندگی صرف ایک بار ملتی ہے۔ میں نور کے ساتھ خوش رہوں گا اور بس...... رابعہ مجھ سے ست بدھائی کی ملکیت حاصل کرنے کے بعد زوہیب سے شادی کرے یا کسی اور سے...... مجھے کیا...... اس کی اپنی زندگی ہے۔

معلوم نہیں یہ حالات کب تک ایسے ہی رہتے، لیکن اچانک ایک دن میں نے ہوش کی حالت میں کھانا کھاتے ہوئے دیکھا تو مجھے کمرے میں ایک نئی چیز نظر آئی۔ یہ ایک ٹی وی تھا جس پر کوئی تصویر دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کے چمکدار سیاہ اسکرین میں مجھے ایک چہرے کی پرچھائیں سی نظر آئی جسے دیکھ کر میں ڈر گیا...... کیونکہ یہ کسی اور کا نہیں میرے ہی چہرے کا عکس تھا، بکھرے ہوئے بال، بڑھی ہوئی بے ترتیب ڈاڑھی...... ویران آنکھیں، یہ آئینہ نہیں تھا لیکن بلب کی روشنی عین میرے چہرے پر تھی جس سے شیشے میں عکس نظر آنے لگا تھا۔

اب مجھے اندازہ ہوا کہ شاید مجھے اس قید خانے میں ایک مہینا ہو گیا ہے' اس سے کم وقت میں میری ڈاڑھی اتنی نہ بڑھتی، نہ جانے کب سے میں نہایا نہیں تھا...... میرے کپڑے وہی تھے اور ان میں سے بو آ رہی تھی۔ خود اپنے عکس نے مجھے اتنا ڈرایا کہ میں رو پڑا۔ میں دیوانہ وار چلانے لگا۔ ''خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو، مجھے جانے دو...... میرا سب کچھ لے لو...... ست بدھائی کی مالک تم ہو رابعہ، میں تمہارا مجرم ہوں۔ میں نے تمہارا حق مارا تھا...... تمہارے ماں باپ کو بھی مارا تھا، خدا کے لیے مجھے معاف کر دو، مجھ پر رحم کرو...... مجھے واپس لندن جانے دو...... رابعہ...... رابعہ......'' میں بے اختیار چلایا اور میں نے کھانے کے برتن اٹھا اٹھا کے ٹی وی پر مارنے کی کوشش کی مگر میرے ہاتھوں میں رعشہ تھا اور دم نہ تھا...... چینی کی ایک پلیٹ گر کے کرچی کرچی ہو گئی، دوسری پلیٹ دیوار سے ٹکرا کے گری اور دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔

معلوم نہیں وحشت اور جنون کی اس کیفیت میں میرا اگلا قدم کیا ہوتا لیکن اچانک ٹی وی کا اسکرین روشن ہوا اور میں نے اس پر رابعہ کا چہرہ دیکھا۔ اس کے لبوں پر انتہائی

پُرتحقیر مسکراہٹ تھی۔ ”میں نے وہ سب سنا کزن! جو تم نے ابھی کہا۔“ رابعہ کی آواز بہت صاف اور واضح سنائی دی۔ ”اب اگر تم نے ٹی وی بھی توڑ دیا۔ اس پر بھی حملہ کیا جیسے مجھ پر کیا تھا، تو تم ایک اور موقع گنوا دو گے۔“

میں نے ہکلا کے کہا۔ ”نہیں...... نہیں رابعہ...... میں ایسا نہیں کروں گا، تم مجھ سے بات کرو۔“

”میں اپنی بات کہہ چکی ہوں۔ تم کو جو کہنا ہے کہو، میں سن رہی ہوں اور تمہیں دیکھ بھی رہی ہوں، سامنے آ کے بات کرنے کا خطرہ میں مول نہیں لوں گی۔“

”تم چاہتی ہو کہ میں ست بدھائی کی ملکیت سے دستبردار ہو جاؤں اور اپنی جگہ تمہیں اس کا مالک بنا دوں؟“

”میرا یہی مطالبہ ہے اور کچھ نہیں......“

میں نے کہا۔ ”لیکن...... یہاں سے کیا ہو سکتا ہے، میرا مطلب ہے میں یہ کیسے کروں گا......؟“

”تم کو کیا کرنا ہے، صرف قانونی دستاویزات پر دستخط کرنے ہیں۔“

”رابعہ...... میرا دماغ ماؤف رہتا ہے، میں صحیح طور سے سوچ سمجھ نہیں سکتا۔ ایسا کیوں ہو رہا ہے۔“

”تمہاری باتوں سے ایسا نہیں لگتا۔“

”رابعہ...... تم جیسا کہو گی میں ویسا ہی کروں گا، اگر تم کو اعتبار نہیں تو میں قسم کھانے کے لیے تیار ہوں، جس کی تم کہو۔“

”اس کی ضرورت نہیں۔ آدمی کا فعل ہی اس کے قول کی ضمانت ہوتا ہے، اگر تم وہی کرتے رہو گے جو تم سے کہا جائے گا تو...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

میرا دماغ اس نئی صورتِ حال میں مستعد ہونے لگا تھا۔ ”کیا ٹھیک ہو جائے گا رابعہ......“

اس نے بڑی عیاری سے کہا۔ ”تم میری مان لو گے، تو میں تمہاری مان لوں گی۔“

”لیکن کیسے رابعہ...... یہ سب کیسے ہو گا؟“

”جو ہو گا تمہارے سامنے آ جائے گا، ابھی میں اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا سکتی۔“

میں نے محسوس کیا کہ وہ بات ختم کر رہی ہے۔ ”رابعہ...... میری بات سنو، اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ جب میں تمہاری ہر بات مان لوں گا تو مجھے زندہ رہنے دیا جائے گا۔“

”تمہیں زندہ رکھنا ایک مجبوری ہے، ورنہ تمہیں مارنا کیا مشکل تھا، تم زندہ رہنا چاہتے ہو نا......؟ نور کے ساتھ لندن میں؟“

”ہاں...... لیکن ایسے میں کب تک زندہ رہ سکتا ہو[ں] تم دیکھ رہی ہو میری حالت، کیا میں ایسا تھا؟...... میں خطرناک جنونی پاگل نظر آتا ہوں، مجھے ایسا بنا دیا گیا آخر کیوں؟“

”کاش میں تمہیں اسی طرح سسکا کے اور تڑپا آہستہ آہستہ مار سکتی، گھلتے گھلتے تم ایک دن ختم ہو جاتے میں سب دیکھتی رہتی، جیسے اس وقت دیکھ رہی ہوں، سکون ملتا اس سے میرے ماں باپ کی بے چین روحوں کو مجھے...... اور جب تمہیں بھی اپنے باپ دادا کے ساتھ نحوست زدہ خاندانی قبرستان میں گاڑ دیا جاتا تو پوچھتی نواب رفیق احمد شیرازی...... تم سمجھتے تھے کہ ایک کمزور عورت ایک یتیم لڑکی سے مقابلے میں جیت گئے......؟ اب بولو آخر جیت کس کی ہوئی۔“ وہ طیش میں آ گئی تھی اور اس کی آنکھو[ں] سے نفرت ابل رہی تھی۔

پھر اچانک اس کا عکس غائب ہو گیا اور میرے سامنے صرف ٹی وی کا تاریک پردہ رہ گیا، میں چلایا۔ ”رابعہ...... لیکن میری آواز میرے زنداں کی دیواروں سے ٹکرا کے ٹوٹ گئی، میں اپنے بیڈ پر گر پڑا۔ میرا دل بیک وقت امید اور خوف کی دو انتہاؤں کے درمیان جھول رہا تھا۔ وہ جھوٹ بول[تی] ہے، جب میں اس کی خواہش پوری کر دوں گا تو وہ مجھے [مر]وا دے گی...... مروا دے گی...... اسے کوئی مجبوری لاحق نہیں ہو گی کہ مجھے زندہ رکھے، لیکن پھر وہی خیال غالب آ جاتا کہ میری لاش سے وہ کوئی کام نہیں لے سکتی، ساری جائداد اپنے نام کرانے کے لیے اسے زندہ سلامت رفیق چاہیے جسے وہ عدالت میں پیش کر کے قانونی طور پر حق ملکیت حاصل کر سکے...... مگر اتنا بڑا خطرہ وہ کیسے مول لے سکتی ہے، ایک بار یہاں سے نکل جانے کے بعد اس کے پاس کون سی قوت ہو گی کہ وہ عدالت میں مجھ سے اپنی مرضی کا بیان دلوا سکے اور جہاں چاہے میرے دستخط کرا لے، وہ مجھے گن پوائنٹ پر نہیں لے جا سکتی۔ بیہوشی کی حالت میں پیش نہیں کر سکتی۔

میرا ذہن متضاد خیالوں کی رزم گاہ بنا ہوا تھا اور میں سیدھا لیٹا چھت کو گھورتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ وقت کی گردش انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا سکتی ہے۔ فقیر سے میں شاہ بنا اور شاہ کو وقت کی ایک کروٹ نے وہ دیوانہ نظر آنے والا قیدی بنا دیا جو میں آج ہوں...... زندگی پہلے بھی ناقابلِ یقین واقعات سے بھری پڑی تھی مگر وہ میری زندگی نہیں تھی اور وہ واقعات مجھ پر نہیں بیتے تھے، میں نے صرف نے غ...

جیسے آنے والے وقت میں لوگ میرے بارے میں سنیں گے کہ راتوں رات ایک معمولی ریٹائرڈ کالج لیکچرار کا بیٹا جو اپنی جان بچانے کے لیے جلا وطنی کی زندگی کاٹ رہا تھا، ایک جاگیر، حویلی اور خزانے کا مالک بنا اور کیسے ایک عورت کی سازش کا شکار ہو کے مارا گیا۔

مجھے رابعہ سے کچھ بھی پوچھنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا کہ میں قید میں ہوں تو کب سے اور کہاں...... اور کیا میرے قید میں یا زندہ ہونے کا علم راجا کو یا نور کو ہے۔ وہ ٹیلی وژن کے پردے پر ایک رنگین جیتے جاگتے عکس کی طرح نمودار ہوئی تھی اور میرے ایک اقرار کے بدلے میں مجھ سے ایک اقرار کر کے غائب ہو گئی تھی۔

اس زنداں میں مجھے دو وقت کھانا ملتا تھا، غالباً دن رات کے وقفوں کو برابر تقسیم کر کے یعنی بارہ گھنٹے میں ایک بار۔ مجھے وقت کے احساس سے بیگانہ رکھنے کے لیے نہ ناشتا ہوتا تھا جس میں چائے شامل ہو، نہ پھر شام کی چائے دی جاتی تھی کہ اس سے میں پہلے کھانے کو لنچ سمجھ لوں اور دوسرے کو ڈنر...... اس سے مجھے معلوم ہو سکتا تھا کہ دن ہے یا رات۔ پہلے پہل چائے کی طلب نے مجھے سخت مضطرب رکھا کیونکہ میں تو کافی کا عادی تھا۔ جسم کو کافی کی کمی نے اتنا ہی بے چین کیا جتنا نشہ کرنے والے کو ہیروئین کی طلب کرتی ہے۔ دونوں کھانوں کے درمیانی وقفے میں اکثر میرا وقت سوتے ہوئے گزرتا تھا۔ جب میں جاگتا تھا تو بیڈ پر پڑا رہتا تھا یا کمرے کے اندر چلتا تھا، واش روم جاتا تھا۔ اس میں بھی مجھے کمزوری اور تھکن محسوس ہوتی تھی۔

اچانک دروازہ کھلا اور وہی دونوں مسلح محافظ اندر آئے جو میری نگرانی پر مامور تھے۔ انہیں بتا دیا گیا ہو گا کہ اس بے ضرر نظر آنے والے قیدی پر اعتبار کی غلطی نہ کریں۔ قریب جانے کی صورت میں اس سے کچھ بعید نہیں کہ وہ نہتا ہونے کے باوجود تم دونوں سے اسلحہ چھین لے، تمہیں اسلحہ استعمال کرنے کا موقع ہی نہ دے اور تمہاری سانڈ جیسی گردنوں کو خالی ہاتھوں کے ایک وار سے توڑ دے۔

میں ایسا ہی تھا، لیکن اب نہیں۔ میری جسمانی طاقت کو سلب کر لیا گیا تھا اور نشہ میرے جسم کے رگ و پے میں ایسے اتار دیا گیا تھا کہ میں حرکت بھی سلو موشن میں کرتا تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے میرے قریب آنے کا خطرہ مول نہیں لیا۔ ایک نے کھانے کی ٹرے میز پر رکھ دی۔ دوسرا گن کا رخ میری طرف کیے کھڑا رہا، خوشبو نے مجھے اٹھ کر بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔

میں نے کہا۔ ”واہ جی واہ...... آج تو دعوت کا انتظام ہے، کس خوشی میں......؟ آپ کی تقریبِ ختنہ تھی یا والدہ کا نکاح۔“

پیچھے والا مشتعل ہو گیا کیونکہ دوسری بات میں نے اس کی طرف منہ کر کے کہی تھی۔ ”خاموشی سے کھا لو۔“

دوسرے نے پلٹ کے اسے گھورا۔ ”چپ نہیں رہ سکتا تو۔“

”ماں کے لیے میں گالیاں نہیں سن سکتا۔“ وہ بولا۔

”ٹھیک ہے میں رانا صاحب کو بتا دوں گا۔ وہ تیری جگہ کسی اور کی ڈیوٹی لگا دیں گے، لیکن اس سے پہلے وہ کتنی گالیاں دیں گے، یہ معلوم ہے نا؟ وہ بلائیں گے تیری ماں کے ساتھ تیری بہن کو بھی۔“

پہلا عاجزی سے بولا۔ ”نہیں یار...... وہ بس میرے منہ سے ایک بات نکل گئی، رانا صاحب سے مت کہنا۔“

میں نے کھانا قریب کرتے ہوئے کہا۔ ”اپنے رانا رجب علی صاحب کا کیا حال ہے؟“

وہ جاتے جاتے ایک دم پلٹے۔

میں نے کہا۔ ”وہ بیمار تھے نا...... کافی بیمار تھے یا تم چھوٹے رانا زوہیب حسن کی بات کر رہے تھے؟“

میں نے دیکھا کہ وہ دونوں خوفزدہ ہو گئے تھے۔ ان کے لیے میری زبان پر چھوٹے بڑے رانا کا نام آنا ہی بڑے اچنبھے کی بات ہوگی لیکن کسی نے بھی میری بات کا جواب نہیں دیا۔ وہ دروازہ بند کر کے چلے گئے۔ باہر سے میں نے دروازہ مقفل ہونے کی آواز سنی۔

شاید سات دن اور گزرے۔ اس کا حساب میں نے یوں رکھا کہ مجھے چودہ بار کھانا دیا گیا...... ایک تبدیلی یہ رونما ہوئی تھی کہ کھانے کا معیار بہت بہتر ہو گیا تھا اور اس کے ساتھ کافی بھی ملنے لگی تھی۔ دوسری خاص بات یہ تھی کہ کسی ایک کھانے میں خواب آور یا نشہ آور دوا ہوتی تھی جسے کھا کے میں کچھ دیر بعد سو جاتا تھا، اپنے طور پر میں نے فرض کیا کہ جس کھانے میں نیند کی دوا شامل ہو گی وہ رات کا کھانا ہو گا اور جس کے ساتھ کافی آئے گی وہ دن کا کھانا ہو گا، دن کے کھانے کے بعد میں لیٹ جاتا تھا اور مجھے غنودگی بھی محسوس ہوتی تھی لیکن نیند نہیں آتی تھی، میں اٹھ کر بیٹھ جاتا تھا۔ بیٹھ کے کھڑا ہو جاتا... اور کمرے میں چکر لگاتا تھا۔ پھر تھک کے بیٹھ جاتا تھا اور ٹی وی کی خالی اسکرین کو گھورتا رہتا تھا، اس امید میں کہ ابھی وہ روشن ہو گی تو مجھے رابعہ نظر آئے گی۔

میری جسمانی توانائی میں کچھ بہتری آئی تھی۔ اب

مجھے کھڑا ہونے سے چکر نہیں آتے تھے اور کمرے میں چلنے کے لیے مجھے دیوار کا سہارا نہیں لینا پڑتا تھا۔ پھر ایک دن میں جاگا تو مجھے اپنا حلیہ تبدیل نظر آیا، میری ڈاڑھی صاف کر کے شیو بنادی گئی تھی اور میرا لباس بدل دیا گیا تھا، خلافِ معمول مجھے ناشتا دیا گیا جو تقریباً وہی ناشتا تھا جس کا میں عادی تھا، سلائس، مکھن جام، انڈے اور کافی...... ایسا ناشتا مجھے نہ جانے کب سے نصیب نہیں ہوا تھا۔ شاید برسوں سے...... کم سے کم مجھے ایسا ہی لگا، میں ناشتے پر ٹوٹ پڑا اور سب چٹ کر گیا۔

نہ جانے کہاں، دور کسی محفوظ مقام پر یا اوپر کسی کمرے میں رابعہ اپنے قیدی کے ندیدے پن کا تماشا دیکھ رہی تھی۔ اپنی انتقامی قوت اور میری کمزوری کے مظاہرے پر خندہ زن تھی۔ آدمی کچھ بھی ہو، افلاطون ہو یا سکندرِ اعظم...... پیٹ کی بھوک سے کیسے شکست کھاتا ہے، جنگل میں دھاڑنے والا ببر شیر جب پنجرے میں قید ہو تو بھوک اسے گھاس کھانے، بلی کی طرح میاؤں میاؤں کرنے اور پیروں میں لوٹنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

اچانک ٹی وی روشن ہو گیا اور میں نے پھر اپنے سامنے رابعہ کو دیکھا۔ فتح مندی کا غرور اس کی آنکھوں سے عیاں تھا اور مجھے تماشائے عبرت بنا کے اس کے انتقامی جذبات کو تسکین حاصل ہو رہی تھی۔ وہ خوش تھی اور مسکرا رہی تھی۔ اس لیے بڑے شوخ رنگ کے اور جدید وضع کے کپڑے پہنے تھے۔ بڑے اسٹائل سے بال بنائے تھے اور ایسا شوخ میک اپ کیا تھا جیسے وہ اپنے قیدی کے سامنے نہیں اپنے محبوب سے ملنے آئی ہو۔

اس کی آنکھیں جیسے براہِ راست مجھے دیکھ رہی تھیں۔

''اب مزاج کیسے ہیں کزن......؟'' اس نے طنز سے کہا۔

میں نے عاجزی سے جواب دیا۔ ''رابعہ...... تھینک یو ویری مچ...... لیکن اب میری سزائے قید کو مزید طول نہ دو، میں وعدہ کر چکا ہوں کہ جیسا تم کہو گی ویسا ہی ہوگا۔''

''مجھے اندازہ ہے رفیق کہ تمہارا دماغ کیسے سوچتا ہے، تم آسانی سے ہار قبول کرنے والوں میں نہیں ہو، لیکن میں آخری وارننگ دے رہی ہوں۔ دماغ میں کوئی اور خیال ہے تو اسے نکال دو، اسے میری مجبوری یا اپنی خوش نصیبی سمجھو۔''

''آخر میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں......''

اس نے میری بات کاٹ دی۔ ''میرا پلان بہت مکمل ہے کزن۔ اس میں کوئی جھول یا کمزوری نہیں ہے جو بعد میں بھی تمہیں فائدہ پہنچائے۔ اگر تم نے سوچا ہے کہ پہلے یہاں سے نکلو اور اس کے بعد سارا کھیل پلٹ دو، تو سمجھ لو کہ یہ ناممکن ہوگا۔''

''میں نے ایسا بالکل نہیں سوچا۔''

''تمہارے سامنے دو راستے ہیں۔ بالکل واضح...... جو میرے سامنے بھی ہیں۔ ایک یہ کہ تم بھی زندہ رہو اور میں بھی۔ ہم الگ الگ اپنی اپنی خودمختار خوش و خرم زندگی گزاریں۔ تم لندن میں نور کے ساتھ عیش کرو، میں یہاں زوہیب کے ساتھ...... نہ تمہیں مجھ سے کوئی سروکار ہو نہ مجھے تم سے...... مال دولت کی نہ تمہیں کمی نہ مجھے...... دوسری صورت......'' وہ بولتے بولتے رک گئی۔

''بتاؤ...... دوسری صورت کیا ہے؟''

''آج میں تم کو بتا رہی ہوں، جب تم لندن سے روانہ ہوئے تھے تو کیا ہوا تھا...... تم اکیلے آئے تھے، نور تمہیں سی آف کرنے ایئرپورٹ کیوں نہیں آئی تھی؟''

میں نے کہا۔ ''وہ پاگل جذباتی لڑکی ہے۔''

وہ ہنسی۔ ''تمہیں الوداع کہنے کا حوصلہ نہیں رکھتی تھی۔ خواہ وہ تھوڑے دن کے لیے ہی کیوں نہ ہو مگر دیکھ لو اس کی جذباتی کمزوری کا خمیازہ تم نے کیسے بھگتا۔''

''ہاں وہ وہاں موجود ہوتی تو......''

اس نے میری بات کاٹ دی۔ ''نواب رستم خاں کی محبوبہ دلنواز کون سی توپ چلاتی۔ وہ ایمبولینس میں تمہارے ساتھ جاتی لیکن کیا وہ تمہیں اسپتال لے جا سکتی تھی؟ چھوڑو اس بات کو...... وہ پلان ایک دن میں نہیں بنا تھا، اس کے لیے زوہیب نے ماہرین کی پوری ٹیم بنائی تھی اور وہ خود نگرانی کے لیے وہیں موجود تھا۔ وہ ایمبولینس ہماری تھی، اس میں سارے بندے ہمارے تھے۔''

''کیا اس کا مطلب میں یہ لوں کہ اغوا کرنے کے بعد مجھے لندن میں رکھا گیا تھا......؟''

''ہاں...... لیکن تم نے فلائٹ مس نہیں کی تھی۔'' اس نے ہنس کے کہا۔ ''ایسے بے وقوفوں کی طرح میری طرف مت دیکھو۔ یہ ہو سکتا ہے اور ایسا ہی ہوا تھا۔ تمہارے پاس بورڈنگ کارڈ تھا۔ امیگریشن کے مراحل سے تم گزر چکے تھے۔ ڈیپارچر لاؤنج میں موجود ایک شخص نے تمہارا بریف کیس لے لیا اور تمہارے بورڈنگ کارڈ پر جہاز میں تمہاری سیٹ پر بیٹھ گیا۔''

''یہ...... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔''

''کیوں؟...... جہاز میں بیٹھنے کے بعد کیا ایسا ہوا ہے کہ کسی نے تم سے پاسپورٹ طلب کیا ہو یا شناختی کارڈ مانگا ہو......؟ چیکنگ کے سارے مرحلے تو پورے ہو چکے تھے، جب اعلان ہوا کہ پی آئی اے کی فلاں فلائٹ سے جانے والے مسافر فلاں گیٹ سے جہاز کی طرف تشریف لے جائیں تو وہ شخص اطمینان سے چلتا ہوا گیا اور تمہاری سیٹ پر جا کے بیٹھ گیا۔ کسی کو کیسے معلوم ہو سکتا تھا خصوصاً فلائٹ کریو کو...... کہ وہ نواب رفیق احمد شیرازی نہیں ہے؟''

میں نے کہا۔ ''یہ تو ٹھیک کہتی ہو تم...... لیکن اس کے بعد پاکستان میں بھی......''

''ہاں...... پاکستان میں بھی، کیا تم نہیں جانتے کہ ناممکن کو اگر ممکن بنانا ہو تو پاکستان میں یہ کام کیسے ہوتا ہے؟...... پیسے کی طاقت سے کزن...... رشوت سب سے بڑی کنجی ہے جو ہر بند تالے کو کھول دیتی ہے، اللہ نظرِ بد سے بچائے، زوہیب بہت ذہین ہے۔ سارے چوروں کو اور چور دروازوں کو دیکھ لیتا ہے۔ پھر جہاں جہاں بھی رکاوٹ ہو وہ رکاوٹ ڈالنے والوں کا تعاون حاصل کر لیتا ہے۔''

میرے لیے کوئی بات انکشاف نہیں تھی۔ مجھے خوب اندازہ تھا کہ میرے پیارے وطن اسلامی جمہوریہ پاکستان کا جو حال آج ہے وہ دشمنوں نے نہیں کیا ہے اپنوں نے کیا ہے اور اس خرابی کے اسباب پر کسی کمیٹی یا کمیشن کی بھاری بھرکم رپورٹ کی ضرورت ہی نہیں، یہ ہر شخص بتا سکتا ہے۔ تانگے والے سے یونیورسٹی کے پروفیسر تک...... گلی کے نکڑ والے موچی سے اعلیٰ عدالت کے جج تک کسی سے بھی پوچھ لیا جائے کہ پاکستان کی تباہی کا سبب کیا ہے تو وہ صرف ایک لفظ میں وہ جواب دے گا جو ہماری نصف صدی کی تاریخ بنا دے گا...... کرپشن......

''تم کہاں کھو گئے نواب صاحب......؟'' رابعہ نے کہا۔

میں چونکا...... ''کیا جہاز کا عملہ بھی تمہاری سازش میں شریک تھا؟''

''میں تو تمہیں بڑا عقلمند سمجھتی تھی کزن...... لیکن زوہیب حسن واقعی تمہارے مقابلے میں زیادہ سمجھدار ہے۔''

''کم سے کم سازش کی پلاننگ میں......''

اس نے میرے طنز کو نظرانداز کر دیا۔ ''وہ کہتا تھا کہ کم سے کم لوگوں کو یہ بات معلوم ہونی چاہیے۔ رشوت لینے کے لیے تو یہاں ہر شخص جھولی پھیلائے کھڑا ہے...... مگر یہ دیکھنا ضروری ہے کہ ہمیں اس کو رشوت دینے کی ضرورت بھی ہے یا نہیں۔ ہم کوئی خیرات نہیں بانٹ رہے ہیں...... حقیقت جاننے والے جتنے کم ہوں گے افشائے راز کا خطرہ بھی اتنا ہی کم ہوگا، جہاز کے عملے کو اس سے کیا کہ کس سیٹ پر کون بیٹھا ہے، یہ رسک تھا اس کے لیے جو تمہاری سیٹ پر بیٹھا تھا کہ کریش کی صورت میں اس کے وارث انشورنس کی رقم سے محروم رہتے اور کچھ لوگوں کو یہ جواب دہی کرنی پڑتی کہ آخر ایرے غیرے خان کی جگہ نتھو خیرے خان کیسے بیٹھ گئے تھے۔''

''میرا مطلب تھا...... پاکستان پہنچنے کے بعد بھی تو باہر سے آنے والوں کے لیے کسٹم وغیرہ کے مرحلے ہوتے ہیں۔''

''تم پاکستان کے ہر ایئرپورٹ سے سفر کر چکے ہو...... پھر بھی ایسی بات کرتے ہو؟...... کیا باہر نکلنے کا ایک ہی راستہ ہوتا ہے......؟ ایک تو وی آئی پی گیٹ ہوتا ہے جہاں سے گزرنے والوں کو سب سلام کرتے ہیں...... سوال کرنے والے کی نوکری یا عزت نہیں رہتی، لیکن اس کے علاوہ اندر کا کوئی بھی بندہ ساتھ ہو...... تو آنے جانے کے سیکڑوں نہ سہی، درجنوں راستے ہیں، اب تم پاکستان میں ہو اور نور کی ابتدائی تحقیق کے مطابق تم لندن سے فلائی کر گئے تھے، کراچی بھی پہنچے تھے لیکن پھر پتا نہیں کہاں گئے، ست بدھائی بہرحال نہیں پہنچے...... ہے نا عجیب جادو کا تماشا...... راجا نے بھی بڑی بھاگ دوڑ کی تھی، اسے بھی یہی معلوم ہوا کہ نواب رفیق احمد شیرازی مقررہ وقت کے بعد دیر سے روانہ ہونے والی فلائٹ پر موجود تھے اور انہوں نے لندن سے کراچی تک کا سفر کیا تھا، اس کے بعد ظاہر ہے پی آئی اے کی ذمے داری ختم ہو جاتی ہے کہ وہ باہر کیوں نہیں آئے اور آئے تو کس راستے سے اور کہاں گئے۔''

''کیا بعد میں نور کو اور راجا کو حقیقت بتا دی گئی تھی؟''

''ہاں...... میں نے راجا کو قائل کیا تھا کہ میرے پیارے بھائی کو اغوا کرنے والوں کے سارے مطالبات تسلیم کیے جائیں، تاکہ اس کی زندگی بچائی جا سکے، سب سے پہلے یہ کہ پولیس یا دیگر سراغرساں اداروں سے کوئی بات نہ کی جائے...... یہ خود تمہارے دوست عبداللہ جان کا بھی مشورہ تھا...... وہ بہت قابل ہیں نا...... پورے صوبے کی پولیس کے سربراہ ہیں لیکن انہوں نے کہا کہ پولیس سے مدد لینے کی صورت میں رسک بہت بڑھ جاتا ہے۔ انہوں نے خود راجا سے کہا کہ میں یہ بات آئی جی کی حیثیت سے نہیں، نواب صاحب کے مخلص دوست کی حیثیت سے کہہ رہا ہوں۔ ان کی زندگی کے مقابلے میں بڑے سے بڑا مطالبہ بھی چھوٹا ہوگا۔ اگر کوئی میرے بھائی یا بیٹے کو بھی اغوا کرے تو میں اغواکاروں کی ہر بات پر عمل کروں گا۔ پولیس کے وسائل استعمال کرنے کا سوچوں گا بھی نہیں...... ظاہر ہے اس کے بعد راجا صبر کر کے خاموش بیٹھ گیا۔ اس نے خود نور کو سمجھایا، ویسے یہ نور

ہے بہت ہمت والی لڑکی...... روتی رہی لیکن پھر اس نے خود کو بھی سنبھال لیا اور کاروبار کو بھی...... راجا نے اسے کہا تھا کہ کسی کمپنی کے چیئرمین کے لاپتا ہونے یا اغوا کاروں کے قبضے میں ہونے کی خبر عام ہو جائے تو بزنس پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔"

خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا۔ پھر میں نے کہا۔ "کیا انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ مجھے کس نے اغوا کیا ہے...... اور کیوں؟"

اس نے پلک جھپکائے بغیر سر ہلایا۔ "ہاں...... مگر صرف راجا کو...... صرف اسی پر اعتماد کیا جا سکتا تھا۔"

"اس سے...... تم نے بات کی تھی......؟"

"میں نے بھی بات کی تھی...... لیکن میں اکیلی نہیں تھی۔"

"تمہارے ساتھ زوہیب ہوگا؟"

"ظاہر ہے...... تمہارے دوست عبداللہ جان نے کہا تھا کہ یہ اغوا برائے تاوان کا کیس ہوگا تو تمہیں کچھ انتظار کرنا پڑے گا، بالکل خاموشی سے...... وہ تمہاری نقل و حرکت پر نظر رکھیں گے، ممکن ہے تمہاری فون کالز ٹیپ کرائیں، ٹیلی فون ایکس چینج کا کوئی آپریٹر بھاری معاوضے اور سنگین دھمکی کے ساتھ خریدا جا سکتا ہے۔ اس لیے بالکل چپ بیٹھو...... کسی سے کوئی بات نہ کرو، وہ خود تم سے رابطہ کریں گے...... عام طور پر چوبیس گھنٹے بعد ایسا ہوتا ہے لیکن یہ معمولی کیس نہیں ہے، وہ کئی بار بات کریں گے، یقین دہانی حاصل کرنے کے لیے۔ تم کو جگہ بدل بدل کے بلائیں گے، اگر تم سے ڈیل ہوگئی تو پھر رسک بڑھ جائے گا...... ففٹی ففٹی چانس ہوگا کہ وہ تم سے رقم بھی وصول کر لیں اور بندے کو بھی نہ چھوڑیں...... لیکن ایسا عموماً تب ہوتا ہے جب اغوا کرنے والا کوئی شناسا ہو، بچوں کے کیس میں بعض اوقات خود قریبی رشتے دار، ہمسائے کا کوئی بندہ یا جان پہچان والا ملوث ہوتا ہے...... ظاہر ہے بچہ اسے پہچانتا ہے چنانچہ وہ تاوان بھی وصول کر لیتے ہیں اور پھر بچے کو بھی زندہ نہیں چھوڑتے...... لیکن یہ تو معاملہ ہی کچھ اور تھا۔ زوہیب نے راجا کو پہلی کال کرائی کسی اور سے...... صرف یہ بتایا کہ تمہارا دوست زندہ ہے اور ہماری تحویل میں ہے...... اس کی زندہ بازیابی چاہتے ہو تو اگلی کال کا انتظار کرو، لیکن اس کال کا تم نے کسی سے ذکر بھی کیا تو ہمیں پتا چل جائے گا کیا تم جانتے ہو کزن کہ تمہاری حویلی کے اندر بھی زوہیب کے جاسوس موجود ہیں۔"

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ "ہوں گے...... ضرور ہوں گے، لیکن نہ مجھے معلوم ہے اور نہ کسی اور کو کہ وہ کون ہیں جیسے ہمارے جاسوس رانا کی حویلی میں ہیں اور ہمیں تمام اطلاعات انہی سے ملتی ہیں۔ ست بدھائی کو تم امریکا سمجھو، رانا نگر ہے روس...... ان دونوں سپر پاورز کا ایک دوسرے پر جاسوسی کا نیٹ ورک کتنا بڑا ہے، اس پر کئی فلمیں بنی ہیں، کتنے ناول لکھے گئے ہیں...... خیر تم آگے بتاؤ...... راجا نے کیا کہا؟"

"اس نے بالکل وہی کہا اور کیا جس کی توقع تھی، خیر اس نے کہا کہ رفیق کے معاملے میں کسی اور سے بالکل کوئی بات نہ کی جائے۔ فیصلہ اسی کا ہوگا۔ اپنے دوست کی زندگی بچانے کے لیے وہ ہر قیمت ادا کرے گا اور اپنی زبان سے نکلے ہوئے ہر لفظ کی پاسداری کرے گا۔ جواب میں یہی کہا گیا کہ رفیق کی زندگی اب تمہارے ہاتھ میں ہے۔"

"جو دونوں طرح سے غلط تھا...... ہر زندگی خدا کے ہاتھ میں ہے اور میں تمہاری قید میں تھا تو یہ دعویٰ تم لوگ کر سکتے تھے...... راجا کے ہاتھ میں کیا تھا؟" میں نے برہمی سے کہا۔

رابعہ نے کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ "زوہیب نے اسے چھ...... نہیں...... سات بار فون کیے۔ میرا مطلب ہے کرائے...... ہر بار مختلف جگہ سے مثلاً ایک جہلم سے تو دوسرا گجرات سے...... تیسرا پنڈی سے...... ہر بار آواز بدل جاتی تھی، فون بدل جاتا تھا...... پہلے راجا سے کہا گیا کہ وہ پچاس کروڑ کے ساتھ تیار رہے۔ راجا نے یہی کیا۔ جاسوس اس وقت تک تمام معاملات سے بے خبر تھے، وہ صرف یہ بتاتے تھے کہ راجا صاحب اور باقی سب لوگ نارمل ہیں اور روزمرہ کے تمام معمولات جاری ہیں...... سب سے بڑی جاسوس خود میں راجا پر نظر رکھتی تھی، کہیں وہ کسی کو فون تو نہیں کر رہا۔ بے شک اس نے نور کو بتایا...... لیکن صرف اتنا کہ رفیق کو اغوا کر لیا گیا ہے اور بہت جلد ہم اغوا کرنے والوں کے مطالبات پورے کر کے اسے زندہ سلامت واپس لے آئیں گے۔ یہ ساری بات میرے سامنے نہیں ہوئی تھی لیکن میں نے سنی تھی، اس نے رات کے بارہ بجے فون کیا تھا...... راجا کے کمرے میں ایک ایف ایم ریموٹ مائیکروفون تھا جو بازار میں عام ملتے ہیں، اس کی مدد سے میں نے اپنے کمرے میں ایف ایم ریسیور پر راجا کی ساری گفتگو سنی۔ اس نے دو گھنٹے سر کھپایا اور دوسری طرف ہسٹریا میں مبتلا ہو کے رونے دھونے والی نور کو دلاسہ دیا، خاموش کرایا اور سمجھایا کہ ان حالات میں اس پر کیا ذمے داری عائد ہوتی ہے اور اگر اس نے جذباتی کمزوری کے باعث کوئی کوتاہی کی تو اس کے نتیجے میں رفیق کی جان جا سکتی ہے۔ اس نے کہا کہ وہ روز رات کو اسی وقت بات کرے گا۔ بائی دا وے کزن...... یہ نور تمہیں لندن میں کہاں سے مل گئی......؟"

میں اس سوال کے لیے بالکل تیار نہ تھا۔ "کہاں سے مل گئی کیا مطلب؟...... ہیرڈز یا اسپنسر جیسے کسی اسٹور سے؟ یا بازار سے......؟"

"میرا مطلب تھا، آخر...... یہ چیز کیا ہے جس نے اتنی جلدی فریال کی جگہ لے لی......؟" رابعہ کے لہجے میں حسد بہت نمایاں تھا۔

"جب تم دیکھو گی تو تمہیں پتا چل جائے گا۔"

"کیا وہ بہت حسین ہے......؟"

میں نے کہا۔ "حسن دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے۔"

"بکواس کرتے ہو تم...... ایک کے بعد دوسری...... دوسری کے بعد تیسری تمہارے سامنے آتی ہے اور تم کو سب میں حسن نظر آتا ہے، ایسا کہ تم فوراً محبوبہ نمبر ون کی جگہ محبوبہ نمبر دو کو لے آتے ہو۔"

"یہ اپنی اپنی قسمت ہے......"

"یہ قسمت نہیں ہوس پرستی ہے...... بیچاری عائشہ تمہارے چکر میں پہنچ گئی پاگل خانے......"

"تمہیں یہ بھی معلوم ہے؟"

"اس سے زیادہ حسین لگی تمہیں فریال...... پھر فریال کے مقابلے پر آ گئی وہ فاحشہ نور جہاں تو وہ تمہیں زیادہ حسین لگی اور تم نے فریال کو چھوڑ دیا۔ نور جہاں غائب ہو گئی تو یہ نور اس کی جگہ لینے کے لیے موجود...... دیکھو اس کے بعد کون آتی ہے، مگر راجا کہہ رہا تھا کہ وہ بہت ذہین اور کوالیفائیڈ بھی ہے۔ وہاں بڑا لمبا چوڑا بزنس سنبھال رہی ہے۔"

میں نے بحث کو لاحاصل سمجھتے ہوئے کہا۔ "راجا نے ٹھیک کہا۔"

وہ کچھ دیر مجھے گھورتی رہی۔ "کیا وہ مجھ سے زیادہ حسین ہے؟"

میں نے کہا۔ "یہ مقابلہ ناممکن ہے...... کم سے کم میرے لیے، ممکن ہے زوہیب کو وہ تمہارے مقابلے میں بدصورت لگے۔"

"تم واقعی اس سے بہت محبت کرتے ہو؟"

"رابعہ...... یہ کیا احمقانہ سوال ہے، میں کیسے کہہ سکتا ہوں کہ نہیں...... مجھے اس سے محبت نہیں......"

وہ تلخی سے ہنسی۔ "تم تو اب سچی محبت اتنی بار کر چکے ہو کہ ایکسپرٹ ہو گئے ہو، مگر کیا تم اس سے شادی کرو گے یا اسے بھی لٹکائے رکھو گے، اگلی ملنے تک......؟"

"رابعہ...... یہ گفتگو بے مقصد اور لاحاصل ہے۔"

وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ "رائٹ...... ہمیں کام کی بات کرنی چاہیے۔ راجا اپنے وعدے پر قائم رہا اور پچاس کروڑ روپے لے کر اس جگہ آ گیا جہاں اسے بہ آسانی لوٹا جا سکتا تھا، اس پر نظر رکھنے والے بہت مستعد اور زوہیب کو مسلسل اس کی نقل و حرکت سے آگاہ رکھتے تھے، پچاس کروڑ بھی بہت بڑی رقم ہوتی ہے لیکن ہم نے اسے واپس جانے دیا۔"

"ہم کا لفظ تم اپنے اور زوہیب کے لیے استعمال کر رہی ہو۔" میں نے کہا۔

"اب میں اور وہ الگ نہیں ہیں۔" وہ ناراضی سے بولی۔

"یہ تو وقت بتائے گا۔" میں نے اپنے دل میں کہا۔

"راجا بہت حوصلہ مند اور مضبوط اعصاب کا مالک ہے، میں اس کی جتنی تعریف کروں کم ہے۔ اس زمانے میں ساری ٹینشن اس نے اکیلے ہی لی مگر کسی پر کچھ بھی ظاہر ہونے نہیں دیا۔ اس نے بڑی ذہانت کا اور صبر کا مظاہرہ کیا۔ وہ ایک بار بھی جھنجلایا نہیں، غصے میں نہیں آیا کہ مجھے بار بار ادھر سے اُدھر کیوں دوڑایا جا رہا ہے۔ سب کے سامنے وہ ہنستا مسکراتا رہا۔ اندر سے وہ کتنا اپ سیٹ ہے اس کا اندازہ صرف میں کر سکتی ہوں کیونکہ میں اسے جانتی ہوں۔ دیکھا جائے تو اس کا خلوص ہی تمہارے کام آیا۔ تمہاری زندگی بچانے کا سارا کریڈٹ اسے جاتا ہے۔"

"مجھے فخر ہے اس کی دوستی پر......" جذبات کی شدت سے میری آنکھوں میں آنسو اتر آئے۔

"آخری بار ہم نے اسے راستے سے اٹھایا۔ معلوم نہیں وہ کہاں جا رہا تھا۔ اس کی گاڑی کو راستے میں روک لیا گیا۔ ایک دن قبل اسے بتا دیا گیا تھا کہ وہ اپنے ساتھ باڈی گارڈ یا ڈرائیور نہ رکھے کیونکہ یہ ہو سکتا ہے راستے میں رقم کا تبادلہ رفیق سے کر لیا جائے...... کسی بھی روز، کہیں بھی...... ایک جگہ اس کی گاڑی روکی گئی سڑک کی دونوں جانب سے چار افراد نکلے، ان سب کے چہروں پر نقاب تھے...... راجا نے گاڑی روک لی۔ ایک اس کی جگہ بیٹھ گیا، دوسرا ساتھ والی سیٹ پر، باقی دو پچھلی سیٹ پر راجا کے دائیں بائیں بیٹھے۔ ایک نقاب راجا کے منہ پر چڑھا دیا گیا تھا۔ وہ کسی برقعے کا اوپر والا حصہ تھا چنانچہ شک کوئی نہیں کر سکتا تھا، لگتا یہی تھا کہ دو

مردوں کے درمیان ایک برقعہ پوش خاتون بیٹھی ہے۔ راجا نے ان سے پوچھا ضرور کہ تم لوگ مجھے کہاں لے جا رہے ہو اور اسے بتایا گیا کہ نواب رفیق سے ملوانے تو اس نے کہا کہ میرا بھی یہی خیال تھا۔"

"کیا وہ برقعے کی جالی سے باہر نہیں دیکھ رہا تھا؟"

"تم اتنا بے وقوف کیوں سمجھتے ہو زوہیب کو...... جالی نہیں تھی، وہ کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس گاڑی میں راجا کو وہاں لے جایا گیا جہاں زوہیب کے ساتھ میں موجود تھی۔"

"تم؟ پہلے سے وہاں موجود تھیں؟"

وہ اپنی چالاکی پر ہنسی۔ "ایک اندھے کو کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ ڈیڑھ گھنٹے میں دائیں بائیں کہاں پہنچا۔ وہ رانا نگر سے چالیس کلومیٹر دور دریائے جہلم کے کنارے ایک ریسٹ ہاؤس تھا جو رانا صاحب کی ملکیت ہے۔"

"میرا خیال ہے میں وہاں جا چکا ہوں، ایک محفل میں۔"

"میں سمجھتی ہوں مجھے وہاں زوہیب کے ساتھ دیکھ کے راجا جتنا حیران ہوا اتنا زندگی میں کبھی نہ ہوا ہوگا۔ اسے صدمے سے سکتہ سا ہو گیا۔ وہ پلک جھپکانا کیا سانس لینا تک بھول گیا۔ یہ اتنا بڑا شاک تھا کہ معمولی اعصاب رکھنے والا برداشت نہ کر پاتا۔ وہ صدمے سے بے ہوش ہو جاتا مگر راجا ایک دم سارے معاملے کی تہ تک پہنچ گیا۔ اس کمرے میں صوفے لگے ہوئے تھے اور دروازے چاروں طرف سے بند تھے۔ کھڑکیوں پر پردے تھے، باہر کی کوئی آواز بھی سنائی نہ دیتی تھی لیکن چاروں طرف مسلح محافظ موجود تھے۔ راجا ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ اس نے میز پر رکھی ہوئی بوتل سے پانی کا گلاس بھر کے پیا اور ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "میں سمجھ گیا رابعہ...... یہ تمہارا گیم ہے، جو تمہیں زوہیب کھلا رہا ہے، مگر خیر...... یہ بتاؤ، کیا میں رفیق سے مل سکتا ہوں۔"

زوہیب نے کہا۔ "تم پوچھو گے نہیں کہ رابعہ میرے ساتھ کیوں ہے؟"

"کیا ضرورت ہے۔ یہ رابعہ کا اور تمہارا معاملہ ہے، شرائط میں ساری منظور کر چکا ہوں، خلاف ورزی میں نے کسی قسم کی بھی نہیں کی۔ رقم گاڑی میں موجود ہے۔"

زوہیب نے کہا۔ "اس رقم کو رکھو اپنے پاس، اگر پچاس کروڑ ہی لینے ہوتے تو تم پہلے بھی لائے تھے۔"

وہ کچھ حیران ہوا۔ "پھر کیا چاہیے تمہیں؟"

"رابعہ کو میرے ساتھ یہاں دیکھ کے تم کو کچھ اندازہ کر لینا چاہیے۔" زوہیب بولا۔

راجا نے میری طرف دیکھا۔ "یہ فرض کرنا تو مشکل ہے کہ صرف اس کا ہاتھ مانگنے یا رشتہ منظور کرانے کے لیے تم نے یہ حرکت کی ہوگی، رابعہ بالغ اور خود مختار ہے...... یہ پہلے بھی چاہتی تھی......"

"راجا صاحب...... رابعہ کو اپنا حق چاہیے، اب یہ مت پوچھنا کون سا حق......"

"حق کا مجھے اندازہ ہے، کیونکہ رابعہ نے پہلے بھی حق تلفی کی بات کی ہے، اگر یہ حق ہے تو رابعہ تمہارے پاس کیوں گئی...... کسی عدالت میں دعویٰ دائر کیوں نہیں کیا؟"

اب میں نے کہا۔ "دیکھو راجا، تم یہاں اپنے دوست کی زندگی بچانے آئے ہو یا قانونی بحث کرنے، تم وکیل نہیں صحافی ہو۔"

"یاد دلانے کا شکریہ...... بولو تم کیا چاہتی ہو؟"

"سیدھی صاف بات سن لو راجا صاحب......" زوہیب بولا۔ "رابعہ قانونی جنگ نہیں لڑ سکتی، وہ بھی اس شخص سے جس کو قانون اس ریاست کا مالک اور وارث تسلیم کر چکا ہے۔ اس ملک کا تو یہی دستور ہے، مانگنے سے کسی کو حق نہیں ملتا، اپنا حق چھیننا پڑتا ہے، سیدھی انگلیوں سے گھی نہ نکلے تو ٹیڑھی سے نکلتا ہے۔"

راجا نے اپنے ہاتھ کی انگلیوں کو دیکھا۔ "رابعہ، تم اپنی انگلیاں کیسے ٹیڑھی کرو گی، مجھے بتاؤ۔"

"دیکھو مسٹر راجا، بات مختصر ہے اور بہت آسان...... یہ ایک سودا ہے جسے منظور کرنا نہ کرنا تمہاری مرضی اور اختیار کی بات ہے...... ست بدھائی کی ریاست رابعہ کے نام کر دی جائے تو نواب رفیق احمد شیرازی کو چھوڑ دیا جائے گا۔"

راجا مجھے اور زوہیب کو ایسے دیکھتا رہا جیسے ہم کوئی خلائی مخلوق ہیں جن کی زبان وہ نہیں سمجھتا، پھر اس نے ماتھے پر ہاتھ پھیر کے جیسے خود سے کہا۔ "ست بدھائی کی ریاست؟ رابعہ کے نام کر دی جائے......؟"

"ہاں...... کیا رفیق کی زندگی کی یہ قیمت تمہیں بہت زیادہ لگتی ہے......؟" زوہیب نے کہا۔

راجا نے میری طرف دیکھا۔ "رابعہ، کیا قیمت ہے اس کی زندگی کی؟...... دراصل میں اس معاملے میں اناڑی ہوں، میرا مطلب ہے زندگیوں کے سودے میں نے کبھی کیے نہیں۔"

"وہ تمہارا دوست ہے......" میں نے کہا۔

"اور تمہارا کچھ نہیں......؟" راجا نے پوچھا۔

میں نے چلا کے کہا۔ "نہیں، صرف دشمن ہے وہ میرا اور کچھ نہیں، کاش یہ ممکن ہوتا کہ میں اسے قتل کر سکتی یا کوئی اسے مار دیتا، لندن میں یا نیویارک میں...... وہ کسی حادثے میں مر جاتا، پھر ست بدھائی کی ریاست کے وارث کیا تم ہوتے؟...... صرف میں ہوں جو حق ملکیت رکھتی ہوں۔"

راجا نے تلخی سے کہا۔ "اسی خون کے رشتے سے جس کو آج تم تسلیم کرنے سے انکار کرتی ہو؟"

"شٹ اپ راجا...... رابعہ سے نہیں مجھ سے بات کرو۔" زوہیب نے برہمی سے کہا۔

"کیوں......؟ تم کیا ہو رابعہ کے؟ وکیل......؟ یا رابعہ نے رفیق کو چھوڑ کر تمہیں بھائی بنا لیا ہے؟"

زوہیب نے راجا کے منہ پر ایک تھپڑ رسید کیا۔ "کتے کی طرح بھونکنے کی ضرورت نہیں، رابعہ مجھ سے شادی کر رہی ہے۔"

راجا نے رومال سے وہ خون صاف کیا جو اس کا اوپر والا ہونٹ پھٹنے سے نکلا تھا۔ "اوہ...... میں سمجھا تم رابعہ سے شادی کر رہے ہو، خیر...... چھوڑو اس بات کو...... ذرا مجھے یہ سمجھا دو کہ ست بدھائی کی ریاست تمہاری رابعہ کو کیسے دی جائے۔ ریاست کو میں یہاں اٹھا لاؤں، شاپنگ بیگ میں ڈال کے...... یا لاؤڈ اسپیکر پر مسجد سے اعلان کرا دوں کہ نواب رفیق احمد شیرازی ریاست کی ملکیت سے دستبردار ہو چکے اور انہوں نے رابعہ شیرازی کو اپنا جانشین مقرر کیا ہے؟ اخبار میں اشتہار شائع کرا دوں......؟"

زوہیب نے کہا۔ "آئی ایم سوری...... مجھے غصہ آ گیا تھا، تم میرے مہمان ہو اور مذاکرات کے لیے آئے ہو، اب میں کسی بات کا برا نہیں مانوں گا، تم نے جو سوال کیا ہے اس کا مطلب میں نے سمجھ لیا ہے۔ تم پرانے اور بہت نامور صحافی ہو، ظاہر ہے یہ مقام تم نے بہت محنت کر کے طویل عرصے میں حاصل کیا ہے، تمہاری معلومات وسیع ہوں گی اور پاکستان کے حالات سے تم سے زیادہ کون باخبر ہوگا۔ مجھے یہ بتاؤ کہ یونیورسٹی کالج کے کسی امتحان میں بیٹھنے والا کوئی امیدوار ہسپتال یا جیل میں ہو، مطلب یہ کہ امتحان دینے نہ آ سکتا ہو مگر امتحان دینا چاہتا ہو، تو کیا ہوتا ہے؟"

راجا نے کہا۔ "اسے وہیں امتحان دینے کی سہولت فراہم کی جا سکتی ہے۔"

"میرا ایک دوست تھا، کیپٹن نذیر...... اس کا اپنڈکس کا آپریشن ہوا، اگلے دن اس کا پیپر تھا، وہ شاید بی ایس سی انجینئرنگ کا فائنل ایئر کا امتحان دے رہا تھا، اسے اسپتال کے کمرے میں ایک مددگار فراہم کیا گیا۔ ایک مجسٹریٹ وہاں موجود رہا، نذیر بولتا گیا وہ مددگار یا معاون لکھتا گیا۔"

میں نے پوچھا۔ "مجسٹریٹ کا وہاں کیا کام تھا؟"

زوہیب ہنسا۔ "اس نے تصدیق کی کہ امتحان دینے والا نذیر ہی تھا۔ اس کی جگہ کوئی ایم ایس سی انجینئرنگ کرنے والے نے جوابات نہیں لکھوائے...... اور یہ کہ جو معاون تھا وہ نذیر کے بتائے ہوئے جوابات لکھ رہا تھا، اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھ رہا تھا اور یہ کہ نقل وغیرہ نہیں ہوئی۔"

راجا نے کہا۔ "اس مثال کا مقصد؟"

"مقصد یہ بتانا تھا کہ پیاسا خود کنویں کے پاس نہ جا سکے تو کنواں چل کے پیاسے تک پہنچ جاتا ہے، یہ ناممکن نہیں ہے۔ اسی مثال کو عدالتی نظام کے حوالے سے دیکھو، کیا پولیس اسپتال میں کسی زخمی یا قیدی کو بیان یا گواہی کی سہولت نہیں دیتی؟ مجسٹریٹ خود جا کے اس کا بیان لیتا ہے اور یہ تصدیق شدہ بیان کسی عدالتِ عالیہ میں بھی وہی حیثیت رکھتا ہے جو خود پیش ہو کے دیا جانے والا بیان۔"

"میں تمہارا مطلب کچھ کچھ سمجھنے لگا ہوں، اب ذرا کھل کے وضاحت کرو۔"

"یہ ایک آسان اور قابلِ عمل فارمولا ہے۔ جیو اور جینے دو کے اصول پر...... رفیق بہت خوش قسمت ہے کہ ایک زندگی میں اس کی لاٹری دو بار نکلی، پہلے اسے ست بدھائی کی جائداد اور حویلی ملی اور اس میں مدفون سارے خزانے، مجھے نہیں معلوم ان کی حقیقت اور مالیت کیا تھی، دوسری بار اس کو لندن میں ایک نواب کا جما جمایا کاروبار، محل اور اصطبل مل گیا، ہے نا بالکل ناقابلِ یقین بات۔ الٰہ دین کے چراغ جیسی کہانی، ہم تو جدی پشتی رئیس ہیں۔ یہ زمین ہمارے خاندان میں رہی ہے۔ ہر نسل نے اس میں اضافہ کیا ہے...... ہم نے محنت کی ہے، زراعت سے دولت کمائی اور صنعت کی طرف آئے، پھر سیاست کے میدان میں قدم رکھا، تم کہہ سکتے ہو کہ ہم نے ناجائز استحصالی طریقے اختیار کیے، غریب غربا کا استحصال کیا۔"

"کیا یہ سچ نہیں ہے؟" راجا بولا۔

"ہوگا...... مگر یہ غریب آخر کیوں غریب ہیں؟ کہنے کو ہم خود بھی کہتے ہیں اور مولوی سے بھی کہلواتے ہیں کہ یہ تمہاری تقدیر ہے اور کاتبِ تقدیر ہے اللہ چنانچہ شکوہ کر کے گناہ گار مت بنو، صبر کرو کیونکہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔" وہ ہنس پڑا۔

"یہ بھی استحصال ہے۔" راجا نے کہا۔

"کیا میرا تمہارا استحصال کیوں نہیں ہوتا؟ ہوتا

ہے...... جو ہم سے اوپر ہیں، بیوروکریٹ...... پارٹی لیڈر...... ہمارے مخالف، وہ کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ معاف کرنا میں باتوں باتوں میں اصل موضوع سے ہٹ گیا۔ کہنے کا مطلب صرف یہ تھا کہ ہم نے محنت سے یہ مقام پایا اور رفیق نے قسمت سے۔ وہ ایک معمولی لیکچرار کا بیٹا ہی رہتا تو لندن میں نوکری کرتا رہتا۔ نواب رفیق احمد شیرازی نہ بنتا۔ اب تو وہ بہت بڑی چیز بن گیا ہے۔ وہ بزنس کو ترقی دے کر ملٹی نیشنل کرلے گا کیونکہ اس نے ہاورڈ سے ایم بی اے کیا تھا، تین سال وہاں کام بھی کر چکا ہے۔ اسے ایک لارڈ کا خاندانی محل اور بہت کچھ مفت میں مل گیا ہے۔ ہوسکتا ہے آنے والے وقت میں دولت مندی کے لحاظ سے وہ ہمیں پیچھے چھوڑ دے۔"

راجا نے کہا۔ "مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم ذہین بھی ہو اور اتنی سمجھ بوجھ رکھتے ہو۔"

زوہیب خوش ہوا۔ "اعلیٰ تعلیم میں نے بھی لندن سے حاصل کی تھی۔ بس وہ میرے کام نہیں آئی، اس طرح تم سے بات کرنے کا موقع بھی مجھے آج ہی ملا ہے۔ رفیق کا واسطہ اب تک میرے والد ماجد سے پڑتا رہا ہے اور وہ پرانے زمانے کے جاہل جاگیردار اور موروثی سیاست داں تھے۔ ان کا زمانہ گزر گیا۔ اب رفیق کے مقابلے پر میں ہوں۔"

"کیا رانا صاحب فوت ہوگئے؟ یا تم نے ان کو سفرِ آخرت پر روانہ کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔"

"اب میرے فیصلہ کرنے کی کیا ضرورت ہے، ان کا وقت پہلے ہی آگیا ہے، وہ بوڑھے اور بیمار ہیں۔ ان کی بیماری اب شدت اختیار کر چکی ہے۔ رفیق کا آئندہ الیکشن میں حریف میں ہوں اور میں دیکھتا ہوں کہ وہ کیسے مجھے ہراتا ہے...... اس کے باپ نے کبھی سیاست نہیں کی اور میری تو گھٹی میں سیاست پڑی ہے، فی الحال تم اسے چھوڑو، رابعہ کے معاملے کو دیکھو۔"

"رابعہ کا معاملہ تم دیکھ رہے ہو۔ میرے نزدیک تو یہ کوئی معاملہ نہیں۔" راجا نے کہا۔

"رائٹ! یہ رفیق کا اور رابعہ کا معاملہ ہے، تم یہاں معاملہ سمجھنے آئے ہوتا کہ رفیق کو سمجھاؤ، رابعہ کا باپ اور نواب رفیق کا باپ سگے بھائی تھے۔ وجہ اور واقعات نے ایک کو اچانک انتہائی امیر بنا دیا۔ دوسرا غربت میں مارا گیا۔ اس میں کچھ بھی غیر قانونی نہیں تھا، یہ نصیب کی بات تھی، تم نواب ہوگئے...... رابعہ کی حیثیت صفر رہی۔ وہ تمہاری طفیلی ہوگئی، میرا مطلب ہے رفیق کی۔ مانگنے پر بھی اسے کچھ نہیں ملا جسے وہ اپنا کہہ سکتی۔"

"چنانچہ اس نے تم سے رجوع کیا۔"

"تم ایسا ہی سمجھو۔"

"اور تم سب غریبوں کو حق دلانے والے، تم کو اس سے ہمدردی ہوگئی یا محبت کہہ لو، رابعہ ایسا ہی سمجھتی ہوگی۔"

"اب رفیق زندہ رہ سکتا ہے، ہنسی خوشی لیکن صرف اس صورت میں کہ وہ ست بدھائی کی لاٹری تحفے میں رابعہ کو دے کر لندن چلا جائے۔ وہاں نور ہے۔ میں نے دیکھا ہے اسے...... اور میں واقعی دنگ رہ گیا۔ وہ بہت خوبصورت ہے، ذہین اور باہمت تو ہوگی کہ اب اکیلی اس جاپانی عورت کے ساتھ مل کے وہ بزنس چلا رہی ہے جو اس نے کبھی نہیں کیا تھا۔ یہ ایک سمپل فارمولا ہے۔ رفیق وہاں عیش کرے، یہاں رابعہ اپنی مرضی سے جیئے۔"

"تمہارے ساتھ......؟" راجا نے بیچ میں کہا۔

"آف کورس یہ بھی اس کی مرضی ہے۔" زوہیب گرم ہوگیا۔

"یعنی اس معاملے میں رفیق کی مرضی نہیں چلے گی۔"

"نہیں...... جیسے اب تک رابعہ کی مرضی نہیں چلی۔"

زوہیب نے گلاس اٹھا کے دیوار پر دے مارا۔ "قیدی کی کوئی مرضی نہیں ہوتی۔ اس نے رابعہ کے ساتھ جو ظلم کیا۔ اس کے ساتھ بھی ویسا ہی ہونا چاہیے تھا مگر قسمت اسے بچا رہی ہے، اس سے ست بدھائی کی جائداد اور حویلی چھین کے رابعہ کو دے دی جاتی اور کہا جاتا کہ اب تم رہو رابعہ کی طرح...... تب کیا پتا چلتا...... اب تو اس کے پاس چوائس ہے، ہم اسے یہ چوائس دینے پر مجبور ہیں۔ وہ جائے اور لندن میں رہے، ہم اسے کچھ نہیں کہیں گے۔ اس سے کوئی غرض نہیں رکھیں گے کہ وہ کروڑ پتی سے ارب پتی بنا یا کھرب پتی، نہ وہ الیکشن میں میرے مقابلے پر کھڑا ہوگا، نہ رابعہ کو اس کا حق دینے سے انکار کرے گا۔ اگر وہ زندہ رہنا چاہتا ہے تو وہی کرے جو میں نے کہا ہے۔"

"اور اگر وہ نہ کرے......"

"تو وہ مارا جائے گا۔ ایسے کہ کسی کو پتا ہی نہ چلے...... ہم اس کو ایک فیئر چانس دے رہے ہیں۔ اس کے پاس دو مواقع ہیں، دولت مندی اور اچھی زندگی کے۔ وہ برطانوی شہری بھی ہے۔ پاکستان سے لندن بہتر ہے، ست بدھائی کے بکھیڑوں سے لندن کا بزنس بہتر ہے۔ فریال سے نور بہتر ہے، جو بہتر ہے وہ اس کی، جو بہتر نہیں ہے وہ رابعہ کا۔"

"تم نے ہمارا نہیں کہا۔ خیر...... رفیق کی طرف سے

میں رابعہ کی یہ رحم دلانہ...... اوہ تمہاری فراخ دلانہ آفر قبول کرتا ہوں۔ جیسا تم نے کہا، بالکل ویسا ہی ہوگا، اب مجھے یہ بھی سمجھا دو کہ کیسے ہوگا، قانونی طور پر......؟"

زوہیب مسکرانے لگا۔ "وہ میں پہلے ہی بتا چکا تھا۔ اب کنواں خود چل کے پیاسے کے پاس آئے گا۔"

"کیا مطلب......؟"

"مطلب یہ کہ قانونی کارروائی مکمل ہوگی، ہر لحاظ سے...... وکیل کے مشورے کے مطابق...... لیکن اس کے لیے رفیق کو مجھے تمہیں یا گواہوں کو...... کسی کو عدالت میں خود پیش نہیں ہونا پڑے گا، عدالت ہر جگہ خود پہنچے گی۔ اس کارروائی میں وقت لگتا ہے۔ جیسے اخبار میں اطلاع عام شائع کرانے کے بعد چودہ دن یا ایک مہینے کا وقت دیا جاتا ہے کہ کسی کو اعتراض ہو تو سامنے آئے۔ پھر رجسٹری، تصدیق اور دیگر عدالتی معاملات، یہ سب یوں طے ہوں گے جیسے رفیق خود اپنی مرضی سے ہر جگہ گیا اور دستخط کیے۔ انگوٹھے لگائے، فنگر پرنٹس دیے۔ یہ ریکارڈ کا حصہ ہوتا ہے۔"

یہ سب سن کر پہلی بار راجا صاحب کی حالت غیر ہوئی، ایک دم اس کے چہرے پر شکست کے آثار نمودار ہوگئے۔ وہ پلک جھپکائے بغیر زوہیب کو اور مجھے دیکھتا رہا۔ لیکن وہ بے باہمت اور مضبوط اعصاب کا مالک، جیسا کہ میں نے پہلے کہا، کچھ دیر بعد اس نے سر ہلا کے کہا۔ "تمہارا پلان بالکل پرفیکٹ ہے مسٹر زوہیب...... میں بہت آگے تک بھی دیکھ سکتا ہوں کہ رفیق کے یہاں سے ہمیشہ کے لیے چلے جانے کے بعد کیا ہوگا، لیکن اس سے مجھے یا رفیق کو سروکار نہیں رکھنا چاہیے۔"

"رفیق بعد میں جب چاہے پاکستان آسکتا ہے۔ یہ میں جانتا ہوں، اسے روکا نہیں جاسکتا لیکن جو کچھ وہ ایک بار قانونی طور پر رابعہ کو دے چکا ہوگا، واپس نہیں لے سکے گا۔ کسی بھی عدالت کے ذریعے......"

راجا نے سر ہلایا۔ "اسی لیے میں نے کہا کہ تمہاری سازش...... معاف کرنا...... اسکیم مکمل اور بے عیب ہے، کیا تم سے پوری طرح اتفاق کرنے کے بعد اور رفیق کی طرف سے ضمانت دینے کے بعد میں اس سے مل سکتا ہوں؟"

زوہیب نے سر ہلایا۔ "تمہیں اس سے ضرور ملوایا جائے گا تاکہ تم یہ سب اسے سمجھا سکو جو میں نے تمہیں سمجھایا۔ اسے قائل کرسکو کہ زندگی سے بڑی کوئی چیز نہیں ہوتی، ست بدھائی جانے کے بعد بھی اس کے پاس بہت کچھ ہے، یہ فائدے کا سودا ہے۔ مجھے امید ہے وہ سمجھ جائے گا۔"

"بالفرضِ محال...... وہ نہ سمجھا۔ پھر!...... اس نے میری بات ماننے سے انکار کردیا؟"

"تو دو باتیں ہوسکتی ہیں، اس کی لاش کہیں مل جائے، کچھ عرصے بعد...... یا وہ سات سال قید میں رہے...... رابعہ اس کے لاپتا ہونے کی رپورٹ لکھوا چکی ہے۔ سات سال بعد بھی وہ اس کی موت کا سرٹیفکیٹ حاصل کرسکتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ نہ رفیق اتنا بے وقوف ہے کہ اپنا برا بھلا نہ سوچے، نہ تم کوئی کمزور وکیل کہ اسے قائل نہ کرسکو۔"

"اگر یہ تعریف ہے تو شکریہ، لیکن مجھے لگتا ہے زوہیب کہ تمہارے مقابلے میں رفیق اناڑی ہے اور میں کچھ بھی نہیں۔ وہ کہاں ہے......؟ میں اسے ملے بغیر قائل نہیں کرسکتا۔"

"بالکل ٹھیک...... تم اس کو دیکھو گے، اس سے بات کرو گے، براہِ راست لیکن یہ ایک ویڈیو کانفرنس ہوگی۔ تم اور وہ ٹی وی اسکرین پر نظر آؤ گے اور تمہاری آواز بھی ایک دوسرے تک پہنچے گی لیکن سنسر ہو کے، جو تم کہو گے وہ ریکارڈ ہوکے جائے گا۔ اس کے قابلِ اعتراض حصے کاٹ دیے جائیں گے۔ یہ ملاقات بہت جلد ہوگی، ابھی تم واپس جاؤ بالکل نارمل طریقے سے ایسے ہی رہو جیسے رہتے ہو۔ رابعہ بھی واپس جائے گی۔ ابھی کسی کو کچھ معلوم نہیں ہوگا، تم رفیق کی زندگی کا سودا کرنے آئے ہو، آفر تمہیں مل چکی ہے، آگے تمہاری مرضی......"

میں رابعہ کی باتیں ایسے سن رہا تھا جیسے خواب میں ہوں...... غالب نے کیا خوب کہا ہے...... تھے خواب میں ہنوز جو جاگے تھے خواب میں...... اچانک ٹی وی اسکرین پر سے رابعہ کا چہرہ غائب ہوگیا اور اس کی آواز بند ہوگئی تو میں کچھ دیر اس شخص کی طرح بیٹھا رہا جو سوتے میں ڈراؤنا خواب دیکھ کے جاگے تو اندھیرے میں بیٹھا سوچتا رہے کہ یہ کیا تھا؟ حقیقت یا خواب۔ جو کچھ میں نے سنا تھا اس پر یقین کرنا مشکل تھا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے مگر رابعہ نے بڑی تفصیل سے مجھے سمجھا دیا تھا کہ ناممکن کچھ بھی نہیں ہوتا۔ بہت دیر تک میں ساکت بیٹھا رہا اور سوچتا رہا۔ پھر میں نے مان لیا کہ یہ ہوسکتا ہے اور یہی ہوگا۔

خوابِ غفلت یا احساسِ بے گانگی اور ہوشمندی کے چار اور وقفے گزرے جس میں میری فکر اور سوچ ایک دائرے میں محدود رہی اور ذہن میں وہی سوالات جنم لیتے رہے جن کا جواب تھا اور نہیں بھی تھا کسی جواب کو عقل ایک وقت میں تسلیم کرتی تھی تو دوسرے وقت میں مسترد کردیتی تھی۔ ایسا ہوسکتا

ہے، ایسا نہیں ہوسکتا۔ ایسا ہو جائے تو کیا ہوگا، نہیں ہوا تو کیا ہوگا۔

اس کے ساتھ اپنے ماضی کے نقوش تھے۔ یادیں تھیں اور ان سے جڑے ہوئے سوالات تھے۔ وہی جو غالب نے کہا تھا کہ نہ تھا کچھ تو خدا تھا، کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا...... ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا...... میں نے کہاں کیا غلطی خود کی۔ کب حالات کے جبر نے مجھ سے وہ کرایا جو میں کرنا نہیں چاہتا تھا۔

ان خیالات پر ایک سوال کسی عذاب کی طرح مسلط تھا، کیا میرے بچنے کی کوئی صورت ہے، کوئی امکان ہے کہ میں رابعہ اور زوہیب کے سامنے انکار کرسکوں اور زندہ بھی رہوں۔ کہیں حالات میں کوئی ایسی تبدیلی آسکتی ہے جس کو تائید غیبی سمجھا جائے اور وہ سب نہ ہو جو ہونے والا ہے۔ ایسے تمام سوالات کا جواب نفی میں رہتا تھا۔

میری نظر دن میں سو بار ٹی وی کی طرف اٹھتی تھی جو کسی لاش کی طرح خاموش بے جان اور سرد پڑا تھا۔ میری دعائیں تھیں تو ایک مقصد کے لیے وقف تھیں کہ میری راجا سے بات ہو جائے...... اس کے بعد جو ہونا ہے وہ بھی ہو جائے۔ سزائے موت پانے والا وہ قیدی جس کی سزا پر عمل درآمد کی تاریخ بے سبب آگے بڑھ رہی ہو اور کیا دعا مانگے گا کہ یہ زندگی ختم ہو تو موت کے انتظار کا عذاب بھی ختم ہو۔

بالآخر ایک روز اچانک ٹی وی بھی روشن ہو گیا اور میں نے پورے اسکرین پر راجا کا جیتا جاگتا کلوز اپ یوں دیکھا جیسے وہ میرے سامنے ہو اور میں بے اختیار چلایا۔ ''راجا...... راجا...... کہاں ہے تو...... میری آواز سن رہا ہے نا......''

چند سیکنڈ کے وقفے سے راجا نے جذبات سے عاری سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''فیکے پتر پریشان نہ ہو، میں سب ٹھیک کرلوں گا، اللہ پر بھروسا رکھ۔''

راجا کی اور میری گفتگو سنسر ہو رہی تھی۔ میرے سوال یا اس کے جواب کی کہیں کوئی ایڈیٹنگ کر رہا تھا چنانچہ اس کے ہونٹ ہلتے تھے یوں لگتا تھا کہ وہ کچھ اور کہہ رہا ہے یا جتنا میں نے سنا راجا نے اس سے زیادہ بولا تھا لیکن جیسے یہ بات مجھے سمجھا دی گئی تھی راجا کو بھی بتا دی گئی ہوگی اور ہم دونوں اس پابندی کو قبول کرنے پر مجبور تھے۔

راجا نے کوشش سے اپنے جذبات پر قابو رکھا تھا لیکن میں نہ رکھ سکا۔ نہ جانے کتنا عرصہ تنہائی کی قید میں ذہنی و جسمانی اذیت اٹھانے سے میرے اعصاب بھی جواب دے چکے تھے۔ اتنے دنوں کی تنہائی کے بعد یہ پہلی دلدار صورت تھی جو میں نے ایک طویل عرصہ انتظار کا عذاب جھیلنے کے بعد دیکھ[ی] تھی، شاید یہ عذاب صدیوں پر محیط تھا، یہ میرے کانوں تک پہنچنے والی پہلی مہربان آواز دوست کی تھی۔ میں رو پڑا۔ بے اختیار میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ ''راجا...... مجھے اس اذیت سے نجات چاہیے...... تو کچھ بھی کر، مجھے ان کی ہر شرط منظور ہے۔''

ہوسکتا ہے راجا تک میرے الفاظ نہ پہنچے ہوں لیکن جیسے میں اسے دیکھ رہا تھا۔ راجا کے سامنے میرا چہرہ ہوگا۔ خو[د] پر قابو رکھنے کی سخت جدوجہد کے باوجود وہ اپنی آنکھوں میں ا[مڈ] آنے والے اشکوں پر قابو نہ رکھ سکا۔ اس نے رومال سے آنکھیں صاف کر کے پھر بات شروع کی۔

''دیکھ...... رونے دھونے میں وقت ضائع کرنے [کا] کوئی فائدہ نہیں، اس سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔''

میں نے ہتھیلی سے آنسو صاف کیے۔ ''تو کیسا ہے راجا، باقی لوگ کیسے ہیں؟''

''سب ٹھیک ہیں......'' راجا نے کہا۔ آگے میرے او[ر] اس کے درمیان جتنی گفتگو ہے وہ سب مکمل نہیں ہے۔ صرف اتنی ہے جتنی مجھے یا اسے سننے کی اجازت دی گئی۔ اس کی او[ر] میری باتوں میں سے بہت کچھ حذف کر دیا گیا۔ اس کا انداز راجا کو بھی ہوگا، بعض اوقات ٹی وی ڈراموں یا فلموں [کی] Dubbing کا تکنیکی معیار خراب ہوتا ہے تو صاف نظر آ[تا] ہے کہ الفاظ کے مطابق لبوں کی حرکت نہیں ہے۔ بات [ختم] ہو گئی لیکن کردار بولتا دکھائی دے رہا ہے یا اس کے ہونٹ نہیں ہلے مگر آواز سنائی دے رہی ہے۔ یہاں بھی کچھ ایسا ہی مسئلہ رہا۔ میں نے جو کہا وہ مکمل ہے۔ جو سنا وہ نامکمل درج ہ[وا] ہے۔

میں نے کہا۔ ''سب سے پہلے مجھے یہ بتا راجا کہ آج تاریخ کیا ہے، دن کیا ہے اور وقت کیا ہے؟''

راجا نے کچھ کہا جو مجھے سنائی نہیں دیا۔

میں نے کہا۔ ''کتنا عرصہ ہو گیا مجھے اس قید میں، مجھے کچھ پتا نہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کئی سال بیت گئے، آخر مجھے کب اغوا کیا گیا تھا؟ اور میں کہاں ہوں، تو کہاں ہے؟''

راجا نے کچھ زیادہ کہا مگر میں نے سنا۔ ''چھوڑ ان باتوں کو۔ ان سے کیا فرق پڑتا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''میں سمجھ گیا، تجھے بھی یہ بتانے سے روک دیا گیا ہے، خیر، یہ بتا...... تیری نور سے بات ہوئی تھی؟''

''ہاں...... وہ لندن کے معاملات کو بہت اچھی طرح سنبھال رہی ہے، میں خود......'' اس کے آگے سنائی نہیں دیا مگر میں نے ہونٹوں کی حرکت سے اندازہ کیا کہ اس نے کہا۔ ''اس سے ملا تھا......''

اس کا مطلب تھا کہ راجا نے درمیان میں ایک چکر لندن کا بھی لگا لیا۔ اس نے فون پر نور کو سب بتانے اور وہاں کے حالات دیکھنے کے لیے خود جانا بہتر سمجھا۔ میں نے کہا۔ ''مجھے تجھ پر بھروسا ہے راجا...... آئندہ جو کرنا ہے تجھے کرنا ہے۔ رابعہ کے بارے میں واقعی یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ وہ میرے خلاف اتنی بڑی سازش کرسکتی ہے۔ وہ بھی زوہیب جیسے دشمن کے ساتھ مل کر...... وہ پچھتائے گی۔''

یہ سب راجا نے نہیں سنا ہوگا۔ اس کا چہرہ سپاٹ رہا۔ پھر اس نے کہا۔ ''دیکھ میری بات سمجھ۔ ایسا نہ ہو پھر یہ مہلت بھی نہ ملے۔ اس لیے کام کی بات کر...... فضول کی باتوں میں وقت ضائع نہ کر۔''

''ٹھیک ہے راجا، ان کا مطالبہ ہے کہ میں ست بدھائی کی ساری جاگیر اور حویلی رابعہ کے نام کر دوں۔''

''تجھے ایسا ہی کرنا چاہیے فیکے پتر...... کوئی چیز تیری زندگی سے بڑھ کر نہیں۔''

''لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے؟''

''سب ہوسکتا ہے رفیق...... یہ بات سمجھ لے۔''

''مگر کیسے......''

''انہوں نے تجھے سب کچھ تو سمجھا دیا تھا۔ اب میں اور کیا کہوں۔''

میں راجا کی صورت دیکھتا رہا جس پر کوئی جذبات نہ تھے، مجھے یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ راجا بھی ایسی بات کرسکتا ہے۔ ''وہ کہتے ہیں کہ عدالت میں میرا حاضر ہونا ضروری نہیں، خود عدالت میری خدمت میں حاضر ہوگی۔''

''وہ ٹھیک کہتے ہیں...... ایسا ہی ہوگا۔''

''پھر میں کیا کروں...... اس جعلسازی میں تعاون کروں؟''

''اس میں کوئی جعلسازی نہیں ہوگی۔'' راجا بولا۔

میں نے کہا۔ ''یعنی وہ جو مجھ سے کاغذات پر دستخط کرانے اور میرے انگوٹھے لگوانے آئیں گے، اصلی عدالتی اہلکار ہوں گے؟''

''یس...... ساری کارروائی قانونی اور اصلی ہوگی، ورنہ اس کا فائدہ؟......'' راجا نے کہا۔

''اسے بعد میں چیلنج نہیں کیا جاسکے گا؟''

''نہیں...... تو ست بدھائی میں اپنے حق ملکیت سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جائے گا، تیری جگہ لے گی رابعہ۔''

''لیکن......''

''لیکن ویکن کچھ نہیں، تو اسے ہر چیز گفٹ کرے گا۔ اس کے لیے ہبہ کا قانون ہے۔''

''کوئی مجھ سے پوچھے گا نہیں کہ کیا تم پاگل ہو گئے ہو جو ایسا کر رہے ہو...... یا تم پر جبر ہو رہا ہے۔''

''قانون کے مطابق کوئی بھی شخص اپنی کوئی بھی چیز کسی کو دینا چاہے تو دے سکتا ہے، سوائے بیوی کے۔'' راجا مسکرایا۔

''او کے...... میں تیری بات مان لیتا ہوں، اس کے بعد؟''

راجا نے کہا۔ ''اس کے بعد کیا...... تو لندن میں رہے گا کیونکہ تیرا وہاں بہت بڑا بزنس ہے...... اور نور ہے۔''

''اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ مجھے لندن جانے کے لیے زندہ چھوڑ دیا جائے گا۔''

''مجھے یقین ہے...... ایسا ہوگا کیونکہ اس کے بعد کسی کو تجھ سے کوئی خطرہ نہیں اور تو خود وہیں محفوظ ہوگا۔''

میں نے کہا۔ ''اور باقی سب...... تو...... شہناز......''

''سب کی اپنی اپنی زندگی ہے، جو پہلے تھی۔ ہم اسی کی طرف لوٹ جائیں گے۔''

''اور ست بدھائی ترقیاتی پروگرام کا کیا ہوگا؟''

''اس کے بارے میں کچھ سوچنا نہ تیرا کام ہے نہ میرا، نئے مالکوں کے لیے میں کچھ نہیں کہہ سکتا، وہ جو چاہیں کریں۔''

''یہ جو اتنا بڑا اسپتال بن گیا تھا۔''

راجا نے کہا۔ ''ہوسکتا ہے وہ چلتا رہے۔ اسکول بھی باقی رہے، میں اپنی اور شہناز کی بات کرسکتا ہوں کہ ہم ست بدھائی میں نہیں رہیں گے۔''

''تم کہاں جاؤ گے؟''

''اپنی اسی دنیا میں، جہاں سے ہم آئے تھے۔ میں صحافت کی طرف اور ڈاکٹر شہناز اپنے کلینک میں جو بند پڑا ہے۔ ہماری فکر نہ کر، ہم ساتھ ساتھ ہیں اور زندگی بھر کے لیے۔''

''لیکن میرا اور تیرا ساتھ ختم......''

''کیوں ختم...... کبھی یہ ساتھ محض ست بدھائی کی وجہ سے تھا؟ اس سے پہلے نہیں تھا جب نہ میں صحافی تھا نہ تو نواب...... وہ وقت یاد کر کہ کبھی ہم پھکو ہوتے تھے تو جیب میں چائے پینے کے لیے پیسے نہیں ہوتے تھے، ہم نے سڑکوں

پر سے سگریٹوں کے ٹوٹے اٹھا کے بھی پیے، اب لندن اتنی ہی دور ہے جتنی دور...... دوری کیا چیز ہوتی ہے فیکے پتر، پیدل جاؤ تو گوجرانوالہ پہنچنے میں یا سائیکل پر پنڈی جانے میں بھی اتنا ہی وقت لگتا ہے جتنا ٹرین سے یا بس سے ملتان جانے میں۔ جہاز اتنی دیر میں لندن پہنچا دیتا ہے اور ہم ککھ نہیں رہے۔ جہاز کا کرایہ افورڈ کر سکتے ہیں۔''

میں نے آہستہ سے کہا۔ ''ہاں...... میں بھی آسکتا ہوں اور تم دونوں بھی، اپنا ہنی مون منانے......''

''یار ہم جذباتی ہو گئے۔'' راجا مسکرایا۔ ''ایسی باتیں کرنے کے لیے عمر پڑی ہے۔''

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ''ست بدھائی کو ہم ایک رات کا خواب سمجھ کے فراموش کر دیں۔''

''ایک خواب پر ساری زندگی کا سودا کرنا کوئی عقلمندی نہیں۔ آدمی جو چاہتا ہے سب اسے نہیں ملتا۔ ہر خواہش پوری نہیں ہوتی کیونکہ تقدیر پر کسی کا بس نہیں چلتا۔ زندگی کے روشن پہلو کو سامنے رکھ۔ تیرے اور میرے پاس بہت کچھ ہے، جو اس ملک کے کروڑوں انسانوں کے پاس نہیں۔''

''فضول لیکچر مت دے، افلاطون کے بچے۔ یہ سب میں جانتا ہوں، میں نے تیری بات مان لی ہے۔''

''اس لیے میں نے قانونی کارروائی کا آغاز کرنے کا گرین سگنل دے دیا تھا۔''

''کیا مطلب......؟''

''اخبار میں اطلاعِ عام کے عنوان سے نوٹس شائع ہو چکا ہے، تیری طرف سے......''

''میری طرف سے......''

''ہاں...... یہ کام وکیل کرا لیتے ہیں، اس کے لیے تیرا بقلم خود کہیں بھی حاضر ہونا ضروری نہیں۔''

''کیا ہے اس اطلاعِ عام میں......؟''

''یہی کہ تو اپنی تمام ملکیتی جائداد اور جاگیر اپنی عم زاد رابعہ شیرازی کو ہبہ کر رہا ہے...... کسی کو اعتراض ہو تو مطلع کرے۔ اعتراض کون کرے گا؟''

''کب شائع ہوا تھا یہ نوٹس اور کس اخبار میں؟''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اخبار کون سا تھا۔ عدالتوں میں قانونی ضرورت پوری کرنے کے لیے بعض وکیل کسی بھی نام سے اخبار یا ڈیکلریشن حاصل کر لیتے ہیں۔ ہفتے میں ایک بار چار یا آٹھ صفحے چھپوا لیتے ہیں۔ اس میں یہی اطلاعِ عام کے اشتہارات ہوتے ہیں اور کچھ نہیں۔ لیکن عدالت تسلیم کر لیتی ہے کہ قانونی ضرورت پوری کرتے ہوئے مدعا کو مشتہر کر دیا گیا ہے۔''

''کیا اس کی میعاد پوری ہو گئی؟''

جواب کچھ دیر بعد آیا۔ ''نہیں ہوئی تو ہو جائے گی۔ تو باقی کارروائی کے لیے تیار رہ، تجھ سے وکیل جہاں دستخط کرنے کو کہے۔''

''کون وکیل...... ماجد خان......؟''

''اس کا نام ہے...... ملک ارشد...... وہی لندن میں تیرے قانونی معاملات کی دیکھ بھال کرتا ہے۔''

میں بھونچکا رہ گیا۔ ''ملک ارشد؟...... وہ یہاں کیسے آیا......؟''

''میں نے بلوایا اور نور نے بھیجا، وکیل اپنی فیس لیتے ہیں اور آنے جانے کا کرایہ......''

مجھے خوشی بھی ہوئی اور حیرانی بھی۔ ''رابعہ کا بھی کوئی وکیل ہوگا۔''

چند سیکنڈ بعد راجا نے کہا۔ ''ہاں...... اس نے فاروقی کو وکیل کیا ہے۔''

میری خوشی ایک دم صدمے اور غصے میں بدل گئی۔ میں نے اسے کئی گالیاں دیں۔ افسوس کے جذبات میں نے راجا کی صورت پر بھی دیکھے تھے لیکن میری دی ہوئی گالیاں سنسر کر دی گئیں کیونکہ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ رہا۔ ہاں وہ میری صورت دیکھ کے ضرور سمجھ گیا ہوگا کہ میرے دلی جذبات کیا ہیں۔ ''کل تک وہ میرا دوست تھا اور اتنا ہی قابلِ اعتماد جتنا تو...... آج وہ دشمن ہے۔''

''زندگی اسی کا نام ہے فیکے پتر...... مجھ پر بھی اتنا بھروسا نہ کر، کوئی انسان فرشتہ نہیں ہوتا کہ شیطان کے بہکانے میں نہ آئے۔''

''اس بات کے جواب میں میرا تھپڑ ادھار......''

راجا مسکرایا اور اس نے اپنے ہاتھ سے ایک تھپڑ اپنے چہرے پر مار لیا۔ ''لے...... تیرا کام میں کر دیتا ہوں، اب ساری بات تیری سمجھ میں آ گئی ہے نا، تو اس کے خلاف کچھ نہیں کرے گا۔ کورٹ کا جو بھی نمائندہ...... رجسٹرار یا جج تیرے پاس ان دو وکیلوں کے ساتھ آئے گا...... ان کے سامنے تو کوئی بکواس نہیں کرے گا، یہ سمجھ لینا کہ وہ تیرے پاس نہیں آئے تو ان کے سامنے پیش ہونے گیا ہے کیونکہ ریکارڈ پر ایسا ہی ہوگا۔''

میں نے دکھی دل سے کہا۔ ''ٹھیک ہے راجا، میں خود پر قابو رکھوں گا۔''

''ایسا کئی بار بھی ہو سکتا ہے، تو اچھی طرح سمجھ لے کہ تیرے مفاد میں ہے، تیری زندگی سب سے اہم ہے۔ اس کا نہ کوئی مول ہے نہ قیمت۔ اگر لندن بزنس بھی تجھے بچانے میں کام آتا تو ہم دے دیتے۔ تیرے کون سے بیوی بچے بھوکے مر جاتے۔ جو صلاحیت اور قابلیت تیرے پاس ہے وہ تجھ سے کون چھین سکتا ہے، اس سے تو پھر ایک نئی کامیاب زندگی بنا لیتا لیکن ایسا کچھ نہیں ہو رہا۔ ست بدھائی کو اپنی زندگی کا صدقہ جان، اس ہاتھ لے کے اس ہاتھ دے دیا۔ یہ کون سی تیری ساری عمر کی کمائی تھی یا تو نے محنت سے بنائی تھی، فرض کر لے کہ لاٹری نکلی تھی مگر نمبر جعلی تھا۔ فیکے پتر...... دماغ کی مت مان، دل کو قائل کر، مجھے اور کچھ نہیں کہنا۔ امید ہے تجھ سے بہت جلد ملاقات ہوگی...... اپنا خیال رکھنا۔''

اس سے پہلے کہ میں راجا کے انتہائی جذباتی انداز میں رخصت ہونے پر کسی ردِعمل کا اظہار کرتا اس کا چہرہ ٹی وی اسکرین سے غائب ہو گیا۔ میں پھر اکیلا ہو گیا، ان تمام بے جان چیزوں کی طرح جو اس کمرے میں موجود تھیں، قیدی میں اور قید خانے کی دیواروں کی بے بسی میں کیا فرق ہوتا ہے، دونوں کا نہ کوئی رشتہ ہوتا ہے نہ اختیار۔

میں بہت دیر تک ٹی وی کو دیکھتا رہا۔ وہ سب جو میں نے دیکھا تھا اور سنا تھا بالکل خوابِ سحر کی طرح مجھے یاد تھا، میرے سامنے تھا، میں اپنی جگہ بیٹھا سوچتا رہا، راجا نے میرے خیالات کو ایک واضح سمت دے دی تھی۔ میرا ذہنی انتشار ختم کر دیا تھا، صاف الفاظ میں مجھے بتا دیا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا ہے، راجا اور میں ایک ہی تھے جو اس نے کہا وہی تھا جو میں کرتا......

لیکن ایک معاملہ طے ہو جانے کے بعد میرا ذہن جیسے آزاد ہو گیا تھا کہ آگے کی زندگی کے بارے میں سوچ سکے۔ ٹھیک ہے، اس معاملے میں میرا اختیار باقی نہ رہا تھا چنانچہ میں نے رابعہ کے سامنے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیے تھے۔ اس کے سوا چارہ بھی نہ تھا لیکن اب میں کسی شکست خوردہ بادشاہ کی طرح سوچ رہا تھا۔ اس کی مثال ہمایوں سے دی جا سکتی ہے کہ جب شیر شاہ سے شکست کھانے کے بعد اس کی سلطنت چھن گئی تو وہ جان بچا کے اِدھر اُدھر پھرتا رہا اور سوچتا رہا کہ کس طرح اپنی کھوئی ہوئی حکومت واپس حاصل کرے۔ بالآخر ایران کے شہنشاہ طہماسپ نے اس کی مدد کی اور ہمایوں نے شیر شاہ جانشین کو نکال باہر کیا اور دوبارہ دہلی کے تخت پر اقتدار حاصل کر لیا۔ اسی کی ہمت کا نتیجہ تھا کہ مغل حکومت کا چراغ روشن رہا اور بعد میں اکبرِ اعظم، جہانگیر، شاہجہاں اور اورنگ زیب جیسے حکمران پیدا ہوئے۔

میں نے بازی ہار دی تھی لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہ تھا کہ میں نے ہمت بھی ہار دی تھی۔ میرے دو دشمنوں نے اتحاد کر لیا تھا اور میرے سامنے اس کے سوا کوئی راستہ نہ چھوڑا تھا کہ میں اپنی ہار مان لوں۔ اگر کسی طرح میں اس قید خانے سے ان کی تمام شرائط بلا چوں و چرا قبول کرنے کے بعد زندہ نکلنے میں کامیاب رہا تو پھر یار زندہ صحبت باقی، دیکھتے ہیں کہ انگریزی محاورے کے مطابق...... آخر میں کون کس پر ہنستا ہے۔ آخری شکست کس کی ہوتی ہے۔ یہ تو باکسنگ کی طرز کے مقابلے کا آغاز تھا جس میں پہلا راؤنڈ یقیناً رابعہ یا زوہیب حسن نے جیت لیا تھا مگر یہ آخری راؤنڈ نہیں تھا۔

اب جنگ کے وہ اخلاقی اصول نہیں ہوتے جو پہلے ہوتے تھے۔ پہلے بھی مکروفریب کو حکمتِ عملی (Strategy) کہا جاتا تھا۔ دشمن کو دھوکے میں مبتلا رکھنے کے لیے ہر چال چلی جاتی تھی۔ یہ ہو سکتا تھا کہ رابعہ اور زوہیب نے مجھ سے جھوٹ بولا ہو، یہ سوچا ہو کہ پہلے رفیق کو اپنا کام نکلوانے کے لیے راضی کرو، وہ ست بدھائی سے دستبرداری پر راضی ہو جائے، جہاں ہم کہیں دستخط کر دے۔ ہماری اس یقین دہانی پر کہ اس کے بعد وہ لندن جانے کے لیے آزاد ہوگا۔ مقصد حاصل ہو جانے کے بعد ہم اسے مار دیں تو کوئی ہمارا کیا بگاڑ لے گا۔

اب مجھے امید کی ایک کرن نظر آنے لگی تھی جو روشن سے روشن تر ہوتی جا رہی تھی۔ محاورہ ہے کہ انسان غلطی کا پتلا ہے۔ چالاک سے چالاک مجرم غلطی کرتے ہیں اور پکڑے جاتے ہیں۔ جرنیل غلطی کرتے ہیں اور جنگ ہار دیتے ہیں۔ شاید ایک غلطی رابعہ اور زوہیب سے بھی ہو گئی تھی۔ حد سے بڑھے ہوئے اعتماد کے باعث یا دشمنی کے اندھے پن میں...... انہوں نے مجھ سے اپنی بات منوانے کے لیے راجا کو بیچ میں ڈالا تھا۔ شاید ان کا خیال ہوگا کہ میں قید و بند کی سختی سے گھبرانے والا نہیں ہوں۔ ایسا بہرحال نہیں تھا اور میں مر جانا قبول کروں گا لیکن ان کی خواہش پر آنکھ بند کر کے ست بدھائی سے دستبرداری کی دستاویز پر دستخط نہیں کروں گا، ایسا بھی نہیں تھا۔ مجھے اپنی زندگی عزیز تھی اور یہ بھی معلوم تھا کہ ست بدھائی میرے اثاثوں کا صرف نصف ہے۔ باقی نصف لندن میں محفوظ تھا لیکن وہ بھی نہ ہوتا تو میری زندگی بے وقعت نہ ہوتی۔ میرے پاس ہمت تھی، ذہانت تھی، جینے کی لگن تھی اور میرے کام آنے والی وہ ڈگریاں تھیں جن سے میں پھر لندن میں اعلیٰ ملازمت حاصل کر سکتا تھا اور ایک برطانوی شہری کی حیثیت سے دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑا

ہو کر خوشحال زندگی بسر کر سکتا تھا۔

میں ست بدھائی کے لیے جان دینے والا نہیں تھا مگر کبھی اندازے کی غلطی رابعہ اور زوہیب کے مستقبل کے لیے ایک چیلنج بن کے سامنے آسکتی تھی۔ مجھ سے اپنی بات منوانے کے لیے انہوں نے راجا کو آگے بڑھایا اور اب وہ بہت خوش ہوں گے کہ ان کی چال کامیاب رہی۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ راجا کیا چیز ہے۔ انہوں نے مجھے بھی Under Estimate کیا اور میرے دستِ راست راجا کو بھی۔

میں تو اس قید خانے میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے بھی محروم کر دیا گیا تھا مگر راجا کے دماغ نے کام کیا۔ ایک چیلنج کو سامنے رکھ کر دشمنوں کو اعتماد کے فریب میں مبتلا کیا۔ اس کا پہلا مقصد میری زندگی کا یقین حاصل کرنا تھا۔

میں یہ سمجھ سکتا تھا کہ اب میری زندگی کو خطرہ لاحق نہیں رہا۔ وعدہ خلافی کرتے ہوئے دشمنوں نے مجھے مار دیا تو وہ خود بھی مارے جائیں گے۔ راجا ان کی جان کو آجائے گا اور انہیں کیفرِ کردار تک پہنچائے بغیر اس کا انتقام پورا نہیں ہوگا۔

اس نے ایک بہت گہری چال چلی تھی جو دشمن نہ سمجھ سکے۔ اس نے میرے لیے کسی مقامی وکیل کی خدمات حاصل نہیں کی تھیں۔ اس نے لندن سے ملک ارشد کو بلا لیا تھا۔ ممکن ہے رابعہ اور زوہیب نے کہا ہو کہ اتنی دور سے وکیل بلانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہاں بہت وکیل ہیں اور اب ماجد خان اس کے قانونی معاملات کو دیکھتے ہیں۔ راجا نے کسی نہ کسی طرح ان سے اپنی بات منوائی کہ آج کل جو رفیق کا قانونی مشیر ہے اسی کو رہنے دیا جائے۔ زیادہ سے زیادہ اس کے لندن سے آنے جانے کا کرایہ خرچ ہوگا۔ وہ کوئی بڑا خرچ نہیں...... اور رابعہ زوہیب نے ان کی بات مان لی۔

شاید یہ دوسری زیادہ بڑی غلطی تھی جو پہلی غلطی کا تسلسل تھی۔ خود مجھے معلوم نہ تھا کہ ارشد ملک کے پاس پاکستان میں پریکٹس کرنے کا لائسنس تھا یا نہیں۔ وہ لندن میں پریکٹس کر رہا تھا اور وہاں پاکستانیوں کے کیس لیتا تھا۔ وہ برطانوی شہریت کے مسائل سے نمٹنے میں مدد کرتا تھا۔ ظاہر ہے اس کو وہاں کے امیگریشن قواعد اور قانون سے زیادہ واقفیت ہوگی۔ پھر وہ یہاں قانونی معاملات میں میرا معاون و مشیر کیسے ہوگا؟ یہ سوال زوہیب یا رابعہ کو کرنا چاہیے تھا جو انہوں نے نہیں کیا، ملک ارشد کا نام پاکستانی تھا' وہ مان گئے۔

میں جاگتا رہا اور سوچتا رہا۔ اگر ملک ارشد کے پاس یہاں پریکٹس کرنے کا لائسنس تھا تب بھی کوئی حرج نہیں۔ مجھے ایک اور گواہ ملے گا جو کہہ سکے گا کہ فلاں دن اور تاریخ کو نواب رفیق نے میرے سامنے بقائمی ہوش وحواس دستخط کیے تھے۔ اب وہ کہاں ہے؟ فریقِ ثانی بتائے...... راجا اور ارشد ملک کے رابعہ کی اور زوہیب کی زندگی مشکل کر دیں گے۔ انہیں گھیر لیں گے اور قانون کی مدد سے ان کے گرد حلقہ تنگ کرتے جائیں گے۔

اس خیال نے مجھے بڑی خوشی اور طاقت دی لیکن میں نے چہرے کے تاثرات سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا کیونکہ میں کیمرے کی نگاہ میں تھا اور مجھے ڈر تھا کہ کہیں دور زوہیب اور رابعہ کی نظر مجھ پر نہ ہو اور وہ مجھے خوش پا کر اعتماد نہ کھو بیٹھیں، اچھا ہے۔ میں پہلے کی طرح پریشان، فکرمند، شکست خوردہ اور ملول نظر آنے کی کوشش کرتا رہا۔ میں نے کھانا کھایا اور سو گیا۔

معلوم نہیں میں کتنی دیر بعد جاگا۔ کچھ دیر بعد مجھے کافی دی گئی۔ میرے ساتھ اب بہتر سلوک ہو رہا تھا۔ اس کا مقصد یہ بھی ہو سکتا تھا کہ جب وکیل اور عدالتی اہلکار مجھ سے دستخط کرانے آئیں تو ملک ارشد کو میری ذہنی صحت کے ساتھ جسمانی حالت بھی ٹھیک لگے۔

یہ ناممکن تھا کہ میں اپنے دماغ کو پرسکون رکھ سکوں اور ان معاملات کے بارے میں نہ سوچوں جن کی وجہ سے میں یہاں قید تھا...... اچانک مجھے ایک خیال آیا۔ ملک ارشد کو راجا نے دیکھا نہیں تھا۔ پھر اسے زوہیب نے یا رابعہ نے کہاں دیکھا ہوگا، یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ لندن سے آنے والا ملک ارشد نہ ہو۔ تو تمام صورتِ حال لندن پولیس کو بتائے اور وہ کوئی ایسا پلان دیں کہ ملک ارشد بن کے کوئی اور آپہنچے۔ میں ایک برطانوی شہری تھا، میری سلامتی کے لیے اسکاٹ لینڈ یارڈ حرکت میں آجائے تو کچھ عجب نہیں۔ ان کے ایجنٹ ہر روپ دھار لیتے ہیں...... اسکاٹ لینڈ یارڈ میں سارے برطانوی نہیں ہیں۔ ان میں ایشیائی بھی ہیں۔

یہ خیال اتنا سنسنی خیز تھا کہ عام حالات میں یقیناً میں اچھل پڑتا، لیکن میں نے خود پر قابو رکھا اور یہ طے کیا کہ اگر عین وقت پر میرے سامنے ملک ارشد کی جگہ کوئی اور نمودار ہوا تو میں کسی حیرت کا اظہار نہیں کروں گا بلکہ جو بھی ہوا اسے ملک ارشد مان لوں گا۔

یہ بڑا تقویت دینے والا خیال تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ دشمن کے حصار میں رخنہ پڑ چکا...... رابعہ اور زوہیب کی سازش کا قلعہ اچانک ایک دھماکے سے مسمار ہو جائے گا کیونکہ اس میں ایک ٹائم بم نصب کیا جا چکا ہے جسے ان کی لالچی اور کینہ پرور آنکھیں دیکھنے سے قاصر ہیں۔ دھماکا آخری وقت میں ہوگا۔

یہ سارے خیالات بہت حوصلہ اور امید بڑھاتے تھے اور رفتہ رفتہ مجھے یقین حاصل ہوتا جا رہا تھا کہ حالات میرے حق میں ہیں اور زوہیب نے جو سازش رابعہ کو پھانس کے میرے خلاف کی ہے، وہ کامیاب ہو ہی نہیں سکتی۔ اول تو میرے بدھائی پر اپنی حکومت قائم کرنے کا خواب ایک خواب ہی رہے گا۔ وہ اس کا قبضہ حاصل نہیں کر سکے گا۔ قبضہ بھی حاصل کر لیا تو وہ عارضی ثابت ہوگا۔ بالآخر ہمایوں کی طرح میری حکومت پھر مجھے مل جائے گی اور یہ بھی نہ ہوا تو مجھے ان دونوں کو عبرت ناک سزا دینے کے لیے آزادی حاصل ہوگی۔

کھانے کے بعد سونے سے پہلے میں نے تصور میں راجا کی آواز سنی، حوصلہ رکھ فیکے پتر اور اللہ پر بھروسا رکھ۔ میں نے کہا راجا...... تو دیکھنا...... تیرا فیکا پتر اتنا اناڑی بھی نہیں ہے جتنا اس کے دشمنوں نے اسے سمجھ رکھا ہے۔ رانا رجب علی بڈھا شیر تھا مگر اس کے منہ کو خون لگا ہوا تھا۔ اب مقابلہ جوان شیر سے ہے جو چاہتا ہے کہ مجھے پہلا شکار کرے، مجھے یوں نگل جائے کہ کچھ نہ بچے لیکن میں اس کے گلے میں ہڈی بن کے اٹک جاؤں گا...... اور یہ رابعہ...... مارِ آستین...... جس سے میرا خون کا رشتہ تھا، اب اس کا خون مجھے معاف ہے۔

رات دن کا اس قید خانے میں کوئی تصور نہ تھا۔ ایک روشنی تھی جو ہر وقت جلتی رہتی تھی۔ اندر نہ دن کے اجالے کا پتا چلتا تھا اور نہ رات کے اندھیرے کا...... میں فیصلہ نہیں کر سکتا تھا کہ میں نے دن کا کھانا کھایا ہے یا رات کا۔ نیند آنے پر میں سوجاتا تھا تو یہ پتا نہیں ہوتا تھا کہ میں کتنے گھنٹے بعد جاگا۔

میری آنکھ ٹی وی کی آواز سے کھلی۔ اس پر کوئی موسیقی کا پروگرام چل رہا تھا۔ یہ فلمی گانے تھے جو سی ڈی پر مجھے دکھائے جا رہے تھے۔ میں اٹھ بیٹھا، میں نے باتھ روم میں جاکے غسل کیا اور واپس آیا تو کھانا میز پر رکھا تھا اب ٹی وی پر کوئی فلم چل رہی تھی۔ میرے جیلر میری تابعداری سے خوش ہوئے تھے اور مجھے تفریح فراہم کر رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ میں ایزی ہو جاؤں اور جب وکیل آئے تو اسے میں نارمل لگوں۔ یہ احساس نہ ہو کہ مجھ پر کسی قسم کا ذہنی یا جسمانی تشدد ہوا تھا۔

اچانک فلم رک گئی اور ٹی وی پر رابعہ کا چہرہ میرے سامنے آگیا۔ ''کیسے ہو کزن؟''

میں نے تلخی سے کہا۔ ''جیسا تم دیکھ رہی ہو۔''

''تم نے راجا کی بات مان کے ہوش مندی کا ثبوت دیا۔''

''بے ہوشی کی اذیت سے گزرنے کے بعد اور میں کیا کرتا، میری جگہ تم ہوتیں تو کیا کرتیں؟''

''وہی جو تم نے کیا۔''

میں نے دل ہی دل میں کہا۔ وہ وقت میری جان بہت دور نہیں ہے، جب تمہارے لیے بھی فیصلے کی گھڑی آئے گی، تم بھی وہ سب دیکھو گی اور بھگتو گی...... شاید اس سے کہیں زیادہ...... جو میں نے بھگتا۔

اچانک اس نے سوال کیا۔ ''میرے لیے تمہارے دل میں جذبات کیا ہیں کزن......؟''

میں چونک پڑا۔ چونکنے کی وجہ اس کا لہجہ تھا جس میں نفرت، کینہ یا دشمنی نہیں تھی۔ ایک نرم، صلح جو دوستانہ انداز تھا۔ میں محتاط ہو گیا۔ ضرور یہ اس کی نئی چال ہے۔ وہ کوئی ڈراما کرنا چاہتی ہے۔

میں نے کہا۔ ''آخر تم کیا سننا چاہتی ہو مجھ سے؟''

''میں...... سچ سننا چاہتی ہوں......''

میں نے کہا۔ ''تم بہت بے وقوف ہو رابعہ...... کیا میں سچ بول سکتا ہوں؟ اور بالفرض محال...... میں سچ بول دوں تو وہ سچ کیا ہوگا؟''

''مجھے معلوم ہے تمہارے جذبات کیا ہوں گے۔ تم نفرت کرتے تھے پہلے بھی...... اب یہ نفرت کہیں زیادہ ہوگی۔''

''پہلے میں نے تم سے کبھی نفرت نہیں کی۔ ورنہ میں تمہارا اتنا خیال کیوں رکھتا...... ہاں نفرت تمہارے دل میں ضرور تھی جس کا تم نے بار بار اظہار بھی کیا۔''

''اگر میں کہوں...... کہ وہ نفرت نہیں تھی، محبت تھی کزن۔''

''تم کچھ بھی کہہ سکتی ہو......''

''تم نہ مانو...... مگر یہ جھوٹ نہیں ہے۔'' اس کا لہجہ انتہائی جذباتی اور کسی حد تک رومانٹک تھا۔

میں نے ہاتھ جوڑ کے کہا۔ ''رابعہ...... میں نے تمہاری ہر بات مان لی، جو تم نے کہا وہ کیا...... اب یہ نیا ڈراما کس لیے ہے تم جو ڈائیلاگ مجھ سے سننا چاہتی ہو۔ اس کا اسکرپٹ مجھے بھجوا دو، میں بول دوں گا۔''

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی، پھر اس کا چہرہ میری نظر سے اوجھل ہو گیا، نہ جانے کیوں میں اپنے اشتعال کے جذبات پر قابو پانے میں ناکام تھا۔ میں نے اسے دل ہی دل میں ایک ہزار ایک گالیاں دیں۔ عہد کیا کہ موقع ملا تو میں اسے تڑپا تڑپا کے ماروں گا۔ خیر یہ ایک جذباتی عہد تھا، غصے کی بات تھی...... وقت آنے پر شاید میں رابعہ کو قتل بھی نہ کر پاتا۔

اسے معاف کر دیتا۔ اس معاملے میں مجھے اپنی کمزوری کا علم تھا۔

آخر رابعہ مجھ سے چوہے بلی والا کھیل کیوں کھیل رہی ہے۔ میں نے ایسا دیکھا نہیں تھا مگر سنا تھا کہ مارنے سے پہلے بلی بہت دیر تک چوہے کے ساتھ کھیلتی ہے۔ رابعہ مجھے گالیاں دیتی۔ میری تذلیل اور تحقیر کرتی تو مجھے نہ حیرانی ہوتی نہ صدمہ ......اور نہ غصہ آتا۔ یہ کیا تماشا ہے۔

پانی پی کے میں خود کو پُرسکون کر چکا تھا جب رابعہ اچانک اندر آ گئی، جس چیز نے مجھے حیران کیا وہ اس کا لباس اور میک اپ تھا۔ وہ انتہائی فیشن ایبل بلکہ ہیجان انگیز لباس میں تھی اور اس نے آرائشِ حسن میں بھی بڑی محنت کی تھی۔ وہ بڑی نزاکت اور ادائے دلربائی کے ساتھ اندر آئی اور کچھ فاصلے پر رک گئی۔ اس کے لبوں پر بڑی دوستانہ مسکراہٹ تھی۔

''سچ کہو کزن...... کیسی لگ رہی ہوں میں......؟'' اس نے ایک ہاتھ کمر پر رکھ کر بڑی ادا سے کہا۔

میں نے خود کو پُرسکون رکھنے کا عہد کر لیا تھا چنانچہ میں خاموشی سے اس کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر جو بات میں نے کہی وہ خاصی فحش تھی لیکن اس کو شریفانہ انداز میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ ''تم کسی بھی مرد کے لیے حسین اور پُرکشش ہو۔''

وہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ ''اپنی بات بتاؤ، کیا میں تمہیں اپنے ماں باپ کی قسم دوں......؟''

میرا ہاتھ اس پر گلاس پھینک کر مارنے کے لیے اٹھا اور رک گیا۔ ''تم کیوں جاننا چاہتی ہو؟''

اس نے کہا۔ ''مجھے پتا ہے میں خوبصورت ہوں، ایسا نہ ہوتا تو ایک کے بعد دوسرا چاہنے والا نہ ملتا۔''

میں نے تلخی سے طنزاً کہا۔ ''چاہنے والا......!''

''ہاں...... پہلے وہ تھا جس کی بہن کے ساتھ تم نے زیادتی کی تھی اور اس نے مجھ سے شادی کی تو تمہارا بدلہ لینے کے لیے...... مگر محبت کا اظہار تو اس نے بھی بھرپور کیا تھا، پھر شہزاد...... نے بھی مجھے محبت کا یقین دلانے کے لیے زمین آسمان ایک کر دیے تھے...... جھوٹا تھا وہ بھی......''

''زوہیب تو سچا ہے۔'' میں نے کہا۔

وہ بولی۔ ''نہیں...... سب نے اپنی اپنی غرض کے لیے محبت کا کھیل رچایا...... اور میں نے یقین کر لیا۔''

''رابعہ...... آخر کیا چاہتی ہو تم...... کیوں بتانے آئی ہو یہ سب مجھے، کیا مجھ سے کچھ چھپا ہوا ہے، کوئی بات ہے جو مجھے نہیں معلوم۔''

اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''ہاں، ایک بات تم معلوم نہیں کہ میری نفرت میں بھی محبت چھپی ہوئی تھی۔''

میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''بولتی رہو، میں سننے پر ہوں۔''

''میرا خدا گواہ ہے، یہ جھوٹ نہیں ہے کزن، میرے دل میں تمہاری محبت تو بچپن سے ڈال دی گئی تھی۔ ایک بیج دیا گیا تھا جو اگنے کے بعد بڑھتا رہا...... تمہاری مجھ سے غیر اعلانیہ منگنی تھی، یہ طے تھا کہ بالآخر ہماری شادی ہوگی، تم ایک لڑکی کے دل کا حال نہیں سمجھ سکتے۔ میں نے تو تمہیں صرف تمہیں اپنے خیالوں میں بسا لیا تھا۔ ساری عمر کے لیے مان لیا تھا کہ تم صرف میرے ہو، جب تم ملک سے باہر گئے تب بھی مجھے فرق نہیں پڑا تھا۔ میں سمجھتی تھی کہ تم واپس آؤ گے تو وہی ہوگا جو طے ہے، جو ایک طرح سے میرا اور تمہارا مقدر ہو چکا...... نوشتۂ تقدیر جسے بدلا نہیں جا سکتا۔''

''تم پاگل ہو، یہ میں جانتا ہوں۔''

وہ بولتی رہی۔ ''تمہاری فریال سے محبت پہلا صدمہ تھا۔ وہ میں نے برداشت کیا، اس لیے کہ میں طے کر چکی کہ اگر اس شادی کی نوبت آئی تو میں فریال کو جان سے ...... مسکراؤ مت...... میں واقعی اسے قتل کر دیتی مگر اس کے بعد آ گئی نور جہاں، عذابِ جاں...... اس کے لیے میرے وہی جذبات تھے، اب سنا ہے کوئی نور ہے لندن میں......''

''اسے بھی قتل کرا دو، تم سب کچھ کر سکتی ہو۔''

اس کی نظریں مجھ پر جمی رہیں۔ ''دیکھو، تم نے مجھے ٹھکرا دیا، میری تذلیل کی، میرا حق چھینا، جو بھی کیا، میں سب بھول سکتی ہوں۔ میں کیا کروں اپنے دل کا کہ میں تم سے نفرت نہیں کر سکتی۔''

میں نے ایک زہریلا قہقہہ لگایا۔ ''واہ کزن...... یہ سب کچھ تم میرے ساتھ کر رہی ہو، محبت میں کر رہی ہو۔''

وہ بولتی رہی۔ ''میں تمہارے سامنے اپنی تذلیل کرانے آئی ہوں، اپنے اعتراف سے، کوشش اور امید نے کبھی نہیں چھوڑی تھی، اسے آخری کوشش سمجھ لو۔''

''جاؤ رابعہ...... تمہاری قید میں ساری سختی جھیل کے بھی میں عقل سے محروم نہیں ہوا، مجھے بے وقوف بنا کے تمہیں کیا ملے گا؟''

اس کی آنکھوں کی نمی آنسوؤں میں ڈھل گئی۔ ''میں اپنے مرے ہوئے ماں باپ کی قسم کھا کے کہتی ہوں رفیق......''

''بکواس بند کرو، اور جاؤ۔'' میں چلایا۔

''میری بات سنو پلیز...... تم کیا سمجھتے ہو میں بھی زوہیب کو چاہتی ہوں، کیا میں سمجھتی نہیں کہ اس کی محبت کا مقصد کیا ہے؟ اور میں نے خدانخواستہ اس سے شادی کر لی تو میرا انجام کیا ہوگا۔''

میں بھونچکا رہ گیا۔ ''تم...... یہ سمجھتی ہو، پھر بھی......''

اس کے آنسو بہتے رہے۔ ''میں نے یہ سب تمہیں پانے کے لیے کیا۔ بے وقوف زوہیب نے مجھے نہیں بنایا، میں نے اسے بنایا...... وہ نہیں جانتا کہ اپنا مقصد حاصل ہوتے ہی میں اسے خارش زدہ کتے کی طرح پتھر مار کے بھگا دوں گی۔''

''اگر یہ سب اسے معلوم ہو جائے...... پھر؟''

''پھر کیا...... اب وہ میرا کیا بگاڑ سکتا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''تمہارا مقصد صرف ست بدھائی پر قبضہ حاصل کرنا تھا؟''

''یہ کام میں اکیلے نہیں کر سکتی تھی...... یہ خواب میں نے اس کی آنکھوں میں ڈالا کہ اگر وہ ست بدھائی میرے نام کرا دے تو میں اس سے شادی کر لوں گی، پھر یہ دونوں جاگیریں مل کے ایک بہت بڑی ریاست بن جائیں گی جس پر ہماری حکومت ہوگی۔ وہ مجھے محبت کا خواب دکھاتا رہا اور اپنے خواب دیکھتا رہا۔ دل ہی دل میں وہ میری بے وقوفی اور اپنی ہوشیاری پر ہنستا ہوگا۔ اس نے بہت پہلے فیصلہ کر لیا ہوگا کہ مجھ سے شادی کے بعد مجھے کب اور کیسے ٹھکانے لگایا جائے گا۔ یہ کام اس کے لیے مشکل بھی نہیں، اس کے باپ دادا کرتے آئے ہیں۔ پھر اس کے سوا کون اس بہت بڑی ریاست کا مالک ہوگا۔ میری جیسی بیویاں تو پاؤں کی جوتی ہوتی ہیں جو آدمی بدلتا رہتا ہے۔ عورت ان کے لیے ایک کھلونا ہے وہ کسی مزارعے کی بیوی، بہن اور بیٹی ہو یا زرخرید...... طوائف اور داشتہ، کسی سے کچھ عرصہ دل بہلایا پھر پھینک دیا۔ کسی کو بخش دیا، وہ ایک تیر سے دو شکار کر رہا تھا...... بلکہ تین...... وہ تمہاری بہن کی عزت پر شب خون مار رہا تھا۔ تمہاری جاگیر چھین رہا تھا اور تمہیں اپنے انتخابی معرکے سے باہر کر رہا تھا۔ کیا اب بھی تم کہو گے کہ میں بے وقوف ہوں۔''

میں دم بخود بیٹھا اس کی ناقابلِ یقین باتیں سن رہا تھا۔

''ہاں رابعہ، تم بے وقوف ہو...... تمہاری کیا مجال یا اوقات کہ تم رانا کی دشمنی مول لے سکو۔ وہ عام سانپ نہیں...... اژدہا ہے، میں کہاں اس کا مقابلہ کر سکتا تھا...... اگر قسمت ساتھ نہ دیتی، میرے ساتھ دوست تھے۔ ہمدرد تھے، پھر عقیدت مند ہو گئے، عبداللہ جان اور شامی بادشاہ جیسے...... تم انکار کر کے تو دیکھو، تمہارا ساتھ دینے والا کون ہوگا؟''

''اسی لیے تو میں آئی ہوں تمہارے پاس...... تم میرا ساتھ دو، یہ ریاست کچھ نہیں......''

''تمہارا مطلب ہے اب ایسا ہو کہ مہارانی تم بنو، میں تمہاری جگہ لے لوں، ریاست تمہارے نام پر...... میں تمہارا غلام۔''

''ہرگز نہیں...... بالکل نہیں۔'' وہ چلائی۔ ''سب کچھ تمہارا ہی رہے گا، جب میں تمہاری ہوں۔''

''تم میری نہیں ہو، خدا نہ کرے ایسا ہو۔''

''اتنے سنگدل نہ بنو، ذرا سوچو، عقل سے کام لو، یہ ریاست جاگیر، حویلی سب اسی طرح تمہارا رہے گا جیسے آج ہے، بس مجھے بھی حقِ ملکیت میں شریک کر لو، مجھے مالکن کا درجہ دے دو، میرے نام کچھ نہ کرو، اپنا نام مجھے دے دو تاکہ میں رابعہ رفیق ہو جاؤں۔''

میں پلک جھپکائے بغیر اسے دیکھتا رہا۔ ''تم کہہ رہی ہو، میں شادی کر لوں تم سے......؟ اور اسی لیے تم اتنا بن سنور کے آئی ہو۔''

''رفیق...... آخر اس میں حرج ہی کیا ہے، میں تمہیں وہ سب واپس دے رہی ہوں جو تمہارا ہے۔ خود کو بھی تمہارے قدموں میں ڈال رہی ہوں، پھر آخر میں تمہارے لیے اتنی ناقابلِ قبول کیوں ہوں؟''

میں نے اس کے لیے دل میں بہت ترس محسوس کیا۔ ''آخر تم سمجھتی کیوں نہیں ہو۔ افسوس بے وقوف لڑکی، تم اپنے ساتھ میری زندگی بھی تباہ کرنے کے درپے ہو۔''

''تم میری محبت کو نہیں دیکھ رہے ہو۔'' وہ چلائی۔

''یہ جو کچھ تم نے کیا اور کر رہی ہو۔ اسے محبت کہتے ہیں؟'' میں نے زہر آلود لہجے میں سوال کیا۔

''یہ آخری طریقہ تھا میرے لیے اور آج میں خود تمہیں سب بتانے آ گئی ہوں۔'' وہ پھر رونے لگی۔

''رابعہ...... تم جھوٹ بول رہی ہو، تم کو صرف میری محبت نہیں جاگیر کی ملکیت بھی چاہیے۔''

''وہ تمہاری وجہ سے ہوگی۔ میں تمہارے ساتھ اس کی مالک کہلاؤں گی۔''

''لیکن تم کو معلوم ہے، میں شادی صرف نور سے کروں گا اور کسی سے نہیں......''

''خواہ اس کی قیمت تمہیں ست بدھائی کی ملکیت سے محرومی کی صورت میں چکانی پڑے؟''

''محبت کی کوئی قیمت نہیں ہو سکتی۔ مجھ سے پہلے لوگوں

نے اس سے کہیں زیادہ قیمت ادا کی ہے۔ ایڈورڈ ہشتم نے ایک معمولی بیوہ عورت مسز سمپسن کے لیے برطانیہ کی سلطنت سے محرومی قبول کر لی تھی کیونکہ شادی وہ صرف شاہی خاندان میں کر سکتا تھا۔"

اس نے اپنے آنسو صاف کیے اور کچھ دیر مجھے دیکھتی رہی۔ احساسِ ذلت سے اس کا رنگ زرد پڑ گیا تھا۔ "میں جان تو نہیں دوں گی تمہارے لیے......"

"پھر کیا میری جان لوگی......؟" میں نے طنز سے کہا۔

"ایک آخری قربانی میں دے سکتی ہوں جو کوئی عورت نہیں دے سکتی۔ تم نور کو نہیں چھوڑ سکتے نا، چلو تم اس سے بھی شادی کر لو، میں سوکن بھی قبول کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

میرا دماغ گھوم گیا...... یا میرے خدا...... یہ تو نے مجھے کس عذاب اور کس آزمائش میں ڈال دیا۔ ایسا میں دوسری بار سن رہا ہوں، یہی ایلیشا نے کہا تھا۔ یہی رابعہ کہہ رہی ہے۔ ان کے دل دو حصوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ترازو کے دو پلڑوں میں محبت ہے، ایک میں میری دوسرے میں دنیا کی دولت جائداد اور وہ کسی کو چھوڑنا نہیں چاہتیں۔ ان میں ایک کے انتخاب کا حوصلہ نہیں ہے۔ انہیں ایک ساتھ دونوں چاہئیں، پاگل لڑکیاں...... ان کی سمجھ میں کیوں نہیں آتا کہ زمین تقسیم ہو سکتی ہے، سونا چاندی، گھر جائداد...... سب تقسیم ہوتے ہیں، محبت کیسے تقسیم ہو سکتی ہے اور یہ کیسی محبت ہے جو Compromise کی اذیت کو بھی قبول کرتی ہے اور ذلت کو بھی۔ کیا انہیں معلوم نہیں کہ ایک نیام میں دو تلواریں رہ سکتی ہیں ایک دل میں دو عورتیں اور ایک گھر میں دو بیویاں نہیں رہ سکتیں خواہ وہ گھر کوئی جھگی ہو یا محل......!

اس نے کہا۔ "اب کیا سوچ رہے ہو؟"

"یہی کہ تمہارا انجام کیا ہوگا بے عقل لڑکی...... ہر صورت میں تباہی، زوہیب بھی تمہیں تباہ کر دے گا۔"

"تم مجھے بچا سکتے ہو۔ بچانا نہیں چاہتے۔"

"بچانا ضرور چاہتا ہوں، لیکن اس طرح نہیں کہ خود بھی تباہ ہو جاؤں، نہ خدا ہی ملا نہ وصالِ صنم نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے۔ میرے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا سوائے پچھتاوے کے...... میں نور کو کھو دوں گا۔ ایسی ذلت والی شرط پر وہ میری نہیں ہو سکتی۔"

یہ سراسر جھوٹ تھا۔ جب وہ نور جہاں تھی تب سے نور کا ایک ہی موقف تھا کہ اس کی محبت غیر مشروط ہے۔ میں اس سے شادی کروں نہ کروں۔ کسی اور سے کر لوں، اسے اعتراض نہیں۔ بس میں اسے نہ چھوڑوں، اسے اپنے سے جدا نہ کروں لیکن خود میں اتنا بے ضمیر اور بے غیرت نہیں تھا ست بدھائی کا حقِ ملکیت برقرار رکھنے کے لیے شادی راب سے کر لوں اور نور کو بدستور اپنے ساتھ رکھوں، عام الفاظ میں داشتہ بنا کے، لندن میں گرل فرینڈ کا معزز نام دے کر......

میں نے رابعہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔ "دیکھو رابعہ...... صرف اپنے بارے میں سوچو، فرض کرو میں تمہارے ساتھ کوئی چال چلوں، ابھی تم سے شادی پر رضامند ہو جاؤں اور جب معاملات پوری طرح میرے کنٹرول میں آ جائیں، تو میں تمہیں طلاق دے دوں؟ تم کو مروا دوں؟"

"مجھے بہت افسوس ہے کزن...... تم سارے مرد عورتوں کے بارے میں اپنی رائے پر قائم ہو، بڑی بے شرمی سے جس کو تم مستقل مزاجی کہو گے تمہارے نزدیک ہم ناقص العقل ہیں...... بے وقوف ہیں۔"

"ایسا تم ثابت کر رہی ہو۔" میں نے غیر سنجیدگی سے کہا۔

"ایسا تم کہہ رہے ہو، کیا اتنی معمولی سی بات ہر عورت نہیں جانتی کہ اس کا ازدواجی مستقبل مرد کے لبوں سے نکلنے والے تین الفاظ کے کچے دھاگے سے لٹکا رہتا ہے۔ جو وہ غصے میں بھی کہہ سکتا ہے، نشے میں بھی اور بغیر کسی وجہ کے بھی۔ حقیقت ایسی نہیں ہے لیکن میں نے اسے بھی نظر انداز نہیں کیا تھا۔ تم ایسا نہیں کر سکتے...... اگر تم مجھے قبول کر دو گے تو مجھ سے علیحدگی صرف ایک صورت میں ممکن ہو گی، میں مر جاؤں یا تم مجھے مار ڈالو، مطلب یہ کہ مروا دو۔ تو یہ میں بیان حلفی کی صورت میں اپنے وکیل کے پاس اور ایک بینک لاکر میں رکھوا دوں گی کہ میری اچانک موت یا گمشدگی کی صورت میں تمام تفتیش نواب رفیق احمد شیرازی سے کی جائے کہ اس نے مجھے کب اور کیسے قتل کیا اور میری لاش کہاں غائب کی۔"

"واہ...... کیا ہوشیاری ہے اور کیا دلداری ہے۔"

وہ بولتی گئی۔ "رہی طلاق دے کر دودھ کی مکھی کی طرح باہر نکال پھینکنے کی بات...... تو میرا حق مہر وہی ہوگا جو میں آج تم سے مانگ رہی ہوں، ست بدھائی کی ساری جائداد، حویلی...... جو تم کو دینا ہی پڑے گا۔ قانونی طور پر پاکستان کی عدالت میں عورت کا یہ حق تسلیم کیا جاتا ہے، آئی بات سمجھ شریف میں کزن؟"

"بہت اچھی طرح۔" میں نے سر ہلایا۔

"پھر؟...... چلو میں مہلت دیتی ہوں تمہیں...... سوچ لو......" وہ اٹھی۔

"نہیں کزن، مجھے کسی مہلت کی ضرورت ہی نہیں کیونکہ میرے ذہن میں کوئی کنفیوژن نہیں۔ میرا جواب وہی رہے گا خواہ میری ساری عمر اسی زنداں میں سڑتے گزر جائے، تم مجھے فقیر محتاج کر دو یا قتل کرا دو، میری زبان سے اقرار کا لفظ نہ نکلا ہے نہ نکلے گا۔"

"ٹھیک ہے......" اس نے بڑی مشکل سے کہا۔ "میں اس آخری ذلت کے لیے تیار ہو کے آئی تھی۔ میں اپنی کمزوری تم سے چھپانا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے میں نے یہ جوا کھیلا اور ہار گئی۔ اس کا افسوس ضرور ہوگا مجھے، لیکن تم بھی اس جیت پر کیسے خوش ہو سکتے ہو جس میں تم نے یہاں سب کچھ ہار دیا، اپنے خواب بھی......"

"محبت خریدی نہیں جا سکتی رابعہ شیرازی...... اور اس میں کیا گھاٹا اور کیا منافع...... یہ تم نے بھی جان لیا ہوگا۔"

"اب معاملات اسی طرح فائنل ہوں گے، جیسے راجا نے تمہیں بتایا تھا۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میں کہنا چاہتا تھا کہ اب کوئی کسی کا کزن نہیں، ہمارے درمیان صرف دشمنی کا رشتہ ہے۔ یہ لڑائی شروع ہو چکی ہے۔ اب دیکھو قسمت کس کو فتح کا احساس دیتی ہے اور کسے شکست کی ذلت۔ ویسے جنگ صرف تباہ کرتی ہے، ہارنے والے کے ساتھ جیتنے والے کو بھی۔

لیکن میں نے کچھ نہیں کہا۔ یہ احساس رابعہ کو ابھی سے ہو گیا تھا کہ میں ہار کے بھی جیت گیا اور اس کی جیت میں بھی ہار کا پہلو شامل ہے۔ اس زنداں سے رہائی کی قیمت ادا کرنے کے بعد مجھے ابھی مستقبل کی زندگی کو نئے سرے سے منظم کرنا تھا۔ نور اس زندگی میں شامل تھی لیکن میرے مستقبل کے پلان اور میری ترجیحات بدل گئی تھیں۔ اب ست بدھائی ترقیاتی منصوبہ میرے ماضی کا حصہ ہوا۔ میرے مستقبل کے مقاصد میں اب ایک انتقام بھی ہوگا۔ میں لندن کے بزنس کو اس مقام تک لے جانے کے لیے دن رات ایک کر دوں گا کہ دیکھنے والے کہیں کہ میں نے ست بدھائی کو چھوڑا تو اس سے کہیں زیادہ پا لیا۔ رابعہ نے زندگی بھی گنوائی۔

یہ میری زندگی کی کہانی میں ایک نیا موڑ ثابت ہو سکتا تھا لیکن میں جس راستے پر چل رہا تھا اس پر ثابت قدمی سے چلتا رہا۔ اپنے فیصلے پر میں بہت مطمئن تھا لیکن میرے اطمینان میں ایک خوف کا عنصر بھی شامل ہو گیا تھا۔ زخم خوردہ ناگن تو وہ پہلے ہی تھی کیا اب رابعہ مجھے واقعی ڈس لے گی۔ ڈپریشن کی انتہا کو پہنچ کے وہ کچھ بھی کر سکتی ہے اگر اس کے دماغ میں یہ سما گئی کہ اس آخری کوشش کی ناکامی کے بعد ہر جیت بے کار ہے تو وہ اپنے ساتھ میری جان لینے کا فیصلہ بھی کر سکتی ہے۔ تو نہیں تو میں بھی نہیں۔ ڈیڑھ سو سال بعد پھر ست بدھائی کی منحوس جائداد اور جاگیر کا وارث کوئی نہیں رہتا تو نہ رہے۔ اب اس خاندانی قبرستان میں ایک کا نہیں، دو قبروں کا اضافہ ہوگا۔

یہ بڑا پریشان کرنے والا خیال تھا، وہ خواب آور دوا کی جگہ میرے کھانے میں ہلاکت آفریں زہر ملا کے خود بھی وہی زہر کھا سکتی تھی۔ یہ بڑی عجیب صورتِ حال تھی۔ رابعہ مسلسل ہارتی چلی جا رہی تھی اور خود اپنی نظر میں گر رہی تھی۔ اگر میں اس کی نظر سے دیکھتا تو میرے لندن سے لوٹ کر آنے کے بعد اس کی زندگی میں ایک کے بعد دوسری شکست اور محرومی کے سوا کچھ نہ تھا اور ناکامیوں کی اس دلدل سے نکلنے کی وہ جتنی کوشش کرتی تھی اتنی ہی اس میں اتر جاتی تھی۔ پہلے میں نے بحیثیت نامزد شوہر اسے قبول کرنے سے انکار کیا۔ پھر یکے بعد دیگرے اس کی ماں اور باپ اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔ اس کا ذمے دار وہ مجھے سمجھتی تھی۔ وہ میرے رحم و کرم پر رہ گئی، مانگنے کے باوجود اسے اپنا حق نہ ملا، میرے دل سے ایک عورت کی محبت کا دورِ حکومت ختم ہوا تب بھی جگہ اسے نہ ملی۔ اس کی جگہ دوسری عورت آ گئی، پھر تیسری......

یہ اس نے آخری چال چلی تھی۔ وہ میرے دشمنوں سے مل گئی تھی اور اس نے زبردستی مجھے حاصل کرنا چاہا تھا۔ ابھی وہ مجھے یہ بتانے آئی تھی کہ میں اس کو اپنا لوں تو وہ محبت میں شراکت کے لیے بھی تیار ہے لیکن اپنی دانست میں اس نے میرے لیے انکار کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تھی۔ میں نے پھر بھی انکار کر دیا تھا، وہ ایک بار پھر ذلیل ہو کے خالی ہاتھ لوٹ گئی تھی، یہ آخری بازی بھی ہار گئی تھی۔

صورتِ حال واقعی خطرناک ہو گئی تھی۔ رابعہ نے اپنی عقل اور ہمت کے مطابق جو گڑھا میرے لیے کھودا تھا خود اس میں گر گئی تھی۔ وہ پورے یقین کے ساتھ آئی ہو گی کہ ست بدھائی کو بچانے کے لیے میں اسے قبول کر لوں گا، میں نے دونوں کو ٹھکرا دیا تھا کیونکہ میرے عزائم کچھ اور تھے۔ اب رابعہ کے پاس نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن والی صورتِ حال تھی۔ آگے کنواں پیچھے کھائی، وہ اپنے پلان پر عمل کرے تو زوہیب جیسا دشمن سامنے...... اسے پورا یقین ہوگا کہ جب میں اسے قبول کر لوں گا تو یہ دشمن خود مایوس ہو کے پیچھے ہٹ جائے گا۔

لیکن اب وہ اس کو بتائے گی کہ صورتِ حال اس کے بالکل برعکس ہے جو وہ سمجھ رہا ہے۔ اسے تو محض استعمال کیا گیا

ہے ورنہ رابعہ کا نہ پہلے اس سے شادی کا ارادہ تھا نہ اب ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ اس میں آگے چل کے کیا ہوگا، رابعہ کا یہ اعتراف یا اعلان زوہیب کے منہ پر تھوکنے کے بعد طمانچہ مارنے کے برابر ہوگا، وہ بھی ایک عورت کے ہاتھوں۔ اس کا سارا پلان ریت کے محل کی طرح بکھر جائے گا...... ست بدھائی پر قبضے کے سارے خواب چکنا چور ہو جائیں گے اور اسے شدت سے بے وقوف بنائے جانے کا احساس ہوگا۔ وہ بھی اس پر نہیں تم جن کو اس نے بتایا ہوگا کہ بس اب تھوڑے دن کی بات ہے۔ پہلے تو اس عورت رابعہ کو کچھ دن رکھیں گے دل لگی کے لیے۔ وہ اتنی بری بھی نہیں پھر ست بدھائی جہیز میں لا رہی ہے، بعد میں دیکھیں گے کہ اس کا کیا حال کیا جائے۔

اب رابعہ اکیلی ہوگی۔ مقابلے پر ہوں گے چاروں طرف دشمن ہی دشمن...... ایک طرف زوہیب حسن، دوسری طرف میں...... تیسری طرف راجا اور میرے سارے دوست مددگار، چوتھی طرف مجھے سپورٹ کرنے والے شامی بادشاہ...... عبداللہ جان اور ست بدھائی کے سارے حامی، یہ ناممکن ہوگا کہ وہ اکیلی سب کا مقابلہ کر سکے۔ میرے انکار نے بڑی خطرناک صورتِ حال پیدا کر دی تھی۔

نہ جانے کیوں یہ احساس قوی سے قوی تر ہوتا گیا کہ رابعہ مایوسی کے پاگل پن میں کوئی خطرناک قدم اٹھائے گی۔ درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا، کچھ لوگ اس لیے خودکشی کرتے ہیں کہ وہ درد کو لادوا سمجھ لیتے ہیں۔ ہر کوشش میں ناکام ہو جاتے ہیں۔ ہر در سے ٹھکرائے جاتے ہیں اور نعوذ باللہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ خدا بھی ان کی نہیں سن رہا، پھر وہ خود کو بڑی خودغرضی کے ساتھ سارے مسائل سے آزاد کر لیتے ہیں۔ اب کوئی رو کرے پرورش گلشن و ثمر...... ہم تو آرام سے جا کے لیٹتے ہیں قبر میں...... دنیا جو چاہے کرے۔

اس یقین نے میرے ہوش گم کر دیے کہ اب رابعہ کے سامنے اور کوئی راہ نہیں رہی۔ میں نے سوچے سمجھے بغیر اس کو ذلیل کر کے رخصت کر دیا۔ اب سارے خیالات لاحاصل ہیں۔ میں نے کیوں نہیں سوچا کہ وہ اکیلی مایوس و غم زدہ اور شکست خوردہ عورت کیا کرے گی؟ کیا تھا اگر میں اسے جھوٹی تسلی سے ہی بہلا لیتا۔ اس کی مان لیتا، پہلے آگ بجھاتے ہیں۔ پھر آبلوں کا علاج کرتے ہیں۔ یہ تو بے وقوفی کی انتہا ہے کہ آگ پر تیل چھڑکا جائے۔

میں سوچ سوچ کے نروس ہونے لگا۔ میں نے کھانا بھی نہیں کھایا کہ اس میں نشہ آور دوا ہوگی اور میں سو گیا تو مرنے مارنے پر کمربستہ رابعہ کسی بھی وقت اندر آ کے مجھے بھی گولی مار دے گی اور خود کو بھی...... ناکام عشق کی ایک اور خون کے آنسو رلانے والی کہانی...... ایک محبت کرنے والی عورت اور اس کے سنگدل محبوب کی لاشیں ساتھ ساتھ پڑی ہوئی ان کے لہو کے دھارے ملتے ہوئے۔

میں نے کمرے میں چکر لگاتے ہوئے پانی پیا اور اپنے خیالوں کے بے قابو بوڑ کو گھیر کے اکٹھا کیا۔ پہلا سوال یہ ہونا چاہیے کہ اب میں کیا کروں؟...... کیسے رابعہ تک یہ پیغام پہنچاؤں کہ نظرثانی کے بعد میں نے اس کی اپیل منظور کی۔ اسے قبول نہ کرنا میری کم اندیشی اور بے وقوفی تھی...... وغیرہ وغیرہ...... لیکن سوال یہی تھا کہ میں اس سے رابطہ کروں تو کیسے؟

پھر ایک دم راستہ یوں نظر آیا جیسے علی بابا کو جادوئی الفاظ ''کھل جا سم سم'' کہتے ہی خزانے والا غار نظر آیا تھا۔ جیسے علی بابا کو امید کی کرن نظر آئی ایسے ہی میں نے بھی زور زور سے دروازہ پیٹنا شروع کیا اور گلا پھاڑ کے چلاتا رہا، کوئی ہے...... کوئی ہے...... میں نے دروازے پر ہر چیز ماری جو وہاں دستیاب تھی، بالآخر باہر کسی کے کان پر جوں رینگی۔

دروازہ کھلا اور وہی دو مسلح گوریلے نمودار ہوئے جو فرشتۂ اجل کے معاون خصوصی نظر آتے تھے۔ ''یہ کیا شور ہے؟'' ان میں سے ایک نے غرا کے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ''سنو رابعہ سے کہو کہ مجھے منظور ہے۔''

دوسرے نے پہلے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ''کیا منظور ہے؟''

''وہ رابعہ کو معلوم ہے۔ اس نے ابھی یہاں آ کے مجھے ایک پیشکش کی تھی۔'' میں نے کہا۔

اقرار یا انکار کیے بغیر وہ دروازہ بند کر کے واپس چلے گئے۔ اب مجھے کچھ امید ہو چلی تھی اور مجھے سلامتی کا دور کا راستہ صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کے تین مرحلے تھے۔

پہلا مرحلہ...... میں رابعہ کو قبول کروں۔

دوسرا مرحلہ...... مجھے رابعہ کے ساتھ زندگی کی ضمانت حاصل ہو۔

تیسرا مرحلہ...... آزاد ہوتے ہی میں ہر قول سے پھر جاؤں۔

محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔ جھوٹ، فریب، مکاری، دغابازی، یہاں تک کہ قتل اور خوں ریزی...... رابعہ یہ سب کر رہی تھی تو میں بھی کر سکتا تھا۔ محبت اس کی تو

جنگ میری...... میں ہی کتنا اناڑی ہوں کہ یہ نکتہ اس وقت نہیں سوجھا جب رابعہ میرے سامنے ہی نہیں تھی...... بلکہ میری جھولی میں پکے ہوئے پھل کی طرح گرنے کو تیار تھی۔ میرے قدموں میں لوٹ رہی تھی، اس وقت میں اکڑ خان بنا رہا...... بے وقوف، گدھا...... الو کا پٹھا...... راجا سنے گا تو مجھے مارے گا۔ ابے پتر...... تیری کھوپڑی کا مغز کہاں گیا، نور نے فراخی کر کے کھالیا...... فلش میں بہہ گیا۔

میرا خیال ہے کہ میں خود بھی پاگل ہی ہو چکا تھا۔ میرا دماغ ٹھکانے نہیں تھا، اوٹ پٹانگ خیالات کسی کارٹون فلم کی طرح آپس میں ایک مضحکہ خیز جنگ لڑ رہے تھے۔ مجھے بے چینی سے اپنی درخواست کے پہنچنے کا انتظار تھا، یہ منحوس صورت گوریلے منکر نکیر کی طرح میری اس قبر میں بار بار نمودار ہونے والے، پتا نہیں ان کی سمجھ میں میری بات آئی یا نہیں...... اور وہ میری درخواست کو آگے پہنچاتے ہیں یا نہیں، ان کے پاس رابطے کا ذریعہ تو ہوگا، فون...... موبائل وائرلیس۔

پھر ایک خیال نے امیدوں کی بلند ہوتی دیوار کو زلزلے کی طرح گرا دیا۔ یہ جگہ رابعہ کی نہیں ہو سکتی۔ یہ محافظ رابعہ کے نہیں ہو سکتے۔ یہ سب کچھ زوہیب کا حسنِ انتظام ہے۔ لندن میں مجھے اٹھوانے سے یہاں قید رکھنے تک، اس کے پاس وسائل ہیں۔ طاقت ہے اور تجربہ ہے...... رابعہ نے اس سے مدد حاصل کی تھی اور اس نے اپنی شرائط پر مدد فراہم کی تھی۔ رابعہ نے کہا تھا کہ میں تمہاری تو ست بدھائی بھی تمہاری...... لیکن پہلے رقیب کا پتہ تو صاف کرو...... اور اس نے کہا تھا کہ جانِ من...... یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں، سمجھو وہ ہو گیا جو تم چاہتی تھیں۔

اب محافظ رابطہ کریں گے زوہیب سے...... جس کے وہ ملازم اور نمک خوار ہیں، کیا زوہیب حیران پریشان نہیں ہوگا کہ رابعہ نے اس مرحلے میں اپنے کزن کو ایسی کیا آفر دی جو اس نے قبول کر لی ہے۔ یہ تو ناممکن ہے کہ رابعہ نے زوہیب کو کچھ بتایا ہو، یہ چال اس نے زوہیب سے چھپ کے چلی تھی۔ اگر میں مان لیتا تو معاملہ الٹ جاتا۔ شکست جو برا نصیب تھی زوہیب کے حصے میں آتی اور اس کی فتح کے خواب کی تعبیر مجھے ملتی۔ گو ایسا نہیں ہوا، رابعہ کو مایوس لوٹنا پڑا...... لیکن اب زوہیب کو اندازہ ہوگا کہ اس سے چھپ کر اس کے مشورے کے بغیر بھی رابعہ اپنے کزن کے پاس کوئی آفر لے کر گئی تھی۔

وہ کیا اتنا بے وقوف ہے کہ میرا پیغام رابعہ تک پہنچائے۔ شکست کے ساتھ اس کو غصہ آئے گا۔ وہ پوچھے گا کہ تم اگر گئی تھیں تو رقیب سے تمہاری کیا بات ہوئی تھی، اومائی گاڈ...... رابعہ تو ماری گئی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو بے وقوف بنا رہے تھے، دونوں سازشی ذہن رکھتے تھے۔ دونوں کی نیت صاف نہیں تھی، اعتماد پہلے کہاں تھا، یہ چنگاری اس ڈرامے کے اسٹیج کو ہی جلا کے خاکستر کر دے گی۔ پھر نہ کہانی کا وہ انجام ہوگا جو اسکرپٹ میں تھا۔ نہ کوئی کردار بچے گا اور نہ تماشائی۔

لیکن...... میں نے چکر لگاتے ہوئے سوچا۔ زوہیب نے عقل سے کام لیا، دماغ کو ٹھنڈا رکھا تو وہ رابعہ پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دے گا کہ اسے سب پتا چل گیا ہے کہ وہ ڈبل گیم کھیل رہی ہے۔ وہ مسکرا کے خاموش ہو جائے گا۔ رابعہ کو اس دوغلے پن اور دغابازی کی سزا بعد میں بھی دی جا سکتی ہے۔ ابھی وہ میرا پیغام گول کر جائے گا۔ رابعہ کو کچھ پتا نہیں چلے گا۔ سب کچھ ویسے ہی ہوگا جیسے رابعہ کے آنے سے پہلے طے تھا۔

مجھے یقین آ گیا کہ میرا دماغ خراب ہو چکا ہے اور اس ذہنی کیفیت میں جو کچھ میں کر رہا ہوں غلط کر رہا ہوں۔ میں نے رابعہ کو انکار کر کے ایک پاؤں پر کلہاڑی ماری تھی، اس کے نام پیغام دے کر دوسرے پاؤں پر بھی مار لی تھی۔ بہتر ہے کہ میں خود کو تقدیر کے آسرے پر چھوڑ دوں، خدا جو کرے گا بہتر کرے گا۔ میرے کچھ کرنے سے مزید خرابی ہوگی، آگے جو ہو سو ہو۔

یہ طے کر لینے کے بعد میں نے کھانا کھایا اور خواب آور دوا کے زیر اثر سو گیا۔ میں پھر جاگا تو آنکھیں کھولتے ہی مجھے ایک ایسا منظر دکھائی دیا جسے میں نے خواب سمجھا۔ میں نے پھر آنکھیں بند کر لیں لیکن کچھ دیر بعد کھولیں تو وہی منظر میرے روبرو تھا۔ ایک صوفے پر دو اجنبی بیٹھے تھے۔ دونوں درمیانی عمر کے اور فربہ بدن تھے۔ ان کے بیٹھنے کا انداز بھی نیم دراز ہونے کا تھا۔ ایک نے قمیص پتلون پہن رکھی تھی۔ دوسرا شلوار قمیص میں تھا۔ ان کے درمیان چند فائلیں رکھی ہوئی تھیں۔

مقابل کے دو صوفوں پر دو کالے کوٹوں والے وکیل بیٹھے تھے۔ میں ان دونوں کو پہچانتا تھا۔ ایک میرا سابق مخلص دوست فاروقی تھا جو اب صفِ دشمناں میں شامل تھا۔ دوسرا ملک ارشد جو برطانیہ سے میری وکالت کے لیے آیا تھا۔ میری یہ توقع غلط ثابت ہوئی تھی کہ ملک ارشد کی جگہ اسکاٹ لینڈ یارڈ کا کوئی سراغرساں بھیس بدل کے آئے گا، مجھے مایوسی ہوئی مگر زیادہ نہیں، ملک ارشد بھی بہت کچھ کر سکتا تھا۔

میں اٹھا تو ان سب کی نظر میری طرف اٹھی۔ میں نے بڑے سکون اور اعتماد سے کہا۔ ''جنٹلمین...... کیا آپ لوگ مجھے دس منٹ دیں گے، میں واش روم سے فارغ ہو کے آتا ہوں۔''

ملک ارشد نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''ہمیں کوئی جلدی نہیں، ٹیک یور ٹائم......''

فاروقی نے مجھ سے نظر نہیں ملائی اور خاموشی سے چائے پیتا رہا۔ فیصلے کی گھڑی آ گئی تھی۔ بالآخر وہی ہوا، جو طے تھا، دونوں اجنبی یقیناً عدالتی اہلکار تھے جو رشوت کا مال سمیٹ کے اپنا فرض نبھانے خود یہاں آئے تھے، اچانک میرا قید خانہ عدالت کا کمرا بن گیا تھا...... ہاتھ منہ دھو کے میں نے خدا سے بہتری کی دعا مانگی اور ہمت کی۔ میری کوشش بھی اب لاحاصل ہے میرے معبود...... میں راضی بہ رضا ہوں۔

جب میں ہاتھ منہ دھو کر باہر آیا تو درمیان کی میز پر میرے لیے ناشتا موجود تھا۔ آج یہ کھانا نہیں تھا۔ وہی ناشتا تھا جو میں کرتا تھا۔ میں نے اطمینان سے ناشتا کیا اور کافی پیتا رہا، کسی طے شدہ معاہدے پر عمل کرتے ہوئے ان سب نے خاموشی اختیار کیے رکھی۔

میں نے صرف ایک سوال کیا تھا۔ ''نور ٹھیک ہے......؟''

ملک ارشد نے صرف سر ہلایا۔ فاروقی نے بڑی خباثت اور کمینگی دکھاتے ہوئے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''نواب صاحب...... یہاں کوئی غیر ضروری بات نہیں کرے گا، آپ عدالت میں ہیں۔''

میں نے کافی کا مگ ایک طرف رکھ دیا۔ ''عدالت کی طرف سے ناشتا دینے کا شکریہ تو ادا کیا جا سکتا ہے؟''

ایک صوفے پر بیٹھے ہوئے دونوں افراد اب سیدھے ہو کے مستعد بیٹھ گئے تھے۔ شلوار قمیص والے نے ملک ارشد کی طرف ایک فائل بڑھائی۔ ''آپ یہ اپنے موکل کو سمجھا دیں۔''

ملک ارشد نے کہا۔ ''نواب رفیق احمد شیرازی، آپ نے فیصلہ کیا تھا کہ یہاں اپنی تمام غیر منقولہ جائداد اور جاگیر اپنی عم زاد رابعہ شیرازی کو ہبہ کر دیں۔ اس کا اعلان بھی آپ نے اخبار میں شائع کرایا تھا یہ آپ ملاحظہ کر سکتے ہیں۔''

میں نے ''اعلان عام'' اور ''اطلاع عام'' کے عنوان سے دو اخباروں کے اشتہارات دیکھے۔ ان کے گرد حاشیہ بنا دیا گیا تھا۔ اخبار کا وہ صفحہ چار تہ میں موڑ کے فائل میں لگایا گیا تھا۔ اشتہار پڑھنے کے بعد جو پہلا شاک مجھے لگا وہ تاریخ کا تھا۔ ایک دم مجھے معلوم ہو گیا کہ یہاں میں دو ماہ اور دس دن سے قید ہوں۔ ملک ارشد نے ایک بار مجھے سب کی نظر بچا کے آنکھ ماری اور پرسکون رہنے کا اشارہ کیا۔ میں خود بھی اس صورت حال کو بالکل خراب کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں ذہنی طور پرست بدھائی کی ملکیت سے دستبردار ہو چکا تھا۔ آج کے بعد اس کی مالک رابعہ ہو گی۔ بلبل نے آشیانہ چمن سے اٹھا لیا۔ اس کی بلا سے بوم بسے یا ہما بسے۔ رابعہ جو چاہے کرے اور زوہیب اس کے ساتھ جو چاہے کرے۔ مجھے جو کرنا ہو گا بعد میں دیکھا جائے گا۔ ابھی میرے قانونی... وکیل ملک ارشد نے مجھے زندہ سلامت اور صحت مند دیکھ لیا تھا۔ خود عدالتی اہلکار اس کے گواہ تھے کہ وہ بھی عدالت میں حاضر ہوا تھا۔

ملک ارشد نے اپنا قانونی فرض سمجھتے ہوئے مجھے تمام قانونی پوزیشن بتائی اور تمام دستاویزات کی وضاحت کی۔ پھر فاروقی بولا۔ اس نے رابعہ کے وکیل کی حیثیت سے واضح کیا کہ اس قانونی کارروائی کے مکمل ہونے کے بعد میں کیا کر سکتا ہوں اور کیا نہیں کر سکتا۔

پھر وہ شخص جو قمیص پتلون میں تھا جج بن گیا۔ وہ یوں کہ ہمارے بیٹھنے کی جگہ بدل گئی۔ بڑے صوفے پر درمیان میں مجھے جگہ دی گئی تھی۔ میرے دائیں ہاتھ پر ملک ارشد بیٹھا، بائیں جانب فاروقی۔ ایک صوفے پر جج آ گیا۔ شلوار قمیص والا اس کا ریڈر ساتھ والے دوسرے صوفے پر بیٹھا۔ جج نے کھنکار کے کہا۔ ''مسٹر رفیق احمد شیرازی...... تم اس کارروائی میں بقائمی ہوش و حواس شریک ہو؟''

میں نے کہا۔ ''یس سر......''

''تم پر کوئی جبر تو نہیں؟'' جج نے کمال بے غیرتی سے پوچھا۔

''نو سر......'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''تم سمجھتے ہو کہ اس وقت تم کمرۂ عدالت میں اپنی مرضی سے حاضر ہوئے ہو، تم کو یہاں لایا نہیں گیا ہے؟''

''یس سر...... میں خود آیا ہوں۔''

''کل یا آئندہ اس بات کا امکان ایک فیصد بھی نہیں کہ تم انکار کر سکو...... کہ میں عدالت میں حاضر نہیں ہوا تھا؟''

''مجھے اچھی طرح معلوم ہے سر......''

ملک ارشد کا رویہ انتہائی مایوس کن اور حوصلہ شکن تھا۔ اس کے آنے سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ یہاں کا وکیل بھی وہی کرتا جو لندن سے آ کے ملک ارشد نے کیا۔ اس کے باوجود میں نے امید نہیں چھوڑی۔ یقیناً راجا، نور اور ملک

ارشد نے طویل مشاورت کے بعد کوئی حکمت عملی بنائی ہو گی اور اس کا اولین مقصد مجھے بہ حفاظت لندن پہنچانا ہو گا۔ اس کے لیے فریق ثانی سے بھی بات ضروری ہو گی۔

باری باری میرے سامنے مختلف اسٹامپ پیپر رکھے گئے، ان پر کیا عبارت ٹائپ کی گئی تھی۔ یہ پڑھنے کا وقت ہی نہیں تھا اور اسے پڑھنے کا کچھ فائدہ بھی نہ تھا۔ ملک ارشد نے جہاں کہا میں نے اپنے دستخط ثبت کر دیے۔ ریڈر ان پر مہر تصدیق لگاتا گیا اور جج صاحب دستخط کرتے گئے۔ یہ کارروائی دس منٹ میں مکمل ہو گئی۔

میری ذہنی کیفیت عجیب تھی۔ اچانک ست بدھائی کی ریاست میری نہیں رہی تھی۔ رابعہ کی ہو گئی تھی۔ میں نواب رفیق احمد شیرازی نہیں رہا تھا۔ لندن کا ایک بزنس مین رہ گیا تھا۔ ست بدھائی کا ترقیاتی پروگرام کسی خواب ماضی کی طرح صرف میری یادوں میں رہ گیا تھا۔ غصے اور بے بسی کے احساس نے میرے دل کو جکڑ رکھا تھا۔ میرا دماغ ماؤف ہو رہا تھا اور مجھے سانس لینا بھی دوبھر ہو رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ مجھے ہارٹ اٹیک ہو جائے گا۔

اچانک ملک ارشد نے کہا۔ ''اس پر فریق ثانی کے دستخط ہونا باقی ہیں سر......''

فاروقی نے کہا۔ ''وہ عدالت میں سب کے سامنے حاضر ہو کے دستخط کریں گی۔''

ملک ارشد نے کہا۔ ''جیسی ان کی مرضی...... میرا اور میرے موکل کا اب کوئی کام باقی نہیں۔''

''لیکن آپ ابھی نہیں جا سکتے۔''

میں نے میز پر رکھا ہوا بال پین اٹھا لیا اور کچھ دیر اسے اپنی انگلیوں میں گھماتا رہا۔ پھر مجھے ابکائی آنے لگی۔ ایسا لگتا تھا کہ میرا سب کھایا پیا دو ہیں نکل جائے گا۔ میں اٹھ کے واش روم کی طرف لپکا، کسی نے مجھے نہیں روکا۔ کسی نے نہیں دیکھا کہ بال پین میرے ہاتھ میں ہے۔

واش روم میں جا کے میں نے چند لمبے گہرے سانس لیے۔ پھر میں نے ٹوتھ پیسٹ کے خالی کارٹن سے ایک چھوٹا سا ٹکڑا الگ کیا۔ گتے کا یہ ڈیڑھ انچ چوڑا ٹکڑا اندر سے سادہ تھا۔ میں نے اس پر بال پوائنٹ سے لکھا Kill her۔ اسے میں نے اپنی مٹھی میں دبا یا رکھا اور باہر آ گیا۔

باقی سب نے غور سے اور کسی حد تک ہمدردی کے ساتھ مجھے دیکھا، صرف فاروقی کی نظر میں شک اور عناد تھا۔ اس نے بڑے طنز سے کہا۔ ''خود کو سنبھالیے رفیق صاحب۔ اس صدمے سے آپ کا ہارٹ فیل نہ ہو جائے کہ اب آپ نواب نہیں رہے۔''

ملک ارشد نے اسے گھورا۔ ''میرے موکل کے پاس اب بھی لندن میں اتنا ہے......''

جج نے فوراً اسے ٹوک دیا۔ ''عدالت میں فضول باتوں سے احتراز کیا جائے۔''

میں پھر دونوں وکیلوں کے درمیان بیٹھا اور جج کے ریمارکس کے دوران مجھے یہ موقع ملا کہ میں وہ گتے کا چھوٹا سا ٹکڑا ملک ارشد کے ہاتھ میں دے دوں جس پر دو لفظ ہی لکھے ہوئے تھے لیکن یہ میری خواہش تھی...... ہدایت تھی...... حکم تھا...... درخواست تھی...... میں چاہتا تھا کہ یہ ملک ارشد کے ذریعے راجا تک پہنچ جائے۔

ملک ارشد نے بڑی صفائی سے اس کو اپنی مٹھی میں رکھا

اور پھر جیب میں منتقل کرتے ہوئے کہا۔ ''عدالت کا وقت ختم ہونے کے بعد میرے موکل کو میرے حوالے کر دیا جائے گا۔ میں اسے لندن لے جاؤں گا۔''

فاروقی نے گھڑی دیکھی۔ ''ابھی اس میں دو گھنٹے ہیں۔'' اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ''ہم چلتے ہیں۔''

جج نے کہا۔ ''یس...... ہمیں عدالت میں مس رابعہ شیرازی کے دستخط بھی حاصل کرنے ہیں۔''

''وہ ڈائریکٹ وہاں آئیں گی یور آنر......'' فاروقی بولا۔

ایک ایک کرکے وہ سب چلے گئے۔ میں پھر اپنے زنداں میں اکیلا رہ گیا۔ کیا واقعی میری اسیری کے صرف دو گھنٹے باقی ہیں مگر دو ماہ دس دن کے بعد یہ دو گھنٹے زیادہ طویل ثابت ہوئے۔

میں کسی پاگل کتے کی طرح کمرے کے اندر چکر لگاتا رہا اور دیوانگی کے خیالات مجھ پر شہد کی مکھیوں کی طرح یلغار کرتے رہے جو اپنے پر آزار ڈنک مار کے میری اذیت میں اضافہ کر رہی تھیں۔ ایک ہی سوال تھا جس کی بازگشت کسی مرنے والے کی آخری چیخ کی طرح ہر طرف سے مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ اب کیا ہوگا، کیا ملک ارشد یہ پیغام راجا تک پہنچا دے گا۔ اچانک میں نے باہر سے ایک آواز سنی اور میرے قدم رک گئے، میرے دل کی دھڑکن رک گئی۔ میری سانس رک گئی...... کیونکہ یہ آواز کسی اور کی نہیں زوہیب حسن کی تھی۔ رانا رجب علی کے جانشین کی۔ وہ نہ جانے کس سے چلا کے بات کر رہا تھا۔ ''کیوں...... آخر وہ پہنچی کیوں نہیں...... اس رجسٹرار سے کہو کہ انتظار کرے...... وہ جا کہاں سکتی ہے؟ میں آ رہا ہوں۔'' پھر خاموشی چھا گئی۔

میرے کان باہر کی آوازوں پر لگے ہوئے تھے اور دماغ میں مایوسی کا خلا تھا...... اندھیرا تھا جس میں سوالات یوں جل بجھ رہے تھے جیسے تاریک رات میں جہاں کچھ نظر نہ آتا ہو دور سے نیون سائن کے جلتے بجھتے روشن حروف نظر آتے ہیں۔

کہیں کوئی فولادی دروازہ بند ہوا۔ میں نے کسی ڈیزل انجن کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنی جو چند سیکنڈ میں خاموشی کا حصہ بن گئی...... غالباً زوہیب چلا گیا تھا...... جاتے جاتے اس نے میرے زنداں کے آہنی دروازے کو خود مقفل کر دیا تھا۔

اپنی ذلت آمیز شکست کا مجھے کوئی صدمہ نہ تھا جو سازشی ذہن رکھنے والے ایک مرد نے ایک عورت کے سہارے مجھے دی تھی۔ مرد میرا سیاسی دشمن تھا کیونکہ اس کا باپ بھی میرا دشمن تھا۔ عورت وہ تھی جو پیدا ہوئی تو میں صرف پانچ سال کا تھا اور جب میں نے اسے دیکھا تو وہ آنکھیں بند کیے چچی کے پاس بے حس و حرکت پڑی تھی اور کسی نے اسے ہتھیلیوں پر اٹھا کر میری گود میں دینے کی کوشش کی تو میں ڈر کے پیچھے ہٹ گیا تھا اور میں نے پوچھا تھا کہ یہ کہاں سے آئی۔

اس پر چچا نے ہنستے ہنستے کہا تھا۔ ''پتا نہیں، چچی نے صبح دیکھا تو یہ یہاں پڑی تھی۔''

سارا دن میں سوچتا رہا مگر میرا معصوم ذہن رابعہ کی پراسرار آمد کا معما حل نہ کر سکا...... پھر میں نے اس کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا، وہ بڑی ہوتی گئی اور اتنی بڑی ہوگئی کہ میرے ساتھ کھیلنے لگی۔ وہ میری ہر بات مانتی تھی اور اس کے باوجود مجھ سے بہت مار کھاتی تھی۔ پھر اپنے اماں ابا کے علاوہ میرے ماں باپ کے سامنے روتی تھی اور جھوٹ ایسا بولتی کہ میں دنگ رہ جاتا۔ پھر اسے سچ ثابت کرنے کے لیے آنسو بہاتی اور خدا رسولؐ کی قسمیں کھاتی تھی۔ رفیق نے مجھے جوتا مارا...... بڑے ابا کے کمرے سے ہاکی اٹھا کے لایا اور مجھے سر پھاڑنے کی دھمکی دی...... کہہ رہا تھا کنویں میں پھینک دوں گا مار کے...... وغیرہ وغیرہ۔

میری کوئی نہیں سنتا تھا۔ چنانچہ میں زیادہ انتقامی جذبے کے ساتھ اس کی پھینٹی لگاتا تھا، اب جا کے شکایت کرو گی...... قسمیں کھاؤ گی...... تو وہ جھوٹ تو نہیں ہوگا، پھر ایک دن میں اسے گھسیٹ کر کنویں پر لے گیا اور منڈیر پر اس کا سر جھکا کے کہا، کلمہ پڑھ لو...... میں تمہیں دھکا دینے والا ہوں...... وہ اتنا ڈر گئی تھی کہ بے ہوش ہوگئی لیکن اس کے بعد رابعہ نے میرا ظلم برداشت کرنے کی عادت ڈال لی۔ وہ مار کھاتی اور آنسو بہاتی مگر شکایت کسی سے نہ کرتی۔ اس سے حالات بہتر ہوئے، غالب میں ہی رہا لیکن ہماری دوستی ہوگئی۔ ہم ایسا نہ کرتے تو کیا کرتے...... گھر میں ہمارے سوا ہماری عمر کا کوئی بچہ نہ تھا۔

نہ جانے کب اور کیسے یہ تعلق انس میں بدلا اور یہ طے کر لیا گیا کہ ہم تمام عمر کے ساتھی ہوں گے...... چودہ پندرہ سال کی عمر کے بعد اس تعلق میں لطف آنے لگا، میں احساس تفاخر میں مبتلا ہوگیا کہ اس نے فرمانبرداری سیکھ لی۔ سب نے سکھ کا سانس لیا کہ ان کے خواب کو تعبیر ملی اور انہوں نے ہمارے مستقبل کا جو نقشہ ترتیب دیا تھا وہ مثالی ثابت ہو رہا ہے۔

لیکن وہ سن بلوغت کا آغاز تھا۔ کالج اور پھر یونیورسٹی پہنچنے تک میرے خیالات بالکل بدل گئے اور وہ جذباتی طور پر مجھ سے دور ہوتی چلی گئی...... بہت جلد میری سمجھ میں آ گیا کہ خونی رشتے اور ایک ہی گھر میں رہنے کی مجبوری سے محسوس ہونے والی قربت کو محبت کا نام نہیں دیا جا سکتا...... پھر میں باہر چلا گیا اور سب کچھ بدل گیا، یکے بعد دیگرے میری زندگی میں آنے والی لڑکیوں نے رابعہ کو بہت پیچھے دھکیل دیا...... وہ پسپا ہوتی چلی گئی۔ جب میں ست بدھائی کا نواب رفیق بن گیا اور میں نے اسے یکسر مسترد کر دیا تو اس کے اندر جو نفرت کی چنگاری دبی ہوئی تھی وہ ماں باپ کی موت کے بعد ایک آتش فشاں بن گئی۔

وہ جو خوابوں کے سفر میں مجھے شریک سمجھتی تھی نہ میری منگیتر رہی اور نہ عم زاد...... میں نے اسے بہن کا درجہ دے دیا لیکن وہ خود کو رشتوں کی اس نئی تعبیر سے قائل نہ کر سکی۔ بچپن سے میں اس پر ظلم کرتا چلا آیا تھا، میں ہمیشہ سے ظالم تھا اور وہ مظلوم تھی...... ہر بار میں نے اس کا حق مارا تھا...... یکے بعد دیگرے دوسری لڑکیاں اس کی جگہ لیتی رہیں۔ ہر بار اس کی تذلیل ہوئی...... پھر اس کے ماں باپ بھی اسی حق تلفی کے زہر سے میں ہارے گئے...... کم سے کم رابعہ اس کا ذمے دار مجھے ہی سمجھتی تھی، وہ میری پناہ میں، میرے سہارے پر زندہ رہنے والی رشتے دار ہوگئی، جسے میں نے رحم کھا کے بہن کا درجہ دے رکھا تھا مگر وہ مطمئن نہ تھی۔

وہ بچپن سے سازشی تھی...... جھوٹ اور فریب اس کی فطرت میں شامل تھا...... جب اس میں میرے خلاف عناد کے جذبات شامل ہوئے تو اس کے وجود میں سلگنے والا آتش فشاں پھٹ گیا اور انتقام کے جذبات نے اسے اندھا کر دیا، وہ میرے سب سے بڑے دشمن کے ساتھ مل گئی اور اس نے مجھ سے اپنے حق کے علاوہ میری زندگی بھی چھین لینے کا فیصلہ کر لیا۔

میں سخت مایوس تھا۔ ست بدھائی کی ریاست مجھ سے چھن گئی تھی لیکن اس سے زیادہ اب مجھے اپنی زندگی جاتی دکھائی دے رہی تھی۔ رابعہ ایک آخری کوشش کر کے جا چکی تھی اور یہ بات مجھے یقینی نظر آتی تھی کہ اب وہ مجھے کوئی رعایت نہیں دے گی۔ وہ زوہیب سے کہے گی کہ خطرہ مول لینے کی کوئی ضرورت نہیں...... مار ڈالو نواب رفیق کو، خود زوہیب کیوں چاہے گا کہ میں زندہ رہوں۔ رابعہ کی باری بعد میں آئے گی، پہلے میرا قصہ تمام ہوگا۔

ملک ارشد کے ذریعے میں نے راجا کو پیغام بھیجا تھا کہ رابعہ کا قصہ تمام کرے...... Kill Her...... یہی رابعہ نے بھی زوہیب سے کہا ہوگا۔ Kill Him...... زوہیب کے دل میں پہلے ہی یہ ہوگا لیکن خود رابعہ جانتی ہے کہ اس نے زوہیب سے شادی کی تو اس کا انجام کیا ہوگا، یعنی ممکن ہے وہ بھی پلان کر چکی ہو کہ بعد میں زوہیب کو کیسے ٹھکانے لگائے گی۔

کوئی نہیں جانتا کہ یہ موت کا کھیل کیسے ختم ہوگا۔ آخر میں کیا ہوگا، نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم...... سب کے حصے میں دو دو گز زمین آئے گی، نہ کسی کو ست بدھائی کی ریاست حاصل ہوگی نہ رانا نگر کی ملکیت...... میں نے بچپن میں ایک کہانی پڑھی تھی کہ تین دوستوں نے مل کر ایک مدفون خزانے کا سراغ لگایا اور اسے کھود کے نکال لیا۔ وہ ساری رات کھدائی کرتے رہے۔ صبح انہوں نے ایک دوست کو بھیجا کہ کچھ کھانے پینے کے لیے لے آئے، اس کے جانے کے بعد پیچھے رہ جانے والے دوستوں نے طے کیا کہ جیسے ہی تیسرا لوٹے اسے ختم کر دیا جائے تاکہ خزانہ وہ آدھا آدھا بانٹ لیں...... جو کچھ لینے گیا تھا، اس نے کھانے پینے کی چیز میں زہر ملا دیا تاکہ سارا خزانہ اس کا ہو جائے، پہلے وہ خود مارا گیا...... پھر کھانا کھانے والے مر گئے خزانہ وہیں رہ گیا۔

تو ایسا ہی کچھ یہاں ہوتا نظر آ رہا تھا...... زوہیب نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ باہر مکمل خاموشی تھی، ٹی وی چپ تھا...... میں کمرے میں چکر لگاتے لگاتے تھک کر بستر پر گر گیا۔ میری ساری امیدیں خاک میں مل رہی تھیں۔ مجھے ملک ارشد پر بھروسا تھا نہ راجا پر...... ایسا لگتا تھا کہ یہی کمرا میرا مدفن ہوگا۔ اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا۔ ساری دعائیں بے اثر تھیں...... کوئی بددعا کارگر نہ تھی، کسی نے کچھ نہیں کیا تھا...... عائشہ پاگل خانے میں تھی، فریال دبئی میں لاپتا تھی...... نور لندن میں تنہا تھی، اگر میں نے اس سے شادی کر لی ہوتی تو کم سے کم لندن کا بزنس اس کا ہو جاتا۔

اچانک ایک دھماکا سنائی دیا جس سے اس کمرے کے در و دیوار لرز گئے۔ میں بری طرح چونکا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا اور جسم سے پسینا پھوٹ پڑا۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی، باہر کی دیوار سے کوئی چیز ٹکرائی تھی، میرے اعصاب اتنے کمزور ہوگئے تھے کہ یہ آواز بھی مجھے بم کا دھماکا لگی۔

دھماکا پھر سنائی دیا...... کیا کوئی اس قید خانے کی کسی دیوار پر وار کر رہا تھا؟...... میں نے کان لگا کر دھیان سے سنا، تیسرے دھماکے نے میرے شبہے کو تقویت دی، میں نے دیوار پر ہاتھ رکھا، چوتھے دھماکے سے دیوار کی لرزش محسوس

ہوئی، یہ دھماکے کہیں اوپر ہو رہے تھے اور مسلسل ہوتے رہے، پھر خاموشی کا ایک مختصر وقفہ آیا۔

میری عقل کچھ سمجھنے سے قاصر تھی، کیا کوئی دیوار توڑ رہا تھا؟ اور کیا تھا......؟ کیا پاس پڑوس میں کوئی توڑ پھوڑ ہو رہی تھی...... کوئی عمارت گرائی جا رہی تھی، مگر وقتی طور پر دھماکے رک گئے تھے۔

جب دھماکا میرے پیچھے ہوا تو میں اچھل پڑا۔ اس بار آواز میرے پیچھے بہت قریب سے آئی تھی، میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ دھادھم مسلسل سنائی دے رہی تھی جس سے پورا کمرا لرز رہا تھا۔ پھر دیوار کا رنگ اور پلاسٹر گرا۔ میں حیران تھا کہ اس دیوار کے دوسری جانب کیا ہے اور کون ہے جو اسے گرا کے اسی زندان کو میرا مدفن بنانا چاہتا ہے، کسی بھاری ہتھوڑے کے اگلے وار سے ایک ساتھ دو اینٹیں نکل کے مجھ سے کچھ فاصلے پر گریں، میں نے پیچھے ہٹ کے دیکھا، ہتھوڑے کی اگلی ضرب نے کئی اینٹوں کو گرا دیا۔

میں نے جھک کر دیکھا اور پوچھا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے؟''

تقریباً ایک فٹ مربع کے شگاف میں مجھے وحشت زدہ چہرہ دکھائی دیا۔ ''آ جاؤ...... ادھر سے نکل آؤ۔'' اس نے اپنی بھنچی ہوئی آواز میں کہا اور ہلکی چوٹ سے اینٹوں کو گرا کر شگاف کو چوڑا کر دیا۔

اب میں دوسری طرف جا سکتا تھا۔ میں نے پہلے اپنا سر ڈالا اور پھر اپنے جسم کو دیوار کے خلا سے گزار دیا، اپنے پیروں پر کھڑے ہو کے میں نے اپنے محسن کو دیکھا۔ بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ ''تم......''

اس نے سر ہلایا۔ ''جاؤ...... نکل جاؤ ادھر سے۔'' اس کے ہاتھ نے ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا جس سے دن کا اجالا اندر آ رہا تھا۔ پھر وہ جھکا اور پیٹ پکڑ کے فرش پر گر گیا، تب میں نے دیکھا کہ وہ زخمی ہے اور شاید مرنے والا ہے۔ خون اس کے پیٹ یا سینے سے نکل کر اس کے کپڑوں کو تر کر رہا تھا۔ یہ انہی دو میں سے ایک محافظ تھا جو اندر آتے تھے تو مسلح ہوتے تھے، اس دراز قد قوی ہیکل اور مضبوط جسم رکھنے والے شخص کو کسی ریوالور سے نکلنے والی ایک انچ کی گولی نے موت کی سرحد پر دھکیل دیا تھا۔

میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ ''یہ کیا ہوا ہے تمہیں......''

''جاؤ......'' وہ کراہا۔

''میں تمہیں ایسے چھوڑ کے نہیں جاؤں گا۔''

وہ رک رک کے بولا۔ ''دیکھو...... ایسا نہ ہو...... چھوٹے رانا صاحب آ جائیں، میری...... ساری محنت اکارت جائے...... آخری وقت کی...... توبہ تو قبول...... نہیں ہوتی...... لیکن...... کیا پتا یہ نیکی...... میرے کام آ جائے......''

''تمہیں...... کس نے گولی ماری ہے...... رانا نے......؟''

اس نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''جاتے جاتے اس نے...... ہم دونوں کو مار دیا تھا...... وہ...... کوئی گواہ...... زندہ چھوڑنا...... نہیں چاہتا تھا...... دوسرا مر گیا...... میں نے دیکھ لیا تھا...... رانا سمجھا...... میں بھی...... مر گیا...... شاید اس کے...... ریوالور...... میں دو ہی...... گولیاں...... تھیں...... اس نے باہر سے تالا لگا...... دیا تھا......''

''میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلتا ہوں۔''

''نہیں...... تم مجھے...... بچا نہیں سکتے...... اپنا وقت ضائع مت کرو...... جاؤ۔''

''یہ کون سی جگہ ہے......؟''

''اس نے کچھ بتانے کی کوشش کی لیکن اچانک موت نے اسے آ لیا۔ میں نے اس کے چہرے پر کرب کی جگہ ایک پرطمانیت مسکراہٹ دیکھی۔ یہ آخری وقت میں اپنی کوشش میں کامیابی پر اطمینان کی مسکراہٹ تھی۔ اس نے وہ نیکی کمائی تھی جس پر اسے بھروسا تھا کہ اس کی بخشش کا سبب بن سکتی ہے۔

بوجھل دل کے ساتھ میں نے اس کے کپڑوں کی تلاشی لی مگر جانے سے پہلے رانا زوہیب حسن نے اس سے سب کچھ لے لیا تھا۔ تھوڑی سی جان بچی تھی جو زوہیب نے بے مصرف سمجھ کے چھوڑ دی تھی کہ خود ہی ختم ہو جائے گی مگر کہیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ الاؤ کو بجھا دیا جاتا ہے مگر بچ جانے والی ایک چنگاری ہی بستی پھونک دیتی ہے اور جنگل کو خاکستر بنا دیتی ہے۔

اپنے پیروں پر کھڑے ہو کے میں نے اس شخص پر آخری نظر ڈالی جس کو میں صرف اپنے دشمن کے طور پر پہچانتا تھا مگر وہ مرنے سے پہلے مجھے میری زندگی کا تحفہ دے گیا تھا، اس کی نیکی وہ قرض بن گئی تھی جو میں کبھی چکا نہیں سکتا تھا۔

آہستہ آہستہ میں دروازے کی طرف بڑھا۔ یہ ایک نیم روشن ویران کمرا تھا جس میں زمانے بھر کا کباڑ جمع تھا۔ روشنی اوپر سے اس کمرے میں اتر رہی تھی میری نگاہوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ بہ ظاہر یہ ایک ہی گھر کے دو کمرے تھے۔ ایک

وہ جہاں مجھے اسیر رکھا گیا تھا۔ دوسرا یہ جہاں سے میں زندگی کی طرف لوٹ رہا تھا۔ آزادی کی طرف اور اختیار کی طرف لوٹ رہا تھا۔ بغیر پلاسٹر والے چند زینوں کو چڑھ کر میں اوپر پہنچا تو میرے سامنے ایک مختصر سی گیلری آ گئی۔ دوسری طرف والا دروازہ کچن کا تھا، اس کے بعد ایک لاؤنج سا آیا۔ دائیں بائیں دروازے تھے لیکن میں نے انہیں کھول کر دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ میں سیدھا گیا اور ایک برآمدے میں نکل آیا...... برآمدے کے سامنے لمبائی کے رخ پر لان تھا جس پر بید کی کرسیوں کا سیٹ پڑا ہوا تھا۔

چند سیکنڈ کے لیے رک کر میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ کہیں کوئی آواز نہ تھی۔ اس مختصر کوٹھی پر ویرانی کا راج تھا جس کے ایک تہ خانے میں مجھے قید میں رکھا گیا تھا۔ بند مین گیٹ میرے سامنے تھا، میں نے دوڑ کے لان کو عبور کیا اور گیٹ کے اوپر سے باہر اتر گیا۔

میں نے اپنے چاروں طرف ایک جنگل دیکھا جس میں کھپریل کی چھتوں والی یہ سالخوردہ پرانی عمارت تنہا کھڑی تھی۔ جنگل میں تناور گھنے درخت کم تھے...... جھاڑیاں گھنی تھیں اور خودرو گھاس بھی وافر تھی، عمارت مجھے بناوٹ کے اعتبار سے انگریز کے دور حکومت میں تعمیر کردہ ریسٹ ہاؤس لگی تھی۔ ایسے ریسٹ ہاؤس جن کو عوام ڈاک بنگلا کہتے تھے۔

محکمۂ انہار اور جنگلات کے علاوہ دوسرے محکمے بھی افسران بالا کے قیام کے لیے ایسی جگہ تعمیر کرتے تھے جہاں انہیں تفریح اور عیاشی کے اسباب مہیا ہوں اور ان کی حکومت میں کوئی مخل نہ ہو۔ وہ یہاں شکار کھیلتے تھے...... جم کاربٹ کے زمانے میں شیروں کا۔ ورنہ ہرن، خرگوش سے تیتر اور مرغابی تک سب کے لیے الگ الگ شکار گاہیں تھیں...... جو بات سب شکار گاہوں میں مشترک تھی وہ رات کا شکار تھا جب گرد و نواح کے سردار، نمبردار، حاکموں کی خوشنودیاں حاصل کرنے کے لیے علاقے کی چنیدہ کنواریوں کو قربانی کے لیے پیش کرتے تھے۔

یہ دیکھنے کے لیے کہ ڈاک بنگلے تک آنے کا راستہ کہاں ہے، میں نے اس کا ایک چکر لگایا۔ ایک کچا راستہ جس پر کار یا جیپ چل سکتی تھی مجھے دوسری طرف دکھائی دیا۔ قریب سے بجلی کے تار تو گزر رہے تھے لیکن ٹیلی فون کا پول کہیں نہ تھا۔ یہ بات یقینی تھی کہ بہت قریب کوئی گاؤں ہوگا جہاں سے ڈاک بنگلے کو رسد فراہم ہوتی ہوگی اور ملازم ملتے ہوں گے۔ حالت

بتاتی تھی کہ یہ ریسٹ ہاؤس شاید عرصۂ دراز سے کسی کے زیر استعمال ... نہیں تھا۔ میرے حواس اور اعصاب اس غیر متوقع رہائی سے قابو میں نہ تھے اور خوشی کی انتہا کے ساتھ خوف اور اضطراب سے میں نروس تھا۔ میری خواہش تھی کہ جلد از جلد یہاں سے بھاگ جاؤں لیکن اندر جا کے دیکھنے کی جستجو نے مجھے مجبور کر دیا۔ ڈاک بنگلے کا نقشہ بہت سادہ تھا۔ سامنے والے مختصر برآمدے میں دائیں بائیں دو کمروں کے دروازے کھلتے تھے۔ حفاظت کے لیے کھڑکی کے دروازوں کے باہر سریے والے فولادی دروازے بھی لگائے گئے تھے۔ ظاہر ہے افسران بالا اور حکام کو لوٹے جانے اور اغوا کیے جانے کا خطرہ بھی لاحق رہتا ہوگا۔

دونوں دروازے مقفل تھے۔ ان میں قدیم وضع کے بڑے اور بھاری تالے تھے۔ میرا نجات دہندہ ایک دروازے کے ساتھ والی اینٹوں کی دیوار توڑ کے باہر آیا تھا...... پھر زخمی ہونے کے باوجود وہ پچھلی طرف سے تہ خانے میں اترا تھا اور اس نے اپنے جسم کی رہی سہی قوت دوسری دیوار توڑ کے مجھے رہائی دلانے میں صرف کر دی تھی...... یہ ناممکن نظر آنے والا کارنامہ اس نے ایک بھاری ہتھوڑے کی مدد سے سرانجام دیا تھا جو کہیں اندر ہی دستیاب تھا۔ بہ ظاہر وہاں اس کا سوٹ کوئی نہ تھا۔ شاید اس ذات کو جو غیب کا علم رکھتی ہے بہت پہلے سے معلوم تھا کہ جب نواب رفیق احمد شیرازی کو اس کے دشمن یہاں قید کریں گے تو اس کی رہائی کے لیے کیا اسباب درکار ہوں گے...... انتباہ ان کے لیے جو غرور میں خدائی کے دعوے دار بن جاتے ہیں اور سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ اپنے جیسے کسی انسان کی زندگی یا موت پر قادر ہیں۔

میں نے نکلی ہوئی اینٹوں کے خلا سے اندر جھانکا۔ اندر اندھیرا تھا، جب میری نگاہیں تاریکی سے مانوس ہوئیں تو مجھے فرش پر دوسرے محافظ کا مڑا تڑا جسم نظر آیا، فرش پر جم جانے والا خون بھی ہوگا اور وہیں وہ اسلحہ بھی پڑا ہوگا جو ان محافظوں کی طاقت تھا مگر میں نے کچھ نہیں دیکھا...... میں پلٹ کے بھاگ کھڑا ہوا۔

پہلے میں کچے راستے پر سیدھا گیا۔ اس پر آتی جاتی گاڑیوں کے ٹائر پرنٹ نمایاں اور تازہ تھے۔ غالباً آخری گزرنے والی گاڑی زوہیب حسن کی ہوگی جو کچھ دیر پہلے ہی گئی تھی پھر مجھے خیال آیا کہ یوں بھاگ کے میں کہاں جا رہا ہوں......؟ اگر میرا سامنا کسی دشمن سے ہوگیا تو...... اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے...... یہی صورتِ حال درپیش ہوگی اور اگر ملک ارشد یا راجا نے یہاں آ کے مجھے رہائی دلانے کی کوئی پلاننگ کی تو مجھے نہ پا کے وہ کتنے مایوس ہوں گے۔

میں راستہ چھوڑ کے کچھ فاصلے پر جھاڑیوں کے درمیان رک گیا۔ میرے دوست آئیں یا دشمن گزریں گے تو میری نظر کے سامنے سے...... یہ خیال بھی بادل کے سائے کی طرح آیا اور گزر گیا۔ پھر میں نے سوچا کہ آخر میں کب تک اور کتنی دیر یہاں کسی کا انتظار کر کے اپنا وقت ضائع کروں...... راجا مجھے نہ پا کے مایوس اور پریشان ضرور ہوگا لیکن اس کے آنے سے پہلے ہی میں اس سے رابطہ کر سکتا ہوں۔

میں پھر چلنے لگا لیکن اتنی احتیاط ضرور کی کہ اس کچی سڑک سے دور رہا...... یکلخت مایوسی اور ناامیدی کی دھند چھٹ گئی تھی اور جیسے عزم و ہمت کے ساتھ میرا اعتماد بحال ہو رہا تھا۔ خوشی کے ساتھ آتش انتقام کے شعلے بھڑک رہے تھے...... اب مجھے کیا پہلے کرنا ہے...... رابعہ سے نمٹنا ہے، اس کا کچھ ایسا بندوبست کرنا ہے کہ وہ دوبارہ کسی سازش کے قابل نہ ہو سکے۔ اسے قتل کر کے قیامت تک کے لیے زمین میں دبا دینا تو میرے بس کی بات نہیں۔ حالانکہ وہ کم سے کم سزائے موت کی مستحق ہے اور یہ ناممکن بھی نہیں...... ہر قانون میں غداری ناقابل معافی جرم ہے اور اس نے تو مجھے فرشتۂ اجل کے سپرد کر ہی دیا تھا۔ رابعہ خود اپنے انجام کو پہنچے گی جو دیکھنے والوں کے لیے عبرتناک ہوگا، اس کے بعد باری آتی ہے زوہیب کی مگر وہ پہلے ہی جانی دشمن ہے۔ یہ دشمنی کسی ایک فریق کے خاتمے پر ہی ختم ہو سکتی ہے۔

میں جھاڑیوں سے بچتا ہوا ایک سمت میں چلتا جا رہا تھا۔ میں نے صرف یہ خیال رکھا تھا کہ وہ کچا راستہ کہیں بھی میری نظر سے اوجھل نہ ہو اور میرے کان آواز پر تھے۔ سورج کو دیکھنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ دوپہر ڈھل چکی ہے۔ دھوپ میں تیزی تھی اور مجھے پیاس لگ رہی تھی۔ اب مجھے خیال آ رہا تھا کہ فرار ہونے سے پہلے میں نے جوتے کیوں نہیں پہنے تھے...... لیکن جو ہوا اچانک ہوا تھا اور اتنا غیر متوقع تھا کہ میرے حواس گم ہو گئے تھے۔ مجھے یہ احساس بھی نہ ہوا کہ میرے پاؤں میں جوتے نہیں ہیں۔

اب میرے پیر ٹہنیوں، کانٹوں اور نوکیلی گھاس سے زخمی ہو رہے تھے۔ میرے قدموں کے نیچے کنکر آتے تھے تو شیشے کے ذرات بن کر چبھتے تھے۔ اردگرد سے پرندوں کی

آوازوں کا ملا جلا شور آ رہا تھا۔ ایک خرگوش چھلاوا بن کے نمودار ہوا اور غائب ہوگیا۔ اگر اس جنگل میں دوسرے جانور تھے تو میرے سامنے نہیں آئے۔ پھر اچانک میرے قدم رک گئے۔ میری کلائی سے دگنا موٹا سانپ سرسراتا ہوا ایک جھاڑی سے نکلا اور دوسری طرف کی جھاڑی میں غائب ہوگیا۔ بیشتر سانپ زہریلے نہیں ہوتے۔ میں یہ بات جانتا تھا، اس کے باوجود سانپ کی دہشت اور اس خیال نے مجھے سن کر دیا کہ میں چند قدم آگے ہوتا تو وہ مجھ پر حملہ کر سکتا تھا...... وہ چتکبرا سانپ تھا۔ ممکن ہے کوبرا ہو......

شاید جنگل میں اور بھی سانپ ہوں گے لیکن اس خوف سے میں رک نہیں سکتا تھا اور اس کچے راستے پر نہیں جا سکتا تھا جو مجھے نظر آ رہا تھا۔ میں جلد از جلد کسی انسانی آبادی تک پہنچ جانا چاہتا تھا۔ جہاں سے میں اپنی خبر دے سکوں اور مدد طلب کر سکوں۔ میں معلوم کرنا چاہتا تھا کہ میں کہاں ہوں۔ آج کیا دن ہے، کیا تاریخ ہے...... یا نور کو اطلاع دینا چاہتا تھا کہ میں زندہ ہوں اور آزاد ہوں۔

اسیری کے طویل اور اعصاب شکن دور کے بعد جو مجھے عمر قید کے برابر لگتا تھا میری آنکھوں نے پہلی انسانی صورت ایک عورت کی دیکھی جو کاٹی ہوئی لکڑیوں کا گٹھا سر پر سنبھالے اور ایک بچے کو گود میں اٹھائے سیدھی چلتی جا رہی تھی۔

''بہن جی......'' میں نے چلا کے کہا اور اس کی طرف دوڑا۔

مجھے اپنے سامنے دیکھ کر وہ اتنی گھبرائی کہ گٹھا اس کے سر سے گر گیا۔ وہ بے اختیار ایک قدم پیچھے ہٹ گئی اور مجھے خوفزدہ نظروں سے دیکھنے لگی۔ ''کون ہو تم......؟''

میں نے پرسکون لہجے میں اسے تسلی دی۔ ''گھبراؤ نہیں، میں صرف یہ پوچھنا چاہتا تھا...... کہ میں کہاں ہوں؟''

اس سوال نے مزید خرابی پیدا کر دی۔ وہ پیچھے مڑ کے چلانے لگی۔ ''راشی...... او راشی...... کہاں رہ گیا تو...... دیکھ یہ کون پاگل ہے؟''

راشی کا اصل نام غالباً رشید یا راشد جیسا ہوگا لیکن گاؤں میں پیار سے یا سہولت کے لیے فقیر محمد بھی فیکا بن جاتا ہے اور رفیق بھی...... اگر عورت جانتی کہ اردو میں راشی کا مطلب رشوت خور ہوتا ہے تو شاید اسے وہ پورے نام سے پکارنا بہتر سمجھتی...... راشی ریسکیو 1122 سے بھی زیادہ کسی جن کی طرح نمودار ہوا...... وہ ہاف دھوتی پر بنیان واسکٹ میں ملبوس جوان آدمی تھا جو سختی حالات کے باعث ایسے سوکھ گیا تھا جیسے انگور سوکھ کے کشمش ہو جاتا ہے۔

مسٹر راشی کا یہ فرض کرنا بالکل جائز تھا کہ ان کی زوجہ کی فریاد بے سبب نہیں ہو سکتی اور یقیناً میں نے بری نیت سے اس کا راستہ روکا ہوگا۔ حالانکہ خاتون ایسی تھی کہ گود میں بچہ نہ ہوتا تو اسے بہن کہتے ہوئے بھی شک رہتا کہ کسی کھسرے سے تو رشتہ نہیں جوڑ لیا......

راشی کے ہاتھ میں ڈنڈا... اور تیز دھار کلہاڑی تھی، جس کا پھل دھوپ میں چمک رہا تھا۔ ''کیا...... کیا ہوا...... اس نے ہاتھ ڈالا ہے تجھ پر......؟''

عورت نے نفی میں سر ہلا کے میری جان بچالی۔ ''پوچھ رہا ہے مجھ سے کہ میں کہاں ہوں؟''

راشی نے جلالی انداز میں پوچھا۔ ''اوئے مخول کرتا ہے میری زنانی سے...... کون ہے تو......؟''

میں نے کہا۔ ''راشی...... میں بڑی مصیبت میں ہوں...... مجھے تمہاری مدد چاہیے......''

راشی نے عورت کی جانب دیکھا۔ ''یہ تو کوئی فقیر ہے چل دے دے اسے ایک روپیا......''

عورت اپنی اوڑھنی کے پلو کی گرہ کھولنے لگی۔

میں نے سر پر ہاتھ رکھ کے کہا۔ ''دیکھو راشی...... مدد کا یہ مطلب نہیں تھا...... میں کوئی فقیر نہیں ہوں، اگر تم نے اس وقت میری مدد کی تو میں تم کو مالا مال کر دوں گا۔ انعام میں جو تم کہو گے دوں گا۔ زمین، نقد رقم...... گائے بھینس...... تم مجھے نہیں جانتے، میں ست بدھائی کا نواب ہوں، رفیق احمد شیرازی۔''

میری تقریر دلپذیر کے دوران بھی شک دوبارہ مسٹر راشی کی آنکھوں سے عیاں ہونے لگا تھا۔ اس نے میرا حلیہ دیکھا اور پھر اپنی بیوی کی طرف...... ''بیچارا کوئی پاگل ہے، پاؤں میں جوتے نہیں خود کو نواب سمجھتا ہے...... چل جا، اپنا راستہ پکڑ......'' وہ اپنی بیوی کے سر سے گر جانے والا بوجھ اٹھانے کے لیے جھکا۔

اب حکمت عملی بدلتے ہوئے میں نے مقامی لہجہ اختیار کیا اور اس سے کہا۔ ''بھائی میں سچ کہہ رہا ہوں۔ مجھے ایک بدمعاش نے ادھر کہیں بند کر رکھا تھا۔'' میں نے ہاتھ سے پیچھے اشارہ کیا۔ ''آج مجھے جان بچا کے نکلنے کا موقع ملا ہے، مجھے واقعی نہیں معلوم کہ میں کہاں ہوں۔ یہ کون سی جگہ ہے......؟''

راشی کے تاثرات بدل گئے۔ ''یہ ادھر ہمارا گاؤں ہے جوگی والا۔''

میں نے کہا۔ ''ٹیلہ جوگیاں......؟''

جوگی والا...... چھوٹا سا گاؤں ہے......''

میں نے کہا۔ ''ہوں قریب میں بڑا شہر کون سا ہے؟''

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ''بڑا شہر...... ادھر تو مظفر گڑھ ہے، ادھر...... میانوالی...... تو نے کہاں جانا ہے؟''

''کہیں نہیں...... تم مجھے اپنے گاؤں لے چلو...... وہاں کسی کے پاس موبائل تو ہوگا......؟''

''وہ کیا ہوتا ہے......؟''

میں نے ہاتھ کو کان پر رکھا۔ ''ٹیلی فون...... جس کو جیب میں لے کر پھرتے ہیں...... ہر جگہ بات کر سکتے ہیں۔''

وہ پھر شک میں پڑ گیا۔ ''تیری بات سمجھ میں نہیں آتی۔''

''اچھا مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ وہاں کوئی میری بات سمجھنے والا مل جائے گا۔''

اس نے لکڑی کا گٹھا اپنی گھر والی کے سر پر رکھ دیا۔ ''چل آ جا......''

شہری ادب آداب کا تقاضا تھا کہ میں خاتون کی مدد کرتے ہوئے یہ بوجھ خود اٹھاتا لیکن یہاں اس کا مطلب کچھ اور لیا جاتا۔ چنانچہ میں خاموش رہا اور ان کے پیچھے چلنے لگا...... والد صاحب یعنی راشی نے فرط محبت میں اولاد نرینہ کو گود میں اٹھا لیا تھا مگر اس نے پہلا کام یہ کیا کہ ابا جی کو نہلا دیا...... انہوں نے چند گالیاں دینے کے بعد بیٹے کو ماں کے حوالے کیا اور بولا۔ ''اسے کھیت میں چھوڑ دے...... اس سال پانی کی کمی ہے۔'' اس کا سینس آف ہیومر اچھا تھا۔

میں نے چلتے چلتے کہا۔ ''تمہارا پورا نام کیا ہے رشید یا راشد......''

''مرشد داد...... مگر تو کیوں پوچھ رہا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''مرشد...... کیا تم بتا سکتے ہو کہ آج کون سی تاریخ ہے اور کیا دن ہے......؟''

وہ چلتے چلتے رک گیا۔ ''تجھے نہیں معلوم آج رجب کی بائیس تاریخ ہے اور جمعے کا دن ہے...... مولوی صاحب نے بتایا تھا۔''

''مجھے قید میں دن رات کا پتا نہیں چلتا تھا۔'' میں نے وضاحت کی اور پھر اختصار کے ساتھ اسے بتایا کہ ایک دشمن نے مجھے بہت عرصے سے ڈاک بنگلے میں بند کر رکھا تھا۔ ''تم نے دیکھا ہے وہ ڈاک بنگلا؟''

''ادھر کوئی نہیں جاتا...... وہاں جنات رہتے ہیں، انہوں نے تمہیں کچھ نہیں کہا۔ مارا نہیں......؟''

میں نے کہا۔ ''مجھے تو وہاں انسانوں نے مارنے کی کوشش کی تھی۔''

''وہ جنات ہی ہوں گے......'' راشی نے یقین سے کہا۔

گاؤں میری توقعات سے بھی چھوٹا تھا...... اس میں مشکل سے پچاس گھر ہوں گے جن میں بیشتر کچے تھے...... صرف ایک پکا گھر نظر آ رہا تھا جس کے بارے میں راشی نے بتایا کہ اس میں صوبیدار صاحب ہیں...... وہ فوج میں تھے اور ان کے سارے بچے شہر میں ہیں، یہاں وہ اکیلے اپنی بیوی کے ساتھ رہتے ہیں۔

میں نے کہا۔ ''تم مجھے انہی کے پاس لے چلو......''

راشی نے مجھے صوبیدار کے گھر کا دروازہ دکھایا اور خود اپنی گھر والی کے ساتھ دوسری طرف مڑ گیا جو کم سے کم دس کلو لکڑیوں کا بوجھ سر پر اٹھا کے چلنے کے ساتھ ساتھ اب بچے کو دودھ بھی پلاتی جا رہی تھی۔ شہر کی کوئی لڑکی ان میں سے ایک بھی کام نہیں کر سکتی۔ میں نے دستک دی تو کافی دیر بعد سفید ڈاڑھی والا ایک خمیدہ کمر بوڑھا نمودار ہوا۔ ''کون ہے بھئی؟''

میں نے کہا۔ ''صوبیدار صاحب، میں بڑی امید لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔ خیال ہے کہ آپ ہی میری مدد کر سکتے ہیں۔''

''او پتر...... یہ بڈھا اب کسی کی کیا مدد کرے گا۔ جوانی میں تو سوچا تھا کشمیر فتح کرنے کا......''

''آپ ایک منٹ میری بات سن لیں......''

''اندر آ جا اور تسلی سے بیٹھ کے بات کر...... یہ کیا حالت ہو رہی ہے تیری...... جیسے دشمن کی قید سے فرار ہو ہے۔'' اس نے مجھے راستہ دیا۔

''کیا آپ کو اس کا تجربہ ہے؟......'' میں نے کہا۔

''آپ نے کیسے جان لیا۔''

وہ ہنس پڑا۔ ''چودہ سال کا عرصہ جاپانیوں کی قید میں گزارا تھا میں نے...... دوسری جنگ عظیم میں...... تو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوا ہوگا...... ہم تین بندے فرار ہوئے تھے، دو مارے گئے...... میں نوے سال کا تیرے سامنے ہوں چل بیٹھ ادھر......''

میں ایک چارپائی پر بیٹھ گیا۔ ''میری بھی زندگی تھی کہ دشمن کی قید سے نکل آیا۔''

''میں دیکھ رہا ہوں...... تیرے پیر زخمی ہیں، کپڑے پھٹے ہوئے ہیں اور تیری حالت خراب ہے۔''

اندر سے کسی عورت نے کہا۔ ''کون ہے جی...... کس سے باتیں کر رہے ہیں...... کیا میرا پتر آیا ہے۔''

صوبیدار نے تلخی سے کہا۔ ''اب وہ نہیں آنے والے...... انہیں ماں باپ کی ضرورت ہی نہیں۔''

ایک عورت بیچ کے دروازے میں نمودار ہوئی۔ صوبیدار کے مقابلے میں اس کی عمر خاصی کم تھی۔ ''یہ کون ہے؟''

''ہے ایک مصیبت کا مارا...... چل گرم پانی لا...... اس کے پیر زخمی ہیں...... اور چائے بنا چینی والی......''

میں نے کہا۔ ''صوبیدار صاحب...... میرے پاس وقت نہیں ہے...... مجھے ٹیلی فون کرنا ہے۔''

اس نے مجھے پُرملال نظروں سے دیکھا۔ ''کتنا عرصہ رہا تو قید میں؟''

میں نے کہا۔ ''کچھ اندازہ نہیں مجھے...... دو ہفتے یا شاید دو مہینے...... مگر میرے لیے وہ دو صدیوں کا عذاب تھا۔''

''پھر یہ جلدی کیسی...... اب تو صوبیدار جلال الدین کے گھر میں ہے...... اور بالکل محفوظ ہے، یہاں تو مدد مانگنے آیا تھا اور میں تیری مدد کر رہا ہوں، کیا پتا دشمن تیری تلاش میں نکلے ہوں، تو باہر نکلے اور پھر پکڑا جائے...... پتر حوصلے اور صبر سے کام لے، خدا کو یہ منظور نہ ہوتا تو اس وقت بھی تو اسی قید خانے میں پڑا ہوتا۔''

میں راجا اور نور سے رابطہ کر کے انہیں یہ بتانے کے لیے مضطرب تھا کہ میں اس وقت کہاں ہوں لیکن بوڑھے صوبیدار کے شفقت آمیز خلوص نے مجھے خاموش کر دیا۔ اس کی بیوی ایک لوٹے میں گرم پانی لائی۔ میرا انکار کسی نے نہیں سنا۔ زبردستی مجھے ایک چوکی پر بٹھا دیا گیا اور بڑھیا نے صابن لگا کے میرے پیر صاف کیے۔ مجھے ایک شلوار قمیص کا جوڑا دیا گیا جو ان کے کسی بیٹے کا تھا۔ ان بیٹوں میں سے کسی کا جو اپنے بیوی بچوں میں مگن ہو کے ماں باپ کو فراموش کر چکے تھے۔ وہ میاں بیوی تنہا تھے اور محبت کے بھوکے تھے۔ شاید اب ان کے گھر مہمانوں نے بھی آنا چھوڑ دیا تھا کہ وہ میری تواضع میں جُت گئے۔

میں یورپ امریکا میں رہ کے کافی کا عادی ہو جانے والا اب مزے لے لے کر وہ خالص گاڑھے دودھ والی چائے پی رہا تھا تو وہ ایسے میری طرف دیکھ رہے تھے جیسے یہ خوشی دے کر میں نے ان پر بڑا احسان کیا ہے۔ زندگی میں کیا تضادات کا تماشا ہے۔ ایک یہ گزشتہ صدی کا صد سالہ بوڑھا تھا جو رانا کے مقابلے میں کسی اور دنیا کی مخلوق لگتا تھا۔ ایک مجسم خیر...... دوسرا مکمل شر...... ایک فرشتہ تو دوسرا شیطان۔

انہوں نے میرا نام پتا کچھ نہیں پوچھا تھا، کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ میں ان کے دروازے پر آیا تھا اور میں نے مدد مانگی تھی۔ کسی شک یا اندیشے میں پڑے بغیر اور کچھ سوچے بغیر انہوں نے وہ سب کیا جو ان کے اختیار میں تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس حسن سلوک نے میرا اضطراب ختم کر دیا تھا...... بے چینی کی جگہ مجھے سکون عطا کیا تھا اور میرے اعصاب پر سوار خوف کو اعتماد سے بدل دیا تھا۔

''صوبیدار صاحب...... کیا اب مجھے اجازت ہے......'' میں نے چائے کا آخری گھونٹ لیا۔

میں نے اس کا جھریوں بھرا ہاتھ تھام لیا۔ ''سب بتاؤں گا، بتائے بغیر نہیں جاؤں گا لیکن پہلے مجھے فون کرنا ہے۔''

''ٹیلی فون تو یہاں نہیں ہے، دس میل پر مظفر گڑھ کے قریب ملے گا۔''

''دس میل'' میں نے مایوسی سے کہا۔ ''مجھے وہاں تک پیدل جانا ہوگا۔''

''نہیں...... تو یہ سائیکل لے جا...... کب سے ادھر کھڑی ہے۔ میرا چھوٹا بیٹا لایا تھا، اس میں ہوا نہیں ہوگی لیکن ہوا بھرنے والا پمپ ہے میرے پاس......'' وہ اٹھا اور ایک الماری میں سے پمپ نکال لایا۔

میں نے باری باری سائیکل کے دونوں ٹائروں میں ہوا بھری اور دعا کرتا رہا کہ کوئی پنکچر نہ ہو...... صوبیدار نے مجھے راستہ سمجھایا اور جب اس کے چپل پہن کر میں سائیکل پر سوار ہوا تو گرتے گرتے بچا۔ میں نے اپنے بچپن میں بھی سائیکل چلائی تھی۔ ''میں ابھی آتا ہوں۔'' میں نے پیڈل مارتے ہوئے چلّا کے کہا۔ بڈھا بڑھیا مجھے دروازے میں کھڑے یوں دیکھ رہے تھے جیسے انہوں نے کبھی اپنے بچوں کو پہلی بار سائیکل چلاتے دیکھا ہوگا۔ وہ مسکرا رہے تھے۔ ان کے دل میں اس اندیشے کا کہیں گزر نہ تھا کہ میں سائیکل لے کر بھاگ جاؤں گا۔

میرے لیے اس چھوٹے سے گاؤں کے پگڈنڈی جیسے کچے راستے پر سائیکل چلانا ایک دیوانے کے خواب جیسا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے جب میں قید خانے کی دیواروں میں پاگلوں کی طرح سرگرداں تھا تو کیا یہ سوچ سکتا تھا کہ دو گھنٹے بعد آزاد ہو کے میں اس صوبیدار سے ملوں گا اور سائیکل پر اس گاؤں کے کھیتوں کی کھلی فضا اور تازہ ہوا میں نئی زندگی کا پہلا سفر کروں گا۔

اور وہ سب جنہوں نے مجھے دیکھا اور نظر انداز کر دیا۔

کھیتوں میں کام کرنے والے...... ایک لڑکا جو بھینس کو نہلا رہا تھا، ایک لڑکی جو پانی سے بھرا ایک مٹکا سر پر اور دوسرا کولہوں پر رکھے جا رہی تھی۔ ان سب نے پرانی چپل پہن کے زخمی پیروں کے ساتھ سائیکل پر گزرنے والے اس اجنبی کو کیا سمجھا ہوگا جو میں تھا۔ مسٹر اینڈ مسز راشی نے تو مجھے پاگل کہہ بھی دیا تھا۔ کون سوچ سکتا تھا یا تصور کر سکتا تھا کہ یہ دیوانہ اور کوئی نہیں نواب رفیق احمد شیرازی ہے۔ ست بدھائی کا مالک اور حاکم...... نور اینڈ شیرازی کمپنی آف لندن کا اور ارنسٹ مینشن کا مالک...... ہارورڈ سے ایم بی اے...... لاکھوں کی گاڑی میں شوفر اور باڈی گارڈ کے ساتھ پھرنے والا اور اگر دیکھنے والوں کو یہ پتا چلے تو ان کی کیا حالت ہوگی۔

ایک کتا مجھ پر بھونکا۔ کچھ دیر میرے پیچھے دوڑا اور پھر خود ہی رک گیا۔ میں ہنس پڑا۔ آخری بار میں کب ہنسا تھا؟ میں نے سوچا مگر مجھے کچھ یاد نہ آیا۔ میرے دماغ میں وقفے وقفے سے جذبات اور خیالات کی طوفانی لہر اٹھ رہی تھی...... رابعہ...... ضمیر فروش...... ایمان فروش جسم فروش...... میں آ رہا ہوں۔ تیری اور تیرے زوہیب حسن کی ایسی تیسی کرنے...... ابھی وقت ہے، کہیں روپوش ہو جا...... میری نظر کے سامنے پھر نہ آنا ورنہ تمہارا وہ حشر کروں گا کہ دیکھنے والوں کو بھی عبرت ہوگی۔ پھر دوسری لہر آئی اور میری نظر میں راجا کا مسکراتا چہرہ آ گیا تھا۔ تو نے دیکھا فیکے پتر...... مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے، مدعی کا اپنا خانہ خراب ہو جاتا ہے۔ پھر نور کے حسن بے مثال کی تازگی میری نگاہوں کو خیرہ کر دیتی تھی اور اس کی آنکھوں سے کھیلتے موتی اور اس کے لبوں پر جھلملاتی مسکراہٹ سے لگتا تھا جیسے میں چودھویں شب کی چاندنی میں ہوں اور مجھ پر شبنم اتر رہی ہے۔

کچا راستہ اچانک سڑک سے جا ملا اور میں نے ایک بس کو دیکھا جو ملتان سے ڈیرہ اسماعیل خان جا رہی تھی۔ ایک فرلانگ دور مجھے دوسری مخالف سمت میں جانے والی بس دکھائی دی۔ یہ کوئی روڈ سائڈ ہوٹل تھا جو سب ایک جیسے ہی ہوتے ہیں، باہر بان کی چارپائیوں پر بیٹھے لوگ ماش کی دال فرائی کے ساتھ تنور کی گرم روٹیاں کھا رہے تھے، چائے پی رہے تھے اور برآمدے جیسی عمارت کے ایک حصے میں ہوٹل کا مالک اپنے گرد بہت سے سلور کے برتن رکھے سالن نکال رہا تھا۔ پیالیوں میں چائے نکال رہا تھا اور پیسے وصول کر کے گلے میں ڈالتا جا رہا تھا۔ وہ ایک باریش درمیانی عمر کا پٹھان تھا۔ ٹیلی فون اس کے پیچھے رکھا تھا۔

یہ خیال مجھے اچانک آیا کہ بغیر پیسے دیے میں فون استعمال نہیں کر سکتا۔ میری جیب میں ایک پیسا نہیں تھا۔ واہ نواب رفیق احمد شیرازی...... بزعم خود تم ہو گے کروڑوں کے مالک...... یہاں تمہاری کیا اوقات ہے۔ پیروں میں چپل کسی کی دی ہوئی، جسم پر لباس کسی اور کا...... سائیکل مانگے کی اور جیب خالی، کیا تھا اگر تم اپنے محسن صوبیدار جلال الدین سے دس روپے بھی مانگ لیتے بے شرم بن کے...... اب بھی تو ایک کال کی خیرات لو گے...... جو ملے نہ ملے......

لیکن فارسی میں کہتے ہیں جس کا ترجمہ کچھ یوں ہے...... بادشاہ اگر فقیری لباس پہنے رعایا میں چلا جائے تب بھی بادشاہ ہی رہتا ہے...... شرمندگی کا خیال مجھے شرمندہ نہیں کر سکتا تھا، میں بڑے اطمینان سے ہوٹل کے مالک تک گیا۔

اس نے مجھے غور سے دیکھا۔ ''کیا بات ہے؟''

''ایک گزارش تھی......''

''گزارش...... وہ کیا ہوتا ہے، یار روٹی موٹی کھانے کا پیسا نہیں ہے تو کھا لو۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے ایک فون کرنا تھا، لیکن میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ آپ یہ سائیکل رکھ لیں، میں بعد میں لے جاؤں گا۔''

وہ بھونچکا رہ گیا۔ ''سائیکل......؟ اوہ خانہ خراب ہم سائیکل کا کیا کرے گا، کیا معلوم تمہارا ہے یا چوری کا...... فون کرنا ہے تو فون کرو......'' اس نے فون اٹھا کے میرے سامنے رکھ دیا اور پھر اپنے گاہکوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

کانپتے ہاتھوں اور دھڑکتے دل کے ساتھ میں نے راجا کا نمبر ملایا اور دل ہی دل میں دعا کرتا رہا کہ نمبر مل جائے...... حالات جب ٹھیک ہونے پر آئیں تو خود بخود ٹھیک ہوتے جاتے ہیں، جیسے بگڑنے پر آئیں تو سنبھالے نہیں سنبھلتے...... دوسری بیل پر ہی راجا کی آواز سنائی دی۔

''ہیلو۔''

میں نے کہا۔ ''راجا......''

وہ چلایا۔ ''تو...... فون کہاں سے کر رہا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''میں اس قید خانے سے نکل بھاگا ہوں راجا...... اب دھیان سے میری بات سن...... میں یہاں مظفر گڑھ سے ڈیرہ اسماعیل خان جانے والی سڑک پر ایک ہوٹل سے فون کر رہا ہوں...... یہاں میں کیسے پہنچا۔ یہ بعد میں بتاؤں گا، ابھی تو میری جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں۔ بس تو وہیں رک کر میرا انتظار کر۔''

''یہ شاہ جی گولڈن ہوٹل'' ہے...... اس کے بالکل

سامنے بسیں کھڑی ہوتی ہیں، یہاں تک آنے میں تجھے چار پانچ گھنٹے ضرور لگیں گے۔''

''تو نے اور کسی کو کچھ بتایا ہے؟''

''نہیں...... یہ کال بھی مفت کر رہا ہوں۔''

''اور کسی کو فون مت کرنا...... نور کو بھی نہیں فیکے پتر......''

میں نے کہا۔ ''میرے پاس جوتے کپڑے کچھ نہیں ہیں۔''

ہوٹل والے نے ایک دم فون پر ہاتھ رکھ دیا۔ شاید اسے اچانک خیال آیا کہ کال لمبی ہوتی جا رہی ہے۔ کال کٹ گئی مگر مجھے جو کہنا تھا میں کہہ چکا تھا۔ میں نے ہوٹل کے مالک کا شکریہ ادا کیا مگر اس نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔

ایک بار پھر میں سائیکل پر پیڈل مارتا واپس صوبیدار جلال الدین کے گھر پہنچا۔ حیرت کی بات تھی کہ آتے جاتے اس کچے راستے پر سائیکل کا ٹائر پنکچر نہیں ہوا۔ ورنہ خود پیدل چلنے کے ساتھ مجھے سائیکل کو بھی گھسیٹنا پڑتا۔ میرے پاؤں درد کر رہے تھے لیکن جسمانی اور ذہنی طور پر میں چاق و چوبند تھا، میری تمام توانائی بحال ہو چکی تھی اور میں اس ڈراؤنے خواب کے اثرات سے نکل آیا تھا جو قید خانے میں گزرے ہوئے تجربات کی صورت مجھے یاد تھا۔

میں جینا سیکھ رہا تھا...... زندگی مجھے ہر سبق ایک تجربے کی صورت میں پڑھا رہی تھی۔ یہ سب میں نے کتابوں میں نہیں پڑھا تھا کہ وہ دولت جس کے حصول کے لیے لوگ دن رات محنت کرتے ہیں۔ ڈگریاں حاصل کرتے ہیں جوا کھیلتے ہیں، لاٹری کے ٹکٹ خریدتے ہیں اور ڈاکے ڈالتے ہیں، جب وہ مل جاتی ہے اور وہ بھی کچھ کیے بغیر...... تو دنیا کتنی بدل جاتی ہے۔ اپنے پرائے اور پرائے اپنے ہو جاتے ہیں، خون کے رشتے خونیں رشتے ہو جاتے ہیں، خون سفید ہونا اسی کو کہتے ہیں۔

ابھی میرے پاس کافی فرصت کا وقت تھا۔ میں نے پہلے اپنے محسن صوبیدار جلال الدین کی آپ بیتی سنی۔ وہ دوسری جنگِ عظیم میں حوالدار تھا، پھر ترقی کرتے کرتے صوبیدار بن گیا۔ جنگِ عظیم کے درمیان اس کی پوری رجمنٹ کو جاپانیوں نے پکڑ لیا تھا۔ اگر وہ فرار کی کوشش میں کامیاب نہ ہوتا تو قید میں جاپانیوں کے مظالم سے ہلاک ہو جاتا۔ صوبیدار کی پنشن بہت قلیل تھی، پہلی شادی سے اس کی چار بیٹیاں تھیں۔ دوسری سے چار بیٹے ہوئے لیکن اب کوئی بھی ان کے ساتھ نہیں تھا۔ بیٹیاں عید بقرعید پر ملنے آ جاتی تھیں، بیٹے ایسے گئے تھے کہ لوٹ کر نہیں آئے تھے۔ حالانکہ ان کی بیویاں بھی بھانجی بھتیجی تھیں، اس بات پر وہ بہت دکھی تھے۔

جب میری باری آئی تو میں نے وہی بتایا جو سچ تھا لیکن بہت اختصار کے ساتھ...... صوبیدار کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ اسے میری الف لیلوی کہانی پر اعتبار نہیں مگر میرا دل رکھنے کے لیے وہ سب سن رہا ہے۔ مجھے اس پر نہ صدمہ تھا نہ غصہ اور نہ حیرت...... میری سرگزشت میں طلسم ہوشربا کے سارے عناصر تھے۔ ان کی جگہ کوئی بھی ہوتا یہی سمجھتا کہ میں کوئی خواب سنا رہا ہوں، مجھے داستان طرازی میں کمال حاصل ہے، وہ سپاہی تھا اور اس کی زندگی ایک گمنام سے گاؤں سے شروع ہونے والا سفر تھی جو اسی گاؤں میں ختم ہو رہا تھا...... دنیا گول ہے۔

دن ڈھلا تو مجھے فکر لاحق ہونے لگی۔ پہلے تو میں سائیکل لے گیا تھا۔ سائیکل واپس کرنا بھی ضروری تھی لیکن رات کے وقت میں دوبارہ دس میل کا فاصلہ طے کر کے شاہ جی گولڈن ہوٹل تک کیسے جاؤں گا۔ میرے اندازے کے مطابق راجا کو وہاں پہنچنے کے لیے مزید دو گھنٹے درکار تھے، اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ رات نو بجے سے پہلے نہیں آ سکتا۔

صوبیدار کی بیوی پھر چائے بنا لائی تھی۔ میرے سامنے وہ چوتھی بار چائے پی رہا تھا۔ تین مرتبہ مروت میں اس کا ساتھ دینے کے بعد میرا حوصلہ جواب دے گیا۔ میں نے معذرت کر لی۔ ''میں بہت کم چائے پیتا ہوں۔''

''مجھے فوج کی نوکری میں یہ عادت پڑ گئی۔'' وہ بولا۔ ''جب میں جاپانیوں کی قید میں تھا تو مجھے بھی سب کی طرح بہت اذیت دی جاتی تھی لیکن مجھے پریشانی تھی تو صرف چائے نہ ملنے کی۔''

اس کے پاس سنانے کے لیے دو ہی موضوع تھے...... یا میدانِ جنگ کے قصے یا اولاد کی ناخلفی کے واقعات۔ آج میں تھا ورنہ ہر روز اس کی سننے والی ایک بیوی کی ذات تھی۔ اکیلے پن کے احساس کو بہلاوے کے لیے وہ مسلسل بولتا تھا۔ اچھی بات یہ تھی کہ بیوی کم گو تھی جو سارا دن صرف سنتی رہتی ہوگی۔ چنانچہ اس عمر میں ان کی رفاقت مکمل تھی۔

اچانک اس نے مجھ سے ایک سوال کر لیا۔ ''کیا بات ہے پتر...... دھیان کدھر ہے تیرا...... تو کچھ پریشان ہے ابھی تک......''

میں چونکا۔ ''نہیں...... اب تو سارے کام ٹھیک ہو گئے آپ کی دعا سے بس...... میں سوچ رہا تھا کہ رات کو وہاں کیسے جاؤں گا۔ میری گاڑی تو یہاں مجھے لینے نہیں آ سکتی۔''

وہ ہنسنے لگا۔ ''لے یہ بھی کوئی پریشانی کی بات ہے، میں چلوں گا تیرے ساتھ...... تو مجھے بٹھا کے سائیکل چلا سکتا ہے نا؟''

میں نے اقرار میں سر ہلایا۔ ''لیکن تم واپس کیسے آؤ گے؟''

''اسی سائیکل پر...... ادے بڑا دم ہے ابھی ان بوڑھی ہڈیوں میں۔ آخر فوج کا راشن کھایا ہے۔''

''پھر میرا خیال ہے چلنا چاہیے۔'' میں نے کہا۔

اس کی بیوی نے دوسرے کمرے سے خفگی کا اظہار کیا۔

''ایسے کیسے جانے دوں گی میں...... روٹی تیار ہے......''

انکار کی گنجائش نہ تھی...... کسی کے خلوص کو ٹھکرانا بھی میرے نزدیک ایک گناہ عظیم تھا۔ وہ بوڑھے لوگ خود اپنی اولاد کی بے توجہی سے دکھی تھے اور ان کے دل میں کھلنے والے محبت اور ممتا کے سارے پھول مرجھا رہے تھے۔ میں کچھ دیر کا مہمان سہی، انہیں یہ پھول میری نذر کرنے کا موقع ملا تھا۔ بڑی بی نے میرے لیے خالص دیسی گھی کے پراٹھے بنائے تو خوشبو سارے گھر میں بھر گئی۔ اس کے ساتھ خالص مکھن تھا جو بالکل سفید اور پھیکا تھا، کسی خاندانی طریقے سے بنایا ہوا گھریلو اچار تھا لیکن سب سے بڑھ کر محبت اور خلوص کا وہ ذائقہ تھا جس نے اس کھانے کو کسی فائیو اسٹار ہوٹل کے ڈنر سے زیادہ لذت بخش دی تھی۔

آٹھ بجے ہی گھر کے باہر آدھی رات کا سماں تھا۔ گاؤں میں بجلی نہیں تھی چنانچہ گھروں کے اندر چلنے والے چراغ بے نور لگتے تھے اور پورے گاؤں پر خاموشی اور تاریکی مسلط تھی۔ ویسے بھی وہاں لوگ سرِشام روکھی سوکھی کھا کے سو جانے کے عادی تھے۔ گلیوں میں کتے بھونک رہے تھے۔ صوبیدار نے مجھے بتایا کہ اس علاقے میں جنگلی جانور بھی ہیں۔ کبھی کبھار آدھی رات کے بعد بھیڑیے گاؤں کے اندر آ کے بھیڑ بکری بھی لے جاتے ہیں۔

مجھے کچھ فکر لاحق ہونے لگی۔ ''پھر آپ اکیلے کیسے واپس آئیں گے؟''

وہ ہنسا۔ ''او پتر...... یہاں کے تو جانور بھی لحاظ کرتے ہیں میرا۔ بھیڑیوں نے کسی بندے کو کبھی نہیں اٹھایا۔ صرف ایک بار ایسا ہوا تھا۔ کوئی لڑکی تھی جو آدھی رات کو کسی یار سے ملنے گئی تھی، صبح اس کی آدھی کاٹی ہوئی لاش ملی تھی۔ لڑکی کا باپ اور میں اسے تلاش کرنے نکلے تھے۔ ہم نے کسی کو کچھ نہیں بتایا اور اسے وہیں گڑھا کھود کے دفن کر دیا۔ اللہ سب کی عزت کا بھرم رکھے۔ اس کی ماں سوتیلی تھی، باپ نے کہا کہ میں نے لڑکی کو اس کی خالہ کے پاس بھجوا دیا ہے۔''

میں نے بے خیالی میں سوال کیا۔ ''وہ کس سے ملنے گئی تھی؟ کون تھا جس کی محبت میں اس نے اپنی جان گنوائی۔''

''کچھ پتا نہیں...... بہت پرانی بات ہے، جو بھی تھا کہیں شادی کر کے بیٹھا ہوگا بیوی بچوں کے ساتھ......''

ایک اجنبی محبت کی ادھوری داستانِ محبت نے وقتی طور پر مجھے دکھی کر دیا پھر سڑک آ گئی۔ اس پر رات کے وقت بھی گاڑیاں گزر رہی تھیں، شاہ جی گولڈن ہوٹل کے سامنے کھڑی ہوئی دو گاڑیاں مجھے دور سے نظر آ گئیں، مجھے اپنے ساتھ لے جانے والے پہنچ چکے تھے۔ میرے ذاتی استعمال کی سیاہ ہنڈا سوک پر ریاست کا جھنڈا لگا ہوا تھا۔ اسے غنی ڈرائیو کر کے لایا تھا۔ دوسری گاڑی میں چار سیکیورٹی گارڈز تھے جو پوری طرح مسلح اور یونیفارم میں آئے تھے۔

ہوٹل میں بیٹھے ہوئے عام لوگ بھی حیران اور مرعوب تھے کہ یہ اہتمام کس کے لیے ہے۔ جب میں نے قریب جا کے سائیکل روکی اور صوبیدار کو اتارا تو سب سے پہلے پروٹوکول کے مطابق سیکیورٹی گارڈز نے مجھے سیلوٹ کیا۔ پھر راجا مجھ سے لپٹ گیا۔

''کہاں مر گیا تھا تو فیکے پتر...... میں کب سے انتظار کر رہا ہوں۔'' راجا نے کہا اور ضبط کی کوشش کے باوجود اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

میں نے کہا۔ ''راجا...... تو اتنی جلدی کیسے پہنچ گیا۔'' پھر غنی سے گلے ملا۔ ''تم نے گاڑی دوڑائی ہوگی۔''

غنی نے حوصلے سے کام لیا۔ ''آپ ٹھیک ہیں سر......''

''ہاں...... دیکھ لو سب کی دعائیں میرے کام آئیں۔'' میں نے کہا۔

پھر اچانک مجھے احساس ہوا کہ بہت سے لوگ میرے استقبال کا یہ منظر بڑی حیرانی سے دیکھ رہے ہیں۔ ان میں صوبیدار جلال الدین بھی تھا جس کو اب یقین آ گیا تھا کہ میری زبان سے اس نے جو بھی سنا تھا، میرے ذہن کی داستان گوئی کا کمال نہیں تھا۔ وہ ہوٹل کے مالک کے ساتھ ہکا بکا اور دم بخود کھڑا تھا...... سب کے سامنے میں اس بوڑھے صوبیدار کو سائیکل پر آگے بٹھا کے لایا تھا۔ میرے پیروں میں اسی کے دیے ہوئے پرانے چپل تھے اور میں نے اسی کا دیا ہوا پرانا شلوار قمیص پہن رکھا تھا۔

میں نے کہا۔ ''صوبیدار صاحب...... آپ وہاں کیوں کھڑے ہیں؟ اِدھر آئیے...... یہ میرا سب سے عزیز دوست اور میرا بھائی ہے...... راجا...... اور راجا یہ صوبیدار جلال

الدین ہیں، آج میں انہی کا مہمان تھا، ان کی محبت اور خاطر داری میں تمام عمر نہیں بھول سکتا۔''

راجا اور غنی اس بوڑھے صوبیدار سے مل رہے تھے ہوٹل کا مالک آگے بڑھا۔ ''آپ...... آپ دن میں آئے تھے...... فون کرنے......''

راجا نے سو روپے کا ایک نوٹ اس کی طرف بڑھایا تو میں نے فوراً کہا۔ ''اس وقت واقعی میری جیب خالی تھی۔ آپ کا احسان اپنی جگہ......''

وہ ایک قدم پیچھے ہو گیا۔ ''آپ شرمندہ کرتے ہو نواب صاحب۔ یہ تو ہمارے لیے بڑی عزت کی بات تھی کہ آپ آئے...... ہم سے کوئی گستاخی ہوئی تو معاف کریں۔''

میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ ''آپ کی مدد مجھے یاد رہے گی۔''

''میں بھی بھول نہیں سکتا کہ ایک نواب کس طرح میرے پاس آیا تھا اور کس حالت میں۔ اب ایک درخواست ہے......''

''بولو......'' میں نے دوستانہ انداز میں اس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھا۔

''میرے ساتھ ایک کپ چائے کا پی لیں...... آپ اور حاجی صاحب۔''

''کون حاجی صاحب......؟''

''وہی جن کے ساتھ آپ تشریف لائے ہیں، صوبیدار جلال الدین...... دن میں آپ نے فرمایا ہوتا کہ آپ ان کے مہمان ہیں تو ہم آپ کو ایسے نہ جانے دیتے۔ یہ ہمارے علاقے کی بہت معزز شخصیت ہیں، سب انہیں اپنا بزرگ مانتے ہیں، اللہ ان کا سایہ ہم پر سلامت رکھے۔''

اب میں نے صوبیدار کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل خاموش اور لاتعلق سا کھڑا شان و شوکت کے اس مظاہرے کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''یہ میرے میزبان ہی نہیں، محسن بھی ہیں، وہ سائیکل ان کی تھی جس پر میں آیا تھا جو کپڑے میں نے پہن رکھے ہیں ان کے دیے ہوئے ہیں اور یہ چپل......''

صوبیدار نے مجھے روک دیا۔ ''چل بس کر پتر...... گھر آئے مہمان کے لیے اتنا سب ہی کرتے ہیں۔''

ہم سب دو چارپائیوں پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ ہمارے درمیان لکڑی کی بوسیدہ میز تھی۔ چارپائیوں کی بان مسلسل دھوپ اور بارش میں پڑے رہنے سے ڈھیلی ہو گئی تھی اور کالی پڑ گئی تھی۔ جو لوگ دور سے دیکھ رہے تھے وہ مجھے کوئی سیاسی لیڈر یا اعلیٰ سرکاری عہدیدار سمجھ کے قریب نہیں آ رہے تھے۔ میری خواہش تھی کہ صوبیدار کو اپنی گاڑی میں بٹھا کے واپس گھر تک چھوڑ دوں لیکن اس نے انکار کر دیا۔

''میری فکر نہ کر پتر...... میں چلا جاؤں گا۔ مجھے کوئی خطرہ نہیں، ساری زندگی گزاری ہے یہاں......''

ہوٹل کے مالک نے کہا۔ ''آپ فکر مت کرو جناب۔ حاجی صاحب کو ہم پہنچا دیں گے۔''

راجا گاڑی میں سے ایک ہینگر نکال کر لایا جس پر پلاسٹک کور چڑھا ہوا تھا۔ ''اپنا لباس تو بدل لیں نواب صاحب......''

یہ واقعی عجیب مضحکہ خیز صورتِ حال نظر آتی اگر اس شاہانہ شان و شوکت کے ساتھ میں اسی لباس میں روانہ ہوتا...... پیچھے بنے ہوئے ایک کمرے میں جا کے میں نے کپڑے بدلے اور جب باہر آیا تو بہترین سوٹ اور ٹائی میں تھا...... کم سے کم پچاس افراد منہ کھولے آنکھیں پھاڑے یہ تماشا دیکھ رہے تھے، میں نے صوبیدار جلال الدین سے اجازت لی کہ میں اتارا ہوا لباس یادگار کے طور پر اپنے پاس رکھ لوں۔

صرف آدھے گھنٹے بعد میں اپنی گاڑی میں راجا کے ساتھ پیچھے بیٹھا تھا...... گاڑی کا ڈرائیور غنی تھا اور سیکیورٹی گارڈز والی گاڑی ہمارے پیچھے تھی...... شدتِ جذبات سے میں شدید ہیجانی کیفیت کا شکار تھا۔ مجھے قید سے فرار ہوئے چھ گھنٹے ہو گئے تھے۔ یہ وقت میں نے خود کو پُرسکون رکھنے اور اپنے اعصاب پر قابو پانے کی پوری کوشش کرتے گزارا تھا۔ اس کے باوجود جب میں پھر نواب رفیق احمد شیرازی بنا تو مجھے یوں لگا جیسے میں مر کے زندہ ہو گیا ہوں...... مجھے خدا نے ایک اور زندگی عطا کر دی ہے۔

گاڑی کے روانہ ہوتے ہی میں نے راجا کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''راجا مجھے یقین نہیں آتا کہ وہ سب جو میں نے بھگتا...... وہ حقیقت تھا یا یہ حقیقت ہے کہ میں اپنی دنیا میں لوٹ آیا ہوں۔''

''دو مہینے دس دن بعد......'' راجا نے میرا ہاتھ دبایا۔

''اب انشاءاللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''پہلے مجھے یہ بتا...... رابعہ کہاں ہے......؟''

''وہیں...... جہاں اسے ہونا چاہیے تھا۔'' راجا سپاٹ لہجے میں بولا۔

''میرا پیغام ملا تھا تجھے......؟''

''ملا تھا...... لیکن میں اس سے پہلے ہی یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے...... میرے جیتے جی یہ ناممکن تھا کہ وہ اتنی

آسانی سے ہمیں بے دخل کر دے، ہم سے ہمارے خواب ہمارا مستقبل سب چھین لے، ست بدھائی صرف تیری ملکیت میں نہیں۔ ہم سب کا اثاثہ ہے۔ بس فکر مجھے تیری تھی۔ اصل آزمائش یہی تھی کہ تجھے زندہ سلامت کیسے بازیاب کیا جائے اور سچ بتاؤں...... مجھے کامیابی کی امید بہت کم تھی۔ رابعہ کو میں ست بدھائی کی ملکہ بننے سے پہلے ہی سرِعام گولی مار دیتا اور پھانسی چڑھ جاتا تو مجھے افسوس نہ ہوتا۔ اصل خطرہ تھا زوہیب سے...... مجھے کسی وعدے کسی ضمانت پر بھروسا نہ تھا، پھر بھی میں کوشش کر رہا تھا کہ ان کی مرضی کے خلاف کوئی بات نہ ہو۔ وہ سب کچھ لے لیں۔ بس تجھے چھوڑ دیں...... اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ طے تھا کہ نہ رابعہ رہے گی اور نہ زوہیب بچے گا۔ یہ میں نے شہناز کو بھی بتا دیا تھا اور اسے مجھ سے مکمل اتفاق تھا۔ ایک بار اس نے میرے سامنے قسم کھائی کہ اس رابعہ کو خود میں قتل کروں گی۔ زوہیب تو آخر دشمن ہے، اس سے کچھ بھی توقع کی جاسکتی ہے لیکن رابعہ کو معاف نہیں کیا جاسکتا۔"

"میں نے پوچھا تھا کہ وہ کہاں ہے...... مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ وہ گفٹ ڈیڈ پر سائن کرنے کورٹ نہیں پہنچی......"

"ہاں...... مگر یہ تجھے کیسے معلوم ہوگیا......؟"

میں نے کہا۔ "میں نے خود زوہیب سے سنا، وہ نہ جانے کس سے بات کر رہا تھا۔"

راجا کچھ دیر خاموش رہا۔ "ہاں...... یہ ٹھیک ہے، وہ بڑی خاموشی سے ہر چال چل رہی تھی۔ بڑی رازداری سے زوہیب کا ساتھ دے رہی تھی۔ کسی نے انہیں ملتے نہیں دیکھا۔ ظاہر ہے ان کے سارے معاملات فون پر طے ہو رہے تھے، مجھے اس وقت پتا چلا جب سازش تقریباً کامیاب ہوگئی تھی۔ غنی کے ساتھ میں تجھے ریسیو کرنے ایئرپورٹ پر موجود تھا۔ سارے مسافر نکل گئے تو میں نے پسنجر لسٹ دیکھی۔ اس میں تیرا نام تھا، میں نے لندن سے تصدیق کی۔ وہاں سے بھی تیری روانگی کنفرم ہوگئی تو میں سمجھ گیا کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ رابعہ کی طرف تو میرا شک ہی نہیں گیا تھا۔ میں نے غنی سے کہا کہ وہ کسی کو کچھ نہ بتائے۔ ہم یہی کہیں گے کہ نواب رفیق نے اپنی پاکستان واپسی کچھ دن کے لیے ملتوی کر دی ہے۔ لندن میں کوئی ضروری کام آگیا تھا۔ میں نے صرف نور سے پوچھا اور اس نے کہا کہ میں تو ایئرپورٹ نہیں گئی تھی انہیں سی آف کرنے مگر بورڈنگ کارڈ لینے کے بعد انہوں نے مجھے فون کیا تھا۔ جہاز کی طرف جاتے ہوئے، ظاہر ہے یہ سمجھ میں نہ آنے والی بات تھی، میں نے بہت سوچا اور پھر صرف عبداللہ جان سے مشورہ کیا۔ کچھ ان کی مدد تھی، کچھ میرے بھی تعلقات تھے۔ میں نے لندن کا ویزا لیا اور وہاں ایک پرائیویٹ سراغ رساں سے ملا۔ اس نے آسانی سے معلوم کرلیا کہ تیری روانگی سے پہلے ایئرپورٹ پر کیا ہوا تھا۔ ایک مسافر کا بریف کیس غائب ہوگیا تھا پھر اسے ہارٹ اٹیک ہوا اور ایک ایمبولینس اسے لے گئی تھی، مزید تفتیش سے ثابت ہوگیا کہ کسی اسپتال میں ایئرپورٹ سے کوئی مریض داخل نہیں کیا گیا جس کو دل کا دورہ پڑا ہو...... تین دن کی تفتیش سے معلوم ہوگیا کہ تجھے ایئرپورٹ سے اغوا کیا گیا اور تیری جگہ کسی اور نے سفر کیا...... یہ کام مشکل ضرور تھا مگر ناممکن نہیں...... عبداللہ جان نے مشورہ دیا کہ کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں، اغوا کرنے والوں کے فون کا انتظار کرو...... وہ رابطہ ضرور کریں گے۔"

"تو نور سے بھی ملا تھا......؟"

"یہ ضروری تھا، میں نے ہی اسے سمجھایا کہ خاموشی سے اپنا کام کرتی رہے۔ کسی کو بھی معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ رفیق کو اغوا کرلیا گیا ہے اور میں داد دیتا ہوں اس عورت کی ہمت کی...... اور ذہانت کی۔ سب کے سامنے وہ پُراعتماد اور پُرسکون رہی۔ میں ایک ہفتے بعد لوٹ آیا تھا۔ میرے یا نور کے علاوہ صرف دو افراد کو حقیقت کا علم تھا۔ ایک غنی کو اور دوسرے شہناز کو...... بعد میں حقیقت سامنے آگئی۔ پورا پلان خود سمجھ آگیا تھا کہ وہ چاہتی کیا ہے۔ رابعہ سے کچھ بھی کہنا لاحاصل تھا۔ میں نے ہر بات سے مکمل اتفاق کیا، صرف اس لیے کہ پہلا اور آخری مقصد تیری سلامتی کا تھا۔ ست بدھائی کچھ نہیں...... کسی بات کی کوئی اہمیت نہیں تھی سوائے تیری زندگی کے...... میں کسی بات سے شک بھی پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ دشمنوں کا منصوبہ اتنا مکمل تھا کہ میں کچھ کر ہی نہیں سکتا تھا۔ بس ایک بات کا انہیں اندازہ نہیں تھا کہ بعد میں کیا ہوگا، تو زندہ سلامت لوٹ آتا...... یا وعدہ خلافی کرتے ہوئے وہ تجھے مار دیتے، دونوں صورتوں میں رابعہ کا ایک ہی انجام ہوتا۔ زوہیب اسے بچا نہیں سکتا تھا۔"

"وہ پاگل ہوگئی ہے راجا...... اس نے زوہیب سے مدد لی، یہ جانتے ہوئے کہ زوہیب سے شادی کی صورت میں جب دونوں ریاستوں کا انضمام ہوجائے گا۔ تو خود اس کا انجام بالآخر کیا ہوگا۔"

"یہ بات رابعہ سمجھتی ہے......؟"

"بالکل سمجھتی ہے...... بہت اچھی طرح جانتی ہے کہ زوہیب مردوں کے کس قبیلے سے تعلق رکھتا ہے۔ جو عورت کو زرخرید کنیز اور پاؤں کی جوتی سمجھتے ہیں خواہ وہ ان کی اپنی ماں ہو، بہن یا بیٹی...... وہ حاکم ہیں اور مالک ہیں، اسلام اور شریعت کا نام لے کر چار کو نکاح میں رکھیں تو درجنوں کو داشتہ بنا رکھتے ہیں۔ ہر گھر میں...... ہر شہر میں...... اور جو عورت ان کی ہو وہ ان کے رحم و کرم پر ہوتی ہے...... ڈسپوزیبل ہوتی ہے، اسے وہ جیسے چاہیں رکھیں یا نہ رکھیں...... رابعہ کو اچھی طرح معلوم ہے۔"

"پھر بھی وہ زوہیب کی بیوی بننے پر تیار ہے؟"

میں نے ہنس کے کہا۔ "نہیں راجا...... زوہیب اسے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ یہ سمجھتا ہے کہ رابعہ اس کے جال میں پھنس گئی ہے۔ اس کے ذہن میں جو پلان ہے اس کے تین مرحلے ہیں، پہلے وہ رابعہ کی خواہش کے مطابق اور اس کی مدد سے میرا کام تمام کرتا...... رابعہ کو ست بدھائی کی ریاست مل جاتی اور زوہیب کے راستے کی سب سے بڑی دیوار نہ رہتی...... دوسرے مرحلے میں وہ رابعہ کو اپنا لیتا جب وہ ست بدھائی کی بلاشرکت غیرے مالک ہوتی...... الو کا پٹھا...... سمجھتا ہے رابعہ کی آنکھوں پر عشق کا پردہ پڑا ہوا ہے، اس کی عقل پر جذبات کا غلبہ ہے، وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہوچکی ہے۔ تیسرے مرحلے میں وہ رابعہ کے ساتھ وہی کرتا جو رابعہ نے میرے ساتھ کیا۔ رابعہ سے جہاں چاہتا کسی بھی دستاویز پر دستخط کرالیتا...... بالآخر اس کا انتقال پُرملال ہوجاتا۔ کسی اسپتال میں اس کے بچے کو جنم دیتے ہوئے، کسی حادثے میں...... ڈاکوؤں کی فائرنگ سے...... خوب سوگ ہوتا...... جنازہ بڑی دھوم دھام سے اٹھایا جاتا لیکن زوہیب کی طرف کوئی انگلی اٹھنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا، رابعہ کی نظر دور تک دیکھ سکتی تھی۔"

راجا کی حیرانی جائز تھی۔ "کیا وہ زوہیب کو استعمال کرنے کے بعد شادی سے انکار کر دیتی......؟"

"پاگل زوہیب بن رہا تھا، مرد جو خود کو بڑا طرم خاں اور افلاطون سمجھتا ہے، ہمیشہ عورت کے چکر میں مارا جاتا ہے۔"

"تو اندازے کی بات کر رہا ہے۔"

"نہیں راجا...... رابعہ نے میرے سامنے خود اعتراف کیا۔ زوہیب سمجھتا ہے کہ رابعہ کئی بار دھوکا کھانے کے بعد اس کے عشق میں دیوانی ہوگئی ہے۔ نہیں...... دیوانہ وہ خود ہے جو رابعہ کی چال کو نہیں سمجھ رہا تھا...... اور یہ بھی رابعہ کا مقصد نہیں تھا کہ زوہیب کے ہاتھوں مجھے مروا دے۔"

"دیکھ پتر......" راجا نے اپنا سر پکڑ لیا...... "اور کیا مقصد تھا؟ کون سی کسر باقی رہ گئی تھی رابعہ کی دشمنی میں...... تو بچ کے نکل آیا ہے تو بکواس کر رہا ہے کہ رابعہ کا مقصد تجھے مروانا نہیں تھا۔"

"میں تجھے سچ بتا رہا ہوں...... جس کا اعتراف آج ہی رابعہ نے خود میرے سامنے آ کے کیا تھا۔"

"کون سا سچ......؟"

"اس نے کہا کہ وہ مجھ پر دباؤ ڈال رہی تھی...... اس نے صاف کہا کہ زوہیب سے شادی کا مطلب ہے خودکشی......"

"یعنی وہ صرف ست بدھائی پر قبضہ چاہتی تھی۔"

"ہاں...... اور یہ اسی صورت میں ممکن تھا کہ میں نہ رہوں...... لیکن آج رابعہ نے کہا کہ ایک راستہ اور بھی ہے، میں اس سے شادی کرلوں۔"

راجا کی زبان حیرت سے گنگ ہوگئی۔ "یہ...... رابعہ نے کہی؟"

"ہاں...... اس نے صاف کہا...... مجھ سے شادی کرلو اور حق مہر میں ست بدھائی کی ریاست میرے نام لکھ دو...... تاکہ بعد میں تم مجھے چھوڑ دو تو تمہیں ریاست چھوڑنی پڑے، وہ نور کے ساتھ مجھے شیئر کرنے کو بھی تیار تھی۔"

"میں نہیں مان سکتا......"

"مان لے راجا...... میں تجھ سے کیوں غلط بیانی کروں گا، اس کے سارے گلے شکوے اپنی جگہ کہ اسے حق نہیں ملا اور اس کے ماں باپ کو یہی غم کھا گیا...... وہ طفیلی بن گئی...... میں نے اسے ٹھکرایا۔ بچپن کی نسبت توڑ دی اور اس کی بار بار تذلیل کی...... فریال کے بعد نور جہاں آگئی...... اور اب نور ہے...... لیکن وہ اس پر بھی تیار ہے کہ میں اس سے بھی شادی کروں اور نور سے بھی......"

"اب مجھے اس پر ترس آ رہا ہے۔"

"افسوس مجھے بھی ہوا تھا کہ کوئی عورت اس حد تک گر سکتی ہے۔"

"پھر تو نے کیا کہا......؟"

"وہی جو تو کہتا...... میں نے انکار کر دیا، میں نور کو نہیں چھوڑ سکتا راجا...... ست بدھائی کو چھوڑ سکتا ہوں اور جس طرح رابعہ مجھے خریدنا چاہتی تھی، اس قیمت پر میں نہیں بک سکتا تھا۔ بعد میں کیا اوقات ہوتی میری...... میں صرف رابعہ کا شوہر ہوتا...... ست بدھائی کا نواب نہیں...... اور جس رسواکن سمجھوتے کے تحت رابعہ مجھے شیئر کرنے پر تیار تھی، کیا نور مانتی؟ جو مرد ایک سے زیادہ بیویاں رکھے، وہ مجھے اس بکرے کی طرح لگتا ہے جو ریوڑ کی بکریوں کا مشترکہ شوہر ہوتا ہے یا وہ مرغا جو ڈربے کی تمام مرغیوں کو بیوی سمجھتا ہے، اس میں

محبت کہیں نہیں ہوتی...... میرے انکار کے بعد رابعہ آخری بازی بھی ہار گئی، مگر اس نے کہا کہ تم نے یہ آخری موقع بھی گنوا دیا...... شاید اسی لیے وہ کورٹ نہیں پہنچی اگر وہ بھی تمام دستاویزات پر دستخط کر دیتی تو پھر باقی کیا رہتا، زوہیب جیت جاتا وہ ہار جاتی۔“

”کیوں ہار جاتی...... وہ ست بدھائی کی مالک بن جاتی۔ پھر زوہیب کو انکار کر دیتی...... صاف بتا دیتی کہ چلو اپنا راستہ پکڑو، پاگل کے بچے، اپنی شکل دیکھی ہے۔ میں شادی کروں گی تم سے......“

میں نے کہا۔ ”شاید اس میں ہمت نہیں تھی بعد کے حالات سے نمٹنے کی...... پھر زوہیب اس کا دشمن ہو جاتا تو اس کی جان کو آ جاتا۔ وہ ہر طرف سے پھنس جاتی، ہم کیا اسے بخش دیتے۔“

”نہیں فیکے پتر...... وہ کورٹ پہنچ ہی نہیں سکتی تھی۔“

میں نے کہا۔ ”کیا مطلب......؟“

”مطلب صاف ہے، بے شک زوہیب نے اس کی طرف سے وہ سارے کام کر دیے جو رابعہ نہیں کر سکتی تھی لیکن ایک آخری کام خود اسی کو کرنا تھا، وہ تھا تیرے تحفے کو قبول کرنے کا...... گفٹ ڈیڈ پر تیرے سائن آدھی کارروائی تھی۔ باقی آدھی اس وقت مکمل ہوتی جب رابعہ بھی سائن کر دیتی کہ میں نے یہ گفٹ قبول کیا۔ آخری بار میری زوہیب سے بات ہوئی تو اس نے کہا کہ راجا صاحب...... میں نے جج سے بات کر لی ہے۔ وہ گفٹ ڈیڈ پر رفیق کے دستخط کرانے کے لیے خود میرے ساتھ جائے گا۔ ساتھ اس کا ریڈر بھی ہوگا۔“

میں نے کہا۔ ”رشوت سے ہر کام ہو جاتا ہے۔“

”زوہیب میرے سامنے بہت بول رہا تھا کہ متعلقہ جج کو ایمانداری کا مرض لاحق تھا۔ میں نے دس لاکھ تک آفر کیے مگر نہیں مانا...... اس بات پر اڑا رہا کہ نہ میں تمہارے ساتھ جا کے رفیق سے کاغذات پر دستخط کراؤں گا اور نہ ایسے دستخط قبول کروں گا جو جبر کے تحت حاصل کیے گئے ہوں...... الٹا اس نے زوہیب کو دھمکی دی کہ کارروائی آگے بڑھائی گئی تو وہ رپورٹ کر دے گا۔“

”پھر؟ زوہیب نے اسے مروا دیا یا اپنے راستے سے ہٹا دیا؟“

”اس نے جج کی بیوی سے رابطہ کیا...... ظاہر ہے معاشرے میں ہر طرف دولت حاصل کرنے کی دوڑ لگی ہوئی ہے۔ جائز ناجائز حرام حلال کا فرق مٹ گیا ہو تو اس دوڑ میں شریک نہ ہونے والے کی تعریف نہیں ہوتی کہ وہ ایماندار ہے اور یہ رزق حلال بھی دنیا و آخرت میں اس کی فلا[ح] کا سبب ہوگا...... نہیں...... ایسے شخص کو احمق بزدل اور غیر عملی [کہا] جاتا ہے...... اور ایسا سمجھنے والوں میں سب سے آگے ہے خود اس کی فیملی......“

”فیملی نہیں بیوی......“

”ہاں...... اکثر لوگ بیویوں کی لامحدود خواہشات، حرص اور ہوس کی وجہ سے رشوت لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں...... وہ اپنی تنخواہ تو بڑھا نہیں سکتے، بیوی کو چاہیے اچھے کپڑے، زیور، کوٹھی کار...... وہ سب کی برابری کرنا چاہتی ہے بلکہ سب کو نیچا دکھانا چاہتی ہے، خیر زوہیب نے دس لاکھ اس کی بیوی کو پہنچائے اور کہا کہ نقد رقم لیتے ہوئے اس کو شو[ہر] کا ڈر ہے تو اسے زیور...... یا کوئی پلاٹ دیا جا سکتا ہے جس پر اس کا گھر بن جائے تو وہ کرائے پر رہنے کی ذلت سے [بچ] جائے۔ اسے کار بھی پیش کی جا سکتی ہے، ایک جج کی بیوی رکشا میں سفر کرے تو بڑے شرم کی بات ہے...... یہ طریقہ کامیاب رہا۔“

میں نے بے یقینی سے کہا۔ ”وہ مان گئی......؟“

”اس نے موقعے سے پورا فائدہ اٹھایا۔ اس نے [کہا] کہ مجھے دونوں چیزیں چاہئیں، گاڑی بے شک چھوٹی ہو...... گھر بھی چھوٹا ہو...... یہ کم سے کم بھی بیس پچیس لاکھ کا نقصان تھا...... زوہیب چکر میں پڑ گیا لیکن جج کی بیوی نے گارنٹی دی کہ تمہارا کام کرانے کی ذمے داری میری...... اور شا[ید] زوہیب مان جاتا مگر اس نے باپ سے ذکر کیا تو اس نے [کہا] کہ پاگل کے بچے...... ایسے تو میری ساری دولت تیرے ہاتھ میں آنے سے پہلے ہی ختم ہو جائے گی...... بیس پچیس لاکھ میں وہ جج اپنی بیوی اور بیٹی کو تیرے پاس چھوڑ جاتا [یہ] بات تھی...... اب دیکھ میں کیا کرتا ہوں اور بڑے رانا نے صرف ایک فون کیا، راتوں رات جج کا ٹرانسفر ہو گیا اور اس کی جگہ لینے والا جج حکم کا غلام تھا...... زوہیب نے اپنی خوشی سے اسے پانچ لاکھ دیے تو وہ بڑا احسان مند ہوا اور وہ اپنی عدالت سمیت وہاں حاضر ہو گیا، تجھ سے دستخط کرانے...... زوہیب سے ایک بھول ہو گئی۔ ان دستاویزات پر رابعہ کے دستخط نہیں ہوئے۔ یہ کام وہ پہلے کرا سکتا تھا، مجھے شک ہے کہ خود رابعہ نے اسے ٹالا ہوگا کہ میرے دستخطوں کی فکر مت کرو...... میں تمہارے ساتھ ہوں، پہلے نواب کے دستخط کرا کے لاؤ...... شاید اسے یہ بھی خیال ہوگا کہ تو دستخط نہیں کرے گا...... مرد مجاہد...... سر کٹا سکتے ہیں لیکن سر جھکا نہیں سکتے......“

میں نے آہ بھری...... ”مرد مجاہد نہیں میں بزنس مین ہوں...... سودے میں اپنا نفع نقصان دیکھتا ہوں، زندگی کی محبت زیادہ ہے یا ست بدھائی کی؟“

”جب تو نے دستخط کر دیے اور تصدیق ہو گئی کہ یہ کارروائی عدالت میں بلا جبر و کراہ...... بقائمی ہوش و حواس مکمل کر لی گئی ہے تو رابعہ کی اصل آزمائش شروع ہوئی...... اس سے پہلے وہ اپنا آخری ترپ کا پتا بھی پھینک چکی تھی، انتہائی بے شرمی سے اس نے خود کو تیرے سامنے ڈال دیا تھا کہ زور سے محبت کی شادی ضرور کرو...... ضرورت کی شادی مجھ سے بھی کر لو تا کہ تمہیں بھی کچھ نہ گنوانا پڑے اور مجھے بھی سب مل جائے۔ تو نے انکار کر دیا تو اس کا کھیل ختم ہو گیا۔ اس ناکامی کے بعد اگر وہ خودکشی بھی کر لے تو مجھے حیرت نہیں ہوگی۔“

”کیوں...... وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہی۔“

”نہیں فیکے پتر...... یہ کامیابی خاک کامیابی ہے...... اگر وہ ان کاغذات پر اپنے دستخط کرنے کورٹ پہنچ جاتی تو کیا ہوتا......؟“

”کیا ہوتا......؟ وہ ست بدھائی کی مالک بن جاتی؟“

”ہاں...... اور اس کے بعد کیا ہوتا؟...... جب وہ زوہیب سے کہتی کہ تم سے شادی کروں گی میں؟ تم کیا سمجھتے ہو کہ میں پاگل ہوں؟...... میں تو تمہیں استعمال کر رہی تھی، میرا کام ہو گیا اب تم جا سکتے ہو۔ کیا رابعہ میں اتنی ہمت تھی کہ وہ زوہیب سے دشمنی مول لے سکے؟ اس تذلیل کے بعد کیا زوہیب اسے بخش دیتا؟ رابعہ کتنے دشمنوں سے نمٹتی؟ ایک طرف تو، دوسری طرف میں...... یعنی ہم سب جو ست بدھائی میں ساتھ ہیں، تیسری طرف رانا اینڈ کمپنی...... کیا وہ سب کا مقابلہ کر سکتی تھی؟ اور کیا اس میں اتنی صلاحیت ہے کہ وہ ست بدھائی کے سارے معاملات اسی طرح چلا سکے جیسے وہ آج چل رہے ہیں، نہیں فیکے پتر...... وہ خود بھی جانتی ہوگی کہ یہ اس کے بس کی بات نہیں...... بس وہ چاہتی تھی کہ اسے اپنے پرانے خواب کی تعبیر مل جائے، تو اس کے ساتھ ہو...... وہ بھی ست بدھائی کی مالک کہلائے، سب کچھ ویسا ہی رہے جیسا آج ہے۔ ہاں تو مان جائے تو یہ رعایت بھی دی جا سکتی ہے کہ زور کو مجبوراً قبول کر لیا جائے...... یہ سب اس نے سوچا تھا جو نہیں ہوا۔“

”یعنی وہ خود جانتے بوجھتے عدالت نہیں گئی......؟“

”بالکل ایسا ہی ہوا ہوگا فیکے پتر...... اس کا پلان ریت کی دیوار کی طرح گر گیا اور ملبا خود رابعہ پر گرا......“

میں نے کہا۔ ”پھر وہ کہاں گئی راجا......؟“

”مجھے کیا معلوم...... لیکن اس ذلت، شکست اور پسپائی کے نتیجے میں رابعہ نے خودکشی نہیں کی ہوگی تو وہ روپوش رہے گی......“

”لیکن کہاں...... اور کب تک راجا؟“

”میں کوئی غیب کا حال نہیں جانتا...... یہ محض میرا اندازہ ہے، کوئی نجومی والی پیش گوئی نہیں ہے......“ راجا چڑ کے بولا۔

”یہ بہت اچھا ہوگا اگر وہ خودکشی کر لے...... اس کے حق میں بھی اور ہمارے حق میں بھی...... ورنہ......“

”ورنہ کیا؟“

”پتا نہیں...... میں اسے معاف کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ میں اسے ختم بھی نہیں کر سکتا حالانکہ سانپ بچھو کو اور جانی دشمن کو پھر حملہ کرنے کے لیے زندہ چھوڑنے کا خطرہ کوئی مول نہیں لیتا۔“

”سیاست کا اصول تو یہی ہے فیکے پتر...... جس سے بھی خطرہ ہو اسے مت چھوڑو...... اورنگ زیب نے بھی یہی کیا اور ہمارے بعض حکمران نے بھی......“

”رابعہ سے میری اقتدار کی جنگ نہیں تھی......“

”لیکن اس نے دہرے اقتدار کی جنگ بنا لی۔ اقتدار ست بدھائی پر...... اختیار تجھ پر...... اس پر ترس کھانے کی ضرورت نہیں کیونکہ جو خواہش اس کی فطرت میں ہے وہ بدل نہیں سکتی۔ ختم نہیں ہو سکتی...... رابعہ پیچھے نہیں ہٹ سکتی۔ قناعت اختیار نہیں کر سکتی اور یہ نہیں سمجھ سکتی کہ جو اس کے مقدر میں نہیں ہے، وہ سازشوں سے حاصل نہیں کر سکتی۔“

”آخر وہ کہاں جائے گی راجا، میرے سوا اس کا دنیا میں کوئی بھی نہیں...... وہ آ جائے میرے سامنے...... ہاتھ جوڑ کے معافی مانگے، میرے پیر پکڑ لے تو میں کیا کروں گا۔ وہ زمانہ تو ہے نہیں کہ میں اسے قید میں ڈال دوں یا اس کی کھال کھنچوا دوں...... میں تو اس کے خلاف کسی عدالت میں بھی نہیں جا سکتا...... یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ اسے دھکے دے کر باہر نکال دو۔“

راجا بگڑ گیا...... ”بس تو پھر وہی کرنا جو رابعہ چاہتی ہے...... دماغ خراب ہے تیرا، ابھی سے اس کے لیے پریشان ہے، یہ نہیں سوچتا کہ اس نے تیرے ساتھ کیا سلوک کیا...... تیرے دشمنوں کے ساتھ مل کر۔ ذرا حالت دیکھ اپنی، کوئی کہہ سکتا ہے کہ تو وہی رفیق ہے جو دو مہینے پہلے تھا، خدا کا شکر ادا نہیں کرتا کہ زندہ سلامت لوٹ آیا۔“

میں خاموش رہا، راجا کی ناراضی برحق تھی اور یہ اس کا خلوص تھا جو غصے میں ڈھل گیا تھا۔ راجا باہر دیکھتا رہا۔ باہر اندھیری رات تھی، غنی نے گاڑی کی رفتار کہیں بھی سو سے کم نہیں ہونے دی تھی۔ دوسری گاڑی جس میں سیکیورٹی گارڈز تھے عین ہمارے پیچھے آرہی تھی اور میرا اندازہ تھا کہ ہم تین اور چار کے درمیان ست بدھائی میں ہوں گے لیکن گاڑیاں جی ٹی روڈ پر رفتار کم کیے بغیر دینہ سے آگے نکل گئیں تو میں نے کہا۔ ''ہم کہاں جارہے ہیں راجا......؟''

راجا نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''آئی ایم سوری فیکے پتر...... تجھے اندازہ نہیں کہ یہ وقت میں نے کتنی ٹینشن میں گزارا ہے، ایک شہناز تھی جو مجھے سنبھالتی تھی۔ یہ احساس دلاتی تھی کہ دیکھو تم کو کچھ نہیں ہونا چاہیے کیونکہ تمہیں ہی سب کچھ کرنا ہے...... ابھی تک میں شاک کی کیفیت میں ہوں...... اگر میرے اختیار میں ہوتا تو تیرے ساتھ میں بھی اسپتال میں داخل ہوجاتا لیکن ابھی مجھے بہت سے کام ہیں۔ ایک میں ہی کیا......ہم سب بڑی آزمائش سے گزرے ہیں۔ جن کو حقیقت کا علم تھا۔ یہاں شہناز کے علاوہ یہ غنی تھا۔ ہم سب کے لیے دہرا عذاب تھا۔ پھر بھی یہاں ہم ایک دوسرے کے ساتھ تھے۔ صرف نور اکیلی تھی جس کے ساتھ کوئی نہیں تھا اور اس کی ذمے داریاں سب سے بڑھ کر تھیں۔ میں اس کی جتنی بھی تعریف کروں کم ہے۔ اس نے کسی کو معلوم نہیں ہونے دیا کہ کمپنی کے چیئرمین صاحب کو اغوا کرلیا گیا ہے اور وہ لاپتا ہیں......شروع میں تو بس اتنا ہی تھا کہ نواب رفیق لندن سے تو روانہ ہوئے مگر پاکستان نہیں پہنچے...... یہ بات ناقابل فہم تھی۔ آدمی جہاز میں سے کہاں گیا؟......جن بھوت تو تھا نہیں کہ غائب ہوگیا، پھر تیرے کراچی پہنچنے کی تصدیق ہوئی اور معاملہ مزید الجھ گیا، مسافر پورے تھے، فہرست میں نواب رفیق احمد شیرازی کا نام تھا جن کو بورڈنگ کارڈ جاری کیا گیا تھا۔ وہ جہاز سے اتر کر کدھر نکل گئے؟ اے ایس ایف اور پولیس کی تفتیش نے ایئرلائن کو بری الذمہ کردیا کہ نواب رفیق کو لندن سے کراچی پہنچانا ان کی ذمے داری تھی اب وہ کہاں ہیں؟ یہ سراغ لگانا مقامی پولیس اور تفتیشی اداروں کا کام ہے۔ ثابت یہ ہوا کہ تجھے کسی نے یہاں اغوا کیا مگر تفتیش میں سب سے بڑا سوال یہی تھا کہ کیسے؟......نہ کسی نے اغوا ہوتے دیکھا نہ یہ ممکن ہے کہ کوئی اندر جاکے ایسی مجرمانہ کارروائی کرسکے۔ ایئرپورٹ انتظامیہ تو کسی قسم کی ذمے داری لیتی ہی نہیں تھی۔ ان کا رویہ ایسا ہوتا تھا جیسے ہمارا موقف غلط ہے۔ نہ کوئی اغوا ہوا نہ غائب ہوا، ہم محض الزام تراشی کررہے ہیں۔ جب بالآخر لندن جاکے میں نے پتا لیا کہ تو نے سفر کے لیے بورڈنگ کارڈ ضرور لیا تھا مگر اس کے بعد پہلے تیری تمام سفری دستاویزات چوری ہوئیں۔ پولیس نے چوری کی تصدیق کی، پھر تجھے بڑے اہتمام سے اغوا کیا گیا، چوری کی رپورٹ درج کرانے والے مسافر کی طبیعت اچانک خراب ہوئی اور اسے ایک ایمبولینس لے گئی۔ آگے ایک بند راستہ تھا...... DEAD END ......وہ ایمبولینس کہیں نہیں پہنچی...... بالآخر یہ ثابت ہوگیا کہ تجھے بڑی ہوشیاری سے اغوا کیا گیا اور تیری جگہ کسی اور نے سفر کیا، عملے کی مدد سے کراچی میں اترا اور نہ جانے کدھر سے نکل گیا۔ اس وقت تک رابعہ ہمارے ساتھ ساتھ رہی، جتنے پریشان ہم تھے اتنی ہی پریشان وہ تھی اور بلاشبہ اس نے اچھی اداکاری کی، ہمیں پتا نہیں چلنے دیا کہ اس ڈرامے کی پیشکش میں وہ بھی شامل ہے۔ اس کا ڈائریکٹر زوہیب حسن تھا لیکن اسکرپٹ کا بنیادی خیال رابعہ نے ہی دیا تھا۔ وہ ہم سب کی طرح پریشان بھی نظر آئی اور کہیں گئی بھی نہیں، ساری گفتگو اس کے سامنے ہوتی رہی اور وہ آگے پہنچاتی رہی۔ کسی کے خواب و خیال میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ وہی اصل کرتا دھرتا ہے، یہ تو اس نے مجھے بالکل آخر میں بتایا......ابھی بیس دن پہلے......''

''اس سے پہلے تجھے کوئی شک نہیں تھا کہ......'' میں نے پھر پوچھا۔

وہ بولا۔ ''یار شک کیسے ہوتا اور کیوں ہوتا......وہ ہم میں سے تھی، ہمارے ساتھ تھی، کسی کو اس کی صورت سے اندازہ نہیں ہوسکتا تھا کہ اس کے دل میں کیا ہے اور اس کا دماغ کیسی خطرناک سازش میں شریک ہے، یہ سب کمال ہے موبائل فون کا......روز رات کو وہ زوہیب سے بات کرتی ہوگی، فون پر ہی سارے راز و نیاز ہوئے، دونوں ایک دوسرے کو پوری طرح بے وقوف بناتے رہے......ایکسپلائٹ کرتے رہے......رابعہ نے زوہیب کو اپنا آلۂ کار بنایا اور ایک بار اس بے وقوف عورت کی کمزوری زوہیب کے ہاتھ آگئی تو اس نے پورا فائدہ اٹھایا۔ تو خود سوچ کہ گھر کا کوئی فرد ہی ڈاکوؤں سے مل جائے تو پہرے دار کیا کرے۔ محبت کا جال وہ پہلے ہی پھینک چکا تھا، رابعہ نے کہا کہ مجھے میرا حق دلا دو تو میں تمہاری اور میرے ساتھ یہ ریاست بھی...... زوہیب کی تو عید ہوگئی......اس کے نام تو ایک ساتھ تین لاٹریاں نکل آئیں......اس کا سب سے خطرناک اور طاقتور دشمن ختم، اس کی ریاست اور ساری دولت اپنے قبضے میں، اس خاندان کی عزت کی نشانی ایک عورت اپنی، تو سب اپنا......ساری

پلاننگ اس نے کی...... سارے وسائل اس کے تھے، دوڑ دھوپ اس نے کی......رابعہ اسے اندر کی ساری خبریں پہنچاتی رہی، روز کی باتیں روز سناتی رہی...... یہ اغوا برائے تاوان کی واردات بنادی گئی، وہ سب جو صدق دل سے تیری سلامتی اور بحفاظت واپسی چاہتے تھے انہوں نے ایک ہی بات کہی کہ اغوا کرنے والے جو بھی مانگیں دے دو، خاموشی سے...... رفیق کی جان سے بڑھ کر کچھ نہیں...... یہ کون اندازہ کرسکتا تھا کہ تاوان میں وہ کیا مانگنے کا ارادہ رکھتے ہیں، پچاس کروڑ مانگے تو میں نے بھی اسے تیری جان کا صدقہ سمجھا، جہاں انہوں نے کہا میں گیا۔ کسی کو کچھ بھی نہیں بتایا۔ ان کے بردے کو ٹھیس پہنچانا تیری جان سے کھیلنے کے مترادف ہوتا، جب انہیں مجھ پر اعتبار آگیا تو وہ مجھے اٹھا کے لے گئے اور اپنا مطالبہ پیش کردیا۔''

''تو نے بڑا خطرہ مول لیا میری خاطر......''

''اور کون کرتا یہ کام......؟ لیکن یہ حقیقت ہے کہ شہناز بھی تیار تھی اور نور بھی...... مجھے کتنا افسوس ہوتا ہے اپنی عقل پر......آخر ہم سب کو کیا ہوگیا تھا، ہم رابعہ کے دھوکے میں کیسے آگئے...... کسی کو اس پر شک کیوں نہیں ہوا، دراصل کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایسا ہوسکتا ہے، ہم تین افراد تھے......غنی سمیت چار، کون کس پر شک کرتا؟ میں شہناز پر یا شہناز مجھ پر......جب ایک روز مجھے اٹھالیا گیا اور زوہیب کے سامنے پیش کیا گیا تو وہاں اس کے ساتھ رابعہ کو دیکھ کر مجھ پر تو جیسے بم گر پڑا......خود کو یقین دلانا مشکل ہوگیا کہ میں جو کچھ دیکھ رہا ہوں وہ حقیقت ہے، لیکن فیکے پتر...... انہوں نے اتنا ڈرا دیا مجھے کہ میں نے آنکھیں بند کرکے ان کے ہر حکم کی تعمیل کی، میں ذرا جذباتی ہوجاتا، یا ان کو بلاوجہ کا شک بھی محسوس ہوتا تو خمیازہ مجھے بھگتنا پڑتا، میں تجھے بچانے کے لیے ان کے ساتھ پورا تعاون کرتا رہا...... اور اس آخری مرحلے میں کوئی بھی میرے ساتھ نہیں تھا، نہ شہناز نہ غنی...... میں نے کسی کو بھی پتا نہیں چلنے دیا کہ وہ رابعہ ہی ہے جس نے پیٹھ میں خنجر گھونپا ہے اور ہمارے درمیان کیسی معصوم بنی بیٹھی ہے، وہ بھی ہر لمحہ دیکھ رہی تھی کہ میں کیا کرتا ہوں، ڈر کے مارے میں نے غنی کو یا شہناز کو کچھ نہیں بتایا تھا......کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے رویے سے رابعہ کو شک ہوجائے یا ان کے منہ سے کوئی غلط بات نکل جائے، میں نے ہر پہلو سے غور کیا کہ مجھے کچھ کرنا چاہیے لیکن تیرے خلاف سازش اتنی مکمل تھی کہ مجھے کہیں سے بھی اس کو ناکام بنانے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔''

''رابعہ بھی زوہیب سے ملنے تو جاتی ہوگی؟''

''ہاں......ضرور جاتی ہوگی لیکن نہ میں نے اس کا پیچھا کیا نہ کسی کو اس کے پیچھے لگایا تاکہ وہ بے خوف رہے اور اسے کوئی شک نہ ہو......راز کو راز رکھنے کے چکر میں میرا نروس بریک ڈاؤن ہوگیا، میں دہرے عذاب میں مبتلا تھا، مجھے شہناز کو بھی دھوکا دینا پڑا، اس کے سامنے میں نہ خوف کا اظہار کرسکتا تھا اور نہ بے اطمینانی کا...... وہ بھی بے وقوف نہیں ہے، نہ عام عورت ہے اور نہ نادان بچی، وہ ڈاکٹر ہے......اس نے کئی بار کہا، رابعہ کے سامنے بھی کہا...... کہ تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو اور میں نے قسم کھائی کہ ایسی کوئی بات نہیں، ایک بار اس پر برس پڑا کہ کیوں خوامخواہ شک کرکے مجھے پریشان کرتی ہو...... میں ظاہر کرتا تھا کہ سب ٹھیک ہے، ٹھیک کچھ بھی نہیں تھا، میں چوری چھپے نیند کی گولیاں خرید کے لایا، اس کے باوجود مجھے رات کو سونا مشکل ہوگیا تھا، میری عقل، چالاکی، بہادری اور ذہانت، میرے تعلقات، سب دھرے رہ گئے۔ میں نے لندن سے ملک ارشد کو بلالیا اور اس کو سارا معاملہ سمجھا دیا۔ وہ بہت ذہین اور سمجھدار ہے، اس نے مجھ سے اتفاق کیا کہ شکنجہ بہت مضبوط ہے۔ رفیق کے لیے دستخط کردینے کے سوا چارہ نہیں، وہ ست بدھائی کو بھول جائے، یہ نہ سوچے کہ بعد میں رابعہ کے ساتھ کیا ہوگا، بس اپنا لندن کا بزنس سنبھالے اور نور کے ساتھ خوش رہے۔''

''میرا خیال تھا کہ اس نے لندن پولیس سے رابطہ کیا تو وہ ایک برطانوی شہری کو بچانے کے لیے کوئی ایکشن پلان ضرور دیں گے۔''

''ملک ارشد ایسا تب کرتا جب میں نے اسے کچھ بتایا ہوتا، میں نے تو اسے بلالیا کہ نواب رفیق کو تم سے کوئی کام ہے۔''

''اس کے پاس یہاں پریکٹس کرنے کا لائسنس تھا؟''

''ہاں......لندن سے وکیل طلب کرنے پر سب سے پہلے فاروق نے بھی اعتراض کیا تھا، میں نے کہا کہ اب یہاں کسی پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔ اس نے کہا کہ چلو پاکستان چھوڑ کے ولایتی وکیل کی خدمات حاصل کرلو۔ وہ کون سی توپ چلا لے گا اور اس میں کوئی شک بھی نہیں فیکے پتر کہ توپ کوئی نہیں چلا سکتا تھا، جو کچھ ہم نے کیا لاحاصل تھا۔ ہم تجھے بچا نہیں سکتے تھے، تجھے بچایا اسی ہاتھ نے جو مارنے والے ہاتھ سے زیادہ طاقتور ہے......رابعہ بھی مطمئن تھی اور زوہیب بھی سمجھ رہا تھا کہ کام ہوگیا۔ اب تیری ضرورت ہی کیا ہے۔ وہ تجھے اس ویران ڈاک بنگلے کے تہ خانے میں مرنے کے لیے چھوڑ آئے تھے اور ان دونوں محافظوں کو بھی جو وہاں ہونے والی ساری کارروائی کے چشم دید گواہ تھے۔ ان میں سے ایک نے

تیری مدد نہ کی ہوتی تو کچھ بھی نہ ہوتا۔"

''وہ خود مر گیا، لیکن اس نے مرتے مرتے ایک نیکی کے خیال سے مجھے رہائی دلا دی۔''

''اور یہ جو ست بدھائی کی ریاست اور جاگیر تیرے ہاتھ سے نہیں گئی، اس میں بھی نہ میرا کمال ہے نہ کسی اور کا...... رابعہ چاہتی تو پہلے ہی دستخط کر دیتی...... یا بعد میں عدالت میں پہنچ کے کارروائی مکمل کر سکتی تھی، بس وہ ڈر گئی یا اس نے اپنی شکست تسلیم کر لی، کوئی بات ایسی ہوئی ضرور تھی جس کا مجھے بھی صحیح اندازہ نہیں...... وہ خود ہی بتا سکتی ہے کہ اس نے ایسا کیوں کیا۔ آخری وقت میں اس نے اپنا ارادہ کیوں بدلا، جب وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکی تھی۔ میں خود بھی کورٹ میں موجود تھا اور معاملہ ایسا تھا کہ دوپہر کے بعد صرف ایک ہی کیس رکھا گیا تھا۔ فاروقی بار بار رابعہ کو فون کرتا تھا، میں اس کی بے چینی اور جھنجلاہٹ دیکھ رہا تھا۔ اسے رابعہ سے کوئی جواب موصول نہیں ہو رہا تھا۔ ملک ارشد میرے ساتھ تھا۔ اس نے کہا کہ فاروقی صاحب تو ایسے بے قرار ہیں جیسے ست بدھائی کی ملکیت ان کو ملنے والی ہے۔ زوہیب وہاں کچھ دیر سے پہنچا تھا۔ وہ فاروقی سے مشورہ کرتا رہا، ظاہر ہے سب سے زیادہ وہی پریشان تھا۔''

''آخر وہ گئی کہاں......؟''

''خدا معلوم...... اس کے فون سے کسی کو بھی جواب موصول نہیں ہو رہا تھا۔ اس رات میں نے ایک عقل مندی کی...... پتا نہیں کیوں مجھے یہ خیال آیا کہ ملک ارشد کو عدالت سے روانہ کر دوں۔''

''کہاں روانہ کر دوں؟......''

''کہیں بھی...... میں نے اس کے کان میں کہا کہ وہ نکل جائے، کہیں بھی چلا جائے۔ اپنی گاڑی میں جا بیٹھے اور جب تک میں فون کر کے نہ بلاؤں ادھر نہ آئے۔''

''لیکن کیوں...... ایسی کیا بات تھی؟'' میں نے کہا۔

راجا بولا ''مگر یار...... اس وقت یہ خیال بھی احمقانہ لگ رہا تھا لیکن اب میں سوچتا ہوں تو بڑی عقل کی بات لگتی ہے، کورٹ روم میں جج بھی زوہیب کا زرخرید تھا' ریڈر بھی...... سب رشوت کھا کے بیٹھے تھے اور حکم کے غلام بنے ہوئے تھے، انہیں وہاں اسی مقصد کے لیے لایا گیا تھا...... باقی سب کیس غیر اہم ہو گئے تھے۔ ریڈر نے سب کو تاریخ دے کر رخصت کر دیا تھا۔ وہاں گنے چنے لوگ رہ گئے تھے۔ میں اور زوہیب...... ملک ارشد اور فاروقی، جج اور اس کا ریڈر، کلرک اور دو گواہ...... دونوں جونیئر وکیل تھے۔ رابعہ کے نہ آنے سے سب کو پریشانی لاحق ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ تمہارا کاغذات تیرے وکیل ملک ارشد کے پاس ہیں۔ گفٹ کرنے والا تو تھا...... پہلے تو نے دستخط کیے تھے، ایسا نہ ہو کہ یہ عاصم غنڈے اور غلام ایک رائے ہو کے ملک ارشد سے کاغذات چھین لیں۔''

میں بھونچکا رہ گیا۔ ''بڑے دور کی سوجھی تجھے راجا......''

''بس فیکے پتر...... اس وقت جو بڑے دور کی بات لگی تھی کہ ایسا بھلا کیسے ہو سکتا ہے...... اب عین ممکن نظر آتا ہے انہوں نے تجھ سے قید میں کہاں دستخط کرائے تھے لیکن قانونی پوزیشن اس کے برعکس تھی...... عدالتی عملہ تیرے پاس نہیں گیا تو عدالت میں حاضر ہوا اور دستخط بھی عدالت میں سب کے سامنے کیے۔ یہ لوگ ملک ارشد سے کاغذات چھین لیتے...... عدالت میں غالب اکثریت انہی کی تھی، وہ دروازے بند کر دیتے اور گن پوائنٹ پر ملک ارشد سے کہتے کہ گفٹ ڈیڈ کے پیپرز ہمارے حوالے کرو...... تو وہ کیسے انکار کرتا، اصل مشکل تھی تیرے دستخط حاصل کرنا.... رابعہ سے وہ بعد میں بھی دستخط کرا سکتے تھے۔ شام تک یا رات تک...... یا پھر اگلے دن۔''

میں نے کہا۔ ''صرف یہی نہیں، اس کے دستخط بنا لیے جاتے۔ کورٹس میں ہر قسم کی جعلسازی کے ماہرین دستیاب ہوتے ہیں جو صرف دستخط کیا ہینڈ رائٹنگ تک بنا لیتے ہیں۔''

''اگر ایسا ہو جاتا تو ڈیل مکمل سمجھی جاتی، قانونی طور پر، پھر نہ تیرے کرنے کے لیے کچھ رہتا نہ کسی عدالت کے اختیار میں...... ملک ارشد واقعی ذہین ہے، وہ سمجھ گیا۔ باتھ روم جانے کا بہانہ کر کے گیا اور غائب ہو گیا۔ اپنی گاڑی میں جا بیٹھا، جیسے جیسے وقت گزرا سب کی پریشانی میں اضافہ ہوتا گیا۔ میں نے غصے میں زوہیب حسن کو گالیاں بکتے سنا...... وہ فاروقی پر گرم ہو رہا تھا کہ وہ تمہاری موکل ہے۔ اسے عدالت میں وقت پر پیش کرنا تمہاری ذمے داری تھی۔ فاروقی کیا کم حرامی ہے، اس نے کہا کہ رانا صاحب...... میں کیا اسے اپنی گود میں اٹھا کے لاتا۔ خدانخواستہ میرا کوئی موکل یہاں آنے ہوئے کسی حادثے کا شکار ہو جائے تو کیا میرا قصور ہے...... اور خدانخواستہ حادثے میں وہ مارا جائے تو کیا میں اسے عالم بالا سے واپس لاؤں؟''

''زوہیب کو فکر ہو گئی کہ کہیں مجھ سے مل کے رابعہ کا ارادہ متزلزل نہ ہو جائے...... ویسے بھی عورت کے موڈ کا کیا بھروسا کب بدل جائے۔''

راجا ہنسا۔ ''عدالت کا وقت ختم ہونے لگا تو خود جج صاحب نے فاروقی سے کہا کہ وکیل صاحب کہاں ہے آپ کا موکل...... ہم کب تک ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہیں، فاروقی نے تڑ سے جواب دیا کہ آپ کون سے خالی ہاتھ بیٹھے ہیں۔ تھوڑی دیر انتظار کر لیں، وقت کی بڑی قیمت ہوتی ہے...... یہ جج صاحب پر رشوت لینے کا کھلا الزام تھا مگر اس نے یہ ذلت برداشت کر لی۔ میں قریب ہی کھڑا تھا، میں نے کہا کہ آج عدالت کا وقت ختم ہو جانے کے بعد کوئی کارروائی نہیں ہو سکتی۔ جج مجھ پر غصہ نکالنے لگا کہ آپ وکیل نہیں صحافی ہیں۔ آپ کو عدالت میں کسی کی طرف سے بولنے کا حق نہیں...... میں نے کہا کہ مجھے عدالت کی کارروائی رپورٹ کرنے کی آزادی تو ہے، اس پر زوہیب میرے پاس آ گیا اور کہنے لگا کہ راجا صاحب...... آپ کا کیا خیال ہے رابعہ کیوں نہیں آئی ابھی تک...... میں نے اسے پریشان کرنے کے لیے کہا کہ ہو سکتا ہے رابعہ نے اپنا ارادہ بدل دیا ہو، زوہیب کا رنگ اڑ گیا...... وہ کہنے لگا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے، میں نے کہا کہ دنیا میں کیا نہیں ہو سکتا...... نواب رفیق احمد شیرازی کے بارے میں تو شک کی کوئی گنجائش بھی نہیں...... وہ ریاست اپنی بہن کو تحفے میں دینا چاہتے تھے۔ انہوں نے بلا تامل گفٹ ڈیڈ پر دستخط کر دیے۔ اب ہو سکتا ہے کہ رابعہ کو کسی نے سمجھایا ہو یا خود اسے احساس ہوا ہو کہ ریاست کے معاملات کو صرف نواب رفیق ہی خوش اسلوبی سے نبھا سکتے ہیں اور اس نے محسوس کیا ہو کہ ست بدھائی صرف ایک جاگیر نہیں۔ وہاں ایک ترقیاتی منصوبہ بھی مکمل ہو رہا ہے۔ اسکول ہے، اسپتال ہے، ان سب کا انتظام وہ کیسے سنبھال سکے گی، مت پوچھ فیکے پتر کہ میری بات کا زوہیب پر کیا اثر ہوا۔

''کہنے لگا کہ ایسا نہیں ہو سکتا، میں نے اسے مزید پریشان کیا کہ رانا صاحب کوئی کسی کو زبردستی گفٹ نہیں دے سکتا۔ گفٹ لینے والا انکار بھی کر سکتا ہے...... اس دوران مجھے دو بار ملک ارشد کی کال موصول ہوئی، اس نے صرف یہ پوچھا تھا کہ کیا مجھے آنا چاہیے اور میں نے کہا کہ نہیں...... تیسری مرتبہ، اس نے پوچھا کہ کیا مجھے اب جانا چاہیے تو میں نے پھر ایک لفظ کا جواب دیا کہ ہاں...... آدھا گھنٹا اوپر ہو گیا، میں زوہیب کو پریشان کر رہا تھا کہ ایسی عورت پر آپ بھروسا مت کریں...... وہ عین وقت پر آپ کو بھی دھوکا دے سکتی ہے، اگر اس نے عین نکاح کے وقت قاضی کے سامنے آپ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تو سوچیے آپ کی کتنی بے عزتی ہو گی، دراصل رابعہ کے نہ آنے سے میں بہت پرامید تھا...... اور خوش بھی۔

پھر زوہیب نے فاروقی سے مشورہ کیا اور اس نے جج سے بات کی...... جج نے پوچھا۔

''ملک صاحب کہاں ہیں...... میں نے جواب دیا کہ نہ میرا یہاں کوئی کیس ہے اور نہ میرا کوئی وکیل ہے، میں تو ایک صحافی ہوں۔ ریڈر نے بتایا کہ وہ باتھ روم گئے تھے، تب تک کورٹس خالی ہو چکی تھیں۔ فاروقی اور زوہیب نے بھی ملک ارشد کو تلاش کیا، پھر مجھے یقین آنے لگا کہ ملک ارشد ہوتا تو اس سے گفٹ ڈیڈ کے پیپرز چھین لیے جاتے اور خود جج صاحب اس کے دستخط کر کے اپنی مہر لگا دیتے کہ کارروائی مکمل...... لیکن نہ رابعہ آئی اور نہ ملک ارشد ملا تو کارروائی ملتوی ہو گئی، زوہیب سخت مشتعل اور مایوس لوٹ گیا...... مگر وہ دن اور آج کا دن...... رابعہ غائب ہے......''

''اور ملک ارشد......؟''

''اسے میں نے روپوش رکھا ہے، مشہور یہ کیا ہے کہ وہ کب تک انتظار کرتا، واپس لندن چلا گیا۔''

''تو نے رابعہ کے غائب ہو جانے کی رپورٹ نہیں لکھوائی؟''

''رپورٹ میں کیوں لکھواؤں فیکے پتر...... میں اس کا ماما لگتا ہوں...... اور وہ عاقل بالغ ہے، جہاں چاہے جائے...... جہنم میں جائے۔''

''گمشدگی کی رپورٹ لواحقین لکھواتے ہیں۔''

''لواحقین ہیں آپ نواب صاحب...... اور آپ خود ابھی گمشدہ ہیں۔ خود آپ کے اغوا کی رپورٹیں یہاں اور لندن میں لکھوائی گئی تھیں۔''

غنی سارا راستہ نہیں بولا تھا۔ اس کی ساری توجہ صرف ڈرائیونگ پر تھی اور شاید اس نے بلاوجہ دخل اندازی کو بھی مناسب نہیں سمجھا۔ دوسری گاڑی بیس فٹ پیچھے سائے کی طرح ساتھ رہی۔ صبح کے تین بجے دونوں گاڑیاں آگے پیچھے ایک اسپتال کے گیٹ سے اندر داخل ہوئیں۔ یہ اسلام آباد کا ایک مشہور اسپتال تھا جہاں راجا نے میرے چیک اپ اور قیام کا سارا انتظام کر رکھا تھا۔ اوپر کی منزل میں ایک ونگ کے آخری تین کمرے میرے لیے بک تھے۔ ان میں سے ایک میں فرضی نام سے کوئی مریض داخل دکھایا گیا تھا لیکن درحقیقت اس میں میرے سیکورٹی گارڈز تھے...... دوسری طرف بھی کچھ ایسا ہی انتظام تھا لیکن اس کمرے میں راجا اور غنی خود موجود تھے اور بندوبست ایسا تھا کہ اسپتال کے عملے کے سوا کوئی بھی براہ راست مجھ تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

راجا کا اعتراض سو فیصد حقیقت پر نہیں تھا۔ اسپتال میں جب لباس بدل کے میں بستر پر لیٹ گیا اور باہر ڈاکٹرز کی ایک ٹیم نے جسے خاص طور پر بلایا گیا تھا میرا تفصیلی معائنہ شروع کیا تو میں یہی سوچ رہا تھا کہ آخر یہ سب کیسے ہوا، مجھے

کسی نے نہیں بچایا تھا۔ نہ کسی کی کوشش نے نہ کسی کی مدد نے ...... نہ میری عقل نے نہ راجا کی ہوشیاری نے ...... وہ بڑا توپ صحافی تھا، آئی جی عبداللہ جان مجھ پر بڑے مہربان تھے، لیکن عملاً کوئی بھی کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ میں زندہ ہوں تو صرف اس لیے کہ خدا کو ایسا ہی منظور تھا اور خدا نے مجھے جتنی زندگی عطا کی تھی کوئی فانی انسان اس میں نہ ایک سانس کی کمی کرسکتا تھا نہ مجھے ایک سانس کی اضافی مہلت دے سکتا تھا اور وہی ہے جو عزت دیتا ہے یا ذلت ...... چنانچہ یہ بھی ہوا کہ رابعہ جو مجھ سے سب کچھ چھین لینا چاہتی تھی اور میری تقدیر کو اپنی تقدیر کا حصہ بنانے پر کمربستہ تھی کچھ بھی نہ کرسکی ...... جو اس نے سوچا تھا ...... یا چاہا تھا ...... آج سب کچھ وہی ہے اور ویسا ہی ہے جیسا دو مہینے دس دن پہلے تھا، جب میرے خلاف سازش کرنے والے بدخواہوں نے اتحاد کرلیا تھا اور پہلے لندن سے پاکستان کے راستے میں ایسے غائب کردیا تھا کہ کسی کو میرا سراغ ہی نہ ملے ...... میرے مولا کی مرضی کچھ اور تھی، اس لیے پہلے ہی ایک ایسے بندے کو مامور کردیا تھا کہ مرنے سے پہلے وہ زندگی کی آخری سانسوں میں ایک نیکی کمالے جو اس کی بخشش کا سبب بھی ہوسکتی ہے، اس بندے نے مجھے اپنی جان پر کھیل کے قید سے رہائی فراہم کی اور پھر خود مرگیا۔ حالانکہ وہ میرا دشمن تھا کیونکہ وہ ان کے حکم کا غلام تھا۔

ایک ڈاکٹر نے کہا۔ ''نواب رفیق ...... آپ کوئی نشہ کرتے ہیں؟''

میں چونکا۔ ''نہیں ...... میرا مطلب ہے پہلے کرتا تھا، اب نہیں کرتا۔''

''بظاہر آپ کو مسئلہ کوئی نہیں ...... آپ کم خوراکی سے زیادہ Malnutrition کی کمزوری میں مبتلا ہیں، کچھ روز آرام کریں اور اس کے بعد اپنی ڈائٹ پر توجہ دیں، سب ٹھیک ہوجائے گا۔''

دوسرے ڈاکٹر نے کہا۔ ''آپ کے کچھ ٹیسٹ ہم صبح لیں گے۔''

انہوں نے مجھے ایک انجکشن لگایا جو مجھے یقین تھا کہ محض خواب آور ہوگا، پھر وہ چلے گئے۔ راجا اندر آیا اس نے مجھ سے کہا۔ ''فی الحال سب کچھ بھول کے سوجا ...... تو یہاں بالکل محفوظ ہے، کسی کو یہاں آنے کی اجازت نہیں اور نہ معلوم ہے کہ تو یہاں ہے۔''

''راجا ...... تو بھی آرام کرلے ......''

''میں ساتھ والے کمرے میں ہوں، فکر مت کرنا۔''

''تو نے نور کو بتایا ...... اور شہناز کو ......''

''ابھی نہیں ...... سب سے پہلے میں بتاؤں گا پولیس کو ...... کہ بندہ مل گیا ہے، پھر سب کو معلوم ہوجائے گا، جلدی کوئی نہیں ......''

اس کی بات سنتے سنتے میں سوگیا، یہ بےخبری کا نیا دور تھا جس میں سکون تھا اور عافیت تھی۔ میری خبرگیری کرنے والے اور ہمدرد میرے ساتھ تھے، مجھے قوت بخش دوا اور خوراک دی جارہی تھی لیکن کسی کو بھی مجھ سے ملنے کی اجازت نہ تھی۔ راجا کا پہرا بہت سخت تھا، میرے ہر سوال کے جواب میں وہ ایک ہی بات کہتا تھا۔ ''ابھی نہیں فیکے پتر ...... دنیا بھر کی فکروں کے لیے ہم جو ہیں۔''

عجیب بات یہ تھی کہ خود میں اپنے آپ کو بیمار اور کمزور محسوس کررہا تھا جو میں نے قید تنہائی کے دو ماہ میں کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ وہاں اندر کی طاقت تھی جو مجھے حوصلہ دیتی تھی اور کمزور نہیں پڑنے دیتی تھی۔ میں زندہ رہنے کی جدوجہد کررہا تھا اور ہارنا نہیں چاہتا تھا ...... یہاں ایک بےفکری تھی، اطمینان اور اعتماد تھا کہ میری حفاظت کی جارہی ہے اور میں دوستوں ہمدردوں اور محافظوں کے درمیان ہوں۔

پھر بھی تیسرے دن میں راجا سے لڑ پڑا۔ ''بس راجا زبردستی مجھے بیمار نہ بنا، میں بالکل ٹھیک ہوں۔''

''تیری صحت ......'' اس نے کچھ کہنا چاہا۔

''کیا ہوا ہے میری صحت کو ......؟ میں چل پھر نہیں سکتا۔ کھڑا ہوا تو گر جاؤں گا ...... میں نے بتا دیا تجھے ...... تو نے زبردستی کی تو میں یہاں سے بھاگ جاؤں گا اور دیکھوں گا کون روکتا ہے مجھے۔''

وہ میرے پاس بیٹھ گیا۔ ''ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ تجھے ایک مہینا آرام کرنا ہے، صرف کھانا پینا ہے اور کچھ نہیں کرنا۔''

''ایسی کی تیسی ڈاکٹروں کی اور ان کے ساتھ تیری بھی ...... ہوجائے گا آرام بھی ...... ایسے کون ہر وقت لیٹ سکتا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ میں پھر قید میں ہوں، تو مجھے ست بدھائی نہیں لے جائے گا تو میں خود چلا جاؤں گا۔''

راجا مسکرایا۔ ''کوشش کرکے دیکھ لے، میری اجازت کے بغیر نہ یہاں کوئی آسکتا ہے اور نہ تو یہاں سے جاسکتا ہے۔ اسپتال کے اندر باہر سخت سیکیورٹی خود آئی جی صاحب نے رکھی ہے۔ کل رات وہ خود آئے تھے سارے انتظامات کا جائزہ لینے ......''

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''اب اس کی کیا ضرورت ہے راجا ......؟''

''اس کی غیر سرکاری تفتیش ابھی جاری ہے ...... پولیس نے اس ڈاک بنگلے پر بھی چھاپا مارا تھا، جہاں کچھ نہیں ملا ......''

میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''رابعہ ملی ......''

راجا نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''نہیں ...... اس کی خیر خبر بھی کوئی نہیں، اس نے کسی کو فون بھی نہیں کیا۔''

''پولیس نے رانا سے پوچھ گچھ کی ......''

''فیکے پتر ...... ہم نے تیرے لاپتا ہونے کی رپورٹ ضرور لکھوائی تھی اور اندیشہ یہ بھی ظاہر کیا تھا کہ تجھے اغوا کیا گیا ہے لیکن ہم نے شک کسی پر ظاہر نہیں کیا تھا ...... نہ کسی کا نام لیا تھا، پولیس کو صرف اتنا معلوم تھا کہ اغوا کرنے والوں نے پچاس کروڑ کا تاوان طلب کیا ہے، اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ کسی کو بھی معلوم نہیں ...... اب میں نے رپورٹ درج کرا دی ہے کہ نواب رفیق احمد شیرازی کو بازیاب کرالیا گیا ہے۔ تاوان ادا کرنے کے بعد ...... انہیں کسی نامعلوم مقام پر قید رکھا گیا تھا اور تاوان لینے کے بعد چھوڑ دیا گیا۔ عبداللہ جان کو میں نے صرف اس جگہ کے بارے میں بتایا تھا جہاں سے میں تجھے لایا تھا اور اندازے سے اس ڈاک بنگلے کی لوکیشن بتا دی تھی، لیکن وہ برسوں سے غیر آباد ہے۔ پولیس کو وہاں سے کوئی سراغ نہیں ملا، نہ کسی کی لاش ملی اور نہ اس بات کا کوئی ثبوت ملا کہ تجھے وہاں رکھا گیا تھا ...... خود میں نے تفتیش پر زور نہیں دیا، میں نہیں سمجھتا کہ اس معاملے کی پبلسٹی سے کوئی فائدہ ہوگا، ہمیں رانا کا یا رابعہ کا نام لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔''

''لیکن وہ گئی کہاں راجا ...... یہ تو معلوم ہونا چاہیے، ہم ایسے بالکل ہی لاتعلق ہو کے کیسے رہ سکتے ہیں، آخر وہ ہمارے ساتھ رہتی تھی، رشتے میں وہ میری کزن ہے جو کچھ رابعہ نے کیا اس پر خاموش رہنا ہماری مجبوری تھی یا مصلحت ...... کیونکہ ہم کچھ کرتے تو اپنا نقصان کرتے۔''

''ہمارے پاس کوئی ثبوت بھی نہیں تھا ...... لیکن معاملہ ثبوت کا نہیں، تیری جان کا تھا، اسے خاک بھی علم نہیں ہوگا کہ زوہیب نے تجھے کیسے اغوا کیا تھا اور کہاں رکھا ہے ...... وہ تو اپنی خواہش کے جال میں خود گرفتار تھی، اس نے کہا ہوگا کہ ایسا ہوسکتا ہے اور زوہیب نے ساری ذمے داری قبول کرلی ہوگی کہ تم جو چاہتی ہو ویسا ہی ہوگا اور تم پر الزام بھی کوئی نہیں آئے گا۔ وہ پھنس گئی ...... سب کچھ زوہیب کرتا رہا اور وہ اس کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی کی طرح اس کے اشاروں پر چلتی رہی، میری اس پر نظر تھی۔ مجھے ذرا بھی شک ہوتا کہ وہ کچھ جانتی ہے تو اس سے معلومات لینا کوئی مشکل نہیں تھا، بڑے بڑے سخت جان مجرم سب بتا دیتے ہیں۔ رابعہ کیا چیز تھی ...... لیکن اس کا رابطہ زوہیب سے صرف فون پر تھا اور اس نے رابعہ کو کچھ نہیں بتایا تھا۔''

''یہ تو نے کیسے جانا ......؟''

''میرے پاس ریکارڈ ہے ساری گفتگو کا۔ جو وہ ہر رات کرتے تھے، زوہیب نے اسے سختی سے منع کر رکھا ہوگا، رابعہ نے ایسی کوئی بات نہیں کی ...... سب ٹھیک ہے، ہاں سب ٹھیک ہے ...... باقی پیار محبت کی باتیں ...... دونوں طرف سے جھوٹ ......''

میں نے کہا۔ ''ممکن ہے زوہیب نے اسے الگ سے کوئی فون دے رکھا ہو، وہ ہر روز سم بدل کے بات کرتی ہو۔''

''لیس ...... ایسا ہوگا، ورنہ زوہیب کو اندر کی خبریں کیسے ملتیں، لیکن رابعہ سے تفتیش کرکے کیا ملتا، وہ نہیں جانتی تھی کہ تجھے کہاں رکھا گیا ہے ......''

''وہ ضرور جانتی ہوگی، ورنہ وہ مجھ تک کیسے پہنچتی؟''

''زوہیب اتنا بےوقوف نہیں ہوسکتا، وہ رابعہ کو بھی ایسے لے جاتا ہوگا کہ اسے کچھ پتا نہ چلے، ہم رابعہ سے پوچھ گچھ کرتے تو زوہیب کو فوراً معلوم ہوجاتا، پھر خطرہ لاحق ہوتا تیری جان کو ......''

میں نے کہا۔ ''آخری دن وہ مجھ سے ملنے اکیلی آئی تھی۔''

''اور اس کے بعد سے وہ خود غائب ہے۔'' راجا نے کہا۔ ''زوہیب نے کہا ہوگا کہ تمہیں عدالت میں گفٹ ڈیڈ سائن کرنے کے علاوہ کچھ نہیں کرنا ہے۔ اس کے بعد ہم شادی کرلیں گے، لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ رابعہ کو اس صورت حال کی سنگینی کا اندازہ بعد میں ہوا جب وہ کچھ بھی نہیں کرسکتی تھی، پھر بھی اس نے حالات کی اس دلدل سے نکلنے کی کوشش کی جس میں وہ اپنی مرضی سے گری تھی۔ جرم کی ترغیب رابعہ نے دی۔ وہ شریک جرم رہی لیکن اصل مجرم تو زوہیب تھا۔ وہ بھی رابعہ سے خطرہ محسوس کرتا ہوگا کہ کمزور عورت ہے۔ کہیں اس کا دماغ الٹ گیا تو میرے خلاف ہوجائے گی۔''

''اور ایسا ہی ہوا ......؟''

''شاید ایسا ہی ہوا ...... زوہیب کو آخر تک یقین تھا کہ سب اس کی مرضی کے مطابق ہورہا ہے۔ خود کو محفوظ رکھنے کے لیے اس نے احتیاط سے کام لیا اور رابعہ کو اپنے ساتھ نہیں رکھا۔ اس کے ساتھ کہیں نظر بھی نہیں آیا۔ ذرا سی چوک اسے مہنگی پڑ گئی۔ اس نے رابعہ سے پہلے دستخط کروائے ہوتے تو کچھ نہ ہوتا۔ آخری وقت میں رابعہ کا حوصلہ جواب دے گیا۔ اس کا نروس بریک ڈاؤن ہوگیا۔ وہ عدالت نہیں پہنچی، وہ ڈر گئی کیونکہ وہ خود زوہیب کو دھوکا دے رہی تھی۔ وہ کیسے اس پر بھروسا کرتی۔ اگر وہ زوہیب سے شادی کرلیتی تو اسے معلوم

تھا کہ انجام کیا ہوگا، نہ کرتی تو پھر کس کا مقابلہ کرتی اور کیسے مقابلہ کرتی...... آخری دن جب تو نے اسے صاف انکار کر دیا تو رابعہ کے لیے کھیل ختم ہوگیا۔ اس نے اپنی ہار مان لی لیکن اس کے بعد وہ کہیں کی نہ رہی۔ نہ دین کی نہ دنیا کی......"

میں نے پریشانی سے کہا۔ "راجا...... تو بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے مگر اس کے بعد وہ کہاں گئی، کیا یہ پریشانی کی بات نہیں ہے؟"

"اگر ہے...... تو اس کا پتا چل جائے گا، ہم پولیس میں رپورٹ لکھوا کے اپنا فرض پورا کریں گے، اس کے بعد کچھ بھی ہو......"

میں نے کہا۔ "راجا...... وہ کہاں جائے گی؟"

راجا بگڑ گیا...... "وہ جائے جہنم میں...... میری بلا سے...... تو اس کے بارے میں کیوں سوچ رہا ہے۔"

میں نے دبے دبے لہجے میں کہا۔ "اس لیے کہ میں جانتا ہوں میرے سوا دنیا میں اس کا کوئی نہیں ہے۔"

"کیوں نہیں ہے، زوہیب ہے نا۔ اس سے اتنی محبت کرتا ہے، شادی کرلے اور اس کے ساتھ رہے۔" راجا کے لہجے میں زہر تھا۔ "اور کچھ نہیں تو اس کے حرم میں ایسے ہی رہے۔ اس کی داشتہ بن جائے...... کھانے پینے کو ملتا رہے گا۔"

"راجا اتنا سفاک نہ بن......"

"کیوں؟...... جن لڑکیوں کا دنیا میں کوئی نہیں ہوتا وہ کیا کرتی ہیں؟ جاہل اور بے وقوف ہوں تو دلال کوٹھوں پر بٹھا دیتے ہیں، سمجھدار اور پڑھی لکھی سب کچھ بن سکتی ہیں۔ ایکسٹرا سے ماڈل تک...... اسٹینو سے کال گرل تک...... اور تیری رابعہ خیر سے ان معاملات میں بہت تیز ہے۔ مردوں کو بے وقوف بنانا جانتی ہے۔"

"یہی تو بات ہے۔ وہ کچھ نہیں جانتی، ورنہ زوہیب جیسے لوگوں کے چکر میں کیوں پڑتی، اسے فاروقی نے ورغلایا۔ شہزاد نے ورغلایا...... اور اب زوہیب نے......"

"اور وہ سب کے ورغلانے میں آگئی؟ ایسا اسی کے ساتھ کیوں ہوتا رہا؟ اس نے رشتوں کی آبرو کا خیال نہیں رکھا۔ جس تھالی میں کھایا اسی میں چھید کیا...... اسے اس کی سزا تو ملنی چاہیے۔"

میں نے کہا۔ "راجا...... وہ ایک دکھی اور تنہا لڑکی ہے۔ قصوروار میں بھی ہوں جس نے اس کی حق تلفی کے لیے قانونی طور پر یہ غلط سہی...... جذباتی طور پر وہ ایسا سمجھتی ہے، اگر شروع سے میں نے اسے بھی احساسِ ملکیت میں شریک کرلیا ہوتا......"

"یعنی ست بدھائی کی ریاست اور جاگیر میں سے نصف اس کے نام کردی ہوتی......"

"نصف نہ سہی...... ایک حصہ اسے دیتا اور باقی خود رکھ لیتا تو ایک شرعی جواز بن جاتا۔ بہن کو اتنا ہی ملتا ہے،" "مطمئن ہو جاتی......"

راجا نے تردید میں سر ہلایا۔ "یہ خوش فہمی ہے تمہاری فیکے پتر...... ہوس کی اور لالچ کی حد ایک تہائی پر ختم نہیں ہوتی، سب سے پہلے تیرا دوست فاروقی، جو تیرا وکیل تھا، جس پر تو سب سے زیادہ بھروسا کرتا تھا، اس نے رابعہ کو اکسایا تھا کہ رفیق کا پتا صاف کردو......"

"اس ذلیل آدمی نے تو اپنی بیوی کو بھی مجبور کیا تھا کہ مجھے زہر دے کر ہلاک کردے......"

"یہی مقصد شہزاد کا تھا اور زوہیب کیا چاہتا تھا میری ریاست پر قبضے کے سوا...... رابعہ کی کمزوری سب نے پکڑ لی اور وہ سب کے ہاتھوں میں کھیلتی رہی، بس اب بہت ہوگیا فیکے پتر...... وہ کسی رعایت کی مستحق نہیں رہی۔ خون کے رشتے کا لحاظ صرف تو کرتا رہا، وہ رشتے کا خون کرنے کی ہر سازش میں تیرے دشمنوں کا ساتھ دیتی رہی، کیا وہ تجھے منہ دکھا سکتی ہے اور اس کے باوجود تجھے اس سے ہمدردی ہے تو پھر ریاست اس کے حوالے کر اور چلا جا لندن...... ہم بھی جاتے ہیں واپس...... بھاڑ میں جائے ست بدھائی کا ترقیاتی منصوبہ......" وہ اٹھا اور باہر نکل گیا۔

راجا کو اتنا غصے میں، میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا...... یہ غصہ بے جواز نہ تھا، رابعہ نے اس بار ساری حدیں عبور کرلی تھیں۔ وہ کسی رعایت کی نہیں سزا کی مستحق تھی۔ راجا کو میں نے رات تک نہیں دیکھا۔ میں یہ محسوس کرتا تھا کہ میرا اتنے کڑے پہرے میں۔ یہاں لیٹے رہنا اب غیر ضروری ہے۔ مجھے کوئی بیماری نہیں تھی اور نہ یہاں میرا علاج ہو رہا تھا...... آرام میں اپنے گھر میں رہ کے بھی کرسکتا تھا۔ صحت کی مکمل بحالی کے لیے وقت درکار تھا۔ آہستہ آہستہ گزرے ہوئے وقت کے حالات کا اثر زائل ہوگا۔ شاید راجا کا خیال تھا کہ ست بدھائی پہنچ کر میں پھر اپنے معمولات میں اتنا گم ہو جاؤں گا کہ آرام کے لیے وقت نہیں نکال پاؤں گا لیکن صرف دو دن ایک کمرے میں بند رہ کے میں بیزاری کا مریض بن گیا تھا۔

صبح راجا سے میری پھر لڑائی ہوئی۔ "تو نے کیوں بند کر رکھا ہے مجھے یہاں راجا......؟"

راجا کا موڈ اس وقت لڑنے کا نہیں تھا۔ "یار تھوڑے دن کی بات ہے یہاں تیری صحیح دیکھ بھال ہو رہی ہے۔"

"کیوں؟...... کیا ہوا ہے مجھے؟...... میں اٹھ بیٹھ نہیں سکتا۔ چل پھر نہیں سکتا...... ذہنی عدم توازن کا شکار ہوں...... تھوڑی بہت کمزوری ہے تو وہ ٹھیک ہو جائے گی۔"

"میں نے عبداللہ جان سے مشورہ کیا تھا۔ انہوں نے بھی کہا کہ فوراً ست بدھائی جانا ٹھیک نہیں ہوگا۔"

"آج تیسرا دن ہے، ڈاکٹرز کی طرف سے کوئی پابندی نہیں، میں ست بدھائی جا رہا ہوں، دیکھتا ہوں مجھے کون روکتا ہے، تو نے اچھا تماشا بنا لیا ہے۔ دشمنوں کی قید سے نکلا تو دوستوں نے قید کرلیا۔ اب تک تو نے کسی سے مجھے ملنے نہیں دیا۔ کسی سے میری بات نہیں کرائی، شہناز کیوں نہیں آئی یہاں؟...... نور نے مجھے فون کیوں نہیں کیا...... کیا ہے یہ سب؟"

"تو سمجھ نہیں رہا ہے...... دو چار دن ہم صورتِ حال کو جوں کی توں رکھنا چاہتے تھے، یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ وہ سب کیا کرتے ہیں جن کو منہ کی کھانی پڑی، ورنہ یہ کیا مشکل تھا کہ ہم تجھے جلوس کی صورت میں ڈھول بجاتے ہوئے ست بدھائی لے جاتے۔"

"راجا...... مجھے آج ہر صورت میں ست بدھائی جانا ہوگا، یہ میرا فیصلہ ہے اور بالکل آخری...... قطعی......"

"ٹھیک ہے...... جیسی تیری مرضی لیکن وہ ملک ارشد آیا بیٹھا ہے، اس سے مل لے......"

"وہ کب سے آیا ہوا ہے...... بلا اسے...... وہ بھی کیا سوچتا ہوگا کہ یہ تو سچ مچ کا نواب بن گیا ہے؟" میں نے کہا۔

"ابھی آیا تھا وہ، ہم ناشتا کر رہے تھے۔"

راجا باہر گیا اور چند منٹ بعد واپس آیا تو ملک ارشد اس کے ساتھ تھا۔ وہ میرے قریب ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔

"آپ کی طبیعت کیسی ہے رفیق صاحب......؟"

"طبیعت بالکل سے بھی زیادہ ٹھیک ہے، محض سیکیورٹی کے نام پر مجھے اس کمرے میں بند کر رکھا جا رہا ہے۔"

"میرا خیال ہے آپ کے دوست راجا صاحب نے احتیاط سے کام لیا، اچھا کیا...... میں بھی اندازہ نہیں کرسکتا تھا کہ مجھے کسی سے کوئی خطرہ لاحق ہوسکتا ہے، میں آج واپس لندن جا رہا ہوں۔" وہ بولا۔

میں نے اسے غور سے دیکھا۔ "ملک صاحب...... سب ٹھیک ہے نا...... آپ کچھ پریشان سے لگ رہے ہیں۔"

ملک ارشد نے بریف کیس کھول کے ایک فائل نکالی۔

"یہ میں آپ کے وہ گفٹ ڈیڈ والے پیپرز لایا ہوں...... جو کل رابعہ کے نہ آنے سے سائن ہونے سے رہ گئے تھے۔"

میں نے اسٹامپ پیپرز کا وہ پلندا لے لیا۔ "تھینک یو......"

"اس دن آپ کے ذہن میں ایک بات بروقت آگئی۔ میں کورٹ سے نکل کے گاڑی میں جا بیٹھا اور لوٹ کے نہیں آیا...... میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ انصاف اور قانون کے محافظ اور علمبردار سمجھے جانے والے جہاں جھنڈا لگا کے بیٹھتے ہیں، وہاں ایسی ننگی لاقانونیت کا مظاہرہ بھی ہوسکتا ہے۔"

میں نے کہا۔ "آخر کیا ایسی بات ہوگئی......"

"ہوئی نہیں...... قسمت آپ کی...... لیکن ہو جاتی اگر میں وہیں ہوتا، وہ سارے غنڈے بدمعاش...... ان میں وہ ضمیر فروش عدالتی اہلکار بھی شامل ہیں، انہوں نے طے کرلیا تھا کہ مجھ سے کاغذات چھین کر رابعہ کے دستخط بھی وہ خود بنالیں گے۔ ان پر لگ جاتا عدالت کا ٹھپا تو کون اسے چیلنج کرتا۔"

"آج کے پاکستان میں سب ممکن ہے ملک صاحب......"

اس نے بڑے دکھ اور افسوس سے سر ہلایا۔ "دس بارہ سال پہلے اتنی لاقانونیت نہیں تھی نواب صاحب...... اس قدر جھوٹ اور فریب، ہر عدالت میں پیشہ ور گواہ بھرے پڑے ہیں۔ دن میں سو بار قرآن پر جھوٹا حلف اٹھاتے ہوئے نہ دنیا کی پروا کرتے ہیں نہ دین کی...... جعلساز...... فریب کار...... پیسے کے لیے اپنا سب کچھ بیچ دینے والے...... لاقانونیت کے ہمراہ...... یہ انہی کی دنیا ہے...... خیر...... ایسی باتوں سے بھی کیا ہوگا، آپ بچ گئے...... خدا کا شکر ادا کریں۔"

"آپ کا شکریہ میں کیسے ادا کروں...... صرف فیس ادا کردینا کافی نہیں۔"

"فیس کی مجھے کوئی فکر نہیں تھی...... لندن میں بھی آپ کے ساتھ میرے معاملات میں کوئی مسئلہ نہیں رہا، میرا ایک آفس یہاں بھی ہے۔ ہر سال میرے پریکٹس لائسنس کی تجدید ہوتی رہتی ہے۔ میرا اپنا گھر بھی لاہور میں تھا اور آفس بھی...... آفس میں میرا چھوٹا بھائی ہے اور کچھ جونیئر وکیل ہیں...... اچھی بات یہ ہوئی کہ کاغذات دفتر میں نہیں تھے، مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ آپ کے مخالف زوہیب حسن نے اپنے وکیل فاروقی کے ساتھ کیسا سلوک کیا۔ اس نے فاروقی کو بہت برا بھلا کہا کہ اس نے کاغذات اپنی تحویل میں کیوں نہیں لیے اور وہ لندن کا وکیل غائب کیسے ہوگیا۔"

میں نے کہا۔ "اس کا دماغ خراب ہے۔"

"سوچنے کی بات ہے نواب صاحب۔ گفٹ آپ کی طرف سے ہے...... گفٹ ڈیڈ آپ بنوائیں گے...... وکیل آپ کی مرضی کے مطابق ہی تمام دستاویزات تیار کرے گا، سائن بھی پہلے آپ کریں گے تو کاغذات فریقِ ثانی کے وکیل

کی تحویل میں کیسے ہو سکتے ہیں۔"

"کیا آپ سے کسی نے یہ کاغذات طلب کیے تھے؟"

"فاروقی مجھ سے ملنے آیا تھا۔ میرے بھائی کے آفس میں...... اس نے مجھ سے پوچھا کہ وہ گفٹ ڈیڈ کہاں ہے جس پر نواب رفیق نے سائن کر دیے تھے لیکن رابعہ کے رہ گئے تھے، میں نے صاف کہا کہ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں...... اس نے بھی صاف بات کی اور کہا کہ اگر آپ وہ کاغذات مجھے دے دیں تو آپ کو منہ مانگی قیمت ادا کی جا سکتی ہے۔ میں نے اسے بے عزت کر کے نکال دیا لیکن یہ بھی کہہ دیا کہ میں وہ کاغذات نواب رفیق کو واپس کر چکا ہوں اور انہوں نے ضائع بھی کر دیے ہیں...... اب کچھ نہیں ہو سکتا...... مجھے اس کے تیور ٹھیک نہیں لگ رہے تھے، اسی لیے میں آج واپس جا رہا ہوں۔"

"آپ نے میرے لیے وقت نکالا...... یہاں آئے......"

"حالات ایسے ہو گئے تھے نواب صاحب...... میں کیسے نہ آتا۔" وہ بولا۔

"لندن میں آپ کے کام کا حرج ہوا ہوگا۔"

"نہیں...... اب اللہ کے فضل سے میرے ساتھ اچھے معاون ہیں، وہ سب سنبھال لیتے ہیں...... ایک پاکستانی سینئر ہے...... ایک جونیئر انڈین...... جب میں شروع میں اکیلا تھا تو مشکل ہوتی تھی۔"

"آنے والے دنوں میں آپ کے سب سے بڑے ضرورت مند ہم ہوں گے...... آپ کو زیادہ وقت نور شیرازی اینڈ کمپنی کو دینا ہوگا۔"

"ویسے تو نواب صاحب آپ کی طرح ہم بھی پیسا کمانے کے لیے ہی وہاں بیٹھے ہیں...... گھر بار خاندان شہر اور ملک سب چھوڑا کس کے لیے...... میں آپ کی نہیں اپنی بات کر رہا تھا...... مگر پیسے کے ساتھ آدمی بھی دیکھا جاتا ہے۔"

"ہمارا آپ کا کنٹریکٹ ابھی تک نہیں ہوا۔"

اس نے خوش اخلاقی سے کہا۔ "مجھے کوئی جلدی نہیں۔ یہ اعتماد ہی تھا جو مجھے یہاں بھی لے آیا...... تعلق اگر کاروبار سے زیادہ خلوص پر استوار ہو تو اچھا رہتا ہے۔"

"ملک صاحب...... پہلے لندن کا بزنس لارڈ ارنسٹ کا تھا تو ان کے قانونی مشیر جان آرنلڈ رہے...... میں نے ان کو آفر کی تھی کہ حسبِ سابق اپنی ذمے داری نبھاتے رہیں لیکن ذاتی وجوہ کی بنا پر انہوں نے معذرت کر لی...... اب بات نکلی ہے تو میں آپ کو وہی آفر دے سکتا ہوں...... انہی شرائط پر آپ مجھ سے تعاون کریں...... آپ اپنی شرائط بھی بتا سکتے ہیں۔"

"نہیں نواب صاحب...... مجھے منظور ہے...... اعتراف کرنے میں کوئی حرج نہیں کہ یہ میری عزت افزائی ہے...... کاروباری طور پر بھی اس سے میری ساکھ بہتر ہو گی...... جب میں یہاں آیا تو بہت معمولی حیثیت کا گمنام وکیل تھا...... لاہور جیسے بڑے شہر میں جہاں ہزاروں وکیل ہیں میری پریکٹس نہیں چلتی تھی...... بھائی نے مشورہ دیا کہ برطانیہ، امریکا جا کے قسمت آزماؤ...... امریکا کا ویزا نہیں ملا...... میں لندن آ گیا...... یہاں کے امیگریشن لاء پر محنت کی...... ایک بہت پرانے وکیل کے ساتھ کام کر کے بہت کچھ سیکھا...... پھر اپنے کیس لیے اور نیک نیتی سے کام کیا...... بہت سے لوگ یہاں اس لیے ناکام ہوئے کہ انہوں نے ضرورت مندوں کو بے وقوف سمجھ کے اور جھوٹے وعدوں پر بہلا کے لوٹا...... دعوے بہت کیے، مال بھی کھینچا مگر کام پھر بھی نہ ہوا...... آپ دیکھ لیں...... نہ میں نمبر ون ہونے کا دعوے دار ہوں...... اور نہ ہوں...... مگر آپ کو مجھ پر اعتماد ہے...... اور میں اس اعتماد پر پورا اترنے کی کوشش ضرور کرتا ہوں...... اب آپ میری موجودگی میں ان گفٹ ڈیڈ کے پیپرز کو پھاڑ دیں یا جلا دیں۔"

"آپ جرم کا سراغ نہ چھوڑنے کے قائل ہیں...... اچھی بات ہے۔" میں نے فائل میں سے کاغذات کے پلندے نکالے۔

"ایک وجہ اور بھی ہے...... امکانات نہ ہونے کے برابر ہیں لیکن فرض کریں یہ کاغذات آپ کے دشمنوں کے ہاتھ لگ جاتے۔"

"وہ تو جیسے روپوش ہیں۔"

"ایک تو دشمن کو موقع نہیں دینا چاہیے...... اور پھر یہ توقع بھی رکھنی چاہیے کہ وہ غیر متوقع وار کر سکتا ہے...... یہ کوئی بڑے پتے کی بات نہیں...... آپ خود مجھ سے بہتر سمجھتے ہوں گے لیکن میں اس قانونی معاملے کے حوالے سے بات کر رہا ہوں...... یہ پیپرز ان کے ہاتھ لگ جائیں تو وہ آپ کے خلاف ایک سنگین کیس بنا سکتے ہیں۔"

میں نے حیرانی سے کہا۔ "صرف ان کاغذات کی مدد سے؟"

"جی سر...... زوہیب یا زوہیب کے کہنے پر مس رابعہ کا وکیل فاروقی آپ کے خلاف پولیس تھانے میں رپورٹ درج کرا سکتا ہے کہ آپ نے رابعہ کو غائب کر دیا ہے...... قتل کرا دیا ہے۔"

"میں نے...... میں تو ان کی قید میں تھا۔"

وہ مسکرایا...... "کیا آپ نے اس کی رپورٹ لکھوائی ہے...... یا کوئی ثبوت گواہ ہے آپ کے پاس......؟ نہیں جناب...... آپ بالکل فری تھے...... کسی کی قید میں نہیں تھے...... آپ عدالت میں خود حاضر ہوئے اور اپنی رضا اور خوشی سے ساری جائداد اور جاگیر اپنی کزن رابعہ کو گفٹ میں دینے کے لیے کاغذات پر سائن کیے...... رابعہ آپ کے ساتھ ہی تھی لیکن وہ عدالت میں نہیں پہنچی...... کیوں؟...... وہ کہاں گئی......؟"

"وہ میرے ساتھ نہیں تھی۔"

"آپ کہتے رہیں...... وہ آپ کے ساتھ ہی رہتی تھی سارا زمانہ گواہی دے گا...... آپ کا اور اس کا ایک ساتھ نہ آنا کوئی اہمیت نہیں رکھتا مگر کہا یہ جائے گا کہ آپ کا ارادہ بدل گیا کسی وجہ سے آپ بدگمان ہو گئے...... اس کے اور آپ کے درمیان کوئی ایسی بات ہو گئی کہ آپ خود تو دستخط کرنے عدالت میں پہنچ گئے...... تاکہ کسی کو شک نہ ہو مگر آپ نے رابعہ کو وہاں نہیں پہنچنے دیا...... اور پھر کوئی ایسا انتظام کیا کہ وہ بعد میں بھی نہ آ سکے...... اور ایسا ہی ہوا...... ابھی تک دستخط کرنے عدالت میں نہیں پہنچی بلکہ اس دن کے بعد سے غائب ہے...... آپ سے پوچھا جائے گا کہ وہ کہاں ہے؟"

میں دم بخود بیٹھا یہ مفروضے پر مبنی الزامات سنتا رہا مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ مجھے بدنام کرنے یا مجرم بنانے کے لیے دشمن یہ الزام عائد کر سکتے تھے۔

ملک ارشد نے اپنی بات جاری رکھی۔ "اب تو بال آپ کے کورٹ میں ہے...... آپ انکار کر سکتے ہیں کہ کیسی گفٹ ڈیڈ...... میرا کیا دماغ خراب ہے کہ سب کچھ رابعہ کے نام کر کے خود جلا وطنی اختیار کر لوں...... یہاں کے سارے کام کون کرے گا...... رابعہ کے پاس عقل نام کی کوئی چیز ہے؟ اور آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ میں رابعہ کے آنے جانے کا ذمے دار نہیں ہوں...... یہاں سب اپنے کام سے آتے جاتے رہتے ہیں...... نہ وہ کسی کو بتا کے گئی نہ کسی کو اندازہ ہے کہ کہاں ہو گی...... گمشدگی کی رپورٹ ہم نے لکھوا دی ہے...... اب یہ پولیس کی ذمے داری ہے کہ میری کزن کو برآمد کر کے واپس لائے۔"

میں نے اس کے کندھے پر تھپکی دی۔ "وکیل کو ایسا ہی ہونا چاہیے...... یہ سب میں یا راجا نہیں سوچ سکتے تھے۔"

میں نے بیڈ کے ساتھ رکھی ہوئی ٹین کی خوب صورت رنگ والی ویسٹ پیپر باسکٹ آگے کھسکائی اور گفٹ ڈیڈ کے پیپرز کو پھاڑ کے اس میں ڈال دیا۔ ماچس مجھے ملک ارشد نے فراہم کی...... میں نے ایک کاغذ سلگا کے باسکٹ میں ڈال دیا...... آہستہ آہستہ تمام کاغذات نے آگ پکڑ لی۔ کمرے میں تھوڑا سا دھواں بھی جمع ہوا...... باسکٹ کے سارے کاغذات جل کر راکھ ہو گئے...... ملک ارشد نے انہیں فلیش میں ڈال کے بہایا اور باسکٹ کو پھر دھو کے وہیں رکھ دیا۔

جب وہ جانے کے لیے تیار تھا تو میں نے کہا۔ "ایک سب سے ضروری بات آپ بھول گئے ملک صاحب۔"

وہ رک گیا۔ "وہ کیا؟"

"آپ کا حقِ خدمت...... یہاں آپ خدمت خلق کے لیے تو نہیں آئے تھے۔"

وہ مسکرایا۔ "مجھے اس کی فکر نہیں...... مل جائے گا۔"

"مجھے تو فکر ہے وکیل صاحب...... قرض مجھ پر ہے...... آپ پر نہیں...... یہ بتائیے لندن میں نور سے پاؤنڈز لیں گے یا مجھ سے یہاں پاکستانی روپے؟"

"پاکستان میں پاکستانی کرنسی......" وہ بولا۔ "اس میں ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ مجھے کوئی انکم ٹیکس نہیں دینا پڑے گا۔ لندن میں تو ایک ایک پاؤنڈ کو شمار کیا جاتا ہے۔"

"جیسی آپ کی مرضی۔" میں نے کہا اور اپنے بریف کیس میں سے چیک بک نکال کے ایک چیک پر دستخط کر دیے۔ "ایک کام آپ کر لیں اور وہ ہے اس میں رقم بھرنے کا۔"

"یہ کام بھی آپ کے کرنے کا ہے نواب صاحب۔"

"میں ذرا کنجوس ہوں...... ایسا نہ ہو دو چار صفر کم کر دوں۔" میں نے چیک اس کی طرف بڑھا دیا۔ "پلیز...... مجھے معلوم ہے آپ ناجائز نہیں لکھیں گے۔"

ملک ارشد نے چیک لے لیا اور میرے سامنے اس پر دس لاکھ کی رقم لکھ کر مجھے دکھایا...... "اگر آپ کو زیادہ لگے تو میں ایک صفر کم کر دوں؟"

"صرف ایک...... سارے صفر مجھے زیادہ لگ رہے ہیں...... آپ کو قائداعظم کی تقلید کرنا چاہیے...... وہ ایک روپیا ماہانہ لیتے تھے۔"

"وہ قائداعظم تھے...... اب ہم نے ان کی تصویر کو قائداعظم کہنا شروع کر دیا ہے...... بڑے صاحب کا چپراسی بھی کس بے شرمی سے کہتا ہے...... ایک قائداعظم نکالو۔" اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور دروازے سے باہر چلا گیا۔

میرا خیال تھا کہ ڈاکٹروں کو اب مجھے چھٹی دینے میں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے لیکن جب میں نے اس خواہش کا اظہار کیا تو ایک سینئر ڈاکٹر نے درخواست کی۔ "اگر آپ ایک دن اور ٹھہر جائیں۔"

میں نے کہا۔ "اس سے کیا ہوگا؟"

"آپ کا ایک ٹیسٹ دوبارہ ہونا چاہیے...... پہلی رپورٹ کچھ ٹھیک نہیں لگتی۔" وہ بولا۔

مجھے شک تھا کہ یہ راجا کی سازش ہو گی لیکن دوبارہ

بحث سے بچنے کے لیے میں نے انکار نہیں کیا۔ راجا شام کو نمودار ہوا تو اس نے مجھے مطلع کیا کہ رابعہ کے لاپتا ہونے کی رپورٹ پولیس کو دے دی گئی ہے اور ایک تفتیش تو معمول کے مطابق ہو رہی ہے لیکن عبداللہ جان کی ہدایت پر ایک بہت ذہین افسر کو بھیجا گیا ہے...... وہ خاموشی سے کام کرے گا اور پتا چلائے گا کہ رابعہ کہاں ہے۔''

اس تمام نفرت کے باوجود جو میں رابعہ کے لیے محسوس کرتا تھا اچانک اس کا لاپتا ہو جانا مجھے بھی فکرمند کر رہا تھا...... اس روز شام کے وقت ڈاکٹر شہناز اسپتال پہنچ گئی...... گنے چنے چند لوگ ہی یہ جانتے تھے کہ میں پاکستان میں ہوں اور شہناز ان میں سے ایک تھی۔

وہ راجا کے ساتھ اندر آئی اور کچھ کہے بغیر مجھ سے لپٹ گئی۔ گھر سے یقیناً وہ عہد کر کے آئی ہو گی کہ خود پر قابو رکھے گی، نہ خود کو تماشا بنائے گی اور نہ مجھے...... ویسے بھی وہ ڈاکٹر تھی اور یہ اسپتال تھا لیکن ساری خرابی یہ تھی کہ اپنی فطرت اور مزاج کے اعتبار سے عورت تو عورت ہی رہتی ہے، جذباتی طور پر ایک کمزور مخلوق...... زبانی لاکھ مردوں کی ہمسری کے دعوے کرے لیکن اس کے وجود سے پیار کا جو قدرتی چشمہ پھوٹتا ہے وہ آنکھوں کے حفاظتی بند توڑ کے بہ نکلتا ہے، اس پیار کے روپ الگ ہو سکتے ہیں، وہ مامتا ہو سکتی ہے...... شوہر کی چاہت ہو سکتی ہے، بھائی کا پیار ہو سکتا ہے یا باپ کی محبت، وہی اسے کمزور بناتا ہے۔

میں نے اٹھنے کی کوشش کی اور اسے سنبھالا۔

''شہناز...... واٹ از دس......؟''

راجا کا موڈ خراب ہو گیا۔ وہ آگے بڑھا...... میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ پھر میں نے شہناز کو الگ کیا اور اپنے ہاتھوں سے اس کے آنسو صاف کیے۔ ''کیوں رو رہی ہو آخر تم، دیکھو میں ٹھیک ہوں، بالکل ٹھیک...... تم تو خود بھی دیکھ سکتی ہو، چیک کر سکتی ہو...... میری رپورٹیں دیکھ لو......''

اس نے اپنے آنسو پونچھے اور خفت سے مسکرائی۔ ''رپورٹیں کیا میں دیکھوں جب تم میرے سامنے ہو۔ کیا حال ہو گیا ہے تمہارا......''

''قصور تمہاری فکر کا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ایک نظر کی نظر خراب نہیں ہونی چاہیے۔ ورنہ مریضوں کا کیا بنے گا۔''

''تمہیں کچھ اندازہ نہیں۔ راجا نے اور میں نے اور یہاں ہم سب نے یہ دن کیسے گزارے، حقیقت، جب سے پتا چلی۔''

''مجھے اندازہ ہے تم سب کی پریشانی کا......''

راجا نے کہا۔ ''یہاں ہم سب ساتھ تھے، پریشانی شیئر کر سکتے تھے، نور کا سوچو...... وہاں وہ اکیلی تھی، خود کو بھی سنبھال رہی تھی اور وہاں کے معاملات کو بھی......''

''راجا تو نے اسے سب سچ بتا دیا تھا؟''

وہ شہناز کو دیکھتا رہا جو مجھے دیکھ رہی تھی۔ انہی نظروں سے جن نظروں سے کوئی بھی ماں برسوں کے بچھڑے بیٹے کو سامنے پا کے دیکھتی ہے یا کوئی بہن اس بھائی کو دیکھتی ہے جس کے ملنے کی آس بھی نہ رہی ہو اور پھر اچانک مل جائے...... شاید اور کوئی جذبہ اتنا پاکیزہ، خالص اور بھرپور نہیں ہوتا۔

''میں نے آدھے سچ سے کام چلایا تھا پتر...... اس میں جھوٹ کی آمیزش کرنا میری مجبوری تھی۔''

شہناز سیدھی ہو کے میرے سرہانے کی طرف ہو گئی۔ ''ہم سے نور ہر روز پوچھتی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ اس میں سوچنے کی کون سی بات ہے؟ رابعہ جو مانگ رہی ہے رفیق اسے دے کیوں نہیں دیتا؟ دیر کیوں کر رہا ہے۔ وہ سمجھتی تھی کہ شاید ہم معاملات کو لمبا کر رہے ہیں، ہم یہ سوچ رہے تھے کہ ست بدھائی میں جو کچھ ہو رہا تھا...... جو ترقیاتی کام شروع ہوئے تھے اور جو منصوبے مکمل ہونے تھے، ان کا کیا بنے گا، رابعہ سارے کام کیسے کرے گی۔''

راجا نے کہا۔ ''ایک دن نور نے براہ راست کہہ دیا کہ تم سب کو اپنے مستقبل کی فکر ہے، ورنہ رفیق کو کیا کمی ہے؟...... خدا نے یہ سب دے کر لے لیا تو اس سے زیادہ کا انتظام پہلے کر دیا...... اس کے ساتھ تم یہاں آ جاؤ...... کاروبار بھی ست بدھائی کی طرح ہم سب کا ہے اور سچ سب کے لیے اتنا ہی بڑا چیلنج ہے۔ کیا رفیق اکیلا اسے چلا سکتا ہے، بڑھا سکتا ہے؟...... میں کچھ گرم ہو گیا کہ نور بی بی تم بالکل غلط سوچ رہی ہو۔ اب خوامخواہ ہم پر شک کر رہی ہو، رفیق ہمارا دوست تھا ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ میں پہلے بھی اس کے ساتھ تھا اور آئندہ بھی رہوں گا، تم اس کے اور میرے رشتے کو نہیں جانتی ہو نہ سمجھتی ہو، ورنہ ایسی بات نہ کرتیں۔ اس پر وہ کچھ پشیمان ہوئی کہ راجا تم ناراض ہو گئے، میرا ہرگز یہ مطلب نہیں تھا جو تم نے سمجھا...... خیر...... اس کے بعد میں یہی کہتا رہا کہ قانونی معاملات ہیں، ان میں وقت لگتا ہے...... رفیق سے روز بات ہوتی ہے، کئی بار میں مل چکا ہوں، وہ یہاں آرام سے ہے اور اسے کسی قسم کی تکلیف نہیں...... ہاں رابعہ نے کیا اس کا دکھ ہے اور یہ صدمہ بھی ہے کہ وہ دشمنوں سے جا ملی گئی، جاگیر جائداد جائے بھاڑ میں......''

میں نے پوچھا۔ ''اس نے کبھی یہاں آنے کی بات نہیں کی؟''

شہناز ہنسنے لگی۔ ''اگر وہ آنا چاہتی تو کیا ہم میں سے کوئی اسے روک سکتا تھا۔''

''پھر وہ اب تک لندن میں کیسے رکی ہوئی ہے؟'' میں نے کہا۔

راجا بولا۔ ''اس میں کمال ہے میرا...... میں نے تیری طرف سے اس کو یہ پیغام پہنچا دیا تھا کہ وہ لندن میں ہے، یہاں آ کے وہ کوئی توپ نہیں چلا سکتی۔ نقصان صرف یہ ہو گا کہ لندن کے کاروباری معاملات کا بھی بیڑا غرق ہو جائے گا۔ یہاں کے مسائل سے نمٹنے کے لیے بہت لوگ ہیں...... وہ کہنے لگی کہ رفیق سے میری بات کرا دو، میں نے کہا کہ یہ میرے اختیار میں نہیں۔ اس کے پاس اپنا کوئی موبائل فون نہیں ہے۔ ضرورت کی بات ہوتی ہے تو اسے فون فراہم کر دیا جاتا ہے لیکن وہ کوئی فالتو بات کرے تو فون بند کر دیا جاتا ہے۔''

شہناز نے کہا۔ ''راجا گولی دینے کا ماہر ہے۔ مجھے بھی پہلے تو کچھ بتانا نہیں تھا۔''

راجا نے احتجاج کیا۔ ''جھوٹ مت بولو...... تم سے میں نے کچھ نہیں چھپایا، ایک تم ہی کو ہر بات معلوم تھی۔''

شہناز نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''یہاں آنے کے لیے بھی آج کیا ہوا، پہلے تو کتنا جھگڑا ہوا۔ میں نے کہا کہ رفیق بھائی اسپتال میں ہیں تو تمہیں نہیں مجھے جانا چاہیے ان کے پاس...... ڈاکٹر تم نہیں میں ہوں، پھر میں بیٹھ گئی گاڑی میں...... خیر اب میں آئی ہوں تو آپ کو اپنے ساتھ لے کر ہی جاؤں گی، چلیں اٹھیں۔''

میں نے ہنس کے کہا۔ ''ایسے اٹھ کے چل دوں تمہارے ساتھ، کسی سے پوچھے بغیر؟''

''پوچھنا کیسا۔ یہ اسپتال ہے یا جیل خانہ کہ اجازت لیے بغیر کوئی باہر نہ نکل سکے۔''

''ڈاکٹر نے آج ایک دن کے لیے روکا ہے۔ پتا نہیں کیا ٹیسٹ دوبارہ ہوں گے، پہلے کی رپورٹ کچھ ٹھیک نہیں آئی۔''

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''میں ابھی دیکھ لیتی ہوں، ایسی کون سی رپورٹ ہے اور کیا بیماری ہے؟''

صرف دس منٹ بعد وہ پھر نمودار ہوئی۔ ''سب دیکھ لیا ہے میں نے۔ آپ اٹھیں...... یہ اسپتال والے صرف اپنی اہمیت بڑھانے کے لیے بیماری بڑھاتے ہیں، آپ کو کوئی پرابلم نہیں...... چلیں اٹھیں۔''

صرف آدھے گھنٹے بعد آگے پیچھے تین گاڑیاں پوری رفتار سے ست بدھائی کی جانب رواں تھیں، آگے والی گاڑی پولیس کی تھی، اس پر نیلی لائٹ بھی گھوم رہی تھی اور اسلام آباد سے دینہ تک جہاں کہیں ٹریفک زیادہ ہوتی تھی اس کا سائرن چلانے لگتا تھا۔ ہٹو...... بچو...... نواب رفیق شیرازی آف ریاست ست بدھائی کی سواری کے لیے راستہ دو، یہ انتظام غیر سرکاری طور پر عبداللہ جان آئی جی پولیس کے اشارے پر ہوا تھا کیونکہ میں ان کا خاص آدمی تھا۔ درمیان کی گاڑی کو حسب معمول غنی ڈرائیو کر رہا تھا۔ راجا اس کے ساتھ تھا۔ پیچھے والی سیٹ پر میرے ساتھ شہناز بیٹھی تھی۔ ہمارے پیچھے میرے اپنے سیکیورٹی گارڈز تھے۔

ایک بار پھر حویلی میں پہنچ کے میں نے وہ خوشی محسوس کی جو کسی جیل میں عمر قید کی سزا کاٹنے والا بے گناہ اپنے گھر میں اور اپنی فیملی کے درمیان پہنچ کے محسوس کرتا ہے، سب کچھ وہی تھا۔ ویسا ہی تھا لیکن میری نظر کو وہ دنیا بدلی بدلی نظر آ رہی تھی۔ گویا بندے کو یوں لگتا ہے جیسے جو شیر خوار تھا وہ قد میں اس سے کچھ ہی کم ہے اور جو بچہ تھا وہ بالغ ہو چکا ہے اور جو بالغ تھا وہ خود بچوں والا ہے۔

رابعہ نے میرے خیالات کی دنیا کو تہس نہس کر دیا تھا۔ رشتوں کے اعتبار کا خون کر دیا تھا اور میرے دل میں دنیاوی مال و متاع سے نفرت پیدا کر دی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ میں بہت دکھی تھا۔ رابعہ کے ساتھ گزارے ہوئے وقت کا ہر لمحہ میری نظر میں گھومنے لگا تھا۔

یہ شام سے پہلے کا وقت تھا۔ میرے آنے کی اطلاع سب کو مل چکی تھی، حویلی کے باغ میں فوارہ چل رہا تھا۔ سرسبز و شاداب لان پر جہاں بطخیں پھر رہی تھیں چائے کے لیے کرسیاں لگا دی گئی تھیں۔ حویلی کے گارڈز اور ملازم باری باری مجھ سے ملنے کے لیے آئے، میں نے رسماً سب کی خیر و عافیت دریافت کی۔

پھر ریشم شرماتی مسکراتی ہوئی نمودار ہوئی۔ اس کی گود میں مہینا سوا مہینے کا بچہ گلابی کپڑوں اور چادروں میں پھنسا ہوا خود بھی گلابی لگ رہا تھا۔ اس نے وہ بچہ میری گود میں دے دیا۔ ریشم کے شگفتہ چہرے پر مامتا کے اجالوں سے روشن مسکراہٹ تھی اور مامتا کا غرور تھا۔ اس کے پیچھے غنی آ کے کھڑا ہو گیا۔ ابھی زیادہ دن کی بات نہیں تھی کہ غنی ٹرک چلاتا تھا اور وہ حویلی کے باہر چھپ چھپ کے ملتے تھے پھر ان کی شادی بھی کل کی بات لگتی تھی۔

میں نے کہا۔ ''تم نے تو کمال کر دیا ریشم...... کتنا پیارا

بچہ ہے۔''

وہ کہنے لگی۔ ''ہم نے اس کا نام رشید رکھا ہے سر...... رشید احمد......''

میں چونکا۔ ''یہ تو میرے مرحوم والد کا نام تھا۔''

غنی نے کہا۔ ''اللہ ان کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ ہم پر ان کا ہاتھ نہ ہوتا تو کچھ بھی نہ ہوتا۔''

میں نے چوم کے بچے کو واپس کر دیا۔ ''اللہ اس کے نصیب اچھے کرے۔ ابھی صرف دعا دے رہا ہوں۔ اس کا انعام ادھار۔''

جب ریشم چلی گئی تو میں نے کہا۔ ''راجا...... تجھے کچھ شرم آئی؟'' اور پھر شہناز کی طرف دیکھا جو کچھ لال ہو رہی تھی۔

راجا نے آہ بھری۔ ''سوچا تو تھا فیکے پتر...... اور سوچا کیا تھا...... طے بھی کر لیا تھا لیکن......''

''لیکن کیا......'' میں نے کہا۔

راجا خفگی سے بولا۔ ''بتا ذرا اسے شہناز...... اب تک تو ہم ہنی مون منا کے واپس آ چکے ہوتے، کیا پتا ایک بچہ شہناز کی گود میں بھی ہوتا، لیکن تیری وجہ سے سب چوپٹ ہو گیا۔''

''یار میری وجہ سے کیسے......''

شہناز نے مسکرا کے کہا۔ ''دراصل جب تم لندن میں تھے تو ہم نے شادی کا پروگرام فائنل کر لیا تھا۔''

''ساری تیاری مکمل تھی، مہمانوں کی فہرست بن گئی تھی دعوت نامے کا مضمون لکھا جا چکا تھا۔ کارڈ کا ڈیزائن منتخب ہو گیا تھا۔ تاریخ بھی کسی حد تک طے تھی، بس تیری رسمی منظوری باقی تھی۔''

شہناز نے کہا۔ ''یہ ٹھیک ہے، اگر آپ خیر و عافیت کے ساتھ پہنچ جاتے تو ہم آپ کو یہ سرپرائز دیتے۔ رابعہ کو سب معلوم تھا، بس جو اس کے دل میں تھا وہ ہمیں معلوم نہ ہو سکا۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے ابھی تک یقین نہیں آتا کہ رابعہ پر یہ کیسا کیا پاگل پن سوار ہوا۔''

میں نے کہا۔ ''مجھے ایسا لگتا ہے وہ ابھی اندر سے نکل آئے گی، حالانکہ میں جانتا ہوں وہ یہاں نہیں ہے اور ہو بھی نہیں سکتی، پتا نہیں کیوں، میں اس کے لیے سوچے بغیر نہیں رہ سکتا۔''

''اسے معاف نہیں کیا جا سکتا فیکے پتر......''

''ہاں...... دستور تو یہی ہے۔ حاکم کے خلاف بغاوت کرنے والے کا سر قلم کر دیا جاتا ہے۔ آج بھی غداری کی سزا موت ہے، لیکن وہ ذہنی طور پر کسی نادان بچے کی طرح ہے، کیا ذہنی معذوری میں مبتلا بچوں کو ماں باپ قتل کر دیتے ہیں یا انہیں گھر سے باہر نکال دیتے ہیں؟''

''وہ بہت چالاک اور ہوشیار سمجھتی ہے خود کو۔ تو اس کے بارے میں پریشان مت ہو، وہ یہاں سے گئی تو ہماری زندگی سے گئی اور ہمارے لیے مر گئی۔ شاید دنیا کے لیے بھی مر گئی، وہ کہیں ہوتی تو معلوم ہو جاتا۔''

''تو یہی سمجھتا ہے کہ اس نے خودکشی کر لی ہوگی؟''

''اگر نہیں کی تو اسے کر لینی چاہیے، پولیس اسے تلاش کر رہی ہے، پولیس کے علاوہ بھی بہت سے لوگ اس کی تلاش میں ہیں مجھے تو لگتا ہے کسی روز اس کی لاش مل جائے گی۔''

''ایسا مت کہہ راجا......'' میں اٹھ کھڑا ہوا۔

ست بدھائی کا اسپتال ان دو مہینوں میں تیزی سے پھیلا تھا اور اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ڈاکٹر حسن اور ان کے بیٹے احمد حسن کے ساتھ اب ان کی بیٹی ٹینا بھی یہاں پہنچ گئی تھی۔ اس نے وحید سے شادی کر لی تھی جو اس حد تک میرا ہم شکل تھا کہ ٹینا نے مجھے وحید سمجھ لیا تھا۔ وہ ایک مصور تھا جسے میں نے لندن میں ڈھونڈ نکالا تھا۔ وہاں وہ اپنے فطری لاابالی پن کے باعث خوار پھر رہا تھا اور قرض خواہوں نے اس کا جینا محال کر رکھا تھا۔ اب وہ فراغت سے مصوری کر رہا تھا۔ اس نے جنگل میں اپنا اسٹوڈیو بنا لیا تھا اور بہت خوش تھا۔

یہ سب مجھے ڈاکٹر احمد نے بتایا۔ وہ میرے ساتھ اسپتال کا دورہ کرتے رہے۔ اس میں اب دو وارڈ مریضوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ایک میں مرد تھے، دوسرے میں عورتیں۔ ڈاکٹر احمد کی بیٹی جو ماہر امراض نسواں ہونے کے باوجود نفسیاتی مریض بن چکی تھی اب بالکل نارمل ہو گئی تھی اور پوری تندہی سے ڈاکٹر شہناز کے ساتھ مل کر دن رات مریضوں کی خدمت میں لگی رہتی تھی۔

''یہ آپ نے اتنا بڑا احسان کیا مجھ پر......'' نواز مہدی حسن نے باہر آ کے کہا۔ ''میں تو بالکل مایوس ہو چکا تھا ٹینا کی طرف سے۔''

''اللہ جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے، جو ہوتا ہے اپنے وقت پر ہوتا ہے۔ میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔''

''آپ نے وحید کو تلاش کیا۔ ٹینا کی زندگی سنور گئی۔ اب وہ وحید کی پینٹنگز کی نمائش کرا رہی ہے اسے مصروف دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہوتی ہے۔ بس ایک احمد حسن کی زندگی ایسے ہی گزر رہی ہے۔''

''فکر کیوں کرتے ہیں اس کا بھی کچھ ہو جائے گا۔''

ڈاکٹر مہدی حسن کچھ دیر میرے پاس بیٹھے رہے، پھر وہ مجھے آرام کرنے کا مشورہ دے کر چلے گئے۔ میں خود بھی اس وقت آرام کے موڈ میں تھا اس لیے راکنگ چیئر پر بیٹھ کر یوں ہی اخبار اٹھا لیا اور اسی وقت ریشم کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں بھاپ اگلتی کافی کا مگ تھا۔

''تمہیں کیسے معلوم ہوا ریشم کہ اس وقت میں کافی کی طلب محسوس کر رہا ہوں؟'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''لو جی، یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟'' ریشم نے ہنس کر کہا۔ ''مجھے معلوم ہے کہ جب آپ اس کرسی پر بیٹھ کر اخبار پڑھتے ہیں تو کافی ضرور پیتے ہیں۔''

مجھے اس کے مشاہدے پر حیرت نہیں ہوئی۔ وہ کافی عرصے سے میرے معمولات دیکھ رہی تھی۔

''غنی کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس نے کہاں جانا ہے جی...... وہ حویلی ہی میں کہیں خانگی انتظامات دیکھ رہا ہوگا۔''

''ایک کافی سے کام نہیں چلے گا ریشم!'' راجا نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ''کافی تو میں بھی پیوں گا۔''

''میں ابھی دو منٹ میں لاتی ہوں جی!'' ریشم نے کہا اور ہوا کے جھونکے کے مانند باہر نکل گئی۔

''رابعہ کا کوئی سراغ ملا؟'' میں نے راجا سے پوچھا۔

''رابعہ کی فکر اب چھوڑ دے فیکے پتر!'' کچھ دن آرام کر اور راجا نے بے زاری سے کہا۔ ''وہ اگر زندہ بھی ہوگی تو تیرے سامنے تو کبھی نہیں آئے گی۔ وہ کس منہ سے تیرے سامنے آئے گی اور کیوں آئے گی؟'' راجا کا موڈ ایک دم خراب ہو گیا۔ ''وہ تو اب تک کہیں مر کھپ گئی ہوگی، پولیس تو خیر کچھوے کی رفتار سے تفتیش کرتی ہے لیکن عبداللہ جان نے جس باصلاحیت افسر کو اپنے طور پر یہ کام سونپا ہے فیکے پتر! اسے بھی رابعہ کا کوئی سراغ نہیں ملا۔''

''وہ باصلاحیت افسر علم غیب تو نہیں رکھتا۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

اتنی دیر میں ریشم کافی کا دوسرا مگ لے آئی اور راجا کے نزدیک سائڈ ٹیبل پر رکھ کر چلی گئی۔

راجا نے کافی کا مگ اٹھایا ہی تھا کہ اس کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے جیب سے سیل فون نکالا اور اس کے اسکرین پر نظر ڈال کر چونک اٹھا۔ ''نور کی کال ہے۔'' اس نے کہا، پھر اس نے فون کان سے لگا لیا۔ ''ہیلو!...... ہاں میں راجا ہی بول رہا ہوں، میں خیریت سے ہوں...... تم کیسی ہو؟...... رفیق...... وہ بھی خیریت سے ہے...... نہیں نور...... ابھی یہ ممکن نہیں ہے، کیا، ابھی تم ایسا کچھ مت کرنا...... میں نے کہا نا کہ وہ خیریت سے ہے...... تمہیں یاد نہیں کہ اس نے تمہیں کیا ہدایات دی تھیں؟...... اچھا ایک بات مان لو...... تم فی الحال کوئی فیصلہ مت کرو...... مجھے آدھے گھنٹے بعد کال کر لینا...... ہاں ہاں، آدھے گھنٹے کا مطلب، آدھا گھنٹا یعنی تیس منٹ!...... ہیلو نور...... ہیلو!'' اس نے سیل فون کو دیکھا اور بولا۔ ''اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔''

اس کی یک طرفہ گفتگو سے مجھے کچھ اندازہ نہیں ہوا تھا کہ نور نے اس سے کیا کہا ہے؟ میں نے عالم اضطراب میں کافی کا ایک بڑا سا گھونٹ لیا کچھ کافی چھلک کر میرے کپڑوں پر بھی گری۔

''کیا کہہ رہی تھی نور؟'' میں نے پوچھا۔ ''وہ کسی پریشانی میں تو نہیں ہے۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے فیکے پتر!'' راجا نے ہنس کر کہا۔ ''نور پاکستان آ رہی ہے۔''

''کب آ رہی ہے اور کیوں آ رہی ہے؟'' میں نے کہا۔ ''تو نے اسے روکا نہیں کہ......''

''میں نے اس سے آدھے گھنٹے کی مہلت اسی لیے لی ہے۔ اب تو بتا، میں اس سے کیا کہوں؟ کیا تیری بات کرا دوں اس سے؟''

''یار، یہ تو بہت ٹیڑھا سوال ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اگر نور یہاں آ گئی تو لندن کے کاروباری معاملات بری طرح متاثر ہوں گے۔''

''تو پھر تو لندن چلا جا۔'' راجا نے کہا۔ ''فیکے پتر! مجھے نور کے لہجے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس نے پاکستان آنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اب میں تو اسے نہیں روک سکتا۔ میں کیا، اسے کوئی بھی نہیں روک سکتا۔ اب تو جلد ہی فیصلہ کر کہ کیا کرنا ہے۔ دس منٹ گزر چکے ہیں۔ وہ سیل فون ہاتھ میں لیے گھڑی دیکھ رہی ہوگی۔ وہاں رہ کر وہ گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ چلنا سیکھ گئی ہے۔''

میں نہیں چاہتا تھا کہ نور فوری طور پر پاکستان آئے۔ میں خود بھی فی الحال ست بدھائی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ یہاں کے بہت سے معاملات ایسے تھے جن کی وجہ سے میرا یہاں رکنا ناگزیر تھا۔ میں اٹھ کر عالم اضطراب میں ٹہلنے لگا۔

جب راجا کے دیے ہوئے وقت میں صرف تین منٹ رہ گئے تو میں نے اچانک کہا۔ ''تو اس سے میری بات کرا دینا۔ اب تو شاید وہ میری بات بھی مشکل سے مانے گی۔''

''آرام سے بیٹھ جا!'' راجا نے کہا۔ ''تیرے یوں ٹہلنے سے بات نہیں بنے گی۔ گھومتے گھومتے ساری عقل ٹخنوں میں آ جائے گی۔''

''یار، تجھے مذاق سوجھ رہا ہے۔'' میں نے منہ بنا کر کہا۔ ''وہ ایک منٹ بعد پھر فون کرے گی۔ مجھے بتا، میں کیا کروں؟''

''اوہ تو تو خود بہت بڑا افلاطون ہے۔ مجھ سے کیا پوچھتا ہے، پھر یہ بازی تو عشق کی بازی ہے۔ اس میں کہاں فٹ ہوتا ہوں میں فیکے پتر؟''

ٹھیک آدھے گھنٹے بعد پھر راجا کے سیل فون کی گھنٹی بجی۔

''لے بھئی جہانگیر، تیری نور جہاں نے زنجیر عدل کھڑکا ہی دی۔'' اس نے سیل فون کے اسکرین کو دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر اسے آن کر کے کان سے لگا لیا۔ ''ہیلو...... ہاں نورا!...... بھئی تم تو لندن میں رہ کر پوری انگریز ہو گئی ہو۔ تم نے تو واقعی آدھے گھنٹے بعد کال کر لی...... ہوتا اگر ہمارا پاکستان تو...... میں باتیں کہاں بنا رہا ہوں، میں تو حقیقت بیان کر رہا ہوں...... کیا؟ تم نے سیٹ بھی بک کرا لی؟...... میں نے کب کہا کہ تم مذاق کر رہی تھیں؟ اچھا لو، رفیق سے بات کرو۔'' اس نے اچانک سیل فون میری طرف بڑھا دیا۔

''ہیلو نورا!'' میں نے تھوک نگل کر کہا۔ ''تم ٹھیک تو ہو؟''

''آج کتنے عرصے بعد تمہاری آواز سنی ہے۔'' نور نے تنک کر کہا۔ ''اور تم پوچھ رہے ہو کہ تم ٹھیک تو ہو۔ آخر وہاں کیا ہو رہا ہے۔ تم لوگ آخر مجھے کیوں نہیں بتاتے؟''

''راجا نے تمہیں سب کچھ تو بتا دیا ہے۔ اب تو اس ڈرامے کا بلکہ ٹریجڈی کا ڈراپ سین بھی ہو گیا ہے۔''

''ٹھیک ہے، پھر میں پرسوں کی فلائٹ سے آ رہی ہوں۔''

''تم ابھی یہاں آ کر کیا کرو گی؟'' میں نے کہا۔

''میں کچھ نہیں جانتی۔'' نور نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ ''میں نے پرسوں کی فلائٹ میں سیٹ بک کرا لی ہے۔''

''نور، پلیز، میری خاطر کچھ دن اور صبر کر لو۔'' میں نے کہا۔ ''پھر یا تو میں خود لندن آ جاؤں گا یا تمہیں یہاں بلا لوں گا۔''

''آخر تم لوگ مجھے بتاتے کیوں نہیں کہ وہاں کیا کھچڑی پک رہی ہے؟'' نور نے جھنجلا کر کہا۔

''تمہیں راجا نے سب کچھ تو بتا دیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اب اور کیا سننا چاہتی ہو؟''

''تم سب لوگوں نے مجھے بالکل تنہا کر دیا ہے۔'' نور نے کہا۔ ''تمہیں تو اندازہ ہی نہیں ہو سکتا کہ میں کس کرب سے گزر رہی ہوں۔ ایک طرف تمہاری فکر دوسری جانب کاروباری معاملات مجھے پریشان رکھتے ہیں۔''

''میں جانتا ہوں جان!'' میں نے رومینٹک موڈ میں کہا۔ ''میں نے کہا تھا کہ بس کچھ دن کی بات ہے۔''

''اور وہ کچھ دن کتنے ہوں گے۔ ایک ہفتہ، ایک مہینہ، ایک سال؟'' نور نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''بس دو ہفتے سے زیادہ نہیں لگیں گے۔'' میں نے ... ''پھر یا تو تم ست بدھائی میں ہو گی یا پھر میں لندن پہنچ جاؤں گا۔''

''دو ہفتے کا مطلب دو ہی ہفتے ہے نا؟'' اس نے ... سے کہا۔

''ہاں بھئی، دو ہفتے کا مطلب دو ہی ہفتے ہوتا ہے، ... معنوں میں دو ہفتے کا مطلب کچھ اور ہوتا ہے؟''

''ٹھیک ہے، میں اب سے ٹھیک دو ہفتے بعد ست بدھائی پہنچ جاؤں گی۔'' نور کے لہجے میں دھمکی تھی۔ ''... اب تو شاید تمہارے پاس سیل فون بھی ہو گا؟''

''اب تو کیا مطلب؟'' میں نے بات کو مذاق میں اڑانے کی کوشش کی۔ ''سیل فون میرے پاس کب نہیں تھا۔ میں تو سوچ رہا ہوں کہ لندن میں اپنی سیل فون کی ایک کمپنی......''

''زیادہ باتیں مت بناؤ۔'' نور نے میری بات کاٹ دی۔ ''مجھے اپنا سیل نمبر بتاؤ۔''

میں نے فوراً اس کی فرمائش پوری کر دی۔

''یہ نمبر تمہارا ہی ہے نا؟'' نور کے لہجے میں شبہ تھا۔ ''میں ابھی اس نمبر پر کال کرتی ہوں۔'' اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

''کیا فرما رہی تھی ملکہ نور جہاں، عالم پناہ سے؟'' راجا نے پوچھا۔

''یہ تو تمہید تھی۔'' میں نے کہا۔ ''فرمائیں گی تو اب میرے سیل فون پر۔'' میں نے کہا۔ ''وہ مجھے ابھی کال......''

میری بات ادھوری رہ گئی کیونکہ اسی وقت میرے سیل فون کی گھنٹی بجی تھی۔

''نمبر تو تم نے واقعی صحیح دیا ہے۔'' نور میری آواز سن کر چہکی، پھر اچانک سنجیدہ ہو گئی۔ ''اب تو سب کچھ نارمل ہو گیا ہے رفیق! اب تو تم لندن آ سکتے ہو؟ تم نہیں جانتے، میں تمہارے بغیر خود کو کتنا تنہا محسوس کرتی ہوں۔'' اس کی آواز آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ''یا پھر میں کچھ دن کے لیے ست بدھائی آ جاؤں۔'' اس نے ایک سسکی لی۔

''ابھی بہت سے مسائل ہیں نورا!'' میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''میں نے تم سے وعدہ تو کیا ہے کہ دو ہفتے کے اندر اندر تم سے ملاقات ہو گی۔ لندن میں یا ست بدھائی میں۔ اس کا فیصلہ تو حالات پر ہو گا۔''

''ابھی تو تم نے کہا تھا کہ......''

''ہاں۔'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''میں نے کہا تھا کہ تم ست بدھائی آ جاتا لیکن ابھی میں نے اس مسئلے پر مزید غور کیا تو یہی فیصلہ کیا کہ جگہ کا تعین ہم بعد میں کریں گے۔''

''چلو، یوں ہی سہی لیکن لگ رہا ہے کہ تم مجھے پھر ٹال رہے ہو؟''

''میں تمہیں کیوں ٹالوں گا نور؟'' میں نے کہا۔ ''لگتا ہے وہاں رہ کر تم بہت شکی مزاج ہو گئی ہو؟''

''اچھا، ابھی مجھے ایک بزنس میٹنگ میں جانا ہے۔ میں رات میں کسی وقت کال کروں گی، اللہ حافظ!'' وہ ایک دم محبوبہ سے بزنس وومین بن گئی۔

''خدا حافظ نورا!'' میں نے کہا۔ پھر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

راجا بہت غور سے ہماری گفتگو سن رہا تھا۔ ''تو دو ہفتے میں یہاں کے مسائل سے نمٹ لے گا؟'' اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''نور تو کچھ دن کے لیے یہاں آ سکتی ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''مسائل تو زندگی بھر رہتے ہیں راجا!'' پھر میں چونک کر بولا۔ ''ہاں، وہ تیرے شادی کارڈ کا ڈیزائن اور مہمانوں کی لسٹ کہاں ہے؟''

''کیوں، کیا تو وہ کارڈ اپنے نام سے چھپوائے گا؟'' راجا نے کہا۔

''تو کیا بالکل عقل سے پیدل ہو گیا ہے؟'' میں نے کہا۔ ''وہ تیرے اور شہنازی کے نام سے چھپے گا۔ مہمانوں کی لسٹ مجھے دے۔ میں اس میں کچھ ترمیم اور اضافہ کروں گا۔ اتنا تو حق ہے مجھے؟''

''سارے حقوق تیرے ہیں فیکے پتر۔ تو چاہے تو پورے شہر کو بلا لے، چاہے تو صرف دو گواہوں کی موجودگی میں ایسا ہو جائے لیکن تجھے ابھی اس لسٹ کی کیا ضرورت پڑ گئی؟''

''یار، تم لوگ اچھی بھلی شادی کر رہے تھے۔ میری وجہ سے رنگ میں بھنگ پڑ گیا۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اب تجھے اور شہناز کو ہنی مون کے لیے روانہ کر ہی دوں۔''

''وہ بھنگ شاید تو نے پی لی ہے۔'' راجا نے کہا۔ ''تو کیا میری شادی میں اس حلیے میں شریک ہو گا۔ ساری بھاگ دوڑ تو ہی کرے گا۔ میں تو اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کروں گا۔ تیری صحت اس قابل ہے کہ تو......''

''میری صحت کو چھوڑ۔ میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ تو اپنی شادی کا پروگرام فائنل کر لے۔''

''تو کہیں گھاس تو نہیں کھا گیا ہے؟'' راجا نے مجھے گھورا۔ ''اس وقت ہم چاروں طرف سے مسائل میں گھرے ہوئے ہیں اور میں شادی رچا کر بیٹھ جاؤں؟''

اچانک راجا کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے اسکرین پر نمودار ہونے والا نمبر دیکھا اور بڑبڑایا۔ ''یہ کون ہے؟ نمبر تو نیا ہے۔'' پھر اس نے سیل فون کان سے لگا لیا۔ ''ہیلو!...... کون بول رہی ہو، یہ مجھے بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہاری آواز بہت اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ یہ بتاؤ کہاں سے بول رہی ہو؟...... تو پھر... فون کیوں کیا ہے؟...... کون رفیق...... تم تو اپنے طور پر اسے مار چکی ہو۔''

میں سمجھ گیا کہ وہ کال رابعہ کی ہے۔ میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔

''کون سا خون کا رشتہ رابعہ بی بی! تم نے تین مرتبہ اسی رشتے کا خون کرنے کی کوشش کی، اس کے بدترین دشمنوں سے جا ملیں۔ یہاں کی تمام خبریں... وہاں پہنچاتی رہیں، اب تمہیں اپنے خون کے رشتے یاد آ رہے ہیں؟...... نہیں، رفیق تم سے کوئی بات نہیں کرنا چاہتا...... میرے پاس اس کا سیل نمبر بھی نہیں ہے...... تو پھر ہم کیا کر سکتے ہیں؟'' راجا کا پارا آہستہ آہستہ چڑھتا جا رہا تھا۔ ''رفیق نے تو گفٹ ڈیڈ پر دستخط بھی کر دیے تھے۔ پھر تم کورٹ میں کیوں نہیں پہنچیں؟...... نیک نیتی؟...... رابعہ بی بی! میں نے تم جیسے بہت سے نیک نیت دیکھے بھی ہیں اور ان سے نمٹا بھی ہوں...... اس میں بھی تمہارا ہی کوئی مفاد ہو گا......''

میں نے ہاتھ بڑھا کر سیل فون راجا سے لینے کی کوشش کی لیکن اس نے بری طرح میرا ہاتھ جھٹک دیا اور ماؤتھ پیس میں بولا۔ ''کس عزت کی بات کر رہی ہو تم...... اس شیرازی خاندان کی عزت جسے تم بار بار پامال کرتی ہو...... ہماری طرف سے تم جاؤ جہنم میں، اب تمہارا ہم سے کوئی ناتا نہیں ہے۔ میرے لیے تو تم اسی دن مر گئی تھیں جب میں نے تمہیں زوہیب کے ساتھ دیکھا تھا...... بس اب یہ آنسو بہانا بند کرو اور اپنی ان لچھے دار باتوں سے زوہیب کو لبھاؤ۔ تم تو اس سے ٹوٹ کر محبت کرتی ہو۔ وہ بھی یہی دعویٰ کرتا تھا، پھر اب اس

کی محبت کیا ہوئی؟.....اچھا اب بکواس بند کرو، ہمارے پاس تمہاری مظلومیت کی داستان سننے کا وقت نہیں ہے..... مجھے ضرورت بھی نہیں ہے کہ میں تم سے رابطہ کروں، ناؤ گیٹ لاسٹ!'' یہ کہہ کر اس نے لائن کاٹ دی اور مجھے یوں گھورنے لگا جیسے اب تک وہ مجھ ہی سے گفتگو کرتا رہا ہو۔ وہ اس وقت شدید غصے میں تھا اس لیے میں نے اس سے کچھ پوچھنا بھی مناسب نہ سمجھا۔

اسی وقت شہناز کمرے میں داخل ہوئی اور وہاں کا کشیدہ ماحول دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ ''کیا ہوا؟'' اس نے پوچھا۔

''کیا تم دونوں پھر کسی بات پر لڑ رہے ہو؟''

''وہ تمہاری چہیتی کا.... فون آیا تھا۔ مجھ سے رفیق کا نمبر مانگ رہی تھی۔''

''کون رابعہ؟'' شہناز اچھل پڑی۔ ''کہاں ہے وہ؟''

''ہوگی کسی قبر میں۔'' راجا نے کہا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے، اس نے اپنا پتا مجھے دے دیا ہوگا؟ وہ ابھی صرف رفیق سے بات کرنا چاہ رہی تھی۔ وہ یا تو کسی ویرانے میں تھی یا پھر کسی ایسے بند کمرے میں جہاں مکمل سناٹا تھا۔''

''مجھے بتاؤ وہ نمبر۔'' شہناز نے کہا۔ ''میں اس سے بات کرتی ہوں۔''

''احمقانہ باتیں مت کرو شہناز!'' راجا جھنجلا گیا۔ ''وہ اتنی احمق نہیں کہ دوبارہ تمہیں اسی نمبر پر مل جائے گی۔'' راجا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''ویسے ہم ٹریس کر سکتے ہیں کہ یہ کال کہاں سے ہوئی ہے۔'' میں نے پہلی دفعہ اس معاملے میں زبان کھولی۔

''اس سے کیا ہوگا؟'' راجا نے منہ بنا کر کہا۔ ''وہ ابھی بول رہی ہوگی جہلم سے تو کال ریسیو ہونے تک وہ پہنچ جائے گی پنڈی، پھر تجھے اس کی اتنی فکر کیوں ہے فیکے پتر! وہ جیے یا مرے، ہمارے لیے سب برابر ہے۔''

''وہ اگر زندہ بھی ہوئی تو تیری آج کی باتوں کے بعد زندہ نہیں رہے گی۔'' میں نے کہا۔

''تو مر جائے۔'' راجا نے بپھر کر کہا۔ ''اگر تو اس کی قید سے نہ چھوٹتا تو تیرا کیا حشر ہوتا؟ کیا تو آج یہاں بیٹھا ہوتا؟ کیا اس کی قید میں رہ کر تیری یادداشت بھی کمزور ہوگئی ہے؟''

''میری یادداشت کو کیا ہوا؟''

''تیری باتوں سے مجھے ایسا لگ رہا ہے فیکے پتر! جیسے تجھے اس بدذات لڑکی سے ہمدردی ہو رہی ہے۔''

''بات ہمدردی کی نہیں، خون کے رشتے کی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کچھ بھی ہو وہ شیرازی خاندان کی عزت اور نواب رفیق شیرازی کی بہن ہے۔''

''بس کر فیکے!'' راجا بپھر گیا۔ ''بہت سن لی تمہاری خون کے اس رشتے کی گردان اور خاندانی عزت کی۔ اس بدچلن اور بدکردار لڑکی نے تو خاندان کی عزت کا جنازہ نکال دیا، ایک بار نہیں، کئی بار، تو اسی عزت کی بات کر رہا ہے؟''

''لیکن راجا......!''

''اب تو نے رابعہ کی بات کی تو میں اٹھ کر چلا جاؤں گا۔ اچھا بھلا موڈ غارت کر دیا اس منحوس.... فون کال نے۔''

میں نے راجا کو اتنے شدید غصے میں کم ہی دیکھا تھا۔ میں نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا ورنہ نتیجہ اس کے زبردست قسم کی جھڑپ کی صورت میں نکلتا۔

شہناز نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ راجا نے کہا۔ ''رابعہ کے موضوع پر کوئی بات نہیں ہوگی۔ یہ تم دونوں اچھی طرح سن لو اور دوسروں کو بھی سمجھا دو کہ اب اس حویلی میں رابعہ کا نام بھی نہیں لیا جائے گا۔''

''اچھا تو غصہ تھوک اور ریشم سے دوسری کافی منگوا۔ یہ کافی تو ٹھنڈی ہوگئی۔''

''اب بول تو کیا کہہ رہا تھا؟'' راجا نے کہا۔ ''مجھے شادی کارڈ کا ڈیزائن اور مہمانوں کی لسٹ چاہیے۔''

''شادی کارڈ؟'' شہناز نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں، موصوف ہماری شادی کرا رہے ہیں۔'' راجا نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''ہم چاروں طرف سے دشمنوں میں گھرے ہوئے ہیں اور یہ ہمیں ہنی مون پر بھیجنا چاہتا ہے۔''

چند لمحے کو شہناز کا چہرہ سرخ ہو گیا لیکن اس نے فوراً ہی خود پر قابو پالیا۔

''ان حالات میں ایسا کیسے ہوسکتا ہے رفیق؟'' شہناز نے کہا۔ ''ہر چیز پہلے کی طرح نارمل ہو جائے تو پھر یہ بھی کرلیں گے۔''

راجا اچانک جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے کہا۔ ''ارے بیٹھ، میں تیرے لیے کافی منگاتا ہوں۔''

''مجھے ایک ضروری کام یاد آگیا ہے۔'' راجا نے کہا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

''تمہارے سلسلے میں راجا جس ذہنی اذیت سے گزرا ہے، وہ بہت شدید تھی۔ وہ رات رات بھر ٹہلتا تھا۔'' شہناز نے کہا۔ ''بے بسی سے اپنے بال نوچتا تھا اور ہر گزرنے والا دن اس کی ذہنی اذیت میں اضافہ کر رہا تھا۔ پھر جب اسے یہ معلوم ہوا کہ رابعہ بھی ان کے ساتھ شریک ہے تو اس کی ذہنی کیفیت عجیب ہوگئی تھی۔ مجھے حیرت ہے کہ اس کا نروس بریک

ڈاؤن کیوں نہیں ہوا۔ خود مجھے بھی بہت شدید صدمہ پہنچا تھا کہ رابعہ بھی ایسا کر سکتی ہے۔ بس اس دن کے بعد سے راجا کو رابعہ سے نفرت ہو گئی ہے۔ مجھے تو یہ خوف ہے کہ اگر رابعہ اسے کہیں مل گئی تو وہ اسے کہیں قتل ہی نہ کر دے۔''

''وہ اتنا احمق نہیں ہے۔ جو لڑکی خود ہی موت کے منہ میں جانے والی ہو، راجا اس کا خون اپنے سر کیوں لے گا؟''

ٹینا نے کمرے میں جھانکا اور بولی۔ ''ڈاکٹر شہناز! ایک ایمرجنسی کیس میں آپ کی ضرورت ہے۔''

''چلو۔'' شہناز اٹھ کھڑی ہوئی۔

''نور اور پھر رابعہ کی.... فون کالز نے میری کافی بھی ٹھنڈی کر دی تھی۔ میں نے ریشم سے دوسری کافی لانے کو کہا۔

ہم سب لوگوں میں بلاشبہ نور آہنی اعصاب کی مالک تھی۔ مجھے اس سے یہ امید نہیں تھی کہ وہ نہ صرف اکیلی رہ کر میری گمشدگی کی اذیت برداشت کر لے گی بلکہ نور شیرازی اینڈ کمپنی کو بھی احسن طریقے سے چلاتی رہے گی۔

مجھے رات بھر بے چینی سی رہی اور بار بار آنکھ کھلتی رہی۔ عجیب و غریب خواب نظر آتے رہے۔ کبھی میں نے دیکھا کہ رابعہ ڈھانچے کی صورت میں میرے سامنے کھڑی ہے اور کہہ رہی ہے۔ اس جاگیر پر میرا بھی حق تھا، تم نے پوری جائداد پر قبضہ کر کے مجھے میرے حق سے محروم کر دیا ہے۔ ایک دفعہ وہ مجھے دلہن کے لباس میں نظر آئی اور بولی۔ ''دیکھو، میں تمہارے لیے دلہن بن گئی ہوں، اب تو مجھ سے شادی کر لو۔ کبھی مجھے رانا نظر آتا اور طنزیہ لہجے میں کہتا۔ ''تو سمجھتا ہے کہ تو میرے مقابلے پر آ جائے گا۔ میں نے تو تیرے خاندان کی عزت کو پامال کر دیا۔ تیرے ستارے اچھے تھے کہ وہ بدبخت لڑکی کورٹ نہیں پہنچی ورنہ میں دیکھتا تیری نوابی!''

میں صبح اٹھا تو طبیعت میں خاصی کسل مندی تھی۔ گرم پانی سے غسل کرنے اور کافی کا ایک کپ پینے کے بعد میری حالت کچھ سنبھلی۔

مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی اور کچھ کھانے کو دل بھی نہیں چاہ رہا تھا۔

شہناز کمرے میں داخل ہوئی تو مجھے حیرت نہیں ہوئی۔ ریشم نے اسے میری طبیعت کے بارے میں بتایا ہوگا۔ وہ اس وقت ڈاکٹر شہناز بن کر آئی تھی۔ اس نے مجھے بیڈ پر لیٹنے کا حکم دیا اور اسٹیتھسکوپ سے میرا سینہ چیک کیا، پھر بی پی آپریٹس کے ذریعے میرا بلڈ پریشر لیا اور بولی۔ ''تمہارا بلڈ پریشر کچھ ہائی ہے رفیق! کیا رات میں پھر نور کا ٹیلی فون آیا تھا؟''

''بلڈ پریشر کے ہائی ہونے سے نور کے.... فون کا کیا تعلق؟'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''رات اس کا فون نہیں آیا تھا لیکن مجھے رات بھر بے چینی سی رہی، اوٹ پٹانگ خواب دیکھتا رہا اور ان کی جزئیات پر غور کرتا رہا۔''

''ریشم بتا رہی تھی کہ تم نے ابھی تک ناشتا بھی نہیں کیا ہے۔ پہلے ناشتا کر لو، پھر میں تمہیں انجکشن دے دوں گی تاکہ تمہارا ڈپریشن دور ہو۔''

''ناشتا تو میں کر لوں گا لیکن تم انجکشن مت دینا۔ میں ابھی سونا نہیں چاہتا، میں جانتا ہوں کہ تم اینٹی ڈپریشن کے بہانے نیند کا انجکشن دے دو گی۔''

میں نے شہناز کی موجودگی میں دو سلائس اور ابلا ہوا انڈا زہر مار کیا اور زیر تعمیر اسپتال کے معائنے کے لیے نکل گیا۔ اسپتال کے لیے میں نے بہت جگہ رکھی تھی، جہاں نئے وارڈز کی تعمیر کا کام زور و شور سے جاری تھا۔ حویلی کے گرد فصیل نما ایک چار دیواری تھی۔ اس کا مین گیٹ اتنا بڑا تھا کہ اس میں سے ایک بڑا ٹرالر آسانی سے گزر سکتا تھا۔ اسی میں ایک چھوٹا ذیلی دروازہ بھی تھا۔ وہاں مجھے غنی نظر آیا جو ایک شخص کی تلاشی لے رہا تھا۔

میں خاموشی سے ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ غنی نے اس سے پوچھا۔ ''کہاں سے آئے ہو؟''

''سائیں، میں رحیم یار خان سے آیا ہوں۔ میں نے کافی عرصہ لاہور اور پنڈی میں بھی مزدوری کی ہے۔''

''کیا نام ہے تمہارا؟''

''سائیں میرا نام کرم داد ہے، لوگ مجھے کرماں کہتے ہیں۔''

''یہاں کس نے بھیجا ہے؟'' غنی نے پوچھا۔

''کسی نے بھی نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''مجھے معلوم ہوا تھا کہ یہاں کے نواب صاحب کوئی اسپتال بنا رہے ہیں جہاں مزدوروں کی ضرورت ہے۔ یہ سن کر میں بھی چلا آیا۔''

''یہاں تمہارے علاقے کا کوئی آدمی کام کرتا ہے؟''

''کرتا ہوگا سائیں۔'' کرماں نے کہا۔ ''لیکن مجھے معلوم نہیں۔''

''اپنا شناختی کارڈ دکھاؤ۔''

''شناختی کارڈ تو سائیں اس وقت نہیں ہے میرے پاس۔'' مزدور نے لجاجت سے کہا۔

''ٹھیک ہے، کل شناختی کارڈ لے کر آنا اور معلوم کرنا کہ تمہارے علاقے کا کوئی اور مزدور بھی یہاں کام کرتا ہے؟ کل تمہیں مزدوری مل جائے گی۔ ہاں، شناختی کارڈ کی کاپی نہیں چلے گی، اصلی شناختی کارڈ لے کر آنا۔''

وہ مزدور گیٹ ہی سے واپس چلا گیا۔

غنی مڑا تو اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ وہ ایک دم مستعد ہو گیا۔ میں نے ہنس کر کہا۔ ''یہ تم اسے مزدوری دے رہے تھے یا کسی اعلیٰ ملازمت کے لیے اس کا انٹرویو کر رہے تھے؟''

''سیکیورٹی کے لیے ایسا کرنا پڑتا ہے سر!'' غنی نے کہا۔ ''ورنہ مزدور کے بھیس میں کوئی بھی یہاں آ سکتا ہے۔''

''وہ تو اصلی شناختی کارڈ لے کر بھی آ سکتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''صرف تلاشی ہی کافی ہے کہ کوئی مزدور کسی قسم کا اسلحہ لے کر تو اندر نہیں جا رہا ہے۔''

''یس سر!'' غنی نے مستعدی سے جواب دیا۔

''میں وہاں سے ایم ایس کے آفس میں چلا گیا۔ کمرے میں اس وقت کوئی نہیں تھا۔ ایم ایس صاحب غالباً راؤنڈ پر تھے۔

میں واپس جانے ہی والا تھا کہ وہاں رکھے ہوئے.... فونز میں سے ایک کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے یہ سوچ کر کال ریسیو کر لی کہ ممکن ہے ڈاکٹر صاحب کا کوئی ضروری.... فون ہو۔

دوسری طرف آپریٹر تھی۔ اس نے مودب لہجے میں کہا۔ ''سر، ابھی ابھی نواب صاحب آپ کے کمرے میں داخل ہوئے ہیں۔ ان کے لیے لاہور سے کال ہے، اگر کہیں تو میں اسے یہاں ٹرانسفر کر دوں؟''

''کس کی کال ہے روبی؟'' میں نے پوچھا۔

''سر...... کوئی مس فریال ہیں۔'' روبی کچھ گھبرا گئی۔ اسے توقع نہیں تھی کہ ... فون براہ راست میں اٹھا لوں گا۔

''مس فریال؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''کہاں سے کال کر رہی ہیں؟''

''سر، انہوں نے یہ تو نہیں بتایا کہ کال کس شہر سے ہے۔''

فریال کو اچانک میری یاد کیسے آ گئی؟ میں نے سوچا، کیا اس کی اپنے عاشق سے ان بن ہو گئی یا پھر کوئی اور بات ہے۔ میں اس سے ہر قسم کا ناتا توڑ چکا تھا۔ وہ ایک طرح سے میرے لیے مر گئی تھی۔ پھر اچانک اسے میری کیا ضرورت پڑ گئی؟

میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی روبی سے کہا۔ ''بات کراؤ۔''

دوسرے ہی لمحے.... فون پر جو آواز مجھے سنائی دی، اسے سن کر خون میری کن پٹیوں میں ٹھوکریں مارنے لگا، وہ فریال نہیں رابعہ تھی۔

اس نے خوشامد بھرے انداز میں جلدی سے کہا۔ ''رفیق پلیز.... ؟ فون بند مت کرنا۔ میں تم سے آخری بار بات کرنا چاہتی ہوں۔ پھر میں کبھی تم سے بات نہیں کروں گی، تم سے کیا میں کسی سے بھی بات کرنے کے قابل نہیں رہوں گی۔''

''بولو، کیا کہنا چاہتی ہو؟'' میں نے اس کی بات پر توجہ دیے بغیر سرد لہجے میں پوچھا۔

اس کے ساتھ ہی میں نے اپنا سیل فون نکالا اور راجا کو ایس ایم ایس کر دیا کہ اس کال کو فوری طور پر ٹریس کرنے کی کوشش کرو۔

''رفیق! میں نے جو کچھ تمہارے ساتھ کیا ہے۔ اس کے لیے پشیمانی اور ندامت تو بہت چھوٹے الفاظ ہیں۔ تم شاید میری بات کا یقین نہ کرو مگر یہ سچ ہے کہ مجھے زوہیب نے ورغلا دیا تھا۔''

''تمہیں زوہیب نے ورغلا دیا تھا یا تم نے اسے ورغلایا تھا کہ ست بدھائی کی جاگیر ہتھیانے کا یہی ایک طریقہ ہے۔''

''میری بات کا یقین کرو رفیق! زوہیب سے ایک پارٹی میں ملاقات ہوئی تھی۔ وہ مجھ سے بے تکلف ہو گیا اور......''

''اس نے تمہیں ورغلا دیا کہ رفیق کا خاتمہ کر دو......'' میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''اس نے تو صرف اشاروں کنایوں میں یہ بات کی تھی۔ وہ دراصل مجھے آزما رہا تھا۔ میں نے کھل کر اس سے کہا کہ اگر رفیق راستے سے ہٹ جائے تو ست بدھائی کی یہ جاگیر میری ہو سکتی ہے۔''

''میں اس کہانی کے پورے پس منظر سے واقف ہوں۔ تم یہ بتاؤ کہ اب کیا کہنا چاہتی ہو؟'' میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔

''مجھے تو جو کچھ کہنا تھا، وہ میں تم سے آخری ملاقات میں کہہ چکی تھی۔'' رابعہ نے کہا۔ اس کی آواز آنسوؤں سے بوجھل ہو رہی تھی۔

''تم نے میرا جواب بھی سن لیا تھا۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''اب کیا چاہتی ہو؟''

''رفیق! مجھے جائداد، جاگیر، کچھ نہیں چاہیے، مجھے صرف تمہاری پناہ چاہیے ورنہ زوہیب کے آدمی مجھے زیادہ دیر زندہ نہیں رہنے دیں گے۔''

''اس کے باوجود کہ تم نے میری موت کا پورا پورا

سامان کر دیا تھا۔ اگر میری زندگی نہ ہوتی تو میں اسی قید خانے میں بھوکا پیاسا مر جاتا اور ہاں، اب مجھے..... فون کرنے کی کوشش مت کرنا۔''

''رفیق! میری بات......'' اچانک..... فون کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

کیا... رابعہ زوہیب کے آدمیوں کے ہتھے چڑھ گئی؟ میں نے سوچا یا پھر اس کے سیل فون کا کریڈٹ ختم ہو گیا؟ ممکن ہے اس نے جان بوجھ کے سلسلہ منقطع کر دیا ہو۔ وہ بہت چالاک تھی، سمجھ گئی ہو گی کہ میں اس کی کال ٹریس کرنے کی کوشش کروں گا۔ ست بدھائی میں ابھی ایسے جدید آلات نہیں تھے جن سے کسی سیل فون کی کال کو ٹریس کیا جا سکے۔

میں نے ریسیور کریڈل پر رکھا اور بوجھل قدموں سے باہر نکل گیا۔ مجھے ابھی کمرے میں پہنچے ہوئے مشکل سے دس ہی منٹ ہوئے تھے کہ راجا کمرے میں داخل ہوا۔ ''کیا ضرورت تھی تجھے رابعہ سے بات کرنے کی؟'' اس نے تند لہجے میں پوچھا۔

''اس نے مجھے فریال کے نام سے..... فون کیا تھا۔'' میں نے کہا۔

''تو فریال تیری کون سی سگی ہے فیکے پتر؟'' راجا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔'' وہ لاہور میں عیش کر رہی ہے، لندن اور پیرس میں شاپنگ کرتی ہے۔ اسے کیا ضرورت ہے کہ وہ تجھے..... فون کرے؟''

''میں بھی اس سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن پھر نہ چاہتے ہوئے بھی بات کر لی۔''

''اور دوسری طرف نکلی رابعہ؟'' راجا نے پھر طنز کیا۔ اس نے ریسیور اٹھایا اور آپریٹر سے کہا۔ ''آئندہ کوئی کال نواب صاحب کے بجائے ڈاکٹر شہناز کو ٹرانسفر کرنا روبی! نواب صاحب آج کل بہت مصروف ہیں۔'' یہ کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا۔

''کچھ معلوم ہوا کہ وہ کہاں سے کال کر رہی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ ست بدھائی ہے فیکے پتر!'' راجا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تو اس وقت لندن یا نیو یارک میں نہیں ہے کہ جہاں پولیس ایک منٹ میں کال ٹریس کر کے بندے کے سر پہ پہنچ جاتی ہے۔ ہاں اتنا ضرور معلوم ہو گیا ہے کہ وہ دینہ کے نزدیک سے بات کر رہی تھی۔''

''یار، پھر بات کرتے کرتے اچانک لائن کٹ گئی، کہیں وہ......''

''ماری تو نہیں گئی؟ یہی کہنا چاہتا ہے نا تو؟ اگر ماری گئی ہو تو بہت اچھا ہے۔ اسے تو اب تک مر جانا چاہیے تھا۔''

''راجا! تو اتنا سفاک اور سنگ دل کب سے ہو گیا؟'' میں نے پوچھا۔

''تیرے چکر میں، میں پاگل ہو گیا تھا۔ میں نے کبھی خود کو اتنا بے بس محسوس نہیں کیا تھا۔ میں کیا آئی جی صاحب بھی بے بس تھے۔ سوال تھا تیری زندگی کا ورنہ میں زوہیب ہی کو اٹھوا لیتا۔ رابعہ ہمارے ساتھ تھی اور اسے پل پل کی خبریں پہنچا رہی تھی۔ اسے زوہیب کے ساتھ دیکھ کر میں نے قسم کھائی تھی کہ اگر تجھے کچھ ہوا تو میں ان دونوں کو اپنے ہاتھ سے گولی مار دوں گا۔''

دروازے پر دستک ہوئی اور غنی اندر داخل ہوا۔ ''سر، وہ انسپکٹر صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''کس سلسلے میں؟'' راجا نے پوچھا۔

''یہ تو انہوں نے نہیں بتایا۔''

''ٹھیک ہے، ان سے کہو کہ انتظار کریں، نواب صاحب ابھی مصروف ہیں۔'' راجا نے کہا۔

غنی اس کا جواب سن کر واپس چلا گیا۔

''یار، یہ انسپکٹر یہاں کیوں آیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''آیا ہو گا کوئی مسئلہ لے کر۔ تجھے کس بات کی پریشانی ہے، بیٹھا رہنے دے اسے۔ کوئی خاص بات ہو گی تو وہ پھر غنی کو بھیجے گا۔''

غنی چند منٹ بعد پھر آیا اور بولا۔ ''سر! وہ انسپکٹر کہہ رہا ہے کہ معاملہ فوری نوعیت کا ہے۔ میرا فوری طور پر نواب صاحب سے ملنا بہت ضروری ہے۔''

''اسے وزیٹنگ روم میں بٹھاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''میں ابھی کچھ دیر میں آتا ہوں۔'' پھر میں راجا سے مخاطب ہوا۔ ''انسپکٹر آخر کیوں آیا ہے؟''

''یہ سوال تو دوسری دفعہ مجھ سے پوچھ رہا ہے۔'' راجا نے کہا۔ ''تجھے اتنی بے چینی ہے تو چل کر اس سے بات کر لے۔''

میں اور راجا وزیٹنگ روم میں داخل ہوئے تو انسپکٹر ایک صوفے پر بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔

مجھے دیکھ کر اس نے پھرتی سے سگریٹ ایش ٹرے میں بجھایا اور کھڑا ہو گیا۔ ''زحمت کی معذرت چاہتا ہوں نواب صاحب!'' انسپکٹر نے مودب لہجے میں کہا۔

اگر میں نواب رفیق شیرازی کے بجائے صرف رفیق ہوتا تو وہ یہاں آنے کے بجائے پولیس والوں کو میرے

بھیجتا کہ جاؤ اوئے فیکے کو اٹھا لاؤ۔ پولیس کے سپاہی مجھے مارتے اور ٹھڈے لگاتے ہوئے اس کے حضور پیش کر دیتے۔ وہ فرعون بنا اپنی کرسی پر بیٹھا رہتا اور مجھے بیٹھنے تک کی اجازت نہ دیتا۔ وہ میرا قصور بعد میں بتاتا، پہلے اٹھ کر دو چار تھپڑ مارتا، غلیظ گالیاں دیتا اور مجھے حوالات میں بند کر دیتا۔ یہ اس کی مجبوری تھی کہ وہ انتظار کرنے اور مجھ سے اس لہجے میں بات کرنے پر مجبور تھا۔

''کیا بات ہے انسپکٹر؟'' راجا نے پوچھا۔ ''ایسا کون سا ضروری کام تھا کہ تم نے نواب صاحب کو ڈسٹرب کیا؟''

''ہمیں ست بدھائی سے دس بارہ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک عورت کی لاش ملی ہے۔'' انسپکٹر نے کہا۔

میرے جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ مجھے بے اختیار خیال آیا کہ وہ لاش رابعہ کی ہو گی۔

''تو پھر ہم کیا کریں؟'' راجا نے درشت لہجے میں پوچھا۔

''اس عورت کو بہت قریب سے گولی ماری گئی ہے۔ اتنے قریب سے کہ اس کا چہرہ مسخ ہو گیا ہے لیکن اس کے ہاتھ میں جو انگوٹھی ہے، اس پر "R" لکھا ہوا ہے اور گلے میں ایک لاکٹ بھی ہے۔ اس لاکٹ میں نواب صاحب کی تصویر ہے۔''

رابعہ لاکھ بری سہی لیکن تھی تو میری چچا زاد! اس کی موت کی خبر سن کر میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا، اس نے وہ انگوٹھی خاص طور پر بنوائی تھی اور مجھے بتایا تھا کہ "R" کا مطلب رابعہ نہیں بلکہ رفیق ہے۔ لاکٹ کا علم مجھے نہیں تھا، ممکن ہے جب وہ آخری بار مجھ سے ملنے آئی ہو تو اس کے گلے میں وہ لاکٹ بھی ہو۔

''لاش کہاں ہے؟'' راجا نے پوچھا۔

''دینہ کے مردہ خانے میں۔ یہاں تو ایسی کوئی سہولت موجود نہیں ہے۔ لاش کی شناخت کے لیے نواب صاحب کو دینہ تک چلنے کی زحمت کرنا پڑے گی۔''

''تم بیٹھو، میں ابھی آتا ہوں۔'' میں نے کہا اور کمرے سے باہر آ گیا۔

راجا بھی میرے پیچھے پیچھے باہر آیا اور بولا۔ ''خس کم جہاں پاک! تو اتنا پریشان کیوں ہے فیکے پتر! ایسی بدکردار اور بدچلن عورتوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔ ایک دن فریال بھی اسی انجام کو پہنچے گی۔'' پھر اس نے ایک ملازم سے کہا۔ ''غنی کو یہاں بھیج دو۔''

غنی فوراً ہی وہاں پہنچ گیا۔

''گاڑی نکالو۔ نواب صاحب دینہ جا رہے ہیں۔'' راجا نے کہا اور پورے پروٹوکول کے ساتھ۔ گارڈز کی ایک گاڑی آگے ہو گی اور دوسری پیچھے۔ تم بھی اپنی یونیفارم پہن لو۔''

''اس طمطراق کی کیا ضرورت ہے؟'' میں نے کہا۔

''طمطراق!'' راجا نے کہا۔ ''یار نواب رفیق شیرازی کیا سائیکل یا موٹر سائیکل پر جائیں گے۔ وہ اپنی شان کے مطابق جائیں گے کہ رانا ہاؤس کا کوئی آدمی دیکھے تو اس کے سینے پر سانپ لوٹ جائے۔''

ذرا سی دیر میں یہ خبر پوری حویلی میں پھیل گئی کہ رابعہ کی لاش مل گئی ہے اور میں اس کی شناخت کے لیے جا رہا ہوں۔ رابعہ کی تمام تر دھوکے بازیوں اور غداری کے باوجود حویلی کی خواتین نے آنسو بہانا شروع کر دیے۔ ان میں ریشم اور شہناز بھی شامل تھیں۔ شہناز نے تو خیر فوراً ہی خود پر قابو پا لیا لیکن ریشم سسکیاں بھرتی رہی۔ اس نے رابعہ کے ساتھ بہت وقت گزارا تھا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد نواب رفیق شیرازی آف ست بدھائی کا قافلہ حویلی سے برآمد ہوا۔ سب سے آگے میرے گارڈز کی گاڑی تھی جو یونیفارم میں تھے اور پوری طرح مسلح تھے، درمیان میں میری ہنڈا سوک تھی۔ اس پر ریاست کا پرچم لہرا رہا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر غنی تھا۔ وہ بھی یونیفارم میں تھا اور پوری طرح مسلح تھا۔ میرے پیچھے محافظوں کی ایک اور گاڑی تھی۔ وہ سب بھی یونیفارم میں اور مسلح تھے۔

میرے ساتھ راجا تھا اور میں گاڑی کی پچھلی نشست پر بیٹھا تھا۔

میرے پاس آنے والا انسپکٹر کھٹارا سی ایک موٹر سائیکل پر آیا تھا۔ اسے میں نے پہلے ہی روانہ کر دیا تھا۔

''یار راجا! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک لاش کی شناخت کے لیے اس کروفر کی کیا ضرورت تھی۔ ہم دونوں خاموشی سے جا کے بھی تو اسے شناخت کر سکتے تھے۔'' میں نے کہا۔

''ست بدھائی سے جی ٹی روڈ تک رانا کے بہت سے آدمی بھی دیکھیں گے، بے شمار لوگ دیکھیں گے۔ انہیں بھی تو اندازہ ہو کہ اب اس علاقے پر رانا کی اجارہ داری نہیں ہے بلکہ اس کا ایک مضبوط حریف بھی موجود ہے۔ یہ باتیں الیکشن کے موقع پر بہت کام آتی ہیں۔ ویسے بھی رانا کے مقابلے میں تو ہر دل عزیز ہے فیکے پتر!'' راجا نے ہنس کر کہا۔ ''یہ الگ بات ہے کہ اس ہر دل عزیزی میں عورتوں کا تناسب کچھ زیادہ

ہے۔"

"تیری یہ بات غلط ہے راجا؟" میں نے کہا۔

"عورتوں کے معاملے میں رانا مجھ سے میلوں آگے ہے۔"

"میں ہر دل عزیزی کی بات کر رہا ہوں۔ عیاشی کی نہیں۔ رانا تو عورتوں پر پیسے لٹاتا ہے اور وہ عورتیں اس وقت یہی ظاہر کرتی ہوں گی کہ اس علاقے میں رانا سے بڑا، طاقت ور اور سخی جاگیردار کوئی نہیں ہے لیکن وہ دل ہی دل میں اسے گالیاں دیتی ہوں گی اور صبح ہوتے ہوتے رانا بھی سب کچھ بھول جاتا ہوگا اور وہ عورتیں بھی، کیا سمجھا؟"

"ارے یار، تو نے تو پوری تقریر کر ڈالی۔"

"اچھا تو خود دیکھ سڑک کی دونوں اطراف کتنے لوگ کھڑے عقیدت اور محبت سے تیری گاڑی کو دیکھ رہے ہیں، کتنے لوگ ہاتھ اٹھا اٹھا کر سلام کر رہے ہیں۔ ایسی مقبولیت کو تو صدر بش بھی ترستا ہوگا۔ فیکے پتر!"

"اب تو مجھے زیادہ آسمان پر مت چڑھا۔"

"چل نہیں چڑھاتا، نیچے آجا۔" راجا نے ہنس کر کہا۔ پھر غنی سے بولا۔ "او یار کوئی اچھا سا گانا ہی چلا دے۔"

غنی نے فوراً گاڑی کا ڈیک آن کر دیا اور نصرت فتح علی کی آواز گاڑی میں گونجنے لگی۔ پیا، رے، پیا، رے، پیا، رے، پیا، رے، تورے بنا لاگے نہیں مارا جیا رے۔"

"میرے خاندان میں ایک موت ہوگئی ہے اور تو موسیقی سے دل بہلا رہا ہے؟" میں نے منہ بنا کر کہا۔

"اس کی موت تو کئی ہفتے پہلے ہو چکی ہے فیکے پتر!" راجا نے کہا۔

میں خاموش ہوگیا۔ مزید اس موضوع پر بولتا تو راجا کا موڈ خوامخواہ خراب ہو جاتا۔ اس کے دل میں رابعہ کے خلاف جو نفرت پیدا ہو چکی تھی، اسے دیکھتے ہوئے میں نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔

گاڑی میں ڈیک گونج دار آواز میں بج رہا تھا لیکن نہ جانے کیوں مجھ پر ڈپریشن طاری تھا۔ رابعہ غدار تھی، زوہیب کی مخبر تھی اور سب سے بڑھ کر میری جان لینا چاہتی تھی، اس کے باوجود وہ میرے خاندان کی آخری نشانی تھی۔ میں نے اسے بہن کا درجہ دیا تھا۔ ہم اسی کروفر کے ساتھ تھانے پہنچ گئے۔ ہمیں اطلاع دینے والا انسپکٹر بھی شاید اسی وقت پہنچا تھا کیونکہ میں نے اسے موٹر سائیکل سے اترتے دیکھا تھا۔ پھر وہ تیزی سے ہماری پیشوائی کو آگے بڑھا۔

اس سے پہلے ہی غنی نے اتر کر گاڑی کا عقبی دروازہ کھول دیا تھا اور مودب انداز میں میرے اترنے کا انتظار کر رہا تھا۔

انسپکٹر نے ایک دفعہ پھر مجھ سے معذرت کی۔ "آپ کو اتنی زحمت دے رہا ہوں۔ یہ بھی قانون کا تقاضا ہے نواب صاحب! مرنے والے کی لاش کو اس کے ورثا ہی شناخت کرتے ہیں۔"

"تم اور کتنے تقاضے پورے کرتے ہو قانون کے؟" راجا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"میں کیا عرض کروں جناب عالی!" انسپکٹر نے انکساری سے کہا، ورنہ اس کے چہرے پر تو اس وقت ایسے تاثرات تھے کہ راجا کو فوری طور پر حوالات میں بند کر دے۔

"آیئے میرے ساتھ!" انسپکٹر نے کہا۔ "آپ کو دیہہ کے سرکاری اسپتال تک چلنا پڑے گا۔"

میں اور راجا اپنی گاڑی میں سرکاری اسپتال کی طرف چل دیے۔

انسپکٹر نے مردہ خانے کا دروازہ کھلوایا تو بدبو کا خفیف سا بھپکا آیا۔ یہ موت کی بو تھی۔ وہاں کئی مردے تھے جو اپنے لواحقین کے انتظار میں وہاں پڑے ہوئے تھے۔ کسی کا سینہ کھلا ہوا تھا، کسی کا منہ کھلا ہوا تھا، کسی کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور کوئی زخموں سے چور نشان عبرت بنا ہوا تھا۔ ان میں سے ہر مردہ گویا چیخ چیخ کر ہم سے کہہ رہا تھا کہ کل تک ہم بھی تمہاری طرح جیتے جاگتے، ہنستے بولتے انسان تھے، آج بے بس ولاچار پڑے ہیں، دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو۔

وہاں گویا موت کی بو پھیلی ہوئی تھی اور مردہ خانے میں ساٹھ واٹ کا ایک مدقوق سا بلب روشن تھا۔ جس لاش کی شناخت ہمیں کرنا تھی، وہ مردہ خانے کے آخری سرے پر تھی۔

انسپکٹر ایک لاش کے سرہانے جا ٹھہرا۔ اس کے چہرے پر میلی سی جو چادر تھی، وہ بھی خون میں تر ہوگئی تھی۔ انسپکٹر نے لاش کے چہرے سے کپڑا ہٹایا تو مجھے اس کا مسخ شدہ چہرہ نظر آیا۔ مجھے اچانک متلی سی محسوس ہوئی لیکن میں نے خود پر قابو پالیا۔ پھر انسپکٹر نے اس کے جسم سے پوری چادر ہٹا دی۔

میں نے اس کے جسم پر نظر ڈالی۔ مجھے کچھ صاف نظر نہیں آرہا تھا یا پھر وہاں روشنی ہی اتنی کم تھی۔

"کیا یہاں صرف یہی ایک بلب ہے؟" راجا نے کہا تو مجھے یقین آیا کہ قصور میری نظروں کا نہیں بلکہ روشنی کا ہے۔ "اس روشنی میں تو کپڑوں کا رنگ بھی واضح نہیں ہے۔"

"میں ابھی لائٹ کا بندوبست کرتا ہوں جناب عالی!" انسپکٹر نے کہا۔ "ویسے اپنا بندہ تو اندھیرے میں بھی پہچانا جاتا ہے۔"

"اگر تمہارا چہرہ مسخ ہو اور تم یہاں اس نیم اندھیرے میں پڑے ہو تو کیا تمہارے لواحقین تمہیں پہلی نظر میں پہچان لیں گے؟" راجا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں جناب عالی!" انسپکٹر کے لہجے میں ناگواری تھی۔

"اوئے غلام محمد!" اس نے بلند آواز میں کسی کو پکارا۔ "وڈا بلب نکال کر لے آ۔ نواب صاحب کو شناخت میں دشواری ہو رہی ہے۔"

"ہم اس وقت تک باہر ٹھہرتے ہیں۔" میں نے کہا۔ موت کی اس بھیانک بو سے میرا دم گھٹ رہا تھا۔ کچھ یہی کیفیت راجا کی بھی تھی۔ میں نے کھلی فضا میں آکر کئی گہرے سانس لیے لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بدبو دماغ میں بس کر رہ گئی ہے۔

تھوڑی دیر بعد غلام محمد نے دو سو واٹ کے ایک بلب کا انتظام کر لیا تھا۔ جس کی روشنی پھیلنے سے میری آنکھیں چندھیا گئیں۔

میں نے بغور رابعہ کے جسم کا جائزہ لیا۔ اگرچہ زندگی میں کبھی اسے اتنے غور سے نہیں دیکھا تھا کہ اس کے جسم سے اسے شناخت کر سکتا۔ البتہ اس کے جسم پر لباس خاصا قیمتی اور جدید تراش کا تھا۔ ہاں، مجھے رابعہ کے خوبصورت ہاتھ اور پیر اچھے لگتے تھے۔ میں نے اسے ہاتھوں ہی سے شناخت کیا۔ اس کی انگلی میں وہ انگوٹھی بھی تھی جس پر انگریزی حرف "R" کندہ تھا۔ گلے میں لاکٹ بھی تھا جس کا تذکرہ انسپکٹر نے کیا تھا۔ اس نے لاکٹ کو کھول کر دکھایا۔ اس کے ایک حصے میں میری تصویر تھی، دوسرا حصہ خالی تھا۔ بلاشبہ وہ لاش رابعہ ہی کی تھی۔

"اب تو تسلی ہوگئی سرکار؟" انسپکٹر نے کہا۔

"ہاں" میں نے بوجھل آواز میں کہا۔ "یہ لاش رابعہ ہی کی ہے۔" یہ کہہ کر میں تیزی سے باہر نکل گیا۔

میرا سر بری طرح چکرا رہا تھا اور میری عجیب سی کیفیت ہو رہی تھی۔ رابعہ جیسی بھی تھی، میری چچا زاد تھی۔ ہم دونوں ساتھ کھیل کر جوان ہوئے تھے۔ راجا نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور اپنے رومال سے میرے آنسو خشک کیے تو مجھے احساس ہوا کہ میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔

"میں نے رپورٹ تیار کر لی ہے نواب صاحب!" انسپکٹر نے کہا۔ "مرحومہ کی انگوٹھی، لاکٹ، ان کی چوڑیاں، بالیاں، کپڑوں اور جوتوں سمیت تمام چیزیں اس میں تحریر تھا۔ یہ چیزیں عدالت سے آپ کو مل جائیں گی۔" ہم لوگ ایک مرتبہ پھر تھانے روانہ ہوگئے۔ "اب ذرا آپ ایک فارم پر دستخط کر دیں۔" انسپکٹر نے کہا۔

"ہم تو گاڑی میں بیٹھے ہیں، تم وہ فارم لے کر وہیں آجاؤ۔" راجا نے کہا۔ میں گاڑی کی سیٹ پر گویا ڈھیر ہوگیا۔

غنی نے گاڑی اسٹارٹ کی تو راجا نے کہا۔ "ابھی ٹھہرو، انسپکٹر ایک کاغذ پر رفیق کے دستخط بھی لے گا۔"

انسپکٹر چند منٹ بعد نمودار ہوا۔ وہ یوں خراماں خراماں چلا آرہا تھا جیسے اپنے گھر کے لان میں ٹہل رہا ہو۔ پیٹ سے نیچے کھسکنے والی پینٹ کو وہ بار بار اوپر کرتا تھا۔ اس کے چہرے پر جو خباثت تھی، اسے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ خود کو اس علاقے کا بادشاہ سمجھتا ہے۔ وہ زیر تفتیش ملزمان سے جو سلوک کرتا ہوگا، مجھے اس کا بھی اندازہ تھا کیونکہ میں خود بھی اس مرحلے سے گزر چکا تھا۔

وہ کچھوے کی رفتار سے گاڑی کے پاس آیا اور ایک فارم میری طرف بڑھا دیا۔ اس کی رو سے اس لاش کو میں نے اپنی چچا زاد رابعہ کی حیثیت سے شناخت کر لیا تھا۔ میرے دستخط کرنے سے پہلے راجا نے بھی اس پر ایک نظر ڈالی اور میں نے اس پر دستخط کر دیے۔ میرا دل غم سے بوجھل ہو رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ دھاڑیں مار مار کے روؤں۔ نہ جانے کیوں میری یہ کیفیت ہو رہی تھی؟

"سرکار!" انسپکٹر نے آہستہ سے کہا۔ "اگر آپ کا حکم ہو تو لاش کا پوسٹ مارٹم روک دیا جائے؟ مرنے والی تو اپنی جان سے گئی اب اس کی میت کی بے حرمتی کرنے سے کیا فائدہ؟"

"یہ رعایت تم کتنے لوگوں کو دیتے ہو؟" راجا نے درشت لہجے میں کہا۔ "میں نے تو زخمیوں کو، سڑکوں پر ہونے والے حادثوں میں مرنے والوں کے لواحقین کو پولیس کی خوشامدیں کرتے دیکھا ہے کہ وہ پوسٹ مارٹم کر کے لاشوں کی مزید بے حرمتی نہ کریں۔ ان حالات میں تو موت کا واضح سبب بھی موجود ہوتا ہے اور وہ قتل نہیں بلکہ حادثہ ہوتا ہے مگر تم لوگ فرعونیت سے انکار کر دیتے ہو یا پھر "نذرانہ" لے کر لاشوں کو ورثا کے حوالے یوں کرتے ہو جیسے ان کی سات پشتوں پر احسان کر رہے ہو۔"

"آپ تو بہت سینئر صحافی ہو جناب عالی!" انسپکٹر نے اس تذلیل کے باوجود لجاجت سے کہا۔ "آپ تو قانون کی مجبوریاں سمجھتے ہو۔ آخر ہمیں بھی تو اوپر جواب دہی کرنا پڑتی ہے۔"

"تو پھر ایسا کرو......" میں نے کہنا چاہا۔

راجا نے میری بات کاٹ دی۔ ''پوسٹ مارٹم کرو اور معلوم کرو کہ اسے کسی نے ہلاک کیا ہے یا اس نے خودکشی کی ہے؟''

''یہ خودکشی ہوتی جناب عالی تو پستول بھی لاش کے نزدیک یا اس کے ہاتھ میں ہوتا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ اسے بہت قریب سے گولی ماری گئی ہے اور یہ گولی کسی پستول یا ریوالور کی نہیں ہے بلکہ سیون ایم ایم کی رائفل سے چلائی گئی ہے۔''

''کیا گولی بھی مل گئی ہے؟'' راجا نے پوچھا۔

''گولی تو نہیں ملی ہے سرکار لیکن میں بھی پچیس سال سے پولیس میں ہوں۔ رائفل اور ریوالور کی گولی کے زخم کو اچھی طرح شناخت کرسکتا ہوں۔''

''لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دو۔'' راجا نے اسے یوں حکم دیا جیسے وہ اس کا افسر ہو، پھر اس نے غنی کو چلنے کا اشارہ کیا۔

محافظوں کی گاڑیاں تھانے کے احاطے کے باہر ہی کھڑی تھیں، ہماری گاڑی تھانے کے گیٹ سے نکلی تو دونوں گاڑیاں بھی حرکت میں آگئیں اور ہمارا قافلہ پھر پہلے کی طرح ست بدھائی کی طرف روانہ ہوگیا۔ یعنی مجھ سے تقریباً پچیس فٹ آگے محافظوں کی پہلی گاڑی تھی اور اتنے ہی فاصلے پر عقب میں دوسری گاڑی تھی۔

میری آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ غنی کی آنکھوں میں بھی مجھے نمی نظر آئی۔ اس دن مجھے اندازہ ہوا کہ چاہے کوئی اپنا کتنا ہی برا گناہ گار اور دھوکے باز ہو، اس کی موت کا صدمہ ضرور ہوتا ہے۔ میرا بچپن اور پھر لڑکپن رابعہ کے ساتھ کھیلتے اور اس سے لڑتے جھگڑتے گزرا تھا۔ اس لیے اب مجھے اس کی ایک ایک بات یاد آرہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی مجھے چچا چچی بھی یاد آئے جو رابعہ کے غم ہی میں اس دنیا سے رخصت ہوگئے تھے۔ مجھے اپنے والد سے کیا ہوا وعدہ یاد آیا کہ میں رابعہ کو بہن کو درجہ دوں گا اور اس کا ہر طرح خیال رکھوں گا۔

''بس کر فیکے پتر!'' راجا نے نرم لہجے میں کہا۔ ''میں جانتا ہوں کہ تجھے رابعہ کی موت سے بہت صدمہ پہنچا ہے لیکن یہ تو ایک دن ہونا ہی تھا۔''

''تو تو اب خوش ہے نا! تو یہی چاہتا تھا کہ رابعہ اب زندہ نہ رہے۔'' میں نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''ہاں، میں ایسا سوچتا ضرور تھا لیکن اسے واقعی مردہ دیکھ کر مجھے بھی صدمہ پہنچا ہے۔ دشمن مرے تو خوشی نہ کریے، سجناں بھی مر جانا!'' راجا نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ پھر ٹھہر کر بولا۔ ''بس کر او ئے فیکے پتر! اس کی موت کا اتنا غم مت منا۔ اچھا ہوا وہ مرگئی ورنہ وہ نہ جانے اور کیا کیا گل کھلاتی۔''

اچانک راجا کے سیل فون کی بیل بجنے لگی۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ ''ایک منٹ!'' پھر اس نے سیل فون جیب سے نکال کر اس کی اسکرین پر نظر ڈالی اور بولا۔ ''پتا نہیں کون ہے؟'' یہ کہہ کر اس نے سیل فون کان سے لگا لیا۔ ''ہیلو......''

پھر میں نے راجا کو بری طرح چونکتے دیکھا۔ ''تم لیکن...... ہنسو مت...... میں کیا کرلوں گا؟...... تمہیں تو ابھی اس کا اندازہ بھی نہیں ہے...... کیا؟...... نہیں ہے میرے پاس رفیق کا سیل نمبر!...... بکواس بند کرو۔'' اس نے سیل فون آف کردیا۔

مارے غصے کے اس کا برا حال تھا۔

''کیا ہوا راجا؟......'' میں نے پوچھا۔ ''کون تھا کیا دوسری طرف زوہیب تھا؟''

''کاش ایسا ہوتا۔'' راجا نے اپنی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''پھر کون تھا؟'' میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''جو میرا سیل نمبر مانگ رہا تھا۔''

''تھا نہیں بلکہ تھی۔'' راجا نے کہا۔ ''تیری وہ چہیتی رابعہ فیکے پتر جس کی موت پر تو آنسو بہا رہا تھا۔''

اگر کوئی میرے سر پر پوری قوت سے ہتھوڑا بھی رسید کر دیتا تو مجھے اتنا شاک نہ پہنچتا جتنا یہ سن کر ہوا تھا کہ رابعہ زندہ ہے۔ میرا رنج اور صدمہ اچانک شدید غصے میں تبدیل ہوگیا۔

''کیا کہہ رہی تھی وہ کمینی؟''

''وہ ہنس رہی تھی ہم پر، تجھ پر، تیرے آنسو بہانے پر۔ میں نے زندگی میں کبھی خود کو اتنا احمق تصور نہیں کیا ہے جتنا اس وقت کررہا ہوں۔'' راجا نے بپھرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ایک معمولی سی لڑکی مجھے انگلیوں پر نچا رہی ہے اور تو تو مجھ سے بھی بڑا بے وقوف ہے جو اس کی موت پر آنسو بہا رہا تھا۔''

''راجا!'' میں چونک کر کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ وہ کہیں آس پاس ہی موجود تھی۔''

''ہماری طرف سے جہنم میں جائے۔'' راجا نے کہا۔ ''میں جانتا ہوں کہ آج نہیں تو کل اس کا یہی انجام ہوگا۔''

''لیکن میں تو اس لاش کو رابعہ کی حیثیت سے شناخت کرچکا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''یہ تو مزید اچھا ہوا۔ اب کم از کم وہ تیری چچازاد کی حیثیت سے کچھ نہیں کرسکے گی۔ اس نے تو خود ہی اپنی موت کے پروانے پر دستخط کردیے ہیں۔ اب تو اس کی کسی بھی حرکت کی طرف سے بری الذمہ ہوجا۔ پریس ریکارڈ میں وہ مرچکی ہے۔ اب وہ مجھے کہیں نظر آئی تو میں اسے ماردوں گا۔ ایک ہی شخص دوبارہ نہیں مرسکتا۔''

''لیکن راجا! وہ......''

اچانک ایک زوردار دھماکا ہوا اور میری بات ادھوری رہ گئی۔ دھماکا اتنا شدید تھا کہ گاڑی بری طرح لہرائی۔ غنی اگر مہارت سے اسے سنبھال نہ لیتا تو وہ کسی بھی درخت یا ٹیلے سے ٹکرا سکتی تھی۔

کچھ لمحے تک تو ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ یہ کیسا دھماکا تھا؟ غنی نے گاڑی روک دی تھی۔ آگے جانے والی گارڈز کی گاڑی بھی رک گئی تھی۔ میں نے پیچھے گھوم کر دیکھا تو مجھے گردوغبار اور دھوئیں کے سوا کچھ بھی نظر نہ آیا۔

میری چھٹی حس کسی خطرے کی نشان دہی کررہی تھی، میں نے پھرتی سے دروازہ کھولا اور گاڑی سے باہر چھلانگ لگا دی، میں نے راجا اور غنی کو بھی گاڑی سے باہر کودتے دیکھا۔

سڑک کے کنارے درختوں اور خودرو جھاڑیوں کی بہتات تھی۔ میں رینگتا ہوا تیزی سے ان جھاڑیوں میں گھس گیا۔

اب گرد کسی حد تک بیٹھ چکی تھی۔ میں نے دیکھا، ہمارے عقب میں آنے والے گارڈز کی گاڑی کے پرخچے اڑ چکے تھے۔ غالباً اس میں کسی نے بہت طاقت ور ٹائم بم یا ریموٹ بم فٹ کیا تھا۔

یہ سب کچھ ایک منٹ سے بھی کم عرصے میں ہوگیا تھا۔

اچانک میری گاڑی کے پیچھے ایک ٹرالر نمودار ہوا۔ ٹرالر سے میری گاڑی پر شدید فائرنگ ہونے لگی۔ اگر ہم میں سے کوئی گاڑی میں موجود ہوتا تو اس کا زندہ بچنا محال تھا۔ میری گاڑی کے آگے چلنے والی گاڑی کے گارڈز نے ٹرالر پر جوابی فائرنگ کی اور وہ ویرانہ کسی میدان جنگ کا منظر پیش کرنے لگا۔

میرے گارڈز بھی گاڑی سے کود کر جھاڑیوں میں جاچکے تھے۔ میں ٹرالر میں موجود دشمنوں کی فائرنگ سے تو بچ گیا تھا لیکن اب بھی شدید خطرے میں تھا۔ میں بالکل خالی ہاتھ تھا۔ اتنے محافظوں اور غنی کی موجودگی میں مجھے خود مسلح رہنے کی ضرورت بھی کیا تھی؟ ممکن ہے راجا مسلح ہو۔ میرے اغوا کے بعد سے وہ مسلح رہنے لگا تھا۔ ایک امکان یہ بھی تھا کہ اس نے بھی میری طرح یہی سوچا ہو کہ جب آگے پیچھے پانچ پانچ پوری طرح مسلح اور چوکس گارڈز ہیں اور غنی بھی پوری طرح مسلح ہے تو پھر اضافی بوجھ اٹھانے کی کیا ضرورت ہے؟ یوں بھی ہم کسی مشن پر تو نکلے نہیں تھے۔ ہم تو ست بدھائی سے دینہ تک جانے کے لیے نکلے تھے۔ راستے میں کسی سے تصادم کا ذرہ برابر بھی خطرہ نہیں تھا۔ ان گارڈز کو بھی محض راجا نے نواب رفیق شیرازی کی شان و شوکت اور کروفر دکھانے کو ساتھ رکھا تھا ورنہ لاش کی شناخت کے لیے تو میں اور راجا اکیلے بھی جاسکتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ غنی ہمارے ساتھ ہوتا۔ وہ میرے لاکھ منع کرنے کے باوجود بھی مجھے تنہا نہیں چھوڑتا تھا۔

وہاں اب بھی فائرنگ ہورہی تھی لیکن اب فائرنگ میں وہ شدت نہیں تھی۔ حملہ آور ٹرالر میں محفوظ تھے۔ جس کی موٹی آہنی چادر پر گولیاں اثر انداز نہیں ہورہی تھیں۔ میرے گارڈز کے پاس بھی کوئی توپ یا راکٹ لانچر نہیں تھے۔ بس پوائنٹ تھری ایٹ کے ریوالور اور سیون ایم ایم کی رائفلیں تھیں۔ وہ تعداد میں بھی اب صرف پانچ تھے۔ ممکن ہے ان میں سے بھی کوئی کام آگیا ہو۔ میرے پیچھے آنے والی گاڑی تو مکمل طور پر تباہ ہوچکی تھی۔ جب گاڑی کے پرخچے اڑ گئے تھے تو ان بے چاروں کے بچنے کا کیا سوال تھا؟ مجھے اپنے ان محافظوں کی موت کا شدید صدمہ تھا جو محض میری خاطر اپنی جان گنوا بیٹھے تھے۔ انہیں بھلا کب معلوم ہوگا کہ یہ سفر ان کی زندگی کا آخری سفر ہے۔ ان کی بیویاں اور بچے ابھی تک اس بات سے لاعلم ہوں گے کہ ان کے پیارے اب اس دنیا میں نہیں رہے، مسافر ہیں مہمان خانہ ہے دنیا، گھڑی دو گھڑی کا ٹھکانا ہے دنیا! اگر سب یہی سوچ لیں تو کوئی برائی کبھی جنم نہ لے۔ ہر طرف امن ہو، سکون ہو۔ کوئی کسی کا حق غصب نہ کرے، کسی کا استحصال نہ کرے۔

اچانک مجھے ایسا لگا جیسے میری پشت پر کوئی آہٹ ہوئی ہو۔ میں نے ہلنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ اگر کوئی میری پشت پر ہوتا تو میری نقل و حرکت سے اسے معلوم ہوجاتا کہ میں کس جگہ موجود ہوں۔ اس وقت تو میں پوری طرح خودرو جھاڑیوں میں چھپا ہوا تھا۔

پھر اچانک مجھے ایسا لگا جیسے کوئی بہت آہستگی سے خشک پتوں پر چل رہا ہو۔ اسے شاید میری وہاں موجودگی کا علم نہیں تھا ورنہ وہ اتنی بے احتیاطی نہ کرتا پھر ایسی آواز آئی جیسے کسی نے ماچس جلائی ہو۔ دوسرے ہی لمحے میری ناک نے تمباکو کی بو محسوس کی۔ آنے والا غالباً سگریٹ پی رہا تھا یا تو وہ سگریٹ کی طلب سے بے چین ہوگیا تھا یا پھر اسے گمان بھی نہ ہوگا کہ میں بھی یہاں موجود ہوں۔

میں جانتا تھا کہ غنی سگریٹ نہیں پیتا۔

اب وہ شخص اپنی بھونڈی آواز میں گنگنا بھی رہا تھا۔
''نہ لحاف، نہ غلاف، ٹھنڈی ہوا بھی خلاف.....''
پھر وہ مجھے نظر آ گیا۔ وہ گہرے رنگ کے شلوار سوٹ میں تھا۔ ہاتھوں میں S.G کی جدید فولڈنگ رائفل تھی اور ہونٹوں میں سگریٹ دبی ہوئی تھی جسے پینے کے لیے وہ وقفے وقفے سے اپنا دایاں ہاتھ استعمال کر رہا تھا۔ ابھی وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر تھا لیکن بہت آہستگی سے میری طرف ہی بڑھ رہا تھا۔
اچانک وہ پوری طرح چوکنا ہو گیا، سگریٹ اس کے ہونٹوں سے نکل کر گر گیا۔ اس کی رائفل کا رخ میری ہی طرف تھا۔ شاید اسے میرے جسم کا کوئی حصہ نظر آ گیا تھا۔
میرا پورا جسم پسینے میں تر ہو گیا۔ ''واہ نواب رفیق شیرازی آف ست بدھائی! تمہاری موت اسی ویرانے میں لکھی تھی۔ ابھی تم اپنے محافظوں کی موت پر آنسو بہا رہے تھے۔ تمہاری موت پر کتنے لوگ آنسو بہائیں گے؟''
میری نظر اس شخص کے اس ہاتھ پر تھی جو رائفل کے ٹریگر پر تھا۔ پھر میں نے اس کی انگلی کو ٹریگر کی طرف بڑھتے دیکھا اور سانس روک لی۔ اب میں آخری کوشش یہی کر سکتا تھا کہ عین وقت پر قلابازی کھا کر خود کو اس کے فائر سے بچانے کی کوشش کروں لیکن اس کی پہلی کوشش ناکام ہوتی تو دوسرے فائر میں میری موت یقینی تھی۔
اچانک مجھ سے بالکل قریب سرسراہٹ ہوئی اور خاصا بڑا اور طویل سانپ تیزی سے رینگتا ہوا دوسری نکل گیا۔
میں نے اس شخص کے چہرے پر پیدا ہونے والے تناؤ کو کم ہوتے محسوس کیا اور اس نے سکون کی اتنی گہری سانس لی جس کی آواز واضح طور پر مجھ تک پہنچی۔ وہ چند قدم مزید آگے بڑھا۔ شاید وہ سوچ رہا ہو کہ کہیں کوئی اور سانپ جھاڑیوں میں موجود نہ ہو۔ سانپوں کے جوڑے بھی عموماً جھاڑیوں میں ایک ساتھ پائے جاتے ہیں۔
اس کوشش میں وہ میرے مزید نزدیک آ گیا۔ اب وہ پوری طرح میری رینج میں تھا۔ اس نے خطرہ ٹلنے کے بعد ایک مرتبہ پھر سگریٹ کا پیکٹ جیب سے نکالنا چاہا۔ میں ایسے ہی کسی موقعے کا منتظر تھا۔ میں نے اچانک زقند لگائی اور اسے لیے ہوئے ڈھیر ہو گیا۔ میرا ایک ہاتھ مضبوطی سے اس کے منہ پر جما ہوا تھا اور دوسرا ہاتھ رائفل پر تھا۔ رائفل میں نے ایک ہی جھٹکے میں اس سے چھین لی اور دوسرے ہاتھ سے اس کی گردن دبوچ لی۔ وہ خاصا جاندار جوان تھا، قد و قامت میں بھی کسی طرح مجھ سے کم نہیں تھا لیکن زوہیب کی قید میں دو مہینے رہنے کے بعد مجھ میں ابھی تک پہلے جیسی توانائی پیدا نہیں ہو[ئی] تھی۔ اس نے ایک جھٹکے سے میرا ہاتھ اپنے منہ سے ہٹایا [اور] اچانک اپنے مضبوط ہاتھوں سے میری گردن دبوچ لی۔
میں نے اپنا داہنا ہاتھ خاصی قوت کے ساتھ اس [کے] پیٹ میں رسید کر دیا لیکن معمولی سے جھٹکے کے علاوہ [اس پر] بالکل اثر نہ ہوا۔
اس دن پہلی دفعہ مجھ پر انکشاف ہوا کہ رانا کی قید میں [رہ] کر میں اپنی جسمانی قوت خاصی حد تک کھو چکا ہوں۔ [میں نے] ایسے ہی ایک وار سے لندن میں گنجوں کے ایک لیڈر کو ناک آؤٹ کر دیا تھا۔ باقی دو گنجے اپنے طاقت ور ساتھی کا حشر دیکھ کر فرار ہو گئے تھے۔ اب یہ حال تھا کہ حملہ آور مجھ[سے] بچوں کی طرح کھیل رہا تھا۔
جسمانی قوت کے علاوہ سب سے بڑی رکاوٹ [میرا] کوٹ اور ٹائی تھی۔ کوٹ میں یوں بھی آزادی سے ہاتھ پیر [چلانا] ممکن نہیں ہو رہا تھا۔
مجھے کمزور پا کر وہ مزید شیر ہو گیا اور اس نے میر[ی] گردن چھوڑ کر میری ٹائی پکڑ لی اور مجھے زور دار جھٹکا دیا۔ [میں] لڑکھڑا کر زمین پر گرا۔ وہ بیل کی طرح میری طرف بڑھا۔ [میں] نے لیٹے لیٹے اپنے پاؤں سے اس کی پنڈلی پر زوردار ضرب رسید کی۔ میرا یہ وار کارگر رہا اور وہ اوندھے منہ گر گیا۔
میں اس مقابلے میں بری طرح تھک گیا تھا لیکن جب زندگی داؤ پر لگی ہو تو پھر آدمی آخری دم تک موت کا مقابلہ [کرتا] ہے۔ میں کوشش کر کے اٹھ بیٹھا۔ اسی دوران میرا حملہ آور [بھی] اٹھ بیٹھا تھا۔ میں جھپٹ کر اس کی پشت پر پہنچ گیا اور اسے پیچھے بیٹھے بیٹھے پیچھے سے دبوچ لیا۔ میں زیادہ دیر تک اس مقابلے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اپنے بائیں ہاتھ سے اس کا سر پکڑا اور دائیں ہاتھ سے ٹھوڑی اور چہرے کا نچلا حصہ پکڑ لیا۔
اس نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے میری پنڈلیاں پکڑ لیں اور مجھے گرانے کی کوشش کی۔ میں نے اس کا [سر] مضبوطی سے تھام کر دائیں ہاتھ کو جھٹکے سے دائیں طرف [موڑ] دیا۔ چٹاخ کی آواز آئی جیسے خشک ٹہنی کے ٹوٹنے [کی آواز ہوتی] ہے۔ میرے اس وار سے اس کی گردن ٹوٹ چکی تھی۔ [وہ] زمین پر گرا، چند لمحے پھٹی پھٹی نظروں سے میری طرف [دیکھتا] رہا، پھر اس کا جسم بری طرح لرزا اور اس کی گردن ڈھلک گئی۔ اس کے منہ اور ناک سے خون کی پتلی سی دھار [اس] کے چہرے اور ٹھوڑی کو تر کر رہی تھی۔ وہ زندگی کی قید سے آزاد ہو چکا تھا۔
اس خوں ریز جنگ میں مشکل سے دو منٹ لگے ہوں [گے]۔

میں نے لوگوں کو سگریٹ کے جان لیوا عذاب سے مرتے دیکھا تھا، کینسر اور دل کی بیماریوں میں مبتلا دیکھا تھا لیکن سگریٹ کی طلب میں مرنے والا یہ پہلا آدمی میری نظروں سے گزر رہا تھا۔
ڈیڑھ منٹ کی اس لڑائی میں بے دم ہو کر میں زمین پر پڑا ہانپ رہا تھا۔ مجھے نقاہت کا احساس ہو رہا تھا اور سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ رہی تھی لیکن یوں آرام سے پڑے رہنا بھی ممکن نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اکیلا نہیں ہے بلکہ اس کے دوسرے ساتھی بھی ہیں۔
میں اپنے جسم کی پوری قوت مجتمع کر کے اٹھا۔ پہلے مرنے والے کی رائفل پر قبضہ کیا، پھر آگے بڑھ کر اس کی جامہ تلاشی لی۔
اس کی جیب سے ایک پرس برآمد ہوا جس میں تقریباً دس ہزار کی رقم تھی۔ وہ دس نوٹ ایک ربڑ بینڈ میں بندھے ہوئے تھے۔ اس رقم کے علاوہ اس کی جیب سے ایک کنگھا، بڑے پھل کا کمانی دار چاقو بھی برآمد ہوا۔ پرس میں نوٹوں کے علاوہ ایک لڑکی کی تصویر بھی تھی۔ لڑکی کے چہرے کے نقوش اچھے تھے لیکن وہ تصویر بہت بھونڈے طریقے سے کھینچی گئی تھی۔ اس کے پرس سے نوٹوں اور تصویر کے علاوہ کچھ بھی نہیں نکلا۔ اس دس ہزار کی رقم کے علاوہ ڈیڑھ سو روپے مزید تھے۔ وہ دس ہزار شاید مجھے ہلاک کرنے کا معاوضہ تھا۔ میں نے اس کا پرس اور چاقو اپنی پینٹ کی جیب میں ڈالا۔ کوٹ کی تمام چیزیں نکال کر اپنی ویسٹ کوٹ اور پینٹ کی جیبوں میں منتقل کیں اور کوٹ اتار کر پھینک دیا۔ پھر میں نے مرنے والے کی رائفل اٹھائی اور جھاڑیوں کی طرف بڑھ گیا۔
میرے جسم میں ابھی تک اپنا بوجھ سہارنے کی قوت نہیں تھی، سانس البتہ کسی حد تک بحال ہو چکا تھا۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب اگر کوئی دشمن مجھے نظر آیا تو اسے براہ راست گولی مار دوں گا۔
اسی وقت جھاڑیوں میں پھر سرسراہٹ ہوئی تو میں خود جھاڑیوں میں مزید چھپ کر بیٹھ گیا۔ اس علاقے میں گرگٹ، سانپ اور دوسرے حشرات الارض کی بہتات تھی۔ وہاں چھپنے میں بھی خطرہ تھا۔ کوئی بھی سانپ مجھے ڈس سکتا تھا لیکن میں تن بہ تقدیر ہو کر بیٹھا رہا۔
آنے والا بہت محتاط انداز میں چل رہا تھا۔ اگر وہاں خشک پتے نہ ہوتے تو مجھے اس کی آمد کا احساس بھی نہ ہوتا۔ پھر اس کی نظر شاید مرنے والے پر پڑ گئی تھی جو نشانِ عبرت بنا

آسمان کو گھور رہا تھا۔

وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھا اور جھک کر اس کا جائزہ لینے لگا۔ آنے والے کی شکل دیکھتے ہی میرا دل بلیوں اچھلنے لگا کیونکہ وہ غنی تھا۔

غنی نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ میں نے اسے آواز دینا چاہی لیکن میرے حلق سے آواز ہی نہ نکل سکی۔

غنی کی نظر اچانک میرے کوٹ پر پڑی جو میں نے وہیں لاش کے نزدیک پھینک دیا تھا۔ اس نے کوٹ اٹھایا اور اسے دیکھ کر زاروقطار رونے لگا۔

میں نے اپنے جسم کی پوری طاقت مجتمع کر کے اسے آواز دی۔ ''غنی!''

آواز اگرچہ اس مرتبہ بھی زیادہ بلند نہیں تھی لیکن غنی نے میری آواز سن لی اور تیر کی طرح آواز کی سمت دیکھا۔ مجھے دیکھ کر وہ ایک مرتبہ پھر رونے لگا اور بولا۔ ''آپ ٹھیک تو ہیں سر؟''

''میرے یار، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ بس اس ڈشکرے نے مجھے تھکا دیا ہے۔ اگر اسے موقع مل جاتا تو اس وقت اس کی جگہ میں ہوتا۔''

غنی میرے نزدیک ہی بیٹھ گیا اور بولا۔ ''سر، اٹھیں، میں آپ کو کسی محفوظ مقام تک پہنچا دوں۔''

''میں یہاں بھی محفوظ ہوں، تم یہ بتاؤ راجا کہاں ہے اور ہمارے باقی بچ جانے والے محافظ کہاں ہیں؟''

''راجا صاحب بالکل ٹھیک ہیں، بس وہ معمولی سے زخمی ہوئے ہیں، ایک گولی ان کا بایاں بازو چھوتی ہوئی گزر گئی ہے۔''

''وہ ہے کہاں؟ میں نے پوچھا۔

''وہ اس ٹیلے کے پیچھے ہیں، اس کے پیچھے جو درخت ہیں، ان پر ہمارے گارڈز چڑھے ہوئے اردگرد کا جائزہ لے رہے ہیں۔ میں بھی ایک درخت پر تھا۔ مجھے تھوڑی دیر پہلے یہاں جھاڑیوں میں ہلچل محسوس ہوئی۔ وہی دیکھ کر یہاں آیا تھا، شکر ہے کہ آپ خیریت سے ہیں۔''

''خطرہ ابھی ٹلا نہیں ہے غنی!'' میں نے کہا۔ ''ٹرالر میں مزید دشمن بھی ہو سکتے ہیں۔''

''ممکن ہے کوئی آدمی اب بھی اندر موجود ہو لیکن اس کا امکان بہت کم ہے سر! آپ اس ٹیلے تک چل سکیں گے یا میں......''

''میں ابھی اتنا کمزور نہیں ہوا ہوں غنی!'' میں نے کہا اور ہمت کر کے کھڑا ہو گیا۔

اس دوران میں میری طاقت کافی حد تک بحال ہو چکی تھی۔ غنی بہت محتاط انداز میں ٹیلے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کسی چیتے کی طرح مستعد تھا اور اس کی نظریں تیزی سے اردگرد کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ میرے پیچھے یوں چل رہا تھا جیسے خطرہ محسوس کرتے ہی مجھے اپنے جسم کے پیچھے چھپا لے گا۔ ٹیلے کے پیچھے راجا موجود تھا۔ اس کا بازو زخمی تھا۔ غنی نے خون روکنے کے لیے اس کے بازو پر پٹی باندھ دی تھی۔ خود راجا مجھ سے لپٹ کر بے اختیار رونے لگا۔ وہ بولا ''رفیق! تو خیریت سے تو ہے۔'' وہ غور سے میرے جسم کا جائزہ لے رہا تھا۔

''میں بالکل خیریت سے ہوں، البتہ تیری خیر نیک مطلوب ہے۔''

''مجھے کچھ نہیں ہوا، بس بازو پر معمولی سی ایک خراش ہے۔'' راجا مسکرایا۔ ''ویسے یار، اگر تو عین وقت پر گاڑی سے چھلانگ لگانے کا مشورہ نہ دیتا تو اس وقت اس گاڑی میں میری لاش بھی ہوتی۔ چھلانگ لگاتے لگاتے بھی ایک گولی بازو چھوتی ہوئی گزر ہی گئی۔''

''میں نے موبائل فون پر کال کر کے حویلی سے گاڑیاں منگوائی ہیں۔'' غنی نے کہا۔

''تم نے انہیں یہ تو نہیں بتا دیا کہ......''

''نہیں سر!'' غنی نے کہا۔ ''میں نے صرف اتنا بتایا ہے کہ واپسی میں ہماری گاڑیاں خراب ہو گئی ہیں۔ اس لیے فوری طور پر دو گاڑیاں بھیج دو۔ میں نے یہ پیغام خادم حسین کو دیا تھا۔ وہ سمجھ بھی گیا ہو گا تو کسی کو کچھ نہیں بتائے گا۔''

درخت پر چڑھے ہوئے ایک گارڈ نے کہا۔ ''ست بدھائی کی طرف سے ہماری دو گاڑیاں آ رہی ہیں۔''

''تم لوگ اس وقت تک سامنے مت آنا جب تک میں تمہیں اشارہ نہ دوں۔ ممکن ہے اس مرتبہ بھی ہم اپنی گاڑیاں سمجھ کر دشمن کی گاڑیوں میں بیٹھ جائیں۔''

مشکل سے دو منٹ بعد مضبوط انجن والی دو ڈبل کیبن پک اپ وہاں پہنچ گئیں۔ ایک گاڑی کو خادم حسین ڈرائیو کر رہا تھا، دوسری گاڑی احمد خان چلا رہا تھا۔

خادم حسین کو دیکھتے ہی غنی سامنے آ گیا۔ خادم حسین دہشت زدہ لہجے میں بولا۔ ''یہ...... یہ سب کیا ہے سر؟'' ہر گارڈ غنی کو سر کہہ کر پکارتا تھا۔ کیونکہ وہی پوری حویلی کا سیکیورٹی انچارج تھا۔ ''نواب صاحب تو خیریت سے ہیں۔ ان کی گاڑی ...تو گولیوں سے چھلنی ہے، ونڈ اسکرین اور پیچھے کا شیشہ ٹوٹا ہوا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے یہاں بہت زبردست جھڑپ ہوئی ہے۔''

''نواب صاحب اور راجا صاحب، خیریت سے ہیں۔'' غنی نے کہا۔ ''اب ہمیں فوراً حویلی روانہ ہونا ہے۔ باقی تفصیل میں تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔''

پھر اس نے منہ سے عجیب سی آواز نکالی تو درختوں پر چڑھے ہوئے چار گارڈز نیچے اتر آئے۔

میں نے ان کا جائزہ لیا۔ وہ سب زندگی سے بھرپور چاق و چوبند تھے۔ میں اپنے تمام محافظوں کو نہ صرف چہروں بلکہ ناموں سے بھی پہچانتا تھا۔

''نصیر کہاں ہے؟'' میں نے غنی سے پوچھا۔ میں جانتا تھا کہ آگے جانے والی گاڑی میں پانچواں گارڈ نصیر تھا۔

''نصیر نے اپنی جان قربان کر کے حق نمک ادا کر دیا سر!'' غنی نے کہا۔

میری آنکھیں نم ہو گئیں۔ اچانک مجھے ان محافظوں کا خیال آیا جو تباہ ہونے والی گاڑی میں تھے۔ ان کے جسموں کے پرخچے اڑ گئے تھے۔ ہم انہیں اس حالت میں حویلی بھی نہیں لے جا سکتے تھے ورنہ ان کی مائیں، بہنیں اور بیویاں تو انہیں اس حالت میں دیکھ کر خود بھی اللہ کو پیاری... یا پاگل ہو جاتیں۔

''حویلی پہنچ کر پولیس میں حملے کی رپورٹ درج کراؤں گا۔'' میں نے کہا۔ ''اس لیے سب کا سب جوں کا توں چھوڑ دو۔ ہاں، اپنے دو آدمی یہاں چھوڑ دو تا کہ مرنے والے جاں نثاروں کے بچے کھچے اعضا جنگلی جانوروں سے محفوظ رہیں نصیر کی لاش کو بھی یہیں چھوڑ دو۔''

''سرور اور اکرام مل کر یہاں کی نگرانی کریں گے۔'' پھر غنی خادم حسین سے بولا۔ ''تم ڈائنامیٹ لائے ہو؟''

خادم حسین نے اثبات میں سر ہلایا۔

غنی محتاط انداز میں ٹرالر کی طرف بڑھا اور بلند آواز میں بولا۔ ''خادم حسین! اس ٹرالر کے نیچے ڈائنامیٹ لگا دو۔ ابھی تھوڑی دیر میں یہ ٹرالر بھی دھماکے سے اڑ جائے گا۔ ٹرالر میں اگر اب بھی کوئی موجود ہے اور وہ زندہ رہنا چاہتا ہے تو ٹرالر سے باہر آ جائے گا۔ تم ٹرالر کے نیچے ڈائنامیٹ لگا دو۔''

اس کے بعد بھی کوئی ٹرالر سے باہر نہیں آیا۔ غنی نے سرور کو اشارہ کیا کہ وہ ٹرالر کا دروازہ کھول کر اس کا جائزہ لے۔

سرور نے اس ٹرالر پر چڑھ کر اس کا جائزہ لیا۔ اس کا دروازہ تو پہلے ہی کھلا ہوا تھا۔ ٹرالر میں کوئی ذی روح موجود نہیں تھا۔

چند منٹ بعد ہماری گاڑیاں تیز رفتاری سے ست بدھائی کی طرف جا رہی تھیں۔

میں سوچ رہا تھا کہ میں ست بدھائی پہنچ کر ان خواتین کو کیا جواب دوں گا جن کے بیٹے، بھائی اور شوہر مجھ پر جان نثار کر چکے تھے۔ میری حالت خود بھی بہت ابتر تھی۔ راجا بھی زخمی تھا۔ اس موقع پر مجھے شہناز اور مریم کا خیال آیا۔ اس وقت وہی ان خواتین کو تسلی دے سکتی تھیں۔

ہم لوگ ست بدھائی پہنچے تو پوری حویلی میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی کہ واپسی میں ہماری گاڑیوں پر حملہ ہوا ہے اور اس میں کئی افراد اپنی جان ہار چکے ہیں۔

میں نے مریم کو حویلی کی طرف روانہ کر دیا تھا کہ وہ ان خواتین کی دل جوئی کر سکے جن کے گھروں کے چراغ بجھ چکے تھے۔

راجا کو میں نے شہناز کے حوالے کر دیا۔ وہ راجا کو اس حال میں دیکھ کر بے اختیار آنسو بہانے لگی۔ ''ارے، تم تو خود ڈاکٹر ہو۔ تم بھی آنسو بہانے لگو گی تو مریض کا کیا بنے گا۔''

شہناز نے فوراً آنسو پونچھ لیے اور راجا کو ایکسرے کے لیے لے گئی۔

میں خود بھی بہت کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ شہناز نے ایک انجکشن مجھے بھی دیا اور بولی۔ ''تم اور راجا تو کہہ رہے تھے کہ معمولی خراش ہے۔ اس کے بازو میں گولی اب بھی موجود ہے۔ وہ تو اللہ کا کرم ہے کہ اس کی ہڈی محفوظ ہے۔ میں راجا کو O.T. میں لے جا رہی ہوں۔ ویسے اس کے چہرے سے یہ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ اتنی شدید تکلیف میں ہے۔ غنی نے یہ اچھا کہ اس کے زخم پر مضبوطی سے پٹی باندھ دی۔ اس کا خون زیادہ ضائع نہیں ہوا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے O.T. کی طرف بڑھ گئی۔

میں نے غنی کو بلوایا اور کہا کہ اس حرام خور تھانے دار کو بلاؤ مجھے اس حملے کی رپورٹ لکھوانا ہے۔

''میں اسے.... فون کر چکا ہوں سر!'' غنی نے کہا۔

''ویسے تمہارے خیال میں یہ سب ہوا کیسے غنی؟'' میں نے پوچھا۔

''سر، یہاں سے تو میں تینوں گاڑیوں کو اچھی طرح چیک کر کے نکلا تھا۔ کسی نے یہ کام اس وقت کیا ہے جب ہم تھانے سے اسپتال کے مردہ خانے کی طرف گئے تھے۔ دشمن تو شاید یہ بم آپ کی گاڑی میں لگانا چاہتے تھے لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ وہ کامیاب ہو بھی نہیں سکتے تھے۔ میں آپ لوگوں کے جانے کے بعد گاڑی سے اتر آتا ہوں اور

اردگرد کا جائزہ لیتا رہتا ہوں۔ یہ چوک ابراہیم اور اس کے ماتحت گارڈ سے ہوئی ہے سر! وہ گاڑی ہی میں بیٹھے رہے ہوں گے سر، وہیں کسی کو یہ سب کرنے کا موقع مل گیا۔ دشمنوں سے بھی ایک غلطی ہوئی تھی جوان کی موت کا سبب بن گئی۔ وہ لوگ ٹرالر ہی میں سے گولیاں برساتے رہے۔ میں نے موبائل فون پر سرور سے کہا کہ گاڑی سے فوراً باہر آجاؤ اور اس ٹرالر کو گھیر لو۔ ان لوگوں نے ایسا ہی کیا۔ ٹرالر کی باڈی بلٹ پروف تو ہوتی نہیں ہے۔ سیون ایم ایم کی طاقت ور گولی کا راستہ ٹرالر کی باڈی کب روک سکتی تھی۔ وہ سب بھی گھبرا کر ٹرالر سے باہر کود گئے۔ اس افراتفری میں تین بڑے ریوالور کا نشانہ بن گئے، ایک سرور کے ہتھے چڑھ گیا اور پانچویں کو آپ نے ہلاک کر دیا۔''

پولیس کا انسپکٹر تقریباً چالیس منٹ بعد پہنچا۔

میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''ویسے تمہاری پھرتی اور مستعدی کی داد دینی پڑے گی۔ تم صرف چالیس منٹ میں یہاں پہنچ گئے۔''

''تھانے میں نفری کی کمی بھی ہے اور گاڑی تو صرف ایک ہے۔ میں تو خود اپنی ذاتی موٹر سائیکل استعمال کرتا ہوں ویسے میں نے جائے واردات کا معائنہ کرلیا ہے سر! آپ بتایئے یہ سب کیسے ہوا؟''

میں نے شروع سے لے کر آخر تک سب کچھ اسے تفصیل سے بتایا۔ وہ اپنے ساتھ ایک ہیڈ محرر کو بھی لایا تھا۔ وہ میرا بیان لکھتا رہا۔ میرا بیان لینے کے بعد اس نے وہ پرچہ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے اس کا ایک ایک لفظ پڑھا حالانکہ اس ہیڈ محرر کی جناتی تحریر پڑھتے ہوئے مجھے دانتوں پسینا آگیا۔ پھر میں نے اس پر دستخط کر دیے۔

ہیڈ محرر نے نیچے لکھا۔ ب س م ت اور اس کے نیچے نہ صرف اپنے دستخط کیے بلکہ اسٹیمپ بھی لگا دی۔

''انسپکٹر صاحب!'' میں نے کہا۔ ''یہ ب س م ت کیا ہے؟''

''نواب صاحب! یہ اس کا مخفف ہے کہ بیان سن کر صحت تسلیم کی۔''

پھر اس نے مجھ سے گھسا پٹا سوال کیا۔

''کیا آپ کو کسی پر شک ہے۔ یہ حملہ آپ پر کون کرا سکتا ہے؟''

''ہاں، مجھے رانا زوہیب حسن پر شبہ ہے۔ اس قسم کی گھٹیا اور اوچھی حرکت وہی کر سکتا ہے۔ تم ہیڈ محرر کو ساتھ لائے ہو تو ایف آئی آر کا رجسٹر بھی ہوگا۔ ابھی اس واردات کی ایف آئی آر درج کرو اور اس کی ایک کاپی مجھے بھی دو۔''

''نواب صاحب! ہم ایف آئی آر کا رجسٹر تھا[illegible] حدود سے باہر نہیں لے جا سکتے۔ میں آپ کے بیان کی [illegible] میں ایف آئی آر درج کر دوں گا اور صبح اس کی ایک کاپی [illegible] بھی بھجوا دوں گا۔''

محافظوں کی دوسری گاڑی میں سرور تھا۔ میں نے [illegible] کے ذریعے اسے بلالیا اور پوچھا۔ ''سرور! ذرا ذہن پر [illegible] دے کر بتاؤ کہ جب ہم لوگ تھانے سے سرکاری اسپتال [illegible] مردہ خانے کی طرف گئے تھے تو تم نے کوئی خلاف معمول [illegible] محسوس کی تھی، کسی مشکوک آدمی کو اپنی گاڑیوں کے اردگرد [illegible] تھا؟''

''نہیں سر، میں اپنی گاڑی کے اسٹیئرنگ پر تھا اور...''

وہ ایک دم چونک اٹھا۔ ''ہاں سر، مجھے یاد آیا کہ وہاں [illegible] پاگل شخص گھوم رہا تھا۔ اس کا چہرہ اور بال مٹی میں اٹے ہو[illegible] تھے۔ وہ عجیب وغریب حرکتیں کر رہا تھا۔ کبھی ہنسنے لگتا، [illegible] رونے لگتا۔ ایک مرتبہ اس نے ایک رکعت نماز بھی پڑھی۔ [illegible] رکعت بھی کیا، وہ نیت باندھ کر فوراً ہی رکوع اور سجدے میں [illegible] اور سر اٹھاتے ہی فوراً سلام پھیر دیا۔ وہ میرے پاس بھی آیا [illegible] کہ مجھے ایک وقت کا کھانا کھلا دو۔ میں نے سوچا، بیچارہ پا[illegible] ہے، ترس کھا کر میں نے جیب سے پچاس روپے نکالے [illegible] اسے دیتے ہوئے کہا۔ ''لو یہ پیسے رکھو اور جا کر کھانا کھا لو۔'' [illegible] نے وہ نوٹ میرے منہ پر کھینچ مارا اور چیخ کر بولا۔ ''تم [illegible] سمجھتا ہے مجھے جو پیسے دے رہا ہے۔ چل میرے لیے کھا[illegible] لے کر آ۔''

میں نے اسے جھڑک دیا تو وہ ہماری دوسری گاڑی [illegible] طرف بڑھ گیا۔ وہاں سے بھی کسی نے اسے جھڑک دیا تو وہ [illegible] کر بولا۔ ''کھانا تو تم ہی لوگ لے کر آؤ گے ورنہ میں تمہاری [illegible] گاڑی کے نیچے لیٹ کر اپنی جان دے دوں گا۔''

''پھر واقعی وہ گاڑی کے نیچے لیٹ گیا اور کھسکتا [illegible] آگے کی طرف بڑھ گیا۔ لوگ اس پر ہنسنے لگے۔''

''بس، اسی وقت اس نے گاڑی کے نچلے حصے [illegible] میگنیٹ بم نصب کر دیا۔'' میں نے کہا۔ ''پھر کیا ہوا؟''

''پھر وہ کچھ دیر گاڑی کے نیچے لیٹنے کے بعد باہر [illegible] آیا اور ہمیں انتہائی غلیظ گالیاں دینے لگا کہ تم جیسے والوں [illegible] بھروسا! مجھ غریب کو کچل ہی دو۔ میرے چھوٹے چھوٹے [illegible] بچے مارے جائیں گے۔'' پھر آسمان کی طرف دیکھ کر بو[illegible] ''یا اللہ! اگر ان لوگوں نے مجھے کچلنے کی کوشش کی ہے تو تو ان [illegible] کچل دینا۔'' پھر وہ چیخ کر بولا۔ ''میں چلتا ہوں، میری نماز [illegible] وقت ہو گیا ہے۔''

''اس پاگل کو دوبارہ دیکھو تو پہچان لو گے؟'' غنی نے پوچھا۔ اس وقت کمرے میں وہ بھی موجود تھا۔

''بالکل پہچان لوں گا۔'' سرور نے کہا۔

''ویسے اب وہ کسی کو کبھی نظر نہیں آئے گا۔'' میں نے کہا۔ ''اس کا کام صرف اتنا ہی تھا کہ وہ ہماری کسی گاڑی کے نیچے بم فٹ کر دے۔ اس نے اپنے آقا کو اطلاع دی ہوگی کہ کام ہو گیا ہے۔ ان لوگوں کا خیال ہوگا کہ اس گاڑی میں اتنا طاقت ور بم نصب ہے کہ وہ اس گاڑی کے ساتھ ساتھ ہماری گاڑی بھی تباہ کر دے گا لیکن جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے!'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''عین اس وقت جب بم پھٹنے والا تھا، پیچھے والی گاڑی کے راستے میں بھیڑ بکریوں کا ایک ریوڑ آ گیا اور اس کے اور ہمارے درمیان کافی فاصلہ ہو گیا ورنہ وہ بم واقعی اتنا طاقت ور تھا کہ ہماری گاڑی کو بھی اڑا دیتا۔ تم نے دیکھا نہیں، جہاں بم پھٹا ہے، وہاں زمین میں تقریباً چھ فٹ کا گڑھا پڑ گیا ہے۔ اردگرد کے درخت اور پودے تک جھلس گئے ہیں۔'' پھر میں نے سرور سے کہا۔ ''ٹھیک ہے تم جاؤ۔''

اس کے جانے کے بعد میں مردانہ وارڈ کی طرف نکل گیا لیکن وہاں مجھے راجا کہیں نظر نہ آیا۔ وہاں موجود مریض بھی کسی حد تک اس واردات سے واقف ہو چکے تھے۔ وہ سب میری خیریت پوچھ رہے تھے۔

اسی وقت مجھے ڈاکٹر حسن نظر آیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''راجا کو تم لوگوں نے کہاں رکھا ہے۔ ابھی تو یہاں پرائیویٹ روم تعمیر ہو رہے ہیں۔''

''وہ تو O.T. سے نکل کر آپ کے کمرے میں چلے گئے تھے۔'' ڈاکٹر حسن نے جواب دیا۔ ''انہوں نے ڈاکٹر شہناز سے صاف صاف کہہ دیا کہ مریض بن کر لیٹنے سے بہتر ہے کہ آدمی قبر میں جا کر لیٹ جائے۔''

میں ہنستا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھا اور اس سے کہا۔ ''دلہا راجا! تو نے کیا میرے کمرے کو قبر سمجھ لیا ہے؟''

اس نے پلکیں جھپکا کر مجھے دیکھا۔ وہ اس وقت میری راکنگ چیئر پر بیٹھا کافی پی رہا تھا۔ ''تم نے شہناز سے یہی کہا ہے نا کہ مریض بن کر لیٹنے سے بہتر ہے کہ آدمی کسی قبر میں جا کر لیٹ جائے۔''

''تو میں نے کیا غلط کہا تھا پتر!'' راجا نے سنجیدگی سے کہا۔ ''تیرا کمرا قبر ہوتا تو میں یہاں بیٹھا نہ ہوتا بلکہ لیٹا ہوتا۔ ویسے بھی ایک قبر میں دو مردے اور ایک نیام میں دو تلواریں نہیں سما سکتیں۔''

''تیری دونوں مثالیں غلط ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''قبر کشادہ ہو تو دو کیا تین مردے بھی وہاں آسانی سے رہ سکتے ہیں۔ نیام بھی اگر ذرا بڑی بنوائی جائے تو اس میں دو تلواریں آنے کے بعد بھی اتنی جگہ بچ جائے گی کہ مزید ایک تلوار آ سکے۔ اس لیے تیری دونوں مثالیں کینسل! ویسے تیرے زخم کا کیا حال ہوا ہے؟''

''یار، اس وقت تو مجھے محسوس نہیں ہوا لیکن اب تو ہاتھ ہلاتے ہوئے بھی تکلیف ہو رہی ہے۔ تو بتا، کیا تیر مار کے آیا ہے؟''

میں نے اسے انسپکٹر کی آمد، اپنے بیان، ایف آئی آر اور رانا زوہیب پر شبے کے بارے میں بتایا۔

''تو نے رانا زوہیب کا نام ایف آئی آر میں درج کرایا ہے؟'' راجا نے پوچھا۔

''نہیں ابھی تو انسپکٹر نے صرف میرا بیان لیا ہے اور اپنی عادت کے مطابق پوچھا کہ آپ کو کسی پر شبہ ہے، کسی سے دشمنی تو نہیں ہے آپ کی؟ میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ یہ حرکت صرف رانا زوہیب ہی کر سکتا ہے۔''

''یہ بات تو نے اپنے دستخط شدہ بیان میں بھی لکھی ہے؟''

''نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن تو اتنا فکرمند کیوں ہے؟''

''یار، ہم پہلے ہی کیا کم پریشانیوں میں گھرے ہوئے ہیں کہ اب رانا سے بھی کھلی دشمنی کا اعلان کر دیں، وہ اپنے وکیل کے ذریعے فوراً تیرے خلاف ہتک عزت کا دعویٰ کر دیتا۔ پھر تیرے پاس کیا ثبوت ہے کہ رانا ہی اس واردات میں ملوث ہے۔ کورٹ ثبوت مانگتی ہے۔ ثبوت تیرے پاس تو ہے نہیں، اس کا نتیجہ کیا ہوتا۔ تجھے ہتک عزت کا جرمانہ ادا کرنا پڑتا۔ یہ کیس ہارنے کے بعد تو لوگوں کی نظروں میں جھوٹا سمجھا جاتا کہ نواب رفیق نے الیکشن جیتنے کے لیے اپنے حریف رانا زوہیب پر حملے کا جھوٹا الزام لگایا۔ وہ ہر جگہ اس بات کو اچھالتا، تجھ پر بار بار حملے ہوتے اور تو اس پر شک کرنے کے قابل بھی نہیں رہتا۔ رانا جیسے لوگ کوئی ثبوت کب چھوڑتے ہیں؟ انہیں تو ہم جیسے گھیرتے ہیں اور انہیں مشتعل کر کے ایسا بیان دینے پر مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ خود ہی اپنے جال میں پھنس کر رہ جاتے ہیں۔''

''یار راجا! بات تو تیری واقعی درست ہے، لیکن میں نے تو انسپکٹر سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ مجھ پر حملہ رانا نے کرایا تھا۔''

''تو نے صرف کہا ہے۔ اپنے بیان میں ایسا کچھ بھی

نہیں لکھا۔ پھر وہ انسپکٹر بھی اتنا احمق نہیں ہے کہ صرف تیرے کہنے پر ایف آئی آر میں رانا کا نام درج کر دے۔ وہ جانتا ہے کہ جب کورٹ میں تیرا بیان پیش ہوگا تو اس میں ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔ اس لیے وہ انسپکٹر بھی اپنی زبان پر اس وقت تک رانا کا نام نہیں لائے گا جب تک تیری طرف سے اس پر شبے کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں مل جائے۔ سمجھا کہ نہیں فیکے پتر! یہ سیاست ہے اور تو ابھی سیاست کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہے۔"

"لیکن وہ انسپکٹر ہے بہت کائیاں۔" میں نے کہا۔

"در پردہ رانا سے بھی اس کے تعلقات ضرور ہوں گے۔ وہ اسے بتا دے گا کہ نواب رفیق نے حملے کا شبہ آپ پر ظاہر کیا ہے۔"

"وہ یہ تو کرے گا تا کہ رانا اسے اس کی کارکردگی کا انعام دے سکے لیکن جب اسے یہ معلوم ہوگا کہ یہ سب زبانی کلامی باتیں ہیں تو وہ انسپکٹر کو جھڑک دے گا کہ جب اس نواب نے مجھ پر شک ظاہر کیا ہی تھا تو اس کے بیان میں ایسا کیوں نہیں ہے؟"

"یار وہ رابعہ......"

"دیکھو فیکے! تو رابعہ کی موت کی تصدیق کر چکا ہے۔ آج شام اس کی لاش بھی تیرے حوالے کر دی جائے تو اسے دفن کر دینا اور اس کی قبر پر رابعہ شیرازی کے نام کا کتبہ لگا دینا۔ بس اب رابعہ کی کوئی بات نہیں ہوگی اور ہاں، حویلی میں بھی کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ رابعہ زندہ ہے۔ یہ بات صرف تیرے علاوہ غنی جانتا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ غنی ان معاملات میں اپنی زبان نہیں کھولتا۔ پھر بھی تو اسے تاکید کر دینا کہ رابعہ کے زندہ ہونے کی بات کسی کو معلوم نہ ہو۔"

شہناز مجھے وٹامن بی کمپلیکس کے انجکشن اور گولیاں پابندی سے کھلا رہی تھی۔ میری غذا کا بھی خاصا خیال رکھ رہی تھی۔ میں نے اس دوران میں ہلکی پھلکی ورزش بھی شروع کر دی تھی اور میری توانائی تیزی سے لوٹ رہی تھی۔ راجا بھی اب کسی حد تک ٹھیک تھا۔ اس کا زخم تقریباً بھر چکا تھا اور وہ ایک مرتبہ پھر اپنی مصروفیات میں لگ گیا تھا۔

اس دن حسب معمول ہم لوگ شام کو کافی پی رہے تھے۔ شہناز ایسے موقعوں پر کبھی موجود ہوتی، کبھی نہیں ہوتی تھی۔ اس وقت میں اور راجا ہی تھے۔ شہناز کسی ایمرجنسی کیس کی وجہ سے موجود نہیں تھی۔ اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے بیڈ پر سے سیل فون اٹھا کر اسکرین پر نام دیکھا تو چونک اٹھا۔ وہ کال نور کی تھی۔ میں نے سیل فون کان سے لگا لیا۔ "ہیلو جان، کیسی ہو؟" میں نے کہا۔

"میں کیسی ہو سکتی ہوں تمہارے بغیر!" نور نے کہا۔ "اور تم شاید بھول گئے کہ آج دو ہفتے پورے ہو گئے ہیں۔ اب یہ بتاؤ کہ تم لندن آ رہے ہو یا میں ست بدھائی آ جاؤں؟"

"تم مجھے دس منٹ کی مہلت دو۔" میں نے کہا۔ "اس وقت میں بہت اہم میٹنگ میں ہوں۔ دس منٹ بعد تمہیں کال کرتا ہوں۔"

"تمہارے دس منٹ تو کبھی کبھی دو گھنٹے میں بھی تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اس لیے میں دس منٹ بعد خود ہی کال کر لوں گی۔"

"نور کا فون تھا؟" راجا نے پوچھا۔

"ہاں یار!" میں نے کہا۔ "دو ہفتے پورے ہو چکے تھا اور وہ ست بدھائی آنے کو تیار ہے یا پھر مجھے لندن جانا پڑے گا۔"

"فیکے پتر! یہ بات تو تو وعدہ کرنے سے پہلے سوچتا۔ اب تو تو فی الحال لندن جا نہیں سکتا۔ نور ہی کو ست بدھائی بلا لے۔"

"لیکن یار، وہاں کا بزنس!......وہ......"

"وہاں سوشی ہے، تیرے دوسرے ہمدرد ہیں، تو چاہے تو غنی کو وہاں بھیج دے۔ ایک آدھ ہفتے میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ پھر نور بھی وہاں کا کچھ نہ کچھ انتظام کر کے ہی آئے گی۔ تو اس سے کہہ دے کہ وہ ست بدھائی آ جائے۔"

ٹھیک دس منٹ بعد نور کی کال دوبارہ آ گئی۔ اس نے ہنس کر مجھ سے پوچھا۔ "تمہاری وہ اہم میٹنگ ختم ہو گئی یا ابھی جاری ہے۔ میرے خیال میں تم نے راجا سے مشورہ کرنے کے لیے دس منٹ کی مہلت مانگی تھی ورنہ وہاں ایسی کون سی میٹنگ ہو سکتی ہے جو نواب رفیق شیرازی کو کسی سے بات کرنے سے روک سکے۔"

"اچھا، ان باتوں کو چھوڑو۔ تم ست بدھائی آنے کی تیاری کرو۔ آنے سے پہلے مجھے .... فون کر دینا کہ کس فلائٹ سے آ رہی ہو۔"

"واقعی!" نور چہکی۔ "تم تو اپنے وعدے کے سچے نکلے۔ میں آج ہی اپنی سیٹ کنفرم کرا لیتی ہوں۔ سیٹ تو میں نے تین دن پہلے ہی بک کرا لی تھی۔ کنفرم نہیں کی تھی۔ وہ آج کر لوں گی۔ میں کل صبح کی فلائٹ سے اسلام آباد پہنچ جاؤں گی۔" نور نے کہا۔

"ٹھیک ہے، پھر میں بھی اسلام آباد کے لیے نکل جاتا

دں۔ اب تم سے کل صبح ملاقات ہوگی۔"

"ارے ارے، تم اتنے کاروباری کیسے ہو گئے۔ کاروبار تو یہاں میں کر رہی ہوں۔ کبھی لندن، کبھی پیرس، کبھی لی، کبھی جرمنی کے چکر تو میری قسمت میں لکھے ہیں۔ تم لندن آ گے تو مایوس نہیں ہو گے۔ ہمارا ٹرن اوور گزشتہ سال کے تقابلے میں فورٹی پرسنٹ بڑھ گیا ہے۔"

"کیا واقعی؟" میں نے حیرت سے کہا۔ نور نے میری عدم موجودگی میں نہ صرف بزنس کو سنبھالا بلکہ اسے توسیع بھی دی تھی۔ یہ معمولی بات نہیں تھی۔ ایک تو اتنے وسیع کاروبار کو کامیابی سے سنبھالنا ہی ایک مسئلہ تھا، نور نے تو میری توقع سے بڑھ کر کام کیا تھا اور کاروبار کو مزید وسعت دی تھی۔

"سوشی کے کیا حال ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"سوشی بہت محنتی اور ذمے دار لڑکی ہے۔ وہ میری عدم موجودگی میں بہت کامیابی سے یہ کاروبار سنبھال لیتی ہے۔"

"یو آر گریٹ جان، آئی لو یو!" میں نے جذباتی ہو کر کہا۔

"کیا راجا سامنے ہے؟" نور نے کہا۔

"ہاں، وہ کافی پینے میں مگن ہے۔"

"تمہیں اس کے سامنے ایسی باتیں کرتے ہوئے شرم نہیں آتی؟"

"وہ جب شہناز سے عشق جھاڑتا ہے، راز و نیاز کرتا ہے تو کون سا مجھ سے شرماتا ہے۔"

"تم دونوں ہی بے شرم ہو، اچھا، پھر کل ملاقات ہو رہی ہے۔"

"اس ملاقات کے موقع پر یہ مت بھول جانا کہ تم لندن میں نہیں بلکہ پاکستان میں ہو۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"شٹ اپ!" نور نے پیار بھرے انداز میں کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

"تو ایسا کر۔" راجا نے کہا۔ "غنی کو لے کر خاموشی سے اسلام آباد کے لیے نکل جا۔ یہاں سے جی ٹی روڈ تک تو میری گاڑی میں جائے گا، وہاں سے غنی تجھے اسلام آباد لے جائے گا۔ تو غنی کو ابھی روانہ کر دے۔"

"لیکن اس کی کیا ضرورت ہے؟" میں نے کہا۔

"فیکے پتر۔" تیری یادداشت کمزور ہے یا مت ماری گئی ہے۔ تو تو ہر وقت خطرے میں ہے۔ اب جب تک تو الیکشن جیت نہیں جاتا، تجھے اسی طرح زندگی گزارنا پڑے گی۔ اگر تو اسلام آباد، لاہور یا کراچی میں ہوتا تو ایسا کچھ بھی نہ ہوتا لیکن ست بدھائی، دینہ بلکہ جہلم میں بھی یہ سب کچھ ہو سکتا ہے۔"

میں نے انٹرکام پر غنی کو بلایا اور اس سے کہا کہ ہم ابھی اسلام آباد کے لیے نکل رہے ہیں۔ "تم......"

میری بات ختم ہونے سے پہلے ہی وہ کمرے سے جانے لگا۔

"پوری بات سنا کرو۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "ہمارے ساتھ گارڈ نہیں ہوں گے۔ گاڑی پر ریاست کا جھنڈا نہیں ہوگا۔ ہم بہت خاموشی سے اسلام آباد جائیں گے اور کل صبح واپس آ جائیں گے۔ ہاں تم البتہ پوری طرح مسلح رہنا۔ ایک بات اور!" میں نے کہا۔ "میں یہاں سے جی ٹی روڈ تک راجا کی گاڑی میں جاؤں گا۔ تم ابھی نکل جاؤ اور میں تمہیں جی ٹی روڈ پر وہاں ملوں گا جہاں سے گاڑیاں دینہ کے لیے مڑتی ہیں۔" اس کے جانے کے بعد میں نے راجا سے کہا۔ "غنی کو میرا فیصلہ پسند نہیں آیا۔"

"ہاں، لگتا تو کچھ ایسا ہی ہے۔"

تھوڑی دیر بعد میں اور راجا بھی ست بدھائی سے نکل گئے۔ جی ٹی روڈ پر غنی پہلے سے ہمارا منتظر تھا۔ اس نے ایک عقل مندی یہ کی تھی کہ وہ میری سیاہ ہنڈا سوک کے بجائے آف وہائٹ کرولا لایا تھا۔ میں نے راجا کو خدا حافظ کہا اور غنی کی گاڑی میں سوار ہو گیا۔ غنی نے گاڑی اپنے مخصوص انداز میں دوڑانا شروع کر دی۔

میرے سیل فون کی بیل بجی تو میں چونک اٹھا۔ اسکرین پر راجا کا نام تھا۔ مجھے فکر لاحق ہو گئی کہ راجا مجھے کیوں کال کر رہا ہے؟ کیا ست بدھائی میں کوئی ایمرجنسی پیدا ہو گئی ہے؟ میں نے ٹیلی فون کان سے لگا لیا۔ "ہیلو۔"

"فیکے پتر! غنی نے آخر تیری بات نہیں مانی۔ تم سے کچھ فاصلے پر تیرے گارڈز کی گاڑی بھی ہے۔ ست بدھائی جاتے ہوئے مجھے وہ گاڑی نظر آئی تھی۔ میں نے بھی اپنی گاڑی کا رخ دوبارہ جی ٹی روڈ کی طرف کر لیا۔ وہاں گاڑی میں تیرے چار بہترین گارڈز موجود ہیں۔ تو اسے کچھ کہنا مت۔ وہ ایسا تیری محبت میں کرتا ہے۔ میں نے یہ بات پہلے سے تجھے، اس لیے بتا دی۔ کہ تجھے اگر بعد میں معلوم ہوتا تو غنی پر ضرور غصہ کرتا۔ بس اب جا اللہ حافظ!" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

غنی خاموش اور پورے انہماک سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ مجھے وہ گاڑی کہیں نظر نہیں آئی جس کے بارے میں راجا نے مجھے بتایا تھا۔ غنی ان معاملات میں خاصا تجربے کار تھا۔ اس نے یقیناً اپنے آدمیوں سے کہا ہوگا کہ ہمارے پیچھے اس انداز میں آنا کہ نواب صاحب کو شبہ بھی نہ ہو سکے۔ یہ سب کچھ

اس نے میری محبت ہی میں تو کیا تھا اس لیے قابل معافی تھا۔

اچانک ہیڈ لیمپس کی روشنی میں مجھے ایک آلٹو دکھائی دی۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اسے ایک نازک اندام لڑکی دھکا لگا رہی ہے۔ گاڑی میں شاید کوئی خرابی پیدا ہوگئی تھی کیونکہ اسٹیئرنگ پر ایک ہٹا کٹا مرد بیٹھا تھا۔ گاڑی ہلکی تھی لیکن ایک نازک اندام لڑکی کے لیے وہ بھی بہت بھاری تھی۔

میں نے غنی سے گاڑی روکنے کو کہا۔ غنی نے ان سے کچھ فاصلے پر گاڑی روک دی۔ میں گاڑی سے اتر کر آلٹو کی طرف بڑھا اور مرد سے پوچھا۔ ''کیا گاڑی میں کوئی خرابی پیدا ہوگئی ہے یا پیٹرول ختم ہوگیا ہے؟''

''گاڑی اوور ہوگئی ہے۔ اب جب تک اسے بھرپور دھکا نہیں لگے گا، یہ اسٹارٹ نہیں ہوگی۔''

لڑکی بھی ہانپتی ہوئی ہمارے نزدیک آگئی اور بولی۔ ''پلیز، اگر آپ لوگ گاڑی کو تھوڑا سا پش کردیں تو یہ اسٹارٹ ہوجائے گی۔''

''آپ آرام سے گاڑی میں بیٹھیں۔'' غنی نے کہا۔ ''میں دھکا لگاتا ہوں۔''

لڑکی ہانپتی ہوئی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ غنی نے اکیلے ہی اس ہلکی پھلکی آلٹو کو اتنا زوردار دھکا لگایا کہ وہ فوراً ہی اسٹارٹ ہوکر وہاں سے روانہ ہوگئی۔

غنی بھی اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

ابھی ہم اپنی گاڑی کے نزدیک پہنچے ہی تھے کہ جھاڑیوں میں سے اچانک چار آدمی نکل کر ہمارے سامنے آگئے۔ ان سب کے حلیے ایک جیسے تھے، یعنی سیاہ شلوار قمیص اور سیاہ پگڑیاں۔ ان لوگوں نے پگڑی ہی کے ایک پلو سے اپنے چہرے چھپا رکھے تھے۔ ان چاروں کے ہاتھوں میں کلاشنکوف تھیں اور ان کا رخ ہماری طرف تھا۔

''دونوں اپنے دونوں ہاتھ گاڑی سے لگا کر کھڑے ہوجاؤ۔'' ان میں سے ایک گرج دار آواز میں بولا۔

میں نے فوراً اپنے دونوں ہاتھ گاڑی کی چھت سے لگا دیے۔ ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر بہت ماہرانہ انداز میں میری تلاشی لی۔ دوسری طرف غنی بھی اسی پوزیشن میں کھڑا تھا اور دوسرا سیاہ پوش اس کی تلاشی لے رہا تھا۔ میری جیب سے ایک ریوالور، ایک مشینی پسٹل اور اس کے کئی راؤنڈز برآمد ہوئے۔ غنی کے پاس بھی ایک ریوالور تھا، رائفل بھی تھی لیکن وہ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر رکھی رہ گئی تھی۔

ان میں سے ایک نے بڑھ کر ہم دونوں کے ریوالورز اور پسٹل پر قبضہ کیا اور گاڑی کی پچھلی سیٹ سے رائفل بھی اٹھالی۔

''زحمت کی معذرت چاہتا ہوں نواب صاحب!'' ان میں سے ایک سیاہ پوش بولا۔ ''لیکن آپ کو ہمارے ساتھ چلنا پڑے گا۔'' یہ کہہ کر اس نے جیب سے کالے کپڑے کی ایک پٹی نکالی اور مضبوطی سے میری آنکھوں پر باندھ دی پھر وہ گرج دار آواز میں غنی سے مخاطب ہوا۔ ''اب تو یہاں سے ست بدھائی جا اور وہاں جا کر بتا کہ نواب صاحب کو مولا داد کے آدمیوں نے اغوا کرلیا ہے۔ تاوان کے لیے ہم بعد میں کال کریں گے۔ اب یہاں سے چلتا بن۔''

''پیدل؟'' غنی نے کہا۔

''نہیں تیرے لیے ہیلی کاپٹر کا انتظام کیا ہے، ابھی آجائے گا۔'' اسی سیاہ پوش نے کہا جس نے مجھ سے معذرت کی تھی۔ ''ابھی چلے گا تو صبح تک ست بدھائی پہنچ جائے گا۔ ہم بھی اب صبح ہی فون کریں گے۔ ہاں، نواب صاحب کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔''

''تم لوگوں کو کیا چاہیے؟'' میں نے کہا۔ ''ابھی بتاؤ تاکہ میں ابھی تمہارا مطالبہ پورا کردوں، اس وقت میرا اسلام آباد پہنچنا بہت ضروری ہے۔'' میں نے تحکمانہ لہجہ اختیار کیا تھا۔ ''بولو کیا چاہیے۔ پانچ لاکھ، دس لاکھ!''

''نواب صاحب! آپ مولا داد کو اتنا بے وقوف سمجھتے ہیں کہ وہ آپ کو صرف دس لاکھ میں چھوڑ دے گا۔ ہمیں پورا ایک کروڑ روپیا چاہیے، پورا ایک کروڑ!'' سیاہ پوش کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

''میں وہ بھی تمہیں ابھی دے سکتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''تو کیا آپ اتنی رقم اپنے ساتھ لے کر چلتے ہیں؟'' سیاہ پوش نے کہا۔

''میرے پاس نقد رقم تو نہیں ہے لیکن چیک بک ہے۔ میں تمہیں ایک کروڑ روپے کا چیک دے دوں گا۔''

''نواب صاحب! آپ کیا مولا داد کو عقل سے بالکل ہی پیدل سمجھتے ہیں۔ آپ مجھے چیک دے دیں اور صبح معلوم ہو کہ آپ کے بینک میں تو اتنی رقم ہی نہیں ہے، پھر میں کیا کروں گا۔ میں اگر اتنا ہی بے وقوف ہوتا تو اپنے باپ کی طرح کہیں چھابڑی لگائے بیٹھا ہوتا۔'' سیاہ پوش کے لہجے میں طنز تھا۔

''اچھا ایسا کرو۔ تم اپنا کوئی آدمی میرے ساتھ کردو۔ میں صبح بینک کھلتے ہی وہاں سے رقم نکال کر اسے دے دوں گا۔''

''واہ نواب صاحب!'' سیاہ پوش طنزیہ انداز میں بولا۔ ''آپ میرے آدمی کو لے جائیں اور راستے میں اسے کسی تھانے میں دے دیں یا خود ہی دھکا دے کر اتار دیں تو میں کیا کروں گا؟'' پھر وہ غنی سے مخاطب ہوا۔ ''تو نے سنا نہیں۔ نکل یہاں سے اور ست بدھائی پہنچ۔''

''ست بدھائی میں کون اسے اس وقت اتنی بڑی رقم دے گا۔ سارے چیک میں ہی سائن کرتا ہوں۔ میرے چیک کے بغیر تو کوئی ایک کروڑ تو چھوڑو، ایک ہزار بھی نہیں نکال سکتا۔''

''لگتا ہے اب زندگی سے آپ کا دل بھر گیا ہے۔ حویلی میں کوئی ایسا نہیں ہے جو آپ کے بدلے ایک کروڑ روپے کا بندوبست کرسکے؟''

''ایک طریقہ اور ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں اپنے ڈرائیور کو چیک دے دیتا ہوں۔ تم صبح جہاں کہو گے، وہ نقد رقم پہنچا دے گا۔ اس کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ اگر تم میری یہ بات بھی نہیں مانو گے تو پھر مجھے گولی ماردو۔''

''ہاں، یہ بات کچھ سمجھ میں آتی ہے۔'' سیاہ پوش نے کہا جو یقیناً مولا داد تھا۔

اس نے گزشتہ کئی مہینوں سے ڈکیتیوں اور اغوا برائے تاوان کے ذریعے لوگوں کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ وہ ذرا سی مزاحمت پر قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا تھا۔

''نواب صاحب!'' اس نے کہا۔ ''آپ اپنے ڈرائیور کو چیک دے دیں، اس کے پاس موبائل بھی ہوگا۔ جب صبح یہ رقم نکلوالے تو آپ کو... فون کردے۔ ہم اسے بتائیں گے کہ اسے کب اور کہاں پہنچنا ہے۔'' پھر وہ غنی سے مخاطب ہوا۔ ''رقم چھوٹے نوٹوں میں ہو۔ زیادہ سے زیادہ پانچ سو کے نوٹوں کی شکل میں اور نوٹ پرانے ہونا چاہئیں۔''

''لگتا ہے تم فلمیں کچھ زیادہ ہی دیکھتے ہو، اس قسم کے مطالبات تو فلموں میں ہوتے ہیں۔''

''ایسا حقیقی زندگی میں بھی ہوتا ہے۔'' مولا داد نے کہا۔ وہ اپنی گفتگو سے پڑھا لکھا لگ رہا تھا۔ ''ہزار اور پانچ ہزار کے نوٹوں کے ذریعے پکڑے جانے کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ نوٹ اگر نئے ہوں تو بینک کے پاس ان کے نمبروں کی لسٹ بھی ہوتی ہے، ادھر آپ نے مارکیٹ میں کوئی نوٹ چلانے کی کوشش کی اور آپ دھر لیے گئے۔''

''گاڑی کی پچھلی سیٹ پر میرا بریف کیس رکھا ہے۔ اس میں چیک بک بھی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''وہ بریف کیس مجھے دے دو۔ اگر مجھ پر اعتبار نہیں ہے تو بریف کیس کھول کر خود ہی چیک بک نکال لو اور میری آنکھوں سے یہ پٹی کھولو تاکہ میں چیک لکھ کر اس پر دستخط کرسکوں۔''

فوراً ہی ایسی آواز آئی جیسے بریف کیس کھولا گیا ہو۔ پھر میری آنکھوں سے پٹی کھول دی گئی اور چیک بک کے ساتھ پین بھی میرے حوالے کردیا گیا۔ وہ پین بھی انہوں نے بریف کیس میں سے نکالا تھا۔

میں نے ایک کروڑ روپے کا بیرر چیک لکھ کر غنی کے حوالے کیا اور اس سے کہا کہ اگر بینک منیجر کوئی اعتراض کرے تو اس سے میری بات کرادینا۔''

غنی نے اشاروں میں کچھ کرنے کا اشارہ کیا لیکن میں نے اسے روک دیا۔

''کیا بینک منیجر آپ کے چیک پر بھی اعتراض کرسکتا ہے نواب صاحب؟'' مولا داد نے ایک بار پھر میری آنکھوں پر پٹی باندھتے ہوئے پوچھا۔

''وہ صرف مجھ سے تصدیق کرنا چاہے گا کہ میں نے اتنی بڑی رقم کا چیک اپنے آدمی کو دیا ہے یا نہیں؟'' میں نے کہا۔ ''بعض اوقات لوگ جعلی دستخط پر بھی تو چیک نکالنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

پھر مولا داد نے مجھے بہت آرام سے عقبی سیٹ پر بٹھادیا اور خود وہیں سے دائیں طرف کچے راستے پر مڑ گیا۔

مجھے حیرانی تو اس بات کی تھی کہ اگر کوئی گاڑی ہمارے پیچھے آرہی تھی تو وہ کہاں رہ گئی تھی۔ میں اسی لیے باتوں میں وقت ضائع کررہا تھا کہ وہ لوگ پہنچ جائیں لیکن وہ لوگ آخر تک نہیں آئے۔ گاڑی کچے لیکن ہموار راستے پر چلتی رہی۔ مجھے اندازہ ہوگیا کہ یہ راستہ عموماً گاڑیوں کے استعمال میں رہتا ہوگا اسی لیے اتنا ہموار تھا۔ اس دوران میں گاڑی صرف ایک مرتبہ بائیں طرف، دو مرتبہ دائیں طرف اور پھر دو مرتبہ بائیں طرف گھومی تھی لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کون سا گاؤں ہے۔

''نواب صاحب کو صبح ہونے سے پہلے ہی اپنے ڈیرے پر پہنچانا ہے۔'' ایک سیاہ پوش نے کہا۔

''صبح ہونے میں تو ابھی دیر ہے۔ اس وقت تو ہم اپنے اسی پرانے دوست کے گھر ٹھہریں گے جہاں ایک دفعہ اس سے پہلے بھی ٹھہرے تھے۔''

وہ جان بوجھ کر اپنے اس دوست کا نام نہیں لے رہا تھا۔

پھر گاڑی ایک جگہ رک گئی۔ فوراً ہی ایک آہنی پھاٹک کھلنے کی آواز آئی۔ گاڑی اندر داخل ہوئی تو وہ پھاٹک دوبارہ

بند کر دیا گیا۔

مولا داد نے مجھے بہت احترام سے نیچے اتارا۔ پھر وہ میرا ہاتھ پکڑ کر ایک کمرے میں لے گیا۔ اس کا احساس مجھے اس طرح ہوا کہ کمرے میں دبیز قالین تھا اور ایک پنکھا چل رہا تھا۔

اچانک میری آنکھوں سے پٹی اتار دی گئی۔ وہ خاصا بڑا اور سادگی سے آراستہ کمرا تھا۔ کمرے میں ایک ٹیوب لائٹ روشن تھی۔ پنکھے اور ٹیوب لائٹ سے یہ ثابت ہو رہا تھا کہ میں جس جگہ موجود ہوں' وہ بالکل پس ماندہ نہیں ہے بلکہ وہاں بجلی بھی موجود ہے۔

''نواب صاحب!'' مولا داد نے کہا'' کیا خدمت کروں آپ کی؟'' اس کے لہجے میں احترام تھا۔ ''کافی پینا پسند فرمائیں گے یا کچھ کھانے کو لاؤں؟''

میرا ارادہ تھا کہ میں کھانا اسلام آباد جا کر کھاؤں گا لیکن مولا داد کی وجہ سے میرا راستہ کھوٹا ہو گیا۔ انسان ارادہ کچھ بھی کرے' ہوتا وہی ہے جو قدرت کو منظور ہوتا ہے۔

مجھے لگ رہا تھا کہ اب مجھے صبح نو بجے کے بعد ہی یہاں سے چھٹکارا ملے گا۔ نور اس وقت تک پہنچ چکی ہوگی۔ وہ مجھے ائرپورٹ پر نہ پا کر کتنی افسردہ ہو جائے گی کہ رفیق پاکستان آ کر مجھے بالکل بھلا بیٹھا' مجھے لینے ائرپورٹ تک نہیں آیا۔ ممکن ہے وہ غصے میں ائرپورٹ ہی سے لندن لوٹ جائے۔ وہ کچھ ایسی ہی تھی۔ وہ مجھ سے ٹوٹ کر محبت کرتی تھی اور جواب میں بھی ایسی ہی شدت چاہتی تھی۔ یہ میری محبت ہی تو تھی جو وہ لندن میں نہ صرف رکی ہوئی تھی بلکہ بزنس کو بھی بہترین انداز میں چلا رہی تھی۔

میں بھی کیا کرتا' میں دو مہینے دس دن تک تو اس مردود رانا جونیئر کی قید میں رہا تھا' وہاں سے نکلا تو راجا نے مجھے اسلام آباد کے اسپتال میں قید کر دیا' پھر مجھے کمزوری اور نقاہت نے گھیر لیا۔ میں دوسروں کے سامنے خود کو بظاہر تندرست و توانا ہی ظاہر کرتا تھا لیکن شہناز جانتی تھی کہ ابھی میں اس قابل نہیں ہوں کہ کوئی بھی ذہنی یا جسمانی مشقت کا کام کر سکوں۔ میں خود بھی اپنے آپ کو توانا ہی محسوس کرتا تھا' میں چلتا پھرتا تھا' ہنستا بولتا تھا اور اپنے جسم میں توانائی محسوس کرتا تھا لیکن اس روز تھانے سے واپسی پر حملہ آور سے ٹکرانے کے بعد مجھے یہ احساس ہوا کہ میرے جسم میں جان بالکل نہیں ہے۔ ابھی مجھے مزید آرام اور دواؤں کی ضرورت ہے۔

میں نے لگ کر وٹامن بی کمپلیکس کے شربت اور گولیاں کھائی تھیں' ایکسرسائز کی تھی اور اب خود کو بہت بہتر محسوس کر رہا تھا۔ پھر جب میں نور کو ریسیو کرنے نکلا تو یہ مولا داد کی افتاد آن پڑی۔ میرا اندازہ ہے کہ آلٹو والا وہ جوڑا بھی انہی کا ساتھی تھا ورنہ کوئی گاڑی اگر او ور ہو جائے تو اسے بہت زوردار دھکے کی ضرورت پڑتی ہے۔ میرا خیال تھا کہ مجھے بھی دھکا لگانے میں غنی کا ساتھ دینا پڑے گا، جبکہ غنی کے ایک ہی دھکے میں گاڑی اسٹارٹ ہو گئی تھی۔

مجھے صبح ہونے سے پہلے ہر صورت یہاں سے نکلنا تھا ورنہ ممکن ہے نور مجھ سے بدظن ہو جاتی۔ راجا کو شاید غلط فہمی ہوئی تھی کہ میرے محافظوں کی گاڑی میرے پیچھے تھی۔ ممکن ہے وہ لوگ کہیں اور جا رہے ہوں ورنہ انہیں مجھ تک پہنچنے میں اتنی دیر نہ لگتی۔

مجھے بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔ مولا داد دوبارہ آیا تو میں نے کہا'' مولا داد! اس وقت کچھ کھانے کو مل سکتا ہے؟''

''ارے اپنا ہی گھر ہے نواب صاحب! کھانا ابھی حاضر ہو جائے گا' آپ اگر اس وقت بتا دیتے تو میں اب تک آپ کے لیے کھانا لے آتا۔''

پھر واقعی پندرہ منٹ کے اندر اندر مولا داد نے بھنے ہوئے قیمے' پراٹھے' مکھن اور اچار کا انتظام کر دیا۔ کھانا لانے والی ایک کمسن لڑکی تھی۔ اس کی عمر مشکل سے پندرہ سال ہوگی لیکن اس کی آنکھوں کی چمک سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ذہنی طور پر اپنی عمر سے زیادہ بڑی ہے۔ دیہات میں لڑکیاں ذہنی طور پر جلد بالغ ہو جاتی ہیں۔ اس کی نظروں میں میرے لیے ایک خاص پیغام تھا۔ وہ اتنی چھوٹی تھی کہ مجھے یہ سوچ کر ہی شرمندگی ہو رہی تھی۔

میں نے دل پر جبر کر کے پوچھا'' نام کیا ہے تمہارا؟''

''نیلم!'' اس نے سر جھکا کر یوں شرما کر کہا جیسے میں اس کا منگیتر ہوں یا ہونے والا ہوں۔

''مولا داد سے تمہارا کیا رشتہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''مولا داد چاچا ابا کا دوست ہے۔ وہ اکثر یہاں مہمانوں کو لے کر آتا رہتا ہے۔'' اس نے کہا۔

''مہمانوں کو......؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''یا پھر ان لوگوں کو جن سے اسے تاوان وصول کرنا ہوتا ہے؟'' اس نے گردن جھکا لی' میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

''میں نے کچھ پوچھا ہے نیلم!'' میں نے بے تکلفی سے کہا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں جی!'' نیلم نے آہستہ سے کہا۔'' مولا داد چاچا ابھی ابا سے کہہ رہا تھا کہ اس دفعہ بہت بڑا

[ہا]تھ مارا ہے۔ نینا اور سہیل نے تو کمال کر دیا۔ انہوں نے [گ]اڑی کی خرابی کا بہانہ بنا کر اس نواب کو روک لیا۔''

''مولا داد کو کیسے معلوم ہوا کہ میں نواب ہوں؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ تو مجھے نہیں معلوم لیکن مولا داد چاچا نے ایک گھنٹا پہلے [ہ]ی نینا اور سہیل کو جی ٹی روڈ پر کھڑا کر دیا تھا کہ جب میں فون کروں تم لوگ اپنا ڈراما شروع کر دینا۔''

''اس وقت یہاں کتنے آدمی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ابا کو ملا کر چھ آدمی ہیں اور سب کے سب مسلح ہیں۔ [ا]س مکان کی دیواریں بہت اونچی ہیں۔ صحن میں دو آدمی بندوقیں لیے بیٹھے ہیں۔ ابا کے پاس بھی بھرا ہوا پستول ہے۔ [و]ہ بھی مولا داد کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ صحن کے ساتھ دو کمروں میں بھی دو دو آدمی ہیں۔ ان کے پاس بھی بندوقیں ہیں۔ مولا داد چاچا کے پاس بھی بندوق ہے اس لیے اگر آپ یہاں سے بھاگنے کا ارادہ کر رہے ہیں تو باز رہیں۔ مولا داد چاچا بہت جنگلی اور وحشی قسم کا آدمی ہے۔ وہ شکار ہاتھ سے نکلتا دیکھتا ہے تو اسے جان سے مار دیتا ہے۔ اس کے چاروں آدمی بھی وحشی ہیں' بالکل جنگلی اور اجڈ!''

اچانک مولا داد کمرے میں داخل ہوا تو میں نے گفتگو کا موضوع بدل دیا اور کہا'' نیلم! تم پڑھتی ہو؟''

''میں نے آٹھ جماعت تک پڑھا ہے نواب صاحب!'' وہ جلدی سے بولی۔

''تمہیں کافی بنانی آتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کافی میں بنا دوں گا نواب صاحب! یہ تو ابھی بچی ہے۔ ہاں یہ چائے بہت اچھی بناتی ہے۔''

''تو پھر چائے ہی لے آؤ۔'' میں نے کہا۔

نیلم اٹھلاتی' بل کھاتی کمرے سے باہر نکل گئی۔

اس کا باپ برابر والے کمرے میں موجود تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ وہ ہماری باتیں سن رہا تھا' نیلم کے جاتے ہی وہ کمرے میں آیا اور مولا داد سے بولا۔

''مولے! یہ میری بیٹی سے ساری معلومات لے رہا تھا کہ یہاں کتنے آدمی ہیں' کہاں کہاں ہیں؟ یہ کہیں بھاگنے کا ارادہ تو نہیں رکھتا؟''

''ارے نواب صاحب تو بہت شریف اور سیدھے سادے آدمی ہیں۔ یہ بھاگ کر کہاں جا سکتے ہیں؟'' مولا داد مکاری سے مسکرایا۔ اس وقت اس کی کلاشنکوف اس کے شانے سے لٹک رہی تھی۔

میرے نزدیک ہی پانی سے بھرا ہوا سلور کا جگ رکھا تھا۔ میں نے پہلے گلاس اٹھایا' پھر جگ اٹھا کر یہ ظاہر کیا کہ میں پانی پینا چاہتا ہوں۔ اچانک میں نے وہ جگ نیلم کے باپ کے چہرے پر پوری قوت سے دے مارا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے جھپٹ کر مولا داد کی گردن دبوچ لی' میرا دوسرا ہاتھ اس کی کلاشنکوف پر تھا۔ نیلم کے باپ نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن میں نے دائرے میں لات گھما کر اسے ناک آؤٹ کر دیا۔

پھر میں نے مولا داد کی گردن پر اپنے ہاتھ کی گرفت مزید سخت کر دی اور ایک جھٹکے سے کلاشنکوف اس کے شانے سے اتار لی۔'' اگر ذرا سی بھی آواز نکالی تو گلا دبا کر یہیں مار دوں گا۔''

اس نے میرے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

''اپنے آدمیوں کو اندر بلاؤ۔'' میں نے کہا۔

اس نے باری باری سب کو آواز دی۔ وہ سب دوڑے ہوئے آئے لیکن اپنے سردار کی حالت دیکھ کر وہیں ساکت رہ

گئے۔

''ان سے کہو کہ اپنے ہتھیار پھینک دیں۔'' میں نے کہا۔
اس کی گردن سختی سے میری کہنی کے جوڑ کے شکنجے میں جکڑی ہوئی تھی۔ اس نے اشارے سے کہا کہ ہتھیار پھینک دو' ان میں سے ایک نے چالاکی دکھانے کی کوشش کی۔ میں نے اس سے پہلے ہی اس کے منہ پر زوردار لات رسید کردی۔ وہ اوندھے منہ گرا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کے دو چار دانت ضرور ٹوٹ گئے ہوں گے۔

اسی وقت باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز آئی۔ میں نے مولاداد کی گردن پکڑے پکڑے اسے گن پوائنٹ پر لے لیا اور نیلم سے کہا۔ ''دیکھو' دروازے پر کون ہے۔ کوئی تمہارے ابا کو پوچھے تو کہہ دینا کہ انہیں بخار ہے اور وہ سوئے ہوئے ہیں۔''

دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی اور آواز آئی ''دروازہ کھلواوئے...... پولیس!''

اس دفعہ میں نے غنی کی آواز پہچان لی اور نیلم سے کہا کہ دروازہ کھول دے۔

نیلم نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ فوراً ہی غنی اور چاروں محافظ کمرے میں داخل ہوئے۔ ان سب کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں جن کا رخ سامنے کی طرف تھا۔

وہ کمرے میں داخل ہوئے تو اندر کا منظر دیکھ کر حیران رہ گئے۔

''نواب صاحب! آپ خیریت سے تو ہیں؟''

''میں خیریت سے ہوں لیکن یہ بتاؤ' تم لوگ کہاں رہ گئے تھے؟ لیکن پہلے ان سب کو باندھو اور حویلی لے چلو۔''

''اس لڑکی کو بھی؟'' غنی نے کہا۔

''ہاں' اس لڑکی کو بھی۔ یہ اکیلی یہاں کیا کرے گی؟''

ان لوگوں نے ان سب کی تلاشی لی اور انہیں وہیں سے رسی ڈھونڈ کر باندھ دیا۔ پھر سرور نے ان سب کو جانوروں کی طرح اپنی ڈبل کیبن پک اپ میں ٹھونس دیا۔

''تم لوگ انہیں حویلی کے تہ خانے میں بند کردو۔ ان کا فیصلہ میں اسلام آباد سے واپسی پر کروں گا۔''

صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں تھی' میں نے غنی سے کہا۔ ''ہمیں سات بجے تک اسلام آباد ائرپورٹ پر پہنچنا ہے۔''

''آپ فکر ہی نہ کریں نواب صاحب!'' غنی نے کہا اور گاڑی کو جیٹ فائٹر کی طرح بھگانے لگا۔

غنی بہت ماہر ڈرائیور تھا لیکن رات کے وقت اتنی خوفناک ڈرائیونگ خطرناک ہوتی ہے لیکن مجھے ہر صورت میں نور کو ائرپورٹ پر ریسیو کرنا تھا اس لیے میں نے بھی غنی کو نہیں ٹوکا۔

سات بجنے میں دس منٹ باقی تھے جب ہم لوگ اسلام آباد انٹرنیشنل ائرپورٹ پر تھے۔ فلائٹ بالکل صحیح وقت پر آرہی تھی۔ گویا وہ ٹھیک سات بجے وہاں لینڈ کرنے والی تھی۔ میں ایک ایک لمحہ شمار کررہا تھا۔ پھر اناؤنسر نے فلائٹ کے لینڈ کرنے کا اعلان کیا تو میں ڈیپارچر لاؤنج کے باہر جا کر ایسے حصے میں کھڑا ہوگیا جہاں سے آنے والے مسافر صاف نظر آتے تھے۔ جہاں درمیان میں شیشے کی دیوار تھی۔

میں چاہتا تو میں اپنا اسٹیٹس اور خاندانی پس منظر بتا کر وی آئی پی لاؤنج میں جاسکتا تھا لیکن وہاں جا کر بھی کیا کرتا' نور تو مجھے انہی شیشے کی دیواروں کے اس پار نظر آنے والی تھی۔

مجھے ابھی تک نور دکھائی نہیں دی تھی۔ میری بے قراری تھی کہ بڑھتی جارہی تھی۔ مجھے نہ جانے کیوں اس موقع پر یہ شعر یاد آرہا تھا 'زندگی کچھ روز کی ہے اور میں' کچھ روز سے بہت پریشاں ہوں!

میں تو مہینوں سے پریشان تھا اور ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا تھا کہ نہ جانے کب زندگی کی شام ہوجائے۔ زیادہ دولت بھی جان کا عذاب ہوتی ہے۔ پاکستان میں رانا فیملی میری دشمن تھی تو میں وہاں لندن میں پوری انگریز قوم کی آنکھوں میں کھٹکتا تھا۔

جب اس فلائٹ کا آخری مسافر بھی نکل گیا تو مجھے فکروں اور وسوسوں نے گھیر لیا۔ کہیں نور کے ساتھ بھی تو ایسا ہی کوئی حادثہ پیش نہیں آگیا جیسا میرے ساتھ پیش آیا تھا؟ وہ تو بہت نرم و نازک لڑکی تھی' قید و بند کی صعوبتیں کب برداشت کرسکتی تھی۔

میں نے غنی سے کہا ''اسٹیشن منیجر کے کمرے میں جا کر کہو کہ نواب رفیق احمد شیرازی آف ست بدھائی اسٹیٹ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔''

غنی اسٹیشن منیجر کے کمرے کے دروازے پر پہنچا تو اس کا چپراسی راہ میں حائل ہوگیا۔ غنی نے اس سے کچھ دیر بحث کی پھر اسے ایک طرف دھکیل کر اسٹیشن منیجر کے کمرے میں داخل ہوگیا۔

دوسرے ہی لمحے اسٹیشن منیجر خود دوڑا دوڑا میرے استقبال کو آگیا۔ ''میری خوش نصیبی ہے سر کہ آپ یہاں تشریف لائے۔ فرمایئے' میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟ آیئے میرے آفس میں تشریف لے آیئے۔'' وہ مجھے اپنے آفس میں لے گیا۔

''منیجر صاحب!'' میں نے کہا۔ ''میری ایک فرینڈ اس فلائٹ کے ذریعے لندن سے پاکستان آنے والی تھی لیکن''

پہنچی نہیں' کیا آپ کنفرم کرسکتے ہیں کہ وہ آن بورڈ ہوئی تھیں یا نہیں یا پھر انہوں نے سیٹ کینسل کرادی تھی؟''

''آپ پلیز ان کا نام بتایئے۔'' منیجر نے ایک فائل اٹھاتے ہوئے کہا۔

''مس ماہ نور! سی ای او آف نور شیرازی اینڈ کمپنی۔''

اسٹیشن منیجر نے اپنی ایک طرح دار اسسٹنٹ کو طلب کیا اور اس سے معلومات حاصل کرنے کو کہا۔ وہ لچکتی ہوئی' مصنوعی مسکراہٹ کی بجلیاں گراتی وہاں سے چلی گئی۔ وہ دو ہی منٹ بعد واپس آگئی اور بولی۔ ''سر' مس ماہ نور نے سیٹ تو کینسل نہیں کرائی لیکن وہ فلائٹ پر پہنچی ہی نہیں۔''

''اوکے' تھینک یو!'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''ارے نواب صاحب! کچھ ہمیں بھی خدمت کا موقع دیں' کچھ کولڈ ڈرنک' چائے' کافی وغیرہ......''

''تھینک یو! میں اس وقت جلدی میں ہوں' آئندہ آیا تو آپ کی آفر ضرور قبول کروں گا۔ آپ کبھی ست بدھائی تشریف لائیں۔'' یہ کہہ کر میں نے اس کے ہاتھ میں اپنا وزیٹنگ کارڈ دے دیا۔

میں نے ائرپورٹ کی عمارت سے باہر نکل کر نور کا سیل نمبر ملایا۔ میں اس وقت شدید جھنجلاہٹ کا شکار تھا۔ اس نے دوسری ہی بیل پر فون اٹھالیا ''ہائے جان! کیسے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''جان کی بچی! تم آئیں کیوں نہیں' میں رات بھر خوار ہوتا رہا اور صبح چھ بجے سے ائرپورٹ پر موجود ہوں۔''

''اتنا غصہ مت کرو جان!'' اس نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔

''اور تمہیں نہیں آنا تھا تو کم از کم ایک فون تو کرسکتی تھیں۔ جانتی ہو اتنی سی دیر میں میرے دل پر کیا بیت گئی ہے۔ مجھے طرح طرح کے اندیشوں نے گھیر لیا تھا۔''

''میں فون تو تمہیں تب کرتی جب میرا پروگرام کینسل ہوتا۔ میرا پروگرام تو فلائٹ سے آدھا گھنٹا پہلے کینسل ہوا تھا۔ دراصل فرانس کی ایک فرم سے گزشتہ دو ماہ سے ہمارے مذاکرات چل رہے تھے۔ آج اس کا سی ای او اچانک ڈیل پر رضامند ہوگیا اور اس نے فلائٹ سے ٹھیک آدھے گھنٹے پہلے کا ٹائم دے دیا۔ میں نے سوچا' تمہیں تو میں بعد میں فون کرکے منالوں گی لیکن کروڑوں روپے کی یہ ڈیل ہاتھ سے نکل گئی تو پھر نہیں ملے گی' اس کے بعد بھی پے در پے چار میٹنگز ہیں۔ اب میں اگلے ہفتے اسی دن آؤں گی۔''

''واہ' کیا بات ہے آپ کی۔ یعنی اب الٹی گنگا بہہ رہی ہے۔ پہلے تم آنے کو بے تاب تھیں' اب میں کہہ رہا ہوں تو تم مصروفیت پر مصروفیت نکال رہی ہو۔''

''ایک ہی ہفتے کی تو بات ہے جان!'' اس نے پیار بھرے لہجے میں کہا۔ ''اور تم غصے میں بالکل اچھے نہیں لگتے۔ اس لیے خدارا غصہ مت کیا کرو' چلو اب ہنس دو۔''

مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔

''گڈ بوائے!'' اس نے ہنس کر کہا۔ ''اب انشاءاللہ اگلے ہفتے تم سے اسی وقت ملاقات ہوگی' اوکے بائی!'' اس نے فضا میں ہوائی بوسہ اتنی بلند آواز میں اچھالا کہ اس کی چمکار مجھ تک بھی پہنچی۔

میں نے غنی سے گاڑی لانے کو کہا اور خود ائرپورٹ سے باہر نکل آیا۔

حویلی میں یہ خبر پھیل چکی تھی کہ نور آرہی ہے اور میں اسے ریسیو کرنے اسلام آباد گیا ہوں۔ مجھے تنہا دیکھ کر وہ سبھی گھبرا گئے۔ باری باری ہر شخص پوچھنے لگا۔ ''خیریت تو ہے' نور آئی کیوں نہیں؟'' میں نے اس کے نہ آنے کا جواز بتایا تو شہناز نے کہا۔ ''نور بھی پکی بزنس وومن ہوگئی ہے۔ اس نے بزنس ڈیل کی خاطر فلائٹ چھوڑ دی اور میٹنگ میں ایسی مصروف ہوئی کہ ائرپورٹ نہ پہنچ سکی۔''

''فیکے پتر' اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔'' راجا نے کہا ''اب تو افسوس کیوں کررہا ہے' تجھے تو خوش ہونا چاہیے' تو نور کو ایسا ہی تو دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے ثابت کردیا ہے کہ وہ لندن کا کاروبار نہ صرف تیرے بغیر چلاسکتی ہے بلکہ اسے وسعت بھی دے سکتی ہے۔'' پھر وہ چونک کر بولا۔ ''اس بات کو چھوڑ' یہ بتا کہ تو نے اس مولاداد اور اس کے ساتھیوں کو کہاں سے پکڑوادیا۔''

میں نے شروع سے لے کر آخر تک ساری بات اسے بتادی۔

''ہاں' میں سرور سے یہ تو پوچھنا ہی بھول گیا کہ وہ لوگ اس رات کہاں غائب ہوگئے تھے؟''

''کہیں غائب نہیں ہوئے تھے۔'' شہناز نے کہا۔ ''وہ لوگ تمہاری گاڑی کے عین پیچھے تھے۔ آدھے راستے میں تمہارے ایک گارڈ کو دل کا شدید دورہ پڑا۔ وہ بے چارے اسے لے کر سیدھے واپس یہاں آگئے۔ انہیں معلوم تھا کہ اسے یہاں سے اچھا میڈیکل ٹریٹمنٹ صرف لاہور یا اسلام آباد میں مل سکتا تھا۔ اسلام آباد دور تھا' ست بدھائی نزدیک تھا اس لیے وہ یہاں آگئے اور بروقت آگئے۔ اگر انہیں آدھے گھنٹے کی بھی دیر ہوجاتی تو تمہارا ایک محافظ مزید کم ہوجاتا۔ ڈاکٹر احمد نے اسے بچانے کے لیے پوری رات

کوشش کی ہے اب اس کی حالت خطرے سے باہر ہے لیکن میں نے ابھی اسے آئی سی یو میں رکھا ہے۔ دو چار دن ریسٹ کرے گا تو بالکل نارمل ہو جائے گا۔ اسے بہت سیریس انجائنا کا اٹیک ہوا تھا جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دل کے دورے میں تبدیل ہو سکتا تھا اور یہی دورہ اس کی جان لینے کا سبب بن جاتا۔"

"مولا داد اور اس کے ساتھیوں کا کیا کرنا ہے؟" میں نے راجا سے پوچھا۔

"مولا داد کے سر پر بیس لاکھ روپے کا انعام ہے۔ تجھے تو اس انعام سے کوئی دلچسپی نہیں ہوگی۔ تو انعام غنی کے حوالے کر دے۔"

"ویسے بھی غنی اس انعام کا مستحق ہے۔" میں نے کہا۔

"تو ابھی اس صورت حرام انسپکٹر چیمہ کو بلا کر مولا داد اور اس کے ساتھیوں کو غنی کے ذریعے پولیس کے حوالے کرا دے۔ میں آئی جی صاحب سے بات کرتا ہوں ورنہ یہ کم بخت پولیس والے کبھی بھی کسی کو انعام نہیں لینے دیتے۔ یہ لوگ سارا کریڈٹ بھی خود لے جاتے ہیں اور انعام بھی!"

میں نے اسی وقت آئی جی صاحب کو فون کیا اور انہیں بتایا کہ حویلی کے ایک گارڈ غنی نے خطرناک ڈاکو مولا داد اور اس کے ساتھیوں کو پکڑا ہے۔ وہ انہیں پولیس کے حوالے کرنا چاہتا ہے لیکن یہ شیورٹی بھی چاہتا ہے کہ اس کی گرفتاری پر جو انعام مقرر ہے وہ اسی کو ملے۔ آپ انسپکٹر چیمہ کو فون کر کے ہدایات دیں کہ وہ انعام ہر صورت میں غنی ہی کو ملنا چاہیے۔ آپ ہی اسے حویلی پہنچنے کا حکم دیں تو بہتر ہوگا۔"

ایک گھنٹے بعد وہ یوں منہ لٹکائے ہوئے حویلی میں آیا جیسے ابھی ابھی اپنے کسی عزیز کو دفنا کر آیا ہو۔ اس نے میری اور راجا کی موجودگی میں ان مجرموں کو اپنی تحویل میں لیا اور گواہوں کے طور پر ہمارے دستخط بھی لیے اور انہیں پولیس موبائل میں لے کر واپس چلا گیا۔

پھر میں اسپتال کے توسیعی منصوبوں اور اسکول کی تعمیر میں اتنا مصروف ہوا کہ مجھے ایک ہفتہ گزرنے کا احساس تک نہ ہوا۔

یہ احساس اس وقت شدید ہوتا تھا جب نور کا فون آتا تھا۔ وہ روزانہ رات کو فون کرتی تھی۔

میں غنی کے ساتھ ایک مرتبہ پھر اسلام آباد انٹرنیشنل ائرپورٹ کی طرف جا رہا تھا۔ میرے ساتھ اس مرتبہ گارڈز بھی تھے۔ میں اب کسی بھی قسم کا رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔ ائرپورٹ پہنچ کر پھر وہی منظر تھا۔ مسافر ایک ایک کر کے باہر

نکلتے گئے لیکن نور نہیں نکلی' میں نے منیجر کے پاس جانے کے بجائے اسے فون کر لیا۔

"ہیلو جان!" میں نے کہا "کیا اس مرتبہ پھر کوئی پرابلم ڈیل آڑے آ گئی؟" میرے لہجے میں جھنجلاہٹ کے ساتھ طنز بھی تھا۔

"تم یہ بتاؤ' تم مجھ سے جھوٹ کب سے بولنے لگے ہو؟" اس نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"جھوٹ......؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "میں ساری دنیا سے جھوٹ بول سکتا ہوں لیکن اپنی جان سے جھوٹ بولنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔" میں نے جذباتی ہو کر کہا۔

"رابعہ کو مرے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"شاید ایک مہینا یا اس سے کچھ زیادہ۔" میں نے کہا۔ "میں نے تمہیں بتایا تو تھا۔"

"ہاں' تم نے بتایا تھا کہ رابعہ مر گئی۔"

"اسے کسی نے قتل کر دیا تھا۔" میں نے کہا۔ "شاید میں نے تمہیں یہ نہیں بتایا تھا۔" میں نے کہا۔ "اور تمہیں یہ اچانک رابعہ کا دورہ کیوں پڑ گیا؟ کیا تمہیں بھی رابعہ فوبیا ہو گیا ہے؟"

"رابعہ کو قتل کیا گیا یا وہ مر گئی؟ بات تو ایک ہی ہے نا؟"

"ہاں تو پھر......؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"لیکن رابعہ زندہ سلامت میرے سامنے بیٹھی ہے۔ تم نے کسی عورت کو مار کے اس کی لاش کو رابعہ کی لاش کی حیثیت سے شناخت کیا اور مشہور کر دیا کہ رابعہ مر گئی؟"

"ایسا نہیں ہے جان!" میں نے کہا۔

"اچھا' لو تم خود اس سے بات کرو۔"

اچانک مجھے فون پر رابعہ کا قہقہہ سنائی دیا۔ "میں نے کہا تھا نا کہ مجھے مارنا اتنا آسان نہیں ہے۔" وہ پھر پاگلوں کی طرح ہنسی اور میں نے سر پکڑ لیا۔

رابعہ کے قہقہے سن کر مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی میرے سر پر ہتھوڑے برسا رہا ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اگر زندہ تھی تو اس نے اپنی موت کا ڈراما کیوں رچایا؟ زوہیب پر بھی سازش کا شبہ کیا جا سکتا تھا لیکن وہ ایسا کیوں کرتا؟ اگر مجھے اس کے خود ساختہ قتل میں پھانسنے کی کوشش کی جاتی تو یہ کوشش ناکام ہو جاتی۔ رابعہ کی جان لینے میں میرا کیا مفاد تھا۔ میں تو کورٹ میں ست بدھائی کی جاگیر اسے گفٹ کر چکا تھا۔ وہ تو خود ہی کورٹ میں نہیں پہنچی تو اس میں میرا کیا قصور؟ اگر میں اسے قتل کرتا تو گفٹ ڈیڈ پر دستخط کرنے سے پہلے کرتا۔ پھر...... پھر یہ سب کیا تھا؟ اب رابعہ کون سا کھیل

کھیل رہی تھی؟

میں اس وقت ارائیول لاؤنج میں بیٹھا ہوا تھا۔ غنی مجھ سے کچھ فاصلے پر مستعد کھڑا تھا۔ میرا چہرہ دیکھ کر وہ بھی تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس نے سیل فون پر ہونے والی گفتگو بھی نہیں سنی تھی اس لیے وہ مزید پریشان تھا کہ نور اگر پاکستان نہیں پہنچی تو کیوں نہیں پہنچی؟ وہ کسی حادثے کا شکار ہو گئی یا اسے بھی اغوا کر لیا گیا؟

سوچ سوچ کر میرا دماغ پھوڑے کی طرح دکھنے لگا۔ رابعہ سیل فون کا سلسلہ منقطع کر چکی تھی۔ مجھے یہ بھی فکر تھی کہ کہیں وہ نور کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے یا جھوٹے سچے قصے سنا کر، اپنی اداکاری سے اسے مجھ سے بدظن نہ کر دے۔ مجھے یہ فکر تو برائے نام تھی کہ وہ نور کو مجھ سے بدظن کر سکے گی لیکن وہ مظلوم بن کر نور کو نقصان تو پہنچا ہی سکتی تھی۔

"سر!" غنی کی آواز پر میں چونک اٹھا۔ "سب خیریت تو ہے سر؟"

"ہاں، سب خیریت ہے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "چلو، واپس ست بدھائی چلو۔"

غنی نے میرے لیے گاڑی کا دروازہ کھولا اور میں عقبی سیٹ پر تقریباً ڈھے سا گیا۔ غنی مجھ سے خاصا بے تکلف تھا لیکن اس وقت شاید میرے چہرے پر جھنجلاہٹ اور غصے کے ایسے تاثرات ہوں گے کہ وہ بھی کچھ پوچھنے کی ہمت نہ کر سکا۔

میں نے بے چین ہو کر ایک مرتبہ پھر نور کا سیل نمبر ملایا لیکن دوسری طرف کئی گھنٹیاں بجنے کے بعد مجھے ریکارڈنگ سنائی دی کہ آپ کے مطلوبہ نمبر سے جواب موصول نہیں ہو رہا ہے۔

اس نئی صورتِ حال سے میں بہت بری طرح پریشان ہو گیا تھا۔ مجھ پر بہ یک وقت غصہ، جھنجلاہٹ اور پریشانی طاری ہو گئی تھی۔ میں نے جھنجلا کر دوبارہ نور کا سیل فون نمبر ڈائل کیا لیکن اس مرتبہ معلوم ہوا کہ آپ کا مطلوبہ نمبر اس وقت بند ہے۔ میں نے جھنجلا کر سیل فون سیٹ پر اچھال دیا۔

اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے جھپٹ کر سیل فون اٹھایا کہ نور کو بالآخر میرا خیال آ ہی گیا لیکن اسکرین پر راجا کا نمبر تھا۔ میں نے سیل فون کا بٹن دبا کر اسے کان سے لگا لیا۔ "ہیلو!" میں نے کہا۔

"کیا بات ہے فیکے پتر؟" راجا نے چونک کر پوچھا۔ "تیری آواز میں اتنی مردنی کیوں ہے؟ کیا ابھی تک ہوائی جہاز نے لینڈ نہیں کیا یا......"

"نور اس مرتبہ بھی نہیں آئی؟" میں نے بھنا کر کہا۔

"نہیں آئی؟" راجا نے حیرت سے پوچھا۔ "کیوں نہیں آئی؟ اس نے فلائٹ مس کر دی یا پھر کوئی اور بزنس میٹنگ......"

"ایسا کچھ نہیں ہے راجا!" میں نے کہا۔ "اس کے نہ آنے کی وجہ یہ ہے کہ رابعہ وہاں پہنچ گئی ہے۔"

"کیا؟" راجا کی آواز میں شدید حیرت تھی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے غنی کو بھی بری طرح چونکتے دیکھا۔ "کیا رابعہ زندہ ہے؟" راجا نے پوچھا۔

"ہاں، وہ بدچلن اور آوارہ لڑکی نہ صرف زندہ ہے بلکہ لندن بھی پہنچ چکی ہے۔" میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"کیا تجھے یقین ہے کہ رابعہ زندہ ہے؟" راجا نے پوچھا۔

"یقین!" میں نے کہا۔ "میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے اس سے بات کی ہے۔ تفصیل تجھے وہاں پہنچ کر بتاؤں گا۔ اس وقت میرا ذہن ماؤف ہو رہا ہے۔"

"تو زیادہ پریشان مت ہو فیکے پتر!" راجا نے کہا۔ "تو واپس آ جا، پھر سوچتے ہیں کہ اب کیا کرنا چاہیے؟ ہاں، ایک بات بتا!" راجا نے کہا۔ "رابعہ کے زندہ ہونے یا نہ ہونے سے نور کا کیا تعلق ہے؟"

"وہ کمینی نور کے پاس پہنچی ہوئی ہے۔" میں نے دانت پیس کر کہا۔

"اچھا تو گھر آ جا، پھر بات کرتے ہیں۔" راجا نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے سیل فون جیب میں رکھا اور سیٹ کی پشت سے سر ٹیک کر آنکھیں موند لیں، میں مسلسل یہی سوچ رہا تھا کہ یہ رابعہ کی کوئی نئی سازش ہے۔ اگر یہ سازش تھی تو وہ تنہا یہ سب کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ جب میں رابعہ کی لاش شناخت کر کے لوٹ رہا تھا تو میرے گارڈز کی ایک گاڑی کو دھماکے سے اڑا دیا گیا تھا اور مجھ پر بھی قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔ یہ اکیلی رابعہ کے بس کی بات نہیں تھی۔ یقیناً اس کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی شامل ہیں۔

غنی بار بار عقبی شیشے میں مجھے دیکھ کر پہلو بدل رہا تھا۔ پھر اس نے دبے لفظوں میں کہا۔ "سر، آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟ رابعہ بی بی اگر زندہ بھی ہیں تو اس سے ہمیں کیا فرق پڑے گا؟"

"ابھی میں اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا کہ رابعہ کے مقاصد کیا ہیں؟" پھر میں چونک کر بولا۔ "غنی، تم حویلی کے حفاظتی اقدامات کے ذمے دار ہو، ان انتظامات میں دراڑیں کیسے پڑ رہی ہیں۔ مولا داد کو کیسے معلوم ہوا کہ میں تنہا

اسلام آباد کی طرف جا رہا ہوں؟ گھر کا کوئی بھیدی ضرور ہے جو یہاں کی خبریں میرے دشمنوں تک پہنچا رہا ہے، پہلے تو سب سے بڑی بھیدی رابعہ تھی، اب تو وہ بھی نہیں رہی، تم نے معلوم کرنے کی کوشش کی کہ اب یہ کام کون کر رہا ہے؟''

''سر، میں تو اسی دن سے کوشش کر رہا ہوں اور اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ حویلی کا کوئی عام آدمی نہیں ہے۔ وہ ایسا شخص ہے جو آپ کے بھی نزدیک ہے ورنہ آپ کے اسلام آباد جانے کا علم تو چند خاص افراد کے علاوہ کسی کو بھی نہیں تھا۔''

''ان گارڈز کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے جنہیں تم اپنے طور پر ساتھ لے جا رہے تھے؟''

''وہ سب میرے آزمائے ہوئے لوگ ہیں سر!'' غنی نے کہا۔ ''اس کے باوجود میں ان پر بھی نگاہ رکھوں گا۔''

میں حویلی پہنچا تو راجا اور شہناز میرے ہی منتظر تھے۔ وہاں ڈاکٹر حسن اور ٹینا بھی موجود تھے؟ راجا اور شہناز کے علاوہ ان میں سے کسی کو علم نہیں تھا کہ رابعہ زندہ ہے۔ ان لوگوں کو نور کے نہ آنے پر مایوسی ہوئی تھی۔ میں نے ان سے یہی کہا کہ نور پھر کسی بڑی بزنس ڈیل میں مصروف ہو گئی ہے۔

دوسرے لوگ کچھ دیر بیٹھ کر چلے گئے تو راجا نے کہا۔ ''او یار فیکے! تو اتنا پریشان کیوں ہے؟ تجھے رابعہ سے کیا خطرہ ہے؟''

''یار، وہ نور کو میرے خلاف بھڑکا سکتی ہے۔ وہ لندن میں میری بہن کی حیثیت سے بزنس کو بھی نقصان پہنچا سکتی ہے۔ اس نے نور سے یہی کہا ہے کہ رفیق نے میری جان لینے کی کوشش کی، اس میں ناکام ہو کر اس نے کسی دوسری لڑکی کو قتل کیا، اس کا چہرہ مسخ کیا۔ اس کی انگلی میں میری انگوٹھی اور لاکٹ ڈالا اور پھر اسے میری لاش کی حیثیت سے شناخت بھی کر لیا۔''

''فرض کر ایسا ہی ہے تو کیا ہوگا؟ اس کی بکواس پر کون یقین کرے گا؟ قتل کرنے کے لیے سب سے پہلے وجہ قتل کا ہونا ضروری ہے۔ تو نے تو جج کے سامنے ریاست ست بدھائی رابعہ کو گفٹ کر دی تھی۔ اب تو اسے قتل کر کے کیا کرے گا؟ ہاں، وہ اگر زوہیب کے ہتھے چڑھ گئی تو واقعی ماری جائے گی۔''

''یار، مجھے فکر تو اس بات کی ہے کہ وہ لندن میں کیوں ہے؟ اور اگر وہاں ہے تو نور کے پاس کیوں پہنچی ہے؟''

''تو نور سے بات کر۔ اگر وہ غصے میں بھی ہوگی تو اب تک اس کا غصہ اتر گیا ہوگا۔''

''وہ میرے ٹیلی فون کا کوئی جواب نہیں دے رہی ہے۔'' میں نے کہا۔

''میں کوشش کرتا ہوں۔'' راجا نے کہا۔ ''شاید وہ مجھ سے بات کرنے پر آمادہ ہو جائے۔'' پھر وہ ہنس کر بولا۔ ''او یار، ایسی رونی صورت بنا کر بیٹھے گا تو کام کیسے چلے گا؟ بار بار بھول جاتا ہے کہ تو رفیق نہیں بلکہ اب ... نواب رفیق شیرازی آف ریاست ست بدھائی ہے۔'' اس نے جیب سے اپنا سیل فون نکالا اور بولا۔ ''میں نور سے بات کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' وہ نور کا نمبر ملانے لگا۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی اور ریشم کمرے میں داخل ہوئی۔ ''صاحب جی، آپ کے لیے کافی لاؤں یا آپ کھانا کھائیں گے؟''

میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی راجا نے کہا۔ ''کھانا لگواؤ، رفیق نے صبح ناشتا نہیں کیا تھا۔'' وہ اپنی عادت کے مطابق ہوا کے جھونکے کی طرح باہر نکل گئی۔

''یار، میں سوچ رہا ہوں کہ کچھ دن کے لیے لندن چلا جاؤں۔'' میں نے کہا۔

''یہاں کے حالات ابھی ایسے نہیں ہیں کہ تو ست بدھائی چھوڑے۔'' راجا نے کہا۔ سیل فون اس کے کان سے لگا ہوا تھا۔ وہ اچانک بولا۔ ''ہیلو نور! کیسی ہو؟ ...... ہم لوگ تو دو ہفتے سے تمہارے استقبال کی تیاریاں کر رہے تھے اور تم ...... اچھا پھر ...... مجھے ایک بات بتاؤ، وہ تم تک پہنچی کیسے؟ ...... تم اس سے ملنے سے انکار کر دیتیں ...... چلو مان لیا لیکن تم نے رفیق کے ... فون کا جواب کیوں نہیں دیا ...... کیا ...... اچھا تم رفیق سے خود ہی بات کر لو ...... پریشان! وہ تو خود لندن آنے کے لیے پر تول رہا ہے، میں ابھی ...... ہیلو ...... ہیلو ...... نور ......'' راجا نے اپنے سیل فون کی اسکرین کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''لائن کٹ گئی یا پھر نور نے دانستہ سلسلہ منقطع کر دیا۔''

میں اس کی یک طرفہ گفتگو سے کچھ بھی نہیں سمجھا تھا۔ میں نے بے تاب ہو کر پوچھا۔ ''کیا کہہ رہی تھی وہ؟''

''کہہ رہی تھی کہ رابعہ لندن پہنچی تو سیکیورٹی اسٹاف نے اسے روک لیا۔ اس نے کہا کہ وہ لارڈ رفیق شیرازی کی بہن ہے اور میڈم سے ملنا بہت ضروری ہے۔ سیکیورٹی آفیسر نے نور کو یہی بات بتائی تو اس نے رابعہ کو اندر بھیجنے کی اجازت دے دی۔ نور خود حیران تھی کہ رابعہ تو مر چکی ہے، پھر یہ لڑکی کون ہے جو خود کو رابعہ کہہ رہی ہے؟ نور سے مل کر اس نے وہی کچھ اسے بتایا جو نور تجھے بتا چکی ہے۔''

''نور نے اس کی بات پر یقین کر لیا؟'' میں نے جھنجلا کر پوچھا۔

''وہ کہہ رہی تھی کہ مجھے رابعہ کی لندن آمد کسی سازش کا حصہ لگ رہی ہے۔''

''کیسی سازش؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''مجھے تفصیل سے بات کرنے کا موقع ہی کب ملا۔ نور نے شاید خود ہی لائن کاٹ دی۔''

''راجا! مجھے لگ رہا ہے کہ نور خطرے میں ہے۔ میں ابھی لندن روانہ ہو جاتا ہوں۔''

''اتنی جلدی مت کر فیکے!'' راجا نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''رابعہ، نور سے زیادہ ذہین اور چالاک نہیں ہے، تھوڑی دیر بعد تو خود اسے ... فون کر لینا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ میں نے جان بوجھ کر رفیق کی کال کا جواب نہیں دیا۔''

''کیوں؟'' میں نے الجھ کر پوچھا۔

''اب اس کیوں کا جواب تو نور ہی دے گی۔'' راجا نے کہا۔ ''پریشان مت ہو، نور تیری پریشانی کی وجہ سے فکر مند تھی۔''

''لیکن وہ بات کیوں نہیں کر رہی ہے؟'' میں جھنجلا کر بولا۔

''او یار، بات بھی کرے گی۔ صبر سے کام لے فیکے! صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے، تو نے کچھ کھایا ہے؟'' ریشم کو دروازے پر دیکھ کر اس نے کہا۔ ''چل پہلے کھانا کھا لے۔ تو بھوکا ہے ویسے بھی مجھے لگتا ہے تیری عقل معدے میں ہے۔''

کھانے کے دوران میں بھی وہ اسی قسم کی اوٹ پٹانگ باتیں کر کے میرا دھیان بٹانے کی کوشش کرتا رہا۔

کھانے کی میز پر اس وقت ڈاکٹر حسن، ان کا بیٹا، ٹینا اور شہناز وغیرہ بھی موجود تھے۔ وہ سب ہی راجا کی باتوں پر ہنس رہے تھے۔

''نواب صاحب!'' ڈاکٹر حسن نے اچانک مجھے مخاطب کیا۔ ''آپ کچھ پریشان لگ رہے ہیں؟''

''ارے یہ تو پیدا ہی پریشان ہونے کے لیے ہوئے تھا۔'' راجا نے ہنس کر کہا۔ ''اب الیکشن سر پر ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ اس بکھیڑے میں نہ پڑیں۔''

''نہیں نواب صاحب!'' ڈاکٹر حسن نے کہا۔ ''آپ کو الیکشن میں تو ضرور حصہ لینا چاہیے۔ آپ کو اسمبلی میں سیٹ ملی تو ہماری ریاست کو بہت فائدہ پہنچے گا۔''

کھانے کے بعد میں دوبارہ اپنے کمرے میں آ گیا۔

شہناز بھی ہمارے ساتھ چلی آئی تھی لیکن ایک ایمرجنسی کیس آ گیا تو وہ بے چاری فوراً ہی اٹھ گئی۔ ریشم کافی لے کر آ گئی تھی۔ میں نے راجا سے کہا۔ ''میں نور سے بات کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے اس کا نمبر ڈائل کیا۔

دوسری طرف دوسری گھنٹی بجتے ہی نور نے کال ریسیو کر لی اور چہک کر بولی۔ ''ہیلو جان! ...... کیسے ہو؟''

''میں کیسا ہو سکتا ہوں؟'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''تم تو مجھ سے بات کرنے پر آمادہ ہی نہیں ہو۔''

''میں جانتی ہوں، تم مجھ سے ناراض ہو لیکن صورت حال اس وقت ایسی تھی کہ میں تم سے کھل کر بات نہیں کر سکتی تھی۔''

''اب تو کر سکتی ہو؟'' میں نے پوچھا۔ ''یہ رابعہ کا کیا چکر ہے، وہ تمہارے پاس کیا کر رہی ہے؟''

''ہاں جب وہ میرے پاس آئی تو اپنی مظلومیت کی داستان سناتی رہی تھی کہ رفیق نے مجھے قتل کرنے کی کوشش کی لیکن جب اس میں کامیاب نہیں ہوا تو میری جگہ کسی اور لڑکی کو قتل کر کے اسے رابعہ بنا دیا۔''

''وہ یہ سب کچھ تمہیں بتانے کے لیے لندن پہنچ گئی۔ اسے تو یہاں کی پولیس کے پاس جانا چاہیے تھا کہ میں زندہ ہوں، رفیق نے میرے بدلے کسی اور لڑکی کا خون کر دیا ہے اور اسے رابعہ کی حیثیت سے شناخت بھی کر لیا۔''

''مجھے لگ رہا ہے رفیق کہ اسے لندن بھیجا گیا ہے۔ میں یہی معلوم کرنے کی کوشش کر رہی ہوں کہ اس کے یہاں آنے کا مقصد کیا ہے؟ میں نے اس سے ہمدردی جتائی، تمہیں برا بھلا کہا اور اسے تسلی دی کہ اگر تمہارے ساتھ کوئی زیادتی ہوئی ہے تو رفیق کو اس کا ازالہ کرنا پڑے گا۔ میں نے اسے دکھانے کے لیے ... فون پر تم سے ناراضی کا اظہار کیا، تمہاری کال ریسیو نہیں کی، پھر کچھ دیر کے لیے اپنا سیل فون بند ہی کر دیا۔''

''اب کیا صورت حال ہے؟''

''ابھی کوئی خاص نہیں ہوئی ہے۔'' نور نے کہا۔ ''لیکن میں معلوم کر لوں گی کہ رابعہ کی یہاں آمد کا مقصد کیا ہے؟''

''تم ایسا کرو کہ وہ جس کمرے میں مقیم ہے، اسے Bugged کرا دو۔''

''میں تمہارے کہنے سے پہلے ہی یہ کام کر چکی ہوں۔'' نور نے ہنس کر کہا۔

''میں سوچ رہا ہوں کہ میں ہی کچھ دن کے لیے لندن

آجاؤں؟'' میں نے کہا۔ ''رابعہ نے تو خوامخواہ ایک پریشانی کھڑی کر دی ہے۔''

''رابعہ کی وجہ سے پریشان مت ہو۔'' نور نے کہا۔ ''اس کے لیے میں ہی کافی ہوں۔ وہ کیا سمجھتی ہے کہ ماڈرن لباس پہن کر اور انگلش کے دو چار جملے سیکھ کر مجھے ٹریپ کر لے گی۔ اس نے اپنی اداؤں سے گھٹیا ذہنیت رکھنے والے مردوں کو متاثر کیا ہے۔ میں نے تو بڑے بڑے گھاگ بزنس مینز سے ڈیل کی ہے۔''

''تمہاری صلاحیتوں کا تو میں معترف ہوں، تمہارا اور رابعہ کا بھلا کیا مقابلہ؟''

پھر ہم دیر تک ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر اچانک مجھے ایک خیال آیا اور میں نے اس سے کہا۔ ''نور! جیسے تم نے رابعہ کا کمرا Bugged کیا ہے، اسی طرح وہ بھی تو......''

''تمہیں اس بات کا خیال اب آرہا ہے؟'' نور ہنسی۔ ''میں اس وقت عمارت کی چھت پر ہوں۔''

''وہاں تو اس وقت سردی ہوگی اور تم کھلی چھت پر چڑھی ہوئی ہو؟''

''اچھا اب میں نیچے جارہی ہوں، کل تک کے لیے خدا حافظ!'' اس نے کہا اور ایک ہوائی بوسہ اچھال دیا۔

نور سے بات کر کے میں بہت ہلکا پھلکا ہوگیا تھا۔ راجا بہت غور سے میری باتیں سن رہا تھا۔ میں نے اسے تفصیل بتائی تو وہ بھی ریلیکس ہوگیا پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ''یار فیکے! ابھی تک میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ رابعہ وہاں گئی کیوں ہے؟''

''نور! معلوم کر لے گی۔'' میں نے کہا۔ ''ذہانت میں رابعہ اس کی پاسنگ بھی نہیں ہے۔''

''او یار، اسے اب اتنا ہلکا بھی مت لے۔'' راجا نے منہ بنا کر کہا۔ ''اسی نے زوہیب کے ساتھ مل کر تجھے اغوا کرایا تھا نا!''

''یہ ساری کارروائی تو زوہیب کی تھی۔'' میں نے کہا۔

''لیکن زوہیب کو یہ راستہ تو اسی نے دکھایا تھا۔ وہ اتنی بھولی نہیں ہے۔ نور سے کہہ دے کہ وہ بہت زیادہ ہوشیار رہے اور بہتر یہی ہے وہ لارڈ کی حویلی میں شفٹ ہوجائے۔ وہاں سیکیورٹی کا انتظام فول پروف ہے۔ نور کی اجازت کے بغیر وہاں پرندہ پر بھی نہیں مار سکتا۔ جس اپارٹمنٹ میں نور اس وقت ہے، وہ بھی محفوظ ہے لیکن لارڈ کے محل سے زیادہ نہیں۔''

''تیری یہ بات دل کو لگتی ہے مہاراجا!'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''میں کل ہی نور سے کہوں گا کہ وہ محل میں شفٹ ہوجائے۔''

''کیا بات ہے فیکے پتر؟'' راجا نے ہنس کر کہا۔ ''اس وقت تو بہت چہک رہا ہے۔ بہت عرصے بعد تو نے مجھے مہاراجا کہہ کر مخاطب کیا ہے؟''

''یار، مجھے نور کی طرف سے جو پریشانی تھی، وہ ختم ہوگئی ہے تو کیا اب بھی نہ چہکوں؟''

''ارے تو بھنگڑا ڈال۔'' راجا نے کہا۔ ''زیادہ ہی خوش ہے تو مجرا کرا لے۔''

''یہ مجرا وغیرہ تو گھٹیا لوگ کرتے ہیں مہاراجا!'' میں نے گردن اکڑا کر کہا۔ ''تو اس وقت نواب رفیق شیرازی آف ریاست ست بدھائی سے مخاطب ہے۔ ادب سے بات کر، سمجھا!''

''تو جانتا ہے کہ میں ادب سے کیسے بات کرتا ہوں؟'' راجا مسکرایا۔

''لگتا ہے آج کوئی خاص بات ہوگئی ہے؟'' شہنا نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

''عورتوں کے سمجھنے کی بات نہیں ہے۔'' راجا نے کہا۔

''ویسے تم کچھ زیادہ ہی تھکی تھکی نظر آرہی ہو۔''

''صبح سے اب تک چھ آپریشن کر چکی ہوں۔ تم آپریشن مینا نے کیے ہیں۔ رفیق، ہمیں اپنا اسٹاف بڑھانا پڑے گا۔ مریضوں کی تعداد روز بہ روز بڑھتی جارہی ہے۔''

''تو بڑھا لو۔'' میں نے کہا۔ ''مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟''

دوسری صبح میں حسب معمول صبح سویرے بیدار ہوگیا۔ پہلے ہلکی پھلکی ایکسرسائز کی، پھر جوگنگ کے لیے نکل گیا۔ جوگنگ کرتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ اب میری کمزوری تقریباً دور ہوچکی ہے۔ کیونکہ جوگنگ کرنے کے بعد نہ مجھے کمزوری محسوس ہوئی تھی، نہ تھکن کا احساس ہوا تھا۔ میں نے فریش جوس کا ایک گلاس پیا اور باتھ روم کی طرف جا رہا تھا کہ میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔

میں نے بیڈ سے سیل فون اٹھایا تو اسکرین پر نور کا نام تھا۔

''ہاں جان، کیسی ہو، یہ بے وقت کال کیوں کی ہے؟''

''رفیق! میں نے رابعہ کی بات چیت سن لی ہے۔'' نور نے کہا۔ ''وہ کسی دلاور سے فون پر بات کر رہی تھی۔ اس نے کہا کہ میں نے نور کو تو اپنی باتوں سے متاثر کر لیا ہے

اب رفیق گھبرا کر لندن کی طرف دوڑ لگائے گا...... دوسری طرف سے کیا کہا گیا، یہ تو میں نہیں سن سکی۔ رابعہ نے کہا۔ ''ہاں، ست بدھائی میں اسے گھیرنا ممکن نہیں ہے۔ لندن میں ہم اسے آسانی سے گھیر لیں گے۔ تم کب آرہے ہو؟...... اسی فلائٹ میں...... لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوگا کہ رفیق وہاں سے کب اور کس فلائٹ سے آئے گا؟''...... اچھا اچھا...... تمہیں اطلاع مل جائے گی۔ ٹھیک ہے، اب میں فون بند کر رہی ہوں۔ ہاں، تم مجھے اب اس نمبر پر کال مت کرنا۔'' یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔'' پھر نور پرتشویش لہجے میں بولی۔ ''رفیق، یہ دلاور کون ہے؟''

''میں نہیں جانتا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن معلوم کر لوں گا۔''

''مجھے لگتا ہے کہ اس دلاور نے وہاں حویلی میں بھی کسی کو مخبری پر لگا رکھا ہے۔ اسی لیے وہ اتنے اعتماد سے کہہ رہا تھا کہ مجھے معلوم ہوجائے گا کہ رفیق وہاں سے کب نکلے گا؟ سب سے پہلے گھر کے اس بھیدی کا سراغ لگاؤ!''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو، ہاں، تم ایک کام کرو، تم دوبارہ محل میں شفٹ ہوجاؤ۔ وہاں سیکیورٹی کے انتظامات فول پروف ہیں۔ رابعہ کو بھی اپنے ساتھ ہی لے جاؤ اور گارڈز کو ہدایت کر دینا کہ وہ محل سے نکلنے نہ پائے۔''

''اچھا، میں آج ہی محل میں شفٹ ہوجاؤں گی لیکن تم اپنا خیال رکھنا۔ فی الحال لندن آنے کا خیال چھوڑ دو۔ میں رابعہ کو محل میں رکھ کر خود وہاں آجاؤں گی۔ میری اجازت کے بغیر وہ زندگی بھر وہاں سے نہیں نکل سکے گی۔''

''او کے جان، ہم اس موضوع پر بعد میں بات کریں گے۔ تم بھی اپنا خیال رکھنا۔ میں پہلے تو اس دلاور کا جغرافیہ معلوم کرتا ہوں، او کے بائی ڈارلنگ۔'' میں نے ہوائی بوسہ اچھالتے ہوئے کہا۔

راجا صبح صبح پنڈی چلا گیا تھا۔ اسے وہاں کوئی ضروری کام تھا۔

ناشتا کرنے کے بعد میں نے غنی کو بلایا اور اس سے پوچھا۔ ''غنی! تم دلاور کو جانتے ہو؟''

''دلاور!'' اس نے اپنے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''ایک دلاور تو اسی حویلی میں تھا لیکن وہ دو سال پہلے مر چکا ہے اور کوئی دلاور میرے ذہن میں نہیں آرہا ہے۔''

''اچھا، تم نے معلوم کیا کہ یہاں کی خبریں باہر کون پہنچا رہا ہے؟''

''میں کوشش تو کر رہا ہوں سر!'' غنی نے کہا۔ ''جس وقت بھی مجھے اس شخص کا علم ہوگیا میں......''

''تم نے کیسے کیسے لوگ بھر رکھے ہیں؟'' اچانک ہی میرا موڈ خراب ہوگیا۔ ''اس پر تم یہ دعویٰ کرتے ہو کہ ہر آدمی تمہارے اعتماد کا ہے۔''

''سر...... میں...... نے تو...... اپنی طرف سے...... ان ہی لوگوں کو رکھا ہے...... جن پر مجھے اعتماد تھا۔ اب اگر......''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''جاؤ اور جا کر اس آدمی کو تلاش کرو ہاں یہ بھی معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ دلاور کون ہے اور کیا کرتا ہے؟''

''ٹھیک ہے سر!'' غنی نے کہا اور سر جھکا کر باہر نکل گیا۔

بعد میں مجھے خود بھی افسوس ہوا کہ مجھے غنی سے اس لہجے میں بات نہیں کرنا چاہیے تھی۔ کوئی کتنے ہی اعتماد کا ہو لیکن پیسے میں بہت طاقت ہوتی ہے۔ اگر توقع سے بڑھ کر قیمت لگائی جائے تو چند ایک لوگوں کو چھوڑ کر سب ہی بک جاتے ہیں۔ کوئی پیسے کے لیے، کوئی شہرت کے لیے اور کوئی اپنا مقصد پورا کرنے کے لیے، مجھے اس موقعے پر ماضی کا ایک مقبول فلمی گیت یاد آیا۔ آپ فرمائیں کیا خریدیں گے؟ اس جہاں، اس نگار خانے میں، کون بکتا ہے نہیں زمانے میں، مال و دولت کا ہے اسیر کوئی۔ ذہن بیچے کوئی، ضمیر کوئی! پھر سب سے بڑی مثال تو رابعہ کی تھی۔ اس نے تو نہ رشتے کا بھرم رکھا، نہ خون کی لاج رکھی اور میرے دشمنوں کے ہاتھوں بک گئی۔

یہی سب کچھ سوچتے ہوئے نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

راجا کی آواز سے میری آنکھ کھلی۔ ''فیکے پتر! جو سوتا ہے، وہ کھوتا ہے اور تو تو کھوتا نہیں بلکہ کھوتے کا کھر ہے۔''

''اچھا بکواس مت کر، یہ بتا تو نے جاگ کر کون سا تیر مار لیا؟'' اچانک مجھے خیال آیا کہ ممکن ہے راجا، دلاور کے بارے میں کچھ جانتا ہو۔ میں نے کہا۔ ''راجا، تو دلاور کو جانتا ہے؟''

''کون دلاور؟'' راجا چونک کر بولا۔

''یہی تو میں تجھ سے پوچھ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

پھر میں نے اسے اپنی اور نور کی پوری گفتگو تفصیل سے بتائی۔

''ہاں، میں دلاور کو جانتا ہوں۔'' راجا نے کہا۔ ''لیکن رابعہ اس تک کیسے پہنچ گئی؟''

''یہ بعد میں سوچنا، پہلے تو یہ بتا کہ یہ دلاور ہے کون؟''

''اس کا پورا نام دلاور خان ہے، اسلحے کا بین الاقوامی اسمگلر ہے اور منشیات فروشی میں بھی سرفہرست ہے۔ اگر رقم معقول دی جائے تو لوگوں کو قتل بھی کرا دیتا ہے۔''

''تو اس کے بارے میں اتنا کچھ جانتا ہے اور وہ ابھی تک آزاد ہے۔ کیا قانون کے رکھوالے اس کے بارے میں نہیں جانتے ہوں گے؟''

''یہ پاکستان ہے ٹیکے پتر!'' راجا نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''بے شمار لوگ جانتے ہیں کہ ان بڑے بڑے سیاست دانوں نے قوم کا اربوں روپیہ ہڑپ کرلیا ہے لیکن ان سے بات کی جائے تو وہ ڈھٹائی سے کہتے ہیں کہ ہمارے خلاف کچھ بھی ثابت کردیں اور ہمیں سولی پر چڑھا دیں۔ اب ثابت کون کرے؟ ثابت کرنے والے تو خود اس غبن میں حصے دار ہوتے ہیں۔ دلاور بھی اسی قسم کا ایک ''معزز بدمعاش'' ہے۔ پولیس کے بڑے بڑے افسران اسے سلام کرتے ہیں۔ بڑے بڑے سیاست دانوں سے اس کے تعلقات ہیں۔ اس کے خلاف کون انگلی اٹھا سکتا ہے۔''

''تو نے تو پوری تقریر کرڈالی۔'' میں نے کہا۔

''ٹیکے! تجھے بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ دلاور کوئی معمولی چور اچکا یا مولا داد قسم کا ڈاکو نہیں ہے۔ وہ بین الاقوامی دہشت گرد ہے ٹیکے پتر! اس کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ یورپ اور امریکا تو اس کے لیے گویا گھر آنگن ہے۔ نور بھی خطرے میں ہے۔''

''یار، راجا! تو نے تو مجھے بھی ڈرا دیا ہے۔'' میں نے کہا۔

''میں تو حقائق بتا رہا ہوں۔'' پھر وہ چونک کر بولا۔ ''اب میں سمجھا، ہماری وہ گاڑی دھماکے سے کیسے اڑی تھی؟ اس کا نشانہ تو نہیں بلکہ وہ ہمیں دہشت زدہ کرنا چاہتا تھا ورنہ اسے مارنا ہی ہوتا تو دھماکے کے بجائے اس کے لوگ کسی بھی جگہ ہمیں چاروں طرف سے گھیر لیتے، پھر ہمارے دس محافظ اس کے آدمیوں کا کہاں تک مقابلہ کرتے؟''

''راجا! میں تو بہت پریشان ہوگیا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''نور وہاں بالکل اکیلی ہے اور وہ بدبخت رابعہ اس کے ساتھ ہے۔ میں چاہ رہا ہوں کہ خود لندن چلا جاؤں۔''

''ایسا بھول کر بھی مت کرنا۔'' راجا نے کہا۔ ''دلاور تجھے ست بدھائی سے نکالنا چاہتا ہے۔ یہاں سے نکل کر تو اس کا مقصد پورا کردے گا۔''

''پھر...... پھر میں کیا کروں راجا؟'' میں نے کہا۔ ''میں نور کو یوں خطرے میں بھی تو نہیں چھوڑ سکتا۔''

''نور اگر محل میں شفٹ ہوجائے تو اس کے لیے کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ ایسا کرتا ہوں، میں لندن چلا جاتا ہوں۔''

''تو وہاں جا کر کیا کرسکتا ہے؟'' میں نے کہا۔

''تو وہاں کون سی توپ چلا لے گا؟'' راجا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تو کیا خود کو بہت بڑا اطرم خان سمجھتا ہے؟ میں کل کی فلائٹ سے لندن کے لیے سیٹ ریزرو کرا لیتا ہوں۔''

راجا نے یہ کہہ کر اپنا سیل فون نکال لیا۔ اس کے چہرے پر تشویش کے آثار تھے۔ دلاور کا نام سن کر وہ کچھ پریشان ہوگیا تھا۔ مجھے حیرت تو یہ تھی کہ رابعہ کی اس تک رسائی کیسے ہوئی اور اس نے دلاور کو اس کام کی کتنی رقم دی ہوگی؟ اتنے پیسے اس کے پاس کہاں سے آئے۔

یہی سوال میں نے راجا سے کیا تو وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''نواب صاحب! آپ بھول رہے ہیں کہ آپ نے وقتاً فوقتاً لاکھوں روپے دیے ہیں، تو نے جو زیورات دیے ہیں وہ الگ ہیں۔ پھر اس کے عشاق نے بھی تو اسے کچھ نہ کچھ دیا ہی ہوگا۔ اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے زوہیب نے بھی اسے دل کھول کر نقد رقم اور تحائف دیے ہوں گے۔ میرا اندازہ ہے کہ اس وقت بھی اس کے اکاؤنٹ میں دو، ڈھائی کروڑ روپے ہوں گے۔''

اس نے فوری طور پر کسی ٹریول کمپنی سے رابطہ کیا اور لندن کے لیے پہلی میسر پرواز میں نشست محفوظ کرلینے کے لیے کہا۔

''تو واقعی لندن جا رہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، یوں ہی تفریحاً سیٹ بک کرا رہا ہوں۔'' راجا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ پھر وہ چونک کر بولا۔ ''گھر کے اس بھیدی کا کوئی سراغ ملا؟''

میں نے نفی میں سر ہلایا اور کہا۔ ''غنی کوشش تو کر رہا ہے۔''

''سب کچھ غنی پر چھوڑنے کے بجائے اگر آپ بھی کچھ کرلیں نواب صاحب تو آپ کی شان گھٹے گی نہیں۔''

''میں تو خود بھی یہی سوچ رہا تھا کہ میں خود ہی اس شخص کو تلاش کروں۔'' میں نے اپنی پیشانی رگڑتے ہوئے کہا۔

''یار، راجا! دلاور اگر اتنا ہی طاقت ور ہے تو وہ ست بدھائی پر بھی حملہ کرسکتا ہے۔''

''ایک تو ست بدھائی پر حملہ کرنا اتنا آسان نہیں ہے؟ غنی نے حویلی کی حفاظت کے بہت فول پروف انتظامات رکھے ہیں پھر وہ جانتا ہے کہ تیرے پاس بھی محافظوں اور ہتھیاروں کی کمی نہیں ہے۔ سب سے بڑھ کر ست بدھائی کے

...ی ہیں۔ وہ لوگ تیرے لیے اپنی جان پر کھیل جائیں گے۔ دلاور کے آدمی تو یہاں آکر بری طرح گھر جائیں گے اور ان میں سے ایک بھی زندہ واپس نہیں جائے گا۔'' پھر وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں ذرا پیکنگ کرلوں۔''

''پہلے سیٹ تو کنفرم ہونے دے۔'' میں نے کہا۔

''ٹیکے پتر! تو شاید بھول گیا کہ میں ایک سینئر جرنلسٹ بھی ہوں۔ ایئر لائن میں صحافیوں کا کوٹہ ہوتا ہے۔''

''اب نہیں ہوتا۔'' میں نے اسے چڑانے کو کہا۔

''کوٹہ ہو یا نہ ہو، بہرحال کل مجھے سیٹ ضرور مل جائے گی۔''

میں نے پریشان ہوکر پوچھا۔ ''یار راجا! تیرے لیے بھی تو خطرہ ہے۔ دلاور تجھے بھی نقصان پہنچا سکتا ہے۔''

''اوئے تو میری فکر مت کر۔'' راجا نے کہا۔ ''میری ساری زندگی خطرات سے کھیلتے گزری ہے۔''

''کیوں، تو کیا موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلاتا تھا؟'' میں نے ہنس کر کہا۔

''شکر ہے، تیرے چہرے پر ہنسی تو آئی۔'' راجا نے بھی ہنس کر کہا۔ ''کرائم رپورٹنگ موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلانے بھی زیادہ خطرناک ہے۔'' راجا نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بس شرط یہ ہے کہ کرائم رپورٹر بکاؤ نہ ہو ورنہ آج کل زیادہ تر کرائم رپورٹر بلیک میلر ہوتے ہیں۔ اچھے اور سچے کرائم رپورٹرز کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔'' پھر وہ چونک کر بولا۔ ''میں بھی کس بحث میں پڑ گیا۔ مجھے ابھی لندن میں اپنے اعتماد کے کچھ لوگوں سے رابطہ بھی کرنا ہے۔ میں چلا۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھ گیا۔

شام ہو رہی تھی۔ میں کمرے سے باہر نکل آیا اور یوں ہی ٹہلتا ہوا حویلی کے لان کی طرف نکل گیا۔ حویلی میں راجا اور شہناز کے علاوہ کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ میں کس نئی پریشانی میں مبتلا ہوں۔

اسی وقت مجھے غنی نظر آیا۔ وہ میری ہی طرف آ رہا تھا۔ جب وہ نزدیک آیا تو میں نے اس سے پوچھا۔ ''ہاں غنی! کیا رپورٹ ہے۔ اس شخص کا کوئی سراغ ملا جو یہاں کی خبریں باہر پہنچاتا ہے؟''

''سر، آج رات تک معلوم ہوجائے گا۔'' غنی کے لہجے میں اعتماد تھا۔ ''مجھے کچھ سراغ ملا تو ہے لیکن جب تک میں اس کو پکڑ نہیں لوں گا، کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔''

''ہمارے پاس تربیت یافتہ گارڈز کتنے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہمارے پاس آرمی کے بیس سابق کمانڈوز ہیں۔ ان کے علاوہ مزید پچیس آدمی ہیں جنہیں صوبیدار میجر شریف صاحب نے تربیت دی ہے۔''

صوبیدار میجر شریف صاحب بھی آرمی کے سابق کمانڈوز تھے۔ غنی ہی نے ان کی خدمات حاصل کی تھیں۔

''تم ایسا کرو، پہلے آرمی کے تمام ریٹائرڈ لوگوں کو یہاں بلالو۔''

''یہاں؟'' غنی نے حیرت سے پوچھا۔

''کیوں، وہ یہاں نہیں آسکتے؟''

''میرا یہ مطلب نہیں تھا سر!'' غنی نے کہا۔ ''اگر آپ کو ان سے کوئی بات کرنا ہے تو آپ اندر کانفرنس روم میں چلیں۔ میں انہیں وہیں بلالیتا ہوں۔''

غنی کا مشورہ مناسب تھا۔ میں یہاں سے کانفرنس روم کی طرف مڑ گیا۔ غنی اپنے سیل فون پر کسی کو کال کرنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد کانفرنس روم میں بیس چاق و چوبند جوان موجود تھے۔ وہ سب ایک قطار میں کھڑے تھے۔ میں کانفرنس روم میں داخل ہوا تو بیسوں جوانوں نے ایڑیاں فرش پر مار کے مجھے سیلیوٹ کیا اور تن کر کھڑے ہوگئے۔ بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی جنرل اپنے آفیسرز کا معائنہ کر رہا ہو۔

میں نے ان میں سے ایک ایک کا جائزہ لیا۔ اگرچہ میں ان سے پہلے بھی مل چکا تھا لیکن اتنے غور سے ان کا جائزہ نہیں لیا تھا۔ وہ سب پتھر کے بتوں کے طرح کھڑے ہوئے تھے۔

''آپ لوگوں کا کمانڈر کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''غنی سر ہمارے کمانڈر ہیں۔'' ان میں سے ایک سینئر کمانڈو نے جواب دیا۔

''آپ لوگوں کو اب پہلے کے مقابلے میں زیادہ چاق و چوبند رہنے کی ضرورت ہے۔'' میں نے کہا۔ ''حویلی کے لیے خطرات میں مزید اضافہ ہوگیا ہے۔''

''ہم تیار ہیں سر!'' وہ سب ایک ساتھ بولے۔

میں نے پھر ان سب کا بغور جائزہ لیا اور ساتویں نمبر پر کھڑے ہوئے کمانڈو سے پوچھا۔ ''تمہارا نام احمد شاہ ہے؟''

''یس سر!'' اس نے مشینی انداز میں جواب دیا۔ اس کے چہرے پر البتہ تھوڑی دیر کے لیے حیرت نمودار ہوئی کہ میں اسے نام سے جانتا ہوں۔

میں اپنے ہر محافظ کو نہ صرف شکل سے بلکہ نام سے بھی

جانتا تھا۔

"تم کہاں کے رہنے والے ہو احمد شاہ؟" میں نے پوچھا۔

"میں پنڈ دادن خان کا رہنے والا ہوں سر!" اس نے فخر سے کہا۔ "ہمارے علاقے کے بارے میں مشہور ہے کہ پنڈ دادن خان کی مائیں آرمی جنرلوں کو جنم دیتی ہیں۔"

"اچھا؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "لیکن تم تو افسر نہیں تھے؟"

"یہ میری بدقسمتی ہے سر!" اس نے جواب دیا۔ "میں نے میٹرک سے آگے پڑھ کر ہی نہیں دیا۔"

"آرمی سے کیوں ریٹائر ہوئے؟" میں نے پوچھا۔

"ایک اونچی پہاڑی سے جمپ لگاتے ہوئے میری کمر میں شدید چوٹ آئی تھی سر!" اس نے جواب دیا۔ "میرا میڈیکل ٹیسٹ ہوا اور ڈاکٹرز نے کہا کہ اب میں کمانڈو نہیں رہ سکتا۔ ہاں چاہوں تو اپنی رجمنٹ میں واپس چلا جاؤں۔ مجھے یہ پسند نہیں تھا۔ کمانڈو بننا بچپن ہی سے میرا خواب تھا سر! میں نے آرمی سے ریٹائرمنٹ لے لی۔" پھر وہ جلدی سے بولا۔ "ویسے میں ہر طرح سے فٹ ہوں سر! اب بھی اکیلا کم سے کم پانچ آدمیوں کا مقابلہ کرسکتا ہوں۔"

غنی بھی وہاں موجود تھا اور میرے سوال و جواب پر کچھ حیران بھی تھا۔ میں ان سے بے تکلف ہوکر بات چیت اس لیے کر رہا تھا کہ وہ بھی کچھ بے تکلف ہو جائیں۔ وہ تو سب پتھر کے بتوں کی طرح کھڑے ہوئے تھے۔

"آپ سب کے پاس سیل فونز ہیں؟" میں نے اچانک پوچھا۔

"یس سر!" ان سب نے جواب دیا۔

"اپنے سیل فونز غنی کے حوالے کر دیں۔" میں نے کہا۔

ایک لمحے کو غنی سمیت ان سب کے چہروں پر مجھے حیرت نظر آئی، پھر ان سب نے اپنے سیل فونز نکالے اور کانفرنس روم کی ٹیبل پر ڈھیر کر دیے۔

"او کے، اب آپ لوگ جا سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

ان سب نے مجھے فوجی انداز میں سیلیوٹ کیا اور فوجی انداز میں وہاں سے روانہ ہو گئے۔

ان کے جانے کے بعد غنی نے مجھ سے پوچھا۔ "سر، آپ کو ان میں سے کسی پر شبہ ہے؟"

"ان میں سے بھی کوئی مخبر ہوسکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "تم یہ تمام سیل فون سمیٹو اور دوسرے پچیس گارڈز کو یہاں بلا لو۔"

"او کے سر!" غنی نے کہا، پھر وہ سیل فون سمیٹنے لگا۔ اس کے گلے میں مفلر تھا۔ اس نے تمام سیل فون اس مفلر میں باندھے اور اپنا سیل فون نکال کر کسی کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔

میں وہیں کانفرنس روم میں بیٹھا رہا، پھر میں نے غنی سے کہا۔ "تم جا کر کوئی بیگ لے آؤ، میں ان سب کے سیل فون بھی لینے والا ہوں۔"

غنی کے چہرے پر حیرت تھی لیکن اس نے کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ فوراً ہی ایک سفری بیگ لے کر آ گیا۔

اس کے بعد ایک ایک کر کے تمام گارڈز بھی وہاں آ گئے۔ وہ سب ہی چاق و چوبند، لمبے تڑنگے اور مضبوط جسم کے مالک تھے۔ وہ بھی ریاست کی یونیفارم میں تھے۔ ان سب نے بھی مجھے فوجی انداز میں سلام کیا اور قطار بنا کر کھڑے ہو گئے۔ صوبیدار میجر شریف صاحب نے انہیں بھی آرمی کے کمانڈوز ہی کی طرح ٹرینڈ کیا تھا۔ اس ٹریننگ میں غنی بھی شامل تھا۔

"پچیسواں آدمی کہاں ہے۔ میرا مطلب ہے کہ تم لوگوں میں محمد دین نظر نہیں آ رہا؟" میں نے پوچھا۔

"سر، محمد دین کی طبیعت خراب ہے۔" غنی نے جواب دیا۔ "آپ تو جانتے ہیں کہ اسے دل کا شدید دورہ پڑا تھا۔ ڈاکٹر شہناز نے اسے کل ہی اسپتال سے ڈسچارج کیا ہے لیکن ابھی اسے آرام کی ہدایت کی ہے۔"

مجھے یاد آ گیا کہ محمد دین وہی گارڈ ہے جسے اس دن دل کا دورہ پڑا تھا جب میں اسلام آباد جا رہا تھا اور مولا داد کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔

"ٹھیک ہے، میں اس سے اس کے کمرے میں جا کر مل لوں گا۔" پھر میں نے ان سے کہا۔ "آپ سب لوگوں کو اب پہلے سے زیادہ ہوشیار رہنا ہے کیونکہ حویلی کے لیے خطرہ بڑھ گیا ہے۔"

"دشمن ہماری لاشوں پر سے گزر کر ہی آپ تک پہنچ سکتا ہے سر!" سرور نے کہا۔ غنی کے بعد وہ سب سے سینئر تھا۔

"فلمی ڈائیلاگ مت بولو۔" میں نے کہا۔ "بس ہوشیار رہو۔ ایک بات اور! ہم میں کوئی ایسا شخص ہے جو غداری کا مرتکب ہو رہا ہے۔ آپ سب لوگوں کو اس کا سراغ بھی لگانا ہے۔ وہ غدار کوئی بھی ہوسکتا ہے۔ ممکن ہے ڈاکٹر حسن ہوں، ڈاکٹر شہناز ہوں، راجا ہو یا غنی ہو، کوئی بھی ہو۔ آپ لوگوں کو اس غدار کو تلاش کرنا ہے۔"

"یس سر!" ان سب نے ایک ساتھ کہا۔

"آپ لوگوں کے پاس سیل فونز ہیں؟" میں نے پوچھا۔ میں نے دھیرے سے چلتے ہوئے کہا۔ "آپ سب اپنے سیل فون نکال کر غنی کے حوالے کر دیں۔"

"جی سر؟" سرور کے لہجے میں حیرت تھی۔

"اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے؟" میں نے کہا۔ "کیا میری بات سمجھ میں نہیں آئی؟"

ان سب نے اپنی اپنی جیبوں سے سیل فون نکالے اور کانفرنس ہال کی ٹیبل پر ڈھیر کر دیے۔

اس موقعے پر میں نے آرمی کے کمانڈوز اور ان لوگوں میں ایک واضح فرق محسوس کیا۔ آرمی والوں نے اس موقعے پر مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ بس مشینی انداز میں اپنے سیل فونز نکالے اور میز پر ڈھیر کر دیے تھے۔ یہ ان کی تربیت اور ڈسپلن کا حصہ تھا۔

"آپ لوگوں میں سے کسی کے پاس کوئی اور سیل فون تو نہیں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نو سر!" ان سب نے جواب دیا۔

میں نے دیکھا، میرے ایک گارڈ رشید کے چہرے پر کچھ تذبذب کے تاثرات تھے۔ وہ آہستہ سے بولا۔ "سر، میرے پاس ایک سیل فون اور بھی ہے؟"

"کیوں؟" میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔ "کیا غنی نے تم لوگوں کو بتایا نہیں تھا کہ کوئی بھی گارڈ ایک سیل فون سے زیادہ نہیں رکھے گا۔ آپ سب کو سیل فون اور سم بھی غنی نے فراہم کی تھی؟"

"سر، وہ میرا ذاتی فون ہے۔" رشید نے کہا۔

"وہ ذاتی فون بھی تم یہاں جمع کرا دو۔" میں نے اسے حکم دیا، پھر دوسروں سے پوچھا۔ "آپ لوگوں میں سے کسی کے پاس کوئی اور سیل فون تو نہیں ہے؟"

"نو سر!" ان سب نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے، آپ لوگ جا سکتے ہیں؟" میں نے کہا۔

وہ سب حیران پریشان سے وہاں سے چلے گئے۔ اس کارروائی کا مقصد ان کی کیا، غنی کی سمجھ میں بھی نہیں آیا تھا۔

غنی نے وہ تمام سیل فون سمیٹ کر بیگ میں بھر لیے۔

تھوڑی دیر بعد رشید ایک سیل فون لے کر آ گیا۔ وہ سیل فون دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ انتہائی مہنگا سیٹ تھا اور بالکل نیا تھا۔

"یہ...... میرے سالے نے مجھے دبئی سے بھیجا تھا سر!" اس نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے، اسے بھی غنی کے پاس جمع کر دو۔"

اس نے بلاں چوں و چرا وہ سیٹ غنی کے حوالے کر دیا اور میرے اشارے پر وہاں سے چلا گیا۔

"اس رشید پر نظر رکھنے کی خاص ضرورت ہے غنی!" میں نے کہا۔ "اس کے پاس اتنا مہنگا سیٹ کہاں سے آیا؟ کیا اس کا سالا واقعی دبئی میں ہے؟"

"جی سر!" غنی نے کہا۔ "میں رشید کو ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ یہ بچپن میں میرے ساتھ ہی پڑھا تھا۔ اس کے دو سالے دبئی میں ہیں۔" پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ "ٹھیک ہے، میں اس پر خاص طور پر نظر رکھوں گا۔"

"اب تمہارے ذمے ایک اور کام ہے۔" میں نے کہا۔ "تمام سیٹس نکالو اور انہیں اپنے کمرے میں رکھ دو۔ جس سیٹ پر بھی کوئی کال آئے، اس کا نمبر نوٹ کرو اور وہ کال ریسیو بھی کرو، کوشش کرنا کہ تمہاری آواز نہ پہچانی جائے۔ اگر دوسری طرف سے بولنے والا آواز پہچان بھی لے تو کہنا کہ اس کی طبیعت خراب ہے وہ سو رہا ہے...... اگر کوئی ضروری پیغام ہو تو مجھے دے دیں۔" پھر اس کی پریشانی دیکھ کر میں نے کہا۔ "تم اس کام میں سرور، احمد بخش اور صوبیدار میجر شریف صاحب کو بھی شریک کر سکتے ہو۔ چوالیس سیل فونز پر نظر رکھنا ایک آدمی کے لیے ممکن نہیں ہوگا۔"

"او کے سر!" غنی نے مستعدی سے جواب دیا اور بیگ اٹھا کر کانفرنس ہال سے نکل گیا۔

میں وہاں سے محمد دین کے کمرے کے دروازے پر پہنچا۔ اس کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ میں دروازے پر دستک دی تو اس نے کہا۔ "کون ہی بھائی، اندر آ جاؤ، دروازہ کھلا ہوا ہے۔"

یہ وہی گارڈ تھا جسے ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔

میں کمرے میں داخل ہوا تو وہ مجھے دیکھ کر بوکھلا گیا اور اٹھنے کی کوشش کی۔

"لیٹے رہو محمد دین۔" میں نے کہا۔ "اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟"

"اب تو سر میں بالکل ٹھیک ہوں لیکن ڈاکٹر شہناز صاحبہ نے مجھے مزید دس دن آرام کرنے کا حکم دیا ہے۔"

"تم جوان آدمی ہو محمد دین!" میں نے کہا۔ "تمہیں ہارٹ اٹیک کیسے ہو گیا؟" کیا اس سے پہلے بھی تمہیں کبھی دل کی تکلیف ہوئی تھی؟"

"نہیں سر!" محمد دین نے جواب دیا۔ "اس دن پہلی

دفعہ میرے سینے اور بائیں ہاتھ میں شدید درد ہوا۔ پہلے تو میں اسے برداشت کرتا رہا، پھر جب برداشت سے باہر ہوگیا تو میں نے سرور صاحب سے کہا کہ میری حالت خراب ہو رہی ہے۔ انہوں نے میری حالت دیکھی تو فوراً گاڑی کا رخ ست بدھائی کی طرف موڑ دیا۔ ان کے کسی عزیز کو بھی دل کا دورہ پڑ چکا تھا اس لیے وہ فوراً سمجھ گئے کہ مجھے ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔" پھر وہ مایوسی سے بولا۔ "سر، اب میں آپ کا گارڈ تو نہیں رہ سکتا، کیا میں واپس گاؤں چلا جاؤں؟"

"نہیں، میں تمہیں حویلی میں کسی اور کام پر لگا دوں گا۔" میں نے کہا۔ پھر سرسری انداز میں اس سے پوچھا۔ "تمہارا سیل فون کہاں ہے؟"

"میرے پاس ہے سر؟" اس نے جواب دیا اور تکیے کے نیچے ہاتھ ڈال کر سیل فون نکال لیا۔

"لاؤ اسے ابھی میرے حوالے کردو۔ صبح غنی سے لے لینا۔"

وہ حیرت سے مجھے دیکھنے لگا اور بولا۔ "مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہے سر؟"

"نہیں بھئی۔" میں نے کہا۔ "یہ تو ضابطے کی کارروائی ہے، میں نے تمام گارڈز کے سیل فون لے لیے ہیں۔"

"میرے گھر سے ٹیلی فون آئے گا سر!" محمد دین نے کہا۔

"تم اس کی فکر مت کرو، اس کا جواب غنی دیدے گا۔ وہ بتادے گا کہ محمد دین اس وقت سو رہا ہے۔ اسے ڈاکٹروں نے آرام کا مشورہ دیا ہے۔"

"ٹھیک ہے سر!" محمد دین نے کہا۔

"اب تم آرام کرو۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

میں نے غنی کو بلا کر محمد دین کا سیل فون بھی غنی کے حوالے کیا اور اس سے کہا۔ "رات میں کوئی بھی غیر معمولی بات ہو یا کوئی مشکوک فون آئے تو مجھے فوری طور پر اطلاع دینا۔ اگر میں سو رہا ہوں تو مجھے جگا لینا۔"

"او کے سر!" غنی نے کہا۔ "میں نے سرمد، احمد بخش اور صوبیدار میجر صاحب کو بھی اپنے کمرے میں بلا لیا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

میں کمرے میں پہنچا تو راجا میرا منتظر تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر بولا۔ "تو دو گھنٹے سے کہاں غائب ہے؟"

میں نے مختصراً اسے بتایا کہ میں اس وقت کہاں مصروف تھا۔

"شکر ہے، تو حرکت میں تو آیا۔" راجا نے کہا، پھر بولا۔ "میری سیٹ کنفرم ہوگئی ہے۔ میں کل صبح یہاں سے نکل جاؤں گا۔"

"بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے راجا!" میں نے تشویش سے کہا۔

"تو پریشان مت ہو فیکے!" راجا نے اپنے مخصوص انداز میں سر جھٹک کر کہا۔ "اللہ مالک ہے، ہاں، نور کے لیے کوئی خاص پیغام ہو تو مجھے بتا دے۔ حالانکہ ایسا کوئی پیغام ہوگا نہیں کیونکہ تم لوگ ... فون پر گھنٹوں بات کرتے ہو۔"

راجا ہنس کر بولا۔ "میں نے تو صرف رسماً پوچھ لیا ہے۔" میں جانتا تھا کہ وہ ماحول کی کشیدگی ختم کرنے کے لیے ایسی باتیں کر رہا ہے۔ میں کچھ زیادہ ہی پریشان ہوگیا تھا۔

"یار آدھے گھنٹے سے میں تیرے انتظار میں یہاں سوکھ رہا ہوں۔ کم سے کم ایک کپ کافی ہی پلا دے۔"

"کافی پینے کے لیے بھی تجھے میری اجازت کی ضرورت ہے؟" میں نے منہ بنا کر کہا۔ "ریشم سے کہہ دیا ہوتا۔ وہ ایک کیا تجھے اب تک دس کپ کافی پلا چکی ہوتی۔"

"یار، یہ بات نہیں ہے۔" راجا ہنس کر بولا۔ "تیرے ساتھ کافی پینے کا مزہ ہی اور ہے۔"

میں نے بیل بجا کر ریشم کو بلایا اور اس سے کافی لانے کو کہا۔

اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ راجا نے پہلے ہی ہنس کر کہا۔ "یار، تیرے عشق کی تلی تو کھڑک گئی۔ اب میں چلوں، میرا یہاں کیا کام؟"

"بیٹھا رہ۔" میں نے کہا اور سیل فون اٹھا کے دیکھا۔ واقعی وہ نور کا ٹیلی فون تھا۔ میں نے بٹن دبا کر فون کان سے لگا لیا۔ "ہیلو جان من!" میں نے جان بوجھ کر اسے چڑانے کو کہا۔ وہ "جان من" کہنے سے چڑ جایا کرتی تھی۔

"کیا میں لائن کاٹ دوں؟" وہ جھنجلا کر بولی۔

"ارے جان، ایسا غضب مت کرنا۔ میں تو مذاق کر رہا تھا ڈارلنگ' مائی سوئٹ ہارٹ، مائی......"

"اچھا بس بس!" نور کھلکھلا کر ہنسی تو میرے کانوں میں گویا جلترنگ سے بجنے لگے۔

"کیا خبریں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"میں ایک گھنٹا پہلے محل میں شفٹ ہوگئی ہوں۔ سیکیورٹی کے لیے اپنے ذاتی گارڈز کے علاوہ لندن کی ایک بہت معروف سیکیورٹی ایجنسی کو ہائر بھی کرلیا ہے۔"

"ویری گڈ!" میں نے ہنس کر کہا۔ "یار تم تو مجھ سے قدم آگے چل رہی ہو۔" پھر سیریس ہو کر بولا۔ "ہاں، اس رابعہ کا کیا حال ہے؟"

"میں نے اسے یہاں بھی ایک ایسا کمرا دیا ہے، جسے تم نے پہلے ہی Bugged کرا دیا تھا۔ اس کے کمرے کے باہر ایک محافظ بھی کھڑا کر دیا ہے کہ اس کی نقل و حرکت پر نظر رکھے۔"

"اس محافظ کو وہاں سے ہٹا لو اور رابعہ کو فوری طور پر یہ احساس مت ہونے دو کہ وہ تمہاری قید میں ہے۔ محل سے باہر وہ یوں بھی نہیں جا سکتی۔"

"ٹھیک ہے، میں اس محافظ کو وہاں سے ہٹا دیتی ہوں۔ ہاں، میں نے رابعہ کا سیل فون اس کے پاس رہنے دیا ہے تاکہ وہ کسی سے بات کرے تو میں سن سکوں۔"

"تم تو روز بہ روز ذہین ہوتی جا رہی ہو۔" میں نے کہا۔ "ہاں، راجا کل یہاں سے لندن کے لیے روانہ ہو رہا ہے۔"

"اس بے چارے کو تکلیف دینے کی کیا ضرورت تھی۔" نور نے کہا۔ "یہاں کے معاملات میرے قابو میں ہیں۔"

"ارے یار، اس کا کوئی ذاتی کام بھی تو ہو سکتا ہے۔ اب وہ لندن جانا چاہ رہا تھا تو کیا میں اسے منع کر دیتا۔"

"مجھے بچوں کی طرح بہلاؤ مت رفیق!" نور نے کہا۔ "راجا کو اچانک اپنا ذاتی کام بھی یاد آگیا۔ خیر، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"میں بھی آ جاتا لیکن میں فوری طور پر ست بدھائی نہیں چھوڑ سکتا۔ یہاں کے معاملات کچھ پیچیدہ ہوگئے ہیں۔" میں اسے دلاور کے بارے میں تفصیل بتا کر خوف زدہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"ایک منٹ ذرا ہولڈ کرو۔ رابعہ کسی سے سیل فون پر بات کر رہی ہے۔" نور نے کہا۔

میں خاموشی سے سیل فون کان سے لگائے بیٹھا رہا۔

"کیا نور تجھے کوئی گانا سنا رہی ہے یا کسی رومانی فلم کی سٹوری شروع کر دی ہے کہ تو بالکل خاموش ہوگیا۔" راجا بولا۔

"اس نے مجھے ہولڈ کرنے کو کہا ہے۔ وہ رابعہ کی باتیں سن رہی ہے۔ رابعہ سیل فون پر کسی سے بات کر رہی ہے۔"

تقریباً پانچ منٹ بعد پھر نور کی آواز سنائی دی۔ "ہیلو، ہاں جان، میں موجود ہوں۔" میں نے کہا۔ "کیا کہہ رہی تھی رابعہ؟"

"وہ ابھی دلاور ہی سے بات کر رہی تھی۔ شاید دلاور نے اس سے پوچھا ہوگا کہ رفیق ست بدھائی سے کب نکل رہا ہے، جواب میں اس نے کہا کہ ابھی تک مجھے نور نے کچھ نہیں بتایا ہے؟...... تمہارا آدمی بھی تو وہاں ہے...... کیا...... اس کی طرف سے بھی خاموشی ہے؟ رفیق لندن آ بھی رہا ہے یا نہیں؟...... نور تو بہت یقین سے کہہ رہی تھی کہ میں اس سے ناراض ہوگئی ہوں، وہ اب مجھے منانے لندن دوڑا چلا آئے گا۔" پھر دلاور کچھ کہتا رہا اور وہ سنتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد پھر اس کی آواز سنائی دی۔ "سمجھ میں نہیں آیا کہ نور اچانک محل میں شفٹ کیوں ہوگئی؟...... ٹھیک ہے، میں تمہیں حالات سے آگاہ کرتی رہوں گی۔" پھر اس نے ... فون بند کر دیا۔"

"اپنے تمام گارڈز کو ہدایت کردو کہ رابعہ کسی بھی قیمت پر وہاں سے نکلنے نہ پائے۔" میں نے کہا۔ "باقی باتیں راجا وہاں آ کر تمہیں سمجھا دے گا۔" پھر رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

اس دوران میں ریشم کافی بنا لائی تھی۔

راجا نے کافی ختم کی اور بولا۔ "یار، میں تو اب چلا سونے، مجھے کل صبح منہ اندھیرے اٹھنا ہے۔" یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے بھی ایک میگزین اٹھا لیا اور اس کا مطالعہ کرنے لگا۔ میں دن میں خاصا سو چکا تھا اس لیے اس وقت نیند نہیں آ رہی تھی۔ کافی دیر تک اس رسالے کا مطالعہ کرتا رہا، پھر دو بجے کے قریب مجھے جماہیاں آنے لگیں۔ میں نے رسالہ رکھا اور ٹیبل لیمپ آف کرنے ہی والا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

"یس کم ان!" میں نے کہا۔

دوسرے ہی لمحے غنی کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر دبا دبا جوش تھا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اسے یقیناً کوئی اہم بات معلوم ہوگئی تھی۔ "سر!" اس نے پرجوش انداز میں کہا۔ "ہم نے گھر کے اس بھیدی کا پتا لگا لیا ہے۔"

"واقعی؟" میں نے پوچھا۔ "کون ہے وہ؟ اور تم نے کیسے پتا لگایا؟"

"سر، ہم لوگ تمام سیل فون ایک ساتھ رکھے بیٹھے تھے۔ ہم نے گیارہ گیارہ سیل فون آپس میں تقسیم کر لیے تھے۔ میرے پاس البتہ محمد دین اور رشید کا اضافی سیل فون

بھی تھا۔ اچانک میز پر رکھے ہوئے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ سرور نے سیل فون اٹھا کر اسکرین دیکھی، اس پر کسی کا نام نہیں تھا، بس اسکرین پر ''فرینڈ'' نظر آرہا تھا۔ سرور نے فون ریسیو کر کے دو تین مصنوعی چھینکیں ماریں، پھر بری طرح کھانسنے لگا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''ہیلو!''

''بلی تھیلے سے باہر کب نکلے گی؟'' دوسری طرف سے آواز آئی۔ سرور نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''پرسوں!'' دوسری طرف اچانک خاموشی چھا گئی، پھر آواز آئی، کون ہو تم، تم سردار خان تو نہیں ہو۔'' سرور نے لائن کاٹ دی۔

سردار خان ہمارے تربیت یافتہ کمانڈوز میں سے ایک تھا۔ وہ بہت زبردست فائٹر تھا۔ صوبیدار میجر شریف صاحب اس کی بہت تعریف کرتے تھے کہ وہ خالی ہاتھ بھی چار، چھ آدمیوں کا مقابلہ کرسکتا ہے۔ اس کا نشانہ غضب کا ہے اور وہ بہترین تیراک ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھا ڈرائیور بھی ہے، سردار خان چہرے سے بہت سیدھا اور شریف آدمی لگتا تھا۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ کال سردار خان ہی کے لیے ہی ہوگی۔

''اچھا، تمہارا کام ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ تم جاکر دوسرے سیل فونز کو بھی چیک کرو۔'' میں نے کہا۔ ''سردار خان سے صبح پوچھ گچھ کروں گا۔''

غنی واپس چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد بھی میں دیر تک جاگتا رہا۔ مجھے نیند ہی نہیں آرہی تھی۔

ٹینا رات میں ڈیوٹی پر تھی۔ اس نے میرے کمرے میں روشنی دیکھی تو کمرے میں آگئی اور بولی۔ ''آپ ابھی تک سوئے نہیں؟''

''نہیں، میں دن میں بہت زیادہ سولیا تھا اس لیے مجھے نیند نہیں آرہی ہے۔'' میں نے کہا۔

''میں کوئی نیند کی ٹیبلٹ دے دوں؟'' اس نے کہا۔

''نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے نیند آئے گی تو سوجاؤں گا۔'' پھر میں نے اس سے پوچھا۔ ''اور تمہارے ان آرٹسٹ صاحب کا کیا حال ہے؟''

''انہوں نے تو ست بدھائی کے جنگل میں ایک کاٹیج بنالیا ہے۔ وہیں وہ پینٹنگ کرتے رہتے ہیں۔ دن میں ایک آدھ بار ادھر بھی آجاتے ہیں۔ کبھی میری ڈیوٹی آف ہوتی ہے تو میں بھی وہاں چلی جاتی ہوں۔''

مجھے اچانک خطرے کا احساس ہوا۔ میں نے کہا۔ ''وحید کے پاس سیل فون ہے؟''

''جی ہاں، ان کے پاس سیل فون موجود ہے۔''

''مجھے اس کا نمبر دو۔'' میں نے کہا۔

ٹینا نے حیرت سے مجھے دیکھا، پھر اپنے پرس سے سیل فون نکال کر وحید کا نمبر نکالا اور مجھے لکھوا دیا۔

میں نے اسے بتایا نہیں کہ میں نے وحید کا سیل نمبر کیوں لیا ہے۔ میں اسے خطرے کے بارے میں بتا کر ہراساں نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وحید میری کاربن کاپی تھا۔ دشمن اس کے ذریعے بھی میرے خلاف کوئی سازش کرسکتے تھے۔ ٹینا کے جانے کے بعد میں نے وحید کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی لیکن اس نے فون کا جواب نہیں۔ میں نے سوچا کہ دن بھر کی تھکن کے بعد وہ اس وقت گہری نیند میں ہوگا۔ میں نے دوبارہ، پھر سہ بارہ اس کا نمبر ملایا۔ ہر مرتبہ گھنٹی بجتی رہی اور یہی ریکارڈنگ سنائی دیتی رہی کہ آپ کے مطلوبہ نمبر سے جواب موصول نہیں ہورہا ہے۔

اچانک مجھے وحید کی طرف سے تشویش ہوگئی۔ انسان لاکھ نیند میں ہو لیکن اتنی گھنٹیوں کے بعد تو وہ ہر صورت میں بیدار ہوجاتا ہے۔

میں گھبرا کر اپنے کمرے سے باہر آگیا اور غنی کو بلانے کے بجائے خود ہی اس کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

وہ مجھے اچانک سامنے دیکھ کر حیران رہ گیا اور جلدی سے بولا۔ ''ابھی تک مزید کوئی خاص بات معلوم نہیں ہوئی ہے سر!''

''تم ایسا کرو، گاڑی نکلوا اور دو تین گارڈز کو لے کر وحید کے کاٹیج کی طرف جاؤ۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ خطرے میں ہے۔ ہاں، ان گارڈز میں سردار خان کو مت لے جانا بلکہ سرور سے کہو کہ سردار خاں پر کڑی نظر رکھے اور اگر وہ حویلی سے باہر نکلنے کی کوشش کرے تو اسے باہر نہ نکلنے دے۔ جاؤ اب جلدی کرو۔''

غنی تیزی کے ساتھ وہاں سے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد حویلی کے کسی حصے میں گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہونے اور بڑا آہنی دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ غنی اپنے مشن پر روانہ ہوچکا تھا۔ میں دل ہی دل میں دعا مانگ رہا تھا کہ یااللہ وحید خیریت سے ہو ورنہ ٹینا ایک مرتبہ پھر نفسیاتی مریضہ بن جائے گی۔ ٹینا سے زیادہ مجھے وحید کی زندگی کی فکر تھی۔ میں نے غنی سے کہہ دیا تھا کہ سیل فون پر مجھ سے رابطہ رکھنا۔

دو منٹ بعد میرے سیل فون کی بیل بجی۔ غنی کی کال تھی۔ میں نے بے تابی سے پوچھا۔ ''کیا صورت حال ہے غنی؟''

''مجھے کچھ گڑبڑ محسوس ہورہی ہے سر!'' غنی نے کہا۔

میں نے اپنی گاڑی تو کافی دور چھوڑ دی تھی۔ احتیاطاً اس کے ہیڈ لیمپس بھی آف تھے۔ ہم لوگ پیدل ہی دبے پاؤں کاٹیج تک پہنچے ہیں۔ کاٹیج کے باہر ایک جیپ کھڑی ہے۔''

''بہت احتیاط کی ضرورت ہے غنی۔'' میں نے کہا۔ ''ذرا سی بے احتیاطی سے وحید کی جان بھی جاسکتی ہے۔ تمہارے پاس اسلحہ کتنا ہے؟''

''اسلحہ تو کافی ہے، میں اپنی مخصوص لینڈ روور لے گیا ہوں، اس کی سیٹوں کے نیچے بھی خفیہ خانے ہیں، ان میں دستی بم بھی موجود ہیں اور ریوالورز بھی۔ اس کے علاوہ ہم لوگوں کے پاس ایک ایک رائفل اور ریوالور ہے۔''

رائفلوں پر سائیلنسر فٹ کرلو۔'' میں نے کہا۔

''میں نے پہلے ہی یہ کام کرلیا ہے سر!'' غنی نے کہا۔ ''اب میں آہستہ آہستہ کاٹیج کی طرف بڑھ رہا ہوں۔ ہم چار آدمی ہیں اور مختلف سمتوں سے اس طرف بڑھ رہے ہیں تاکہ کاٹیج کو چاروں طرف سے گھیر سکیں۔''

''اپنے سیل فونز کو سائلنٹ پر کرلو۔''

''میں یہ کام بھی کرچکا ہوں۔ سیل فون کی گھنٹی سناٹے میں دور تک گونجتی ہے۔ اس سے اندر جو کوئی بھی ہے، وہ ہوشیار ہوسکتا ہے۔''

''ٹھیک ہے، تم احتیاط سے کاٹیج میں داخل ہونے کی کوشش کرو۔'' یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کردیا۔

میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں خود بھی وہاں پہنچ جاؤں۔ میں حویلی کے گیٹ تک گیا، پھر واپس آگیا۔ وہاں گارڈز چاق و چوبند کھڑے تھے، مجھے دیکھ کر وہ لوگ کچھ پریشان ہوگئے۔

میں واپس کمرے کی طرف جارہا تھا تو کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں بھڑک کر پلٹا تو دیکھا، وہ راجا تھا۔

''ٹیکے، سب خیر تو ہے، تو اتنی رات گئے کہاں پھر رہا ہے؟''

''خیریت نہیں ہے یار!'' میں نے تشویش ناک لہجے میں کہا۔ پھر اسے وحید کے بارے میں بتایا۔

''ارے یار، ہم سے بہت بڑی بھول ہوگئی۔ ہم اپنے چکروں میں وحید کو بھلا بیٹھے۔'' راجا بھی فکرمند ہوگیا اور میرے ساتھ ہی کمرے میں آگیا۔

وقت بہت سست رفتاری سے گزرتا رہا، میں نے اس سے پوچھا۔ ''تو اس وقت کیسے جاگ رہا ہے، تجھے تو صبح لندن کے لیے نکلنا ہے؟''

''یار، میں باتھ روم گیا تھا، واپس آیا تو تجھے کمرے کی طرف جاتے دیکھا، بس تجھے دیکھ کر میں بھی باہر آگیا۔'' پھر وہ گھڑی دیکھ کر بولا۔ ''یار، مجھے یہاں آئے ہوئے بیس منٹ سے زیادہ ہوگئے ہیں، تو غنی کو۔۔۔ فون تو کر۔ نہ جانے وہاں کیا صورت حال ہے؟''

میں نے سیل فون اٹھایا ہی تھا کہ اس کی بیل بجنے لگی۔ اسکرین پر غنی کا نام دیکھ کر میں نے فوراً کال ریسیو کرلی۔ ''ہاں غنی! کیا صورت حال ہے؟''

''دو آدمی وحید صاحب کے کاٹیج میں تھے۔ انہوں نے وحید کو رسیوں سے باندھ رکھا تھا۔ اگر ہمیں پانچ منٹ کی بھی دیر ہوجاتی تو وہ وحید صاحب کو لے کر نکل جاتے۔ اب وہ دونوں ہمارے قبضے میں ہیں۔''

''تم وحید کو ان دونوں آدمیوں سمیت لے کر حویلی پہنچو۔'' میں نے سکون کا سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ان کی گاڑی بھی وہاں مت چھوڑنا۔'' پھر میں نے راجا سے کہا۔ ''شکر ہے خدا کا۔ غنی نے حالات پر قابو پالیا۔ وہ لوگ وحید کو لے کر حویلی آرہے ہیں۔''

''کیا ہوا تھا وحید کو؟'' راجا کو پوری صورت حال کا علم نہیں تھا اس لیے وہ کچھ بھی نہیں سمجھا تھا۔

میں نے اسے بتایا کہ کیسے اتفاقاً ڈاکٹر ٹینا ادھر نکل آئی۔ میں نے یوں ہی باتوں باتوں میں وحید کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ بس پھر مجھے اچانک احساس ہوا کہ وحید خطرے میں ہے۔ ہم لوگ تو حویلی میں محفوظ ہیں لیکن وہ لاابالی آرٹسٹ تو جنگل میں اکثر راتیں بھی گزارتا ہے۔ میں نے پھر اسے تفصیل سے بتایا کہ وحید کو۔۔۔۔ فون کرنے کے بعد جب کوئی جواب نہیں آیا تو میں نے غنی اور دوسرے گارڈز کو وہاں روانہ کردیا تھا۔ ''اب وہاں کیا ہوا یہ تو غنی ہی بتائے گا۔'' پھر میں نے چونک کر کہا۔ ''ایک اہم بات تو میں تجھے بتانا ہی بھول گیا کہ سردار خان کے سیل فون پر کسی کی کال آئی تھی کہ بلی تھیلے سے باہر کب نکلے گی؟''

''سردار خان کون؟''

''ہمارا ایک گارڈ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کال سرور نے ریسیو کی تھی۔ اس نے جواب دیا کہ پرسوں۔ فوراً ہی کال کرنے والا پہچان گیا کہ بولنے والا سردار خان نہیں ہے۔ سرور نے لائن کاٹ دی۔''

اسی وقت حویلی کا آہنی پھاٹک ایک مرتبہ پھر کھلا اور گاڑیوں کے انجن کا شور سنائی دیا تو میں سمجھ گیا کہ غنی لوٹ آیا ہے۔

چند منٹ بعد غنی میرے سامنے تھا۔ اس کا بایاں شانہ زخمی تھا اور قمیص کی آستین خون میں تر ہو رہی تھی۔

''یہ تو زخمی ہے یار!'' راجا گھبرا کر بولا۔ پھر وہ غنی سے مخاطب ہوا۔ ''تم یہاں کیوں کھڑے ہو؟ اسپتال کی طرف چلو۔''

غنی کے ساتھ میں بھی اسپتال کی طرف روانہ ہو گیا۔ ثمینا اس وقت بھی ڈیوٹی پر تھی۔ اس نے غنی کا زخم دیکھا، پھر بولی۔ ''گولی کا زخم ہے لیکن زیادہ خطرناک نہیں ہے، گولی بازو کا گوشت ادھیڑتی ہوئی نکل گئی ہے۔ میں انہیں فرسٹ ایڈ دے کر ایکسرے کرواتی ہوں۔''

''ایکسرے کی ضرورت نہیں ہے ڈاکٹر صاحبہ!'' غنی نے کہا۔ ''میری ہڈی کو نقصان پہنچا ہوتا تو میں یہ ہاتھ ہلانے کے قابل بھی نہ ہوتا۔'' اس نے اپنا بازو اوپر نیچے لہراتے ہوئے کہا۔

''پھر بھی ایکسرے ضروری ہے۔'' ثمینا نے کہا۔ ''آپ میرے ساتھ آئیں۔''

''غنی! تم زخمی ہو، زیادہ باتیں مت کرنا۔'' میں نے اسے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ ثمینا کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ''ہاں، یہ بتاؤ، تمہارے ساتھ اور کون تھا؟''

''میرے ساتھ زاہد ابراہیم..... عمر خان اور احمد شاہ تھے۔'' غنی نے کہا۔

''ٹھیک ہے، تم جاؤ۔ میں ان لوگوں سے ملتا ہوں۔ تم بھی نہ جانے کہاں کہاں مارے مارے پھرتے ہو۔'' میں نے ثمینا کو سنانے کی خاطر کہا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے ایک گارڈ سے کہا کہ ''تم احمد شاہ کو بلا لاؤ!''

غنی نے ایک عقل مندی یہ کی تھی کہ وہ اپنے ساتھ ماہر کمانڈوز لے کر گیا تھا۔

احمد شاہ تھوڑی دیر بعد میرے سامنے کھڑا تھا۔

''بیٹھ جاؤ احمد شاہ!'' میں نے کہا۔ ''اور مجھے تفصیل سے بتاؤ کہ وہاں کیا ہوا۔ غنی تو زخمی ہے۔''

''سر، ہم کاٹیج کے پاس پہنچے تو اندھیرے میں ہمیں کاٹیج کے باہر ایک جیپ نظر آئی۔ ہم لوگ فوراً محتاط ہو گئے۔ غنی صاحب نے ہمیں چار حصوں میں تقسیم کرنے کے بعد کاٹیج کو گھیرنے کا حکم دیا۔ ہم لوگوں نے کاٹیج کو بہت محتاط انداز میں چاروں طرف سے گھیر لیا۔ کاٹیج کے باہر کوئی موجود نہیں تھا۔ اندر سے باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ غنی صاحب نے دو آدمیوں کو کاٹیج کے پچھلے حصے کی طرف بھیجا اور خود ہم لوگ سامنے کے دروازے سے ایک دم اندر داخل ہو گئے اور اندر بیٹھے ہوئے لوگوں کو گن پوائنٹ پر لے لیا۔ وہ دو آدمی تھے۔ دونوں اس وقت بہت ترنگ میں تھے اور چائے پی رہے تھے۔ اندر داخل ہونے سے پہلے میں نے سنا تھا۔ ایک آدمی دوسرے سے کہہ رہا تھا۔ یار، اس ڈھیلے ڈھالے آدمی کو پکڑنے کے لیے باس نے ہم لوگوں کو بھیجا ہے۔ اس کے پاس تو ہتھیار کے نام پر صرف ایک چھری ہے جو سبزی وغیرہ کاٹنے کے کام آتی ہے۔ ویسے اس کی بنائی ہوئی تصویریں بہت غضب کی ہیں۔ جاتے ہوئے میں دو چار تصویریں بھی لے جاؤں گا۔'' دوسرے آدمی نے کہا۔

''جلدی کر کہیں ایسا نہ ہو کہ حویلی کی طرف سے کوئی آ جائے؟''

''اس وقت وہاں سے کون آئے گا؟'' پہلے آدمی نے کہا۔

''تو نے چائے بہت اچھی بنائی ہے، میں تو ایک کپ اور پیوں گا۔ ابھی صبح ہونے میں بہت وقت ہے۔ ویسے بھی اس جنگل میں تو صبح ہونے پر بھی کوئی نہیں آتا ہوگا۔'' وہ دونوں ہمیں دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں ریوالور تھے لیکن وہ اس وقت چائے پینے اور باتیں کرنے میں اتنے محو تھے کہ انہیں ریوالور اوپر اٹھانے کا موقع ہی نہ ملا۔ ہم نے وحید صاحب کو کھولا اور اسی رسی سے ان دونوں کو باندھ لیا۔''

''غنی زخمی کیسے ہوا؟'' راجا نے پوچھا۔

''ہم لوگ دونوں قیدیوں اور وحید صاحب کو لے کر باہر نکلے تو اچانک دور سے کسی نے بے آواز فائر کیا۔ ہم نے بھی فوراً پوزیشن لے لی۔ ہماری فائرنگ سے گھبرا کر وہ لوگ فرار ہو گئے۔ میرا اندازہ ہے کہ وہاں سے کچھ فاصلے پر ان کا ایک آدمی اور بھی موجود تھا کیونکہ فائرنگ صرف ایک ہی رائفل سے ہو رہی تھی، پھر اچانک مجھے کسی گاڑی کے اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی اور وہ فرار ہو گیا لیکن اس کی چلائی ہوئی پہلی گولی سے غنی صاحب زخمی ہو گئے۔''

''خیریت سے تو ہیں؟''

''ہاں، وہ ٹھیک ہے، گولی نے ہڈی کو نقصان نہیں پہنچایا ہے۔ ڈاکٹر ثمینا اسے ایکسرے کے لیے لے گئی ہیں۔'' پھر میں نے چونک کر پوچھا۔ ''دونوں قیدی کہاں ہیں؟''

''انہیں ہم نے سرور صاحب کے حوالے کر دیا تھا۔'' احمد شاہ نے جواب دیا۔ ''وحید صاحب اپنے کمرے میں چلے گئے ہیں لیکن وہ بہت خوف زدہ ہیں۔''

''ایسا کرو، تم وحید صاحب کو یہاں بھیج دو۔'' میں نے

[احم]د شاہ سے کہا۔ ''قیدیوں سے میں صبح نمٹوں گا۔''

تھوڑی دیر بعد وحید وہاں آ گیا۔ اس کے جسم پر جینز [او]ر ڈھیلی ڈھالی ٹی شرٹ تھی۔ اس نے کئی دن سے شیو بھی [نہ]یں کی تھی اور سر کے بال بھی بکھرے ہوئے تھے۔ وہ ابھی [ت]ک خوف زدہ نظر آ رہا تھا۔

میں نے ایک ملازم کو بلا کر کافی لانے کو کہا اور وحید سے پوچھا۔ ''یہ واقعہ کیسے پیش آیا؟''

''میں تو اپنے کاٹیج میں بے خبر سو رہا تھا نواب [ص]احب!'' وحید نے کہا۔ ''اچانک مجھے سیل فون کی وائبریشن [سن]ائی دی۔ میں پہلے تو اسے اپنا وہم سمجھا، جنگل میں اس قسم [ک]ی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ جب وائبریشن کی ہلکی سی آواز دوبارہ آئی تو میں سیل فون کی طرف بڑھا۔ سیل فون میری [ش]رٹ کی جیب میں تھا جو میرے بیڈ سے کچھ فاصلے پر ٹنگی ہوئی [تھ]ی۔ اس دوران میں تیسری دفعہ وائبریشن ہوئی۔ میں بیڈ سے اٹھ کر شرٹ تک پہنچ چکا تھا اور سیل فون نکالنے ہی والا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے حیرت سے دروازے کی طرف دیکھا، پھر سوچا کہ اس وقت کون ہو سکتا ہے۔ [س]رور حویلی سے کوئی آیا ہوگا لیکن اتنی رات گئے کسی کو کیا [ض]رورت پڑ گئی۔ میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ شاید [ثمی]نا کو ایک مرتبہ پھر دورہ پڑ گیا ہے۔ وہ حالانکہ پوری طرح [ص]حت یاب ہو چکی ہے لیکن مجھے اب بھی کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ جیسے وہ پوری طرح نارمل نہیں ہوئی ہے۔ میں نے اٹھ کر [د]روازہ کھولا تو دو آدمی اچانک اندر گھس آئے۔ ان دونوں کے ہاتھ میں ریوالور تھے۔ انہوں نے مجھے رسی سے باندھا، [ڈ]وری بھی شاید اپنے ساتھ ہی لائے تھے۔ پھر ان میں سے ایک بولا کہ چلو اسے لے کر نکل چلو۔ دوسرے نے ہنس کر کہا۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے، مجھے سردی لگ رہی ہے، تھکن بھی محسوس ہو رہی ہے، یہاں چائے کا سامان ضرور ہوگا۔ میں چائے بنا کر لاتا ہوں، ایک کپ چائے پی لیں پھر چلیں گے۔ دوسرے نے کہا کہ جانو پریشان ہو جائے گا کہ ہمیں اتنی دیر کیوں لگی۔ پہلے آدمی نے ہنس کر کہا، وہ بھی یہیں آ جائے گا، ایک کپ چائے وہ بھی پی لے گا۔ بس اگر وہ چائے نہ پیتے تو شاید مجھے لے کر نکل جاتے۔ وہ تو عین وقت پر غنی اور اس کے [سات]ھی پہنچ گئے۔'' پھر وہ چونک کر بولا۔ ''نواب صاحب! یہ [ک]ون لوگ ہیں، میری تو یہاں کسی سے دشمنی تو دور کی بات ہے، دوستی بھی نہیں ہے۔''

''وہ تمہارے نہیں بلکہ میرے دشمن ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''اب تم میری اجازت کے بغیر حویلی سے باہر نہیں نکلو گے اور ہاں، ثمینا کو بھی کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ وہ پوری طرح نارمل نہیں ہے۔ وہ پوری طرح نارمل ہے، ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے اپنا کام بہت خوبی سے کرتی ہے لیکن خاصی حساس ہے، تمہارے معاملے میں تو وہ کچھ زیادہ ہی جذباتی ہے اس لیے اسے کچھ مت بتانا ورنہ وہ تمہارا حویلی سے باہر نکلنا دوبھر کر دے گی۔''

اس دوران میں ملازم کافی لے آیا تھا۔ ہم لوگ کافی پی ہی رہے تھے کہ ثمینا، غنی کو لے کر آ گئی اور مجھ سے بولی۔ ''زخم تو خاصا گہرا ہے لیکن ہڈی محفوظ ہے۔ خون بھی زیادہ ضائع نہیں ہوا ہے اس لیے......'' وہ بولتے بولتے اچانک چونک پڑی۔ وحید دروازے کے ساتھ دائیں جانب والے صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس کی نظر اچانک ہی اس پر پڑی تھی۔ وہ چونک کر بولی۔ ''تم کب آئے؟''

''میں تو رات ہی کو آ گیا تھا۔'' اس نے ہنس کر کہا۔ ''تمہیں اپنے مریضوں سے فرصت ملے تو کسی اور طرف دھیان دو۔''

''لیکن نواب صاحب تو تمہارا سیل نمبر مانگ رہے تھے؟'' ثمینا نے مشتبہ لہجے میں کہا۔

''نواب صاحب کے فون ہی پر تو میں نے انہیں بتایا کہ میں اپنے کمرے میں موجود ہوں۔ نواب صاحب نے کہا کہ مجھے نیند نہیں آ رہی ہے تو میں اٹھ کر ان کے پاس چلا آیا۔''

''یار لیکے!'' راجا نے کہا۔ ''مجھے اب نکلنا چاہیے۔ اسلام آباد پہنچنے میں بھی ڈھائی تین گھنٹے تو لگیں گے۔''

''تو اکیلا مت جا۔ میں سرور اور احمد شاہ کو تیرے ساتھ بھیج دیتا ہوں۔''

''او یار، میں کوئی نواب یا لارڈ نہیں ہوں کہ گارڈز لے کر جاؤں لیکن گاڑی کو واپس لانے کے لیے بھی تو کسی کی ضرورت پڑے گی۔ چل پھر میں سرور کو ساتھ لے جاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھ گیا۔

''نواب صاحب! اگر اجازت ہو تو میں بھی ذرا آرام کر لوں؟'' وحید نے کہا۔

''ہاں آرام ضرور کرو لیکن میری بات یاد رکھنا۔ وہ تصویر تمہیں تیس دن میں مکمل کرنا ہے۔ میں ڈی سی صاحب سے وعدہ کر چکا ہوں۔''

''مجھے آپ کی بات یاد ہے۔'' وحید نے کہا۔ ''تصویر آپ کو وقت سے پہلے ہی مل جائے گی۔'' یہ کہتا ہوا وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ ثمینا بھی اس کے پیچھے پیچھے باہر نکل گئی۔

غنی وہیں موجود تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”غنی، تمہیں زیادہ تکلیف تو نہیں ہو رہی ہے؟“

”نہیں سر، معمولی سا زخم ہے، ہاں اگر گولی چند انچ آگے آجاتی تو اور بات تھی۔“

”تم ایسا کرو کہ سرور اور کچھ گارڈز کو راجا کے پیچھے روانہ کر دو، لیکن اسے معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ وہ لوگ اس کے پیچھے آرہے ہیں۔“

”جی سر!“ غنی نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔

جانے سے پہلے راجا ایک دفعہ پھر مجھ سے ملنے آیا۔ وہ اس وقت سوٹ میں ملبوس تھا اور کچھ زیادہ ہی ہینڈسم لگ رہا تھا، پھر وہ شہناز سے ملا اور رخصت ہو گیا۔ شہناز رات کو ڈیوٹی پر نہیں تھی، یقیناً راجا نے رات کو اس سے تفصیلی ملاقات کی ہوگی۔

راجا کے جانے کے بعد وہ بھری بھری حویلی مجھے اچانک خالی خالی سی لگنے لگی۔ میں نے سرور سے کہہ دیا تھا کہ سیل فون پر مجھ سے رابطہ رکھنا اور راجا کو اسلام آباد چھوڑ کر ہی واپس آنا۔

رات بھر جاگنے کی وجہ سے مجھے کچھ تھکن کا احساس ہو رہا تھا۔ اگر میں دن میں کئی گھنٹے سویا نہ ہوتا تو رات بھر جاگنے کے بعد مجھے خاصی تھکن ہو جاتی۔

میں نے حسبِ معمول پہلے ایکسرسائز کی، پھر جوگنگ کے لیے نکل گیا۔

جوگنگ کر کے لوٹا تو مجھے سردار خان کا خیال آگیا۔ میں نے سوچا کہ اس سے پوچھ گچھ کے لیے اسے اپنے کمرے ہی میں بلالوں لیکن پھر میں نے اپنا ارادہ بدل دیا اور ایک گارڈ سے کہا کہ سردار خان کو کانفرنس ہال کی طرف بھیج دو، میں وہاں اس کا انتظار کر رہا ہوں۔

سردار خان نے مجھے فوجی انداز میں زبردست سیلیوٹ کیا اور بولا۔ ”سر، آپ نے مجھے یاد فرمایا؟“

”دروازہ بند کر دو سردار خان!“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔“

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ پھر دروازہ بند کر دیا۔ میں صوفے پر بیٹھا تھا۔ وہ میرے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔

”تم یہاں کب سے ہو سردار خان؟“ میں نے پوچھا اور آہستہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”مجھے یہاں ڈھائی سال ہو گئے ہیں سر!“

”میرا خیال ہے کہ میری حویلی کا ہر گارڈ مسلح رہتا ہے۔“

”آپ کا قول درست ہے سر!“ سردار خان نے کہا۔ ”اسلحہ تو سوتے ہوئے بھی ہمارے نزدیک ہوتا ہے۔“

”تمہارے پاس ریوالور ہے یا پسٹل؟“ میں نے کہا۔ ”میں سوچ رہا ہوں کہ اپنے تمام گارڈز کو پوائنٹ تھری ایٹ کا کولٹ ریوالور دے دوں۔ اس کا نام ہی پولیس اسپیشل پڑ گیا ہے، تمہارے پاس کون سا ریوالور ہے؟“

”میرے پاس تو جرمنی کا ریوالور ہے سر!“ سردار خان نے جواب دیا۔

”ذرا مجھے دکھاؤ۔“ میں نے کہا۔ اس نے جیب سے ریوالور نکال کر میری طرف بڑھا دیا۔

”دوسرا ریوالور بھی نکالو۔“ میں نے درشت لہجے میں کہا۔

”دوسرا ریوالور؟“ اس نے حیرت سے کہا۔ ”میرے پاس تو یہ ایک ہی ریوالور ہے سر!“ سردار خان نے کہا۔

”تم دوسرا ریوالور خود نکالو گے یا میں تلاشی لوں؟“ میں نے سخت لہجے میں کہا۔

سردار خان کے چہرے پر لمحے بھر کو مجھے جھنجلاہٹ کی دکھائی دی، پھر اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوئی۔ اس نے بغلی ہولسٹر میں ہاتھ ڈالا اور دوسرا ریوالور نکال کر ایک دم مجھ پر تان لیا۔ پھر وہ زہریلے لہجے میں بولا۔ ”نواب صاحب! آپ کی بھلائی اسی میں ہے کہ مجھے یہاں سے جانے دیں۔ میں گن پوائنٹ پر آپ کو باہر لے جاؤں گا۔ گھبرایئے مت، میں ریوالور اپنی جیب میں رکھ لوں گا۔ یہ بات آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں جیب کے اندر سے بھی فائر کر سکتا ہوں اور میرا نشانہ کبھی نہیں چوکتا، اٹھیے میرے ساتھ چلیں، میں تو اب تک نکل گیا ہوتا لیکن مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ نے حویلی سے باہر جانے پر پابندی لگا دی ہے۔ اب آپ خود ہی مجھے یہاں سے باہر نکالیں گے۔“

اس نے لات مار کے وہ ریوالور بھی دور پھینک دیا جو پہلے اس نے مجھے دیا تھا۔ پھر وہ میرے قریب آیا اور ریوالور کی نال میرے پہلو میں اڑا کر بولا۔ ”چلیے نواب صاحب مجھے دروازے تک چل کر رخصت کیجیے، ہاں مجھے ایک گاڑی بھی چاہیے۔ میں آپ کی گاڑی میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ پھر آگے جا کر کہیں اتار دوں گا۔ ہاں اپنا سیل فون آپ

ساتھ رکھ سکتے ہیں تاکہ کسی ویرانے میں اترنے کے بعد مدد کے لیے اپنے گارڈز کو بلا سکیں۔“

اس نے ریوالور پینٹ کی جیب میں رکھ لیا اور مجھ سے بولا۔ ”نال کا رخ آپ ہی کی طرف ہے، آپ نے ذرا بھی چالاکی دکھائی تو آپ کے سینے میں سوراخ ہو جائے گا۔“

اس بیچارے کو شاید یہ نہیں معلوم تھا کہ میں بھی مارشل آرٹ کا ماہر ہوں۔

جب اس نے مجھے دروازے کی طرف چلنے کا اشارہ کیا تو میں نے اچانک گھوم کر اس کے اسی ہاتھ پر لات ماری جس میں ریوالور تھا۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ وہ لڑکھڑا کر پیچھے گر پڑا۔ میں نے دوسری لات ماری تو اس کا ہاتھ جیب سے باہر آگیا لیکن ریوالور جیب ہی میں رہ گیا۔

میں نے تیسری دفعہ اس کے سر پر لات مارنے کی کوشش کی تو وہ اچانک قلابازی کھا گیا اور مجھ سے چند قدم دور ہٹ کر اس نے اچانک ریوالور نکال لیا اور بولا۔ ”پہلے تو میں تجھے باعزت طور پر یہاں سے لے جانا چاہتا تھا لیکن لگتا ہے، عزت تجھے راس نہیں آتی، چل دروازے کی طرف!“

اس کا رخ میری طرف اور پشت دروازے کی طرف تھی۔ میں نے وہی پرانا حربہ آزمایا جو کبھی کبھی کارگر رہتا ہے۔

میں اچانک چیخا۔ ”نہیں غنی، فائر مت کرنا۔“

سردار خان نے مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھا اور مار کھا گیا۔ اس مرتبہ میری لات اس کے ریوالور والے ہاتھ پر پڑی تھی۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا پڑا۔

اس نے سر کو دائیں بائیں جھٹکا، پھر اچانک میرے پیٹ میں لات مار دی۔ وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر تھا اس لیے اس کی لات میں وہ شدت نہیں تھی لیکن لمحے بھر کو مجھے ایسا لگا جیسے میرا سانس رک جائے گا۔ اس نے گھوم کر دوسری لات ماری، میں نے بچنے کی کوشش کی لیکن بچتے بچتے بھی وہ لات میرے شانے پر پڑی۔ میں لڑکھڑا کر گر گیا۔ اس نے جھپٹ کر مجھ پر چھلانگ لگائی لیکن میں نے لیٹے ہی لیٹے اس کی پنڈلی پر زوردار لات رسید کر دی۔ وہ اوندھے منہ گرا تو میں نے اچانک اسے دبوچ لیا۔ اس نے ایک دم میری گردن پکڑ لی اور میرا گلا دبانے لگا۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے گھوم کر کچھ ایسے انداز میں مجھ سے لپٹا تھا کہ میرے دونوں ہاتھ اس کے گھٹنوں کے نیچے دبے ہوئے تھے۔ وہ قد و قامت اور وزن میں مجھ سے کہیں زیادہ تھا۔ اس کے ہاتھوں میں بے پناہ طاقت تھی۔ ایک لمحے کو تو مجھے ایسا لگا جیسے بس اب میرا آخری وقت آپہنچا ہے۔ میری سانس رکنے لگی اور آنکھیں حلقوں سے باہر ابل پڑیں۔

موت سامنے ہو تو انسان کے جسم میں ایک انجانی سی قوت آجاتی ہے۔ میں نے بھی اپنے جسم کا سارا زور مجتمع کر کے اپنا دایاں ہاتھ اس کے گھٹنے کے نیچے سے نکال لیا اور اس کے چہرے پر اسی ہاتھ سے گھونسا مارا۔ اس پر کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ بس اتنا ضرور ہوا کہ اس کی گرفت کچھ کمزور پڑ گئی اور میری سانس بحال ہو گئی۔ میں نے دوسرا ہاتھ بھی جھٹکے سے اس کے گھٹنے کے نیچے سے نکال لیا۔ پھر میں نے بائیں ہاتھ سے اس کی کنپٹی پر زوردار ضرب لگائی۔ وہ چکرا کر سر جھٹکنے لگا۔ میرا دایاں ہاتھ چلا اور پوری قوت سے اس کے سر پر پڑا۔ وہ الٹ کر پیچھے گرا۔ پھر میں نے اسے اٹھنے کا موقع نہیں دیا۔ میں اچھل کر کھڑا ہوا اور اس کے سر پر زوردار لات رسید کر دی۔ یہ تو غنیمت ہے کہ اس وقت میرے پیروں میں جوگر تھے۔ اگر چمڑے کے بھاری جوتے ہوتے تو اس کی کھوپڑی تربوز کی طرح ٹوٹ جاتی۔ اس کی کھوپڑی تو ٹوٹنے سے بچ گئی لیکن وہ ناک آؤٹ ہو گیا۔ میں نے جھک کر احتیاطاً اس کی کنپٹی پر ہلکا سا ایک ہاتھ بھی مار دیا۔ میں اسے ہلاک نہیں کرنا چاہتا تھا ورنہ اب تک اسے ختم کر چکا ہوتا۔ وہ زمین پر پڑا گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ میں نے اسے چھوڑ کر دونوں ریوالور اٹھائے اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

مجھے یہ محسوس کر کے خوشی ہوئی کہ میری توانائی لوٹ آئی تھی۔ میرا سانس بھی معمول پر تھا اور مجھے کسی کمزوری کا احساس بھی نہیں ہو رہا تھا۔

میں نے کانفرنس ہال کا دروازہ کھول کر ایک گارڈ کو آواز دی۔ وہ بھاگا ہوا میرے پاس آیا اور بولا۔ ”نواب صاحب! خیریت تو ہے، آپ کے ہونٹوں سے خون بہہ رہا ہے؟“

”ہاں خیریت ہے۔“ میں نے کہا۔ ”تم اس مردود کو سرور کے حوالے کر دو لیکن ٹھہرو، سرور تو راجا کے ساتھ گیا ہے۔ تم رسی لے کر آؤ اور غنی کو میرے پاس بھیج دو۔“

اس کے آنے سے پہلے غنی آندھی طوفان کی طرح کانفرنس ہال میں داخل ہوا۔ اس نے ایک نظر مجھ پر ڈالی، پھر بے ہوش سردار خان کو دیکھا اور مجھ سے بولا۔ ”سر، آپ خیریت سے تو ہیں؟“

''ہاں، میں ٹھیک ہوں، یہ سردار خان کچھ ہیرو بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اگر مجھ سے تھوڑی سی چوک ہو جاتی تو اس وقت اس کی جگہ میری لاش پڑی ہوتی۔ اسے بانده کر تہ خانے میں ڈال دو۔ میں ناشتے کے بعد اس کی خبر لوں گا۔ خیال رکھنا کہ یہ مرنے نہ پائے۔''

دوسرا گارڈ رسی لے آیا تھا۔ اس نے سردار خان کو بری طرح جکڑ دیا، پھر اسے کھینچتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔

''اسے اٹھا کر لے جاؤ۔'' میں نے گارڈ سے کہا۔ ''میں ابھی اسے زندہ رکھنا چاہتا ہوں۔ یہ تم اکیلے سے نہیں اٹھے گا۔ کسی دوسرے گارڈ کو بلا لو۔'' پھر میں نے غنی سے کہا۔ ''اسے تہ خانے میں بند کر کے تم میرے پاس آؤ۔'' یہ کہہ کر میں کانفرنس ہال سے باہر آ گیا۔

کانفرنس ہال ایسی جگہ تھا جو اقامتی حصے اور اسپتال سے کچھ فاصلے پر تھا۔ میں وہاں بھی اسپتال کے لیے کچھ کمرے بنوانا چاہتا تھا۔ اس لیے وہ جگہ میں نے خالی چھوڑ دی تھی۔ کانفرنس ہال عموماً اس وقت استعمال ہوتا تھا جب تمام ڈاکٹرز راجا اور ست بدھائی کے کچھ معززین کسی اہم معاملے پر بات چیت کرنے کے لیے اکٹھے ہوتے تھے۔

میں وہاں سے اپنے کمرے میں آیا اور دیر تک گرم پانی سے نہاتا رہا۔

میں تازہ دم ہو کر باہر نکلا تو ریشم ناشتا لے آئی تھی۔ وہاں غنی پہلے سے موجود تھا۔ میں نے اسے بھی اپنے ساتھ ناشتے میں شریک کر لیا اور اسی دوران میں نے اسے بتایا کہ سردار خان نے کیسے مجھ پر حملہ کیا۔

''سردار خان بہت خطرناک فائٹر ہے!'' اس نے کہا۔ ''لیکن آپ نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ آپ سے اچھا فائٹر نہیں ہے۔''

''وقت وقت کی بات ہوتی ہے غنی!'' میں نے کہا۔ ''ابھی میرا وقت نہیں آیا تھا اس لیے میں نے اس پر قابو پا لیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سردار خان بہت زبردست لڑاکا ہے۔ اسے قابو کرنے میں مجھے دانتوں پسینا آ گیا لیکن خوشی مجھے اس بات کی ہے کہ مجھے کمزوری کا ذرہ برابر احساس نہیں ہوا۔ میں اسی طرح چاق و چوبند ہوں جیسا زوہیب کی قید سے پہلے تھا۔''

میں ناشتے فارغ ہوا تو ریشم کافی لے آئی۔ وہ ہمیشہ کافی اسی وقت لاتی تھی جب میں ناشتے سے فارغ ہو جاتا تھا۔ میں نے کافی پیتے ہوئے پوچھا۔ ''سرور نے ان دونوں قیدیوں کو کہاں رکھا ہے جنہیں رات تم لوگوں نے پکڑا تھا؟''

''سر، انہیں بھی تہ خانے کے ایک کمرے میں رکھا گیا ہے۔'' غنی نے جواب دیا۔

میں کافی کا کپ خالی کر کے اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔ ''چلو ذرا ان قیدیوں کی مزاج پرسی کر لیں۔''

''آپ آرام کریں سر!'' غنی نے کہا۔ ''وہ قیدی کون سے بھاگے جا رہے ہیں۔''

''آرام کروں؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''کیوں، میں نے کیا پہاڑ توڑا ہے یا کوئی قلعہ فتح کیا ہے؟''

''چلیے۔'' غنی نے ادب سے ایک طرف ہٹ کر کہا۔

دونوں قیدی حیرت سے مجھے دیکھنے لگے۔ میں نے ان میں سے ایک سے پوچھا۔ ''تم لوگ کون ہو اور اس آرٹسٹ کو کیوں اغوا کرنا چاہتے تھے؟''

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

میں نے آگے بڑھ کر اس کی پسلیوں میں زوردار ٹھوکر ماری۔ وہ بلبلا کر رہ گیا۔ ''کس نے بھیجا تھا تمہیں؟'' میں نے پھر پوچھا۔

وہ پھر خاموش رہا۔

''غنی!'' میں نے غنی کو مخاطب کیا۔ ''خان محمد کو بلاؤ، وہی ان کی زبان کھلوائے گا۔ زبان تو خیر میں بھی کھلوا سکتا ہوں لیکن میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔''

خان محمد آرمی کا سابق کمانڈو تھا اور لوگوں کی زبان کھلوانے کا ماہر تھا۔

''اگر یہ لوگ پندرہ منٹ کے اندر اندر منہ نہ کھولیں تو انہیں گولی مار کے ان کی لاش کسی ویرانے میں پھینک دینا۔ چیلیں اور گدھ ان کی لاشوں کو ایک ہی دن میں چٹ کر جائیں گے۔'' یہ کہہ کر میں اس قید خانے سے باہر نکل آیا۔

غنی نے ایک مرتبہ پھر سلاخوں والا دروازہ لاک کر دیا۔

''اب ذرا اس سردار خان کی خبر بھی لے لیں۔ میں بھی دیکھوں کہ اس میں کتنی قوت برداشت ہے؟''

غنی مجھے دوسرے کمرے کی طرف لے گیا۔ وہاں سردار خان بندھا پڑا تھا لیکن اس وقت وہ ہوش میں تھا۔

''تو کیا سمجھ رہا تھا کہ میں کسی روایتی نواب ہی کی طرح نازک اندام ہوں اور تیری دھمکی سے خوف زدہ ہو جاؤں گا۔''

''مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم بھی مارشل آرٹ کے ماہر ہو، بس میں اس دھوکے میں مار کھا گیا۔''

''اب تو تجھے اندازہ ہو گیا؟'' میں نے کہا۔ ''کیا خیال ہے، اب تیرے ہاتھ پیر کھلوا دوں، مقابلہ کرے گا؟''

''تمہاری لات سے شاید میرا دایاں شانہ اتر گیا ہے یا پھر فریکچر ہو گیا ہے ورنہ میں تمہارا چیلنج ضرور قبول کرتا قبلہ نواب صاحب!''

غنی نے آگے بڑھ کر اس کے چہرے پر زناٹے دار تھپڑ رسید کر دیا اور بولا۔ ''تو اب تک نواب صاحب کے ٹکڑوں پر پلتا رہا ہے۔''

''یہ بتا، تو یہاں کس کے لیے کام کر رہا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھ میں بہت قوت برداشت ہے نواب صاحب!'' اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''مر جاؤں گا لیکن زبان نہیں کھولوں گا۔''

''اچھا!'' میں نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔ ''تیری زبان تو ابھی ایسی کھلے گی کہ پھر بند ہونے کا نام نہیں لے گی۔'' پھر میں غنی سے مخاطب ہوا۔ ''کسی سے ہیٹنگ راڈ منگوا لو اور ہاں، میں نے بہت دیر سے سگریٹ نہیں پی ہے۔ میرے کمرے سے سگریٹ اور لائٹر بھی منگوا لو۔''

غنی سر ہلا کر چلا گیا۔

میں نے پھر سردار خان سے پوچھا۔ ''میں تجھ سے آخری بار شرافت سے پوچھ رہا ہوں کہ تو اس آدمی کا نام بتا دے جس کے لیے تو کام کر رہا تھا؟ تو نے کتنے پیسوں میں اپنے ضمیر کا سودا کیا ہے؟''

''آپ اسے ضمیر کا سودا کہہ لیں، انسان کو جہاں سے چار پیسے ملتے ہیں، وہ انہیں حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ میں بھی بیوی بچوں والا ہوں، میری بھی کچھ ضروریات تھیں۔''

''تیری کون سی ضرورت یہاں پوری نہیں ہو رہی تھی۔ میں تجھے اتنی تنخواہ دے رہا تھا جس کا تو نے تصور بھی نہ کیا ہوگا۔ تو ایک سیکیورٹی ایجنسی میں معمولی گارڈ تھا۔ جہاں تیری تنخواہ تھی صرف پانچ ہزار روپے!'' میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''یہاں تجھے کیا مل رہا تھا پانچ گنا زیادہ تنخواہ، کھانا، کپڑے اور عید، بقر عید کے موقعے پر بونس! تو نے چند ٹکوں کی خاطر اپنا ضمیر بیچ دیا۔ اس پر تجھے کوئی ندامت نہیں ہے؟ جن بچوں اور بیوی کے لیے تو نے خود کو بیچا ہے، میں اگر ان کو بھی تیرے سامنے ذبح کر دوں تو کیسا رہے گا؟''

''قصور میرا ہے نواب صاحب!'' وہ گھبرا کر بولا۔ ''میرے بیوی بچے تو بے قصور ہیں۔''

''تم نے ان ہی کی وجہ سے تو اپنا ضمیر بیچا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''جب وہی نہیں رہیں گے تو تجھے احساس ہوگا کہ تو نے گھاٹے کا سودا کیا ہے، ان کا یہی قصور ہے کہ وہ تجھ جیسے لالچی اور خود غرض اور بے ضمیر انسان کے بچے ہیں۔''

''لیکن وہ معصوم کیا جانیں کہ......''

''بس!'' میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے روک دیا۔ ''میرے سوال کا جواب دیدے، میں وعدہ کرتا ہوں کہ تیرے بیوی بچوں پر آنچ بھی نہیں آئے گی۔ تو یہاں کس کے لیے کام کر رہا تھا؟''

''میں نے اگر اس کا نام لے لیا تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔'' اس نے کہا۔

''اور اگر تو نے زبان نہ کھولی تو میں تیرے ساتھ ساتھ تیری بیوی اور بچوں کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اب جلدی فیصلہ کر کہ تجھے کیا کرنا ہے۔''

''مجھے مجبور نہ کریں نواب صاحب! میں اس شخص کا نام نہیں بتا سکتا۔ وہ بہت ظالم آدمی ہے، آپ تو صرف کہہ رہے ہیں لیکن وہ میرے بچوں اور بیوی کو میرے سامنے ذبح کرنے کے بعد مجھے بھی ذبح کر دے گا۔''

''تجھے اس مردود نے کتنے پیسے دیے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس نے مجھے بیس لاکھ روپے دیے تھے۔''

''تو تو نے میری زندگی کا سودا صرف بیس لاکھ میں کر دیا۔ میں ایک پوری ریاست کا مالک اور کروڑوں پاؤنڈز کے بزنس کا مالک ہوں۔ تو نے مجھے صرف بیس لاکھ میں بیچ دیا۔ تجھے پیسوں کی اتنی ہی ضرورت تھی تو مجھ سے کہتا۔ میں بیس لاکھ کیا، تجھے چالیس لاکھ روپے دے دیتا۔ کیا میں نے کبھی تم لوگوں کے سامنے کسی کنجوسی کا مظاہرہ کیا ہے۔ تو نے دو سال پہلے اپنے مکان کی مرمت کے لیے مجھ سے دو لاکھ روپے مانگے تھے۔ کیا میں نے انکار کیا تھا؟ کیا میں نے وہ رقم تیری تنخواہ میں سے کاٹی ہے؟''

''میری آنکھوں پر لالچ اور خود غرضی کی پٹی بندھ گئی تھی نواب صاحب!'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''تو مجھے اس آدمی کا نام بتا، میں وعدہ کرتا ہوں کہ تیرے بیوی بچوں کی میں حفاظت کروں گا۔ تو جانتا ہے کہ

میں جب وعدہ کرلیتا ہوں تو اسے پورا بھی کرتا ہوں، میں آخری دفعہ تجھ سے اس شخص کا نام پوچھ رہا ہوں، پھر تیرے پورے خاندان کو غنی کے حوالے کردوں گا۔ تو جانتا ہے کہ وہ کتنا ظالم ہے۔ خاص طور پر میرے دشمنوں کے ساتھ وہ رتی بھر رعایت نہیں کرتا۔''

''مجھے...... دلاور...... نے یہاں بھیجا تھا۔'' اس نے سہمے ہوئے انداز میں کہا۔

''کون دلاور؟'' میں نے پوچھا۔ ''میں تو کسی دلاور کو نہیں جانتا۔''

''آپ اسے نہیں جانتے لیکن وہ آپ کو جانتا ہے۔'' سردار خان نے کہا۔

''تو نے دلاور ہی کے کہنے پر میرے گارڈز کی گاڑی کے نیچے بم نصب کیا تھا؟'' میں نے کہا۔

''وہ بم میں نے نہیں لگایا تھا بلکہ دلاور کے کسی اور آدمی نے لگایا تھا، میں نے تو صرف دلاور کو اطلاع دی تھی کہ نواب صاحب ست بدھائی سے نکل کر دینہ کی طرف جارہے ہیں۔''

''یہ دلاور آخر ہے کون؟ تو اسے کیسے جانتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''تین مہینے پہلے اس کا ایک آدمی مجھے ملا تھا۔ اس نے کہا کہ ہمارے صاحب کو تم سے بہت ضروری کام ہے۔ اس کے لیے تمہیں پنڈی چلنا پڑے گا۔ پیسے بھی معقول ملیں گے اور جیب خرچ بھی پانچ ہزار روپے ملے گا۔ آپ جانتے ہیں کہ میرے بیوی بچے پنڈی میں رہتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ میں اس کے صاحب کا کام کروں یا نہ کروں۔ یہ مجھے فوری طور پر پانچ ہزار روپے دے رہا ہے۔ میں ان پیسوں سے بچوں کے لیے کچھ خرید لوں گا۔ آنے جانے کا بھی کوئی خرچہ نہیں ہورہا تھا کیونکہ وہ مجھے اپنی سوزوکی میں لے جارہا تھا۔ میں نے غنی سے دو دن کی چھٹی لی اور اس شخص کے ساتھ روانہ ہوگیا۔''

''تو نے اس وقت بھی یہ نہیں سوچا کہ یہ آدمی محض اپنے صاحب سے ملوانے کے لیے مجھے پانچ ہزار روپے کیوں دے رہا ہے۔''

''وہ آدمی مجھے پنڈی کے بجائے اسلام آباد لے گیا۔ جہاں اس کا صاحب ایک ہوٹل میں مقیم تھا۔ یہ تو مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ دلاور تھا۔''

''اس نے تجھے بیس لاکھ کی پیشکش کی اور تو فوراً راضی ہوگیا۔ تو میرے سب احسانات بھول گیا؟''

''میں نے کہا نا کہ میری آنکھوں پر خودغرضی اور لالچ کی پٹی بندھ گئی تھی۔ میرا کام صرف یہ تھا کہ میں حویلی میں ہونے والے ہر واقعے کی اطلاع دلاور کو دوں۔ وہ ہمیشہ فون پر مجھ سے بات کرتا تھا۔ اس کا کوڈ ورڈ تھا۔ ''بلی تھیلے سے باہر کب نکلے گی؟'' میں جواب میں کہتا تھا کہ جب بھی تھیلے کا منہ کھلے گا، بلی باہر ہوگی۔ اس کے بعد وہ مجھ سے اپنے مطلب کی بات کرتا تھا۔ اس دن جب آپ نے ہم سب سے سیل فون لے لیے تو میں نے بھی بلا جھجک اپنا سیل فون آپ کو دے دیا۔ اس سے کچھ ہی دیر پہلے دلاور سے میری بات ہوئی تھی۔ مجھے اطمینان تھا کہ اب وہ دو چار دن مجھ سے رابطہ نہیں کرے گا لیکن شاید میرا برا وقت شروع ہوچکا تھا۔ دلاور نے مجھ سے رابطہ کیا اور میں پکڑا گیا۔''

''تیری سزا میں بعد میں تجویز کروں گا۔ راجا لندن سے لوٹ آئے۔ اس وقت تک تو میری قید میں رہے گا۔''

غنی ہیٹنگ راڈ اور سگریٹ لائٹر لے آیا تھا لیکن ہماری بات چیت سن کر کچھ فاصلے پر رک گیا تھا۔ میں نے سوچا کہ جب غنی یہ چیزیں لے ہی آیا ہے تو پھر ان دونوں میں سے کسی ایک کی زبان کھلوالوں۔

''ان دونوں قیدیوں کے کمرے میں چلو۔'' میں نے غنی سے کہا۔

''نواب صاحب!'' ان میں سے ایک بولا۔ ''آپ تو کسی خان محمد کو بھیج رہے تھے لیکن آپ تو خود ہی آگئے۔''

''میں نے غنی سے کہا۔ ''ہیٹنگ راڈ کا پلگ سوئچ میں لگا کر اسے آن کردو۔'' دائروں کی شکل میں بنی ہوئی وہ راڈ عام طور پر پانی گرم کرنے کے کام آتی ہے۔ اسے پانی میں ڈالا جائے تو بالٹی کا پانی چند منٹ میں کھولنے لگتا ہے۔

غنی نے راڈ کا پلگ ساکٹ میں لگایا اور اسے آن کرکے کھڑا ہوگیا۔ راڈ دو منٹ کے اندر اندر سرخ ہوگئی۔

''بتاؤ، تمہیں کس نے بھیجا تھا؟''

ان میں سے ایک طنزیہ انداز میں مسکرایا۔

میں غنی سے وہ راڈ لے کر ہنسنے والے کے پاس پہنچ گیا، اس کی ابھی تک سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ میں ان کے ساتھ کیا کرنے والا ہوں؟ میں نے دہکتی ہوئی وہ راڈ اچانک اس کے سینے پر لگادی۔ اس کے سینے کا وہ حصہ کھلا ہوا تھا۔

اس کے منہ سے بھیانک قسم کی ایک کراہ نکلی اور وہ پانی سے نکلی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ کمرے میں گوشت

اور بال جلنے کی بدبو پھیل گئی۔

''بتاؤ، تمہیں کس نے بھیجا تھا؟'' میں نے سفاک لہجے میں پوچھا۔

اس نے سختی سے اپنے ہونٹ بھینچ لیے۔ میں نے وہ راڈ پھر غنی کے حوالے کردی۔ لمحوں میں وہ پھر انگارے کی طرح سرخ ہوکر دہکنے لگی۔ میں نے کراہتے ہوئے اس شخص کی گردن پکڑ کر سامنے کی اور راڈ لے کر اچانک اس کی گردن کے حساس گوشت پر رکھ دی۔ اس مرتبہ اس کی چیخ بہت بھیانک تھی۔ اس کے سینے اور گردن پر دو دائرے سے بن گئے تھے۔ جہاں سے چربی نکل رہی تھی۔ کمرے میں گوشت جلنے کی چراند پھیل گئی تھی۔

میں نے راڈ ایک مرتبہ پھر غنی کو دے دی۔ اس نے دوبارہ راڈ کا پلگ ساکٹ میں لگا دیا۔ وہ لمحوں میں پھر سرخ ہوگئی۔ میں نے اس مرتبہ جلنے والے کے پیٹ سے قمیص ہٹائی اور راڈ لے کر اس کے کھلے ہوئے پیٹ کی طرف بڑھائی۔

میں راڈ اس کے پیٹ پر رکھنے ہی والا تھا کہ وہ چیخ اٹھا۔ ''رک جائیں نواب صاحب! بتاتا ہوں۔''

''بتاؤ۔'' میں نے راڈ اس کے پیٹ کے نزدیک ہی رکھی۔

''ہمیں دلاور نے بھیجا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ ست بدھائی کے ویرانے میں ایک کاٹیج ہے وہاں ایک شخص رہتا ہے جو تصویریں بناتا ہے، اسے اٹھالاؤ۔''

''کون دلاور؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ دلاور کو نہیں جانتے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''کیوں دلاور کیا امریکا کا صدر ہے شاہِ برطانیہ ہے کہ اسے جاننا ضروری ہے۔''

''دلاور اسلحے اور منشیات کا بہت بڑا اسمگلر ہے۔ وہ انسانوں کی اسمگلنگ بھی کرتا ہے۔''

''اس نے تمہیں اس کام کے کتنے پیسے دیے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس نے کہا تھا کہ کام معمولی ہے لیکن اس کے باوجود میں تم لوگوں کو پچاس ہزار روپے دے رہا ہوں۔ تم تینوں انہیں آپس میں بانٹ لینا۔ وہاں کسی بھی قسم کا کوئی خطرہ نہیں ہے، بس تم جانا اور اسے اٹھالانا۔''

''تیسرا آدمی کون تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''تیسرا آدمی جانو تھا۔ اسے ہم نے دور کھڑا کردیا تھا تاکہ اگر کوئی خطرہ بھی ہو تو وہ اس سے نمٹ لے۔''

''تم لوگ دلاور کے لیے باقاعدہ کام کرتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''باقاعدہ تو نہیں لیکن جب بھی اسے کسی کام کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ ہم سے رابطہ کرتا ہے۔''

''وہ تم سے کیسے رابطہ کرتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ خود تو ہم جیسے چھوٹے لوگوں سے بات بھی نہیں کرتا بلکہ میں نے تو اسے دیکھا بھی نہیں ہے۔ اس کا ایک خاص آدمی ہے شہباز، وہی ہم سے رابطہ کرتا ہے۔''

''شہباز کہاں ہوتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ لاہور میں چھوٹا سا ایک ہوٹل چلاتا ہے۔''

''لاہور میں کہاں؟'' میں نے پوچھا۔

''لاہور میں گوالمنڈی کے پاس ایک ہوٹل ہے، شہباز خان اسی ہوٹل کا مالک ہے۔ ''کشمیر ہوٹل''۔''

''شہباز کا تعلق کشمیر سے ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کا تعلق تو شاید پشاور یا نوشہرہ سے ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں پہلے شہباز خان کو دیکھوں گا، پھر تم لوگوں کو یہاں سے چھوڑوں گا۔'' میں نے کہا۔

پھر میں نے غنی سے کہا۔ ''اسپتال سے کسی ڈسپنسر کو بلا کر اس کی مرہم پٹی کرادو۔''

انہیں ایک مرتبہ پھر بند کرنے کے بعد میں تہ خانے سے باہر نکل آیا۔ یہ دلاور میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ آخر یہ کون تھا؟ کیا یہ رابعہ کے کہنے پر میرا دشمن ہورہا تھا یا زوہیب نے اسے میرے پیچھے لگایا تھا۔ اگر رابعہ نے اسے میرے پیچھے لگایا تھا تو کیوں لگایا تھا۔ میں تو اسے ست بدھائی کی ریاست گفٹ کرچکا تھا۔ اب وہ مجھ سے کیا چاہتی تھی۔ یہی سوچتا ہوا میں اپنے کمرے میں آگیا۔ آنے سے پہلے غنی سے کہہ چکا تھا کہ ''تم ریشم سے کہو کہ مجھے ایک کپ کافی دیدے اور سرور آگیا ہو تو اسے بھیج دو۔''

''سرور تو ابھی تک واپس نہیں آیا ہے سر!'' غنی نے جواب دیا۔

''نہیں آیا؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''ٹائم کیا ہوا ہے؟''

''چار بج رہے ہیں سر!'' غنی نے کہا۔

''اس وقت تک تو ان لوگوں کو لوٹ آنا چاہیے۔ تم ذرا سرور کو فون کرو۔'' میں نے اپنا سیل فون اس کی طرف بڑھا دیا۔

غنی نے سرور کا نمبر ملایا اور سیل فون کان سے لگالیا۔

وہ کچھ دیر سیل فون کان سے لگائے بیٹھا رہا۔ پھر بولا۔ ''سر بیل تو جا رہی ہے لیکن کوئی جواب نہیں آ رہا ہے۔''

''راجا کا فون ملاؤ۔'' میں نے مضطرب ہو کر کہا۔

غنی نے راجا کا نمبر ملایا اور بولا۔ ''سر نیٹ ورک کام نہیں کر رہا ہے۔''

میں نے سیل فون اس سے لے کر دوبارہ راجا کا نمبر ملایا۔ اس مرتبہ رابطہ مل گیا۔ ''ہیلو!'' دوسری طرف سے راجا کی آواز سن کر میری جان میں جان آئی۔

''ہاں راجا! کہاں پہنچا ہے تو؟'' میں نے کہا۔

''یار ابھی تو جہاز نے......''

اس کے بعد پھر سلسلہ منقطع ہو گیا۔ میں نے دوبارہ ملایا لیکن رابطہ نہیں ہو سکا۔ مجھے یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ راجا خیریت سے ہے اور جہاز میں بیٹھ چکا ہے۔

غنی، ریشم سے کافی بنوانے جا چکا تھا۔

میں نے ایک مرتبہ پھر سرور کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی، پھر اچانک اس نے فون ریسیو کر لیا۔ ''ہاں سرور، کہاں ہو تم؟''

''سرور نہیں، میں تیرا باپ بول رہا ہوں، نواب کے نطفے!'' دوسری طرف سے کوئی غراہٹ آمیز لہجے میں بولا۔

''کون بدتمیز ہے؟'' میں نے کہا۔ ''تمہیں بات کرنے کی بھی تمیز نہیں ہے۔''

''اوئے، تو کیا سمجھتا ہے کہ میرے دو آدمیوں کو پکڑ کر تو بہت بڑا بدمعاش بن گیا ہے۔ تو اپنے اس بل سے نکل کر تو دکھا۔ پھر میں دیکھوں تو کتنا بڑا اطرم خان ہے۔''

''تم ہو کون؟'' میں نے پھر اپنے غصے پر قابو پایا۔

''میں تیرا باپ ہوں دلاور! جو لوگ مجھے جانتے ہیں، وہ مجھے زمین کا زلزلہ کہتے ہیں۔''

''زلزلہ زمین ہی پر آتا ہے۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''شرافت سے میرے دونوں آدمیوں کو چھوڑ دے۔'' اس نے کہا۔

''او بھائی زلزلے!'' میں نے تضحیک آمیز انداز میں کہا۔ ''تو اگر زلزلہ ہے تو میں سونامی ہوں، سمجھا۔ تو کن آدمیوں کی بات کر رہا ہے؟''

''زیادہ بھولا مت بن!'' اس نے کہا۔ ''تو نے رات کو میرے دو بندے پکڑے ہیں، انہیں چھوڑ دے۔''

''اچھا تو وہ تمہارے آدمی ہیں؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''میں تو ان سے پوچھ پوچھ کر تھک گیا لیکن انہوں نے کچھ بتایا ہی نہیں ورنہ میں انہیں پہلے ہی چھوڑ دیتا۔''

''اب تو معلوم ہو گیا۔'' اس نے مغرور لہجے میں کہا۔ ''اب چھوڑ دو۔''

''سرور کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کون سرور؟'' اس نے پوچھا۔

''وہی سرور جس کے سیل فون سے تم بات کر رہے ہو؟''

''اس نے تو مجھے بہت نقصان پہنچایا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میرے دو بندے مار دیے ہیں۔ اس کے ساتھ گاڑی میں تین بندے اور تھے، وہ فرار ہو گئے ہیں۔''

''چلو حساب برابر ہو گیا۔'' میں نے کہا۔ ''تمہارے آدمی کی گولی سے میرا بھی ایک بندہ مارا گیا ہے۔'' میں نے غنی کے زخمی ہونے کا یوں تذکرہ کیا جیسے وہ مارا گیا ہو۔

''میں تمہارے بندے کو نہیں چھوڑوں گا۔'' اس نے کہا۔

''مت چھوڑو۔'' میں نے کہا۔ ''وہ میرا کوئی ایسا خاص آدمی نہیں ہے۔ میرا ایک معمولی گارڈ ہے۔ میری طرف سے تم اسے بھی مار دو۔''

''لیکن تمہیں میرے بندے چھوڑنا ہوں گے۔'' اس نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

''اور اگر میں نہ چھوڑوں تو؟''

''تو پھر نتائج کے تم خود ذمے دار ہو گے۔'' اس نے کہا۔

''یہ جملہ میں نے اتنی بار سنا ہے کہ اب اسے سن کر ہنسی آنے لگی ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''آج کے بعد ہنسنا بھول جاؤ......''

اچانک فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ پھر سیل فون پر مختلف آوازیں آنے لگیں۔ سرور کا سیل فون مسلسل آن تھا۔ میں دوسری طرف کی آوازیں سن رہا تھا۔ اچانک دلاور کی آواز آئی۔ ''چلو، اوئے نکلو یہاں سے، اس حرام زادے نے ہمیں دھوکا دیا ہے۔ اس کے کچھ اور بندے بھی یہاں موجود ہیں۔'' پھر مجھے بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔

تھوڑی دیر بعد سرور کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو سر!''

''ہاں سرور، کیا صورتِ حال ہے وہاں؟''

''سر! ان لوگوں نے راجا صاحب کی گاڑی پر حملہ کرنے کی کوشش کی تھی لیکن ہم نے انہیں ان تک پہنچنے ہی نہیں دیا۔ کافی دیر تک فائرنگ ہوتی رہی۔ پھر ان کے کچھ اور لوگ بھی آ گئے۔ میرے دو گارڈز زخمی ہو گئے تھے۔ میں نے انہیں پیچھے ہٹنے کو کہا۔ اس دوران میں انہوں نے ہلا بول کر مجھے پکڑ لیا۔ ہمارے باقی گارڈز زخمی آدمیوں کو لے کر وہاں سے نکل گئے۔ پھر ابھی احمد شاہ آ گیا، اس نے فائرنگ کچھ ایسے انداز میں کی کہ یہ لوگ بوکھلا کر بھاگ گئے۔ تفصیل آپ کو وہیں آ کر بتاؤں گا۔ ابھی تو مجھے اپنے زخمی ساتھیوں کی فکر ہے۔ میں انہیں سیل فون پر کال کر کے ٹریس کرتا ہوں، پھر میں حویلی پہنچتا ہوں۔''

آدھے گھنٹے بعد سرور، احمد شاہ اور دونوں زخمی گارڈز بھی حویلی پہنچ گئے۔

سرور نے بتایا کہ جب راجا صاحب کی گاڑی ویناسے آگے نکلی تو اس روڈ سے ایک جیپ برآمد ہوئی جس میں کچھ مسلح افراد سوار تھے۔ انہیں دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا اور میں نے گاڑی کی اسپیڈ بڑھا کر اس جیپ کو اوورٹیک کرنے کی کوشش کی۔ ان کے نزدیک سے گزرتے ہوئے مجھے بس ایک جملہ سنائی دیا۔

''وہ کالی گاڑی جو جا رہی ہے اس میں بیٹھے ہوئے بندے کو اڑانا ہے۔'' سڑک پر اس وقت کالی گاڑی ایک ہی تھی۔ اس میں راجا صاحب سوار تھے۔ اسے احمد شاہ ڈرائیو کر رہا تھا۔ میں اچانک جیپ اور راجا صاحب کے درمیان میں آ گیا اور اپنی رفتار ہلکی کر دی۔ پھر میں نے انہیں راستہ نہیں دیا اور سیل فون پر احمد شاہ کو بتا دیا کہ گاڑی کی اسپیڈ بڑھاؤ۔ راجا صاحب خطرے میں ہیں۔ میں حملہ آوروں کو روک رہا ہوں۔'' احمد شاہ نے گاڑی آندھی طوفان کی طرح اڑا دی۔ جیپ میں سوار ڈرائیور نے جھلا کر مجھے گالی دی۔ میں نے مزید وقت ضائع کرنے کو گاڑی روک دی اور اسے بھی رکنے پر مجبور کر دیا۔ وہ جھنجلا کر گاڑی سے اترا اور بھنا کر بولا۔

''تجھے سڑک پر چلنے کا سلیقہ نہیں ہے۔ کیا یہ پوری سڑک تیرے باپ کی ہے جو تو پوری سڑک کے درمیان چل رہا ہے؟ میں نے چیخ کر کہا۔

''اوئے باپ تک مت جا۔'' اچانک ان کا ایک آدمی چیخ کر بولا۔

''یہ بھی نواب کا آدمی ہے۔ اس نے شاید جان بوجھ کر اس گاڑی والے کو نکلنے کا موقع دیا ہے۔''

بس پھر ان لوگوں نے فائر کر دیا۔ جواب میں ہمارے گارڈز بھی پھرتی سے نیچے اتر گئے اور انہوں نے پوزیشن لے لی، پھر ان کے کچھ اور لوگ آ گئے۔ اس وقت تک ہمارے دو گارڈز زخمی ہو چکے تھے۔ میں نے انہیں دوسروں کے ساتھ وہاں سے نکال دیا۔ اس وقت ان لوگوں نے اچانک ہلا بول دیا اور مجھے پکڑ لیا۔ آپ سے جو بھی بات ہوئی تھی۔ وہ میرے سامنے ہی ہوئی تھی۔''

''احمد شاہ! تم ان لوگوں تک کیسے پہنچے؟'' میں نے پوچھا۔

''سر، میں راجا صاحب کو ایئرپورٹ پر چھوڑ کر واپس آ رہا تھا تو مجھے سڑک سے کچھ فاصلے پر اپنی گاڑی دکھائی دی۔ میں نے اپنی گاڑی کچھ فاصلے پر چھوڑی اور رائفل اور ریوالور لے کر اتر گیا۔ پھر میں نے وہاں پوزیشن بدل بدل کر فائرنگ کی۔ وہ لوگ بوکھلا کر فرار ہو گئے۔ میں ان لوگوں کو لے کر یہاں آ گیا۔''

''وہ دلاور تھا؟'' میں نے سرور سے پوچھا۔

''دلاور؟'' سرور نے حیرت سے کہا۔ ''اس کے ساتھی تو اسے شہباز خان کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔''

''شہباز خان!'' میں نے زیرلب دہرایا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ وہ شہباز خان تھا اور دلاور بن کر بات کر رہا تھا۔ میرے قبضے میں جو بندے تھے، وہ شہباز کے تھے، ہاں کبھی کبھی دلاور کے لیے بھی کام کرتے تھے۔''

میں چکرا کر رہ گیا تھا۔

میں نے آرمی کے ایک سابق کمانڈو علی حسن کو بلایا اور اس سے کہا۔ ''تمہیں ابھی اور اسی وقت لاہور جانا ہے۔''

''او کے سر!'' اس نے مستعدی سے جواب دیا۔

''تم اپنے ساتھ دو آدمیوں کو مزید لے جا سکتے ہو۔ وہاں گوال منڈی کے علاقے میں ایک ہوٹل ہے، کشمیر ہوٹل! اس کے مالک شہباز خان کو اٹھانا ہے۔''

''او کے سر!'' اس نے کہا۔

''ایڈریس ایک دفعہ پھر سمجھ لو۔ گوالمنڈی، کشمیر ہوٹل کا مالک شہباز خان۔''

''سمجھ گیا سر!''

''یہ کام کیسے کرنا ہے، یہ تم خود طے کرو گے۔'' میں نے کہا۔

علی حسن مجھے فوجی انداز میں سیلیوٹ کر کے روانہ

ہو گیا۔

پے در پے واقعات سے میں پریشان ہو گیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ راجا بھی موجود نہیں تھا کہ وہی مجھے کچھ مشورہ دیتا۔

شہناز تو تھی، میں اس سے بھی مشورہ کر سکتا تھا۔ وہ بھی خاصی ذہین اور سمجھ دار تھی۔ اگر میرا دماغ کام نہیں کر رہا تھا تو اس کا ذہن تو حاضر تھا۔

میں نے شہناز کو بلا کر ساری صورتِ حال اسے بتائی تو وہ بھی پریشان ہو گئی اور بولی۔ ''رفیق! میرا مشورہ تو یہ ہے کہ ابھی فوری طور پر شہباز خان کو مت چھیڑو۔ کچھ وقت گزرنے دو، اس کے بعد دیکھیں گے۔ تم نے اسے یہاں اٹھوا بھی لیا تو فائدہ کیا ہو گا؟''

''تو پھر میں علی حسن کو منع کر دوں؟''

''ہاں، ابھی اسے روک دو۔'' شہناز نے کہا۔ ''یہ میرا مشورہ ہے، میں تم پر زور نہیں دے رہی ہوں۔''

''ہاں تمہارا مشورہ مناسب ہے۔ میں علی حسن کو ابھی بلا لیتا ہوں۔''

میں نے سیل فون اٹھا کے علی حسن کا نمبر ڈائل کیا اور اس سے کہا۔ ''علی حسن! تم اس وقت کہاں ہو؟''

''سر، میں لاہور کے لیے نکل چکا ہوں۔''

''تم فوری طور پر واپس آجاؤ، مشن کینسل!''

''او کے سر!'' اس نے جواب دیا۔

میں ابھی کمرے میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے سیل فون اٹھایا۔ اسکرین پر راجا کا نمبر تھا۔

''ہاں راجا!'' میں نے سیل فون کان سے لگا کر کہا۔

''تو کہاں تک پہنچا؟''

''میں اس وقت فرینکفرٹ میں ہوں، یہاں تھوڑی دیر کا ٹرانزٹ ہے، پھر طیارہ لندن کی طرف فلائی کر جائے گا۔ طیارے میں تیری کال آئی تھی لیکن شاید نیٹ ورک کام نہیں کر رہا تھا۔''

''ہاں یار، مجھے تیری وجہ سے بہت فکر تھی۔''

''فکر کرنا چھوڑ دے لیکے پتر!'' راجا نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ ''تو تو اس وقت بھی پریشان تھا جب میں ست بدھائی سے نکل رہا تھا۔''

''چل ٹھیک ہے یار، تو خیریت سے ہے اب میری ساری پریشانی دور ہو گئی۔''

میں اسے کیا بتاتا کہ اسے خیریت سے پہنچانے کے لیے میرے دو گارڈز زخمی ہو گئے تھے اور سرور کی جان بھی خطرے میں تھی۔ اگر احمد شاہ بروقت حاضر دماغی کا ثبوت نہ دیتا تو شاید وہ لوگ سرور کو بھی ہلاک کر دیتے۔

''اچھا لیکے پتر! اب میں لندن پہنچ کر کال کروں گا۔''

''خدا حافظ!'' میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

راجا سے بات کر کے مجھے عجیب سی توانائی کا احساس ہو رہا تھا۔ میں یہاں پیش آنے والے واقعات ابھی اسے بتانا نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ وہاں پریشان ہونے کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتا تھا۔

اس دن پھر کوئی واقعہ پیش نہیں آیا سب کچھ حسب معمول تھا۔ رات بھی خیریت سے گزر گئی۔ میں نور کی کال کا انتظار کرتے کرتے سو گیا تھا۔ اس نے بھی مجھے کال نہیں کی تھی۔

دوپہر تک راجا کا فون آگیا۔ وہ بخیریت لندن پہنچ گیا تھا اور اس وقت نور کے ساتھ موجود تھا، مجھ سے چند رسمی باتیں کرنے کے بعد اس نے سیل فون نور کو دے دیا۔

''ہیلو جان!'' نور نے چہک کر کہا۔ ''تم نے فضول میں راجا کو پریشان کیا، یہاں کے معاملات میرے قابو میں ہیں۔''

''راجا تو خود ہی چلا گیا، مجھ سے زیادہ اسے تمہاری فکر ہے۔ میں تو فوری طور پر ست بدھائی چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ راجا نے میری پریشانی دیکھ کر ہی لندن جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ نور، یہ بتاؤ کہ اس وقت رابعہ کہاں ہے؟''

''تمہاری چہیتی...... بہن۔'' اس نے چہیتی کے بعد کچھ توقف دے کر بہن کہا، پھر ہنس کر بولی۔ ''وہ اس وقت استراحت فرما رہی ہیں۔''

''ارے، اتنی گاڑھی اردو مت بولو بھئی۔'' میں نے کہا۔

''کیوں، کیا تم مجھ سے بات کر کے ڈکشنری دیکھو گے؟''

چند منٹوں کی نوک جھونک کے بعد نور نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

راجا بھی خیریت سے پہنچ گیا تھا۔ نور بھی خیریت سے تھی، رابعہ بھی ابھی محل سے باہر نہیں نکلی تھی لیکن نہ جانے کیوں مجھے عجیب سی پریشانی تھی۔ جیسے کچھ ہونے والا ہو۔

شام کو میں کافی پی کر بیٹھا تھا کہ میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ نمبر میرے لیے نیا تھا۔ میں نے چند لمحے توقف کیا، پھر کال ریسیو کر لی۔ ''ہیلو!'' میں نے کہا۔ ''نواب رفیق اسپیکنگ!''

''نواب صاحب!'' دوسری طرف سے ایک بھاری آواز سنائی دی۔ ''میں دلاور بول رہا ہوں۔''

''کون دلاور؟'' میں نے انجان بن کر پوچھا۔

''تم مجھے نہیں جانتے۔ چلو میں خود ہی تعارف کرائے دیتا ہوں۔ میرا پورا نام دلاور خان ہے۔ میں اپنے علاقے سے صوبائی اسمبلی کا ممبر بھی رہ چکا ہوں اور اب ست بدھائی سے الیکشن لڑنے کی تیاری کر رہا ہوں۔''

''بہت خوشی ہوئی۔'' میں نے کہا۔ ''یہ خبر تم میرے بجائے اگر رانا زوہیب کو دو تو اسے زیادہ خوشی ہو گی کیونکہ وہ یہاں کی سیٹ کو اپنی موروثی سیٹ سمجھتا ہے۔ اب تک اس کا باپ الیکشن جیتتا آیا ہے۔ اب وہ الیکشن لڑ رہا ہے۔''

''میں نے زوہیب سے بات کر لی ہے۔ وہ میرے حق میں دستبردار ہو رہا ہے۔''

''وہ آپ کے حق میں دستبردار ہو رہا ہے، اپنی موروثی سیٹ سے دستبردار ہو رہا ہے؟''

''ہاں، کچھ ایسا ہی ہے۔'' دلاور نے کہا۔

''پھر آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟'' میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''میں نے سنا ہے کہ آپ بھی الیکشن لڑنے کی تیاری کر رہے ہیں؟''

''میں، کیا کر رہا ہوں اور کیا نہیں کر رہا ہوں، اس سے آپ کو کیا انٹرسٹ ہے۔''

''انٹرسٹ ہے اسی لیے تو پوچھ رہا ہوں۔''

''فرض کریں کہ میں بھی الیکشن لڑ رہا ہوں تو؟''

''تو پھر میں آپ سے بھی یہ درخواست کروں گا کہ آپ بھی میرے حق میں دستبردار ہو جائیں۔''

''ایسی باتیں فون پر نہیں ہوتی ہیں خان صاحب!'' میں نے کہا۔ ''آپ ایسا کیوں نہیں کرتے کہ کل ڈنر میرے ساتھ ہی کر لیں۔''

''ہمارے تو بڑے بڑے کام، کروڑوں کے سودے فون پر ہوتے ہیں نواب صاحب!'' دلاور نے سرد لہجے میں کہا۔ ''اس ڈنر وِنر کی فضولیات کو چھوڑیں۔''

''یہ کوئی سودا نہیں ہے خان صاحب!'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''آپ کو ملاقات تو کرنا ہی پڑے گی۔''

''وہ بھی ہو جائے گی لیکن ابھی نہیں۔''

''تو پھر جب آپ کا ملنے کا موڈ ہو، اس وقت یہ بات کیجیے گا۔'' میں نے بھی سرد لہجے میں کہا۔

''میں ابھی صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ الیکشن کو بھول جائیں۔'' دلاور کا لہجہ تحکمانہ تھا۔

''یہ آپ مجھے حکم دے رہے ہیں یا......''

''اسے آپ میرا حکم ہی سمجھیں۔'' دلاور نے درشت لہجے میں کہا۔

''تو پھر آپ بھی سن لیں، آپ کسی ایرے غیرے سے نہیں نواب رفیق شیرازی آف ریاست ست بدھائی سے مخاطب ہیں جو صرف حکم دیتا ہے، پہلے تو میرا ارادہ نہیں تھا لیکن اب میں اس الیکشن میں ضرور حصہ لوں گا۔''

''شوق سے حصہ لیں، پھر اس کے نتیجے کے ذمے دار بھی آپ ہوں گے۔''

''اپنی دھمکیاں بند کرو اور آئندہ مجھے فون کرنے کی کوشش مت کرنا، ناؤ گیٹ لاسٹ!''

''تو مجھے ابھی اچھی طرح جانتا نہیں ہے نواب!'' دلاور خان اچانک آپ سے تو پر آگیا۔

''شٹ اپ!'' میں چیخ کر بولا۔ ''میں تجھ جیسے اچکے سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتا۔'' یہ کہہ کر میں نے لائن کاٹ دی۔

غنی میری بلند آواز سن کر کمرے میں آگیا تھا۔ وہ حیرت سے بولا۔ ''کون تھا سر؟''

''دلاور خان!'' میں نے جواب دیا۔ ''کہہ رہا تھا کہ میں اس الیکشن سے دستبردار ہو جاؤں۔''

''سر، یہ دلاور کوئی فرضی کردار تو نہیں ہے۔'' غنی نے اپنی دانست میں ایک اہم نکتہ اٹھایا۔ ''ہو سکتا ہے یہ زوہیب کا کوئی آدمی ہو اور اس کی آڑ میں ہمیں نقصان پہنچانے کی کوشش کر رہا ہو؟''

''نہیں غنی! یہ کوئی فرضی آدمی نہیں ہے، راجا اسے اچھی طرح جانتا ہے۔ ہاں، یہ ممکن ہے کہ زوہیب نے اسے خرید لیا ہو، بہ قول راجا کے پیسے لے کر یہ ہر کام کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ اسلحے کے بین الاقوامی اسمگلر، منشیات فروش اور جرائم پیشہ افراد پیسے کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں۔''

''ہاں سر۔'' غنی چونک کر بولا۔ ''سردار خان اور ان دونوں قیدیوں کا کیا کرنا ہے؟''

''ان لوگوں کو ابھی وہیں رہنے دو۔ ہاں، اس قیدی کا علاج اچھی طرح کرانا جسے میں نے ہیٹنگ راڈ سے جلایا تھا۔ وہ دونوں دلاور کے تو نہیں لیکن شہباز خان کے خاص آدمی ہیں۔''

پھر مجھے اپنے ان گارڈز کا خیال آیا جو راجا کو بچانے کے لیے زخمی ہو گئے تھے۔ میں نے غنی سے پوچھا۔ ''سرور کے ساتھ جو گارڈز زخمی ہوئے تھے، ان کا کیا حال ہے؟''

''ان میں سے ایک تو شدید زخمی ہے، دوسرے کے پیر میں گولی لگی ہے۔ اس کی ہڈی کو معمولی سا نقصان پہنچا ہے لیکن دونوں کی حالت خطرے سے باہر ہے۔''

''چلو، میں بھی ان لوگوں کو ایک نظر دیکھ لوں۔'' یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔

اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اسکرین پر کوئی نیا نمبر تھا کیونکہ دلاور نے جس نمبر سے کال کی تھی، میں اسے اس کے نام سے محفوظ کر چکا تھا۔

میں نے سیل فون کان سے لگالیا۔ ''ہیلو، نواب رفیق اسپیکنگ!''

''نواب صاحب! میں آپ کا ایک خیر خواہ بول رہا ہوں۔''

''او بھائی، آپ کا کوئی نام بھی تو ہوگا۔'' میں نے جھنجلا کر کہا۔

''ابھی میں آپ کو اپنا نام نہیں بتا سکتا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ حویلی سے نکلنے کی کوشش مت کیجیے گا کیونکہ آپ شدید خطرے میں ہیں۔''

''یہ میرے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ میں جب سے ست بدھائی آیا ہوں، مسلسل خطرے میں ہوں، کوئی نئی بات کریں خیر خواہ صاحب!''

''آپ میری بات کو مذاق میں مت لیں نواب صاحب! بس آپ یا آپ سے متعلق کوئی بھی ایسا آدمی حویلی سے قدم باہر نہ نکالے، جو آپ کو عزیز ہو۔''

''او بھائی، حویلی کا ہر آدمی مجھے عزیز ہے، کیا میں ان سب کو حویلی میں بند کر دوں؟''

''نواب صاحب! میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔ آپ کے خلاف ایک زبردست جال بچھایا گیا ہے۔ یہ جال بچھانے والے کون ہیں؟ میں فی الحال ان کی نشان دہی بھی نہیں کر سکتا۔ خطرے سے آگاہ کرنا میرا کام تھا۔ ویسے آپ خود سمجھ دار ہیں۔ میں آپ سے زیادہ دیر بات بھی نہیں کر سکتا۔ خدا حافظ۔'' یہ کہہ کر اس نے لائن کاٹ دی۔

''یہ کون ہے جو مجھے پریشان کرنے کی کوشش کر رہا ہے؟'' میں زیر لب بڑبڑایا۔ ''پہلے شہباز خان پھر دلاور اور اب یہ خیر خواہ!''

ان پے در پے رونما ہونے والے واقعات سے میں چکرا کر رہ گیا تھا۔

اب میں بزدلوں کی طرح حویلی میں بند ھ کر تو نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ یہی سوچتا ہوا میں اس وارڈ کی طرف بڑھ گیا جہاں میرے دونوں زخمی گارڈز زیر علاج تھے۔

ان دونوں نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے سلام کیا اور مسکرانے لگے۔

''گڈ!'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''میرے گارڈز کو اتنا ہی بہادر ہونا چاہیے۔ اب کیسی طبیعت ہے آپ لوگوں کی؟''

''ہم ٹھیک ہیں سر!''

''تم لوگ بالکل پریشان مت ہونا۔ تمہارے علاج کا پورا خرچ میں برداشت کروں گا۔ انعام کے طور پر دو دو مہینے کی تنخواہ کا بونس بھی ملے گا۔ جب تک تم لوگ چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہو جاتے، تمہیں پہلے کی طرح تنخواہ ملتی رہے گی۔''

ان دونوں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں جلدی سے آگے بڑھ گیا۔

وہاں سے نکل کر میں نے حویلی کا ایک چکر لگایا۔ میں نے بہت باریک بینی سے حفاظتی اقدامات کا جائزہ لیا۔

اس موقعے پر غنی تو میرے ساتھ تھا ہی، صوبیدار میجر شریف صاحب بھی میرے ساتھ ان انتظامات کا جائزہ لینے لگے۔ ان کا کام صرف حفاظتی اقدامات کرنا اور غنی کی مدد کرنا تھا۔ میں اس سلسلے میں ان سے مشورہ بھی کرتا رہتا تھا۔

میں نے انہیں اپنے اس ''خیر خواہ'' کے فون کے بارے میں بتایا تو وہ کچھ پریشان ہو گئے۔ پھر کچھ سوچ کر بولے۔ ''رفیق میاں! ایسا کرو، تم لاہور یا اسلام آباد کی کسی بڑی سیکیورٹی ایجنسی کی خدمات بھی حاصل کر لو۔''

میں نے چونک کر انہیں دیکھا۔ ''کیوں؟ کیا ہمارے حفاظتی انتظامات ناکافی ہیں؟''

''ہمارے حفاظتی انتظامات بھرپور ہیں لیکن ان سیکیورٹی ایجنسیز کے پاس انتہائی جدید اسلحہ اور دوسرے آلات ہوتے ہیں۔''

وہ میرے مرحوم والد کے دوست بھی تھے۔ انہیں لالا بے شک غنی تھا لیکن بعد میں انہوں نے بتایا تھا کہ وہ میرے

مرحوم کے کلاس فیلو بھی رہ چکے ہیں۔ اسی لیے وہ مجھے میاں کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

''صوبیدار میجر صاحب!'' میں نے کہا۔ ''آپ تو خود لاہور کی ایک معروف سیکیورٹی ایجنسی میں رہ چکے ہیں۔ مجھے بتائیے کہ ہمارے پاس کن چیزوں کی کمی ہے۔ جو چیزیں کہیں گے، میں انہیں مہیا کر دوں گا۔ کیمرے، لائٹس، وائرلیس سیٹ، بھاری اسلحہ، ایل جی ایم وغیرہ میں یہاں مہیا کر سکتا ہوں۔ ان میں کوئی چیز یہاں نہیں ملی تو میں وہ لندن یا امریکا سے منگالوں گا۔ آپ افرادی ت بڑھانا چاہتے ہیں تو وہ بھی کر لیں۔ ست بدھائی میں اور مضبوط نوجوانوں کی کمی نہیں ہے۔ اتنا سب کچھ ہوتے نے میں کسی سیکیورٹی ایجنسی کو ہائر کروں؟ کیا زوہیب اور رے لوگ مجھ پر ہنسیں گے نہیں کہ نواب رفیق نے اپنی... لت کے لیے کسی سیکیورٹی کمپنی کی خدمات حاصل کی ہیں؟''

''اچھا، اگر ایسا ہے تو میں تمہیں شام تک ان چیزوں لسٹ پہنچا دوں گا، حفاظتی انتظامات کے لیے جن کا ہونا دری ہے، میں چاہتا ہوں کہ کم سے کم پچیس نوجوانوں کو ید ٹرینڈ کروں۔ مجھے حویلی کے چپے چپے پر ایک گارڈ یے۔''

''جیسا آپ مناسب سمجھیں، وہ کریں۔'' میں نے ہا۔

میں سمجھ گیا کہ وہ یہ سب کچھ غنی کے الفاظ بول رہے ھا۔ اس سے پہلے وہ بھی کہہ چکا تھا کہ ہمیں نہ صرف حویلی ن بلکہ حویلی سے باہر بھی مختلف مقامات پر کیمرے نصب رنا چاہئیں؟

''سر، میرا تو خیال ہے کہ آپ اپنے لیے باہر سے ایک لٹ پروف گاڑی منگوالیں۔'' غنی نے کہا۔

میں نے گھور کے اسے دیکھا تو صوبیدار میجر صاحب لے۔ ''غنی کا یہ مشورہ بہت مناسب ہے رفیق میاں! بلٹ پروف گاڑیاں تو آج کل عام ایم این اے اور ایم پی اے یے پھرتے ہیں۔ اس میں آخر حرج ہی کیا ہے؟''

''ٹھیک ہے، میں بلٹ پروف گاڑی منگوالوں گا۔'' ں نے کہا۔

مجھے وہ حملہ یاد آیا جو دینہ سے ست بدھائی کی طرف تے ہوئے مجھ پر ہوا تھا۔ اگر ہم لوگ عین وقت پر گاڑی سے چھلانگ نہ لگاتے تو وہیں چھلنی ہو کر رہ جاتے۔ بلٹ پروف کار کا مشورہ مجھے بھی مناسب لگ رہا تھا۔

حویلی کا چکر لگانے کے بعد جب میں اپنے کمرے میں آیا تو ریشم حسب معمول میرے لیے کافی لے کر آگئی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہے۔

''کیا بات ہے ریشم؟'' میں نے پوچھا۔ ''تم کچھ کہنا چاہتی ہو؟''

''صاحب جی! آپ نے اس نیلم کو حویلی میں کیوں رکھا ہوا ہے؟''

''نیلم!'' میں نے الجھ کر پوچھا۔ ''کون نیلم؟''

''سر، یہ اس لڑکی کی بات کر رہی ہے جسے مولا داد کے ساتھ ہم یہاں لائے تھے۔''

''اچھا اچھا، وہ نیلم!'' میں نے کہا۔ مجھے یاد آگیا کہ مولا داد کے کیس میں نیلم سلطانی گواہ بن گئی تھی۔ اس نے مولا داد کے کچھ اور ساتھیوں کی نشان دہی بھی کی تھی جو مختلف مقامات پر روپوش تھے۔ پھر اس نے عدالت میں یہ کہا تھا کہ میں دارالامان جانے کی بجائے ریاست ست بدھائی کی حویلی میں رہنا چاہتی ہوں۔ اس نے ایک طرح سے میری جان بچائی تھی۔ یہ بھی اس کا احسان تھا۔ اس لیے میں اسے اپنے ساتھ حویلی لے آیا تھا اور اسے غنی کے کوارٹر میں ٹھہرا دیا تھا۔

''اس نیلم سے تمہیں کیا شکایت ہے؟'' میں نے کہا۔

''وہ صاحب جی...... وہ...... اچھی لڑکی...... نہیں ہے...... غنی کو ایسے دیکھتی ہے جیسے......'' وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔

مجھے اچانک اس کی آنکھوں کی چمک یاد آگئی۔ وہ بہت کم سن تھی لیکن اس کی آنکھوں میں مجھے عجیب سی کشش نظر آتی تھی۔ وہ مجھے ان نظروں سے دیکھ رہی تھی کہ میں بھی شرمندہ ہو گیا تھا۔

''ارے، ریشم، وہ بے چاری تو بچی ہے، تمہیں اس سے بھی خطرہ پیدا ہو گیا؟''

''وہ بچی نہیں ہے جی، پوری ہے۔'' ریشم نے منہ بنا کر کہا۔ ''آج اس کی شادی کر دی جائے تو کل وہ خود بچوں والی ہو جائے گی۔ آپ اس کا بندوبست کہیں اور کر دیں۔''

''بھئی، تم اس سے کام لو، گھر کی صفائی کراؤ، کپڑے دھلواؤ اور اسے کافی بنانا سکھا دو تاکہ بار بار میرے لیے کافی بنانے سے تمہاری جان چھوٹے۔''

''صاحب جی! آپ بھی کیسی باتیں کر رہے ہیں، میں تو آپ کا ہر کام بہت شوق سے کرتی ہوں۔ میں اس سے آپ

کے لیے کافی کیوں بنواؤں گی؟ مجھے تو آپ کے لیے کافی بنا کر خوشی ہوتی ہے۔''

''تو پھر تم اسے حویلی کے دوسرے کاموں پر لگا دو۔''

''یہ ٹھیک ہے صاحب جی! کام کرے گی تو اس کے سارے کس بل نکل جائیں گے۔ ابھی تک تو میں نے اسے مہمانوں کی طرح رکھا ہوا تھا۔ اب میں واقعی اس سے کام لوں گی بلکہ اسے مائی زینب کے حوالے کر دوں گی۔ وہ خود ہی اس کو سیدھا کر دے گی۔''

مائی زینب ایک طرح سے حویلی کے کچن کی انچارج تھی۔ اسے پرانے زمانے میں ''داروغہ مطبخ'' کہا جاتا تھا۔ اسٹور کی چابیاں اسی کے پاس رہتی تھیں۔

''یہ ٹھیک رہے گا۔ وہ مائی کے ساتھ رہے گی تو کام کاج میں طاق ہو جائے گی بلکہ اسے مائی ہی کے کوارٹر میں بھیج دو، مائی تو ویسے بھی اکیلی ہی رہتی ہے۔''

ریشم نے فاتحانہ انداز میں غنی کی طرف دیکھا۔

اس کے جانے کے بعد غنی نے مجھ سے کہا۔ ''سر، ریشم کا مزاج بہت شکی ہے۔ نیلم تو ابھی بچی ہے۔ یہ اس کے ساتھ ساتھ مجھ پر بھی شک کرتی ہے سر!''

''ویسے قصور اس میں ریشم کا بھی نہیں ہے۔ میں نے بھی محسوس کیا تھا کہ نیلم کمسن ضرور ہے لیکن ذہنی طور پر بچی نہیں ہے۔''

اسی وقت میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے جھنجلا کر سیل فون اٹھایا اور سوچ لیا تھا کہ اگر کوئی نیا نمبر ہوا تو بات ہی نہیں کروں گا لیکن وہ کال نور کی تھی۔

میں نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ''نور اس وقت کال کیوں کر رہی ہے؟''

یہ سن کر غنی وہاں سے چلا گیا۔

میں نے سیل فون کا بٹن دبا کر کہا۔ ''ہیلو جان، کیسی ہو، تم نے بے وقت کال کیوں کی ہے؟ سب خیریت تو ہے؟''

''کیا میں تم سے بات کرنے کے لیے بھی وقت کی پابند ہوں؟'' نور نے کہا۔ ''میں تو چاہتی ہوں کہ ہر وقت تم سے بات کروں جان لیکن سات سمندر پار کی یہ دوریاں......''

''فکر مت کرو ڈارلنگ! ہم جلدی ملیں گے، پھر میں تم سے کہوں گا، چلو دل دار چلو، چاند کے پار چلو! تم کہو گی، ہم ہیں تیار چلو!''

''خواب تو بہت رومینٹک دیکھتے ہو۔'' نور نے ہنس کر کہا۔ ''میں نے اس وقت تمہیں یہ بتانے کے لیے کال کی تھی کہ رابعہ نیم پاگل ہو گئی ہے۔ وہ تنہائی میں چیخ چیخ کر تم سے باتیں کرتی ہے، کبھی ہنستی ہے، کبھی روتی ہے، خاص طور پر رات میں تو وہ اتنی بھیانک آواز میں روتی ہے کہ میرا دل ڈوبنے لگتا ہے۔''

''وہ اتنا بڑا مسئلہ ہے جان، اسے تم نے اپنے نزدیک کیوں رکھا ہوا ہے، اسے کسی ایسے کمرے میں رکھو کہ تم تک اس کی آواز ہی نہ پہنچے۔''

''تم اس بات کو مذاق سمجھ رہے ہو، وہ پاگل ہوتی جا رہی ہے اور اگر مزید اس کی یہی حالت رہی تو وہ پوری پاگل ہو جائے گی۔''

''تمہیں اس کی اتنی فکر کیوں ہے؟'' میں نے کہا۔ ''پاگل ہو جائے تو اسے کسی پاگل خانے میں بھجوا دینا۔''

''کیسی باتیں کر رہے ہو جان! تمہاری چچازاد ہے، وہ......''

''بس نور! اب یہ مت کہنا کہ وہ تمہارا خون ہے، خاندان کی آخری نشانی ہے وغیرہ وغیرہ۔ ویسے وہ اس وقت ہے کہاں؟''

''وہ ابھی تو اپنے کمرے میں گئی ہے۔'' نور نے کہا۔

''اور وہ راجا صاحب کہاں ہیں؟''

''راجا، ابھی کہیں باہر گئے ہیں۔''

''اچھا، باتوں کا سارا اسٹاک ابھی ختم کرو گی تو رات کو کیا باتیں کرو گی؟''

''میں خود بھی ابھی فون بند کرنے ہی والی تھی۔ سوشی نے کہا تھا کہ وہ کچھ ضروری کاغذات پر میرے دستخط لینے آ رہی ہے۔ اوکے بائے۔'' اس نے کہا اور حسبِ عادت ایک ہوائی بوسہ اچھال دیا۔

رات کے کھانے پر سب ہی موجود تھے۔ ڈاکٹر حسن، ٹینا، وحید۔ کھانا بہت خوش گوار انداز میں کھایا گیا۔

میں نے اپنے کمرے میں ٹیبل لیمپ آن کیا اور حسبِ عادت ایک میگزین اٹھا لیا۔ میں جب تک کچھ پڑھتا نہیں تھا، مجھے نیند نہیں آتی تھی۔

پڑھتے پڑھتے نہ جانے کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔

اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ باہر سے مجھے کسی نسوانی چیخ کی آواز سنائی دی تھی۔ میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ میں نے سرعت سے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈال کر اپنا ریوالور نکالا اور باہر کی طرف لپکا۔ چیخ دوسری دفعہ سنائی دی تو مجھے اندازہ ہو گیا کہ آواز کس طرف سے آ رہی ہے۔

میں دیوانہ وار اس کی طرف لپکا۔

اچانک پشت سے کسی نے مجھے دبوچنے کی کوشش کی۔ میں بجلی کی سی تیزی سے پلٹا اور حملہ آور کی گردن پکڑ لی۔

حملہ آور کے چہرے پر نقاب تھا، اس کے قد ...امت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ مضبوط ہاتھ پیروں کا دراز ...آدمی ہے۔ اس نے دائیں ہاتھ سے میرے چہرے پر ...ونا مارنے کی کوشش کی لیکن میں نے ایک طرف جھک کر ...کی یہ کوشش ناکام بنا دی، پھر نہ صرف میں نے اس کی بیل ...ی مضبوط گردن پر دباؤ بڑھایا بلکہ اچانک اس کی ناف ...ے نیچے گھٹنے سے زوردار وار کیا۔

حملہ آور کے حلق سے ''اوغ'' کی آواز نکلی اور وہ دہرا ...ہو گیا۔ اسے کمزور پڑتا دیکھ کر میں نے چاہا کہ اس کی کنپٹی ...زوردار وار کر کے اسے ناک آؤٹ کر دوں۔ بس یہی میری ...ی تھی۔ میں نے جیسے ہی اس کی گردن چھوڑی اس نے بجلی ...کی سرعت سے اپنی لات چلائی۔ اس کی مگدر نما لات ...رے سینے پر پڑی لیکن اس کے باوجود ضرب بھرپور نہیں ...کیونکہ میں پہلے ہی لاشعوری طور پر کچھ پیچھے ہٹ گیا تھا۔ ...بھی میں لڑکھڑا کر پیچھے کی طرف گرا لیکن فوراً ہی کھڑا ...گیا۔ حملہ آور نے اچانک کسی بیل کی طرح میرے سینے پر ...ماری اور ایک دم وہاں سے فرار ہو گیا۔ میں اس کے پیچھے ...ا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے بلند آواز میں کہا۔ ''غنی، ...ور! پکڑو اسے، یہ نکلنے نہ پائے۔''

یہ سب کچھ ایک منٹ سے بھی کم وقت میں ہوا تھا۔ حملہ ...ور چھلاوے کی طرح دوڑ رہا تھا، پھر وہ حویلی میں بائیں ...ب گھوم کر میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

میں دیوانہ وار اس طرف بھاگا لیکن اب وہاں کوئی ...یں تھا۔

مجھے اپنے پیچھے دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں ...ائی دیں۔ میں وہاں رک کر اس جگہ کا جائزہ لینے لگا کہ حملہ ...ور کہاں جا سکتا ہے؟ فوراً ہی غنی، سرور اور دو تین گارڈز ...ڑتے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔

غنی نے تشویش بھرے انداز میں پوچھا۔ ''کیا ہوا ...صاحب خیریت تو ہے؟''

''تم سب لوگ کہاں مرے رہتے ہو؟'' میں نے دہاڑ ...کر کہا۔ ''اب دشمنوں کی اتنی جرأت ہو گئی ہے کہ وہ حویلی کے ...در گھس کر مجھ پر حملہ کرنے لگے ہیں۔'' پھر اچانک مجھے اس ...نسوانی چیخ کا خیال آیا جسے سن کر میں باہر لپکا تھا۔

میں پھر برق رفتاری سے اپنے کمرے کی طرف آیا۔ ...غنی، سرور اور دوسرے گارڈز کچھ نہ سمجھنے کے باوجود میرے ...پیچھے دوڑنے لگے۔ اس وقت وہ سب پوری طرح مستعد تھے۔ ان کے ریوالورز ان کے ہاتھوں میں تھے۔

میں اندازے سے اس جگہ پہنچا جہاں سے چیخ کی آواز سنائی دی تھی۔

''فلش لائٹس آن کرو۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔ فوراً ہی حویلی کے اندرونی حصے میں تیز روشنی پھیل گئی۔ ان فلش لائٹس کی روشنی اتنی تیز تھی کہ میری آنکھیں بھی چندھیا کر رہ گئیں۔ میں آگے بڑھا تو مجھے لان میں ایک کیاری کے پاس کوئی عورت دکھائی دی۔ میں اسے پہلی ہی نظر میں پہچان گیا کہ وہ ٹینا ہے کیونکہ حویلی میں جینز صرف ٹینا پہنتی تھی اور اس عورت کے جسم پر بھی جینز تھی۔ ایک لمحے کو میرا دل اچھل کر گویا حلق میں آ گیا۔ کہیں اس حملہ آور نے ٹینا کو ہلاک تو نہیں کر دیا؟ اس کے لمبے بال چہرے پر بکھرے ہوئے تھے اور وہ آڑی ترچھی زمین پر پڑی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے سیدھا کیا تو یہ دیکھ کر میری جان میں جان آئی کہ وہ زندہ تھی اور گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔ اس کی ٹی شرٹ البتہ سامنے سے بری طرح پھٹی ہوئی تھی۔ غنی نے اپنا مفلر کھول کر اس کے جسم پر ڈال دیا۔

میں نے غنی سے کہا۔ ''اسے اٹھا کر اسپتال کی طرف لے چلو۔''

غنی نے فوراً اسے اٹھایا اور تیزی سے اندر کی طرف بڑھا۔

اس کی چیخ حویلی میں مقیم دوسرے افراد تک نہیں پہنچی تھی۔ یہ کوئی ایسی حیرت انگیز بات نہیں تھی، میں نے اپنے لیے حویلی میں جو اقامتی حصہ بنوایا تھا۔ وہ حویلی کے دوسرے حصوں سے خاصا الگ تھلگ تھا لیکن وہاں کوئی بھی گارڈز کیوں موجود نہیں تھا؟ میں نے سوچا پہلے ٹینا کی طرف سے اطمینان ہو جائے، پھر گارڈز سے باز پرس کروں گا۔

ڈیوٹی پر مجھے شہناز کی بجائے ایک نیا چہرہ نظر آیا۔

اس نے بہت ادب سے مجھے سلام کیا، پھر ٹینا کو دیکھ کر کچھ گھبرا سی گئی اور اسے فوراً ایمرجنسی روم میں لے گئی۔

وہاں موجود ایک نرس سے میں نے پوچھا۔ ''ڈاکٹر شہناز کہاں ہیں؟''

''وہ اپنے کمرے میں ہوں گی نواب صاحب!'' نرس کچھ بوکھلا سی گئی۔ ''آج ان کا آف تھا اور ڈاکٹر ٹینا نائٹ ڈیوٹی پر تھیں۔''

''ابھی جا کر شہناز کو بلا کر لاؤ۔'' میں نے سرد اور تحکمانہ لہجے میں کہا۔

وہ فوراً ہی باہر کی طرف دوڑ گئی۔

میں اسپتال کے ویٹنگ روم میں بیٹھ گیا۔غنی، سرور اور دوسرے گارڈز سر جھکائے کھڑے تھے۔

''غنی!'' میں نے اسے مخاطب کیا۔''تم اور سرور یہاں ٹھہرو، باقی لوگوں کو واپس بھیج دو۔''

نئی ڈاکٹر ایمرجنسی روم سے باہر نکلی تو خاصی مطمئن تھی۔ اس نے مجھ سے کہا۔''نواب صاحب! ڈاکٹر ثمینا بالکل خیریت سے ہیں، ان کے جسم پر زخم کا کوئی نشان نہیں ہے۔ بس ان کی کنپٹی کے پاس ہلکا سا ورم ہے شاید ان کی کنپٹی پر ہلکی سی چوٹ ماری گئی ہے مگر ان کی گردن اور سینے پر کچھ خراشیں ہیں۔ایسا لگتا ہے جیسے کسی نے ان کی شرٹ پھاڑنے کی کوشش کی ہے، چوٹ سے زیادہ ان پر دہشت کا اثر ہے، میں نے انہیں انجکشن دے دیا ہے۔وہ ابھی ہوش میں آجائیں گی۔''

میں نے بغور اس نئی ڈاکٹر کا جائزہ لیا۔وہ خاصی خوب صورت اور پرکشش لڑکی تھی، اس کی آواز بھی بہت خوب صورت تھی اور بات کرنے کا انداز بھی بہت اچھا تھا۔

میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔''ڈاکٹر شہناز آئیں تو انہیں میرے کمرے میں بھیج دیں۔'' یہ کہہ کر میں اسپتال سے باہر نکل آیا۔

غنی اور سرور سائے کی طرح میرے ساتھ تھے۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے غنی سے پوچھا۔''آج میرے پورشن کی طرف ڈیوٹی پر کون تھا؟''

''سر!'' غنی نے تھوک نگل کر کہا۔''آج اس طرف ڈیوٹی پر کوئی نہیں تھا۔ میں نے تمام گارڈز کی ڈیوٹی حویلی کے ان حصوں کی طرف لگا دی تھی جہاں سے کسی حملے کا خطرہ ہے۔''

''حویلی میں ایسے حصے موجود ہی کیوں ہیں؟'' میں نے دہاڑ کر کہا۔''کیا ان حصوں کو مستقل طور پر بند نہیں کیا جاسکتا؟''

''بند ہوسکتے ہیں سر!''غنی کے بجائے سرور نے جواب دیا۔''لیکن اب تک کسی دشمن کی جرأت نہیں ہوئی تھی کہ وہ حویلی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے۔ آج صوبیدار میجر صاحب نے خصوصی حفاظتی اقدامات کی ہدایات کی تھیں اس لیے......''

''اور تم لوگوں کے وہ انتظامات دھرے کے دھرے رہ گئے۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔''حویلی تو رہی ایک طرف حملہ آور نے تو براہ راست مجھ پر حملہ کردیا۔''

''سر، وہ جو کوئی بھی ہے، حویلی سے باہر نہیں نکل سکتا۔''غنی نے کہا۔''سرور نے اسی وقت حویلی کی چار دیواری کے اوپر لگے ہوئے خاردار تاروں میں الیکٹرک کرنٹ چھوڑ دیا ہے۔''

''لیکن سوال تو یہ ہے کہ وہ آیا کہاں سے؟'' میں نے دہاڑتے ہوئے کہا۔''کیا حویلی کی حفاظت کرنے والے تمام گارڈز نے بھنگ پی رکھی تھی۔ایک شخص حویلی میں داخل ہوا ہے، وہ پہلے ڈاکٹر ثمینا پر حملہ کرتا ہے، پھر مجھ پر حملہ کرتا ہے۔ میں اگر ذرا بھی سستی سے کام لیتا تو وہ میرا کام تمام کردیتا۔کیا فائدہ ہے ان گارڈز اور کمانڈوز کا؟ اگر مجھے خود ہی اپنی حفاظت کرنا ہے تو پھر ان سب کی چھٹی کردو۔ مجھے کسی گارڈ کی ضرورت نہیں ہے۔''

صوبیدار میجر صاحب اور شہناز ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔شہناز کی آنکھوں میں اب بھی نیند کا خمار تھا اور وہ سرخ ہورہی تھیں۔

''یہ سب کیسے ہوا رفیق؟'' اس نے تشویش ناک انداز میں پوچھا۔

شاید اسے نرس نے پہلے ہی اس حملے کی تفصیل سے آگاہ کردیا تھا۔

''یہی تو میں ان لوگوں سے پوچھ رہا ہوں کہ باہر سے ایک حملہ آور نہ صرف حویلی میں داخل ہوا بلکہ وہ میرے اقامتی حصے تک پہنچ گیا۔حویلی کی چار دیواری سے میرا حصہ کم سے کم ایک فرلانگ کے فاصلے پر تو ہوگا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اسے راستے میں بھی کسی نے نہیں روکا۔ حالانکہ وہاں گارڈز گشت پر رہتے ہیں۔''

''تم تو خیریت سے ہو؟'' شہناز نے پریشان ہوکر پوچھا۔

''ہاں، ابھی میری زندگی باقی ہے اس لیے حملہ آور مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکا۔''

شہناز نے مجھے غور سے دیکھا اور اچانک بولی۔''لیکن تم تو زخمی ہو۔تمہارے سینے سے خون بہا ہے جو اوپر شرٹ تک چھلک آیا ہے۔ چلو اپنی شرٹ اتارو۔''

میں نے شرٹ اتاردی۔ حملہ آور کی لات سے میرے سینے پر خاصی گہری خراش آئی تھی، جس میں سے خون رس رہا تھا۔

ڈاکٹر شہناز نے سرور سے کہا۔''فرسٹ ایڈ بکس منگواؤ، جلدی کرو۔''

یہ سنتے ہی سرور تیزی سے باہر نکل گیا۔

خراش زیادہ گہری نہیں تھی۔اس پر تو میں ڈیٹول ہی لگا لیتا بہت تھا لیکن شہناز سے بحث کرنا بے کار تھا۔اس نے باقاعدہ خراشوں کی صفائی کی، پھر اس پر ڈیٹول کے بجائے کوئی دوسرا اینٹی سیپٹک لوشن لگایا اور اس پر کوئی پاؤڈر چھڑک دیا۔

''مجھے گولی نہیں لگی ہے بلکہ یہ کسی کے ناخنوں کی خراشیں ہیں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''خاموش رہو۔'' شہناز نے مجھ سے کہا، پھر اپنے کام سے فارغ ہوکر بولی۔''اب شرٹ پہن لو۔''

''ہاں، یہ نئی ڈاکٹر کون ہے؟'' میں نے پوچھا''اور یہ تم نے کب اپائنٹ کیا ہے؟''

''یہ میری کزن ہے شہلا۔'' شہناز نے کہا۔''اس نے ابھی حال ہی میں ایف جے میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کیا ہے، پھر میو اسپتال سے ہاؤس جاب مکمل کیا تو میں اسے یہاں لے آئی، یہ گائنی اور پیڈز میں اسپیشلائز کرنا چاہتی ہے۔''

''تم نے تو اس کا پورا حسب نسب بتانا شروع کر دیا ہے۔'' میں نے کہا۔''میں صرف اتنا جاننا ہوں کہ تمہاری کزن ہے اور تم اسے حویلی میں لائی ہو تو قابل اعتبار ہوگی۔''

''جتنا اعتبار تم مجھ پر اور راجا پر کرتے ہو، شہلا پر بھی کرسکتے ہو۔ ویسے شہلا خاصی ایڈونچر پسند لڑکی ہے۔ کالج کے زمانے میں ایتھلیٹ رہ چکی ہے۔ ہنڈریڈ میٹر ریس اور دو ہنڈریڈ میٹر ریس کی چیمپئن ہے۔ اس کے علاوہ سوئمنگ میں بھی کئی تمغے جیت چکی ہے۔''

''ویری گڈ!'' میں نے کہا۔''یہ تو میڈیکل سے زیادہ کسی ایجنسی کے لیے موزوں ہے، بس ذرا سی ٹریننگ کی ضرورت ہے یعنی، ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی!''

ایک نرس نے آکر بتایا کہ ڈاکٹر ثمینا کو ہوش آگیا ہے۔

''ڈاکٹر شہلا سے کہو کہ وہ انہیں یہاں بھیج دے۔''

نرس سر جھکا کر چلی گئی۔

تھوڑی دیر بعد ثمینا کے بجائے ڈاکٹر شہلا وہاں آگئی۔ مجھے ایسا لگا جیسے اس کے حسن کی وجہ سے کمرے کی روشنی میں اضافہ ہوگیا ہو۔

''نواب صاحب! ڈاکٹر ثمینا چینج کرنے اپنے کمرے میں گئی ہیں، ویسے وہ اب بالکل ٹھیک ہیں۔''

''آپ کھڑی کیوں ہیں مس شہلا؟'' میں نے کہا۔ ''تشریف رکھیں۔''

وہ ہچکچاتے ہوئے بیٹھ گئی۔ میں نے پوچھا۔''کیا ہوا تھا ثمینا کو؟''

''میں نے ان سے کچھ نہیں پوچھا۔'' شہلا نے جواب دیا۔ وہ عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک خاص چمک تھی، میرے لیے توصیف تھی، یہ نظریں میرے لیے نئی نہیں تھیں۔ ایسا تاثر میں اس سے پہلے بہت سی لڑکیوں کی آنکھوں میں دیکھ چکا تھا۔ میں نے دانستہ اس سے نظریں چرالیں۔

ثمینا کمرے میں داخل ہوئی۔اس کے چہرے پر اب بھی نقاہت کے تاثرات تھے لیکن وہ جبراً مسکرا کر بولی۔ ''میری وجہ سے آپ لوگوں کو بہت پریشانی ہوئی اس کے لیے......''

''ہماری پریشانی کو چھوڑو ثمینا!'' میں نے کہا۔''تم بتاؤ، تمہارے ساتھ کیا ہوا تھا؟''

''میں اپنے ڈیوٹی روم میں تھی۔'' ثمینا نے کہا۔''مجھے نیند آنے لگی تو میں نے تھرمس سے کافی نکال کر ایک کپ پیا۔ ڈاکٹر شہلا اس وقت کسی مریضہ کو دیکھنے وارڈ میں گئی ہوئی تھیں۔ کافی پینے کے باوجود جب نیند کا غلبہ طاری ہونے لگا تو میں نے سوچا کہ کچھ دیر کھلی فضا میں سانس لے لوں۔ ممکن

ہے سردی کی وجہ سے نیند بھاگ جائے۔ میں یہی سوچ کر باہر نکلی، میرا ارادہ تھا کہ کچھ دیر وحید سے باتیں کروں گی تو فریش ہو جاؤں گی لیکن وہ تو بہت گہری نیند سو رہا تھا۔ میں ٹہلتے ہوئے اس طرف آنکلی۔ آپ دیر تک جاگنے کے عادی ہیں، آپ کے کمرے کی لائٹ بھی آن تھی۔ میں اس خیال سے آپ کے کمرے کی طرف بڑھی کہ کچھ دیر آپ ہی سے باتیں کرلوں گی۔ میں برآمدے سے نکل کر لان میں آئی تھی کہ اچانک کسی نے مجھے دبوچ لیا۔ میں نے چیخنے کی کوشش کی لیکن اس نے ایک ہاتھ سختی سے میرے منہ پر جما دیا۔ میں نے گھبرا کر پوری قوت سے اسے پیچھے دھکیلا۔ اس کوشش میں اس کا ہاتھ میرے منہ سے ہٹ گیا اور میری چیخ نکل گئی۔ اس نے دوبارہ مجھے پکڑنے کی کوشش کی تو میری ٹی شرٹ اس کے ہاتھ میں آکر پھٹ گئی۔ اسی لمحے پھر میرے حلق سے ایک اور چیخ نکلی، پھر مجھے ایسا لگا جیسے میری کنپٹی پر ہتھوڑا پڑا ہو۔ اس کے بعد مجھے اتنا یاد ہے کہ میں تیورا کر زمین پر گری تھی اور کسی کو بھاگتے دیکھا تھا، پھر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔ دوبارہ مجھے اسپتال کے کمرے میں ہوش آیا۔''

''تم نے حملہ آور کا چہرہ دیکھا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''اس نے چہرے کو نقاب میں چھپا رکھا تھا ورنہ وہاں اتنی روشنی تو تھی ہی کہ میں اس کا چہرہ دیکھ سکتی۔''

مجھے بھی یاد آگیا کہ حملہ آور نقاب پوش تھا۔

''تم وحید کے کمرے سے باہر لان تک آئیں اور تمہیں کوئی گارڈ نہیں ملا؟''

''نہیں، کسی گارڈ سے میرا سامنا نہیں ہوا۔'' ٹینا نے کہا۔

''تم جا کر اپنے کمرے میں آرام کرو ٹینا!'' شہناز نے کہا۔ ''میں دیکھ لوں گی۔''

''لیکن ڈاکٹر شہناز! آپ نے تو کل بھی نائٹ کی تھی اور آج کا سارا دن اسپتال ہی میں گزارا ہے۔''

''میں نے اپنی نیند پوری کر لی ہے، میری فکر مت کرو، پھر میرے ساتھ شہلا بھی ہے، تم جا کر آرام کرو، صبح بات کریں گے۔''

ٹینا اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

میں نے محسوس کیا کہ اس دوران میں شہلا مجھے دیکھتی رہی تھی۔ جب بھی میں نے اس کی طرف دیکھا، اس نے جلدی سے نظریں چرالیں۔

''ہمارے گارڈز کیا بھنگ پی کر بیٹھے تھے؟'' شہناز نے کہا۔

''میں صبح ان سب کو دیکھ لوں گا۔ اتنے محافظوں کے ہوتے ہوئے حملہ آور میرے کمرے تک پہنچا کیسے؟'' پھر میں نے شہناز سے کہا۔ ''اب تم بھی تھوڑی دیر ڈیوٹی روم میں آرام کرلو۔ ڈاکٹر شہلا موجود ہیں۔ یہ کسی بھی ایمرجنسی کی صورت میں تمہیں اٹھا دیں گی۔''

شہناز اٹھتے ہوئے بولی۔ ''ویسے اب صبح ہونے میں دیر ہی کتنی ہے؟''

واقعی صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں تھی۔ ان دونوں کے جانے کے بعد میں نے لیٹنے کے بجائے حسب معمول ایکسرسائز کی، پھر ٹریک سوٹ اور جوگر پہن کر جوگنگ کے لیے نکل گیا۔ اس دوران بھی میں یہی سوچتا رہا کہ حملہ آور آیا تو کہاں سے آیا؟ کیا غنی، سرور اور صوبیدار میجر صاحب اتنے بے پروا ہیں کہ انہوں نے حویلی کے اس حصے کو نظر انداز کر دیا ہو جہاں سے کوئی اندر آسکتا ہے۔

میں نے حسب معمول ایک گھنٹے تک جوگنگ کی، پھر میں لان میں رکھی ہوئی بید کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اسی وقت ایک ملازم تولیا اور فریش جوس کا جگ لے کر وہاں پہنچ گیا اور میرے سامنے رکھی ہوئی بید کی میز پر رکھ دیا۔

میں تولیا سے اپنا پسینا خشک کر رہا تھا کہ مجھے صوبیدار میجر صاحب نظر آئے۔ وہ بھی صبح صبح چہل قدمی کے عادی تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ میری طرف آگئے۔ میں نے مسکرا کر کہا۔ ''آیئے صوبیدار میجر صاحب! ان لوگوں نے حملہ آور کو تلاش کیا؟''

''نہیں، ایسا لگتا ہے جیسے اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ میرے آدمیوں نے حویلی کا چپا چپا چھان ڈالا لیکن حملہ آور کا کوئی سراغ نہیں ملا؟'' پھر وہ کچھ سوچتے ہوئے بولے۔ ''رفیق میاں! یہ حویلی سو سال پرانی تو ہوگی، پرانے وقتوں میں نواب اور راجا حویلیوں اور محلوں میں ایسے چور راستے بھی بناتے تھے جن کا علم صرف چند مخصوص لوگوں کو ہوتا تھا۔ ممکن ہے، ایسا ہی کوئی خفیہ راستہ اس حویلی میں بھی موجود ہو اور ہمیں اس کا علم ہی نہ ہو۔''

میں ان کی بات سن کر چونک اٹھا۔ ان کی بات میں وزن تھا، کسی خفیہ راستے کے امکانات کو رد نہیں کیا جاسکتا تھا لیکن اس وسیع و عریض حویلی میں کسی خفیہ راستے کا سراغ لگانا بھی تو جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔

میں نے انہیں جوس کی آفر کی لیکن انہوں نے معذرت کرلی۔ اچانک میرے ذہن میں ایک خیال اور آیا۔ میں نے کہا۔ ''صوبیدار میجر صاحب! یہ بھی تو ممکن ہے کہ حملہ

یہیں کا کوئی آدمی ہو اور اب وہ بھی دوسرے گارڈز کے ساتھ مل کر حملہ آور کو تلاش کر رہا ہو؟''

''ایک امکان یہ بھی ہے۔'' صوبیدار میجر صاحب نے کہا۔

''میں ابھی خود حویلی کے اس حصے کا جائزہ لوں گا جہاں حملہ آور غائب ہوا تھا۔'' میں نے کہا اور وہاں سے اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

ناشتے کی میز پر سبھی موجود تھے۔ ان میں ڈاکٹر شہلا کا اضافہ ہو گیا تھا۔ حویلی میں رہنے والے ہر شخص کو میرے ساتھ کھانے کی میز پر بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی۔ راجا نے ان چند مخصوص لوگوں کا انتخاب کیا تھا۔ اگرچہ مجھے یہ پسند نہیں تھا لیکن راجا کا کہنا تھا کہ ست بدھائی کے نواب اور عام لوگوں میں فرق تو ہونا چاہیے۔ وحید ناشتے میں ہمارے ساتھ شریک نہیں تھا۔ وہ عموماً دیر سے سو کر اٹھتا تھا۔ آج کل یوں بھی وہ حویلی تک محدود ہو کر رہ گیا تھا۔ ٹینا کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ اس سے گھنٹوں بیٹھ کر باتیں کرے۔

ناشتے کے دوران میں بھی رات کے واقعے پر تبصرہ ہوتا رہا۔ ہر شخص کو یہ فکر لاحق تھی کہ حملہ آور کہاں سے آیا اور کہاں چلا گیا۔ میں نے طے کرلیا تھا کہ میں آج حویلی کے اس حصے کا تفصیلی جائزہ لوں گا جہاں حملہ آور غائب ہوا تھا۔ ناشتے کی میز پر بھی میں نے محسوس کیا کہ شہلا بار بار مجھے دیکھ رہی ہے، میں جوں ہی اس کی طرف دیکھتا، وہ نظریں چرا لیتی۔ میری نظریں بھی بے اختیار اس کے پرکشش چہرے پر اٹھ جاتی تھیں اس لیے میں چائے کا کپ لے کر اٹھ گیا۔ کمرے میں آکر میں نے کپڑے بدلے جب باہر نکلنے لگا تو مجھے اپنے ریوالور کا خیال آگیا۔ میں اب ہر وقت مسلح رہنا چاہتا تھا۔ میں نے کوٹ اتار کر بغلی ہولسٹر لگایا اور ریوالور رکھ کر دوبارہ باہر نکلا۔ میرا رخ گارڈ روم کی طرف تھا۔

صوبیدار میجر شریف صاحب نے مرکزی دروازے کے بالکل قریب آرمی کی طرز پر گارڈ روم بنایا تھا۔ وہاں چار گارڈ ہر وقت موجود رہتے تھے۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے فوجی انداز میں سلام کیا۔ میں ان کے سلام کا جواب دیتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ گارڈز کے سیلوٹ کی زوردار آواز سن کر غنی اور سرور کمروں سے نکل آئے۔ آج وہ دونوں بھی ریاست کی وردی میں تھے۔

''غنی!'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''تم نے کچھ معلوم کیا، وہ حملہ آور کہاں گیا؟''

''سر! میں...... یہی معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں؟'' غنی نے آہستہ سے کہا۔

''کوشش کر رہا ہوں؟'' میں نے دہاڑ کر کہا۔ ''تم کوشش ہی کرتے رہ جاؤ گے اور کوئی سوتے میں میرا کام تمام کر کے چلا جائے گا۔''

''سر! میں......''

''میری بات ابھی پوری نہیں ہوئی۔'' میں نے اسے بری طرح جھڑک دیا۔ ''تم اس حویلی کے سیکیورٹی انچارج ہو۔ حملہ آور کا سراغ اگر نہیں بھی مل رہا تو یہ تو معلوم کر ہی لیا ہوگا کہ وہ آیا کہاں سے تھا؟''

''سر! یہی تو معلوم نہیں ہو پا رہا ہے کہ......''

''تم کیسے سیکیورٹی انچارج ہو غنی؟'' میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔ ''میرا خیال ہے کہ تم اس عہدے کے اہل نہیں ہو، مجھے اس کے لیے کسی اور کا بندوبست کرنا پڑے گا۔'' پھر میں سرور سے مخاطب ہوا۔ ''غنی کے بعد تم سب گارڈز میں سینئر ہو، میرے خیال میں تم دونوں ہی اس کے اہل نہیں ہو۔''

''سر!'' سرور نے کہا۔ ''ہمیں ایک موقع اور دیں۔ ہم......''

''ہاں، تاکہ میرے دشمن آئیں اور میرا گلا کاٹ کر چلے جائیں۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تم دونوں نے حویلی کے اس حصے کا جائزہ لیا جہاں وہ پراسرار حملہ آور غائب ہوا تھا؟''

''جی سر! میں وہاں کا ایک ایک کونہ تلاش کر چکا ہوں۔'' غنی نے کہا۔

میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے اسکرین پر نظر ڈالی، کوئی اجنبی نمبر تھا۔ میں نے رابطہ منقطع کر کے سیل فون دوبارہ جیب میں ڈال لیا۔ گھنٹی دوبارہ بجی، اس مرتبہ بھی وہی نمبر تھا۔ میں نے جھنجلا کر فون ریسیو کرلیا۔ ''ہیلو!'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

''کیا حال ہیں نواب صاحب!'' دوسری طرف سے اس شخص کی آواز آئی جس نے دلاور کی حیثیت سے اپنا تعارف کرایا تھا۔ نہ جانے وہ دلاور تھا بھی یا نہیں۔

''کون بول رہا ہے؟'' میں جان بوجھ کر انجان بن گیا۔

''واہ نواب صاحب!'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''ایک ہی حملے میں یادداشت جواب دے گئی؟'' اس کا لہجہ تضحیک آمیز تھا۔ ''میرا مقصد آپ کو ہلاک کرنا نہیں تھا ورنہ میرے آدمی کے لیے یہ کیا مشکل تھا، اس ڈاکٹر کو اس نے اس لیے

چھیڑا تھا کہ اس کی آواز پر آپ باہر نکلیں اور وہ آپ پر حملہ کرے۔ اگر آپ کو مارنا ہی مقصود ہوتا تو وہ خاموشی سے آپ کے کمرے میں داخل ہوتا اور سائلنسر لگے ہوئے ریوالور کی صرف ایک گولی آپ کی کھوپڑی میں اتار دیتا، پھر جیسے وہ اندر آیا تھا اسی طرح نکل جاتا۔''

''مگر تمہارا مقصد کیا تھا؟'' میں نے تلخ لہجے میں پوچھا۔

''صرف آپ کو یہ جتانا کہ میں جب چاہوں اور جہاں چاہوں آپ کو ختم کرسکتا ہوں۔''

''یہ جتا کر تم کہنا کیا چاہ رہے ہو؟'' میں نے خود پر ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ الیکشن کے موقعے پر میرے حق میں دست بردار ہو جائیں۔''

''اب ایک بات میری بھی سن لو!'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔''میرا ارادہ تو بالکل نہیں تھا کہ میں الیکشن لڑوں لیکن اب میں الیکشن میں ضرور حصہ لوں گا۔''

''لگتا ہے، آپ کو اپنی زندگی بالکل عزیز نہیں ہے؟''

''تم صحیح سمجھے۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔''مجھے واقعی ایسی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے جس میں ڈر ڈر کے جینا پڑے۔ تم نے سنا نہیں ہے وہ مشہور مکالمہ، جو ڈر گیا، سمجھو مر گیا۔''

''یہ آپ کا آخری فیصلہ ہے؟'' دلاور نے بھی سرد لہجے میں پوچھا۔

''ہاں، یہ میرا آخری فیصلہ ہے، کہو تو اسٹامپ پیپر پر لکھ کر تمہیں بھجوا دوں۔ ایک بات اور سن لو، رانا سے کہنا کہ یہ ڈرامے بند کرے اور ہمت ہے تو سامنے آکر بات کرے۔''

''رانا صاحب تو مجھ سے بات کر چکے ہیں، آپ اس بے چارے کو کیوں الزام دے رہے ہیں؟'' اس نے گویا چڑانے والے انداز میں کہا۔

''تو پھر تم بے چارے ہی سامنے آکر بات کرو، ویسے اب تمہارا کوئی آدمی یہاں آیا تو زندہ نہیں جائے گا۔'' یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

غنی اور سرور دونوں میری یک طرفہ گفتگو سمجھ کر مزید پریشان نظر آرہے تھے لیکن ان میں مجھ سے کچھ پوچھنے کی جرأت نہیں ہو رہی تھی۔

میں حویلی کے اس حصے کی طرف بڑھ گیا جہاں وہ آدمی غائب ہوا تھا۔ حویلی کے اس حصے میں کسی زمانے میں اصطبل رہا ہوگا۔ اب وہاں حویلی کے کچھ ملازمین کے کوارٹرز تھے۔

بقیہ حصہ غیر آباد تھا۔ وہاں چھوٹے چھوٹے کئی کمرے تھے۔ ان کے سامنے کسی زمانے میں لکڑی کے جالی دار دروازے ہوں گے جو امتدادِ زمانہ سے ٹوٹ پھوٹ کر جھڑ گئے تھے۔ کچھ کمروں پر ایک آدھ بوسیدہ سا لکڑی کا دیمک زدہ دروازہ اب بھی جھول رہا تھا۔ یہ حویلی کا دور افتادہ حصہ تھا اور چاروں طرف سے محفوظ بھی تھا اس لیے محافظوں نے بھی اس پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ میں نے بہت باریک بینی سے اس جگہ کا جائزہ لیا۔ میری کوشش تھی کہ اگر کوئی اس طرف آیا ہے تو اس دھول بھرے ٹوٹے پھوٹے اینٹوں کے فرش پر اس کے پیروں کے نشانات ضرور ہوں گے لیکن غنی اور سرور کی بے پروائی سے وہ نشانات بھی ضائع ہو گئے تھے کیونکہ وہاں ایک آدمی کے نہیں بلکہ کئی آدمیوں کے قدموں کے نشانات تھے۔

''تم لوگوں نے بے پروائی سے ایک اہم سراغ ضائع کر دیا۔'' میں نے کہا۔''تمہیں یہاں آکر دیکھنا چاہیے تھا کہ یہاں کسی کے قدموں کے نشانات ہیں یا نہیں اور اگر ہیں تو وہ کس طرف گئے ہیں؟'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

''ہمیں تو اس بات کا گمان بھی نہیں تھا کہ حملہ آور ان کمروں میں چھپا بیٹھا ہوگا۔'' غنی نے کہا پھر وہ چونک کر بولا۔ ''سر! بابا دینا کھرا اٹھانے میں ماہر ہے۔ اس کی عمر خاصی ہے لیکن نظر اب بھی بہت تیز ہے۔ وہ بتا سکتا ہے کہ یہاں کتنے آدمیوں کے قدموں کے نشانات ہیں، اس کمرے میں میرے اور سرور کے علاوہ اور کوئی نہیں آیا ہے۔ اگر کوئی تیسرا یہاں آیا ہوگا تو بابا دینا اس کے نشانات سے شناخت کرلے گا۔ آپ حکم دیں تو میں بابا دینا کو بلا لاؤں۔ علاقے کے پولیس والے بھی اس سے مدد لیا کرتے ہیں۔''

میں نے چند لمحے سوچا۔ سنا تو میں نے بھی تھا کہ پرانے وقتوں میں ایسے کھوجی ہوتے تھے جو دس آدمیوں کے نشانات کے درمیان بھی کسی ایک آدمی کے قدموں کے نشانات پہچان لیا کرتے تھے۔ انسان تو انسان وہ تو جینسوں اور گھوڑوں تک کا کھرا اٹھا لیتے تھے۔ میں نے ایسے لوگوں کے بارے میں اور بھی بہت کچھ سنا تھا کہ وہ لوگ محض قدموں کے نشانات سے جنس تک بتا دیا کرتے تھے۔ میں نے غنی سے کہا۔''تم خاموشی سے بابا دینا کو لے کر آجاؤ، کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ اسے میں نے بلایا ہے۔''

''ٹھیک ہے سر!'' غنی نے کہا اور تیزی سے باہر کی طرف بڑھ گیا۔

میں نہیں چاہتا تھا کہ دلاور کو یہ معلوم ہو کہ میں اس کے آدمی کی وجہ سے اتنا پریشان ہوں۔

میں اس حصے سے باہر آگیا اور سگریٹ پھونکنے لگا۔ ...ر میرے ساتھ ہی کھڑا تھا۔

میں نے اس سے پوچھا۔''تمہیں کچھ اندازہ ہے سرور ...حملہ آور کہاں سے آیا ہوگا۔ حویلی کا کون سا حصہ ایسا غیر ...فوظ ہے جہاں سے کوئی آدمی باہر سے اندر داخل ہوسکے؟''

''سر، میں نے حویلی کی چار دیواری کے ایک ایک ...ے کا جائزہ لیا ہے، وہاں سے کسی انسان کے داخلے کا کوئی ...نہیں ہے۔ آپ نے خود ہی تو حویلی کی چار دیواری ...بارہ تعمیر کرائی ہے۔ دیوار اتنی بلند اور مضبوط ہے کہ اسے ...ولی پرندہ تو پار کرسکتا ہے لیکن انسان نہیں، پھر اس کے اوپر ...لے ہوئے خاردار تاروں میں فوراً ہی میں نے کرنٹ چھوڑ دیا ...۔ اگر کوئی حویلی میں آیا بھی ہوتا تو اس کی واپسی ناممکن ہے ...راہ فوری طور پر تو ادھر گیا بھی نہیں۔ دوسری طرف گارڈز ...ی تھے۔ وہ کہیں چھپ کر بیٹھا ہوگا کیونکہ فوراً ہی باہر نکلنے ...کے تمام راستے مسدود کر دیے گئے تھے۔''

میرا ذہن چکرا کر رہ گیا تھا۔ جب تک بابا دینا... آیا ...سگریٹ کا پورا پیکٹ پھونک چکا تھا، حالانکہ میں اتنی زیادہ ...گریٹ پیتا نہیں تھا۔

بابا دینا کی عمر اسی سال کے لگ بھگ ہوگی لیکن وہ اس ...عمر میں بھی خاصا چاق و چوبند تھا۔ سب سے زیادہ حیرت انگیز ...بات یہ تھی کہ اس کی نظریں اب بھی اتنی ہی تیز تھیں۔ اس نے ...بہت مودب انداز میں مجھے سلام کیا اور آہستہ سے بولا۔ ...''نواب صاحب! پہلے مجھے وہ جگہ دکھائیں جہاں سے حملہ آور ...بھاگا تھا۔ میں وہاں سے کھرا اٹھانے کی کوشش کروں گا۔''

میں اسے حویلی کے اس حصے میں لے آیا جہاں حملہ آور ...نے دینا پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی تھی، وہ جگہ بھی کچی تھی، جس ...کے ساتھ کیاریاں تھیں۔ بابا دینا نے غور سے اس جگہ کا جائزہ ...لیا اور بولا۔''نواب صاحب! مجھے یہاں ایک عورت اور تین ...مردوں کے پیروں کے نشانات دکھائی دے رہے ہیں۔ ...عورت کے پیروں کے نشانات صرف یہیں تک ہیں۔ مردوں ...کے قدموں کے نشانات مختلف سمتوں میں گئے ہیں۔'' اس ...نے جھک کر غور سے دیکھا۔''عورت کے بالکل نزدیک ایک ...مرد کے قدموں کے نشانات ہیں۔ یہاں شاید اس کی کسی کے ...ساتھ ہاتھا پائی ہوئی ہے، کیونکہ نشانات بے ترتیب ہیں۔'' یہ ...کہہ کر بابا دینا بیٹھ گیا اور غور سے نشانات کا جائزہ لینے لگا۔ ...''اس مرد کی عمر تیس سال کے لگ بھگ ہے جس کے یہ ...نشانات ہیں۔ وہ بھاری بھر کم جثے اور مضبوط ہاتھ پیر کا آدمی ...ہے۔ اس نے پیروں میں ربڑ کے جوتے پہن رکھے تھے پھر

وہ نشانات دیکھتا ہوا میری طرف بڑھا اور بولا۔''وہ یہاں آکر رک گیا ہے۔ یہاں پر پھر دو مردوں کے نشانات ہیں۔ دوسرے مرد نے نرم تلے کی چپل پہن رکھی ہے۔ اس کی عمر بھی تیس، پینتیس سال کے لگ بھگ ہے۔'' پھر وہ نشانات دیکھتا ہوا اس حصے کی طرف بڑھ گیا جہاں حملہ آور گیا تھا۔

وہاں پہنچ کر اس نے عجیب انکشاف کیا۔''اس شخص کے قدموں کے نشانات اس طرف گئے ہیں۔'' اس نے اس اقامتی حصے کی طرف اشارہ کیا جہاں حویلی کے ملازمین کے کوارٹرز تھے۔

''ادھر تو حویلی کے ملازمین رہتے ہیں۔'' سرور نے کہا۔

''کوئی بھی رہتا ہو۔'' بابا دینا نے وثوق سے کہا۔ ''لیکن نشانات یہاں آخر ختم ہو گئے ہیں کیونکہ اس سے آگے اینٹوں کا پختہ فرش تھا۔ وہاں گرد بھی نہیں تھی کیونکہ وہاں رہنے والے روزانہ وہاں کی صفائی کرتے تھے۔

میں اسے ایک مرتبہ پھر اس اصطبل نما حصے کی طرف لے گیا۔ وہاں کمروں میں مٹی کی تہ پر بھی قدموں کے نشانات تھے لیکن بابا دینا نے نفی میں سر ہلا کر بتایا کہ ان نشانات میں اس شخص کے قدموں کے نشان نہیں ہیں۔

وہ یہ نہ بتا سکا کہ پختہ فرش پر آنے کے بعد حملہ آور کس طرف گیا لیکن ایک بات اس نے یقین سے بتائی کہ حملہ آور اصطبل کی طرف نہیں گیا ہے۔ نہ اس حصے کے باہر ایسا کوئی نشان ہے، نہ کمروں کے اندر!

''ٹھیک ہے۔'' میں نے غنی سے کہا۔''تم بابا کو واپس گاؤں چھوڑ آؤ۔''

غنی اسے لے کر چلا گیا۔ میں نے سرور کو بھی جانے کی اجازت دے دی اور خود صوبیدار میجر شریف کی طرف نکل گیا۔ وہ اپنی رائفل کی صفائی کر رہے تھے۔ میز پر ایک ریوالور بھی رکھا ہوا تھا جس کی صفائی غالباً وہ کر چکے تھے۔

میں نے مسکرا کر کہا۔''صوبیدار میجر صاحب! آپ بھی آج اپنے ہتھیاروں کی صفائی کر رہے ہیں؟''

''روز ہی کرتا ہوں۔'' انہوں نے جواب دیا۔''تیس سال تک یہی کرتا رہا ہوں۔ اب تو کچھ عادت سی پڑ گئی ہے۔'' وہ مسکرائے۔''حالانکہ جب میں جمعدار بنا تو مجھے ایک اردلی بھی ملا تھا (ان دنوں فوج میں جمعدار کا عہدہ ہوتا تھا جسے آج کل نائب صوبیدار کہتے ہیں) لیکن میں اپنے ہتھیاروں کی صفائی اس وقت بھی خود ہی کرتا تھا۔''

''آپ نے کچھ اندازہ لگایا کہ حملہ آور کہاں سے

آسکتا ہے؟''

وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئے اور بولے۔ ''میں نے کافی عرصہ آرمی انٹیلی جنس میں بھی گزارا ہے۔ اس سلسلے میں مجھے خصوصی تربیت بھی دی گئی تھی، میرے خیال میں صرف دو امکانات ہیں، یا تو حویلی میں کوئی خفیہ راستہ موجود ہے یا پھر حملہ آور حویلی کے لوگوں میں سے کوئی ہے ورنہ کوئی بھی حملہ آور اول تو حویلی کے اندر آ ہی نہیں سکتا، بالفرض وہ آ بھی گیا تھا تو اس کی واپسی کے تمام راستے مسدود ہو چکے تھے۔ آپ کی آواز سنتے ہی سرور نے اپنے آدمیوں کو الرٹ کر دیا تھا اور چار دیواری کے اوپر خاردار تاروں میں دو سو بیس واٹ کا کرنٹ چھوڑ دیا گیا تھا۔ اب حویلی میں اگر کوئی خفیہ راستہ نہیں ہے تو پھر حملہ آور یقیناً گھر کا کوئی بھیدی ہے۔''

اس پر اچانک مجھے سردار خان اور ان دو قیدیوں کا خیال آیا جنہیں سرور نے تہ خانے میں رکھا تھا۔ اس تہ خانے میں داخل ہونے کا راستہ بھی خفیہ تھا لیکن اس کا علم سرور اور غنی سمیت کئی گارڈز کو تھا۔

میں اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔ صوبیدار میجر صاحب نے حیرت سے کہا۔ ''کیا ہوا رفیق میاں؟''

''مجھے ایک ضروری بات یاد آگئی ہے۔ مجھے خیال آیا تھا کہ اگر حملہ آور گھر کا کوئی بھیدی تھا تو وہ تہ خانے کی طرف ضرور گیا ہوگا۔ مجھ پر حملہ کرنے سے پہلے اس نے سردار خان اور ان دونوں قیدیوں کو رہا کرانے کی کوشش کی ہوگی۔''

میں نے باہر نکل کر سرور کو آواز دی۔ وہ فوراً ہی دوڑتا ہوا آ گیا۔

''قیدیوں کا کیا حال ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ تینوں ٹھیک ہیں۔'' سرور نے جواب دیا۔ ''میں نے آج ہی اس زخمی قیدی کی ڈریسنگ کرائی ہے۔ اس کے زخم بھی اب بھر رہے ہیں۔''

''چلو، ذرا ایک نظر میں بھی انہیں دیکھ لوں۔'' میں نے کہا اور سرور کے ساتھ تہ خانے کی طرف بڑھ گیا۔

وہاں داخلے کا راستہ بھی بہت پیچیدہ تھا۔ ایک کمرے کی دیوار گیر الماری میں داخل ہو کر وہاں لگا ہوا ایک لیور گھمانا پڑتا تھا تو دوسرے کمرے میں ایک خلا نمودار ہوتا تھا جس کے نیچے ایک زینہ تھا جو تہ خانے کی طرف جا رہا تھا۔ تہ خانے کے باہر اور اندر دو چاق و چوبند گارڈز موجود تھے۔ انہوں نے مجھے دیکھ کر فوجی انداز میں سلام کیا اور تن کر کھڑے ہو گئے۔

میں سمجھ گیا کہ حملہ آور ادھر نہیں آیا ہوگا۔ یہاں چوبیس گھنٹے دو آدمی ڈیوٹی پر رہتے تھے۔ یہ میرا ہی حکم تھا کہ جب تک سردار خان اور وہ دونوں قیدی وہاں موجود ہیں، تہ خانے کے اندر اور باہر گارڈز کا پہرا رہنا چاہیے۔ میں تہ خانے میں داخل ہو کر سیدھا سردار خان کی طرف گیا۔ میرے تیور دیکھ کر سہم گیا اور یہ سمجھا کہ شاید میں نے اسے ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ ممکن ہے اس وقت میرے چہرے پر ایسے ہی غضب ناک تاثرات ہوں۔

''سردار خان!'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''تم نے تو کہا تھا کہ تم نے سب کچھ بتا دیا ہے؟''

''مجھے جو کچھ معلوم تھا نواب صاحب، وہ میں نے آپ کو بتا دیا تھا۔'' سردار خان جلدی سے بولا۔

''تم نے یہ نہیں بتایا کہ حویلی میں تمہارا دوسرا ساتھی کون ہے؟''

''دوسرا ساتھی؟'' اس نے حیرت سے کہا۔ ''حویلی میں تو میرا کوئی ساتھی نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''تم پھر جھوٹ بول رہے ہو۔'' میں نے کہا۔ ''لگتا ہے، مجھے تمہاری بیوی اور بچوں کو یہاں بلانا ہی پڑے گا۔''

''آپ یقین کریں نواب صاحب!'' اس نے سہم کر کہا۔ ''میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔ حویلی میں میرا کوئی ساتھی نہیں ہے۔'' اس کے لہجے میں سچائی کی جھلک تھی۔

''تمہیں کسی ایسے خفیہ راستے کا علم ہے جو حویلی سے باہر جاتا ہو؟'' میں نے اچانک پوچھا۔

''حویلی سے باہر جانے کے دو ہی خفیہ راستے ہیں۔'' اس نے مجھے بتایا۔ ''اور دونوں آپ کے علم میں ہیں۔''

میں اس کی بات پر چونک اٹھا لیکن میں نے اس پر ظاہر نہیں کیا۔ مجھے صرف ایک چور دروازے کا علم تھا جبکہ وہ دو راستوں کی بات کر رہا تھا۔

''میں جانتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن میں تمہاری زبان سے سننا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے بتاؤ وہ راستے کون سے ہیں؟''

سردار خان نے حیرت سے مجھے دیکھا، پھر بولا۔ ''نواب صاحب ایک راستہ تو وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں اس وقت گارڈ روم ہے۔''

''اور دوسرا راستہ؟'' میں نے اپنے اضطراب پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔

''دوسرا راستہ حویلی کے اندرونی حصے میں ہے۔ اس حصے میں حویلی کے ملازمین رہتے ہیں۔ ان ہی کوارٹرز میں سے ایک کوارٹر میں دوسرا خفیہ راستہ ہے۔''

''اس کوارٹر میں کون رہتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس میں کوئی بھی نہیں رہتا۔'' سردار خان نے بتایا۔

''تمہارے علاوہ ان خفیہ راستوں کا علم اور کتنے لوگوں کو ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میرے علاوہ غنی، سرور اور حاکم خان کو ان راستوں کا علم ہے۔ہم چار آدمیوں کے بعد آپ پانچویں آدمی ہیں جو ان چور دروازوں کے بارے میں جانتے ہیں۔''

میں جانے کے لیے مڑا تو اس نے لجاجت سے کہا۔

''نواب صاحب! آپ نے میرے بارے میں کیا فیصلہ کیا؟''

''تمہارے بارے میں ابھی میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے۔تمہارا فیصلہ تو راجا کے آنے کے بعد ہی ہوگا۔''

''میرے بیوی بچے......''

''تم ان کی فکر مت کرو۔'' میں نے کہا۔ ''انہیں پیسے بھجوا دیے گئے ہیں، تمہارے بعد بھی انہیں اسی طرح پیسے پہنچتے رہیں گے۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو قصوروار کے ساتھ ساتھ اس کے بچوں اور بیوی کو بھی زندہ جلا دیتے ہیں۔''

یہ کہہ کر میں باہر نکل گیا۔ دوسرے دونوں قیدیوں کا سیل وہاں سے کچھ فاصلے پر تھا۔ میں نے دور ہی سے انہیں دیکھا اور تہ خانے سے باہر آ گیا۔

اس وقت غنی بھی بابا دینا کو گاؤں واپس چھوڑ کر آ چکا تھا اور وہ گارڈ روم کے پاس ٹہل رہا تھا۔

''غنی!'' سرور نے اسے بلایا۔ ''ہمیں خفیہ راستے کا علم ہوگیا ہے۔''

''اچھا!'' غنی نے حیرت سے کہا۔ ''کہاں ہے وہ خفیہ راستہ؟''

''تم اس حویلی کے سیکیورٹی انچارج ہو اور تم ہم سے پوچھ رہے ہو؟'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''وہ خفیہ راستہ ان ہی کوارٹرز میں سے ایک کوارٹر میں ہے جہاں حملہ آور غائب ہوا تھا۔ اس بات کا علم سردار خان کو ہے تو تمہیں کیوں نہیں ہے؟'' میں نے کہا۔

''سردار خان کو اس راستے کا علم کیسے ہے، میں نہیں جانتا لیکن......''

''لیکن ویکن مت کرو۔ یہ سراسر تم لوگوں کی غفلت بلکہ نااہلی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''چلو اب چل کر وہ راستہ تلاش کرو۔'' میں نے صوبیدار میجر صاحب کو بھی اپنے ساتھ لے لیا تھا۔

''وہاں صرف ایک ہی کوارٹر خالی ہے سر!'' غنی نے کہا۔ ''باقی کوارٹرز میں تو حویلی کے ملازمین اور ان کے بیوی بچے رہتے ہیں۔''

ہم اس خالی کوارٹر میں پہنچے، بہ ظاہر وہاں کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن فرش پر جمی ہوئی گرد پر قدموں کے نشانات اس کوارٹر کے باورچی خانے کی طرف گئے تھے، وہاں پرانے وقتوں کے مٹی کے چولہے بنے ہوئے تھے۔ ایک چولہے سے مجھے گرد کچھ صاف دکھائی دی۔ میں نے اسے ہاتھ لگا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ چولہا مٹی کی بجائے پختہ مسالے سے تیار کیا گیا ہے۔ یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی تھی۔

''اس دور میں جب سیمنٹ نہیں تھا، لوگ اتنے پختہ اور ناقابل تسخیر قلعے اور فصیلیں کیسے تیار کر لیتے تھے؟'' میں نے کہا۔

''اس زمانے کے کاریگر سیمنٹ کے بجائے دوسرے اجزا سے کام لیتے تھے۔ اس میں ایک خاص قسم کی مٹی، روئی اور ماش کی دال استعمال ہوتی تھی۔ تاج محل اور مغلوں کی بنوائی ہوئی دوسری عمارتیں شاہی مسجد، شاہی قلعہ وغیرہ اس کی زندہ مثالیں ہیں۔'' صوبیدار میجر صاحب نے کہا۔

میں وہ چولہا وہاں سے ہٹانے لگا تو صوبیدار میجر صاحب نے چیخ کر کہا۔ ''ٹھہرو رفیق میاں! جلدی باہر نکلو، اس کوارٹر میں ٹائم بم لگا ہوا ہے۔'' ہم سب فوراً ہی باہر نکل آئے۔

انہوں نے باہر آنے کے بعد کہا۔ ''تمہیں تو اس کا اندازہ نہیں ہوا لیکن مجھے اس کی ٹک ٹک کی مخصوص آواز سے اندازہ ہوگیا کہ یہاں ٹائم بم موجود ہے۔ یہاں سے دور ہٹ جاؤ۔'' پھر وہ غنی سے مخاطب ہوئے۔ ''تم اپنے سیل فون کے ذریعے گارڈز کو بتا دو کہ دھماکا ہو تو اس طرف کوئی نہ آئے۔''

غنی اور سرور آس پاس کے کوارٹرز والوں کو وہاں سے نکالنے کے لیے دوڑ پڑے تھے۔

ایک منٹ کے اندر اندر دوسرے کوارٹرز سے بچے اور عورتیں باہر آ گئے۔ غنی نے ان لوگوں کو وہاں سے کافی دور بھیج دیا۔

پھر اسی حالت میں دس منٹ گزر گئے لیکن کوئی دھماکا نہیں ہوا۔

''ٹائم شاید آگے کا سیٹ ہے۔'' صوبیدار میجر صاحب نے کہا۔ ''میں دیکھتا ہوں کہ بم کہاں ہے، اسے ناکارہ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔''

''نہیں صوبیدار میجر صاحب!'' میں نے کہا۔ ''ہم

...ے کسی کو علم نہیں ہے کہ اس میں ٹائم کیا سیٹ ہے؟ ممکن ...پ مکان میں داخل......''

زوردار دھماکے سے میرا جملہ ادھورا رہ گیا۔ دھماکے کی ...رت سے ہم لوگ لڑکھڑا گئے۔ عورتیں اور بچے تو بری طرح ...خ چلانے لگے۔

''خاموش ہو جاؤ۔'' غنی نے چیخ کر کہا۔ ''کچھ بھی نہیں ...ے، چپ ہو جاؤ۔''

غنی کے چیخنے پر وہ سب خاموش ہو گئے۔ دھماکے کی ...واز سن کر اسپتال کا پورا اسٹاف اور دوسرے ملازمین ...تے ہوئے وہاں پہنچ گئے۔ ڈاکٹر شہناز نے مجھے دیکھا اور ...ی طرح میری طرف آئی۔ ''تم ٹھیک تو ہو رفیق؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ...ھماکا اتفاق سے ہوگیا۔ تم چلو، میں تمہیں سب کچھ بتا دوں ...''

ڈاکٹر نواز مہدی حسن، ڈاکٹر حسن، ٹینا، شہلا حتیٰ کہ ...یہ تک وہاں سب موجود تھے۔ شہناز ان سب لوگوں کو تسلی ...ے کر وہاں سے لے گئی۔ دوسرے ملازمین کو غنی اور سرور ...نے مطمئن کر دیا۔ ہاں، میرا کوئی گارڈ اس طرف نہیں آیا تھا۔ ...نے پہلے ہی انہیں ہدایت کر دی تھی کہ دھماکا ہو تو کوئی اپنی ...نہ چھوڑے۔

اچانک مین گیٹ کے پاس سے شور شرابے کی آواز ...ئی دی۔ میں دوڑتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ احمد شاہ کسی شخص سے ...تا ہوا تھا اس نے گھوم کر احمد شاہ کو پیچھے پھینک دیا۔ احمد شاہ ...ا کر بولا۔ ''کوئی فائر نہیں کرے گا۔ اسے زندہ پکڑنا ہے۔''

یہ کہہ کر وہ پھر اس شخص کی طرف بڑھا جو اس سے بھڑا ہوا ...ا۔ میں نے غور سے اس شخص کا جائزہ لیا۔ اس کے جسم پر سیاہ ...بز اور شرٹ تھی، پیروں میں ربڑ کے جوتے تھے، ایسے جوتے ...موماً ان علاقوں میں استعمال ہوتے ہیں جہاں بہت زیادہ ...ف باری ہوتی ہے یا پھر سڑک بنانے والے مزدور پہن لیتے ...ہ تاکہ تارکول ان کے پیروں سے نہ چپک جائے۔

اس کے انداز سے میں سمجھ گیا کہ وہ مارشل آرٹ میں ...ہر ہے، اس کے پاس کسی قسم کا اسلحہ شاید نہیں تھا ورنہ وہ اب ...ک اسے نکال چکا ہوتا۔

میں نے بھی چیخ کر کہا۔ ''کوئی بھی اس پر فائر نہیں ...رے گا۔ احمد شاہ! اسے زندہ پکڑنے کی کوشش کرو۔''

پھر میں نے سوچا، یہ کوئی ریسلنگ کا چیلنج مقابلہ نہیں ہو ...ہا ہے۔ پھر احمد شاہ کو زخمی کرانے سے کیا فائدہ؟ میں نے غنی ...اور سرور کو اشارہ کیا کہ حملہ آور کو پکڑ لو۔

اس دوران میں احمد شاہ دائرے کی شکل میں گھوم کر اس کے سینے پر زبردست لات مار چکا تھا۔ وہ الٹ کر پیچھے گرا تو غنی اور سرور نے اسے دبوچ لیا اور لمحوں میں اسے باندھ لیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس کے چہرے سے نقاب کھینچ لیا اس کا چہرہ میرے لیے بالکل اجنبی تھا۔ وہ سرخ وسفید رنگت کا خاصا کبھرو جوان تھا اور قہر آلود نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔

''کون ہو تم؟'' میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔

اس نے حقارت سے مجھے دیکھا لیکن کوئی جواب نہیں دیا۔

''غنی!'' میں نے غنی کو مخاطب کیا۔ ''اس کی آنکھوں پر پٹی باندھو اور اسے بھی وہیں لے چلو۔ میں ابھی اس کی ساری شہ زوری نکالتا ہوں۔''

''ہاتھ بندھے ہوں تو چھوٹے بچے بھی بڑے بڑے پہلوانوں کو مار لیتے ہیں۔''

''یہ مکالمے کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھو۔'' میں نے کہا۔ ''رات بھی تمہارے ہاتھ بندھے ہوئے تھے؟''

اس دوران میں غنی اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ چکا تھا۔ پھر وہ اسے دھکیلتا ہوا تہ خانے کی طرف لے گیا۔

میں اس ذہنی دباؤ سے اتنا تھک گیا تھا کہ کافی کی شدید طلب محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے سرور سے کہا۔ ''میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔ اس آدمی سے بعد میں نمٹوں گا۔'' یہ کہہ کر میں اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

مجھے دیکھ کر ریشم بھی کمرے میں آ گئی اور فکر مند لہجے میں بولی۔ ''صاب جی! آپ خیریت سے تو ہیں، وہ نورا بتا رہا تھا کہ رات کو آپ پر کسی نے حملہ کیا تھا اور اس وقت بھی......''

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' میں نے تیزی سے اس کی بات کاٹ دی۔ وہ بولتی تھی تو پھر بولتی ہی چلی جاتی تھی۔

اسی وقت ڈاکٹر شہلا دروازے پر ہلکی سی دستک دے کر اندر داخل ہوئی اور مجھے سلام کیا۔

میں نے سلام کا جواب دے کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ریشم سے کہا۔ ''اب تم ہمیں ذرا اچھی سی کافی پلا دو۔''

''ابھی لائی جی!'' یہ کہہ کر ریشم ہوا کے جھونکے کی طرح کمرے سے نکل گئی۔ اس کی یہی چستی اور مستعدی مجھے پسند تھی۔

''نواب صاحب! میں آپ کی خیریت معلوم کرنے آئی تھی۔ یہ دھماکا کیسا تھا؟''

''ہمارے سیکیورٹی انچارج صاحب کی غلطی کی وجہ سے یہ بم پھٹ گیا۔'' میں نے اسے ٹالنے کو کہا۔ میں اس کی آنکھوں میں براہ راست دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں عجیب سا سحر تھا۔

ریشم کافی دے کر چلی گئی۔ میں نے کافی پیتے ہوئے شہلا سے پوچھا۔ ''مس شہلا! آپ کا تعلق لاہور ہی سے ہے یا کسی اور شہر سے؟''

''میرا تعلق لاہور ہی سے ہے۔'' شہلا نے جواب دیا۔ ''میری فیملی گلبرگ میں رہتی ہے۔''

''پھر تو آپ کو یہاں بہت تکلیف ہوتی ہوگی۔ ست بدھائی اور لاہور میں زمین آسمان کا فرق ہے۔''

''میں یہاں اپنی خوشی سے آئی ہوں نواب صاحب!'' شہلا نے کہا۔ ''لوگ ایم بی بی ایس کر کے یہ چاہتے ہیں کہ راتوں رات ان کے پاس دولت آجائے۔ وہ کسی گاؤں میں جاب نہیں کرتے، شہر کے بڑے اسپتال میں جاب کرنے کی کوشش کرتے ہیں، کچھ پیسا بھی ہو تو وہ پہلی فرصت میں اپنا ذاتی کلینک کھول لیتے ہیں تا کہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ لوٹ سکیں۔ مجھے گوجرانوالہ کی ایک تحصیل میں جاب مل گئی تھی، میں وہاں جانے ہی والی تھی کہ میری بات شہناز باجی سے ہوگئی۔ وہ شروع ہی سے میری آئیڈیل ہیں، میں بچپن سے ان سے بہت زیادہ متاثر ہوں۔ جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ میں کسی دیہی علاقے میں جاب کرنا چاہتی ہوں تو انہوں نے مجھے یہاں بلا لیا۔''

''اچھا۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''شہناز نے کبھی بتایا نہیں کہ اس کی کوئی کزن بھی میڈیکل میں ہے لیکن آپ کسی گاؤں ہی میں جاب کیوں کرنا چاہتی تھیں؟'' میں نے پوچھا۔

''اب بھی ڈاکٹر شہروں میں رہیں گے تو گاؤں والوں کا علاج کون کرے گا؟'' اس نے کہا۔ ''میں نے تو جب میڈیکل کالج میں ایڈمشن لیا تھا، اسی وقت یہ عہد کر لیا تھا کہ میں کسی پس ماندہ گاؤں کے اسپتال میں جاب کروں گی۔''

''اچھا، تو گویا ست بدھائی آپ کے خیال میں کوئی پس ماندہ گاؤں ہے؟'' میں نے ہنس کر کہا۔

''نہیں، ایسا تو نہیں ہے، آپ نے یہاں بہت زبردست اسپتال بنایا ہے اور شہناز باجی نے مجھے بتایا ہے کہ آپ اس اسپتال کو جدید بنانا چاہتے ہیں، جہاں ہر وہ سہولت میسر ہو جو شہر کے کسی بھی بڑے اسپتال میں ہوتی ہے۔ اگر ایسا ہو گیا تو نہ صرف ست بدھائی، اس کے اردگرد کے علاقوں سے بلکہ شہروں سے بھی لوگ یہاں کا رخ کریں گے۔''

''ہاں، میرا ارادہ تو کچھ یہی ہے، بہ شرط زندگی!'' میں نے ہنس کر کہا۔

''اللہ تعالیٰ آپ کو لمبی زندگی عطا فرمائے۔'' وہ مسکرا کر بولی۔

''ویسے آپ کا دل یہاں لگ گیا ہے؟''

''پہلے دن تو میں بہت بور ہوئی لیکن جب...... رات کو...... آپ کو دیکھا تو...... ساری بوریت دور ہوگئی۔'' وہ جھجکتے ہوئے بولی۔ اس کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔

''میں سمجھا نہیں۔'' میں نے انجان بن کر پوچھا۔

''میرا خیال تھا کہ یہاں کا نواب کوئی خرد ماغ سا آدمی ہوگا جو بات بات پر اپنے ملازمین کو جھڑکتا ہوگا لیکن اس رات آپ کو دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ کوئی نواب اتنا خوش اخلاق بھی ہو سکتا ہے۔''

''اکیلے اکیلے کافی پی رہے ہو؟'' اچانک شہناز کمرے میں داخل ہوئی۔

''اکیلے اکیلے کیوں؟'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''ڈاکٹر شہلا بھی میرے ساتھ ہیں۔'' پھر میں نے ملازم کو بلا کر کہا کہ ریشم سے...... ایک کپ کافی مزید بھجوادو۔

''تم سوئیں نہیں۔ تمہاری نیند رات بھی پوری نہیں ہوئی تھی۔ آج پھر تم نائٹ ڈیوٹی کرو گی کیونکہ مجھے نہیں لگتا کہ ٹینا ابھی نائٹ ڈیوٹی کرنے کے قابل ہوگی۔ اپنی صحت کا خیال رکھو شہناز ورنہ وہ راجا مجھے کچا چبا جائے گا۔''

''راجا حرام گوشت کھانے کا عادی نہیں ہے۔'' شہناز نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ویسے بھی وہ کوئی چیز بھی ابالے بغیر نہیں کھاتا، اس لیے اس کی طرف سے بے فکر ہو۔''

''بات کو مذاق میں مت ٹالو، دن رات ڈیوٹی کر کے تمہاری آنکھوں کے گرد حلقے پڑ گئے ہیں۔''

''شہناز باجی! آپ آج مکمل آرام کریں۔ میں اور ٹینا او پی ڈی سے تو فارغ ہو ہی چکے ہیں۔ میں نائٹ ڈیوٹی بھی کر لوں گی۔ مجھے بھی تو کام کرنے کا موقع دیں۔''

''ڈاکٹر شہلا ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''تم آج آرام کرو۔''

اسی وقت میرے سیل فون کی بیل بجنے لگی۔ میں نے سیل فون اٹھا کر دیکھا، اس پر راجا کا نام تھا۔

''ہاں مہاراجا!'' میں نے سیل فون کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''خیریت تو ہے؟''

''ہاں سب خیریت ہے، سوائے اس کے کہ رابعہ پاگل ہوچکی ہے۔''

''یار، پاگل تو وہ پہلے ہی ہوگئی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''یہ کون سی نئی خبر ہے؟''

''پہلے وہ نیم پاگل تھی، اب وہ مکمل پاگل ہوچکی ہے۔''

''تو پھر اسے کسی پاگل خانے میں ایڈمٹ کردو۔ میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں؟'' میں نے کہا۔

''پاگل پن میں اس نے یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ جب سے اس کی شادی ہوچکی ہے۔'' پھر وہ ہنس کر بولا۔ ''یہاں کے مسائل سے تو میں نمٹ لوں گا۔ تو بتا، وہاں کی کیا ...ریاں ہیں۔''

میں نے مختصراً اسے یہاں پیش آنے والے واقعات بتائے۔

وہ تشویش سے بولا۔ ''یار فیکے! تو تو بہت ذہنی دباؤ کا شکار ہوگا۔ یہاں نور کے لیے رابعہ مسئلہ بنی ہوئی ہے۔''

''تو رابعہ کو تو سیدھا سیدھا پاگل خانے میں ایڈمٹ کرادے۔'' میں نے کہا۔ ''وہاں وہ بکواس کرے گی تو پاگل خانے والے خود ہی زوہیب سے رابطہ کریں گے کہ آپ کی بیوی پاگل ہوچکی ہیں۔ انہیں آپ یہاں رکھنا چاہیں گے یا اپنے پاس پاکستان بلانا چاہیں گے؟''

''مسئلہ اتنا آسان نہیں ہے فیکے پتر!'' راجا نے کہا۔ ''پہلے تو یہی پرابلم ہوگی کہ محل سے ہر لڑکی پاگل ہو کر کیوں نکلتی ہے۔ اس سے پہلے وہ لارڈ کی بیٹی بھی پاگل ہو چکی ہے۔ میں رابعہ کو پاگل خانے کے حوالے کروں گا تو وہ اس کے بارے میں مزید معلومات کریں گے۔ سب سے پہلے تو وہ یہی سن کر چونک اٹھیں گے کہ مس رابعہ شیرازی، لارڈ رفیق شیرازی کی کزن ہیں۔''

''او بھائی، کیا کزن پاگل نہیں ہو سکتی؟'' میں نے ہنس کر کہا اور ڈاکٹر شہلا کی طرف دیکھا جو خواہ مخواہ میری بات پر مسکرا رہی تھی۔

''یار تو بات کو سیریس نہیں لے رہا ہے۔'' راجا نے کہا۔ ''رابعہ ہر وقت تیرا نام جپتی ہے اور خیالوں میں تجھ سے باتیں کرتی ہے۔ میں نے اس سے یہ کہا تمہارا نکاح تو زوہیب کے ساتھ ہوچکا ہے، پھر رفیق کو یاد کیوں کرتی ہو؟ اس پر وہ بولی کہ زوہیب نے تو زبردستی میرے ساتھ نکاح کیا تھا۔ میں اس کے پاس سے بھاگ کر ہی تو لندن آئی ہوں۔ اس نے تو اچھا خاصا پرابلم پیدا کر دیا ہے، اب وہ راتوں کو روتی پیٹتی نہیں ہے بلکہ نور جہاں اور لتا کے درد بھرے گانے گاتی ہے، مشتبہ ڈائیلاگ بولتی ہے اور ہر وقت بنی سنوری رہتی ہے۔''

''تو تو کہہ رہا تھا کہ وہ مکمل پاگل ہوچکی ہے؟'' میں نے جھنجلا کر کہا۔

''ہاں، وہ بھی کبھی آپے سے اتنی باہر ہوتی ہے کہ اپنے کپڑے پھاڑ لیتی ہے، بال نوچتی ہے اور توڑ پھوڑ کرتی ہے...... مکمل پاگل کیسے ہوتے ہیں؟''

''ہو سکتا ہے کہ وہ ڈراما کر رہی ہو، وہاں تو ایسے ماہرین ہیں کہ رابعہ کو دیکھ کر بتا دیں گے کہ وہ پاگل ہے یا پاگل پن کا ڈراما کر رہی ہے؟''

''واہ، تو نے کیا زبردست مشورہ دیا ہے۔'' راجا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''یار تو پھر جو دل چاہے کر، مجھے یہاں کے بکھیڑوں سے نمٹنے دے، یہ بتا نور کہاں ہے، رات بھی اس سے بات نہیں ہو سکی۔''

''نور تو اس وقت بھی کسی بزنس میٹنگ میں مصروف ہے۔'' راجا نے ہنس کر کہا۔ ''اب تو اس سے بات کرنے کے لیے مجھے بھی وقت لینا پڑتا ہے فیکے پتر۔'' پھر وہ ہنس کر بولا۔ ''لیکن ہم بھی مہاراجا ہیں، نور کو مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ ہم سے ٹائم لے۔ تو یہ بتا، شہناز کہاں ہے؟ اس کا سیل فون بھی آف ہے۔''

''وہ یہیں موجود ہے، لے بات کر۔'' میں نے سیل فون شہناز کی طرف بڑھا دیا۔

شہناز سیل فون لے کر کمرے سے نکل گئی۔

میں نے ہنس کر شہلا سے کہا۔ ''دیکھیے منگنی کرنے کے بعد یہ بکھیڑے ہوتے ہیں۔ ایک لندن میں بیٹھا آہیں بھر رہا ہے، دوسری یہاں اس کی یاد میں دن گن رہی ہے۔''

''آپ کے ساتھ تو کوئی ایسا بکھیڑا نہیں ہے؟'' اس نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

''میرے ساتھ!'' میں نے کچھ توقف کیا، پھر کہا۔ ''سب سے زیادہ بکھیڑا تو میرے ہی ساتھ ہے، میری منگیتر نہ صرف لندن میں اکیلی ہے بلکہ وہ میرا کروڑوں پاؤنڈز کا بزنس بھی سنبھال رہی ہے۔''

میں نے دیکھا، شہلا کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ معصوم اور بھولی بھالی لڑکی کسی قسم کی غلط فہمی کا شکار ہو۔ میں نے اس کی نظروں کا خاموش پیغام پڑھ لیا تھا۔

''آپ کی منگیتر بہت خوب صورت ہوں گی؟'' اس کے لہجے میں حسرت تھی۔

''دنیا کے ہر شخص کو اپنی منگیتر خوب صورت لگتی ہے، شادی کے بعد وہی لڑکی جس کے حسن کی شان میں وہ زمین آسمان کے قلابے ملاتا ہے، اسے زہر لگنے لگتی ہے۔ پھر وہ دوسروں سے کہتا ہے۔''یار، بیک ہی تھوبڑا دیکھ دیکھ کر آنکھیں پتھرا گئی ہیں۔ گویا، دل گیا تھا تو یہ آنکھیں بھی کوئی لے جاتا، میں فقط ایک ہی تصویر کہاں تک دیکھوں!''

میری بات سن کر شہلا کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ ہنس کر بولی۔''کیا آپ بھی بعد میں یہی شعر پڑھا کریں گے؟''

''مستقبل کا حال تو اللہ جانتا ہے، ممکن ہے، معاملہ اس کے الٹ ہو۔''

وہ ہنس کر بولی۔''ویسے مجھے آپ کے اعصاب پر حیرت ہوتی ہے، رات آپ پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے، صبح بم کا ایک دھماکا ہوا اور آپ اس انداز میں بات کر رہے ہیں جیسے یہ سب کچھ کسی اور کے ساتھ پیش آیا ہو۔''

''اس میں حیرت کی کون سی بات ہے، جو ہو گیا اس پر پریشان کیوں ہوا جائے اور جو ہونے والا ہے، پہلے سے اس پر فکرمند کیوں رہوں؟ جو لوگ یہ بات سمجھ لیتے ہیں، وہ ہمیشہ فائدے میں رہتے ہیں۔''

اچانک مجھے خیال آیا کہ ابھی مجھے اس حملہ آور سے پوچھ گچھ بھی کرنا ہے جسے پکڑا گیا ہے۔ خفیہ راستہ بھی تلاش کرنا ہے۔ یہ سوچ کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے ساتھ ساتھ شہلا بھی کھڑی ہو گئی اور مجھے آداب کر کے باہر نکل گئی۔

میں کمرے سے باہر نکلا تو شہناز اس وقت تک راجا سے گفتگو میں مصروف تھی۔

میں نے کہا۔''میں مین گیٹ کی طرف جا رہا ہوں۔ تم باتوں سے فارغ ہو جاؤ تو میرا سیل فون بھجوا دینا۔''

''میں بس فارغ ہو چکی ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے سیل فون میری طرف بڑھا دیا۔

میں سیل فون لے کر گارڈ روم کی طرف بڑھ گیا۔ گارڈ روم کے باہر غنی اور سرور دونوں ہی موجود تھے۔

''تم لوگوں نے اس جگہ کا جائزہ لیا جہاں بم دھماکا ہوا ہے؟''

''جی سر!'' غنی نے کہا۔''ہمارے ساتھ صوبیدار میجر صاحب بھی تھے۔ بم کے دھماکے سے زمین میں کئی فٹ گہرا گڑھا پڑ گیا ہے۔ صوبیدار میجر صاحب کا اندازہ ہے کہ بم بہت زیادہ طاقت ور تھا۔ بم پھٹنے سے وہ راستہ بھی مسدود ہو گیا ہو گا جس کی ہمیں تلاش تھی۔''

''وہاں کئی مزدور لگا دو۔'' وہ دو گھنٹے کے اندر اندر سارا ملبا ہٹا دیں گے۔ معلوم تو ہو کہ وہ راستہ کون سا ہے اور کس طرف نکل رہا ہے؟''

''ٹھیک ہے سر!'' میں ابھی وہاں مزدور لگا دیتا ہوں۔''

''ابھی نہیں، پہلے میں خود اس جگہ کا جائزہ لوں گا، پھر ملبا ہٹانے کا کام کرنا۔'' یہ کہہ کر میں صوبیدار میجر صاحب کے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

صوبیدار میجر صاحب اس وقت اخبار پڑھنے میں مصروف تھے۔ اخبارات پنڈی اور لاہور سے آتے تھے۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے اخبار رکھ دیا اور بولے۔''آؤ رنگی میاں!''

''صوبیدار میجر صاحب!'' میں نے کہا۔''میری سمجھ میں ایک بات نہیں آئی۔ جب حملہ آور اندر ہی تھا تو اس نے اس راستے پر ٹائم بم کیوں لگایا؟''

''وہ ٹائم بم ڈبل میکنزم کا تھا۔ اس میں ٹائم تو اس وقت کا سیٹ تھا، اس کے ساتھ ہی یہ بھی تھا کہ اگر اسے چھیڑا جاتا تو اس کا فیوز نکل جاتا اور وقت سے پہلے ہی بلاسٹ ہو جاتا۔ میں نے اس جگہ کا جائزہ لیا ہے، وہ خاصا طاقتور بم تھا۔''

''لیکن میری سمجھ میں یہ نہیں آ رہا کہ حملہ آور نے خود ہی وہاں بم لگا کر اپنا راستہ مسدود کیوں کیا؟ یہی کام وہ باہر نکلنے کے بعد بھی کر سکتا تھا۔'' پھر میں کچھ سوچتے ہوئے بولا۔''کسی نے حملہ آور کو اندر بھیجا اور اس خفیہ راستے پر بم فٹ کر دیا۔ اس کا مقصد یہی ہو سکتا ہے کہ حملہ آور اگر ہمارے گارڈز سے بچ جائے تو بم دھماکے میں مارا جائے۔''

''ہاں لگتا تو ایسا ہی ہے۔'' صوبیدار میجر صاحب نے کہا۔

''آپ آرام کریں۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں ذرا نئے قیدی کا انٹرویو لے لوں۔''

میں ان کے کمرے سے باہر نکلا تو میری نظر احمد شاہ پر پڑی، میں نے آواز دے کر اسے بلا لیا اور پوچھا۔''احمد شاہ! تم نے حملہ آور کو کب دیکھا؟''

''سر، حویلی کی پشت پر جو گھنے درخت ہیں، وہ ان ہی میں ایک میں اوپر چھپا بیٹھا تھا۔ میری ڈیوٹی اسی طرف تھی، میں دوربین سے اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا۔'' اس نے بتایا پھر مزید گویا ہوا۔''دھماکا ہوا تو اس نے لوگوں کو اس طرف دوڑتے دیکھا، غنی صاحب نے تمام گارڈز کو.... حکم دیا تھا کہ کوئی بھی اپنی جگہ نہیں چھوڑے۔ دھماکا ہوتے ہی سارے

گارڈز مزید الرٹ ہو گئے۔ حملہ آور نے حویلی میں بھاگ دوڑ دیکھی تو اس نے موقعے سے فائدہ اٹھا کر فوراً درخت سے اتر کر فرار ہونے کی کوشش کی۔ میں نے اسے للکارا تو وہ مجھ سے بھڑ گیا۔''

میں تہ خانے میں داخل ہوا تو حملہ آور دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کے چہرے کے عضلات تن گئے۔

میں نے سرد لہجے میں کہا۔''امید ہے، اب تک تمہیں عقل آ گئی ہو گی۔ اب بتاؤ تم کون ہو اور یہاں کیوں آئے تھے؟''

''میں تمہارے کسی بھی سوال کا جواب نہیں دوں گا نقلی نواب!'' اس نے زہریلے لہجے میں کہا۔

''دیکھو ابھی تو میں نرمی سے پوچھ رہا ہوں، میں نہیں چاہتا کہ تمہارا یہ خوب صورت چہرہ مسخ ہو جائے۔''

''اپنے گھر میں تو بزدل سے بزدل آدمی بھی بڑے بڑے دعوے کرتا ہے۔'' اس نے تحقیر آمیز لہجے میں کہا۔ ''اتنے گارڈز کی موجودگی کے باوجود تم مجھے باندھ کر دھمکیاں دے رہے ہو۔ اگر مرد ہو تو میرے ہاتھ کھول دو۔''

''دیکھو، یہ فلمی مکالمے چھوڑو اور میری بات کا جواب دو۔ رہی یہ بات کہ تمہارے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں تو رات تو تمہارے ہاتھ کھلے ہوئے تھے، پھر کیا ہوا تھا؟''

''تم خود کو نواب کہتے ہو؟'' اس نے کہا۔''وہ تمہارا کوئی ملازم تھا۔ اگر واقعی نواب ہو تو خود مقابلہ کر کے دیکھ لو۔''

''رات میرا کوئی گارڈ نہیں تھا بلکہ میں ہی تمہارے مقابلے پر تھا۔''

''میں نہیں مان سکتا۔'' وہ تضحیک آمیز لہجے میں بولا۔

''مت مانو۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔''میری ایک بات سمجھ لو۔ جس نے تمہیں یہاں بھیجا تھا، وہ نہیں چاہتا تھا کہ تم زندہ واپس جاؤ۔''

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔

''تمہیں خفیہ راستہ بتایا گیا، پھر جب تم اندر داخل ہو گئے تو اس راستے پر بم لگا دیا گیا۔ اس کا مطلب تو یہی ہے کہ اگر تم یہاں سے بچ بھی نکلتے تو بم پھٹنے سے تمہارے پرخچے اڑ جاتے۔''

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔'' اس نے بے یقینی سے کہا۔

''میں جھوٹ بول رہا ہوں؟'' میں نے کہا۔''کیا تم نے دھماکے کی آواز نہیں سنی؟''

''مجھے تو یہ بتایا گیا تھا کہ میرے محل میں داخل ہوتے ہی خفیہ راستے پر نواب کے گارڈز نے بم لگا دیا ہے اس لیے وہاں سے نکلنے کی کوشش مت کرنا، اگر مجھے چند سیکنڈ کی بھی دیر ہو جاتی تو میں مارا جاتا۔ میرے سیل فون پر کال عین اس وقت آئی تھی جب میں خفیہ راستے کا لیور ہٹانے والا تھا۔ پھر میں نے یہی سوچا کہ جب مرنا ہی ہے تو بزدلوں کی موت کیوں مروں؟ نواب کے دو چار بندوں کو ساتھ لے کر مروں، یہی سوچ کر میں درخت کے گھنے پتوں میں چھپ کر بیٹھ گیا تھا۔''

''اس درخت کے پاس سے تو کئی بار میں بھی گزرا اور دوسرے لوگ بھی۔ جب تم مرنے مارنے کا عہد کر ہی چکے تھے تو مجھے تو کم سے کم مار ہی سکتے تھے۔''

''مجھے یہی تو افسوس ہے، اس بھاگ دوڑ میں میرا ریوالور کہیں گر گیا تھا۔''

''اب تم جھوٹ بول رہے ہو؟'' میں نے کہا۔

''میرے آدمیوں نے میرے کمرے سے یہاں تک چپے چپے کی تلاشی لی تھی لیکن انہیں ریوالور نہیں ملا۔''

''تو پھر اس وقت گرا ہو گا جب میں نے اس خفیہ راستے والے مکان کی دیوار پھاندی تھی۔ تمہارے آدمی مکان کے اندر تو گئے ہی نہیں۔''

وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا، ہم لوگ مکان کے اندر نہیں گئے تھے یا شاید صرف سرور گیا تھا اور مکان کے کمروں میں دیکھ کر واپس آ گیا تھا۔ وہ لوگ وہاں چھ فٹ کے آدمی کو ڈھونڈ رہے تھے، کسی ریوالور کو نہیں۔ ہاں اگر وہ مکان کے صحن کو بھی غور سے دیکھتے تو یقیناً انہیں ریوالور نظر آ جاتا۔

''بہرحال!'' میں نے کہا۔''جس نے بھی تمہیں یہاں بھیجا ہے، وہ تمہارا دوست نہیں بلکہ جانی دشمن ہے۔ وہ ایک تیر سے دو شکار کرنا چاہتا تھا۔ تم بھی اپنی جان سے جاؤ اور میرا بھی خاتمہ ہو جائے۔''

''وہ بم تمہارے آدمیوں نے انسٹال نہیں کیا تھا؟'' وہ کچھ سنجیدگی سے بولا۔ پھر وہ خود ہی پرخیال انداز میں بولا۔ ''ہاں مجھے یاد آ گیا، جب میں درخت پر بیٹھا تھا تو تم اپنے کسی گارڈ سے کہہ رہے تھے کہ وہ خفیہ راستہ ہر قیمت پر تلاش کرو جس سے وہ پراسرار حملہ آور آیا تھا، اس کا مطلب ہے کہ......''

''ہاں، اس کا وہی مطلب ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''یعنی جس نے بھی مجھے یہاں بھیجا تھا، وہ نہیں چاہتا تھا

کہ میں زندہ رہوں؟''

''اس کا تو یہی مطلب نکل رہا ہے۔'' میں نے کہا، پھر میں کچھ سوچ کر بولا۔'' مجھے ایک بات بتاؤ، تم نے میرے کمرے میں آ کر سیدھا سیدھا مجھ پر فائر کیوں نہیں کیا؟ اس لڑکی کو کیوں چھیڑا، کیا اسے دیکھ کر اپنے ہوش کھو بیٹھے تھے؟ ویسے وہ ہے واقعی اتنی ہی خوب صورت کہ......''

''نواب صاحب! ایسی کوئی بات نہیں ہے، لڑکیاں مجھے دیکھ کر اپنے ہوش کھوتی ہیں، میں نہیں۔ میں نے اسے صرف اس لیے چھیڑا تھا کہ وہ چیخے اور تم اپنے کمرے سے باہر نکلو، میں نہیں چاہتا تھا کہ بزدلوں کی طرح سوتے میں تمہاری جان لوں اور نکل جاؤں۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تمہارے گارڈز بھی مارشل آرٹ میں اتنے ماہر ہیں ورنہ میں تمہارے کمرے میں جا کر تمہیں جگاتا، پھر للکار کر مارتا۔''

''تمہیں یقین کیوں نہیں آ رہا ہے کہ وہاں میرا کوئی گارڈ نہیں بلکہ میں خود تھا۔''

''نواب تو بہت نازک اندام ہوتے ہیں، پھر تم......''

''نواب تو میں قسمت سے بن گیا ہوں۔ اس سے پہلے تو میں ایک عام آدمی تھا۔ شاید تمہیں یہ نہیں معلوم؟''

''میں جانتا ہوں کہ یہ ریاست اچانک ہی لاٹری کی طرح تمہیں وراثت میں ملی ہے۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

''اب تو اس شخص کا نام بتا دو جو میرے ساتھ ساتھ تمہارا بھی دشمن ہے؟''

اچانک، اس کے سیل فون کی بیل بجنے لگی۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اس لیے میں نے اس کی جیب میں ہاتھ ڈال کر سیل فون نکال لیا۔ غنی نے سیل فون میری ہدایت پر اس کے پاس چھوڑا تھا تاکہ وہ کسی سے بات کرے تو صوبیدار میجر صاحب سن سکیں۔ یہاں کے ہر کمرے میں اسپیکر فٹ تھے۔ ان کی آواز صوبیدار میجر صاحب صاف سن سکتے۔ غنی سے چوک یہ ہوئی کہ وہ اس کے ہاتھ کھولنا بھول گیا۔

میں نے سیل فون کی اسکرین پر نظر ڈالی۔ اس پر کسی کا نام نہیں تھا، بس "A" کالنگ نظر آ رہا تھا۔

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور سیل فون کا بٹن دبا کر اسے آن کر دیا، اس کے ساتھ ہی میں نے سیل فون کا اسپیکر بھی کھول دیا تاکہ ہماری بات وہ حملہ آور بھی سن سکے۔

''ہیلو سجاد...... ہیلو!''

''سجاد تو بہت لمبے سفر پر روانہ ہو چکا ہے۔'' میں نے کہا۔'' اب اسے ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر!''

''خس کم جہاں پاک!'' دوسری طرف سے بولنے والے نے مکروہ آواز میں کہا......'' وہ بم کے دھماکے سے تو نہیں مرا ہو گا کیونکہ میں نے اسے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا۔ محض اس لیے کہ وہ کم از کم نواب یا اس کے کسی قریبی آدمی کی جان لے سکے۔ وہ ایسا ہی جذباتی ہے، خطرے میں گھرتا ہے تو پھر مرنے مارنے پر تل جاتا ہے۔''

''یار، تم اتنی دیر سے بک بک کر رہے ہو، اپنا نام تو بتا دو۔''

''تمہیں میرے نام سے کیا لینا ہے؟'' وہ ہنستے ہوئے بولا۔'' تم بتاؤ، تم کون بول رہے ہو؟''

''میں نواب رفیق بول رہا ہوں۔ مجھے افسوس ہے کہ تمہارا آدمی میرے ہاتھوں مارا گیا۔''

''ویری گڈ!'' دوسری طرف سے کہا گیا۔'' کم سے کم تم سے نہیں تو اس سے تو میری جان چھوٹ ہی گئی۔''

سجاد نے کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور کہا۔'' یار، مجھے نہیں معلوم کہ سجاد سے تمہاری کیا دشمنی تھی؟ میں پوچھوں گا بھی نہیں لیکن یہ تو بتا دو کہ مجھ سے کیا دشمنی ہے؟'' پھر کچھ توقف کے بعد ہنس کر بولا۔ ''اور تم ہو کون؟''

''اب تم اس وقت تک بیٹھے اس سوال پر غور کرتے رہو، جب تک میری گولی تمہاری کھوپڑی میں نہ اتر جائے۔''

''میں ابھی اور اسی وقت مرنے کو تیار ہوں، مگر شرط یہ ہے کہ پہلے اپنا نام بتاؤ۔''

''سوچتے رہو۔'' یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

''یہ تو معلوم ہو گیا کہ تمہارا نام سجاد ہے لیکن یہ معلوم نہیں ہوا کہ تمہیں یہاں بھیجا کس نے تھا۔ اب تو تم نے اپنے کانوں سے اس کی باتیں سن لیں۔ کیا تم اب بھی یہی سمجھتے ہو کہ میں نے جو کچھ کہا، وہ جھوٹ تھا؟''

''نہیں۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔'' اتنا بڑا دھوکا، میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

'' کسے زندہ نہیں چھوڑو گے؟'' میں نے کہا۔ ''یار ویسے تم چہرے اور بات چیت سے تو پڑھے لکھے لگتے ہو؟''

''پڑھے لکھے؟'' اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔''میں نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے انگلش لٹریچر میں ماسٹرز کیا ہے۔''

''ویری گڈ!'' میں نے توصیفی انداز میں کہا۔''اور یہ مارشل آرٹ؟''

''یہ میرا شوق ہے۔ میں نے سات سال تک ایک کورین سے مارشل آرٹ کی تربیت لی ہے۔''

''گڈ!'' میں نے پھر کہا۔''میرے اور تمہارے حالات قدرے ملتے جلتے ہیں۔ میں نے بھی لندن میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے، اس کے ساتھ ساتھ کورین سے ہی مارشل آرٹ کی تربیت بھی حاصل کرتا رہا۔ میرا ٹیچر تربیت کے دوران میں اتنی سختی سے پیش آتا تھا کہ آدمی جان تو نکل ہی جاتی تھی۔ لندن کی سردی میں اس نے صرف ایک ٹراؤزر اور بنیان میں مجھ سے میدان کے دس چکر لگوائے تھے۔ مجھے دوڑ کر وہ میدان عبور کرتا تھا۔ میری نیند کا تو وہ دشمن تھا۔ ادھر میں سویا، ادھر اس نے ٹھنڈے پانی کی بالٹی مجھ پر الٹی۔ ایک سال گزرنے کے باوجود میں اس کی ٹریننگ سے خوف زدہ ہو کر نہیں بھاگا۔''

''ارے!'' سجاد نے کہا۔''تمہارے اس کورین ٹرینر کا نام کیا تھا؟'' سجاد نے پوچھا۔

''ٹرینر نہیں، وہ میرا استاد تھا۔ اس نے مارشل آرٹ کے ساتھ ساتھ زندگی کے مختلف امور سے نبرد آزما ہونے کے گر بھی سکھائے اور یہ بھی بتایا کہ ہارنے والا وہ نہیں ہوتا جو کسی سے مقابلے میں ہار جائے بلکہ ہارنے والا وہ ہوتا ہے جو خود اپنے آپ سے ہار جائے، جو خود ہی ہار مان لے۔''

''ارے!'' وہ حیرت سے بولا۔''یہ تو میرے استاد وانگ یو کا قول تھا۔'' سجاد نے کہا۔

''تمہارا استاد بھی وانگ یو تھا؟'' میں نے پرجوش لہجے میں پوچھا۔'' ویری گڈ! تب تو ہم ایک ہی استاد کے شاگرد ہیں۔'' میں نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ کھول دیے لیکن اس کے باوجود اس کی طرف سے ہوشیار تھا کہ وہ ہاتھ کھلتے ہی مجھ پر حملہ نہ کر دے۔ اب تو میں اس سے مزید محتاط تھا۔ وہ وانگ یو کی شاگردی میں سات سال رہا تھا۔ میں نے تو مشکل سے چار سال بھی نہیں گزارے تھے۔ وانگ یو نے ایک دن خود ہی مجھ سے کہا تھا کہ مجھے جو کچھ آتا تھا، وہ سب کچھ میں تمہیں سکھا چکا ہوں، اس کے باوجود میں سجاد کی طرف سے محتاط تھا۔

میں نے اس کے ہاتھ کھولے تو وہ پرجوش انداز میں مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔ اس کا جسم ٹھوس اور گرفت بہت سخت تھی۔ اسے بھی اندازہ ہو گیا ہو گا کہ وہ بھی کسی عام آدمی سے گلے نہیں مل رہا ہے۔ میں نے بھی جان بوجھ کر اپنی گرفت سخت رکھی تھی۔

''دیکھو سجاد! اب تمہارا اور میرا دشمن مشترکہ ہے۔ اس لیے دشمن کا دشمن کیا ہوتا ہے، دوست! میں تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر میں نے معنی خیز انداز میں اس کی طرف اپنا دایاں ہاتھ بڑھا دیا۔

سجاد بے ساختہ ہنسنے لگا اور میرا ہاتھ تھام کر بولا۔''تم واقعی وانگ یو کے شاگرد ہو۔ دوستی کا ہاتھ بڑھانے کے باوجود مجھ سے محتاط ہو۔ یہ وانگ یو کا خاص اسٹائل تھا کہ کسی سے ہاتھ بھی ملاؤ تو اپنے جسم کو ایسے زاویے پر رکھو کہ دوسرا تم پر حملہ کرے تو اسے اپنے بائیں ہاتھ سے روک سکو۔''

''پہلے تو اس کے لیے کوشش کرنا پڑتی تھی لیکن اب تو یہ عادت بن گئی ہے۔ خیر، اب تو اس کا نام بتا دو۔'' میں نے کہا۔'' جبکہ میں نے دل سے تمہیں دوست مان لیا ہے۔''

''میں ایک شرط پر نام بتاؤں گا۔'' سجاد نے سنجیدگی سے کہا۔

''چلو، وہ شرط بھی بتا دو۔''

''وہ صرف میرا شکار ہے، اسے میں خود اپنے ہاتھوں سے ماروں گا۔''

''مجھے تمہاری یہ شرط منظور ہے۔'' میں نے کہا۔

''اس شخص کا نام ہے دلاور!'' اس نے گویا دھماکا کر دیا۔ میں اب تک اسے زوہیب کا آدمی سمجھ رہا تھا لیکن اس کے انکشاف پر مجھے یاد آیا کہ اس کے بارے میں دلاور نامی شخص سے سیل فون پر بات ہو چکی تھی۔

''کیا میں اب بھی خود کو تمہارا قیدی سمجھوں؟'' سجاد نے کہا۔

''میری طرف سے تم آزاد ہو۔'' میں نے کہا۔'' جب میں زبان سے ایک دفعہ کسی کو دوست کہہ دوں تو اس دوستی کو نبھاتا بھی ہوں، میری طرف سے تم پر کہیں بھی جانے کی پابندی نہیں ہے۔ بس ایک درخواست ہے، ابھی تم یہاں سے باہر نہ ہی نکلو تو بہتر ہے۔ دلاور سمجھ رہا ہے کہ تم مر چکے ہو، ابھی اسے یہی سمجھنے دو۔ جب اسے شکار کرنے کا موقع آئے گا تو تمہیں یہ حق حاصل ہو گا کہ تم خود اسے اپنے ہاتھوں سے ہلاک کر سکو۔ میری رائے تو یہ ہے کہ ابھی تم اسی حویلی میں رہو۔ میرے گارڈز کے علاوہ کسی کو معلوم نہیں ہو گا کہ تم کون ہو؟ تم میرے لندن کے ایک دوست کی حیثیت سے حویلی میں رہو گے۔''

''او کے ڈن!'' سجاد نے مسکرا کر کہا۔''لیکن تمہارا دوست ایسی پھٹیچر حالت میں تو لندن سے نہیں آئے گا۔''

''تم اس کی فکر مت کرو۔ تمہارے اور میرے سائز میں انیس بیس کا فرق ہو گا۔ فی الحال تو تم میرے ایک سوٹ

سے کام چلاؤ۔ کل تمہارے لیے نئے کپڑے بھی آجائیں گے۔''

''اور میرا نام؟'' اس نے کہا۔

''تمہارا نام فرخ ہے، فرخ احسان!''

''ویری گڈ!'' اس نے ہنس کر کہا۔

پھر مجھے اچانک سردار خان اور دوسرے قیدیوں کا خیال آیا۔ میں نے سوچا، سردار خان اگر دلاور کے لیے کام کرتا ہے تو سجاد کو بھی جانتا ہوگا۔ ممکن ہے وہ دونوں قیدی بھی اسے شکل سے پہچانتے ہوں۔ سجاد کے انداز سے لگ رہا تھا جیسے وہ دلاور کے لیے بہت خاص رہا ہوگا۔

''اس کونے والی کوٹھری میں ایک قیدی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''وہ بھی دلاور کے لیے کام کرتا ہے۔ تم اس کے سامنے جاؤ، میں یہیں رہتا ہوں، ممکن ہے وہ تمہیں پہچان لے۔''

میں نے سجاد عرف فرخ کو سردار خان کی کوٹھری کی طرف بھیج دیا۔

سجاد اس کی کوٹھری کے سامنے پہنچا تو سردار خان کی حیرت بھری آواز سنائی دی۔ ''خان جی آپ؟ آپ یہاں کیسے؟''

''آہستہ بولو بے وقوف!'' سجاد نے کہا۔ ''میں تمہیں یہاں سے نکالنے آیا ہوں۔''

''لیکن آپ......''

''دیر مت کرو۔'' سجاد نے کہا۔ ''تم نے کچھ دیر پہلے دھماکے کی آواز نہیں سنی؟ وہ دھماکا میں نے ہی کیا تھا۔ تم تیار ہو جاؤ، میں تالے پر فائر کر رہا ہوں۔'' سجاد نے جیب میں ہاتھ ڈالا، پھر پریشانی سے بولا۔ ''اوہ! میرا ریوالور تو اوپر ہی رہ گیا۔ کوئی بات نہیں، اوپر بھی ہمارے ہی آدمی ہیں، اب یہ حویلی ہمارے قبضے میں ہے۔ میں ابھی آتا ہوں، ہاں تم نے نواب کو دلاور کا نام تو نہیں بتایا تھا؟''

''مجھے مجبوراً بتانا پڑا۔'' سردار خان نے کہا۔ ''ورنہ وہ میرے سامنے میری بیوی اور بچوں کو ذبح کر دیتا۔''

''صرف نام ہی بتایا تھا یا......'' سجاد نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''میں نے صرف نام ہی بتایا تھا اور کچھ نہیں۔''

''اور کچھ کیا ہے بتانے کو؟''

''یہی کہ نواب کی جان کو خطرہ ہے۔ دلاور نے اس کے لیے اٹلی کے ایک کرائے کے قاتل کی خدمات حاصل کی ہیں لیکن اب یہ سب کچھ بتانے سے فائدہ بھی کیا، نواب تو مر چکا ہے۔''

''نواب اتنی آسانی سے نہیں مرے گا۔'' سجاد نے کہا۔ ''وہ بچ نکلا ہے۔''

''ہاں، لندن میں اس کی بیوی بھی خطرے میں ہے۔ اس نے لندن میں بھی تو کسی کرائے کے قاتل کی خدمات حاصل کی ہیں۔''

میرے جسم پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ گویا نور کی جان کو بھی خطرہ تھا۔

''تم ٹھہرو، میں چابیوں کا گچھا یا ریوالور لے کر ابھی آتا ہوں۔'' سجاد نے کہا اور تیزی سے واپسی کے لیے مڑا۔ وہ مجھ سے وحشت زدہ لہجے میں بولا۔ ''میرا سیل فون کہاں ہے؟''

''میرے پاس ہے۔''

''سیل فون جلدی مجھے دو، کہیں دیر نہ ہو جائے۔''

''بات کیا ہے؟'' میں نے گھبرا کر پوچھا۔

''بعد میں بتاؤں گا۔'' اس نے کہا اور سیل فون پر کسی کا نمبر ملانے لگا۔ سلسلہ ملنے پر وہ بولا۔ ''ہیلو جیکسن! سجاد بول رہا ہوں...... نو...... اب اس کی ضرورت نہیں ہے...... آپریشن کینسل...... باقی رقم تمہیں آج ہی مل جائے گی...... او کے......''

''کیا ہوا ہے سجاد! تم اتنے پریشان کیوں ہو گئے؟''

''میں نے ایک امریکن کرائے کے قاتل کو انگلینڈ میں تمہاری وائف کے قتل کا حکم دیا تھا۔ اگر مجھے پانچ منٹ بھی دیر ہو جاتی تو وہ نکل جاتا لیکن اب میں نے اسے روک دیا ہے۔ اس سے پچاس ہزار پاؤنڈز میں سودا ہوا تھا۔ پچیس ہزار اسے ایڈوانس دے دیے تھے، باقی کام ہونے کے بعد۔ وہ بقیہ رقم کا تقاضا کر رہا ہے، میں ابھی لندن میں اپنے ایک دوست کو کال کرتا ہوں کہ وہ جیکسن کو بقیہ رقم بھی پہنچا دے۔''

''تمہارے اس دوست کو دلاور بھی جانتا ہوگا؟''

''ہاں دلاور اس سے نام کی حد تک واقف ہے۔'' سجاد نے کہا۔

''اور جیکسن کو؟''

''وہ جیکسن کو نہیں جانتا۔'' میں نے کہا۔ ''اس نے یہ کام میرے سپرد کیا تھا لیکن اب وہ یہی کام خود کرے گا۔ بھابی کی زندگی اب بھی خطرے میں ہے۔''

''تم جیکسن کا پتا بتاؤ تاکہ بقیہ رقم اسے میں ادا کر دوں۔'' میں نے کہا۔ ''تمہارا دوست دے گا تو ممکن ہے دلاور کو بھی اس بات کا علم ہو جائے اور اسے یہ بھی معلوم ہو جائے کہ تم ابھی زندہ ہو اور اپنے دوستوں سے رابطے میں

''ہاں، یہ بات تو ہے۔'' سجاد نے کہا۔ ''دلاور کے میرے دوست عمران کا سیل نمبر بھی ہے۔''

پھر اس نے مجھے جیکسن کا ایڈریس لکھوایا اور رقم کی ئیگی کا طریقہ کار بھی بتا دیا۔ میں نے اسی وقت راجا کو کال کر کے ہدایت کی کہ اس ایڈریس پر سجاد کی طرف سے پچیس ار پاؤنڈز بھجوا دو۔ وہ مجھ سے تفصیل پوچھنے لگا لیکن میں ے کہا کہ پہلے یہ کام زیادہ ضروری ہے، تفصیل میں بعد میں اؤں گا۔

میں نے سیل فون پر غنی کو طلب کیا تو وہ سجاد کو آزاد دیکھ ر حیران رہ گیا لیکن بولا کچھ نہیں۔

''میرے کمرے سے میرا ایک نیا سوٹ جو میں نے ب تک پہنا نہ ہو، ایک شرٹ، ٹائی، میرے جوتے اور وزے وغیرہ لے آؤ۔ ہاں، شیونگ کا سامان اور پرفیوم یرہ بھی لے آنا لیکن کسی کو بھی معلوم نہ ہو، شہناز کو بھی نہیں، جھ گئے؟'' میں نے کہا۔

''جی سر! سمجھ گیا۔'' غنی نے کہا۔ اس کی آنکھوں میں ی تک حیرت تھی۔ ''اور سنو، صوبیدار میجر صاحب کو یہاں یج دینا۔''

''انہوں نے آپ کی آواز سن لی ہوگی۔ وہ میرے نے سے پہلے ہی اس طرف آ رہے ہوں گے۔'' غنی نے کہا ر باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد صوبیدار میجر صاحب نیچے آگئے۔ وہ کرا کر بولے۔ ''مجھے کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے، میں ب کچھ سن چکا ہوں۔''

''لیکن آپ کو اعتماد میں لینا تو ضروری ہے، آپ غنی، رار اور ان دوسرے گارڈز کو بھی سمجھا دیجیے گا کہ......''

''میں انہیں سمجھا دوں گا۔ پہلے مجھے سوچنے دو کہ وہاں وان کون تھا جب تم نے سجاد کے چہرے سے نقاب اتارا تھا؟''

''وہاں سرور، غنی، احمد شاہ کے علاوہ ایک گارڈ اور بھی تھا۔ اس کی پشت میری جانب تھی اس لیے میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکا تھا۔''

''یہ تو خیر میں معلوم کر لوں گا۔'' صوبیدار میجر صاحب نے کہا، پھر کچھ سوچ کر بولے۔ ''اس دلاور کو آخر تم سے کیا ئی ہو گئی ہے رفیق میاں؟ یہ تو روز روز بڑھتا ہی جا رہا ہے۔''

''ممکن ہے سجاد کو اس بارے میں کوئی علم ہو؟'' میں نے کہا۔ ''میں ابھی اس سے تفصیلی بات کروں گا۔''

دس منٹ کے اندر اندر غنی ایک بیگ میں میرا مطلوبہ سامان لے آیا۔ وہ بیگ اس نے میلی سی ایک چادر میں چھپا رکھا تھا تاکہ کسی کو علم نہ ہو کہ وہ کیا لے کر جا رہا ہے؟

میں نے پہلے سجاد کو شیونگ کا سامان دیا، پھر اسے تہ خانے ہی میں بنے ہوئے باتھ روم میں بھیج دیا۔

نہا دھو کر، نیا سوٹ پہن کر تو اس کی شخصیت ہی بدل گئی۔ اس نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ میں لڑکیوں پر مرنے والوں میں سے نہیں ہوں بلکہ لڑکیاں مجھ پر مرتی ہیں۔

''اب تمہیں کچھ دیر مزید یہاں رہنا ہوگا۔ میں حویلی میں جا کے سب کو بتا دوں کہ میرا ایک دوست فرخ لندن سے آ رہا ہے۔ ہاں، وہاں تمہاری راجا سے ملاقات ہوئی ہے نہ نور سے۔'' میں نے کہا۔ ''تم لندن سے امریکا چلے گئے تھے کئی برسوں بعد لندن آئے تو تمہیں معلوم ہوا کہ میں واپس پاکستان جا چکا ہوں۔ تم نے مجھ سے سیل فون پر رابطہ کیا اور پاکستان آگئے۔ تم اپنے گاؤں سے میرے پاس آئے ہو اور اب کچھ دن میرے پاس ہی قیام کرو گے۔''

''یار، تم تو مجھے بچوں کی طرح پڑھا رہے ہو، میں جانتا ہوں کہ مجھے کیا کہنا اور کرنا ہے۔ تم اس کی بالکل فکر مت کرو۔''

میں تہ خانے سے باہر آگیا اور غنی سے کہا۔ ''سجاد اب میرا مہمان ہے۔ باقی باتیں تمہیں صوبیدار میجر صاحب ابھی تفصیل سے بتا دیں گے۔ ہاں، بس اتنا دھیان رکھنا کہ وہ حویلی سے باہر نہ نکلنے پائے۔''

اور اگر وہ باہر جانے کی کوشش کرے تو؟''

''تو اسے بتا دینا کہ نواب صاحب کا حکم ہے کہ حویلی کا کوئی بھی شخص کچھ دن کے لیے ان کی مخصوص اجازت کے بغیر باہر نہیں جا سکتا۔''

''او کے سر!'' غنی نے کہا لیکن اس کی آنکھوں میں ابھی تک حیرت تھی۔

میں اپنے کمرے میں پہنچا تو شہناز وہاں موجود تھی۔ صرف شہناز، راجا اور غنی کو اجازت تھی کہ وہ میری غیر موجودگی میں بھی کمرے میں بیٹھ سکتے تھے۔ اس کے علاوہ ٹینا یا ڈاکٹر حسن کو بھی میں نے یہ اجازت نہیں دی تھی۔ وہ لوگ یوں بھی میری موجودگی ہی میں کمرے میں آتے تھے۔

''تم عین لنچ کے وقت کہاں غائب ہو گئے تھے؟'' شہناز نے اپنے مخصوص انداز میں پوچھا۔

''میں کچھ ضروری کام نمٹا رہا تھا۔ ویسے بھی مجھے بھوک

نہیں ہے۔ بس کافی کے ساتھ کچھ سینڈوچز لے لوں گا۔'' پھر میں نے چونکنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، لندن سے میرا ایک پرانا دوست فرخ آ رہا ہے۔ ریشم سے کہو کہ اس کے لیے میرے برابر والا کمرا صاف کرا دے۔''

میرے پورشن میں ایک بڑے ڈرائنگ روم سمیت چھ کمرے اور بڑا سا ایک لاؤنج تھا۔ اس کے باہر وسیع وعریض لان تھا۔ میرے کمرے کے بالکل سامنے راجا کا کمرا تھا۔ باقی چار کمرے خالی تھے لیکن وہ ہر طرح سے آراستہ تھے۔ وہ کمرے میں نے خاص مہمانوں کے لیے مخصوص کر رکھے تھے۔

''ان کمروں کی صفائی تو ریشم دن میں دو دفعہ نیلم سے کراتی ہے۔ نیلم ابھی ابھی سب کمروں کی صفائی کر کے گئی ہے۔ ہاں، تمہارے کمرے کی صفائی وہ خود کرتی ہے۔''

آدھے گھنٹے بعد میری لینڈ کروزر حویلی کے اس حصے میں رکی جہاں صرف چند مخصوص گاڑیاں آ سکتی تھیں۔ اس میں سے سجاد اترا۔ غنی نے آگے بڑھ کر میرے کمرے تک اس کی رہنمائی کی۔

وہ بہت باوقار انداز میں چلتا ہوا میرے کمرے تک آیا۔ میں اس کے استقبال کے لیے پہلے ہی کمرے سے باہر نکل آیا تھا۔

میرے نزدیک آ کر وہ والہانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گیا اور آہستہ سے بولا۔ ''کیسی اداکاری ہے؟''

''فرخ! کیسے ہو تم؟'' میں نے بلند آواز میں کہا۔ ''تم تو لندن سے ایسے غائب ہوئے جیسے......''

''تمہارے سر سے سینگ!'' فرخ نے جملہ پورا کر دیا پھر ہنستے ہوئے آہستہ سے بولا۔ ''سوری!''

''سوری کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے بھی آہستہ سے کہا اور اسے لے کر اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ غنی نے وہی بیگ اٹھا رکھا تھا جس میں وہ یہاں سے سجاد کے لیے کپڑے لے گیا تھا، میں جانتا تھا کہ بیگ بالکل خالی ہے لیکن غنی یوں چل رہا تھا جیسے وہ خاصا وزنی ہو۔ اس نے وہ بیگ سجاد کے لیے مخصوص کیے گئے کمرے میں رکھ دیا۔

میں نے ریشم سے کافی، سینڈوچز اور دوسرے لوازمات لانے کو کہا۔ وہ حسبِ عادت ہوا کے جھونکے کی طرح نکل گئی۔

ڈاکٹر شہناز دستک دے کر کمرے میں داخل ہوئی تو سجاد احتراماً کھڑا ہو گیا۔

میں نے سجاد کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''میرے بہت پرانے دوست فرخ احسان اور فرخ! یہ ڈاکٹر شہناز ہیں۔ ست بدھائی کے اسپتال کی ایڈمنسٹریٹر اور میری بہن؟''

''تیری بہن؟'' سجاد نے بے تکلفی سے کہا۔ ''یار جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، تیری کوئی بہن نہیں تھی۔''

''بھابی بھی تو بہن ہی ہوتی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ ہمارے دوست راجا کی ہونے والی......''

''بس اتنا تعارف کافی ہے۔'' شہناز نے مسکرا کر کہا۔ ''فرخ صاحب! آپ سیدھے لندن سے آ رہے ہیں؟''

''نہیں، میں پہلے اپنے گاؤں گیا تھا۔ وہاں میری بہن ہے، والدین تو اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ میں سال میں ایک آدھ دفعہ پاکستان ضرور آتا ہوں۔''

''یار، تو لندن میں تھا اور مجھ سے وہاں تیری ملاقات نہیں ہوئی۔''

''ڈاکٹر صاحبہ میں گزشتہ پانچ سال سے ہیوسٹن میں مقیم ہوں۔'' سجاد نے کہا۔ ''کافی عرصے بعد لندن گیا تو مجھے اس سے ملنے کا خیال آیا۔ میرے پاس تو اس کا سیل نمبر بھی نہیں تھا۔ لاہور میں ہمارے ایک مشترکہ دوست عمران کے پاس اس کا سیل نمبر تھا۔ میں نے اس سے سیل فون پر بات کی اور اسے بتایا کہ میں پاکستان آ رہا ہوں۔ اس نے مجھے ریاست ست بدھائی کا ایڈریس بتا کر کہا۔ ''تو گاؤں آ کر مجھے فون کر دینا۔ میں اسے سرپرائز دینا چاہتا تھا لیکن پھر میں نے سوچا کہ رفیق ست بدھائی سے باہر نہ ہو اس لیے آج چلنے سے پہلے اسے فون کر لیا تھا۔ اس وقت یہ مجھے بہت پریشان لگ رہا تھا۔ پریشان تو خیر یہ اب بھی ہے لیکن ظاہر نہیں کر رہا ہے۔ یہ اس کی پرانی عادت ہے۔''

''یار تو ڈاکٹر شہناز کو بتا رہا ہے یا ان سے پوچھ رہا ہے؟'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''میری عادتوں کے بارے میں ان سے پوچھ، انہیں بتانے کی کوشش مت کر۔''

ریشم کافی اور دیگر لوازمات کی ٹرالی لے کر آ گئی۔ اس میں سینڈوچز کے علاوہ فش فرائی، پکوڑے، شامی کباب، گاجر کا حلوہ اور جانے کیا کچھ تھا۔

''او بھائی، کیا تو مجھے رات کو کھانا نہیں کھانے دے گا جو اتنا کچھ منگوا لیا؟'' سجاد نے ہنس کر کہا۔

''ابے یار، مجھے اندازہ ہے کہ تو نے لنچ بھی نہیں کیا ہوگا۔ تو بے تکلف ہو کر کھا، رات کا کھانا میں رات کو گیارہ بجے سے پہلے نہیں کھاتا۔''

سجاد رات کا بھوکا تھا، اس نے ہر چیز کے ساتھ پورا

انصاف کیا۔ شہناز کافی پی کر چلی گئی تھی۔ اسے یوں بھی ...ہوئی تھی کہ سجاد، نور اور راجا سے ملا ہی نہیں تھا۔ اگر وہ ...سے ملا ہوتا تو شہناز اس سے دو چار باتیں مزید کر لیتی۔

کافی بلکہ کھانے سے فارغ ہو کر سجاد نے سگریٹ سلگا ...صوفے پر پھیل کر بیٹھ گیا۔

''ہاں سجاد! اب مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔ تم ...کے ساتھ کب سے ہو اور کیا کام کر رہے ہو؟''

''رفیق! میں تمہارا مہمان ہوں۔ پہلے تم مجھے اپنے ...ے میں بتاؤ۔''

''میرے بارے میں تمہیں بہت کچھ تو دلاور سے ...م ہو گیا ہوگا۔ جو باتیں نہیں معلوم ہیں، وہ میں بتا دیتا ...۔'' میں نے کہا اور اسے مختصراً اپنے بارے میں بتا دیا۔

سجاد نے دوسرا سگریٹ سلگایا پھر یوں خلا میں تکنے لگا ...، ماضی میں جھانک رہا ہو۔ کچھ توقف کے بعد وہ کھوئے ...ئے انداز میں بولنے لگا۔

☆☆☆

میں دو بہنوں کا اکلوتا بھائی ہوں۔ دونوں بہنیں مجھ ...، بڑی تھیں اس لیے اماں، ابا سمیت میں سب کا لاڈلا تھا۔ ...ا گاؤں ساون پور گجرات سے تقریباً پینتیس کلومیٹر کے ...ملے پر ہے۔ میرے والد بہت بڑے تو نہیں لیکن اچھے ...ے زمیندار تھے۔ ہماری زمین پچیس مربع تھی۔ گھر میں ...کی ریل پیل تھی، میں گھر بھر کا لاڈلا تو تھا ہی، پیسے کی ...وانی اور بے جا لاڈ پیار نے مجھے بگاڑ دیا۔

بابا نے مجھے گاؤں کے اسکول میں داخل کرا دیا۔ ایک ...ل تک تو میں نے ایک لفظ بھی پڑھ کر نہ دیا۔ اکثر میں ...کول جاتا ہی نہیں تھا۔ اپنے جیسے دوستوں کے ساتھ کھیتوں ...ں نکل جاتا۔ ہم لوگ سارا وقت کھیتوں میں آوارہ گردی ...رتے، لوگوں کے باغوں سے پھل چرا کر کھاتے، نہر میں ...اتے اور چھٹی کے وقت گھر آ جاتے۔ پھر ایک دن بابا ...رے بارے میں پوچھنے اسکول گئے تو انہیں معلوم ہوا کہ ...جاد تو گزشتہ پندرہ دن سے اسکول ہی نہیں آیا۔ پندرہ دن ...پہلے بھی وہ صرف دو دن اسکول آیا تھا یعنی میں پورے مہینے ...میں صرف دو دن اسکول گیا تھا۔

اس دن بابا نے گھر آ کر پہلی دفعہ میری پٹائی کی۔ مجھے ...اندازہ نہیں تھا کہ بابا غصے کے اتنے تیز ہیں، میں نے تو ان کا ...غصہ دیکھا ہی نہیں تھا۔

پھر میں باقاعدگی سے نہ صرف اسکول جانے لگا بلکہ ...پڑھنے بھی لگا لیکن اسکول کے بعد میری وہی مصروفیات رہیں۔ بابا چاہتے تھے کہ میں ان آوارہ لڑکوں کی دوستی چھوڑ دوں۔ اس لیے انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ وہ مجھے پڑھنے کے لیے مری بھیج دیں گے۔ اماں اور بہنوں نے بہت احتجاج کیا۔ میں خود بھی وہاں جانے پر راضی نہیں تھا لیکن بابا کا فیصلہ ہمیشہ اٹل ہوتا تھا۔

پہلے تو میرا دل وہاں نہیں لگا لیکن چند ہی دن میں میری وہاں کئی لڑکوں سے دوستی ہو گئی۔ وہ سب معزز اور دولت مند خاندانوں کے بیٹے تھے۔ کسی کا باپ بڑا فوجی افسر تھا، کوئی سیکریٹری، چیف سیکریٹری کا بیٹا، کوئی کسی سیاست دان اور کوئی کسی جاگیردار یا صنعت کار کا بیٹا تھا۔ وہ سب اعلیٰ خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ میں اب تک گاؤں کے آوارہ لڑکوں کے ساتھ رہا تھا اس لیے مجھے وہاں کا ماحول سمجھنے میں کئی ہفتے لگے لیکن میری دوستی وہاں جاتے ہی دو تین زمیندار گھرانوں کے لڑکوں سے ہو گئی تھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ بابا کا فیصلہ میرے حق میں بہتر ہی تھا۔

میں ابھی پڑھ ہی رہا تھا کہ میری دونوں بہنوں کی ایک ساتھ شادی ہو گئی۔

میں گھر آتا تو عجیب سی ویرانی اور وحشت کا احساس ہوتا۔ بابا زمینوں پر ہوتے اور اماں گھر کے کاموں میں مصروف ہوتیں۔ پرانے دوستوں سے اب ملنے کو دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ ہوسٹل میں رہ کر میں بہت سدھر گیا تھا۔

میٹرک تک پہنچتے پہنچتے میں روانی سے انگریزی بولنے لگا۔

میں میٹرک کا امتحان دے کر فارغ ہی ہوا تھا کہ بابا کا انتقال ہو گیا۔ میرا ارادہ تھا کہ میٹرک کرنے کے بعد میں لاہور میں ایچی سن کالج میں داخلہ لوں گا لیکن بابا کے انتقال کے بعد زمینداری کا سارا بوجھ مجھ پر پڑ گیا۔ پھر وہی روایتی کہانی دہرائی گئی۔ میری زمینیں تایا اور ان کے بیٹوں نے ہتھیا لیں اور مجھے زمین سے بے دخل کر دیا گیا۔

اماں کو یہی غم لے گیا۔ ان کے انتقال کے بعد گاؤں میں میرا تھا ہی کون؟ دونوں بہنیں مختلف علاقوں میں تھیں۔ میں گاؤں چھوڑ کر شہر آ گیا۔

وہاں میرا ایک دوست رہتا تھا جس کے والد سیاست میں تھے۔ ان دنوں الیکشن ہو رہے تھے۔ میرے دوست کے والد کی انتخابی مہم بھی زوروں پر تھی۔ میں نے دن رات ان کے لیے کام کیا۔ وہ الیکشن میں کامیاب ہوئے تو انہیں مرکزی وزارت مل گئی۔ میں اس وقت تک ان ہی کے گھر میں مقیم تھا اور ملازمت بھی تلاش کر رہا تھا لیکن ایک میٹرک پاس

نوجوان کو ملازمت کیسے مل سکتی تھی۔

اپنے دوست کے والد کو میں انکل کہتا تھا۔

ایک دن انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ ”سجاد، تم لندن جاؤ گے؟“

”میں..... میں بھلا کیسے جاسکتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”میں تمہیں اور عمران کو لندن بھجوا رہا ہوں۔ تیاری کرلو۔“

انہوں نے مجھے اور عمران کو لندن بھجوا دیا۔ مجھے اتنا یقین ہے کہ اس میں ان کا کوئی پیسا خرچ نہیں ہوا ہوگا۔ وہ سب کچھ قومی خزانے سے کہا گیا ہوگا۔

لندن آنے کے بعد ہمیں وہاں کے ایک کالج میں ایڈمشن مل گیا۔ ابتدائی دو سال تو مجھے کوئی مالی پریشانی نہیں ہوئی کیونکہ عمران کے والد اسے اتنے پیسے بھیج دیتے تھے جو ہم دونوں کی ضرورت سے زیادہ ہوتے تھے۔ پھر وہ اتنے ہی پیسے بھیجنے لگے جو عمران کے لیے کافی ہوتے تھے۔ میں نے یہ دیکھ کر وہاں مختلف چھوٹی موٹی ملازمتیں کیں لیکن اپنی پڑھائی جاری رکھی۔ اس دوران میں مجھے مارشل آرٹ کا شوق پیدا ہوا، اس کا احوال تو میں سنا ہی چکا ہوں۔ عمران نے تو پڑھ کر نہ دیا البتہ اس نے وہیں ایک میم سے شادی کرلی اور وہیں رہ گیا۔ میں نے بھاگ دوڑ کر کے آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ اس دوران میں میری مارشل آرٹ کی تربیت بھی جاری رہی۔

آکسفورڈ سے انگلش ادب میں ماسٹرس کرنے کے بعد مجھے وہاں ایک بڑی فرم میں بہت اچھی ملازمت مل گئی۔

ملازمت ملنے کے دو سال بعد مجھے اطلاع ملی کہ میری بڑی بہن کا انتقال ہوگیا ہے۔ میں کئی سال بعد پاکستان آیا۔ دونوں بہنیں اپنے گھروں میں خوش تھیں۔ ان کے بچے بھی اب کافی بڑے ہوگئے تھے۔

میں ایک مہینا رہنے کے بعد جب دوبارہ لندن جارہا تھا تو کراچی ایئرپورٹ پر میری ملاقات دلاور سے ہوگئی۔ وہ بہت خوش اخلاقی سے ملا اور مجھے بتایا کہ ”میں بھی گجرات کا رہنے والا ہوں۔ پھر اس نے مجھ سے کہا کہ یار سجاد! کافی پینے کا موڈ ہورہا ہے۔ ابھی فلائٹ میں تو دیر ہے۔ ایک ایک کپ کافی پی لیتے ہیں۔ تم بیٹھو، میں کافی لے کر آتا ہوں۔“

دلاور عمر میں مجھ سے بڑا تھا، میں نے کہا۔ ”آپ تکلیف مت کریں۔ میں کافی لے آؤں گا۔“

میں کافی لینے چلا گیا۔ جب میں کافی لے کر آرہا تھا تو میری نظر بک اسٹال پر رکھی ایک کتاب پر پڑی۔ مجھے اس کتاب کی تلاش تھی۔ میں تھرل اور ایکشن ناولز کا شوقین تھا اور وہ تھرل اور ایکشن سے بھرپور ناول تھا۔ بک اسٹال کافی شاپ سے کچھ فاصلے پر تھا، میں نے سوچا کہ کافی پینے کے بعد میں یہ کتاب خرید لوں گا۔

میں مخالف سمت سے دلاور کی طرف آیا تھا۔ اس کی نظریں اس طرف تھیں جدھر کافی شاپ تھی، میں نے اسے عجیب حرکت کرتے دیکھا۔ اس نے میرے سوٹ کیس کے کور کا ایک کونا اٹھا کر اس میں کوئی چیز ڈالی تھی۔

میں نے اس پر ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میں نے اسے یہ حرکت کرتے ہوئے دیکھ لیا ہے۔

کراچی کسٹم سے تو ہم بہ خیر و عافیت نکل آئے۔ میں کسٹم کرانے کے بعد جان بوجھ کر دلاور کی نظروں سے اوجھل ہوگیا اور اپنا سوٹ کیس کھول کر دیکھا۔ اس میں ایک طرف ایک تھیلی پڑی ہوئی تھی۔ میرا اندازہ ہے کہ اس کا وزن تقریباً آدھا کلو ہوگا۔ اس میں سفید رنگ کا سفوف سا تھا۔

میرے ذہن میں اچانک جھماکا سا ہوا کہ یہ ہیروئن ہے، دلاور مجھے کیریئر کے طور پر استعمال کررہا ہے۔ میں نے سوٹ کیس سے وہ تھیلی نکال کر اپنے بریف کیس میں رکھ لی۔ میرا سوٹ کیس کارگو میں چلا گیا۔ بریف کیس میرے پاس ہی تھا۔

دلاور کی نشست مجھ سے کافی فاصلے پر تھی۔

جہاز نے پرواز شروع کی تو میرے ساتھ بیٹھا ہوا بوڑھا سا ایک انگریز اونگھنے لگا، پھر اس نے اپنی سیٹ پیچھے کی طرف کی اور آنکھوں پر بلائنڈ فولڈ لگا کر سو گیا۔ میں نے وہ تھیلی اپنے بریف کیس سے نکال کر اس کے بیگ میں ڈال دی۔

لندن ایئرپورٹ پر ہماری بہت سخت چیکنگ ہوئی۔ دلاور دانستہ مجھ سے دور رہا کہ اگر میں پکڑا بھی جاؤں تو وہ بچ کر نکل جائے۔ اس کی چیکنگ مجھ سے پہلے ہوگئی۔ کئی مسافروں کے بعد میرا نمبر آیا۔

کسٹم حکام نے میرا سوٹ کیس اور بریف کیس دونوں کھلوا کر دیکھے اور مجھے جانے کی اجازت دے دی۔

وہ انگریز وہاں کا کوئی معزز آدمی تھا جو میرے ساتھ بیٹھا تھا۔ کسٹم حکام نے اس کا سامان کھولے بغیر اسے فارغ کردیا۔

دلاور باہر میرے انتظار میں کھڑا تھا۔ وہ ہنس کر بولا۔

”یار سجاد! تم نے بہت دیر لگادی؟“

”ہاں، چیکنگ میں اتنی دیر ہوگئی۔“ میں نے کہا۔

”اب تم کہاں جاؤ گے؟“ دلاور نے پوچھا۔

میں نے لندن سے کچھ فاصلے پر چھوٹا سا ایک

فلیٹ لے رکھا تھا۔ میں نے کہا کہ میں اپنے گھر جاؤں گا۔

”ارے اس وقت اتنی شدید سردی میں اتنی دور کہاں جاؤ گے۔ میرا اپارٹمنٹ لندن میں ہی ہے، رات میرے ساتھ گزارلو۔ صبح چلے جانا۔ ویسے بھی گھر میں تمہارا انتظار کرنے والا کون ہے؟“

اس کے اصرار پر میں اس کے ساتھ ہی روانہ ہوگیا۔ میں خوب سمجھ رہا تھا کہ وہ مجھے اپنے گھر لے جانے کے لیے اتنا اصرار کیوں کررہا ہے۔

اپارٹمنٹ پہنچ کر اس نے مجھ سے کہا تم کپڑے وغیرہ بدل کر اطمینان سے بیٹھو، میں کافی بناتا ہوں۔ میں نے سوٹ کیس کھول کر اپنے کپڑے نکالے اور باتھ روم میں چلا گیا۔

میرے جاتے ہی وہ میرے سوٹ کیس کی طرف لپکا، میں فوراً ہی واپس آگیا۔ وہ دیوانہ وار میرے سوٹ کیس کی تلاشی لے رہا تھا۔

میں نے اچانک کہا۔ ”دلاور صاحب! یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟“

وہ بری طرح چونک اٹھا پھر بولا۔ ”کراچی ایئرپورٹ پر میں نے ایک چیز تمہارے سوٹ کیس میں رکھی تھی، وہی ڈھونڈ رہا ہوں۔“

”میرے سوٹ کیس میں کیوں رکھی تھی؟“ میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔ ”اور آپ نے کب وہ چیز رکھی، مجھے تو یاد نہیں۔“

”تم اس وقت کافی لینے گئے ہوئے تھے، میرے سامان کا وزن زیادہ تھا۔ میں نے سوچا کہ تمہارے پاس اتنا وزن نہیں ہے اس لیے میں نے تمہارے سوٹ کیس کا کور سائڈ سے ہٹا کر وہ چیز اس میں ڈال دی تھی۔“

”تو پھر اسی میں ہوگی۔“ میں نے کہا۔ ”میں نے تو اس کے بعد سوٹ کیس کھولا ہی نہیں ہے۔ ابھی آپ کے سامنے کھول کر کپڑے نکالے ہیں۔ میں ٹوتھ پیسٹ اور برش بھول گیا تھا، وہی لینے آیا ہوں۔“ میں نے سوٹ کیس کی سائڈ پاکٹ سے ٹوتھ پیسٹ اور برش نکالا، پھر بولا۔ ”اچھی طرح چیک کرلیں، میں جب تک کپڑے بدل کر آتا ہوں۔“

میں کپڑے بدل کر آیا تو میرا سارا سامان بکھرا ہوا تھا۔ کپڑے، کتابیں، سگریٹ کے پیکٹ، لائٹر اور تمام چیزیں سوٹ کیس سے باہر تھیں۔ دلاور نے میرا بریف کیس بھی کھول لیا تھا۔ اس کا سارا سامان بھی باہر نکلا ہوا تھا۔ میں نے سب سے پہلے اپنا پاسپورٹ اٹھا کر جیب میں رکھا اور انجان بن کر اس سے پوچھا۔ ”ارے، آپ نے تو میرا سامان ہی بکھیر دیا۔ آپ کو وہ چیز ملی نہیں؟“

”زیادہ ہوشیار مت بنو، میں نے تھیلی تمہارے ہی سوٹ کیس میں ڈالی تھی۔“

”میرا سوٹ کیس آپ کے سامنے ہے، اس کی ہر چیز باہر بکھری ہوئی ہے۔ میں نے آپ ہی کے سامنے سوٹ کیس کھول کر کپڑے نکالے ہیں۔ اگر وہ تھیلی یا جو کچھ بھی تھا، وہ سوٹ کیس ہی میں ہونا چاہیے۔“

”تم اتنے سیدھے ہو نہیں، جتنے نظر آتے ہو، سیدھی طرح وہ تھیلی میرے حوالے کرو۔“

”کون سی تھیلی؟“ میں نے بھی درشت لہجے میں کہا۔

”جانتے ہو اس تھیلی کی مالیت کیا تھی؟ چالیس لاکھ روپے!“

”کیا تھا اس تھیلی میں؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”مجھ سے اڑنے کی کوشش مت کرو۔“ اس نے اچانک پستول نکال لیا۔

پستول اس کے فلیٹ میں موجود ہوگا کیونکہ فلائٹ پر تو کسی بھی قسم کا اسلحہ لے جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

”وہ تھیلی دیتے ہو یا میں تمہاری کھوپڑی میں سوراخ کردوں؟“

”میں نہیں جانتا کہ تم کس تھیلی کی بات کررہے ہو؟“ میں نے کہا۔

”صاف صاف بتاؤں؟“ اس نے کہا۔ ”اس تھیلی میں آدھا کلو خالص ہیروئن تھی۔“

”ہیروئن تھی یا ہیرو۔“ میں نے جھنجلا کر کہا۔ ”میں بھلا کیا جانوں کہ وہ تھیلی کہاں ہے؟“

”میں آخری مرتبہ پوچھ رہا ہوں، پھر میں فائر کردوں گا۔ بتاؤ وہ تھیلی کہاں گئی؟“

وہ میری لات کی رینج میں تھا۔ میں نے گھوم کر اچانک اس کی پستول والی کلائی پر زوردار لات ماری۔ پستول اس کے ہاتھ سے اچھل کر دور جا گرا۔ دوسری لات میں نے اس کے سینے پر ماری تو وہ پیچھے کی طرف الٹ گیا۔ میں اس کے سینے پر سوار ہوگیا اور اس کی گردن دبوچ لی۔ پھر میں نے غرا کر کہا۔ ”آئندہ مجھے پستول دکھانے کی کوشش مت کرنا ورنہ تمہاری یہ بیل جیسی گردن سوکھی لکڑی کی طرح توڑ دوں گا۔ اب میں یہاں نہیں ٹھہروں گا۔“ میں نے اس کا پستول اٹھاتے ہوئے کہا، پھر میں نے اپنا سارا سامان سوٹ کیس اور بریف کیس میں بھرا اور وہاں سے باہر نکل آیا۔

دلاور بے بسی سے مجھے دیکھتا رہ گیا۔

اس نے یقیناً میری ٹیکسی کا پیچھا کیا ہوگا کیونکہ دوسرے دن جب میں اپنے فلیٹ میں داخل ہوا تو وہاں دو بدمعاش پہلے سے موجود تھے۔

''کون ہو تم لوگ؟'' میں نے پوچھا۔

''منے!'' ان میں سے ایک طنزیہ لہجے میں بولا۔''ڈیوڈ کے سامنے اونچی آواز میں بولنے والا پھر کبھی بولنے کے قابل نہیں رہتا۔ وہ تھیلی ہمارے حوالے کردو جو دلاور نے تمہارے سوٹ کیس میں ڈالی تھی ورنہ قتل کرنا ہمارا پیشہ ہے۔''

''اچھا۔'' میں نے یوں کہا جیسے ان سے خوف زدہ ہوگیا ہوں۔''اب تم لوگ آئے ہو تو میں انکار تو نہیں کرسکتا۔'' میں یہ کہہ کر بہ ظاہر الماری کی طرف بڑھا لیکن اچانک میں نے ان میں سے ایک کے چہرے پر زوردار گھونسا رسید کر دیا۔ اس سے پہلے کہ دوسرا سنبھلتا، میں نے اسے بھی ایک زوردار لات رسید کردی۔ میرے پاس دلاور کا پستول موجود تھا۔ میں نے اچانک پستول نکال لیا اور ان سے کہا۔''اب تم نے ہلنے کی کوشش کی تو پھر کبھی ہلنے کے قابل نہیں رہو گے۔''

وہ دونوں چھٹے ہوئے بدمعاش تھے۔ میں نے اطمینان سے ان کی تلاشی لی۔ ان میں سے ایک کی جیب سے ایک ریوالور برآمد ہوا اور دوسرے کی جیب سے بڑا سا ایک شکاری چاقو! میں نے دونوں چیزیں اپنے قبضے میں کیں، پھر ان دونوں کو بری طرح دھن کر رکھ دیا۔ ان میں سے ایک کا ہاتھ توڑ دیا اور دوسرے کے سامنے کے تین دانت توڑ دیے۔ وہ میرے سامنے ہاتھ جوڑنے لگے۔

میں نے کہا۔''آج تو میں تمہیں زندہ چھوڑ رہا ہوں، آئندہ اگر میرے فلیٹ کا رخ بھی کیا تو پولیس تمہاری لاشیں ہی اٹھائے گی یہاں سے۔'' پھر میں نے دونوں کو ایک ایک لات رسید کی اور فلیٹ سے باہر پھینک دیا۔

وہ دونوں لندن کے سکہ بند بدمعاش تھے۔ ان کا حشر دیکھ کر دلاور کے ہوش ٹھکانے آگئے۔

اس نے ایک دن مجھے صلح کی پیش کش کردی۔

پھر وہ مجھ سے روز ہی ملنے لگا۔ میں بھی نادانستہ طور پر اس کے جال میں الجھتا چلا گیا۔ اس نے ایک موقعے پر میرے ہاتھوں ایک آدمی کا قتل کرایا اور خفیہ کیمرے سے اس کی ویڈیو فلم بنالی۔ پھر اس نے مجھے بلیک میل کرنا شروع کر دیا۔ میں نے اس کے اشارے پر ایسے ایسے خطرناک کام کیے کہ وہ حیران رہ گیا۔

ایک دن اچانک مجھے اپنی زمینوں کا خیال آیا۔ میں نے دلاور سے اس کا تذکرہ کیا۔ دلاور اب بہت قوت پکڑ چکا تھا۔ وہ منشیات کے ساتھ ساتھ اسلحے کی اسمگلنگ بھی کر رہا تھا۔ دنیا بھر میں زیر زمین مافیاز سے اس کے تعلقات تھے۔ پاکستان میں بھی اس کا نیٹ ورک تھا۔ اس کے آدمیوں نے ایک مہینے کے اندر اندر میری زمین سے تایا اور ان کے پٹھوؤں کو نکال باہر کیا اور زمین دوبارہ میرے نام ہوگئی۔ میں نے وہ زمین دونوں بہنوں میں آدھی آدھی بانٹ دی۔ بس اس کے بعد سے میں دلاور کے ساتھ ہوں۔''

☆☆☆

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہوگیا۔ چند لمحے سکوت طاری رہا، پھر میں نے اس سے پوچھا۔''یہ تو بتاؤ کہ دلاور تمہارا دشمن کیسے ہوگیا؟''

''دلاور اور میرے درمیان چالیس اور ساٹھ فیصد کی شراکت ہے۔ گزشتہ مہینے ہم نے اسلحے کی ایک بہت بڑی کھیپ پاکستان اسمگل کی تھی۔ اس میں میرا منافع کروڑوں میں بن رہا تھا۔ دلاور نے مجھے صرف بیس فیصد پر ٹرخانا چاہا۔ میں بھی اڑ گیا کہ اپنا پورا حصہ وصول کروں گا۔ دلاور سے تلخ کلامی ہوئی۔ اس نے ریوالور نکالنے کی کوشش کی تو میں نے اسے دھنک کر رکھ دیا۔ ویسے وہ بہت جی دار اور بہترین فائٹر ہے، صرف مجھ سے خوف کھاتا ہے کیونکہ میں نے اس کے سامنے دنیا کے بڑے بڑے بدمعاشوں کو کتے کی طرح مارا ہے۔ ایسے بدمعاش جن کی دہشت سے لوگ کانپتے تھے۔ دلاور کے دل میں بھی میری دہشت بیٹھ گئی ہے۔ اب وہ خاصا طاقت ور ہوگیا ہے اور مجھ سے چھٹکارا پانا چاہتا ہے۔ اسی لیے اس نے مجھے یہاں بھیجا تھا، پھر اس نے وہ راستہ ہی مسدود کردیا کہ اگر میں حویلی کے گارڈز سے بچ بھی گیا تو بم سے نہیں بچ سکوں گا۔''

''لیکن وہ جو کہتے ہیں نا کہ جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔''میں اگر تمہیں زندہ پکڑنے کا حکم نہ دیتا تو میرے گارڈز تمہیں لمحوں میں چھلنی کر دیتے۔'' پھر میں نے اس سے پوچھا۔''اب یہ بتاؤ کہ دلاور میرا دشمن کیوں ہوگیا؟''

''مجھے اس بارے میں علم نہیں ہے۔ وہ مجھے صرف ٹاسک دیتا تھا۔ میں بھی اس کی غرض وغایت نہیں پوچھتا تھا۔'' سجاد نے کہا۔''اس نے مجھے صرف اتنا بتایا تھا کہ ایک پارٹی نے نواب رفیق کو ختم کرنے کا دس کروڑ روپیہ دیا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ آخر نواب رفیق میں ایسی کون سی بات ہے جس کے لیے وہ پارٹی دس کروڑ دے رہی ہے۔ اس نے کہا کہ ہمیں تو اپنے معاوضے سے غرض ہے۔ پارٹی نے پانچ کروڑ ایڈوانس بھی دے دیے ہیں۔ اس میں سے دو کروڑ

[...]نے مجھے بھی دے دیے کہ یہ تمہارا حصہ ہے اور کام تم ہی کو [...]ہے۔ قتل ایسا ہو کہ حادثہ معلوم ہو۔ اس سے پہلے اسے [...]شت زدہ کردو کہ وہ اپنے سائے سے بھی بدکے۔''

''[...]ینہ سے ست بدھائی آتے ہوئے مجھ پر جو حملہ ہوا [...]وہ تم ہی نے کرایا تھا؟''

''ہاں، وہ حملہ میں نے ہی کرایا تھا۔ میں نے اپنے [...]یوں کو تاکید کردی تھی کہ اس حملے میں نواب رفیق کو [...]ان نہیں پہنچنا چاہیے، اسے صرف دہشت زدہ کرنا ہے۔ [...]بے وقوفوں نے تمہیں دہشت زدہ کرنے کے لیے [...]رے گارڈز کی ایک گاڑی بھی دھماکے سے اڑا دی۔ وہ تو [...]گاڑی محض اتفاقاً پیچھے نہ رہ جاتی تو تمہارا بچنا بھی مشکل تھا [...]تمہارے گارڈز کی ہمت کو داد دینے کو جی چاہتا ہے۔ [...]ں نے حملہ آوروں میں سے ایک کو بھی نہیں چھوڑا۔ اگر وہ [...]ے بچ جاتے تو میں انہیں خود گولی مار دیتا۔ میرا اصول ہے [...]جتنا کہا جائے، اتنا ہی کرو، میں خود بھی اسی اصول پر عمل [...]تا ہوں اور چاہتا ہوں کہ میرے ساتھ جو لوگ کام کریں، [...]ی اسی اصول پر عمل کریں۔ اس دن مجھے تمہاری سیکیورٹی [...]انتظامات دیکھ کر یہ اندازہ ہوا کہ وہ پارٹی تمہیں قتل [...]انے کے اتنے پیسے کیوں دے رہی ہے۔ اس کے ساتھ [...]رط بھی تھی کہ قتل حادثہ معلوم ہو۔''

''لیکن تم مجھے قتل کرنے حویلی کے اندر تو آگئے [...]ے؟'' میں نے کہا۔

''ہاں، حویلی میں تمہارا قتل ہوتا تو کوئی کسی پر انگلی نہیں [...]اٹھا سکتا تھا۔ اتنے زبردست سیکیورٹی انتظامات کے ہوتے [...]ئے اگر قتل ہوا بھی تو کیسے ہوا ہے۔ پولیس تو یہی رائے قائم [...]رتی کہ نواب کو اس کے ہی کسی آدمی نے قتل کردیا ہے۔ باہر [...]ے تو کسی کے اندر آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔''

''پھر تم نے مجھے قتل کیوں نہیں کیا؟''

''اس کی وجہ میں پہلے بتا چکا ہوں۔ اپنی اس عادت [...]سے پہلے بھی مجھے کئی دفعہ نقصان پہنچا ہے لیکن اس دفعہ تو میری [...]ن کے لالے پڑ گئے تھے۔ وہ تو اللہ کا شکر ہے کہ میں نے [...]اتے میں تم پر فائر نہیں کیا ورنہ میں بھی بم دھماکے میں اڑ جاتا [...]پولیس کو میری لاش کے ٹکڑے ملتے تو کوئی کچھ بھی ثابت [...]نہ کرسکتا تھا۔ دلاور تو پولیس کے سامنے برملا یہ کہتا ہے کہ [...]بہت سرکش ہوگیا ہے۔ بہت سے کام یہ میری مرضی کے [...]خلاف اور مجھے بتائے بغیر ہی کرلیتا ہے۔ پولیس کے اعلیٰ [...]افسران بھی اس کی مٹھی میں ہیں بلکہ اب تو کئی بڑے سیاست [...]دان، بیوروکریٹس اور صنعت کار بھی دلاور کی مٹھی میں ہیں۔

وہ ان کے ذریعے اپنے کام نکالتا ہے۔ جب دلاور ہی اس حملے سے لاتعلقی کا اظہار کرتا تو کون پوچھتا کہ سجاد کون تھا اور کہاں گیا؟''

''تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔'' میں نے کہا۔''پولیس یہی سمجھتی کہ تم کسی طرح حویلی میں داخل ہونے میں کامیاب ہوگئے لیکن فرار ہوتے وقت نواب رفیق کے حفاظتی انتظامات کا شکار ہوگئے۔''

''خیر، اب کچھ بھی ہو، دلاور کو میں اپنے ہاتھوں سے ماروں گا۔'' سجاد نے کہا۔

''تم اپنی یہ حسرت ضرور پوری کرنا لیکن پہلے اس سے یہ معلوم کرلینا کہ میرے قتل کے لیے اسے رقم کس نے دی ہے۔ مجھے زوہیب پر شبہ ہے۔ اس وقت اس کا سب سے بڑا انتخابی حریف میں ہی ہوں لیکن مجھے اس موقعے پر کچھ ہوا تو پولیس رانا زوہیب پر شبہ کرے گی۔ ایک وہی ہے جو میری موت سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ وہ خود بھی یہ بات سمجھتا ہے اس لیے کوئی ایسی حرکت نہیں کرے گا۔ آخر وہ موروثی سیاست دان ہے۔ کوئی کچا کھلاڑی نہیں ہے۔''

''پھر کون تمہارے قتل کا خواہاں ہوسکتا ہے؟'' سجاد نے پوچھا۔

''دوسرا شبہ مجھے اپنی چچازاد رابعہ پر ہے۔ میری موت کے بعد یہ پوری ریاست اسی کی ہوگی۔'' پھر میں نے اسے بتایا کہ کس طرح زوہیب کے آدمیوں نے مجھے ایئرپورٹ سے اغوا کیا۔ اس کارروائی میں رابعہ بھی ملوث تھی۔ اس نے زوہیب کو ورغلایا تھا یا زوہیب ہی نے اسے لالچ دیا تھا کہ رفیق کی موت کے بعد ست بدھائی کی ریاست تمہاری ہوگی۔ زوہیب نے مجھے مجبور کر کے گفٹ ڈیڈ پر دستخط بھی کرالیے تھے لیکن رابعہ عین وقت پر کورٹ نہیں پہنچی اس لیے وہ گفٹ ڈیڈ نامکمل رہ گئی ورنہ آج یہ ریاست رابعہ کی ہوتی۔

''رابعہ اب کہاں ہے؟'' سجاد نے پوچھا۔ پھر چونک کر بولا۔''ہاں، مجھے یاد آگیا۔ اس نام کی ایک لڑکی لندن میں ہے۔ دلاور نے لندن میں اس سے ملاقات کی تھی۔''

''لیکن رابعہ تو پاگل ہوچکی ہے، پھر اس کے پاس اتنی بڑی رقم ہے ہی نہیں کہ وہ دلاور کو دے سکے۔ میرا اندازہ ہے کہ اس کے پاس اگر رقم ہوئی بھی تو وہ ایک ڈیڑھ کروڑ سے زیادہ نہیں ہوگی۔ ممکن ہے اتنی بھی نہ ہو کیونکہ وہ بہت شاہ خرچ ہے۔ اسے مہنگے کپڑوں، جیولری اور بڑے بڑے ہوٹلوں میں ٹھہرنے کا خبط ہے۔ اس نے ساری رقم ان ہی عیاشیوں میں اڑا دی ہوگی۔'' پھر میں چونک کر بولا۔''رات کے

کھانے کا وقت ہوگیا ہے۔ کیا تمہیں بھوک محسوس ہو رہی ہے؟''

''نہیں، میں صرف ایک کپ بلیک کافی پیوں گا۔ میں رات کو ہمیشہ بلیک کافی پیتا ہوں۔''

''کھانے کا موڈ تو میرا ابھی نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن وہ جو میری سرپرست ہے ڈاکٹر شہناز! وہ مجھے کھلائے بغیر دم نہیں لے گی۔ اسے میری صحت کی بہت فکر رہتی ہے۔ یوں بھی رانا کی قید سے رہائی کے بعد میں بہت زیادہ کمزور ہوگیا تھا۔ یہ تو شہناز ہی کا دم تھا کہ میں پھر پہلے کی طرح چاق وچوبند ہوگیا۔''

اسی وقت شہناز کمرے میں داخل ہوئی اور بولی۔ ''تم دونوں ابھی تک اسی حالت میں بیٹھے ہو، جس میں چھوڑ کر گئی تھی؟'' پھر وہ سجاد سے مخاطب ہوئی۔ ''آپ ہی اسے سمجھائیں کہ اپنے کھانے پینے کا خیال رکھا کرے۔ ابھی یہ پوری طرح صحت مند نہیں ہوا ہے۔'' وہ میری طرف مڑی۔ ''چلو کھانا لگ چکا ہے، اسی بہانے سب سے تمہارے... دوست کا تفصیلی تعارف بھی ہوجائے گا۔''

''چلو یار!'' میں نے سجاد سے کہا۔ ''کھانے کی میز پر تو بیٹھنا ہی پڑے گا۔''

کھانے کی میز پر حسبِ معمول سب ہی موجود تھے۔ میں نے فرداً فرداً سب سے سجاد کا تعارف کرایا۔ میں نے دیکھا کہ شہلا کی نظروں میں سجاد کے لیے پسندیدگی ہے لیکن وہ مجھے اب بھی ان ہی نظروں سے دیکھ رہی تھی جن سے مجھے خوف آتا تھا۔ وہ بہت معصوم لڑکی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کے نازک دل کو ذرا سی بھی ٹھیس پہنچے۔

میں اور سجاد دونوں ہی کھانے کے موڈ میں نہیں تھے اس لیے کھانا تو صرف ٹونگ رہے تھے، باتیں زیادہ کر رہے تھے۔ حسبِ معمول وحید کھانے کی میز پر نہیں تھا یہ بھی اچھا ہی تھا۔ سجاد اسے دیکھ کر چونک اٹھتا کہ میرا ہم شکل کہاں سے پیدا ہوگیا؟

کھانے کے بعد سجاد ایک مرتبہ پھر میرے کمرے میں آگیا۔ ریشم ہمارے لیے کافی لے آئی تھی۔ اس مرتبہ ہمارے ساتھ شہناز بھی شریک تھی۔

وہ کافی پیتے ہوئے مسلسل کچھ سوچ رہی تھی۔

پھر وہ اچانک بولی۔ ''رفیق! فرخ تمہارا اتنا بے تکلف دوست ہے اور مجھے حیرت یہ ہے کہ راجا اسے نہیں جانتا۔''

''اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟'' میں نے کہا۔

''لندن میں میرے بہت سے دوست ایسے ہیں جنہیں راجا نہیں جانتا۔''

''بھئی وہ مجھے جانیں یا نہ جانیں۔'' فرخ نے ہنس کر کہا۔ ''میں تو انہیں جانتا ہوں۔'' پھر وہ انگڑائی لے کر بولا۔ ''میں اب کچھ تھکن محسوس کر رہا ہوں۔ نیند بھی آرہی ہے۔ پروگرام تو یہ تھا کہ آج رات دیر تک ہم پرانی یادیں اور باتیں تازہ کریں گے لیکن رفیق! اب یہ پروگرام کل پر رکھو۔'' یہ کہہ کر وہ اٹھ گیا۔ غنی نے میری ہدایت کے مطابق اس کے کمرے میں سلیپنگ سوٹ اور ضرورت کی ہر چیز پہنچا دی تھی۔ اس نے یہ کام اس وقت کیا تھا جب ہم لوگ کھانا کھانے میں مصروف تھے۔

سجاد کے جانے کے بعد بھی شہناز بیٹھی رہی اور بولی۔ ''میں ایک کپ کافی اور پیوں گی۔''

''تو ریشم سے کہہ کر منگوالو۔ مجھ سے کیا کہہ رہی ہو۔ میں کوئی داروغۂ مطبخ ہوں؟''

''اتنی گاڑھی اردو مت بولو ورنہ پھر سے بیمار ہو جاؤ گے۔'' شہناز نے ہنس کر کہا۔ پھر وہ اچانک بولی۔ ''رفیق! یہ فرخ کون ہے اور کہاں سے آیا ہے؟''

میں نے چونک کر اسے دیکھا، پھر کچھ کہنے کی کوشش کی۔ میرے بولنے سے پہلے وہ بول اٹھی۔ ''جھوٹ مت بولنا، میں جانتی ہوں کہ تم اور راجا میرے سامنے جھوٹ نہیں بول سکتے۔''

''مجھے جھوٹ بولنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟'' میں نے کہا۔ ''فرخ میرا دوست ہے ورنہ وہ اس حویلی میں نظر کیوں آتا؟''

''میں کہہ رہی ہوں کہ جھوٹ مت بولو، مجھ سے آخر کیا چھپا رہے ہو؟ اچھا اگر وہ تمہارا دوست ہے اور یہاں رہنے آیا ہے تو اس کا سامان کہاں ہے؟''

''سامان کیا وہ کوئی مغل بادشاہ ہے کہ کہیں سفر کرے تو پورا حرم ساتھ ہو، کتب خانہ ساتھ ہو اور......''

''باتیں مت بناؤ۔'' شہناز نے مجھے جھڑک دیا۔ ''میں اس بیگ کو بھی پہچانتی ہوں جو غنی نے گاڑی سے اتارا تھا۔ مجھے یہ بھی اندازہ ہے کہ وہ بیگ اس وقت بالکل خالی تھا، سب سے بڑی بات یہ کہ اس کے جسم پر وہ سوٹ ہے جو تمہاری گزشتہ برتھ ڈے پر میں نے تمہیں گفٹ کیا تھا۔ اس نے جو ٹائی باندھ رکھی ہے، اس پر غلطی سے میرا بال پوائنٹ لگ گیا تھا اور خفیف سی ایک لکیر پڑ گئی تھی۔ وہ لکیر دوسروں کو نظر نہ آئی ہو لیکن ٹائی دیکھ کر مجھے یاد آگیا کہ میرے ہاتھ سے اس پر بہت معمولی سی ایک لکیر پڑ گئی تھی۔ میں نے غور کیا تو مجھے وہ باریک لکیر نظر آگئی اور

...اس کے پیروں میں جو جوتے ہیں، وہ تنگ ہیں اس لیے ...ے چلتے وقت تکلیف ہو رہی تھی۔ اب سیدھی طرح بتا دو کہ ...وکون ہے؟''

''تمہیں تو ڈاکٹر کے بجائے کسی انٹیلی جنس ایجنسی میں ...ہونا چاہیے تھا۔'' میں نے کہا۔

''یہ میری بات کا جواب نہیں ہے۔'' شہناز نے مجھے ...گھورتے ہوئے کہا۔

میں نے طویل سانس لی اور اسے مختصراً سجاد کے بارے ...سب کچھ بتا دیا۔

''تم نے اس پر اعتبار بھی کرلیا؟'' شہناز نے کہا۔ ''اپنی ...نا پر بن جائے تو انسان کچھ بھی کرسکتا ہے۔ وہ بھی دلاور کے ...ن نفرت ظاہر کرکے تمہارا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ...ہے۔''

''لیکن اس کے سامنے ہی دلاور کا فون بھی تو آیا تھا۔''

''اگر دلاور اسے مارنا چاہتا تو کبھی یہ اطلاع نہ دیتا کہ ...یہ راستے پر بم نصب کیا گیا ہے۔ بقول تمہارے دلاور اس کا ...ن ہو رہا ہے، پھر اس نے سجاد کو بچانے کی کوشش کیوں کی؟ ...ناہی دشمن ہے تو مرنے دیتا اسے۔''

''کیا آج تمہاری راجا سے بات ہوئی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، فرخ یا سجاد کے آنے کے بعد میں نے راجا سے ...ت کی تھی اور اسے سب کچھ تفصیل سے بتایا تھا۔ وہ بھی یہی کہہ رہا تھا کہ رفیق کا دماغ کام نہیں کر رہا ہے، تم بھی اس کی ...رکتوں پر نظر رکھنا۔ پھر تم نے اس کے ذریعے جیکسن نامی کسی ...شخص کو پچیس ہزار پاؤنڈز دلوائے۔ راجا کہہ رہا تھا کہ رفیق کو آخر ہو کیا گیا ہے، میں نے وجہ پوچھی تو اس نے یہ کہہ کر فون بند کردیا کہ رات کو تم سے تفصیلی گفتگو کروں گا۔''

''ایک تو تم لوگ مجھے مزید کنفیوز کرتے رہتے ہو۔'' میں نے جھنجلا کر کہا۔

''اگر میری کوئی بات یا مشورہ اتنا ہی برا لگتا ہے تو آئندہ ...میں تم سے اس قسم کی کوئی بات نہیں کروں گی۔''

''ارے یار! میرا یہ مقصد نہیں تھا۔'' میں نے کہا۔ ''میرا مقصد صرف اتنا تھا کہ تم لوگ میری بات سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔''

''پے در پے جس قسم کے واقعات رونما ہوئے ہیں، اس ...نے تمہاری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ہی چھین لی ہے، بقول سجاد ...کہ وہ دلاور کا خاص الخاص آدمی ہے اس نے دلاور کے لیے بڑے بڑے معرکے سرانجام دیے ہیں، تو کیا دلاور اپنے اتنے قیمتی آدمی کو یوں مرنے کے لیے بھیج دے گا؟''

''چلو، میں اگر تمہاری بات مان بھی لوں تو، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ ٹائم بم وہاں کس نے نصب کیا تھا؟''

''ممکن ہے کہ وہ بم سجاد نے تمہاری ہمدردیاں سمیٹنے کو یا پھر تمہارے قتل کو، تمہارے ساتھ اس وقت کئی آدمی اس ٹائم بم کا شکار ہوتے۔''

''پھر کیا اپنی واپسی کی راہ اس نے خود ہی مسدود کرلی کہ آؤ اور مجھے پکڑلو۔''

''ممکن ہے جہاں بم نصب ہو، وہاں خفیہ راستہ موجود ہی نہ ہو۔'' شہناز نے کہا۔ ''وہ صرف تم لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے ہو۔''

''تو پھر وہ فرار کیوں نہیں ہوا؟'' میں نے جھنجلا کر کہا۔

''سجاد جیسے لوگ کبھی کبھی اپنی جان داؤ پر لگا کر جوا بھی کھیلتے ہیں۔ یہ بھی ایک طرح کا جوا تھا۔ اگر تم اس بم دھماکے میں اللہ کو پیارے ہوجاتے تو وہ بھی اطمینان سے نکل جاتا۔ کسی کو باہر کے کسی آدمی پر شبہ بھی نہ ہوتا۔ سب یہی سمجھتے کہ نواب رفیق اپنے ہی حفاظتی انتظامات کی زد میں آکر ہلاک ہوگئے۔''

''اسے یہ بھی یقین تھا کہ وہ اس طرح ہمدردیاں حاصل کرلے گا؟''

''کوئی اگر تمہیں تھوڑا سا بھی جانتا ہے تو وہ یہ رسک لے لے گا۔ اسے یقین تھا کہ تم اسے زندہ پکڑنے کی کوشش کرو گے، تم نے یہی کیا۔ اسے یہ بھی یقین تھا کہ اس کے سیل فون پر دلاور کی کال آئے گی۔ ہاں، یہ اس کی خوش قسمتی ہے کہ دلاور کی کال اس وقت آئی جب وہ خود بھی موجود تھا، اسے یہ یقین نہیں ہوگا کہ تم اس کا سیل فون اس کے پاس ہی چھوڑ دو گے یا پھر ممکن ہے سردار خان نے اسے بتا دیا ہو کہ نواب رفیق کا قید خانہ Bagged ہے۔ وہاں ہونے والی بات چیت سنی جاتی ہے۔ سیل فون نہ ہوتا تو وہ کسی اور طرح تمہارا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کرتا۔ تم سے کہتا کہ دلاور کو فون کرو اور اس سے میری بات کرادو۔ تم اس کے سیل فون سے دلاور کو کال کرتے اور پھر وہی ڈراما کھیلا جاتا جو کھیلا گیا۔''

''میرا ذہن تو واقعی ماؤف ہوکر رہ گیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''صوبیدار میجر صاحب نے اس کی ساری گفتگو سنی تھی۔ وہ اتنے تجربہ کار آدمی ہیں انہوں نے تو ایسا کوئی شبہ ظاہر نہیں کیا؟''

''جب میں نے تمہارا سوٹ اور ٹائی پہچان لی تو میں نے راجا سے بات کی، پھر میں صوبیدار میجر صاحب کے پاس گئی تو وہ بھی یہی کہہ رہے تھے کہ رفیق میاں کو سمجھاؤ، وہ ایسے اندھا دھند کسی پر اعتماد نہ کریں۔ سجاد نے لندن کا حوالہ دیا، مارشل

آرٹ کی ٹریننگ کا حوالہ دیا اور اس کورین استاد کا حوالہ دیا تو تم نے اس پر آنکھیں بند کر کے یقین کرلیا۔ یہ معلوم کرنا کیا مشکل ہے کہ تم لندن میں تھے تو تم نے مارشل آرٹ کی تربیت کہاں اور کس سے حاصل کی۔'' پھر وہ کچھ سوچ کر بولی۔''اب تم ایک کام کرو، باتوں باتوں میں اس کے باپ کا نام پوچھو جو اس نے تمہیں نہیں بتایا ہے، اس کے چچا یا تایا کا نام بھی پوچھ لو۔ اس کے بہنوئی ہیں، ان کا نام بھی پوچھ لو اور کل کسی کو ساون پور بھیج دو۔ اگر اس کا باپ اتنا ہی بڑا زمیندار تھا تو اسے گاؤں کے بوڑھے لوگ اب بھی جانتے ہوں گے۔ اس سیاست داں کا نام بھی پوچھو جو وزیر بھی رہ چکا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوجائے گا کہ کس وزیر نے اپنے بیٹے عمران کے ساتھ سجاد کو پڑھنے کے لیے لندن بھیجا تھا؟''

''تمہاری باتوں نے تو مجھے پریشان کر دیا ہے۔ واقعی مجھے اس پر اس حد تک اعتماد نہیں کرنا چاہیے تھا کہ اسے حویلی میں لے آیا اور اسے اپنے ساتھ والے کمرے میں ٹھہرا بھی دیا۔ اب مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ اس کی کہانی میں کئی جگہ جھول ہے۔ کوئی بھی وزیر اتنا نیک نہیں ہوتا کہ اپنے بیٹے کے ساتھ اس کے دوست کو بھی بیرون ملک بھیجے اور اس کی تعلیم کے اخراجات بھی برداشت کرے۔ پھر سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس جیسے شخص نے آکسفورڈ یونیورسٹی سے ماسٹرز کیسے کرلیا اور کر ہی لیا تھا تو دلاور کے چکر میں کیسے پھنس گیا۔ یہ بات تو راجا کل ہی معلوم کرلے گا کہ سجاد نام کے کسی شخص نے آکسفورڈ سے انگریزی ادب میں ایم اے کیا ہے یا نہیں!''

''ایک بات اور!'' شہناز نے کہا۔''اب ایسے سوٹ کیس نہیں ملتے جن کے اوپر کا کور کسی بھی سائڈ سے اٹھایا جاسکے۔ ممکن ہے ایسا کوئی سوٹ کیس ہو لیکن دلاور کو ہیروئن اس کے سوٹ کیس میں رکھنے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کی ہیروئن تو یوں بھی پکڑی جاتی۔ اسے کیا فائدہ ہوتا۔ بس فائدہ ایک ہی صورت میں ہوسکتا ہے کہ دلاور، سجاد کو کسی پرانی دشمنی کی بنا پر پھنسانا چاہتا ہو لیکن بقول سجاد کے دلاور سے تو یہ اس کی پہلی ملاقات تھی۔ اس کی باتوں سے تمہیں لگ رہا ہے کہ اس نے انگریزی ادب میں ایم اے کیا ہوگا؟'' یہ کہہ کر شہناز اٹھ کھڑی ہوئی۔''میری نیند بھی پوری نہیں ہوئی اور میں نے آج آف بھی کرلیا۔ میں اب آرام کروں گی۔'' یہ کہہ کر شہناز چلی گئی۔

میں نے اسی وقت سیل فون نکالا اور غنی کو بلالیا۔

وہ فوراً ہی چراغ کے جن کی طرح حاضر ہوگیا۔

''غنی!'' میں نے اسے مخاطب کیا۔''مہمان کی کڑی نگرانی کی ضرورت ہے۔''

''جی؟'' غنی کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

لمحہ لمحہ بدلتی ہوئی صورت حال سے وہ بھی پریشان ہوگیا تھا۔

''اس میں اتنی حیرانی کی کیا بات ہے؟'' میں نے کہا۔

''اس طرف گارڈز کی تعداد بڑھا دو۔ وہ اگر حویلی سے باہر جانے کی کوشش کرے تو اسے کسی بھی قیمت پر باہر نہ جانے دیا جائے۔ ہاں، اگر وہ حویلی کے اندرونی حصے کی طرف جائے تو بہت احتیاط سے اس کا پیچھا کرنا۔ وہ بہت چالاک آدمی ہے، ذرا سی بھی بے احتیاطی سے وہ چوکنا ہوجائے گا۔ میرا خیال ہے کہ اس کام پر احمد شاہ کو لگا دو، وہ آرمی کا تربیت یافتہ کمانڈو ہے اور بہت احتیاط سے اس کا پیچھا کرسکتا ہے۔ میرے پورشن میں کم سے کم چار گارڈز ہونا چاہئیں۔ احمد شاہ پانچواں ہوگا جو اس کا پیچھا کرے گا۔ ضروری نہیں ہے کہ وہ کمرے سے باہر نکلے لیکن اگر وہ باہر نکلے تو میری ہدایات پر عمل کیا جائے۔''

''جی سر!'' غنی نے مستعدی سے جواب دیا۔

''ذرا ایک مرتبہ دہراؤ کہ میں نے کیا کہا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

غنی نے میری پوری ہدایات دہرا دیں۔

''ٹھیک ہے، اب تم جاؤ اور چار بہترین گارڈز کو یہاں ڈیوٹی پر لگا دو، ہاں سجاد کو معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ اس کی نگرانی کی جا رہی ہے۔''

''ٹھیک ہے سر؟''

وہ جانے لگا تو مجھے ایک بات اور یاد آئی۔''دھماکے کے بعد وہاں سے ملبا صاف کر دیا گیا ہے؟''

''جی سر!'' میں نے خود اس کام کی نگرانی کی تھی، پھر وہ چونک کر بولا۔''سر، وہاں چار دیواری کے پاس ایک ریوالور بھی ملا ہے۔ وہ بہت قیمتی اور نیا ریوالور ہے۔ میں نے اسے صوبیدار میجر صاحب کے حوالے کر دیا تھا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔

پھر میں دیر تک جاگتا رہا کہ شاید نور یا راجا کی کال آجائے لیکن فون خاموش ہی رہا۔ مجھ پر جھنجلاہٹ طاری ہو رہی تھی کہ ہر مرتبہ میں ہی رابطہ کیوں کروں؟

میں جتنا سوچتا گیا، مجھے غصہ آتا گیا۔ میں نے دل ہی دل میں طے کرلیا کہ اس وقت تک ان دونوں سے بات نہیں کروں گا، جب تک وہ خود رابطہ نہ کریں۔

میں .... تھوڑی دیر بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے نیم دراز رہا۔ پھر میں نے ٹیبل لیمپ آف کرنا ہی چاہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

''کون ہے؟'' میں نے کہا۔''اندر آجاؤ، دروازہ کھلا ہے۔''

آنے والی ٹینا تھی۔ اس نے آہستہ سے کہا۔''نواب صاحب! اب میں بالکل ٹھیک ہوں لیکن ڈاکٹر شہلا مجھے ڈیوٹی نہیں کرنے دے رہی ہیں۔''

''ڈاکٹر شہلا سے نہیں اس سلسلے میں ڈاکٹر شہناز سے بات کرنا۔'' میں نے کہا۔''وہی چاہتی ہیں کہ تم زیادہ سے زیادہ آرام کرو۔''

''لیکن سر، مجھے نیند نہیں آرہی ہے، رات کی ڈیوٹی کرتے کرتے مجھے جاگنے کی عادت ہوگئی ہے۔''

میں نے اس وقت ڈاکٹر شہناز کو بیدار کرنا تو مناسب نہ سمجھا اس لیے میں نے اس سے کہا۔''تم ایسا کرو ٹینا! ڈاکٹر شہلا کو میرے پاس بھیج دو!''

تھوڑی دیر بعد شہلا اپنی پرکشش مسکراہٹ اور سحر انگیز آنکھوں سمیت یہاں موجود تھی۔

''شہلا ابھی ابھی ٹینا میرے پاس آئی تھی۔ اسے نیند نہیں آرہی ہے۔ وہ ڈیوٹی کرنا چاہتی ہے، میں نے سوچا کہ ڈاکٹر شہناز کو بیدار کرنے سے بہتر یہ ہے کہ اس سے نائٹ ڈیوٹی کرالو، انکار کرو گی تو اس کے دل میں تمہاری طرف سے خوامخواہ برائی پیدا ہوجائے گی۔''

''ٹھیک ہے سر!'' شہلا نے کہا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے ایک مرتبہ پھر لیٹنے کا ارادہ کیا لیکن اسی وقت میرے سیل فون کی بیل بج اٹھی۔ میں نے اسکرین پر نظر ڈالی، وہاں راجا کا نام تھا۔ دوسری بیل پر میں نے سیل فون اٹھا کر کان سے لگالیا۔''ہاں راجا!'' میں نے اپنی عادت کے مطابق کہا۔''میں تو سمجھ رہا تھا کہ تو اللہ کو پیارا ہوگیا، تو کہاں سے بول رہا ہے؟''

''میں عالم بالا سے بول رہا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''اچھا اچھا، جنت کا ماحول کیسا ہے۔ وہاں زیادہ سردی تو نہیں ہوگی۔''

''اوئے فیکے! تیرا کیا خیال ہے کہ مرنے کے بعد ہم جنت میں جائیں گے؟''

''اچھا تو جنت میں نہیں گیا؟'' میں نے ہنس کر کہا۔''تیرے گناہوں کی فہرست بھی تو بہت لمبی ہے۔ تو ٹھہرا صحافی اور صحافی تو جنت میں......''

''یار! وقت مت ضائع کر، میری بات سن!''

''تو سنا۔'' میں نے بھی اسی کے لہجے میں کہا۔

''یار، وہ رابعہ فرار ہوگئی ہے۔'' اس نے گویا میرے سر پر ہتھوڑا مار دیا۔

''کیا؟'' میں گھبرا کر کھڑا ہوگیا۔''یہ تو کیا کہہ رہا ہے؟''

''یار، میں کیا فارسی بول رہا ہوں۔'' راجا نے کہا۔

''لیکن...... وہ کیسے فرار ہوگئی؟...... وہاں ہمارا سیکیورٹی سسٹم تو فول پروف ہے اور......''

''پہلے میری پوری بات تو سن لے۔'' راجا نے کہا۔''آج اس پر پاگل پن کا شدید دورہ پڑا تھا۔ اس نے اپنے کمرے میں توڑ پھوڑ کی، اپنے کپڑے تک پھاڑ لیے۔ نور اس وقت آفس

میں تھی۔ میں بھی بس نکلنے ہی والا تھا کہ محل کی ایک ملازمہ گھبرائی ہوئی میرے پاس آئی اور بولی۔ ''سر، مس رابعہ کو پاگل پن کا شدید دورہ پڑا ہے۔'' میں گھبرا گیا۔ شور شرابے کی وجہ سے نور نے اسے محل کے ایک اندرونی کمرے میں بند کر دیا تھا۔ میں دوڑتا ہوا وہاں پہنچا تو اس وقت تک رابعہ بے ہوش ہو چکی تھی اور نیم برہنگی کے عالم میں فرش پر پڑی تھی۔ میں نے ملازمہ سے کہا کہ اس کے کپڑے بدلو، پھر میں نے نور کو فون کیا۔ نور نے کہا کہ اب میں اسے زیادہ برداشت نہیں کر سکتی۔ اسے فوراً دماغی امراض کے اسپتال لے جاؤ۔ میں نے ڈرائیور سے گاڑی نکالنے کو کہا اور رابعہ کو عقبی نشست پر لٹا دیا۔ لندن کا ٹریفک تو تو جانتا ہی ہے۔ ایک سنگل پر ہمیں رکنا پڑا۔ ہمارے آگے پیچھے گاڑیوں کی لمبی قطار تھی۔ اچانک مجھے عقبی نشست کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ میں نے چونک کر پیچھے دیکھا تو رابعہ گاڑیوں کے بیچ سے نکل کر دوڑی جا رہی تھی۔''

''ارے!'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ''کیا تم لوگوں نے دروازے لاک نہیں کیے تھے؟''

''یار، اب تو یہ بچوں والی باتیں مت کر۔'' راجا جھنجلا کر بولا۔ ''لاک کھولنے میں کتنی دیر لگتی ہے؟ اب میں سوچ رہا ہوں کہ وہ سرے سے پاگل ہی نہیں تھی، وہ صرف پاگل پن کی اداکاری کر رہی تھی۔''

''لیکن کیوں؟'' میں نے الجھ کر پوچھا۔ ''اسے پاگل پن کی اداکاری کرنے کی کیا ضرورت تھی؟''

''وہ بھی شاید سمجھ گئی تھی کہ اس محل میں اس کی حیثیت ایک قیدی کی سی ہے۔ اس نے ایک دو مرتبہ باہر نکلنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن سیکیورٹی والوں نے اسے باہر نہیں نکلنے دیا تھا۔''

''یار مجھے حیرت تو تجھ پر ہے۔'' میں نے جھنجلا کر کہا۔ ''تو بھی اس کی اداکاری سے فریب کھا گیا؟''

''او بھائی افلاطون!'' راجا نے کہا۔ ''میری جگہ تو ہوتا تو، تو بھی دھوکا کھا جاتا۔'' پھر وہ ہنس کر بولا۔ ''لیکن تو اتنا پریشان کیوں ہے فیکے پتر! رابعہ تو مر چکی ہے، ہم نے اسے ست بدھائی میں دفن بھی کر دیا ہے۔ اب وہ مرے یا جیے۔ ہماری بلا سے۔''

''لیکن یار، اس کے ذریعے ہمیں دلاور کے بارے میں معلوم ہو سکتا تھا۔''

''اوئے اب مٹی ڈال اس پر!'' راجا نے کہا۔ ''دلاور بھی کھل کر سامنے آ ہی جائے گا۔ تو سنا، وہاں کیا صورتِ حال ہے؟''

میں نے کہا۔ ''یار، یہاں کی تازہ ترین صورتِ حال تو تجھے شہناز کے ذریعے معلوم ہو ہی چکی ہے۔''

''یار فیکے! تجھے واقعی آرام کی ضرورت ہے۔ تیرا ذہن ابھی پوری طرح کام نہیں کر رہا ہے۔ تو نے اس آدمی پر اندھا اعتماد کیسے کر لیا؟''

''یار، اب تو جو ہونا تھا، ہو گیا۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''ایک کام کر! کل آکسفورڈ یونیورسٹی جا کر معلوم تو کر کہ سجاد نے وہاں سے ایم اے کیا بھی ہے یا نہیں؟''

''جب تک اس کی ولدیت معلوم نہ ہو، یہ تصدیق نہیں ہو سکتی، پھر اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اس نے اپنا نام صحیح بتایا ہے۔ اب تو مزید کوئی حماقت مت کرنا۔'' راجا نے کہا۔ ''اس پر کڑی نظر رکھ اور اس کے باپ کا نام معلوم کرنے کے بعد اپنے کسی آدمی کو ساون پور بھیج دے۔''

''میں کل ہی یہ کام کر لوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''تو رابعہ......''

''ارے لعنت بھیج رابعہ پر!'' راجا جھنجلا گیا۔ ''اب تو نے رابعہ کا نام بھی لیا تو میں فون بند کر دوں گا۔''

''اچھا نور سے میری بات کرا دے۔''

''وہ ابھی تھوڑی دیر میں تجھے خود ہی فون کرے گی، تو بس اس آدمی کا خیال رکھنا جسے تو نے دوست بنا کر حویلی میں رکھا ہے۔ اب تو آرام کر، باقی باتیں کل!'' راجا نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

راجا کے فون کے بعد میری نیند بالکل ہی اڑ گئی تھی۔ میں پہلے تو بیڈ پر لیٹا کروٹیں بدلتا رہا، پھر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''کیا میرا ذہن واقعی ماؤف ہو چکا ہے؟'' میں نے خود سے سوال کیا۔ ''مجھے سجاد کی سنائی ہوئی کہانی میں جھول نظر کیوں نہیں آیا؟ پھر یہ کہانی تو اس نے بعد میں سنائی تھی۔ میں تو اسے پہلے ہی حویلی میں لے آیا تھا۔ راجا ٹھیک ہی کہہ رہا تھا کہ مجھے ابھی مزید آرام کی ضرورت تھی۔''

میں دیر تک جاگتا رہا، پھر بیڈ پر لیٹ گیا لیکن مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ ڈاکٹر شہلا سے کوئی خواب آور دوا ہی لے لوں لیکن پھر خود ہی میں نے اپنے اس خیال کو مسترد کر دیا۔ پھر نہ جانے کب مجھے نیند آ گئی۔

میری آنکھ کھلی تو کمرے میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ کھڑکیوں کے پردے یقیناً شہناز نے ہٹائے ہوں گے ورنہ کوئی اور تو یہ جرأت کر نہیں سکتا تھا۔ میری نظر گھڑی پر پڑی تو میں چونک اٹھا۔ اس میں ساڑھے دس بجے تھے۔ میں جلدی سے اٹھ کر باتھ روم میں گھس گیا۔

میں گرم پانی سے نہانے کے بعد خاصا ہلکا پھلکا ہو گیا۔ ریشم میرے بلانے سے پہلے ہی ناشتا لے کر آ گئی۔ ناشتا

رتے ہوئے مجھے سجاد کا خیال آیا۔ میں نے ریشم سے پوچھا۔ یشم! مہمان نے ناشتا کر لیا؟''

''صاب جی، انہوں نے تو سویرے ہی ناشتا کر لیا تھا۔''

''اچھا تم ذرا غنی کو یہاں بھیج دو۔'' میں نے اسے ناشتے کے برتن اٹھانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ برتن لے کر چلی گئی تو میں نے اخبار اٹھا لیا۔

اسی وقت غنی کمرے میں داخل ہوا۔ میں نے اس سے جاد کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ ناشتا کرنے کے بعد اسپتال اور اسکول دیکھنے کے لیے گیا ہے ڈاکٹر شہناز کے ساتھ!

''کوئی خاص بات؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں سر!'' غنی نے کہا۔ ''مہمان رات بھر آرام سے تا رہا۔ اس نے ایک دفعہ بھی کمرے سے باہر نکلنے کی کوشش ہیں کی۔ صبح اٹھنے کے بعد اس نے لان میں جا کر ایکسرسائز ، پھر آپ کے بارے میں پوچھا۔ جب اسے یہ معلوم ہوا کہ پ سو رہے ہیں تو اس نے ایک ملازم سے ناشتا منگوایا، پھر وہ پتال کی طرف نکل گیا۔ احمد شاہ سائے کی طرح اس کے پیچھے اہوا ہے سر!''

میں نے ایک ایک کر کے تمام اخبارات پر سرسری سی نظر الی۔ سب ہی اخبارات میں بدامنی، قانون شکنی اور ڈکیتی کی رداتوں کی خبریں تھیں یا پھر سیاسی رہنماؤں کے کھوکھلے بانات۔ حکومت کے وہی گھسے پٹے دعوے کہ کسی کو بھی قانون کنی اور بدعنوانی کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

مجھے اس قسم کے بیانات پڑھ کر ہمیشہ ہنسی آتی ہے۔ گویا رم حکومت سے ڈکیتی اور بدعنوانی کی اجازت مانگتے ہیں؟ راجا ز یہ کہتا تھا کہ ان بیانات سے تو یہ بھی لگتا ہے کہ اب تک ملک یں جو جرائم ہو رہے ہیں، وہ سب حکمرانوں کی اجازت سے ہو ہے ہیں، ہاں آئندہ کسی کو اجازت نہیں دی جائے گی۔

میرے کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی، ھر سجاد کمرے میں آ گیا۔ اس کے ساتھ ڈاکٹر شہناز بھی تھی۔

''آؤ فرخ!'' میں نے خوش دلی کا مظاہرہ کیا۔

وہ بھی ہنس کر بولا۔ ''تمہاری نیند پوری ہو گئی؟''

''بس یار! رات کافی دیر تک نیند نہیں آئی اس لیے صبح نکھ نہیں کھلی، تم بور تو نہیں ہوئے؟''

''نہیں یار، ڈاکٹر شہناز نے مجھے بور نہیں ہونے دیا۔''

''رفیق! تم نے یہ تو بتایا ہی نہیں تھا کہ فرخ صاحب نے سفورڈ یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم اے کیا ہے۔''

''ارے، آپ تو مجھے شرمندہ کر رہی ہیں۔'' سجاد نے کہا۔ ''اور ڈاکٹر، یہ میرے نام کے ساتھ آپ تو صاحب کا دم چھلا مت لگائیں۔''

''اب آپ رفیق سے باتیں کریں، میں ذرا اسپتال کا چکر لگا لوں۔'' شہناز نے کہا اور مسکراتی ہوئی چلی گئی۔

''سجاد! یہاں تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟'' میں نے پوچھا۔

''یار، تم لوگ مسلسل مجھے شرمندہ کر رہے ہو۔'' سجاد ہنس کر بولا۔ ''او بھائی، میں کہیں کا شہزادہ یا نواب زادہ نہیں ہوں کہ مجھے یہاں کوئی تکلیف ہو گی۔''

''تمہیں کبھی ساون پور یاد نہیں آتا؟'' میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔

''اپنا گاؤں کسے یاد نہیں آتا ہے یار!'' سجاد سنجیدہ ہو گیا۔ ''جس گاؤں میں میرا بچپن گزرا، جہاں کی گلیوں میں، میں نے ہوش سنبھالا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جہاں میرے پرکھوں کی، میرے ماں باپ کی ہڈیاں دفن ہیں، میں اس جگہ کو کیسے بھول سکتا ہوں؟'' سجاد اچانک جذباتی ہو گیا۔ وہ اگر اداکار تھا تو غضب کا اداکار تھا۔

''ارے تم تو جذباتی ہو گئے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''یار، اصل میں گاؤں میری کمزوری ہے۔ میرا بس چلے تو میں اب بھی وہیں جا کر رہ جاؤں لیکن اس دلاور کی وجہ سے میں اپنی مرضی سے کچھ بھی نہیں کر سکتا۔''

''فکر مت کرو یار! جلد ہی وہ وقت آئے گا جب دلاور تمہاری مرضی کے بغیر کچھ نہیں کر سکے گا۔''

''ایسا وقت کبھی نہیں آئے گا۔'' اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''میں دلاور کو زندہ چھوڑوں گا تو وہ کچھ کرنے کے قابل ہو گا۔''

''ویسے ایک بات کا تو مجھے یقین ہے۔ تم دلاور سے ڈرتے نہیں ہو بلکہ......''

''میں اور اس سے ڈروں گا؟'' سجاد نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''اس نے مجھے ایسے جال میں پھانس رکھا ہے کہ میں اس وقت تک آزاد نہیں ہو سکتا، جب تک وہ زندہ ہے۔''

''دلاور کو تم سے کیا دشمنی ہے؟'' میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔ ''تم اس کے لیے بہت قیمتی ہو، کام کے آدمی ہو، اس کی ہر بات ماننے پر مجبور بھی ہو، پھر......'' میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ ''تمہارے والد سے تو اس کی دشمنی نہیں تھی؟''

''نہیں یار!'' سجاد نے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ''بابا تو دشمنوں کو بھی دوست بنا لیتے تھے۔ ان کا کوئی دشمن نہیں تھا۔''

''کیا نام بتایا تھا تم نے اپنے بابا کا؟'' میں نے اچانک

پوچھا۔

''چودھری منظور احمد!'' وہ غیر شعوری طور پر بول اٹھا۔

''ہاں، مجھے یاد آیا، چودھری منظور احمد! گجرات تو یوں بھی چودھریوں کا شہر ہے۔''

میں ہنس کر بولا۔ ''تمہارے والد نے کبھی سیاست میں حصہ نہیں لیا؟''

''یار، وہ تو بہت سیدھے انسان تھے، سیاست سے ان کا کیا واسطہ؟''

''ہاں، یاد آیا۔'' میں نے چونک کر کہا۔ ''عمران آج کل کہاں ہے؟''

''عمران تو لندن ہی میں تھا۔ اس نے وہیں شادی کر لی تھی۔''

''اور اس کے والد؟'' میں نے پوچھا۔ ''وہ آج کل کیا کر رہے ہیں؟''

''ان کا انتقال ہو چکا ہے۔ میں نے بتایا تو تھا یا شاید بتانا بھول گیا ہوں۔'' پھر وہ ہنس کر بولا۔ ''یار، تم تو ابھی ابھی ناشتا کر کے بیٹھے ہو۔ مجھے ایک کپ کافی ہی پلوا دو۔''

''ابھی منگواتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''کچھ کھانے کو بھی منگواؤں؟''

''نہیں، صرف کافی!'' اس نے کہا۔

میں نے ملازم سے کافی لانے کو کہا۔

دستک دے کر غنی اندر آیا اور بولا۔ ''سر، وہ ٹھیکے دار آپ سے ملنا چاہتا ہے جسے آپ نے سڑک بنانے کا ٹھیکا دیا تھا۔''

''اسے بٹھاؤ، میں ابھی آتا ہوں۔'' میں نے غنی سے کہا۔

''سڑک بنانے کا ٹھیکا؟ تم کیا یہ کام بھی کرتے ہو؟''

''یار، میں ست بدھائی سے دینہ تک پختہ سڑک بنانا چاہتا ہوں۔ اس سے ست بدھائی کے لوگوں کو بہت سہولت ہو جائے گی۔ تم بیٹھو، میں ابھی آتا ہوں۔''

''میں یہاں بیٹھ کر کیا کروں گا۔ میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔''

''یار، تم یہیں ٹھہرو، ممکن ہے وہ ٹھیکے دار تمہیں جانتا ہو۔ اس نے تمہیں دلاور کے ساتھ دیکھا ہو؟''

''ہاں، تم ٹھیک کہتے ہو۔'' سجاد نے کہا، پھر اٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں بھی کچھ دیر آرام کر لوں، ملازم سے کہنا کہ کافی میرے کمرے ہی میں لے آئے۔''

میں نے ملازم کو ہدایات دیں اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ کچھ فاصلے پر مجھے احمد شاہ دکھائی دیا۔ وہ پودوں کو پانی دے رہا تھا۔ اس وقت وہ مالی کے بھیس میں تھا اور گارڈز کی یونیفارم کے بجائے دھوتی اور کرتے میں ملبوس تھا۔

میں نے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے کہا۔ ''اس پر نظر رکھنا۔''

ٹھیکے دار سے نمٹ کر میں گارڈ روم کی طرف گیا۔ وہاں صوبیدار میجر صاحب بھی موجود تھے۔

میں نے ان سے کہا۔ ''صوبیدار میجر صاحب! میں آپ کو اپنا بزرگ سمجھتا ہوں۔ مجھ سے کوئی غلطی ہو تو آپ مجھے ٹوک سکتے ہیں۔''

''اس وقت آپ شاید میری بات نہ سنتے، پھر آپ نے مجھے موقع ہی کب دیا۔ آپ تو فوراً ہی روانہ ہو گئے تھے۔ میں بعد میں آپ سے بات کرتا لیکن ڈاکٹر شہناز نے کہا کہ وہ سجاد کے بارے میں خود آپ سے بات کریں گی۔''

''اب ایک کام کریں، آپ ابھی کسی کو ساون پور بھیج دیں۔ ساون پور گجرات کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔''

''میں جانتا ہوں۔'' صوبیدار میجر صاحب نے کہا۔ ''وہاں میرے ایک دوست کی سسرال تھی۔ وہ اکثر ساون پور جاتا رہتا تھا۔''

''گڈ!'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''آپ کے اس دوست سے ہمیں بہت مدد ملے گی۔ اس کی سسرال والے تو ساون پور کے ہر آدمی کو جانتے ہوں گے؟ سجاد نے بھی اپنے گاؤں کا نام ساون پور بتایا ہے۔ بقول سجاد اس کا باپ ساون پور کا بڑا زمیندار تھا۔''

''میرا وہ دوست اب اس دنیا میں نہیں ہے۔'' صوبیدار میجر صاحب نے کہا۔ ''لیکن یہ معلوم کرنا کیا مشکل ہے؟ میں ابھی کسی کو ساون پور بھیج دیتا ہوں۔ وہ چند گھنٹوں میں واپس آ جائے گا۔ ہاں، اگر میرا وہ دوست زندہ ہوتا تو وقت بچ جاتا۔ میں فون ہی پر اس سے معلوم کر لیتا۔''

''ہاں، آپ نے اس جگہ کا جائزہ لیا جہاں بم بلاسٹ ہوا تھا؟ غنی نے ملبا بھی صاف کرا دیا ہے۔''

''میں نے بہت باریک بینی سے اس جگہ کا جائزہ لیا ہے۔'' صوبیدار میجر صاحب نے جواب دیا۔ ''مجھے تو وہاں کسی بھی خفیہ راستے کے آثار نہیں ملے۔''

''اچھا آپ ابھی کسی آدمی کو گاڑی دے کر ساون پور بھیج دیں۔ سجاد کے باپ کا نام چودھری منظور احمد ہے۔''

''میں ابھی فتح محمد کو بھیج دیتا ہوں۔ وہ بھی آرمی کا سابق کمانڈو ہے اور انٹیلی جنس میں بھی رہ چکا ہے۔ وہ ساری معلومات کر لے گا کہ چودھری منظور کا کوئی بیٹا بھی تھا اور یہ کہ

ب وہ کہاں ہے، اس کی زمین کتنی تھی اور اب وہ زمین کس کے
پاس ہے؟''

''ٹھیک ہے، اب میں ذرا خود بھی اس جگہ کا جائزہ لے
لوں۔'' یہ کہہ کر میں آگے بڑھ گیا۔

غنی میرے ساتھ تھا۔ اچانک مجھے سجاد دکھائی دیا۔ وہ
بھی اسی طرف جا رہا تھا جہاں دھماکا ہوا تھا۔ اس سے چند قدم
کے فاصلے پر احمد شاہ تھا جو بہت احتیاط سے اس کا پیچھا کر رہا
تھا۔ میں نے اگر خود ہی احمد شاہ کو اس کام پر نہ لگایا ہوتا تو میں
بھی نہیں سمجھ سکتا تھا کہ وہ دلاور کا پیچھا کر رہا ہے۔

غنی نے بھی سجاد کو دیکھ لیا تھا۔ وہ پُرتشویش لہجے میں
بولا۔ ''سر، یہ آپ کا مہمان اس طرف کیوں جا رہا ہے؟''

''یہ تو تم ہی بتاؤ گے۔'' میں نے کہا۔ ''حویلی کے
سکیورٹی انچارج تم ہی ہو۔''

''سر، میں نے گارڈز سے کہا تھا کہ مہمان کو حویلی سے
نہ نکلنے دیں۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ وہ حویلی کے ہر
حصے میں گھومتا پھرے گا؟ میں ابھی گارڈز سے معلوم کرتا
ہوں۔''

''بعد میں معلوم کر لینا۔'' میں نے کہا۔ ''ابھی تو صرف یہ
دیکھنا ہے کہ سجاد وہاں کیوں جا رہا ہے؟''

''سر، میں نے وہاں بھی دو گارڈز کی ڈیوٹی لگائی ہے۔ وہ
اسے ایک مخصوص حصے سے آگے نہیں جانے دیں گے۔''

''ان لوگوں سے کہو کہ فوری طور پر وہاں سے ہٹ
جائیں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ سجاد وہاں جا کر کیا کرتا ہے؟''

غنی نے سیل فون پر کوئی نمبر ڈائل کیا اور بولا۔ ''اسلم! تم
اور یار محمد فوری طور پر وہاں سے ہٹ جاؤ۔ نواب صاحب کا
مہمان اس طرف آ رہا ہے۔ اسے روکنے کی کوشش مت کرنا۔''

میں کچھ دیر کے لیے ایک گھنے درخت کی چھاؤں میں
کھڑا ہو گیا۔ سجاد اب وہاں پہنچ چکا تھا جہاں دھماکا ہوا تھا، اس
نے بہت غور سے اس جگہ کا جائزہ لیا، پھر جیب سے سیل فون
نکال کر کسی کے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ وہ نہ جانے کسے فون کر رہا
تھا؟ اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں گھنٹی کی آواز
سن کر بری طرح چونک اٹھا کیونکہ میں اس وقت سجاد کی طرف
متوجہ تھا۔

میں نے جیب سے سیل فون نکالا تو اسکرین پر سجاد کا نمبر
دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میں نے سیل فون کا بٹن دبا کر کان سے
لگایا۔ ''ہاں، سجاد!'' میں نے کہا۔ ''خیریت تو ہے؟''

''ہاں، خیریت ہے۔ میں اس وقت اس جگہ موجود ہوں
جہاں دھماکا ہوا تھا۔ میں نے بہت غور سے اس جگہ کا جائزہ لیا
ہے لیکن مجھے اس خفیہ راستے کا سراغ نہیں مل سکا۔''

''میں بھی اسی طرف آ رہا ہوں۔'' میں نے کہا اور رابطہ منقطع کر دیا۔

سجاد یا تو اپنے تعاقب سے واقف ہو گیا تھا یا پھر واقعی وہ اس راستے کی تلاش میں تھا۔ اس نے مجھے کال کر کے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ یہ کام چھپ کر نہیں کر رہا ہے۔

میں وہاں پہنچا تو وہ ایک پتھر پر بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ ''میں نے بہت غور سے یہاں کا جائزہ لیا ہے لیکن مجھے کسی بھی خفیہ راستے کے آثار نظر نہیں آئے۔''

''دھماکا اتنا شدید تھا کہ اگر کوئی خفیہ راستہ ہو گا بھی تو اس دھماکے سے بند ہو گیا ہو گا۔'' میں نے کہا۔

''ہاں، لگتا تو کچھ ایسا ہی ہے۔'' سجاد نے کہا۔

میں نے بھی بہت باریک بینی سے اس جگہ کا جائزہ لیا۔ غنی نے دھماکے سے پڑنے والے گڑھے میں اتر کر بھی دیکھا لیکن کسی خفیہ راستے کا نام و نشان بھی نہ تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہم لوگ واپس اپنے کمرے میں آ گئے۔ دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ حسبِ معمول شہناز مجھے بلانے آ گئی۔

میں نے کہا۔ ''ابھی تو میں نے ناشتا کیا ہے۔ کھانا میں ابھی نہیں کھاؤں گا۔''

''یار، میں تو کھاؤں گا۔'' سجاد نے کہا۔ ''مجھے تیرے ساتھ بھوکا مرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔'' وہ کچھ زیادہ ہی بے تکلف ہو رہا تھا۔

''تو تمہیں کس نے روکا ہے۔ تم کھانا کھاؤ، میرے حصے کا بھی کھا جاؤ۔''

''تم پھر رات دیر تک جاگتے رہے؟'' شہناز نے یوں پوچھا جیسے کوئی سخت گیر ماں اپنے بچے سے پوچھتی ہے۔

''میں شوقیہ نہیں جاگا، بس نیند ہی نہیں آئی۔'' میں نے کہا۔

''اپنے سونے جاگنے اور کھانے پینے کا روٹین صحیح کرو ورنہ صحت بالکل تباہ ہو جائے گی۔''

''اوکے میم!'' میں نے سعادت مندی سے جواب دیا۔

شہناز مجھے گھورتے ہوئے چلی گئی۔ اس کے ساتھ ہی سجاد بھی چلا گیا۔ میں نے کھڑکی میں سے دیکھا، احمد شاہ سائے کی طرح اس کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ میں نے غنی کو بلا کر کہا کہ احمد شاہ کی جگہ کسی اور کی ڈیوٹی لگا دو ورنہ وہ رات کو ڈیوٹی کے قابل نہیں رہے گا۔

وقت کسی طرح گزرنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔
اب مجھے اپنے اس آدمی کا انتظار تھا جو معلومات کے لیے ساون پور گیا تھا۔
کھانے کے بعد سجاد کچھ دیر میرے پاس بیٹھا، پھر اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ کم بخت اتنا محتاط تھا کہ سیل فون پر بھی کسی سے بات نہیں کرتا تھا۔ اب یا تو اسے یہ شبہ ہو گیا تھا کہ اس کا کمرا BUGGED ہے یا پھر وہ واقعی کسی کو یہ نہیں بتانا چاہتا تھا کہ وہ زندہ ہے۔ اس کم بخت سجاد نے میرے دماغ کی چولیں تک ہلا کر رکھ دی تھیں۔
میں نے شام تک کا وقت اپنے کمرے میں اخبارات کا مطالعہ کرتے اور کافی پیتے ہوئے گزارا۔ میری سگریٹ نوشی پر تو شہناز نے مکمل پابندی عائد کر دی تھی۔ یوں بھی اب مجھے سگریٹ کی اتنی طلب نہیں ہوتی تھی۔ بس کبھی کبھار سگریٹ پی لیتا تھا۔
شام کو چائے شہناز میرے کمرے میں پیتی تھی۔ وہ میرے کمرے میں داخل ہوئی تو اس کے ساتھ شہلا بھی تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے کمرا اچانک روشنیوں سے بھر گیا ہو۔ اسے دیکھ کر مجھے عجیب سا احساس ہوتا تھا اس لیے میں دانستہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز کرتا تھا۔
میں نے شہناز کو دیکھ کر کہا۔ ''میں تو یہاں پڑے پڑے بور ہو گیا ہوں، سوچ رہا ہوں کہ کچھ دن کے لیے لاہور ہی چلا جاؤں۔''
''ضرور جاؤ۔'' شہناز نے کہا۔ ''اپنے اس مہمان، بلائے جان کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤ۔''
''اس کے بارے میں آج رات تک سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔'' میں نے جھنجلا کر کہا۔
''کس کی بات ہو رہی ہے؟'' شہلا نے پوچھا۔
''ارے تمہاری یہ شہناز باجی میرے کسی مہمان کو یہاں برداشت نہیں کر سکتیں۔'' میں نے کہا۔
شہناز نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ سجاد آ گیا۔ وہ منہ بنا کر بولا۔ ''یار رفیق! میں تو یہاں پڑے پڑے بالکل ہی ناکارہ ہو جاؤں گا۔ میں نے سوچا ہے کہ آج لاہور چلا جاؤں۔''
''یار، اتنے عرصے کے بعد تو آئے ہو، ابھی سے جانے کی باتیں کر رہے ہو؟'' میں نے کن انکھیوں سے شہلا کی طرف دیکھا اور سجاد کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔
شاید اسے بھی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا کہ کمرے میں اس وقت نہ صرف شہلا موجود تھی بلکہ شہناز بھی تھی۔

چائے پینے کے بعد وہ دونوں چلی گئیں تو میں نے کہا۔ ''تم لاہور جانا چاہتے ہو؟''
''ہاں یار! یہاں پڑے پڑے تو مجھے زنگ لگ جائے گا۔''
''اور یہاں سے باہر نکلتے ہی دلاور کے آدمی تمہاری گردن ناپ لیں گے۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''میں دلاور کے خلاف کارروائی کی تیاری کر رہا ہوں۔ کچھ دن صبر کر لو۔''
''میں یہاں پڑے پڑے بور ہو گیا ہوں۔ جو کچھ کرنا ہے جلدی کرو۔''
''میں خود بھی اب اس دلاور کو زیادہ دن برداشت نہیں کر سکتا۔'' میں نے کہا۔
سجاد کچھ دیر میرے پاس بیٹھا رہا، پھر اٹھ کر چلا گیا۔
میں بھی باہر کا ایک چکر لگانے کے ارادے سے اٹھا تو میرے سیل فون کی بیل بج اٹھی۔ اسکرین پر کوئی اجنبی نمبر تھا۔
میں نے بٹن دبا کر سیل فون کان سے لگا لیا۔ ''ہیلو!''
''نواب صاحب بول رہے ہیں؟'' دوسری طرف سے ایک مردانہ آواز سنائی دی۔
''جی ہاں، فرمایے؟''
''نواب صاحب! آپ نے اپنا جو آدمی ساون پور بھیجا تھا، اسے دینہ کے اسپتال سے اٹھوا لیں۔''
''ساون پور!'' میں نے انجان بن کر پوچھا۔ ''میں نے تو کسی کو ساون پور نہیں بھیجا۔''
''بہر حال، وہ آپ ہی کا آدمی ہے۔'' یہ کہہ کر بولنے والے نے رابطہ منقطع کر دیا۔
میں نے فوراً غنی کو بلایا اور اس سے کہا۔ ''غنی! صوبیدار میجر صاحب نے فتح محمد کو ساون پور بھیجا تھا۔ اسے کسی نے زخمی کر دیا ہے یا ممکن ہے یہ محض بلف ہو۔ مجھے ابھی اطلاع ملی ہے کہ وہ دینہ کے اسپتال میں پڑا ہے۔''
''میں ابھی دینہ چلا جاتا ہوں۔'' غنی نے کہا۔
''اتنی جلدی مت کرو۔'' میں نے کہا۔ ''پہلے فتح محمد کے سیل فون پر کال کرو۔ میرے پاس فتح محمد کا سیل نمبر نہیں ہے۔''
غنی نے جیب سے سیل فون نکالا اور فتح محمد کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔ پھر وہ بولا۔ ''ہیلو فتح محمد؟...... آپ کون بول رہے ہیں؟...... اچھا کب...... ٹھیک ہے میں آ رہا ہوں...... جی ہاں ابھی پہنچ رہا ہوں۔''
''کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔
''سر، فتح محمد واقعی زخمی ہے۔ وہ دینہ کے اسپتال میں

ہے۔ اس کا سیل فون کسی ڈاکٹر نے اٹھایا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ایک آدمی زخمی حالت میں وہاں لے کر پہنچا تھا، پھر وہ اسے اسپتال میں چھوڑ کر خود غائب ہو گیا۔''
''تم دو تین آدمیوں کو دینہ بھیج دو۔ ان سے کہنا کہ محتاط رہیں اور فتح محمد کو یہاں لے آئیں۔ ڈاکٹر نے یہ نہیں بتایا کہ زخم کس نوعیت کے ہیں؟''
''وہ شدید زخمی ہے لیکن اس کی حالت خطرے سے باہر ہے۔ ڈاکٹر نے پولیس سے بھی رابطہ کر لیا ہے۔ وہاں پولیس بھی موجود ہوگی۔ میں کسی کو وہاں بھیجتا ہوں۔'' یہ کہہ کر غنی تیزی سے باہر نکل گیا۔
میں پھر الجھ کر رہ گیا، فتح محمد کو کس نے زخمی کیا اور زخمی کیا ہی تھا تو پھر اسپتال کیوں پہنچایا؟ میں وہاں سے نکل کر ایک مرتبہ پھر صوبیدار میجر صاحب کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں انہیں بلوا بھی سکتا تھا لیکن کمرے میں پڑے پڑے بور ہو گیا تھا اس لیے میں خود ہی وہاں چلا جاتا تھا۔ اب یہ نئی الجھن پیدا ہو گئی تھی۔ مجھے فتح خان کی تو فکر تھی ہی، اس سے زیادہ یہ پریشانی تھی کہ اس کے ساون پور جانے کا علم کتنے لوگوں کو تھا۔ اسے جن لوگوں نے بھی زخمی کیا تھا، وہ جانتے ہوں گے کہ فتح محمد میرا آدمی ہے اور ساون پور کیوں جا رہا ہے؟
مجھے دیکھ کر صوبیدار میجر صاحب نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن میں نے انہیں روک دیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔ ''مجھے فتح محمد کے بارے میں علم ہو چکا ہے۔''
''اس کی روانگی کے بارے میں کتنے لوگ جانتے تھے؟'' میں نے پوچھا۔
''آپ کے علاوہ صرف مجھے علم تھا۔'' انہوں نے جواب دیا۔
''پھر...... پھر کسی اور کو کیسے معلوم ہوا کہ وہ ساون پور جا رہا ہے؟''
''ممکن ہے، اس نے خود ہی کسی سے تذکرہ کیا ہو؟'' صوبیدار میجر صاحب نے کہا۔ ''یہ تو فتح محمد خود ہی بتائے گا کہ اس نے کسی کو بتایا ہے یا نہیں؟ غنی نے تین مسلح گارڈز کو دینہ بھیج دیا ہے؟''
پھر میں نے اگلے دو گھنٹے وہیں گزار دیے۔ صوبیدار میجر صاحب۔ اپنے پرانے مشغلے یعنی رائفل اور ریوالور کی صفائی میں مصروف ہو گئے تھے۔
میں نے ہنس کر کہا۔ ''آپ اگر مصروف نہ ہوں تو یہ مصروفیت نکال لیتے ہیں۔''
''کیا کروں رفیق میاں! برسوں کی عادت ہے۔ اب تو جب تک میں اپنے دونوں ریوالورز اور رائفل کی صفائی نہ کر لوں، مجھے کچھ ادھورے پن کا احساس ہوتا ہے۔'' پھر وہ چونک کر بولے۔ ''آپ بھی کبھی صفائی کر لیا کریں۔''
میں نے اپنے بغلی ہولسٹر سے پسٹل نکالا اور خاموشی سے ان کی طرف بڑھا دیا۔
انہوں نے میرے ہاتھ سے پسٹل لیا، پھر چونک اٹھے۔ پسٹل کو دوبارہ غور سے دیکھا۔ پھر اسے ہاتھ میں یوں اٹھایا جیسے اس کا وزن کر رہے ہوں۔ انہوں نے بٹن دبا کر اس کا میگزین نکال لیا۔
میں دلچسپی سے ان کی محویت دیکھ رہا تھا۔ انہوں نے پسٹل کی نال سونگھی، پھر میگزین میں سے گولیاں نکالنے لگے۔
وہ نو گولیوں والا مشین پسٹل تھا۔ آٹھ گولیاں نکلنے کے بعد پلاسٹک کا ایک گول سا ٹکڑا نکل کر ان کی گود میں جا گرا۔ انہوں نے حیرت سے اس ٹکڑے کو دیکھا۔
میں کچھ بولنے ہی والا تھا کہ انہوں نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور غور سے پلاسٹک کے اس ٹکڑے کا جائزہ لینے لگے۔ اس کا سائز تو پسٹل کی گولی جتنا ہی تھا۔
اب میں بھی تجسس بھرے انداز میں صوبیدار میجر صاحب کو دیکھ رہا تھا۔
انہوں نے اردگرد دیکھا پھر اپنے سامنے رکھے ہوئے اخبار پر لکھا۔ ''حساس مائیکرو فون ہے۔'' پھر بولے۔ ''رفیق میاں! راجا صاحب واپس کب آ رہے ہیں؟''
''ابھی تو راجا نے کچھ نہیں بتایا۔'' میں نے کہا اور اشارے سے پوچھا کہ مائیکرو فون کہاں ہے؟''
انہوں نے پسٹل سے نکلے ہوئے اسی پلاسٹک کے ٹکڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ویسے رفیق میاں! ایک بات ہے، راجا صاحب، آپ کی ہر بات سن لیتے ہیں۔''
''میں بھی تو اس کی بات ہر بات سنتا ہوں تو وہ کیوں نہیں سنے گا۔'' پھر میں نے لکھا۔ ''آپ بولتے رہیں، میں ابھی آتا ہوں۔''
میں دبے پاؤں وہاں سے باہر نکل آیا۔ میرے کانوں میں صوبیدار میجر صاحب کی آواز آ رہی تھی۔ ''دوسری جنگِ عظیم کے موقعے پر میں رنگون میں تھا۔ وہاں......''
میں جانتا تھا کہ اب صوبیدار میجر صاحب کوئی واقعہ شروع کر دیں گے اور مسلسل بولتے رہیں گے۔ میں باہر آیا تو غنی کو طلب کیا اور اس سے کہا۔ ''خاموشی سے جاؤ اور دیکھو کہ ''مہمان'' اس وقت کیا کر رہا ہے؟ اسے علم نہیں ہونا چاہیے۔''
غنی اثبات میں سر ہلا کر وہاں سے چلا گیا۔ میں وہیں

ٹہلتا رہا،غنی نے واپسی میں مشکل سے چھ منٹ لگائے اور بولا۔

''سر،وہ تو ہینڈ فری لگائے موبائل پر ریڈیو سن رہے ہیں۔''

''ہینڈ فری! ہینڈ فری اس کے پاس کہاں سے آیا؟''

''سر،انہوں نے صفدر سے منگوایا تھا۔''

''بلاؤ صفدر کو؟'' میں نے کہا۔صفدر میرا ایک ڈرائیور تھا جو باہر کے کام بھی کرتا تھا۔

صفدر فوراً ہی میرے پاس آ گیا۔میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ فرخ صاحب نے اسے ایک آئی پوڈ دیا تھا کہ اس کے ہینڈ فری نہیں ہیں،تم شہر جاؤ تو لیتے آنا۔''

''تم جانتے ہو آئی پوڈ کیا ہوتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں جی!'' اس نے جواب دیا۔''رابعہ بی بی کے پاس بھی تھا اور ڈاکٹر ٹینا صاحبہ کے پاس بھی ہے۔اس میں گانے ہوتے ہیں جی!''

میں نے صفدر کو واپس بھیج دیا اور غنی سے کہا۔''غنی! فرخ کا وہ آئی پوڈ وہاں سے نکال لو لیکن اسے علم نہ ہو۔''

''مسئلہ ہی کوئی نہیں سر!'' غنی نے مستعدی سے جواب دیا۔''میں یہ کام آج ہی کرلوں گا۔''

میں واپس صوبیدار میجر صاحب کے پاس واپس آ گیا۔ وہ ابھی تک اپنے جنگی کارنامے سنا رہے تھے۔''میں جب اپنی یونٹ میں پہنچا تو سی او صاحب نے پوچھا۔'' کچھ معلوم ہوا؟''

''صوبیدار میجر صاحب!'' میں نے کہا۔''آپ کا واقعہ تو بہت دلچسپ ہے لیکن مجھے ایک ضروری فون کرنا ہے۔ بقیہ واقعہ آئندہ!''

میرے اشارے پر صوبیدار میجر صاحب نے میگزین میں دوبارہ گولیاں ڈالیں اور پسٹل میرے حوالے کر دیا۔

مجھے شدید بے چینی اور اضطراب تھا کہ یہ مائیکروفون میرے پسٹل میں کہاں سے آیا؟ کون میری ساری باتیں سنتا رہا ہے؟ مجھے سجاد پر ابھی صرف شبہ تھا۔ممکن ہے اس کے پاس آئی پوڈ ہی ہو لیکن یہ آئی پوڈ اس کے پاس آیا کہاں سے اور وہ حساس مائیکروفون وہ کہاں سے لایا؟

ڈنر کے بعد میں اپنے کمرے میں آ گیا۔اس وقت تک دینہ سے فتح محمد نہیں آیا تھا۔

سجاد بھی میرے ساتھ ہی کمرے میں آ گیا تھا۔ اسی وقت ریشم کافی لے آئی۔سجاد بلیک کافی پیتا تھا۔اس نے ٹرالی سے بلیک کافی کا مگ سجاد کی طرف بڑھایا اور دوسرا مگ مجھے دے دیا۔

سجاد نے کافی کا گھونٹ بھرنے کے بعد کہا۔''آج ریشم نے کافی اچھی نہیں بنائی۔''

''میں دوسری بنوا دیتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''نہیں، اب یہ اتنی بری بھی نہیں ہے۔'' سجاد ہنس کر بولا۔''میں،تمہاری طرح نواب نہیں ہوں بھائی، میری عادتیں خراب مت کرو۔''

میں نے اس کی بات کے جواب میں کچھ کہنا چاہا تھا کہ میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے چونک کر اسکرین پر نظر ڈالی۔اسکرین پر راجا کا نام تھا۔

میں نے بٹن دبا کر سیل فون کان سے لگا لیا اور کہا۔''ہار مہاراجا! کیا حال ہیں؟''

''حال ایسا نہیں کہ تم سے کہیں۔'' راجا نے گنگنا کر کہا۔ ''فیکے پتر،تو سنا وہاں کیا حال ہے؟''

''او بھائی، میں نے وہ میچ نہیں دیکھا۔کیا خاص بات تھی اس میچ میں؟''

''اس میچ میں خاص بات یہ تھی کہ تو نہ جانے کس لڑکی سے جوتے کھا رہا تھا۔کیوں فیکے پتر،تو نے بھنگ کب سے پینی شروع کر دی؟ یہ تو کیا بکواس کر رہا ہے؟''

''اچھا اچھا،آسٹریلیا کے پانچ کھلاڑی آؤٹ ہو گئے۔''

''کیا بات ہے فیکے؟'' راجا نے پوچھا۔''کیا تو ابھی بات نہیں کرنا چاہتا؟''

''شکر ہے، بات تیری سمجھ میں آ گئی۔'' میں نے کہا۔

''جب میں نے وہ میچ دیکھا ہی نہیں تو میں تبصرہ کیا کروں؟''

''ٹھیک ہے،تو مجھے بعد میں کال کر لینا۔'' یہ کہہ کر راجا نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

''ہیلو...... ہیلو...... راجا!'' میں نے سجاد کو سنانے کے لیے کہا۔پھر بولا۔''لائن ڈراپ ہو گئی۔ نہ جانے یہ راجا بھی فرانس کے کس گوشے سے بول رہا تھا؟''

سجاد نے چونک کر مجھے دیکھا، پھر کافی کا آخری گھونٹ لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''تم کہاں چلے؟'' میں نے ہنس کر پوچھا۔

''یار، میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ میں ذرا آرام کروں گا۔''

''میں سر درد کی کوئی ٹیبلٹ منگوا دیتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''نہیں یار، آرام کروں گا تو ٹھیک ہو جائے گا۔'' سجاد نے کہا اور اٹھ گیا۔

میں نے راجا کا سیل نمبر ملایا تو معلوم ہوا کہ اس کا سیل فون بند ہے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس نے سیل فون بند کیوں کر دیا ہے؟ ممکن ہے اس وقت جہاں وہ موجود ہو، سگنل نہ آ رہے ہوں؟

...ا۔ میں نے نور کا سیل نمبر ملایا لیکن وہ مصروف تھا۔میں نے ...کر سیل فون بستر پر اچھال دیا اور سوچا کہ اب یہ لوگ خود فون کریں گے، میں نہیں کروں گا۔

اچانک دروازے پر دستک دے کر غنی اندر آ گیا۔اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا آئی پوڈ اور ہینڈ فری سیٹ تھا، اس کے ...وہ سجاد کا فون بھی تھا۔اس نے پُرجوش لہجے میں کہا۔''لیجیے میں نے اپنا کام کر دیا۔''

میں نے دونوں چیزیں اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے ...چھا۔''لیکن کیسے؟ کیا تم یہ چیزیں اس سے چھین کر لائے ہو؟''

''نو سر!'' غنی نے کہا۔''ہم مہمان کے ساتھ ایسا سلوک ...یں کرتے۔ریشم نے اس کی کافی میں ویلیوم ٹین کی دو گولیاں ...دی تھیں۔''

''دو گولیاں!'' میں نے حیرت سے کہا۔

''وہ مرے گا نہیں سر، دو گولیوں سے کوئی بھی نہیں مرتا۔ ...گولیاں اس لیے ملائی تھیں کہ ممکن ہے ایک گولی سے کام نہ ...۔ بہت سے لوگوں کے جسم میں قوت مدافعت زیادہ ہوتی ہے۔ان پر دس ملی گرام کی ایک گولی اثر نہیں کرتی۔''

''یہ سبق تمہیں ڈاکٹر شہناز نے پڑھایا ہوگا؟'' میں نے ...ا،پھر سجاد کے آئی پوڈ کی طرف متوجہ ہو گیا۔

میں نے اس کے دونوں اسپیکر کانوں میں لگا کر اسے ...نا کیا تو میرے کانوں میں آواز آئی۔''رنگ دے مجھے رنگ ...دے، مجھے رنگ دے۔''

میں نے جھنجلا کر اسپیکر کانوں سے نکالے اور آئی پوڈ کو ...ور سے دیکھا۔

''کیا ہوا سر؟'' غنی نے پوچھا۔

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور اسپیکر ...دوبارہ کانوں میں لگا لیے۔اب بھی آشا ہی کی آواز آ رہی تھی۔ ...میں بن کے سویرا جاگ اٹھی، ہاں جاگ اٹھی۔ میں بن کے ...ن ناچ اٹھی، ہاں ناچ اٹھی ..... رنگ دے، مجھے رنگ دے۔''

میں نے اسٹاپ کا بٹن دبایا، پھر پلے کا بٹن دبایا تو مجھے ...س سے عجیب سی سرسراہٹ سنائی دی۔ میں نے سوچا، ...یہ کی بات نہیں اور سنی جائے گی اس لیے میں نے بھرائی ...ئی آواز میں کہا۔''ہیلو!''

مجھے اپنی ہی آواز کی بازگشت سنائی دی۔

میرے ...جسم پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ میں نے اچانک ...نکالا تو غنی نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

''تم یہ پسٹل رکھواور باہر لان میں جا کر کچھ بولو۔'' میں نے کہا۔ ''کوئی گانا گاؤ، کچھ بولو۔''

غنی نے مجھے یوں دیکھا جیسے اسے میرے ذہنی توازن پر شبہ ہو۔ پھر میرے گھورنے پر وہ پسٹل لے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد میرے کانوں میں غنی کی آواز آئی۔ وہ اپنی بھاری آواز میں گا رہا تھا۔ ''چھکی پے گئی چن تاریاں دی لو، توں اجے وی نا آیاں سجناں!......'' میں نے ہینڈ فری کانوں سے نکال دیے کیونکہ غنی شاید گانا پورا ہی گانا چاہتا تھا۔

جب دس منٹ گزرنے کے بعد بھی غنی نہ آیا تو میں نے جھنجلا کر اسپیکر پھر کانوں میں فٹ کر لیے اس مرتبہ مجھے ریشم کی آواز سنائی دی۔ ''یہ تو کس کے لیے گا رہا تھا؟''

''ارے، میں ویسے ہی گا رہا تھا جھلی!'' غنی نے کہا۔

''نہیں تو مجھے بتا غنی...... کس کے لیے یہاں کھڑا ہوا ترلے پا رہا تھا؟''

''تجھے اور کوئی کام نہیں ہے؟'' غنی جھنجلا کر بولا۔ ''ہاں، میں گا رہا تھا، پھر......''

''اب تو میں نواب صاحب سے تیری شکایت لگا کر ہی رہوں گی۔ تو اس کنجری نیلم کو دیکھ دیکھ کر گانے گاتا ہے، اس سے یہاں باغ میں ملتا ہے۔''

''او تیرا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟'' غنی نے کہا۔ ''جا کر سو جا، میں نواب صاحب کے پاس جا رہا ہوں۔''

''چل، میں بھی چلتی ہوں تیرے ساتھ!'' ریشم نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

''آ، ہمت ہے تو چل!'' غنی نے اسے چیلنج کیا۔

پھر مجھے ان کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ وہ دونوں میرے ہی کمرے کی طرف آرہے تھے۔ غنی نے دبی دبی آواز میں کہا۔ ''دیکھ اس وقت نواب صاحب کو پریشان مت کر، وہ پہلے ہی پریشان ہیں۔''

''تو پھر تو کیوں جا رہا ہے؟'' ریشم نے پوچھا۔

''مجھے تو انہوں نے بلایا تھا۔'' غنی نے کہا، پھر خاموشی چھا گئی۔

تھوڑی دیر بعد مجھے غنی دکھائی دیا۔ اس کا موڈ خراب ہو گیا تھا لیکن میرے سامنے وہ حتی الامکان نارمل نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''غنی! تم گانا تو بہت اچھا گاتے ہو۔ مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ تم اتنا اچھا گاتے ہو۔''

''جی سر؟'' غنی نے حیرت سے پوچھا۔

''واہ، کیا گانا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''چھکی پے گئی چن تاریاں دی لو!''

وہ اچانک چونک اٹھا اور اپنی جیب سے میرا پسٹل نکال کر اسے بہ غور دیکھنے لگا، پھر حیرت سے بولا۔ ''کیا اس پسٹل میں کوئی ڈیوائس ہے سر؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور آئی پوڈ (IPOD) اس کی طرف بڑھا دیا۔ ''اب یہاں سے کچھ فاصلے پر جا کر سنو لیکن خیال رکھنا، اس دفعہ ریشم سے ٹکراؤ نہ ہو۔''

وہ آئی پوڈ لے کر چلا گیا۔ میں بہ ظاہر نارمل نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میرے اندر ایک ہیجان سا برپا تھا۔ سجاد یا وہ جو کوئی بھی تھا، اس کی اتنی جرأت کیسے ہوئی کہ وہ میری حویلی میں گھس کر مجھے بے وقوف بنائے۔ ''میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''اتنی عبرت ناک سزا دوں گا کہ پھر کسی کو حویلی کا رخ کرنے کی جرأت بھی نہ ہو سکے۔''

مجھے خود پر بھی شدید غصہ آرہا تھا۔ میں کیسے اس حرامزادے کی باتوں میں آگیا؟ کیا واقعی میرا ذہن ماؤف ہو چکا ہے؟

اسی وقت غنی لوٹ آیا تو مجھے احساس ہوا کہ میں جو کچھ سوچ رہا تھا، بہ آواز بلند سوچ رہا تھا۔ غنی نے آہستہ سے کہا۔ ''سر! اس پسٹل میں واقعی کوئی مائیکروفون چھپا ہوا ہے۔''

میرا جسم اب غصے کی شدت سے لرزنے لگا تھا۔

اچانک میز پہ رکھے ہوئے سیل فون میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوا اور بہت خفیف سی گھوں گھوں کی آواز سنائی دی۔ میں نے چونک کر سیل فون کی طرف دیکھا، وہ سیل فون بھی سجاد کا تھا۔ سیل فون اگر بستر یا تکیے کے نیچے ہوتا تو وہ ''گھوں گھوں'' کی ہلکی سی آواز بھی سنائی نہ دیتی۔ گویا اس مردود نے سیل فون سائلنٹ کر دیا تھا۔

میں نے سیل فون اٹھا کر دیکھا۔ کوئی ایس ایم ایس آیا تھا۔ میں نے بٹن دبا کر اسے پڑھنا چاہا لیکن میرے پلے کچھ بھی نہ پڑا۔ پیغام انگریزی ہی میں تھا یعنی انگریزی کے حروف ہی استعمال کیے گئے تھے لیکن سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ میں نے پیغام دوبارہ پڑھا تو مجھے ایسا لگا جیسے وہ ایس ایم ایس پشتو زبان میں ہو اور تحریر کے لیے رومن انگلش استعمال کی گئی ہو۔

میں نے سیل فون غنی کی طرف بڑھا دیا اور کہا۔ ''پڑھ کر سناؤ، شاید پشتو میں ہے اور تمہیں پشتو زبان کسی حد تک سمجھ میں آتی ہے۔''

میں نے شیر خان سے پشتو سیکھی ہے سر!'' غنی نے کہا اور

پیغام پڑھ کر بولا۔ ''اس میں لکھا ہے کہ ''بہت اچھے، اب تم اپنا کام کرو، اور کل رات باہر نکل آؤ۔''

''اس پیغام کو مٹا دو اور یہ دونوں چیزیں اسی طرح رکھ آؤ جیسے لائے تھے۔'' میں نے کہا۔ ''ہاں، احمد شاہ سے کہنا کہ اگر مہمان کمرے سے باہر نکلنے کی بھی کوشش کرے تو اسے نکلنے نہ دے۔ کسی بھی قیمت پر نہیں۔''

غنی کے جانے کے بعد بھی میرا غصہ کم نہ ہوا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ ابھی سجاد کے کمرے میں جاؤں اور اس کی گردن مروڑ دوں لیکن میں نے بہت مشکل سے خود کو روکا۔ وہ اگر میرے ہاتھوں مر جاتا تو مجھے معلوم کیسے ہوتا کہ وہ کون ہے اور کس کے کہنے پر یہاں آیا ہے اور کیوں؟

میرے سیل فون کی گھنٹی اچانک بجی تو میں چونک اٹھا۔ سکرین پر راجا کا نام دیکھ کر میں نے بٹن دبا کر سیل فون کان سے لگایا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔ ممکن ہے سجاد ہماری باتیں سن لے۔ میں نے باہر آکر کہا۔ ''ہاں راجا؟''

''تیرا نشہ اتر گیا فیکے پتر؟'' راجا نے ہنس کر کہا۔

''یار، میں اس وقت تجھ سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔'' میں نے آہستہ سے کہا اور ٹہلتا ہوا لان میں نکل آیا۔ میں نے مختصراً راجا کو مائیکروفون کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔

''اسے مار مت دینا۔'' راجا نے کہا۔ ''تہ خانے میں بند کر دے اور اس سے پوچھ گچھ کر۔ زبان تو وہ مشکل ہی سے کھولے گا لیکن کھولے گا ضرور۔'' پھر وہ ہنس کر بولا۔ ''یار فیکے! میں اور نور جہاں بیگم پرسوں پاکستان پہنچ رہے ہیں۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''اب تجھے پرسوں کا مطلب بتاؤں یا پاکستان کا۔ چل پاکستان کا بتا دیتا ہوں، پاکستان کا مطلب کیا......''

''بس تو ہو گیا شروع!'' میں نے اسے ٹوک دیا۔ ''جب تو میری باتوں کے جواب میں اوٹ پٹانگ بکواس کر رہا تھا تو میں بھی تو سن رہا تھا نا!''

''میرا مطلب ہے کہ پرسوں......''

''ہاں، پرسوں یعنی ڈے آفٹر ٹو مارو۔ اور تو ایئرپورٹ مت آنا، ہم لوگ خود ہی ست بدھائی پہنچ جائیں گے۔''

''مجھے تیری نہیں، نور کی وجہ سے ایئرپورٹ آنا پڑے گا۔'' میں نے کہا۔

''یار تو خود آنے کے بجائے غنی یا سرور کو بھیج دینا۔ میں نور سے کہہ دوں گا کہ میں نے تجھے اطلاع ہی نہیں دی۔ تو ابھی حویلی سے باہر مت نکل!''

''اب کیا تو نے بھنگ پی لی ہے؟'' میں نے کہا۔ ''میں کوئی روایتی نواب یا جاگیردار نہیں ہوں کہ اپنے دشمنوں کے خوف سے قلعہ بند ہو کر بیٹھ جاؤں اور دولت اور جاگیر کے ساتھ ساتھ دشمن تو لازمی ہیں، پھر کیا میں زندگی بھر حویلی میں بند رہوں گا؟''

''اب یہ بھی تو کہہ، راستے بند کیے دیتے ہو دیوانوں کے۔ ڈھیر لگ جائیں گے بستی میں گریبانوں کے!'' راجا ہنس کر بولا۔ ''میں جانتا ہوں تو بہت جی دار ہے لیکن......''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''سیدھی طرح بتا، تم لوگ کس فلائٹ سے آرہے ہو ورنہ مابدولت پرسوں صبح ہی سے ایئرپورٹ پر ڈیرے ڈال دیں گے۔''

''پھر پولیس یا ایئرپورٹ سیکیورٹی فورس کے ہاتھوں پکڑے جائیں گے۔'' راجا نے ہنس کر کہا۔ ''آج کل تو وہاں کوئی دو گھنٹے بھی ایئرپورٹ پر گزارے تو پولیس اسے مشکوک سمجھ کر گرفتار کر لیتی ہے کہ وہ کس مقصد سے ایئرپورٹ پر گھوم رہا ہے۔ کہیں دھماکا کرنا چاہتا ہے یا کسی جہاز کو ہائی جیک کرنے کا پلان بنا رہا ہے یا پھر کسی فلائٹ سے آنے والے وی وی آئی پی کو قتل کرنا چاہتا ہے۔ نہیں فیکے پتر! میں کہاں تیری ضمانت کراتا پھروں گا۔ ہم لوگ پرسوں رات کی فلائٹ سے وہاں پہنچ رہے ہیں۔ فلائٹ اگر لیٹ نہ ہوئی تو ہم پاکستان کے وقت کے مطابق رات یا صبح دو بجے وہاں پہنچیں گے۔''

''ٹھیک ہے یار، میں پہنچ جاؤں گا۔'' میں نے کہا۔ نور کی آمد کی خبر سن کر میری ساری بیزاری ختم ہو گئی تھی۔ میں نے نور کے بارے میں پوچھا تو راجا نے بتایا کہ وہ ابھی کچھ دیر پہلے ایک میٹنگ سے آئی ہے۔

''اسے آرام کرنے دے۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے اس پر بہت زیادہ بوجھ ڈال دیا ہے۔ اسے بات کرنا ہو گی تو خود ہی مجھے فون کر لے گی۔'' میں نے چند رسمی جملوں کے بعد رابطہ منقطع کر دیا۔

نور پاکستان آرہی تھی۔ مجھے ایسی خوشی ہو رہی تھی گویا نور سے برسوں بعد ملاقات ہو گی۔ وہ چھم سے میرے تصور میں اتر آئی اور بولی۔ ''کیا ہوا لارڈ رفیق! تم اتنے پریشان کیوں ہو؟''

''پریشان!'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''میں تو خوش ہوں جان......! بہت خوش! تم آگئے ہو، نور آگیا ہے؟'' میں نے کہا، پھر بولا۔ ''نور آگیا ہے، عجیب سے لگتا ہے نا لیکن شاعر نے اسی طرح کہا ہے۔ اس بے چارے کو کیسے معلوم ہو سکتا تھا کہ نور آتا نہیں ہے بلکہ آتی ہے۔''

میں لان میں کھڑا نہ جانے کب سے یہ بکواس کر رہا تھا۔ ریشم مجھے اس حالت میں دیکھتی تو سر پکڑ لیتی اور سمجھتی کہ غنی کی

طرح اب میں بھی نیلم کے انتظار میں کھڑا میڈم نور جہاں کے درد بھرے گانے گا رہا ہوں۔ ''پھر نور جہاں!'' میں نے خود ہی اپنے سر پر ہلکی سی چپت ماری اور اپنے کمرے کی طرف لوٹ گیا۔

مجھے یقین تھا کہ مجھے خود سے باتیں کرتے، بڑبڑاتے اور ہنستے کئی گارڈز نے دیکھا ہوگا۔ سجاد والے واقعے کے بعد سے گارڈز بہت مستعد ہوگئے تھے۔ وہ یہی سمجھے ہوں گے کہ نواب صاحب کچھ زیادہ ہی پریشان ہوگئے ہیں۔

برآمدے میں آکر میں نے بہت مدھم لہجے میں پکارا۔

''احمد شاہ!''

سامنے والی ڈم ڈم کی باڑھ کے عقب سے نکل کر احمد شاہ میرے سامنے آگیا۔ ''یس سر!'' اس نے پوچھا۔

''گڈ!'' میں نے کہا۔ ''مہمان اگر کمرے سے باہر نکلنے کی کوشش کرے تو اسے نکلنے مت دینا۔''

''او کے سر!'' احمد شاہ نے کہا اور واپس چلا گیا۔

میں بھی اپنے کمرے میں آگیا۔ مجھے اپنے گارڈز کی مستعدی پر اعتبار تھا اس لیے میں بھی لمبی تان کر سوگیا۔

میری آنکھ علی الصباح کھل گئی تو مجھے خوشی ہوئی ورنہ گزشتہ ایک ہفتے سے میں دن چڑھے تک سوتا رہتا تھا۔

میں نے کمرے کی کھڑکی کھول کر دو چار گہرے سانس لیے، پھر ٹریک سوٹ پہن کر لان میں نکل آیا اور ہلکی پھلکی ایکسرسائز کرنے لگا۔

اسی وقت مجھے سجاد نظر آیا۔ اس کے کمرے کا دروازہ میرے سامنے تھا۔ وہ باہر نکلنے لگا تو احمد شاہ اچانک اس کے سامنے آگیا۔ اس نے حیرت سے احمد شاہ کو دیکھا، اس سے پہلے کہ احمد شاہ اس سے کچھ کہتا، میں نے بلند آواز میں کہا۔ ''احمد شاہ! مہمان کو میرے پاس بھیج دو۔'' میرا مقصد صرف یہ تھا کہ احمد شاہ اسے واپس کمرے میں دھکیل نہ دے۔

وہ مسکراتا ہوا میرے پاس آگیا اور بولا۔ ''کیا بات ہے رفیق! آج منہ اندھیرے ہی اٹھ گئے؟''

''ہاں یار، میں اسی وقت اٹھتا ہوں، گزشتہ کچھ دنوں سے میری نیند پوری نہیں ہورہی تھی۔'' پھر میں چونک کر بولا۔ ''یار، اس کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ میرے گارڈز نے ایک مشتبہ شخص کو پکڑا ہے۔ وہ حویلی کے گرد چکر لگا رہا تھا۔ ممکن ہے تم اسے پہچان لو۔''

''وہ ہے کہاں؟'' سجاد نے پوچھا۔

''میرے قید خانے میں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''آؤ میرے ساتھ!'' میں نے اچانک اسے قید خانے میں لے جانے کا فیصلہ کرلیا۔

''ایک منٹ!'' وہ بولا۔ ''میں ڈھنگ کے کپڑے تو پہن لوں۔''

''ارے یار، ہم کسی پارٹی میں نہیں جارہے ہیں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''چلو۔'' میں نے بے تکلفی سے اس کا ہاتھ پکڑ کے کھینچا۔

وہ بادلِ ناخواستہ میرے ساتھ چل دیا۔ میں نے کچھ فاصلے پر احمد شاہ کو دیکھا، وہ بھی محتاط انداز میں ہمارے پیچھے آرہا تھا۔

میں گارڈ روم کے سامنے سے گزرا تو گارڈز نے ایڑیاں بجا کر مجھے فوجی انداز میں سلامی دی۔ یہ سب صوبیدار میجر صاحب کی تربیت کا نتیجہ تھا۔ سجاد بھی اس سلامی سے مرعوب ہوگیا۔ پہلے بھی وہ اسی طرح مرعوب ہوا تھا۔

میں اسے لے کر اس کمرے میں گیا جہاں سے تہ خانے میں جانے کا راستہ تھا۔

نیچے بھی دو گارڈز موجود تھے۔ وہ مجھے دیکھ کر بوکھلا گئے اور مجھے زوردار انداز میں سیلیوٹ کیا۔

''غنی کو بلاؤ۔'' میں نے ایک گارڈ سے کہا۔

''جی سر!'' اوپر سے غنی کی آواز آئی، پھر وہ فوراً ہی سیڑھیاں اتر کر میرے سامنے آگیا۔

''وہ کونے والا کمرا کھول دو۔'' میں نے کہا۔

اسے بھی غالباً اندازہ تھا کہ میں کسی قیدی کے کمرے میں جاؤں گا اس لیے وہ چابیاں پہلے ہی لے آیا تھا۔ مجھے غنی کی یہی باتیں پسند تھیں۔

وہ مستعدی سے آگے بڑھا اور تہ خانے میں دائیں طرف گھوم گیا۔ تہ خانہ انگریزی کے حرف "T" کی شکل میں بنا ہوا تھا۔

میں سجاد کو لے کر کونے والے کمرے میں پہنچا تو اس کے چہرے پر حیرت نمودار ہوئی۔ ''یار، یہاں تو کوئی نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔

''کوئی نہیں ہے؟'' میں نے حیرت کا مظاہرہ کیا۔ ''تم کہیں اور ہو گیا؟''

''میرا مطلب ہے کوئی قیدی۔'' سجاد نے کہا۔

''تو تم ہونا قیدی۔'' میں نے کہا پھر لہجہ بدل کر بولا۔ ''اندر چلو۔''

''کیا مطلب؟'' سجاد نے حیرت سے کہا۔

میں نے گھوم کے اچانک اس کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کردیا۔ ''اندر چلو!'' یہ کہہ کر میں نے اسے اندر کی طرف دھکا دیا۔

وہ ابھی تک حیرت سے آنکھیں پھاڑے مجھے گھور رہا تھا۔

میں نے اس کے منہ پر دوسرا ہاتھ جمایا۔ ''حرام زادے! تو کیا مجھے بالکل ہی الو کا پٹھا سمجھتا ہے؟ کون ہے تو؟''

''یار میں......''

''شٹ اپ!'' میں دہاڑ کر بولا۔ ''ادب سے بات کر۔ تو اس وقت نواب رفیق احمد شیرازی آف ست بدھائی سے مخاطب ہے۔ کون ہے تو؟''

''میں......سجاد......''

میں نے اس کے منہ پر پھر زناٹے دار تھپڑ جڑ دیا۔ ''میں صرف سچ سننا چاہتا ہوں، تجھے کس نے بھیجا ہے یہاں؟''

سجاد نے طویل سانس لیا اور آستین سے ہونٹوں پر بہنے والا خون صاف کرتے ہوئے بولا۔ ''تو تمہیں معلوم ہوگیا کہ......''

''ادب سے بات کر!'' میں نے اس کی کمر پر لات جماتے ہوئے کہا۔ ''ہاں، ہمیں سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔''

''جب معلوم ہو ہی چکا ہے تو آپ مجھ سے کیا پوچھ رہے ہیں؟'' سجاد نے کہا۔ ''مجھے گولی مار کے باہر پھینک دیں۔''

''ہم یہ بھی کریں گے لیکن پہلے تو بتائے گا کہ تجھے یہاں کس نے بھیجا ہے؟''

''میں بتاؤں گا؟'' اس نے تحقیر آمیز انداز میں کہا۔ ''قبلہ نواب صاحب! آپ اگر مجھ سے پوچھ سکتے ہیں تو پوچھ لیں۔'' اس کے انداز میں گویا چیلنج تھا میرے لیے۔

''احمد شاہ!'' میں نے بلند آواز میں کہا۔ ''اس حرام زادے کے کپڑے اتار لو۔ جسم پر لباس کی ایک دھجی بھی نہیں رہنا چاہیے۔''

''مجھے تھانے میں پولیس نے اتنی دفعہ ننگا کیا ہے کہ اب تو میں اس کا عادی ہوگیا ہوں۔'' سجاد نے اطمینان سے جواب دیا۔ ''لو، میں خود ہی اپنے کپڑے اتار دیتا ہوں۔'' اس نے سلیپنگ سوٹ کی شرٹ اتار کر احمد شاہ کی طرف پھینک دی، پھر اس نے بنیان بھی اتار کر احمد شاہ کی طرف اچھال دی۔ اس کا ورزشی جسم اور مسلز بہت بہترین تھے۔ اس نے پاجامہ اتار کے وہ بھی احمد شاہ کی طرف اچھال دیا۔ اس کے جسم پر اب صرف زیر جامہ تھا۔

''کہیں تو یہ بھی اتار دوں؟'' اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

''ہاں، یہ بھی اتارو۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔

اس نے وہ بھی اتار دیا۔

احمد شاہ نے اس کے کپڑے اٹھا کر ان کی گٹھری سی بنالی۔

''اب بتاؤ، تمہیں یہاں کس نے بھیجا ہے؟'' اس کے بازوؤں اور پیٹھ پر زخموں کے بہت سے نشانات تھے۔ زخموں کے نشانات سینے پر بھی ہوں گے لیکن اس کے سینے پر گھنے بال تھے اس لیے کوئی نشان نظر نہیں آرہا تھا۔

''مجھے یہاں شیر شاہ سوری نے بھیجا ہے۔'' وہ تحقیر آمیز انداز میں بولا۔ ''وہ خود رہتاس کے قلعے میں مقیم ہے۔''

میں نے غنی سے کہا۔ ''ہیٹنگ راڈ لے کر آؤ۔''

غنی نے فوراً ہی آگے بڑھ کر ہیٹنگ راڈ کا پلگ ساکٹ میں لگا دیا۔

سجاد وہ سب کچھ یوں دیکھ رہا تھا جیسے کوئی کارٹون فلم دیکھ رہا ہو۔ اس کے چہرے پر کچھ ایسی ہی مسکراہٹ تھی۔

''احمد شاہ!'' میں نے بلند آواز میں کہا۔ ''پہلے رسی لاکر اس کے ہاتھ پیر جکڑ دو۔''

احمد شاہ فوراً ہی کہیں سے مضبوط سی ایک رسی لے آیا۔ اس نے سجاد کی پشت پر جا کر اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا لیکن خلاف توقع سجاد نے گھوم کر اس کے شانے پر ایک لات رسید کردی۔

احمد شاہ اچھل کر پیچھے گرا تو سجاد نے کہا۔ ''مجھے باندھنے کے لیے پہلے مجھے مارنا ہوگا۔ پہلے مجھے گولی مارو، پھر جو دل چاہے کرنا۔'' اس نے سخت لہجے میں کہا۔

میں نے احمد شاہ کو پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا اور خود گھوم کر سجاد کے چہرے پر اتنی زوردار لات جمائی کہ وہ دیوار سے ٹکرا کر فرش پر گر گیا۔ میں نے اس کی پیٹھ پر گھٹنا رکھا اور اس کی گردن یوں پکڑ لی جیسے سپیرے سانپ کی گردن پکڑتے ہیں، پھر میں نے گھٹنے سے اس کی پیٹھ پر زوردار ضرب لگائی۔ اس کے منہ سے کراہ نکل گئی۔ میں نے اس کی گردن چھوڑ کر اس کی دونوں کلائیاں تھام لیں اور انہیں بری طرح مروڑ کر رکھ دیا پھر میں نے رسی اٹھا کر اس کے دونوں ہاتھ مضبوطی سے باندھے اور اسی رسی سے اس کے پیر بھی جکڑ دیے اور اسے سیدھا کردیا۔

دیوار سے ٹکرانے پر اس کا سر پھٹ گیا تھا اور خون اس کے چہرے پر پھیل گیا تھا۔ میں نے اسے بے دردی سے گھسیٹا اور دیوار کے سہارے بٹھا دیا اور درشت لہجے میں کہا۔ ''اب بولو، تمہیں کس نے یہاں بھیجا ہے؟''

سجاد خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھتا رہا۔

''تم نے اگر اب بھی جواب نہ دیا تو میں تمہارے ساتھ وہ سلوک کروں گا جس کا تم نے تصور بھی نہ کیا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

جواب دینے کے بجائے اس نے سختی سے ہونٹ بھینچ لیے۔

''غنی! ہیٹنگ راڈ مجھے دو۔''

راڈ اس وقت تک انگارے کی طرح سرخ ہو رہی تھی۔ غنی نے اس کا پلگ نکالا اور راڈ میری طرف بڑھا دی۔

میں نے اچانک راڈ اس کے شانے پر رکھ دی۔ تکلیف کی شدت سے سجاد بری طرح کراہ کر رہ گیا۔

''تمہارے جسم پر ابھی زخموں کی بہت گنجائش ہے۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''گئے وقتوں میں بادشاہ اپنے غلاموں کو داغنے کے لیے ان کی پشت پر اسی طرح اپنی مہر ثبت کرتے تھے۔ بولو ورنہ میں تمہارا پورا جسم داغدار کر دوں گا۔''

''تم مجھے ذبح بھی کر دو تو میں زبان نہیں کھولوں گا۔'' سجاد نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

غنی راڈ دوبارہ سرخ کر چکا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے راڈ لی اور اس مرتبہ اس کے سینے پر رکھ دی۔ وہ بری طرح چیخا۔ اس کے ساتھ ہی کمرے میں گوشت اور بال جلنے کی بو پھیل گئی۔ میں نے راڈ اس کے سینے سے ہٹا کر اچانک اس کے پیٹ پر رکھ دی۔ وہ ایک مرتبہ پھر زور سے چیخا لیکن منہ سے کچھ نہ بولا۔

میں نے غنی کے ہاتھ سے سگریٹ اور لائٹر لیا اور احمد شاہ سے کہا۔ ''اسے پانی پلاؤ۔''

احمد شاہ پانی کی بوتل لے آیا اور اس کے منہ سے لگا دی۔

اس نے ایک ہی سانس میں آدھی بوتل خالی کر دی اور گہرے گہرے سانس لینے لگا، پھر پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ''زبان کھلوانے کا یہ طریقہ بھی شاید آپ کو صوبیدار میجر صاحب نے سکھایا ہے؟ وہ آخر جاپانیوں کی قید میں رہ چکے ہیں۔''

''بتاؤ، تمہیں کس نے بھیجا ہے یہاں؟'' میں نے اس کی بات کا جواب دیے بغیر سرد لہجے میں پوچھا۔

''میں رانا سانگا کا ایلچی ہوں۔'' اس کے لہجے میں تضحیک تھی۔

''لگتا ہے، تمہیں تاریخ سے بہت لگاؤ ہے۔ کچھ دیر پہلے تم نے شیر شاہ سوری کا نام لیا تھا، اب رانا سانگا کے آدمی بن بیٹھے۔'' میں نے غنی کے ہاتھ سے تپتی ہوئی ہیٹنگ راڈ پھر لے لی اور کہا۔ ''مجھے تو تم ہیموں بقال کے آدمی لگتے ہو۔'' یہ کہتے ہوئے راڈ میں نے اس کی گردن پر لگا دی۔ اس مرتبہ میں نے خاصی قوت سے راڈ اس کی گردن پر جمائی تھی۔ اس کے حلق سے کرب ناک چیخ برآمد ہوئی اور وہ بری طرح مچلنے لگا۔ ''نہیں بولو گے تو تمہارے پورے جسم کی چربی اسی طرح بہا دوں گا۔''

''میں اس کا نام بتا بھی دوں تو تم کچھ نہیں کر سکتے۔'' وہ بلبلا کر بولا۔

''اس کا فیصلہ میں کروں گا کہ مجھے کیا کرنا ہے، تم صرف نام بتاؤ۔ جھوٹ مت بولنا۔ میں تصدیق کیے بغیر تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔'' میں نے راڈ ایک مرتبہ پھر غنی کی طرف بڑھا دی۔

''کوشش کر کے دیکھ لو۔'' اس نے درد سے کراہتے ہوئے کہا۔

میں نے سگریٹ کے پیکٹ سے ایک سگریٹ نکالی اور اس کے دو تین گہرے گہرے کش لے کر اٹھا اور اسے گھسیٹ کر اس کا منہ دیوار کی طرف کر دیا۔ ''بولو، تمہیں کس نے یہاں بھیجا تھا؟''

وہ پاگلوں کی طرح ہنسا۔

میں نے اس کے سر کے بال مٹھی میں جکڑے اور جلتا ہوا سگریٹ اس کے دائیں کان میں ڈال کر بری طرح رگڑ دیا۔

اس مرتبہ اس کے منہ سے فلک شگاف چیخ نکلی اور وہ بری طرح اپنا سر جھٹکنے لگا۔ ''میں اس کا نام بتا بھی دوں تو تم تصدیق کیسے کرو گے؟'' وہ کراہتے ہوئے بولا۔

''یہ میرا مسئلہ ہے۔'' میں نے سفاک لہجے میں کہا اور پیکٹ سے دوسرا سگریٹ نکال کر سلگا لیا۔

''وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔'' اس نے کراہتے ہوئے کہا۔

''تمہارا کیا خیال ہے؟ میں تمہیں زندہ چھوڑ دوں گا؟ ہاں اگر تم نے سچ بولا تو میں تمہیں زندہ چھوڑ دینے کے بارے میں سوچ سکتا ہوں۔''

وہ خاموشی سے خلا میں تکتا رہا۔

میں نے سگریٹ کا ایک گہرا کش لیا اور اچانک سگریٹ اس کے بائیں کان میں مسل دیا۔

وہ پھر بری طرح چیخا اور بولا۔ ''میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ سچ اور جھوٹ کا فیصلہ کرنا تمہارا کام ہے۔ مجھے زوہیب نے یہاں بھیجا تھا۔'' اس نے انکشاف کیا۔

میں نے پھر اسے دیوار کے سہارے بٹھا دیا اور احمد شاہ سے کہا کہ اسے پانی پلاؤ۔

پانی پینے کے بعد اس کی حالت قدرے سنبھل گئی لیکن وہ اب بھی اپنا سر جھٹک رہا تھا۔

''دلاور کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے تمہاری آواز سنائی نہیں دے رہی ہے۔'' وہ کراہتے ہوئے بولا۔ ''دونوں کانوں میں بہت شدید تکلیف

ہے۔''

اس کی حالت واقعی بہت خراب تھی۔ اس کے سینے اور گردن سے خون کے ساتھ ساتھ سفید سفید چربی بھی بہہ کر باہر نکل آئی تھی۔

میں نے احمد شاہ سے کہا۔ ''اس کی مرہم پٹی کر دو۔ کانوں میں بھی کوئی دوا ڈال دو۔ میں تھوڑی دیر بعد پھر آؤں گا۔''

میں اس کے کمرے سے باہر نکل آیا۔ وہ بیٹھنے کے قابل ہی نہیں رہا تھا اس لیے دائیں طرف لڑھک گیا تھا۔

اچانک مجھے سردار خان کا خیال آ گیا۔ وہ بھی تو سجاد کو جانتا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ بھی زوہیب کا آدمی تھا۔

میں چلتے چلتے سردار خان کی کوٹھڑی کی طرف مڑ گیا۔

سردار خان دیوار سے پشت لگائے، فرشی بستر پر نیم دراز تھا۔

وہ مجھے دیکھ کر چونک اٹھا، اس کے زخم اب بھر رہے تھے۔ میں نے غنی کو دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا۔

غنی نے دروازہ کھولا تو میں اندر داخل ہو گیا۔ مجھے دیکھ کر سردار خان کھڑا ہو گیا۔

''تم سجاد کو جانتے ہو؟'' میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔

''کون سجاد؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے اس کے منہ پر الٹا ہاتھ رسید کیا۔ ''تو سجاد کو نہیں جانتا۔ وہ جو اس دن تجھے یہاں سے رہائی دلانے آیا تھا۔'' میں نے طیش میں آ کر کہا۔

''اس کا نام راشد خان ہے نواب صاحب!'' سردار خان نے دلیری سے جواب دیا۔ اس کے سارے کس بل نکل گئے تھے کیونکہ اس وقت میرے ساتھ غنی بھی تھا اور اس کے ہاتھ میں ہیٹنگ راڈ تھی۔

''وہ کس کا آدمی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ دلاور کا آدمی ہے نواب صاحب!'' سردار خان نے جواب دیا۔

میں نے پھر اس کے منہ پر ایک ہاتھ جمایا اور کہا۔ ''جھوٹ مت بولو سردار! سچ سچ بتاؤ، وہ کس کا آدمی ہے؟''

''میں نے آپ کو بتایا تو ہے کہ.....''

''احمد شاہ!'' میں نے آواز دی۔ ''اس کے ہاتھ پاؤں باندھو، غنی تم راڈ گرم کرو۔''

سردار خان کا چہرہ خوف سے زرد پڑ گیا۔ اسے راڈ سے پہنچنے والی اذیت کا علم تھا۔

جب احمد شاہ رسی لے کر اس کی طرف بڑھا تو وہ بولا۔

''وہ..... رانا زوہیب کا آدمی ہے نواب صاحب!''

''اور تم؟'' میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔ ''تم کس کے آدمی ہو؟''

''میں..... میں بھی..... رانا صاحب کے لیے..... کام کر رہا تھا۔'' اس نے اٹکتے ہوئے بتایا۔

''تم نے پہلے جھوٹ کیوں بولا تھا؟'' میں نے دہاڑ کر پوچھا۔ ''تمہیں اس جھوٹ کی سزا معلوم ہے؟''

''مجھے معاف کر دیں نواب صاحب!'' سردار گھگھیا کر بولا۔ ''رانا صاحب نے مجھ سے یہ کہا تھا کہ اگر میں کبھی پکڑا جاؤں تو دلاور کا نام لوں۔''

''اس رانا کو تو میں دیکھ لوں گا۔'' میں نے کہا اور تہ خانے سے باہر آ گیا۔

وہ دونوں حرامزادے زوہیب کے کتے تھے۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ وہ مجھ پر راشد کے اغوا کا الزام لگا کر پولیس کو یہاں بھیج سکتا ہے۔ زوہیب نے جب سردار خان کو خرید لیا تو اسے یہ بھی معلوم ہوگا کہ یہاں کوئی تہ خانہ بھی موجود ہے۔ پولیس آتی اور راشد کے ساتھ ساتھ بقیہ قیدیوں کو بھی تہ خانے سے برآمد کر لیتی۔ پھر کل کے اخبارات میں سرخیاں لگتیں کہ ست بدحالی کے نواب رفیق احمد شیرازی کی نجی جیل کا انکشاف! ان کی نجی جیل سے پانچ قیدی برآمد! ان پر بدترین تشدد کیا گیا ہے۔ قیدیوں میں سے ایک رانا زوہیب کا خاص آدمی راشد خان بھی ہے۔

اچانک مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ کل تک راشد کا رابطہ زوہیب سے تھا۔ آج جب رابطہ نہیں ہوگا تو وہ سمجھ جائے گا کہ اس کا آدمی کسی مصیبت میں پھنس گیا ہے۔ وہ اس کے اغوا کا پرچہ درج کرانے میں تاخیر نہیں کرے گا اور پولیس میری حویلی کی طرف چڑھ دوڑے گی۔

میں نے غنی سے کہا۔ ''ان سب قیدیوں کو تہ خانے سے نکال کر کہیں اور منتقل کر دو۔ تہ خانے میں کسی کی بھی موجودگی کا سراغ نہیں ملنا چاہیے۔''

''او کے سر!'' اس نے سر ہلا کر کہا۔

میں نے صوبیدار میجر صاحب سے اس موضوع پر بات کی تو انہوں نے بھی اسی خدشے کا اظہار کیا۔

میں اپنے کمرے میں پہنچا تو ریشم نمودار ہوئی۔ اس نے کہا۔ ''نواب صاحب! آپ ناشتے کے وقت کہاں تھے؟ ڈاکٹر صاحبہ بہت غصہ کر رہی تھیں جی۔''

''اچھا!'' میں مسکرایا۔ ''تم میرے لیے ناشتا لے آؤ۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

ریشم سر جھکا کر کمرے سے نکل گئی۔ جب ڈاکٹر مہدی حسن، ان کا بیٹا ڈاکٹر حسن اور بیٹی نینا ست بدھائی آئے تھے۔ اسپتال کی ڈیوٹی سے ریشم کو فارغ کر دیا گیا تھا لیکن وہ اپنے شوق سے اب بھی اکثر اسپتال چلی جاتی تھی۔ اب تو ڈاکٹر شہلا بھی آ گئی تھی۔

میں ناشتے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ شہناز وہاں آ گئی۔ اب اسے بھی مسلسل ڈیوٹی کرنے سے نجات مل گئی تھی۔

''صبح صبح کہاں غائب ہو گئے تھے؟''

میں نے اسے تفصیل سے راشد کے بارے میں بتایا۔

''تو یہ راشد، زوہیب کا آدمی ہے؟'' شہناز نے کہا۔

''ہاں، تم ایسا کرو، ابھی غنی کو کانوں کے زخم کے لیے کوئی دوا دے دو۔''

''کیا غنی کے کان زخمی ہو گئے ہیں؟'' شہناز نے چونک کر پوچھا۔

''غنی کے نہیں بلکہ راشد کے کان زخمی ہیں، میں نے اس کے کانوں میں جلتے ہوئے سگریٹ رگڑ دیے ہیں۔''

''تم اتنے اذیت پسند کب سے ہو گئے رفیق؟'' شہناز نے کہا۔

''میں اذیت کو بالکل پسند نہیں کرتا لیکن وہ مردود زبان کھولنے میں آمادہ نہیں تھا۔''

''تم نے ناشتا کر لیا؟'' شہناز نے پوچھا۔

مجھے اچانک فتح محمد کا خیال آیا۔ میں نے شہناز سے پوچھا۔ ''ہاں، رات میں کسی وقت میرا ایک زخمی گارڈ فتح محمد آیا ہوگا؟''

''ہاں، وہ شدید زخمی ہے۔'' شہناز نے کہا۔ ''میں نے سرور کو جہلم بھیج کر اس کے لیے بلڈ منگوایا تھا۔ ویسے اب وہ خطرے سے باہر ہے۔''

''میں سوچ رہا ہوں کہ یہاں ایک جدید میڈیکل لیب کے ساتھ ساتھ بلڈ بینک کا بھی انتظام کر لوں۔''

''یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔'' شہناز نے کہا۔ ''پہلے آپریشن تھیٹر کا بندوبست تو ہو جائے۔''

''وہ تو خیر بن ہی رہا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ڈاکٹر مہدی حسن O.T. کے ساز و سامان کی لسٹ بھی مجھے دے چکے ہیں۔ اس میں سے کچھ مشینیں اور آلات ہمیں یہیں مل جائیں گے، کچھ چیزیں امپورٹ کرنا پڑیں گی۔'' میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں ذرا فتح محمد کی خیر خبر لے لوں۔''

''اس کے دائیں شانے اور پیر میں گولیاں لگی ہیں۔ میں نے فی الحال اسے نیند کا انجکشن دے دیا ہے۔ تم رات میں کسی وقت اس سے مل لینا۔''

''ہاں، کل راجا اور نور بھی آ رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''راجا نے مجھے بتایا تھا۔'' شہناز مسکرا کر بولی۔

''اچھا میں ذرا اسپتال کا چکر لگا لوں۔'' شہناز نے کہا۔ ''شہلا اور نینا کہیں گی کہ میں نے اسپتال کا سارا بوجھ ان پر لاد دیا ہے۔''

''ڈاکٹر شہلا کا دل لگ گیا ہے یہاں؟'' میں نے پوچھا۔ ''اس ویرانے میں کوئی لیڈی ڈاکٹر کبھی آنے کو تیار نہ ہوتی۔''

''شہلا کا دل یہاں لگ گیا ہے۔'' شہناز نے ہنس کر کہا۔ ''وہ بھی بچپن ہی سے میری طرح سرپھری ہے۔''

''تم سرپھری ہو؟'' میں نے ہنس کر پوچھا۔ ''بظاہر نظر تو نہیں آتیں۔''

''ابھی آپ نے دیکھا ہی کیا ہے نواب رفیق احمد شیرازی!'' شہناز نے کہا اور مسکرا کر چلی گئی۔

میں پھر لان میں نکل آیا۔ غنی نے یہ لان بہت محنت سے بنایا تھا۔ اب تو وہ باغ ویران ہو کر رہ گیا تھا۔ راجا یہاں تھا نہیں، رابعہ بھی چلی گئی تھی۔ میں نے بھی وہاں بیٹھنا چھوڑ دیا تھا۔ رانا کی قید سے رہائی پانے کے بعد تو میں وہاں بیٹھا ہی برائے نام تھا۔ مالی آج بھی باغ پر اتنی محنت کرتے تھے۔ مختلف جانور اور پرندے بھی تھے لیکن باغ میں جب تک بیٹھنے والے نہ ہوں، اس کے حسن کو سراہتا کون؟

میں تھکا تھکا سا لان چیئر پر بیٹھ گیا۔ خنکی بڑھتی جا رہی تھی۔ موسم تبدیل ہو رہا تھا اس لیے دھوپ میں اب وہ تمازت نہیں تھی۔

مجھے نیلم نظر آئی جو سرونٹ کوارٹرز کی طرف سے غالباً اسپتال کی طرف جا رہی تھی۔ اچھی غذا اور پُرسکون ماحول نے اسے مزید خوبصورت کر دیا تھا۔ اس کا چہرہ نکھر گیا تھا لیکن آنکھوں میں اب بھی وہی چمک تھی۔

اس نے میرے نزدیک پہنچ کر بہت ادب سے مجھے سلام کیا۔ میں نے سلام کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔ ''کیسی ہو نیلم! تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟''

''مجھے بھلا کیا تکلیف ہوتی ہے نواب صاحب!'' نیلم نے سر جھکا کر کہا۔ ''میں بہت آرام سے ہوں۔''

''تم کچھ پڑھی لکھی بھی ہو؟''

''ہاں جی! میں نے آٹھ جماعت تک پڑھا ہے۔ یہاں بھی مجھے ڈاکٹر شہناز صاحبہ نے اپنے ساتھ اسپتال میں لگا لیا ہے۔ وہ مجھے زخمیوں کی پٹی کرنا اور انجکشن لگانا سکھا رہی ہیں۔''

''اچھا!'' میں نے حیرت سے کہا۔

''ہاں جی! یہاں کرنے کو کوئی کام نہیں تھا تو ڈاکٹر صاحبہ نے مجھے اپنے اسپتال میں رکھ لیا۔'' وہ سر جھکا کر بولی۔ ''میں جاؤں نواب صاحب! ڈاکٹر صاحبہ میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔''

''ہاں، تم جاؤ۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

اس نے پھر عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور وہاں سے چلی گئی۔ اس کی نظروں میں عجیب سی تپش تھی، جھلسا دینے والی۔ وہ تپش مجھے اپنے جسم پر محسوس ہوتی تھی۔ وہ ابھی کم سن تھی لیکن اس کی آنکھیں کسی بھرپور عورت کی طرح تھیں۔

میں نے خود کو ملامت کی، یہ تم کیا سوچنے لگے نواب رفیق احمد شیرازی؟ تم آخر خود کو سمجھتے کیا ہو، یوسف ثانی؟ کہ ہر خوبصورت لڑکی تمہیں دیکھ کر مبہوت ہو جاتی ہے۔ تم کہاں کے دانا ہو، کسی ہنر میں یکتا ہو کہ خوبصورت لڑکیاں راہ چلتے تم پر مرنے لگیں؟

میں سر جھٹک کر واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔

چار گھنٹے بعد میں تازہ دم ہو کر اپنے کمرے سے نکلا تو دن ڈھل چکا تھا۔ میں نے کافی باغ میں پینے کا فیصلہ کیا۔ اس باغ میں اکیلے مور، ہرن اور دوسرے پالتو جانور پھرتے رہتے تھے، ان کی خوبصورتی اور سریلی آوازوں کو سراہنے والا ایک عرصے سے کوئی نہیں تھا۔

میں نے ریشم سے کہا۔ ''ہم کافی آج باغ میں فوارے کے پاس پئیں گے۔ ڈاکٹر شہناز کو بھی یہیں بلا لاؤ۔''

شہناز کے ساتھ شہلا بھی تھی اور نینا بھی۔

''اب فتح محمد کا کیا حال ہے ڈاکٹروں؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ کو اپنے حال سے فرصت ہو تو کسی کا حال پوچھیں۔'' شہناز نے کہا۔

''ہم نے تو صبح بھی اس کے بارے میں استفسار فرمایا تھا ڈاکٹر!'' میں نے گردن اکڑا کر کہا۔

''وہ اب ہوش میں ہے، تم چاہو تو اس سے مل سکتے ہو۔'' شہناز اچانک ڈاکٹر شہناز بن گئی۔ ''لیکن اس سے زیادہ بات چیت مت کرنا۔''

''تم نے پوچھا تو ہوتا کہ اس کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا ہے؟'' میں نے کہا۔

''میں نے نہیں پوچھا۔ ہو سکتا ہے ڈاکٹر حسن نے پوچھا ہو، فتح محمد کا کیس وہی دیکھ رہے ہیں۔''

میں نے کافی اور دوسرے لوازمات کی طرف توجہ دلائی اور شہناز سے کہا۔ ''پہلے کافی اور سموسوں کی طرف رجوع کرو، پھر کوئی اور بات کرنا۔''

''رجوع کریں۔'' نینا ہنس کر بولی۔

''آج تو نواب صاحب بہت گاڑھی اور بامحاورہ اردو بول رہے ہیں۔'' شہلا مسکرا کر بولی۔

ہنستے ہوئے اس کے رخساروں میں ڈمپل پڑتے تھے۔

''واہ ڈاکٹر شہلا کیا خوب صورت بات کہی ہے۔'' نینا نے کہا۔

''خوبصورت لوگ ہی خوبصورت باتیں کر سکتے ہیں۔'' میں نے شہلا کی طرف دیکھ کر کہا جس کے چہرے کی رنگت اچانک سرخ ہو گئی تھی اور وہ نظریں نیچی کیے مسکرا رہی تھی۔

''شہلا! جلدی سے کافی ختم کرو اور اسپتال جاؤ۔'' شہناز نے کہا۔ ''ڈیوٹی پر اس وقت کون ہے؟ ہم تینوں تو یہاں ہیں۔''

''ڈیوٹی پر ڈاکٹر حسن ہیں۔'' نینا نے جواب دیا۔

''کیا عورتوں کی دیکھ بھال بھی وہی کریں گے؟'' شہناز اس پر الٹ پڑی۔

''وہاں ڈاکٹر نیلم بھی تو ہیں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''ڈاکٹر نیلم!'' نینا نے حیرت سے کہا۔ ''یہاں کوئی اور نئی ڈاکٹر بھی آئی ہے؟''

''اسے باہر سے امپورٹ نہیں کیا گیا ہے، ڈاکٹر شہناز نے یہیں تیار کیا ہے۔''

''اچھا وہ۔'' نینا ہنس کر بولی۔ ''اس نیلم کی بات کر رہے ہیں آپ؟''

''انہیں باتیں کرنے کے سوا اور آتا ہی کیا ہے؟'' شہناز نہ جانے کیوں سیخ پا ہو رہی تھی۔

اس کے تیور دیکھ کر شہلا نے جلدی جلدی کافی ختم کی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ٹھہرو ڈاکٹر شہلا!'' نینا نے کہا۔ ''میں بھی چل رہی ہوں۔'' پھر وہ بھی اپنی کافی ختم کر کے اٹھ کھڑی ہوئی اور دونوں تیزی سے روانہ ہو گئیں۔

میں شہلا کی دلکش چال دیکھتا رہا۔ وہ لچکتی ہوئی شاخ کی طرح چلتی تھی۔ جتنی خوبصورت وہ خود تھی، اتنی ہی خوبصورت اس کی چال بھی تھی اور آواز بھی۔

ان کے جانے کے بعد شہناز نے کہا۔ ''رفیق! میں تمہاری حرکات و سکنات دیکھ رہی ہوں۔ تم شہلا سے دور ہی رہو تو بہتر ہے۔''

میں نے حیرت سے اسے دیکھا اور کہا۔ ''کیوں نزدیک جانے پر وہ کاٹ لیتی ہے؟''

’’میں اس سے کچھ کہوں گی تو وہ اپنا بوریا بستر لپیٹ کر لاہور روانہ ہوجائے گی، وہ اسی قسم کی ہے۔ ہاں، تم سے ضرور کہہ سکتی ہوں۔‘‘

’’میں سمجھا نہیں، تم کہنا کیا چاہتی ہو؟‘‘ میں نے انجان بن کر پوچھا۔

’’تم اچھی طرح سمجھتے ہو کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔ جب سے شہلا آئی ہے، میں تمہارے رنگ ڈھنگ دیکھ رہی ہوں۔‘‘

’’خدا کے غضب سے ڈرو ڈاکٹر!‘‘ میں نے کہا۔ ’’تم نے میرا کون سا رنگ اور کون سا ڈھنگ ایسا دیکھ لیا؟‘‘

’’اب میں شہلا ہی سے بات کروں گی۔‘‘ شہناز نے سرد لہجے میں کہا۔

’’ارے، تم تو واقعی سیریس ہوگئیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔‘‘

’’اگر ہے بھی تو اسے دماغ سے نکال دو۔‘‘ شہناز نے کہا۔ ’’شرع میں بھی صرف چار بیویوں کی گنجائش ہے۔‘‘

’’بجا فرمایا آپ نے مفتی صاحب!‘‘ میں نے سر ہلا کر کہا۔ ’’لیکن حضور، آپ کو کیسے الہام ہوا کہ میں چار شادیاں کر چکا ہوں؟ میری تو ابھی ایک شادی بھی نہیں ہوئی۔‘‘

’’کل نور آرہی ہے؟‘‘ شہناز نے کہا۔

’’اس کے باوجود تین کی گنجائش تو موجود ہے۔‘‘

’’میری بلا سے، تم یہاں اپنا حرم بنالو، سو شادیاں کرو لیکن......‘‘

’’تم پریشان مت ہو۔‘‘ میں ایک دم سنجیدہ ہوگیا۔ ’’میرے دل میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔‘‘

’’لیکن شہلا کے دل میں تو آسکتی ہے۔‘‘ شہناز نے کہا۔

’’کیسی باتیں کرتی ہو۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’شہلا پڑھی لکھی، سلجھی ہوئی لڑکی ہے۔ وہ ایسا سوچ بھی کیسے سکتی ہے، کیا اسے علم نہیں کہ میرے جملہ حقوق نور کے لیے محفوظ ہیں۔‘‘

’’ہاں، وہ سمجھ دار اور ذہین ہے لیکن میں اس کی نظریں دیکھ کر خوف زدہ ہوجاتی ہوں۔‘‘

’’تم تو ٹینا کے بارے میں بھی ایسا ہی سوچتی تھیں۔‘‘ میں نے کہا۔

’’تو کیا غلط سوچتی تھی۔ وہ بھی تو وحید سمجھ کر تمہارے پیچھے پڑ گئی تھی۔‘‘

’’وحید سمجھ کر۔‘‘ میں نے زور دے کر کہا۔ ’’اس میں بھلا میرا کیا قصور تھا۔ میں اتنا گھٹیا اور کمینہ نہیں ہوں جتنا تم مجھے ثابت کرنا چاہتی ہو۔‘‘

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ ’’تم تو واقعی سنجیدہ ہوگئے۔‘‘

’’فکر مت کرو، میں شہلا کی طرف سیدھی کیا ٹیڑھی آنکھ سے بھی نہیں دیکھوں گا۔‘‘ میں نے ہنس کر کہا۔ ’’چلو، اب میں ذرا فتح محمد کی مزاج پرسی کرلوں۔‘‘

’’لیکن اسے زیادہ ڈسٹرب مت کرنا۔‘‘ شہناز نے کہا۔

’’مریض تو وہ ڈاکٹر حسن کا ہے؟‘‘ میں نے کہا۔

’’تو......؟‘‘ اس نے ترش لہجے میں کہا۔ ’’اسپتال کا ہر مریض میرا مریض ہے۔ اسپتال میں یہ تیرا میرا مریض نہیں چلتا۔ ہاں، جس ڈاکٹر کے پاس مریض کی کیس ہسٹری ہوتی ہے، مریض اس کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔‘‘

میں اسے برآمدے میں چھوڑ کر اس ہال کمرے کی طرف بڑھ گیا جسے وہ لوگ مردانہ وارڈ کہتے تھے۔

فتح محمد کے بازو میں اب بھی نلکی لگی ہوئی تھی اور اسٹینڈ پر خون کا پلاسٹک بیگ بھی موجود تھا۔ وہ ہوش میں تھا اور چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔

مجھے دیکھ کر ڈاکٹر حسن میری طرف بڑھا۔ ’’زہے نصیب نواب صاحب! چلیے اسی بہانے سہی، آپ میرے وارڈ میں تو آئے۔‘‘

’’اب کیا حال ہے فتح محمد کا؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’اس کے جسم پر تین بہت گہرے زخم ہیں، دو زخم گولی کے ہیں اور تیسرا کسی دھار دار آلے کا۔ وہ چاقو بھی ہوسکتا ہے اور قینچی بھی۔ خدا کا شکر ہے کہ گولیاں لگنے سے اس کے بازو یا پاؤں کی ہڈیوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ خون البتہ بہت ضائع ہوگیا ہے۔‘‘

’’کیسے ہو فتح محمد؟‘‘ میں نے اس کے نزدیک جا کر پوچھا۔

اس کے چہرے پر مجھے ایسے تاثرات نظر آئے جیسے وہ اٹھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

’’آرام سے لیٹے رہو۔‘‘ میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ’’تم تو ساون پور گئے تھے، پھر یہ تمہارے ساتھ کیا ہوا؟‘‘

’’میں ساون پور تو پہنچ ہی نہیں سکا سر!‘‘ اس نے کہا۔ ’’گاؤں سے باہر ہی ایک پرانی جیپ نے میرا راستہ روک لیا۔ میں سمجھا کہ اس کھٹارا جیپ میں چلتے چلتے کوئی خرابی ہوگئی ہے۔ وہاں جگہ تنگ تھی، اردگرد کھیت تھے۔ اگر وہ جیپ ایک طرف کھڑی کی جاتی تو وہاں اتنی گنجائش تھی کہ میں وہاں سے اپنی گاڑی گزار لیتا لیکن ان لوگوں نے جیپ کچھ ایسے انداز سے کھڑی کی تھی کہ راستہ بند ہوگیا تھا۔ ڈرائیور سمیت چار آدمی تھے سر! وہ چاروں جیپ سے باہر نکل آئے۔ ان میں سے جب ایک نے اپنے شانے سے رائفل اتار کے اس کا رخ میری

طرف کیا تو مجھے احساس ہوا کہ وہ دوست نہیں، دشمن ہیں۔ میں ...طرح مسلح تھا۔ میرے پاس دو ریوالور اور گاڑی میں ایک ...فل بھی موجود تھی۔ میں رائفل اٹھا کر نزدیکی کھیتوں میں کود ...۔ اسی وقت اس نے فائر کردیا جو گاڑی کی ونڈ اسکرین پر ...۔ دوسرا فائر اس نے مجھ پر کیا تو مجھے ایسا لگا جیسے میرے بازو ...آگ بھر گئی ہو۔ میں نے بھی جوابی فائر کیا اور وہ آدمی بری ...طرح چیخا۔ میں زخمی ہونے کے باوجود کھیتوں میں اندر کی ...طرف بھاگا۔ اس وقت دوسرے آدمی بھی مجھ پر فائرنگ میں ...شریک ہوگئے تھے۔ پھر اچانک ایسا لگا جیسے ان لوگوں پر کسی ...دوسری جگہ سے بھی فائرنگ ہورہی ہے۔ میں خوش ہوگیا کہ ...میرے لیے مدد آگئی ہے۔ اب حملہ آور دو حصوں میں بٹ گئے ...لیکن میں اس وقت بھی فائرنگ کی زد میں تھا۔ میں فائر ...کرنے کے بعد تیزی سے اپنی جگہ تبدیل کرلیتا تھا۔ میرے ...فائر سے دشمنوں کا ایک اور آدمی ہلاک یا زخمی ہوگیا۔ اسی ...وقت مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری ایک ٹانگ بھی ناکارہ ہوگئی ...۔ اس کے باوجود میں دشمنوں پر فائرنگ کرتا رہا۔ پھر مجھے ...اندازہ ہوگیا کہ اب دشمن کی طرف سے خاموشی ہے۔ میں نے ...بھی فائرنگ بند کردی اور گھسٹتا ہوا آگے بڑھا۔ اسی وقت پیچھے ...سے کسی نے مجھ پر چاقو سے وار کیا۔ میں اوندھے منہ گر پڑا۔ ...مجھے کچھ ہوش نہیں کہ کیا ہوا۔ دوبارہ مجھے اسپتال میں ہوش ...آیا۔ وہاں پولیس کا ایک حوالدار اور ہمارے تین گارڈز موجود تھے۔ میں نے پولیس کو بھی یہ بیان دیا کہ مجھ پر کچھ نامعلوم ...لوگوں نے حملہ کیا تھا اور فرار ہوگئے۔ میں ایک دفعہ پھر بے ہوش ...ہوگیا۔ دوبارہ یہاں آنکھ کھلی۔‘‘

فتح محمد مجھے تفصیل بتا کر یوں ہانپنے لگا جیسے اب تک ...دوڑتا رہا ہو۔ میں اس سے مزید سوالات کرنا چاہتا تھا۔

ڈاکٹر حسن نے مداخلت کی اور بولا۔ ’’نواب صاحب ...پلیز! اسے مزید ڈسٹرب نہ کریں۔‘‘

میں نے فتح محمد کو آرام کا مشورہ دیا اور وہاں سے باہر نکل ...آیا۔

اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اسکرین پر غنی ...کا نام تھا۔

میں نے سیل فون کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ ’’ہاں غنی ...بولو!‘‘

’’سر، پولیس کا ایک ڈی ایس پی اور دو تین سب انسپکٹرز ...اور کانسٹیبل آئے ہیں۔ وہ حویلی کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔ میں ...نے انہیں مین گیٹ پر روک رکھا ہے۔‘‘

’’ٹھیک ہے، میں وہاں آرہا ہوں۔‘‘ میں نے جواب دیا اور تیزی سے مین گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

وہاں مجھے پولیس کا ایک ڈی ایس پی نظر آیا۔ وہ اصیل مرغے کی طرح سینہ پھلائے ہوئے یوں کھڑا تھا جیسے وہ مرغیوں کے غول میں واحد مرغا ہو، اس کے چہرے سے مکاری اور پھولے ہوئے پیٹ سے رشوت گویا ٹپک رہی تھی۔ وہ اپنی توند پر پینٹ کو سنبھالتا ہوا مکروہ آواز میں بولا۔ ’’نواب رفیق شیرازی آپ ہی ہو؟‘‘

’’جی فرمائیے، آپ کو کیا تکلیف لاحق ہے؟‘‘

’’میرے پاس حویلی کی تلاشی کا وارنٹ ہے۔‘‘ اس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ میں سمجھ گیا کہ اسے جس نے بھی بھیجا ہے، اس نے ڈی ایس پی کو بہت زیادہ رشوت دی ہے۔

’’مجھے دکھائیے وارنٹ!‘‘ میں نے سخت لہجے میں کہا، پھر غنی کو اپنا موبائل دیتے ہوئے کہا۔ ’’ذرا آئی جی عبداللہ جان کا نمبر ملاؤ، وہ نہ ملیں تو چیف منسٹر سے بات کرو۔ اب دو دو ٹکے کے لوگ حویلی کی تلاشی کا وارنٹ لے کر آنے لگے ہیں۔‘‘

میری خود اعتمادی اور سخت رویے سے ڈی ایس پی کچھ بوکھلا سا گیا۔

’’تم کس سلسلے میں حویلی کی تلاشی لینا چاہتے ہو؟‘‘ میں آپ سے تم پر آگیا اور غضب ناک انداز میں ڈی ایس پی کو گھورا۔

وہ مزید بوکھلاہٹ کا شکار ہوگیا اور بولا۔ ’’سر، وہ...... مجھے اطلاع ملی ہے کہ آپ نے رانا نگر کے ایک ملازم کو یہاں حبس بے جا میں رکھا ہوا ہے۔‘‘

’’کہاں سے اطلاع ملی ہے؟‘‘ میں نے دہاڑ کر کہا۔ ’’اور کس نے دی ہے تمہیں اطلاع؟ کوئی راہ چلتا آدمی بکواس کرے گا اور تم خانہ تلاشی کا وارنٹ لے کر کسی معزز شہری کے گھر پر چڑھ دوڑو گے؟‘‘

غنی نے سیل فون میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ’’سر آئی جی صاحب لائن پر ہیں۔‘‘

میں نے سیل فون کان سے لگا کر کہا۔ ’’السلام علیکم عبداللہ صاحب! کیسے ہیں آپ؟‘‘

ان کی آواز سن کر میں نے دانستہ سیل فون کا اسپیکر آن کر دیا تاکہ ڈی ایس پی بھی ان کی آواز سن لے۔

’’ہم تو خیریت سے ہیں نواب صاحب! آپ ہی یہاں ٹک کر نہیں بیٹھتے۔ آپ لندن سے کب آئے؟‘‘

’’میں تو لندن سے آنے کے بعد یہیں ہوں آئی جی صاحب! بس آپ سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔ یوں بھی آپ اب اتنے بڑے افسر ہوگئے ہیں کہ آپ سے بات کرتے

ہوئے ڈر لگتا ہے۔"

دوسری طرف سے آئی جی صاحب کے ہنسنے کی آواز آئی، پھر وہ بولا۔ "کہیے اس وقت مجھے کیسے یاد فرمایا؟"

"مجھے آپ کے ڈپارٹمنٹ سے بہت شکایت ہے آئی جی صاحب! یہ لوگ خوامخواہ مجھے اشتعال دلاتے رہتے ہیں۔ اس وقت بھی ایک ڈی ایس پی صاحب......" میں نے ڈی ایس پی کی جیب پر لگی ہوئی نام کی چٹ پڑھتے ہوئے کہا۔ "اکرم باجوہ صاحب میرے غریب خانے کی تلاشی کے لیے موجود ہیں۔"

"ارے کیوں نواب صاحب؟" آئی جی صاحب نے کہا۔ "فون ذرا اس ڈی ایس پی کو دیں۔"

ڈی ایس پی کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور اس کا سارا طنطنہ ختم ہو گیا تھا۔ اس نے بے چارگی سے میری طرف دیکھا، پھر تھوک نگلتے ہوئے سیل فون میرے ہاتھ سے لے لیا۔

"السلام علیکم سر! میں ڈی ایس پی اکرم باجوہ ہوں۔ سر، نواب صاحب کے خلاف رانا زوہیب نے رپورٹ لکھوائی ہے کہ ان کے ایک ملازم کو نواب صاحب نے حبس بے جا میں رکھا ہوا ہے۔"

"اور تم منہ اٹھا کر چل دیے؟" آئی جی صاحب نے درشت لہجے میں کہا۔ "نواب صاحب کوئی معمولی آدمی نہیں ہیں احمق! یہ لندن کے بہت بڑے لارڈ بھی ہیں۔ ان کے ایک فون پر برطانیہ کا سفیر مجھے اسلام آباد طلب کر لے گا۔ تمہاری تو نوکری جائے گی سو، تمہارے ساتھ میری نوکری بھی جائے گی احمق!"

"سر، وہ۔ مجھے......"

"شٹ اپ!" آئی جی صاحب نے اسے بری طرح ڈانٹ دیا۔ "نواب صاحب سے معافی مانگو اور سیل فون انہیں دے دو۔"

ڈی ایس پی کے چہرے پر اب یتیمی سی برس رہی تھی۔ میں نے سیل فون اس سے لے کر کہا۔ "آئی جی صاحب، آپ کا بہت شکریہ! کبھی ڈنر ہمارے ساتھ بھی کریں۔"

"دیکھیے، فرصت ملتے ہی میں آپ کو آگاہ کر دوں گا۔" آئی جی صاحب نے کہا۔

"میں آپ کا منتظر رہوں گا، اس وقت اس بے جا داخلت پر معذرت چاہتا ہوں، خدا حافظ!" میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

وہ ڈی ایس پی جس کی خودی کا غبارہ چند منٹ پہلے اتنا اونچا اڑ رہا تھا کہ اسے اپنے ساتھ کھڑے ہوئے لوگ بھی بونے نظر آ رہے تھے، اب اس غبارے سے ہوا نکلی تو وہ سردی کھائے ہوئے پلے کی طرح میرے سامنے کھڑا تھا۔

میں نے نسبتاً نرم لہجے میں کہا۔ "تم خانہ تلاشی کا وارنٹ لے کر آئے ہو، میں تمہیں روکوں گا نہیں لیکن تمہارے ساتھ نفری کم ہے، حویلی اتنی بڑی ہے کہ اس کی تلاشی لیتے ہوئے صبح ہو جائے گی۔ آؤ لے لو تلاشی!"

"کیوں میری نوکری کے پیچھے پڑے ہیں نواب صاحب!" اس نے کہا۔

"اب تم میرے دروازے پر آ ہی گئے ہو تو میں تمہیں چائے پیے بغیر نہیں جانے دوں گا۔" پھر میں غنی سے بولا۔ "ڈی ایس پی صاحب کو مہمان خانے میں لے چلو، ان کے آدمیوں کے لیے یہیں کرسیاں ڈال دو اور انہیں بھی چائے پلاؤ۔"

"ہم تو سرکاری ڈیوٹی پر ہیں جناب عالی!" ڈی ایس پی نے گھگھیا کر کہا۔ "ہم......"

"ارے آیئے ڈی ایس پی صاحب!" میں نے کہا۔ "یہ ہماری روایت کے خلاف ہے کہ کوئی ہمارے دروازے پر آئے اور ہم اسے چائے پلائے اور کھانا کھلائے بغیر رخصت کر دیں۔"

"بیٹھو تم لوگ!" ڈی ایس پی نے اپنے ماتحتوں سے کہا۔ "میں ابھی آتا ہوں۔"

ڈی ایس پی یوں مودبانہ انداز میں میرے پیچھے پیچھے چل رہا تھا کہ مجھے بے اختیار ایک شعر یاد آ گیا کہ آگے آگے جھومتا جاتا ہے وہ محشر خرام، پیچھے پیچھے نقش پا کو چومتا جاتا ہوں میں۔ اس کی حالت بھی کچھ ایسی ہی تھی پیچھے پیچھے نقش پا چومنے والی۔

میں اسے اپنے مہمان خانے کے آراستہ ڈرائنگ روم میں لے آیا جہاں ہر چیز بیش قیمت اور امپورٹڈ تھی۔ قالین، پردے، فانوس، ڈیکوریشن پیس سبھی کچھ انتہائی بہترین اور رابعہ کی محنت کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ اس نے نہ جانے کہاں کہاں سے یہ نادر اشیا اکٹھی کی تھیں۔ اس موقعے پر مجھے رابعہ بھی یاد آئی۔ حویلی کی آرائش میں وہ بہت دلچسپی لیتی تھی۔

میں نے ایک صوفے کی طرف اشارہ کیا اور ڈی ایس پی سے کہا۔ "تشریف رکھیں۔"

ڈی ایس پی اس صوفے میں گویا دھنس گیا۔ اس کا وزن ہی بہت تھا، پھر اس سے دگنا اس کے گناہوں کا بوجھ تھا۔

"آج تک پولیس کے کسی اہلکار کو میرے اس ڈرائنگ روم تک پہنچنے کا موقع نہیں ملا ہے۔"

"دوسرے لفظوں میں کسی کو یہ سعادت نصیب نہیں ہوئی ہے۔ آپ وہ پہلے پولیس والے افسر ہیں جو یہاں تک پہنچے ہیں۔" میں بھی اس کے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

ایک باوردی ملازم چائے کی ٹرالی دھکیلتا ہوا لایا اور ادب سے سر جھکا کر باہر نکل گیا۔

یہ سب غنی کی تربیت تھی۔ ایسے مواقع پر وہ کروفر کا خصوصی اہتمام کرتا تھا تاکہ فریق مخالف پر زیادہ سے زیادہ نفسیاتی دباؤ ڈالا جا سکے۔ ڈی ایس پی بھی مرعوب ہو گیا تھا۔ وہ اینکر تھا بہت نچلی سطح سے ترقی کرتا ہوا وہ اس عہدے پر پہنچا ہوگا۔ اینکر اس سے آگے جاتا بھی نہیں ہے۔ اسے یہیں سے ریٹائر کر دیا جاتا ہے۔ اس کی ذہنی سطح وہی تھی جو ایک حوالدار یا اے ایس آئی کی ہوتی ہے۔

میرے اشارے پر وہ بہت مشکل سے صوفے سے اٹھا، اپنے لیے چائے بنائی اور ایک طشتری میں ڈرائی فروٹ اور سینڈوچز وغیرہ لے کر دوبارہ صوفے میں دھنس گیا۔

ڈرائنگ روم کی دیواروں پر بہت سی تصاویر ٹنگی ہوئی تھیں۔ کئی تصویروں میں آئی جی صاحب میرے ساتھ تھے، ایک تصویر چیف منسٹر کے ساتھ بھی تھی۔ یہ اس موقعے کی تصویر تھی جب چیف منسٹر پنجاب ست بدھائی آئے تھے۔ دوسری تصویروں میں میرے ساتھ لندن کے کچھ لارڈز اور لیڈیز تھیں۔ ڈی ایس پی بے شک انہیں نہ پہچانتا ہو لیکن ہماری غلامانہ ذہنیت کے لیے انگریز کی تصویر ہی مرعوب کرنے کو کافی ہے۔

اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان تصویروں کو دیکھا، پھر نئے سرے سے معافی مانگنے لگا۔ "معافی چاہتا ہوں جناب عالی! مجھ سے بہت بڑی بھول ہو گئی۔"

"یہ بتاؤ، تمہیں رانا نے رقم کتنی دی ہے؟" میں نے اچانک پوچھا۔

ڈی ایس پی غالباً اس وار کے لیے ذہنی طور پر تیار نہیں تھا اس لیے کچھ بوکھلا سا گیا۔ "جی، وہ...... میں نے تو جی......"

"آرام سے چائے پیو۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "ہاں، تم نے بتایا نہیں کہ رانا نے تمہیں کتنی رقم دی تھی۔" پھر میں ہنس کر بولا۔ "آپس کی بات ہے، اب مجھ سے کیا چھپانا، میں تمہیں اس سے بھی زیادہ رقم دوں گا۔ میرا بھی ایک آدمی زخمی ہوا ہے، اگر تم وعدہ کرو کہ رانا زوہیب کو گرفتار کر کے حوالات میں بند کر دو گے تو میں تمہیں اس سے دگنی رقم دوں گا۔ بتاؤ اس نے تمہیں کتنے پیسے دیے تھے؟"

"آپ اس بات کو چھوڑیں جناب عالی! آپ پرچہ کٹائیں، میں کرتا ہوں قانونی کارروائی!"

میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر چیک بک نکالی اور اس کے سامنے رکھ دی۔ "تم اس میں اپنی مرضی کی رقم لکھ دو، میں چیک پر سائن کر دوں گا لیکن رانا زوہیب مجھے لاک اپ میں نظر آنا چاہیے۔"

ڈی ایس پی کے بڑھتے ہوئے ہاتھ رک گئے۔ شاید اسے اپنی حیثیت کا احساس ہو گیا تھا کہ دو ہاتھیوں کی لڑائی میں وہ پس کر رہ جائے گا۔ اس نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔ "آپ کے تو آئی جی صاحب اور وزیراعلیٰ صاحب سے بھی تعلقات ہیں، آپ نے اب تک رانا صاحب کو کیوں چھوڑا ہوا ہے؟ مجھے اس آزمائش میں مت ڈالیں سرکار!"

"تم نے یہاں آنے سے پہلے سوچا تھا کہ رانا تمہیں کس مصیبت میں پھنسانا چاہتا ہے؟"

"مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا جناب عالی!" ڈی ایس پی نے کہا۔ "کہ وہ مجھے پھنسا رہا ہے، اس نے تو مجھ سے کہا تھا کہ نواب رفیق عیاش سا ایک آدمی ہے، تلاشی کا وارنٹ لے کر اس کی حویلی جاؤ اور میرے آدمی کو وہاں سے برآمد کر لو تو میں تمہیں ایک لاکھ روپے مزید دوں گا۔" وہ روانی میں بولتا چلا گیا۔

"اس کا مطلب ہے کہ اس نے تمہاری قیمت صرف ایک لاکھ روپے لگائی۔ خیر میری پیش کش اب بھی برقرار ہے۔ تم جتنی رقم لکھو گے میں تمہیں دوں گا۔"

"اب شرمندہ مت کریں جناب عالی!" وہ بوکھلا کر بولا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس صورتِ حال سے کیسے نمٹے؟ رانا زوہیب کو بھی حوالات میں پہنچانا آسان نہیں تھا۔ یہ بات وہ حرام خور ڈی ایس پی بھی جانتا تھا۔ رانا جدی پشتی جاگیردار تھا، اس کا باپ کئی دفعہ صوبائی اور قومی اسمبلی کا ممبر رہ چکا تھا، اس کے تعلقات بھی پولیس کے اعلیٰ حکام اور وزیروں، سفیروں سے تھے۔ اسے اٹھا کر حوالات میں بند کرنا ڈی ایس پی جیسے رشوت خور افسر کے بس سے باہر تھا۔

اس نے چیک بک کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا، پھر صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ "اب مجھے اجازت دیں جناب عالی!" اس نے کہا۔ "ابھی مجھے بہت کام ہے۔"

میں نے اجازت دے دی۔ میں جانتا تھا کہ سب سے بڑا کام تو رانا زوہیب کو مطمئن کرنا ہے۔

"میں اپنی رپورٹ میں لکھ دیتا ہوں کہ حویلی میں رانا کا کوئی آدمی قید نہیں ہے۔"

"جو تمہارا دل چاہے لکھو۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "رانا کون سا مجھ سے تصدیق کرنے آ رہا ہے۔"

وہ لڑھکتا ہوا باہر کی طرف بڑھ گیا۔ انسان مرعوب ہو تو

اس کی چال میں بھی لڑکھڑاہٹ پیدا ہو جاتی ہے۔

اس کے جانے کے بعد میں بھی ڈرائنگ روم سے باہر نکل آیا۔ غنی باہر ہی موجود تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''غنی! قیدی اس وقت کہاں ہیں؟''

''وہ جہاں بھی ہیں، خیریت سے ہیں سر! ابھی ایک گھنٹے میں وہ یہاں پہنچ جائیں گے۔ میں نے انہیں وحید صاحب کے کاٹیج میں بند کر دیا تھا۔ میں جانتا تھا کہ رانا اپنے آدمی کو حویلی میں تلاش کرائے گا۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں قیدی کو جنگل میں اتنے غیر محفوظ مقام پر رکھوں گا۔''

''وہ جگہ تو واقعی غیر محفوظ ہے۔'' میں نے کہا۔

''سر، وہاں ہمارے چار گارڈز بھی موجود ہیں۔ اب میں انہیں قیدیوں سمیت یہیں بلا لیتا ہوں۔ اب کسی پولیس والے کی جرأت نہیں ہوگی کہ وہ حویلی کا رخ بھی کر سکے۔''

میں نے توصیفی انداز میں سر ہلایا اور حویلی کے اقامتی حصے کی طرف بڑھ گیا۔ غنی نے مجھے اپنا عادی بنا لیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر خدانخواستہ اسے کچھ ہو گیا تو میں کیا کروں گا۔ میں تو اس کے بغیر ادھورا ہوں۔ پھر اندر سے آواز آئی۔ ہر انسان اکیلا ہی اس دنیا میں آتا ہے اور اسے تنہا ہی جانا پڑتا ہے۔ تم کہاں کے جدی پشتی نواب ہو رفیق احمد! تم تو ایک معمولی سے پروفیسر کے گھر میں پیدا ہوئے جسے ایمانداری اور فرض شناسی کے امراض بھی لاحق تھے۔ تم اپنی محنت اور صلاحیت سے لندن گئے تھے۔ اب اگر تقدیر تم پر مہربان ہو گئی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم پرانے رفیق احمد کو مار دو اور نواب رفیق احمد شیرازی آف ست بدھائی بن کر زندہ رہو۔

نہیں، میں وہی رفیق احمد ہوں اور مرتے دم تک رہوں گا۔ میں نے خود سے وعدہ کیا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

میری زندگی تو اب مسلسل ایک وار گیم بن کر رہ گئی تھی۔ اب مجھے دیکھنا تھا کہ رانا اب کیا کرتا ہے؟ وہ خاموش نہیں بیٹھے گا۔ یہ بات میں اچھی طرح جانتا تھا۔ اب تو وہ کھل کر سامنے آ گیا تھا۔ ممکن ہے پولیس کی ایف آئی آر میں رانا کا نام نہ ہو بلکہ وہ راشد خان کے کسی رشتے دار نے درج کرائی ہو لیکن وہ ایس پی بوکھلاہٹ میں رانا کا نام لے بیٹھا ہو کہ رقم تو اسے رانا ہی نے دی تھی۔ خیر، اس سے نمٹ لوں گا، ابھی سے اس کی کیا پروا کرنا؟ جب کچھ ہوگا تو دیکھا جائے گا۔ میں نے سر جھٹک کر سوچا۔

میرے کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور نیلم اندر آ گئی، اس کا چہرہ اترا ہوا تھا اور آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ایسا لگا جیسے وہ روتی رہی ہو۔

''کیا بات ہے نیلم؟'' میں نے پوچھا۔ ''کوئی پریشانی ہے؟''

وہ میرے مخاطب کرنے پر بری طرح رونے لگی۔

''ارے کیا ہوا؟'' میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ ''سب خیریت تو ہے نا؟''

''نواب صاحب!'' اس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''اب آپ مجھے اجازت دیں۔ میں یہاں اور نہیں رہ سکتی جی!''

''ہوا کیا ہے؟'' میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ''کیا غنی نے کچھ کہا ہے؟''

''غنی نے نہیں ان کی بیوی نے مجھ پر بہت برے برے الزام لگائے ہیں نواب صاحب!''

''ریشم نے؟'' میں نے پوچھا۔ ''اس نے تم سے کیا کہہ دیا۔ وہ تو اس قسم کی لڑکی نہیں ہے۔''

''آپ کو کیا پتا جی!'' نیلم نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''وہ تو ذرا سی دیر میں غنی صاحب کو بھی لتاڑ کر رکھ دیتی ہے۔''

''تم سے کیا کہہ دیا اس نے؟'' میں نے ہنس کر پوچھا۔

''اس نے پہلے تو مجھ پر یہ الزام لگایا تھا کہ میں اس کے شوہر پر ڈورے ڈال رہی ہوں، حویلی کے باورچی خانے سے کھانے پینے کی چیزیں چراتی ہوں۔ اب جب ڈاکٹر صاحب نے مجھے اسپتال میں لگا لیا ہے تو اس نے حویلی کی دوسری عورتوں کے سامنے الزام لگایا......کہ......کہ......''

''کیا الزام لگایا ہے؟'' اب میں جھنجلا گیا۔

''آپ ڈاکٹر شہلا سے پوچھ لیں جی، میں اپنی زبان سے نہیں بتا سکتی۔''

''ایسی کیا بات کہی ہے ریشم نے؟'' میں نے الجھ کر پوچھا۔

''مم...... مجھے شرم آتی ہے جی!'' وہ سر جھکا کر بولی۔

''تم ابھی تک بچی ہی ہو نیلم!'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''ریشم کو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ ایسی کوئی بات نہیں کر سکتی۔''

''میں اب بچی نہیں ہوں جی!'' نیلم نے اچانک کہا۔ ''بابا کہتا تھا کہ تو اب بچی نہیں رہی۔ میں اگلے مہینے پورے سترہ سال کی ہو جاؤں گی جی! آپ مجھے بچی سمجھتے ہیں۔'' اس نے پھر پیاسی نظروں سے مجھے دیکھا۔

''تو پھر بتاؤ ریشم نے کیا کہا ہے؟''

''میں آپ کو نہیں بتا سکتی، آپ ڈاکٹر شہلا سے پوچھ لیں۔'' یہ کہہ کر وہ جھپاک سے باہر نکل گئی۔

لڑکی اب تک میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ مجھے پہلے وہ بچی لگی تھی تو میں نے یہ مفروضہ قائم کر لیا تھا کہ وہ بچی ہے، میں اسے میں نے غور سے دیکھا ہی نہیں۔ ہاں، اس کی بولتی آنکھیں ضرور مجھے پریشان کر دیتی تھیں۔ اب تو وہ خود بتا رہی تھی کہ وہ بچی نہیں بلکہ سترہ سال کی ہے لیکن ریشم نے اس پر ایسا کیا الزام لگا دیا کہ وہ مجھے بتاتے ہوئے شرما رہی تھی۔

میں نے سوچا کہ شہلا کے بجائے براہ راست ریشم ہی سے پوچھ لوں کہ اس نے نیلم پر ایسا کیا الزام لگایا ہے کہ وہ حویلی چھوڑنے کی بات کر رہی تھی۔ اس کے باپ پر اغوا، ڈکیتی، اور قتل کے الزامات ثابت ہونے پر عدالت نے اسے موت کی سزا بھی دی تھی۔ اسے پھانسی ہونے والی تھی، اس صورت میں نیلم حویلی سے جاتی بھی تو کہاں جاتی؟ پھر میرے ضمیر کی آواز آئی، تمہیں اس کی اتنی فکر کیوں ہے نواب صاحب! اس مملکت خداداد میں ہزاروں بلکہ لاکھوں لڑکیاں بے سہارا ہیں، زلزلوں، سیلاب اور دوسری آسمانی آفتوں نے ان کے سر سے سائبان تو چھینا ہی ہے، کچھ بے ضمیر اور بدقماش لوگوں نے تو ان سے عزت سے جینے کا حق بھی چھین لیا ہے۔ ان کی عزتیں نیلام کر رہے ہیں۔ یہ ہمارے ملک کا المیہ ہے کہ آفات ناگہانی سے بھی کچھ لوگ فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔ کہیں زلزلہ آئے تو امدادی ٹیمیں بعد میں پہنچتی ہیں۔ پہلے ڈاکو اور لٹیرے پہنچ جاتے ہیں۔ جن کا مقصد متاثرین کی مدد کرنا نہیں بلکہ انہیں لوٹنا ہوتا ہے۔ مصیبت کے اس موقعے پر جب نفسا نفسی کا عالم ہوتا ہے، ان لٹیروں کی بن آتی ہے۔ تم کتنی لڑکیوں کو اس پامالی سے بچاؤ گے نواب رفیق احمد شیرازی اور کیوں بچاؤ گے؟ میں نیلم کو صرف اس لیے رکھا تھا کہ وہ میری وجہ سے بے سہارا ہوئی تھی۔ میں نے اپنی صفائی پیش کی۔

دروازے پر دستک ہوئی تو میں اپنے خیالات سے چونک اٹھا۔ ریشم کمرے میں داخل ہوئی اور بولی۔ ''ڈنر کا وقت ہو گیا ہے نواب صاحب! ڈاکٹر شہناز آپ کو بلا رہی ہیں۔''

''آج میں ڈنر نہیں کروں گا۔'' میں نے کہا۔ ''مگر ابھی نہیں، کچھ دیر بعد، تم میرے لیے کافی لے آؤ۔''

ریشم واپس چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ کافی کے مگ سمیت واپس آئی۔ پہلے وہ بہت اہتمام سے کافی کی ٹرے ٹرالی پر سجا کر لاتی تھی۔ میں نے ہی اسے منع کر دیا تھا کہ وہ صرف میرے لیے اتنا اہتمام نہ کیا کرے۔ اس نے کافی کا مگ

میرے سامنے رکھا تو میں نے اسے روک لیا۔ ''ٹھہرو ریشم! مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔'' میں نے کہا۔

''مجھ سے جی؟'' وہ حیرت سے بولی۔ ''ضروری باتیں؟''

''ہاں، بیٹھ جاؤ۔'' میں نے کہا۔

''میں آپ کے سامنے بیٹھنے کی جرأت نہیں کرسکتی نواب صاحب!'' ریشم نے کہا۔

میں نے کافی کا مگ اٹھا کر ایک گھونٹ لیا، پھر اس سے پوچھا۔ ''تم نے آج نیلم سے کیا کہا تھا؟''

''میں نے...... میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا تھا؟'' وہ ٹپٹا کر بولی۔

''اب تم جھوٹ بھی بولنے لگی ہو؟'' میں نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''میں تمہیں ایسا نہیں سمجھتا تھا۔''

''میں آپ سے جھوٹ کیوں بولنے لگی نواب صاحب! میری اس سے لڑائی ضرور ہوئی تھی، پہلے بھی ہوتی رہی ہے۔ مجھے معاف کردیں نواب صاحب! آئندہ میں اس سے کچھ بھی نہیں کہوں گی۔'' ریشم بری طرح رونے لگی۔

میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ''اچھا رونا بند کرو اور جاؤ آئندہ احتیاط رکھنا۔''

وہ آنسو پونچھتے ہوئے چلی گئی۔ میں نے سوچا کہ میں کن زنانہ قسم کے مسائل میں الجھ کر رہ گیا ہوں۔ کیا یہ میرے شایان شان ہے کہ میں حویلی کی ملازماؤں کے جھگڑے نمٹاتا رہوں۔ راجا ہوتا تو طنزیہ انداز میں کہتا، واہ پتر فیکے! تیرا اصل کام تو یہی ہے۔ اب اگر قسمت نے تجھے نواب بنا دیا ہے تو اس میں تیرا کیا قصور ہے؟ تو ذہنی طور پر خود بھی غلام ہے۔ میں نے سوچا کہ اب ان جھگڑوں میں نہیں پڑوں گا بلکہ ان میں سے کوئی بھی میرے پاس شکایت لے کر آئی تو اسے بری طرح جھڑک دوں گا۔

میں نے کافی ختم کر کے ایک اسپورٹس میگزین اٹھایا ہی تھا کہ شہناز کمرے میں داخل ہوئی۔ ''تم پھر کھانا وقت پر نہیں کھا رہے؟''

''میں نے پولیس کے اس ڈی ایس پی کے ساتھ سموسے اور سینڈوچز کھا لیے تھے۔'' میں نے کہا جو بالکل جھوٹ تھا۔ میں نے تو وہاں چائے تک نہیں پی تھی۔

''ڈی ایس پی کے ساتھ؟'' شہناز نے سوالیہ انداز میں میری طرف دیکھا۔

''ہاں، پولیس کا ایک ڈی ایس پی چند ماتحتوں کے ساتھ حویلی کی تلاشی لینے آیا تھا۔'' میں نے اسے تفصیل سے پورا واقعہ بتایا۔

''اب وہ تمہارا دوست اور مہمان کہاں ہے؟'' شہناز نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

''وہیں جہاں اسے ہونا چاہیے۔'' میں نے کہا۔

''راجا لندن کیا گیا کہ تم شتر بے مہار ہو گئے۔'' شہناز ہنس کر بولی۔ ''آج اور اپنی من مانی کرلو، کل تو وہ پھر آجائے گا۔'' اس نے اس انداز میں کہا جیسے کوئی ماں اپنے بچے کو سخت گیر باپ سے ڈراتی ہے۔

مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ دروازے پر دستک دے کر شہلا اندر آگئی۔ میں نے شہناز کی طرف دیکھا، اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ظاہر ہوئے، پھر وہ نارمل ہوگئی۔

''کیا آپ لوگ کافی پی چکے ہیں؟'' شہلا نے مسکرا کر پوچھا۔

''نہیں، ابھی پیوں گی۔'' شہناز نے مسکرا کر کہا۔

''بیٹھو۔''

شہلا میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔

میں نے دانستہ اس کی طرف دیکھنے سے گریز کیا۔ شہناز نے ریشم کو طلب کر کے کافی کے لیے کہہ دیا۔

شہلا، شہناز کو ایک مریضہ کے بارے میں بتانے لگی۔ وہ دونوں آپس میں اسپتال اور مریضوں کی باتیں کرتی رہیں۔ میں نے احتجاجاً کہا۔ ''اٹینشن پلیز خواتین! آپ دونوں شاید بھول گئیں کہ یہاں میں بھی موجود ہوں اور خرابیٔ قسمت سے ڈاکٹر بھی نہیں ہوں جو آپ کی طبی گفتگو اور کلینیکل باتوں کو انجوائے کرسکوں۔''

ریشم کافی کے مگ رکھ کر باہر چلی گئی۔ اس کا منہ ابھی تک پھولا ہوا تھا۔

''یہ ریشم بھی خوب ہے؟'' شہلا نے ہنس کر کہا۔

''تمہیں یہاں ہر شخص میں کوئی نہ کوئی خوبی نظر آئے گی سوائے اس خاکسار کے!'' میں نے عادت سے مجبور ہو کر شہلا کو مخاطب کیا۔

''کیوں، ریشم نے کیا کر دیا؟'' شہناز نے اسے اپنی طرف متوجہ کرلیا۔

''آج اس کی اور نیلم کی بہت زوردار قسم کی جھڑپ ہوئی تھی۔'' شہلا ہنس کر بولی۔ ''ریشم نے اس پر الزام لگایا کہ تو

اداؤں سے غنی پر ڈورے ڈال رہی ہے۔ میں بھی تجھے ... سے نہ نکلواؤں تو میرا نام ریشم نہیں۔ نیلم نے ترکی بہ ترکی ... دیا کہ حویلی سے نکلوا سکتی ہے تو نکلوا دے۔ ریشم نے بے ... سے میری طرف دیکھا، پھر بولی کہ اس نے تو نواب ... کو بھی اپنی ادائیں دکھائی ہیں، وہ اسے حویلی سے کیوں ... ہیں گے۔''

''سن لیا آپ نے نواب صاحب قبلہ!'' شہناز نے ... زیہ انداز میں کہا۔ ''حویلی کے ملازمین کو زیادہ سر چڑھائیں ... تو یہی ہوگا۔ آج ریشم نے یہ کہا ہے، کل وہ اس سے بڑی ... بات کہہ سکتی ہے؟''

''اب ان لوگوں کے جھگڑے تم ہی نمٹانا۔ واقعی میں ... ان لوگوں کو سر چڑھا لیا ہے۔'' میں نے جھنجلا کر کہا۔

شہلا اور شہناز دونوں میری جھنجلاہٹ پر ہنسنے لگیں۔

''جب حویلی کے لوگ ہی اس قسم کی باتیں کریں گے تو ... مین کا کیا ہے۔ وہ بھی کر سکتے ہیں۔'' میں نے شہناز پر ... ٹ کی۔

''حویلی کے کس فرد نے تم سے ایسی باتیں کی ہیں؟'' ... ناز نے مجھے آنکھیں دکھائیں اور دانت پیسے۔

''نہیں کی ہیں تو اب کرنے لگیں گے۔''

دروازے پر دستک ہوئی تو میں نے چونک کر دروازے ... طرف دیکھا۔ پھر مجھے غنی کا پر تفکر چہرہ نظر آیا۔

''کیا بات ہے غنی؟'' میں نے پوچھا۔

''سر! وہ راشد خان کی حالت بگڑ گئی ہے۔'' غنی نے ... ہا۔ ''اس کے کانوں سے خون بھی رس رہا ہے۔ اس نے دیوار ... سے اپنا سر ٹکرا کر خودکشی کی کوشش کی ہے۔ اس کے سر سے خون ... رہا ہے۔ میں نے پٹی تو کر دی ہے لیکن اس کی حالت بہت ... راب ہے۔''

''چلو!'' شہناز نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''تم میرا بیگ ... لاؤ۔''

غنی مستعدی سے باہر نکل گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے شہلا ... بھی چلی گئی۔ شہناز میرے ساتھ قید خانے کی طرف چل دی۔

''مجھے لگتا ہے کہ تم نے اپنے مہمان کو ہمیشہ کے لیے بہرا ... دیا ہے۔ آخر اس کے کانوں کو ایش ٹرے بنانے کی کیا ... ضرورت تھی؟'' وہ کچھ سوچ کر چونکی۔ ''اور یہ تم نے سگریٹ پھر ... شروع کر دی؟''

''تمہارے کس سوال کا جواب پہلے دوں؟'' میں نے ... کر کہا۔ ''چلو ترتیب کے مطابق جواب دیتا ہوں، جواب صحیح ہو تو نمبر مت کاٹنا۔ سوال نمبر ایک، مجھے اس کے کانوں کو ایش ٹرے بنانے کی کیا ضرورت تھی؟ جواب! میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ وہ اس کے بغیر زبان نہیں کھولتا۔ اس میں قوت برداشت بہت زیادہ ہے۔ سردار خان کو تو میں نے ہلکے پھلکے تین ہی چرکے لگائے تھے اور اس نے زبان کھول دی تھی۔ راشد کی میں چربی بھی پگھلا دیتا تو وہ زبان نہ کھولتا، مجھے مجبوری کی حالت میں ایسا کرنا پڑا۔ سوال نمبر 2 کا جواب: میں نے سگریٹ چھوڑ دی ہے تو پھر پینے کا کیا سوال! میں نے تو اسے آلۂ تفتیش کے طور پر استعمال کیا تھا۔''

''تم نے اس آلے کو کچھ زیادہ ہی استعمال کرلیا ہے۔'' شہناز نے کہا۔ ''اس کے کانوں سے خون رسنے کا مطلب تو یہی ہے۔ میں نے اسے جو دوا دی تھی اس سے بھی کچھ افاقہ نہیں ہوا۔ اسے کسی ای این ٹی اسپیشلسٹ کو دکھانا پڑے گا۔''

''وہ سب بعد کی بات ہے۔'' میں نے کہا 'تم پہلے اسے دیکھ تو لو۔ ممکن ہے سر پھٹنے سے اس کا خون زیادہ بہہ گیا ہو؟''

ہم تہ خانے میں پہنچے تو راشد ایک طرف پڑا ہوا تھا۔ ایک لمحے کو مجھے اس پر ترس آیا۔ جب میں زوہیب کی قید میں تھا تو میری بھی یہی حالت تھی۔

غنی نے آہنی سلاخوں والا دروازہ کھول دیا اور شہناز کا بیگ اس کے نزدیک فرش پر رکھ دیا۔

''اسے سیدھا کرو۔'' اس نے غنی سے کہا۔

غنی نے جھک کر راشد خان کو سیدھا کر دیا۔ اس کے سر سے بہنے والا خون ابھی تک رکا نہیں تھا۔ سر پر بندھی ہوئی موٹے کپڑے کی پٹی خون میں تر ہو رہی تھی۔

''گرم پانی لے کر آؤ۔'' شہناز نے غنی سے کہا۔

غنی فوراً ہی گرم پانی لے آیا۔ حویلی کے مختلف حصوں میں گیزر لگے ہوئے تھے۔ غنی چاہتا تھا کہ حویلی میں سینٹرلی ہیٹڈ پلانٹ لگایا جائے لیکن ابھی تک ہم دوسرے ضروری کاموں سے فارغ نہیں ہوئے تھے اس لیے یہ پلانٹ بھی التوا کا شکار تھا۔

شہناز نے ایک پیالے میں گرم پانی لیا۔ اس میں روئی ڈبو کر اس نے راشد خان کے چہرے سے خون صاف کیا۔ وہ ہوش میں نہیں تھا۔ سانسیں بھی اکھڑی اکھڑی لے رہا تھا۔ شہناز نے اس کی نبض دیکھی، پھر اسٹیتھسکوپ لگا کر اس کے دل کی دھڑکن سنی اور بولی۔ ''رفیق! اس کی حالت تو بہت خراب ہے۔''

اس نے پٹی کھول کر سر کا زخم دیکھا، پھر اپنے بیگ سے

قینچی نکال کر اس کے سر کے بال کاٹنے لگی۔ بال کٹنے کے بعد اس کا زخم نمایاں ہوگیا۔ زخم کی لمبائی ڈھائی انچ سے زیادہ ہی ہوگی۔

شہناز نے سرجیکل سیزر کے ذریعے اس کے سر کے زخم کی صفائی کی اور بولی۔ ''یہ ہیڈ انجری کا کیس ہے رفیق! اس کا بچنا محال ہے، میں اسے انجکشن دے رہی ہوں۔ اس انجکشن کے بعد یہ سنبھل گیا تو اسے اسپتال میں شفٹ کر دینا۔ میں نے آکسیجن کا ایک سلنڈر بھی منگوالیا تھا۔ ممکن ہے اس کے بعد یہ اس قابل ہو جائے کہ اسے کسی بڑے اسپتال میں شفٹ کیا جاسکے۔ ہمارے پاس سرجیکل کی سہولیات تو سرے سے ہیں ہی نہیں۔''

''تم اسے بڑے اسپتال میں لے جاؤ گی، کہاں؟''

''لاہور یا اسلام آباد کے کسی بھی بڑے اسپتال میں لے جاؤں گی۔''

اس نے انجکشن تیار کر کے راشد خان کی نس میں وہ انجکشن لگا دیا۔

اس انجکشن کے حیرت انگیز اثرات ظاہر ہوئے، دس منٹ بعد راشد خان نے آنکھیں کھول دیں اور پلکیں جھپکا کر مجھے دیکھنے لگا۔

''غنی! اسٹریچر لے کر آؤ اور اسے اسپتال میں شفٹ کرو۔'' شہناز نے کہا۔

''رہنے دیں ڈاکٹر صاحب! میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ مجھے نواب صاحب سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''رفیق! تم نے مجھے اپنا دوست کہا تھا تو اسے نبھایا بھی۔ میں چاہتا ہوں کہ مرنے سے پہلے تم مجھے ایک مرتبہ پھر اسی طرح مخاطب کرو۔ میں واقعی تمہیں اپنا دوست سمجھنے لگا تھا۔ مجھے خوشی ہوتی تھی کہ اتنا بڑا آدمی مجھ جیسے حقیر آدمی کو اپنا دوست سمجھ رہا ہے۔ میں کسی بھی زمیندار یا جاگیردار کا بیٹا نہیں ہوں۔ ساون پور کے نائی عبدالصمد کا بیٹا ہوں۔ ابا کو تعلیم کا بہت شوق تھا۔ اسی وجہ سے مجھے بھی پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ میں نوعمری میں ہی لندن چلا گیا تھا لیکن میں وہاں پڑھنے نہیں گیا تھا بلکہ ملازمت کے لیے گیا تھا۔ لندن کے ایک سپر اسٹور میں مجھے اسٹور اسسٹنٹ کی جاب مل گئی۔ وہاں میری ملاقات انڈر ورلڈ کے ایک آدمی ایڈی سے ہوئی۔ اس کی ترغیب پر میں اس راہ پر چلنے لگا جو بالآخر تباہی اور بربادی کی طرف جاتی ہے۔ زوہیب کے باپ سے میری ملاقات لاہور میں ہوئی تھی۔ وہ سیاسی آدمی تھا اور جائز و ناجائز ہر قسم کے کام کرتا تھا۔ اس نے مجھے بھاری معاوضے پر اپنے ساتھ کام کرنے کی پیشکش کی اور میں اس کے لیے کام کرنے لگا۔''

''دلاور سے تمہارا کیا تعلق ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''دلاور میرا دشمن ہے۔'' اس کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''ممکن ہے اس کے تعلقات رانا زوہیب سے ہوں۔ اس کا مجھے علم نہیں ہے۔''

''لندن میں نور کو قتل کرنے کے لیے کسے پیسے دیے تھے؟''

وہ ایک مرتبہ پھر مسکرایا۔ ''کسی کو بھی نہیں۔ وہ تو میں نے ایک تیر سے دو شکار کیے تھے۔ لندن میں ایک گروپ کے کچھ پیسے واجب الادا تھے۔ میں نے وہ رقم بھی تم ہی سے وصول کرلی۔'' پھر وہ چونک کر بولا۔ ''ویسے تمہاری جان کو بہت خطرہ ہے۔ زوہیب نے تمہارے قتل کے لیے مجھے بھیجا تھا۔ میں اس میں ناکام رہا تو وہ یہ کام کسی دوسرے کے حوالے کر دے گا...... میں چاہتا ہوں...... کہ......'' اس کی حالت پھر بگڑنے لگی......

''میں چاہتا ہوں کہ...... تمہیں ہر بات...... بتا...... دوں...... خفیہ...... راستہ...... وہ...... ہاں...... نہیں...... ہے...... بلکہ......''

اس کا سانس اکھڑنے لگا اور چہرے پر موت کی زردی پھیلنے لگی۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ''ہاں سجاد!...... بتاؤ...... خفیہ راستہ کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''خف...... خفیہ...... را...... ستہ۔'' اس نے اپنی رہی سہی جسمانی قوت مجتمع کر کے اٹھنا چاہا۔ ''وہ...... او...... دھر......'' اس کا اٹھا ہوا ہاتھ گر گیا اور گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

شہناز نے اس کی نبض دیکھی۔ پھر آہستہ سے بولی۔ ''ختم ہوگیا۔''

میں آہستہ آہستہ اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے راشد خان کی موت کا افسوس ہوا تھا۔ میں شہناز کے ساتھ خاموشی سے باہر نکلا اور بوجھل قدموں سے حویلی کے اقامتی حصے کی طرف بڑھنے لگا۔

''واہ نواب رفیق احمد شیرازی!'' شہناز نے ماحول کی کشیدگی اور بوجھل پن ختم کرنے کے لیے کہا۔ ''آدمی وضع دار ہو تو آپ جیسا کہ بدترین دشمنوں کی موت پر بھی آپ کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔''

''وہ بہرحال ایک ذہین اور باصلاحیت آدمی تھا۔'' میں نے کہا۔ ''اگر غلط ہاتھوں میں نہ پڑتا تو اس انجام کو نہ پہنچتا لیکن اب تو صورتِ حال یہ ہے کہ بے شمار نوجوان بے روزگاری اور فاقہ کشی سے تنگ آکر انہی راہوں کا انتخاب کر رہے ہیں۔''

''نواب صاحب! راشد کے ساتھ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' شہناز نے کہا۔ ''وہ نہ غربت کا ستایا ہوا تھا نہ بے روزگاری کا! اسے کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کرنے کا جنون لے ڈوبا۔''

''سر! اب اس کی لاش کا کیا کرنا ہے؟'' غنی نے پوچھا۔

''اسے ٹھکانے بھی تم ہی لگاؤ غنی!'' میں نے کہا۔ ''تم ان کاموں میں زیادہ ماہر ہو۔ لاش کا نام و نشان بھی نہیں ملنا ہے کیونکہ اس کے اغوا کی ایف آئی آر درج ہو چکی ہے اور اس میں میرا نام بھی آچکا ہے۔ اس کی لاش سے پولیس یہی نتیجہ اخذ کرے گی کہ نواب رفیق احمد شیرازی نے دھونس اور دھاندلی سے پولیس کو تلاشی سے روک دیا اور مغوی کو قتل کر کے اس کی لاش قید خانے سے باہر پھینک دی۔''

''اس وقت تو تمہارا ذہن خوب کام کر رہا ہے۔'' شہناز نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''ہمارا ذہن سوتے میں بھی کام کرتا ہے گستاخ لڑکی!'' میں نے آواز کو رعب دار بنا کر کہا۔ ''اور ہم سوتے ہوئے بھی ایک آنکھ کھلی رکھتے ہیں۔ ہم خواب بھی ایک ہی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔''

''اسی لیے آپ کے خواب بھی ون سائیڈڈ یعنی یک رخہ ہوتے ہیں۔'' شہناز نے کہا۔

میری ہدایات سن کر غنی تہ خانے کی طرف لوٹ گیا تھا۔

میرے سیل فون کی بیل بجنے لگی۔ میں نے اسکرین پر راجا کا نام دیکھا تو ہنس کر شہناز سے بولا۔ ''اپنے مہاراجا صاحب کی کال ہے۔'' میں نے سیل فون کان سے لگالیا۔ ''ہاں راجا!'' میں نے کہا۔ ''سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے؟''

''ابے نواب کی دم!'' راجا اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ ''سلام نہ دعا، بس اٹھا کر لٹھ مار دیا کہ ہاں راجا!''

''سرکار مہاراجا صاحب! السلام علیکم!'' میں نے کہا۔ ''میری دعا ہے کہ آپ ہزاروں برس جئیں۔ وہ تو خیر آپ جئیں گے کیونکہ آپ کالے کوے کھا کر آئے ہیں اور اپنا ریکارڈ درست کرلیں، ہم نواب ہیں کوئی لٹھ باز نہیں ہیں کہ لٹھ ماریں گے۔ مارنا بھی ہوتا تو ہم آپ کو اپنی شمشیر آب دار سے ماریں گے، توپ دم کر دیں گے، ہاتھی کے پاؤں کے نیچے پھنکوا دیں گے۔ کھال کھنچوا کر اس میں بھس بھروا دیں گے اور اسے ڈیکوریشن پیس کے طور پر اپنے ڈرائنگ روم میں سجائیں گے۔''

''آپ بکواس فرما چکے ہوں تو بندہ کچھ عرض کر لے۔'' راجا نے غالباً یہ کہتے ہوئے دانت بھی پیسے ہوں گے۔

''جان کی امان بھی چاہ لو تو بہتر ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم غیظ میں آکر آپ کا زن و بچہ کولہو میں پیل دیں؟ لیکن بچہ تو ابھی آپ کا کوئی ہے نہیں۔ ہاں، ایک زن ہے تو......''

''خبردار!'' راجا دہاڑ کر بولا۔ ''زن کے بارے میں کچھ نہ سنوں میں۔ زر، زن، زمین! یہ تین فتنے اگر دنیا سے ختم ہو جائیں تو......''

''مہاراجا صاحب! باملاحظہ ہوشیار رہیں کیونکہ سیل فون کا اسپیکر کھلا ہوا ہے اور آپ کی زنِ طرح دار بھی یہاں تشریف رکھتی ہیں۔''

شہناز بے ساختہ ہنسنے لگی۔

دوسری طرف سے راجا کی آواز آئی۔ ''ہیلو شہناز! تم یہاں موجود ہو یا اپنے نواب صاحب بکواس فرما رہے ہیں؟''

''راجا! میں یہاں موجود ہوں۔'' شہناز نے اپنی ہنسی روک کر کہا۔ ''تم فکر مت کرو۔ اس مغل بچے سے میں خود نمٹ لوں گی۔''

''یہ تو اپنے حواس میں نہیں ہے۔'' راجا نے کہا۔ ''کام کی بات یہ ہے کہ ہم کل رات یا تم اسے پرسوں صبح بھی کہہ سکتی ہو، پاکستان میں قدم رنجہ فرما رہے ہیں۔''

''کیا فرما رہے ہیں؟'' میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''ہمارے ساتھ میڈم ماہ نور عرف نور جہاں بھی ہوں گی لیکن اسلام آباد آنا ہی ہے تو اپنے ساتھ کوئی فوج لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ بس خاموشی سے شریف آدمی کی طرح آجانا ورنہ میری طرف سے اکیس جوتوں کی سلامی پکی سمجھ! صبح دو بجے فلائٹ اسلام آباد پہنچے گی۔ بہتر ہے کہ تو کل دن میں نکل آ۔ اسلام آباد ہوٹل میں دو کمرے بک کرالینا۔''

''دو کمرے کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''تو کیا تو بھی ہمارے ہی کمرے میں رہے گا۔'' راجا نے شرارت بھرے انداز میں کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

شہناز ایک مرتبہ پھر ہنسنے لگی۔ وہ ہنستی تھی تو اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا تھا اور چہرے سے زبردستی کی بردباری اور سنجیدگی کا نقاب اتر جاتا تھا۔ اس عالم میں وہ اپنی عمر سے دس سال چھوٹی نظر آتی تھی۔

شہناز کی باتوں اور راجا کے فون سے میرا ذہن ہلکا پھلکا ہوگیا تھا۔

ڈنر پر بھی میرا موڈ بہت خوشگوار تھا۔ شہلا کے چہرے پر مجھے وہ شوخی نظر نہیں آرہی تھی جو ہمیشہ ہوتی تھی۔ وہ بہت سنجیدگی

سے کھانے میں مصروف تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ''ڈاکٹر شہلا! کیا آپ مسئلہ کشمیر پر غور کر رہی ہیں؟''

''میں!'' شہلا چونک کر بولی۔ ''نہیں میں کچھ اور سوچ رہی تھی۔'' وہ سر جھکا کر مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ دیکھ کر میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور مجھ پر منکشف ہوا کہ وہ بالکل نور کی طرح مسکراتی تھی۔ اسی لیے مجھے اس کی مسکراہٹ اچھی لگتی تھی۔ شاید اسی موقعے کے لیے شاعر نے کہا ہے کہ کل مسکرائی جو گھونگٹ اٹھا کے، خدا کی قسم تم بہت یاد آئے ہائے!

کھانے سے فارغ ہوا تو غنی میرے نزدیک آیا اور آہستہ سے بولا۔ ''میں نے راشد خان کی لاش کو اس طرح ٹھکانے لگایا ہے کہ اب اس کا سراغ قیامت کے روز ہی ملے گا۔''

میں نے کمرے میں آ کر سیل فون اٹھایا اور نور کا نمبر ملا لیا۔ مجھے ریکارڈنگ سنائی دی کہ آپ کا مطلوبہ نمبر اس وقت بند ہے۔ میں نے کئی بار اس کا نمبر ملایا اور ہر بار یہی جواب آیا کہ اس کا نمبر بند ہے۔

یہ نور کی بہت پرانی عادت تھی۔ وہ اکثر اپنا سیل فون بند کر دیتی تھی۔ مجھے گجرات کی وہ رات یاد آئی جب میں نور سے دھوکا کھا گیا تھا اور بار بار اس کا فون ملانے کی کوشش کے بعد غصے میں اپنا موبائل فون ہی دیوار پر دے مارا تھا۔ اس وقت تو خیر بہت ایمرجنسی تھی۔ چودھری سلطان کے قتل کے الزام میں فریال لاک اپ میں تھی اور خود میں نے ضمانت قبل از گرفتاری کرائی تھی۔

اب مجھے ایسی کوئی ایمرجنسی نہیں تھی۔ میں نے سیل فون سائڈ ٹیبل پر رکھا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔

میں لائٹ بند کرنے ہی والا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ مجھے اس وقت واقعی جھنجلاہٹ سی ہوئی اور میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔ ''کون ہے؟''

''غنی ہوں سر!'' باہر سے غنی کی آواز آئی۔

غنی! یہ اب کیوں آیا ہے؟ ضرور کوئی خاص بات ہوگی کہ اس وقت غنی میرے دروازے پر چلا آیا تھا۔ حویلی میں راجا اور شہناز کے بعد صرف وہی تھا جو کسی بھی وقت مجھے ڈسٹرب کر سکتا تھا ورنہ شدید ہنگامی حالات میں بھی حویلی کے کسی دوسرے ملازم کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ اس وقت میرے کمرے کا دروازہ بجائے۔

میں نے ابھی تک لائٹ آف نہیں کی تھی۔ سائڈ پر رکھا ہوا بغلی ہولسٹر اٹھانے کے بعد میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ ''کیا بات ہے غنی؟'' میں نے قدرے نرم لہجے میں پوچھا اور بغلی ہولسٹر لگا کر اوپر سے نائٹ گاؤن پہن لیا۔

''سر، احمد شاہ نے وہ خفیہ راستہ تلاش کر لیا ہے جہاں سے راشد خان اندر آیا تھا۔'' غنی کے چہرے پر دبا دبا جوش تھا۔

''اچھا!'' میں نے کہا۔ ''احمد شاہ خود کہاں ہے؟''

''سر، خود تو اس کی یہاں آنے کی جرأت نہیں تھی۔ اس نے مجھے آپ کے پاس بھیج دیا۔ وہ اسی خفیہ دروازے کے پاس موجود ہے۔''

میں غنی کے ساتھ باہر نکل گیا۔ جب سے راشد خان حویلی میں داخل ہوا تھا، حویلی کے اندر اور باہر تیز روشنی والی سرچ لائٹس جلتی رہتی تھیں۔ حویلی کے اندر یا باہر پرندہ پر بھی مارتا تو گارڈز کو معلوم ہو جاتا۔

غنی مجھے اسی گھنے درخت کے پاس لے گیا جس پر راشد خان چھپ کر بیٹھا تھا۔ درخت کے عین سامنے والا سرونٹ کوارٹر خالی تھا۔ اس پر ہمیشہ تالا پڑا رہتا تھا۔ اسی پر کیا ہر خالی سرونٹ کوارٹر پر تالا تھا۔ وہ کوارٹر اس جگہ سے دور تھا جہاں دھماکا ہوا تھا۔

میں نے دیکھا، اب اس کوارٹر کا تالا کھلا ہوا تھا اور اندر بھی روشنی ہو رہی تھی۔

احمد شاہ کوارٹر میں موجود تھا۔ وہ ایک دیوار گیر الماری کے پاس کھڑا تھا۔ اس نے مستعدی سے مجھے سیلوٹ کیا اور بولا۔ ''سر! خفیہ راستہ یہاں سے باہر نکلتا ہے۔''

اس نے ایک دیوار گیر الماری کی طرف اشارہ کیا جس پر پرانے زمانے کے لکڑی کے بھاری دروازے تھے۔ وہ دروازے کھلے ہوئے تھے اور وہاں بھی روشنی ہو رہی تھی۔

میں نے آگے بڑھ کر دیکھا۔ الماری کا نچلا حصہ غائب تھا اور وہاں سے پتلا سا ایک زینہ نیچے کی طرف جا رہا تھا۔

''اس دروازے کا میکنزم کہاں ہے؟'' میں نے احمد شاہ سے پوچھا۔

''سر باہر جو یہ لکڑی کی تین کھونٹیاں سی لگی ہوئی ہیں۔ ان ہی میں سے درمیان والی کھونٹی کے ذریعے یہ دروازہ کھلتا ہے۔'' اس نے جواب دیا اور کھونٹی کو پکڑ کر تین مرتبہ دائیں طرف گھمایا۔ خفیف سی آواز آئی اور دیوار سے چوکور سا ایک پتھر نکل کر باہر آ گیا۔ اس سے زینہ غائب ہو گیا اور وہ الماری بھی عام الماریوں کی طرح نظر آنے لگی۔

''گڈ!'' میں نے کہا۔ ''اور یہ راستہ کہاں نکلتا ہے؟''

''سر! زینے کے بعد ایک طویل سرنگ ہے۔ وہ سرنگ ت بدھائی کے جنگل میں نکلتی ہے۔'' اس نے ایک مرتبہ پھر وازہ کھول دیا اور سیڑھیاں اتر کر بولا۔ ''زینے ختم ہونے پر ر اسی طرح کی ایک کھونٹی لگی ہے۔ اسے تین مرتبہ بائیں رف گھمایا جائے تو اوپر والا دروازہ بند ہو جاتا ہے اور سرنگ کے سامنے سے ایک پتھر ہٹ جاتا ہے۔ سرنگ گھنے جنگل میں نکلتی ہے لیکن وہاں صرف چھوٹا سا ایک گڑھا ہے۔ گڑھے کو انٹے دار جھاڑیوں اور گھاس پھونس سے چھپا دیا گیا ہے۔ باہر نکلنے کے لیے وہاں سے گھاس پھونس ہٹانا پڑتا ہے۔''

پہلے میں نے سوچا کہ میں خود سرنگ میں جا کر وہ راستہ دیکھوں لیکن وہ سرنگ بقول احمد شاہ کے خاصی طویل تھی۔ مجھے بھی اندازہ تھا کہ ست بدھائی کا گھنا جنگل حویلی سے بہت دور تھا۔

میں نے فوری طور پر سرنگ میں جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ میں نے احمد شاہ سے کہا۔ ''دروازہ بند کر دو اور یہاں ایک گارڈ کی ڈیوٹی لگا دو۔ میں صبح اس راستے کا جائزہ لوں گا۔''

میں اپنے کمرے کی طرف مڑ گیا۔ غنی میرے ساتھ ساتھ تھا۔ میں نے غنی سے کہا۔ ''تو راشد خان اس راستے سے اندر آیا تھا؟''

''سر! یہ بات تو سمجھ میں آ گئی۔'' غنی نے کہا۔ ''لیکن یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ جب راستہ یہاں تھا تو بم وہاں کیوں فٹ کیا گیا تھا؟''

''وہاں کبھی راستہ تھا ہی نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''ہمیں دھوکا دینے کے لیے راشد خان ہی نے یہ جال بچھایا تھا۔'' میں نے کہا۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ ''راشد خان اس راستے سے اندر آیا، پھر وہ اس کوارٹر کی دیوار پھاند کر اندر گیا اور وہاں بم فٹ کر دیا۔''

''لیکن سر! ہمیں اس کوارٹر کے اندر راشد خان کا ریوالور بھی ملا تھا۔'' غنی بھی بال کی کھال نکالنے پر تلا ہوا تھا۔

''یہ ممکن ہے کہ یہاں سے باہر نکلتے ہوئے اس کا ریوالور یہیں گر گیا ہو اور اسے معلوم نہ ہوا ہو۔'' میں نے کہا۔ ''دوبارہ اسے یہاں آنے کا موقع ہی نہ ملا ہو۔''

''ایک بات اور۔'' غنی نے یوں کہا جیسے میں ہی راشد خان ہوں اور وہ مجھ سے جرح کر رہا ہو۔ ''اس نے ڈاکٹر ٹینا کو پکڑنے کی کوشش کیوں کی؟''

''اس نے مجھ سے تو یہی کہا تھا کہ وہ بے خبری میں میری جان نہیں لینا چاہتا تھا اس لیے مجھے ہوشیار کرنا چاہتا تھا۔'' میں نے کہا اور خود کو ایک مرتبہ پھر ملامت کی کہ میں نے اس کے بیان پر اعتبار کیا۔ ''میرا خیال ہے کہ وہ ڈاکٹر ٹینا کو دیکھ کر ڈم ڈم کی باڑھ کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ ٹینا جب باغ کی طرف آئی تو وہ یہ سمجھا کہ ٹینا نے اسے دیکھ لیا ہے اور اب شور مچا دے گی تو اس نے ٹینا کو بے ہوش کرنے کی کوشش کی لیکن اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا اور ٹینا کی چیخ نکل گئی۔''

یہ سب مفروضے تھے کہ ایسا ہوا ہوگا۔ پھر مجھے سردار خان کا خیال آیا۔ وہ بھی تو رانا کا آدمی تھا۔ میں نے سوچا کہ اس سے بھی پوچھ گچھ کروں گا۔

میں دوبارہ کمرے میں آ کر لیٹا تو مجھے کافی دیر تک نیند نہیں آئی۔ میں ایک مرتبہ پھر خود کو لعنت ملامت کر رہا تھا کہ میں نے اس کی بے سر و پا باتوں پر کیسے اعتبار کر لیا؟ پھر اس کے پاس وہ ڈیوائس کہاں سے آئی؟ اس کا جواب تو بہت آسان تھا کہ میں نے اس کی صرف جیبوں کی تلاشی لی تھی، اس کی مکمل طور پر جامہ تلاشی لی ہی نہیں گئی، پھر سیل فون بھی اس کے پاس چھوڑ دیا۔ یعنی حماقت در حماقت! اب یہی قیاس کیا جا سکتا تھا کہ وہ ڈیوائس اس کے پاس موجود ہوگی۔ جب اس نے میرا اعتماد حاصل کر لیا تو یہاں رہ کر رانا کو معلومات پہنچانے کا پلان بنا لیا ہو۔ رانا سے تو اس کا رابطہ سیل فون کے ذریعے ہو ہی چکا تھا۔

راجا یہاں ہوتا تو میری اس حرکت پر مجھے گالیاں دیتا لیکن راجا یہاں ہوتا تو ایسا ہوتا ہی کیوں؟

یہی باتیں سوچتے ہوئے میری آنکھ لگ گئی۔

صبح حسبِ معمول میں اپنے وقت پر بیدار ہوا اور ٹریک سوٹ پہن کر باہر لان میں آ گیا۔ میں نے پہلے ہلکی پھلکی ایکسرسائز کی، پھر باغ میں جوگنگ کرنے لگا۔ فضا میں خنکی بڑھتی بھی جا رہی تھی اس لیے مجھے جوگنگ میں مزید لطف آ رہا تھا۔

جوگنگ کرنے کے بعد میں باغ کے اس مخصوص گوشے میں بیٹھا تو ریشم بھاگی بھاگی میرے لیے تولیا لے کر آ گئی۔ مجھے تولیا دے کر وہ پھر واپس بھاگ گئی اور دوبارہ لوٹی تو اس کے ہاتھوں میں فریش جوس کا جگ اور گلاس تھا۔

اس نے جگ اور گلاس میرے سامنے رکھی ہوئی میز پر رکھ دیا اور وہاں سے چلی گئی۔ اس کے اس عمل سے مجھے بے اختیار مغل شہنشاہ بابر یاد آیا۔ وہ دو آدمیوں کو بغل میں دبا کر قلعے کی فصیل پر دوڑتا تھا۔ اس سے فارغ ہونے کے بعد وہ شربت یا دودھ پیتا تھا جو کنیز اس کے لیے شربت کا جگ لے کر آتی تھی، وہ پہلے ایک گلاس نکال کر وہ شربت ضرور چکھتی تھی کہ اس

میں زہر نہ ملایا گیا ہو۔

مجھے بے اختیار ہنسی آگئی کہ کہاں مغل شہنشاہ ظہیر الدین بابر اور کہاں میں۔ گویا کہاں راجا بھوج اور کہاں گنگو تیلی؟ اس نے اپنے زور بازو سے ہندوستان کی سلطنت حاصل کی تھی۔ میری جھولی میں تو ست بدھائی کی جاگیر پکے ہوئے پھل کی طرح آگری تھی۔

میں نے جوس کے دو گلاس پیے، پھر میں قید خانے کی طرف روانہ ہوگیا۔

غنی نے مجھے جانے کہاں سے دیکھ لیا تھا۔ وہ بھی بھاگتا ہوا میرے پاس آگیا تھا۔ میں تہ خانے کی طرف بڑھا تو غنی بھی میرے ساتھ ساتھ تھا۔

میں نے اس کمرے کا جائزہ لیا جہاں راشد خان کی موت واقع ہوئی تھی۔ وہاں اب کسی کی موجودگی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ کمرا بالکل صاف ستھرا تھا۔ میں نے توصیفی انداز میں غنی کی طرف دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔ تہ خانے میں بائیں جانب وہ کمرا تھا جس میں سردار خان کو رکھا گیا تھا۔

میں نے آہنی سلاخوں والے دروازے سے دیکھا، سردار خان بے خبر سو رہا تھا۔

''دروازہ کھولو۔'' میں نے غنی سے کہا۔

میری آواز سن کر سردار خان بیدار ہوگیا۔ میں اندر داخل ہوا تو وہ کھڑا ہوگیا اور مجھے سلام کیا۔

میں نے اس کے سلام کا بھی جواب نہ دیا اور اسے گھورتا رہا۔ پھر میں نے اچانک اس سے پوچھا۔ ''سردار خان تو رانا کے لیے کام کرتا تھا تو اس سے رابطہ کیسے کرتا تھا؟''

''سیل فون کے ذریعے۔'' سردار خان نے جلدی سے کہا۔ ''وہ مجھ سے بات نہیں کرتا تھا۔ کبھی بہت ضروری ہوتا تو ایس ایم ایس کر دیتا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔

''تیرا سیل فون کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کا سیل فون تو میں نے چھین لیا تھا، وہ صوبیدار میجر صاحب کے پاس ہے۔'' غنی نے کہا۔

''تو راشد خان کو پہچانتا تھا؟''

''جی ہاں، میں اسے پہچانتا تھا۔'' سردار خان نے کہا۔ ''وہ رانا کا بہت خاص آدمی تھا۔ اسے یہاں دیکھ کر پہلے تو میں یہی سمجھا تھا کہ وہ میری مدد کرنے آیا ہے۔''

''تو راشد کو کیسے جانتا تھا؟'' غنی نے پوچھا۔ ''کیا تو پہلے رانا کے پاس ملازمت کر چکا ہے؟''

''جی ہاں۔'' اس نے کہا۔ ''میں نے دو سال تک رانا صاحب کی ملازمت کی ہے۔'' سردار خان نے بتایا۔ ''میں ان کے لاہور والے بنگلے پر ہوتا تھا اس لیے مجھے ست بدھائی کے زیادہ لوگ نہیں جانتے تھے۔ مجھے یہاں ملازمت کے لیے بھیجنے کی تجویز بھی راشد ہی کی تھی۔'' سردار خان سہم سہم کر بول رہا تھا اور میں جانتا تھا کہ وہ سچ بول رہا ہے۔

میں وہاں سے نکل کر صوبیدار میجر صاحب کے پاس چلا گیا۔ وہ بھی علی الصباح اٹھنے کے عادی تھے۔ نماز فجر کے بعد وہ کھلی فضا میں چہل قدمی کرتے تھے۔

وہ بھی ابھی مارننگ واک سے واپس آئے تھے۔

میں نے انہیں بتایا کہ احمد شاہ نے خفیہ راستے کا سراغ لگالیا ہے۔

''رفیق میاں! میں احمد شاہ اور ایک گارڈ کے ساتھ رات ہی اس سرنگ میں گیا تھا۔ وہ خاصی تنگ و تاریک سرنگ ہے لیکن اس میں چلتے ہوئے گھٹن کا احساس نہیں ہوتا۔ ہاں قدرے جھک کر چلنا پڑتا ہے کیونکہ وہ سرنگ زیادہ اونچی نہیں ہے۔ میں رات ہی کو اس کا جائزہ لے کر آچکا ہوں۔ مجھے آنے جانے میں سوا تین گھنٹے لگے تھے۔'' انہوں نے بتایا۔

''کیا میں اس سرنگ کو برقرار رکھوں یا بند کرا دوں؟'' میں نے ان سے پوچھا۔ ''یہ سرنگ ہمارے بھی تو کام آسکتی ہے؟''

''اس جگہ کا علم اب رانا کو بھی ہے۔'' صوبیدار میجر صاحب نے کہا۔ ''اس لیے آپ کا اس کو بند کرانا ہی بہتر ہے۔ وہ دوبارہ اس راستے کو استعمال کر سکتا ہے۔ وہ تو یہی سمجھ رہا ہے کہ ابھی تک ہمیں اس راستے کا علم نہیں ہوا ہے۔''

''رفیق میاں!'' صوبیدار میجر صاحب سنجیدگی سے بولے۔ ''مجھے آپ سے ایک شکایت ہے، آپ کسی بھی معاملے میں مجھے اعتماد میں لیتے ہیں نہ مجھ سے مشورہ کرتے ہیں۔'' انہوں نے ناراضی کا اظہار کیا۔ ''پھر سوال یہ ہے کہ میرا یہاں کیا کام ہے؟''

''ایسی بات نہیں ہے صوبیدار میجر صاحب!'' میں نے نظریں جھکا کر کہا۔ ''جب سے آپ یہاں آئے ہیں۔ میں نے ہمیشہ آپ سے مشورہ کیا ہے، بس یہ ایک بھول مجھ سے ہوگئی ہے۔ اب آپ بھی مجھے شرمندہ کریں گے؟''

''میرا مقصد شرمندہ کرنا نہیں ہے رفیق میاں!'' صوبیدار میجر صاحب بولے۔ ''میں صرف یہ کہہ رہا تھا کہ یہاں میرا کیا کام ہے؟ میں نے آپ کے گارڈز کو ٹرینڈ کر دیا ہے۔ آرمی کے سابق کمانڈوز کو تو کسی تربیت کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔''

''آپ نے بہت سے مواقع پر میری مدد کی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ابھی آپ کا کام ختم نہیں ہوا ہے۔ بس آپ یہاں سے کہیں نہیں جائیں گے۔'' میں جانتا تھا کہ یہاں ان کی بیوی ہے نہ کوئی بچہ! ان کا ایک بیٹا تھا جو برسوں پہلے پیسا کمانے ملک سے باہر گیا تھا، پھر وہ ایسا گیا کہ لوٹ کر دوبارہ پاکستان نہیں آیا۔ اس نے امریکا ہی میں ایک گوری میم سے شادی رچالی۔ صوبیدار میجر صاحب نے اس سے کہہ دیا کہ اب پاکستان آنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں تیری ماں تیرے انتظار میں روز جیتی اور روز مرتی تھی، اب وہ ہمیشہ کے لیے مرگئی ہے۔ بیٹا بھی اتنا سعادت مند تھا کہ اس نے باپ کے حکم سے انکار نہیں کیا اور دوبارہ پاکستان نہیں آیا۔

میں کچھ دیر بیٹھا صوبیدار میجر صاحب کی دل جوئی کرتا رہا۔ ان سے کہا کہ واقعی مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی ہے۔ وہ مسکرانے لگے۔ گویا انہوں نے حویلی چھوڑنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

ناشتے کے بعد شہناز نے مجھ سے کہا۔ ''رفیق! تمہیں اسلام آباد جانا ہے تو ابھی نکل جاؤ۔''

''یہ تم کہہ رہی ہو یا راجا کے الفاظ دہرا رہی ہو؟''

''راجا نے تو کہا ہی تھا۔ میرا بھی یہی مشورہ ہے کہ تم دن ہی دن میں اسلام آباد پہنچ جاؤ۔''

میں نے غنی سے کہا کہ وہ گاڑی نکالے اور اس کا تیل پانی اور انجن کی کارکردگی چیک کرلے۔

صبح دس بجے میں اپنی ہنڈا سوک کے بجائے ایک ڈبل کیبن پک اپ میں اسلام آباد روانہ ہوا۔ میری گاڑی خادم حسین لا رہا تھا۔

ڈبل کیبن پک اپ کے عقبی حصے میں میرے دو بہترین گارڈز بھی تھے لیکن اپنے حلیوں سے وہ کاشتکار دکھائی دے رہے تھے۔

غنی اس مرتبہ ہر لحاظ سے چوکنا تھا اور وہ نزدیک سے گزرتی ہوئی ہر گاڑی کو مشکوک نظروں سے دیکھتا تھا۔ میں خود بھی بہت چوکنا تھا اور بہت غور سے اردگرد کا جائزہ لیتا ہوا جا رہا تھا۔

راستے میں ایک جگہ مجھے ایک گاڑی کھڑی ہوئی نظر آئی۔ اس کا بونٹ اٹھائے ہوئے کوئی آدمی انجن کو دیکھ رہا تھا۔ پسنجر سیٹ پر غالباً اس کی بیوی یا بہن بیٹھی تھی۔

اس شخص نے ہماری گاڑی کو رکنے کا اشارہ کیا لیکن میں نے غنی سے کہا۔ ''چلتے رہو، رکنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

غنی نے گاڑی روکے بغیر آگے بڑھادی۔

وہ کوئی شریف صورت آدمی تھا۔ میں اس کی ایک ہی جھلک دیکھ سکا تھا۔

اس نے بعد میں ہمیں گالیاں دی ہوں گی کہ عجیب جاہل لوگ تھے۔ اللہ نے ان لوگوں کو پیسا تو دے دیا ہے لیکن ان کی ذہنیت نہیں بدلی۔

ایک مرتبہ ایک گاڑی ہمارے پیچھے مسلسل ہارن بجاتی رہی تو غنی نے جھنجلا کر گاڑی کی اسپیڈ بڑھادی اور منہ ہی میں منہ میں بڑبڑایا۔ ''اتنا ہی شوق ہے تو اب پیچھے آکر دکھا۔''

غنی کی تیز رفتاری کے باعث میں جلدی اسلام آباد پہنچ گیا۔ غنی اسلام آباد ہوٹل میں دو کمرے پہلے ہی بک کرا چکا تھا۔

گاڑی ہوٹل کے پورچ میں رکی تو ایک پورٹر دوڑتا ہوا آیا لیکن اسے مایوسی ہوئی۔ میرے پاس صرف ایک ہینڈ بیگ اور بریف کیس تھا۔

''غنی!'' میں نے چونک کر پوچھا۔ ''تم نے ان لوگوں کے لیے بھی کوئی انتظام کیا ہے؟ یہ لوگ کہاں ٹھہریں گے؟'' میں نے گارڈز کی طرف اشارہ کیا۔

''میں ان سب کا بندوبست کر چکا ہوں سر!'' غنی نے جواب دیا۔

میں گاڑی سے باہر آگیا۔ ایک گارڈ نے لپک کر میرا بریف کیس بھی اٹھالیا۔ غنی گاڑی پارکنگ کے لیے لے گیا۔

میں باوقار انداز میں ہوٹل کے داخلی دروازے کی طرف بڑھا تو دربان نے بہت عزت سے دروازہ کھول دیا اور مجھے زوردار سلام بھی کیا۔ میں نے سلام کا جواب دیتے ہوئے جیب میں ہاتھ ڈالا اور سو روپے کا ایک نوٹ اسے عنایت کر دیا۔

میں استقبالیہ کاؤنٹر پر پہنچا جہاں ایک خوبصورت سی لڑکی بیٹھی تھی۔

''جی فرمایئے؟'' وہ سراپا اخلاق بن گئی۔

''رفیق شیرازی کے نام سے یہاں دو کمرے بک ہوں گے؟'' میں نے کہا۔

''رفیق شیرازی!'' اس نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا، پھر اپنے سامنے رکھے ہوئے مانیٹر پر دیکھنے لگی۔ اس کی

انگلیاں تیزی سے کمپیوٹر کے کی بورڈ پر چل رہی تھیں۔

''نو سر!'' اس نے بہت ادب سے کہا۔ ''اس نام سے کوئی کمرا بک نہیں ہے۔''

''کیا مطلب ہے آپ کا؟'' میں نے دہاڑ کر کہا۔ میں نے یہ جملہ انگریزی میں ادا کیا تھا۔ اردگرد کے لوگ چونک کر مجھے دیکھنے لگے۔

اسی وقت غنی آ گیا۔ مجھے غصے میں دیکھ کر وہ بھی سہم گیا۔

''کیا ہوا سر؟'' اس نے پوچھا۔

''تم تو کہہ رہے تھے کہ میں نے کمرے بک کرا دیے ہیں۔ ان موصوفہ کا کہنا یہ ہے کہ یہاں اس نام سے کوئی کمرا بک نہیں ہے۔''

غنی خود استقبالیہ کاؤنٹر کی طرف بڑھا اور درشت لہجے میں بولا۔ ''آپ ایک دفعہ پھر غور سے دیکھیں خاتون! فون پر میں نے ہی نواب رفیق احمد شیرازی کے نام سے دو کمرے بک کرائے تھے۔''

لڑکی گھبرا کر بولی۔ ''ہاں نواب صاحب کے کمرے تو بک ہیں۔''

میں نے آگے بڑھ کر لڑکی سے کہا۔ ''ابھی تو تم کہہ رہی تھیں کہ کمرے بک نہیں ہیں۔''

وہ ایک دم مودب ہو گئی۔ ''نواب صاحب! معذرت چاہتی ہوں۔ آپ نے مجھے اپنا پورا نام نہیں بتایا تھا۔ کمرا نمبر دو سو چار اور دو سو پانچ آپ کے لیے محفوظ ہیں۔'' اس نے دونوں کمروں کی چابیاں غنی کے حوالے کر دیں اور مجھ سے بولی۔ ''سر، ویری ویری سوری اگین!''

''اٹس آل رائٹ!'' میں نے بے نیازی سے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ میں اور غنی اوپر پہنچے۔ کمرا خاصا آرام دہ تھا۔

غنی نے بتایا کہ ''ابھی تو میں بھی آپ کے ساتھ والے کمرے میں مقیم ہوں۔ جب راجا صاحب آ جائیں گے تو کہیں اور بندوبست کر لوں گا۔''

راجا کی فلائٹ آدھا گھنٹا لیٹ تھی۔ موسم کی خرابی کی وجہ سے اسے فرینکفرٹ میں کچھ زیادہ رکنا پڑا تھا۔

میں اس دفعہ بھی وزیٹر لاؤنج میں ٹہل رہا تھا۔

اچانک پیچھے سے ایک مترنم آواز سنائی دی۔ ''ہیلو!'' میں نے گھوم کر دیکھا۔ بولنے والی انتہائی مختصر ٹی شرٹ اور جینز میں تھی اور میری طرف پرشوق نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے حیران ہو کر کہا۔ ''جی فرمائیے؟''

''ہاؤ سوئیٹ!'' وہ مسکرا کر بولی۔ ''ابھی تک وہی پرانا انداز ہے۔''

''ایکسکیوزمی!'' میں نے خشک لہجے میں کہا۔ ''میں آپ کو پہچانا نہیں۔''

''اب کیوں پہچانو گے؟'' لڑکی بلند آواز میں بولی۔ ''میرا سب کچھ تو تم نے لوٹ لیا۔ اب تم مجھے کیوں پہچانو گے؟''

''چھوڑو بے بی!'' کسی مرد کی آواز سنائی دی۔ ''یہ آدمی تو شروع ہی سے گھٹیا ہے؟''

بولنے والا سامنے بھی آ گیا۔ وہ پچاس، پچپن سال کا خرانٹ سا آدمی تھا۔ اس نے تھری پیس سوٹ پہن رکھا تھا لیکن اس کے چہرے سے نہیں لگ رہا تھا کہ یہ سوٹ اسی کا ہے۔

اچانک میرے عقب سے غنی آگے بڑھا اور اس شخص کا گریبان پکڑ لیا۔ ''تمیز سے بات کرو۔'' غنی نے سخت لہجے میں کہا۔ ''تم جانتے ہو، یہ کون ہیں؟''

''تو میرا گریبان تو چھوڑ۔'' وہ آدمی بپھر کر بولا۔ ''میں اس شخص کو اچھی طرح جانتا ہوں۔''

غنی نے اس کے چہرے پر ایک ہاتھ جما دیا۔ وہ الٹ کر مختصر کپڑوں والی بے بی پر گرا اور بے بی ایک مسافر کے سامان کی ٹرالی پر جا پڑی۔ ٹرالی وہاں بیٹھی ہوئی ایک موٹی سی عورت سے ٹکرائی اور عورت چیخ کر بولی۔ ''ہائے، میں مر گئی۔''

بے بی ٹرالی سے اٹھ چکی تھی۔ وہ دوڑتے ہوئے ہمارے نزدیک آئی اور چیخنے لگی۔ ''ہیلپ...... ہیلپ! مجھے اس آدمی سے بچاؤ۔ یہ مجھے قتل کر دے گا۔''

ایئرپورٹ پر اب سیکورٹی کچھ زیادہ ہی ہوتی ہے۔ عورت کی چیخ پکار سن کر اے ایس ایف کے دو سیکورٹی افسر دوڑتے ہوئے وہاں آ گئے۔ ان میں سے ایک ڈپٹ کر بولا۔ ''کیا ہوا...... یہاں کیا ہو رہا ہے؟''

''مجھے اس شخص سے بچائیں، یہ مجھے بھی قتل کر دے گا۔'' اس نے چیخ کر میری طرف اشارہ کیا۔

ایئرپورٹ سیکورٹی فورس (اے ایس ایف) کے افسر نے مشینی انداز میں اپنا سروس ریوالور نکالا اور مجھ پر تان لیا۔ ''خبردار! اپنی جگہ سے جنبش بھی نہ کرنا۔''

''وہاٹ!'' میں دہاڑ کر بولا۔ ''تم لوگ کیا بھنگ پی گئے ہو؟''

''شٹ اپ!'' دوسرے افسر نے کہا اور اپنا ریوالور نکال کر مجھے گن پوائنٹ پر لے لیا اور بولا۔ ''اب تم فرار کی کوشش مت کرنا۔ ورنہ میں فائر کر دوں گا۔''

اچانک کہیں سے ایک فائر ہوا اور اے ایس ایف کا وہ افسر زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔

میں حیرت سے اس افسر کو دیکھ رہا تھا۔ فائر بالکل بے آواز ہوا تھا۔ اگر میں اس افسر کی طرف دیکھ نہ رہا ہوتا تو مجھے معلوم بھی نہ ہوتا کہ اسے گولی لگی ہے۔ گولی اس کے دائیں شانے میں دھنس گئی تھی۔ اس کی قمیص پر سرخ رنگ کا ایک دھبا نمودار ہو گیا تھا جو بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ ائرپورٹ پر ایک افراتفری مچ گئی۔ اے ایس ایف کے اہلکار لوگوں کو پرسکون رہنے کی تلقین کر رہے تھے۔ پھر پولیس اور ایمبولینس ایک ساتھ وہاں پہنچی۔ زخمی افسر کو ایمبولینس میں وہاں سے روانہ کر دیا گیا۔

ابھی تک مجھے اے ایس ایف کے افسران نے گن پوائنٹ پر لے رکھا تھا۔ پولیس کی مستعدی پر میں حیران تھا لیکن میں نے اپنی حیرانی پر قابو پا لیا۔ مجھے یاد آ گیا تھا کہ ائرپورٹ پر تو پولیس کے اہلکار ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ یہ بات الگ ہے کہ وہ کوئی کام کرتے بھی ہیں یا نہیں؟

پولیس کا ایک اے ایس آئی میری طرف بڑھا۔ وہ روایتی پولیس والوں کے برعکس چھریرے بدن کا پھرتیلا نوجوان تھا۔ شاید اس نے پولیس فورس حال ہی میں جوائن کی تھی کیونکہ اس کے چہرے پر وہ مکاری نہیں تھی جو پولیس والوں کا ٹریڈ مارک ہے۔

''کیا ہوا ہے؟'' اس نے پوچھا۔ ''یہاں فائرنگ کس نے کی ہے اور یہ کون ہے؟'' اس نے میری طرف اشارہ کیا۔ کیا فائر انہوں نے کیا ہے؟''

اے ایس ایف کے افسر نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''پھر کیا پرابلم ہے؟'' اس نے قدرے تلخ لہجے میں پوچھا۔

''میں بتاتا ہوں آفیسر کہ میں کون ہوں؟'' میں نے ...ال انگریزی میں کہا۔ ''میں نواب رفیق احمد شیرازی ...اں۔ میں ان لوگوں کے خلاف ہتک عزت کا دعویٰ کروں ...ا۔ مجھ پر یوں ریوالور تاننے کا مقصد کیا ہے؟''

''کیوں انہیں گن پوائنٹ پر لے رکھا ہے؟'' اے ...س آئی گن بردار افسر کی طرف مڑا۔

''اس نے ایک لڑکی پر حملہ کیا تھا۔'' اے ایس ایف کا ...ر بولا۔

''کس لڑکی پر؟'' اے ایس آئی نے سرد لہجے میں ...ا پوچھا۔

اس افسر نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا لیکن اب اس بے بی کا دور دور تک کوئی نام و نشان نہیں تھا۔

''ابھی تو وہ یہیں تھی۔'' افسر گڑبڑا کر بولا۔

نہ صرف بے بی غائب ہو گئی تھی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ بابا بھی غائب تھا جسے غنی نے ہاتھ رسید کیا تھا۔

''وہ لڑکی کہاں ہے؟'' اس مرتبہ اے ایس آئی نے قدرے درشت لہجے میں پوچھا۔

''مجھ سے اس لہجے میں بات مت کرو۔'' اے ایس ایف کا افسر اپنے ہی علاقے میں اپنی بے عزتی برداشت نہ کر سکا۔ ''میں بھی سرکاری ملازم ہوں۔''

''کسی بھی سرکاری ملازم کو یہ حق نہیں ہے کہ لوگوں پر بلا جواز ریوالور تان لے۔''

اس بھیڑ میں مجھے غنی دکھائی دیا۔ وہ تیزی سے میری طرف آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ائرپورٹ منیجر بھی تھا۔ اس نے حیرت سے مجھے دیکھا، پھر بولا۔ ''نواب صاحب! خیریت تو ہے، یہ سب کیا ہے؟''

''یہ آپ اپنے ان افسران سے پوچھیے۔'' میں نے کہا۔

''میں ایک میٹنگ میں گیا ہوا تھا۔ وہاں مجھے اطلاع ملی کہ اے ایس ایف کا ایک افسر زخمی ہو گیا ہے۔ میں فوراً ادھر دوڑا۔'' وہ افسر کی طرف گھوم کر بولا۔ ''کیا پرابلم ہے! تم نے نواب صاحب کو کیوں روک رکھا ہے؟''

''سر...... وہ...... انہوں نے...... ایک لڑکی...... پر بھی حملہ کیا تھا؟'' افسر بوکھلا سا گیا۔

''تو وہ لڑکی کہاں گئی؟'' اے ایس آئی تلخی سے بولا۔

پولیس کے دو مزید افسر وہاں پہنچ گئے تھے اور وہ جائے واردات کو نشان زد کر رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے پولیس اور ائرپورٹ سیکورٹی نے ائرپورٹ کو سیل کر دیا تھا۔ وہاں موجود تمام افراد کو یقین دلایا تھا کہ اب کوئی پریشانی نہیں ہے۔ آپ لوگ پلیز یہاں مجمع نہ لگائیں۔

''میں بہت شرمندہ ہوں نواب صاحب!'' ائرپورٹ منیجر نے کہا۔ ''ان لوگوں سے نادانستگی میں یہ غلطی ہوئی ہے۔'' وہ بے چارہ انتہائی شریف آدمی تھا جو محض ایک سرسری ملاقات کے بعد یوں بات کر رہا تھا جیسے مجھے برسوں سے جانتا ہو۔

''شرمندہ تو ہمیں ہونا پڑتا۔'' میں نے کہا۔ ''اگر میرے گارڈز آپ کے آدمیوں کو کوئی نقصان پہنچا دیتے تو۔''

''سر، آپ کو پولیس اسٹیشن تک چلنے کی زحمت کرنا ہوگی۔'' اے ایس آئی بھی مجھ سے مرعوب ہو گیا تھا۔ وہ سیکورٹی افسر سے مخاطب ہوا۔ ''آپ کو بھی پولیس اسٹیشن تک چلنا ہوگا۔''

''ہم اپنے دوستوں کا استقبال کرنے آئے ہیں، ہم فوری طور پر نہ آ سکیں گے۔'' میں نے بارعب لہجے میں کہا۔ ''ہاں بعد میں ہم پولیس اسٹیشن ضرور آئیں گے۔''

اچانک اعلان ہونے لگا۔ ''توجہ فرمائیے، لندن سے کراچی آنے والی پرواز پی کے سیون ٹو سیون کراچی پہنچ چکی ہے۔'' یہی اعلان دوسری مرتبہ انگریزی میں ہوا۔

''آپ کس ریاست کے نواب ہیں؟'' اے ایس آئی

اس بات پر تو یقین کر ہی چکا تھا کہ میں نواب ہوں۔

"ہم ست بدھائی کے نواب رفیق احمد شیرازی ہیں۔" میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر اسے دیا۔ وہ کارڈ بہت قیمتی تھا۔ اسے دیکھ کر واقعی لگتا تھا کہ یہ کسی ریاست کے نواب ہی کا ہے۔

انسپکٹر نے کارڈ کا جائزہ لیا اور میری ڈگریوں سے مزید مرعوب ہوا۔ "ٹھیک ہے نواب صاحب! آپ اپنے دوستوں کو ریسیو کرنے کے بعد پولیس اسٹیشن آ جائیں۔"

میں نے اے ایس آئی اور ائرپورٹ منیجر سے ہاتھ ملایا اور وزیٹرز لاؤنج کی طرف بڑھ گیا۔

طیارے سے آنے والے مسافر اب ارائیول لاؤنج میں پہنچ گئے تھے اور امیگریشن اور کسٹم وغیرہ کے مراحل سے گزر رہے تھے۔

بھانت بھانت کے مسافروں کی اس بھیڑ میں مجھے اچانک راجا دکھائی دیا۔ وہ پہلے سے زیادہ اسمارٹ اور ہینڈسم لگ رہا تھا۔ اس کے پیچھے نور تھی۔ اس نے بہت خوب صورت ساڑھی باندھ رکھی تھی، شانوں پر خوب صورت اور بیش قیمت شال تھی۔ اس کا حسن مزید نکھر گیا تھا۔ میرا دل بری طرح دھڑکنے لگا۔ نور مسکرائی تو مجھے ایک بار پھر بے اختیار ہالی وڈ کی معروف اداکارہ آڈرے ہیپ برن یاد آئی۔ بالکل ایسا لگ رہا تھا کہ اس نے ابھی ابھی رومن شہزادی کا لباسِ فاخرہ اتار کے ساڑھی پہن لی ہو۔

میں اتنی محویت سے اسے دیکھ رہا تھا کہ اپنے گرد و پیش سے بے خبر ہو گیا تھا۔ ایسے میں میرا کوئی دشمن مجھے بہت آسانی سے مار سکتا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میں نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ غنی اور میرے دونوں گارڈز پوری طرح مستعد کھڑے تھے۔ میں پھر شیشے کی دیوار سے اندر دیکھنے لگا۔ وہ لوگ کسٹم سے فارغ ہو کر اپنا سامان ٹرالیوں میں رکھ رہے تھے۔ نور اور راجا کے سامان میں چار بڑے بڑے سوٹ کیس، دو بیگ، ایک قدرے چھوٹا شولڈر بیگ اور دو بریف کیس تھے۔ گویا نور بھی اب بریف کیس رکھنے لگی تھی۔

راجا نے اچانک مجھے دیکھ لیا اور ہاتھ ہلایا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے نور سے کچھ کہا۔ نور نے بھی چونک کر میری طرف دیکھا۔ وہ مجھے نہ دیکھ سکی کیونکہ اب میں لاؤنج کے اس دروازے کی طرف آ گیا تھا جہاں سے مسافر ٹرالیاں دھکیلتے ہوئے باہر آ رہے تھے۔ دروازے پر ائرپورٹ سیکیورٹی فورس کا ایک اہلکار موجود تھا، عام لوگوں کے ساتھ اس کا سلوک وہی تھا جیسا پولیس والوں کا ہوتا ہے۔ پھر راجا اور نور ٹرالیاں دھکیلتے ہوئے باہر نکلے تو میں ایک دم سامنے آ گیا۔

راجا مجھ سے یوں بغل گیر ہوا جیسے برسوں بعد ملا ہو۔ وہ ہنس کر بولا۔ "ٹھیکے پتر، سب خیر تو ہے نا؟"

"ہاں، سب خیریت ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا اور نور کی طرف بڑھ گیا۔ نور بھی والہانہ انداز میں میری طرف بڑھی۔ میں نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے جو آہستہ آہستہ لرز رہے تھے۔

"خیال رہے جان! اس وقت ہم لندن میں نہیں مملکتِ خداداد پاکستان میں ہیں۔"

نور نے جھینپ کر دونوں ہاتھ چھڑا لیے۔

ان کے سامان کی ٹرالیاں دونوں گارڈز لے کر جا رہے تھے۔ غنی مستعدی سے میرے نزدیک ہی کھڑا تھا۔

میں نے سامان دیکھ کر کہا۔ "ماہ نور بیگم! آپ کیا گھر کی تمام چیزیں سمیٹ لائی ہیں۔ اس سامان کو دیکھ کر تو بے اختیار وہ شعر یاد آتا ہے۔ جس میں شاعر نے لوگوں کو یہ اطلاع دی ہے کہ اپنی موت کا کسی کو بھی علم نہیں، پھر سامان پر تنقید کی ہے کہ یہ سامان تو سو برس کے لیے کافی ہے، یہاں تو پل کی خبر نہیں ہے۔"

"یار، میں تو سمجھ رہا تھا کہ تو اب تک بندے دا پتر بن چکا ہوگا لیکن میں تو جیسا تجھے چھوڑ کر گیا تھا، تو بالکل ایسا ہی ہے۔"

میں نے کہا۔ "غلط! ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں۔"

"تو کیا یہیں کھڑا ہوا شاعری کی مار مارتا رہے گا؟" راجا نے آنکھیں نکالیں۔ "کچھ خیال کر، مسافر تھکے ہوئے ہیں۔"

غنی گاڑی وہیں لے آیا۔ اس نے بہت ادب سے نور کے لیے دروازہ کھولا۔ نور کے بیٹھنے کے بعد میں بھی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ راجا نے خود ہی پسنجر سیٹ کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھ گیا۔

مجھے پولیس کا ایک سپاہی نظر آیا تو مجھے یاد آ گیا کہ ابھی مجھے پولیس اسٹیشن بھی جانا ہے۔ میں نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی۔ اس میں صبح کے تین بج رہے تھے، غنی ہمیں لے کر اسلام آباد ہوٹل پہنچ گیا۔

"ارے، کیا ہم ست بدھائی نہیں جا رہے؟" نور نے پوچھا۔ راجا نے شاید اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ صبح تک ہم کسی ہوٹل میں قیام کریں گے۔

ہوٹل پہنچ کر نور نے روم ہیٹر آن کیا اور بیڈ پر پھیل گئی۔

ہم اب خاصا خنک ہو گیا تھا۔ نور بیڈ پر نیم دراز بہت غور ے مجھے دیکھ رہی تھی۔

"ایسے کیا دیکھ رہی ہو جان!" میں نے کہا۔

وہ اچانک جذباتی ہو گئی۔ "رفیق! تم کتنے کمزور ہو گئے ہو؟" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "مجھے تو ان وں نے کچھ بتایا ہی نہیں کہ یہاں کیا ہوتا رہا؟ تم ان کی قید یں کتنے دن رہے؟" اس نے اٹھ کر اچانک میرے گلے یں بانہیں ڈال دیں۔ "اگر...... اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو...... یں بھی اپنی جان دے دیتی۔"

"ٹیک اٹ ایزی جان!" میں نے اس کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا۔ "دیکھو، مجھے کچھ بھی نہیں ہوا۔"

مجھے اچانک یاد آیا کہ پولیس اسٹیشن میں سب انسپکٹر برا انتظار کر رہا ہوگا، وہ نہ جانے کیوں میرے ساتھ اتنی رعایت کر گیا تھا۔ شاید اس کی وجہ ائرپورٹ منیجر کا رویہ تھا۔ و جب پولیس اسٹیشن پہنچا ہوگا تو ایس ایچ او نے کہا ہوگا کہ ائے تم ملزم کو کہاں چھوڑ آئے؟ ایسے تو ہر ملزم خود کو نواب کہہ کر نکل جائے گا۔ کیا اس کے ماتھے پر لکھا تھا کہ وہ نواب ہے؟

"نور تم آرام کرو۔" میں نے کہا۔ "میں ایک ضروری کام نمٹا کر ابھی آتا ہوں۔"

"اب اس وقت کون سا کام آن پڑا؟" نور جھنجلا گئی۔

"بس ہے کوئی ضروری کام!" میں نے کہا۔ "میں بس ول گیا اور یوں آیا۔ تم بھی ذرا آرام کر لو۔ ہمیں صبح ست بدھائی کے لیے بھی نکلنا ہے۔"

اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتی، میں کمرے سے باہر نکل آیا۔ راجا شاید سو گیا تھا کیونکہ اس کے کمرے کا دروازہ اندر سے لاک تھا۔ میں نے دروازے پر دستک دی تو اس نے فوراً ہی دروازہ کھول دیا۔

"او بھائی، تو غلط کمرے میں آ گیا ہے۔" راجا نے ہنس کر کہا۔ "یہ کمرا میرے لیے بک ہوا ہے۔"

"یار، ایک ضروری بات تجھے بتانا ہے۔"

"وہ ضروری بات کیا صبح نہیں ہو سکتی قبلہ نواب صاحب؟"

"نہیں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا اور کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا۔

میں نے اسے تفصیل سے ائرپورٹ پر پیش آنے والا واقعہ سنایا۔ راجا بہت توجہ سے میری بات سنتا رہا، پھر بولا۔

"یار، تو تو بہت عقل مند ہو گیا ہے۔ تو نے اچھا کیا کہ پولیس اسٹیشن نہیں گیا۔"

"لیکن پولیس کا وہ فرض شناس اے ایس آئی میرا انتظار کر رہا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"تو یہیں رک۔" راجا نے کہا۔ "ست بدھائی کے نواب رفیق احمد شیرازی اتنے گئے گزرے نہیں ہیں کہ وہ بہ نفسِ نفیس پولیس اسٹیشن جائیں گے۔ وہاں جائے گا تیرا پی آر او!"

"یعنی تو؟" میں نے پوچھا۔

"اور کتنے پی آر او ہیں تیرے؟" راجا آنکھیں نکال کر بولا۔ "کیا میری غیر موجودگی میں تو نے کوئی نیا پی آر او رکھ لیا ہے؟"

"لیکن یار، تو تھکا ہوا آیا ہے اور......"

"میں کیا لندن سے پیدل آ رہا ہوں؟" راجا نے مجھے گھورا۔ "یا پھر ہوائی جہاز کو دھکا لگایا ہے؟ میں تو فلائٹ میں بھی سارا وقت سوتا ہی رہا ہوں۔ اب تو جا اپنے کمرے میں۔ میں پولیس اسٹیشن جا کر کہوں گا کہ میں نواب صاحب کا پی آر او ہوں۔ اگر آپ کو نواب صاحب سے کچھ پوچھنا ہے تو صبح دس بجے سے پہلے ہوٹل اسلام آباد آ جائیں۔ وقت کا خیال رکھیے گا کیونکہ نواب صاحب گیارہ بجے پرائم منسٹر سے ملیں گے۔"

"نہیں یار!" میں نے کہا۔ "پرائم منسٹر کی ملاقاتوں کا شیڈول پہلے سے تیار ہوتا ہے۔ وہ آفیسر اگر ذہین ہوا تو وہ پی ایم ہاؤس ٹیلی فون کرے گا، اسے وہاں سے معلوم ہوگا کہ کون نواب رفیق؟ پی ایم صاحب تو گیارہ بجے آسٹریلیا کے سفیر سے مل رہے ہیں، پھر سوچ کیا عزت رہ جائے گی نواب رفیق احمد شیرازی کی؟ وہ تو فوراً چڑھ دوڑے گا ہمارے ہوٹل پر!"

"اس کا مطلب ہے تیرا دماغ چل گیا ہے...... میرا مطلب ہے کہ چل رہا ہے۔" راجا نے ہنس کر کہا۔ "میں اس سے کچھ اور کہہ دوں گا۔ تو فکر مت کر۔" راجا نے ٹائی باندھتے ہوئے کہا۔ "تو جا نور کے پاس، اب صبح ملاقات ہوگی۔"

میں وہاں سے نکل کر دوبارہ کمرے میں داخل ہوا تو نور بستر پر دراز گہری نیند سو رہی تھی۔ میں نے بھی اسے جگانا مناسب نہ سمجھا اور لمبی تان کر سو گیا۔

میری آنکھ کھلی تو وال کلاک میں ساڑھے آٹھ بج رہے تھے۔ نور بیڈ پر نہیں تھی۔ اسی وقت وہ باتھ روم سے برآمد ہوئی۔ اس نے بالوں پر تولیا لپیٹ رکھا تھا۔

''رات تم کب آئے تھے؟'' نور نے پوچھا۔

''میں تو دس منٹ بعد ہی لوٹ آیا تھا۔ تم اتنی بے خبر سو رہی تھیں کہ میں نے تمہیں جگانا مناسب نہ سمجھا۔''

''سوری رفیق!'' نور نے کہا۔ ''تم گئے تھے تو میرا خیال تھا کہ اب تم ایک گھنٹے سے پہلے نہیں آؤ گے۔ پھر نہ جانے کب مجھے اتنی گہری نیند آ گئی۔ ویسے اتنی پرسکون نیند مجھے ایک عرصے کے بعد نصیب ہوئی ہے۔ تمہارے ساتھ رہ کر تحفظ کا احساس ہوتا ہے۔ میں ہر فکر و پریشانی سے آزاد ہو جاتی ہوں۔''

میں نے کہا۔ ''ویسے تم سوتی ہوئی بھی بہت اچھی لگتی ہو۔''

میں باتھ روم میں گھس گیا۔ جب تیار ہو کر نکلا تو نور بھی پوری طرح تیار تھی۔

''تم نے ابھی تک روم سروس سے ناشتا نہیں منگایا؟'' میں نے پوچھا۔

''تم راجا کو بھول گئے؟'' نور نے کہا۔ ''ہم سب ایک ساتھ ناشتا کریں گے۔ تم راجا کو بلاؤ۔ میں ناشتا منگا رہی ہوں۔''

راجا کمرے میں موجود نہیں تھا۔ غنی اپنے کمرے سے نکل آیا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''راجا صاحب کہاں گئے؟''

''راجا صاحب تو رات ہی چلے گئے تھے۔'' غنی نے جواب دیا۔ ''رات میں نے انہیں جاتے دیکھا تھا۔''

''وہ ابھی تک واپس نہیں آئے؟''

''نہیں سر!'' غنی نے جواب دیا۔ ''میں نے انہیں واپس آتے نہیں دیکھا۔''

مجھے اچانک پریشانی ہوئی کہ راجا واپس نہیں آیا تو کہاں گیا؟ میں نے سیل فون نکال کر راجا کا نمبر ملایا تو معلوم ہوا کہ اس کا سیل فون آف ہے۔ میری پریشانی دو چند ہو گئی۔ غنی بہت غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ وہ پرتشویش لہجے میں بولا۔ ''خیریت تو ہے سر؟''

''راجا کا سیل فون بھی بند ہے۔ کیا وہ گاڑی لے گئے تھے؟''

''جی سر!'' غنی نے جواب دیا۔ ''انہوں نے مجھ سے گاڑی کی چابی مانگی تھی۔''

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ راجا کہاں چلا گیا۔ صبح تین بجے تک تو سب اخبارات کی آخری کاپی بھی پریس جا چکی ہوتی ہے۔ راجا اس وقت کسی اخبار کے دفتر بھی نہیں جا سکتا تھا۔ میں اپنے کمرے میں واپس آ گیا۔

روم سروس سے ناشتا آ چکا تھا اور نور میرے انتظار میں بیٹھی تھی۔ وہ میرا چہرہ دیکھ کر چونک اٹھی۔ ''سب خیریت تو ہے جان؟'' اس نے پوچھا۔

''مجھے راجا کی طرف سے پریشانی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اسے رات میں نے اپنے کام سے بھیجا تھا۔ وہ اب تک واپس ہی نہیں آیا۔''

''اسے کال کرو۔'' نور نے کہا۔

''اس کا سیل فون آف ہے۔'' میں نے کہا۔

''اس میں اتنی پریشانی کی کیا بات ہے؟'' نور نے کہا۔ ''راجا کوئی بچہ نہیں ہے۔ نکل گیا ہوگا اپنے کسی صحافی دوست کے پاس۔''

''رات کے بلکہ صبح کے اس پہر؟'' میں نے کہا۔ ''اور گیا ہی تھا تو سیل فون کیوں آف ہے؟''

اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ سیل فون کے چھوٹے سے اسکرین پر کوئی اجنبی نمبر تھا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ اس کال کو نظر انداز کر دوں لیکن پھر یہ سوچ کر میں نے کال ریسیو کر لی کہ شاید پولیس اسٹیشن سے اے ایس آئی مجھے کال کر رہا ہو۔ میرے وزیٹنگ کارڈ پر میرا اسیل نمبر بھی تھا۔

''ہیلو!'' میں نے باوقار آواز میں کہا۔

''نواب صاحب! میں آپ کا پی آر او بول رہا ہوں۔'' دوسری طرف سے راجا کی آواز آئی۔

''ہاں راجا، بول۔'' میں نے کہا۔ مجھے اس پر شدید غصہ تھا۔ یہ کال اگر اس کے سیل فون سے آتی تو میں اسے بری طرح لتاڑتا لیکن وہ کسی نئے نمبر سے کال کر رہا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ حالات نارمل نہیں ہیں۔

''نواب صاحب، میں پولیس اسٹیشن سے بول رہا ہوں۔'' راجا نے کہا۔

''تو کیا تجھے پولیس نے لاک اپ میں بند کر دیا ہے؟'' میں جھنجلا کر بولا۔ ''یا تو رضا کارانہ طور پر وہاں بیٹھا ہے؟''

''نہیں یور ہائی نیس! ابھی تک پی ایم صاحب کے سیکریٹری سے میری بات نہیں ہو سکی ہے لیکن میں آج ہر صورت میں ملاقات کا ٹائم لے لوں گا۔''

''لگتا ہے تو واقعی تھانے میں بیٹھا ہے۔ یہ سب کیسے سنا رہا ہے؟''

''نہیں نواب صاحب! یہ اپنے جنجوعہ صاحب تو بہت اچھے انسان ہیں۔ میں نے فون اس لیے کیا ہے کہ آپ تیار

رہیں۔ آج بارہ بجے آپ کی ملاقات ہوم منسٹر صاحب سے ہے۔ میں بس دس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔''

''یار، جلدی آ۔ تیرے انتظار میں ہم بھوکے بیٹھے ہیں۔''

''آپ زحمت نہ کریں نواب صاحب! میں بس یہاں سے نکل رہا ہوں۔''

اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

''کیا ہوا؟'' نور نے پوچھا۔ ''راجا کہاں ہے؟''

''وہ اس وقت پولیس اسٹیشن میں موجود ہے۔'' میں نے کہا۔ ''چلو، تم ناشتا شروع کرو۔''

''پولیس اسٹیشن میں کیوں؟'' نور نے پوچھا۔

''رات میں نے تمہیں کچھ بتانا مناسب نہیں سمجھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہاں پہنچتے ہی تمہیں پریشان ہونا پڑے۔'' میں نے اسے بھی مختصراً رات کے واقعے کے بارے میں بتا دیا۔

''راجا ابھی تک پولیس اسٹیشن میں کیوں ہے؟ پولیس نے اسے گرفتار تو نہیں کر لیا؟''

''وہ کوئی چھابڑی والا نہیں ہے کہ پولیس اسے لاک اپ میں بند کر دے گی۔ وہ معروف صحافی ہے اور صحافی تو آج کل ویسے بھی پولیس کے قابو میں نہیں آتے۔''

ہم ناشتے سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ راجا کمرے میں داخل ہوا۔

''تو کہاں رہ گیا تھا الو کے پٹھے!'' میں نے بھنا کر کہا۔ ''پھر تو نے فون پر بھی کوئی جواب نہیں دیا...... اور تیرا سیل فون بند کیوں ہے؟'' میں نے پے در پے اس سے کئی سوالات کر دیے۔

''اول طعام بعد کلام!'' راجا نے کہا اور ناشتے کی ٹرالی دھکیل کر صوفے تک لے گیا اور ناشتے پر ٹوٹ پڑا۔

''کیا لندن میں تم نے اسے کھانے کو نہیں دیا؟'' میں نے نور سے پوچھا۔ ''یہ کھا تو یوں رہا ہے جیسے کئی دن کے فاقے سے ہو۔''

راجا نے سب کچھ چٹ کر کے اپنے لیے کافی بنائی اور بڑے اطمینان سے مزے لے لے کر کافی پینے لگا۔ میں اس کے اطمینان پر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا رہا۔ اس کا اطمینان دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔

''نورا! تیار ہو جاؤ۔ ہم ابھی ست بدھائی روانہ ہو رہے ہیں گے۔''

''اتنی جلدی مت کریں نواب صاحب!'' اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اپنے دوستوں سے مل کر جائیے گا۔''

''راجا!'' میں نے بھنا کر کہا۔ ''پولیس والوں نے کیا تجھے افیون کھلا دی ہے؟''

''ایسا تجھے کیوں لگ رہا ہے فیکے پتر! پولیس والے صرف ایک چیز کھلاتے ہیں، حوالات کی ہوا۔'' پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ''قبلہ نواب صاحب، آپ ابھی کیسے جا سکتے ہیں، بارہ بجے تو آپ ہوم منسٹر سے مل رہے ہیں۔''

''ان سے ہمارا پی آر او مل لے گا۔ ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔ ہوم منسٹر کو اگر ملنا ہوگا تو وہ ست بدھائی آ جائیں گے۔'' میں نے باوقار لہجے میں کہا۔

''بجا فرمایا نواب صاحب!'' راجا نے کہا۔ ''لیکن آپ پہلے میری عرض سن لیں، پھر ست بدھائی جائیں یا چیچو کی ملیاں۔''

''ہم اب تک آپ کی بکواس ہی سن رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''تو عرض یہ ہے قبلہ نواب صاحب! کہ آپ کا پی آر او جب پولیس اسٹیشن پہنچا تو بہ قول آپ کے اس ذہین پولیس آفیسر نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔''

''کیا تجھے لاک اپ میں بند کر دیا تھا؟'' میں ہنس کر بولا۔

''یار، وہ تو مجھے بند کر ہی دیتے لیکن اسی وقت میرا ایک صحافی دوست وہاں پہنچ گیا۔ وہ ایک کثیر الاشاعت انگریزی روزنامے کا کرائم رپورٹر ہے۔ مجھ دیکھ کر وہ خوش تو کم ہوا، پریشان زیادہ، کہ صبح کے اس پہر میں تھانے میں کیا کر رہا ہوں؟ وہ بہت تپاک سے ملا۔ میں نے اسے بتا دیا کہ میں وہاں کیوں آیا ہوں۔ میرے حوالے سے وہ کرائم رپورٹر تجھے بھی جانتا ہے۔ وہ ایس ایچ او سے بولا کہ تم نے مسٹر راجا کو یہاں کیوں روک رکھا ہے۔ ایس ایچ او نے پوچھا، آپ انہیں جانتے ہیں؟ کرائم رپورٹر نے فوراً کہا، تم انہیں نہیں جانتے، ان کے تو صرف ایک کالم سے پولیس کے کئی افسروں کی ملازمت جاتی رہی ہے۔ ایس ایچ او نے کہا، لیکن یہ تو کہہ رہے ہیں کہ میں نواب صاحب کا پی آر او ہوں؟''

''اس نے کہا تو تمہیں کیا پرابلم ہے؟ تمہیں جو کچھ پوچھنا ہے، پوچھو۔ مجھے بھی ان سے ضروری کام ہے۔'' ایس ایچ او کا جوش و خروش کچھ ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس کے چہرے سے تو یہی لگ رہا تھا کہ وہ مجھے لاک اپ میں بند کر دے گا۔ اب ایک کرائم رپورٹر کے سامنے وہ مجھے کیسے بند کرتا اور کس جرم

میں۔ اس نے بس اتنا کہا، مجھے نواب صاحب سے کچھ پوچھ گچھ کرنا ہے۔ کرائم رپورٹر تند لہجے میں بولا، تم اس وقت نواب صاحب سے پوچھ گچھ کرو گے؟ ایس ایچ او گڑبڑا کر بولا، بے شک وہ صبح آجائیں۔ کرائم رپورٹر نے کہا۔ تم نواب صاحب کو کیا سمجھتے ہو؟ وہ یہاں آئیں گے؟ ان سے کچھ پوچھنا ہے تو صبح تمہیں ان کے پاس جانا پڑے گا۔ میں نے جلدی سے کہا کہ میں نواب صاحب تک تمہارا پیغام پہنچا دوں گا۔ ہم پولیس اسٹیشن سے باہر آئے تو کرائم رپورٹر نے کہا کہ نواب صاحب تو اب تک سو گئے ہوں گے، تم بھی میرے ساتھ چلو۔ یہ انسپکٹر بہت حرامی ہے، آسانی سے قابو میں نہیں آئے گا۔ میں صبح اسے یا ہوم سیکریٹری کے ذریعے اس کے ایس ایس پی کو جھاڑ پڑوا دوں گا۔'' وہ سانس لینے کو رکا تو نور نے کہا۔

''تو کیا پولیس اب یہاں آنے والی ہے؟''

''پولیس اب تک یہاں پہنچ چکی ہوتی۔'' راجا نے کہا۔ ''لیکن میں صبح پھر پولیس اسٹیشن پہنچ گیا اور بولا۔ ''تمہیں نواب صاحب سے جو کچھ پوچھنا ہے، وہ ابھی چل کر پوچھ لو کیونکہ بارہ بجے تو ان کی ملاقات ہوم منسٹر سے طے ہے۔'' اس بات پر اس کے غبارے کی ہوا بالکل ہی نکل گئی۔ میں نے اسی وقت اسی کے سیل فون سے تجھے فون کیا اور اسے سنانے کو کہا کہ بارہ بجے ہوم منسٹر سے ملنا ہے۔''

''لیکن تو نے اس کے سیل فون سے کال کیوں کی؟'' میں نے پوچھا۔

''میں اپنا سیل فون یہیں بھول گیا تھا۔'' راجا نے کہا۔

''لیکن، وہ تو آف تھا؟'' میں نے کہا۔

''ہاں، فلائٹ میں خود میں نے ہی اسے آف کیا تھا۔''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ تو ساری رات جاگتا رہا؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، یہ سب کچھ میں نیند میں کر رہا تھا۔'' راجا نے جواب دیا۔

''ہاں یہ معلوم ہوا کہ اے ایس ایف کے اس افسر پر فائر کس نے کیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''فائر بے شک بے آواز ریوالور سے کیا گیا تھا لیکن فائر کرنے والا اتنی جلدی تو وہاں سے غائب نہیں ہوسکتا۔ فائرنگ کی اطلاع ملتے ہی پولیس نے ائرپورٹ کے تمام راستوں کو سیل کر دیا تھا۔ ائرپورٹ پر فائرنگ کا واقعہ معمولی نہیں ہے۔ فوراً ہی ہوم سیکریٹری کو اطلاع مل گئی۔ اس نے علاقے کے ایس ایس پی کو الرٹ کر دیا۔''

''اس کا مطلب ہے کہ پولیس اتنی آسانی سے میرا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔''

''ہاں، کم سے کم آج تو تجھے یہیں ٹھہرنا پڑے گا۔''

''زخمی کا کیا حال ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''گولی اس کے بازو میں دھنس گئی تھی لیکن ہڈی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے۔ اس کی حالت اب بہتر ہے۔''

فون کی گھنٹی بجی تو میں چونک اٹھا۔

راجا نے ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھالیا۔ ''یس!'' راجا نے کہا۔ ''وہاٹ؟...... اچھا انہیں وہیں بٹھاؤ، میں آرہا ہوں۔'' ریسیور کریڈل پر رکھ کر وہ مجھ سے بولا۔ ''پولیس کے دو افسر یہاں پہنچ چکے ہیں۔'' ''میں ان سے جا کر بات کرتا ہوں۔'' وہ جاتے جاتے رک گیا اور مجھ سے بولا۔ ''ذرا اپنا سیل فون مجھے دے۔''

میں نے اپنا سیل فون اسے دیدیا۔

راجا نے جیب سے کسی کا وزیٹنگ کارڈ نکالا اور کوئی نمبر ملا کر بولا۔ ''ناصر! میں راجا بول رہا ہوں۔ وہ پولیس والے یہاں پہنچ گئے ہیں۔ لگتا ہے، تم نے ہاتھ ذرا ہلکا رکھا ہے؟...... ہاں...... اچھا ٹھیک ہے...... ہاں، میں ہی جا رہا ہوں۔'' سلسلہ منقطع کر کے وہ مجھ سے بولا۔ ''قبلہ نواب صاحب! آپ استراحت فرمائیں اور جب تک آپ کو میرا ایس ایم ایس موصول نہ ہو، آپ وہاں نہ آئیں۔''

راجا کے جانے کے بعد نور بولی۔ ''یہاں تو سب کچھ ویسے کا ویسا ہی ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ یہاں ذہنی طور پر کچھ سکون نصیب ہوگا لیکن یہاں تو مسائل کا ختم نہ ہونے والا سلسلہ ہے۔''

''میں نے اسی لیے تو کہا تھا جان کہ تم ابھی یہاں مت آؤ۔''

''اس سے تو بہتر ہے کہ تم لندن ہی چلو۔ وہاں اتنی پریشانی تو نہیں ہے۔''

''لندن یا ست بدھائی سے کوئی فرق نہیں پڑتا نور جہاں بیگم!'' میں نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ''پریشانیاں تو خود مجھے گھیر لیتی ہیں۔''

میرے سیل فون پر راجا کا ایس ایم ایس آگیا۔ اس نے لکھا تھا، اب دس منٹ بعد نواب صاحب پولیس کو شرفِ ملاقات بخشیں گے۔

میں نے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اپنا جائزہ لیا اور نور سے کہا۔ ''میں نیچے لاؤنج کی طرف جا رہا ہوں بلکہ ایسا کرو، تم اس وقت تک شہناز سے بات کرلو۔''

میں لاؤنج میں پہنچا تو پی آر او کی حیثیت سے راجا فوراً کھڑا ہوگیا۔ اسے دیکھ کر ایس ایچ او کو بھی اٹھنا پڑا۔

''یور ہائی نس! یہ پولیس اسٹیشن کے انچارج انسپکٹر ہنو عہ ہیں۔'' راجا نے اس کا تعارف کرلیا۔

میں نے سر کی ایک خفیف سی جنبش سے انسپکٹر کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ ''جی فرمائیے!'' میں نے انسپکٹر سے پوچھا۔

''سر، کل ائرپورٹ پر سیکیورٹی کے ایک افسر پر اچانک حملہ ہوا ہے۔'' انسپکٹر نے کہا۔ ''وہ افسر اس وقت آپ کے ساتھ موجود تھا۔''

''پھر؟'' میں نے پوچھا۔ ''کیا تمہیں شبہ ہے کہ وہ حملہ ہم نے کیا تھا؟''

''سر، وہ اس وقت آپ سے گفتگو کر رہا تھا اور وہ گفتگو کوئی خوشگوار نہیں تھی۔''

''کھل کے بات کرو آفیسر!'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''گفتگو تو اس وقت تم بھی کر رہے ہو اور یہ بھی ہمارے لیے خوشگوار نہیں ہے۔ تو کیا تم پر بھی قاتلانہ حملہ ہوگا؟''

''اور اگر ہوگا تو اس کی ذمے داری کیا نواب صاحب پر ہوگی؟'' راجا نے کہا۔

''میرے کہنے کا مقصد یہ نہیں ہے۔'' انسپکٹر نے کہا۔

سیل فون کی گھنٹی بجی تو ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

انسپکٹر نے جلدی سے کہا ''ایکسکیوز می سر!'' اور اپنی جیب سے سیل فون نکال لیا۔ وہ مہنگا ترین سیٹ تھا۔

وہ ہم سے کچھ فاصلے پر جا کر سیل فون پر گفتگو کرتا رہا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کوئی خوشگوار گفتگو نہیں ہے۔

وہ بات چیت سے فارغ ہو کر آیا تو اس کے چہرے پر بارہ بج رہے تھے۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''نواب صاحب! فارملٹی کے لیے مجھے آپ کا اسٹیٹمنٹ چاہیے۔''

''او کے!'' میں نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔ ''پوچھو کیا پوچھنا ہے؟''

''اس سیکیورٹی افسر نے آپ پر گن کیوں نکالی تھی؟''

''اس گدھے کو شبہ تھا کہ ہم کسی لڑکی کو قتل کرنا چاہتے تھے۔'' میں نے کہا۔ ''اسی سلسلے میں تو آج ہم ہوم منسٹر سے بات کریں گے۔ ائرپورٹ سیکیورٹی فورس کے خلاف قانونی چارہ جوئی بھی کریں گے۔ اس انسپکٹر کی جرأت کیسے ہوئی کہ وہ ہمیں گن دکھائے، ہمیں یعنی نواب رفیق احمد شیرازی آف ست بدھائی کو گن دکھائے۔'' میرے لہجے میں ناگواری تھی۔

''اسے کیوں شبہ ہوا تھا کہ......''

''یہی تو ہم اس سے پوچھ رہے تھے۔'' میں نے منہ بنا کر کہا۔

''وہ لڑکی کون تھی جو آپ کے خوف سے چیخ رہی تھی؟''

''کون سی لڑکی؟'' میں نے آنکھیں نکالیں۔ ''ہم بھی اس احمق آفیسر سے یہی پوچھ رہے تھے۔ یہ تو تم اسی سے پوچھو، ائرپورٹ منیجر سے پوچھو۔ وہ بھی اس وقت وہیں موجود تھے، اس کے ساتھی افسر سے پوچھو۔ اس نے بھی ہم پر گن نکالنے کی جرأت کی تھی۔ اب فائر کہاں سے اور کیسے ہوا، یہ معلوم کرنا تمہارا کام ہے؟''

''یہ معلوم ہوگیا ہے سر!'' انسپکٹر نے کہا۔

''معلوم ہوگیا ہے؟'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''تو پھر تم یہاں وقت ضائع کیوں کر رہے ہو؟''

''صرف یہ معلوم ہوا ہے کہ فائر SIG کی دور مار رائفل سے کیا گیا ہے۔ رائفل پر ٹیلی اسکوپ بھی فٹ ہے۔''

میرے بدن پر چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ جس کسی نے بھی وہ فائر کیا تھا، اس کا نشانہ میں تھا۔ اس افسر سے بھلا کسی کی کیا دشمنی ہوسکتی تھی کہ اس کے لیے اتنا اہتمام کیا جائے؟ اگر اسے ہی مارنے کا ارادہ ہوتا تو حملہ آور اسے کہیں بھی مار سکتا تھا۔ وہ بے چارہ معمولی سرکاری ملازم تھا۔ وہ خود تو ائرپورٹ کی حفاظت کرتا تھا لیکن اپنی سیکیورٹی کے لیے اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ اسے ڈیوٹی آف ہونے کے بعد گھر جاتے ہوئے یا بازار میں شاپنگ کرتے ہوئے کہیں بھی نشانہ بنایا جاسکتا تھا، پھر حملہ آور نے اتنا بڑا خطرہ کیوں مول لیا؟ اس کا ایک جواب تھا کہ حملہ آور کا نشانہ میں تھا۔ وہ افسر تو بے چارہ بدقسمتی سے اس کی زد میں آگیا۔

میں نے اپنے خیالات کا اظہار انسپکٹر سے نہیں کیا۔

''تمہیں اور کچھ پوچھنا ہے انسپکٹر؟'' میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''آپ کے گارڈز کے پاس ہتھیار بھی ہیں؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''سوائے ایک کے ہمارا کوئی گارڈ اس وقت ائرپورٹ پر نہیں تھا۔'' میں نے کہا۔ ''وہ بھی مسلح نہیں تھا۔ ہم جانتے ہیں کہ ائرپورٹ پر اسلحہ لے جانے پر پابندی ہے۔ وہی گارڈ ائرپورٹ منیجر کو بلا کر لایا تھا۔''

''کیا میں آپ کے اس گارڈ سے مل سکتا ہوں؟'' انسپکٹر نے کہا۔

''ضرور ملو!'' میں نے کہا۔ ''لیکن ذرا جلدی کرو، ہمارے پاس وقت کم ہے۔'' میں نے ایک مرتبہ پھر گھڑی دیکھی۔ ''راجا صاحب! آپ غنی کو یہاں بھیج دیں۔''

راجا سر ہلا کر اٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

''نواب صاحب!'' انسپکٹر نے کہا۔ ''ایک آخری سوال! جس وقت اس افسر پر فائر ہوا، آپ کا گارڈ کہاں تھا؟''

''ظاہر ہے، وہ ائرپورٹ ہی پر موجود تھا۔'' یہ کہہ کر میں باوقار انداز میں چلتا ہوا لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔

مجھے یقین تھا کہ غنی بھی وہی کچھ کہے گا جو میں نے کہا تھا۔ میں نے راجا کو اس لیے بھیجا تھا کہ وہ غنی کو بریف کر سکے۔

''ہاں۔'' میں نے چلتے چلتے رک کر انسپکٹر سے کہا۔ ''ہم آج ست بدھائی روانہ ہو جائیں گے۔ اگر تمہیں مزید کچھ پوچھنا ہو تو ست بدھائی آ سکتے ہو۔''

میں کمرے میں پہنچا تو نور روانگی کے لیے بالکل تیار تھی۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ ''چلیں؟''

''ابھی کچھ دیر اور لگے گی۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''میں نے تو شہناز سے کہہ دیا ہے کہ ہم آج شام تک ست بدھائی پہنچ جائیں گے۔''

''ہم شام سے بہت پہلے پہنچ جائیں گے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''یہ خوش فہمی ہے آپ کی قبلہ نواب صاحب!'' راجا نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ ''ابھی آپ کو ہوم منسٹر سے ملاقات کرنا ہے، پھر شام کو ڈائریکٹر جنرل پولیس کے ساتھ ڈنر کرنا ہے اور......''

''یہاں تو یہ سب کسے سنا رہا ہے مہاراجا؟'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''نور تو اس سے بھی مرعوب نہیں ہوگی کہ میں وہائٹ ہاؤس میں صدر امریکا کے ساتھ ڈنر کروں۔''

''یہ میں کسی کو سنا نہیں رہا بلکہ تجھے بتا رہا ہوں۔'' راجا نے ہنس کر کہا۔ ''میرے کرائم رپورٹر دوست ناصر نے ان ملاقاتوں کا بندوبست کیا ہے، اس کی پی آر بہت اچھی ہے۔ صدر پاکستان سے لے کر مختلف محکموں کے وزرا، چیف سیکریٹریز اور کسٹم کے اعلیٰ حکام سبھی سے اس کے تعلقات ہیں۔ وہ کرائم رپورٹنگ سے پہلے پولیٹیکل انویسٹی گیٹر تھا۔ بڑے بڑے جغادری سیاست دانوں کو اس نے ناکوں چنے چبوا دیے تھے۔''

''تیری طرح!'' میں نے ہنس کر پوچھا۔

''میں تو پھر لحاظ مروت کر جاتا ہوں، وہ لگی لپٹی رکھے بغیر صاف بات کرتا تھا۔''

''اس لیے اس کی نوکری جاتی رہی۔'' میں نے کہا۔

''ہاں، اخبار کا مالک خود بھی سیاست داں تھا، اسے ناصر کی یہ بات پسند نہیں آئی۔'' پھر وہ چونک کر بولا۔ ''ویکھے پتر! یہ بات تجھے کیسے معلوم ہوئی؟ تو ناصر کو جانتا ہے؟''

''یہ بات تو کوئی بھی بتا سکتا ہے کہ زیادہ کھل کر لکھنے والوں کو کم ہی برداشت کیا جاتا ہے۔ آج کل اخبارات کے مالکان خود صحافی نہیں ہوتے۔ وہ اخبار کو کاروباری بنیادوں پر چلاتے ہیں۔ ایسے میں راجا یا ناصر کہاں فٹ ہوتے ہیں؟''

''تیرا اندازہ بالکل درست ہے ویکھے!'' راجا نے کہا۔ ''ناصر نے وہاں سے ملازمت چھوڑی تو اس انگریزی روزنامے نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اسے کرائم رپورٹنگ پر لگا دیا۔''

''یار، یہ ناصر تو ہمارا ہم مزاج ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''کبھی اس سے بھی تفصیلی ملاقات کروں گا۔''

''کبھی کیوں؟'' راجا نے ہنس کر کہا۔ ''وہ ابھی تھوڑی دیر میں یہاں پہنچنے والا ہے۔ وہ لنچ ہمارے ساتھ ہی کرے گا، پھر وہ تیرے ساتھ ہوم منسٹر اور ڈائریکٹر جنرل پولیس سے تیری ملاقات کرائے گا۔''

''لیکن ہوم منسٹر سے تو بارہ بجے ملنا تھا۔'' میں نے کہا۔

''اب یہ ملاقات شام چار بجے ہوگی۔'' راجا نے کہا۔

میں نے نور کی طرف دیکھا۔ وہ ہماری باتیں سن کر برے برے منہ بنا رہی تھی۔

''تمہیں کیا ہوا جان؟'' میں نے پوچھا۔

''ان ملاقاتوں میں میری کوئی گنجائش نہیں ہے اس لیے میں سوچ رہی ہوں کہ مری چلی جاؤں۔ شام تک لوٹ آؤں گی۔''

''تم انتہائی نامناسب موقعے پر بہت نامناسب بات سوچ رہی ہو۔'' میں نے کہا۔ ''تم کیا سمجھتی ہو، وہ فائر اس افسر پر کیا گیا تھا؟...... وہ فائر مجھ پر کیا گیا تھا۔ وہ بے چارہ خوامخواہ لپیٹ میں آ گیا۔''

نور نے حیرت بھرے انداز میں مجھے دیکھا، پھر بولی۔ ''اور تم کتنے آرام سے بیٹھے ہو، کیا اس بات کی تصدیق ہو چکی ہے؟''

''یہ ابھی صرف میرا اندازہ ہے۔'' میں نے کہا۔

''تو بھی حملے کو اسی زاویے سے دیکھ رہا ہے؟'' راجا نے چونک کر کہا۔

''پھر اسے اور کیا سمجھوں؟'' میں نے کہا۔ ''کوئی رپورٹ سیکیورٹی فورس کے اس معمولی افسر کو مارنے کے لیے اتنا اہتمام کیوں کرے گا؟ جو رائفل وہاں سے ملی ہے، وہ نہایت قیمتی رائفل ہے، پھر اس پر ٹیلی اسکوپ بھی فٹ ہے...... ارے اس بے چارے کو قتل کرنے کے لیے تو درے کا بنا ہوا معمولی سا پستول ہی کافی تھا۔''

''ہاں، حملے کا انداز تو یہی بتاتا ہے کہ نشانہ وہ افسر نہیں تھا۔'' راجا نے کہا۔

''اور تم لوگ کس بے فکری سے گھوم رہے ہو۔ حملہ آور ایک کوشش کی ناکامی کے بعد دوسری بھی کر سکتا ہے۔'' نور نے کہا۔

''تو میں کیا کروں؟'' میں نے کہا۔ ''کہیں قلعہ بند ہو کر بیٹھ جاؤں، لوگوں سے ملنا جلنا چھوڑ دوں؟'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''اب ان سب خطرات کا مقابلہ تو کرنا پڑے گا۔ تم بھی محتاط رہنا اور منہ اٹھا کے کہیں نکل مت جانا، میرے دشمن بھی جانتے ہیں کہ تم میرے لیے کتنی اہم ہو۔''

''تو پھر مجھے ست بدھائی بھجوا دو۔'' نور نے کہا۔ ''ہوٹل کے اس کمرے میں اکیلے پڑے پڑے تو میرا دم گھٹ جائے گا۔ وہاں تو میں ہر وقت مصروف رہتی تھی۔''

''بس آج اور صبر کر لو۔'' راجا نے کہا۔ ''کل صبح ہم سب ست بدھائی چلیں گے۔''

راجا کے سیل فون کی گھنٹی بجی تو وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ نور اچانک اٹھ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ ''رفیق! تم بھی کہیں مت جاؤ۔ تم یہاں اتنے خطرات میں ہو اور میں لندن میں آرام سے زندگی گزارتی رہی۔ کم سے کم یہ بے سکونی تو نہیں تھی کہ ابھی کسی طرف سے کوئی گولی آئے گی اور میرے سینے میں پیوست ہو جائے گی۔''

''یہی تو زندگی ہے نور، آنے والے کل کا کچھ پتا نہیں، آئے نہ آئے۔''

''لیکن آج تو اپنا ہے ناں۔'' راجا نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

اسے دیکھ کر نور بوکھلا کر مجھ سے علیحدہ ہو گئی۔

''سوری، میں نے بہت غلط وقت پر انٹری دی۔ تو تیار ہو کر میرے کمرے میں آ جا ویکھے پتر!'' یہ کہہ کر راجا باہر نکل گیا۔

نور کا چہرہ ابھی تک سرخ ہو رہا تھا۔ میں نے کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا اور بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔

دروازے پر دستک ہوئی، پھر آواز آئی۔ ''روم سروس! آپ کے کپڑے لایا ہوں۔''

''یس کم ان۔'' نور شرمیلی دوشیزہ کے بجائے اچانک نور شیرازی اینڈ کمپنی کی سی ای او بن گئی۔

روم سروس کا ویٹر اندر داخل ہوا اور استری شدہ کپڑے الماری میں ٹانگنے لگا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے پوچھا۔ ''یہ میرے کپڑے کہاں سے لایا ہے؟''

''یہ تو میں لندن سے لائی ہوں۔ میں نے روم سروس کو استری کرنے کے لیے دیے تھے۔ یہ سوٹ تم کل سے پہنے ہوئے ہو اس پر شکنیں پڑ گئی ہیں۔''

مجھے اس پر بے تحاشا پیار آیا۔ کسی سگھڑ بیوی کی طرح اسے میرا کتنا خیال تھا۔ میں نے بے اختیار اسے بانہوں میں بھر لیا۔ پھر وقت گویا تھم گیا۔

میں دوبارہ تیار ہو کر اور نیا سوٹ پہن کے اپنے کمرے سے برآمد ہوا۔ راجا پہلے سے تیار تھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر کہا۔ ''وہ ناصر آ گیا ہے ویکھے پتر!''

''اسے لاؤنج میں کیوں بٹھایا ہوا ہے؟'' میں نے کہا۔ ''اسے بھی اوپر بلا لے اور روم سروس کو لنچ کے لیے کہہ دے۔'' ناصر تیس بتیس سال کا خوب رو اور دراز قد شخص تھا۔ اپنے حلیے سے وہ صحافی سے زیادہ ایکٹر یا ماڈل لگتا تھا لیکن اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں ذہانت تھی۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا تو مجھے احساس ہوا کہ ناصر باقاعدگی سے جم بھی جاتا ہو گا۔ اس کی گرفت مضبوط اور جسم ٹھوس تھا۔

''نواب رفیق احمد شیرازی!'' راجا نے میرا تعارف کرایا۔ ''اور یہ میرا دوست ناصر ہے۔''

''ناصر صاحب، آپ سے مل کر واقعی خوشی ہوئی۔'' میں نے کہا۔

''مجھے بھی آپ سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا نواب صاحب!'' ناصر نے کہا۔ ''میں تو بہت دن سے آپ سے ملنا چاہ رہا تھا لیکن بس وقت ہی نہیں مل سکا ورنہ ست بدھائی پہنچ جاتا۔ راجا بتا رہا تھا کہ آپ رانا کے خلاف الیکشن بھی لڑنا چاہتے ہیں؟''

''یار میرا ارادہ تو نہیں تھا لیکن ان لوگوں نے مجھ سے کہا کہ اگر آپ اسمبلی کے ممبر بن جائیں گے تو آپ کے ترقیاتی منصوبے بغیر کسی رکاوٹ کے پورے ہو جائیں

گے۔''

''میری رائے بھی یہی ہے۔'' ناصر نے کہا۔ ''آپ الیکشن میں ضرور حصہ لیں۔ وزیر داخلہ سے ملاقات بھی اس لیے ضروری ہے، آپ دیکھیے گا، آپ کو اس سے کتنا فائدہ ہوگا۔''

اسی وقت نور کمرے میں داخل ہوئی۔ ناصر اسے دیکھ کر لمحے بھر کو پلکیں جھپکانا بھول گیا۔ ناصر تو رہا ایک طرف، خود میرا حال بھی یہی تھا۔ وہ اس وقت نیوی بلیو ساڑھی میں ملبوس تھی جس کا بلاؤز بہت مختصر تھا۔ اس نے اپنے گھنے بالوں کو کھلا چھوڑ دیا تھا۔ نیوی بلیو کلر میں اس کا سرخ و سفید رنگ چاندی کی طرح دمک رہا تھا۔

میں نے ہنس کر کہا۔ ''ناصر، یہ نور ہیں۔''

''آپ کی بیگم یا پی اے؟'' ناصر نے پوچھا۔

''سبھی کچھ!'' میں نے ہنس کر کہا۔ نور کے چہرے پر گلاب سے کھل اٹھے۔

اسی خوشگوار ماحول میں کھانا کھایا گیا۔ کافی پینے کے بعد ہم لوگ کچھ دیر بیٹھے ملک کی عمومی صورت حال پر بات چیت کرتے رہے، پھر ناصر نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ اب ہمیں چلنا چاہیے۔''

''شیور!'' میں نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ جاتے جاتے میں نے نور سے کہا۔ ''تم یہاں سے باہر مت نکلنا۔ ویسے تو ہمارے دو گارڈز یہاں موجود رہیں گے لیکن اپنے طور پر تم بھی ہوشیار رہنا۔''

ناصر نے اپنی گاڑی وہیں چھوڑ دی۔ غنی میری گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا، راجا اس کے ساتھ پسنجر سیٹ پر بیٹھا تھا۔ میں اور ناصر عقبی نشست پر تھے۔

ناصر نے جیب سے ایک چھوٹا سا کیمرا نکالا اور بولا۔ ''یہ کیمرا دیکھنے میں تو چھوٹا سا ہے لیکن اس کا لینس بہت طاقت ور ہے۔ یہ کافی دور کی تصویر بھی فوکس کر لیتا ہے۔ اس میں ریکارڈر بھی ہے جو کم سے کم ڈھائی گھنٹے کی گفتگو ریکارڈ کر سکتا ہے۔''

''ویری گڈ!'' میں نے توصیفی انداز میں کہا، پھر ہنس کر بولا۔ ''یار، آپ تو بہت خطرناک آدمی ہیں، آپ سے بچ کر رہنا پڑے گا، نہ جانے کس لمحے کیا ریکارڈ کر لیں یا تصویر بنا لیں۔''

''آپ کو ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، مجھ سے تو کرپٹ بیوروکریٹس اور سیاست داں ڈرتے ہیں، آپ تو اپنی جیب سے پیسے خرچ کر کے ست بدھائی میں ترقیاتی کام کرا رہے ہیں۔''

ہوم منسٹر بہت خوش اخلاق اور خوش مزاج انسان تھے۔ ناصر نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''سر، نواب رفیق احمد شیرازی آف ست بدھائی اسٹیٹ! یہ اپنی ریاست میں ایک معیاری اسپتال اور اسکول بنا رہے ہیں۔''

''بنا کیا رہے ہیں، بنا چکے ہیں۔ اب تو ان منصوبوں کی توسیع پر کام ہو رہا ہے۔''

''ویری گڈ!'' ہوم منسٹر نے کہا۔ ''جہاں تک میرا خیال ہے، آپ کو حکومت سے تو کسی قسم کی گرانٹ نہیں ملی؟''

''آپ کا خیال درست ہے سر!'' میں نے انگریزی میں کہا۔ ''اسپتال اور اسکول تو میں اپنے خرچ پر بنا رہا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ غریب آدمی کو بالخصوص میرے علاقے کے لوگوں کو اسلام آباد یا لاہور کے بڑے اسپتالوں میں جانے کی ضرورت نہ پڑے اور میرے علاقے کے بچوں کو میلوں پیدل چل کر تعلیم کے لیے دور دراز کے علاقوں میں نہ جانا پڑے۔''

''ویری گڈ! آپ بہت زبردست کام کر رہے ہیں۔ اگر ہمارے ملک کا ہر جاگیردار اور نواب اسی طرح کام کرے تو ہمارا ملک بہت جلد ترقی یافتہ قوموں کی صف میں شامل ہو سکتا ہے۔''

''سر، کیا میں آپ سے بھی امید رکھوں کہ ان کاموں میں میری مدد فرمائیں گے؟'' میں نے کہا۔

''شیور نواب صاحب!'' ہوم منسٹر نے مسکرا کر کہا۔ پھر کچھ توقف کے بعد بولے۔ ''آپ الیکشن میں حصہ کیوں نہیں لیتے؟''

''سر! نواب صاحب سیاست سے بہت دور بھاگتے ہیں۔'' راجا نے کہا۔

''یہ درست ہے کہ میں سیاست کی ابجد سے بھی واقف نہیں ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''پھر میرے پاس اتنا وقت بھی نہیں ہے۔ لندن میں بھی میرا وسیع و عریض کاروبار ہے۔ جو یورپ اور امریکا تک پھیلا ہوا ہے۔''

ہماری یہ ملاقات ایک گھنٹے تک جاری رہی۔ اس دوران میں ناصر نے میری اور ہوم منسٹر کی بہت سی تصاویر بنائیں۔

ہم لوگ وہاں سے نکلے تو سوا پانچ بج رہے تھے۔ ناصر نے کہا۔ ''ابھی ہمارے پاس وقت ہے، آیئے نواب صاحب میں آپ کو دوسرے صحافیوں سے بھی ملوا دوں۔ اس وقت پریس کلب میں تقریباً سبھی اخبارات کے

رپورٹرز اور کالم نگار موجود ہوں گے۔''

''یار، ابھی مجھے پریس والوں سے مت ملواؤ۔'' میں نے کہا۔ ''میں کچھ دن بعد ست بدھائی میں تمام اخبارات کے نمائندوں کو مدعو کروں گا۔'' میں نے کہا۔

''ہاں یار ناصر!'' راجا نے کہا۔ ''ابھی پریس والوں سے ملنا مناسب نہیں ہے۔''

ہم لوگ دوبارہ اپنے ہوٹل کی طرف آ گئے۔

دوسری ملاقات اعلیٰ پولیس آفیسر سے ہوئی۔ وہ بھی لندن میں رہا تھا اور آکسفورڈ سے کرمنالوجی کی ڈگری لی تھی۔ اس کی اور میری پسند میں کئی باتیں مشترک تھیں۔ وہ بھی اردو ادب اور شاعری کا دلدادہ تھا، مجھے بھی ادب سے دلچسپی تھی۔ وہ بھی میری طرح سیر و سیاحت کا شوقین تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہم دونوں یوں بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے جیسے برسوں کی دوستی ہو، میں نے اسے ست بدھائی آنے کی دعوت دی۔ اس نے بہت خندہ پیشانی سے میری دعوت قبول کر لی اور ست بدھائی آنے کا وعدہ کیا۔

''سر، نواب صاحب کو یہاں کی پولیس سے بہت شکایت ہے۔'' ناصر نے کہا۔

''کیوں بھئی؟'' ڈائریکٹر جنرل سرنواز ملک نے مسکرا کر پوچھا۔

ناصر نے انہیں ایک دن قبل پیش آنے والا واقعہ بتایا اور بولا۔ ''پولیس کو کم سے کم اتنی تربیت ضرور دینا چاہیے کہ وہ اپنی حدود سے تجاوز نہ کرے۔'' ناصر نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ اس محکمے کے سربراہ ہیں، آپ کو اس سلسلے میں اقدامات کرنا چاہئیں۔'' ناصر اچانک صحافی بن گیا۔

''ہم پولیس کے محکمے میں تبدیلی لانے کی کوشش کر رہے ہیں ناصر صاحب!'' سرفراز ملک نے جواب دیا۔ ''یہ کام دو چار مہینے یا دو چار سال کا نہیں ہے۔ اس محکمے سے گند صاف کرنے میں ہمیں کافی وقت لگے گا۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ اس ڈیپارٹمنٹ میں پڑھے لکھے لوگ آئیں، جب تک تعلیم یافتہ اور مہذب نوجوان ڈیپارٹمنٹ میں نہیں آئیں گے، تبدیلی کا عمل ست رفتاری کا شکار رہے گا۔''

وہاں سے واپسی میں ہمیں دس بج گئے۔ ملک صاحب تو ہمیں مزید روکنا چاہتے تھے لیکن میں نے بہت خوب صورت انداز میں ان سے معذرت کر لی۔ غنی، ملک صاحب کے گارڈز کے ساتھ باہر ہی بیٹھا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ تیزی سے گاڑی کی طرف بڑھا اور گاڑی ہمارے سامنے لا کر روک دی۔ ہم لوگ ایک مرتبہ پھر اپنے ہوٹل کی طرف جا رہے تھے۔ ناصر نے پارکنگ سے اپنی گاڑی لے کر جانے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے روک لیا کہ ابھی کچھ دیر ہمارے ساتھ رہو۔

''تو گھر جا کے بھی کیا کرے گا؟'' راجا نے کہا۔ ''نہ تیری بیوی نہ بچے!''

''ناصر صاحب! آپ نے ابھی تک شادی بھی نہیں کی؟'' میں نے پوچھا۔

''کیا آپ نے کر لی؟'' ناصر ہنس کر بولا۔

''میری شادی تو دو سال پہلے ہی ہو گئی ہوتی۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن میرے ساتھ تو مسائل ایسے ہو گئے کہ شادی التوا میں پڑ گئی۔''

''کچھ یہی صورت حال میرے ساتھ بھی ہوئی۔'' ناصر مسکرا کر بولا۔ ''ماں نے دو سال پہلے میری شادی کرنا چاہی تھی، منگنی تو بچپن سے تھی...... ان لوگوں نے انکار کر دیا کیونکہ ان کی بیٹی کے لیے کسی دولت مند کا رشتہ آ گیا تھا۔ اچانک انہیں مجھ میں خامیاں نظر آنے لگیں۔ اماں ان سے شادی کی تاریخ لینے گئیں تو ان لوگوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ ہم سے غلطی ہو گئی، تمہارے بیٹے کے ساتھ رہ کر ہماری بیٹی کڑھ کڑھ کر مر جائے گی۔ ناصر کے گھر نہ آنے کا وقت ہے نہ جانے کا! جان کا خطرہ الگ، نہ معلوم کب کوئی سیاست دان، پولیس افسر یا انڈر ورلڈ مافیا کا کوئی ڈان اسے گولی مار دے۔'' اماں بے چاری اپنا سا منہ لے کر آ گئیں لیکن انہیں شدید صدمہ تھا کیونکہ انکار ان کے بھائی نے کیا تھا، میں انہیں سمجھاتا تھا کہ اماں! مجھے نہ اس منگنی کی خوشی تھی، نہ اس کے ٹوٹنے پر کوئی افسوس ہوا ہے۔ آپ ہی کی ضد تھی کہ اپنی بھتیجی کو بہو بنائیں گی۔

اماں ٹھنڈی سانس لے کر کہتیں۔ مجھے اسی بات کا تو صدمہ ہے بیٹا! میرے سگے بھائی نے میرے ساتھ یہ سلوک کیا! وہ بے چاری یہی غم دل میں لیے اس دنیا سے رخصت ہو گئیں۔''

''ویری سیڈ ناصر صاحب!'' میں نے کہا۔ اس وقت تک ہم ہوٹل کی لابی میں پہنچ چکے تھے۔

موسم اب کچھ زیادہ ہی سرد ہو گیا تھا۔ میں نے ویٹر سے کافی لانے کو کہا، پھر ناصر سے پوچھا۔ ''ناصر صاحب! آپ کی سکونت کہاں ہے؟''

''میں سیٹلائٹ ٹاؤن کے ایک چھوٹے سے گھر میں رہتا ہوں۔'' ناصر نے کہا، پھر مجھ سے بولا۔ ''میں نے سوچا تھا کہ شادی کے بعد اسلام آباد شفٹ ہو جاؤں گا لیکن کیا

فائدہ......"

"کیوں؟" میں نے کہا۔ "کیا اب لڑکیاں ختم ہوگئی ہیں یا......"

"ایسی بات نہیں ہے۔" ناصر ہنس کر بولا۔ "شادی تو خیر جب وقت آئے گا، ہو ہی جائے گی پر اماں کو میری شادی کا بہت ارمان تھا۔ اب وہ ہی نہ رہیں تو......"

"آپ کی کوئی بہن تو ہوگی یا کوئی بھائی؟"

"نہیں نواب صاحب! میں اس دنیا میں بالکل تنہا ہوں، کچھ رشتے داروں نے مجھ سے ناتا توڑ لیا، کچھ کو میں نے خود ہی چھوڑ دیا۔" کافی ختم کر کے اس نے گھڑی دیکھی، پھر چونک کر بولا۔ "اوہو، گیارہ بج گئے۔ اب مجھے اجازت دیں، دراصل ابھی مجھے آفس بھی جانا ہے۔ وہاں دو چار خبریں لگوا کر گھر جاؤں گا۔"

ابھی میں اس سے بات کر ہی رہا تھا کہ لفٹ کا دروازہ کھلا اور دو آدمی لفٹ سے نکل کر تقریباً دوڑنے والے انداز میں زینے کی طرف بھاگ گئے۔

یہ بات میں نے بھی نوٹ کی اور ناصر نے بھی۔ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ "نہ جانے کس کس کے پاس پیسا آ گیا ہے، ان لوگوں کو کسی معقول جگہ پر رہنے کی تمیز نہیں ہے تو فائیو اسٹار ہوٹلوں میں ٹھہرتے ہی کیوں ہیں؟"

ابھی وہ یہی بات کہہ رہا تھا کہ دوسری لفٹ کا دروازہ کھلا اور نور باہر نکلی۔ میں اسے دیکھ کر چونک اٹھا۔ وہ کچھ حواس باختہ سی نظر آ رہی تھی اور ایسا لگ رہا تھا، جیسے وہ کسی سے خوفزدہ ہو۔

"کیا ہوا جان؟" میں نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

"وہ...... وہ...... انہوں...... نے...... ہمارے دونوں گارڈز کو...... مار دیا اور......" اس نے اتنا کہا اور بے ہوش ہو کر گرنے لگی۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے سنبھال لیا ورنہ وہ بری طرح فرش پر گرتی۔

ہوٹل میں اس وقت بھی اچھے خاصے لوگ تھے۔ نور کو یوں گرتا دیکھ کر اردگرد سے لوگ دوڑ پڑے۔ "کیا ہوا...... کون ہے یہ؟"

"کچھ نہیں، بس ذرا چکر آ گیا ہے۔ میری بیوی ہے یہ؟" میں نے درشت لہجے میں کہا۔

نور کی ہمدردی میں آگے بڑھنے والے لوگ پیچھے ہٹ گئے۔ میں نے نور کو لابی کے ایک صوفے پر بٹھا دیا۔ راجا اور غنی، نور کی بات سن کر اوپر چلے گئے تھے۔ ناصر البتہ میرے ساتھ تھا۔

میں نور کو صوفے پر آرام سے بٹھانے کے بعد سیدھا ہوا تو ناصر نے جست لگا کر مجھے اچانک گرا دیا۔ دوسرے ہی لمحے صوفے کے نزدیک رکھا ہوا گلدان کرچی کرچی ہوگیا۔

پہلے تو مجھے یہ شبہ ہوا کہ ناصر نے مجھ پر حملہ کیا ہے۔ ہمارے گرتے ہی وہاں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ میں نے نیچے جھکے جھکے نور کو صوفے سے گھسیٹ کر کارپٹ پر ڈال دیا۔ میں نے ریوالور نکالنے کے لیے بغلی ہولسٹر پر ہاتھ مارا تو مجھے یاد آ گیا کہ چلتے وقت میں نے اپنا ریوالور ہوٹل ہی میں چھوڑ دیا تھا۔

مجھے ناصر کے ہاتھ میں ریوالور دکھائی دے رہا تھا۔ پھر اس نے ایک ہوائی فائر کیا اور ہوٹل کے داخلی دروازے کی طرف بھاگا۔

فائر کی آواز وہاں موجود لوگوں کے لیے گویا صورِ اسرافیل ثابت ہوئی۔ مجھ پر تو بے آواز فائر کیا گیا تھا۔ اگر ناصر جست لگا کر مجھے نہ گراتا تو شاید گولی گلدان کے بجائے مجھے لگتی۔

پھر تو وہاں ایسی بھگدڑ مچی کہ بھاگنے والے داخلی دروازے میں پھنس کر رہ گئے۔ میں نے نور کو اٹھا کر صوفے پر لٹایا تو اس نے آنکھیں کھول دیں اور خالی خالی ویران آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگی۔

اچانک راجا اور غنی حواس باختہ سے دوڑتے ہوئے میری طرف آئے۔ غنی نے گھبرا کر پوچھا۔ "آپ ٹھیک تو ہیں سر، میں نے ابھی فائر کی آواز سنی تھی؟"

"ہاں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے کہا۔

"فائر کس نے کیا تھا اور ناصر کہاں گیا؟" راجا نے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم کہ فائر کس نے کیا تھا۔ ناصر نے فائر کرنے والے کو دیکھ لیا تھا۔ وہ فائر کرنے والے کے پیچھے گیا ہے۔"

اس وقت تک ہوٹل کی پوری لابی اور لاؤنج خالی ہو چکا تھا۔

مجھے ہوٹل کے داخلی دروازے کے پاس ناصر نظر آیا۔ اس نے کسی شخص کا کالر پکڑ رکھا تھا اور اسے دھکیلتا ہوا اندر لا رہا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے ہوٹل کی سیکیورٹی کے دو اہلکار تھے۔

پھر وہاں چیف سیکیورٹی افسر اور منیجر بھی آ گیا۔ وہ ڈپٹ کر بولا۔ "یہ سب کیا ہے؟"

"اس کا جواب تو تم دو گے مسٹر منیجر!" ناصر نے تلخ لہجے میں کہا۔ "یہاں معزز لوگوں پر فائرنگ کی جاتی ہے۔"

"صرف فائرنگ!" راجا بھی دہاڑ کر بولا۔ "یہاں برے دو آدمی قتل ہوگئے ہیں۔"

"قق...... قتل......" منیجر تھوک نگل کر بولا۔ "کک...... کہاں؟"

"تھرڈ فلور پر۔" راجا نے کہا۔ "کیا یہاں شرفا کے ساتھ یہی سلوک کیا جاتا ہے؟"

"اس سے پہلے تو کبھی یہاں کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا؟" چیف سیکیورٹی افسر نے کہا۔

"ہاں، لیکن اب ہوگیا؟" راجا نے درشت لہجے میں کہا۔

"اے مسٹر! بی ہیو یور سیلف!" سیکیورٹی افسر چیں بہ جبیں ہو کر بولا۔ وہ غالباً آرمی کا ریٹائرڈ افسر تھا اور اس قسم کی باتیں سننے کا عادی نہیں تھا۔

"پولیس کو بلاؤ۔" ناصر نے دہاڑ کر کہا۔

"میں...... پولیس...... کو پہلے ہی فون...... کر چکا ہوں۔" منیجر نے کہا۔ وہ بہت زیادہ پریشان نظر آ رہا تھا۔ ظاہر ہے اس کی ملازمت کے ساتھ ساتھ ہوٹل کی ساکھ بھی داؤ پر لگ گئی تھی۔

"قتل کہاں ہوا ہے غنی؟" میں نے پوچھا۔

اس وقت تک نور بھی ہوش میں آ چکی تھی۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "ان لوگوں نے ہمارے گارڈز کو قتل کر دیا۔"

"کیسے؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ "وہ لوگ تو پوری طرح مسلح تھے؟"

"مجھے کچھ معلوم نہیں۔" نور نے کہا۔ "میں تو کمرے سے نکل کر نیچے لابی میں آنا چاہتی تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ کچھ دیر لابی میں بیٹھوں گی، ایک کپ کافی پیوں گی اور تمہارا انتظار کروں گی۔ پھر مجھے گارڈز کا خیال آیا۔ میں انہیں اطلاع دینے کی غرض سے ان کے کمرے کی طرف گئی تو وہاں کا منظر دیکھ کر میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں، وہاں دونوں گارڈز زمین پر پڑے تھے اور دو آدمی کمرے سے باہر نکل رہے تھے۔ فرش پر ہر طرف خون پھیلا ہوا تھا۔ بہت سا خون کمرے سے بہہ کر باہر آ گیا تھا۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں چاقو تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ میری طرف لپکے۔ میں دیوانہ وار زینے کی طرف بھاگی۔ مجھے زینے کی طرف بھاگتا دیکھ کر وہ واپس گئے اور ان میں سے ایک سیل فون نکال کر کسی سے بات کرنے لگا۔ اس وقت تک میری طرف سے ان کی پشت ہوگئی تھی۔ میں نے لفٹ کو رکتے دیکھا تو بھاگ کر لفٹ کے پاس پہنچ گئی اور اس کا بٹن دبا دیا اور پھر میں نیچے آ گئی۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہیں کیا ہوا؟"

ناصر نے اس شخص کا سر دیوار میں دے مارا جسے اس نے باہر سے پکڑا تھا۔

"یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟" سیکیورٹی افسر چیخ کر بولا۔ "آپ ایک معزز آدمی پر تشدد کر رہے ہیں؟"

"معزز آدمی!" ناصر تلخ لہجے میں بولا۔ "اسی معزز آدمی نے نواب صاحب پر فائر کیا تھا۔"

"کون نواب صاحب؟" ہوٹل کا سیکیورٹی افسر حیرانی سے بولا۔

"نواب رفیق احمد شیرازی!" ناصر نے تند لہجے میں کہا۔ "یہ تمہارے سامنے کھڑے ہیں۔" اس نے میری طرف اشارہ کیا۔

ہوٹل کے دو سیکیورٹی گارڈز نے آ کر بتایا کہ تھرڈ فلور پر واقعی دو آدمیوں کا مرڈر ہوگیا ہے۔ ہمارا ایک گارڈ وہاں کھڑا ہے تاکہ پولیس کے آنے تک وہاں کی کوئی بھی چیز اپنی جگہ سے نہ ہٹے۔"

"وہ دونوں ہمارے ہوٹل کے ایک ہی کمرے میں مقیم تھے؟" سیکیورٹی افسر نے پوچھا۔

"یہ تو ریکارڈ دیکھ کر ہی معلوم ہوگا۔"

"وہ دونوں نواب صاحب کے گارڈز تھے۔" غنی نے کہا۔ "وہ ہوٹل رائل میں مقیم تھے اور یہاں مجھ سے ملنے آئے تھے اور میری واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔"

"آپ کون ہیں؟" سیکیورٹی افسر نے غنی کو گھورا۔

"میں نواب صاحب کا چیف سیکیورٹی آفیسر ہوں۔" غنی نے جواب دیا۔ "میں نواب صاحب کا باڈی گارڈ بھی ہوں۔"

پولیس کا سائرن سنائی دیا، پھر پولیس کا ایک ایس آئی، ایک ہیڈ کانسٹیبل اور دو سپاہی وہاں پہنچ گئے۔

ایس آئی نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ "کیا ہوا ہے یہاں! فون کس نے کیا تھا؟"

"فون میں نے کیا تھا؟" منیجر آگے بڑھ کر بولا۔ اس کی حالت اب کچھ بہتر تھی۔ "یہاں دو آدمیوں کا مرڈر ہوگیا ہے۔" منیجر نے کہا۔

ایس آئی اچھل پڑا۔ "مرڈر! لیکن آپ نے تو کہا تھا کہ صرف فائرنگ ہوئی ہے؟" اس نے منیجر کو گھورا۔ "فائرنگ کون کر رہا تھا اور کس پر؟"

"فائرنگ یہ کر رہا تھا۔" ناصر نے اس شخص کو ایس آئی

کی طرف دھکیل دیا جسے ابھی تک اس نے پکڑ رکھا تھا۔''اس نے نواب صاحب پر فائرنگ کی تھی۔''

''میرا خیال ہے کہ آپ اخبار کے آدمی ہیں۔'' ایس آئی نے غور سے ناصر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ کا خیال بالکل درست ہے۔'' ناصر نے کہا۔ ''میں واقعی کرائم رپورٹر ہوں، آپ کیا اس محکمے میں نئے ہیں؟''

''نہیں جی، میں اس سے پہلے فیصل آباد میں تھا۔'' ایس آئی نے جواب دیا۔ ''دو ہفتے پہلے ہی میری پوسٹنگ یہاں ہوئی ہے۔''

''گڈ!'' ناصر نے مضحکہ خیز لہجے میں کہا۔

''مقتول کہاں ہیں؟'' ایس آئی نے ہوٹل کے سیکیورٹی آفیسر سے پوچھا۔

''مرڈر تو تھرڈ فلور کے روم نمبر 312 میں ہوا ہے۔'' ایک سیکیورٹی گارڈ نے جواب دیا۔

ایس آئی اور اس کے دو ماتحت لفٹ کی طرف بڑھ گئے۔

نور کی حالت بھی اب تک کسی حد تک سنبھل چکی تھی۔ میں نے اس سے کہا کہ تم یہیں آرام کرو، میں ابھی آتا ہوں۔ میں بھی لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔

''آپ کہاں جا رہے ہیں؟'' ایس آئی نے درشت لہجے میں مجھ سے پوچھا۔

''تمیز سے بات کرو انسپکٹر!'' ناصر نے اسے جھڑک دیا۔ ''یہ نواب رفیق احمد شیرازی ہیں۔ مقتول ان ہی کے سیکیورٹی گارڈز تھے۔'' یہ کہتا ہوا وہ بھی ہمارے ساتھ ہی آ گیا۔

راجا اور غنی نے اوپر جانے کی کوشش نہیں کی۔

وہ دونوں میرے بہت اچھے گارڈز تھے۔ انہیں بہت بے دردی سے قتل کیا گیا تھا۔ قاتلوں نے ان دونوں کو ذبح کر دیا تھا۔ حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ وہ دونوں قاتلوں سے مار کیسے کھا گئے۔ کمرے میں کہیں بھی مزاحمت کے آثار نہیں تھے۔

ایس آئی نے غور سے کمرے کی ایک ایک چیز کا جائزہ لیا اور بولا۔ ''لگتا ہے ان دونوں کو سوتے میں قتل کیا گیا ہے۔''

''کوئی بھی آدمی اتنی گہری نیند نہیں سوتا سر کہ یوں خاموشی سے مر جائے۔'' ہیڈ کانسٹیبل نے کہا۔ وہ ایس آئی سے زیادہ تجربے کار تھا۔

''میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔'' ایس آئی نے کہا۔ ''میرا قیاس ہے کہ ان دونوں کو بے ہوشی کی حالت میں قتل کیا گیا ہے۔''

ایس آئی نے تفتیش کا حکم دیا اور خود ہمارے ساتھ نیچے آ گیا۔ ''اس واقعے کا کوئی چشم دید گواہ ہے؟''

''جی ہاں، نواب صاحب کی منگیتر ماہ نور اس واقعے کی چشم دید گواہ ہیں۔'' راجا نے کہا۔

''جی ہاں، میں نے یہ واقعہ دیکھا ہے۔'' نور نے کہا پھر اس نے انسپکٹر کو وہ سب کچھ تفصیل سے بتایا جو اس سے پہلے مجھے بتا چکی تھی۔

''میڈم! اگر آپ قاتلوں کو دیکھیں تو انہیں پہچان لیں گی؟''

''آف کورس!'' نور نے کہا۔ اس کی حالت اب بالکل نارمل تھی۔

''جب آپ زینے کی طرف بھاگیں تو وہ کسے فون کر رہے تھے؟'' ایس آئی نے پوچھا۔

''یہ تو وہ خود ہی بتا سکیں گے!'' نور نے کہا۔

''میرا مطلب ہے کہ آپ نے ان کی بات چیت سنی تھی! انہوں نے کسی کا نام بھی لیا ہوگا۔''

''میں ان کی باتیں کیسے سن سکتی تھی۔'' نور نے کہا۔ ''وہ مجھ سے کافی فاصلے پر تھے۔''

''آپ کہاں رہتی ہیں، میرا مطلب ہے آپ کہاں سے آئی ہیں؟'' ایس آئی نے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے'' شاید اس کا تکیۂ کلام تھا۔

''میں لندن سے آئی ہوں۔'' نور نے کہا۔

''میرا مطلب ہے کہ یہاں کس شہر سے آئی ہیں؟''

''میں نے کہا تو ہے کہ لندن سے آئی ہوں۔'' نور نے سرد لہجے میں کہا۔ ''میں آج صبح دس بجے یہاں پہنچی تھی۔''

ہیڈ کانسٹیبل بہت تیزی سے نور کا بیان لکھ رہا تھا۔

ایس آئی میری طرف متوجہ ہوا۔ ''نواب صاحب! آپ کہاں کے نواب ہیں؟''

''ہم ریاست ست بدھائی کے نواب ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''ست بدھائی! یہ کہاں ہے؟'' اس نے تضحیک آمیز انداز میں پوچھا۔

''یہ تم اپنے آئی جی یا ڈائریکٹر جنرل آف پولیس سے پوچھنا۔'' میں نے کہا۔ ''ویسے ہم ابھی ان ہی سے مل کر آ رہے ہیں۔''

''ڈی جی صاحب سے؟'' انسپکٹر نے بے یقینی سے کہا۔

''ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''اگر یقین نہ ہو تو ہم ابھی ان سے تمہاری بات کرا دیتے ہیں۔'' میں نے جیب سے سیل فون نکالتے ہوئے کہا۔

''سر، مجھے آپ کی بات پر یقین ہے۔'' ایس آئی کا لہجہ دھیما پڑ گیا تھا۔

وہ مجھ سے گارڈز کے بارے میں پوچھتا رہا۔ میں نے بتایا کہ دونوں گارڈز میرے پاس گزشتہ دو سال سے تھے۔

''اس شخص کو پہچانتے ہیں؟'' اس نے اس آدمی کی طرف اشارہ کیا جسے ناصر نے پکڑا تھا۔

''ہم اسے نہیں جانتے۔'' میں نے کہا۔

ناصر نے اسے بتایا۔ ''میں نے اسے ریوالور نکالتے دیکھ لیا تھا۔ اس سے پہلے کہ نواب صاحب پر فائر کرتا، میں نے دھکا دے کر نواب صاحب کو گرا دیا اور خود ہوائی فائر کر کے اس کے پیچھے دوڑا۔ اب یہ اس کی بدقسمتی ہے کہ اسے بھاگتے ہوئے ہوٹل کے دو سیکیورٹی گارڈز نے دیکھا اور ٹانگ اڑا کر اسے گرا دیا۔ میں اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ میں نے اسے پکڑ لیا۔''

''اس کا ریوالور کہاں ہے؟'' ایس آئی نے پوچھا۔

''اس نے بھاگتے ہوئے ریوالور شاید کہیں پھینک دیا ہے۔ وہ ریوالور بھی آپ کو تلاش کرنے پر مل جائے گا۔''

پولیس کی کارروائی سے نمٹنے میں رات کے تین بج گئے۔ مجھے راجا پر رحم آ رہا تھا۔ وہ کل بھی رات بھر جاگتا رہا تھا۔ آج بھی اسے جاگنا پڑ رہا تھا۔ اس کی حالت تھکن سے غیر ہو رہی تھی۔

پولیس نے دونوں گارڈز کی لاشیں پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا کر کمرا سیل کر دیا تھا۔ میں نے ناصر سے وہیں رکنے کو کہا لیکن وہ معذرت کر کے چلا گیا۔

''رفیق!'' نور نے کہا۔ ''میں اب اس ہوٹل میں نہیں رہوں گی۔''

''ایک ہی رات کی تو بات ہے جان!'' میں نے کہا۔ ''میں تو ابھی چیک آؤٹ کرنے کو تیار ہوں لیکن راجا کا حال بہت خراب ہے۔ ہم اگر کچھ دیر اور یہاں رکتے تو راجا وہیں بیٹھے بیٹھے سو جاتا۔''

راجا پولیس کے جاتے ہی اپنے کمرے میں جا چکا تھا، غنی البتہ پریشان تھا۔ اس کا کمرا سیل کر دیا گیا تھا۔

میں نے منیجر سے کہا۔ ''منیجر صاحب! میرے چیف سیکیورٹی آفیسر کا کمرا تو پولیس نے سیل کر دیا ہے۔ اسے کوئی دوسرا کمرا دے دیں۔''

''او کے۔'' منیجر نے کہا۔ وہ کلرک سے مخاطب ہوئے۔ ''انہیں نواب صاحب کے سامنے والا کمرا دے دو۔''

ہوٹل کی سیکیورٹی نے تمام مہمانوں کو بھی ان کے کمروں تک محدود کر دیا تھا۔ پولیس کے جاتے ہی بہت سے لوگ کمروں سے باہر نکل آئے تھے۔ وہ سب وہاں سے چیک آؤٹ کرنا چاہتے تھے۔ خاص طور پر تھرڈ فلور پر مقیم ہر آدمی وہاں سے جانا چاہتا تھا۔

ہوٹل کے بقیہ فلورز سے بھی کچھ لوگ گئے لیکن تھرڈ فلور کا تو ایک ایک مہمان وہاں سے رخصت ہو گیا۔ اس فلور پر صرف میں، راجا، غنی اور نور رہ گئے۔ پورا فلور بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ غنی آج کی رات سو نہیں سکے گا۔ میری حفاظت کے خیال سے وہ رات بھر جاگتا رہے گا۔ پھر اسے اپنے ساتھیوں کی موت کا صدمہ بھی ہوگا۔ صدمہ تو مجھے بھی تھا لیکن زیادہ وقت تو وہ غنی کے ساتھ رہتے تھے۔

میں سونے کے لیے لیٹا تو نور مجھ سے بولی۔ ''یہاں تو حالات بہت خراب ہیں رفیق! چھوڑو ست بدھائی کو، میرے ساتھ لندن چلو۔''

''تو لندن میں حالات ہمارے لیے کون سے اچھے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''پھر حالات سے ڈر کے میں کہاں تک بھاگ سکتا ہوں۔ ان مشکلات سے تو نمٹنا ہی پڑے گا۔''

''یہ کون لوگ ہیں جو تمہاری جان کے درپے ہیں؟''

''یہ کوئی بھی ہو سکتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''رانا زوہیب تو میرا کھلا دشمن ہے لیکن ہر واردات میں اس کا ہاتھ نہیں ہو سکتا۔''

''یہ آخر کب تک چلے گا؟'' نور نے الجھ کر پوچھا۔

''جب تک میں زندہ ہوں یا میرے دشمن زندہ ہیں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ پھر اس کا سر سہلاتے ہوئے بولا۔ ''تم اپنے ذہن پر بوجھ مت ڈالو، سو جاؤ آرام سے۔''

''مجھے نیند نہیں آ رہی ہے۔'' نور نے کہا۔

''کوشش کرو، آ جائے گی۔'' میں نے اسے اپنی بانہوں میں بھرتے ہوئے کہا، پھر نہ جانے کب مجھے بھی نیند آ گئی۔

میری آنکھ کھلی تو دیوار گیر گھڑی میں آٹھ بج رہے تھے۔ نور حسب معمول غائب تھی۔ باتھ روم سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔

وہ باتھ روم سے نکلی تو میں بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے نیم دراز تھا۔ وہ بالکل تر و تازہ دکھائی دے رہی تھی اور اس ڈری سہمی نور سے بالکل مختلف تھی جو کل میرے ہاتھوں میں بے ہوش ہوگئی تھی۔

''جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ مجھے بہت بھوک لگی ہے۔'' اس نے کہا۔

بھوک لگنا بھی اچھی علامت تھی۔

میں بھی گرم پانی سے دیر تک نہاتا رہا، میں باتھ روم سے نکلا تو راجا کو دیکھا۔ وہ بھی مجھے تر و تازہ لگ رہا تھا۔ وہ دو راتوں کا جاگا ہوا تھا لیکن اس میں یہ صلاحیت تھی کہ اپنی مرضی سے جاگتا تھا اور اپنی مرضی سے سوتا تھا۔

روم سروس سے اسی وقت ناشتا بھی آگیا۔

ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد راجا نے پوچھا۔ ''فیکے پتر، اب کیا پروگرام ہے؟''

''یار، ابھی ہم اسلام آباد تو نہیں چھوڑ سکتے۔'' میں نے کہا۔

''کیوں بھئی؟'' راجا نے پوچھا۔ ''کیا اس احمق ایس آئی نے تجھ پر کوئی پابندی لگائی ہے؟''

''نہیں، لیکن دونوں گارڈز کے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آنے تک میں یہاں رکنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''تو کون سا مشکل ہے۔ رپورٹ بھی تجھے آج شام تک مل جائے گی۔''

''آج شام تک!'' میں نے ہنس کر پوچھا۔ ''مہاراجا! ہم لندن میں نہیں، پاکستان میں ہیں۔''

''اوئے سر پر پڑے تو یہاں کی پولیس بہت چست ہو جاتی ہے۔ رپورٹ تو ناصر آج شام تک لے آئے گا۔''

دروازے پر دستک ہوئی اور ناصر اندر آگیا۔

''دیکھا تو نے۔'' راجا ہنس کر بولا۔ ''بھئی ابھی تیرا نام لیا اور ابھی تو حاضر ہوگیا۔''

''لیکن میں شیطان ہرگز نہیں ہوں۔'' ناصر نے ہنس کر کہا۔ پھر وہ مجھ سے بولا۔ ''نواب صاحب! میں نے رات ہی ایس ایس پی سے پولیس اسٹیشن فون کرا دیا تھا کہ جو آدمی کل میں نے پولیس کے حوالے کیا تھا، اس کا منہ کھلواؤ۔''

''وہ اب تک منہ کھول چکا ہوگا۔'' راجا نے ہنس کر کہا۔

''یاروں منہ تو کھول چکا ہے لیکن وہ لاہور کے کسی بدمعاش کا نام لے رہا ہے۔''

''لاہور کا کون سا بدمعاش میرا دشمن ہوسکتا ہے؟'' میں نے الجھ کر کہا۔

''اس کا نام مقصود ہے۔ وہ مسودے کے نام سے مشہور ہے۔ پولیس آج شام تک اسے بھی پکڑ لائے گی۔''

''میں کسی مسودے کو نہیں جانتا۔'' میں نے کہا۔

''فرض کرو، وہ یہاں آکر کہے کہ اسے فلاں وزیر یا سرکاری افسر نے بھیجا تھا تو پولیس کیا کرے گی؟ ظاہر ہے وہ بااثر شخصیت تو اسے پہچاننے سے بھی انکار کر دے گی۔''

''یہ سب بعد کے معاملات ہیں رفیق صاحب!'' ناصر نے پہلی دفعہ مجھے نواب صاحب کے بجائے رفیق صاحب کہہ کر مخاطب کیا۔ ممکن ہے پہلے بھی کیا ہو لیکن وہ ابھی تک مجھے نواب صاحب ہی کہتا آیا تھا۔

''ناصر صاحب! آپ کی نیند پوری ہوگئی؟'' میں نے پوچھا۔

''ہم اخبار والے تو یوں بھی رات کے الو مشہور ہیں رفیق صاحب!'' وہ ہنس کر بولا۔ ''ہم تو راتوں کو جاگتے ہیں اور اکثر دن میں بھی سونا نصیب نہیں ہوتا۔ میرے لیے تو چار گھنٹے کی نیند کافی ہے۔''

''یار ناصر! ہمیں دونوں مقتولین کی پوسٹ مارٹم رپورٹ چاہیے۔'' راجا نے کہا۔

''میں کوشش کروں گا کہ رپورٹ آج شام تک مل جائے۔'' ناصر نے کہا۔ ''ویسے رپورٹ تو آپ کو ست بدھائی میں بھی مل سکتی ہے۔''

''پھر ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ہم آج دوپہر تک روانہ ہو جائیں گے۔''

روانگی کا ذکر سن کر نور کے چہرے پر ایک دم رونق آگئی۔ ناصر نے اس سے پوچھا۔ ''آپ کیسی ہیں مس ماہ نور؟''

''آئی ایم فائن!'' نور نے خالص برطانوی لہجے میں کہا۔

شام کو جب ہم ست بدھائی کے لیے روانہ ہوئے تو میں اپنے گارڈز کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ چار تھے۔ ان میں سے دو کو غنی نے اس گاڑی میں بٹھایا۔ انہیں بھی مجھ سے بالا ہی بالا غنی ہی نے بلایا تھا۔ اس واقعے کے بعد وہ حد سے زیادہ محتاط ہوگیا تھا اور میرے ساتھ چلتے ہوئے چیتے کی طرح چوکنا تھا۔ اس کا کمرا ابھی تک سیل تھا۔ اس کا کچھ ضروری سامان بھی کمرے میں رہ گیا تھا۔ اس میں غنی کی ایک رائفل بھی شامل تھی۔ مجھے یہ اطمینان تھا کہ غنی کے پاس اس کا لائسنس بھی تھا۔ کسی مشن پر جانے کی بات اور تھی۔ اس وقت تو

ہم پاکستان کے دارالحکومت اسلام آباد آئے تھے۔ وہاں تو قدم قدم پر چیکنگ ہوتی ہے۔ میں نے احتیاط کے طور پر کوئی بھی ایسی چیز نہیں رکھی تھی جس پر پولیس یا قانون نافذ کرنے والے کسی بھی ادارے کو اعتراض ہوتا۔

میں گاڑی میں بیٹھ گیا تو ناصر مجھ سے بولا۔ ''او کے سر، آج رات کو یا کل صبح ست بدھائی میں ملاقات ہوگی۔''

پھر ہمارا قافلہ آگے روانہ ہوگیا۔ میری ایک گاڑی ہمارے آگے تھی اور دوسری پیچھے لیکن یہ ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ وہ دونوں گاڑیاں بھی ہمارے ساتھ ہیں۔ غنی نے گارڈز کو ہدایت کر دی تھی کہ کوئی بھی غیر معمولی بات دیکھو تو میرے سیل فون پر فوراً اطلاع دینا۔

جی ٹی روڈ پر خاصا رش تھا، غنی بہت مہارت سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ وہ کسی بھی گاڑی کو اپنے ساتھ چلنے کا موقع نہیں دے رہا تھا یا تو وہ گاڑی کو نکل جانے دیتا یا پھر اپنی اسپیڈ بڑھا کر اسے اوورٹیک کر لیتا۔

نور ارد گرد کے بھاگتے ہوئے نظاروں میں گم تھی یا پھر وہ کچھ سوچ رہی تھی۔ میں نے اسے چھیڑنا مناسب نہیں سمجھا۔

دینہ سے تقریباً دس کلومیٹر پہلے ایک لینڈ کروزر طوفانی رفتار سے ہماری طرف آئی۔ غنی اسے دیکھ کر ایک دم چوکنا ہوگیا تھا۔ گاڑی کی طوفانی رفتار دیکھ کر میں بھی کچھ فکر مند ہوگیا تھا۔ راجا کی آنکھوں میں بھی تشویش تھی، وہ پسنجر سیٹ پر بیٹھا تھا۔ میں نے اسے ریوالور نکالتے دیکھا۔ غنی نے بھی اپنا ریوالور نکال کر گود میں ڈال لیا۔ اس کی نظریں مسلسل بیک ویو مرر پر جمی ہوئی تھیں۔

''غنی! گاڑی ایک طرف کر کے بالکل آہستہ کر دو اور اس لینڈ کروزر کو جانے دو۔'' میں نے کہا۔

غنی نے گاڑی کی رفتار کم کی اور سڑک کے کنارے لگا کر اسے روک دیا۔ دوسرے ہی لمحے لینڈ کروزر جیٹ فائٹر کی طرح زن سے ہمارے پاس سے گزر گئی۔ اس میں سوار لڑکوں کی میں ایک ہی جھلک دیکھ سکا۔ وہ سب بڑے گھرانوں کے بگڑے ہوئے رئیس زادے لگ رہے تھے۔ کیونکہ وہ شور شرابا بھی کر رہے تھے اور گاڑی میں اچھل کود بھی مچا رہے تھے۔ مجھے صرف ان کی ایک جھلک دکھائی دی، پھر لینڈ کروزر لمحوں میں نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ ان کے جانے کے بعد غنی نے سکون کا سانس لیا۔ ماہ نور کے چہرے پر بھی پریشانی کے تاثرات تھے۔ یقیناً میرے چہرے پر بھی ہوں گے۔ ان کے گزرتے ہی میرے اعصاب پرسکون ہوگئے۔ مجھے خود پر ہنسی بھی آئی کہ میں خوامخواہ سڑک پر چلنے والی گاڑیوں سے بھی ڈرنے لگا ہوں۔

ہماری دونوں گاڑیاں بھی مناسب فاصلے پر رک گئی تھیں اور دونوں گاڑیوں سے باری باری غنی کو فون موصول ہو چکا تھا کہ کوئی پریشانی کی بات تو نہیں؟

غنی نے دونوں گاڑیوں کو روانہ ہونے کا سگنل دیا۔ اس نے بھی اپنی گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔

میں سوچ رہا تھا کہ اگر مزید چند ماہ یہی ذہنی کیفیت رہی تو میرا نروس بریک ڈاؤن بھی ہوسکتا ہے۔ انسانی ذہن آخر کتنا بوجھ اٹھا سکتا ہے؟ مجھے تو جب سے یہ جاگیر اور لارڈ ارنسٹ کا محل اور کاروبار ملا تھا، میں مسلسل اسی قسم کے حالات سے نبرد آزما تھا۔ کبھی میں سکون کی تلاش میں لندن بھاگتا تھا، کبھی وہاں سے تنگ آکر پھر پاکستان کا رخ کرتا تھا۔

راستہ گویا پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے گزرا۔ جب ہماری گاڑی ست بدھائی کی حدود میں داخل ہوگئی تو میں نے سکون کا سانس لیا اور اپنا سر نور کے شانے پر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔ نور آہستہ آہستہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

''صبح ہوگئی فیکے پتر!'' راجا نے کہا۔

میں نے آنکھیں کھولیں تو ہم اپنی حویلی کے سامنے کھڑے تھے۔ ہماری گاڑی دیکھتے ہی حویلی کا دروازہ کھل جاتا تھا لیکن میں نے گارڈز کو ہدایات دے رکھی تھیں کہ گاڑی کوئی بھی ہو، جب تک باہر آکر آنے والوں کی شناخت نہ کر لو، گیٹ مت کھولنا۔

مین گیٹ میں لگا ہوا ذیلی دروازہ کھلا اور اندر سے سرور باہر نکلا۔ اس نے گاڑی کے نزدیک آکر ایک نظر ہمارا جائزہ لیا، پھر وہ ایک دم مستعد ہوگیا اور وہیں سے کسی کو اشارہ کیا۔ حویلی کا بھاری بھرکم دروازہ آہستگی سے اندر کی طرف کھل گیا۔ دروازہ کھلتے ہی ہماری گاڑی اندر داخل ہوگئی۔

میں گاڑی سے اترا تو سب سے پہلے صوبیدار میجر صاحب سے سامنا ہوا۔ میں نے انہیں سلام کیا تو وہ مجھے دعائیں دینے لگے۔

ہم آگے بڑھے تو پورچ ہی میں کچھ فاصلے پر شہناز سمیت تمام خواتین کھڑی تھیں۔ ان سب نے نور کو گھیر لیا۔

خواتین میں صرف ایک ایسی تھی جسے نور سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، وہ تھی ڈاکٹر شہلا! وہ بقیہ خواتین سے کافی دور کھڑی تھی۔ میں نے اسے دیکھا تو اس نے مسکرا کر مجھے سلام کیا۔

''آپ کیسی ہیں ڈاکٹر شہلا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' شہلا بولی۔ ''فکر تو سب کو آپ کی تھی۔''

''میری فکر کیوں تھی؟'' میں نے ہنس کر پوچھا۔

''بس شہناز باجی ہی کو بہت پریشانی تھی۔ وہ بار بار یہی کہہ رہی تھیں کہ جب نور وہاں پہنچ چکی ہے تو وہ لوگ اسلام آباد میں کیوں رکے ہوئے ہیں۔ آپ لوگ تو گزشتہ کل آنے والے تھے۔''

''ہاں، کچھ ضروری کام نمٹانے تھے اس لیے دیر ہوگئی؟''

میں نے دیکھا کہ نور ابھی تک خواتین کے حلقے میں وہیں کھڑی ہے۔ حویلی کی دوسری خواتین بھی وہاں پہنچ گئی تھیں۔

''ارے بھئی، کیا نور سے یہیں کھڑے کھڑے سب کچھ پوچھ لوگی؟'' میں نے ریشم سے کہا۔

اسے فوراً اپنی اس غلطی کا احساس ہوگیا اور وہ نور کا ہاتھ پکڑ کر اسے خواتین کے نرغے میں سے نکال لائی۔

شہناز نے نور کے لیے ایک کمرا پہلے ہی آراستہ کرادیا تھا، حویلی کے اس پورشن تک آتے آتے خواتین میں صرف شہناز، نینا، ریشم اور شہلا رہ گئی تھیں۔ شہلا اس وقت بھی نور سے کچھ دور دور تھی۔ نور کمرے میں جانے کے بجائے وہیں باغ میں بیٹھ گئی۔ میں بھی ایک آرام دہ کرسی پر ڈھیر ہوگیا۔ میں نے کوئی ایسا قابل ذکر سفر نہیں کیا تھا لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے میں کئی دن کی مسافت کے بعد سٹ بدھائی پہنچا ہوں۔ یہاں آکر مجھے سکون کا احساس ہوا تھا۔

خلاف توقع راجا وہاں موجود نہیں تھا، پھر میں نے دیکھا کہ شہناز بھی اٹھ گئی اور نور سے بولی۔ ''تم ابھی چائے وغیرہ پی کر تازہ دم ہوجاؤ، میں ذرا اسپتال کا ایک راؤنڈ لگا لوں۔'' وہ تیزی سے چلی گئی۔

میں نے سوچا کہ اس وقت اسپتال کا تو محض بہانہ ہے، وہ راجا سے ملنے جارہی تھی۔ آخر وہ بھی شہناز سے تقریباً پانچ ہفتے دور رہا تھا۔

میری نظر پھر شہلا پر پڑی۔ وہ ہم سے کچھ فاصلے پر کھڑی باغ کے پھولوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ میں نے اسے آواز دی تو اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور باوقار انداز میں چلتے ہوئے میری طرف آگئی۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ مجھے اس کی چال بھی کیٹ واک لگتی تھی۔

وہ میرے نزدیک پہنچی تو میں نے اس سے کہا۔ ''آؤ شہلا! میں تمہیں نور سے ملواؤں۔'' پھر میں نے نور سے کہا۔

''نور! یہ ڈاکٹر شہلا ہیں، شہناز کی کزن! یہ بھی ہمارے اسپتال میں ہیں اور شہناز ہی کی طرح ان تھک محنت کرتی ہیں۔'' میں نے شہلا کی طرف دیکھا، پھر اس سے کہا۔ ''شہلا! یہ مس ماہ نور ہیں، لندن کی معروف کمپنی ماہ نور اینڈ شیرازی کی ایم ڈی اور......''

''اور کچھ نہیں۔'' نور ہنس کر بولی، پھر شہلا سے کہا۔ ''ادھر آؤ شہلا! بھئی تم شہناز سے چھوٹی ہو تو مجھ سے بھی چھوٹی ہوگی اس لیے میں تمہارے ساتھ رسمی گفتگو نہیں کروں گی، ویسے راجا نے مجھے تمہارے بارے میں بتا دیا تھا۔ تم سے غائبانہ تعارف تو پہلے ہی تھا۔ آج تمہیں دیکھ بھی لیا۔'' یہ کہہ کر نور نے اسے بانہوں میں بھر لیا۔

مجھے ایسا لگا جیسے دو گلاب ایک ساتھ دہک رہے ہوں اور میرے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ ان میں سے کس کا رنگ زیادہ سفید ہے؟ یا ان دونوں میں سے زیادہ خوبصورت کون ہے؟

میں نے ایک مرتبہ پھر دونوں کو غور سے دیکھا تو مجھے شہلا کا حسن ماند نظر آنے لگا۔ نور واقعی خوبصورتی کا نمونہ تھی۔ شہلا بھی خوبصورت تھی لیکن نور کی طرح بے پناہ حسن کی مالک نہیں تھی یا ممکن ہے یہ میری نظروں کا قصور ہو، کہتے ہیں حسن تو دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے۔ نور نے شہلا سے بے تکلفی کا برتاؤ کیا تو وہ بھی اس کے ساتھ گھل مل گئی۔

میں ان لوگوں کو وہیں چھوڑ کر اپنے کمرے میں آگیا۔ میں نے کپڑوں کی الماری کھولی تو مجھے سفید بے داغ شلوار سوٹ ٹنگا ہوا نظر آیا۔ اب یا تو یہ ریشم کا کمال تھا یا شہناز کا! وہ دونوں ہی میرا مزاج سمجھتی تھیں اور نور کے بعد اگر کوئی میرا خیال رکھ سکتا تھا تو وہ یہی دونوں تھیں۔ میں نے کپڑے بدلے اور سردی سے بچنے کے لیے ایک اونی شال شانوں پر ڈال لی۔ یہ شال بھی اسی ہینگر میں تھی جس میں کپڑے ٹنگے ہوئے تھے۔

ریشم میرے لیے کافی لے کر آئی تو مجھے حیرت ہوئی کہ وہ تو وہاں خواتین میں تھی، کافی کیسے لے آئی؟ مجھے اس کی مستعدی دیکھ کر بہت اچھا لگا۔

میں نے اس سے کہا۔ ''ریشم! تم جا کر نور کو یہاں بھیج دو، اس کی کافی بھی یہیں لے آؤ اور دیکھو، وہ راجا صاحب کہاں ہیں؟ انہیں بھی یہاں بھیج دینا۔''

ریشم سر جھکا کر باہر نکل گئی۔

اچانک مجھے نیلم کا خیال آیا۔ وہ ان خواتین میں موجود نہیں تھی۔

شام کا ملگجا اندھیرا رات میں تبدیل ہوگیا۔ سردی بھی بڑھ گئی تھی۔ میں نے اٹھ کر کھڑکی بند کی اور ہیٹر آن کر دیا۔ میں بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر لیٹ گیا۔ لیٹے لیٹے نہ جانے کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔

میری آنکھ شہناز کی آواز پر کھلی۔ وہ مجھ سے کہہ رہی تھی۔ ''کیا رات بھر جاگنے کا پروگرام ہے جو تم بے وقت پڑ کر سو گئے؟''

''ٹائم کیا ہوا ہے؟'' میں نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا۔

''دس بج رہے ہیں، تم لوگ کیا اسلام آباد میں جاگتے رہے ہو۔ راجا بھی گھوڑے گدھے بیچ کر سو رہا ہے، نور بھی لمبی تانے پڑی ہے اور تم بھی۔ اٹھو، پہلے کھانا کھالو، پھر سو جانا۔''

کھانے کی میز پر راجا کے علاوہ سبھی موجود تھے۔ میں جانتا تھا کہ راجا نے اٹھنے سے انکار کر دیا ہوگا۔ اب وہ اپنی نیند پوری کرکے ہی اٹھے گا۔

کھانا خوشگوار ماحول میں کھایا گیا۔ پھر نور اور دوسری خواتین لاؤنج میں جا بیٹھیں۔ نور کو کچھ خیال آیا تو اس نے ریشم سے کہا۔ ''میرے کمرے سے کالا سوٹ کیس لے آؤ۔ ہاں، اس کے ساتھ بڑا سا ایک بیگ بھی ہے۔ وہ بھی لیتی آنا۔''

''وہ بے چاری اتنا بھاری سوٹ کیس اور بیگ کیسے لائے گی؟'' میں نے کہا۔

شہناز نے ہنس کر کہا۔ ''ابھی تم خود دیکھ لینا کہ وہ کیسے لاتی ہے؟''

پانچ منٹ بعد مجھے ریشم دکھائی دی لیکن وہ خالی ہاتھ تھی۔ اس کے پیچھے پیچھے حویلی کا ایک ملازم تھا جس نے ریلوے کے قلیوں کی طرح سوٹ کیس سر پر رکھا ہوا تھا اور بھاری بیگ کو اس نے شانے پر لٹکا رکھا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ شہناز اور نور بھی ہنسنے لگیں۔

نور نے سوٹ کیس کھولا اور اس میں سے مختلف چیزیں نکال کر حویلی کی خواتین کو دینے لگی۔ وہ شہناز کے لیے بہت قیمتی شال، رسٹ واچ اور سیل فون کے ساتھ ساتھ میڈیکل کٹ بھی لے کر آئی تھی۔ حیرت تو مجھے اس وقت ہوئی جب اس نے اسی قسم کی چیزیں شہلا اور نینا کو بھی دیں۔

وہ دونوں خوش ہوگئیں۔ شہلا تو باقاعدہ آنسو بہانے لگی۔

''ارے کیا ہوا بھئی؟'' نور نے پوچھا۔ ''کیا تمہیں یہ گفٹ پسند نہیں آئے، کچھ اور چاہیے؟''

''نہیں نور باجی!'' شہلا نے کہا۔ ''یہ تو خوشی کے آنسو ہیں۔ شہناز باجی کے بعد آپ دوسری ہستی ہیں جس نے مجھے سگی بہنوں کا پیار دیا ہے۔''

نور نے ریشم اور حویلی کی دوسری خواتین کو بھی مختلف تحائف دیے۔ اس کا بیگ اور سوٹ کیس دونوں تقریباً خالی ہوچکے تھے۔

میں نے گھڑی دیکھی، اس وقت بارہ بج رہے تھے۔

میں وہاں سے اپنے کمرے میں آگیا۔ نور جب سے ست بدھائی پہنچی تھی، مجھ سے کوئی بات ہی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے ریشم سے کہا بھی تھا کہ نور کو یہاں بھیج دو لیکن اس نے ریشم سے کہہ دیا تھا کہ رفیق سے کہو، میں ابھی مصروف ہوں۔ یہ جملہ راجا کے بعد صرف نور ہی بول سکتی تھی۔

میں نے راجا کو دیکھا، وہ میری ہی طرف آرہا تھا۔ وہ اس وقت مجھے تروتازہ دکھائی دے رہا تھا۔

میں نے اسے دیکھ کر کہا۔ ''مہاراجا! تو اب سو کر اٹھا ہے، کیا رات بھر جاگتا رہے گا؟''

''فیکے پتر! تو تو مجھ سے اچھی طرح واقف ہے، میں چاہوں تو ابھی پھر سو جاؤں۔'' وہ باتیں کرتا ہوا میرے کمرے میں آگیا۔

میرے سیل فون کی گھنٹی بجی تو میں نے جیب سے سیل فون نکالا، اسکرین پر غنی کا نام تھا۔ میں نے بٹن دبا کر سیل فون کان سے لگالیا۔ ''ہاں غنی، بولو۔''

''سر، وہ ناصر صاحب آئے ہیں۔'' غنی نے کہا۔

''تو انہیں اندر لے کر آؤ۔'' میں نے کہا اور سیل فون دوبارہ جیب میں ڈال لیا۔

''کون آیا ہے؟'' راجا نے پوچھا۔ ''تو کسے اندر بلا رہا ہے؟''

''یار، وہ ناصر آگیا۔'' میں نے کہا۔ ''وہ یقیناً پوسٹ مارٹم کی رپورٹ لے کر آیا ہوگا۔''

''فیکے پتر! تو تو یوں خوش ہو رہا ہے جیسے وہ تیرے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ لایا ہو۔'' راجا نے کہا۔

''فکر مت کر دمہا راجا!'' میں نے کہا۔ ''اگر یہی صورتِ حال رہی تو وہ دن دور نہیں جب کوئی اسی طرح ہمارے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ لاکر شہناز کو دے گا۔''

''اور اس کی ایک کاپی پکڑائے گا نور کو! یا ممکن ہے اس وقت تک نور کی جگہ کوئی چھٹی، ساتویں خاتون موجود ہوں۔''

''بس شروع کردی بکواس!''

''یہ بکواس شروع کس نے کی تھی فیکے پتر؟''

اس سے پہلے کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو گالیاں دیتے، تکیے اٹھا اٹھا کر مارتے کہ ہمیں خاموش ہوجانا پڑا کیونکہ میرے کمرے کے باہر قدموں کی آہٹیں سنائی دے رہی تھیں، دروازے پر دستک ہوئی تو میں پہچان گیا کہ یہ غنی ہے۔

''ہاں غنی!'' میں نے کہا۔

''سر، یہ ناصر صاحب......''

''اندر بھیج دو بھئی۔'' میں نے کہا۔

دوسرے ہی لمحے دروازہ کھول کر ناصر اندر داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ سردی کی شدت میں مزید اضافہ ہوگیا ہے۔ اس نے چمڑے کی جیکٹ پہن رکھی تھی۔

''آیئے ناصر صاحب!'' میں نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا تو اس کے ہاتھ بھی برف کی طرح سرد ہورہے تھے۔

''خیریت تو ہے ناصر صاحب۔'' میں نے کہا۔ ''اسلام آباد اور پنڈی میں برف باری شروع ہوگئی ہے؟''

''فیکے پتر!'' راجا نے مخصوص انداز میں کہا۔ ''تو پاگل تو نہیں ہوگیا۔ اسلام آباد اور پنڈی میں بے وقت برف باری کب ہوتی ہے۔''

''آپ لوگ میرا مذاق مت اڑائیں۔ میں اصل میں پنڈی سے موٹر سائیکل پر آرہا ہوں۔''

ایک دم مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ بے چارہ مہمان تھا۔ اس کی مزاج پرسی کے بجائے ہم فضول بکواس کرنے لگے تھے۔

''سوری یار ناصر!'' راجا نے کہا۔ ''ہمیں معلوم نہیں تھا کہ تم اتنی شدید سردی میں موٹر سائیکل پر اتنا لمبا سفر کرو گے۔''

''یار مہاراجا! کسی ملازم سے کہہ کافی کے لیے......اور ناصر صاحب! آپ ادھر میرے پاس آجائیں۔ صوفے کے بجائے بیڈ پر بیٹھیں۔''

''میں ٹھیک ہوں رفیق صاحب!'' ناصر ہنس کر بولا اور آگے بڑھ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ ''میں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ لے آیا ہوں۔''

''ویری گڈ!'' میں نے کہا۔

دستک دے کر ملازم کافی کی ٹرالی دھکیلتا ہوا اندر داخل ہوا۔ ٹرالی پر رکھے ہوئے سامان کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ کافی ریشم نے تیار کی ہے۔ ٹرالی میں کافی کے علاوہ دیگر لوازمات بھی تھے۔

''آپ نے کھانا کھایا؟'' میں نے پوچھا۔ ''ناصر صاحب! تکلف بالکل مت کیجیے گا۔''

''میں کبھی تکلف نہیں کرتا۔'' ناصر نے ہنس کر کہا۔ ''کھانے پینے کے معاملے میں تو بالکل نہیں۔ میں نے کھانا تو نہیں کھایا ہے لیکن میرا موڈ ہورہا تھا کہ ہلکا پھلکا کچھ کھاؤں۔ یہاں تو کافی کے ساتھ بہت کچھ ہے۔'' دو کپ کافی پینے اور کئی سینڈوچز اور انڈے کھانے کے بعد ناصر کے چہرے پر کچھ تازگی آئی۔ میں اور راجا بھی کافی ختم کرچکے تھے۔ ناصر نے چمڑے کی جیکٹ اتار دی تھی، پھر اس نے پوسٹ مارٹم رپورٹس نکال کر میرے سامنے دکھ دیں اور بولا۔ ''رفیق صاحب! آپ کے دونوں گارڈز کو پہلے کھانے پینے کی کسی چیز میں بے ہوشی کی دوا دی گئی ہے؟ پھر ان بے چاروں کو بہت آرام سے ذبح کردیا گیا۔ اسی لیے کمرے میں مزاحمت کے آثار نہیں تھے۔''

''یہ ہوٹل کے کسی ملازم کا کام ہے۔'' راجا نے کہا۔

''ہاں، پولیس نے شبہے میں ہوٹل کے دو ویٹرز، فلور منیجر اور جنرل منیجر کو گرفتار کرلیا ہے۔ تا اطلاع ثانی ان لوگوں سے پوچھ کچھ جاری تھی لیکن اصل پوچھ کچھ تو شروع ہوئی ہے رات بارہ بجے کے بعد۔ آپ نے یہ بات نوٹ کی ہوگی کہ تھانہ انچارج اور دوسرے افسر دن بھر تھانے میں موجود نہیں ہوتے لیکن رات کو سبھی موجود ہوتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ رات کے وقت انہیں ہر طرح سے پوچھ کچھ تفتیش کرنے کی کھلی آزادی ہوتی ہے، پھر وہ زیرِ تفتیش ملزمان کے لواحقین سے مک مکا بھی اسی وقت کرتے ہیں۔ تو اصل تفتیش تو اب شروع ہوئی ہوگی۔''

''ہوٹل کے کتنے ملازمین کو پولیس نے شاملِ تفتیش کیا ہے؟'' راجا نے پوچھا۔

''دو ویٹرز، ایک فلور منیجر، ایک کک اور جی ایم صاحب کو حوالات لے گئے ہیں وہ لوگ۔''

''یار، وہ جی ایم تو مجھے بہت سیدھا سادا اور شریف بندہ لگ رہا تھا۔'' راجا نے کہا۔

''راجا صاحب! وہ جس طرح گھبراہٹ کا شکار تھا، اسے دیکھ کر تو مجھے بھی اس پر شبہ ہورہا تھا کہ یہ اتنا پریشان کیوں ہے۔''

''یار، میری سمجھ میں یہ نہیں آرہا کہ ان غریب لوگوں کا کوئی دشمن بھی ہوسکتا ہے۔'' راجا نے کہا۔

''یار! ممکن ہے نواب صاحب کا دشمن انہیں دہشت زدہ کرنا چاہتا ہو۔ ایسے بے شمار کیس میری نظروں سے گزرے ہیں کہ محض خوفزدہ کرنے کے لیے لوگ بے گناہوں کا خون بہادیتے ہیں۔''

''راجا! کسی ملازم سے کہو کہ وہ ناصر صاحب کے لیے مہمانوں والا کمرا کھول دے۔''

''آپ زحمت نہ کریں رفیق صاحب!'' ناصر نے کہا۔ ''میں ابھی واپس جاؤں گا۔''

''موٹر سائیکل پر؟'' راجا نے ہنس کر کہا۔

''ہاں یار!'' ناصر نے جواب دیا۔ ''اس وقت تو یہی ہماری شاہی سواری ہے۔''

''میرا تو خیال ہے کہ آپ آرام کریں۔'' میں نے کہا۔ ''جانا اتنا ہی ضروری ہے تو صبح منہ اندھیرے نکل جایئے گا۔''

''یار، تیرے وہاں کون سے کام پھنسے ہوئے ہیں؟'' راجا نے کہا۔ ''دو دو دن تو آفس نہیں جاتا بلکہ خبریں باہر سے بھجوا دیتا ہے، پھر کون سا صبح تجھے آفس جانا ہے؟''

''اچھا یار! نہیں جاتا۔'' ناصر نے کہا۔ ''اب میں کل سہ پہر تک نکلوں گا۔''

''اپنی بائیک یہیں چھوڑ دیں، میرا کوئی ڈرائیور آپ کو پنڈی تک چھوڑ آئے گا۔''

''نہیں رفیق صاحب!'' ناصر نے کہا۔ ''موٹر سائیکل کی ضرورت تو مجھے وہاں بھی ہوگی۔ میری گاڑی ٹھیک ہونے میں بھی کم سے کم دو تین دن تو لگ ہی جائیں گے۔''

''اچھا کل کی کل دیکھیں گے۔'' راجا نے کہا۔ ''ابھی تو تم جاکر خاموشی سے سو جاؤ۔''

راجا نے ملازم سے کمرا صاف کرنے کو کہہ دیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ملازم نے بتایا کہ کمرے کی صفائی ہوچکی ہے۔ میں نے ہیٹر بھی آن کردیا ہے۔

ناصر کو راجا خود مہمانوں والے کمرے تک چھوڑ کر آیا اور ایک سیکیورٹی گارڈ سے کہہ دیا کہ مہمان کا خیال رکھنا۔

راجا پھر میرے پاس آبیٹھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''مہاراجا! اگر آپ یہ سوچ کر میرے پاس بیٹھے ہیں کہ میں رات بھر الو کی طرح آپ کے ساتھ جاگوں گا تو یہ آپ کی خوش فہمی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''آپ تو پانچ چھ گھنٹے سو لیے تھا، اس لیے عربی النسل گھوڑے کی طرح تازہ دم ہیں۔''

''فیکے پتر!'' راجا نے کہا۔ ''یہ مت سمجھنا کہ میں تیرے جھانسے میں آجاؤں گا۔ میں جانتا ہوں کہ تو بھی دس بجے تک خوب ڈٹ کر سویا ہے۔''

''تو میں نے کب کہا کہ میں نہیں سویا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اب پھر سونا چاہتا ہوں۔''

''تو میرے ہاتھوں سے ہمیشہ کی نیند سوجائے گا فیکے پتر، اس لیے ان فضول باتوں سے گریز کر۔''

''اور تیری بکواس سنتا رہوں۔'' میں نے جھنجلا کر کہا۔

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''یار! تجھ سے گالیاں کھائے اور تجھے گالیاں دیے ہوئے کافی دن ہوگئے تھے۔ زندگی میں کچھ ادھورا پن سا تھا۔ بس اب تو سونا چاہتا ہے تو سو جا۔'' راجا اٹھ کھڑا ہوا۔ ''ہاں اگر نیند نہ آئے تو میرے کمرے میں چلے آنا یا مجھے بلا لینا۔'' راجا مسکراتا ہوا چلا گیا۔

وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ ہم لوگوں کو اس فضول بکواس کی عادت پڑ گئی تھی۔ دن میں اگر ایک دو دفعہ راجا سے جھگڑا نہ ہو تو مزہ ہی نہیں آتا تھا۔ اچھا دوست بھی اللہ کی نعمت ہوتا ہے۔

میں یہی سوچتا ہوا ایک بار پھر سو گیا۔

سوتے سوتے اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے اپنے بالکل قریب ایک ہیولا سا نظر آیا۔ میں نے اچانک لات چلائی۔ وہ پھرتی سے بیٹھ گیا۔ میں نے بیڈ سے چھلانگ لگائی اور اس کے منہ پر گھونسا مارنے ہی والا تھا کہ کوئی چیخا۔ ''مارنا مت رفیق!''

میرے کشیدہ اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ وہ نور تھی، میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''نور! تم اس وقت یہاں کیا کررہی ہو؟''

''تم تو مجھے یہاں بلا کر بھول ہی گئے ہو۔'' نور نے شکوہ کیا۔

''میں بھول گیا ہوں؟'' میں نے کہا۔ ''میڈم نور جہاں! آپ شاید بھول رہی ہیں کہ مابدولت نے تو آپ کو یاد فرمایا تھا لیکن آپ ہی نے ہماری درخواست کو سندِ قبولیت عطا نہیں فرمائی۔''

''اس وقت میں تمہارے پاس آکر بیٹھ جاتی تو وہ لوگ کیا سوچتے کہ نور تو لندن میں رہ کر بہت مغرور ہوگئی ہے، بات کو سمجھا کرو۔''

''جیسے اب تو سب آپ کی خوش اخلاقی کے گن گا رہے ہوں گے۔'' میں نے چڑ کر کہا۔

''یہ شہلا کون ہے؟'' نور نے اچانک پوچھا۔

''شہلا!'' میں نے حیران ہوکر کہا۔ ''میں نے بتایا تو تھا کہ......''

''ہاں تم نے بتایا تھا کہ وہ ڈاکٹر شہناز کی کزن ہے اور ڈاکٹر ہے......لیکن تم سے اس کا کیا تعلق ہے؟''

''مجھ سے...... وہی تعلق ہے جو شہناز کا ہے، ثمینا کا ہے، ریشم کا ہے۔''

''جھوٹ مت بولو، رفیق!'' نور نے کہا۔ ''میں نے

شاید پہلے بھی تمہیں بتایا تھا کہ عورتوں کے پاس ایک ساتویں حس بھی ہوتی ہے، اس کے ذریعے انہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ کہیں نہ کہیں کوئی گڑبڑ ہے۔''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے جان!'' میں نے محبت بھرے لہجے میں کہا اور اسے آغوش میں سمیٹنے کی کوشش کی۔

وہ مجھ سے کچھ دور ہو گئی اور بولی۔ ''پہلے یہ معاملہ صاف کر دو، پھر کچھ اور کہنا۔''

''اور تمہارے خیال میں معاملہ کیسے صاف ہوگا؟'' میں نے جھنجلا کر پوچھا۔

''مجھے سب کچھ سچ سچ بتا دو۔'' نور نے کہا۔

''ارے کچھ ہے ہی نہیں تو تمہیں کیا بتاؤں؟'' میں بھی سنجیدہ ہو گیا تھا۔

''ٹھیک ہے، اب اس حویلی میں ہم دونوں میں سے کوئی ایک ہی رہے گی۔'' نور نے تریاہٹ کا مظاہرہ کیا۔

''مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے، تم شہناز سے کہہ دینا کہ......''

''اس کی فکر تم مت کرو۔ میں شہناز سے بات کرلوں گی۔''

''تو پھر معاملہ صاف ہو گیا؟'' میں نے منہ بنا کر کہا۔

''ہاں۔'' نور کھلکھلا کر ہنسی اور میرے نزدیک آ گئی۔

''تم نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ تم شہناز سے کیا کہو گی؟''

''مجھے کیا کہنا چاہیے؟'' نور نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

''تم اسے صاف صاف بتا دینا کہ میں اب حویلی میں رہنا نہیں چاہتی اس لیے واپس لندن جا رہی ہوں۔''

''یں...... میں تو واپس نہیں جا رہی۔''

''بھی تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ اس حویلی میں تم رہو گی یا شہلا!'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

بات سمجھنے میں اسے ایک سیکنڈ لگا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے میرے سینے پر گھونسا مارا اور بولی۔ ''فضول باتیں مت کرو رفیق! میں جانتی ہوں کہ میری موت سے پہلے میری جگہ کوئی بھی نہیں لے سکتا۔'' نور نے کہا۔ ''اور تم بھی اچھی طرح جانتے ہو کہ اگر کوئی اور لڑکی تمہاری زندگی میں آئی تو میں اسے اپنے ہاتھ سے گولی مار دوں گی۔''

''اچھا، اب یہ شمشیر وسناں، توپ و تفنگ کی باتیں چھوڑو۔'' میں نے کہا اور اسے اپنی طرف گھسیٹ لیا۔

''ہاں، وہ ناصر بھی تو آیا ہے، وہ کیا خبر لایا ہے؟''

''وہ پوسٹ مارٹم رپورٹ لے کر آیا ہے۔ رپورٹ سے یہ معلوم ہوا ہے کہ دونوں گارڈز کو پہلے کھانے پینے کی کسی چیز میں خواب آور دوا کی بھاری مقدار دی گئی، پھر......'' میں بولتے بولتے رکا۔ ''لیکن یہ تم کیا باتیں لے بیٹھیں، اس موضوع پر ہم صبح بات کریں گے۔'' میں نے کہا اور اسے بانہوں میں بھر لیا۔

صبح میری آنکھ کھلی تو نور حسب معمول غائب تھی۔ میں جانتا تھا کہ وہ صبح کسی وقت اپنے کمرے میں چلی گئی ہوگی۔ میں تھوڑی دیر اسی طرح لیٹا رہا۔ میں اگر کچھ دیر اور اسی طرح لیٹا رہتا تو پھر سو جاتا۔ دروازے پر ہونے والی دستک نے مجھے جاگنے پر مجبور کر دیا۔ ''کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''غنی سر!'' باہر سے غنی کی آواز آئی۔

''آجاؤ۔'' میں نے کہا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

غنی کمرے میں داخل ہوا تو اس کے ہاتھوں میں مختلف اخبارات تھے۔

''کوئی خاص خبر ہے غنی؟'' میں نے پوچھا۔

''خاص الخاص سر!'' غنی نے کہا اور اخبار میرے سامنے ڈال دیا۔

ملک کے کثیر الاشاعت انگریزی روزنامے کے فرنٹ پیج پر ہوم منسٹر کے ساتھ میری تصویر تھی، اس کے نیچے چھوٹی سی دو کالمی خبر بھی تھی۔ ''ملک کے معروف سوشل ورکر اور ست بدھائی کے نواب رفیق احمد شیرازی نے ہوم منسٹر سے ملاقات کی۔ نواب صاحب نے ملک کے موجودہ حالات کے پیش نظر ہوم منسٹر کو مختلف تجاویز بھی دیں۔ واضح رہے کہ نواب رفیق احمد شیرازی برطانوی شہریت کے حامل ہیں اور لندن میں لارڈ رفیق کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ وہ یہاں بھی مختلف شعبوں میں سرمایہ کاری کرنا چاہتے ہیں اور وہ لاکھوں روپے کا زرمبادلہ ہر ماہ پاکستان بھیجتے رہتے ہیں۔''

دوسری خبر اندرونی صفحات پر تھی، اس کے ساتھ بھی میری ہی تصویر تھی۔ اس کے ساتھ ایک کالمی چھوٹی سی خبر بھی تھی۔ ''لندن کے لارڈ رفیق نے پولیس کے ڈائریکٹر جنرل سے ملاقات میں کہا کہ وہ پولیس کی تنظیم نو کے سلسلے میں حکومت کا ہاتھ بٹائیں گے۔''

خبروں سے زیادہ بڑی اور نمایاں میری تصاویر تھیں۔

ناصر تقریباً بارہ بجے میرے پاس پہنچا۔ رات کے مقابلے میں اس وقت وہ بہت تر و تازہ لگ رہا تھا۔ ناشتہ وہ اپنے کمرے ہی میں کر چکا تھا۔ وہ کمرے میں داخل ہوا تو میں نے ہنس کر کہا۔ ''ناصر صاحب! یہ آپ نے کیا کر دیا؟'' میں نے اخبار اس کی طرف بڑھا دیا۔

''اس کی آپ کو ضرورت تھی رفیق صاحب!'' ناصر

مسکرا کر بولا۔ ''اس طرح کی ایک ایک تصویر چیف منسٹر، پرائم منسٹر اور صدر پاکستان کے ساتھ ہو تو کوئی آپ کو ٹیڑھی آنکھ سے بھی نہیں دیکھ سکتا۔ میرا مطلب ہے کوئی سرکاری اہلکار!'' رفیق نے مسکرا کر کہا۔

''محض اس تصویر کی وجہ سے؟'' میں نے کہا۔

''جی ہاں۔ آپ تو ماشاءاللہ خود بھی نواب ہیں اور واقعی سوشل ورک کر رہے ہیں۔ میں نے تو ایسے لوگوں کو دیکھا ہے جنہوں نے کسی نہ کسی طرح کسی وزیراعلیٰ یا وزیر داخلہ کے ساتھ تصویریں بنوالیں اور اس تصویر کے ذریعے اپنے ایسے ایسے کام نکالے کہ آپ سنیں تو حیران رہ جائیں۔''

راجا کمرے میں داخل ہوا تو ناصر نے اسے اخبار دکھانا چاہا۔

''میں دیکھ چکا ہوں۔'' راجا نے کہا۔ ''بھئی ان کا چیف سیکیورٹی آفیسر ان کا پی آر او بھی ہے، اس نے اخبار میں یہ خبر دیکھی ہوگی۔ وہ فوراً دینہ اور جہلم کے ہر اسٹال سے اس اخبار کی تمام کاپیاں اٹھا لایا، دیکھنا، ابھی بچے بچے کے ہاتھ میں اخبار ہوگا۔'' پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ''ویکھے پتر! اس غنی نے تو تیری آدھی شہرت ہونے سے پہلے ہی ختم کر دی۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''یار، اخبار اسٹال پر ملتا تو بہت سے لوگ اسے پڑھتے لیکن وہ احمق تو ساری کاپیاں اٹھا لایا۔''

''غنی اتنا بے وقوف نہیں ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

اسی وقت غنی کمرے میں داخل ہوا۔

''غنی!'' راجا نے کہا۔ ''تم اس انگریزی اخبار کی کتنی کاپیاں لے آئے ہو؟''

''تین، چار لایا ہوں سر!'' غنی نے جواب دیا۔ ''اگر ضرورت ہے تو اور لے آؤں، یہاں کے لوگ تو ویسے بھی انگریزی اخبار کم پڑھتے ہیں، اسٹال والا بتا رہا تھا کہ میں اخبار کی دس کاپیاں لیتا ہوں، ان میں سے دو تین شام تک پڑی رہتی ہیں۔''

غنی نہ جانے اپنے کس کام سے میرے پاس آیا تھا۔ راجا کی باتوں میں الجھ کر وہ بھول ہی گیا کہ وہ کیوں آیا تھا؟

تھوڑی دیر بعد وہ پھر کمرے میں داخل ہوا اور بولا۔ ''ڈاکٹر شہناز صاحبہ کہہ رہی ہیں کہ انہیں لاہور جانے کے لیے گاڑی چاہیے۔''

''شہناز لاہور جا رہی ہے؟'' راجا بڑبڑایا۔ ''رات تو اس نے اس کا تذکرہ نہیں کیا تھا؟'' راجا اٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں ابھی آتا ہوں۔''

وہ تھوڑی دیر بعد واپس آیا اور بولا۔ ''یار، وہ شہلا لاہور جا رہی ہے۔ شہناز اس کو چھوڑنے کی بات کر رہی تھی۔''

شہلا لاہور جا رہی ہے؟ کہیں نور نے اس کے ساتھ الٹی سیدھی بات تو نہیں کر دی۔ وہ بہت معصوم اور حساس لڑکی ہے۔ یہ نور تو کبھی کبھی بہت خودغرض اور سفاک بن جاتی ہے۔

''قبلہ نواب صاحب!'' راجا نے کہا۔ ''نصیب دشمناں آپ کو کسی پریشانی نے تو نہیں گھیر لیا؟''

میں بغیر کچھ کہے وہاں سے اٹھ کر نور کے کمرے میں پہنچ گیا اور اس سے درشت لہجے میں کہا۔ ''نور! جب میں نے تم سے کل کہہ دیا تھا کہ میرے اور شہلا کے درمیان کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہے، پھر تم نے ایسا کیوں کیا؟''

''کیوں، اب کیا ہو گیا؟'' نور نے حیران ہو کر پوچھا۔

''شہلا لاہور جا رہی ہے۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

''تم نے اس سے کیا کہا ہے؟''

''میری تو اس سے یا شہناز سے کسی بھی قسم کی کوئی بات نہیں ہوئی ہے؟'' نور نے الجھ کر کہا۔

''پھر وہ لاہور کیوں جا رہی ہے؟''

''میں اسی سے پوچھ کر بتاتی ہوں۔'' نور نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

میں وہیں بیٹھا نور کے کمرے کا جائزہ لیتا رہا۔ اس کے آتے ہی اس کمرے سے وہ مخصوص مہک اٹھنے لگی تھی جو لڑکیوں کے کمروں سے اٹھتی ہے، اس میں پرفیوم، پاؤڈر اور کریموں کی خوشبو یکساں ہو جاتی ہے۔

وہ ہنستی ہوئی واپس آئی اور بولی۔ ''اس کے گھر سے فون آیا ہے، اس کی چھوٹی بہن کی طبیعت کچھ خراب ہے، اس نے ضد پکڑ لی ہے کہ شہلا آپی کو بلاؤ، بس اتنی سی بات ہے۔''

میں دل ہی دل میں نادم ہوا لیکن ڈھٹائی سے بولا۔ ''ابھی کچھ نہیں کہا ہے تو آئندہ بھی احتیاط کرنا۔''

باہر نکل کر میں نے غنی کو بلایا اور اس سے کہا کہ سرور سے کہو، وہ شہلا کو لاہور لے جائے گا۔

میں کمرے میں واپس آیا تو نہ وہاں راجا تھا، نہ ناصر! ملازم نے بتایا کہ راجا صاحب مہمان کے ساتھ باغ میں ہیں۔

شہلا باہر آئی تو اس کے ہاتھ میں اس کا ہینڈ بیگ بھی تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے ریشم اس کا چھوٹا سا سوٹ کیس اٹھائے چل رہی تھی۔

شہلا دیکھ کر رک گئی اور مجھے سلام کیا۔

میں نے سلام کا جواب دے کر پوچھا۔ ''شہلا تم لوٹو گی کب تک؟''

''شاید پرسوں یا دو دن بعد!'' اس نے ہنس کر کہا۔

''میں اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ اس دن گاڑی بھیج دوں۔''

''میں شہناز باجی کو یا آپ کو فون پر بتادوں گی۔'' اس نے کہا اور پورچ کی طرف بڑھ گئی جہاں سرور گاڑی لیے موجود تھا۔ سرور نے شہلا کے لیے دروازہ کھولا، پھر دروازہ بند کر کے اس نے شہلا کا سوٹ کیس ڈگی میں رکھا اور روانہ ہوگیا۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ اس وقت پونے گیارہ بجے تھے، پھر میں بھی راجا کی تلاش میں باغ کی طرف نکل گیا۔

ڈیڑھ بجے کے قریب ناصر نے روانگی کا ارادہ کیا۔ میں نے اس سے ایک مرتبہ پھر کہا کہ موٹر سائیکل چھوڑ دو۔ میرا ڈرائیور آپ کو پنڈی چھوڑ آئے گا لیکن وہ ہنس کر بولا۔

''رفیق صاحب! اب تو سردی بھی کم ہے، میں دن ہی دن میں لاہور......'' وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہوگیا۔ اس کی نظریں سامنے کی جانب جمی ہوئی تھیں۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''یہ کون ہے؟''

میں نے مڑ کر دیکھا تو میرا دل اچھل کر گویا حلق میں آگیا۔ وہ سرور تھا۔ اس کے سر اور بازو سے خون بہہ کر جم گیا تھا، چہرے کا آدھا حصہ بھی خون میں تر تھا۔

میں اس کی طرف بڑھا اور وحشت زدہ لہجے میں پوچھا۔ ''کیا ہوا سرور! سب خیریت تو ہے نا؟''

''میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں سر!'' یہ کہتے ہوئے سرور گرنے لگا۔

میں نے بڑھ کر اسے تھام لیا۔ میرے دل میں مختلف خدشات اور وسوسے سانپ کی طرح رینگ رہے تھے۔ میں سرور سے کچھ پوچھنا بھی نہیں چاہتا تھا کہ نہ جانے وہ کون سی خبر سنا دے۔ میں نے سرور کو دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا۔ پھر غنی نے اسے سنبھال لیا۔

''اسے اسپتال لے چلو۔'' میں نے کہا۔

غنی نے ایک گارڈ کو آواز دی اور اس سے اسٹریچر لانے کو کہا۔

گارڈ اسٹریچر لے کر آیا تو اس کے ساتھ شہناز بھی دیوانہ وار دوڑتے ہوئے آگئی اور وحشت بھرے لہجے میں بولی۔ ''سرور، کیا ہوا...... شہلا کہاں ہے؟''

اس وقت تک سرور بے ہوش ہو چکا تھا۔

''کیا ہوا رفیق! اس نے کچھ بتایا؟'' شہناز نے مجھ سے سوال کیا۔

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''یہ حویلی میں داخل ہوتے ہی بے ہوش ہو کر گر پڑا۔''

غنی اور دوسرا گارڈ اسٹریچر لے کر اسپتال کی طرف دوڑنے لگے۔

شہناز اور ڈاکٹر احمد حسن دونوں ہی سرور کے زخم دیکھنے لگے۔ اس کے جسم پر صرف دو زخم تھے، ایک زخم اس کے دائیں پیر پر تھا اور دوسرا سر پر۔ ڈاکٹر حسن نے فوراً اس کی مرہم پٹی کر دی۔ شہناز نے بھی اس کا بلڈ چیک کر کے اسے بلڈ لگا دیا۔

تھوڑی دیر بعد سرور نے آنکھیں کھول دیں اور حیرت سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

''سرور!'' میں نے اسے آواز دی۔

اس نے مجھے دیکھ کر اٹھنے کی کوشش کی۔

''لیٹے رہو۔'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ''اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟''

''میں ٹھیک ہوں سر!'' سرور نے کہا۔

''تمہیں کیا ہوا، تم زخمی کیسے ہوگئے؟'' میں نے دل کڑا کر کے پوچھا۔

اسی وقت راجا اور ناصر وہاں داخل ہوئے۔

''میں ڈاکٹر شہلا کو لے کر لاہور کے لیے نکلا تھا۔ میں جی ٹی روڈ پر پہنچا تو ایک ڈبل کیبن پک اپ میرے پیچھے لگ گئی۔ پہلے تو میں نے اسے اپنا وہم سمجھا۔ میں نے تصدیق کرنے کے لیے ایک جگہ گاڑی روکی اور اس کے ریڈی ایٹر میں پانی ڈالنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ وہ پک اپ بھی مجھ سے کچھ فاصلے پر رک گئی۔ میں چلتے چلتے یوں ہی ایک کچی سڑک پر مڑ گیا۔ وہ پک اپ بھی میرے پیچھے آنے لگی۔ میں نے سوچا کہ آگے جا کر نہ جانے یہ سڑک کہاں ختم ہو۔ کسی گاؤں میں یا کسی جوہڑ کے کنارے یا پھر آگے سڑک بند ہو، میں نے لمبا یوٹرن لے کر گاڑی واپس جی ٹی روڈ کی طرف موڑ دی۔ پک اپ بھی قدرے ترچھی ہو کر رک گئی، پھر میں نے دیکھا، وہ بھی یوٹرن لے کر میرے پیچھے آرہی ہے، میں نے گاڑی دوڑانا شروع کر دی، پک اپ نے بھی رفتار پکڑ لی اور میرے پیچھے چلنے لگی۔ مجھے یاد آیا کہ جب میں جی ٹی روڈ کے لیے مڑا تو وہ پک اپ پنڈی کی طرف جا رہی تھی یعنی بالکل مخالف سمت میں۔ مجھے معلوم ہی نہیں ہوا کہ کب وہ مڑی اور اس نے میرا پیچھا شروع کر دیا۔'' بولتے بولتے سرور ہانپنے لگا۔ غنی نے سہارا دے کر اسے اٹھایا اور پانی پلایا۔

پانی پینے کے بعد وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔

''میں ایک سو بیس کلومیٹر فی گھنٹا کی رفتار سے گاڑی دوڑا رہا تھا۔ اچانک میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ سڑک کے عین وسط میں ایک روڈ رولر کھڑا تھا۔ اس کی دونوں طرف تنگ سی جگہ تھی۔ میں نے ایمرجنسی بریک لگایا اور گاڑی کو روڈ رولر سے بچالیا۔ بریک لگانے سے شہلا بی بی اچھل کر پسنجر سیٹ سے ٹکرائی تھیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ ٹھیک تو ہیں ڈاکٹر صاحبہ؟ انہوں نے کہا ہاں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ پھر میں نے بائیں طرف کی تنگ سی جگہ سے نکلنا چاہا، اسی وقت جھاڑیوں میں سے نکل کر چار آدمی گاڑی کی طرف دوڑے اور دروازہ کھولنے کی کوشش کی۔ گاڑی کے دروازے لاک تھے، ان میں سے ایک نے مجھے ریوالور دکھایا اور کچھ بولا بھی جو میری سمجھ میں نہ آیا۔ اس وقت تک ان کا ایک ساتھی روڈ رولر کو سڑک کے بیچ سے ہٹا چکا تھا۔ ان کے ایک آدمی نے سڑک کے کنارے پڑا ہوا پتھر اٹھایا اور بائیں طرف دروازے پر دے مارا۔ شیشہ ٹوٹنے سے اس کے کچھ ٹکڑے میرے چہرے سے بھی ٹکرائے۔ اس وقت مجھے اتنا ہوش نہ تھا، میں تو صرف یہ سوچ رہا تھا کہ وہ لوگ ڈاکٹر صاحبہ کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں۔ ٹوٹے ہوئے شیشے میں سے ایک آدمی نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن میں نے ریوالور نکال کر اس کے ہاتھ پر فائر کر دیا۔ وہ چیخ مار کر پیچھے ہٹا، اچانک ڈرائیونگ سیٹ کی طرف دھماکا سا ہوا۔ اس دفعہ ان لوگوں نے میری طرف کا شیشہ توڑا تھا۔ پھر مجھے ایسا لگا جیسے میرے دائیں شانے میں کسی نے گرم گرم سلاخ گھسا دی ہو، فوراً ہی میرے سر پر دھماکا سا ہوا اور میں اسٹیئرنگ پر جھک گیا۔ انہوں نے ہاتھ ڈال کر لاک کھولا اور مجھے باہر کھینچ لیا۔ اس کھینچا تانی میں میرا ریوالور بھی ہاتھ سے گر گیا، مجھے ایک طرف دھکیل کر ان میں سے ایک آدمی اسٹیئرنگ پر بیٹھا اور بولا۔ ''کہہ دینا اس نواب کے نطفے سے کہ اگر اس چڑیا کی زندگی چاہتا ہے تو پچاس لاکھ روپے تیار رکھے۔ یہ ہم بعد میں بتائیں گے کہ اسے کہاں آنا ہے، ہاں اگر اس لڑکی کی زندگی اور عزت بچانا ہے تو پولیس کو اطلاع مت دینا ورنہ اس لڑکی کے ٹکڑے کر دیں گے۔'' وہ تیز رفتاری سے نکل گئے۔ میرا خون تیزی سے بہہ رہا تھا لیکن میں نے زخموں کی پروا کیے بغیر ایک گاڑی کو روکا۔ وہ میرا خون دیکھ کر گھبرا گیا اور میری بات سنے بغیر ہی چلا گیا۔ پھر میں نیم بے ہوش ہو کر سڑک کے کنارے گر پڑا۔ دینہ کی طرف جانے والی ایک سوزوکی وین کے ڈرائیور نے ترس کھا کر مجھے اٹھالیا اور بولا کہ میں تجھے تیرے گھر پہنچا سکتا ہوں لیکن اسپتال نہیں پہنچا سکتا، اس نے مجھے ست بدھائی کے نزدیک جی ٹی روڈ پر چھوڑ دیا۔ وہاں سے آدھا راستہ میں نے گرتے پڑتے طے کیا، پھر ہمارے ہی گاؤں کے ایک آدمی غلام رسول کی نظر مجھ پر پڑ گئی اور وہ مجھے حویلی کے دروازے پر چھوڑ گیا۔''

''جو لوگ ڈاکٹر صاحبہ کو لے گئے ہیں، ان کے حلیے بتا سکتے ہو؟'' ناصر نے پوچھا۔

''ہاں جی!'' سرور نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''جس نے پہلی دفعہ گاڑی کا شیشہ توڑا وہ اونچا لمبا جوان تھا۔ اس کا رنگ بھی سفید تھا، سر کے بال بھورے تھے۔''

''اس کے دائیں گال پر مسا تھا؟'' ناصر نے پوچھا۔

''مسا اس کے گال پر نہیں، اس آدمی کے گال پر تھا جس نے مجھے کھینچ کر گاڑی سے باہر نکالا، وہ بھی لمبا چوڑا جوان تھا۔ اس کا رنگ بھی سفید اور بال بندر کی طرح بھورے تھے۔''

''وہ گوگا بدمعاش کا گروہ تھا۔'' ناصر نے کہا۔

''گوگا بدمعاش!'' راجا نے چونک کر پوچھا۔ ''یہ لوگ تو فیصل آباد اور اس کے نواح میں وارداتیں کرتے تھے۔''

''ہاں، مجھے بھی یہ اطلاع ملی تھی۔'' ناصر نے کہا۔ ''لیکن ڈرائیور ان کا جو حلیہ بتا رہا ہے، وہ گوگا کا حلیہ ہے۔ دوسرا اس کا بھائی تھا۔ دونوں بھائی ہر واردات ایک ساتھ کرتے ہیں۔''

''مجھے ایک گاڑی چاہیے۔'' ناصر نے کہا۔ ''مضبوط اور تیز رفتار!''

''گاڑی تو مل جائے گی لیکن تم جاؤ گے کہاں؟ کیا تم گوگا کے ٹھکانے سے واقف ہو؟''

''میں ان کے گروہ کے ایک آدمی کا ٹھکانا جانتا ہوں، وہ گجرات میں رہتا ہے۔''

''اگر وہ گوگا کے ساتھ ہوا تو گجرات میں کب ملے گا؟'' راجا نے کہا۔

''ففٹی ففٹی چانسز ہیں۔'' ناصر نے جواب دیا۔ ''ممکن ہے، وہ اس واردات میں گوگا کے ساتھ نہ گیا ہو، ساتھ گیا بھی ہوگا تو رات تک گھر لوٹ آئے۔ ہم اسے وہیں پکڑ لیں گے۔''

''چلو، میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''سر! میں آپ کو اکیلا نہیں جانے دوں گا۔'' غنی نے کہا۔

میں نے راجا سے کہا۔ ''تم یہیں رکو، اس وقت شہناز کو تمہاری ضرورت ہے۔ اس وقت تو وہ سب کچھ بھول کر سرور کا علاج کر رہی ہے لیکن مجھے اندازہ ہے کہ اس کے دل پر کیا

گزر رہی ہوگی۔"
راجا نے اثبات میں سر ہلایا۔
میں نے غنی سے لینڈ کروزر نکالنے کو کہا۔
غنی پانچ منٹ کے اندر اندر گیراج سے گاڑی لے کر آ گیا۔ "کہاں چلوں سر؟" غنی نے گاڑی کا انجن اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔
"گجرات چلو۔" ناصر نے کہا۔
غنی نے جی ٹی روڈ پر پہنچ کر گاڑی کو راکٹ بنا دیا۔ لینڈ کروزر مضبوط انجن کی تیز رفتار گاڑی ہے، غنی تو یوں بھی برق رفتاری کا شوقین تھا۔
"اتنی اسپیڈ کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے اسے ٹوک دیا۔ "وہ شخص اگر گھر میں نہ بھی ہوا تو لوٹ کر گھر ہی آئے گا نا!"
غنی نے اسپیڈ کم کر دی۔ ہم گجرات پہنچے تو شام ڈھل رہی تھی۔
"وہ شخص کہاں رہتا ہے ناصر صاحب؟" میں نے پوچھا۔
"پہلے تو وہ یہاں کی ایک پس ماندہ بستی میں رہتا تھا۔ ڈاکے مارنا شروع کیے تو وہ کچھ خوش حال ہو گیا، پھر شہر کی ایک اچھی آبادی میں مکان بنا لیا۔"
"اس کے بیوی بچے بھی اس کے ساتھ رہتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔
"اس نے ابھی تک شادی نہیں کی ہے۔" ناصر ہنس کر بولا۔
"لیکن ناصر صاحب!" میں نے کہا۔ "آپ ایک جرائم پیشہ شخص کو کیسے جانتے ہیں؟ وہ بھی اتنی تفصیل سے؟"
ناصر ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ "وہ دراصل اکو میرے ساتھ ہی پڑھتا تھا، جب تک میرے والد زندہ تھے۔ ہم لوگ گجرات ہی میں رہتے تھے، اکو نے پہلے چھوٹی موٹی چوریاں شروع کیں، پھر آہستہ آہستہ وہ پختہ ہو گیا اور ڈاکے ڈالنے لگا۔ جب اس نے پہلی واردات کی تھی، ابا جی نے اسی وقت اس سے ملنے پر پابندی لگا دی تھی۔ پھر ہم لوگ پنڈی آ گئے۔ ابا جی نے پنڈی میں مکان خرید لیا تھا۔ اکو سے میری دوستی تھی اس لیے ابا جی سے چوری چھپے میں کبھی کبھار اس سے مل لیتا تھا۔ میں اسے بہت سمجھاتا تھا کہ چوری چکاری چھوڑ دے اور کوئی کام شروع کر دے لیکن وہ نہ مانا اور آخر ڈاکے کے الزام میں اسے پانچ سال قید ہو گئی۔ ہم لوگ اس وقت تک پنڈی آ چکے تھے۔ اکو کو بھی اڈیالہ جیل بھیج دیا گیا۔ میں یہاں بھی اس سے ملتا رہا۔ میرا خیال تھا کہ وہ جیل سے سدھر کر نکلے گا لیکن وہاں اس کی ملاقات کو گے کے کسی ساتھی سے ہو گئی۔ بس پھر وہ جیل سے رہا ہوتے ہی ایک مرتبہ پھر ڈاکے ڈالنے لگا۔ اس مرتبہ وہ اغوا برائے تاوان کی وارداتیں بھی کرنے لگا تھا۔ اس کی اطلاع پر میں نے کئی مرتبہ پولیس کو اس کے ٹھکانے کے بارے میں بتایا لیکن ہر دفعہ پولیس کے پہنچنے سے پہلے ہی وہ لوگ وہاں سے نکل جاتے تھے۔ بعد میں اکو ہی نے بتایا کہ پولیس کے کچھ لوگ بھی ہمارے ساتھ شامل ہیں۔ ہر تھانے میں ہم نے ایک دو بندے خرید رکھے ہیں۔ جب ہمارے خلاف کوئی کارروائی ہوتی ہے ہمیں پہلے ہی اطلاع مل جاتی ہے اور ہم نکل جاتے ہیں۔ میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ اکو! میرے راستے میں کبھی مت آنا ورنہ یا تو ایک دن تو میرے ہاتھوں مارا جائے گا یا پھر پولیس کے شکنجے میں جکڑ جائے گا۔"
گاڑی گلی کے نکڑ پر رکوا کر ناصر گلی میں روانہ ہو گیا۔ یہ نچلے متوسط طبقے کی آبادی تھی۔ غنی نے گاڑی ایک محفوظ جگہ پر پارک کر دی۔ میں گاڑی سے اتر کر ناصر کا انتظار کرنے لگا۔ غنی بھی میرے ساتھ آ کر کھڑا ہو گیا۔

اس دلچسپ ترین کہانی کے بقیہ واقعات نویں حصے میں ملاحظہ فرمائیں۔

قسمت کے پھیر میں اُلجھے ایک نوجوان کی داستان

اناڑی

احمد اقبال

9

قسمت کے پھیر میں اُلجھے ایک نوجوان کی کتھا، حالات اور واقعات کا بہاؤ اُسے دیارِ غیر لے گیا جہاں وہ اناڑی تھا مگر خود کو کسی کھلاڑی سے کم نہیں سمجھتا تھا۔ ایسا کھلاڑی جسے کسی بساط پر شکست نہیں دی جا سکتی تھی۔ اس کا اناڑی پن اُسے کھلاڑیوں کے مقابل کامیابیاں دلاتا رہا۔ اُسے پردیس راس آ گیا تھا جہاں کی ہنگاماں خیزیاں اُس کا دل لبھاتی تھیں مگر دوسری طرف دیس میں اس کی لاٹری کھل گئی، ایسی لاٹری کہ جس کے بعد اُسے لوٹنا تھا۔ اناڑی سے کھلاڑی بننے کے بعد...... وہ لوٹا...... تو ہنگامے اور شرارتیں اس کے ساتھ تھیں۔ قدم قدم پر آنسو اور لحہ قہقہوں سے لبریز اُس اناڑی کی کہانی جس کا دل دو حصوں میں منقسم تھا۔

اناڑی دولہا

خوب صورت و گل رنگ جذبوں سے گندھی ایک تیز رفتار کہانی

تھوڑی دیر بعد ناصر ایک گھر سے باہر نکلا تو اس کے ساتھ دہرے گٹھیلے بدن کا ایک جوان تھا۔ اس کا رنگ سیاہ اور کان بڑے بڑے تھے۔ میں نے غنی کو گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر خود بھی بیٹھ گیا۔

ناصر اس آدمی کے ساتھ گلی سے باہر نکلا اور گاڑی دیکھ کر سیدھا ہماری طرف آنے لگا۔ اس کے ساتھ آنے والے کی نظر جیسے ہی مجھ پر پڑی وہ بھڑک کے ایک دم بھاگا۔ ناصر اس کے پیچھے دوڑا اور اسے پکڑ لیا۔ وہ چھوٹنے کے لیے دیوانہ وار ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ ناصر نے اس کی کنپٹی پر ہلکا سا ہاتھ مارا۔ وہ بے ہوش ہو کر ناصر کے ہاتھ میں جھول گیا۔

اس دوران میں وہاں محلے کے لوگ اکٹھے ہو گئے۔

''کیا ہوا، کیا ہو گیا باؤ جی؟'' کئی آوازیں آنے لگیں۔

ناصر نے کہا۔ ''یار، اس کی طبیعت کچھ خراب ہے۔ میں اسے ڈاکٹر کے پاس لے جا رہا ہوں۔ تم لوگ ذرا اسے میری گاڑی تک پہنچاؤ۔''

دو تین آدمیوں نے اکو کو اٹھایا اور گاڑی کی عقبی سیٹ پر لٹا دیا۔

ناصر بھی فوراً ہی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ غنی نے سرعت سے گاڑی آگے بڑھا دی۔

آن کی آن میں غنی نے گاڑی جی ٹی روڈ پر چڑھا دی اور تیز رفتاری کے سابقہ ریکارڈ توڑنے لگا۔ ناصر نے احتیاطاً اکو کو ایک ہاتھ اور مار دیا۔ جب ہم لوگ ست بدھائی پہنچے تو رات کے نو، ساڑھے نو کا عمل ہو گا۔ میں اکو کو لے کر سیدھا تہ خانے میں چلا گیا۔ وہ ابھی تک بے ہوش تھا۔ غنی نے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔

مجھے دیکھ کر وہ ایک دم اٹھ بیٹھا۔ ''م...... میرا...... میرا کوئی قصور نہیں ہے جناب! میں تو ان لوگوں کے ساتھ واردات میں شریک بھی نہیں تھا۔''

''کس کی بات کر رہے ہو تم؟'' غنی نے ڈپٹ کر پوچھا۔

''گوگے نے ان کا بچہ اٹھایا تھا۔ میں نے بہت کہا کہ بچے کو چھوڑ دو لیکن وہ نہیں مانا۔''

''بچہ!'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''تم کس بچے کی بات کر رہے ہو؟''

''آپ کے بچے کی جناب!'' اکو نے کہا۔ ''اسے ہم نے لاہور سے اٹھایا تھا اور گوگے نے بیس لاکھ روپے مانگے تھے۔''

''گوگا اس وقت کہاں ہو گا؟'' غنی نے پوچھا۔

''وہ...... اس وقت...... پتا نہیں...... جی...... وہ تو''

''دیکھو، اگر سچ بولو گے تو تمہاری جان بچ جائے گی اور سزا بھی معاف ہو جائے گی۔ اگر جھوٹ سے کام لیا تو میں تمہیں قتل کر کے یہیں کہیں دبا دوں گا۔'' میں نے سفاک لہجے میں کہا۔

پھر ناصر بھی اچانک سامنے آ گیا۔

وہ ناصر کو دیکھ کر برس پڑا۔ ''اوئے تو خود کو دوست کہتا

ہے میرا؟ ایسے ہوتے ہیں دوست؟''

''دوست تو ایسا ہی ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''دوست وہ ہے جو تمہیں برائی سے روکے۔ ناصر بھی تمہیں برائی سے روکتا رہا ہے۔ تم اگر اب بھی سچ بولو تو تمہارا دوست تمہیں سزا سے بھی بچا سکتا ہے۔''

''شاباش اکو!'' ناصر نے کہا۔ ''بتا دے کہ گوگا اور اس کے ساتھی اس وقت کہاں ہوں گے؟''

''کیا ان لوگوں نے پھر کوئی واردات کی ہے؟'' اکو نے پوچھا۔

''اس بات کو چھوڑ اکو!'' ناصر نے کہا۔

''اگر واردات کی ہوگی تو وہ سب اس وقت لاہور میں تجمل کے ڈیرے پر ہوں گے۔ اگر واردات نہیں کی ہوگی تو الگ الگ ہوں گے۔''

''یہ تجمل کا ڈیرا کہاں ہے؟'' ناصر نے پوچھا۔

''اس کا ڈیرا ملتان روڈ پر ہے۔ وہ جگہ لاہور سے بھی چھ سات کلومیٹر دور ہے۔'' وہ آہستہ آہستہ ناصر کو تجمل کے ڈیرے کا پتا بتانے لگا۔

میرے سیل فون کی بیل اچانک بج اٹھی۔ اسکرین پر شہلا کا نام دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ میں نے جلدی سے بٹن دبا کر فون کان سے لگا لیا۔ ''ہیلو!'' میں نے کہا۔

''ہاں، نواب صاحب! تمہاری یہ چہیتی ہمارے قبضے میں ہے۔''

''کس کی بات کر رہے ہو تم؟'' میں نے ٹھہر کر کہا۔

''لو، خود ہی اس سے بات کر لو۔'' یہ کہہ کر اس نے شاید سیل فون شہلا کی طرف بڑھا دیا۔

مجھے شہلا کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو...... نواب صاحب! یہ لوگ پتا نہیں مجھے کیوں اٹھا لائے ہیں، اس جگہ میرا دم گھٹ رہا ہے نواب صاحب!...... یہ لوگ مجھے مار دیں گے۔''

''تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔'' میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''میں......''

''جی نواب صاحب!'' مجھے دوسری طرف سے کسی کی آواز سنائی دی۔ ''اب بتایئے، کیا کہتے ہیں آپ؟''

''تم لوگ کیا چاہتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ بیس لاکھ روپے تیار رکھیں، اب ہم صبح کے وقت فون کریں گے۔''

''دیکھو اگر اس لڑکی کو کوئی نقصان پہنچا تو اچھا نہیں ہوگا۔''

''اچھا!'' دوسری طرف سے بولنے والا طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''تو کیا کریں گے آپ؟''

''میں...... تم لوگوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

''پہلے تو اپنی اس بلبل کی خیر منائیں نواب صاحب!'' بولنے والے نے کہا۔ ''اگر آپ چاہتے ہیں کہ اسے کوئی تکلیف نہ پہنچے تو پولیس کے کانوں میں بھنک نہ پڑنے دیجیے گا۔''

''نہیں بتاؤں گا۔'' میں نے کہا۔ ''پیسے لے کر کہاں آؤں؟''

''اتنی جلدی مت کریں نواب صاحب!'' وہ شخص ہنس کر بولا۔ ''آپ رقم تیار رکھیں۔'' یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

غنی نے اکو کو ایک گارڈ کے حوالے کیا اور خود ہمارے ساتھ تہ خانے سے نکل آیا۔

ہماری گاڑی ایک مرتبہ پھر جی ٹی روڈ پر دوڑ رہی تھی۔ اس مرتبہ ہمارا رخ لاہور کی طرف تھا۔

لاہور پہنچتے پہنچتے ہی ساڑھے بارہ بج گئے۔ آدھا گھنٹا تجمل کا ڈیرا ڈھونڈنے میں لگا۔ معلوم ہوا وہ کوئی اینٹوں کا بھٹہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی تجمل کا گھر تھا جو عرف عام میں تجمل کا ڈیرا کہلاتا تھا۔ تجمل علاقے کا بااثر آدمی تھا۔ بھٹے کے سلسلے میں اس کے تعلقات جرائم پیشہ لوگوں سے بھی تھے۔ کسی واردات کے بعد وہ لوگ تجمل کے پاس ہی جایا کرتے تھے۔ تجمل نہ صرف ان سب کو اپنے گھر میں پناہ دیتا تھا بلکہ مغوی یا مغویہ کے لواحقین سے رقم کی وصولی کا کام بھی کرتا تھا۔ وہ اپنی اس محنت کا صلہ پچیس فیصد کی شرح سے وصول کرتا تھا یعنی اگر بیس لاکھ روپے تاوان ہو تو اس میں سے پانچ لاکھ روپے تجمل کے ہوتے تھے۔

تجمل کا ڈیرا دیکھنے کے بعد ناصر نے ایک دو جگہ فون کیے، پھر علاقے کے تھانے میں پہنچ گیا۔

حسب توقع تھانے میں بڑا صاحب موجود تھا۔ ناصر نے اسے اپنا کارڈ دکھایا تو وہ سراپا انکسار بن گیا اور ہنس کر بولا۔ ''ناصر صاحب! ایس ایس پی جناب سے ٹیلی فون کرانے کی کیا ضرورت تھی۔ آپ فرمائیں کیا خدمت کریں ہم؟''

ناصر نے اسے مختصراً بتایا کہ گوگے نے نواب صاحب کے اسپتال کی ایک ڈاکٹر کو اغوا کر لیا گیا ہے، مجھے اغوا کرنے والوں کا پتا معلوم ہو گیا ہے۔

''اچھا جی!'' ایس ایچ او نے ہنس کر کہا۔ ''لو، آدھے سے زیادہ کام تو آپ نے خود کر لیا بادشاہو!''

''ہم باقی کام بھی کر سکتے ہیں لیکن قانون کو اپنے ہاتھ میں لینا نہیں چاہتے۔'' پھر وہ مجھ سے بولا۔ ''نواب صاحب! آپ ڈی جی صاحب سے کہہ دیں کہ ایس ایچ او......'' اس نے انسپکٹر کی جیب پر نام کی پٹی پڑھتے ہوئے کہا۔ ''ہاں شیر افضل صاحب، انہوں نے یقین دلایا ہے کہ کام آج ہر قیمت پر کریں گے۔ کہنے لگے کہ آپ نے ڈی جی صاحب کو ناحق اس وقت تکلیف دی آپ تو ان کا صرف نام لے لیتے تو کام ہو جاتا...... جی شیر افضل! جی ہاں، میں کام ہونے کے بعد آپ کو فون کرتا ہوں۔'' میں نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

ایس ایچ او کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اپنے محکمے کے افسر اعلیٰ کے نام سن کر اس کی حالت خراب ہو گئی تھی۔

وہ سنبھل کر بولا۔ ''یہ آپ نے اچھا کیا نواب صاحب کہ آپ نے ڈی جی صاحب سے یہ کہہ دیا کہ شیر افضل تو آپ کا نام سن کر ہی کام کرنے کو تیار ہو گیا تھا۔''

''سمجھا کریں شیر افضل صاحب!'' ناصر مسکرا کر بولا۔ ''میرے خیال میں اب چلنا چاہیے، ہاں وہاں میں نے اپنے بھی کچھ آدمی کھڑے کر دیے ہیں۔ مجرم اگر وہاں سے نکلیں گے تو انہیں فوراً معلوم ہو جائے گا۔''

انسپکٹر کے غبارے کی رہی سہی ہوا بھی نکل گئی۔ اگر وہ مجرموں کو خبردار کرنے کے بارے میں سوچ بھی رہا تھا تو اب ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ یوں بھی ایس ایس پی اور ڈائریکٹر جنرل جیسے افسران جس کیس میں دلچسپی لے رہے ہوں، ایس ایچ او کی کیا مجال کہ اس سے انکار کرے۔

شیر افضل نے اس وقت تھانے میں موجود دو موبائلیں تیار کرنے کا حکم دیا۔ آدھے گھنٹے بعد ہم لوگ پھر ملتان روڈ کی طرف جا رہے تھے اس مرتبہ ہماری گاڑی کے پیچھے پیچھے پولیس کی دو موبائل وین بھی تھیں۔ تجمل کے ڈیرے سے کچھ فاصلے پر غنی نے گاڑی روک دی اور پولیس والوں کو بتایا کہ اس بھٹے کے ساتھ جو پختہ مکان ہے، ملزمان وہیں روپوش تھا۔

''یہ تو تجمل کا ڈیرا ہے۔'' موبائل کے ساتھ آنے والے ایک اے ایس آئی نے بے ساختہ کہا۔

''اوئے ڈیرا کسی کا بھی ہو۔ اس وقت تو ہمیں ڈی جی صاحب کا حکم ماننا ہے، چلو آگے بڑھو۔''

پولیس نے دو طرف سے اس مکان کو گھیر لیا۔ ناصر ہمیں لے کر اس طرف چلا گیا جہاں پولیس نے کوئی توجہ نہ دی تھی حالانکہ ملزم وہاں سے بھی فرار ہو سکتے تھے۔ وہاں ایک ڈبل کیبن پک اپ دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ ہم بالکل صحیح جگہ پہنچے ہیں۔

ناصر نے پک اپ کے سب ٹائروں کی ہوا نکال دی۔

مکان کے اندر اچانک زلزلہ سا آ گیا۔

پولیس کا ایک افسر میگافون پر چیخ رہا تھا۔ ''تم لوگ چاروں طرف سے گھیر لیے گئے ہو اس لیے فرار ہونے کی کوشش مت کرنا۔''

مکان کے اندر سے بھاگ دوڑ کی آوازیں آئیں، پھر ایک چھوٹا سا دروازہ آہستگی سے کھلا۔ میں دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑا ہو گیا۔ سب سے پہلے لمبے قد کا ایک آدمی باہر نکلا۔ اس نے کسی کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور اسے کھینچ کر لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ لڑکی شہلا تھی۔ اس کے منہ پر ان لوگوں نے کپڑا باندھ دیا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ بندھے ہوئے تھے، صرف پاؤں آزاد تھے تاکہ اسے آسانی سے باہر لے جا سکیں۔

میں نے اچانک ریوالور کی نال لمبے آدمی کی کن پٹی پر رکھ دی اور سرد لہجے میں بولا۔ ''اپنی گن پھینک دو، بھاگنے کی کوشش مت کرنا ورنہ گولی مار دوں گا۔''

اس نے اپنی گن پھینک دی اور ہاتھ سر سے اونچے اٹھا لیے۔ پھر میں نے اس شخص کو غنی کے حوالے کیا اور شہلا کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنی طرف گھسیٹ لیا۔ عقبی راستہ ناہموار تھا اس لیے شہلا کو چلنے میں بہت دشواری ہو رہی تھی۔ وہ بار بار ٹھوکر کھاتی تھی۔

میں نے جھپٹ کر اسے کندھے پر اٹھایا اور اپنی گاڑی کی طرف بھاگا۔ شہلا کو گاڑی کی عقبی نشست پر بٹھایا تو مجھے معلوم ہوا کہ ان لوگوں نے اس کی آنکھوں پر پٹی بھی باندھ رکھی ہے۔ میں نے پہلے اس کی آنکھوں سے پٹی ہٹائی۔

اس کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ خوشی کے مارے رونے لگی۔ میں نے اس کے منہ پر بندھا ہوا غلیظ کپڑا ہٹایا تو معلوم ہوا کہ اس کے منہ کے اندر بھی کپڑا ٹھونسا گیا تھا۔ میں نے اس کے منہ سے بھی کپڑا نکال لیا۔ شہلا نے گہرے گہرے کئی سانس لیے، پھر میں نے پانی کی بوتل اس کے حوالے کر دی۔

وہ ایک سانس میں آدھی بوتل پی گئی۔

''ذرا صبر سے کام لو شہلا! زیادہ پانی مت پیو۔'' میں نے اس کے ہاتھ بھی کھول دیے اور اسے آرام سے لیٹ جانے کو کہا۔

وہاں اغواکاروں نے باقاعدہ پولیس سے مقابلہ شروع کر دیا تھا۔ عقبی دروازے سے نکلنے والوں کو غنی نے فائرنگ کر کے دوبارہ اندر جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ پھر غنی نے جھپٹ کر وہ دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ ان کا ایک آدمی ہمارے قبضے میں تھا۔

ناصر نے اسے دیکھا تو بولا۔ ''نواب صاحب! یہی گوگا ہے۔''

''یہ گوگا ہے؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''یہ تو مجھے اپنے انداز و اطوار سے پڑھا لکھا لگ رہا ہے۔''

''میں پڑھا لکھا بھی ہوں۔'' گوگا نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''اب میں ان پولیس والوں کو نہیں چھوڑوں گا۔ مجھ سے اور تجمل سے ہر مہینے بھاری رقم بھی وصول کرتے ہیں اور خود ہی مجھے پکڑنے آ گئے۔''

''رشوت خور یہی کرتے ہیں گوگا صاحب!'' ناصر نے کہا۔ ''اگر ان کے مفادات کو نقصان پہنچ رہا ہو تو یہ لوگ اپنے سگے بھائی کو بھی نہ چھوڑیں۔''

ایک گھنٹے کی جدوجہد کے بعد پولیس نے تجمل اور گوگا سمیت ان کے تقریباً سبھی آدمی پکڑ لیے تھے۔ صرف وہ لوگ ہی بچیں ہوں گے جو اس وقت گوگا کے ساتھ نہیں تھے۔

ایس ایچ او نے مجھ سے کہا۔ ''نواب صاحب! ان لوگوں کے قبضے سے کوئی لڑکی تو برآمد نہیں ہوئی اور میں ان پر کون سی دفعہ لگاؤں۔ یہ تو صبح ہی ضمانتیں کرا لیں گے۔''

''اور اگر لڑکی برآمد ہوتی تو؟''

''تب تو میں ان لوگوں کو کم سے کم پانچ سال یا سات سال کے لیے جیل بھجوا دیتا۔''

''چلیے، پھر میں آپ کو بتا دوں کہ لڑکی برآمد ہو گئی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اسے گوگا پچھلے دروازے سے لے کر بھاگ رہا تھا کہ ہم نے اسے پکڑ لیا۔''

انسپکٹر نے دل ہی دل میں مجھے ایک غلیظ گالی دی ہو گی، پھر آہستہ سے بولا۔ ''لڑکی کہاں ہے؟''

''میں نے اسے اپنی گاڑی میں بٹھا دیا تھا۔ آپ چلیں، میں لڑکی کو پولیس اسٹیشن لے کر پہنچتا ہوں۔''

پھر ایک گھنٹا مزید پولیس کی کارروائی میں لگا۔ وہ شہلا کو بھی ہمارے ساتھ نہ جانے دیتے لیکن یہاں پھر ناصر کی دھونس کام آئی۔ جب اس نے دو چار افسران بالا کے نام لیے تو ایس ایچ او پھر سے ہمارا اور عوام کا خادم بن گیا۔ اس نے شہلا کا بیان لیا، اس سے دستخط کرائے اور ہمیں جانے کی اجازت دیدی۔

میں نے شہلا سے پوچھا۔ ''تم لاہور جاؤ گی یا ست بدھائی چلو گی؟''

''اب اس وقت لاہور کہاں جاؤں گی۔ آپ ست بدھائی ہی لے چلیں۔ ویسے بھی اس حلیے میں گھر پہنچی تو امی ابو خوامخواہ پریشان ہو جائیں گے۔''

اس کی بات ٹھیک تھی۔ اس کا حلیہ ایسا نہیں تھا کہ اسے گھر لے جایا جاتا۔ اس کے والدین ایسے دہشت زدہ ہوتے کہ اسے دوبارہ ست بدھائی بھیجنے پر راضی ہی نہ ہوتے۔ ان لوگوں نے شہلا کو میری وجہ سے ہی اغوا کیا تھا۔ ممکن ہے ان لوگوں نے شہلا کو میری بہن یا بھتیجی وغیرہ کچھ سمجھا ہو۔

میں نے یہی سوال شہلا سے کیا تو وہ بولی۔ ''وہ لوگ آپ کی گاڑی پہچانتے تھے۔ آپ اپنی جاگیر میں اس گاڑی میں ہوتے ہیں۔ گاڑی دیکھتے ہی انہوں نے یوٹرن لے لیا ورنہ وہ لوگ تو جہلم جا رہے تھے۔ وہ سمجھ رہے تھے کہ میں...... آپ...... کی......'' اس نے سر جھکا لیا۔

''اچھا! وہ لوگ ایسا سمجھ رہے تھے۔ انہیں عمروں کا فرق بھی محسوس نہیں ہوا، کہاں ایک کم سن لڑکی اور کہاں مجھ جیسا خرانٹ بوڑھا!''

''آپ بوڑھے تو نہیں ہیں۔'' شہلا نے ہنس کر کہا۔ ''ینگ مین'' شہلا نے خوش دلی کا مظاہرہ کیا۔ ''ویسے میں آپ کی احسان مند ہوں کہ آپ نے خود کو خطرے میں ڈال کر میری جان بچالی۔''

''اگر ان لوگوں کا سراغ نہ ملتا، تو میں ان کا مطالبہ پورا کر کے تمہیں چھڑا لیتا۔''

''اس کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ وہ گورا آدمی جسے سرور نے اپنے ریوالور سے زخمی کر دیا تھا، بار بار یہی کہہ رہا تھا کہ یہ لڑکی مجھے پسند آ گئی ہے بھائی! اسے واپس مت کرو۔''

''واپس نہ کرتے تو کیا کرتے؟'' میں نے کہا۔ ''انہوں نے مجھ سے بیس لاکھ کا مطالبہ کیا تھا، ان کے بیس لاکھ تو مارے جاتے۔''

''وہ بھورا یہ چاہتا تھا کہ وہ اگر مجھے واپس بھی کریں تو میری عزت......'' شہلا پھر سر جھکا کر خاموش ہو گئی۔

ہم لوگ ست بدھائی پہنچے تو صبح کاذب کا دھندلکا ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔

شہناز، شہلا سے لپٹ کر یوں روئی جیسے وہ اس کی سگی بیٹی ہو۔ واقعی وہ شہلا کو بہنوں کی طرح چاہتی تھی۔ راجا بھی بہت خوش تھا۔ شہناز نے تو باقاعدہ شہلا کا طبی معائنہ کر ڈالا کہ اسے کہیں چوٹ تو نہیں آئی ہے۔ اس کی پیشانی اور گردن پر چھوٹی چھوٹی خراشیں تھیں۔ وہ خراشیں بھی اسے گاڑی کا شیشہ ٹوٹنے سے آئی تھیں۔

نور بھی بہت خوش تھی۔ میں تھکا ہارا اپنے کمرے میں آیا تو میری پلکیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ نور نے مجھے بستر پر لٹایا اور خود دبے پاؤں باہر نکل گئی۔

میں نیم غنودگی کی کیفیت میں تھا کہ میرے سیل فون کی بیل بجنے لگی، پہلے تو میں اسے نظر انداز کرتا رہا لیکن ایک دفعہ کال ختم ہونے کے بعد فون کرنے والے نے دوبارہ کال کی تو میری نیند اڑ گئی۔ میں نے جھنجلا کر سیل فون اٹھایا اور بٹن دبا کر اسے کان سے لگا لیا۔

''ہیلو!'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''ہیلو، رفیق!'' دوسری طرف سے آنے والی آواز سن کر میرے گویا چودہ طبق روشن ہو گئے تھے۔

☆☆☆

دوسری طرف رابعہ تھی۔ میرا خون کھولنے لگا۔ میں نے بھنا کر پوچھا۔ ''تم آخر چاہتی کیا ہو؟''

''میں بہت مصیبت میں ہوں رفیق!'' رابعہ نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

''میری طرف سے جہنم میں جاؤ۔'' میں نے دانت پیسے۔

''فون بند مت کرنا رفیق!'' وہ جلدی سے بولی۔ ''پہلے میری بات سن لو!'' اس کی آواز میں التجا تھی۔

''کیا اب بھی کچھ باقی رہ گیا ہے؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''نہیں...... سب کچھ ختم ہو گیا ہے۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے خود تباہ کر لیا۔'' وہ اب رو رہی تھی۔

''تم نے کیا یہی بتانے کے لیے مجھے فون کیا ہے؟'' میں جھنجلا کر بولا۔

''میری جان خطرے میں ہے رفیق!''

''تو پھر مر جاؤ۔'' میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ اس وقت مجھے اپنا لہجہ خود بھی اجنبی سا لگا۔ ''میرے لیے تو تم اسی دن مر گئی تھیں جب تم نے زوہیب کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تھا۔''

''اتنے سنگ دل مت بنو رفیق! میری جان واقعی خطرے میں ہے۔''

''تو پھر میں کیا کروں؟'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔

''مجھے بچا لو رفیق! اسی طرح ایک دن فریال نے تمہیں مدد کے لیے پکارا تھا۔''

''دیکھو رابعہ! اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں۔'' میرے انداز میں بے زاری تھی۔

''میری جان خطرے میں ہے اور......''

''مجھ سے کیا چاہتی ہو؟'' میں نے جھلا کر پوچھا۔

رابعہ نے کہا۔ ''میں اس وقت زندگی اور موت کے درمیان گھری ہوئی ہوں۔ جب تم فریال کی مدد کر سکتے ہو تو میری مدد کیوں نہیں کرو گے؟''

''بار بار فریال کا طعنہ مت دو رابعہ!'' میں نے کہا۔

''میں طعنہ نہیں دے رہی بلکہ تمہیں یاد دلا رہی ہوں۔ میں تو پھر تمہارا خون ہوں، خاندان کی عزت اور آخری نشانی، تم......''

''بس کرو رابعہ!'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''یہ ڈراما ختم کرو، مجھے سونے دو اور خود بھی سو جاؤ۔''

''تمہیں یہ ڈراما لگ رہا ہے؟'' رابعہ سسک کر بولی۔ ''میں دشمنوں میں گھری ہوئی ہوں، موت آہستہ آہستہ میری طرف بڑھ رہی ہے اور تم اسے ڈراما کہہ رہے ہو؟''

''اب تک تم ڈرامے ہی کرتی آئی ہو، میں اسے اور کیا سمجھوں؟''

''میری بات کا یقین کرو رفیق!''

''چلو، میں نے یقین کر لیا۔'' میں نے تضحیک آمیز لہجے میں کہا۔ ''اب مجھے سونے دو۔''

''تم میری بات کا یقین کیوں نہیں کرتے رفیق! یقین تو تمہیں اس وقت آئے گا جب میری لاش جھاڑیوں یا کسی کھڈ میں ملے گی۔''

''تمہاری لاش تو مجھے مل چکی ہے۔'' میں نے اپنا تضحیک و تحقیر آمیز لہجہ برقرار رکھا۔ ''میں تو اسے دفن بھی کر چکا ہوں۔''

''وہ دلاور کی ایک چال تھی رفیق!'' رابعہ نے کہا۔ ''میں اس کے چنگل میں اس بری طرح پھنسی ہوں کہ میرا اب تک زندہ رہنا بھی کسی معجزے سے کم نہیں ہے۔''

''تم دلاور کو کیسے جانتی ہو؟''

''میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گی لیکن پہلے مجھے یہاں سے نکال لو رفیق! میں ابھی مرنا نہیں چاہتی...... میں جینا چاہتی ہوں۔'' وہ بری طرح رونے لگی۔

''تم اس وقت کہاں ہو؟'' میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''میں اس وقت ایک گاؤں میں ہوں۔''

''ویری گڈ ڈیئر کزن! تمہارا بھی جواب نہیں ہے، تم نے مجھے اتنا ہی احمق سمجھ لیا ہے کہ میں تمہاری ہر بے سروپا بات پر یقین کرلوں گا اور وہاں دوڑا چلا آؤں گا؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اور وہاں پہنچوں تو دشمن میری گھات میں ہوں۔''

''تم......''

''بس رابعہ!'' میں نے اسے جھڑک دیا۔ ''اب یہ اپنی فضول بکواس بند کرو اور مجھے سونے دو۔'' میں نے سلسلہ منقطع کردیا۔

نیند میری آنکھوں سے اڑ چکی تھی۔ اس الو کی پٹھی رابعہ نے بھی مجھے کاٹھ کا الو سمجھ لیا تھا کہ وہ بلائے گی اور میں دوڑا دوڑا چلا جاؤں گا۔

اچانک میرے کانوں میں اپنی ہی آواز آئی۔ ''قبلہ نواب صاحب! رابعہ اگر اس حد تک گری ہے تو اس کا سبب بھی آپ ہیں، آپ ہی کی وجہ سے اس کے ماں باپ کی جان گئی۔''

''جھوٹ بولتے ہو تم!'' میں نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ اگر رابعہ سچ بول رہی ہے تو اس کا سیل فون آف ہوگا۔ وہ ہمیشہ یہی تو کرتی تھی۔ سیل فون کو ٹریس کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ یہ بات وہ خود بھی جانتی ہوگی لیکن اس کے دل میں تو چور تھا۔ میں نے سیل فون اٹھا کر رابعہ کا نمبر ملا دیا۔ مجھے یقین تھا کہ رابعہ کا سیل فون بند ہوگا۔

یہ جان کر مجھے حیرت ہوئی کہ رابعہ کا سیل فون آن تھا۔ اس نے پہلی ہی گھنٹی پر کال ریسیو کرلی۔ ''مجھے یقین تھا کہ تم میری مدد ضرور کرو گے۔'' رابعہ نے کہا۔ ''دیکھو رفیق! میں واقعی بہت مصیبت میں ہوں۔ اب تم ہی مجھے اس مصیبت سے نکال سکتے ہو۔''

''تم نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ میں تمہاری مدد کروں گا۔ میں ایک مرتبہ پھر تمہارے جال میں پھنسنا نہیں چاہتا۔''

''تم نے ابھی تک میری بات کا یقین نہیں کیا ہے۔ میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں رفیق! ممکن ہے یہ رات میری زندگی کی آخری رات ہو۔''

''مجھے تمہاری عقل پر حیرت ہے رابعہ! تم نے میری جان لینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی، تم کس منہ سے مدد کی بات کررہی ہو؟''

''وہ میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی رفیق! میں دشمنوں کی باتوں میں آگئی تھی۔ میں اپنے مرے ہوئے ماں باپ کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ اس دفعہ میں تمہیں کوئی دھوکا نہیں دے رہی ہوں۔''

''اچھا یہ بتاؤ!'' میں نے کچھ سوچ کر کہا۔ ''تم اس وقت کہاں ہو؟''

''میں اس وقت لاہور میں ہوں۔'' رابعہ نے جلدی سے جواب دیا۔

''اور تمہیں کس سے خطرہ ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے کئی طرف سے خطرہ ہے رفیق! زوہیب...... دلاور اور پولیس! یہ سبھی میری جان کے درپے ہیں۔''

''پولیس!'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''پولیس سے تمہیں کیا خطرہ ہے؟''

''دلاور نے پولیس کو بھی میرے پیچھے لگا دیا ہے۔ اس وقت سب سے بڑا خطرہ مجھے پولیس ہی کی طرف سے ہے۔ دلاور کے ساتھی بھی میری گھات میں ہیں اور رانا تو اسی وقت سے میرا دشمن ہے جب میں کورٹ نہیں پہنچی تھی۔''

''یہ سب تمہارا ہی کیا دھرا ہے رابعہ! خود کردہ را علاج نیست!'' یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کردیا۔

میرے سر میں دھماکے سے ہورہے تھے۔ رابعہ نے مجھے عجیب پریشانی میں مبتلا کردیا تھا۔ مجھے بہت سی باتوں کا جواب نہیں ملا تھا۔ وہ کورٹ کیوں نہیں پہنچی تھی؟ اس کی موت کا ڈراما کس نے کیا تھا اور اس کا مقصد کیا تھا؟ رابعہ لندن کیوں گئی تھی اور پاگل پن کا ڈراما کیوں رچایا تھا؟ اور سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ دلاور سے رابعہ کا کیا تعلق تھا؟ ان سب سوالوں کا جواب فوری طور پر رابعہ ہی دے سکتی تھی۔ میں سوچتا رہا اور کروٹیں بدلتا رہا۔ رابعہ کیا واقعی کسی مصیبت میں ہے؟ نہ جانے کیوں مجھے افسوس ہورہا تھا۔ اس نے سوچا ہوگا کہ کزن ہونے کے ناتے میں اس کی مدد ضرور کروں گا۔ اسے مجھ سے اس صاف جواب کی توقع نہیں ہوگی۔ میں نے فریال کی مدد بھی تو ایسے موقعے پر کی تھی جب وہ میری زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکل چکی تھی۔ اسی کی وجہ سے مجھ پر چودھری سلطان کے قتل کا الزام آیا تھا اور مجھے ضمانت قبل از گرفتاری کرانا پڑی تھی۔ اس کے باوجود میں اس کی مدد کو دوڑ پڑا تھا۔ رابعہ تو میرے مزاج سے اچھی طرح واقف تھی۔ اسے یقین تھا کہ بدترین تعلقات کے باوجود میں اس کی مدد ضرور کروں گا۔

اچانک سیل فون کی بیل بجی تو میں چونک اٹھا۔ جو بیڈ پر بالکل میرے کان کے پاس پڑا تھا۔ گھنٹی کی آواز بھی

ہتھوڑے کی طرح میرے سر میں لگ رہی تھی۔ میں نے سیل فون کان سے لگالیا۔ ''ہیلو!''

''رفیق!'' دوسری طرف سے رابعہ کی آواز سنائی دی۔ ''مجھے امید نہیں تھی کہ تم اتنے بدل جاؤ گے۔ میں معافی کے قابل تو نہیں ہوں، اس کے باوجود تم سے معافی مانگ رہی ہوں۔ ہوسکے تو میری ہر غلطی کو معاف کردینا۔ میں نے تمہیں بہت پریشان کیا ہے، بہت دکھ دیے ہیں۔ اب شاید میں تم سے کبھی بات نہ کروں۔''

''سنو رابعہ!'' میں نے بے اختیار کہا۔ ''تم اس وقت ہو کہاں؟''

''اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے مائی ڈیئر کزن!'' رابعہ کی آواز آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھی۔ ''میں اب تم سے، سب سے بہت دور جارہی ہوں۔ میں زندہ نہ زوہیب کے ہاتھ آؤں گی، نہ دلاور کے۔ میں اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی جان لے رہی ہوں۔''

''رابعہ!'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''مزید کوئی حماقت مت کرنا۔ مجھے اپنا صحیح پتا بتاؤ، میں آرہا ہوں۔''

''میں لاہور کے ایک محلے دارو غہ والا میں ہوں۔ تم لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچو۔ میں خود تم سے رابطہ کرلوں گی۔ پلیٹ فارم نمبر سات پر!''

''کوئی حماقت کرنے کی ضرورت نہیں رابعہ!'' میں نے کہا۔ ''میں آرہا ہوں۔''

میں نے عجلت میں کپڑے تبدیل کیے۔ بغلی ہولسٹر لگائے اور اوپر سے چمڑے کی جیکٹ پہن لی۔ ہر طرح سے تیار ہوکر میں حویلی کے صدر دروازے کی طرف بڑھا۔ گاڑیوں کی چابیاں گارڈ روم میں ہوتی تھیں۔

گارڈز مجھے دیکھ کر مستعد ہوگئے۔ میں نے ایک گارڈ سے کہا۔ ''مجھے لینڈ کروزر نکال دو۔''

''او کے سر!'' گارڈ نے کہا اور تیزی سے چلا گیا۔

میں اس کے انتظار میں کھڑا تھا کہ اچانک میرے عقب سے غنی کی آواز آئی۔ ''سر! اس وقت آپ کہاں جارہے ہیں؟''

''میں اس وقت انتہائی ضروری کام سے جارہا ہوں۔''

''آپ مجھے جگا لیتے۔ میں گاڑی لے کر آتا ہوں۔''

''میں اکیلا ہی جارہا ہوں غنی!'' میں نے سرد لہجے میں کہا تاکہ وہ مجھ سے زیادہ سوال نہ کرے۔

''سر! اس وقت آپ کا تنہا جانا ٹھیک نہیں ہے۔ مجھے تو آپ اپنے ڈرائیور کی حیثیت سے لے جاہی سکتے ہیں۔''

میں نے سوچا کہ غنی کو بھی ساتھ لے لوں۔ پھر مجھے خیال آیا کہ اسے ساتھ نہ لے جانا زیادہ مناسب ہے۔ میں کب تک غنی کا سہارا تلاش کرتا رہوں گا۔ میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''تم سے جتنا کہا جائے اتنا ہی کیا کرو۔''

غنی نے سر جھکا لیا۔ اس وقت تک دوسرا گارڈ میری گاڑی گیراج سے نکال لایا تھا۔

لینڈ کروزر مضبوط انجن کی سبک رفتار گاڑی تھی۔ میں نے حویلی سے باہر نکلتے ہی اسے دوڑانا شروع کردیا۔ ست بدھائی سے جی ٹی روڈ تک راستہ کچا لیکن ہموار تھا۔ اس کچے راستے پر بھی لینڈ کروزر ہوا سے باتیں کررہی تھی۔

جی ٹی روڈ پر آنے کے بعد میں نے گاڑی کو گویا جیٹ فائٹر بنا دیا۔ میری نظر اسپیڈ میٹر پر پڑی۔ اس کی سوئی ایک سو پینتیس اور ایک سو بیس کے درمیان تھرک رہی تھی۔ رفتار خطرناک حد تک تیز تھی۔ اس تیز رفتاری میں کچھ بھی ہوسکتا تھا۔ میرا ہاتھ ذرا سا بہکتا اور گاڑی قابو سے باہر ہوکر دائیں یا بائیں طرف کھیتوں میں گھس جاتی۔ میں نے رفتار کچھ کم کردی۔ رات کے وقت ہائی وے پر عموماً مال بردار ٹرکوں کا راج

ہوتا ہے۔ ٹرک ڈرائیور اس وقت بڑی سے بڑی گاڑی کو راستہ دینے پر آمادہ نہیں ہوتے۔ آپ لاکھ ہارن بجائیں لیکن ان کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔ اس میں ان بیچاروں کا بھی کوئی تصور نہیں ہوتا۔ ہر ٹرک پر ٹنوں کے حساب سے سامان لادا جاتا ہے۔ اگر وہ راستہ دینے کے چکر میں ایک دفعہ کچے میں اتر جائیں تو پھر مشکل ہی سے سڑک پر آتے ہیں۔ بعض اوقات تو ٹرک سامان سمیت الٹ جاتا ہے۔ اب یہ ڈرائیور کی مہارت ہے کہ وہ ٹنوں وزنی اس متحرک مشین کو منزلِ مقصود پر پہنچا کر ہی دم لیتے ہیں۔

مجھے وہ واقعہ یاد آیا جب جاپان سے سوزوکی موٹرز کے مالکان پاکستان آئے تھے۔ انہوں نے یہاں عجیب وغریب تماشا دیکھا۔ چار پہیوں کی چھوٹی سی سواری میں اس کی بساط سے دگنے سے زیادہ سامان لدا ہوا تھا۔ انہوں نے حیرت سے پوچھا کہ یہ کون سی گاڑی ہے؟ جب انہیں معلوم ہوا کہ یہ ان ہی کی کمپنی کی سوزوکی پک اپ ہے تو وہ حیران رہ گئے۔ یہاں آئے دن ان شہروں میں اور شاہراہوں پر جو حادثات ہوتے ہیں، ان میں ایک بڑا سبب گاڑیوں کی فٹنس بھی ہے۔

اچانک میرے سامنے ایک بلند وبالا دیوار آ گئی۔ شکر ہے کہ وہ دیوار حرکت کر رہی تھی۔ میں نے اپنی گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی روشنی میں دیکھا۔ وہ کوئی دیوہیکل ٹرک تھا جس پر بھوسا لدا ہوا تھا۔ بھوسے کی بوریاں گویا آسمان تک چلی گئی تھیں اور ٹرک سے دائیں بائیں بھی وہ ناجائز تجاوزات کی طرح پھیلی ہوئی تھیں۔ اس ٹرک نے پوری سڑک کو گھیر لیا تھا۔ مجبوراً مجھے بھی اپنی طوفانی رفتار کم کرنا پڑی۔ میں نے چاہا کہ گاڑی کچے میں اتار کر بائیں طرف سے نکل جاؤں لیکن وہاں کی زمین ایسی نہیں تھی کہ نکلا جا سکے۔ کیونکہ وہ ناہموار تھی دائیں طرف سے نکلنے میں بھی خطرہ تھا۔ میں سامنے سے آنے والے کسی ٹرک یا تیز رفتار گاڑی سے ٹکرا سکتا تھا۔

ٹرک کا بایاں انڈیکیٹر روشن تھا۔ اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ٹرک بائیں طرف مڑنا چاہتا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ پیچھے والی گاڑی اوورٹیک نہ کرے کیونکہ سامنے سے ٹریفک آ رہا ہے۔

ہائی وے کے ڈرائیوروں نے اپنے مخصوص اشارے بنا رکھے ہیں۔ جو لوگ ہائی وے پر سفر کرتے ہیں، وہ ان اشاروں کو سمجھتے ہیں۔ دائیں جانب کا انڈیکیٹر روشن ہونے کا مطلب یہ ہے کہ پیچھے والی گاڑی کا ڈرائیور اب اوورٹیک کر سکتا ہے، راستہ صاف ہے۔

میں اگر اس ٹرک کے اشارے کا انتظار کرتا تو جی ٹی روڈ میں ہی صبح ہو جاتی۔ ٹرک کچھوے کی رفتار سے چل رہا تھا۔ ٹرک والے کو ہارن دینا بے کار تھا۔ اچانک بائیں طرف کچی زمین ہموار دکھائی دی۔ میں نے لینڈ کروزر کی رفتار بڑھائی اور اسے کچے میں اتار دیا۔ وہ زمین اتنی بھی ہموار نہیں تھی جتنی میں سمجھ رہا تھا۔ گاڑی اچھلتے کودتے آگے بڑھی۔ میں نے انتہائی خطرناک انداز میں اس ٹرک کو اوورٹیک کیا اور یہ دیکھ کر جھنجلا گیا کہ اس سے آگے بھی ایک اتنا ہی بڑا ٹرک تھا۔ مجھ پر جھلاہٹ طاری ہو گئی۔ میں نے اسی حالت میں گاڑی دوڑائی اور دوسرے ٹرک کو بھی اوورٹیک کر لیا۔ اگر میں حاضر دماغی سے کام نہ لیتا تو میری گاڑی یا تو الٹ جاتی یا پھر ٹرک سے بری طرح ٹکرا جاتی۔ میرے سامنے اچانک مٹی کا ایک تودا آ گیا، میں نے بجلی کی سی تیزی سے گاڑی کا اسٹیئرنگ دائیں طرف موڑا۔ گاڑی اچھلتی ہوئی ٹرک کے بالکل قریب سے گزری۔ ٹرک میں سے کسی نے چیخ کر مجھے گالی دی لیکن میں اس کی پروا کیے بغیر گاڑی کو پختہ سڑک پر لے گیا۔ سخت مٹی کے اس تودے سے گاڑی بس انچوں کے حساب سے بچ کر نکل گئی۔ پختہ سڑک پر آتے ہی میں پھر تیز رفتاری کے ریکارڈ توڑنے لگا۔ اس وقت اگر ٹریفک پولیس کا کوئی افسر مجھے دیکھ لیتا تو مجھے کچھ لیے بغیر نہ چھوڑتا۔ ٹرک والے یہ سمجھے ہوں گے کہ اس لینڈ کروزر کا ڈرائیور نشے میں ہے۔

ان خطروں سے کھیلنے کا یہ فائدہ ہوا کہ آگے جا کر مجھے سڑک بالکل صاف ملی۔ میں لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچا تو فجر کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ گاڑی کو پارک کر کے میں دوڑتا ہوا ریلوے اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہوا۔ لاہور کا ریلوے اسٹیشن دنیا کے بڑے بڑے ریلوے اسٹیشنز میں سے ایک ہے۔ کل تک میں یہ بات فخر سے کرتا تھا لیکن اس وقت مجھے شدید جھنجلاہٹ ہو رہی تھی۔ رابعہ نے بھی چھپنے کے لیے بہت بہترین جگہ کا انتخاب کیا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ اس نے مجھے پلیٹ فارم نمبر سات پر آنے کو کہا تھا۔

میں نے احتیاطاً دو پلیٹ فارم ٹکٹ خرید لیے کہ ممکن ہے رابعہ کے پاس بھی پلیٹ فارم ٹکٹ نہ ہو اور ہم فضول میں مزید ایک پریشانی میں مبتلا ہو جائیں۔

میں نے دوڑتے ہوئے ایک ریلوے پل عبور کیا اور دوسری طرف پہنچ گیا لیکن وہ پلیٹ فارم نمبر پانچ تھا۔ میں نے پل سے جانے کے بجائے نیچے ہی سے جانا مناسب سمجھا اور دائیں بائیں دیکھ کر پٹڑیوں پر کود گیا۔ دوسری طرف دو ہے کا

جنگلا تھا۔ اس میں ایک جگہ ریلوے ملازمین اور قلیوں نے اپنی آسانی کے لیے درمیان کی ایک سلاخ نکال کر راستہ بنا رکھا تھا۔ میں دوڑتا ہوا اس راستے سے گزر گیا۔

دیکھنے والے یہی سمجھ رہے ہوں گے کہ مجھے کوئی ٹرین پکڑنا ہے۔

پلیٹ نمبر سات تک پہنچتے پہنچتے میرا سانس دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ اس وقت پلیٹ فارم بالکل سنسان تھا۔ شاید وہاں سے اس وقت کسی بھی گاڑی کی آمد یا روانگی نہیں تھی۔ کونوں کھدروں اور تاریک گوشوں میں کچھ لوگ پڑے سو رہے تھے۔ ان میں زیادہ تر فقیر اور نشے باز تھے۔ آگے ایک بینچ پر مجھے ایک دیہاتی گھرانا بھی دکھائی دیا۔ مرد سامان پر لیٹا سو رہا تھا اور اتنے خوفناک خراٹے لے رہا تھا کہ اردگرد پڑے ہوئے فقیر اور ہیروئن کے عادی اس کے خراٹوں سے اٹھ کر بیٹھ گئے تھے اور اسے گندی گالیاں دے رہے تھے۔ اس خراٹے باز کے ساتھ ادھیڑ عمر کی ایک عورت اور دو جوان لڑکیاں بھی تھیں۔ ان کے علاوہ چھوٹے بڑے چار بچے تھے۔ وہ سب آڑھے ترچھے پڑے یوں سو رہے تھے، جیسے وہ ریلوے اسٹیشن پر سونے ہی آئے ہوں۔ انہیں دیکھ کر مجھے بچپن کی ایک تصویر یاد آ گئی۔ اٹھارہ سو ستاون کی جنگ آزادی کی خیالی تصویر تھی۔ آڑھی ترچھی بہت سی لاشیں پڑی ہوئی تھیں اور تصویر کے نیچے عنوان تھا۔ ''جنگ آزادی کے شہید!''

مجھے وہ لوگ بھی جنگ آزادی کے شہید ہی لگ رہے تھے۔

میں ان ''شہیدوں'' کو دیکھنے میں ایسا محو تھا کہ کچھ فاصلے پر استراحت فرمائے ہوئے ایک سائیں بابا پر چڑھ گیا۔ سائیں بابا بلبلا کر اٹھا تو اچانک میرا توازن بگڑ گیا اور میں وہیں گٹھری بنے ہوئے ایک کتے پر چڑھ گیا۔

کتے نے بری طرح غرا کر اپنے دانتوں سے میری پنڈلی پکڑنا چاہی۔ میں بدحواسی میں پیچھے ہٹا تو اس خراٹے باز پر جا پڑا۔ اس کے حلق سے ڈری ڈری آوازیں نکلیں اور اس نے اپنے مگدر جیسے ہاتھوں سے مجھے دبوچ لیا۔ اس ہڑبونگ میں خواتین کی آنکھ بھی کھل گئی اور وہ سب بری طرح چلانے لگیں اور ''چور چور'' کے نعرے بھی لگانے لگیں۔

میں نے بہ مشکل تمام خود کو اس خراٹے باز کی گرفت سے چھڑایا اور کھڑا ہو گیا۔ خواتین اب بھی چیخ رہی تھیں۔ ان کی چیخ پکار سے اردگرد سونے والے فقیر، محنت کش اور ہیروئنچی بھی اپنی اپنی زبان بولنے لگے تھے۔

''بند کرو یہ بکواس!'' میں دہاڑ کر بولا۔ ''ورنہ ایک ایک کو لے جا کر تھانے میں بند کر دوں گا۔''

میری اس دہاڑ کا خاطر خواہ اثر ہوا اور وہ سب چابی سے چلنے والے کھلونوں کی طرح یوں خاموش ہو گئے جیسے ان کی چابی ختم ہو گئی ہو۔

''کہاں جا رہے ہو تم لوگ؟'' میں نے ڈپٹ کر پوچھا۔

''حضور...... ہم لوگ...... وزیر آباد جائیں گے۔'' خراٹے باز بولا۔ اس کی آواز بھی بلغمی تھی۔

''کیا سوتے سوتے وزیر آباد پہنچ جاؤ گے؟'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔

''نہیں سرکار...... وہ...... ہماری گاڑی...... صبح ساڑھے سات بجے آئے گی۔'' مرد نے جواب دیا۔

اسی وقت دو تین قلی اور ریلوے کے دو ملازم وہاں پہنچ گئے۔ ایک ملازم نے ڈپٹ کر پوچھا۔ ''کیا ہو رہا ہے یہاں؟'' یہ کہہ کر وہ بری طرح کھانسنے لگا۔

''شٹ اپ!'' میں اسی پر الٹ پڑا۔ ''اپنے کام سے کام رکھو، سمجھے۔'' میں نے رواں انگریزی میں کہا۔

''جناب وہ''

''بس اب چلے جاؤ یہاں سے۔''

وہ سب حیران ہو کر مجھے دیکھنے لگے۔ وہ شاید اندازہ لگا رہے تھے کہ میرا تعلق کس محکمے سے ہو سکتا ہے؟ ان کے خیال میں جس کسی بھی محکمے کا تھا لیکن یہ طے تھا کہ کوئی بڑا افسر ہوں۔

''غصہ مت کریں سرکار!'' خراٹے باز خوشامد بھرے لہجے میں بولا۔

اس شخص کی یہ بات سن کر تو ان لوگوں کو یقین آ گیا ہوگا کہ میں کوئی چھوٹا آدمی نہیں ہوں۔ وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹ گئے۔

خراٹے باز نے اپنا پھیلا ہوا جسم سمیٹا اور مجھے تشریف رکھنے کی دعوت دی جسے میں نے قبول کر لیا۔

''تمہارے پاس کچھ پانی وغیرہ بھی ہے؟''

''بالکل ہے سرکار!'' وہ شخص بلغمی آواز میں بولا اور ایک جگہ سے کپڑا ہٹا دیا۔ میں اب تک یہی سمجھ رہا تھا کہ اس چادر کے نیچے بھی فقیر یا نشے باز ہوں گے لیکن وہاں تو اس کا سامان ڈھیر تھا۔ وہاں چھوٹے بڑے ٹین کے ٹرنک، دو تین بوریاں، کپڑوں کی گٹھریاں، برتن اور بستر وغیرہ تھا۔ اسی ڈھیر میں ایک طرف پانی کی صراحی بھی رکھی ہوئی تھی۔ اگر

صراحی پر ڈھکنا نہ ہوتا تو شاید میں پانی پینے سے انکار کر دیتا۔

میں نے پانی کا گلاس اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے پوچھا۔ ''تم کیا نقل مکانی کر رہے ہو؟''

وہ حیرت سے منہ کھولے مجھے دیکھتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ میں نے کیا پوچھا ہے۔

''میرا مطلب ہے کہ تم نے اپنا گاؤں چھوڑ کر کہیں اور جانے کا فیصلہ کر لیا ہے؟'' میں نے کہا۔

''او نہ جی نہ!'' وہ جلدی سے بولا۔ ''میں اپنی سسرال جا رہا ہوں۔ میری سسرال وزیر آباد میں ہے۔''

''کیا دو چار سال کے لیے؟'' میں نے ہنس کر پوچھا۔

''نہیں سرکار!'' وہ بلغمی آواز میں بولا۔ ''وہاں تو ہم لوگ صرف ایک مہینا رہیں گے۔ میرے سب سے چھوٹے سالے کی شادی ہو رہی ہے۔''

اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں اس شخص سے فضول کی بکواس میں الجھا ہوا ہوں۔ کیا رات کے اس پہر اپنی جان پر کھیل کر میں اسی لیے آیا تھا کہ ان کی بکواس سنوں؟

میں نے جیب سے سیل فون نکالا اور اس سے پہلے کہ میں رابعہ کا نمبر ملاتا، سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اسکرین پر رابعہ کا نام تھا۔

''ہاں رابعہ؟'' میں نے مضطرب ہو کر پوچھا۔ ''تم کہاں ہو؟''

''میں یہاں پلیٹ فارم نمبر ایک پر ہوں۔'' رابعہ نے جلدی سے کہا۔

''اچھا! میں آ رہا ہوں۔'' میں نے کہا اور ایک بار پھر تیزی سے پلیٹ فارم نمبر ایک کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں پہنچا تو رابعہ نے سیل فون پر کہا۔ ''رفیق! تم فرسٹ کلاس کی بکنگ کے پاس پہنچو!''

میرا دماغ گھوم گیا۔ الو کی پٹھی! مجھے یوں دوڑا رہی ہے جیسے فلموں میں اغوا کرنے والے تاوان لینے کے لیے لواحقین کو دوڑاتے ہیں۔ میں نے اس سے کچھ نہیں کہا اور خاموشی سے باہر نکل گیا۔

میں ابھی باہر نکلا ہی تھا کہ رابعہ نے پھر سیل فون پر کہا۔ ''سوری رفیق! میں تمھیں بہت تنگ کر رہی ہوں۔'' اس نے مجھے ایک دوسری جگہ بتاتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا۔ ''دیکھو رابعہ! مجھے نہیں معلوم۔ تم کس حال میں ہو لیکن اس بات کا یقین ہے کہ تمہاری جان کو خطرہ نہیں ہے ورنہ مجھے یوں نہ دوڑاتیں۔ اب مزید بھاگ دوڑ کے بجائے میں واپس جا رہا ہوں۔ مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ تم مجھے بے وقوف بنا رہی ہو۔''

''رفیق پلیز!'' رابعہ نے جلدی سے کہا۔ ''تم مجھ سے ملو گے تو تمہیں یقین آ جائے گا۔''

میں خاموشی سے اس طرف بڑھ گیا جہاں اس نے کہا تھا۔ پاکستان میں ہر ریلوے اسٹیشن پر مسافروں کے عارضی قیام کے لیے چھوٹے چھوٹے صاف ستھرے کمرے بنائے گئے تھے۔ ان کمروں میں مسافروں کو ہر سہولت میسر ہوتی تھی۔ بستر سے لے کر کھانے تک ہر چیز مہیا ہوتی تھی اور معاوضہ بھی برائے نام لیا جاتا تھا۔ یہ سلسلہ ہمارے ملک میں زیادہ چل نہ سکا۔ لوگوں نے ان کمروں کو باقاعدہ قیام کا ذریعہ بنا لیا۔ پھر کچھ مسافر بھی ان کمروں کو غلط مقاصد کے لیے استعمال کرنے لگے۔ اب وہ کمرے موجود تو تھے لیکن اب وہاں کوئی سہولت میسر نہیں تھی۔ وہ کمرے اب مقفل رہتے تھے، ان میں ریلوے کے ملازمین قیام کر لیتے تھے۔

میں سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا تو وہاں بالکل سناٹا تھا۔ میں نے اردگرد کا جائزہ لیا لیکن مجھے وہاں کوئی ذی روح دکھائی نہیں دیا۔

میں آہستہ آہستہ ان کمروں کی طرف بڑھا جہاں رابعہ نے مجھے بلایا تھا۔ وہ کمرے اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کوریڈور میں مدھم سا ایک بلب روشن تھا۔ اس کی روشنی اتنے طویل کوریڈور کے لیے ناکافی تھی۔

میں نے سیل فون پر رابعہ کا نمبر ملایا لیکن اس کا سیل فون آف تھا۔

مجھے اچانک شدید خطرے کا احساس ہوا۔ مجھے ایسا لگا جیسے کوئی مجھے چھپ کر دیکھ رہا ہو۔

میں نے واپسی کا ارادہ کیا۔ اسی لمحے کسی نے میری گردن پر ریوالور کی نال رکھ دی اور غرا کر بولا۔ ''نہیں قبلہ نواب صاحب! مڑ کر مت دیکھیے گا، ورنہ آپ کی گردن میں سوراخ ہو جائے گا۔ اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھیں۔'' اس نے مجھے حکم دیا۔

میں نے اپنے ہاتھ سر پر رکھ لیے۔ میں اس آواز کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے یاد نہیں آ رہا تھا کہ میں نے وہ آواز کب سنی ہے۔ سنی بھی ہے یا یہ محض میرا واہمہ ہے؟

ریوالور والے نے بہت مہارت سے میری تلاشی لی اور میرے دونوں ریوالور لے لیے۔

''سیدھے چلیں۔'' پشت سے پھر آواز آئی۔ میں نے گردن گھمانے کی کوشش کی تو وہ غرا کر بولا۔ ''نو!'' اس کے ساتھ ہی میری کمر پر زوردار لات پڑی۔

میں لڑکھڑا کر چند قدم آگے بڑھ گیا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میری کمر پر کسی نے پانچ کلو کا وزنی ہتھوڑا رسید کر دیا ہو۔

''گردن کو ادھر ادھر گھمانے کی کوشش کریں گے تو اس مرتبہ لات کے بجائے گولی آئے گی۔ سیدھے چلتے رہیں۔''

اس وقت تک نیچے پلیٹ فارم پر اچھی خاصی گہما گہمی ہو گئی تھی۔ کئی گاڑیوں کی آمد کا اعلان ہو چکا تھا لیکن اوپر کی طرف سناٹا تھا۔

میں سیدھا چلتا رہا۔

''اب دائیں طرف گھوم جائیں۔'' کوریڈور کے اختتام پر مجھے محبت سے حکم دیا گیا۔

کوریڈور آگے جا کر انگریزی کے حرف "L" کی طرح گھوم گیا تھا۔ مڑتے ہوئے میں اچانک بیٹھ گیا اور بیٹھے ہی بیٹھے بجلی کی سی تیزی سے اپنی لات دائرے کی شکل میں گھما دی۔

میرے عقب میں جو بھی تھا وہ انتہائی درجے کا محتاط تھا۔ میری لات اسے اچٹتی ہوئی لگی کیونکہ وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر تھا۔ اس کے باوجود وہ لڑکھڑا گیا۔ میں نے ریوالور کی پروا کیے بغیر اس پر جست لگائی اور اسے ساتھ لیے ہوئے ڈھیر ہو گیا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ میں نے ریوالور اٹھانا چاہا تو اچانک ایک بے آواز فائر ہوا اور گولی میری سامنے والی دیوار میں پیوست ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی کوئی درشت لہجے میں بولا۔ ''تجھے عزت راس نہیں آتی، نواب کے نطفے؟'' بولنے والی آواز بہت مکروہ اور لہجہ درشت تھا۔ ''چل اٹھ اور بازو والے کمرے میں جا!''

میں آہستہ آہستہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میری دائیں جانب ایک قطار میں چار کمرے تھے۔ ان میں سے تیسرے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں رابعہ کو دل ہی دل میں انتہائی غلیظ گالیاں دیتا ہوا اس کمرے کی طرف بڑھا۔ اچانک کسی نے پھر میری کمر پر لات رسید کی اور میں اوندھے منہ کمرے میں جا گرا۔ میرے عقب میں دروازہ بند ہو گیا۔

میں بھڑک کر پلٹا لیکن دروازہ اب بند ہو چکا تھا، میں نے دروازے کا جائزہ لیا۔ وہ قدیم طرز کا بنا ہوا مضبوط دروازہ تھا۔ وہ دس بائی بارہ کا چھوٹا سا کمرا تھا۔ اس میں کوئی کھڑکی نہیں تھی۔ خاصی بلندی پر ایک روشن دان تھا۔ کمرے میں پرانی سی ایک مسہری اور چوڑے ہتھوں کی بڑی سی ایک آرام دہ کرسی پڑی تھی۔ اس قسم کی بھاری بھرکم کرسیاں انگریزوں کے دور کی یادگار ہیں اور اب بھی اکثر ریلوے اسٹیشنوں اور ڈاک بنگلوں میں نظر آتی ہیں۔ کرسی کے ساتھ ہی بھاری بھرکم ڈریسنگ ٹیبل تھی جس کا آئینہ امتداد زمانہ سے اپنی آب و تاب کھو بیٹھا تھا اور اب محض شیشے کا ایک ٹکڑا رہ گیا تھا۔ مسہری پر بستر البتہ صاف ستھرا تھا۔

وہاں ہر طرف سناٹے کا راج تھا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر دروازے پر زور آزمائی کی لیکن نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔ میں نے دروازہ پوری قوت سے پیٹ ڈالا۔ ''کوئی ہے؟'' مجھے اپنی ہی آواز کی بازگشت سنائی دی۔ میں پھیپھڑوں کی پوری قوت صرف کر کے دوبارہ چیخا۔ ''کوئی ہے یہاں؟''

میرا خیال تھا کہ میری آواز ریلوے کے کسی ملازم یا ریٹائرنگ روم کے بیرے تک پہنچ جائے گی لیکن میری آواز دیواروں سے ٹکرا کر واپس آ گئی۔ میرا دل چاہا کہ اپنا جوتا اتار کر اپنے ہی سر پر مارنا شروع کر دوں۔ حماقت کی بھی کوئی انتہا ہوتی ہے۔ میں نے نہ جانے کس گھمنڈ میں رابعہ کی باتوں پر اعتبار کر لیا تھا۔ فریال میں اور رابعہ میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ فریال نے مجھ سے بے وفائی ضرور کی تھی لیکن وہ مجھے نقصان نہیں پہنچانا چاہتی تھی۔ اس نے صرف اپنا راستہ بدلا تھا۔ دوسری طرف رابعہ تھی۔ وہ میری محبت کا دم بھرتی تھی اور میری جان بھی لینا چاہتی تھی۔ میں نے خود سے کہا۔ ''نواب رفیق احمد شیرازی! تم نے رابعہ سے کہا تھا کہ خودکردہ را علاج نیست! فارسی کا یہی محاورہ تم پر بھی صادق آتا ہے۔ تم نے اس دشمن جاں رابعہ پر ایسا اندھا اعتماد کر لیا کہ اکیلے ہی لاہور کی طرف دوڑ پڑے اور اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر لاہور پہنچے اور اس مصیبت میں گرفتار ہو گئے۔'' میں نے بے خیالی میں سیل فون نکالنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا لیکن فوراً ہی یاد آ گیا کہ سیل فون مجھ سے چھینا جا چکا ہے۔ اس مردود نے تلاشی لیتے وقت میرا رومال اور پرس تک نکال لیا تھا۔ میں نے بھنا کر لکڑی کے مضبوط دروازے پر لاتیں ماریں لیکن سوائے شور شرابے کے کچھ حاصل نہ ہوا۔ میں پھر پوری قوت سے چیخا۔ ''رابعہ!'' میری آواز پھر سناٹے میں گونج کر رہ گئی۔

اچانک بیڈ کے نیچے سرسراہٹ سی ہوئی پھر آواز آئی۔ ''شور شرابا کر کے اپنی انرجی کیوں ضائع کر رہے ہو نواب رفیق! اب یہ کمرا ہی تمہارا مدفن بننے والا ہے۔''

''مجھے دفن کرنے سے پہلے یہ تو بتا دو کہ تم ہو کون؟''

''ابھی ساری شوخی اور بزلہ سنجی ناک کے رستے بہہ جائے گی۔ میری بات کو مذاق مت سمجھو۔''

''میں اسے کب مذاق سمجھ رہا ہوں۔'' میں نے ہنس کر

کہا۔ ''میں تو صرف یہ پوچھ رہا ہوں کہ تم ہو کون؟ اتنا تو میرا حق ہے کہ میں مرنے سے پہلے اپنے قاتل کا نام پوچھ لوں۔''

''تمہاری یہ خواہش ضرور پوری ہوگی۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔ ''میں دلاور بول رہا ہوں۔ اب تمہاری تسلی ہوگئی۔ اب میری بات غور سے سنو۔ یہ جو کمرے میں چھوٹا دروازہ ہے۔ یہ باتھ روم ہے لیکن اسے کھولنے کی کوشش مت کرنا، باتھ روم میں انتہائی طاقت ور ٹائم بم ہے، اس کا فیوز دروازے کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ اگر تم نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو وہ بم قبل از وقت بھی پھٹ سکتا ہے۔ بم ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے پھٹ جائے گا۔ اس وقت ساڑھے سات بجے ہیں یعنی اگر تم نے باتھ روم کا دروازہ نہ کھولا تو تمہارے پاس ایک گھنٹا ہے۔ تم خود کو بہت افلاطون سمجھتے ہونا! اب اگر بچ سکتے ہو تو بچ جاؤ۔''

میں نے بیڈ کے نیچے جھانک کر دیکھا، وہاں مجھے چھوٹا سا ایک پاکٹ سائز ریڈیو نظر آیا۔ آواز اسی ریڈیو سے آرہی تھی۔ میں نے وہ ریڈیو اٹھا لیا۔ دیکھنے میں وہ عام سا ریڈیو تھا۔ غالباً اسے کسی خاص فریکوئنسی پر سیٹ کیا گیا تھا یا پھر اس میں کوئی ایسی ڈیوائس لگائی گئی تھی جس کے ذریعے میری آواز بھی دوسری طرف سنی جارہی تھی۔

اب وہ ریڈیو خاموش تھا۔ میں نے اسے منہ کے نزدیک لاکر کہا۔ ''ہیلو! ہیلو...... کیا تم میری آواز سن رہے ہو؟''

دوسری طرف خاموشی طاری رہی۔ میں نے وہ ریڈیو ایک طرف رکھ دیا اور سوچنے لگا کہ اس صورتِ حال میں مجھے کیا کرنا چاہیے؟

وقت آہستہ آہستہ گزر رہا تھا۔ گزرنے والا ہر منٹ مجھے موت سے نزدیک کررہا تھا۔ ان لوگوں نے مجھ پر احسان کیا تھا کہ میری کلائی کی گھڑی میرے پاس چھوڑ دی تھی۔ اس وقت مجھے بچپن میں پڑھا ہوا ایک شعر یاد آیا، غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی۔ گردوں نے گھڑی عمر کی ایک اور بتادی! مجھے رہ رہ کر رابعہ پر غصہ آرہا تھا پھر رابعہ سے زیادہ مجھے خود پر غصہ آیا کہ میں اس کی باتوں میں کیوں آگیا؟ اس کی جان خطرے میں تھی تو ہوا کرے، مجھے کیا ضرورت تھی اس عذاب میں مبتلا ہونے کی؟ میں نے خود سے کہا، تم کیا خود کو دوسروں کا بہت ہمدرد سمجھتے ہو نواب رفیق احمد شیرازی! تمہیں کیا ضرورت تھی محمد بن قاسم بننے کی؟ میں مضطرب ہوکر کھڑا ہوگیا۔ یہ وقت خود پر یا کسی پر لعنت ملامت کرنے کا نہیں تھا۔ مجھے تو صرف یہ سوچنا چاہیے کہ میں اپنی جان کیسے بچاسکتا ہوں؟

میں نے اردگرد نظر دوڑائی۔ مجھے وہ روشن دان نظر آیا جس میں سے روشنی کی ایک لکیر اندر آرہی تھی۔ کمرے کی دیواریں بالکل سپاٹ تھیں اور وہ روشن دان خاصی بلندی پر تھا۔ میں اگر کسی نہ کسی طرح وہاں تک پہنچ بھی جاتا تو بھی میں اس میں سے نکل نہیں سکتا تھا۔

میں نے سوچا، میں وہاں سے باہر کا جائزہ تو لے ہی سکتا ہوں۔ وہاں چڑھ کر شور مچاسکتا ہوں، دوسروں کو اپنی طرف متوجہ کرسکتا ہوں۔

یہ سوچ کر میں نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ کمرے میں بھاری بھرکم سی ایک ڈریسنگ ٹیبل موجود تھی۔ اگر میں اسے مسہری پر رکھ کر اس کے آئینے والے حصے پر چڑھ جاتا تو روشن دان تک پہنچ سکتا تھا۔

میں نے مسہری کھینچ کر روشن دان کے نیچے لگائی۔ پھر میز گھسیٹنے کی کوشش کی تو مجھے دانتوں پسینا آگیا۔ وہ میز خاصی بھاری تھی۔ میز گھسیٹنے میں ہی پسینے پسینے ہوگیا۔ میں نے اپنی کوشش ترک کردی۔ اس ڈریسنگ ٹیبل کو جگہ سے ہلانا ہی مشکل تھا، میں اسے بیڈ پر کیسے رکھ سکتا تھا۔

میز ہٹانے سے پلاسٹر کا ایک ٹکڑا اکھڑ کر فرش پر گر گیا۔ میں نے غور سے دیکھا۔ وہاں شاید دروازہ تھا جسے بعد میں بند کردیا گیا تھا۔ میں نے اس پر ہاتھ مارا تو پلاسٹر کا ایک اور ٹکڑا جھڑ کر میرے سامنے گر پڑا۔

پھر مجھے ایسا لگا جیسے دوسری طرف سے بھی کوئی دیوار پر ٹھک ٹھک کررہا ہو۔ میں نے پھر دیوار پر کے مارے تو مزید پلاسٹر جھڑ کر گرا اس کے ساتھ ہی مجھے دوسری طرف سے ٹھک ٹھک کی آواز واضح سنائی دی۔

میں نے دیوار تھپتھپائی تو دوسری طرف سے پھر کسی نے ٹھک ٹھک کی۔ پلاستر جھڑنے کے بعد مجھے اینٹیں دکھائی دے رہی تھیں لیکن وہ بہت مضبوطی سے لگی ہوئی تھیں۔ میرے پاس کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس کی مدد سے میں کوئی اینٹ نکال سکتا۔

میں دیوانہ وار کمرے میں چکر انے لگا۔ میں نے ڈریسنگ ٹیبل کی دراز کھولی کہ شاید مجھے اس میں کچھ مل جائے لیکن اس میں کچھ بھی نہیں تھا۔

میں نے گھڑی دیکھی تو میرا سانس رکنے لگا۔ بم پھٹنے میں اب صرف سات منٹ اور چوالیس سیکنڈ باقی تھے۔ میں کمرے میں دیوانہ وار چکر لگانے لگا۔ میں نے کبھی خود کو اتنا بے بس محسوس نہیں کیا تھا، سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب کیا کیا جائے؟ واہ نواب رفیق شیرازی! تم تو خود کو ناقابلِ تسخیر سمجھتے

تھے، بہت عقل مند سمجھتے تھے۔ خود ہی مرنے کے لیے اس چوہے دان میں آپھنسے۔ میں نے اپنی موت کا تصور کیا، جب اس کمرے کے ملبے سے میری لاش ملے گی تو اس کی شناخت بھی نہ ہوسکے گی۔ تمہیں لاوارث لاش کی طرح لاہور کے کسی اسپتال میں پھینک دیا جائے گا۔ کسی کو معلوم نہیں ہوگا کہ یہ ٹوٹا پھوٹا جسم نواب رفیق کا ہے۔ وہ نواب رفیق جو لندن میں اپنے تئیں لارڈ رفیق کہلاتے تھے۔ مجھے ایک ایک کرکے اپنے پیاروں کے چہرے نظر آئے۔ وہ سب میری گم شدگی سے پریشان تھے۔ راجا کہہ رہا تھا، نکل گیا ہوگا کسی لڑکی کے چکر میں۔ نور اس کی یہ بات نہیں مان رہی تھی کہ رفیق ایسا نہیں کرسکتا۔ اب اس کی زندگی میں کوئی لڑکی نہیں آسکتی۔ کم سے کم میری زندگی میں تو نہیں۔ غنی اپنی صفائی پیش کررہا تھا کہ میں نے نواب صاحب سے بہت کہا کہ میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں لیکن انہوں نے مجھے بری طرح جھڑک دیا۔ پھر میری آنکھوں کے سامنے دوسرا منظر آگیا۔ میری لاش حویلی کے ہال میں رکھی ہے اور حویلی میں آہ و بکا مچی ہوئی ہے۔ ہر آدمی اشک بار ہے۔

اچانک جھرجھری لے کر میں نے آنکھیں کھول دیں۔

انسان موت کے خوف میں مبتلا ہوتا ہوگا تو اس کے ذہن میں ایسے ہی خیالات آتے ہوں گے۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ اب بم پھٹنے میں ایک منٹ رہ گیا تھا۔ میں نے آخری کوشش کے طور پر میز کو گھسیٹ کر کمرے کے دوسرے سرے پر پہنچا دیا اور خود میز کے نیچے بیٹھ گیا کہ ممکن ہے بم اتنا طاقت ور نہ ہو اور اس سے صرف باتھ روم اور اس طرف کی دیوار گرے یا دھماکے سے کمرے کی دوسری دیواریں بھی گر جائیں تو مجھے زیادہ نقصان نہ پہنچے۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے کہ ڈوبتا ہوا انسان تنکے کو بھی سہارے کے طور پر پکڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ میں دونوں ہاتھ کان پر رکھ کے دھماکے کا انتظار کرنے لگا۔ وقت اب بہت سست رفتاری سے گزر رہا تھا۔ میں کسی خوف زدہ بچے کی طرح دونوں ہاتھ کانوں پر رکھے بیٹھا رہا۔ میں نے آنکھیں بھی بند کرلی تھیں کہ دھماکے کے بعد گرد و غبار اور مٹی اڑ کر میری آنکھوں میں نہ جائے۔

مجھے بیٹھے ہوئے کافی دیر ہوگئی تھی یا پھر مجھے ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے میں گھنٹوں سے یہاں بیٹھا ہوں۔

اچانک کسی کا مکروہ قہقہہ وہاں گونجا تو میں بری طرح اچھل پڑا۔ پھر ریڈیو سے آواز آئی۔ ''نواب صاحب! کیسا رہا یہ تجربہ؟ موت کا انتظار کررہے ہو؟'' میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

''نواب کی دم! تم اتنے بزدل تو نہیں ہوسکتے کہ موت کے خوف سے بے ہوش ہوجاؤ۔ وہاں کوئی بم نہیں ہے۔'' ریڈیو سے آواز آئی۔

''تم کیا سمجھتے ہو، میں نے تمہاری بکواس پر یقین کرلیا تھا؟'' میں نے کہا۔ یہ جان کر مجھ میں ایک نئی توانائی بھر گئی تھی کہ وہاں بم نہیں ہے۔ ''تم لوگ اتنے احمق تو نہیں ہوسکتے کہ ایک بھرے پڑے اسٹیشن پر بم کا دھماکا کرو۔''

''ہم اس سے بھی زیادہ احمق ہیں۔'' بولنے والا زہریلے لہجے میں بولا۔ ''بس ابھی تمہاری موت کا وقت نہیں آیا۔ ورنہ ہمیں اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ دھماکا کسی بھرے پرے ریلوے اسٹیشن پر ہورہا ہے یا کسی ویرانے میں۔ ہم سے کون پوچھے گا اور کیسے پوچھے گا کہ دھماکا کیوں کیا؟''

''بہت بکواس کرچکے تم!'' میں نے کہا۔ ''مجھے یہ بتاؤ کہ مجھے یہاں لائے کیوں ہو؟''

''یہاں تو تم خود آئے ہو جعلی نواب!'' بولنے والا مضحکہ خیز انداز میں بولا۔ ''ہم لوگ تو......''

اچانک وہ بولتے بولتے خاموش ہوگیا۔ پھر ایسی آوازیں آئیں جیسے کوئی کسی کا گلا دبا رہا ہو۔ اس کے بعد مجھے ایک کراہ سنائی دی پھر سناٹا چھا گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بولنے والے کو کیا ہوا ہے؟ کیا وہ دانستہ خاموش ہوا ہے یا اسے خاموش کردیا گیا ہے؟

میں کچھ دیر کان لگائے دوسری طرف کی آواز سننے کا انتظار کرتا رہا لیکن وہاں اب بالکل خاموشی تھی۔ میں نے چیخ کر کہا۔ ''میں نے تجھ سے پوچھا تھا کہ مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟''

دوسری طرف سناٹا رہا۔ میں سمجھا کہ اس میں بھی دشمنوں کی کوئی چال ہے۔ وہ لوگ مجھے ذہنی اذیت پہنچانا چاہتے ہیں۔ یہ سوچ کر میں بھی خاموش ہوگیا۔

میں ابھی تک ڈریسنگ ٹیبل کے نیچے ہی بیٹھا ہوا تھا۔ میں خاموشی سے باہر نکل آیا۔

اچانک مجھے کوریڈور میں قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ وہ آواز میرے کمرے کے دروازے پر آکر رک گئی۔

میں تیزی سے دروازے کے نزدیک پہنچا اور دیوار سے چپک کر کھڑا ہوگیا۔

دروازہ کھلا تو میں چوکنا ہوکر کھڑا ہوگیا۔ پھر اچانک کمرے میں ایک آدمی آگرا۔ اسے شاید باہر سے کسی نے دھکا دے کر اندر پھینکا تھا۔ میں سمجھا کہ مجھے قید کرنے والے

کسی اور قیدی کو لائے ہیں۔

اس کے پیچھے پیچھے جو آدمی داخل ہوا، اسے دیکھ کر مجھے خوشگوار حیرت ہوئی۔ وہ غنی تھا۔ اس نے اندر گرنے والے کو گن پوائنٹ پر لے رکھا تھا۔ اس نے اندر آ کر گرنے والے کو ایک لات رسید کی اور بولا۔ ''بتا تو کس کے لیے کام کر رہا ہے؟ جلدی بول میرے پاس وقت نہیں ہے۔ میں تجھے ذبح کر کے یہیں چھوڑ جاؤں گا۔''

''وہ...... میں......'' گرنے والے کے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

اچانک پھر کسی نے برابر والے کمرے کی دیوار پر ٹھک ٹھک کی۔

غنی چونک کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

''اس کمرے میں بھی شاید کوئی قید ہے۔'' میں نے غنی سے کہا۔

غنی نے ایک ریوالور مجھے دیا اور خود جھپٹ کر باہر نکل گیا۔

دو تین منٹ بعد مجھے پھر حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ غنی کے ساتھ رابعہ تھی۔ اس کے بال خاک آلود اور لباس جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف اور دہشت کے تاثرات تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ دیوانہ وار مجھ سے لپٹ گئی اور روتے ہوئے بولی۔ ''تم آ گئے رفیق! مجھے یقین تھا کہ تم مجھے مصیبت میں تنہا نہیں چھوڑو گے۔''

اچانک مجھے شدید خطرے کا احساس ہوا۔ اگر رابعہ بھی یہاں قید تھی تو وہ لوگ اس طرف سے غافل نہیں ہوں گے۔

''غنی! یہاں سے فوراً نکلو۔'' میں نے کہا۔

''فکر مت کریں سر! دشمن یہاں سے فرار ہو چکے ہیں۔ باہر ہمارے آدمی موجود ہیں۔''

''تو کیا اب تم مستقل یہیں قیام کرو گے؟'' میں نے جھنجلا کر کہا۔

''نہیں سر!'' غنی نے کہا۔ ''میں اس شخص کو بھی ساتھ لے جانا چاہتا ہوں۔''

''یہ کوئی اہم آدمی نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اسے ذبح کر کے یہیں چھوڑ دو۔''

''ٹھیک ہے سر!'' غنی نے یوں کہا جیسے میں نے مرغی ذبح کرنے کی بات کی ہو۔

کمرے میں پڑے ہوئے شخص کا چہرہ کورے لٹھے کی طرح سفید پڑ گیا۔ میرے تیور دیکھ کر اسے اپنی موت کا یقین آ گیا تھا۔ وہ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''نواب صاحب! میں واقعی بہت معمولی سا آدمی ہوں۔ مجھے...... مجھے شہباز نے پانچ ہزار روپے دیے تھے اور کہا تھا کہ میں آپ کو یہاں لا کر بند کر دوں۔''

''بکواس کی تو میں خود تجھے ذبح کر دوں گا۔'' میں نے سفاک لہجے میں کہا۔ ''کیا تجھے الہام ہوا تھا کہ میں یہاں آ رہا ہوں یا پھر اس شہباز کو غیب کا حال معلوم ہے؟''

''میں آپ کو سب کچھ بتا دوں گا، پہلے آپ یہاں سے تو نکلیں۔ یہاں آپ کی جان کو شدید خطرہ ہے؟'' وہ آدمی لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''شہباز اور اس کے ساتھی ابھی تھوڑی دیر میں واپس آ جائیں گے۔ وہ شاید مجھے بھی زندہ نہ چھوڑیں۔''

''شہباز اور اس کے ساتھیوں کی فکر تم مت کرو۔'' غنی نے درشت لہجے میں کہا۔ ''میں خود ان کا انتظار کر رہا ہوں۔''

''یہ آدمی ٹھیک کہہ رہا ہے رفیق!'' رابعہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''وہ لوگ واقعی نہ تمہیں زندہ چھوڑیں گے نہ مجھے۔''

''یہاں سے نکل ہی چلو!'' میں نے غنی سے کہا۔

رابعہ کا حلیہ خراب ہو رہا تھا۔ اس کا لباس جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ وہ اس حلیے میں باہر نکلنے کے قابل نہیں تھی۔ میں نے بیڈ کی چادر اٹھائی اور رابعہ کے جسم پر ڈال دی۔

''میں دوسرے کمروں کی تلاشی لے لوں۔'' غنی نے کہا۔ ''ممکن ہے وہاں ہمیں کچھ سراغ مل جائے۔''

غنی کمرے سے باہر نکلا تو میں نے قیدی کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرا ستا کر رہ گیا تھا۔ اس نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ ''آپ لوگ بلاوجہ فضول میں دیر کر رہے ہیں۔ وہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔''

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

پانچ منٹ بعد غنی لوٹ آیا۔ وہ کچھ بوکھلایا ہوا تھا۔

''کیا بات ہے غنی؟'' میں نے پوچھا۔

''سر، یہاں ایک کمرے میں اسلحے اور منشیات کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ کمرے میں کسی کی لاش بھی پڑی ہے۔ اسے گلا گھونٹ کر مارا گیا ہے۔ یہاں سے فوراً نکلیں سر؟ اگر ان لوگوں نے پولیس کو اطلاع دے دی کہ یہاں اسلحے اور منشیات کے ساتھ نواب رفیق اور اس کے آدمی بھی موجود ہیں۔ انہوں نے اپنے ایک آدمی کو قتل بھی کر دیا ہے تو ہماری پوزیشن کیا ہو گی؟''

غنی واقعی ٹھیک کہہ رہا تھا۔ نہ جانے وہ کون لوگ تھے اور انہوں نے یہاں اسلحے اور منشیات کا ذخیرہ کیوں کیا

تھا؟ ممکن ہے ان سماج دشمن عناصر کے ساتھ ریلوے کا کوئی افسر بھی ملوث ہو ورنہ وہ اتنا اسلحہ ریلوے اسٹیشن پر نہیں رکھ سکتے تھے۔

غنی نے جیب میں ہاتھ ڈال کر میرے دونوں ریوالورز، پرس اور موبائل فون نکالا اور میرے حوالے کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ کی یہ چیزیں بھی مجھے اسی کمرے سے ملی ہیں۔'' میں نے وہ چیزیں جیبوں میں رکھیں اور غنی کو باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔

غنی نے اپنے شکار کو گھسیٹا اور بولا۔ ''اگر تو نے کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش کی تو تجھے گولی مار دوں گا۔ میرا ریوالور بے آواز چلتا ہے اور میں جیب سے بھی فائر کر سکتا ہوں۔'' اس نے قیدی کو آگے کی طرف دھکا دیا۔

میں نے چلتے چلتے وہ ریڈیو بھی اٹھا لیا جس کے ذریعے مجھ سے بات کی جا رہی تھی۔

غنی کے ساتھیوں میں احمد شاہ بھی تھا۔ اس کے ساتھ تین گارڈز اور تھے۔ وہ تیزی سے نیچے گیا پھر اوپر آ کر ہمیں نکلنے کا اشارہ کیا۔ پہلے میں ٹہلنے والے انداز میں باہر نکلا۔ وہ زینہ نسبتاً ویران گوشے میں تھا، اس لیے کسی نے مجھ پر دھیان نہ دیا۔ میرے پیچھے پیچھے رابعہ تھی۔

احمد شاہ تیزی سے آگے بڑھا اور بولا۔ ''سر، اس طرف سے باہر آ جائیں۔'' اس نے کچھ فاصلے پر موجود دوسرے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ ''میں گاڑی لے کر وہیں آتا ہوں۔''

میں خاموشی سے اس دوسرے دروازے کی طرف بڑھ گیا جسے قلی اور ریلوے کے دوسرے ملازمین استعمال کرتے ہوں گے۔ میرے پیچھے پیچھے رابعہ بھی نکل آئی۔ اس کے پیچھے غنی تھا۔ وہ قیدی کے ساتھ یوں چل رہا تھا جیسے وہ اس کا بے تکلف دوست ہو۔

احمد شاہ نے گاڑی بالکل میرے سامنے روکی تو میں نے رابعہ کو گاڑی میں بٹھایا، پھر خود بھی گاڑی میں بیٹھ گیا اور احمد شاہ سے کہا۔ ''احمد شاہ! یہاں میری لینڈ کروزر بھی ہے۔''

''یس سر!'' احمد شاہ نے کہا۔ ''آپ کی گاڑی غنی لے آئے گا۔ اسے معلوم ہے کہ یہاں آپ کی گاڑی موجود ہے۔'' اس نے گاڑی کو آگے بڑھا دیا۔

''تم کہاں جا رہے ہو؟'' میں نے چونک کر احمد شاہ سے پوچھا۔

''سر! غنی صاحب نے ست بدھائی چلنے کو کہا تھا۔''

''نہیں!'' میں نے کہا۔ ''ابھی میں لاہور میں رکنا

چاہتا ہوں۔''

احمد شاہ نے گاڑی سڑک کے کنارے روک دی۔

فوراً ہی میری لینڈ کروزر وہاں آ کر رک گئی۔ اس میں سے غنی اترا اور لپک کر ہماری طرف آیا۔ ''کیا ہوا سر؟''

''ہم فی الحال ست بدھائی نہیں جائیں گے۔'' میں نے کہا۔ ''لاہور میں کہیں قیام کریں گے۔''

''سر! اگر آپ پسند کریں تو یہاں ماڈل ٹاؤن میں ایک بنگلا موجود ہے۔'' غنی نے کہا۔

''یہاں کس کا بنگلا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ بنگلا میرے ایک دوست کا ہے سر!'' غنی نے جواب دیا۔ ''اس کا کوئی رشتے دار پاکستان میں نہیں ہے۔ وہ خود بھی آج کل کینیڈا گیا ہوا ہے۔ بنگلے کی چابی وہ مجھے دے گیا تھا۔''

''تمہیں کیوں دے گیا؟'' میں نے پوچھا۔

''سر! وہ بنگلا بیچنا چاہتا ہے، اس نے مجھ سے کہا تھا کہ اس بنگلے کو مناسب قیمت پر فروخت کر دوں۔''

''چلو، پھر وہیں چلو۔'' میں نے کہا۔

غنی نے احمد شاہ کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور ہماری گاڑیاں ایک مرتبہ پھر روانہ ہوگئیں۔

غنی کے اس دوست کا بنگلا پرانی طرز کا بنا ہوا تھا۔ اس کے سامنے بڑا سا لان تھا اور کار پورچ اتنا بڑا تھا کہ اس میں بیک وقت چار گاڑیاں کھڑی ہوسکتی تھیں۔ بنگلے میں فرنیچر بھی پرانی طرز کا تھا اور اس بنگلے کے لحاظ سے بہت کم تھا۔ اس میں چار بیڈ روم تھے جن میں سے دو بالکل خالی تھے۔

وہاں اطمینان سے بیٹھنے کے بعد میں نے غنی سے کہا کہ وہ بازار سے کھانا لے آئے اور رابعہ کے سائز کے دو تین ریڈی میڈ سوٹ بھی لیتا آئے۔

غنی کھانا لینے چلا گیا۔ احمد شاہ اور دوسرے گارڈز بنگلے کے گیٹ اور مختلف جگہوں پر کھڑے ہوگئے۔ ان لوگوں نے قیدی کو بھی ایک کمرے میں بند کر دیا تھا۔ غنی نے ایک احتیاط یہ کی تھی کہ قیدی کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی۔

رابعہ اب تک بالکل خاموش تھی۔ اس کی آنکھوں میں ویرانی تھی اور وہ مسلسل کچھ سوچ رہی تھی۔ میں نے اسے مخاطب کیا۔ ''رابعہ!''

''آں!'' اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔

''یہ سب کیا ہے رابعہ؟'' میں نے پوچھا۔ ''تم تو لندن گئی تھیں، یہاں واپس کب آئیں اور یہ دلاور کون ہے؟''

''یہ لمبی کہانی ہے رفیق!'' رابعہ کے چہرے پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ ''میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں کہاں سے شروع کروں؟''

''یہ بتاؤ، تم کورٹ کیوں نہیں پہنچی تھیں؟ میں نے تو گفٹ ڈیڈ پر سائن کر دیے تھے۔''

''میں نے جذبات سے مغلوب ہو کر زوہیب کا ساتھ دینے کا فیصلہ تو کر لیا تھا لیکن مجھے فوراً ہی احساس ہوگیا تھا کہ میں زوہیب سے شادی کر کے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کروں گی۔ وہ مجھے ٹشو پیپر کی طرح استعمال کر کے پھینک دے گا اور میں جب تک زندہ رہوں گی، اس کا ظلم سہتی رہوں گی۔ میں نے تم سے کہا تو تھا کہ میں اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔ تمہاری پناہ میں آنا چاہتی ہوں۔''

''تم نے تو میری جان لینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''اس کے باوجود تمہیں امید تھی کہ میں تمہیں اپنا لوں گا؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''ہاں، میں تمہیں بچپن سے جانتی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ تم میری تمام غلطیوں کو معاف کر دو گے لیکن تم نے ایسا نہ کیا تو میں عین وقت پر غائب ہوگئی۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔''

''تمہارا کیا خیال تھا کہ زوہیب تمہیں چھوڑ دے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں جانتی تھی کہ زوہیب کسی بھی قیمت پر نہیں چھوڑے گا۔ میں کافی دن تک تو دینہ کے ایک گاؤں میں چھپی رہی، وہاں میری ایک دوست رہتی تھی اسکول کے زمانے کی۔ وہ شادی ہو کر اسی گاؤں میں گئی تھی۔ اس کا شوہر اچھا خاصا زمیندار ہے۔''

''تم نے یہ سوچا تھا کہ زندگی بھر وہیں چھپی رہو گی؟'' میں نے کہا۔

''میں وہاں اس وقت تک چھپی رہنا چاہتی تھی جب تک معاملہ دب نہیں جاتا۔'' رابعہ نے کہا۔

''پھر تم نے اپنی موت کا ڈراما رچایا؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''وہ ڈراما زوہیب کا تھا۔'' رابعہ نے کہا۔

''لیکن فون پر بات تو بعد میں تم نے کی تھی؟'' میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ مجھے اس کی بے سروپا کہانی پر بالکل یقین نہیں آیا تھا۔

''جب تم اس عورت کو شناخت کر کے باہر نکلے تو میری دوست کے شوہر نے تمہیں دیکھا تھا۔ اس نے بتایا کہ نواب رفیق اپنی کزن کی موت پر آنسو بہا رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ

اب بھی تمہارے دل میں میرے لیے نرم گوشہ موجود ہے۔ یہی سوچ کر میں نے تمہیں فون کیا تھا۔ میں نے تو تمہیں سرپرائز دینا چاہا تھا لیکن تمہاری باتیں بہت حوصلہ شکن تھیں۔ مجھے تمہاری باتیں سن کر ایک مرتبہ پھر تم پر غصہ آگیا ورنہ میں اسی وقت تمہیں سب کچھ بتا دیتی۔'' وہ بولتے بولتے خاموش ہوگئی۔

اس نے سائڈ ٹیبل پر رکھا ہوا جگ اٹھا کر گلاس میں پانی لیا اور اسے ایک ہی سانس میں پی گئی۔

اس نے پھر بولنا شروع کیا۔ ''زوہیب کتوں کی طرح ہر جگہ میری بو سونگھتا پھر رہا تھا۔ میری دوست کے شوہر غلام علی نے مجھے مشورہ دیا کہ آپ کچھ دن کے لیے ملک سے باہر چلی جائیں۔ دبئی، سعودی عرب، امریکا یا انڈیا، کہیں بھی! میں خود بھی یہی سوچ رہی تھی۔ غلام علی کو اپنی بھی فکر تھی۔ وہ زوہیب سے بھی خوف زدہ تھا اور تم سے بھی۔ اس نے کئی دفعہ دبے لفظوں میں کہا کہ آپ کی وجہ سے میں بھی مارا جاؤں گا۔ ایک طرف رانا ہے اور دوسری طرف نواب رفیق! دو بڑے لوگوں کی لڑائی میں، میں پس جاؤں گا۔ مجھے خود بھی احساس تھا کہ میری وجہ سے وہ بھی مصیبت میں پڑ جائے گا۔ میں نے بھی ملک چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ میرے اکاؤنٹ میں رقم تو اچھی خاصی تھی۔ میں نے لندن کا ویزا لگوایا اور لندن پہنچ گئی۔''

''دلاور تمہیں کہاں ملا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''دلاور مجھے لندن میں ہی ملا تھا۔ وہ کیا ملا تھا، میں ہی اس سے ملی تھی۔ غلام علی کے اس سے تعلقات تھے۔ میں نہیں جانتی کہ ان تعلقات کی نوعیت کیا تھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میرا ایک دوست بھی آج کل لندن میں ہے۔ میں اس کے نام تمہیں خط لکھ دوں گا، تم اس سے مل لینا، وہ ہر طرح سے تمہاری مدد کرے گا۔ پھر غلام علی نے اپنے اس دوست کا ایسا نقشہ کھینچا کہ میں بھی مرعوب ہوگئی۔ غلام علی نے یہ بھی بتایا تھا کہ میرا وہ دوست بھی اتنی قوت رکھتا ہے کہ تمہیں رانا اور رفیق سے بھی بچالے گا۔ میں لندن جا کر اس سے ملی، وہ دلاور تھا۔ دلاور نے میری بہت خاطر تواضع کی۔ میں نے اسے بتا دیا کہ زوہیب اور نواب رفیق دونوں ہی میری جان کے درپے ہیں۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ مجھے تم دونوں سے بچالے گا۔''

''تم نے ابھی تک یہ نہیں بتایا کہ میری گاڑی کو دھماکے سے کس نے اڑایا تھا؟''

''میں نہیں جانتی کہ تمہاری گاڑی کو کس نے اڑایا۔ میں یہ بھی نہیں جانتی کہ اس عورت کو قتل کرنے کے بعد اس کے گلے میں میرا لاکٹ اور انگلی میں میری انگوٹھی کس نے ڈالی؟ جب میں زوہیب کے ساتھ تھی تو وہاں میری انگوٹھی، لاکٹ اور چوڑیاں وغیرہ رہ گئی تھیں۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ یہ حرکت زوہیب کی ہوسکتی ہے۔ دلاور نے میرے واقعات سنے تو وہ میری مدد پر آمادہ ہوگیا۔ لندن میں بھی اس کا حلقۂ احباب بہت وسیع ہے۔ دلاور کسی بھی طرف سے جرائم پیشہ نہیں لگتا۔ وہ پڑھا لکھا شخص ہے اور اپنی گفتگو، لباس اور طرز عمل سے بہت جلد لوگوں کو دوست بنا لیتا ہے۔''

''وہ لوگوں کے کام کرنے کے لیے بھاری معاوضہ وصول کرتا ہے۔ تمہارے پاس اتنے پیسے کہاں سے آئے؟''

''مجھے غلام علی نے بتایا تھا کہ وہ اسلحے اور منشیات کا ڈیلر ہے اور بھاری معاوضہ لے کر ہر قسم کا کام کرتا ہے۔ میں نے دلاور سے کہا، میں زیادہ معاوضہ ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ اس نے کہا۔ ''میں ابھی آپ سے اس کام کا معاوضہ نہیں لوں گا۔ جب آپ کا کام ہوجائے گا تو آپ کے پاس اتنی دولت ہوگی کہ مجھے دگنا معاوضہ ادا کر سکیں۔''

''تم نے کہا ہوگا کہ پہلے تم نواب رفیق کو ٹھکانے لگاؤ، پھر میں تمہیں دگنا کیا چار گنا معاوضہ ادا کر دوں گی۔''

رابعہ کھسیانی ہوگئی۔ ''میں اس وقت انتقام کی آگ میں جل رہی تھی۔ میں نے ہامی بھر لی۔ پھر اس نے اپنے طور پر تمہارے خلاف کارروائی شروع کر دی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ یہاں نواب رفیق کی ہونے والی بیوی نور بھی ہے۔ تم اس سے ملاقات کرو۔ پھر میں تمہیں بتاؤں گا کہ کیا کرنا ہے؟''

''پھر اس نے کیا بتایا؟'' میں نے پوچھا۔ ''وہ کیا چاہتا تھا؟''

''وہ چاہتا تھا کہ میں کسی نہ کسی طرح نور کا اعتماد حاصل کر کے تمہارے آفس تک پہنچ جاؤں لیکن نور اتنی احمق ہے نہیں جتنا ہم لوگوں نے سمجھا تھا۔ اس نے مجھے قید کر دیا تو میں نے پاگل پن کا ڈراما رچایا اور وہاں سے فرار ہوگئی۔''

''لیکن دلاور تمہارا دشمن کیسے ہوگیا؟'' میں نے پوچھا۔ ابھی تک مجھے اس کی کہانی پر ذرا سا بھی یقین نہیں آیا تھا۔

''دلاور چاہتا تھا کہ میں اس کے ساتھ شادی کر لوں۔'' رابعہ نے کہا۔ ''وہ بھی زوہیب کی طرح مجھ سے شادی کر کے ست بدھائی پر قبضہ کرنا چاہتا تھا۔''

''تمہیں شاید علم نہیں ہے کہ دلاور کے تعلقات زوہیب سے بھی تھے؟'' میں نے کہا۔

''مجھے پہلے واقعی اس بات کا علم نہیں تھا لیکن ایک دن

سیں نے دلاور کو فون پر بات چیت کرتے سن لیا۔ وہ زوہیب سے بات کر رہا تھا۔ مجھے اگر علم نہ ہوتا تو شاید میں آج زوہیب کے قبضے میں ہوتی۔ یہاں آ کر میں نے دلاور کے ساتھ شادی کرنے سے انکار کر دیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ دلاور کا ردعمل کیا ہوگا اس لیے میں اس سے پہلے ہی وہاں سے فرار ہوگئی۔ میں نے داروغہ والا میں چھوٹا سا ایک مکان پہلے ہی لے لیا تھا۔ وہاں سے فرار ہو کر میں داروغہ والا میں چھپ گئی لیکن دلاور کو نہ جانے کیسے میرے گھر کا علم ہوگیا۔ اس نے مجھ پر چوری کا جھوٹا مقدمہ قائم کر کے پولیس کو بھی میرے پیچھے لگا دیا؟ وہ خود تو پہلے ہی میری جان کا دشمن تھا۔ کل رات ان لوگوں نے اچانک مجھے گھیر لیا۔ میں چھت کے ذریعے پڑوس کے مکان میں گئی اور وہاں سے بھی فرار ہوگئی۔ میں نے تمہیں فون کیا اور خود ریلوے اسٹیشن پر جا کر چھپ گئی۔''

اتنا کہہ کر رابعہ خاموش ہوگئی۔

میں بہت غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس کی سنائی ہوئی کہانی کے ایک لفظ پر بھی یقین نہیں آیا تھا۔ وہ تو بہر حال ذہین اور طاقت ور نہیں تھی کہ زوہیب کے ساتھ دلاور جیسے بین الاقوامی مجرم سے بھی نمٹ سکتی۔

غنی کھانا اور دوسرا سامان لے کر آ گیا تھا۔ میں نے رابعہ کو نئے کپڑے دیے۔ وہ باتھ روم میں چلی گئی تو غنی نے کھانا لگا دیا۔ رابعہ بھی نہا دھو کر آ گئی تھی۔ اس نے خاموشی سے کھانا کھایا۔ وہ مسلسل کچھ سوچ رہی تھی۔

''رابعہ! تم کچھ دیر آرام کرلو۔'' میں نے کہا۔ ''تم رات بھر کی جاگی ہوئی ہو۔ اب شام کو بات ہوگی۔''

رابعہ خاموشی سے اٹھ کر چلی گئی۔ دوسرے کمرے میں بھی ایک بیڈ تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے راجا کا نمبر ملایا۔

میری آواز سنتے ہی وہ بولا۔ ''تو کہاں غائب ہے فیکے پترا!''

''میں لاہور میں ہوں۔'' میں نے کہا۔

''لاہور میں!'' راجا نے کہا۔ ''تو اچانک وہاں کیسے چلا گیا؟''

''یار، مجھے رابعہ نے بلایا تھا۔'' میں نے کہا۔

''کیا؟'' راجا چیخ پڑا۔ ''الو کے پٹھے! تو ابھی تک اس کے چکر میں پڑا ہوا ہے۔ اس نے بلایا اور تو چل دیا؟ تو اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ تیری دشمن ہے۔ پھر کیا تیری اس سے ملاقات ہوئی؟'' راجا نے پوچھا۔

''ہاں، میری ملاقات ہوئی۔'' میں نے جواب دیا۔

''وہ بے چاری ایک جگہ قید تھی۔''

''وہ اتنی بے چاری بھی نہیں۔'' راجا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تو نے ہیرو بن کر اسے قید سے رہائی دلا دی نا! اب تو وہاں کیا کر رہا ہے؟''

''یار......! وہ رابعہ میرے ساتھ ہی ہے......میں......''

''کیا؟'' راجا چونک کر بولا۔ ''وہ خبیث لڑکی تیرے ساتھ ہے؟''

''ہاں یار!'' میں نے کہا۔ ''وہ اپنے دشمنوں سے بہت خوف زدہ ہے۔''

''اسے فوراً چلتا کر دے فیکے پترا۔'' راجا نے کہا۔

''مجھے تو یہ بھی رابعہ کی کوئی چال ہی لگ رہی ہے۔'' پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ''تو لاہور میں کہاں ہے؟''

''ماڈل ٹاؤن کے ایک بنگلے میں!'' میں نے جواب دیا۔

''وہ بنگلا اگر رابعہ کا ہے یا اس نے اس کا پتا بتایا ہے تو فوراً وہاں سے نکل جا۔'' راجا پر تشویش انداز میں بولا۔

''بنگلا رابعہ کا نہیں ہے۔ یہاں مجھے احمد شاہ لایا ہے۔'' میں نے کہا۔

''تو کیا احمد شاہ اور غنی کو بھی ساتھ لے کر گیا ہے؟''

''نہیں یار!'' میں نے کہا۔ ''یہ لوگ تو بعد میں آئے ہیں۔'' اس کی بات پر میں نے سوچا کہ میں نے اب تک غنی سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ وہ وہاں کیسے پہنچ گیا۔

''اگر رابعہ تیرے ساتھ ہے تو اس سے فوراً پیچھا چھڑا لے۔'' راجا نے کہا۔ ''یہ اچھی بات ہے کہ غنی اور احمد شاہ تیرے ساتھ ہیں۔''

''یار راجا! تو لاہور آ سکتا ہے؟'' میں نے کہا۔ ''تیرا یہاں آنا بہت ضروری ہے۔''

''ضروری ہے تو میں آ جاؤں گا۔'' راجا نے کہا۔ ''تو مجھے ایڈریس بتا۔''

''تو ماڈل ٹاؤن تو پہنچ۔ تجھے احمد شاہ ایڈریس سمجھا دے گا۔''

''او کے یار، میں آ رہا ہوں۔'' راجا نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے غنی سے پوچھا۔ ''غنی! تم وہاں کیسے پہنچ گئے؟''

''جب آپ حویلی سے باہر نکلے تو میں بھی احمد شاہ اور دوسرے گارڈز لے کر آپ کے پیچھے روانہ ہوگیا۔ آپ کا پیچھا کرنے میں مجھے دانتوں پسینا آ گیا۔ آپ جس طوفانی انداز

میں ڈرائیونگ کر رہے تھے اسے دیکھ کر میں ہول رہا تھا۔ مجھے یہی دھڑکا تھا کہ آپ کسی حادثے کا شکار نہ ہو جائیں۔ میں آپ کا تعاقب کرتا ہوا لاہور کے ریلوے اسٹیشن تک پہنچا۔ پھر آپ کے پیچھے پلیٹ فارموں پر بھاگتا رہا۔ آپ جب ریلوے اسٹیشن سے باہر نکلے تو میں یہ سمجھا کہ آپ واپس جا رہے ہیں لیکن کسی سے فون پر بات کرنے کے بعد آپ پھر پلیٹ فارم پر گئے اور اس زینے کی طرف بڑھے جو رننگ روم کی طرف جاتا ہے۔ وہاں اچانک آپ کو گھیر لیا گیا۔ ان لوگوں نے آپ کو اوپر ہی ایک کمرے میں بند کر دیا اور ایک آدمی کو چھوڑ کر وہ لوگ وہاں سے چلے گئے۔ میں نے احمد شاہ اور دوسرے گارڈز کو بھی وہاں بلا لیا۔ ہم لوگ دوبارہ اوپر جانے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ میں نے دو تین آدمیوں کو پھر اوپر جاتے دیکھا۔ احمد شاہ دبے پاؤں ان کے پیچھے گیا تو اس نے ان لوگوں کو ایک کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ ان کا ایک ساتھی کمرے کے دروازے پر کھڑا ہوگیا تھا۔ میں وہاں شور شرابا اور ہنگامہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ریلوے اسٹیشن پر بہت رش ہوگیا تھا۔ ایسے میں اگر فائرنگ کی نوبت آ جاتی تو ہمارے لیے بہت مشکل کھڑی ہو جاتی۔ ہم لوگ وہاں رک کر مناسب وقت کا انتظار کرنے لگے۔ مجھے اتنا تو یقین تھا کہ آپ خیریت سے ہیں، ایک گھنٹے بعد وہ لوگ دوبارہ وہاں سے نکلے تو ہم لوگ اوپر چلے گئے۔ احمد شاہ نے دو گارڈز کو زینے کے ساتھ ہی کھڑا کر دیا اور خود اس نے کوریڈور میں پوزیشن لے لی۔ میں فیصلہ کر چکا تھا کہ اب میں پوری قوت سے ان لوگوں کا مقابلہ کروں گا۔ چاہے مجھے فائرنگ کرنا پڑے یا بمباری۔ اوپر بالکل سناٹا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ان کا وہ آدمی کس کمرے میں ہے۔ میں اس کمرے تک پہنچا کمرے کا دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ میں نے آہستگی سے دروازہ کھولا اور کمرے میں داخل ہوگیا۔ کمرے میں بیٹھا ہوا آدمی شاید سیل فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ میری جانب اس کی پشت تھی۔ میں اچانک اس کے سر پر جا پہنچا اور ریوالور کی نال اس کی گردن پر رکھ دی۔ اس کے ہاتھ میں شاید ٹرانسمیٹر تھا۔ میں نے اس سے ٹرانسمیٹر چھینا اور اس کے منہ پر زوردار ہاتھ جما دیا۔ وہ ایسا بدحواس ہوا کہ کچھ بول ہی نہ سکا۔ میں نے خود بھی احتیاط کی تھی کہ میری آواز نہ نکلے۔ اس کے ٹرانسمیٹر کے ذریعے میری آواز کہیں اور بھی سنی جا سکتی تھی۔ میں نے ٹرانسمیٹر کا سوئچ آف کر کے اسے جیب میں ڈال لیا۔ اس آدمی کے پاس اس کمرے کی چابی تھی جہاں ان لوگوں نے آپ کو قید کیا تھا۔''

''وہاں بھاری مقدار میں اسلحہ اور منشیات کے علاوہ ایک لاش بھی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''وہ لاش......''

''میں نے ایک پی سی او سے پولیس کو فون کر کے بتا دیا تھا کہ ریلوے اسٹیشن پر ایک لاش کے ساتھ بھاری مقدار میں اسلحہ اور منشیات موجود ہیں۔'' غنی نے کہا۔ ''پولیس اب تک وہاں پہنچ گئی ہوگی۔''

''وہ ڈیوائس کہاں ہے جو تم نے ٹرانسمیٹر سمجھ کے چھینی تھی؟''

''ڈیوائس!'' غنی نے حیرت سے کہا۔

''ہاں، وہ ٹرانسمیٹر نہیں ہے بلکہ ایف ایم ریڈیو کا مائیکروفون ہے۔''

غنی نے پلاسٹک کی چپٹی سی ایک ڈبیا نکالی اور میرے سامنے رکھ دی۔ اس ڈبیا کے اندر حساس مائیکروفون پوشیدہ تھا۔ اگر یہ ڈبیا اس شخص کے ہاتھ میں نہ ہوتی تو غنی کو بھی معلوم نہ ہوتا کہ وہ کسی سے بات بھی کر رہا تھا۔

''اس کا رابطہ ایک ایف ایم ریڈیو سے ہے۔ ایف ایم ریڈیو کی وہ ڈیوائس آج کل مارکیٹ میں عام ملتی ہے۔'' میں نے ریڈیو نکالتے ہوئے کہا۔ ''فرق صرف یہ ہے کہ ان لوگوں نے ریڈیو میں بھی ایک مائیکروفون فٹ کر دیا ہے تاکہ دوسری طرف کی بات بھی سنی جا سکے۔ وہ قیدی کہاں ہے؟'' میں نے غنی سے پوچھا۔

''اسے احمد شاہ نے ایک کمرے میں بند کر دیا ہے۔''

میں اٹھ کر اس کمرے میں پہنچا تو قیدی فرش پر بیٹھا تھا۔ احمد شاہ نے اس کے ہاتھ اور پاؤں باندھ دیے تھے۔

''ہاں، اب بتاؤ، تم کس کے لیے کام کر رہے ہو! میں صرف سچ سننا چاہتا ہوں۔ جھوٹ بولو گے تو خسارے میں رہو گے اور میں تم پر زیادہ وقت بھی ضائع نہیں کروں گا۔ چلو، اب شروع ہو جاؤ۔''

قیدی نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور تھوک نگل کر بولا۔ ''مجھے...... تھوڑا سا پانی پلا دیں۔''

میرے اشارے پر غنی نے پانی کا بھرا ہوا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اس نے ایک سانس میں پورا گلاس ختم کر دیا۔

''میں رانا زوہیب کے لیے کام کرتا ہوں۔'' قیدی نے یوں کہا جیسے وہ حالت نزع میں بیان دے رہا ہو۔

''رانا زوہیب نے رابعہ کو بند کیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے یوں پلکیں جھپکائیں جیسے میری بات اس کی

سمجھ میں نہ آئی ہو، پھر وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''میں کسی رابعہ کو نہیں جانتا۔''

''تم رابعہ کو نہیں جانتے؟'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''وہ لڑکی جو وہاں پر قید تھی، وہی رابعہ ہے۔''

''وہ لڑکی وہاں کب لائی گئی، مجھے کچھ پتا نہیں۔ ہوسکتا ہے وہ لڑکی وہاں پہلے سے بند ہو۔''

''تم زوہیب کے ساتھ کب سے کام کر رہے ہو؟''

''میں اس کے ساتھ کام نہیں کرتا ہوں۔ اپنے طور پر چھوٹی موٹی وارداتیں کرتا ہوں۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔ ''ہاں شاکر کے لیے کبھی کبھی کام کرتا ہوں۔ شاکر جعل سازوں کے ایک گروہ کا سرغنہ ہے۔ ایک مہینا پہلے اسی نے مجھ سے کہا تھا کہ رانا صاحب کو کچھ لوگوں کی ضرورت ہے۔ تم آج کل فارغ ہو، ان کے لیے کام کرنا چاہتے ہو تو بتاؤ، میں بالکل فارغ تھا۔ کافی دنوں سے کوئی واردات بھی نہیں کی تھی اس لیے راضی ہوگیا۔''

''شاکر نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ کام کیا کرنا ہے؟''

''ہم لوگ پیسوں کے لیے قتل کے علاوہ سب کچھ کرتے ہیں۔ میں جانتا تھا کہ اگر شاکر مجھے کہیں بھیج رہا ہے تو کام کی نوعیت کیا ہوگی۔''

''رانا نے تم سے کیا کام لیا؟'' غنی نے پوچھا۔

''ابھی تک اس نے کوئی خاص کام نہیں لیا۔'' اس شخص نے جواب دیا۔ ''وہ پیسے معقول دیتا ہے اس لیے میں نے کبھی اس بات کی فکر نہیں کی کہ وہ مجھ سے کیا کام لے رہا ہے اور کام لے بھی رہا ہے یا نہیں۔'' وہ سانس لینے کو رکا، پھر کچھ توقف کے بعد بولا۔ ''کل رانا نے مجھ سے کہا کہ تمہیں منیر، صاحب داد اور موجو کے ساتھ جانا ہے۔ کام تمہیں صاحب داد سمجھا دے گا۔''

''صاحب داد کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ رانا کا آدمی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا نام تو مسلم ہے لیکن مجھے مچھو کہتے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

میں نے غور سے اسے دیکھا، اس کے چہرے پر مونچھ نام کی کوئی چیز نہیں تھی اس کے باوجود مچھو کہلاتا تھا۔

''صاحب داد نے مجھے بتایا کہ ہمیں ریلوے اسٹیشن جانا ہے۔ وہاں سے ایک آدمی کو اٹھانا ہے۔ پھر ہم لوگ وہاں بیٹھ گئے۔ آپ خود ہی اس طرف آ گئے تھے، صاحب داد اور منیر آپ کو گن پوائنٹ پر وہاں لے آئے اور اس کمرے میں بند کر دیا، پھر صاحب داد نے مجھے وہ مائیکروفون دیا اور کہا، اس مائیکروفون کا رابطہ ایک ریڈیو سے ہے جو برابر والے کمرے کے قیدی کے پاس ہے۔ پہلے تم اسے بتانا کہ باتھ روم میں ایک ٹائم بم پوشیدہ ہے جو ایک گھنٹے بعد پھٹ جائے گا۔ سوا گھنٹے بعد پھر تم اسے مخاطب کرنا اور بتانا کہ میں تمہیں بے وقوف بنا رہا تھا۔''

''تم مجھے جانتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

مچھو نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ''میں آپ کو نہیں جانتا لیکن آپ کا نام سنا ہوا تھا، آپ ست بدھائی کے نواب رفیق ہیں نا؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں، میں ہی رفیق ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن ابھی تک مجھے یہ معلوم نہیں ہوا کہ رانا نے یہ سب ڈراما کیوں کھیلا؟ اس کا مقصد کیا تھا؟''

''یہ تو میں بھی نہیں جانتا۔'' مچھو نے کہا۔

''شاکر کہاں ملے گا؟'' غنی نے اچانک پوچھا۔

لمحے بھر کو اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہوا، پھر وہ بولا۔ ''شاکر سے ایک مہینا قبل میری ملاقات ہوئی تھی۔ اس وقت وہ لاہور میں تھا۔''

''شاکر کیا لاہور ہی میں رہتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں سر، وہ شیخوپورہ میں رہتا ہے، شیخوپورہ کے علاقے ننکانہ صاحب میں۔''

''ٹھیک ہے مچھو!'' میں نے کہا۔ ''تم واقعی ذہین آدمی ہو کہ تم نے سچ سچ سب کچھ بتا دیا۔ اگر تم غلط بیانی سے کام لیتے تو غنی اب تک تمہیں ذبح کر چکا ہوتا۔ تم ایک دفعہ پھر غور کرلو، تم نے کوئی بات ہم سے چھپائی تو نہیں ہے یا غلط بیانی سے کام تو نہیں لیا۔''

''مجھے جو کچھ معلوم تھا، وہ میں نے آپ کو بتا دیا۔ اب آپ مجھے ذبح کریں یا میری کھال کھینچ لیں، میں مزید کچھ نہیں بتا سکوں گا۔''

میں کمرے سے باہر آ گیا۔

باہر آ کر مجھے تھکن کا احساس ہوا۔ گزشتہ پندرہ گھنٹے سے مجھے سکون سے بیٹھنا بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔ میں بیڈروم میں پہنچا اور لمبی تان کر سو گیا۔ سونے سے پہلے میں نے غنی اور احمد شاہ کو ہدایات دے دی تھیں کہ رابعہ کو کسی بھی قیمت پر یہاں سے نکلنے مت دینا!

میں رات بھر کا جاگا ہوا تھا۔ بستر پر لیٹتے ہی مجھے نیند آ گئی اور نہ جانے کب میں بے سدھ ہو گیا۔

میری آنکھ کھلی تو راجا میرے سامنے ہی بیٹھا تھا۔

وہ مجھے دیکھ کر بولا۔ ''اوہو، نواب صاحب خوابِ خرگوش سے بیدار ہو گئے۔''

''تو کب آیا راجا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں تو شام ہی کو آ گیا تھا۔'' راجا نے کہا۔ ''تو اس وقت اپنا پورا اصطبل بیچ کر سو رہا تھا۔ میں نے تجھے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔''

''شام کو؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''اس وقت کیا بجا ہے؟''

''اس وقت شام کے سات بج رہے ہیں نواب صاحب!'' راجا ہنس کر بولا۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ غنی ہمارے لیے چائے لے آیا۔ میں نے چائے پیتے ہوئے راجا سے پوچھا۔ ''راجا! تو رابعہ سے ملا؟''

''ابھی نہیں۔'' راجا نے سرد لہجے میں کہا۔

''تو کیا وہ تیرے سامنے نہیں آئی؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''یا وہ بھی ابھی تک سو رہی ہے؟''

''وہ یہاں آ ہی نہیں سکتی۔'' راجا نے جلدی سے کہا۔ ''میں نے اسے کمرے میں بند کرا دیا ہے۔''

''بند کرا دیا ہے...... لیکن کیوں؟''

''تو پہلے نہا دھو کر فریش ہو جا، پھر بات کریں گے۔'' راجا نے کہا۔

میں دیر تک گرم پانی سے نہاتا رہا۔ نہانے سے واقعی مجھ میں ایک نئی توانائی آ گئی۔ میں باتھ روم سے باہر نکلا تو راجا سیل فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ احمد شاہ نے روم ہیٹر آن کر دیا تھا۔ کمرے میں خوشگوار حرارت تھی۔

''یار ٹھیک ہے تو! یہی پوچھنے کو بے چین ہے نا کہ میں نے رابعہ کو بند کیوں کر دیا ہے؟'' راجا نے پوچھے بغیر ہی بولنا شروع کر دیا۔ ''وہ اب بھی تیرے ساتھ ڈراما کر رہی تھی۔ اسی نے دھوکے سے تجھے یہاں بلایا تھا۔''

''دھوکے سے بلایا تھا؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں، وہ اب بھی ست بدھائی کی جاگیر حاصل کرنا چاہتی ہے۔ وہ ہر حال میں تیری موت کی خواہاں ہے۔'' راجا نے ناگواری سے کہا۔ ''اب تو پوچھے گا، مجھے یہ سب کیسے معلوم ہوا؟''

''ظاہر ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس کی تو جان خطرے میں تھی۔''

''اس کی جان کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔'' راجا نے کہا۔ ''اس نے داروغہ والا میں جس مکان کا پتا بتایا تھا، میں غنی کے ساتھ وہاں گیا تھا۔'' راجا نے کہا۔ ''وہاں آس پاس کے لوگوں سے معلوم ہوا کہ یہاں کوئی میڈم آتی تو ہیں لیکن وہاں رہتی نہیں ہیں۔ وہ مکان ہمیشہ بند ہی رہتا ہے۔''

''یار، یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ رابعہ کسی کے علم میں لائے بغیر وہاں جاتی ہو؟'' میں نے کہا۔

''میرے ذہن میں بھی یہ سوال آیا تھا۔'' راجا نے کہا۔ ''میں نے اپنی ایک دوست جرنلسٹ کو وہاں بلالیا۔ اس نے پڑوس کے گھروں میں جا کر عورتوں اور لڑکیوں سے پوچھ گچھ کی تو ایک لڑکی نے بتایا کہ میڈم رخسانہ تو گلبرگ میں رہتی ہیں۔ یہ مکان تو انہوں نے اپنے کسی ملازم کے لیے لیا تھا...... میڈم رخسانہ کے نام پر چونک مت۔ رابعہ نے لوگوں کو اپنا یہی نام بتایا تھا۔''

''لیکن راجا وہ لڑکی اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتی ہے کہ رابعہ گلبرگ میں رہتی ہے؟'' میں نے کہا۔

''اس لیے کہ رابعہ اس لڑکی کو دو تین دفعہ اپنے ساتھ گلبرگ لے گئی تھی۔'' راجا نے منہ بنا کر کہا۔ ''میری دوست نے اس لڑکی سے گلبرگ کا پتا لیا اور میرے حوالے کر دیا۔ گلبرگ کی وہ کوٹھی بھی خالی ہے لیکن مزے کی بات یہ ہے کہ وہ کسی دلاور کے نام ہے۔'' راجا مسکرایا۔ ''اس کے بعد میں نے غنی کو ہدایت کر دی کہ رابعہ اپنے کمرے سے باہر نکلنے نہ پائے۔''

''تو نے رابعہ سے پوچھا کہ......''

''میں نے اس سے کچھ نہیں پوچھا۔'' راجا نے میری بات کاٹ دی۔ ''یہ سعادت تو خود حاصل کر لے۔ اس بدچلن عورت کی شکل دیکھ کر مجھے غصہ آتا ہے۔''

''یار! اگر وہ میرے خلاف سازش کر رہی ہے تو اس نے اب تک اپنے ہمدردوں کو بتا دیا ہوگا کہ اس وقت وہ کہاں ہے؟'' میں نے کہا۔

''تجھے اس بات کا بہت جلدی خیال آ گیا؟'' راجا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تو، تو یوں اطمینان سے لمبی تان کر سو گیا تھا جیسے تو ست بدھائی کی حویلی میں ہو۔''

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں ابھی اس مکار عورت کی خبر لیتا ہوں۔''

''اس کی خبر لینے سے پہلے تو اس مچھو کی خبر لے تو اچھا ہے۔ وہ حرام زادہ بھی بالکل جھوٹ بول رہا ہے۔ وہ تو رانا زوہیب کو پہچانتا بھی نہیں ہے، بس اس کا نام سن رکھا ہے۔ میں نے رانا کی تصویر اسے دکھا کر پوچھا کہ یہ صاحب داد ہے یا منیر؟ تو اس نے جواب دیا کہ یہ آدمی ان دونوں میں

سے کوئی نہیں ہے۔ میں نے اس آدمی کو کبھی نہیں دیکھا۔"

"کیا؟" میں غصے کے مارے لرزنے لگا۔" اس نے اتنی صفائی سے میرے سامنے جھوٹ بولا۔ میں نے اس کی بے سروپا کہانی پر یقین نہیں کیا تھا لیکن مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ حرام زادہ جان بچانے کی خاطر رانا کا نام لے رہا ہے۔ اس کی تو میں کھال ادھیڑ دوں گا۔"

"اوئے آرام سے بیٹھ جا۔" راجا ہنس کر بولا۔" اب ان دونوں میں سے یہاں کوئی نہیں ہے۔" راجا نے کہا۔ "میں نے ان دونوں کو ست بدھائی بھجوا دیا ہے۔"

"لیکن غنی اور احمد شاہ تو ابھی یہیں موجود ہیں۔" میں نے کہا۔

"میرے ساتھ سرور آیا تھا۔" راجا نے کہا۔ "میں نے اسے رابعہ اور اس مچھو یا بچھو کے ساتھ ست بدھائی بھیج دیا۔ ان دونوں کو جب ہوش آئے گا تو وہ تہ خانے کو دیکھ کر حیران رہ جائیں گے۔"

"یار، اگر رابعہ نے ہمارے خلاف سازش کی تھی تو وہ اکیلی نہیں ہوگی۔ اس کی پشت پر دلاور ہوگا۔ اس نے رابعہ پر نظر رکھی ہوگی۔ وہ راستے میں......"

"او یار، ٹینشن مت لے۔" راجا نے کہا۔ "سرور ان لوگوں کو لے کر ست بدھائی پہنچ چکا ہے۔ ابھی جب تو باتھ روم سے نکلا تو میں اسی سے بات کر رہا تھا۔"

میرا سارا جوش و خروش ٹھنڈا پڑ گیا۔ میں نے کہا۔ "یار، اگر دلاور یا رانا نے رابعہ کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوا دی اور پولیس کو حویلی کی طرف روانہ کر دیا تو......"

"اب یہ اتنا آسان نہیں ہے فیکے پتر!" راجا نے کہا۔ "کون رابعہ! رابعہ تو مر چکی ہے۔ تو نے اس کی لاش شناخت کی تھی۔ وہ اس وقت قبرستان میں میٹھی نیند سو رہی ہے۔ وہ دوبارہ زندہ ہو کر گم کیسے ہو سکتی ہے اور تو...... کسی مردے کو اغوا کیسے کر سکتا ہے؟ فرض کر کہ رابعہ زندہ بھی ہو گئی، پھر بھی پولیس میں اتنی جرأت نہیں ہوگی کہ وہ ڈائریکٹر جنرل پولیس اور ہوم منسٹر کے دوست کے گھر کی تلاشی لے سکے۔ تو شاید بھول گیا کہ ہوم منسٹر اور ڈی جی پولیس سے تیری تفصیلی ملاقات ہو چکی ہے۔"

"پھر ہم یہاں کیوں رکے ہوئے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی مجھے یہ بھی معلوم کرنا ہے کہ ریلوے اسٹیشن کے اس کمرے میں ملنے والی لاش کس کی تھی اور اس اسلحے اور منشیات کے ذخیرے کا مالک کون ہے؟"

"یار، میری سمجھ میں تو یہ گورکھ دھندا نہیں آ رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"فیکے پتر، تو نے کبھی شطرنج کھیلی ہے، نہ سیاست کی ہے۔ تو اس گورکھ دھندے کو ابھی نہیں سمجھ سکتا۔" راجا نے کہا۔ "اقتدار کی ہوس بہت ظالم ہوتی ہے۔ اس ہوس میں انسان گھٹیا سے گھٹیا کام کرتا ہے اور اسے سیاست کا نام دیتا ہے۔" پھر راجا اٹھتے ہوئے بولا۔ "تو آرام کر، میں پریس کلب اور اس پولیس اسٹیشن کا چکر لگا کر آتا ہوں جس کی حدود میں ریلوے اسٹیشن ہے، ممکن ہے وہ لاش اور اسلحہ وغیرہ ابھی ریلوے پولیس کی تحویل میں ہو۔"

"تو غنی یا احمد شاہ کو ساتھ لے جا۔" میں نے کہا۔

"او یار، مجھے ان نوابی چکروں میں مت ڈال۔" راجا نے کہا۔ "میں اگر ان چونچلوں میں پڑ گیا تو کر چکا صحافت۔"

"یار، پھر بھی احتیاط کرنا چاہیے نا؟" میں نے کہا۔ "تو احمد شاہ کو ساتھ لے جا۔"

"یار، تو بہت تنگ کرتا ہے۔" راجا نے کہا۔ "میں احمد شاہ کو ساتھ لے جاتا ہوں۔"

راجا کے جانے کے بعد میں نے غنی کو بلایا۔ وہ کمرے میں آیا تو اس کے چہرے پر تشویش کے سائے تھے۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "کیا بات ہے غنی۔ تم اتنے پریشان کیوں ہو؟"

"سر! ایک ڈبل کیبن پک اپ کافی دیر سے کوٹھی کے اردگرد چکر لگا رہی تھی۔ میں نے پہلے تو اس پر توجہ نہ دی لیکن جب وہ گاڑی مجھے اسٹریٹ کے نکڑ پر نظر آئی تو مجھے پریشانی ہوئی۔"

"ارے یار، ہوگی کسی کی گاڑی، اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟"

"پریشانی کی یہ بات ہے سر کہ وہ گاڑی راجا صاحب کی گاڑی کے تعاقب میں روانہ ہو گئی ہے۔ میں نے احمد شاہ کو اطلاع دے دی ہے۔"

"تم نے گاڑی کا نمبر نوٹ کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے کوشش کی تھی سر!" غنی نے جواب دیا۔ "لیکن اس کی سامنے والی نمبر پلیٹ پر کالک سی لگی ہوئی تھی۔ عقبی نمبر پلیٹ کے اوپر کسی نے مٹی پھیر دی تھی۔ اس وجہ سے نمبر بالکل چھپ کر رہ گیا تھا۔"

"تم احمد شاہ سے رابطے میں رہو۔ اس سے کہنا کہ ذرا سی بھی گڑبڑ ہو تو فوراً اطلاع دے۔"

"میں نے احمد شاہ سے بھی کہہ دیا ہے اور راجا

صاحب سے بھی۔" غنی نے کہا۔ "کوئی بھی گڑبڑ ہوئی تو وہ لوگ فوراً اطلاع دیں گے۔"

اچانک مجھے باہر سے فائرنگ کی آواز سنائی دی۔ فوراً ہی کوٹھی سے بھی فائرنگ ہوئی، پھر تو وہ علاقہ گویا میدانِ جنگ بن گیا۔

غنی تیزی سے باہر کی طرف دوڑا۔ میں نے بھی بغلی ہولسٹر سے اپنا ریوالور نکال لیا اور دروازے کی طرف بڑھا تو غنی مجھے برآمدے میں لیٹا نظر آیا۔ میں بھی محتاط انداز میں باہر نکلا تو مجھے برآمدے میں ایک زینہ نظر آیا جو کوٹھی کی اوپری منزل کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اوپر جا کر باہر کا جائزہ لیتا ہوں۔ یہ سوچ کر میں رکوع کی حالت میں چلتا ہوا زینے کی طرف بڑھا۔ فائرنگ میں ابھی تک کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ فائرنگ باہر سے زیادہ ہو رہی ہے، کوٹھی کے اندر سے اتنے تواتر سے فائرنگ نہیں ہو رہی تھی۔ میرے گارڈز ایمونیشن ضائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔

میں زینے تک پہنچا، پھر لپک کر زینے پر چڑھ گیا، یہاں میں فائرنگ سے محفوظ تھا۔ میں تیزی سے زینہ چڑھ کر اوپر پہنچا۔ اوپر زیادہ تعمیر نہیں ہوئی تھی۔ صرف دو کمرے بنے ہوئے تھے۔ باقی کھلا ہوا ٹیرس تھا۔ ٹیرس کی دیواریں خاصی اونچی تھیں۔

میں محتاط انداز میں چلتا ہوا ٹیرس کے سامنے والے حصے کی طرف گیا اور وہاں سے باہر جھانکنے کی کوشش کی۔ فائرنگ دو گاڑیوں سے ہو رہی تھی۔ میں نے ان کا نشانہ لینے کی کوشش کی لیکن پھر ارادہ ترک کر دیا کیونکہ دونوں گاڑیاں ریوالور کی رینج سے دور تھیں۔ میں نے سوچا کہ مجھے رائفل لے کر آنا چاہیے تھا۔ میں نے غنی کے سیل فون پر رابطہ کیا اور اس سے رائفل لانے کو کہا۔

"آپ کہاں ہیں سر؟" غنی گھبرا کر بولا۔

"میں اوپر چھت پر ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

وہ فوراً ہی رائفل اور اس کے راؤنڈ لے کر آ گیا۔ "میں نے پولیس کو فون کر دیا ہے سر!" غنی نے کہا۔

اچانک باہر خاصا زوردار دھماکا ہوا۔ اس سے پورا گھر لرز کر رہ گیا۔ میں نے اوپر سے جھانک کر دیکھا۔ باہر کھڑی ہوئی گاڑی کچھ پیچھے ہٹ گئی تھی۔ دوسری گاڑی نظر نہیں آ رہی تھی۔ اسی گاڑی میں سے دستی بم پھینکا گیا تھا۔

میں نے غنی کے ہاتھ سے ٹیلی اسکوپ رائفل لے لی۔ وہ SIG کی جدید رائفل تھی اور ہلاکت خیزی میں یوزی (Yozi) سے کسی بھی طرح کم نہیں تھی۔ ڈبل کیبن پک اپ بالکل میرے نشانے کی زد پر تھی۔ ان لوگوں کو شاید اندازہ بھی نہ ہوگا کہ ہمارے پاس اتنی دور مار رائفل بھی ہوگی۔ ویسے بھی میرے گارڈز اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ وہ کسی گاڑی کا نشانہ لے سکتے۔ اسی لیے باہر والوں کو اطمینان ہوگا۔ میں نے ڈرائیور کی کھوپڑی کا نشانہ لیا اور گولی چلا دی۔ دوسرے ہی لمحے میں نے ڈرائیور کو الٹ کر پیچھے گرتے دیکھا۔ گولی اس کی کھوپڑی میں پیوست ہو گئی تھی۔ میں نے بہترین نشانے پر خود کو داد دی۔

وہ لوگ بوکھلا گئے۔ ان کی اس بوکھلاہٹ سے فائدہ اٹھا کر غنی نے ان کے ایک اور آدمی کو نشانہ بنا لیا۔

گاڑی میں چھ آدمی تھے۔ ان میں سے دو تو کم ہو گئے تھے۔ باقی چار آدمیوں نے گاڑی سے چھلانگ لگائی اور اسی کی اوٹ میں چھپ کر بیٹھ گئے۔

"گاڑی کے پیٹرول ٹینک پر فائر کریں سر!" غنی نے کہا۔ "میں بھی پیٹرول ٹینک کو نشانہ بناتا ہوں۔"

"ٹھہر جاؤ غنی!" میں نے اسے روک دیا۔ "میں ان لوگوں کو زندہ پکڑنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"میں کوشش کرتا ہوں۔" غنی نے کہا۔

اسی وقت ایک آدمی اٹھ کر بھاگا۔ میں نے اس کے پیروں کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ متحرک ہدف پر بالکل صحیح نشانہ لگانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ یہ ہنر کئی برسوں کی پریکٹس کے بعد آتا ہے۔ میری گولی اس کے پیروں کے بجائے اس کی پیٹھ میں لگی کیونکہ عین وقت پر وہ لڑکھڑا کر دہرا ہو گیا تھا۔ پھر میں نے اسے الٹ کر گرتے دیکھا۔ اسی وقت مجھے دوسری گاڑی دکھائی دی۔ وہ مین روڈ سے دوسری گاڑی کی طرف آ رہی تھی۔ وہ گاڑی اس شخص کے نزدیک پہنچ کر رک گئی جسے میں نے گولی ماری تھی۔ وہ آدمی نہ جانے زندہ تھا یا مر گیا تھا۔

میں نے اس گاڑی کے ڈرائیور کا نشانہ لیا ہی تھا کہ میرے دائیں بازو میں آگ سی بھر گئی۔ میں پھرتی سے نیچے بیٹھ گیا۔ میں ان لوگوں کا نشانہ لینے میں اتنا آگے آ گیا تھا کہ گاڑی سے اترنے والوں میں سے کسی نے مجھے دیکھ لیا۔ میں اس خوش فہمی میں تھا کہ دور مار رائفل صرف میرے ہی پاس ہے۔ شانے میں گولی اترنے کے بعد میری یہ خوش فہمی دور ہو گئی تھی۔

میرا خون بہت تیزی سے ضائع ہو رہا تھا۔ بازو میں شدید تکلیف تھی اور ایسا لگ رہا تھا جیسے میرا دایاں بازو موجود ہی نہ ہو۔ رائفل میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی تھی۔

اچانک میرے کانوں میں پولیس کے سائرن کی آواز گونجی، پھر میرا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔

بے ہوشی کا یہ وقفہ کتنا طویل تھا، دس منٹ یا بیس منٹ یا ایک گھنٹا؟ مجھے کچھ احساس نہیں تھا۔ میں نے نظریں گھما کر اردگرد کا جائزہ لیا۔ یہ اس کوٹھی کا کمرا نہیں تھا جہاں مجھے گولی لگی تھی۔ اس وقت تکلیف کا احساس کم تھا لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ میرے پہلو میں دایاں بازو نہیں ہے۔

''ہیلو سر! کیسے ہیں آپ؟'' میری بائیں جانب سے آواز آئی۔

میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ وہ کوئی ڈاکٹر تھا۔ میں نے مسکرانے کی کوشش کی اور کہا۔ ''آئی ایم فائن ڈاکٹر!''

''گڈ!'' ڈاکٹر ہنس کر بولا۔ ''آپ کو تکلیف محسوس ہو رہی ہے؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

''زیادہ نہیں۔'' میں نے جبراً مسکرانے کی کوشش کی۔

''آپ زخمی کیسے ہوئے سر؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

عجیب چغد ڈاکٹر ہے، میں نے سوچا، اسی ڈاکٹر نے مجھے فرسٹ ایڈ دی ہوگی اور اب وہی مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ میں زخمی کیسے ہوا؟

''میرا خیال ہے کہ میں آم توڑتے ہوئے درخت سے گر پڑا ہوں۔'' میں نے منہ بنا کر کہا۔ ''آپ نے کبھی چوری کے آم کھائے ہیں؟''

''بہت سر!'' ڈاکٹر بھی اسی لہجے میں بولا۔ ''میں تو آم، امرود، کیلا وغیرہ خریدنے کا قائل ہی نہیں ہوں۔ ہمیشہ محلے والوں کے درختوں سے آم، امرود چوری چھپے توڑ کر کھاتا ہوں۔''

''آپ تو ماشاءاللہ پیشہ ور چور لگتے ہیں۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''کیا یہاں بھی کچھ چرانے آئے ہیں؟'' پھر میں درشت لہجے میں بولا۔ ''مجھے کسی چور سے علاج کرانے کا کوئی شوق نہیں۔ غنی!'' میں نے غنی کو پکارنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں میرے حلق سے عجیب سی آواز برآمد ہوئی اور مجھے زوردار چکر آیا۔

''یس سر!'' کہیں سے غنی کی آواز سنائی دی تو مجھے معلوم ہوگیا کہ وہ زخمی نہیں ہوا تھا۔ دوسرے ہی لمحے غنی میرے سامنے آگیا۔ ''یس سر!''

''اس فضول اسپتال میں تم لائے ہو مجھے؟'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''یہاں کے تو ڈاکٹر ہی چور ہیں۔''

''سر، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' غنی پریشان ہوگیا۔

میں اب تک پوری صورتِ حال کو سمجھ چکا تھا۔ وہاں پولیس کا ایک انسپکٹر بھی موجود تھا۔ میں فوری طور پر اس سے بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے یہ الٹی سیدھی بکواس شروع کردی تھی۔

''تم کون ہو؟'' میں نے کرخت لہجے میں کہا۔

''مم...... میں...... غنی ہوں سر!'' وہ بوکھلا کر بولا۔

''جھوٹ مت بولو۔'' میں نے اسے جھڑک دیا۔

اسی وقت راجا آگے بڑھا اور بولا۔ ''کیا بات ہے، تکلیف زیادہ ہے؟''

''ڈاکٹر صاحب! مجھے تکلیف تو ہے لیکن یہاں آپ نے کیسا اسٹاف رکھا ہوا ہے جسے بات کرنے کی بھی تمیز نہیں ہے۔''

''اچھا اچھا، میں آپ کے لیے دوسرا اسٹاف بلوا لوں گا۔ آپ غصہ تو مت کریں۔''

''چلو نہیں کرتے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن ان سب لوگوں کو یہاں سے باہر نکالو۔''

پولیس انسپکٹر آگے بڑھا اور بولا۔ ''اب آپ کی طبیعت کیسی ہے نواب صاحب؟''

''یار، اب یہاں کے چپراسی اور وارڈ بوائز بھی ہمارے منہ لگ رہے ہیں۔ غنی!'' میں نے ایک مرتبہ پھر غنی کو آواز دی۔

اچانک ایک ڈاکٹر آگے بڑھا اور بولا۔ ''آپ سب لوگ باہر چلے جائیں پلیز! پیشنٹ کی کنڈیشن اس وقت ٹھیک نہیں ہے۔''

وہ سب لوگ باہر نکل گئے۔ غنی کے چہرے پر زلزلے کے سے تاثرات تھے۔ اس کی آنکھوں میں ویرانی تھی اور ایسا لگ رہا تھا جیسے اب وہ رونا شروع کردے گا۔ راجا اسے سمجھا بجھا کر باہر لے گیا۔

''آپ آرام کریں نواب صاحب!'' ڈاکٹر نے کہا اور ایک انجکشن تیار کرنے لگا۔

وہ یقیناً نیند کا انجکشن ہوگا۔ اس قسم کی صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے ڈاکٹر فوری طور پر یہی نسخہ آزماتے ہیں۔

''ڈاکٹر صاحب!'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''ذرا میرے سیکریٹری کو بلوائیں۔''

''کون ہے آپ کا سیکریٹری؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔ ''اس کا نام بتائیے، میں اسے ابھی یہاں بلا لیتا ہوں۔''

''ارے نام ہی تو ہم بھول گئے۔'' میں نے پیشانی پر ہاتھ مارنے کی کوشش کی لیکن مجھ سے ہاتھ ہلایا بھی نہیں گیا۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ میرا دایاں ہاتھ موجود ہی نہیں ہے۔

ڈاکٹر باہر گیا اور راجا کو ساتھ لے کر آگیا۔

راجا نے بڑے ادب سے جھک کر کہا۔ ''جی نواب صاحب! آپ نے مجھے یاد فرمایا؟''

''تم ہی ہمارے سیکریٹری ہو؟'' میں نے اس سے پوچھا اور ڈاکٹر کی نظر بچا کر اسے آنکھ ماری۔

راجا بے ساختہ مسکرانے لگا۔ ''جی نواب صاحب! یہ ناچیز ہی آپ کا سیکریٹری ہے۔''

''ہمیں کیا ہوا ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''حضور گھوڑے سے گر پڑے تھے۔'' راجا نے چبا چبا کر کہا۔ ''آپ کے دائیں شانے پر بہت گہرا زخم آیا ہے۔ اس چوٹ سے دماغ بھی متاثر ہوتا لیکن وہ سرے سے آپ کی کھوپڑی میں نہیں ہے۔'' راجا نے آہستہ سے کہا۔

ڈاکٹر میری طرف انجکشن لے کر بڑھا۔ میں نے جلدی سے کہا۔ ''آئی ایم آل رائٹ ڈاکٹر! میں فوری طور پر پولیس کو بیان نہیں دینا چاہتا اس لیے......''

''آئی سی!'' ڈاکٹر مسکرا کر بولا۔ ''آپ تو بہت زبردست ایکٹر ہیں نواب صاحب! لیکن پولیس کو بیان تو دینا ہی پڑے گا۔ وہ انسپکٹر صبح پھر آجائے گا۔''

''میں اس وقت تک خود کو ذہنی طور پر تیار کرلوں گا۔'' میں نے کہا۔

''دیکھیے، پولیس کو فوری طور پر بیان دینا تو آپ ہی کے مفاد میں ہے۔'' ڈاکٹر نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''میرا سیکریٹری پولیس کو تفصیلی رپورٹ دے چکا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''او کے سر!'' ڈاکٹر مسکرا کر بولا۔ ''آپ ٹینشن مت لیں، صبح تک کوئی پولیس والا یہاں نہیں آئے گا۔''

''میرے زخم کی نوعیت کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ کے دائیں بازو میں کسی طاقت ور رائفل کی گولی لگی ہے۔ گولی آپ کے بازو کا گوشت پھاڑتی ہوئی نکل گئی ہے لیکن بازو کی ہڈی محفوظ ہے۔ ہاں، ابھی آپ ہاتھ ہلانے کی کوشش مت کیجیے گا۔ اب اگر اجازت ہو تو میں آپ کو انجکشن دے دوں؟''

''اس وقت آپ نیند کے علاوہ مجھے ہر قسم کا انجکشن دے سکتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''آپ کی تکلیف بڑھ سکتی ہے نواب صاحب!'' ڈاکٹر نے کہا۔

''ابھی تو قابلِ برداشت ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تکلیف بڑھی تو میں انجکشن لگوا لوں گا۔''

''او کے سر، ایز یو وش!'' ڈاکٹر نے کہا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

''یہ کیا ڈراما تھا فیکے پتر!'' راجا نے کہا۔ ''کچھ دیر کو تو میں بھی پریشان ہوگیا تھا۔''

''یعنی ہماری، نواب رفیق احمد شیرازی کی اب اتنی ہی وقعت رہ گئی ہے کہ ان کے لیے کچھ دیر کو، محض کچھ دیر کو پریشان ہوا جائے؟'' میں نے آنکھیں نکالیں۔

''شکر کر میں زیادہ پریشان نہیں ہوا ورنہ تو جانتا ہے، میں کیا کرتا ہوں۔'' راجا نے کہا۔

''یار، وہاں میرے ہاتھ سے کتنے آدمی مارے گئے؟'' میں سنجیدہ ہو کر بولا۔

''تو پوچھ تو ایسے رہا ہے جیسے وہاں بہت سے آدمی مارے گئے ہوں۔'' راجا نے کہا۔ ''وہاں تو کوئی بھی نہیں مرا۔ پولیس کو نہ وہاں کوئی زخمی ملا، نہ لاش!''

''اس کا مطلب ہے کہ وہ مرنے والوں کی لاشوں کو بھی اپنے ساتھ لے گئے؟'' میں نے حیران ہو کر کہا۔

''کون سی لاشیں فیکے پتر!'' راجا نے کہا۔ ''تو، تو اپنے گھر میں بیٹھا چلغوزے کھا رہا تھا اور گرم گرم کافی پی رہا تھا۔ اچانک تو نے فائرنگ کی آواز سنی۔ باہر سے کوئی تیری کوٹھی پر اندھا دھند فائرنگ کر رہا تھا۔ تو گھبرا کر صورتِ حال معلوم کرنے کے لیے چھت پر چڑھا تو، تو بھی فائرنگ کی زد میں آگیا۔''

''باہر ایک گاڑی کا ونڈ اسکرین گولی لگنے سے چور چور ہوگیا تھا۔ اس گاڑی کے ڈرائیور کو بھی گولی لگی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''کیا وہ لوگ وہ گاڑی بھی وہاں سے لے گئے؟''

''ہاں لگتا تو کچھ ایسا ہی ہے۔'' راجا نے کہا۔ ''پولیس کو وہاں کوئی گاڑی نہیں ملی، کوئی زخمی نہیں ملا۔ کوئی لاش نہیں ملی۔ ہاں وہاں ونڈ اسکرین کے ٹکڑے اور گولیوں کے خول ضرور ملے ہیں۔''

''پولیس کو کیا بیان دیا ہے تو نے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے بتایا تو ہے۔ تیرے کسی دشمن نے تجھ پر حملہ کیا۔ تیرے گارڈز نے مزاحمت کی۔ اس حملے میں تو بھی زخمی ہوا۔ تیرے ایک ملازم نے پولیس کو اطلاع دے دی۔ پولیس آئی تو حملہ آور فرار ہوگئے۔ اس حملے کی گواہی تو محلے والے بھی دیں گے۔ بس اب تو آرام کر، میں ڈاکٹر کو بھیجتا ہوں کہ وہ تجھے انجکشن لگا دے۔'' راجا چلا گیا۔

میں دیر تک خالی الذہنی کے عالم میں پڑا رہا۔ میری زندگی بھی ایک مسلسل جنگ بن کر رہ گئی تھی۔ ہر لمحہ نیا زخم

زمانے نے دیا ہے، ہر رتم کا مرہم زمانہ ہی بنا ہے۔ طرح دار سی ایک نرس آئی اور اس نے میرے بازو میں سرنج گھونپ دی، مجھے نہ جانے کب نیند آ گئی۔ نیند بھی ایسی کہ میں نہ سوتا تو زیادہ بہتر رہتا۔

مجھے خواب میں اہلیشا، رابعہ اور نہ جانے کون کون سی لڑکیاں چڑیلیں بن کر ڈراتی رہیں، نور بار بار آتی اور ان چڑیلوں کو مار کے پیچھے ہٹا دیتی، وہ چلی جاتی تو وہ بلائیں پھر آ جاتیں۔ میں سوتے میں نور ہی کو آوازیں دے رہا تھا۔ ہم بے خودی میں تم کو پکارے چلے گئے۔

صبح آنکھ کھلی تو میرے بازو میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ مجھے ایک دو دفعہ پہلے بھی گولی لگ چکی تھی۔ اتنی شدید تکلیف تو کبھی نہیں ہوئی تھی۔

اچانک میرے دل میں یہ ہولناک خیال آیا کہ شاید میرا بازو کاٹ دیا گیا ہے۔ ڈاکٹرز اور راجا مجھ سے جھوٹ بول رہے ہیں۔ یہ تصور ہی اتنا وحشت ناک تھا کہ میرا پورا جسم پسینے میں نہا گیا۔ شدید سردی کے باوجود میرے ماتھے سے پسینا بہہ رہا تھا۔

ایک نرس کمرے میں آئی اور اسٹینڈ پر لٹکی ہوئی بلڈ کی بوتل دیکھنے لگی۔ اس نے خون کی منتقلی کی رفتار کا جائزہ لیا، پھر تھرمامیٹر لے کر میری طرف بڑھی تو چونک اٹھی۔ ''آر یو آل رائٹ سر!'' وہ بوکھلا کر بولی۔ ''آپ کو تو بہت پسینا آ رہا ہے۔'' اس نے تولیا اٹھا کر میرے چہرے سے پسینا صاف کیا۔

''میں ٹھیک ہوں سسٹر!'' میں نے کہا۔ ''مجھے ذرا پانی پلا دیں۔''

اس نے مجھے پانی پلایا تو میری حالت میں نمایاں تبدیلی آئی۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ''سسٹر، مجھے ایک بات سچ سچ بتایئے گا۔'' وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ ''میرے جسم پر کتنے زخم ہیں؟''

''آپ کے جسم پر صرف ایک زخم ہے۔'' وہ مسکرا کر بولی۔

''کیا میرے دونوں ہاتھ موجود ہیں؟'' میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''پہلے تو وہ حیرانی سے مجھے دیکھتی رہی، پھر ہنس کر بولی۔ ''آف کورس سر! آپ کے دونوں بازو موجود ہیں۔'' پھر اس نے تھرمامیٹر میرے منہ میں لگا دیا اور بی پی آپریٹس کی پٹی میرے بازو پر باندھنے لگی۔ یہ آپریٹس جب میرے بازو پر بندھتا تھا، مجھے اماں یاد آ جاتی ہیں، وہ ہمیشہ اسی طرح میرے بازو پر امام ضامن باندھا کرتی تھیں۔ نرس نے میرے جسم کا درجۂ حرارت چیک کیا، پھر مطمئن ہوئی کہ فوری طور پر میرے مرنے کا کوئی امکان نہیں۔

نرس کے جانے کے بعد غنی کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں بڑا سا ایک شاپر تھا۔ اس نے میرے چہرے کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''آپ کیسے ہیں سر؟''

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' میں نے کہا۔

''آپ چھت پر گئے ہی کیوں تھے؟'' اس نے کہا اور آنسو بہانے لگا۔ اتنا لمبا چوڑا مضبوط مرد، عورتوں کی طرح آنسو بہا رہا تھا۔ مجھے اس پر ہنسی آ گئی۔ میں نے کہا۔ ''غنی! تم تو عورتوں سے بھی دو قدم آگے ہو۔''

اس نے اپنے آنسو پونچھ لیے اور بولا۔ ''کل تو آپ نے مجھے ڈرا دیا تھا۔'' پھر اس نے شاپر سے ناشتے کا سامان نکالا اور بولا۔ ''آپ نے رات بھی کھانا نہیں کھایا تھا۔ آپ کو بھوک لگ رہی ہوگی۔''

مجھے واقعی بھوک لگ رہی تھی۔ غنی نے میرا بیڈ سرہانے سے اونچا کر کے مجھے ناشتا کرایا۔ کافی پلائی تو واقعی میری جان میں جان آئی۔ میں نے اس سے بھی وہی سوال کیا جو نرس سے کر چکا تھا۔ ''غنی! کیا میرے دونوں بازو موجود ہیں؟''

''سر، آپ کے دائیں بازو میں گولی لگی ہے۔'' غنی نے کہا۔ ''گولی کا زخم بہت گہرا ہے۔ اس سے آپ کے بازو کا گوشت بری طرح ادھڑ گیا ہے لیکن ہڈی محفوظ ہے۔''

پولیس انسپکٹر نے اندر جھانکا، پھر ڈاکٹر نمودار ہوا اور مجھ سے بولا۔ ''اب کیسی طبیعت ہے نواب صاحب!'' اس نے میرے سرہانے رکھا ہوا چارٹ اٹھا لیا اور اس کا جائزہ لینے لگا۔

''اب میں ٹھیک ہوں ڈاکٹر!'' میں نے کہا۔

اس نے پولیس انسپکٹر سے کہا۔ ''آفیسر! آپ صرف دس منٹ لے سکتے ہیں لیکن پے شنٹ کو زیادہ پریشان مت کیجیے گا۔''

انسپکٹر اندر آیا اور ایک کرسی کھینچ کر میرے سامنے بیٹھ گیا۔ میں نے اسے وہی سب کچھ بتایا جو راجا نے مجھ سے کہا تھا۔

اس نے وہی گھسا پٹا سوال کیا۔ ''نواب صاحب! آپ کو کس پر شبہ ہے؟''

''شبہ کرنے کو تو میں کسی پر بھی کر سکتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''تو کیا آپ ان...... لوگوں کو شاملِ تفتیش کر لیں گے؟''

''یقیناً نواب صاحب! آپ نام تو لیجیے۔''

''مجھے اس ملک کے نظام پر شبہ ہے۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''پولیس ڈیپارٹمنٹ پر شبہ ہے، صدر اور وزیراعظم اور پوری کیبنٹ پر شبہ ہے۔''

''آپ تو مذاق کر رہے ہیں نواب صاحب!'' اس نے کھسیانی ہنسی ہنس کر کہا۔

''مذاق! مذاق تو آپ کر رہے ہیں۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''آپ چاہتے ہیں کہ میں کسی کا نام لے دوں اور آپ اس پر چڑھ دوڑیں۔''

''سر، پوچھنا تو پڑتا ہی ہے۔''

''یہ آپ کا کام ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لندن کی پولیس کبھی یہ نہیں پوچھتی کہ آپ کو کس پر شک ہے۔ وہ لوگ خود ہی تمام ثبوت اور شواہد اکٹھے کرتے ہیں اور قانون شکن عناصر تک پہنچ جاتے ہیں۔ اگر مدعی کسی پر شبہ بھی ظاہر کرتا ہے تو وہ اسے شاملِ تفتیش ضرور کرتے ہیں لیکن اسے اس وقت تک پریشان نہیں کرتے جب تک انہیں مشتبہ فرد کے خلاف ٹھوس ثبوت نہ مل جائے۔''

''آپ کے ساتھ تو پہلے بھی اسی قسم کے واقعات پیش آتے رہے ہیں اس لیے پوچھ رہا ہوں۔'' انسپکٹر نے کہا۔

''میرے ساتھ کبھی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا کہ کسی مسلح دشمن نے میرے گھر پر دھاوا بولا ہو۔ میرے گھر پر بمباری کی ہو۔''

''او کے سر! یہاں سائن کر دیں۔'' اس نے ایک رائٹنگ پیڈ میری طرف بڑھایا۔

''میں ابھی اس پوزیشن میں نہیں ہوں انسپکٹر! آپ دیکھ رہے ہیں کہ میرا دایاں ہاتھ اس وقت کام نہیں کر رہا ہے اور بائیں ہاتھ سے لکھنے کی مجھے پریکٹس نہیں ہے۔ اگر آپ کہیں تو میری طرف سے میرا یہ گارڈ دستخط کر دے گا۔''

''نو سر! اس سے کام نہیں چلے گا۔ میں بعد میں آپ کے دستخط لے لوں گا۔ اس نے اپنے کاغذات سمیٹے اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد غنی پھر کمرے میں آ گیا۔ میں نے اس سے راجا کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ صبح صبح کہیں چلے گئے تھے۔ پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ''ہاں سر، وہ میڈم نور کا فون بھی آیا تھا۔ وہ آپ کے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔''

''پھر تم نے کیا کہا؟'' میں نے پوچھا۔

''میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں ان سے کیا کہوں؟ میں نے ان سے کہہ دیا کہ نواب صاحب صبح ہی صبح راجا صاحب کے ساتھ کہیں چلے گئے ہیں۔''

''وہ راجا کو فون کرے گی اور جب راجا اسے بتائے گا کہ رفیق میرے ساتھ نہیں ہے تو وہ پریشان ہو جائے گی۔ میرا اسیل فون کہاں ہے؟''

اس نے سیل فون جیب سے نکال کر مجھے دے دیا۔

میں نے پہلے راجا کا نمبر ملایا لیکن وہ آف تھا۔ میں نے سکون کا سانس لیا اور نور کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری ہی بیل پر اس نے فون ریسیو کر لیا اور بولی۔ ''تم بیٹھے بیٹھے اچانک کہاں غائب ہو جاتے ہو۔ میری اتنی بھی حیثیت نہیں ہے تمہاری نظروں میں کہ مجھے کچھ بتا ہی دو۔''

''ارے ارے...... ایسی بات نہیں نورا!'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''بس ایمرجنسی میں وہاں سے نکلنا پڑا ورنہ......''

''بس بس، رہنے دو۔'' نور نے یہ کہتے ہوئے برا سا منہ بھی بنایا ہوگا۔ ''اب بھی میں نے فون کیا تو معلوم ہوا کہ نواب صاحب اپنا فون ہی بھول کر چلے گئے ہیں۔ تم واپس کب آ رہے ہو؟''

''کل تک انشاءاللہ واپس آ جاؤں گا۔'' میں نے کہا۔

''رفیق! تم لاہور ہی میں ہو نا؟''

''ابھی تک تو لاہور ہی میں ہوں۔'' میں نے ٹھنڈا سانس لے کر کہا۔

''میں بھی لاہور آ جاؤں؟'' وہ آہستہ سے بولی۔

''تم...... تم لاہور آ کر کیا کرو گی؟'' میں نے جلدی سے کہا۔

''میں چاہتی ہوں کہ ہمارا ایک گھر لاہور میں بھی ہو۔'' نور نے کہا۔

''چاہتا تو میں بھی ہوں کہ کراچی، اسلام آباد اور کوئٹہ میں بھی ہمارا ایک ایک گھر ہو لیکن......''

''بس شروع کر دیں تم نے اپنی اوٹ پٹانگ باتیں۔'' نور نے جھلا کر میری بات کاٹ دی۔ ''بس تم جلدی آ جاؤ۔''

''میں آج شام تک یا پھر کل صبح ست بدھائی پہنچ جاؤں گا۔'' میں نے کہا اور اسے خدا حافظ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

راجا دوپہر کو واپس آیا۔ وہ بہت تھکا تھکا لگ رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ ابھی تک پولیس کو یہ معلوم نہیں ہو سکا ہے کہ اسلحے اور منشیات کے اس ذخیرے کا مالک کون ہے؟ ہاں، اخبار والوں کی نشان دہی پر ان لوگوں نے ریلوے کے دو سابق افسران کے خلاف تحقیقات شروع کر دی ہیں۔''

''اور وہ لاش!'' میں نے پوچھا۔

''وہ لاش زمان ٹاؤن کے رہنے والے ایک نوجوان کی ہے۔ اسے فلمی ہیرو بننے کا بہت شوق تھا۔ اسے گلا گھونٹ کر مارا گیا ہے۔ اس کی جیب سے دس ہزار روپے کی رقم، پاسپورٹ اور انڈیا کا ٹکٹ برآمد ہوا ہے۔''

''انڈیا کا ٹکٹ؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''ہاں، اس میں حیرانی کی کیا بات ہے۔'' راجا نے کہا۔ ''کیا انڈیا جانے کے لیے ٹکٹ کی ضرورت نہیں پڑتی؟''

''وہ ریلوے اسٹیشن پر کیا کر رہا تھا؟ کیا ٹرین کے ذریعے انڈیا جا رہا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، اس کی جیب میں قومی ایئر لائن کا ٹکٹ تھا۔'' راجا نے کہا پھر مسکرا کر بولا۔ ''اس کی جیب سے جو پرس برآمد ہوا ہے اس میں کسی لڑکی کی تصویر بھی ہے۔''

''ظاہر ہے، وہ ہیرو تھا تو کوئی ہیروئن بھی ہوگی۔'' میں نے کہا۔

''اس ہیروئن کو تم بھی اچھی طرح پہچانتے ہو۔'' راجا نے کہا۔

''کون......فریال؟''

''نہیں فیکے پتر! رابعہ......اس کی ہیروئن رابعہ تھی۔''

''رابعہ!'' میں نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

''اس لڑکے کا نام کیا تھا؟''

''پاسپورٹ پر ماجد احمد لکھا ہوا ہے۔'' راجا نے کہا۔

''گویا یہ بات ثابت ہوگئی کہ رابعہ نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔''

''تجھ پر یہ بات اب ثابت ہوئی ہے؟'' راجا نے آنکھیں نکالیں۔

میں نے اسے نور کے فون کے بارے میں بتایا اور کہا۔ ''میں آج ہی ست بدھائی جانا چاہتا ہوں۔''

''ہاں تو چل!'' راجا نے کہا۔ ''پولیس کو مزید کچھ معلوم کرنا ہے تو وہ ست بدھائی آ جائے۔''

شام کو تقریباً چار بجے کے قریب ہم جانے کی تیاری کر رہے تھے کہ ناصر آ گیا۔ وہ مجھے دیکھ کر فکر مند ہو گیا۔ ''نواب صاحب! آپ زخمی کیسے ہوئے؟'' اس نے پوچھا۔

''بس یار، یہ ہمارے دشمنوں کی محبت ہے۔'' میں نے کہا۔

''دشمنوں کی محبت سے زیادہ یہ آپ کی اپنی حماقت ہے قبلہ نواب صاحب!'' راجا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

میں تھوڑی دیر پہلے اسپتال سے گھر واپس آیا تھا۔ ڈاکٹر تو مجھے ڈسچارج کرنے پر راضی نہیں تھا لیکن جب میں نے زیادہ اصرار کیا تو اس نے کہا کہ اگر آپ اپنی ذمے داری پر جانا چاہتے ہیں تو چلے جائیں۔ میں نے اسے بتایا کہ ست بدھائی میں میرا اپنا اسپتال ہے جہاں ہر قسم کی سہولیات میسر ہیں تو وہ بہت حیران ہوا کہ اس پسماندہ علاقے میں اسپتال کہاں سے آیا؟ بہرحال اس نے مجھے جانے کی اجازت دے دی۔

''تم اچانک یہاں کیسے آ گئے؟'' میں نے ناصر سے پوچھا۔

''میں تو ست بدھائی گیا تھا۔'' ناصر نے کہا۔ ''وہاں معلوم ہوا کہ آپ اور راجا دونوں لاہور میں ہیں۔ مجھے یہاں کچھ کام تھا اس لیے میں یہاں آ گیا۔ میں تو دوپہر ہی یہاں پہنچ گیا تھا۔ اپنا کام نمٹانے میں مجھے شام ہوگئی۔'' پھر وہ ہنس کر بولا۔ ''یہاں تو لگتا ہے چاند ماری ہوئی ہے۔ کوٹھی کی باؤنڈری وال اور گیٹ پر گولیوں کے بے شمار نشانات ہیں۔ میں نے آتے ہی یہ بات نوٹ کرلی تھی۔ یہ سب ہوا کیسے؟''

راجا نے اسے مختصراً بتایا کہ یہ سب کیسے ہوا؟

''کچھ معلوم ہوا، وہ لوگ کون تھے؟'' ناصر نے پوچھا۔

''اس کا جواب تو ان کی چہیتی رابعہ ہی دے گی۔'' راجا نے کہا۔ ''اس وقت دلاور اور رانا دونوں اسکرین سے غائب ہیں۔''

''دلاور تو آج کل لندن میں ہے۔'' ناصر نے کہا۔ ''میں نے اپنے ذرائع سے کل رات ہی یہ بات معلوم کی ہے۔''

''رانا بھی آج کل ملک سے باہر ہے۔'' راجا نے کہا۔

''ویسے یہ ضروری نہیں ہے کہ کوئی کارروائی کرنے کے لیے وہ خود بھی یہاں موجود رہے۔'' ناصر نے کہا۔ ''یہ ان سیاست دانوں اور جرائم پیشہ لوگوں کی پرانی تیکنیک ہے کہ خود کو شبے سے بالاتر رکھنے کے لیے یہ لوگ جائے واردات سے سیکڑوں میل دور ہوتے ہیں۔ خیر معلوم ہو جائے گا کہ یہ حرکت کس کی ہے؟'' پھر وہ ہنس کر بولا۔ ''اب آپ کا کیا پروگرام ہے؟''

''ہم لوگ ست بدھائی کے لیے نکلنے ہی والے تھے۔'' راجا نے کہا۔ ''تم بھی ہمارے ساتھ ہی چلو۔''

ہم لوگ ست بدھائی کے لیے روانہ ہوئے تو بہت محتاط تھے۔ ناصر بھی میرے ساتھ ہی تھا۔ اس کی گاڑی میرا ایک گارڈ لے کر آ رہا تھا۔ غنی میری گاڑی ڈرائیو کر رہا

تھا۔ اس کے ساتھ ناصر تھا، عقبی نشست پر میرے ساتھ راجا بیٹھا تھا۔ مجھے بیٹھنے میں خاصی تکلیف ہو رہی تھی لیکن گھر تو جانا ہی تھا۔

ہم لوگ بخیر و عافیت ست بدھائی پہنچ گئے۔

وہاں کسی کے وہم و گمان میں نہ تھا کہ میں زخمی ہو چکا ہوں۔ سب سے پہلے شہناز کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ لپک کر میری طرف آئی۔ ''یہ کیا ہو گیا؟ کہیں ایکسیڈنٹ ہو گیا کیا؟'' اس نے راجا سے پوچھا۔

''ہاں رفیق پھسل گیا سیڑھیوں سے۔'' راجا نے کہا۔

''کیسے......کہاں؟'' شہلا نے پوچھا۔ وہ نہ جانے کب وہاں آ گئی تھی۔

''ان لوگوں کو اندر تو آنے دو۔'' شہناز نے کہا۔

فوراً ہی یہ خبر ساری حویلی میں پھیل گئی کہ نواب صاحب زخمی ہو گئے ہیں۔ نور اپنے کمرے سے ننگے پاؤں بھاگتی ہوئی باہر آئی۔ میرا بازو پٹیوں میں جکڑا دیکھ کر وہ وحشت زدہ ہو کے بولی۔ ''کیا ہوا رفیق؟''

''کچھ نہیں۔'' راجا جلدی سے بولا۔ ''نواب صاحب پھسل کر گر پڑے ہیں۔''

''گرنے سے اتنی زیادہ چوٹ آ گئی؟'' نور نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

شہناز نے ایک مرتبہ پھر کہا۔ ''ارے بھئی، رفیق کو اندر تو آنے دو۔''

نور نے راستہ چھوڑ دیا۔ راجا اور ناصر مجھے کمرے کی طرف لے گئے۔ مجھ سے اس وقت کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا تھا لیکن خود پر جبر کر کے کھڑا ہوا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ نور یا شہناز میری وجہ سے زیادہ پریشان ہوں۔

میں جانتا تھا کہ جب شہناز میری ڈریسنگ کرے گی تو اسے معلوم ہو جائے گا کہ میں گولی لگنے سے زخمی ہوا ہوں لیکن فوری طور پر راجا نے اس بات کو چھپا کر بہت اچھا کیا تھا۔

پھر وہی ہوا جو میں نے سوچا تھا۔ پندرہ منٹ بعد ہی ڈاکٹرز کے ایک سہ رکنی میڈیکل بورڈ نے مجھے اپنی تحویل میں لے لیا۔ یہ میڈیکل بورڈ ڈاکٹر شہناز، ڈاکٹر مہدی حسن اور ڈاکٹر احمد حسن پر مشتمل تھا۔ ان تینوں نے میرا تفصیلی معائنہ کیا اور حسب توقع چونکے۔

ڈاکٹر شہناز نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ ''یہ زخم گرنے سے آیا ہے؟''

''نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''یہ زخم کھانے کے بعد تو میں گرا تھا۔ یہ زخم اپنی اونچی اڑانوں کے ہیں، زمیں پر بھی خواب آسمانوں کے ہیں! مزید تفصیلات کے لیے معروف صحافی راجا سے رجوع کریں۔ غنی بھی اس مسئلے پر مناسب روشنی ڈال سکتا ہے۔''

''میں تم سے پوچھ رہی ہوں رفیق!'' شہناز نے آنکھیں نکالیں۔

''کیا پوچھتے ہو، کیا تم سے کہوں، میں کس لیے جیتا ہوں؟ بھئی اب پوچھ ہی رہی ہو تو بتائے دیتا ہوں۔ یہ زخم دراصل اس نا ہنجار گولی کا ہے جو کسی کی رائفل سے نکلی اور ہمارے بازو کو چومتی ہوئی نہ جانے کہاں نکل گئی۔''

اس دوران میں ڈاکٹر احمد حسن میرا زخم صاف کرنے کے بعد اب پٹی کر رہے تھے۔

''مجھے اس وقت آرام کی شدید ضرورت ہے ڈاکٹر صاحب!'' میں نے کہا تاکہ وہ اس وقت مزید سوال و جواب نہ کرے۔ میری بات سن کر وہ انجکشن تیار کرنے لگی۔

''میں راستے بھر سوتا ہوا آیا ہوں۔'' میں نے جلدی سے کہا۔ مجھے خدشہ تھا کہ وہ مجھے خواب آور انجکشن نہ لگا دے۔

''یہ اینٹی بائیوٹک ہے۔'' شہناز نے کہا۔ اس نے دوسرا انجکشن تیار کیا۔ ''یہ باڈی ٹشوز کی بحالی کے لیے ہے۔''

اس نے یکے بعد دیگرے مجھے تین انجکشن لگائے، پھر غنی سے کہا کہ نواب صاحب کو ان کے بیڈ روم میں لے جاؤ۔ میں غنی کا سہارا لے کر باہر نکلا تو مجھے چکر سا آ گیا۔

میں نے شہناز کی طرف دیکھا تو وہ ہنس کر بولی۔ ''پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے تمہیں نیند کا انجکشن دے دیا ہے۔''

میں غنی کا سہارا لے کر اپنے کمرے تک پہنچا۔ غنی نے میرے گلے میں لٹکا ہوا آرم سلنگ اتارا اور میرے بازو کے نیچے ایک نرم و ملائم تکیہ رکھ کر مجھے بہت احتیاط سے بیڈ پر لٹا دیا۔

نور میرے پاس ہی بیٹھی کچھ کہہ رہی تھی لیکن اس کی آواز بہت دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ پھر نہ جانے کب ساری آوازیں، سارے منظر غائب ہو گئے۔

میری آنکھ کھلی تو مجھے شدید سردی کا احساس ہوا۔ پھر میری نظر دائیں جانب پڑی تو مجھے نور نظر آئی۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھی اونگھ رہی تھی۔ میں نے کمبل اوڑھنے کی کوشش کی تو مجھے شدید تکلیف کا احساس ہوا اور میرے حلق سے بے اختیار ایک کراہ بلند ہوگئی۔ نور نے آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا، پھر جھپٹ کر میرے پاس آئی اور بولی۔ ''کیا بات ہے رفیق!

تکلیف زیادہ ہو رہی ہے؟''
''مجھے سردی لگ رہی ہے۔'' میں نے کہا۔
نور نے میرے جسم پر کمبل پھیلا دیا۔
میرے منہ کا ذائقہ بھی عجیب ہو رہا تھا۔ حلق میں بھی کڑواہٹ اور خشکی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے نور سے پانی مانگا اور پانی پی کر پھر مجھے غنودگی آ گئی۔
دوبارہ میری آنکھ کھلی تو گھڑی ساڑھے آٹھ بجا رہی تھی۔ میری تکلیف اب کسی حد تک کم تھی۔ تھکاوٹ کے بجائے تر و تازگی کا احساس ہو رہا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں نیم گرم پانی سے غسل کروں لیکن اس وقت یہ ممکن نہ تھا۔
ریشم نے میرے نزدیک ہی پانی کا تسلہ رکھ دیا اور میرا منہ دھلانے لگی۔
تھوڑی دیر بعد وہ ناشتا لے کر آ گئی۔ نور نے مجھے اپنے ہاتھ سے ناشتا کرایا۔ ناشتے کے بعد میں نے گرما گرم کافی پی تو مجھے ایک نئی توانائی کا احساس ہوا۔ میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔
نور نے اچانک کہا۔ ''تمہیں ابھی تک رابعہ سے ہمدردی ہے؟''
میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔
''مجھے سب معلوم ہو چکا ہے۔'' نور نے کہا۔ ''تم اسی کے بلانے پر لاہور گئے تھے۔''
''اس نے اپنی مظلومیت کا ایسا نقشہ کھینچا تھا کہ مجھ سے رہا نہیں گیا۔'' میں نے اس سے نظریں چرا کر کہا۔
''تمہاری یہ ہمدرد دواخانے والی عادت تمہیں لے ڈوبے گی۔'' نور نے کہا، پھر اچانک اس کے آنسو بہنے لگے۔ ''اگر تمہیں وہاں کچھ ہو جاتا تو میں کیا کرتی، تمہیں میرا ذرا بھی خیال نہیں ہے؟''
''جانو...... نور جہاں...... جان...... میری بات سنو!''
میں نے اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا تو اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ میں نے ہائے کہہ کر اپنا زخمی بازو پکڑ لیا۔
نور نے ندامت بھرے انداز میں مجھے دیکھا، پھر اچانک اس نے میرے سینے پر سر رکھ دیا۔ میں اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا۔ میں نے اس سے کہا۔ ''جان! آج میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ یوں بغیر سوچے سمجھے کسی کی مدد کو نہیں دوڑوں گا۔'' میں نے اس کے ریشمی بال سہلاتے ہوئے کہا۔
دروازے پر دستک ہوئی تو وہ مجھ سے علیحدہ ہو گئی۔ راجا اور ناصر کمرے میں داخل ہوئے۔ ناصر نے مسکرا کر پوچھا۔ ''اب کیسی طبیعت ہے نواب صاحب؟''
''اس وقت تو طبیعت ہری ہو رہی ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''ویسے میری طبیعت اب بہت بہتر ہے۔''
''اور آپ کی طبیعت میں یہ رنگینی کہاں سے آئی؟'' راجا نے پوچھا۔ ''میں نے تو دھانی رنگ چوڑیوں کا سنا تھا، خوب صورت لڑکیاں بھی بعض اوقات دھانی چنریا اوڑھ لیتی ہیں۔ بعض اوقات پتنگ بھی دھانی ہوتی ہے۔ جیسے ایک گانا ہے، رنگ میری پتنگ کا دھانی!''
اس کی باتوں پر نور بے اختیار مسکرانے لگی۔ ناصر کے چہرے پر بھی مسکراہٹ آ گئی۔
راجا ہنس کر بولا۔ ''دیکھے پتر! تو خوش قسمت ہے کہ تجھے اتنے چاہنے والے لوگ ملے ہیں۔''
''ہاں واقعی! میری خوش قسمتی میں تو کوئی شبہ نہیں ہے۔'' میں نے نور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
اس سے پہلے کہ میں مزید کچھ کہتا، نور کمرے سے باہر نکل گئی۔ اسے شاید اندازہ ہو گیا تھا کہ اب میں اس کے بارے میں کچھ کہنے والا ہوں۔
اس کے جانے کے بعد راجا نے کہا۔ ''یار، وہ اس رابعہ کا کیا کرنا ہے؟''
''اسے کچھ دن آرام کرنے دے۔'' میں نے کہا۔
''میں نے مزید کنفرم کر لیا ہے کہ رانا اور دلاور میں سے کوئی بھی ملک میں موجود نہیں ہے۔'' ناصر نے کہا۔ ''مجھے تو لگتا ہے کہ یہ کارروائی رابعہ نے اپنے طور پر کی ہے۔''
''رابعہ نے؟'' میں نے حیران ہو کر کہا۔ ''اس کا تعلق کبھی بھی انڈر ورلڈ سے نہیں رہا۔ ورنہ میں بھی یہی سوچتا۔''
''میں بہت جلد معلوم کر لوں گا کہ اس ''واردات'' کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے؟''
''یار، ناصر کی بات دل کو لگتی ہے۔'' راجا نے کہا۔ ''رانا سے تو رابعہ کا کوئی رابطہ ہی نہیں تھا، ہو بھی نہیں سکتا۔ اس کے کورٹ نہ پہنچنے پر رانا بھی مشتعل ہوگا۔ وہ تو رابعہ کے خون کا پیاسا ہوگا۔ رہا دلاور، تو وہ رفیق کے خلاف اتنی لمبی چوڑی کارروائی کیوں کرے گا۔ وہ تو موقع ملتے ہی نواب صاحب کو راہی ملکِ عدم کر دے گا اور کوئی رفیق کا ایسا دشمن ہے نہیں۔ چودھری سلطان مر چکا ہے۔ فریال اپنے ہی حال میں مست ہے، پھر یہ سب کچھ کون کر سکتا ہے؟''
''اس میں سر کھپانے کے بجائے اس شخص کی زبان کھلوانا چاہیے جسے ہم نے ریلوے اسٹیشن کے اس کمرے سے پکڑا ہے۔'' میں نے کہا۔

''کون......! وہ مچھو؟''
''ہاں وہ مچھو ہے یا کوئی اور، ہمیں اس کی زبان کھلوانا ہوگی۔''
''میں کوشش کروں؟'' ناصر اٹھتے ہوئے بولا۔
''چلو میں بھی چل رہا ہوں۔'' میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا، پھر راجا سے پوچھا۔ ''تم نے کسی کو رابعہ کے بارے میں بتایا تو نہیں ہے کہ ہم لوگ اسے ست بدھائی لے آئے ہیں؟''
''اگر میں کسی کو بتا دیتا تو حویلی میں اب تک زلزلہ آ چکا ہوتا۔'' راجا نے کہا پھر مجھ سے بولا۔ ''تو آرام کر فیکے پتر! ہم لوگ ہیں نا!''
''یار، اب میں اتنا بھی نازک اندام نہیں ہوں کہ ذرا سے زخم پر بستر پکڑ لوں۔'' میں نے کہا اور آرم سلنگ گلے سے اتار دیا۔ مجھے شدید تکلیف کا احساس ہوا لیکن میں نے برداشت کیا اور آہستہ آہستہ اپنا دایاں ہاتھ نیچے لٹکا لیا۔
میں ان دونوں کے ساتھ کمرے سے نکلا تو ڈاکٹر شہلا پر نظر پڑی۔ وہ میری ہی طرف آ رہی تھی۔ اس نے نزدیک آ کر پوچھا۔ ''اب آپ کی طبیعت کیسی ہے نواب صاحب؟''
''اب میں بالکل ٹھیک ہوں ڈاکٹر صاحبہ!'' میں نے ہنس کر کہا اور آگے بڑھ گیا۔
''یار، کل دو دفعہ صوبیدار میجر صاحب بھی تجھے دیکھنے آئے تھے۔'' راجا نے کہا۔ ''لیکن تو سو رہا تھا۔''
''اچھا!'' میں نے کہا۔ ''یار، ان بیچارے سے بھی ملاقات کرنا چاہیے تھی۔'' میں نے کہا۔ ''چل پہلے ان ہی سے ملاقات کر لیں۔''
صوبیدار میجر صاحب مجھے دیکھ کر خوش ہو گئے اور بولے۔ ''رفیق میاں! مجھے آپ کی طرف سے بہت فکر تھی۔ کل میں نے آپ کو دور سے دیکھا تھا۔ اس وقت تو آپ کی حالت بہت ہی خراب تھی۔ شکر ہے اللہ کا آپ خیریت سے ہیں۔'' پھر وہ سنجیدگی سے بولے۔ ''آپ کہیں بھی جانے سے پہلے کم سے کم مجھے یا غنی کو تو بتا ہی دیا کریں اور ہاں، اب آپ تنہا کہیں نہیں جائیں گے۔''
''جیسے آپ کا حکم!'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''اصل میں اب تک مجھے کسی نے اس انداز میں حکم نہیں دیا تھا۔ آپ کا لہجہ سن کر تو ابا یاد آ گئے۔''
''خیر اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟'' صوبیدار میجر صاحب مسکرا کر بولے۔
''اب تو کافی بہتر ہے۔'' میں نے جواب دیا۔
غنی سائے کی طرح میرے ساتھ لگا ہوا تھا۔ راجا نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ تو خوش قسمت ہے جس کے اتنے چاہنے والے ہیں۔ میں واقعی خوش قسمت تھا جسے راجا جیسا دوست، غنی جیسا ہمدرد، شہناز جیسی محبت کرنے والی بہن اور نور جیسی محبوبہ ملی تھی۔
میں نے غنی سے کہا۔ ''ذرا تہ خانے کی چابیاں لے آؤ۔''
''چابیاں میں نے پہلے ہی لے لی ہیں سر!'' غنی نے کہا۔
میں نے پہلے اس سیل کا رخ کیا جس میں غنی نے مچھو کو رکھا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں کمبل اوڑھے بیٹھا تھا۔ تہ خانے میں سردی کچھ زیادہ ہی تھی۔
مجھے دیکھ کر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔
''بہت سردی لگ رہی ہے؟'' غنی نے اس سے پوچھا۔
''مجھے شاید بخار ہو گیا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''ورنہ مجھے اتنی سردی نہیں لگتی۔'' پھر وہ مجھ سے بولا۔ ''نواب صاحب! آپ نے مجھے یہاں قید کیوں کر رکھا ہے؟''
''تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا؟'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''دیکھو، میں تمہیں پانچ منٹ دے رہا ہوں۔ اگر تم اب بھی سچ نہ بولے تو پھر میں تمہیں اپنے اس گارڈ کے حوالے کر دوں گا۔ یہ تمہارے ہاتھ پیر توڑ کر تمہیں کسی کوڑے کے ڈھیرے پر پھینک دے گا۔ پھر بقیہ زندگی بھیک مانگتے گزرے گی۔''
''نواب صاحب! میں......''
''اتنی جلدی مت کرو۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''میں سچ کے سوا کچھ بھی سننا نہیں چاہتا۔'' میں نے اپنی کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی۔ ''تمہارا وقت شروع ہوتا ہے اب!'' میں نے ڈرامائی انداز میں کہا اور غنی سے مخاطب ہوا۔ ''پانچ منٹ بعد اس کے ہاتھ پیر باندھ دینا۔'' میں تہ خانے سے باہر آ گیا۔
چار منٹ بعد میں پھر تہ خانے میں داخل ہوا۔ غنی ہاتھ میں ایک مضبوط رسی لیے کھڑا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر پہلے مچھو کے ہاتھ پشت پر باندھے، پھر اسے بے رحمی سے گرا کر اس کے دونوں پاؤں بھی جکڑ دیے۔
''ہاں، اب شروع ہو جاؤ۔'' میں نے مچھو سے کہا۔
''مجھے جو کچھ بتانا تھا، بتا چکا ہوں۔'' مچھو تھوک نگل کر بولا۔
''بکواس کی ہے تم نے، جھوٹ بولا ہے۔'' میں دہاڑ

کر بولا۔

''اگر آپ اسے جھوٹ سمجھتے ہیں تو میں کیا کرسکتا ہوں۔'' مجّھو نے ڈھٹائی سے کہا۔

''اچھا!'' میں نے بھنا کر کہا اور جیب سے رانا کی تصویر نکال لی۔ ''اسے پہچانتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے تصویر پر نظر ڈالی اور بولا۔ ''میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ میں نے اس آدمی کو کبھی نہیں دیکھا ہے۔''

''تم رانا کے لیے کام کرتے ہو اور اس آدمی کو نہیں جانتے؟'' میرا غصہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

''ہوسکتا ہے یہ رانا کا کوئی خاص آدمی ہو؟'' مجّھو نے کہا۔ ''لیکن میں نے اسے کبھی رانا صاحب کے پاس نہیں دیکھا۔''

''الو کے پٹھے!'' میں نے اس کے شانے پر زوردار لات مارتے ہوئے کہا۔ ''تو اس آدمی کو نہیں جانتا۔'' میں نے دوسری لات اس کے منہ پر ماری۔ ''تو اس کے لیے کام کرتا ہے اور اسی کو نہیں جانتا۔ یہ رانا ہے، اسی کے لیے تو کام کرتا ہے۔''

اس کے چہرے کا رنگ لمحے بھر کو اڑ گیا، پھر اس نے فوراً ہی اپنی حالت پر قابو پالیا۔ ''ممکن ہے، مجھ سے ملنے والا شخص رانا نہ ہو۔'' اس نے پینترا بدلا۔ ''لیکن مجھے اس نے یہی بتایا تھا کہ میں رانا ہوں۔''

''غنی!'' میں نے اسے مخاطب کیا۔ ''ترکیب نمبر گیارہ استعمال کرو۔''

غنی سر ہلا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ ترکیب نمبر گیارہ کا میں خود بھی شکار ہو چکا تھا۔ لندن میں جب چیف کے آدمیوں نے مجھے پکڑ لیا تھا۔ تو میں نے یادداشت گم ہونے کی اداکاری کی تھی۔ اس پر چیف کے ایک آدمی نے کہا تھا کہ اس پر ترکیب نمبر گیارہ استعمال کرو۔ ترکیب گیارہ کوئی فارمولا نہیں تھا۔ بس چیف کے اس آدمی نے یوں ہی تشدد کے اس طریقے کو ترکیب نمبر گیارہ کا نام دے دیا تھا۔

غنی واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں مٹی کی ایک ہانڈی تھی جس میں کوئلے دہک رہے تھے۔ غنی جانتا تھا کہ ترکیب نمبر گیارہ سے میری کیا مراد ہے۔ ایک دفعہ میں نے ہی اسے اپنے اغوا کا واقعہ سنایا تھا۔

غنی نے مجّھو کے پیروں میں ایک لمبی سی رسی باندھی اور اس کا دوسرا سرا کمرے میں لگے ہوئے پنکھے کی طرف پھینکا، پھر دوسری طرف سے آہستہ آہستہ اسے کھینچنے لگا۔

ایک ہی منٹ میں مجّھو سر کے بل لٹک رہا تھا۔

''میں تمہیں سچ بولنے کا آخری موقع دے رہا ہوں۔'' میں نے آگے بڑھ کے مجّھو کے چہرے پر زوردار تھپڑ مارا۔ چٹاخ کی آواز آئی اور وہ پینڈولم کی طرح جھولنے لگا۔

''مجھے جو کچھ معلوم تھا، میں بتا چکا ہوں۔'' مجّھو نے ڈھٹائی سے کہا۔

میں نے غنی کو اشارہ کیا اور خود کمرے سے باہر نکل آیا۔

غنی نے مٹی کی وہ ہانڈی عین مجّھو کے سر کے نیچے رکھ دی۔ مجّھو کا سر ہانڈی سے بہت اوپر تھا لیکن دہکتے ہوئے کوئلوں کی تپش اوپر تک جا رہی ہوگی۔ ایک منٹ سے بھی کم عرصے میں مجّھو کا چہرہ پسینے میں تر ہوگیا لیکن اس نے زبان نہ کھولی۔

غنی نے اچانک دہکتے ہوئے کوئلوں میں مرچیں جھونک دیں۔ مرچوں کی دھانس اس کے کمرے سے باہر تک آرہی تھی۔ مرچوں کی بدبو میری ناک میں چڑھی تو میں بری طرح کھانسنے لگا۔ میں نے جلدی سے رومال نکال کر ناک اور منہ پر رکھ لیا۔ راجا اور ناصر بھی کھانس رہے تھے۔

میں نے دیکھا، مجّھو کی حالت غیر ہوگئی تھی۔ وہ بری طرح اپنا سر جھٹک رہا تھا، اپنے جسم کو اوپر اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا اور بری طرح کانپ رہا تھا، کھانس رہا تھا اور حلق سے اذیت ناک کراہیں نکال رہا تھا۔

غنی نے بھی اپنے چہرے پر رومال رکھ لیا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر انگاروں پر سرخ مرچیں ڈالیں۔ اس میں سے گاڑھا گاڑھا دھواں اٹھا اور مجّھو ذبح ہونے والے مرغ کی طرح جھٹکے کھانے لگا۔ میرے اشارے پر غنی نے ہانڈی اس کے سر کے نیچے سے ہٹالی کیونکہ مجّھو کا سر ڈھلک گیا تھا اور وہ بے جان لاش کی طرح رسی میں جھول رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد غنی نے ایک جگ میں پانی لے کر اس کے چہرے پر چھینٹے مارے۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ مجّھو کو ہوش میں لانے میں کامیاب ہوگیا۔

''اب سچ بولو گے یا نہیں؟'' میں نے کہا۔ ''اپنا نام بتاؤ۔''

''سلامت علی!'' اس نے یوں کہا جیسے مداری کا جمورا بولتا ہے۔ ''لوگ مجھے مجّھو کے نام سے جانتے ہیں۔''

''تم رانا زوہیب کو جانتے ہو؟''

''نہیں، میں اسے نہیں جانتا۔'' مجّھو نے جواب دیا۔

''تم کس کے لیے کام کرتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''جہاں سے مجھے پیسے ملیں، میں اسی کے لیے کام کرنے پر تیار ہو جاتا ہوں۔''

''ریلوے اسٹیشن کیوں گئے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''میڈم رابعہ نے مجھے وہاں بھیجا تھا۔'' اس نے کہا۔

''میں اب کچھ نہیں چھپاؤں گا نواب صاحب! آپ کو خدا کا واسطہ، مجھے نیچے اتاریں۔ میری حالت بہت خراب ہو رہی ہے۔ مجھے نیچے اتاریں۔''

''نیچے بھی اتار لوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''پہلے تم میرے سوالات کا جواب دو۔ رابعہ تمہیں کہاں ملی تھی؟''

''میڈم رابعہ مجھ سے نہیں بلکہ شاکر سے ملی تھیں۔''

مجّھو نے گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے کہا۔ وہ ناک کے بجائے منہ سے سانس لے رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس وقت اس کی کیا کیفیت ہوگی۔

''رابعہ شاکر کو کیسے جانتی ہے؟'' راجا نے پوچھا۔

''شاکر دلاور کے لیے کام کرتا ہے۔ دلاور نے شاکر سے کہا تھا کہ میڈم رابعہ کا خیال رکھنا۔ میں کچھ ضروری کاموں سے لندن جا رہا ہوں۔''

اس نے پھر سر جھٹکا اور خوشامد بھرے لہجے میں بولا۔ ''نواب صاحب! آپ کو اللہ کا واسطہ! مجھے معاف کردیں اور نیچے اتار لیں ورنہ میں مر جاؤں گا۔''

میں نے غنی کو اشارہ کیا۔ غنی نے اس کی رسی آہستہ آہستہ ڈھیلی کی اور اسے نیچے اتار لیا۔

نیچے اترتے ہی وہ بے ہوش ہوگیا۔

''اسے بستر پر آرام سے لٹا دو۔'' میں نے غنی سے کہا۔ ''اور اس کے ہاتھ پیر بھی کھول دو۔ میں کچھ دیر بعد آؤں گا۔'' میں ناصر اور راجا کے ساتھ تہ خانے سے باہر آگیا۔ میری حالت بھی مرچوں کی اس دھانس سے خراب ہو گئی تھی۔ راجا اور ناصر کا بھی یہی حال تھا، وہ دونوں بھی کھلی فضا میں گہرے گہرے سانس لے رہے تھے۔

''نواب صاحب!'' ناصر ہنس کر بولا۔ ''آپ واقعی نواب ہیں۔''

''او بھائی!'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''میں نے ابھی تم سے سچ بولنے کو نہیں کہا۔ تم تو دہکتے ہوئے کوئلوں اور مرچوں کی دھانس سے بہت دور تھے۔''

میری بات پر ناصر بے اختیار ہنسنے لگا اور بولا۔ ''میرا مطلب تھا کہ آپ میں بھی نوابوں اور جاگیرداروں والی خصوصیات موجود ہیں۔ ہر جاگیردار اور نواب تشدد اور تھرڈ ڈگری کے بے شمار طریقے جانتا ہے۔''

میں نے ناصر کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے کہا۔ ''یہ تم طنز کر رہے ہو یا میری تعریف کر رہے ہو؟''

''نواب صاحب!'' ناصر بھی سنجیدہ ہوگیا۔ ''میں جن لوگوں پر طنز کرتا ہوں، ان کے ساتھ قیام نہیں کرتا، ان کے ساتھ کھانا بھی نہیں کھاتا۔ کھانا تو دور کی بات ہے، میں تو ان کے گھر کا پانی بھی خود پر حرام سمجھتا ہوں۔''

''او ہو، تم تو واقعی سیریس ہوگئے۔ میں نے تو یونہی ایک بات کہی تھی۔''

''تو پھر میں بھی یوں ہی سیریس ہوگیا تھا۔'' ناصر نے مسکرا کر کہا۔ ''میں بھی اداکار ہوں یا نہیں؟''

''تم تو اداکاری کا اکیڈمی ایوارڈ بھی جیت سکتے ہو۔'' میں نے کہا، پھر راجا سے مخاطب ہوا۔ ''میں اب اپنے کمرے میں جاؤں گا۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے کچھ تھکن سی محسوس ہو رہی ہے۔''

وہ دونوں بھی میرے ساتھ ہی میرے کمرے میں آگئے۔ راجا نے کہا۔ ''یار تو آرام کر، ہم لوگ تھوڑی دیر بعد آجائیں گے۔''

وہ دونوں چلے گئے۔ راجا نے شہناز کو بھیج دیا تھا۔

شہناز نے تشویش سے مجھے دیکھا، پھر بولی۔ ''تم نے وہ آرم سلنگ کیوں نکال دیا؟ ہاتھ لٹکا ہونے کی وجہ سے تکلیف ہو رہی ہوگی۔ تم آرام سے لیٹ جاؤ۔''

''مجھے تکلیف نہیں ہے بلکہ تھکن ہو رہی ہے۔'' میں نے کہا۔

''تھکن بھی کمزوری کی وجہ سے ہوتی ہے۔'' اس نے زبردستی مجھے لٹا دیا اور بولی کہ میں تمہیں ایک انجکشن اور دیتی ہوں۔

میں نے گھبرا کر کہا۔ ''اس وقت خواب آور انجکشن مت دے دینا۔ یوں بھی پرسوں سے لے کر اب تک مجھے اتنے خواب آور انجکشن دیے گئے ہیں کہ میرا ذہن بوجھل ہو کر رہ گیا ہے۔''

''فکر مت کرو، میں تمہیں نیند کا انجکشن نہیں دوں گی۔'' شہناز نے مسکرا کر کہا۔

اچانک غنی گھبرایا ہوا آیا۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر میں بھی گھبرا گیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''کیا ہوا غنی، تم اتنے پریشان کیوں ہو؟''

''پولیس آئی ہے سر!'' اس نے کہا۔

''تو اس میں اتنی پریشانی کی کیا بات ہے؟'' مجھے غصہ آگیا۔ ''راجا کو بلاؤ۔''

شہناز مجھے انجکشن دے کر چلی گئی۔ راجا اور ناصر ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔

میں نے راجا سے کہا۔ ’’بھئی وہ تیرے پرانے دوست آئے ہیں۔‘‘

’’کون! وہ تیرے سسرالی رشتے دار؟‘‘ راجا ہنس کر بولا۔ ’’ان سے تو ناصر نمٹ لے گا۔ تو تو یوں بھی اس وقت ملاقات کی پوزیشن میں نہیں ہے۔‘‘

’’یار، وہ کہیں تلاشی کا وارنٹ لے کر نہ آئے ہوں۔‘‘

’’تلاشی!‘‘ راجا نے کہا۔ ’’وہ کیوں تلاشی لیں گے اور کس کی تلاشی لیں گے؟‘‘

’’آپ آرام کریں، ہم ابھی آتے ہیں۔‘‘ ناصر نے کہا اور راجا کو لے کر باہر نکل گیا۔

مجھے کافی کی طلب ہو رہی تھی۔ میں نے ایک ملازم کو بلایا اور کافی کے لیے کہا۔

تھوڑی دیر بعد ریشم کافی لے کر آ گئی۔ اس کے ساتھ نور بھی تھی۔ ریشم کے جانے کے بعد نور بولی۔ ’’رفیق! اس سے بہتر تو ہم لندن میں تھے۔ یہاں تو ایک ہی گھر میں ہونے کے باوجود تم سے گھنٹوں ملاقات ہی نہیں ہوتی ہے۔ میں یہاں پڑے پڑے بور ہو گئی ہوں۔ وہاں تو میں اتنی مصروف رہتی تھی اور یہاں......‘‘

مجھے ہنسی آ گئی۔ ’’تم تو واقعی اس وقت کسی ملٹی نیشنل کمپنی کی سی ای او نظر آ رہی ہو۔‘‘

’’مذاق مت کرو۔‘‘ نور جھینپ کر بولی۔

اس وقت وہ خوب صورت سیاہ ساڑی اور بلاؤز میں ملبوس تھی۔ سیاہ ساڑی اس کے سفید رنگ پر بہت اچھی لگ رہی تھی اور اس کی شخصیت میں جو وقار، جو رعب پیدا ہوا تھا، اس سے وہ مجھے کسی کمپنی کی سی ای او ہی لگ رہی تھی۔

دروازے پر دستک دے کر راجا اندر آ گیا اور بولا۔ ’’پولیس کی یہ پارٹی لاہور سے آئی ہے۔ یہ سب ناصر کا کمال ہے۔ اس نے پولیس کے ڈائریکٹر جنرل کو فون کر کے کہا تھا کہ نواب صاحب پر لاہور میں قاتلانہ حملہ ہوا ہے۔ اسی قسم کا ایک فون اس نے ہوم منسٹر کو کیا تھا۔ نتیجے میں پورے پولیس ڈیپارٹمنٹ میں ہلچل مچ گئی۔ میں پولیس پارٹی کے انچارج ایس پی کو یہاں بلوا لیتا ہوں۔ وہ تجھ سے ملاقات کرنا چاہتا ہے۔‘‘ راجا یہ کہہ کر واپس چلا گیا۔ میں نے نور سے دوسرے کمرے میں جانے کو کہا۔

نور نے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا اور کمرے سے نکل گئی۔ اس کی آنکھوں میں شکوہ تھا بے سکونی کا، ہجر کا۔

تھوڑی دیر بعد غنی دستک دے کر اندر آ گیا اور بولا۔ ’’سر! ایس پی صاحب آئے ہیں۔‘‘

’’انہیں اندر بلاؤ۔‘‘ میں نے کہا۔ میں اس وقت بیڈ سے اٹھ کر آرام کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔

ایس پی اندر آیا اور اس نے مجھے بہت مودبانہ انداز میں سلام کیا۔ میں نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے بیٹھے ہی بیٹھے اسے اشارے سے بیٹھنے کو کہا۔ وہ میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گیا۔

’’جی ایس پی صاحب!‘‘ میں نے کہا۔ ’’حکم کریں۔‘‘

’’حکیم کیا کرنا ہے نواب صاحب!‘‘ ایس پی ہنس کر بولا۔ ’’آپ کو ڈسٹرب کرنے کی معافی چاہتا ہوں۔‘‘

’’اٹ از آل رائٹ آفیسر!‘‘ میں نے باوقار لہجے میں کہا۔ میں جانتا تھا کہ ایس پی کی یہ فرماں برداری اور تابعداری ڈی جی پولیس کی وجہ سے ہے۔

’’سر، ماڈل ٹاؤن میں آپ کی کوٹھی پر حملہ ہوا تھا، میں اسی سلسلے میں تحقیقات کر رہا ہوں۔‘‘

’’میں نے اس کی رپورٹ متعلقہ تھانے میں لکھوا دی تھی آفیسر!‘‘ میں نے باوقار لہجے میں کہا۔ ’’میں نے سب کچھ تفصیل سے پولیس کو بتا دیا تھا۔‘‘

’’سر، آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ آپ پر یہ حملہ کون کرا سکتا ہے؟‘‘ ایس پی نے پوچھا۔

’’مجھے اگر ذرا بھی اندازہ ہوتا تو میں پہلے ہی پولیس کو بتا دیتا۔‘‘ میں نے کہا۔

’’وہ کوٹھی آپ کی ہے؟‘‘ ایس پی نے پوچھا۔

’’کس کوٹھی کی بات کر رہے ہو آفیسر!‘‘ میں نے پوچھا۔

’’ماڈل ٹاؤن کی وہ کوٹھی جہاں آپ پر حملہ ہوا تھا۔‘‘ ایس پی نے کہا۔

’’اس سوال کا حملے سے کیا تعلق ہے؟‘‘ میں نے کہا۔ ’’وہ کوٹھی میرے ایک ملازم کی ہے۔‘‘

’’میں اس لیے پوچھ رہا تھا کہ ممکن ہے کوئی پہلے سے وہاں آپ کی تاک میں بیٹھا ہو لیکن آپ کہہ رہے ہیں کہ وہ کوٹھی آپ کی نہیں ہے۔‘‘

’’آفیسر! تم کیا یہی معلوم کرنے کے لیے لاہور سے یہاں تک آئے ہو؟‘‘ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

ایس پی نے ایسی نظروں سے مجھے دیکھا جیسے دل ہی دل میں مجھے گالیاں دے رہا ہو۔ پھر وہ سنبھل کر بولا۔ ’’نواب صاحب! آپ نے پولیس کو جو اسٹیٹمنٹ دیا تھا، اس پر سائن نہیں کیے تھے۔ میں آپ کا وہ بیان لے کر آیا ہوں، آپ اس پر سائن کر دیں۔ یہ ضابطے کی کارروائی ہے نواب

صاحب!‘‘

’’میں تو اس وقت بھی سائن کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’میری طرف سے میرا سیکریٹری دستخط کر دے گا۔‘‘

ایس پی کے ہاتھ میں ایک فائل تھی۔ اس نے فائل کھول کر میرا وہ بیان نکالا جو میں نے لاہور میں پولیس انسپکٹر کو دیا تھا۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر وہ پرچہ اس سے لے لیا۔ اسے پڑھنا بھی ایک مسئلہ تھا کیونکہ تحریر ایسی جناتی تھی کہ اسے وہ شخص خود بھی مشکل ہی سے پڑھ پاتا جس نے لکھا تھا۔

میں نے ایس پی سے کہا۔ ’’آفیسر! کیا تم اسے پڑھ سکتے ہو؟‘‘

’’آف کورس سر!‘‘ اس نے کہا۔

’’تو پھر ذرا مجھے پڑھ کر سناؤ۔‘‘ میں نے وہ پرچہ دوبارہ اسے دے دیا۔

اس نے پرچہ میرے ہاتھ سے لے کر پڑھنا شروع کیا۔ ’’میں نواب رفیق احمد شیرازی بہ قائمی ہوش وحواس...... یہ......‘‘ وہ پڑھتے پڑھتے اٹک گیا۔ ’’یہ......‘‘

’’آفیسر!‘‘ میں نے ناگوار لہجے میں کہا۔ ’’میرا یہ بیان ٹائپ کر کے لاؤ تاکہ میں اسے آسانی سے پڑھ سکوں۔ اب میں تو نہیں جانتا کہ اس میں کیا لکھا ہے۔ تمہارا وہ انسپکٹر اس میں کچھ بھی لکھ سکتا ہے۔ مثلاً وہ لکھ سکتا ہے کہ میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں نے دو آدمیوں کو قتل کر کے ان کی لاش فلاں جگہ دبا دی ہے اور میں اس بیان پر اپنے دستخط بھی کر دوں۔ نیچے تم ’’ب س م ت‘‘ لکھ کر اس پر اپنے سائن بھی کر دو تو مجھے تو پریشانی ہو جائے گی نا!‘‘ ب س م ت، دراصل مخفف تھا ’’بیان سن کر صحت تسلیم کی‘‘ کا۔

’’آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں نواب صاحب!‘‘ ایس پی نے کہا۔ ’’پولیس کا کوئی ذمے دار افسر ایسی حرکت کر سکتا ہے؟‘‘

’’پولیس کے ذمے دار افسران تو اس سے بھی بڑی بڑی حرکتیں کرتے ہیں آفیسر!‘‘ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ’’یہ تو ایک غیر ذمے دار افسر کی حرکت ہے۔‘‘ پھر میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ’’اس بیان کو ٹائپ کروا کر لے آؤ، میں اس پر اپنے سیکریٹری سے دستخط بھی کرا دوں گا اور اپنی اسٹیمپ بھی لگا دوں گا اور کچھ پوچھنا ہے؟‘‘

’’نواب صاحب!‘‘ ایس پی خون کے سے گھونٹ پی کر بولا۔ ’’اصل میں ہم نے ایک آدمی کو گرفتار کیا ہے۔ پولیس کو شبہ ہے کہ وہ ان آدمیوں میں سے ایک ہے جنہوں نے آپ پر حملہ کیا تھا۔ کیا آپ اس آدمی کو شناخت کر سکتے ہیں؟‘‘

’’کیسی باتیں کرتے ہو آفیسر!‘‘ میں نے ناگواری سے کہا۔ ’’میں اسے کیسے شناخت کر سکتا ہوں۔ میں نے کسی بھی حملہ آور کی شکل نہیں دیکھی تھی۔‘‘

’’میرا مطلب ہے کہ آپ یہ تو بتا سکتے ہیں کہ آپ اس آدمی کو پہچانتے ہیں یا نہیں۔‘‘

’’اس کے لیے مجھے کیا کرنا ہو گا؟‘‘ میں نے درشت لہجے میں کہا۔ اب مجھے واقعی غصہ آنے لگا تھا۔ ’’کیا تمہارے کسی تھانے میں حاضر ہو کر ملزم کو شناخت کرنا ہو گا یا پھر تم خود مجھے اپنے ساتھ لے جاؤ گے؟‘‘

’’میں صرف یہ چاہتا تھا کہ آپ اسے ایک نظر دیکھ لیتے۔‘‘

’’کیا ملزم کو اپنے ساتھ لائے ہو؟‘‘ میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

’’مجھے اندازہ نہیں تھا نواب صاحب کہ آپ اتنے زخمی ہیں ورنہ میں یہاں نہ آتا۔ میں نے یہی سوچا تھا کہ آپ معمولی زخمی ہوئے ہوں گے، اسی لیے تو ایک ہی دن میں اسپتال سے ڈسچارج ہو گئے۔ سوری سر، میں تو صرف یہ چاہتا تھا کہ آپ ایک نظر اس شخص کو دیکھ لیں لیکن آپ کی طبیعت خراب ہے۔‘‘

’’وہ شخص کون ہے؟‘‘ میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔ ’’اس کا نام پتا تو معلوم کیا ہو گا تم نے؟‘‘

’’وہ لاہور کا ایک کرمنل شاکر علی ہے۔‘‘ ایس پی نے کہا۔

شاکر علی کا نام سن کر میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا تھا۔ میں نے اپنے چہرے سے یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ میں شاکر کا نام اس سے پہلے بھی سن چکا ہوں۔

’’میں نے اس سے پہلے یہ نام نہیں سنا۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’وہ کرتا کیا ہے؟‘‘

’’شاکر علی ہر قسم کا غیر قانونی کاروبار کرتا ہے۔ اسمگلنگ سے لے کر بردہ فروشی تک اور منشیات سے لے کر اسلحے کی فروخت تک وہ ہر کام کرتا ہے۔‘‘

’’اور ابھی تک قانون کی نظروں سے بچا ہوا تھا؟‘‘ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

میرے اس طنز کا ایس پی نے برا نہیں مانا۔ ہاں اگر کوئی اور وقت ہوتا تو شاید وہ مجھے فوری طور پر گرفتار کر کے

تھانے لے جاتا اور میری اچھی طرح چھترول کرنے کے بعد کہتا۔ ''قانون تو بہت کچھ کر سکتا ہے اوئے، تو کیا سمجھتا تھا، قانون بے بس ہے۔''

''اسے پولیس نے کئی دفعہ گرفتار کرنے کی کوشش کی لیکن ہر دفعہ وہ عدم ثبوت کی بنا پر بچ گیا۔'' ایس پی نے کہا۔

''ہاں، پاکستان میں ہر وہ مجرم بچ جاتا ہے جس کے پاس پیسا ہو یا کوئی سیاست داں یا بیوروکریٹ اس کا پشت پناہ ہو۔ قانون کو پھر کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ پیسے کی چمک دمک اور سفارش کی دیوار کے پیچھے پہنچ کر وہ مجرم باعزت شہری بن جاتا ہے اور پولیس کے افسران اسے گرفتار کرنے کے بجائے صبح شام سلام کرتے ہیں۔''

ایس پی کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات نمودار ہوئے۔ میں بار بار اس کے اختیارات کو چیلنج کر رہا تھا اور وہ ہر بار خون کے گھونٹ پی رہا تھا۔

''نواب صاحب!'' اس نے کہا۔ ''میں صرف یہ پوچھ رہا تھا کہ آپ شاکر علی کو جانتے ہیں یا نہیں؟''

''میں بتا تو چکا ہوں کہ میں اسے نہیں جانتا۔'' میں نے کہا۔

''یہ شاکر علی دراصل ہمیں کئی اور وارداتوں میں مطلوب تھا۔ اگر آپ اس کے خلاف بیان دے دیں تو ہم اس کے خلاف مضبوط کیس بنا سکتے ہیں ورنہ وہ عدالت سے ایک مرتبہ پھر بری ہو جائے گا۔''

''ایس پی! تم کہنا کیا چاہتے ہو! میں بغیر جانے بوجھے کسی بھی شخص کے خلاف بیان دے دوں۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''تم مجھ سے جھوٹا بیان لینا چاہتے ہو۔''

''اس نے آپ پر حملہ کیا تھا۔'' ایس پی جز بز ہو کر بولا۔

''یہ تمہارا بیان ہے۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''میں کسی شاکر علی کو نہیں جانتا۔''

''لیکن وہ آپ کو جانتا ہے۔'' ایس پی نے کہا۔

''تو پھر میں کیا کروں؟'' میں نے کہا۔ ''لاہور میں، پنڈی میں، ست بدھائی میں بے شمار لوگ مجھے جانتے ہیں۔'' پھر میں کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''ایس پی صاحب! آپ جا سکتے ہیں۔''

اچانک باہر سے شور شرابے کی آوازیں آنے لگیں، پھر غنی کے چیخنے کی آواز آئی۔ وہ کسی کو بلا رہا تھا۔ میں نے چونک کر ایس پی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔

ایس پی کے پیچھے پیچھے جب میں بھی کمرے سے باہر نکلا۔ تو میں نے عجیب منظر دیکھا۔ وہاں ایک عورت کھڑی تھی۔ جو اپنے حلیے اور حرکتوں سے پاگل ہی لگ رہی تھی۔ اس نے میکسی نما لبادہ پہن رکھا تھا جو اس کے ٹخنوں تک تھا۔ ہاتھوں میں موٹے موٹے کڑے تھے، گلے میں منکوں کی چھوٹی بڑی کئی مالائیں پڑی تھیں۔ ایک پیر میں گھنگرو تھے۔ اس کے گھنے بال کھلے اور دھول مٹی میں اٹے ہوئے تھے۔ چہرہ کبھی خاصا پرکشش رہا ہوگا لیکن اس وقت اجڑا اجڑا سا تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں انگارے کی طرح سرخ ہو رہی تھیں اور ان میں وحشت ناچ رہی تھی۔

اس نے ایس پی کو دیکھ کر اپنی پاٹ دار آواز میں کہا۔ ''تھانے دار صاحب! رب سائیں شاناں اُچی رکھے، پولیس دا سب توں وڈا افسر بنا دے، خوش رؤ بادشاہ!'' وہ میری طرف مڑی۔ ''نواب صاحب! کوٹھے دھرے رویں، کھیتی آباد روے، رب سائیں آن ودھا دے!'' اس نے ایک نعرۂ مستانہ لگایا اور دیوانہ وار رقص کرنے لگی۔ ''میری چیچی دا چھلا ماہی لا لیا، گھر جا کے شکایت لاواں گی!''

غنی پھر چیخا۔ ''بس کر مائی!''

میں نے اشارے سے اسے روک دیا۔ وہ وجد میں آکر گانے لگی۔ ''پیارے...... پیارے...... پیارے......، تمارے بنا لاگے نہیں مارا جیا رے!''

ایس پی نے دلچسپی سے اسے دیکھا، پھر مجھ سے بولا۔

''کون ہے یہ؟''

''آئی ڈونٹ نو!'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ میں واقعی اسے نہیں جانتا تھا۔

مجھے اب اپنے گارڈز پر بھی غصہ آ رہا تھا کہ وہ پگلی اندر کیسے آ گئی۔ میں نے غنی سے کہا۔ ''غنی، ایس پی صاحب کو باہر تک رخصت کر کے آؤ۔''

پگلی اسے دیکھ کر گانے لگی۔ ''دیس پرائے جانے والے، وعدہ کر کے جانا کہ خط لکھو گے!...... مجھے خط لکھو گے روزانہ!''

ایس پی نے مجھ سے ہاتھ ملایا، پھر وہاں سے رخصت ہو گیا۔

پگلی ابھی تک گانے میں مصروف تھی۔ میں نے احمد شاہ سے پوچھا۔ ''یہ پگلی اندر کیسے آ گئی؟''

''اللہ لوک ہے نواب صاحب!'' سرورؔ کے بجائے ایک دوسرے گارڈ نے عقیدت بھرے انداز میں پگلی کو

دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کی بات سن کر پگلی نے ٹریک بدلا اور گانے لگی۔

''اب ٹھنڈی آہیں بھر پگلی، جا اور محبت کر پگلی!''

''خاتون!'' میں نے پگلی کو مخاطب کیا۔ ''مانا کہ آپ بہت زبردست گلوکارہ ہیں لیکن خدارا اس وقت مجھے معاف کر دیں، میں آپ کے فن سے......''

''کوئی یوں بھی روٹھتا ہے۔'' پگلی نے تان لگا کر میرا جملہ کاٹ دیا۔ ''مانا میری خطا ہے، مگر اب معاف کر دو...... مگر اب معاف کر دو!''

غنی واپس آیا تو میں نے اس پر آنکھیں نکالیں۔ ''یہ سب کیا ہے چیف سیکیورٹی آفیسر صاحب! یہ تان سین کا فی میل ایڈیشن اندر کیسے آیا؟''

''سر؟ یہ اللہ لوک ہے۔'' غنی نے کہا۔ ''یہ جو کچھ کہتی ہے، وہ پورا ہو جاتا ہے۔ گارڈز نے اسے دھکیلنے کی کوشش کی تھی لیکن یہ رکی نہیں اور سیدھی اندر آ گئی۔''

مجھے ایک دم غصہ آ گیا۔ ''کوئی اگر یہاں آ کر الٹی سیدھی حرکتیں کرے گا، اچھل کود کرے گا، گانے گائے گا تو تم اسے اندر آنے دو گے، چاہے وہ اندر آ کر مجھے گولی مار دے؟''

''سر، ایسی بات نہیں ہے۔'' ایک گارڈ جلدی سے بولا۔ ''اس مائی کو سبھی جانتے ہیں۔ یہ اگر کسی کو بددعا دیدے تو وہ تباہ ہو جاتا ہے۔ یہ تو کبھی کبھی اس موڈ میں آتی ہے۔ ویسے تو یہ کسی سے بات بھی نہیں کرتی۔ بس سائیں بڑے شاہ کے مزار پر پڑی رہتی ہے۔ کبھی گجرات چلی جاتی ہے اور کبھی لاہور جا کر مہینوں داتا دربار پر پڑی رہتی ہے۔''

''اوہو، تمہیں تو اس کا پورا شجرہ معلوم ہے۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

پگلی نے مڑ کر مجھے دیکھا، پھر رقص کرتے ہوئے میری طرف بڑھی اور تان لگائی۔ ''کر دیا دیار کا وہ سماں، میرے پاس بیٹھے تھے تم یہاں۔ لیا ہاتھ میرا جو ہاتھ میں، گئیں ٹوٹ کانچ کی چوڑیاں۔ تو گلے سے مجھ کو لگا لیا۔ تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو۔''

حویلی کی خواتین کچھ فاصلے پر کھڑی کھی کھی کر رہی تھیں۔

''غنی!'' میں چیخ کر بولا۔ ''اسے باہر نکالو یہاں سے۔''

غنی اس کی طرف بڑھا تو وہ ایک دم خاموش ہو گئی۔

''چلو، باہر نکلو۔'' غنی نے درشت لہجے میں کہا۔

مجھے ناصر دکھائی دیا۔ وہ نہ جانے اب تک کہاں تھا؟ اس نے غنی سے کہا۔ ''چھوڑ دو اسے۔'' پھر وہ پگلی سے مخاطب ہوا۔ ''تم یہاں ہو، اندر چل کر بیٹھو، وہ یہاں نہیں آئے گا۔''

''وہ کہاں ہے؟'' پگلی نے چونک کر ناصر کی طرف دیکھا، پھر بولی۔ ''وہ نہیں ہے تو کیا؟ اس کی پرچھائیں ہے، اس کا احساس ہے۔''

''اندر چلو مائی!'' ناصر نے کہا۔ ''وہ اتنے لوگوں کے سامنے نہیں آئے گا۔''

''چلو!'' پگلی نے کہا اور ناصر کے ساتھ اندر چلی گئی۔

شہناز نے آگے بڑھ کر پوچھا۔ ''کون ہے یہ؟''

''یہ اللہ لوک ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''اللہ لوک ہے تو یہاں کیا کر رہی ہے؟'' نور نے کہا۔ وہ نہ جانے کب وہاں آ گئی تھی۔

''یہ تو وہی بتا سکے گی۔'' راجا نے کہا۔ ''اسے اس موقعے کا بھی کوئی گانا ضرور یاد ہوگا۔''

''نہ جانے یہاں کیا ہو رہا ہے؟'' شہناز نے منہ بناتے ہوئے نور سے کہا۔ ''چلو، اندر چلو، یہ سب پاگل ہیں۔'' پھر وہ مجھ سے بولی۔ ''چلتا کرو اس مغنیہ کو، وہ نہ جانے کون ہے اور کہاں سے آئی ہے؟'' یہ کہہ کر وہ حویلی کے اندرونی حصے کی طرف روانہ ہو گئی۔

ہاتھ لٹکائے لٹکائے مجھے بھی تکلیف کا احساس ہو رہا تھا۔ میں بھی اندر کی طرف چلا آیا۔

وہ پگلی مجھے برآمدے میں دکھائی دی۔ وہ اس وقت گانے اور اچھل کود کرنے کے بجائے فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔ ناصر اس کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ اس سے کہہ رہا تھا۔ ''بس اب بتا دو، تم یہاں کیوں آئی ہو؟''

''تم پوچھو اور میں نہ بتاؤں، ایسے تو حالات نہیں، ایک ذرا سا دل ٹوٹا ہے اور تو کوئی بات نہیں۔''

''دیکھو، اب یہ ڈراما بند کرو۔'' ناصر نے کہا ''ورنہ......''

''تم اسے جانتے ہو ناصر؟'' میں نے پوچھا۔

ناصر نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''تو پھر اسے یہاں سے چلتا کرو۔'' میں نے انگلش میں کہا۔ ''یہ ایب نارمل عورت ہے، ہمارے لیے بعد میں کوئی پریشانی بھی کھڑی ہو سکتی ہے۔ پولیس کا وہ ایس پی اسے اپنی آنکھوں سے یہاں دیکھ چکا ہے۔''

''لیکن یار! یہ اندر کیسے آئی؟'' راجا نے کہا۔ وہ نہ جانے کب وہاں آ گیا تھا۔ اس کے پیچھے غنی بھی تھا۔

''یہ کیا بتائے گی کہ یہاں کیسے آئی؟ اس کا جواب تو غنی دے گا۔'' میں نے کہا پھر غنی سے مخاطب ہوا۔ ''ہاں بھئی چیف سیکیورٹی آفیسر؟''

''سر!'' غنی نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ ''میں تو اس وقت ڈاکٹر حسن صاحب کا کچھ سامان لینے جہلم گیا ہوا تھا۔ میں......''

''تو کیا حویلی کی سیکیورٹی کے لیے تمہاری یہاں موجودگی ضروری ہے؟'' میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔ ''یہ ہے تمہارا فول پروف حفاظتی نظام؟''

''سر! آپ مجھے ایک گھنٹا دے دیں۔ میں ان گارڈز کی کھال کرا دوں گا جو اس وقت ڈیوٹی پر تھے۔''

''تم اسے جانتے ہو؟'' میں نے غنی سے پوچھا۔

غنی نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں سر، میں اسے نہیں جانتا۔''

''تم نہیں جانتے کہ یہ ''اللہ لوک'' ہے؟'' راجا اور ناصر بھی حیرت سے بولے۔

''مجھے ڈیوٹی والے گارڈز نے بتایا تھا کہ یہ اللہ لوک ہے۔''

''اسے فی الحال یہاں سے لے جاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن اسے اپنی نگرانی میں رکھنا، اسے کچھ کھلاؤ پلاؤ اور ان گارڈز کو یہاں بھیج دو۔''

''اور سنو!'' راجا نے کہا۔ ''اسے تہ خانے میں مت لے جانا۔''

غنی اس ''اللہ لوک'' کو لے کر چلا گیا۔ میں نے ایک ملازم سے کرسیاں منگوائیں اور برآمدے ہی میں بیٹھ گیا۔

دونوں گارڈز میرے سامنے مودبانہ انداز میں کھڑے ہو گئے۔

''جب وہ عورت اندر آئی تو تم ڈیوٹی پر تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''یس سر!'' ان دونوں نے کہا۔

''پھر وہ اندر کیسے آ گئی؟'' راجا نے درشت لہجے میں پوچھا۔

''وہ جی......وہ......''

''اللہ لوک ہے۔'' راجا نے اس کا جملہ پورا کر دیا۔

''جی سر......وہ......جی ہاں......'' ایک گارڈ ہکلایا۔

''بکواس کرو گے تو کھال اتار لوں گا۔'' راجا بپھر کر بولا۔ ''حویلی میں کوئی بھی منہ اٹھا کر چلا آئے گا اور تم لوگ اس کی عقیدت میں جھومتے رہو گے۔''

''سر......وہ باہر سے اندر آئی تو ہم سمجھے کہ اسے باہر سے بھیجا گیا ہے۔ باہر بھی تو گارڈ ہوتے ہیں۔''

''کیا نام ہے تمہارا؟'' راجا بپھر کر بولا۔

''میرا نام صابر علی ہے جی!'' وہ گارڈ بوکھلا کر بولا۔

''اب تم اپنی غلطی باہر والوں کے سر منڈھنے کی کوشش کر رہے ہو؟ باہر والوں نے کیا کیا اور کیا نہیں کیا، تمہاری کیا ڈیوٹی تھی؟''

''غلطی ہو گئی سر!'' صابر علی گھگیا کر بولا۔

غنی واپس آیا تو میں نے کہا۔ ''غنی! ان دونوں کو فوری طور پر حویلی کی سیکیورٹی سے ہٹا کر کہیں اور لگا دو۔''

''ٹھیک ہے سر!'' غنی نے کہا۔ پھر ان سے بولا۔ ''تم دونوں اپنے ہتھیار اور سیل فون سرور کے حوالے کر دو۔''

صابر علی شاید کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن پھر اس نے اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔

وہ جانے لگا تو میں نے کہا۔ ''سرور سے کہنا کہ وہ باہر والے دونوں گارڈز کو بھی یہاں بھیج دے اور صوبیدار میجر صاحب کو بھی!''

''جی سر!'' اس مرتبہ دوسرا گارڈ مری مری آواز میں بولا۔

ان کے جانے کے بعد راجا نے مجھ سے کہا۔ ''اب تو بھی آرام کر لے۔ ابھی تجھے کمزوری ہے۔ تجھے کم سے کم دو ہفتے تک بیڈ ریسٹ کرنا ہوگا۔''

میں نے منہ بنا کر کہا۔ ''یار، تو مجھ سے اتنا ہی بیزار ہو گیا ہے تو مجھے مار دے۔ مجھے بستر پر قید مت کر۔''

''یار بہت اچھا خیال ہے، اسیر بستر؟''

''یار اب تو میرے اس عالی شان بیڈ کو بستر کہہ کر میرے ساتھ ساتھ اس لگژری بیڈ کی بھی توہین کر رہا ہے۔''

''چل اسیر چھپر کٹ، سہی۔''

مجھے دور سے وہ دونوں گارڈز دکھائی دیے جن کی ڈیوٹی حویلی سے باہر تھی۔ ان کے چہروں پر بھی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ شاید پہلے والے گارڈز نے انہیں ٹرمینیشن کے بارے میں بتا دیا تھا۔

وہ دونوں برآمدے میں آ کر رکے ان میں سینئر آدمی نے بلند آواز میں کہا۔ ''سلام باش!'' فوراً ہی ان دونوں کی ایڑیاں فرش سے ٹکرائیں اور ان دونوں نے بہت زوردار انداز میں مجھے سیلوٹ کیا۔

''حویلی کے گیٹ کے باہر تم لوگوں کی ڈیوٹی تھی؟'' میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''یس سر!'' دونوں نے ایک ساتھ جواب دیا۔

''وہ پاگل عورت اندر کیسے آ گئی؟'' راجا نے درشت لہجے میں پوچھا۔

''سر......وہ پاگل نہیں ہے، وہ......''

''چلو پاگل نہ سہی، وہ اندر کیسے آ گئی؟''

''سر......اس نے کہا تھا کہ...... مجھے ایک نظر نواب صاحب کو دیکھنا ہے۔ وہ زخمی ہو گئے ہیں نا؟ میں انہیں ٹھیک کر دوں گی۔'' ایک گارڈ نے مشینی انداز میں جواب دیا۔

''چاہے وہ مجھے یہاں آ کر گولی ہی مار دیتی؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''میں تم دونوں کو آج سے حویلی کی سیکیورٹی سے ہٹا رہا ہوں۔ اب تم چاہو تو حویلی میں دوسرے کام کر سکتے ہو۔''

''سر، ہم سے واقعی بہت غلطی ہوئی ہے۔ ہم......''

''تم لوگ ابھی اپنے ہتھیار اور سیل فون غنی کے حوالے کر دو۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''غنی تمہیں بتائے گا کہ اب تمہیں کیا کرنا ہے؟''

''سر! وہ......'' سینئر گارڈ نے جھجکتے ہوئے کچھ کہنا چاہا۔

''ہاں بولو!'' میں نے کہا۔ ''تم کچھ کہنا چاہ رہے ہو؟''

''سر......ہم ٹرینڈ کمانڈوز ہیں، ہم اس کے علاوہ کوئی اور کام نہیں کر سکتے؟''

''او کے!'' میں نے بدستور سرد لہجے میں کہا۔ ''تم گارڈ روم میں ٹھہرو۔''

وہ دونوں سیلوٹ کر کے چلے گئے۔ صوبیدار میجر صاحب برآمدے میں داخل ہوئے تو ناصر نے ان کے لیے کرسی چھوڑ دی۔

''آپ بیٹھیے!'' صوبیدار میجر صاحب نے کہا۔

''آپ تشریف رکھیں سر!'' ناصر نے کہا۔ ''میں اپنے لیے کرسی منگوا لیتا ہوں۔'' اس نے بلند آواز میں ملازم سے کرسی لانے کو کہا۔

''صوبیدار میجر صاحب!'' میں نے کہا۔ ''میں نے حویلی کے چار گارڈز کو ٹرمینیٹ کر دیا ہے۔''

''ان کے ساتھ یہی ہونا چاہیے۔'' انہوں نے کہا۔

''اکرم اور علی احمد ملازمت چھوڑنا چاہتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

صوبیدار میجر صاحب نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ''رفیق میاں! کیا آپ نے انہیں حویلی چھوڑنے کو کہا ہے؟''

''میں نے صرف انہیں سیکیورٹی کی ڈیوٹی سے ہٹایا ہے لیکن وہ دونوں کوئی اور کام کرنا نہیں چاہتے۔'' پھر میں چونک کر بولا۔ ''لیکن صوبیدار میجر صاحب! وہ حویلی کے دفاعی نظام کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ تہ خانے کے بارے میں بھی ضرور جانتے ہوں گے۔ اب اگر وہ میرے کسی دشمن کے پاس چلے گئے تو......''

''آپ پریشان نہ ہوں رفیق میاں!'' صوبیدار میجر صاحب نے کہا۔ ''وہ کہیں نہیں جائیں گے۔ ان کی جگہ دوسرے گارڈز ہوتے تو مجھے بالکل فکر نہ ہوتی لیکن وہ دونوں ہمارے بہترین گارڈز ہیں۔ آپ فکر مت کریں، میں انہیں جانے نہیں دوں گا۔''

''صوبیدار میجر صاحب! اس مسئلے سے آپ ہی نمٹیں۔'' میں نے کہا۔

غنی واپس آیا تو کچھ فکرمند تھا۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے غنی! تم پریشان کیوں ہو؟''

''سر، میں اس پاگل عورت ہی کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔'' غنی نے کہا۔ ''ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ پاگل ہونے کا ڈراما کر رہی ہے۔ پہلے تو میرا ارادہ تھا کہ اسے ست بدھائی کی حدود سے باہر چھوڑ آؤں، پھر میں نے سوچا، اسے پولیس کا ایک افسر حویلی میں دیکھ چکا ہے۔ اب اسے کوئی نقصان پہنچا تو شبہ ہم لوگوں پر جائے گا۔ یہ سوچ کر میں اسے تھانے لے گیا اور انچارج کو بتایا کہ یہ پاگل عورت زبردستی

حویلی میں گھس آئی تھی۔ اس وقت تمہارے ایس پی صاحب بھی موجود تھے۔ انہوں نے ہی مجھ سے کہا تھا کہ اس عورت کو پولیس کے حوالے کر دو اور درخواست دے دو کہ یہ عورت زبردستی حویلی میں داخل ہوئی ہے اور پاگل پن کا ڈراما کر رہی ہے۔ انچارج صاحب مناسب سمجھیں گے تو اسے پاگل خانے بھجوا دیں گے۔"

"اور تم نے اسے پولیس کے حوالے کر دیا؟" راجا نے کہا۔

"سر، تو اور میں کیا کرتا؟" غنی نے کہا۔ "ایس پی صاحب اسے یہاں دیکھ چکے تھے۔ اب اگر اس کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ جاتا تو......"

"وہ جوان عورت ہے، شکل کی بھی بری نہیں ہے۔ تمہیں اندازہ ہے کہ تھانے میں اس کے ساتھ کیا سلوک ہوگا؟" ناصر نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اب مجھے ہی کچھ کرنا پڑے گا۔"

ناصر ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ تھانے میں اس عورت کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

ناصر اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے جیب سے سیل فون نکالا اور کسی کا نمبر ملا کر ٹہلتا ہوا برآمدے کے دوسرے سرے کی طرف چلا گیا۔

صوبیدار میجر صاحب بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

"میں ابھی آتا ہوں۔" میں نے راجا سے کہا اور اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

ڈاکٹر حسن نے میرے زخم کی صفائی کی اور بینڈیج کرتے ہوئے بولے۔ "نواب صاحب! آپ کا زخم بہت تیزی سے بھر رہا ہے۔ اگر آپ نے بے احتیاطی سے کام نہ لیا تو زخم چار پانچ دن ہی میں بھر جائے گا۔"

بینڈیج کرنے کے بعد اس نے مجھے ایک کیپسول اور دو ٹیبلیٹ کھلائیں۔ پھر انجکشن تیار کرنے لگا۔

"یہ کیسا انجکشن ہے ڈاکٹر؟"

"پریشان مت ہوں، نیند کا نہیں ہے۔" ڈاکٹر حسن نے مسکرا کر کہا۔

وہ تھوڑی دیر بیٹھ کر چلا گیا۔ میں نے ملازم سے کہا کہ ناصر صاحب اور راجا صاحب کو یہیں بھیج دو۔ راجا اور ناصر میرے کمرے میں آ گئے۔ میں اس وقت بیڈ کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔

راجا ہنس کر بولا۔ "فیکے پتر! تو تو اپنی اس تکلیف کو باقاعدہ سیلی بریٹ کر رہا ہے۔"

"او یار! اس سیلی بریشن میں زیادہ ہاتھ ڈاکٹرز کا بالخصوص ڈاکٹر شہناز کا ہے۔ وہ لوگ تو یہ چاہتی ہیں کہ میں بستر سے ہلوں بھی نہیں اور ابھی کچھ دیر پہلے تو بھی تو مجھے آرام کرنے کا مشورہ دے رہا تھا۔" میں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "چل تو کہتا ہے تو بیڈ کو بائے بائے۔" میں اچانک اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

"او نواب کی دم! یہ کیا کر رہا ہے۔" راجا سنجیدگی سے بولا۔ "میں تو مذاق کر رہا تھا۔ تجھے واقعی ابھی آرام کی ضرورت ہے۔"

ناصر نے کلائی کی گھڑی دیکھی۔ "مجھے اب اجازت دیں نواب صاحب! مجھے پنڈی میں ایک دو بہت ضروری کام ہیں۔"

"اگر کام ہیں تو میں روکوں گا نہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن تم یہاں سے جاؤ گے کیسے؟"

"جیسے آیا تھا؟" ناصر نے مسکرا کر کہا۔

"اس کا مطلب ہے کہ تم اسی ناقابل اعتبار گاڑی میں جاؤ گے؟"

"نہیں۔ اب تو میری گاڑی بالکل ٹھیک ہے۔" ناصر مسکرا کر بولا۔ "اس کی ظاہری شکل و صورت پر مت جائیں۔ وہ جب چلتی ہے تو اچھی اچھی گاڑیوں کو پیچھے چھوڑ دیتی ہے۔"

"تمہیں ایک شرط پر اجازت ملے گی۔" میں نے کہا۔ "تم پنڈی کے کام نمٹا کر یہاں آ جاؤ گے۔"

"او کے نواب صاحب!" ناصر نے کہا۔ پھر سنجیدہ ہو کر بولا۔ "یوں بھی اب آپ لوگوں کی ایسی عادت پڑ گئی ہے کہ پنڈی کے اکیلے گھر میں مجھے وحشت سی ہوتی ہے۔"

"تم بیٹھو، میں تمہاری گاڑی نکلواتا ہوں۔" میں نے غنی کو آواز دی اور کہا۔ "غنی! ناصر صاحب کی گاڑی نکالو۔ اس کا آئل، پانی وغیرہ چیک کر لو۔"

"یہ کام میں پہلے ہی کر چکا ہوں سر!" غنی نے کہا۔ "ناصر صاحب کی گاڑی کی سروس ہو چکی ہے۔" غنی چابی لے کر چلا گیا۔

"سوری نواب صاحب!" میں جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اس کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے سیل فون جیب سے نکالتے ہوئے کہا۔ "یہ کس کا فون آ گیا اور سیل فون کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ "ہیلو...... کیا؟...... کب؟ ...... اچھا...... یہ تو اچھی خبر نہیں ہے...... ہاں، میں پنڈی آ ہی رہا تھا...... ابھی...... میں پنڈی سے زیادہ دور نہیں ہوں...... ہاں، میں پہنچ رہا ہوں...... آپ کہاں ہیں؟ ...... او کے،

خدا حافظ!" اس کے چہرے پر تفکر کے آثار تھے۔

"کیا ہوا؟" راجا نے پوچھا۔

"اچھی خبر نہیں ہے۔" ناصر نے کہا۔ "ہوم منسٹر کو ان کے عہدے سے ہٹا دیا گیا ہے...... اور ان کی جگہ جو شخص ہوم منسٹر بنا ہے، اس کی ریپوٹیشن اچھی نہیں ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ رانا فیملی سے اس کے دیرینہ تعلقات ہیں۔"

"یار، خبر تو واقعی اچھی نہیں ہے۔" راجا نے کہا۔ "نیا ہوم منسٹر کون ہے؟"

"اشفاق احمد گردیزی!" ناصر نے کہا۔ "سیاسی حلقوں میں اپنی رنگین مزاجی اور کرپشن کے باعث خاصا "نیک" نام ہے۔ اے اے گردیزی کے نام سے مشہور ہے وہ۔"

"یار واقعی یہ آدمی تو اچھا نہیں ہے۔ نہ جانے اسے ہوم منسٹر بنایا کیوں گیا ہے؟"

"یہاں تو ہر آدمی ایسا ہی ہے۔ پورے نظام میں اکا دکا لوگ ہی ایسے ہوں گے جن کا دامن بے داغ ہو۔" میں نے کہا۔

"فیکے پتر! مسئلہ یہ نہیں ہے کہ گردیزی کرپٹ ہے، مسئلہ یہ ہے کہ رانا سے اس کے گھریلو تعلقات ہیں۔" راجا نے کہا۔ "اب پولیس میں بھی اکھاڑ پچھاڑ ہوگی۔"

"جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔" میں نے کہا۔

"مجھے چلنا چاہیے۔" ناصر نے کہا۔

غنی نے آ کر بتایا کہ میں نے ناصر صاحب کی گاڑی نکال دی ہے۔

ناصر عجلت میں وہاں سے رخصت ہو گیا۔

"فیکے پتر!" راجا نے کہا۔ "لگتا ہے تیرا ستارہ بھی گردش میں آنے والا ہے۔"

"میرا ستارہ تو اسی دن سے گردش میں ہے جب میں پہلی دفعہ لندن سے پاکستان آیا تھا۔" میں نے کہا۔ "سکون کے لمحے تو مجھے بہت کم نصیب ہوئے ہیں۔"

"یار! میرا مشورہ ہے کہ تو کچھ دن کے لیے لندن چلا جا۔" راجا نے کہا۔

"ایسی کیا آفت آ گئی؟" میں نے منہ بنا کر کہا۔ "کہ میں چوروں کی طرح یہاں سے فرار ہو جاؤں۔"

"تیرا واسطہ ابھی سیاست دانوں سے پڑا نہیں ہے۔" راجا نے سنجیدگی سے کہا۔ "یہ گردیزی اول درجے کا کرپٹ آدمی ہے۔ یہ تیرے لیے مشکلات کھڑی کر دے گا۔ رانا کی طاقت بھی اب کئی گنا زیادہ ہو جائے گی۔ عجب خان کریلہ بھی اس کے دوستوں میں سے تھا لیکن اس گردیزی کی تو بات ہی الگ ہے۔"

"یار، تو مجھے کیوں ڈرا رہا ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"میں تجھے ڈرا نہیں رہا ہوں بلکہ اس نئی صورت حال سے آگاہ کر رہا ہوں۔" پھر وہ چونک کر بولا۔ "رابعہ کو بھی یہاں سے کہیں اور منتقل کر دے۔ رانا سے کچھ بعید نہیں کہ اس مرتبہ وہ پولیس کو تلاشی کا وارنٹ دے کر بھیج دے۔ میں تو کہتا ہوں کہ اس رابعہ کا پتا صاف ہی کر دے۔" راجا نے سفاکی سے کہا۔

میں نے چونک کر راجا کی طرف دیکھا۔ "تو چاہتا ہے کہ......"

"ہاں یار! میں یہی چاہتا ہوں۔" راجا نے کہا۔ "اس کم بخت نے ہمارا سکون حرام کر رکھا ہے۔ یہ جب تک زندہ رہے گی تیرے لیے عذاب ہی بنی رہے گی۔ ست بدھائی کی جاگیر کے لالچ میں لوگ اسے آلۂ کار بناتے رہیں گے۔ وہ خود بھی تیرے خون کی پیاسی رہے گی۔ اس کا یہی علاج ہے کہ تو ہمیشہ کے لیے اس سے چھٹکارا پا لے۔"

"لیکن یار! میں کیسے......"

"میں تیری تقریر سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔" راجا نے میری بات کاٹ کر کہا۔ "اب خاندان، خون اور رشتے داری کی دہائی شروع مت کر دینا۔ تیری یہ حالت بھی تیری اسی چہیتی کزن کی وجہ سے ہے۔"

"ابھی تو اس سے بہت کچھ معلوم کرنا ہے راجا!" میں نے کہا۔ "وہ لندن کیوں گئی تھی؟ دلاور سے اس کا کیا تعلق ہے؟ اس نے دھوکے سے مجھے لاہور کیوں بلایا؟"

"اور تیرا خیال ہے کہ وہ یہ باتیں تجھے بتا دے گی؟"

"اسے بتانا پڑے گا۔" میں نے کہا۔

"کوشش کر کے دیکھ لے۔" راجا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ پھر وہ ہنس کر بولا۔ "ابھی تو، تو آرام کر۔ تو کافی دیر سے ان ہی بکھیڑوں میں الجھا ہوا ہے۔"

اس کے کہنے پر مجھے احساس ہوا کہ واقعی مجھے آرام کی ضرورت ہے۔

میں اس وقت راجا کے ساتھ لان میں بیٹھا تھا جب میرے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ سیل فون کی چھوٹی سی اسکرین پر ناصر کا نام تھا۔ میں نے سیل فون کان سے لگا کر کہا۔

"ہاں ناصر!"

"ست بدھائی سے نکلنے کے بعد میری گاڑی کو حادثہ پیش آ گیا ہے نواب صاحب!" ناصر کی آواز آئی۔

"حادثہ پیش آ گیا ہے؟" میں عالم اضطراب میں کھڑا ہو گیا۔ "کیسا حادثہ ناصر؟ تم ٹھیک تو ہو؟"

''مجھے معمولی چوٹیں آئی ہیں۔'' ناصر نے کہا۔ ''میں اس وقت پنڈی میں ہوں۔''

''حادثہ کہاں پیش آیا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں اس وقت پنڈی سے زیادہ دور نہیں تھا۔ جب ایک گاڑی سے ٹکر ہوگئی۔ میں اس وقت پنڈی کے ایک اسپتال میں ہوں۔''

''اچھا پریشان مت ہو، میں ابھی پہنچتا ہوں۔''

''کیا ہوا فیکے؟'' راجا نے پوچھا۔ ''ناصر خیریت سے تو ہے؟''

''یار، اس کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ وہ اس وقت پنڈی کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں ہے۔''

دروازے پر دستک ہوئی اور شہلا متوحش سی کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے ڈاکٹر شہناز بھی تھی۔

اسے اس حال میں دیکھ کر میں بھی گھبرا گیا۔ ''کیا ہوا شہلا؟''

''نواب صاحب! ابو کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔'' شہلا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''حوصلہ رکھو شہلا! تمہارے ابو انشاءاللہ ٹھیک ہوجائیں گے۔'' میں نے کہا۔ شہلا بری طرح رونے لگی۔

''ارے بھئی، تم کیسی ڈاکٹر ہو؟'' میں نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔ ''ڈاکٹر تو بہت مضبوط ہوتے ہیں۔''

''میں ابھی لاہور جانا چاہتی ہوں۔'' شہلا نے روتے ہوئے کہا۔ ''مجھے جی ٹی روڈ تک ڈراپ کرادیں۔ وہاں سے میں چلی جاؤں گی۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟'' شہناز نے کہا۔ ''بھئی میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔''

''راجا! تم ایسا کرو کہ رابعہ اور شہناز کو لاہور لے جاؤ۔ میں پنڈی چلا جاتا ہوں۔''

''تم اس حالت میں کیسے جاؤ گے؟'' شہناز نے کہا۔

''میری حالت کو کیا ہوا؟'' میں نے کہا۔ ''اور میں وہاں ہاتھوں کے بل نہیں جاؤں گا، گاڑی میں جاؤں گا۔ ناصر کو اس وقت میری ضرورت ہے۔''

میں نے غنی کو آواز دی۔ وہ میرے کمرے کے آس پاس ہی رہتا تھا، فوراً ہی چراغ کے جن کی طرح حاضر ہوگیا۔

''غنی! سرور سے کہو کہ لینڈ کروزر نکال لے۔ ڈاکٹر صاحبہ اور راجا صاحب لاہور جارہے ہیں اور تم بھی میری گاڑی نکال لو۔''

غنی نے چونک کر پہلے مجھے پھر شہناز کو دیکھا۔ ''آپ بھی لاہور جارہے ہیں؟''

''نہیں، ہم پنڈی جائیں گے۔'' میں نے کہا۔

غنی کے جانے کے بعد راجا نے شہلا سے کہا۔ ''تم جلد ہی چلنے کی تیاری کرو۔''

''مجھے کیا تیاری کرنا ہے؟'' شہلا نے کہا۔ ''میں بالکل تیار ہوں۔''

راجا نے بغلی ہولسٹر لگایا اور کوٹ پہن کر تیار ہوگیا۔

''زیادہ بھاگ دوڑ مت کرنا فیکے پتر!'' راجا نے کہا۔ ''ان لوگوں کو لاہور چھوڑ کر میں بھی پنڈی آجاؤں گا۔''

''مجھے کون سے ہل چلانا ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''گاڑی ڈرائیو کرے گا۔ میں تو بس پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر اونگھوں گا۔''

سرور نے آکر بتایا کہ گاڑی تیار ہے۔ راجا اور شہناز نے پھر مجھے ہدایات دیں اور روانہ ہوگئے۔

میں نے بھی اٹھ کر جوتے پہنے۔ جب بغلی ہولسٹر لگانے لگا تو مجھے شدید تکلیف محسوس ہوئی۔ نور بہت غور سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''زخمی شانے پر وزن اٹھانے کی کیا ضرورت ہے۔ اپنا ریوالور مجھے دے دو میں رکھ لیتی ہوں۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے کہا۔ ''میں کیا خالی ہاتھ جاؤں؟''

''تمہیں ضرورت پڑے تو کسی بھی وقت مجھ سے لے لینا۔''

''کیا؟...... کیا تم بھی میرے ساتھ جارہی ہو؟''

''آف کورس!'' نور نے سر جھٹک کر اور شانے اچکا کر کہا۔

''یہ مناسب نہیں ہوگا۔'' میں نے کہا۔ ''میں بس ناصر کی مزاج پرسی کر کے لوٹ آؤں گا۔ ممکن ہے میں اسے بھی اپنے ساتھ ہی لے آؤں۔''

''لیکن رفیق......''

''نور پلیز!'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں وہاں تفریح کرنے نہیں جارہا ہوں۔ حالات پہلے ہی مخدوش ہیں۔''

''آخر یہ سب کچھ کب تک چلے گا رفیق؟'' نور نے کہا۔

''جب تک حالات میرے قابو میں نہیں آجاتے۔'' میں نے کہا۔

''اس سے بہتر تو یہ ہے کہ تم یہ ریاست یہاں کسی کے حوالے کردو اور لندن چلو۔ ایسی جاگیر کا ہمیں کرنا بھی کیا ہے؟''

دستک کی آواز سن کر نور کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ میں نے کہا۔ ''آجائیں، دروازہ کھلا ہے۔''

دوسرے ہی لمحے نیلم کمرے میں داخل ہوئی۔

''جی، فرمایئے، آپ کو کیا پریشانی ہے؟'' نور کا لہجہ طنزیہ تھا۔

نیلم نے اس کے لہجے کا بالکل برا نہیں مانا اور مجھ سے بولی۔ ''نواب صاحب! آپ پنڈی جارہے ہیں؟''

''ہاں، لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''میرا بابا اڈیالہ جیل میں ہے۔'' نیلم نے کہا۔ ''اس کی حالت بہت خراب ہے، میرے ایک محلے والے نے ٹیلی فون کیا تھا جی کہ اس کا بچنا مشکل ہے۔'' نیلم کی بڑی بڑی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

باپ کیسا بھی ہو لیکن اولاد خصوصاً بیٹیوں کے لیے وہ بہت اہم ہوتا ہے۔ اس کے باپ نے پوری زندگی مجرمانہ سرگرمیوں میں گزاری تھی۔ دنیا کے لیے وہ ایک ڈاکو اور بردہ فروش تھا لیکن بہرحال وہ نیلم کا باپ تھا۔

''نواب صاحب! اگر آپ پنڈی تک چھوڑ دیں تو آپ کی بڑی مہربانی ہوگی جی۔ میں وہاں سے خود ہی واپس آجاؤں گی۔''

''خود ہی کیوں نیلم؟'' نور نے کہا۔ ''نواب صاحب پنڈی سے واپسی پر تمہیں بھی لیتے آئیں گے۔ جاؤ، تم تیاری کرو۔''

''لو جی، مجھے کیا تیاری کرنی ہے، میں تو بالکل تیار ہوں۔ میں نے بابا کے لیے گجریلا بھی بنالیا ہے۔''

''تو کیا تمہیں معلوم تھا کہ میں پنڈی جاؤں گا؟'' میں نے ہنس کر پوچھا۔

''نہیں، مجھے یہ تو معلوم نہیں تھا۔'' نیلم نے کہا۔ ''میں نے تو سوچا تھا کہ آپ سے کہوں گی کہ مجھے لاری اڈے تک چھڑوا دیں۔''

''چلو، پھر جلدی کرو۔'' میں نے کوٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔

نور نے کوٹ مجھ سے لے لیا اور سگھڑ بیویوں کی طرح مجھے کوٹ پہنانے لگی۔ کوٹ پہنتے ہوئے بھی مجھے شدید تکلیف محسوس ہوئی لیکن میں نے نور پر ظاہر نہیں ہونے دی۔

پھر میں نے نور کے ماتھے پر بوسہ دیا اور کمرے سے باہر نکل کر پورچ میں آگیا۔ غنی میری گاڑی کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ ایک دم مستعد ہوگیا۔ پورچ میں وہ چاروں گارڈز بھی موجود تھے جنہیں میں نے آج معطل کر دیا تھا۔ وہ بھی ایک دم مستعد ہوگئے اور مجھے زوردار سیلوٹ کیا۔

صوبیدار میجر صاحب بھی پورچ میں نکل آئے تھے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا۔ ''رفیق میاں! سنا ہے آپ پنڈی جارہے ہیں؟''

''جی ہاں، ناصر ایک حادثے میں زخمی ہوگیا ہے اور اسپتال میں پڑا ہے۔ راجا، شہناز اور شہلا کے ساتھ لاہور گیا ہے ورنہ میری جگہ راجا پنڈی جاتا۔'' پھر میں نے آہستہ سے پوچھا۔ ''صوبیدار میجر صاحب! ان گارڈز کا کیا کرنا ہے؟''

''انہیں ابھی چھوڑیں۔'' صوبیدار میجر صاحب نے بھی دھیمی آواز میں کہا۔ ''میں نے ان سے کہا ہے، میں کوشش کروں گا کہ نواب صاحب تم لوگوں کو معاف کردیں، اسی لیے میں نے اب تک انہیں کوئی دوسری ذمے داری نہیں سونپی ہے۔''

''او کے سر!'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''حویلی کا دھیان رکھیے گا۔ آج غنی بھی نہیں ہوگا اور سرور بھی راجا کے ساتھ جاچکا ہے۔''

''آپ اس طرف سے بےفکر رہیں۔'' صوبیدار میجر صاحب نے مسکرا کر کہا۔

غنی گاڑی کا دروازہ کھولے کھڑا تھا۔

میں گاڑی کی طرف بڑھا تو ریشم بھاگی بھاگی آئی۔ اس کے ہاتھوں میں کافی فلاسک تھا۔ ''نواب صاحب! میں نے اس تھرماس میں کافی بھردی ہے جی! میں جانتی ہوں کہ ابھی کچھ دیر بعد آپ کو کافی کی ضرورت پڑے گی۔'' اس نے کافی کا تھرماس غنی کے حوالے کردیا۔ میں گاڑی میں بیٹھ گیا تو غنی نے دروازہ بند کردیا۔ میرے آرام کے خیال سے شاید وہ نیلم کو پسنجر سیٹ پر بٹھانا چاہتا تھا لیکن ریشم کو دیکھ کر اس نے نیلم کو بھی عقبی نشست پر بٹھادیا۔

گاڑی حویلی سے باہر نکلی تو فلیش لائٹ کی روشنی باہر بھی دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ ست بدھائی سے جی ٹی روڈ تک سڑک زیرِ تعمیر تھی لیکن سڑک اس حالت میں بھی قابلِ استعمال تھی۔

جی ٹی روڈ پر آنے کے بعد غنی نے حسب عادت گاڑی طوفانی انداز میں بھگانا شروع کردی۔

''غنی بھائی!'' نیلم نے کہا۔ ''گاڑی ذرا آہستہ چلاؤ۔ نواب صاحب کو جھٹکا نہیں لگنا چاہیے۔''

غنی نے فوراً گاڑی کی رفتار کم کردی۔ شاید اسے بھی احساس ہوگیا تھا، اتنی تیز رفتاری میرے لیے

مناسب نہیں ہے۔

ایک گھنٹے کے سفر کے بعد میں نے نیلم سے کہا۔ ''غنی سے کافی کا تھرماس لے کر ذرا مجھے کافی نکال دو۔''

''سر، میں گاڑی کہیں روک دوں؟'' غنی نے پوچھا۔

''نہیں چلتے رہو۔'' میں نے کہا۔ ''بس گاڑی کی رفتار ذرا آہستہ کردو تاکہ کافی پر نہ چھلکے۔''

نیلم نے غنی سے تھرماس لے کر میرے لیے کافی انڈیلی اور میری طرف بڑھا دی۔ کافی کا مگ لیتے ہوئے مجھے ریشم کے کھُردرے پن کا احساس ہوا۔ اس نے تھرماس کے ساتھ ایک مگ بھی اس شاپر میں ڈال دیا تھا۔

نیلم اندھیرے میں آنکھیں پھاڑے مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔ اس نے میرا زخمی ہاتھ اپنے کندھے پر رکھ لیا تھا۔ اس کا نرم وگداز لمس مجھے اچھا لگ رہا تھا۔

اچانک میں بری طرح سامنے والی سیٹ سے ٹکرا گیا۔ کافی کا مگ میرے ہاتھ سے چھوٹ کر ڈیش بورڈ سے ٹکرایا اور پسنجر سیٹ پر مگ کے ٹکڑے اور کافی بکھر گئی۔ میرا زخمی بازو بھی نیلم کی پشت سے ٹکرایا۔ تکلیف کی شدت سے میری حالت غیر ہوگئی۔ اگر نیلم درمیان میں نہ ہوتی تو وہ بازو بہت زوردار انداز میں سیٹ کی پشت سے ٹکراتا۔ نیلم بھی بہت بری طرح سیٹ سے ٹکرائی تھی لیکن وہ چوٹ برداشت کر گئی۔

چند لمحوں تک تو کچھ بھی میری سمجھ میں نہیں آیا۔ سڑک کے بیچوں بیچ ایک دیوہیکل ٹرک کھڑا تھا۔ غنی نے اس کو دیکھ کر ہنگامی طور پر بریک لگائے تھے۔ گاڑی رکتے ہی عقب سے بھی ایک ڈبل کیبن پک اپ نمودار ہوئی اور اس نے راستہ مسدود کر دیا۔ مجھے اچانک خطرے کا احساس ہوا۔ میں نے بے اختیار ریوالور کے لیے ہولسٹر پر ہاتھ مارا تو مجھے مایوسی ہوئی۔ اس وقت ریوالور تو دور کی بات، میرے پاس تو سرے سے ہولسٹر بھی نہیں تھا۔

گاڑی کی دونوں اطراف میں خود رو گھنی جھاڑیاں تھیں۔ ان جھاڑیوں میں انسان تو کیا، گاڑی بھی چھپ سکتی تھی۔ میں نے سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں دروازہ کھولا اور بائیں طرف کی جھاڑیوں میں چھلانگ لگا دی۔

زمین پر گرنے سے مجھے شدید تکلیف کا احساس ہوا۔ میرا ہاتھ جھٹکے سے زمین سے ٹکرایا تھا۔ اس کے علاوہ کانٹے دار جھاڑیوں نے زخمی ہاتھ سمیت میرے پورے جسم کو ادھیڑ کر رکھ دیا۔ میں بائیں پہلو پر گرا تھا۔ زمین پر شاید کوئی ابھرا ہوا پتھر تھا جو مسلسل میرے پہلو میں چبھ رہا تھا۔ میں نے ٹٹول کر وہ پتھر نکالنے کی کوشش کی تو معلوم ہوا کہ وہ پتھر نہیں بلکہ میرے کوٹ کی جیب میں پڑا ہوا ریوالور ہے۔ ریوالور جب میں ہولسٹر میں نہیں رکھ سکا تھا تو اسے کوٹ کی جیب میں ڈال لیا تھا اور بھول گیا تھا۔

میں نے جلدی سے وہ ریوالور نکال لیا۔ اچانک جھٹکا لگا اور کوئی مجھ پر آگرا۔ ریوالور میرے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا۔ اب مجھے ایک ہاتھ سے اس حملہ آور کا مقابلہ کرنا تھا۔

میں نے بائیں ہاتھ کا پورا زور لگا کر اسے پیچھے دھکیلا اور اس کے چہرے پر گھونسا مارنے ہی والا تھا کہ مجھے آواز آئی۔ ''ماریے گا مت نواب صاحب! میں نیلم ہوں۔''

میرے کشیدہ اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ میں نے تکلیف برداشت کرتے ہوئے سرگوشی میں کہا۔ ''استراحت فرمانے کی اچھی جگہ ڈھونڈ لی ہے آپ نے؟''

وہ بہت احتیاط سے الگ ہٹ گئی۔ اس نے کوشش کی تھی کہ اس کے ہٹنے سے جھاڑیاں ہلنے نہ پائیں۔

میں نے کروٹ لے کر ریوالور کی تلاش میں ادھر ادھر ہاتھ مارا۔ بالآخر مجھے ریوالور مل گیا۔ ریوالور اٹھا کر میں جھاڑیوں میں مزید اندر کی طرف رینگ گیا۔

سڑک کی طرف سے اچانک فائر ہوا۔ نہ جانے کس نے کس پر فائر کیا تھا۔ اس فائر کا جواب دیا گیا تو مجھے معلوم ہوگیا کہ یہ فائر غنی نے کیا ہے۔ یہ پوائنٹ تھری ایٹ کے کولٹ ریوالور کا فائر تھا۔ اتنے مہنگے ریوالور جرائم پیشہ بدمعاش کم ہی رکھتے ہیں۔ کوئی اگر اچھے ہتھیاروں کا شوقین ہو تو بات الگ ہے۔

اچانک مجھے سڑک کی طرف سے روشنی نظر آئی۔ سڑک کے درمیان میں کھڑے ہوئے ٹرک پر شاید فلیش لائٹ نصب تھی۔ لائٹ کی روشنی سے وہ ویرانہ دن کی طرح روشن ہوگیا تھا لیکن حملہ آوروں میں سے کوئی بھی مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ظاہر ہے، وہ لوگ اتنے احمق تو ہوں گے نہیں کہ اس تیز روشنی میں سامنے آجاتے کہ لو، اب ہمیں آسانی سے گولی مار دو۔

سڑک کی طرف اکا دکا گولیاں چل رہی تھیں۔ اچانک میں نے فلیش لائٹ کو ایک فائر سے تباہ ہوتے دیکھا۔ دھماکے کی آواز سے مجھے معلوم ہوگیا کہ یہ فائر غنی نے کیا ہے۔ غنی کا نشانہ بے خطا تھا۔ فلیش لائٹ تو خیر بہت بڑا ہدف تھا، وہ تو اس سے کہیں چھوٹی چیزوں کو بھی نشانہ بنا سکتا تھا۔

اچانک مجھے ایسا لگا جیسے کوئی جھاڑیوں میں رینگتا ہوا میری طرف بڑھ رہا ہو۔ میں نے بائیں ہاتھ میں ریوالور

لیا۔ میں فائر تو کر دیتا لیکن مجھے امید نہیں تھی کہ میری گولی کس طرف جائے گی۔ میں بائیں ہاتھ سے تو نشانہ لے ہی نہیں سکتا تھا۔ میں نے ریوالور دائیں ہاتھ میں لینے کی کوشش کی لیکن مجھ سے ریوالور اٹھایا نہ جاسکا۔ اتنی دیر تک اندھیرے میں رہنے کی وجہ سے میری آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہوگئی تھیں۔

نیلم نے اچانک میرے ہاتھ سے ریوالور لے لیا۔

''یہ کیا بے ہودگی ہے؟'' میں سرگوشی میں غرایا۔

''نواب صاحب! آپ اس ہاتھ سے فائر نہیں کر سکتے لیکن میں کر سکتی ہوں۔ بھروسا رکھیں، میں اپنے جیتے جی آپ پر آنچ نہ آنے دوں گی۔'' اس نے اندھیرے میں آہٹوں کی سمت دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ شخص ہم سے کچھ فاصلے پر رک گیا، پھر وہ آہستہ آہستہ بائیں جانب چلا گیا۔ حیرت مجھے یہ تھی کہ ابھی تک سڑک پر کوئی دوسری گاڑی کیوں نہیں آئی؟ آئی تھی تو وہ گزری کیسے؟ سڑک کے بیچوں بیچ تو وہ دیوہیکل ٹرک کھڑا تھا؟

پھر مجھے سڑک پر گاڑیوں کی آمدورفت محسوس ہوئی۔ جی ٹی روڈ پر رات بھر گاڑیاں چلتی رہتی ہیں۔ میں نے سوچا، چیخ کر کسی گاڑی والے کو روک لوں لیکن اس سے پہلے میرے ''کرم فرما'' وہاں پہنچ جاتے، پھر وہ مجھے ہر قسم کی مدد سے آزاد کر دیتے اور میں یوں چوہے کی موت مرنا نہیں چاہتا تھا۔

نیلم نے میرا ہاتھ پکڑا اور سڑک کے متوازی اس خاردار جنگل میں چلنے لگی۔ میرے بازو کا درد شدید ہوتا جا رہا تھا۔ اس جگہ سے کافی دور آنے کے بعد میں نے کچھ اطمینان کا سانس لیا۔

اچانک مجھے ایسا لگا جیسے میری ہتھیلی کی پشت پر کوئی چیز رینگ رہی ہو۔ میں نے اپنا سیل فون نکالا تو مجھے ایک دم خیال آیا کہ اسے سائلنٹ پر لگا دوں۔ مجھے یہ خیال بروقت آیا تھا۔ میں نے سیل فون سائلنٹ پر لگایا ہی تھا کہ کسی کی کال آگئی۔ میں نے سیل فون کان سے لگایا اور سرگوشی میں بولا۔ ''ہیلو!''

''کون بول رہا ہے؟'' دوسری طرف سے نسوانی آواز سنائی دی لیکن وہ آواز میرے لیے بالکل اجنبی تھی۔

''آپ کو کس سے بات کرنا ہے؟'' میں نے جھنجلا کر سرگوشی کی۔

''آپ کے گلے میں کچھ خرابی ہے؟'' بولنے والی نے پوچھا۔

''آپ کو بات کس سے کرنا ہے؟'' میں نے جھنجلا کر پوچھا۔

''مجھے نثار صاحب سے بات کرنی ہے۔'' اس نے کہا۔

''رانگ نمبر۔'' میں نے درشت انداز میں کہا اور سیل فون آف کر دیا۔

سیل فون میں لگی ہوئی چھوٹی سی ٹارچ کے ذریعے میں نے اپنے زخمی ہاتھ کا جائزہ لیا۔ میرے بازو سے خون بہہ رہا تھا جو میری کلائی پر رینگتا ہوا میری ہتھیلی تک آکر قطرہ قطرہ نیچے گر رہا تھا۔

نیلم نے بھی میرا خون دیکھ لیا۔ اس بھاگ دوڑ میں میرا زخم کھل گیا تھا۔ اس نے اپنا دوپٹا پھاڑا، پٹی کا سلنگ آرم بنا کر میرے گلے میں ڈالا اور میرا بازو احتیاط سے اس میں ڈال دیا۔ اس سے میری تکلیف خاصی کم ہوگئی۔ میرے جسم پر شرٹ تھی، کوٹ تھا، ان چیزوں کی موجودگی میں وہ میرے زخم پر پٹی کیسے باندھ سکتی تھی۔ پھر وہ مجھے لے کر تیزی سے آگے بڑھ گئی۔

تھکن اور نقاہت سے میری حالت غیر ہو رہی تھی لیکن نیلم مجھے گویا گھسیٹ رہی تھی۔ میرا اندازہ ہے کہ ہم نے کم سے کم تین میل کا فاصلہ تو طے کر لیا ہوگا۔ مجھ سے اب چلا نہیں چلا جا رہا تھا۔ ایک جگہ اچانک مجھے روشنی نظر آئی۔ نیلم بھی وہ روشنی دیکھ کر محتاط ہوگئی۔ ہم لوگ بہت محتاط انداز میں کچھ مزید آگے بڑھے تو مجھے وہاں کچھ ٹرک نظر آئے۔

''یہ کوئی جھونپڑی ہوٹل ہے۔'' نیلم نے کہا۔ ٹرک ڈرائیوروں کے لیے سڑک کے کنارے بنے ہوئے یہ ہوٹل ساری رات کھلے رہتے تھے۔

ہم مزید آگے بڑھے تو مجھے وہاں موجود ڈرائیوروں کی آواز بھی سنائی دینے لگی۔

ایک آدمی دوسرے سے کہہ رہا تھا۔ ''یار، پتا نہیں اس حرامزادے کو زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ ہماری ساری محنت پر پانی پھر گیا۔ باس تو ہماری کھال اتروا دے گا۔ کچھ پتا نہیں کہ وہ ہمیں گولی ہی مار دے۔''

''یار پہلے کھانا تو کھا لے۔'' دوسرے آدمی نے کہا۔ ''باس تو جو کچھ کرے گا، بعد میں کرے گا، بھوک سے تو میں فوری طور پر مر جاؤں گا۔ میں نے دوپہر بھی برائے نام کھایا تھا۔''

''یار، کھانا آنے تو دے۔'' پھر وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ ''ہم نے جھاڑیوں کو اچھی طرح دیکھا لیکن ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ دونوں گاڑی میں موجود ہی نہیں تھے۔''

اسی وقت ہوٹل کا بیرا کھانا لے آیا۔ روٹیوں کی اشتہا انگیز مہک سے مجھے بھی بھوک کا احساس ہوا۔ یوں بھی میرا

تجربہ تھا کہ سڑک کنارے واقع ان چھپر ہوٹلوں کا کھانا بہت لذیذ ہوتا ہے۔

''یار، ویسے ایک بات ہے۔'' پہلے آدمی نے نوالہ توڑتے ہوئے کہا۔''اس حرامزادے نواب کا نشانہ بہت بہترین ہے۔ اس نے کس خوبی سے سرچ لائٹ کو نشانہ بنایا تھا۔''

''یار، ہم ناکام لوٹے تو باس واقعی گولی مار دے گا۔''

''یار تو کھانا کھا، ریاض انہیں چھوڑے گا نہیں۔ وہ کتے لینے گیا ہے۔ وہ ہم سے تو بچ سکتے ہیں لیکن کتے انہیں نہیں چھوڑیں گے۔'' پھر وہ ہنس کر بولا۔''ریاض اندھیرے میں دیکھنے والے چشمے بھی لے کر آئے گا۔''

میری ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہر دوڑ گئی۔ پہلے کتے، اب انفراریڈ گلاسز! یہ کون لوگ ہو سکتے تھے؟ عام چور، اچکے یا ڈاکو تو اس انداز میں کام نہیں کرتے کہ کتوں کا اہتمام بھی کریں اور ان کے پاس جدید قسم کے انفراریڈ گلاسز بھی ہوں۔

مجھے اپنے بائیں ہاتھ پر شدید چبھن کا احساس ہوا۔ میرا وہ ہاتھ نیلم نے پوری قوت سے دبایا تھا، پھر وہ ہذیانی انداز میں بولی۔''نواب صاحب! کتے آگئے تو وہ فوراً ہی ہم تک پہنچ جائیں گے، پھر وہ آدمی اندھیرے میں دیکھنے والے چشمے کی بات بھی کر رہا ہے۔ یہاں سے جلدی نکلیں۔''

''مجھے کچھ سوچنے دو نیلم!'' میں نے کہا۔''اگر وہ کتے لے آئے تو ہم یہاں سے بھاگ کر بھی نہ بچ سکیں گے۔ کتے تو چشم زدن میں ہمیں آلیں گے۔ یہاں سے فرار ہونے کے لیے ہمیں گاڑی چاہیے نیلم! ہم پیدل فرار نہیں ہو سکتے۔''

''پھر..... کیا یہاں بیٹھ کر ہم ان کا انتظار کریں؟''

میں نے گھور کے اسے دیکھا۔''تم کچھ دیر خاموش نہیں رہ سکتیں؟'' میں بھنا کر بولا۔

وقت اور حالات انسان پر کس تیزی سے اثر انداز ہوتے ہیں؟ وہی نیلم جو بات کرتے ہوئے میرے سامنے ہکلا جاتی تھی، نظریں نہیں اٹھا سکتی تھی، اس وقت کیسے مجھ سے بحث کر رہی تھی۔ اپنی تجاویز دے رہی تھی لیکن میرے درشت لہجے نے اسے خاموش کر دیا تھا۔

''میں دیکھتا ہوں، ممکن ہے کوئی ٹرک ڈرائیور اگنیشن میں چابی لگی چھوڑ گیا ہو؟''

''یہ تو بہت خطرناک ہے نواب صاحب!'' نیلم نے کہا۔''پھر آپ کو چابی مل بھی گئی تو آپ ڈرائیونگ کیسے کریں گے؟''

''ڈرائیونگ بھی کر لوں گا۔ ان لوگوں کے ہاتھوں میں پڑنے سے بہتر ہے کہ میں آخری کوشش کرتے ہوئے مارا جاؤں۔''

اچانک مجھے چکر سا آ گیا۔ میں نے نیلم کا سہارا لے لیا۔ اس نے مجھے آہستگی سے زمین پر بٹھا دیا اور بولی۔

''آپ بیٹھیں سر، میں دیکھتی ہوں۔''

''تم کیا کر سکتی ہو؟'' میں نے کہا تو مجھے اپنی ہی آواز بہت دور سے آتی سنائی دی۔

میرے حلق میں کانٹے سے پڑ رہے تھے۔ پانی اور کافی کے تھرماس سب کچھ گاڑی میں رہ گیا تھا۔ غنی کا بھی کچھ پتا نہیں تھا۔

میں نے سوچا، غنی سے سیل فون پر رابطہ کرنا چاہیے۔ میں نے سیل فون نکالا اور غنی کا نمبر ملایا لیکن غنی سے میرا رابطہ نہیں ہو سکا۔ معلوم ہوا کہ میرے سیل فون کی بیٹری جواب دے گئی ہے۔ میرے سر میں اب بھی دھماکے سے ہو رہے تھے۔ آنکھوں کے آگے نیلے پیلے دائرے ناچ رہے تھے۔

''میں آپ کے لیے پانی لے کر آتی ہوں۔'' نیلم نے کہا۔''وہ لوگ سمجھ رہے ہیں کہ گاڑی میں صرف آپ اور غنی تھے۔ میرے بارے میں تو وہ جانتے ہی نہیں ہیں۔''

''نہیں نیلم!'' میں نے انکار کر دیا۔''تمہارا حلیہ اس قابل نہیں ہے۔'' میں نے اس کے لباس کو دیکھتے ہوئے کہا جو کانٹے دار جھاڑیوں میں الجھ کر جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا اور اس کی سفید و شفاف جلد نظر آ رہی تھی۔

''لیکن نواب صاحب! ہم ہاتھ پر ہاتھ دھر کے تو نہیں بیٹھ سکتے۔'' نیلم نے کہا۔

میرا دل چاہ رہا تھا کہ وہیں لیٹوں اور سو جاؤں۔ کمزوری اور نقاہت کی وجہ سے مجھ پر غنودگی طاری ہو رہی تھی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میرا دایاں ہاتھ موجود ہی نہ ہو پھر میں نے ہاتھ ہلانے کی کوشش کی تو مجھے شدید تکلیف کا احساس ہوا۔ اس کے ساتھ میری نظر اپنے کپڑوں پر پڑی۔ میری شرٹ اور پینٹ کا اگلا حصہ خون میں تر تھا۔ زخم سے بہنے والا خون میرے لباس کو تر کر رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر خون اسی طرح بہتا رہا تو کچھ دیر میں میری سانس کی ڈوری ٹوٹ جائے گی۔ کفن باندھے ہوئے سر سے یہاں سب یار بیٹھے ہیں، بہت آگے گئے پیچھے ہیں جو تیار بیٹھے ہیں۔

اچانک نیلم نے مجھے جھنجوڑ دیا۔''نواب صاحب! وہ دیکھیے، سامنے والا ٹرک روانہ ہونے والا ہے۔ آپ بس تھوڑی سی ہمت کر لیں۔ کسی طرح اس ٹرک میں سوار ہو جائیں۔ پھر ہم یہاں سے بہت دور نکل جائیں گے۔''

میں نے دیکھا، واقعی سامنے کھڑے ہوئے ٹرک کا ڈرائیور اور کلینر اس میں سوار ہو چکے تھے بس چند قدم کی بات تھی۔

''آئیے نواب صاحب!'' نیلم نے میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کی۔

مجھ سے اٹھا ہی نہیں گیا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے ٹرک اسٹارٹ ہوا اور وہاں سے روانہ ہو گیا۔ میں ٹرک سے اڑنے والی گرد کو دیکھتا رہ گیا۔

''میں کیا کروں؟'' نیلم عالم اضطراب میں بڑبڑائی اور وحشت زدہ انداز میں ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

میں اپنی قوت ارادی کے بل بوتے پر ابھی تک ہوش و حواس میں تھا۔ اگر میرا خون اسی طرح بہتا رہا تو میں زیادہ دیر زندہ نہیں رہ سکوں گا۔ میں نے ہول کر سوچا۔

اسی وقت وہاں ایک گاڑی آ کر رکی۔ گاڑی میں کوئی فیملی تھی۔ مجھے کھڑکی میں سے چھوٹا سا ایک بچہ اور ایک خاتون کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے صاحب نے گاڑی کا دروازہ کھولا تو اس سے گاڑی کا اندرونی بلب روشن ہو گیا تھا۔ پھر بہت دور سے کسی کی آواز سنائی دی۔

''میں گاڑی میں ڈالنے کے لیے پانی لے کر آتا ہوں۔''

اس کے بعد میرا ذہن آہستہ آہستہ ماؤف ہونے لگا۔

پھر میرے چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔

دوبارہ میری آنکھ کھلی تو میں کسی کمرے میں تھا۔ کمرے کی دیواریں صاف ستھری تھیں اور کھڑکیوں پر سفید پردے لہرا رہے تھے، نہ جانے وہ کون سی جگہ تھی؟ میری پلکیں بہت بھاری ہو رہی تھیں۔ انہیں اوپر اٹھانے میں دقت ہو رہی تھی۔ میں دوبارہ غنودگی میں چلا گیا۔ پھر میری آنکھ کھلی تو وہی کمرا تھا لیکن اب کھڑکیاں بند تھیں۔ میری حالت بھی اب پہلے سے بہتر تھی۔

میں نے نظریں گھما کر ارد گرد کا جائزہ لیا۔ میری بائیں جانب اسٹینڈ پر بلڈ کا بیگ لٹک رہا تھا جس میں سے قطرہ قطرہ میری رگوں میں اتر رہا تھا۔ سفید یونیفارم میں ملبوس ایک نرس اسٹینڈ پر ایک دوسرا بیگ لٹکا رہی تھی۔ وہ ڈرپ تھی۔ نرس نے اس ڈرپ میں سرنج کے ذریعے کوئی اور دوا ملائی، پھر وہ ڈرپ بھی مجھے لگا دی۔

اس کا مطلب ہے کہ میں کسی اسپتال میں ہوں لیکن کیوں؟ میں اسپتال میں کیوں ہوں؟ نور کہاں ہے؟ راجا کہاں ہے؟ اور یہ کمرا میرے ست بدھائی کے اسپتال کا تو نہیں ہے، نہ ہی وہاں کوئی نرس ہے، پھر...... پھر...... میں کہاں ہوں؟

میں نے دائیں جانب نظر ڈالی تو مجھے نیلم دکھائی دی۔ وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو گئی تھی۔

میرے حلق میں کانٹے سے اگ آئے تھے۔ میں نے پانی مانگنا چاہا لیکن میرے حلق سے آواز ہی نہ نکلی۔ میں نے اپنے جسم کی رہی سہی طاقت مجتمع کر کے نیلم کو آواز دی۔''نی...... لم......''

نیلم نے چونک کر میری طرف دیکھا اور جھپٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''پا...... نی......'' میں نے بہ مشکل تمام کہا۔

''سسٹر!'' نیلم کی آواز مجھے بہت دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔''نواب صاحب کو ہوش آ گیا سسٹر!'' پھر اس نے جلدی سے پانی کا گلاس پکڑا اور مجھے سہارا دے کر اٹھایا۔ اس نے پانی کا گلاس میرے ہونٹوں سے لگایا تو کچھ پانی میرے حلق میں گیا اور کچھ میرے کپڑوں پر گر گیا۔

''آرام سے نواب صاحب...... آرام سے!'' نیلم نے کہا۔

اسی وقت نرس ایک ڈاکٹر سمیت واپس آئی۔ ڈاکٹر نے میرا معائنہ کیا، میری نبض دیکھی، بلڈ پریشر چیک کیا، آنکھیں دیکھیں، پھر بولا۔''میڈم، اب خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔''

''اللہ تیرا شکر ہے۔'' نیلم نے بے اختیار کہا۔

''مجھے کیا ہوا ہے ڈاکٹر صاحب؟'' میں نے الجھ کر پوچھا۔

''آپ زخمی ہو گئے تھے سر!'' ڈاکٹر نے کہا۔''لیکن پریشان مت ہوں۔ اب آپ بالکل ٹھیک ہیں۔ بس زیادہ سوچیں مت، آرام کریں۔''

ڈاکٹر نے ڈرپ اور خون کے بیگ کا جائزہ لیا اور چلا گیا۔

مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ میں نے نیلم سے کہا۔ ''مجھے بھوک لگ رہی ہے نیلم! ریشم کو بلاؤ، میں کچھ کھانا چاہتا ہوں۔''

''سسٹر!'' نیلم نے نرس سے کہا۔''نواب صاحب کو سینڈوچز دے دوں؟''

''نہیں میڈم!'' نرس نے کہا۔''ڈاکٹر صاحب نے ابھی صرف جوس دینے کو کہا ہے۔''

نیلم نے لیور کے ذریعے میرے بیڈ کا سرہانہ اونچا کیا اور جوس کا گلاس لے کر میری طرف بڑھی۔

''میں نے کہا ہے کہ ریشم کو بلاؤ۔'' میں نے نیلم کو گھورتے ہوئے کہا۔''نور کہاں ہے، راجا کہاں ہے اور ڈاکٹر شہناز......''

''نواب صاحب...... آپ ست بدھائی میں نہیں ہیں۔'' نیلم نے آہستہ سے کہا۔

''ہم ست بدھائی میں نہیں ہیں؟'' میں نے کہا۔ ''تو پھر...... پھر......''

اچانک میرے ذہن میں جھماکا ہوا اور مجھے یاد آگیا کہ میں ست بدھائی سے راولپنڈی جا رہا تھا، پھر میری گاڑی کے سامنے ایک ٹرک آگیا اور پیچھے سے ایک ڈبل کیبن پک اپ نے راستہ مسدود کر دیا تھا۔ میرے ساتھ نیلم بھی تھی۔ ہم نے گاڑی سے باہر چھلانگ لگا دی تھی۔ پھر...... پھر ہم لوگ بھاگتے رہے تھے۔ مجھے وہ ہوٹل یاد آیا جہاں بہت سے ٹرک کھڑے تھے۔ نیلم نے مجھ سے ایک ٹرک میں چڑھنے کو کہا تھا لیکن میں نہیں چڑھ سکا تھا...... پھر...... ہاں، پھر ایک گاڑی ہمارے عین سامنے آکر رکی تھی اور...... اور...... پھر کیا ہوا تھا؟ غنی کہاں ہے اور...... میں اس وقت کہاں ہوں؟

نیلم نے جوس کا گلاس میرے ہونٹوں سے لگا دیا۔ میں ایک ایک گھونٹ کر کے آہستہ آہستہ جوس پینے لگا لیکن میرے ذہن میں سوالات کی ایک یلغار تھی۔ میں یہاں تک کیسے پہنچا تھا؟

''نیلم!'' میں نے کہا۔ ''ہم یہاں کیسے پہنچے؟''

''جہاں ہم چھپے ہوئے تھے، وہاں ایک گاڑی آکر رکی تھی۔ جو صاحب گاڑی چلا رہے تھے، وہ پانی لینے چلے گئے تھے۔'' نیلم نے کہنا شروع کیا۔ ''میں اس وقت بہت پریشان تھی۔ میں سوچے سمجھے بغیر اس گاڑی کے نزدیک پہنچ گئی۔ گاڑی میں ایک بیگم صاحبہ اپنے بچے کے ساتھ موجود تھیں۔ وہ اچانک مجھے اپنے سامنے دیکھ کر ڈر گئیں۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ ''ڈریں مت میڈم! ہم بہت مصیبت میں ہیں۔ ہماری گاڑی کو ڈاکوؤں نے گھیر لیا تھا۔''

اسی وقت صاحب بھی واپس آگئے۔ بیگم صاحبہ نے ان سے کہا۔ ''دیکھیے، یہ بیچاری کیا کہہ رہی ہے؟ ان کی گاڑی کو ڈاکوؤں نے گھیر لیا تھا۔''

صاحب نے چونک کر مجھے دیکھا، پھر بولے۔ ''ہاں، یہاں سے چار پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر ایک گاڑی کھڑی تو ہے۔''

''جی ہاں سر! وہ ہماری ہی گاڑی ہے۔ ہم لوگ گاڑی سے کود کر جھاڑیوں میں چھپتے ہوئے یہاں تک آئے ہیں۔''

''ہم لوگ؟'' صاحب نے پوچھا۔ ''کیا تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟''

''جی ہاں سر! میرے صاحب بھی ہیں۔ وہ بہت زخمی ہیں۔ ہمارے ساتھ ڈرائیور بھی تھا وہ بے چارہ نہ جانے کہاں ہے۔ میرے صاحب بہت زخمی ہیں سر!'' میں اتنا کہہ کر رونے لگی۔

بیگم صاحبہ نے ہمدردی سے کہا۔ ''آپ پریشان نہ ہوں۔ کہاں ہیں آپ کے صاحب؟''

میں نے جھاڑیوں کی طرف اشارہ کر دیا۔

پھر میں نے صاحب کی مدد سے آپ کو گاڑی میں لٹایا اور وہ فوراً ہی روانہ ہو گئے۔

''آپ لوگ کہاں جا رہے تھے؟'' صاحب نے مجھ سے پوچھا۔

''ہم لوگ راولپنڈی جا رہے تھے۔'' میں نے جواب دیا۔

''میرا نام افتخار ہے، میں گجرات کا ڈی سی ہوں۔'' انہوں نے بتایا۔ ''آپ لوگ آئے کہاں سے ہیں؟''

''ہم لوگ ست بدھائی سے آئے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

''ست بدھائی سے؟'' افتخار صاحب نے حیرت سے پوچھا۔ ''یہ جگہ کہاں ہے؟''

''سر! یہ جگہ دینہ سے تقریباً پندرہ، بیس کلومیٹر دور ہے۔ جی ٹی روڈ سے بھی اتنے ہی فاصلے پر ہوگی۔ یہ نواب صاحب کی جاگیر ہے۔''

''میں آپ کو ست بدھائی پہنچا دیتا لیکن گجرات یہاں سے نزدیک ہے اور ان صاحب کو فوری طور پر طبی امداد کی ضرورت ہے۔ ان کا خون بہت تیزی سے بہہ رہا ہے۔''

''پھر آپ گجرات ہی چلیں سر!'' میں نے کہا۔

''تو کیا ہم اس وقت گجرات میں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں نواب صاحب! ہم اس وقت گجرات میں ہیں۔''

''راجا، نور اور شہناز میری وجہ سے بہت پریشان ہوں گے۔ تم نے انہیں اطلاع دی؟''

''نہیں نواب صاحب!'' نیلم نے کہا۔ ''میں انہیں اطلاع نہیں دے سکی۔ میرے پاس سیل فون ہی نہیں ہے۔ سب لوگوں کے نمبر اسی میں تھے۔''

''تو میرے سیل فون سے اطلاع کر دیتیں۔'' میں نے کہا۔

''وہ...... آپ کا سیل...... فون......''

''چارج نہیں تھا۔'' میں نے کہا۔ ''چارجر کسی سے منگا لیتیں۔ میرا پرس تو میری جیب میں ہے۔''

''نہیں سر...... وہ...... آپ کا سیل فون بھی وہیں کہیں گر گیا تھا۔'' نیلم نے آہستہ سے کہا۔

''یہاں کسی سے سیل فون لے لو۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے راجا کا سیل نمبر بھی یاد ہے اور نور کا سیل نمبر بھی میرے ذہن میں ہے۔''

''میں ابھی نرس سے سیل فون مانگ لیتی ہوں۔'' نیلم نے کہا اور باہر جانے ہی والی تھی کہ نرس خود ہی کمرے میں آگئی۔

''سسٹر!'' میں نے کہا۔ ''آپ کے پاس سیل فون ہے؟''

''یس سر!'' نرس نے ہنس کر کہا اور اپنا سیل فون نکال لیا۔

''اگر آپ مائنڈ نہ کریں تو میں اس سے ایک کال کر لوں؟''

''شیور سر!'' نرس نے کہا اور اپنا سیل فون میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے سیل فون اس سے لے کر راجا کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف کئی گھنٹیاں بجنے کے بعد کسی نے کال ریسیو کی۔ ''ہیلو!'' مجھے راجا کی آواز سنائی دی۔

''راجا! میں......''

''تو کہاں غائب ہے الو کے پٹھے!'' راجا نے کہا۔ ''نہ کوئی خیر، نہ خبر!''

''یار، جب ہم پنڈی جا رہے تھے تو ہماری گاڑی کو رکنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔'' پھر میں نے اسے تفصیل بتانے سے پہلے کہا۔ ''تو ایسا کر، اسی نمبر پر فون کر لے۔ میں اصل میں کسی سے سیل فون عارضیاً مانگ کر تجھے فون کر رہا ہوں۔''

''اچھا تو بند کر، میں کال کرتا ہوں۔'' راجا نے کہا۔

نرس نے مسکرا کر مجھے دیکھا، پھر بولی۔ ''آپ بات کر لیتے سر! سیل فون میں کافی کریڈٹ ہے۔''

''آپ کا بہت شکریہ سسٹر!'' میں نے کہا۔ ''ابھی میرا دوست خود ہی مجھے کال کرے گا۔''

سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اسکرین پر راجا ہی کا نمبر تھا۔ ''ہاں، اب بتا، کیا ہوا تھا؟'' راجا نے پوچھا۔

میں نے جواب میں اسے تفصیل سے سب کچھ بتا دیا۔

''تجھے چار دن بعد ہمیں اطلاع دینے کا خیال آیا ہے؟'' راجا نے کہا۔

''کیا؟'' میں بری طرح چونک اٹھا۔ ''چار دن بعد؟''

''جی ہاں نواب صاحب!'' نیلم نے آہستہ سے کہا۔ ''آپ کو آج چار دن بعد ہوش آیا ہے۔''

''یہ کیا نیلم کی آواز ہے؟'' راجا نے پوچھا۔

''ہاں۔'' میں نے جواب دیا۔

''اس کا مطلب ہے کہ تو چار دن تک بے ہوش رہا؟'' راجا نے تشویش سے پوچھا۔ ''غنی کہاں ہے؟''

میرے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ ''غنی ست بدھائی نہیں پہنچا؟''

''وہ ست بدھائی پہنچا ہوتا تو میں تجھ سے پوچھتا؟'' راجا نے کہا۔

میرا دل بیٹھنے لگا۔ ''تو کیا غنی...... نہیں...... غنی نہیں مر سکتا۔'' میں منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

''اچھا، تو پریشان مت ہو، میں گجرات پہنچ رہا ہوں۔ کیا نام بتایا تو نے اس ڈی سی کا...... افتخار؟''

''ہاں، نیلم نے مجھے یہی نام بتایا ہے۔ میری تو اب تک اس سے ملاقات نہیں ہوئی ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں وہاں پہنچتا ہوں۔'' راجا نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے سیل فون نرس کی طرف بڑھا دیا۔ ''تھینک یو سسٹر!'' میں نے کہا۔

''یو آر ویلکم سر!'' نرس نے مسکرا کر کہا۔

میرا دل غم سے بوجھل ہو رہا تھا۔ غنی اگر ست بدھائی نہیں پہنچا تھا اور اس نے حویلی میں کسی سے رابطہ بھی نہیں کیا تھا تو اس کا یہی مطلب تھا کہ...... وہ...... اب دنیا میں نہیں ہے یا پھر...... وہ دشمنوں کی قید میں ہے۔

''کیا ہوا نواب صاحب! آپ اچانک بہت زیادہ پریشان ہو گئے ہیں۔''

میں نے نظریں گھما کر نیلم کو دیکھا۔

وہ گھبرا کر بولی۔ ''ارے...... آپ رو کیوں رہے ہیں؟''

اس کے کہنے پر مجھے خود بھی احساس ہوا کہ میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ نیلم نے ٹشو پیپر سے میرے آنسو خشک کر دیے۔

''غنی نے میری بہت خدمت کی ہے نیلم...... اس نے میری جان بچانے کے لیے بے شمار دفعہ اپنی جان خطرے میں ڈالی، آخر...... اس نے مجھ پر جان قربان کر دی نیلم...... غنی مر گیا......'' میں ایک مرتبہ پھر رونے لگا۔

''حوصلہ رکھیں سر!'' نیلم نے کہا۔ ''غنی کو کچھ نہیں ہو سکتا۔ وہ اتنی آسانی سے مرنے والا نہیں ہے۔ وہ بھی کہیں

نکل گیا ہوگا۔''

میں نے اپنے آنسو خشک کیے اور نیلم سے پوچھا۔
''ٹائم کیا ہوا ہے اس وقت؟''
''رات کے دس بج رہے ہیں۔'' نیلم نے کہا۔ ''آج ہمیں یہاں چوتھا دن ہے۔ آپ چار دن تک بے ہوش رہے ہیں۔''
''اس دوران میں افتخار صاحب آئے تھے؟''
''وہ کئی دفعہ آ چکے ہیں۔ ایک دفعہ تو ان کی بیگم بھی آئی تھیں۔ انہوں نے مجھے اپنے کپڑے دیے ہیں۔''
مجھے یاد آیا کہ نیلم کے کپڑے تو جھاڑیوں میں الجھ کر پھٹ گئے تھے۔ اس وقت وہ صاف ستھرے کپڑوں میں تھی۔
''نیلم! اس وقت کافی مل سکتی ہے؟''
''جی ہاں نواب صاحب!'' نیلم نے کہا۔ ''چائے اور کافی کا سامان آج ہی ڈی سی صاحب نے بھجوایا ہے۔ میں ابھی بنا کر لاتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ گویا لچکتی کمرے سے نکل گئی۔
مجھے اس وقت وہ کہیں سے بھی بچی نہیں لگ رہی تھی۔ وہ ایک بھرپور دوشیزہ لگ رہی تھی۔ میں نکلا تھا ناصر کی عیادت ... کرنے اور نیلم کو اس کے بابا سے ملوانے، اب لوگ میری عیادت کو آ رہے تھے اور اگر نیلم نہ ہوتی تو لوگ نورا اور راجا سے میری تعزیت کر رہے ہوتے۔ میں نے تو نیلم کو کبھی اتنی اہمیت ہی نہیں دی تھی۔ وہ اچانک ہی میرے لیے اہم ہوگئی تھی۔ یہ اسی کی ہمت تھی کہ مجھے اس ویرانے سے اٹھا کر گجرات لے آئی تھی۔

نرس کمرے میں داخل ہوئی اور کوئی انجکشن تیار کرنے لگی۔
''یہ انجکشن کیسا ہے سسٹر؟'' میں نے پوچھا۔
''میں سمجھی نہیں'' نرس نے سرنج بھر کے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔
''میرا مطلب ہے کہ یہ نیند کا انجکشن تو نہیں ہے؟''
''نو!'' نرس مسکرائی۔ ''آپ کو خواب آور انجکشن کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے سکون کا سانس لیا۔
''کیونکہ وہ انجکشن تو میں پہلے ہی ڈرپ میں ملا چکی ہوں۔ آپ کے لیے سکون بہت ضروری ہے۔''
''اونو!'' میں نے کہا۔ ''میں ابھی سونا نہیں چاہتا۔''
''اس سے آپ کو فوراً نیند نہیں آئے گی سر!'' نرس پھر مسکرائی۔ ''ہاں، وہ آپ کی بیگم کہاں گئیں؟''
''میری بیگم؟'' میں حیران ہو کر بولا۔
''کیا میڈم نیلم آپ کی بیگم نہیں ہیں؟'' نرس شرمندہ سی ہوگئی۔

''وہ میری سیکریٹری ہے۔'' میں نے جواب دیا۔
''او، آئی سی!'' نرس نے مسکرا کر کہا۔ ''سوری سر! میں غلط سمجھی۔'' اس نے وہ انجکشن بھی ڈرپ میں ملا دیا۔ ''یہ اینٹی بائیوٹک انجکشن ہے۔'' وہ مسکراتی ہوئی چلی گئی۔
تھوڑی دیر بعد نیلم کافی لے کر آ گئی اور بہت احتیاط سے مجھے پلانے لگی۔
کافی تو میں یوں بھی بہت دیر میں پیتا ہوں۔ کافی پی کر مجھے توانائی کا احساس ہوا۔ میں نے نیلم سے کہا۔ ''اب تم بھی کچھ دیر آرام کر لو۔ تمہاری آنکھیں بھی کم خوابی سے سرخ ہو رہی ہیں۔''
''مجھے اتنی مشکل اردو نہیں آتی سر!'' نیلم نے مسکرا کر کہا۔
''مشکل اردو؟'' میں نے ہنس کر پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے کہ جاگ جاگ کر تمہاری آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔ اب تم بھی سو جاؤ۔''
''میں آج دن میں کچھ دیر سو لی تھی۔ میری فکر مت کریں نواب صاحب! میں تو راتوں کو جاگنے کی عادی ہوں۔ جب بابا رات رات بھر گھر سے باہر رہتا تھا تو میں اس کے انتظار میں جاگتی رہتی تھی۔'' وہ آرام کرسی پر نیم دراز ہوگئی۔
مجھے اس کی آنکھوں میں پھر وہی چمک دکھائی دی۔ اس وقت مجھے اس چمک سے وحشت نہیں ہو رہی تھی۔
''نیلم! تمہاری ماں بہت حسین ہوگی؟''
نیلم نے چونک کر مجھے دیکھا، پھر مسکرا کر بولی۔ ''میری ماں کا خیال آپ کو کیسے آ گیا؟ جی ہاں، ماں بہت خوب صورت بلکہ حسین تھی۔''
''تم نے اپنی ماں ہی کا حسن لیا ہے۔'' میں نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔
اس نے شرما کر سر جھکا لیا اور آہستہ سے بولی۔ ''میری ماں بہت حسین تھی سر! بابا کہتا تھا کہ تجھے دیکھ کر مجھے جینا یاد آ جاتی ہے۔ میری ماں ایک حادثے میں مر گئی تھی۔''
''تمہارا کوئی اور بھائی بہن، کوئی رشتے دار بھی نہیں ہے؟''
''نہیں نواب صاحب! بابا کے علاوہ دنیا میں میرا کوئی بھی نہیں تھا۔ اب بابا بھی......'' وہ بولتے بولتے اچانک خاموش ہوگئی۔
دروازے پر دستک ہوئی تو میں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے راجا کمرے میں داخل ہوا۔ وہ میرے پاس آیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر جذباتی

لہجے میں بولا۔ ''فیکے! تو نے یہ کیا حالت بنا لی ہے۔'' اس کی آواز بھرا گئی۔ ''اگر تجھے کچھ ہو جاتا تو......''
''او بھائی! تو میرا حال پوچھنے آیا ہے یا مجھے رلانے آیا ہے؟'' میں نے زبردستی مسکرا کر کہا۔ ''اس نیلم کا شکریہ ادا کر۔ یہ صحیح سلامت مجھے یہاں لائی ہے۔''
''اب ایسی بات بھی نہیں ہے نواب صاحب!'' نیلم سر جھکا کر بولی۔ ''میں نے کون سے پہاڑ توڑے ہیں؟''
''اس ویرانے میں جہاں میرے دشمن بھی موجود تھے، وہاں سے مجھے نکالنا کوئی آسان کام تو نہیں ہے۔''
''میرے ساتھ کوئی اور بھی آیا ہے۔'' راجا نے مسکرا کر کہا۔
''کیا نورا آئی ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''تو خود ہی دیکھ لے۔'' یہ کہہ کر اس نے بلند آواز میں کہا۔ ''اندر آ جاؤ بھئی۔''
دوسرے ہی لمحے اندر آنے والے کو دیکھ کر میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے لیکن یہ خوشی کے آنسو تھے۔ اندر آنے والا غنی تھا۔ اس کی آنکھوں سے بھی آنسو بہہ رہے تھے اور ایک ہاتھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔
غنی بلکتا ہوا آگے بڑھا اور میرے پیر پکڑ کر رونے لگا۔ ''مجھے معاف کر دیں سر!'' وہ روتے ہوئے بولا۔ ''میں آپ کی حفاظت نہ کر سکا۔''
''احمق ہو تم!'' میں نے کہا۔ ''میرے پاؤں کو چھوڑو۔''
''میں بہت شرمندہ ہوں سر! میں......''
''غنی!'' میں نے اسے جھڑک دیا۔ ''یہ کیا پاگل پن ہے۔ تم کیوں شرمندہ ہو۔ یہ رونا دھونا بند کرو ورنہ ڈاکٹر صاحب تم سب کو باہر نکال دیں گے۔'' میں نے کہا۔ ''اور ان سے پہلے میں نکال دوں گا۔''
غنی میرے پیر چھوڑ کر میرے سینے سے لگ گیا۔
''نواب صاحب!'' نیلم نے ہنس کر کہا۔ ''ابھی تھوڑی دیر پہلے تو آپ بھی غنی کے لیے بچوں کی طرح رو رہے تھے۔ غنی صاحب! آپ بہت بھاگوں والے ہیں کہ آپ کو نواب صاحب جیسا مالک ملا ہے۔''
''اچھا، یہ بتاؤ غنی!'' میں نے اس سے پوچھا۔ ''تم وہاں سے کہاں غائب ہوگئے تھے؟''
''میں نے بھی آپ کے ساتھ ہی گاڑی سے باہر چھلانگ لگائی تھی۔ مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ میں مخالف سمت کی جھاڑیوں میں گھس گیا۔ اس کا یہ فائدہ ہوا کہ دشمنوں کی

توجہ میری طرف ہی رہی۔ میں نے جان بوجھ کر ان پر فائرنگ بھی کر دی۔''
مجھے یاد آ گیا کہ غنی نے فائرنگ بھی کی تھی۔
''مجھے اس بات کا افسوس تھا کہ گاڑی میں اچھا خاصا اسلحہ موجود تھا لیکن وہ میری دسترس میں نہیں تھا ورنہ میں کئی گھنٹے تک انہیں مصروف رکھتا۔ مجھے آپ کی طرف سے زیادہ فکر تھی۔ آپ کے پاس تو کوئی ہتھیار بھی نہیں تھا۔''
''میرے پاس ایک ریوالور تھا لیکن اس کا بھی ہونا، نہ ہونا برابر تھا کیونکہ مجھے بائیں ہاتھ سے فائرنگ کی پریکٹس بالکل نہیں ہے۔ جیسے انگریزی فلموں کے ہیرو دونوں ہاتھوں سے دنادن فائرنگ کرتے ہیں۔''
''میرا پورا دھیان آپ ہی کی طرف تھا۔ پھر مجھے نیلم کی بھی فکر تھی۔ حملہ آور اسے بھی اٹھا لے جاتے۔ میری کوشش تھی کہ کسی طرح میں سڑک کی دوسری جانب والی جھاڑیوں میں چلا جاؤں۔ اچانک پشت سے کسی نے میرے سر پر کوئی وزنی چیز ماری۔ میں کچھ دیر کے لیے ہوش و حواس سے بیگانہ ہوگیا۔ مجھے دوبارہ ہوش آیا تو میرے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے اور میں اسی ویرانے میں پڑا تھا۔ حملہ آوروں میں سے دو آدمی وہاں موجود تھے، باقی دو آپ کی تلاش میں چلے گئے تھے۔ وہ دونوں مجھے بے ہوش ہی سمجھ رہے تھے۔ ان کی باتوں سے مجھے معلوم ہوا کہ ان لوگوں نے سڑک پر دونوں جانب ''تعمیراتی کام جاری ہے، متبادل راستہ اختیار کریں'' کے بورڈ لگا دیے تھے لیکن یہ عذر زیادہ دیر نہیں چل سکتا تھا۔ اسی لیے ان لوگوں نے آپ کی گاڑی سڑک کے کنارے لگا کر اس کا بونٹ کھول دیا تھا تاکہ دیکھنے والے یہی سمجھیں کہ گاڑی کے انجن میں کچھ خرابی ہوگئی ہے اور مالک مدد کی تلاش میں گیا ہے ورنہ رات کے اس پہر لاوارث گاڑی دیکھ کر کوئی بھی شبہے میں پڑ سکتا تھا۔ مجھے انہوں نے گاڑی کے نزدیک ہی باندھ کر ڈالا تھا۔ میرے منہ میں انہوں نے حلق تک کپڑا ٹھونس دیا تھا۔ آخر ڈھائی تین گھنٹے بعد ان کے دوسرے ساتھی بھی لوٹ آئے۔ وہ بہت جھنجلائے ہوئے تھے اور کہہ رہے تھے کہ وہ آخر گیا کہاں؟ ہم نے اس علاقے کا چپا چپا چھان مارا۔ اس کا یہ ڈرائیور تو مل گیا لیکن وہ خود نکل گیا۔''
''وہ کون لوگ تھے غنی؟''
''میں نے یہ معلوم کرنے کی بہت کوشش کی لیکن معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کون لوگ تھے؟'' غنی نے کہا۔ ''مجھے اس وقت یہ تو سکون ہو گیا تھا کہ آپ ان لوگوں کے ہاتھ نہیں آئے۔ حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ نیلم کہاں گئی؟''

"نیلم ہی کی وجہ سے تو میں ان کے ہاتھ نہیں آیا۔" میں نے کہا۔ "اگر یہ مجھے وہاں سے لے کر بھاگتی نہیں تو شاید وہ لوگ مجھے پکڑ لیتے۔ کانٹے دار جھاڑیوں کی پروا کیے بغیر یہ میرا ہاتھ پکڑ کر بھاگتی رہی۔ یہ تو مجھے ابھی معلوم ہوا ہے کہ ہم پانچ چھ کلومیٹر تک بھاگتے رہے۔"

"وہ لوگ مجھے کسی پک اپ میں ڈال کر لے گئے۔" غنی نے کہا۔ "وہاں پہنچ کر انہوں نے اتنا ضرور کیا کہ میرے منہ سے کپڑا نکال دیا اور میرے ہاتھ پاؤں کھول دیے۔ پھر میں کئی گھنٹے اسی تنگ و تاریک کوٹھری میں پڑا رہا۔ دوسرے دن انہوں نے مجھے سوکھی ہوئی ایک روٹی اور بدمزہ چائے دی۔ وہ میری طرف سے زیادہ محتاط نہیں تھے اور مجھے محض ڈرائیور ہی سمجھ رہے تھے۔ اسی کوٹھری میں ایک طرف پانی کا گندا سا ایک مٹکا رکھا ہوا تھا اور ایک کونے میں اینٹیں رکھ کر رفع حاجت کے لیے جگہ بنا دی گئی تھی۔ غلاظت اور بدبو سے میرا دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔ وہ لوگ صبح شام مجھے کبھی سوکھی روٹی، کبھی ابلے ہوئے بدبودار چاول دیتے تھے۔ کوشش کے باوجود مجھے معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ لوگ کون ہیں اور کس کے اشارے پر یہ سب کچھ کر رہے ہیں۔ کھانا لے کر آنے والا شخص پہلے تو بہت محتاط تھا لیکن میرے مفاہمانہ رویے سے بعد میں بے پروا ہو گیا۔ مجھے اب کسی موقع کی تلاش تھی۔ ایک دفعہ رات کو وہ آیا تو اچانک میں نے اسے دبوچ لیا اور لمحوں میں اسے بے ہوش کر دیا۔ اس کے ریوالور پر قبضہ کرنے کے بعد میں وہاں سے دبے پاؤں نکلا۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس وقت میں کہاں ہوں؟ وہ آبادی سے دور کوئی بے آباد مکان تھا۔ مکان بھی کیا وہ کوئی کھنڈر تھا جسے وہ لوگ اپنے ٹھکانے کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔ وہاں گھوڑے دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی۔ ڈاکو آج بھی جنگل کے دشوار گزار راستوں میں سفر کے لیے گھوڑے استعمال کرتے ہیں۔ گویا وہ ڈاکوؤں کا کوئی گروہ تھا۔ کاش مجھے یہ معلوم ہو جاتا کہ یہ ڈاکو کس کے لیے کام کر رہے ہیں؟"

"یہ معلوم کر کے آپ کون سا تیر مار لیتے؟" راجا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "چلیے میں آپ کو بتا دیتا ہوں وہ رانا کے آدمی تھے۔ اب توپ لے کر جائیے اور رانا کا نام و نشان مٹا دیجیے۔"

"آپ مجھ پر طنز کر رہے ہیں؟" غنی نے برا مان کر کہا۔ "میں ایسا بھی کر سکتا ہوں۔"

"راجا کی بات کو چھوڑو غنی!" میں نے کہا۔ "پھر کیا ہوا؟"

"میں سمجھ رہا تھا کہ وہاں کوئی نہیں ہے لیکن اچانک ایک آدمی میرے سامنے آ گیا۔ اس کے چہرے پر گھنی مونچھیں تھیں اور سر کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ میں کلاشنکوف تھی۔ اس نے درشت لہجے میں کہا، تو کیا سمجھتا ہے، ہم اتنے ہی غافل ہیں۔ واپس چل ورنہ......" اس نے اپنی کلاشنکوف سے اشارہ کیا۔ میں اس وقت اتنا جھنجلایا ہوا تھا کہ نتائج کی پروا کیے بغیر اس پر جھپٹ پڑا۔ کلاشنکوف اس کے ہاتھ سے نکل گئی لیکن وہ فوراً ہی سنبھل گیا اور اس نے گرتے گرتے بھی خنجر نکال لیا۔ میرے پاس اس شخص کا ریوالور تھا جو میرے لیے کھانا لے کر آتا تھا۔ میں نے ریوالور کا سیفٹی کیچ ہٹایا لیکن اس نے مجھے فائر کرنے کا موقع نہیں دیا اور میری پنڈلی پر لات مار کے مجھے نیچے گرا لیا، دوسرے ہی لمحے اس کا خنجر میرے شانے میں پیوست ہو گیا۔ اس نے تو میرے سینے پر وار کیا تھا لیکن میں تھوڑا سا ترچھا ہو گیا تھا۔ ہم دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ میں جانتا تھا کہ اگر اسے ذرا بھی موقع مل گیا تو یہاں میری لاش پڑی ہو گی۔ میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کی گردن دبوچ لی۔ جنون کے عالم میں میری گرفت کچھ زیادہ ہی سخت ہو گئی تھی۔ خنجر اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ میں نے عالم دیوانگی میں اس کی ناک پر زوردار ٹکر دے ماری، وہ الٹ کر پیچھے گرا۔ میں نے اس کا خنجر اس کے گلے پر پھیر دیا۔ وہاں چوکیداری کے لیے شاید صرف وہی تھا۔ باقی لوگ وہاں نہیں تھے یا پھر کھنڈر میں کسی اور جگہ ہوں...... میں نے ایک گھوڑا کھولا اور جدھر منہ اٹھا، بھاگ نکلا۔ آدھا گھنٹے تک گھوڑا سرپٹ دوڑانے کے بعد مجھے آبادی کے آثار نظر آئے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ میں اس وقت اٹک کے علاقے میں موجود ہوں۔ میرے بازو سے خون بہت تیزی سے بہہ رہا تھا لیکن میں اس کی پروا کیے بغیر گھوڑا دوڑاتا رہا اور ست بدھائی پہنچ کر گر گیا۔"

"غنی کے اس ایڈونچر میں ایک فائدہ تو ہوا ہے۔" راجا نے کہا۔ "یہ جو گھوڑا لے کر آیا ہے، وہ بہت قیمتی ہے۔ بعد میں اگر قبلہ نواب صاحب کو ریس کا مرض لاحق ہوا تو وہ گھوڑا ریس میں کام آئے گا۔ اپنا حرم مکمل کرنے کے بعد نواب صاحب اس معزز شوق کو بھی عزت بخشیں گے۔"

"اور میرے منیجر ہوں گے راجا۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "ویسے ان کی مرضی ہے، یہ جوکی بھی بن سکتے ہیں۔" پھر میں کچھ سوچ کر بولا۔ "لیکن نہیں، ان کے وزن سے دوڑنا تو دور کی بات ہے، گھوڑا ہل بھی نہیں پائے گا۔ جوکی تو بہت ہلکے پھلکے ہوتے ہیں۔"

"سر، راجا صاحب کا اتنا وزن بھی نہیں ہے۔" غنی

نے کہا۔

"ان کا وزن تو زیادہ نہیں ہے لیکن ان کے گناہوں کا وزن اس سے کئی گنا زیادہ ہے۔"

ڈاکٹر کمرے میں آیا تو میں خاموش ہو گیا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ "سر! آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ اب آپ آرام کریں۔" پھر اس نے راجا کی طرف دیکھا۔ "سر......!"

"او کے ڈاکٹر!" راجا مسکرا کر بولا۔ "میں بس جا ہی رہا ہوں۔"

"تھینک یو سر!" ڈاکٹر نے کہا اور باہر نکل گیا۔

"ٹھیکے پتر! اب تو آرام کر، کل انشاللہ ہم ست بدھائی چلیں گے۔"

"یار، وہ ناصر اب کیسا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ناصر تو اسی شام کو گھر آ گیا تھا۔ اس کے جسم پر معمولی سے زخم تھے لیکن اس کی گاڑی ناکارہ ہو گئی ہے۔ کل وہ بھی یہاں آئے گا۔" یہ کہہ کر راجا اٹھ کھڑا ہوا۔

"غنی! تم بھی راجا صاحب کے ساتھ جاؤ۔" میں نے کہا۔ میں جانتا تھا کہ غنی اسپتال کے باہر رہ کر میری حفاظت کرے گا۔ موسم خاصا سرد ہو گیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ غنی اس سردی میں باہر ٹھٹھرتا رہے۔ میں نے نیلم سے کہا۔ "نیلم، تم بھی چلی جاؤ۔ میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔"

"نیلم کو یہیں رہنے دیں۔" غنی نے کہا۔ "نرس چوبیس گھنٹے تو یہاں بیٹھی نہیں رہتی۔" راجا، غنی کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔

ان لوگوں کے جانے کے بعد میں نے آنکھیں موند لیں۔ اچانک مجھے ایسا لگا جیسے کوئی میرے پیر دبا رہا ہو۔ میں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ نیلم بیڈ پر میرے پیروں کی طرف بیٹھی تھی اور آہستہ آہستہ پیر دبا رہی تھی۔

میں نے پیر سمیٹتے ہوئے کہا۔ "یہ کیا کر رہی ہو نیلم؟"

"بھاگنے کی وجہ سے آپ کے پیروں میں چھالے پڑ گئے ہیں۔" نیلم نے میرے تلوے سہلاتے ہوئے کہا۔ "آپ سو جائیں۔"

"میں ٹھیک ہوں، تم بھی سو جاؤ۔" میں نے کہا۔

نیلم بدستور میرے پاؤں دباتی رہی۔ پاؤں دبانے سے مجھے واقعی سکون مل رہا تھا۔ میں نہ جانے کب سو گیا۔

میری آنکھ کھلی تو دیوار گیر گھڑی سات بجا رہی تھی۔ پھر میری نظر نیلم پر پڑی۔ وہ میرے پیروں کے پاس ہی مختصر سی جگہ میں سو رہی تھی۔ میں نے آہستہ سے اسے آواز دی۔

"نیلم!"

اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھوں میں نیند کا خمار تھا۔ اس نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور بستر سے اتر گئی۔ مجھے شدید پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اس سے پانی مانگا۔ اس نے پانی کا گلاس بھرا اور سہارا دے کر مجھے اٹھایا۔

میں پانی پی رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی اور دواؤں کی ٹرے لیے نرس اندر آ گئی۔ اس نے مسکرا کر کہا۔ "گڈ مارننگ سر! رات کیسی گزری؟"

"تھینکس!" میں نے مسکرا کر کہا۔ "رات مجھے بہت اچھی نیند آئی۔"

نرس نے مجھے دو کیپسول اور ایک ٹیبلٹ دی جو نیلم نے مجھے کھلائی۔ پھر اس نے میرا ٹمپریچر لیا، بلڈ پریشر چیک کیا اور چارٹ میں لکھنے لگی۔

تھوڑی دیر بعد اسپتال کا ملازم ناشتا لے کر آ گیا۔ ناشتے کے بعد کافی نے تو گویا تن مردہ میں نئی جان ڈال دی۔

ساڑھے آٹھ بجے کے قریب راجا کے ساتھ ایک باوقار سے صاحب بھی آ گئے۔ راجا نے بتایا کہ وہی افتخار صاحب ہیں۔ میں نے انہیں سلام کیا اور اٹھنے کی کوشش کی۔

"لیٹے رہیے صاحب!" وہ مسکرا کر بولے۔ "اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟"

"اب تو خاصی بہتر ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ نے مجھ پر جو احسان کیا ہے افتخار صاحب! میں زندگی بھر آپ کا ممنون رہوں گا۔"

"ارے صاحب! شکریہ تو آپ اپنی بیگم کا ادا کریں۔ یہ بہت باہمت خاتون ہیں۔" انہوں نے نیلم کی طرف اشارہ کیا۔

ان کی بات پر نیلم کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ راجا نے بھی آنکھیں گول گول گھما کر مجھے دیکھا۔ میں نے جلدی سے کہا۔ "افتخار صاحب! یہ میری بیگم نہیں، سیکریٹری ہیں۔"

"او، سوری!" وہ بے چارے شرمندہ ہو گئے۔ "میں معذرت چاہتا ہوں خاتون۔" وہ نیلم سے بولے۔

اس طرز تخاطب پر نیلم مزید شرما گئی۔ یہ بیگم اور خاتون جیسے الفاظ اس کے لیے کبھی کسی نے استعمال نہیں کیے تھے۔

"آپ کو صحت یاب دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔" افتخار صاحب نے کہا۔

"آپ کی بہت نوازش ڈی سی صاحب!" راجا نے کہا۔ "اب رفیق صاحب کی حالت خاصی بہتر ہے۔ ہم شاید آج ہی یہاں سے روانہ ہو جائیں۔"

''آپ کبھی ست بدھائی آیئے نا!'' میں نے کہا۔''یہ میرا کارڈ رکھ لیں۔''

افتخار صاحب نے میرا وزیٹنگ کارڈ جیب میں رکھ لیا، پھر وہ ڈاکٹر سے مخاطب ہوئے۔''ڈاکٹر صاحب! کیا نواب صاحب سفر کے قابل ہیں؟''

''سر! نواب صاحب کی طبیعت اب خاصی بہتر ہے۔ یہ سفر کر سکتے ہیں۔''

''لیجیے صاحب!'' افتخار صاحب مسکرا کر بولے۔ ''اب تو ڈاکٹر صاحب نے بھی آپ کو اجازت دے دی۔ زندگی رہی تو انشاءاللہ پھر ملاقات ہوگی۔'' افتخار صاحب مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے رخصت ہو گئے۔

نیلم نے واپسی کی تیاری شروع کر دی۔ راجا، ڈی سی صاحب کو رخصت کر کے آیا تو مجھ سے بولا۔''یار نیکے! اس ڈی سی میں تو بیوروکریسی والی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ یہ تو بالکل انسانوں کی طرح بات کر رہا تھا۔''

''ہاں یار! مجھے بھی حیرت ہے کہ یہ کیسا افسر ہے۔ اس کی تو نہ گردن اکڑی تھی، نہ آنکھوں میں حقارت تھی۔''

''سر! اس نے کسی عام آدمی کی مدد نہیں کی ہے بلکہ نواب رفیق احمد شیرازی کی مدد کی ہے۔ اپنے ہم پلہ لوگوں کے ساتھ تو یہ بڑے افسر اسی طرح پیش آتے ہیں۔''

''ہاں یار وہ مجھ سے بھی پوچھ رہا تھا۔ نواب صاحب! آپ خود چلنے کے قابل ہیں یا آپ کے لیے وہیل چیئر منگواؤں۔'' میں نے راجا کو بتایا۔

''یہ تو ابھی مجھے خود بھی معلوم نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''میں بستر سے اٹھوں گا تو اندازہ ہوگا نا!''

ڈی سی کے آنے سے پہلے ڈرپ بھی نکالی جا چکی تھی اور خون کی بوتل بھی ہٹائی جا چکی تھی۔ نیلم نے مجھے بتایا تھا کہ ان چار دنوں میں مجھے خون کے آٹھ بیگ لگے تھے۔ ڈرپ بھی مسلسل لگ رہی تھی۔ شاید اسی وجہ سے مجھے کمزوری بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

راجا نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا۔ میں نے زمین پر قدم رکھا تو مجھے ہلکا سا چکر آیا لیکن میں نے خود کو سنبھال لیا۔ غنی نے آگے بڑھ کر مجھے سہارا دینے کی کوشش کی لیکن میں نے اشارے سے اسے روک دیا اور آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ میں نے کمرے کا ایک چکر لگایا اور راجا سے کہا۔''ہاں، میں چل سکتا ہوں۔''

راجا مجھے کچھ جواب دینے ہی والا تھا کہ اس کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے سیل فون جیب سے نکالا اور اسے آن کر کے بولا۔''ہاں ناصر!......'' وہ دوسری طرف کی بات سننے لگا۔ اچانک مجھے اس کے چہرے پر سراسیمگی کے آثار دکھائی دیے۔''کیا؟......'' وہ حیرت سے بولا۔ ''کب؟...... تم نے خود دیکھی ہے؟...... اچھا...... ہاں میں ابھی گجرات ہی میں ہوں...... اچھا...... ہاں، میں سمجھ گیا...... نواب صاحب ٹھیک ہیں...... ہم لوگ بس نکلنے ہی والے ہیں...... اچھا ٹھیک ہے...... اچھا ہوا تم نے مجھے اطلاع دے دی......'' اس نے سیل فون آف کر کے جیب میں رکھ لیا۔

اس کی یک طرفہ گفتگو سے مجھے اتنا ضرور معلوم ہو گیا تھا کہ فون ناصر کا تھا اور اس نے کوئی پریشان کن خبر دی ہے۔ میں نے راجا سے پوچھا۔''کیا ہوا راجا؟ تیری شکل پر بارہ کیوں بج رہے ہیں؟''

''نیکے پتر! خبر ہی ایسی ہے۔ تو سنے گا تو تیرا چہرہ بھی اس قابل نہیں رہے گا کہ اس پر کچھ بجے۔'' پھر وہ غنی سے بولا۔''گاڑی اسپتال کے کمپاؤنڈ میں لے آؤ۔ جلدی کرو۔''

''گاڑی تو میں پہلے ہی اندر لے آیا ہوں سر!'' غنی نے کہا۔

''چل نیکے پتر، جلدی کر!'' راجا نے مضطرب ہو کر کہا۔

''بات کیا ہے راجا؟'' میں نے الجھ کر پوچھا۔

''پہلے یہاں سے تو نکل!'' راجا نے کہا اور میرا ہاتھ پکڑ کے باہر کی طرف بڑھا۔

گاڑی تک پہنچنے میں میرا سانس پھول گیا۔ میرے ساتھ ساتھ نیلم بھی تھی۔ غنی پہلے ہی باہر بھاگ چکا تھا اور گاڑی کا دروازہ کھولے کھڑا تھا۔ راجا لینڈ کروزر لے کر آیا تھا۔ اس نے مجھے گاڑی کی عقبی نشست پر بٹھایا۔ میرے ساتھ نیلم بیٹھ گئی، پھر وہ خود پسنجر سیٹ پر بیٹھا اور غنی سے کہا۔''بس نکل چلو۔''

غنی نے گاڑی کا انجن اسٹارٹ کیا اور بہت احتیاط سے گاڑی اسپتال سے باہر نکال لی۔

''ہم ابھی ست بدھائی نہیں جا رہے ہیں۔'' راجا نے کہا۔''گاڑی پولیس اسٹیشن کی طرف لے چلو۔''

غنی نے بغیر کوئی سوال کیے گاڑی کا رخ موڑا اور انتہائی تیز رفتاری سے روانہ ہو گیا۔

''یار! اب تو بتا دے کیا بات ہے؟'' میں نے جھنجلا کر کہا۔

''کسی نے فریال کو قتل کر دیا ہے۔'' راجا نے گویا میرے سر پر وزنی ہتھوڑا رسید کیا تھا۔

''کب؟'' میں نے صدمے کے ابتدائی جھٹکے سے سنبھل کر پوچھا۔

''پولیس کو ابھی تھوڑی دیر پہلے اس کی لاش ملی ہے۔'' راجا نے کہا۔''ناصر بھی لاہور ہی میں موجود ہے۔ وہ فوراً جائے واردات پر پہنچ گیا۔''

''لیکن تو اتنا خوف زدہ کیوں ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''کیا فریال کو تو نے قتل کیا ہے؟''

''نہیں نیکے پتر! میں نے نہیں، فریال کو تو نے قتل کیا ہے۔'' راجا نے کہا۔

''تو پاگل تو نہیں ہو گیا؟'' میں نے منہ بنا کر کہا۔''تو جانتا ہے کہ میں گجرات میں تھا۔''

''لاش کئی دن پرانی ہے نیکے پتر!'' راجا نے کہا۔''یہ تو پوسٹ مارٹم کے بعد ہی معلوم ہوگا کہ اسے کب قتل کیا گیا ہے؟ لاش کے نزدیک ہی تیرا سیل فون ملا ہے۔''

''میرا سیل فون؟'' میں نے کہا۔''میرا سیل فون تو اس رات کی بھاگ دوڑ میں گر گیا تھا۔''

''لیکن اب وہ پولیس کے قبضے میں ہے۔'' راجا نے کہا۔''ناصر بتا رہا تھا کہ پولیس کی ایک پارٹی تجھ سے تفتیش کرنے کے لیے ست بدھائی روانہ ہو چکی ہے۔ پولیس اگر کسی بااثر شخصیت کے کہنے پر حرکت میں آئی ہے تو وہ گجرات بھی ضرور پہنچیں گے۔''

''لیکن یار، میں تو گزشتہ کئی دن سے گجرات کے اس اسپتال میں تھا۔'' میں نے کہا۔''اس کی گواہی اسپتال کا ڈاکٹر بھی دے گا اور ڈی سی بھی۔''

''نیکے پتر! اس مرتبہ بھی دشمنوں نے تیرے خلاف سازش کی ہے۔ تیرا سیل فون ان کے ہاتھ لگ گیا ہوگا۔ تجھے قتل کے کیس میں پھنسانے کے لیے انہوں نے لاش کے پاس ڈال دیا ہوگا، کچھ بعید نہیں کہ یہ قتل بھی انہوں نے خود ہی کیا ہو؟ تو یہ بتا کہ تو نے اپنے سیل فون سے آخری کال کب کی تھی؟'' راجا نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے کہ آخری کال میں نے ناصر کی ریسیو کی تھی۔'' میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ سولہ تاریخ کو شام کے تقریباً سات بجے تک سیل فون تیرے ہی پاس تھا۔''

''تو کہنا کیا چاہتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ظاہر ہے، سیل فون اس کے بعد ہی لاش کے پاس ڈالا گیا ہوگا۔ میں ابھی گزشتہ تاریخ میں سیل فون کی گمشدگی کی ایف آئی آر کٹوا دیتا ہوں۔''

''تھانے والے سب سے پہلے یہ سوال کریں گے کہ سیل فون کہاں گم ہوا؟''

''لگتا ہے تیرا دماغ بھی چل گیا ہے۔'' راجا نے کہا۔ ''ہم یہ کیوں بتائیں گے کہ سیل فون کہیں اور گم ہوا ہے، پھر سب سے بڑی بات یہ کہ میں گجرات کے ڈی سی کا حوالہ دوں گا۔ تو بھی جانتا ہے کہ ڈی سی کا نام کیا حیثیت رکھتا ہے، خاص طور پر چھوٹے شہروں میں۔''

غنی نے پولیس اسٹیشن کے سامنے گاڑی روکی اور سوالیہ نظروں سے راجا کو دیکھنے لگا۔

''گاڑی کو تھانے کے احاطے میں لے چلو۔'' راجا نے کہا۔

غنی نے گاڑی کا رخ گیٹ کی طرف کر دیا۔

پولیس اسٹیشن کے گیٹ کا ایک [illegible] بند تھا۔ وہاں ایک سنتری بھی موجود تھا۔ غنی نے ہارن بجایا تو اس نے سر اٹھا کر ہماری گاڑی کو دیکھا، پھر ڈھیلے ڈھالے انداز میں ہماری طرف آیا۔

راجا نے درشت لہجے میں کہا۔''تم کیا ڈیوٹی کے دوران میں سوتے رہتے ہو؟ گیٹ کھولو!''

وہ راجا کے تحکمانہ لہجے سے زیادہ چمچاتی ہوئی لینڈ کروزر سے متاثر ہوا اور اس نے آگے بڑھ کر فوراً گیٹ کھول دیا۔

پولیس اسٹیشن کی عمارت خاصی پرانی تھی لیکن مضبوط اینٹوں کی بنی ہوئی تھی۔ اس کا احاطہ بہت وسیع و عریض تھا۔ سامنے ہی بڑا سا ایک برآمدہ تھا جو درمیان سے دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ اس میں اندر کے رخ پر آمنے سامنے چار چار کمرے تھے۔

ہماری گاڑی دیکھ کر پولیس کا ایک ڈھیلا ڈھالا کانسٹیبل برآمدے میں نکل آیا۔

راجا نے اپنی ٹائی کی گرہ ٹھیک کی، رے بین کا چشمہ لگایا اور بہت باوقار انداز میں گاڑی سے اترا۔ اس نے بہت مودب انداز میں گاڑی کا عقبی دروازہ کھولا اور بولا۔ ''تشریف لایئے نواب صاحب!'' اس نے دانستہ اپنی آواز اتنی بلند رکھی تھی کہ اسے دوسرے لوگ بھی سن لیں۔

میں بھی بہت باوقار انداز میں گاڑی سے اترا۔ غنی بھی تیزی سے اتر کر میرے پیچھے آ گیا۔

''یہ تم ہمیں کہاں لے آئے ہو سیکریٹری؟'' میں نے گردن اکڑا کر راجا سے پوچھا۔

''یہ پولیس اسٹیشن ہے نواب صاحب!'' راجا نے دبے دبے جواب دیا اور برآمدے کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

''یہ...... پولیس اسٹیشن ہے؟'' میں نے حیرت کا مظاہرہ کیا۔ ''یہ تو ہمیں کوئی طویلہ لگ رہا ہے...... لیکن نہیں...... یہ پولیس اسٹیشن ہی ہے۔'' میں نے اردگرد دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہاں نحوست تو ویسی ہی برس رہی ہے جیسے دوسرے تھانوں میں برستی ہے۔''

ہم باتیں کرتے ہوئے برآمدے میں پہنچے۔ راجا نے تحکمانہ انداز میں کانسٹیبل سے پوچھا۔ ''انچارج صاحب موجود ہیں؟''

''نہیں جناب!...... ان چارج صاحب تو نہیں ہیں۔'' اس نے انچارج کی ''ر'' پر زبر لگاتے ہوئے کہا۔

''علاقہ گشت پر ہوں گے؟'' راجا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''وہ...... جی...... وہ...... ابھی گھر سے ہی نہیں آئے ہیں۔''

''نہیں آئے ہیں؟'' راجا نے اسے گھورتے ہوئے کہا، پھر اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈالی۔ ''انہیں فوراً بلواؤ۔'' راجا نے درشت لہجے میں کہا۔

کانسٹیبل جواب میں کچھ کہتے کہتے رک گیا اور گیٹ کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''لو جی، وہ انچارج صاحب بھی آ گئے۔''

میں نے مڑ کر دیکھا۔ گیٹ سے ایک سیاہ مرگلہ اندر داخل ہو رہی تھی۔ اس میں سے انچارج اترا۔ وہ عہدے کے لحاظ سے انسپکٹر تھا۔ اس کا حلیہ عین روایتی پولیس افسروں کی طرح تھا۔ اس کا جسم چاروں طرف پھیل گیا تھا اور پولیس والوں کا ٹریڈ مارک یعنی اس کا پیٹ خمیری آٹے کی طرح اس کی وردی سے باہر نکلا پڑ رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی پینٹ سنبھالی، ایک نظر میری چمکتی ہوئی گاڑی اور دمکتی ہوئی نیلم پر ڈالی اور ہماری طرف بڑھا۔

''انسپکٹر صاحب! یہ آپ کے آنے کا ٹائم ہے؟'' راجا نے درشت لہجے میں پوچھا۔

انسپکٹر بھی بڑا گھاگ تھا۔ وہ راجا کے لہجے سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہوا اور بولا۔ ''ہم تو چوبیس گھنٹے کے ملازم ہیں جناب! ہمارا کوئی ٹائم نہیں ہوتا۔ آپ حکم فرمائیں!''

''یہ نواب رفیق احمد شیرازی ہیں۔'' اس نے میری طرف اشارہ کیا۔ ''اور میں ان کا سیکریٹری ہوں...... یہاں ڈی سی صاحب کے مہمان ہیں۔''

ڈی سی کا نام سن کر اس کے چہرے پر رعونت کے بجائے خوشامدانہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''یہاں کیوں کھڑے ہیں۔ اندر آ جائیں جناب!'' اس نے کمرے کی طرف اشارہ کیا جس کے دروازے پر اسٹیشن ہاؤس آفیسر کی پلیٹ لگی تھی۔

ایک کانسٹیبل بہت مستعدی سے اس کے کمرے کا دروازہ کھول چکا تھا۔ میں اور راجا اس کے پیچھے اس کمرے میں داخل ہو گئے۔ غنی باہر ہی رہ گیا۔ انچارج نے ہمیں کرسیاں پیش کیں، پھر اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔ ''حکم کریں جناب!'' اس نے مسکراتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

''انسپکٹر صاحب! آپ ذرا رجسٹر دیکھ کر یہ بتایئے کہ یہاں آخری ایف آئی آر کب درج ہوئی ہے؟''

انسپکٹر نے چونک کر راجا کی طرف دیکھا۔ ''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔'' اس نے الجھ کر پوچھا۔

''افتخار صاحب نے کہا تھا کہ انسپکٹر محسن صاحب آپ کے ساتھ تعاون کریں گے۔'' راجا نے محسن کا نام اس کی جیب پر لگی ہوئی پٹی میں پڑھ لیا تھا۔

''افتخار صاحب؟'' انسپکٹر نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

''آپ اپنے ڈی سی کا نام بھی نہیں جانتے؟'' راجا نے سرد لہجے میں کہا۔ ''افتخار نام ہے ان کا۔''

''سیکریٹری!'' میں نے بارعب لہجے میں کہا۔ ''افتخار کو فون کرو اور بتاؤ کہ ہم لنچ تک گھر نہیں پہنچ سکیں گے۔''

راجا نے سیل فون نکال کر کوئی نمبر ملایا اور بولا۔ ''ہیلو، ڈی سی صاحب! نواب صاحب آپ سے بات کریں گے۔'' اس نے سیل فون میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے سیل فون اس سے لے لیا۔ میں جانتا تھا کہ دوسری طرف کوئی بھی نہیں ہوگا۔ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''افتخار! میں رفیق بول رہا ہوں۔''

''جی سر......'' دوسری طرف سے غنی کی آواز آئی۔

''بھئی ہم نے یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ ہم شاید لنچ کے وقت تک نہ پہنچ سکیں، کچھ دیر ہو جائے گی۔''

''کیوں سر؟'' غنی نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ ''دیر کیوں ہوگی۔''

''نہیں نہیں، پولیس اسٹیشن میں دیر نہیں ہوگی۔ انسپکٹر محسن صاحب تو بہت اچھے آدمی ہیں۔ ہمیں دراصل ایس پی صاحب سے بھی ملنا ہے۔'' پھر میں سیل فون کان سے ہٹا کر انسپکٹر سے بولا۔ ''انسپکٹر صاحب! آپ ڈی سی صاحب سے بات کریں گے؟''

''نہیں سر!'' انسپکٹر جلدی سے بولا۔ ''میں ان سے کیا بات کروں گا؟''

میں نے سیل فون دوبارہ کان سے لگایا۔ ''ہاں بھئی افتخار! تم ہماری بات سن رہے ہو نا؟...... ٹھیک ہے۔'' میں نے غنی کا جواب سنے بغیر ہی سلسلہ منقطع کر دیا۔

''محسن صاحب! مجھے گزشتہ تاریخ میں ایک ایف آئی آر درج کرانا ہے۔'' راجا نے کہا۔

''سر جی! اب ڈی سی صاحب نے کہا ہے تو آپ کا کام تو کرنا ہی پڑے گا۔'' انسپکٹر نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ ''لیکن آپ فکر مت کریں۔ میں آپ کی بھی خدمت کروں گا۔''

''نہیں سر، کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ آپ ڈی سی صاحب کے مہمان ہیں۔''

''یہ بات تو ہمارے درمیان رہے گی۔'' راجا نے جھک کر آہستہ سے کہا۔ ''ڈی سی صاحب کو معلوم نہیں ہوگی۔ ذرا میرے ڈرائیور کو بلوا دیں۔''

''فتح خان!'' انسپکٹر نے کسی کو آواز دی۔

فوراً ہی وہی ڈھیلا ڈھالا کانسٹیبل اندر آ گیا جو ہمیں برآمدے میں ملا تھا۔

''دیکھو، باہر نواب صاحب کا ڈرائیور ہوگا، ذرا اسے بلا لاؤ۔ ہاں، کرامت خان سے کہنا کہ ایف آئی آر کا رجسٹر لے آئے۔'' پھر وہ راجا سے مخاطب ہوا۔ ''جی سر! اب فرمائیں کیا حکم ہے؟''

''بھئی نواب صاحب کا بیگ گاڑی سے چوری ہو گیا ہے، اس میں نواب صاحب کے کچھ ضروری کاغذات اور سیل فون تھا، تقریباً دو لاکھ روپیہ نقد بھی تھا۔ نواب صاحب اس معمولی چوری کی رپورٹ کبھی نہ کرتے لیکن بیگ میں اہم نوعیت کے کچھ کاغذات بھی تھے۔ بس اسی کی رپورٹ لکھوانی ہے۔'' راجا نے کہا۔

''تو سر، اس رپورٹ کو بیک ڈیٹ میں لکھنے کی کیا ضرورت ہے؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔

''بھئی سیدھی سادی رپورٹ تو ہمارا ڈرائیور بھی لکھوا دیتا۔'' راجا نے کہا۔ ''اس بیگ میں جو کاغذات تھے، وہ نواب صاحب کے لندن والے بزنس سے متعلق تھے۔ وقت مقررہ پر ان کا بھیجنا ضروری تھا۔''

''میں سمجھ گیا۔'' انسپکٹر ہنس کر بولا۔

غنی نے اندر جھانکا تو راجا نے کہا۔ ''ڈرائیور! گاڑی میں میرا بریف کیس رکھا ہے، اسے لے آؤ۔''

فتح خان دبیز سا ایک رجسٹر لے کر کمرے میں داخل ہوا اور وہ انسپکٹر کی میز پر رکھ دیا۔

''فتح خان! نواب صاحب کے لیے کچھ لے کر آؤ۔'' وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''سر، کیا لیں گے آپ! چائے، کافی یا ٹھنڈا؟''

''شکریہ انسپکٹر صاحب!'' میں نے بارعب لہجے میں کہا۔ ''ہمارے پاس وقت کم ہے اور ابھی ایس پی صاحب کے پاس بھی جانا ہے۔''

راجا کے سیل فون کی بیل بجی تو اس نے سیل فون جیب سے نکالا اور اس کی اسکرین پر نظر ڈال کر اسے کان سے لگا لیا۔ ''السلام علیکم ایس پی صاحب!'' اس نے ہنس کر کہا۔ ''جی ہاں، نواب صاحب موجود ہیں۔'' پھر اس نے مجھ سے کہا۔ ''سر! ایس پی صاحب بات کریں گے۔'' دوسری طرف سے ناصر کی آواز آئی۔

میں نے سیل فون اس سے لے لیا۔ ''ہیلو! السلام علیکم نواب صاحب۔''

''وعلیکم السلام!'' میں نے کہا۔ ''بھئی، بس ہم نکلنے ہی والے ہیں۔''

''سر! یہ سب کیا ہے؟''

''ارے نہیں ایس پی صاحب! بس ہم پہنچتے ہیں دس منٹ میں......''

''آپ ہیں کہاں؟''

''بھئی ہم ابھی گجرات ہی میں ہیں۔ بس ایک ضروری کام میں الجھے ہوئے ہیں۔''

''میں نے یہ اطلاع دینے کے لیے فون کیا ہے کہ پولیس پارٹی گجرات کے لیے روانہ ہو چکی ہے۔''

''اچھا اچھا! آپ فکر مت کریں، بس ہم نکلتے ہیں یہاں سے۔'' میں نے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

''دیکھیے جناب!'' انسپکٹر نے کہا۔ ''آخری ایف آئی آر چودہ تاریخ کو درج ہوئی ہے۔''

''بھئی واہ!'' میں نے کہا۔ ''گویا اس کے بعد آپ کے تھانے کی حدود میں کوئی جرم ہی نہیں ہوا؟''

''جرم تو ضرور ہوا ہوگا۔'' انسپکٹر نے کہا۔ ''لیکن ہمارے ریکارڈ کے مطابق نہیں ہوا۔ آپ فرمائیں، کیا چیزیں چوری ہوئی ہیں۔''

''ہماری لندن والی فرم نور شیرازی اینڈ کمپنی کے کاغذات! وہ دراصل ایک دوسری کمپنی گریوٹی انٹرنیشنل سے معاہدے کے کاغذات تھے۔''

''گریوٹی انٹرنیشنل!'' انسپکٹر نے لکھتے ہوئے کہا۔

''بلیک بیری کا ایک سیل فون مع سم! سیکریٹری!'' میں

راجا سے مخاطب ہوا۔ ''ہمارا سیل نمبر لکھواؤ۔''

راجا نے میرا سیل نمبر لکھوایا۔

''دو لاکھ ستاون ہزار روپے نقد، ہماری چیک بک وغیرہ!''

غنی بریف کیس راجا کو دے کر واپس چلا گیا۔

راجا نے بریف کیس سے ہزار ہزار روپے کے بیس نوٹ نکالے اور انسپکٹر کی طرف بڑھا دیے۔

نوٹ دیکھ کر انسپکٹر کی آنکھیں چمکنے لگیں، وہ بولا۔

''نواب صاحب! یہ تکلف نہ کریں، آپ ڈی سی صاحب کے مہمان ہیں اور......''

''کمسن صاحب!'' میں نے کہا۔ ''یہ تو میں اپنی خوشی سے دے رہا ہوں، پھر بھلا ڈی سی کو یہ بات بتائے گا کون؟''

اس نے ہچکچاتے ہوئے نوٹ راجا سے لے لیے، پھر وہ لکھنے میں مصروف ہوگیا۔ ڈی سی اور ایس پی کے حوالے موجود ہوں اور کسی سرکاری اہلکار کی مٹھی بھی گرم کر دی جائے تو ہر کام چشم زدن میں ہو جاتا ہے۔ پانچ منٹ بعد انسپکٹر نے کہا۔ ''لیجیے نواب صاحب! رپورٹ کا اندراج ہو چکا، تاریخ کون سی ڈالوں؟''

''سولہ دسمبر، بہ وقت شام چھ بجے!'' میں نے کہا۔

''اس رپورٹ کی ایک کاپی مجھے بھی دے دیں۔'' راجا نے کہا۔

اگلے پانچ منٹ میں انسپکٹر نے ایف آئی آر کی ایک نقل میرے سامنے رکھ دی۔ اس پر مہر بھی لگی ہوئی تھی۔

راجا نے اس نقل کا تفصیلی جائزہ لیا، پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

''بہت شکریہ کمسن صاحب!''

انسپکٹر ہمیں باہر تک رخصت کرنے آیا۔ مجھے دیکھ کر غنی نے گاڑی کا دروازہ کھول دیا۔

''اب ست بدھائی چلو!'' راجا نے کہا۔

''ایک منٹ غنی!'' میں نے کہا۔ ''نیلم کو شاید پنڈی جانا تھا۔''

''نہیں نواب صاحب! آپ تو پہلے ہی زخمی ہیں۔''

''نہیں بھئی، تمہیں بھی تو اپنے بابا سے ملنا ہے۔''

''نیلم کو بعد میں غنی یا سرور کے ساتھ بھیج دینا۔'' راجا نے کہا۔ پھر مجھ سے انگریزی میں بولا۔ ''نیکے پتر! یہ تو بتا، یہ تیری بیگم کب سے ہوگئی؟''

''یار، بکواس مت کر!'' میں نے جواب دیا۔ ''ڈاکٹر کو غلط فہمی ہوگئی تھی۔''

''اور ڈی سی صاحب کو بھی غلط فہمی ہوگئی؟'' راجا نے مضحکہ خیز لہجے میں کہا۔

''تیرا کیا مطلب ہے۔ یہ...... یہ......''

''حلیہ تو اس کا بیگموں والا ہی ہے۔''

''حلیہ تو تیرا بھی جوکروں والا ہے۔'' میں نے کہا۔

''اس نے ڈی سی کی بیگم کے کپڑے پہن رکھے ہیں۔''

''ویسے نیکے پتر! آثار کچھ اچھے نہیں ہیں۔ تو تو ویسے بھی ریزرو میں ایک محبوبہ رکھتا ہے۔ اب تو ایک چھوڑ، تو نے دو دو رکھی ہوئی ہیں۔''

''اب ذرا یہ بھی فرما دیں کہ دوسری کون ہے؟'' میں نے کہا۔

''اب یہ بھی میں ہی بتاؤں۔'' راجا نے شرارتی انداز میں کہا۔ ''ویسے یہ بھی ایک طرح سے خدمت خلق ہے نیکے پتر! ہمارے ملک میں کتنی ہی لڑکیاں شادی کے انتظار میں بوڑھی ہو جاتی ہیں۔ اگر ہر آدمی شرعی طریقے پر عمل کرے تو یہ معاشرتی مسئلہ چٹکی بجاتے حل ہو سکتا ہے۔''

''اس کار خیر میں تو بھی تو حصہ لے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''میری تو اکلوتی شادی بھی کھٹائی میں پڑی ہوئی ہے۔'' راجا نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''فکر مت کر!'' میں نے کہا۔ ''ست بدھائی پہنچ کر پہلا کام یہ کروں گا کہ تیری شادی کرا دوں گا۔''

اچانک مجھے پولیس کی موبائل وین نظر آئی۔ وہ ہماری مخالف سمت میں جا رہی تھی۔

''نیکے پتر! وہ تیرے مہربان گجرات کی طرف جا رہے ہیں۔'' پھر وہ چونک کر بولا۔ ''یار تو ماجد خان سے مشورہ کر لے۔ ہو سکتا ہے اس کیس میں بھی تجھے ضمانت قبل از گرفتاری کی ضرورت پیش آئے؟''

میں نے سیل فون اس سے لیا اور پہلے ٹائم دیکھا۔ دوپہر کے دو بج رہے تھے۔ اس وقت تک ماجد خان کورٹ سے فارغ ہو جاتا تھا۔ میں نے اس کا نمبر ملا لیا۔

''ہیلو!'' دوسری طرف سے ماجد خان کی بھاری آواز سنائی دی۔

''السلام علیکم خاں صاحب!'' میں نے کہا۔ ''میں رفیق بول رہا ہوں۔''

''رفیق صاحب! آپ نے کیا سیل نمبر تبدیل کر لیا ہے۔''

''میرا سیل فون کہیں گم ہو گیا ہے۔'' پھر میں نے کہا۔ ''خان صاحب! آپ سے ایک مشورہ کرنا تھا۔'' میں نے انہیں تفصیل سے سب کچھ بتا دیا۔

''اب بتائیے، مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

''بھئی اس کیس میں تو آپ کے خلاف پولیس کو ایک ثبوت بھی مل گیا ہے لیکن آپ کے گواہان بھی کوئی معمولی لوگ نہیں ہیں۔ ویسے آپ ضمانت قبل از گرفتاری کرا لیں۔''

''یہ کام تو آپ ہی کریں گے۔''

''ظاہر ہے، میں ہی کروں گا۔'' ماجد خان نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''آپ کو لاہور آنا پڑے گا۔''

''میں حاضر ہو جاؤں گا خان صاحب! کیا آج ہی آ جاؤں؟''

''جی ہاں، آج ہی آ جائیں۔'' ماجد خان نے کہا۔ ''میں آج ہی ضمانت کی کوشش کر لوں گا۔ مجسٹریٹ سے گھر پر بھی ملاقات ہو سکتی ہے۔''

میں نے سلسلہ منقطع کیا تو راجا نے کہا۔ ''کیا ماجد خان تجھے لاہور بلا رہا ہے؟''

''ہاں یار!'' میں نے جواب دیا۔ ''وہ کہہ رہے تھے کہ میں آج ہی لاہور پہنچ جاؤں۔ وہ آج ہی میری ضمانت قبل از گرفتاری کی کوشش کریں گے۔''

''لیکن تو اس وقت لاہور تک جانے کی پوزیشن میں ہے؟'' اس نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔

''یار، جانا تو پڑے گا۔'' میں نے کہا۔ ''ورنہ پولیس مجھے حوالات میں پہنچا دے گی۔''

''غنی!'' راجا نے کہا۔ ''سیدھے لاہور چلو۔''

غنی نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ یوں بھی ہم جی ٹی روڈ پر چل رہے تھے۔

''نیکے پتر! تو ایسا کر، کچھ دن کے لیے لندن چلا جا!''

''یار، میں کب تک یہ بھاگ دوڑ کرتا رہوں گا۔ حالات دونوں جگہ یکساں ہیں، لندن میں کب مجھے سکون ملتا ہے؟ وہاں سے پریشان ہو کر پاکستان آیا تو یہاں بھی وہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ اب میں اس وقت تک لندن نہیں جاؤں گا، جب تک اونٹ کسی کروٹ نہیں بیٹھ جاتا۔''

''یار، مجھے تو یہ خدشہ ہے کہ کہیں اونٹ سے پہلے ہم ہی نہ بیٹھ جائیں ہمیشہ کے لیے؟'' راجا نے ہنس کر کہا۔

''اب تخت ہو یا تختہ!'' میں نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔ ''دشمن ابھی تک ہم پر اس لیے وار کر رہے ہیں کہ ہم نے انہیں ڈھیل دے رکھی ہے۔ اپنی بقا کے لیے ہمیں بھی وہی ہتھکنڈے استعمال کرنا پڑیں گے۔ جو وہ ہمارے خلاف استعمال کر رہے ہیں۔ بس بہت ہو گیا راجا! اب مزید نہیں۔

وہ کیا سمجھتے ہیں، میں کم عقل ہوں، کمزور ہوں، بزدل ہوں، میرے پاس دولت یا افرادی قوت کی کمی ہے؟ میں انہیں بتاؤں گا کہ مخالفت کیسے کی جاتی ہے، ذہانت کیا ہوتی ہے؟''

''ہوش میں آ نیکے پتر!'' راجا نے تیز لہجے میں کہا تو میں ہوش میں آ گیا۔ میں شاید جذبات سے مغلوب ہو کر زور زور سے چیخنے لگا تھا اور اب بری طرح ہانپ رہا تھا۔

نیلم نے تھرماس سے پانی نکالا اور میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے ایک ہی سانس میں پورا گلاس خالی کر دیا۔

''غنی!'' راجا نے کہا۔ ''سڑک کے کنارے کوئی چھپر ہوٹل دیکھ کر گاڑی روک لو۔ ہم لوگ کچھ آرام کر کے آگے بڑھیں گے۔''

''نہیں راجا!'' میں نے کہا۔ ''ہم اگر اسی رفتار سے چلتے رہے تو دو گھنٹے میں لاہور پہنچ جائیں گے۔'' میں نے کہا۔ میں جانتا تھا کہ راجا میری بے آرامی کی وجہ سے کہہ رہا ہے۔ وہاں رک کر بھی مجھے کون سا آرام مل جاتا۔

''تو بیٹھے بیٹھے تھک تو نہیں گیا ہے؟'' راجا نے پوچھا۔

''نہیں یار، میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے کہا۔

غنی نے یہ عقل مندی کی تھی کہ روانگی سے پہلے تھرماس میں چائے، پانی، کچھ بسکٹ اور پیٹیز وغیرہ رکھ لیے تھے۔ ہم نے ایک پُرسکون جگہ رک کر کھایا پیا، غنی نے گاڑی کے ریڈی ایٹر میں پانی ڈالا اور تازہ دم ہو کر ہم لوگ پھر لاہور روانہ ہو گئے۔

مجھے بیٹھے بیٹھے اونگھ آ گئی۔

میری آنکھ گاڑی کے دھچکے سے کھل گئی۔ میں نے اردگرد کا جائزہ لیا، میں اس وقت گاڑی ہی میں تھا۔ غنی خاموشی سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ راجا کچھ اس انداز میں سیٹ پر بیٹھا تھا کہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں اس وقت گاڑی کی عقبی سیٹ پر نیم دراز تھا۔ میرا سر نیلم کے شانے پر ٹکا ہوا تھا۔ میں گھبرا کر سیدھا ہو کے بیٹھ گیا اور نیلم سے پانی مانگا۔

''ہم کہاں پہنچ گئے غنی؟'' میں نے پانی پینے کے بعد پوچھا۔

غنی نے میری طرف دیکھے بغیر جواب دیا ''سر، بس ہم لاہور پہنچ چکے ہیں۔''

میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا تو مجھے محسوس ہوا کہ گاڑی کی رفتار خطرناک حد تک تیز ہے اس وقت تک سورج غروب نہیں ہوا تھا۔

''غنی!'' میں نے کہا۔ ''اسپیڈ کم کرو، اس رفتار سے چلو گے تو ٹریفک پولیس تو بعد میں پکڑے گی اور ممکن ہے اس کی

نوبت ہی نہ آئے کیونکہ ہم میں سے کوئی اس قابل ہی نہیں ہوگا کہ پولیس ہمیں گرفتار کرے۔''

غنی نے رفتار کم کردی۔

راجا ہنس کر بولا۔ ''فیکے پتر! تیرا لہجہ روز بہ روز کڑدا نہیں ہوتا جارہا ہے۔ او یار! تو تو بہت زندہ دل ہوا کرتا تھا۔ تجھے کیا ہوتا جارہا ہے؟''

''یار، جب مصیبتیں اور پریشانیاں کسی کا گھر دیکھ لیں، وہ مسلسل گردش میں ہو، اسے بار بار پولیس کی قید سے بچنے کے لیے ضمانت کرانا پڑے، تیرے خیال میں وہ بندہ زندہ دل رہ سکتا ہے؟ لو وہ بھی کہہ رہے ہیں کہ بے ننگ و نام ہے، یہ جانتا اگر تو لٹا تا نہ گھر کو میں!'' پھر میں چونک کر بولا۔ ''یار، ہم اس نیلم کو کس بات کی سزا دے رہے ہیں۔ اسے تو ست بدھائی پہنچا دیتے۔ ہماری وجہ سے یہ بھی مصیبت میں مبتلا ہے۔''

''لاہور پہنچ کر اسے ست بدھائی بھجوا دوں گا۔ ابھی تو اتنا وقت ہی نہیں تھا کہ......''

''نہیں نواب صاحب!'' نیلم نے کہا۔ ''مجھے کوئی پریشانی نہیں ہے۔ مجھے تو آپ کی خدمت کر کے خوشی ہورہی ہے۔''

☆☆☆

ماجد خان نے میری حالت دیکھی تو حیران رہ گئے۔ ''رفیق صاحب! آپ کی کنڈیشن تو ٹھیک نہیں ہے۔ آپ چاہیں تو کچھ دیر آرام کرلیں۔''

''خان صاحب! میں اب اپنے ہوٹل جا کر ہی آرام کروں گا۔''

''میں نے اس قتل کے بارے میں معلوم کیا تھا۔'' ماجد خان ایک وکیل بن گیا۔ ''پہلی بات تو یہ کہ ابھی تک لاش کی شناخت نہیں ہوسکی ہے کہ وہ لاش واقعی فریال کی ہے یا نہیں۔ آپ کا سیل فون لاش کے پاس ملا ہے۔ اس وجہ سے آپ کے لیے پریشانی پیدا ہوگئی ہے۔''

''لیکن سیل فون تو کئی دن پہلے مجھ سے گم ہوگیا تھا، میں نے اس کی رپورٹ بھی درج کرائی ہے۔'' میں نے کہا۔

''لاش کئی دن پرانی ہے۔'' ماجد خان نے کہا۔ ''آپ نے ایف آئی آر تو ابھی درج کرائی ہے۔''

''ایف آئی آر چودہ تاریخ کو درج کرائی گئی ہے۔'' میں نے کہا۔

ماجد خان نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ''آپ کا مطلب ہے کہ ایف آئی آر چودہ تاریخ کو لکھوائی گئی ہے اور آپ پانچ دن سے گجرات میں تھے۔''

''جی ہاں، میں نے آپ کو بتایا تو تھا۔'' میں نے کہا۔

''لیکن آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آپ کی حالت اتنی خراب ہے۔'' ماجد خان نے شکوہ کیا۔ ''نہ آپ نے یہ بتایا کہ ایف آئی آر کب درج کی گئی ہے؟''

''تو کیا اب ان کی ضمانت قبل از گرفتاری نہیں ہوسکتی؟'' راجا نے پوچھا۔

''جی نہیں۔'' ماجد خان نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اسی لیے کہتے ہیں کہ وکیل اور ڈاکٹر سے کچھ چھپانا نہیں چاہیے۔''

میں ایک دم پریشان ہوگیا۔ گویا اب مجھے پولیس کا عذاب بھی سہنا پڑے گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ میں پولیس سے بچنے کے لیے فرار ہوجاؤں۔ فرار ہو کے میں کہاں جا سکتا تھا اور کب تک بچ سکتا تھا۔ اس طرح تو خود کو واقعی مجرم ثابت کردیتا۔

''خان صاحب!'' راجا نے کہا۔ ''کوئی راستہ تو ہوگا اس صورتِ حال سے بچنے کا؟''

''کوئی راستہ نہیں ہے۔'' ماجد خان نے سنجیدگی سے کہا۔ پھر ہنس کر بولے۔ ''کیونکہ نواب صاحب کی ضمانت کی ضرورت ہی نہیں ہے۔''

''جی؟'' راجا نے چونک کر پوچھا۔

''جی ہاں۔'' وکیل صاحب مسکرائے۔ ''بھئی، سیل فون کی ایف آئی آر چودہ تاریخ کو درج ہوچکی ہے، نواب صاحب گجرات میں موجود تھے۔ ان کی موجودگی کے گواہ کوئی عام افراد نہیں بلکہ خاص الخاص لوگ ہیں۔ ایک تو ہے ضلع کا حاکم، دوسرا وہاں کے سب سے بڑے سرکاری اسپتال کا ایم ایس یعنی میڈیکل سپرنٹنڈنٹ! ان کے علاوہ اسپتال کے دوسرے ڈاکٹر اور نرسیں ہیں۔ اسپتال کا ریکارڈ ہے اور ڈی سی صاحب کی بیگم ہیں۔ اتنے گواہوں کے ہوتے ہوئے پولیس آپ پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت بھی نہیں کرسکتی۔''

میرے ذہن سے بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے واقعی مجھے قید سے رہائی ملی ہو۔

''اب اگر نواب صاحب مجھے سب، کچھ تفصیل سے بتا دیتے تو اس وقت آرام سے اپنی حویلی میں بیٹھے ہوتے۔'' ماجد خان مسکرایا۔

''جی ہاں، یہ میری غلطی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کہ میں نے آپ کو ایف آئی آر کی تاریخ نہیں بتائی۔''

''جی ہاں۔'' ماجد خان نے کہا۔ ''اگر آپ بتا دیتے تو میں اسی وقت آپ سے کہہ دیتا کہ آپ بے خوف ہو کر بیٹھیں۔ پولیس آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ مجھے افسوس ہے کہ......''

''نہیں خان صاحب! غلطی میری ہے۔'' میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب مجھے اجازت دیں۔''

''چائے تیار ہے، آپ مجھے میزبانی کا شرف نہیں بخش رہے۔ کم سے کم میرے ساتھ چائے ہی پی لیں۔''

چائے خاصی پُرتکلف تھی۔ میرے ذہن سے بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا تھا، اس لیے مجھے چائے بھی اچھی لگ رہی تھی اور دوسرے لوازمات بھی۔

ماجد خان نے چائے پیتے ہوئے اچانک کہا۔ ''بھئی نواب صاحب! آپ کی بیگم تو بہت تکلف کررہی ہیں۔'' اس نے نیلم سے کہا۔ ''آپ نے تو کچھ لیا ہی نہیں۔''

''خان صاحب!'' میں نے سنجیدہ ہو کر کہا۔ ''یہ میری بیگم نہیں ہیں۔''

''اوئیس!'' ماجد خان چونک کر بولا۔ ''سوری...... آئی ایم ریئلی سوری! میں...... اپنی......''

''اٹز آل رائٹ خان صاحب!'' میں نے ہنس کر کہا تاکہ ان کی شرمندگی کچھ کم ہو۔

''مجھے واقعی افسوس ہے۔'' ماجد خان نے کہا۔ ''آپ کی تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی ہے، پھر......'' وہ نیلم کی طرف مڑے۔ ''بیٹا، مجھے افسوس ہے۔''

نیلم کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔ ماجد خان اس کی طرف مڑا تو بوکھلاہٹ میں اس کے ہاتھ سے چائے چھلک کر کپڑوں پر گر گئی۔

اس سے پہلے کہ ماجد خان مزید شرمندہ ہوتا، میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ''خان صاحب! اب اجازت دیں۔ اتنی اچھی اور پُرتکلف چائے کا بہت شکریہ! اب آپ بھی کسی دن ست بدھائی آہی جائیں، میں آپ کو وکیل کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک دوست، ایک خیر خواہ کی حیثیت سے بلا رہا ہوں۔''

''میں خود بھی کچھ دن ست بدھائی میں گزارنا چاہتا ہوں۔ میں بھی دن رات کی اس مصروفیت سے بہت تھک گیا ہوں۔ جوں ہی موقع ملا میں ست بدھائی آجاؤں گا۔''

وہ ہمیں رخصت کرنے گاڑی تک آیا اور نیلم سے بولا۔ ''ہماری بیگم اس وقت موجود نہیں ہیں ورنہ آپ کو اتنی بوریت نہ ہوتی۔''

نیلم نے سر جھکا لیا۔ وہ خود بھی حیران پریشان تھی کہ اتنا بڑا وکیل اس سے اس انداز میں بات کررہا ہے۔ وہ بے چاری تو حویلی میں ملازموں کی طرح رہتی تھی بلکہ اس سے تو رنشم ہی اچھی تھی۔ اس کے ساتھ تو کوئی بھی اتنا بے تکلف نہیں تھا۔

غنی نے گاڑی فلیٹز کے سامنے روک دی اور بولا۔

''آیئے سر!''

''تم پہلے کمرے تو بک کرالو۔'' راجا نے کہا۔

''میں کمرے بک کرا چکا ہوں۔'' غنی نے کہا۔ ''جس وقت آپ لوگ وکیل صاحب کے ساتھ چائے پی رہے تھے، میں نے فون کر کے کمرے بک کرالیے تھے۔''

ہوٹل کے آرام دہ کمرے میں پہنچ کر میں ایسا سویا کہ پھر اردگرد کی کچھ خبر ہی نہ رہی۔ میں نے تو روم سروس سے رات کا کھانا تک نہیں منگوایا۔ میری آنکھ کھلی تو طبیعت خاصی گری گری سی تھی۔ میں نے دیوار گیر گھڑی پر نظر ڈالی۔ وہ ساڑھے آٹھ بجا رہی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میں تقریباً بارہ گھنٹے تک سوتا رہا تھا۔ ہاتھ میں شدید تکلیف ہورہی تھی۔ وہ زخم تو میرے لیے مصیبت بن گیا تھا۔ گجرات کے ڈاکٹر نے جو دوائیں مجھے لکھ کردی تھیں، وہ بھی میں نے نہیں کھائی تھیں۔ میں آہستہ آہستہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

دروازے پر دستک ہوئی تو میں نے پوچھا۔ ''کون؟''

''فیکے، میں ہوں راجا!'' باہر سے راجا کی آواز آئی تو میں نے اٹھ کر دروازہ کھول دیا۔

راجا کمرے میں آکر بولا۔ ''کیا بات ہے فیکے! تیری طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' اس نے میری پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''بخار تو نہیں ہے۔'' وہ بولا۔ ''تو نے کل دوا بھی تو نہیں لی۔''

''یار، کل تو میں اتنا تھک گیا تھا کہ بستر پر لیٹتے ہی انٹا غفیل ہوگیا۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''اب جلدی سے تیار ہوجا، میں نے روم سروس کو ناشتے کے لیے کہہ دیا ہے۔ صبح سے کئی مرتبہ غنی اور نیلم نے تیرے کمرے کے چکر لگائے لیکن وہ لوگ دستک دینے کی جرأت نہ کرسکے۔''

میں باتھ روم سے نکلا تو ناشتا آچکا تھا۔ کمرے میں راجا کے علاوہ نیلم بھی موجود تھی۔ اس وقت وہ خاصی نکھری نکھری نظر آرہی تھی۔

اس نے آہستہ سے کہا۔ ''نواب صاحب! آپ ناشتا کرلیں تو میں آپ کو دوائیں دے دوں۔ میں نے غنی سے دوائیں منگوالی ہیں۔''

ہم ناشتا کر ہی رہے تھے کہ کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی، پھر باہر سے غنی کی آواز سنائی دی۔ ''آپ لوگ نیچے انتظار کریں۔ نواب صاحب، اس وقت ناشتا کررہے ہیں۔''

''اوئے ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ بیٹھے

انتظار کرتے رہیں، سامنے سے ہٹ!'' کوئی درشت لہجے میں بولا۔

راجا نے چائے کا کپ میز پر رکھا اور دروازے کی طرف لپکا، باہر سے اس کے زور زور سے بولنے کی آواز آنے لگی۔ ''آپ لوگ اوپر کیسے آئے؟ میں منیجر سے بات کرتا ہوں، یہاں شرفا کی کوئی عزت ہی نہیں ہے۔ آپ ٹھہریں، نواب صاحب اس وقت مصروف ہیں۔ وہ خود آپ کو بلا لیں گے۔ پولیس افسر ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ جب چاہیں، کسی معزز آدمی پر چڑھ دوڑیں؟''

میں نے سیل فون نکالنے کے لیے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا، پھر مجھے خیال آیا کہ سیل فون تو میرے پاس ہے ہی نہیں۔

راجا غصے میں بھرا ہوا اندر آیا اور مجھ سے بولا۔ ''دیکھے، پتر! وہ تیرے سسرا لیے آئے ہیں۔''

''انہیں اپنے کمرے میں بٹھا، میں وہیں آ رہا ہوں۔'' میں نے کچھ سوچ کر کہا۔ ''یار، میں نے اس ڈی سی کا سیل نمبر بھی نہیں لیا۔ ورنہ میں اسی سے بات کرتا۔''

''تو فکر مت کر۔'' راجا نے کہا۔ ''میں نے گجرات کے ڈی سی کا نمبر بھی لے لیا تھا۔''

غنی نے کمرے میں آ کر اطلاع دی کہ ناصر صاحب آئے ہیں۔ میں نے ناصر کو فوراً ہی بلوا لیا۔

''سر! آپ تو گجرات میں تھے، یہاں کب آئے؟''

''ہم لوگ یہاں کل پہنچے تھے۔'' میں نے کہا، پھر اسے تفصیل سے سب کچھ بتا دیا۔ وہ بہت غور سے میری بات سنتا رہا۔

''اب پولیس کا ایک انسپکٹر اور ڈی ایس پی یہاں پہنچ گئے ہیں۔'' راجا نے کہا۔

''پولیس کی تو آپ فکر ہی نہ کریں۔'' ناصر نے کہا۔ ''آپ کے پاس جائے واردات سے دور ہونے کے اتنے ٹھوس ثبوت موجود ہیں کہ پولیس آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔''

وہ اور راجا اٹھ کر وہاں سے چلے گئے۔ جاتے جاتے راجا نے کہا۔ ''یار! جب تک میں تجھے نہ بلواؤں تو میرے کمرے میں مت آنا۔''

نیلم کچھ ہراساں نظر آ رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ''تم اتنی پریشان کیوں ہو؟ تم تو مجھے دوائیں دینے والی تھیں۔''

''جی، میں ابھی لاتی ہوں۔'' نیلم نے کہا۔ ''پولیس کا آنا اچھی علامت نہیں ہوتا ہے صاحب جی!'' اس نے پہلی دفعہ مجھے ریشم کی طرح صاحب جی کہا۔ ''پولیس ہمارے گھر جب بھی آتی تھی، بابا کو لے جایا کرتی تھی۔''

''تم پریشان مت ہو۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

وہ دوائیں لینے چلی گئی۔ میں اس سے کیسے کہتا کہ تمہارا بابا ایک جرائم پیشہ آدمی تھا، گھٹیا درجے کا بدمعاش تھا۔ میں نواب رفیق احمد شیرازی ہوں، مجھ میں اور اس میں بہت فرق ہے۔

دوا کھانے کے بعد میں اخبار پڑھتا رہا۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد غنی کے بجائے راجا خود ہی آیا اور بولا۔ ''دیکھے پتر! میں نے اس ڈی ایس پی سے کہہ دیا ہے کہ نواب صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے انہیں زیادہ ڈسٹرب مت کرنا۔''

''یہ پولیس آئی کس سلسلے میں ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''انہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں یہاں موجود ہوں؟''

''یار! جو لوگ اس سازش کے پیچھے ہیں، وہ خاصے باخبر معلوم ہوتے ہیں۔ انہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ تو نے ماہ رخ خان سے ملاقات کی ہے۔ تو بستر پر لیٹ جا، میں اس صورت حرام ڈی ایس پی کو یہاں بھیجتا ہوں۔''

وہ ڈی ایس پی کمرے میں آیا تو میں بستر پر لیٹا ہوا تھا اور نیلم میرے سرہانے کھڑی تھی۔

ڈی ایس پی نے ایک نظر نیلم پر ڈالی، پھر میری طرف بڑھا اور بولا۔ ''رفیق احمد شیرازی آپ ہیں؟''

''نواب رفیق احمد شیرازی!'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''کہو، کیا کام ہے؟''

''آپ منگل کی رات کو کہاں تھے؟'' ڈی ایس پی نے پوچھا۔

''واٹ؟'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''اس سوال کا مقصد؟''

''مقصد بھی سمجھ میں آ جائے گا نواب صاحب!'' وہ چبا کر بولا۔ اس کا چہرہ کسی بل ڈاگ کی طرح لٹکا ہوا تھا، آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ میں نے اس سے بیٹھنے کو نہیں کہا تھا۔

میں نے نیلم سے پوچھا۔ ''ہم منگل کی رات کو کہاں تھے؟''

''سر! آپ منگل کی رات کو گجرات کے ڈی سی افتخار صاحب کے ساتھ تھے۔'' نیلم نے یوں کہا جیسے واقعی وہ میری پی اے ہو۔ حویلی میں رہ کر اسے بات کرنے کا سلیقہ تو تھا۔ ریشم کے مقابلے میں وہ زیادہ ذہین اور پڑھی لکھی تھی، ہر بات سیکھنے کی کوشش بھی کرتی تھی۔

''ہاں، ہم منگل کی رات کو گجرات میں تھے۔'' میں نے ڈی ایس پی کو بتایا۔

اس کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی۔ ''ابھی افتخار صاحب بھی یہاں آنے والے ہیں۔'' میں نے اسے مرعوب کرنے کو کہا۔ ''تم ان ہی سے پوچھ لینا آفیسر کہ ہم کہاں تھے؟''

''آپ کا سیل فون کہاں ہے؟'' اس نے غور سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''سیل فون!'' میں نے سوچنے کی اداکاری کی۔ ''ہاں، کیا ہمارا سیل فون مل گیا؟''

''کیا مطلب؟'' ڈی ایس پی کے چہرے پر مکروہ مسکراہٹ پھیل گئی۔

''بھئی وہ ہم سے کہیں گم ہو گیا تھا۔ وہ بہت مہنگا سیٹ تھا۔ ہم نے تو اس کی رپورٹ بھی درج کرائی تھی۔''

''رپورٹ درج کرائی تھی؟'' ڈی ایس پی نے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔ ''رپورٹ کی کاپی تو ہوگی آپ کے پاس؟'' اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''واٹ ڈو یو مین آفیسر!'' میں نے تیز لہجے میں کہا۔ ''رپورٹ درج کرائی ہے تو اس کی کاپی بھی ہوگی۔ تمہیں کوئی شک ہے؟''

''مجھے وہ کاپی دکھائیں گے آپ؟''

''لیکن تمہیں اس کی کیا ضرورت ہے آفیسر؟'' میں نے تیکھے لہجے میں کہا۔ ''کیا ہمارا سیل فون مل گیا ہے؟''

''جی ہاں!'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''آپ کا موبائل فون مل گیا ہے۔''

''مل گیا ہے تو ہمارا سیکریٹری یا چیف سیکیورٹی آفیسر لے آئے گا یا تم سیل فون لائے ہو آفیسر!''

''آپ کا سیل فون اس وقت پولیس کی تحویل میں ہے۔ وہ ایک لاش کے پاس پڑا ملا تھا؟''

مجھے اس کے انداز پر ہنسی آ گئی۔ ''لاش کو سیل فون کی کیا ضرورت پڑ گئی؟''

''وہ ایک مقتولہ کی لاش تھی نواب صاحب!''

''اوہ!'' میں نے تشویش کا مظاہرہ کیا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ اس عورت کا قاتل، چور بھی تھا۔ اسی نے ہمارا سیل فون چرایا ہوگا۔'' میں نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ ''ایف آئی آر کی کاپی ہمارے سیکریٹری کے پاس ہوگی۔'' میں نے نیلم سے کہا۔ ''ذرا ہمارے سیکریٹری کو بلا لاؤ۔'' اس کے چہرے سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ میری بات سمجھ نہیں سکی تھی کہ میں سیکریٹری کسے کہہ رہا ہوں۔ وہ دروازے کی طرف بڑھی تو میں نے کہا۔ ''راجا صاحب اپنے کمرے میں ہوں گے یا باہر کوریڈور میں ہوں گے۔''

تھوڑی دیر بعد راجا کمرے میں داخل ہوا۔ ''یس سر!''

''سیکریٹری، ڈی ایس پی کو وہ رپورٹ دکھا دو جو ہم نے گجرات میں درج کرائی تھی۔''

''سیکریٹری!'' ڈی ایس پی الجھ کر بولا۔ ''آپ تو صحافی ہیں جناب؟''

''ہاں، میں صحافی ہوں۔ کیا کوئی صحافی قانونی طور پر کسی کا سیکریٹری نہیں ہو سکتا؟'' راجا نے سرد لہجے میں پوچھا۔ ''میں جرنلسٹ بھی ہوں اور سیکریٹری بھی، آپ کو کوئی اعتراض ہے؟''

''نہیں جناب!'' ڈی ایس پی جلدی سے بولا۔ ''مجھے بھلا کیوں اعتراض ہوگا۔''

''میں رپورٹ لے کر آتا ہوں۔'' راجا کمرے سے باہر نکل گیا۔

وہ ڈی ایس پی ابھی تک کھڑا ہوا تھا۔ میں نے ایک دفعہ بھی اس سے بیٹھنے کو نہیں کہا۔ یوں بھی وہاں ایک ہی کرسی تھی جس پر نیلم بیٹھی تھی۔ وہ دراصل سویٹ تھا۔ اس کے سامنے والے حصے میں ایک صوفہ سیٹ اور کرسیاں رکھی تھیں۔ ڈی ایس پی کا بس چلتا تو مجھے وہیں سے گھسیٹتا ہوا تھانے لے جاتا۔ میں اس سے بیٹھنے کو کہتا بھی کیوں؟ وہ لوگ تو اچھے خاصے شریف آدمی کو مجرم ثابت کرنے کے لیے اتنا تشدد کرتے ہیں کہ وہ ہر جرم کا اعتراف کر لیتا ہے۔

راجا نے واپسی میں خاصی دیر لگا دی تھی۔ ڈی ایس پی جتنی دیر کھڑا رہا، بری طرح پیچ و تاب کھاتا رہا۔ میں بھی بے نیازی سے بہ ظاہر اخبار پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔ میں کن انکھیوں سے ڈی ایس پی کو دیکھ لیتا تھا۔

راجا نے واپس آ کر ایف آئی آر کی فوٹو کاپی اس کے حوالے کر دی۔

''فوٹو کاپی!'' ڈی ایس پی نے غور سے رپورٹ کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں، اصل رپورٹ میرے پاس موجود ہے۔'' راجا نے اسے اصل کاپی دکھاتے ہوئے کہا۔

اس نے غور سے وہ رپورٹ دیکھی، پھر اس کے چہرے پر مایوسی کے تاثرات ظاہر پھیل گئے۔

میں نے اس کے غبارے کی ہوا بالکل نکالنے کو کہا۔ ''سیکریٹری! آئی جی صاحب نے کب آنے کا کہا ہے؟''

''سر! وہ بس آنے ہی والے ہیں۔''

''گڈ!'' میں نے کہا۔ ''ڈی ایس پی صاحب! آپ آئی جی صاحب سے مل کر ہی جایئے گا۔''

''سوری سر!'' ڈی ایس پی نے کہا۔ ''میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔''

''اب یہ بھی بتا دو آفیسر کہ تمہیں یہاں کس نے بھیجا ہے؟''

''سر! ظاہر ہے، مجھے اوپر ہی سے حکم ملا تھا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ قتل کا مفرور ملزم رفیق شیرازی اس وقت فلیٹز کے اس کمرے میں موجود ہے...... لیکن سوری سر! مجھے غلط بتایا گیا تھا۔ مجھے اجازت دیں۔''

''اپنے آئی جی سے تو ملتے جاؤ آفیسر!'' میں نے کہا۔ ''میں ان سے بھی پوچھوں گا کہ پولیس محض شبے کی بنیاد پر کسی کو بھی گرفتار کرنے کی مجاز کب سے ہوگئی؟'' میں نے کچھ توقف سے کہا۔ ''یہاں تو آپ کو احکامات دیے گئے کہ فلاں آدمی کو پکڑ لاؤ۔ کیا آپ نے ثبوت کی ضرورت محسوس نہیں کی آفیسر؟''

''سر! مجھے استعمال کیا گیا ہے۔'' ڈی ایس پی نے آہستہ سے کہا۔ ''کیس میرے ہاتھ میں ہوتا تو میں پہلے تفتیش کرتا، اس کے بعد ہی کسی پر ہاتھ ڈالتا۔ ایک پولیس پارٹی کل ست بدھائی گئی تھی۔ آپ وہاں نہیں ملے تو ان لوگوں نے فرض کرلیا کہ آپ فرار ہو چکے ہیں۔ ایک دفعہ پھر معذرت سر!'' اس نے ایف آئی آر کی کاپی تہ کر کے جیب میں رکھی اور باہر نکل گیا۔

''فیکے پتر! یہ تو بہت آسانی سے ٹل گیا۔'' راجا نے کہا۔ ''ناصر نے تو پریس کے کچھ لوگوں کو بھی بلا رکھا ہے۔ خیر، میں انہیں چائے پلا کر روانہ کرتا ہوں۔'' راجا باہر نکل گیا۔

میں نے غنی کو بلا کر کہا کہ مارکیٹ سے سیل فون لے آئے۔ پھر نیلم سے میں نے کافی منگانے کو کہا۔

نیلم نے روم سروس کو فون پر کافی لانے کو کہا۔

مجھے پھر اس کی صلاحیت کا معترف ہونا پڑا۔ وہ بے چاری چھوٹے سے ایک گاؤں میں رہنے والی لڑکی تھی۔ وہ شاید لاہور بھی پہلی دفعہ آئی تھی۔ اس نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی فائیو اسٹار ہوٹل باہر سے بھی نہیں دیکھا ہوگا۔ اس نے صرف ایک مرتبہ راجا کو فون پر روم سروس سے ناشتا منگواتے دیکھا ہوگا یا ممکن ہے رات کے وقت اسے غنی نے بتایا ہوگا کہ روم سروس سے رابطہ کیسے کیا جاتا ہے۔

اس وقت اس نے بہت اعتماد سے فون پر بات کی تھی۔

اچانک میرے اندر سے آواز آئی۔ ''نواب رفیق احمد شیرازی صاحب! آپ کو اس لڑکی سے اتنی دلچسپی کیوں ہے؟ اگر وہ ذہین ہے تو آپ سے کیا تعلق؟''

''مجھ سے کوئی تعلق نہیں لیکن اس نے میری جان بچائی ہے۔ مجھے اس سے ہمدردی ہے۔''

''جان تو اس نے کچھ دن پہلے ہی بچائی ہے۔ آپ تو اس سے پہلے بھی ہمدردی کرتے رہے ہیں۔''

میں نے نیلم کی طرف دیکھا۔ وہ بھی میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھ سے نظریں ملیں تو وہ دوسری طرف دیکھنے لگی۔ مجھے ایسا لگا جیسے وہ میرے خیالات پڑھتی رہی ہو۔

اس موقعے کے لیے راجا کہتا تھا کہ فیکے پتر! تو انگریزی میں سوچا کرتا کہ عام آدمی سمجھ ہی نہ سکے۔

مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ نیلم نے چونک کر مجھے دیکھا، پھر خود بھی مسکرانے لگی۔ دروازے پر دستک ہوئی تو نیلم اٹھ کر دروازے تک گئی اور دروازہ کھول دیا۔ روم سروس کا ویٹر کافی لے کر آیا تھا۔ ہم کافی پی ہی رہے تھے کہ راجا آگیا اور بولا۔ ''فیکے پتر! کیا اب زندگی بھر یہیں رہنے کا ارادہ ہے؟''

''یہ بات تو میں تجھ سے پوچھنے والا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''میں تو خود فوراً ست بدھائی جانا چاہتا ہوں۔''

غنی سیل فون اور نئی سم لے آیا تھا۔

ہم لوگ ست بدھائی کے لیے روانہ ہوئے تو دوپہر کے ساڑھے بارہ بجے تھے۔ موسم خاصا خوشگوار تھا۔

☆☆☆

ہم ست بدھائی پہنچے تو سب سے پہلے شہناز نے ہمیں دیکھا، پھر نور اور ڈاکٹر شہلا بھی آگئیں۔ نور مجھے دیکھ کر رونے لگی۔ ''رفیق! تم نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟ میں اب یہاں نہیں رکوں گی۔ میں کل ہی تمہیں اپنے ساتھ لندن لے جاؤں گی۔''

شہناز نے نرم لہجے میں کہا۔ ''نور! مجھے ان کا زخم تو دیکھنے دو۔ مجھے خدشہ ہے کہ انفیکشن نہ ہوگیا ہو۔''

پھر ڈاکٹر حسن، شہناز اور ڈاکٹر شہلا پر مشتمل طبی بورڈ نے میرا چیک اپ کیا اور متفقہ طور پر رائے دی کہ انفیکشن نہیں ہوا ہے لیکن مریض کو آرام کی شدید ضرورت ہے۔

ڈاکٹر حسن نے میرا زخم اچھی طرح صاف کر کے اس پر پٹی کی اور بولا۔ ''آپ کا زخم بہت تیزی سے فل اپ ہو رہا ہے نواب صاحب! بس تھوڑی سی احتیاط کرلیں۔''

''میں تو پوری احتیاط کر رہا ہوں ڈاکٹر صاحب!'' میں

نے ہنس کر کہا۔ ''لیکن مصیبتیں اور پریشانیاں میرا پیچھا ہی نہیں چھوڑتیں۔''

''آپ کچھ دن کے لیے حویلی سے بالکل باہر نہ نکلیں۔'' ڈاکٹر حسن نے کہا۔

میں اپنے کمرے میں آیا تو نور وہاں پہلے سے میری منتظر تھی۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''رفیق! آخر ایسی زندگی ہم کب تک جیتے رہیں گے؟ اس سے اچھے تو ہم لندن میں تھے۔''

''نہیں نور!'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''میں نے سوچ لیا ہے کہ اب میں بھی اپنے دشمنوں سے اسی طرح پیش آؤں گا، وہی سازشیں اور ہتھکنڈے استعمال کروں گا جو وہ میرے خلاف کرتے آئے ہیں۔ انگریزی محاورے کے مطابق اب میں ان ہی کے سکوں میں انہیں ادائیگی کروں گا۔ بہت شرافت ہوگئی۔ اب مزید نہیں۔''

''لیکن تم ان گھٹیا لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے رفیق!'' نور نے کہا۔

''ان کا مقابلہ کرنے کے لیے مجھے خود بھی ان جیسا بننا پڑے گا، نو پرابلم، میں ان جیسا بن جاؤں گا۔''

میں نے واقعی فیصلہ کرلیا تھا کہ اب میں بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دوں گا۔ میں اس رانا اور اس کے خاندان پر زندگی حرام کر دوں گا۔

یہی سب سوچتے سوچتے میں سو گیا۔

صبح میری آنکھ کھلی تو ذہن ہلکا پھلکا اور طبیعت بشاش تھی۔ میں چہل قدمی کے لیے باغ میں نکل گیا۔ میری حالت کل سے قدرے بہتر تھی۔ مجھے پھولوں کے ایک کنج کے پاس نیلم نظر آئی۔ اس نے اٹھ کر مجھے سلام کیا اور حسرت سے مجھے دیکھا۔ میں جب سے واپس حویلی میں آیا تھا، نیلم سے ایک دفعہ بھی بات نہیں ہوئی تھی۔ اچانک اس کی وہ اہمیت ختم ہوگئی تھی۔ اب وہ پھر حویلی کی عام سی ملازمہ تھی۔

میں نے ہنس کر پوچھا۔ ''کیسی ہو نیلم؟''

''میں ٹھیک ہوں صاحب جی!'' اس نے جواب دیتے ہوئے پھر میری آنکھوں میں جھانکا۔

میں جلدی سے آگے بڑھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں مجھے پھر وہی چمک نظر آئی تھی۔ میں ٹہلتا ہوا صوبیدار میجر صاحب کی طرف چلا گیا۔ وہ دیر تک میری خیریت معلوم کرتے رہے۔ اچانک مجھے رابعہ کا خیال آیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے دلاور کا خیال بھی آیا۔

میں نے غنی کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھا کیونکہ تہ خانے کی چابیاں اسی کے پاس تھیں۔ وہ نزدیک ہی تھا، میرے اشارے پر فوراً آگیا۔

رابعہ فرش پر گٹھری بنی سو رہی تھی۔ ان دنوں بہت شدید سردی پڑ رہی تھی۔ اسے غنی نے بستر بھی فراہم کیا تھا لیکن تہ خانے میں تو کچھ زیادہ ہی سردی تھی۔

غنی نے اس کے کمرے کا دروازہ کھولا تو اس نے چونک کر لحاف سے منہ باہر نکالا۔ اسے دیکھ کر مجھے افسوس ہوا۔ اس کے بال الجھے ہوئے تھے اور چہرے پر ایک وحشت سی تھی۔ اس نے نفرت بھرے انداز میں مجھے دیکھا۔

میں نے اس سے کہا۔ ''کیسی ہو رابعہ؟''

''تمہیں یہ سوال کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔'' وہ زہریلے لہجے میں بولی۔

''چلو، یہ بتا دو کہ تم نے مجھے دھوکے سے وہاں کیوں بلایا تھا؟''

''معلوم کر سکتے ہو تو کرلو۔'' اس نے تضحیک آمیز لہجے میں کہا۔ ''اب تک میں نے سنا تھا یا کتابوں میں پڑھا تھا کہ دولت اور جائداد کی خاطر لوگ اپنے اور پرائے کی تمیز بھول جاتے ہیں، تم نے تو وہ سچ کر دکھایا۔''

''زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم بھی اچھی طرح جانتی ہو کہ تم نے کیا، کیا ہے؟''

''وہ تو تمہارے عمل کا ردعمل تھا۔ میں نے بچپن سے صرف تمہارے خواب دیکھے تھے رفیق! خاندان کے بڑوں نے میرے ذہن میں یہ ہی بٹھایا تھا کہ میری شادی تمہارے ساتھ ہوگی۔''

''بڑوں نے نہیں، صرف تمہاری ماں نے۔'' میں نے کہا۔

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟'' رابعہ نے کہا۔ ''میں تمہارا انتظار کرتی رہی۔ تم لندن سے آئے تو اس گھٹیا عورت فریال کے عشق میں ڈوبے ہوئے تھے۔ میں نے برداشت کرلیا لیکن جب اس نے تمہیں دھوکا دیا، تب بھی تم نے میری قدر نہ کی۔''

''تم یہ سب کچھ کیوں دہرا رہی ہو؟'' میں نے بیزاری سے پوچھا۔

''اس لیے کہ میں آج بھی تمہیں چاہتی ہوں۔'' رابعہ نے وحشت بھرے انداز میں کہا۔

''بہت خوب!'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تم تو اس مصرعہ کی تفسیر بنی ہوئی ہو کہ میں جس سے پیار کرتا ہوں، اسی کو مار دیتا ہوں۔ تم مجھے چاہتی ہو نا؟'' میں نے اچانک پوچھا۔ ''تو مجھے بتاؤ کہ دلاور کون ہے، اس سے تمہارا کیا تعلق ہے؟''

''اس سے کیا فرق پڑے گا؟'' رابعہ نے کہا۔ ''اگر میں نے سب کچھ بتادیا تو کیا تم مجھ سے شادی کرلو گے؟'' اس نے حسرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''تم مجھ سے ایک دفعہ وعدہ کرلو رفیق! جھوٹا ہی سہی!''

''تم جانتی ہو رابعہ کہ میں جھوٹے وعدے نہیں کرتا۔ ہاں، یہ وعدہ کرسکتا ہوں کہ اگر تم غیر مشروط طور پر مجھے سب کچھ سچ سچ بتادو تو میری طرف سے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا اور تمہاری بقیہ زندگی بھی عیش و آرام سے گزرے گی۔''

''نہیں ڈیئر کزن!'' رابعہ نے تلخی سے کہا۔ ''اس سے بہتر ہے کہ تم مجھے مار ہی دو۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تم مجھے کچھ نہیں بتاؤ گی؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔'' رابعہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''اوکے، مت بتاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''پھر زندگی بھر یہیں سڑتی رہو۔''

میں تہ خانے سے واپس آگیا۔

تہ خانے سے باہر نکلا تو راجا باغ میں بیٹھا تھا۔ اس کے نزدیک ہی شہناز کھڑی تھی۔ شہناز نے مجھے دیکھا تو مسکرا کر بولی۔ ''اوہو، آج تو نواب صاحب کی طبیعت ماشاءاللہ بہت اچھی ہے۔''

''تم جیسے ڈاکٹر ہوں تو کوئی کیسے بیمار رہ سکتا ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''تم دونوں شاید کسی اہم موضوع پر مذاکرات کررہے تھے۔ سوری، میں نے تمہیں ڈسٹرب کیا۔ اپنے مذاکرات جاری رکھو، میں کمرے میں جارہا ہوں۔''

''تو نے تو ہماری پوری زندگی کو ڈسٹرب کردیا ہے۔'' راجا نے منہ بنا کر کہا۔ ''تو صرف مذاکرات کی بات کررہا ہے فیکے پتر!''

''ہاں یار! مجھے احساس ہے۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''کہ میری وجہ سے تمہیں بہت زیادہ پریشانی ہوئی ہے۔ اب اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ......''

''کہ تجھے مرغا بنا کر اوپر سے دو من وزن رکھ دیا جائے۔'' راجا نے بھنا کر کہا۔ ''تجھے ہو کیا گیا ہے فیکے پتر! تو اتنا قنوطی کب سے ہوگیا ہے؟''

''بات قنوطی ہونے کی نہیں ہے راجا!'' مجھے واقعی احساس ہے کہ میری وجہ سے تم لوگوں کا پروگرام چوپٹ ہوگیا۔ اب تم لوگ پہلی فرصت میں شادی کرلو۔''

''تو پاگل تو نہیں ہوگیا ہے فیکے پتر؟'' راجا نے آنکھیں نکالیں۔

''رفیق ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' نور کی آواز آئی۔ وہ نہ جانے کب وہاں آکر کھڑی ہوگئی تھی۔

''تم بھی اسی کی زبان بولنے لگیں میڈم نور جہاں!'' راجا نے کہا۔

''یار! یہ بکھیڑے تو چلتے ہی رہیں گے۔'' میں نے کہا۔ ''ایک کے بعد دوسری پریشانی کھڑی ہوجاتی ہے۔ یہ سب پریشانیاں زندگی کا حصہ بن کر رہ گئی ہیں۔ تو پھر دوسرے کام کیوں رکے جائیں۔''

''ہاں، جب مغل بادشاہ کسی جنگ پر بھی جایا کرتے تھے تو ان کا حرم بھی ان کے ساتھ ہوتا تھا۔ کئی شہزادے اور شہزادیاں تو میدانِ جنگ میں پیدا ہوئے ہیں۔'' راجا نے ہنس کر کہا۔ ''لیکن نہ تو میں مغل ہوں، نہ ہی شہزادہ!''

''تو راجا تو ہے۔ برصغیر کے راجے مہاراجے بھی اس فعل میں کسی طور کم نہیں تھے۔ بس تو شادی پر راضی ہوجا، تیاری تو ساری میں کروں گا۔''

''ابھی تیرا پیٹ خالی ہے۔'' راجا نے ہنس کر کہا۔ ''اس لیے تیرا ذہن کام نہیں کررہا ہے۔ اس موضوع پر بعد میں بات کریں گے۔''

''راجا! میں مذاق نہیں کررہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''پہلے تو ٹھیک ہوجا، پھر اس موضوع پر بات کریں گے۔'' راجا نے کہا۔ ''تو آج صبح اٹھ کیسے گیا؟''

''موضوع بدلنے کی کوشش مت کر راجا!'' میں نے کہا۔

''تو الیکشن جیت جا...... پھر میں شادی کرلوں گا۔''

''اور اگر میں الیکشن ہار گیا؟'' میں نے کہا۔ ''یا میرے دشمنوں نے مجھے الیکشن میں کھڑا ہی نہ ہونے دیا تو؟ نہیں راجا! یوں کام نہیں چلے گا۔''

''میرا مطلب ہے کہ تو الیکشن سے فارغ ہوجا، اس وقت تک صورتِ حال واضح ہوچکی ہوگی۔ تیرے الیکشن میں حصہ لینے یا نہ لینے، دونوں صورتوں میں مخالفین اور دشمن تیرا پیچھا چھوڑ چکے ہوں گے۔''

''یہ تو کیسے کہہ سکتا ہے؟'' میں نے کہا۔

''فیکے پتر! تو شاید بھول گیا کہ میں ایک صحافی بھی ہوں اور سیاسی تجزیہ کار بھی!'' راجا نے ہنس کر کہا۔ ''تو نے الیکشن میں حصہ لیا اور جیت گیا تو تیرے دشمن خود ہی مایوس ہوجائیں گے۔ اگر تو الیکشن ہار گیا تو بھی ان کی یہ دشمنی برقرار نہیں رہے گی۔ اپنی فتح سے انہیں یقین آجائے گا کہ تجھ سے انہیں کوئی خطرہ نہیں، وہ آئندہ الیکشن تک تیری طرف سے بے پروا ہوجائیں گے۔''

''میں جانتا ہوں اور تو بھی اچھی طرح جانتا ہے کہ ایسا نہیں ہے لیکن چل، میں تیری بات مان لیتا ہوں۔ الیکشن بھی اب کون سے دور ہیں؟'' میں نے کہا۔

راجا کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے سیل فون جیب سے نکالا، اسکرین پر نظر ڈالی، پھر خود کلامی کے انداز میں بولا۔ ''یہ کس کا نمبر ہے؟'' اس نے سیل فون کا بٹن دبا کر اسے کان سے لگالیا۔ ''ہیلو!...... جی ہاں موجود ہیں...... آپ کون؟...... ہاں ان کا سیل فون گم ہوگیا تھا...... آپ اپنا نام تو بتائیے...... جی...... چلیے نہ بتائیں...... لیجیے، نواب صاحب سے بات کیجیے۔'' اس نے سیل فون میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''نہ جانے کون ہے۔ اپنا نام نہیں بتارہا ہے، تجھ سے بات کرنا چاہتا ہے۔''

میں نے سیل فون اس کے ہاتھ سے لے کر کان سے لگالیا۔ ''ہیلو!''

''نواب صاحب؟'' دوسری طرف سے آواز آئی۔

''جی ہاں، میں رفیق بول رہا ہوں، آپ کون؟''

''میں شاکر بول رہا ہوں نواب صاحب!''

''کون شاکر؟'' میں نے پوچھا۔

''ارے، میرے بارے میں جاننے کے لیے آپ بے چین تھے، اب پوچھ رہے ہیں کہ کون شاکر؟''

''کام کی بات کرو۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

''کام کی بات یہ ہے کہ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔''

''ملنا چاہتے ہیں تو ست بدھائی آجائیں۔'' میں نے کہا۔

''میں اس وقت وہاں نہیں آسکتا۔'' اس نے کہا۔ ''آپ کو لاہور آنا پڑے گا۔''

''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، میں لاہور نہیں آسکتا۔'' میں نے کہا۔

''دیکھیے، بات آپ کے فائدے کی ہے۔'' شاکر نے کہا۔

''آپ سمجھ رہے ہیں کہ میں غلط بیانی سے کام لے رہا ہوں۔'' میں نے تیز لہجے میں کہا۔

''میں ایک دو دن انتظار کرلوں گا۔'' اس نے کہا۔

''شاکر صاحب! مجھے معمولی نزلہ بخار نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں زخمی ہوں، مجھے گولی لگی ہے۔''

''اوہ، مجھے افسوس ہے۔'' شاکر نے کہا۔

''آپ کو اتنا ہی ضروری کام ہے تو یہاں کیوں نہیں آجاتے! میں سمجھا نہیں کہ آپ کو کس بات کا خوف ہے؟''

''شاکر نے کسی سے خوف زدہ ہونا نہیں سیکھا ہے نواب صاحب!'' وہ تلخ لہجے میں بولا۔ ''میری اپنی کچھ مجبوری ہے۔''

''تو پھر میں کیا کہہ سکتا ہوں، میری بھی مجبوری ہے۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''اگر آپ خود نہیں آسکتے تو اپنے کسی آدمی کو یہاں بھیج دیں۔''

''نواب صاحب! میرا کوئی آدمی اس قابل نہیں ہے کہ آپ سے بات کرسکے۔''

''پھر آپ کیا چاہتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''اوکے میں انتظار کرلوں گا۔''

میں نے فون بند کردیا۔

''کون تھا؟'' راجا نے پوچھا۔

''کوئی شاکر تھا۔'' میں نے کہا۔

''شاکر!'' راجا نے کہا، پھر چونک کر بولا۔ ''یار فیکے! یہ وہی شاکر تو نہیں جو دلاور کا خاص آدمی ہے؟ جس کے بارے میں ایس پی کہہ رہا تھا کہ اس نے تجھ پر حملہ کیا تھا۔''

''ہاں۔'' مجھے یاد آگیا۔ ایس پی کسی شاکر کی بات کر رہا تھا کہ میں اسے شناخت کرلوں۔

''یار! اسے مجھ سے کیا کام پڑ گیا؟'' میں نے الجھ کر پوچھا۔

''یہ تو وہ خود ہی بتاسکے گا۔'' راجا نے کہا۔

''اس کی باتوں سے یہ اندازہ بھی ہورہا تھا کہ اسے میرے زخمی ہونے کا علم نہیں ہے۔ اگر اس نے مجھ پر حملہ کیا ہوتا تو اسے علم بھی ہوتا۔'' میں نے کہا۔

''یہ ضروری تو نہیں ہے۔'' راجا نے منہ بنا کر کہا۔

''اسے کیسے معلوم ہوسکتا تھا کہ اس کی فائرنگ سے نواب صاحب زخمی ہوئے ہیں۔ اس نے کسی کی شکل تو نہیں دیکھی ہوگی۔''

''لیکن وہ یہاں آنے سے خوف زدہ کیوں ہے؟''

''میں کیا بتا سکتا ہوں؟'' راجا نے کہا۔ ''یہ تو اس سے مل کر ہی معلوم ہوگا۔''

میرے سیل فون کی گھنٹی بجی تو میں خود چونک اٹھا۔ یہ میرا نیا نمبر تھا۔ اس کے بارے میں سوائے غنی اور راجا کے کسی کو بھی علم نہیں تھا۔

میں نے سیل فون جیب سے نکالا اور کان سے لگا کر بولا۔ ''ہیلو!''

''سر، بہت گڑبڑ ہوگئی ہے۔'' غنی کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔

''کیسی گڑبڑ؟'' میں نے پوچھا۔

''سر، وہ رابعہ!''

''کیا ہوا ہے؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

جواب میں غنی نے کچھ کہا لیکن میری سمجھ میں نہ آیا، میں گھبرا کر کھڑا ہوگیا۔

میں گھبراہٹ میں باہر نکلا تو غنی برآمدے میں وہاں سے کچھ ہی فاصلے پر حیران پریشان کھڑا تھا۔ میں نے اس کے نزدیک پہنچ کر پوچھا۔ ''کیا بات ہے غنی؟''

''سر، وہ رابعہ کو پتا نہیں کیا ہوگیا ہے؟''

''کیا ہوگیا ہے؟'' میں نے کہا۔ ''مر تو نہیں گئی؟''

''اس کی حالت بہت خراب ہے، آپ خود چل کر دیکھ لیں۔''

''چلو!'' میں اس کے ساتھ تہ خانے کی طرف روانہ ہوگیا۔ میں نے چلتے چلتے پوچھا۔ ''تم آخر اتنے پریشان کیوں ہو غنی! وہ مرتی ہے تو مر جائے، مجھے اس کی موت سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

''سر! میں اس لحاظ سے نہیں کہہ رہا تھا۔'' غنی نے کہا۔ ''آپ نے اسے زندہ رکھا ہوا تھا۔ اسی لیے نا! کہ آپ اس سے کچھ معلوم کرنا چاہتے تھے؟'' غنی نے میری طرف دیکھا، پھر بولا۔ ''اس کی موت کے بعد تو ہمیں کچھ معلوم نہیں ہو سکے گا۔''

ہم تہ خانے میں پہنچے تو رابعہ واقعی غیر فطری سے انداز میں آڑی ترچھی پڑی تھی اور بالکل بے سدھ تھی، پہلی نظر میں تو مجھے ایسا لگا جیسے واقعی اس کی موت واقع ہو چکی ہو۔ میں نے اس کی نبض دیکھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ معمول کے مطابق چل رہی تھی۔ سانس کی آمد و رفت بھی جاری تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ ڈراما کر رہی تھی یا ممکن ہے اس کی حالت واقعی خراب ہو، بعض لوگوں کی نبض اور سانس کی رفتار سے کچھ بھی معلوم نہیں ہوتا۔

میں نے بلند آواز میں کہا۔ ''رابعہ! اداکاری بہت ہو چکی، اب اٹھ جاؤ۔'' وہ اسی طرح بے سدھ پڑی رہی۔ میں نے دوسری مرتبہ زیادہ سخت لہجے میں کہا۔ ''رابعہ! اگر تم ایک منٹ کے اندر اندر نہ اٹھیں تو میں دوسرا طریقہ اختیار کروں گا۔''

وہ اسی طرح مردہ بنی پڑی رہی۔

''غنی! وہ جو غیر آباد سرونٹ کوارٹرز ہیں۔ وہاں چھپکلیاں بہت ہیں، وہاں سے دو چار چھپکلیاں لے آؤ ذرا موٹی تازی!''

''جی سر!'' غنی نے کہا اور باہر نکل گیا۔

میں جانتا تھا کہ چھپکلی سے رابعہ کی جان جاتی ہے۔

اکثر خواتین چھپکلی اور کاکروچ سے یوں ڈرتی ہیں جیسے وہ چھپکلی یا کاکروچ انہیں کھا جائے گا۔

اگر رابعہ ڈراما کر رہی ہوگی تو ابھی اچھل کر اٹھ بیٹھے گی۔

تھوڑی دیر بعد غنی واپس آ گیا۔ اس نے ایک شاپر میری طرف بڑھا دیا۔ شاپر میں کم از کم چار موٹی موٹی، زرد چھپکلیاں تھیں۔

''غنی! اتنی چھپکلیاں کیوں لے آئے؟'' میں نے بلند آواز میں پوچھا۔ مجھے رابعہ کی پپوٹوں میں لرزش سی محسوس ہوئی۔ ''چلو ٹھیک ہے۔ ان میں سے ایک چھپکلی اس کی قمیص میں ڈال دو۔ دوسری میں شلوار کے پائنچے میں چھوڑ کر اسے اوپر سے باندھ دوں گا۔''

میں نے جھک کر جونہی اس کی ٹانگ پکڑی، وہ چیخ مار کے اٹھ بیٹھی۔ میرے ہاتھ میں چھپکلیوں کا شاپر دیکھ کر اس نے دوسری فلک شگاف چیخ ماری اور خوف زدہ لہجے میں بولی۔ ''ان چھپکلیوں کو یہاں سے ہٹاؤ رفیق! ورنہ میرا ہارٹ فیل ہو جائے گا۔''

''تو ہو جائے۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''تم یہ ڈراما کر کے کیا حاصل کرنا چاہ رہی تھیں؟'' میں نے پوچھا۔

رابعہ خاموشی سے میری شکل دیکھتی رہی۔

''میرا وقت ضائع مت کرو رابعہ!'' میں نے کہا۔ ''ورنہ پھر جو کچھ پوچھنا ہوگا، احمد شاہ یا غنی پوچھیں گے اور ان میں سے کوئی بھی تم پر رحم نہیں کھائے گا۔''

''میں چاہتی تھی کہ میں کسی طرح اس منحوس قید خانے سے باہر نکل جاؤں۔ میری حالت خراب ہوتی تو تم لامحالہ مجھے اپنے اسپتال لے جاتے۔ وہاں ڈاکٹر شہناز، نینا یا ڈاکٹر حسن کی ہمدردیاں حاصل کرنا میرے لیے نسبتاً آسان ہوتا۔''

''آئندہ بھول کر بھی اس قسم کی ڈرامے بازی مت کرنا ورنہ مجھے اطلاع دیے بغیر بھی یہ لوگ تمہارے جسم پر چھپکلیاں چھوڑ دیں گے۔''

''تم نے مجھے یہاں قید کیوں کیا ہے؟'' رابعہ جھنجلا کر بولی۔

''تم اتنی بھولی کیوں بن رہی ہو؟'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''تم نے اب تک میرے ساتھ جو کچھ کیا ہے، اس کے بعد یہ سوال کرنے کا مقصد کیا ہے؟ اور اس بھول میں بھی مت رہنا کہ تم اب بھی ڈاکٹر شہناز، ڈاکٹر نینا اور ڈاکٹر حسن کی ہمدردیاں حاصل کر لوگی؟''

''تو پھر ایک ہی دفعہ میں مجھے گولی کیوں نہیں مار دیتے؟'' رابعہ رونے لگی۔

لیکن اس کے یہ آنسو بھی اب میرے لیے بے معنی تھے۔ میں نے غنی سے کہا۔ ''اب اس کے ساتھ ذرہ برابر بھی رعایت مت کرنا اور گولی ضائع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ چھپکلیوں سے دہشت زدہ ہو کر خود ہی مر جائے گی۔''

میں جانے کے لیے مڑا تو رابعہ چیخ کر بولی۔ ''رفیق، رفیق...... مجھے یوں چھوڑ کر نہ جاؤ...... رفیق...... مارنا ہی ہے تو مجھے اپنے ہاتھ سے مارو...... رفیق...... حرام زادے...... کتے...... کمینے...... میری بات سنو...... دیکھو...... رفیق!'' اس پر آہستہ آہستہ جنون طاری ہو رہا تھا۔ میں اس کی آواز ان سنی کرتے ہوئے باہر نکل آیا۔

غنی بھی میرے پیچھے پیچھے باہر نکل آیا اور بولا۔ ''سر! یہ کوئی ایسی حرکت دوبارہ کرے تو کیا اسے گولی مار دوں یا......''

''ایسا کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اسے خوف زدہ کرنے کے لیے میں نے وہ سب کچھ کہا تھا احمق!'' پھر میں جاتے جاتے مڑا اور اس سے بولا۔ ''ہاں، رابعہ کے سیل میں کوئی بھی ایسی چیز مت چھوڑنا جس سے وہ خود کو نقصان پہنچا سکے۔''

''او کے سر!'' غنی نے کہا اور واپس چلا گیا۔

میں حویلی کے مین گیٹ کے نزدیک پہنچا تو مجھے شور شرابے کی آوازیں سنائی دیں، پھر دو گارڈز سراسیمگی کے عالم میں اندر داخل ہوئے۔ انہیں اس حال میں دیکھ کر میں بھی پریشان ہوگیا اور ان سے پوچھا۔ ''کیا بات ہے، تم لوگ اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟''

''سر...... وہ باہر وہی پاگل عورت کھڑی ہے جو کچھ دن پہلے بھی آئی تھی۔'' ایک گارڈ نے کہا۔

مجھے یاد آ گیا کہ کچھ دن پہلے ایک پاگل عورت حویلی میں آ گئی تھی اور گارڈز نے بھی اسے نہیں روکا تھا۔ میں نے ان چاروں گارڈز کو معطل کر دیا تھا۔ اب پھر وہ عورت آ گئی تھی۔ وہ نہ جانے کون تھی اور بار بار یہاں کیوں آ رہی تھی۔

میں نے سرور کو بلایا اور اس سے کہا۔ ''باہر وہی پاگل عورت موجود ہے جو چند دن پہلے بھی آئی تھی۔ تم اسے جانتے ہو؟''

''نہیں سر! میں اسے نہیں جانتا۔'' سرور نے جواب دیا۔

''تم اسے اندر لے آؤ اور معلوم کرو کہ وہ کون ہے؟ کہاں رہتی ہے اور یہاں کیوں آئی ہے؟''

''لیکن سر، وہ تو پاگل ہے۔'' سرور نے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ وہ پاگل نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم اسے اندر آؤ۔''

سرور نے اثبات میں سر ہلایا اور باہر چلا گیا۔

میں حویلی میں واپس آیا تو شہناز اور نور برآمدے ہی میں کھڑی تھیں۔

نور نے کہا۔ ''تم صبح صبح کہاں غائب ہو گئے، ہم سب ناشتے کے لیے تمہارے انتظار میں بیٹھے ہیں۔''

''اوہو۔'' میں نے کہا۔ ''آپ لوگ چلیں، میں کپڑے بدل کر آتا ہوں۔'' میں نے کہا اور کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے جاگنگ کے لیے ٹریک سوٹ پہنا ہوا تھا لیکن جاگنگ نہ کر سکا تھا دوڑنے سے میرے ہاتھ پر دباؤ پڑتا اور ممکن ہے بازو کا زخم پھر رسنے لگتا۔ یہی سوچ کر میں نے جاگنگ نہیں کی تھی۔ میں کپڑے بدل کر ڈائننگ روم میں پہنچا تو وہاں شہناز کے ساتھ صرف ڈاکٹر شہلا تھی۔ راجا اور ناصر سمیت بقیہ تمام لوگ موجود نہیں تھے۔

''راجا، ناصر اور بقیہ ڈاکٹر صاحبان کہاں ہیں؟'' میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''راجا اور ناصر تو آ رہے ہیں۔'' ڈاکٹر شہناز نے کہا۔ ''ڈاکٹر حسن اور بڑے ڈاکٹر صاحب لاہور گئے ہوئے ہیں۔ انہیں وہاں لیب کا کچھ سامان بہت سستا مل گیا ہے۔ اس سامان میں ایکسرے مشین اور الٹرا ساؤنڈ مشین بھی شامل

ہے۔'' شہناز نے کہا۔

''لیکن شہناز! ایکسرے اور الٹراساؤنڈ کے لیے تو الیکٹرک......''

''ڈاکٹر مہدی حسنؒ واپڈا سے سارا بندوبست کر چکے ہیں۔'' شہناز نے کہا۔ ''انہوں نے بہت بہترین اور معیاری لیب کا پلان بنایا ہے۔''

''کمال ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یہاں اتنا کام ہوگیا اور مجھے علم بھی نہیں ہوا؟''

''دونوں باپ بیٹا بہت جی جان سے کام کر رہے ہیں۔'' شہناز نے کہا۔ ''بالخصوص ڈاکٹر مہدی حسن تو ہر وقت یہی سوچتے رہتے ہیں کہ اسپتال کو کیسے ترقی دی جائے؟''

''اور اسکول کا کیا حال ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اسکول کا حال اچھا نہیں ہے۔'' شہناز نے کہا۔ ''اسکول چلاتی تھیں رابعہ، لیلٰی بھابی اور ثریا! ان تینوں کے نہ ہونے سے اسکول کا کیا حال ہوسکتا ہے؟''

''شہناز! میں چاہتا ہوں کہ اسپتال کی طرح ہمارا اسکول بھی علاقے کے اچھے اور معیاری اسکولوں میں سے ایک ہو۔''

''نواب صاحب! اس کے لیے اسکول کی عمارت کا ہونا ضروری ہے۔ دو کمرے بنا کر ان میں اچھا اور معیاری اسکول تو قائم نہیں ہوسکتا۔'' شہناز نے منہ بنا کر کہا۔

''اسکول کی عمارت تو ایک مہینے میں تیار ہوسکتی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن اس کے لیے اسٹاف بھی تو چاہیے۔''

''جب اسکول شروع ہوگا تو اسٹاف بھی ہو جائے گا۔'' شہناز نے کہا۔

میں نے نور کی طرف دیکھا۔ وہ بہت خاموش بیٹھی تھی۔ میں نے ہنس کر اس سے کہا۔ ''کچھ تو کہیے کہ لوگ کہتے ہیں، آج غالب غزل سرا نہ ہوا۔''

اس نے شکایتی نظروں سے مجھے دیکھا لیکن بولی کچھ نہیں۔

''کیا ہوا میڈم ماہ نور بلکہ نور جہاں! نصیبِ دشمناں کیا طبیعت کچھ ناساز ہے؟''

''ذرا آسان اردو میں بات کریں نواب صاحب!'' نور نے کہا۔ ''آپ کی یہ ثقیل اردو مجھے ہضم نہیں ہوتی۔''

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، راجا اور ناصر آگئے۔

''یار، تم لوگوں کے انتظار میں ناشتا ٹھنڈا ہوگیا۔'' میں نے منہ بنا کر کہا۔

''نواب صاحب قبلہ!'' راجا نے کہا۔ ''آپ کو اپنی ریاست کی بھی کچھ خبر ہے یا آپ نے کھانا پینا ہی زندگی کا مقصد بنالیا ہے؟''

''ہمارے مخبر پل پل کی خبریں ہم تک پہنچاتے ہیں گستاخ!'' میں نے رعب دار آواز میں کہا۔ ''ہر طرف امن و امان ہے۔ شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پیتے ہیں۔''

''پھر اس گھاٹ پر صرف شیر رہ جاتا ہے۔'' راجا نے کہا۔ ''ویسے آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ جو ٹھیکے دار ست بدھائی سے جی ٹی روڈ تک سڑک بنا رہا تھا۔ اس نے مزید کام کرنے سے انکار کردیا ہے۔''

میں چونک اٹھا۔ ''انکار کردیا ہے! لیکن کیوں؟''

''اس کی کوئی معقول وجہ نہیں بتائی اس نے۔'' راجا نے کہا اور سلائس اور بوائل انڈے اپنی طرف کھسکاتے ہوئے بولا۔ ''یار پہلے ناشتا تو کرلے۔''

میں نے سلائس پر مکھن لگاتے ہوئے کہا۔ ''معقول نہ سہی، اس نے کوئی غیر معقول وجہ تو بتائی ہوگی؟''

''تو پہلے ناشتا کرلے فیکے پتر!'' راجا نے کہا اور ناشتا کرنے میں مصروف ہوگیا۔

ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے راجا سے کہا۔ ''یار، وہ پاگل عورت پھر آئی تھی۔''

''کون سی پاگل عورت!...... اچھا وہ گلوکارہ!'' راجا ہنسا۔ ''کیا ہوا اسے؟''

''راجا، میرا خیال ہے کہ وہ پاگل نہیں ہے۔''

''دنیا کی ہر عورت پاگل ہے فیکے پتر!'' راجا نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

''کیا کہا...... دنیا کی ہر عورت پاگل ہے؟'' شہناز نے آنکھیں نکالیں، نور بھی اسے گھور رہی تھی۔

''یس!'' راجا نے ڈھٹائی سے کہا۔

''تم مجھے پاگل کہہ رہے ہو؟'' شہناز نے بھنا کر کہا۔

''تمہاری تو خیر ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''نور! یہ تو تمہیں بھی پاگل کہہ رہا ہے۔''

''فیکے پتر! لگتا ہے تو بھی پاگل ہوگیا ہے۔ خواتین کو میرے خلاف بھڑکا رہا ہے۔ میں نے عورت کہا تھا، نالائق! یہ دونوں عورتیں کب ہیں...... یہ تو لڑکیاں ہیں۔'' پھر وہ چونک کر بولا۔ ''تجھے اس بات کا خیال کیسے آیا فیکے پتر کہ وہ عورت پاگل نہیں تھی؟''

''کیا تو نے اس پر غور نہیں کیا؟'' میں نے کہا۔

''میں نامحرم عورتوں پر غور نہیں کرتا۔'' راجا نے منہ بنا کر کہا۔

''سوال یہ ہے کہ وہ یہاں کیوں آئی تھی؟'' میں نے کہا۔

''یہ سوال تو نے بہت دن بعد اٹھایا، کیا اتنے دن سے اٹھ نہیں رہا تھا؟'' راجا نے کہا۔

''بھئی تم لوگ بکواس کرتے رہو، میں اسپتال جارہی ہوں، ریشم دو دفعہ دروازے سے جھانک کر جاچکی ہے۔'' شہناز نے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ٹھہرو، میں بھی چلتی ہوں۔'' نور نے کہا اور وہ بھی اٹھ گئی۔ شہلا، پہلے ہی اٹھ چکی تھی۔ وہ تینوں خراماں خراماں وہاں سے چلی گئیں۔

ان کے جانے کے بعد میں نے کہا۔ ''یار، اس پگلی کو میں نے حویلی میں بلالیا ہے۔''

''کیوں، پہلے یہاں پگلیوں کی کمی ہے جو تو نے ایک اور بلالی۔ ویسے وہ اتنی خوبصورت تو نہیں ہے کہ......''

''الو کے پٹھے! بکواس کرے گا تو میں جھانپڑ ماردوں گا۔'' میں نے بھنا کر کہا۔

''اچھا ناراض مت ہو فیکے پتر!'' راجا ہنس کر بولا۔ ''میرے ایک دوست کے پاس بہت اعلیٰ نسل کا کتا تھا۔ اس کی دم پر پاؤں پڑ جاتا تو وہ بھی بہت بری طرح غراتا تھا۔''

''تو اس وقت سنجیدہ نہیں ہے۔'' میں نے بیزاری سے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

''تجھے پتا ہے، سڑک بنانے والے ٹھیکے دار نے کام کرنے سے انکار کیوں کیا؟''

''یہی تو میں تجھ سے پوچھ رہا تھا۔'' میں نے کہا۔

''اس نے تو غنی کو سیل فون پر صرف اتنا بتایا ہے کہ اس کی بیوی کی طبیعت خراب ہے۔'' راجا نے کہا۔ ''لیکن کسی کی طبیعت خراب ہونے پر یہ تو نہیں ہوتا کہ کام کرنے ہی سے انکار کردیا جائے۔ بیوی کی طبیعت خراب ہے تو دو چار دن میں یا ایک آدھ ہفتے میں ٹھیک بھی ہوسکتی ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ......''

''ہاں فیکے پتر! اس کا یہی مطلب ہے کہ رانا نے اسے ڈرا دھمکا کر اور خوف ناک نتائج کی دھمکیاں دے کر کام کرنے سے روکا ہے۔''

''رانا کیا سمجھتا ہے، پوری دنیا میں صرف وہی ایک ٹھیکے دار تھا؟'' میں نے کہا۔

''کوئی دوسرا آئے گا، وہ بھی یہی کرے گا فیکے پتر!'' راجا نے کہا۔ ''رانا اسے بھی ڈرا دھمکا کر یہاں سے بھگا دے گا۔ اگر تجھے میری بات پر کچھ شک ہے تو آزما کر دیکھ لے۔''

''تیری بات دل کو لگتی ہے لیکن میں اس کی تصدیق ضرور کروں گا۔ میں آج ہی غنی سے کہتا ہوں کہ وہ کسی دوسرے آدمی سے بات کرے۔ سڑک تو میں ہر قیمت پر بنوا کر رہوں گا۔''

''نواب صاحب!'' ناصر نے پہلی دفعہ زبان کھولی۔ ''مجھے اب اجازت دیں۔ مجھے پنڈی میں دو تین ضروری کام ہیں پھر آج ہی مجھے لاہور بھی جانا ہے۔''

''تمہاری گاڑی تو پھر ورک شاپ میں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم میری کوئی گاڑی لے جاؤ۔''

''شکریہ نواب صاحب!'' ناصر نے کہا۔ ''میں کوئی نہ کوئی بندوبست کرلوں گا۔''

''کیا پھر موٹر سائیکل پر سفر کرو گے؟'' میں نے کہا۔ ''میری گاڑی لے جاؤ۔ جب تک تمہاری گاڑی ورک شاپ میں ہے، اس وقت تک میری گاڑی استعمال کرو۔'' پھر میں کچھ سوچ کر بولا۔ ''ہاں، تم شاکر کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے؟''

''میں نے آپ کو بتایا تو تھا کہ وہ لاہور کا سکہ بند بدمعاش ہے۔ پہلے وہ معمولی جرائم کرتا تھا، پھر دلاور کے لیے کام کرنے لگا۔ اب تو بہت بڑا بدمعاش ہے۔ پولیس بھی اس پر ہاتھ ڈالتے ہوئے گھبراتی ہے کیونکہ ایک دو صوبائی وزیروں اور اعلیٰ سول افسران سے اس کے تعلقات ہیں۔ وہ قتل اور اقدام قتل کی ستائیس اور اغوا برائے تاوان کی سترہ وارداتوں میں ملوث ہے لیکن پولیس کو آج تک کوئی ثبوت ملا ہے نہ گواہ۔ وہ آج بھی دندناتا پھر رہا ہے۔ وہ اس وقت دلاور کا دایاں ہاتھ ہے۔''

''یار، تم نے تو اس پر اچھی خاصی تقریر کر ڈالی۔'' میں نے کہا۔ ''ابھی ایک گھنٹا پہلے اس کا فون آیا تھا۔''

''مجھے راجا نے بتایا تھا سر!'' ناصر نے کہا۔ ''شاکر آپ سے ملنا چاہتا ہے لیکن مجھے تو یہ بھی کوئی سازش ہی لگتی ہے، بھلا شاکر کو آپ سے کیا کام ہوسکتا ہے؟''

''یہی تو میں سوچ رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''دلاور کیا مجھے بالکل ہی الو کا پٹھا سمجھتا ہے کہ میں اس کے بچھائے ہوئے جال میں پھنس جاؤں گا؟''

''ویسے اب تک ہوتا تو یہی آیا ہے فیکے پتر!'' راجا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''تو پھر اب بھی یہی ہوگا!'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''میں اس شاکر سے ضرور ملوں گا۔''

راجا نے چونک کر مجھے دیکھا۔ ''تیری طبیعت تو ٹھیک

ہے؟'' اس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔ ''تو جان بوجھ کر اس کے جال میں پھنسنا چاہتا ہے؟''

''یہ تو آنے والا وقت بتائے گا مہاراجا کہ کون کس کے جال میں پھنستا ہے۔ تو شاید بھول گیا کہ میں نے اپنے ان تمام گھٹیا اور کمینے دشمنوں کے لیے اپنی شرافت کو بالائے طاق رکھنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

''لیکن وہ طاق اتنا اونچا نہ ہو کہ پھر شرافت تیری پہنچ سے بہت دور ہو جائے۔'' راجا ہنس کر بولا۔ ''ویسے کیا کرے گا تو؟ منشیات کی اسمگلنگ کرے گا یا بردہ فروشی کرے گا؟'' راجا نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''میں اپنے دشمنوں کے اس تمام کاروبار کو تباہ کر دوں گا۔ میں بھی ان کے خلاف اسی طرح کی سازشیں کروں گا، وہی اوچھے ہتھکنڈے استعمال کروں گا جو آج تک وہ میرے خلاف کرتے آئے ہیں۔ مہاراجا صاحب! اگر کوئی شریف آدمی بدمعاشی پر آمادہ ہو جائے تو اس سے بڑا کوئی بدمعاش نہیں ہوتا۔''

''تو پھر تو اپنے نام کے ساتھ بھائی بھی لگا لے۔ ممبئی کے سارے انڈر ورلڈ ڈان پہلے دادا کہلاتے تھے، اب بھائی کہلاتے ہیں۔'' راجا ہنس کر بولا۔

''اسے مذاق مت سمجھ راجا!'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں اب اینٹ کا جواب پتھر سے دوں گا۔ تو بھی اچھی طرح سوچ لے۔ اس راستے پر میرا ساتھ دے سکے گا یا نہیں۔''

''بکواس کی تو تھپڑ مار دوں گا'' راجا نے بھنا کر کہا۔ ''میں اب تک تیرا ساتھ نہیں دے رہا تو کیا کر رہا ہوں؟ تیری خاطر میں نے اپنا پورا کیریئر داؤ پر لگا دیا، تیری طرف آنے والی ہر مصیبت کے سامنے دیوار بن کر کھڑا ہو گیا اور تو کہہ رہا ہے کہ......'' راجا اچانک جذباتی ہو گیا۔ ''اچھا صلہ دیا ہے تو نے دوستی کا!'' راجا کی آنکھوں سے آنسو نکلے تو میں چونک گیا۔

''اوہو، مہاراجا! تو تو واقعی برا مان گیا۔ میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ میں تو صرف یہ......''

''بس کر فیکے!'' راجا نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''آج مجھے اپنی اوقات کا علم ہو گیا۔''

''اب زیادہ بک بک کرے گا تو پٹ جائے گا میرے ہاتھ سے۔'' میں نے جھنجلا کر کہا۔ ''تو کیا سمجھتا ہے، میں تیرے بغیر رہ سکتا ہوں؟'' میں نے اسے سینے سے لگا لیا۔ ''تو نے یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ میں......''

''بس فیکے! آئندہ مذاق میں بھی ایسی دل آزاری والی بات مت کرنا۔'' پھر وہ مسکرا کر بولا۔ ''اب جبکہ تو نے شرافت کو بالائے طاق رکھ ہی دیا ہے تو اس نیک عمل کی ابتدا اپنے گھر سے کر!''

''تیرا اشارہ رابعہ کی طرف ہے؟'' میں نے کہا۔

''یار، تو تو اچھا خاصا ذہین ہے۔'' راجا کا لہجہ طنزیہ تھا۔ ''اشاروں کی بات بھی سمجھ جاتا ہے۔''

''مت بھول گستاخ صحافی! تو اس وقت نواب رفیق احمد شیرازی آف ست بدھائی سے مخاطب ہے، جو اپنی فہم اور ذہانت میں یکتا ہے۔''

''جو کل تک سڑکوں پر جوتیاں چٹخاتے پھرتے تھے، جو لندن میں اپنے تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے مانگ مانگ کر گزارہ کرتے تھے۔''

''کر دی نہ چھوٹی اور سطحی بات!'' میں نے کہا۔ ''تم جیسے قلم کے مزدور اور کر بھی کیا سکتے ہیں سوائے ان گھٹیا باتوں کے؟'' میں نے مصنوعی افسردگی سے کہا۔

''ڈریں اس وقت سے نواب شیرازی صاحب! جب میں باتوں کے بجائے گھٹیا لاتوں کو استعمال کروں۔'' راجا نے منہ بنا کر کہا اور میری طرف یوں بڑھا جیسے واقعی اپنی دھمکی کو عملی جامہ پہنانے کا ارادہ بھی رکھتا ہو۔

''ایک منٹ!'' میں نے اسے روک دیا۔ ''میں غنی سے کہوں گا کہ رابعہ کا منہ کھلوانے کی آخری کوشش کر لے۔ اگر وہ منہ سے کچھ پھوٹ دیتی ہے تو ٹھیک ہے ورنہ اس کا قصہ تو تمام ہی سمجھو۔ وہ اس تہ خانے سے اب زندہ نہیں جائے گی۔''

''ویسے مجھے یقین ہے کہ چھپکلیوں کے خوف سے وہ اپنی زبان کھول دے گی۔''

''وہ زبان کھولے یا نہ کھولے، ہر دو صورتوں میں اب موت اس کا مقدر ہے، میں نے اسے بے شمار مواقع دیے کہ ممکن ہے وہ سدھر جائے لیکن وہ تو مزید بگڑ گئی۔''

راجا اچانک چونک کر بولا۔ ''تو اس پگلی کے بارے میں کیا بتلا رہا تھا، کہاں ہے وہ؟''

''وہ حویلی کے ایک کمرے میں بند ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''پہلے ان گارڈز سے اس کے بارے میں پوچھ جنہیں تو نے معطل کر دیا تھا اور جو اس پگلی سے خوف زدہ ہو گئے تھے۔'' راجا نے کہا۔

میں نے ملازم کو آواز دے کر کہا کہ غنی کو یہاں بھیج

دے۔ ہم لوگ وہاں سے اٹھ کر برآمدے میں آ گئے۔ فوراً ہی غنی بھی وہاں آ گیا۔ ناصر نے کلائی کی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ''نواب صاحب! میں اب اجازت چاہوں گا۔''

''ہاں، تمہیں تو ابھی پنڈی جانا ہے۔'' پھر میں نے غنی سے کہا۔ ''گیراج میں سے ناصر صاحب کو آف وہائٹ کرولا نکال دو اور ان گارڈز کو بھی یہاں بھیج دینا جنہیں میں نے معطل کر دیا تھا۔''

''او کے سر!'' غنی نے کہا اور ناصر کے ساتھ وہاں سے چلا۔

ڈاکٹر شہناز برآمدے میں داخل ہوئی اور بولی۔ ''نواب صاحب! اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو میں آپ کی پٹی بدل دوں؟''

''زحمت تو ضرور ہو گی لیکن اب ہم تم جیسی حسین اور خوبصورت لڑکی کا دل بھی تو نہیں توڑ سکتے۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

میں نے کافی دن بعد اسپتال کا جائزہ لیا تھا۔ وہاں کا تو نقشہ ہی بدل گیا تھا۔ ڈاکٹر مہدی حسن نے واقعی اسے ایک اچھا اور جدید اسپتال بنانے میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ وہاں ایم ایس آفس تھا، مختلف ڈاکٹرز کے روم تھے، گو، ابھی وہاں ڈاکٹر نہیں تھے لیکن کمرے بہرحال موجود تھے۔ او پی ڈی کے لیے ایک وسیع و عریض ہال تھا جو ابھی زیرِ تعمیر تھا۔ جدید ترین آپریشن تھیٹر تھا اور ماڈرن قسم کی لیب تھی لیکن ابھی اس کا ساز و سامان مکمل نہیں تھا۔ غرض ست بدھائی کا وہ اسپتال کسی بھی طرح کسی بڑے اور جدید اسپتال سے کم نظر نہیں آ رہا تھا۔

پٹی بدلتے ہوئے شہناز نے کہا۔ ''تمہارا زخم بہت تیزی سے بھر گیا ہے، جو تھوڑا بہت باقی ہے، وہ بھی دو ایک دن میں بھر جائے گا۔ ابھی زیادہ اچھل کود اور بھاگ دوڑ مت کرنا۔''

''ہوم ورک پوری توجہ سے کرنا، اسکول میں ٹیچرز کو پریشان مت کرنا......''

''بس تم شروع ہو گئے۔'' شہناز نے منہ بنا کر کہا۔

''تم ہدایات ہی یوں دے رہی تھیں جیسے کوئی ماں اپنے شرارتی بچے کو دیتی ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

نواب صاحب!'' شہناز نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''آپ کو یہ خوش فہمی کیوں ہے کہ آپ بڑے ہو گئے ہیں؟''

''اس کا جواب میں تمہیں بریک کے بعد دوں گا۔'' یہ کہہ کر میں اسپتال سے باہر نکل آیا۔

برآمدے میں وہ چاروں گارڈز موجود تھے جنہیں میں نے معطل کیا تھا۔ وہ چاروں برآمدے کے ایک سرے پر گویا بت بنے کھڑے تھے۔ میں نے ان میں سے ایک کو بلایا۔

''نذیر! ادھر آؤ۔''

نذیر سہما ہوا سا میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

''تم نے اس پاگل عورت کو یہاں سے پہلے کب اور کہاں دیکھا تھا؟''

''میں نے پہلی دفعہ اسے حویلی کے باہر دیکھا تھا۔'' نذیر نے مجھ سے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

''وہاٹ؟'' میں دہاڑا۔ ''تم نے تو کہا تھا کہ...... تم اس پگلی کو جانتے ہو؟''

''میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ اللہ لوک ہے اور......''

''شٹ اپ!'' میں نے اسے بری طرح جھڑک دیا۔ ''تم نے محض اس لیے اسے اندر آنے دیا کہ تمہارے خیال میں وہ اللہ لوک ہے؟''

میں نے دوسرے گارڈ کو بلایا۔ ''تم بتاؤ قربان احمد! تم اس پگلی کو کب سے جانتے ہو؟''

''میں نے اسے یہیں دیکھا تھا نواب صاحب!'' وہ سر جھکا کر بولا۔

بقیہ دو گارڈز کا بیان بھی یہی تھا کہ انہیں وہ پگلی پہلی دفعہ حویلی کے گیٹ پر نظر آئی تھی، دوسری مرتبہ ست بدھائی کی حدود سے باہر ایک گھنے پیڑ کی چھاؤں میں بیٹھی تھی اور لوگ اس سے اپنی مرادیں مانگ رہے تھے۔

''گیٹ لاسٹ!'' میں نے اسے بری طرح جھڑک دیا، پھر بلند آواز میں چیخا۔ ''غنی!''

غنی شاید کہیں باہر تھا، وہ ہانپتا کانپتا وہاں پہنچ گیا۔

''یس سر!''

''یہ تم نے کس قسم کے سیکیورٹی گارڈز رکھے ہوئے ہیں۔ یہ گارڈز ہیں یا کسی مزار کے مجاور؟ اگر یہ اسی طرح اپنی ڈیوٹی سرانجام دیتے رہے تو ایک دن یہاں میرا مزار بن جائے گا۔ ان سے پوچھو، انہوں نے کیا سوچ کر اس پگلی کو اندر گھسنے دیا۔''

''یار فیکے! یہ تو کن چکروں میں الجھ گیا؟'' راجا نے منہ بنا کر کہا۔ ''ہمارے لیے پہلے ہی کیا کم پریشانیاں ہیں جو تو ایک نئی پریشانی مول لینے کے چکر میں ہے۔''

''مجھے صرف یہ پریشانی ہے کہ وہ خاص طور پر یہاں

کیوں آئی تھی؟'' میں نے کہا۔ ''وہ پگلی ہے تو کیا کہیں بھی گھس جائے گی۔''

''بات تو پریشانی کی ہے نیکے پتر!'' راجا نے کہا۔ ''لیکن اس میں سارا قصور تیرے گارڈز کا ہے۔ کوئی بھی پاگل، ایب نارمل یا مجذوب ایوان صدر یا اسمبلی ہال میں گھس کر دکھائے۔ وہاں کا سیکیورٹی اسٹاف بھی پاکستانی ہے۔''

''تو ٹھیک کہہ رہا ہے راجا!'' میں نے فکرمندی سے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ یہاں کا سیکیورٹی نظام فول پروف نہیں ہے۔ میں آج ہی صوبیدار میجر صاحب اور غنی سے بات کرتا ہوں۔'' پھر میں اٹھتے ہوئے بولا۔ ''اب ایک نظر اس پگلی کو بھی دیکھ لیں۔''

میں نے سرور کو بلوایا اور اس سے پوچھا۔ ''تم نے اس پگلی کو کہاں رکھا ہے؟''

''وہ حویلی کے پیچھے والے ایک کمرے میں ہے۔'' سرور نے جواب دیا۔

ہم اس کمرے میں پہنچے تو پگلی آلتی پالتی مارے فرش پر بیٹھی تھی اور خلا میں گھور رہی تھی۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' راجا نے پوچھا۔

''میرا نام ہے چنبیلی، میں ہوں مالن' البیلی، چلی آئی میں اکیلی بیکانیر سے!'' پگلی نے تان لگائی۔

''تم حویلی میں کیا لینے آئی تھیں؟'' میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔

''بنو تیرے ابا کی اونچی حویلی، بنو میں پوچھتا چلا آیا!'' پگلی نے پھر لہک کر کہا۔

''سیدھی طرح بتاؤ تمہارا نام کیا ہے؟'' میں نے بھنا کر پوچھا۔ ''ورنہ میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گا۔''

''اکیلے میں بتاؤں گی۔'' پگلی نے بل کھا کر کہا۔ ''اتنے لوگوں کے سامنے نہیں بتاؤں گی۔''

''ٹھیک ہے، ہم باہر چلے جاتے ہیں۔'' راجا نے کہا اور سرور کو لے کر باہر نکل گیا۔

''ہاں اب بتاؤ۔'' میں نے ان کے جانے کے بعد پوچھا۔

''میں...... پاگل نہیں ہوں نواب صاحب!'' اس نے اپنے خیال میں گویا دھماکا کر دیا۔

''تم پاگل نہیں ہو؟'' میں نے حیرت ظاہر کی۔

''پھر...... یہ سب کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''اپنی جان بچانے کے لیے میں نے یہ سوانگ بھرا ہے۔'' پگلی نے کہا۔

''کون تمہاری جان لینا چاہتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''اور کیوں؟''

''رانا زوہیب!'' پگلی نے دوسرا دھماکا کیا۔

''رانا زوہیب کی تم سے کیا دشمنی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ انتہائی گھٹیا، کمینہ اور ظالم آدمی ہے نواب صاحب!''

''یہ بات تو ایک زمانہ جانتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم سے اسے کیا دشمنی ہے؟''

''میں پنڈ سخی پورہ کے ماسٹر حمید الدین کی بیٹی بشریٰ ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''سخی پورہ رانا زوہیب کی جاگیر میں شامل ہے۔ میں نے میٹرک تو دینہ ہی سے کیا تھا، پھر ابا جی نے مجھے جہلم کے ایک کالج میں ایڈمشن دلا دیا۔ کالج آتے جاتے مجھے رانا زوہیب نے دیکھا تو وہ میرے پیچھے پڑ گیا۔ اس نے ابا جی سے کہا کہ میں بشریٰ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ ابا جی جانتے تھے کہ یہ صرف رانا کی ہوس ہے۔ جب اس کا دل بھر جائے گا وہ مجھے استعمال شدہ کپڑے کی طرح اٹھا کر پھینک دے گا۔ ابا جی موقع پا کر گاؤں سے نکل بھاگے۔ پنڈی کے ایک گاؤں میں ان کے بہت پرانے دوست چاچا غلام رسول رہتے تھے۔ وہ مجھے اور میری تین بہنوں کو لے کر سیدھے پنڈی پہنچے، چاچا غلام رسول نے ہماری بہت مدد کی۔ ابا جی نے اسی گاؤں میں کریانہ کی چھوٹی سی ایک دکان کھول لی اور زندگی کی گاڑی چلنے لگی۔ رانا کو نہ جانے کیسے علم ہو گیا کہ ہمارا خاندان اس گاؤں میں ہے۔ ایک رات اس کے آدمیوں نے ہمارے گھر پر دھاوا بول دیا۔ انہوں نے مجھے اور مجھ سے چھوٹی بہن کو اٹھانے کے بعد گھر کو آگ لگا دی۔ اس آگ میں ابا جی، اماں اور میری دو بہنیں جل کر راکھ ہو گئیں۔'' بشریٰ زاروقطار رونے لگی۔

''میری آنکھوں کے سامنے میرے گھر والے زندہ جل گئے نواب صاحب! اسی وقت میں نے قسم کھائی کہ اگر میں زندہ رہی تو اس رانا کو اپنے ہاتھ سے ماروں گی۔ اس کے آدمی مجھے رانا کی حویلی میں لے گئے۔ رانا نے میری آنکھوں کے سامنے میری چھوٹی بہن کی عزت کو پامال کر دیا۔ اس معصوم کی فلک شگاف چیخیں سن کر میں ہوش و حواس کھو بیٹھی۔ مجھے دوبارہ ہوش آیا تو معلوم ہوا کہ میں صدمے سے پاگل ہو گئی تھی۔ مجھ پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ رانا نے میرا دامن عصمت بھی تار تار کر دیا ہے۔ مجھ پر ایک دفعہ پھر جنون سوار ہوا اور میں نے حویلی میں توڑ پھوڑ مچائی اور رانا کے ملازمین کو زخمی کر دیا۔

ملازمین نے مجھے رسیوں سے باندھ دیا۔ میں جانتی تھی کہ رانا مجھے بھی زندہ نہیں چھوڑے گا اس لیے میں پاگل پن کی اداکاری کرتی رہی۔ پہلے تو حویلی کے ملازمین مجھے باندھ کر رکھتے تھے، پھر جب انہوں نے دیکھا کہ میں کسی کو نقصان نہیں پہنچا رہی ہوں تو انہوں نے مجھے باندھنا چھوڑ دیا۔ میں پاگل بنی پوری حویلی میں گھومتی رہتی تھی۔ اسی زمانے میں رانا کی زبان سے آپ کا نام سنا۔ وہ آپ کی طرف سے بہت پریشان تھا۔ پھر میں نے حویلی میں ایک لڑکی کو آتے جاتے دیکھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ نواب رفیق کی کزن ہے اور رانا اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ انہوں نے ایئرپورٹ سے آپ کو اغوا کرا لیا تھا۔ پھر عین موقعے پر رابعہ اسکرین سے غائب ہو گئی۔ اس دن رانا بہت غصے میں تھا اور آپ کو، رابعہ کو اور آپ کی پوری فیملی کو انتہائی غلیظ گالیاں دے رہا تھا۔ بے اختیار میرا قہقہہ نکل گیا۔ پھر میں دیوانہ وار ہنسنے لگی اور پاگل پن کی حرکتیں کرنے لگی تاکہ رانا کو شبہ نہ ہو جائے۔ میں دو ڈھائی مہینے تک یونہی پاگل بنی رانا کی حویلی میں بھٹکتی رہی۔ میں موقعے کی تلاش میں تھی کہ میں رانا کو قتل کر سکوں۔ وہ حرام زادہ ہمیشہ ایک دو گارڈز کے ساتھ ہوتا تھا۔ وہ جب رات کو سوتا تو ایک گارڈ برآمدے میں اور دوسرا گارڈ اس کے کمرے کے دروازے پر موجود ہوتا تھا۔ میں نے سوچا کہ مجھے تو شاید زندگی بھر رانا کو قتل کرنے کا موقع نہ مل سکے گا۔ اسے کوئی ایسا آدمی مار سکتا تھا جو اس کی طرح طاقت ور اور لامحدود وسائل کا مالک ہو۔ میں ایک دن حویلی سے باہر نکل گئی۔ میں نے وہ دن حویلی سے باہر لیکن اسی گاؤں میں گزارا۔ میں یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ حویلی سے نکلنے پر رانا کے آدمیوں کا کیا ردعمل ہوتا ہے۔ ان میں سے کسی نے مجھ پر توجہ نہ دی۔ لوگ مجھے مجذوب اور اللہ والی سمجھ کر میرے گرد اکٹھے ہو گئے۔ بس اسی دن سے میں ماری ماری پھر رہی ہوں۔ کبھی کسی مزار پر، کبھی کسی پارک میں، دکان کے کسی چبوترے پر یا کسی کے گیراج میں۔ اس بہروپ میں کم سے کم میری عزت محفوظ ہے۔ میں نے ایک دفعہ پہلے بھی آپ تک پہنچنے کی کوشش کی تھی لیکن آپ کے سیکیورٹی گارڈ نے مجھے آپ تک پہنچنے ہی نہ دیا۔ وہی گارڈ آپ کا ڈرائیور بھی ہے۔''

میں سمجھ گیا کہ وہ غنی کے بارے میں بات کر رہی ہے۔

''پچھلی دفعہ میں یہاں آئی تو گارڈز نے مجھے روکنے کی کوشش کی لیکن زیادہ سختی سے پیش نہیں آئے اور میں حویلی میں آ گئی۔ مجھے آپ سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ آپ شاید کہیں جا رہے تھے۔ آپ نے مجھے پولیس کے حوالے کر دیا۔ میں تھانے سے باہر آ کر ایک درخت کے سائے میں بیٹھ گئی۔ آپ دوبارہ سیت بدھائی آئے تو میں بھی چلی آئی۔'' وہ بولتے بولتے تھک گئی تھی۔

میں نے پانی کی گلاس بھر کے اسے دیا اور اس سے پوچھا۔ ''تم نے حویلی میں کسی دلاور کو بھی دیکھا ہے؟''

وہ ذہن پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ''دلاور......! یہ نام مجھے کچھ سنا ہوا تو لگ رہا ہے...... ہاں، میں نے رانا کے منہ سے اکثر دلاور کا نام سنا تھا۔''

''کبھی اسے حویلی میں نہیں دیکھا؟'' میں نے پوچھا۔

''رانا کے پاس اکثر اس کا ایک آدمی شاکر آتا تھا۔'' بشریٰ نے جواب دیا۔

''اب رانا مجھ سے کیا چاہتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ آپ کو چین سے نہیں بیٹھنے دے گا نواب صاحب! چودھری سلطان کا قتل بھی اس نے آپ کے سر منڈھنے کی کوشش کی تھی، اسی نے رابعہ کے ساتھ مل کر آپ کو مارنے کی کوشش کی۔ اگر اس دن رابعہ کورٹ پہنچ جاتی تو رانا آپ کو قتل کر چکا ہوتا۔''

''موت زندگی تو اللہ کے ہاتھ میں ہے بشریٰ!'' میں نے کہا۔ ''جب تک میرا وقت پورا نہیں ہو گا، ایک رانا تو کیا، روئے زمین کی کوئی بھی طاقت مجھے نہیں مار سکتی۔''

''لیکن وہ آپ کو پریشانی میں مبتلا تو کر ہی سکتا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ آپ گھبرا کر یا تو ست بدھائی چھوڑ دیں یا الیکشن سے دست بردار ہو جائیں۔''

راجا نے کمرے میں جھانکا اور حیرت سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''اندر آ جاؤ مہاراجا!'' میں نے کہا، پھر بشریٰ سے مخاطب ہوا۔ ''یہ میرا جگری دوست اور......''

''یہ راجا صاحب ہیں نا؟'' بشریٰ نے پوچھا۔

''تم جانتی ہو انہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''رانا ان کی طرف سے بھی بہت پریشان ہے۔'' بشریٰ نے کہا۔

''یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں نیکے پتر!'' راجا نے کہا۔ ''تو نے کیا جادو کیا کہ یہ......''

''پاگل، ہوش مند ہو گئی؟'' بشریٰ نے مسکرا کر اس کا جملہ پورا کر دیا۔ ''نواب صاحب نے کوئی جادو نہیں کیا، میں تو پاگل تھی ہی نہیں۔''

''اب تمہیں پاگل بنے رہنے کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اور اپنا یہ لباس فاخرہ بھی بدل لو، میں تمہارے لیے معقول کپڑے بھجواتا ہوں۔ نہا کر حلیہ درست

کرلو۔"

میں باہر آیا تو سرور موجود تھا۔ اس نے مجھے حیرانی سے دیکھا لیکن بولا کچھ نہیں۔ میں نے اس سے کہا۔ "وہ پاگل اب ہماری مہمان ہے۔ اس کا خیال رکھنا۔"

"یس سر!" اس کے چہرے پر ابھی تک حیرانی تھی۔

"اور ہاں، وہ پاگل نہیں ہے۔" میں اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

برآمدے میں شہناز اور نور کھڑی تھیں، نور نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ "اب تک تو تم ہوش مندوں سے پوچھ گچھ کرتے تھے، اب پاگلوں پر بھی طبع آزمائی شروع کر دی ہے۔"

"اب کیا۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "میں تو کافی عرصے سے ایک پاگل کے ساتھ مغز ماری کر رہا ہوں۔"

میری بات سمجھ کر نور نے نزدیک رکھا کشن مجھ پر کھینچ مارا۔ کشن میرے سینے پر لگا، میں فوراً اپنا ہاتھ پکڑ کر بیٹھ گیا۔

نور تیزی سے میری طرف لپکی اور پشیمانی سے بولی۔

"سوری رفیق! کیا بہت تکلیف ہو رہی ہے؟"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ آہستہ آہستہ اپنا دایاں ہاتھ سہلاتا رہا۔

"آئی ایم سوری رفیق!" نور نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"فیکے پتر!" راجا نے کہا۔ "بند کر یہ ڈراما ورنہ......"

"ورنہ کیا مہاراجا! تو نے پڑھا تو نہیں ہوگا، سنا ضرور ہوگا کہ رائٹر شیکسپیئر نے کہا ہے کہ یہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہم سب اداکار ہیں۔"

"شیکسپیئر کو تو تجو کہنا تھا کہہ گیا۔" راجا نے کہا۔ "ان لوگوں کو یہ بتا کہ اس لیگی نے کیا کہا ہے؟"

"لیگی سے تیرے تعلقات ہوں گے اس لیے تو ہی بتا۔"

"تم......تم ...... مجھے بے وقوف بنا رہے تھے؟" نور نے بھنا کر کہا۔

"میڈم ماہ نور! میری کیا بساط؟ میں اگر چاہوں بھی تو ایسا نہیں کر سکتا۔ ویسے درد بہت شدید ہو رہا ہے۔"

نور جھنجلا کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں داخل ہوا تو وہ منہ پھلائے بیڈ پر بیٹھی تھی۔

"ہیلو جان!" میں نے آہستہ سے کہا۔ "تم یہ ٹین ایج لڑکیوں کی طرح کب سے روٹھنے لگیں؟" وہ کچھ نہ بولی۔

"بھئی اگر تم یونہی خاموش بیٹھی رہیں تو......"

"تو؟" نور نے آنکھیں نکالیں۔

"تو میں تمہیں یوں ہی مناتا رہوں گا۔"

نور بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس دی، پھر اٹھ کر میرے سینے پر دو تین ہلکے ہلکے مکے مارے اور اچانک مجھ سے لپٹ گئی۔

"میں تو ماحول کی اس کشیدگی سے نکلنے کی کوشش کر رہا ہوں جان!" میں نے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "تم ایک دم چراغ پا ہو جاتی ہو۔"

"سوری جان!" وہ میرے سینے میں منہ گھسا کر بولی۔ ہم دونوں دیر تک کیف و مستی کی انھی وادیوں میں بھٹکتے رہے۔

"رفیق!" اس نے بوجھل آواز میں کہا۔ "مجھ سے اب یہ دوری برداشت نہیں ہوتی، بس اب لندن چلو۔"

"لندن والے کیا ہمیں پکڑ کر زبردستی ایک کر دیں گے؟" میں نے کہا۔

"یہاں تو تم میرے پاس رہ کر بھی میرے پاس نہیں ہوتے۔" نور نے کہا۔

"واہ، کیا زبردست لائن ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"میرے پاس ہو کر بھی میرے پاس نہیں ہوتے۔"

"بات کو مذاق میں مت ٹالو رفیق!" نور نے سنجیدگی سے کہا۔ "کیا تم میرے ساتھ لندن نہیں چل سکتے؟"

"ضرور چلوں گا۔" میں نے کہا۔

میں مزید کچھ کہنا چاہتا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ وہاں ڈاکٹر شہناز کھڑی تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر بولی۔ "تمہیں کھانا نہیں کھانا ہے کیا؟ تم کھاؤ نہ کھاؤ۔ اس نور کو بھوکا کیوں مار رہے ہو؟"

"میں نے اسے کب منع کیا ہے، تم اسے اپنے ساتھ بھی کھلا دو۔" میں نے کہا۔ "راجا کہاں ہے؟"

"وہ بھی ابھی تمہیں ہی پوچھ رہا تھا۔" شہناز نے کہا، پھر کچھ سوچ کر بولی۔ "ہاں، تہ خانے میں کوئی عورت بھی ہے؟" شہناز کے چہرے پر شکوک و شبہات کے سائے تھے۔

"مجھے لگ رہا ہے اب تم جاگتے میں بھی خواب دیکھنے لگی ہو؟" میں نے ہنس کر کہا۔ "تم نے تہ خانے میں عورت کہاں سے دیکھ لی؟"

"ابھی کچھ دیر پہلے سرور، نور کے پاس آیا تھا۔ وہ نور کے کپڑے لے کر گیا تھا۔ اب سرور تو زنانہ کپڑے پہنے

رہا۔"

"اچھا......تم وہ بات کر رہی ہو؟" میں نے سکون کا سانس لے کر کہا۔ مجھے واقعی پریشانی ہوگئی تھی کہ شہناز کو قید خانے کی قیدی عورت کے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟ "وہ لڑکی اصل میں رانا کی زخم خوردہ ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ لیگی؟" شہناز چونک کر بولی۔

"وہ لڑکی پاگل نہیں بلکہ اپنی جان، رانا سے بچانے کے لیے پاگل بنی ہوئی تھی۔"

"تھی کیا مطلب؟" شہناز نے کہا۔

"ارے بابا! تھی اس لیے کہ وہ پاگل بنی ہوئی تھی، ہے نہیں۔"

"وہ تھی یا ہے۔" شہناز نے کہا۔ "لیکن اسے پہلی فرصت میں چلتا کرو۔"

"میں خود بھی اسے گھر میں رکھنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔" میں نے کہا۔

شہناز ڈائننگ روم کی طرف چلی گئی۔

کھانے سے فارغ ہو کر میں ادھر بڑھ گیا جہاں بشریٰ موجود تھی۔ دروازے کے پاس سرور کے بجائے کوئی دوسرا گارڈ موجود تھا۔ سرور اور غنی بہت تجربے کار اور سینئر گارڈز تھے۔ سرور کا کام یہ نہیں تھا کہ وہ کسی پاگل کی نگرانی کرنے بیٹھ جاتا۔ وہ اپنی جگہ کسی دوسرے گارڈ کی ڈیوٹی لگا کر وہاں سے چلا گیا تھا۔

گارڈ مجھے دیکھ کر ایک دم مستعد ہو گیا۔

میں نے دروازے پر دستک دی تو اندر سے بشریٰ کی آواز آئی۔ "کون ہے؟"

"دروازہ کھولو بشریٰ! میں رفیق ہوں۔"

اس نے فوراً ہی دروازہ کھول دیا۔ میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ میرے سامنے اس میلی کچیلی لیگی کے بجائے ایک خاصی پرکشش اور متناسب جسم کی لڑکی کھڑی تھی۔ اس کے گھنے سیاہ بال اس کی پشت اور کمر پر پھیلے ہوئے تھے۔ نور کے کپڑے اس کے جسم پر یوں فٹ آئے تھے جیسے وہ اسی کے کپڑے ہوں۔ اس کے چہرے پر وہ وحشت نہیں تھی جو وہ پاگل پن میں خود پر طاری کر لیتی تھی۔

"بشریٰ! تمہارا تو گیٹ اپ ہی بدل گیا۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"گیٹ اپ بدلا نہیں ہے نواب صاحب بلکہ میں نے گیٹ اپ اتار پھینکا ہے۔ یہ میرا اصل حلیہ ہے۔" وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"آؤ کھانا کھا لو!" میں نے کہا۔

"میں کھانا کھا چکی ہوں۔" بشریٰ نے میز پر رکھے ہوئے خالی برتنوں کی طرف اشارہ کیا۔ "کچھ دیر پہلے آپ ہی نے تو کھانا بھجوایا تھا۔"

"آؤ، میں تمہیں اپنی بیگم سے ملواؤں، حویلی کے دوسرے لوگوں سے ملواؤں۔"

اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "چلیے۔"

اسے دیکھ کر میری طرح راجا بھی حیرت زدہ رہ گیا لیکن اس نے اپنی حیرت کا اظہار نہیں کیا۔

میں اس کے ساتھ برآمدے ہی میں بیٹھ گیا۔

راجا نے آہستہ سے پوچھا۔ "بشریٰ بی بی! کچھ اندازہ ہے کہ رانا آئندہ ہمارے خلاف کس قسم کے اقدامات کر سکتا ہے؟"

"وہ ہر قیمت پر نواب صاحب کو الیکشن میں حصہ لینے سے روکے گا۔" بشریٰ نے کہا۔

"تم دلاور کے بارے میں کیا جانتی ہو؟" راجا نے پوچھا۔

"میں نے نواب صاحب کو بھی بتایا تھا کہ میں نے صرف دلاور کا نام سنا ہے رانا سے، کبھی اسے دیکھا نہیں۔ اس کے پیغامات یا تو رانا تک فون کے ذریعے پہنچتے تھے یا پھر دلاور کا ایک آدمی شاکر، رانا کے پاس آیا کرتا تھا۔"

"اچھا، تم اب آرام کرو۔" میں نے کہا۔ "مجھے بہت تھکی تھکی سی نظر آ رہی ہو۔"

"یہ تھکن تو برسوں کی ہے نواب صاحب!" بشریٰ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "یہ گھنٹے دو گھنٹے کے آرام سے تو جانے سے رہی۔ ویسے اس وقت مجھے شدید نیند آ رہی ہے۔"

"تو پھر تم جا کر سو جاؤ۔" میں نے کہا۔ "ملازم تمہیں کمرے تک پہنچا دے گا۔"

میں نے ایک ملازم کو آواز دی اور اس سے کہا کہ بشریٰ بی بی کو ان کے کمرے تک چھوڑ آؤ۔

"نواب صاحب! وہ آپ کی بیگم اور......"

"ان سے بعد میں مل لینا۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔ "اس وقت تو تمہیں آرام کی سخت ضرورت ہے۔"

وہ ملازم کے ساتھ کمرے کی طرف بڑھی تو وہ گارڈ بھی غیر محسوس طور پر اس کے پیچھے روانہ ہو گیا۔

میں دوبارہ برآمدے میں آ بیٹھا۔

"فیکے پتر!" راجا نے پرخیال انداز میں کہا۔ "مجھے نہیں لگتا کہ یہ بشریٰ وہی ہے جو یہ ظاہر کر رہی ہے۔"

''یار، مجھے بھی یہی لگتا ہے کہ بشریٰ جھوٹ بول رہی ہے۔ بقول اس کے یہ گزشتہ ڈیڑھ سال سے اس طرح بھٹک رہی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ پاگل بنی تھی تو صرف اپنی جان بچانے کے لیے۔'' میں نے کہا ''لیکن راجا! جو عورت سال ڈیڑھ سال سے سڑکوں اور مزاروں پر بھٹک رہی ہو، وہ ایک ہی دفعہ میں اتنی نہیں نکھر سکتی۔''

''تیری بات میں وزن ہے۔'' راجا نے کہا۔ ''میں نے اس پہلو پر تو ابھی تک غور ہی نہیں کیا تھا۔''

''ظاہر ہے بھٹکنے والی عورت کا چہرہ اتنا شاداب نہیں ہوتا۔ موسم کی شدت سے اس کے چہرے پر نمایاں اثر پڑنا چاہیے تھا۔'' میں نے کہا۔ ''یہاں تو میرا یہ حال تھا کہ اگر شدید گرمی میں آدھا گھنٹا ہی باہر گھوم لوں تو چہرے کی حالت خراب ہو جاتی تھی۔''

پھر یہ سب کیا تھا؟ کیا بشریٰ کو رانا نے بھیجا تھا؟ اپنا ایک مہرہ پٹنے کے بعد رانا اتنی بڑی غلطی نہیں کر سکتا یا پھر وہ مجھے الو کا پٹھا سمجھ رہا ہے؟

''یار راجا!'' میں نے کہا۔ ''ہم بشریٰ کو حویلی میں نہیں رکھیں گے بلکہ ست بدھائی میں بھی نہیں رکھیں گے۔ اگر یہ ہمارے خلاف کوئی سازش ہوئی تو اپنی موت آپ مر جائے گی۔ بشریٰ کو ایسی جگہ بھیج دے جہاں اسے کسی قسم کا عیش آرام میسر نہ ہو۔ بقول اس کے وہ گزشتہ دو سال سے سڑکوں پر بھٹک رہی ہے۔ اس کے لیے تو سر چھپانے کا ایک باعزت ٹھکانا بھی جنت سے کم نہیں ہوگا۔''

''ویکھے پتر! تیری عقل پھر ٹخنوں میں چلی گئی ہے۔'' راجا نے کہا۔ ''او بھائی اتنا کھڑاگ پھیلانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ اس سے صاف صاف کہہ دے کہ ہم تمہیں فی الحال حویلی میں نہیں رکھ سکتے۔''

''نہیں یار!'' میں نے کہا۔ ''اگر وہ واقعی رانا کے ظلم کا شکار ہوئی تو بے موت مر جائے گی۔'' میں نے کہا۔

''تو پھر غنی یا سرور سے کہہ کہ اسے یہاں سے کہیں دور لے جائیں۔ اس سے کہہ دینا کہ اس وقت حویلی میں تمہارے لیے خطرہ ہے اس لیے تمہیں محفوظ جگہ پر بھیج رہا ہوں۔''

میں نے اسی وقت غنی کو بلایا اور ساری صورتِ حال اسے بتائی۔

اس نے کہا۔ ''سر! میرا ایک ٹرک ڈرائیور دوست بہاول نگر میں رہتا ہے۔ میں اس عورت کو بہاول نگر بھجوا دیتا ہوں۔ اگر اسے واقعی جان کا خطرہ ہوگا تو وہیں رہے گی ورنہ وہاں سے بھاگ لے گی۔''

''تم اپنے اس دوست سے ابھی بات کر لو۔'' میں نے کہا۔ ''وہ ٹرک ڈرائیور ہے تو ہر وقت بہاول نگر میں تو نہیں ملے گا۔''

غنی نے سیل فون نکالا اور اپنے دوست رحمت علی کا نمبر ملایا۔ لائن ملنے پر وہ بولا۔ ''ہیلو، رحمت علی! میں غنی بول رہا ہوں......بس یار خیر ہے......تو سنا......!''

پھر وہ کچھ دیر تک رحمت علی سے بات کرتا رہا۔ فون سے فارغ ہو کر وہ بولا۔ ''سر! میں نے رحمت علی سے بات کر لی ہے۔ وہ لاہور سے مال لے کر پنڈی کی طرف جا رہا ہے، کل تک اس کی واپسی ہوگی۔ میں نے اسے یہاں آنے کے لیے کہہ دیا ہے۔''

''غنی! تمہارا یہ دوست رحمت علی اعتبار کا آدمی ہے نا؟'' میں نے پوچھا۔

''سر! رحمت علی زبان کا دھنی ہے۔ وہ اس عورت کو پوری حفاظت سے رکھے گا۔ ہاں، اگر یہ خود کہیں جانا چاہے گی تو اسے روکے گا نہیں۔ اگر آپ یہ بھی کہہ دیں کہ اس عورت کو بہاول نگر ہی میں روکنا ہے تو پھر یہ کبھی وہاں سے نکل نہیں سکے گی۔''

''بس ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔

غنی کے جانے کے بعد میں بھی کچھ دیر کے لیے لیٹ گیا۔

دوبارہ میری آنکھ کھلی تو اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میرے ہاتھ کا زخم بالکل تکلیف نہیں دے رہا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ نیم گرم پانی سے دیر تک نہاتا رہوں لیکن شہناز نے کہا تھا کہ جب تک زخم ٹھیک نہ ہو جائے، اس وقت تک اس پر پانی مت ڈالنا۔ میں نے پولیتھین کی ایک بڑی شیٹ لے کر اپنے دائیں ہاتھ پر اچھی طرح لپیٹی اور دیر تک نہاتا رہا۔ نہانے سے میری طبیعت بہت ہلکی پھلکی اور تر و تازہ ہو گئی۔

میں تیار ہو کر کمرے سے باہر نکلا تو مجھے نیلم دکھائی دی۔ اس نے مجھے سلام کیا، میں نے جواب دے کر پوچھا۔ ''کیسی ہو نیلم؟''

''ٹھیک ہوں صاحب جی! آپ کا زخم اب کیسا ہے؟''

''میرا زخم تقریباً ٹھیک ہو چکا ہے۔'' میں نے کہا، پھر نیلم سے پوچھا۔ ''راجا کہاں ہے؟''

''وہ ڈاکٹر صاحبہ کے ساتھ سٹنگ روم میں ہیں جی۔'' اس نے کہا۔

''تمہیں تو یہاں کوئی تکلیف نہیں نیلم؟'' میں نے پوچھا۔

''صاحب جی! مجھے جتنا عیش اور آرام اس حویلی میں ملا ہے، زندگی میں کبھی کہیں نہیں ملا۔'' نیلم نے کہا۔

میں سٹنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں راجا اور شہناز کے علاوہ ڈاکٹر شہلا، ڈاکٹر ٹینا اور ڈاکٹر حسن بھی موجود تھے۔ حسن نے مجھے سلام کیا۔

''وعلیکم السلام ڈاکٹر صاحب! آپ کب آئے؟''

''سر! میں ایک گھنٹا پہلے پہنچا ہوں۔''

''اور ڈاکٹر مہدی حسن؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ پرسوں تک آجائیں گے۔''

''ڈاکٹر ٹینا! آپ کیسی ہیں؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''آئی ایم فائن سر!'' ٹینا نے جواب دیا۔

''گڈ!'' میں نے کہا، پھر شہناز سے مخاطب ہوا۔ ''بھئی، ایک کپ کافی مجھے بھی منگوا دو۔''

''میں نے تمہیں دیکھتے ہی ریشم سے کہہ دیا تھا۔'' شہناز نے مسکرا کر کہا۔

راجا نے میری طرف جھک کر آہستہ سے کہا۔ ''میں نے بشریٰ بی بی کو بھی یہاں بلا لیا ہے۔ تو اسے بتا دینا کہ میں حفاظت کے خیال سے تمہیں بہاول نگر بھیج رہا ہوں۔''

ریشم کافی کی ٹرالی دھکیلتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے پیچھے بشریٰ بھی تھی۔ شہناز کے سوا سبھی اسے حیرت سے دیکھنے لگے۔

میں نے کہا۔ ''یہ بشریٰ ہیں، میری بہت پرانی جاننے والی۔'' پھر میں نے سب لوگوں سے بشریٰ کا تعارف کرایا۔

میں کافی پینے کے بعد ڈرائی فروٹ ٹونگ رہا تھا کہ غنی کمرے میں داخل ہوا اور میرے نزدیک آ کر آہستگی سے بولا۔ ''سر! رابعہ بی بی کو بخار ہو گیا ہے۔ انہیں بہت شدید کھانسی بھی ہے۔''

''میں شہلا یا ٹینا سے کہہ دوں گا، تم ان سے دوا لے جانا۔''

پھر میں نے بشریٰ سے کہا۔ ''بشریٰ! یہاں تمہارے لیے خطرہ ہے۔ میں نے سوچا ہے کہ تمہیں کسی محفوظ جگہ بھجوا دوں۔''

''اگر یہاں خطرہ ہے تو مجھ سے زیادہ آپ کے لیے ہوگا نواب صاحب!'' بشریٰ نے کہا۔

''میں تو خود دو چار مہینے کے لیے لندن جانے والا ہوں اس لیے میں نے سوچا ہے کہ تمہیں اپنے ایک قابل اعتماد آدمی کے پاس بھجوا دوں۔''

''یہ کہیے، آپ مجھ سے جان چھڑانا چاہتے ہیں۔'' بشریٰ نے آہستہ سے کہا۔

''اگر جان چھڑانا ہوتی تو تمہیں حویلی میں گھسنے ہی نہ دیتے۔'' راجا نے کہا۔

''لیکن...... میں...... وہاں کیسے رہوں گی؟''

''بشریٰ بی بی!'' غنی نے سرد لہجے میں کہا۔ ''تم گزشتہ سال ڈیڑھ سال سے سڑکوں پر ماری ماری پھر رہی ہو، محض اس لیے کہ تمہاری جان بچ جائے۔ جہاں تمہیں بھیجا جائے گا، وہاں تمہیں ہر طرح کا تحفظ فراہم کیا جائے گا۔ سر چھپانے کو ایک ٹھکانا ہوگا، تمہاری زندگی بھی محفوظ رہے گی اور عزت بھی!''

''جانا کب ہے؟'' بشریٰ نے پوچھا۔

''کل اسی وقت ہمارا آدمی یہاں آئے گا۔'' غنی نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے۔'' بشریٰ نے جواب دیا لیکن اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے میرا فیصلہ پسند نہیں آیا۔

اس نے کافی پی، تھوڑی دیر بیٹھی، پھر اٹھ کر چلی گئی۔

میں نے راجا سے کہا۔ ''راجا! اگر یہ یہاں سے کہیں جانا چاہے تو اسے جانے دیا جائے۔''

''ٹھیک ہے، میں غنی سے کہہ دوں گا۔'' راجا نے کہا۔

شہناز، شہلا اور ٹینا تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد چلی گئیں۔ شہناز اور شہلا نائٹ ڈیوٹی پر تھیں، ٹینا کا آف تھا لیکن وہ ہم لوگوں سے اتنی بے تکلف نہیں تھی کہ ہمارے ساتھ بیٹھتی۔ نور بھی شہناز کے ساتھ ہی اٹھ گئی تھی۔

اس دن سردی کچھ زیادہ ہی تھی۔ کمرے میں ہیٹر کی خوشگوار حرارت موجود تھی لیکن دل چاہ رہا تھا کہ لحاف اوڑھ کر بیٹھا جائے۔ میں بھی اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا۔

میں کپڑے بدل کر بستر میں گھس گیا۔ یہاں بھی ہیٹر چل رہا تھا لیکن لحاف سے شاید ہمارا نفسیاتی تعلق ہے۔ جب تک لحاف میں سمٹ کر، لپٹ کر نہ لیٹا جائے، اس وقت تک سردی نہیں جاتی۔ میں نور کا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے توقع تھی کہ وہ ضرور میرے پاس آئے گی۔ میں شام کو اچھا خاصا سو لیا تھا اس لیے نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔

اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی بجی تو میں چونک اٹھا۔ اسکرین پر غنی کا نام دیکھ کر مجھے تھوڑی سی حیرانی ہوئی، میں

نے سیل فون آن کر کے کان سے لگالیا۔ ''ہاں غنی؟''

''سر! وہ عورت باہر جانے کی کوشش کر رہی ہے۔''

''کون عورت؟'' میں نے پوچھا۔

''سر وہی پاگل عورت جو اب پاگل نہیں ہے۔'' غنی نے کہا۔

''اسے باہر جانے دو۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن اپنے کسی آدمی کو اس کے تعاقب میں بھیج دو۔ اس سے کہنا کہ بہت احتیاط سے اس کا تعاقب کرے؟''

''ٹھیک ہے سر!'' غنی نے کہا اور میں نے فون بند کر دیا۔

میں ایک مرتبہ پھر نور کا انتظار کرنے لگا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ جا کر نور کو بلا لوں لیکن پھر میں یہ سوچ کر لیٹا رہا کہ نور کو آنا ہوگا تو خود ہی آئے گی۔ اس کا انتظار کرتے کرتے نہ جانے کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔

میں نے خواب میں دیکھا کہ نور میرے بالوں میں اپنی مخروطی انگلیاں پھیر رہی ہے۔ میری پیشانی پر ہاتھ پھیر رہی ہے، پھر وہاں اچانک بارش ہونے لگی۔ بارش سے اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ وہ خواب نہیں حقیقت تھی۔ نور میرے سرہانے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے گرنے والے آنسوؤں کے قطروں کو میں بارش سمجھ رہا تھا۔

میں تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔ ''نور...... تم رو رہی ہو جان؟'' میں نے اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔

''روؤں نہ تو اور کیا کروں؟'' نور نے شکوہ بھرے لہجے میں کہا۔

''کیوں، کیا غم ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''کیا میری موت واقع ہوگئی ہے؟ یا پھر......''

نور نے میرے منہ پر اپنا خوب صورت اور نرم گداز ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے شاید مہندی لگائی تھی۔ اس کے ہاتھوں سے اب تک حنا کی خوشبو آرہی تھی۔ مہندی کی یہ ہیجان انگیز خوشبو میری کمزوری تھی۔ پھر میں سب کچھ بھول گیا۔

ہوش تو مجھے اس وقت آیا جب میرے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ سیل فون تکیے کے نیچے تھا اور اس پر نور سر رکھے آسودگی سے لیٹی تھی۔ اس کے چہرے پر بھی ایک آسودہ سی مسکراہٹ تھی۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر تکیے کے نیچے سے سیل فون نکالنا چاہا لیکن نور نے کہا۔ ''دفع کرو، نہ جانے کون بدتمیز ہے۔ اسے نہ خود نیند آرہی ہے، نہ دوسروں کو سونے دے رہا ہے۔''

''کوئی ایمرجنسی کال بھی ہو سکتی ہے۔'' میں نے کہا۔

جب تک نور نے سیل فون مجھے نکال کر دیا۔ کال منقطع ہو چکی تھی۔

میں نے فون کرنے والے کا نام دیکھنا چاہا لیکن وہاں صرف ایک نمبر تھا۔ مجھے یاد نہیں آرہا تھا کہ وہ نمبر کس کا ہے؟

''لعنت بھیجو اس سیل فون پر۔'' نور نے کہا۔ ''کسی کو زیادہ پریشانی ہوئی تو وہ پھر کال کرے گا۔''

میں نے لعنت بھیج دی لیکن ابھی لعنت بھیجے ہوئے ایک منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ سیل فون کی گھنٹی پھر بجنے لگی۔ میں نے جھنجلا کر سیل فون کان سے لگایا اور کرخت لہجے میں بولا۔ ''ہیلو!''

''فیکے پتر! تو مجھے ڈرا رہا ہے یا ڈانٹ رہا ہے؟'' راجا نے کہا۔

''مہاراجا! یہ تو ہے؟'' میں نے کہا۔ ''اس سے پہلے بھی تو نے کال کی تھی؟''

''ہاں، اس سے پہلے بھی میں نے ہی کال کی تھی لیکن کسی دوسرے سیل فون سے۔'' راجا نے کہا۔ ''میرا سیل فون کام نہیں کر رہا ہے۔ جب تو نے جواب نہ دیا تو میں نے دوسرے سیل فون میں اپنی سم لگالی ہے۔''

''خیریت تو ہے؟'' میں نے پوچھا۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔

''خیریت نہیں ہے فیکے پتر!'' راجا نے کہا۔ ''اس مرتبہ رابعہ کی حالت واقعی خراب ہے، وہ بخار میں بری طرح تپ رہی ہے۔ یہ کم سے کم اس کی اداکاری نہیں ہو سکتی۔'' راجا نے فکرمندی سے کہا۔ ''کیا میں شہناز کو وہاں بھیجوں؟''

''تو شہناز سے کیا کہے گا؟'' میں نے پوچھا۔ ''وہ تو ایک دم بھڑک اٹھے گی کہ تم لوگ رابعہ کو یہاں لائے اور مجھ سے اس کا تذکرہ تک نہیں کیا۔''

''یار! یہی بات تو میں بھی سوچ رہا ہوں۔''

''یار، میں آرہا ہوں۔ شہناز اس وقت اسپتال میں ہوگی۔''

''ہاں، آج اس کی نائٹ ڈیوٹی ہے۔'' راجا نے کہا۔

میں اٹھنے لگا تو نور نے پوچھا۔ ''خیریت تو ہے؟ راجا بھائی کیا کہہ رہے تھے؟''

''ہاں، خیریت ہے۔'' میں نے سلیپنگ گاؤن کی ڈوریاں کستے ہوئے کہا۔ ''ایک گارڈ کی طبیعت کچھ خراب ہوگئی ہے۔''

''اس گارڈ کا نام رابعہ ہے؟'' نور نے اچانک پوچھا۔

''رابعہ؟'' میں نے چونک کر اسے دیکھا۔

''رفیق! تم تو بات کر کے بھول جاتے ہو۔ ابھی تو تم

راجا بھائی سے کہہ رہے تھے کہ تم لوگ رابعہ کو یہاں لائے ہو اور کسی کو بتایا تک نہیں۔''

''نور پلیز!'' میں نے خوشامد بھرے لہجے میں کہا۔ ''تم تو مجھے اچھی طرح سمجھتی ہو، ہم رابعہ کو اس پوزیشن میں نہیں لائے تھے کہ تم لوگوں کو بھی بتاتے۔ رابعہ نے ایک مرتبہ پھر مجھے قتل کرنے کی کوشش کی تھی، اس نے دھوکے سے مجھے لاہور بلایا تھا۔ پھر اس کے نتیجے میں فائرنگ ہوئی تھی۔ میں اسی فائرنگ میں زخمی ہوا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''اب تم ہی بتاؤ۔ میں تم لوگوں کو کیا بتاتا کہ میں خاندان کا ایک فرد سمجھ کر خلوص دل سے رابعہ کی مدد کرنے گیا تھا لیکن اس نے میرے خلوص کو ایک مرتبہ پھر دھوکا دیا۔ وہ تو میری زندگی ہی تھی کہ غنی نے میرا تعاقب کیا اور ان لوگوں تک پہنچ گیا جنھوں نے مجھے قید کر لیا تھا۔ میں تمھیں سب کچھ بتا دوں گا لیکن اس وقت مجھے جانے دو۔''

''اس وقت کہاں جا رہے ہو؟'' نور نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں ناراضی سے زیادہ فکرمندی کا عنصر تھا جس سے مجھے کافی اطمینان ہوا۔

''رابعہ کی حالت خراب ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اسے ڈاکٹر کی اشد ضرورت ہے۔ میں ڈاکٹر شہناز کے پاس جا رہا ہوں۔''

''چلو، میں بھی چلتی ہوں۔ میں شہناز کو زیادہ بہتر انداز میں بریف کر سکتی ہوں۔''

میں نے سر پر ایک اونی ٹوپی پہن لی اور باہر نکلا۔ نور میرے ساتھ تھی۔ اس نے بھی جسم پر شال لپیٹ لی تھی۔ سردی اتنی شدید تھی کہ مجھے لندن یاد آگیا۔ یخ بستہ ہوا میں ایک کاٹ تھی۔

میں اسپتال کے نزدیک پہنچا تو وہاں راجا اور غنی پہلے سے موجود تھے۔

ہم اسپتال میں داخل ہوئے تو غنی باہر ہی مل گیا۔

شہناز ہم سب کو ایک ساتھ دیکھ کر پہلے تو حیران ہوئی، پھر اچانک پریشان ہوگئی اور گھبرا کر بولی۔ ''کیا بات ہے سب خیریت تو ہے؟''

شہناز کی آواز سن کر شہلا بھی وہاں آگئی۔ وہ بھی حیرانی سے ہمیں دیکھ رہی تھی۔ اسپتال کا وہ حصہ بالکل یخ بستہ تھا جہاں اس وقت ہم موجود تھے۔ ڈاکٹر مہدی حسن نے وارڈز اور ڈاکٹرز کے روم میں ہیٹر لگوائے تھے۔

''پہلے یہاں سے اپنے آفس میں چلو۔'' راجا نے کہا۔ ''میں تو سردی سے ٹھٹھر جاؤں گا۔''

شہناز ہمیں اپنے کمرے میں لے آئی۔

نور نے آہستہ آہستہ، سے سب کچھ بتا دیا۔

''ارے، تو وہ اس وقت کہاں ہے؟'' شہناز نے پوچھا۔

''وہ ابھی قید خانے ہی میں ہے۔'' راجا نے جواب دیا۔

''تو دیر کیوں کر رہے ہو، چلو، میں وہاں چلتی ہوں۔'' شہناز نے کہا۔

''بہتر ہے کہ ہم اسے یہاں لے آئیں۔'' راجا نے کہا۔ ''تہ خانے میں اس وقت شدید سردی ہوگی، وہاں ہیٹنگ کا بھی کوئی بندوبست نہیں ہے۔''

''تو پھر جلدی اسے یہاں لاؤ۔ مجھے خدشہ ہے کہ اسے نمونیا نہ ہو گیا ہو، رات کو غنی، شہلا سے دوا لے کر تو گیا تھا لیکن یوں بغیر مریض کو دیکھے کوئی دوا کیسے دی جا سکتی ہے؟''

راجا تیزی سے باہر نکل گیا۔

پھر دس منٹ سے بھی کم عرصے میں وہ غنی کے ساتھ لوٹ آیا۔ غنی نے رابعہ کو اٹھا رکھا تھا۔

''اسے روم میں پہنچا دو۔'' شہناز نے کہا۔

شہناز نے مریضوں کے معائنے کے لیے ایک چھوٹا سا کمرا بنا رکھا تھا، وہاں ایک بیڈ اور دو تین کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ راجا نے ہیٹر آن کر دیا۔

''اب آپ لوگ ذرا باہر جائیں پلیز! تاکہ میں مریض کا چیک اپ کر سکوں؟'' شہناز نے خالص ڈاکٹروں والے انداز میں کہا۔

میں اور غنی باہر آگئے۔ رابعہ نے نور کو وہیں روک لیا۔

ہم لوگ وہاں سے آکر شہناز کے ڈیوٹی روم میں بیٹھ گئے۔ اس کمرے میں ہیٹر کی خوشگوار حرارت پھیلی ہوئی تھی۔ وہیں ایک عدد انگیٹھی بھی پڑی تھی جس پر نرم و ملائم کمبل بھی رکھا ہوا تھا۔

میں نے پہلی دفعہ کمرے کا بھرپور انداز میں جائزہ لیا۔ شہناز نے اس کمرے کو اپنے ذوق کے مطابق آراستہ کیا ہوا تھا۔ کھڑکیوں پر ہلکے آسمانی رنگ کے پردے تھے۔ کمرے کی دیواریں ہلکی نیلی تھیں۔

غنی باہر کوریڈور میں کھڑا تھا۔ باہر شدید سردی تھی۔ میں نے آواز دے کر غنی کو بھی اندر بلا لیا، پھر مجھے بشریٰ یاد آئی۔ میں نے غنی سے پوچھا۔ ''غنی! بشریٰ چلی گئی؟''

''جی سر! وہ تو اسی وقت چلی گئی تھی۔ میں نے احمد شاہ کو اس کے پیچھے بھیجا تھا۔ مجھے خود بھی یہ تجسس تھا کہ وہ اتنی رات کو

کہاں جائے گی اور کیسے جائے گی۔ اس کے پاس گاڑی تو تھی نہیں۔ مجھ سے تو وہ یہ کہہ کر نکلی تھی کہ میں ذرا باہر چہل قدمی کروں گی۔ وہ باہر نکلی تو فوراً ہی احمد شاہ باہر نکلا۔ باہر بھی دور دور تک طاقت ور سرچ لائٹس کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ پیدل ہی جی ٹی روڈ کی طرف روانہ ہوگئی۔ وہ مشکل سے ایک کلومیٹر چلی ہوگی کہ مخالف سمت سے ایک پرانی جیپ اس کے نزدیک پہنچ کر رک گئی۔ جیپ کے ہیڈ لیمپس آف تھے اس لیے احمد شاہ کو بھی وہ جیپ اس وقت دکھائی دی جب وہ حویلی کی سرچ لائٹس کی روشنی میں آگئی۔ اس سے پہلے کہ احمد شاہ کچھ اور سوچتا، بشریٰ جیپ میں سوار ہوئی اور روانہ ہوگئی۔ احمد شاہ ہاتھ ملتا رہ گیا۔ اس نے جیپ کا نمبر نوٹ کرلیا ہے۔"

"وہ نمبر یقیناً جعلی ہوگا یا پھر جیپ چوری کی ہوگی۔" میں نے کہا۔ "یار راجا! میں سوچ رہا ہوں کہ اپنے علاقوں میں باؤنڈری وال کھنچوا لوں اور جی ٹی روڈ سے جو سڑک ہماری حویلی کی طرف مڑتی ہے، اس پر وہیں ایک چیک پوسٹ بنا دوں۔"

"یہ بات تو غنی کب سے کہہ رہا ہے۔" راجا نے کہا۔ "ابھی تو یہ سوچ کہ وہ جیپ کس کی تھی اور بشریٰ یہاں کیوں آئی تھی؟ تو بھی بہت ہمدرد دواخانہ بنا ہوا ہے۔" راجا نے منہ بنا کر کہا۔ "وہ بھی صرف لڑکیوں اور عورتوں کے لیے۔ تو تو اخبار میں ایک اشتہار دے دے کہ اگر کوئی پرکشش خاتون (عمر اٹھائیس سے پینتیس سال کے درمیان) یا لڑکی (لڑکی کا خوبصورت اور پرکشش ہونا ضروری ہے۔ عمر، اٹھارہ سے پچیس کے درمیان) کسی مصیبت یا پریشانی میں مبتلا ہو تو نواب رفیق احمد شیرازی آف ست بدھائی سے رجوع کرے۔"

"الو کے پٹھے!" میں نے جھنجلا کر کہا۔ "بکواس ہی کیے جائے گا یا کوئی کام کی بات بھی کرے گا؟"

"اب کیا کام کی بات لیکے پتر! وہ جو بیچتے تھے دوائے دل، وہ دکان اپنی بڑھا گئے۔ میں بھی اب تجھے شعروں اور مصرعوں کی مار ماروں گا۔" پھر وہ غنی سے بولا۔ "تم ابھی اس کمرے کی اور ان تمام جگہوں کی تلاشی لو جہاں جہاں بشریٰ گئی ہو، خاص طور پر یہ دیکھو کہ اس نے کہیں کوئی ڈکٹا فون یا پھر کوئی ایسی ڈیوائس تو نہیں چھپا دی جس کے ذریعے ہماری ساری باتیں کہیں اور سنی جاسکیں۔"

"صوبیدار میجر صاحب کے پاس ایک الیکٹرانک ڈیوائس ہے جس کے ذریعے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ وہاں کوئی ڈیوائس، کوئی سیل فون یا وائرلیس وغیرہ موجود ہے یا نہیں۔"

پھر وہ جھجک کر بولا۔ "سر! وہ صوبیدار میجر صاحب اس وقت آرام کر رہے ہوں گے۔"

"کوئی پرابلم نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "تم انہیں اٹھا دو۔ ہم اس کے لیے صبح تک انتظار نہیں کرسکتے۔"

غنی کے جانے کے بعد ریشم وہاں آگئی۔ میں اسے اتنی رات کو وہاں دیکھ کر حیران ہوا۔ وہ سادگی سے بولی۔ "صاحب جی آپ، یہاں؟ خیریت تو ہے؟"

"ہاں خیریت ہے۔ اپنے یہ مہاراجا صاحب، ڈاکٹر صاحبہ سے ملنے آئے تھے۔ تم ایسا کرو کہ......"

"کافی لے آؤں؟" ریشم نے ہنس کر میرا جملہ مکمل کر دیا۔

"واہ!" میں نے بے ساختہ کہا۔ "یار، تم تو اب میرا ذہن بھی پڑھنے لگی ہو۔ کافی ذرا جلدی لے آؤ۔ ہاں، چار کپ کافی بنانا کیونکہ نور بھی ڈاکٹر صاحبہ کے پاس ہیں۔"

ریشم تیزی سے باہر نکل گئی۔ وہ تھوڑی دیر میں گرما گرم مہکتی ہوئی کافی لے کر آگئی۔

ڈاکٹر شہناز اور نور بھی واپس آگئی تھی۔ کافی دیکھ کر شہناز بھی خوش ہوگئی۔

"کیا حال ہے رابعہ کا؟" میں نے پوچھا۔

"اسے نمونیا کا اٹیک ہوا ہے۔" شہناز نے کہا۔ "لیکن اب حالت خطرے سے باہر ہے۔ اسے شدید سردی کی وجہ سے نمونیا ہوگیا ہے۔"

"تو اسے ہم دوبارہ تہ خانے میں لے جائیں؟" میں نے پوچھا۔

"خبردار!" شہناز نے سنجیدگی سے کہا۔ "وہ اب تمہاری قیدی نہیں بلکہ میری مریض ہے۔ اب تو میری اجازت کے بغیر اسے لے جانا تو دور کی بات، تم اس سے مل بھی نہیں سکتے۔"

"اب بولو؟" راجا مجھ سے بولا۔ "شہناز تیری بھابی بعد میں ہے لیکے پتر! وہ ایک ڈاکٹر پہلے ہے۔ اس سے پہلے لاہور کے ایک اسپتال میں جہاں اس کے مریض کو پے منٹ نہ ہونے کے سبب لان میں ڈالنے کا کہہ دیا تھا مگر شہناز تو ہتھے سے اکھڑ گئی۔ اس نے کہا کہ کوئی میرے مریض کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ رقم کے لین دین کا معاملہ آپ لوگ نمٹائیں لیکن مریض کو نہ چھیڑیں۔"

"پھر شہناز کو تو معطل کر دیا گیا ہوگا؟" میں نے کہا۔

"معطل!" راجا ہنس کر بولا۔ "ہاں، معطل ضرور کیا گیا تھا لیکن اسپتال کے ایڈمنسٹریٹر کو! ان کی برادری میں

بہت ایکا ہے لیکے پتر! جب سے میڈیا اتنا فاسٹ ہوا ہے، کوئی بھی ڈاکٹروں اور وکیلوں کو چھیڑتے ہوئے ڈرتا ہے۔"

"بس اب تم لوگ جاؤ۔" شہناز نے کہا۔ "تم تو یوں بیٹھے ہوئے ہو جیسے پہلی ڈلیوری کے وقت لڑکی کا شوہر اور دیور وغیرہ بیٹھے ہوتے ہیں۔"

"ڈاکٹر صاحبہ! آپ کا روئے سخن راجا کی طرف ہے نا؟" میں نے پوچھا۔

ڈاکٹر شہناز جھینپ کر رہ گئی۔ پھر آہستہ سے بولی۔ "تم دونوں ہی اداس لگڑبگوں کی طرح بیٹھے ہو۔"

"محترمہ ماہ نور صاحبہ!" میں نے کہا۔ "آپ سن رہی ہیں کہ ڈاکٹر صاحبہ کیا ارشاد فرما رہی ہیں؟"

"ڈاکٹر ٹھیک تو کہہ رہی ہیں۔ یہ تو دوسروں کی بیویوں کو سنبھال لیں گی، پریشانی یہ ہے کہ ایسا موقع آیا تو انہیں کون سنبھالے گا؟"

اس مرتبہ شہناز کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ وہ جھینپ کر ماہ نور سے بولی۔ "رفیق کی صحبت میں رہ کر تم بھی بہت بولنے لگی ہو۔"

"میرا خیال ہے اب اٹھنا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "ورنہ ڈاکٹر صاحبہ ہمیں سیکیورٹی کے ذریعے باہر پھنکوا دیں گی۔"

"نہیں بھئی!" شہناز نے کہا۔ "میں تو رات کو یہاں بور ہی ہوتی ہوں۔ تم لوگوں کے یہاں بیٹھنے سے مجھے تو فائدہ ہی ہوگا۔"

کافی پینے کے بعد بھی ہم لوگ کافی دیر تک وہاں بیٹھے رہے، پھر جب نور کو نیند کے جھونکے آنے لگے تو ہم لوگ وہاں سے اٹھ گئے۔

اگلی صبح میں نے غنی سے پوچھا کہ رات کی تلاش میں کچھ ملا یا نہیں؟

"نو سر!" غنی نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ویسے صوبیدار میجر صاحب نے کہا ہے کہ آج ان راستوں کی بھی تلاشی لیں گے جہاں سے بشریٰ گزری ہوگی۔"

صوبیدار میجر صاحب اور غنی کی یہ تلاش بھی بے ثمر رہی۔ انہیں کچھ بھی نہیں ملا۔ میں بشریٰ کو بے قصور سمجھ لیتا لیکن بار بار مجھے اس جیپ کا خیال آجاتا تھا جو بشریٰ کو لے کر وہاں سے گئی۔ ایسا لگتا تھا جیسے جیپ والوں کو پہلے ہی سے خبر ہو کہ بشریٰ حویلی سے نکل کر جی ٹی روڈ کی طرف آرہی ہے۔ میرے پوچھنے پر غنی اور سرور، دونوں نے یہ کہا کہ ہم نے بشریٰ کی تلاشی نہیں لی تھی۔

"وہ عورت تھی اس لیے ہم نے تھوڑی سی رعایت دے دی۔" سرور نے کہا۔ "میں تو اس کے باوجود اس کی تلاشی لے ہی لیتا لیکن اچانک ہی اسے حویلی کا مہمان بنا دیا گیا۔"

"یقینی طور پر اس کے پاس سیل فون ہوگا۔" غنی نے کہا۔ "اس نے حویلی چھوڑنے سے پہلے اپنے ہمدردوں کو فون کر دیا ہوگا کہ میں یہاں سے نکل رہی ہوں، گاڑی لے کر آجاؤ۔"

پھر دو دن یونہی گزر گئے۔ میرا زخم اب کافی ٹھیک ہوگیا تھا۔ رابعہ کی حالت بھی اب کافی بہتر تھی۔ وہ شہناز کو دیکھ کر خوش بھی ہوئی تھی اور پریشان بھی۔ راجا کی ہدایت کے مطابق شہناز نے بھی اس سے دلاور، شاکر اور دوسرے ہمدردوں کے بارے میں پوچھا لیکن رابعہ نے اسے بھی بڑی خوبصورتی سے ٹال دیا۔

مجھے دیکھ کر پھر اس نے وہی راگ الاپنا شروع کر دیا کہ میں تمہیں بچپن سے چاہتی ہوں۔ تمہارا نام لے کر جیتی ہوں، تمہارا نام لے کر مرتی ہوں، وغیرہ وغیرہ۔

میں نے اسے دھمکا دیا کہ اگر تم نے اب بھی زبان نہ کھولی، تو میں تمہارا وہ حشر کروں گا جو تم نے سنا بھی نہ ہوگا۔

"تم مجھے ایک ہی دفعہ اپنے ہاتھوں سے گولی مار دو رفیق!" وہ مجھ سے کہتی تو مجھے ایسا لگتا جیسے وہ مجھے چڑا رہی ہو۔

ان ہی دنوں دہشت گردی کا ایک بڑا واقعہ ہوا۔ دہشت گردوں نے پشاور کے ایک بھرے پرے بازار میں بم بلاسٹ کر دیا۔ ریموٹ کنٹرول بم تھا اور خاصا طاقتور بھی۔ نتیجے میں ستر کے قریب بے گناہ افراد جاں بحق اور دو سو سے زیادہ زخمی ہوگئے۔ ابھی اس دھماکے کی بازگشت فضاؤں میں تھی کہ دہشت گردوں نے کراچی کے ایک بڑے اجتماع میں دھماکا کر دیا۔ بے شمار کارکن اور عام شہری جاں بحق ہوگئے۔ زخمی ہونے والوں کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔

حکومت نے بوکھلا کر الیکشن غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی کر دیے۔ مجھے اس خبر سے مایوسی ہوئی۔ میں تو سوچ رہا تھا کہ الیکشن سے فارغ ہو کر لندن کا ایک چکر لگاؤں گا اور وہاں کچھ دن آرام کروں گا۔ اس دن میں دیر تک سوتا رہا۔ میری آنکھ کھلی تو حویلی میں عجیب سراسیمگی تھی۔ میں دریافت حال کے لیے باہر آیا تو معلوم ہوا کہ رابعہ اپنے بیڈ سے غائب ہے۔

میں نے غنی اور سرور کو بلا لیا اور سخت لہجے میں ان سے

پوچھا۔ ''اتنے سیکیورٹی گارڈز اور فول پروف انتظامات کے باوجود رابعہ حویلی سے کیسے نکل گئی؟''

ان دونوں کے پاس میری بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

''دو تین گاڑیاں لے کر ابھی مختلف سمتوں میں جاؤ اور اسے تلاش کرو۔ وہ ابھی زیادہ دور نہیں گئی ہوگی۔'' میں نے شہلا سے پوچھا۔ ''ڈاکٹر شہلا! آپ نے رابعہ کو آخری بار کس وقت دیکھا تھا؟''

''ڈاکٹر ٹینا نو بجے ڈیوٹی آف کر کے گئی تھیں۔ میں بھی اسی وقت اسپتال پہنچی تھی۔ اس وقت تک رابعہ موجود تھی۔ ساڑھے نو بجے کے قریب شہناز باجی نے اسپتال کا راؤنڈ لگایا تھا۔ میں بھی ان کے ساتھ تھی۔ اس وقت بھی رابعہ موجود تھی۔''

اچانک میں نے سوچا، کہیں ایسا تو نہیں کہ رابعہ حویلی میں ہی کہیں چھپ کر بیٹھ گئی ہو؟ وہ تو حویلی کے کونے کونے سے واقف تھی، یہاں برسوں رہی تھی۔

میں نے احمد شاہ کو بلایا اور اس سے کہا کہ تم حویلی کا ایک ایک کونا دیکھ لو۔ ممکن ہے رابعہ کہیں دبکی بیٹھی ہو۔

''فضول ہے۔'' ڈاکٹر شہناز نے کہا۔ وہ اسی وقت وہاں پہنچی تھی۔ ''ساڑھے نو، پونے دس بجے تک او پی ڈی شروع ہوتی ہے۔ مردوں کو ڈاکٹر حسن دیکھتے ہیں، عورتوں کو میں اور شہلا یا ٹینا دیکھتے ہیں۔ او پی ڈی کے لیے آنے والی ایک عورت نے بتایا کہ اسپتال کی ایک مریضہ نے اس سے اس کی چادر مانگی تھی۔ اس کی چادر بوسیدہ تھی، اس کے بدلے میں مریضہ نے اسے بہت اچھی اور قیمتی شال دی تھی۔ اسے بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ اسے اعتراض صرف اس کے بیڈ پر لیٹنے پر تھا لیکن نئی شال اور کچھ نقد رقم لے کر وہ شال اوڑھ کر رابعہ کے بیڈ پر لیٹ گئی۔ رابعہ اس کا بوسیدہ دوپٹا اوڑھ کر حویلی سے نکل گئی۔''

''تو کیا اس گیٹ پر گارڈز نہیں ہیں جہاں سے اسپتال کے لیے مریض اندر آتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''اس سوال کا جواب تو تمہیں غنی ہی دے سکتا ہے۔'' شہناز نے کہا۔

مجھے لگ رہا تھا کہ اب ساری بھاگ دوڑ، سب تلاش بے سود ہے۔ رابعہ اب تک جانے کہاں پہنچی ہوگی۔

''راجا کہاں ہے؟'' میں نے شہناز سے پوچھا۔

''مجھے وہ صبح سے نظر نہیں آیا۔'' شہناز نے کہا۔

''راجا صاحب! ابھی ابھی باہر گئے ہیں۔'' نیلم نے جواب دیا۔

''وہ گاڑی لے کر گئے ہیں یا......''

''وہ گاڑی لے کر گئے ہیں صاحب جی!'' نیلم نے کہا۔

میں واپس اپنے کمرے میں آگیا۔ اس کم بخت رابعہ کی وجہ سے موڈ خراب ہوگیا تھا۔

نور ابھی باتھ روم میں تھی۔ اسے ابھی تک رابعہ کے فرار کا علم نہیں تھا۔

میں اپنے کمرے میں پہنچا تو نور بھی وہیں آگئی اور بولی۔ ''کیا بات ہے رفیق! تم کچھ پریشان نظر آرہے ہو؟''

''یہ پریشانیاں تو میرا مقدر ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ایک پریشانی ختم نہیں ہوتی کہ دوسری کھڑی ہوجاتی ہے۔''

''آخر ہوا کیا ہے جان؟'' اس نے اپنے مخصوص انداز میں پوچھا۔

''وہ تمہاری چہیتی رابعہ صاحبہ فرار ہوگئی ہیں۔'' میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔

نور اچھل پڑی۔ ''وہاٹ! رابعہ فرار ہوگئی؟'' اس نے تقریباً چیخ کر کہا۔ ''لیکن کیسے؟''

میں نے مختصراً اسے بتایا کہ رابعہ کیسے فرار ہوئی۔

وہ مزید کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اس کے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے سیل فون کی اسکرین پر نظر ڈالی اور چونک کر بولی۔ ''سوشی! یہ مجھے کیوں کال کر رہی ہے؟'' اس نے ریسیور کان سے لگانے کے بعد کہا۔ ''ہیلو سوشی! کیسی ہو؟ ...... اچھا کب؟...... بھئی تم ہی اسے ڈیل کرلو...... اچھا...... اور...... کب...... کب چاہیے اسے...... ایک ہفتے کے اندر اندر...... ہاں...... بھئی آئی ایم سوری...... مجھے بتانا یاد نہیں رہا۔ ہاں، لارڈ رفیق کا سیل نمبر بدل گیا ہے، ہاں نیا نمبر لکھو...... وہاں تو ابھی رات ہوگی، میرا مطلب ہے کہ ابھی سورج نہیں نکلا ہوگا۔ تم کہاں سے بول رہی ہو؟...... ارے بھئی، آج تو میں کسی بھی حالت میں نہیں پہنچ سکتی...... ہاں لارڈ رفیق کا سیل نمبر لکھو......'' اس نے سیل نمبر لکھوایا۔ ''تم بھی انہیں کال کرلو۔ میں بھی ان سے بات کرتی ہوں...... او کے، ہاں سوشی، ٹیک کیئر!'' اس نے سیل فون آف کر دیا۔

''کیا کہہ رہی تھی سوشی؟'' میں نے پوچھا۔

''کہہ رہی تھی کہ دو دن بعد مسٹر بابا کے سی ای او کے ساتھ میری میٹنگ ہے۔'' نور نے کہا۔ مسٹر بابا یورپ کی ایک معروف کمپنی تھی جو صرف دس سال کی عمر تک کے لڑکوں کے ملبوسات تیار کرتی تھی۔ وہ کمپنی نہ صرف ملبوسات بلکہ لڑکوں کے استعمال اور دلچسپی کی دوسری چیزیں بھی بناتی تھی مثلاً ٹوتھ پیسٹ، ٹوتھ برش، موزے، جوتے، کھلونے جن میں کھلونا ہتھیار اور ٹینک وغیرہ سرفہرست تھے۔ نور نے بتایا تھا کہ اگر مسٹر بابا سے ایگریمنٹ ہوجاتا ہے تو ہمارا ٹرن اوور دگنے سے بھی زیادہ ہوجائے گا۔

''تمہاری میٹنگ ہے تو تمہیں کل ہی نکلنا چاہیے۔ میں ابھی راجا یا ناصر سے بات کرتا ہوں۔ اتنے کم وقت میں لندن روانگی کے انتظامات راجا ہی کر سکتا تھا۔''

اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اسکرین پر کوئی انٹرنیشنل نمبر تھا۔ وہ یقیناً سوشی کا فون تھا۔

میں نے سیل فون کا بٹن دبا کر سیل فون کان سے لگالیا۔ ''ہیلو!'' میں نے باوقار انداز میں کہا۔

''ہیلو سر!'' سوشی کی زندگی سے بھرپور آواز سنائی دی۔ ''گڈ مارننگ، ہاؤ آر یو سر؟''

''آئی ایم فائن سوشی! میں خیریت سے ہوں۔''

''سر، وہ ارنسٹ پیلس کی فروخت کے سلسلے میں اس بروکر کی کال آئی تھی۔ اسے ایک ہفتے کے اندر اندر ارنسٹ پیلس کا قبضہ چاہیے۔''

''او کے، فکر مت کرو سوشی! میں دیکھ لوں گا۔''

''سر! پلیز ذرا میڈم نور کو سیل فون دے دیں۔''

میں نے سیل فون نور کی طرف بڑھا دیا اور خود باہر نکل گیا کیونکہ مجھے کھڑکی سے راجا کی جھلک نظر آگئی تھی۔

''راجا! تو صبح صبح کہاں غائب ہوگیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''بھاگنے والے وقت نہیں دیکھتے ٹیکے پتر! اور رابعہ تو دن دہاڑے ہماری آنکھوں میں دھول جھونک کر یہاں سے گئی ہے۔ میں غنی اور سرور سے پہلے رابعہ کی تلاش میں نکل گیا تھا لیکن یار ٹیکے! ایسا لگتا ہے جیسے اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا؟ زمین ہی کھا گئی ہو تو اچھا ہے۔''

''اچھا مٹی پا اس حرام زادی پر!'' میں نے کہا۔ ''تو نور کے لندن جانے کا بندوبست کر۔''

''خیریت؟'' راجا نے چونک کر پوچھا۔

''ہاں یار خیریت ہے۔ اصل میں کئی مہینے سے مسٹر بابا والوں سے ایک ڈیل چل رہی تھی۔ ان کے سی ای او نے پرسوں میٹنگ کے لیے کہا ہے۔''

''پرسوں میں تو ابھی بہت وقت ہے ٹیکے پتر! پرابلم تو کل کی ہے...... کل ہونہ ہو؟''

''اچھا، یہ شاعری کی بیماری آپ کو بھی لگ گئی۔'' نور نے پوچھا۔

''اسے بیماری کہہ کر میرے دوست کی توہین مت کرو، نادان لڑکی!'' راجا نے کہا۔

''او بھائی ظل الٰہی!'' میں نے کہا۔ ''تو نور کی سیٹ ہی کنفرم کرالے۔''

''تو اس کی فکر مت کر۔ آج کل قومی ایئرلائن کے ایک بڑے افسر کی گوٹ پھنسی ہوئی ہے۔ اس کے تو ایک اشارے پر ایک سیٹ کیا، پورا جہاز مل جائے۔''

''تو جہاز کو چھوڑ!'' میں نے کہا۔ ''تو صرف ایک سیٹ کا بندوبست کردے۔''

''ہوجائے گا بچہ!'' راجا نے کہا اور نور سے بولا۔ ''رابعہ کے سوگ میں کھانا پینا بھی چھوڑ دیا تم لوگوں نے؟''

''میں نے ریشم سے ناشتا لگانے کو کہہ دیا ہے۔'' نور نے کہا۔

شام تک ناصر بھی آگیا۔ اسے رابعہ کے فرار کا علم ہوا تو اسے بھی بہت افسوس ہوا۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے آیا تھا۔ ابھی تھوڑی دیر بعد اسے لاہور جانا تھا۔ راجا نے نور کی لندن کی سیٹ کنفرم کرادی تھی۔ وہ بھی شاپنگ کے لیے لاہور جانا چاہ رہی تھی۔

میں نے اس سے کہا۔ ''تمہیں کچھ خریداری ہی کرنا ہے تو تم پنڈی اور اسلام آباد سے بھی کرسکتی ہو۔''

''لیکن اسلام آباد میں چیزیں بہت مہنگی ملتی ہیں۔''

''اب تم نواب شیرازی آف ست بدھائی اور لارڈ رفیق کی ہونے والی بیگم ہو۔ تم تو ایسی گھٹیا بات مت کرو۔''

''وہ اصل میں مجھے داتا دربار بھی جانا ہے۔'' نور نے کہا اور میری طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہی ہو اب بولو، داتا دربار تو پنڈی یا اسلام آباد میں نہیں ہے۔

''او کے!'' میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ ''ہم لاہور ہی چلیں گے بلکہ ابھی لاہور کے لیے نکل لیتے ہیں۔ ناصر صاحب بھی لاہور جارہے ہیں۔ ان کے ساتھ ہی چلتے ہیں۔''

ہم لوگ ٹھیک سات بج کر پانچ منٹ پر حویلی سے نکلے۔ میرے پیچھے گارڈز کی ڈبل کیبن پک اپ تھی۔ گارڈز کے تیور بتا رہے تھے کہ اس دفعہ وہ کسی کا ذرہ برابر لحاظ کرنے کے موڈ میں نہیں ہیں۔

میری گاڑی حسبِ سابق غنی ڈرائیو کر رہا تھا۔

ہم بہ خیر و عافیت لاہور پہنچ گئے۔ غنی نے فلیٹس میں کمرے پہلے ہی بک کرالیے تھے۔ سردی اس دن بھی بہت

زیادہ تھی لیکن نور بضد تھی کہ رات کا کھانا ہم باہر کھائیں۔

ہوٹل میں اپنا سوٹ کیس رکھنے کے بعد ہم لوگ پھر نکل کھڑے ہوئے۔ نور بہت دن کے بعد باہر نکلی تھی اس لیے بچوں کی طرح خوش تھی۔ میں نے غنی سے شملہ پہاڑی چلنے کو کہا۔ غنی نے مہارت سے ٹریفک کے رش میں جگہ بنائی اور گاڑی کا رخ لاہور ریلوے اسٹیشن کی طرف موڑ دیا۔ وہ گڑھی شاہو کا چکر کاٹ کر اسٹیشن سے شملہ پہاڑی کی طرف مڑ گیا۔

میں نے وہیں گاڑی رکوائی اور وہاں واقع ایک اوپن ایر ریسٹورنٹ کی طرف بڑھا۔ ایسے موقعوں پر غنی ہمارے ساتھ نہیں بیٹھتا تھا۔ وہ دور رہ کر نگرانی کرتا تھا۔ میں نے غنی سے کہہ دیا تھا کہ وہ خود بھی کھانا کھالے اور دوسرے گارڈز کو بھی کھلا دے۔ غنی اس دفعہ کسی بھی قسم کا کوئی رسک نہیں لینا چاہتا تھا۔ میرے لاکھ منع کرنے کے باوجود نہ صرف گارڈز کی ویگن میرے ساتھ ست بدھائی سے لاہور آئی تھی بلکہ اب بھی وہ میرے پیچھے پیچھے تھی۔

میں نے چکن لیور، بروسٹ اور تندوری نان کا آرڈر دیا۔ نور نے خالص لاہوری ڈش چرغا کا آرڈر دیا۔

ابھی ہم نے کھانا شروع ہی کیا تھا کہ ریسٹورنٹ میں تین آدمی داخل ہوئے۔ وہ چہروں سے کوئی اچھے آدمی نہیں لگ رہے تھے۔ ان میں سے ایک بہتر حلیے میں تھا، باقی دو تو بالکل سڑک چھاپ بدمعاش لگ رہے تھے۔ ان لوگوں نے میلی کچیلی جینز اور ٹی شرٹ پہن رکھی تھی۔ پیروں میں جوگرز تھے۔ دو بدمعاشوں کے ہاتھوں میں کڑے تھے اور بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے۔

تیسرا آدمی بے داغ شلوار قمیص میں ملبوس تھا۔ اس نے پیروں میں بہت نفیس چمڑے کے جوتے پہن رکھے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ دونوں بدمعاش اسے اغوا کر کے لائے ہوں۔

چند منٹ بعد ہی مجھے اپنا خیال بدلنا پڑا۔ خوش پوش آدمی سیل فون پر کسی سے بات کر رہا تھا۔ اچانک وہ درشت لہجے میں بولا۔ ''بکواس کیے جائے گا یا میری بات بھی سنے گا؟...... میں اب تجھے یا تیرے باس کو زیادہ مہلت نہیں دوں گا۔ بس تیرے پاس آج کی رات ہے۔ تو نے بندوبست کر لیا تو تیری خوش قسمتی ہوگی ورنہ شاکر کے ساتھ دھوکے بازی کرنے والے زیادہ دیر زندہ نہیں رہتے۔'' اس نے سیل فون آف کر کے جیب میں ڈال لیا۔

میرے کانوں میں ایک ہی نام گونج رہا تھا۔ شاکر...... شاکر! تو گویا وہ شاکر تھا۔ میں نے دوسری مرتبہ بہت غور سے اس کا جائزہ لیا۔ وہ اپنے حلیے، چہرے مہرے اور حرکات وسکنات سے واقعی کوئی بڑا بدمعاش لگ رہا تھا۔ ایسا بدمعاش جو دوسرے لوگوں کو کیڑے مکوڑے سمجھتا ہو۔

''کھانا کیوں نہیں کھا رہے؟'' نور نے مجھے ٹوک دیا۔

''ہاں...... کھا تو رہا ہوں۔'' میں دل پر جبر کر کے پھر کھانے میں مصروف ہو گیا۔

میں نے چند لقمے لے کر ہاتھ روک لیا۔ نور نے پھر سوالیہ انداز میں مجھے دیکھا۔ ''کیا ہوا رفیق! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' میں نے کہا۔ پھر اشارے سے غنی کو اپنے پاس بلایا اور کہا۔ ''نور کھانے سے فارغ ہو جائے تو اسے لے کر گاڑی میں بیٹھ جانا۔''

غنی بھی میرے لہجے پر چونک اٹھا۔ ''سر! کوئی خاص بات؟''

''کوئی خاص بات نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''بس، مجھے یہاں شاکر نظر آ گیا ہے۔''

''شاکر؟'' غنی نے حیرت سے دہرایا۔ ''اچھا...... شاکر! وہ دلاور کا خاص آدمی۔''

''ہاں وہی!'' میں نے کہا۔ ''میں اسے اپنی میز پر بلاؤں گا۔''

''میں کہیں نہیں جاؤں گی۔'' نور بچوں کی طرح ٹھنک کر بولی۔ ''تمہیں اس سے جو بھی بات کرنا ہے، میرے سامنے کر لو۔''

''سمجھا کرو جان!'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ''شاکر جیسے بدمعاش عورتوں کا بہت احترام کرتے ہیں اس لیے ان کے سامنے کھل کر بات بھی نہیں کرتے۔ پھر میں تمہارے سامنے ہی تو رہوں گا۔''

بہ مشکل تمام میں نے نور کو گاڑی میں بیٹھنے پر راضی کیا۔

وہ گاڑی میں بیٹھی تو ایک گارڈ اس کے ساتھ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ غنی بھی بہت مستعد انداز میں اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

میں نے ویٹر کو بلا کر بل ادا کیا اور اس سے کہا۔ ''وہ جو سفید شلوار قمیص میں صاحب بیٹھے ہیں، ان سے کہنا کہ میں انہیں بلا رہا ہوں۔''

''صاحب، آپ...... آپ ان صاحب کو بلا رہے ہیں؟'' ویٹر نے حیرت سے پوچھا۔ ''آپ جانتے ہیں، وہ کون ہیں؟''

''ارے جانتا ہوں جبھی تو بلا رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''وہ شاکر ہے۔''

ویٹر نے پھر چونک کر مجھے دیکھا۔ وہ شاید شاکر کو پہچانتا تھا اور سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس معقول آدمی اور اس بدمعاش کا کیا تعلق؟ پھر وہ سر جھٹک کر شاکر کی طرف بڑھ گیا۔

میری نظریں ویٹر کا تعاقب کر رہی تھیں۔ وہ شاکر کے پاس پہنچا اور جھک کر سہمے ہوئے انداز میں اس سے کچھ کہا۔ شاکر نے پہلے تو اسے گھور کر دیکھا۔ پھر اس نے اور اس کے دونوں چمچوں نے گھوم کر مجھے دیکھا۔ ان تینوں کے چہروں پر الجھن اور جھنجلاہٹ کے تاثرات تھے۔ شاکر نے منہ بگاڑ کر ویٹر سے کچھ کہا تو وہ سر ہلا کر وہاں سے چلا گیا۔

شاکر کا ایک چمچہ اٹھا اور میری طرف بڑھا۔ میں بے نیازی سے دوسری طرف دیکھنے لگا۔ وہ میرے نزدیک آ کر بولا۔ ''جی فرمایے؟''

میں نے سر سے پاؤں تک اسے دیکھا، پھر سرد لہجے میں بولا۔ ''آپ فرمائیے کیسے زحمت کی؟''

وہ کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''آپ نے مجھے بلایا تھا؟''

''آپ کو؟'' میں نے سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لیا۔ ''میں نے تو آپ کو نہیں بلایا۔''

''تم نے شاکر بھائی کو نہیں بلایا؟'' وہ آپ سے تم پر آ گیا۔

''ہاں، لیکن تم شاکر تو نہیں ہو؟'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''اب یہاں سے اٹھو اور چلتے پھرتے نظر آؤ۔''

وہ اپنے خیال میں مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس حالت میں وہ مزید مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔

''او بھائی! میں ڈر گیا۔'' میں نے تحقیر آمیز انداز میں کہا۔ ''اب ذرا شاکر کو بھیج دو۔'' پھر میں طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''تمہیں یاد ہے، تم آخری دفعہ کب نہائے تھے؟''

اس کا سیاہ چہرہ مزید سیاہ پڑ گیا۔ ''میں شاکر بھائی کی وجہ سے رعایت کر رہا ہوں اور تو سر پر چڑھا جا رہا ہے!'' چمچے نے غرا کر کہا۔ اس نے اب تم سے مجھے تو بنا دیا تھا۔

میں کسی شاعر کا محبوب تو نہیں کہ آپ تھے پھر تم ہوئے پھر تو کا عنواں ہو گئے۔ میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''شٹ اپ، دفع ہو جاؤ یہاں سے۔''

''تو شاید مجھے جانتا نہیں ہے؟''

''گیٹ لاسٹ!'' میں نے ڈپٹ کر کہا۔

اس کے چہرے پر مجھے شدید غصے کے تاثرات دکھائی دیے۔ اس عالم میں اس کا چہرہ مزید مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔

وہاں بیٹھے ہوئے لوگ مڑ مڑ کر مجھے دیکھنے لگے۔

اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا، شاکر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ دوسرا چمچہ بھی اس کے ساتھ ہی اٹھا تھا۔ ریستوران میں موجود لوگ کسی متوقع ہنگامے کے پیش نظر وہاں سے اٹھنے لگے۔ شاید وہاں اکثر لوگ شاکر کو پہچانتے تھے۔ میں اسی طرح بے نیازی سے بیٹھا رہا۔ شاکر نپے تلے قدم اٹھاتا ہوا میرے نزدیک پہنچ گیا۔

''او میاں! تو کیا اپنی زندگی سے بیزار ہو گیا ہے؟'' شاکر نے تحقیر آمیز لہجے میں پوچھا۔ اس کی آواز بھاری اور لہجہ صاف تھا۔ چمچے کے برعکس وہ خاصا بارعب آدمی تھا۔ اس کا ذوق بھی اچھا تھا۔ اس نے رولیکس کی انتہائی قیمتی گھڑی باندھ رکھی تھی، پرفیوم بھی خاصا قیمتی استعمال کیا تھا۔

میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''میں تو اپنی زندگی سے اسی روز بیزار ہو گیا تھا۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تھا۔ تم بیٹھو، کھڑے کیوں ہو؟''

''تم شاید مجھے جانتے نہیں ہو؟'' اس مرتبہ اس کا لہجہ قدرے نرم تھا۔

''میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں شاکر!'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ میں نے اسے چونکتے دیکھا۔ ''ورنہ میں تمہیں یہاں نہ بلواتا۔''

''کون ہو تم؟'' شاکر نے مشتبہ انداز میں مجھے دیکھا۔

''اپنے ان چمچوں سے کہو کہ وہ واپس اپنی جگہ پر جائیں۔'' میں نے کہا۔

شاکر نے چند لمحے غور کیا، پھر چمچوں کو واپس جانے کا اشارہ کر دیا۔ ''ہاں، اب بولو!'' شاکر نے کہا۔

''کیا تم واقعی مجھے نہیں پہچانتے؟'' میں نے پوچھا۔

''اگر پہچانتا ہوتا تو کام کی بات کرتا۔'' شاکر نے جواب دیا۔

''حیرت ہے؟'' میں نے کہا۔ ''تم تو مجھ سے ملنے کے لیے بے تاب تھے اور اب پہچان بھی نہیں رہے ہو؟ میں ہوں نواب رفیق احمد شیرازی آف ست بدھائی!'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''اوہو، نواب صاحب!'' شاکر نے چونک کر کہا۔ ''ست بدھائی کے نواب رفیق احمد شیرازی آپ ہیں؟''

''اب تک تو میں ہی ہوں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''تم شاید یہ سمجھ رہے ہو گے کہ نواب صاحب شلوار قمیص اور شیروانی میں ملبوس ہوں گے، سر پر قراقلی ٹوپی یا کلف دار اونچے شملے والی پگڑی ہوگی اور ان کی عمر پچاس سال سے زیادہ ہوگی؟''

''ہاں، میں کچھ ایسا ہی سوچ رہا تھا۔ آپ......تو......''

''کہیں سے بھی نواب نہیں لگتے؟'' میں نے اس کا جملہ پورا کر دیا۔ ''اب یہ بھی بتا دو کہ تم مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟''

''میں نہیں جانتا کہ آپ میری بات کا یقین کریں گے یا نہیں؟'' وہ تذبذب کے عالم میں بولا۔

''ایسی کیا بات ہے؟''

''بات کچھ ایسی ہی ہے نواب صاحب!'' شاکر نے کہا۔

میں خاموشی سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔

اس نے اردگرد دیکھا، پھر بولا۔ ''یہ جگہ بھی کچھ مناسب نہیں ہے اگر آپ......''

''جو کچھ کہنا ہے یہیں کہہ ڈالو۔ بعد میں شاید مجھے وقت ہی نہ ملے۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

''میں دلاور کے ساتھ کام کرتا تھا۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''کام کرتے تھے؟ کیا اب نہیں کرتے؟''

''نہیں؟'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

''اچھا، تو پھر؟''

''دلاور سلحے اور منشیات کا بین الاقوامی اسمگلر تو ہے ہی، وہ بردہ فروشی اور انسانی تجارت بھی کرتا ہے۔ دو ماہ قبل میرے چھوٹے بھائی زاہد کو بھی بیرون ملک جانے کا بھوت سوار ہوا۔ اس نے بالا ہی بالا ایک ایجنٹ سے رابطہ کرلیا۔ اسے شاید یہ خدشہ تھا کہ میں اسے جانے نہیں دوں گا۔ وہ میرا اکلوتا بھائی تھا نواب صاحب! میں نے اسے باپ بن کر پالا تھا۔ اس کی ہر ضد پوری کی تھی۔ وہ بھی مجھ پر جان چھڑکتا تھا۔''

''میں اس کہانی میں کہاں فٹ ہوتا ہوں؟'' میں نے پوچھا۔

''میں اسی طرف آ رہا ہوں۔'' شاکر نے کہا۔ ''میں یہ باتیں اس لیے بتا رہا تھا کہ ان کا بھی اس کہانی سے تعلق ہے۔'' شاکر نے کہا۔ ''جو ایجنٹ زاہد کو لے جا رہا تھا اسے بھی معلوم نہیں تھا کہ زاہد میرا بھائی ہے۔ اس نے زاہد سے پانچ لاکھ روپے لیے اور اسے ایران کے ایک ایجنٹ کے حوالے کر دیا۔ اسے ایران میں یرغمال بنا لیا گیا۔ مجھے وہاں کے ایجنٹ کا فون موصول ہوا تو حقیقت کا علم ہوا۔ وہ زاہد کی رہائی کے بدلے میں دس لاکھ مانگ رہا تھا۔''

''اور یہ کام کھلے عام ہو رہا تھا؟''

''جی ہاں نواب صاحب!'' شاکر نے کہا۔ ''یہ کام کھلے عام ہوتا ہے۔ لاکھوں بلکہ کروڑوں روپے کی اس رقم میں قانون کے رکھوالوں کا حصہ بھی ہوتا ہے اس لیے ان لوگوں کو قانون کا کوئی خوف نہیں ہوتا۔ المیہ یہ تھا کہ پاکستانی ایجنٹ دلاور کا آدمی تھا۔ میں نے دلاور سے شکایت کی تو اس نے کہا کہ معاملہ میرے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔ تم فی الحال دس لاکھ روپے دے کر اپنے بھائی کو چھڑا لو، بعد میں دیکھیں گے۔ میں غصے میں پاگل ہو گیا۔ میں نے پاکستانی ایجنٹ کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس سے دلاور کا بہت زیادہ نقصان ہو گیا۔ اس نے جوابی طور پر میرے بھائی کو...... موت کی نیند سلا دیا۔''

یہ کہتے ہوئے شاکر کی آواز بھرا گئی۔ اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔

اس نے ایک گلاس پانی پیا، پھر آہستہ سے بولا۔ ''بس اس دن کے بعد سے میں نے دلاور کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ میں نے اس سے کہا کہ میں پاکستان میں تیرے ہر ٹھکانے کا نام و نشان مٹا دوں گا۔ میں جب تک اپنے ہاتھ سے تیری جان نہیں لوں گا، سکون سے مر بھی نہیں سکوں گا۔ بس اس دن کے بعد سے میں دلاور کو ہر طرح زک پہنچانے کی کوشش کرتا ہوں۔ رانا نے آپ کو نقصان پہنچانے کے لیے دلاور سے گٹھ جوڑ کر لیا ہے۔ اب تک ان دونوں کے درمیان رابطے کا ذریعہ میں ہی تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ دلاور کے رابطے کا ذریعہ بنتا ہے؟''

''اسے کسی آدمی کو درمیان میں ڈالنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ خود تو پاکستان کبھی کبھار ہی آتا ہے۔ اس قسم کے کام وہ کم ہی کرتا ہے لیکن رانا سیاست دان ہے اور آئندہ منسٹر بھی بن سکتا ہے اس لیے دلاور اسے انکار نہیں کر سکتا۔'' شاکر نے کہا۔ ''رانا ہر قیمت پر آپ کو الیکشن میں حصہ لینے سے روکنا چاہتا ہے۔''

''تم میری مدد، میری بھلائی میں نہیں بلکہ دلاور کی دشمنی میں کرنا چاہتے ہو؟'' میں نے کہا۔

''آپ کا اندازہ درست ہے۔'' شاکر نے کہا۔ ''میں

لگی لپٹی رکھے بغیر کہوں گا کہ میں دلاور کا سر کچلنا چاہتا ہوں۔ اس کا نیٹ ورک توڑنا چاہتا ہوں۔ دلاور آپ کا دشمن ہے۔ سیدھا سا اصول ہے کہ دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے۔ آپ چاہیں تو میری مدد سے انکار کر دیں لیکن رانا اور دلاور کے خلاف آپ جیسے کسی طاقت ور دوست سے مجھے بھی فائدہ ہو گا اور میری دوستی سے نقصان آپ کو بھی نہیں ہو گا۔'' شاکر نے صاف گوئی سے کہا۔

وہ اپنی گفتگو سے مجھے تعلیم یافتہ بھی لگ رہا تھا۔ میں نے اس سے یہی سوال کر لیا۔

''جی ہاں نواب صاحب!'' اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''تعلیم سے اگر آپ کی مراد ڈگریاں ہیں تو میرے پاس ایم اے اکنامکس کی ڈگری ہے لیکن اس ڈگری کا کیا فائدہ جو مجھے مجرم بنانے سے نہ روک سکی۔''

''اس ملک میں ہزاروں بلکہ لاکھوں ایسے نوجوان ہیں شاکر صاحب! جو بڑی بڑی ڈگریاں ہونے کے باوجود بے روزگاری کا عذاب بھگت رہے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ان کی سوچ منفی نہیں ہے۔ اگر وہ بھی اسی راستے پر چل نکلیں تو عام آدمی کا جینا دوبھر ہو جائے۔''

''مجھے تو حالات نے ان راہوں کا مسافر بنا دیا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے اس راستے پر چلنا پڑا۔ بہرحال، اب تو میری زندگی کا مقصد دلاور کو ختم کرنا ہے۔'' شاکر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''آپ ایسا کریں، ست بدھائی آ جائیں۔'' میں نے اسے ٹالنے کو کہا۔ میں راجا اور ناصر سے مشورہ بھی کرنا چاہتا تھا۔

''میں جانتا ہوں نواب صاحب! آپ اتنی جلدی مجھ پر اعتماد نہیں کر سکتے، آپ کو کرنا بھی نہیں چاہیے۔ میں ست بدھائی بھی ضرور آؤں گا لیکن میں نے ایک بات کا فیصلہ کر لیا ہے کہ چاہے اس دنیا میں کوئی میرا ساتھ نہ دے، میں اس کے باوجود دلاور کو نہیں چھوڑوں گا۔ اب یا تو وہ نہیں، یا میں نہیں۔''

''شاکر صاحب! ایک بات بتائیں۔'' میں نے کہا۔ ''یہ دلاور آخر ہے کیا چیز؟''

''انتہائی گھٹیا اور کمینہ آدمی ہے۔'' شاکر نے کہا۔ ''چوروں، ڈاکوؤں اور بدمعاشوں کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں بلکہ اپنے کام میں وہ اس معاشرے کے شرفا سے کچھ زیادہ ہی ایمان دار ہوتے ہیں لیکن دلاور تو صرف اور صرف پیسے کا غلام ہے۔ پیسوں کی خاطر وہ اپنی ماں کا سودا بھی کر سکتا ہے۔''

''تم نے اتنے سال تک اس کے ساتھ کام کیا ہے۔ کیا تمہیں اب معلوم ہوا ہے کہ وہ اتنا کمینہ آدمی ہے؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا اور آپ سے تم پر آ گیا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، جب بھائی کے معاملے میں اس نے مجھ سے بھی آنکھیں پھیر لیں تو مجھے اس کے کمینے پن کا احساس ہوا۔ وہ چاہتا تو میرے بھائی کی زندگی بچ سکتی تھی لیکن......''

''تم اس وقت بھی تو دلاور کے لیے کام کر رہے ہو۔'' میں نے کہا۔ ''تمہارے ساتھ جتنے بھی آدمی ہیں، وہ بھی دلاور کے آدمی ہیں۔ اس سے بگاڑ کر تو تم تنہا رہ جاؤ گے۔'' میں نے کہا۔

''دلاور بھی یہی سمجھتا ہے۔'' شاکر نے کہا۔ ''لیکن ایسا ہے نہیں۔ لاہور اور پنجاب میں زیادہ تر میرے آدمی ہیں جو دلاور کو جانتے بھی نہیں۔ دلاور کے چند مخصوص آدمی ہیں۔ ان سے نمٹنا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔''

''آخری بار تم دلاور سے کب ملے تھے؟'' میں نے اسے کریدا۔

''اپنے بھائی کی موت کے بعد۔'' شاکر نے کہا۔ ''دلاور ان دنوں چند روز کے لیے پاکستان آیا تھا۔ جب میں نے اس سے اپنے بھائی زاہد کے بارے میں بات کی تو وہ مشتعل ہو گیا۔ مجھے بھی غصہ آ گیا۔ میں نے اس سے کہا کہ میرے حصے کی رقم مجھے دے دو۔ میں آج کے بعد تمہارے ساتھ کام نہیں کروں گا۔ وہ یہ سن کر آپے سے باہر ہو گیا اور مجھے کچھ بھی دینے سے انکار کر دیا۔

''میں نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ دلاور اور رانا کے بیچ میرے ہی ذریعے معاملات طے ہوتے تھے کیونکہ دلاور تو عام طور پر ملک سے باہر رہتا ہے، وہ سال میں ایک آدھ دفعہ ہی پاکستان آتا ہے۔ یہاں اس کے معاملات کی نگرانی میرے ہی ذمے تھی۔ میں نے بھی اس سے صاف صاف کہہ دیا کہ آئندہ میں تمہارے ہر کام میں رکاوٹ ڈالوں گا۔ میں تو جو کام کرتا ہوں، ڈنکے کی چوٹ پر کرتا ہوں۔'' پھر وہ چونک کر بولا۔ ''نواب صاحب! کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ مجھ سے کل مل لیں؟''

''ایسا فی الوقت نہیں ہو سکتا۔ مجھے کل ہی ست بدھائی واپس جانا ہے۔ ہاں، اگر تم چاہو تو ست بدھائی آ جاؤ۔ میں نے پہلے بھی تمہیں ست بدھائی آنے کی دعوت دی تھی لیکن تم نے قبول نہیں کی۔''

''ہاں، اس وقت بات اور تھی۔'' شاکر نے کہا۔ ''میرا آپ سے تعارف نہیں تھا، میں تمام نوابوں، جاگیرداروں کو اچھی طرح جانتا ہوں، وہ اگر کسی سے ناراض ہو جائیں تو پھر مرتے دم تک اس شخص کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ میں چاہتا تھا کہ آپ سے پہلی ملاقات حویلی سے باہر ہو۔ ہاں، اب میں ست بدھائی ضرور آؤں گا۔''

''یہ بتاؤ شاکر!'' میں نے کہا۔ ''تم رابعہ کو جانتے ہو؟''

''بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''گزشتہ دنوں لاہور ریلوے اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں فائرنگ ہوئی تھی، کچھ لوگ مارے بھی گئے تھے۔'' میں نے جان بوجھ کر ''کچھ لوگ'' کے الفاظ استعمال کیے تھے۔ ''کیا تم جانتے ہو کہ اس حملے میں کون لوگ ملوث تھے؟''

شاکر چند لمحے تک مجھے گھورتا رہا، پھر بولا۔ ''آپ یہ معلوم کر کے کیا کریں گے نواب صاحب؟''

''میں اس لیے معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اگر میری زندگی نہ ہوتی تو پولیس کو اسٹیشن کے اس ویٹنگ روم سے میری لاش ملتی۔ مجھے رابعہ نے وہاں دھوکے سے بلایا تھا۔''

''ارے! وہ آپ تھے؟'' شاکر چونک کر بولا۔ ''مجھے تو رابعہ نے کچھ نہیں بتایا تھا۔''

''تم رابعہ کو کیسے جانتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''رابعہ رانا زوہیب سے شادی کرنے والی تھی۔'' شاکر نے کہا۔ ''اس نے اور رانا زوہیب نے رابعہ کے کزن کو اغوا کرا لیا۔ اس اغوا میں رانا اور دلاور دونوں کے آدمی شامل تھے۔ رابعہ کے کزن نے پریشر میں آ کر یا خوف زدہ ہو کر اپنی پوری جاگیر رابعہ کو گفٹ کر دی لیکن وہ عین اس وقت دھوکا دے گئی جب گفٹ ڈیڈ پر مجسٹریٹ کے سامنے سائن کرنے کا موقع آیا۔ زوہیب نے ہم سب کو حکم دے دیا کہ رابعہ جہاں بھی نظر آئے زندہ یا مردہ میرے حوالے کرنا ہے۔ ہم سب اسے ڈھونڈ رہے تھے۔ رابعہ ایک دن خود ہی زوہیب کے پاس پہنچ گئی۔ پھر ان دونوں کے درمیان کیا سمجھوتا ہوا، اس کا علم نہ مجھے ہے، نہ دلاور کو یا ممکن ہے دلاور جانتا ہو۔ پھر معلوم ہوا کہ رابعہ لندن چلی گئی۔ دلاور وہیں تھا۔ پھر وہ......''

شاکر بولتے بولتے رک گیا اور غور سے مجھے دیکھنے لگا۔

پھر اچانک بولا۔ ''میری یادداشت اتنی کمزور کیسے ہو گئی۔ آپ ہی تو رابعہ کے کزن ہیں۔''

''یہ بات تمہیں اب یاد آئی ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''رابعہ کے وہ کزن آپ ہی ہیں جس نے اپنی جا[گیر] اسے گفٹ کر دی تھی؟''

''ہاں، وہ الو کا پٹھا میں ہی ہوں۔'' میں نے کہا۔

''رابعہ بہت چالاک لڑکی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اگر جاگیر لے لیتی تو اب تک زندہ نہ ہوتی۔ رانا اسے بھی [ختم] کر دیتا۔ جاگیر تو اسے مل ہی جاتی۔''

''تم نے یہ نہیں بتایا کہ ریلوے اسٹیشن والی وارد[ات] کس نے کی تھی؟''

''وہ واردات میرے ہی آدمیوں نے کی تھی۔'' شاکر نے جواب دیا۔ ''لیکن میرے آدمی مار کھا گئے۔ آپ کے گارڈ اچانک ہی وہاں پہنچ گئے تھے۔'' پھر وہ چونک کر بولا۔ ''ہاں، آپ لوگ تو رابعہ کو بھی لے گئے تھے!''

''ہاں، ہم اسے لے گئے تھے۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''پھر تم نے ماڈل ٹاؤن کی اس کوٹھی پر فائرنگ کروا[ئی] تھی یا کی تھی جس میں میرا قیام تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔'' شاکر نے کہا۔ ''اس فائرنگ کا مجھے [علم] نہیں۔ میں صرف ریلوے اسٹیشن والی واردات میں شریک تھا۔''

''ست بدھائی سے پنڈی جاتے ہوئے جی ٹی روڈ پر مجھ پر حملہ ہوا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں، وہ حملہ رانا نے اپنے آدمیوں سے کرایا تھا۔ میرا اس حملے سے بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔ رانا نے وہ حملہ اچانک ہی کرا دیا تھا۔ اس کے آدمی ان دنوں اکثر ست بدھائی کے اردگرد گھومتے رہتے تھے۔ ان ہی میں سے کسی نے رانا کو اطلاع دی کہ نواب رفیق صاحب ست بدھائی سے نکل کر جی ٹی روڈ پر آ گئے ہیں۔ رانا کو یہ بھی بتایا گیا تھا کہ نواب کے ساتھ گاڑی میں کوئی خوبصورت سی لڑکی بھی موجود ہے۔ رانا کا خیال تھا کہ وہ آپ کی بیگم ہوں گی۔ اس وقت آپ کے گارڈز بھی موجود نہیں تھے۔ اس نے آپ کی بیگم ہی کو اٹھانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ ان کے ذریعے وہ آپ سے سودے بازی کرتا اور رابعہ کو وہاں سے نکلوا لیتا۔''

''یہ بتاؤ کہ دلاور اس وقت کہاں ہے؟''

''دلاور اس وقت بھی پاکستان سے باہر ہے۔ الیکشن سے ایک مہینا پہلے آتا ہے اور ان لوگوں کی مدد کرتا ہے جو اس کی شرائط مان لیتے ہیں۔''

''شرائط مان لیتے ہیں؟'' میں نے حیرت سے

پوچھا۔

''ہاں، الیکشن میں جتوانے کے لیے دلاور پیسے تو لیتا ہی ہے، اپنی کچھ شرائط بھی اس امیدوار کے سامنے رکھتا ہے۔ ان شرائط میں مختلف محکموں کے ٹھیکے، زرعی، انڈسٹریل زمینے اور قیمتی پلاٹ شامل ہوتے ہیں۔''

''اور اگر کوئی اس کی شرائط ماننے کے بعد مکر جائے؟'' میں نے کہا۔

''اسے وہ بے رحمی سے قتل کرا دیتا ہے۔'' پھر وہ گھڑی دیکھ کر بولا۔ ''اب مجھے اجازت دیجیے۔ میں کسی وقت ست بدھائی حاضر ہو جاؤں گا۔'' پھر وہ جاتے جاتے رکا اور بولا۔ ''اپنے آدمی سے کہیے کہ اتنا نمایاں ہو کر نہ بیٹھے کہ اندھا بھی کہے کہ وہ نواب صاحب کا آدمی بیٹھا ہے اور آپ پر نظر رکھنے کے بجائے اپنے اردگرد بھی نظر رکھے۔''

''میرے آدمی نے خود کو چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس کے علاوہ مزید میرے تین گارڈز موجود ہیں۔ اب میں نے تنہا نکلنا چھوڑ دیا ہے۔'' میں نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ ''خدا حافظ!''

اس کے جانے کے بعد میں بھی گاڑی میں آ کر بیٹھ گیا۔ میں نے نور سے پوچھا۔ ''تم نے کھانا تو کھا لیا تھا نا!''

''ہاں، میں نے کھا لیا تھا لیکن تم نے ڈھنگ سے نہیں کھایا۔'' نور نے کہا۔

''میں نے بھی کھا لیا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''اب واپس چلیں؟'' میں نے نور سے پوچھا۔ اس وقت وہ بالکل بچوں کی طرح لگ رہی تھی۔

''ہاں، اب چلو۔'' اس نے گاڑی سے باہر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں اصل میں بہت دنوں بعد باہر نکلی ہوں نا!'' اس نے وضاحت کر ہی دی۔

غنی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تو میں نے اس سے کہا۔ ''راستے میں کوئی آئس کریم کی دکان آئے تو گاڑی وہاں روک لینا۔''

''آئس کریم!'' نور ہنسی لیکن بولی کچھ نہیں۔

غنی نے آئس کریم کی دکان دیکھ کر گاڑی روکی اور مجھ سے بولا۔ ''آپ گاڑی میں بیٹھیے، میں آپ کے لیے آئس کریم لے کر آتا ہوں۔''

غنی آئس کریم لینے چلا گیا۔ میں غنی ہی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اچانک گاڑی کی عقبی نشست کا دروازہ کھلا اور کوئی مجھے دھکیل کر میرے برابر میں بیٹھ گیا۔

''کیا بدتمیزی ہے یہ؟'' میں نے غرا کر پوچھا۔

''خاموشی سے بیٹھے رہو۔'' آنے والا بھی غرایا اور اس نے اپنی جیب سے سیاہ رنگ کا خوف ناک ریوالور بھی نکال لیا۔

مجھے امید تھی کہ ابھی غنی آئے گا تو ان کی ساری محنت اکارت جائے گی۔

ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھلا اور اسٹیئرنگ پر درمیانے قد اور موٹی گردن والا ایک شخص آ بیٹھا۔

نور ابھی تک صورت حال سے واقف نہیں تھی، وہ کھڑکی سے باہر ایک بچے کو دیکھ رہی تھی جو آدھی آئس کریم خود کھا رہا تھا، آدھی اپنے کپڑوں پر گرا رہا تھا۔

ڈرائیونگ سیٹ پر وہ موٹی گردن والا آ کے بیٹھا تو نور کو بھی حالات کی سنگینی کا احساس ہوا۔ پھر اس کی نظر میرے برابر بیٹھے ہوئے شخص کے ریوالور پر پڑی۔ اس کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص نے اچانک گاڑی کا انجن اسٹارٹ کر دیا۔ اس نے شاید ماسٹر کی استعمال کی تھی۔

اچانک پسنجر سیٹ کا دروازہ کھلا اور موٹا سا ایک شخص مزید گاڑی میں آ گیا۔ اس نے بیٹھتے ہی ریوالور نکال لیا اور اس کا رخ نور کی طرف کر دیا اور بولا۔ ''اگر تمہارے دل میں ہیرو بننے کا خیال بھی ہے تو اس سے باز رہنا۔ تم سے پہلے میں اس چڑیا کو گولی ماروں گا۔''

موٹی گردن والے نے اچانک گاڑی گیئر میں ڈال کر آگے بڑھا دی۔ میں نے مڑ کر پیچھے دیکھنے کی کوشش کی لیکن دیکھ نہ سکا۔

گاڑی تیز رفتاری سے ریلوے اسٹیشن کی طرف جا رہی تھی۔ اسٹیشن کے نزدیک پہنچ کر انہوں نے گاڑی روکی۔ میرا خیال تھا کہ میرے گارڈز کی گاڑی ہمارے پیچھے ہو گی لیکن وہاں کوئی گاڑی نہیں تھی۔ فوراً ہی ایک سوزوکی پک اپ گاڑی کے نزدیک آ کر کھڑی ہو گئی۔ ان لوگوں نے مجھے اور نور کو بے رحمی سے باہر کھینچا اور سوزوکی پک اپ میں دھکیل دیا۔ اس عمل میں مشکل سے ایک منٹ سے بھی کم لگا ہو گا۔ موٹی گردن والا گاڑی کو اسٹیشن کی پارکنگ میں لے گیا۔

سوزوکی پک اپ ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔ اس مرتبہ میں اور نور پک اپ کی عقبی نشست پر بیٹھے تھے۔

ان میں سے ایک آدمی نے جیب سے رومال نکالا اور وہ میری طرف بڑھا۔ میں ابھی کچھ سمجھنے بھی نہ پایا تھا کہ اس نے رومال میرے منہ پر رکھ کر اسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ پہلا

سانس لیتے ہی مجھے معلوم ہوگیا کہ رومال میں کلوروفارم تھا۔ ایک منٹ سے بھی کم عرصے میں میرے ہوش وحواس رخصت ہوگئے، ہر طرف گہری تاریکی اور سناٹا چھا گیا۔ بے ہوشی کا یہ وقفہ نہ جانے کتنا طویل تھا، شاید ایک گھنٹا، شاید ایک دن یا ایک لمحہ! میری آنکھ کھلی تو سر میں شدید درد محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے کراہ کر کروٹ بدلی تو میں کسی انسانی جسم سے ٹکرا گیا۔

میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے کی کوشش کی لیکن تاریکی اتنی گہری تھی کہ مجھے کچھ نظر نہ آسکا۔ مجھے تو فوری طور پر یہ بھی یاد نہ آیا کہ میں اس وقت کہاں ہوں؟

کچھ دیر بعد میرے حواس کام کرنے کے قابل ہوئے تو مجھے یاد آیا کہ ہم آئس کریم کھانے رکے تھے۔ غنی آئس کریم لینے گیا تھا۔ پھر اچانک گاڑی میں تین آدمی داخل ہوئے تھے اور...... ہاں، پھر انہوں نے ایک جگہ گاڑی تبدیل کی تھی اور ہم لوگوں کو ایک پک اپ میں سوار کیا تھا، پھر...... پھر...... ہاں، پھر ان میں سے کسی نے جیب سے کلوروفارم والا رومال نکالا تھا اور...... میری ناک پر رکھ دیا تھا۔

تو کیا میں مر چکا ہوں؟ میں نے ہول کر سوچا لیکن نہیں، اگر میں مر گیا ہوتا تو قبر میں اکیلا ہوتا۔ یہاں تو میری قبر میں کوئی اور بھی تھا۔ میں نے ٹٹول کر نزدیک پڑے ہوئے انسانی جسم کو محسوس کرنا چاہا۔ پھر میں نے اچانک ہاتھ ہٹا لیے وہ کوئی مرد نہیں بلکہ عورت تھی۔ عورت کون ہے، کہیں نور تو نہیں ہے؟ میں نے سوچا۔ اور زندہ بھی ہے یا......

میں نے اس کی نبض پکڑی تو معلوم ہوا کہ اس کی نبض آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ میں نے اندازے سے اس کا چہرہ تلاش کیا اور اپنے ہاتھ کی پشت اس کی ناک کے نزدیک لے گیا۔ اس کی سانس بھی چل رہی تھی لیکن یہ ہے کون؟ میں نے سوچا۔

مجھے اس اندھیرے میں عجیب سی وحشت بلکہ گھٹن کا احساس ہو رہا تھا۔ شاید وہاں کوئی کھڑکی یا روشن دان نہیں تھا۔ آہستہ آہستہ میں اٹھ کھڑا ہوا اور اندازے سے دیوار کی طرف بڑھا۔ چند قدم چلنے کے بعد میرے ہاتھ دیوار سے ٹکرائے۔ میں دیوار کے سہارے آگے بڑھتا رہا۔ آخر میں دروازے تک پہنچ گیا۔ دروازہ باہر سے لاک تھا۔ میں نے وہ دروازہ جھنجوڑ ڈالا پھر میں نے اس پر مکے برسائے اور حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخا۔ ''کوئی ہے؟ یہاں کوئی ہے؟'' میں نے چیخ کر کہا۔

دروازے کی دوسری طرف قدموں کی آہٹ سنائی دی اور میرا کمرا بقعہ نور بن گیا۔ پھر باہر سے کوئی چیخ کر بولا۔

''کیا پریشانی ہے؟''

''مجھے پیاس لگی ہے، پانی پلا دو۔''

''پانی اندر ہی موجود ہے۔'' وہ آدمی چیخ کر بولا۔

میں نے اردگرد کا جائزہ لیا۔ کمرے میں فرش پر بوسیدہ سا ایک کارپیٹ تھا۔ ایک طرف ایک بے رنگ زنگ زدہ تپائی رکھی تھی۔ اس پر ایلومینیم کا میلا سا جگ اور اس میلا ایلومینیم ہی کا گلاس تھا۔ اس کمرے میں ایک پ... دروازہ اور تھا جو یقیناً باتھ روم کا دروازہ ہوگا۔ میں نے تصدیق کے لیے وہ دروازہ کھول کر دیکھا تو مجھے باتھ روم... آیا۔ باتھ روم کا فرش کائی زدہ تھا۔ ایک طرف میلا سا بدر... واش بیسن لگا تھا۔ دوسری طرف فلیش تھا۔ وہ بھی انتہائی... اور جگہ جگہ سے ٹوٹا پھوٹا تھا۔ میں پھر کمرے میں واپس آ... کمرے میں سو واٹ کا ایک بلب روشن تھا۔ اس کی پیلی ر... کمرے میں پھیل رہی تھی۔

میں نے فرش پر پڑی ہوئی لڑکی کی طرف دھیان دیا۔ وہ نور نہیں تھی کیونکہ نور نے تو سفید دودھیا رنگ کی سا... باندھ رکھی تھی۔ فرش پر جو لڑکی پڑی تھی۔ اس نے شلوار... پہن رکھا تھا۔ اس کے لمبے، گھنے اور سیاہ بال اس کے چہرے پر پھیلے ہوئے تھے۔ پھر اس کا ایک ہاتھ بھی چہرے پر تھا۔

اچانک لڑکی کسمسائی اور اس نے آہستہ سے ک...

''پانی...... پانی......''

میں نے جگ سے پانی لیا اور لڑکی کا سر تھوڑا سا اٹھا کر پانی کا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ وہ ایک سانس میں آدھا گلاس پی گئی، پھر کچھ پانی اس کی باچھوں سے ہوتا ہوا بدرنگ کارپیٹ میں جذب ہوگیا۔ میں نے اس کا... آہستگی سے زمین پر رکھ دیا۔

پھر میں اٹھ ہی رہا تھا کہ کسی کے چیخنے کی آواز سنا... دی۔ ''کوئی ہے؟...... مجھے یہاں سے نکالو...... کوئی ہے؟''

اس آواز کو تو میں لاکھوں آوازوں میں شناخت کر... تھا۔ وہ نور کی آواز تھی۔

نور پھر چیخی۔ ''مجھے یہاں سے باہر نکالو...... کو... ہے؟''

''پریشان مت ہو نور!'' میں نے چیخ کر کہا۔

''تم...... تم کہاں ہو رفیق؟'' نور نے چیخ کر پوچھا۔

''میں تمہارے نزدیک ہی ہوں۔'' میں نے ک...

''بس زیادہ پریشان مت ہو، میں تمہیں یہاں سے باہر نکا... لوں گا۔'' میں نے اسے بہلانے کو جھوٹی تسلی دی۔

مجھے پریشانی یہ تھی کہ میرے گارڈز کہاں رہ گئے؟ رہ رہ کر ان پر غصہ بھی آرہا تھا۔ فرش پر پڑی ہوئی لڑکی بھی آہستہ آہستہ اٹھ بیٹھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے گردن گھما کر مجھے دیکھا۔ اچانک اس کے حلق سے ہلکی سی ایک چیخ برآمد ہوئی اور وہ خوف زدہ انداز میں بولی۔ ''کو...... کون ہو تم...... مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟''

''میں تمہیں یہاں نہیں لایا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے تو خود یہ لوگ لے کر آئے ہیں۔''

''میں کہاں ہوں؟'' لڑکی نے وحشت زدہ لہجے میں پوچھا۔ ''تم مجھے کہاں لائے ہو؟''

''میں تمہیں نہیں لایا ہوں۔'' میں نے جھنجلا کر کہا۔ ''اور مجھے نہیں معلوم کہ اس وقت ہم لوگ کہاں ہیں؟''

''رفیق!'' دوسرے کمرے سے نور کی آواز آئی۔ ''تمہارے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں، میرے ساتھ ایک لڑکی بھی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اس کا...... نام...... نام......'' میں لڑکی کی طرف مڑا۔ ''تمہارا نام کیا ہے؟''

''ثمرہ!'' لڑکی نے کہا۔ پھر مجھ سے پوچھا۔ ''اے، تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟''

''فار گاڈ سیک ثمرہ!'' میں نے چیخ کر کہا۔ ''میں تمہیں یہاں نہیں لایا ہوں۔''

''تو پھر مجھے یہاں کون لایا ہے؟'' لڑکی کے لہجے میں وحشت تھی۔

''میں نہیں جانتا!'' میں نے جھنجلا کر کہا۔ ''اور اب خاموش رہو۔''

لڑکی نے مجھے دیکھا، پھر اس نے سر جھکا لیا، اس کے جسم میں ہلکی ہلکی لرزش ہو رہی تھی۔ شاید وہ رو رہی تھی۔

''سنو ثمرہ!'' میں نے نرم لہجے میں اسے مخاطب کیا۔ ''تم کہاں رہتی ہو؟''

''میں؟'' اس نے میری طرف دیکھا۔ ''میں گلبرگ میں رہتی ہوں۔''

''تمہیں ان لوگوں نے کہاں سے اٹھایا ہے؟'' میں نے ہمدردی سے پوچھا۔

''میں کالج سے واپس آرہی تھی۔'' اس نے کہا۔ ''اچانک ایک گاڑی میرے سامنے آکر رکی۔ اس کا سلائیڈنگ دروازہ کھلا اور کسی نے مجھے اندر گھسیٹ لیا۔ پھر اس سے پہلے کہ میں چیختی، چلاتی، کسی نے میری ناک پر رومال رکھ دیا۔ اس میں بہت تیز قسم کی بو تھی۔ بس اس کے بعد مجھے یاد نہیں کہ کیا ہوا؟''

''تم کس کلاس میں پڑھتی ہو؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''میں...... فرسٹ ایئر میں ہوں۔''

''تم...... فرسٹ ایئر میں ہو؟'' میں نے حیرت سے اسے دیکھا، اپنے قدوقامت سے وہ فرسٹ ایئر کی بچی لگتی نہیں تھی، چہرے پر بھی بہت زیادہ معصومیت تھی۔

''تمہارے ابو کیا کرتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ابو! ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں مارکیٹنگ منیجر ہیں۔''

''تم کتنے بہن بھائی ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ہم دو بہنیں اور ایک بھائی ہیں۔ بھائی جان ہم دونوں سے بڑے ہیں۔''

''گڈ!'' میں نے کہا۔ میں صرف اس لیے اس سے سوال وجواب کر رہا تھا کہ اس کا دھیان بٹا رہے۔

''آپ کیا کرتے ہیں بھائی جان؟'' اس نے معصومیت سے پوچھا۔

''میں تو کچھ بھی نہیں کرتا ہوں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''آپ پڑھتے نہیں ہیں؟'' ثمرہ نے پوچھا۔

''یہ پڑھاتے ہیں ثمرہ۔'' دوسرے کمرے سے نور کی آواز آئی۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ میرے ساتھ ساتھ ثمرہ نے بھی چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ میں نے دروازہ اندر سے بھی بولٹ کر دیا تھا۔

اس مرتبہ زیادہ زور سے دستک دی گئی۔

میں نے چیخ کر پوچھا۔ ''کون ہے؟''

''دروازہ کھول!'' باہر سے کوئی چیخا۔

''تم ہو کون؟'' میں نے پھر چیخ کر کہا۔

''تو دروازہ کھولتا ہے یا میں اسے توڑ دوں؟'' آنے والا غرایا۔

''تم توڑ سکتے ہو تو توڑ لو۔'' دوسرے کمرے سے نور کی آواز سنائی دی۔

''یہ کتیا کہاں سے بھونک رہی ہے۔'' کوئی باہر سے غرایا۔

''دفع ہو جا یہاں سے۔'' میں نے چیخ کر کہا۔

''دروازہ کھول دے ورنہ میں تم میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

''باہر ہی سے بکواس کیے جائے گا بزدل! اگر جرأت ہے تو اندر آ!'' میں نے اسے چڑا دیا۔ میرا خیال تھا کہ وہاں

ایک ہی آدمی ہے ورنہ اگر کوئی اور ہوتا تو وہ بھی ضرور بولتا۔

پھر وہ دروازے پر شاید اپنے شانے سے ضربیں لگانے لگا۔

میں نے سوچا کہ دروازہ نہیں کھولوں گا، تب بھی وہ لوگ توڑ دیں گے۔ مجھے دروازہ کھول دینا چاہیے۔ وہ شخص جب دروازے سے دور ہٹ گیا تو میں نے آہستگی سے دروازے کا بولٹ کھول دیا۔ وہ شخص جب دوبارہ دروازے پر ٹکر مارنے آیا تو اپنے ہی زور میں لڑکھڑا کر دروازے سے اندر آ پڑا۔

میں نے اس کی گردن پر پاؤں رکھ دیا اور تھوڑا سا دباؤ ڈالا۔ وہ بری طرح تڑپا، میں نے جھک کر اس کا ریوالور نکال لیا اور گرج کر بولا۔ ''خبردار!''

''ثمرہ!'' میں نے تیزی سے خبردار کرتے ہوئے کہا۔ ''دروازہ بند کردو۔''

وہ بری طرح لرز رہی تھی۔ اس نے سہمی سہمی نظروں سے میری طرف دیکھا لیکن اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے میری بات ہی نہ سنی ہو۔

''دیکھو، اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ یہاں سے زندہ نکل جاؤ گے تو یہ تمہاری بھول ہے۔'' میرا شکار گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔

میرا پاؤں اب بھی اس کی گردن پر تھا اور چہرے کا رخ فرش کی طرف تھا۔

''یہ ڈائیلاگ میں نے اتنی دفعہ سنا ہے کہ اب مجھے اس سے چڑ ہونے لگی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''بتاؤ، تم لوگ کون ہو اور ہمیں یہاں کیوں لائے ہو؟''

''میں اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتا۔'' میرا شکار کراہ کر بولا کیونکہ میں نے اس کی گردن پر اپنے پیر کا دباؤ بڑھا دیا تھا۔

''میں تمہیں آخری موقع دے رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے سب کچھ سچ سچ بتا دو ورنہ میرا تو حشر بعد میں ہوگا، لیکن تمہاری کھوپڑی میں پہلے ضرور سوراخ ہو جائے گا۔''

''آپ میری بات کا یقین کریں، مجھے کچھ نہیں معلوم، میں تو پیسے لے کر ان لوگوں کے لیے اکثر کام کرتا ہوں۔''

''اور وہ لوگ کون ہیں؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''مجھے حضور بخش یہاں لایا تھا جی!'' اس نے کہا۔ ''وہی ان لوگوں کے بارے میں جانتا ہوگا۔''

''اور یہ حضور بخش کون ہے؟''

''وہ لاہور کا ایک بڑا غنڈا ہے۔ عموماً چھوٹی موٹی ڈکیتیاں کرتا ہے، مارکیٹ میں دہشت پھیلا کر بھتا وصول کرتا ہے اور کبھی کبھی کسی سیاسی پارٹی کو درہم برہم کرنے کا کام بھی کرتا ہے۔'' اس نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ سچ بول رہا تھا اور شاید اسے ریوالور چلانے کا تجربہ بھی نہیں تھا ورنہ ریوالور استعمال کرنے والے پلک جھپکتے میں ریوالور نکال لیتے ہیں۔ اس نے شاید ہمیں خوف زدہ کرنے کے لیے ریوالور رکھا ہوا تھا۔

''یہاں اور کتنے آدمی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ابھی تو یہاں کوئی نہیں ہے۔'' اس نے کہا اور اپنی گردن سہلاتے ہوئے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''لیکن کچھ دیر میں وہ لوگ یہاں پہنچ جائیں گے۔'' پھر وہ اچانک بولا۔ ''لو وہ آ گئے۔''

میں نے بجلی کی سی تیزی سے گھوم کر پیچھے دیکھا، یہی میری غلطی تھی۔

اس نے اس لمحاتی مہلت سے فائدہ اٹھا کر میری کلائی پر ہاتھ مارا، ساتھ ہی اس کا پیر بھی چلا اور میرے پیٹ میں بھرپور لات لگی۔ ریوالور میرے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا اور میں درد کی شدت سے دُہرا ہو گیا۔ اس نے انتہائی گھٹیا ترکیب استعمال کی تھی اور میں آسانی سے اس کے جھانسے میں آ گیا تھا۔ میں یہ بھی بھول گیا تھا کہ دروازہ میں نے خود ہی اندر سے بولٹ کیا تھا، پھر وہاں کوئی کیسے آ سکتا تھا؟

میرا سانس لینا دوبھر ہو رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے میرا سر پکڑا اور خاصی قوت کے ساتھ اپنے کدو جیسے سر سے ٹکرا دیا۔ میری آنکھوں میں لمحے بھر کو دھنک کے ساتوں رنگ لہرائے اور میں کٹے ہوئے درخت کی طرح فرش پر گر پڑا۔ ابھی میرے حواس کام کر رہے تھے لیکن میں نے یہی ظاہر کیا کہ میں اس کی ٹکر سے بے ہوش ہو گیا ہوں۔

وہ اتنا آسان شکار تھا نہیں جتنا میں اسے سمجھ رہا تھا۔ چاہے وہ عقل سے پیدل ہو لیکن لڑنے بھڑنے میں ماہر تھا۔

میں آنکھیں بند کیے پڑا رہا اور گہرے گہرے سانس لیتا رہا۔

''کک...... کیا...... تم نے اسے مار دیا؟'' ثمرہ نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔

''ابھی نہیں مرا ہے تو کچھ دیر بعد مر جائے گا۔'' اس نے بے نیازی سے کہا۔ ''شادے کو رگڑا دینا کوئی مخول نہیں ہے۔ وہ بھی اس جیسا شہری بابو! ...... دل تو چاہ رہا ہے کہ ابھی اس کی گردن کاٹ دوں۔ اس کی اتنی جرأت کہ شادے پہلوان پر ہاتھ اٹھائے لیکن میں حضور بخش کی وجہ سے مجبور ہوں۔ وہ ابھی اس حرام زادے کو زندہ رکھنا چاہتا ہے۔''

وہ کچھ زیادہ ہی بول رہا تھا۔ ''پہلے میں اس کا کچھ بندوبست کردوں۔'' اس نے کہا۔ پھر ثمرہ سے بولا۔ ''اپنا دوپٹا اتار!''

''میں...... دو...... پٹا...... کیوں؟'' وہ ہکلا کر بولی۔

پھر مجھے ثمرہ کی ہلکی سی چیخ سنائی دی۔ شاید اس نے ثمرہ کا دوپٹا چھین لیا تھا۔

میری توانائی تیزی سے بحال ہو رہی تھی۔ میں نے آنکھوں کی خفیف سی جھری سے دیکھا، وہ ثمرہ کے دوپٹے کو دو حصوں میں تقسیم کر رہا تھا لیکن اس کا رخ میری ہی طرف تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یا تو وہ دوپٹے کے ان ٹکڑوں سے ثمرہ کے ہاتھ پاؤں باندھنا چاہتا ہے یا پھر مجھے بے دست و پا کرنا چاہتا ہے۔

پھر وہ آہستہ آہستہ میری طرف بڑھا اور کچھ سوچ کر رک گیا۔ اس نے دروازے کا نہ صرف بولٹ کھولا بلکہ دروازہ بھی کھول دیا اور ثمرہ سے بولا۔ ''یہاں سے باہر نکلنے کی کوشش مت کرنا۔ میں نے جھوٹ بولا تھا، باہر اب بھی تین آدمی موجود ہیں۔ وہ تمہیں ماریں گے تو بعد میں، پہلے......''

اس نے خباثت بھرے انداز میں کہا۔

میں جانتا تھا کہ وہ ثمرہ کو خوف زدہ کرنے کے لیے اب جھوٹ بول رہا ہے۔ وہاں کوئی ہوتا تو ثمرہ کی چیخیں، نور کی آوازیں اور یہ دھما چوکڑی سن کر ادھر ضرور آتا۔

وہ گھوم کر میرے سر کی طرف آیا اور جھک کر میرا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی لیکن یہ کوشش اسے بہت مہنگی پڑی۔

میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کے منہ پر اتنا زوردار گھونسا مارا کہ وہ سب پہلوانی داؤ پیچ بھول گیا۔ میں پلک جھپکتے میں اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کی سانڈ جیسی گردن دبوچ لی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے گھٹنے سے اس کی ناف پر وار کیا۔ وہ ادھ موا سا ہو کر فرش پر گر پڑا۔

میں نے ثمرہ ہی کے دوپٹے سے پہلے اس کی دونوں ٹانگیں مضبوطی سے باندھیں، پھر میں اس کے ہاتھ باندھ رہا تھا کہ کوئی گرج دار آواز میں بولا۔ ''خبردار! اب تمہارا کھیل ختم ہو گیا۔'' میں بری طرح اچھل پڑا۔ ثمرہ کے منہ سے تو چیخ نکل گئی۔

کھلے ہوئے دروازے سے دو آدمی اندر آ گئے۔ وہ دونوں مسلح تھے اور ان کی کلاشنکوفوں کا رخ میری طرف تھا۔

''بس نواب صاحب! آپ کا کھیل اب ختم ہو گیا۔ دونوں ہاتھ دیوار سے ٹیک کر کھڑے ہو جائیں۔'' ان میں سے ایک غرا کر بولا۔

''تم لوگ تو حکم کے غلام ہو۔ اس لیے میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ مجھے یہاں کس کے حکم سے لائے ہو۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''رفیق!'' دوسرے کمرے سے نور کی دہشت زدہ آواز آئی۔ ''تم ٹھیک تو ہو، وہاں کیا ہو رہا ہے؟''

''یہ حکم کے غلام شاید کوئی تماشا کرنے والے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''تم فکر مت کرو، میں بالکل ٹھیک ہوں البتہ ان کے ایک آدمی کے چار چھ دانت اس معرکے میں کام آ گئے ہیں۔''

میں اس موقعے کی تلاش میں تھا جب وہ لوگ میری طرف سے کچھ غافل ہوں لیکن وہ پوری طرح محتاط تھے۔ ان میں سے ایک کمرے کے ایسے گوشے میں چلا گیا جہاں سے مجھے نشانہ بنانا بہت آسان تھا۔

دوسرے شخص نے کلاشنکوف ایک ہاتھ میں سنبھالی اور دوسرے ہاتھ سے ماہرانہ انداز میں میری تلاشی لے کر میرا ریوالور، نقد رقم وغیرہ سب نکال لیا۔ اس کارروائی کے بعد وہ دو قدم پیچھے ہٹا۔ مجھے دیوار پر لگی ہوئی پینٹنگ کے شیشے کے فریم میں سب کچھ نظر آ رہا تھا۔ میری تلاشی لینے والے نے جیب سے پتلی سی ریشم کی ڈوری نکالی۔ اس کے سرے پر غالباً کوئی وزنی چیز یا لوہا وغیرہ تھا۔ اس نے وہ رسی گھما کر میرے پیروں پر پھینکی۔ رسی کے ایک سرے پر وزن ہونے کی وجہ سے وہ میرے پیروں میں لپٹ گئی۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ سمجھتا، اس نے مجھے یوں بے رحمی سے کھینچ لیا جیسے قربانی کے موقعے پر قصاب گائے کو گرانے کے لیے کھینچتے ہیں۔ اگر میرے دونوں ہاتھ آزاد نہ ہوتے تو میرے چہرے کا بھی حلیہ بگڑ جاتا۔ میں ہاتھوں کے بل فرش پر دھڑام سے گرا۔

دوسرے آدمی نے میری پشت پر سوار ہو کر میرے دونوں

ہاتھ بھی اس پتلی لیکن مضبوط ریشمی ڈوری سے باندھ دیے۔

''تو بہت بڑا سورما ہے؟'' ان میں سے ایک غرا کر بولا۔

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس دوران میں ثمرہ مسلسل چیخ رہی تھی۔

''خاموش ہو جاؤ!'' ان میں سے ایک ڈپٹ کر بولا۔ ''ورنہ......'' وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

ثمرہ کی چیخیں اس کے حلق ہی میں گھٹ کر رہ گئیں۔

اس دوران میں پہلوان شادے کو بھی ہوش آ گیا تھا۔ اس نے منہ سے بہنے والا خون تھوکا تو دو دانت بھی فرش پر آ گرے۔ اپنا خون اور ٹوٹے ہوئے دانت دیکھ کر پہلوان غضب ناک ہو گیا۔ وہ بپھر کر میری طرف بڑھا۔ اسلحہ بردار میں سے ایک نے اسے روک لیا اور بولا۔ ''بس اوئے، زیادہ جوش مت دکھا۔ تو پہلوان ہے! ایک شہری باؤ سے مار کھا گیا؟''

''اس نے مجھے بے خبری میں مار لیا۔ قسم پاک پروردگار کی ورنہ......''

''بس کر اوئے! اب اس پر ہاتھ مت اٹھانا۔ حضور بخش نے جو کچھ کہا تھا، وہ یاد ہے نا؟''

''یار، مجھے تو یہ کام بہت مہنگا پڑا۔'' پہلوان نے کہا۔

''کام تو کام ہی ہوتا ہے پہلوان جی۔'' دوسرے آدمی نے مضحکہ خیز لہجے میں کہا۔ ''استاد نے بیس ہزار روپے تفریح کے لیے تو نہیں دیے تھے نا!'' پھر وہ خاموش ہو کر بولا۔ ''شاید استاد آ گیا؟''

باہر کسی گاڑی کے رکنے کی آواز مجھے بھی آئی تھی۔

''رفیق! تم ٹھیک تو ہو نا؟'' نور نے کہا۔ اس کی آواز رندھی ہوئی تھی۔

''یہ تو ابھی تک ٹھیک ہے۔'' ایک کلاشنکوف والے نے کہا۔ ''تو اپنی خیر منا، اس کے بعد تیرا ہی نمبر ہے۔''

''اگر نور کا بال بھی بیکا ہوا تو میں......''

''تو، تو پوری دنیا کو آگ لگا دے گا۔ یہ بھی کسی فلم کا ڈائیلاگ ہے۔''

دروازے کے باہر آہٹیں سنائی دیں، پھر دو آدمی مزید کمرے میں آ گئے۔

ان میں سے ایک کا قد درمیانہ لیکن جسم ورزشی تھا۔ اس نے بڑے بڑے بال رکھے ہوئے تھے۔ وہ بوسکی کے کرتے اور لٹھے کی شلوار میں ملبوس تھا۔ پیروں میں تلے والے قیمتی کھسے تھے اور گلے میں ایک چین بھی تھی۔ اس نے کرتے میں سونے کے بٹن لگا رکھے تھے لیکن گریبان کھلا ہوا تھا۔ وہ اپنے حلیے سے کوئی ایسا شوقین مزاج فلم ساز لگ رہا تھا جو محض معروف ہیروئنوں کے چکر میں فلم سازی شروع کر دیتے ہیں۔

دوسرا آدمی پینٹ شرٹ میں ملبوس تھا۔ اس کا لباس بے داغ اور جوتے چمک رہے تھے۔ وہ حلیے سے بھی پڑھا لکھا نظر آ رہا تھا۔ اس کا بدن اکہرا تھا اور آنکھوں پر نفیس فریم کا چشمہ تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بریف کیس بھی تھا۔

''چل بھئی، شروع ہو جا۔'' فلم ساز نظر آنے والے شخص نے اس سے کہا۔ پھر وہ کلاشنکوف والوں سے مخاطب ہوا۔ ''اس نے زیادہ پریشان تو نہیں کیا؟''

''اس نے پہلوان کو تو مار مار کے کتا کر دیا ہے استاد!'' ان میں سے ایک بولا۔ ''اگر عین وقت پر ہم یہاں نہ پہنچتے تو یہ پہلوان کا جھٹکا کر کے یہاں سے نکل گیا ہوتا۔''

پینٹ شرٹ والا شخص اس دوران میں اپنا بریف کیس کھول کر اس میں سے سرنج اور کوئی انجکشن نکال چکا تھا اور اس وقت بہت انہماک سے انجکشن کی دوا سرنج میں منتقل کر رہا تھا۔

دوا بھرنے کے بعد اس نے استاد کی طرف دیکھا۔

''او میاں! میری شکل کیا دیکھ رہا ہے، اپنا کام شروع کر۔''

وہ انجکشن لے کر میری طرف بڑھا۔

''یہ کیسا انجکشن ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''فکر مت کرو، یہ زہر کا انجکشن نہیں ہے۔'' استاد نے ہنس کر کہا۔ ''تمہیں مارنا ہی ہوتا تو وہیں گولی مار دیتے۔''

پینٹ شرٹ والا میری طرف بڑھا اس نے میری کلائی کے جوڑ کے نزدیک خون کی شریان ڈھونڈی اور دوسرے ہی لمحے بہت احتیاط سے وہ انجکشن میری رگ میں اتار دیا۔

کچھ دیر بعد میرا سر بھاری بھاری سا ہونے لگا اور جسم میں عجیب سی سنسناہٹ دوڑ رہی تھی۔ ان لوگوں نے میری حالت دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں کھول دیے۔

میری آنکھیں کھلی تھیں، ہاتھوں پیروں کو خفیف سی حرکت بھی دے سکتا تھا لیکن ذہن ماؤف ہو کر رہ گیا تھا۔ مجھے اب ان کی آوازیں بھی سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ ہر طرف سناٹا تھا، گہرا سناٹا اور تنہائی کا احساس! ایسی تنہائی کہ حسن تمام یاد آتا نہیں، اتنا سناٹا کہ اپنا نام یاد آتا نہیں، لیکن میں دیکھ سب کچھ رہا تھا۔

پینٹ شرٹ والے نے دوسری سرنج میں دوا بھری اور وہ دوا ثمرہ کی نس میں اتار دی۔ اس کے چہرے کے کشیدہ

عضلات اچانک پرسکون ہو گئے۔ اس کی آنکھوں میں اب مجھے وحشت کے بجائے خمار نظر آ رہا تھا لیکن میں کچھ بھی بولنے سے قاصر تھا۔

پھر پینٹ شرٹ والا شخص جو یقیناً ڈاکٹر تھا، اسٹیتھو اسکوپ سے میرا معائنہ کرنے لگا۔ اس کے بعد اس نے یہی عمل ثمرہ کے ساتھ کیا اور اثبات میں گردن ہلا کر رخصت ہو گیا۔

میں سب کچھ خواب کی سی حالت میں دیکھ رہا تھا۔

ان لوگوں نے وہاں لائٹس فٹ کیں، پھر اسٹینڈ پر تین اطراف سے کیمرے فٹ کیے اور میرے کپڑے اتارنے لگے۔

میں نے ذرا بھی مزاحمت نہ کی۔ میرے ہاتھ پیر میرے قابو ہی میں نہیں تھے۔ پھر ان لوگوں نے مجھے اٹھا کر کمرے کے واحد بیڈ پر لٹا دیا۔ ثمرہ کے ساتھ بھی انہوں نے یہی کیا۔ اس نے ذرہ برابر مزاحمت نہ کی بلکہ اس کے چہرے پر تو خمار کی سی کیفیت تھی۔ یہ شاید میری قوت ارادی کا کمال تھا کہ میں کچھ نہ کچھ گڑبڑ محسوس کر رہا تھا۔ ثمرہ کو تو شاید اس کا بھی احساس نہیں تھا۔

اچانک تیز روشنیوں سے میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ روشنیاں تقریباً آدھے گھنٹے تک پورے کمرے میں پھیلی رہیں، پھر اچانک وہ گل ہو گئیں اور ٹیوب لائٹ کی روشنی کے باوجود مجھے ایسا لگا جیسے کمرے میں اندھیرا چھا گیا ہو۔

اس کے بعد ان لوگوں نے جیسے تیسے ہمیں کپڑے پہنائے اور ان میں سے ایک آدمی نے مجھے کندھے پر اٹھا لیا۔

پھر آہستہ آہستہ میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا۔

دوبارہ میری آنکھ ایک آراستہ خواب گاہ میں کھلی۔

پہلے تو مجھے کچھ دیر تک یاد ہی نہیں آیا کہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے اور میں اس وقت اس کمرے میں کیوں ہوں؟ یہ میرا بیڈ روم تو ہرگز نہیں تھا۔

پیاس کے باعث میرے حلق میں کانٹے سے پڑ رہے تھے اور مجھے شدید کمزوری بھی محسوس ہو رہی تھی لیکن میں اپنے جسم کو حرکت دے سکتا تھا۔

میں نے پانی کی تلاش میں اردگرد کا جائزہ لیا تو بری طرح اچھل پڑا۔

میرے ساتھ بیڈ پر ایک لڑکی بھی تھی۔ وہ قابل اعتراض حالت میں پڑی تھی۔ مجھے یاد نہیں آ رہا تھا کہ میں نے اس سے پہلے اسے کہاں دیکھا ہے؟ اس کی شکل البتہ مجھے کچھ جانی پہچانی سی لگ رہی تھی۔

بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر پانی کا جگ اور گلاس رکھا تھا۔ میں یکے بعد دیگرے دو گلاس پانی پی گیا۔

پانی بھی گویا قدرت کا عطا کردہ ایک ٹانک ہے۔ پانی پیتے ہی مجھے اپنے جسم میں کچھ توانائی محسوس ہوئی۔

میں نے ایک مرتبہ پھر لڑکی کو غور سے دیکھا اور میرے ذہن میں اچانک جھماکا سا ہوا۔ یہ تو وہی لڑکی تھی جو میرے ساتھ قید تھی۔ اس کا نام...... ہاں اس کا نام ثمرہ ہے۔ مجھے اس کا نام بھی یاد آ گیا۔

میں ذہن پر زور دے کر یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ میرے ساتھ کیا ہوا تھا؟ پھر اچانک ہی مجھے سب کچھ یاد آ گیا۔ بدمعاش فلم سازوں کے حلیے والا استاد یاد آیا، وہ دونوں کلاشنکوف بردار یاد آئے، پینٹ قمیص والا یاد آیا۔ پھر میری یادداشت نے میرا ساتھ نہیں دیا۔ ہاں شاید اس شخص نے مجھے کوئی انجکشن دیا تھا، پھر...... پھر...... پھر کیا ہوا تھا؟ لاکھ کوشش کے باوجود بھی مجھے یاد نہیں آیا کہ پھر کیا ہوا تھا؟

دیوار پر گھڑی موجود تھی، اس میں ساڑھے تین بج رہے تھے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ صبح کے ساڑھے تین کا وقت ہے یا شام کا؟ مجھے کمرے میں ایک کھڑکی بھی نظر آئی جس پر دبیز پردہ تھا، کمرے میں دو دروازے تھے، ان میں سے ایک دروازہ غالباً باتھ روم کا ہو گا۔

میں ہمت کر کے اپنی جگہ سے اٹھا اور باتھ روم کی طرف بڑھا تو میری چال میں ایسی لڑکھڑاہٹ تھی جیسے میں نے شراب پی رکھی ہو۔ میں جیسے تیسے باتھ روم میں پہنچا اور واش بیسن کھول کر منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے۔ اس سے میری طبیعت مزید بحال ہوئی۔ باتھ روم میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی، حتیٰ کہ گرم اور ٹھنڈے پانی کی لائنیں بھی تھیں۔

میں نے سوچا کہ نہانے سے شاید کسل مندی دور ہو جائے تو ذہن کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہو۔ نتائج کی پروا کیے بغیر میں دیر تک نیم گرم پانی سے نہاتا رہا۔

نیم گرم پانی نے گویا میرے تنِ مردہ میں جان ڈال دی۔ میں باتھ روم سے نکلا تو اب میری چال میں لڑکھڑاہٹ نہیں تھی۔ جسم میں بھی وہ پہلے جیسی کمزوری اور نقاہت نہیں تھی اور ذہن بھی سوچنے سمجھنے کے قابل ہو گیا تھا۔

میں نے کمرے کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو وہ حسب توقع باہر سے بند تھا۔

اب مجھے ثمرہ کی فکر ہوئی۔ وہ تو بڑی بے خبری کی نیند سو رہی تھی جیسے اپنی خواب گاہ میں ہو۔

میں نے پہلے اسے ہلایا جلایا، آوازیں دیں لیکن وہ کچھ کسمسا کر رہ گئی۔ میں نے اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے

مارے۔ایک منٹ کے اندر اندر اس نے آنکھیں کھول دیں۔

وہ ویران ویران اور اجنبی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی، پھر اس نے چیخنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

اس نے مچلنے کی کوشش کی لیکن اس کے جسم میں اتنی جان ہی نہیں تھی، وہ بس بل کھا کر رہ گئی۔

ہوش میں لانے سے پہلے میں نے وہاں رکھا ہوا ایک کمبل اس کے جسم پر ڈال دیا تھا۔

اس نے اپنے منہ سے میرا ہاتھ ہٹانے کی کوشش کی۔

''دیکھو اگر تم شور شرابا نہ کرنے کا وعدہ کرو تو میں تمہارے منہ سے ہاتھ ہٹا سکتا ہوں۔''

اس نے اقرار میں سر ہلا دیا۔

میں نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹایا تو وہ گہرا سانس لے کر بولی۔''پانی...... مجھے ایک گلاس پانی دے دو۔''

میں نے پانی کا گلاس بھر کے اسے دیا۔اس نے وہ گلاس ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔

پانی پی کر اس نے مجھے خوف زدہ نظروں سے دیکھا اور بولی۔''تم کون ہو تم اور میرے بیڈروم میں کیا کر رہے ہو؟''

''ثمرہ بیگم! ذرا غور فرمائیں، یہ آپ کا بیڈروم نہیں ہے۔''

''میرا بیڈروم نہیں ہے؟'' اس نے اچانک اٹھنا چاہا، پھر کمزوری کے باعث بستر پر گر گئی۔

اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے کمرے کا جائزہ لیا، پھر کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔''ہاں، یہ میرا بیڈروم نہیں ہے...... لیکن...... پھر یہ کس کا بیڈروم ہے اور تم میرا نام کیسے جانتے ہو؟''

''تم ابھی اپنے ذہن پر زور مت دو۔'' میں نے کہا۔ ''پہلے باتھ روم میں جا کر شاور لے لو تو طبیعت خاصی بہتر ہو جائے گی۔''

''لیکن تم ہو کون؟'' وہ جھنجلا کر بولی۔

''میں خدائی فوجدار ہوں۔'' میں نے بھی اس کے لہجے میں جواب دیا۔''تم اٹھو اور باتھ روم میں جاؤ۔''

وہ بہ مشکل تمام اٹھنے میں کامیاب ہوئی، جب وہ باتھ روم کی طرف بڑھی تو اس کی چال میں مجھ سے زیادہ لڑکھڑاہٹ تھی۔ میں اگر بڑھ کر اسے سہارا نہ دیتا تو وہ اوندھے منہ فرش پر گر جاتی۔

اچانک اس کی نظر اپنے لباس پر پڑی۔اس نے چیخ مارنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے اس کا منہ پھر بند کر دیا۔ میں نے اسے کپڑے اٹھا کر دیے اور اسے باتھ روم تک لے گیا۔اس نے منہ دھویا تو اس کی حالت میں نمایاں تبدیلی آ گئی۔

''تم گرم پانی سے شاور لو، میں دیکھتا ہوں کہ یہاں سے نکلنے کی کیا تدبیر ہو سکتی ہے؟''

''کیا مطلب ہے تمہارا! ہم یہاں قید ہیں؟''

''تو تمہارا کیا خیال ہے، ہم کیا اس وقت ایوانِ صدر میں سرکاری مہمان ہیں؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

اسے باتھ روم تک چھوڑ کر میں کمرے میں آیا اور ایک مرتبہ پھر غور سے کمرے کا جائزہ لیا۔کمرے میں صرف ایک ہی کھڑکی تھی اور میں جانتا تھا کہ یا تو وہ بند ہوگی یا پھر اس کے سامنے آہنی گرل لگی ہوگی۔ ہمیں یہاں قید کرنے والے اتنے احمق ہرگز نہیں ہو سکتے تھے کہ ہمارے فرار کا کوئی راستہ باقی رہنے دیتے۔

میں نے کھڑکی کا دبیز پردہ ہٹا کر دیکھا تو مجھے باہر گھور اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ کھڑکی میں گرل نہیں تھی بلکہ صرف شیشے لگے ہوئے تھے لیکن جلد ہی میری یہ خوشی کافور ہو گئی۔ہم کسی عمارت کی تیسری یا چوتھی منزل پر تھے۔

میں اگر کسی طرح کھڑکی سے باہر نکل بھی جاتا تو نیچے پہنچنے تک میری ہڈیوں کا سرمہ بن چکا ہوتا۔

اچانک مجھے نور کا خیال آیا۔وہ بھی تو ہمارے ساتھ ہی تھی، ممکن ہے وہ بھی اسی عمارت کے کسی کمرے میں ہو؟

ثمرہ باتھ روم سے نکلی تو اس کی حالت بھی اب قدرے بہتر تھی اور ذہن بھی کام کر رہا تھا۔

''تم...... تم وہی ہو نا...... جو میرے ساتھ اس کمرے میں بھی بند تھے؟'' وہ ذہن پر زور ڈالتے ہوئے بولی۔

''شکر ہے، تمہیں یاد تو آیا۔'' میں نے کہا۔''تمہیں یہ بھی یاد ہوگا کہ تمہیں اغوا کیا گیا تھا؟''

''ہاں......!'' وہ ذہن پر زور دے کر بولی۔''مجھے کچھ لوگوں نے اغوا کر لیا تھا، پھر وہ لوگ تمہیں بھی وہاں لائے تھے اور...... اور...... تم نے اس آدمی کو زخمی کر دیا تھا...... پھر...... دو آدمی گن لے کر آ گئے تھے اور...... تمہیں باندھ دیا تھا...... پھر انہوں نے تمہیں کوئی انجکشن لگایا تھا اور...... مجھے بھی...... پھر...... پھر کیا ہوا تھا؟''

''پھر میری آنکھ اس کمرے میں کھلی تھی اور تم بھی میرے ساتھ بیڈ پر تھیں۔'' میں نے کہا۔

میری بات سن کر اس کا چہرہ شرم سے گلنار ہو گیا۔ پھر

اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔''تم نے...... مجھے...... اس حالت میں......''

''میں نے تمہارے جسم پر کمبل ڈال دیا تھا۔'' میں نے جلدی سے کہا۔

''ہاں ہمارے ساتھ والے کمرے میں کوئی عورت اور بھی تھی جو چیخ چیخ کر کسی رفیق کو پکار رہی تھی۔''

''رفیق میرا نام ہے اور وہ لڑکی بھی میرے ساتھ ہی اغوا ہوئی تھی۔اس وقت نہ جانے وہ کہاں ہے؟''

وہ اچانک بولی۔''تمہارے پاس سیل فون ہے؟''

مجھے اس کی بات پر ہنسی آ گئی۔''سیل فون! ان لوگوں نے ہمارے کپڑے چھوڑ دیے، یہی کیا کم ہے؟''

''تم فکر مت کرو۔'' ثمرہ نے کہا۔''میرے پاپا بہت بڑے سرکاری افسر ہیں۔ وہ پولیس کے پورے محکمے کو ہلا کر رکھ دیں گے۔''

''تم نے تو کہا تھا کہ تمہارے پاپا کسی کمپنی میں ہیں؟'' میں نے کہا۔

''میں نے اس وقت جھوٹ بولا تھا۔ میں تمہیں بھی اغوا کرنے والوں کا ساتھی سمجھ رہی تھی۔''

''تمہارے پاپا کیا صدرِ پاکستان ہیں؟'' میں نے ہنس کر پوچھا۔

''تم میری بات کو مذاق سمجھ رہے ہو؟'' وہ برا مان کر بولی۔''پاپا ڈپٹی سیکریٹری ہیں، اب تک تو انہوں نے ایک طوفان کھڑا کر دیا ہوگا۔''

''اس سے کچھ بھی نہیں ہوگا۔'' میں نے کہا۔''جن لوگوں نے ہمیں اغوا کیا ہے، ان کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔''

''تم کیا پریس رپورٹر ہو؟'' اس نے پوچھا۔''اس قسم کی زبان تو وہی استعمال کرتے ہیں۔''

''اس قسم کی زبان تمہارے پاپا جیسے لوگ استعمال کرتے ہیں بے بی! کسی کو قانون ہاتھ میں لینے کی اجازت نہیں دی جائے گی، ملک دشمن عناصر سے آہنی ہاتھوں سے نمٹا جائے گا، قانون کے ہاتھ بہت لمبے ہیں، وغیرہ اور کیا معلوم تم اب بھی سچ بول رہی ہو یا جھوٹ؟ میں تمہاری کس بات پر اعتبار کروں؟''

وہ پریشانی کے باوجود میری باتوں پر مسکرانے لگی۔

''تم تو مذاق بھی کر لیتے ہو!'' وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

''میں اس دفعہ واقعی سچ بول رہی ہوں۔ میرے پاپا ڈپٹی سیکریٹری ہیں۔ ویسے تم خاصے زندہ دل آدمی ہو۔ ایسے وقت میں بھی مذاق کر لیتے ہو۔''

''مجھے تمہاری حالت سدھرنے کا انتظار تھا، تم چلنے پھرنے اور سوچنے سمجھنے کے قابل ہو جاؤ تو کچھ سوچوں۔'' میں نے کہا۔

''اس کھڑکی میں اگر گرل نہ ہو تو ہم یہاں سے بھی نکل سکتے ہیں۔'' اس نے گویا انکشاف کیا۔

''اس کھڑکی میں گرل نہیں ہے، صرف شیشے کے سلائڈنگ ڈور ہیں۔'' میں نے کہا۔

''پھر کیا مسئلہ ہے؟'' وہ خوش ہو کر بولی۔''شیشہ تو توڑا جا سکتا ہے۔''

''شیشہ تو ٹوٹ جائے گا۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''لیکن یہاں سے باہر نکلنے میں ہم خود بھی ٹوٹ پھوٹ جائیں گے۔''

''کیا تم اتنے ہی نازک ہو؟'' وہ طنز سے بولی۔''کہ ایک کھڑکی سے چھلانگ لگانے سے ٹوٹ جاؤ گے؟''

''میں اتنا نازک نہیں ہوں لیکن اتفاق سے کھڑکی اس وقت بلڈنگ کی چوتھی منزل پر واقع ہے۔'' میں نے کہا۔

اس کے چہرے پر مایوسی کے تاثرات ظاہر ہوئے۔

''لیکن تم فکر مت کرو، میں کچھ کرتا ہوں۔'' میں نے کہا اور کھڑکی کا پردہ ہٹا دیا۔

باہر ابھی تک گھور تاریکی کا راج تھا، سردیوں میں سورج ویسے بھی خاصی دیر میں طلوع ہوتا ہے۔

''تم کیا کرو گے؟'' وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''کیا یہاں سے چھلانگ لگاؤ گے؟''

''ابھی میں نے مرنے کا ارادہ نہیں کیا ہے۔'' میں نے کہا۔

میں نے کھڑکی کا سلائڈنگ دروازہ کھولا تو یخ بستہ ہوا کا جھونکا میرے چہرے سے ٹکرایا میں نے کھڑکی سے جھانک کر باہر دیکھا۔ وہ شاید کوئی کمپلیکس تھا۔ وہاں مجھے فلیٹ دکھائی دے رہے تھے۔ چند فلیٹوں میں روشنی ہو رہی تھی۔ دیواریں بالکل سپاٹ تھیں۔صرف ایک ہی طریقہ تھا کہ یا تو میرے پاس اتنا لمبا رسا ہو جس کی مدد سے میں نیچے اتر سکوں یا پھر میں سپرمین کی طرح اڑنے کی اہلیت رکھتا ہوں۔

''کیا کر رہے ہو؟'' وہ جھنجلا کر بولی۔''کھڑکی بند کرو، سردی سے میری جان نکلی جا رہی ہے۔''

''تمہاری جان تو ابھی نکلے گی جب وہ لوگ آئیں گے۔'' میں نے کہا۔

وہ برا سا منہ بنا کر خاموش ہو گئی۔

اچانک مجھے کوریڈور میں قدموں کی آہٹ سنائی دی۔

میں کھڑکی بند کر چکا تھا۔ میں نے تیزی سے پردہ برابر کیا اور ثمرہ سے کہا۔ ''بیڈ پر لیٹ جاؤ اور یہ ظاہر کرنا کہ ابھی تک بے ہوش ہو۔ کمبل بھی اوڑھ لینا۔'' پھر میں خود بھی سرعت سے بستر میں گھس گیا۔

ایک خدشہ یہ بھی تھا کہ ممکن ہے آنے والے کسی دوسرے فلیٹ میں آئے ہوں لیکن قدموں کی آہٹ ہمارے کمرے کے سامنے آکر رک گئی۔ پھر تالے میں چابی گھومنے کی آواز آئی، میں نے جسم ڈھیلا چھوڑ کر آنکھیں موند لیں۔

دروازہ کھلا تو میں نے آنکھوں کی جھری سے دیکھا، کمرے میں داخل ہونے والا استاد حضور بخش اور وہ ڈاکٹر نما آدمی تھا۔ اس کے پیچھے دونوں کلاشنکوف بردار بھی تھے۔

''اوئے، یہ تو ابھی تک ٹن ہیں۔'' استاد نے کہا۔ ''تو نے ڈوز کہیں زیادہ تو نہیں دے دی ڈاکٹر؟''

''نہیں استاد!'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''میں نے تو ان دونوں کو نارمل ڈوز ہی دی تھی۔''

''پھر یہ ابھی تک بے ہوش کیوں ہیں؟''

''استاد! جو لوگ پان، سگریٹ، تمباکو یا کسی ٹرانکولائزر کے عادی نہیں ہوتے، ان پر یہ دوا دیر تک اثر کرتی ہے۔ ویسے پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔ ''نبض تو اس لڑکی کی ٹھیک چل رہی ہے، سانس بھی نارمل ہے۔'' اس نے غالباً ثمرہ کی نبض چیک کی تھی۔

''انہیں ہوش میں لاؤ۔'' استاد نے کہا۔

''یہ ابھی دس پندرہ منٹ میں خود ہی ہوش میں آجائیں گے استاد!'' ڈاکٹر نے کہا۔

''اوئے ایک گھنٹے بعد تو یہاں پولیس پہنچ جائے گی۔ اس سے پہلے ان کا ہوش میں آنا ضروری ہے۔''

''پھر میں انہیں دوسرا انجکشن دے دیتا ہوں۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

''جو بھی کرنا ہے، جلدی کر ڈاکٹر!'' استاد نے درشت لہجے میں کہا۔ ''ورنہ میرا سارا پروگرام چوپٹ ہوجائے گا۔ لڑکی کا باپ پاگلوں کی طرح اسے تلاش کر رہا ہے۔''

''لیکن استاد! پولیس یہاں تک کیسے پہنچے گی؟'' ایک کلاشنکوف بردار نے پوچھا۔

''فضول باتیں مت کیا کر!'' استاد نے اسے جھڑک دیا۔ ''پولیس کو ہم اطلاع دیں گے کہ نواب رفیق شیرازی نے اس لڑکی کو اغوا کرلیا ہے اور یہ لوگ اس فلیٹ میں موجود ہیں۔ بس پھر ہمارا کام ختم ہوجائے گا۔''

''تو اس میں ان کا ہوش میں آنا کیا ضروری ہے؟'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''پولیس انہیں اس حالت میں پکڑے گی تب بھی کیا فرق پڑے گا؟'' ڈاکٹر نے کہا۔

''یار، تو نے پہلی دفعہ عقل کی بات کی ہے۔ پولیس والے تو یہی سمجھیں گے کہ یہ شراب کے نشے میں ٹن ہیں۔ یہاں شراب کی ایک دو بوتلیں بھی رکھ دو اور ان کے کپڑوں اور جسموں پر شراب چھڑک بھی دو تاکہ ہمارا پلان ہر طرح سے پورا ہوجائے۔'' پھر وہ ایک کلاشنکوف بردار سے بولا۔ ''جا اوئے، گاڑی سے شراب کی دو بوتلیں نکال لا۔''

میں نے سوچا کہ اب ہوش میں آجانا چاہیے۔ ان کا ایک آدمی فوری طور پر کم ہوگیا تھا۔ ڈاکٹر یوں بھی بے ضرر تھا۔ اصل مسئلہ استاد اور کلاشنکوف بردار سے نمٹنے کا تھا۔

میں نے کراہ کر کہا۔ ''پا......نی......''

''یہ ہوش میں آرہا ہے۔'' استاد چونک کر بولا۔ ''اسے پانی پلاؤ۔''

کلاشنکوف والے نے اپنی گن شانے سے لٹکائی، جگ سے پانی لیا اور میرے نزدیک پہنچ گیا۔ اس بے وقوف کو یہ خیال بھی نہ آیا کہ بھرا ہوا جگ آدھے سے زیادہ خالی کیسے ہوگیا؟

اس نے پانی کا گلاس جوں ہی میرے ہونٹوں سے لگایا۔ میں نے ایک ہاتھ اس کی کلاشنکوف پر مارا اور دوسرا اس کے چہرے پر رسید کردیا۔

وہ الٹ کر پیچھے گرا تو اس کی کلاشنکوف میرے ہاتھ میں آگئی۔ اس سے پہلے کہ استاد سنبھلتا، میں نے اس کے چہرے پر بھی زوردار لات رسید کردی۔ وہ دیوار سے ٹکرایا اور مجھے انتہائی غلیظ گالیاں دینے لگا۔

میں اچھل کر ایک دم کھڑا ہوگیا اور گرج کر بولا۔ ''کوئی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرے گا ورنہ بھون کر رکھ دوں گا۔''

استاد اور اس کا ساتھی ساکت ہوگئے۔ ڈاکٹر تو سہم کر پہلے ہی دیوار سے ٹک کر کھڑا ہوگیا تھا۔

میرے پاس وقت کم تھا۔ میں نے ایک لات میں کلاشنکوف والے کو ناک آؤٹ کردیا، پھر استاد کے سر پر کلاشنکوف کے دستے سے ضرب لگائی۔ وہ بھی فوراً ڈھیر ہوگیا۔

میں ڈاکٹر کی طرف متوجہ ہوا۔ ''تم نے مجھے کون سا انجکشن دیا تھا؟ تمہارا بریف کیس کہاں ہے؟''

بریف کیس اس نے کمرے میں داخل ہونے کے بعد فرش پر رکھ دیا تھا۔

''میں بالکل بے قصور ہوں، بس پیسوں کے لالچ میں آگیا تھا۔''

میں نے اس سے کہا۔ ''ابھی ان کا ایک ساتھی شراب کی بوتل لے کر آئے گا۔ دروازہ تم کھولو گے اور کوئی چالاکی کرنے کی کوشش مت کرنا ورنہ......''

میرا جملہ ادھورا رہ گیا کیونکہ باہر سے قدموں کی آہٹ سنائی دی تھی۔ میں نے استاد اور شاگرد دونوں کو گھسیٹ کر بیڈ کے دوسری طرف ڈال دیا تاکہ آنے والے کو پہلی نظر میں وہ دکھائی نہ دیں۔

دروازے پر دستک ہوئی تو ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ میں دروازے کے ساتھ دیوار سے چپک کر کھڑا ہوگیا۔

''یہ دروازہ بند کیوں کردیا تھا؟'' اس نے اندر داخل ہوکر پوچھا۔ ''اور یہ استاد اور......''

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ میں نے پیچھے سے اس کی گردن پر وار کیا تھا۔ وہ اوندھے منہ گر پڑا۔ میں جانتا تھا کہ اب ان تینوں میں سے کوئی ایک گھنٹے سے پہلے ہوش میں نہیں آئے گا۔

''نور کہاں ہے؟'' میں نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

''نور؟'' ڈاکٹر نے حیرت سے دہرایا۔ ''کون نور؟''

''وہ لڑکی جو ہمارے ساتھ دوسرے کمرے میں بند تھی۔'' میں نے کہا۔

''اسے تو استاد گاڑی میں کہیں لے گیا تھا۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

''کہاں لے گیا تھا؟'' میں نے وحشت زدہ لہجے میں پوچھا۔

وہ میرے لہجے سے گھبرا گیا اور بولا۔ ''مجھے......نہیں معلوم......کہ......وہ اسے کہاں لے گیا تھا؟''

''تم میرے ساتھ چلو اور بتاؤ کہ ان کی گاڑی کون سی ہے؟''

گاڑی کی چابیاں اس شخص کے پاس تھیں جو شراب کی بوتلیں لینے گیا تھا۔ میں نے اس کی جیب سے گاڑی کی چابیاں نکالیں اور ثمرہ سے کہا۔ ''اب اٹھ جاؤ اور یہاں سے نکلو، ان لوگوں سے میں بعد میں نمٹوں گا، پہلے تمہیں گھر چھوڑ دوں۔''

ثمرہ ایک دم اٹھ بیٹھی۔ ڈاکٹر اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

''چلو باہر نکلو!'' میں نے ڈاکٹر سے کہا۔ ''یہاں استاد کے اور کتنے آدمی ہیں؟''

''مجھے نہیں معلوم؟'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''ویسے ابھی تک تو مجھے ان لوگوں کے علاوہ کوئی نظر نہیں آیا۔''

باہر نکل کر میں نے وہ کمرا باہر سے لاک کردیا اور ڈاکٹر کو آگے چلنے کو کہا۔

میں خود بہت محتاط تھا۔

''اس بلڈنگ میں لفٹ بھی موجود ہے۔'' ڈاکٹر نے بتایا۔

''لفٹ کو چھوڑو۔'' میں نے کہا۔ ''زینوں سے نیچے اترو۔'' میں کسی بھی قسم کا خطرہ اب مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ ممکن ہے لفٹ کے آس پاس استاد کا کوئی آدمی موجود ہو۔

ہم ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر آگے پیچھے زینے سے اترے اور اس بلڈنگ کے پارکنگ لاٹ میں آگئے۔

وہ کوئی بڑی اور جدید بلڈنگ تھی لیکن ابھی تک میری یہ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ یہ بلڈنگ لاہور کے کس علاقے میں ہے؟

ڈاکٹر ایک ٹویوٹا کرولا تک پہنچا اور بولا۔ ''یہ استاد کی گاڑی ہے۔'' پھر وہ سہم کر بولا۔ ''اب میں جاؤں؟''

''تم کہاں جاؤ گے ڈاکٹر!'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا اور گردن پکڑ کر اسے گاڑی میں دھکیل دیا۔

میں نے اسٹیئرنگ پر بیٹھتے ہوئے کلاشنکوف ثمرہ کو دے دی اور اس سے کہا۔ ''اگر یہ ڈاکٹر تھوڑی سی بھی ہوشیاری دکھائے تو اسے گولی مار دینا۔''

میں نے گاڑی پارکنگ لاٹ سے باہر نکالی تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ ماڈل ٹاؤن کا کوئی علاقہ ہے۔

مجھے یہ بھی خدشہ تھا کہ پولیس ثمرہ کو سارے شہر میں تلاش کررہی ہوگی۔ پولیس کی کوئی پارٹی ہمیں بھی روک سکتی تھی۔

میں نے ثمرہ سے کہا۔ ''میں تمہیں تمہارے گھر کے پاس چھوڑ دوں گا۔ وہاں سے تم پیدل چلی جانا۔ تمہارا گھر کس طرف ہے؟''

''ہمارا گھر گلبرگ میں ہے۔'' اس نے بتایا۔

یہ تو قسمت ہے کہ راستے میں، کسی پولیس پارٹی سے ہمارا ٹکراؤ نہیں ہوا۔

میں نے ثمرہ کو روڈ پر اس جگہ چھوڑ دیا جہاں سے اس کا بنگلا بالکل نزدیک تھا، پھر میں نے تیزی سے واپسی کا سفر اختیار کیا۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ کون لوگ تھے، انہوں نے مجھے اغوا کیوں کیا تھا؟ وہ ثمرہ کے ساتھ مجھے گرفتار کیوں کرانا چاہتے تھے؟ اور نور کہاں ہے؟

''وہ لوگ نور کو کہاں لے گئے ہیں؟'' میں نے ڈاکٹر سے سرد لہجے میں پوچھا۔

''نور کون؟'' ڈاکٹر نے چونک کر پوچھا۔

''وہ لڑکی جو میرے ساتھ تھی۔''

''اسے ابھی آپ نے خود ہی گلبرگ چھوڑا ہے۔'' ڈاکٹر کے لہجے میں الجھن تھی۔

میں نے ایک جھٹکے سے گاڑی روک دی۔ ''الو کے پٹھے!'' میں چیخ کر بولا۔ ''وہ ثمرہ تھی، میں نور کی بات کر رہا ہوں۔''

''میں نے وہاں ثمرہ کے علاوہ کوئی لڑکی نہیں دیکھی۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

میں نے مشتعل ہو کر اس کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔ ''بکواس کرتا ہے، تو نور کو نہیں جانتا؟''

''میں واقعی نہیں جانتا۔'' اس نے ہتھیلی کی پشت سے اپنے ہونٹ صاف کرتے ہوئے کہا۔ میرے تھپڑ سے اس کے ہونٹ سے خون نکل آیا تھا۔

''استاد کہاں رہتا ہے؟'' میں نے اچانک پوچھا۔

''استاد کا کوئی ایک ٹھکانا نہیں ہے۔ ویسے وہ عموماً لکشمی چوک کے ایک ہوٹل میں بیٹھتا ہے۔''

''وہ لوگ نور کو کہاں لے گئے ہیں؟''

''میں نہیں جانتا کہ وہ لوگ اسے کہاں لے گئے ہوں گے۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔

''لکشمی چوک کے اس ہوٹل کا نام بتاؤ۔'' میں نے کہا۔

اس نے بلا چون و چرا ہوٹل کا نام بتا دیا۔

میں نے اس ہوٹل کی طرف جانے کا ارادہ کیا، پھر یہ سوچ کر اسے رد کر دیا کہ اگر میں وہاں ڈاکٹر کو لے کر گیا تو یہ شور مچا دے گا۔ میں اسے کہیں چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا۔ مجھے وہ شخص بے ضرر نظر آ رہا تھا لیکن بے ضرر نظر آنے والے لوگ بھی اکثر شیطان ثابت ہوتے ہیں۔ وہ ان جرائم پیشہ افراد کے ساتھ تھا تو اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ شریف آدمی ہرگز نہیں ہے اور ذرا سا موقع ملنے پر مجھے نقصان پہنچا سکتا ہے۔

مجھے رہ رہ کر غنی اور اپنے دوسرے گارڈز پر بھی غصہ آ رہا تھا کہ وہ لوگ اس وقت کہاں مرے ہوئے تھے جب دشمن مجھے اور نور کو اغوا کر رہے تھے؟

میں نے سیل فون کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ سب چیزیں تو وہ لوگ نکال چکے تھے البتہ میرے پاس استاد اور اس کے آدمیوں کے سیل فون تھے۔ ڈاکٹر کا سیل فون بھی میرے پاس ہی تھا۔ میں نے وہ سب سیل فون آف کر دیے تھے۔ میں نے ان ہی میں سے ایک سیل فون نکال کر آن کیا اور غنی کا نمبر ڈائل کر دیا۔

دوسری طرف سے پہلی ہی بیل پر فون ریسیو کر لیا گیا۔ ''ہیلو!'' مجھے غنی کی آواز سنائی دی۔

''غنی! تم لوگ کہاں ہو؟''

''آ...... آپ ٹھیک تو ہیں سر؟'' غنی نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

''میں ٹھیک ہوں، اس وقت تم لوگ کہاں ہو؟''

''ہم آپ کی تلاش میں ہیں سر!'' غنی نے کہا۔

''تم فوراً ہوٹل پہنچو، میں بھی وہیں جا رہا ہوں۔'' یہ ہدایت دے کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ پھر غنی کا نمبر اس سیل فون سے مٹایا اور سیل فون آف کر دیا۔

اب میرا رخ ہوٹل کی طرف تھا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ رانا سمیت اپنے تمام دشمنوں کو زندہ جلا دوں۔ ان لوگوں نے میرے لیے سکھ کا ایک لمحہ بھی حرام کر دیا تھا۔ وہ بدبخت نور کو جانے کہاں لے گئے تھے اور اب وہ نہ جانے کس حال میں ہوگی؟

میں جتنی رفتار سے سوچ رہا تھا، اس سے دگنی رفتار سے ڈرائیونگ کر رہا تھا۔

میں ہوٹل پہنچا تو غنی مین گیٹ پر موجود تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ دیوانہ وار میری طرف بڑھا اور مجھ سے لپٹ گیا۔

''آپ خیریت سے تو ہیں سر؟'' غنی نے بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''دوسرے لوگ کہاں ہیں؟''

''وہ سب موجود ہیں۔'' غنی نے کہا۔

''ان میں سے کسی سے کہو کہ اس گاڑی کو کہیں ٹھکانے لگا دے۔'' پھر میں ڈاکٹر سے مخاطب ہوا۔ ''تم اس میں سے اپنا ضروری سامان اتار لو۔''

ڈاکٹر نے اپنا بھاری بھرکم بریف کیس گاڑی سے اتار لیا۔

میں ڈاکٹر کو لے کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ مجھے ڈاکٹر کے رویے پر بھی حیرت ہو رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ یہاں پہنچ کر کچھ مزاحمت کرے گا۔ میرے ساتھ جانے سے انکار کرے گا لیکن اس نے کسی بھی قسم کی کوئی مزاحمت نہ کی ورنہ میں نے یہی سوچا تھا کہ اسے غنی کے حوالے کر دوں گا۔ وہ اس سے اپنے طور پر نمٹ لے گا۔

تھوڑی دیر بعد غنی بھی واپس آ گیا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ''غنی! چار چار گارڈز کی موجودگی میں وہ لوگ کیسے ہمیں اغوا کر کے لے گئے؟''

''سر، پہلے ان لوگوں نے بے آواز رائفل سے فائر کر کے گارڈز کی گاڑی کے دو ٹائر ناکارہ کر دیے، پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتے، آپ کی گاڑی تیز رفتاری سے روانہ ہو گئی۔ ان کی گاڑی سے گارڈز پر بھی فائرنگ ہوئی اور ہمارا ایک گارڈ زخمی ہو گیا۔ میں نے پولیس اسٹیشن میں اس واقعے کی رپورٹ درج کرا دی ہے۔ پھر میں آپ کی گاڑی کے تعاقب میں روانہ ہوا لیکن کچھ فاصلے پر مجھے آپ کی گاڑی تو مل گئی لیکن آپ اس میں نہیں تھے۔''

مجھے یاد آ گیا کہ ان لوگوں نے فوراً ہی مجھے اور نور کو دوسری گاڑی میں منتقل کر دیا تھا۔

''سر، وہ میڈم نور......'' غنی کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

میں نے مختصراً اسے بتایا کہ میرے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا تھا۔

''سر، اس ڈاکٹر کو معلوم ہوگا کہ وہ لوگ میڈم کو کہاں لے گئے ہیں؟'' غنی نے کہا۔

''اسے کچھ بھی نہیں معلوم۔'' میں نے کہا۔

''تمہیں وہ مکان تو معلوم ہوگا جہاں وہ لوگ نواب صاحب کو لے گئے تھے؟'' غنی نے درشت لہجے میں ڈاکٹر سے پوچھا۔ ''جہاں تم نے انہیں انجکشن دیا تھا؟''

''ہاں، مجھے اس مکان کا علم ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''وہ ملتان روڈ پر کافی آگے جا کر الگ تھلگ سا ایک مکان ہے۔''

اچانک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ میں نے استاد اور اس کے دو آدمیوں کو ماڈل ٹاؤن کے ایک فلیٹ میں بند کر دیا تھا۔ اگر انہوں نے شور شرابا نہیں کیا ہوگا تو وہ لوگ اب بھی وہیں موجود ہوں گے۔ میں نے غنی سے کہا۔ ''تم اس بلڈنگ کی نگرانی کرو بلکہ تیسری منزل کے فلیٹ نمبر تین سو اٹھارہ کا جائزہ لے لو۔ موقع ملے تو ان لوگوں کو وہاں سے نکال کر ست بدھائی لے جاؤ۔ ان سے نور کا پتا معلوم ہو جائے گا۔''

''سر، آپ اس ڈاکٹر کو لے کر ست بدھائی چلے جائیں، میں بھی ان لوگوں کو لے کر پہنچتا ہوں۔''

''وہ لوگ اتنی آسانی سے ان کے ساتھ نہیں آئیں گے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

''استاد کس کے لیے کام کرتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''استاد آج کل شاہ جی کے لیے کام کر رہا ہے۔''

''شاہ جی!'' میں نے کہا۔ ''صوبائی وزیر سید مسکین شاہ؟''

''جی ہاں۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

اس وقت یہ سوچنے کا موقع نہیں تھا کہ شاہ جی میرا دشمن کیوں ہو رہا ہے؟ میں نے غنی سے کہا۔ ''تم ان لوگوں کو قید سے نکالنا اور کہنا کہ مجھے شاہ جی نے بھیجا ہے، شاہ جی کے آدمیوں نے نواب کو پکڑ لیا ہے۔''

''ہاں، یہ سنتے ہی وہ ان کے ساتھ آ جائیں گے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

میں نے غنی کو اس بلڈنگ کا پتا سمجھایا اور اسے فوراً روانہ ہونے کو کہا۔

''سر، آپ میرا سیل فون رکھ لیں۔'' غنی نے کہا۔ ''آپ کو اس کی ضرورت پڑے گی۔ میں غلام نبی سے اس کا سیل فون لے لوں گا۔ وہ تو یوں بھی زخمی ہے۔''

''ہاں، اس کا اب کیا حال ہے؟ وہ کس اسپتال میں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ ہمارے ساتھ ہی ہے سر!'' غنی نے کہا۔ ''اس کے بازو میں گولی لگی ہے لیکن ہڈی محفوظ ہے۔ ہاں، میں آپ کی گاڑی لے آیا تھا۔ وہ پارکنگ میں موجود ہے۔'' یہ کہہ کر غنی عجلت میں وہاں سے روانہ ہو گیا۔

میں بھی اسی وقت ہوٹل سے باہر آ گیا۔ پارکنگ میں میری لینڈ کروزر موجود تھی۔

ڈاکٹر یوں تابعداری سے میرے ساتھ ساتھ تھا جیسے وہ میرا ہی ملازم ہو۔ مجھے اس کے رویے پر حیرت ہو رہی تھی۔

وہ خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گیا۔

مجھے رہ رہ کر نور کا خیال آ رہا تھا اور میرا دل گویا بیٹھا جا رہا تھا۔ وہ نہ جانے اس کے ساتھ کیا سلوک کریں۔ یہ سوچ کر ہی میری کنپٹیاں چٹخنے لگیں۔ اگر ایسا ہوا تو میں انہیں بتاؤں گا کہ دہشت گردی کیا ہوتی ہے اور دشمنی کیسے کی جاتی ہے؟

''ایسا کریں۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''آپ مجھے اگلے چوک پر اتار دیں۔ وہاں سے مجھے اس وقت بھی کوئی نہ کوئی سواری مل جائے گی۔''

''تم کیا سمجھ رہے ہو کہ میں تمہیں اتنی آسانی سے چھوڑ دوں گا؟'' میں نے کہا۔ ''تم بھی تو ان لوگوں کے جرم میں برابر کے شریک ہو بلکہ تمہارا جرم تو ان سے کہیں زیادہ بڑا ہے۔ تم تو اپنے مقدس پیشے کو بدنام کر رہے ہو۔''

''لیکن نواب صاحب...... میں...... مجھے اب جانے دیں۔''

''تم تو میرے خاص مہمان ہو۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تمہاری تو میں بہت اچھی طرح خاطر مدارت کروں

گا۔ تم یہ بتاؤ کہ وہ انجکشن کیسا تھا؟''

''وہ انجکشن لگنے سے انسان تقریباً مفلوج ہوکر رہ جاتا ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''وہ سب کچھ دیکھتا ہے لیکن اسے سنائی کچھ نہیں دیتا۔ انجکشن کا اثر زائل ہونے کے بعد اسے کچھ یاد بھی نہیں رہتا کہ اس دوران میں اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟''

''میرے ساتھ کیا ہوا تھا؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''مجھے تو ان لوگوں نے وہاں سے روانہ کردیا تھا لیکن میں جانتا ہوں کہ آپ کے ساتھ کیا ہوا تھا؟'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''استاد نے آپ کی اور اس لڑکی کی انتہائی قابل اعتراض تصویریں اور ویڈیو بنائی ہے۔''

''کیا؟'' میرا ہاتھ اسٹیئرنگ پر بہک گیا اور گاڑی لہرا گئی۔

''جی ہاں، اس نے آپ دونوں کی ویڈیو بنائی ہے اور اب وہ غالباً آپ کو بلیک میل کرے گا۔ وہ یہ کام اس سے پہلے دوسرے لوگوں کے ساتھ بھی کرچکا ہے۔''

''میں ان لوگوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔'' میں نے بپھر کر کہا۔

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا نواب صاحب!'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''استاد نے وہ ویڈیو اب تک ان لوگوں تک پہنچادی ہوگی جن کے لیے وہ کام کررہا ہے۔''

''تم ڈاکٹر ہوکر ایسے گھٹیا کام میں ان لوگوں کا ساتھ دے رہے ہو؟''

میں حالات سے مجبور ہوں نواب صاحب!'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''مجھ پر تین جوان بہنوں اور بوڑھے ماں باپ کا بوجھ ہے۔ والد فالج کے مریض ہیں اور برسوں سے بستر پر ہیں۔ میں نے ایم بی بی ایس کس مشکل سے پاس کیا ہے، یہ میں ہی جانتا ہوں۔'' وہ ایک دم جذباتی ہوگیا۔

''تمہارے والد کرتے کیا تھے؟''

''وہ محکمہ ڈاک میں پوسٹ ماسٹر تھے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''اور آپ جانتے ہیں کہ ایک پوسٹ ماسٹر کی تنخواہ کیا ہوتی ہے؟ پھر انہیں تو اپنی اولاد کو تعلیم دلوانے کا شوق بھی تھا۔ اماں نے میری تعلیم کے لیے چپکے چپکے اپنا زیور بیچ دیا جسے وہ برسوں سے اپنی بیٹیوں کے لیے محفوظ رکھے ہوئے تھیں۔ میں نے اپنے اخراجات پورے کرنے کے لیے ٹیوشنز پڑھانا شروع کردیں۔ میں ایم بی بی ایس کے تھرڈ ایئر میں تھا تو ابو پر فالج کا اٹیک ہوا۔ میرے پاس اس وقت اتنے پیسے نہیں تھے کہ میں ان کا اچھی طرح علاج کراسکتا ورنہ وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوجاتے۔ میرے گھر والوں کا خیال تھا کہ میرے ڈاکٹر بننے کے بعد ہمارے دن پھر جائیں گے اور گھر میں ہن برسنے لگے گا۔''

اس نے ایک سرد آہ بھری اور اپنی بات جاری رکھی۔

''ہاؤس جاب کرنے کے بعد مجھے تو کہیں ملازمت بھی نہ ملی۔ بہت بھاگ دوڑ کے بعد مجھے سرکاری ملازمت ملی لیکن پس ماندہ سے ایک گاؤں میں بھیج دیا گیا۔''

''میں نے تمہیں داستان الم سنانے کو نہیں کہا تھا۔ میں نے صرف یہ پوچھا ہے کہ تم نے ان جرائم پیشہ افراد کے لیے کیوں کام شروع کردیا؟ شکل وصورت سے تو خاصے شریف اور معقول آدمی لگتے ہو۔''

''میں وہی تو آپ کو بتا رہا تھا۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

''یار، پہلے تو تم اپنا نام بتاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''اتنی دیر سے میرے ساتھ ہو اور مجھے تمہارا نام تک معلوم نہیں لیکن نام صحیح بتانا۔''

''میرا نام سعید ہے، سعید الرحمان!'' اس نے کہا۔

''میں یہ بتا رہا تھا کہ اس گاؤں میں دو زمینداروں کے درمیان جھگڑا ہوا۔ ان میں سے ایک کا آدمی مارا گیا۔ اس کی لاش اسپتال آئی تو میں ڈیوٹی پر تھا۔ تھوڑی دیر بعد دوسرا زمیندار میرے پاس آیا اور بولا۔ ''ڈاکٹر صاحب! پوسٹ مارٹم رپورٹ تو آپ ہی تیار کریں گے؟''

''جی ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''رپورٹ تو میں ہی تیار کروں گا۔ کیا مرنے والا آپ کا کوئی عزیز تھا؟''

''وہ میرے دشمن کا آدمی تھا۔'' اس نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ آپ موت کا وقت دس کے بجائے گیارہ بجے درج کریں۔''

''کیوں؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا۔

''اس لیے کہ قتل کا الزام میرے بھائی پر آرہا ہے۔ گیارہ بجے وہ علاقے کے ایس ڈی او کے ساتھ موجود تھا۔ موت کا وقت گیارہ بجے درج ہوگا تو میرے بھائی پر الزام ثابت نہ ہوسکے گا کیونکہ اس کی موجودگی کا گواہ نہ صرف ایس ڈی او ہے بلکہ ضلع کا ایکس سی این بھی ہے۔'' پھر اس نے اپنی جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور بولا۔ ''یہ ایک لاکھ روپے ہیں۔''

''میں بھی غربت کی چکی میں پس کر ادھ موا ہوچکا تھا۔ مجھے لگتا تھا کہ سچائی، ایمان داری سب کتابی باتیں ہیں اور ایسی باتیں وہ لوگ کرتے ہیں جو یا تو بزدل ہوتے ہیں یا پھر انہیں موقع نہیں ملتا۔ میں بھی لالچ سے مغلوب ہوگیا۔ میں

نے کہا۔ ''چودھری صاحب! آپ اپنے بھائی کی جان کی قیمت صرف ایک لاکھ روپے لگا رہے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ سے کیا ہوگا؟''

''تم اتنے سیدھے ہو نہیں ڈاکٹر جتنے نظر آتے ہو۔'' اس نے ہنس کر کہا۔ ''چلو میں تمہیں ایک لاکھ اور دے دوں گا۔''

''چودھری صاحب!'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''آپ کو شاید معلوم نہیں کہ ابھی کچھ دیر پہلے وہ لوگ بھی آئے تھے جن کا بندہ مارا گیا ہے۔''

''کون...... ملک ذاکر؟'' چودھری نے پریشان ہوکر کہا۔

''جی ہاں۔'' میں نے ہٹ دھرمی سے جھوٹ بولا۔ ''وہ مجھے ان پیسوں سے کئی گنا زیادہ کی پیشکش کررہے تھے اور وہ ایک گھنٹے بعد پھر آئیں گے۔''

''تمہیں کیا چاہیے؟'' چودھری سنجیدہ ہوگیا۔

''میں دس لاکھ روپے لوں گا۔'' میں نے کہنے کو تو یہ کہہ دیا لیکن مجھے ایسا لگا جیسے میرے اندر چھناکے سے کچھ ٹوٹ گیا ہو۔ مگر میں نے نظر انداز کردیا۔

''دس لاکھ روپے تو بہت زیادہ ہیں۔'' چودھری نے کہا۔

''آپ کی مرضی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے اس سے کہیں زیادہ رقم ملک ذاکر سے مل جائے گی۔''

''وہ کنجوس تمہیں کیا دے گا؟'' چودھری نے نفرت سے کہا۔

''پھر آپ ہی سخی بن جائیں۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

وہ کچھ دیر سوچتا رہا، پھر بولا۔ ''ٹھیک ہے، رقم تمہیں مل جائے گی۔''

''پوسٹ مارٹم رپورٹ کل شام یا پرسوں تک تیار ہوجائے گی۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے رقم کل ہی چاہیے۔''

''تم تو بہت بے صبرے آدمی ہو۔'' چودھری نے کہا۔

''بات بے صبرے پن کی نہیں بلکہ اصول کی ہے۔''

''اگر ملک ذاکر نے تمہیں اس سے زیادہ رقم کی پیشکش کردی تو؟'' چودھری نے پوچھا۔

''جب آپ سے بات ہوگئی ہے تو پھر وہ مجھے بیس لاکھ بھی دے تو میں نہیں مانوں گا۔ یہ بھی میرا اصول ہے لیکن پیسے میں ایڈوانس لیتا ہوں۔'' یہ میری پہلی ناجائز کمائی تھی۔ پھر تو میں اس دلدل میں دھنستا چلا گیا۔ کل حضور بخش میرے پاس آیا اور مجھے بتایا کہ اسے مجھ سے کیا کام لینا ہے۔''

''اس نے تمہیں اس کام کے کتنے پیسے دیے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''اس نے کہا تھا کہ کام معمولی ہے، ایک لاکھ روپے میں اس سے سودا ہوا تھا۔''

''تم تو اب لکھ پتی بلکہ کروڑ پتی ہوگے؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''نہیں نواب صاحب! حرام کی کمائی مجھے راس نہیں آئی۔ جس دن میں نے چودھری سے دس لاکھ روپے وصول کیے تھے، اسی صبح میرے والد کا انتقال ہوگیا۔ اس کے سال بھر بعد والدہ بھی اس دنیا سے رخصت ہوگئیں۔ میں نے ماڈل ٹاؤن میں بہت شاندار بنگلا تعمیر کرایا ہے لیکن وہ نیا گھر بھی مجھے راس نہیں آیا۔ میری ایک بہن ہیپا ٹائٹس کا شکار ہوکر مرگئی، دوسری بہن کسی آوارہ لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی۔ تیسری بہن کی میں نے شادی کردی لیکن وہ شادی کے ایک سال بعد ہی بیوہ ہوکر واپس میرے پاس آگئی۔'' پھر وہ چونک کر بولا۔ ''یہ آپ جا کہاں رہے ہیں؟''

''یہ خیال تمہیں بہت دیر بعد آیا۔'' میں نے کہا۔

''میں اپنے گھر جارہا ہوں۔''

''آپ لاہور میں نہیں رہتے؟'' اس نے کہا۔

''میں ست بدھائی میں رہتا ہوں۔ جو میری جاگیر ہے۔ میں تمہیں وہیں لے جارہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''کیا آپ مجھے پولیس کے حوالے نہیں کریں گے؟''

پولیس کے ذکر پر مجھے یاد آیا کہ میں نے استاد اور اس کے دو آدمیوں کو لاہور کی ایک بلڈنگ کے فلیٹ میں بند کردیا تھا۔

مجھے نور کی فکر ستانے لگی تھی مگر ابھی تو فوری طور پر مجھے ست بدھائی پہنچنا تھا۔ میں نے گاڑی کی رفتار مزید بڑھادی۔

میں ست بدھائی پہنچا تو پوری حویلی میں ایک ہلچل سی مچ گئی۔ میری آمد کی خبر سن کر راجا، شہباز، شہلا اور حویلی کے تمام لوگ وہاں اکٹھے ہوگئے تھے۔ راجا بھی مجھ سے اس والہانہ انداز میں ملا کہ دوسرے دیکھنے والے بھی حیران رہ گئے۔ مجھے اس کی آنکھوں میں نمی صاف نظر آرہی تھی۔

''فیکے پتر!'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''تو اس الیکشن ولیکشن کے چکر کو چھوڑ اور کچھ عرصے کے لیے لندن چلا جا۔''

''راجا! یہ تو کہہ رہا ہے؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''ہاں، یہ میں کہہ رہا ہوں۔'' راجا نے کہا۔ ''رانا اور دوسرے لوگ تیرا جینا دوبھر کردیں گے بلکہ انہوں نے تیری زندگی عذاب کردی ہے۔ تو جب سے پاکستان آیا ہے، تو نے سکون کا ایک لمحہ بھی نہیں گزارا ہے۔ لعنت بھیج اس الیکشن پر اور واپس لندن جاکر عیش کر۔ یہاں کے معاملات میں سنبھال لوں گا۔''

''مجھے بزدلی کا مشورہ مت دے راجا!'' میں نے کہا۔ ''تو جانتا ہے ٹیپو سلطان نے کیا کہا تھا؟''

''زیادہ بکواس مت کر۔'' راجا نے کہا۔ ''نہ تو ٹیپو سلطان ہے، نہ تو شیر ہے اور نہ تیرا جھگڑا انگریزوں سے ہے۔''

''یہ دشمن تو انگریز سے زیادہ خطرناک ہے راجا! یہ تو ہمارے ملک کی بنیادیں کھود رہا ہے۔ میں ان لوگوں کو کھل کھیلنے کا موقع نہیں دوں گا۔''

''پھر تو بھی ٹیپو سلطان کی طرح مارا جائے گا۔''

''مرنا تو ایک دن ہے۔'' میں نے کہا۔ ''موت سے کس کو رستگاری ہے؟''

''بکواس نہیں فیکے پتر! اس وقت میں کوئی شعر سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔''

''رفیق!'' شہناز نے اچانک پوچھا۔ ''نور کہاں ہے؟''

''نور؟'' میں نے نظریں جھکا کر کہا۔ اس سوال کا جواب میرے پاس تھا ہی نہیں تو اسے کیا بتاتا۔

''ہاں نور!'' راجا نے چونک کر کہا۔ ''نور جہاں یا ماہ نور یا پھر اس کی کوئی اور نشانی بتاؤں؟''

''وہ تمہارے ساتھ تھی نا؟'' شہناز نے مضطرب ہوکر پوچھا۔

''ہاں، وہ میرے ساتھ ہی تھی لیکن......''

''لیکن کیا فیکے؟'' راجا نے جھنجلا کر کہا۔ ''صاف صاف بتاتا کیوں نہیں کہ بات کیا ہے؟''

''وہ......لوگ اسے...... لے گئے ہیں۔'' میرے حلق میں گولہ سا اٹک گیا۔

''کون لوگ لے گئے ہیں؟'' شہناز نے چیخ کر کہا۔

''وہی لوگ جنہوں نے مجھے اغوا کیا تھا۔'' میں نے نظریں جھکا کر کہا۔

اس وقت تو میں خود اپنی ہی نظروں میں گر گیا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ سب حقارت سے مجھے دیکھ رہے ہوں اور ان کی نظریں سوال کررہی ہوں کہ تم کیسے مرد ہو؟ اپنی عزت کی بھی حفاظت نہ کرسکے اور اپنی جان بچا کر بھاگ آئے۔ نور اب میری عزت ہی تو تھی۔

''تم اسے ان لوگوں کے رحم وکرم پر چھوڑ کر آگئے؟'' شہناز ہسٹریائی انداز میں بولی۔

''میں اسے ڈھونڈنے کی کوشش کررہا ہوں۔ غنی بھی اسی سلسلے میں گیا ہے۔ میں نور کو اتنی آسانی سے نہیں چھوڑ سکتا۔'' میں نے بلند آواز میں کہا۔ ''اور میں آج بھی آپ سب لوگوں کے سامنے یہ وعدہ کرتا ہوں کہ اگر نور کو کسی بھی قسم کی گزند پہنچی تو میں ان سب کو بتاؤں گا کہ دہشت گردی کیا ہوتی ہے۔ میں ان میں سے ایک کو بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا، ان کی نسلیں تباہ کردوں گا۔ میں پورے علاقے کو نیست و نابود کردوں گا۔ ابھی تک میں نے شرافت کا مظاہرہ کیا ہے لیکن اب نہیں۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ طاقت صرف انہی کے پاس ہے، کان کھول کر سن لے راجا! وہ رفیق شیرازی مرگیا جو لندن سے پاکستان آیا تھا۔ اب ان سب کا واسطہ ایک ایسے رفیق شیرازی سے پڑے گا جو قہر وغضب کا چلتا پھرتا نمونہ ہوگا۔ میں ان سب کو......''

''ہوش میں آفیکے!'' راجا نے مجھے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ اس نے شاید مجھے تھپڑ بھی مارا تھا۔

میں اس وقت واقعی ہوش میں نہیں تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ میں ہذیانی انداز میں چیخ رہا تھا، اپنے دشمنوں کو برا بھلا کہہ رہا تھا، انہیں گالیاں دے رہا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میں چکرا کر گر پڑوں گا۔

''رفیق!'' شہناز نے کہا۔ ''اس وقت تمہیں ذہنی سکون کی شدید ضرورت ہے۔ تم میرے ساتھ آؤ۔''

مین گیٹ پر کوئی گاڑی آکر رکی۔ پھر گیٹ کھلا اور غنی کی ڈبل کیبن پک اپ اندر داخل ہوئی۔

میں اس وقت تک حویلی کے برآمدے میں پہنچ چکا تھا۔ راجا نے زبردستی مجھے کرسی پر بٹھادیا۔

یہ سوچ کر میرا ذہنی دباؤ خاصا کم ہوگیا کہ غنی کے آدمی استاد اور اس کے گرگوں کو اٹھا لائے ہوں گے۔ تھوڑی دیر بعد غنی میرے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر مایوسی اور تفکرات کے سائے تھے۔

''کیا ہوا غنی؟'' میں نے پوچھا۔ ''ان لوگوں کو لے آئے؟''

غنی نے نظریں جھکا کر نفی میں سر ہلادیا۔

''کیوں؟'' میں چیخ کر بولا۔

''پولیس ہم سے پہلے وہاں موجود تھی۔'' غنی نے کہا۔ ''ان تینوں کو کسی نے بہت بے رحمی سے قتل کردیا ہے۔ انہیں جانوروں کی طرح ذبح کیا گیا ہے۔ اسی بلڈنگ کا ایک آدمی پرنٹنگ پریس میں کام کرتا ہے۔ وہ نائٹ شفٹ کے بعد گھر واپس آیا تو اسے اس فلیٹ سے خون بہتا دکھائی دیا جہاں وہ تینوں بند تھے۔ اس نے فوراً پولیس کو فون کردیا۔''

''تو کیا ان تینوں میں سے کوئی بھی نہیں بچا؟'' میں نے بلند آواز میں پوچھا۔

''جی سر، کسی نے ان تینوں کو ذبح کردیا۔''

''جھوٹ بولتے ہو تم!'' میں حلق پھاڑ کر چیخا۔ ''وہ نور کا پتا بتائے بغیر کیسے مرسکتے ہیں؟''

غنی سر جھکائے کھڑا رہا۔

''تمہیں وہاں پہنچنے میں دیر ہوئی ہوگی۔'' میں چیخ کر بولا۔ ''تم سب نکمے اور ناکارہ ہو۔ دفع ہوجاؤ یہاں سے...... دور ہوجاؤ میری نظروں سے۔'' میں پاگلوں کی طرح چیخ رہا تھا۔ ''کوئی کچھ نہیں کرسکتا۔ اب جو کچھ کروں گا، میں خود ہی کروں گا۔ میں ابھی رانا زوہیب کی حویلی میں جاکر اسے موت کی نیند سلادوں گا۔'' میں غنی سے مخاطب ہوا۔ ''اپنی رائفل مجھے دو۔''

''سر......آپ......''

''رائفل مجھے دو۔'' میں اتنی زور سے چیخا کہ میری آواز پھٹ گئی۔

غنی نے گھبرا کر رائفل مجھے دے دی۔

میں نے اس سے رائفل لے کر میگزین چیک کیا، پھر اسے شانے پر لٹکا کر گاڑی کی طرف بڑھا۔

''پاگل ہوگیا ہے فیکے؟'' راجا نے کہا۔

''ہاں، میں پاگل ہوگیا ہوں۔ میں کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

''ہاں، سب کو ماردینا لیکن نور کو ان کے چنگل سے چھڑانے کے بعد۔'' راجا نے کہا۔ ''ابھی ان کی موت کا وقت نہیں آیا ہے فیکے!'' راجا مجھے بچوں کی طرح بہلا رہا تھا۔ ''تو کیا سمجھتا ہے، ہمیں نور کی فکر نہیں ہے؟'' اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے میرے کمرے میں لے گیا۔ ''تو کچھ دیر آرام کرلے، پھر بات کرتے ہیں۔''

''آرام!'' میں نے کہا۔ ''میں آرام کرلوں، نور نہ جانے کس حال میں ہوگی؟ یہ بہت گھٹیا اور کمینے لوگ ہیں راجا! یہ کچھ بھی کرسکتے ہیں۔''

''وہ تجھے صرف ذہنی اذیت دینا چاہتے ہیں فیکے پتر!'' راجا نے کہا۔ ''انہیں کچھ کرنا ہی ہوتا تو نور کو اغوا نہ کرتے بلکہ وہیں گولی ماردیتے۔''

ڈاکٹر شہناز کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک سرنج تھی۔

''شہناز! مجھے نیند کا انجکشن مت دینا، میں ابھی سونا نہیں چاہتا۔''

''یہ نیند کا انجکشن نہیں ہے۔'' شہناز نے کہا۔ ''تمہارا بلڈ پریشر نارمل کرنے کے لیے یہ انجکشن تمہیں دے رہی ہوں۔''

''شہناز پلیز!'' میں نے کہا ''مجھے اس وقت کسی انجکشن کی ضرورت نہیں ہے۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔'' شہناز نے کہا۔ ''میں انجکشن نہیں لگاؤں گی، تم ایسا کرو، دودھ میں اوولٹین ملا کر پی لو۔ میں ریشم کو بھیجتی ہوں۔''

تھوڑی دیر بعد ریشم اوولٹین اور دودھ کا گلاس لے آئی۔ اس نے دودھ میں اوولٹین ملائی اور گلاس میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے دودھ کا گلاس ایک سانس میں خالی کر دیا۔

''ایک گلاس اور پی لیں صاحب جی!'' ریشم نے کہا۔

''نہیں، بس کافی ہے۔'' میں نے کہا۔

''فیکے پتر! اب تو کچھ دیر آرام کر لے۔'' راجا نے کہا۔

''ابھی تو مجھے اس ڈاکٹر سے پوچھ گچھ کرنا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''آرام کرنے کو تو ایک عمر پڑی ہے، میں......''

میں بولتے بولتے رک گیا۔ مجھے اپنا سر بھاری بھاری سا محسوس ہو رہا تھا، پلکیں بھی بھاری ہو رہی تھیں۔

میں نے چونک کر ریشم کی طرف دیکھا تو مجھے اس کا چہرہ بھی دھندلا دھندلا دکھائی دیا۔ اس کا چہرہ یوں لہرا رہا تھا جیسے وہ پانی میں بیٹھی ہو۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ ان لوگوں نے مجھے دودھ میں ملا کر خواب آور گولیاں دے دی ہیں۔

میں نے ریشم سے درشت لہجے میں پوچھا۔ ''و......د...... دودھ...... میں......'' پھر مجھے زور کا چکر آیا اور میں بیڈ پر ڈھے گیا۔

غنودگی اور بے ہوشی کا یہ دورانیہ نہ جانے کتنا طویل تھا۔ میری آنکھ کھلی تو حلق میں کڑواہٹ سی گھلی ہوئی تھی اور پیاس کے باعث زبان میں کانٹے سے چبھ رہے تھے۔ اس کے باوجود میرے ذہن پر بوجھ نہیں تھا۔ میں نے وال کلاک پر نظر ڈالی وہ دو بجا رہی تھی۔ گویا میں پانچ گھنٹے تک سویا تھا۔

میں اٹھ کر باتھ روم میں چلا گیا اور دیر تک نیم گرم پانی سے نہاتا رہا۔ نہانے سے طبیعت مزید ہشاش ہو گئی۔ میں نہا کر باہر نکلا تو ریشم نے کمرے میں جھانکا۔ مجھے بیدار دیکھ کر وہ اندر آئی اور بولی۔ ''صاحب جی! کھانا لگاؤں آپ کے لیے؟''

''تم پہلے تو یہ بتاؤ کہ مجھے دودھ میں کیا ملا کر پلایا تھا؟'' میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''اوولٹین ملائی تھی صاحب جی!'' ریشم نے معصومیت سے کہا۔ ''آپ کے سامنے تو ملائی تھی۔''

''اور کیا ملایا تھا؟'' میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔

''اور تو کچھ بھی نہیں ملایا تھا صاحب جی!'' ریشم میرے درشت لہجے سے سہم گئی۔

''اس کا مطلب ہے کہ میں تمہاری لائی ہوئی چیزیں کھانا پینا چھوڑ دوں۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''آج کے بعد تم میرے لیے کچھ بھی لے کر نہیں آؤ گی۔ میرے دودھ میں کسی نے بے ہوشی کی دوا ملا دی تھی۔ آئندہ میرا کوئی دشمن میرے کھانے میں زہر بھی ملا سکتا ہے۔''

''مجھ سے قسم لے لیں صاحب جی!'' ریشم رونے لگی۔ ''مجھے تو وہ دودھ ڈاکٹر صاحبہ نے دیا تھا کہ نواب صاحب کو پلا دو۔''

''ڈاکٹر صاحبہ کچن میں کب سے کام کرنے لگیں؟'' میں نے کہا۔ میں جانتا تھا کہ میرے دودھ میں شہناز ہی نے خواب آور دوا ملائی ہوگی۔ اوولٹین کی وجہ سے مجھے دودھ کے ذائقے میں زیادہ فرق محسوس نہیں ہوا یا پھر میں نے اس پر توجہ ہی نہ دی۔

''وہ جی اس وقت خود ہی کچن میں آ گئی تھیں۔ انہوں نے مجھ سے کافی بنانے کو کہا اور خود گلاس میں دودھ نکال لیا۔ پھر مجھ سے بولیں کہ پہلے یہ دودھ نواب صاحب کو دے آؤ، اوولٹین بھی لے جاؤ۔ مجھے نہیں پتا کہ انہوں نے دودھ میں کیا ملایا تھا؟''

شہناز کمرے میں داخل ہوئی اور بولی۔ ''اٹھ گئے نواب صاحب!''

''میں نے تمہیں منع کیا تھا کہ......''

''تمہاری حالت اس وقت ایسی نہیں تھی کہ تم مزید اپنے ذہن پر زور دیتے۔'' شہناز نے کہا۔

''ڈاکٹر صاحبہ! صاحب جی تو مجھ پر غصہ ہو رہے ہیں کہ میں نے دودھ میں کچھ ملا دیا تھا۔''

''اس بے چاری کا کوئی قصور نہیں ہے۔'' شہناز نے کہا۔ ''دودھ میں خواب آور دوا کے قطرے میں نے ہی ملائے تھے، انجکشن تو تم لے نہیں رہے تھے اس لیے مجبوراً ایسا کرنا پڑا۔'' پھر وہ چونک کر بولی۔ ''راجا کہاں ہے؟'' وہ

ریشم سے مخاطب تھی۔

''انہیں جی تھوڑی دیر پہلے میں نے باغ میں دیکھا تھا۔''

''اچھا تم کھانا لگاؤ، رفیق کے چکر میں ہم نے بھی کھانا نہیں کھایا۔''

مجھے خود بھی شدید بھوک لگ رہی تھی۔ میں نے صبح ناشتا بھی نہیں کیا تھا۔ رات کو بھی کھانا بس یوں ہی کھایا تھا۔ پھر شاکر سے ٹاکرا ہو گیا تھا۔

شاکر کا خیال آتے ہی میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ وہ واقعی اگر میرے ساتھ مخلص تھا تو اس معاملے میں میری مدد کر سکتا تھا۔ میں نے سوچا کہ ابھی سیل فون پر اس سے رابطہ کرتا ہوں۔ میں نے حسبِ عادت سیل فون کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا لیکن سیل فون نہ پا کر مجھے مایوسی ہوئی۔ شاکر کا نمبر میرے سیل فون میں محفوظ تھا لیکن سیل فون میرے پاس نہیں تھا۔ نہ جانے استاد نے سیل فون کہاں رکھا تھا؟ جب میں نے اس کی تلاشی لی تھی تو مجھے نہ اپنا سیل فون ملا تھا، نہ پرس! مجھے ایک دفعہ پھر یہ خدشہ پیدا ہوا کہ دشمن مجھے پھانسنے کے لیے میرا سیل فون یا پرس استعمال نہ کریں۔

شہناز نے دوسری مرتبہ کمرے میں آ کر کھانے کے لیے کہا تو میں ڈائننگ ٹیبل پر جا بیٹھا لیکن شدید بھوک کے باوجود مجھ سے زیادہ نہیں کھایا گیا۔

کھانے کی میز سے اٹھتے ہوئے میں نے راجا کو کمرے میں آنے کا اشارہ کیا اور خود کمرے میں آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد راجا بھی وہیں آ گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے ریشم بھی تھی۔ وہ ہمارے لیے کافی لے کر آئی تھی۔

''اب آپ کو کیا چنتا ہے نواب صاحب؟'' راجا نے پوچھا۔

''لگتا ہے آج کل انڈین چینل خوب دیکھ رہے ہو۔'' میں نے کہا۔

''فیکے پتر! ہمارے تو بڑے بڑے سیاست دان انڈین چینلز اور ہندی فلمیں دیکھ رہے ہیں، کسی کو ایشوریا رائے اچھی لگتی ہے، کوئی رانی مکھر جی کا دیوانہ ہے، کوئی آج بھی ریکھا کے نام کی مالا جپ رہا ہے۔''

''یار، تو چھوڑ ان فضول باتوں کو۔'' میں نے کہا۔ ''اغوا کے وقت ان لوگوں نے میرا سیل فون، پرس اور ریوالور سب کچھ چھین لیا تھا۔ میں نے روانگی سے پہلے ان لوگوں کی تلاشی لی تھی لیکن مجھے کچھ نہیں ملا۔''

''یہ بات تجھے اب یاد آئی ہے؟'' راجا نے مجھے گھورا۔ ''وہ سب قتل ہو چکے ہیں فیکے پتر! اب اگر تیرا سیل فون یا پرس ان لاشوں کے پاس ملا ہوگا تو پولیس پارٹی تجھے گرفتار کرنے کے لیے ست بدھائی روانہ ہو چکی ہوگی۔''

''یار! نور کی وجہ سے میرا ذہن منتشر ہو گیا تھا۔''

''چل اٹھ، پہلے تو حسبِ معمول بیک ڈیٹ میں ایف آئی آر لکھوانا پڑے گی۔''

میں نے اپنا حلیہ درست کیا اور باہر نکلنے ہی والا تھا کہ دستک دے کر غنی اندر آ گیا اور بولا۔ ''سر! وہ شاکر صاحب آئے ہیں۔''

''انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ، میں ابھی آ رہا ہوں۔''

''میں نے انہیں باہر والے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہے۔'' غنی نے کہا۔

''یار راجا!'' میں نے کہا۔ ''یہ وہی شاکر ہے جو......''

''میں سمجھ گیا۔'' راجا نے کہا۔ ''یار فیکے! تو اسے فی الحال چھوڑ پہلے ہم ایف آئی آر درج کرا دیں۔''

''یار، بس اس سے سلام دعا کر کے چلتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''چل پھر جلدی کر۔'' راجا نے کہا۔

''غنی! تم گاڑی نکالو۔'' میں نے غنی سے کہا اور خود تیزی سے بیرونی ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔

شاکر مجھے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ آج بھی خاصے معقول لباس میں تھا۔ اسے دیکھ کر کوئی انجان آدمی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ خوش لباس، خوش شکل اور مہذب نظر آنے والا آدمی اتنا بڑا بدمعاش ہوگا۔

میں نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے راجا کا تعارف کرایا۔

''انہیں کون نہیں جانتا نواب صاحب!'' شاکر نے کہا۔ ''یہ تو کرائم رپورٹنگ بھی کرتے رہے ہیں۔''

''شاکر صاحب!'' میں نے کہا۔ ''آپ کو زحمت تو ہوگی لیکن میں اس وقت ایک انتہائی ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ بس میں آدھے گھنٹے تک واپس آ جاؤں گا، پھر آپ سے تفصیلی ملاقات ہوگی۔''

''نو پرابلم!'' شاکر نے کہا۔ ''میں آپ کا انتظار کر لوں گا۔'' پھر وہ چونک کر بولا۔ ''ابھی آپ اپنی امانت تو سنبھال لیں۔''

''میری امانت؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''جی ہاں، آپ کی امانت!'' شاکر مسکرا کر بولا اور اپنا

بریف کیس کھولنے لگا۔ راجا نے مجھے آنکھوں ہی آنکھوں میں جلدی چلنے کا اشارہ کیا۔

اس نے بریف کیس سے جو چیزیں نکالیں، انہیں دیکھ کر نہ صرف میں بلکہ راجا بھی بری طرح چونک اٹھا۔

اس کے ہاتھ میں میرا پرس اور سیل فون تھا۔

''یہ......یہ......آپ کو......''

''کہاں سے ملا؟'' شاکر نے ہنس کر کہا۔ ''بات کافی طویل ہے اور مجھے لگ رہا ہے کہ آپ کہیں جانے کی عجلت میں ہیں۔ راجا صاحب آپ کو دو دفعہ چلنے کا اشارہ بھی کر چکے ہیں۔''

شاکر اگر اتنا بڑا بدمعاش تھا یوں ہی تو نہیں تھا۔ اس نے راجا کا خفیف سا اشارہ بھی بھانپ لیا تھا۔ راجا خود بھی حیران تھا۔

میرے ذہن سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا تھا۔ اس لیے میں اطمینان سے صوفے پر بیٹھ گیا اور بولا۔ ''میں دراصل اپنے سیل فون اور پرس کے گم ہونے کی ایف آئی آر درج کرانے ہی جا رہا تھا۔ آپ کو یہ چیزیں کہاں سے ملیں؟''

''پھر یقیناً یہ دونوں پسٹل بھی آپ ہی کے ہوں گے؟'' شاکر نے اپنے بریف کیس میں سے دو پسٹل بھی نکال کر میری طرف بڑھائے۔

میں نے انہیں دیکھتے ہی پہچان لیا۔ ''ہاں یہ بھی میرے ہیں۔''

''شاکر صاحب!'' راجا نے کہا۔ ''اب یہ بھی بتا دیں کہ یہ چیزیں آپ کو ملیں کہاں سے؟''

''رات کو جب میں نواب صاحب کے ساتھ بیٹھا تھا تو وہاں مجھے کچھ مشتبہ چہرے نظر آئے تھے۔'' شاکر نے کہا۔ ''اس کا تذکرہ میں نے نواب صاحب سے بھی کیا تھا۔ انہی لوگوں میں مجھے غلامو کا شناسا چہرہ نظر آ گیا۔ غلامو دو سال پہلے میرے لیے چھوٹے موٹے کام کرتا تھا۔ پھر میں نے اس سے کام لینا چھوڑ دیا تھا کیونکہ وہ ہیروئن کے نشے کا عادی ہو گیا تھا۔''

''شاکر صاحب! آپ تو یوں بات کر رہے ہیں جیسے آپ کوئی فلاحی ادارہ چلا رہے ہیں۔'' راجا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''بیشتر جرائم پیشہ افراد نشہ کرتے ہیں۔''

''آپ کی بات بالکل درست ہے لیکن ہیروئن کا نشہ انسان کو کھا جاتا ہے۔ وہ مہینوں میں ناکارہ ہو جاتا ہے۔ اسی لیے میں ہیروئن کے عادی افراد سے کام نہیں لیتا۔ یہ نشہ انہیں بے حس اور بے غیرت کر دیتا ہے۔ وہ کوئی بھی اہم بات محض ہیروئن کی ایک خوراک کی خاطر دوسروں کو بتا سکتے ہیں۔

غلامو بھی اس نشے میں مبتلا ہو گیا تھا۔ وہ باقاعدہ میرے ساتھ شامل نہیں تھا۔ میں اکثر اس سے کام لیتا تھا۔ مجھے غلامو کو وہاں دیکھ کر حیرت ہوئی۔ پھر وہ اچانک ہی وہاں سے غائب ہو گیا۔ میں صبح منہ اندھیرے اٹھ کر ایکسرسائز کرتا ہوں، پھر ابراہیم کی دکان پر جا کر لسی کے دو گلاس پیتا ہوں، آج صبح میں لسی پی کر اٹھ ہی رہا تھا کہ مجھے غلامو نظر آیا۔ میں نے اسے اپنے پاس بلا لیا۔

وہ کچھ گھبرایا ہوا بھی تھا اور عجلت میں دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے اسے ناشتا کرنے کو کہا تو وہ رک گیا۔ ناشتے کے دوران میں اس نے مجھے بتایا کہ اب اس نے ہیروئن پینا چھوڑ دی ہے۔

''ایسا ہے تو تم کل میرے پاس آ جاؤ۔ میں تمہیں اپنے ساتھ کام پر لگا لوں گا۔''

غلامو حقارت سے ہنسا اور بولا۔ ''شاکر صاحب! جتنے پیسے آپ مجھے دیتے تھے نا، اس سے چار گنا زیادہ پیسے مجھے ملتے ہیں۔ میں اس وقت ایک بہت بڑے آدمی کے ساتھ کام کر رہا ہوں۔ اب تو پولیس بھی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔''

''او بھائی، ایسا کیا کام کر رہے ہو؟'' میں نے ہنس کر پوچھا۔

''ابھی تو میں جلدی میں ہوں، کل کسی وقت آپ کی طرف چکر لگاؤں گا۔'' غلامو کے انداز میں بے نیازی تھی۔

مجھے اس کی بے نیازی پر مزید شبہ ہوا۔ میں نے پوچھا۔ ''تم اس وقت جا کہاں رہے ہو، ایسی بھی کیا جلدی ہے؟''

''مجھے یہ چیزیں ایک جگہ ڈالنا ہیں۔'' اس نے چھوٹے سے ایک بیگ کی طرف اشارہ کیا۔ ''اور مجھے اس معمولی سے کام کے پورے پچاس ہزار روپے ملے ہیں۔''

''پورے پچاس ہزار!'' میں نے حیرت کا مظاہرہ کیا۔ ''اس بیگ میں ہے کیا؟''

''کوئی نواب رفیق ہے......ہاں رفیق شیرازی۔ یہ اسی کی چیزیں ہیں لیکن مجھے اس سے کیا غرض کہ وہ کس کی چیزیں ہیں؟ مجھے تو میرے کام کا معاوضہ مل رہا ہے۔''

اس کی باتوں سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ آپ کو پہچانتا نہیں ہے۔

''لیکن اس میں ہے کیا؟'' میں نے بیگ کی طرف اشارہ کیا۔

''اسی نواب کا سیل فون، پرس اور دو پسٹل ہیں۔''

میں نے اس سے کہا۔ ''چلو، میں تمہیں وہاں تک چھوڑ دیتا ہوں، تمہیں پہلے ہی دیر ہو رہی ہے۔''

''ہاں، اگر آپ مجھے ماڈل ٹاؤن تک چھوڑ دیں تو بڑی مہربانی ہو گی۔'' غلامو نے لجاجت سے کہا۔

میں نے اسے گاڑی میں بٹھایا اور روانہ ہو گیا۔ میرا رخ گلبرگ کی طرف تھا۔ وہ چونک کر بولا۔ ''یہ آپ کہاں جا رہے ہیں؟''

''خاموش بیٹھو!'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔

اس نے چونک کر مجھے دیکھا، پھر بولا۔ ''شاکر صاحب! آپ مجھے یہیں اتار دیں۔''

''میں نے کہا تھا کہ خاموش بیٹھو۔'' میں نے اسے بری طرح جھڑک دیا اور اچانک ریوالور نکال لیا۔ ''اب اگر تمہارے منہ سے ایک لفظ بھی نکلا تو میں تمہیں گولی مار دوں گا۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں صرف دھمکیاں نہیں دیتا ہوں، گولی مار بھی دیتا ہوں۔''

''لیکن......شاکر......صاحب......''

میں نے ریوالور کا سیفٹی کیچ ہٹایا تو وہ بولتے بولتے رک گیا۔ غلامو بنیادی طور پر بزدل آدمی ہے۔ وہ اپنے طور پر چھوٹی موٹی وارداتیں کر لیتا ہے۔ میرے ہاتھ میں ریوالور اور چہرے پر غصہ دیکھا تو وہ بدحواس ہو گیا۔

میں اسے اپنے بنگلے پر لے گیا اور بے رحمی سے بنگلے کے ایک کمرے میں دھکیل دیا۔

''ہاں، اب بتاؤ غلامو، یہ چیزیں تمہیں کس نے دی تھیں اور کیوں؟''

وہ مجھ سے اچھی طرح واقف ہے، میرے ساتھ کام کر چکا ہے اس لیے جانتا ہے کہ میں آسانی سے اس کی جان نہیں چھوڑوں گا۔ میرے ایک ہی تھپڑ پر وہ سہم گیا۔

میں نے گن نکال کر اس کی کنپٹی پر رکھ دی اور کہا۔ ''جو کچھ میں پوچھ رہا ہوں، سچ سچ بتانا۔ میرے پاس وقت بالکل نہیں ہے، جھوٹ بولا تو میں دوبارہ کچھ نہیں پوچھوں گا، لیکن تو کچھ بتانے کے قابل نہیں رہے گا کیونکہ تیری کھوپڑی بکھر چکی ہو گی۔ تو جانتا ہے کہ میں گولی مارنے میں ایک لمحے کی تاخیر بھی نہیں کرتا۔ یہ چیزیں تجھے کس نے دی تھیں؟''

''یہ مجھے منظورے نے دی تھیں اور کہا تھا کہ انہیں ماڈل ٹاؤن کے ایک فلیٹ میں ڈال آؤ۔''

''کیوں؟'' میں نے گرج کر پوچھا۔

''یہ مجھے اس نے نہیں بتایا تھا۔'' غلامو نے سہم کر کہا۔

''منظورا کون؟'' میں نے پوچھا۔

''نچلے درجے کا ایک بدمعاش ہے۔'' شاکر نے جواب دیا۔ پھر آگے بتانے لگا۔ ''پھر میں نے غلامو سے پوچھا۔ منظورا اس وقت کہاں ملے گا؟''

''وہ اس وقت شاہ عالمی میں پہلوان لسی والے کی دکان پر ہو گا۔''

میں نے آپ کی تمام چیزیں بیگ میں رکھیں، پھر اپنے ایک آدمی کو بلا کر کہا۔ ''غلامو کو لے جا کر بند کر دو۔ میرے واپس آنے تک یہ یہاں سے نکلنے نہ پائے۔''

''میں نے سب کچھ سچ سچ تو بتا دیا ہے۔ اب مجھے یہاں کیوں روک رہے ہو؟'' غلامو گھگیا کر بولا۔

''اگر یہ شور شرابا کرے یا زیادہ بکواس کرے تو اسے گولی مار کے کسی کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دینا۔''

مجھے آپ کی طرف سے بہت پریشانی ہو گئی تھی۔ پھر میں نے اس فلیٹ پر جانے کا فیصلہ کر لیا۔

میں وہاں پہنچا تو پولیس کی موبائل...... اور لوگوں کی بھیڑ دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ میرے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ آپ کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے۔ میں نے اپنی گاڑی وہاں سے کچھ فاصلے پر پارک کی اور ٹہلتے ہوئے دوبارہ وہاں پہنچا۔ لوگ چار چار اور چھ چھ کی ٹولیوں میں بٹے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔

میں بھی ایک ٹولی کے پاس جا کھڑا ہوا اور ایک آدمی سے پوچھا۔ ''یہاں کیا ہوا ہے بھائی؟''

''یہاں پر تین آدمیوں کو کسی نے ذبح کر دیا ہے۔'' وہ برا سا منہ بنا کر بولا۔ ''ذبح کرنے کا مطلب سمجھتے ہیں آپ؟'' وہ شخص بولا۔ وہ کچھ زیادہ ہی باتونی تھا۔ ''بالکل جانوروں کی طرح ان تینوں کے گلے پر چھری چلائی گئی ہے۔''

''آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''خالق صاحب نے سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے، ان کا فلیٹ اس فلیٹ کے سامنے ہی ہے جس میں یہ واردات ہوئی ہے۔ ان تینوں کا اتنا خون بہا ہے کہ کوریڈور میں بھی آ گیا ہے۔''

''کچھ معلوم ہوا کہ مرنے والے کون تھے؟''

''یار، اب یہ جگہ بھی شریفوں کے رہنے کے قابل نہیں رہی۔'' ایک صاحب نے کہا۔

''مجھے تو ڈکیتی کی واردات لگتی ہے۔'' ایک اور آدمی بولا۔

''ڈکیتی کیسی یار!'' پہلا آدمی بولا۔ ''اس فلیٹ میں سوائے پرانے فرنیچر اور برتنوں کے تھا ہی کیا؟ یہ فلیٹ تو گزشتہ سات آٹھ مہینے سے خالی ہے۔ اسد صاحب نے

گلبرگ میں ایک بنگلا خرید لیا ہے۔ وہ اس فلیٹ کو فروخت کرنا چاہ رہے تھے۔"

میں نے سوچا کہ یہاں سے کچھ بھی معلوم نہیں ہوگا کہ مرنے والے کون تھے؟ وہاں کے مقامی تھانے میں ایک سب انسپکٹر میرا دوست ہے۔ ایسے دوست لاہور کے تقریباً ہر تھانے میں ہیں۔ مجھے ان لوگوں کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔

میں وہاں سے سیدھا تھانے پہنچا اور سب انسپکٹر وسیم ملک سے ملا۔ اس نے میرے لیے انتہائی پرتکلف چائے منگائی۔ وہ جانتا ہے کہ اس چائے کا بل بھی میں ادا کروں گا۔

ہم چائے پی ہی رہے تھے کہ وہ ٹیم واپس آگئی جو ماڈل ٹاؤن کے اس فلیٹ پر گئی تھی۔ اس ٹیم کے ساتھ جانے والا سب انسپکٹر ریاض چودھری سیدھا وسیم کے پاس آیا اور بولا۔ "ہم وہاں خوار ہوکر آرہے ہیں اور تم اکیلے اکیلے چائے پی رہے ہو۔"

"تم بھی پی لو یار!" وسیم نے کہا، پھر اس سے پوچھا۔ "یہ قتل کی واردات ہے یا...... خودکشی کی ہے ان لوگوں نے؟"

"خودکشی!" سب انسپکٹر ریاض طنزیہ لہجے میں بولا۔ "کوئی آدمی اپنا گلا خود کیسے کاٹ سکتا ہے؟"

"یہ تو معلوم ہو ہی گیا ہوگا کہ مرنے والے کون تھے؟"

"مرنے والوں ہی نے تو ہم پر دقت ڈال دیا ہے۔ مرنے والا استاد حضور بخش ہے جو عرف عام میں استاد کے نام سے مشہور تھا۔ اس کے ساتھ اس کے دو چمچے بھی تھے۔ بلڈنگ والوں کا بیان ہے کہ وہ فلیٹ کئی مہینوں سے خالی تھا، پھر استاد حضور بخش وہاں کیوں گیا؟ وہاں کوئی لڑکی بھی تھی کیونکہ بیڈ پر ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے بھی ملے ہیں۔"

میرا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ میں تھانے سے باہر نکل آیا اور اپنے دو آدمیوں سے کہا کہ منظورے کو اٹھالاؤ۔ مجھے یہ اطمینان ہوگیا تھا کہ آپ محفوظ ہیں۔

تھوڑی دیر بعد میرے آدمیوں نے اطلاع دی کہ منظورا وہاں نہیں ہے۔ انہوں نے اس کے دوسرے ٹھکانے بھی دیکھ لیے تھے۔ وہ وہاں بھی نہیں تھا۔ میں نے انہیں تلاش جاری رکھنے کو کہا اور خود ست بدھائی آگیا۔ یہاں آکر جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ آپ ست بدھائی پہنچ چکے ہیں اور خیریت سے ہیں تو میں نے سکون کا سانس لیا۔" پھر وہ مسکرا کر بولا۔ "اب آپ ہی بتایئے، یہ سب کیا تھا؟"

میں نے مختصراً اسے بتایا کہ میرے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ میں نے احتیاطاً اسے یہ نہیں بتایا کہ ڈاکٹر اب میرے قبضے میں ہے۔

"شاہ جی کے بارے میں اڑتی اڑتی خبریں تو میں نے سنی تھیں لیکن میں نے ان پر یقین نہیں کیا تھا۔ لوگ تو بڑے سے بڑے آدمی کے لیے بھی ایسی افواہیں اڑا دیتے ہیں۔" شاکر نے کہا۔ "میرے آدمیوں نے اب تک منظورے کا سراغ لگالیا ہوگا۔ اسے معلوم ہوگا کہ انہوں نے میڈم نور کو کہاں رکھا ہے؟ اب میں یہ معلوم کرنے کی کوشش بھی کروں گا کہ مسکین شاہ عرف شاہ جی کے لیے کون لوگ کام کر رہے ہیں؟ وہ اکیلا تو اس قسم کے کام نہیں کرسکتا، اس کے ساتھ پورا گینگ ہوگا۔ اگر آپ اس ڈاکٹر کو روک لیتے تو شاید اس سے شاہ جی کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہوجاتیں۔"

اس دوران میں حویلی کا ایک ملازم دو دفعہ ہمارے لیے چائے لاچکا تھا۔

شاکر نے اچانک کہا۔ "نواب صاحب! اب مجھے اجازت دیں۔ آپ کا سیل نمبر میرے پاس ہے، جیسے ہی میڈم کے بارے میں کچھ معلوم ہوا، میں آپ کو اطلاع دے دوں گا۔ آپ فکر مت کریں، میں بہت جلد میڈم کو ان کے چنگل سے نکال لوں گا۔" پھر وہ چونک کر بولا۔ "اس کا مطلب ہے کہ رانا اور شاہ جی کا بھی کچھ جوڑ ہے ورنہ شاہ جی کو آپ سے کیا دشمنی ہوسکتی ہے؟" یہ کہتے ہوئے وہ کھڑا ہوگیا۔ اس نے باری باری ہم دونوں سے ہاتھ ملایا اور روانہ ہوگیا۔ غنی اسے باہر تک رخصت کرنے چلا گیا۔

"کیا بات ہے مہاراجا!" میں نے کہا۔ "تو بہت خاموش ہے؟"

"میں اس شخص کی باتوں پر غور کررہا ہوں۔" راجا نے کہا۔ "آخر اسے ہم سے ایسی کیا ہمدردی ہوگئی ہے کہ وہ ست بدھائی تک دوڑا چلا آیا؟"

"یہ ہم سے ہمدردی نہیں بلکہ دلاور سے دشمنی کی خاطر یہاں آیا ہے۔" میں نے کہا۔

"اچھا اس پر ابھی مٹی ڈال، چل ذرا اس ڈاکٹر کا بھی انٹرویو کرلیں، وہ ہے کیا شے؟" راجا نے کہا۔

ڈاکٹر سٹنگ روم میں بہت بے زاری کے عالم میں بیٹھا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر بولا۔ "نواب صاحب! یا تو آپ مجھے پولیس کے حوالے کردیں یا پھر جانے دیں۔"

"کیوں بھئی، تم نے ایسا کون سا نیک کام کیا ہے کہ تمہیں پولیس کے حوالے کیا جائے؟"

"نیک کام؟" ڈاکٹر نے حیرت سے کہا۔

"اوئے یہ تو تمہارے ساتھ نیکی ہی ہوگی کہ تمہیں پولیس کے حوالے کردیا جائے اور تم کک مکا کرکے جان چھڑالو۔" راجا نے کہا۔

"آپ نے اپنا تعارف نہیں کرایا؟" ڈاکٹر نے بہت مہذب انداز میں راجا سے پوچھا۔

"اوئے میرا تعارف حاصل کرکے کیا کروگے۔ میں تو بہت بدنام آدمی ہوں۔ جرنلسٹ تو آج کل ویسے بھی بدنام ہیں۔"

"اچھا اچھا!" ڈاکٹر نے کہا۔ "میں آپ کو پہچان گیا ہوں، یہی میں سوچ رہا تھا کہ میں نے آپ کو کہاں دیکھا ہے؟"

"اب تو سوچ لیا نا!" راجا نے کہا۔ "اب شروع ہوجاؤ اور بالکل سچ بولنا ورنہ جھوٹ بولنے والے اس حویلی سے کبھی باہر نہیں نکلتے۔"

"میں نواب صاحب کو سب کچھ بتاچکا ہوں۔"

"تمہیں یہ کام کرنے کے لیے کس نے کہا تھا؟" راجا نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"میں نے بتایا تو ہے کہ استاد......"

"میں نے کہا نا کہ جھوٹ مت بولنا۔" راجا نے درشت لہجے میں کہا۔ اس وقت تو اس کی پوری شخصیت ہی بدل کر رہ گئی تھی۔

"تو پھر جو آپ کہیں میں کہنے کو تیار ہوں۔" ڈاکٹر نے ڈھٹائی سے کہا۔

"تمہارا وہ دواؤں کا بیگ کہاں ہے؟" راجا نے اچانک پوچھا۔

"وہ تو گاڑی میں ہے۔" ڈاکٹر کچھ پریشان ہوگیا۔

"ٹھیکے پتر! غنی سے کہہ کر اس گاڑی سے ڈاکٹر کے بیگ سمیت تمام سامان نکال لے اور گاڑی کو ٹھکانے لگا دے۔" اس نے غنی کو آواز دی۔

غنی ہمیشہ میرے اردگرد ہی موجود رہتا تھا۔ وہ فوراً کمرے میں آگیا۔ میں نے اسے گاڑی کی چابیاں دیں اور کہا کہ میری گاڑی کا تمام سامان نکال کر لے آؤ اور اس گاڑی کو فوری طور پر کہیں چھپا دو۔ اس کا سراغ نہیں ملنا چاہیے۔

غنی تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر کا بھاری بھرکم بیگ لے کر آگیا۔ بیگ کیا وہ چھوٹا سا سوٹ کیس تھا۔

"ان میں کون کون سی دوائیں اور انجکشن ہیں؟" راجا نے پوچھا۔

"میں نواب صاحب کو بتاچکا ہوں۔" ڈاکٹر نے کچھ ناگواری سے کہا۔

"تمہیں شاید معلوم نہیں کہ یہاں پنجاب کے بہترین اسپتالوں میں سے ایک اسپتال تعمیر ہورہا ہے۔ یہاں پاکستان بھر کے ڈاکٹروں کی کریم موجود ہے۔" راجا نے گنتی کے ان چند ڈاکٹروں کو پاکستان بھر کی کریم بنادیا۔ "ہمارے پاس پاکستان کے کسی بھی جدید اسپتال کے معیار کی مشینری، آلات، لیب اور آپریشن تھیٹرز بھی موجود ہے۔ میں تمہارا بیگ ابھی ڈاکٹر مشہود احمد کے حوالے کردوں گا۔ وہ خود بتادیں گے کہ اس میں کس قسم کی دوائیں ہیں۔"

ڈاکٹر کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ ڈاکٹر مشہود کے نام سے میں بھی واقف تھا۔ وہ پاکستان بلکہ ایشیا کے بہترین فزیشنز اور سرجنز میں سے ایک تھے۔

"ڈاکٹر مشہود!" ڈاکٹر نے تھوک نگل کر کہا۔ "وہ تو سان فرانسسکو میں تھے۔ وہ......"

"وہ اب یہاں ست بدھائی میں ہیں۔" راجا نے ڈھٹائی سے جھوٹ بولا۔

"دیکھیے اس بیگ میں میری کئی پرسنل چیزیں بھی موجود ہیں۔" ڈاکٹر نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

"دواؤں کے علاوہ تم اس میں سے اپنی تمام ذاتی چیزیں نکال لو۔" راجا نے بیگ ڈاکٹر کے سامنے رکھ دیا۔

ڈاکٹر نے بیگ کھولا تو اس کے ہاتھوں میں لرزش تھی۔ راجا کی نظریں اس کے بیگ پر جمی ہوئی تھیں۔

اس نے بیگ کے اندر ہاتھ ڈال کر دوائیں الٹ پلٹ کیں، پھر پھرتی سے دو لفافے نکال لیے۔ وہ خاکی رنگ کے لفافے تھے۔ ڈاکٹر کے اٹھانے کے انداز سے وہ خاصے وزنی لگ رہے تھے۔ پھر اس نے ان سے کچھ چھوٹا ایک اور لفافہ نکالا اور بیگ راجا کے حوالے کردیا۔ ڈاکٹر کے چہرے پر پسینے کے قطرے تھے۔

"ان دواؤں کو تو میں ابھی لیب بھجوادوں گا۔ ممکن ہے ان پر لیبل کسی اور دوا کا ہو اور اندر کچھ اور ہو۔" راجا نے کہا۔ "تم پہلے یہ لفافے کھول کر دکھاؤ۔"

"میں نے کہا نا کہ یہ میری ذاتی چیزیں ہیں۔"

"ان میں دوائیں بھی ہوسکتی ہیں۔" راجا نے کہا۔ "لفافے کھول دو۔ کوئی دوا نہیں ہوئی تو میں انہیں جوں کا توں واپس کردوں گا۔"

"جب میں نے آپ سے کہہ دیا کہ یہ میری پرسنل چیزیں ہیں تو آپ......"

"تم لفافے دیتے کیوں نہیں؟" میں نے درشت لہجے میں کہا۔

"یہ میں نہیں دے سکتا۔" ڈاکٹر نے لفافے اپنے پیچھے چھپاتے ہوئے کہا۔

''غنی!'' میں نے بلند آواز میں کہا۔

غنی فوراً ہی اندر آ گیا۔ ''جی سر!''

''ڈاکٹر صاحب سے یہ لفافے لے لو۔'' میں نے کہا۔

''دیکھیے نواب صاحب! یہ آپ زیادتی کر رہے ہیں۔''

''میں زیادتی کر رہا ہوں؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تم نے میرے ساتھ جو کچھ کیا، وہ کیا تھا؟ میں نے تو ابھی تک کچھ بھی نہیں کیا۔''

''میں آپ کو سب کچھ تو بتا چکا ہوں۔'' اس نے کہا۔

''غنی!'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''تم نے سنا نہیں؟''

غنی آگے بڑھا تو ڈاکٹر نے لفافے پوری قوت سے اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیے۔

غنی نے لفافے چھیننے کے بجائے ڈاکٹر کی کنپٹی پر ہلکا سا ایک ہاتھ رسید کر دیا۔ ڈاکٹر چکرا کر صوفے پر گر پڑا۔ وہ ہوش میں تھا لیکن اب اس کے ہاتھوں میں سکت نہیں رہی تھی۔ غنی نے اطمینان سے تینوں لفافے اس کے ہاتھوں سے نکال کر میری طرف بڑھا دیے۔ وہ خاصے وزنی لفافے تھے۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ ان میں کاغذات کے بجائے کچھ اور ہی ہے۔

راجا نے وہ لفافے میرے ہاتھ سے لے لیے اور ان میں سے سب بڑا لفافہ کھولنے کی کوشش کی۔

ڈاکٹر اپنی جگہ سے اٹھ کر راجا پر جھپٹا۔ ان لفافوں میں یقیناً کوئی ایسی چیز تھی جسے ڈاکٹر ہم سے چھپانا چاہتا تھا۔

غنی نے جھپٹ کر اسے پکڑ لیا۔ پھر تو گویا ڈاکٹر پر جنون طاری ہو گیا۔ غنی نے ایک مرتبہ پھر اس کی کنپٹی کو نشانہ بنایا۔ اس مرتبہ اس کا ہاتھ قدرے سخت پڑا تھا۔ ڈاکٹر لڑھک کر صوفے پر گرا اور بے سدھ ہو گیا۔

''کہیں یہ مر تو نہیں گیا؟'' میں نے پوچھا۔

''سر! یہ اتنی آسانی سے نہیں مرے گا۔ میں نے ہاتھ ہلکا ہی رکھا ہے۔ یہ ابھی تھوڑی دیر بعد ہوش میں آ جائے گا۔'' غنی نے کہا۔

راجا نے ایک لفافہ کھولا تو اس کے اندر سے بہت سی ڈی وی ڈیز کے علاوہ کاغذات بھی نکلے۔ اس نے تہ شدہ ایک فل اسکیپ کاغذ کو کھولا اور بلند آواز میں پڑھنے لگا۔

''تمہارے پاس جو لڑکیاں بھیجی جا رہی ہیں، انہیں انجکشن دو اور ان کی ویڈیوز بنوا کر ان کے عاشقوں کے حوالے کر دو۔ روبی اور حنا کو انجکشن نمبر دو دینا۔''

''یہ انجکشن نمبر دو کیا ہے؟'' راجا نے بڑبڑا کر کہا۔ پھر دوسرا تہ شدہ کاغذ کھول لیا۔

''نواب رفیق شیرازی اور اس لڑکی کو انجکشن نمبر ایک دے کر ویڈیو بناؤ، پھر انہیں استاد کے حوالے کر دو۔ استاد جانتا ہے کہ اسے کیا کرنا ہے۔''

تیسرے کاغذ میں تحریر تھا۔ ''نواب شیرازی کے ساتھ جو لڑکی ہے، اس کے کلوز اپ بھی بنانا، نواب بھی کیا یاد کرے گا کہ اس کا کن لوگوں سے پالا پڑا ہے۔''

دوسرے لفافے میں صرف ڈی وی ڈیز تھیں، تیسرے لفافے میں پچاس لاکھ روپے کا بیرر چیک تھا جو کسی ڈاکٹر اجمل کے نام جاری کیا گیا تھا۔

''یہ انجکشن نمبر ایک، دو اور تین کیا ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کا جواب تو یہ ڈاکٹر ہی دے گا۔'' راجا نے کہا۔ ''ٹھیکے پتر! تو بھی کیسے کیسے عجوبے لے کر آتا ہے؟''

''غنی!'' میں نے کہا۔ ''اسے ہوش میں لاؤ۔''

غنی نے پانی کا جگ اٹھایا اور ڈاکٹر کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے لگا۔

اس دوران میں راجا اس کے دواؤں کے بیگ کی تلاشی لے رہا تھا۔ اس میں کئی سرنج، انجکشن کے وائل اور فرسٹ ایڈ کا سامان تھا۔ کسی بھی انجکشن کے وائل پر کوئی نمبر نہیں تھا۔

''ان تمام دواؤں کو لیب میں ٹیسٹ کرانا پڑے گا۔'' راجا نے کہا۔

اس وقت تک ڈاکٹر نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ وہ پھٹی پھٹی نظروں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔

پھر اس نے کہا۔ ''نواب صاحب! اگر مجھے پینے کو کچھ مل جائے تو......''

''یہاں تمہیں پانی، کولڈ ڈرنک اور چائے کافی کے سوا کچھ بھی نہیں ملے گا۔'' میں نے کہا۔ ''غنی! اسے پانی پلاؤ۔''

ڈاکٹر نے ایک ہی سانس میں پورا گلاس خالی کر دیا۔

''میں نے کہا تھا کہ صرف سچ بولنا۔'' راجا نے کہا۔ ''لیکن بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی۔''

ڈاکٹر ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔

''یہ انجکشن ایک، دو، تین کیا ہیں؟''

''یہ اصل میں طاقت کے انجکشن ہیں۔'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''نمبروں کے حساب سے ان کی اثر انگیزی میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔''

''تم پھر جھوٹ بول رہے ہو؟'' میں نے کہا۔ ''کسی بھی لڑکی کو وہ انجکشن دینے کا فائدہ کیا ہے؟ کیا انہیں ریسلنگ میں حصہ لینا ہے۔''

''آپ یقین کریں، ایسا ہی ہے۔ مجھ سے تو جو کچھ کہا جاتا ہے، میں کرتا ہوں، وہ انجکشن بھی مجھے اس شخص نے فراہم کیے تھے؟''

''کس شخص نے؟'' میں نے پوچھا تو جواب میں اس نے ایک صوبائی وزیر کا نام بتایا جو انتہائی نیک نام تھا۔

''اس سے اس کا مقصد کیا ہوتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''مقصد تو وہی جانتا ہوگا۔ وہ مجھے ہر ایسے کام کے دس لاکھ روپے دیتا ہے۔''

''وہ انجکشن اس وقت تمہارے پاس ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، وہ اس وقت تو میرے پاس نہیں ہیں۔'' اس نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' راجا نے کہا۔ ''اس وقت تمہارے بیگ میں جو انجکشن ہیں، وہ کس مقصد کے لیے استعمال ہوتے ہیں؟''

''ان میں سے کچھ اینٹی سیپٹک ہیں، کچھ اینٹی بائیوٹک ہیں اور کچھ وٹامن بی کمپلیکس کے انجکشن ہیں۔''

''یہ انجکشن انسانوں پر کوئی منفی اثرات تو نہیں ڈالتے؟'' راجا نے پوچھا۔ ''میرا مطلب ہے کہ ان کے لگنے سے کسی کی موت واقع ہو جائے یا پھر وہ ہمیشہ کے لیے مفلوج ہو جائے؟''

''نہیں، اس میں ایسی کوئی دوا نہیں ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

''ان تمام دواؤں کو لیب ٹیسٹ کے لیے بھجوا دو۔'' میں نے کہا۔

''اس کی کیا ضرورت ہے؟'' راجا نے کہا۔ ''میں باری باری یہ تمام انجکشن اس ڈاکٹر کو لگاؤں گا۔ یہ سب بے ضرر دوائیں ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ان کے آفٹر ایفیکٹ ہوں گے۔ وہ بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ہمارے پاس ڈاکٹر ہیں۔ وہ اسے سنبھال لیں گے۔''

ڈاکٹر کے چہرے پر اچانک موت کی سی زردی کھنڈ گئی۔ وہ ہذیانی لہجے میں بولا۔ ''نہیں...... نہیں...... ایسا مت کرنا۔ یہ دوائیں...... ان کے آفٹر ایفیکٹس بہت زیادہ ہوتے ہیں۔''

''فکر مت کرو۔ یہاں ڈاکٹرز کی پوری ٹیم موجود ہے۔ وہ تمہیں مرنے نہیں دے گی۔'' راجا نے اس کے بیگ سے ایک سرنج اور انجکشن نکالا اور سرنج کا ریپر پھاڑنے لگا۔

''نہیں، پلیز نہیں!'' ڈاکٹر چیخا۔ ''مجھ پر رحم کریں۔ میں آپ کو سچ سچ بتا دوں گا۔''

''بولو۔'' راجا نے کہا۔

''میں جس منسٹر کے لیے کام کرتا ہوں، وہی مجھ سے یہ سب کراتا ہے۔''

''تمہارا نام اجمل ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں، میرا نام اجمل ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''میں نے آپ کو سب کچھ سچ سچ بتایا تھا۔ بس ان انجکشنز کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔''

''اب ذرا ان کے بارے میں بھی بتا دو۔'' راجا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''انجکشن نمبر ایک میں ایسی دوا ہے جو میں نے آپ کو اور اس لڑکی کو دی تھی۔ منسٹر وہ انجکشن لگانے کے بعد لوگوں کی قابل اعتراض ویڈیوز بناتا ہے اور انہیں بلیک میل کرتا ہے۔ انجکشن نمبر دو لگنے کے بعد وہ شخص وقتی طور پر اپنے حواس میں نہیں رہتا اور کچھ بھی اول فول بک سکتا ہے۔ انجکشن نمبر تین لگنے کے بعد وہ شخص ہمیشہ کے لیے پاگل ہو جاتا ہے، پھر اسے اپنے تن بدن کا ہوش نہیں رہتا۔''

''اور تم یہ انسانیت سوز کام کرتے ہو؟ ایک ڈاکٹر ہوتے ہوئے تمہیں بالکل شرم نہیں آتی کہ تم نے انسانی زندگیوں کو مذاق سمجھ لیا ہے؟'' میں نے بپھر کر کہا۔ ''کیا نام ہے اس حرام زادے منسٹر کا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے آپ کو بتایا تو ہے کہ اس کا نام مسکین شاہ ہے۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

''اور وہ تمہیں اس کام کے دس لاکھ روپے دیتا ہے۔''

''وہ کبھی کبھی اس سے دگنے بھی دیتا ہے۔'' ڈاکٹر نے ڈھٹائی سے کہا۔

''اتنی دولت کا کیا کرو گے؟ اگر تم مر گئے تو یہ دولت کس کے کام آئے گی؟''

ڈاکٹر نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

''تم نے میری ویڈیو کس سلسلے میں بنائی تھی؟''

''مجھے شاہ جی نے حکم دیا تھا کہ استاد ایک بندے کو لا رہا ہے اس کی ویڈیو بنانا ہے۔ لڑکی کو استاد پہلے ہی اٹھا چکا تھا۔''

''اور میرے ساتھ جو لڑکی تھی اس کے بارے میں تمہارے شاہ جی نے کیا حکم دیا تھا؟''

"اس نے کہا تھا کہ آپ کی ویڈیو بنانے کے بعد اس لڑکی کو بھی استاد کے حوالے کر دوں۔"

"یہ ویڈیوز کیسی ہیں؟" راجا نے پوچھا۔ وہ بھی لمحے بھر کو گنگ ہو کر رہ گیا تھا۔

"یہ ویڈیو بھی میں ان لوگوں کو ارسال کرتا ہوں، شاہ جی نے کہا تھا کہ کل ہر حالت میں ان میں سے کچھ ویڈیوز ارسال کرنا ہیں۔ آج مجھے اسلام آباد میں جانا تھا، پھر آپ کی ویڈیو بھی بنانا تھی۔ میں نے جلدی میں دو مہینے کے اندر اندر بنائی ہوئی تمام ویڈیوز اس بیگ میں رکھ لیں کہ اسلام آباد پہنچ کر ان میں سے ارسال کرنے والی ویڈیوز چھانٹ لوں گا۔"

"تم کس اسپتال میں سروس کرتے ہو؟"

"میں آج کل کسی بھی اسپتال میں سروس نہیں کرتا۔ ویسے میں میو اسپتال میں تھا۔ وہاں سے ضابطے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے نکالا گیا۔ شاہ جی سے پہلے ہی تعلقات ہو گئے تھے۔ وہ چاہتا تو مجھے دوبارہ وہیں لگوا سکتا تھا لیکن اس نے کہا کہ نوکری کو چھوڑو، میرے ساتھ کام کرو۔ تم اتنا کماؤ گے کہ تم نے تصور بھی نہ کیا ہوگا؟"

"استاد اور شاہ جی کے درمیان کیا تعلق ہے؟"

"استاد تو اس کا معمولی سا ایک مہرہ ہے۔ وہ اکثر اس سے لوگوں کو اغوا کرانے، دنگا فساد کرانے، مخالفین کے جلسے درہم برہم کرانے کے کام لیتا ہے۔ اس نے تو شاید کبھی شاہ جی کو دیکھا تک نہ ہو۔"

"میری ویڈیو کا ماسٹر پرنٹ کہاں ہے؟" میں نے اچانک پوچھا۔

"وہ میں نے ایک بندے کے ہاتھ شاہ جی کو روانہ کر دیا تھا۔ اب وہ اس کی مختلف ڈی وی ڈیز بنائے گا اور پھر وہی کرے گا جو وہ کرتا ہے۔"

"اب تمہارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے؟" راجا نے پوچھا۔

"میں نے تو سب کچھ آپ کو سچ سچ بتا دیا ہے۔ اب آپ چاہیں ...تو مجھے گولی مار دیں۔ میں جانتا تھا کہ ان کاموں کا انجام آخر میں یہی ہوتا ہے۔"

"میں تمہیں اتنی آسان موت نہیں دوں گا بے ضمیر، حرام زادے!" میں بپھر کر بولا۔ "تمہیں بھی وہی انجکشن نمبر تین دے کر لاہور کی سڑکوں پر چھوڑ دیا جائے گا۔"

"نہیں، ایسا مت کریں...... میں......"

"تم نے کبھی کسی پر رحم کھایا ہے جو میں ایسا نہ کروں؟" میں نے کہا۔ "صرف ایک صورت میں تمہیں اس صورت سے نجات مل سکتی ہے۔ مجھے اپنی ویڈیو کا ماسٹر پرنٹ، تمام ڈی وی ڈیز اور شاہ جی کے خلاف ٹھوس ثبوت چاہئیں۔ اگر تم یہ کر سکتے ہو تو کرو ورنہ میں وہی کروں گا جو میں نے کہا ہے۔"

"میں نہیں جانتا کہ شاہ جی وہ تمام اسٹاک کہاں رکھتا ہے۔" ڈاکٹر بے چارگی سے کہا۔

"ایک انجکشن میں تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔" راجا نے کہا۔

"آپ مجھے کچھ دن کی مہلت دیں تو میں معلوم کرنے کی کوشش کروں۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "میں شاہ جی سے مل کر اس سے اگلوانے کی کوشش کروں گا کہ اس نے وہ تمام مواد کہاں رکھا ہوا ہے؟"

"اس خوش فہمی میں مت رہنا کہ ہم تمہیں چھوڑ دیں گے۔ تمہیں جو کچھ کرنا ہے، یہیں رہ کر کرنا ہے۔"

"میں یہاں رہ کر کیا کر سکوں گا؟" ڈاکٹر نے بے بسی سے کہا۔

"تم ہمیں ان لوگوں کے بارے میں تو بتا سکتے ہو جو شاہ جی کے دست راست ہیں؟"

"ہاں، میں ان لوگوں کے بارے میں بتا سکتا ہوں۔" ڈاکٹر نے کہا۔

"ہمیں ان لوگوں کی ایک لسٹ بھی چاہیے جنہیں شاہ جی اب تک بلیک میل کر کے اپنے کام نکال چکا ہے۔"

"میں ان کی لسٹ بھی دے دوں گا بلکہ میرے پاس یہاں بہت سی ویڈیوز بھی ہیں۔"

"بس تو پھر تم لسٹ تیار کرو۔ جب تک شاہ جی ہمارے جال میں نہیں پھنس جاتا، تم ہمارے مہمان رہو گے۔"

ڈاکٹر کو غنی کے حوالے کرنے کے بعد میں اور راجا دوبارہ اپنے کمرے میں آ گئے۔

ہمارے پیچھے پیچھے نیلم کمرے میں داخل ہوئی اور بولی۔ "صاحب جی! ڈاکٹر صاحبہ پوچھ رہی ہیں کہ آج کھانا نہیں کھانا ہے؟"

"تم چلو، ہم آ رہے ہیں۔" راجا نے کہا، پھر وہ مجھ سے بولا۔ "ٹھیکے پتر! اس مرتبہ تو بہت بری طرح پھنس گیا ہے۔ یہ مسکین شاہ! میں تو اسے واقعی مسکین سمجھتا تھا۔ آج تک اس کے بارے میں ایسی کوئی خبر میں نے اڑتی اڑتی بھی نہیں سنی تھی۔ اسے مجرم ثابت کرتے میں دانتوں پسینا آ جائے گا۔ میڈیا کا کوئی آدمی ہماری بات پر یقین نہیں کرے گا۔"

"ہمارے پاس اس کی تیار کردہ ویڈیوز ہیں۔" میں نے کہا۔

"ان سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ وہ ویڈیوز اس نے بنائی ہیں؟ وہ ایک پریس کانفرنس کرے گا اور سارا الزام تجھ پر دھر دے گا کہ یہ مجھے بدنام کرنے کی سازش ہے۔ تیرا سیاسی کیریئر شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو جائے گا ٹھیکے پتر! میڈیا شاہ جی کی بات کو زیادہ اہمیت دے گا۔ وہ پریس اور ملک دونوں میں بہت نیک نام ہے، کئی رفاہی ادارے اس کی سرپرستی میں چلتے ہیں، بہت سی بیواؤں اور یتیم بچیوں کی وہ امداد کرتا رہتا ہے۔ تیری بات کا کون یقین کرے گا؟"

"پھر...... پھر کیا، کیا جائے؟"

"فی الحال تو کھانا کھاتے ہیں، پھر کچھ سوچیں گے۔" راجا نے کہا۔

کھانے کی میز پر سبھی موجود تھے۔ سبھی نے میری خاموشی کو محسوس کیا۔ شہناز نے تو پوچھ بھی لیا۔ "کیا بات ہے رفیق! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"ہاں، رات بھر جاگنے کی وجہ سے کچھ تھکن محسوس ہو رہی ہے۔" میں نے کہا۔

کھانے کے بعد بھی میں دیر تک یہی سوچتا رہا کہ آخر اس شاہ جی کو مجھ سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟

راجا نے مجھے چونکا دیا۔ "ٹھیکے پتر! کہاں کھو گیا؟"

"میں سوچ رہا ہوں کہ تمہیں لندن بھیج دوں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"ہرگز نہیں۔" راجا نے کہا۔ "میں بھلا وہاں جا کر کیا کروں گا؟"

"احمقوں والی باتیں مت کرو۔" میں نے کہا۔ "سوشی کا فون آیا تھا۔ اسٹیٹ ایجنٹ نے ارنسٹ پیلس کا گاہک ڈھونڈ لیا ہے۔ ایسے موقعے پر میری یا کسی ایسے شخص کی موجودگی وہاں ضروری ہے جسے میں نے پاور آف اٹارنی دیا ہو۔"

"یہ پاور آف اٹارنی تو سوشی کو بھی تو دے سکتا ہے۔" راجا نے کہا۔

"تم بات سمجھنے کی کوشش کرو۔" میں نے کہا۔ "میں فی الحال ست بدھائی نہیں چھوڑ سکتا۔ میں سوچ رہا ہوں کہ یہاں کی جاگیر کا سودا کر کے مستقل طور پر لندن شفٹ ہو جاؤں۔ ایسے دو کشتیوں میں کب تک سفر کیا جا سکتا ہے؟ کشتیاں بھی ایسی جو ہر وقت طوفانی موجوں کی زد میں رہتی ہیں۔ تم لندن جاؤ، میں بھی پیچھے سے پہنچ رہا ہوں۔"

"نہیں ٹھیکے پتر! میں ان حالات میں تجھے تنہا نہیں چھوڑ سکتا اور اب بحث مت کرنا۔" راجا نے کہا۔

راجا کا انداز دیکھ کر میں خاموش ہو گیا۔ مجھے یقین تھا کہ آج کل میں سوشی کا فون آ جائے گا کیونکہ میں نے ایجنٹ کو ارنسٹ پیلس خالی کرنے کی جو مہلت دی تھی، وہ ہفتے دس دن میں پوری ہونے والی تھی۔

"میں سوشی سے خود بات کروں گا۔" راجا نے کہا۔

"تو بھی اس سے بات کر لینا۔" میں نے کہا۔ "لیکن ابھی نہیں، ابھی وہ سو دکھڑے رونا شروع کر دے گی کہ رفیق صاحب کے نہ ہونے سے یہ نقصان ہو گیا، وہ ڈیل نہیں ہو سکی، فلاں اسائنمنٹ ہم وقت پر نہیں دے سکے، میں نے تو اسے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ وہاں کے معاملات کا علم نور کو ہے۔ وہی کچھ بتا سکتی ہے۔ تم فی الحال تمام معاملات کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔ نور کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اسے ڈسٹرب مت کرنا۔"

اچانک ہی راجا نے کہا۔ "ٹھیکے پتر! کیا نام ہے اس ڈپٹی سیکریٹری کا جس کی دختر نیک اختر کے ساتھ تیری ویڈیو بنی ہے؟"

"یار! نام تو اس نے بتایا تھا۔ ہاں، شیروانی، جمال خان شیروانی!" میں نے کہا۔

"جمال خان شیروانی؟" راجا نے حیرت سے کہا۔ "ٹھیکے پتر! تو، تو دونوں طرف سے مارا گیا۔ یہ جمال خان شیروانی بہت دبنگ بندہ ہے۔ یہ تو وزیروں اور سفیروں کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔ یہ تجھے نہیں چھوڑے گا۔" پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ "ایک صورت ہے، ہم آج ہی اس سے مل کر اسے تمام صورتِ حال بتا دیتے ہیں۔ اسے کسی اور ذریعے سے اس بات کا علم ہوا تو وہ تیرا دشمن ہو جائے گا۔"

"لیکن یار مہاراجا! میں ایک باپ کو کیسے بتاؤں گا کہ......"

"بتانا پڑے گا پتر جی! تو تیاری کر، ہم ابھی اسلام آباد جائیں گے۔ میں ناصر کو فون کر دیتا ہوں۔ اس قسم کے افسروں سے اس کے اچھے تعلقات ہیں۔ ممکن ہے شیروانی سے بھی اس کے تعلقات اچھے ہوں۔"

☆☆☆

ہم اسلام آباد کے لیے نکلے تو موسم بہت خوشگوار تھا۔ گاڑی حسب معمول غنی ڈرائیو کر رہا تھا۔ میں نے راجا کے کہنے پر مزید گارڈز ساتھ نہیں لیے تھے۔ ہم لوگ بہت خاموشی سے اسلام آباد جانا چاہتے تھے۔ ہمارے اعلانیہ جانے سے شاہ جی کو علم ہو جاتا کہ میں شیروانی سے ملا ہوں یا اسلام آباد جا رہا ہوں تو وہ یقیناً کوئی مشکل کھڑی کرنے کی

کوشش کرتا۔ مجھے یقین تھا کہ ابھی تک میری ویڈیو کی ڈی وی ڈی شیروانی تک نہیں پہنچی ہوگی۔ اسے ارسال کرنے والا تو ہمارے قبضے میں تھا۔ شاہ جی پہلے تو ایک دو دن اسے تلاش کرتا، پھر کوئی متبادل بندوبست کرتا۔

''یار مہاراجا!'' میں نے کہا۔ ''ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ اس شاہ جی کو مجھ سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟ میں تو اسے جانتا بھی نہیں۔''

''فیکے پتر! تو نے یہ سوال بہت دیر میں کیا۔'' راجا نے ہنس کر کہا۔ ''دشمنی کی ایک وجہ تو وہی تیرا پرانا حریف اور رقیب رانا ہے۔''

''رانا؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''رانا کا شاہ جی سے کیا تعلق؟''

''بظاہر تو کوئی تعلق نہیں ہے لیکن الیکشن نزدیک ہیں۔ ممکن ہے رانا اور شاہ جی کا کوئی گٹھ جوڑ ہو گیا ہو؟''

''ہاں، یہ ہو سکتا ہے؟'' میں نے کہا۔

''دوسری وجہ یہ ہے کہ شاہ جی نے تجھے صرف مہرہ بنایا ہو۔ اصل شکار شیروانی ہو۔ شاہ جی کو یہ تو معلوم ہوگا کہ تو کروڑوں روپے کی آسامی ہے۔ اس نے ایک تیر سے دو شکار کیے ہوں۔ شیروانی کو قابو کرنے کے لیے اور تجھ سے دولت بٹورنے کے لیے۔''

''سر جی!'' غنی نے کہا۔ ''شاہ جی جیسا نیک بندہ ایسے کام کیسے کر سکتا ہے؟''

''لے فیکے پتر! تیرے تو گھر ہی میں شاہ جی کے حمایتی موجود ہیں۔ ہن کر لے گل!''

''میں شاہ جی کی حمایت نہیں کر رہا ہوں۔'' غنی نے کہا۔ ''میں تو صرف یہ بتا رہا ہوں کہ وہ بہت نیک بندہ ہے، نماز روزے کا پابند ہے۔ لاہور اور اسلام آباد میں اس نے بہت بڑی بڑی مسجدیں بنائی ہیں۔ ایسا بندہ بھی یہ کام کر سکتا ہے تو انسان کس پر اعتبار کرے؟''

''تم سامنے دیکھو اور گاڑی چلاؤ۔'' راجا نے کہا۔ ''آج کل ایسے ہی بندے اس قسم کے کام کرتے ہیں۔ ملک سے باہر کے بینکوں میں اربوں ڈالرز پڑے ہوتے ہیں اور انکم ٹیکس دینے کے موقع پر ان سے زیادہ غریب اور نادار کوئی نہیں ہوتا۔ فیکے پتر!''

اسلام آباد پہنچنے تک راجا اسی طرح دل کے پھپھولے پھوڑتا رہا۔ ہم لوگ سیکریٹریٹ آفس پہنچے تو ناصر وہاں پہلے سے ہمارا منتظر تھا۔ راجا نے اسے مختصراً ساری صورت حال سے آگاہ کیا تو وہ بھی فکر مند ہو گیا۔

''یار راجا! یہ شیروانی بہت ٹیڑھی کھیر ہے۔ اس کے بارے میں مشہور ہے کہ ہر وقت اپنا استعفیٰ جیب میں رکھے رہتا ہے لیکن وہ میڈیا کو زیادہ منہ نہیں لگاتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ ننانوے فیصد صحافی بلیک میلر ہوتے ہیں۔ خیر، میں اس سے نواب صاحب کو ملوانے کی کوشش کرتا ہوں۔''

''مجھے...... لیکن...... میں اس سے کیا کہوں گا...... میں......''

''تو فکر مت کر فیکے پتر! میں تیرے ساتھ ہوں گا۔ میں تھوڑا بہت اس کی نفسیات کو سمجھتا ہوں۔''

شیروانی کے دفتر کے باہر کئی لوگ موجود تھے۔ وہ سب اس کے ملاقاتی تھے۔ اس کا پی اے راجا کو بھی جانتا تھا اور ناصر کو بھی۔ وہ مسکرا کر بولا۔ ''اوہو ناصر صاحب! آج یہاں کیسے بھول پڑے؟''

''یار! یہ نواب صاحب، شیروانی صاحب سے ملنا چاہتے ہیں۔''

''نواب صاحب!'' پی اے نے حیرت سے مجھے دیکھا۔

میں اس وقت بہترین سوٹ میں ملبوس تھا، میں نے بہت مہنگا پرفیوم لگا رکھا تھا، ہاتھ میں رے بن کا چشمہ تھا جو میں نے دفتر میں داخل ہونے کے بعد اتار لیا تھا۔

''کیوں جناب! کیا میں شکل سے آپ کو نواب نہیں لگتا یا پھر......؟''

''نہیں سر!'' وہ جلدی سے بولا۔ ''اصل میں اس سے پہلے آپ سے ملاقات نہیں ہوئی اس لیے...... آپ نے شیروانی صاحب سے ملاقات کا وقت تو لیا ہوگا۔''

''یار، یہی تو مسئلہ ہے۔ نواب صاحب کو بہت ایمرجنسی میں شیروانی صاحب سے ملنا ہے۔''

''پھر تو مشکل ہے۔'' پی اے نے کہا۔ ''خیر، آپ اپنا کارڈ مجھے دے دیں۔''

میں نے اپنا کارڈ نکال کر اسے دیا۔ اس نے کارڈ پر ایک نظر ڈالی، پھر منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ ''نواب رفیق احمد شیرازی آف ست بدھائی۔ سر! میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کی اسٹیٹ کہاں ہے؟''

''ست بدھائی دینہ کے نزدیک جی ٹی روڈ سے تقریباً سولہ سترہ کلومیٹر اندر کی طرف واقع ہے۔'' میرے بجائے راجا نے جواب دیا۔ ''میں نواب صاحب کا پرسنل اسسٹنٹ بھی ہوں اور پی آر او بھی!'' راجا نے کہا۔

''میں کوشش کرتا ہوں کہ شیروانی صاحب اس

ملاقات پر راضی ہو جائیں۔ دراصل وہ بہت پریشان ہیں۔ ان کی بیٹی لاپتا ہو گئی تھی۔ وہ تو شکر ہے کہ وہ صبح ہونے سے پہلے ہی گھر پہنچ گئی۔ آج ان کی دو تین اہم میٹنگز ہیں ورنہ شاید آج بھی وہ آفس نہ آتے۔ ان کا موڈ بہت خراب ہے۔ صبح سے کئی بار کئی افسران ان کی جھاڑ سن چکے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ میرا کارڈ لے کر اندر چلا گیا۔

اس کے پیچھے پیچھے میں، راجا اور ناصر بھی لپکے۔

مجھے دیکھ کر وہ تلخی سے بولے۔ ''جی فرمایئے؟''

سیکریٹری نے ان کے کہنے پر گھوم کر ہمیں دیکھا اور اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

وہ جلدی سے بولا۔ ''سر، یہ نواب رفیق احمد شیرازی آف ست بدھائی ہیں۔ میں ان ہی کا کارڈ لے کر آیا تھا۔ انہیں شاید بہت زیادہ ایمرجنسی ہے۔''

''تم وہاں کس لیے بیٹھے ہو؟'' شیروانی صاحب کی آواز بھی بہت گرج دار تھی۔ ''تم کارڈ لے کر خود ہی دوڑے چلے آئے۔ کیا سارے پیون مر گئے ہیں؟''

''سر! نواب صاحب نے استدعا کی تھی کہ......''

''شٹ اپ، اینڈ گیٹ لاسٹ!'' انہوں نے گرج کر کہا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ''جی فرمایئے، کیا پرابلم ہے آپ کو؟''

''سر، بات ذرا تفصیلی ہے۔'' میرے بجائے راجا نے کہا۔ ''میں نواب صاحب کا پی آر او ہوں۔''

''اس کے لیے آپ کو پہلے سے وقت لینا چاہیے تھا۔ آج تو میرے پاس بالکل وقت نہیں ہے۔ میں خود بھی آفس تین چار گھنٹے لیٹ پہنچا ہوں۔ آپ کل کسی وقت آ جائیں، ابھی مجھے بہت کام ہے۔''

''سر! معاملہ بہت سیریس ہے۔'' راجا نے کہا۔ ''نواب صاحب خود بھی بغیر وقت لیے ملنے کے قائل نہیں ہیں۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ لندن میں گزرا ہے اس لیے یہ وقت کی اہمیت سے واقف ہیں لیکن معاملہ اتنا نازک ہے کہ آپ سے آج ہی ڈسکس کرنا بہت ضروری ہے۔''

''میں آپ کو پانچ منٹ دے سکتا ہوں مسٹر پی آر او۔'' شیروانی صاحب نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

''سر، معاملہ آپ کی بیٹی سے متعلق ہے۔'' راجا نے جلدی سے کہا۔

''میری بیٹی سے؟'' شیروانی صاحب چونک کر بولے۔ ''وہ تو گھر پہنچ چکی ہے۔''

''جی ہاں، اسے نواب صاحب ہی نے گھر پہنچایا ہے۔ اسے کچھ لوگوں نے اغوا کر لیا تھا اور......'' راجا انہیں تفصیل بتانے لگا۔

''آپ کو یقین ہے کہ ان لوگوں نے آپ کی ویڈیو بنائی ہے؟'' شیروانی صاحب کا سارا غصہ ختم ہو گیا۔ وہ آواز کسی مجبور اور بے بس باپ کی آواز تھی۔

''جی ہاں سر! مجھے یقین ہے۔'' میں نے کہا۔

شیروانی صاحب نے اپنا سر پکڑ لیا۔ وہ چند لمحوں تک اسی پوزیشن میں رہے، پھر انہوں نے گھنٹی بجائی۔

فوراً ہی پیون کمرے میں داخل ہوا۔

''ابرار کو بھیجو۔'' انہوں نے کہا۔ وہ اتنے حواس باختہ ہو گئے تھے کہ انٹر کام پر ابرار کو بلانے کے بجائے پیون کے ذریعے بلوا رہے تھے۔

ابرار بھاگم بھاگ وہاں پہنچا۔ ''یس سر!''

''ابرار! سارے اپائنٹ منٹس کینسل کر دو۔ دونوں میٹنگز بھی کینسل کر دو۔ میری طبیعت خراب ہو رہی ہے۔ میں اب آفس میں نہیں بیٹھ سکتا۔ میں گھر جا رہا ہوں۔''

''او کے سر!'' ابرار نے جلدی سے کہا۔ ''میں آپ کے ڈرائیور سے کہتا ہوں کہ گاڑی نکالے۔'' ابرار تیزی سے واپس چلا گیا۔

شیروانی صاحب خاصے دراز قد آدمی تھے لیکن ایسا لگ رہا تھا کہ اس شیروانی میں اور پندرہ منٹ پہلے کے شیروانی میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ وہ اچانک مجھے بوڑھے لگنے لگے تھے۔

انہوں نے مجھ سے کہا۔ ''آیئے نواب صاحب! باقی باتیں گھر پر ہوں گی۔''

مجھے دیکھ کر غنی بھی گاڑی پورچ میں لے آیا تھا۔ شیروانی صاحب کی گاڑی وہاں پہلے سے موجود تھی۔

ہماری گاڑیاں آگے پیچھے نکلیں۔ گیٹ پر کھڑے ہوئے سنتری نے شیروانی صاحب کو سلام کیا۔

گھر پہنچ کر وہ ہمیں ڈرائنگ روم میں لے گئے اور ایک صوفے پر تقریباً ڈھے گئے۔ مجھے ان کی طبیعت واقعی خراب لگ رہی تھی۔

''سر، کیا آپ یہاں تنہا رہتے ہیں؟'' راجا نے پوچھا۔

''نہیں میری بیگم بھی میرے ساتھ رہتی ہیں۔'' انہوں نے جواب دیا۔

''اگر آپ مناسب سمجھیں تو میں ڈاکٹر کو بلا لوں؟'' میں نے کہا۔ ''مجھے آپ کی طبیعت بہتر نہیں لگ رہی ہے۔''

''میں ٹھیک ہوں۔'' پھر انہوں نے کسی ملازم کو آواز دی اور بولے۔ ''بیگم صاحبہ سے کہو کہ مہمانوں کے لیے کھانے کا بندوبست کریں۔''

''شیروانی صاحب! یہ تکلف چھوڑیے۔'' میں نے کہا۔

''تکلف کیسا نواب صاحب! کھانا تو کھانا ہی پڑے گا۔'' انہوں نے کہا۔

پھر انہوں نے مجھ سے ساری تفصیل پوچھی۔ مجھے بتاتے ہوئے بھی عجیب سا لگ رہا تھا۔ ان کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔

''یہ کس کی حرکت ہو سکتی ہے؟'' شیروانی صاحب نے کہا۔

''آپ یقین نہیں کریں گے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ ہمارے ملک کے معروف سیاست دان مسکین شاہ کی حرکت ہے۔''

''ناممکن!'' شیروانی صاحب نے کہا۔ ''میں شاہ جی کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ کئی بار ان سے ملاقات ہو چکی ہے۔ ایک منسٹری میں وہ میرے پاس بھی رہے ہیں۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے نواب صاحب! یہ ان کی حرکت نہیں ہو سکتی۔''

''میں ابھی فوری طور پر تو ثابت نہیں کر سکتا لیکن جلد ہی ثابت کر دوں گا کہ یہ شاہ جی کی حرکت ہے۔'' پھر میں کچھ سوچ کر بولا۔ ''آپ ذرا ذہن پر زور ڈالیے۔ شاہ جی نے ابھی حال ہی میں آپ سے کوئی کام کہا تھا؟''

''نہیں۔'' وہ پر یقین لہجے میں بولے۔ ''وہ کبھی کوئی ناجائز کام نہیں کراتے۔''

''ان کے حوالے سے یا ان کے کسی دوست کے حوالے سے کوئی آپ کے پاس کام لے کر آیا ہو؟'' میں نے کہا۔

وہ چند لمحے سوچتے رہے پھر چونک کر بولے۔ ''ہاں، ایک شخص ان کے حوالے سے آیا تو تھا۔ مجھے اس وقت اس کا نام یاد نہیں آ رہا۔ آفس میں اس کی فائل موجود ہے۔ اس میں اس کا نام بھی ہوگا۔ وہ کام انتہائی ناجائز تھا۔ میں نے اسے بری طرح جھڑک دیا اور کہا تھا کہ اگر تم نے شاہ جی کا حوالہ نہ دیا ہوتا تو میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دیتا۔ اب یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ شاہ جی نے اگر تمہاری سفارش کی ہے تو ان سے لکھوا کر لے آؤ یا ان سے کہو، مجھ سے فون پر بات کریں۔''

''نہ وہ خط لایا ہوگا، نہ شاہ جی نے فون کیا ہوگا۔ وہ آپ کو اپنی تحریر تو دینے سے رہے، فون بھی اس لیے نہیں کیا کہ آپ اپنے فون کی ہر کال ریکارڈ کرتے ہیں۔'' راجا نے کہا۔

''آپ کو کیسے معلوم کہ میں اپنے فون پر کال ریکارڈ کرتا ہوں۔''

''سر، میں نواب صاحب کا پی آر او ضرور ہوں لیکن گزشتہ کئی برس سے کوچۂ صحافت کی خاک بھی چھان رہا ہوں۔ مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ آپ کے سیل فون پر کال بھی کسی مخصوص سسٹم کے تحت ریکارڈ ہوتی ہے۔ جب یہ بات میں جانتا ہوں تو شاہ جی بھی جانتا ہوگا۔''

''ہاں، لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس شخص نے محض شاہ جی کا نام لیا ہو؟'' شیروانی صاحب اب کسی حد تک سنبھل گئے تھے۔

''ہو سکتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''آپ ایسا کریں، خود ہی شاہ جی کو کال کریں اور اس سے کہیں کہ پچھلے دنوں آپ کا ایک آدمی اپنا ایک کام لے کر میرے پاس آیا تھا۔ مجھے اس پر شبہ تھا اس لیے میں نے اسے منع کر دیا۔ مجھے بعد میں احساس ہوا کہ میں نے اس کے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔ آپ کل اس شخص کو بھیج دیں۔ اس کا کام ہو جائے گا۔ اب اگر واقعی شاہ جی نے اسے بھیجا ہوگا تو وہ آدمی کل پھر آ جائے گا۔''

''بات تو آپ کی ٹھیک ہے۔'' شیروانی صاحب نے کہا۔ ''اس سے یہ تو معلوم ہو جائے گا کہ اس شخص کو واقعی شاہ جی نے بھیجا تھا یا وہ شخص ان کا نام استعمال کر رہا تھا۔ میں ابھی شاہ جی کو فون کرتا ہوں۔'' انہوں نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا ہوا فون سیٹ اپنی طرف کھسکایا اور اس کا اسپیکر فون آن کر کے شاہ جی کا نمبر ملایا۔

دوسری طرف دو گھنٹیاں بجیں، پھر ریسیور اٹھا لیا گیا اور کسی نے بہت نرم لہجے میں کہا۔ ''السلام علیکم!''

''وعلیکم السلام! شاہ جی، میں جمال شیروانی بول رہا ہوں۔''

''زہے نصیب!'' شاہ جی نے انتہائی نرم لہجے میں کہا۔ ''شیروانی صاحب آج آپ کو اس ناچیز کی یاد کیسے آ گئی؟''

''سر! کافی عرصے سے آپ سے گفتگو نہیں ہوئی تھی۔ آپ سے بات کرنے کو دل چاہ رہا تھا۔''

''ارے شیروانی صاحب! یہ تو میری خوش قسمتی ہے۔ کبھی غریب خانے پر تشریف لائیں۔''

''انشاء اللہ وقت ملتے ہی حاضری دوں گا۔ ہاں، پچھلے دنوں ایک صاحب اپنا ایک کام لے کر آئے تھے۔'' شیروانی صاحب نے کہا۔ ''کام تو کوئی مشکل نہیں تھا۔ مجھے صرف ایک دستخط ہی تو کرنے تھے۔ وہ آپ کا نام لے رہے تھے کہ آپ

نے انہیں بھیجا ہے، اس وقت تو میں نے انکار کر دیا لیکن بعد میں خیال آیا کہ ناحق میں نے اس شریف آدمی پر شبہ کیا۔ ظاہر ہے آپ کا نام لے کر کوئی ایرا غیرا تو آ نہیں سکتا۔ میں نے ان کا کام کر دیا ہے۔ ان سے کہیں کل پرسوں کسی وقت آ کر اپنی فائل لے جائیں۔''

''جناب! یہ تو محبت ہے آپ کی۔ نہ جانے کہاں کہاں سے لوگ میرے پاس آتے ہیں؟ آپ جانتے ہیں کہ میں سفارش کو سخت ناپسند کرتا ہوں لیکن وہ شخص بے چارہ بہت مجبور تھا۔ میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ آپ شیروانی صاحب کو میرا حوالہ دے دیں لیکن اگر کام ناجائز ہوا تو وہ کریں گے نہیں۔''

''سر! آپ کسی ناجائز کام کی سفارش کر ہی نہیں سکتے۔'' شیروانی صاحب نے کہا۔ ''بہرحال میں نے ان کا کام کر دیا ہے۔''

''آپ کی بہت نوازش شیروانی صاحب! آپ نے اس ناچیز کا بھرم رکھ لیا۔ دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ کسی دن بھابی اور بچوں کے ساتھ غریب خانے پر تشریف لائیں۔''

''جی ضرور!'' شیروانی صاحب نے کہا۔ ''میں تو خود بھی آپ سے ملاقات کا مشتاق ہوں۔ انشاء اللہ جلد ہی ملاقات ہوگی۔''

''میں آپ کا بہت ممنون ہوں شیروانی صاحب! اللہ آپ کو خوش رکھے فی امان اللہ!'' انہوں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

شیروانی صاحب کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ انہوں نے آہستہ سے کہا۔ ''کسے دلیل کریں، کس سے منصفی چاہیں؟ میں تو اس شاہ جی کو بہت برگزیدہ سمجھتا تھا۔ آپ جانتے ہیں کام کیا تھا؟'' انہوں نے کہا۔ ''وہ کروڑوں روپے کا کام تھا۔ میری جگہ کوئی اور ڈپٹی سیکریٹری ہوتا تو وہ اس شخص سے کم از کم ایک کروڑ روپے وصول کرتا۔'' پھر وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگے۔ ''لیکن اس شخص کا نام کیا تھا؟''

''سر! آپ کے پی اے کو تو معلوم ہوگا۔'' راجا نے کہا۔ ''اس نے پہلے تو آپ کے پی اے کو شاہ جی کا حوالہ دیا ہوگا۔''

''ہاں، ابرار کو معلوم ہوگا۔ میں ابھی اس سے معلوم کرتا ہوں۔'' شیروانی صاحب نے کہا اور فون پر نمبر ملانے لگے۔

سلسلہ ملنے پر وہ بولے۔ ''ہاں ابرار...... ہاں طبیعت اب بہتر ہے...... یہ بتاؤ، کچھ دن پہلے ایک شخص شاہ جی کے حوالے سے آیا تھا...... مسکین شاہ صاحب!...... تم شاہ جی کو نہیں جانتے؟...... ہاں، یہ بتاؤ کہ اس کا نام کیا تھا؟...... اچھا ٹھیک ہے۔'' انہوں نے سلسلہ منقطع کر دیا اور بولے۔ ''اس شخص کا نام شہاب الدین تھا۔ اب کل وہ پھر آئے گا۔''

''اس کا کام تو آپ نے کیا نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''آپ اس سے کیا کہیں گے؟''

شیروانی صاحب پہلی دفعہ مسکرائے۔ ''میں اس سے کہوں گا کہ شاہ جی سے میری بات ہو گئی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ کوئی جائز کام ہو تو ضرور کر دیں۔ تمہارا کام تو سراسر ناجائز ہے۔'' پھر وہ فکرمند ہو کر بولے۔ ''نواب صاحب! اس خبیث نے میری بیٹی کی شرمناک ویڈیو بنا لی ہے۔ وہ مجھے اس حوالے سے بلیک میل کرے گا۔ اگر میں انکار کروں گا تو وہ ویڈیو......''

''آپ پریشان نہ ہوں شیروانی صاحب!'' میں نے انہیں تسلی دی۔ ''میری بھی عزت داؤ پر لگی ہوئی ہے۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ کسی طرح اس سے ویڈیو کا ماسٹر پرنٹ اور اگر اس نے ڈی وی ڈیز تیار کر لی ہیں تو وہ حاصل کر لوں۔''

''میں نے ہمیشہ بہت ایمان داری اور حلال کی روزی کمائی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اب جب میرے ریٹائر ہونے میں تین چار سال رہ گئے ہیں تو میرے دامن پر ذلت اور رسوائی کا یہ داغ لگے۔''

''شیروانی صاحب! یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ خود تو یہاں رہتے ہیں اور آپ کی بیٹی لاہور میں رہتی ہے؟''

''اصل میں، میرا تعلق لاہور ہی سے ہے۔'' شیروانی صاحب نے کہا۔ ''میں نے زندگی بھر کی جمع پونجی لگا کر وہیں گھر بنایا۔ ثمرہ وہاں اکیلی نہیں رہتی ہے بلکہ میرا بیٹا اور بہو بھی وہاں ہیں۔ میرا بیٹا انجینئر ہے اور لاہور ہی کی ایک فرم میں ملازمت کرتا ہے۔''

''شیروانی صاحب! میں نے تو یہ سب کچھ آپ کو قبل از وقت اس لیے بتا دیا کہ اگر آپ کو کسی اور ذریعے سے علم ہوتا تو آپ مجھ پر بھی شبہ کرتے، میں اپنی سی ہر ممکن کوشش کروں گا کہ آپ کی عزت پر آنچ نہ آئے۔''

ملازم نے آ کر بتایا کہ کھانا تیار ہے۔

شیروانی صاحب نے کہا۔ ''آئیے، پہلے کھانا کھا لیں، پھر بات کریں گے۔''

کھانے کی میز پر ان کی بیگم بھی موجود تھیں۔ وہ خاصی خوش اخلاق خاتون تھیں۔ انہیں صورت حال کا علم نہیں تھا اس لیے وہ خوب ہنسی مذاق کر رہی تھیں۔ میں نے ان لوگوں کو ست بدھائی آنے کی دعوت دی۔

''نواب صاحب! میں بھی کام کر کے بہت تھک گیا ہوں۔ اب کچھ دن کسی پرسکون جگہ پر آرام کرنا چاہتا ہوں۔

جیسے ہی موقع ملا، میں آپ کے دولت خانے پر حاضری ضرور دوں گا۔"

ان سے رخصت ہوتے وقت میں نے کہا۔ "شیروانی صاحب! جب تک میں اس خبیث شاہ جی سے وہ ویڈیو حاصل نہ کرلوں، آپ یہی ظاہر کریں کہ مجھے جانتے ہی نہیں ہیں۔ یہ بہت ضروری ہے ورنہ وہ فتنہ گر کوئی نیا فتنہ بھی کھڑا کرسکتا ہے۔"

ان سے رخصت ہوکر میں ست بدھائی کی طرف لوٹا تو میرا ذہن بہت ہلکا پھلکا ہوگیا تھا۔ شیروانی صاحب یقیناً ایک سخت گیر اور دبنگ افسر تھے لیکن ایک بیٹی کے باپ بھی تھے۔

ہم ست بدھائی پہنچے تو اندھیرا پھیل چکا تھا۔ شہناز نے مجھ سے پوچھا۔ "تم لوگ اچانک کہاں چلے گئے تھے؟"

"میں اچانک ایک ضروری کام سے اسلام آباد چلا گیا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے۔" اس نے کہا۔ "تمہیں تو یہ توفیق ہوئی نہیں لیکن راجا نے مجھے ضرور اطلاع دے دی تھی کہ ہم اسلام آباد میں ہیں۔"

"میں ذرا نہا دھو کر تازہ دم ہوجاؤں، پھر حاضر ہوتا ہوں۔" میں نے جان چھڑاتے ہوئے کہا۔

میں اپنے کمرے میں آیا تو میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے جیب سے سیل فون نکال کر اس کی اسکرین پر نظر ڈالی تو مجھے سوشی کا نام نظر آیا۔

"گڈ آفٹر نون سر!" اس نے کہا۔ "کیسے ہیں آپ؟"

"میں ٹھیک ہوں، تم بتاؤ، وہاں کے معاملات ٹھیک چل رہے ہیں؟"

"تھوڑی بہت پریشانی تو ہوتی ہے سر!" اس نے کہا۔ "لیکن میں اس سے نمٹ لیتی ہوں۔ اس وقت میں نے اس لیے کال کی ہے کہ اس اسٹیٹ ایجنٹ کا فون دو مرتبہ آچکا ہے۔ آپ نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ چھ مہینے کے اندر اندر ارنسٹ پیلس اس کے حوالے کردیں گے۔"

"میں نے اس سے وعدہ نہیں کیا تھا سوشی، بلکہ اس نے مجھے چھ ماہ کا وقت دیا تھا کہ اس دوران میں وہ ارنسٹ پیلس کے لیے گاہک تلاش کرلے گا۔"

"چلیے یوں ہی سہی۔" سوشی غالباً دوسری طرف مسکرائی تھی۔ میں جانتا تھا کہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر بھی رہتی ہے۔ "اس نے گاہک تلاش کرلیا ہے اور وہ جلد از جلد پیلس کا قبضہ چاہتا ہے۔"

"اس سے پندرہ دن کی مہلت لے لو۔ نور کی طبیعت آج کل کچھ خراب ہے ورنہ میں اسے کل ہی روانہ کردیتا۔" میں نے کہا۔

"میڈم کی طبیعت خراب ہے؟" سوشی فکرمندی سے بولی۔ "کیا ہوا ہے انہیں؟"

"ارے انہیں معمولی نزلہ بخار ہے۔ ایک دو دن میں ٹھیک ہوجائیں گی۔"

"ویسے میں نے اس ایجنٹ سے ایک ماہ کا وقت لے لیا ہے۔" سوشی نے ہنس کر کہا۔

"گڈ گرل!" میں نے کہا۔ "تم تو واقعی ضرورت سے زیادہ ذہین ہو۔"

"تھینک یو سر!" اس نے کہا۔ "میڈم لندن کب تک آرہی ہیں؟"

"ان کا آنا فی الحال مشکل ہے، میں راجا صاحب کو پاور آف اٹارنی دے کر بھیج رہا ہوں۔ اور کوئی خاص بات؟"

"کوئی خاص بات نہیں ہے سر!" سوشی نے کہا۔ "ہوتی بھی تو اس وقت میں نہ بتاتی۔ میڈم خوامخواہ پریشان ہوجاتیں۔"

"اوکے سوشی، اپنا خیال رکھنا!" میں نے سیل فون آف کرکے جیب میں رکھ لیا۔ مجھے خدشہ تھا کہ کہیں سوشی نور کے بارے میں مزید نہ پوچھے۔

اچانک اس کی کال پھر آگئی۔ "سر! میڈم کا سیل تو آف ہے۔ آپ پلیز مجھے بتایئے، کوئی پریشانی کی بات تو نہیں ہے نا؟"

"نہیں بھئی، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" میں نے پھر سلسلہ منقطع کردیا۔

میں تازہ دم ہوکر کمرے سے نکلا تو راجا میری راکنگ چیئر پر بیٹھا جھول رہا تھا۔

"ٹھیکے پتر!" اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ "اس دو نمبری ڈاکٹر نے دو نام بتائے ہیں۔ دونوں شاہ جی کے خاص آدمی ہیں۔ ڈاکٹر کا خیال ہے کہ ان دونوں میں سے کسی کے پاس ویڈیو فلموں کا مواد ہوگا اور نہ بھی ہوا تو انہیں معلوم ضرور ہوگا۔"

"وہ دونوں کہاں رہتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"وہ دونوں لاہور میں رہتے ہیں۔ ایک لاہور کا بہت بڑا ٹرانسپورٹر ہے اور دوسرا نچلے درجے کا ایک سیاست دان ہے۔ دونوں شاہ جی کے گویا مرید خاص ہیں۔ وہ بھی خود کو غریبوں کا بہت ہمدرد اور خیر خواہ ظاہر کرتے ہیں۔"

"اس ڈاکٹر نے ان لوگوں کی لسٹ دی جنہیں اب تک بلیک میل کیا جا چکا ہے؟"

"ہاں، اس نے ایک لسٹ بنائی تو ہے لیکن اس نے کہا کہ یہ مکمل لسٹ نہیں ہے۔ مجھے جیسے جیسے نام یاد آتے جائیں گے، تمہیں بتاتا جاؤں گا۔"

"مہاراجا!" میں نے کہا۔ "اس دو نمبری ڈاکٹر نے اپنی جان بچانے کو جھوٹ تو نہیں بولا؟"

"جھوٹ بول کر اسے کیا ملے گا؟" راجا نے کہا۔ "ہم اسے چھوڑنے سے تو رہے اور اگر اس نے کچھ نہ بتایا تو میں واقعی اسے وہ انجکشن نمبر تین دے دوں گا۔"

"یار! تو ان انجکشنز کو لیب میں ٹیسٹ تو کرا۔" میں نے کہا۔ "آخر معلوم تو ہو کہ ان میں کون سی دوائیں شامل ہیں؟"

"میں نے یہ کام تیرے کہنے سے پہلے ہی کرلیا ہے۔ میں نے وہ سب انجکشن اور دوائیں لیب میں دے دی ہیں۔ آج شام تک ان کی رپورٹ مل جائے گی۔ میں نے انہیں ارجنٹ رپورٹ بنانے کے لیے کہا ہے۔"

"ان لوگوں کے نام کیا ہیں جو شاہ جی کے خاص آدمی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ٹرانسپورٹر کا نام آفتاب خان ہے اور سیاست دان خود کو احسان علی قدوائی کہتا ہے۔" پھر وہ میری شکل دیکھ کر بولا۔ "اس ڈاکٹر نے ان کے پتے بھی دے دیے ہیں۔"

"مہاراجا! اب مجھے شدت سے احساس ہورہا ہے کہ ہمارے پاس لاہور اور اسلام آباد میں بھی کوئی ٹھکانا ہونا چاہیے۔"

"لاہور میں تو ماڈل ٹاؤن میں ایک کوٹھی ہے۔"

"وہ کوٹھی تو پولیس کی نظروں میں آچکی ہے۔" میں نے کہا۔

"میں اس کوٹھی کی بات نہیں کررہا ہوں ٹھیکے پتر! میں اپنے ایک دوست کی کوٹھی کی بات کررہا ہوں۔ پچھلے ہفتے اس سے بات ہوئی تھی تو اس نے بتایا تھا کہ وہ اپنی فیملی کے پاس کینیڈا جارہا ہے اور لاہور والی کوٹھی بیچنا چاہتا ہے۔ اس نے مجھ سے گاہک تلاش کرنے کو کہا تھا۔ ممکن ہے کسی اسٹیٹ ایجنٹ سے بھی بات کی ہو۔"

"یار اگر بات ایک ہفتہ پرانی ہے تو وہ کوٹھی تو اب تک بک چکی ہوگی۔"

"وہ دو کنال کی کوٹھی ہے ٹھیکے پتر! اتنی بڑی کوٹھیاں اتنی جلدی نہیں بکتیں۔ میں ابھی اس سے بات کرلیتا ہوں، اب بک گئی ہوگی تو کیا ہے۔ لاہور میں بنگلوں اور کوٹھیوں کی کمی تھوڑی ہے۔"

اس نے جیب سے سیل فون نکالا اور نمبر ڈائل کرکے بولا۔ "ہیلو...... وعلیکم السلام! کیا حال ہیں؟...... اچھا، یار، میں تو سمجھ رہا تھا کہ تو اب تک کینیڈا چلا گیا ہوگا لیکن تو، تو ابھی تک یہیں موجود ہے۔ یار وہ کوٹھی تیرے گلے پڑی ہوئی ہے تو اسے کرائے پر کیوں نہیں دے دیتا؟...... کیا کہتے ہیں؟...... اچھا...... تیری ڈیمانڈ کیا ہے؟...... چل میں کوئی گاہک دیکھتا ہوں...... ہاں، میں کل لاہور آرہا ہوں، خدا حافظ!"

"ابھی تک کوٹھی بکی نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں! تو لاہور چلنے کی تیاری کر ٹھیکے پتر!" راجا نے ہنس کر کہا۔

"ایسا کر، تو فی الحال لاہور جاکر کوٹھی کا سودا کرلے۔ میں ایک دو دن بعد آؤں گا۔" میں نے کہا۔ "ہوسکتا ہے اس دوران میں شیروانی صاحب کی کال آجائے اور مجھے اسلام آباد جانا پڑے۔ ویسے بھی فوری طور پر میرا لاہور جانا ضروری تو نہیں ہے۔"

"ضروری تو نہیں ہے۔" راجا نے کہا۔

"میں اس دو نمبری ڈاکٹر سے مزید معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ ممکن ہے، اس دوران میں شاکر ہی کوئی کام کی خبر لے آئے۔"

"یہ شاکر ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا۔" راجا نے کہا۔

"وہ اگر مجھ سے مخلص نہ ہوتا تو میرا اسیل فون، پرس اور پستول مجھے واپس نہ کرتا۔"

راجا اٹھ کر شہناز کی طرف چلا گیا۔

لاہور روانگی سے پہلے راجا، شہناز سے ملنے کے بعد میرے پاس آیا اور بولا۔ "میں ابھی لاہور کے لیے نکل رہا ہوں۔ اب کوٹھی جس حالت میں بھی ہو۔ میں آج ہی اس کا سودا کرلوں گا۔"

"راجا! کوٹھی کسی ایسے نام سے خریدنا جس سے بظاہر ہمارا کوئی تعلق نہ ہو۔ ایک قسم کا بے نامی سودا ہونا چاہیے تاکہ کل کلاں خدانخواستہ کوئی گڑبڑ ہوتی ہے تو ہم پر کوئی الزام نہ آئے۔"

راجا کو رخصت کرکے میں صوبیدار میجر صاحب کی طرف چلا گیا۔ وہ حسب معمول اپنے معمولات میں مصروف تھے۔ وہ مجھے اپنے بچوں کی طرح عزیز رکھتے تھے لیکن کبھی خود سے ملنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ میں خود ہی ان سے مل لیتا تھا۔ میں نے غنی کو ہدایت کی تھی کہ وہ صوبیدار میجر صاحب کو اپ ڈیٹ رکھا کرے تاکہ انہیں کوئی شکایت پیدا نہ ہو۔

"آئیں رفیق میاں! آپ سے تو آج کل ملاقات

ہی نہیں ہوتی۔'' پھر وہ اچانک بولے۔''رفیق میاں! یہ شاہ جی کا کیا چکر ہے؟''

''میں تو خود حیران ہوں صوبیدار میجر صاحب کہ اس سے میری کیا دشمنی ہے؟''

''میں اس شاہ جی کو اس وقت سے جانتا ہوں جب یہ سائیکلوں کے پنکچر لگایا کرتا تھا۔''

''سائیکلوں کے پنکچر؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''لیکن میں نے تو سنا ہے کہ یہ جدی پشتی رئیس ہے؟''

''جدی پشتی رئیس!'' صوبیدار میجر صاحب نے طنزیہ لہجے میں کہا۔''اس نے بہت ہی گھٹیا طریقوں سے دولت کمائی ہے۔ چار پیسے جیب میں آئے تو یہ سید بن بیٹھا۔ آج سارا زمانہ اس کی شرافت، پارسائی اور ایمان داری کے گن گاتا ہے لیکن میرے لیے وہ آج بھی مجرمانہ ذہنیت رکھنے والا مسکینہ پنکچر والا ہے۔''

''آپ جانتے ہیں، اس نے میرے ساتھ کیا، کیا ہے؟'' میں نے کہا۔

''میں جانتا ہوں۔'' انہوں نے کہا۔''رفیق میاں! تمہیں اب بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ پہلی فرصت میں اس سے وہ ویڈیو حاصل کرو۔ تم نے شیروانی صاحب کو اعتماد میں لےکر بہت اچھا کیا ہے۔''

میں تھوڑی دیر تک ان کے ساتھ رہا۔ ان کے ہاتھ کی بنی ہوئی چائے مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ اپنے لیے چائے خود ہی بناتے تھے اور نہ جانے کون سا فارمولا استعمال کرتے تھے کہ کسی اور چائے میں وہ مزہ ہی نہیں آتا تھا۔

ان سے رخصت ہوکر میں اسپتال کی طرف چلا گیا۔ میں لیب کی طرف جارہا تھا کہ ڈاکٹر شہلا مجھے اسپتال کے برآمدے ہی میں مل گئی۔

اس نے مجھ سے کہا۔''نواب صاحب! ان دواؤں کی لیب رپورٹ آگئی ہے۔ ان میں کئی دوائیں تو بہت ہولناک ہیں۔ ان کی تفصیل تو ڈاکٹر شہناز ہی بتائیں گی لیکن آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ان دواؤں میں ایک ڈبیا ایسی بھی ہے جس میں سوئیاں بھری ہوئی ہیں۔ ان سوئیوں کی نوک پر کسی کیمیکل کے ساتھ مکس کرکے سائنائیڈ کا کوٹ کیا گیا ہے۔ ہمارا لیب ٹیکنیشن اگر احتیاط سے کام نہ لیتا تو ان میں سے کوئی سوئی اس کے ہاتھ میں بھی چبھ سکتی تھی، پھر موت یقینی تھی۔''

میں فکرمند ہوگیا کہ ملک کا اتنا نیک نام آدمی جب اس قسم کی گھٹیا حرکتیں کررہا ہے تو عام سیاست دان تو نہ جانے کیا کرتے ہوں گے؟

میں ڈاکٹر شہناز کے کمرے میں پہنچا تو وہ اس رپورٹ کا جائزہ ہی لے رہی تھی۔ وہ رپورٹ دیکھنے میں اتنی محو تھی کہ اسے میری آمد کا علم نہیں ہوسکا۔

میں کرسی کھینچ کر اس کے سامنے بیٹھا تو وہ چونکی اور گہری سانس لے کر بولی۔''رفیق! یہ دوائیں تو بڑی ہولناک ہیں۔ اس کی۔ ذرہ برابر مقدار کے اثرات بھی انتہائی تباہ کن ہوتے ہیں۔ اس کے اثرات سے انسان پر جنون طاری ہوسکتا ہے اور وہ وقتی طور پر درندہ بن سکتا ہے۔ اس عالم میں وہ کچھ بھی کرسکتا ہے۔ کسی کو قتل کردے یا خود کو گولی مار لے۔ دوسری دوا اس سے بھی زیادہ تباہ کن ہے۔ اس میں انسان کے اعصاب بالکل ست ہوجاتے ہیں لیکن ذہن جاگتا رہتا ہے، پر کچھ سوچنے سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے۔ اسے سب کچھ نظر آتا ہے، ہاتھ پاؤں بھی معمولی طور پر حرکت کرتے ہیں لیکن وہ کچھ بھی سننے اور بولنے سے قاصر ہوتا ہے۔ تم پر شاید اسی انجکشن کا استعمال کیا گیا تھا۔ تیسرا انجکشن بھی بہت تباہ کن ہے۔ اس میں دو تین دواؤں کی آمیزش ہے۔ اس کے اثرات سے انسان کا ذہن ہمیشہ کے لیے مفلوج ہوجاتا ہے۔ وہ ہوش وحواس سے بےگانہ ہوجاتا ہے اور اسی عالم میں مرجاتا ہے۔ اس کے علاوہ سائنائیڈ میں بجھی ہوئی ہزاروں کی تعداد میں سوئیاں ہیں اور ان کی صرف نوک چبھونے سے انسان کی موت واقع ہوسکتی ہے۔''

''ہزاروں کی تعداد میں؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''ڈاکٹر شہلا نے تو مجھے بتایا ہے کہ ایسی ایک ڈبیا ہے؟''

''بریف کیس کی دو تہیں تھیں۔ اس کی نچلی تہ میں اس قسم کی سوئیوں کے تقریباً بیس ڈبے ہیں۔''

''لیکن شہناز! انہیں استعمال کرنے والا بھی تو اتنے ہی خطرے میں ہوتا ہے۔ ذرا سی چوک ہوجائے تو وہ سوئی خود اسے بھی تو چبھ سکتی ہے۔''

''وہ عام سوئیاں نہیں ہیں رفیق!'' شہناز نے کہا۔ ''ان کے اوپری حصے پر پلاسٹک کا کور ہے۔ سوئی کی بہت معمولی سی نوک باہر نکلی ہوئی ہے اور انہیں دستانے پہن کر استعمال کیا جاتا ہوگا کیونکہ وہ معمولی سی نوک بھی استعمال کرنے والے کی جان لے سکتی ہے۔''

''مجھے وہ سوئیاں دکھاؤ۔ یہ تو ہمارے بھی کام آسکتی ہیں۔''

شہناز نے الماری میں سے پلاسٹک کی ایسی مضبوط سی ڈبیا نکالی جیسی عموماً ٹوتھ پکس کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ وہ ڈبیا لمبائی میں چھوٹی لیکن موٹائی میں زیادہ تھی۔ اس کے

اوپر والے حصے پر کھولنے کے لیے ایک اوپنر لگا تھا جو اس پر لگے ہوئے پلاسٹک کو انگوٹھے کی مدد سے دھکیلنے پر خفیف سا کھل جاتا تھا اور ڈبیا میں سے سوئی کا پلاسٹک والا حصہ خود بہ خود باہر آجاتا تھا۔

''احتیاط سے!'' ڈاکٹر شہناز تیز لہجے میں بولی۔

میں نے بہت احتیاط سے اس میں سے ایک سوئی نکال لی۔ سوئی کا اوپر کا تقریباً پورا حصہ مضبوط پلاسٹک میں چھپا ہوا تھا، بس نچلے سرے پر بہت خفیف سی ایک نوک تھی۔ اتنی معمولی نوک تھی کہ وہ پہلی نظر میں دکھائی بھی نہیں دیتی تھی۔ سوئی کے اوپری حصے پر پلاسٹک میں چٹکی میں پکڑنے کی گرپ بھی تھی۔ اس کے باوجود یہ سوئیاں خطرناک تھیں۔

شہناز نے پرخیال انداز میں کہا۔''سوال یہ ہے کہ وہ ڈاکٹر اتنی خوفناک چیزیں ساتھ لے کر کیوں گھوم رہا تھا؟ وہ شاہ جی کا کوئی خاص آدمی ہے؟''

''خاص آدمی تو وہ ہے۔ رہا یہ سوال کہ وہ یہ چیزیں لے کر کیوں گھوم رہا تھا تو اس کا جواب بھی اس سے مل جائے گا۔ ابھی وہ ہمارے ہی قبضے میں ہے۔''

''رفیق!'' شہناز نے اچانک کہا۔''تم یہ سیاست کا چکر چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟ کیا صرف فلاحی کام نہیں کرسکتے۔ اسکول بنواؤ، سڑک بنواؤ، لوگوں کو زمین آباد کرنے کے لیے قرضے دو۔''

''میں یہ سب کچھ تو کر ہی رہا ہوں لیکن رانا یہ سب کچھ بھی نہیں ہونے دے گا۔ جتنے بڑے جاگیردار اور زمیندار ہیں، سب یہی چاہتے ہیں کہ ان کے مزارعے اور کھیت مزدور ہمیشہ ان کے محتاج رہیں۔ میں اب میدان چھوڑ کر بھاگنے والا نہیں ہوں۔''

''وہ تو خیر میں تمہیں برسوں سے جانتی ہوں۔'' شہناز نے کہا۔''انکل اگر تمہیں زبردستی لندن نہ بھیج دیتے تو تم یہاں سے بھی میدان چھوڑ کر کبھی نہ بھاگتے۔''

''سوئیوں کی ایک ڈبیا مجھے دے دو۔'' میں نے کہا۔ ''جن حالات میں اس وقت میں گرفتار ہوں، مجھے اس قسم کے ہتھیاروں کی شدید ضرورت ہے۔''

''نہیں رفیق!'' شہناز نے سختی سے انکار کردیا۔''یہ میں ابھی تمہیں نہیں دے سکتی۔''

''حالات کو سمجھو شہناز! ہم جس قسم کے کمینے اور گھٹیا لوگوں کے درمیان گھرے ہوئے ہیں ان کے لیے یہ ہتھیار بہت ضروری ہیں۔ تم نے انگریزی کا وہ محاورہ تو سنا ہوگا کہ قرض کی ادائیگی اس کے سکوں میں کی جائے۔ میں بھی ان ہی ہتھیاروں سے انہیں نشانہ بناؤں گا۔''

شہناز نے میرے اصرار پر وہ ڈبیا میرے حوالے کردی۔

اسے میں نے بہت احتیاط سے اپنی جیب میں رکھ لی۔

''راجا لاہور کیوں گیا ہے؟'' شہناز نے پوچھا۔

''ایک ضروری کام تھا۔'' میں نے کہا۔''اب میں بھی لاہور کے لیے نکل رہا ہوں۔ تم یہاں کا خیال رکھنا۔''

میں شہناز کے کمرے سے باہر آگیا۔

میں نے غنی سے گاڑی نکالنے کو کہا اور بتایا۔''ہم اسی وقت لاہور جارہے ہیں۔''

''سر کوئی گارڈ......''

''کوئی گارڈ نہیں۔'' میں نے سختی سے منع کردیا۔''اس سے فضول میں تشہیر ہوتی ہے کہ نواب صاحب کہیں جارہے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ احمد شاہ کو ساتھ لے لو۔'' میں نے کہا۔

''ہاں، ہنڈا سوک کے بجائے لینڈکروزر نکالنا۔''

میں اپنے کمرے میں آگیا اور چھوٹے سے ایک ہینڈ بیگ میں جان لیوا سوئیوں کی ڈبیا اور دستانہ رکھ دیا۔ پھر میں نے دونوں بغلی ریوالور چیک کیے اور ہر طرح سے تیار ہوکر باہر آگیا۔

غنی گاڑی کے پاس ہی کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ احمد شاہ بھی تھا۔ میں غنی کے ساتھ پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ احمد شاہ عقبی نشست پر بیٹھا اور غنی نے گاڑی حویلی کے پھاٹک سے باہر نکال لی۔

ست بدھائی سے جی ٹی روڈ تک جو سڑک میں بنوا رہا تھا۔ اس کا کام ابھی تک ادھورا تھا۔ سڑک بنانے والے ٹھیکے دار کو رانا ہاؤس کے کسی بدمعاش نے نہ جانے کیا دھمکی دی تھی کہ وہ کام چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

میں نے طے کرلیا تھا کہ اب یہ سڑک میں گاؤں والوں کی مدد سے خود بناؤں گا۔ خواہ اس کے لیے مجھے خود بھی مزاروں کے ساتھ کام کرنا پڑے یا روڈ رولر چلانا پڑے۔

سڑک پر پتھر بچھے ہوئے تھے۔ اس لیے غنی کنارے کے کچے راستے پر بہت احتیاط سے گاڑی چلا رہا تھا۔ میں نے عقبی آئینے میں دیکھا۔ احمد شاہ یوں چوکنا بیٹھا تھا جیسے ابھی کوئی حملہ آور جھاڑیوں سے نکل کر ہم پر حملہ کرنے والا ہے۔ غنی اور سرور کے بعد وہ میرا تیسرا گارڈ تھا جو مجھے بہت پسند تھا۔

راوی کا پل کراس کرنے کے بعد میں نے سیل فون پر راجا سے بات کی۔

''میں یہیں ماڈل ٹاؤن میں ہوں۔'' راجا نے کہا۔

راجا نے ماڈل ٹاؤن کا ایڈریس بتایا تو میں نے غنی سے ماڈل ٹاؤن چلنے کو کہا۔ ہم ماڈل ٹاؤن کی ایک سڑک سے گزر رہے تھے کہ ایک وسیع و عریض بنگلے سے کتے کا ایک پلا نکلا اور ٹریفک کے شور سے ڈر کر ادھر ادھر بھاگنے لگا۔

غنی نے فوراً گاڑی روک دی۔

''کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''سر، وہ جرمن شیفرڈ کا پلا ہے۔ بہت زبردست کتا ہوتا ہے۔'' پھر وہ احمد شاہ سے بولا۔ ''احمد شاہ اس پلے کو اٹھا لاؤ۔''

احمد شاہ تیزی سے نیچے اترا اور پلے کی طرف بھاگا۔

''یہ کسی کوٹھی میں سے نکلا ہے غنی! ان ہی کوٹھی والوں کا ہوگا۔ تم اب کتے بھی چوری کرو گے؟'' میں نے کہا۔

''میں نے تو اس سے پہلے بھی کتے چوری کیے تھے سر!'' غنی نے کہا۔ ''آپ جانتے ہیں، جرمن شیفرڈ دنیا کا خوف ناک ترین کتا ہوتا ہے۔ یہ اپنے حریف کو لمحوں میں چیر پھاڑ کر رکھ دیتا ہے۔''

میں خاموش ہوگیا۔ میں جانتا تھا کہ غنی کو کتوں سے عشق ہے۔ وہ اگر میری بات مان بھی گیا تو بہت بے دلی سے مانے گا۔

اس دوران میں احمد شاہ نے وہ پلا پکڑ لیا تھا اور اسے لے کر تیزی سے گاڑی کی طرف آ رہا تھا۔

کچھ لوگوں نے یہ منظر دیکھا، اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھتے احمد شاہ گاڑی میں سوار ہوگیا۔ دیکھنے والے بھی سمجھے ہوں گے کہ اتنی قیمتی گاڑی رکھنے والے چور نہیں ہوسکتے۔ یہ کتا اسی گاڑی سے نکلا ہوگا۔

غنی نے فوراً گاڑی آگے بڑھا دی۔ اس کی نظریں عقب نما آئینے پر بھی تھیں کہ کوئی ہمارا تعاقب تو نہیں کر رہا۔ انسان کے دل میں چور ہو تو اسے ہر گاڑی اپنے تعاقب میں نظر آتی ہے لیکن ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔

غنی دس منٹ کے اندر اندر اس کوٹھی کے سامنے پہنچ گیا جس کا ایڈریس راجا نے بتایا تھا۔

وہ کوٹھی اتنی بری بھی نہیں تھی۔ اس کے اگلے حصے میں خاصا بڑا لان تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہاں رہنے والا لان کی باقاعدہ دیکھ بھال کرتا ہو، گھاس ترشی ہوئی تھی، کیاریوں میں خوش رنگ پھول بھی لہلہا رہے تھے۔ لان کے بعد خاصا وسیع و عریض کار پورچ تھا جس میں بیک وقت چار گاڑیوں کی گنجائش تو ہوگی۔ پورچ میں اس وقت دو گاڑیاں موجود تھیں۔ ایک گاڑی تو راجا کی تھی، دوسری یقیناً کوٹھی کے مالک حبیب کی ہوگی۔

گاڑی کی آواز سن کر راجا اور درمیانی عمر کا ایک آدمی باہر برآمدے میں نکل آئے۔

''آیئے نواب صاحب!'' راجا نے آگے بڑھ کر گاڑی کا دروازہ کھولا۔ پھر اس نے کوٹھی کے مالک حبیب کا اور میرا تعارف کرایا۔

''نواب صاحب! آپ پہلے کوٹھی دیکھ لیں، باقی باتیں بعد میں کریں گے۔''

''احمد شاہ!'' غنی نے کہا۔ ''تم گاڑی لے جاؤ اور مارکیٹ سے ایک فیڈر اور ٹیٹرا پیک دودھ کا ایک ڈبا لے آؤ۔''

''کیوں بھئی؟'' راجا نے ہنس کر کہا۔ ''کیا اب تم نے فیڈر سے دودھ پینا شروع کر دیا ہے؟''

''نہیں سر!'' غنی نے ہنس کر کہا۔ ''یہ دودھ تو میں اپنے کتے کے لیے منگا رہا ہوں۔ میں نے ابھی لاہور آتے ہوئے یہ پلا لیا ہے۔'' اس نے کتے کا پلا راجا کو دکھاتے ہوئے کہا۔

حبیب بہت دلچسپی سے کتے کے اس پلے کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے غنی کے ہاتھ سے لے کر کتے کے پنجے دیکھے، اس کے کان دیکھے، اس کی آنکھیں دیکھیں اور بولا۔ ''ویری گڈ! بالکل پیور جرمن شیفرڈ ہے۔ کراس نہیں ہے۔''

''کیا آپ کو بھی کتے پالنے کا شوق ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' حبیب نے کہا۔ ''میرے پاس تو اب سے ایک مہینا پہلے کم سے کم چھ کتے تھے۔ میں نے وہ کتے بیچ دیے۔ اصل میں یہاں کتوں کے قدر دان بہت کم ہیں۔ ویسے جرمن شیفرڈ کی یہ نسل نایاب ہے۔ یہ کتا آپ کو کہاں سے مل گیا؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔

''یہ کتا میرا چیف سیکیورٹی آفیسر لایا ہے۔'' میں نے کہا۔ اب میں اس سے یہ کہنے سے تو رہا کہ چیف سیکیورٹی آفیسر کتا چور بھی ہے۔

وہ کوٹھی ضرورت سے کچھ زیادہ ہی بڑی تھی۔ اس میں پانچ بیڈ روم تھے، ایک ڈرائنگ روم، ڈائننگ روم، خاصا بڑا ٹی وی لاؤنج تھا اور کوٹھی کے عقبی حصے میں پپیتے، آم اور جامن کے درخت لگے ہوئے تھے۔ وہ کوٹھی آبادی سے ذرا ہٹ کر تھی۔ مجھے وہ جگہ پسند آئی۔

ہم دوبارہ ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔ اس دوران میں احمد شاہ واپس آ گیا تھا۔ وہ نہ صرف فیڈر اور دودھ لے آیا تھا بلکہ کافی، کریم، بسکٹ وغیرہ بھی لایا تھا۔

''میں نے سوچا کہ یہاں اس وقت کوئی کک تو ہوگا نہیں۔ نواب صاحب کو کافی پینے کی عادت ہے اس لیے میں یہ سامان لے آیا۔''

''مجھے کوٹھی بہت پسند آئی ہے۔'' میں نے راجا سے کہا۔ ''باقی تفصیلات تم خود طے کر لو۔ مکان کس کے نام ہوگا، وغیرہ؟''

احمد شاہ اس دوران میں کافی بنا کر لے آیا۔

کافی پیتے ہوئے حبیب نے کہا۔ ''نواب صاحب! میں نے مکان کو بہت احتیاط سے رکھا ہے۔ یہ عمارت گو پرانی ہے لیکن میں نے اس کے رنگ و روغن اور دیکھ بھال پر بہت توجہ دی ہے۔ خاص طور پر میں نے لان کا بہت خیال رکھا ہے۔ میں آپ سے بھی گزارش کروں گا کہ اس کوٹھی کے لان اور دیکھ بھال کا خیال رکھیے گا۔ میرا بچپن، لڑکپن اسی مکان میں گزرا ہے۔ میں کبھی پاکستان آیا تو مجھے اتنی تو اجازت ہوگی کہ میں اس مکان کو اندر سے دیکھ سکوں؟''

''حبیب صاحب! آپ صرف دیکھنے کی بات کر رہے ہیں، میری طرف سے تو آپ کو آفر ہے کہ آپ جتنے دن بھی رہیں، یہاں میرے مہمان بن کر رہیں۔ آپ کو وہی کمرا دیا جائے گا جس میں آپ اس وقت رہتے ہیں۔''

''نواب صاحب! میں چاہتا ہوں کہ آج رات آپ یہیں قیام کریں۔ اتنی رات کو آپ کہاں جائیں گے؟''

میں یہ بتانا بھول گیا کہ حبیب نے مکان کی قیمت پچاس لاکھ روپے لگائی تھی، اس میں موجود سامان بھی وہ بیچنا چاہتا تھا۔ میں نے وہ سامان بھی ایک لاکھ روپے میں خرید لیا تھا۔ مجھے یہ سودا بہت سستا پڑا تھا۔

مجھے ست بدھائی سے اپنا کچھ ضروری سامان لینا تھا، اپنے کپڑے، ہتھیار اور لیپ ٹاپ وغیرہ، پھر سرور اور صوبیدار میجر صاحب کو کچھ ضروری ہدایات دینا تھیں۔ اس لیے میں نے حبیب سے معذرت کر لی اور کہا کہ کل مجھے اسلام آباد میں بہت ضروری کام ہے۔ راجا البتہ یہیں رہے گا اور یہ تمام قانونی کارروائی پوری کرنے کے بعد ہی لوٹے گا۔

☆☆☆

ہم واپس ست بدھائی پہنچے تو رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ میں غیر شعوری طور پر نور کے کمرے میں چلا گیا اور اسی کے بیڈ پر لیٹ گیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے نور میرے پاس آ کر بیٹھ گئی ہے۔

وہ مجھے دیکھتے ہی سکون بھرے انداز میں بولی۔ ''کل میری روانگی ہے اور تمہیں میری اتنی بھی فکر نہیں کہ تم کچھ وقت میرے ساتھ گزار لو۔''

''آپ بھول رہی ہیں میڈم ماہ نور! آپ کی فلائٹ کل نہیں بلکہ پرسوں ہے۔''

''بارہ بجے کے بعد تاریخ بدل جاتی ہے نواب صاحب!'' نور نے بھاری لہجے میں کہا۔ ''اب میری فلائٹ کل ہی ہوگی۔''

''ابھی تمہاری فلائٹ میں چوبیس گھنٹے سے زیادہ کا وقفہ ہے۔ اتنی دیر میں تو کچھ بھی ہوسکتا ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا اور اسے شانوں سے پکڑنے کی کوشش کی۔

میں اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے بڑھاتے رک گیا۔

میرے اس انداز پر نور کھلکھلا کر ہنس دی۔ میں نے بہت دن بعد اس کی کھنکتی ہوئی ہنسی سنی تھی۔ میں نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور اسے احتیاط سے بیڈ پر لٹا دیا۔

ایسے لمحات ست بدھائی میں ہمیں کم ہی میسر آئے تھے کیونکہ پہلے تو میں اپنے چکروں پھنسا رہا، پھر زخمی ہوگیا۔ اس وقت گویا میرے چاروں طرف رنگ و نور کی برسات ہو رہی تھی۔ نور میرے کانوں میں نہ جانے کیا سرگوشیاں کر رہی تھی لیکن مجھے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

ایسا لگ رہا تھا جیسے دریا میں طغیانی آ گئی ہو، سیلاب تھا کہ تھمنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ بالآخر جب تند و تیز لہروں کا زور ختم ہوا تو نور کے چہرے پر آسودہ سی مسکراہٹ تھی۔

اس نے ہنس کر کہا۔ ''رفیق! آج کی یہ پوری رات میرے نام!''

''منظور ہے جان!'' میں نے کہا۔ ''یوں بھی اب تین تو بج رہے ہیں۔''

اچانک باہر سے ریشم کے چیخنے کی آواز آئی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ وہاں نہ نور تھی نہ اس کی مسحور کن خوشبو! وہ گویا خواب تھا۔

میں جھنجلا کر باہر نکلا۔ باہر ریشم اور غنی ایک دوسرے سے لڑ رہے تھے۔ ریشم پوری قوت سے چیخ رہی تھی۔ ''نہیں تو آج فیصلہ کر لے کہ مجھے رکھے گا یا اس کتے کے پلے کو؟''

''کتے کا وہ معصوم پلاّ تجھے کیا کہہ رہا ہے؟'' غنی نے کہا۔

''کیا بات ہے ریشم؟'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''کیوں اس وقت دوسروں کی نیندیں حرام کر رہی ہو؟''

''صاحب جی! پہلے یہ دو منحوس کتے لایا تھا تو میں خاموش رہی، اب یہ ایک اور پلاّ اٹھا لایا ہے۔''

''تم پہلے بھی کب خاموش رہی تھیں۔'' میں نے کہا۔ ''یہ بے چارہ بن ماں کا پلا ہے، کسی گاڑی کے نیچے آ کر مر جاتا۔ غنی اگر اسے اٹھا لایا تو تم اتنا غصہ کیوں کر رہی ہو؟''

''صاحب جی! یہ جب سے آیا ہے، اس پلّے ہی کی خدمت میں لگا ہوا ہے۔ اسے بوتل بھر بھر کر دودھ پلا رہا ہے، اس کے لیے اس نے میرے بچے کا نیا گدا نکال لیا اور کتّے کے نیچے بچھا دیا۔ اسے اپنے بچے کا بھی خیال نہیں ہے۔''

''نیلم!'' میں نے بلند آواز میں کہا۔

نیلم بھی اس ہنگامے سے بیدار ہو گئی تھی اور وہیں قریب موجود تھی۔ ''جی صاحب جی!'' وہ جلدی سے بولی۔

''اس کتّے کے پلے کا دھیان اب تم رکھو گی۔ اسے کب اور کیسے دودھ دیا جائے گا، کیا کھلایا جائے گا۔ یہ سب تمہیں غنی سمجھا دے گا اور ہاں، آج کے بعد میرے سارے کام بھی تم کرو گی۔'' میں نے غصے میں کہا۔ مجھے ریشم کے اس بے وقت ہنگامے پر واقعی غصہ آ گیا تھا۔

''کیوں صاحب جی؟'' ریشم حواس باختہ ہو کر بولی۔

''جب تم ایک کتّے کے پلے کے لیے اتنا ہنگامہ کر سکتی ہو تو میرے کام بھی اسی بے دلی سے کرتی ہو گی۔ آج کے بعد میرے تمام کام نیلم کرے گی۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ ریشم کے لیے فی الحال یہی سزا کافی تھی۔

دوسرے دن سہ پہر تک راجا واپس آ گیا۔ اس نے کوٹھی کے تمام قانونی معاملات طے کر لیے تھے۔ میں نے اس سے کہا کہ فوری طور پر کسی مالی کا بندوبست کر دو جو اس کوٹھی کے لان کی دیکھ بھال کر سکے۔ وہی مالی اس کوٹھی کا چوکیدار بھی ہو گا۔

''اس کے لیے کوئی بہت زیادہ اعتبار کا بندہ چاہیے۔'' راجا نے کہا۔ ''ہم نے وہ کوٹھی تفریحاً تو خریدی نہیں ہے۔''

اس کا کہنا درست تھا۔

''میں غنی سے کہتا ہوں، وہ یہیں سے کسی آدمی کو وہاں بھیج دے گا۔''

☆☆☆

دوسرے دن علی الصباح راجا میرے پاس آ گیا۔ میں نے جب سے نور کو خواب میں دیکھا تھا، میرا برا حال تھا۔ وہ نہ جانے کس حال میں تھی؟

''فیکے پتر!'' راجا نے کہا۔ ''اتنا غم کرے گا تو کام کیسے چلے گا؟ تو جانتا ہے ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ وہ کمینہ شاہ جی کسی بھی وقت کوئی اوچھی حرکت کر سکتا ہے۔ ہمیں آج ہی سے اپنے منصوبے پر عمل کرنا ہو گا۔''

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ صبح کا اجالا تیزی سے پھیل رہا تھا اس لیے مجھے اس کا چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا جس پر سنجیدگی اور تفکر کے تاثرات تھے۔

''ابتدا پھر اس ٹرانسپورٹر آفتاب خان سے کرتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ہاں، وہ اس منحوس شاہ جی کے زیادہ قریب ہے۔'' راجا نے کہا۔ ''یار، ویسے مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ شاہ جی نے ابھی تک ڈاکٹر کی تلاش میں کچھ نہیں کیا؟''

''یہ تو کیسے کہہ سکتا ہے؟'' راجا نے کہا۔ ''وہ درپردہ ڈاکٹر کو تلاش کر رہا ہو گا۔ اسے شاید امید نہیں ہو گی کہ ڈاکٹر کو میں اٹھا لایا ہوں ورنہ وہ ست بدھائی تک پولیس لے کر دوڑ پڑتا۔''

''اس خوش فہمی میں رہنا بھی مت!'' راجا نے کہا۔ ''وہ جانتا ہے کہ تیری حویلی کی تلاشی آسان کام نہیں ہے۔ وہ پورا بندوبست کرنے کے بعد ہی ادھر کا رخ کرے گا۔'' پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ''فیکے پتر! میرا تو خیال ہے کہ اس ڈاکٹر اور دوسرے قیدیوں کو ست بدھائی سے فوری طور پر کہیں منتقل کر دیا جائے۔''

''کہاں؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ کام غنی بہت آسانی سے کر لے گا۔ یہ پہلے بھی ایسے کام کرتا رہا ہے۔'' پھر وہ غنی سے بولا۔ ''کیوں غنی! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟''

''سر، آپ حکم کریں۔ میں ان سب کو ایسے غائب کر دوں گا جیسے وہ کبھی اس دنیا میں تھے ہی نہیں۔'' غنی نے کہا۔

''میں انہیں ہمیشہ کے لیے غائب کرنا نہیں چاہتا، ان سے بعد میں بھی تو کام پڑ سکتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''بس فوری طور پر انہیں ست بدھائی کی حویلی سے منتقل کر دو، تہ خانے میں پرانا سامان اور کاٹھ کباڑ بھر دو۔ یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ یہ تہ خانہ کبھی آباد تھا۔''

''اس کی تو آپ فکر ہی نہ کریں سر!'' غنی نے کہا۔ ''یہ کام آج ہی ہو جائے گا۔''

''یہ کام آج شام تک ہو جانا چاہیے۔'' میں نے کہا۔ ''رات میں ہمیں پھر لاہور جانا ہے۔''

''یہ کام تو ابھی دوپہر تک ہو جائے گا۔'' غنی نے کہا۔

ان امور سے فارغ ہو کر میں نے کچھ دیر آرام کیا کیونکہ آج رات مجھے بہت کام کرنا تھا۔ میں نے آفتاب خان کو اٹھانے کا منصوبہ بنا لیا تھا۔

تین بجے کے قریب غنی نے بتایا کہ کام ہو گیا ہے۔ تمام قیدیوں کو یہاں سے منتقل کر دیا گیا ہے۔

''تم لاہور چلنے کی تیاری کرو۔'' میں نے کہا۔ ''صرف سرور اور احمد شاہ کو ساتھ لینا، زیادہ بھیڑ بھاڑ کی ضرورت نہیں ہے۔''

غنی سر ہلا کر چلا گیا۔

وہ کمرے سے نکل ہی رہا تھا کہ راجا آ گیا اور بولا۔ ''فیکے پتر! تو تیار ہے؟''

''ہاں یار، میں تیار ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے اپنا ضروری سامان اور کچھ کپڑے ایک سوٹ کیس میں رکھ لیے ہیں۔ ممکن ہے ہمیں لاہور میں کچھ زیادہ دن لگ جائیں۔''

''یار، ایک بات کہوں، برا مت ماننا۔'' راجا نے کہا۔

''اب تو میں ضرور برا مانوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''اوئے کھوتے دے کھر! تجھے بھی یہ پوچھنے کی ضرورت ہے؟''

''میں یہ کہہ رہا تھا کہ تو نیلم کو بھی لاہور ساتھ لے چل!''

''نیلم کو؟'' میں نے حیرت سے کہا اور راجا کی شکل دیکھی کہ کہیں اس کے چہرے پر طنز کا کوئی تاثر تو نہیں ہے لیکن وہ بالکل سنجیدہ تھا۔

''یار، وہاں اگر ہمیں دو چار دن بھی رہنا پڑا تو کھانے اور چائے کی ضرورت تو پڑے گی نا! ہم کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں تو ٹھہرنے جا نہیں رہے ہیں۔'' پھر وہ ہنس کر بولا۔ ''ویسے میں آنے سے پہلے کوٹھی کے کچن میں ضرورت کا تمام سامان ڈال آیا تھا۔ فریج میں سبزیاں، چکن، دودھ اور مکھن سب کچھ بھر دیا تھا۔''

''راجا! اس کام کے لیے تو احمد شاہ بھی برا نہیں ہے، پھر نیلم ہی کیوں؟''

''کسی بھی گھر میں عورت ہو تو لوگ کم سے کم شک کرتے ہیں۔ وہ تو ویسے بھی تیری......''

''بکواس کرے گا تو میرے ہاتھ سے مارا جائے گا۔'' میں نے کہا۔

''یار، میں اب تجھ سے مذاق بھی نہیں کر سکتا؟'' راجا نے ہنس کر کہا۔ ''ویسے بھی غنی کے کتّے کی دیکھ بھال کے لیے اس کی ضرورت تو پڑے گی نا!''

اس نے یوں کہا جیسے وہ کتّے کی پلّے کی نہیں، غنی کے بچے کی بات کر رہا ہو۔ پھر وہ ہنس کر بولا۔ ''یار، غنی نے مالی کا بندوبست بھی کر دیا ہے۔ وہ ہمارا ایک گارڈ شوکا ہے۔ نام تو اس کا شوکت ہے لیکن لوگ اسے شوکا کہتے ہیں۔''

''اعتبار کا آدمی ہے نا؟'' میں نے پوچھا۔ ''ہم وہاں تیتر یا بٹیر کے شکار کو نہیں جا رہے ہیں۔''

''ہم سے بہتر یہ سب کچھ غنی جانتا ہے۔'' راجا نے کہا۔ ''ویسے یار، اسی بہانے لاہور میں ایک معقول ٹھکانا ہو گیا ورنہ ہمیں ہوٹلوں میں ٹھہرنا پڑتا تھا۔ اب کم سے کم شریفانہ طریقے سے وہاں رہ تو سکیں گے۔'' وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ''تو نیلم سے کہہ کہ وہ بھی چلنے کی تیاری کرے۔''

''راجا! کیا تو سنجیدہ ہے؟''

''ہاں بھئی۔'' راجا نے کہا۔ ''نیلم پہلے بھی اس قسم کے واقعات سے گزر چکی ہے۔ اس کا باپ بھی کوئی نیک نام آدمی نہیں تھا۔ وہ بہت کام آئے گی۔''

راجا کے جانے کے بعد میں نے نیلم کو بلوایا تو ریشم آ گئی اور روتے ہوئے بولی۔ ''صاحب جی! آپ مجھ سے ناراض ہیں؟''

''ہاں، ریشم!'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''میں تمہارا جتنا خیال کرتا ہوں، تم مجھے اتنی ہی تکلیف پہنچاتی ہو، تم نے اس حویلی کو کیا سمجھ رکھا ہے؟ کسی اور ملازم میں اتنی جرأت ہے کہ وہ رات کے اس پہر بلند آواز میں بات بھی کر سکے۔ تم نے تو پوری حویلی سر پر اٹھا لی تھی۔''

''مجھے معاف کر دیں صاحب جی!'' ریشم روتے

ہوئے میرے قدموں میں بیٹھ گئی۔'' وہ اصل میں اس غنی نے بات ہی ایسی کی تھی۔''

''اچھا، میرے پیروں میں مت بیٹھو!'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔'' آیندہ اگر تمہاری طرف سے ایسی کوئی حرکت ہوئی تو تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔ غنی آخر تمہارا شوہر ہے، تم تو اسے بالکل اپنا زرخرید ملازم سمجھتی ہو۔ وہ تو تم سے بہت محبت کرتا ہے اس لیے کچھ کہتا بھی نہیں ہے، ورنہ تم جانتی ہو کہ گاؤں کے دوسرے مرد اپنی عورتوں کے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہیں؟''

''اب آپ کو میری طرف سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ میری بلا سے وہ گھر میں کتے پالے یا بندر یا پورے گھر کو چڑیا گھر بنادے۔''

مجھے اس کے انداز پر ہنسی آگئی۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔''میں نے وہ کتا نیلم کے حوالے کردیا ہے، اب تمہیں کیا تکلیف ہے؟''

''آپ پہلے سارا کام مجھ سے کراتے تھے، اب وہی کام نیلم کرتی ہے۔'' اس نے کہا۔'' آپ جانتے ہیں کہ مجھے اس سے کتنی تکلیف ہوتی ہے۔''

''اچھا آیندہ سے میرے سارے کام تم ہی کروگی۔ ابھی تو میں ست بدھائی سے باہر جارہا ہوں۔ ہاں، ذرا نیلم کو بھیج دینا۔''

''جی صاحب جی!'' وہ خوش ہوکر بولی۔

تھوڑی دیر بعد نیلم اپنی تمام تر حشر سامانیوں سمیت وہاں موجود تھی یا پھر مجھے ہی ایسا لگتا تھا کہ اس کے آنے سے ماحول ایک دم بدل جاتا ہے۔ ویسے جب سے وہ گجرات اور لاہور میں میرے ساتھ رہ کر آئی تھی، مجھ سے کچھ بے تکلف بھی ہوگئی تھی۔

''نیلم! میں چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ لاہور چلو۔ تمہیں اس پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟''

''صاحب جی لاہور؟'' اس نے حیرت سے کہا۔

''ہاں لاہور!'' میں نے کہا۔'' تم نے کبھی لاہور کا نام نہیں سنا؟''

''آپ نے اچانک جانے کا فیصلہ کیا ہے اس لیے مجھے حیرت ہوئی تھی۔'' نیلم نے کہا۔'' مجھے بھلا کیا اعتراض ہوگا۔ کب جائیں گے؟''

''میں ابھی آدھے گھنٹے میں نکلوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''تم ایک سوٹ کیس میں اپنے کپڑے اور ضرورت کی دوسری چیزیں رکھ لو۔''

''میرے پاس سامان ہی کیا ہے صاحب جی!'' نیلم نے کہا۔

''میں تو ابھی دس منٹ میں تیار ہوجاؤں گی۔'' یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔

''آدھے گھنٹے بعد ہم لاہور کے لیے روانہ ہوگئے۔ اس مرتبہ میرے پیچھے گارڈز کی ایک گاڑی بھی تھی لیکن وہ لوگ پرانی سی ایک ٹویوٹا پک اپ میں موجود تھے اور اپنے حلیوں سے گوالے لگ رہے تھے۔ پک اپ میں دودھ کے دو چار ڈرم بھی تھے۔

میری گاڑی حسب معمول غنی ڈرائیو کررہا تھا۔ پسنجر سیٹ پر راجا تھا اور عقبی سیٹ پر میرے ساتھ نیلم بیٹھی تھی۔

سرور، احمد شاہ اور شوکا (مالی) ٹویوٹا پک اپ میں سوار تھے۔ اس پک اپ کو شوکا ڈرائیو کررہا تھا۔ ان کی گاڑی کا فاصلہ ہماری گاڑی سے کچھ زیادہ تھا لیکن غنی کا سرور اور احمد شاہ سے سیل فون پر رابطہ تھا۔

ہاں، میں بتانا تو بھول ہی گیا کہ ہماری گاڑی میں ایک مسافر اور موجود تھا، یہ مسافر وہ جرمن شیفرڈ تھا جو غنی اور ریشم کے درمیان وجہ تنازع بن گیا تھا۔ وہ اس وقت بہت آرام سے اس ٹوکری میں سو رہا تھا جو غنی نے خاص طور پر اس کے لیے تیار کی تھی۔

نیلم البتہ اب تک حیران تھی کہ ہم اسے لاہور میں کیوں لے جارہے ہیں؟

آخر اس نے پوچھ ہی لیا۔''صاحب جی! آپ کو مجھ سے کوئی شکایت ہے؟''

''تم سے شکایت؟'' میں نے کہا۔'' تم سے کیا شکایت ہوگی؟''

''پھر آپ مجھے لاہور کیوں لے جارہے ہیں۔ مجھے تو آپ کی حویلی میں جو آرام ملا ہے، میں نے تو اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ آپ مجھے کس کے حوالے کرنے جارہے ہیں؟''

''تم کیا سمجھ رہی ہو، ہم تمہیں کسی کے حوالے کرنے جارہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''میں تو یہی سمجھ رہی ہوں۔'' نیلم نے کہا۔'' ہوسکتا ہے لاہور میں آپ کے کسی دوست کو ملازمہ کی ضرورت ہو ورنہ آپ مجھ سے سامان باندھنے کو نہ کہتے۔'' اس کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

''ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔''اصل میں ہم لوگ خود لاہور میں کچھ دن رہنا چاہتے ہیں۔ وہاں ہمیں کھانے اور چائے وغیرہ کی ضرورت تو پڑے گی نا! یہ کام کون

کرے گا؟''

اس کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔'' سچ صاحب جی؟'' اس نے ہنس کر پوچھا۔'' آپ کو واقعی لاہور میں کوئی کام ہے؟''

''ہاں۔'' میں نے کہا۔'' ہم نے لاہور میں بھی ایک کوٹھی کا بندوبست کرلیا ہے لیکن نیلم! ایک بات یاد رکھنا۔ وہاں کی کوئی بات باہر نہیں جائے گی۔ ہمارا کام بہت خطرناک ہے، میں نے اسی لیے تمہیں ساتھ لیا ہے کہ تم خطروں سے گھبراتی نہیں ہو۔''

''میری جان تو جاسکتی ہے صاحب جی!'' نیلم نے اٹل لہجے میں کہا۔''لیکن میری زبان سے کوئی ایک لفظ بھی نہیں نکلوا سکتا۔ پھر آپ کے لیے تو میں سو بار مرسکتی ہوں۔''

''ملاحظہ فرمایا آپ نے نواب صاحب؟'' راجا نے انگریزی میں کہا۔'' یہ تو ابھی سے سو بار مرنے کی بات کر رہی ہے۔''

''اپنی زبان کو قابو میں رکھ راجا!'' میں نے کہا۔'' تو نے پھر بکواس شروع کردی؟''

ہم خیر و عافیت سے لاہور پہنچ گئے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ہمارے دشمن یا تو ہم سے غافل ہوگئے ہیں یا پھر انہیں یقین ہے کہ وہ جب چاہیں گے ہماری گردن ناپ لیں گے۔

☆☆☆

اس وقت رات زیادہ نہیں گزری تھی۔ سڑکوں پر ابھی ٹریفک رواں دواں تھا۔ میں نے ایک پی سی او سے آفتاب خان کے گھر فون کیا تھا۔ وہ ابھی تک پہنچا نہیں تھا۔ پیشے کے لحاظ سے وہ ٹرانسپورٹر تھا۔ وہ رات گئے ہی گھر لوٹتا ہوگا۔ میں نے اور راجا نے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ آفتاب خان کو اس کے گھر کے نزدیک سے اٹھائیں گے۔ ایک تو اس کا گھر ماڈل ٹاؤن میں تھا جو ہماری کوٹھی سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا، پھر دفتر کے مقابلے میں گھر سے اٹھانا زیادہ آسان تھا۔ بس اس میں ایک ہی خطرہ تھا، آفتاب خان کے ساتھ مسلح محافظ ہوئے تو گڑبڑ ہوسکتی تھی۔ میں نے ان سے نمٹنے کا بھی انتظام کرلیا تھا۔

غنی نے گاڑی ایسی جگہ کھڑی کی تھی کہ کسی کو شبہ نہ ہوسکے۔ ہماری نظریں اس سڑک پر جمی ہوئی تھیں جہاں سے آفتاب خان کو آنا تھا۔ اس میں یہ مشکل تھی کہ میں آفتاب خان کو پہچانتا نہیں تھا لیکن راجا نے اس کی گاڑی کا میک اور ماڈل معلوم کرلیا تھا۔

''یار فیکے!'' راجا کی آواز اندھیرے سے ابھری۔ ''ادھر ہم کب تک کھڑے رہیں گے؟ آفتاب آیا بھی تو وہ سیدھا اپنے گھر میں داخل ہوجائے گا۔''

''یہ منصوبہ تو تیرا ہی تھا۔'' میں نے کہا۔

''اب اس منصوبے میں تھوڑی سی ترمیم کرلے۔'' راجا نے کہا۔'' ہم براہ راست آفتاب خان کے گھر چلتے ہیں۔''

''نہیں یار، اس میں بھی خطرہ ہے۔ گھر جائیں گے تو اس کے ملازم ہمیں اندر بٹھادیں گے یا پھر صاف کہہ دیں گے کہ ابھی صاحب آیا نہیں ہے۔ آپ لوگ صبح آئیں۔''

''تیرے پاس آفتاب خان کا سیل نمبر ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، میں نے یہ نمبر اس کی بیٹی سے حاصل کیا تھا۔''

''تو اسے فون کرکہ اس کی بیٹی کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ وہ فوری طور پر گھر پہنچے۔''

''وہ فوراً اپنے گھر فون کرے گا اور اسے معلوم ہوجائے گا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کسی نے اسے دھوکا دیا ہے۔'' راجا نے کہا۔

''سر جی!'' اچانک غنی نے کہا۔''سامنے سے ایک گاڑی آرہی ہے۔ شاید آفتاب خان اسی میں ہو۔''

''تم گاڑی اسٹارٹ کرکے سڑک کے بالکل درمیان لے آؤ۔'' راجا نے کہا۔''اگر آفتاب خان ہوا تو اسے گھیر لیں گے ورنہ معذرت کرلیں گے۔''

غنی نے گاڑی اسٹارٹ کی اور اسے جھٹکے سے آگے بڑھا کر سڑک کے عین درمیان میں لے آیا۔ اس نے گاڑی کے ہیڈ لیمپس بھی آن کردیے تھے۔

سامنے سے آنے والی گاڑی نے ایک دم بریک لگائے، پھر بھی غنی نے اس کے اگلے حصے پر گاڑی آہستہ سے مار ہی دی۔

گاڑی میں سے ڈرائیور بپھر کر نیچے اترا۔''اوئے، تجھے سڑک پر چلنے کی تمیز نہیں ہے یا نئی نئی ڈرائیونگ سیکھی ہے؟''

''میرا ہاتھ بہک گیا تھا صاحب جی!'' غنی نے کہا۔ ''ویسے آپ فکر مت کریں، آپ کا جو بھی نقصان ہوا ہے وہ میں پورا کرنے کو تیار ہوں۔''

''میری گاڑی کی ایک ہیڈ لائٹ ٹوٹ گئی ہے۔ اس کے علاوہ گاڑی میں ڈینٹ بھی پڑگیا ہے۔''

''وہ میں نے کہا نا کہ آپ کا جو بھی نقصان ہوا ہے، میں پورا کردوں گا۔ میں کسی کی زیادہ بات سننے کا عادی بھی نہیں ہوں۔'' غنی کا لہجہ تلخ ہوگیا۔

''تو مجھے جانتا ہے؟'' ڈرائیور نے کہا۔

میں نے غور سے اس کا حلیہ دیکھا۔ وہ سفید براق

کلف دار شلوار قمیص اور سفید سلک کی واسکٹ میں تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ یہی آفتاب خان ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کی گاڑی کی عقبی نشست پر بیٹھے ہوئے دو آدمی بھی باہر آ گئے تھے۔ وہ دونوں مسلح تھے لیکن ان کی رائفلیں ان کے کندھوں سے لٹک رہی تھیں۔

''آپ پاکستان کے وزیراعظم ہوں تو بھی مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں نے کہا تو ہے کہ آپ کا نقصان پورا کر دوں گا۔ ویسے میں آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں؟''

''میرا نام سنے گا تو تیرا پیشاب خطا ہو جائے گا۔'' وہ غرا کر بولا۔ ''میرا نام آفتاب خان ہے۔''

''آف..... تاب..... خان!'' غنی جان بوجھ کر ہکلایا۔ ''سر جی! غلطی ہو گئی، معاف کر دیں۔ میں ذرا اپنے دوستوں کو سیر کرانے نکلا تھا۔ میرا مالک بہت ظالم آدمی ہے۔ وہ تو میری کھال کھینچ لے گا۔''

اس دوران میں سرور اور احمد شاہ بہت خاموشی سے گاڑی سے اتر گئے تھے۔

غنی اور آفتاب خان کی تکرار میں انہیں موقع مل گیا اور وہ ایک لمبا چکر کاٹ کر ان دونوں مسلح آدمیوں کی پشت پر جا پہنچے۔

''تو ڈرائیور ہے۔'' آفتاب خان نے کہا۔ ''میں تجھ سے پیسے کیا لوں گا۔ ویسے شراب پی کر گاڑی مت چلایا کر۔ وہ بھی اتنی قیمتی گاڑی۔''

اچانک سرور اور احمد شاہ نے پشت سے اس کے گارڈز پر حملہ کر دیا۔ وہ دونوں کٹے ہوئے درخت کی طرح اوندھے منہ گرے تو آواز سن کر آفتاب خان نے مڑ کر انہیں دیکھا۔

غنی نے اچانک ریوالور نکال لیا اور بولا۔ ''آفتاب خان! خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ جاؤ ورنہ میرے ریوالور پر سائیلنسر فٹ ہے۔''

''کون ہو تم؟''

''کوئی سوال نہیں۔'' غنی نے لہجے کو خوفناک بنا کر کہا۔ ''گاڑی میں بیٹھ ورنہ میں فائر کر دوں گا۔ اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھ لے۔''

آفتاب خان بلکا جھلکتا گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس کے بیٹھتے ہی غنی نے اس کی کھوپڑی پر بھی ریوالور کا دستہ دے مارا۔ وہ سیٹ پر لڑھک گیا۔

آفتاب خان کی گاڑی اور دونوں گارڈز کو اس حالت میں چھوڑ کر ہم بہت تیز رفتاری سے اپنی کوٹھی کی طرف روانہ ہو گئے۔

مشکل سے دس منٹ کا فاصلہ تھا جسے غنی نے سات منٹ میں طے کر لیا۔

آفتاب خان کو ہم نے کوٹھی کے آخر میں واقع ایک بیڈروم میں ڈالا اور اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے۔

میں نے احمد شاہ سے کہا۔ ''تم ابھی اور اسی وقت ست بدھائی جاؤ، یہ گاڑی وہاں چھوڑ کر صبح دوسری گاڑی میں واپس آ جاؤ۔ اپنے مکینک سے کہنا کہ وہ گاڑی کی اچھی طرح ڈینٹنگ اور پینٹنگ کر دے اور رنگ بھی تبدیل کر دے۔ اس کے گارڈز نے اگر گاڑی دیکھی بھی ہو گی تو اسے پہچان نہیں سکیں گے۔''

احمد شاہ اسی وقت روانہ ہو گیا۔

مجھے آفتاب خان کے ہوش میں آنے کا انتظار تھا۔

غنی نے ہاتھ ہلکا مارا تھا۔ وہ تھوڑی دیر بعد ہی کسمسایا اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا کیونکہ غنی نے اس کے ہاتھ بیڈ کی پشت سے بھی باندھ دیے تھے۔ میں دوسرے کمرے سے اسے دیکھ رہا تھا اور ابھی اس کے سامنے جانا نہیں چاہتا تھا۔ راجا اور غنی البتہ اس کے سامنے تھے۔

''کون ہو تم لوگ؟'' آفتاب خان نے ڈپٹ کر پوچھا۔

''ہم موت کے فرشتے ہیں۔'' راجا نے کہا۔ ''تو نے اس دنیا میں بہت عیش کر لیے آفتاب خان! ہم تجھے لے جانے آئے ہیں۔''

''دیکھو، اگر تم سردار جہانگیر کے آدمی ہو تو اسے بتا دو کہ میرا اب اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''ہم شاہ جی کے آدمی ہیں۔'' راجا نے اچانک کہا۔

آفتاب خان بری طرح چونکا۔ ''شاہ جی کے آدمی! لیکن شاہ جی نے مجھے اس طرح یہاں کیوں بلوایا ہے؟''

''وہ ڈاکٹر کئی دن سے غائب ہے۔ شاہ جی کو اس کی طرف سے بہت فکر ہے۔ تم نے اسے تلاش کرنے کے سلسلے میں کیا، کیا؟''

''اس ڈاکٹر کے بارے میں تو کچھ معلوم ہی نہیں ہو رہا ہے۔ اسے زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ میرا تو خیال ہے کہ اسے نواب رفیق اپنے ساتھ لے گیا۔''

''شاہ جی کا خیال ہے کہ اسے تم نے غائب کرایا ہے۔ آخر تمہارے بھی تو کچھ راز تھے اس کے پاس!'' راجا نے اندھیرے میں تیر چلایا۔

''شاہ جی اب مجھ پر شک کر رہے ہیں؟'' آفتاب

خان حیرت سے بولا۔

''ہم تو حکم کے غلام ہیں۔'' غنی نے کہا۔ ''شاہ جی نے کہا کہ آفتاب خان کو اٹھانا ہے۔ میں نے تمہیں اٹھا لیا، وہ کہیں گے کہ آفتاب خان کو گولی مار دو تو ہم تمہیں گولی بھی مار دیں گے۔''

''لیکن میرا قصور؟''

''ڈاکٹر کہاں ہے؟'' راجا نے لہجے کو کرخت بنا کر پوچھا۔

''میں نہیں جانتا کہ ڈاکٹر کہاں ہے؟'' آفتاب خان نے کہا۔

''تم جانتے ہو کہ اس کے پاس کتنی ویڈیوز اور سی ڈیز ہیں۔ اگر وہ شاہ جی کے کسی مخالف کے ہاتھ لگ گئیں تو جانتے ہو کیا ہو گا؟'' راجا نے درشت لہجے میں کہا۔ ''شاہ جی سب سے پہلے تو تمہیں اس دنیا سے رخصت کر دے گا کیونکہ صرف تم ہی اس راز سے واقف ہو کہ شاہ جی وہ تمام ویڈیوز اور ڈی وی ڈیز کہاں رکھتے ہیں۔''

''میں ہی نہیں اس راز سے قدوائی اور جابر خان بھی واقف ہیں۔'' آفتاب خان نے کہا۔

''ان کا نمبر بھی آئے گا۔'' راجا نے کہا۔ ''پہلے تو شاہ جی تمہیں ختم کرنا چاہتے ہیں۔''

''شاہ جی مجھے ختم کرنا چاہتے ہیں۔'' آفتاب خان ذوبانی انداز میں بولا۔ ''انہیں شاید معلوم نہیں کہ میں نے بھی اپنا بندوبست کر رکھا ہے۔ میں نے اپنے وکیل سے کہہ دیا ہے کہ میری موت کی صورت میں وہ تمام سی ڈیز، خطوط اور ڈی وی ڈیز پریس کانفرنس کر کے سردار جہانگیر کے حوالے کر دینا۔ پھر شاہ جی کہاں ہو گا؟''

''تم صبح اپنے وکیل کو فون کرو گے اور اس سے کہو گے کہ وہ تمام اشیا تمہیں واپس کر دے۔'' راجا نے کہا۔

''تم مجھے اتنا ہی بے وقوف سمجھتے ہو؟'' آفتاب خان نے کہا۔ ''میں خود اپنے ہاتھوں اپنی قبر کھود دوں گا؟''

''اس کا مطلب تو یہی ہے کہ شاہ جی کا تمام ریکارڈ تمہارے پاس محفوظ ہے۔''

''ہاں، اور یہ بات شاہ جی بھی جانتا ہے۔''

''پھر تو مجبوری ہے۔'' راجا نے کہا۔

آفتاب خان کے چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ آ گئی۔ ''میں شاہ جی کے کمینے پن سے واقف ہوں۔ اس لیے میں نے اپنے بچاؤ کا پہلے ہی بندوبست کر لیا تھا۔''

''یار، پھر اپنے ان آدمیوں کو واپس بلا لو جو قدوائی کو اٹھانے گئے ہیں۔ اسے اٹھانا بے کار ہے۔'' راجا نے غنی سے کہا۔

''وہ بھی ایک نمبر کا حرام زادہ ہے۔'' آفتاب خان نے کہا۔ ''شاہ جی جتنی بھی نئی ویڈیوز بناتا ہے، انہیں ڈی وی ڈیز پر وہی منتقل کرتا ہے اور ڈاکٹر انہیں ارسال کرتا ہے۔''

''لیکن اب ڈاکٹر بھی تو کہیں غائب ہو گیا ہے۔'' راجا نے کہا۔ ''اب شاہ جی کیا کرے گا؟''

''اس کے پاس بندوں کی کمی نہیں ہے۔ اسے ڈاکٹر کی نہیں، ان سی ڈیز کی فکر ہے جو اس کے پاس ہیں۔ ویسے بھی وہ صاف مکر جائے گا کہ میرا ان سی ڈیز سے کیا تعلق؟ استغفراللہ! میں بھلا ایسا کام کر سکتا ہوں۔''

''شاہ جی کو زندگی میں پہلی دفعہ میں نے اپنی غلطی پر پچھتاتے دیکھا ہے۔''

''شاہ جی پچھتا رہا ہے۔'' آفتاب خان نے کہا۔ ''وہ تو اپنی سگی بہن کا سودا کرتے ہوئے بھی نہ پچھتائے۔''

''وہ کہہ رہا تھا کہ میں نے جمال خان شیروانی کو چھیڑ کر اچھا نہیں کیا۔ وہ بہت ضدی افسر ہے۔ اس کی جان چلی جائے لیکن وہ شاہ جی کی بات نہیں مانے گا۔''

آفتاب خان قہقہہ لگا کر ہنسا۔ ''ذرا قدوائی کو اس ویڈیو کی ڈی وی ڈی تیار کر لینے دو۔ پھر دیکھنا، اس ضدی اور اصول پسند افسر کا کیا حشر ہوتا ہے؟ اولاد کی محبت بہت بری ہوتی ہے۔''

''میں تم سے کہوں گا۔'' راجا نے اچانک سنجیدہ ہو کر کہا۔ ''اپنے وکیل کو صبح فون کر کے تمام ریکارڈ منگوا لینا ورنہ.....''

''ورنہ کیا.....؟'' آفتاب خان حقارت سے بولا۔

''ورنہ تمہاری بھی تو ایک جوان بیٹی ہے۔ شاہ جی اس کی ویڈیو بھی بنوا سکتا ہے۔ اولاد کی محبت واقعی بہت بری ہوتی ہے۔''

''اگر اس کتے نے میری بیٹی کی طرف میلی آنکھوں سے بھی دیکھا تو میں اس کا بھانڈا پھوڑ دوں گا۔ میں میں.....'' وہ بری طرح ہانپنے لگا۔

''وہ تمہاری بیٹی کو میلی آنکھ سے نہیں بلکہ کیمرے کی آنکھ سے دیکھے گا۔ نہ صرف خود دیکھے گا بلکہ دنیا کو بھی دکھائے گا۔ سنا ہے، تمہاری بیٹی بہت خوب صورت ہے؟''

''بکواس بند کرو.....'' وہ اپنے ہاتھ آزاد کرانے کے لیے بری طرح مچلنے لگا۔

''اس سے کچھ نہیں ہو گا۔ تم صبح یا تو تمام ریکارڈ شاہ جی

کے حوالے کرو گے یا پھر تمہاری بیٹی کی ویڈیو یہیں تمہاری آنکھوں کے سامنے بنے گی۔''

آفتاب خان غضب ناک ہو کر شاہ جی کی شان میں ایسی گالیاں بکنے لگا جو میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں سنی تھیں۔ میرے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ راجا نے اپنی ذہانت سے کام لے کر آفتاب خان کو شاہ جی کے خلاف کر دیا تھا۔ اب دوسرا مرحلہ قدوائی کو اٹھانے کا تھا۔

☆☆☆

''یہ تو بتاؤ، تم لوگ کون ہو؟'' آفتاب خان نے پوچھا۔

''او بھائی!'' راجا نے کہا۔ ''تم یہ سوال کتنی دفعہ کرو گے؟''

''تم نے پہلے کب بتایا ہے کہ تم لوگ کون ہو؟'' آفتاب خان نے راجا کو گھورتے ہوئے کہا۔

''پہلے نہیں بتایا ہے تو اب کیسے بتا سکتے ہیں؟'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ہم تو تمہیں بہت عقل مند سمجھتے تھے۔ شاہ جیسا کمینہ آدمی کسی احمق کو تو اپنا دست راست بنا نہیں سکتا۔ تمہیں ابھی تک یہ بھی اندازہ نہیں ہوا کہ ہم لوگ کون ہیں؟''

''اندازہ کیا، مجھے یقین ہے کہ تم اسی حرامی کے لیے کام کر رہے ہو، اسی بگلا بھگت شاہ جی کے زرخرید ہو لیکن میں صرف تصدیق کرنا چاہ رہا تھا۔''

''ہم کسی کے لیے کام نہیں کرتے احمق!'' راجا نے کہا۔ ''ہم صرف پیسے کے لیے کام کرتے ہیں، صرف پیسے کے لیے۔'' راجا کا لہجہ خالص بدمعاشوں والا تھا۔ ''اگر تم شاہ جی سے زیادہ پیسے دے دو تو ہم تمہارے لیے بھی کام کر سکتے ہیں۔''

آفتاب خان کے چہرے پر اس دوران میں پہلی دفعہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''اس حرامی نے کتنی رقم دی ہے تمہیں؟'' آفتاب خان نے پوچھا۔

''اس نے ہمیں اس کام کی اتنی رقم دی ہے کہ تم سوچ بھی نہیں سکتے۔ اسے کروڑوں روپے کی ان ڈی وی ڈیز کی ضرورت تو ہے ہی، وہ تمہیں بھی پارٹی سے نکالنا چاہتا ہے۔'' راجا نے کہا۔

''یار! تم اسے سچ سچ کیوں نہیں بتا دیتے؟'' میں نے راجا سے کہا۔ ''وہ تمہیں پارٹی ہی سے نہیں، اس دنیا سے بھی نکالنا چاہتا ہے۔''

''میں اس سے دگنی رقم دوں گا۔'' آفتاب خان بپھر کر بولا۔

''ہم ہمیشہ رقم ایڈوانس لیتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''اور نقد یعنی کیش کی صورت میں وصول کرتے ہیں۔'' راجا نے ٹکڑا لگایا۔

''اور تم شاید فوری طور پر اتنی رقم کا بندوبست نہ کر سکو۔'' میں نے کہا۔ ''اس لیے اس بات کو بھول جاؤ۔''

''تم رقم بتاؤ۔'' آفتاب خان نے گردن اکڑا کر کہا۔

''دس کروڑ روپے!'' میں نے یوں کہا جیسے دس ہزار کی بات کی ہو۔

''دس کروڑ؟'' آفتاب خان حیرت سے بولا۔ ''یہ تو بہت بڑی رقم ہے۔''

''یہ تو ہمیں شاہ جی سے ملی ہے۔'' راجا نے کہا۔ ''تم نے تو اس کا دگنا دینے کا وعدہ کیا ہے۔''

آفتاب خان پاگلوں کی طرح ہنسنے لگا۔ ''وہ حرام زادہ کنجوس اتنی بڑی رقم خرچ کر ہی نہیں سکتا۔''

''اس کا ایک کام نہیں ہے بلکہ پورا پیکیج ہے۔ تمہارا اغوا، تم سے ڈی وی ڈیز کی وصولی، تمہاری بیٹی کا اغوا اور اس کی وڈیو کی......''

''بکواس بند کرو۔'' آفتاب خان نے بپھر کر میری بات کاٹ دی۔ ''اگر میری بیٹی کا نام بھی لیا تو......''

میں نے اچانک اس کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔ ''میں بہت دیر سے تمہاری بکواس سن رہا ہوں۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''آیندہ اس لہجے میں بات کرو گے تو میں تمہاری زبان کاٹ کر پھینک دوں گا۔''

''بیس کروڑ میرے لیے بہت بڑی رقم ہے، میں اتنی بڑی رقم کہاں سے لاؤں؟'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''ہم نے تو ایک آفر کی تھی۔'' راجا نے کہا۔ ''تمہیں نہیں قبول تو نہ سہی۔''

''اس بات کو چھوڑو۔ اب جلدی سے یہ فیصلہ کر لو تم وہ ڈی وی ڈیز دے کر اپنی بیٹی کی عزت بچاؤ گے یا......'' میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ ''ہم سوچنے کے لیے تمہیں صرف آدھا گھنٹا دے سکتے ہیں۔''

''آدھا گھنٹا تو بہت ہے نی......'' راجا عادت کے مطابق مجھے نیکے پتر کہتے کہتے رک گیا۔ وہ بات بنانے کو بولا۔ ''فی زمانہ ایک منٹ کی بھی بہت قیمت ہے۔''

''ٹھیک ہے، تم سوچو۔'' راجا نے کہا۔ ''ہم آدھے گھنٹے بعد آئیں گے۔''

ہم کمرے سے باہر نکلے تو حسب معمول وہاں غنی موجود تھا۔

''تم یہیں ٹھہرو۔'' میں نے غنی سے کہا۔ ''یا پھر احمد شاہ کی ڈیوٹی لگا دو۔''

میں راجا کے ساتھ ڈرائنگ روم میں جا بیٹھا۔

تھوڑی دیر بعد نیلم نے کمرے میں جھانکا۔ ''کافی لاؤں صاحب جی؟'' اس نے پوچھا۔

''ابھی نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''اور تم اس وقت تک جاگ کیوں رہی ہو؟''

''آپ بھی تو جاگ رہے ہیں صاحب جی!'' اس نے نظریں جھکا کر کہا۔

''نیکیے پتر!'' راجا نے مسکرا کر کہا، پھر انگریزی میں بولا۔ ''اس کی تمام حرکات وسکنات بیگمات والی ہیں، میرا مطلب ہے بیویوں والی! تو آخر مان کیوں نہیں لیتا کہ......''

''میں نہیں مانتا، میں نہیں جانتا۔'' میں نے گنگنا کر کہا۔ ''ہاں یہ ضرور جانتا ہوں کہ اب آپ نے بکواس فرمائی تو آپ میرے ہاتھوں مارے جائیں گے۔''

''پھر میں کہتا پھروں گا عورت یعنی زن کے معاملے میں جگری دوست بھی ایک دوسرے کے دشمن ہو جاتے ہیں۔ جیسے تو میرا ہو گیا ہے کہ اپنی بیگم نمبر پانچ کی خاطر میرا خون کرنے پر آمادہ ہے۔'' راجا مسلسل انگریزی میں بکواس کر رہا تھا۔

نیلم کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں پلکیں جھپکا رہی تھی۔

''تم اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو۔'' میں نے نیلم سے کہا۔ ''مجھے کافی کی ضرورت ہوگی تو میں غنی سے کہہ دوں گا۔ وہ بھی اچھی کافی بنا لیتا ہے۔''

میں نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی۔ راجا کی مسلسل بکواس میں آدھا گھنٹا گزر چکا تھا، صرف ایک منٹ باقی تھا۔

میں اور راجا دوبارہ اس کمرے کی طرف روانہ ہو گئے جہاں آفتاب خان کو بند کیا گیا تھا۔

ہمیں دیکھ کر وہ بولا۔ ''میں نے بہت سوچا ہے، بہت غور کیا ہے اور میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تم شاہ جی کے آدمی نہیں ہو۔''

میں نے آگے بڑھ کر اس کے چہرے پر زوردار تھپڑ رسید کر دیا۔ ''الو کے پٹھے! ہم نے کب کہا کہ ہم شاہ جی کے آدمی ہیں؟'' میں نے کہا۔ ''تو اب تک یہی سوچتا رہا ہے کہ ہم شاہ جی کے آدمی ہیں یا نہیں ہیں۔'' پھر میں نے بلند آواز میں کہا۔ ''تو عزت سے رہنا نہیں چاہتا ہے، یہ ہے تو پھر یہی کہا۔ احمد شاہ!'' میں نے آواز دی۔

احمد شاہ فوراً ہی کمرے میں آ گیا۔ ''یس باس!''

''بھئی، تم لوگوں نے آفتاب صاحب کا گھر تو دیکھ ہی لیا ہے۔ صبح ہونے سے پہلے پہلے ان کی بیٹی کو یہاں ہونا چاہیے۔''

''او کے باس!'' احمد شاہ نے مودبانہ انداز میں کہا۔

''م...... میری بیٹی تو دہشت ہی سے مر جائے گی۔ وہ بہت کمزور دل ہے۔''

''کیا جمال خان شیروانی کی بیٹی مر گئی؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''وہ بھی اتنی ہی معصوم ہے جتنی تمہاری بیٹی ہے۔ اس کی وڈیو اور تصویریں بناتے ہوئے تمہیں یہ خیال نہیں آیا؟''

''ٹھیک ہے، میں وہ ڈی وی ڈیز تمہیں دینے کو تیار ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''میں صبح اپنے وکیل کو فون کر دوں گا لیکن وہ ڈی وی ڈیز کہاں پہنچائے گا؟''

''اسے پہنچانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اس سے خود وصول کر لیں گے۔''

''وہ میرے بغیر ڈی وی ڈیز، تصویریں اور ان کے نگیٹو دے گا نہیں۔'' آفتاب خان نے کہا۔

''یہ تمہارا دردِ سر ہے۔'' راجا نے کہا۔ ''ہمیں تو ہر صورت میں وہ چیزیں صبح چاہییں۔''

''تم نے کیا وکیل کو یہ بھی بتا دیا ہے کہ ان ڈی وی ڈیز اور بند لفافوں میں کیا ہے؟''

''نہیں وکیل کو میں نے کچھ نہیں بتایا ہے۔'' آفتاب خان نے کہا۔ ''وہ سب چیزیں ایک بریف کیس میں ہیں۔''

''پھر تو وکیل کو کسی بھی قسم کا اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔''

''میں کوشش کرتا ہوں۔'' آفتاب نے کہا۔

''کوشش نہیں، ہمیں وہ بریف کیس چاہیے۔'' راجا نے کہا۔ ''ورنہ پھر ہم صرف کوشش نہیں کریں گے بلکہ......''

''یار، مجھے بار بار دھمکیاں مت دو۔'' آفتاب خان منہ بنا کر بولا۔

''ایک بات اور!'' میں نے کہا۔ ''ہمارے پاس ان تصویروں اور وڈیوز کا ریکارڈ بھی ہے۔ ان میں سے ایک بھی تصویر، ڈی وی ڈی یا وڈیو کم نہیں ہونا چاہیے۔ ہم وہ چیزیں پہلے چیک کریں گے، پھر تمہارے بارے میں کوئی فیصلہ کریں گے۔''

ہم کمرے سے باہر نکل آئے۔ میں نے غنی سے کہا۔ ''تم اس کا کمرا اچھی طرح لاک کر دو اور خود جا کر سو جاؤ۔''

''جی سر، آپ سو جائیں۔'' احمد شاہ نے کہا۔ ''میں یہاں موجود ہوں۔''

اب صبح ہونے میں زیادہ دیر نہیں تھی۔ میں نے سوچا، میں بھی کمر سیدھی کرلوں۔

راجا بھی اپنے کمرے میں جا چکا تھا۔ میں بھی کپڑے بدلے بغیر بستر پر گر پڑا اور فوراً ہی مجھے بہت گہری نیند آ گئی۔ ایک عرصے کے بعد مجھے اتنی گہری نیند آئی تھی ورنہ میری نیندیں ہی اڑ گئی تھیں۔

مجھے کسی نے آہستہ آہستہ سے شانہ تھپک کر اٹھایا۔

''سونے دو نور!'' میں نے غنودگی کے عالم میں کہا۔

''بہت دیر ہو گئی ہے، اب اٹھ جاؤ۔'' میرے کانوں میں نور کی آواز آئی۔ اس نے پھر میرا شانہ تھپتھپایا۔

میں نے آنکھیں بند کیے کیے اسے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔

آہستہ آہستہ میرے ذہن سے دھند صاف ہونے لگی۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ نور تو یہاں ہے ہی نہیں، پھر...... پھر یہ کون ہے؟ میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

میرے بازوؤں میں تکیہ تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا کیونکہ واقعی ہر طرف دن پھیل گیا تھا۔ میں نے وال کلاک پر نظر ڈالی۔ اس میں ساڑھے نو بج رہے تھے۔ اس دن بھی شدید سردی تھی لیکن بستر سے تو نکلنا ہی تھا۔

اچانک میرے کمرے کا دروازہ کھلا اور راجا کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''قبلہ نواب صاحب، سپیدۂ سحر نمودار ہو کر غائب ہو چکا تھا۔ اب جلدی سے تیار ہو جا اور سوچ کہ اس ٹرانسپورٹر کے وکیل سے وہ بریف کیس کیسے وصول کیا جائے؟''

''راجا! آج نور کو اغوا ہوئے کتنے روز ہو گئے؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

''تیرے خیال میں کیا مجھے احساس نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کیا صرف تجھے ہی نور کی فکر ہے؟''

''ایک لڑکی میرے لیے اپنی جان تک قربان کرنے کو تیار رہتی تھی۔ وہ اغوا ہونے کے بعد نہ جانے کس حال میں ہے اور ہم یہاں عیش کر رہے ہیں۔'' میں نے دل گرفتگی سے کہا۔ ''جب تک وہ موجود تھی تو میرے لیے بہت اہم تھی، وہ لوگ جن سے تیری بزم میں تھے ہنگامے، گئے تو کیا تیری بزم خیال سے بھی گئے؟''

''یہ سب کچھ ہم نور ہی کے لیے تو کر رہے ہیں فیکے!'' راجا نے خلافِ معمول نرم لہجے میں کہا۔ ''مجھے اتنا یقین ہے کہ وہ لوگ نور کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ وہ تجھ سے کسی قسم کی سودے بازی کریں گے۔''

''یہ تو میں بھی جانتا ہوں راجا!'' میں نے کہا۔ ''مجھے صرف یہ خدشہ ہے کہ وہ......''

''تو تمام خدشات کو دل سے نکال دے فیکے پتر! آج ہی صبح تو بھی کیا بات لے بیٹھا۔ فی الحال تو ہمیں اس آفتاب خان سے نمٹنا ہے۔''

''تو کہیں شکار پر جا رہا ہے؟'' میں نے راجا کی جینز اور لیدر جیکٹ دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں، شکار بھی آدم خور شیر کا!'' راجا ہنس کر بولا۔ ''وہ کمینہ شاہ جی آدم خور ہی تو ہے۔ وہ اپنے زہد و تقویٰ اور شرعی گیٹ اپ کی آڑ میں کیسے کیسے گھناؤنے کام کر رہا ہے۔'' پھر وہ چونک کر بولا۔ ''چل اب اٹھ جا، ناشتا تیار ہے اور چوہے میرے پیٹ میں کبڈی کھیل کھیل کے نڈھال ہو چکے ہیں۔''

میں تیار ہو کر کمرے سے باہر نکلا تو راجا ڈرائنگ روم میں میرے انتظار میں ٹہل رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی نیلم نے ناشتا لگا دیا۔

''غنی! اپنے مہمان کو بھی ناشتا کرا دو۔'' میں نے کہا۔

''اور دھیان رکھنا وہ کوئی معمولی چور اچکا نہیں ہے۔'' میں نے بلند آواز میں کہا۔

غنی اثبات میں سر ہلا کر باہر نکل گیا۔

ہم لوگ ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد آفتاب کے کمرے میں پہنچے تو اس نے ناگواری سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ''آپ لوگ اب آئے ہیں۔ میرا وکیل تو اب تک کورٹ کے لیے نکل چکا ہوگا۔''

''کورٹ کیا عالم بالا میں ہے؟'' راجا نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''جہاں سے واپس نہیں آ سکتا؟ اس کے پاس سیل فون تو ہوگا؟''

میں نے غنی سے اس کا سیل فون منگوایا اور اس سے کہا۔ ''اپنے وکیل کو فون کرو کہ وہ جہاں بھی ہے، فوراً اپنے آفس پہنچے۔''

''وہ آفس تو پہنچ جائے گا، پھر؟'' آفتاب نے مجھے گھورا۔

''اس سے کہنا کہ میں نے جو بریف کیس رکھوایا ہے، وہ تیار رکھے۔ میں اپنے ایک آدمی کو بھیج رہا ہوں۔ وہ بریف کیس اسے دے دینا۔''

''وہ نہیں دے گا۔'' آفتاب نے کہا۔

راجا نے آگے بڑھ کر اس کے چہرے پر زوردار تھپڑ رسید کر دیا اور بولا۔ ''ہم نے رات ہی تجھے بتا دیا تھا کہ یہ تیرا دردِ سر ہے۔ ہمیں آج ہر صورت میں وہ بریف کیس چاہیے۔''

''وہ...... دراصل...... میں نے ہی اسے ہدایت دی تھی کہ جب تک میں خود نہ آؤں، وہ بریف کیس کسی کو نہ دے۔''

''اور تمہاری موت کی صورت میں وہ کیا کرے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''میری موت کی صورت میں؟'' آفتاب نے کہا۔

''ہاں، فرض کرو، تم ابھی مر جاؤ تو وہ بریف کیس کسے ملے گا؟''

''میری موت کی صورت میں وہ بریف کیس میری بیوی کو ملے گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' راجا نے کہا۔ ''پھر تمہارا مر جانا ہی بہتر ہے۔''

''ہم وہ بریف کیس تمہاری بیوی سے وصول کر لیں گے۔'' میں نے سفاک لہجے میں کہا اور جیب سے پستول نکال لیا اور اس کا سیفٹی کیچ ہٹا کر اس کا رخ آفتاب کی طرف کر دیا۔

آفتاب کا چہرہ کورے لٹھے کی طرح سفید پڑ گیا۔

''ایک منٹ!'' راجا نے کہا۔ ''اس پستول پر سائیلنسر فٹ کر لو تاکہ فائر کی آواز اس کمرے سے باہر نہ جائے۔''

''گڈ آئیڈیا!'' میں نے کہا اور غنی سے سائیلنسر فٹ کرنے کو کہا۔

''باس! اسے مارنے میں اتنا اہتمام کیوں کر رہے ہیں؟ میں ایک سیکنڈ میں اس کی گردن توڑ دوں گا۔''

غنی اس کی طرف بڑھا تو وہ جلدی سے بولا۔ ''میں نے غلط کہا تھا کہ بریف کیس میری بیوی کو ملے گا۔ میرے مرنے کے بعد وہ بریف کیس میری ٹرانسپورٹ کمپنی کے ایک ڈائریکٹر اشرف کو ملے گا۔ میں نے تھوڑا بہت اسے بتا بھی دیا ہے اور......''

''یہ وقت ضائع کر رہا ہے باس!'' غنی، آفتاب کے سامنے مجھے مسلسل باس کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔

''تمہارا خیال درست ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ذرا احمد شاہ کو بلاؤ۔''

غنی، احمد شاہ کو بلا لایا۔

احمد شاہ خاصا دراز قد تھا، اس کا جسم کسرتی تھا اور رنگت سرخ و سفید تھی۔ وہ چہرے سے کسی ملٹی نیشنل کمپنی کا کوئی اعلیٰ عہدے دار لگتا تھا۔

''احمد شاہ!'' میں نے کہا۔ ''تم ابھی آفتاب کے گھر جاؤ اور اس کی بیٹی کو اٹھا لاؤ۔ آج کل سردیوں کی چھٹیاں ہیں اس لیے وہ اس وقت گھر میں ہی ہوگی۔''

''میری بات سنو، دیکھو میری بیٹی بہت معصوم ہے۔ وہ تو یہاں تک آتے آتے ہی مر جائے گی۔'' آفتاب تلملا کر بولا۔

میں نے اس کی طرف توجہ دیے بغیر کہا۔ ''ہاں، آفتاب کی کوئی اور بیٹی ہو تو اسے بھی اٹھا لانا۔''

''میری بات سنو!'' آفتاب چیخ کر بولا۔

''ہاں جانے سے پہلے عامر کو فون کر لینا کہ وہ مووی کیمرے اور لائٹس وغیرہ لے کر یہاں پہنچ جائے۔''

''میری بات سنو حرام زادے!'' آفتاب بپھر کر بولا۔

میں نے مڑ کر اس کے منہ پر اتنا زوردار ہاتھ مارا کہ نہ صرف اس کے ہونٹ بلکہ بایاں رخسار بھی زخمی ہو گیا۔ ''اب اگر تو نے بکواس کی تو تیری زبان کاٹ کر پھینک دوں گا۔'' پھر میں احمد شاہ سے مخاطب ہوا۔ ''اپنے ساتھ تین چار آدمی لے جانا۔ اس کے گھر میں کوئی ذرا بھی مزاحمت کرے تو اسے گولی مار دینا۔ ہاں، آتے ہوئے اس کی بیوی کو بھی گولی مار دینا۔''

''خدا کے واسطے میری بات سن لو۔'' آفتاب نے خوشامد بھرے لہجے میں کہا۔

میں نے ایک مرتبہ پھر اس کی بات سنی ان سنی کر دی اور احمد شاہ سے کہا۔ ''اگر اس کی بیوی طرح دار اور خوب صورت ہو تو گولی مارنے کے بجائے اسے بھی اٹھا لانا۔''

''تمہیں اللہ کا واسطہ! اپنے بچوں کا واسطہ! میری بات سن لو۔''

''جاؤ احمد شاہ!'' میں نے آفتاب کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

احمد شاہ کمرے سے باہر جانے لگا تو میں نے غیر محسوس انداز میں اشارہ کر دیا کہ ابھی جانے کی ضرورت نہیں ہے۔

وہ باہر نکل گیا تو آفتاب خان نے کہا۔ ''اگر...... میری بیٹی...... اور بیوی...... کو...... کوئی گزند پہنچی تو...... تو میں...... پورے شہر کو...... الٹ پلٹ کر دوں گا۔''

وہ اس وقت مجھے بالکل جنونی لگ رہا تھا۔

''شہر کو کیا، تم پورے ملک کو تہ و بالا کر دینا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن تمہاری بیٹی کی وڈیو ضرور بنے گی۔''

''کمینے ہو تم لوگ، کتے ہو حرام زادو! یہ کوئی مردانگی ہے؟'' وہ آہستہ آہستہ اپنے حواس کھو رہا تھا۔

میں نے آگے بڑھ کے اس کے منہ پر پھر ایک زناٹے دار تھپڑ رسید کیا اور کہا۔ ''میں نے کہا تھا کہ اپنی زبان کو قابو میں رکھو، میں ابھی تمہاری زبان ہی کٹوا دیتا ہوں۔'' میں نے

بلند آواز میں غنی کو پکارا۔

غنی فوراً ہی کمرے میں آ گیا۔ ''یس باس!''

''تمہارے کتے نے آخری مرتبہ انسانی زبان کب کھائی تھی؟''

''تین دن ہو گئے باس!'' غنی نے کہا۔ ''انسانوں کی زبان، کان اور ناک تو اس کی پسندیدہ غذا ہے۔''

''چلو، پھر اس کی زبان بھی کاٹ لو۔'' میں نے بے نیازی سے کہا۔

''او کے باس!'' غنی نے مستعدی سے کہا۔

''دیکھو میری بات سنو!'' آفتاب خان نے ہذیانی انداز میں کہا۔ ''تمہیں وہ بریف کیس چاہیے نا! وہ تمہیں مل جائے گا۔ اللہ کے واسطے اپنے آدمی کو واپس بلا لو۔ میری بچی تو دہشت سے مر ہی جائے گی۔''

''یہ میں تمہیں آخری موقع دے رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''تمہارے پاس صرف آدھا گھنٹا ہے۔'' پھر میں نے جیب سے سیل فون نکالا اور یونہی ایک نمبر پنچ کر کے سیل فون کان سے لگا لیا۔ ''ہاں احمد شاہ! مشن آدھے گھنٹے کے لیے ملتوی کر دو۔ اپنی گھڑی دیکھ لو۔ اگر آدھے گھنٹے کے اندر اندر میری کال نہ آئے تو تم اپنا کام کر سکتے ہو۔'' میں نے سیل فون آف کیا اور جیب میں ڈال لیا۔

''آدھا گھنٹا تو بہت کم ہے۔ میں......''

''دیکھو، اب تم خود وقت ضائع کر رہے ہو۔'' میں نے کہا۔ ''تیس منٹ میں سے دو منٹ گزر چکے ہیں۔''

''میرا سیل فون دو۔ وکیل کوئی اجنبی نمبر دیکھ کر شبہے میں پڑ جائے گا۔''

راجا اس دوران میں لاتعلقی سے ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔

میں نے غنی کو اشارہ کیا۔ غنی نے جیب میں ہاتھ ڈال کر اس کا سیل فون نکال لیا، اسے آن کیا اور میری طرف بڑھا دیا۔

وہ خاصا قیمتی سیل فون تھا۔ میں نے آفتاب سے پوچھا۔ ''وکیل کا فون نمبر بتاؤ۔''

''مجھے زبانی یاد نہیں ہے۔''

''وکیل کا نام بتاؤ۔'' میں نے کہا۔ مجھے یہ بھی خدشہ تھا کہ وہ وکیل کے بجائے کسی اور کو فون نہ کر دے۔

''صفدر ڈھلوں!'' اس نے مرے مرے انداز میں کہا۔

''میں نے اس کے موبائل کی فون بک سے سرور ڈھلوں کا نمبر نکالا اور اس نمبر پر اپنے سیل فون سے کال کر دی۔

دوسری طرف کئی گھنٹیاں بجیں، پھر کسی نے فون ریسیو کر لیا اور مجھے ایک بھاری آواز سنائی دی۔ ''ہیلو!''

''وکیل صاحب!'' میں نے کہا۔ ''ایک کیس کے سلسلے میں مجھے آپ سے مشورہ کرنا ہے۔''

''ابھی تو میں کورٹ میں ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''آپ شام پانچ بجے میرے آفس آ جائیں۔ ویسے میرا نمبر کس نے دیا آپ کو؟''

''اب آپ اتنے غیر معروف بھی نہیں ہیں وکیل صاحب!'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''شہر میں آپ کا نام ہے۔''

''کون صاحب بول رہے ہیں؟''

''میں مسعود احمد خاکوانی بول رہا ہوں وکیل صاحب!'' میں نے کہا۔ ''میں ملتان سے اسی کیس کے سلسلے میں لاہور آیا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، آپ میرے آفس کا ایڈریس لکھ لیں۔''

''جی بتائیے!'' میں نے کہا۔ پھر غنی کو نوٹ کرنے کا اشارہ کیا۔

غنی نے اس کا ایڈریس اپنے سیل فون میں لکھ کر محفوظ کر لیا۔ رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

''اب تو تمہاری تسلی ہو گئی؟'' آفتاب نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''ہاں، یہ بہت ضروری تھا۔'' راجا نے کافی دیر بعد زبان کھولی۔ ''اب تم وکیل کو اپنے سیل سے فون کرو گے اور فون کا اسپیکر آن رکھو گے۔''

''میں نمبر ملا دیتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''آفتاب خان کے چہرے پر تذبذب کے تاثرات تھے۔ میں نے آفتاب خان کے سیل فون سے وہی نمبر ملایا اور رابطہ ہونے پر فون کا اسپیکر آن کر کے آفتاب کو دے دیا۔ دوسری طرف گھنٹی بج رہی تھی۔

تیسری گھنٹی پر وکیل نے کال ریسیو کر لی۔ ''جی خان صاحب!'' اسپیکر پر وکیل کی آواز سنائی دی۔ ''آج صبح صبح کیسے یاد کر لیا؟''

''وکیل صاحب!'' آفتاب نے کہا۔ ''میں نے آپ کے پاس جو بریف کیس رکھوا دیا تھا، مجھے فوری طور پر اس کی ضرورت ہے۔''

''سر، وہ بریف کیس تو میں نے بینک کے لاکر میں رکھوا دیا ہے۔'' وکیل نے کہا۔ ''آپ ایسا کریں شام تک

میرے آفس آجائیں، میں.....''

''اس میں میرے کچھ انتہائی اہم کاغذات ہیں اور مجھے فوری طور پر ان کی ضرورت ہے۔''

''اس وقت تو میں ہائی کورٹ میں ہوں۔'' وکیل نے کہا۔ ''دو مقدمات کی پیشیاں ہیں، میں اس وقت کیسے آسکتا ہوں؟'' وکیل نے سرد لہجے میں کہا۔

''آپ کورٹ میں اپنے کسی اسسٹنٹ کی ڈیوٹی لگا دیں، مجھے آدھے گھنٹے میں وہ بریف کیس چاہیے۔''

''لیکن سر! میرے دوسرے مقدمات.....''

''لعنت بھیجو ان مقدمات پر!'' آفتاب جھنجلا کر بولا۔ ''میں تمہیں اتنا بھاری معاوضہ یوں ہی نہیں دیتا۔''

''لیکن سر.....!''

''میں کچھ نہیں جانتا۔'' آفتاب خان نے چیخ کر کہا۔ ''مجھے آدھے گھنٹے کے اندر اندر وہ بریف کیس چاہیے، انڈر اسٹینڈ!''

''او کے سر!'' وکیل نے سرد لہجے میں کہا۔ ''اس وقت ساڑھے دس بجے ہیں۔ آپ گیارہ بجے تک دفتر آجائیں یا میں خود وہ بریف کیس آپ کے گھر پہنچا دوں؟''

''نہیں، میں اس وقت گھر پر نہیں ہوں، میں آدھے گھنٹے بعد خود ہی تمہارے آفس آجاؤں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا، پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ 'اب تو اپنے آدمی کو فون کر دو کہ وہ میرے گھر کی طرف نہ جائے۔''

''چلو، تمہیں آدھے گھنٹے کی مہلت مزید دے دیتے ہیں۔'' راجا نے کہا۔

میں نے پھر اسے دکھانے کے لیے یوں ہی ایک نمبر ملایا اور بولا۔ ''احمد شاہ! میں آدھے گھنٹے بعد تمہیں کال کروں گا۔'' یہ کہہ کر میں نے سیل فون جیب میں ڈال لیا۔

آفتاب خان نے میری ہی ہدایت پر وکیل کے آفس آنے کو کہا تھا۔ غنی نے اس کے دفتر کا پتا تو لکھ ہی لیا تھا، میں نے تصدیق کرنے کو آفتاب خان سے پوچھا۔ ''وکیل کے آفس کا ایڈریس بتاؤ۔''

''جب تم مجھے لے جا رہے ہو تو ایڈریس کی کیا ضرورت ہے؟''

''تمہیں کون لے جا رہا ہے؟'' راجا نے کہا۔ ''وکیل بریف کیس لے آئے گا تو باقی کام ہم لوگ خود ہی کر لیں گے۔''

راجا کے جواب سے آفتاب خان کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

''تم کیا سمجھ رہے تھے کہ ہم تمہیں بھی وہاں لے جائیں گے اور تم وہاں جا کر کوئی چالاکی دکھاؤ گے؟ تم صفر ڈھلون کا ایڈریس بتاؤ۔''

آفتاب خان نے اس کا وہی پتا دہرا دیا جو وکیل نے مجھے بتایا تھا۔

''وکیل کا حلیہ بتاؤ۔'' میں نے پوچھا۔

''آپ کی طرح قد آور اور صحت مند آدمی ہے۔ رے بین کا چشمہ استعمال کرتا ہے۔''

میں نے غنی کو باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ باہر آکر میں نے اس سے کہا۔ ''تم اور احمد شاہ ابھی وہاں چلے جاؤ۔ تم اس وکیل سے پہلے پہنچ جاؤ گے۔ بڑے وکیل اپنی کوئی سیکریٹری یا کوآرڈی نیٹر ضرور رکھتے ہیں۔ اگر اس کا آفس کھلا ہو تو تم لوگ اندر جا کر بیٹھ جانا اور اگر......'' میں بولتے بولتے خاموش ہو گیا۔ میں نے سوچا، اس بریف کیس میں انتہائی قیمتی اسٹف ہے۔ اس موقعے پر مجھے یا راجا کو بھی ان لوگوں کے ساتھ ہونا چاہیے۔

''میں بھی ان لوگوں کے ساتھ چلا جاتا ہوں۔'' راجا نے کہا۔

میں چونک اٹھا کہ راجا بھی میرے ہی انداز سے سوچ رہا ہے۔

غنی نے آفتاب خان کے کمرے کو تالا لگایا اور وہ لوگ عجلت میں روانہ ہو گئے۔ غنی نے جانے سے پہلے آفتاب خان کے کمرے پر مالی کی ڈیوٹی لگا دی تھی۔ وہ وہیں برآمدے میں بیٹھا ہوا تھا۔

میں اپنے کمرے میں آکر بیٹھ گیا۔ مجھے عجیب سی بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔

''صاحب جی! کافی لاؤں آپ کے لیے؟'' نیلم نے کمرے میں جھانکا۔

''نہیں۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔

میری نظریں گھڑی پر جمی ہوئی تھیں۔

جب مجھ سے ضبط نہ ہو سکا تو میں نے راجا کو فون کر لیا۔

مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ راجا کا سیل فون بند تھا۔ میں نے دوبارہ کوشش کی لیکن دوبارہ بھی وہی ریکارڈنگ سنائی دی۔

میں مزید پریشان ہو گیا کہ راجا نے سیل فون آف کیوں کر رکھا ہے؟

میں نے غنی کو فون کیا۔ اس کا سیل فون بھی بند تھا۔ میں

بہت زیادہ فکر مند ہو گیا۔ بات تھی بھی پریشانی کی۔ میں شدید اضطراب اور بے چینی محسوس کر رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ احمد شاہ کو کال کروں لیکن پھر یہ سوچ کر نہیں کیا کہ اگر اس کی طرف سے بھی کوئی جواب نہیں آیا تو؟

اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں گھنٹی کی آواز سے یوں اچھلا جیسے میرے قریب ہی بم پھٹا ہو۔

میں نے جیب سے سیل فون نکالا تو اسکرین پر احمد شاہ کا نام تھا۔ میں نے بے تابی سے سیل فون کان سے لگا لیا۔

''ہاں احمد شاہ؟'' میں نے پوچھا۔

''سر، یہاں تو اچھی خاصی گڑبڑ ہو گئی ہے۔'' احمد شاہ نے کہا۔ ''راجا صاحب اور غنی کو کچھ لوگوں نے گن پوائنٹ پر اس وکیل کے آفس ہی میں روک لیا ہے۔''

''تم اس وقت کہاں ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''میں اس بلڈنگ کے نزدیک ہی ہوں، بالکل سامنے سڑک کی دوسری طرف کھڑا ہوں۔''

''تم وہیں ٹھہرو، میں ابھی پہنچ رہا ہوں۔'' میں نے کہا اور سیل فون جیب میں رکھتے ہوئے تیزی سے باہر نکل گیا، جاتے جاتے میں نے مالی سے کہا۔ ''محتاط رہنا اور قیدی کا خیال رکھنا۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے اپنی گاڑی نکالی اور آندھی طوفان کی طرح روانہ ہو گیا۔

احمد شاہ وہیں موجود تھا۔ میں نے گاڑی مناسب جگہ پارک کی اور احمد شاہ کی طرف بڑھ گیا۔

''کیا ہوا تھا؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔

''سر! راجا صاحب اور غنی مجھ سے کچھ فاصلے پر تھے۔ میں احتیاطاً ان کے پیچھے چل رہا تھا۔ ہم لوگ البتہ ایک ہی لفٹ میں اوپر پہنچے تھے۔ لفٹ میں ہمارے علاوہ کچھ لوگ اور بھی تھے۔ میں ان دونوں سے بالکل انجان بنا اوپر پہنچا۔ کوریڈور میں بھی وہ لوگ مجھ سے کچھ فاصلے پر تھے۔ وہ دونوں وکیل کے دفتر کے سامنے پہنچے ہی تھے کہ اندر سے دو آدمی نکلے۔ مجھے ان میں سے ایک کے ہاتھ میں پستول کی جھلک دکھائی دی، پھر وہ ان لوگوں کو یوں اندر لے گئے جیسے وہ کوئی معزز مہمان ہوں کیونکہ اس وقت کوریڈور میں لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔''

''کیا وہ لوگ اب بھی وہیں ہیں؟''

''جی سر!'' احمد شاہ نے جواب دیا۔ ''اس عمارت سے باہر نکلنے کا ایک ہی راستہ ہے۔ ان دونوں کو اگر کہیں اور لے جایا جاتا تو مجھے ضرور معلوم ہو جاتا۔ میں نے بلڈنگ کے مین گیٹ سے ایک لمحے کو بھی نظر نہیں ہٹائی ہے۔''

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟

''میں اس وکیل کے دفتر میں جا رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''تم پہلے کی طرح دور رہ کر میری نگرانی کرنا اور اگر میں آدھے گھنٹے تک نہ آؤں تو تم اپنے طور پر کارروائی کرنا۔''

''سر، آپ یہیں ٹھہریں۔'' احمد شاہ نے کہا۔ ''میں ابھی اپنے طور پر کارروائی کر لیتا ہوں۔''

احمد شاہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ میں نے اسے جانے کی اجازت دے دی اور خود بھی کچھ فاصلے سے اس کے پیچھے روانہ ہو گیا۔

ابھی احمد شاہ لفٹ سے کچھ فاصلے پر تھا کہ لفٹ کا دروازہ کھلا اور اس میں سے کئی آدمی باہر نکلے۔ ان میں ایک وکیل بھی تھا۔ وہ اپنے کالے کوٹ کی وجہ سے پہچانا جا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں خاصا بھاری بھرکم ایک بریف کیس بھی تھا۔

لفٹ سے نکلتے ہی اس نے دوڑنا شروع کر دیا اور احمد شاہ کے نزدیک سے گزر کر مین گیٹ کی طرف بھاگا۔

میں اسے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ وہ بلڈنگ کی عمارت سے نکل کر مین روڈ پر دوڑنے لگا۔

اسی وقت مجھے راجا اور غنی دکھائی دیے۔ وہ دونوں شاید سیڑھیوں کے ذریعے نیچے آئے تھے۔ غنی کی نظر اس وکیل پر پڑ گئی۔ وہ بھی اندھا دھند اس کے پیچھے بھاگ لیا۔

احمد شاہ نے بھی راجا اور غنی کو دیکھ لیا تھا۔ وہ بھی تیزی سے واپس آگیا۔

وکیل دوڑ کر ایک بس میں سوار ہو گیا۔

''احمد شاہ!'' میں نے کہا۔ ''جلدی سے گاڑی لے کر آؤ۔''

وہ میرے ہاتھ سے گاڑی کی چابی لے کر گاڑی کی طرف جھپٹا۔ وہ بس میری نظروں میں تھی۔ احمد شاہ گاڑی لایا تو میں اور راجا اس میں بیٹھ گئے۔ میں نے احمد شاہ سے بس کا پیچھا کرنے کو کہا۔

غنی اس کے پیچھے دوڑتا ہوا نہ جانے کس طرف نکل گیا تھا۔ اسے ڈھونڈنے کا وقت نہیں تھا، اس لیے ہم بس کے پیچھے چلتے رہے۔ بس ایک اسٹاپ پر رکی تو احمد شاہ نے بھی گاڑی کی رفتار بہت کم کر دی۔

بس میں سے دو آدمی اترے۔ ان دونوں میں سے کوئی وہ وکیل نہیں تھا۔

میں نے احمد شاہ سے کہا۔ ''تم بس کو اوورٹیک کر کے

اس کے آگے آ جاؤ، میں بس سے اترنے والے مسافروں پر دھیان رکھوں گا۔"

اسی وقت بس کی رفتار بہت سست ہوگئی۔ احمد شاہ نے بہت مہارت سے اسے اوورٹیک کیا اور بس کے آگے آگیا۔ اب میں بہت آسانی سے اترنے والے تمام مسافروں پر نظر رکھ سکتا تھا۔

میں نے ابھی تک راجا سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ وہاں کیا واقعہ پیش آیا تھا، نہ اس نے مجھے کچھ بتایا تھا۔ فوری طور پر تو ہمیں اس بریف کیس کی فکر تھی جو ہمارے ہاتھوں سے نکلا جا رہا تھا۔

اچانک میری نظر پیچھے کی طرف سڑک پر پڑی۔ وکیل آنے والی گاڑیوں کی پروا کیے بغیر سڑک پار کر رہا تھا۔

"گاڑی روکو!" میں نے چیخ کر احمد شاہ سے کہا۔

اس نے ایک دم بریک لگا دیے۔ بریکوں کی چرچراہٹ سے آس پاس کی گاڑیوں والے اور راہ گیر ہماری طرف متوجہ ہوگئے۔ وہ تو شکر ہے کہ ہمارے پیچھے جو گاڑی تھی، وہ خاصے فاصلے پر تھی۔ اس نے بھی بروقت بریک لگا دیے۔

میں نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ "وہ جا رہا وکیل!" اور گاڑی سے باہر کود گیا۔

میں خاصی تیزی رفتاری سے وکیل کے پیچھے بھاگا لیکن اس وقت تک وہ آنے جانے والی دونوں سڑکیں پار کر کے دوسری طرف پہنچ چکا تھا۔ میں نے بھی سڑک پار کرنے کی کوشش کی لیکن میرے دیکھتے ہی دیکھتے وکیل ایک رکشا میں بیٹھ کر روانہ ہوگیا۔

"تم گاڑی گھما کر لاؤ۔" میں نے احمد شاہ سے کہا۔ "میں دوسری طرف جا کر کوئی رکشا یا ٹیکسی دیکھتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں بھی اندھا دھند سڑک پار کرنے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ گاڑی کو یوٹرن لینے کے لیے بہت آگے جا کر سڑک کے درمیان راستہ ملے گا۔

میں آناً فاناً سڑکیں پار کر کے دوسری طرف پہنچا لیکن دور دور تک کسی رکشا یا ٹیکسی کا پتا نہیں تھا۔

وکیل کا رکشا بھی نظروں سے اوجھل ہوگیا تھا۔

میں نے ایک دو گاڑی والوں کو بھی رکنے کا اشارہ کیا لیکن وہ لوگ رکے بغیر گزر گئے۔ جس قسم کے حالات تھے، ان میں تو وہ گاڑی والے گاڑی نہ روکنے میں حق بہ جانب تھے۔

اسی وقت احمد شاہ نے میرے پاس گاڑی روکی۔ میں تھکے تھکے انداز میں دروازہ کھول کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔

"نکل گیا مردود!" میں نے جھنجلا کر کہا۔ "لیکن جائے گا کہاں؟ میں آفتاب خان کے جسم کی کھال گرا دوں گا۔" میں راجا سے مخاطب ہوا۔ "ہاں راجا! اب تو بتا، وہاں کیا واقعہ پیش آیا تھا؟"

"میں اور غنی وہاں پہنچے تو احمد شاہ ہم سے کچھ فاصلے پر تھا۔" راجا نے کہنا شروع کیا۔ "غنی نے آفس کے دروازے پر دستک دی تو فوراً ہی دروازہ کھل گیا اور اندر سے کرخت چہرے والے آدمی نے باہر جھانکا۔

"مجھے وکیل صاحب سے ملنا ہے۔" میں نے کہا۔

"آیئے اندر آ جایئے۔ وکیل صاحب ابھی تھوڑی دیر میں آ جائیں گے۔" اس نے کہا اور عجیب سی نظروں سے ایک جانب دیکھ کر خفیف سا اشارہ کیا۔

مجھے فوراً ہی کسی گڑبڑ کا احساس ہوگیا۔ غنی نے اندر جانا چاہا لیکن میں نے اسے روک دیا اور کرخت چہرے والے سے کہا۔ "ٹھیک ہے، ہم باہر ہی وکیل صاحب کا انتظار کر لیتے ہیں۔"

میں واپس مڑنے ہی والا تھا کہ کرخت چہرے والے نے اچانک گن نکال لی۔ پھر ایک دوسرا شخص نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں بھی ریوالور تھا۔ وہ دونوں جلدی سے باہر آ گئے۔ ایک نے میری کمر سے ریوالور لگایا اور دوسرے نے غنی کو گن پوائنٹ پر لیا لیکن اتنی مہارت سے کہ آس پاس سے گزرنے والوں کو شبہ تک نہ ہو سکا کہ ان دونوں کے ہاتھوں میں پستول ہیں۔

کرخت چہرے والا ہنس کر بولا۔ "کوئی چالاکی مت دکھانا ورنہ میرا پستول بے آواز چلتا ہے۔"

دوسرا دوستانہ انداز میں مسکرا کر غنی سے بولا۔ "میرا خیال ہے کہ تم نے بھی میرے ساتھی کی بات سن لی ہوگی۔ اب خاموشی سے اندر چلو۔"

قریب سے گزرنے والے لوگوں نے یہی سمجھا ہوگا کہ ہم لوگ وہاں کھڑے ہوئے گپ شپ کر رہے ہیں۔

ہم دونوں اندر داخل ہوئے تو انہوں نے ہمیں ہاتھ سر پر رکھنے کا حکم دیا اور رخ دیوار کی طرف پھیر دیا۔

"یہ سب کیا ہے؟" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "وکیل صاحب کے کلائنٹس کے ساتھ یہی سلوک ہوتا ہے یہاں؟"

"وکیل صاحب وقت دیے بغیر کسی سے نہیں ملتے۔" کرخت چہرے والے کی آواز سنائی دی۔ ہمارا رخ دیوار کی طرف تھا اس لیے مجھے ان کے چہرے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

ان دونوں نے بہت مہارت سے ہماری تلاشی لی اور ان میں سے ایک طنزیہ لہجے میں بولا۔ "وکیل صاحب کے

کلائنٹس مسلح ہو کر نہیں آتے۔"

میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "میں کوئی ایرا غیرا نہیں ہوں۔ مجھے اپنی حفاظت کے لیے نہ صرف مسلح رہنا پڑتا ہے بلکہ باڈی گارڈ بھی رکھتا ہوں۔"

ان لوگوں نے ہماری جیبوں سے سیل فون بھی نکال کر آف کر دیے۔

"سر! آپ کے وکیل تو بیرسٹر سجاد صاحب ہیں۔ پھر کسی چھوٹے موٹے وکیل سے بات کرنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی؟" غنی نے کہا۔

میں جانتا تھا کہ غنی ان لوگوں کو مشتعل کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ سرور ڈھلون بھی شہر کے چند بہترین اور مہنگے وکیلوں میں سے ایک تھا۔

"کیا کہا؟" کرخت چہرے والا بھنا کر بولا۔ "چھوٹے موٹے وکیل!"

"یار! یہ تو دیکھ کر ہی معلوم ہوگا کہ وہ چھوٹے ہیں یا موٹے؟" غنی نے تضحیک آمیز لہجے میں کہا۔

ہم لوگ غیر محسوس طور پر ان کی طرف گھوم چکے تھے۔ میں نے بہت پرانا اور گھسا پٹا حربہ آزمایا۔ وہ حربہ کبھی کبھی کامیاب بھی ہو جاتا ہے۔ میں نے اچانک کہا۔ "او وہ وکیل صاحب بھی آ گئے۔"

ان دونوں نے بہ یک وقت گھوم کے دروازے کی طرف دیکھا۔ غنی کے لیے اتنی مہلت کافی تھی۔ اس نے اپنے نزدیک کھڑے ہوئے بدمعاش کے پستول پر ہاتھ مارا اور دوسرے بدمعاش کی ناف پر زوردار لات رسید کر دی۔

اس کے حلق سے ایک کراہ برآمد ہوئی اور ریوالور دور جا گرا۔ میں نے لپک کر ریوالور اٹھا لیا۔ غنی بھی دوسرے بدمعاش سے ریوالور چھین چکا تھا۔

"ہاں، اب تم یہ بتاؤ کہ تم لوگ کون ہو اور یہ سب کیا ہے؟"

"ہم تو وکیل صاحب کے ملازم ہیں۔" ان میں سے ایک بولا۔

"تم لوگ کیا وکیل صاحب کے ہر کلائنٹ کے ساتھ یہی سلوک کرتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتے۔" وہ ڈھٹائی سے بولا۔

"غنی!" میں نے کہا۔ "ان دونوں کے گلے میں پھندا ڈالو اور انہیں پنکھے سے لٹکا دو۔"

"سر، میں انہیں ذبح کر کے ان کی لاشیں اور روالے کمرے میں یا باتھ روم میں چھپا دیتا ہوں، پھر اس وکیل سے بھی نمٹ لیں گے۔" یہ کہتے ہوئے غنی نے اپنی جیب سے تیز دھار والا خنجر نکال لیا۔

"ہم سے وکیل صاحب نے کہا تھا کہ یہاں آفتاب صاحب کے علاوہ کوئی بھی آئے اسے میرے پاس آنے سے روک کر رکھنا۔"

"کیوں؟"

"یہ تو وکیل صاحب خود ہی بتائیں گے۔ وہ بس آنے ہی والے ہوں گے۔"

میں نے غنی کو اشارہ کیا۔ اس نے باری باری پشت پر جا کر دونوں کی کھوپڑیاں ریوالور کے دستے سے سہلا دیں۔

وہ دونوں فوراً ہی ناک آؤٹ ہوگئے۔ غنی نے انہیں کھینچ کر دوسرے کمرے میں ڈال دیا۔

ہم لوگ خاموشی سے بیٹھ گئے۔ ہم نے اپنے سیل فون تک آف نہیں کیے تھے۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی تو غنی نے آہستگی سے دروازہ کھولا۔

وکیل نے بھی آہستہ سے دروازہ کھولا۔ پھر مجھ پر اور غنی پر نظر پڑتے ہی وہ اچانک بھاگ نکلا۔ لیکن وہ بھاگ کر جائے گا بھی کہاں؟" راجا نے کہا۔ "ابھی آفتاب خان تو ہمارے قبضے میں ہے۔"

"یار، مہاراجا! یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وکیل کو سب کچھ معلوم ہو اور وہ آفتاب خان کو بھی ڈبل کراس کر رہا ہو؟"

"ہونے کو تو کچھ بھی ہو سکتا ہے۔" راجا نے کہا۔ "تو مرغ کی طرح بانگ دے سکتا ہے، سر کے بل کھڑا ہو سکتا ہے۔"

"سوسائٹی میں اور بھی بے شمار ایسے ہیں مہاراجا! تو کن کن مسائل کو روئے گا۔" میں نے کہا۔

"تو تو یوں چہک رہا ہے جیسے تو نے نور کو بازیاب کرا لیا ہے؟" راجا نے کہا۔

میرا اچھا بھلا موڈ راجا کے اس جملے سے غارت ہوگیا۔

شاید راجا کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہوگیا تھا۔ وہ جلدی سے بولا۔ "سوری فیکے پتر! وہ میں......"

"بس کر یار!" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "چل ذرا اس ٹرانسپورٹر کی خبر لیں۔ مجھے شبہ ہے کہ اس حرام زادے نے فون پر وکیل سے کوئی ایسی بات کہہ دی تھی کہ وہ پہلے ہی سے محتاط ہوگیا ورنہ وہ ان بدمعاشوں کا بندوبست کیوں کرتا؟"

ہم گھر پہنچے تو دوپہر کے بارہ بج رہے تھے۔

میں سیدھا آفتاب خان کے کمرے میں جا پہنچا۔ وہ بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ میرے تیور دیکھ کر بوکھلا کے اٹھ بیٹھا۔

''میں نے تم سے کہا تھا کہ زیادہ اسمارٹ بننے کی کوشش مت کرنا۔'' میں نے کہا۔

''میں سمجھا نہیں۔'' وہ تھوک نگل کر بولا۔

میں نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر اتنی زور سے تھپڑ مارا کہ وہ الٹ کر بیڈ پر گر گیا۔ ''الو کے پٹھے! تو نے فون پر اس وکیل سے کیا کہا تھا؟''

''میں نے آپ کے سامنے ہی تو بات کی تھی۔'' وہ اپنا گال سہلاتے ہوئے بولا۔ اس کے چہرے پر میری انگلیوں کے نشانات ثبت ہو گئے تھے۔ اس کے ہونٹ بھی پھٹ گئے تھے اوران سے بھی خون جاری تھا۔

''تم نے وکیل سے کیا کہا تھا؟'' میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔

''تو کیا سرور تمہیں نہیں ملا؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

''دیکھو آفتاب خان!'' میں نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھ سے اڑنے کی کوشش مت کرو، ورنہ تم جانتے ہو کہ میں......''

''میں قسم کھانے کو تیار ہوں کہ میں نے اس سے کچھ بھی......''

''بند کرو یہ بکواس!'' میں نے گرج دار آواز میں اس کا جملہ کاٹ دیا۔ ''کیا تم مجھے اتنا ہی الو کا پٹھا سمجھتے ہو کہ میں تمہاری اس بکواس پر یقین کر لوں گا۔ وہ حرام زادہ پہلے تو ہمیں گھیرنے کے چکر میں تھا، پھر جب بات نہیں بنی تو وہ بریف کیس سمیت کہیں غائب ہو گیا۔''

''ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟'' آفتاب خان الجھ کر بولا۔

''ایسا ہوا ہے؟'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''میں تمہیں پانچ منٹ دے رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے سب کچھ سچ سچ بتا دو۔'' پھر میں نے بلند آواز میں پکارا۔ ''احمد شاہ!''

تھوڑی دیر بعد احمد شاہ کمرے میں موجود تھا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ شاید وہ کوٹھی کے کسی دوسرے حصے میں تھا اور یقیناً غنی نے سیل فون پر کال کر کے اسے بلایا تھا۔

''یس سر!''

''تم ابھی آفتاب خان کے گھر جاؤ اور اس کی دونوں بیٹیوں کو اٹھا لاؤ۔''

''یہ...... یہ...... تت...... تم کیا کہہ رہے ہو، میری چھوٹی بیٹی تو مشکل سے ابھی تیرہ چودہ سال کی ہو گی۔''

''ہاں، اس کی بیوی کو بھی اٹھا لانا۔''

''دیکھو! میں نہیں جانتا کہ وہ وکیل کیوں بھاگ گیا، میں......''

''ابھی تمہارے دو منٹ باقی ہیں۔'' میں نے کہا۔

میں گھڑی پر نظریں جمائے کھڑا رہا۔

پانچ منٹ پورے ہوتے ہی میں نے احمد شاہ کو جانے کا اشارہ کیا۔

وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

''دیکھو، میری بیٹیوں پر یہ ظلم مت کرو۔ مجھے جو کچھ معلوم تھا وہ میں نے بتا دیا۔''

''ممکن ہے تمہاری بیٹیوں یا بیوی کو کچھ معلوم ہو؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''تم لوگ میری بات کا یقین کیوں نہیں کرتے؟'' آفتاب خان اچانک چیخ کر بولا۔

''اگر تمہیں کچھ یاد آ جائے تو بتا دینا۔'' میں نے کہا۔ ''میں تمہاری بیٹیوں کو یہاں لانے کے بعد بھی چھوڑ دوں گا۔''

میں کمرے سے باہر آ گیا۔ راجا مجھے کوریڈور میں ملا۔ ''کچھ بتایا اس ٹرک ڈرائیور نے؟'' راجا نے پوچھا۔

''کون ٹرک ڈرائیور؟'' میں نے کہا۔

''فیکے پتر! یہ آفتاب خان جو آج اتنا معزز بنا بیٹھا ہے۔ یہ پہلے ٹرک ڈرائیور تھا۔'' راجا نے کہا۔ ''اور ٹرک بھی اس کا اپنا نہیں تھا بلکہ یہ ٹھیکے پر ٹرک چلاتا تھا۔ جیسے تو اچانک ست بدھائی کا نواب بن بیٹھا ہے۔'' راجا نے مجھے چھیڑنے کو کہا۔

''میں نے نواب بننے کے لیے کسی کا گلا نہیں کاٹا، غیر اخلاقی اور غیر قانونی ہتھکنڈوں سے کام نہیں لیا، منشیات کی اسمگلنگ نہیں کی، بردہ فروشی اور اغوا برائے تاوان کی وارداتیں نہیں کیں۔''

''ہاں، تیری تو لاٹری نکلی ہے۔'' راجا نے کہا۔ ''لیکن ہر شخص اتنا خوش قسمت نہیں ہوتا۔ اس بات کو چھوڑ، اس نے تجھے کچھ بتایا اس وکیل کے بارے میں؟''

''وہ مسلسل یہی کہہ رہا ہے کہ اسے نہیں معلوم کہ وکیل فرار کیوں ہوا ہے؟''

''یار! میں تو سمجھتا تھا کہ تو ہی ڈھیٹ ہے پر یہ ٹرک ڈرائیور تو تجھ سے بھی دو ہاتھ آگے ہے۔''

''بکواس کرے گا تو میرے ہاتھوں مارا جائے گا۔''

''یار، یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ آفتاب خان کو کچھ معلوم ہو۔'' راجا نے سنجیدگی سے کہا۔

''تو کیا واقعی اس کی بیٹیوں کو اٹھوا لوں؟''

''تو پہلے اس سے وکیل کا پتا اور اس کے دوسرے ٹھکانے معلوم کر۔'' راجا نے کہا۔ ''بلکہ تو رہنے دے۔ یہ کام غنی کو کرنے دے۔''

''کھانا کھا کر میں خود ہی معلوم کر لوں گا۔''

☆☆☆

کھانے کے بعد میں راجا اور غنی کے ساتھ ایک مرتبہ پھر آفتاب خان کے کمرے میں پہنچا۔

''مجھے یقین ہے کہ اب تک تمہیں یاد آ گیا ہو گا۔'' میں نے کہا۔

آفتاب خان خاموشی سے ہمارے چہرے دیکھتا رہا۔

میں نہیں چاہتا تھا کہ میں اس کی بیٹی اور بیوی کو دہشت زدہ کروں لیکن وہ آفتاب خان اتنا ڈھیٹ تھا کہ کسی طرح زبان کھولنے پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا، ایک آخری کوشش کر لوں، پھر اس کی بیٹی اور بیوی کو اٹھوائے بغیر کوئی چارہ نہیں رہے گا۔

میں نے اچانک گن نکالی اور آفتاب خان کی کنپٹی پر رکھ دی۔ ''اگر تم نے میرے تین کہنے سے پہلے زبان نہ کھولی تو میں تمہاری کھوپڑی اڑا دوں گا۔'' میں نے سفاک لہجے میں کہا۔ ''مجھے تمہاری زندگی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس وکیل کو شاہ جی بھی خود تلاش کر لے گا۔''

''اس کی بیٹیوں اور بیوی کا کیا کرنا ہے سر؟'' راجا نے سنجیدگی سے کہا۔

''ان کی وڈیو بنا کر مارکیٹ میں پھیلا دو۔'' میں نے کہا۔ پھر آفتاب خان کی طرف متوجہ ہوا۔ ''ایک، دو......''

''ٹھہرو۔'' آفتاب خان نے کہا۔ ''ایک دفعہ میری بیوی سے بات کرا دو۔'' اس نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔

''اب یہ ممکن نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تمہاری فیملی یہاں نہیں ہے۔ ان کی تو وڈیو بن رہی ہو گی۔''

''ایسا مت کرو۔ میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔'' آفتاب خان نے کہا۔

''اب یہ کوئی نئی چال ہے؟'' راجا نے پوچھا۔

''وہ اصل میں میری بیوی...... وہ...... وکیل...... میری بیوی ہی کے پاس...... گیا ہو گا...... میں نے...... اسے فون پر کچھ ہدایات دی تھی۔''

''پھر بکواس کر رہے ہو تم؟'' میں نے کہا۔ ''فون تو تم نے میرے سامنے کیا تھا۔''

''میں نے اپنے وکیل کو پہلے ہدایت دے رکھی تھی کہ اگر میں کبھی فون پر تم سے بریف کیس کا مطالبہ کروں تو اس پر یقین مت کرنا۔ مجھے جب بھی بریف کیس کی ضرورت ہو گی، میں خود آفس آ جاؤں گا۔''

''لیکن اس مردود نے تو ہمیں گھیرنے کا بندوبست کر رکھا تھا۔'' میں نے کہا۔

''یہ اس نے میری بیوی کی ہدایت پر کیا ہو گا۔'' آفتاب خان نے کہا۔ ''میں نے وکیل کو ہدایت دی تھی کہ اگر کبھی تمہیں میری طرف سے ایسا کوئی فون موصول ہو تو تم میرے گھر فون کر کے مجھ سے یا میری بیوی سے تصدیق ضرور کرنا۔''

''تو کیا ان کالے دھندوں میں تمہارے ساتھ تمہاری بیوی بھی ملوث ہے؟'' راجا نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں۔'' آفتاب خان نے سر جھکا کر کہا۔ ''وہ میرے ساتھ برابر کی شریک ہے۔ اس کا رابطہ براہ راست شاہ جی سے بھی ہے۔ اب تک شاہ جی کو بھی میرے اغوا کا علم ہو گیا ہو گا۔''

''اس کا تو خیر کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ہم نے اسی کے حکم پر تو تمہیں اٹھایا ہے۔ شاہ جی نے اس سے یہی کہا ہو گا کہ آفتاب خان کو میں نے اپنے کسی کام سے بھیجا ہے۔''

''میری بیوی اچھی عورت نہیں ہے۔'' آفتاب خان نے کہا۔ ''اسے آپ جیسے چاہیں سزا دیں لیکن میری دونوں بیٹیاں بہت معصوم ہیں...... وہ......''

''اگر یہ بات تم پہلے ہی بتا دیتے تو ہم تمہاری بیٹیوں کو کیوں اٹھواتے؟'' راجا نے اسے نفسیاتی طور پر مرعوب کرنے کو کہا۔ ''اب تو یہ باس کی مرضی پر منحصر ہے۔'' اس نے میری طرف اشارہ کیا۔

''مجھے اگر وہ بریف کیس مل جائے تو میں اب بھی تمہاری بیٹیوں کو باعزت طور پر واپس چھوڑ آؤں گا۔'' میں نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

راجا میرے پیچھے پیچھے آیا اور بولا۔ ''فیکے پتر! کہیں یہ بھی اس ٹرک ڈرائیور کی چال نہ ہو۔''

''یہ اگر کوئی چال ہوئی تو میں اسے گولی مار کے کسی کوڑے کے ڈھیر پر پھنکوا دوں گا۔'' میں نے کہا۔

''یار! ہمیں اس تندوائی کی بھی فکر کرنا چاہیے۔ آفتاب خان کے اغوا کے بعد وہ بھی ہوشیار ہو گیا ہو گا۔ ممکن ہے شاہ جی نے اسے فی الحال منظر عام سے ہٹا دیا ہو؟''

''پہلے میں آفتاب خان کے معاملے سے نمٹ لوں، پھر اس کے بارے میں کچھ سوچیں گے۔''

میں کمرے میں پہنچا تو نیلم کمرے کی صفائی کر رہی

تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ رک گئی۔

''تم اپنا کام کرتی رہو۔ ہم باہر لاؤنج میں بیٹھ جاتے ہیں۔'' میں نے کہا اور لاؤنج میں آ گیا۔ ''احمد شاہ کو بلاؤ۔'' میں نے راجا سے کہا۔

راجا سے پہلے غنی اسے بلانے چلا گیا کیونکہ اس وقت لاؤنج میں وہ بھی موجود تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد احمد شاہ میرے سامنے کھڑا تھا۔

''احمد شاہ!'' میں نے کہا۔ ''تم نے آفتاب خان کا گھر دیکھا ہے؟''

''یس سر!'' احمد شاہ نے جواب دیا۔

''تم اور غنی جا کر ایک بار پھر اس کا جائزہ لے لو۔ وہاں کتنے گارڈ ہیں، کتنے ملازم ہیں اور......''

''یہ سب جائزہ میں لے چکا ہوں سر!'' احمد شاہ نے کہا۔ ''آفتاب خان کا بنگلا آبادی سے کچھ ہٹ کر ہے۔ اس کے اردگرد کئی پلاٹ خالی پڑے ہیں۔ گیٹ پر دو گارڈز ہوتے ہیں۔ بنگلے کے اندر تین مرد ملازم ہیں اور دو عورتیں، وہ لوگ سرونٹ کوارٹرز میں رہتے ہیں۔''

''آج تم لوگوں کو آفتاب خان کی بیوی اور اس کی بیٹیوں کو اٹھانا ہے۔'' میں نے یوں کہا جیسے برسوں سے یہی کام کرتا آیا ہوں۔

''ابھی؟'' غنی نے پوچھا۔

''رات میں کسی وقت۔'' راجا نے کہا۔

''یار راجا!'' میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''اگر وہ بریف کیس آفتاب کی بیوی کے پاس ہے تو ہم وہاں خود بھی تو جا سکتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ تیرا دماغ چل گیا ہے...... میرا مطلب ہے کہ چل رہا ہے، یہی بات اگر میں تجھ سے کہتا تو کبھی نہ مانتا۔''

''یار! میں لڑکیوں کے اغوا وغیرہ کا قائل نہیں ہوں۔'' میں نے کہا ''اگر وہ بریف کیس ہمیں آفتاب خان کے بنگلے سے مل جائے تو ہمیں ان لوگوں کو اغوا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟'' پھر میں غنی سے بولا۔ ''ہم آج رات آفتاب خان کے بنگلے میں داخل ہوں گے۔ تم اور احمد شاہ تیار رہنا۔''

''میں ست بدھائی سے کچھ اور گارڈز کو بلا لوں؟'' غنی نے کہا۔

''کیا ہم کسی ملک پر حملہ کرنے جا رہے ہیں؟'' میں نے اسے گھورا۔ ''مجھے کسی لاؤ لشکر کی ضرورت نہیں ہے۔''

☆☆☆

ہم لوگ آفتاب خان کے بنگلے کے دو چکر لگا چکے تھے۔ اس کے مین گیٹ پر تیز روشنی والے دو بلب روشن تھے اور گیٹ بند تھا۔ گارڈز گیٹ کے اندر تھے۔

''میرا خیال ہے کہ ہمیں بنگلے کی عقبی سمت سے اندر داخل ہونا چاہیے۔'' میں نے کہا۔

''بنگلے میں کتے تو نہیں ہیں؟'' راجا نے پوچھا۔

''نہیں سر!'' احمد شاہ نے جواب دیا۔

''دو ٹانگوں پر چلنے والے کتے تو بنگلے کے اندر بھی ہیں اور باہر بھی۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیکے پتر!'' راجا نے کہا۔ ''تجھے اس وقت بھی فلسفہ سوجھ رہا ہے؟''

''اس وقت تو اندھیرے میں کچھ بھی نہیں سوجھ رہا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تیری مکروہ صورت تک دکھائی نہیں دے رہی ہے۔''

''پھر تو تجھے آئینہ بھی دکھائی نہیں دے رہا ہوگا ورنہ اپنی مکروہ صورت تو دیکھ ہی لیتا۔''

غنی نے گاڑی ایک ایسی جگہ پارک کر دی کہ کسی کو شبہ نہ ہو۔ وہ دو بنگلوں کی درمیانی دیوار تھی۔ ہر بنگلے کا مکین یہی سمجھتا کہ گاڑی میں پڑوس کے بنگلے میں کوئی آیا ہوگا۔ وہاں سے آفتاب کے بنگلے کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔

ہم لوگوں نے پھر ایک مرتبہ اپنے ہتھیار چیک کیے اور بنگلے کی پشت پر پہنچ گئے۔

رائفل چھپانے کے لیے غنی نے چادر اوڑھ رکھی تھی۔ احمد شاہ کی پشت پر کینوس کا ایک بیگ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس بیگ میں ضرورت کی ہر چیز موجود ہوگی۔

بنگلے کی چار دیواری سے کچھ فاصلے پر نیم کا ایک گھنا درخت تھا۔ اس درخت کے ذریعے اوپر چڑھ کر بنگلے کا جائزہ تو لیا جا سکتا تھا لیکن اس کے ذریعے بنگلے میں داخل ہونا ممکن نہیں تھا کیونکہ وہ بنگلے سے اتنے فاصلے پر تھا کہ کوئی بندر یا لنگور ہی لمبی چھلانگ لگا کر اندر جا سکتا تھا۔ چار دیواری خاصی اونچی تھی اور اس پر خاردار تار بھی تھے۔

احمد شاہ پھرتی سے درخت پر چڑھ گیا۔ اس کی پھرتی دیکھ کر میں اش اش کر اٹھا۔ ہم سب اس سے کچھ فاصلے پر اندھیرے میں کھڑے تھے۔

اب ہمیں احمد شاہ کسی ہیولے کی طرح نظر آ رہا تھا کیونکہ بنگلے کی پشت پر تاریکی تھی۔ احمد شاہ اوپر نہ جانے کیا کر رہا تھا۔ غنی نے جیب سے سیل فون نکالا اور اس سے رابطہ کرنے ہی والا تھا کہ وہ ہمیں ایک مضبوط شاخ پر جھولتا نظر آیا۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ احمد شاہ نے شاخ کے گرد رسی لپیٹ رکھی ہے اور اس رسی میں جھول رہا ہے۔

پھر اس نے ایک لمبی سوئنگ لی لیکن اندر پہنچنے میں کامیاب نہیں ہوا۔ اس نے دوبارہ زیادہ قوت سے سوئنگ لی اور گویا اڑتے ہوئے بنگلے کی چار دیواری عبور کر گیا۔ اس کے کودنے سے اندر ہلکا سا دھماکا ہوا۔ ہم لوگ اضطراب کے عالم میں باہر کھڑے رہے۔ احمد شاہ نے یوں اندر کود کر گویا اپنی جان داؤ پر لگا دی تھی۔ ممکن ہے اس حصے میں بھی آفتاب خان کا کوئی گارڈ ہو۔ وہ تو احمد شاہ کو دیکھتے ہی گولی مار دیتا۔ مجھے اپنے اتنے اچھے گارڈ اور کمانڈو کے ضائع ہونے کا افسوس زندگی بھر رہتا۔

چند منٹ تک وہاں بالکل سناٹا رہا۔ ایسا سناٹا کہ ہمیں اپنے دل کی دھڑکن بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔

پھر بہت آہستگی سے عقبی سمت کا چھوٹا سا دروازہ کھلا اور مجھے احمد شاہ کا ہیولا دکھائی دیا۔ وہ ہمیں اندر آنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ میں بے اختیار احمد شاہ سے لپٹ گیا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ''مجھے تم پر فخر ہے احمد شاہ!''

''شکریہ سر!'' احمد شاہ نے انکساری سے جواب دیا۔

ہم نے اندر داخل ہو کر وہ دروازہ بھیڑ دیا۔ اس میں بھی تالا تھا لیکن احمد شاہ نے اسے نہ جانے کیسے کھول لیا تھا۔

''میں اور غنی مین گیٹ کی طرف جا کر ان دونوں گارڈز کو قابو میں کرتے ہیں۔ آپ لوگ سرونٹ کوارٹرز کی طرف چلے جائیں۔''

''پہلے ہم سب مین گیٹ کی طرف چلتے ہیں۔'' راجا نے کہا۔

''سر! وہاں صرف دو آدمی ہیں۔ ان سے میں اور غنی آسانی سے نمٹ سکتے ہیں۔'' احمد شاہ نے کہا۔

''زیادہ بھی ہو سکتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''تم لوگ چلو، ہم لوگ کچھ فاصلے سے تمہیں کور دیں گے۔''

ہم لوگ سرگوشیوں میں بات کر رہے تھے۔ ہم ایک لمبا چکر کاٹ کر بنگلے کے سامنے والے حصے کی طرف آئے تو غنی نے ہمیں وہیں دیوار کی آڑ میں رکنے کا اشارہ کیا اور خود بیٹھے بیٹھے مین گیٹ کی طرف بڑھنے لگا۔ مین گیٹ کے ساتھ ہی چھوٹا سا ایک کمرا بنا ہوا تھا۔ وہ گویا گارڈ روم تھا۔ اس طرف تیز روشنی تھی اور مجھے ابھی تک وہاں کوئی گارڈ دکھائی نہیں دیا تھا۔ میری نظریں غنی اور احمد شاہ پر جمی ہوئی تھیں۔ دونوں مخالف سمتوں سے مین گیٹ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اچانک عمارت کی طرف سے ایک شخص نکلا اور دبے پاؤں احمد شاہ کی طرف بڑھا۔ میں بھی تیزی سے اس طرف بڑھ گیا۔ اس شخص کے ہاتھوں میں رائفل تھی جسے اس نے نال کی طرف سے پکڑ رکھا تھا اور احمد شاہ پر اس کے دستے سے وار کرنے والا تھا۔

اس نے جوں ہی رائفل ڈنڈے کی طرح بلند کی، میں نے پیچھے سے اس کی کمر پر زوردار لات رسید کر دی۔ وہ اوندھے منہ گرا تو احمد شاہ نے بھی چونک کر اسے دیکھا۔

اس شخص کے منہ سے مغلظات کا طوفان امل پڑا۔ میری لات زیادہ بھرپور نہیں پڑی تھی ورنہ وہ گالیاں تو درکنار اپنا نام تک بھول جاتا۔ احمد شاہ نے جھپٹ کر اس کی کھوپڑی پر زوردار ہاتھ رسید کر دیا۔ وہ فوراً ہی ناک آؤٹ ہو گیا۔ میں نے احتیاطاً اس کی کنپٹی پر ایک ہاتھ مزید رسید کر دیا۔

اچانک وہاں کتے کے بھونکنے کی آواز گونجی تو میرے ساتھ ساتھ احمد شاہ بھی بری طرح چونک اٹھا۔

فوراً ہی گارڈ روم سے ایک آدمی نکلا اور الجھن آمیز انداز میں اردگرد دیکھنے لگا۔ میں اور احمد شاہ ڈم ڈم کی باڑھ کے پیچھے چھپ گئے۔

اب دو طرف سے خطرہ تھا۔ ایک طرف تو وہ گارڈ تھا، دوسری جانب وہ کتا تھا جو نہ جانے کس نسل کا تھا۔ آواز اور غراہٹ سے تو مجھے وہ خوف ناک قسم کا ڈوبرمین لگ رہا تھا۔ میں نے ریوالور نکال لیا اور فائر کرنے کو تیار ہو گیا۔ احمد شاہ کے ہاتھ میں لمبے اور چمک دار پھل کا خنجر تھا۔

گارڈ مزید آگے بڑھا تو اچانک لڑکھڑا کر گر گیا۔ میں نے سر تھوڑا سا اوپر اٹھا کر اس طرف دیکھا، وہ گرا نہیں تھا بلکہ غنی نے اس کا پیر پکڑ کر کھینچ لیا تھا اور وہ اس کے سینے پر سوار تھا۔ غنی نے ایک ہاتھ سے گارڈ کے بال پکڑے اور دوسرے ہاتھ سے اس کا گلا دبوچ لیا۔ وہ خاصا لحیم شحیم آدمی تھا لیکن غنی کے بھاری بھرکم وجود کے نیچے دب کر گویا بے بس ہو گیا تھا۔

لمحوں میں اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔

غنی نے اسے کھینچ کر ڈم ڈم کی باڑھ کے ساتھ ڈالا اور دبے قدموں گارڈ روم کی طرف بڑھا۔ گارڈ روم کے ساتھ بھی ڈم ڈم کی گھنی باڑھ تھی۔ غنی اس باڑھ کے پیچھے غائب ہو گیا اور مجھے پھر کتے کی آواز سنائی دی۔

میں نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا، پھر احمد شاہ سے سرگوشی میں پوچھا۔ ''تم نے تو کہا تھا کہ اس بنگلے میں کتے نہیں ہیں؟''

اس سے پہلے کہ احمد شاہ کوئی جواب دیتا۔ اقامتی حصے کا دروازہ کھلا اور ایک آدمی برآمدے میں آ گیا۔ ہم دونوں بالکل

زمین سے چپک گئے۔ وہاں اتنی روشنی تھی کہ اگر ہم معمولی سی حرکت بھی کرتے تو اس شخص کی نظروں میں آجاتے یا اگر وہ برآمدے سے اتر کر پورچ میں آجاتا تو ہمیں دیکھ لیتا۔

اس نے خمار آلود آواز میں کہا۔ ''کون ہے؟...... غلام علی! دیکھو، یہ کتا کہاں سے آگیا؟''

''ابھی دیکھتا ہوں۔'' دور سے غلام علی کی آواز سنائی دی، پھر وہ بری طرح کھانسنے لگا۔

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ آواز غلام علی کی نہیں بلکہ غنی کی تھی۔

وہ آدمی تجسس میں مزید آگے بڑھا۔ اسی وقت پیچھے سے کسی نے اسے دبوچ لیا۔ دوسرے ہی لمحے دونوں ایک دوسرے سے گتھے ہوئے زمین پر گر پڑے۔ اس پر عقب سے حملہ کرنے والا راجا تھا اور اس نے بہت صحیح وقت پر مداخلت کی تھی۔ احمد شاہ بجلی کی سی تیزی سے اٹھا اور لمحوں میں ان دونوں کے سر پر پہنچ گیا، پھر اس نے راجا سے لپٹے ہوئے آدمی کی گردن یوں پیچھے سے پکڑ لی جیسے سپیرے سانپ کی گردن پکڑتے ہیں۔ وہ شخص بوکھلا کر پلٹنا چاہتا تھا لیکن احمد شاہ کی گرفت اتنی سخت تھی کہ وہ کسی کیچوے کی طرح بے بس ہوگیا۔

احمد شاہ نے اسے چھوڑا تو وہ مردہ چھپکلی کی طرح پٹ سے زمین پر گر گیا۔

''کیا یہ مر گیا؟'' راجا نے پوچھا۔

''یہ صرف بے ہوش ہوا ہے سر!'' احمد شاہ نے کہا اور بے ہوش ہونے والے کی کنپٹی پر ایک ہاتھ اور مار دیا۔ اس نے اسے بھی گھسیٹ کر ڈم ڈم کی باڑھ کے ساتھ ڈال دیا۔

''جلدی کریں سر!'' غنی کی آواز آئی۔ ''وقت بہت کم ہے، یہ لوگ زیادہ دیر بے ہوش نہیں رہیں گے۔''

''راجا!'' میں نے کہا۔ ''تم گاڑی بنگلے کے گیٹ پر لے آؤ۔''

غنی نے گاڑی کی چابیاں راجا کو دے دیں اور بولا۔ ''گیٹ کی طرف اب کوئی نہیں ہے۔''

''وہ کتے بھی شاید تم ہی تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''جی سر!'' غنی نے کہا۔ ''گارڈز کو ان کے کمرے سے تو نکالنا تھا نا!''

اس سے ہمیں دوسرا فائدہ یہ ہوا تھا کہ بنگلے کے اقامتی حصے کا صدر دروازہ کھل گیا تھا ورنہ اس کے لیے بھی ہمیں کوئی شیشہ توڑنا پڑتا یا کوئی گرل کاٹنا پڑتی۔

ہم تینوں تیزی سے اندر کی طرف بڑھے۔ راجا مین گیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

''غنی! تم دروازے کے پاس ٹھہرو۔ ممکن ہے کوئی ملازم سرونٹ کوارٹر سے اس طرف آجائے۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''اندر کوئی ملازم ہوا تو اس سے ہم لوگ نمٹ لیں گے۔''

ہم لاؤنج عبور کر کے کوریڈور کی طرف آگئے۔ وہاں دونوں اطراف میں دو دو کمرے تھے۔ میں نے پہلے کمرے کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو وہ آسانی سے کھل گیا۔ احمد شاہ کے پاس محدود روشنی والی پنسل ٹارچ تھی۔ اس نے کمرے کا جائزہ لیا اور بولا۔ ''یہ کمرا تو خالی ہے سر!''

ہم آہستگی سے دوسرے کمرے کی طرف بڑھے۔ میں نے دروازے پر لگی ہوئی ناب گھمائی لیکن کمرا اندر سے لاک تھا۔

احمد شاہ نے جیب سے عجیب سا ایک آہنی تار کا ٹکڑا نکالا اور اسے کی ہول میں ڈال کر مخصوص انداز میں حرکت دی۔ بیس سیکنڈ سے بھی کم عرصے میں لاک کھل گیا۔

میں نے آہستگی سے دروازہ کھولا اور دبے قدموں اندر داخل ہوگیا۔ کمرے میں زیرو پاور کا نیلگوں بلب روشن تھا اس لیے احمد شاہ کو ٹارچ روشن کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ بہت شاندار اور آراستہ خواب گاہ تھی۔ کمرے میں جہازی سائز ڈبل بیڈ تھا۔ اس پر کوئی سو رہا تھا۔ سردی کے باعث سونے والے نے لحاف اوڑھ رکھا تھا لیکن مجھے اندازہ ہوگیا کہ سونے والا ایک ہی ہے کیونکہ بیڈ کا آدھا حصہ خالی تھا۔

میں دبے پاؤں آگے بڑھا اور اس کے سرہانے پہنچ گیا۔ پھر میں نے احمد شاہ کو اشارہ کیا۔

احمد شاہ نے جیب سے وہی لمبے پھل والا خنجر نکالا اور بائیں ہاتھ سے لحاف گھسیٹ لیا۔

اچانک برق سی کوند گئی۔ سونے والی نے بجلی کی سی تیزی سے احمد شاہ کے سینے پر لات ماری اور پلک جھپکتے میں ریوالور نکال لیا۔ وہ اس پر فائر کرنے ہی والی تھی کہ میں نے جھپٹ کر پشت سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں نے اس کے ریوالور والے ہاتھ کو زوردار جھٹکا دیا، ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ دوسرا ہاتھ میں نے اس کے منہ پر جما دیا تھا کہ وہ شور شرابا نہ کر سکے۔

اس نے اپنے لمبے لمبے ناخنوں سے میرے ہاتھ پر خراشیں ڈال دیں۔ اس نے میرا چہرہ بھی نوچنے کی کوشش کی لیکن میں نے سر پیچھے جھکا کر اپنا چہرہ بچا لیا۔

احمد شاہ نے اچانک خنجر اس کے گلے پر رکھ دیا اور سفاک لہجے میں بولا۔ ''اگر آواز نکالی تو تمہاری یہ خوب صورت گردن صابن کی ٹکیا... کی طرح کاٹ دوں گا۔''

اس نے زور زور سے سر ہلایا اور اشاروں سے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

''اگر تم شور شرابا نہ کرنے کا وعدہ کرو تو میں تمہارے منہ سے اپنا ہاتھ ہٹا سکتا ہوں۔''

عورت نے جلدی جلدی اثبات میں سر ہلایا۔

''اگر آواز نکالے تو اس کی گردن جسم سے علیحدہ کر دینا۔'' میں نے احمد شاہ سے کہا اور اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا دیا۔ پھر میں گھوم کر اس کے سامنے آگیا۔ میں نے بنگلے میں داخل ہونے سے پہلے احتیاطاً اپنے چہرے پر مفلر لپیٹ لیا تھا۔ احمد شاہ کے چہرے پر بھی مفلر تھا، صرف اس کی آنکھیں نظر آرہی تھیں۔

وہ انتہائی حسین عورت تھی۔ اس کی عمر تقریباً چالیس، بیالیس سال ہوگی لیکن وہ اپنے متناسب جسم اور پرکشش چہرے سے تیس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔

''اگر تم لوگوں کو کیش یا زیورات چاہئیں تو تمہیں مایوسی ہوگی۔'' اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ اس کی آواز میں گھبراہٹ نمایاں تھی۔ ''میں گھر میں کیش نہیں رکھتی اور زیورات بھی بینک لاکر میں ہیں۔'' اس نے کہا۔

''وہ بریف کیس کہاں ہے جو وکیل نے تمہیں دیا ہے؟'' میں نے غرا کر پوچھا لیکن آواز دھیمی تھی۔

اس نے چونک کر مجھے دیکھا، پھر بولی۔ ''کون ہو تم؟''

''دیکھو! میں عورتوں پر ہاتھ اٹھانے کا قائل نہیں ہوں اس لیے تم سے جو کچھ پوچھ رہا ہوں اس کا جواب دو۔''

''تم کس بریف کیس کی بات کر رہے ہو؟'' اس نے ڈھٹائی سے کہا۔

''دیکھو، میرے پاس وقت بہت کم ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اگر تم نے فوراً جواب نہ دیا تو میرا ساتھی تمہارے ٹکڑے کر دے گا۔''

''تم کس بریف کیس کی بات کر رہے ہو؟'' وہ پھر بولی۔

میں نے اچانک اس کے لمبے اور گھنے بال اپنی مٹھی میں جکڑ لیے۔ ''مجھے مجبور مت کرو کہ میں تم پر ہاتھ اٹھاؤں۔''

''میں نہیں جانتی کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' اس نے پھر ڈھٹائی دکھائی۔

احمد شاہ نے میرے اشارے پر اس کی کنپٹی پر ہلکا سا ہاتھ مار دیا۔ وہ الٹ کر بستر پر گر گئی۔

''اس کے ہاتھ پیر باندھو۔'' میں نے احمد شاہ سے کہا۔ ''میں اس کی بیٹیوں کو دیکھتا ہوں۔''

میں تیزی سے کمرے سے باہر آگیا۔ اس تمام عمل میں مشکل سے تین منٹ لگے تھے۔ میں اس کے سامنے والے بیڈروم میں پہنچا تو وہ خالی تھا۔ سامنے والے دوسرے بیڈروم کا دروازہ اندر سے بند تھا۔

میں نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ دوسری دستک کے جواب میں اندر سے کسی لڑکی کی آواز سنائی دی۔

''کون ہے؟''

''دروازہ کھولو بیٹا!'' میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

دوسرے ہی لمحے دروازہ کھل گیا۔

میرے سامنے شب خوابی کے لباس میں ایک لڑکی کھڑی تھی۔ اس کی عمر بہ مشکل سولہ سترہ سال رہی ہوگی۔

وہ لڑکی اتنی معصوم تھی کہ مجھے ایک لمحے کو تو خود سے شرم محسوس ہوئی۔ اس نے چیخنے کے لیے منہ کھولا لیکن میں نے فوراً ہی اس کے منہ پر اپنا ہاتھ جما دیا۔ وہ مجھے پھٹی پھٹی آنکھوں سے گھورنے لگی۔ میں نے بائیں ہاتھ سے اس کی دونوں کنپٹیاں دبائیں۔ وہ چند لمحوں بعد میرے ہاتھوں میں جھول گئی۔

میں نے اسے آہستگی سے فرش پر لٹایا اور بیڈ کی طرف بڑھا۔

بیڈ پر اس سے بھی چھوٹی ایک معصوم صورت بچی سو رہی تھی۔ اس نے کسمسا کر کروٹ بدلی تو میں فوراً نیچے کی طرف جھک گیا۔

اچانک میری نظر بیڈ کے نیچے رکھے ہوئے ایک بنڈل پر پڑی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا چیز ہے اور بچیوں کے کمرے میں کیوں ہے؟

میں نے اپنا سیل فون نکالا اور اس کی ٹارچ روشن کر کے دیکھا تو مجھے ایک چادر میں کچھ لپٹا ہوا نظر آیا۔

اچانک میرے ذہن میں بجلی سی کوند گئی۔ چادر کا ایک سرا ہٹا ہوا تھا اور اس میں سے سیاہ رنگ کے بریف کیس کا ایک کونا جھانک رہا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے بیڈ سے باہر گھسیٹ لیا۔ میں نے اسے کھولنے کی کوشش کی لیکن مجھے ناکامی ہوئی۔

اس بریف کیس کے بارے میں زیادہ بہتر طور پر وہ

لڑکی ہی بتاسکتی تھی جسے میں نے بے ہوش کردیا تھا۔

میں نے اسے اٹھا کر بستر پر ڈالا اور اس کی چھوٹی بہن کی کنپٹیاں دبا کر بے ہوش کردیا۔ یہ داؤ میرے کورین کوچ نے مجھے سکھایا تھا۔

میں نے پانی کا جگ اٹھا کر بڑی بہن کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے۔ تھوڑی دیر میں وہ ہوش میں آگئی۔

اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اردگرد دیکھا، پھر مجھ پر نظر پڑتے ہی اس نے چیخنے کی کوشش کی۔ میں نے ایک مرتبہ پھر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ بری طرح مچلنے لگی۔

''ڈرو مت بیٹا!'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ''میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ مجھے تم سے ایک دو باتیں پوچھنا ہیں، پھر میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ اگر تم شور نہ کرنے کا وعدہ کرو تو میں اپنا ہاتھ ہٹاؤں؟'' میں نے کہا۔

لڑکی نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹادیا۔ وہ گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ میں نے پانی کا گلاس بھر کر اسے دیا، جسے وہ ایک ہی سانس میں پی گئی۔

''آ...... آپ...... کون ہیں اور......''

''میں تمہارا دشمن نہیں ہوں بیٹا!'' میں نے کہا۔ ''یہ بتاؤ، تمہارے ڈیڈی کہاں ہیں؟''

''پاپا!...... وہ تو دو دن پہلے شہر سے باہر گئے تھے۔'' اس نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

''گڈ گرل!'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''اچھا، یہ بتاؤ، یہ بریف کیس کس کا ہے؟'' میں نے اسے وہ بریف کیس دکھایا۔

''یہ...... بریف کیس تو مما نے مجھے دیا تھا کہ اسے اپنی الماری میں رکھ دو۔ میری الماری میں کپڑے اور دوسرا سامان بھرا ہوا تھا۔ میں نے سوچا کہ جب وقت ملے گا، الماری خالی کرکے اسے کپڑوں کے پیچھے رکھ دوں گی۔ مما نے کہا تھا کہ اسے چھپا کر رکھنا۔ میں نے اس وقت تو اسے چادر میں لپیٹ کر بیڈ کے نیچے رکھ دیا تھا۔''

''یہ بریف کیس تمہارے پاپا کا تو نہیں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''پاپا کا بریف کیس ان کے پاس ہے، دوسرا بریف کیس براؤن کلر کا ہے۔ وہ ان کے بیڈ روم میں ہے۔ یہ...... بریف کیس......'' وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ''یہ تو سرور انکل لائے تھے۔ میں اس وقت باہر لاؤنج میں اپنی دوست سے فون پر بات کررہی تھی۔''

''ویری گڈ!'' میں نے کہا ''تم آرام سے سو جاؤ۔ کمرے سے باہر مت نکلنا بیٹا! باہر خطرہ ہے۔'' یہ کہتے ہوئے میں نے اچانک اس کی کنپٹیاں پکڑ لیں۔

لڑکی نے سہمے ہوئے انداز میں مجھے دیکھا، پھر وہ بے ہوش ہو کر بستر پر گر گئی۔ میں نے اسے لحاف اوڑھایا اور دروازہ بند کرکے باہر نکل آیا۔

احمد شاہ بے تابی سے کمرے کے باہر ٹہل رہا تھا۔

''احمد شاہ!'' میں نے کہا۔ ''اس بریف کیس کو کھولو...... بلکہ اس کا لاک توڑ دو۔ ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔''

وہ خاصا دبیز اور بھاری بھرکم بریف کیس تھا۔ احمد شاہ نے وہی خنجر نکالا اور لمحوں میں اسے کھول دیا۔ بریف کیس میں بہت سی، سی ڈیز اور ڈی وی ڈیز بھری ہوئی تھیں۔ دو چار فائلیں بھی تھیں۔

مارے خوشی کے میرا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ گویا یہ وہی بریف کیس تھا جس کی ہمیں تلاش تھی۔

''آفتاب کے بیڈ روم میں مزید بریف کیس بھی ہوں گے۔ میں انہیں بھی چیک کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''وہاں تین بریف کیس تھے سر!'' احمد شاہ نے کہا۔

''ان تینوں کے کاغذات اور تمام چیزوں کو میں ایک شاپر میں ڈال کر لے آیا ہوں۔'' اس نے مجھے ایک بڑا سا شاپر دکھایا۔

''یہ شاپر بھی مجھے آفتاب خان کی الماری ہی سے ملا ہے۔''

''گڈ!'' میں نے کہا۔

''سر! وہ عورت جھوٹ بول رہی تھی کہ میرے پاس کیش نہیں ہے۔ اس کی الماری میں کم سے کم چار لاکھ روپے اور لاکھوں کی مالیت کے زیورات ہوں گے۔''

''بس اب یہاں سے نکل چلو۔'' میں نے کہا۔ ''ہمارا کام پورا ہوگیا ہے۔'' میں نے بریف کیس احمد شاہ کے حوالے کردیا۔

ہم لاؤنج میں پہنچے تو غنی بے تابی سے ٹہل رہا تھا۔

ہم لوگ تیزی سے گیٹ کی طرف بڑھے۔ غنی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور ہم لوگ تیز رفتاری سے روانہ ہوگئے۔

''کیا رہا فیکے پتر؟'' راجا نے پوچھا۔

''بریف کیس مل گیا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے آفتاب خان کی بیٹی سے تصدیق بھی کرلی ہے۔ یہ وہی بریف کیس ہے جو وکیل دے کر گیا ہے۔''

ہم گھر پہنچے تو رات کے بلکہ صبح کے ساڑھے تین بج رہے تھے۔ ہم لوگوں نے آفتاب کے بنگلے میں اپنا کوئی سراغ نہیں چھوڑا تھا، سوائے اس رسی کے جو احمد شاہ نے بنگلے

میں داخل ہونے کے لیے استعمال کی تھی۔

''فیکے پتر!'' راجا نے کہا۔ ''ان ڈی وی ڈیز کو چیک تو کرلے۔''

''پہلے میں شاور لے لوں۔'' میں نے کہا۔ ''تو اس وقت تک غنی سے ذرا بہترین قسم کی کافی بنوالے۔''

''غنی سے کیوں؟'' راجا نے کہا۔ ''وہ آپ کی بیگم نمبر...... میرا مطلب ہے کہ نیلم جاگ رہی ہے۔''

''تو پھر اسی سے بنوالے۔'' میں یہ کہہ کر باتھ روم میں گھس گیا۔

☆☆☆

بھاپ اگلتی کافی کے دو مگ کے بعد مجھ میں ایک نئی توانائی دوڑ گئی۔ راجا نے ڈی وی ڈی پلیئر ٹی وی میں لگا دیا تھا۔ یہ ٹی وی، ڈی وی ڈی پلیئر، ڈیپ فریزر، فریج، مائیکروویو اوون اور اسی قسم کے دوسرے الیکٹرانک آئٹم اس بنگلے کے ساتھ ہی ملے تھے۔

راجا نے ڈی وی ڈی پلیئر آن کیا تو نیلم وہیں موجود تھی۔ وہ غالباً کافی کے خالی مگ اٹھانے آئی تھی اور تجسس میں وہیں رک گئی تھی۔

اچانک مجھے اس کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے نیلم سے کہا۔ ''اب تم جا کر سو جاؤ۔''

''جی صاحب جی!'' وہ جلدی سے بولی اور کپ اٹھا کر باہر نکل گئی۔

ڈی وی ڈی چلنا شروع ہوئی لیکن وہ کسی علاقے کی ڈاکومینٹری تھی۔

راجا نے دوسری ڈی وی ڈی لگائی، وہ بھی نیشنل جیوگرافک چینل سے ریکارڈ کی گئی تھی۔

پھر اس کے بعد دیگرے تمام ڈی وی ڈیز چلائیں لیکن ان میں سے کام کی ایک بھی نہیں تھی۔ کسی میں ہندی فلموں کے گانے تھے۔ کسی میں صدرِ مملکت کی تقریر تھی، ٹی وی کے ڈرامے تھے، ہندی فلمیں تھیں اور ڈاکومینٹریز تھیں۔

میں بپھر کر کھڑا ہوگیا۔ ''اس الو کی پٹھی نے مجھے بے وقوف بنایا ہے۔'' میں نے دانت پیس کر کہا۔

''کس الو کی پٹھی کی بات کررہا ہے فیکے پتر؟'' راجا نے کہا۔ ''تو ہمیشہ کسی الو کی پٹھی ہی کے ہاتھوں بے وقوف بنتا ہے۔'' اس کے لہجے میں طنز تھا۔

''میں آفتاب خان کی بیوی کے بارے میں کہہ رہا ہوں۔'' میں نے دانت پیس کر کہا۔

''اس نے کب کہا تھا کہ اس بریف کیس میں وہ اسٹف ہے جس کی تجھے تلاش ہے؟'' راجا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تو ایک گلاس ٹھنڈا پانی پی بلکہ سر پر ڈال اور پھر ٹھنڈا ہو کر سوچ۔ اس میں کس کا قصور ہے؟''

میں نے اس کی بات پر ٹھنڈے دل سے غور کیا تو مجھے احساس ہوا کہ اس میں قصور میرا ہی ہے۔ آفتاب خان کی بیوی نے کب کہا تھا کہ اس بریف کیس میں وہی ڈی وی ڈیز ہیں۔ اس کی بیٹی نے بھی ایسی کوئی بات نہیں کی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وکیل ہی نے اصل بریف کیس وہاں نہیں پہنچایا تھا۔

نور کو اغوا ہوئے آج پانچ دن ہوگئے تھے اور میں ابھی تک آفتاب خان اور وکیل کے چکر میں الجھا ہوا تھا۔ اب آفتاب خان کو قید رکھنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ بریف کیس تو فی الحال میرے ہاتھ لگا نہیں تھا لیکن وہ مجھے مل بھی جاتا تو کیا ہوتا؟ اس میں شاہ جی کے خلاف ثبوت تھے۔ وہ بریف کیس یقیناً وکیل کے پاس تھا اور وہ زیادہ دیر تو چھپا رہ نہیں سکتا تھا۔ وہ شہر کا خاصا نامور وکیل تھا۔ اس بریف کیس اور آفتاب خان کے چکر میں اپنا کیریئر تو داؤ پر نہیں لگا سکتا تھا۔ مجھے فوری طور پر نور کو تلاش کرنا تھا۔ اسے اغوا کرنے والوں نے اب تک مجھ سے کوئی مطالبہ کیا تھا اور نہ ہی رابطہ کیا تھا۔

میں نے گھڑی دیکھی، صبح ہونے والی تھی، میں نے احمد شاہ کو بلایا اور اس سے کہا۔ ''آفتاب خان کو بے ہوش کرکے کسی دور دراز کے علاقے میں ڈال آؤ۔''

''یس سر!'' احمد شاہ نے کہا۔

''اب تو کیا اس قدوائی کو اٹھوائے گا؟'' راجا نے پوچھا۔

''جہنم میں گیا قدوائی۔'' میں نے جھنجلا کر کہا۔ ''مجھے فوری طور پر نور کا سراغ لگانا ہے۔ اسے کن لوگوں نے اغوا کیا ہے؟''

اچانک مجھے شاکر کا خیال آیا۔ وہ ان لوگوں کے بارے میں ضرور کچھ نہ کچھ جانتا ہوگا۔ اس نے اس وقت بھی ان لوگوں کو پہچان لیا تھا جب ہم اس ریسٹورنٹ میں کھانا کھا رہے تھے۔

''یار فیکے!'' راجا نے کہا۔ ''اس وقت تو اپنے دماغ پر بالکل زور مت ڈال اور کچھ دیر کے لیے سو جا۔ صبح دیکھیں گے کہ اس سلسلے میں کیا ہوسکتا ہے؟''

رات بھر کی بھاگ دوڑ اور ڈی وی ڈیز دیکھنے کی ذہنی اذیت نے مجھے واقعی نڈھال کر دیا تھا۔ میرا ذہن ماؤف ہوکر رہ گیا تھا۔ میں نے ایک ساتھ ویلیم ٹین کی دو گولیاں پانی سے نگل لیں اور خالی الذہنی کے عالم میں بیڈ پر ڈھیر ہوگیا۔ کچھ ہی دیر بعد میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگیا۔

☆☆☆

میری آنکھ کھلی تو دیوار گیر گھڑی سات بجا رہی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی کہ ویلیم ٹین کی دو گولیاں کھانے کے باوجود میں دو گھنٹے سے زیادہ نہیں سو پایا تھا لیکن مجھے تھکن بالکل بھی نہیں تھی۔ میں اٹھ کر باتھ روم میں چلا گیا۔ تھوڑی بہت جو کسل مندی تھی وہ گرم پانی سے نہانے کے بعد دور ہوگئی اور میں بالکل ہلکا پھلکا ہوگیا۔

میں باتھ روم سے باہر نکلا تو راجا میری راکنگ چیئر پر بیٹھا جھول رہا تھا۔

''نواب صاحب خواب خرگوش بلکہ خواب غر سے بیدار ہو گئے؟'' اس نے ہنس کر پوچھا۔

''ہیں خواب میں ہنوز کہ جاگے ہیں خواب سے!'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''یار مہاراجا! میں دو گھنٹے کی نیند سے اتنا ہشاش بشاش ہوگیا؟''

''دو گھنٹے؟'' راجا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''قبلہ نواب صاحب! آپ تو اب زمان و مکان سے بھی بے بہرہ ہو گئے۔ حضور! آپ پورے پندرہ گھنٹے بعد اس خواب غفلت سے بیدار ہوئے ہیں۔''

اس کا مطلب ہے کہ اس وقت شام کے سات بج رہے ہیں؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''ساڑھے رت!'' راجا نے کہا۔

''اسی لیے میں سوچ رہا تھا کہ مجھے اتنی بھوک کیوں لگ رہی ہے؟'' میں نے کہا۔

''سوچیے مت بلکہ اب ڈنر تناول فرما لیجیے۔ آیئے تشریف لایئے، کھانا لگا دیا گیا ہے۔''

کھانے کی میز پر واقعی کھانا موجود تھا۔ میں راجا کی طنزیہ باتوں کو نظرانداز کر کے کھانے پر ٹوٹ پڑا۔

کھانے کے بعد نیلم کافی لے آئی، میں نے کافی پیتے ہوئے احمد شاہ کو بلایا اور اس سے آفتاب خان کے بارے میں پوچھا۔

''آفتاب خان کو شیخوپورہ کے ایک علاقے میں ڈال کر آیا ہوں سر!'' احمد شاہ نے کہا۔

''گڈ!'' میں نے کہا۔ پھر میں نے جیب سے سیل فون نکالا۔ میرا ارادہ تھا کہ شاکر کو فون کر کے کہیں ملنے کا وقت طے کرلوں۔ فی الحال لاہور کا یہ ٹھکانا میں اسے بھی نہیں دکھانا چاہتا تھا۔

اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے اسکرین پر نظر ڈالی۔ وہ کوئی اجنبی نمبر تھا۔ دو تین گھنٹیوں کے بعد میں نے کال ریسیو کرلی۔ ''ہیلو!''

''نواب رفیق شیرازی صاحب بول رہے ہیں؟'' دوسری طرف سے کسی نے بہت مہذب انداز میں پوچھا۔ مجھے اس کے لہجے میں طنز سا محسوس ہوا۔

''جی فرمایئے، کون صاحب بول رہے ہیں؟''

''نواب صاحب! آپ کی ایک امانت ہے ہمارے پاس!'' دوسری طرف سے آواز آئی۔

''کون صاحب بول رہے ہیں۔'' میں نے جھنجلا کر کہا۔ ''اپنا تعارف تو کرایئے۔''

''اجی چھوڑیے، ان رسمی باتوں میں کیا رکھا ہے۔'' دوسری طرف سے گویا چڑانے والے انداز میں کہا گیا۔ ''آپ کو تو اپنی امانت سے غرض ہونا چاہیے۔''

''کیسی امانت؟'' میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ نور کے بارے میں بات کرنے والا ہے۔

''آپ اتنی جلدی بھول گئے؟'' دوسری طرف سے طنز کیا گیا۔ ''ویسے ہم نے سنا تو تھا کہ آپ اپنی محبوبائیں بدل دیتے ہیں لیکن ......''

''آپ صاف صاف بات نہیں کر سکتے؟'' میں نے جھنجلا کر کہا۔

''چلیے، پھر صاف لفظوں ہی میں سن لیجیے۔'' اس نے کہا۔ ''آپ کی محبوبۂ دوراں یعنی مس ماہ نور، اس وقت ہماری مہمان ہیں۔''

''تم ہو کون؟'' میں نے جھنجلا کر کہا ''اور نور کو تم نے کیوں اغوا کیا ہے؟''

''نواب صاحب!'' دوسری طرف سے سرد آواز ابھری۔ ''میں آپ سے انتہائی شائستگی سے گفتگو کر رہا ہوں اور آپ جواب میں انتہائی غیر شائستہ زبان استعمال فرما رہے ہیں۔''

''جناب شائستہ صاحب! آپ نے نور کو کیوں قید کر رکھا ہے۔ یہ کہاں کی شائستگی ہے؟'' میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''میں نے عرض کیا نا، کہ محترمہ ماہ نور ہماری مہمان ہیں۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ مجھے چڑا رہا ہو۔

''اور آپ چاہتے کیا ہیں، اب یہ بھی فرما دیں۔'' میں نے تلملا کر کہا۔

''ابھی تو آپ کو صرف یہ اطلاع دینا مقصود تھا۔'' اس نے کہا۔ ''باقی باتیں بعد میں ہوں گی اور ہاں، اب اس نمبر پر کال کرنے کی زحمت مت کیجیے گا کیونکہ اب اس نمبر سے آپ کو کبھی جواب نہیں ملے گا۔''

''تو آخر ہے کون؟'' میں نے بھنا کر کہا۔ ''اور تو کیا سمجھتا ہے کہ میں تجھ تک پہنچ نہیں سکتا؟ میں ......'' اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں خود ہی بکواس کر رہا ہوں۔ دوسری طرف سے سلسلہ منقطع ہو چکا ہے۔

''کون تھا فیکے پتر؟'' راجا نے پوچھا۔ ''وہ نور کے بارے میں کیا کہہ رہا تھا اور تو اتنا غصے میں کیوں ہے؟''

میں نے اسے ٹیلی فون کال کے بارے میں بتایا۔

''یہ رانا زوہیب اور دلاور اینڈ کمپنی ہی کی حرکت معلوم ہوتی ہے فیکے!'' راجا نے کہا۔

''مجھے بھی یقین ہے کہ نور کے اغوا میں رانا اور دلاور کا ہاتھ ہے۔'' میں نے کہا ''لیکن اس مبہم سی ... فون کال کا کیا مطلب ہوسکتا ہے؟''

''تجھے نفسیاتی طور پر توڑنا۔'' راجا نے کہا۔

''تو شاکر سے بات کیوں نہیں کرتا؟'' راجا نے کہا۔ ''وہ بھی ان ہی کے قبیلے کا آدمی ہے۔ وہ واقعی اگر تیرے ساتھ مخلص ہے تو اس سلسلے میں تیرے بہت کام آسکتا ہے۔''

''میں اسی کو فون کر رہا تھا کہ یہ کال آگئی۔'' میں نے کہا اور شاکر کا نمبر تلاش کرنے لگا۔

''میں اسے یہاں تو نہیں بلاؤں گا۔'' میں نے کہا۔

''تو اسے ست بدھائی بلا لے۔'' راجا نے کہا۔ ''ہم لوگ بھی ست بدھائی روانہ ہوجاتے ہیں۔ یوں بھی اب لاہور میں کوئی خاص کام تو ہے نہیں۔''

میں نے شاکر کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی لیکن شاکر نے کال وصول نہیں کی۔

میں جھنجلا کر سلسلہ منقطع کرنے ہی والا تھا کہ مجھے شاکر کی آواز سنائی دی۔ ''السلام علیکم نواب صاحب!''

''وعلیکم السلام!'' میں نے کہا۔ ''تم اس وقت کہاں ہو شاکر؟''

''خیریت تو ہے نواب صاحب!'' شاکر سنجیدہ ہوگیا۔

''ہاں، خیریت ہے بھی اور نہیں بھی۔'' میں نے کہا۔ ''کیا تم مجھ سے آج مل سکتے ہو؟''

''کیا آپ لاہور ہی میں ہیں؟'' شاکر نے پوچھا۔

''میں لاہور میں تھا لیکن اب ست بدھائی جا رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''میرے لیے آج ست بدھائی پہنچنا تو مشکل ہے۔ ہاں، میں کل دوپہر تک حاضر ہوسکتا ہوں۔ ویسے کوئی ایمرجنسی ہے تو میں آج بھی آسکتا ہوں۔''

''ایمرجنسی تو ہے لیکن تم کل تک ست بدھائی آجاؤ۔''

''ٹھیک ہے نواب صاحب! میں کل بارہ، ساڑھے بارہ بجے تک ست بدھائی پہنچ جاؤں گا۔''

''میں تمہارا انتظار کروں گا، اوکے، اللہ حافظ!'' میں نے کہا۔ پھر میں نے غنی کو بلا کر کہا۔ ''ہم ابھی ست بدھائی کے لیے نکل رہے ہیں۔''

غنی نے اثبات میں سر ہلایا اور چلا گیا۔

اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی پھر بجنے لگی۔ میں نے سیل فون جیب سے نکالا۔ میرا خیال تھا کہ یہ کال اسی ''شائستہ خان'' کی ہوگی لیکن اسکرین پر ناصر کا نام تھا۔

میں نے بٹن دبا کر سیل فون کان سے لگا لیا۔ ''ہیلو ناصر! کیسے ہو؟''

''میں بخیریت ہوں نواب صاحب! مجھے معلوم ہوا تھا کہ آپ لاہور میں ہیں؟''

''ہاں، بس ابھی تھوڑی دیر بعد ست بدھائی کے لیے نکلنے ہی والے ہیں۔''

''ابھی کچھ دیر ٹھہر جائیں، میں آپ کے پاس آرہا ہوں۔ مجھے اپنا پتا بتایئے۔''

میں نے اسے پتا بتایا اور ناصر کا انتظار کرنے لگا۔ وہ شاید کہیں قریب ہی تھا، اس لیے دس منٹ کے اندر اندر وہاں پہنچ گیا۔

''میڈم! نور کی کوئی اطلاع؟'' اس نے پوچھا۔

''ابھی تک مجھے صرف ایک فون کال موصول ہوئی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس شخص نے صرف مجھے یہ اطلاع دی کہ نور اس کے قبضے میں ہے۔'' پھر میں نے چونک کر پوچھا۔ ''تم لاہور کب آئے؟''

''میں دوپہر کے وقت اپنے ایک ذاتی کام سے لاہور آیا تھا۔ یہاں پہنچ کر مجھے اطلاع ملی کہ شاہ جی کا سب سے

قریبی ساتھی پریس کلب میں پریس کانفرنس کرنے والا ہے۔''

''کون قریبی ساتھی، آفتاب خان؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، وہی شاہ جی کا دایاں ہاتھ تھا۔ اس نے پریس کانفرنس میں سب سے پہلے تو یہ اعلان کیا کہ میں مسکین شاہ کی پارٹی سے مستعفی ہو رہا ہوں۔ آج کے بعد میرا اس پارٹی سے کوئی تعلق نہیں ہوگا پھر اس نے شاہ جی پر اتنے گھٹیا الزامات لگائے کہ میں حیران رہ گیا۔ میں ہی کیا پوری صحافی برادری حیران تھی۔ جواب میں صحافیوں نے آفتاب خان سے ایسے ایسے چبھتے ہوئے سوالات کیے کہ وہ تلملا کر رہ گیا۔ اس نے اعلان کیا کہ وہ جلد ہی اس بگلا بھگت شاہ جی کے خلاف میڈیا کو ایسے ثبوت فراہم کرے گا کہ اس کے چہرے سے شرافت کا نقاب اتر جائے گا۔''

''مسٹر آفتاب! میں نے کہا۔'' آپ جانتے ہیں کہ آپ پارلیمنٹ کے ایک معزز اور نیک نام رکن پر اتنے رکیک الزامات لگا رہے ہیں۔ اگر آپ ثبوت فراہم نہ کر سکے آ خود آپ کی پوزیشن کیا ہوگی؟''

''شاہ جی مجھ پر ہتک عزت کا دعویٰ کر دے۔ عدالت، کے دروازے تو سب کے لیے کھلے ہیں لیکن وہ کبھی ایسا کرے گا نہیں۔'' آفتاب خان نے جواب دیا۔

''نواب صاحب! ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ آفتاب خان جو کل تک محض ایک ٹرک ڈرائیور تھا، جو شاہ جی کی وجہ سے آج اس مقام پر پہنچا ہے، وہ یکا یک اس کے خلاف کیسے ہو گیا؟''

میں نے جواب میں اسے آفتاب خان کے اغوا سے لے کر اس کی رہائی تک سب کچھ تفصیل سے بتا دیا۔

''اچھا...... اچھا...... اسی لیے وہ کہہ رہا تھا کہ شاہ جی کے بدمعاشوں نے اسے اغوا کرنے کے بعد حبس بے جا میں رکھا، اس کے گھر میں غیر قانونی طور داخل ہوئے اور اس کی بیوی سے بدسلوکی کی۔ ان لوگوں کو ان شواہد کی تلاش تھی جو میں نے شاہ جی کے خلاف اکٹھے کر رکھے ہیں۔ ان بدمعاشوں نے مایوس ہو کر مجھے خود ہی چھوڑ دیا۔''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ ہماری محنت رائگاں نہیں گئی۔'' راجا نے کہا۔

میں نے ناصر کو شاکر کے بارے میں بتایا تو اس نے کہا۔ ''محض اس کے لیے آپ ست بدھائی جا رہے ہیں۔ اس سے تو آپ یہیں ملاقات کر سکتے ہیں۔ آپ اگر اسے یہاں نہیں بلانا چاہتے تو گلبرگ بلا لیں۔ وہاں میرا ایک صحافی دوست رہتا ہے۔''

میں نے شاکر کو فون کر کے بتایا کہ مجھے ایک ضروری کام سے دوبارہ لاہور آنا پڑے گا۔ تم کل شام کو چار بجے مجھ سے گلبرگ میں مل لو، میں وہاں اپنے ایک دوست کے گھر میں قیام کروں گا۔'' میں نے اسے ناصر کا بتایا ہوا پتا بھی بتا دیا۔

میں نے ناصر سے پوچھا۔ ''جمال خان شیروانی کی کوئی خیر خبر ہے؟''

''ان سے پرسوں میری سرسری سی ملاقات ہوئی تھی۔'' ناصر نے کہا۔ ''ابھی تک شاہ جی کی طرف سے انہیں کوئی دھمکی نہیں ملی ہے۔''

☆☆☆

ہم اس وقت ناصر کے دوست درانی کے بنگلے میں بیٹھے شاکر کا انتظار کر رہے تھے۔ درانی خود کسی ضروری کام سے چلا گیا تھا۔

ٹھیک چار بجے شاکر وہاں پہنچ گیا۔

رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد اس نے کہا۔ ''یہ بہت اچھا ہوا کہ آپ سے لاہور میں ملاقات ہو گئی۔ میں آج کل ایک ضروری کام میں پھنسا ہوا ہوں۔'' پھر وہ ہنس کر بولا۔ ''آپ فرمائیے، کیسے زحمت کی؟''

''شاکر، تم ان لوگوں کو پہچانتے ہو جو اس دن ریسٹورنٹ میں بھی موجود تھے؟ تم نے مجھے خطرے سے آگاہ بھی کیا تھا۔''

شاکر چند لمحے تک سوچتا رہا، پھر بولا۔ ''میں یہ بات آپ کو اسی دن بتا دیتا لیکن مجھے خود بھی پوری طرح علم نہیں تھا۔ میں نے بعد میں اپنے طور پر معلومات کی تو علم ہوا کہ وہ اکبر سندھو کے آدمی تھے۔''

''اکبر سندھو!'' میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''یہ کون ہے اور اسے مجھ سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟''

''انڈر ورلڈ کا ایک مضبوط آدمی ہے۔ اسے آپ کرائے کا غنڈا سمجھ سکتے ہیں۔ آپ سے دشمنی کی ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے، کسی نے اس کی خدمات حاصل کی ہیں۔''

''مطلب یہ کہ وہ دلاور بھی ہو سکتا ہے اور رانا بھی؟'' میں نے کہا۔

''فی الحال تو آپ کے دشمن وہی ہیں۔'' شاکر نے کہا۔ ''یہ بھی ممکن ہے کہ اس نے میڈم نور کو تاوان کے لیے اغوا کیا ہو اور وہ آپ سے بھاری رقم کا مطالبہ کرے۔ وہ جانتا ہوگا کہ آپ اس کا مطالبہ پورا کر سکتے ہیں۔''

''یہ اکبر سندھو کہاں ملے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''اس کے کئی ٹھکانے ہیں۔'' شاکر نے کہا۔ ''لیکن آپ پریشان نہ ہوں۔ میں ابھی آدھے گھنٹے کے اندر اندر اس کے تمام ٹھکانے معلوم کر لیتا ہوں۔'' اس نے جیب سے سیل فون نکالا اور کسی کا نمبر پنچ کرنے لگا۔

میرے سیل فون کی بیل بجنے لگی۔ میں نے اسکرین پر نظر ڈالی۔ جہاں کوئی اجنبی نمبر تھا۔ میں نے چند لمحے توقف کیا، پھر کال ریسیو کر لی۔ ''ہیلو!'' میں نے کہا۔

''نواب صاحب! کیسے ہیں آپ؟''

''کون صاحب بول رہے ہیں؟'' میں اس کی آواز پہچان گیا تھا۔ یہ اسی کا فون تھا جس نے مجھے نور کے بارے میں بتایا تھا۔

''حیرت کی بات ہے۔ آپ میری آواز نہیں پہچان رہے ہیں؟''

''جناب! نفسا نفسی کے اس دور میں بعض اوقات بھائی، بھائی کو اور باپ بیٹے کو پہچاننے سے انکار کر دیتا ہے۔ آپ آواز کی بات کر رہے ہیں، یہاں تو لوگ خون کے رشتے بھی بھلا دیتے ہیں۔''

''نواب صاحب! آپ مذاق اچھا کر لیتے ہیں۔'' اس نے ہنس کر کہا۔

''آپ کو میری باتیں مذاق لگ رہی ہیں؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''بہرحال، آپ اپنا نام تو بتائیے؟''

''میں آپ کا خدمت گزار بول رہا ہوں، آپ کی جانِ جاناں ہماری مہمان ہیں۔''

''تو بھائی کریں مہمان نوازی!'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''یہ بات مجھے بار بار کیوں بتا رہے ہیں؟''

''جی میں...... وہ...... آپ......'' وہ جواب دیتے ہوئے کچھ بوکھلا سا گیا۔ ''یعنی آپ کو ان خاتون کی کوئی فکر ہی نہیں ہے؟''

''بھئی، جب آپ جیسا مہذب اور شائستہ میزبان ہو تو مجھے فکر کیوں ہوگی؟''

''آپ...... کو......''

''ایک تو بات کرتے ہوئے آپ ہکلاتے بہت ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''میری طرف سے جب تک دل چاہے، آپ ان موصوفہ کو مہمان بنا کر رکھیں۔''

''نواب صاحب! آپ شاید میری بات کو مذاق سمجھ رہے تھے۔ وہ خاتون میری مہمان ضرور ہیں لیکن میرے باس میری طرح رحم دل نہیں ہیں۔''

''مطلب کی بات کر لیں۔'' میں نے لہجے کو حتی الامکان نارمل رکھنے کی کوشش کی۔

''باس کے کچھ مطالبات ہیں۔'' اس نے یوں کہا جیسے اسے یہ جملہ ادا کرتے ہوئے بہت شرمندگی ہو رہی ہو۔

''پھر اپنے باس سے کہیں کہ وہ خود مجھ سے بات کریں۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''اور آپ کے باس ہیں کون؟''

''آپ کچھ توقف فرمائیں۔'' اس نستعلیق شخص نے کہا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ مجھے چڑا رہا ہو۔

تھوڑی دیر بعد دوسری طرف سے ایک بھاری اور کرخت آواز سنائی دی۔ ''نواب رفیق! تمہاری ہونے والی بیگم میرے قبضے میں ہیں۔''

میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''مطلب کی بات کرو۔''

''پہلے تو میں تمہیں یہ بتا دوں کہ اگر تم مجھے باتوں میں لگا کر یہ چاہتے ہو کہ میرا نمبر ٹریس کر سکو گے تو یہ تمہاری بھول ہوگی۔ اپنا وقت اور توانائی ضائع مت کرو۔'' اس نے اکھڑ لہجے میں کہا۔

''یار! مجھے کوئی ضرورت نہیں ہے اپنا وقت ضائع کرنے کی، تم بتاؤ، کیا چاہتے ہو؟''

''میں کیا چاہتا ہوں یہ بھی تمہیں جلد ہی معلوم ہو جائے گا۔'' یہ کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کال کا کیا مقصد تھا؟ کیا وہ لوگ مجھے ذہنی طور پر مزید ڈسٹرب کرنا چاہتے تھے؟

راجا بہت غور سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ ''کیا ہوا فیکے! کس کا فون تھا؟''

''یار، وہ نور کے بارے میں بات کر رہا تھا۔'' میں نے کہا۔

''اتنا تو میں بھی سمجھ گیا ہوں لیکن وہ ہے کون؟''

''اس نے اپنا نام نہیں بتایا۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''فضول بک بک کے بعد سلسلہ منقطع کر دیا۔ میرا خیال ہے کہ نور سرے سے ان لوگوں کے قبضے میں ہے ہی نہیں۔''

''ممکن ہے وہ لوگ تجھے ذہنی طور پر منتشر کرنے کے لیے ایسا کر رہے ہوں۔'' راجا نے کہا۔ ''اب اگر ان کی کال آئے تو ان سے کہنا کہ نور سے میری بات کراؤ۔''

شاکر مختلف جگہ فون کرنے کے بعد مجھ سے بولا۔ ''نواب صاحب! ابھی ایک شخص سے میری بات ہوئی ہے۔ وہ کچھ دن پہلے تک اکبر سندھو کے ساتھ کام کرتا تھا...... اب ان میں کچھ اختلافات ہو گئے ہیں۔''

''تم اس سے معلومات حاصل کرو۔ اکبر سندھو کے بارے میں وہ بہت کچھ جانتا ہوگا۔'' ناصر نے کہا۔

''میں نے آج اسے اپنے ایک ٹھکانے پر بلایا ہے۔'' پھر وہ چونک کر بولا۔ ''آپ ابھی لاہور میں رکیں گے یا ست بدھائی چلے جائیں گے؟''

''تم معلومات کرو۔ میں کہیں بھی ہوا، تم سے سیل فون پر رابطہ کرلوں گا۔ ویسے آج رات میں تو لاہور ہی میں گزاروں گا۔'' میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے، پھر میں آپ سے رابطہ کرلوں گا۔''

اچانک ناصر نے کہا۔ ''یار شاکر! تم یہ چھوٹے موٹے کام ہی کرتے ہو یا کوئی بڑا کام بھی کرتے ہو؟''

شاکر نے ناگواری سے اسے دیکھا۔ ''ناصر صاحب! میں جو کچھ کرتا ہوں، اس کا علم آپ کو بھی ضرور ہوگا۔ یہ کام تو میں محض نواب صاحب کی خاطر کررہا ہوں۔''

''یہ کام تو کوئی بھی کرلے گا۔'' ناصر نے کہا۔ ''تم سے اگر کوئی بڑا کام کہا جائے تو تم کرلو گے؟''

''آپ حکم کریں، کام کیسا ہی ہو، میں کبھی انکار نہیں کرتا۔ سوائے دو کاموں کے۔'' شاکر نے کہا۔ ''میں لڑکیوں کا اغوا اور بردہ فروشی نہیں کرتا، چاہے کوئی مجھے کتنا ہی معاوضہ کیوں نہ دے۔''

''ہمیں بھی ایسے گھٹیا کاموں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' ناصر نے کہا۔

''تو پھر کیا چاہتے ہیں آپ؟'' شاکر نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''رانا زوہیب کو اٹھالاؤ۔'' ناصر نے اچانک گویا دھماکا سا کردیا۔

''رانا زوہیب کو!...... آپ کا مطلب ہے کہ......''

''ہاں، میرا یہی مطلب ہے۔'' ناصر نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''کرسکو گے یہ کام؟''

''رانا زوہیب کوئی بھیڑ کا بچہ نہیں ہے کہ کوئی بھی جائے اور اسے کان سے پکڑ کر لے آئے۔'' شاکر نے کہا۔

''بقول تمہارے، تم ہر قسم کا کام کرتے ہو؟'' ناصر نے کہا۔ ''پھر کیا مسئلہ ہے؟''

''میں تو یہاں نواب صاحب کی مدد کرنے آیا تھا۔'' شاکر نے کہا۔ ''کوئی ڈیل کرنے نہیں آیا تھا۔''

''یہ بھی تو نواب صاحب کی مدد ہی ہوگی۔'' ناصر نے کہا۔ ''اس وقت نواب صاحب کا سب سے بڑا دشمن وہی ہے۔ وہی یہ بھی بتاسکے گا کہ میڈم نور کہاں ہیں۔''

''لیکن اسے اغوا کرنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔'' شاکر نے کہا۔

''اسی لیے تو میں تم سے کہہ رہا ہوں ورنہ تو کسی بھی چھوٹے موٹے بدمعاش سے یہ کام لیا جاسکتا تھا۔ یوں بھی تم نے کھلے عام دلاور کی مخالفت شروع کردی ہے۔''

شاکر نے میری طرف دیکھا۔ ''نواب صاحب! کیا آپ بھی یہی چاہتے ہیں؟ اگر آپ کہیں تو میں دلاور کو ختم کر دوں؟''

''چاہتا تو میں بھی یہی ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن رانا مجھے زندہ چاہیے۔ ویسے اگر یہ کام تمہیں مشکل لگ رہا ہے تو رہنے دو۔ ہم کوئی اور بندوبست کرلیں گے۔''

''نواب صاحب! آپ کو شاید میری قوت کا اندازہ نہیں ہے۔''

''مجھے اندازہ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اسی لیے تو میں تم سے بات کررہا ہوں۔ اخراجات کی فکر مت کرنا۔''

''اخراجات کا نام لے کر مجھے گالی مت دیں نواب صاحب!'' شاکر نے کہا۔ ''اس سلسلے میں جتنے بھی اخراجات ہوں گے، میں خود کروں گا۔'' پھر وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ''اگر رانا زوہیب پاکستان میں ہے تو آپ کا کام بہت جلد ہوجائے گا۔'' اس نے ہم سب سے ہاتھ ملایا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے ناصر سے پوچھا۔ ''تمہیں اچانک کیا سوجھی؟''

''نواب صاحب!'' ناصر نے کہا۔ ''مجھے شروع سے اس شخص پر نہ جانے کیوں اعتبار نہیں ہے۔ وہ صرف دلاور کی مخالفت میں آپ کی حمایت کررہا ہے۔ جس دن اس نے دلاور کا پتا صاف کردیا، اسی دن یہ آپ سے لاتعلق ہوجائے گا۔''

''بغض وعناد ہی میں سہی، وہ ہماری مدد تو کررہا ہے۔'' راجا نے کہا۔

''یہ ہماری مدد نہیں کررہا ہے بلکہ نواب صاحب کے کندھے پر رکھ کر بندوق چلانا چاہتا ہے۔'' ناصر نے منہ بنا کر کہا۔

''ہائیں!'' راجا نے کہا۔ ''تم بھی بامحاورہ اردو بولنے لگے۔ شکر ہے کہ فیکے کی صحبت میں رہ کر تم نے شعروشاعری شروع نہیں کی۔''

''بھلا کہاں اب ایسے پراگندہ طبع لوگ، افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی۔'' میں نے کہا۔

''اور جہاں تک ان اکبر سندھو کا معاملہ ہے تو جب چاہوں، میں الو کی گردن ناپ سکتا ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ کس وقت وہ کہاں ملتا ہے۔''

''تم جانتے ہو؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''نواب صاحب! آپ شاید بھول رہے ہیں کہ میں نے دس سال تک کرائم رپورٹنگ کی ہے۔ آج بھی ایک طرح سے کرائم رپورٹنگ ہی کررہا ہوں۔ پولیٹیکل انویسٹی گیٹر بھی تو کرائم رپورٹر ہی ہوتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ وہ بڑے بڑے سیاست دانوں کے کرائم منظر عام پر لاتا ہے۔''

''یہ تم مجھ سے پوچھ رہے ہو یا مجھے بتارہے ہو؟'' راجا نے ہنس کر پوچھا۔

''میں نواب صاحب کو بتارہا ہوں، تم تو اس میدان کے پرانے کھلاڑی ہو۔'' ناصر نے کہا۔

''یہ اکبر سندھو کہاں ملے گا اس وقت؟'' میں نے اچانک پوچھا۔

ناصر نے اپنی کلائی کی گھڑی دیکھی، پھر جیب سے سیل فون نکال کر کسی کو کال کرنے لگا۔ سلسلہ ملنے پر وہ بولا۔ ''ہیلو، لالو! میں...... اچھا تم پہچان گئے...... ہاں، خاص کام تو نہیں ہے۔ بس یہ معلوم کرنا ہے کہ اس وقت سندھو کہاں ہوگا؟...... ہاں...... ہاں ہاں، تم بولو...... گلبرگ...... اچھا...... ٹھیک ہے......'' اس نے سلسلہ منقطع کرکے میری طرف دیکھا۔ ''اکبر سندھو اس وقت گلبرگ کے ایک فلیٹ میں موجود ہے۔ وہ کچھ خوش وقتی کے لیے وہاں اپنی محبوبہ کے پاس جاتا ہے۔''

''چلو، پھر وہیں چلتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''فیکے پتر!'' راجا نے کہا۔ ''اتنی پھرتکی مت دکھا۔ پہلے شاکر کو معلومات کرلینے دے۔''

''شاکر اب صرف دلاور اور رانا کی فکر میں ہوگا۔'' ناصر نے کہا۔ ''اور صحیح لفظ پھرتی ہے، پھرتکی نہیں۔'' ناصر ہنس کر بولا۔

''او یار! اب تو بھی مجھے اردو سکھائے گا؟'' راجا منہ بنا کر بولا۔ ''میں جانتا ہوں کہ صحیح لفظ پھرتی ہے لیکن اپنے نواب صاحب کچھ زیادہ ہی تیزی سے کام کرتے ہیں اس لیے میں اسے پھرتکی کہہ رہا ہوں۔''

''سندھو کے لیے میرے ساتھ صرف غنی اور ناصر جائیں گے۔'' میں نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''یار، مجھے گھر تو چھوڑ دے۔'' راجا نے اس انداز میں کہا کہ مجھے ہنسی آگئی۔ ''میں بھی تیرے ساتھ چلتا لیکن ناصر کی سندھو سے کچھ یاداللہ بھی رہی ہے۔''

میں نے ناصر کی طرف دیکھا۔

''ہاں، وہ مجھے اچھی طرح جانتا ہے۔ راجا کو بھی جانتا ہے۔ کرائم رپورٹر اور کرمنل کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔''

☆☆☆

ہم وہاں سے نکلے تو ہلکی ہلکی بارش ہورہی تھی۔ ہمارا مطلوبہ فلیٹ وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔

راجا نے مجھ سے کہا۔ ''اب تو میری وجہ سے ماڈل ٹاؤن جائے گا فیکے؟ چل میں بھی تیرے ساتھ ہی چلتا ہوں۔''

ڈرائیونگ سیٹ پر غنی تھا۔ ناصر نے غنی کو ایڈریس بتایا۔ اس نے سات منٹ کے عرصے میں ہمیں اس کمپلیکس کے سامنے پہنچادیا جہاں سندھو کے ملنے کا امکان تھا۔

''غنی! تم اوپر جاؤ۔ میں اور ناصر تمہارے پیچھے پیچھے آئیں گے۔ راجا گاڑی میں بیٹھ کر اردگرد نظر رکھے گا۔'' میں نے کسی فوجی کمانڈر کی طرح ہدایات دیں۔

غنی گاڑی سے اتر کر ٹہلنے والے انداز میں بلڈنگ کے مرکزی دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ بہت صاف ستھرے اور لگژری فلیٹ تھے۔ مین گیٹ پر بیریئر بھی موجود تھا، اس کا مقصد غالباً اجنبیوں اور مہمانوں کی گاڑیوں کو اندر آنے سے روکنا تھا۔ بیریئر کے دائیں جانب اتنی جگہ تھی کہ ایک آدمی آرام سے گزر سکتا تھا۔ گیٹ پر چوکیدار بھی موجود تھا لیکن اس نے غنی سے کوئی تعرض نہیں کیا۔

میں اور ناصر بھی گاڑی سے باہر آگئے اور غنی کے پیچھے روانہ ہوگئے۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ سندھو کو تو صرف ناصر پہچانتا ہے۔ اگر وہ فلیٹ میں ہوا بھی تو کہہ سکتا ہے کہ اکبر سندھو یہاں نہیں ہے۔

میں نے جیب سے سیل فون نکالا اور غنی کا نمبر ڈائل کرنے کے بعد کہا۔ ''غنی! تم ٹھہرو! فلیٹ میں ناصر جائے گا۔ تم میرے ساتھ رہنا۔'' میں نے سیل فون اپنی جیب میں رکھ لیا۔

''یہی میں بھی سوچ رہا تھا۔'' ناصر نے کہا۔ ''فلیٹ میں پہلے مجھے جانا چاہیے تھا۔''

غنی لفٹ کے پاس کھڑا تھا۔ اسی وقت لفٹ آگئی۔ ناصر لپک کر اس میں سوار ہوگیا۔ میں اور غنی زینے کی طرف بڑھ گئے کیونکہ ہمیں صرف سیکنڈ فلور تک ہی جانا تھا۔

میں فلیٹوں کے نمبر دیکھتے ہوئے آگے بڑھا تو ایک کوریڈور میں مجھے ناصر دکھائی دیا۔ وہ ایک فلیٹ کے ساتھ کھڑا تھا۔ میں نے غنی کو کوریڈور کے دوسرے سرے کی طرف جانے کا اشارہ کیا اور خود وہیں ٹھہر کر جیب سے سگریٹ

کا پیکٹ نکال لیا۔ میں عادی سگریٹ نوش نہیں ہوں لیکن دن میں دو چار سگریٹ پی لیتا ہوں۔ اس وقت تو مجھے وہاں ٹھہرنے کا جواز بھی چاہیے تھا۔

اچانک فلیٹ کا دروازہ کھلا لیکن اسے کھولنے والا میری نظروں سے اوجھل تھا۔

ناصر نے اس سے کچھ کہا، پھر فوراً ہی اپنا پاؤں دروازے کے بیچ میں اڑا دیا۔ اندر سے شاید کسی نے دروازہ بند کرنے کی کوشش کی تھی۔

دوسرے ہی لمحے مجھے ناصر کے ہاتھ میں گن نظر آئی۔ اس نے درشت لہجے میں کچھ کہا تھا۔ مجھے صرف اس کے چہرے کے تاثرات نظر آ رہے تھے۔ الفاظ سنائی نہیں دے رہے تھے۔

میں نے بھی سگریٹ پھینکی اور اس فلیٹ کی طرف لپکا۔ فلیٹ کا دروازہ اب تک کھلا ہوا تھا۔ میں نے بھی بغلی ہولسٹر سے ریوالور نکال لیا اور اندر داخل ہو گیا۔

اندر اٹھائیس، تیس سال کی ایک دلکش عورت سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ مزید سہم گئی۔ میں نے فلیٹ کا دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

''میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ اکبر یہاں نہیں ہے۔'' وہ عورت آہستہ سے بولی۔

''لیکن ہمیں اطلاع ملی ہے کہ وہ یہیں آیا ہے۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔

''آپ کی اطلاع درست ہے جناب!'' وہ عورت اب کچھ زیادہ اعتماد سے بول رہی تھی۔ ''اکبر کو یہاں آنا تھا لیکن وہ اب تک یہاں آیا نہیں ہے۔''

میں نے غور سے اس کا جائزہ لیا۔ بلاشبہ وہ خاصی حسین عورت تھی۔ اس وقت کچھ سہمی ہوئی تھی لیکن اس سے اس کی دلکشی مزید بڑھ گئی تھی۔ وہ شاید میک اپ کرنے میں مصروف تھی اور ادھورا چھوڑ کر دروازہ کھولنے آ گئی تھی۔ اس کی دائیں آنکھ پر آئی شیڈ اور کاجل لگا ہوا تھا۔ جسم انتہائی متناسب تھا۔ وہ نیلے رنگ کی ساڑی اور مختصر سے بلاؤز میں تھی۔ اس میں اس کی پیٹھ اور پیٹ برہنہ تھا اور دودھیا جلد نظر آ رہی تھی۔

''آپ چاہیں تو میرے فلیٹ کی تلاشی لے لیں۔'' اس نے کہا۔ ''یوں بھی پولیس والے کئی دفعہ میرے فلیٹ کی تلاشی لے چکے ہیں۔''

گویا وہ ہمیں پولیس والا سمجھ رہی تھی۔ اتنے دھڑلے سے کسی کے گھر میں داخل ہونے کا خودساختہ اختیار صرف ہماری پولیس ہی کو تھا۔

اس کا ادھورا میک اپ دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ اس کی یہ تیاری اور سولہ سنگھار صرف اکبر سندھو ہی کے لیے ہو سکتا ہے۔

''ٹھیک ہے، ہم فلیٹ کی تلاشی ضرور لیں گے۔'' میں نے کہا۔

میں نے فلیٹ کا داخلی دروازہ بولٹ کیا اور عورت کے پیچھے پیچھے لاؤنج سے گزر کر اندر کی طرف بڑھا۔

میں اس وقت بھی بہت محتاط تھا۔ مبادا سندھو اندر کسی کمرے میں ہو اور اچانک میرا کام تمام کر دے۔

اس عورت کی چال مشتعل کر دینے والی تھی۔ اس فلیٹ میں تین کمرے تھے۔ دو بیڈ روم اور ڈرائنگ، ڈائننگ روم۔ اس میں خاصا کشادہ ایک لاؤنج بھی تھا۔

ناصر میرے ساتھ ساتھ تھا۔ اس نے پہلے لاؤنج اور ڈرائنگ روم کا اچھی طرح جائزہ لیا پھر وہ بیڈ روم کی طرف بڑھا۔

میں عورت کے پیچھے اس کے بیڈ روم میں چلا گیا۔ اس کا آراستہ بیڈ روم دیکھ کر مجھے اس کے ذوق کا اندازہ ہوا۔ وہ نہ صرف حسین تھی بلکہ نفاست پسند بھی تھی۔

''اچھی طرح تلاشی لے لیں آفیسر!'' اس نے کہا۔

مجھے اس کے لہجے میں ہلکا سا طنز محسوس ہوا۔

میں نے بیڈ کے نیچے جھانکنے کی کوشش کی لیکن اس کا بیڈ ماڈرن طرز کا تھا۔ ایسے بیڈز میں عموماً نیچے چھپنے کی جگہ نہیں ہوتی ہے۔ وہ چاروں طرف سے بند ہوتے ہیں اور عام بیڈ کے مقابلے میں ان کی اونچائی بھی کم ہوتی ہے۔

اس نے اپنی جہازی سائز دیوار گیر الماریاں پہلے ہی کھول دی تھیں۔ ان میں اس کے کپڑے اور ضرورت کا دوسرا سامان بھرا ہوا تھا۔ میں نے باتھ روم میں جھانک کر دیکھا، پھر بیڈ روم میں موجود ایک دروازہ مزید دکھائی دیا۔ وہ دروازہ باہر ٹیرس میں کھلتا تھا۔ وہاں بھی کوئی نہیں تھا اور وہاں کوئی ایسی جگہ بھی نہیں تھی جہاں سے کوئی فرار ہو سکے۔

''آپ کی تسلی ہو گئی؟'' عورت نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''میری تسلی ابھی نہیں ہوئی۔'' میں نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس کا گدا اتنا نرم تھا کہ میں اس میں دھنس کر رہ گیا۔ ''اگر اکبر کو یہاں آنا ہے تو وہ یہاں ضرور آئے گا۔ میں اس کا انتظار کروں گا۔''

مجھے اس کے چہرے پر پہلی دفعہ شدید پریشانی کے تاثرات دکھائی دیے۔

''تمہارا نام کیا ہے؟'' میں نے موضوع بدلنے کو پوچھا۔

''میرا نام نورین ہے۔'' اس نے کہا۔

ناصر بھی مایوسی کے عالم میں اندر داخل ہوا۔ ''یہاں تو ان خاتون کے علاوہ چڑیا کا بچہ تک نہیں ہے، میرے خیال میں ہمیں غلط اطلاع ملی تھی۔''

''نورین نے ابھی تھوڑی دیر پہلے بتایا ہے کہ اکبر کو آج یہاں آنا تھا۔'' میں نے کہا۔

''نورین!'' ناصر چونک کر بولا۔ ''اچھا ان خاتون کا نام نورین ہے؟'' پھر وہ سرسری انداز میں بولا۔ ''مس نورین! کیا یہ آپ کا اصلی نام ہے؟''

''جی ہاں، یہی میرا نام ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میں ایک پرائیویٹ فرم میں جاب کرتی ہوں۔''

''اکبر سے آپ کا کیا تعلق ہے؟'' ناصر نے پوچھا۔

''اکبر میرا دوست ہے۔'' اس نے کہا۔

''ایسا دوست جو رات کو یہاں قیام بھی کرتا ہے؟'' ناصر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''جی ہاں، کبھی رات زیادہ ہوتی ہے تو وہ یہاں ٹھہر بھی جاتا ہے۔''

اچانک سیل فون کی بیل بجنے لگی۔ میں نے چونک کر ناصر کی طرف دیکھا، پھر نورین کو دیکھا، وہ بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر رکھا ہوا سیل فون اٹھا رہی تھی۔ ''نو!'' میں نے ڈپٹ کر کہا۔ ''سیل فون مجھے دے دو۔''

''یہ...... میری...... پرسنل کال ہے آفیسر!'' اس نے رک رک کر کہا۔

''سیل فون مجھے دو۔'' میں نے ڈپٹ کر کہا۔

اس نے سیل فون میرے حوالے کر دیا۔

گھنٹی بج بج کر خاموش ہو چکی تھی۔ میں نے مس کال دیکھی تو معلوم ہوا کہ وہ کسی اکو کی کال تھی۔ میں سمجھ گیا کہ نورین نے اکبر سندھو کا نمبر اکو کے نام سے محفوظ کر رکھا ہے۔

''یہ اکبر تمہیں فون کیوں کر رہا ہے؟''

''وہ آنے سے پہلے ہمیشہ فون کرتا ہے۔'' نورین نے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ اس کی کال ابھی پھر آئے گی۔ تم اس مرتبہ کال ریسیو کرو گی اور اس سے کہو گی کہ تم باتھ روم میں تھیں۔ اس سے کہو کہ تم بہت بے چینی سے اس کا انتظار کر رہی ہو۔''

''اسپیکر فون آن کر دینا۔'' ناصر نے کہا۔ ''اور اگر ایسی ویسی کوئی بات کی تو میں تمہاری یہ خوبصورت گردن اپنے ہاتھوں سے ماچس کی تیلی کی طرح توڑ دوں گا۔ یہ سمجھ لو کہ......''

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا کیونکہ نورین کے سیل فون کی بیل پھر بجنے لگی تھی۔ اسکرین پر اکو کا نام تھا۔ میں نے اسپیکر آن کر کے سیل فون اس کی طرف بڑھا دیا۔

ناصر نے اس کی کنپٹی پر ریوالور رکھ دیا۔

''ہیلو!'' نورین نے سنبھل کر کہا۔

''تم کہاں تھیں رینو؟'' دوسری طرف سے ایک بھاری آواز سنائی دی۔ ''میں کب سے تمہیں فون کر رہا ہوں۔''

''میں باتھ روم میں تھی۔'' نورین نے کہا۔ ''اور یہ تو مجھے پوچھنا چاہیے کہ تم کہاں تھے؟ میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔''

''میں ایک ضروری کام میں پھنس گیا تھا جان!'' اکبر نے کہا۔ ''میں بس ابھی پندرہ بیس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔ وہاں، کوئی گڑبڑ تو نہیں ہے؟''

ناصر نے ریوالور کی نال اس کی کنپٹی پر رکھ کر اس کا سیفٹی کیچ ہٹا دیا۔

''گڑبڑ کیسی جانو؟'' نورین نے پوچھا۔

''آج کل ایک کیس کے سلسلے میں دشمن میری بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ پولیس بھی میری تاک میں ہے۔''

''یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔'' نورین نے کہا۔

ناصر نے اشارے سے کہا کہ اب بات ختم کرو۔

''او کے جانو! ٹیک کیئر۔'' نورین نے یہ کہہ کر سیل فون آف کر دیا۔

اس کا چہرہ پریشانی میں مزید حسین لگ رہا تھا۔

ناصر نے اس کا سیل فون آف کر کے اپنی جیب میں ڈال لیا اور اس سے کہا۔ ''چلو، تم لاؤنج میں بیٹھو۔''

وہ خاموشی سے اٹھی اور لاؤنج کی طرف بڑھ گئی۔

نورین کے چہرے پر فکرمندی اور پریشانی کے تاثرات تو تھے لیکن وہ اضطرابی کیفیت نہیں تھی جو اس موقعے پر ہونا چاہیے تھی۔

ظاہر ہے، اکبر وہاں اپنی زندگی کے کچھ لمحات کو رنگین کرنے آتا تھا۔ اس ضمن میں وہ نورین کو ہر ماہ خاصی خطیر رقم دیتا ہوگا۔ نورین کو اکبر سے ملنے والی رقم آئندہ نہ ملنے کا افسوس ہو تو ہو، اسے اکبر کی گرفتاری پر کوئی پریشانی نہیں تھی۔

میں اپنے خیالات میں اتنا گم تھا کہ اس دوران میں

اطلاعی گھنٹی بجی تو میں بری طرح چونک اٹھا۔

میں اور ناصر اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے اپنا ریوالور لیا اور دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑا ہوگیا۔ دروازے کے دوسرے سرے پر ناصر ریوالور بہ دست کھڑا تھا۔ میں نے ریوالور کی نال سے نورین کو دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا۔ نورین ابھی تک ادھورے میک اپ میں تھی۔ اس نے ہچکچاتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ میں نے نورین کو چونکتے دیکھا۔

وہ مسکرا کر بولی۔ ''آؤ اندر آجاؤ۔''

آنے والا اندر آیا تو اس کا رخ نورین کی طرف تھا۔

میں نے اچانک پیچھے سے اس کی کمر پر ایک بھرپور لات رسید کی۔ ضرب غیر متوقع تھی اس لیے وہ اوندھے منہ گرا لیکن فوراً ہی سیدھا ہوگیا۔ میں نے جھک کر اس کی پیشانی پر ریوالور کی نال رکھ دی۔

ناصر نے فوراً ہی دروازہ بند کر دیا اور نووارد پر نظر پڑتے ہی بولا۔ ''یہ اکبر نہیں ہے۔''

وہ فرش پر پڑا پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔

''اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھو اور کھڑے ہوجاؤ۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔

اس نے دونوں ہاتھ سر پر رکھے اور اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ خاصے کسرتی جسم کا مالک تھا۔ اس کا قد درمیانہ اور ہاتھ پیر خاصے مضبوط لگ رہے تھے۔

ناصر نے آگے بڑھ کر انتہائی مہارت سے اس کی تلاشی لے ڈالی۔ اس کی جیب سے ایک بھدا سا دیسی ساختہ پستول اور تقریباً ساڑھے چار ہزار روپے کے کرنسی نوٹ برآمد ہوئے۔

''کون ہو تم لوگ اور......''

اس کا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی میں نے اس کے منہ پر تھپڑ رسید کر دیا۔ ''سوال کرنے کا حق صرف ہمیں ہے۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔

''آپ میرے گھر میں بلا اجازت گھس آئے ہیں اور......''

میں نے اس مرتبہ اس کے چہرے پر زیادہ زوردار تھپڑ مارا اور بولا۔ ''تمہارا گھر! یہ تمہارا گھر ہے؟''

''یہ پولیس آفیسر ہیں بابو!'' نورین نے کہا۔

''یہ پولیس کے آدمی ہیں؟'' بابو چونک کر بولا۔

''یہ تمہارا گھر ہے؟'' میں نے اس کے سوال کا جواب دیے بغیر اپنا سوال دہرایا۔

''یہ گھر تو اصل میں مس نورین کا ہے لیکن میں بھی یہاں آتا جاتا رہتا ہوں۔'' بابو گھگیا کر بولا۔

''اکبر کہاں ہے؟'' میں نے اچانک پوچھا۔

''مجھے ان کے بارے میں تو کچھ نہیں معلوم۔'' بابو نے کہا۔

''جھوٹ بولو گے تو میں اسی گھر کو تمہاری قبر بنا دوں گا۔'' میں نے سفاک لہجے میں کہا۔ پھر جیب سے سیل فون نکال کر غنی کا نمبر ڈائل کیا اور اس سے کہا۔ ''غنی! اندر آجاؤ۔''

''او کے سر!'' غنی نے مستعدی سے جواب دیا۔

میں نے سلسلہ منقطع کر کے سیل فون جیب میں رکھا اور بابو کو گھورنے لگا۔

دروازے پر غنی نے مخصوص انداز میں دستک دی تو ناصر نے پوچھا۔ ''کون؟''

''دروازہ کھولیں سر!'' باہر سے غنی کی آواز سنائی دی۔

ناصر نے دروازہ کھول دیا لیکن اس کے ہاتھ میں ابھی تک ریوالور تھا۔

اندر داخل ہو کر غنی نے پہلے دروازہ بند کیا اور میرے سامنے مؤدب انداز میں کھڑا ہوگیا۔

''غنی! اس سورما کی زبان کھلواؤ۔ اس سے پوچھو کہ سندھو اس وقت کہاں ہے؟ پہلی دفعہ میں نہ بتائے تو اس کے دونوں کان کاٹ دینا۔''

''او کے سر!'' غنی نے کہا اور اپنی پنڈلی سے بندھا ہوا دو دھاری خنجر نکال لیا، پھر وہ انتہائی درشت لہجے میں بولا۔ ''اب شروع ہوجاؤ ورنہ میں نے آج تک کسی کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی ہے۔ اکبر سندھو ہمیں کہاں ملے گا؟'' یہ کہتے ہوئے غنی نے اس کے بال پکڑ لیے۔

''میں بتا تو چکا ہوں کہ......''

غنی نے اس کے بازو پر ہلکا سا چرکا لگایا اور بولا۔ ''اگر تم نے ایک منٹ کے اندر اندر زبان نہ کھولی تو میں تیرے دونوں کان کاٹ دوں گا۔''

غنی نے اس کی ٹانگوں میں پاؤں اڑا کر اسے گرایا اور اس کے سینے پر گھٹنا رکھ کر اس کا ایک کان مضبوطی سے پکڑ لیا۔

''اکبر اس وقت شکور کے اڈے پر ہے۔'' بابو نے جلدی سے کہا۔

''اور یہ شکور کون ہے اور اس کا اڈا کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں جانتا ہوں۔'' ناصر نے کہا۔ ''کہ شکور کا اڈا کہاں ہے۔''

''ٹھیک ہے، ہم لوگ شکور کے اڈے کی طرف جا رہے ہیں۔'' میں نے غنی سے کہا۔ ''تم اس وقت تک ان دونوں کو مت چھوڑنا جب تک اکبر ہمارے ہاتھ نہ لگ جائے۔ اگر یہ شور شرابا کرنے یا ہوشیاری دکھانے کی کوشش کریں تو انہیں ذبح کر کے کہیں ڈال دینا۔''

''او کے سر!'' غنی نے مستعدی سے جواب دیا۔

ہم باہر نکلنے ہی والے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ بابو اور نورین کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ میں نے غنی کو اشارہ کیا۔ وہ بابو کو دھکیل کر اندر لے گیا۔

''تم دروازہ کھولو۔'' میں نے سرگوشی میں نورین سے کہا لیکن میرا لہجہ انتہائی درشت تھا۔

ہم دونوں پہلے کی طرح دروازے کے دائیں بائیں طرف دیوار سے لگ کر کھڑے ہوگئے۔

نورین نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

''اتنی دیر کیوں کر دی جان؟'' آنے والے نے چہک کر کہا۔ ''کیا سو رہی تھیں؟''

''تم ...... اندر تو آؤ۔'' نورین جلدی سے بولی۔ ''اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں آنے والے کو خفیف سا اشارہ بھی کیا تھا جو میری نظروں سے چھپا نہ رہ سکا۔

میں نے نورین کو ایک طرف دھکا دیا اور پلک جھپکتے میں آنے والے کا گریبان پکڑ کر اسے اندر کھینچ لیا۔

آنے والے نے جیب میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی لیکن ناصر نے سخت لہجے میں کہا۔ ''نو! اپنے ہاتھوں کو قابو میں رکھو اکبر ورنہ میں کھوپڑی اڑا دوں گا۔''

اکبر طنزیہ انداز میں ہنسا، پھر بولا۔ ''اوہو، یہاں تو میرے استقبال کی زبردست تیاریاں ہیں۔''

''اپنے ہاتھ سر پر رکھو۔'' ناصر نے کہا۔

''اور رونا شروع کر دوں۔'' اکبر مزاحیہ انداز میں بولا۔ ''ماں اکثر بچپن میں کہتی تھی کہ سر پہ ہاتھ رکھ کے رو دے گا۔''

جواب میں ناصر نے جھنجلا کر اس کے چہرے پر تھپڑ مار دیا۔ ''بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

اکبر نے نتائج کی پروا کیے بغیر ناصر پر چھلانگ لگائی اور اسے رگیدتا ہوا دیوار تک لے گیا۔

میں نے فلیٹ کا دروازہ بند کیا اور ڈپٹ کر بولا۔ ''پیچھے ہٹو ورنہ......''

ناصر نے اس وقت تک اسے سامنے کی طرف اچھال دیا تھا۔ وہ میرے سامنے آکر گرا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر اپنا ہاتھ جیب میں ڈالنے کی کوشش کی لیکن میں نے اس کی کلائی پر مضبوطی سے پاؤں رکھ دیا۔

ناصر کے ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھ کے نیچے بھی نیل کا نشان تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر پہلے تو اکبر کی تلاشی لے کر اس کی جیب سے ایک جرمن لیوگر اور پینٹ کی بیلٹ میں پشت کی طرف اڑسا ہوا ایک ریوالور نکالا، پھر اس کے چہرے پر اتنا زوردار گھونسا مارا کہ اس کے دو تین دانت ٹوٹ گئے۔

''تو نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا۔'' ناصر نے نفرت انگیز لہجے میں کہا۔ ''دو ٹکے کے بدمعاش! کل تک تو لوگوں کی

جیبیں کاٹتا تھا اور عورتوں کے پرس چھین کر بھاگتا تھا۔''

میں نے بال پکڑ کر اسے اٹھا کر بٹھا دیا۔

''وہ کل کی بات تھی ناصر صاحب!'' اکبر نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''کل تک آپ بھی تو تیسرے درجے کے اخبارات میں ملازمت کرتے تھے، جہاں بھی سیلری دو مہینے بعد ملتی تھی، کبھی تین مہینے بعد اور کبھی ملتی ہی نہیں تھی۔ آج آپ پولیس کے ایک افسر کے سامنے بہت باعزت اور معزز بن رہے ہیں۔''

ناصر نے تابڑ توڑ اس کے چہرے اور جسم پر کئی گھونسے رسید کر دیے۔

''کھڑے ہو جاؤ اکبر!'' میں نے کہا۔ ''اور اندر بیڈ روم میں چلو۔''

وہ آہستہ سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے خون تھوکنے کی کوشش کی تو اس کے ساتھ اس کے دو دانت بھی باہر آ گرے۔

میں نے راجا کا نمبر ملایا اور اس سے کہا۔ ''تم بھی اوپر آ جاؤ۔''

''میں اس تشدد اور مار پیٹ کا مطلب نہیں سمجھا؟'' اکبر نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ سامنے کے دانت ٹوٹنے کی وجہ سے اس کے الفاظ بھی گڈمڈ ہو کر رہ گئے تھے۔

''ابھی سمجھ جاؤ گے۔'' میں نے کہا، پھر کچھ توقف کے بعد اچانک بولا۔ ''تم دلاور اور رانا زوہیب کے لیے کب سے کام کر رہے ہو؟''

اکبر نے چونک کر مجھے دیکھا، پھر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''میں رانا زوہیب کے لیے تو نہیں لیکن دلاور کے لیے ضرور کام کرتا ہوں۔''

''تم نے ابھی حال ہی میں ایک لڑکی اغوا کی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ کس لڑکی کی بات کر رہے ہیں؟'' اکبر نے پوچھا۔

''دیکھو، مجھے سختی پر مجبور نہ کرو۔ جو کچھ پوچھ رہا ہوں، اس کا صحیح صحیح جواب دو ورنہ......''

''ورنہ آپ مجھے تھانے لے جائیں گے اور......''

''وہاں کی نوبت تو بعد میں آئے گی۔ تم سے جو کچھ پوچھا جا رہا ہے۔ اس کا جواب دو۔''

''میں جواب دے تو رہا ہوں۔'' اکبر نے کہا۔ ''میں نے اس ہفتے میں دو لڑکیاں اغوا کی تھیں۔ ان میں سے ایک تو فرار ہو گئی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ کسی ڈپٹی سیکریٹری کی بیٹی تھی۔''

''اور دوسری؟'' میں نے پوچھا۔

''دوسری لڑکی کسی نواب کی منگیتر تھی۔'' اس نے کہا۔

''وہ لڑکی اس وقت کہاں ہے؟'' میں نے بہ مشکل تمام اپنے غصے اور جذبات پر قابو پا کر کہا۔

''دیکھو آفیسر!'' اکبر نے کہا۔ ''میرا کام صرف اتنا ہی ہے کہ میں لڑکیوں کو اٹھا کر اس شخص کے حوالے کر دوں جو مجھے اس کا معاوضہ دیتا ہے۔ پھر میں نہیں جانتا کہ وہ لڑکیاں کہاں جاتی ہیں؟''

''تم معلوم تو کر سکتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔ ''کہ وہ لڑکیاں اس کے بعد کہاں جاتی ہیں؟''

وہ تلخ انداز میں مسکرا کر بولا۔ ''اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میرے اس بیان کو میرے خلاف استعمال کر سکتے ہیں تو......''

''مجھے قانون مت سکھاؤ اکبر!'' میں نے کہا۔ ''میں بھی جانتا ہوں کہ تمہارے اس بیان کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہے۔ میں نے قانونی کارروائی کی بھی نہیں ہے اور میں ایسا کر بھی نہیں سکتا......'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''کیونکہ میرا تعلق پولیس سے نہیں ہے۔''

میرے اس انکشاف سے اکبر اور نورین دونوں ہی چونک اٹھے۔ ''تمہارا تعلق پولیس سے نہیں ہے؟'' اکبر نے حیرت سے پوچھا۔ ''تو...... پھر...... تم......''

''دیکھو اکبر!'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ''میں تم سے ایک ڈیل کرنا چاہتا ہوں۔''

''کیسی ڈیل؟'' اکبر نے الجھ کر پوچھا۔

''جتنا معاوضہ دلاور نے تمہیں اس لڑکی کے اغوا کا دیا تھا، میں اس سے دگنا معاوضہ دوں گا۔ تم اس لڑکی کو واپس لے آؤ۔''

''سوری!'' اکبر نے کہا۔ ''یہ تو دلاور کو ڈبل کراس کرنا ہوا۔''

''اچھا، تم اتنا ہی بتا دو کہ اس لڑکی کو اغوا کرنے کے بعد تم نے کس کے حوالے کیا تھا؟ دلاور تو یہاں موجود ہی نہیں ہے۔''

''دلاور یہاں کبھی کبھار ہی آتا ہے۔'' اکبر نے کہا۔ ''لیکن اس کا خاص آدمی بلکہ اس کا پورا نیٹ ورک یہاں کام کر رہا ہے۔''

''مجھے اس خاص آدمی کا نام پتا بتا دو۔'' میں نے جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی۔

''اتنے معمولی سے کام کے میں پیسے نہیں لیتا۔'' اکبر نے کہا۔ ''ویسے بھی وہ آدمی اتنا طاقتور ہے کہ تم اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔''

''تم صرف نام بتاؤ پھر میں دیکھتا ہوں کہ وہ آدمی کتنا طاقتور ہے؟'' میں نے کہا۔

''اس آدمی کا نام ہے مسکین شاہ۔'' اکبر کے انکشاف نے میرے جسم میں گویا آگ بھر دی۔

''مسکین شاہ نے کیا خود تم سے کہا تھا کہ اس لڑکی کو اغوا کرو۔''

''وہ اس قسم کے کام خود کب کرتا ہے۔'' اکبر نے جواب دیا۔ ''اس کے خاص آدمی آفتاب خان نے مجھ سے کہا تھا۔''

''آفتاب خان!'' میرے ذہن کو دھچکا سا لگا ''گویا نور کو آفتاب خان نے اغوا کرایا تھا؟''

''جھوٹ مت بولو۔'' میں نے اسے آزمانے کو کہا۔ ''آفتاب خان اور شاہ جی میں تو اچھے خاصے اختلافات پیدا ہو گئے ہیں۔''

''وہ اختلافات تو ابھی پیدا ہوئے ہیں لیکن دنیا کے سامنے وہ اب بھی ایک ہی ہیں۔'' اکبر نے جواب دیا۔

''تم نے اس لڑکی کو آفتاب خان کے حوالے کیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، میں نے اسے آفتاب خان کے حوالے کر کے اپنا معاوضہ وصول کر لیا تھا۔'' اکبر کے لہجے میں سچائی تھی۔

''میں نہیں جانتا کہ آفتاب خان سے تم نے کتنا معاوضہ وصول کیا تھا'' میں نے کہا۔ ''لیکن میں تمہیں اس سے دگنا معاوضہ دوں گا۔ تم آفتاب خان کی بیٹی کو اٹھا لاؤ۔'' مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے آفتاب خان کو اتنی آسانی سے چھوڑ کیسے دیا؟

''کیا تم سنجیدہ ہو؟'' اکبر نے حیرت سے پوچھا۔

''اس میں تمہیں کون سی بات مذاق لگ رہی ہے؟'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''ایک دفعہ خود ہی میں نے آفتاب خان کی بیٹی کو اغوا کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا کیونکہ اس وقت تک مجھے علم نہیں تھا کہ اسی نے نور کو اغوا کرایا ہے۔''

''میں نے آفتاب خان سے پانچ لاکھ روپے لیے تھے۔'' اکبر نے کہا۔ ''میں پروفیشنل آدمی ہوں اور لگی لپٹی رکھے بغیر بات کرتا ہوں۔''

''میں تمہیں دس لاکھ دوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''کہو تو پیشگی دے دوں؟''

''نہیں۔'' اکبر نے کہا۔ ''میں پوری رقم کام کرنے کے بعد ہی وصول کرتا ہوں۔''

''اور اگر کوئی کام کرانے کے بعد رقم دینے سے انکار کر دے تو؟''

''تو پھر اس کی زندگی کے دن پورے ہو جاتے ہیں۔'' اکبر نے سفاک لہجے میں کہا۔ ''میں وعدہ خلافی کرنے والوں کو کبھی معاف نہیں کرتا۔'' پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ''لڑکی تمہیں کب اور کہاں چاہیے؟''

''میں تمہیں سیل فون پر بتا دوں گا۔ فی الحال میرے پاس کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔''

''کل شام تک تمہارا کام ہو جائے گا۔'' اکبر نے کہا۔ پھر وہ ہنس کر بولا۔ ''میں نے تو تمہارا نام بھی نہیں پوچھا؟''

''میرا نام آصف ہے، آصف خلان!'' میں نے کہا۔ ''میں کل شام کو تمہیں فون کروں گا۔''

''تم اپنا سیل نمبر مجھے دے دو۔ میں خود ہی تم سے رابطہ کر لوں گا۔''

میں نے غنی کو اشارہ کیا اس نے اپنا سیل نمبر اکبر کو بتا دیا۔

ہم لوگ ایک ایک کر کے وہاں سے نکل آئے۔

راجا نے کہا۔ ''ویکھے پتر! تو کیا سمجھتا ہے، یہ سندھو تیرا کام کرے گا؟''

''میرا خیال ہے کہ کرے گا۔'' میں نے کہا۔ ''وہ دلاور یا مسکین شاہ کے ساتھ باقاعدہ شامل نہیں ہے بلکہ وہ لوگ پیسے دے کر اس سے کام کراتے ہیں۔ شاہ جی صرف لڑکیاں ہی اغوا نہیں کراتا ہو گا بلکہ اپنے مخالفین کے سیاسی جلسے بھی درہم برہم کراتا ہو گا۔ ممکن ہے، مخالف سیاسی جماعتوں کے کارکنان کو اغوا بھی کرتا ہو۔''

''ہاں، میں نے اس وکیل سرور ڈھلون کے بارے میں بھی معلوم کر لیا ہے۔ وہ دو تین ہفتے کے لیے بیرون ملک گیا ہوا ہے۔'' ناصر نے کہا۔ ''اس کی قانونی فرم میں دو تین وکیل اتنے سینئر ہیں کہ سرور ڈھلون اگر دو تین مہینے بھی ملک سے باہر رہے تو اس کے مقدمات کی پیروی پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔''

''سرور ڈھلون گیا بھاڑ میں۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے تو نور کی طرف سے پریشانی ہے۔ مسکین شاہ نے اسے اغوا کرایا ہے تو رانا زوہیب کے کہنے پر کرایا ہو گا۔''

''کیا ہم اس کے دوسرے چچے قدوائی کی خبر لیں؟'' ناصر نے کہا۔

''کل شام تک انتظار کر لیتے ہیں۔'' راجا نے کہا۔ ''اگر اکبر سندھو واقعی آفتاب خان کی بیٹی کو اغوا کر لایا تو پھر صورتِ حال کچھ اور ہی ہو گی۔''

''راجا!'' میں نے اسے مخاطب کیا۔ ''تو ایسا کر کہ

ست بدھائی چلا جا۔ وہاں بھی تو کسی ذمے دار آدمی کی ضرورت ہے۔ یوں بھی وہاں تعمیراتی کام جاری ہے۔ ڈاکٹر مہدی حسن آخر یہ سارے کام کہاں تک سنبھالیں گے۔''

''ست بدھائی تو میں خود بھی جانا چاہ رہا ہوں۔ ویسے انگریزوں میں رہ کر تیری ذہنیت بھی انگریزوں والی ہو گئی ہے۔'' راجا نے ہنس کر کہا۔ ''ٹھیکے پتر! تو بھی ڈیوائڈ اینڈ رول کی پالیسی پر عمل کر رہا ہے۔ تو نے شاکر کو دلاور کے پیچھے لگا دیا ہے اور اب اکبر کو آفتاب خان کے پیچھے لگایا ہے۔''

''اکبر تو کل تک اپنے مشن میں کامیاب ہو جائے گا لیکن مجھے نہیں لگتا کہ شاکر دلاور پر قابو پا سکے گا۔''

''یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''فی الحال تو مجھے نور کی فکر ہے۔ اس حرامزادے ٹرک ڈرائیور نے نہ جانے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہوگا؟''

رات کو راجا ست بدھائی کے لیے روانہ ہو گیا۔

رات کو کھانے کے بعد میں نے کچھ دیر لان میں چہل قدمی کی۔ مجھے دیکھ کر ناصر بھی وہیں آ گیا۔

''یار ناصر!'' میں نے کہا۔ ''میری وجہ سے تمہارے کام کا بھی حرج ہو رہا ہے۔ اخبارات میں اتنی چھٹی تو کبھی نہیں ملتی۔''

''میں بھی اب راجا کی طرح فری لانسنگ کر رہا ہوں۔'' ناصر نے کہا۔ ''اخبار سے میرا تعلق تو ہے لیکن میں اسے صرف اپنا ہفتہ وار کالم اور پولیٹیکل اور کرائم انویسٹی گیشن کی اسٹوریز ہی دوں گا۔ مثلاً کس محکمے میں کتنے گھپلے ہوئے، کتنے کروڑ بلکہ اب تو اربوں روپے کس نے کھائے۔ کون سا کام صرف کاغذوں کی حد تک ہوا اور کس ٹھیکیدار نے متعلقہ افسروں کو کاغذی سڑک بنانے کے لیے کتنا کمیشن دیا اور خود کتنا پیسا ہڑپ کیا؟''

''یہ بھی تو فل ٹائم جاب ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تمہیں متعلقہ محکموں میں جانا پڑے گا۔ جرائم کی خبروں کے لیے پولیس افسران سے ملنا پڑے گا۔''

''میں برسوں سے یہی سب کچھ کر رہا ہوں نواب صاحب! ہر سرکاری، نیم سرکاری اور دوسرے اہم محکموں میں میرے آدمی موجود ہیں۔ وہ مجھے خود ہی خبریں پہنچا دیتے ہیں۔''

''گویا اب تم نے بھی راجا کے نقش قدم چلنے پر کا فیصلہ کر لیا ہے؟'' میں نے ہنس کر کہا۔

''میں نے اپنے اخبار سے یہ بھی طے کر لیا ہے کہ میری اسٹوریز اور خبریں دوسرے اہم اخباروں میں بھی لگیں گی۔''

''تمہاری ان اندر کی کہانیوں سے کوئی فرق تو پڑتا نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''فرق تو بہت پڑتا ہے نواب صاحب! لیکن یہاں آوے کا آوے ہی بگڑا ہوا ہے۔ وزیر اور سفیر سے لے کر معمولی کلرک تک سبھی اپنے اپنے طور پر پیسا بٹور رہے ہیں۔ مسکین شاہ کی مثال آپ کے سامنے ہی ہے، اس سے پہلے کریلا تھا، رانا زوہیب ہے اور بھی بے شمار سیاست دان ہیں جو صرف اپنا مفاد دیکھتے ہیں، اس تالاب کی تو ہر مچھلی ہی گندی ہے۔''

تھوڑی دیر مزید چہل قدمی کے بعد میں اپنے بیڈروم کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں نے غنی اور احمد شاہ کو دیکھا۔ وہ بہت مستعدی سے کوٹھی کی نگرانی کر رہے تھے۔ غنی کا کتا بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ وہ ابھی مشکل سے تین ہفتے کا ہوگا لیکن غنی کو خوب پہچانتا تھا۔

میں بیڈروم میں داخل ہوا تو نیلم نے کمرے میں جھانکا۔ میں نے اسے اشارے سے اندر بلا لیا۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی تو مجھے دھچکا سا لگا۔ اس نے نور کی ایک ساری باندھی ہوئی تھی۔

''تمہارے پاس یہ ساری کہاں سے آئی!'' باوجود کوشش کے میں اپنی تلخی کو نہ چھپا سکا۔

''یہ...... یہ...... بیگم...... صاحبہ نے مجھے خود دی تھی صاب جی!'' وہ ہکلا کر بولی اور سہمے ہوئے انداز میں مجھے دیکھنے لگی۔

مجھے غصہ اس بات پر آیا تھا کہ وہ بغیر پوچھے نور کے کپڑے استعمال کر رہی ہے۔ اس کی وضاحت کے بعد میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ''ٹھیک ہے، اب تم جا کر سو جاؤ۔ تم اتنی رات تک جاگتی کیوں رہتی ہو؟''

''وہ جی...... ڈاکٹر صاحبہ اور بیگم صاحبہ نے مجھے بتایا تھا کہ آپ کافی کے بہت شوقین ہیں۔ رات کو جب تک جاگتے رہتے ہیں، کافی پیتے رہتے ہیں اس لیے......''

''مجھے کافی کی طلب ہوگی تو میں غنی سے کہہ دوں گا۔ وہ تو ساری رات جاگتا رہتا ہے۔ تم اپنی نیند خراب مت کرو۔''

نیلم کے جانے کے بعد میں نے دوا لی اور خود بھی بیڈ پر لیٹ گیا۔ جب سے نور اغوا ہوئی تھی، مجھے سونے کے لیے خواب آور گولیاں کھانا پڑتی تھیں۔

اس کے بعد بھی مجھے پرسکون نیند نہیں آتی تھی۔ اس وقت بھی ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی مندر میں گھنٹیاں بج رہی ہوں۔ وہ سلسلہ تھما تو خاصا سکون ملا۔ دوسری مرتبہ مجھے ایسا لگا جیسے میں کسی تیسرے درجے کے ایرانی ہوٹل میں بیٹھا ہوں اور وہاں کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا سیٹھ وقفے وقفے سے تیز اور کانوں

میں چبھتی ہوئی گھنٹیاں بجا رہا ہو۔

اچانک میری آنکھ کھل گئی۔

میرے سیل فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ میں نے دیوار گیر گھڑی پر نظر ڈالی، وہ ساڑھے آٹھ بجا رہی تھی۔

میں نے سیل فون اٹھا کر دیکھا۔ اسکرین پر شاکر کا نام تھا۔ صبح صبح اسے فون کرنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی؟ میں نے بٹن دبا کر سیل فون کان سے لگا لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''ہاں شاکر! بولو، کوئی خاص خبر ہے؟''

''اب آپ کو شاکر سے جواب لینے کے لیے عالم بالا کا رخ کرنا پڑے گا نواب صاحب!'' دوسری طرف سے کوئی کرخت لہجے میں بولا لیکن وہ آواز میرے لیے مانوس تھی۔ میں اس سے پہلے بھی وہ آواز کہیں سن چکا تھا۔

''آپ بھی کیا عالم بالا ہی سے گفتگو فرما رہے ہیں؟'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ دوزخ میں ابھی تک سیل فون کی سہولت میسر نہیں ہے۔''

''میری بات توجہ سے سنیں نواب صاحب!'' دوسری طرف سے جھنجلائی ہوئی آواز آئی۔ ''میں دلاور بول رہا ہوں۔''

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ''کون دلاور؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ کی یادداشت اتنی کمزور تو نہیں ہے نواب صاحب!'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

''تم تو منہ چھپائے چھپائے پھرتے ہو، اس لیے مجھے پوچھنا پڑا۔ تم پاکستان میں رہتے ہی کب ہو؟''

''لیکن میں اچانک ہی پہنچ جاتا ہوں۔ بہرحال، شاکر ابھی میرے ہاتھوں مارا گیا ہے۔ وہ بہت اونچا اڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔''

''لیکن یہ اطلاع تم مجھے کیوں دے رہے ہو؟ پولیس کو دو، اپنے آقا رانا زوہیب کو دو۔ ویسے بھی شاکر تمہارا ہی آدمی تھا۔''

''وہ میرا آدمی تھا لیکن مجھے بھی آنکھیں دکھانے لگا تھا۔ میں نے سنا ہے کہ وہ آپ کے پاس ست بدھائی بھی آیا تھا؟''

''ہاں، وہ ست بدھائی آیا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن میں پھر پوچھوں گا کہ تم نے یہ غیر متعلقہ اطلاع دینے کے لیے میری نیند کیوں خراب کی ہے؟''

''آپ نیند کی خرابی کی بات کر رہے ہیں۔'' وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''آپ کی نیندیں تو اڑنے والی ہیں۔ میں اس مرتبہ پاکستان میں کچھ زیادہ عرصہ ٹھہروں گا۔ چلیے، آپ سو جائیں، جلد ہی آپ سے دوبارہ ملاقات ہوگی۔'' یہ کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

اس کے بعد سونے کا کیا سوال تھا۔ میں نے تصدیق کے لیے شاکر کے سیل نمبر پر فون کیا کہ مبادا کسی نے مذاق کیا ہو یا اس کا سیل فون کسی کے ہاتھ لگ گیا ہوگا۔

دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی، تیسری گھنٹی پر کسی نے فون اٹھا لیا اور پھر مجھے دلاور کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو! نواب صاحب، لگتا ہے آپ کو میری بات پر یقین نہیں آیا۔ اب غالباً آپ کو یقین آ گیا ہوگا اور ابھی تھوڑی دیر میں شاکر کی موت کی خبر آپ کو ٹی وی کے چینلز پر بھی مل جائے گی۔ ویسے میں اتنا بتا دوں کہ اس بچارے کو سانپ نے ڈس لیا ہے۔''

''سانپ نے ڈس لیا ہے؟'' میں نے حیرت سے دہرایا۔

''اور سانپ بھی ایسا مہلک کہ اس بچارے کو دوسری سانس لینے کی مہلت بھی نہیں ملی۔ دلاور اتنا ہی زہریلا سانپ ہے نواب صاحب!''

میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور مجھے ان سوئیوں کا خیال آ گیا جو مجھے ڈاکٹر کے قبضے سے ملی تھیں۔

''مجھے امید ہے کہ اب آپ کی تسلی ہو گئی ہوگی۔'' دلاور نے کہا۔ ''میری مجبوری یہ ہے کہ میں یہ سم فوری طور پر ضائع بھی نہیں کر سکتا۔ مختلف افراد کے فون آ رہے ہیں جو میرے لیے کام کرتے تھے اور شاکر نے انہیں مجھ سے بدظن کر دیا تھا۔ وہ دوبارہ میرے ساتھ شامل ہو رہے ہیں۔''

''ان میں سے ایک اکبر سندھو بھی ہے؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

دوسری طرف لمحے بھر کو خاموشی چھا گئی، پھر دلاور کچھ توقف کے بعد بولا۔ ''نواب صاحب! اکبر سندھو میرا آدمی نہیں ہے۔ اسے تو میں ٹھیکے پر کام دیتا ہوں۔ اچھا کام کرتا ہے اور بہترین معاوضہ وصول کرتا ہے۔ بس اب فون کرنے کی زحمت نہ کیجیے گا۔'' یہ کہہ کر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

میں باتھ روم میں گھس گیا۔ مجھے شاکر کی موت کا افسوس تھا۔ ویسے مجھے ابھی تک یقین نہیں آیا تھا کہ شاکر واقعی مر چکا ہے یا پھر دلاور کی قید میں ہے؟

میں باتھ روم سے نکلا تو سینٹرل ٹیبل پر اخبارات اور کافی کا مگ موجود تھا۔

میں کافی پینے کے ساتھ ساتھ اخبارات بھی دیکھنے لگا۔ ان اخبارات میں ناصر کا اخبار بھی شامل تھا۔ اس کا کالم ''قلم گزیدہ'' بہت ہی بے باکی سے لکھا گیا تھا اور اس نے نام

لیے بغیر مسکین شاہ کی دھجیاں بکھیر دی تھیں۔ میں نے پہلی دفعہ ناصر کا کوئی کالم پڑھا تھا۔ اس کے قلم میں راجا کی طرح کاٹ تھی بلکہ بعض جگہ تو وہ راجا سے بھی دو ہاتھ آگے نظر آتا تھا۔

نیلم نے کمرے میں جھانکا تو میں نے اسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

وہ جھجکتے ہوئے اندر آگئی۔ میں نے سرد لہجے میں کہا۔

''نیلم! یہ تم کمرے میں جھانکتی کیوں ہو؟ یہ کوئی مناسب طریقہ نہیں ہے۔ مہذب لوگ دروازے پر دستک دیتے ہیں۔''

وہ ایک دم بوکھلا گئی اور بولی۔ ''صاب جی...... میں دروازے پر...... دستک...... اس لیے نہیں دیتی کہ اگر...... آپ سو رہے ہوں گے تو...... آپ کی نیند خراب...... ہوگی۔''

''تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں کب سو کر اٹھتا ہوں، پھر تاک جھانک!''

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔

''آجاؤ!'' میں نے کہا۔

دوسرے ہی لمحے ناصر کمرے میں داخل ہوا۔

''ایک کپ کافی اور لے آؤ۔'' میں نے نیلم سے کہا۔

''میں کافی پی چکا ہوں سر!'' ناصر نے کہا۔

نیلم خاموشی سے باہر نکل گئی۔

''کوئی خاص خبر؟'' ناصر نے میرے آگے اخبارات بکھرے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔

''خاص الخاص!'' میں نے کہا۔ ''شاکر مارا گیا۔''

ناصر بری طرح چونک اٹھا۔ ''شاکر مارا گیا؟ لیکن وہ اتنی آسانی سے مرنے والا تو ہے نہیں۔'' ناصر نے کہا۔ ''وہ تو اکیلا ہی دس پر بھاری تھا۔ کس اخبار میں ہے یہ خبر؟''

''کسی اخبار میں نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ اطلاع مجھے سیل فون پر ملی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اطلاع بھی شاکر ہی کے سیل فون سے ملی ہے اور اطلاع دینے والا ہے دلاور!'' میں نے کہا۔

''دلاور!'' ناصر حیرت سے بولا۔ ''وہ تو پاکستان سے باہر تھا؟''

''ایسے لوگوں کا کوئی شیڈول نہیں ہوتا۔'' میں نے کہا۔ ''یہ بات تم بھی اچھی طرح جانتے ہو۔ وہ جب چاہتے ہیں اور جہاں چاہتے ہیں چلے جاتے ہیں۔''

''اس نے آپ ہی کو یہ اطلاع کیوں دی؟'' ناصر نے پوچھا۔

''اسے معلوم ہو گیا ہوگا کہ شاکر میرے لیے کام کر رہا ہے۔'' میں نے کہا۔

''مجھے تو اکبر سندھو کی فکر بھی پیدا ہو گئی ہے۔'' ناصر نے کہا۔

''ویسے میرا خیال ہے کہ ہمیں اس وقت ست بدھائی میں ہونا چاہیے۔'' میں نے کہا۔ ''دلاور سے کچھ بعید نہیں کہ وہاں کا رخ کرے۔''

''ایک دفعہ رخ کرے تو۔'' ناصر ہنس کر بولا۔ ''وہ وہاں سے زندہ نہیں جائے گا۔ وہاں صوبیدار میجر صاحب ہیں، سرور ہے، راجا ہے اور حویلی کے ہر کونے پر آپ کے گارڈز ہیں۔ وہ اتنا بے وقوف نہیں ہے کہ حویلی کا رخ کرے گا۔ رانا زوہیب بھی کبھی اسے حویلی کی طرف جانے کا مشورہ نہیں دے گا۔''

اس مرتبہ نیلم دروازے پر دستک دے کر اندر آئی اور اس نے اطلاع دی کہ ناشتا تیار ہے۔ وہ اطلاع دے کر چلی گئی۔

ناصر نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی کھول لیا اور یوں ہی چینل تبدیل کرنے لگا۔

ایک چینل پہ آخر شاکر کی خبر مل ہی گئی۔ ''ہیلتھ کلب کے مالک شاکر علی کا پراسرار قتل! پولیس ذرائع کا خیال ہے کہ ان کی موت زہر خورانی سے ہوئی ہے۔''

اس کے ساتھ ہی شاکر کی تصویر بھی تھی۔

اب تک جو ایک فیصد امید تھی کہ شاکر کی موت کی خبر جھوٹ بھی ہو سکتی ہے، وہ دم توڑ گئی۔ مجھے اس کی موت کا واقعی افسوس ہوا تھا لیکن وہ جن راہوں پر چل رہا تھا، ان کا اختتام بہرحال یہی ہوتا ہے۔

ہم لوگ وہاں سے اٹھ کر ڈائننگ روم میں آگئے۔

میں نے ناشتا شروع کیا ہی تھا کہ میرے سیل فون کی بیل بجنے لگی۔ اسکرین پر راجا کا نام تھا۔ میں نے بٹن دبا کر سیل فون کان سے لگا لیا۔ ''ہاں مہاراجا!'' میں نے کہا۔

''ویکھے پتر! تو نے ٹی وی دیکھا؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں یار! میں ٹی وی دیکھ چکا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''تو شاکر کی موت کے بارے میں کہہ رہا ہے شاید؟''

''ہاں، وہ اچانک کیسے مر گیا؟''

''وہ اچانک مرا نہیں ہے، اسے دلاور نے قتل کیا ہے۔'' میں نے کہا۔ پھر میں نے مختصراً اسے دلاور کی فون کال کے بارے میں بتایا۔

''اس کا مطلب ہے کہ خطرے کی گھنٹی بج گئی ہے ویکھے پتر! تیری پریشانیوں میں مزید اضافہ ہونے والا ہے۔''

''دلاور کا خطرہ...... مائی فٹ!'' میں نے کہا۔ ''مجھے تو

فی الحال نور کی فکر ہے۔ وہ نہ جانے کس حال میں ہوگی؟''

''تو وہاں لاہور میں کیا کر رہا ہے۔ ست بدھائی کیوں نہیں آتا؟'' راجا نے کہا۔

''یہاں کئی ضروری کام ہیں مہاراجا!'' میں نے کہا۔

''نمبر ایک نور کی تلاش، نمبر دو نور کی بازیابی نمبر تین نور... نمبر چار نور!'' راجا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''تو میرا مذاق اڑا رہا ہے؟'' میں نے بھنا کر کہا۔

''تو خود اپنا مذاق اڑا رہا ہے۔ اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ نور کو اب تک ان لوگوں نے لاہور ہی میں رکھا ہوگا؟''

''کوئی گارنٹی نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن تلاش شروع کرنے کے لیے کوئی سراغ تو چاہیے۔''

''تو پھر مجھے تو نے ست بدھائی کیوں بھیج دیا ہے؟'' راجا کے لہجے میں شکوہ تھا۔

''ارے مہاراجا! میں نے تجھے شہناز کی وجہ سے وہاں بھیجا ہے۔ وہ بے چاری بھی تو تنہائی محسوس کر رہی ہوگی۔''

''وہ تنہائی کی عادی ہو گئی ہے۔ میں لاہور آرہا ہوں۔'' یہ کہہ کر راجا نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

ابھی میں اپنے کمرے سے نکل کر باہر لاؤنج میں آیا ہی تھا کہ اکبر سندھو کا فون آگیا۔

''ہاں اکبر!'' میں نے پوچھا۔ ''کوئی پیش رفت؟''

''آپ کو مال کی ڈلیوری کہاں چاہیے؟'' اس نے یوں کہا جیسے کسی کمپنی کا نمائندہ اپنی پروڈکٹ کے بارے میں پوچھتا ہے۔ ''میں زیادہ دیر اسے اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا۔''

''تم اس وقت کہاں ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''اس وقت میں شادمان ٹاؤن کی طرف ہوں۔''

''ٹھیک ہے، میں وہاں پہنچ رہا ہوں۔''

''میں ایک ہی جگہ کھڑا نہیں رہ سکتا۔'' اکبر نے کہا۔

''تو پھر تم ایسا کرو، نورین کے فلیٹ کے نزدیک پہنچو، میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔ اس کا فلیٹ یہاں سے نزدیک ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں وہاں پہنچ رہا ہوں۔''

میں نے فوری طور پر غنی سے گاڑی نکالنے کو کہا۔ اس کے علاوہ میں نے صرف احمد شاہ کو ساتھ لیا اور گلبرگ کے اس علاقے میں پہنچ گیا جہاں نورین کا فلیٹ تھا۔

وہاں لوگوں کی اور گاڑیوں کی خاصی آمد و رفت تھی۔ میں نے سیل فون پر اکبر سے کہا کہ ہمارے پیچھے پیچھے آؤ، کوئی مناسب جگہ دیکھ کر ہم مال کی ڈلیوری لے لیں گے۔

☆☆☆

آفتاب خان کی بیٹی بے ہوش تھی۔ میں نے اسی حالت میں اسے اپنی کوٹھی کے ایک بیڈ روم میں منتقل کر دیا۔

پھر میں نے آفتاب خان کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی لیکن کسی نے فون ریسیو نہیں کیا۔

احمد شاہ نے بتایا کہ لڑکی کو ہوش آرہا ہے۔

میں نے اسے کمرے سے باہر بھیج دیا اور خود اس کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگا۔ اس لڑکی کے چہرے پر ایسی معصومیت تھی کہ لمحے بھر کو تو میرا دل بھی کٹ کر رہ گیا۔ وہ انتہائی حسین، نازک اندام بچی تھی۔ اکبر نے شاید اسے کلوروفارم کے ذریعے بے ہوش کیا تھا۔

آہستہ آہستہ اس نے آنکھیں کھول دیں اور خالی الذہنی کے عالم میں کمرے کی چھت کو گھورتی رہی۔ اس کے چہرے پر الجھن کے تاثرات تھے۔ پھر اس نے ارد گرد نظر دوڑائی تو اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ میں اس وقت تھری پیس سوٹ میں تھا، چہرے پر بھی مشفق مسکراہٹ تھی لیکن اس کے باوجود لڑکی گھبرا کر اٹھ بیٹھی اور اس نے ایک فلک شگاف چیخ ماری۔

''ڈرو مت بیٹا!'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ''میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔''

''کک...... کون ہیں آپ...... اور...... مم...... مجھے...... یہاں...... کیوں لائے ہیں...... میں تو کالج سے...... گھگ...... گھر جا...... رہی تھی۔'' وہ لرزتی ہوئی آواز میں ہکلا کر بولی۔

''بیٹا! مجھ سے بالکل مت ڈرو۔ میں تمہارا انکل ہوں۔'' میں نے انتہائی نرم لہجے میں کہا۔ ''مجھے تمہارے باپ سے کچھ حساب بے باق کرنا ہے۔ اگر تم نے مجھ سے تعاون کیا تو تمہیں یہاں بالکل تکلیف نہیں ہوگی۔''

''تعاون...... مطلب؟''

''تعاون یعنی کوآپریشن!'' میں نے دل ہی دل میں جھنجلا کر کہا۔ آج کل کی نسل کو اردو زبان کے روزمرہ استعمال کے الفاظ بھی انگریزی میں سمجھانا پڑتے ہیں۔

''اگر...... پاپا...... سے...... آپ کی...... کوئی ڈیل...... ہوئی ہے تو...... مجھے...... یہاں کیوں لائے ہیں؟''

وہ اب کافی حد تک سنبھل گئی تھی۔

''تمہارا نام کیا ہے گڑیا؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا نام ارم آفتاب ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''لیکن آپ نے مجھے یہاں لا کر...... بہت بڑی مسٹیک (Mistake) بلکہ بلنڈر کیا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میری

خاطر پاپا کچھ بھی کر گزریں گے...... وہ مجھے...... اتنا ہی چاہتے ہیں۔"

"جانتی ہو تمہارے پاپا نے کیا کیا ہے؟" میں نے اس مرتبہ سرد لہجے میں کہا۔ "انہوں نے میری منگیتر کو اغوا...... میرا مطلب ہے کہ کڈنیپ کرایا ہے۔"

"نور!" وہ پر یقین لہجے میں بولی۔

"اٹ از فیکٹ بے بی!" میں نے خالص انگریزی لہجے میں کہا تھا کہ وہ مجھے اغوا برائے تاوان کا کوئی مجرم نہ سمجھے۔ "میں تمہارے پاپا سے ابھی تمہارے سامنے بات کرتا ہوں۔ اسپیکر فون آن کردوں گا تاکہ تم بھی اپنے باپ کی آواز سن سکو، او کے!"

میں نے جیب سے سیل فون نکالا۔ اس کی سم بدلی اور آفتاب خان کا نمبر ڈائل کیا۔

دوسری طرف سے دوسری ہی گھنٹی میں کال ریسیو کرلی گئی اور آفتاب خان کی مکروہ آواز سنائی دی۔ "ہیلو آفتاب خان!"

"آپ کون؟" اس نے پوچھا۔

"اتنی جلدی مجھے بھول گئے۔ تم تو میرے مہمان رہے ہو؟"

"اب میں پہچان گیا۔ بولو، اب کیا تکلیف ہے؟"

"تمہارے جانے کے بعد میں نے اکبر سندھو کو پکڑ لیا تھا۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ اس نے تمہارے کہنے پر نور کو اغوا کیا ہے؟"

"وہ کہنے کو تو کچھ بھی کہہ سکتا ہے۔" آفتاب خان ڈھٹائی سے بولا۔

"اچھا یہ بتاؤ، ارم گھر پہنچ گئی؟" میں نے اچانک پوچھا۔

"نہیں، ہم لوگ گزشتہ دو گھنٹے سے اس کا انتظار کر رہے ہیں لیکن وہ ابھی تک گھر نہیں پہنچی ہے۔ تم اس کے بارے میں کیا جانتے ہو؟" آفتاب خان مضطرب ہوکر بولا۔

"وہی جو تم نور کے بارے میں جانتے ہو۔" میں نے ہنس کر کہا۔ پھر میں کچھ توقف کے بعد بولا۔ "ایک منٹ، تم پہلے اسی سے بات کرلو۔" میں نے سیل فون ارم کی طرف بڑھا دیا۔ "ہیلو پاپا!" ارم گلوگیر آواز میں بولی۔ "وہاٹس گوئنگ آن پاپا!"

"تم ٹھیک تو ہو بیٹا...... تم کہاں ہو میری جان...... میں......"

میں نے سیل فون ارم کے ہاتھ سے لے لیا۔ "آفتاب خان! اب بولو کیا کہتے ہو؟ ہاں، یہ نمبر ٹریس کرنے کی کوشش مت کرنا، فضول میں وقت اور توانائی ضائع ہوگی۔ اب بتاؤ نور کہاں ہے؟"

"تم نواب رفیق احمد شیرازی ہو؟" آفتاب خان نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"اور نواب صاحب اس قسم کے کام نہیں کرتے۔ انہیں خود کام کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟"

"دیکھو، میری بیٹی کو کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچنا چاہیے۔" آفتاب خان کے لہجے میں خوشامد تھی۔

"تم اپنی ہی بکواس کیے جارہے ہو۔" میں نے جھنجھلا کر کہا۔ "میں پوچھ رہا ہوں کہ نور کہاں ہے؟"

"نور کل تک میرے ہی پاس تھی لیکن......"

"تھی کیا مطلب؟" میں چیخ کر بولا۔ "اب وہ کہاں ہے؟"

"آج صبح دلاور کے لوگ اسے یہاں سے لے گئے۔"

"آفتاب خان!" میں نے دانت پیس کر کہا۔ "اگر نور کو کسی بھی قسم کی گزند پہنچی تو میں تمہارے پورے خاندان کو برباد کردوں گا۔ جب تک نور مجھے نہیں مل جاتی، تمہاری یہ خوب صورت اور نازک اندام بیٹی میرے پاس رہے گی۔ علاوہ ازیں خواہ تم پورے پاکستان کی پولیس اکٹھی کرلو۔ میں اسے کسی قیمت پر نہیں چھوڑوں گا۔"

"پاپا!" ارم روتے ہوئے بولی۔ "مجھے بچالیں پاپا!"

"تم گھبراؤ مت بیٹی!" آفتاب خان نے کہا۔ "میں تمہیں زیادہ دیر وہاں نہیں رہنے دوں گا۔"

"تو پھر آپ انکل کی منگیتر کو ان کے حوالے کردیں۔" ارم نے روتے ہوئے کہا۔ "آپ نے ایسا کام ہی کیوں کیا؟ مجھے تو ابھی تک یقین نہیں آرہا ہے کہ آپ کڈنیپنگ جیسے گندے کام میں بھی انوالو ہوسکتے ہیں۔"

"سن لیا آفتاب خان!" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "میں نے ابھی تو ارم پر کوئی سختی نہیں کی ہے لیکن ہر گزرنے والا دن اس کے لیے پہلے سے زیادہ برا ہوگا۔ تمہیں یاد ہے؟ تم نے دوسروں کی بیٹیوں کی کیسی کیسی وڈیوز بنائی ہیں؟ اب یہی سب کچھ ارم کے ساتھ بھی ہوگا۔ میں تمہیں تین دن کی مہلت دے رہا ہوں۔ اس دوران میں نور میرے پاس پہنچ جائے، ورنہ تم جانتے ہی ہو کہ اس کے بعد کیا ہوگا؟" میں نے سلسلہ منقطع کردیا اور وہ سم نکال کر سیل فون میں دوبارہ

اپنی سم لگالی۔

"انکل! آپ نے تو کہا تھا کہ مجھے آپ سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا لیکن آپ......" ارم بلک بلک کر رونے لگی۔

"وہ تو میں نے تمہارے باپ کو دھمکی دی ہے بیٹا!" میں نے کہا۔ "تم تو بہت اچھی بیٹی ہو، میں تمہارے ساتھ زیادتی کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔"

ارم نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھ لیے اور معصومیت سے میری طرف دیکھنے لگی۔ "انکل! تین دن بعد آپ مجھے گھر جانے دیں گے نا؟" اس نے بچوں کی طرح پوچھا۔

"ہاں بیٹا!" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ "اگر تمہارے پاپا نے نور کو میرے حوالے کردیا تو میں تمہیں ضرور جانے دوں گا۔ ویسے تمہیں یہاں کسی بھی قسم کی تکلیف نہیں ہوگی۔ بس تم اس کمرے سے باہر نکلنے کی کوشش مت کرنا۔ ورنہ میرے گارڈز بہت خونخوار اور اجڈ قسم کے لوگ ہیں۔ وہ تم سے کچھ پوچھے بغیر گولی ماردیں گے۔"

"انکل! کیا آپ واقعی نواب ہیں؟" اس نے معصومیت سے پوچھا۔

"کیا میں شکل سے گھسیارا لگتا ہوں؟" میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"آپ تو بہت ڈیشنگ پرسنالٹی کے مالک ہیں۔ میرے ذہن میں کسی نواب کا امیج کچھ اور تھا۔"

"مثلاً کہ وہ شلوار اور شیروانی پہنتا ہوگا، سر پر کلف لگی ہوئی طرح والی پگ ہوگی۔"

خوف زدہ ہونے کے باوجود ارم ہنسنے لگی۔ "ہاں، میرے ذہن میں کسی نواب کا ایسا ہی امیج تھا۔ آپ تو نواب سے زیادہ......"

"میونسپل کارپوریشن کے کلرک لگتے ہیں۔" اچانک راجا کی آواز آئی۔ وہ بہت خاموشی سے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آگیا تھا۔

ارم نے چونک کر راجا کی طرف دیکھا۔ پھر وہ سہمے ہوئے انداز میں مجھے دیکھنے لگی۔

"تم یہاں آرام سے رہو۔ بس باہر نکلنے کی کوشش مت کرنا۔" میں نے بلند آواز میں احمد شاہ کو پکارا۔ "احمد شاہ!"

احمد شاہ فوراً ہی کمرے میں آگیا۔ "یس سر!"

"دیکھو، یہ ہماری مہمان ہیں لیکن اگر یہ اس کمرے سے باہر نکلنے کی کوشش کریں تو انہیں بلاجھجک گولی ماردینا۔ دوسرے گارڈز کو بھی بتادو اور کتے تو کھلے ہوئے ہیں نا!"

"یس سر!" احمد شاہ نے جواب دیا۔ "چاروں کتے کھلے ہوئے ہیں۔"

میرے لہجے میں کچھ ایسی سفاکی تھی کہ ارم کا چہرہ کورے لٹھے کی طرح سفید ہوگیا۔ میں نے راجا کو کمرے سے باہر نکلنے کا اشارہ کیا اور خود بھی باہر آگیا۔ احمد شاہ پہلے ہی کمرے سے جاچکا تھا۔

"یہ کیسے پکڑ لایا ٹھیکے پتر؟" راجا نے پوچھا۔

"میں نے تجھے بتایا تو تھا کہ اس کے باپ نے نور کو اغوا کرایا ہے۔"

"تو نے یہ بات مجھے کب بتائی تھی؟" راجا نے کہا۔ "ہوسکتا ہے بتائی ہو لیکن آفتاب خان کوئی معمولی آدمی نہیں ہے۔ وہ زمین آسمان ایک کردے گا، اپنی بیٹی کے لیے کنوؤں میں جال ڈلوادے گا۔"

وہ الٹا لٹک جائے۔" میں نے کہا۔ "لیکن وہ جب تک نور کو واپس نہیں کرے گا۔ اس کی بیٹی اسے نہیں ملے گی۔"

"ٹھیکے پتر! تیری ذہنیت بھی غیر محسوس طریقے پر روایتی جاگیرداروں اور نوابوں والی نہیں ہوتی جارہی ہے؟"

"میں نے کتنے ہاریوں کے گھر جلوائے، کتنی لڑکیاں اٹھا کرلایا، مخالفین سے نمٹنے کے لیے کتنے ڈاکو پالے ہیں اور کتنے مخالفین کو قتل کرایا ہے؟" میں نے بھنا کر کہا۔

"تو، تو واقعی برا مان گیا۔" راجا نے کہا، پھر سنجیدہ ہوکر بولا۔ "شاکر تو مارا ہی گیا ہے، مجھے اب اکبر سندھو کی فکر پیدا ہوگئی ہے۔"

"اس قسم کے لوگ اسی طرح مرتے ہیں، کبھی گینگ وار میں، کبھی پولیس مقابلے میں اور کبھی اپنے ہی بندوں کے ہاتھوں۔"

"ٹھیکے پتر!" راجا نے کہا۔ "تو آج کل کچھ زیادہ ہی قنوطی نہیں ہوگیا ہے؟"

"خدانخواستہ اگر شہناز اس طرح اغوا ہوجائے تو تو گلیوں کی خاک چھانتا پھرے گا، پاگل ہوجائے گا۔ میں تو صرف قنوطی ہوا ہوں۔" میں نے کہا۔

اسی وقت مجھے لاؤنج میں نیلم نظر آئی۔ وہ شاید ابھی ابھی نہا کر آئی تھی۔ اس کے بالوں سے اب بھی پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے اور وہ پہلے سے زیادہ نکھری نکھری لگ رہی تھی۔ اس نے فیشن ایبل اور پڑھی لکھی لڑکیوں کی طرح لمبی قمیص اور ٹراؤزر پہن رکھا تھا۔

"یار یہ نیلم......"

اگر تو نے فضول قسم کی بکواس کی تو میں جان سے

ماردوں گا۔‘‘ میں نے راجا کے تیور دیکھ کر کہا، پھر میں نے نیلم سے کہا۔ ’’نیلم! اس کوٹھی میں ایک لڑکی بھی ہے۔ تم اس کی ہر ضرورت کا خیال رکھو گی۔ وہ جس چیز کی بھی فرمائش کرے، اسے پورا کر دینا۔ یہ سمجھ لو، وہ ہماری مہمان ہے۔ ہاں، اس سے بات کرنے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ تمھیں کریدنے کی کوشش کرے گی۔‘‘

نیلم نے سر جھکا کر کہا۔ ’’جی صاب جی!‘‘ پھر وہ چونک کر بولی۔ ’’وہ لڑکی کس کمرے میں ہے سر؟‘‘

’’اس کے بارے میں تمھیں احمد شاہ بتا دے گا۔‘‘

نیلم کے جانے کے بعد راجا نے چونک کر کہا۔ ’’ناصر کیا چلا گیا؟‘‘

’’ناصر ابھی دو گھنٹے پہلے تک تو یہیں تھا۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’ممکن ہے اپنے کسی کام سے گیا ہو۔‘‘

’’فیکے پتر!‘‘ راجا نے سنجیدگی سے کہا۔ ’’اب تیرا دشمن صرف رانا زوہیب ہی نہیں بلکہ دلاور اور مسکین شاہ بھی ہے۔ ان لوگوں کے بے شمار ساتھی بھی ہوں گے، پھر اب تو نے آفتاب خان سے بھی پنگا لے لیا ہے، تیرا یہ حسین مکھڑا سب ہی پہچانتے ہیں۔‘‘

’’تو میں اپنے چہرے کو کیا کروں؟‘‘ میں نے جھنجلا کر کہا۔ ’’کیا برقع پہننا شروع کر دوں یا پھر یہ چہرہ اتار کر دوسرا چہرہ لگا لوں؟‘‘

پورچ میں گاڑی رکنے کی آواز آئی تو راجا کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

’’میرے خیال میں ناصر آ گیا؟‘‘ راجا نے کہا۔

دوسرے ہی لمحے ناصر لاؤنج میں داخل ہوا اور مجھ سے بولا۔ ’’کیا رہا سر! اس اکبر سندھو نے دھوکا تو نہیں دے دیا؟‘‘

’’وہ زبان کا کھرا آدمی ہے۔ آفتاب خان کی بیٹی یہاں موجود ہے۔‘‘ پھر میں نے اسے اپنی اور آفتاب خان کی گفتگو کے بارے میں بتایا۔

’’آفتاب خان سمجھ گیا ہوگا کہ آپ ہی نواب رفیق شیرازی ہیں۔ آپ باہر نکلیں گے تو اس کے آدمی، دلاور یا مسکین شاہ کے آدمی آپ کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک آ جائیں گے۔‘‘

’’یہی بات راجا کہہ رہا ہے۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’اب میں اپنے اس چہرے کو کیا کروں؟ کیا پلاسٹک سرجری کروا لوں؟‘‘

’’اس کا بھی حل ہے۔‘‘ ناصر مسکرا کر بولا۔ ’’فلم انڈسٹری کا ایک ماہر میک اپ مین میرا جاننے والا ہے۔ آج کل پاکستان میں فلم انڈسٹری تو رہی نہیں ہے۔ وہ بے چارہ آج کل بہت کسمپرسی کی زندگی گزار رہا ہے لیکن اپنے فن میں ماہر ہے۔‘‘

’’تو کیا وہ میرے چہرے کی جگہ امیتابھ کا چہرہ لگا دے گا؟‘‘ میں نے ہنس کر پوچھا۔

’’چہرہ تو آپ ہی کا ہوگا لیکن وہ اس میں ایسی تبدیلیاں کرے گا کہ آپ خود بھی اپنے آپ کو نہیں پہچان پائیں گے۔‘‘

’’اگر ایسا ہے تو پھر صرف میرا چہرہ بدلنے سے کام نہیں چلے گا۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’یہ راجا جو سائے کی طرح میرے ساتھ رہتا ہے، اسے دیکھ کر لوگ مجھے بھی پہچان جائیں گے۔‘‘

’’راجا کے چہرے میں بھی ترمیم کرنا پڑے گی اور مجھے خود بھی اپنے چہرے کی مرمت کرانا پڑے گی۔ میں بھی کافی عرصے سے آپ کے ساتھ دیکھا جا رہا ہوں۔‘‘

’’تو پھر اسے جلدی بلا لو، ایک تجربہ یہ بھی سہی!‘‘

’’میں ابھی جا کر اسے لے آتا ہوں لیکن میک اپ کے سامان کے لیے اسے کچھ رقم کی ضرورت بھی پڑے گی، پھر وہ ام الخبائث کا بھی رسیا ہے، دو بوتلیں وہ بھی چاہئیں۔‘‘

میں نے جیب سے پرس نکالا اور اس میں سے نوٹ نکالے تو ناصر بولا۔ ’’اتنے اخراجات تو میں بھی کر سکتا ہوں۔ اصل میں میرا اے ٹی ایم کارڈ مشین میں پھنس گیا ہے۔‘‘

’’ایک ہی بات ہے یار!‘‘ میں نے ہزار ہزار کے کئی نوٹ اس کی جیب میں ٹھونستے ہوئے کہا۔

ناصر زیادہ دیر رکا نہیں، وہ ایک کپ چائے پی کر اس ماہر فن کی طرف نکل گیا، جسے میک اپ میں ید طولیٰ حاصل تھا۔

’’فیکے پتر! یہ نوابی وغیرہ چھوڑ، ہم دونوں مل کر ایک جاسوس ایجنسی بنا لیتے ہیں۔‘‘

’’ہاں اگر زندہ بچ گئے تو تیرے مشورے پر ضرور عمل کروں گا۔‘‘

’’نور سے ملے بغیر ہی مر جائے گا۔‘‘ راجا نے کہا۔ ’’پھر وہ تیری یاد میں گائے گی۔ جو وعدہ کیا، وہ نبھانا پڑے گا......‘‘

’’تو بار بار مجھے نور کا طعنہ کیوں دے رہا ہے؟‘‘ میں نے جھنجلا کر پوچھا۔

’’اس لیے کہ آج کل تیرے ذہن پر نور سوار ہے۔ تجھے اس کے علاوہ کچھ سجھائی ہی نہیں دیتا۔‘‘ پھر وہ مسکرا کر بولا۔ ’’یہ جو دنیا میں شاہ جہاں اور تاج محل کی مثال موجود ہے، اس کی حقیقت میں بھی مجھے شبہ ہے۔‘‘

’’تو ٹھہرا صحافی!‘‘ میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ’’تجھے تو

اپنی پیدائش پر بھی شبہ ہو سکتا ہے۔ پھر بھلا شاہ جہاں اور ممتاز محل کیا بیچتے ہیں۔‘‘

ناصر لاؤنج میں داخل ہوا تو ہم دونوں اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

میں اس ماہر فن میک اپ مین کو لے آیا ہوں۔‘‘

’’یار! وہ آدمی اعتبار کا تو ہے نا؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’تو نے اسے ہمارا یہ ٹھکانا بھی دکھا دیا۔‘‘

’’وہ بالکل بے ضرر آدمی ہے۔ اسے خود بھی معلوم نہیں ہوگا کہ اس وقت وہ لاہور کے کس علاقے میں ہے، لاہور میں ہے بھی یا کسی اور شہر میں ہے۔ میں نے اس کے گھر پہنچ کر سب سے پہلے اسے شیمپین کی ایک بوتل پیش کر دی تھی۔ بس بوتل دیکھ کر تو وہ گویا پاگل ہی ہو گیا۔ آدھی بوتل تو اس نے گھر ہی میں چڑھا لی، پھر وہ کچھ بات کرنے کے قابل ہوا۔ آدھی بوتل اس نے گاڑی میں بیٹھنے کے بعد ڈکار لی اور ٹن ہو گیا۔‘‘

’’ابے ایسا آدمی کیا خاک میک اپ کرے گا؟‘‘ راجا نے منہ بنا کر کہا۔

’’یہی تو اس کا کمال ہے۔ جب وہ کام شروع کرتا ہے تو صرف کام کرتا ہے، نشے میں ہو تو مزید اچھا کام کرتا ہے۔ میں نے اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا ہے۔‘‘

’’اسے میرے بیڈ روم میں لے آؤ۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’ڈرائنگ روم میں تو کوئی بھی آ سکتا ہے۔‘‘

☆☆☆

وہ مجہول سا ایک آدمی تھا۔ سر اور ڈاڑھی کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے تھے۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا لیکن آنکھوں میں بھرپور چمک تھی۔ اس نے مجھے شرٹ اور بنیان اتارنے کا حکم دیا۔

’’آرٹسٹ صاحب!‘‘ میں نے ہنس کر کہا۔ ’’مجھے اپنے چہرے میں ردوبدل کرانا ہے، جسم میں نہیں۔‘‘

اس نے ناصر کی طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو، کن جاہلوں میں لائے ہو مجھے؟

’’سوری صاحب، ماہر فن سر!‘‘ ناصر نے جلدی سے کہا۔ ’’ان کی ہدایات پر عمل کیجیے۔‘‘

میں نے اپنی شرٹ اور بنیان اتار دی۔ باہر اچھی خاصی خنکی تھی۔ میرے کمرے میں اگر روم ہیٹر نہ ہوتا تو میری قلفی جم جاتی۔

اس مجہول ماہر فن کا نام سوری تھا۔ اس نے میرے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر یوں جائزہ لیا، جیسے جوتے بیچنے والے دکان دار جوتے کا جائزہ لیتے ہیں۔

مختلف زاویوں سے میرے چہرے کا جائزہ لینے کے بعد اس نے کہا۔ ’’میں آپ کو کچھ تصویریں دکھاتا ہوں۔ ان میں سے جو تصویر آپ پسند کریں گے، میں آپ کو اس جیسا بنا دوں گا۔‘‘

’’کوئی تصویر شہزادہ گلفام کی بھی ہے؟‘‘ میں نے ازراہِ تمسخر پوچھا۔

’’ناصر صاحب! یہ صاحب کام کرانے میں سیریس نہیں ہیں۔‘‘ وہ منہ بنا کر بولا۔ ’’آپ نے فضول میں میرا وقت اور اتنا پیسا ضائع کیا۔ مجھے اجازت دیں۔‘‘

’’ارے ارے...... سر کی تو مذاق کی عادت ہے سوری صاحب! آپ ان کی باتوں کا خیال مت کریں۔ آپ تصویریں دکھائیں۔‘‘

سوری نے اپنے بوسیدہ بیگ سے تصویروں کا ایک بنڈل نکالا۔ اس میں شین کونری، گریگوری پیک اور دلیپ کمار سے لے کر شاہ رخ اور سلمان خان کی تصویریں بھی تھیں۔ اس کے علاوہ مجھ سے ملتی جلتی عام نوجوانوں کی تصویریں بھی تھیں۔ ایک تصویر مجھے پسند آئی۔ میں نے سوری سے کہا۔ ’’یہ تصویر کچھ بہتر ہے۔‘‘

’’ٹھیک ہے۔‘‘ اس نے کہا۔

’’لیکن یہ تصویر ہے کس کی؟ یہ نہ ہو کہ یہ نوجوان پولیس کو مطلوب ہو اور میں باہر نکلتے ہی پکڑا جاؤں؟‘‘

’’ایسا نہیں ہوگا۔‘‘ سوری مسکرایا۔ ’’غور سے دیکھیں، یہ وان ڈیم کی نوجوانی کی تصویر ہے، میں پلاسٹک سرجن تو ہوں نہیں کہ آپ کو بالکل ایسا ہی بنا دوں گا۔ ہاں، کوشش کروں گا کہ آپ کی موجودہ شکل پہچانی نہ جائے۔‘‘

اس نے بوتل اٹھا کر ہونٹوں سے لگائی اور وہسکی کے دو تین گھونٹ پی کر وہ میرے چہرے پر جت گیا۔ اس نے نہ جانے کون کون سی کریمیں اور لوشن میرے چہرے پر ملے۔ ساتھ ساتھ وہ بولتا بھی جا رہا تھا۔ ’’اس لوشن سے شدید جلن ہوتی ہے لیکن یہ میک اپ کم از کم دو مہینے کے لیے پائیدار ہوتا ہے۔ اس قسم کا میک اپ کرتے ہوئے فلم اسٹار محمد علی نے مجھے تھپڑ مار دیا تھا کہ میرا میک اپ کر رہے ہو یا چہرے کی کھال اتار رہے ہو۔‘‘

اس نے میرے بال پہلے بلیچ کیے، پھر انہیں بہت لائٹ براؤن کلر میں ڈائی کیا، ہیئر اسٹائل بدلا، آنکھوں میں گرین کلر کے لینس لگائے، دونوں بازوؤں پر ٹیٹو بنائے اور مجھ سے بولا۔ ’’اگر آپ فرنچ کٹ ڈاڑھی بھی رکھ لیں تو ناصر صاحب بھی آپ کو نہیں پہچان سکیں گے۔ ڈاڑھی تو میں نقلی بھی

لگا سکتا ہوں لیکن اصل ڈاڑھی کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔''

''پھر ڈاڑھی پر بھی وہی شیڈ دینا ہوگا جو بالوں کا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ڈاڑھی کو چھوڑو۔''

''ہاں، یہ تو ہے۔'' اس نے کہا۔ پھر اپنے سامان سے نفیس فریم کا ایک چشمہ نکالا اور مجھے لگادیا۔ ''اب آپ اگر پائپ یا سگار پینا شروع کر دیں تو آپ خود کو بھی نہیں پہچان سکیں گے۔''

اس نے مجھے آئینہ دکھایا تو میں حیران رہ گیا۔ آئینے میں نواب رفیق احمد شیرازی کی جگہ کوئی اور نوجوان تھا جو مقامی سے زیادہ یورپین لگ رہا تھا۔ میں خود بھی اپنے آپ کو نہ پہچان سکا۔ واقعی سوری اپنے فن کا ماہر تھا۔

راجا اور ناصر لاؤنج میں تھے۔ میں نے آزمانے کے لیے خاموشی سے باہر کا رخ کیا تو احمد شاہ نے حیرت سے مجھے دیکھا، پھر اس نے آگے بڑھ کر میرا راستہ روک لیا۔

''آپ کون ہیں مسٹر اور اندر کیسے آئے؟''

''مجھے...... ناصر صاحب سے ملنا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''گیٹ پر کوئی تھا نہیں اس لیے میں مجبوراً اندر آ گیا۔''

''گیٹ پر کوئی موجود نہیں ہے؟'' احمد شاہ نے حیرت سے کہا۔ ''لیکن گیٹ تو بند ہے۔''

''جب میں آیا تو گیٹ کھلا ہوا تھا۔'' میں نے آواز اور لہجہ بدل کر ناگواری سے کہا۔ ''اگر ناصر صاحب یا نواب صاحب ہیں تو آپ میری ملاقات کرا دیں۔ میرا وقت ضائع مت کریں۔''

''آیئے، میں آپ کو ناصر صاحب سے ملوا دوں۔'' احمد شاہ میرے پر اعتماد لہجے سے کچھ نرم پڑ گیا۔

''ناصر صاحب! کوئی صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں؟'' احمد شاہ نے کہا۔

ناصر نے بہ غور میرا جائزہ لیا، پھر الجھ کر بولا۔ ''جی فرمایئے؟''

''مجھے آصف صاحب نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔''

''کون آصف؟'' ناصر نے ذہن پر زور دینے کی کوشش کی۔

''آپ کیسے صحافی ہیں، آپ کے آصف کو نہیں جانتے؟'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''کے آصف؟'' راجا نے حیرت سے دہرایا۔ ''وہ مغل اعظم والے؟''

''واہ! آپ کی معلومات تو بہت اچھی ہیں۔'' میں نے توصیفی انداز میں کہا۔

''آصف صاحب خیریت سے ہیں، سنا ہے وہاں بھی کوئی فلم بنا رہے ہیں؟'' راجا نے اپنے خیال میں مجھے گھمانا شروع کر دیا۔ ''آپ یہاں کس فلائٹ سے آئے ہیں، کیا عالم بالا کی فلائٹس شروع ہو چکی ہیں؟''

''زیادہ بذلہ سنج بننے کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے لہجہ بدل کر کہا۔ ''وہ لڑکی کہاں ہے جسے تم لوگ اٹھا لائے ہو؟'' یہ کہتے ہوئے میں نے پھرتی سے اپنا ریوالور نکال لیا۔ ''نو!'' میں نے کرخت لہجے میں کہا۔ ''حرکت مت کرنا ورنہ کھوپڑی اڑا دوں گا۔'' میں نے ناصر کو مخاطب کیا جو غیر محسوس انداز میں ریوالور نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اچانک میرے دائیں شانے پر اتنی زوردار ضرب لگی کہ چند لمحے کے لیے تو میرا ہاتھ بے جان ہو کر پہلو میں جھول گیا۔ میں خود سامنے والی دیوار سے ٹکرا گیا اور میرا ریوالور میرے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا۔

''اب اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا۔'' احمد شاہ نے کرخت لہجے میں کہا۔ ''ورنہ یہاں سے سیدھا آصف صاحب کے پاس پہنچا دوں گا۔''

''اگر تم اتنے ہی بڑے سورما ہو تو اس کھلونے کے بغیر مجھ پہ قابو پا کر دکھاؤ، پھر میں بتاؤں گا کہ کون کسے کہاں بھیجتا ہے۔''

احمد شاہ کے ذہن پر بھی اس وقت شاید دھند چھا گئی تھی۔ اس نے اپنا ریوالور ایک طرف اچھال دیا اور مجھ سے بولا۔ ''آؤ!''

میں دیوار سے ٹکرانے کے بعد اس کا سہارا لیے کھڑا تھا۔ میرا دایاں ہاتھ ابھی تک شل تھا لیکن تکلیف میں اب وہ پہلی سی شدت نہیں تھی۔

میں نے اچانک اس کے سینے پر فلائنگ کک ماری اور الٹی قلابازی کھا کر پھر اس کے مقابل آ گیا۔

احمد شاہ نے میری ناف پر لات مارنے کی کوشش کی لیکن میں نے تھوڑا سا ترچھا ہو کر خود کو اس کے داؤ سے بچایا اور اس کا پیر ٹخنے کے پاس سے پکڑ کر ہلکا سا جھٹکا دیا۔ اگر زوردار جھٹکا دیتا تو اس کے پیر کا جوڑ نکل جاتا۔

احمد شاہ نے دوسرے پیر سے میرے چہرے پر لات مارنے کی کوشش کی۔ میں اگر عین وقت پر پیچھے کی طرف نہ جھکتا تو میرے جبڑے کے ساتھ ساتھ میرے کئی دانت بھی ٹوٹ جاتے۔

میں نے جھپٹ کر اس کی کلائی جوڑ کے پاس سے پکڑ لی۔ وہ اگر زور لگاتا تو اس کا جوڑ نکل جاتا۔ اس نے حیرت سے مجھے دیکھا، پھر آہستہ سے بولا۔ ''سوری سر! میں نے آپ پر ہاتھ اٹھایا۔''

''بس بہت ہو گیا۔'' ناصر نے اچانک ریوالور نکال لیا۔ ''پیچھے ہٹو۔'' اس نے غرا کر کہا۔

''فائر مت کیجیے گا ناصر صاحب!'' احمد شاہ نے چیخ کر کہا۔ ''یہ نواب صاحب ہیں۔''

''تم گھاس کھا گئے ہو احمد شاہ!'' ناصر نے جھلا کر کہا۔

''گھاس احمد شاہ نے نہیں کھائی بلکہ تم لوگوں نے کھائی ہے۔'' میں نے اپنی اصل آواز میں کہا۔

سوری لاؤنج میں داخل ہوا اور فخریہ انداز میں بولا۔ ''کہیے سر، کیسا میک اپ کیا ہے؟''

''حیرت انگیز!'' ناصر نے کہا، پھر وہ احمد شاہ سے مخاطب ہوا۔ ''احمد شاہ! تم نے رفیق صاحب کو کیسے پہچانا؟''

''سر کی فلائنگ کک بہت منفرد ہے۔ مجھے اسی وقت شبہ ہوا تھا، جب سر نے مجھے فلائنگ کک ماری تھی، یقین مجھے اس وقت آیا جب انہوں نے میری کلائی جوڑ کے پاس سے پکڑ لی۔ یہ ان کا خاص اسٹائل ہے۔ مجھے آج خود تو اس کا تجربہ پہلی بار ہوا ہے لیکن میں اس سے قبل بھی انہیں یہ داؤ استعمال کرتے دیکھ چکا ہوں۔''

''ویسے سوری بھی کمال کا آدمی ہے۔ فیکے پتر! اب تو تجھے فیکے پتر کہتے ہوئے بھی مجھے سوچنا پڑے گا۔''

''تو سوچتا رہ۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''ناصر! تم بھی اپنا حلیہ کچھ بدلوا لو۔''

پھر سوری نے ناصر اور راجا کا حلیہ بھی اس طرح بدلا کہ وہ بھی پہچانے نہیں جا رہے تھے۔

ناصر اپنے حلیے سے کسی ملٹی نیشنل کمپنی کا ڈائریکٹر لگ رہا تھا۔ راجا کو سوری نے کالج کا کھلنڈرا لڑکا بنا دیا تھا۔

''یہ بتاؤ کہ یہ میک اپ کب تک برقرار رہے گا؟'' ہم نے سوری سے پوچھا۔

''یہ کم سے کم ایک مہینے تک تو اسی طرح رہے گا۔ آپ کے بالوں کا اسٹائل، ان کا رنگ اور جلد کا رنگ ایک مہینے سے پہلے نہیں ختم ہوگا۔ آپ چاہیں تو اپنے طور پر بھی بالوں کا وہ اسٹائل زیادہ دن تک برقرار رکھ سکتے ہیں۔ میں کچھ کریمیں اور لوشنز آپ کو دے جاؤں گا۔ انہیں اپنے چہرے اور جسم کے کھلے ہوئے حصوں پر لگاتے رہیے گا۔ ویسے آپ کی قدرتی رنگت بھی اس سے زیادہ مختلف نہیں ہے اس لیے کچھ زیادہ فرق نہیں پڑے گا۔ بال رنگنے کے لیے میں کلر بھی دے دوں گا۔ راجا صاحب اور ناصر صاحب کو بھی ہیئر کلر کی

ضرورت پڑے گی۔''

میں نے سوری کو بیس ہزار روپے دیے تو وہ خوش ہو گیا اور بولا۔ ''جب بھی میری ضرورت پڑے، مجھے بلوا لیجیے گا۔ ہاں، ایک بوتل میں وہ محلول بھی ہے جس سے فوری طور پر یہ میک اپ ختم ہو سکتا ہے۔''

''تم نے کیا، کیا ہے؟'' راجا نے آئینہ دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں نے صرف مختلف رنگوں کے ہلکے اور گہرے شیڈز دیے ہیں۔ اصل کمال ان ہی شیڈز کا ہے۔ بس یہی میرا فن ہے۔''

میں نے ناصر کو اشارہ کیا کہ سوری کو شراب پلاؤ تاکہ یہ یہاں سے واپسی پر ہوش و حواس میں نہ رہے۔

ناصر نے اسے لاؤنج میں بٹھا کر ایک مرتبہ پھر شیمپین کی بوتل اس کے حوالے کر دی۔

تھوڑی دیر بعد وہ کائنات کے مسائل پر گفتگو کرنے لگا۔ انسان کے اس دنیا میں آنے کا مقصد معلوم کرنے لگا اور کسی فلاسفر کی طرح نیم باز آنکھوں سے ہمیں دیکھنے لگا۔

ناصر نے اسے سہارا دے کر گاڑی میں بٹھایا اور اسے لے کر روانہ ہو گیا۔

ابھی تک غنی، نیلم اور اس مالی نے مجھے اس حلیے میں نہیں دیکھا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ غنی بھی کوئی ہنگامہ کھڑا کر دے۔ میں نے خود ہی اسے دن میں سونے کی اجازت دی تھی کیونکہ وہ رات رات بھر جاگ کر پوری کوٹھی کی نگرانی کرتا تھا۔

نیلم اچانک ہی لاؤنج میں آ گئی۔ وہ مجھے اور راجا کو دیکھ کر ٹھٹکی، پھر فوراً ہی سنبھل کر بولی۔ ''کون ہیں آپ لوگ؟''

''ہم نواب صاحب کے مہمان ہیں۔'' راجا نے کہا۔

''نواب صاحب کہاں ہیں؟'' نیلم نے پوچھا اور ہمارے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ ''اور آپ اندر کب آئے۔ نہ دروازے کی گھنٹی بجی، نہ مجھے گیٹ کھلنے کی آواز آئی۔''

''آپ شاید نواب صاحب کی بیگم ہیں؟'' راجا نے کہا۔

نیلم نے جھک کر اچانک اپنی پنڈلی پر بندھا ہوا ریوالور نکال لیا اور سخت لہجے میں بولی۔ ''کون ہیں آپ لوگ اور یہاں لاؤنج میں کیا کر رہے ہیں؟ نواب صاحب اپنے مہمانوں کو ہمیشہ ڈرائنگ روم میں بٹھاتے ہیں۔''

''فائر مت کر دینا نیلم!'' میں نے جلدی سے اپنی اصلی آواز میں کہا۔

وہ چونک کر مجھے گھورنے لگی۔ ''صاحب جی...... آپ ...... یہ...... آپ نے......''

''دشمنوں سے بچنے کے لیے ہم نے فوری طور پر یہ حلیہ بدلا ہے۔ ناصر بھی بدلے ہوئے حلیے میں ہے۔''

مجھے خوشی ہوئی تھی کہ نیلم عام لڑکیوں کی طرح نازک اور چھوئی موئی نہیں تھی۔ وہ خطرے سے نمٹنا بھی جانتی تھی۔ اس کی جگہ اگر ریشم ہوتی تو شاید چیخ مار کے بھاگ جاتی۔

میں نے اس سے کہا کہ غنی کو بھی جا کر بتا دو ورنہ ممکن ہے وہ بے خبری میں ہم پر حملہ کر دے۔

''ہاں، ارم کا کیا حال ہے؟''

''صاب جی! وہ تو جب سے آئی ہے روئے جا رہی ہے۔ وہ بار بار یہی کہہ رہی ہے کہ میرے باپ کے کیے کی سزا مجھے کیوں دے رہے ہو؟''

''اس سے کہنا کہ سزا تو ابھی شروع ہی نہیں ہوئی ہے، سزا تو اسے اس وقت ملے گی جب اس کے باپ کو دی ہوئی تین دن کی مہلت ختم ہو جائے گی۔''

نیلم نے غنی کو بھی ہمارے بدلے ہوئے حلیوں کے بارے میں بتا دیا تھا۔ ناصر اور غنی دونوں ایک ساتھ ہی ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوئے۔

میں نے نیلم سے کافی لانے کو کہا تھا۔ وہ ہم سب کے لیے کافی کے مگ لے آئی تھی۔

غنی بہت غور سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔

ناصر کافی کا مگ اٹھاتے ہوئے کھنکارا تو غنی ہنس کر بولا۔ ''ناصر صاحب کو تو میں پہچان گیا ہوں۔''

''فیکے پتر! یہ اس نے کیسا میک اپ کیا ہے؟''

غنی ہنسنے لگا پھر بولا۔ ''راجا صاحب میک اپ واقعی لاجواب ہے لیکن آپ کو فیکے پتر چھوڑنا پڑے گا۔''

''اوئے اس کے بغیر تو اس پر اثر ہی نہیں ہوتا۔'' راجا نے کہا۔

''پھر آپ یہ احتیاط کریں کہ دوسروں کے سامنے سر کو فیکے پتر کہہ کر مخاطب نہ کریں۔''

میں نے ایک پرانا سیل فون نکالا۔ اس میں ایک دوسری سم لگائی اور آفتاب خان کا نمبر ڈائل کر دیا۔

اس نے پہلی ہی گھنٹی میں ریسیور اٹھا لیا اور بولا۔

''میری بات پوری سنے بغیر فون بند مت کرنا۔''

مجھے مذاق سوجھا، میں نے کہا۔ ''ماجد صاحب! یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں، آپ نے ابھی تک جوتوں کا اسٹاک بھی نہیں بھیجا۔''

''سوری، میرے خیال میں رانگ نمبر مل گیا ہے۔''

میں نے دس منٹ بعد پھر آفتاب خان کو اسی سم سے فون کیا۔

''یار! میں نے آپ کو بتایا تو تھا کہ یہ رانگ نمبر ہے۔'' آفتاب خان جھنجلا کر بولا۔

''لیکن یہ رانگ نمبر نہیں ہے۔'' میں نے اپنی اصل آواز میں کہا۔

''دیکھو، تمہیں خدا کا واسطہ! میری بیٹی پر رحم کرو۔ وہ تو خوف ہی سے مر جائے گی۔''

''تم نے کبھی دوسروں کی بہنوں اور بیٹیوں کا خیال کیا ہے آفتاب خان؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''تمہارے جرائم کی فہرست تو بہت لمبی ہے!'' میں نے کہا۔ ''لیکن فی الحال مجھے صرف نور چاہیے ورنہ اپنی بیٹی کو بھول جاؤ۔''

''تم کیا ست بدھائی میں ہو؟'' آفتاب خان نے سرسری انداز میں پوچھا۔

''میں ہڑپہ کے کھنڈرات میں ہوں۔'' میں نے تضحیک آمیز لہجے میں کہا۔ ''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میں کہاں ہوں۔ تم بھی یہ اطمینان رکھو کہ دو دن کے لیے تمہاری بیٹی مکمل محفوظ ہے۔''

''تم نے تو مجھے تین دن کا وقت دیا تھا؟''

''اس میں سے ایک دن تو گزر چکا ہے۔'' میں نے کہا۔

''دیکھو، میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میرے ہاتھ میں اب کچھ نہیں ہے۔'' آفتاب خان نے لجاجت سے کہا۔

''لیکن میرے ہاتھ میں بہت کچھ ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

''یار! اس لڑکی کو ہم کب تک قید رکھیں، فیکے پتر؟'' راجا نے کہا۔

''جب تک آفتاب خان، نور کو ہمارے حوالے نہیں کر دیتا۔ وہ اتنا بے بس نہیں ہے جتنا ظاہر کر رہا ہے۔ وہ نور کو واپس لانے کے لیے اپنی جان پر کھیل جائے گا۔''

اچانک سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی، یہ میری رنگ ٹون نہیں تھی۔

ناصر نے جیب سے سیل فون نکالا اور بولا۔ ''ہیلو!...... وعلیکم السلام!...... ہاں، ابھی میں لاہور ہی میں ہوں...... کیا؟ اچھا کب......؟...... تم نے خود اپنی آنکھوں سے اسے دیکھا ہے......؟ اچھا...... اچھا...... ہاں، تمہارے کام کے لیے میں نے کہہ دیا ہے، بس دو چار دن میں ہو جائے گا۔ خدا حافظ؟''

''کون تھا؟'' راجا نے پوچھا۔

''میرے اخبار کا ایک جونیئر صحافی تھا۔'' ناصر نے کہا۔ ''وہ بتا رہا تھا کہ بیرسٹر سرور ڈھلون واپس آ گیا ہے۔''

''لیکن وہ تو کئی ہفتے کے دورے پر گیا تھا۔'' راجا نے کہا۔

''او یار! سیدھی سی بات ہے۔'' میں نے کہا۔ ''آفتاب خان نے اس سے کہا ہوگا کہ اب میدان صاف ہے، تم واپس آ جاؤ۔ یوں بھی وہ زیادہ دن باہر نہیں رہ سکتا تھا۔''

''پھر کیا خیال ہے، اس وکیل سے نمٹ لیا جائے؟'' ناصر نے کہا۔

''تم تو ہم سے بھی دو قدم آگے چل رہے ہو۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''پہلے اس کا گھر معلوم کرنا پڑے گا۔ اس کے معمولات پر نظر رکھنا ہوگی۔ پھر اس سے کچھ پوچھا جا سکتا ہے۔''

''وہ سب میں کر چکا ہوں۔'' ناصر نے کہا۔ ''وکیل شادمان ٹاؤن میں رہتا ہے۔ کورٹ سے وہ کچھ دیر کے لیے گھر جاتا ہے۔ کھانا وغیرہ کھانے اور آرام کرنے کے بعد وہ اپنے آفس چلا جاتا ہے۔ اس کے آفس میں تین جونیئر وکیل، ایک ٹائپسٹ اور ایک ریکارڈ کیپر ہے۔ ٹائپسٹ، استقبالیہ کاؤنٹر پر بیٹھتی ہے اور وہی سرور ڈھلون کے کلائنٹس کو ملاقات کا وقت دیتی ہے۔''

اس کا جملہ پورا ہوا ہی تھا کہ میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے اسکرین پر نام دیکھا تو سوشی کا نام دیکھ کر چونک اٹھا۔ ''ہیلو!'' میں نے کہا۔

''سر، میں کب سے میڈم نور کا انتظار کر رہی ہوں۔ وہ کیا ابھی تک وہاں سے روانہ نہیں ہوئیں؟''

''سوشی! نور کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی ہے۔ وہ اس وقت اسپتال میں ہے۔ میں خود اس کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔''

''سر، یہ تو بہت بڑا پرابلم ہو گیا۔ اسٹیٹ ایجنٹ بھی اب ارنسٹ مینشن خالی کرنے کا تقاضا شروع کر دے گا۔ میں اس سے کیا کہوں؟''

''میں ایسا کرتا ہوں، پاور آف اٹارنی دے کر راجا کو لندن بھیج دیتا ہوں۔ وہ میری طرف سے تمام ڈیل کرے

گا۔"

"میڈم کی طبیعت کیا بہت زیادہ خراب ہے؟" سوشی نے فکرمندی سے پوچھا۔ "انہیں ہوا کیا ہے؟"

"کوئی وائرل انفیکشن ہے۔ فی الحال تو ان کی حالت خطرے سے باہر ہے لیکن وہ آئی سی یو میں ہیں۔" میں نے کہا۔ مجھے سوشی جیسی مخلص لڑکی سے جھوٹ بولتے ہوئے... شرمندگی ہو رہی تھی۔

"تو پھر آپ...... لیکن میڈم کو اس حال میں چھوڑ کر آپ بھی کیسے آ سکتے ہیں؟"

"تم فکر مت کرو سوشی!" میں نے کہا۔ "فوری نوعیت کے تمام مسائل راجا سنبھال لے گا۔ میں بھی پہلی فرصت میں لندن آنے کی کوشش کروں گا۔"

"سر، میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا ہے۔" سوشی نے بے چارگی سے کہا۔

"تم جس طرح کام چلا رہی ہو، چلاتی رہو۔ اپنے کلائنٹس کو بھی یہ بتا دو کہ میڈم بیمار ہیں اس لیے فوری طور پر ان کا آنا ممکن نہیں ہے۔ میں کل ہی راجا کو بھیج دیتا ہوں۔ اس سے تمہیں بھی کچھ ریلیف مل جائے گا۔ او کے، ڈونٹ وری بے بی! سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ بائے!" میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

"فیکے پتر! تو نے یہ فیصلہ کیسے کر لیا کہ میں فوری طور پر لندن چلا جاؤں گا؟" راجا نے کہا۔

"تو نے پہلے بھی نور اور سوشی کے ساتھ وہاں کام کیا ہے۔ کام کی نوعیت کو تو، تو بھی سمجھتا ہی ہے۔"

"چل اب تو نے کہہ ہی دیا ہے تو مجھے تیری بات تو رکھنا ہی ہوگی۔"

"بڑی نوازش ہوگی آپ کی!" میں نے کہا۔ "میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔"

"اس سے پہلے کے تو سارے احسان تو بھول گیا۔" راجا نے مجھے چڑانے والے انداز میں کہا۔ "حالانکہ ہر موقع پر تو نے یہی کہا تھا کہ یہ احسان میں زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔"

"راجا! تجھ میں کسی پھپھّر، اسی سالہ بڑی بی کی روح سما گئی ہے کیا؟ میں محسوس کر رہا ہوں کہ تو ہر بات میں طنز اور طعنے کی گنجائش نکال لیتا ہے۔"

"تو تو نواب بننے کے بعد ہر بات بھول جاتا ہے۔ انسان کو اپنا ماضی کبھی نہیں بھولنا چاہیے۔ محمود غزنوی کا غلام ایاز، وہی ایاز جس کے لیے علامہ اقبال نے کہا ہے کہ ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز! وہ اپنا غلامی کے دور کا لباس بہت سنبھال کر رکھتا تھا اور وقتاً فوقتاً اسے دیکھ کر اپنے نفس کو مارا کرتا تھا۔"

"میں نفس کے بجائے بندے کو مارنے کا قائل ہوں۔ ڈر اس وقت سے جب میں تیری گردن مروڑ دوں۔"

"بات طے ہو گئی۔" راجا نے منہ بنا کر کہا۔ "جب تو نے فیصلہ کر لیا ہے فیکے پتر کہ مجھے لندن جانا ہے تو پھر جانا ہے۔ پاسپورٹ پر ملٹی پل ویزا ہے، بس مجھے لندن کی سیٹ کنفرم کرانا ہو گی۔"

اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اسکرین پر کوئی اجنبی نمبر تھا۔ میں نے پہلے تو اس کال کو نظر انداز کرنا چاہا، پھر یہ سوچ کر کال ریسیو کر لی کہ مبادا کوئی کام کا فون ہو۔

"ہیلو!" میں نے سیل فون کان سے لگا کر کہا۔

"کیا میں نواب رفیق احمد شیرازی سے بات کر سکتا ہوں۔" دوسری طرف سے کوئی انتہائی مہذب انداز میں بولا۔

"جی فرمائیے، میں رفیق بول رہا ہوں۔"

"رفیق صاحب! ہمارے ایک دوست ہیں آفتاب خان! ان کی بیٹی آپ کی مہمان ہے، اسے اب واپس بھیج دیں۔"

"آپ کون صاحب بول رہے ہیں۔" میں نے پوچھا۔

"میرا نام جان کر کیا کریں گے نواب صاحب، بس آپ ہمارے دوست کی بچی کو گھر پہنچا دیں۔"

"یہی بات آپ آفتاب صاحب سے بھی کر دیں۔" میں نے کہا۔ "میری بھی منگیتر ان کی مہمان ہے، وہ اسے واپس چھوڑ جائیں اور اپنی بیٹی لے جائیں۔"

"نواب صاحب!" دوسری طرف سے بولنے والے کا لہجہ ایک دم درشت ہو گیا۔ "آفتاب کی بیٹی کو تو ہم تلاش کر ہی لیں گے لیکن یہ سمجھ لیں کہ پھر نور آپ کو زندہ نہیں ملے گی۔"

"چلیے یوں ہی سہی۔ اگر نور کو تھوڑی سی خراش بھی آئی تو میں اس لڑکی کے اتنے ٹکڑے کروں گا کہ آفتاب کے لیے سمیٹنا مشکل ہو جائے گا۔"

"آپ مجھے دھمکی دے رہے ہیں؟"

"اس کی ابتدا تو آپ نے کی تھی قبلہ!" میں نے کہا۔ "میں صرف دھمکیاں نہیں دیتا بلکہ اپنے کہے پر عمل بھی کرتا ہوں۔"

"میری بات غور سے سنو جعلی نواب!" بولنے والا تمام ادب آداب بھول گیا۔ "تم نے آفتاب خان کو تین دن کی مہلت دی ہے نا! میں تمہیں بارہ گھنٹے دے رہا ہوں۔ میں

اس دوران میں آفتاب کی بیٹی کو لے جاؤں گا، مجھے روک سکتے ہو تو روک لینا۔"

یہ کہہ کر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

☆☆☆

"کون تھا؟" راجا نے پوچھا۔ ناصر بھی سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"اس نے اپنا نام نہیں بتایا۔" میں نے کہا، پھر انہیں بتایا کہ وہ کس قسم کی دھمکی دے رہا تھا۔ میں اضطراب کے عالم میں ٹہلنے لگا۔ بولنے والا کوئی بھی رہا ہو لیکن اس کے لہجے میں تحکم اور اعتماد کی جھلک تھی۔

"کہیں اسے ہمارے اس ٹھکانے کے بارے میں علم تو نہیں ہو گیا؟" میں نے راجا سے کہا۔ پھر خود ہی بولا۔ "لیکن اگر اسے یہاں کا علم ہوتا تو فون کرنے کے بجائے براہ راست یہاں ہلا بولتا۔ اس نے اندھیرے میں تیر چلایا تھا۔"

میں نے جیب سے سیل فون نکالا اور صوبیدار میجر صاحب کا نمبر ملانے لگا۔

انہوں نے دوسری ہی گھنٹی پر کال ریسیو کر لی۔

"السلام علیکم!" میں نے کہا۔

"وعلیکم السلام!" صوبیدار میجر صاحب نے جواب دیا۔ "خیریت تو ہے رفیق میاں؟"

"خیریت ہے بھی اور نہیں بھی۔" میں نے مبہم سا جواب دیا۔ "آپ حویلی کی سیکیورٹی مزید الرٹ کر دیں۔ حویلی کے باہر لگی ہوئی سرچ لائٹس آن کر دیں اور آپ نے جو کیمرے مختلف جگہ لگوائے ہیں، انہیں بھی چیک کر لیں۔"

"یہ سب انتظام تو اب ہر وقت رہتا ہے۔" انہوں نے کہا۔ "اب کوئی خاص بات ہے؟" انہوں نے الجھ کر پوچھا۔

"خاص بات ہو بھی سکتی ہے۔" میں نے کہا۔ "ابھی تو یہ صرف میرا اندازہ ہے۔"

"حویلی کی سیکیورٹی کی طرف سے تم بے فکر رہو۔ یہاں سے چڑیا کا بچہ بھی اندر نہیں جا سکتا۔"

"صوبیدار میجر صاحب!" میں نے کہا۔ "اگر حویلی پر حملہ ہوا تو بہت بھرپور انداز میں ہو گا۔ حملہ آور دستی بم اور راکٹ لانچر بھی استعمال کر سکتے ہیں۔"

"تم اس کی فکر مت کرو۔" صوبیدار میجر صاحب نے اطمینان سے کہا۔ "وہ لوگ اگر ہماری ریاست کی حدود میں داخل بھی ہوئے تو زندہ بچ کر نہیں جا سکیں گے۔" پھر چونک کر بولے۔ "تم اس وقت کہاں ہو؟"

"میں آپ سے زیادہ دور نہیں ہوں اور ہر طرح سے محفوظ ہوں۔"

پھر رسمی کلمات ادا کرنے کے بعد میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

"فیکے پتر!" راجا نے ہنس کر کہا۔ "نور کے بغیر تو تیرا دماغ خوب چلتا ہے، پھر اس کی موجودگی میں کیوں چل جاتا ہے؟ میں نے خود بھی یہی سوچا تھا کہ ست بدھائی میں سیکیورٹی کو مزید الرٹ کرا دوں۔ وہ لوگ تو یہی سمجھ بیٹھے ہیں نا کہ ہم ست بدھائی کی حویلی میں موجود ہیں۔"

"میرے ذہن میں ایک آئیڈیا ہے۔" میں نے کہا۔ "جنگ کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ دفاع کرنے کے بجائے کبھی کبھی آگے بڑھ کر دشمن پر حملہ کرنا پڑتا ہے۔"

"فیکے پتر! تو کس ملک کی فوج میں کمانڈر رہا تھا؟" راجا نے ہنس کر کہا۔

"وقت اور حالات سب کچھ سکھا دیتے ہیں مہاراجا!" میں نے کہا۔ "کیا تو نے قلم کے علاوہ کبھی کوئی ہتھیار چلایا ہے؟ لیکن اب تجھے قلم کے ساتھ ساتھ ہتھیار بھی چلانا پڑ رہا ہے۔"

"آپ کیا چاہتے ہیں، ہم دلاور پر براہ راست حملہ کر دیں؟" ناصر نے کہا۔

"دلاور جیسے لوگ اتنا آسان شکار نہیں ہوتے۔" میں نے کہا۔ "میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ اس شاہ جی کے دوسرے چمچے کی بھی خبر لے لیں۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ قدوائی......"

"ہاں، میرا یہی مقصد ہے۔ بہ ظاہر وہ شاہ جی کا بے ضرر سا سیاسی کارکن ہے۔ اس قسم کے کارکن کسی بھی سیاسی پارٹی میں ہزاروں کی تعداد میں ہوتے ہیں بلکہ اگر سیاسی پارٹی بڑی ہو تو ان کی تعداد لاکھوں میں پہنچ سکتی ہے۔ یہ شاید پارٹی کے بہت سے عہدے داروں کو بھی معلوم نہ ہو کہ قدوائی شاہ جی کے لیے کیا کام کرتا ہے؟"

"اس کا پتا......"

"اس کا پورا پتا غنی اور احمد شاہ کے پاس موجود ہے۔ وہ ایبٹ روڈ کے عقب میں معمولی سے ایک مکان میں رہتا ہے۔ اس کی وجہ بھی شاید یہی ہے کہ وہ دوسروں کی نظروں میں نہ آئے ورنہ میرا خیال ہے کہ قدوائی لکھ پتی سے کم نہیں ہو گا۔" میں نے کہا۔

"تو پھر قدوائی ہی سے شروعات کرتے ہیں۔" راجا نے کہا۔ "ہم لوگ اسے پوچھ گچھ کے لیے کسی ایسی جگہ لے جائیں گے جہاں اس کی چیخ پکار سننے والا کوئی نہ ہو۔"

اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اسکرین پر پھر کوئی نیا نمبر تھا۔ میں نے بٹن دبا کر کال ریسیو کرلی۔

''ہیلو!''

''بارہ گھنٹے میں سے دو گھنٹے گزر چکے ہیں۔'' وہی مکروہ آواز سنائی دی۔

''اچھا!'' میں نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی، گردوں نے گھڑی عمر کی اک اور بتا دی۔ ویسے تم بھی نوٹ کرلو کہ میری دی ہوئی مہلت میں سے ایک دن گزر چکا ہے۔ اب صرف اڑتالیس گھنٹے باقی ہیں۔''

''تم کیا سمجھتے ہو، ست بدھائی کے بل میں گھس کر تم مجھ سے بچ جاؤ گے؟''

''میں تو تمہاری آمد کا منتظر ہوں۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''اور ہاں، یہ شاکر اور اکبر جیسے چھوٹے موٹے پلے میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ شاکر کا انجام تو تمہارے سامنے ہی ہے، اب اکبر سندھو کی لاش بھی کسی کوڑے کے ڈھیر پر پڑی مل جائے گی۔''

''اپنے قد سے بڑی باتیں مت کرو۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''تم میں اتنی جرأت تو ہے نہیں کہ مجھے اپنا سیل نمبر ہی بتا سکو۔ میرا تو سیل نمبر بھی تمہارے پاس ہے اور پتا بھی۔ تم تو خود کو شیر سمجھتے ہو تو پھر اپنا پتا کیوں نہیں بتا دیتے۔ تم تو ست بدھائی آنے کی جرأت نہیں کرو گے لیکن میں دنیا کے کسی بھی کونے میں تمہاری گردن ناپ لوں گا۔''

''میں صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ بارہ گھنٹے میں سے اب ایک گھنٹا دس منٹ گزر چکے ہیں۔''

''گھڑی میرے پاس بھی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اب تم بارہ گھنٹے بعد اس لڑکی کو لے جانے کے بعد ہی فون کرنا۔'' یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے مختصراً ناصر اور راجا کو اس کال کے بارے میں بتایا۔

''اسے کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔ وہ صرف اندھیرے میں تیر چلا رہا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''چلو، اب ذرا اس قدوائی سے بھی ملاقات کرلیں۔''

ڈرائیونگ سیٹ پر غنی تھا۔ اس کے ساتھ راجا بیٹھا تھا۔ میں اور ناصر عقبی نشست پر تھے۔ احمد شاہ دوسری گاڑی میں ہمارے پیچھے آ رہا تھا۔

غنی نے ایبٹ روڈ کے عقب میں اس مکان کا ایک چکر لگایا اور گاڑی کو ایسی جگہ پارک کر دیا جہاں سے نکلنے میں دشواری نہ ہو۔

میں قدوائی کے مکان کی طرف بڑھا۔ ناصر مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر تھا۔

قدوائی کا مکان پرانی طرز کا بنا ہوا تھا۔ اس نے غالباً حال ہی میں دیواروں اور دروازوں پر پینٹ کرایا تھا۔ دروازے سے ابھی تک پینٹ کی مخصوص بو آ رہی تھی۔

دروازے کی دائیں جانب اطلاعی گھنٹی کا بٹن لگا ہوا تھا۔ میں نے چند لمحے سوچا، پھر گھنٹی کے بٹن پر انگلی رکھ دی۔

اندر کہیں گھنٹی کی آواز پھر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔

کوئی عورت اندر سے بولی۔ ''کون؟''

''میں........ شکور ہوں جی!'' میں نے کہا۔

''قدوائی صاحب گھر میں ہیں تو انہیں ذرا باہر بھیج دیں۔''

''قدوائی صاحب تو گھر میں نہیں ہیں۔'' عورت نے کہا۔

''اچھا، ان سے کہیے گا کہ شکور آیا تھا۔ شاہ جی کا پیغام لے کر۔''

اندر سے کھسر پھسر کی آواز آئی، پھر عورت بولی۔

''بھائی! اگر کوئی ضروری کام ہے تو آپ تھوڑی دیر انتظار کرلیں، قدوائی صاحب بازار تک گئے ہیں، بس آنے ہی والے ہیں۔ میں بیٹھک کھولتی ہوں۔''

فوراً ہی مرکزی دروازے کے ساتھ ہی واقع ایک اور دروازہ کھل گیا اور اسی عورت کی آواز سنائی دی۔ ''شکور بھائی! آپ بیٹھیں۔ قدوائی صاحب بس آ ہی رہے ہوں گے۔''

''میرے پاس وقت بہت کم ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اگر وہ پانچ منٹ میں آگئے تو ٹھیک ہے ورنہ میں چلا جاؤں گا، پھر قدوائی صاحب کو آپ شاہ جی کے پاس ہی بھیج دیجیے گا۔''

دو منٹ سے بھی کم عرصے میں ایک شخص ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ اس کے سر پر لمبے لمبے بال تھے، چہرے پر چھوٹی سی ڈاڑھی بھی تھی، اس کا جسم اکہرا تھا اور وہ اس وقت پان چبا رہا تھا۔ کسی سیاسی پارٹی کے عام کارکن کے برعکس اس کے چہرے پر پژمردگی نہیں تھی بلکہ خوش حالی کا احساس ہوتا تھا۔

اس نے پلکیں جھپکا کر غور سے مجھے دیکھا، پھر بولا۔

''شکور صاحب! میں پہچانا نہیں آپ کو؟''

''مجھے پہچاننے سے زیادہ بہتر یہ ہے کہ آپ شاہ جی کے پیغام پر فوری طور پر عمل کریں۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

''پارٹی میں بے شمار آدمی ہیں، کیا آپ سب کو پہچانتے ہیں؟''

''ارے، ناراض کیوں ہوتے ہیں جناب؟'' وہ ہنس

کر بولا۔ ''میں پارٹی کے تقریباً ہر آدمی کو جانتا ہوں۔''

''آپ اس جان پہچان کے چکر کو چھوڑیے۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''شاہ جی نے فوری طور پر آپ کو بلایا ہے۔ انہیں آپ سے بہت ضروری کام ہے۔''

''شاہ جی نے بلایا ہے؟'' وہ حیرت سے بولا۔ ''لیکن......''

''وقت ضائع مت کریں قدوائی صاحب!'' میں نے کہا۔ ''ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔''

''میں ابھی حاضر ہوا۔'' یہ کہہ کر وہ چھپاک سے اندر داخل ہوگیا۔

وہ پانچ منٹ سے بھی کم عرصے میں تیار ہوگیا۔ اس کے جسم پر اجلا شلوار قمیص اور پیروں میں چمڑے کی قیمتی چپل تھی۔ اس نے شلوار قمیص پر واسکٹ بھی پہن رکھی تھی۔ وہ اپنی پانوں کی ڈبیا جیب میں رکھتے ہوئے میرے ساتھ باہر آ گیا۔

غنی کی نظریں مجھ ہی پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے اسے گاڑی نزدیک لانے کا اشارہ کیا۔

غنی نے فوراً گاڑی اسٹارٹ کی اور اسے لے کر گلی میں آ گیا۔

''بیٹھیے قدوائی صاحب۔'' میں نے اس کے لیے عقبی سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

وہ جھجکتے ہوئے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ میں بھی اس دروازے سے گاڑی میں بیٹھا۔

اچانک دوسری طرف کا دروازہ کھلا اور ناصر گاڑی میں داخل ہوا۔

قدوائی نے چونک کر ناصر کو دیکھا لیکن بولا کچھ نہیں۔ اس کے چہرے پر الجھن کے تاثرات تھے۔

وہ اب میرے اور ناصر کے درمیان بیٹھا تھا۔

قدوائی بہ ظاہر پارٹی کا ایسا عام سا کارکن تھا کہ اگر وہ ڈاکٹر ہمیں اس کے بارے میں نہ بتاتا تو ہمارے فرشتوں کو بھی علم نہ ہوتا کہ یہ آدمی کتنا اہم ہے؟

''شکور بھائی! خیریت تو ہے؟'' قدوائی نے خاموشی سے تنگ آ کر پوچھا۔

''ہاں یار خیریت تو ہے لیکن اس نواب نے ایک مصیبت کھڑی کر رکھی ہے۔ اسے نہ جانے کیسے علم ہوگیا ہے کہ اس کی وڈیو بنانے میں شاہ جی کا ہاتھ ہے۔''

''وہ بہت حرام کا تخم ہے شکور بھائی! دیکھا نہیں تھا، کیسے وہ اس لونڈیا کو نکال کر لے گیا تھا اور جاتے جاتے شاہ جی کے آدمیوں کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔''

''وہ وڈیو اس وقت کہاں ہے؟'' میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔

''کون سی وڈیو؟'' قدوائی چونک کر بولا۔

''اسی نواب اور اس ڈپٹی سیکریٹری کی بیٹی والی وڈیو؟'' میں نے کہا۔

''کون ہو تم؟'' قدوائی ایک دم بدک گیا۔

''میں نے بتایا تو تھا کہ میں شکور ہوں۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

''تم شکور ہو یا غفور!'' قدوائی نے کہا۔ ''لیکن اب مجھے اتنا یقین ہوگیا ہے کہ تمہیں شاہ جی نے نہیں بھیجا ہے۔''

''یہ الہام تمہیں کیسے ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''شاہ جی کسی ایرے غیرے سے ایسی خاص باتیں نہیں کرتا۔''

''میں تمہیں ایرا غیرا نظر آ رہا ہوں؟'' میں نے غرا کر کہا۔ ''آئندہ میرے لیے اس قسم کے الفاظ استعمال کیے تو میں زبان کاٹ کر ہاتھ پر رکھ دوں گا۔''

''تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟'' اس نے باہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''شاہ جی کا بنگلا اس طرف تو نہیں ہے۔''

''خاموشی سے بیٹھو۔'' ناصر نے پہلی دفعہ کہا۔ ''تم بولتے بہت ہو۔''

وہ خاموش ہوگیا لیکن اس کے چہرے پر فکر و تردد کے آثار تھے۔

''میں نے پوچھا تھا کہ نواب اور اس لڑکی کی وڈیو کہاں ہے؟'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔

''اگر تمہیں شاہ جی نے بھیجا ہے تو یہ سوال بھی تم شاہ جی سے کرنا۔'' قدوائی نے جواب دیا۔

''فی الحال تو میں یہ سوال تم سے کر رہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''میں نہیں جانتا۔'' اس نے کہا۔ ''میں وڈیو بنا کر شاہ جی تک پہنچا دیتا ہوں۔''

میں نے گاڑی سے باہر نظر دوڑائی۔ غنی گاڑی کو ماڈل ٹاؤن کے غیر آباد علاقے کی طرف لے گیا تھا۔ وہاں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اکا دکا بنگلے زیر تعمیر تھے۔ کچھ بنگلوں کی تعمیر جاری تھی۔ کچھ بنگلوں کے صرف ڈھانچے کھڑے ہوئے تھے۔

میں نے ایک دم ریوالور نکال کر قدوائی کی کنپٹی پر رکھ دیا۔

''کک...... کیا مطلب؟'' وہ بوکھلا کر بولا۔

''میں نے پوچھا ہے کہ وہ وڈیو فلم کہاں ہے؟''

''م...... میں...... نہیں...... جانتا...... وہ...... شاہ جی کے...... پاس......''

''ٹھیک ہے سر!'' ناصر نے کہا۔ ''اگر اسے کچھ معلوم نہیں تو اس کا فائدہ ہی کیا ہے؟ اسے یہیں کہیں مار کے پھینک دیتے ہیں۔ ہم شاہ جی سے بعد میں اس وڈیو فلم کے بارے میں پوچھ لیں گے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تمہیں شاہ جی نے نہیں بھیجا؟'' قدوائی خوف زدہ لہجے میں بولا۔ وہ کمزور دل کا بزدل سا آدمی تھا۔ ایسے لوگ عموماً بہت سازشی اور مکار ہوتے ہیں لیکن جب جان پر بن جائے تو سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ غنی نے گاڑی اچانک ایک زیر تعمیر عمارت کے اندر لے جا کر روک دی۔ اس بنگلے کا ابھی تک پھاٹک بھی نہیں لگا تھا۔

گاڑی رکتے ہی میں باہر نکلا اور قدوائی کو گریبان سے پکڑ کر باہر گھسیٹ لیا۔ اس کے گھٹنوں میں شدید چوٹ آئی ہوگی کیونکہ میں نے بالکل غیر متوقع طور پر اسے باہر گھسیٹ لیا تھا۔ پھر میں نے اس کا کالر پکڑ کر اسے کھڑا کیا اور گھسیٹتے ہوئے ایک زیر تعمیر کمرے کی طرف چلا۔ کمرے بھی دروازوں اور کھڑکیوں سے محروم تھے۔

''دیکھیے شکور بھائی! آپ میرے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔'' اس نے پان کی پیک نگلتے ہوئے کہا۔

''تم مجھے اس وڈیو فلم کا پتا بتا دو۔ میں تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کروں گا۔''

''م...... میں...... میں......''

''بکری کی طرح سے ممیانا چھوڑو۔'' ناصر نے کہا۔ ''جلدی بتاؤ، وہ وڈیو فلم اور دوسری فلمیں کہاں ہیں؟''

''میں نے وہ فلم شاہ جی کے ایک آدمی نادر کو دی تھی۔'' قدوائی نے کہا۔

''نادر کون؟'' میں نے پوچھا۔

''نادر، آفتاب خان کا خاص آدمی ہے۔ وہ ساری فلمیں آفتاب خان تک پہنچا دیتا ہے۔'' قدوائی نے کہا اور اچانک وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی۔

غنی نے پاؤں اڑا کر گرا دیا۔ وہ ان سریوں پر گرا جو دروازے کے گیٹ کے لیے بنائے جانے والے پلر میں ابھرے ہوئے تھے۔ دوسریے اس کے سینے اور پیٹ کے آر پار ہو گئے۔

مجھے لمحے بھر کو جھرجھری آ گئی۔ کچھ لمحے پہلے ہنستا، کھیلتا ایک آدمی اچانک موت کی اندھی وادیوں میں اتر گیا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں اور وہ بے بسی کی تصویر بنا پڑا تھا۔

ناصر بھی تاسف بھرے انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے جھک کر اس کی نبض دیکھی، پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ ان سریوں کے آر پار ہونے کے بعد کوئی معجزہ ہی اسے بچا سکتا تھا۔

''اس کی جیبوں کی تلاشی لو اور یہاں سے نکل چلو۔'' میں نے غنی سے کہا۔

غنی نے بہت پھرتی سے اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ اس کی جیبوں میں کچھ وزیٹنگ کارڈز، ساڑھے چار ہزار روپے کے کرنسی نوٹ اور ایک سیل فون تھا جو اس وقت آف تھا۔

میں نے وہ چیزیں گاڑی کے ڈیش بورڈ میں رکھیں اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔

دوسرے ہی لمحے ہماری گاڑی واپسی کا سفر تیز رفتاری سے طے کر رہی تھی۔ احمد شاہ سائے کی طرح ہمارے پیچھے لگا ہوا تھا لیکن اتنی مہارت اور احتیاط سے کہ مجھے خود بھی اس تعاقب کا احساس نہیں ہو سکا تھا۔

''واقعات کی تمام کڑیاں گھوم پھر کر آفتاب خان سے جا کر ملتی ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''ہم نے اسے اتنی آسانی سے چھوڑ کر اچھا نہیں کیا۔''

''اس کی بیٹی ہمارے قبضے میں ہے سر!'' غنی نے کہا۔ ''وہ کب تک ہم سے بچا رہے گا۔''

ہمیں اس آپریشن میں مشکل سے چالیس منٹ لگے تھے۔

میں نے گھر پہنچ کر سب سے پہلے ارم کی خبر لی۔ وہ نڈھال سی بیڈ پر پڑی ہوئی تھی۔

مجھے دیکھ کر وہ اچھل کر بیڈ پر بیٹھ گئی۔ ''آپ کون ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے حیرت سے اسے دیکھا، پھر مجھے یاد آ گیا کہ ارم بدلے ہوئے حلیے کی وجہ سے مجھے پہچان نہیں سکی ہے۔

''کیسی ہو ارم بیٹی؟'' میں نے بدلی ہوئی آواز میں پوچھا۔

''وہ انکل کہاں ہیں جو مجھے یہاں لائے تھے؟'' اس نے پوچھا۔

''وہ انکل ایک ضروری کام سے گئے ہیں بیٹا!'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ''لیکن تم ڈرو مت، انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ اس بچی کا خاص خیال رکھنا۔'' میں نے بدلے ہوئے لہجے اور آواز میں کہا۔

''آپ لوگ آخر مجھے گھر کیوں نہیں پہنچا دیتے؟'' وہ رونے لگی۔

''پہنچا دیں گے بیٹا، پہنچا دیں گے۔'' میں نے کہا۔ ''بس دو دن کی بات ہے۔''

''دو دن؟'' اس نے روتے ہوئے کہا۔

''بیٹا! تمہیں یہاں کوئی تکلیف ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''مجھے سب سے بڑی تکلیف یہ ہے کہ میں آپ کی قید میں ہوں۔'' اس نے کہا۔ وہ خاصی ذہین اور حاضر جواب لڑکی تھی۔

''اس کا ذمے دار تمہارا باپ ہے۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''وہ اگر آج نور کو واپس کر دے تو میں آج ہی تمہیں گھر چھوڑ آؤں گا۔ مشکل تو یہ ہے کہ تمہاری ماں بھی تمہارے باپ کے ساتھ برابر کی شریک ہے۔''

''ہاں، مما! بزنس پارٹنر ہیں پاپا کی؟'' اس نے کہا۔

''جانتی ہو تمہارے پاپا کیا کرتے ہیں؟'' میں نے کہا۔

''میں جانتی ہوں۔'' اس نے کہا۔

''بس تم اسی طرح ہم سے کوآپریٹ کرتی رہو۔'' میں نے کہا۔ میں نے جان بوجھ کر تعاون کا لفظ استعمال نہیں کیا تھا ورنہ وہ پھر اس کا مطلب پوچھتی۔

میں ارم کے کمرے سے باہر نکلا تو ناصر نے کہا۔ ''سر! میرا خیال ہے کہ آپ یہاں مزید سیکیورٹی کا بندوبست کر لیں۔ ممکن ہے دلاور کو یہاں کا علم ہو ہی گیا ہو۔''

''یہاں جتنے لوگ ہیں کافی ہیں ناصر!'' میں نے کہا۔ ''میں اب مزید کسی پر اعتبار کر بھی نہیں سکتا۔ ست بدھائی سے لوگوں کو بلانے میں یہ نقصان ہے کہ ممکن ہے ان کے پیچھے پیچھے دلاور یا رانا کے آدمی یہاں تک پہنچ جائیں۔ پھر ست بدھائی میں بھی قابلِ اعتبار آدمیوں کی ضرورت ہے۔''

''ہاں، سر وہ وکیل سرور ڈھلون بھی تو واپس آ گیا ہے۔ اس کا کیا کرنا ہے؟'' ناصر نے کہا۔

''اس وکیل سے بعد میں نمٹیں گے، پہلے میں آفتاب خان سے نمٹ لوں۔''

''سر، ایسا نہ ہو کہ شاہ جی آفتاب خان کو قتل کرا دے۔'' ناصر نے کہا۔ ''اس نے میڈیا کے سامنے شاہ جی پر انتہائی گھٹیا الزامات لگائے ہیں۔''

''شاہ جی اتنا احمق نہیں ہے ناصر!'' میں نے کہا۔ ''اگر آفتاب خان فوری طور پر قتل ہوا تو شاہ جی پر شبہ کیا جائے گا۔ وہ آفتاب خان کو کسی اور طرح خاموش کرنے کی کوشش کرے گا۔ ممکن ہے اس کے خلاف عدالت کا رخ کرے، یہ بھی ممکن ہے کہ ان دونوں کے درمیان ڈیل ہو جائے اور ان کی غلط فہمیاں دور ہو جائیں۔'' پھر میں ہنس کر بولا۔ ''میں خود بھی ایک بار شاہ جی سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں بھی تو دیکھوں کہ وہ کس قسم کا آدمی ہے؟ وہ اگر مجھے پہچانتا بھی ہوگا تو اس حلیے میں نہیں پہچانے گا۔''

میں نے غنی اور احمد شاہ کو تاکید کی کہ یہاں سے ایک لمحے کو بھی نہ ہٹیں اور اس لڑکی کی پوری حفاظت کریں۔

''ہم پوری طرح سے تیار ہیں سر!'' غنی نے کہا۔ ''اگر کسی نے ہماری اجازت کے بغیر بنگلے میں گھسنے کی کوشش کی تو وہ زندہ واپس نہیں جائے گا۔''

''اور لڑکی کی طرف سے آپ بے فکر رہیں۔'' احمد شاہ نے کہا۔ ''اس تک پہنچنے کے لیے آنے والوں کو پہلے ہماری لاشوں پر سے گزرنا پڑے گا۔''

''فلمی ڈائلاگ بولنے سے پرہیز کرو۔'' میں نے کہا اور گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے ناصر اور راجا کو بھی گھر میں چھوڑ دیا تھا اور نیلم کو بھی خطرے سے آگاہ کر دیا تھا۔ مجھے حیرت تو اس بات پر ہوئی تھی کہ نیلم بھی مسلح رہتی تھی۔ اس نے خطرہ دیکھ کر اپنی پنڈلی سے بندھا ہوا ریوالور پلک جھپکتے میں نکال لیا تھا۔ میں نے اسے تاکید کر دی تھی کہ تم زیادہ سے زیادہ لڑکی کے کمرے میں رہنا۔

میں گاڑی لے کر باہر نکل آیا۔ فوری طور پر میں بے مقصد ہی گاڑی دوڑا رہا تھا۔ میں مسکین شاہ سے ملنا چاہتا تھا لیکن اس سے مل کر حاصل کیا ہوتا؟ میں مال روڈ کی طرف مڑا تو ٹریفک جام تھا۔ گاڑیوں کی ایک لمبی قطار لگی ہوئی تھی۔ میں سمجھا کہ یا تو کسی سیاسی پارٹی نے کوئی ریلی نکالی ہے یا پھر لوگ کسی بات پر احتجاج کر رہے ہیں۔ میں نے اپنی گاڑی روکی اور صورت حال معلوم کرنے کے لیے گاڑی سے نیچے اتر گیا۔ میں نے اردگرد کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ دو گاڑیاں آپس میں ٹکرا گئی ہیں اور ان کے مالکان آپس میں بحث و تکرار کر رہے ہیں۔ ایسے موقعے پر ٹریفک پولیس ہمیشہ کی طرح غائب تھی۔

میں نے اکتائے ہوئے انداز میں ادھر ادھر دیکھا۔ واپسی کا راستہ بھی مسدود ہو چکا تھا۔ میری گاڑی کے پیچھے بھی بہت سی گاڑیاں کھڑی تھیں اور ان کے ڈرائیور جاہلوں کی طرح ہارن بجا رہے تھے۔ انہیں کم سے کم یہ تو معلوم کرنا

چاہیے تھا کہ ٹریفک کیوں رکا ہوا ہے؟ میں نے تو بہت سے جاہلوں کو ٹریفک سگنل پر بھی ہارن بجاتے دیکھا تھا۔

اچانک ایک شخص کو دیکھ کر میں بری طرح چونک اٹھا۔ میری آنکھوں میں خوشگوار حیرت تھی۔ وہ فٹ پاتھ پر لوگوں کی بھیڑ سے بچتا ہوا آگے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ شامی تھا، شامی بادشاہ!

میں نے اسے آواز دی۔ ''شامی بادشاہ!''

اس نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ پھر محتاط انداز میں آگے بڑھنے لگا۔

میں نے دوبارہ اسے آواز دی۔ ''شامی!''

اس مرتبہ اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ اس نے حیرت سے مجھے دیکھا، پھر محتاط انداز میں آہستہ آہستہ میری طرف بڑھنے لگا۔

''تم کہاں چلے گئے تھے شامی؟'' میں نے بے تابی سے پوچھا۔

''آپ ہیں کون اور مجھے کیسے جانتے ہیں؟'' شامی نے ناگواری سے کہا۔

مجھے فوراً خیال آ گیا کہ میں اس وقت بدلے ہوئے حلیے میں ہوں۔ شامی بے چارہ مجھے کیسے پہچان سکتا ہے؟

''تم نے مجھے پہچانا نہیں شامی؟'' میں نے ہنس کر کہا۔

شامی نے غور سے مجھے دیکھا، پھر والہانہ انداز میں مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔ ''نواب صاحب! میں آپ کو کیسے بھول سکتا ہوں۔'' اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ''آپ کی آواز سن کر مجھے پہلے ہی شک ہوا تھا لیکن جب دوبارہ آپ نے مجھے مخاطب کیا تو میں نے آپ کی آواز پہچان لی۔'' اس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''یہ...... آپ نے...... حلیہ کیوں بدل رکھا ہے اور اس وقت......''

''لمبی کہانی ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''آؤ گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔''

اس وقت تک دونوں گاڑی والوں کے درمیان تصفیہ ہو چکا تھا یا پولیس کی مداخلت سے ٹریفک بحال ہوا تھا کیونکہ اب وہاں ٹریفک پولیس کا ایک وارڈن بھی نظر آ رہا تھا اور گاڑیاں آہستہ آہستہ رینگنے لگی تھیں۔

میں نے شامی کو گاڑی میں بٹھایا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔

تھوڑی دیر تک رینگنے کے بعد سڑک صاف ہو گئی اور گاڑی تیز رفتاری سے دوڑنے لگی۔

''اب بتائیں نواب صاحب!'' شامی نے کہا۔ ''کیسے ہیں آپ اور یہ حلیہ کیوں بدل رکھا ہے؟''

''میں تو اسی وقت سے مصیبتوں میں گھرا ہوا ہوں شامی بادشاہ جب تم سے آخری ملاقات ہوئی تھی۔'' میں نے کہا اور مختصراً اسے ساری بات بتا دی۔

''تو کیا رانا زوہیب ابھی تک زندہ ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''کیوں! تم نے کیا اسے حالتِ نزع میں چھوڑا تھا یا وہ مرنے کے قریب تھا جو تم اس انداز میں پوچھ رہے ہو؟''

''اس کی حرکتیں تو ایسی ہی تھیں کہ اسے اب تک مر جانا چاہیے تھا۔''

''وہ اگر مرتا تو اس کی خبر نمایاں طور پر اخبارات میں شائع ہوتی۔'' میں نے کہا۔ ''کیا تم اخبارات نہیں دیکھتے؟''

''میں پاکستان میں تھا ہی نہیں۔'' شامی بادشاہ نے بتایا۔ ''پرسوں ہی واپس آیا ہوں۔''

''تم اچانک غائب کہاں ہو گئے تھے؟'' میں نے پوچھا۔ ''اور گولی کیسی ہے؟''

''بس حالات ہی کچھ ایسے ہو گئے تھے۔'' شامی نے کہا۔ ''کیا آپ ست بدھائی جا رہے ہیں؟''

''نہیں، میں نے لاہور میں ایک کوٹھی خرید لی ہے اور فی الحال وہیں مقیم ہوں۔''

''چلیں پھر گھر چل کر آپ سے تفصیلی بات ہوگی۔ پہلے تو میں کھانا کھاؤں گا۔ میں نے کل سے کچھ نہیں کھایا ہے۔''

میں نے گاڑی کا رخ ماڈل ٹاؤن کی طرف موڑ دیا اور انتہائی تیز رفتاری سے گھر پہنچ گیا۔

گیٹ پر وہ گارڈ موجود تھا جو کوٹھی میں مالی کے طور پر کام کرتا تھا۔ اس نے میری گاڑی دیکھ کر اور مجھے پہچان کر گیٹ کھول دیا۔

''نادر بخش! سب خیریت تو ہے نا؟'' میں نے پوچھا۔

''جی سر! سب خیریت ہے۔'' اس نے جواب دیا اور گیٹ بند کرنے چلا گیا۔

شامی نے پہلے تو خوب ٹوٹ کر کھانا کھایا، پھر چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے بولا۔ ''نواب صاحب! یہ زندگی بھی عجیب شے ہے۔ جب انسان زندگی سے مایوس ہو جاتا ہے تو وہ اس پر اچانک مہربان ہو جاتی ہے۔''

''یہ تم نے آپ جناب کب سے شروع کر دی شامی؟'' میں نے پوچھا۔ ''تم مجھ سے اس انداز میں بات تو نہیں کرتے تھے؟''

''اس وقت کے شامی بادشاہ اور اس شامی میں بہت فرق ہے نواب بھائی!'' اس نے کہا پھر اس نے تفصیلاً بتانا شروع کیا۔

☆☆☆

''میں اس رات گہری نیند سو رہا تھا کہ اچانک گولی نے مجھے اٹھا دیا اور آہستہ سے بولی۔ ''باہر شاید پولیس آئی ہے۔''

''پولیس!'' میں جھپٹ کر اٹھ بیٹھا۔ میں نے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈال کر اپنا ریوالور نکالا اور گولی کو لے کر بنگلے کی اندرونی سمت دوڑا۔

فرار کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ میں جانتا تھا کہ بنگلے کے عقب میں بھی پولیس موجود ہوگی۔ میں نے خود کو پولیس کے حوالے کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔

گولی نے میرے اس فیصلے کی مخالفت کی۔ اس کا خیال تھا کہ مجھے اتنی آسانی سے خود کو پولیس کے حوالے نہیں کرنا چاہیے۔

بنگلے کے عقب میں پرانا سا برگد کا ایک درخت تھا۔ مجھے اور تو کچھ نہیں سوجھا، میں پھرتی سے اس درخت پر چڑھ گیا اور خود کو پتوں کے درمیان چھپا لیا۔ گولی کو واپس میں نے بنگلے میں بھیج دیا۔

اس وقت کسی نے اطلاعی گھنٹی بجانے کے بجائے جاہلانہ انداز میں زور زور سے آہنی گیٹ پیٹنا شروع کر دیا۔

''کون ہے؟'' مجھے گولی کی آواز سنائی دی۔

''دروازہ کھولو۔'' باہر سے کوئی کرخت لہجے میں بولا۔

''لیکن تم ہو کون؟'' گولی نے بھی سخت لہجے میں کہا۔

''پولیس!'' باہر سے پھر وہی کرخت آواز سنائی دی۔

گولی نے دروازہ کھول دیا۔ پولیس کے چار پانچ کانسٹیبل اور ایک سب انسپکٹر دندناتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔

''کیا چاہتے ہیں آپ لوگ؟'' گولی نے پوچھا۔ ''یہ ڈاکٹر مہدی حسن کا بنگلا ہے اور وہ ایسے آدمی نہیں ہیں کہ ان کے گھر میں پولیس اس انداز میں دھاوا بولے۔''

''ڈاکٹر صاحب موجود ہیں؟'' سب انسپکٹر کا کرخت لہجہ کچھ نرم ہو گیا۔

''ڈاکٹر صاحب اپنی فیملی کے ساتھ آج کل باہر گئے ہوئے ہیں۔ میں ان کی ملازمہ ہوں۔'' گولی نے بہت اعتماد سے جواب دیا۔

''ہمیں اطلاع ملی ہے کہ یہاں بدنام ڈکیت شامی بادشاہ چھپا ہوا ہے۔''

''شامی بادشاہ؟'' گولی نے حیرت کی اداکاری کی۔ ''یہ کون ہے؟''

''یہ بہت ہی خطرناک ڈکیت ہے بی بی!'' سب انسپکٹر نے کہا۔

''میرے علاوہ یہاں صرف ایک بوڑھا چوکیدار ہے۔ وہ بھی آج چھٹی پر ہے۔ آپ چاہیں تو بنگلے کی تلاشی لے لیں۔''

''تم شامی بادشاہ کو نہیں جانتیں؟''

''آپ ہی بتا رہے ہیں کہ وہ کوئی ڈکیت ہے۔ میرا یا ڈاکٹر صاحب کا بھلا اس سے کیا تعلق؟''

''لیکن ہمیں تو اطلاع ملی تھی کہ......''

''آپ محض اطلاعات پر شریف لوگوں کے گھروں پر دھاوا بول دیں گے؟'' گولی نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''ڈاکٹر مہدی حسن کوئی معمولی آدمی نہیں ہیں۔ ان کی پہنچ بہت اوپر تک ہے۔'' گولی کے لہجے میں بلا کا اعتماد تھا۔ ''ویسے آپ چاہیں تو اس بنگلے کی تلاشی لے سکتے ہیں۔ بعد میں ڈاکٹر صاحب آپ سے خود ہی نمٹ لیں گے۔''

انسپکٹر تذبذب سے گولی کو دیکھتا رہا۔ میں درخت پر بیٹھا ہوا سب کچھ دیکھ بھی رہا تھا اور سن بھی رہا تھا۔ گولی نے گیٹ پر لگے ہوئے دونوں لیمپ روشن کر دیے تھے۔

انسپکٹر اچانک اپنے ایک سپاہی کی طرف گھوما۔ ''اوئے، تو تو کہہ رہا تھا کہ شامی بادشاہ یہاں چھپا ہوا ہے؟'' وہ درشت لہجے میں بولا۔

''اس کے ساتھی کریمو نے اطلاع دی تھی سر!'' سپاہی نے کہا۔ ''اس نے بہت وثوق سے کہا تھا کہ شامی بادشاہ اس بنگلے میں چھپا ہوا ہے۔ وہ خود بھی اس سے ملاقات کر کے گیا تھا۔''

''اس بنگلے میں؟'' سب انسپکٹر نے پوچھا۔

''ہاں، وہ یہی بتا رہا تھا۔''

''اب وہ آئے تو اسے حوالات میں بند کر دینا۔ پھر میں خود اس سے پوچھوں گا کہ غلط مخبری کرنے کا کیا انجام ہوتا ہے۔'' سب انسپکٹر گولی کی طرف گھوما۔ ''مجھے اس بنگلے کی تلاشی بھی لینا ہوگی۔''

''میں تو ملازمہ ہوں جناب!'' گولی نے کہا۔ ''اس سے کیا فرق پڑے گا۔ آپ شوق سے تلاشی لیں۔ ڈاکٹر صاحب برا مانیں گے تو وہ خود ہی نمٹ لیں گے۔''

سب انسپکٹر بہت کائیاں تھا۔ وہ گولی کے پراعتماد لہجے

سے مرعوب تو ہوگیا تھا لیکن اس نے پوری طرح گولی پر اعتبار نہیں کیا تھا۔

گولی نے اس وقت ایک عجیب حرکت کی۔ اس نے کہا۔ ''انسپکٹر صاحب! آپ کے پاس اگر سگریٹ ہو تو مجھے ایک سگریٹ دے دیں۔ مجھے سگریٹ کی شدید طلب محسوس ہو رہی ہے۔ میرے سگریٹ کمرے میں ہیں۔''

سب انسپکٹر نے اپنی جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور ایک سگریٹ گولی کی طرف بڑھا کر دوسری خود بھی سلگا لی۔

میں گولی کی ذہانت پر حیرت زدہ رہ گیا۔ اسے اندازہ تھا کہ پولیس والے ابھی بیڈ روم کی تلاشی لیں گے۔ میرا سامان تو سرونٹ کوارٹر میں تھا لیکن میں رات میں ڈاکٹر صاحب کے بیڈ روم میں ائرکنڈیشنڈ چلا کر سوتا تھا۔ بیڈ روم میں ڈاکٹر صاحب کے سامان کے علاوہ صرف ایک سگریٹ کا پیکٹ ہی تھا جو میرا تھا۔ میری چپل بھی کمرے میں ہی رہ گئی تھی لیکن گولی اس کے بارے میں بھی کوئی بہانہ بنا سکتی تھی۔

پولیس والے تھوڑی دیر بعد مایوسی سے باہر نکل آئے۔

''صاحب جی! آپ کہیں تو میں سرونٹ کوارٹرز بھی کھول دوں۔'' گولی نے کہا۔ ''آپ وہاں کی بھی تلاشی لے لیں۔''

''سرونٹ کوارٹرز میں کون رہتا ہے؟'' انسپکٹر نے پوچھا۔ ''میں نے، آپ کو بتایا تو ہے کہ وہاں ڈاکٹر صاحب کا بوڑھا چوکیدار رہتا ہے۔ اکثر گاؤں سے اس کا ایک بھتیجا بھی آجاتا ہے لیکن اس وقت ان دونوں میں سے کوئی موجود نہیں ہے۔''

''رب نواز!'' سب انسپکٹر نے کہا۔ ''تم سرونٹ کوارٹر کی تلاشی بھی لے ہی لو تاکہ میں اس کریمو کی اچھی طرح خبر لے سکوں۔ میں اس کے ساتھ وہ سلوک کروں گا کہ آئندہ وہ غلط مخبری کرنا بھول جائے گا۔''

تھوڑی دیر بعد رب نواز نے آکر بتایا کہ سرونٹ کوارٹر تو بالکل خالی ہے، ہاں ایک کمرے میں چوکیدار اور اس کے بھتیجے کا سامان ہے۔

اصل میں وہاں کوئی چوکیدار نہیں تھا۔ میں ہی ایک کمرے میں رہتا تھا۔ وہاں تمام سامان میرا ہی تھا۔

''اس کے بھتیجے کا حلیہ بتاؤ؟'' سب انسپکٹر نے گولی سے پوچھا۔

''وہ پچیس، تیس سال کا آدمی ہے لیکن دیکھنے میں پچاس سال کا لگتا ہے۔ وہ شاید چرس یا ہیروئن کا عادی ہے کیونکہ وہ جب بھی آتا ہے، سارا وقت چوکیدار کے کمرے میں پڑا رہتا ہے۔ دبلا پتلا اور چھوٹے قد کا وہ آدمی مجھے تو ایک آنکھ نہیں بھاتا۔''

حلیہ سن کر تو سب انسپکٹر بالکل ہی مایوس ہوگیا۔ میرا حلیہ اس حلیے سے بالکل مختلف تھا جو گولی نے انسپکٹر کو بتایا تھا۔

پولیس والے مایوس ہو کر چلے گئے۔

گولی تھوڑی دیر تک انتظار کرتی رہی، پھر وہ اس درخت کی طرف آئی تو میں بھی آہستگی سے نیچے آگیا اور اسے بتایا کہ پولیس کا کوئی آدمی یہاں چھپا ہوا ہے۔ میں نے جاتے وقت ان کی گنتی کی تھی۔ ان میں سے ایک آدمی کم تھا۔ مجھ پر لاکھوں روپے کا انعام ہے۔ پولیس یوں آسانی سے میرا پیچھا نہیں چھوڑ سکتی۔ تم واپس جاؤ، میں رات اس درخت پر ہی گزاروں گا۔

گولی کی سمجھ میں میری بات آگئی اور وہ جس طرح دبے پاؤں آئی تھی اسی طرح دبے پاؤں لوٹ گئی۔

وہ پوری رات میں نے نیند سے لڑتے ہوئے اسی درخت پر گزار دی۔ صبح گولی باہر لان میں نکلی تو میرا شبہ درست ثابت ہوا۔ سرونٹ کوارٹر سے پولیس کا ایک سپاہی بھی باہر نکل آیا اور بولا۔ ''معاف کرنا بی بی! ہم نے تم پر شبہ کیا۔ ایس آئی صاحب نے تو فضول میں میری ساری رات کالی کر دی۔ میں یہاں بیٹھا ہوا ڈیوٹی دیتا رہا کہ اگر شاہی بادشاہ کسی کونے کھدرے میں چھپا ہوگا تو میدان صاف ہونے کے بعد ضرور باہر نکلے گا۔ میں نے کئی دفعہ جا کر اندر کے کمروں کا جائزہ بھی لیا لیکن یہاں تو واقعی کوئی نہیں ہے۔''

''کیا نام ہے تمہارے اس سب انسپکٹر کا؟'' گولی نے پوچھا۔

''ان کا نام اصغر چودھری ہے، سب انسپکٹر اصغر چودھری!'' سپاہی نے جواب دیا۔

''میں ابھی ڈاکٹر صاحب کو فون کرتی ہوں کہ اب پولیس قاتلوں اور ڈاکوؤں کی تلاش میں آپ کے گھر پر دھاوا بولنے لگی ہے۔ وہ بھی تلاشی کے وارنٹ کے بغیر۔''

''تم تو قانون بھی جانتی ہو۔'' سپاہی نے کہا۔

''میں ڈاکٹر صاحب کے پاس برسوں سے ملازم ہوں۔ یہ قانون تو عام آدمی بھی جانتا ہے کہ تلاشی کے وارنٹ کے بغیر کسی کے گھر میں گھسنا جرم ہے۔''

اس کے جانے کے بعد میں چند ہی منٹ میں درخت سے اترا۔ میرا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا لیکن میں اس وقت آرام نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے گولی سے کہا۔ ''اب یہاں سے نکلنے کی تیاری کرو۔''

''میں نے تو رات ہی میں اپنا سامان ایک بیگ میں بھر لیا تھا۔'' گولی نے کہا۔ ''مجھے تو تمہاری فکر ہے، تم ابھی کچھ دن پہلے تو لمبی بیماری سے اٹھے ہو۔''

مجھے یاد آیا کہ شاہی بادشاہ تو وہیل چیئر پر تھا۔ یہ یقیناً گولی کی محبت اور محنت کا نتیجہ تھا کہ وہ اپنے پیروں پر دوبارہ کھڑا ہو گیا تھا۔

میں گولی کو وہاں سے لے کر چھپتا چھپاتا شاہدرہ میں اپنے ایک دوست کے مکان پر پہنچا۔ وہ بھی کسی زمانے میں میرے گروہ میں رہ چکا تھا لیکن اب شریفانہ زندگی گزار رہا تھا۔

''یار مجید!'' میں نے کہا۔ ''تو میرا ایک کام کر سکتا ہے؟'' میں نے کہا۔ ''میں جانتا ہوں کہ تو نے جرم کی دنیا سے اب توبہ کر لی ہے لیکن میری خاطر......''

''تم کام بتاؤ شاہی بادشاہ؟'' مجید نے کہا۔

''مجھے کہیں سے ایک گاڑی لا دے۔''

''یہ کسی زمانے میں میرے لیے بہت معمولی کام تھا۔'' مجید نے کہا۔ ''لیکن شاہی بادشاہ! تمہارے مجھ پر اتنے احسانات ہیں کہ میں انکار نہیں کر سکتا۔ میں تمہیں ابھی گاڑی لا دیتا ہوں۔''

''ایک کام اور ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم کریمو کو تو جانتے ہو؟''

''ہاں، اچھی طرح جانتا ہوں۔'' مجید نے نفرت بھرے لہجے میں کہا۔ ''وہ بھی پہلے ہمارے ساتھ ہی ہوتا تھا، پھر اس نے جب معاملات خراب دیکھے تو پولیس کا مخبر بن گیا۔ وہ تو مجھے پرسوں بھی ملا تھا۔''

''تم کسی بہانے سے اسے یہاں بلالو۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے اس سے بھی کچھ پرانے حساب بے باق کرنا ہیں۔''

''یہ بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' مجید نے کہا اور اسی وقت باہر چلا گیا۔

اسے واپسی میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ وہ گاڑی لے آیا تھا۔ گاڑی مرگلہ تھی اور بہت بہترین کنڈیشن میں تھی۔

مجید ہنس کر بولا۔ ''شاہی بادشاہ! یہ تمہاری قسمت ہے۔ اس گاڑی کے ڈیش بورڈ میں ایک ریوالور اور چار پانچ ہزار روپے کا کیش بھی موجود ہے۔''

''تم اب کریمو کو کسی بہانے سے یہاں بلالو، پھر میں یہاں سے نکلتا ہوں۔''

مجید نے گاڑی نہ جانے کہاں جا کر چھپا دی۔ پھر اس نے سیل فون پر کریمو سے رابطہ کیا اور کہا۔ ''یار کریمو! تجھے معلوم ہے کہ شاہی بادشاہ آج کل کہاں ہے؟''

''یار، مجھے معلوم تو تھا لیکن وہ حرام زادہ عین وقت پر وہاں سے نکل گیا اور میرا انعام مارا گیا۔''

''میں جانتا ہوں کہ شاہی بادشاہ اس وقت کہاں ہے؟'' مجید نے کہا۔ ''تو میرے پاس آجا! ہم دونوں مل کر اسے گھیر لیں گے۔ پولیس کو بلائیں گے تو وہ پھر بھاگ نکلے گا۔''

تھوڑی دیر بعد کریمو وہاں پہنچ گیا اور بولا۔ ''مجید! کہاں ہے شاہی بادشاہ؟ پولیس نے کل مجھے بہت ذلیل کیا ہے۔ انہوں نے اچھی خاصی چھترول بھی کی ہے۔''

''حرام زادے!'' اچانک گولی کمرے سے باہر نکل آئی۔ ''تجھے شاہی بادشاہ کی تلاش ہے؟'' گولی نے اچانک آگے بڑھ کر اس کا گلا دبوچ لیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے گھٹنے سے اس کی ناف پر وار کیا۔ کریمو لمحوں میں بے دم ہو کر اس کے ہاتھ میں جھول گیا۔

''یہ تو نے کیا، کیا؟'' مجید فکرمندی سے بولا۔ ''یہ تو مر گیا۔''

''اسے مر ہی جانا چاہیے تھا۔'' گولی نے نفرت بھرے لہجے میں کہا

''لیکن تم فکر مت کرو۔'' میں نے کمرے سے نکلتے ہوئے کہا۔ ''میں اس کی لاش بھی اپنے ساتھ لے جاؤں گا اور اسے کسی ویرانے میں پھینک دوں گا۔ تم گاڑی لے آؤ۔''

وہاں سے فرار ہو کر میں گجرات پہنچا اور وہاں اپنے ایک اور ساتھی سے کچھ قرض لے کر کراچی کے راستے دبئی نکل گیا۔

گولی میرے ساتھ تھی۔ میں نے دبئی میں کچھ دن تو محنت مزدوری کی پھر وہاں مجھے اپنے دو پرانے ساتھی مل گئے۔ ہم نے پھر وہی دھندا شروع کر دیا لیکن وہاں کی پولیس پاکستانی پولیس کی طرح کاہل اور کام چور نہیں ہے۔ ہم لوگ زیادہ دن وہ دھندا نہ کر سکے اور عمان کی طرف فرار ہو گئے۔

وہاں ہم لوگ تقریباً ایک مہینا روپوش رہے۔ پھر جس طرح غیر قانونی طور پر پاکستان سے گئے تھے اسی طرح لانچ کے ذریعے واپس بھی آ گئے۔ تم فکر مت کرو نواب بھائی!'' شامی بادشاہ نے کہا۔ ''اب میں آ گیا ہوں تو تمہارے ایک ایک دشمن سے نمٹ لوں گا۔ میں آج ہی اپنے دوسرے ساتھیوں کا پتا لگاتا ہوں کہ وہ کہاں ہیں؟''

''گولی کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''گولی بھی مغل پورہ کے اس مکان میں ہے جہاں میں رہ رہا ہوں۔''

''تم رات میں جا کر اسے بھی لے آنا۔'' میں نے کہا۔

شامی بادشاہ کے ملنے سے مجھے بہت تقویت پہنچی تھی۔ وہ سیاست دانوں کو بھی جانتا تھا اور ان کے ہتھکنڈوں کو بھی، کئی معزز و معروف سیاست داں شامی بادشاہ سے کئی کام لیتے تھے۔ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہ دلاور کو بھی جانتا تھا لیکن اس کے موجودہ ٹھکانے سے واقف نہیں تھا۔

''میں ایک دن کے اندر اندر معلوم کر لوں گا نواب بھائی کہ دلاور اس وقت کس بل میں چھپا ہوا ہے؟'' شامی بادشاہ نے بڑے اعتماد سے کہا۔

''مجھے تو زیادہ فکر نور کی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''دلاور نے اسے کوئی تکلیف نہ پہنچائی ہو؟''

''دلاور انتہائی گھٹیا اور کمینہ آدمی ہے۔'' شامی نے کہا۔ ''لیکن اس وقت وہ نور کو نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ آفتاب خان کی بیٹی جو تمہارے قبضے میں ہے۔'' پھر وہ چونک کر بولا۔ ''ہاں اس نے تمہیں بارہ گھنٹے کی مہلت دی تھی نواب بھائی! اس میں اب کتنا وقت باقی ہے؟''

میں نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''اس میں ابھی کچھ گھنٹے باقی ہیں۔''

اچانک میرے سیل فون کی بیل بجنے لگی۔ دوسری طرف میرا گارڈ سرور تھا۔ غنی کے بعد میں سرور پر اعتماد کرتا تھا اور اسے حویلی کی حفاظت کے لیے ست بدھائی میں چھوڑ آیا تھا۔

''ہاں سرور! بولو۔''

''سر، ابھی کچھ دیر پہلے دو جیپوں میں کچھ لوگ ست بدھائی کی حدود میں داخل ہونے کی کوشش کر رہے تھے لیکن ہمارے گارڈز نے انہیں ست بدھائی کی حدود میں داخل ہی نہیں ہونے دیا۔''

''بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے سرور!'' میں نے کہا۔ ''وہ لوگ پیدل بھی تو حویلی کی طرف آ سکتے ہیں۔''

''وہ لوگ ہیلی کاپٹر میں بھی آئیں گے سر تو میں انہیں مار گراؤں گا۔'' سرور نے پر اعتماد لہجے میں کہا۔

''ویری گڈ!'' میں نے کہا۔ ''مجھے تم سے یہی امید ہے۔ اس لیے تو میں تمہیں وہاں چھوڑ کر آیا ہوں۔''

شامی بادشاہ سیل فون لے کر بیٹھ گیا اور نہ جانے کن کن لوگوں کو فون کرنے لگا۔ میں اسے کمرے میں مصروف چھوڑ کر باہر آ گیا۔

ناصر اور راجا واپس آ چکے تھے۔

''تم لوگ کیا تیر مار آئے؟'' میں نے ہنس کر پوچھا۔

''یہ تیر، تفنگ اور تلواروں کا زمانہ نہیں ہے نواب صاحب!'' راجا نے کہا۔

''ہم لوگ صرف سیل فون ہی پر اپنے لوگوں سے رابطہ کر سکتے ہیں۔'' ناصر نے کہا۔ ''اپنی موجودہ حیثیت میں کسی سے مل نہیں سکتے۔''

''لیکن ہم سیل فون پر کام چلا سکتے ہیں۔'' راجا نے کہا۔ ''اپنے حلیے فی الحال بدلنا مناسب نہیں ہے۔ دلاور اگر پاکستان میں ہے تو اس نے اپنی ساری توجہ ست بدھائی اور ہماری طرف کر رکھی ہوگی۔ اسے ہم میں سے کسی پر شبہ بھی ہو گیا تو وہ ہماری بو سونگھتا ہوا یہاں تک پہنچ سکتا ہے۔'' پھر راجا چونک کر بولا۔ ''ٹھیکے پتر! تو کمرے میں کس سے باتیں کر رہا تھا، کیا اندر ٹی وی چل رہا ہے آواز تو اب بھی آ رہی ہے؟''

''اندر میرا ایک پرانا دوست ہے۔'' میں نے کہا۔

''تو دیکھے گا تو خوش ہو جائے گا۔ موجودہ حالات میں''

ہمارے بہت کام آ سکتا ہے۔ وہ ان تمام سیاست دانوں اور جاگیرداروں کی رگ رگ سے واقف ہے۔''

''ایسا تیرا کون سا دوست ہے؟'' راجا نے کہا۔ ''تو نے اب تک اسے کہاں چھپا رکھا تھا؟''

اسی وقت شامی بادشاہ باہر نکل آیا۔

اسے دیکھ کر راجا کھل اٹھا۔ ''ارے شامی بادشاہ!'' وہ والہانہ انداز میں اس سے لپٹ گیا۔ ''تم کہاں چلے گئے تھے؟''

''میں تو اسی دنیا میں ہوں راجا صاحب!'' شامی مسکرا کر بولا۔ ''آپ سمجھ رہے ہوں گے کہ شاید شامی بادشاہ کہیں ٹپک گیا۔''

''شامی بادشاہ اتنی آسانی سے مرنے والا نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم نے تو موت سے پنجہ آزمائی کر کے اسے بھی شکست دے دی تھی۔ اس وقت جب ہمیں تمہاری موت کا یقین ہو گیا تھا۔ اس وقت بھی گولی کو تمہاری موت کا یقین نہیں تھا۔''

''میں اگر اب سچ مچ مر جاؤں تو بھی اسے یقین نہیں آئے گا۔'' شامی بادشاہ نے کہا۔ ''وہ میرے لیے اتنی ہی دیوانی ہے۔'' پھر وہ مجھ سے بولا۔ ''میں نے ابھی دلاور کے دو ٹھکانوں کے بارے میں معلوم کیا ہے۔''

''تم نے یہاں بیٹھے بیٹھے معلوم کر لیا؟'' راجا نے حیرت سے کہا۔

''راجا صاحب! میری پوری عمر ان ہی راستوں پر چلتے ہوئے گزری ہے۔ میں پاکستان سے باہر ضرور تھا لیکن اس دوران میں یہاں کوئی انقلاب نہیں آیا ہے۔ لوگ بھی وہی ہیں، ان کی سوچ بھی وہی ہے اور ان کی ذہنیت بھی وہی ہے۔'' پھر وہ ہنس کر بولا۔ ''میں ذرا ان دونوں ٹھکانوں کے بارے میں کنفرم کر لوں، پھر کوئی ایکشن لوں گا۔'' پھر وہ مجھ سے بولا۔ ''نواب بھائی! اگر اعتراض نہ ہو تو میں کچھ دیر آرام کر لوں۔ میں بہت تھک گیا ہوں۔''

''واہ شامی بادشاہ! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے، میں ابھی تمہارے آرام کا بندوبست کیے دیتا ہوں۔''

میں نے غنی کو بلا کر کہا کہ شامی بادشاہ کو اوپر کے بیڈ روم میں لے جاؤ۔

غنی بھی اسے دیکھ کر خوش ہو گیا اور بولا۔ ''تم کب آئے شامی؟'' وہ اس سے بغل گیر ہوتے ہوئے بولا۔

''میں آج ہی آیا ہوں۔'' شامی نے کہا اور غنی کے ساتھ بالائی منزل پر چلا گیا۔

''آپ شامی بادشاہ کو کیسے جانتے ہیں؟'' ناصر نے پوچھا۔

''یہ ایک لمبی کہانی ہے ناصر!'' میں نے کہا۔ ''کبھی فرصت سے سناؤں گا۔''

''سر! یہ نہایت خطرناک آدمی ہے۔ پولیس کے بڑے بڑے افسران اور اعلیٰ بیوروکریٹس اس کے نام سے آج بھی دہشت زدہ ہو جاتے ہیں۔ آخری بار پولیس نے اس کی تلاش میں چھاپہ مارا تھا تو یہ وہاں موجود نہیں تھا۔ پولیس کا خیال ہے کہ شامی مر چکا ہے اور اس کا گروہ منتشر ہو گیا ہے۔''

''تم اس کے بارے میں اتنی معلومات کیسے رکھتے ہو ناصر؟''

''سر! آپ بھول جاتے ہیں کہ میں نے اب تک صرف اور صرف کرائم رپورٹنگ کی ہے۔'' اس نے ہنس کر کہا۔ ''ایک زمانے میں شامی بادشاہ پورے پنجاب خاص طور پر مرکزی پنجاب میں دہشت کی علامت تھا۔ اس کی پشت پر دو تین صوبائی وزیر تھے۔ شامی کے تعلقات اس زمانے میں رانا سے بھی تھے۔''

''ہاں، شامی ہی نے ایک موقعے پر میری اور رانا کی ملاقات کرانے کا بندوبست کیا تھا۔ وہ تو عین وقت پر رانا نہیں پہنچا ورنہ آج حالات یہ نہ ہوتے۔'' میں نے کہا۔ ''میں......''

میرا جملہ ادھورا رہ گیا تھا کہ میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی تھی۔ اسکرین پر سرور کا نام تھا۔

میں نے فوراً ہی کال ریسیو کر لی۔ ''ہاں سرور!''

''سر ابھی کچھ نامعلوم آدمیوں نے حویلی میں داخلے کی کوشش کی تھی۔ انہوں نے داخلے کے لیے حویلی کا عقبی حصہ استعمال کیا تھا لیکن ہمارے گارڈز نے انہیں بھون کر رکھ دیا۔ ان کی لاشیں حویلی کے اندر اور باہر پڑی ہیں۔''

''یہ کتنی دیر پہلے کی بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ابھی پانچ منٹ پہلے ہی سب کچھ ہوا ہے۔'' سرور نے بتایا۔

''تم فکر مت کرو۔ صوبیدار میجر صاحب سے کہو کہ وہ مجھ سے بات کریں۔ وہ خود ہی پولیس میں رپورٹ بھی درج کرا دیں گے۔''

''او کے سر!'' سرور نے کہا۔

''او کے۔'' میں نے جواب میں کہا اور رابطہ منقطع

کردیا۔

رابطہ منقطع کرتے ہی سیل فون کی گھنٹی پھر بجی۔ اس مرتبہ اسکرین پر صوبیدار میجر صاحب کا نام تھا۔

درپیش صورتِ حال کے پیش نظر میں نے سرور کو ہدایت کی کہ میجر صاحب کو مسئلے سے آگاہ کرے۔ لہٰذا کچھ ہی دیر بعد میرے موبائل پر میجر صاحب کا نمبر نمودار ہوا۔ بیل بجنے پر میں نے کال ریسیو کی۔ ''السلام علیکم!''

''وعلیکم السلام!'' انہوں نے جواب دیا۔ ''رفیق میاں، یہاں اچھی خاصی گڑبڑ ہوگئی ہے لیکن تم پریشان مت ہونا، میں نے پولیس کو فون کردیا ہے اور وہ لوگ پہنچ رہے ہوں گے۔''

''پولیس اگر کوئی گڑبڑ کرے تو آپ فوراً مجھے فون کیجیے گا۔''

''تم فکر مت کرو۔'' انہوں نے کہا۔ ''کسی گڑبڑ کا کیا سوال؟ مرنے والے کسی مذموم ارادے سے حویلی میں داخل ہونے کی کوشش کررہے تھے۔ وہ پانچ آدمی تھے اور پانچوں مسلح تھے۔ میں رات دس بجے کے بعد حویلی کی چاردیواری میں لگی ہوئی خاردار باڑھ میں کرنٹ بھی چھوڑ دیتا ہوں۔ اس وقت اگر دیوار میں کرنٹ ہوتا تو ان کی لاشیں کوئلہ ہوگئی ہوتیں۔ تم فکر مت کرو، میں پولیس سے نمٹنا جانتا ہوں۔'' پھر وہ کچھ سوچ کر بولے۔ ''وہاں کی کیا صورت حال ہے؟''

''یہاں صورتِ حال میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے لیکن بہت جلد بہتری کی امید ہے۔ مجھے امید ہے کہ میں دو تین دن میں نور کو بازیاب کرالوں گا۔''

''انشاءاللہ!'' صوبیدار میجر صاحب نے کہا۔ ''اپنا خیال رکھنا۔''

''آپ بھی حویلی کی سیکیورٹی کا اور اپنا خیال رکھیے گا، کسی بھی الجھن کے سلسلے میں مجھ سے فوراً رابطہ کیجیے گا۔''

''حویلی کی طرف سے تم بے فکر رہو۔ سرور بہت ہی محنت اور جانفشانی سے اپنی ڈیوٹی انجام دے رہا ہے۔ اس کی وجہ سے مجھے غنی کی کمی محسوس نہیں ہورہی۔''

پھر رسمی جملوں کی ادائیگی کے بعد انہوں نے رابطہ منقطع کردیا۔

''حویلی میں کچھ نامعلوم افراد نے داخل ہونے کی کوشش کی ہے۔'' میں نے راجا اور ناصر کو مطلع کیا۔ ''سرور اور اس کے گارڈز نے ان پانچوں کو اندر آنے سے پہلے ہی مار گرایا۔''

''کیا میں ست بدھائی جاؤں؟'' راجا نے فکرمندی سے کہا۔

''فکر اور پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''صوبیدار میجر صاحب اس صورتِ حال سے نمٹ لیں گے۔ وہ بہت تجربہ کار افسر ہیں اور پولیس سے نمٹنا بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔''

اچانک کال بیل کی آواز نے ہم لوگوں کو چونکا دیا۔

قادر بخش نے آکر بتایا کہ سامنے والے بنگلے کی ملازمہ تھی۔ وہ بیگم صاحبہ کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔

''کیوں؟'' راجا چونک کر بولا۔ ''کون بیگم صاحبہ؟ کیا وہ انہیں جانتی ہے؟''

''میں نے اس سے یہی پوچھا تھا، کہنے لگی کہ ہمارے بنگلے میں قرآن خوانی ہورہی ہے۔ ہماری بیگم صاحبہ نے اس بنگلے کی بیگم صاحبہ کو بلایا ہے۔''

''پھر تم نے کیا جواب دیا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں اس سے پہلے ہی کہہ چکا تھا کہ بیگم صاحبہ اس وقت سو رہی ہیں۔ اس نے کہا کہ جب وہ اٹھیں تو انہیں ہماری بیگم صاحبہ کا پیغام دے دیجیے گا۔''

''ٹھیک ہے، تم جاؤ۔'' میں نے کہا۔

راجا فکرمندی سے بولا۔ ''دیکھے پتر! یہ کوئی نیا چکر شروع ہوگیا ہے۔ یہاں سبھی برگر ٹائپ لوگ رہتے ہیں۔ قرآن خوانی کا ان لوگوں کو کہاں خیال؟''

''کیوں ان بڑے بنگلوں میں مسلمان نہیں رہتے؟'' میں نے پوچھا۔ ''ممکن ہے واقعی اس بنگلے میں قرآن خوانی ہورہی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی سازش ہو۔ دونوں امکانات ففٹی ففٹی ہیں۔''

''اب بیگم صاحبہ کہاں سے پیدا کی جائیں؟'' راجا نے ہنس کر کہا۔ ''بیگم صاحبہ تو نہ صرف پیدا ہوچکی ہیں بلکہ......''

''یار کیا ضروری ہے کہ اس بنگلے میں جایا ہی جائے؟'' میں نے جھنجلا کر کہا۔ ''ان لوگوں نے گن پوائنٹ پر تو دعوت دی نہیں ہے۔''

''مجھے صرف اس بات پر حیرت ہورہی ہے کہ اس قسم کی پوش آبادیوں میں لوگ گھر گھر جاکر تو قرآن خوانی کی دعوت نہیں دیتے۔'' راجا نے کہا۔ ''اور اگر قرآن خوانی کرتے بھی ہیں تو کسی مدرسے کے طالب علموں کو بلا کر اپنے بزرگوں کی ارواح کو ثواب پہنچا دیتے ہیں اور مدرسے کے بچوں اور مولوی صاحب کو نذرانے کے طور پر کچھ رقم دے دیتے ہیں۔ بقیہ سال پارٹی کا ہوتا ہے جو مرنے والے کے لیے مغفرت کی دعا تو معمولی بات ہے، اس کا ذکر تک نہیں

کرتے اور خوش گپیوں میں مصروف رہتے ہیں۔''

''یہ تو خیر مہاراجا! آپ بجا فرمارہے ہیں۔ لوگ تو تدفین کے موقعے پر بھی الگ الگ ٹکڑیوں میں بٹ کر کاروباری معاملات، سیاست اور شوبز پر ڈسکس کرتے ہیں، پھر مولوی کے ساتھ ساتھ دعا کے لیے ہاتھ اٹھا کر واپس آجاتے ہیں۔

''یار مسئلہ تھا سامنے والے بنگلے میں قرآن خوانی کا!'' ناصر نے کہا۔ ''یہ ہم کس معاشرتی بحث میں الجھ گئے؟''

''یار! یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اب بیگم صاحبہ نہیں ہیں تو فوری طور پر تو ان کا بندوبست ہو نہیں سکتا۔ ہاں، بس یہ تجسس ضرور ہے کہ سامنے والوں کی ملازمہ خاص طور پر ہمیں دعوت دینے کیوں آئی؟''

''شام تک دیکھ لیتے ہیں۔'' راجا نے کہا۔ ''اگر واقعی وہاں قرآن خوانی ہوگی تو شام کو گاڑیوں کی ایک لمبی قطار اس بنگلے کے سامنے ہوگی۔''

''اگر قرآن خوانی نہ ہوئی تو پھر کچھ اور سوچیں گے۔'' میں نے کہا۔

''یار فیکے پتر!'' راجا نے چڑ کر کہا۔ ''ایک تو مسائل خود ہی تیرا پیچھا نہیں چھوڑتے ہیں اور اگر کوئی مسئلہ نہ بھی ہو تو تو خود اسے پیدا کرلیتا ہے۔ بھاڑ میں جائے سامنے والا بنگلا اور بھاڑ میں جائے ان کی ملازمہ!''

مجھے اس کے جھنجلانے پر ہنسی آگئی۔ میں نے کہا۔ ''یار! اتنا مشتعل کیوں ہورہا ہے؟ بندے کو تجسس تو ہوتا ہی ہے نا!''

''تو تجسس کر اپنی ہونے والی بیگم کے لیے۔'' راجا نے جل کر کہا۔ ''فضول کے مسائل پیدا مت کر۔''

ہم لوگ شام کی چائے پی رہے تھے کہ شامی اوپر سے نیچے آتا دکھائی دیا۔

''کیا بات ہے شامی بادشاہ!'' راجا نے کہا۔ ''بہت جوش میں نظر آرہے ہو؟''

''یار میں نے آفتاب کے......'' وہ ناصر کی طرف دیکھ کر کچھ کہتے ہوئے رک گیا، پھر مجھ سے بولا۔ ''ان صاحب سے تعارف نہیں کرایا آپ نے؟''

''یہ بھی ہمارے دوست ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''راجا کی طرح یہ بھی بہت بڑے صحافی ہیں۔''

''شامی! تمہیں اڈیالہ جیل یاد ہے؟'' ناصر نے کہا۔

''اڈیالہ جیل کو میں کیسے بھول سکتا ہوں۔ وہاں......'' وہ کہتے کہتے رک گیا، پھر ناصر کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''مجھے یاد آگیا...... آپ...... کا نام...... ہاں...... آپ کا نام شاید عامر ہے؟''

''میرا نام......''

''ایک منٹ!'' شامی نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''آپ کا نام ناصر ہے...... ہاں، وہ جیل سپرنٹنڈنٹ بار بار آپ کو اسی نام سے پکاررہا تھا۔''

''تم نے ٹھیک پہچانا۔'' ناصر نے کہا۔ ''میرا نام ناصر ہے۔''

''کیا تم بھی شامی بادشاہ کے ساتھ اڈیالہ جیل میں رہ چکے ہو؟'' راجا نے کہا۔ ''ویسے تمہاری حرکتیں تو اسی قسم کی ہیں۔ مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ اب تک تمہاری سرگرمیاں پولیس سے چھپی کیسے رہیں؟''

''اگر تم بکواس کرچکے ہو تو میں کچھ کہوں؟'' ناصر نے کہا۔

''اب تمہارے پاس کہنے کو رہ ہی کیا گیا ہے؟'' راجا نے کہا۔

''ہاں شامی! تم کچھ بتارہے تھے؟ راجا کے ساتھ رہ کے تو ناصر بھی اسی کے رنگ میں رنگتا جارہا ہے۔''

''میں نے آفتاب کے ایک دست راست کے بارے میں معلوم کرلیا ہے؟'' شامی نے کہا۔ ''اس کا نام ارشد ہے۔ وہ آفتاب کی ٹرانسپورٹ کمپنی کا منیجر ہے۔ آفتاب خان کی طرح وہ بھی پہلے ٹرک ڈرائیور تھا، پھر آفتاب نے کچھ ہیرا پھیری کرکے ایک بس خرید لی۔ ارشد خان اس کے ساتھ بس میں کنڈیکٹر تھا اور آفتاب خان اپنی بس کا ڈرائیور بھی خود ہی تھا۔''

مجھے آفتاب خان کے بارے میں ناصر اور راجا پہلے ہی بتاچکے تھے۔ میں نے شامی سے پوچھا۔ ''ارشد کے بارے میں اور کیا معلوم ہوا؟''

''وہ آفتاب خان کے کالے دھندوں میں برابر کا شریک ہے۔ آفتاب خان کی بسوں اور ٹرک میں اب بھی منشیات بہت بڑے پیمانے پر اسمگل ہوتی ہیں۔ ارشد کو آفتاب خان کے ہر کالے دھندے کا علم ہے۔ وہ نور کے بارے میں بھی جانتا ہوگا اور اس بریف کیس کے بارے میں بھی جو آفتاب خان نے وکیل سرور ڈھلون کے پاس رکھوایا تھا۔''

''اور یہ ارشد ہوتا کہاں ہے؟''

''بادامی باغ کے علاقے میں آفتاب خان نے اچھی خاصی زمین گھیر رکھی ہے۔ وہاں اس کی بسیں اور ٹرک کھڑے ہوتے ہیں۔ وہیں اس کی ورک شاپ بھی ہے اور اسی جگہ آفتاب خان نے ایک دفتر بھی بنا رکھا ہے۔

ارشد اسی دفتر میں بیٹھتا ہے۔'' شامی نے تفصیل سے ارشد کے بارے میں بتایا۔

''وہ آفتاب خان کا سب سے محفوظ ٹھکانا ہے۔'' ناصر نے کہا۔ ''ممکن ہے اس نے نور کو بھی وہیں کہیں رکھا ہو۔''

''پھر ہم آج ہی ارشد پر ہاتھ ڈال دیتے ہیں۔'' راجا نے کہا۔

''اتنی جلدی مت کریں راجا صاحب!'' شامی نے کہا۔ ''آفتاب کی طرح ارشد بھی لومڑی کی طرح چالاک ہے۔ اگر وہ جلد بازی میں ہمارے ہاتھ سے نکل گیا تو پھر اسے پکڑنا بہت مشکل ہوگا۔ ہمیں پوری منصوبہ بندی سے کام کرنا ہوگا۔ وہاں نہ صرف کمپنی کے بہت سے ڈرائیور اور کنڈیکٹر ہوں گے بلکہ ورک شاپ میں کام کرنے والے افراد بھی ہوں گے اور ان میں زیادہ تر لوگ جرائم پیشہ ہوں گے۔ آفتاب اور ارشد کے ساتھ شریف آدمی تو چل ہی نہیں سکتا۔'' پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ''میں نے اپنے گروہ کے لوگوں سے بھی رابطہ کرنے کی کوشش کی ہے لیکن وہ سب اس وقت منتشر ہیں۔ کوئی دبئی میں ہے، کوئی انڈیا میں اور کوئی کراچی میں۔''

''ہمیں زیادہ لوگوں کی ضرورت بھی نہیں ہے شامی بادشاہ!'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''آفتاب اور ارشد جیسے نچلے درجے کے بدمعاشوں کے لیے تم اکیلے ہی کافی ہو۔'' پھر میں نے چونک کر کہا۔ ''لیکن تم بھی اکیلے کب ہو، تمہارے ساتھ تو گولی بھی ہے۔ تم ابھی جاکر اسے لے آؤ۔ میری دونوں گاڑیوں میں سے کوئی بھی گاڑی لے جاؤ۔''

''نواب بھائی!'' شامی نے کہا۔ ''حلیہ تو آپ نے بدل لیا لیکن دشمن آپ کی گاڑیاں بھی تو پہچانتے ہوں گے۔''

''میری کوئی مخصوص گاڑی نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں کبھی لینڈ کروزر استعمال کرتا ہوں، کبھی پراڈو اور کبھی ہنڈا اسٹی! آج کل تو میں نے اپنے استعمال کے لیے ایک کرولا رکھی ہوئی ہے۔ غنی اور احمد شاہ وغیرہ ڈبل کیبن پک اپ استعمال کرتے ہیں اور ناصر کے پاس بھی کرولا ہے۔''

''یہ تو شامی بادشاہ نے بہت اہم بات بتائی ہے۔'' راجا نے کہا، پھر اس نے غنی کو آواز دی۔

حسب معمول غنی کمرے کے باہر ہی موجود تھا۔ وہ فوراً اندر آگیا۔ ''یس سر!''

''یہ گاڑیاں جو ہمارے استعمال میں ہیں۔ دشمن انہیں بھی تو پہچان سکتے ہیں؟''

''لاہور میں اس میک اور ماڈل کی ہزاروں گاڑیاں ہیں سر!'' غنی نے کہا۔ ''وہ زیادہ سے زیادہ گاڑی کے نمبر سے ہمیں پہچان سکتے ہیں۔ حالانکہ یہ بھی کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کے باوجود میں نے ہر گاڑی کی نمبر پلیٹ بدل دی ہے۔''

''ویری گڈ!'' میں نے کہا۔ ''مجھے تم سے اسی حاضر دماغی کی توقع تھی۔''

''گاڑیوں کی نمبر پلیٹس تو میں نے اسی وقت تبدیل کردی تھیں جب ہم آفتاب خان کو لائے تھے۔''

''اوکے غنی!'' میں نے کہا۔ وہ خاموشی سے باہر نکل گیا۔

''شامی بادشاہ!'' راجا نے کہا۔ ''اب تم ناصر صاحب کی گاڑی لے جاؤ اور گولی کو یہاں لے آؤ۔''

''گولی تو خود آپ لوگوں سے ملنے کو بے تاب ہے۔'' شامی نے کہا۔ ''میں نے فون پر اسے بتادیا تھا کہ آج آپ سے میری ملاقات ہوگئی ہے۔'' وہ گاڑی کی چابی لے کر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد ناصر نے تشویش سے کہا۔ ''سر! یہ بہت خطرناک آدمی ہے، قابل اعتبار تو ہے نا؟''

''ہاں ناصر!'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''شامی میرے لیے اتنا ہی قابل اعتبار ہے جتنا راجا ہے اور تم ہو۔''

''سر! مجھے حیرت ہے کہ اس سے آپ کی دوستی کیسے ہوگئی۔ یہ تو وہ شخص ہے جو پیسے کے لیے کچھ بھی کرسکتا ہے۔ اس کے تعلقات بہت بڑے بڑے لوگوں سے تھے لیکن یہ دوست کسی کا نہیں تھا۔''

''یہ ایک طویل کہانی ہے ناصر!'' راجا نے کہا۔ ''میں کبھی فرصت میں سناؤں گا کہ شامی، فیکے کا دوست بلکہ مرید کیسے بنا؟''

''ناصر، شامی تو......''

میرے سیل فون کی گھنٹی بجی تو میری بات ادھوری رہ گئی۔ میں نے سیل فون کی اسکرین پر نظر ڈالی تو اس پر مجھے جمال خان شیردانی کا نام دیکھ کر حیرت ہوئی۔ میں نے فوراً ہی کال ریسیو کرلی۔ ''السلام علیکم سر! کیسے ہیں آپ؟''

''نواب صاحب!'' انہوں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''مجھے اطلاع ملی ہے کہ معروف ٹرانسپورٹر آفتاب خان کی بیٹی آپ کے قبضے میں ہے؟''

ان کا سرد لہجہ سن کر میں چونک اٹھا۔ مجھے ان کے لہجے سے لگ رہا تھا کہ یہ ڈپٹی سیکریٹری کا لہجہ ہے، کسی دوست کا لہجہ نہیں ہے۔

میں نے بھی کسی قدر سرد لہجے میں کہا۔ ''آپ بھی سنی سنائی باتوں پر یقین کر لیتے ہیں۔ آفتاب خان کی بیٹی بھلا میرے قبضے میں کیوں ہوگی؟''

''میں جانتا ہوں رفیق صاحب کہ ارم آپ ہی کے پاس ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے آفتاب خان کا فون آیا تھا۔ انہوں نے مجھے بتایا ہے کہ ان کی بیٹی ارم کو آپ نے اغوا کر لیا ہے۔ آپ اسے فوراً اس کے گھر پہنچا دیں ورنہ میں قانونی کارروائی پر مجبور ہو جاؤں گا۔''

''اگر آپ سنی سنائی باتوں پر یقین رکھتے ہیں تو ضرور قانونی کارروائی کریں۔'' میں بھی سنجیدہ ہو گیا اور میرے لہجے میں تلخی آ گئی۔ ''آپ بہت اعلیٰ افسر ہیں، بہت بااختیار ہیں، آپ ست بدھائی کے سرچ وارنٹ حاصل کریں اور شوق سے میرے خلاف قانونی کارروائی کریں لیکن میں بھی کوئی گیا گزرا نہیں ہوں اور اپنا قانونی حق محفوظ رکھتا ہوں۔''

''آپ اس وقت ہیں کہاں؟'' جمال خان نے پوچھا۔

''میں کہیں بھی ہوں، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آپ ارم کو برآمد کریں اور مجھے ہتھکڑیاں پہنا دیں۔''

''دیکھیے نواب صاحب! میں ابھی تو آپ سے درخواست کر رہا ہوں کیونکہ آپ ایک باعزت آدمی ہیں ورنہ میں کسی مجرم سے اس لہجے میں بات نہیں کرتا۔''

''آپ نے میرے مجرم ہونے کا فیصلہ بھی کر لیا؟'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''آپ بااختیار آدمی ہیں، کچھ بھی کر سکتے ہیں لیکن اتنا تو سوچیں کہ میں آفتاب خان کی بیٹی کو اغوا کیوں کروں گا؟ کیا تاوان کے لیے یا پھر......''

''آفتاب خان نے بتایا ہے کہ آپ نے کسی غلط فہمی کی بنا پر ان کی بیٹی کو اغوا کیا ہے۔''

''آپ شوق سے اپنا فرض پورا کریں۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

''کون تھا؟'' ناصر نے پوچھا۔ ''میرا اندازہ ہے کہ دوسری طرف جمال خان شیروانی تھا۔''

''وہ کیا کہہ رہا تھا نیکے پتر؟'' راجا نے کہا۔ ''اور تو اتنے غصے میں کیوں ہے؟''

''کہہ رہا تھا کہ آفتاب خان کی بیٹی کو گھر چھوڑ آئیں ورنہ میں قانونی کارروائی کروں گا۔''

''جمال خان کو کس نے بتایا کہ ارم ہمارے قبضے میں ہے۔''

اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی پھر بجنے لگی۔ اس مرتبہ اسکرین پر پھر کوئی اجنبی نمبر تھا۔

''ہیلو!'' میں نے سیل فون کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

''نواب رفیق! تم نے اگر دو گھنٹے کے اندر اندر ارم کو واپس نہ بھیجا تو تمہاری اور ڈپٹی سیکریٹری کی بیٹی کی وڈیو فلم مارکیٹ میں پہنچ جائے گی۔'' دوسری طرف سے دلاور کی آواز سنائی دی۔

''اچھا ابھی دو گھنٹے باقی ہیں؟'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''تمہاری دی ہوئی مہلت کے دس گھنٹے تو پورے ہو چکے ہیں۔''

''باتیں مت بناؤ رفیق!'' دلاور نے درشت لہجے میں کہا۔ ''تمہارے پاس صرف دو گھنٹے ہیں، صرف دو گھنٹے!''

''یہ کون جانتا ہے دلاور کہ کس کے پاس کتنا وقت ہے؟'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''تم مجھے دھمکیاں مت دو اور جو کچھ کرنا چاہتے ہو کر گزرو لیکن تمہارے پاس ابھی ایک دن باقی ہے۔ میں تمہیں دھمکیاں نہیں دوں گا بلکہ ارم کی لاش تمہارے حوالے کر دوں گا۔''

''تمہیں اندازہ نہیں ہے رفیق کہ تم کتنی بڑی مصیبت میں پڑنے والے ہو۔''

''مجھے ہر قسم کی مصیبت کا اندازہ ہے۔'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ''اور تم اتنے ہی جی دار ہو تو یہ چوروں کی طرح نمبر بدل بدل کر فون کیوں کرتے ہو؟''

''یہ میرا ہی نمبر ہے۔'' دلاور نے کہا۔ ''اور میں ہمیشہ تمہیں اسی نمبر پر ملوں گا۔''

''ہمیشہ سے تمہاری کیا مراد ہے؟ دو گھنٹے بعد یا ایک دن بعد؟'' میں نے کہا۔

''اگر تم نے اپنی بدنامی کے خوف سے خودکشی نہ کر لی تو ہمیشہ!'' دلاور نے کہا اور فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

راجا اور ناصر تشویش سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں نے انہیں بتایا کہ دلاور کیا کہہ رہا تھا۔

''حیرت تو مجھے شیروانی صاحب پر ہے۔'' راجا نے کہا۔

''یار، اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟'' ناصر نے کہا۔ ''شیروانی ایسا ہی بااصول اور سخت گیر افسر ہے۔ آفتاب خان نے تیرے ظلم کا نقشہ کچھ اس انداز میں کھینچا ہوگا کہ وہ طیش میں آ گیا۔''

''نیکے پتر!'' راجا نے کچھ سوچ کر کہا۔ ''تو ایک دفعہ شیروانی صاحب کو فون تو کر۔ وہ بھی تو......''

سیل فون کی گھنٹی میں اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ اس مرتبہ پھر شیروانی مجھے کال کر رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اس کی کال منقطع کر دوں لیکن پھر میں نے اس سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

''اب کیا پرابلم ہے؟'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

''نواب صاحب! میں بہت مصیبت میں ہوں۔'' شیروانی کا لہجہ اس دفعہ بالکل بدلا ہوا تھا۔ ''آفتاب خان کے کچھ آدمی اچانک میرے گھر میں گھس آئے تھے اور انہوں نے وہ کال گن پوائنٹ پر مجھ سے کرائی تھی۔ ان لوگوں میں ایک آدمی بہت درشت لہجے میں بات کر رہا تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں کو بھی بات بات پر جھڑک رہا تھا۔ اس نے میری بیٹی کی کنپٹی پر گن رکھ کر مجھے مجبور کیا کہ میں آپ سے وہ باتیں کروں۔''

''آپ اس وقت لاہور میں ہیں یا......''

''میں آج کل لاہور ہی میں ہوں۔'' شیروانی نے کہا۔ ''اگر آپ کے پاس اس کی بیٹی ہے تو واپس کر دیں۔ اس نے مجھے دھمکی دی ہے کہ اگر دو گھنٹے کے اندر اندر آفتاب خان کی بیٹی گھر نہ پہنچی تو تمہاری بیٹی کی وڈیو فلم مارکیٹ میں پہنچ جائے گی۔''

''آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ میں آپ کی عزت پر آنچ نہیں آنے دوں گا۔''

''تو پھر آفتاب خان کی بیٹی کو اس کے گھر پہنچا دیں۔'' شیروانی نے خوشامد بھرے لہجے میں کہا۔

''آپ ان سے یہ کہیں کہ تم مجھے اس وڈیو کا ماسٹر پرنٹ دے دو۔ میں رفیق سے تمہاری بیٹی کو رہا کرا دوں گا۔''

''اگر انہوں نے ماسٹر پرنٹ دے دیا تو آپ اس کی بیٹی کو واپس بھیج دیں گے؟'' شیروانی نے بچوں کی طرح کہا۔ مجھے اس وقت اندازہ ہوا کہ ایک باپ کتنا مجبور ہوتا ہے۔

''جی ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''اگر انہوں نے وہ فلم واپس کر دی تو ارم گھر پہنچ جائے گی۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔''

''اس کا مطلب یہ ہے کہ ارم واقعی تمہارے قبضے میں ہے؟'' جمال شیروانی نے کہا۔

''جی ہاں، ان لوگوں نے میری منگیتر کو اغوا کیا ہے۔ میں نے جوابی طور پر آفتاب خان کی بیٹی کو یرغمال بنا لیا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ آپ اقرار کرتے ہیں کہ ارم آپ کے قبضے میں ہے۔'' شیروانی کا لہجہ اچانک بدل گیا۔

''یہ میں نے کب کہا کہ ارم میرے قبضے میں ہے۔'' میں نے بھی قلابازی کھائی۔ ''میں صرف یہ کہہ رہا ہوں کہ اگر یہ لوگ میری اور ثمرہ کی اس شرمناک وڈیو فلم کو واپس کر دیں جو انہوں نے دھوکے سے بنائی ہے اور نور کو میرے حوالے کر دیں تو میں بھی کوشش کروں گا کہ ارم کو ان کے حوالے کر دیا جائے۔''

''آپ کے پاس صرف دو گھنٹے ہیں مسٹر رفیق!'' شیروانی نے کہا۔

''دو گھنٹے کہاں اب تو ایک گھنٹا چالیس منٹ ہی رہ گئے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''پرابلم ان لوگوں کا ہے۔ یہ اتنی جلدی وہ وڈیو فلم کیسے واپس کریں گے۔ نور کو مجھ تک کیسے پہنچائیں گے۔ دو گھنٹے تو ست بدھائی پہنچنے ہی میں لگ جائیں گے۔''

''آپ کو شاید علم نہیں ہے کہ آپ کی تمام گفتگو ریکارڈ ہو چکی ہے۔'' شیروانی نے سرد لہجے میں کہا۔

''چلیے اچھا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تو پھر آپ مجھے پھانسی پر چڑھوا دیں۔'' یہ کہہ کر میں نے فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

جمال خان شیروانی کے ساتھ کوئی نہ کوئی پرابلم ضرور تھا۔ مجھے تو لگ رہا تھا کہ وہ اس وقت بھی گن پوائنٹ پر بول رہا تھا۔

''یہ جمال خان شیروانی کو کیا ہوا ہے؟'' میری پوری بات سن کر ناصر نے کہا۔

''وہ پہلے بھی گن پوائنٹ پر گفتگو کر رہا تھا اور اب بھی!'' میں نے کہا۔ ''میں اس وقت کھٹکا تھا جب اس نے بدلے ہوئے لہجے میں مجھ سے پوچھا تھا کہ آپ اعتراف کرتے ہیں کہ ارم آپ کے قبضے میں ہے۔ لہٰذا میں بھی جوابی طور پر گول مول بات کروں۔ مجھے بھی شبہ ہو گیا تھا کہ میری گفتگو ریکارڈ ہو رہی ہے۔''

اگر واقعی اس نے یہ باتیں ریکارڈ کی ہیں تو اب دلاور یا آفتاب خان اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ میں نے جان بوجھ کر نور کے اغوا اور ثمرہ کی شرمناک وڈیو کا تذکرہ کیا ہے، بس اچانک مجھے خیال آ گیا کہ شیروانی اس مرتبہ بھی کسی اور کی زبان بول رہا ہے۔

گیٹ کھلا اور پورچ میں ناصر کی گاڑی داخل ہوئی جسے شاہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ پسنجر سیٹ پر کوئی خاتون تھیں۔ ہاں، وہ گولی ہی تھی جسے میں پہلی نظر میں پہچان بھی نہ سکا۔ وہ اس گولی سے بالکل مختلف تھی جسے میں جانتا تھا۔ اس نے بہت سلیقے سے میک اپ کر رکھا تھا۔ رنگ تو اس کا پہلے بھی صاف تھا لیکن اب اس کی جلد میں ایک چمک سی تھی۔ اس نے اپنے بال براؤن کر رکھے تھے جو اس وقت کھلے ہوئے تھے اور اس کی کمر تک پہنچ رہے تھے، جسم پر بہت نفیس ساری تھی اور پیروں میں سیاہ پٹیوں والی چپل تھی جو اس کے پیروں میں بہت اچھی لگ رہی تھی۔ میں اسے دیکھتا رہ گیا۔ راجا کی بھی یہی کیفیت تھی۔ وہ گاڑی سے اتر کر خراماں

خراماں ہماری طرف بڑھی اور مسکرا کر بولی۔ ''مجھے اتنی حیرت سے کیوں دیکھ رہے ہیں آپ لوگ؟ مجھے شامی نے بتایا تھا کہ آپ لوگوں نے حلیہ بدل رکھا ہے۔ آپ لوگوں میں سے نواب صاحب کون ہیں؟'' اس نے سر سے پیر تک ہمارا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

''تو خود ہی پہچان گولی!'' شامی نے کہا۔ ''تو تو بہت ذہین بنتی ہے نا؟''

''یہ بات ہے تو ابھی پہچان لیتی ہوں۔'' گولی نے کہا، پھر بہت غور سے ہمارا جائزہ لیا اور اچانک مجھ سے بولی۔ ''السلام علیکم نواب صاحب!''

میں نے چونک کر اسے دیکھا، پھر اس سے پوچھا۔ ''تم نے مجھے کیسے پہچانا گولی؟''

''نواب صاحب! آپ کے قد اور جسم سے۔ آپ کا قد ان سب لوگوں سے لمبا ہے، پھر آپ کی انگلی میں ہیرے کی جو انگوٹھی ہے، میں اسے کیسے بھول سکتی ہوں؟''

''تم نے تو کمال کر دیا گولی!'' راجا نے کہا۔ ''تمہیں تو کسی سراغ رساں ایجنسی میں ہونا چاہیے تھا۔''

''اب ایسی بات بھی نہیں ہے راجا صاحب!'' گولی نے راجا کو اس کی آواز سے پہچانا۔ ''اگر نواب صاحب آپ لوگوں کے ساتھ نہ ہوتے تو شاید میں بھی انہیں نہ پہچان پاتی۔''

''اچھا، اندر تو چلو۔'' میں نے کہا۔ ''تم کیسی ہو گولی؟''

''میں تو جیسی بھی ہوں، آپ کے سامنے ہوں۔'' گولی نے ہنس کر کہا۔ ''آپ مجھے کچھ کمزور اور پریشان نظر آ رہے ہیں۔''

ہم لوگ لاؤنج میں جا بیٹھے۔ میں نے غنی سے کہا کہ نیلم سے کافی بنواؤ۔

''یہ نیلم کون ہے نواب صاحب؟'' گولی نے پوچھا۔

''نیلم ہماری ملازمہ ہے، میں کام کاج کے لیے اسے ست بدھائی سے یہاں لے آیا ہوں۔''

گولی بھی نور کے اغوا پر بہت افسردہ اور فکر مند ہو گئی۔ شامی نے شاید اسے نور کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔

اسی وقت نیلم کافی کی ٹرالی دھکیلتے ہوئے وہاں آ گئی۔

گولی نے حیرت سے اسے دیکھا، پھر کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

میں نے نیلم سے اس کا تعارف کرایا اور اسے بتایا کہ اب گولی بھی ہمارے ساتھ ہی رہے گی۔

میں نے ابھی کافی ختم بھی نہیں کی تھی کہ میرے سیل فون کی گھنٹی پھر بجنے لگی۔ اسکرین پر ایک مرتبہ پھر مجھے جمال خان شیروانی کا نام دکھائی دیا۔

میں نے بٹن دبایا اور جھنجلا کر سیل فون کان سے لگالیا۔

''جی فرمایئے، اب کیا مسئلہ ہے؟''

''نواب صاحب!'' شیروانی نے کہا۔ ''میں آپ سے بہت شرمندہ ہوں۔ آپ سے دو مرتبہ فون پر بات ہوئی اور دونوں مرتبہ دلاور میرے سر پر موجود تھا۔ اس نے ثمرہ کو یرغمال بنا رکھا تھا۔ وہ مجھے دھمکی دے کر گیا ہے کہ اگر ایک گھنٹے کے اندر اندر ارم گھر نہ پہنچی تو میں نہ صرف اس کی وڈیو مارکیٹ میں پھیلا دوں گا بلکہ اسے بھی اغوا کرلوں گا۔ تم چاہے پورے پنجاب کی پولیس کو جمع کرلو۔''

''جہاں تک وڈیو کا تعلق ہے، وہ دلاور کو ابھی تک ملی ہی نہیں ہے ورنہ وہ اس کی ایک کاپی آپ کو ضرور دیتا۔'' میں نے کہا۔ ''یہ دلاور کی چال بھی ہوسکتی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ آپ یا آپ کا کوئی آدمی میرے پاس دوڑا دوڑا آئے گا یا پھر میں آپ کے بنگلے پر پہنچوں گا اور وہ لوگ مجھے وہاں گھیر لیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کے بنگلے کے اردگرد دلاور کے آدمی ضرور موجود ہوں گے۔''

''پھر میں کیا کروں؟'' شیروانی نے کہا۔ ''کیا میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہوں؟''

''آپ پولیس کو طلب کریں اور ان لوگوں کے خلاف رپورٹ درج کرائیں، آپ رپورٹ میں راجا زوہیب اور دلاور کا نام بھی ظاہر کردیں۔''

''میں پولیس کو تو پہلے ہی اطلاع دے چکا ہوں۔'' شیروانی نے کہا۔ ''اور پولیس کا ایک ایس ایس پی اس وقت بھی میرے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا ہے لیکن رپورٹ میں کسی کا نام نہیں لیا ہے میں نے۔''

''اس ایس ایس پی کے بارے میں آپ کچھ جانتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔ ''وہ کس قسم کا آدمی ہے؟ پولیس کے اکثر افسران ان لوگوں کے ہاتھوں بکے ہوئے ہیں۔''

''میں اس ایس ایس پی کے بارے میں اتنا جانتا ہوں کہ اس کی شہرت اچھی نہیں ہے۔''

''آپ ایسا کریں، ثمرہ کو شاپنگ کے لیے پیس (Pace) شاپنگ سینٹر تک بھیج دیں، وہ سینٹر آپ کے بنگلے سے زیادہ دور بھی نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ مشکل سے تین چار منٹ کی ڈرائیو ہوگی۔''

''اس سے کیا ہوگا؟'' شیروانی نے پوچھا۔

''اس سے یہ ہوگا کہ وہاں سے ثمرہ کو میرے آدمی

لے جائیں گے اور وہ محفوظ ہاتھوں میں پہنچ جائے گی، پھر دلاور پورے لاہور کے بدمعاش بھی جمع کرلے تو اس کا سراغ نہیں لگا سکے گا۔''

''نواب صاحب! آپ کیا لاہور ہی میں ہیں؟''

''میں اس وقت جہاں بھی ہوں، محفوظ ہوں۔'' میں نے اسے مبہم سا جواب دیا۔ ''آپ اگر مجھ پر اعتبار کرتے ہیں تو ثمرہ کو بھیج دیں ورنہ پولیس تو اس کی حفاظت کے لیے موجود ہی ہے۔ آپ ایسے پولیس افسروں کو بھی ضرور جانتے ہوں گے جو نیک نام ہیں اور اپنی ڈیوٹی فرض سمجھ کر کرتے ہیں۔''

''میں ایسے پولیس افسروں کو جانتا ہوں۔'' شیروانی نے کہا۔

''تو پھر آپ ان میں سے کسی کو بلالیں۔''

''میں تو عجیب مصیبت میں پڑ گیا ہوں۔'' شیروانی نے کہا۔

''آپ پریشان نہ ہوں۔ بس ایسے پولیس افسروں کو ڈیوٹی پر بلائیں، جو آپ کے خیال میں مخلص اور ایمان دار ہیں۔ میں اس دوران میں دلاور تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' میں نے اسے تسلی دے کر فون کا سلسلہ منقطع کر دیا۔

''اولاد کی محبت واقعی ایسی چیز ہے جو انسان کو بزدل بنا دیتی ہے۔ شیروانی جیسا سخت گیر اور بااختیار افسر بھی اس وقت ذہنی طور پر مفلوج ہو کر رہ گیا ہے۔'' میں نے ناصر سے کہا۔

''دیکھیے پتر!'' راجا نے کہا۔ ''تو نے اس سے جھوٹ کیوں بولا کہ وہ ویڈیو ابھی تک دلاور کو نہیں ملی ہے؟''

''یہ جھوٹ نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اگر ویڈیو اسے مل گئی ہوتی تو وہ شیروانی کو اس کی ایک کاپی ضرور دیتا۔''

''یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ ان لوگوں نے ابھی تک اس ویڈیو فلم کی کاپیاں تیار نہ کی ہوں۔ آج نہیں تو کل وہ شیروانی کو کاپی بھیج دے گا۔''

''مہاراجا! آپ ذرا اپنے گھٹنوں کو تکلیف دیں۔'' میں نے کہا۔ ''کیونکہ آپ کی عقل تو گھٹنوں میں ہے۔ ان کا ایک اہم مہرہ قدوائی مارا گیا ہے۔ اس سے تو یہ پوچھنے کا موقع ہی نہیں ملا کہ وہ ویڈیو فلمیں کسے دیتا ہے؟ ان کا ایک اور اہم آدمی ڈاکٹر ہمارے قبضے میں ہے۔ ویڈیو فلمز کی تیاری اور ترسیل کے ذمے دار ابھی تو یہ لوگ ہی تھے۔ امکان یہی ہے کہ ویڈیو فلم اب تک دلاور کو نہیں ملی ہے۔ ثمرہ کو اغوا کرنے کی دھمکی تو اس نے شیروانی صاحب کو نفسیاتی طور پر الجھانے کے لیے دی ہے۔ اسے اگر ثمرہ کو اغوا ہی کرنا ہوتا تو وہ اسے اس وقت اغوا کرلیتا جب وہ شیروانی صاحب کے بنگلے پر موجود تھا۔''

اچانک مجھے یاد آیا تو میں نے شامی کو مخاطب کیا۔

''شامی! تم نے آفتاب خان کے کس دست راست کا ذکر کیا تھا؟''

''میں نے ارشد خان کے بارے میں بتایا تھا۔'' شامی نے کہا۔ ''میں نے مزید تصدیق کرلی ہے۔ ارشد خان ہی آفتاب کا دایاں ہاتھ ہے۔ اس سے ہمیں بہت کچھ معلوم ہوسکتا ہے۔''

''تو پھر دیر کیوں کر رہے ہو؟'' میں نے تنبیہی لہجے میں پوچھا۔ ''اس سے مزید پوچھ گچھ کیوں نہیں کرتے؟''

''میں تو آپ کے حکم کا منتظر تھا۔'' شامی نے کہا۔ ''اسے تو میں آج رات ہی اٹھالوں گا۔''

''شامی بادشاہ!'' میں نے کہا۔ ''ہم اس وقت ست بدھائی کی حویلی میں نہیں بلکہ ماڈل ٹاؤن کی ایک کوٹھی میں موجود ہیں۔ تم اسے......''

''آپ فکر مت کرو نواب بھائی!'' شامی نے کہا۔ ''میں اتنا گیا گزرا نہیں ہوں کہ لاہور میں کوئی ٹھکانا نہ ملے۔ میں ارشد کو اپنے کسی ٹھکانے پر لے جاؤں گا۔''

''لیکن تم وہاں اکیلے نہیں جاؤ گے۔'' میں نے کہا۔ ''میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔ ارشد اور قدوائی میں بہت فرق ہے۔ ارشد ایک جرائم پیشہ آدمی ہے اور اس کے اردگرد بھی ایسے ہی لوگ ہوں گے۔''

''شامی کبھی ایسے خطروں سے گھبرایا ہے نہ گھبرائے گا؟'' شامی نے کہا۔

''لیکن میں پھر بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔'' میں نے زور دیتے ہوئے کہا اور ناصر اور راجا کو تاکید کی کہ وہ یہیں بنگلے پر رکیں اور محتاط رہیں۔ قادر بخش کو بلا کر بھی یہی ہدایت دی۔

''آپ یہاں کی فکر مت کرو نواب بھائی!'' شامی نے کہا۔ ''یہاں راجا صاحب اور ناصر صاحب کے علاوہ گولی بھی تو ہے۔''

''ہاں، گولی کو تو میں بھول ہی گیا تھا۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''یہ تو تمہیں بھی موت کے منہ سے نکال لائی تھی۔''

☆☆☆

رات تاریک تھی لیکن فضا میں اتنی خنکی نہیں تھی۔ میں نے اس وقت ڈبل کیبن پک اپ استعمال کرنے کو ترجیح دی۔

ڈرائیونگ سیٹ پر حسبِ معمول غنی موجود تھا، اس کے ساتھ احمد شاہ بیٹھا تھا۔ میں اور شامی عقبی نشست پر تھے۔ غنی اپنی عادت کے مطابق بہت تیز رفتاری سے ڈرائیونگ کر رہا

تھا۔ میں نے کئی بار اسے ٹوکا بھی۔

اس وقت زیادہ رات نہیں گزری تھی۔ صرف ساڑھے دس ہی بجے تھے۔ احمد شاہ اور غنی نے آفتاب خان کا وہ گیراج پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔

ہم لوگ بادامی باغ کے لاری اڈے سے گزر کر دو تین فرلانگ ہی چلے ہوں گے کہ غنی نے گاڑی روک دی اور بولا۔ ''سر! وہ سامنے جو احاطہ نظر آرہا ہے، اس میں آفتاب خان کا گیراج اور ورک شاپ ہے اور اس کا دفتر بھی!''

''تم گاڑی کو ایسی جگہ پارک کرو جہاں وہ کسی کی نظروں میں نہ آئے۔'' میں نے کہا۔

غنی نے اردگرد دیکھا۔ وہاں دور دور تک خالی پلاٹ تھے..... کچھ فاصلے پر ایک پلاٹ میں درختوں کے جھنڈ میں غنی نے گاڑی پارک کر دی۔ اب ہماری گاڑی اس وقت تک کسی کی نظر میں نہیں آسکتی جب تک اسے خاص طور پر تلاش نہ کیا جاتا۔

آفتاب خان کا گیراج وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ہم لوگ مشکل سے دو منٹ میں وہاں پہنچ گئے۔ گیراج کے اندر تیز روشنی..... تھی اور اندر سے لوگوں کے چیخنے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ورک شاپ میں بھی کام ہو رہا تھا۔

ہم نے گھوم پھر کے اس گیراج کا جائزہ لیا۔ وہ خاصی وسیع و عریض جگہ پر بنایا گیا تھا۔ اس کی چار دیواری بھی خاصی بلند تھی۔ ایک اچھی بات یہ تھی کہ اس کے اردگرد کوئی دوسری عمارت موجود نہیں تھی۔ ہمیں عمارت کے اندرونی نقشے کا بھی علم نہیں تھا۔ ہم اگر عقب سے اس گیراج میں داخل ہوتے تو یہ بھی ممکن تھا کہ ہم ورک شاپ میں اترتے۔ شامی نے آوازوں سے اندازہ لگایا کہ ورک شاپ مین گیٹ کے ساتھ ہی ہے۔

غنی اور احمد شاہ کی پشت پر تھیلے بھی لدے ہوئے تھے۔ شامی کے ہاتھ میں بھی ایک تھیلا تھا، جبکہ میرے ہاتھ خالی تھے۔ میرا ریوالور اور اس کے فاضل راؤنڈز جیکٹ کی جیبوں میں تھے۔

شامی نے ایک جگہ رک کر کہا۔ ''ہمیں یہاں سے باؤنڈری وال پھلانگ کر اندر داخل ہونا چاہیے۔'' اس نے دیوار سے کان لگانے کے بعد کہا۔ ''اس طرف بالکل سناٹا ہے۔''

اس نے اپنے تھیلے سے پتلی سی مضبوط رسی کا لچھا نکالا۔ اس کے ایک سرے پر اس قسم کا ہک لگا ہوا تھا جیسے بحری جہازوں کے لنگر ہوتے ہیں۔ اس ہک میں چار کونے تھے۔ شامی نے مخصوص انداز میں رسی کو گھمایا اور دیوار پر پھینک دیا۔

''ٹھک'' کی ہلکی سی آواز آئی اور وہ ہک چار دیواری میں اٹک گیا۔ شامی نے رسی کو اچھی طرح کھینچ کر اندازہ لگایا کہ ہک صحیح طرح پھنسا ہے یا نہیں، پھر وہ اس کے سہارے بہت مہارت سے اوپر چڑھ گیا۔ اس نے دیوار پر بیٹھ کر اردگرد کا جائزہ لیا، پھر غنی کو اوپر آنے کا اشارہ کیا۔

غنی اور احمد شاہ بھی دیوار پر پہنچ گئے۔ وہ لوگ دیوار پر چھپکلی کی طرح چپکے ہوئے تھے۔

شامی نے رسی اندر پھینکی اور اس کی مدد سے پہلے خود اندر اترا۔ اس نے چند لمحے ٹھہر کر اندر کی سن گن لی، پھر ہمیں بھی نیچے آنے کا اشارہ کر دیا۔ تاریکی میں مجھے صرف شامی کا ہیولا نظر آرہا تھا۔ ہم تینوں بھی اسی طرح نیچے پہنچ گئے۔

شامی نے اس کو اسی طرح چھوڑنے کا ارادہ کیا، پھر کچھ سوچ کر وہ پلٹ کر آیا اور مخصوص جھٹکا دے کر ہک دیوار سے نکال لیا اور اس کا لچھا بنا کر اسے دوبارہ اپنے تھیلے میں رکھ لیا۔

شامی نے بہت مناسب جگہ منتخب کی تھی۔ وہاں سے خاصے فاصلے پر تین چار بسیں اور ٹرک کھڑے ہوئے تھے۔

کافی دور سے ورک شاپ کا شور اور لوگوں کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔

میں اندازے سے اس طرف بڑھا جہاں دفتر ہو سکتا تھا۔ بس مجھے ایک ہی خدشہ تھا کہ ارشد چلا نہ گیا ہو لیکن شامی نے بتایا کہ ارشد رہتا بھی وہیں تھا۔ دفتر کی عمارت دو منزلہ تھی۔ بالائی منزل پر ارشد اور ایک دو ہم وائزر رہتے تھے۔

ہم کچھ آگے ہی بڑھے تھے کہ ہمیں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ہم لوگ پھرتی سے زمین پر لیٹ گئے۔ وہاں تو خودرو جھاڑیاں بھی اتنی نہیں تھیں کہ وہ ہمیں چھپا لیتیں۔ وہ آدمی اپنی ہی دھن میں گنگناتے ہوئے ہماری ہی طرف آرہا تھا۔ وہ اگر غور سے زمین کی طرف دیکھ لیتا تو ہم لوگ فوراً ہی اس کی نظر میں آجاتے۔

وہ کچھ نزدیک آیا تو اچانک اس کی نظر ہم پر پڑ گئی۔ وہ ٹھٹک کر رک گیا اور ڈپٹ کر بولا۔ ''کون ہو اوئے تم لوگ؟''

''مسافر ہیں سائیں!'' شامی نے کہا اور اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔

''مسافر ہو؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔

اتنی دیر میں احمد شاہ چھپکلی کی طرح رینگتے ہوئے اس کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔

''ہاں بھائی، ہم لوگ مسافر ہیں۔'' شامی نے کہا۔ ''ہماری بس خراب ہو گئی تھی تو ہم ادھر آگئے۔''

''کون سی بس..... تم لوگ.....''

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا کیونکہ احمد شاہ نے اچھل کر
ے دبوچ لیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ اور احمد شاہ دونوں
ین پر تھے۔ احمد شاہ کا ایک ہاتھ مضبوطی سے اس کے منہ پر
ا ہوا تھا۔

''اگر حلق سے آواز نکالی تو ذبح کر دوں گا۔'' شامی
ے نہ جانے کہاں سے ایک خنجر برآمد کرتے ہوئے کہا اور خنجر
ں کی گردن پر رکھ دیا۔

احمد شاہ نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا دیا۔ وہ گہرے
ہرے سانس لینے لگا۔

''منیجر کا دفتر کس طرف ہے؟'' شامی نے سرگوشی میں
ے پوچھا۔

''اس طرف!'' اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ''
مے جا کر بائیں ہاتھ پر..... گھومو گے تو تمہیں دفتر نظر
جائے گا۔''

''وہاں اس وقت کتنے آدمی ہیں؟'' شامی نے پوچھا۔

''دفتر کے باہر ایک چوکیدار ہے اور اندر ارشد
احب کے علاوہ ایک چپراسی ہے۔'' اس آدمی نے سہمے
ئے لہجے میں جواب دیا۔

''چوکیدار کے پاس کوئی بندوق وغیرہ ہے؟'' شامی
ے پوچھا۔

''ہاں، اس کے پاس ایک رائفل ہے۔'' اس نے
اب دیا۔

شامی نے احمد شاہ کو اشارہ کیا۔ شامی نے اس کی کنپٹی
ایک زوردار ہاتھ مارا تو اس کی گردن ایک طرف ڈھلک
ی۔ اسے سائڈ میں ڈال کر ہم لوگ اس سمت میں بڑھے
دھر اس نے اشارہ کیا تھا۔

دائیں طرف گھومتے ہی ہمیں دفتر کی عمارت نظر
آگئی۔ اس کے سامنے اور اردگرد کیاریاں تھیں لیکن وہ ایسی
نہیں تھیں کہ ہم ان میں چھپ سکتے۔

ہم کچھ دور آگے بڑھتے تو چوکیدار کی نظروں میں
آجاتے۔ وہ مسلح تھا اور فائر بھی کر سکتا تھا۔ اس کی فائرنگ
ے ہم میں سے کوئی زخمی یا ہلاک تو ہوتا ہی، ارشد اور اس کی
ورک شاپ میں کام کرنے والے ہوشیار ہو جاتے۔ میں نے
چند لمحے اس صورت حال پر غور کیا، پھر شامی سے سرگوشی میں
کہا۔ ''ہم دفتر کے عقب میں بھی تو جا سکتے ہیں۔''

''ہاں نواب بھائی! میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔''

وہ احاطہ دور دور تک ویران تھا۔ ہم نے ایک لمبا چکر
کاٹا اور دفتر کے عقب میں پہنچ گئے۔ بالائی منزل کی ایک

کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ جس سے روشنی باہر آرہی تھی۔ ہم لوگ زمین پر پیٹ کے بل کھسکتے ہوئے آگے بڑھے۔ جلد ہی مجھے چوکیدار نظر آ گیا۔ وہ اپنی رائفل کندھے سے لٹکائے ایک کرسی پر ڈھیلے ڈھالے انداز میں بیٹھا تھا۔ مشکل یہ تھی کہ اس کا رخ ہماری طرف تھا۔

شامی نے مٹی کا ایک ڈھیلا اٹھایا اور اسے چوکیدار کی طرف اچھال دیا۔ مٹی کا وہ ڈھیلا اس سے چند قدم کے فاصلے پر گرا۔ وہ چونک کر اردگرد دیکھنے لگا۔ ہم لوگ دفتر کی عقبی دیوار کے ساتھ بالکل چپک کر کھڑے ہو گئے۔

میں نے دیوار کی اوٹ سے جھانک کر دیکھا، چوکیدار اب کھڑا ہو گیا تھا اور حیرت سے اردگرد دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ ٹہلتا ہوا چوکنا انداز میں اس طرف بڑھا جدھر ہم چھپے ہوئے تھے۔

وہ جوں ہی میرے نزدیک آیا۔ میں نے اچھل کر اسے پکڑ لیا اور ایک ہی وار میں اسے ناک آؤٹ کر دیا۔

''اس بے چارے کو مار کیوں دیا؟'' شامی نے کہا۔

''یہ مرا نہیں ہے، صرف بے ہوش ہے۔'' میں نے کہا۔

''تو اب بھائی! میں نے اتنا خون خرابا کیا ہے کہ میں صرف آواز سن کر بتا سکتا ہوں کہ بندہ مر گیا یا زندہ ہے۔ مجھے بہت ہلکی سی چٹ کی آواز سنائی دی تھی، اس کی گردن ٹوٹ چکی ہے۔''

میں نے جھک کر اس کا جائزہ لیا، وہ بے چارہ واقعی مر چکا تھا۔ اس کی موت پر مجھے افسوس ہوا۔ کسی بھی بے گناہ انسان کی موت واقعی افسوس کا مقام ہے۔

شامی نے اس کی لاش کو گھسیٹ کر دفتر کی عقبی دیوار کے ساتھ ڈال دیا اور ہم لوگ محتاط انداز میں دفتر کی طرف بڑھے۔

اچانک چپڑاسی ٹائپ ایک شخص ہمارے سامنے آ گیا اور بولا۔ ''کون ہو تم لوگ، یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''ہمیں ارشد صاحب سے ملنا ہے۔'' شامی نے کہا۔ ''کہنا، گوجرانوالہ سے سکندر آیا ہے۔''

''اچھا! آپ ٹھہریں، میں صاحب کو اطلاع دیتا ہوں۔'' چپڑاسی نے کہا اور اندر کی طرف بڑھ گیا۔

اس کے جاتے ہی شامی نے ہمیں بھی چلنے کا اشارہ کیا۔ پھر اس نے غنی اور احمد شاہ کو وہیں رکنے کو کہا اور پھر ہمیں ساتھ لے کر چپڑاسی کے پیچھے پیچھے خود بھی کمرے میں داخل ہو گیا۔ چپڑاسی اس سے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اچانک سامنے بیٹھے ہوئے شخص کی نظر ہم پر پڑی۔ وہ چونک کر بولا۔ ''کون ہو تم لوگ اور یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''جناب عالی! میں ڈرائیور ہوں۔ مجھے پندرہ سال کی ڈرائیونگ کا تجربہ ہے۔ آج کل بے روزگار ہوں۔ مجھے اگر آپ اپنی کمپنی میں ملازمت دے دیں تو آپ کی بہت مہربانی ہوگی۔''

''تمہارا ڈرائیونگ لائسنس کہاں ہے اور وہ کتنا پرانا ہے۔'' ارشد نے کہا۔ ''ڈرائیونگ کا تجربہ تو وہی مانا جائے گا، جتنا پرانا لائسنس ہوگا۔''

میں نے اس درمیان اس شخص کا ٹھیک ٹھاک جائزہ لے لیا تھا۔ وہ خاصا تندرست و توانا شخص تھا اور ہاتھ پیر کا بھی مضبوط تھا۔

''ڈرائیونگ لائسنس میرے پاس ہے جناب عالی!'' شامی نے کہا۔

''یہ کون ہے؟'' ارشد نے میری طرف اشارہ کیا۔

''یہ میرا بھائی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''یہ بھی ٹرک پر میرے ساتھ کلینر تھا، اگر اسے بھی کوئی چھوٹی موٹی ملازمت مل جائے تو......''

''پہلے تم اپنی ملازمت کا بندوبست تو کر لو۔'' ارشد مسکرایا۔ ''اپنا ڈرائیونگ لائسنس دکھاؤ۔''

شامی نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور اچانک ریوالور نکال لیا۔

ارشد نے حیرت سے شامی کو دیکھا پھر اس نے دراز کی طرف ہاتھ بڑھایا تو شامی انتہائی درشت لہجے میں بولا۔ ''نہیں، تم اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کرو گے ورنہ میں کھوپڑی اڑا دوں گا۔ میرا ریوالور بے آواز چلتا ہے۔''

چپڑاسی نے دہشت زدہ ہو کر وہاں سے بھاگنے کی کوشش کی لیکن میں نے ایک ہی تھپڑ میں اسے زمیں بوس کر دیا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے بھی ریوالور نکال لیا اور جھک کر چپڑاسی کے سر پر اس کے دستے سے وار کر دیا۔ پھر میں گھوم کر ارشد کی طرف چلا گیا اور اس سے کہا۔ ''اپنے دونوں ہاتھ سر پر رکھو اور کھڑے ہو جاؤ۔''

''تم لوگ ہو کون اور کیا چاہتے ہو؟'' وہ بھنا کر بولا۔ وہ آدمی جی دار تھا ورنہ دو دو ریوالورز کی زد میں تو اچھے اچھوں کی گھگی بندھ جاتی ہے۔

میں نے اسے گریبان سے پکڑ کر کھڑا کر لیا اور ریوالور کی نال اس کی کنپٹی پر رکھ دی۔ ''میں نے جو کہا ہے، کیا تو نے وہ سنا نہیں؟'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔

ارشد نے دونوں ہاتھ سر پر رکھ لیے۔ میں نے اسے کھینچ کر ایک طرف دھکیل دیا۔

شامی نے انتہائی مہارت سے پہلے ارشد کی تلاشی لی، پھر اس کی دراز... کی تلاشی لی تو سب سے اوپر والی دراز میں اسے ریوالور نظر آ گیا۔ اس نے ریوالور نکال کر اپنی جیب میں ڈالا۔

''تم لوگ آخر ہو کون؟'' ارشد نے پوچھا۔

''ہم موت کے فرشتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''اور تیرا کام تمام کرنے آئے ہیں لیکن اگر چاہے تو تو بچ بھی سکتا ہے۔''

''آفتاب خان نے جو بریف کیس وکیل کے ہاتھ بھجوایا تھا، وہ کہاں ہے؟'' شامی نے اچانک پوچھا۔

ارشد نے چونک کر ہمیں دیکھا، پھر ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔ ''آفتاب خان نے مجھے کوئی بریف کیس نہیں بھجوایا۔''

''شامی!'' میں نے کہا۔ ''تم اپنا کام کرو۔ اسے ختم کر دو، ہم آفتاب خان سے بعد میں نمٹ لیں گے۔''

شامی نے اچانک وہی خنجر نکال لیا جو پہلے بھی مجھے اس کے ہاتھ میں نظر آیا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر ارشد کی ناف پر گھٹنے سے وار کیا۔ وہ تکلیف کی شدت سے دہرا ہوا تو شامی نے اس کے پیٹ پر ایک گھونسا رسید کر دیا۔ وہ اوندھے منہ گر پڑا۔ شامی اس کی پشت پر بیٹھ گیا اور اس کا ایک کان پکڑ کر بولا۔ ''جلدی بول ورنہ میں تیرا کان کاٹ دوں گا۔''

''میں نہیں جانتا کہ تم کس بریف کیس کی بات کر رہے ہو؟'' ارشد نے ڈھٹائی سے کہا۔

شامی نے اس کی گردن کی پشت پر خنجر سے ہلکا سا چرکا لگایا اور بولا۔ ''میں نے ابھی صرف اپنے خنجر کی دھار آزمائی ہے، بول ورنہ ایک ایک کر کے تیرے کان اور ناک کاٹ دوں گا۔''

''میں نے کہا نا کہ......''

شامی نے اچانک اس کا ایک کان کاٹ لیا۔ اس نے دوسرا ہاتھ ارشد کے منہ پر جما دیا تھا تاکہ اس کی چیخ نکلے تو حلق ہی میں گھٹ کر رہ جائے۔

وہ بری طرح اپنا سر جھٹکنے لگا۔ شامی نے اس کا کان اس کے سامنے زمین پر پھینک دیا۔ کم از کم اتنی سفاکی میں تو نہیں کر سکتا تھا۔ شامی نے اس کا دوسرا کان پکڑا اور اسے کاٹنے ہی والا تھا کہ ارشد نے اوں اوں کر کے اشارے سے اسے روک دیا۔ شامی نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا دیا۔

''بول کیا کہنا چاہتا ہے؟'' شامی نے پوچھا۔

''وہ بریف کیس آفتاب خان کا وکیل میرے پاس لایا ضرور تھا لیکن......''

شامی نے اس کا جملہ پورا بولنے سے پہلے ہی اس کا دوسرا کان پکڑ لیا اور اس پر خنجر رکھ دیا۔

''بتاتا ہوں۔'' ارشد کانپتے ہوئے بولا۔ ''میرا خون تیزی سے بہہ رہا ہے۔ مجھے......''

''ہم تیری مرہم پٹی بھی کر دیں گے اور تجھے اسپتال بھی لے جائیں گے لیکن صرف اس صورت میں جب تو سچ بولے گا۔'' میں نے کہا۔

''وہ بریف کیس اوپر میرے کمرے کی الماری میں ہے۔''

''ہمارے ساتھ کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش مت کرنا۔'' شامی نے کہا۔ ''میں کم سے کم تجھے تو ذبح کر ہی جاؤں گا۔''

''میں جھوٹ نہیں بول رہا۔'' ارشد نے سر اِدھر اُدھر جھٹکتے ہوئے کہا۔ ''وہ بریف کیس میری الماری کے تیسرے خانے میں کپڑوں کے پیچھے رکھا ہے۔''

''غنی!'' میں نے بلند آواز میں کہا۔

غنی دوسرے ہی لمحے کمرے میں آ گیا۔

''الماری کی چابیاں کہاں ہیں؟'' میں نے ارشد سے پوچھا۔

''وہ میری میز کی دراز میں ہیں۔'' ارشد نے کہا۔

میں نے اس کی دراز کھولی تو گاڑی کی چابیوں کے علاوہ ایک کی چین میں تین چار چابیاں اور دکھائی دیں۔ میں نے چابی اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔ ''یہی الماری کی چابیاں ہیں؟''

''ارشد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

میں نے غنی کو ہدایات دے کر اوپر بھیج دیا۔

''اگر یہ جھوٹ نکلا تو میں تیری گردن پر چھری پھیر دوں گا۔'' شامی نے سفاکی سے کہا۔ ''تو نے کبھی گائے یا بکرے کو ذبح ہوتے دیکھا ہے؟'' شامی نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ ''ضرور دیکھا ہوگا لیکن کبھی کسی انسان کو ذبح ہوتے نہیں دیکھا ہوگا لیکن افسوس یہ ہے کہ تو اب بھی نہیں دیکھ سکے گا۔''

''مجھے دھمکیاں مت دو۔'' ارشد نے کہا۔ ''میں موت سے نہیں ڈرتا۔ میں تو خود آفتاب خان سے نفرت کرتا ہوں، میں منشیات کی اسمگلنگ کرتا ہوں۔ آفتاب خان میرا پارٹنر ہے۔ ہمارے دھندے میں بے ایمانی بھی بہت ایمان داری سے کی جاتی ہے لیکن آفتاب خان تو یہاں بھی بے ایمانی کرتا ہے۔ میں کافی دن سے یہ بات نوٹ کر رہا ہوں کہ وہ میرے حصے کی پوری رقم مجھے نہیں دیتا۔''

''اگر تجھے آفتاب خان سے اتنی ہی نفرت ہے تو اپنا کان کیوں کٹوایا؟'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔

"میں آفتاب خان سے اس بریف کیس کا سودا خود کرنا چاہتا تھا۔"

"تجھے معلوم ہے کہ اس بریف کیس میں کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"دو دن پہلے تک معلوم نہیں تھا، پھر مجھے خیال آیا کہ جب آفتاب خان میرے ساتھ بے ایمانی کر رہا ہے تو میں اس کے ساتھ رعایت کیوں کروں؟ میں نے وہ بریف کیس کھول لیا۔ اس میں کچھ فائلیں اور بہت سی ڈی وی ڈیز تھیں۔ میں نے ایک ڈی وی ڈی چلا کر دیکھی تھی مجھے اندازہ ہوگیا کہ یہ بریف کیس آفتاب خان کے لیے کتنا اہم ہے، مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ یہ گھناؤنا کام بھی کرتا ہے۔"

"ان فائلوں میں کیا ہے؟"

"مجھے انگریزی نہیں آتی ورنہ میں وہ فائلیں بھی ضرور پڑھتا۔"

اسی وقت غنی واپس آگیا۔ اس کے ہاتھ میں خاصا بڑا بریف کیس تھا بلکہ اسے چھوٹا موٹا سوٹ کیس بھی کہا جاسکتا تھا۔ میں نے وہ بریف کیس کھول کر دیکھا، وہ ڈی وی ڈیز سے بھرا ہوا تھا، ہر ڈی وی ڈی پر اس لڑکی یا لڑکے کا نام لکھا تھا جنہیں بلیک میل کیا جاتا ہوگا۔

"اب ایک بات اور بتادو۔" میں نے ارشد سے کہا۔

"پہلے میرا خون روکنے کا کوئی بندوبست تو کرو ورنہ میں مرجاؤں گا۔"

"میں نے کہا نا کہ ہم سب کچھ کریں گے لیکن اپنے سوالات کے جواب لینے کے بعد۔"

"اب کیا پوچھنا ہے؟" ارشد نے جھنجلا کر کہا۔

"قدوائی نے جو ویڈیو فلم تمہیں پہنچائی تھی، وہ کہاں ہے؟"

ارشد چونک کر بولا۔ "قدوائی سے تمہارا کیا تعلق ہے؟"

"میرے تعلق کو چھوڑو۔" میں نے کہا۔ "تم یہ بتاؤ کہ وہ ویڈیو فلم کہاں ہے؟"

"قدوائی تو سیدھا سادا بندہ تھا۔" ارشد نے کہا۔ "اس کا تو آفتاب خان سے کوئی خاص تعلق بھی نہیں تھا۔ وہ پارٹی کا پُرجوش کارکن تھا اس لیے کبھی کبھار آفتاب خان سے مل لیتا تھا۔ اس کا ایک ہی شوق تھا۔ وہ موو ی کیمرے سے بہت بہترین ویڈیو بناتا تھا، پھر کچھ پیسے لے کر اسے ایک نجی ٹی وی چینل کو فروخت کردیتا تھا۔"

"وہ ویڈیو کہاں ہے جو قدوائی نے تمہیں دی تھی؟" شامی نے ایک مرتبہ پھر اس کے بال مضبوطی سے پکڑ لیے۔

وہ ابھی تک اوندھے منہ زمین پر پڑا تھا اور شامی اس کی پشت پر سوار تھا۔

"وہ بھی میں نے اسی دراز میں رکھی تھی جس میں بریف کیس تھا لیکن وہ بے ضرر سی ویڈیو فلم ہوگی، تمہیں اس سے کیا ملے گا۔ مجھے جب قدوائی کی موت کی اطلاع ملی تو میں نے سوچا تھا کہ میں یہ ویڈیو اس کے گھر پہنچادوں گا۔"

میں نے غنی کو ایک مرتبہ پھر اشارہ کیا کہ وہ اوپر جاکر ارشد کی الماری سے وہ ویڈیو لے آئے۔ تھوڑی دیر بعد غنی واپس آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ڈی وی ڈی تھی۔ اس ڈی وی ڈی میں میری فلم کے علاوہ مزید فلمیں بھی ہوسکتی تھیں۔

"اب تو مجھے چھوڑ دو۔" ارشد کراہ کر نحیف آواز میں بولا۔ اس کا خون تیزی سے ضائع ہورہا تھا اور لگ رہا تھا کہ اگر مزید وہ کچھ دیر اسی حالت میں رہا تو مرجائے گا۔

"ایک آخری سوال!" میں نے کہا۔ "وہ لڑکی نور کہاں ہے جسے آفتاب خان نے اغوا کیا ہے؟"

"میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" ارشد نے دانت بھینچ کر کہا۔

"لگتا ہے تم نے مرنے کا فیصلہ کرلیا ہے؟" میں نے کہا۔

"مجھے مارنا چاہتے ہو تو ماردو۔" اس نے کہا۔ "اب میں تم سے زندگی کی بھیک نہیں مانگوں گا۔"

"آفتاب خان لڑکیوں کو اغوا کرکے کہاں رکھتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ لڑکیاں بھی اغوا کرتا ہے، میں نے یہ سنا تو تھا لیکن مجھے یقین نہیں تھا۔" ارشد نے کہا۔ "میں شروع ہی سے قتل اور اغوا کا مخالف ہوں اس لیے آفتاب خان اس سلسلے میں مجھے اعتماد میں نہیں لیتا۔"

"تم پھر جھوٹ بول رہے ہو۔" شامی نے کہا اور دوسرا کان پکڑلیا۔

"اب تم چاہے میرے جسم کے ٹکڑے کردو، مجھے کچھ معلوم ہی نہیں ہے تو تمہیں کیا بتاؤں گا؟" ارشد کراہ کر بولا۔

"میں آخری دفعہ پوچھ رہا ہوں۔" شامی نے کہا اور اچانک اسے سیدھا کردیا۔

اس کا چہرہ خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ کان سے بہنے والا خون اس کے چہرے اور گردن پر پھیل گیا تھا اور فرش پر بھی جم گیا تھا۔

شامی نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے گھٹنوں کے نیچے دبائے اور ایک ہاتھ سے اس کی تھوڑی پکڑ کر اوپر اٹھائی اور

بولا۔ "اب میں تمہیں ذبح ہی کردوں گا۔" اس نے اپنا خنجر ارشد کے گلے پر رکھ دیا۔ "اگر آخری وقت میں کلمہ پڑھنا چاہتے ہو تو پڑھ لو۔"

"میں نے زندگی بھر برے کام کیے ہیں۔ اب آخری وقت میں کلمہ پڑھ کے کون سا میں جنت میں چلا جاؤں گا۔ تم اپنا کام کرو۔" یہ کہہ کر اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور ہونٹ سختی سے بھینچ لیے۔

شامی اس کے گلے پر اپنا خنجر پھیرنے ہی والا تھا کہ میں نے اسے روک لیا۔ مجھے اس وقت ارشد کے لہجے میں سچائی کی جھلک محسوس ہورہی تھی۔

شامی نے ارشد کو چھوڑا تو اس نے آنکھیں کھولیں اور حیرت سے مجھے دیکھا۔ اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد پڑگیا تھا۔

"چلو، اسے اسپتال لے چلو۔" میں نے کہا۔

"اب کوئی فائدہ نہیں ہے۔" ارشد مایوسی سے بولا۔ "مجھے لگتا ہے کہ...... میرا آخری وقت آگیا ہے۔ میری...... آنکھوں ...... کے سامنے...... اندھیرا...... ہی...... اند......"

وہ بولتے بولتے خاموش ہوگیا۔

میں نے آگے بڑھ کر اس کی نبض دیکھی، وہ بہت سست رفتاری سے چل رہی تھی۔

"اس کے زخم سے خون روکنے کا کوئی بندوبست کرو۔" میں نے تیزی میں شامی سے کہا۔ "اور اسے کسی اسپتال تک پہنچادو۔"

شامی نے اس کی قمیص پھاڑ کے اس کے زخم پر پٹی باندھ دی۔ خون یوں بھی رک چکا تھا۔

"اسے کسی اسپتال تک پہنچانے میں خطرہ ہے۔" شامی نے کہا۔

"ایک طریقہ ہے، ہم جس راستے سے اندر آئے ہیں، اسی سے باہر چلے جائیں۔ پھر ہم میں سے کوئی مین گیٹ کی طرف سے آکر اس کے کسی آدمی کو اطلاع دے دے کہ ارشد بہت بری طرح زخمی ہوگیا ہے، اسے فوری طور پر اسپتال پہنچادو ورنہ اس کی زندگی خطرے میں ہے۔"

"اس کے لیے اتنا کچھ کرنے کی کیا ضرورت ہے نواب بھائی؟" شامی نے کہا۔ "یہ مرگیا تو کیا فرق پڑے گا بلکہ اس کا تو مرجانا ہی بہتر ہے۔"

"نہیں شامی!" میں نے کہا۔ "میں دشمن کی جان اس وقت تک نہیں لیتا جب تک میری جان خطرے میں نہ ہو۔"

ہم لوگ یہاں سے باہر نکلنے ہی والے تھے کہ اس کے چپراسی کو ہوش آنے لگا۔

شامی نے کہا۔ "لیں، اب تو مسئلہ ہی حل ہوگیا۔ چپراسی ہوش میں آگیا ہے۔ یہ خود ہی ارشد کو اسپتال پہنچانے کا بندوبست کردے گا۔"

چپراسی نے تھوڑی دیر بعد آنکھیں کھول دیں۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہماری طرف دیکھا۔ پھر وہ اچانک اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے چیخنے کے لیے منہ کھولا لیکن شامی نے فوراً اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "آواز مت نکالنا ورنہ تمہارا بھی یہی حشر کریں گے جو ارشد کا کیا ہے؟"

اس نے دہشت ناک نظروں سے ارشد کو دیکھا، فرش پر جما ہوا خون دیکھا اور بری طرح لرزنے لگا۔

"ہم تمہیں چھوڑ دیں گے لیکن ایک شرط پر!" شامی نے کہا۔

اس نے جلدی جلدی اثبات میں سرہلایا۔

شامی نے اس کے منہ پر سے ہاتھ ہٹایا اور بولا۔ "ہمارے جانے کے بعد ارشد کو اسپتال لے جانا، یہ ابھی مرا نہیں ہے لیکن اگر اسپتال نہ پہنچے تو مرجائے گا، اور سنو! شور کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم جس طرح خاموشی سے آئے تھے، اسی طرح خاموشی سے چلے جائیں گے۔" پھر وہ مجھ سے بولا۔ "آپ اس کا خیال رکھیں، میں باہر جاکر دیوار پر رسی پھینکتا ہوں۔"

وہ اپنا تھیلا لے کر باہر چلا گیا۔ چپراسی کی آنکھوں میں ابھی تک وحشت تھی، اس نے غور سے ارشد کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے...... تو لگ رہا ہے...... کہ ...... ارشد...... صاحب...... مرگئے۔"

"یہ ابھی زندہ ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن اگر تم نے اسے اسپتال لے جانے میں دیر کی تو مرجائے گا۔ میں پھر ایک دفعہ کہہ رہا ہوں کہ ہمارے جانے کے بعد شور شرابا کرنے کے بجائے ارشد کو اسپتال پہنچانے کا بندوبست کرنا۔"

اس نے خوف زدہ انداز میں اثبات میں سرہلایا۔

کچھ دیر بعد شامی لوٹ آیا اور بولا۔ "آیئے، ہمارے دونوں آدمی اوپر پہنچ چکے ہیں۔ اسے بھی ساتھ لے لیں۔" اس نے چپراسی کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں، اللہ کے واسطے! مجھے معاف کردیں، میں کچھ نہیں کروں گا، کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔" وہ گڑگڑا کر بولا۔

"بے وقوف! ہم تمہیں قتل کرنے نہیں لے جارہے ہیں۔" شامی نے کہا۔ "بس، ذرا باہر تک لے جارہے ہیں۔ جب ہم چلے جائیں تو تم اپنے آدمیوں کو ارشد کے بارے میں بتاسکتے ہو۔"

شامی نے چپراسی کا کالر پیچھے سے پکڑا اور اسے زبردستی گھسیٹتے ہوئے باہر کی طرف لایا کیونکہ وہ کسی طور بھی باہر آنے پر آمادہ نہیں تھا۔

غنی اور احمد شاہ دونوں دیوار پر بلیوں کی طرح بیٹھے تھے۔ شامی نے مجھے اوپر چڑھنے کا اشارہ کیا اور جب میں اوپر پہنچ گیا تو اس نے چپراسی سے کہا۔ ''اگر تم ہماری اجازت کے بغیر یہاں سے ہلے بھی تو میں اوپر ہی سے گولی مار کے تمہاری کھوپڑی اڑا دوں گا۔ خاموشی سے یہیں کھڑے رہنا۔''

''تم فکر مت کرو شامی!'' میں نے اوپر سے کہا۔ ''یہ یہاں سے جانے کی کوشش کرے گا تو میں اسے گولی مار دوں گا۔''

شامی چند سیکنڈ میں دیوار پر پہنچ گیا۔

ہم سب ایک ایک کر کے نیچے اتر گئے۔ شامی ہم سب کے بعد آیا اور مخصوص جھٹکا دے کر رسی نکالی اور بولا۔ ''اب فوراً اپنی گاڑی تک پہنچیں۔ چپراسی دہشت زدہ انداز میں چیختے ہوئے بھاگا ہے۔''

ہم دوڑتے ہوئے اپنی گاڑی تک پہنچے اور دو منٹ سے بھی کم عرصے میں گاڑی میں بیٹھ گئے۔

غنی کے ہاتھ میں وہ بریف کیس بھی تھا جو اس نے ارشد کی الماری سے حاصل کیا تھا۔ اس کی جیب میں وہ ڈی وی بھی تھی، میں نے اس سے ایک مرتبہ پھر تصدیق کر لی تھی۔ ڈی وی اس کی جیب میں موجود تھی۔

دوسرے ہی لمحے ہماری گاڑی تیز رفتاری کے ریکارڈ توڑتی ہوئی وہاں سے روانہ ہو گئی۔

مین روڈ پر پہنچ کر میری ہدایت کے مطابق غنی نے گاڑی کی رفتار کافی حد تک کم کر دی۔

مجھے آج بہت بڑی کامیابی نصیب ہوئی تھی اور اس کا سہرا شامی کے سر تھا۔ شامی ہی نے ارشد کا سراغ لگایا تھا ورنہ کوئی اس پر شبہ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ آفتاب نے وہ بریف کیس ارشد کے پاس رکھوایا ہوگا۔ اب مجھے صرف نور کی فکر تھی، وہ نہ جانے کس حال میں تھی؟ میں اس کے بارے میں سوچتا تو کلیجا منہ کو آنے لگتا اور اسی شدت سے دلاور اور رانا زوہیب کے خلاف میری نفرت اور غصے میں اضافہ ہو جاتا تھا۔

ہم گھر پہنچے تو سوا ایک بجا تھا۔ گویا ہم نے یہ اتنا بڑا اور کامیاب آپریشن صرف ڈھائی گھنٹے میں مکمل کر لیا تھا۔ راجا اور ناصر بے چینی سے ہمارے منتظر تھے۔

''کوئی گڑبڑ؟'' میں نے ناصر سے پوچھا۔

''کوئی ایسی بات نہیں ہے فیکے پتر!'' راجا نے کہا۔ ''تو بتا، تو کون سا تیر مار کے آیا ہے؟''

''میں پہلے وہ ویڈیو دیکھوں گا، پھر کچھ کہوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے اپنی ویڈیو فلم کی ڈی وی بھی حاصل کر لی ہے لیکن اسے ڈی وی ڈی پر منتقل کرانا مشکل ہے، یہ کام تو کوئی پروفیشنل ہی کر سکتا ہے۔ ہم کسی عام اسٹوڈیو میں تو جا نہیں سکتے۔''

''یہ کوئی پرابلم نہیں ہے، میرا ایک دوست پروڈکشن ہاؤس چلا رہا ہے، وہ خود بھی آئی ٹی کا ماہر ہے۔ اس نے اپنے اسٹوڈیو میں پورا سسٹم لگا رکھا ہے۔ میں وہیں جا کر اس کو شفٹ کرا دوں گا۔''

''یار! اس سے بھی آسان طریقہ یہ ہے کہ ہم کوئی ڈی وی پلیئر خرید لیں۔ اسے کمپیوٹر کے مانیٹر کے ذریعے دیکھا جا سکتا ہے۔''

''ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔'' میں نے کہا۔ ''یار مہاراجا! کبھی کبھی تو واقعی اپنا گھٹنا استعمال کر لیتا ہے۔'' راجا نے مجھے گھور کر دیکھا تو میں نے کہا۔ ''بھئی عقل مندی کی بات کہنے کے لیے۔''

''ابھی اتنا خوش مت ہو فیکے پتر!'' راجا نے ہنس کر کہا۔ ''پہلے ان ڈی وی ڈیز کا دیدار کر لے۔ یہ نہ ہو کہ پھر پہلے کی طرح اس بریف کیس میں ہندی فلموں اور گیت مالا کی ڈی وی ڈیز بھری ہوں۔''

''چل، پھر پہلے یہی کام کر لیں۔''

''یار پہلے کھانا کھا لے۔'' راجا نے کہا۔

''تجھے بھوک لگ رہی ہے تو، تو کھا لے، میں تو پہلے یہ ڈی وی ڈیز دیکھوں گا۔'' میں نے کہا۔

''چل یہی سہی۔'' راجا نے مرے مرے لہجے میں کہا۔ ''لیکن فیکے پتر! اگر میں بھوک کی شدت سے فوت ہو گیا تو میرا خون تیری گردن پر ہوگا۔''

''یار میری گردن پر اتنے خون ہیں کہ اگر انہیں شمار کرنے بیٹھوں تو صرف خون ہی رہ جائے گا، گردن غائب ہو جائے گی۔''

کافی دیر بات چیت کا سلسلہ چلتا رہا۔ ناصر نے اس دوران میں ڈی وی ڈی پلیئر کا انتظام کر کے لگا دیا تھا۔

میں نے اس بریف کیس میں سے ٹٹول کر ایک ڈی وی ڈی یوں نکالی جیسے قرعہ اندازی کے لیے لوگ پرچیاں نکالتے ہیں۔ میرا مقصد صرف یہ تھا کہ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ کہیں اوپر تو دو چار ڈی وی ڈیز اصل نہیں ہیں۔ اندر پھر وہی گیت

مالا اور ہندی فلمیں نہ ہوں۔

ڈی وی ڈی چلنا شروع ہوئی، وہ لڑکی مجھے بہت بھولی بھالی لگ رہی تھی۔ اس کے مقابلے میں لڑکا بہت گھاگ اور مکار تھا، یقیناً یہ ڈی وی ڈی اسی لڑکی یا اس کے باپ کو بلیک میل کرنے کے لیے بنائی گئی تھی۔

وہ اتنی شرم ناک ویڈیو تھی کہ مجھ سے مزید نہیں دیکھا گیا اور میں نے ڈی وی ڈی پلیئر آف کر دیا۔ مجھے پسینا آ گیا تھا، ناصر کے چہرے پر بھی غصے اور نفرت کے تاثرات تھے اور راجا تو بلند آواز میں مسکین شاہ اور آفتاب کو گالیاں دے رہا تھا۔ ہم نے ایک ایک کر کے آدھی سے زیادہ ڈی وی ڈیز دیکھیں، ان سب میں یہی کچھ تھا۔ ان میں چند ایسے معروف سیاست دان بھی تھے جنہیں میں اچھی طرح پہچانتا تھا۔ ان سب ڈی وی ڈیز کے کور پر اس شخص یا لڑکی کا نام مع ولدیت لکھا ہوا تھا جس کی ویڈیو فلم بنائی گئی تھی۔ میں نے تمام ڈی وی ڈیز دوبارہ اس بریف کیس میں بھریں اور انہیں احتیاط سے اپنی الماری میں رکھ دیا۔

''چل، اب کھانا کھا لے۔'' میں نے راجا سے کہا۔

''فیکے پتر! یہ فلمیں دیکھ کر تو میری بھوک مر گئی ہے، اب مجھ سے کچھ نہیں کھایا جائے گا۔ نیلم سے ایک کپ کافی اور ایک آدھ سینڈوچ بنوا لیتا ہوں۔''

ناصر نے بھی کھانے سے انکار کر دیا۔

میری طبیعت بھی مکدر ہو گئی تھی اور شامی بھی غم و غصے کی تصویر بنا ہوا تھا۔

میں نے غنی سے کہا۔ ''نیلم سے کہو، وہ ہم سب کے لیے کافی اور سینڈوچ ہی لے آئے۔ اس وقت ہم میں سے کسی کا بھی کچھ کھانے کا موڈ نہیں ہے۔''

شامی نے غصے سے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''نواب بھائی! ہم بہت گناہ گار ہیں۔ بے شمار انسانوں کا خون میری گردن پر ہے۔ میں نے نہ جانے کتنے ڈاکے ڈالے ہیں، کتنے لوگوں کو لوٹا ہے لیکن ایسی بے غیرتی کا کام کبھی نہیں کیا۔ میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں اس مسکین شاہ کا نرخرہ اپنے دانتوں سے ادھیڑ کر پھینک دوں۔ حرام زادہ! بہت معتبر اور نیک بنتا ہے، میں دیکھوں گا کہ وہ کتنا نیک ہے۔''

''شامی بادشاہ!'' میں نے کہا۔ ''یہاں تو ہر آدمی بے حسی اور بے غیرتی کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہے، تم کس کس کو دیکھو گے؟''

''جس جس کے بارے میں جانتا ہوں، اسے تو جہنم رسید کر ہی دوں گا۔''

☆☆☆

رات خاصی گزر چکی تھی۔ مجھے اچانک ارم کا خیال آیا۔ میں آج اس کے کمرے میں نہیں گیا تھا، میں نے نیلم سے پوچھا۔ ''نیلم! ارم کا کیا حال ہے؟''

''وہ تو زیادہ وقت روتی ہی رہتی ہے صاحب جی!'' نیلم نے کہا۔ ''میں نے باجی کو بھی اس کے پاس بھیجا تھا، انہوں نے اسے بہت تسلی دی کہ تم فکر مت کرو، تمہیں یہاں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔''

''باجی!'' میں چونک اٹھا۔ ''یہ باجی کہاں سے پیدا ہو گئیں؟''

''وہ جی گولی......''

''اچھا اچھا!'' میں نے کہا۔ ''تم گولی کو باجی کہہ رہی ہو؟''

''صاحب جی! ان کا نام تو عجیب سا ہے، پھر وہ مجھ سے اتنی بڑی بھی ہیں۔''

''ارے ہاں، وہ سامنے والے بنگلے میں تو آج قرآن خوانی تھی ناں؟''

''ہاں جی!'' نیلم جلدی سے بولی۔ ''وہاں تو شام کو بہت مہمان آئے تھے، بہت گاڑیاں تھیں۔''

میرے ذہن سے ایک بوجھ اتر گیا، ورنہ میں یہی سمجھ رہا تھا کہ قرآن خوانی میں اس گھر کی کسی عورت کو بلانا بھی کہیں کوئی سازش نہ ہو۔ جب چاروں طرف مصائب کے پہاڑ کھڑے ہوں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ انسان اپنے سائے سے بھی بدکتا ہے اور رسی کو سانپ سمجھ کر خوف زدہ ہو جاتا ہے۔

''صاحب جی! میں آپ کے لیے کافی لاؤں؟'' نیلم نے پوچھا۔

''نہیں، اب میں سونے کی کوشش کروں گا۔'' میں نے کہا۔ ''تم بھی جا کر سو جاؤ۔''

نیلم کے جانے کے بعد میں دیر تک بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ میرا جسم تو تھکن سے چور تھا لیکن ذہن میں مختلف خیالات آ رہے تھے۔ اب مجھے سب سے زیادہ فکر نور کی تھی۔ میں نے آفتاب خان کو جو مہلت دی تھی، وہ بھی صبح پوری ہونے والی تھی، میں نے اسے بھی ذہنی طور پر ڈسٹرب کرنے کا فیصلہ کر لیا، جب میں بے سکون تھا تو وہ سکون سے کیسے سو سکتا تھا؟

میں نے سیل فون نکال کر اس کا نمبر ملایا اور سیل فون

کان سے لگالیا۔ ''ہیلو!'' فوراً ہی اس کی آواز سنائی دی۔

''آفتاب خان! تمہاری دی ہوئی مہلت تو کب کی ختم ہو چکی ہے، میری مہلت صبح ختم ہو رہی ہے، تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟''

''دیکھو، میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ اب نور میرے پاس نہیں ہے۔''

''ٹھیک ہے، صبح تمہیں اپنی بیٹی کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں مل جائیں گی، پھر میں اس کا ایک ہاتھ روانہ کروں گا، پھر دوسرا ہاتھ اور......''

''اللہ کے واسطے مجھ پر رحم کرو۔'' آفتاب خان ہذیانی انداز میں بولا۔

''یہ بات تمہارے منہ سے کچھ اچھی نہیں لگتی آفتاب خان!'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''رحم کا مطلب جانتے ہو تم؟''

''میں نے تمہاری منگیتر کو اغوا کر کے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کی ہے۔'' اس نے کہا۔

''اور جن دوسری لڑکیوں کو اغوا کرایا ہے، وہ کوئی نیکی تھی؟'' میں نے کہا۔

''میں جانتا ہوں کہ تم اتنے بے رحم اور سفاک نہیں ہو۔'' آفتاب خان نے کہا۔ ''میری اس غلطی کو معاف کر دو۔''

''نور کے لیے تو میں پوری دنیا کو الٹ پلٹ کر سکتا ہوں آفتاب خان!'' میں نے کہا۔ ''تم کیسے کہہ رہے ہو کہ میں سفاک نہیں ہوں۔ اپنے دشمنوں کے لیے تو میں اتنا سفاک ہوں کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ صبح کوریئر سے تمہیں ایک پارسل موصول ہوگا۔ اس میں تمہاری بیٹی کی انگلیاں ہوں گی۔ تم اب تک یہ بھی اندازہ لگا چکے ہو گے کہ میں جو کہتا ہوں، اس پر عمل بھی کرتا ہوں۔''

''میں تو اس حرام زادے مسکین شاہ کے چکر میں مارا گیا۔'' آفتاب خان بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''تمہارا وہ حمایتی دلاور کہاں گیا جس نے مجھے بارہ گھنٹے کی مہلت دی تھی؟''

''سب لوگ مفاد پرست اور اپنے مطلب کے چوکس ہیں۔ جب تک میں ان کے کام کا تھا، یہ میرے لیے کام کر رہے تھے۔ شاہ جی سے اختلاف ہوتے ہی ان سب نے بھی آنکھیں پھیر لیں۔''

''وہ لوگ آنکھیں پھیریں یا منہ۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''مجھے صبح تک نور چاہیے ورنہ......''

''مجھے بار بار دہشت زدہ مت کرو، کچھ سوچنے دو۔''

''تم صبح تک سوچتے رہو۔'' میں نے کہا۔ پھر اچانک میں نے اس سے پوچھا۔ ''کیا تمہاری کمپنی کا منیجر ارشد جانتا ہے کہ نور کہاں ہے؟''

دوسری طرف بالکل سناٹا چھا گیا۔ میں سمجھا کہ فون کا سلسلہ منقطع ہو گیا لیکن مجھے آفتاب خان کے تیز تیز سانسوں کی آواز سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ لائن پر ہے۔ وہ ارشد کے نام سے بری طرح چونکا ہوگا۔

چند لمحوں بعد اس کی آواز سنائی دی۔ ''تو ارشد کا یہ حال تم نے بنایا ہے؟''

''میں نہیں جانتا اس کا کیا حال ہے؟'' میں نے کہا۔ ''میں نے تم سے صرف یہ پوچھا ہے کہ ارشد، نور کے بارے میں کچھ جانتا ہے؟''

''وہ نور کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' آفتاب نے کہا۔

''ہاں، تمہاری اطلاع کے لیے یہ بتا دوں کہ اب وہ بریف کیس میرے قبضے میں ہے جس کے لیے تم نے مجھے اتنا دوڑایا ہے۔''

''کیا مطلب!'' وہ شدید حیرت سے بولا۔

''مطلب یہ کہ مجھے وہ بریف کیس مل گیا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تم ارشد تک پہنچ ہی گئے، میں بھی سوچ رہا تھا کہ ہمارا ایسا کون سا دشمن ہے جو ارشد کی جان لینے پر آمادہ ہو جائے گا اور اس کا صرف ایک کان کاٹ کر چھوڑ دے گا۔''

''اب تم اندازہ لگالو کہ اس طرح میں ایک دن نور تک بھی پہنچ جاؤں گا لیکن تم تک صرف ارم کی لاش پہنچے گی۔'' یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ اب ساری رات وہ بھی جاگ کر گزارے گا، میں بھی دیکھوں گا کہ وہ مجھے کب تک نور کے بارے میں نہیں بتاتا۔

یہی سوچتا ہوا میں نہ جانے کب سو گیا۔

میں اس وقت شاید نیم غنودگی میں تھا، جب میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے سیل فون اٹھا کر اسکرین پر نظر ڈالی۔ وہ کال صوبیدار میجر صاحب کی تھی، میں نے فوراً سیل فون کان سے لگالیا۔ ''ہیلو، صوبیدار میجر صاحب خیریت تو ہے؟''

''حویلی پر پولیس نے دھاوا بولا تھا۔ ان کی قیادت ڈی آئی جی کرائمز کر رہا تھا۔''

''پھر؟''

''ان کے پاس سرچ وارنٹ بھی تھا اس لیے میں انہیں

حویلی میں داخل ہونے سے نہ روک سکا۔"

"کیا پولیس ابھی حویلی میں موجود ہے؟" میں نے تشویش سے پوچھا۔

"نہیں، ان لوگوں نے حویلی کا کونہ کونہ چھان مارا لیکن انہیں یہاں سے کوئی بھی ایسی چیز نہیں ملی۔ ڈی آئی جی بہت زیادہ پریشان نظر آرہا تھا۔ اس نے مجھ سے معذرت کی اور بولا۔ "سر! میں معذرت خواہ ہوں۔" میں نے کہا کہ یہ معذرت آپ نواب صاحب سے کورٹ میں کیجیے گا۔"

"پولیس والوں نے حویلی کی کسی چیز کو نقصان تو نہیں پہنچایا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں سر! انہوں نے صرف تلاشی لی ہے لیکن اتنے برے طریقے سے کہ پوری حویلی کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا ہے۔ ڈاکٹر شہناز اور ڈاکٹر شہلا نے اس ڈی آئی جی کو بے بھاؤ کی سنائی ہیں۔"

"ٹھیک ہے، آپ بے فکر رہیں، میں ابھی آئی جی صاحب سے بات کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

پہلے میں نے سوچا کہ عبداللہ جان کو اس وقت ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں ہوگا لیکن انہیں اس واقعے کی اطلاع دینا بھی ضروری تھا۔

میں نے ان کا نمبر ملالیا۔ دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی، میں نے وال کلاک پر نظر ڈالی۔ اس وقت صبح کے چار بج رہے تھے۔ عبداللہ جان صاحب یقینی طور پر اس وقت بہت گہری نیند میں ہوں گے۔ میں مایوس ہو کر لائن منقطع ہی کرنے والا تھا کہ دوسری طرف سے فون اٹھالیا گیا۔ پھر عبداللہ جان کی بھاری بھرکم اور بارعب آواز سنائی دی۔ "ہیلو!"

"السلام علیکم سر! میں رفیق بول رہا ہوں، نواب رفیق شیرازی!"

"خیریت تو ہے نواب صاحب؟" عبداللہ جان صاحب ایک دم فکر مند ہو گئے۔

"اس دور میں خیریت کہاں ہے عبداللہ صاحب؟" میں نے کہا۔ "نہ کسی کی جان محفوظ ہے، نہ مال اور نہ عزت!"

"رفیق صاحب! صاف صاف بتائیں آخر بات کیا ہے؟"

"ابھی تھوڑی دیر پہلے میری حویلی پر پولیس نے چھاپا مارا ہے۔ انہیں کسی مغویہ کی تلاش تھی۔ پولیس کا خیال ہے کہ اس کے اغوا میں میرا ہاتھ ہے۔"

"ارے!" عبداللہ جان صاحب غالباً اٹھ کر بیٹھے ہوں گے۔ "کس کی رپورٹ پر ایسا ہوا؟"

"مجھے کچھ علم نہیں سر!" میں نے کہا۔ "میں تو اس وقت ست بدھائی میں ہوں بھی نہیں، اپنے ایک دو ضروری کام نمٹانے لاہور آیا ہوا ہوں۔" میں نے کہا۔

"چھاپا مارنے کون آیا تھا؟" وہ ایک دم سخت گیر پولیس افسر بن گئے۔ "اس کے پاس سرچ وارنٹ تھے؟"

"میرے سکیورٹی چیف نے مجھے اطلاع دی ہے کہ اس کے پاس حویلی کے سرچ وارنٹ تھے۔ چھاپا مارنے والی ٹیم کی سربراہی ڈی آئی جی کرائمز بہ نفس نفیس خود کر رہا تھا۔" میں نے کہا۔

"میں ابھی معلوم کرتا ہوں کہ یہ سب کس کی رپورٹ پر کیا گیا ہے اور سرچ وارنٹ کس مجسٹریٹ نے جاری کیے ہیں؟"

"میں پولیس پر مقدمہ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ ان لوگوں نے تلاشی کے دوران میں نہ صرف حویلی کے سامان کو الٹ پلٹ کیا بلکہ میرے لاکھوں روپے کے ڈیکوریشن پیس بھی غائب ہیں، بہت سا قیمتی سامان اور فرنیچر ان لوگوں نے تباہ کر دیا ہے اور حویلی کے افراد کو ہراساں کرنے کے ساتھ ساتھ خواتین کے ساتھ بھی بدزبانی کی ہے۔ میں اس معاملے کو بہت اوپر تک لے جاؤں گا۔"

"آپ پریشان نہ ہوں۔ پولیس نے اگر آپ کا کوئی نقصان کیا ہے تو سخت نوٹس لیا جائے گا۔ میں ابھی اس ڈی آئی جی سے بھی جواب طلب کرتا ہوں کہ وہ کس کے حکم پر وہاں دوڑا چلا گیا۔ اسے کم سے کم میرے علم میں تو یہ بات لانا چاہیے تھی۔" پھر وہ آہستہ سے بولے۔ "ویسے مجھے یہ آپ کے خلاف کوئی بہت بڑی سازش لگ رہی ہے۔ کسی کی اتنی جرات نہیں ہو سکتی کہ وہ آپ جیسے مرتبے کے آدمی کی حویلی پر اپنے طور پر چڑھ دوڑے۔ میں دیکھتا ہوں اس سلسلے میں کیا ہو سکتا ہے؟" انہوں نے کہا۔

"سر! میں نے آپ کو اطلاع اس لیے دی ہے کہ بعد میں آپ مجھ سے شکایت نہ کریں۔"

"آپ نے بہت اچھا کیا۔ میں ابھی اس معاملے کی تحقیقات کا حکم دے دیتا ہوں۔ آپ بے فکر ہو جائیں، ویسے پولیس پر مقدمہ کرنے کا حق تو آپ محفوظ رکھتے ہیں۔" انہوں نے رسمی کلمات ادا کرنے کے بعد سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے سرور کا نمبر ملایا اور اس سے کہا۔ "سرور! پولیس نے حویلی میں جو سامان الٹ پلٹ کیا ہے، تم اسے مزید الٹ پلٹ کر دو۔ جو قیمتی ڈیکوریشن پیس میں لندن اور

[illegible] سے لایا تھا، ان کی بڑی تعداد کو کہیں غائب کر دو اور اگر کوئی پوچھے تو یہی جواب دینا کہ پولیس نے حویلی کے افراد کے ساتھ انتہائی بدسلوکی کی، خواتین کے ساتھ بدزبانی کی اور [illegible] حویلی کا سامان الٹ پلٹ کر دیا۔"

"او کے سر!" سرور نے کہا۔ "میں ابھی یہاں ایسا منظر پیش کروں گا کہ لگے گا پولیس والوں نے یہاں لاٹھی چارج کیا ہے، میں ڈاکٹر صاحبہ اور دوسری خواتین کو بھی سمجھا دیتا ہوں، آپ فکر مت کریں۔ تمام کام آپ کی مرضی کے مطابق ہو جائے گا۔"

اسی وقت شامی میرے پاس آگیا اور بولا۔ "نواب بھائی! ابھی میرے ایک آدمی نے مجھے اطلاع دی ہے کہ پولیس نے ست بدھائی کی حویلی پر چھاپا مارا ہے۔ وہاں کی تلاشی لی ہے؟"

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "یہ اطلاع مجھے مل چکی ہے اور میں نے آئی جی صاحب کو بھی اس واقعے سے آگاہ کر دیا ہے۔ میں اس ڈی آئی جی کو تو ایسا سبق سکھاؤں گا کہ آئندہ وہ کبھی کسی شریف آدمی کے گھر کی طرف رخ کرتے ہوئے بھی ڈرے گا۔" پھر میں چونک کر بولا۔ "لیکن شامی! یہ اطلاع تمہیں کیسے اور کہاں سے ملی؟"

"پولیس میں بھی میرے ایک دو مخبر موجود ہیں۔" اس نے کہا۔ "میں نے آج ہی ان سے کہا تھا کہ اگر پولیس ست بدھائی میں کوئی کارروائی کرے یا اس کا منصوبہ بنائے تو فوراً مجھے اطلاع دینا۔" پھر وہ تلخ لہجے میں بولا۔ "نواب بھائی! اب پانی سر سے اونچا ہو گیا ہے۔ یہ سب اس رانا کی حرامزدگی ہے، آپ کہو تو میں کل اس کا سر اتار لاؤں؟"

"ابھی اس کا وقت نہیں آیا ہے شامی!" میں نے کہا۔ "پہلے مجھے نور کو بازیاب کرانا ہے۔ نور کے ملنے کے بعد میں خود رانا کی کھوپڑی اڑا دوں گا۔ پانی واقعی سر سے اونچا ہو چکا ہے۔ اب ان کی یہ جرأت ہو گئی کہ وہ میری حویلی کی تلاشی بھی لینے لگے۔"

"انہیں وہاں سے کوئی چیز ملی تو نہیں نا!" شامی نے کہا۔ "میرا مطلب ہے کہ ایسی کوئی چیز جسے وہ آپ کے خلاف استعمال کر سکیں؟"

"غنی اور سرور بہت ذہانت اور دور اندیشی سے کام کرتے ہیں۔ انہوں نے کافی پہلے حویلی سے سب کچھ غائب کر دیا تھا۔ پھر پولیس کو وہاں اسلحہ ملا ہو گا تو میرے پاس ہر اسلحے کا لائسنس موجود ہے۔ شاید اس لیے وہ اسلحہ وہاں سے لے بھی نہیں گئے۔"

ہم باتیں کر ہی رہے تھے کہ گولی بھی وہاں آگئی۔ اس نے ہمدردی سے کہا۔ "نواب صاحب! آپ کی مشکلیں اور پریشانیاں تو مزید بڑھ گئی ہیں۔ حالات جوں کے توں ہیں بلکہ پہلے سے بھی بدتر ہو گئے ہیں۔"

"لیکن اب حالات جوں کے توں نہیں رہیں گے؟" میں نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

"گولی!" شامی نے کہا۔ "تو اٹھ ہی گئی ہے تو ہمیں اچھی سی چائے ہی پلا دے۔"

"میں سوئی ہی کب تھی۔ پھر تم اٹھ کر آئے تو میں بھی اٹھ کر چلی آئی۔ میں ابھی چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

"گولی! تم پریشان مت ہو۔ نیلم کو اٹھا دو۔ وہ چائے بنا لائے گی۔"

"ارے اب چائے بنانے کے لیے میں نیلم بے چاری کو کیا اٹھاؤں؟" یہ کہہ کر وہ وہاں سے چلی گئی۔

آسمان پر صبح کاذب کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ ہم لوگوں نے گرما گرم چائے پی، گولی اس کے ساتھ حلوا بھی بنا لائی تھی۔ رات بھی ہم لوگوں نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اس وقت بھوک بھی محسوس ہو رہی تھی۔

ہم نے چائے پی اور دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ناصر اپنے کمرے سے باہر نکلا تو سیدھا میرے کمرے کی طرف چلا آیا۔ وہ ہمیں بیٹھا دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"خیریت تو ہے سر!" اس نے تشویش زدہ لہجے میں پوچھا۔

میں نے اسے بتایا کہ پولیس نے رات میری ست بدھائی کی حویلی پر چھاپا مارا ہے۔

"آپ نے اسی وقت مجھے کیوں نہیں بتایا۔ میں اپنے اخبار میں بہت ہی دھانسو قسم کی خبر لگاتا۔ اپنا فوٹو گرافر وہاں بھیج کر حویلی کی تصویریں بنواتا۔"

"یہ چار بجے صبح کا واقعہ ہے۔ اس وقت تک تمام اخبارات چھپ چکے ہوتے ہیں۔ میں نے اس لیے تمہیں اس وقت بے آرام نہیں کیا۔ یہ خبر کل بھی تو لگ سکتی ہے۔" پھر میں کچھ توقف کے بعد بولا۔ "میں نے آئی جی صاحب کو اس واقعے سے آگاہ کر دیا ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ انہیں خود بھی اس واقعے کا علم نہیں تھا ورنہ اتنی بڑی کارروائی جس کی سربراہی ڈی آئی جی کر رہا ہو، آئی جی کے علم اور اجازت کے بغیر نہیں ہو سکتی۔"

"میں اس کے باوجود اپنے اخبار میں خبر دے دیتا ہوں۔"

''کیا بچوں والی باتیں کر رہے ہو۔'' میں نے کہا۔ ''یہ کوئی اتنی بڑی خبر نہیں ہے۔''

''خبر کو بڑا اور چھوٹا تو رپورٹر بناتے ہیں سر!'' ناصر نے مسکرا کر کہا۔ ''میں تو پولیس کے خلاف ایسی خبر شائع کراؤں گا کہ پوری وزارتِ داخلہ ہل کر رہ جائے گی۔ ویسے مجھے یقین ہے کہ پولیس نے یہ کارروائی، رانا زوہیب کے ایما اور مسکین شاہ کے حکم پر کی ہوگی۔''

''مسکین شاہ براہ راست تو پولیس کو حکم نہیں دے سکتا۔'' میں نے کہا۔ ''اس نے سیکریٹری داخلہ یا وزیر داخلہ سے کہا ہوگا۔''

''کچھ بھی ہو سر!'' ناصر نے کہا۔ ''میں اپنے اخبار میں یہ خبر ایسے زاویے سے لگاؤں گا کہ پورا پریس اور الیکٹرانک میڈیا پولیس کے پیچھے پڑ جائے گا۔''

''فی الحال تو تم یہ کام کرو کہ فوری طور پر ڈی وی پلیئر کو آن کرو۔ میں اسی انتظار میں بیٹھا ہوں۔''

''شٹ!'' ناصر اپنی پیشانی پر ہاتھ مار کے بولا۔ میرا دماغ بھی ماؤف ہو کر رہ گیا ہے۔ میں ابھی جا کر ڈی وی پلیئر لے آتا ہوں۔''

''اب ایسی بھی کوئی ایمرجنسی نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''پہلے ناشتا کرلو۔''

میرے لاشعور میں کہیں یہ خوف بھی تھا کہ اگر اس ڈی وی میں میری ویڈیو نہ ہوئی تو کیا ہوگا شاید اسی لیے میں اسے جانے سے روک رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد راجا بھی ہماری آوازوں سے بیدار ہوگیا۔ اس نے کمرے میں جھانک کر کہا۔ ''مُنڈیکے پتر! کیا تو نے رت جگا کیا ہے؟''

''یار! رت جگا ہی سمجھ لے۔'' میں نے کہا۔ پھر اسے ست بدھائی پر پولیس کے چھاپے کی تفصیل بتادی۔

''اب ان لوگوں کی اتنی جرأت ہوگئی ہے۔'' راجا بھنا کر بولا۔ ''اگر ہمارے ہوتے ہوئے پولیس والے نواب رفیق شیرازی آف ست بدھائی کی حویلی پر چھاپا ماریں اور اسے الٹ پلٹ کریں تو لعنت ہے ہمارے صحافی ہونے پر اور ہمارے تعلقات پر!'' راجا کا موڈ ایک دم خراب ہوگیا تھا۔

''یہی میں بھی نواب صاحب سے کہہ رہا تھا۔'' ناصر نے کہا۔ ''آپ رات ہی میں ہمیں بتاتے۔''

''یار، میں کتنی دفعہ بتاؤں کہ پولیس نے چھاپا رات کو نہیں، صبح کے چار بجے کے قریب مارا تھا۔ اس وقت تم لوگ کس اخبار میں خبر لگواتے۔''

''مُنڈیکے پتر!'' راجا نے کہا۔ ''تو ہمیں بہت ہلکا لے رہا ہے۔ تو نے ابھی میرے قلم کی کاٹ دیکھی نہیں ہے۔''

''یار! یہ بات تو مجھ سے کہہ رہا ہے۔ مجھ سے زیادہ کون تیرے قلم کی کاٹ سے واقف ہوگا؟''

''تو ابھی وکیل کو فون کرا اور ان سے کہہ کہ تو پولیس کے خلاف مقدمہ کرنا چاہتا ہے۔ نواب رفیق کی حویلی میں گھسنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔''

''میں بھی مقدمہ کرنا چاہتا ہوں لیکن عبداللہ جان کی وجہ سے فی الحال رک گیا ہوں۔''

''وہ بے چارے کیا کر سکتے ہیں۔ وہ سرکاری افسر ہیں۔ وہ اگر باز پرس بھی کریں گے تو وزارت داخلہ کا چیف سیکریٹری یا پھر خود صوبائی وزیر داخلہ ان کی زندگی اجیرن کر دے گا۔ یہ سب کچھ اسی مسکین شاہ کے کہنے پر ہو رہا ہے۔ اس مسکین شاہ کو تو میں سرعام بے نقاب کروں گا۔''

''نواب صاحب!'' ناصر نے کہا۔ ''اس بریف کیس میں ڈی وی ڈیز کے علاوہ کچھ فائلیں بھی تھیں۔ ذرا ان فائلوں پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔ ممکن ہے ان میں کوئی کام کی بات ہو؟''

گولی کمرے سے اٹھ کر نہ جانے کس وقت چلی گئی تھی۔ پھر وہ نیلم کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی تو نیلم ناشتے کی ٹرالی دھکیل رہی تھی اور گولی نے بھی دونوں ہاتھوں میں کوئی ڈش تھام رکھی تھی۔

''نیلم! ناشتا صرف ہم لوگ کریں گے، کوئی بیس پچیس آدمی نہیں کریں گے۔'' راجا نے کہا۔

''یہ سب تو باجی نے کیا ہے۔'' نیلم نے جواب دیا۔ ''کہہ رہی تھیں کہ سب رات سے بھوکے ہیں اس لیے اس وقت سب کو خوب ڈٹ کر ناشتا کرنا چاہیے۔''

''اتنا ناشتا؟'' میں نے ٹرالی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

اس میں تر تراتے ہوئے پراٹھے تھے، بھنا ہوا قیمہ تھا، انڈوں کا آملیٹ تھا۔ اس کے علاوہ گاجر کا حلوا تھا، پوریاں تھیں اور نہ جانے کیا کچھ تھا۔ راجا کے کہنے پر نیلم نے ناشتا ڈائننگ ٹیبل پر لگا دیا۔

ہر چیز بہت لذیذ تھی اور اس کا ذائقہ منفرد بھی تھا۔ یقیناً یہ گولی کے ہاتھوں کا کمال تھا۔

سب نے خوب ڈٹ کر ناشتا کیا۔ پھر گرما گرم کافی پی کر تو گویا توانائی کئی گنا زیادہ بڑھ گئی۔ ناشتے کے بعد میں نے بریف کیس سے وہ فائلیں نکال لیں۔ ناصر باہر گولی اور نیلم دونوں کچن میں چلی گئیں۔

میں نے سب سے اوپر والی فائل کھولی۔ اس میں مسکین شاہ کا نام دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ اس فائل میں اس کے ان بینک اکاؤنٹس اور اثاثوں کی تفصیل تھی جو ملک سے باہر تھے اور ان کی مالیت اربوں روپے تھی۔ یہ تمام بینک اسٹیٹمنٹ، لندن اور امریکا کی جائداد کی ملکیت کے کاغذات کی فوٹو کاپی تھی۔ آفتاب خان نے اس کے لیے بہت محنت کی ہوگی۔

دوسری فائل میں مسکین شاہ کے ہاتھ سے بنی ہوئی ایک لسٹ تھی جس میں ملک کے معروف افسران، بیوروکریٹس اور پولیس افسروں کے نام تھے۔ ناموں کے آگے رقم کا اندراج تھا۔ کوئی بھی رقم چھ ہندسوں سے کم نہیں تھی۔ نیچے مسکین شاہ نے تمام رقوم کا ٹوٹل کیا تھا اور لکھا تھا کہ ان لوگوں سے ہر ماہ اتنی رقم وصول کرنا ہے۔ وہ فوٹو کاپی نہیں تھی بلکہ اصل تھی۔ اس میں مسکین شاہ کا نام تو نہیں تھا لیکن تحریر سے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ مسکین شاہ ہی کی ہوسکتی ہے ورنہ آفتاب خان اسے اتنا سنبھال کر کیوں رکھتا۔

تیسری فائل پر بزنس لکھا ہوا تھا۔ اس میں ہیروئن اور اسلحے کی اسمگلنگ کی تفصیلات تھیں۔ اس بزنس کے تین پارٹنر تھے۔ مسکین شاہ، چودھری سلامت اور آفتاب خان۔

دوسرے صفحے پر ان رقوم کا حساب کتاب درج تھا۔ جو ان لوگوں کے حصے میں آتی تھیں۔ یہ بھی کسی کی تحریر تھی لیکن پہلی تحریر سے مختلف تھی۔

میں جیسے جیسے فائلیں پڑھ رہا تھا، میرا جوش بڑھتا جا رہا تھا۔

ایک فائل میں مسکین شاہ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے خطوط تھے جو اس نے مختلف محکموں کے اعلیٰ افسران کے نام لکھے تھے۔ ان خطوط میں صرف یہ تھا کہ میں فلاں آدمی کو بھیج رہا ہوں۔ اس کا کام ہو جانا چاہیے۔ نیچے مسکین شاہ کے دستخط بھی تھے۔ یہ خطوط بھی فوٹو کاپی تھے لیکن مجھے تحریر اس تحریر سے ملتی جلتی لگی جس میں مختلف افسروں اور صنعت کاروں کے نام درج تھے اور ان کے آگے رقوم لکھی ہوئی تھیں۔

میں نے تحریر کو دوبارہ غور سے دیکھا۔ وہ ایک ہی آدمی کے ہاتھ کی تحریر تھی۔ میرا دل خوشی سے بلیوں اچھلنے لگا۔

میں ہر فائل دیکھ کر راجا کی طرف بڑھا دیتا تھا۔ راجا کا چہرہ بھی جوش سے تمتما رہا تھا۔

ایک خط پولیس کے ایک اعلیٰ افسر کے نام تھا۔ اس میں لکھا تھا ''میں اپنا آدمی بھیج رہا ہوں، اسے وہ رقم دے دو جو تم پر واجب ہے۔'' اس کے نیچے بھی مسکین شاہ کے دستخط تھے۔

راجا تو گویا جوش سے اچھلنے لگا۔ اس نے کہا۔ ''میں نے بھی اس مسکین شاہ کو واقعی مسکین بنا کر نہ چھوڑا تو میرا نام راجا نہیں۔''

ان فائلوں کے نیچے دو تین آڈیو کیسٹ تھے۔ آڈیو کیسٹ پلیئر اب متروک ہو چکے ہیں لیکن اب بھی دکانوں پر مل جاتے ہیں۔

''مُنڈیکے پترا!'' راجا نے کہا۔ ''میں نے ایک کیسٹ پلیئر اور ریکارڈر یہاں تیرے بیڈروم میں بھی دیکھا تھا۔''

''میرے بیڈروم میں؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''یار، جس بندے سے تو نے کوٹھی خریدی ہے، وہ اپنا سارا سامان تو یہیں چھوڑ کر گیا ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ تیرے بیڈروم میں ایک ٹیپ ریکارڈر اور کیسٹ پلیئر بھی تھا۔''

''اگر تھا بھی تو اس کا علم نیلم کو ہوگا۔'' میں نے کہا۔ ''وہی میرے کمرے کی صفائی کرتی ہے۔''

راجا نے غنی کو آواز دے کر کہا کہ نیلم کو یہاں بھیج دو۔

تھوڑی دیر بعد نیلم کمرے میں داخل ہوئی۔

''نیلم! یہاں کوئی ٹیپ ریکارڈر بھی تھا؟'' میں نے پوچھا۔

وہ سہم کر رہ گئی۔ ''جی صاحب جی! وہ ...... اس میں ...... ریڈیو بھی تھا ...... تو میں ...... اسے اپنے ...... کمرے میں ...... لے گئی تھی ...... آپ تو ...... اسے ...... استعمال نہیں کرتے ہیں ...... میں نے ......''

''ذرا وہ ٹیپ ریکارڈر لے آؤ۔'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔

نیلم شاید سمجھ رہی تھی کہ میں ٹیپ ریکارڈر اٹھانے پر اسے ڈانٹوں گا۔

وہ فوراً ٹیپ ریکارڈر لے کر آگئی۔

''مجھے کچھ کام ہے، پھر یہ ٹیپ ریکارڈر تم واپس لے جانا۔'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔

نیلم خوش ہوگئی کہ میں اس سے ناراض نہیں ہوں۔ اس کے جانے کے بعد راجا نے ٹیپ ریکارڈر میں کیسٹ لگا کر ریوائنڈ کیا اور اسے پلے کر دیا۔

اس میں سے مہناز کی آواز ابھری۔ ''میرا تجھ سے ایسا بندھن ہے، جیسے دل سے رشتہ دھڑکن کا!''

راجا نے میری طرف مایوسی سے دیکھا۔

میں نے اس سے زیادہ اپنی مایوسی کم کرنے کو ہنس کر کہا۔ ''یار! یہ گانا بھی بہت اچھا ہے، چل یہ گانا ہی سن لیں۔''

"ٹھیکے پتر!" راجا نے کہا۔ "تو کسے دھوکا دے رہا ہے؟ مجھے یا اپنے آپ کو؟"

گانا مسلسل چل رہا تھا۔ "ہو جیسے دھرتی سے ناتا ساون کا! میرا تجھ سے ایسا بندھن......"

اچانک گانا ختم ہو گیا اور ایک آواز ابھری۔ "ہیلو! کیا اب مجھے بار بار فون کرنا پڑے گا؟ رقم اب تک کیوں نہیں پہنچی؟...... کوئی مہلت نہیں...... تم کئی مہینوں سے یہی کر رہے ہو...... کل تک رقم نہ پہنچی تو...... تمہاری بیٹی کی ویڈیو پوری مارکیٹ میں پھیل جائے گی۔"

دوسری طرف سے بولنے والے کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ لگتا تھا کہ آفتاب خان نے کسی خفیہ ٹیپ ریکارڈر کے ذریعے یہ گفتگو ریکارڈ کی تھی۔ فون اگر ٹیپ ہوتا تو دونوں طرف کی گفتگو ریکارڈ ہوتی۔

دوسری کیسٹ میں صرف نور جہاں کے درد بھرے گانے تھے لیکن بالکل آخر میں مسکین شاہ نے ایک پولیس افسر کا نام لے کر اسے گالی دی تھی اور کہا تھا۔ "تو اس زعم میں مت رہنا زاہد کہ تو ایس ایس پی ہے۔ تو اچھی طرح جانتا ہے کہ مجھے یہاں تک پہنچایا کس نے ہے؟ تو اب مسکین شاہ کو دھوکا دے گا...... اب تو مجھے ہی ڈبل کراس کر رہا ہے، تیری......" اس نے جملے کے شروع اور آخر میں انتہائی فحش گالیاں دیں اور بولا۔ "حرام زادے! تو بھول گیا کہ تیری ویڈیو فلم میرے پاس ہے۔ میں تجھے نہ صرف جیل بھجوا دوں گا بلکہ تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا......" اس نے پھر ایک گالی دی۔

تیسری کیسٹ میں بھی گانوں کے درمیان میں ایسی ہی گفتگو تھی لیکن اس میں کسی کا نام نہیں لیا گیا تھا۔

راجا کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ "ٹھیکے پتر! تو نے تو واقعی تیر مارا ہے۔ میں نے تو کل رات مذاق میں یہ کہا تھا۔" وہ جوش میں آ کر مجھ سے لپٹ گیا۔

شامی بھی نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ میں نے بہت احتیاط سے وہ آڈیو کیسٹ، فائلیں اور تمام ڈی وی ڈیز بریف کیس میں رکھ کر اسے الماری میں رکھ دیا۔

"ٹھیکے پتر!" راجا نے کہا۔ "میں پہلی فرصت میں ان آڈیو کیسٹس کو سی ڈی پر منتقل کرا لوں گا۔ کیسٹ کا تو کوئی بھروسا نہیں کہ کب اس کا ٹیپ گھس جائے یا ٹوٹ جائے بلکہ میں تو اس کی کئی کاپیاں بنواؤں گا۔ اب تو اونٹ پہاڑ کے نیچے آیا ہے۔"

مسکین شاہ جو دنیا کے سامنے بہت نیک طینت، پاک باز اور عوام کا ہمدرد بنتا تھا، اس کا اصل چہرہ بہت گھناؤنا تھا لیکن اب اس کے ظلم کی درازرسی کو اللہ نے ہمارے ذریعے کھینچنے کا بندوبست کر دیا تھا۔ سنو کہ ہم بندگان بے بس، علیم بھی ہیں، خبیر بھی ہیں، سزا جزا سب یہیں پر ہو گی، یہیں پر یوم حساب ہو گا! مجھے فیض کی ایک نظم یاد آئی جو مسکین شاہ کے حسب حال تھی۔ وہ جو قرض رکھتے تھے جان پر۔ وہ حساب ہم نے چکا دیا۔

ناصر کمرے میں داخل ہوا تو ہمیں دیکھ کر چونک اٹھا اور بولا۔ "کوئی خاص بات ہے، آپ لوگ اتنے خوش کیوں نظر آ رہے ہیں؟ کیا آئی جی صاحب نے اس ڈی آئی جی کے خلاف کوئی ایکشن لے لیا؟"

"یہ تو بہت چھوٹی بات ہے ناصر!" راجا نے کہا۔ "تم سنو گے تو تمہارے ہوش اڑ جائیں گے۔"

"یار، اس سے پہلے کہ راجا تمہارے ہوش اڑائے، تم ذرا یہ ڈی وی پلیئر کمپیوٹر میں لگا دو۔" میں نے ہنس کر کہا۔

ناصر کو اتنا اندازہ نہیں تھا کہ راجا نے یہ بات کیوں کہی ہے، اس نے فوراً ہی ڈی وی پلیئر مانیٹر کے ساتھ منسلک کر دیا۔

میں نے الماری سے وہ ڈی وی ڈی نکالی جو ارشد سے حاصل کی تھی اور ناصر کو دے دی۔

ناصر اسے ریوائنڈ کرنے لگا اور میرا دل نہ جانے کیوں زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ڈی وی کو ریوائنڈ کرنے کے بعد اس نے پلے کا بٹن دبا دیا۔

وہ ایک پولیس آفیسر کی ویڈیو تھی۔ اس میں بھی سب کچھ وہی تھا جو دوسری ویڈیوز میں تھا۔ راجا نے اٹھ کر دروازہ اندر سے بند کر دیا کہ کہیں نیلم یا گولی میں سے کوئی اچانک کمرے میں نہ آ جائے۔

تیسری ویڈیو دیکھ کر میرا دل اتنی زور زور سے دھڑکنے لگا گویا پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ وہ میری ہی ویڈیو فلم تھی۔ میں اس وقت نشے میں دھت لگ رہا تھا۔ ثمرہ بھی نشے میں تھی، پھر مجھ سے مزید دیکھا نہ گیا اور میں نے چیخ کر کہا۔ "بند کرو اسے۔"

ناصر نے گھبرا کر ڈی وی پلیئر آف کر دیا۔

راجا نے بھی چونک کر مجھے دیکھا اور گھبرا کر بولا۔ "ٹھیکے پتر! تیری طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"ہاں، میری طبیعت ٹھیک ہے۔" میں نے گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے کہا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میں میلوں سے بھاگتا چلا آ رہا ہوں، پسینا میرے چہرے پر پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔

موسم میں خنکی تھی اس کے باوجود راجا نے اٹھ کر اسپلٹ آن کر دیا اور تولیا اٹھا کر میرے چہرے کا پسینا خشک کرنے لگا۔ ناصر نے پانی کا گلاس بھر کے مجھے دیا جسے میں نے ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔

"ٹھیکے پتر!" راجا نے کہا۔ "تو لیٹ جا۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" میں نے جبراً مسکرانے کی کوشش کی۔ "بس ویڈیو دیکھ کر فوری طور پر مجھے اپنے وجود سے کراہیت محسوس ہوئی تھی کہ میں ایسی گھناؤنی حرکتیں بھی کر سکتا ہوں۔"

"تجھے کیوں شرمندگی اور کراہیت محسوس ہو رہی ہے؟" راجا نے کہا۔ "ٹھیکے پتر! تو اپنے ہوش میں ہی کب تھا؟"

"لیکن راجا! اگر یہ ویڈیو کوئی اور دیکھتا تو میرا امیج تو خاک میں مل جاتا۔ مجھے تو اپنے ملک میں منہ چھپانے کو جگہ نہ ملتی اور مجھے یہاں سے کہیں اور جانا پڑتا۔ اگر یہ ویڈیو جمال خان شیروانی دیکھ لیتا تو اس کا کیا حال ہوتا۔ ہمارے لاکھ سمجھانے کے باوجود بھی وہ غصے میں پاگل ہو کر مجھے قتل کرنے نکل کھڑا ہوتا۔"

میری حالت آہستہ آہستہ اعتدال پر آ گئی۔

راجا فریج سے کولڈ ڈرنک نکال لایا اور مجھے دیتے ہوئے بولا۔ "ٹھیکے پتر! اسے پی جا۔"

"یار، تم لوگوں نے تو مجھے مریض بنا دیا۔" میں نے ہنس کر کہا۔ "وقتی طور پر میرا بلڈ پریشر بڑھ گیا ہو گا۔ اب میں بالکل نارمل ہوں۔"

"میں چاہتا ہوں کہ تو ذہنی طور پر بھی نارمل ہو جائے۔" راجا نے کہا۔ "لیکن ڈاکٹر کہتے ہیں کہ پیدائشی ایب نارمل لوگوں کا علاج ممکن نہیں ہوتا۔ اگر ہوتا بھی ہے تو بہت طویل ہوتا ہے۔" راجا اپنی بے سروپا باتوں سے مجھے ہنسانے کی کوشش کر رہا تھا۔

ناصر نے اچانک کہا۔ "راجا! تم مجھے کوئی ایسی خبر سنانے والے تھے کہ میرے ہوش اڑ جائیں؟"

"او بھائی! میں دو دو ایب نارمل لوگوں کو کیسے سنبھالوں گا؟" راجا نے ہنس کر کہا۔

"مہاراجا! اب ناصر کو بتا بھی دے۔" میں نے کہا۔ "اسے بھی خوش ہونے کا حق ہے۔"

راجا نے ناصر کے سامنے پہلے فائلیں رکھ دیں۔ میں ناصر کے چہرے کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ وہ جیسے جیسے فائلیں اور ان میں لگے کاغذات پڑھ رہا تھا۔ اس کا چہرہ بھی جوش سے سرخ ہوتا جا رہا تھا۔

"مسکین شاہ تو گیا کام سے۔" ناصر نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

"ایک منٹ!" راجا نے کہا۔ "ابھی تیرے ہوش کہاں اڑے ہیں؟"

اس نے آڈیو کیسٹس نکالیں اور ایک ایک کر کے اسے سنا دیں۔

ناصر نے خوشی سے نعرہ لگایا۔ "ہرا! اب میں دیکھتا ہوں کہ یہ مسکین شاہ، دلاور اور رانا زوہیب کتنے بڑے بدمعاش ہیں؟"

"دیکھا، اڑ گئے نا ہوش!" راجا نے چہک کر کہا۔

"میرے تو صرف ہوش اڑے ہیں، مسکین شاہ تو اب عالم بالا کی طرف پرواز کرنے والا ہے۔" وہ کچھ توقف کے بعد بولا۔ "یار، یہ آفتاب خان بہت ذہین بھی ہے اور کمینہ بھی! اس نے اپنے ہی باس کو بلیک میل کرنے کا سامان کر رکھا تھا۔"

"مسکین شاہ اس سے بھی بڑا کمینہ ہے۔" میں نے کہا۔ "آفتاب خان جانتا ہو گا کہ آئندہ مسکین شاہ اس کے لیے خطرہ بن سکتا ہے۔ اس نے احتیاط کے طور پر یہ سب کچھ کر ڈالا۔"

"جو اس کے کام تو نہ آ سکا لیکن ہمارے کام آئے گا۔"

"یہ بھی ایک طرح سے اس کے کام آئے گا۔" ناصر نے کہا۔ "مسکین شاہ راستے سے ہٹ جائے گا تو آفتاب خان محفوظ ہو جائے گا۔ وہ سیاسی طور پر تو ختم ہو جائے گا لیکن زندہ تو رہے گا نا!"

"اب سوچو کہ ہم اس مہم کی ابتدا کہاں سے کریں۔" راجا نے کہا۔

"یار، پہلے تو ہمیں میڈم نور کو ان کے چنگل سے نکالنا ہے۔" ناصر نے کہا۔ "وہ گویا مایوس اور بددل ہو کر یا انتقاماً انہیں نقصان پہنچا سکتے ہیں۔"

اچانک میرے سیل فون کی بیل بجنے لگی۔ اسکرین پر جمال خان شیروانی کا نام تھا۔

"ہیلو!" میں نے سیل فون کان سے لگا کر کہا۔

"نواب رفیق!" شیروانی صاحب کی پژمردہ آواز سنائی دی۔ "ان لوگوں نے دھمکی دی ہے کہ اگر آپ نے ابھی آدھے گھنٹے کے اندر اندر ارم کو نہ چھوڑا تو وہ میری بیٹی کی ویڈیو مارکیٹ میں پھیلا دیں گے۔"

"آپ ان کی دھمکیوں میں مت آئیں۔" میں نے

کہا۔ ''صرف ثمرہ کی حفاظت کا انتظام کرلیں۔ اس ویڈیو کا ماسٹر پرنٹ میرے پاس ہے۔ ابھی تک انہیں اس ویڈیو کو ڈی وی ڈی پر منتقل کرنے کا موقع ہی نہیں ملا ہے۔''

''نواب صاحب! کیا واقعی ایسا ہے؟'' شیروانی نے بے یقینی سے پوچھا۔

''جی ہاں، وہ ویڈیو میرے پاس موجود ہے لیکن آپ ان لوگوں پر یہ ظاہر مت کیجیے گا کہ آپ کو اس کا علم ہوگیا ہے۔ وہ اگر دھمکی دیں تو آپ بھی درشت لہجے میں جواب دیں کہ تم لوگ جو کرنا چاہتے ہو، کرلو۔''

''کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں؟'' جمال خان شیروانی کو ابھی تک میری بات پر یقین نہیں آیا تھا۔

''اگر آپ چاہیں تو اس ویڈیو کا ماسٹر پرنٹ میں آپ کو بھی دکھا سکتا ہوں لیکن آپ اسے دیکھ نہیں سکیں گے۔ آپ میری بات پر یقین کریں، وہ ویڈیو واقعی میرے پاس ہے۔ ہاں، وہ لوگ جھنجلا کر ثمرہ کو اغوا کرنے کی کوشش کرسکتے ہیں۔'' میں بولتے بولتے رکا، پھر کہا۔ ''شیروانی صاحب! آپ کے بیٹے کے بھی بچے ہیں؟''

''میرا ایک پوتا ہے جو ابھی بہت چھوٹا ہے۔'' جمال خان شیروانی نے جواب دیا۔

''دشمن آپ کے پوتے یا بہو کو بھی اغوا کرسکتے ہیں اور آپ کے بیٹے کو بھی۔'' میں نے کہا۔ ''آپ ان کی حفاظت کا بھرپور بندوبست کردیں اور مطمئن ہوجائیں۔''

''میں نے اپنے اعتبار کے ایک ایس ایس پی کی ڈیوٹی اپنے بنگلے پر لگوالی ہے۔ وہ بہت نیک نام افسر ہے۔''

''ایس ایس پی کا نام کیا ہے؟'' میں نے یونہی پوچھ لیا۔

''اس کا نام زاہد علی ہے۔'' جمال خان شیروانی نے جواب دیا۔

میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ مسکین شاہ نے بھی کسی ایس ایس پی زاہد کا نام لیا تھا۔

میں نے جمال خان شیروانی سے پوچھا۔ ''آپ زاہد صاحب کو کب سے جانتے ہیں؟''

''میری ان سے دو چار ملاقاتیں ہوئی ہیں لیکن وہ پولیس کے محکمے کے خاصے نیک نام اور ایمان دار افسر ہیں۔ ان کے بارے میں یہی مشہور ہے۔''

''شیروانی صاحب! آپ اس ایس ایس پی کو فوراً وہاں سے ہٹا دیں۔'' میں نے کہا۔ ''میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں، وہ انتہائی کمینہ اور گھٹیا آدمی ہے۔''

''یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟'' شیروانی الجھ کر بولا۔

''اس لیے کہ میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ آپ کو کس نے مشورہ دیا تھا کہ ایس ایس پی زاہد کی ڈیوٹی وہاں لگائیں؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نے سیکریٹری داخلہ سے بات کی تھی۔ انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ زاہد بہت ایمان دار افسر ہے۔ مجھے بھی ان کی شخصیت میں بہ ظاہر ایسی کوئی برائی نظر نہیں آئی اس لیے میں نے انہیں ڈیوٹی پر بلالیا۔''

''سیکریٹری خارجہ بھی کوئی نیک نام آدمی نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ بات تو آپ بھی اچھی طرح جانتے ہوں گے۔ آپ سے اس کا ملنا جلنا رہتا ہوگا۔ یوں بھی وہ آپ ہی کی طرح ایک اعلیٰ سول افسر ہے۔''

''ہاں، میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ انتہائی رشوت خور اور گھٹیا انسان ہے۔'' جمال خان شیروانی نے کہا۔

''اور آپ نے اس گھٹیا انسان کے مشورے پر ایک دوسرے گھٹیا انسان کو اتنی بڑی ذمے داری سونپ دی۔ آپ فوراً اسے وہاں سے چلتا کریں۔''

''اچھا، میں اسے اپنے بنگلے سے ہٹا دیتا ہوں۔'' اس نے کہا۔

میں نے سلسلہ منقطع کردیا۔

میرے دل میں نہ جانے کیوں وسوسے اٹھ رہے تھے۔ میں نے غنی سے کہا کہ گاڑی نکالو۔

''کہاں جارہا ہے فیکے پتر؟'' راجا نے چونک کر پوچھا۔

''میں ذرا جمال خان شیروانی کے بنگلے کی طرف جارہا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''فیکے پتر، تو واقعی پاگل ہوگیا ہے۔'' راجا نے کہا۔ ''جمال خان شیروانی تجھے اس حلیے میں پہچانے گا کب؟''

''میں اس سے ملوں گا ہی نہیں، بس ذرا اس کے بنگلے کی نگرانی کروں گا۔ میری چھٹی حس کسی خطرے کی گھنٹی بجا رہی ہے۔''

''چھٹی حس؟'' راجا نے مضحکہ خیز لہجے میں کہا۔ ''کیا تجھے یقین ہے فیکے پتر کہ تیری بقیہ پانچوں حسیں کام کررہی ہیں؟''

''یہ مذاق کا وقت نہیں ہے راجا!'' میں نے جھنجلا کر کہا۔

''پھر تو اکیلا نہیں جائے گا۔'' راجا نے کہا۔

''میں اکیلا کب جارہا ہوں۔ غنی اور احمد شاہ کو ساتھ لے جارہا ہوں؟'' میں نے کہا۔

''میں بھی تیرے ساتھ چلوں گا۔'' راجا نے فیصلہ کن

ﮦ میں کہا۔

''خدمت کر راجا!'' میں نے کہا۔

''ہاں میرے لیے تو تو ایسے ہی جملے استعمال کرے گا، ﺪمت کر، ٹہلنے پر چل، دودن رہ، ابا تالا لایا۔''

''راجا! کبھی تو سنجیدہ ہوجایا کر۔'' میں نے کہا۔ ''تم ﻟﻮں کا یہاں رہنا ضروری ہے۔ تو شاید بھول گیا ہے کہ ﺮے قبضے میں آفتاب خان کی بیٹی ہے۔''

''سر ٹھیک کہہ رہے ہیں راجا!'' ناصر نے کہا۔ ''ہم ﻟﻮں کا یہاں رہنا بہت ضروری ہے، سر تو صرف باہر سے ﺎل خان شیروانی کے بنگلے کا جائزہ لیں گے۔ ان کے ساتھ ﺮشاہ اور غنی جیسے لوگ ہیں۔''

''اچھا، مجھ سے سیل فون پر رابطہ رکھنا۔'' راجا نے کہا۔

غنی گاڑی پورچ میں لے آیا تھا۔ اس مرتبہ بھی اس ﮯ ڈبل کیبن پک اپ نکالی تھی۔ وہ گاڑی کے پاس بہت ﺴﺘﻌﺪ انداز میں کھڑا ہوا تھا۔

''احمد شاہ کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔ ''اسے بھی ﺎلو۔''

غنی فوراً ہی اندر کی طرف چل دیا۔ پھر فوراً ہی وہ مجھے ﺮشاہ کے ساتھ نظر آیا۔

''سر ہم لوگ پوری طرح مسلح ہیں۔'' احمد شاہ نے ﺍﺏ دیا۔

''ہمیں وہاں کسی ایسی صورتِ حال کا سامنا نہیں کرنا ﮍے گا کہ ہتھیار استعمال کرنے کی نوبت آجائے لیکن نوبت ﺁﺑﮭی سکتی ہے۔'' میں نے کہا۔

اچانک شامی مین گیٹ کی ذیلی کھڑکی سے اندر ﺩﺍﺧﻞ ہوا۔

''وہ مجھے دیکھ کر چونکا اور تیزی سے میری طرف ﺑﮍھا۔ میں اس وقت تک گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔

''کہاں چلے نواب بھائی؟'' شامی نے پوچھا۔

''میں ایک ضروری کام سے جارہا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''چلو، پھر میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔'' شامی نے کہا اور عقبی نشست کا دروازہ کھول کر میرے ساتھ بیٹھ گیا۔

میں نے غنی کو چلنے کا اشارہ کیا۔ اس نے گاڑی گیٹ سے باہر نکال کر پوچھا۔ ''کس طرف چلوں سر؟''

''گلبرگ!'' میں نے جواب دیا۔ ''تم نے جمال ﺧﺎﻥ شیروانی کا بنگلا دیکھا ہے؟''

''میں نے ابھی تک نہیں دیکھا۔'' غنی نے جواب دیا۔

''تم گلبرگ پہنچ کر چودھری ظہور الٰہی روڈ پر پہنچو۔ میں وہاں سے تمہیں پتا سمجھا دوں گا۔''

''خیریت تو ہے نواب بھائی؟'' شامی نے پوچھا۔ ''جمال خان شیروانی کے بنگلے پر جانے کی ضرورت کیوں پیش آگئی؟''

''مجھے لگ رہا ہے شامی کہ وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہونے والا ہے۔ تم اسے میری چھٹی حس کہہ لو۔''

پھر شامی خاموش ہوگیا۔ میں بھی خاموشی سے جمال خان شیروانی اور زاہد کے بارے میں سوچتا رہا۔ ہماری گاڑی گلبرگ کے علاقے میں داخل ہوچکی تھی۔

اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے سیل فون جیب سے نکالا۔ اسکرین پر جمال خان شیروانی کا نام تھا۔

''ہیلو!'' میں نے سیل فون کان سے لگا کر کہا۔

''نواب صاحب! کچھ بدمعاش میری بیٹی کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔'' وہ گلوگیر لہجے میں بولا۔

''کب؟'' میں نے پوچھا۔

''ابھی ایک منٹ پہلے وہ لوگ یہاں سے نکلے ہیں؟''

''گاڑی کا نمبر تو آپ نے نوٹ کیا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''میں نمبر تو نوٹ نہیں کرسکا لیکن وہ آف وہائٹ کرولا ہے۔ اسی سال کا ماڈل ہے۔''

غنی چودھری ظہور الٰہی روڈ پر گھوما تو مجھے ایک کرولا تیزی سے مخالف سمت سے آتی دکھائی دی۔

''غنی گاڑی روکو۔'' میں نے چلّا کر کہا۔

غنی نے گھبرا کر بریک لگادیے۔

کرولا تیز رفتاری سے ہمارے سامنے سے گزر گئی۔ مجھے اس میں ثمرہ کی صرف ایک جھلک دکھائی دی۔ میں نے غنی سے کہا۔ ''گاڑی کو یوٹرن دے کر اس کرولا کا پیچھا کرو؟''

غنی نے بہت خطرناک انداز میں یوٹرن لیا۔ جلد بازی میں اس نے مخالف سمت سے آنے والی کوسٹر کا بھی خیال نہ کیا۔

کوسٹر کا ڈرائیور اگر ماہر نہ ہوتا تو بہت خوف ناک تصادم ہوتا۔ بس سیکنڈوں کے فرق سے ہماری گاڑی نکل گئی۔ کوسٹر کے ڈرائیور نے غنی کو چیخ کر گالی دی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید غنی اس سے بھڑ جاتا لیکن اس وقت تو ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔

غنی کا چہرہ غصے کی شدت سے سرخ ہوگیا۔

''ہوتا ہے، ایسا بھی ہوتا ہے۔'' شامی نے غنی کی پیٹھ

تھپک کر کہا۔ ’’ویسے غلطی تمہاری ہی تھی۔ اب ڈرائیونگ پر دھیان دو اور غصہ تھوک دو۔‘‘

غنی نے ایک نظر مجھ پر ڈالی، پھر سر جھٹک کر گاڑی کی رفتار خوف ناک حد تک بڑھا دی۔ دو منٹ کی برق رفتار ڈرائیونگ کے بعد مجھے وہ ٹویوٹا نظر آ گئی۔

’’اب ذرا احتیاط سے چلو غنی!‘‘ میں نے کہا۔ ’’ان لوگوں کو یہ احساس نہیں ہونا چاہیے کہ ہم ان کا تعاقب کر رہے ہیں۔‘‘

’’پہلے یہ تو کنفرم کر لو کہ یہ ہماری مطلوبہ ٹویوٹا ہے یا کوئی اور ہے؟‘‘ شامی نے کہا۔

’’یہ وہی ٹویوٹا ہے شامی بادشاہ!‘‘ احمد شاہ نے کہا۔ ’’جب غنی نے بریک لگایا تھا، میں نے اسی وقت اس کا نمبر نوٹ کر لیا تھا۔‘‘

’’ویری گڈ!‘‘ میں نے خوش ہو کر کہا۔ ’’مجھے ایسے ہی حاضر دماغ لوگوں کی ضرورت ہے۔‘‘

گاڑیاں آگے پیچھے بھاگتی رہیں، ٹویوٹا کبھی دائیں مڑ رہی تھی، کبھی بائیں، پھر وہ چکر کاٹ کر مین روڈ پر آ جاتی تھی۔

’’حرام زادہ!‘‘ میں منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

’’کیا ہوا نواب بھائی؟‘‘ شامی نے پوچھا۔

’’ان مردودوں کو شبہ ہو گیا ہے کہ ہم لوگ ان کا پیچھا کر رہے ہیں۔ اپنے شبہے کی تصدیق کے لیے وہ لوگ بلا مقصد گاڑی ادھر ادھر دوڑا رہے ہیں۔‘‘

’’تو پھر ان لوگوں سے یہیں دو دو ہاتھ کیے لیتے ہیں۔‘‘ شامی نے کہا۔

’’ہاں شامی بادشاہ!‘‘ میں نے کہا۔ ’’میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔‘‘

میں نے کہا اور غنی سے مخاطب ہوا۔ ’’غنی! گاڑی کی رفتار بڑھاؤ اور اس ٹویوٹا کے نزدیک لے چلو۔‘‘

غنی نے ایکسی لریٹر پر پیر کا دباؤ بڑھا دیا۔

ہمیں دھچکا سا لگا اور گاڑی جیٹ فائٹر کی طرح دوڑنے لگی۔

میں نے عقبی نشست سے کچھ آگے کھسک کر اسپیڈ میٹر چیک کرنا چاہا لیکن دیکھ نہ سکا۔

’’غنی!‘‘ میں نے کہا۔ ’’ہماری گاڑی اتنی طاقت ور اور برق رفتار تو ہے نہیں، تم نے کیا انجن میں کچھ......‘‘

’’جی سر!‘‘ غنی نے نظریں ونڈ اسکرین پر جمائے جمائے کہا۔ ’’یہ گاڑی ہمیشہ ہمارے ہی استعمال میں رہتی ہے، میں نے اپنی ہی ورک شاپ میں لے جا کر گاڑی کے انجن میں کچھ تبدیلیاں کرائی ہیں۔‘‘

میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ہم اس وقت ملتان روڈ پر ہیں۔ اس بھاگ دوڑ میں مجھے احساس ہی نہیں ہوا کہ ہم کن کن راستوں سے گزر رہے ہیں۔

اچانک ٹویوٹا سے ایک فائر ہوا اور گولی ہماری گاڑی کے بائیں دروازے سے رگڑ کھاتی ہوئی گزر گئی۔ فوراً ہی احمد شاہ نے بھی ریوالور نکال لیا اور کھڑکی میں سے ہاتھ نکال کر ٹویوٹا پر فائر کر دیا۔

اس فائر کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ احمد شاہ بہترین نشانے باز تھا لیکن بائیں ہاتھ سے کسی چلتی ہوئی گاڑی کو نشانہ بنانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اس صورت میں مزید مشکل ہو جاتا ہے جب ہدف کا صحیح طور پر نشانہ نہ لیا جا سکے۔

ٹویوٹا سے دوسرا فائر ہوا تو گولی گاڑی کی چھت سے ٹکرا کر نکل گئی۔

احمد شاہ نے ریوالور کے دستے سے ونڈ اسکرین توڑ دیا۔ اب وہ ٹویوٹا کو نشانے پر لے سکتا تھا۔

اس نے ٹویوٹا کا نشانہ لیا اور فائر کر دیا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے ٹویوٹا کو لہراتے دیکھا۔ احمد شاہ نے اس کے ایک ٹائر کو نشانہ بنایا تھا۔ اس نے دوسرا فائر کیا اور دوسرا عقبی ٹائر بھی ناکارہ کر دیا۔

گاڑی فوراً ہی رک گئی۔ غنی نے بھی بریک لگا دیے۔

’’وہ لوگ گاڑی سے اتر کر بھاگ رہے ہیں سر!‘‘ احمد شاہ نے کہا۔ ’’کچھ لوگ بائیں طرف کی جھاڑیوں میں گئے ہیں۔ ان کے ساتھ ایک لڑکی بھی ہے۔ دو آدمی دائیں طرف بھاگے ہیں۔‘‘

پھر احمد شاہ بھی دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر کود گیا۔ میں نے عقبی دروازہ کھولا اور باہر چھلانگ لگا دی۔ باہر کود کر میں نشیب میں لڑھکتا ہوا چلا گیا۔ اسی وقت شامی کی آواز میرے کانوں میں آئی۔ وہ غنی سے کہہ رہا تھا۔ ’’ہم لوگ دوسری طرف سے انہیں گھیرتے ہیں غنی!‘‘

میں نے گاڑی سے باہر آنے کے بعد اردگرد کا جائزہ لیا۔ ہم لوگ کسی متروک سڑک پر تھے۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ وہ لوگ اتنی آزادی اور دیدہ دلیری سے فائرنگ کیسے کر رہے تھے۔

احمد شاہ مجھ سے آگے تھا لیکن اس وقت وہ جھاڑیوں میں نہ جانے کس طرف نکل گیا تھا۔ میں بھی اندازے سے اس طرف بڑھا جدھر ان لوگوں کی موجودگی کا امکان تھا۔ پھر میں آگے بڑھتا ہی چلا گیا لیکن مجھے ان لوگوں کا کوئی سراغ نہ ملا۔ احمد شاہ بھی جھاڑیوں میں کہیں گم ہو گیا تھا۔

میں مزید آگے بڑھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ میری بائیں جانب والی جھاڑیوں اور خودرو گھاس میں اچانک ہلچل سی پیدا ہوئی۔ میں پھرتی سے جھاڑیوں میں لیٹ گیا۔

پھر میں نے کسی کی گھٹی گھٹی آواز سنی۔ ’’اب بھاگنے کی یا آواز نکالنے کی کوشش بھی کی تو گلا دبا دوں گا۔‘‘

میں جھاڑیوں میں لیٹے ہی لیٹے آواز کی جانب سرکنے لگا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ بولنے والے نے احمد شاہ کو مخاطب کیا ہے یا کسی اور کو؟ ممکن ہے ان لوگوں نے احمد شاہ پر قابو پا لیا ہو؟ میں نے سوچا لیکن احمد شاہ اتنی آسانی سے ان کے ہاتھ آنے والا نہیں تھا کہ وہ خاموشی سے اسے بے بس کر دیتے۔

’’تو کیا سمجھتی ہے۔‘‘ وہی آواز پھر سنائی دی۔ آواز میں غراہٹ نمایاں تھی لیکن بولنے والا بہت دبے لہجے میں بول رہا تھا۔ ’’تیرے باپ کے بھیجے ہوئے یہ آدمی تجھے یہاں سے چھڑا کر لے جائیں گے؟ اگر ایسا کوئی موقع......‘‘

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا اور اس کے حلق سے ایک کراہ بلند ہوئی۔

پھر فوراً ہی کوئی سرگوشی میں بولا۔ ’’خاموشی سے میرے ساتھ چلو...... جلدی کرو...... میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔‘‘

یہ آواز سن کر میں نے سکون کا سانس لیا۔ وہ آواز احمد شاہ کی تھی۔

’’لیکن تم ہو کون؟‘‘ اس مرتبہ مجھے ثمرہ کی آواز سنائی دی۔

’’میں نے کہا نا کہ میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔‘‘ احمد شاہ سرگوشی میں بولا۔ ’’بس اب نکل چلو۔‘‘

اسی وقت مجھے دائیں جانب کی جھاڑیوں میں ہلکی سی سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے غور سے ادھر دیکھا۔ کوئی بہت محتاط انداز میں اس طرف بڑھ رہا تھا جہاں احمد شاہ موجود تھا۔

میں بھی محتاط انداز میں اسی طرف کھسکنے لگا۔

میں کچھ اور آگے بڑھا تو مجھے جھاڑیوں کی اوٹ میں ایک شخص نظر آیا۔ اس کا رخ احمد شاہ کی طرف تھا اور ہاتھ میں لمبی نال کا ریوالور تھا۔ شاید اس نے ریوالور پر سائلنسر فٹ کر رکھا تھا۔

اچانک کچھ فاصلے پر ایک فائر ہوا۔ وہ بدک کر پلٹا تو اس کی نظر مجھ پر پڑی۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر فائر کرتا۔ میرے ریوالور نے شعلہ اگلا اور دھماکے کے ساتھ ہی اس کے حلق سے کرب ناک چیخ بلند ہوئی۔ گولی اس کے سینے میں پیوست ہو گئی تھی۔

زمین پر گرنے کے بعد اس نے دوبارہ اٹھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا اور اوندھے منہ گر گیا۔

میں تیزی سے آگے بڑھا اور اس کا جائزہ لیا۔ وہ زندگی کی قید سے نجات پا چکا تھا۔ میں نے اس کا ریوالور قبضے میں لیا اور بہت پھرتی سے اس کی تلاشی لی۔ اس کی جیب میں چند سو روپوں کی رقم کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں تھا۔

میں اس کی تلاشی لے کر فارغ ہوا ہی تھا کہ کوئی درشت لہجے میں بولا۔ ’’بس، اب اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا ورنہ......‘‘

وہ آواز احمد شاہ کی تھی۔ میں نے سوچا کہ اگر میں فوراً گھوموں گا تو احمد شاہ سے کچھ بعید نہیں ہے کہ وہ فائر کر دے۔

’’ویری گڈ احمد شاہ!‘‘ میں نے ہنس کر کہا۔ ’’بہت اچھے جا رہے ہو۔‘‘

’’سر!...... یہ آپ ہیں؟‘‘ احمد شاہ نے کہا۔ ’’آپ ٹھیک تو ہیں؟‘‘

’’ہاں، ابھی تک تو ٹھیک ہوں۔‘‘ میں نے جواب دیا۔

’’سر، یہاں سے فوراً نکلیں۔ فائر کی آواز نے اس کے دوسرے ساتھیوں کو بھی چوکنا کر دیا ہوگا۔‘‘

’’چلو!‘‘ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

احمد شاہ کے ساتھ سہمی ہوئی ثمرہ بھی تھی۔

احمد شاہ جھکا جھکا اس طرف بڑھا جدھر ہماری گاڑی کھڑی تھی۔ میں ان دونوں کے پیچھے تھا۔

میرا اندازہ تھا کہ ثمرہ کے علاوہ گاڑی میں چار آدمی اور تھے۔ جن میں سے دو تو ہمارے ہاتھوں مارے گئے تھے گویا دو ابھی باقی تھے، پھر مجھے اس فائر کا خیال آیا جس پر چونک کر میرے ہاتھوں مارے جانے والے آدمی نے پلٹ کر دیکھا تھا۔ وہ فائر کس نے کیا تھا؟ فائر کی آواز سے مجھے کچھ اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ وہ فائر ریوالور سے کیا گیا ہے یا پستول سے؟ یقیناً احمد شاہ کو علم ہوگا۔ وہ آواز سن کر بتا سکتا تھا کہ فائر کس بور کے ریوالور یا پستول سے ہوا ہے۔

اسی وقت پھر ایک کرب ناک چیخ بلند ہوئی اور خاموشی چھا گئی، پھر چند لمحے بعد ایک فائر مزید ہوا اور اس کے ساتھ ہی ایک اور کرب ناک چیخ بھی سنائی دی، پھر بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ بھاگنے سے گھاس اور جھاڑیوں میں سے عجیب طرح کی آواز پیدا ہو رہی تھی۔

میں پوری طرح آواز کی طرف متوجہ تھا۔ احمد شاہ بھی

اسی طرف دیکھ رہا تھا۔ بھاگنے والا اسی طرف آرہا تھا جہاں ہم موجود تھے۔ اچانک میرے سامنے ایک شخص آگیا۔ اس نے گہرے رنگ کا شلوار قمیص پہن رکھا تھا۔ پیروں میں موٹے تلے والی پشاوری چپل تھی اور ہاتھ میں ریوالور تھا۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر اچانک ٹھٹک گیا اور ایک دم مجھ پر گن تان لی۔ اس سے پہلے کہ وہ فائر کرتا، کہیں سے ایک فائر ہوا اور ریوالور بردار کی کھوپڑی میں سوراخ ہوگیا۔ وہ چند لمحے کھڑا رہا، پھر کٹے ہوئے درخت کی طرح اوندھے منہ زمین پر گر پڑا۔

احمد شاہ نے گھوم کر دیکھا، پھر چونک کر بولا۔ ''یہ لڑکی کہاں گئی؟''

موقع پا کر ثمرہ وہاں سے فرار ہوگئی تھی۔

میں اور احمد شاہ تیزی سے اس طرف لپکے جس طرف ثمرہ فرار ہوئی تھی۔ وہ ان کانٹے دار جھاڑیوں میں زیادہ دور نہیں جاسکتی تھی۔

ہم مزید آگے بڑھے تو ثمرہ کی آواز سن کر ٹھٹک کر رک گئے۔ وہ چیخ رہی تھی۔ ''چھوڑ دو مجھے......چھوڑو۔''

''چھوڑ دوں گا۔'' مجھے شامی کی آواز سنائی دی تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ ''لیکن ہمیں اپنا دشمن مت سمجھو۔''

''میں کہتی ہوں مجھے چھوڑ دو ورنہ......''

میں اور احمد شاہ بھاگ کر وہاں پہنچے، ثمرہ شامی سے الجھی ہوئی تھی اور اس کی گرفت سے نکلنے کے لیے بری طرح مچل رہی تھی۔

میں نے آگے بڑھ کر اچانک اس کی کنپٹیاں پکڑیں اور دبا دیں۔ وہ شامی کے ہاتھوں میں جھول کر رہ گئی۔

''اسے اٹھاؤ اور گاڑی کی طرف چلو۔'' میں نے احمد شاہ سے کہا۔

احمد شاہ نے اسے اپنے کندھے پر اٹھالیا اور تیزی سے گاڑی کی طرف بڑھا۔ غنی ہم سے پہلے ہی گاڑی تک پہنچ چکا تھا۔ ہم نے اسے گاڑی میں ڈالا اور غنی تیز رفتاری سے واپسی کے لیے روانہ ہوگیا۔

جب وہ مین روڈ پر آیا تو میں نے اس سے کہا۔

''غنی! مجھے اور شامی کو راستے میں اتار دو اور تم ثمرہ کو لے کر شیروانی کے بنگلے پر چلے جاؤ۔ احمد شاہ بھی تمہارے ساتھ ہوگا۔''

''او کے سر!'' غنی نے کہا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا۔ ''سر! میں شیروانی صاحب کو اپنے بارے میں کیا بتاؤں؟''

''بتا دینا کہ میں نواب صاحب کا چیف سیکیورٹی آفیسر ہوں اور نواب صاحب کی ہدایات پر آپ کے بنگلے پر ڈیوٹی دے رہا تھا۔''

''ٹھیک ہے سر!'' غنی نے کہا۔ ''میں سمجھ گیا۔''

اس نے مجھے اور شامی کو ایسی جگہ چھوڑ دیا جہاں ہمیں ٹیکسی آسانی سے مل سکتی تھی۔

میں ٹیکسی کی تلاش میں نظریں دوڑا رہا تھا کہ راجا کا فون آگیا۔ ''سب خیریت تو ہے ٹیکے پتر؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں، سب خیریت ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میں آدھے گھنٹے میں گھر پہنچ رہا ہوں، پھر تجھے تفصیل سے سب کچھ بتاؤں گا۔''

''اچھا!'' راجا نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ ''تو تفصیل سے بتانے کو بھی کچھ ہے؟''

''کچھ نہیں، بہت کچھ ہے مہاراجا!'' میں نے کہا اور سلسلہ منقطع کردیا۔

اس وقت تک شامی ایک ٹیکسی روک چکا تھا۔

حسب عادت اس نے ٹیکسی دو بلاک پہلے ہی رکوالی اور وہاں سے ہم محتاط انداز میں پیدل روانہ ہوگئے۔

گھر پہنچے تو راجا اور ناصر بے چینی سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ شامی بھی میرے ساتھ ہے۔ میں نے انہیں ثمرہ کے اغوا اور پھر بازیابی کی تفصیل بتائی تو دونوں حیران رہ گئے۔

''ٹیکے پتر!'' راجا ہنس کر بولا۔ ''ہم فضول میں تیرے حواس خمسہ پر شک کر رہے تھے۔ تیری تو واقعی چھٹی حس بھی کام کر رہی ہے۔''

''اب جلدی سے میرے لیے کافی منگوا ورنہ میری ساتویں اور آٹھویں حس بھی کام کرنے لگیں گی۔'' میں نے کہا۔

''میں جانتا ہوں ٹیکے پتر! تو کتنا حساس ہے۔''

''یار ناصر!'' میں نے چونک کر کہا۔ ''میرے خیال میں اب ہمیں مزید اس حلیے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم ابھی اپنے اس ہونق میک اپ ماسٹر کو بلاؤ تاکہ وہ ہمارا حلیہ درست کرسکے۔''

''سر، ضرورت تو اب بھی ہے لیکن......''

''میرے خیال میں ایسی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے زور دیتے ہوئے کہا۔

''ہاں یار ناصر!'' راجا نے کہا۔ ''میں خود اس حلیے سے تنگ آگیا ہوں۔ کیا دشمنوں کے خوف سے ہم زندگی بھر ان ہی شکلوں کے ساتھ پھرتے رہیں گے؟''

''اچھا، میں اس میک اپ مین کو بلواتا ہوں۔'' ناصر

نے ہنس کر کہا۔ پھر اس نے جیب سے سیل فون نکالا اور نمبر ڈائل کرنے لگا۔

☆☆☆

میں نے کئی دن بعد اپنی شکل دیکھی تو عجیب سا احساس ہوا۔ ایسا لگا جیسے میں خود کہیں گیا ہوا تھا اور ابھی ابھی لوٹا ہوں۔ میں دیر تک آئینے کے سامنے کھڑا اپنا چہرہ دیکھتا رہا۔ اس دن مجھے اپنے چہرے کی اہمیت کا اندازہ ہوا۔ نہ جانے وہ کیسے لوگ ہوتے ہیں جو پلاسٹک سرجری کے ذریعے اپنا وہ چہرہ کھو دیتے ہیں جو زندگی بھر ان کی شناخت رہتا ہے۔

میں تیار ہو کر باہر نکلا تو راجا اور ناصر لاؤنج ہی میں موجود تھے اور اپنی اصل شکلوں میں تھے۔

راجا تو بے اختیار مجھ سے لپٹ گیا اور بولا۔ ''ٹیکے پتر! کتنے عرصے بعد تجھے دیکھ رہا ہوں۔''

''او بھائی!'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''لگتا ہے تیرا دماغ بالکل ہی چل گیا ہے؟ ابھی پندرہ منٹ پہلے تو ہماری ملاقات ہوئی تھی۔''

''ہاں ہوئی تھی۔'' راجا نے کہا۔ ''لیکن وہ تو کوئی اجنبی تھا جس کی ملاقات مجھ سے ہوئی تھی۔''

''اچھا اب یہ فلسفہ بگھارنا بند کر اور......''

''حالانکہ ابھی تنہائی میں یہی فلسفہ تو بگھار رہا تھا۔'' راجا نے میری بات کاٹ دی۔ ''توبہ توبہ آواز بلند سوچ رہا تھا ٹیکے پتر!''

''یار راجا!'' میں نے کہا۔ ''غنی اور احمد شاہ ابھی تک لوٹے نہیں؟''

''یار، وہ بچے تو ہیں نہیں جو تو اتنا فکر مند ہوگیا ہے۔''

''وہ بچے نہیں ہیں لیکن شیروانی کے بنگلے پر ایس ایس پی زاہد کی ڈیوٹی ہے۔ اس سے کچھ بعید نہیں کہ......''

ناصر اچھل پڑا۔ ''ہاں، ایس ایس پی زاہد سے کچھ بھی بعید نہیں کہ اس نے غنی اور احمد شاہ ہی کو اغوا کے شبے میں دھر لیا ہو۔''

میں اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔

''اب تو کہاں چلا؟'' راجا نے پوچھا۔

''میں شیروانی کے بنگلے پر جارہا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اس کمینے ایس ایس پی نے اگر اس گاڑی کی تلاشی لی ہوگی تو وہ غنی اور احمد شاہ پر ناجائز اسلحہ رکھنے کا کیس بھی بنا دے گا۔''

''لیکن وہ ایسا کیوں کرے گا؟'' ناصر نے پوچھا۔

''میرا مطلب ہے کہ اسے یہ چکر چلانے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ غنی اور احمد شاہ کو گرفتار کرے گا پھر ان پر اغوا کا مقدمہ

بنا کے انہیں حوالات میں بھجوا دے گا پھر......"

"ناصر!" میں نے کہا۔ "تم کیسے صحافی ہو کہ......"

"یار فیکے!" راجا نے کہا۔ "یہ مفروضے قائم کرنے سے بہتر ہے کہ تو غنی کو فون کر لے۔"

"واہ!" میں نے ہنس کر کہا۔ "کیا زبردست بات کی ہے مہاراجا! یہ بات میرے ذہن میں کیوں نہیں آئی؟"

"اچھا زیادہ طنز کرنے کی ضرورت نہیں ہے فیکے پتر!" راجا منہ بنا کر بولا۔ "تیرے ذہن میں کچھ اور ہو تو وہ بھی بتا دے۔"

"او بھائی دانش مند! میں غنی کو پہلے ہی فون کر چکا ہوں۔ اس کا سیل فون بند ہے۔ اسی لیے تو مجھے پریشانی ہے۔ نہ صرف غنی بلکہ احمد شاہ کا سیل فون بھی آف ہے۔"

"یہ تو واقعی پریشانی کی بات ہے۔" ناصر نے کہا۔

"اسی لیے میں جمال خان شیروانی کے بنگلے پر جا رہا ہوں۔"

"چل پھر میں بھی چلتا ہوں۔" راجا نے کہا۔ "ناصر کو بھی ساتھ لے لے۔ اگر زاہد واقعی کسی گڑبڑ کا ذمے دار ہے تو وہ میرے اور ناصر ہی کے قابو میں آئے گا۔"

"شابی بادشاہ!" میں نے کہا۔ "تمہارا گھر میں رہنا ضروری ہے۔ غنی اور احمد شاہ بھی موجود نہیں ہیں۔ اب ہم......"

"آپ فکر مت کرو نواب بھائی!" شابی نے کہا۔ "میں اور گولی یہاں موجود ہیں۔ اس طرف سے تم بالکل مطمئن ہو جاؤ۔"

اس دفعہ میں نے اپنی ہی گاڑی میں جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اسٹیئرنگ پر ناصر تھا۔ وہ غنی کی طرح گاڑی بہت تیز چلاتا تھا لیکن اس وقت زیادہ محتاط ڈرائیونگ کر رہا تھا۔

ہم جمال خان شیروانی کے گھر کے نزدیک پہنچے تو مجھے دور ہی سے غنی کی ڈبل کیبن پک اپ دکھائی دی۔

"گاڑی کو باہر روکنے کے بجائے اندر پورچ میں لے لینا۔" میں نے ناصر سے کہا۔

ناصر نے گیٹ پر پہنچ کر ہارن دیا تو بڑے گیٹ میں ایک ذیلی کھڑکی کھلی اور پولیس کا ایک سپاہی باہر آ گیا اور بولا۔ "جی سر، کس سے ملنا ہے آپ کو؟"

"شیروانی صاحب سے۔" ناصر نے مختصر جواب دیا۔

"آپ کا نام سر!" سپاہی نے پوچھا۔

"نواب رفیق احمد شیرازی آف ست بدھائی، شیروانی صاحب سے ملاقات کریں گے۔"

"نواب...... رفیق......" وہ جلدی سے اندر کی طرف بڑھ گیا۔ پھر وہ جس تیزی سے اندر گیا تھا، اس سے کہیں زیادہ تیز رفتاری سے باہر آیا اور فوراً ہی بڑا گیٹ کھول دیا۔

برآمدے میں مجھے شیروانی صاحب کے ساتھ سادہ لباس میں ایک اور شخص نظر آیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہی ایس ایس پی زاہد ہے۔

مجھے گاڑی سے اترتا دیکھ کر جمال خان شیروانی صاحب میری طرف لپکے اور بولے۔ "آیئے نواب صاحب!"

زاہد نے چونک کر مجھے دیکھا۔ جمال خان شیروانی نے اس سے میرا تعارف کرایا۔

زاہد نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن میں نے اسے نظر انداز کر دیا اور شیروانی صاحب سے پوچھا۔ "شیروانی صاحب! آپ کی بیٹی تو خیریت سے پہنچ گئی؟"

"جی ہاں نواب صاحب!" شیروانی نے جواب دیا۔

"وہ آپ کے آدمی ہیں؟" زاہد نے پوچھا۔

"آپ کن آدمیوں کی بات کر رہے ہیں؟" میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

"وہی جو ثمرہ کو اغوا کر کے لے گئے تھے؟"

"ہوش میں رہ کر بات کرو آفیسر!" میں نے درشت لہجے میں کہا۔ "میرے آدمیوں نے تو اسے اغوا کرنے والوں سے بچایا ہے۔" پھر میں جمال خان شیروانی سے مخاطب ہوا۔ "میرے دونوں آدمی کہاں ہیں؟"

"وہ پولیس کی حراست میں ہیں۔" زاہد نے جواب دیا۔

"کس جرم میں؟" ناصر نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"شیروانی صاحب کی بیٹی کو اغوا کرنے کے جرم میں۔" زاہد نے جواب دیا۔

"ویری گڈ!" ناصر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "آپ تو خود یہ کام کرتے رہے ہیں ایس ایس پی صاحب!" ناصر نے کہا۔ "مسکین شاہ کے کہنے پر آپ نے کئی لڑکیوں کو اغوا کرا کے سمندر پار اسمگل کیا ہے۔"

"کیا بکواس کر رہے ہو؟" زاہد دہاڑ کر بولا۔ "اور تم ہو کون؟"

"میں تو معمولی سا ایک جرنلسٹ ہوں ایس ایس پی صاحب لیکن جانتا سب کچھ ہوں۔"

"کیا جانتے ہو؟" ایس ایس پی پھر دہاڑا۔ "لگتا ہے تمہیں بھی حراست میں لینا پڑے گا۔"

"زاہد صاحب!" جمال خان شیروانی درشت لہجے میں بولا۔ "یہ لوگ میرے مہمان ہیں۔ آپ میرے ہی گھر میں کھڑے ہو کر انہیں حراست میں لینے کی دھمکیاں دے رہے ہیں؟"

"میں اس وقت ڈیوٹی پر ہوں شیروانی صاحب!" ایس ایس پی نے بھی تلخ لہجے میں جواب دیا۔

"آپ تو اس وقت بھی ڈیوٹی پر تھے جب سینیٹر منیر چودھری کی بیٹی کو اغوا کیا گیا تھا۔" ناصر نے تلخ لہجے میں کہا۔ "اور اس وقت بھی ڈیوٹی پر تھے جب اس کی ویڈیو بنائی گئی۔ اس وقت آپ کو اپنا فرض یاد نہیں آیا؟"

"کیا بک رہے ہو؟" ایس ایس پی نے درشت لہجے میں کہا لیکن اس کے اعتماد کے غبارے میں سوراخ ہو چکا تھا۔ اس کا لہجہ کھوکھلا تھا۔

"میرے پاس تو اتنے ثبوت ہیں ایس ایس پی کہ تمہیں پھانسی نہ بھی ہوئی تو عمر قید ضرور ہو جائے گی۔"

"میرے آدمی کہاں ہیں؟" میں نے تلخ لہجے میں پوچھا۔

"وہ یہیں ہیں۔" جمال خان شیروانی نے کہا۔

"شیروانی صاحب! افسوس تو یہ ہے کہ میرے آدمیوں نے جان پر کھیل کر آپ کی بیٹی کو بچایا اور اس ایس ایس پی نے آپ کے سامنے انہیں گرفتار کر لیا؟"

"پولیس نے ان لوگوں کو مجھ تک پہنچنے ہی نہیں دیا۔" شیروانی نے کہا۔ "مجھے صرف یہ بتایا گیا کہ پولیس نے ثمرہ کو بازیاب کرا لیا ہے اور دو مشتبہ آدمیوں کو گرفتار بھی کر لیا ہے۔ ثمرہ کی حالت خراب ہے۔ وہ ابھی بیان دینے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ ڈاکٹر نے اسے انجکشن دے کر سلا دیا ہے۔"

"تو پھر تفصیل مجھ سے سنیے۔" میں نے کہا۔ "جب مجھے یہ معلوم ہوا کہ آپ نے ڈیوٹی پر ایس ایس پی زاہد کو بلایا ہے تو مجھے بہت زیادہ تشویش ہو گئی۔ گویا آپ بلی سے دودھ کی رکھوالی کرا رہے تھے۔ مجھے خدشہ تھا کہ اب کوئی نہ کوئی واقعہ ضرور رونما ہو گا۔ میں نے اپنے آدمیوں کو ہدایت کر دی کہ وہ آپ کے بنگلے کے آس پاس موجود رہ کر اس کی نگرانی کریں۔"

میں نے دیکھا، ایس ایس پی کا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور سارا چہرہ پسینے میں ڈوب گیا تھا۔

"ان لوگوں نے ایک گاڑی کو آپ کے بنگلے کی سمت آتے دیکھا۔" میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ "اس میں انہیں ثمرہ کی جھلک بھی دکھائی دی۔ ان لوگوں نے اس گاڑی کا پیچھا کیا اور اپنی جان پر کھیل کر ثمرہ کو ان کے پنجے سے رہا کرا لیا۔ آپ نے الٹا ان ہی دونوں کو گرفتار کر لیا؟" میں نے آخری جملہ ایس ایس پی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے ابھی ان لوگوں کا بیان نہیں لیا ہے۔" ایس ایس پی کا لہجہ شکست خوردہ تھا۔

"ٹھیک ہے، آپ انہیں گرفتار کر کے عدالت کے سامنے پیش کر دیں۔" ناصر نے کہا۔ "ہمارے پاس تو ان آدمیوں میں سے بھی ایک ہے جس نے ثمرہ کو اغوا کیا تھا۔"

"جھوٹ بولتے ہو تم!" ایس ایس پی نے کہا۔ "وہ چاروں تو مارے گئے۔"

"کون چاروں؟" میں نے پوچھا۔ "آپ کیسے جانتے ہیں کہ وہ چار تھے اور وہ مارے گئے۔ آپ نے تو ابھی میرے آدمیوں کا بیان ہی نہیں لیا ہے۔"

"میرا مطلب ہے کہ...... وہ......" ایس ایس پی ہکلا کر رہ گیا۔

"مطلب صاف ظاہر ہے۔" میں نے کہا۔ "اس اغوا میں آپ بھی ملوث ہیں۔ آپ میرے آدمیوں کو عدالت میں پیش کریں۔ میں وہاں ثابت کر دوں گا کہ ثمرہ کے اغوا میں آپ ہی ملوث ہیں۔"

"نواب صاحب!" ایس ایس پی سنبھل کر بولا۔ "میں پولیس کا ایک ذمے دار افسر ہوں، آپ مجھ پر بہت بڑا الزام لگا رہے ہیں۔"

"پھر آپ ہمارے دونوں آدمیوں کو یہاں بلائیں۔" ناصر نے کہا۔ "آپ نے تو ان سے سیل فون تک چھین لیے۔" پھر ناصر مجھے وہاں سے کچھ فاصلے پر لے گیا اور بولا۔ "سر! ابھی اس ایس ایس پی کو مت چھیڑیں، یہ تو مسکین شاہ کا بہت چھوٹا سا مہرہ ہے۔ اس کی گرفتاری سے مسکین شاہ ہوشیار ہو جائے گا۔ ممکن ہے، وہ ملک چھوڑ کر فرار ہونے کی کوشش کرے۔"

ناصر کی بات میری سمجھ میں آ گئی۔

"آپ لوگ یہاں کیوں کھڑے ہیں؟" جمال خان شیروانی نے کہا۔ "آیئے، ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہیں۔"

"آپ ایسا کریں، یہیں کرسیاں ڈلوا دیں۔" میں نے

کہا۔ ”میں کچھ دیر تازہ ہوا کھانا چاہتا ہوں۔“

جمال خان شیروانی کا ایک ملازم لاؤنج سے کرسیاں اٹھا لایا۔

اسی وقت دو سپاہی غنی اور احمد شاہ کو وہاں لے آئے۔ ان دونوں کے ہاتھ میں ہتھکڑی پڑی ہوئی تھی۔

غنی اور احمد شاہ کو اس حالت میں دیکھ کر میرا خون کھول اٹھا۔

ایس ایس پی نے میرے چہرے پر ناگواری کے تاثرات دیکھ لیے تھے۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ”ان دونوں کی ہتھکڑی کھولو۔“

ایک سپاہی نے فوراً ہی ان کی ہتھکڑی کھول دی۔

ہتھکڑی کھلتے ہی احمد شاہ اور غنی نے فوجی انداز میں مجھے سلام کیا اور غنی بولا۔ ”سر! پولیس والوں نے ہماری کوئی... بات سنی ہی نہیں۔ بس ہمیں گرفتار کرلیا۔“

”آپ ہی کی ہدایات ہیں سر کہ ہمیں کسی پولیس والے پر ہاتھ نہیں اٹھانا۔“ احمد شاہ نے کہا ”اور قانون کا احترام کرنا ہے۔“

”میں جانتا ہوں۔“ میں نے کہا۔ پھر میں ایس ایس پی سے مخاطب ہوا۔ ”ان دونوں کے سیل فون اور دوسری چیزیں کہاں ہیں؟“ میں نے جان بوجھ کر ریوالورز کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔

”وہ تمام چیزیں پولیس کی تحویل میں ہیں۔“ ایس ایس پی نے مزید کہا۔ ”مجھے یقین ہے کہ ان دونوں کے پاس ان ہتھیاروں کے لائسنس بھی ہوں گے جو ان کی جیبوں سے برآمد ہوئے ہیں۔“

”ابھی تم نے سنا نہیں آفیسر!“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”کہ میرے آدمی نے کیا کہا ہے کہ قانون کا احترام کرنا، وہ کوئی غیر قانونی کام کیسے کر سکتے ہیں؟ تم کہو گے تو وہ لائسنس بھی دکھا دیں گے۔“

”اس کی ضرورت نہیں ہے نواب صاحب!“ ایس ایس پی نے کہا۔ ”میں جانتا ہوں کہ ان کا اسلحہ غیر قانونی نہیں ہوگا۔“ پھر وہ غنی سے مخاطب ہوا۔ ”ہاں، اب بتاؤ تم نے ثمرہ کو کیسے بازیاب کرایا؟“

غنی نے میری طرف دیکھا۔ میں نے خفیف سا اشارہ کیا کہ ایس ایس پی جو پوچھ رہا ہے، بتا دو۔

غنی نے میری ہدایت کے مطابق اسے وہی کہانی سنا دی۔

”ان لوگوں سے تمہارا مقابلہ کہاں ہوا تھا؟“ ایس ایس پی نے پوچھا۔

”ملتان روڈ کی ایک سنسان اور ذیلی سڑک پر!“ غنی نے جواب دیا۔ ”وہ ٹویوٹا ممکن ہے اب بھی وہاں موجود ہو۔“

”ممکن ہے سے کیا مراد ہے تمہاری؟“ ایس ایس پی نے پوچھا۔

”یہ بھی ممکن ہے کہ مجرموں کے ساتھیوں نے وہ گاڑی اور لاشیں وہاں سے غائب کر دی ہوں۔“

”یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟“ ایس ایس پی نے کہا۔

”میں امکان ظاہر کر رہا ہوں۔“ غنی نے کہا۔ ”مجرموں کے اور ساتھی بھی تو ہو سکتے ہیں۔“

”ناصر صاحب!“ ایس ایس پی نے کہا۔ ”آپ کہہ رہے تھے کہ مجرموں کا ایک ساتھی آپ کے قبضے میں بھی ہے۔“

”میں کہہ رہا تھا؟“ ناصر نے ڈھٹائی سے کہا۔ ”میں نے ایسا کب کہا ہے؟ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ غنی اور احمد شاہ کا مقابلہ کہاں ہوا ہے؟“

غصے سے ایس ایس پی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ناصر کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید وہ اسی وقت اسے حراست میں لے لیتا۔

”تم دونوں کو میرے ساتھ چل کر اس جگہ کی نشان دہی کرانا ہوگی جہاں تمہارا مجرموں سے مقابلہ ہوا تھا۔“ ایس ایس پی نے کہا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو غنی نے کہا۔ ”ہم اس جگہ کی نشان دہی ضرور کریں گے۔“

ایس ایس پی نے ایک سب انسپکٹر اور چار سپاہیوں کو حکم دیا کہ ان لوگوں کے ساتھ جاؤ اور جائے واردات کا معائنہ کرنے کے بعد مجھے رپورٹ دو۔

غنی اور احمد شاہ پولیس والوں کے ساتھ چلے گئے۔ ایس ایس پی نے ان کے ریوالور، نقدی اور سیل فون سب کچھ لوٹا دیا تھا۔

ان کے جانے کے بعد میں نے بھی شیروانی صاحب سے کہا۔ ”شیروانی صاحب اب مجھے بھی اجازت دیں۔“

”نواب صاحب! ایسے کیسے جا سکتے ہیں آپ؟ کچھ چائے وغیرہ تو پی لیں۔“

”آپ کی چائے اور وغیرہ ڈیو رہی، پھر کسی وقت سہی، اس وقت تو مجھے دوسرے ضروری کام ہیں۔“

جمال خان شیروانی مجھے رخصت کرنے گاڑی تک آیا

اور آہستہ سے بولا۔ ”نواب صاحب! آپ نے کہا تھا کہ وہ ویڈیو اب آپ کے پاس ہے؟“

”جی ہاں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”وہ ویڈیو واقعی میرے پاس ہے۔ آپ چاہیں گے تو میں آپ کو دکھا بھی دوں گا لیکن میرا مشورہ ہے کہ آپ وہ ویڈیو نہ ہی دیکھیں تو اچھا ہے۔“

”نواب صاحب! اس ویڈیو میں ایسا کیا ہے؟“ جمال خان شیروانی نے پوچھا۔

”اس میں وہ کچھ ہے کہ کوئی بھی غیرت مند باپ اپنی بیٹی کی ایسی شرم ناک ویڈیو نہیں دیکھ سکتا۔“ پھر میں نے آہستہ سے کہا۔ ”میں نے آپ سے کہا تھا کہ اس ایس پی کو ڈیوٹی سے ہٹا دیں۔“

”میں نے آئی جی صاحب سے کہا تھا۔“ جمال خان شیروانی نے کہا۔ ”انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر وہ زاہد کو وہاں سے ہٹا کر کسی دوسرے افسر کی ڈیوٹی لگا دیں گے۔“

”چوبیس گھنٹے تو بہت ہوتے ہیں شیروانی صاحب۔“ میں نے کہا۔

”ہاں، آئی جی صاحب کسی دوسرے افسر کو یہاں بھیجیں گے تو ایس ایس پی زاہد کو ہٹائیں گے۔“

”آپ ان سے کہیں کہ زاہد کو فوری طور پر یہاں سے ہٹا دیں۔ دوسرا افسر بعد میں آتا رہے گا۔“

”ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے۔“ شیروانی نے کہا۔ ”میں ابھی آئی جی صاحب سے بات کرتا ہوں کہ زاہد کو فوری طور پر یہاں سے ہٹا دیں۔“

”ہاں، ثمرہ نیند سے جاگے تو ایس ایس پی کو اس سے بھی مت ملنے دیجیے گا۔“

”ثمرہ اس وقت بھی جاگ رہی ہے۔“ شیروانی نے کہا۔ ”میں نہیں چاہتا کہ یہ ایس ایس پی اس سے الٹے سیدھے سوالات کرے۔“

”میں بعد میں آؤں گا۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے امید ہے کہ اس وقت تک یہ ایس ایس پی یہاں سے جا چکا ہوگا۔“ یہ کہہ کر میں گاڑی میں سوار ہو گیا۔

اس وقت میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ دوسری طرف غنی تھا۔ میں نے سیل فون کان سے لگانے کے بعد کہا۔ ”ہاں غنی!“

”سر! یہاں تو نہ وہ گاڑی ہے، نہ ان لوگوں کی لاشیں۔ کچھ بھی نہیں ہے۔“

”ایسے آثار بھی نہیں ہیں جن سے یہ معلوم ہو کہ یہاں مسلح تصادم ہوا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ایسے آثار تو ہیں۔“ غنی نے جواب دیا۔ ”جھاڑیاں کئی جگہ سے کچلی ہوئی ہیں۔ دو تین جگہ خون کے دھبے بھی ہیں اور پولیس کو کئی جگہ سے کارتوسوں کے خول بھی ملے ہیں لیکن آدمی کوئی نہیں ملا۔ البتہ وہاں دو گاڑیوں کے ٹائروں کے نشانات ضرور ہیں۔ ان میں سے ایک تو ہماری گاڑی کے نشانات ہیں، دوسرے نشانات اس ٹویوٹا کے ہیں۔“

”تم لوگ وہاں سے سیدھے گھر پہنچو۔“ میں نے کہا۔ ”میں تمہاری گاڑی بھی اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔“

”او کے سر!“ غنی نے کہا۔

”ناصر!“ میں نے سلسلہ منقطع کرتے ہوئے ناصر سے کہا۔ ”گاڑی واپس لے لو، ہمیں وہاں سے اپنی ڈبل کیبن پک اپ بھی لینا ہے۔“

”تجھے اس گاڑی کا خیال پہلے نہیں آیا کیسے پتر؟“ راجا نے کہا۔

”آیا تھا۔“ میں نے جواب دیا۔ ”لیکن میرا خیال تھا کہ اسے غنی اور احمد شاہ لے آئیں گے۔ غنی اور پولیس پارٹی کو وہاں کچھ بھی نہیں ملا ہے۔ نہ ان اغوا کنندگان کی گاڑی ہے، نہ ان میں سے کسی کی لاش ہے۔ پولیس ایک مرتبہ پھر غنی اور احمد شاہ کو پریشان کر سکتی ہے۔“

”اس صورت میں تو گاڑی وہاں سے ہٹانا بہت ضروری ہے۔“ ناصر نے کہا۔ ”گاڑی میں تو بہت سا اسلحہ بھی ہے۔“

”ہاں۔“ میں نے کہا۔ ”وہ سب ممنوعہ بور کا اسلحہ ہے۔ اگر گاڑی سے وہ برآمد ہو گیا تو غنی اور احمد شاہ کے ساتھ ساتھ میرے لیے بھی پریشانی کھڑی ہو جائے گی۔“

ناصر نے فوراً گاڑی کو یوٹرن دے دیا۔ ہم اس وقت وہاں سے زیادہ دور نہیں گئے تھے۔ دو منٹ بعد ہم پھر شیروانی کے بنگلے پر پہنچ گئے۔

اس وقت مجھے ایس ایس پی نظر آیا۔ وہ پولیس کی ایک جیپ میں کہیں جا رہا تھا۔

ہماری پک اپ اب بھی وہیں کھڑی تھی جہاں میں نے پہلے دیکھی تھی۔

”گاڑی کی چابی غنی کے پاس ہوگی۔“ ناصر نے کہا۔

”ایک چابی میرے پاس بھی ہے۔“ میں نے کہا۔

''گاڑی کے ڈیش بورڈ میں ایک کی رنگ ہے اس میں ان تمام گاڑیوں کی ڈپلی کیٹ چابیاں موجود ہیں جو ہمارے استعمال میں ہیں۔''

ناصر نے ڈیش بورڈ کھولا تو اس میں چابیاں موجود تھیں۔

ہمیں دوبارہ وہاں دیکھ کر ڈیوٹی پر موجود پولیس اہلکار مستعد ہو گئے۔ ایک پولیس والے نے بنگلے کا گیٹ کھولنے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے منع کر دیا اور کہا کہ ہم صرف اپنی گاڑی لینے آئے ہیں۔

میں نے راجا سے کہا کہ تم وہ پک اپ لے کر ہمارے ساتھ ساتھ چلو۔

راجا نے چابیوں کا گچھا لیا اور دو چابیاں لگانے کے بعد تیسری چابی سے گاڑی کا دروازہ کھولنے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر وہ اسٹیئرنگ پر بیٹھا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی۔ پولیس والوں نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔

''بال بال بچ گئے۔'' میں نے وہاں سے نکلنے کے بعد کہا۔ ''اس گاڑی میں ممنوعہ بور کا اسلحہ تو تھا ہی، غنی نے شاید دستی بم بھی رکھ لیا ہو تو کچھ بعید نہیں۔''

''واقعی سر!'' ناصر نے کہا۔ ''فضول کی پریشانی گلے پڑ جاتی۔'' پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ شیروانی صاحب نے آئی جی صاحب سے بات کر لی ہے اور ایس ایس پی زاہد کو وہاں سے ہٹا دیا ہے۔''

''شیروانی صاحب کا مسئلہ تو حل ہو گیا۔'' میں نے کہا۔ ''اب ہمیں نور کو بازیاب کرانا ہے۔ میں نے اسی لیے اپنا میک اپ ختم کرایا ہے کہ دشمن سامنے ہی نہیں آ رہے تھے۔''

''سر! دشمن تو ہمارے سامنے ہی ہیں۔''

''یہ تو چھوٹے موٹے کرائے کے لوگ ہیں۔ اب تو میرا ٹارگٹ رانا زوہیب، دلاور اور مسکین شاہ ہیں۔''

''مسکین شاہ تو کل پرسوں اپنی موت آپ مر جائے گا۔'' ناصر نے کہا۔ ''میں اور ناصر مل کر ابھی اس کے خلاف خبر بناتے ہیں، اس خبر سے ملک میں ایک بھونچال آ جائے گا۔ مسکین شاہ عوامی حلقوں میں بہت نیک نام ہے۔ جب اس کے چہرے سے نقاب اترے گا تو ایک ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا۔''

میں نے سوچا، ممکن ہے مسکین شاہ کو نور کے بارے میں کوئی علم ہو۔ اس پر دباؤ ڈال کر نور کے بارے میں معلوم بھی کیا جا سکتا تھا۔

میں نے اسی خیال کا اظہار ناصر سے کیا تو وہ بولا۔ ''ہاں، مسکین شاہ سے اس بارے میں معلوم کیا جا سکتا ہے۔ آپ ایسا کریں، اس کے خلاف جو تحریری ثبوت ہیں، ان کی ایک ایک فوٹو کاپی اور آڈیو کیسٹس کی ایک ایک نقل لے کر اس کے پاس پہنچ جائیں۔ پھر اس کا ردعمل دیکھیں۔''

''میں اس سے سودے بازی تو ہرگز نہیں کروں گا۔'' میں نے دانت پیس کر کہا۔ ''وہ چاہے نور کے بارے میں کچھ بتائے یا نہ بتائے۔ میں اسے پھانسی کے تختے پر پہنچا کر ہی دم لوں گا۔ اس کی سیاسی موت تو پہلے واقع ہو جائے گی۔''

''ہم بھی اسے چھوڑیں گے نہیں۔'' ناصر نے کہا۔ ''میں صرف اس پر دباؤ ڈالنے کی بات کر رہا ہوں۔''

باتوں کے دوران ہم گھر پہنچ چکے تھے۔

میں نے چونک کر ناصر سے کہا۔ ''یار، تمہاری باتوں میں مجھے اپنے عقب میں توجہ دینا ہی یاد نہیں رہا، ممکن ہے وہاں سے کسی نے ہمارا تعاقب کیا ہو؟''

''آپ فکر نہ کریں۔'' ناصر مسکرا کر بولا۔ ''میری پوری توجہ اس طرف بھی تھی۔ کسی بھی گاڑی نے ہمارا پیچھا نہیں کیا ہے۔''

پورچ میں غنی کی ڈبل کیبن پک اپ بھی کھڑی تھی۔ گویا راجا ہم سے پہلے ہی گھر پہنچ چکا تھا۔

حیرت تو مجھے غنی اور احمد شاہ کو دیکھ کر ہوئی، غنی نے بتایا کہ پولیس کی جو پارٹی جائے واردات کا جائزہ لینے گئی تھی انہی لوگوں نے ہمیں گلبرگ چھوڑ دیا تھا۔ ہم وہاں سے ٹیکسی پکڑ کر سیدھے یہاں پہنچ گئے۔

''تم پہلا کام تو یہ کرو غنی کہ پک اپ میں سے تمام اسلحہ نکال کر کہیں چھپا دو۔''

''اسے گھر میں مت چھپانا۔'' ناصر نے کہا۔ ''ممکن ہے پولیس تمہارا بیان لینے کو ایک مرتبہ پھر یہاں پہنچے اور......''

''نواب بھائی!'' شامی نے کہا۔ ''اسلحے سے زیادہ خطرناک وہ لڑکی ہے جو اس وقت ہمارے قبضے میں ہے۔''

''ٹھیک کہتے ہو تم!'' میں نے کہا۔ پھر راجا سے بولا۔ ''کیا خیال ہے راجا، اس لڑکی کو ست بدھائی بھجوا دوں؟''

''ست بدھائی کیوں؟'' شامی نے پوچھا۔ ''کیا لاہور میں کوئی ٹھکانا نہیں ہے؟''

''ممکن ہے یہ ٹھکانا بھی دشمن کی نظروں میں آ گیا ہو؟'' میں نے کہا۔ ''اس موقعے پر میں کوئی خطرہ مول نہیں لے سکتا۔''

''ست بدھائی میں تو خطرہ اس سے بھی دوگنا ہے۔'' شامی نے کہا۔ ''پولیس اور ہمارے دشمن لڑکی کی تلاش میں سب سے پہلے ست بدھائی ہی کا رخ کریں گے اور وہاں کا رخ تو وہ کر بھی چکے ہیں۔''

''تو پھر کیا کروں؟'' میں نے کہا۔ ''کیا اس لڑکی کو یہیں رہنے دوں؟''

''میرے پاس لاہور میں اب بھی کئی محفوظ ٹھکانے ہیں۔'' شامی نے کہا۔ ''اگر مجھ پر اعتبار کرتے ہو نواب بھائی تو اس لڑکی کو میرے ساتھ بھیج دو۔ گولی چوبیس گھنٹے اس کے پاس رہے گی۔ آپ چاہیں تو اپنا بھی کوئی آدمی وہاں چھوڑ دیں۔''

''کیسی باتیں کرتے ہو شامی بادشاہ؟'' میں نے برا مان کر کہا۔ ''مجھے تم پر اعتبار نہیں ہو گا؟ تمہاری یہ بات سن کر بہت افسوس ہوا۔''

''میرا یہ مطلب نہیں تھا نواب بھائی!''

''شامی بادشاہ!'' راجا نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''باتوں میں وقت ضائع مت کرو۔ لڑکی کو لے کر ابھی نکل جاؤ۔ تمہارے اور گولی کے ہوتے ہوئے ہمیں کسی کی کیا ضرورت ہے۔''

''تم میری گاڑی لے جاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''احمد شاہ اور غنی لڑکی کو اس محفوظ مقام پر چھوڑ کر واپس آ جائیں گے۔'' پھر میں نے غنی سے کہا۔ ''پک اپ کا اسلحہ بھی میری گاڑی میں منتقل کر دو۔ وہ اسلحہ بھی شامی کے اسی ٹھکانے پر چھوڑ آنا۔''

غنی فوراً ہی گاڑی کی طرف چلا گیا۔ میں نے سوچا کہ میں ذرا ارم سے مل لوں۔ نہ جانے اس کا کیا حال تھا؟

میں نے نیلم کو بلایا اور اس سے پوچھا۔ ''نیلم! ارم کا اب کیا حال ہے؟''

''اس کا حال بہت برا ہے صاحب جی!'' نیلم نے کہا۔ ''وہ ڈھنگ سے کھاتی ہے نہ سوتی ہے۔ وہ تو کپڑے بھی نہیں بدلتی۔''

''چلو میرے ساتھ!'' میں نے کہا۔ ''میں ایک نظر اسے دیکھ لوں۔''

میں ارم کے کمرے میں داخل ہوا تو مجھے شدید دھچکا لگا۔ جب میں اسے یہاں لایا تھا تو وہ گلاب کی طرح تروتازہ تھی لیکن اس وقت بالکل مرجھائی ہوئی لگ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر زردی کھنڈی ہوئی تھی اور آنکھوں کے گرد حلقے تھے۔ وہ خلا میں نہ جانے کیا ڈھونڈ رہی تھی، ایک لمحے کو تو مجھے شدید شرمندگی محسوس ہوئی کہ میری وجہ سے پھول سی ایک بچی ان حالوں کو پہنچ گئی۔

میں نے آہستہ سے کہا۔ ''ارم!''

میری آواز پہ سر گھما کر اس نے مجھے دیکھا، پھر تیزی سے اٹھی اور مجھ سے لپٹ گئی۔ وہ بری طرح رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ ''انکل! آپ نے تو وعدہ کیا تھا کہ آپ مجھے گھر چھوڑ دیں گے۔ آپ تو خود ہی پتا نہیں کہاں چلے گئے تھے۔''

''فکر مت کرو بیٹا؟'' میں نے کہا۔ ''اب میں آ گیا ہوں نا! اب میں تمہیں گھر چھوڑ دوں گا۔ بس ایک دو دن کی بات اور ہے۔''

وہ بری طرح رونے لگی۔ ''انکل! خدا کے واسطے مجھ پہ رحم کریں۔ مجھے...... مجھے میرے گھر چھوڑ دیں...... مجھے...... گھر چھوڑ دیں انکل...... پلیز!'' اس نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

میرا ضمیر اس وقت مجھے شدید ملامت کر رہا تھا کہ اگر کسی نے نور کو اغوا کر لیا ہے تو اس میں ارم کا کیا قصور ہے؟ ہماری اس دشمنی اور چپقلش کی بھینٹ وہ معصوم کیوں چڑھ رہی ہے؟

میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ''ارم بیٹا! میں تو تمہیں ابھی چھوڑ دوں لیکن تمہارا باپ......''

''انکل، پلیز میری بات کرائیں ڈیڈی سے...... پلیز انکل! میں ان سے کہوں گی کہ اگر انہوں نے فوراً ہی آپ کی بات نہ مانی تو پھر میں کبھی ان کے پاس نہیں آؤں گی۔ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں انکل! پھر میں ہمیشہ کے لیے آپ کے پاس رہوں گی۔ باپ تو بیٹیوں کے لیے اپنی جان تک قربان کر دیتے ہیں۔ یہ کیسا باپ ہے جسے میری ذرہ برابر پروا نہیں ہے۔ یہ کیسا باپ اور کیسی ماں ہے جسے بالکل فکر ہی نہیں ہے کہ ان کی جوان بیٹی دوسروں کے قبضے میں ہے۔'' وہ اب ہسٹریائی انداز میں چیخ رہی تھی۔

''بیٹا! تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں پہنچی؟'' میں نے کہا۔

''یہ تو میں جانتی ہوں انکل!'' ارم نے کہا۔ ''ڈیڈی کو نہیں پتا کہ میں کیسے لوگوں کے درمیان ہوں۔ مجھے حیرت ہے کہ وہ چین سے سو کیسے جاتے ہیں؟''

''اچھا تم زیادہ ٹینشن مت لو۔'' میں نے کہا۔ ''اپنے آنسو پونچھ لو۔ میں ابھی تمہارے باپ سے بات کرتا ہوں۔'' پھر میں نیلم سے مخاطب ہوا۔ ''نیلم! ارم کو پانی پلاؤ اور ہمارے لیے کافی اور سینڈوچز وغیرہ لے کر آؤ۔ آج میں اپنی بیٹی کے ساتھ کافی پیوں گا۔''

"میرا کچھ بھی کھانے پینے کو دل نہیں چاہ رہا ہے انکل!" ارم نے کہا۔

"بیٹا! زندگی میں بہت سی باتیں نہ چاہتے ہوئے بھی کرنا پڑتی ہیں۔ پھر کھانا تو ایسی چیز ہے کہ زندہ رہنے کے لیے کھانا ہی پڑتا ہے۔" پھر میں نیلم سے مخاطب ہوا۔ "ایک کام کرو۔ کافی لانے سے پہلے ارم کو ذرا اچھے سے صاف ستھرے کپڑے پہنادو۔ میں ابھی آتا ہوں۔"

"انکل!" ارم نے کہا۔ "میں جانتی ہوں، آپ پھر کچھ دنوں کے لیے کہیں چلے جائیں گے۔ آپ پہلے بھی اسی طرح بتائے بغیر اچانک کہیں چلے گئے تھے۔"

"سوری بیٹا!" میں نے کہا۔ "اس وقت کچھ ایمرجنسی تھی۔ اب ایسا نہیں ہوگا۔ تم شاور لے کر جلدی سے کپڑے بدلو، پھر ہم ایک ساتھ کافی پییں گے۔"

یہ کہہ کر میں کمرے سے باہر آگیا۔

"گاڑی تیار ہے سر!" غنی نے کہا۔

"ابھی ارم واش روم میں ہے۔" میں نے کہا۔

"جلدی کر فیکے پتر!" راجا نے کہا۔ "اس وقت میری چھٹی حس کام کر رہی ہے۔ نہ جانے کیوں مجھے خطرہ محسوس ہو رہا ہے۔"

"غنی!" میں نے اس سے کہا۔ "نیلم سے کہو، ارم جوں ہی باتھ روم سے نکلے، اسے بے ہوش کردے۔"

"نیلم کیسے بے ہوش کرے گی فیکے پتر!" راجا نے کہا۔ "اس کے بے ہوش کرنے سے ارم کہیں مر ہی نہ جائے۔"

"پھر یہ کام تجھے کرنا پڑے گا راجا!" میں نے کہا۔

غنی وہاں سے جاچکا تھا۔ فوراً ہی اس نے آکر بتایا کہ ارم کپڑے بدل چکی ہے اور آپ کو بلا رہی ہے۔

"فیکے پتر! تو اسے بے ہوش کرکے گاڑی تک پہنچا دے۔ تو یہ کام بہت آسانی سے کرسکتا ہے۔"

میں ارم کے کمرے میں پہنچا تو وہ پہلے کے مقابلے میں نکھری نکھری لگ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ خوش ہوگئی۔

"ارم بیٹا!" میں نے کہا۔ "میں نے ابھی تمہارے باپ کو فون کیا تھا لیکن اس کا سیل فون بند ہے۔"

"آپ ایک مرتبہ پھر ٹرائی کریں انکل!" ارم نے کہا۔

"میں کئی دفعہ کوشش کرچکا ہوں بیٹا!" میں نے کہا۔ "تھوڑی دیر بعد پھر کوشش کرلوں گا۔" پھر میں نے اٹھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور کہا۔ "ارم بیٹا! اگر تمہیں کوئی تکلیف ہے تو مجھے بتاؤ۔" یہ کہتے ہوئے میں نے غیر محسوس طریقے پر اس کی دونوں کنپٹیاں دبادیں۔

دوسرے ہی لمحے وہ میرے بازوؤں میں جھول گئی۔

غنی نے ارم کو گاڑی میں منتقل کیا۔ پھر غنی ہشامی اور گولی ارم کو لے کر روانہ ہوگئے۔

میں نے احمد شاہ کو دوسری گاڑی میں ان کے پیچھے بھیج دیا تاکہ کوئی گڑبڑ ہو تو وہ غنی کو کور دے سکے۔

میں نے نیلم سے کہا۔ "ارم کے کمرے کی اچھی طرح صفائی کردو اور خود اس کمرے میں منتقل ہوجاؤ۔"

اس سے فارغ ہوکر میں نے سیل فون کی سم تبدیل کی اور آفتاب خان کا نمبر ملالیا۔

آفتاب خان نے دوسری ہی گھنٹی پر فون ریسیو کرلیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "ہیلو!"

"آفتاب خان! میری دی ہوئی مہلت ختم ہوچکی ہے۔ تم کیا چاہتے ہو کہ تمہاری بیٹی کی انگلیاں تمہیں ارسال کردوں؟" میرا لہجہ سرد اور سفاک تھا۔

"میں تو تم سے رحم کی بھیک بھی نہیں مانگ سکتا۔" اس نے گلوگیر لہجے میں کہا۔ "جب تک تمہیں نور نہیں ملے گی، تم کوئی بات بھی سننے پر آمادہ نہیں ہوگے اور نور اب میری پہنچ سے بھی دور ہے...... اس لیے...... اس لیے...... میں...... تم سے بھی درخواست کرسکتا ہوں کہ...... میری بیٹی کو...... اذیت دے کر مارنے کے بجائے...... ایک ہی دفعہ میں مار دینا...... میں...... تم سے رحم کی...... بھیک نہیں مانگ رہا ہوں...... اگر میری بیٹی کی جان لینے سے...... تمہاری پرابلم حل ہوجائے تو...... ضرور اس...... کی جان لو...... بس...... تم سے ایک ہی درخواست ہے کہ......"

وہ مسلسل ایک ہی جملہ دہرا رہا تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اس کی بات کا کیا جواب دوں؟ میں نے نہ صرف سلسلہ منقطع کیا بلکہ سیل فون بھی آف کردیا۔

"کیا کہہ رہا تھا آفتاب خان؟" راجا نے پوچھا۔

"وہ تو اپنی بیٹی کی زندگی سے پوری طرح مایوس ہوچکا ہے۔" میں نے کہا۔ "رو رو کر مجھ سے درخواست کر رہا تھا کہ اس کی بیٹی کو اذیت دے کر نہ ماروں، بس ایک بار میں ختم کردوں تاکہ اس معصوم کو تکلیف نہ ہو۔"

"اوہ!" راجا نے کہا۔ "اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ واقعی مجبور ہے اور نور کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔"

"ایک کام ہوسکتا ہے۔" راجا نے کہا۔ "ہم آفتاب

خان کو اپنے ساتھ ملاسکتے ہیں۔"

"آفتاب خان کو؟" میں نے پوچھا۔ پھر آہستہ سے بولا۔ "ہاں، ہم اسے اپنے ساتھ تو ملاسکتے ہیں لیکن اس پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا۔"

"میں اس پر اعتبار کرنے کی بات نہیں کر رہا ہوں۔" ناصر نے کہا۔ "میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ اس کی ہمدردیاں حاصل کرلوں۔ اپنی بیٹی کی وجہ سے وہ بالکل ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا ہے۔"

"ہاں، لیکن اسے نور کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔"

"نور کے بارے میں نہیں تو وہ دلاور کے بارے میں، اس کے ٹھکانوں کے بارے میں ضرور جانتا ہوگا۔"

میں نے سیل فون کی سم دوبارہ تبدیل کی اور اس میں وہ سم لگادی جو عموماً میرے استعمال میں رہتی تھی۔

"ایک بات اور!" میں نے کہا۔ "ارم! اب اپنے باپ سے بھی برگشتہ ہوگئی ہے۔ وہ ابھی مجھ سے کہہ رہی تھی کہ میں اب اپنے گھر نہیں جاؤں گی۔ وہ......"

میرے سیل فون کی بیل بجی تو جملہ ادھورا رہ گیا۔ میں نے سیل فون کے اسکرین پر نظر ڈالی۔ اس پر کوئی اجنبی نمبر تھا۔ میں نے سیل فون دوبارہ میز پر ڈال دیا۔

کچھ وقفے کے بعد پھر اس کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس دفعہ بھی وہی نمبر تھا۔ دو تین گھنٹیاں بجنے کے بعد میں نے کال ریسیو کرلی۔ "ہیلو!"

"نواب صاحب!" دوسری طرف سے کوئی بولا۔

"بول رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"میں اکبر...... بول رہا ہوں...... اکبر سندھو!"

"اکبر سندھو!" میں نے دہرایا، پھر مجھے یاد آگیا کہ اکبر سندھو کون ہے۔ میں نے جلدی سے کہا۔ "ہاں اکبر بولو، کوئی خاص بات؟"

"نواب صاحب! میں نے معلوم کرلیا ہے کہ دلاور اس وقت کہاں ہے۔"

"وہ اس وقت کہاں ہے؟" میں نے مضطرب ہوکر پوچھا۔

"وہ اس وقت گلبرگ کے ایک بنگلے میں موجود ہے۔ آپ پتا لکھیں۔" پھر اس نے گلبرگ کے اس بنگلے کا پتا لکھوایا اور بولا۔ "نواب صاحب! میں اس وقت چاروں طرف سے خطرات میں گھرا ہوا ہوں۔ دلاور کے آدمی میری تاک میں ہیں۔ اگر زندگی رہی تو پھر ملاقات ہوگی۔"

"تم اس وقت کہاں ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں اس وقت محسن آباد کے ایک فلیٹ میں موجود ہوں لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ دلاور کو میرے اس ٹھکانے کا علم ہوگیا ہے اور اس کے آدمی فلیٹ کے باہر موجود ہیں۔"

"تم مجھے اپنا پتا لکھواؤ۔" میں نے کہا۔ "میں ابھی تمہیں وہاں سے نکال لوں گا۔"

"نواب صاحب!" اکبر آہستہ سے بولا۔ "ہم جیسے لوگوں کو موت اسی طرح آتی ہے، آپ مجھے بچالیں گے لیکن......"

"وقت ضائع مت کرو اکبر!" میں نے کہا۔ "مجھے اپنا ایڈریس بتاؤ، تم جیسا آدمی بھی ایسی مایوسی کی باتیں کر رہا ہے؟"

"اس لیے کہ دلاور میرے دو قریبی ساتھیوں کو ہلاک کرچکا ہے۔ اب وہ مجھے بھی نہیں چھوڑے گا۔"

میں نے جھنجلا کر کہا۔ "دلاور نہ ہوا، موت کا فرشتہ ہوگیا۔ جب تک تمہاری زندگی ہے اکبر، دلاور تو کیا دنیا کی سپر پاور بھی اگر تمہاری جان لینا چاہے تو نہیں لے سکتی۔ اپنا ایڈریس بتاؤ۔"

اکبر نے محسن آباد کا پتا بتایا جو میرے اشارے پر راجا نے لکھ لیا۔

"کون تھا؟" راجا نے پوچھا۔

"یار اکبر سندھو تھا۔ وہی اکبر سندھو جو......"

"ہاں ہاں، مجھے یاد آگیا۔" راجا نے کہا۔ "وہ دلاور کے بارے میں کیا کہہ رہا تھا؟"

"اس نے گلبرگ کے ایک بنگلے کا پتا لکھوایا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ دلاور اس پتے پر موجود ہے۔"

"سر! یہ کوئی چال بھی ہوسکتی ہے۔" ناصر نے کہا۔

"ہاں، میں اس پہلو پر بھی غور کرچکا ہوں۔" میں نے کہا۔ "یہ دلاور کی چال بھی ہوسکتی ہے۔" پھر میں چند لمحے سوچنے کے بعد بولا۔ "میں وہاں خود نہیں جاؤں گا۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں۔" ناصر نے کہا۔ "کہ آپ وہاں خود نہ جائیں، وہاں میں جاؤں گا۔"

"تم تنہا مت جانا۔" میں نے کہا۔ "غنی کو ساتھ لے جانا۔"

"غنی تو آپ کا ٹریڈ مارک ہوگیا ہے سر!" ناصر ہنس کر بولا۔ "آپ کے دشمن بھی اسے اچھی طرح پہچاننے لگے ہیں،

میں احمد شاہ کو ساتھ لے جاؤں گا۔"
"ٹھیک ہے، تم احمد شاہ کے ساتھ چلے جانا۔" پھر میں چونک کر بولا۔ "یار! ہم اکبر کو بھی تو وہاں بھیج سکتے ہیں۔"
"اکبر وہاں کیوں جائے گا؟" راجا نے منہ بنا کر کہا۔ "ابھی تو خود ہی کہہ رہا تھا کہ وہ دلاور کو موت کا فرشتہ سمجھتا ہے۔"
"اسے ایک دفعہ اس فلیٹ سے نکلنے تو دو۔" میں نے کہا۔
احمد شاہ اور غنی ارم کو دوسرے ٹھکانے پر چھوڑ کر واپس آ چکے تھے۔
"یار، میرا خیال ہے کہ پہلے آفتاب خان سے ملاقات کی جائے۔" میں نے اچانک کہا۔ "میں ارم کو اب زیادہ دیر تک قید نہیں رکھ سکتا۔"
"تو جذباتی ہو کر سوچ رہا ہے ٹیکے پتر!" راجا نے کہا۔
"ہم میں سے کوئی بھی نہیں چاہتا کہ کسی لڑکی کو اغوا کر کے قید میں رکھا جائے لیکن یہ ہمارا پیشہ نہیں بلکہ مجبوری ہے۔ اگر ہم نے اس موقعے پر ارم کو چھوڑ دیا تو دلاور یہی سمجھے گا کہ ہم نے اس کے خوف سے ارم کو آزاد کر دیا۔"
"اس کی دی ہوئی مہلت تو کب کی تمام ہو چکی ہے۔" میں نے کہا۔ "پھر میں آفتاب خان سے کہہ سکتا ہوں کہ ابھی ارم کے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتائے۔"
"ہاں، یہ ہو سکتا ہے۔" ناصر نے پرخیال انداز میں کہا۔ "آفتاب خان اس وقت ذہنی طور پر بہت منتشر ہوگا، دلاور سے بھی اسے کسی مدد کی توقع نہیں ہے۔ مسکین شاہ کو وہ پہلے ہی اپنا مخالف ثابت کر چکا ہے۔ اب ہمارا ساتھ دینا اس کی بھی مجبوری ہے۔"
"تو پھر میں آفتاب خان سے بات کرتا ہوں۔" میں نے کہا اور سیل فون نکال کر اس کے نمبر ملانے لگا۔
دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی لیکن آفتاب خان نے کال ریسیو نہیں کی، میں جھنجلا کر لائن کاٹنے ہی والا تھا کہ اس نے کال ریسیو کر لی۔ "ہیلو!"
"کیا اب تم دن دہاڑے نشہ کرنے لگے ہو آفتاب خان؟" میں نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔
"اچھا، تم ہو۔" آفتاب خان نے طویل سانس لی۔
"تم کسی دوسرے نمبر سے کال کر رہے ہو؟"
مجھے اچانک اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں نے اسے اپنے نمبر سے کال کر دی تھی۔
"نمبر سے کیا فرق پڑتا ہے آفتاب خان!" میں نے کہا۔
"کیا تم نے ارم کو مار دیا؟" اس نے شکستہ لہجے میں پوچھا۔
"میں اسے اب تک مار چکا ہوتا لیکن...... وہ بہت معصوم ہے، تم اگر اب بھی زبان کھول دو تو میں اسے رہا کر سکتا ہوں۔"
"میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ مجھے نور کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔" آفتاب خان نے کہا۔
"دلاور کو تو معلوم ہوگا۔" میں نے کہا۔
"ہاں، اسے معلوم ہے لیکن وہ مجھے کیوں بتائے گا؟"
"تم نے ان لوگوں کے لیے کیا کچھ نہیں کیا ہے؟" میں نے کہا۔ "اب تم پر برا وقت آیا تو یہ تمہارا ساتھ چھوڑ گئے۔"
"یہ تو دنیا کا دستور ہے۔" آفتاب خان کا لہجہ تلخ تھا۔
"دلاور نے مجھے جھوٹی تسلی دی تھی کہ میں نے ارم کے بارے میں معلوم کر لیا ہے، اگر اس نے ارم کو نہ چھوڑا تو میں خود اسے جا کر لے آؤں گا۔ اب وہ بس آئیں بائیں شائیں کر رہا ہے۔ میرا فون تک ریسیو نہیں کرتا۔"
"آفتاب خان!" میں نے اچانک کہا۔ "تم مجھ سے مل سکتے ہو؟"
"تم سے؟" آفتاب خان نے حیرت سے دہرایا۔ "کہاں؟"
"تم جمال خان شیروانی کے بنگلے پر پہنچ جاؤ، میں تمہیں وہیں ملوں گا۔"
"مجھے ان کا ایڈریس بتا دو۔" آفتاب خان نے کہا۔ "میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔"
میں نے اسے جمال خان شیروانی کا پتا بتایا اور اس سے کہا۔ "ایک گھنٹے بعد میں تمہیں وہیں ملوں گا۔ ان کے بنگلے پر پولیس کا پہرا ہے لیکن تم ڈیوٹی انسپکٹر سے صرف یہ کہنا کہ مجھے شیروانی صاحب سے ملنا ہے، وہ تمہیں اندر پہنچا دے گا۔ ہاں، وہاں مسلح ہو کر مت آنا ورنہ پولیس کو فضول میں شبہ ہوگا۔"
"ٹھیک ہے، میں وہاں پہنچتا ہوں۔"
میں نے سلسلہ منقطع کر دیا اور راجا سے کہا۔ "میں شیروانی صاحب کے بنگلے پر جا رہا ہوں۔"
"وہ تو ہم نے سن ہی لیا ہے۔" راجا نے کہا۔ "لیکن ٹیکے پتر! ذرا یہ بھی بتا دے کہ اب تیرا پلان کیا ہے؟"
"پلان بتایا تو ہے۔" میں نے کہا۔ "میں آفتاب خان

سے کہوں گا کہ وہ ارم کو لے جائے لیکن ابھی اس کا تذکرہ دلاور یا کسی اور سے نہ کرے۔"

"اور وہ تیری بات مان لے گا؟" راجا نے کہا۔

"ضرور مانے گا۔" ناصر نے کہا۔ "دلاور نے اس کے ساتھ کون سا اچھا سلوک کیا ہے، پھر اسے یہ بھی بتا دیا جائے گا کہ دلاور، رانا زوہیب کا خاص آدمی ہے اور رانا زوہیب، مسکین شاہ کا دوست ہے۔ دوست کیا، وہ اس وقت الیکشن جیتنے کے لیے مسکین شاہ کے اشاروں پر ناچ رہا ہے، ممکن ہے یہی دلاور اور زوہیب، آفتاب خان ہی کو کوئی نقصان نہ پہنچا ئیں۔"

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "تم لوگ گھر ہی میں رہنا۔" میں نے کہا۔ "گھر میں نہ بھی رہو تو کم سے کم اپنے سیل فون آن رکھنا۔" یہ کہہ کر میں برآمدے سے اتر کر پورچ میں آ گیا۔

غنی اور احمد شاہ لان میں پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ دونوں جلدی سے کھڑے ہو گئے۔

"غنی!" میں نے کہا۔ "تم اور احمد شاہ میرے ساتھ چل رہے ہو۔"

غنی نے فوراً میرے لیے گاڑی کی عقبی نشست کا دروازہ کھولا۔ پھر اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور احمد شاہ اس کے ساتھ پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ان دونوں سے یہ پوچھنا فضول تھا کہ وہ دونوں مسلح ہیں یا نہیں۔

"شیروانی صاحب کے بنگلے پر چلو۔" میں نے کہا۔

"یس سر!" غنی نے کہا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

☆☆☆

میں نے کافی کی پیالی خالی کر کے رکھی ہی تھی کہ جمال خان شیروانی کے ایک ملازم نے آ کر بتایا۔ "سر! باہر کوئی آفتاب خان ہے، وہ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"

"اسے اندر بھیج دو۔" جمال خان شیروانی نے کہا، پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "نواب صاحب! میرے خیال میں یہاں میری موجودگی غیر ضروری ہے، آپ اطمینان سے بات کریں، میں دوسرے کمرے میں جا رہا ہوں۔" یہ کہہ کر شیروانی وہاں سے چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد آفتاب خان نے جھجکتے ہوئے کمرے میں قدم رکھا۔ وہ بھی جانتا تھا کہ جمال خان شیروانی بہت سخت گیر افسر ہے۔

"آؤ آفتاب خان!" میں نے اٹھ کر اس کا استقبال کیا۔

اس کی حالت ابتر تھی، چہرے پر عجیب سی ویرانی تھی، وزن بھی خاصا کم ہو گیا تھا۔

"بیٹھو!" میں نے نرم لہجے میں کہا۔ وہ خاموشی سے بیٹھ گیا۔ "کیا پیو گے؟ چائے، کافی یا پھر کولڈ ڈرنک؟" میں نے پوچھا۔

"میرا مذاق مت اڑائیں نواب صاحب!" آفتاب خان نے کہا۔

"میں تمہارا مذاق کیوں اڑاؤں گا؟" میں نے کہا۔ اس سے پہلے کہ میں کسی ملازم کو طلب کرتا، شیروانی کا ایک ملازم چائے کی ٹرالی دھکیلتا ہوا کمرے میں داخل ہوا، ٹرالی میں کافی کے علاوہ اور بھی بہت کچھ تھا لیکن میرے اصرار پر آفتاب خان نے صرف کافی لینے پر اکتفا کیا۔

"آفتاب خان!" میں نے کافی کا گھونٹ لے کر کہا۔ "اگر میں ارم کو تمہارے حوالے کر دوں تو مجھے کیا دو گے؟"

"میں آپ کو کیا دے سکتا ہوں۔" آفتاب خان کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔

"تم مجھے دلاور کے ٹھکانوں کے بارے میں بتا سکتے ہو، رانا زوہیب کے بارے میں بتا سکتے ہو اور......"

"میں دلاور کے بارے میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ وہ آج کل گلبرگ کے بنگلے میں مقیم ہے۔"

"یہ اطلاع تمہیں کہاں سے ملی؟" میں نے پوچھا۔

"میں ابھی اتنا بے دست و پا نہیں ہوا ہوں۔" آفتاب خان نے کہا۔ "میرا ایک آدمی یہ ساری اطلاعات لاتا ہے۔"

"تم اپنے اس آدمی سے یہ بھی تو کہہ سکتے ہو کہ وہ دلاور کی نقل و حرکت پر نظر رکھے اور دلاور جہاں بھی جائے، تمہیں اطلاع مل جائے۔ تم اپنے اس آدمی کو بھاری انعام کا لالچ دے سکتے ہو۔"

"لیکن اس سے آپ کو کیا فائدہ ہوگا؟"

"تم نے سوال کی ترتیب بدل دی، یہ پوچھو کہ اس سے تمہیں کیا فائدہ ہوگا؟"

"چلیے یوں ہی سہی۔"

"تمہیں ایک فائدہ تو یہ ہوگا کہ تمہاری بیٹی فوری طور پر گھر پہنچ جائے گی۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ مسکین شاہ کا کانٹا ہمیشہ کے لیے نکل جائے گا۔"

"ہمیشہ کے لیے؟" آفتاب خان حیران ہو کر بولا۔

"ہاں، ہمیشہ کے لیے۔" میں نے کہا۔ "اور تم خود بھی اپنی سیکیورٹی کا دھیان رکھو، مجھے تو اس بات پر حیرت ہے کہ

اب تک مسکین شاہ نے تمہارے خلاف کوئی کارروائی کیوں نہیں کی؟"

"اصل میں در پردہ ہم دونوں میں صلاح ہو چکی ہے۔" آفتاب خان نے آہستہ سے کہا۔ "جب قدوائی کو بھی شاہ جی کے دشمنوں نے راستے سے ہٹا دیا تو شاہ جی کو فکر پیدا ہوئی، ان کے کئی خاص آدمی یا تو ہلاک ہو چکے ہیں یا پھر غائب ہو گئے ہیں۔"

"خیر، یہ تمہارا مسئلہ ہے۔" میں نے کہا۔ "اگر صلح ہو بھی چکی ہے تو ابھی یہ خبر میڈیا میں نہیں آنی چاہیے ورنہ شاہ جی کے ساتھ ساتھ تم بھی حالات کی چکی میں پس جاؤ گے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "تم صرف یہ کرو کہ مجھے دلاور کی نقل و حرکت سے باخبر رکھو۔"

"جب تک دلاور لاہور میں ہے، مجھے معلوم ہوتا رہے گا کہ وہ کہاں ہے اور کس سے مل رہا ہے۔ ہاں اگر وہ لاہور چھوڑ کر کراچی یا بیرون ملک چلا گیا تو پھر اس کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھنا مشکل ہو جائے گا۔"

"تم اکبر سندھو کو جانتے ہو؟" میں نے اچانک پوچھا۔

آفتاب خان چونک اٹھا اور بولا۔ "آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"اکبر سندھو کبھی کبھی میرے لیے کام کرتا رہتا ہے...... آفتاب خان!" میں نے اسے مخاطب کیا۔ "ایک گھنٹے بعد ارم گھر پہنچ جائے گی۔"

آفتاب خان دیوانہ وار اٹھ کر مجھ سے لپٹ گیا، پھر اس نے جھک کر میرے پیر پکڑنے کی کوشش کی۔

"یہ کیا کر رہے ہو بھئی!" میں نے کہا۔

"میں نے آپ کے بارے میں بہت غلط اندازہ لگایا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ...... کہ......"

"کیا سوچا تھا تم نے؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے سوچا تھا کہ...... آپ...... ارم کو...... بے آبرو کر چکے ہوں گے اور...... وہ کبھی مجھے زندہ...... نہیں ملے گی۔" یہ کہہ کر وہ اپنے چہرے پر تھپڑ مارنے لگا۔ "لیکن میں بھی کیسا بدبخت ہوں۔ آپ کے بارے میں کتنا غلط سوچ رہا تھا۔"

"اب میری ایک بات اور دھیان سے سنو۔" میں نے کہا۔ "ابھی کچھ دن تک کسی کو بھی معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ ارم واپس گھر پہنچ چکی ہے۔"

"نہیں معلوم ہوگا۔" آفتاب خان نے کہا۔ "کسی کو بھی معلوم نہیں ہوگا۔ میں اسے اپنی بہن کے پاس کراچی بھیج دوں گا اور اسے بھی سختی سے ہدایت کر دوں گا کہ وہ کراچی میں بھی جا کر یہ نہ بتائے کہ وہ میری بیٹی ہے جب تک آپ کہیں گے میں اسے کراچی میں رکھوں گا۔" پھر وہ ندامت بھرے انداز میں بولا۔ "کاش!...... کاش میں...... نور کو اسی وقت آپ تک پہنچا دیتا جب اسے میرے پاس لایا گیا تھا۔"

"ان باتوں کو چھوڑو آفتاب خان!" میں نے کہا۔ "اب تم وہی کرو جو میں کہہ رہا ہوں۔" یہ کہہ کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "ارم ایک گھنٹے بعد گھر پہنچ جائے گی۔" یہ کہہ کر میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

آفتاب خان، نے مضبوطی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھر وہ نپے تلے قدم رکھتا ہوا باہر نکل گیا۔

یہ آفتاب خان اس پژمردہ اور زندگی سے بیزار آفتاب خان سے بالکل مختلف تھا جو ابھی کچھ دیر پہلے آیا تھا، رخصت ہوتے وقت اس کے چہرے پر تازگی بھی تھی اور آنکھوں میں جینے کی امنگ بھی۔

آفتاب خان کے جانے کے بعد جمال خان شیروانی ڈرائنگ روم میں آ گیا۔

"آپ کی ملاقات خاطر خواہ رہی نواب صاحب؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں، فی الحال یہی لگ رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "اصل میں آفتاب خان جیسے لوگ ناقابلِ اعتبار ہوتے ہیں لیکن کبھی کبھی ان پر بھروسا کرنے میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔"

"نواب صاحب!" شیروانی نے آہستہ سے کہا۔ "وہ...... ویڈیو...... آپ کے پاس موجود ہے؟"

"آپ کو اب تک اس بات کا یقین نہیں آیا ہے؟" میں نے کہا۔ "اگر آپ بضد ہیں تو وہ ویڈیو میں آپ کو دکھا دوں گا لیکن میں پھر کہوں گا کہ آپ نہ دیکھیں تو اچھا ہے۔"

"تم مجھے اتنی ویڈیو تو دکھا سکتے ہو جتنی میں دیکھ سکوں؟"

"ہاں، اس ویڈیو کا ابتدائی حصہ آپ دیکھ سکتے ہیں۔ آپ کہیں تو میں کل ہی وہ ویڈیو یہاں لے آؤں؟"

"برا مت مانیے گا نواب صاحب!" جمال خان شیروانی نے کہا۔ "آپ بھی سوچ رہے ہیں کہ کیسا بے اعتبار آدمی ہے۔ میری بات کا یقین ہی نہیں کر رہا ہے...... لیکن......"

"میں سمجھتا ہوں شیروانی صاحب!" میں نے کہا۔ "اگر آپ کی جگہ میں ہوتا تو مجھے بھی اس وقت تک یقین نہ آتا جب

تک وہ ویڈیو میں اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیتا۔ میں کل کسی وقت وہ ویڈیو لے آؤں گا۔" پھر میں چونک کر بولا۔ "ثمرہ کہاں ہے؟ پولیس نے دوبارہ تو آپ کو تنگ نہیں کیا؟"

"نواب صاحب!" جمال خان شیروانی نے کہا۔ "پولیس ہمیں تنگ نہیں کرسکتی، میں نے سرے سے ثمرہ کے اغوا کی رپورٹ ہی درج نہیں کرائی تو پولیس ثمرہ کو پریشان کیسے کرتی؟"

"اور وہ جو میرے آدمیوں کے ہاتھوں کچھ لوگ مارے گئے ہیں؟"

"کون سے لوگ؟" جمال خان شیروانی مسکرایا۔ "جب وہاں کوئی لاش ہی نہیں ہے تو کیسا قتل؟" پھر وہ چونک کر بولے۔ "اگر آپ ثمرہ سے ملنا چاہتے ہیں تو میں اسے یہاں بلواؤں؟"

"نہیں، بس آپ اس سے اتنا کہہ دیں کہ وہ کچھ دن تک بہت محتاط رہے اور بغیر سیکیورٹی کے گھر سے نہ نکلے!" پھر میں اٹھ کھڑا ہوا۔ "اب مجھے اجازت دیجیے۔ کل کسی وقت میں ویڈیو لے کر حاضر ہوجاؤں گا۔" میں نے جمال خان شیروانی سے ہاتھ ملایا اور روانہ ہوگیا۔ غنی اور احمد شاہ دونوں پورچ میں گاڑی کے پاس کھڑے تھے۔ مجھے دیکھ کر مستعد ہوگئے۔

میں نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ "شامی کی طرف چلو۔"

غنی نے چونک کر مجھے دیکھا لیکن بولا کچھ نہیں۔

میں اطمینان سے عقبی نشست پر نیم دراز ہوگیا اور آنکھیں موندلیں۔

پھر غنی کی آواز پر میں چونکا۔ شاید مجھے نیند آگئی تھی۔

"سر! ہم شامی کے گھر پہنچ چکے ہیں۔"

میں نے گاڑی سے اتر کر ارد گرد کا جائزہ لیا۔ وہ کوئی محل نما کوٹھی تھی۔

اچانک دو آدمی نہ جانے کہاں سے نمودار ہوئے اور بولے۔ "آپ کو شامی صاحب سے ملنا ہے؟"

"ہاں، مجھے شامی سے ملنا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"آیئے میرے ساتھ۔" ان میں سے ایک بولا اور ایک طرف روانہ ہوگیا۔

ہم لوگ اس کے پیچھے پیچھے تھے۔ دوسرا آدمی وہیں رہ گیا تھا۔

احمد شاہ نے بہت دھیمے لہجے میں غنی سے کہا۔ "ابھی تھوڑی دیر پہلے جب ہم یہاں سے گئے تھے تو یہاں کوئی سیکیورٹی نہیں تھی، یہ اچانک سیکیورٹی گارڈز کہاں سے آگئے؟"

"یہ تو شامی بادشاہ ہی سے معلوم ہوگا۔" میں نے کہا۔ "ویسے یہاں تو ارم کیا، ہوائی جہاز بھی چھپایا جاسکتا تھا۔"

شامی کو شاید پہلے ہی ہماری آمد کی اطلاع مل چکی تھی۔ وہ ہمارے استقبال کے لیے برآمدے میں نکل آیا تھا۔

"نواب بھائی! خیریت تو ہے؟"

"ہاں شامی بادشاہ! سب خیریت ہے۔" میں نے کہا۔ "میں اس لڑکی کو لینے آیا ہوں۔"

"لڑکی کو لینے آئے ہو؟" شامی نے حیرت سے کہا۔ "کیا مجھ پہ بھروسا نہیں ہے یا......"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے شامی!" میں نے کہا۔ "اصل میں لڑکی کے باپ سے ایک معاہدہ ہوگیا ہے۔ میں اسے واپس چھوڑنا چاہتا ہوں۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے نواب بھائی!" شامی نے کہا۔ "کیا نور کا سراغ مل گیا ہے؟"

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "لیکن اب ارم کو مزید اپنے پاس رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔"

"آپ نے یہ فیصلہ کیا ہے تو کچھ سوچ سمجھ کر ہی کیا ہوگا۔" شامی نے کہا، پھر چونک کر بولا۔ "آپ باہر کیوں کھڑے ہیں، اندر آیئے نا!"

"شامی بادشاہ!" میں نے مسکرا کر کہا۔ "یہ ٹھکانا تو بہت زبردست ہے۔ یہاں ایک کیا، بیس لڑکیاں بھی چھپائی جائیں تو کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو، یہ کوٹھی کس کی ہے؟"

"یہ کوٹھی تو اصل میں ابوظہبی کے ایک شیخ کی ہے۔" شامی نے کہا۔ "لیکن یہاں کا سپروائزر میرا خاص آدمی ہے، میں نے دو چار دفعہ شیخ کے لیے بھی کام کیا ہے اس لیے میں ضرورت پڑنے پر اس کوٹھی کو استعمال کرلیتا ہوں۔ شیخ صاحب تو یہاں سال میں ایک آدھ بار ہی آتے ہیں۔"

کوٹھی کے اندر بہت سے کمرے تھے، ان میں سے دو کمرے شامی نے اپنے لیے مخصوص کرلیے تھے۔

"ارم کا کیا حال ہے؟" میں نے کمرے میں داخل ہوکر گولی سے پوچھا۔

"وہ بے چاری تو جب سے یہاں آئی ہے مسلسل رو رہی ہے۔ کہہ رہی تھی کہ انکل نے ایک بار پھر مجھے دھوکا دے دیا!"

"میں اس کو لینے آیا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم لوگ بھی چلنے کی تیاری کرو۔ میں ارم سے بات کرلوں۔"

ارم بیڈ پر گھٹنوں میں منہ دیے بیٹھی تھی۔ باہر کچھ خنکی تھی لیکن کمرے میں ہیٹر چل رہا تھا۔

"ارم!" میں نے نرم لہجے میں کہا۔

اس نے جھٹکے سے سر اٹھا کر مجھے دیکھا، پھر روتے ہوئے بولی۔ "انکل! آپ نے پھر مجھے چیٹ (Cheet) کیا، آپ تو کہہ رہے تھے کہ......"

"میں تمہیں لینے ہی آیا ہوں بیٹا!" میں نے کہا۔ "اب جلدی سے ہاتھ منہ دھو کر تیار ہوجاؤ۔ کیا اسی طرح اپنے ڈیڈی کے پاس جاؤ گی؟"

وہ خوشی کے مارے ایک دفعہ پھر رونے لگی۔

"اب کیوں رو رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے یقین نہیں آرہا ہے۔" وہ آنسو پونچھ کر بولی۔

"جلدی کرو بیٹا! تمہیں یقین تو اس وقت آئے گا جب میں تمہیں تمہارے گھر پہنچاؤں گا۔"

"مجھے کیا کرنا ہے؟" وہ اپنا جائزہ لے کر بولی۔ "کپڑے تو میں نے آج ہی بدلے ہیں، ہاں منہ ہاتھ دھو کر بال بنالیتی ہوں۔"

وہ دس منٹ کے اندر اندر تیار ہوگئی۔ اس وقت تو لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ وہی ارم ہے جو بات بات پر آنسو بہانے لگتی تھی۔

وہ تیار ہوکر بولی۔ "چلیے۔"

میں اسے لے کر باہر نکلا تو وہ بولی۔ "انکل! وہ نیلو باجی کہاں ہیں؟"

"نیلو باجی؟" میں نے حیرت سے دہرایا۔

"آپ نیلو باجی کو نہیں جانتے۔ وہ بے چاری تو میرا بہت خیال رکھتی تھیں۔"

مجھے خیال آیا کہ وہ نیلم کو نیلو کہہ رہی ہے۔ "نیلو باجی یہاں نہیں ہیں۔ ہم تمہیں دوسری جگہ لے آئے تھے نا!"

"لیکن وہ آنٹی تو یہاں بھی موجود ہیں۔"

اسی وقت گولی اور شامی بھی کمرے سے نکل آئے۔ میں نے شامی سے کہا۔ "اگر کوئی چادر ہے تو وہ ارم کو اوڑھا دو۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی اسے پہچان کر ہمارے پیچھے لگ جائے۔"

گولی نے اپنی بڑی سی گرم شال اتار کر ارم کے سر پر ڈال دی۔

"اسے اچھی طرح اپنے جسم اور چہرے پر لپیٹ لو۔" میں نے کہا۔

ارم نے وہ شال اپنے جسم اور چہرے پر اس طرح لپیٹی کہ مجھے اس کا چہرہ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

گاڑی میں جگہ کم تھی اس لیے شامی نے کہا کہ وہ اور گولی دوسری گاڑی میں گھر آجائیں گے۔

ڈرائیونگ سیٹ پر حسبِ معمول غنی تھا، اس کے ساتھ احمد شاہ بیٹھا ہوا تھا۔ ارم میرے ساتھ عقبی نشست پر تھی۔ میں وہاں آتے وقت سو گیا تھا اس لیے مجھے خود بھی معلوم نہیں تھا کہ شیخ کا وہ محل لاہور کے کس علاقے میں ہے، جب غنی مین روڈ پر آیا تو مجھے معلوم ہوا کہ ہم لوگ اس وقت ڈیفنس کے علاقے میں ہیں۔

آدھے گھنٹے کے اندر اندر غنی نے ہمیں آفتاب خان کے گھر پہنچا دیا۔

غنی نے گیٹ کے پاس پہنچ کر ہارن دیا تو ملازم کے بجائے آفتاب خان خود باہر نکلا۔ ہمیں دیکھ کر اس نے چوکیدار کو گیٹ کھولنے کا اشارہ کیا۔

ارم حیرت اور خوشی سے اپنے گھر کو دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ گاڑی سے اتری اور دیوانہ وار آفتاب خان سے لپٹ گئی۔ پھر وہ دونوں باپ بیٹی اس بری طرح روئے کہ میرے ہاتھ پیر پھول گئے۔ میں نے کہا۔ "آفتاب خان! بس اب خاموش ہوجاؤ۔ دیکھو، کوئی ملازم دیکھ لے گا تو......"

"سوری نواب صاحب!" آفتاب خان نے کہا۔ "اتنے عرصے بعد بیٹی ملی ہے نا! میں اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ پایا۔"

"اب کسی کو معلوم نہ ہو کہ ارم تمہارے پاس واپس آچکی ہے۔"

"ہرگز معلوم نہیں ہوگا۔"

"بس اب میں چلوں گا۔" میں نے کہا۔

"ایسے کیسے جاسکتے ہیں آپ؟" آفتاب خان نے کہا۔ "اندر آکر ایک کپ کافی تو پی لیں۔"

"کافی پھر کسی وقت سہی۔" میں نے کہا۔

"انکل پلیز!" ارم نے کہا۔ "اتنے دن تک آپ نے اور نیلو باجی نے مجھے کھلایا پلایا ہے۔ آپ کم از کم ایک کپ کافی ہی پی لیں۔"

"ارم بیٹا! میں تمہارے گھر کافی بھی پیوں گا اور کھانا بھی کھاؤں گا لیکن اس وقت نہیں، اس وقت تو......"

"انکل پلیز!" ارم نے کہا۔

اس کے لہجے میں ایسی خوشامد تھی کہ پھر مجھ سے انکار نہ ہوسکا۔

''چلو۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن میں صرف کافی پیوں گا۔''

''نواب صاحب!'' آفتاب خان نے کہا۔ ''اپنے ڈرائیور کو بھی بلالیں۔''

''وہ میرا ڈرائیور نہیں بلکہ چیف سیکیورٹی آفیسر ہے۔'' میں نے کہا۔ ''وہ باہر رہ کر ہی میری حفاظت کرتا ہے۔''

ہم لوگ اندر داخل ہوئے تو کوئی ملازم نہیں تھا۔ شاید آفتاب خان نے تمام ملازمین کو چھٹی دے دی تھی۔ صرف ایک چوکیدار تھا۔ وہ بھی بنگلے کے گیٹ تک محدود تھا۔

ڈرائنگ روم میں بھی کوئی نہیں تھا۔

''آفتاب خان!'' میں نے کہا۔ ''تمہاری بیگم بھی نظر نہیں آرہی ہیں۔''

''میری بیگم اور چھوٹی بیٹی پنڈی چلی گئی ہیں۔ پنڈی میں میرے دونوں سالے رہتے ہیں۔ میرے ایک سالے کی طبیعت کچھ خراب ہے۔ میری بیگم تو جانے کے موڈ میں نہیں تھی لیکن میں نے اسے زبردستی پنڈی بھیج دیا۔ وہ اچانک ارم کو دیکھتی تو مارے خوشی کے پاگل ہوجاتی، اگر آپ ارم کی آمد خفیہ رکھنے کی ہدایت نہ دیتے تو میں اپنی بیگم کو کبھی پنڈی نہ بھیجتا۔'' پھر وہ ارم سے بولا۔ ''ارم بیٹا! اس وقت گھر میں کوئی ملازم ہے نہ تمہاری مما! تم نے انکل کو کافی کے لیے روک تو لیا ہے، اب......''

''انکل کے لیے میں کافی بناؤں گی ڈیڈی۔'' ارم چہک کر بولی۔

وہ دس منٹ کے اندر اندر کافی بنالائی۔ اس کے ساتھ کچھ بسکٹ اور سینڈوچز بھی تھے۔ میں نے جلدی جلدی کافی پی اور آفتاب خان کو ایک دفعہ پھر ہدایت کی کہ ہوسکے تو ارم کو آج ہی کراچی بھجوا دے پھر میں نے آفتاب خان سے ہاتھ ملایا، ارم کے سر پر ہاتھ پھیرا اور باہر نکل آیا۔

ہم واپس آ ہی رہے تھے کہ میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اسکرین پر کوئی اجنبی نمبر تھا۔ میں نے بٹن دبا کر سیل فون کان سے لگالیا۔ ''ہیلو!''

''ہیلو صاحب جی!'' دوسری طرف سے نیلم کی آواز آئی۔ ''میں نیلم بول رہی ہوں۔'' اس کی آواز میں گھبراہٹ تھی۔

میں نے جلدی سے کہا۔ ''ہاں نیلم! خیریت؟''

''خیریت نہیں ہے صاحب جی!'' اس نے کہا۔ ''آپ کے جانے کے بعد راجا صاحب اور ناصر صاحب بھی کہیں چلے گئے۔ اچانک گھر میں کچھ لوگ گھس آئے۔ مالی نے انہیں روکا تو انہوں نے ریوالور نکال لیے اور مالی پر فائر کردیا۔ اس نے بھی اپنا ریوالور نکالا اور ان لوگوں پر فائر کردیا۔ پھر وہ مالی کو مارنے کے بعد اندر کی طرف بڑھے۔ میں خطرہ بھانپ کر تیزی کے ساتھ چھت پر چڑھ گئی اور وہاں سے ایک درخت کے ذریعے پڑوسیوں کی چھت پر اتر گئی۔ میں اس وقت پڑوسیوں کے گھر سے آپ کو فون کررہی ہوں۔''

''جو لوگ گھر میں گھسے تھے، وہ اس وقت کہاں ہیں؟'' میں نے مضطرب ہوکر پوچھا۔

''وہ اس وقت بھی گھر میں موجود ہیں۔'' نیلم نے کہا۔

''اچھا، میں پہنچ رہا ہوں۔'' میں نے کہا اور سلسلہ منقطع کردیا۔ پھر میں نے غنی سے کہا۔ ''غنی! فوراً گھر پہنچو۔ گھر میں کچھ لوگ گھس آئے ہیں۔''

غنی نے گاڑی کو جیٹ فائٹر کی طرح دوڑانا شروع کر دیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب میں نے اسے تیز رفتاری سے نہیں روکا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح اڑ کر گھر پہنچ جاؤں۔ مجھے اپنے اس گارڈ کی فکر تھی جو حملہ آوروں کی فائرنگ سے زخمی ہوگیا تھا، پتا نہیں وہ بے چارہ زندہ بھی تھا یا نہیں۔ اس سے زیادہ فکر مجھے ان ویڈیو فلموں اور کاغذات کی تھی جو میں نے بہت مشکل سے حاصل کیے تھے۔ وہ سب چیزیں الماری کے سیف میں بند تھیں لیکن الماری اور سیف کا تالا توڑنا ان لوگوں کے لیے مشکل نہیں تھا۔

میں نے جھنجلا کر غنی سے کہا۔ ''تم گاڑی تیز نہیں چلا سکتے؟''

''سر! میں انتہائی تیز رفتاری سے چل رہا ہوں۔'' غنی نے جواب دیا۔

''میں نے دیکھا، واقعی گاڑی بندوق سے نکلی ہوئی گولی کی طرح دوڑ رہی تھی۔

اچانک غنی نے آگے جانے والے ایک موٹر سائیکل سوار کو بچانے کے لیے بہت خطرناک انداز میں گاڑی کو دائیں جانب بالکل رانگ سائڈ پر کردیا پھر سامنے سے آنے والی بس سے بچنے کے لیے وہ دوبارہ انتہائی خطرناک انداز میں اپنی لین میں واپس آیا اور گاڑی کو انتہائی مہارت سے بائیں جانب موڑ دیا۔

اس سڑک پر آگے جاکر ہماری کوٹھی تھی۔ گویا غنی نے

منٹوں کا فاصلہ سیکنڈوں میں طے کرلیا تھا۔

میں نے احمد شاہ کو دیکھا، وہ اپنے ہتھیار ایک مرتبہ پھر چیک کررہا تھا۔

غنی نے گاڑی کو کوٹھی سے کچھ فاصلے پر روک دیا اور ہم لوگ گاڑی سے اتر کر تیزی سے اپنی کوٹھی کی طرف بڑھے۔

اچانک نیلم میرے سامنے آگئی۔ وہ بنگلے کے باہر ہی کہیں کھڑی ہوئی تھی۔

''وہ لوگ ابھی اندر ہی ہیں صاحب جی!'' نیلم نے اطلاع دی۔

میں نے سکون کا سانس لیا اور نیلم سے کہا۔ ''تم شامی کو بھی سیل فون پر اطلاع دے دو۔ وہ بے خبری میں سیدھا گھر میں گھس جائے گا۔''

''میرے پاس ان کا سیل نمبر نہیں ہے۔'' نیلم نے کہا۔ ''نمبر تو آپ کا بھی نہیں تھا لیکن آپ کا نمبر تو مجھے زبانی یاد ہے اس لیے......''

''اچھا، تم یہیں ٹھہرو، شامی بھی بس آنے ہی والا ہوگا۔'' یہ کہہ کر میں نے غنی اور احمد شاہ کو اندر چلنے کا اشارہ کیا۔

غنی اور احمد شاہ اس وقت چیتے کی طرح چوکنا نظر آرہے تھے۔ وہ مین گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی زمین پر گر گئے اور سینے کے بل آگے کی طرف کھسکنے لگے۔ میں بھی ان کے ساتھ ساتھ تھا۔

برآمدے میں پہنچ کر مجھے کسی شخص کا جسم نظر آیا۔ اس کا چہرہ ایک ستون کی آڑ میں تھا لیکن وہ غیر فطری انداز میں پڑا ہوا تھا۔ میں کچھ اور آگے بڑھا تو اس شخص کو دیکھ کر مجھے دھچکا سا لگا۔ وہ میرا گارڈ تھا جو مالی کے روپ میں رہتا تھا۔ میں نے اس کی نبض ٹٹول کر دیکھی، وہ بالکل ساکت تھی۔ اس کے گرد اچھا خاصا خون پھیلا ہوا تھا جو اب جم کر سیاہی مائل ہوتا جارہا تھا۔

میں نے آہستگی سے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ وہ حق نمک ادا کرگیا تھا۔

اس وقت اندر سے دو آدمی باہر نکلے۔ ان کے ایک ہاتھ میں بریف کیس اور دوسرے ہاتھ میں ریوالور تھے۔ غنی نے اچانک ایک آدمی کے ریوالور والے ہاتھ پر فائر کیا۔ احمد شاہ نے دوسرے آدمی کی پیشانی کو نشانہ بنایا اور اس کی پیشانی کے عین وسط میں سوراخ ہوگیا۔ ہم لوگ تیزی سے ایک ستون کی آڑ میں چھپ گئے۔ فائرنگ کے دھماکوں سے دوسرے لوگ بھی باہر کی طرف دوڑ پڑے تھے لیکن آنے والے دروازے کے پاس آکر رک گئے۔ وہ بھی خاصے گھاگ اور منجھے ہوئے لوگ تھے، اندھا دھند باہر نہیں آنا چاہتے تھے۔ اچانک احمد شاہ نے پھر فائر کیا اور ایک انسانی چیخ گونج کر رہ گئی۔ میں اس کے نشانے پر اش اش کر اٹھا۔ دروازہ بہت معمولی سا کھلا ہوا تھا۔ اس معمولی کھلے ہوئے دروازے سے کسی کو نشانہ بنانا احمد شاہ جیسے ماہر ہی کا کام تھا۔

''تم لوگ ہر طرف سے گھر چکے ہو۔'' غنی نے کہا۔ ''اس لیے ہتھیار پھینک کر باہر آجاؤ ورنہ تم میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچے گا۔'' یہ کہتے ہی اس نے اپنی جگہ تبدیل کرلی۔

اس کے ساتھ ہی اندر سے ایک فائر ہوا اور گولی اس ستون پر پڑی جس کے پیچھے غنی چھپا ہوا تھا۔

جواب میں احمد شاہ نے بھی فائر کیا اور پھر ایک انسانی چیخ گونج کر رہ گئی۔

پھر فوراً ہی اندر سے ایک ریوالور باہر آکر گرا اور ایک شخص دونوں ہاتھ اٹھائے ہوئے باہر آگیا۔

غنی نے جھپٹ کر اس کی تلاشی لی۔ اس کی جیب میں نقدی اور سیل فون کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں تھا۔

غنی اسے کھینچ کر کمرے سے دور لے گیا اور درشت لہجے میں بولا۔ ''اندر اور کتنے آدمی ہیں؟''

''اندر دو آدمی اور ہیں۔ وہ دونوں آپ کی فائرنگ سے زخمی ہوگئے ہیں۔''

غنی نے ریوالور کا دستہ اچانک اس کے سر پر رسید کر دیا۔ وہ فوراً ہی ناک آؤٹ ہوگیا۔

احمد شاہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بہت محتاط انداز میں اندر کی طرف بڑھا۔ میں نے بھی اندر جانا چاہا لیکن غنی نے مجھے روک دیا اور بولا۔ ''سر! آپ باہر ہی ٹھہریں اور یہاں رہ کر ہمیں کور دیں۔'' یہ کہہ کر وہ کمرے میں داخل ہوگیا۔

تھوڑی دیر بعد غنی اور احمد شاہ باہر نکلے تو ان کے ساتھ دو زخمی آدمی بھی تھے۔ ایک آدمی کا شانہ بری طرح ادھڑ گیا تھا اور دوسرے کے سینے میں دائیں جانب گولی لگی تھی۔ ان دونوں کا خون فرش پر ٹپک رہا تھا۔

سب سے پہلے باہر نکلنے والوں کے ہاتھ میں دو بریف کیس تھے۔ وہ میرے ہی بریف کیس تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر وہ دونوں بریف کیس اٹھا لیے جن میں ویڈیو فلمیں اور کاغذات تھے۔ گویا میں عین وقت پر وہاں پہنچ گیا تھا ورنہ وہ دونوں مردود میری ساری محنت پر پانی پھیر دیتے۔

''کون ہو تم لوگ؟'' میں نے ڈپٹ کر پوچھا۔

"مجھے اسپتال پہنچا دو۔" ان میں سے ایک کراہ کر بولا۔ "شاید میں مر رہا ہوں۔"

"اگر تم سب کچھ سچ سچ بتا دو تو میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔" میں نے کہا۔ "ابھی اور اسی وقت تمہیں اسپتال لے جاؤں گا۔"

"پوچھو، کیا پوچھتے ہو؟" دوسرے آدمی نے نحیف آواز میں کہا۔

"تمہیں کس نے بھیجا ہے یہاں؟" میں نے پوچھا۔

"ہمیں امیر علی لایا تھا۔" ان میں سے ایک آدمی بولا۔

"امیر علی کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں ہوں امیر علی!" دوسرا آدمی کراہ کر بولا۔

"تمہیں یہاں کس نے بھیجا تھا؟" میں نے امیر علی سے پوچھا۔

"مجھے یہاں شاہ جی نے بھیجا تھا۔" امیر علی نے کراہتے ہوئے کہا۔

"کیوں بھیجا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"انہوں نے کہا تھا...... کہ ...... تو......ا......ب ......کے......" وہ خاموش ہو کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

"غنی! اسے پانی پلاؤ۔" میں نے کہا۔

غنی نے جلدی سے پانی کا جگ اٹھایا اور گلاس میں پانی نکال کر اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

امیر علی نے ایک آدھ گھونٹ پیا، باقی اس کے منہ سے باہر آ گیا۔ وہ زندگی کی قید سے رہائی پا چکا تھا۔

میں دوسرے آدمی کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ ابھی ہوش میں تھا اور اس کی حالت اتنی ابتر نہیں تھی۔ "تم کون ہو اور یہاں کیوں آئے تھے؟"

"میں آپ کو بتا تو چکا ہوں کہ مجھے امیر علی یہاں لایا تھا۔"

"کیوں لایا تھا؟" میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔ "یہاں کوئی دعوت تو تھی نہیں۔"

"اس نے مجھ سے کہا تھا کہ ماڈل ٹاؤن میں ایک واردات کرنا ہے۔"

"تم وارداتیں کرتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں تو چھوٹی موٹی چوری کی وارداتیں کرتا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔ "تم کس کے لیے کام کرتے ہو؟"

"میں...... میں کس کے لیے کام کروں گا۔ اپنے ہی لیے کرتا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے، تم بھی مرنا چاہتے ہو تو یہی سہی۔ تین آدمی پہلے ہی مر چکے ہیں، چوتھے تم سہی۔"

"آپ میری بات کا یقین کریں، میں......"

"غنی!" میں نے چیخ کر کہا۔ "اسے ایک گولی اور مارو اور اس کی لاش بھی ان لاشوں کے ساتھ ڈال دو۔" میں نے دوسری لاشوں کی طرف اشارہ کیا۔

وہ بوکھلا کر بولا۔ "آپ...... میری بات کا یقین کریں، مجھے امیر علی یہاں لایا تھا۔"

"امیر علی کس کے لیے کام کرتا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"میں نہیں جانتا۔" اس نے کہا۔

"غنی! پولیس کو فون کرو۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

پولیس کا نام سن کر اس کے چہرے پر سکون سا پھیل گیا۔

"لیکن اس سے پہلے اسے بھی ٹھکانے لگا کر وہاں ڈال دو۔" میں نے دوسری لاشوں کی طرف اشارہ کیا۔

غنی بھی جانتا تھا کہ میں اس شخص کو ڈرانے کے لیے یہ کہہ رہا ہوں۔

اس شخص کے چہرے پر ایک مرتبہ پھر زردی کھنڈ گئی۔ اس نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ "میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ میں مر جاؤں گا تو وہ بے آسرا ہو جائیں گے۔ مجھے معاف کر دیں۔"

"یہ بات تو تم اس وقت سوچتے جب تم یہاں واردات کرنے آئے تھے۔" میں نے کہا۔ "تم تو وارداتیں کرتے رہتے ہو، اتنا بھی نہیں جانتے کہ بعض اوقات کسی واردات میں انسان کے ساتھ بھی واردات ہو جاتی ہے۔"

اسی وقت شامی اور گولی گھبرائے ہوئے اندر داخل ہوئے اور اندر کا منظر دیکھ کر شامی بوکھلا کر بولا۔ "نواب بھائی! خیریت تو ہے، آپ تو ٹھیک ہیں نا؟"

"ہاں شامی بادشاہ!" میں نے کہا۔ "ابھی میری زندگی کے کچھ دن باقی ہیں اس لیے نیلم نے مجھے بروقت مطلع کر دیا ورنہ میں ان حرام زادوں کے ہاتھوں مارا جاتا۔" پھر میں احمد شاہ سے مخاطب ہوا۔ "احمد شاہ! یہ دونوں بریف کیس اٹھا کر الماری میں رکھ دو اور پولیس کو فون کرو۔"

احمد شاہ نے اپنا سیل فون نکالا ہی تھا کہ اس آدمی کو ہوش آ گیا جسے غنی نے ریوالور کا دستہ مار کے بے ہوش کیا تھا۔ وہ چند

لمحے تک پڑا پلکیں جھپکاتا رہا، پھر جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور گھبرائے ہوئے انداز میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

"فکر مت کرو۔" میں نے کہا۔ "ابھی تم زندہ ہو لیکن تھوڑی دیر بعد مرنے والے ہو۔"

وہ گھبرا کر اچانک کھڑا ہو گیا۔ احمد شاہ نے آگے بڑھ کر ریوالور اس کی کنپٹی پر رکھ دیا اور بولا۔ "اپنی جگہ سے حرکت کی کوشش مت کرنا۔"

"تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میرا نام غوث بخش ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "لوگ مجھے غوسو کہتے ہیں۔"

"یہاں کیوں آئے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"یہاں مجھے امیر علی لایا تھا۔"

"تمہیں بھی امیر علی لایا تھا؟" میں نے پوچھا۔ "کیوں لایا تھا؟"

"اس نے کہا تھا کہ یہاں واردات کریں گے تو اچھا خاصا مال ملے گا۔ میں نے کہا بھی تھا کہ......"

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا کیونکہ پولیس وین کے سائرن کی آواز سے میں خود بھی چونک اٹھا تھا۔

شاید کسی پڑوسی نے پولیس کو اطلاع دے دی ہو گی کہ یہاں فائرنگ ہو رہی ہے۔ پولیس نے روایتی سستی اور کاہلی کا مظاہرہ کیا تھا۔ پولیس والے شور مچاتے، چیختے چنگھاڑتے اندر داخل ہوئے۔ "خبردار...... کوئی اپنی جگہ سے نہیں ہلے گا۔"

میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "آپ لوگ اگر کچھ دیر پہلے آ جاتے تو شاید ایک آدھ آدمی کی زندگی بچ جاتی۔"

"وہاٹ ڈو یو مین؟" پولیس پارٹی کی قیادت کرنے والے سب انسپکٹر نے تلخ لہجے میں کہا۔

"پولیس کو آدھا گھنٹا پہلے فون کیا گیا تھا۔ آپ لوگ اب تشریف لا رہے ہیں۔ کیا ڈاکوؤں اور چوروں کو موقع دیتے تھے کہ وہ اپنا کام کر لیں تو آپ لوگ جائے واردات پر پہنچیں؟" میں نے بھی رواں انگریزی میں جواب دیا۔

میری انگریزی اور لب و لہجے سے انسپکٹر مرعوب ہو گیا اور بولا۔ "ہماری بھی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں جناب، تھانے کی ایک ہی موبائل ہے اور وہ اس وقت موجود نہیں تھی۔ نفری بھی کم ہے۔"

"اور موبائل کے بغیر تو تھانے سے باہر نکلنا تم لوگ اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہو؟" میں نے طنزیہ کہا۔

انسپکٹر نے اچانک پوچھا۔ "آپ کی تعریف جناب!"

اسے شاید ماتحتوں کے سامنے اپنی تذلیل کا احساس ہوا تھا اسی لیے وہ سنبھل کر ایک مرتبہ پھر روایتی پولیس افسر بننے کی کوشش کر رہا تھا۔

"نواب رفیق احمد شیرازی آف ست بدھائی کے سامنے کھڑے ہو تم!" غنی نے کہا۔ "ذرا ادب سے بات کرو۔"

"ست بدھائی! یہ کہاں ہے؟"

"اس ریاست کا محل وقوع تمہیں تمہارے آئی جی صاحب ہی بتائیں گے۔" میں نے درشت لہجے میں کہا، پھر غنی سے بولا۔ "آئی جی صاحب سے بات کراؤ۔"

"ایک منٹ سرکار!" انسپکٹر کا لہجہ ایک دم بدل گیا۔ "آپ لوگ پہلے واردات کی رپورٹ تو لکھوا دو۔"

"میں اس وقت گھر میں موجود نہیں تھا۔" میں نے کہا۔ "یہ لوگ چوری کی نیت سے میرے گھر میں گھس آئے اور میرے چوکیدار کو قتل کر دیا۔" پھر میں نے اسے تفصیل سے بتایا کہ وہ لوگ کیسے میرے چیف سیکیورٹی افسر کے ہاتھوں مارے گئے۔

"آپ کے پاس ریوالور کا لائسنس تو ہو گا؟" انسپکٹر نے غنی سے پوچھا۔

"میرا چیف سیکیورٹی افسر ہے تو لائسنس بھی ضرور ہو گا۔" میں نے درشت لہجے میں کہا۔

انسپکٹر نے جیب سے سیل فون نکال کر دو تین فون کیے، پھر برآمدے میں آ کر لاشوں کا جائزہ لینے لگا۔

"آپ کے چوکیدار کے پاس بھی ریوالور تھا؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں چوکیدار کے پاس بھی ریوالور تھا......... اور لائسنس بھی!" میں نے جھنجلا کر کہا۔

اس نے باری باری میرا، احمد شاہ، غنی اور نیلم کا بیان لیا اور بولا۔ "نواب صاحب! یہ لوگ آئے کیوں تھے؟ آپ نے آج یا کل بینک سے کوئی بڑی رقم تو نہیں نکالی؟"

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "اور یہ سوال تو آپ ان ہی لوگوں سے کریں تو بہتر ہے۔"

"مردوں سے؟" انسپکٹر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"آپ کے سامنے تو مردے بھی بولنے لگتے ہیں۔" میں نے بھی طنزیہ لہجے میں کہا۔ "آپ لوگ دعویٰ تو یہی کرتے ہیں، غور سے دیکھیں، ان میں سبھی مردے نہیں ہیں۔"

اس وقت پولیس ڈیپارٹمنٹ کے دوسرے لوگ بھی

آ گئے۔ وہ لاشوں کی تصویریں لینے لگے، جگہ جگہ سے فنگر پرنٹ اٹھانے لگے۔

میں نے اشارے سے احمد شاہ کو بلایا اور آہستہ سے کہا۔ "احمد شاہ! وہ دونوں بریف کیس کسی طرح اس کمرے سے نکال کر کہیں اور منتقل کر دو، پولیس ابھی میرا بیڈروم اور ڈرائنگ روم سیل کر دے گی۔"

"میں نے نیلم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا سر!" احمد شاہ نے کہا۔ "میں جانتا تھا کہ ابھی یہاں پولیس آ جائے گی، پھر آپ کا کمرا اور ڈرائنگ روم وغیرہ سیل کر دے گی۔ پولیس کے آنے سے پہلے ہی نیلم تمام ضروری کاغذات، بریف کیس وغیرہ وہاں سے لے گئی تھی۔"

"ویری گڈ!" میں نے کہا۔

فرش پر چاک سے نشان لگانے کے بعد پولیس نے لاشیں وہاں سے اٹھالیں اور زخمی کو حراست میں لے کر اسپتال بھجوا دیا۔ جو آدمی صحیح سلامت تھا، پولیس نے اسے بھی حراست میں لے لیا۔

پھر انسپکٹر نے میرا کمرا سیل کر دیا کیونکہ ان لوگوں نے میرے ہی کمرے کا سامان الٹ پلٹ کیا تھا اور وہیں وہ دونوں آدمی زخمی بھی ہوئے تھے۔ وہاں فرش پر ابھی تک ان کا خون پڑا ہوا تھا جو اب جم کر سیاہ ہو چکا تھا۔

"نواب صاحب!" انسپکٹر نے روانگی سے پہلے کہا۔ "آپ بھی اطلاع دیے بغیر لاہور مت چھوڑیے گا۔"

"انسپکٹر صاحب!" میں نے ترش انداز میں کہا۔ "میں آپ کو ابھی اطلاع دے رہا ہوں کہ میں کل، پرسوں کسی بھی وقت ست بدھائی جا سکتا ہوں۔ یہ میرا کارڈ رکھ لیں۔ اس میں میرے ست بدھائی کے ٹیلی فون نمبرز بھی ہیں اور ایڈریس بھی!"

"چلیں ٹھیک ہے، پھر آپ کے یہ دونوں آدمی......"

"یہ دونوں میرے باڈی گارڈز ہیں۔" میں نے جھنجلا کر کہا۔ "یہ بھی میرے ساتھ ہی جائیں گے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ میں لاہور سے کہیں بھی گیا، آپ کو انفارم ضرور کروں گا۔"

انسپکٹر باہر نکل ہی رہا تھا کہ راجا اور ناصر لوٹ آئے۔ گھر کے باہر پولیس وین دیکھ کر وہ دونوں پہلے ہی پریشان ہو گئے ہوں گے، گھر میں پولیس دیکھ کر تو راجا ایک دم چیخ کر بولا۔ "فیکے...... فیکے پتر! تو ٹھیک تو ہے نا!" اس نے گلوگیر لہجے میں کہا اور بے اختیار مجھ سے لپٹ گیا۔

"میں ٹھیک ہوں راجا!" میں نے اس کی پشت تھپکتے ہوئے کہا۔ "بالکل ٹھیک ہوں۔" پھر میں نے اسے مختصراً اس واردات کے بارے میں بتایا۔

انسپکٹر شاید راجا اور ناصر دونوں کو جانتا تھا۔ اس کا لہجہ پھر بدل گیا۔ "نواب صاحب! میں بس اتنی درخواست کروں گا کہ آپ کہیں بھی جانے سے پہلے مجھے انفارم ضرور کیجیے گا۔"

نیلم نے میرے لیے دوسرا کمرا تیار کر دیا تھا۔ وہ میرے بیڈروم سے جوتے، کپڑے اور شیونگ کا سامان تک نکال کر لے گئی تھی۔ پولیس کی اس کارروائی نے مجھے ذہنی طور پر تھکا دیا تھا، میں نے نیلم سے کافی لانے کو کہا اور خود ان چیزوں کا جائزہ لینے لگا جو وہ لوگ لے کر جا رہے تھے۔ بریف کیس میں سب سے اوپر وہ ڈی وی ڈی تھی جس میں میری ویڈیو بنائی گئی تھی۔

"فیکے پتر! تو ان کاغذات کی فوٹو کاپیاں بنا کر یہ تمام چیزیں بینک کے لاکر میں رکھ دے یا پھر انہیں ست بدھائی لے جا!" راجا نے کہا۔

"ہاں، آپ کل صبح ہی ان چیزوں کو ست بدھائی پہنچا دیں۔" ناصر نے تائید کی۔

"صبح نہیں بلکہ ابھی!" میں نے کہا۔ "یہ کوٹھی اب مسکین شاہ کی نظروں میں آ گئی ہے، یہاں تو سب کچھ غیر محفوظ ہے، کیا عجب کہ وہ پولیس ہی کو یہاں کی تلاشی کا وارنٹ دے کر بھیج دے۔" پھر میں شامی سے مخاطب ہوا۔ "شامی بادشاہ! تم ابھی ست بدھائی چلے جاؤ، گولی اور راجا بھی تمہارے ساتھ جائیں گے۔ ان چیزوں کو حفاظت سے ست بدھائی پہنچا دو۔"

"ابھی ست بدھائی جانے کی کیا ضرورت ہے نواب بھائی؟" شامی نے کہا۔ "میں یہ تمام چیزیں اسی شیخ کے محل میں لے جاتا ہوں اور وہیں رہ کر ان کی حفاظت کروں گا۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "تم لوگ ابھی نکل جاؤ۔" میں نے غنی سے کہا کہ شامی کو کسی گاڑی کی چابی دے دو۔

شامی اور گولی کے جانے کے بعد نیلم کافی لے آئی۔

"یہ کافی کا کون سا وقت ہے فیکے پتر؟" راجا نے کہا۔ "میری تو بھوک کے مارے حالت خراب ہے اور تجھے کافی کی سوجھ رہی ہے۔"

"آپ کو بھوک لگ رہی ہے تو کھانا بھی تیار ہے۔" نیلم نے کہا۔

"تم لوگ کھانا کھا لو۔" میں نے کہا۔ "میرا تو بالکل موڈ نہیں ہے۔"

☆☆☆

دوسرے دن ناشتے کی میز پر ناصر نے کہا۔ "سر! آپ آج مسکین شاہ سے مل لیں۔ میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔ آپ کچھ کاغذات کی فوٹو کاپیاں اور آڈیو کیسٹس کی دو تین کاپیاں اپنے ساتھ لے چلیں۔"

"مسکین شاہ تو میرا نام سنتے ہی بدک جائے گا اور ملاقات سے انکار کر دے گا۔"

"انکار تو نہیں کرے گا، ہاں ٹال مٹول سے کام ضرور لے گا کہ میں اس وقت میٹنگ میں ہوں یا اس وقت بہت بزی ہوں یا کوئی بھی بہانہ بنا سکتا ہے۔ میں اس سے ملاقات کا وقت لیتا ہوں اور کہتا ہوں کہ مجھے اپنے اخبار کے لیے آپ کا انٹرویو کرنا ہے، میں اپنے فوٹو گرافر کے ساتھ آنا چاہتا ہوں۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "اخبار اور ٹی وی چینل کے انٹرویو میں ایسی کشش ہے کہ بڑے سے بڑا سیاست دان بھی اس کے لیے وقت نکال لیتا ہے، خاص طور پر اس وقت جب الیکشن نزدیک ہوں۔" اس نے جیب سے اپنا سیل فون نکالا اور کسی کا نمبر ملا کر بولا۔ "یار، ذرا مجھے مسکین شاہ کا سیل نمبر بھیج دو۔ ہاں، شاہ جی کا۔" اس نے کہا۔ "وہ نمبر بھیجنا جس پر اس سے بات ہو جائے۔" اس نے سلسلہ منقطع کر دیا اور مجھ سے بولا۔ "میرے پاس مسکین شاہ کا سیل نمبر ہے لیکن وہ نمبر یا تو مصروف ہوتا ہے یا آف ہوتا ہے۔ ابھی میں نے جس سے نمبر مانگا ہے، وہ مسکین شاہ کا خاص آدمی ہے۔"

تھوڑی دیر بعد ناصر کو مسکین شاہ کا سیل نمبر موصول ہو گیا۔

اس نے وہی نمبر ملا لیا، پھر کچھ دیر بعد بولا۔ "السلام علیکم!...... میں ناصر بول رہا ہوں شاہ جی...... ناصر خان!...... جی ہاں، آپ نے ٹھیک پہچانا، میں جرنلسٹ ہوں...... نہیں شاہ جی...... میں اپنے اخبار کے لیے آپ کا ایک زبردست انٹرویو کرنا چاہتا ہوں...... شاہ جی...... ایک ہفتے بعد تو بہت دیر ہو جائے گی...... جی ہاں...... میں آج آ سکتا ہوں...... ابھی...... شاہ جی ابھی مجھے فوٹو گرافر کو بھی...... اچھا ٹھیک ہے، میں آ رہا ہوں۔" اس نے اچانک سلسلہ منقطع کر کے مسکین شاہ کو زیرلب گالی دی اور بولا۔ "وہ انٹرویو کے لیے ابھی بلا رہا ہے۔"

"تو پھر چلو۔" میں نے کہا۔

"قبلہ نواب صاحب!" راجا نے کہا۔ "کیا آپ کی عقل گھاس چرنے کہیں دور نکل گئی ہے؟"

"کیوں مہاراجا! آپ ایسا کیوں فرما رہے ہیں؟"

"اس لیے کہ تو ایک ریاست کا مالک ہے فیکے پتر! اور الیکشن میں ایک امیدوار بھی ہے۔ تو مسکین شاہ سے یہ بات کرتا ہوا اچھا لگے گا؟ یہ کام تو ہم صحافیوں کا ہے، ہمارے ہی لیے رہنے دے۔"

"اس کے لیے اتنی لمبی چوڑی بکواس کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" میں نے منہ بنا کر کہا۔ "سیدھی طرح کہہ دیتا کہ وہاں مت جاؤ۔"

"میرے دل میں بھی یہی خیال آیا تھا۔" ناصر نے کہا۔ "لیکن میں نے اس خیال سے آپ کو منع نہیں کیا کہ آپ بہرحال مجھ سے زیادہ عقل مند ہیں۔"

"خاک عقل مند ہیں۔" راجا نے کہا، پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "ناصر کے ساتھ میں جا رہا ہوں۔"

"وہاں مسلح ہو کر مت جانا۔" میں نے کہا۔ "اور غنی کو ڈرائیور کی حیثیت سے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ مسکین شاہ بہت ہی خبیث آدمی ہے لیکن وہ اپنے گھر پر کسی قسم کی کوئی گڑبڑ نہیں کرے گا۔"

راجا اور ناصر وہ اسٹف لے کر روانہ ہو گئے۔

میں نے آفتاب خان کا نمبر ملا لیا۔ اس نے دوسری ہی گھنٹی پر کال ریسیو کر لی۔ "ہیلو، کیسے ہیں نواب صاحب؟"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے کہا۔ "دلاور کی کوئی خیر خبر؟"

"دلاور ابھی مسکین شاہ سے ملاقات کے لیے نکلا ہے۔" آفتاب خان نے کہا۔

"دلاور...... مسکین شاہ!" میں نے زیرلب دہرایا۔ "مسکین شاہ کا دلاور سے براہ راست کیا تعلق ہے؟"

"ممکن ہے رانا زوہیب کے ذریعے ان دونوں کی ملاقات ہوئی ہو۔" آفتاب خان نے کہا۔ "دلاور، مسکین شاہ کے مطلب کا آدمی ہے، شاید وہ اپنے طور پر بھی دلاور سے کوئی کام لینا چاہ رہا ہو گا۔"

"اطلاع کنفرم ہے کہ دلاور، مسکین شاہ ہی سے ملاقات کے لیے نکلا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ اطلاع دو سو فیصد کنفرم ہے۔" آفتاب خان نے کہا۔

"ٹھیک ہے، میں کچھ دیر بعد تمہیں فون کرتا ہوں۔" میں نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے فوری طور پر راجا کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے راجا کی جھنجلائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''فیکے پتر! ابھی تو ہم پہنچے بھی نہیں ہیں۔ تجھے ابھی سے فکر پڑ گئی۔''

''تم لوگوں کے لیے ایک اہم اطلاع ہے۔'' میں نے کہا۔ ''ابھی ابھی دلاور بھی مسکین شاہ سے ملاقات کے لیے نکلا ہے۔''

''دلاور؟'' راجا نے کہا۔ ''کیا یہ اطلاع کنفرم ہے؟''

''ہاں، ابھی تک تو کنفرم ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''تم لوگوں کے پاس تو کوئی ہتھیار ہوگا نہیں۔ میں غنی سے بات کرتا ہوں۔''

''فیکے پتر! تجھ پر ہر وقت ہتھیاروں کا بھوت کیوں سوار رہتا ہے، لگتا ہے تجھ میں سلطان راہی کی روح حلول کر گئی ہے۔''

''مہاراجا!'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''جن لوگوں سے ہمارا سامنا ہے، وہ ہتھیاروں ہی کی زبان سمجھتے ہیں، کیا سمجھا؟''

''سمجھ گیا۔'' راجا نے کہا۔ ''ابھی تو غنی ڈرائیونگ کر رہا ہے، وہ بعد میں خود تجھے کال کر لے گا۔''

میں نے سلسلہ منقطع کر دیا اور شامی بادشاہ کا نمبر ملا لیا۔

''کیسے ہو نواب بھائی؟'' شامی نے پوچھا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں، تم یہ بتاؤ شامی کہ تم دلاور کو پہچانتے ہو؟''

''میں تو نہیں پہچانتا لیکن ایسے لوگ ہیں جو دلاور کو پہچانتے ہیں۔'' شامی نے کہا۔

''تم ان میں سے کسی ایک آدمی کو لے کر ابھی یہاں آ سکتے ہو؟''

''میں آ جاؤں گا لیکن خیریت تو ہے نواب بھائی؟''

''مجھے اطلاع ملی ہے کہ دلاور، مسکین شاہ سے ملنے جا رہا ہے۔''

''میں ابھی پہنچتا ہوں۔'' شامی نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں غنی کا نمبر ملا ہی رہا تھا کہ میرے سیل فون کی گھنٹی بج اٹھی، اسکرین پر غنی کا نام تھا۔

''ہیلو!'' میں نے سیل فون کان سے لگا کر کہا۔

''جی سر!'' غنی نے جواب دیا۔

''غنی، تم دلاور کو پہچانتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''پہچانتا نہیں ہوں لیکن جب وہ یہاں آئے گا تو خود ہی معلوم ہو جائے گا۔''

''وہ کوئی بینڈ باجے یا پروٹوکول کے ساتھ تو آئے گا نہیں۔'' میں نے کہا۔ ''وہ خاموشی سے آئے گا، ممکن ہے وہ اندر جانے کے لیے بھی عقبی دروازہ استعمال کرے، پھر تمہیں کیسے معلوم ہوگا؟''

''سر! راجا صاحب سے میری بات ہوئی ہے، وہ کہہ رہے تھے کہ اگر ان کی موجودگی میں دلاور وہاں آیا تو وہ فون کے ذریعے مجھے بتا دیں گے۔''

میں نے کہا۔ ''او کے غنی! یہ اچھا چانس تھا لیکن کوئی بات نہیں۔ ہمیں ایسا موقع دوبارہ بھی ملے گا۔'' سلسلہ منقطع کرنے کے بعد میں نے احمد شاہ کو بلایا اور اس سے پوچھا۔

''احمد شاہ! تم دلاور کو پہچانتے ہو؟''

''یس سر!'' احمد شاہ نے کہا۔ ''میں نے کئی برس پہلے اسے صرف ایک دفعہ دیکھا تھا لیکن میں اسے پہچان لوں گا۔''

''تم ابھی مسکین شاہ کے گھر چلے جاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''وہاں غنی موجود ہے۔ تم سیل فون پر اس سے رابطہ کر سکتے ہو۔''

''او کے سر، میں جاتا ہوں۔'' احمد شاہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

میں نے وقت گزاری کے لیے اخبار اٹھا لیا لیکن اخبار میں بھی دھماکوں، اغوا برائے تاوان، لوڈ شیڈنگ اور احتجاج کی خبروں کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ میں نے ایک کے بعد دوسرا اخبار اٹھایا۔ ہر اخبار میں ایک ہی طرح کی خبریں اور ایک ہی طرح کی سرخیاں تھیں۔

میرے سیل فون کی گھنٹی بجی تو میں نے چونک کر سیل فون اٹھا لیا۔ اسکرین پر جمال خان شیروانی کا نام تھا۔ میں نے بٹن دبا کر سیل فون کان سے لگا لیا اور بولا۔ ''السلام علیکم شیروانی صاحب! کیسے ہیں آپ؟''

''میں بہ خیریت ہوں۔'' جمال خان شیروانی نے کہا۔

''آپ آج میری طرف آ رہے ہیں؟''

''دیکھیے اگر شام کو آپ کی کوئی مصروفیت نہ ہو تو میں آ جاتا ہوں۔''

''خالی ہاتھ مت آیئے گا۔'' شیروانی نے کہا۔

''میں خود بھی خالی ہاتھ کہیں جانے کا قائل نہیں ہوں۔'' میں نے ان کا مطلب سمجھ کر انجان بنتے ہوئے کہا۔

''میرا مطلب تھا کہ وہ ویڈیو لیتے آیئے گا۔''

''آپ وہ ویڈیو دیکھے بغیر نہیں رہیں گے۔'' میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ ''ٹھیک ہے، میں وہ ویڈیو لیتا آؤں گا۔''

''شکریہ نواب صاحب!'' جمال خان شیروانی نے کہا۔ پھر بولے۔ ''ہاں، میں نے سنا ہے کہ کل رات آپ کے گھر ڈاکو آ گئے تھے؟''

''جی ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''وہ ڈاکو کیا، مسکین شاہ کے بھیجے ہوئے لوگ تھے، اگر مجھے چند منٹ کی بھی تاخیر ہو جاتی تو اس ویڈیو سمیت مسکین شاہ کے خلاف تمام ثبوت میرے ہاتھ سے نکل جاتے۔ میں عین اس وقت گھر پہنچ گیا جب وہ تمام اسٹف لے کر فرار ہونے والے تھے۔''

''اچھا، پھر......؟'' جمال خان شیروانی نے پوچھا۔

''انہوں نے میرے ایک گارڈ کو پہلے ہی ہلاک کر دیا تھا۔ میرے گارڈز نے ان لوگوں کو بھون کر رکھ دیا۔ دو آدمی موقعے ہی پر مارے گئے، ایک بعد میں زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے مر گیا، چوتھا زخمی حالت میں تھا اور پانچواں صرف بے ہوش ہوا تھا۔ اب وہ دونوں پولیس کی حراست میں ہیں۔''

''اور آپ کا گارڈ؟'' جمال خان شیروانی نے پوچھا۔

''پولیس نے ابھی تک اس کی ڈیڈ باڈی مجھے نہیں دی ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں، پولیس نے آپ کو پریشان تو نہیں کیا؟'' شیروانی نے پوچھا۔

''ابھی تک تو پریشان نہیں کیا۔'' میں نے کہا۔ ''اچھا شیروانی صاحب، آپ سے شام کو ملاقات ہوگی۔''

میں نے سلسلہ منقطع کیا تو دروازے کی اطلاعی گھنٹی بج اٹھی۔ گھنٹی جب دوبارہ بجی تو مجھے احساس ہوا کہ اس وقت میں گھر میں بالکل اکیلا ہوں، نیلم کے علاوہ گھر میں کوئی نہیں تھا۔ گھنٹی کی آواز سن کر نیلم گیٹ کی طرف بڑھی تو میں نے اسے روک دیا اور بولا۔ ''تم اندر جاؤ، میں دیکھتا ہوں۔''

''صاحب جی!...... آپ......''

نیلم نے کچھ کہنا چاہا لیکن میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے خاموش کر دیا اور دروازے کی طرف بڑھا۔

دروازے پر شامی تھا، اس کے ساتھ ایک آدمی اور تھا۔

''آؤ شامی بادشاہ!'' میں نے کہا۔

شامی نے حیرت سے کہا۔ ''کیا بات ہے نواب بھائی! کیا اس وقت گھر میں کوئی ملازم، کوئی گارڈ، کوئی چوکیدار نہیں ہے؟''

''نہیں شامی بادشاہ!'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ ایسے میں مجھے اپنی پرانی زندگی یاد آتی ہے جب دودھ اور دہی لینے کے لیے بھی مجھے خود ہی بازار کی طرف دوڑنا پڑتا تھا۔''

''لیکن اب ایسا نہیں ہے نواب بھائی!'' شامی مسکرا کر بولا۔ ''اس گھر میں اب بھی آپ کا ایک جاں نثار موجود ہے گو کہ کسی خوب صورت لڑکی کے ہاتھ میں ریوالور اچھا نہیں لگتا لیکن ......''

اس کی بات پر میں نے اچانک گھوم کر دیکھا تو مجھے نیلم دکھائی دی۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور وہ بہت اعتماد سے برآمدے کے ستون کے پاس کھڑی تھی۔

مجھے دیکھ کر اس نے جلدی سے ریوالور اپنی پشت کی طرف چھپا لیا۔

''اندر تو آؤ شامی بادشاہ!'' میں نے کہا۔ ''کیا یہیں کھڑے کھڑے ساری بات کر لو گے؟''

''یہ غفورا ہے نواب بھائی!'' اس نے اپنے ساتھ کھڑے ہوئے نوجوان کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ دلاور کو اچھی طرح پہچانتا ہے۔''

''اندر تو آؤ۔'' میں نے کہا۔ مجھے غفورا ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔ مجھے شامی پر بھی غصہ آ رہا تھا کہ وہ اسے گھر کیوں لایا ہے؟ وہ نیلم کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے اس نے پہلی بار کوئی لڑکی دیکھی ہو۔

''نواب بھائی!'' شامی نے کہا۔ ''آپ کہہ رہے تھے کہ دلاور کہیں آنے والا ہے؟''

''وہ کام ہو گیا ہے شامی بادشاہ!'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ احمد شاہ بھی دلاور کو پہچانتا ہے۔''

''اچھا!'' شامی ہنس کر بولا۔ پھر وہ غفورے سے بولا۔ ''کام ہو گیا ہے غفورے! اب تم جاؤ۔''

''استاد!'' غفورا کوے جیسی آواز میں بولا۔ ''میں کئی مہینے سے بے روزگار ہوں، مجھے کوئی کام دلا دو۔ اب تو فاقوں کی نوبت آ گئی ہے۔''

''ہاں ہاں، میں تمہارے لیے کہیں بات کروں گا۔'' شامی نے اپنی جیب سے ہزار روپے کا ایک نوٹ نکالا اور غفورے کو دے دیا۔ ''فی الحال یہ رکھو۔''

''بھولنا مت استاد!'' غفورے نے کہا۔ ''میں آج کل واقعی بہت پریشان ہوں۔'' اس نے شامی سے ہاتھ ملایا، مجھے سلام کیا اور روانہ ہو گیا۔

''نواب بھائی!'' اس کے جانے کے بعد شامی نے کہا۔ ''لگتا ہے آپ کو میری کوئی بات بری لگی ہے، شاید میں فوراً نہیں آسکا یا شاید......''

''ایسی کوئی بات نہیں شامی بادشاہ!'' میں نے جبراً مسکرا کر کہا۔ ''تم سے کوئی غیروں والا رشتہ ہے۔ مجھے کوئی بات بری لگے گی تو میں صاف صاف کہہ دوں گا۔'' میں نے کہا۔

''نہیں نواب بھائی!'' شامی نے کہا۔ ''کوئی بات تو ہے۔''

''بس، مجھے یہ غفورا اچھا نہیں لگا۔'' میں نے صاف گوئی سے کہا۔ ''تم نے اسے یہ گھر بھی دکھا دیا۔''

''مجھے پہلے ہی اندازہ تھا۔'' شامی نے کہا۔ ''لیکن ایک بات کا اطمینان رکھیں نواب بھائی! میں کسی ایسے ویسے آدمی کو یہاں تک نہیں لاسکتا ہوں۔ غفورا مرتے مرجائے گا لیکن آپ کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں بتائے گا۔ اس بات کی ضمانت......''

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا کیونکہ غفورا بہت سراسیمگی کے عالم میں واپس آیا تھا۔

''کیا بات ہے غفورے؟'' شامی نے چونک کر پوچھا۔

''استاد! باہر میں نے کچھ ایسے چہرے دیکھے ہیں جو دلاور کے ساتھ ہوتے ہیں۔'' غفورے نے کہا۔ ''اس کے آدمیوں کو اچھی طرح پہچانتا ہوں میں۔ وہ دلاور کے آدمی ہیں اور ان کے ارادے ٹھیک نہیں لگ رہے۔''

شامی جھٹکے سے کھڑا ہوگیا۔ ''کتنے آدمی ہیں؟''

''دو آدمی تو میں نے سامنے دیکھے ہیں۔'' غفورے نے کہا۔ ''ادھر ادھر اور بھی ہو سکتے ہیں۔''

''تمہارے پاس ریوالور ہے؟'' شامی نے اس سے پوچھا۔

''ہاں استاد ریوالور تو ہے۔'' غفورے نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے، تم مین گیٹ کے پاس کہیں چھپ کر بیٹھ جاؤ۔ ان میں سے کوئی اندر داخل ہونے کی کوشش کرے تو اسے بلا جھجک گولی مار دینا۔''

''میرے ریوالور میں صرف چھ گولیاں ہیں استاد!'' غفورے نے کہا۔

''ریوالور کون سا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کولٹ پوائنٹ تھری ایٹ کا ریوالور ہے۔'' غفورے نے جواب دیا۔

مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ بوسیدہ سے کپڑوں میں نظر آنے والا وہ لڑکا جو چہرے سے اٹھائی گیرا لگ رہا تھا، اس کے پاس ڈیڑھ لاکھ روپے مالیت کا کولٹ پوائنٹ تھری ایٹ ریوالور تھا۔

''ٹھہرو، میں تمہیں ریوالور کی مزید گولیاں دے دیتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''میرے پاس بھی پوائنٹ تھری ایٹ کا ایک ریوالور ہے۔''

میں اندر اپنے کمرے کی طرف گیا اور الماری سے ریوالور کی بہت سی گولیاں نکال کر لے آیا۔

''یہ رکھ لو۔'' میں نے غفورے سے کہا۔ ''گولیوں کی طرف سے فکر مت کرنا۔ گولیاں مزید مل جائیں گی۔''

غفورا گولیاں اپنی جیب میں بھر کر چلا گیا۔ وہ گیٹ کے نزدیک جا کر ایسی جگہ بیٹھا کہ کوئی بھی اس کی نظروں سے بچ کر اندر داخل نہیں ہوسکتا تھا۔

''اب آپ بھی اپنے کمرے میں جائیں نواب بھائی!'' شامی نے کہا۔ ''اگر کوئی آدمی غفورے سے بچ کر یہاں آگیا تو وہ مجھ سے نہیں بچ سکے گا۔''

''میں بھی یہیں تمہارے ساتھ رہوں گا شامی!'' میں نے کہا۔

''شامی چاچا ٹھیک کہہ رہے ہیں صاحب جی!'' نیلم کی آواز سنائی دی۔ ''میں یہاں کوریڈور میں موجود رہوں گی۔ آپ کمرے میں جائیں۔''

''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے نیلم!'' میں نے دانت پیس کر کہا۔ ''میں کوئی دودھ پیتا بچہ ہوں جو دھماکوں کی آواز سے ڈر جاؤں گا یا پھر کوئی نازک اندام لڑکی ہوں کہ ریوالور اٹھانے سے میری کلائی میں موچ آجائے گی۔''

''نواب بھائی! میں......''

''مجھے بچ بچ کا نازک اندام نواب مت بناؤ شامی!'' میں نے بگڑ کر کہا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے، میں کمرے میں بند ہو کر بیٹھ جاؤں گا؟''

''ارے غصہ کیوں کرتے ہو نواب بھائی!'' شامی مسکرا کر بولا۔ ''میں تو......''

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ باہر سے فائر کا دھماکا ہوا تھا اور اس کی آواز اس دھماکے میں دب کر رہ گئی تھی۔

شامی نے ریوالور نکالا اور بہت مہارت سے برآمدے میں جا کر ایک ستون کی اوٹ میں چھپ گیا۔

میں نے بھی ریوالور نکال لیا تھا لیکن وہاں کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں میں گھات لگا کر بیٹھ سکتا۔ میرا وہ کمرا بہترین تھا جو پولیس نے سیل کر دیا تھا۔ وہاں سے گیٹ سے لے کر لان تک سب کچھ نظر آتا تھا۔

اچانک مجھے ''ٹھک'' کی ہلکی سی آواز سنائی دی، اس کے ساتھ ہی گیٹ کے پاس کوئی دلخراش انداز میں چیخا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ غفورے کے پاس سائلنسر بھی تھا۔ دوسرا فائر کرنے سے پہلے اس نے ریوالور پر سائلنسر فٹ کرلیا تھا۔

میں نے سوچا، یہاں بیٹھنے کے بجائے میں کوٹھی کی چھت پر چلا جاؤں۔ میں وہاں سے نہ صرف دور دور کا جائزہ لے سکتا تھا بلکہ اندر آنے والوں کو نشانہ بھی بنا سکتا تھا۔

میں نے اپنے کمرے میں جا کر پستول کے کئی فاضل میگزین لیے اور ایک ٹیلی اسکوپ رائفل لے کر چھت پر چلا گیا۔

میں نے چھت پر جا کر دیکھا، دروازے کے پاس تین آدمی تھے۔ وہ غالباً کسی اور طرف سے دیوار پھاند کر گھر میں گھسنے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔

اچانک وہ سر پر پیر رکھ کر بھاگنے لگے۔

فوراً ہی ان کے بھاگنے کا سبب بھی میری سمجھ میں آگیا۔ مجھے دور سے پولیس موبائل دکھائی دی تھی جو ہماری کوٹھی ہی کی طرف آرہی تھی۔

میں بہت عجلت میں نیچے آیا اور شامی سے کہا۔ ''شامی بادشاہ! پولیس آرہی ہے، غفورے سے کہو کہ وہ فوراً یہاں سے نکل جائے۔''

''غفورے کا پولیس میں کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔'' شامی نے کہا۔ ''وہ آج تک کبھی جیل نہیں گیا ہے۔ اسے اندر بلا لیں نواب بھائی! باہر تو وہ فضول میں یا تو پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہوجائے گا یا پھر دلاور کے آدمی اسے ہلاک کر دیں گے۔''

شامی ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ ممکن ہے اس فائرنگ کی اطلاع بھی کسی پڑوسی نے پولیس کو دے دی ہو۔ پولیس غفورے کو مشکوک انداز میں دیکھ کر اس سے پوچھ گچھ کرتی، اس کی تلاشی لیتی تو اس کی جیب سے نہ صرف ریوالور بلکہ بہت سے فاضل راؤنڈز بھی برآمد ہوتے۔ ریوالور کا لائسنس تو یقیناً اس کے پاس نہیں ہوگا۔

میں نے آواز دے کر غفورے کو بھی اندر بلا لیا اور اس سے کہا۔ ''اپنا ریوالور شامی کو دے دو اور برآمدے میں بیٹھ جاؤ۔ تم ست بدھائی سے آئے ہو اور وہاں میری حویلی میں کام کرتے ہو۔''

غفورے نے اثبات میں سر ہلایا اور ریوالور شامی کے حوالے کر کے برآمدے میں بیٹھنے کے بجائے لان کی کیاریوں کی صفائی کرنے لگا۔

کچھ دیر بعد پولیس کی موبائل وین وہاں آکر رکی۔ اس میں سے وہی انسپکٹر اترا جو ایک دن پہلے بھی آیا تھا اور کوٹھی سے لاشیں اور ملزمان کو گرفتار کر کے لے گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دو کانسٹیبل بھی تھے۔

میں اور شامی جان بوجھ کر کمرے میں چلے گئے۔ شامی نے غفورے کا ریوالور اور گولیاں میری الماری میں رکھ دیں۔

میں اطمینان سے راکنگ چیئر پر بیٹھ کر جھولنے لگا۔

تھوڑی دیر بعد غفورا بھی اندر آیا اور مجھ سے بولا۔

''صاحب جی! وہ پولیس والے آئے ہیں۔''

''اچھا، انہیں باہر برآمدے ہی میں بٹھاؤ، میں ابھی آرہا ہوں۔'' میں نے غفورے سے کہا پھر شامی سے بولا۔ ''شامی تم باہر جاؤ اور پولیس والوں سے بات کرو۔ تم بھی ست بدھائی سے آئے ہو۔''

''نواب بھائی!'' اس نے کہا۔ ''میں جانے کو تو چلا جاؤں گا لیکن پولیس سے برسوں میری آنکھ مچولی چلی ہے، ہوسکتا ہے وہ انسپکٹر بھی مجھے پہچانتا ہو، وہ میرا کچھ بگاڑ سکتا ہے، نہ آپ کا...... لیکن فضول میں ٹینشن لینے سے کیا فائدہ؟''

''ٹھیک ہے، تم یہیں ٹھہرو، میں خود جا کر پولیس والوں سے بات کروں گا۔''

اس وقت مجھے پورچ میں کسی گاڑی کے رکنے اور پھر راجا کے تیز تیز بولنے کی آواز سنائی دی۔ ''اب کیا ہے؟'' وہ چیخ کر بولا۔ ''تم لوگوں نے تو گھر ہی دیکھ لیا۔''

''ہمیں ان دونوں آدمیوں سے کچھ پوچھ گچھ کرنا ہے جن کے ہاتھوں کل تین قتل ہوئے ہیں۔'' انسپکٹر نے بھی تلخ لہجے میں کہا۔

''میں بلواتا ہوں ان دونوں کو۔'' راجا نے کہا۔

میں جانتا تھا کہ غنی اور احمد شاہ گیراج میں سے نکل کر اندر کی طرف چلے گئے ہوں گے۔

راجا بکتا جھکتا میرے کمرے کی طرف آیا اور آکر ایک کرسی پر ڈھیر ہوگیا۔ اس کے ساتھ ناصر بھی تھا۔

''کیا رہا؟'' میں نے پوچھا۔

''زبردست!'' ناصر نے کہا۔

''مجھے تفصیل سے بتاؤ۔'' میں نے کہا۔

''ہم ابھی کچھ بھی نہیں بتا رہے۔ پہلے ایک کپ چائے پئیں گے، پھر کوئی بات ہوگی لیکن اس سے پہلے اس پولیس انسپکٹر کا یہاں سے دفع ہونا ضروری ہے۔''

''وہ احمد شاہ اور غنی سے اب کیا پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ تو روز کھڑاگ رہے گا۔'' ناصر نے کہا۔ ''اس کا خیال ہے کہ معاملہ ایک نواب کا ہے اس لیے یہاں سے رقم بھی تگڑی ملے گی۔ میں ابھی اس کا دماغ درست کرتا ہوں۔'' پھر وہ چونک کر بولا۔ ''یہ باہر لان میں کوئی آدمی کام کر رہا ہے۔ کیا آپ نے ست بدھائی سے کسی کو بلایا ہے سر!''

''میں نے تو نہیں، شاہی بادشاہ نے بلایا ہے۔''

''نیلم!'' ناصر نے نیلم کو آواز دی۔

نیلم فوراً ہی کمرے میں داخل ہوئی۔ ''جی ناصر صاحب!''

''غنی اور احمد شاہ کو یہاں بھیج دو۔''

وہ اثبات میں سر ہلا کر چلی گئی۔

اچانک غفورے کی بلند آواز سنائی دی۔ ''وہ لوگ کوئی ویلے نہیں بیٹھے ہیں، آرام سے بیٹھو، میں نے انہیں بلایا ہے۔''

''نام کیا ہے تیرا اوئے؟'' اس کے طرز تخاطب پر انسپکٹر کو جلال آ گیا۔

احمد شاہ اور غنی ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔

''وہ انسپکٹر پھر تم دونوں سے کچھ پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہے۔''

''میرے ساتھ آؤ۔'' ناصر نے طیش میں آ کر اٹھتے ہوئے کہا۔

''میرا نام جان کر کیا کرو گے انسپکٹر صاحب!'' غفورے نے کہا۔ ایسا لگ رہا تھا، جیسے کوئی منجھا ہوا اداکار بغیر اسکرپٹ کے ڈائیلاگ بول رہا ہو۔ ''میں تو اس حویلی کا بہت چھوٹا ملازم ہوں، ہاں، میرا صاحب بہت بڑا آدمی ہے، وہ اس وقت آرام کر رہا ہے اس لیے زیادہ شور وغل مت کرو۔''

اس وقت ناصر کی آواز سنائی دی۔ ''پرابلم کیا ہے انسپکٹر! کیوں شور مچا رکھا ہے تم نے؟ یہ تمہارا تھانا نہیں بلکہ نواب رفیق احمد شیرازی کی کوٹھی ہے۔''

''ناصر صاحب!'' انسپکٹر تلخ لہجے میں بولا۔ ''آپ مجھے میرے فرائض سے روک رہے ہیں؟''

''اگر چیخنا چلانا اور معزز لوگوں کے گھروں پر جا کر شور مچانا تمہارے فرائض میں شامل ہے انسپکٹر تو میں واقعی تمہیں روک رہا ہوں، اگر گالم گلوچ اور بدکلامی تمہارے فرائض میں شامل ہے تو میں تمہیں روک رہا ہوں۔''

''میں یہاں دو ملزموں سے پوچھ گچھ کرنے آیا ہوں۔''

''ملزم؟'' ناصر نے حیرت سے کہا۔ ''یہاں کون سے ملزم ہیں؟''

''نواب صاحب کے یہ دونوں گارڈز!'' انسپکٹر نے کہا۔ ''ان کے ہاتھوں کل ہی تین آدمی ہلاک ہوئے ہیں۔''

''تو پھر ان کے خلاف وارنٹ لاؤ اور انہیں گرفتار کر لو۔'' ناصر بھنا کر بولا، پھر دونوں طرف سے خاموشی چھا گئی، اچانک ناصر کی آواز دوبارہ سنائی دی۔

''ہیلو! ذرا ہوم سیکریٹری سے بات کرائیے...... میں ناصر خان ہوں۔'' اس کے بعد پھر خاموشی چھا گئی۔ ''سر، کیسے ہیں آپ...... جی ہاں، میں ناصر بول رہا ہوں، کل میں نے آپ سے ڈکیتی کی ایک واردات کا تذکرہ کیا تھا...... جی ہاں...... نواب صاحب کے بنگلے پر...... وہاں نواب صاحب کے گارڈز کے ہاتھوں تین ڈاکو مارے گئے تھے...... ایک فرض شناس پولیس انسپکٹر کو اچانک خیال آیا ہے کہ وہ دونوں تو قتل کے ملزم ہیں...... شاید وہ انہیں حراست میں لینے آیا ہے...... انسپکٹر کا نام...... ہاں، منیر احمد!...... اچھا ٹھیک ہے...... نہیں نہیں، یہ اتنا بڑا افسر نہیں ہے...... جی سر...... آپ کا کام انشاءاللہ پرسوں تک ہو جائے گا...... جی ہاں، پرسوں میں پہلے صدر سے ملوں گا، پھر وزیراعظم سے ملاقات کروں گا...... جی ہاں، وہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔''

وہ پھر خاموش ہو گیا۔

انسپکٹر نے اس مرتبہ بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ناصر صاحب! میں کب ان لوگوں کو گرفتار کرنے آیا ہوں؟''

''یہ قتل کے ملزم ہیں نا!'' ناصر نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''ان پر تو دفعہ تین سو دو لگتی ہے۔ اس کے لیے تو کسی وارنٹ کی بھی ضرورت نہیں ہے۔''

''لیکن سر! میں......''

''تم ملزمان کا کیا کرتے ہو انسپکٹر؟'' ناصر نے بلند آواز میں کہا، میں نے اسے پہلی دفعہ اتنے غصے میں دیکھا تھا۔

''میں ملزمان کو گرفتار کرتا ہوں۔'' انسپکٹر نے جواب دیا۔

''تو پھر گرفتار کرو۔'' ناصر کا غصہ لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا

تھا۔

راجا گھبرا کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ''ناصر کہیں اس انسپکٹر کی پٹائی شروع نہ کر دے۔ اس کا غصہ اتنا ہی خطرناک ہوتا ہے، میں جا کر اسے روکتا ہوں۔'' پھر وہ جاتے جاتے بولا۔ ''دیکھے پتر! تو باہر مت آنا۔''

''کیا بات ہے ناصر؟'' فوراً ہی راجا کی آواز سنائی دی۔ ''بھئی انسپکٹر صاحب ان لوگوں سے کچھ تفتیش کرنے آئے ہیں تو اتنا غصہ کیوں کر رہا ہے؟'' پھر وہ انسپکٹر سے مخاطب ہوا۔ ''انسپکٹر صاحب! آپ کو جو کچھ پوچھنا ہے پوچھیں اور جائیں یہاں سے۔''

''اب تو میں ان دونوں کو تھانے ہی بلا کر پوچھ گچھ کروں گا۔'' انسپکٹر کو بھی تاؤ آ گیا، پھر برآمدے میں بھاری بوٹوں کی دھمک سنائی دی اور دور ہوتی چلی گئی۔

انسپکٹر شاید چلا گیا تھا، ناصر اور راجا ایک مرتبہ پھر میرے کمرے میں آ گئے۔ ناصر نے کہا۔ ''لگتا ہے، یہ انسپکٹر بھی مسکین شاہ کا آدمی ہے، آج اسے خصوصی ہدایات ملی ہوں گی کہ نواب رفیق کے گارڈز پر قتل کا مقدمہ بنا دو۔ میں ابھی اس انسپکٹر کا علاج کرتا ہوں ورنہ اس دفعہ وہ واقعی وارنٹ لے کر آ جائے گا۔''

''تو صدر اور وزیراعظم سے کب مل رہا ہے؟'' راجا نے ہنس کر پوچھا۔

''یار! اس وقت تک ہوم سیکریٹری صاحب فون بند کر چکے تھے۔ آخری جملہ تو میں نے انسپکٹر کو مرعوب کرنے کے لیے بولا تھا اور وہ مرعوب بھی ہو گیا ورنہ وہ ابھی احمد شاہ اور غنی کو گرفتار کر کے لے جاتا۔''

میرے سیل فون کی گھنٹی بجی تو ناصر خاموش ہو گیا۔ میں نے سیل فون اٹھا کر دیکھا، دوسری طرف آئی جی عبداللہ جان صاحب تھے۔ میں نے سیل فون کان سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''السلام علیکم سر! کیسے ہیں آپ؟''

''وعلیکم السلام!'' انہوں نے خوش دلی سے کہا، پھر بولے۔ ''نواب صاحب! آپ لاہور میں ہیں اور آپ نے مجھے اطلاع بھی نہیں دی۔'' ان کے لہجے میں شکوہ تھا۔

''میں اپنے ہی کچھ کاموں میں ایسا الجھ گیا کہ آپ سے ملاقات نہ کر سکا۔'' میں نے کہا۔

''آپ کے گھر میں ڈکیتی کی ناکام واردات ہوئی، چار آدمی مارے گئے لیکن آپ نے مجھے بتانا ضروری نہیں سمجھا۔''

''میں ابھی آپ کو فون کرنے ہی والا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''ابھی علاقے کا انسپکٹر میری کوٹھی پر آیا تھا، وہ میرے دونوں گارڈز کو ان ڈاکوؤں کے قتل میں ملوث کرنا چاہتا ہے۔''

''انسپکٹر منیر احمد؟'' عبداللہ جان صاحب نے پوچھا۔

''جی ہاں، اس کا نام یہی ہے۔''

''نواب صاحب! منیر انتہائی گھٹیا اور کمینہ آدمی ہے۔ اس کی بہت سی شکایتیں میرے پاس پہلے بھی پہنچی ہیں، میں ابھی اسے لائن حاضر کرتا ہوں۔''

''آپ کی نوازش ہے جناب!'' میں نے کہا۔ ''میں اپنے بکھیڑوں سے فارغ ہوتے ہی آپ سے ملاقات کروں گا۔''

''میں آپ کا انتظار کروں گا۔'' آئی جی صاحب نے کہا اور رسمی جملوں کی ادائیگی کے بعد سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے ناصر اور راجا کو بھی صورت حال سے آگاہ کر دیا۔

''شکر ہے، ایک بلا تو ٹلی۔'' ناصر نے کہا۔

''ہاں، اب تم بتاؤ، مسکین شاہ سے ملاقات کیسی رہی؟'' میں نے ناصر سے پوچھا۔

''میں وہاں پہنچا تو وہ بن سنور کر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے بہت پرتپاک انداز میں میرا استقبال کیا لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ میرے ساتھ فوٹو گرافر نہیں ہے تو اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ظاہر ہوئے۔

اس نے کہا۔ ''ناصر صاحب! میرے پاس وقت بہت محدود ہے۔ آپ کو اگر تفصیلی انٹرویو کرنا ہے تو آپ پھر کسی وقت آ جائیے گا۔''

''میں آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا شاہ جی!'' میں نے کہا۔ ''پہلے ذرا آپ یہ فائلیں دیکھ لیں۔''

''کیا ہے ان فائلوں میں؟'' مسکین شاہ بیزاری سے بولا۔ ''کسی کمیٹی کی رپورٹ ہے یا......''

''یہ آپ کے خلاف میری رپورٹ ہے۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔

مسکین شاہ نے مجھے گھور کر دیکھا، پھر وہ فائلیں اٹھائیں، پہلی فائل دیکھتے ہی اس کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ وہ بپھرے ہوئے انداز میں بولا۔ ''یہ سب کیا ہے؟ تم مجھے بلیک میل کرنے آئے ہو؟''

''آپ یہ فائلیں اطمینان سے پڑھیے گا۔ یہ میں خاص طور پر آپ کے لیے لایا ہوں۔ آپ ذرا یہ آڈیو کیسٹس سن لیں۔'' میں نے چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر آن کر دیا۔

اپنی باتیں سن کر تو شاہ جی کا رنگ اڑ گیا۔

''شاہ جی!'' میں نے کہا۔ ''میرے پاس بہت معزز لوگوں کی ویڈیو فلمیں بھی ہیں جو آپ نے بنوائی ہیں، میرے پاس اس بات کا ثبوت بھی موجود ہے کہ وہ ویڈیوز آپ کے حکم پر اور آپ کے لیے بنائی گئی ہیں، اب بولیے کیا کہتے ہیں آپ؟''

کچھ دیر تک شاہ جی کے حلق سے آواز تک نہیں نکلی، اس نے کانپتے ہاتھوں سے پانی کا گلاس اٹھایا اور ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔ اس کی حالت سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کئی میل تک دوڑتا رہا ہے۔

پھر وہ سنبھل کر آہستہ سے بولا۔ ''میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ یہ تمام اسٹف تمہارے پاس کہاں سے آیا کیونکہ تم ایک بڑے اخبار کے انوسٹی گیشن رپورٹر بھی ہو اور کالم نگار بھی۔ مجھے صرف یہ بتاؤ کہ تم نے ان کاغذات، آڈیوز اور ویڈیو فلموں کی کیا قیمت لگائی ہے؟''

''قیمت تو آپ لگائیں گے شاہ جی۔'' میں نے کہا۔ ''آپ اطمینان سے سوچ کر جواب دیجیے گا۔ اس وقت یوں بھی آپ کے پاس وقت کم ہے۔''

''وقت کو چھوڑو۔'' شاہ جی نے کہا۔ ''مجھ سے ابھی فائنل بات کر لو۔''

''تو پھر بتایئے، کیا کہتے ہیں آپ؟''

''میں ان فائلوں اور دوسری چیزوں کے بدلے تمہیں ایک کروڑ دے سکتا ہوں۔'' شاہ جی نے کہا۔

میں ہنسنے لگا اور بولا۔ ''شاہ جی! یہ کوئی عوام کے ووٹ نہیں ہیں جنہیں آپ اتنے سستے داموں خریدیں گے، یہ تو آپ کی سیاسی موت کے ساتھ ساتھ آپ کے گلے میں پھانسی کا پھندا ہے، آپ اپنے سیاسی امیج اور زندگی کی قیمت صرف ایک کروڑ لگا رہے ہیں؟''

''دو کروڑ...... تین کروڑ...... پانچ کروڑ...... دس کروڑ!'' شاہ جی نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ''بس میں اس سے زیادہ نہیں دے سکتا۔''

''آپ اس سے کہیں زیادہ دے سکتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''بیس کروڑ آخری ہے۔'' شاہ جی نے یوں کہا، جیسے نیلامی میں بولی لگا رہے ہوں۔ ''میرے پاس فوری طور پر بیس کروڑ سے زیادہ نہیں ہیں۔''

راجا نے کہا۔ ''یار ناصر! شاہ جی اتنے بڑے آدمی ہیں۔ وہ کہہ رہے ہیں تو واقعی ان کے پاس اس سے زیادہ پیسے نہیں ہوں گے، چل فائنل کر۔''

''یار راجا!'' میں نے کہا۔ ''یہ تو دیکھو کہ اس سے شاہ جی کو نقصان کتنا ہوگا۔''

''میں مانتا ہوں۔'' شاہ جی نے کہا۔ ''میرا سیاسی کیریئر تباہ ہو جائے گا، میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا...... مجھ پر بے شمار مقدمات ہو جائیں گے۔''

''اس کے باوجود آپ اپنی نیک نامی اور زندگی کی قیمت صرف بیس کروڑ لگا رہے ہیں؟''

''تم صحافی بھی بہت موقع پرست ہوتے ہو، کوئی ایک دفعہ تمہارے جال میں پھنس جائے تو تم لوگ زندگی بھر اسے بلیک میل کرتے ہو۔ میں اس وقت تمہیں پچیس کروڑ سے زیادہ تو دے ہی نہیں سکتا۔ اب تم چاہے کچھ بھی سمجھو۔ نقصان تمہارا بھی ہے، پچیس کروڑ کی رقم کوئی معمولی نہیں ہوتی، تم دونوں زندگی بھر بیٹھ کر کھاؤ گے تب بھی وہ رقم ختم نہیں ہوگی۔''

''او کے شاہ جی!'' راجا نے کہا۔ ''پچیس کروڑ ڈن!''

''لیکن مجھے فوٹو کاپی نہیں بلکہ اصل کاغذات چاہئیں۔''

''ہم بھی کسی بندے کی بساط سے زیادہ نہیں مانگتے اور اسے دوبارہ پریشان بھی نہیں کرتے، ہم آپ کو ہر چیز اصل دیں گے لیکن پہلے آپ رقم ہمارے سوئس اکاؤنٹ میں جمع کرائیں گے پھر......''

''اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم پچیس کروڑ روپے لے کر......''

''شاہ جی!'' راجا نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''آپ تو ابھی اپنی زبان سے پھر گئے۔''

''کیا مطلب؟'' شاہ جی سودا مکمل کرنے کے بعد کچھ شیر ہو گیا تھا۔

''مطلب یہ کہ آپ نے ایک ہی جھٹکے میں پچیس کروڑ پاؤنڈز کو پچیس کروڑ روپے بنا دیا۔''

''وہاٹ!'' شاہ جی دہاڑ کر بولا۔ ''تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے، تم نے تو کبھی یک مشت پچیس لاکھ روپے نہیں دیکھے ہوں گے اور تم پچیس کروڑ پاؤنڈز کی بات کر رہے ہو؟''

''او کے!'' راجا اٹھ کھڑا ہوا، اس کے ساتھ ہی میں بھی اٹھ گیا۔ ''ہمارے پاس ایسی پارٹیاں بھی ہیں جو اس

اسٹف کے پچاس کروڑ پاؤنڈز بھی ادا کرنے کو تیار ہیں۔'' میں نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن آج کے بعد آپ کی سیاسی موت واقع ہو گئی ہے، چلو راجا!''

''ایک منٹ ٹھہرو، تم لوگ پچاس کروڑ روپے لے لو۔ بس......''

''سوری شاہ جی!'' میں نے کہا۔ ''آپ سے سودا طے نہیں ہو سکتا۔ اب ذرا یہ بھی سن لیں۔ میں نے اپنی جیب سے وہ یو ایس بی نکالی جس میں ڈھائی تین گھنٹے کی ریکارڈنگ ہو سکتی ہے۔ ''ذرا یہ بھی سن لیں۔''

اس یو ایس بی میں وہ تمام گفتگو ریکارڈ تھی جو شاہ جی اور ہمارے درمیان ہوئی تھی۔ وہ گفتگو سن کر تو شاہ جی بالکل ہی ڈھیر ہو گیا۔ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''ناصر! مجھے دو دن کی مہلت دے سکتے ہو۔ میرے اکاؤنٹ میں واقعی اتنی بڑی رقم نہیں ہے۔''

''میں یہ بھی جانتا ہوں کہ باہر کے بینکوں میں آپ کا کتنا سرمایہ جمع ہے اور کہاں کہاں ہے؟''

''مجھے کوئی فکسڈ ڈپازٹ ختم کرنا ہوگا۔ مجھے صرف دو دن کی مہلت دے دو۔''

''ایک بات اچھی طرح سن لیں شاہ جی!'' راجا نے کہا۔ ''آپ کا تمام اسٹف ہمارے دوستوں کے پاس محفوظ ہے۔ اگر ہم دونوں میں سے کسی کو بھی کچھ ہوا، کوئی حادثہ پیش آیا تو ان میں سے کوئی وہ تمام ثبوت میڈیا کے حوالے کر دے گا۔ پھر سوچ لیں کہ آپ کہاں ہوں گے؟''

ہم دونوں وہاں سے باہر نکل آئے۔

میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ ''ناصر! اگر اس نے اتنی رقم دے دی تو کیا تم اسے چھوڑ دو گے؟''

''وہ مر جائے گا لیکن اتنی بڑی رقم نہیں دے گا۔ مال اس نے اس لیے تو کمایا نہیں ہے کہ وہ دوسروں کو بانٹ دے۔'' راجا نے کہا۔ ''اس نے دو دن کی مہلت شاید اس لیے مانگی تھی کہ ہم دونوں کا کچھ بندوبست کر سکے لیکن میں نے اس کے ارادے پر پانی پھیر دیا۔ اسے جتا دیا کہ ہماری موت کے بعد بھی اس کا پیچھا نہیں چھوٹے گا۔''

اچانک مجھے دلاور کا خیال آیا۔ میں نے راجا سے پوچھا۔ ''کیا وہاں دلاور بھی آیا تھا؟''

''ہماری موجودگی میں تو آیا نہیں تھا۔'' راجا نے کہا۔ ''ممکن ہے بعد میں آیا ہو یا نہ آیا ہو۔''

میں نے احمد شاہ کو بلایا اور اس سے پوچھا۔ ''تم نے وہاں دلاور کو دیکھا؟''

''نہیں سر!'' احمد شاہ نے جواب دیا۔ ''میں نے دلاور کو تو نہیں دیکھا لیکن کچھ لوگوں کو ضرور دیکھا جو مشکوک انداز میں وہاں موجود لوگوں کا جائزہ لے رہے تھے، وہاں آنے والی ہر گاڑی میں جھانک رہے تھے۔''

''ٹھیک ہے، تم جاؤ۔'' میں نے کہا، پھر راجا سے بولا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ آفتاب خان کی اطلاع درست نہیں تھی کہ دلاور مسکین شاہ سے ملاقات کے لیے جا رہا ہے۔''

''راجا!'' ناصر نے کہا۔ ''تو ذرا اخبار کے لیے ایک زبردست سی تین کالمی خبر بنا۔ میں مختلف ٹی وی چینلز پر بات کرتا ہوں۔''

''ایک کام ہو سکتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تم لوگ مسکین شاہ سے اس سودے بازی میں نور کا مطالبہ بھی کر سکتے ہو۔''

راجا نے چونک کر مجھے دیکھا اور بولا۔ ''واہ یار! زبردست آئیڈیا ہے، یہ خیال ہمیں کیوں نہیں آیا؟''

''لیکن تم اگر نور کی رہائی کا مطالبہ کرو گے تو شاہ جی بدک جائے گا۔ اسے معلوم ہو جائے گا کہ تم لوگوں کا تعلق مجھ سے ہے۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' راجا نے کہا۔ ''فیکے پتر! تو شاہ جی کو کچا کھلاڑی مت سمجھ۔ وہ اس دو دن کی مہلت میں سب کچھ معلوم کر لے گا؟ اور میرے بارے میں تو ایک زمانہ جانتا ہے کہ میں تیرے ساتھ ہوں۔''

اچانک مجھے یاد آیا کہ میں نے جمال خان شیروانی سے شام کو آنے کا وعدہ کیا ہے، میں نے شامی سے کہا۔ ''شامی بادشاہ! تم ذرا وہ ڈی وی لے آؤ جس میں......''

''میں ابھی لے آتا ہوں نواب بھائی!'' شامی نے کہا۔ ''لیکن میرا مشورہ یہ بھی ہے کہ اب اس ویڈیو کو ضائع ہی کر دو تو بہتر ہے، خدانخواستہ وہ ہمارے دشمنوں کے ہاتھ لگ گئی تو بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔''

''تم ٹھیک کہتے ہو۔'' میں نے کہا۔ ''یوں بھی یہ کوٹھی دشمنوں کی نظروں میں آ گئی ہے۔''

''تو ست بدھائی کیوں نہیں چلا فیکے پتر؟'' راجا نے کہا۔ ''اب یہاں کیا کام ہے؟''

''ہاں یار، میں خود بھی یہی سوچ رہا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''ہم آج ہی ست بدھائی روانہ ہو جائیں گے۔''

میں نے غنی اور احمد شاہ سے کہہ دیا تھا کہ بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ دشمنوں نے ہمارا یہ ٹھکانا دیکھ لیا ہے۔ وہ کسی بھی وقت دوبارہ ہلا بول سکتے ہیں۔

احمد شاہ رائفل لے کر چھت پر چلا گیا اور غنی نے برآمدے میں مورچہ بنالیا۔

شامی صرف وہی ڈی وی لایا تھا جس میں میری ویڈیو تھی۔

''فیکے پتر! تو جمال خان شیروانی کو وہ ویڈیو دکھانا چاہتا ہے؟''

''میں نے تو بہت منع کیا لیکن وہ مانتا ہی نہیں۔'' میں نے کہا۔

''ویڈیو دیکھ کر کہیں وہ پاگل نہ ہوجائے اور اسی پاگل پن میں شاہ جی پر چڑھ دوڑے۔''

''وہ بہت تجربہ کار بیوروکریٹ ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس سے اس پاگل پن کی توقع تو نہیں ہے اور وہ کچھ کرتا بھی ہے تو کرتا رہے، ہمیں کیا فرق پڑے گا۔''

''نواب بھائی!'' شامی نے کہا۔ ''آپ ویڈیو اپنے ساتھ لے کر مت جائیں۔ وہ میں اور گولی لے آئیں گے۔''

''شامی ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔'' راجا نے کہا۔ ''احتیاط بہت ضروری ہے۔''

''میں اس ڈی وی کو جمال خاں شیروانی کی آنکھوں کے سامنے ہی ضائع کروں گا تاکہ وہ مطمئن ہوجائے۔'' پھر میں نے شامی سے پوچھا۔ ''تم نے جمال خان شیروانی کا بنگلا دیکھا ہے؟''

''اس کا بنگلا بھی میں نے دیکھا ہے۔''

''ٹھیک ہے، پھر تم وہ ویڈیو لے کر وہاں پہنچو، میں بھی آرہا ہوں بلکہ ایسا کرو، تم ناصر کی گاڑی میں چلو، میں تمہارے پیچھے پیچھے آرہا ہوں۔''

☆☆☆

جمال خان شیروانی مجھ سے نظریں نہیں ملا رہا تھا۔ میں نے کچھ کہے بغیر میز پر رکھا ہوا لائٹر اٹھایا اور وہ ڈی وی لے کر برآمدے میں نکل آیا۔

میں نے باہر آکر لائٹر جلایا اور اس ڈی وی کو آگ لگانے لگا۔

جمال خان شیروانی میرے ساتھ ساتھ تھا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد پلاسٹک نے آگ پکڑ لی۔ میں کچھ دیر اسے ہاتھوں میں لیے کھڑا رہا، پھر جلتی ہوئی ڈی وی کو فرش پر پھینک دیا۔

ہم دونوں خاموشی سے اس وقت تک اس جلتی ہوئی ڈی وی کو دیکھتے رہے، جب تک وہ جل کر خاک نہ ہوگئی۔

جمال خان شیروانی نے اپنے ایک ملازم کو آواز دے کر کہا کہ یہاں کی صفائی کردو۔

ہم ایک مرتبہ پھر ڈرائنگ روم میں آگئے۔

جمال خان شیروانی کچھ دیر خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا، پھر اچانک اپنی جگہ سے اٹھ کر مجھ سے لپٹ گیا اور بری طرح رونے لگا۔

میں اس کے رونے پر گھبرا گیا اور بولا۔ ''شیروانی صاحب! اب تو پریشانی کی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ میں نے اسی لیے وہ ویڈیو آپ کے سامنے ضائع کی ہے تاکہ آپ مطمئن ہوجائیں۔''

''آپ نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے نواب صاحب! آپ نے میری عزت بچائی۔''

''عزت دینے والا تو اللہ ہے شیروانی صاحب! میں نے آپ کی نہیں بلکہ اپنی عزت بچائی ہے۔'' پھر میں ہنس کر بولا۔ ''مجھے امید ہے کہ اب آپ کچھ دن کے لیے ست بدھائی ضرور آئیں گے۔'' میں اٹھتے ہوئے بولا۔ ''مجھے اب اجازت دیں۔''

''میں آپ کو کھانا کھائے بغیر نہیں جانے دوں گا۔''

''کسی تکلف میں پڑنے کی ضرورت نہیں ہے شیروانی صاحب! مجھے ابھی ست بدھائی کے لیے نکلنا ہے۔ زندگی رہی تو آئندہ کبھی آپ کے ساتھ کھانا بھی کھالوں گا۔''

''ست بدھائی تو آپ صبح بھی جاسکتے ہیں نواب صاحب!''

''میں جس کوٹھی میں مقیم ہوں، وہ دشمنوں کی نظروں میں آچکی ہے۔ مجھے دشمنوں کا خوف نہیں ہے، فضول میں ٹینشن رہے گی اس لیے میں آج ہی ست بدھائی کے لیے نکلنا چاہتا ہوں۔''

میں نے مصافحے کے لیے شیروانی کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ بے اختیار میرے گلے لگ گیا۔

شامی نے پوچھا۔ ''نواب بھائی! کیا آپ واقعی ست بدھائی جارہے ہو؟''

''ہاں شامی بادشاہ!'' میں نے کہا۔ ''مجھے ست بدھائی سے نکلے ہوئے کئی دن ہوگئے ہیں لیکن تم ابھی اپنے اس ٹھکانے پر رہنا، میں وہ سامان ابھی ست بدھائی تو نہیں

لے جاسکتا، تم کل یا پرسوں وہ سامان لے کر ست بدھائی آجانا۔''

''میں آپ سے رکنے کو نہیں کہوں گا نواب بھائی!'' شامی نے کہا۔ ''میں بھی کل شام سے پہلے پہلے ست بدھائی پہنچ جاؤں گا۔''

''بہت احتیاط کی ضرورت ہے شامی بادشاہ!'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''اس سامان میں پچیس کروڑ پاؤنڈز کی خطیر رقم چھپی ہوئی ہے۔''

''میں تو کہتا ہوں کہ راجا صاحب کو یہ رقم لے لینا چاہیے۔'' شامی نے کہا۔

''ٹھیک ہے، باقی باتیں گھر پر ہوں گی۔'' میں نے کہا اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

گھر پہنچتے ہی میں نے نیلم سے کہا۔ ''نیلم! سامان باندھ لو، ہم ابھی ست بدھائی جارہے ہیں۔''

''سامان تو میں نے پہلے ہی باندھ لیا ہے صاحب جی۔'' نیلم نے کہا۔ ''راجا صاحب نے کہا تھا کہ آپ واپس آتے ہی ست بدھائی کی طرف نکل جائیں گے۔'' پھر وہ ہچکچا کر بولی۔ ''صاحب جی! میں...... کافی لے کر آؤں؟''

''نہیں نیلم!'' میں نے کہا۔ ''اب کھانا پینا سب کچھ ست بدھائی پہنچنے کے بعد ہوگا۔''

''میں تیار ہوں صاحب جی!'' نیلم نے کہا۔ ''غنی نے آپ کا سامان بھی تیار کردیا ہے۔''

شامی اور گولی کو رخصت کرنے کے بعد میں بھی ست بدھائی کے لیے روانہ ہوگیا۔ گاڑی حسب معمول غنی ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ پسنجر سیٹ پر نیلم بیٹھی تھی۔ میں اور راجا عقبی نشست پر تھے۔ ناصر اپنی گاڑی میں ہمارے پیچھے آرہا تھا، اس کے پیچھے احمد شاہ کی ڈبل کیبن پک اپ تھی۔

اچانک مجھے اس گارڈ کا خیال آیا جس نے ہماری خاطر اپنی جان دے دی تھی، میں نے ناصر کا سیل نمبر ملایا اور اس سے کہا۔ ''ناصر! تم پولیس کو فون کردو کہ جاں بحق ہونے والے گارڈ کی میت ست بدھائی بھجوادیں کیونکہ نواب صاحب ست بدھائی جاچکے ہیں۔''

''اوکے سر!'' ناصر نے کہا۔ ''میں ابھی فون کردیتا ہوں۔''

غنی اپنی روایتی تیز رفتاری کے ساتھ ست بدھائی کی طرف جارہا تھا۔ میری حالت اس وقت ایسی تھی کہ میں اپنے ہی سائے سے بدک رہا تھا۔ میرے ساتھ متعدد مرتبہ ایسا ہوا تھا کہ میں تاریک راہوں میں مارا گیا تھا۔

''کس سوچ میں ہے فیکے پتر؟'' راجا نے پوچھا۔

''یار، میں یہ سوچ رہا ہوں کہ جب تو پاؤنڈز میں کروڑ پتی ہوجائے گا تو کیا حال ہوگا؟ تو، تو کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرے گا۔''

''سیدھے منہ؟'' راجا نے کہا۔ ''فیکے پتر! میں تو کسی سے ٹیڑھے منہ بھی بات نہیں کروں گا۔ میں کوئی رفیق احمد شیرازی نہیں ہوں کہ دولت کا ڈھیر ہونے کے باوجود بیٹھا مرتا رہوں گا، کڑھتا رہوں گا۔''

''تیرے خیالات تو بہت زبردست ہیں۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''زریں خیالات کہہ!'' راجا نے کہا۔ ''جیسے اقوال زریں! میں بچپن سے یہ الفاظ پڑھتا آیا ہوں لیکن میں نے آج تک زرین نامی اس خاتون کو نہیں دیکھا جس کے اقوال اس کثرت سے اخباروں اور رسالوں میں چھپتے ہیں۔''

''تیرا خیال ہے کہ دولت مند ہونے کے بعد تو اس خاتون کو دیکھ سکے گا؟''

''آف کورس دیکھ سکوں گا۔'' راجا نے کہا۔ ''میں روز صبح اٹھ کر آئینہ دیکھا کروں گا کیونکہ میں اپنا تخلص زریں رکھنے والا ہوں۔''

میں اور راجا اس قسم کی لایعنی گفتگو اس وقت کرتے تھے جب ہمارے اعصاب بہت کشیدہ ہوتے تھے۔ یہ بارہا آزمایا ہوا نسخہ تھا کہ ایسی لایعنی بکواس کے بعد ہم دونوں ہی خود کو بہت پرسکون محسوس کرتے تھے۔

غنی نے اچانک گاڑی کو بریک لگا دیا۔ گاڑی اتنی رفتار سے جارہی تھی کہ بریک لگتے ہی میں اور راجا اچھل کر سامنے والی سیٹوں کی پشت سے ٹکرا گئے۔ پسنجر سیٹ پر بیٹھی ہوئی نیلم اچھل کر ڈیش بورڈ سے ٹکرائی، پھر سیٹ اور ڈیش بورڈ کے درمیان گر گئی۔

''غنی!'' راجا دھاڑ کر بولا۔ ''تم ہوش میں تو ہو، یہ تم کس انداز میں ڈرائیونگ کررہے ہو؟''

میں نے سامنے دیکھا، سڑک پر ایک ٹرالر اس انداز میں کھڑا تھا کہ راستہ مسدود ہوکر رہ گیا تھا۔ سڑک پر ایک آدمی لالٹین لیے کھڑا تھا۔ وہ جھپٹ کر ہمارے نزدیک آیا اور معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ''معاف کرنا صاحب! ہمارے ٹرک کی کرینک شافٹ ٹوٹ گئی ہے اس لیے انجن جام ہوگیا ہے، ٹرالر اتنا بھاری ہے کہ اسے دو چار آدمی تو دور

کی بات، دس بیس آدمی بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتے۔"

"تو کم سے کم سڑک پر ایسا بندوبست تو کرو کہ دوسری گاڑیوں کو حادثہ پیش نہ آئے۔" راجا نے کہا۔

"اسی لیے تو میں لالٹین لیے کھڑا ہوں۔" وہ شخص نرم لہجے میں بولا۔

میں نے دیکھا کہ ٹرالر اور سڑک پر اگی ہوئی خود رو جھاڑیوں کے درمیان کچے راستے پر اتنی گنجائش تھی کہ وہاں سے ایک گاڑی گزر سکتی تھی۔

غنی نے اچانک گاڑی آگے بڑھا دی۔ وہ شخص اگر اچھل کر پیچھے نہ ہٹ جاتا تو ہماری ہی گاڑی سے کچلا جاتا۔ غنی نے بہت مہارت سے گاڑی اس تنگ جگہ میں سے نکال لی جس پر میری نظر بھی پڑی تھی۔

پھر وہ انتہائی پھرتی سے مین روڈ پر آیا لیکن دوسری طرف مخالف سمت سے آنے والی گاڑیوں کی لمبی قطار تھی۔

وہ گاڑیاں دیکھ کر میں نے سکون کا سانس لیا اور غنی سے کہا کہ گاڑی کو روک کر اپنے ساتھیوں کا انتظار کرو اور سب کو پانی پلاؤ۔

غنی گاڑی روک کر کھڑا ہو گیا۔ پانی کی بوتلیں نیلم کے پاس تھیں۔ نیلم نے جھک کر پانی کی بوتل اٹھائی اور میری طرف بڑھا دی۔ میں نے بوتل سے چند گھونٹ لینے کے بعد اسے راجا کی طرف بڑھا دیا اور بولا۔ "مہاراجا! میں تو سمجھ رہا تھا کہ......"

"تو کیا، ہر آدمی یہی سمجھ رہا تھا فیکے پتر!" راجا نے کہا۔ "کہ ہمیں پھر دشمنوں نے گھیر لیا ہے لیکن......"

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا کیونکہ ہماری پشت پر زوردار دھماکا ہوا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ہمارے پیچھے آنے والی گاڑی ٹرالر سے ٹکرا گئی ہو۔

راجا نے چیخ کر غنی سے کہا۔ "غنی، یہاں سے گاڑی نکالو، جلدی کرو۔"

غنی نے گاڑی کو جھٹکے سے آگے بڑھا دیا اور بولا۔ "سر! ست بدھائی یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ اب تو ہم پیدل بھی وہاں تک جا سکتے ہیں۔" اس نے گاڑی کی رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔

اچانک ایک اور زوردار دھماکا ہوا اور ٹرالر میں آگ لگ گئی۔

سامنے سے آنے والی گاڑیاں ایک دوسرے سے ٹکرا گئیں۔

غنی نے اچانک گاڑی کو کچے میں اتارا اور بائیں جانب پگڈنڈی پر دوڑانے لگا۔

میں نے گھوم کر دیکھا، اب ٹرالر کی جگہ سڑک پر جلتا ہوا بہت بڑا گولا تھا۔ اس کی روشنی دور تک پھیلی ہوئی تھی۔

میں نے جیب سے سیل فون نکالا اور ناصر کا نمبر ملانے ہی والا تھا کہ راجا کی آواز گونجی۔ "ہیلو ناصر!......کون ہو تم؟" راجا ڈپٹ کر بولا۔ "اور ناصر کا سیل فون تمہارے پاس کہاں سے آیا؟ کون حامد؟" راجا نے درشت لہجے میں پوچھا۔

میں بھی ناصر کی طرف سے تشویش میں مبتلا ہو گیا تھا۔

"ناصر سے بات کراؤ!" راجا کا لہجہ سرد تھا۔ "میں راجا......تم بھی کمال کرتے ہو ناصر۔" راجا نے کہا۔ "یہ کسے تم نے اپنا سیل فون دے دیا......کون؟...... یار اسے ساتھ بٹھانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟...... ان حالات میں...... ہاں ہاں، ہم لوگ خیریت سے ہیں لیکن تمہاری خیریت نیک مطلوب ہے؟......راستہ بلاک ہے؟...... واپس چلے جاؤ......ہاں ظاہر ہے......اچھا ٹھہرو، میں احمد شاہ سے بات کرتا ہوں۔"

اس نے سلسلہ منقطع کیا ہی تھا کہ میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اسکرین پر احمد شاہ کا نام تھا۔ میں نے سیل فون کان سے لگا کر کہا۔ "ہاں احمد شاہ!"

"سر، آپ لوگ کہاں ہیں؟" احمد شاہ نے پریشانی کے عالم میں پوچھا۔

"ہم خیریت سے ہیں اور ست بدھائی کی طرف جا رہے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "تم کہاں ہو؟"

"میری گاڑی آپ کے پیچھے ہی تھی لیکن بیچ میں دو تین گاڑیاں بہت تیزی سے گھس گئیں، پھر میں نے ایک بڑا ٹرالر سڑک پر دیکھا۔"

"غنی نے دھماکے سے پہلے ہی وہاں سے گاڑی نکال لی تھی، تم ایسا کرو، تمہارے پیچھے ناصر صاحب ہیں۔ ان کا خیال رکھو۔ ہم لوگ تو اب دس منٹ میں ست بدھائی پہنچ جائیں گے، ہماری فکر مت کرو۔"

"او کے سر!" احمد شاہ نے جواب دیا۔

میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

غنی اس وقت تک گاڑی کو ست بدھائی جانے والی سڑک پر موڑ چکا تھا۔ وہ سڑک ابھی تک پختہ نہیں ہوئی تھی لیکن اس پر جو روڑی اور پتھر پڑے ہوئے تھے، ان پر روڈ رولر چل چکا تھا۔

مجھے وہاں سے کچھ فاصلے پر ایک چیک پوسٹ دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی۔ صوبیدار میجر صاحب واقعی بہت محنت اور لگن سے کام کر رہے تھے۔

چیک پوسٹ مضبوط کنکریٹ کے کمرے کی تھی، اس کے دونوں جانب سیمنٹ کی بوریاں رکھ کر مورچے سے بنائے گئے تھے اور دور دور تک مجھے خاصی بلند خاردار تاروں کی باڑھ نظر آ رہی تھی۔

چیک پوسٹ کے سامنے سڑک کے عین درمیان میں مضبوط آہنی بیریئر لگا ہوا تھا۔

غنی نے بیریئر کے پاس گاڑی روکی اور حیرت سے بولا۔ "یہ چیک پوسٹ کب بنی؟"

اسی وقت چیک پوسٹ سے نکل کر ایک باوردی گارڈ باہر آیا اور گاڑی کے نزدیک آتے ہی اس کی نظر غنی پر پڑی۔

اس نے ایک دم اسے فوجی انداز میں سلام کیا، پھر اس نے گاڑی کے عقبی حصے میں مجھے اور راجا کو دیکھا تو ایک مرتبہ پھر سیلیوٹ کیا اور بلند آواز میں بولا۔ "بیریئر ہٹاؤ، نواب صاحب تشریف لائے ہیں۔"

فوراً سڑک کے درمیان لگا ہوا بیریئر ہٹا دیا گیا، غنی نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

"ایک منٹ!" میں نے غنی سے کہا۔ "گاڑی روکو!"

غنی نے گاڑی روک دی۔

"انہیں بتاؤ کہ ابھی ناصر صاحب بھی آئیں گے۔ یہ لوگ شاید ناصر کو نہ پہچانتے ہوں۔"

گاڑی رکتے دیکھ کر وہی گارڈ دوڑا دوڑا آیا جو چیک پوسٹ سے باہر آیا تھا۔

میں نے لیور دبا کر اپنی طرف کا شیشہ نیچے کیا اور اس سے کہا۔ "ابھی ہمارے ایک مہمان بھی آئیں گے ناصر صاحب! انہیں زیادہ پریشانی نہ ہو۔"

"سر، ناصر صاحب کو تو میں پہچانتا ہوں۔ ہاں، ان کے ساتھ اگر کوئی اجنبی بھی ہوا تو میں کنٹرول روم سے رابطہ کر لوں گا۔ ویسے بھی صوبیدار میجر صاحب کلوز سرکٹ ٹی وی پر دیکھ لیں گے۔"

"کلوز سرکٹ ٹی وی؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "یہاں کیمرے اور انٹرکام کب لگے؟"

"انٹرکام تو پہلے ہی تھے سر!" گارڈ نے جواب دیا۔ "کلوز سرکٹ کیمرے ابھی دو دن پہلے ہی یہاں لگے ہیں۔" اس نے ادب سے جواب دیا۔

"او کے!" میں نے کہا۔ "چلو غنی!"

غنی نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ میں صوبیدار میجر صاحب کے انتظامات پر بہت خوش تھا۔ کلوز سرکٹ کیمرے پہلے صرف حویلی کی دیواروں پر تھے۔ اب صوبیدار میجر صاحب نے شاید پوری ریاست کے گرد خاردار تار لگا کر اسے بالکل محفوظ بنا لیا تھا۔ چیک پوسٹ پر ایک بورڈ لگا ہوا تھا جس پر لکھا تھا۔ "ریاست ست بدھائی" اس کے نیچے واضح الفاظ میں لکھا تھا۔ "یہ شارع عام نہیں ہے۔"

صوبیدار میجر صاحب نے اتنی جلدی بہت بڑا کام کر لیا تھا۔

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے ایک چیک پوسٹ اور دکھائی دی۔ اس چیک پوسٹ پر بیریئر کے بجائے بہت بھاری بھرکم اور بلند و بالا آہنی گیٹ تھا۔ ہماری گاڑی دیکھتے ہی وہ آہنی گیٹ کھل گیا۔ اسے کھولنے کے لیے غالباً کسی لیور کا استعمال کیا گیا تھا۔ وہ اتنا بڑا اور بھاری بھرکم گیٹ تھا کہ اس کے نیچے لوہے کے پہیے لگے ہوئے تھے، پہیوں کے نیچے ریل کی پٹڑی نما دو خم دار آہنی پٹیاں تھیں جن پر وہ پہیے حرکت کر رہے تھے۔ اس وقت گیٹ کا صرف ایک پٹ کھولا گیا تھا۔

غنی کھلے ہوئے گیٹ سے اندر داخل ہوا تو ایک ساتھ کئی گارڈز نے ہمیں فوجی انداز میں سلام کیا۔ گویا پہلی چیک پوسٹ سے یہاں ہماری آمد کی اطلاع پہنچ چکی تھی۔ میں اس وقت صحیح معنوں میں خود کو کسی ریاست کا نواب سمجھ رہا تھا۔ مجھے ان سب چونچلوں اور پروٹوکول سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن یہ محض نمود و نمائش نہیں بلکہ وقت کی ضرورت بھی تھی۔

میں نے گارڈز کو سر کے ہلکے سے اشارے سے سلام کا جواب دیا اور راجا سے بولا۔ "یار مہاراجا! یہ صوبیدار میجر صاحب تو واقعی مجھے روایتی نواب بنا کر دم لیں گے۔"

"وہ اگر ایسا نہ کرتے فیکے پتر تو دشمن تیرا دم لے لیتے۔ میں جب یہاں سے گیا تھا تو وہ کچھ انتظامات میں تو مصروف تھے لیکن مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ ریاست ست بدھائی کو ممنوعہ علاقہ بنانے میں مصروف ہیں۔"

"سر! اب تو پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔" غنی نے خوش ہو کر کہا۔ "میں تو کب سے یہی سب کچھ کرنا چاہتا تھا لیکن......"

"مجھے اس وقت بالکل اندازہ نہیں تھا کہ دشمن اس حد تک میری جان کے درپے ہو جائیں گے۔" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"ٹھیک ہے پتر! ابھی جو ٹرالر دھماکے سے اڑا ہے، میری سمجھ میں اب تک وہ واقعہ بھی نہیں آیا ہے۔"

"یار! میں بھی اس وقت سے یہی سوچ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں خود بھی ابھی تک کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا ہوں کہ وہ ٹرالر کیا واقعی خراب ہو گیا تھا یا پھر اسے وہاں جان بوجھ کر کھڑا کیا گیا تھا۔ پھر وہ اچانک دھماکے سے پھٹ بھی گیا۔ یہ تو بعد میں معلوم ہوگا کہ اس میں کتنی گاڑیوں کو نقصان پہنچا، ممکن ہے جانی نقصان بھی ہوا ہو۔"

"یہ ساری رپورٹ ناصر اور احمد شاہ لے آئیں گے۔" راجا نے کہا۔

اس وقت تک ہم حویلی کے صدر دروازے تک پہنچ چکے تھے۔

ہماری گاڑی دیکھتے ہی حویلی کا صدر دروازہ بھی کھل گیا۔ غنی گاڑی وہاں سے سیدھا پورچ میں لے گیا۔

وہاں کھڑے ہوئے ایک گارڈ نے آگے بڑھ کر میرے لیے دروازہ کھولا۔ میں اس پروٹوکول کا عادی نہیں تھا، نہ اسے پسند کرتا تھا، اس لیے مجھے الجھن سی محسوس ہو رہی تھی۔

میں گاڑی سے نیچے اترا تو صوبیدار میجر صاحب نے میرا استقبال کیا۔ "آیئے رفیق میاں!" وہ مسکرا کر بولے۔ "کیسے ہیں آپ؟"

"میں بالکل خیریت سے ہوں، یہاں کیا صورت حال ہے؟"

"سب کچھ کنٹرول میں ہے۔" صوبیدار میجر صاحب نے کہا۔

"آپ نے تو یہاں کا نقشہ ہی بدل دیا ہے۔" میں نے کہا۔

"آپ نے مجھ سے کہا تھا کہ حویلی کی طرف سے بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ میں نے یہی سوچ کر سیکیورٹی کے فول پروف انتظامات کر دیے ہیں۔"

اس وقت تک نیلم گاڑی سے اتر کر حویلی کی طرف جا چکی تھی۔

تھوڑی دیر بعد جب حویلی کے برآمدے میں پہنچا تو وہاں حویلی کی تقریباً سبھی خواتین موجود تھیں۔

"کیسی ہیں ڈاکٹر صاحبہ؟" میں نے شہناز سے پوچھا۔

"اچھی ہوں نواب صاحب!" شہناز نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔

پھر مجھے ڈاکٹر شہلا دکھائی دی۔ اس نے مجھے سلام کیا تو میں اس کے سلام کا جواب دے کر ٹیمنا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ "تم کیسی ہو ٹیمنا؟"

"ایک دم فائن!" ٹیمنا مسکرا کر بولی۔

میں اپنے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے نیلم سے بولا۔ "ریشم سے کہو، ہمارے لیے ذرا اچھی سی کافی بنائے۔"

"رات بہت ہو گئی ہے ٹیکے پتر!" راجا نے کہا۔ "ریشم تو اب سو چکی ہو گی۔ مجھے تو شدید بھوک لگی ہے تو کافی کی فرمائش کر رہا ہے۔" پھر وہ نیلم سے بولا۔ "تم کھانے کا انتظام کرو۔"

"جی صاحب!" نیلم نے کہا اور وہاں سے چلی گئی۔

"یہ ڈاکٹر شہناز وغیرہ اس وقت تک کیوں جاگ رہی ہیں؟" میں نے اپنا کوٹ اتار کر کرسی کی پشت پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"بھئی نواب رفیق احمد شیرازی اپنی حویلی میں تشریف لائے ہیں۔" راجا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "وہ لوگ نواب صاحب کے استقبال کی خاطر جاگ گئی ہوں گی۔"

"اچھا یہ طنز چھوڑ، ناصر کو کال کر کے معلوم کر کہ وہ اس وقت کہاں ہے؟"

"یہ کام میں تیرے کہنے سے پہلے ہی کر چکا ہوں۔" راجا نے جواب دیا۔ "ناصر اور احمد شاہ دونوں بس پہنچنے ہی والے ہوں گے۔"

"یار پھر کچھ صبر کر لے، ہم لوگ ناصر کے ساتھ ہی کھانا کھالیں گے۔"

میں نے گرم پانی سے غسل کیا تو میری ساری تھکن اتر گئی۔ یوں بھی ست بدھائی پہنچ کر مجھے عجیب سے سکون کا احساس ہوا تھا۔

میں باتھ روم سے نکلا تو نیلم کھانا لگا چکی تھی۔ ناصر اور احمد شاہ بھی پہنچ چکے تھے۔

"ناصر!" میں نے کھانے کی میز پر پہنچ کر پوچھا۔ "کچھ معلوم ہوا کہ وہ دھماکا کیسا تھا؟"

"اس ٹرالر میں کسی نے ریموٹ کنٹرول بم فٹ کر

رکھا تھا۔ ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس بم کا ٹارگٹ کون تھا؟"

"دھماکے سے دیگر گاڑیوں کو نقصان بھی پہنچا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں، دھماکے سے دو گاڑیوں کو شدید نقصان پہنچا ہے اور ان میں سوار افراد شدید زخمی ہو گئے ہیں۔ زخمیوں میں سے ایک شخص کی حالت نازک ہے۔"

"یہ ساری اطلاعات تمہیں سڑک پر کھڑے مل گئیں؟" میں نے ہنس کر پوچھا۔ "اور تمہارے ساتھ وہ دوسرا شخص کون تھا؟"

"وہ میرا ایک صحافی دوست تھا سر!" ناصر نے جواب دیا۔ "اس کی گاڑی خراب ہو گئی تھی اس لیے میں نے اسے دینہ تک لفٹ دے دی تھی۔" پھر وہ ہنس کر بولا۔ "صحافی ہونے کا بس یہی فائدہ ہے۔ دنیا بھر کی اطلاعات ایک فون کال پر مل جاتی ہیں۔"

"لیکن تم تو خود جائے واردات پر موجود تھے۔" میں نے کہا۔

"میں اگر کوشش کرتا تو مجھے اس سے زیادہ اطلاعات مل سکتی تھیں۔" ناصر نے کہا۔ "اس چکر میں میرے مزید دو گھنٹے ضائع ہوتے۔ یہ کوئی اتنی اہم خبر نہیں ہے، ملک میں تو آئے دن دھماکے اور خودکش حملے ہوتے رہتے ہیں۔ میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ ہم کتنے بے حس ہو چکے ہیں۔ اس دھماکے میں خدانخواستہ اگر زیادہ تباہی پھیلتی، زیادہ انسانی جانیں ضائع ہوتیں تو اس خبر کی اہمیت کچھ اور ہی ہوتی۔ اب بھی وہاں مختلف ٹی وی چینلز کی ٹیمیں اور رپورٹرز پہنچ گئے ہوں گے۔ ابھی ساری اطلاعات کسی بھی ٹی وی کے نیوز بلیٹن سے مل جائیں گی۔"

کھانا کھانے کے بعد میں دوبارہ اپنے کمرے میں آ گیا۔ میں نے ریموٹ اٹھایا اور ٹیلی وژن آن کر دیا۔ ناصر کی اطلاع کے مطابق وہاں تین بڑے ٹی وی چینلز کے رپورٹرز اور کیمرا مین وغیرہ موجود تھے اور وہ اس خبر کو لائیو ٹیلی کاسٹ کر رہے تھے۔

کیمرا مین بار بار سڑک کا وہ حصہ دکھا رہا تھا جہاں دھماکا ہوا تھا۔ وہاں زمین میں اچھا خاصا گڑھا پڑ چکا تھا۔

نیوز کاسٹر کہہ رہا تھا۔ "پولیس کا کہنا ہے کہ بم حکومت کے ایک وزیر کے خلاف اس ٹرالر میں پلانٹ کیا گیا تھا۔ ٹرالر اگر مضبوط اور دبیز آہنی چادر کا نہ ہوتا تو شاید اس سے کہیں زیادہ تباہی پھیلتی۔ دھماکا ہوتے ہی ٹرالر میں آگ لگ گئی تھی۔"

"کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ دھماکے کے نتیجے میں کتنے افراد زخمی ہوئے ہیں؟" نیوز کاسٹر نے اپنے نمائندے سے پوچھا۔

"جی ہاں، سرکاری اطلاع کے مطابق سات افراد شدید زخمی ہوئے ہیں۔ زخمیوں میں سے دو افراد کی حالت نازک ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"دھماکا کس نوعیت کا تھا اور پولیس کا اس سلسلے میں کیا خیال ہے؟"

"پولیس کے مطابق دھماکا ریموٹ کنٹرول بم سے کیا گیا ہے۔ پولیس نے علاقے کی ناکا بندی کر دی ہے لیکن ابھی تک کوئی گرفتاری عمل میں نہیں آئی ہے۔ جی ٹی روڈ پر بدترین ٹریفک جام ہے اور گاڑیوں کی لمبی لمبی قطاریں لگی ہوئی ہیں۔ پولیس اہلکار ٹریفک کنٹرول کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

میں نے جھنجلا کر ٹی وی بند کر دیا۔ "پولیس نے علاقے کی ناکا بندی کر دی ہے اور دھماکے کے ذمے داروں کو جلد ہی گرفتار کر لیا جائے گا۔" میں منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ "پولیس تو جائے واردات پر پہنچی ہی ایک گھنٹے بعد ہے۔ اس وقت تک کیا دھماکا کرنے والا وہاں بیٹھا پولیس کا انتظار کر رہا ہوگا کہ آؤ اور مجھے پکڑ لو۔" میں نے سوچا۔ جہاں تک سوال ناکا بندی کا تھا تو دھماکا ہونے کے ایک گھنٹے بعد پولیس کی اس ذہانت پر ہنسی آتی تھی۔ جیسے ناصر اور احمد شاہ وہاں سے نکل آئے تھے، اسی طرح وہ شخص بھی وہاں سے غائب ہو گیا ہوگا۔

میں دن بھر کی بھاگ دوڑ سے بہت تھک گیا تھا اس لیے لائٹ آف کر کے سونے کے ارادے سے لیٹ گیا۔

ابھی میں نیم غنودگی میں تھا کہ میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں اس وقت بری طرح جھنجلا گیا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ سیل فون کو اٹھا کر دیوار سے دے ماروں۔ غلطی میری ہی تھی۔ مجھے سیل فون آف کر کے سونا چاہیے تھا۔ پھر میں نے جھنجلا کر سیل فون اٹھا لیا۔ اسکرین پر شامی کا نام دیکھ کر میں چونک اٹھا۔

"ہیلو شامی!" میں نے سیل فون کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

"نواب بھائی! آپ خیریت سے تو ہو؟" شامی نے

پوچھا۔

''ہاں، میں اور تمام لوگ خیریت سے ست بدھائی پہنچ چکے ہیں۔'' پھر میں ہنس کر بولا۔ ''بھلے آدمی! تم صبح بھی تو فون کر سکتے تھے؟''

''میں اس وقت آپ کو کبھی ڈسٹرب نہ کرتا۔'' شامی نے کہا۔ ''لیکن بات ہی کچھ ایسی تھی کہ مجھے اس وقت فون کرنا پڑا۔ اب آپ کی آواز سن کر جان میں جان آئی ہے۔''

''بات کیا ہے شامی بادشاہ؟'' میں نے پوچھا۔ ''تم جیسا آدمی بھی ایسی باتیں کر رہا ہے؟''

''نواب بھائی! مجھے ابھی تھوڑی دیر پہلے معلوم ہوا ہے کہ دشمنوں کو آپ کی روانگی کی اطلاع مل گئی ہے۔ انہوں نے جی ٹی روڈ پر آپ کے لیے ایک خوفناک جال پھیلایا تھا۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ وہ دھماکا.....''

''ہاں نواب بھائی!'' شامی نے کہا۔ ''مجھے اپنے کچھ ذرائع سے اطلاع ملی تھی کہ دشمن آج آپ پر بھرپور انداز میں وار کریں گے۔ میں تو اطلاع دینے والے پر برس پڑا کہ اتنی اہم خبر تم مجھے اب دے رہے ہو؟''

''مجھے قتل کرنے کا ان لوگوں نے پورا سامان کر دیا تھا شامی بادشاہ!'' میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''لیکن میرے خلاف منصوبہ بندی کرنے والے شاید کیا بلکہ یقیناً یہ بھلا بیٹھے کہ زندگی اور موت ان کے ہاتھ میں نہیں بلکہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔''

''نواب بھائی! میں تو بہت پریشان ہو گیا تھا۔'' شامی نے کہا۔ ''پھر ٹی وی پر اس حادثے کی تصدیق بھی ہو گئی تو میں پاگل ہو گیا۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آپ بچ گئے ہو نواب بھائی!''

''واقعی اللہ کا احسان ہے مجھ پر۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن شامی بادشاہ! میرا تو ایمان اس بات پر ہے کہ انسان کی جورات قبر سے باہر ہوا سے دنیا کی تمام سپر پاور زمل کر بھی قبر میں نہیں پہنچا سکتیں۔'' پھر میں چونک کر بولا۔ ''تم ابھی ایک دو دن اس سامان کو لے کر ست بدھائی مت آنا۔''

''میں اتنا کم عقل اور غیر محتاط نہیں ہوں نواب بھائی!'' شامی نے کہا۔ ''میں اس وقت تک وہ سامان لے کر نہیں نکلوں گا، جب تک مجھے راستہ صاف ہونے کا یقین نہ ہو جائے۔''

''یار شامی بادشاہ!'' میں نے پرخیال انداز میں کہا۔

''میری سمجھ میں یہ نہیں آیا کہ دشمنوں کو ہماری روانگی کی اطلاع کیسے مل گئی؟'' میرے لہجے میں الجھن تھی۔

''یہ کوئی سمجھ میں نہ آنے والا معاملہ نہیں ہے نواب بھائی! ہمارا وہ ٹھکانا دشمنوں کی نظر میں آ چکا تھا۔ ممکن ہے وہاں کی نگرانی بھی ہو رہی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اگر آپ آج وہاں سے نہ نکلتے تو آپ کے گھر ہی پر زبردست حملہ ہو جاتا۔ آپ کے دشمن کوئی چھوٹے موٹے چور اچکے نہیں ہیں بلکہ گھاگ سیاست دان ہیں۔ وہ برسوں سے اس ملک کے عوام کو لوٹ رہے ہیں لیکن اپنے پیچھے کوئی سراغ نہیں چھوڑتے۔ پاکستان کی کوئی عدالت بھی بغیر کسی ثبوت کے انہیں بری کرنے پر مجبور ہو گی۔''

''لیکن اب ایسا نہیں ہو گا۔ میرے پاس ان کے کالے کرتوتوں کے ناقابل تردید ثبوت بھی موجود ہیں۔ وہ چند دن مزید سکون سے رہ لیں۔ مناسب موقع آتے ہی میں ان کی گردنیں توڑ دوں گا۔ بس ایک دفعہ مجھے نور کا سراغ مل جائے، پھر میں ان حرام زادوں پر زمین تنگ کر دوں گا۔ میں دنیا کے آخری سرے تک ان کا پیچھا کروں گا۔''

''اس موقعے پر شامی آپ سے دو قدم آگے ہو گا۔'' شامی نے کہا۔

''میں جانتا ہوں شامی بادشاہ!'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''میں نے یوں ہی تو تم پر اعتماد نہیں کیا ہے۔'' پھر میں نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ ''خیریت معلوم کرنے کا بہت بہت شکریہ شامی! اپنا.....''

''نواب بھائی اب آپ غیروں والی بات کر رہے ہو۔'' شامی نے کچھ خفگی سے کہا۔

''اچھا اب ناراض ہونے کی ضرورت نہیں، اب صبح فون پر بات ہو گی، میں......''

''ہاں نواب بھائی! مجھے تو بالکل دھیان ہی نہیں رہا کہ اس وقت آپ سو رہے ہوں گے۔''

''او کے شامی!'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''اپنا خیال رکھنا۔'' یہ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

اب نیند میری آنکھ سے اڑ گئی تھی۔ جسم پر تھکن طاری تھی لیکن دماغ مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ آخر مجھ پر حملہ کون کرا سکتا ہے؟ کسے معلوم تھا اور کیسے کہ میں ست بدھائی کے لیے نکل رہا ہوں۔ کہیں یہ خبر نادانستگی میں میرے ہی کسی اعتماد کے آدمی نے تو لیک نہیں کر دی؟

میں نے پولیس انسپکٹر کو بھی بتایا تھا کہ مجھے ست بدھائی

جانا ہے لیکن میں نے اسے دن اور وقت نہیں بتایا تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ میں نے ناصر سے کہا تھا، فون پر اس پولیس انسپکٹر کو اطلاع دے دو کہ میں ست بدھائی جا رہا ہوں۔ وہ میرے مقتول گارڈ کی ڈیڈ باڈی لا رہا تھا لیکن یہ اطلاع تو ناصر نے اس وقت دی تھی جب ہم لاہور سے ست بدھائی کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔ کیا اتنی جلدی وہ لوگ اس دھماکے کی منصوبہ بندی کر سکتے تھے؟ یہ ممکن نہیں تھا پھر کیسے...... کیسے انہیں اطلاع مل گئی کہ میں ست بدھائی جا رہا ہوں؟ میں سوچتا رہا اور الجھتا رہا۔

نیند میری آنکھوں سے اڑ چکی تھی لیکن جسم پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔

میں نے سوچا کہ اسپتال جا کر خواب آور گولیاں لے لوں۔ اس وقت کوئی نہ کوئی ڈاکٹر تو ڈیوٹی پر ضرور ہوگا۔

فضا میں اس وقت اچھی خاصی خنکی تھی۔ میں نے اپنا سلیپنگ گاؤن پہنا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

میں اسپتال کی طرف بڑھا تو مجھے ایسا لگا جیسے کوئی اور بھی میرے تعاقب میں آ رہا ہو۔

میں ایک دم مڑا تو میرے پیچھے آنے والا ساکت ہو گیا۔ وہ احمد شاہ تھا۔ دن بھر کی بھاگ دوڑ کے بعد اب وہ نائٹ ڈیوٹی بھی دے رہا تھا۔

مجھے اس پر ترس آ گیا۔ میں کوئی روایتی اور ظالم جاگیر دار تو تھا نہیں کہ بس اپنی حفاظت کے لیے اپنے گارڈز کو جانور سمجھتا، ان سے یہ توقع رکھتا کہ وہ روبوٹ ہیں۔ احمد شاہ بھی میری طرح انسان تھا۔ میرے مقابلے میں اس نے دن بھر کہیں زیادہ بھاگ دوڑ کی تھی اور اب رات کے اس پہر بھی وہ ڈیوٹی پر موجود تھا۔

''احمد شاہ!'' میں نے آہستہ سے اسے آواز دی۔

وہ فوراً ہی میرے سامنے پہنچ گیا۔ ''یس سر!''

''تمہیں یہاں نائٹ ڈیوٹی کے لیے کس نے بھیجا ہے؟'' میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''کسی نے بھی نہیں سر!'' احمد شاہ نے جواب دیا۔ ''ایک دفعہ آپ ہی نے تو حکم دیا تھا کہ آج کے بعد احمد شاہ رات کے وقت میرے کمرے پر پہرا دے گا۔''

مجھے اپنی بات یاد آ گئی۔ میں نے کہا۔ ''اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے احمد شاہ کہ تم دن رات جاگتے رہو۔ حویلی میں دوسرے گارڈز بھی تو موجود ہیں۔ تم جا کر آرام کرو اور سرور کو اپنی جگہ بھیج دو۔''

''یس سر!'' احمد شاہ نے مستعدی سے جواب دیا اور وہاں سے چلا گیا۔

میں بھی اسپتال کی طرف روانہ ہو گیا۔

اسپتال کا فاصلہ یہاں سے زیادہ نہیں تھا۔ ڈاکٹر شہناز، شہلا اور دوسرے ڈاکٹر دن میں کئی مرتبہ یہ فاصلہ طے کرتے تھے۔

میں شاید اس دن بہت تھکا ہوا تھا۔ میرا ذہن اگر تھکن کا شکار ہو تو پورا جسم ٹوٹنے لگتا ہے۔

اسپتال کی عمارت میں داخلے کے لیے شیشے کا دروازہ لگا تھا۔ میں اس دروازے کو دھکیل کر کوریڈور میں داخل ہوا تو ڈیوٹی روم سے مجھے شہلا کی آواز سنائی دی۔ ''شہناز باجی! آپ کب تک اس گورکھ دھندے میں الجھی رہیں گی، کب تک اپنے جذبات کا خون کرتی رہیں گی۔ یہاں کے معاملات تو مجھے سدھرتے ہوئے نظر نہیں آتے۔ تو کیا آپ مزید پانچ دس سال حالات بہتر ہونے کا انتظار کرتی رہیں گی؟''

شہلا کا ایک ایک لفظ زہر بن کر میرے کانوں میں اتر رہا تھا۔

''شہلا۔'' شہناز نے سخت لہجے میں کہا۔ ''تم میرے اس مشن کو گورکھ دھندا کہہ رہی ہو؟ تم اگر یہاں سے فیڈ اپ ہو گئی ہو، بیزار ہو گئی ہو تو تم شوق سے واپس جا سکتی ہو۔ ہم نے تمہیں کوئی بانڈ تو نہیں کیا کہ تم اس اسپتال میں جاب کرنے پر مجبور ہو؟''

''میرا یہ مطلب نہیں تھا باجی!'' شہلا نے جلدی سے کہا۔ ''یہاں کام کرنے تو میں اپنی خوشی سے آئی تھی اور یقین جانیے، میں یہاں بہت خوش ہوں، میرا اشارہ تو ان حالات کی طرف تھا جن سے نواب صاحب نبرد آزما ہیں، میں تو آپ کی اور راجا بھائی کی شادی کی بات کر رہی تھی۔'' وہ سانس لینے کو رکی پھر بولی۔ ''فرض کیجیے یہاں کے حالات مزید پانچ سال تک اسی طرح غیر یقینی صورت حال میں چلتے رہے تو کیا آپ......''

''شہلا! تم مجھ سے بہت چھوٹی ہو۔ تمہیں یہ حق کس نے دیا ہے کہ تم میرے نجی معاملات میں دخل اندازی کرو۔ میں صبح ہوتے ہی تمہیں لاہور بھجوا دوں گی۔''

''باجی پلیز! میرا یہ مطلب نہیں تھا، میں تو محض آپ کے خیال سے کہہ رہی تھی۔'' شہلا کی آواز گلوگیر ہو گئی۔

پہلے تو میں نے سوچا کہ واپس چلا جاؤں لیکن میرے سر میں اب شدید درد شروع ہو گیا تھا اور کنپٹیاں گویا چیخ رہی تھیں۔ میں ایک دفعہ پھر داخلی دروازے سے باہر نکلا اور اپنی

انگلیوں کے جوڑ سے شیشے پر دستک دے کر بولا۔ ''ارے بھئی، یہاں کوئی ہے؟''

شہناز کا کمرا صدر دروازے کے بالکل ساتھ تھا۔ اس کے کانوں میں میری دستک پہنچی ہوگی اور میری آواز بھی۔ میں نے وہ جملہ بھی دروازہ تھوڑا سا کھول کر ادا کیا تھا۔

''کون ہے؟'' اندر سے شہلا کی آواز سنائی دی، پھر ٹائلوں والے فرش پر اس کی چپلوں کی دھیمی سی آہٹ سنائی دی، پھر وہ دروازے پر آ گئی۔ اس نے بڑھ کر دروازہ کھولا اور حیرت سے بولی۔ ''نواب صاحب آپ؟ خیریت تو ہے؟''

''ڈیوٹی پر اس وقت آپ ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ڈیوٹی پر تو شہناز باجی ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میں تو ان کے پاس آ کر بیٹھ گئی تھی۔ میں آج دن میں بہت زیادہ سوئی ہوں اس لیے نیند نہیں آ رہی تھی۔'' اس نے وضاحت کی۔

میں شہناز کے ڈیوٹی روم کی طرف بڑھا تو وہ بھی دروازے سے باہر آ رہی تھی۔ ''کیا بات ہے رفیق؟'' شہناز نے میرے چہرے کی طرف غور سے دیکھا۔

''میرے سر میں شدید درد ہو رہا ہے اور دونوں کنپٹیاں بری طرح چیخ رہی ہیں۔'' میں نے کہا۔

''تم ادھر لیٹ جاؤ۔'' اس نے اپنے کمرے میں لگے ہوئے اس بیڈ کی طرف اشارہ کیا جس پر وہ مریضوں کا معائنہ کرتی تھی۔

''اب میں اتنا بھی بیمار نہیں ہوں۔'' میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''دراصل مجھے نیند بہت زیادہ آ رہی تھی اور تقریباً میں سو گیا تھا کہ ایک ٹیلی فون کی وجہ سے اٹھ گیا۔ اس کے بعد سے نہ صرف نیند اڑ گئی بلکہ سر میں بھی شدید درد شروع ہو گیا۔''

شہناز نے میرا بلڈ پریشر چیک کیا تو حیرت سے بولی۔ ''مائی گاڈ! تمہارا بلڈ پریشر تو اس وقت اچھا خاصا ہائی ہے رفیق! کیا پریشانی ہے؟''

''پریشانیاں تو مجھے نہ جانے کیا کیا ہیں۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''اچھا میں تمہیں خواب آور گولیاں دے رہی ہوں اور بلڈ پریشر کو نارمل کرنے کے لیے بھی ایک انجکشن دے رہی ہوں۔ بس سارے خیالات ذہن سے جھٹک کر اطمینان سے سو جانا۔ مجھے تو ایسا لگ رہا ہے جیسے لاہور میں تمہاری نیند ہی پوری نہیں ہوئی ہے۔ آنکھوں کے گرد.... بھی حلقے پڑ گئے ہیں۔''

''راجا بھائی کا بھی یہی حال ہے، ان کا ویٹ بھی خاصا کم ہو گیا ہے۔'' ڈاکٹر شہلا نے کہا۔

''راجا تو انتہائی احمق آدمی ہے کہ میرے ساتھ ان پریشانیوں میں گھرا ہوا ہے، میں اسے سمجھا سمجھا کر تھک گیا کہ میری وجہ سے اپنی زندگی خراب مت کرو لیکن اس کی کھوپڑی میں کوئی بات بیٹھتی ہی نہیں ہے۔''

ڈاکٹر شہلا نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو، ابھی کچھ دیر پہلے یہی باتیں تو وہ بھی کر رہی تھی۔

''اچھا راجا کے ذکر کو اس وقت چھوڑو۔'' شہناز نے انجکشن میں دوا بھر کے میرے بازو سے شرٹ ہٹا دی۔ انجکشن لگانے کے بعد اس نے مجھے دو ٹیبلیٹس دیں اور بولی۔ ''انہیں بھی ابھی کھا لو اور جا کر آرام سے سو جاؤ۔''

شہلا نے بڑھ کر جگ سے گلاس بھرا اور میری طرف بڑھا دیا۔ اس کی آنکھیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے گلاس اسے واپس دیا تو وہ ہمدردی سے بولی۔ ''نواب صاحب! کیا تکلیف بہت زیادہ ہے؟''

''تکلیف تو اب آہستہ آہستہ کم ہو رہی ہے۔'' میں نے کہا اور کرسی سے اٹھ کر اپنا سلیپنگ گاؤن پہننے لگا۔

''اب جا کر سو جانا اور اپنا سیل فون آف کر دینا۔''

میں تھکے تھکے قدموں سے اپنے کمرے میں لوٹ آیا۔

میرے ذہن میں اب تک شہلا کے الفاظ گونج رہے تھے۔

میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب ہر قیمت پر راجا کو شادی کے لیے راضی کر لوں گا۔ شہلا جو کچھ کہہ رہی تھی درست تھا لیکن مجھے اس سے اس قسم کے رویے کی امید نہیں تھی۔ میں غیر ارادی طور پر ایک دفعہ پھر نہ چاہنے کے باوجود سوچ رہا تھا۔ میں نے تمام سوچوں کو ذہن سے جھٹک دیا اور آنکھیں موند کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ میں اپنا سیل فون پہلے ہی آف کر چکا تھا۔ میرا سر بھاری ہو رہا تھا، پھر نہ جانے کب مجھے نیند آ گئی۔

میری آنکھ کھلی تو دیوار گیر گھڑی بارہ بجا رہی تھی۔ کمرے میں خاصی روشنی تھی شاید نیلم یا ریشم میں سے کسی نے کھڑکیوں کے پردے ہٹا دیے تھے۔ میری ہی ہدایت تھی کہ صبح کے وقت میرے کمرے کی کھڑکیوں سے پردے سرکا دیے جائیں۔

میرا سر ابھی تک بھاری ہو رہا تھا۔ میں اٹھ کر باتھ روم

میں گھس گیا اور گرم پانی سے دیر تک غسل کرتا رہا۔ نہانے سے کسل مندی خاصی حد تک کم ہوگئی۔

میں کمرے میں پہنچا تو راجا کرسی پر بیٹھا جھول رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا اور طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ ''ٹھیکے پتر! رات سونے سے پہلے کیا تو نے بھنگ کے دو تین گلاس چڑھا لیے تھے؟''

''یار! وہ بھنگ تھی کیا واقعی؟'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''مجھے تو ڈاکٹر شہناز نے کھلائی تھی۔''

اسی وقت ریشم نے کمرے میں جھانکا اور بولی۔

''صاحب جی! ناشتا لاؤں؟''

''یہ ناشتے کا وقت ہے؟'' راجا نے آنکھیں نکالیں۔

''صاحب جی! میں تو......''

''تم ناشتا لے کر آؤ ریشم!'' میں نے اس سے کہا۔

میں ناشتے سے فارغ ہو چکا تو راجا نے مجھے بتایا۔ ''ٹھیکے پتر! آج صبح صبح پولیس کی ایک وین ہمارے ہلاک شدہ گارڈ کی ڈیڈ باڈی لے آئی تھی۔''

''ہاں یار۔'' میں چونک کر بولا۔ ''ابھی تو اس کی تجہیز وتکفین بھی ہونی ہے۔''

''اس کی ڈیڈ باڈی پولیس صبح کے چار بجے یہاں لے کر آئی تھی۔'' راجا نے کہا۔ ''ہم اس کی تجہیز وتکفین سے فارغ ہو چکے ہیں۔''

''میری وجہ سے کتنے انسان موت کی بھینٹ چڑھتے جا رہے ہیں راجا!''

''ٹھیکے پتر! تو اس وقت کچھ مت سوچ، شہناز نے منع کیا ہے کہ تیرے ذہن پر ذرا بھی دباؤ نہیں پڑنا چاہیے۔''

شہناز کا نام سن کر مجھے شہلا کی گفتگو یاد آئی۔ واقعی میری وجہ سے راجا، شہناز اور کتنے ہی لوگ پریشان تھے، میں نے راجا سے کہا۔ ''راجا ایک بات کہوں، برا تو نہیں مانے گا؟''

''تیری بات پر منحصر ہے۔'' راجا نے بے نیازی سے کہا۔ ''ہوسکتا ہے، میں تیری وہ بات ہنس کر برداشت کرلوں اور ٹھیکے پتر! یہ بھی ہوسکتا ہے کہ میں وہ بات سن کر تیرا سر توڑ دوں۔'' راجا کے لہجے میں شوخی تھی۔ ''تو جانتا ہے کہ میں برا مانتا ہوں تو نخریلی لڑکیوں کی طرح منہ نہیں پھلاتا بلکہ سامنے والے کا منہ توڑنے کی کوشش کرتا ہوں، اب بول!''

''اس بات کو مذاق میں مت لینا راجا! میں بہت سیریس ہوں۔''

''اب پھوٹ بھی چک!'' راجا نے جھنجلا کر کہا۔ ''میں تیری بات پر برا مانوں یا نہ مانوں لیکن تیرے اس اصرار پر ضرور برا مان جاؤں گا۔''

''تو شہناز سے شادی کرلے۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''میں شہناز ہی سے شادی کروں گا۔'' راجا نے تضحیک آمیز لہجے میں کہا۔ ''ٹھیکے پتر! تجھے یہ شبہ کیوں ہوگیا کہ میں کسی اور سے شادی کرنے والا ہوں۔''

''سیریس ہوجا راجا!'' میں نے جھنجلا کر کہا۔ ''تو شہناز سے اسی ہفتے شادی کرلے راجا!'' میں نے کہا۔ ''یہ میری خواہش ہے۔''

''تو تو یوں کہہ رہا ہے جیسے فلموں میں بیمار مائیں اپنے بیٹوں کی خوشامد کرتی ہیں کہ بیٹا شادی کرلے، یہ میری زندگی کی آخری خواہش ہے تاکہ میں آرام سے مرسکوں۔''

''ہاں، یہ میری زندگی کی آخری خواہش ہے۔'' میں نے چیخ کر کہا۔ ''تجھے شہناز سے شادی کرنا پڑے گی۔''

''تو نے کوئی ایسا ویسا خواب تو نہیں دیکھ لیا ٹھیکے پتر!'' راجا نے ہنس کر کہا۔ ''ویسے خوابوں کی تعبیر ہمیشہ الٹی ہوتی ہے۔''

''بات کو مذاق میں مت اڑا راجا!'' میں نے کہا۔ ''تجھے اسی ہفتے شادی کرنا ہوگی۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

راجا نے چونک کر مجھے دیکھا، پھر سنجیدہ ہو کر بولا۔

''اور اگر میں ایسا نہ کروں تو؟''

''تو پھر تیرے اور میرے راستے الگ ہوں گے۔'' میں نے یہ جملہ بھی انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

راجا چند لمحے تک مبہوت ہو کر مجھے دیکھتا رہا، پھر بولا۔ ''اگر ہماری برسوں کی دوستی محض اس ایک بات پر قائم تھی تو مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ میں نے تجھ سے دوستی ہی کیوں کی؟'' وہ چند لمحے توقف کے بعد بولا۔ ''ایسے کتنے ہی موقعے آئے جب میں نے تجھ سے کہا کہ ٹھیکے شادی کرلے۔ میں نے وہ بات مذاق میں نہیں کہی تھی لیکن تو نے یا تو ہر بار بات کو مذاق میں اڑا دیا یا پھر میری تجویز پر کان نہ دھرے۔ کیا میں نے دوستی ختم کرنے کی بات کی؟''

''وہ بات اور تھی؟'' میں نے کہا۔

''کیا واقعی؟'' راجا نے منہ بنا کر کہا۔ ''اس لیے کہ تو نواب اور لارڈ ہے اور بڑے لوگ اپنے غریب دوستوں کی بات سن تو لیتے ہیں لیکن اسے جوتے کی نوک پر مارتے ہیں۔''

''بات کو دوسرا رنگ دینے کی کوشش مت کر راجا!''

میں نے چیخ کر کہا۔ ''تجھے میری بات ماننا ہی پڑے گی۔''

''اس سے پہلے ہی میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔'' راجا نے کہا۔ ''میں...... میری...... اور...... تیری دوستی...... یہیں تک تھی۔'' راجا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور بچوں کی طرح آنسو بہانے لگا۔

''راجا! میری بات تو سن!'' میں نے اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا۔

اس نے بری طرح میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ ''آج کے بعد راجا تیرے لیے مرگیا۔'' اس نے اپنے آنسو صاف کیے۔

اس وقت شہناز کمرے میں داخل ہوئی اور کمرے کا منظر دیکھ کر حیران رہ گئی۔

''یہ تم لوگ چیخ پکار کیوں کر رہے ہو؟'' شہناز نے کہا۔

''اپنا سامان باندھو اور چلنے کی تیاری کرو۔'' راجا نے شہناز سے کہا۔ ''ہم ابھی اور اسی وقت ست بدھائی سے جا رہے ہیں، اب یہاں ہمارے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔''

''آخر ہوا کیا؟'' شہناز نے پوچھا۔

''ضروری نہیں کہ ہر بات تمہیں بھی بتائی جائے۔'' راجا نے اسے بری طرح جھڑک دیا۔

''بیٹھو شہناز!'' میں نے کہا۔ ''میں بتاتا ہوں، میں نے اس الو کے پٹھے سے صرف اتنا کہا ہے کہ تو شادی کرلے۔ اس پر یہ اتنا ہنگامہ کر رہا ہے۔''

''تو نے صرف اتنا ہی کہا ہے؟'' راجا نے چیخ کر کہا۔ ''یہ بھی تو بتا کہ تو نے شادی نہ کرنے پر مجھے دھمکی کیا دی ہے؟''

''وہ بات تو غصے میں میرے منہ سے نکل گئی تھی۔'' میں نے کہا۔

''غصے میں تو کچھ بھی کرسکتا ہے ٹھیکے...... سوری نواب رفیق احمد شیرازی!'' راجا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''آپ اپنے کسی چاہنے والے کی جان بھی لے سکتے ہیں اور پھر کہہ سکتے ہیں کہ غصے میں ایسا ہوگیا۔''

''شہناز! میں نے صرف اتنا کہا ہے کہ اگر تو نے ایک ہفتے کے اندر اندر شہناز سے شادی نہیں کی تو ہمارے تعلقات ختم ہوجائیں گے۔''

''تم نے ایسا کیوں کہا؟'' شہناز نے کہا۔ ''کیا تم راجا کی عادت جانتے نہیں ہو، یہ تو اس کی دوستی کی توہین ہے۔''

''تم بھی ایسا سمجھتی ہو؟'' میں نے کہا۔ ''میری وجہ سے تم لوگ اس گورکھ دھندے میں پھنسے ہوئے ہو۔ فرض کرو کہ میرے حالات آئندہ پانچ سال یا دس سال تک درست نہ ہوئے تو کیا تم میری وجہ سے اپنی زندگیاں خراب کرو گے؟''

شہناز نے چونک کر مجھے دیکھا، پھر بولی۔ ''اچھا، اب میں سمجھی، رات تم نے شہلا کی باتیں سن لی ہیں۔ یہ انتہائی بداخلاقی ہے رفیق!''

''میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے تو محض اتفاق سے وہ باتیں سن لیں۔ اسے بھی یہاں بہت تکلیف ہے، تم ڈاکٹر شہلا کو بھی پہلی فرصت میں لاہور روانہ کردو۔ میرے مسائل اور میری دشمنیاں آخر دوسرے کیوں نبھائیں۔ یہاں تو ایک طرح سے وہ قلعہ بند ہو کر رہ گئی ہے، کوئی سوشل لائف نہیں ہے، نہ کہیں آنا، نہ کہیں جانا، وہ بے چاری تو حویلی سے باہر بھی نہیں نکل سکتی۔''

راجا حیرت سے منہ پھاڑے میری باتیں سن رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''ٹھیکے پتر! یہ تم لوگ کیا باتیں کر رہے ہو؟ کیا کہا ہے شہلا نے؟''

''ڈاکٹر شہلا کو شہناز کی بہت فکر ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اور وہ بھی ایک طرح سے ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ میرے مسائل کی سزا تم لوگ کیوں بھگتو، وہ بے چاری تو شہناز کی ہمدردی میں ہی کہہ رہی تھی۔''

''تم کھل کر بات کیوں نہیں کرتے؟'' راجا نے کہا۔ وہ اس وقت شدید غصے میں تھا۔ اس کی علامت یہ تھی کہ وہ غصے میں مجھے ''تو'' کی بجائے تم یا آپ کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔

''میں نے تو کھل کر ہی بات کی تھی راجا!'' میں نے کہا۔ ''اس لیے تو میں تیری شادی پر زور دے رہا ہوں۔ میرے کیے کی سزا آخر تم لوگ کب تک بھگت سکتے ہو؟''

''یہ تم کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو رفیق؟'' ڈاکٹر شہناز نے کہا۔ ''شہلا ابھی بچی ہے، کم عقل ہے، وہ ناسمجھی میں کچھ ایسی باتیں کرگئی تو تم اتنا برا مان گئے؟''

''میں نے بالکل برا نہیں مانا بلکہ میں تو شرمندہ ہوگیا ہوں۔ اس کی ایک ایک بات درست تھی۔''

''میں آج ہی شہلا کو لاہور بھجوا دیتی ہوں۔'' شہناز نے کہا۔

''وہ تو خیر جائے گی ہی۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ......''

''تم بھی کیسی بچوں والی باتیں کر رہے ہو رفیق؟'' شہناز نے جھنجلا کر کہا۔ ''تم ہر طرف سے مصیبتوں میں گھرے ہوئے ہو اور ہم شادی رچا کر بیٹھ جائیں؟''

''مصیبتیں تو اب میرے ساتھ ہی چلیں گی۔ اگر نور

موجود ہوتی تو خدا کی قسم میں خود بھی شادی کر لیتا۔ شادی کرنے سے کیا مصیبتوں میں اضافہ ہو جائے گا یا کمی واقع ہو جائے گی؟"

"اچھا، یہ بات ہے تو ہماری ایک شرط ہے۔" شہناز نے کہا۔

"ہماری کوئی شرط نہیں ہے۔" راجا نے کہا۔ "شرطیں وہاں پیش کی جاتی ہیں جہاں کوئی تعلق ہو۔ نواب صاحب تو اپنی ایک شرط کے ذریعے ہر تعلق ختم کر چکے ہیں۔ تم چلنے کی تیاری کرو۔"

"تم دونوں ہی بچے ہو۔" شہناز جھنا کر بولی۔

"تمہیں اگر یہاں رہنا ہے تو شوق سے رہو۔" راجا کھڑا ہو گیا۔ "میں جا رہا ہوں۔"

"تمہیں کیا ہو گیا ہے راجا؟" شہناز نے بے بسی سے کہا۔ "کیا تم رفیق کے بغیر زندہ رہ سکو گے؟"

"اگر یہ زندہ رہ سکتا ہے تو میں زندہ کیوں نہیں رہ سکتا؟" راجا نے کہا۔

"یہ الو کا پٹھا تو بکواس کر رہا ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ لاتوں کا بھوت ہے باتوں سے......"

"نواب صاحب!" راجا بپھر کر بولا۔ "اپنی زبان کو لگام دیں، میں نے آج تک کسی بڑے سے بڑے نواب، جاگیردار، سیاست دان اور بیوروکریٹس کی گالیاں نہیں سنیں بلکہ انہیں گالیاں دی ہیں۔"

"راجا!" میں نے بھی بپھر کر کہا اور زناٹے کا ایک تھپڑ اس کے چہرے پر رسید کر دیا۔ "تو مجھے اس سے بڑی اور کیا گالی دے گا۔ تو جاتا ہے تو چلا جا!" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "میں سمجھ لوں گا کہ جیسے میرے والدین مر گئے، دوسرے چچا مر گئے، ایک دوست بھی مر گیا۔ پھر کون جانے میری زندگی بھی کتنی ہے۔ جا...... اب میں تجھے نہیں روکوں گا۔" میرے آنسو بہنے لگے۔ "تو نے آج برسوں کی دوستی کو خاک میں ملا دیا راجا!" میں نے روتے ہوئے کہا۔ "میں نے تو اس مان کے ساتھ یہ شرط رکھی تھی کہ تو دوستی کی لاج رکھے گا۔ تو نے تو مجھے میری ہی نظروں میں گرا دیا۔ تو مجھے نواب ہونے کا طعنہ دے رہا ہے؟ جب تجھ سے دوستی ہوئی تو میں کہاں کا نواب تھا؟ کہاں کا لارڈ تھا۔ ہم دونوں تو میلوں پیدل چلتے تھے، میں تو اب تک تجھے وہی راجا سمجھ رہا تھا لیکن تو...... تو اب ملک کا ایک نامور صحافی ہے، تیرے قلم کی کاٹ سے بڑے بڑے سیاستدان ڈرتے ہیں تو پھر تجھے بھی ڈرنا چاہیے۔" میں نے قمیص کی آستین سے اپنے آنسو صاف کیے اور بولا۔ "جا راجا!...... اب میں نہ تجھے روکوں گا اور نہ شہناز کو۔ میں تم دونوں کا احسان مند ہمیشہ رہوں گا کہ تم نے ایک طویل عرصے تک میرے ساتھ رہ کے صعوبتیں برداشت کیں، سختیاں جھیلیں۔ اس کے لیے مجھے معاف کر دینا۔ ہاں، میں ایک وصیت ضرور کروں گا کہ اگر میں مر جاؤں تو راجا کو میرا یہ مکروہ چہرہ نہ دکھایا جائے۔" یہ کہہ کر میں کمرے سے باہر نکل گیا۔

"رفیق...... سنو تو...... رفیق!" شہناز آواز ہی دیتی رہ گئی۔

میں وہاں سے سیدھا باغ میں آیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ دنیا اس وقت مجھے بے رنگ لگ رہی تھی۔

میں اضطراب کے عالم میں باغ کی ایک سنگل بینچ پر بیٹھ گیا لیکن پھر بھی میرے اضطراب میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی تو میں اٹھ کر ٹہلنے لگا۔

اس وقت مجھے نیلم دکھائی دی۔ وہ میری ہی طرف آ رہی تھی۔ میں نے اس پر کوئی دھیان نہ دیا اور جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ نکالا اور اسے سلگانے لگا۔

نیلم میرے نزدیک آ کر رک گئی اور جھجکتے ہوئے بولی۔ "صاحب جی!...... آپ...... کچھ پریشان ہیں؟"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا، بس اسے گھور کر دیکھا اور دوبارہ سگریٹ پھونکنے میں مشغول ہو گیا۔

"صاحب جی!...... آپ...... اتنی سگریٹ تو نہیں پیتے تھے...... آپ......"

"تم سے کس نے کہا ہے کہ میرے ذاتی معاملات میں مداخلت کرو۔" میں چیخ کر بولا۔ "تم نے مجھ سے پوچھنے کی جرأت بھی کیسے کی؟"

اس کا چہرہ کورے لٹھے کی طرح سفید ہو گیا اور وہ بری طرح سہم کر مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے اس سے تو کیا، کسی بھی ملازم سے اس انداز میں گفتگو نہیں کی تھی۔ "کیا تمہیں نہیں معلوم کہ مالک جب تک کسی ملازم کو طلب نہ کرے، ملازم کو اس کے سامنے نہیں آنا چاہیے اور باغ کا یہ حصہ تو حویلی کے ہر ملازم کے لیے ممنوعہ حصہ ہے، تم یہاں تک آئیں کیسے؟"

نیلم خوف کے مارے بری طرح کانپنے لگی۔

میں نے چیخ کر کہا۔ "سرور!"

سرور ایک منٹ سے بھی کم عرصے میں وہاں پہنچ گیا۔

وہ غالباً بہت تیزی سے بھاگتا ہوا آیا تھا۔ اس کا سانس بری طرح پھولا ہوا تھا۔

"جی سر!" اس نے مستعدی سے کہا۔

"یہ لڑکی یہاں تک کیسے پہنچی؟" میں نے چیخ کر نیلم کی طرف اشارہ کیا۔ "کیا مجھے یاد دلانا پڑے گا کہ تمہاری ذمے داری کیا ہے؟"

سرور نے ایک نظر نیلم کی طرف دیکھا جو اب بے ہوش ہونے کے نزدیک تھی، پھر آہستہ سے بولا۔ "سر! معافی چاہتا ہوں...... میں سمجھا کہ اسے آپ نے خود طلب کیا ہے۔"

"تم سب نکمے ہو گئے ہو۔" میں دھاڑ کر بولا۔

اسی وقت شہناز وہاں آ گئی۔ اس نے سرور سے کہا۔

"سرور! تم یہاں سے جاؤ۔ نیلم! تم بھی جاؤ۔"

اس کی بات سنتے ہی نیلم یوں گرتی پڑتی وہاں سے گئی جیسے اسے اپنے قدموں پر اختیار نہ ہو۔

"تم راجا کا غصہ دوسرے لوگوں پر کیوں اتار رہے ہو؟" شہناز نے کہا۔ "نیلم کی حالت دیکھی ہے، مجھے تو شبہ ہو رہا تھا کہ کہیں اس کی حرکت قلب ہی بند نہ ہو جائے۔ تم تو واقعی نواب بن گئے ہو رفیق!"

اچانک غنی تیزی سے وہاں آیا اور شہناز سے بولا۔ "ڈاکٹر صاحبہ! وہ سرور بتا رہا ہے کہ نیلم کی حالت خراب ہو گئی ہے۔ سرور اسے اٹھا کر اسپتال کی طرف لے گیا ہے۔"

"میں دیکھتی ہوں۔" شہناز نے کہا۔ پھر مجھ سے بولی۔ "دیکھا تم نے! لیکن تمہیں کیا فرق پڑے گا۔ وہ مرے یا جیے۔ نوابوں اور جاگیرداروں کے ملازمین مرتے ہی رہتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ طنزیہ نظروں سے میری طرف دیکھتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں؟ میرا موڈ دیکھ کر غنی بھی وہاں سے کھسک گیا تھا۔

میں نے اچانک ست بدھائی چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں اس جاگیر سے تنگ آ گیا تھا۔ اسے پانے کے بعد میں نے اپنے بہت سے رشتے کھو دیے تھے۔ مجھے رابعہ یاد آئی، اگر یہ جاگیر نہ ہوتی تو میری اس سے کبھی دشمنی نہ ہوتی، اس جاگیر کی وجہ سے نہ جانے کتنے لوگ مارے گئے تھے اور نہ جانے آئندہ کتنے مارے جانے والے تھے۔ ممکن ہے یہ جاگیر ہی میری جان بھی لے لے۔ میری آدھی جان تو راجا سے تعلق ٹوٹنے کے بعد نکل ہی چکی تھی، میں نے سوچا تھا کہ یہاں سے لاہور جاؤں گا۔ وہاں کسی گمنام گوشے میں رہ کر نور کو تلاش کروں گا۔ پھر اس کے ساتھ لندن جاؤں گا اور یہ جاگیر ٹرسٹ کے نام کر دوں گا۔

میں نے یہ سوچ کر غنی کو آواز دی۔ "غنی!"

غنی کی بجائے سرور دوڑا ہوا آیا اور بولا۔ "یس سر!"

"غنی کہاں ہے؟" میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"میں غنی کو بھیجتا ہوں سر!" سرور نے کہا اور بھاگتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ میرا یہ رویہ اس کے لیے بھی ناقابل فہم تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے اس کا اظہار ہو رہا تھا۔

تھوڑی دیر بعد غنی وہاں آ گیا۔ وہ بھی بری طرح ہانپ رہا تھا۔

میں نے اس سے کہا۔ "اب تم لوگ اتنے نازک مزاج ہو گئے ہو کہ حویلی میں ایک جگہ سے دوسری جگہ آنے میں ہانپ جاتے ہو؟ کیا میں تم لوگوں کے لیے کسی گاڑی کا بندوبست کروں؟"

"سر، میں اس وقت مین گیٹ کی طرف تھا، سرور کا پیغام ملتے ہی دوڑا ہوا ادھر آیا ہوں۔" غنی نے کہا۔

مین گیٹ وہاں سے اچھے خاصے فاصلے پر تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "تم میرے کمرے میں جاؤ اور ایک سوٹ کیس میں میرے دو تین جوڑے اور دوسرا ضروری سامان رکھ دو۔"

"او کے سر!" غنی نے کہا۔

"اور ہاں، میرا بریف کیس، تمام چیک بکس اور کریڈٹ کارڈز، اے ٹی ایم کارڈز اور پاسپورٹ وغیرہ بریف کیس میں چیک کر لینا۔"

"او کے سر!" غنی نے کہا اور جانے کے لیے مڑا۔

"یہ تمام سامان گاڑی میں رکھو اور گاڑی نکال کر مجھے اطلاع دو۔"

"کون سی گاڑی میں رکھوں سر؟" غنی نے پوچھا۔

"پراڈو یا لینڈ کروزر میں؟"

"ڈبل کیبن پک اپ میں۔" میں نے کہا۔ "اور کوئی گارڈ میرے ساتھ نہیں جائے گا۔"

"او کے سر!" غنی نے تیسری مرتبہ کہا اور جانے کے لیے مڑ گیا۔

میں اضطراب کے عالم میں وہاں کھڑا سگریٹ پھونکتا رہا۔ اضطراب زیادہ بڑھتا تو میں ٹہلنے لگتا۔

اچانک مجھے شہلا کی آواز سنائی دی۔ وہ چیخ کر کسی سے کہہ رہی تھی۔ "تم ہوتے کون ہو مجھے روکنے والے؟"

جواب میں کسی کی آواز آئی لیکن لہجہ اتنا دھیما تھا کہ مجھے کچھ سنائی نہ دیا۔

میں تیزی سے اس طرف بڑھا۔ وہاں شہلا کھڑی ہوئی تھی اور سرور پر برس رہی تھی۔ ''اپنی حد سے تجاوز مت کرو، میں......''

''کیا بات ہے ڈاکٹر شہلا؟'' میں نے پوچھا تو شہلا اور سرور دونوں نے چونک کر مجھے دیکھا۔

''آپ کا یہ باڈی گارڈ مجھے اس طرف آنے سے روک رہا ہے۔'' شہلا نے کہا۔ ''کہہ رہا تھا کہ نواب صاحب اس وقت کسی سے بھی ملنے کے موڈ میں نہیں ہیں۔''

میں نے سرور کی طرف دیکھا تو وہ سہمی ہوئی نظروں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

''اس میں اس کا قصور نہیں ہے ڈاکٹر صاحبہ!'' میں نے کہا۔ ''میں نے ہی اس سے کہا تھا کہ میں اس وقت تنہائی چاہتا ہوں، کسی کو بھی ادھر آنے مت دینا۔''

''او!'' شہلا طنزیہ لہجے میں بولی۔ ''سوری نواب صاحب! میں نے آپ کو ڈسٹرب کر دیا۔''

''کوئی بات نہیں، آیئے، تشریف لایئے۔''

وہ عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے پھولوں کے اس کنج میں آ گئی جہاں میں اب تک ٹہلتا رہا تھا۔ وہاں جا بہ جا سگریٹ کے ٹوٹے بکھرے ہوئے تھے۔

''میں صرف آپ کو یہ بتانے آئی تھی نواب صاحب کہ میں لاہور جا رہی ہوں۔ میری ذات پر آپ کے کئی احسانات ہیں، میں نے سوچا کہ جاتے ہوئے آپ سے الوداعی ملاقات کر لوں۔''

''احسان تو آپ کا مجھ پر ہے ڈاکٹر شہلا!'' میں نے کہا۔ ''آپ نے اتنا عرصہ ایک ویرانے میں بلکہ قید خانے میں گزارا۔ میں اس کے لیے آپ کا ممنون ہوں۔''

''آپ کو احسان مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے نواب صاحب!'' اس نے کہا۔ ''یہ میری اپنی چوائس تھی۔ پھر میں نے یہاں رہ کر بھاری سیلری وصول کی ہے۔ میں نے آپ پر کون سا احسان کیا ہے، مجھ سے کوئی غلطی ہو گئی ہو تو معاف کر دیجیے گا۔'' اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ''میں جانتی ہوں، آپ میری ان باتوں سے ہرٹ ہوئے ہیں جو میں شہناز باجی سے کر رہی تھی۔ میرا مقصد آپ کی توہین نہیں تھا۔ میں تو......''

''میں سمجھتا ہوں ڈاکٹر!'' میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''آپ نے تو بہت نیک نیتی سے بات کی تھی۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ آپ نے یہاں سے جانے کی کوئی بات نہیں کی تھی لیکن......''

''لیکن وہ باتیں آپ کی طبع نازک پر گراں گزری ہیں۔'' شہلا نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

وہ نیلم نہیں تھی جو میری ایک ہی ڈانٹ میں سہم جاتی یا پھر میرے چیخنے چلانے پر بے ہوش ہو جاتی۔

''میری وجہ سے آپ کے اور راجا بھائی کے تعلقات خراب ہو گئے۔ مجھے زندگی بھر اس کا قلق رہے گا۔''

''ڈاکٹر شہلا! آپ بھی مجھ پر طنز کر رہی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''میں اور طنز!'' شہلا نے حیرت سے کہا۔

میں نے اس کی بات کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا ورنہ ممکن ہے کہ اس کی مزید طنزیہ گفتگو پر میرا دماغ گھوم جاتا۔

میں نے ٹھہرے ہوئے پرسکون لہجے میں کہا۔ ''میں تمہیں لاہور تک بھجوانے کا بندوبست کر دیتا ہوں۔''

''میں راجا بھائی کے ساتھ جا رہی ہوں۔'' ڈاکٹر شہلا نے کہا۔ ''آپ اپنا خیال رکھیے گا۔'' اس نے زخمی نظروں سے مجھے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو۔ ''مجھے آپ سے یہ امید نہیں تھی۔'' پھر وہ اپنی مخصوص کیٹ واک والی چال میں وہاں سے چلی گئی۔

یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ میں نے عالمِ اضطراب میں سوچا۔ میں تنہا کیوں ہوتا جا رہا ہوں؟

میں نے سگریٹ کے لیے پیکٹ کھولا تو اس میں سگریٹ نہیں تھی۔ میں نے وہ پیکٹ ایک طرف اچھال دیا۔

تھوڑی دیر بعد غنی نے آ کر بتایا۔ ''سر! میں نے آپ کا سامان پیک کر دیا ہے اور اسے ڈبل کیبن پک اپ میں رکھ دیا ہے۔ میں نے گاڑی گیراج سے نکال لی ہے۔ گیراج کے مکینک نے اس کا انجن، تیل پانی، ٹائر وغیرہ چیک کر لیے ہیں۔ گاڑی کا پیٹرول ٹینک آدھے سے زیادہ بھرا ہوا ہے۔ سی این جی بھی کافی ہے۔''

''ٹھیک ہے غنی!'' میں نے کہا۔ ''تم جاؤ۔''

یہ کہہ کر میں اپنے کمرے کی طرف بڑھا۔ غنی ہر معاملے میں سمجھ دار اور محتاط تھا۔ میں کمرے پر نظر ڈال کر محض یہ تسلی کرنا چاہتا تھا کہ کوئی ایسی ضروری چیز تو رہ نہیں گئی ہے جس کی وجہ سے مجھے دوبارہ ست بدھائی آنا پڑے۔

بیڈ پر تکیے کے پاس ہی میری قیمتی گھڑی پڑی تھی۔ میں نے گھڑی اٹھا کر کلائی پر باندھی، پھر میں نے یونہی تکیہ اٹھا کر دیکھا تو مجھے وہاں اپنے دونوں ریوالور نظر آئے۔

''یہ غنی بھی بہت بڑا احمق ہے۔'' میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ ''اب مجھے اپنے بریف کیس کی چیزوں کو بھی ایک مرتبہ پھر چیک کرنا پڑے گا۔''

میں نے ریوالور کے فاضل کارتوسوں کے لیے دیوار گیر آہنی سیف کھولا تو اس میں مجھے اچھا خاصا کیش بھی نظر آیا۔ اس کے ساتھ ہی نور کا پاسپورٹ بھی رکھا ہوا تھا۔ میں نے وہ پاسپورٹ اٹھا کر جیب میں ڈال لیا اور غصے میں غنی کو آواز دی۔ ''غنی!''

میری دہاڑ پر غنی میرے کمرے میں داخل ہوا جیسے اس کے پیچھے خونخوار قسم کے کتے لگے ہوئے ہوں یا اگر اسے ایک سیکنڈ کی بھی تاخیر ہو جائے گی تو میں اس کی موت کا حکم صادر کر دوں گا۔

''یس سر!'' وہ بوکھلا کر بولا۔

''لگتا ہے اب تم بھی ناکارہ ہو گئے ہو۔ تم نے میرا سامان پیک کر دیا ہے؟''

''یس سر!'' اس نے جلدی سے جواب دیا۔

''تمہارا کیا خیال ہے کہ میں یہاں سے بغیر کسی ہتھیار کے نکلوں تاکہ دشمنوں کا کوئی بھی آدمی آسانی سے مجھے مار لے؟''

''سر، میں آپ کے ریوالور اٹھانے ہی والا تھا کہ......''

''تمہیں کوئی اور کام یاد آ گیا اور تم ریوالور اٹھانا بھول گئے۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''نو سر!'' غنی نے آہستہ سے کہا۔ ''گاڑی میں بھی ہتھیار موجود ہیں اور میرے پاس بھی......''

''میں نے یہ کب کہا کہ تم بھی میرے ساتھ جا رہے ہو؟'' میں نے درشت لہجے میں کہا۔

''سر! سرور اور احمد شاہ بھی ہمیشہ مسلح رہتے ہیں۔'' غنی نے آہستہ سے کہا۔

''میں کسی کو بھی اپنے ساتھ نہیں لے جا رہا ہوں۔'' میں نے بلند آواز میں کہا۔ ''نہ تم، نہ سرور اور نہ احمد شاہ! کوئی بھی میرے ساتھ نہیں جائے گا۔''

غنی حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔

''میں ست بدھائی ہمیشہ کے لیے چھوڑ رہا ہوں۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

''سر! اس کے باوجود آپ تنہا کیوں جا رہے ہیں؟''

''اب تم بھی مجھ سے جواب طلب کرو گے؟'' میں نے دہاڑ کر کہا۔

''آپ ست بدھائی ہمیشہ کے لیے چھوڑ رہے ہیں۔'' غنی کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔

''ہاں، میں نے یہی فیصلہ کیا ہے۔''

''سر! پھر آپ مجھے بھی فارغ کر دیں۔'' غنی نے کہا۔ ''جب میرا کوئی مصرف ہی نہیں ہے تو پھر یہاں رہنے کا کیا فائدہ؟''

''غنی......تم بھی......تم بھی مجھے چھوڑنے کی بات کر رہے ہو؟''

''سر، میں نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی۔ اس کا فیصلہ تو آپ نے کیا ہے۔ آپ ست بدھائی بھی ہمیشہ کے لیے چھوڑ رہے ہیں، مجھے ساتھ بھی نہیں لے جانا چاہتے تو پھر میرا کیا مصرف رہ جاتا ہے؟''

''لیکن غنی......!''

''سر! میں آپ کے بغیر رہنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا......لیکن آپ کا حکم ٹال بھی تو نہیں سکتا۔ میں نے اتنا عرصہ آپ کی خدمت کی ہے۔ اگر اس پورے عرصے میں مجھ سے یا ریشم سے کسی بھی قسم کی کوئی غلطی یا کوتاہی ہوئی ہو تو ہمیں معاف کر دیجیے گا۔'' غنی کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ لمبا چوڑا آدمی اس وقت بچوں کی طرح رو رہا تھا۔

''آپ نے مجھ پر بے شمار احسانات کیے ہیں سر! میں جب تک زندہ رہوں گا، ان کے بوجھ تلے دبا رہوں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنی جیب سے دونوں ریوالور نکالے، اپنا سیل فون نکالا جو اسے سیکیورٹی چیف کی حیثیت سے دیا گیا تھا، پھر اس نے وہ چیزیں میرے سامنے میز پر رکھ دیں۔ مجھے فوجی انداز میں سلام کیا اور اپنے آنسو پونچھتا ہوا رخصت ہو گیا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' میرے اندر سے آواز آئی۔ ''تم تو بہت بڑے جاگیردار ہو، نواب ہو، لارڈ ہو، تمہیں ملازموں کی کیا کمی؟ تمہارے ایک اشارے پر بے شمار آدمی تمہاری خدمت میں حاضر ہو جائیں گے۔''

میں نے سیف میں رکھا ہوا تمام کیش اٹھا کر ایک رومال میں باندھا، اپنے دونوں ریوالورز جیب میں رکھے اور خالی الذہنی کے عالم میں کئی منٹ تک کھڑا یہی سوچتا رہا کہ اب میں کہاں جاؤں؟ میری عقل ماؤف ہو کر رہ گئی تھی،

دماغ پر عجیب سا بوجھ تھا۔ کوئی میرے اندر سے چیخ رہا تھا۔ ''رفیق! راجا کو ڈاکٹر شہناز کو، ڈاکٹر شہلا کو اور غنی کو روک لے ورنہ تو پلک جھپکتے میں بالکل اکیلا ہوجائے گا۔ یہی لوگ تو تیرے غم گسار اور جاں نثار تھے۔ یہ بھی چلے گئے تو تیرے پاس باقی کیا بچے گا۔ پیسے سے تو دنیا کی ہر چیز خرید سکتا ہے لیکن راجا کی دوستی، شہناز کی بے لوث محبت، ڈاکٹر شہلا کی اپنایت اور غنی کی جاں نثاری نہیں خرید سکتا۔ انہیں روک لے رفیق ورنہ تو بالکل تہی دست اور قلاش ہوجائے گا۔''

''میں انہیں کیسے روکوں؟'' میں نے کہا۔

''کیوں؟'' میرے اندر سے آواز آئی۔ ''کیا انہیں روکنے سے تیری شان میں فرق آجائے گا، کیا تیری نوابی کو ٹھیس پہنچے گی۔ انہیں روک لے رفیق، ورنہ وقت ہاتھ سے نکل گیا تو پھر کچھ باقی نہیں بچے گا۔''

میں نے جیب سے سیل فون نکالا اور بے اختیار غنی کا نمبر ملالیا۔

''جی سر!'' اس نے فوراً ہی جواب دیا۔

''ذرا میرے کمرے میں آؤ۔'' میں نے کہا اور سلسلہ منقطع کردیا۔

غنی فوراً ہی کمرے میں آگیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں اور چہرہ ستا کررہ گیا تھا۔

''یس سر!'' اس نے شکستہ لہجے میں کہا۔

''راجا صاحب کو ذرا میرے پاس بھیجو اور تم میرے جانے سے پہلے حویلی مت چھوڑنا۔''

''اوکے سر!'' اس نے کہا اور باہر نکل گیا۔ اس کی چال میں بھی وہ مستعدی نہیں تھی۔ گویا میرے ایک ہی جملے نے غنی جیسے مضبوط شخص کو توڑ پھوڑ دیا تھا۔ مجھے فوری طور پر اسے روکنے کا یہی طریقہ سوجھا تھا کہ اسے حویلی سے باہر نہ جانے دوں۔

تھوڑی دیر بعد وہ دستک دے کر اندر آگیا اور بولا۔ ''سر! وہ......راجا صاحب کہہ رہے ہیں......کہ......کہ......''

''کیا کہہ رہے ہیں وہ؟'' میں نے جھنجلا کر پوچھا۔

''سر، وہ کہہ رہے ہیں کہ میں نواب صاحب کا ملازم نہیں ہوں کہ ان کے طلب کرنے پر دوڑا چلا جاؤں۔ جاکر انہیں بتادو کہ میں نے آنے سے انکار کردیا ہے۔ ہاں، تم زبردستی مجھے وہاں لے جاؤ تو اور بات ہے۔''

مجھے امید نہیں تھی کہ راجا مجھ سے اتنا ناراض ہے، میں جانتا تھا کہ جب وہ کسی سے ناراض ہوتا تھا تو پھر مہینوں بلکہ برسوں اس سے ناراض رہتا تھا لیکن وہ میرے ساتھ یہ سلوک کرے گا، اس کا تو میں نے تصور بھی نہ کیا تھا۔

غنی مجھے راجا کا پیغام دے کر جاچکا تھا۔ میں خود ہی اٹھا اور راجا کے کمرے کی طرف چل دیا۔

اس کے کمرے کے نزدیک پہنچ کر میں ٹھٹک کر رک گیا۔ اندر سے راجا کی بھرائی ہوئی آواز آرہی تھی۔ ''یار، میں کیسے بھول جاؤں؟ رفیق نے تو برسوں کی دوستی کو ایک پل میں توڑ دیا۔ میں نے کبھی اسے خود سے الگ نہیں سمجھا اور اس نے کتنی بے مروتی سے کہہ دیا کہ اگر تمھیں میری یہ شرط منظور نہیں ہے تو ہماری دوستی ختم!''

''یار راجا!'' ناصر کی آواز آئی۔ ''نواب صاحب ایسے ہیں تو نہیں، نہ جانے انہوں نے کس انداز میں یہ بات کی ہو اور تم نے کس انداز میں اسے لیا ہو۔''

''میں رفیق کے ہر انداز کو جانتا ہوں ناصر! آج سے نہیں بلکہ لڑکپن سے، اس وقت سے جب ہم دوستی کے مفہوم سے بھی آشنا نہیں تھے۔''

''پھر بھی آپ اتنی پرانی دوستی کو ایک پل میں توڑ دیں گے، نواب صاحب کو ان حالات میں اکیلا چھوڑ دیں گے۔ وہ تو پہلے ہی چاروں طرف سے دشمنوں میں گھرے ہوئے ہیں؟''

''میں نے اس کی دوستی چھوڑی ہے ناصر!'' راجا نے کہا۔ ''لیکن اسے اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔ میں......''

مجھ سے ضبط نہ ہوسکا اور میں بے اختیار کمرے میں داخل ہوگیا۔ اس کی باتیں سن کر میری آنکھوں میں نہ جانے کس وقت آنسو آگئے تھے۔

مجھے دیکھ کر اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ میں نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''الو کے پٹھے! تو مجھے چھوڑ کر جائے گا؟'' میں نے اچانک ریوالور نکال لیا۔

راجا کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔

میں نے ریوالور اس کے سامنے بیڈ پر پھینک دیا اور بولا۔ ''جانے سے پہلے مجھے اپنے ہاتھوں سے گولی ماردے ورنہ یہ احساس مجھے روز مارتا رہے گا کہ میں نے تیری دوستی کی قدر نہیں کی۔ تو، تو یہی سمجھتا ہے نا۔''

راجا بے اختیار ہوکر اپنی جگہ سے اٹھا اور بولا۔ ''کمینے، ذلیل، الو کے پٹھے! تو نے یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ میں تجھے چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔'' یہ کہہ کر وہ بے اختیار مجھ سے لپٹ گیا۔ ''اب تو موت ہی ہمیں ایک دوسرے سے الگ کر

سکتی ہے۔''

ناصر اس دوران میں کمرے سے کھسک لیا تھا۔

''ٹھیکے پتر!'' راجا نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''میں تو تیرا دوست ہوں، تیری رگ رگ سے واقف ہوں لیکن شہناز کو تیرے اس رویے سے شدید صدمہ پہنچا ہے۔''

''وہ بھی میری دوست ہے اور میری رگ رگ سے واقف ہے، البتہ شہلا کو ضرور صدمہ پہنچا ہوگا۔''

''تیرے اس چنگیزی رویے نے تو نیلم کو بھی بستر پر ڈال دیا۔''

''یار، اس کی طبیعت اب کیسی ہے؟''

''اگر تو اسے ایک دفعہ اور ڈانٹ دیتا تو اسے دل کا دورہ پڑجاتا۔ وہ لاکھ ملازمہ سہی لیکن ہم ہی لوگوں نے تو اس کی عادتیں بگاڑی ہیں۔ اب اس بیچاری کو کیا پتا کہ نواب صاحب اس وقت واقعی نوابی کے موڈ میں ہیں۔ وہ یہی سوچ کر تیرے پاس چلی گئی تھی کہ تیری پریشانی اس سے دیکھی نہیں گئی تھی۔''

''یار، میں اس سے معذرت کرلوں گا، پہلے تو ذرا شہلا کو یہاں بلوالے۔ میں اس سے معافی مانگ لوں۔ اس پورے واقعے میں وہ بے چاری فضول میں پس کررہ گئی ہے۔''

راجا نے اسی وقت غنی کو آواز دی اور اس سے کہا کہ ڈاکٹر شہلا کو بلالاؤ۔

تھوڑی دیر بعد شہلا افسردہ سی کمرے میں داخل ہوئی، مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ چونک اٹھی، پھر راجا سے مخاطب ہوئی۔ ''راجا بھائی! آپ نے مجھے بلایا ہے؟''

''آپ کو راجا نے نہیں بلکہ میں نے بلایا ہے شہلا!'' میں نے کہا۔

''جی فرمایئے۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''شہلا! میں تم سے بہت شرمندہ ہوں۔ تمہاری ذرا سی بات کا بتنگڑ بن گیا، میں نے واقعی اپنے جملوں سے تمھیں بہت ہرٹ کیا ہے۔''

''ارے ارے! یہ آپ کیا کررہے ہیں؟'' شہلا تڑپ کر بولی۔ ''آپ نے اُس وقت تو نہیں لیکن اب مجھے ضرور ہرٹ کردیا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ تم لاہور نہیں جارہی ہو؟''

''ارے یار! وہ میرے ساتھ لاہور جانے والی تھی۔ میں اگر لاہور جاتا تو شہلا بھی جاتی اور شہناز بھی! میرا تو کبھی ایسا ارادہ ہی نہیں تھا ورنہ اب تک یہاں نہ بیٹھا ہوتا۔ جانے والے اتنی دیر نہیں کرتے۔''

''ذلیل آدمی! تو مجھے بلیک میل کررہا تھا؟'' میں نے آنکھیں نکالیں۔

''ہاں، کبھی کبھی دوستوں کو بھی بلیک میل کرنا پڑتا ہے، ورنہ دوستی برقرار نہیں رہتی۔'' راجا نے ڈھٹائی سے کہا۔

اس کی بات پر شہلا ہنسنے لگی۔ مجھے ایسا لگا جیسے پورے کمرے میں رنگ سے بکھر گئے ہوں۔

اسی وقت شہناز کمرے میں داخل ہوئی اور ہمیں خوش گوار موڈ میں دیکھ کر بولی۔ ''شہلا! میں نے کہا تھا نا کہ یہ ان دونوں کی نورا کشتی ہے، تم بالکل فکر مت کرو۔ نہ تو راجا یہاں سے جائے گا، نہ رفیق اسے جانے دے گا۔'' پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ''رفیق! تم نے اس وقت تو میری بات نہیں سنی تھی۔ میں کہہ رہی تھی کہ میری ایک شرط ہے۔''

''ہاں بولو۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''کیا اب بھی کوئی شرط باقی ہے؟''

''ہاں۔'' شہناز نے کہا۔ ''اور شرط یہ ہے کہ تمہاری اور راجا کی شادی ایک ہی دن ہوگی۔ اب میں اس موضوع پر مزید کوئی بات نہیں سنوں گی۔''

''مجھے تمہاری یہ شرط منظور ہے۔'' میں نے اپنا ہاتھ بڑھایا جسے شہناز نے اپنے نرم و نازک ہاتھوں میں تھام لیا۔

''ہاں، اب وہ نیلم کیسی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ خوف اور صدمے سے بے ہوش ہوگئی تھی۔ اب ٹھیک ہے اور تھوڑی دیر بعد وہ بالکل نارمل ہوجائے گی۔''

''وہ تو اب تک اسپتال سے آبھی گئی ہوگی۔'' شہلا نے کہا۔

''راجا!'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''بہت سہہ لیے تیرے نخرے، اب اپنا سامان کھول دے۔''

''سامان کھول دوں؟'' راجا نے ہنس کر کہا۔ ''ٹھیکے پتر! تو کیا سمجھا تھا کہ میں اتنی آسانی سے تیرا پیچھا چھوڑ دوں گا؟ میں نے سامان باندھا ہی کب تھا؟'' راجا نے ہنستے ہوئے کہا۔

جواب میں اس کی پیٹھ پر میں نے ایک دھپ رسید کرتے ہوئے کہا۔ ''اور وہ جو تو ناصر سے بکواس کررہا تھا۔ اس کا کیا مطلب تھا؟''

''اس کا بھی یہی مطلب تھا کہ ناصر تجھے مجبور کرے کہ راجا کو روک لو۔''

''یار، ویسے تو ہے بہت کمینہ!'' میں نے ہنس کر کہا۔

''تیرا ہی دوست ہوں۔'' راجا نے ہنس کر کہا۔ ''آخر

محبت کا بھی کوئی اثر ہوتا ہے۔"

"میں تو اتنا جانتا ہوں مہاراجا کہ یہ پیار کرنے والے، دل سے نہیں نکلتے۔ بدلیں ہزار موسم، رشتے نہیں بدلتے۔" میں نے باقاعدہ گنگنا کر کہا۔

"یار! میں ذہنی طور پر بہت تھک گیا ہوں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اب ذرا دو گھڑی آرام کروں گا۔"

"تو ٹھہرا نواب!" راجا نے کہا۔ "تو اگر چار یا چھ گھڑی بھی آرام کرلے تو تجھے کون روکنے والا ہے؟"

"لیکن ابھی ایسے آرام کا وقت نہیں آیا۔" میں نے کہا۔ "عشق وہ کارِ مسلسل ہے کہ اپنے لیے۔ ایک لمحہ بھی پس انداز نہیں کرسکتے۔"

میں کمرے سے نکل رہا تھا کہ شہلا کی آواز آئی۔ "اپنی مٹی کو سر فراز نہیں کرسکتے۔ یہ در و بام تو پرواز نہیں کرسکتے۔"

میں چلتے چلتے رک گیا اور بولا۔ "شہلا تمہارا شعری ذوق تو بہت اچھا ہے۔" یہ کہہ کر میں اس غزل کا دوسرا شعر گنگناتا ہوا اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ "حسن کو حسن بنانے میں میرا ہاتھ بھی ہے۔ آپ مجھ کو نظر انداز نہیں کرسکتے!"

میں اپنے کمرے میں پہنچا تو فضا ہی بدلی ہوئی تھی۔ وہی کمرا جو مجھے کاٹ کھانے کو دوڑ رہا تھا، وہاں اب مجھے سکون اور راحت کا احساس ہو رہا تھا۔ بس ایک پھانس سی میرے دل میں چبھی ہوئی تھی کہ میں نے اس معصوم اور بے قصور لڑکی نیلم کو بہت بری طرح جھڑک دیا تھا۔

میں نے غنی کو آواز دی تو وہ فوراً کمرے میں آگیا۔

"جی سر!"

"غنی! تم میرے ساتھ کب سے ہو؟" میں نے کہا۔

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا، پھر بولا۔ "سر، میں نے کبھی حساب نہیں لگایا۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ صدیوں سے آپ کے ساتھ ہوں۔"

"اور تم مجھے چھوڑ کر جانے کی بات کر رہے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"سر! میں ایسی بات تو سوچ بھی نہیں سکتا۔ یہ تو آپ ہی کا حکم تھا کہ......"

"اچھا، ان سب باتوں کو بھول جاؤ اور مجھے......"

"سر!" غنی تڑپ کر بولا۔ "میں جیتے جی تو کبھی آپ کو نہ چھوڑتا۔ آپ کیا سمجھ رہے تھے کہ میں آپ کو تنہا جانے دیتا۔ میں سائے کی طرح آپ کے ساتھ لگا رہتا۔ میں نے تو سرور اور احمد شاہ کو بھی تیار کرلیا تھا کہ نواب صاحب نے غصے میں یہاں سے تنہا کہیں جانے کا فیصلہ کرلیا ہے لیکن ہم انہیں تنہا چھوڑیں گے نہیں۔"

مجھے غنی کی یہ بات سن کر خوشی بھی ہوئی افسوس بھی! خوشی اس بات کی تھی کہ رانا یا میرے کسی اور دشمن کے پاس اس قسم کے جان نچھاور کرنے والے آدمی ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ وہ پیسوں سے صرف لوگوں کو خرید سکتا تھا، ان کے دل میں اپنی ایسی محبت نہیں ڈال سکتا تھا، افسوس اس بات کا تھا کہ میں نے اتنے بے لوث لوگوں کو دکھ دیا تھا، ان کی دل آزاری کی تھی۔

"غنی! آج سے تمہاری، سرور اور احمد شاہ کی تنخواہ میں پانچ ہزار روپے کا اضافہ کر رہا ہوں۔ تم یہ اطلاع سرور اور احمد شاہ کو بھی دے دینا۔"

"سر! وہ......"

"اب ایک کام کرو۔" میں نے کہا۔ "ذرا نیلم کو میرے پاس بھیج دو۔"

"او کے سر!" غنی نے اسی مستعدی سے کہا جو اس کی عادت تھی اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

میں نے کپڑے بدلے اور بیڈ پر نیم دراز ہوگیا۔

دروازے پر دستک ہوئی، پھر نیلم سہمے ہوئے انداز میں اندر داخل ہوئی۔ اس نیلم میں اور اس نیلم میں زمین و آسمان کا فرق تھا جو میرے ساتھ لاہور سے آئی تھی۔ وہ سہمے ہوئے انداز میں بولی۔ "جی صاحب جی! آپ نے مجھے بلایا ہے؟"

"کیا دروازے ہی پر کھڑے رہ کر میری بات سنو گی؟" میں نے نرم لہجے میں کہا۔ وہ اندر داخل ہونے کے باوجود دروازے ہی کے پاس رک گئی تھی۔ "اندر آؤ۔"

وہ جھجکتی ہوئی اندر آگئی۔

"میں جانتا ہوں نیلم کہ میری بات سے تمہیں شدید دکھ اور اذیت پہنچی ہے۔"

"میں اس حویلی میں ملازمہ ہوں صاحب جی!" اس نے بہت ہی زخمی لہجے میں کہا۔ "پھر مالک تو ملازموں کو گالیاں تک دیتے ہیں۔ مجھے آپ کی بات سے بالکل تکلیف نہیں پہنچی۔ ہاں، میں آپ کو غصے میں دیکھ کر بہت زیادہ ڈر گئی تھی۔ میں نے آپ کا وہ روپ کبھی دیکھا نہیں تھا نا!" اس نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔ "مجھے تو اس بات کا افسوس تھا صاحب جی کہ آپ ہی نے تو مجھے اتنی عزت دی تھی۔ بس یہی سوچ کر آپ کے پاس چلی گئی تھی۔"

"میں اس وقت واقعی بہت غصے میں تھا نیلم! وہ غصہ تم پر نہیں تھا لیکن تم خوامخواہ زد میں آگئیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے تم سے اس لہجے میں بات کی۔"

"آپ مجھے شرمندہ مت کریں صاحب جی!" وہ بری طرح رونے لگی۔ "اس حویلی میں آپ کے سوا میرا ہے ہی کون؟ حویلی کے دوسرے ملازم مجھ سے حسد کرتے ہیں کہ یہ جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں حویلی میں آئے ہوئے اور نواب صاحب کی خاص ملازمہ بن بیٹھی ہے۔"

"میں احسان فراموش نہیں ہوں نیلم!" میں نے کہا۔ "تم نے دو دفعہ میری جان بچائی ہے۔ ایک دفعہ اس وقت جب تمہارا باپ میرے اغوا میں شریک تھا اور دوسری دفعہ اس وقت جب میں گجرات جاتے ہوئے بری طرح زخمی ہوگیا تھا۔"

"میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا تھا صاحب جی!" نیلم نے کہا۔ "میں اگر آپ کو اسی حالت میں چھوڑ دیتی تو...... تو......" وہ کہتے کہتے رک گئی۔ "مجھے وہ واقعہ یاد مت دلائیں صاحب جی! میں آج بھی آپ کی وہ حالت یاد کرتی ہوں تو میرا دل خون ہوجاتا ہے۔"

"میں اپنے سخت رویے پر شرمندہ ہوں نیلم!" میں نے کہا۔ "میں نہیں چاہتا کہ میں کسی بھی انسان کی دل آزاری کروں۔ تمہیں پہلے ہی کی طرح آزادی ہے، تم حویلی میں ہر جگہ جاسکتی ہو۔ میں سرور کو بھی سمجھا دوں گا۔ اسے بھی میں نے غصے میں بہت بری طرح جھڑک دیا تھا۔"

نیلم کی آنکھوں میں ستارے سے دمکنے لگے۔ وہ خوشی سے لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ "آپ کے لیے کافی لاؤں صاحب جی!"

"لے آؤ۔" میں نے ہنس کر کہا۔ وہ ہوا کے جھونکے کی طرح کمرے سے باہر نکل گئی۔

نیلم کے جانے کے بعد مجھے تکیے کے پاس ہلکی سی وائبریشن محسوس ہوئی تو مجھے یاد آیا کہ میں نے اپنا سیل فون سائلنٹ کر رکھا ہے۔

جب تک میں سیل فون اٹھاتا، گھنٹی خاموش ہوچکی تھی۔

میں نے سیل فون اٹھا کر دیکھا تو وہ کوئی اجنبی نمبر تھا لیکن اس نمبر سے مجھے سات مرتبہ کال کیا گیا تھا۔

میں نے سوچا نہ جانے کس کا نمبر ہے؟ ممکن ہے شامی نے کسی دوسرے نمبر سے کال کر رہا ہو۔ میں وہ نمبر ملانے ہی والا تھا کہ سیل فون میں ایک دفعہ پھر تھرتھراہٹ ہوئی۔ مجھے یاد آیا کہ سیل فون میرے کوٹ کی باہر والی دائیں جیب میں رکھا تھا، اس لیے مجھے اس کی وائبریشن محسوس نہ ہوسکی۔

میں نے کال ریسیو کرلی۔

"ہیلو!" دوسری طرف سے آنے والی آواز کو میں پہچان نہیں سکا۔ "نواب صاحب بات کر رہے ہیں؟"

"کون صاحب بول رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نواب صاحب! میں اکبر بول رہا ہوں۔"

"اکبر!" میں نے الجھ کر کہا۔

"اکبر سندھو!" اس نے جواب دیا۔

"اچھا اچھا اکبر سندھو! ہاں اکبر! کیسے فون کیا؟"

"میں نے اس لڑکی کے بارے میں معلوم کرلیا ہے جسے آپ کے ساتھ اغوا کیا گیا تھا۔" اکبر نے کہا۔

اس خبر سے میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوگئیں۔ میں نے اپنے ہیجان پر قابو پا کر کہا۔ "تم کس لڑکی کی بات کر رہے ہو اکبر؟ میرے ساتھ دو لڑکیاں اغوا ہوئی تھیں۔"

"میں اس لڑکی کی بات کر رہا ہوں نواب صاحب جس کی آپ کو تلاش ہے، اس کا نام شاید نور ہے۔"

"ہاں، اس کا نام نور ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ کہاں ہے اور تمہیں اس کے بارے میں کیسے اطلاع ملی؟"

"میں اس وقت آپ کو تفصیل نہیں بتا سکتا۔" اکبر نے کہا۔ "میری جان اس وقت خطرے میں ہے۔ میں آپ کو پھر فون کروں گا۔" یہ کہہ کر اس نے عجلت میں رابطہ منقطع کردیا۔

میں بے تاب ہو کر اٹھ بیٹھا اور غنی کو آواز دی۔ "غنی! راجا اور ناصر صاحب کو یہاں بھیج دو۔"

غنی نے مستعدی سے سر ہلایا اور باہر نکل گیا۔

فوراً ہی راجا اور ناصر میرے کمرے میں آگئے۔ راجا نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "کیا بات ہے فیکے پتر! کیا پھر کوئی بات ہوگئی۔ میں نے تو تجھے آرام کرنے کو بھیجا تھا۔"

"یار، اس اکبر سندھو کا فون آیا تھا۔" میں نے کہا اور انہیں تفصیل بتادی۔

"اکبر سندھو کو کیسے معلوم ہوا نور کے بارے میں؟" راجا نے پوچھا۔

"میں نے اس سے یہی پوچھا تھا لیکن اس نے عجلت میں فون بند کردیا اور بولا کہ اس وقت میری جان خطرے میں ہے۔"

"تو اسے دوبارہ فون کر۔" راجا نے کہا۔

میں نے سیل فون اٹھا کر اسی نمبر پر فون کیا لیکن دوسری طرف سے ریکارڈنگ سنائی دی کہ آپ کا ملایا نمبر اس وقت بند ہے۔

"اس کا سیل فون آف ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"اب سوائے اس کے اور کیا ہوسکتا ہے کہ ہم اس کی کال کا انتظار کریں۔" ناصر نے کہا۔

"ناصر!" میں نے پوچھا۔ "باہر کی کیا خبریں ہیں؟ پولیس نے اس دھماکے کے بارے میں کچھ معلوم کیا؟" مجھے اچانک اس پراسرار دھماکے کا خیال آ گیا۔

"پولیس حسب معمول ملزموں کی تلاش میں ہے۔ کچھ گرفتاریاں بھی ہوئی ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ تمام بے قصور لوگ ہوں گے جو اس وقت وہاں سے گزر رہے ہوں گے۔"

اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی پھر بجنے لگی۔ کوئی اجنبی نمبر تھا۔ میں نے یہ سوچ کر کال ریسیو کر لی کہ ممکن ہے یہ کال اکبر سندھو کی ہو۔ "ہیلو!" میں نے کہا لیکن دوسری طرف خاموشی چھائی رہی۔ "ہیلو!" میں نے اس مرتبہ زیادہ بلند آواز سے کہا لیکن دوسری طرف گہرے گہرے سانسوں کی آوازیں آتی رہیں۔ "کون صاحب ہیں؟" میں نے جھنجلا کر پوچھا۔ "آپ بولتے کیوں نہیں؟"

جواب میں وہی گہرے گہرے سانس۔

میں نے جھنجلا کر رابطہ منقطع کر دیا۔ "نہ جانے کون پاگل تھا۔" میں نے کہا۔ "بول ہی نہیں رہا تھا۔"

اسی وقت گھنٹی پھر بجی۔ وہی نمبر تھا۔ میں نے راجا کو بتایا۔ "وہی نمبر ہے۔"

راجا نے سیل فون میرے ہاتھ سے لے لیا اور بولا۔ "ہیلو!...... بھائی بولتے کیوں نہیں؟...... کوئی تکلیف ہے آپ کو؟...... سانس کی بیماری ہے؟ ہمارے پاس اس کا علاج بھی ہے لیکن آپ کچھ بولیں تو۔" پھر اس نے بھی سلسلہ منقطع کر دیا اور بولا۔ "کوئی نہیں بول رہا ہے۔ شاید کوئی تجھے پریشان کر رہا ہے۔ کیے پتر! یا پھر کر رہی ہے؟"

"لعنت بھیج!" میں نے جھنجلا کر کہا۔

اسی وقت سیل فون کی بیل بجی۔ میں نے چونک کر دیکھا لیکن یہ میرے سیل فون کی بیل نہیں تھی بلکہ ناصر کا سیل فون تھا۔

اس نے سیل فون جیب سے نکالا اور بولا۔ "ہیلو واجد!...... نہیں میں پنڈی میں نہیں ہوں...... کیوں...... اچھا کب...... پکی بات ہے؟...... اچھا...... تھینک یو یار!" اس نے رابطہ منقطع کیا اور راجا سے بولا۔ "میرے ایک صحافی دوست کی کال تھی۔ وہ بتا رہا تھا کہ آئی جی عبداللہ جان صاحب کو ان کے عہدے سے ہٹایا جا رہا ہے، ان پر کرپشن کے الزامات ہیں۔"

"کیا؟" میں اچھل پڑا۔ "عبداللہ جان صاحب پر کرپشن کے الزامات؟"

"تم نے مزید تفصیل معلوم نہیں کی؟" راجا نے پوچھا۔

"اسے زیادہ معلوم بھی نہیں ہوگا۔ تفصیل تو مجھے ابھی دوسرے ذرائع سے معلوم ہوجائے گی۔"

"یار، عبداللہ جان صاحب پر یہ ظلم نہیں ہونا چاہیے۔" میں نے کہا۔

ناصر نے کسی کا نمبر ڈائل کیا اور بولا۔ "وعلیکم السلام اکیا خبریں ہیں؟...... کوئی خاص خبر؟...... یار، میں نے سنا ہے کہ عبداللہ جان صاحب کو ان کے عہدے سے ہٹایا جا رہا ہے؟" ناصر نے کہا۔...... "افواہ ہے...... لیکن افواہ کی بھی تو کوئی بنیاد ہوتی ہے...... کون کر رہا ہے...... انہیں کیا تکلیف ہے؟...... اچھا ابھی فیصلہ نہیں ہوا ہے...... ویسے چانسز کیا ہیں؟...... اچھا...... میں دیکھتا ہوں۔" اس نے سیل فون آف کر دیا۔

"کیا ہوا؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"میں نے اپنے ایک خاص آدمی کو فون کیا تھا۔ وہ سیکریٹریٹ میں ہے اور اندر کی ساری خبریں رکھتا ہے۔" ناصر نے کہا۔ "وہ بتا رہا تھا کہ مسکین شاہ، عبداللہ جان صاحب کو ان کے عہدے سے ہٹانے کے لیے پورا زور لگا رہا ہے۔"

"تو پھر یہ افواہ تو نہیں ہوئی؟" راجا نے کہا۔

"ہاں، افواہ نہیں ہے۔" ناصر نے کہا۔ "مسکین شاہ اس وقت اس پوزیشن میں ہے کہ کوئی بھی اس کی بات ٹال نہیں سکتا۔ ممکن ہے ایک دو روز میں کوئی فیصلہ ہوجائے اور یہ فیصلہ عبداللہ جان کے خلاف ہی ہوسکتا ہے۔"

"ٹھیکے پتر! مسکین شاہ کو اندازہ ہے کہ عبداللہ جان صاحب تیری حمایت کرتے ہیں۔ وہ ان ہی کو راستے سے ہٹانا چاہتا ہے۔"

"لیکن میں ایسا ہونے نہیں دوں گا۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "اس سے پہلے ہی مسکین شاہ کو بے نقاب کر دوں گا۔" پھر میں راجا سے مخاطب ہوا۔ "تم اور ناصر اس سلسلے میں کوئی اسٹوری بنا رہے تھے، اس کا کیا ہوا؟"

"اس کا موقع ہی کہاں ملا؟" راجا نے کہا۔ "لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ اسٹوری تو میرے ذہن میں ہے۔ ابھی ہم لوگ بنا لیں گے۔ تو سب سے پہلے وہ اسٹف شامی سے یہاں منگوا لے جو مسکین شاہ کے خلاف استعمال ہوگا۔"

"اس سلسلے میں بھی بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔" ناصر نے کہا۔ "شامی کا یہاں بخیریت پہنچنا بہت ضروری ہے۔"

"میں ایسا کرتا ہوں، غنی، احمد شاہ اور سرور کو لاہور بھیج دیتا ہوں۔ وہ شامی اور گولی کو اپنے ساتھ لے آئیں گے۔"

"یہی مناسب رہے گا۔" راجا نے کہا۔ "یہ لوگ اپنی جان دے دیں گے لیکن شامی پر آنچ نہیں آنے دیں گے۔"

میں نے گھڑی دیکھی۔ "اس وقت چار بج رہے ہیں اگر غنی اس وقت لاہور کے لیے نکل جائے تو وہ لوگ رات کو گیارہ بجے تک واپس آجائیں گے۔"

"رات کے وقت ان کا سفر کرنا مناسب نہیں ہوگا۔" راجا نے کہا۔ "وہ لوگ اس وقت لاہور چلے جائیں اور کل علی الصباح وہاں سے گولی اور شامی کو لے کر ست بدھائی آجائیں۔ وہ کل آٹھ، نو بجے تک یہاں پہنچ جائیں گے۔ اس وقت تک ہم بھی ضروری تیاریاں کر لیں گے۔"

میں نے اسی وقت غنی کو بلایا اور اسے ہدایت دی کہ وہ اسی وقت احمد شاہ اور سرور کے ساتھ لاہور چلا جائے۔ وہاں سے شامی اور گولی کو لے کر ست بدھائی پہنچ جائے۔

"تم نے شامی کا وہ ٹھکانا تو دیکھا ہے نا؟" میں نے غنی سے پوچھا۔

"جی سر!" غنی نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے، تم ابھی لاہور کے لیے نکل جاؤ۔" میں نے کہا۔ "اور بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ شامی اور اس سامان کا یہاں صحیح سلامت پہنچنا بہت ضروری ہے ورنہ ہماری ساری محنت اکارت ہوجائے گی۔"

"آپ فکر نہ کریں سر!" غنی نے اٹل لہجے میں کہا۔ "مجھے اگر اس کے لیے خون کی ندیاں بھی بہانا پڑیں تو میں بہا دوں گا۔ جب تک ہم تینوں میں سے کوئی ایک بھی زندہ ہے۔ شامی کو کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔" یہ کہہ کر غنی وہاں سے چلا گیا۔

مجھے خیال آیا کہ میں خود بھی شامی سے بات کر کے اسے بتا دوں کہ میرے آدمی وہاں آ رہے ہیں۔ وہ ان کے ساتھ چلا آئے۔

اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی پھر بجنے لگی۔ اس مرتبہ بھی کوئی اجنبی نمبر تھا۔ میں نے بٹن دبا کر سیل فون کان سے لگا لیا۔ "ہیلو!" میں نے کہا۔

"نواب صاحب! میں اکبر بول رہا ہوں۔"

"ہاں اکبر!" میں نے کہا۔ "تم اس وقت کہاں ہو؟"

"میں دشمنوں میں گھرا ہوا ہوں نواب صاحب!" اس نے کہا۔ "یہ لوگ کسی بھی وقت میری جان لے سکتے ہیں۔"

"تم اس وقت ہو کہاں؟" میں نے پوچھا۔ "میں اپنے آدمیوں کو بھیج دیتا ہوں۔"

"دشمن شاید مجھے اتنی مہلت نہ دیں۔" اس نے کہا۔ "میں آپ کو نور کے بارے میں بتا رہا تھا۔ وہ اس وقت گجرات کے ایک صنعت کار اشفاق احمد کھمن کی تحویل میں ہے، کھمن انڈسٹریز کے نام سے اس کی فیکٹریاں ہیں۔ وہ وہاں کا خاصا با اثر شخص ہے اور......" وہ بولتے بولتے خاموش ہوگیا، پھر بولا۔ "نواب صاحب! مجھے ایسا لگا ہے جیسے میرے مکان میں کوئی کودا ہے اگر زندگی رہی تو آپ سے ست بدھائی آ کر ملاقات کروں گا۔ خدا حافظ!" اس نے اچانک سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے ناصر اور راجا کو اکبر کی گفتگو سے آگاہ کیا۔

"اشفاق کھمن!" ناصر نے کہا۔ "میں اسے جانتا ہوں۔"

"کس قسم کا آدمی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اس سے میری ایک دو ملاقاتیں بھی ہوئی ہیں۔" ناصر نے کہا۔ "اتنا جانتا ہوں کہ وہ کوئی نیک نام آدمی نہیں ہے۔"

"رانا کا دوست ہے تو نیک نام کیسے ہوسکتا ہے۔" راجا نے کہا۔ "میں بھی اس کے بارے میں جانتا ہوں۔ انتہائی اوباش شخص ہے، بہت ظالم ہے۔"

"بزدل آدمی عیاش اور اوباش بھی ہوتا ہے اور ظالم بھی۔" میں نے کہا۔ "پہلے تو یہ معلوم کیا جائے کہ اس کے معمولات کیا ہیں؟ اس نے نور کو کہاں رکھا ہے اور......"

"یہ سب تو گجرات جا کر ہی معلوم ہوگا۔"

"تھوڑا بہت تو میں ابھی اور اسی وقت معلوم کرسکتا ہوں۔" راجا نے کہا۔ "گجرات کا ایک صحافی میرا دوست ہے، وہ اشفاق کو بہت اچھی طرح جانتا ہوگا۔"

"میں عبداللہ جان صاحب سے بات کرتا ہوں۔" میں نے کہا اور سیل فون اٹھا لیا۔

"ٹھیکے پتر!" راجا نے کہا۔ "تو عبداللہ جان صاحب کو اس سازش کے بارے میں بھی بتا دے جو ان کے خلاف ہو رہی ہے۔"

میں نے عبداللہ جان صاحب کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی، پھر میں مایوس ہو کر لائن کاٹنے ہی والا تھا کہ دوسری طرف سے کال ریسیو کر لی گئی۔ ''ہیلو!'' مجھے عبداللہ جان صاحب کی بھاری آواز سنائی دی۔

''السلام علیکم!'' میں نے کہا۔

''وعلیکم السلام!'' عبداللہ جان صاحب مجھے اس وقت بہت خوش گوار موڈ میں لگے۔ ''کیسے میں نواب صاحب؟''

''میں تو خیریت سے ہوں۔ آپ کے مزاج کیسے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''شکر الحمد للہ!'' عبداللہ جان صاحب نے ہنس کر کہا۔ ''کرم ہے اس مالک کا!'' پھر وہ ہنس کر بولے۔ ''آپ کو اس وقت ہماری یاد کیسے آ گئی نواب صاحب؟''

''کافی عرصے سے آپ سے بات نہیں ہوئی تھی۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے سوچا کہ آپ خود تو فون کریں گے نہیں، میں ہی کر لوں۔''

''آپ کی بہت نوازش نواب صاحب! اصل میں آج کل معروفیت کچھ زیادہ ہے۔ میں تو روز آپ سے بات کرنے کے بارے میں سوچتا ہوں لیکن......''

''آپ آج کل لاہور ہی میں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں بھئی!'' عبداللہ جان صاحب ہنسے۔ ''ہم تو ملازمت پیشہ لوگ ہیں اور کہاں جا سکتے ہیں، آپ کی طرح نواب تو ہیں نہیں کہ جب دل چاہا لاہور چلے آئے، جب دل چاہا لندن چلے گئے یا سیر و شکار کو نکل گئے۔'' وہ ہنس کر بولے۔

''عبداللہ صاحب!'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''مجھے کچھ عجیب و غریب خبریں ملی ہیں کہ......''

''مجھے کرپشن کے الزام میں ہٹایا جا رہا ہے۔'' عبداللہ جان نے میرا جملہ پورا کر دیا۔ ''میں پولیس میں ہوں نواب صاحب! میں دنیا بھر کی خبریں رکھتا ہوں۔ مجھے اپنے ہی بارے میں خبر نہیں ہو گی؟''

''لیکن میں تو اس خبر سے بہت پریشان ہو گیا تھا۔'' میں نے کہا۔

''مجھے ذرہ برابر پریشانی نہیں ہے۔'' عبداللہ جان صاحب نے کہا۔ ''میں جانتا ہوں کہ مسکین شاہ کافی دنوں سے میرے پیچھے لگا ہوا ہے۔ یہ لوگ مجھے میرے عہدے سے تو ہٹا سکتے ہیں لیکن کرپشن کا الزام ثابت نہیں کر سکتے۔''

''کیا آپ ست بدھائی تشریف لا سکتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔ ''اگر آپ کو کوئی خاص معروفیت نہ ہو تو؟''

''نواب صاحب! اگر آپ کو کوئی ضروری کام ہے تو میں اپنی ہر معروفیت چھوڑ سکتا ہوں۔'' عبداللہ جان صاحب نے کہا۔

''مجھے آپ سے واقعی بہت ضروری کام ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اگر آپ کل ہی ست بدھائی تشریف لے آئیں تو......''

''میں آ جاؤں گا۔'' عبداللہ جان صاحب نے کہا۔ ''کل شام کی چائے ہم لوگ آپ کے ساتھ ہی پئیں گے۔'' وہ ہنس کر بولے۔ ''بھئی، اب میں ست بدھائی آ ہی رہا ہوں تو سوچتا ہوں اپنی بیگم اور بچوں کو بھی لے آؤں، ان بے چاروں کی بھی آؤٹنگ ہو جائے گی۔ ہماری بیگم تو یوں بھی اکثر ست بدھائی آنے کا پروگرام بناتی رہتی ہیں۔''

''بسر و چشم!'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''مجھے بہت خوشی ہو گی۔ تو پھر کل شام کو میں آپ کا انتظار کروں گا۔''

''ہم لوگ کل شام ساڑھے چار، پانچ بجے تک ست بدھائی پہنچ جائیں گے۔''

پھر رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد انہوں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

''کیا عبداللہ جان صاحب یہاں آ رہے ہیں؟'' ناصر نے پوچھا۔

''ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''انہوں نے وعدہ تو کر لیا ہے۔ اگر عین وقت پر کوئی معروفیت آڑے نہ آ گئی تو وہ ان شاء اللہ ضرور یہاں آئیں گے۔''

''عبداللہ جان صاحب ان پولیس افسروں میں سے ہیں جو ہر قیمت پر وعدہ نبھاتے ہیں۔ اب آندھی آئے یا طوفان، عبداللہ جان ہر صورت میں کل یہاں ہوں گے۔'' راجا نے کہا۔

''میں نے اپنے صحافی دوست سے کمسن کے بارے میں معلوم کیا ہے؟'' ناصر نے پوچھا۔

''تم نے اس سے کس وقت بات کر لی؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''جب آپ عبداللہ جان صاحب سے بات کرنے میں مصروف تھے۔'' ناصر نے ہنس کر کہا۔

''کیا معلوم ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''کمسن گجرات کا خاصا بدنام آدمی ہے۔'' ناصر نے کہا۔ ''چند برس پہلے تک اس کی سائیکلوں کی دکان تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے پہلے پنکھوں کے چھوٹے موٹے

پرزوں کی فیکٹری لگائی، پھر وہ پنکھے بنانے لگا۔ اس کا محل نما گھر گجرات سے تین چار میل دور ہے اور اس نے بدمعاشوں کی ایک پوری فوج رکھی ہوئی ہے۔ علاقے کی پولیس اس کی مٹھی میں ہے، اس لیے کوئی اس کے خلاف کچھ بولتا بھی نہیں ہے۔''

''وہ آج کل گجرات ہی میں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، آج کل وہ گجرات ہی میں ہے۔'' ناصر نے جواب دیا۔

اچانک مجھے گجرات کے ڈپٹی کمشنر افتخار ٹوانہ کا خیال آیا۔ اس نے ایک دفعہ پہلے بھی میری بہت مدد کی تھی۔ وہی مجھے زخمی حالت میں گجرات لے گیا تھا۔

میں نے اپنا سیل فون اٹھایا لیکن میرے پاس افتخار ٹوانہ کا سیل نمبر نہیں تھا۔

''یار ناصر! تم کسی سے گجرات کے ڈی سی افتخار ٹوانہ کا فون نمبر لے سکتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

راجا نے چونک کر مجھے دیکھا اور بولا۔ ''ہاں یار، مجھے اس ڈی سی کا تو خیال ہی نہیں آیا، اس کا سیل نمبر ملنا کیا مشکل ہے، ابھی وہاں کے کسی صحافی سے معلوم کر لیتے ہیں؟'' پھر وہ ناصر سے بولا۔ ''ناصر! تم اپنے اسی صحافی دوست کو فون کرو۔ اس کے پاس یقیناً ٹوانہ صاحب کا سیل نمبر ہو گا یا نہیں بھی ہو گا تو وہ کسی سے معلوم کر کے بتا دے گا۔''

''ٹوانہ بہت بھلا آدمی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ وہ اس موقعے پر بھی ہماری مدد ضرور کرے گا۔''

''شرط یہ ہے کہ وہ بھی کمسن کے زیر اثر نہ ہو۔'' راجا نے کہا۔

ناصر نے اپنے اسی صحافی دوست کو فون کیا جس سے وہ کمسن کے بارے میں پوچھ چکا تھا۔

پھر ناصر نے بتایا کہ اس کے پاس ڈی سی کا سیل نمبر موجود ہے۔ وہ ابھی اسے ایس ایم ایس کر دے گا۔

اسی وقت ناصر کے سیل فون پر ایس ایم ایس آ گیا۔ ناصر نے مجھے ڈی سی کا سیل نمبر نوٹ کرایا اور بولا۔ ''پہلے آپ ڈی سی صاحب سے کچھ علیک سلیک کر لیں۔''

میں نے ڈی سی کا نمبر ملایا، اس نے دوسری ہی گھنٹی پر کال ریسیو کر لی۔ ''ہیلو!'' مجھے اس کی آواز سنائی دی۔

''افتخار ٹوانہ صاحب!'' میں نے پوچھا۔

''جی بول رہا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''کون صاحب بول رہے ہیں؟''

''میں رفیق احمد شیرازی بول رہا ہوں، ست بدھائی سے۔'' میں نے کہا۔

''اچھا آپ ہیں؟'' وہ گرم جوشی سے بولا۔ ''کیسے ہیں نواب صاحب؟''

''میں خیریت سے ہوں، آپ سنائیے؟'' میں نے ہنس کر کہا۔

''میں بھی بہ خیریت ہوں۔'' پھر وہ ہنس کر بولا۔ ''اس وقت آپ کو میری یاد کیسے آ گئی؟''

''بھئی آپ نے تو پھر لوٹ کر کوئی رابطہ رکھا ہی نہیں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''لیکن ہم اتنے بے مروت نہیں ہیں۔''

''میں نے کئی بار ست بدھائی آنے کا پروگرام بنایا لیکن آپ تو اچھی طرح جانتے ہیں کہ آج کل ملک کی صورت حال کیا ہے، پھر گجرات تو سیاست کا گڑھ ہے، ان سیاسی اکھاڑوں میں سب سے زیادہ کم بختی ڈی سی اور کمشنر کی آتی ہے۔ آپ فرمائیں کیسے فون کیا؟''

''ٹوانہ صاحب، میں گجرات آنے کے بارے میں سوچ رہا تھا، میں نے سوچا، آپ سے بات کر لوں۔ وہاں اور تو کسی سے میری جان پہچان ہے نہیں۔''

''سر آنکھوں پر۔'' افتخار ٹوانہ نے کہا۔ ''اپنی اس پی اے کو بھی ضرور لائیے گا۔ میری بیگم کو وہ بہت پسند آئی تھی۔''

''میری پی اے؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''ہاں، وہ اپنی غلط فہمی پر شرمندہ بھی ہیں، ویسے بھی انہیں آپ کی پی اے سے مل کر بہت خوشی ہوئی تھی۔''

مجھے یاد آیا وہ نیلم کے بارے میں بات کر رہا تھا۔

''میری پی اے آج کل چھٹی پر ہے، دیکھیے اگر وہ آ گئی تو اسے بھی لے آؤں گا۔'' پھر میں نے یوں ہی سرسری انداز میں پوچھا۔ ''افتخار صاحب! وہاں ایک صنعت کار ہیں کمسن صاحب! آپ انہیں جانتے ہیں؟''

''کیا وہ آپ کے دوست ہیں؟'' ڈی سی کے لہجے میں حیرت تھی۔

''میرے دوست ہوتے تو میں آپ سے کیوں پوچھتا۔ میں آپ کو بتا ہی چکا ہوں کہ گجرات میں آپ کے علاوہ میں کسی کو بھی نہیں جانتا۔''

''کمسن سے کیا کام پڑ گیا آپ کو؟'' افتخار نے پوچھا۔

''لاہور میں میرے ایک دوست ہیں۔ وہ کمسن کو جانتے ہیں۔ انہوں نے مجھے بتایا تھا کہ کمسن کسی نئی فیکٹری کی

تیاری کر رہا ہے۔ آپ اگر اس میں سرمایہ لگانا چاہیں تو گھمسن سے بات کر لیں۔"

"میں آپ کو مشورہ دوں گا کہ اس کے ساتھ بالکل شراکت نہ کریں۔ انتہائی کمینہ اور گھٹیا آدمی ہے۔ آپ کو فائدے کے بجائے نقصان ہی ہوگا۔"

"میں نے ابھی سرمایہ کاری کا فیصلہ نہیں کیا ہے، صرف سوچ رہا تھا۔" میں نے کہا۔

"آپ کو سرمایہ لگانا ہی ہے تو یہاں کئی بہت اچھے اور دیانت دار صنعت کار بھی ہیں، آپ ان کے ساتھ سرمایہ کاری کر سکتے ہیں۔"

"میں نے تو یوں ہی پوچھ لیا تھا۔" میں نے کہا۔

"گھمسن انتہائی بددیانت آدمی ہے۔ وہ جائز اور ناجائز ہر حربہ استعمال کرتا ہے بلکہ جائز کم اور ناجائز کام زیادہ کرتا ہے۔ قومی اسمبلی کا ایک ممبر اس کا چچازاد ہے۔ اس وجہ سے علاقے کی پولیس بھی اس سے خوف کھاتی ہے۔"

"اس کا مطلب ہے کہ آپ بھی اس سے خوف زدہ ہیں۔" میں نے سرسری انداز میں پوچھا۔

"میں تو اس کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہوں۔ اگر میرا بھائی چیف سیکریٹری نہ ہوتا تو یہ گھمسن اب تک یہاں سے میرا تبادلہ کرا چکا ہوتا۔ میں خود بھی اس شہر میں رہنا نہیں چاہتا، لیکن جب بھی جاؤں گا، اپنی مرضی سے جاؤں گا۔ میں ٹوانہ ہوں، کوئی گھمسن یا ایرا غیرا نہیں ہوں۔" پھر وہ ہنس کر بولا۔ "چھوڑیے، آپ بھی کس خبیث آدمی کا تذکرہ لے بیٹھے، یہ بتائیے، آپ گجرات کب آ رہے ہیں؟"

"میں اسی ہفتے میں گجرات آؤں گا۔" میں نے کہا۔

"آنے سے پہلے مجھے فون ضرور کر دیجیے گا۔" اس نے کہا۔

"ضرور!" میں نے ہنس کر کہا۔ "اچھا ٹوانہ صاحب! میں نے آپ کا بہت وقت لے لیا۔ اب اجازت چاہوں گا۔"

"نواب صاحب! آپ تو ان چند افراد میں سے ہیں جو مجھے پہلی ہی نظر میں اچھے لگے ہیں، مجھے دوبارہ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوگی۔"

"اس وقت تک کے لیے خدا حافظ!" میں نے ہنس کر کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

راجا اور ناصر بہت دلچسپی سے میری گفتگو سن رہے تھے، راجا ہنس کر بولا۔ "ٹھیکے پتر! تو تو بہت اچھا سیاست دان بن سکتا ہے، تو نے ٹوانہ سے کیسے ساری باتیں اگلوا لیں۔"

"سیاست دان تو خیر میں بنوں گا ہی۔" میں نے کہا۔ "حالانکہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن رانا زوہیب اور اس کے باپ نے مجھے مجبور کر دیا سیاستدان بننے پر!"

"یہ تیری سیکریٹری کب سے پیدا ہو گئی؟" راجا نے کہا۔

"یار، وہ نیلم کو پہلے تو میری بیگم سمجھا، پھر جب میں نے اسے بتایا کہ وہ میری بیگم نہیں ہے تو اس نے نیلم کو میری پی اے کا درجہ دے دیا۔" میں ہنس کر بولا۔

"یار، ویسے تو اب کوئی شوخ اور خوب صورت قسم کی سیکریٹری رکھ ہی لے۔" راجا نے کہا۔

"یہ مشورہ نور کے سامنے دینا۔" میں نے کہا۔

اسی وقت ڈاکٹر شہناز اور شہلا آ گئیں۔ شہناز نے مجھے بیٹھے دیکھ کر آنکھیں نکالیں۔ "رفیق! میں نے تم سے کہا تھا کہ تم آرام کرو، تم یہاں بیٹھے ان لوگوں کے ساتھ گپیں ہانک رہے ہو!"

"گپیں نہیں ہانک رہا بلکہ آئندہ کا لائحہ عمل طے کر رہا ہوں۔ نور کے بارے میں معلوم ہو گیا ہے۔"

"نور کے بارے میں؟" شہناز کے لہجے میں خوش گوار حیرت تھی۔ "وہ کہاں ہے؟"

"وہ اس وقت گجرات میں ہے۔" میں نے اسے بتایا۔ "میں اور راجا ابھی یہی طے کر رہے تھے کہ اس تک کیسے پہنچا جائے؟"

"یہ تو بہت خوشی کی خبر ہے رفیق!" شہناز ہنس کر بولی۔ "اب تو تمہارا بلڈ پریشر نارمل ہو گیا ہوگا؟"

"اب تو اس کا بلڈ پریشر مزید بڑھ گیا ہے۔" راجا ہنس کر بولا۔

اچانک میری نظر شہلا کے چہرے پر پڑی۔ اس کے چہرے پر عجیب سی افسردگی اور آنکھوں میں ویرانی تھی۔ مجھ سے نظریں ملیں تو اس نے جلدی سے نظریں چرا لیں۔ اس کا رویہ کچھ عجیب سا تھا۔

"میں اس گھمسن کے بارے میں مزید معلومات کرتا ہوں۔" ناصر اٹھتے ہوئے بولا۔

"آج تو شام کی چائے پر کچھ اہتمام ہونا چاہیے۔" شہناز نے کہا۔ "میں ابھی ریشم کو ہدایات دیتی ہوں۔" وہ یہ کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔

راجا کے سیل فون کی گھنٹی بجی تو وہ بھی سیل فون لے کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

شہلا ابھی تک وہاں بیٹھی تھی۔ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ "نواب صاحب! آج تو آپ بہت خوش ہوں گے؟"

"بات ہی خوشی کی ہے۔" میں نے کہا۔ "کیا تمہیں خوشی نہیں ہوئی۔ نور تمہارا تو بہت خیال رکھتی تھی۔"

"مجھے خوشی کیوں نہیں ہوگی۔" شہلا نے کہا، لیکن اس کا لہجہ الفاظ کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔

پھر ریشم نے کمرے میں جھانکا اور بولی۔ "صاحب جی! غنی کو آپ نے کہیں بھیجا ہے؟"

"کیوں؟" میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔ "تمہیں اس وقت غنی کی کیا ضرورت پڑ گئی؟"

"وہ دو تین گھنٹے سے غائب ہے، میں نے سوچا کہ......"

"غنی میری اجازت کے بغیر کہیں نہیں جاتا۔" میں نے کہا۔ "وہ ایک ضروری کام سے گیا ہے۔"

"آپ کو ڈاکٹر شہناز بلا رہی ہیں۔" ریشم نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔

"اچھا، تم چلو، میں آ رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

اس کے جانے کے بعد شہلا نے کہا۔ "کبھی کبھی تو مجھے آپ کے رویے پر بہت حیرت ہوتی ہے، آپ نے ان ملازمین کو اتنا سر چڑھا رکھا ہے۔"

"صرف غنی اور ریشم کو!" میں نے کہا۔ "ان لوگوں نے میری خدمت بھی بہت کی ہے۔"

"آپ نیلم کا نام بھول گئے۔ آج کل تو وہ بھی آپ کی گڈ بکس میں ہے۔" شہلا کے لہجے میں خفیف سا طنز تھا۔ "میں نے تو سنا ہے کہ آپ نے ڈانٹنے پر اس سے معذرت بھی کی ہے!"

"ڈاکٹر شہلا! میں اس نظریے کا قائل ہوں کہ جو دلوں کو فتح کر لے، وہی فاتح زمانہ!" یہ کہہ کر میں اٹھ گیا۔

☆☆☆

میں ساری رات نہ جانے کیوں بے چین رہا۔ وقفے وقفے سے میری آنکھ کھلتی رہی، شاید یہ اضطراب اور بے چینی نور کا سراغ ملنے پر تھی۔ اس وجہ سے صبح میری آنکھ خلاف معمول کچھ دیر سے کھلی۔ میں نے حسب عادت غنی کو آواز دی لیکن فوراً ہی مجھے خیال آ گیا کہ غنی تو ابھی لاہور سے لوٹا بھی نہیں ہوگا۔ میری آواز کے جواب میں نیلم کمرے میں داخل ہوئی۔ "صاحب جی! غنی تو ابھی تک لاہور سے واپس نہیں آیا۔"

''اچھا، تم میرے لیے چائے لے کر آؤ اور دیکھو باہر اخبار بھی ہوں گے۔ وہ بھی مجھے دیے جاؤ۔''

نیلم کمرے سے باہر نکلی ہی تھی کہ میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے اسکرین پر نظر ڈالی تو غنی کا نام دیکھ کر چونک اٹھا۔ میں نے فوراً سیل فون کان سے لگالیا۔

''ہاں غنی!''

''سر! وہ شامی تو یہاں موجود ہی نہیں ہے، گولی بھی نہیں ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''اس بنگلے پر موجود آدمی سے میں نے شامی کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ اس نام کے کسی آدمی کو نہیں جانتا۔''

''کیا بکتے ہو؟'' میں نے کہا۔ ''تم اس وقت کہاں ہو؟''

''ہم لوگ ست بدھائی آرہے ہیں۔''

میں نے سلسلہ منقطع کر دیا اور شامی کا سیل نمبر ڈائل کیا لیکن اس کا سیل فون آف تھا اور ریکارڈنگ سنائی دے رہی تھی کہ آپ کا مطلوبہ نمبر بند ہے۔ میں گھبرا کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ غنی اور احمد شاہ کی جگہ باہر ایک دوسرا گارڈ احمد موجود تھا۔ میں نے اشارے سے اسے بلایا اور اس سے کہا۔ ''راجا اور ناصر صاحب کو یہاں بھیج دو۔''

''سر، وہ دونوں تو صبح ہی صبح کہیں چلے گئے تھے۔'' اس نے جواب دیا۔

میں دوبارہ کمرے میں آگیا۔ نیلم میرے لیے چائے لے آئی تھی۔ میں نے چائے کے دو چار گھونٹ لیے، پھر سیل فون اٹھا کر راجا کا نمبر ڈائل کیا۔ اس نے فوراً ہی کال ریسیو کرلی۔ ''ہاں فیکے!'' راجا نے کہا۔

''یار، تم لوگ کہاں ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''ہم لوگ ذرا دینہ تک آئے تھے، اب واپس آرہے ہیں، اس وقت دوسری چیک پوسٹ کے پاس ہیں۔'' راجا نے کہا۔ ''خیریت تو ہے فیکے پتر! تو مجھے بہت گھبرایا ہوا لگ رہا ہے؟''

''خیریت نہیں ہے یار!'' میں نے شکستہ لہجے میں کہا۔ ''تم لوگ واپس آؤ گے تو تمہیں بتاؤں گا۔'' میں نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں تیار ہو کر کمرے سے باہر نکلا تو باہر بالکل سناٹا تھا۔ شہناز اسپتال میں ہوگی یا پھر اپنے کمرے میں آرام کر رہی ہوگی۔ راجا اور ناصر موجود نہیں تھے۔ نیلم ایک مرتبہ پھر آئی اور مجھ سے ناشتے کے بارے میں پوچھا تو میں نے انکار کر دیا اور ٹہلتا ہوا مین گیٹ کی طرف نکل گیا۔ میں نے مین گیٹ کھلتے دیکھا، پھر ایک پرانی سی کرولا اندر داخل ہوئی۔ اس میں شامی اور گولی کو دیکھ کر مجھے اتنی خوشی ہوئی کہ میں بیان نہیں کرسکتا۔

شامی گاڑی سے اترا اور والہانہ انداز میں مجھ سے لپٹ گیا۔ ''کیسے ہو نواب بھائی؟''

''جیسا بھی ہوں، تمہارے سامنے ہوں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''لیکن تمہاری وجہ سے بہت پریشان ہوگیا تھا۔''

''کیوں؟'' وہ حیرت سے بولا۔

میں نے اسے غنی اور احمد شاہ وغیرہ کے بارے میں بتایا۔

''میں نے ہی اس آدمی کو ہدایت کی تھی کہ کسی کو بھی میرے بارے میں نہ بتائے۔ آپ کم سے کم مجھے فون پر بتا دیتے۔'' شامی نے کہا۔

''تمہارا ٹیلی فون بند ہے۔'' میں نے کہا۔

''بند ہے؟'' شامی نے حیرت سے کہا، پھر سیل فون جیب سے نکال کر دیکھا اور بولا۔ ''اوہو، اس کی تو بیٹری ہی ختم ہوگئی۔ میں نے تو دو دن سے بیٹری چارج ہی نہیں کی۔''

''اچھا چلو، اندر تو چلو۔'' میں نے کہا۔ پھر گولی سے بولا۔ ''تم کیسی ہو گولی؟''

''میں بھی جیسی ہوں، آپ کے سامنے ہوں۔'' گولی نے میرا ہی جملہ دہرا دیا اور ہنسنے لگی۔

''ایک منٹ!'' شامی نے کہا۔ ''میں آپ کی امانت تو نکال لوں۔''

اس نے پسنجر سیٹ ہٹا کر اس کے نیچے بنے ہوئے خفیہ خانے سے وہ بریف کیس برآمد کیا، پھر پچھلی سیٹ ہٹا کر ایک اور بریف کیس برآمد کیا اور بولا۔ ''ایک بریف کیس میں نے دشمنوں کو دھوکا دینے کے لیے رکھا تھا کہ اگر میں کہیں گھر بھی جاؤں تو یہ بریف کیس ان کے حوالے کردوں۔ اس میں بھی سی ڈیز ہیں لیکن وہ سب ہندی اور انگریزی فلموں کی ہیں۔''

اس نے پسنجر سیٹ کے نیچے سے نکالا ہوا بریف کیس مجھے دے کر کہا۔ ''اس میں آپ کی امانت ہے۔''

میں نے شامی کو ایک مرتبہ پھر گلے لگالیا اور بولا۔ ''تم نے واقعی مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔''

''نواب بھائی!'' شامی نے کہا۔ ''اب آپ میری

محبت کا مذاق تو مت اڑاؤ۔''

''چلو، پہلے ناشتا کرلیں۔'' میں نے کہا۔ ''باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔''

''ناشتا ہم نے بھی نہیں کیا ہے؟'' راجا کی آواز آئی۔ وہ لوگ نہ جانے کس وقت آگئے تھے۔ میں شامی میں اتنا محو تھا کہ مجھے ان کی آمد کا علم ہی نہ ہوسکا۔

ناشتا تیار تھا۔ ریشم اور نیلم نے مل کر جلدی جلدی ناشتا لگادیا۔

''تو، تو بہت پریشان تھا فیکے پتر؟'' راجا نے پوچھا۔ ''لیکن اس وقت تو تیرے چہرے پر پریشانی کی پرچھائیں تک نہیں ہے۔''

میں نے اسے بتایا کہ میں کیوں پریشان تھا۔

''یہ بات تو واقعی پریشانی کی تھی۔'' ناصر نے کہا۔

''تم لوگ صبح صبح کہاں چلے گئے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''میرے لیپ ٹاپ کی ہارڈ ڈسک اڑ گئی تھی۔'' ناصر نے جواب دیا۔ ''میرا خیال تھا کہ دینہ سے مجھے ہارڈ ڈسک مل جائے گی لیکن وہاں لیپ ٹاپ کی کوئی دکان نہیں ہے۔ ایک دکان ہے بھی تو اس میں کچھ پرانے لیپ ٹاپ رکھے ہوئے ہیں، البتہ پی سی کی کئی دکانیں ہیں۔''

''تمہیں اگر ضرورت ہے تو میرا لیپ ٹاپ استعمال کرلو۔'' میں نے کہا۔

''ضرورت پڑے گی تو آپ سے لے لوں گا۔ فی الحال تو میں راجا کے لیپ ٹاپ ہی سے کام چلالوں گا۔''

ہم لوگوں نے ناشتا خوش گوار موڈ میں کیا۔

☆☆☆

میں نے صوبیدار میجر صاحب کو بتایا کہ نور کا سراغ مل گیا ہے تو وہ ایک دم پرجوش ہوگئے اور بولے۔ ''رفیق میاں! بہت محتاط ہو کر یہ آپریشن کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر رانا کو بھنک بھی مل گئی کہ ہمیں نور کا سراغ مل چکا ہے تو وہ راتوں رات نور کو کہیں غائب کر دے گا۔''

''آپ کی بات تو درست ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اسی لیے میں نے ابھی تک کوئی پلاننگ بھی نہیں کی ہے۔''

''پلاننگ تو ہمیشہ دشمن کی پوزیشن دیکھ کر کی جاتی ہے۔'' ان کے اندر کا فوجی ایک دم بیدار ہوگیا۔ ''پہلے ہمیں دشمن کی خامیوں کو تلاش کرنا ہوگا، پھر اس پر اچانک حملہ کرنا ہوگا لیکن سوچنے میں زیادہ وقت صرف نہیں کرنا چاہیے۔''

میں ان کے پاس بیٹھا ہی تھا کہ غنی، احمد شاہ اور سرور آگئے۔ ان کے چہرے لٹکے ہوئے تھے۔ انہیں شاید علم ہوگیا تھا کہ میں اس وقت صوبیدار میجر صاحب کے پاس بیٹھا ہوں۔ وہ تینوں اس لیے سیدھے وہیں آگئے تھے۔

''سر!'' غنی نے سر جھکا کر کہا۔ ''وہ شامی......''

''شامی اور گولی دونوں یہاں پہنچ چکے ہیں۔'' میں نے کہا۔

ان تینوں کے چہرے اچانک کھل اٹھے۔ ''سر، آپ کم سے کم مجھے فون ہی کر دیتے۔'' غنی نے کہا۔ ''میری تو جان ہی نکلی جارہی تھی کہ اب میں آپ کا سامنا کیسے کروں گا۔''

میں صوبیدار میجر صاحب سے رخصت ہو کر باہر نکلا تو غنی اور سرور میرے ساتھ ساتھ تھے۔ احمد شاہ ان سے چند قدم پیچھے تھا۔ وہ ابھی مجھ سے اتنا بے تکلف نہیں ہوا تھا کہ میرے ساتھ چلنے کی جرأت کرسکتا۔

''غنی! ایک خوش خبری اور بھی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''نور کا سراغ مل گیا ہے۔''

غنی اور سرور دونوں کے چہرے خوشی سے تمتمانے لگے۔ غنی نے پوچھا۔ ''وہ کہاں ہیں سر!''

''وہ گجرات میں ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''اب تم لوگ ایک نئے معرکے کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

''ہم تو ہر وقت تیار رہتے ہیں سر!'' سرور نے کہا۔

شامی باہر برآمدے میں ہی بیٹھا تھا۔ اس نے غنی سے بہت معذرت کی کہ اسے اتنی پریشانی اٹھانا پڑی۔ ''میں نے احتیاطاً اپنے آدمی کو منع کر دیا تھا کہ......''

''شامی بھائی!'' غنی نے کہا۔ ''اس میں شرمندہ ہونے کی کیا بات ہے؟ غلطی ہماری ہی تھی۔ ہمیں پہلے فون کرلینا چاہیے تھا۔''

☆☆☆

حویلی کا مین دروازہ کھلا اور ایک ہنڈا اسٹی اندر داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے پیچھے پولیس کی ایک جیپ بھی تھی۔

گاڑی میں عبداللہ جان صاحب کو دیکھ کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ ان کی بیگم اور دونوں لڑکیاں بھی ساتھ تھیں۔

عبداللہ جان صاحب والہانہ انداز میں میرے گلے لگ گئے۔ میں نے ان کی بیگم کو سلام کیا۔ ڈاکٹر شہناز آگے بڑھ کر ان کے گلے لگ گئی۔ ہم لوگ انہیں سٹنگ روم میں لے آئے۔

ان کے ساتھ آنے والے پولیس کے جوانوں کا

استقبال غنی اور سرور وغیرہ نے کیا۔

"آپ پہلے فریش ہو جائیں، پھر اطمینان سے بات چیت کریں گے۔" میں نے عبداللہ صاحب سے کہا۔

عبداللہ جان صاحب کو بھی میری تجویز پسند آئی اور وہ اس کمرے میں چلے گئے جو ان کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔

اس دوران میں ریشم اور نیلم نے میز پر چائے اور دیگر لوازمات سجا دیے۔ ڈاکٹر شہلا اور شہناز بھی ان کی مدد کر رہی تھیں۔

چائے وغیرہ سے فارغ ہو کر خواتین باغ کی طرف چلی گئیں۔ عبداللہ جان صاحب ہمارے ساتھ رہ گئے۔

"ہاں نواب صاحب! فرمائیں، آپ نے مجھے کیسے یاد فرمایا؟"

"میرے پاس مسکین شاہ کے خلاف اتنے ناقابل تردید ثبوت ہیں کہ اس پر اسے کئی دفعہ پھانسی کی سزا ہو سکتی ہے۔" میں نے کہا۔

عبداللہ جان نے چونک کر مجھے دیکھا۔ "مسکین شاہ کے خلاف ثبوت؟"

"جی ہاں۔" میں نے کہا۔ "میں نے بہت محنت کے بعد یہ ثبوت اکٹھے کیے ہیں۔"

پھر میں نے انہیں تفصیل سے بتایا کہ میرے پاس مسکین شاہ کے خلاف کیا کچھ ہے۔

عبداللہ جان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ انہوں نے پر جوش انداز میں کہا۔ "اب تو اس پیر فرتوت کو میں خود گرفتار کروں گا۔ اس نے لوگوں کو بہت بے وقوف بنا لیا۔ اب اس بگلا بھگت کے دن گنے جا چکے ہیں۔"

"آپ وہ ویڈیو فلمیں دیکھنا چاہیں گے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، میں وہ ویڈیو فلمیں ضرور دیکھوں گا۔" عبداللہ جان صاحب نے کہا۔

میں نے غنی کو آواز دی اور اس سے کہا۔ "اوپر والے ہال کمرے میں ڈی وی ڈی پلیئر اور ٹی وی رکھوا دو۔"

"جی سر!" غنی نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

"ویسے نواب صاحب! اس دفعہ مجھے ست بدھائی آ کر احساس ہوا کہ میں واقعی کسی اسٹیٹ میں آ گیا ہوں، آپ نے تو اپنی اسٹیٹ کو ناقابل تسخیر بنا لیا ہے، آپ کا سیکیورٹی سسٹم مجھے بہت پسند آیا۔ بالکل فوجی انداز میں آپ نے پورا بندوبست کیا ہے۔"

"یہ میرا نہیں بلکہ ہمارے سیکیورٹی ایڈوائزر صوبیدار میجر صاحب کا کمال ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ سابق فوجی اور کمانڈو رہ چکے ہیں، انہوں نے آرمی انٹیلی جنس میں بھی کام کیا ہے اس لیے ست بدھائی کو بھی اس انداز میں سیکیورٹی سے آراستہ کیا ہے۔"

رات کے کھانے کے بعد خواتین تو ڈاکٹر شہناز اور شہلا کے ساتھ اسپتال دیکھنے نکل گئیں۔ عبداللہ جان صاحب کو میں اوپر لے گیا تاکہ انہیں وہ ویڈیو فلمیں دکھا سکوں، راجا اور ناصر بھی میرے ساتھ تھے۔

عبداللہ جان صاحب نے دو ہی ویڈیوز دیکھی تھیں کہ لاحول ولاقوۃ پڑھتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ "یہ غلاظت...... یہ مسکین شاہ کا کارنامہ ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "اسی مسکین شاہ کا جسے لوگ بہت نیک اور خدا ترس سمجھتے ہیں۔"

"میں نے تو سوچا تھا کہ دو چار دن آرام کروں گا لیکن اب مجھے کل ہی واپس جانا ہوگا۔ میں اب اس بگلا بھگت کو نہیں چھوڑ سکتا۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھ پر وار کرے، میں اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈالنا چاہتا ہوں۔"

"میں آپ کو روک بھی نہیں سکتا۔" میں نے کہا۔ "آپ پہلی دفعہ تو آرام کرنے کی غرض سے ست بدھائی آئے تھے۔"

"آرام تو میں اس مسکین شاہ کی گرفتاری کے بعد کروں گا۔" انہوں نے کہا۔ "میری بیگم اور بیٹیاں البتہ یہیں رہیں گی۔ اس پیر فرتوت کو آہنی سلاخوں کے پیچھے دھکیلنے کے بعد میں دوبارہ یہاں آؤں گا۔"

پھر وہ دیر تک سیل فون پر اپنے ماتحتوں سے باتیں کرتے رہے۔

انہوں نے اپنی بیگم کو بھی بتا دیا تھا۔ "مجھے کل علی الصباح ایک ضروری کام سے جانا ہے لیکن تم یہیں رہو، میں وہ کام نمٹا کر دوبارہ ست بدھائی آؤں گا۔"

"میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔" میں نے کہا۔

"نہیں نواب صاحب!" عبداللہ جان صاحب نے کہا۔ "میں اس کا مشورہ نہیں دوں گا۔ آپ کو تو ابھی یہاں رہنا چاہیے۔"

"میں تو آئی جی صاحب کے ساتھ ضرور جاؤں گا۔" ناصر نے کہا۔ "اور شاہ جی کی گرفتاری کی پوری ویڈیو فلم بناؤں گا۔ اب تک وہ دوسروں کی ویڈیو فلمیں بناتا رہا ہے،

اب اس کی ویڈیو بنے گی تو اسے احساس ہوگا کہ......"

"وہ بہت بے ضمیر شخص ہے۔" عبداللہ جان صاحب نے کہا۔ "اسے بالکل احساس نہیں ہوگا۔ ہاں، اسے یہ افسوس ضرور ہوگا کہ اس کی بنی بنائی ساکھ بگڑ گئی اور وہ کروڑوں روپے کی آمدنی سے محروم ہو گیا۔"

ناصر ضروری تیاری کے لیے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس کے پاس چھوٹا سا ایک مووی کیمرا تھا لیکن اس میں چار سے پانچ گھنٹے کی ریکارڈنگ کی جا سکتی تھی۔ اس کیمرے کے ساتھ بہت حساس قسم کا مائیکروفون بھی تھا جو تصویر کشی کے وقت خفیف سی خفیف آواز کو بھی ریکارڈ کر لیتا تھا۔

عبداللہ جان صاحب کچھ دیر مزید میرے کمرے میں بیٹھے رہے، اس دوران میں انہوں نے مجھ سے بات چیت کم کی، سیل فون پر اپنے ماتحتوں کو ہدایات زیادہ دیں۔ میں نے ایک بات خاص طور پر نوٹ کی کہ انہوں نے اب تک شاہ جی کا نام نہیں لیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اگر انہوں نے نام لے لیا تو شاہ جی کا کوئی نہ کوئی تنخواہ دار اسے اطلاع کر دے گا اور وہ فوری طور پر روپوش ہو جائے گا۔

دوسرے دن فجر کی نماز ادا کر کے عبداللہ جان صاحب روانہ ہو گئے۔ ان کے ساتھ ناصر بھی تھا۔ راجا بھی جانا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے روک لیا تھا۔ مجھے اب بے چینی سے اس وقت کا انتظار تھا جب ناصر کی طرف سے مجھے یہ خوش خبری ملے گی کہ وہ بگلا بھگت شاہ جی گرفتار ہو چکا ہے۔

اس دوران میں راجا سیل فون پر اپنے ایک صحافی دوست سے بات کرتا رہا جس کا تعلق گجرات سے تھا۔ مجھے اچانک خیال آیا کہ مسکین شاہ کی گرفتاری کی خبر سن کر رانا کہیں نور کو وہاں سے منتقل نہ کر دے۔

میں نے اس کا اظہار راجا سے کیا تو وہ بھی فکر مند ہو گیا اور بولا۔ "ہاں فیکے پتر! یہ خدشہ تو ہے۔"

"پھر...... پھر کیا ہم گجرات چلیں؟" میں نے راجا سے پوچھا۔ میری سمجھ میں اس وقت کچھ نہیں آ رہا تھا۔

"گجرات جانے سے مسئلہ حل نہیں ہوگا فیکے!" راجا نے کہا۔ "مجھے سوچنے دے اور تو بھی سوچ!"

مجھے ایک دفعہ پھر افتخار ٹوانہ کا خیال آیا، میں نے راجا سے کہا۔ "ہم ٹوانہ کو بھی اعتماد میں لے سکتے ہیں۔ وہ کوئی ایسا بندوبست کر سکتا ہے کہ اگر نور کو وہاں سے منتقل بھی کیا جائے تو اسے معلوم ہو جائے۔" پھر میں نے خود ہی اس خیال کو مسترد کر دیا۔ میں ابھی ٹوانہ پر اتنا اعتماد نہیں کر سکتا تھا، پھر میں کون سا دی آئی جی یا اس کا جگری دوست تھا جس کی خاطر وہ کمسن کے بنگلے کی نگرانی کراتا۔ وہ اگر نگرانی... کراتا بھی تو پولیس ہی کے ذریعے کمسن کو علم ہو جاتا کہ اس کی نگرانی ہو رہی ہے۔

"میں افتخار ٹوانہ کو بتانے کے بجائے غنی، احمد شاہ اور سرور کو گجرات بھیج دیتا ہوں۔ وہ لوگ کمسن کے بنگلے کی نگرانی کر سکتے ہیں۔"

"ہاں، یہ مناسب رہے گا۔" راجا نے کہا۔ "غنی کو ہدایات دے دینا کہ اگر کمسن نور کو وہاں سے منتقل کرنے کی کوشش کرے تو وہ لوگ کسی قسم کی مزاحمت نہ کریں بلکہ تعاقب کر کے یہ معلوم کریں کہ نور کو کہاں لے جایا گیا ہے۔" راجا نے تجویز پیش کی۔

میں نے اسی وقت غنی کو بلایا اور اس سے پوچھا۔ "غنی! گجرات میں تمہارا کوئی بااعتماد دوست ہے؟"

"سر، ایک ٹرک ڈرائیور ہے۔" غنی نے کہا۔ "وہ میرے اعتماد کا بندہ ہے۔ ہم لوگوں نے کافی عرصے تک ایک ساتھ ٹرک ڈرائیونگ کی ہے۔"

میں نے احمد شاہ اور سرور کو بھی بلا لیا اور ان سے بھی یہی سوال کیا۔

سرور نے کہا۔ "میرا ایک سالا گجرات میں رہتا ہے۔ وہ پچھلے سال فوج سے ریٹائرڈ ہوا ہے اور بہت اعتبار کا آدمی ہے۔ پوری سسرال میں صرف اس سے میری بنتی ہے۔"

احمد شاہ کا کوئی جاننے والا گجرات میں نہیں تھا۔

میں نے ان لوگوں سے کہا۔ "تم لوگ اسی وقت گجرات جاؤ اور وہاں جا کر اشفاق کمسن کے گھر کی نگرانی کرو۔" پھر میں نے انہیں تفصیل سے بتایا کہ اشفاق کمسن کون ہے اور کس قماش کا آدمی ہے۔

"اس کی تو آپ فکر ہی نہ کریں۔ اگر کمسن وہاں کا بااثر آدمی ہے تو میرے دوست نواز کو ضرور علم ہوگا۔" غنی نے کہا۔ "اس کا بنگلا ڈھونڈنا تو کوئی مشکل نہیں ہے۔"

پھر میں نے ان لوگوں کو ہدایات دیں کہ انہیں کیا کرنا ہے اور یہ کہ وہ اپنے اپنے سیل فون آن رکھیں اور مجھ سے رابطے میں رہیں۔ میں نے احتیاطاً انہیں افتخار کے بارے میں بھی بتا دیا۔ غنی تو اسے پہلے سے جانتا تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر خدانخواستہ تم لوگ وہاں کسی مشکل میں پڑ جاؤ تو وہاں کے ڈی سی افتخار ٹوانہ سے بات کرنا اور میرا حوالہ دینا۔

وہ لوگ مناسب تیاری کے بعد ڈبل کیبن پک اپ

میں روانہ ہو گئے۔

میں کچھ دیر تو راجا سے ادھر ادھر کی لایعنی باتیں کرتا رہا، پھر بے چینی زیادہ بڑھی تو ڈاکٹر شہناز کے پاس چلا گیا۔ وہاں ڈاکٹر شہلا کی وجہ سے مجھے الجھن ہو رہی تھی۔ وہ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

میرا چہرہ دیکھ کر شہناز نے کہا۔ ''لگتا ہے تمہارا بلڈ پریشر دوبارہ بڑھ گیا ہے؟''

''مجھے تو محسوس نہیں ہو رہا۔'' میں نے کہا۔

شہناز نے میرا بلڈ پریشر چیک کیا تو بولی۔ ''نواب صاحب! اس وقت آپ کا فشارِ خون انتہائی بلندیوں پر ہے۔ میں آپ کو ایک انجکشن دے دیتی ہوں، ابھی بلڈ پریشر نارمل ہو جائے گا۔''

اس نے انجکشن تیار کیا اور سوئی میرے بازو میں گھونپ دی۔

پھر وہ ہنس کر بولی۔ ''اب آپ اطمینان سے جا کر اپنے بیڈ پر لیٹ جائیں۔''

میں یوں بھی وہاں بیٹھنا نہیں چاہتا تھا۔ شہلا مسلسل مجھے زخمی کی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اسے شاید شہناز کی موجودگی کا احساس بھی نہیں رہا تھا۔

میں اپنے کمرے میں آ کر بیڈ پر نیم دراز ہو گیا۔ اچانک مجھ پر نیند کا غلبہ ہوا تو میری سمجھ میں آیا کہ شہناز نے مجھے نیند کا انجکشن دے دیا ہے۔ میں اس کی اس حرکت پر زیادہ دیر جھنجلا بھی نہ سکا اور نہ جانے کب میری آنکھیں بند ہو گئیں۔

میری آنکھ دوبارہ کھلی تو پہلے تو میں یہی سمجھا کہ اس وقت صبح ہے، پھر مجھے یاد آیا کہ میں شہناز کے پاس گیا تھا، اس نے مجھے انجکشن دیا تھا اور......

میں جھپٹ کر اٹھ گیا۔ گھڑی میں اس وقت شام کے پانچ بج رہے تھے۔

میں نے منہ پر پانی کا ایک چھپکا مارا اور اپنے بال سنوارتا ہوا کمرے سے باہر نکل آیا۔

اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اسکرین پر ناصر کا نام تھا۔ میں نے فوراً کال ریسیو کر لی۔

''آپ کہاں تھے سر!'' ناصر نے پوچھا۔ ''میں اس سے پہلے کم سے کم دس بار آپ کو کال کر چکا ہوں۔''

اب میں اسے کیا بتاتا کہ شہناز نے مجھے خواب آور دوا کا انجکشن دے کر سلا دیا تھا۔

میں نے اس سے پوچھا۔ ''وہاں کیا رہا؟''

''آپریشن کامیاب ہو گیا ہے۔ آپ کیا ٹی وی نہیں دیکھ رہے؟''

''نہیں، میں نے ابھی تک ٹی وی نہیں دیکھا۔'' میں نے کہا۔

''عبداللہ جان صاحب نے پولیس کی بھاری نفری کے ساتھ مسکین شاہ کے بنگلے پر چھاپا مارا اور اسے گرفتار کر لیا، وہاں سے ان کے ہاتھ مزید ثبوت لگے ہیں۔ میں تو ان سے کہہ رہا تھا کہ گولی مار کے اس مردود کا قصہ ہمیشہ کے لیے پاک کر دیں لیکن وہاں سے جو ثبوت ملے ہیں، وہی اتنے کافی ہیں کہ مسکین شاہ کو لمبی سزا ہو جائے گی۔''

''تم نے اس واقعے کی ویڈیو بنائی ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''میں نے تو ایک ایک لمحے کی ویڈیو بنائی ہے، میں شاید آج نہ آ سکوں۔'' ناصر نے کہا۔ ''یہاں کافی مصروفیت ہے، مسکین شاہ کے بنگلے سے جو دوسرے افراد گرفتار ہوئے ہیں۔ پولیس ان کی نشاندہی پر مسکین شاہ کے دوسرے ٹھکانوں پر چھاپے مار رہی ہے۔ آپ ٹی وی دیکھیں، آپ کو سب کچھ تفصیل سے معلوم ہو جائے گا۔''

''اچھا، میں تھوڑی دیر بعد تم سے بات کرتا ہوں۔'' میں نے سلسلہ منقطع کر کے سیل فون جیب میں رکھا اور راجا کے کمرے کی طرف دوڑا۔

راجا مجھے کوریڈور میں مل گیا۔ وہ بے اختیار مجھ سے لپٹ گیا اور بولا۔ ''مسکین شاہ گرفتار ہو چکا ہے۔ یار اس کے مکروہ چہرے پر کیسی نحوست اور بے بسی تھی۔'' راجا نے کہا۔ ''میں تو گزشتہ ایک گھنٹے سے ٹی وی کے سامنے بیٹھا ہوں اور نیلم کو کئی دفعہ تیری طرف بھیج چکا ہوں کہ دیکھو نواب صاحب جاگے یا نہیں۔''

''یار، یہ شہناز بھی بعض اوقات بہت زیادتی کر جاتی ہے، بھلا اس وقت مجھے خواب آور دوا کا انجکشن دینے کی کیا ضرورت تھی؟''

''ضرورت تھی فیکے پتر!'' راجا نے ہنس کر کہا۔ ''ورنہ تو اس وقت تک تو پاگل ہو گیا ہوتا۔ چل، ٹی وی لاؤنج میں چل، وہاں ہر چینل سے مسکین شاہ ہی کے بارے میں خبریں آ رہی ہیں۔''

میں ٹی وی کے سامنے جا بیٹھا، اس وقت اشتہارات چل رہے تھے۔

پھر چند منٹ بعد خبروں کا بلیٹن شروع ہو گیا۔ بلیٹن کی

ہیڈ لائن یہ تھی کہ معروف سیاست دان اور قومی اسمبلی کے رکن سید مسکین شاہ کو گرفتار کر لیا گیا۔ پولیس نے اچانک ان کے بنگلے پر چھاپا مار کے نہ صرف انہیں گرفتار کیا بلکہ وہاں سے دو لڑکیوں کو بھی برآمد کر لیا جنہیں چند روز پہلے اغوا کر لیا گیا تھا۔ پولیس ان لڑکیوں کی تلاش میں تھی۔ اس کے علاوہ مسکین شاہ کے بنگلے سے منشیات اور ناجائز اسلحے کی بھاری تعداد بھی برآمد ہوئی ہے۔ ان کے قبضے سے ایسے خطوط بھی برآمد ہوئے ہیں جو ملک کی سالمیت اور خودمختاری کے خلاف تھے۔ پولیس نے ابھی تک ان خطوط کی وضاحت نہیں کی ہے، ابھی مزید انکشافات کی توقع ہے۔ پولیس کے اس آپریشن کی نگرانی آئی جی عبداللہ جان نے خود کی ہے۔

پھر نیوز کاسٹر نے وہاں موجود اپنے نمائندے سے بات کی۔ اس دوران میں مسکین شاہ کی گرفتاری کے مناظر دکھائے جاتے رہے۔ مجھے ان مناظر میں ناصر بھی نظر آیا جو عبداللہ جان صاحب کے ساتھ ساتھ تھا اور اپنے مووی کیمرے سے فلم بنا رہا تھا۔

میں نے جیب سے سیل فون نکال کر غنی کا نمبر ڈائل کیا۔ اس نے فوراً ہی کال ریسیو کر لی۔

''غنی! وہاں کیا صورتِ حال ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''سر، یہاں تو ابھی تک سکون ہے، ہم تینوں ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر رہ کر گھمن کے بنگلے کی نگرانی کر رہے ہیں لیکن ابھی تک وہاں سے کوئی باہر نہیں نکلا ہے۔''

''گھمن خود کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ تھوڑی دیر پہلے اپنے بنگلے میں داخل ہوا ہے۔'' غنی نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے، تم نگرانی جاری رکھو اور کسی بھی غیر معمولی صورتِ حال کے پیدا ہوتے ہی مجھے فوراً اطلاع کرو۔''

''او کے سر!'' غنی نے مستعدی سے جواب دیا۔

''کیا صورت ہے گجرات میں؟'' راجا نے پوچھا۔

''وہاں ابھی تک تو سکون ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

ہم لوگ ٹی وی لاؤنج میں بیٹھے تھے کہ شہناز، عبداللہ جان کی بیگم کے ساتھ وہاں آ گئی۔

''شہناز!'' میں نے کہا۔ ''تم نے میرے ساتھ اچھا نہیں کیا۔''

''اگر میں ایسا نہ کرتی تو اب تک تمہارا بلڈ پریشر واقعی بہت بڑھ چکا ہوتا۔''

''تو کیا اس وقت میرا بلڈ پریشر نارمل تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''کچھ زیادہ تھا۔'' شہناز نے کہا۔

''اچھا تو وہ ضروری کام یہ تھا۔'' بیگم عبداللہ جان نے ہنس کر کہا۔ ان کا اشارہ ٹی وی کی طرف تھا جس کی اسکرین پر عبداللہ جان صاحب نظر آ رہے تھے۔

''جی ہاں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''اس بگلا بھگت کے خلاف ثبوت اکٹھے کرنے میں مجھے دانتوں پسینا آ گیا ہے بھابی!'' میں نے کہا۔

''مجھے پہلے ہی اندازہ تھا کہ اس کے خلاف آپ ہی نے عبداللہ صاحب کو ثبوت بتائے ہوں گے ورنہ وہ یوں اچانک واپس نہ جاتے۔'' وہ مسکرا کر بولیں۔ ''وہ تو کچھ دن آرام کی غرض سے آئے تھے۔ یوں بھی وہ اکثر کہتے رہتے تھے کہ اب تو ہم آرام ہی آرام کریں گے۔ یہ خبیث مسکین شاہ ہماری نوکری کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔''

''لیکن بھابی!'' راجا نے کہا۔ ''یہاں تو الٹا حساب ہو گیا۔''

اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے سیل فون جیب سے نکالا۔ اسکرین پر غنی کا نمبر تھا۔ میں بھابی سے معذرت کر کے باہر نکل آیا اور سیل فون کان سے لگا کر بولا۔ ''ہاں غنی!''

''سر! ابھی تھوڑی دیر پہلے گھمن کے گھر کوئی گاڑی میں آیا تھا۔ پھر میں نے دیکھا کہ دو آدمی میڈم نور کو اٹھا کر گاڑی تک لا رہے ہیں۔''

''تم نے یہ کیسے دیکھ لیا کہ وہ نور ہی ہے؟''

''میں گھمن کے بنگلے کے سامنے ایک گھنے درخت پر چڑھا ہوا ہوں، میرے پاس ایک طاقت ور دوربین بھی ہے۔ یہاں سے گھمن کے بنگلے کا اندرونی منظر بھی نظر آ رہا ہے۔''

''وہ نور کو اٹھا کر کیوں لا رہے تھے۔ کیا اس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے؟'' میں نے پوچھا۔

''جی سر!'' غنی نے جواب دیا۔ ''ان کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے ہیں لیکن وہ ہوش میں ہیں۔ وہ گاڑی اب بنگلے سے باہر آ رہی ہے۔ میں بھی درخت سے اتر رہا ہوں۔'' غنی نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

زندگی میں شاید یہ پہلا موقع تھا جب غنی کی طرف سے سلسلہ منقطع ہوا تھا لیکن یہ اس کی مجبوری تھی۔

راجا بھی میرے پیچھے پیچھے کمرے سے باہر آ گیا تھا۔ میں نے اسے بھی نئی صورتِ حال کے بارے میں بتایا۔

''اس کا مطلب ہے کہ ہمارا اندیشہ درست تھا۔'' راجا نے کہا۔

''یار، اب غنی اور احمد شاہ کامیابی سے ان لوگوں کا

تعاقب کریں ورنہ اس مرتبہ ہم نے نور کا سراغ کھویا تو دوبارہ اس سے بھی زیادہ دشواری پیش آئے گی۔''

اس وقت پھر میرے سیل فون کی گھنٹی بجی۔ اسکرین پر سرور کا نام تھا۔

''بولو سرور!'' میں نے کہا۔

''سر! ہم لوگ بہت کامیابی سے اس گاڑی کا پیچھا کر رہے ہیں۔ غنی اس وقت ڈرائیونگ کر رہا ہے اس لیے میں آپ سے بات کر رہا ہوں۔''

''گاڑی میں کتنے آدمی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ بڑی ویگن ہے۔ اس میں کم سے کم چھ آدمی تو ہوں گے۔'' سرور نے کہا۔ ''ڈرائیور سمیت سات آدمی ہیں سر!'' پھر وہ کچھ توقف کے بعد بولا۔ ''سر! کیا ہم لوگ اس گاڑی کو روکنے کی کوشش کریں؟''

''ابھی اس قسم کی کوئی حماقت مت کرنا۔'' میں نے کہا۔

''سر! ہم ان لوگوں کو بہت آسانی سے گھیر سکتے ہیں۔'' سرور نے کہا۔

''میں جانتا ہوں کہ تم انہیں گھیر سکتے ہو لیکن میں اس کا بالکل مشورہ نہیں دوں گا۔ اس سے نور کو بھی نقصان پہنچ سکتا ہے۔ تم ایسی کوئی حرکت نہیں کرو گے، بس خاموشی سے اس گاڑی کا تعاقب کرتے رہو اور صرف یہ معلوم کرلو کہ وہ لوگ نور کو لے کر کہاں جاتے ہیں؟''

''او کے سر!'' سرور نے جواب دیا۔

ہم لوگ ایک مرتبہ پھر ٹی وی کے سامنے آگئے۔

دوبارہ بلیٹن شروع ہوا تو اس میں ایک نئی خبر تھی۔ پولیس نے گجرات کے ایک صنعت کار اشفاق گھمن کے بنگلے پر چھاپا مارا ہے۔ وہاں سے پولیس کو کوئی قابل اعتراض چیز نہیں ملی لیکن مسکین شاہ کے بنگلے سے گھمن شاہ کے خلاف کچھ ایسے شواہد ملے ہیں کہ پولیس نے اشفاق گھمن کو حراست میں لے لیا ہے۔ انہیں پولیس کی ایک خصوصی ٹیم نے گرفتار کیا ہے جس کی قیادت ایس ایس پی ظفر کر رہے تھے۔ مزید انکشافات کی توقع ہے۔''

''اب سمجھ میں آیا کہ گھمن نے فوری طور پر نور کو وہاں سے منتقل کیوں کر دیا۔'' میں نے کہا۔

''اسے اطلاع مل گئی ہوگی کہ لاہور سے پولیس کی ایک ٹیم اس کے بنگلے پر چھاپا مارنے آرہی ہے، اس نے فوری طور پر ہر قابل اعتراض چیز وہاں سے ہٹا دی۔ نور کو بھی اس نے رانا کے کسی آدمی کے حوالے کیا ہوگا یا پھر اسی کے آدمی اسے کہیں لے جا رہے ہوں گے۔''

''یار، میرا خیال ہے کہ ہمیں رانا کے بنگلے کی بھی نگرانی کرنا چاہیے۔ یقیناً پولیس کو اس کے خلاف بھی کوئی ثبوت ملا ہوگا۔'' راجا نے کہا۔

''ہمارے نگرانی کرنے سے کیا ہوگا؟'' میں نے کہا۔

''پولیس کو ثبوت ملا ہوگا تو وہ رانا کو چھوڑے گی نہیں کیونکہ اب یہ گرفتاریاں رک نہیں سکتیں۔''

''میں ناصر سے معلوم کرتا ہوں کہ وہاں سے کس کس کے خلاف ثبوت ملے ہیں؟'' راجا نے کہا۔ ''اسے ضرور علم ہوگا۔''

اس نے جیب سے سیل فون نکالا اور ناصر کا نمبر ڈائل کرنے لگا، پھر جھنجلا کر بولا۔ ''اس مردود کا نمبر بھی مصروف ہے، اس سے پہلے دو دفعہ کوشش کر چکا ہوں لیکن ہر بار یہی جواب ملا ہے کہ آپ کا مطلوبہ نمبر کسی اور لائن پر مصروف ہے۔'' راجا نے منہ بنا کر کہا۔

اسی وقت میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ اسکرین پر ناصر کا نام تھا۔

''ہاں ناصر!'' میں نے سیل فون کان سے لگا کر کہا۔

''پولیس نے ابھی تھوڑی دیر پہلے گھمن کو گرفتار کیا ہے لیکن نور وہاں سے برآمد نہیں ہوئی۔'' ناصر نے کہا۔

''اس الو کے پٹھے نے نور کو اس سے پہلے ہی اپنے بنگلے سے نکال دیا تھا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے، غنی اور سرور اس گاڑی کا تعاقب کر رہے ہیں جس میں نور کو وہاں سے لے جایا گیا ہے۔''

''غنی اور سرور؟'' ناصر نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں، مجھے پہلے ہی خدشہ تھا کہ شاہ جی کے گرفتار ہونے کے بعد اچھی خاصی ہلچل مچے گی۔ نور گھمن کی تحویل میں ہے تو وہ بھی یقیناً شاہ جی کا وفادار ہوگا۔ میں نے غنی، سرور اور احمد شاہ کو پہلے ہی گجرات روانہ کر دیا تھا۔''

''یہ آپ نے بہت زبردست کام کیا ہے سر!'' ناصر نے کہا۔

''تم یہ بتاؤ کہ شاہ جی کے بنگلے سے اور کتنے لوگوں کے خلاف ثبوت و شواہد ملے ہیں؟''

''کئی بڑے نام ہیں، ان میں دو ایس پی اور دو تین بیوروکریٹس بھی ہیں۔''

''پولیس کو وہاں سے رانا کے خلاف بھی کوئی ثبوت ملا ہے؟''

''حیرت انگیز بات تو یہ ہے کہ وہاں سے رانا کے

خلاف کوئی ثبوت نہیں ملا۔'' ناصر نے کہا۔

''اچھا تم ہم سے رابطے میں رہو۔ راجا بہت جھنجلایا ہوا ہے، وہ کئی دفعہ تمہیں کال کر چکا ہے لیکن تمہارا نمبر ہر دفعہ مصروف ہی ملتا ہے۔''

''اب حماقت کا تو میرے پاس کوئی علاج نہیں ہے سر!'' ناصر نے کہا۔ ''راجا کے پاس میرا وہ نمبر بھی ہے جو آپ کے پاس ہے، وہ نمبر مخصوص افراد کے لیے ہے اس لیے وہ بہت کم مصروف ہوتا ہے، راجا کو میرا وہ فون نمبر یاد نہیں؟''

''میں اسے یاد دلا دوں گا۔'' یہ کہہ کر میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

''کیا فرما رہے تھے دنیا کے عظیم جرنلسٹ؟'' راجا نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

میں نے اسے ساری گفتگو بتائی تو وہ بھی دیر تک اپنی حماقت پر ہنستا رہا، پھر سنجیدہ ہو کر بولا۔ ''دیکھے پتر! یہ بڑی عجیب بات ہے کہ پولیس کو شاہ جی کے بنگلے سے رانا کے خلاف کوئی ثبوت نہیں ملا۔''

''اسی سے اندازہ لگاؤ کہ رانا کتنا چالاک اور محتاط آدمی ہے۔'' میں نے کہا۔

میرے سیل فون کی گھنٹی پھر بجنے لگی۔ اسکرین پر سرور کا نام تھا۔

میں نے کال ریسیو کرنے کے بعد پوچھا۔ ''ہاں سرور؟''

''سر! ہم لوگ اس گاڑی کے پیچھے اس وقت جی ٹی روڈ پر چل رہے ہیں۔''

''جی ٹی روڈ پر؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''یس سر!'' سرور نے جواب دیا۔ ''اس گاڑی کا رخ لاہور کی طرف ہے۔''

''تم لوگ اس وقت کہاں ہو؟''

''ہم سرائے عالم گیر پہنچنے والے ہیں۔'' سرور نے جواب دیا۔ ''غنی نے گاڑی کے ہیڈ لیمپس بند کر رکھے ہیں اور اندھیرے میں اس گاڑی کا پیچھا کر رہا ہے۔ جی ٹی روڈ کی وجہ سے ہمیں بہت آسانی ہے، اس روڈ کے تو ایک ایک پتھر سے ہماری واقفیت ہے۔ غنی تو اس سڑک پر آنکھیں بند کر کے ڈرائیونگ کر سکتا ہے۔''

''اس سے کہنا کہ اس وقت آنکھیں کھلی ہی رکھے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''جی سر!'' سرور بھی ہنسنے لگا۔

"مجھ سے رابطے میں رہو اور بتاتے رہو کہ گاڑی کس طرف جا رہی ہے۔"

"او کے سر!" سرور نے جواب دیا۔

میں نے سلسلہ منقطع کر کے راجا کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

"یار تیکھے!" راجا نے کہا۔ "وہ لوگ نور کو کہیں لاہور تو نہیں لے جا رہے؟"

"ممکن ہے۔" میں نے کہا۔ پھر اچانک میرے ذہن میں ایک خیال آیا۔ "راجا! ہم اگر اپنے لوگوں کے ساتھ جی ٹی روڈ ہی پر اس گاڑی کو روک لیں تو؟"

راجا اچھل پڑا۔ "ہاں یہ ہو سکتا ہے۔" اس نے کہا۔

"ہم غنی سے کہیں گے کہ جب وہ گاڑی دینہ پہنچنے والی ہو تو ہمیں اطلاع کر دے۔ تو سرور سے گاڑی کا میک، ماڈل اور رجسٹریشن نمبر پوچھ لے۔ ہم کسی طرح سڑک بلاک کر دیں گے۔ پھر ان لوگوں کو بہت اطمینان سے گھیر لیں گے، وہ واپس جانے کی کوشش کریں گے تو پیچھے سے غنی اور سرور انہیں گھیر لیں گے۔"

"چل پھر اٹھ۔" میں نے کہا۔ "ہم ابھی سے وہاں پہنچ کر راستہ بلاک کرنے کا بندوبست کرتے ہیں۔"

میں نے کمرے میں آ کر تیزی سے لباس تبدیل کیا۔ سردی بڑھتی جا رہی تھی اس لیے میں نے جیکٹ پہن کر اس کی زپ بند کر لی۔ اپنے ریوالور چیک کیے اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

راجا بھی تیار ہو کر باہر نکل چکا تھا۔

ہم دونوں تیزی سے صوبیدار میجر صاحب کے پاس پہنچے اور انہیں اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔ درمیان میں راجا نے انہیں شاہ جی کی گرفتاری کے بارے میں بتایا تھا۔ باقی تفصیل وہ ٹی وی پر دیکھ چکے تھے۔

"سڑک کے درمیان میں اگر ایک گاڑی بھی کھڑی کر دی جائے تو ان کا راستہ بلاک ہو جائے گا۔ ہم لوگ وہاں آس پاس جھاڑیوں میں اپنے گارڈز کو چھپا سکتے ہیں، ان کی گاڑی کی رفتار سست ہوتے ہی ہمارے آدمی اس پر فائرنگ شروع کر دیں۔ انہیں سنبھلنے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔"

"لیکن اس طرح نور کو بھی نقصان پہنچ سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"بھئی، اب یہ رسک تو ہمیں لینا پڑے گا۔" صوبیدار میجر صاحب نے کہا۔ "ہاں، ہم اپنے گارڈز کو ہدایات دے سکتے ہیں کہ وہ صرف گاڑی کے ٹائروں پر فائرنگ کریں، گاڑی کے اوپری حصے میں فائر نہ کریں، یوں بھی نور کیونکہ لیٹی ہوئی ہے اس لیے قدرے محفوظ ہے۔"

"مجھے کم سے کم چار بہترین گارڈز چاہئیں۔" میں نے کہا۔ "ایسے گارڈز جو سرور، احمد شاہ اور غنی کے ہم پلہ ہوں۔"

"ان جیسے گارڈز تو نہیں مل سکتے۔" صوبیدار میجر صاحب نے بہت صاف گوئی سے کہا۔ "ہاں، ہمارے پاس بہت بہترین نشانے باز ہیں، فوری طور پر ہمیں نشانے بازوں ہی کی ضرورت پڑے گی، پھر غنی اور سرور وغیرہ بھی پہنچ جائیں گے تو ہماری نفری دوگنی ہو جائے گی۔"

انہوں نے انٹرکام پر کسی سے کہا۔ "احمد، علی، اجمل خان اور مشتاق کو بھیج دو۔"

تھوڑی دیر بعد وہ چاروں میرے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔ وہ سب کے سب احمد شاہ کی طرح چاق و چوبند تھے۔

میں نے انہیں اپنی مہم کے بارے میں بتایا اور ان سے کہا کہ ضروری انتظامات کر کے مجھے بتاؤ۔

"کتنی دیر میں تیار ہو جاؤ گے؟" میں نے ان سے پوچھا۔

"پندرہ منٹ میں سر!" ان میں سے ایک نے جواب دیا۔

"نہیں، صرف دس منٹ!" میں نے کہا۔

"او کے سر!" اس نے جواب دیا اور وہ چاروں تیزی سے باہر نکل گئے۔

"ان سب میں سینئر موسٹ علی حسن ہے۔" صوبیدار میجر صاحب نے کہا۔ "آپ اسی کا سیل نمبر لے لیں اور اسے تاکید کر دیں کہ وہ آپ سے رابطے میں رہے۔" صوبیدار میجر صاحب یوں ہدایات دینے لگے جیسے دشمن کے کسی مورچے پر قبضہ کرنے کی بات کر رہے ہوں۔

دس منٹ سے بھی کم عرصے میں وہ لوگ تیاری کر کے آ گئے۔

"گاڑی کون سی لے جا رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"سر! ایسے موقعوں پر ڈبل کیبن پک اپ ہی بہترین ہوتی ہے۔"

"ٹھیک ہے، تم لوگ جی ٹی روڈ تک پہنچو۔ ہم تمہارے پیچھے آ رہے ہیں۔ ہاں علی حسن! تم اپنا سیل نمبر مجھے دے دو۔ تم اس ٹیم کے لیڈر ہو، میں تم ہی سے رابطے میں

رہوں گا۔"

"او کے سر!" علی حسن نے کہا۔ "میں آپ کے سیل فون پر کال کر دیتا ہوں۔ آپ میرا نمبر محفوظ کر لیں۔"

☆☆☆

ہمیں جی ٹی روڈ پر پہنچے پون گھنٹا ہو چکا تھا۔ سردی کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔

میرے گارڈز دو دو کی ٹکڑیوں میں سڑک کی دونوں طرف موجود تھے۔ ڈبل کیبن پک اپ اس وقت ایک طرف کھڑی ہوئی تھی۔ اچانک میرے سیل فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ دوسری طرف سرور تھا۔ میں نے سیل فون کان سے لگاتے ہوئے پوچھا۔ "کہاں تک پہنچے ہو سرور؟"

"سر، جی ٹی روڈ سے وہ گاڑی اچانک رانا زوہیب کی جاگیر کی طرف مڑ گئی ہے۔" سرور نے جواب دیا۔

میں چونک اٹھا۔ "رانا کی زمینوں کی طرف!" میں نے ایک مرتبہ پھر اس خبر کی تصدیق کرنا چاہی۔

"یس سر!" اچانک دوسری طرف غنی لائن پر آ گیا۔ "مجھے یہاں سے رانا زوہیب کی حویلی صاف دکھائی دے رہی ہے۔"

"وہ گاڑی کہاں گئی جس کا تم لوگ تعاقب کر رہے تھے؟"

"وہ گاڑی ابھی ابھی رانا کی حویلی میں داخل ہوئی ہے۔"

"ٹھیک ہے، تم وہیں ٹھہرو، میں آ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

میں نے اس وقت اچانک ہی رانا کی حویلی میں گھسنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے ایک گارڈ کو بلایا اور اس سے کہا۔ "تم اسی وقت حویلی جاؤ اور صوبیدار میجر صاحب سے کہنا کہ حویلی میں جتنے بھی گارڈز ہیں، سب کو لے کر رانا زوہیب کی حویلی کی طرف پہنچیں۔ ہم لوگ اسی طرف جا رہے ہیں۔"

گارڈ فوراً ہی واپس چلا گیا۔

میں نے اسے آواز دے کر روکا اور کہا۔ "گاڑی لے کر جاؤ۔ کیا حویلی تک پیدل ہی جاؤ گے؟"

وہ گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔

"تیکھے پتر! تو کیا پاگل ہو گیا ہے یا اپنی زندگی سے بے زار ہو گیا ہے جو یوں خودکشی کرنے چلا ہے؟"

"میں اور برداشت نہیں کر سکتا راجا!" میں نے کہا۔ "اور تجھے اگر میرے ساتھ نہیں جانا ہے تو بھی حویلی چلا جا۔"

"تیری عقل شاید گھاس چرنے چلی گئی ہے۔" راجا نے کہا۔ "میں تجھے یوں خودکشی نہیں کرنے دوں گا۔"

اسی وقت سڑک پر دور سے روشنیاں نمودار ہوئیں جو بہت تیز رفتاری سے ہماری ہی طرف آ رہی تھیں۔

میں اور راجا سڑک کے کنارے ہی کھڑے تھے۔

مجھے دور سے اندازہ ہو گیا تھا کہ آنے والی ایک نہیں بلکہ کئی گاڑیاں ہیں۔

سب سے آگے والی گاڑی کے ہیڈ لیمپس کی روشنی مجھ پر پڑی تو میں ایک لمحے کے لیے گویا اندھا ہو گیا۔ میری آنکھیں اس تیز روشنی میں چندھیا کر رہ گئی تھیں۔

وہ گاڑی اچانک میرے سامنے آ کر ٹھہر گئی۔ میرے دل میں پہلا خیال یہی آیا کہ آنے والے دشمن ہیں۔ اچانک گاڑی کے ہیڈ لیمپس بند ہو گئے۔ پھر اس میں سے جو شخص اترا، اسے دیکھ کر مجھے خوش گوار حیرت ہوئی۔ پیچھے والی گاڑیوں کی روشنی میں مجھے ناصر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ عبداللہ جان صاحب بھی تھے۔

"نواب صاحب!" عبداللہ جان نے کہا۔ "آپ اس وقت یہاں کیا کر رہے ہیں؟"

"سر!" ناصر نے کہا۔ "خیریت تو ہے؟"

میں نے ان لوگوں کو بتایا کہ میں یہاں کیوں کھڑا ہوں؟

"لیکن آپ لوگ تو لاہور میں تھے؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "آپ لوگ یہاں کیسے؟"

"میں اس وقت تمہارے سب سے بڑے دشمن رانا زوہیب کی حویلی پر چھاپا مارنے جا رہا ہوں۔" عبداللہ جان صاحب نے کہا۔ "اس کے خلاف تو ایسے ناقابلِ تردید ثبوت ملے ہیں کہ وہ سیدھا پھانسی کے تختے پر جائے گا۔"

"لیکن ناصر! تم تو کہہ رہے تھے کہ......"

"مجھے بھی اس وقت تک علم نہیں تھا سر!" ناصر نے کہا۔ "بلکہ مجھے کیا، اس وقت تک تو عبداللہ جان صاحب کو بھی علم نہیں تھا۔"

"چلیں پھر میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "بس مجھے یہ خدشہ ہے کہ وہاں نور بھی ہے، رانا زوہیب اسے کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔"

"نواب صاحب!" عبداللہ صاحب نے کہا۔ "جس اللہ نے اب تک اس کی حفاظت کی ہے، وہی اب

بھی کرے گا۔"

میں نے سیل فون نکال کر صوبیدار میجر صاحب کا نمبر ڈائل کیا لیکن ان کا نمبر آف تھا۔ زیادہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ میں اپنی پراڈو میں سوار ہوا۔ راجا میرے ساتھ تھا، پھر ہم بھی اس قافلے میں شامل ہو گئے۔

☆☆☆

ہم لوگ رانا زوہیب کی حویلی پر پہنچے تو اس کا بلند و بالا پھاٹک بند تھا۔ عبداللہ جان صاحب نے کئی دفعہ ہارن بجایا تو ایک شخص نے پھاٹک کی ذیلی کھڑکی کھولی اور بولا۔ "کون ہے بابا؟"

"دروازہ کھولو۔" ایک انسپکٹر نے ڈپٹ کر کہا۔

"پولیس!"

"پولیس کا یہاں کیا کام؟" اس نے خمار آلود آواز میں کہا۔ وہ شاید سو رہا تھا۔

"دروازہ کھولو۔" انسپکٹر نے ڈپٹ کر کہا۔

"میں ایسے دروازہ نہیں کھول سکتا۔" اس نے کہا۔

"دروازہ کھولو ورنہ، ہم اسے توڑ دیں گے۔"

"توڑ دیں۔" اس نے بے نیازی سے کہا اور ذیلی کھڑکی دوبارہ بند کر دی۔

انسپکٹر نے پولیس کے دو جوانوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے اپنی رائفلوں کے کندوں سے دروازے پر زوردار انداز میں دستک دی۔

چند منٹ بعد ذیلی کھڑکی پھر کھلی، اس مرتبہ وہاں ایک نیا چہرہ نظر آیا۔ "کیا بات ہے؟" اس نے قدرے نرم لہجے میں پوچھا۔

"پولیس!" انسپکٹر نے صرف ایک لفظ کہا۔

"آپ کے پاس حویلی میں داخلے کا وارنٹ ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہمارے پاس خانہ تلاشی کا وارنٹ ہے۔" انسپکٹر نے جواب دیا۔

احمد شاہ نہ جانے کب اور کس طرح خاموشی سے وہاں پہنچ گیا اور اچھل کر اچانک اس شخص کی گردن دبوچ لی، پھر اسے اسی کھڑکی کے راستے باہر نکال لیا۔

"یہ... یہ کیا حرکت ہے؟" وہ برہم ہو کر بولا۔

"تمہیں وارنٹ دیکھنا ہے نا!" انسپکٹر نے کہا۔ "دیکھو وارنٹ!" اس نے ایک چھپا ہوا کاغذ اس کی طرف بڑھایا۔

حویلی کے پھاٹک پر اتنی تیز روشنی ہو رہی تھی کہ وہاں اردگرد دن کا سا سماں تھا۔

اس نے وارنٹ پر ایک نظر ڈالی پھر بولا۔ "آپ مجھے چھوڑیں، میں اندر جا کر دروازہ کھلواتا ہوں۔"

"دروازہ تو آپ یہاں سے بھی کھلوا سکتے ہیں۔" انسپکٹر نے کہا۔

"اگر یہ دروازہ نہ کھولے تو اسے گولی مار کے ایک طرف پھینک دو۔" عبداللہ صاحب نے درشت لہجے میں کہا۔

"بہت بہتر آئی جی صاحب!" انسپکٹر نے کہا اور اچانک اپنا سروس ریوالور نکال لیا۔

"آئی...... جی...... صاحب!" وہ آدمی حیرت سے بولا۔ "تو کیا آئی جی صاحب خود یہاں آئے ہیں؟"

"ہاں۔" انسپکٹر نے کہا۔ "اور پولیس نے اس حویلی کو ہر طرف سے گھیر لیا ہے۔ دروازہ کھولو ورنہ......" اس نے اپنا جملہ ادھورا چھوڑ کر ریوالور کی نال اس شخص کی طرف کر دی۔

"دروازہ کھول دو۔" اس نے بلند آواز میں کہا۔

فوراً ہی وہ بلند و بالا دروازہ کھل گیا جسے توڑنے کے لیے شاید بلڈوزر کی ضرورت پڑتی۔ وہ اتنا ہی مضبوط اور بھاری دروازہ تھا۔

دروازہ کھلتے ہی پولیس کی گاڑیاں اندر داخل ہو گئیں اور بہت سے جوان پیدل ہی اندر کی طرف دوڑے۔

میں نے بھی اپنی گاڑی حویلی کے باہر چھوڑی اور اندر کی طرف دوڑا۔

غنی، سرور اور احمد شاہ سائے کی طرح میرے ساتھ تھے۔

وہاں عجیب افراتفری کا سا سماں تھا۔ پولیس والوں کی چیخ پکار اور بھاگ دوڑ، حویلی میں موجود لوگوں کی گرفتاری۔ کسی کو کسی کا ہوش نہیں تھا۔

میں ایک برآمدے میں آگے کی طرف بڑھا۔ میں براہِ راست رانا کے کمرے میں پہنچنا چاہتا تھا۔

ایک ستون کی آڑ سے اچانک ایک آدمی نے سامنے آ کر میری پیشانی پر ریوالور کی نال رکھ دی اور بولا۔ "رانا کا تو جو بھی حشر ہو لیکن میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا نواب رفیق!"

"کون ہو تم؟" میں نے درشت لہجے میں پوچھا۔

"میں تیری موت ہوں، میرا نام دلاور ہے، دلاور!" اس نے یوں کہا جیسے موت کے فرشتے کا نام واقعی دلاور ہو۔

میں نے غور سے اسے دیکھا، وہ بھاری بھرکم جسم کا

دراز قد شخص تھا۔ چہرے پر بڑی بڑی مونچھیں پال رکھی تھیں اور اس کا رنگ سرخ و سفید تھا۔

"غور سے دیکھ لے۔" اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"تو کہہ رہا ہے کہ تو میری موت ہے؟" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "حالانکہ تیری موت تو تیرے پیچھے کھڑی ہوئی ہے۔" میں نے گھسا پٹا حربہ آزمایا لیکن اس پر ذرا بھی اثر نہ ہوا۔

"اب مرنے کے لیے تیار ہو جا!" اس نے کہا۔

میں اچانک نیچے بیٹھ گیا اور اس کا ریوالور والا ہاتھ دونوں ہاتھوں سے تھام کر اس کا رخ چھت کی طرف کر دیا۔ پھر میں نے اس کی ناف پر گھٹنے سے زوردار ضرب لگائی۔

اچانک ایک فائر ہوا اور گولی دلاور کے سینے میں پیوست ہو گئی۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔ وہاں غنی کھڑا تھا۔ سرور اور احمد شاہ اس سے کچھ فاصلے پر تھے۔

تو یہ تھا دلاور! میں نے سوچا۔ اونہہ، اتنا غرور، اتنا تکبر! آدمی بلبلہ ہے پانی کا! ریوالور کی چھوٹی سی ایک گولی نے اس کی عظمت کا بت پاش پاش کر دیا اور اسے موت کی اندھی وادیوں میں دھکیل دیا۔

وہاں طویل کوریڈور تھا۔ اس میں دونوں طرف کمرے تھے۔ میں نے ایک کمرے کے دروازے کو دھکیلا تو وہ کھلتا چلا گیا۔

اندر ایک لڑکی سہمی ہوئی کھڑی تھی۔ اس کی عمر مشکل سے پندرہ سال ہو گی۔

"دیکھو...... مجھے مت مارو...... مجھے مت مارو۔" وہ ہذیانی انداز میں بولی۔

"کون ہو تم؟" میں نے ڈپٹ کر پوچھا۔

"میں رانا صاحب کی بیوی ہوں۔"

"تم...... تم رانا کی بیوی ہو؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "رانا کہاں ہے؟"

"وہ بڑی بیگم کے کمرے میں ہوں گے یا پھر...... تہ خانے میں ہوں گے۔"

"میرے ساتھ چلو۔" میں نے کہا۔ "مجھے بڑی بیگم کے کمرے کا راستہ دکھاؤ۔"

ہم لوگ کوریڈور میں آگے بڑھے تو مجھے وہاں ناصر اور پولیس کے چند جوان دکھائی دیے۔ ان لوگوں نے مجھے بھی گرفتار کرنا چاہا لیکن ناصر نے انہیں روک دیا اور بولا۔ "یہ تو آئی جی صاحب کے ساتھ ہی آئے ہیں۔"

ہم لوگ اس لڑکی کی راہنمائی میں بڑی بیگم کے کمرے تک پہنچے لیکن کمرا خالی تھا۔

"یہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

اچانک کمرے میں ایک اور لڑکی داخل ہوئی۔ اس کی عمر بھی سولہ سترہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اس کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ اس نے دہشت زدہ لہجے میں کہا۔ "رانا بڑی بیگم کے ساتھ تہ خانے میں چلا گیا ہے، اگر آپ کو اس کی تلاش ہے تو میرے ساتھ آئیں، جلدی کریں ورنہ وہ چور راستے سے فرار ہو جائے گا۔"

ہم اس لڑکی کے پیچھے تقریباً بھاگتے ہوئے ایک طرف روانہ ہو گئے، ایک طرف مجھے عبداللہ جان صاحب دکھائی دیے۔ انہوں نے مجھے آواز دی لیکن میں رکا نہیں۔

وہ لڑکی ایک بیڈروم میں پہنچی جہاں بڑی سی ایک الماری میں تہ خانے کا راستہ تھا۔ اس نے تہ خانے کی طرف اشارہ کیا۔ مجھ سے پہلے غنی کود کر اس میں داخل ہو گیا۔ اس کی تقلید میں سرور اور احمد شاہ بھی کود گئے۔

میں تہ خانے میں داخل ہوا تو پیچھے سے پھر آئی جی صاحب کی آواز سنائی دی لیکن میں اس وقت تک تہ خانے میں اتر چکا تھا۔

کئی سیڑھیاں اترنے کے بعد میں تہ خانے میں پہنچا۔

میں ابھی وہاں پہنچا ہی تھا کہ مجھے سامنے ہی رانا نظر آیا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے رائفل کا رخ میری طرف کر دیا۔

"ہتھیار پھینک دو رانا!" پیچھے سے عبداللہ جان صاحب کی آواز آئی۔ "اب تم کسی بھی طرح بچ نہیں سکو گے۔"

رانا نے شکست خوردہ انداز میں رائفل پھینک دی۔

اس کے پیچھے نور پڑی تھی، اس کے ہاتھ پیر ابھی تک بندھے ہوئے تھے اور بال بری طرح الجھے ہوئے تھے۔

میں آگے بڑھا تو رانا نے نہ جانے کہاں سے ریوالور نکال لیا اور میری طرف نال کر کے بولا۔ "میں تو برباد ہو ہی گیا ہوں رفیق لیکن تجھے بھی زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" یہ کہہ کر اس نے ٹریگر دبا دیا۔ اچانک فائر ہوا لیکن ایک عورت اچھل کر میرے سامنے آ گئی۔ گولی اس کے سینے میں دھنس گئی۔ اس کے ساتھ ہی بہ یک وقت دو فائر ہوئے اور رانا کی کھوپڑی اڑ گئی۔

میں اس عورت کی طرف متوجہ ہوا جس نے میری طرف آتی ہوئی گولی کو اپنے سینے پر روک لیا تھا۔ وہ رابعہ تھی۔ میں نے حسرت اور بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔

"حیران کیوں ہو کزن؟" اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "میں نے بچپن سے تمہیں ٹوٹ کر چاہا لیکن...... لیکن تم...... دوسری...... دوسری......" اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی۔ اس کے چہرے پر ابھی تک مسکراہٹ تھی۔

میں نے اس کا سر آہستگی سے فرش پر رکھا اور بوجھل دل کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔

اس دوران میں احمد شاہ نے نور کے ہاتھ پیر کھول دیے تھے۔ وہ دیوانہ وار مجھ سے لپٹ گئی اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

"اب کیوں رو رہی ہو؟" میں نے کہا۔ "اب تو میں آ گیا ہوں۔"

☆☆☆

دوسرے دن کے اخبارات ایک نئی کہانی سے بھرے ہوئے تھے۔ رانا زوہیب اور بدنام زمانہ دہشت گرد اور اسلحے کے اسمگلر دلاور کی موت کا خصوصی طور پر تذکرہ تھا۔ رانا کی حویلی سے بھی تین اغوا شدہ لڑکیاں اور ڈھیروں ناجائز اسلحہ برآمد ہوا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ ایسے دستاویزی ثبوت بھی تھے جن سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ رانا اور مسکین شاہ پاکستان دشمنوں کے ہاتھوں میں کھیل رہے تھے۔

مجھے یہ سب کچھ ایک خواب لگ رہا تھا۔ میں نے غنی سے کہا۔ "غنی! اب تک ہم نے جتنے لوگوں کو بھی قید کر رکھا تھا، ان سب کو رہا کر دو۔"

غنی اسی وقت واپس چلا گیا۔

اسی وقت جمال خان شیردانی، ثمرہ اور ان کی بیگم حویلی میں داخل ہوئے۔ ان کے پیچھے پیچھے آفتاب خان، اس کی دونوں بیٹیاں اور بیوی بھی تھی، وہ سب مجھے مبارک باد دے رہے تھے۔

آخر میں ایک آدمی میری طرف بڑھا اور مجھ سے لپٹ گیا۔ یہ اکبر سندھو تھا۔ وہی اکبر سندھو جس نے مجھے نور کے بارے میں اطلاع دی تھی۔

نور بنی سنوری میرے ساتھ ہی بیٹھی تھی۔ جی ہاں، یہ ہماری شادی کی تقریب تھی۔ دوسری طرف شہناز اور راجا تھے۔ شہناز بھی دلہن کے لباس میں سکڑی سمٹی بیٹھی تھی۔ میرا پروگرام تھا کہ میں دوسرے دن دو ہفتے کے لیے لندن چلا جاؤں گا۔ پھر ہنی مون منانے کے بعد ہم لوگ واپس ست بدھائی آ جائیں گے۔ مجھے آخر الیکشن میں حصہ بھی تو لینا تھا۔

ختم شد